إرشاد السالکین إلیٰ ریاض الصالحین

المعروف به

حدیث کے اصلاحی مضامین

افادات

حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب

خانپوری دامت برکاتہم

شیخ الحدیث وصدر مفتی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین،ڈابھیل

ناشر

مکتبۂ محمودیہ، محمود نگر،ڈابھیل

اجمالی فہرست مضامین............جلد ۵

۱	مُلَاطَفَةُ الْيَتِيْمِ وَالْبَنَاتِ یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی	از ۳۳ تا ۱۰۳
۲	اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ عورتوں کے بارے میں تاکید	از ۱۰۵ تا ۲۱۷
۳	حَقُّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ شوہر کے حقوق	از ۲۱۹ تا ۲۴۲
۴	اَلنَّفَقَةُ عَلَى الْعِيَالِ اہل وعیال پر خرچ کرنا	از ۲۴۳ تا ۲۹۴
۵	اَلْاِنْفَاقُ مِمَّا يُحِبُّ وَمِنَ الْجَيِّدِ محبوب اور عمدہ چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا	از ۲۹۵ تا ۳۰۹
۶	وُجُوْبُ أَمْرِهٖ أَهْلَهٗ وَأَوْلَادَهُ الْمُمَيِّزِيْنَ تعلیم وتربیتِ اولاد	از ۳۱۱ تا ۳۵۰
۷	حَقُّ الْجَارِ وَالْوَصِيَّةُ بِهٖ پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید	از ۳۵۱ تا ۳۷۶

اجمالی فہرست مضامین......جلد ٦

١	بِرُّ الْوَالِدَیْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید	از ٢٩ تا ١١٤
٢	تَحْرِیْمُ عُقُوْقِ الْوَالِدَیْنِ وَقَطِیْعَةِ الرَّحِمِ والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے کی حرمت	از ١١٥ تا ١٣٦
٣	فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید	از ١٣٧ تا ١٥٨
٤	اِکْرَامُ أَهْلِ بَیْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَبَیَانِ فَضْلِهٖ اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت	از ١٥٩ تا ١٨٨
٥	تَوْقِیْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْکِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا	از ١٨٩ تا ٢٤٦
٦	زِیَارَةُ أَهْلِ الْخَیْرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا	از ٢٤٧ تا ٣١٨
٧	فَضْلُ الْحُبِّ فِی اللّٰهِ وَالْحَثِّ عَلَیْهِ اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید	از ٣١٩ تا ٣٧٠
٨	علامات حُبِّ اللّٰهِ تَعَالٰی الْعَبْدَ وَالْحَثِّ عَلَی التَّخَلُّقِ بِهَا اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب	از ٣٧١ تا ٤٠٥
٩	التَّحْذِیْرُ مِنْ اِیْذَآءِ الصَّالِحِیْنَ وَالضَّعَفَةِ وَالْمَسَاکِیْنَ نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا	از ٤٠٧ تا ٤٢٣

۱۰	اِجْرَآءُ أَحْکَامِ النَّاسِ عَلٰی الظَّاهِرِ وَسَرَائِرُهُمْ اِلٰی اللّٰهِ ظاہر کے مطابق معاملہ کرو۔ دل کا حال اللہ کے حوالے کرو	از ۴۲۵ تا ۴۴۴

صفحات	عنوانات	نمبر
	فہرست اخلاص النیۃ واستحضارھا ۱	
۱۷	عرض ناشر	۱
۱۸	مختصر تعارف امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (صاحبِ ریاض الصالحین)	۲
۲۲	تقریظ حضرت اقدس سید مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری نوراللہ مرقدہٗ	۳
۲۴	تقریظ حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور ادام اللہ فیوضہم بالعافیۃ التامۃ	۴
۲۵	تقریظ حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم بالعافیۃ التامۃ	۵
۲۷	تقریظ حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم بنارسی صاحب زیدمجدہم	۶
۲۹	تقریظ حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب زیدمجدہم	۷
۳۱	پس منظر	۸
۳۴	اقتباس	۹
۳۵	نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو	۱۰
۳۶	دل کا مقام اور اس کی اہمیت	۱۱
۳۹	نیت پر مدار کیوں؟	۱۲
۴۱	عمل کی قدر و قیمت نیت کے مطابق طے کی جائے گی	۱۳
۴۲	وانما لأمرئٍ مانویٰ کی تشریح	۱۴
۴۲	نیت عمل کی روح	۱۵
۴۴	بدنیتی کا وبال	۱۶
۴۶	اچھی نیت بغیر عمل کے بھی باعث ثواب ہے	۱۷

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۸	عادات کو عبادات بنانے کا نسخہ	۴۸
۱۹	ایک قصہ سے اس کی توضیح	۴۹
۲۰	ایک اور واقعہ	۵۲
۲۱	حدیث کی گواہی	۵۳
۲۲	نیت ایک پارس ہے	۵۴
۲۳	حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال	۵۵
۲۴	خلاصۂ کلام	۵۶
۲۵	نیت کے معاملہ میں ہماری کوتاہیاں	۵۷
۲۶	استحضارِ نیت حاصل کرنے کا ماثور طریقہ	۵۸
۲۷	اہل اللہ کے پاس آنا جانا کیوں؟	۵۹
۲۸	دعاؤں کا اہتمام بھی ضروری	۵۹
۲۹	دل کی مثال ٹنکی کی سی ہے	۶۰

فہرست اخلاص النیۃ واستحضارھا ۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۰	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کنیت	۶۲
۳۱	لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے	۶۳
۳۲	بروں کے ساتھ رہنے کی نحوست	۶۴
۳۳	جہاد اور نیت باقی ہے	۶۵
۳۴	وہ بھی چاہتے تھے	۶۶

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۵	معذوری کی وجہ سے سابقہ معمولات ادا نہ کرسکے تو؟	٦٦
۳٦	عذر نے ان کو روک رکھا	٦۷
۳۷	باپ کا صدقہ بیٹے کے پاس آیا	٦۷
۳۸	وصیت کے متعلق سوال	٦۸
۳۹	وصیت کتنی نافذ ہوگی؟	۷۰
۴۰	وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ	۷۰
۴۱	طبعی امور کو بھی عبادت بنایا جاسکتا ہے	۷۱
۴۲	جس شہر کو اللہ کی نسبت پر چھوڑا وہیں موت آئے؟	۷۲
۴۳	فاتحِ قادسیہ	۷۳
۴۴	بے چارہ سعد بن خولہ	۷۳
۴۵	ایک اشکال اور اس کا جواب	۷۴
۴٦	اللہ تعالیٰ جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتے	۷۵
۴۷	اللہ کے راستہ میں لڑنے والا کون ہوا؟	۷۵
۴۸	قاتل ومقتول دونوں جہنم میں	۷٦
۴۹	یادداشت	۷۸

فہرست اخلاص النیۃ واستحضارھا ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۵۰	نماز باجماعت کی فضیلت	۸۰
۵۱	فرشتوں کی آمین کا کیا ہوگا؟	۸۰

نمبر	عنوانات	صفحات
۵۲	جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ مل گئی	۸۱
۵۳	گھر سے وضو کر کے مسجد جانے کی فضیلت	۸۲
۵۴	اخلاصِ عمل پر یہ مقام عطا کیا گیا	۸۲
۵۵	نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا الٰہی نظام	۸۳
۵۶	ارادہ کیا؛ لیکن گناہ نہیں کیا تو؟	۸۵
۵۷	تین شخصوں کا غار میں پھنسنا اور کراماتی انداز سے بچ نکلنا	۸۵
۵۸	بوڑھے ماں باپ کا سعادت مند بیٹا	۸۷
۵۹	پرہیز گار عاشق	۸۸
۶۰	اگر صدیقین کا مقام چاہیے تو؟	۸۹
۶۱	امانت دار سیٹھ	۸۹
۶۲	دعا قبول کروانے کا ایک عمل	۹۰
۶۳	دعا	۹۰
۶۴	یادداشت	۹۴

فہرست توبہ ۱

۶۵	باب التوبۃ	۹۷
۶۶	پورے عالم میں فساد کی وجہ ''گناہ''	۹۷
۶۷	معلم الملائکہ سے شیطان لعین تک	۹۸
۶۸	مختلف قوموں کے مختلف عذاب	۹۸

نمبر	عنوانات	صفحات
٦٩	رسول ﷺ کے خوفِ خدا کی کیفیت	۹۹
۷۰	قومِ لوط کا عذاب	۱۰۰
۷۱	عذاب کس چیز کی نحوست تھی؟	۱۰۰
۷۲	حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کیوں غمگین تھے؟	۱۰۱
۷۳	گناہ کی نحوست روزی سے محرومی	۱۰۲
۷۴	زلزلہ کیوں آتا ہے؟	۱۰۲
۷۵	جب میری نافرمانی کی جاتی ہے	۱۰۲
۷۶	’’جزاء الاعمال‘‘ کا مطالعہ ضرور کیجئے	۱۰۳
۷۷	گناہوں کے نقصانات	۱۰۳
۷۸	ایک روایت	۱۰۴
۷۹	مقبولیت کا راز	۱۰۵
۸۰	مقبولیت اللہ کی طرف سے ہونے کی علامت	۱۰۵
۸۱	نیکیوں کے فوائد گناہوں کے نقصانات حبرُ الامۃؒ کی زبانی	۱۰۶
۸۲	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جسمانی قوت ان کے تقویٰ کا اثر تھی	۱۰۶
۸۳	بعض گناہ جو لعنت کا سبب بنتے ہیں	۱۰۷
۸۴	گیہوں کا ایک دانہ کھجور کی گٹھلی کے برابر	۱۰۸
۸۵	پوری روئے زمین میں بے برکتی صرف ایک گناہ کا اثر ہے	۱۰۸
۸۶	مستریح او مستراح منہ	۱۰۹

نمبر	عنوانات	صفحات
۸۷	گناہ کی وجہ سے مایوسی کا ’’ایک واقعہ‘‘	۱۱۰
۸۸	گناہ کی وجہ سے برے خاتمہ کا اندیشہ ’’چند قصے‘‘	۱۱۰
۸۹	دوسرا قصہ	۱۱۰
۹۰	تیسرا قصہ	۱۱۱
۹۱	چوتھا قصہ	۱۱۱
۹۲	دورِ نبوت کا عبرتناک واقعہ	۱۱۱
۹۳	صغیرہ کبیرہ کی تقسیم	۱۱۲
۹۴	کوئی گناہ چھوٹا نہیں	۱۱۲
۹۵	ان حضرات کی دلیل	۱۱۲
۹۶	ایک شیخ کا حکیمانہ جواب	۱۱۳
۹۷	امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ	۱۱۴
۹۸	ایک ظاہری مثال سے مضمون کی وضاحت	۱۱۵
۹۹	امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مع تشریح ’’توبہ کی حقیقت‘‘	۱۱۵
۱۰۰	گناہ کی دو قسمیں	۱۱۶
۱۰۱	توبہ کی شرطِ اول	۱۱۶
۱۰۲	ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج	۱۱۷
۱۰۳	جب مزاجِ یار......	۱۱۸
۱۰۴	محبوب العالمین ﷺ کی خفگی اور صحابی کی شانِ فدائیت	۱۱۹

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۰۵	محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی	۱۲۰
۱۰۶	عشق است و ہزار بدگمانی	۱۲۲
۱۰۷	مؤمنین کی محبت قرآن کی زبانی	۱۲۳
۱۰۸	تیسری شرط	۱۲۴
۱۰۹	حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا حکیمانہ نسخہ	۱۲۴
۱۱۰	اگر کوئی ایک شرط نہ پائی گئی	۱۲۶
۱۱۱	اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو؟	۱۲۶
۱۱۲	اجمالی معافی کافی نہیں	۱۲۶
۱۱۳	حقوق العباد کی معافی کا طریقہ	۱۲۷
۱۱۴	قیامت میں اعزہ ہی ساتھ چھوڑ دیں گے	۱۲۷
۱۱۵	حاجی معافی کس طرح مانگے؟	۱۲۸
۱۱۶	یادداشت	۱۳۰

فہرست توبہ ۲

۱۱۷	آنحضور ﷺ کیوں استغفار کرتے تھے	۱۳۲
۱۱۸	خادم رسول حضرت انس کے مختصر حالات	۱۳۳
۱۱۹	بندہ کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوتے ہیں	۱۳۵
۱۲۰	اللہ تعالیٰ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں	۱۳۶
۱۲۱	پھر اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی	۱۳۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۲۲	طلب علم کی فضیلت	۱۳۸
۱۲۳	موزوں پر مسح ثابت ہے	۱۳۹
۱۲۴	کوشش ہی علامت ہے محبت کے صحیح ہونے کی	۱۳۹
۱۲۵	لمْ اور لمّا کا فرق	۱۴۰
۱۲۶	توبہ کا دروازہ	۱۴۱
۱۲۷	مسئلہ پوچھنے کا ایک ادب	۱۴۱
۱۲۸	عالم اور عابد کا فرق	۱۴۲
۱۲۹	توبہ کے لئے ایک تدبیر	۱۴۳
۱۳۰	ندامت کے جذبے کی قدر و قیمت	۱۴۴
۱۳۱	اللہ تعالیٰ جب کسی کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو......	۱۴۵
۱۳۲	گناہوں کی کیا حیثیت ہے؟	۱۴۶
۱۳۳	شیطانی چال میں نہ آوے	۱۴۷
۱۳۴	آہِ سحر گاہی	۱۴۸

فہرست توبہ ۳

۱۳۵	جنگ تبوک	۱۵۰
۱۳۶	مدینہ منورہ کی صورت حال	۱۵۲
۱۳۷	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت	۱۵۳
۱۳۸	منافقین کی پول کھول دی	۱۵۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۳۹	اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اوپر رعب ڈال دیا	۱۵۳
۱۴۰	وہ تین جو جنگ سے غیر حاضر رہے	۱۵۴
۱۴۱	سرگذشت بزبان خود	۱۵۵
۱۴۲	بدر کی لڑائی	۱۵۵
۱۴۳	حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور بیعت عقبہ	۱۵۷
۱۴۴	تبوک کی لڑائی اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ	۱۶۰
۱۴۵	مجلس میں کسی مومن کی برائی کی جائے تو کیا کرے؟	۱۶۳
۱۴۶	تم تو اور کھولو گے	۱۶۴
۱۴۷	جنگ تبوک اور حضرت ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ	۱۶۵
۱۴۸	تبوک سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی واپسی	۱۶۶
۱۴۹	ناراضگی کی مسکراہٹ	۱۶۷
۱۵۰	معاملہ تو آپ کا ہے	۱۶۷
۱۵۱	کوئی بہانہ نہیں ہے	۱۶۸
۱۵۲	لوگوں نے بہت اکسایا	۱۶۹
۱۵۳	تینوں سے بائیکاٹ کا حکم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	۱۷۰
۱۵۴	حضراتِ صحابہ کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر عمل کا جذبہ	۱۷۱
۱۵۵	شاہِ غسان کی آفر (OFFER)	۱۷۲
۱۵۶	آفر (OFFER) کا منہ توڑ جواب	۱۷۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۵۷	ایک اور بڑی آزمائش	۱۷۳
۱۵۸	غم کی کیفیت	۱۷۴
۱۵۹	اے کعب! خوش ہو جاؤ	۱۷۵
۱۶۰	خوش خبری سنانے کے لئے جانا ثابت ہے	۱۷۵
۱۶۱	خوش خبری سنانے والے کو انعام دینا ثابت ہے	۱۷۶
۱۶۲	وصال کی لذت	۱۷۷
۱۶۳	حضور اکرم ﷺ کی خوشی کی کیفیت	۱۷۷
۱۶۴	خوشی میں آدمی سارا مال نہ دے ڈالے	۱۷۸
۱۶۵	توبہ کا تکملہ	۱۷۸
۱۶۶	پھر بھی اللہ تعالیٰ تو راضی نہیں ہوگا	۱۷۹

فہرست توبہ ۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۶۷	اسلامی سزاؤں کا اصلی چہرہ	۱۸۲
۱۶۸	ایک اہم اشکال	۱۸۶
۱۶۹	جواب	۱۹۰
۱۷۰	لالچ کسی حد پر نہیں ٹھہرتی ہے	۱۹۹
۱۷۱	لالچ کے نقصان سے اپنے آپ کو کیسے بچائے؟	۲۰۰
۱۷۲	توبہ کا کرشمہ	۲۰۰
۱۷۳	تاریخ میں اس کی مثال	۲۰۱

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۷۴	گنہ گار کے خلاف چار گواہ	۲۰۲
۱۷۵	قیامت کے دن کارروائیاں قانونی ہوں گی	۲۰۴
۱۷۶	توبہ کی اسپرٹ	۲۰۶
۱۷۷	حاکمین اور احکم الحاکمین میں فرق	۲۰۶
۱۷۸	سچی توبہ کے بعد اس گناہ کا تذکرہ بھی نہیں کرنا چاہیے	۲۰۷
۱۷۹	پلّے باندھنے کی بات	۲۰۷
۱۸۰	توبہ......راہِ سلوک کا پہلا قدم	۲۰۸
۱۸۱	اجمالی توبہ اور تفصیلی توبہ	۲۰۹
۱۸۲	حقوقِ واجبہ کی وصیت ضروری ہے	۲۱۰

فہرست صبر ۱

۱۸۳	صبر کے کچھ فضائل	۲۱۴
۱۸۴	صبر کا صحیح مفہوم	۲۱۵
۱۸۵	جلد بازی سے نماز ناقص رہ جاتی ہے	۲۱۶
۱۸۶	عقل کے تقاضے پر جمے رہنے کی مثال	۲۱۶
۱۸۷	امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت افشانی	۲۱۷
۱۸۸	موافق حالات میں صبر کی زیادہ ضرورت	۲۱۸
۱۸۹	مال میں صبر کی ضرورت	۲۱۸
۱۹۰	مال میں صبر کیسے حاصل ہو؟	۲۲۰

صفحات	عنوانات	نمبر
۲۲۰	اسراف منع ہے	۱۹۱
۲۲۱	وضو میں بھی اسراف ہے	۱۹۲
۲۲۲	خرچ کرنے اور نہ کرنے کا ایک بہترین اصول	۱۹۳
۲۲۳	چیزوں میں بھی ''لایعنی'' ہے	۱۹۴
۲۲۴	صبر کی ضرورت ہر جگہ	۱۹۵
۲۲۴	اولاد میں صبر کی ضرورت	۱۹۶
۲۲۵	تندرستی کا صحیح استعمال	۱۹۷
۲۲۶	مال کا صحیح استعمال	۱۹۸
۲۲۷	حساب کیوں؟	۱۹۹
۲۲۷	حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ اور حساب کتاب	۲۰۰
۲۲۸	مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں	۲۰۱
۲۲۸	صبر کی قسمیں	۲۰۲
۲۲۹	ناموافق حالات کی تین قسمیں	۲۰۳
۲۳۰	دوسری قسم	۲۰۴
۲۳۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر کا انداز	۲۰۵
۲۳۱	صبر سے اوپر کا درجہ	۲۰۶
۲۳۱	عام مزاج	۲۰۷
۲۳۲	حسن سلوک کا اثر......آج نہیں تو کل	۲۰۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۰۹	تیسری قسم ''صبر علی الطاعات''	۲۳۴
۲۱۰	نفس کی فطرت میں ربوبیت	۲۳۵
۲۱۱	ربوبیت کا ظہور	۲۳۵
۲۱۲	صبر عن المعاصی	۲۳۶
۲۱۳	غیبت آسان گناہ ہے لیکن تباہ کن	۲۳۶
۲۱۴	بدنگاہی آسان لیکن...... بڑی خطرناک	۲۳۷
۲۱۵	بدنگاہی سے کیسے بچا جائے؟	۲۳۹
۲۱۶	حقیقی بہادر	۲۴۰
۲۱۷	صبر؛ ایک عجیب وصف	۲۴۱
۲۱۸	مقام رضا	۲۴۱
۲۱۹	حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا خلاصہ	۲۴۲
۲۲۰	صبر روشنی ہے	۲۴۲
۲۲۱	درد بھری دعاء	۲۴۴

فہرست صبر ۲

۲۲۲	اچھے اوصاف حاصل کرنے کا طریقہ	۲۴۶
۲۲۳	قناعت کا نمک	۲۵۲
۲۲۴	مؤمن کے دونوں ہاتھ میں لڈو	۲۵۳
۲۲۵	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بے چینی	۲۵۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۲۶	طبعی تکلیف اور بناوٹی تکلیف	۲۵۷
۲۲۷	حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ	۲۶۰
۲۲۸	حضرت اسامہ بنِ زید رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب	۲۶۲
۲۲۹	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحبزادی کے نام تعزیت کا پیغام	۲۶۳
۲۳۰	عادت اور عبادت میں فرق	۲۶۴
۲۳۱	جوابی پیغام......صاحبزادی کا اصرار	۲۶۵
۲۳۲	دین دار لڑکے کی کرامت اور اس کی عجیب قربانی	۲۶۷

فہرست صبر ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۳۳	صبر کا صحیح وقت	۲۷۶
۲۳۴	محبوب کے انتقال پر صبر کی فضیلت	۲۷۹
۲۳۵	ہر نیک عمل میں حصولِ ثواب کا استحضار ضروری ہے	۲۸۱
۲۳۶	طاعون کافر کے لئے عذاب......مؤمن کیلئے رحمت	۲۸۲
۲۳۷	طاعون مؤمنین کے لئے رحمت کب بنتا ہے	۲۸۳
۲۳۸	طاعون زدہ علاقہ کے بارے میں شرعی حکم اور اس کی حکمت	۲۸۴
۲۳۹	بینائی نہ ہونے یا ختم ہو جانے کی فضیلت	۲۸۵
۲۴۰	یہ نہ دیکھئے کہ کیا گیا، یہ دیکھئے کہ کیا ملا	۲۸۶
۲۴۱	حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ	۲۸۸
۲۴۲	ظاہری بدصورتی کی تلافی	۲۸۸

صفحات	عنوانات	نمبر
۲۸۹	ایک صحابیہ سے مرگی میں صبر کرنے پر جنت کا وعدہ	۲۴۳
۲۹۰	ایک بیمار حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں	۲۴۴
۲۹۱	علاج کے سلسلہ میں ایک ہدایت	۲۴۵
۲۹۲	توکل کی حقیقت کیا ہے؟	۲۴۶
۲۹۳	ایک نبی کے صبر کا انداز	۲۴۷
۲۹۴	مؤمن کو پہنچنے والی معمولی تکلیف بھی ضائع نہیں	۲۴۸
۲۹۶	خاص بندوں کے ساتھ خاص معاملہ ہوتا ہے	۲۴۹
۲۹۸	تکلیف پہنچنے پر آدمی کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے پت جھڑ میں پتے	۲۵۰
۲۹۸	مقربین پر حالات کیوں آتے ہیں؟	۲۵۱
۲۹۹	ہمارا وجود ہی گناہ ہے	۲۵۲
۳۰۰	مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا مت کرو	۲۵۳
۳۰۱	موت کی تمنا کرنے کی اجازت صرف ایک صورت میں	۲۵۴

فہرست صبر ۴

۳۰۴	حالات کی سختی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شکایت اور آپ علیہ السلام کی تنبیہ	۲۵۵
۳۰۸	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سبق آموز طرزِ عمل	۲۵۶
۳۱۳	شیطان کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا	۲۵۷
۳۱۵	حاصل کلام	۲۵۸
۳۱۵	گناہوں کے باوجود عذاب نہ آنے کا مطلب کیا سمجھا جائے؟	۲۵۹

صفحات	عنوانات	نمبر
۳۱۷	عافیت ہی مانگے	۲۶۰
۳۱۸	بڑی آزمائش کا بدلہ بھی بڑا	۲۶۱
۳۱۸	محبتِ خداوندی کی ایک پہچان	۲۶۲
۳۱۸	رضا بالقضا حاصل کرنے کا نسخہ	۲۶۳
۳۱۹	انسان کی نادانی	۲۶۴
۳۲۰	ایک بزرگ کا قصہ	۲۶۵
۳۲۱	پوری سلطنت کی قیمت	۲۶۶
۳۲۱	قابلِ عبرت بات	۲۶۷
۳۲۱	قدرِ نعمت بعدِ زوال	۲۶۸
۳۲۲	دولت کس کام کی؟	۲۶۹
۳۲۲	اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوجاتے ہیں	۲۷۰
۳۲۲	اللہ تعالیٰ بھی ناراض	۲۷۱
۳۲۲	مثالی صبر	۲۷۲
۳۲۴	عورتوں کے لئے ایک سبق	۲۷۳
۳۲۶	تحنیک کی سنیت اور اس کا طریقہ	۲۷۴
۳۲۶	تحنیک کیوں؟	۲۷۵

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست صبر ۵

۲۷۶	حقیقی پہلوان	۳۳۲
۲۷۷	غصہ کے وقت کی دعا	۳۳۳
۲۷۸	غصہ دور کرنے کی عارضی تدابیر حدیث کی روشنی میں......	۳۳۴
۲۷۹	غصہ دور کرنے کی دائمی تدبیر	۳۳۴
۲۸۰	غصہ بڑا عقلمند ہے	۳۳۶
۲۸۱	غصہ پی جانے کی فضیلت	۳۳۷
۲۸۲	امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۳۳۸
۲۸۳	غصہ مت کرو	۳۳۸
۲۸۴	سوال ایک جواب الگ الگ	۳۳۹
۲۸۵	حالات کی حکمت	۳۴۰
۲۸۶	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ	۳۴۱
۲۸۷	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک خاص مزاج اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصہ	۳۴۳
۲۸۸	ہمارا مزاج قابل اصلاح	۳۴۵
۲۸۹	جب کھلی ناانصافی دیکھے تو کیا کرے	۳۴۵
۲۹۰	خوشگوار معاشرت کا راز	۳۴۷
۲۹۱	اسلام کی اہم تعلیم	۳۴۸
۲۹۲	بھکاری مفسر	۳۵۰

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۹۳	تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے تو صبر کرو	۳۵۲
۲۹۴	نہ چھیڑو نہ چھوڑو	۳۵۳
۲۹۵	دعا	۳۵۵

نمبر	عنوانات	صفحات

فہرست صدق

۱	افتتاحیہ	۲۱ تا ۳۰
۲	اقتباس	۳۲
۳	صدق کی قسمیں	۳۳
۴	عزم وارادہ میں سچائی	۳۴
۵	منت کونسی صحیح ہے؟ کون سی نہیں؟	۳۴
۶	اگر زبان سے نہیں بولا، صرف دل سے ارادہ کیا تو؟	۳۵
۷	نبوت وہبی ہے اور صدیقیت کسبی ہے	۳۷
۸	صدق کے متعلق قرآن کریم کی آیتیں	۳۷
۹	کون صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا؟	۳۹
۱۰	مقامِ صدیقیت کیسے حاصل ہو؟	۳۹
۱۱	سچائی کے معاملہ میں برتی جانے والی غفلت	۴۰
۱۲	حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سچائی کے معاملہ میں احتیاط	۴۰
۱۳	جنت تک پہنچنے کا آسان گر	۴۱
۱۴	اعمالِ صالحہ پر مداومت حاصل کرنے کی سہل تدبیر	۴۲
۱۵	ہر گناہ سے بچنے کی تدبیر	۴۲
۱۶	مذبذب امور کے لئے ایک رہنما اصول	۴۴
۱۷	ابوسفیان؛ ہرقل کے دربار میں	۴۵
۱۸	نبوی تعلیمات کا خلاصہ	۴۶
۱۹	غیر اختیاری مراتب بھی صدق کی بدولت حاصل ہوسکتے ہیں	۴۷

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۰	حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا ایک سفر	۴۸
۲۱	خیانت کی نحوست	۴۹
۲۲	امت محمدیہ کی ایک خصوصیت	۵۱
۲۳	لین دین میں سچائی؛ برکت لانے والی ہے	۵۲
۲۴	راز کی بات	۵۳
۲۵	خلاصۂ کلام	۵۴
۲۶	ہم نے بھی کسی کے ساتھ لین دین کیا ہے	۵۴
۲۷	یادداشت	۵۶

فہرست مراقبہ ۱

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۸	مراقبہ کا معنٰی	۵۸
۲۹	رقیب کے تین اوصاف	۵۹
۳۰	مراقبہ کے تعلق سے آیاتِ قرآنی	۶۱
۳۱	نگاہِ انسانی؛ خدائی نگرانی میں	۶۲
۳۲	حدیثِ جبرئیل	۶۲
۳۳	اسلام کیا ہے؟	۶۳
۳۴	ایمان کیا ہے؟	۶۴
۳۵	احسان کیا ہے؟	۶۴
۳۶	قیامت کب آئے گی؟	۶۵
۳۷	سوال علم کا دروازہ	۶۶
۳۸	دوسری روایت	۶۶

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۹	گناہ پر پینلٹی	٦۷
۴۰	پیغمبر عالم ﷺ، ایک نونہال، اور بنیادی عقائد	٦۸
۴۱	ایک دور اندیشانہ بات	۷۱
۴۲	کوئی نئی چیز ہونے والی نہیں ہے	۷۳
۴۳	وہی ہوتا ہے؛ جو منظورِ خدا ہوتا ہے	۷۴
۴۴	تدبیروں کو بہت زیادہ اہمیت نہ دے	۷۵
۴۵	دیکھتے ہی دیکھتے زبردست انقلاب	۷۷
۴٦	اس باب کا خلاصہ	۷۸

فہرست مراقبہ ۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۴۷	غیرت کا مطلب	۸۱
۴۸	اللہ تعالیٰ کی غیرت کا مطلب	۸۱
۴۹	آزمائش کیوں؟	۸۲
۵۰	کوڑھی، گنجے اور اندھے کا قصہ	۸۳
۵۱	ہوشیار اور نادان	۸۸
۵۲	فضل الٰہی انجن ہے اور عمل صالح سگنل	۹۰
۵۳	پوری زندگی کی پونجی کا حال	۹۱
۵۴	ایک اور مثال	۹۱

فہرست مراقبہ ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۵۵	آپ ﷺ کا رعب	۹۴
۵٦	پوری زمین مسجد بنادی گئی	۹۵

صفحات	عنوانات	نمبر
۹۶	مالِ غنیمت، شفاعت اور عام بعثت	۵۷
۹۷	جوامع الکلم	۵۸
۹۸	امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک درہم میں جنت خرید لی	۵۹
۹۹	چار جامع ترین روایات	۶۰
۱۰۱	حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد	۶۱
۱۰۲	لایعنی کیا ہے؟	۶۲
۱۰۳	امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان	۶۳
۱۰۴	تمہارا روزہ ہے؟ یہ سوال بھی لایعنی ہے	۶۴
۱۰۵	زبان کے متعلق اکابر کے خیالات	۶۵

فہرست مراقبہ ۴

صفحات	عنوانات	نمبر
۱۱۰	اقتباس	۶۶
۱۱۱	میاں بیوی کے آپسی معاملات میں دخل نہ دیا جائے	۶۷
۱۱۲	کیا بیوی کی پٹائی جائز ہے؟	۶۸
۱۱۴	بیویوں کی سرزنش کی قرآنی ترتیب	۶۹
۱۱۴	عورتوں کی اصلاح کا پہلا درجہ	۷۰
۱۱۵	عورتوں کی اصلاح کا دوسرا درجہ	۷۱
۱۱۵	حضورِ اکرم ﷺ کا ازواجِ مطہرات سے ناراضگی کا واقعہ	۷۲
۱۱۶	علمی فوائد سے مستفید ہونے کا ایک طریقہ	۷۳
۱۱۷	مکی مدنی عورتوں کے مزاج کا فرق	۷۴
۱۱۸	کیا نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دی؟	۷۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۷۶	عورتوں کی اصلاح کا تیسرا درجہ	۱۲۰
۷۷	معاشرتی امور میں نبی کریم ﷺ کا عملی نمونہ	۱۲۰
۷۸	تمہاری ماں کو غیرت آگئی	۱۲۲
۷۹	بیویوں کی پٹائی کے حدود وقیود	۱۲۳
۸۰	عورتوں کی اُلٹی چال	۱۲۴
۸۱	ان صورتوں میں پٹائی کی اجازت ہے	۱۲۵
۸۲	یہ جائز نہیں	۱۲۷
۸۳	گھر سے باہر نکلنے کے لئے کب شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں	۱۲۸

فہرست تقویٰ ۱

۸۴	اقتباس	۱۳۲
۸۵	تقویٰ کیا ہے؟	۱۳۳
۸۶	حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مناقب	۱۳۵
۸۷	تقویٰ کی حقیقت	۱۳۶
۸۸	تقویٰ ڈرنے کی چیز نہیں، ڈرنے کا نام ہے	۱۳۶
۸۹	نیکی کے کام کر لینا بہت آسان	۱۳۷
۹۰	انگارہ اور چنگاری برابر	۱۳۷
۹۱	تقویٰ کے درجات	۱۳۸
۹۲	تقویٰ اختیار کرنے کے فوائد	۱۳۹
۹۳	موجودہ دور کی بڑی مصیبت	۱۳۹
۹۴	کون فائدہ میں رہا؟	۱۴۰

نمبر	عنوانات	صفحات
۹۵	تجارت میں سچائی ایمان لانے کا سبب	۱۴۱
۹۶	تقویٰ اختیار کرنے کی برکت	۱۴۲
۹۷	بصیرت کا نور	۱۴۴
۹۸	تقویٰ کیسے حاصل ہو؟	۱۴۴
۹۹	صحبت کی تاثیر	۱۴۵
۱۰۰	اہل اللہ کی صحبت کی برکت	۱۴۶
۱۰۱	گناہوں کے چھوٹنے کا نسخہ	۱۴۶
۱۰۲	چنبیلی کا تیل	۱۴۷
۱۰۳	رکاوٹیں کیا ہیں؟	۱۴۸
۱۰۴	صحبتِ شیخ بجائے مفید ہونے کے مضر......	۱۴۹
۱۰۵	مہمانِ خصوصی کے ساتھ طفیلیوں کا بھی اکرام	۱۵۰
۱۰۶	شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا بہترین اندازِ بیان	۱۵۰
۱۰۷	باری تعالیٰ کی گارنٹی	۱۵۱

فہرست تقویٰ ۲

۱۰۸	اللہ تعالیٰ سے جیسا ڈرنا چاہیے؛ ویسا ڈرو	۱۵۴
۱۰۹	حصولِ تقویٰ کا آسان طریقہ	۱۵۵
۱۱۰	سب سے زیادہ عزت والا کون؟	۱۵۵
۱۱۱	ہر خاندان کے امتیازی اوصاف ہوتے ہیں	۱۵۶
۱۱۲	سونے پر سہاگہ	۱۵۷
۱۱۳	دنیا بڑی شیرین اور سرسبز وشاداب ہے	۱۵۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۱۴	پھر اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو	۱۵۸
۱۱۵	خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی دو چیزیں	۱۵۹
۱۱۶	عورت؛ بڑی آزمائش کی چیز	۱۶۰
۱۱۷	تقویٰ کی دعا؛ حضور ﷺ کی زبانی	۱۶۰
۱۱۸	تقویٰ والا پہلو اختیار کرنا چاہیے	۱۶۱
۱۱۹	''تقویٰ'' بنیادی امور میں سے ہے	۱۶۲

فہرست یقین وتوکل ۱

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۲۰	یقین اور اس کے درجات	۱۶۴
۱۲۱	شنیدہ کے بود مانند دیدہ	۱۶۵
۱۲۲	انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ	۱۶۶
۱۲۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت	۱۶۸
۱۲۴	مزید توضیح	۱۶۹
۱۲۵	کفرِ جحود	۱۷۲
۱۲۶	یقین وتوکل	۱۷۳
۱۲۷	ترکِ اسباب کا نام توکل نہیں	۱۷۴

فہرست یقین وتوکل ۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۲۸	اقتباس	۱۷۸
۱۲۹	اسباب کی تفصیل اور ان کا حکم......یقینی اسباب	۱۷۹
۱۳۰	ظنی اسباب	۱۸۱
۱۳۱	اسبابِ وہمیہ	۱۸۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۳۲	پرندے اسکیم نہیں بناتے	۱۸۴
۱۳۳	حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دو قصے......ایک سبق	۱۸۵
۱۳۴	اپنی ذاتی ضرورت سے زیادہ کمانا	۱۸۶
۱۳۵	توکل حاصل کرنے کا آسان نسخہ	۱۸۶
۱۳۶	غزوۂ خندق اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان ویقین	۱۸۷

فہرست یقین وتوکل ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۳۷	غزوۂ حمراء الاسد......اجتماعی یقین کا ایمان افروز منظر	۱۹۲
۱۳۸	پروپیگنڈہ کسی بھی حال میں قابلِ قبول نہیں	۱۹۵
۱۳۹	حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو توکل کا حکم	۱۹۵
۱۴۰	مشورہ	۱۹۶
۱۴۱	توکل پر کیا ملے گا؟	۱۹۸
۱۴۲	بغیر حساب کے جنت میں جانے والے	۱۹۹

فہرست یقین وتوکل ۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۴۳	ماثور دعائیں...... نبوی تعلیمات کا نچوڑ	۲۰۶
۱۴۴	ایک اور نمونہ	۲۰۸
۱۴۵	بُروں کی طرف میلان مت رکھو	۲۰۹
۱۴۶	ایک عام کوتاہی	۲۱۰
۱۴۷	بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہو	۲۱۱
۱۴۸	تدبیر ضرور اختیار کرے	۲۱۲
۱۴۹	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مثالی توکل	۲۱۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۵۰	اٹکے ہوئے کاموں کے لئے ایک قرآنی وظیفہ	۲۱۵
۱۵۱	خوف کی خبر کے وقت پڑھنے کا وظیفہ	۲۱۵
۱۵۲	توکل پرندے سے سیکھے	۲۱۶
۱۵۳	ہماری ایک غلطی	۲۱۷
۱۵۴	حضور ﷺ کے توکل کا ایک واقعہ	۲۱۸
۱۵۵	مگر غلو نہ کرے............	۲۲۱
۱۵۶	سونے سے پہلے سارے معاملات خدا تعالیٰ کو سونپ دے	۲۲۳
۱۵۷	سفر ہجرت کا ایک واقعہ	۲۲۴
۱۵۸	ایک معجزہ	۲۲۸
۱۵۹	جب ساری تدابیر بے کار نظر آنے لگیں	۲۲۸
۱۶۰	گھر سے باہر نکلتے وقت حضور ﷺ کیا دعا مانگتے تھے	۲۲۹
۱۶۱	توکل کی بدولت ہدایت کفایت اور حفاظت کا وعدہ	۲۳۱
۱۶۲	ہم خرما و ہم ثواب	۲۳۲
۱۶۳	دو بھائیوں کا قصہ	۲۳۲
۱۶۴	روزی میں پریشانی آنے کا ایک گہرا سبب	۲۳۴
۱۶۵	تاجروں کی خدمت میں ایک قیمتی مشورہ	۲۳۵
۱۶۶	آپ کے پاس اوروں کی روزی بھی ہے	۲۳۶

فہرست الاستقامۃ

۱۶۷	استقامت کی وضاحت	۲۳۸
۱۶۸	استقامت بنیاد اور اصل ہے	۲۳۹

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۶۹	ایک ساکھ قائم ہوگئی	۲۴۰
۱۷۰	استقامت کی کرامت	۲۴۲
۱۷۱	خدائی امتحان میں کامیابی کا راز	۲۴۲
۱۷۲	اسی کا نام استقامت ہے	۲۴۳
۱۷۳	عقیدہ میں استقامت	۲۴۴
۱۷۴	اعمال میں استقامت	۲۴۴
۱۷۵	سرِ موفرق نہ آنا چاہیے	۲۴۵
۱۷۶	استقامت کیسے حاصل ہو؟	۲۴۶
۱۷۷	......یہ مجھے زیادہ پسند ہے	۲۴۷
۱۷۸	اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے	۲۴۷
۱۷۹	یہ میرا طریقہ ہے	۲۴۸
۱۸۰	......اور سفر بھی مکمل نہیں ہوا	۲۴۹
۱۸۱	استقامت روح ہے	۲۴۹
۱۸۲	معاملات میں استقامت	۲۵۰
۱۸۳	اتنا زیادہ اہتمام کیا	۲۵۰
۱۸۴	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قصہ	۲۵۱
۱۸۵	لیکن اس میں ہماری ہمت نہیں ہوتی	۲۵۲
۱۸۶	یہ کرامت سے بڑھ کر ہے	۲۵۳
۱۸۷	موجودہ دور کا سب سے بڑا پروبلم (المیہ)	۲۵۴
۱۸۸	معمولات یا متروکات	۲۵۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۸۹	شَيَّبَتْنِیْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا	۲۵۵
۱۹۰	استقامت پر وعدے	۲۵۶
۱۹۱	جامع نبوی نصیحت	۲۵۷
۱۹۲	غلو کیسے پیدا ہوتا ہے؟	۲۵۸

فہرست التفکر فی عظیم مخلوقات اللّٰہ تعالیٰ

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۹۳	خدا کی مخلوقات میں غور وفکر	۲۶۲
۱۹۴	صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں	۲۶۳
۱۹۵	......بڑی نشانیاں ہیں	۲۶۳
۱۹۶	غور وفکر کا طریقہ	۲۶۴
۱۹۷	یہ انصاف کا طریقہ نہیں ہے	۲۶۵

فہرست المبادرۃ الیٰ الخیرات ا

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۹۸	نیکی کے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے	۲۶۸
۱۹۹	شیطان کے داؤ ہر انسان کے ساتھ الگ الگ	۲۶۹
۲۰۰	باز چوں فردا شود	۲۷۰
۲۰۱	کیا گارنٹی ہے؟	۲۷۱
۲۰۲	”وارِدِ روحانی“ غیرت مند مہمان	۲۷۱
۲۰۳	ایک خاص بات	۲۷۲
۲۰۴	......حاجتِ استخارہ نیست	۲۷۴
۲۰۵	ریس کرنے کی چیزیں یہ ہیں	۲۷۵
۲۰۶	دنیا کے لئے مقابلہ؛ اور آخرت کے لئے؟	۲۷۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۰۷	غزوۂ تبوک کا پس منظر	۲۷۶
۲۰۸	حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ریس	۲۷۷
۲۰۹	کس چیز میں آگے بڑھنے کی کوشش؟	۲۷۸
۲۱۰	فقراء صحابہ کی ایک جماعت خدمتِ نبوی میں	۲۷۹
۲۱۱	سبقت کرنے کی چیز اگر کچھ ہے تو.....	۲۸۰
۲۱۲	آپ زبردستی وقت نکال لیجیے	۲۸۰
۲۱۳	نفس کو دھوکہ دو	۲۸۱
۲۱۴	ڈاکٹر صاحب نے اس طرح نفس کو آمادہ کیا	۲۸۲
۲۱۵	......اور آپ کو استقامت نصیب ہو جائے گی	۲۸۳
۲۱۶	اندھیری رات کے ٹکڑے	۲۸۴
۲۱۷	صبح کو مؤمن، شام کو کافر	۲۸۵

فہرست المبادرۃ الیٰ الخیرات ۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۱۸	نیکی میں جلدی اور آپ ﷺ کا واقعہ	۲۸۸
۲۱۹	......پھر اپنے دوسرے تقاضوں کو نہ دیکھے	۲۹۰
۲۲۰	یہاں تک کہ شہید ہو گئے	۲۹۰
۲۲۱	اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کی	۲۹۲
۲۲۲	تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی	۲۹۲
۲۲۳	کون سے صدقہ کا ثواب زیادہ ہے؟	۲۹۴
۲۲۴	ہماری کفایت شعاری	۲۹۵
۲۲۵	جیسی ڈیمانڈ؛ ویسا بھاؤ	۲۹۶

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۲۶	فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا	۲۹۷
۲۲۷	ایک ضروری مسئلہ	۲۹۷
۲۲۸	وصیت کا اسلامی قانون	۲۹۸
۲۲۹	حلوائی کی دوکان پر نانی ماں کا فاتحہ	۲۹۹
۲۳۰	خلاصۂ کلام	۲۹۹
۲۳۱	ہماری ایک بری عادت	۳۰۰
۲۳۲	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج	۳۰۰
۲۳۳	مَیں اور آپ کیا اس کو گوارا کریں گے؟	۳۰۱
۲۳۴	......تب جا کر مسجد میں آئے	۳۰۲
۲۳۵	خرچ کرنے کی ترتیب	۳۰۲
۲۳۶	ایک پائی خرچ کرنے والا اور ایک لاکھ خرچ کرنے والا؛ دونوں برابر	۳۰۴
۲۳۷	مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول	۳۰۵

فہرست المبادرۃ الیٰ الخیرات ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۳۸	غزوۂ احد اور حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے کارنامے	۳۰۸
۲۳۹	عمل کے لئے زمانۂ حال غنیمت ہے	۳۱۱
۲۴۰	بھلانے والے فقر سے پہلے کچھ کرلو	۳۱۳
۲۴۱	سرکش مالداری	۳۱۴
۲۴۲	کہیں بیماری میں مبتلا نہ ہو جاؤ	۳۱۴
۲۴۳	اور پھر اس کی نوبت نہیں آتی	۳۱۵
۲۴۴	کیا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟	۳۱۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۴۵	کہیں دجال نہ آجائے	۳۱۶
۲۴۶	......بڑی بھیانک چیز ہے	۳۱۶

فہرست المبادرۃ الیٰ الخیرات ۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۴۷	غزوۂ خیبر اور حضرت حیدر رضی اللہ عنہ	۳۱۸
۲۴۸	زبانِ مبارک سے نکلنے والا سرٹیفیکٹ	۳۲۱
۲۴۹	اللہ کرے! ایسی دوا ہمیں بھی مل جاوے	۳۲۲
۲۵۰	اطاعتِ صحابہ کی ایک مثال	۳۲۳
۲۵۱	ایک اور مثال	۳۲۳
۲۵۲	جنگ کی بنیاد	۳۲۴

فہرست المجاھدۃ ۱

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۵۳	اقتباس	۳۲۸
۲۵۴	جہاد اور مجاہدہ میں فرق	۳۲۹
۲۵۵	خواہشات کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ	۳۳۰
۲۵۶	......پھر آخر زنا بالجبر کیوں؟	۳۳۱
۲۵۷	مغربی تہذیب یا تعذیب	۳۳۲
۲۵۸	یہ بے چینی کیوں؟	۳۳۳
۲۵۹	نفس اور شیطان کی ایک خاصیت	۳۳۳
۲۶۰	نفس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال	۳۳۴
۲۶۱	نفس عادت سے مجبور	۳۳۷
۲۶۲	بدنگاہی سے بچنے کی آسان تدبیر	۳۳۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۶۳	تصوف کا حاصل	۳۳۸
۲۶۴	محبت اندھا اور بہرہ کردیتی ہے	۳۳۹
۲۶۵	اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات	۳۴۰
۲۶۶	پھر ایک وقت آئے گا کہ	۳۴۱
۲۶۷	نفس کی قسمیں	۳۴۲
۲۶۸	انگلی پکڑ کے راستہ دکھائیں گے	۳۴۲
۲۶۹	عبادت کرو موت تک	۳۴۳
۲۷۰	محنت بے کار نہیں جائے گی	۳۴۳
۲۷۱	حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور فقیر	۳۴۴
۲۷۲	اس کو کیا ہو گیا؟	۳۴۴
۲۷۳	دو گناہوں پر لڑائی کا اعلان	۳۴۵
۲۷۴	ولی کسے کہتے ہیں؟	۳۴۶
۲۷۵	ایک عام مزاج	۳۴۷
۲۷۶	اندازہ لگائیے	۳۴۸
۲۷۷	ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے	۳۴۹
۲۷۸	ان کے لئے برے خاتمہ کا اندیشہ ہے	۳۵۰
۲۷۹	نمبر اول پر یہ چیز ہے	۳۵۱
۲۸۰	پھر وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے	۳۵۲

فہرست المجاهدة ۲

۲۸۱	بندہ کے عمل کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قدردانی	۳۵۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۸۲	دومحرومِ انصاف نعمتیں	۳۵۵
۲۸۳	پانچ منٹ کی قیمت	۳۵۷
۲۸۴	وقت کے چند صحیح قدردان	۳۶۰
۲۸۵	نقصان در نقصان	۳۶۱
۲۸۶	پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو	۳۶۲
۲۸۷	حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قابلِ اقتداء طرزِ عمل	۳۶۳
۲۸۸	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جفاکشی	۳۶۴
۲۸۹	آخری عشرہ کو وصول فرمانے کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اہتمام	۳۶۶
۲۹۰	وَشَدَّ الْمِئْزَرَ کے دو مطلب	۳۶۶
۲۹۱	جو مجاہدہ زیادہ کرسکتا ہو؛ وہ محبوب بھی زیادہ	۳۶۷
۲۹۲	تصوف کا خلاصہ	۳۶۹
۲۹۳	مقدرات پیش آچکنے کے بعد حسرت مت کرو	۳۶۹
۲۹۴	ایمان بالقدر پر زد نہ پڑتی ہو؛ تو اس کی اجازت ہے	۳۷۱
۲۹۵	جنت اور جہنم کی باڑھ (Boundary)	۳۷۲

فهرست المجاهدة ۳

۲۹۶	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رازدار	۳۷۶
۲۹۷	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور خوفِ خدا کی کیفیت	۳۷۸
۲۹۸	اگر مجھے اللہ تعالی کی طرف سے تمنا کی اجازت ملے	۳۷۹
۲۹۹	نوافل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل قیام کی ایک جھلک	۳۷۹
۳۰۰	حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مناقب	۳۸۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۰۱	حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد پڑھی	۳۸۳
۳۰۲	بڑوں کا ایک ادب	۳۸۴
۳۰۳	اور اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں	۳۸۵
۳۰۴	معمولی مت سمجھو	۳۸۶
۳۰۵	صرف دو رکعتیں کام آئیں	۳۸۷
۳۰۶	نجات ہوگئی	۳۸۷
۳۰۷	مسجد کا ٹاٹ	۳۸۸
۳۰۸	تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ	۳۸۹
۳۰۹	سجدوں کی کثرت کا اہتمام کرو	۳۹۰
۳۱۰	یہ بات بھی مجاہدہ پر موقوف ہے	۳۹۲

فہرست المجاھدۃ ۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۱۱	دشمن کے لئے اقتصادی رکاوٹیں کھڑی کرنا	۳۹۵
۳۱۲	غزوۂ بدر کا پس منظر	۳۹۶
۳۱۳	اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھادیں گے	۳۹۸
۳۱۴	غزوۂ احد اور حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ	۳۹۹
۳۱۵	مجھ سے وہ نہیں ہوسکا	۴۰۱
۳۱۶	اور اپنے آپ کو شہید کرادیا	۴۰۲
۳۱۷	تحصیلِ فضائل کے لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مجاہدہ	۴۰۳
۳۱۸	منافقین کی شرارت	۴۰۴
۳۱۹	اللہ تعالیٰ نے منافقین کا مذاق اڑایا	۴۰۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۲۰	ایک اہم مشورہ	۴۰۵
۳۲۱	قابلِ غور وفکر حدیث	۴۰۶
۳۲۲	سب لوگ گمراہ ہیں سوائے......	۴۰۸
۳۲۳	در بندِ آں مباش......	۴۰۸
۳۲۴	سب لوگ بھوکے ہیں سوائے......	۴۰۹
۳۲۵	اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہی رہنا چاہیے	۴۰۹
۳۲۶	گناہ ہوجائے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں	۴۱۰
۳۲۷	میری شان میں اضافہ نہ ہوگا	۴۱۱
۳۲۸	میری شان میں کمی آنے والی نہیں	۴۱۲
۳۲۹	تسبیح پڑھنے کی برکت	۴۱۲
۳۳۰	میرے خزانے میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں	۴۱۳
۳۳۱	جو کچھ ہیں، تمہارے ہی اعمال ہیں	۴۱۴
۳۳۲	**دعا**	۴۱۵

نمبر	عنوانات	صفحات

اَلُحَث عَلیٰ الازُدِیَادِ مِنَ الُخَیُرِ فِیُ أَوَاخِرِالُعُمُرِ
اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت

۱	افتتاحیہ	۲۶ تا ۴۶
۲	اقتباس	۴۸
۳	باب کا عنوان	۴۹
۴	بہت عظیم نعمت	۴۹
۵	جب دنیا سے جانے کا وقت قریب ہو تو......	۵۰
۶	اتنی عمر نہیں دی تھی	۵۰
۷	اتنی عمر سے کتنی عمر مراد ہے؟	۵۱
۸	جس کو ساٹھ سال کی عمر ملی	۵۱
۹	اہلِ مدینہ کا معمول	۵۲
۱۰	ملک الموت سے مکالمہ	۵۳
۱۱	ملک الموت کے ایلچی	۵۴
۱۲	ملک الموت کی روزانہ کی پکار	۵۵
۱۳	...... یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے	۵۵
۱۴	حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں	۵۷
۱۵	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع	۵۸
۱۶	آخری ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملِ مبارک	۶۰
۱۷	آخری دنوں میں کثرتِ وحی کی ایک وجہ	۶۰
۱۸	جیسی زندگی؛ ویسی موت	۶۲

نمبر	عنوانات	صفحات

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ ١
نیکی کے راستے بہت ہیں

١٩	اقتباس	٦۴
٢٠	نیکی کے کام بہت ہیں	٦۵
٢١	اس کا بدلہ دیا جائے گا	٦۵
٢٢	سب سے زیادہ فضیلت والا عمل	٦٧
٢٣	کون سے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟	٦٨
٢۴	مزدور کا ہاتھ بٹاؤ	٦٩
٢۵	بے ہنر کے لئے کماؤ	٦٩
٢٦	اپنی برائی لوگوں سے روک لو	٦٩
٢٧	اپنے حالات پر نظر ثانی کیجیے	٧٠
٢٨	ایک اصلاح طلب چیز	٧١
٢٩	آدمی کے ہر ہر جوڑ کے اوپر صدقہ ہے	٧٢
٣٠	ہر بھلائی صدقہ ہے	٧٣
٣١	راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا	٧۴
٣٢	تمہارے لئے بھی تو ایک راستہ رکھا ہے	٧۵
٣٣	......تو اس کو گناہ ہوتا یا نہیں؟	٧٦
٣۴	نیکی عبادت ہی میں منحصر نہیں	٧٧
٣۵	یہ بھی ایک صدقہ ہے	٧٨
٣٦	ہم اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں	٧٨

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۷	اس نے اپنے آپ کو جہنم سے محفوظ کرلیا	۷۹
۳۸	مہمانی تیار ہو گی	۸۰
۳۹	اتنی معمولی چیز کیا دوں؟	۸۰
۴۰	خواتین توجہ دیں	۸۱
۴۱	ایک اور پہلو	۸۲
۴۲	ایمان کی ستّر سے اوپر شاخیں ہیں	۸۳

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ ۲
نیکی کے راستے بہت ہیں

۴۳	رضا وخوشنودی والا عمل	۸۶
۴۴	کتے کے ساتھ احسان کر کے جنت کمالی	۸۷
۴۵	نیکی کرنے میں کبھی سوچنا نہیں چاہیے	۸۹
۴۶	بڑا عمل بھی چھوٹے کے برابر نہیں ہو سکتا	۸۹
۴۷	بخشش کا فیصلہ ہو گیا	۹۰
۴۸	ہر عمل میں خوبی پیدا کرنے والی کچھ چیزیں ہوتی ہیں	۹۱
۴۹	جتنی زیادہ محبت وعظمت ہو گی	۹۱
۵۰	اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کی دلیل	۹۲
۵۱	عظمت والا جذبہ اگر دل میں ہے……	۹۲
۵۲	جمعہ کے آداب میں سے ہے	۹۳
۵۳	وضو سے حاصل ہونے والے فائدے	۹۴
۵۴	نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں	۹۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۵۵	......شرط یہ ہے کہ کبائر سے بچے	۹۵
۵٦	...... یہ ہے سرحدوں کی حفاظت	۹٦
۵۷	فجر اور عصر کے اہتمام کی فضیلت	۹۹
۵۸	عمل کئے بغیر ثواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ	۱۰۰

كَثْرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ ٣

نیکی کے راستے بہت ہیں

نمبر	عنوانات	صفحات
۵۹	جب مسلمان کوئی درخت بوتا ہے	۱۰۲
٦۰	دور سے چل کر مسجد آنے کی فضیلت	۱۰۳
٦۱	تمہارے لئے یہ دونوں چیزیں جمع کر دیں	۱۰۵
٦۲	ثواب کی نیت اور امید ہونا ضروری ہے	۱۰۷
٦۳	یہ آرام بھی فائدہ اور ثواب سے خالی نہیں	۱۰۸
٦۴	نیکی کے چالیس کام......	۱۰۹
٦۵	آدھی کھجور ہی سہی	۱۱۰
٦٦	کھانا کھا کر بھی جنت حاصل کی جاسکتی ہے	۱۱۱
٦۷	صدقہ کرنے کے لئے مال نہیں ہے تو......	۱۱۳
٦۸	اگر اس کی طاقت نہ ہو تو......	۱۱۳
٦۹	ہم سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے	۱۱۴

الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ ١

عبادات میں درمیانی راہ

نمبر	عنوانات	صفحات
۷۰	اقتباس	۱۱٦

صفحات	عنوانات	نمبر
۱۱۷	آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوجیے	۷۱
۱۱۸	اللہ تعالیٰ آسانی چاہتے ہیں	۷۲
۱۱۸	......آپ تیمّم کرلیجیے	۷۳
۱۱۸	......تو روزہ نہ رکھے	۷۴
۱۱۹	آسانی کردی گئی	۷۵
۱۲۰	......تو کوئی پابندی نہیں	۷۶
۱۲۱	اس کے ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا	۷۷
۱۲۱	یہ مجھے زیادہ پسند ہے......	۷۸
۱۲۲	یہ راہ بھی کھلی رکھی گئی ہے	۷۹
۱۲۲	اور نہ وہ خود منزلِ مقصود تک پہنچ سکا	۸۰
۱۲۳	دین اسلام کی بڑی خوبی	۸۱
۱۲۴	معمولات کیسے اور کتنے ہوں	۸۲
۱۲۵	انسانی فطرت	۸۳
۱۲۵	اللہ تعالیٰ کے اُکتانے کا مطلب	۸۴
۱۲۶	مداومت ہی اثر دکھلاتی ہے	۸۵
۱۲۷	جیسا تعلق اور جیسی محبت	۸۶
۱۲۸	متروکات	۸۷
۱۲۸	خصوصی تعلق کی علامت	۸۸
۱۲۹	نبی کریم ﷺ کے معمولات	۸۹
۱۳۰	اپنے طور پر تقویٰ کا معیار	۹۰

صفحات	عنوانات	نمبر
۱۳۰	تقویٰ کا اصل معیار	۹۱
۱۳۱	اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں	۹۲
۱۳۲	دین اس کا نام نہیں ہے	۹۳
۱۳۲	آپ کی پکڑ ہو جائے گی	۹۴
۱۳۳	حج میں کیا ہوتا ہے؟	۹۵

الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ ۲

عبادات میں درمیانی راہ

صفحات	عنوانات	نمبر
۱۳۶	اقتباس	۹۶
۱۳۷	ایسے لوگ ہلاک ہوگئے	۹۷
۱۳۸	دین آسان ہے	۹۸
۱۳۹	دین اس پر غالب آجاتا ہے	۹۹
۱۴۱	اگر پہلے ہی سے اس پر عمل کر لیا ہوتا......	۱۰۰
۱۴۱	بہت اونچی اُڑان مت بھرو	۱۰۱
۱۴۱	یہ بھی ایک سفر ہے	۱۰۲
۱۴۲	اعتدال؛ منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے	۱۰۳
۱۴۳	آپ کو لذت بھی محسوس ہوگی	۱۰۴
۱۴۴	ایک اصول	۱۰۵
۱۴۵	دورانِ عبادت جب اونگھ آئے	۱۰۶
۱۴۵	یہ یاد رہے	۱۰۷
۱۴۶	آپ ﷺ کی نماز اور خطبہ	۱۰۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۰۹	بھائی چارگی کا رشتہ بھی ہوتا ہے	۱۴۶
۱۱۰	زینت کس کے لئے ہے؟	۱۴۷
۱۱۱	شوہر کو اپنے گھر بھی اچانک پہنچنے کی اجازت نہیں	۱۴۸
۱۱۲	اور یہاں تو قصداً ایسا ہوتا ہے	۱۴۹
۱۱۳	خاص خاص ہدایات	۱۵۰
۱۱۴	ترکِ زینت پر مارنے کی اجازت	۱۵۱
۱۱۵	نگاہ غیر عورت پر نہیں اٹھے گی	۱۵۱
۱۱۶	دونوں پرابلم سول (problem solve)	۱۵۲
۱۱۷	آمدم برسرِ مطلب	۱۵۲
۱۱۸	حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اصلاح کر دی	۱۵۳

الاقتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ ۳

عبادات میں درمیانی راہ

۱۱۹	یہ معتدل طریقہ ہے	۱۵۶
۱۲۰	مَیں نے سختی کی؛ تو مجھ پر سختی کی گئی	۱۵۸
۱۲۱	دشواری پیدا ہوگئی	۱۵۹
۱۲۲	قرآنِ پاک ختم کرنے کی ترتیب	۱۵۹
۱۲۳	قرآنِ پاک کی سات منزلیں	۱۶۰
۱۲۴	وہ مَیں نے منظور کر لی ہوتی	۱۶۰
۱۲۵	گھر کا بڑا حالات سے باخبر رہے	۱۶۱
۱۲۶	......تو باپ ایسا کر سکتا ہے	۱۶۱

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۲۷	ایسا مت کرو	۱۶۲
۱۲۸	ایسا کرتے تھے	۱۶۳
۱۲۹	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک معمول یہ بھی تھا	۱۶۴
۱۳۰	حضرت حنظلہ نامی دو صحابی ہیں	۱۶۵
۱۳۱	کبھی یہ، کبھی وہ	۱۶۷
۱۳۲	بر پشتِ پائے خود نہ بینم	۱۶۹
۱۳۳	حاصل کلام	۱۷۱
۱۳۴	منت کس چیز کی صحیح ہوتی ہے؟	۱۷۲
۱۳۵	دعاء	۱۷۳

اَلْمُحَافَظَةُ عَلَى الْأَعْمَالِ

اعمال کی پابندی

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۳۶	پابندی؛ اعتدال کی برکت	۱۷۶
۱۳۷	دل میں قساوت پیدا ہونے کی ایک وجہ	۱۷۷
۱۳۸	کسی معمول کو شروع کرنے کے بعد چھوڑنا مضر ہے	۱۷۸
۱۳۹	دوسری آیت	۱۷۹
۱۴۰	رہبانیت کا پس منظر	۱۷۹
۱۴۱	اسلام میں رہبانیت نہیں ہے	۱۸۱
۱۴۲	حلال کو استعمال نہ کرنے کی شکلیں اور ان کا حکم	۱۸۱
۱۴۳	یہ ایک طرح کا غلو ہے	۱۸۳
۱۴۴	مقاصد کو نظر انداز کر دینا برا ہے	۱۸۴

صفحات	عنوانات	نمبر
۱۸۵	یہ مناسب نہیں ہے	۱۴۵
۱۸۶	دمے فارغ مباش	۱۴۶
۱۸۷	کوئی معمول قضا ہو جائے تو کیا کرے؟	۱۴۷
۱۸۸	فلاں جیسا مت بنیو	۱۴۸
۱۸۹	تہجد پر مداومت کا ایک طریقہ	۱۴۹

اَلْمُحَافَظَةُ عَلَی السُّنَّةِ ۱

سنتوں کا اہتمام

۱۹۳	اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر......	۱۵۰
۱۹۳	مجھ سے جو سوال چاہو؛ کرو	۱۵۱
۱۹۴	وحی متلو اور وحی غیر متلو	۱۵۲
۱۹۵	اس زبان سے حق کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا	۱۵۳
۱۹۵	تمام چیزوں میں میری پیروی کرو	۱۵۴
۱۹۶	......تو پھر خود اس ذات کا کیا حال ہوگا؟	۱۵۵
۱۹۷	متبعِ سنت کو محبوبیت سے نوازا جاتا ہے	۱۵۶
۱۹۸	اہل اللہ کی مقبولیت راز	۱۵۷
۱۹۸	کون سی مقبولیت مطلوب ہے؟	۱۵۸
۱۹۹	جو نبی کے فیصلہ پر راضی نہ ہو؛ اس کا فیصلہ	۱۵۹
۲۰۱	آپسی جھگڑے کہاں حل کریں؟	۱۶۰
۲۰۲	کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید	۱۶۱
۲۰۳	آخری فیصلہ	۱۶۲

صفحات	عنوانات	نمبر
۲۰۴	اطاعتِ رسول؛ اطاعتِ خدا	۱۶۳
۲۰۴	صراطِ مستقیم	۱۶۴
۲۰۴	ان کو ڈرنا چاہیے	۱۶۵
۲۰۵	زیادہ کھود کرید مت کرو	۱۶۶
۲۰۶	اگر وہ کھود کرید نہ کرتے	۱۶۷
۲۰۷	کثرتِ سوال نے انہیں ہلاک کیا	۱۶۸
۲۰۷	یہ بے کار باتیں ہیں	۱۶۹
۲۰۸	نوکیلے دانتوں سے مضبوط پکڑ لو	۱۷۰

الْمُحَافَظَةُ عَلىٰ السُّنَّةِ ۲

سنتوں کا اہتمام

۲۱۲	کون ہے انکار کرنے والا؟	۱۷۱
۲۱۲	امتِ دعوت اور امتِ اجابت	۱۷۲
۲۱۳	اس کا وہ ہاتھ بے کار ہو گیا	۱۷۳
۲۱۵	سننِ ہدیٰ اور سننِ زوائد	۱۷۴
۲۱۶	صفیں سیدھی ہونی چاہئیں	۱۷۵
۲۱۷	آپسی اختلاف مٹانا بہت آسان	۱۷۶
۲۱۷	صفیں سیدھی کروانے کا اہتمام	۱۷۷
۲۱۹	تمہارے چہروں کو پھیر دے گا	۱۷۸
۲۱۹	سونے سے پہلے آگ بجھا دیا کرو	۱۷۹
۲۲۰	معاشرت کے چند آداب	۱۸۰

صفحات	عنوانات	نمبر
۲۲۰	جن اور بلاؤں سے بچنے کا آسان طریقہ	۱۸۱
۲۲۲	جن اور جادو سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے	۱۸۲
۲۲۲	گیس سلنڈر لاک (LOCK) کر کے سوئیں	۱۸۳
۲۲۳	ہدایت اور علم نبوی کی ایک مثال	۱۸۴
۲۲۵	اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹ رہے ہو	۱۸۵
۲۲۶	کھانے کی دو سنتیں	۱۸۶
۲۲۷	برکت کا حال لاٹری جیسا ہے	۱۸۷
۲۲۷	کیا انگلیاں اور برتن چاٹنا خلافِ تہذیب ہے؟	۱۸۸
۲۲۸	پھر بھی ہم ان کے دل دادہ ہیں	۱۸۹
۲۲۹	ہمارا حال اتباعِ سنت میں وہی ہونا چاہیے تھا......	۱۹۰
۲۳۰	اس سے بڑی حماقت اور کیا ہو سکتی ہے؟	۱۹۱
۲۳۰	کھانے کے متعلق دیگر تعلیمات	۱۹۲
۲۳۱	برکت کا ایک مطلب	۱۹۳
۲۳۲	شیطان نے قَسم کھائی ہے	۱۹۴
۲۳۲	یہ بسم اللہ کی برکت ہے	۱۹۵
۲۳۳	مؤمن کے شیطان کی کافر کے شیطان سے ملاقات	۱۹۶
۲۳۴	شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو؟	۱۹۷
۲۳۴	یہ کوئی دانشمندی ہے؟	۱۹۸
۲۳۵	حشر کے دن کی نفسا نفسی	۱۹۹
۲۳۶	سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جوڑا عطا کیا جائے گا	۲۰۰

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۰۱	بدعت کی نحوست، آبِ کوثر سے محرومی	۲۳۷
۲۰۲	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حساب	۲۳۸
۲۰۳	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب	۲۳۹
۲۰۴	تعلیماتِ نبوی کو پس پشت ڈالنے والوں کا میدان محشر میں کیا حشر ہوگا؟	۲۴۰
۲۰۵	بیٹھے بیٹھے بلاوجہ کنکریاں پھینکنا	۲۴۱
۲۰۶	عام گزرگاہوں میں کرکٹ وغیرہ کھیل کھیلنا	۲۴۱
۲۰۷	راستہ میں موٹر گاڑی کھڑی کردینا	۲۴۲
۲۰۸	صحابہ کے یہاں آنحضور ﷺ کی تعلیمات کی اہمیت	۲۴۳
۲۰۹	صحابی کا اہتمام عمل	۲۴۳
۲۱۰	بچوں کی اطاعت شعاری	۲۴۴
۲۱۱	امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی غیرتِ ایمانی	۲۴۵
۲۱۲	آج کا ہمارا المیہ	۲۴۵
۲۱۳	حجر اسود کا بوسہ	۲۴۶
۲۱۴	سنت میں حکمت کی تلاش	۲۴۷
۲۱۵	لگن اور عشق کی ضرورت ہے	۲۴۸
۲۱۶	کاش! ہم سنتوں کے معاملہ میں ایسے ہوجائیں	۲۴۹
۲۱۷	حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا سنت پر عمل	۲۴۹

وُجُوبُ الْاِنْقِیَادِ لِحُکْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی

حکم الٰہی کی تابعداری

۲۱۸	اقتباس	۲۵۲

صفحات	عنوانات	نمبر
۲۵۳	حضور ﷺ کے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس نہ کرے	۲۱۹
۲۵۴	جسے شریعت کی طرف دعوت دی جائے؛ تو وہ کیا کہے؟	۲۲۰
۲۵۵	اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے	۲۲۱
۲۵۵	پہلی قوموں کی ہلاکت کے دو سبب	۲۲۲
۲۵۶	حضور ﷺ کا منشا	۲۲۳
۲۵۶	غیر ضروری سوالات منع ہیں	۲۲۴
۲۵۷	شانِ عبدیت کا تقاضہ	۲۲۵
۲۵۷	احکامِ شرع کی علت پوچھنا	۲۲۶
۲۵۸	حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر برتری کا راز	۲۲۷
۲۶۰	حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ	۲۲۸
۲۶۱	ہمارا ایک بڑا روگ	۲۲۹
۲۶۲	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بے چینی اور اشکال	۲۳۰
۲۶۳	حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بارگاہِ نبوی میں	۲۳۱
۲۶۴	ظاہری اور باطنی اعمال کی قسمیں	۲۳۲
۲۶۵	حضور ﷺ کی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تنبیہ اور تعلیم	۲۳۳
۲۶۶	مؤمن کا طرز یہی ہونا چاہیے	۲۳۴
۲۶۷	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی تعریف؛ قرآن کی زبانی	۲۳۵
۲۶۸	فرمانبرداری پر آسانی کا حکم	۲۳۶
۲۶۹	ایک علمی اشکال کا حل	۲۳۷
۲۶۹	آسانی کی دعاء	۲۳۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۳۹	اس روایت کا سبق	۲۷۰
۲۴۰	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اطاعت شعاری	۲۷۱
۲۴۱	حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل	۲۷۳
۲۴۲	خلاصۂ کلام	۲۷۴

اَلنَّھْیُ عَنِ الْبِدَعِ

بدعات سے ممانعت

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۴۳	اقتباس	۲۷۶
۲۴۴	بدعت کیا ہے؟	۲۷۷
۲۴۵	حق کے علاوہ سب گمراہی ہے	۲۷۸
۲۴۶	بدعتی زبانِ حال سے یوں کہنا چاہتا ہے......	۲۷۹
۲۴۷	حق کی کسوٹی؛ کتاب وسنت	۲۸۰
۲۴۸	صراطِ مستقیم کی وضاحت	۲۸۰
۲۴۹	مختصر لفظوں میں دین کی حقیقت	۲۸۱
۲۵۰	نماز ممنوع بھی ہے	۲۸۱
۲۵۱	مسلمان متبع ہے، نہ کہ مبتدع	۲۸۲
۲۵۲	نماز میں آنکھیں بند کرنا	۲۸۳
۲۵۳	ایک واقعہ	۲۸۳
۲۵۴	اسی کو بدعت کہتے ہیں	۲۸۴
۲۵۵	بدعت کی تعریف (Definition) کی وضاحت	۲۸۵
۲۵۶	بدعت کی شرعی تعریف (Definition)	۲۸۵

صفحات	عنوانات	نمبر
۲۸۶	ایصالِ ثواب زندوں کو بھی کیا جاسکتا ہے	۲۵۷
۲۸۷	ایصالِ ثواب کا آسان مطلب	۲۵۸
۲۸۷	ایصالِ ثواب کی اجازت ہے	۲۵۹
۲۸۸	جہاں شریعت نے ہی قید لگائی	۲۶۰
۲۸۹	میت کے گھر والوں کے لئے کھانا بھیجنا	۲۶۱
۲۸۹	اُلٹی چال	۲۶۲
۲۹۰	تیجہ، چالیسہ، برسی وغیرہ	۲۶۳
۲۹۰	پیسے دے کر قرآن خوانی کروانا	۲۶۴
۲۹۱	بدعت اور رسم میں فرق	۲۶۵
۲۹۲	حضور اکرم ﷺ کے بیان کی ایک جھلک	۲۶۶
۲۹۴	حضور اکرم ﷺ کی بعثت؛ قیامت کی علامت	۲۶۷
۲۹۶	بہترین طرزِ زندگی	۲۶۸
۲۹۶	بدترین گناہ بدعت کیوں؟	۲۶۹
۲۹۷	شیطان کو بدعت کی کیوں سوجھی؟	۲۷۰
۲۹۸	نبی کریم ﷺ کو اہل ایمان سے کتنا تعلق ہے؟	۲۷۱
۲۹۹	امت پر آپ ﷺ کی شفقت کا ایک نمونہ	۲۷۲
۲۹۹	مقروض کی نمازِ جنازہ	۲۷۳

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْسَيِّئَةً

کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا

۳۰۲	ازواج واولاد آنکھوں کی ٹھنڈک	۲۷۴

صفحات	عنوانات	نمبر
۳۰۳	آیت کی تفسیر اور عنوان سے مناسبت	۲۷۵
۳۰۵	حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات	۲۷۶
۳۰۶	قابلِ تقلید طرزِ عمل	۲۷۷
۳۰۷	کچھ مفلس حضرات خدمتِ نبوی میں	۲۷۸
۳۰۸	محتاج کی حاجت روائی فرض کفایہ ہے	۲۷۹
۳۰۹	آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعاون کی اپیل کی	۲۸۰
۳۱۱	ایک مثال	۲۸۱
۳۱۱	بعد والوں کے بھروسے پر نہ رہو	۲۸۲
۳۱۲	دوسرے کے مال سے محبت	۲۸۳
۳۱۳	جس میں جتنی طاقت ہو......	۲۸۴
۳۱۴	ذرّہ اور ٹکڑا	۲۸۵
۳۱۵	ایک نے پہل کی اور پھر......	۲۸۶
۳۱۵	جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا......	۲۸۷
۳۱۶	یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے	۲۸۸
۳۱۷	جس نے کوئی بُرا طریقہ جاری کیا	۲۸۹
۳۱۷	معاشرہ میں برائی کی پہل کرنے والے متوجہ ہوں	۲۹۰
۳۱۸	اسلاف کی فضیلت اخلاف پر	۲۹۱
۳۱۸	ہابیل اور قابیل کا قصہ	۲۹۲

نمبر	عنوانات	صفحات

اَلدَّلاَلَۃُ عَلٰی خَیُر
بھلائی کی طرف رہنمائی

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۹۳	اقتباس	۳۲۲
۲۹۴	دین کی دعوت دینے کا حکم	۳۲۳
۲۹۵	داعی کے لئے سوجھ بوجھ اور دانائی ضروری ہے	۳۲۴
۲۹۶	نبی کریم ﷺ کا حکیمانہ انداز	۳۲۵
۲۹۷	ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے......	۳۲۶
۲۹۸	دعوت الی الخیر کی فضیلت	۳۲۷
۲۹۹	روایتِ بالا کا شانِ ورود	۳۲۸
۳۰۰	اگلے باب اور اس باب میں فرق	۳۳۰
۳۰۱	اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں	۳۳۱
۳۰۲	مدینہ منورہ میں اخیر میں وفات پانے والے صحابی	۳۳۲
۳۰۳	آپ ﷺ برے نام بدل دیا کرتے تھے	۳۳۳
۳۰۴	کریکیٹروں اور ایکٹروں کے نام رکھنے کا شوق	۳۳۴
۳۰۵	بارگاہِ نبوی سے اعلیٰ ترین سرٹیفکٹ	۳۳۴
۳۰۶	حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام لاٹری لگی	۳۳۵
۳۰۷	اسلام میں قتل وقتال بذاتِ خود مقصود نہیں ہے	۳۳۶
۳۰۸	کسی بندے کو ہدایت کا راستہ بتانے کی فضیلت	۳۳۷
۳۰۹	ہماری بھی کوشش ہونی چاہیے......	۳۳۸
۳۱۰	عملی نمونہ	۳۳۹

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۱۱	صحابی کی فراخ دلی	۳۳۹
۳۱۲	آپ ضرورت مند کی رہنمائی کر دیں	۳۴۰
۳۱۳	مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے	۳۴۱
۳۱۴	روزہ افطار کرانے کی فضیلت	۳۴۱
۳۱۵	دعاء	۳۴۲

اَلتَّعَاوُنُ عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی
نیکی اور تقویٰ میں مدد و تعاون

۳۱۶	آپسی تعاون کی بنیاد کیا؟	۳۴۴
۳۱۷	اپنے مومن بھائی کی ہر حال میں مدد کرو	۳۴۶
۳۱۸	حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بے مثال طرزِ عمل	۳۴۶
۳۱۹	امامت کا مفہوم	۳۴۷
۳۲۰	سورۂ عصر، ترجمہ اور مختصر تفسیر	۳۴۸
۳۲۱	امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد	۳۴۹
۳۲۲	جہاد کا سامان فراہم کر دینا	۳۵۰
۳۲۳	ایک بھائی دین کا کام کرے اور دوسرا کاروبار	۳۵۱
۳۲۴	دوطرفہ سلپنگ پارٹنر شپ (Sleeping Partner ship)	۳۵۲
۳۲۵	کون کسے کھلاتا ہے؟	۳۵۳
۳۲۶	حضرت شیخ کے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ	۳۵۴
۳۲۷	نابالغ کو حج کرانے پر والدین کو بھی ثواب	۳۵۵
۳۲۸	نابالغ کا حج معتبر ہے؟	۳۵۶

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۲۹	خزانچی کو بھی چند شرائط کے ساتھ صدقہ کا ثواب ملتا ہے	۳۵۶

النَّصِیُحَةُ

خیر خواہی اور بھلائی

۳۳۰	اقتباس	۳۶۰
۳۳۱	ایک جامع لفظ	۳۶۱
۳۳۲	معاشرت کو قائم کرنے والا ایک ضروری وصف	۳۶۲
۳۳۳	ہر ایک کی بھلائی چاہنا؛ نبیوں کے اوصاف میں سے ہیں	۳۶۳
۳۳۴	دین کی حقیقت مختصر الفاظ میں	۳۶۵
۳۳۵	اللہ تعالیٰ کے لئے خیر خواہی کا کیا مطلب؟	۳۶۶
۳۳۶	اللہ تعالیٰ کی کتاب کی خیر خواہی	۳۶۷
۳۳۷	حکمرانوں کی خیر خواہی	۳۶۷
۳۳۸	عام لوگوں کی خیر خواہی	۳۶۸
۳۳۹	حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیعت	۳۶۸
۳۴۰	نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر کیے گئے عہد و پیمان کا لحاظ	۳۶۹
۳۴۱	یک جان، دو قالب	۳۷۰

الْأَمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَالنَّهُیُ عَنِ الْمُنْكَرِ ۱

بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

۳۴۲	امر بالمعروف کی تشریح	۳۷۲
۳۴۳	نہی عن المنکر کا مطلب	۳۷۳
۳۴۴	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلّف کون؟	۳۷۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۴۵	فرضِ عین اور فرضِ کفایہ	۳۷۵
۳۴۶	امر بالمعروف کا حکم	۳۷۷
۳۴۷	بنی اسرائیل کی حرکتیں اور ان پر انبیاءِ وقت کی زبانی پھٹکار	۳۷۷
۳۴۸	کفر کی ممانعت مخصوص لہجہ میں	۳۷۹
۳۴۹	لاگ لپیٹ اور مداہنت نہ ہو	۳۸۰
۳۵۰	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ؛ عمومی عذاب سے محافظ	۳۸۱
۳۵۱	جو آدمی کوئی برائی ہوتی دیکھے؛ تو کیا کرے؟	۳۸۲
۳۵۲	برائی کرنے والوں کا مقابلہ	۳۸۳
۲۵۳	کسی بھی حال میں شریعت کا دامن نہیں چھوڑیں گے	۳۸۴
۳۵۴	اربابِ اقتدار سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے	۳۸۶
۳۵۵	اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے	۳۸۷
۳۵۶	محبت اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے	۳۸۸
۳۵۷	دعاء	۳۸۹

اَلْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ ۲

بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۵۸	داد و دہش کے معاملہ میں اولاد کے ساتھ برابری	۳۹۱
۳۵۹	ہمارے سماج کا المیہ	۳۹۳
۳۶۰	ایک مثال سے وضاحت	۳۹۴
۳۶۱	نہی عن المنکر نہ کرنے کا نقصان...ایک مثال	۳۹۵
۳۶۲	بدعمل حکام کے ساتھ رعایا کا ردِّ عمل کیا ہو؟	۳۹۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۶۳	برائی سے روکنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟	۳۹۹
۳۶۴	بچوں کی تعلیم میں نرمی سے کام لیا جائے	۳۹۹
۳۶۵	نہی عن المنکر کے لئے کوئی سخت طرز اختیار نہ کرے	۴۰۰
۳۶۶	آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل... تین نمونے	۴۰۰
۳۶۷	ٹکراؤ کی شکل اختیار نہ کی جائے	۴۰۳
۳۶۸	حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا	۴۰۳
۳۶۹	پھر صلحاء کا وجود بھی نہیں بچا سکے گا	۴۰۵
۳۷۰	عام گذرگاہوں پر بیٹھنے کی مشروط اجازت	۴۰۶
۳۷۱	بات چھوٹی سی، لیکن فتنہ بڑا	۴۰۸
۳۷۲	دعا	۴۰۹ ، ۴۱۰

اَلْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ ۳

بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۷۳	مردوں کے لئے سونا اور ریشم منع ہے	۴۱۲
۳۷۴	صحابہ رضی اللہ عنہم کے جذبۂ اطاعت کی ایک مثال	۴۱۳
۳۷۵	حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ	۴۱۵
۳۷۶	حضرت عائذ رضی اللہ عنہ کی نصیحت عبید اللہ بن زیاد کو	۴۱۵
۳۷۷	ایں خانہ ہمہ آفتاب است	۴۱۶
۳۷۸	ظالم حُکّام کیوں مسلط ہوتے ہیں؟	۴۱۷
۳۷۹	افضل ترین جہاد	۴۱۹
۳۸۰	بنی اسرائیل میں بگاڑ کیسے شروع ہوا؟	۴۲۰

صفحات	عنوانات	نمبر
۴۲۱	پھراس برائی کی برائی دل سے نکل جاتی ہے	۳۸۱
۴۲۳	ورنہ تمہارے ساتھ بھی بنی اسرائیل والا معاملہ ہوگا	۳۸۲
۴۲۵	ہمارا متضاد طرزِ عمل	۳۸۳
۴۲۷	ایک ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ	۳۸۴

قول اور عمل میں تضاد پر سخت سزا

۴۳۰	علماءِ یہود حضور ﷺ کی حقانیت سے واقف تھے	۳۸۵
۴۳۲	ایک یہودی کا قصہ	۳۸۶
۴۳۳	اعتبار الفاظ کے عموم کا ہے، خاص موقعہ کا نہیں	۳۸۷
۴۳۴	دوسروں کو نصیحت کرتے ہو خود کو بھول جاتے ہو؟	۳۸۸
۴۳۵	امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۳۸۹
۴۳۶	کیا نصیحت کے لئے خود عمل کرنا ضروری ہے؟	۳۹۰
۴۳۷	یہ انداز غلط ہے	۳۹۱
۴۳۹	ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو خود کرتے نہیں؟	۳۹۲
۴۴۰	اپنی ذات پر نگاہ نہ ہو	۳۹۳
۴۴۱	حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا قصہ	۳۹۴
۴۴۲	حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آنکھ لگی رہ گئی	۳۹۵
۴۴۳	عہدہ طلب کرنا اسی لئے منع ہے	۳۹۶
۴۴۳	بے عمل علماء اور واعظوں کا انجام	۳۹۷
۴۴۴	حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد	۳۹۸
۴۴۴	حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے مناقب	۳۹۹

صفحات	عنوانات	نمبر
۴۴۷	مساوات کا اسلامی قانون	۴۰۰
۴۴۹	لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا	۴۰۱
۴۵۰	دعاء	۴۰۲

نمبر	عنوانات	صفحات

الأمر بأداء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۱

۱	افتتاحیہ	۲۰ تا ۳۱
۲	فتح مکہ کا ایک منظر	۳۴
۳	امام مہدی جب ظاہر ہوں......	۳۷
۴	بڑی بڑی مخلوقات نے بوجھ اُٹھانے سے انکار کر دیا	۳۷
۵	امانت کی وسعت	۳۸
۶	آیتِ امانت کی تفسیر	۳۹
۷	دین پورا ہی امانت ہے	۴۱
۸	آنکھ کی خیانت	۴۱
۹	زبان اور کان بھی امانت ہے	۴۲
۱۰	آدمی اپنی جان کا مالک نہیں ہے؛ امین ہے	۴۳
۱۱	دولت بھی امانت ہے	۴۴
۱۲	ملازمت میں خیانت	۴۵
۱۳	ملازمین کے لئے سبق آموز طرزِ عمل	۴۶
۱۴	پھر تو دنیا میں جھگڑے ہی ختم ہو جائیں	۴۸
۱۵	دفتری سامان بھی امانت ہے	۵۰
۱۶	ایک ضروری مسئلہ	۵۱

الأمر بأداء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۲

۱۷	منافقین؛ اور ان کا پس منظر	۵۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۸	رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے کارنامے	۵۶
۱۹	منافقین کے ساتھ آنحضور ﷺ کا برتاؤ	۵۹
۲۰	غزوۂ مریسیع اور عبداللہ بن اُبی کی فتنہ انگیزی	۶۰
۲۱	تحزّب اور تعصّب کیا ہے؟	۶۲
۲۲	نفاقِ عمل	۶۷
۲۳	یہ منافقین کے اعمال ہیں	۶۸
۲۴	بہترین مثال سے وضاحت	۶۹
۲۵	جھوٹ کی شناعت......ابوسفیان کا قصہ	۷۰
۲۶	جھوٹ صرف زبان سے ہی نہیں ہوتا	۷۱

الأمر بأدآء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۷	آپ ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولا	۷۶
۲۸	جھوٹا میڈیکل سرٹیفکٹ جھوٹی گواہی ہے	۷۷
۲۹	جھوٹی گواہی کی شناعت	۷۹
۳۰	کیریکٹر سرٹیفکٹ کب دیا جاسکتا ہے	۸۰
۳۱	اخلاق ومزاج ناپنے کا تھرمامیٹر	۸۰
۳۲	سفارش کب کی جائے؟	۸۱
۳۳	تصدیق نامہ لکھنے کے شرائط	۸۲
۳۴	وعدہ خلافی	۸۳
۳۵	نہایت کڑے وقت میں بھی آپ ﷺ نے وعدہ خلافی نہیں فرمائی	۸۵
۳۶	مصلحت کے نام سے احکامِ شرع کی خلاف ورزی	۸۷

نمبر	عنوانات	صفحات
۳۷	ملکی قوانین کی خلاف ورزی بھی وعدہ خلافی ہے	۸۸

الأمر بأدآء الأمانة

ادائے امانت کی تاکید ۴

۳۸	امانت ایک فطری وصف ہے	۹۲
۳۹	آناً فاناً تبدیلی	۹۳
۴۰	جذبۂ امانت ختم ہونے کی حسی کیفیت	۹۴
۴۱	رائی کے دانہ کے برابر بھی امانت نہ ہوگی	۹۶
۴۲	جس سے چاہو معاملہ کرلو	۹۶
۴۳	جنت کا دروازہ کون کھلوائے گا؟	۹۸
۴۴	امانت دار کے لئے پل صراط پر آسانی	۱۰۰
۴۵	حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ادائے قرض کا فکر	۱۰۳
۴۶	امانت اور قرض میں فرق	۱۰۵

تحریم الظلم و الأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۱

۴۷	قابلِ توجہ بات	۱۱۲
۴۸	نفس کا بڑا دھوکہ	۱۱۳
۴۹	باب کا عنوان	۱۱۴
۵۰	کوئی دوست اور سفارشی نہیں ہوگا	۱۱۵
۵۱	نہایت اہم روایت	۱۱۶
۵۲	اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام قرار دیا	۱۱۷
۵۳	عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ......	۱۱۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۵۴	ہمیشہ مجھ سے مانگتے رہو	۱۱۸
۵۵	ہم تو سراپا گناہ ہیں	۱۲۰
۵۶	یہ ہمارے بس میں ہے ہی نہیں	۱۲۲
۵۷	من نہ گردم پاک از تسبیح شاں	۱۲۲
۵۸	اللہ تعالیٰ کے لامحدود خزانے	۱۲۴
۵۹	بھلے عمل کا بھلا نتیجہ	۱۲۴
۶۰	بار بار پڑھتے رہنے کے قابل روایت	۱۲۶
۶۱	ظلم سے بچو	۱۲۶
۶۲	اگلوں کو ہلاک کرنے والی صفت	۱۲۷
۶۳	اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل کا نمونہ	۱۲۷

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۲

۶۴	حجۃ الوداع کا مطلب	۱۳۰
۶۵	حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی فقاہت	۱۳۲
۶۶	خطبۂ حجۃ الوداع	۱۳۴
۶۷	مسلمان کی جان، مال اور عزت اُسی طرح محفوظ ہے......	۱۳۵
۶۸	میرے بعد تم بھی ایسے نہ بن جانا	۱۳۷
۶۹	جس نے ایک بالشت کے برابر کسی کی زمین ناحق دبالی	۱۳۸
۷۰	جب اللہ تعالیٰ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے	۱۳۸
۷۱	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نصیحتیں	۱۳۹
۷۲	مظلوم کی بددعا سے بچنا	۱۴۱

نمبر	عنوانات	صفحات

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۳

۷۳	بیت المال کا اسلامی نظام	۱۴۴
۷۴	یہ تمہارا؛ اور یہ میرا	۱۴۵
۷۵	ہدیہ کے نام سے رشوت	۱۴۶
۷۶	ناحق چیز اپنے ہی کندھے پر	۱۴۷
۷۷	ظالموں کے لئے اپنے کئے کی تلافی کا موقعہ آج ہی ہے	۱۴۸
۷۸	ایک دانگ کے بدلہ ستر مقبول نمازیں	۱۵۰
۷۹	حضور اکرم ﷺ کا اہتمام	۱۵۱

تحریم الظلم والأمر برد المظالم

ظلم کی حرمت ۴

۸۰	حدیثِ باب اور اس کی تشریح	۱۵۳
۸۱	عکرمہ بن ابی جہل بارگاہِ نبوت میں	۱۵۴
۸۲	زبان سے ایذا رسانی کا دائرہ وسیع ہے	۱۵۶
۸۳	حقیقی معنٰی میں مہاجر کون؟	۱۵۷
۸۴	ایک چادر کی خیانت جہنم میں جانے کا سبب بنی	۱۵۹
۸۵	جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا حق ہضم کرنے پر وعید	۱۶۰
۸۶	یہ بھی ایک طرح کی خیانت ہے	۱۶۳
۸۷	تمام ذمہ داریاں امانت ہیں	۱۶۵
۸۸	انفرادی معاملہ تو آسان ہے لیکن......	۱۶۶
۸۹	معمولی خیانت شہادت جیسی قربانی کو ضائع کردیتی ہے	۱۶۷

صفحات	عنوانات	نمبر

تحریم الظلم والأمر برد المظالم
ظلم کی حرمت ۵

۱۷۰	شہادت کی فضیلت کے حصول میں دَین رکاوٹ ہے	۹۰
۱۷۲	مفلس کون ہے؟	۹۱
۱۷۴	غیبت؛ زنا سے زیادہ سخت کیوں؟	۹۲
۱۷۵	چرب زبانی سے کسی کا حق ہڑپ کرنے پر وعید	۹۳
۱۷۸	غلط فیصلہ کروالینے سے دوسرے کی چیز حلال نہیں ہوجاتی	۹۴
۱۷۸	جیسا آپ کا سوال؛ ویسا ہی مفتی صاحب کا جواب	۹۵
۱۷۹	کسی مفتی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں	۹۶
۱۸۰	نزاعی معاملات میں قابلِ تقلید طرزِ عمل	۹۷
۱۸۱	......جب تک کہ حرام خون کا مرتکب نہ ہو	۹۸
۱۸۲	اللہ تعالیٰ کے مال میں بے جا تصرفات پر وعید	۹۹

تَعۡظِیۡم حُرُمَاتِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ
مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کرنا ۱

۱۸۵	عنوان کا خلاصہ	۱۰۰
۱۸۶	شعائر اللہ کی تعظیم تقویٰ کی علامت ہے	۱۰۱
۱۸۷	......یہ پوری انسانیت کا قتل ہے	۱۰۲
۱۸۸	کسی ایک کی بیجا جرأت دوسروں کو حوصلہ بخشتی ہے	۱۰۳
۱۸۹	......اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی	۱۰۴
۱۹۰	مؤمنین باہم ایک عمارت کے مانند ہیں	۱۰۵
۱۹۱	نادانستہ طور پر پہنچنے والی تکلیف سے بچانے کا اہتمام	۱۰۶

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۰۷	مسلمان ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں	۱۹۲
۱۰۸	جذبۂ رحم کا تقاضہ	۱۹۴
۱۰۹	تطفیف ہر چیز میں ہوا کرتی ہے	۱۹۵
۱۱۰	جذبۂ رحمت اگر تمہارے دل میں نہیں؛ تو مَیں کیا کروں؟	۱۹۶
۱۱۱	جذبۂ رحمت کا ظہور موقعہ بموقعہ ہوتا رہنا چاہیے	۱۹۷

تَعۡظِیۡم حُرُمَاتِ الۡمُسۡلِمِیۡن

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کرنا ۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۱۲	جو دوسروں کے ساتھ رحم نہیں کرتا	۲۰۰
۱۱۳	امام کو مقتدیوں کی رعایت کا حکم	۲۰۰
۱۱۴	اس سے زیادہ شفقت اور کیا ہو سکتی ہے؟	۲۰۲
۱۱۵	ایک لطیفہ	۲۰۴
۱۱۶	ذمہ دارانِ مسجد کے لئے ایک زرّین مشورہ	۲۰۴
۱۱۷	نبی کریم ﷺ کی امت پر شفقت کا ایک نمونہ	۲۰۵
۱۱۸	تراویح کا واقعہ	۲۰۶
۱۱۹	بعد میں تکلیف ہو؛ مَیں یہ نہیں چاہتا	۲۰۷
۱۲۰	صومِ وصال سے ممانعت بوجہ شفقت علی الامۃ	۲۰۸
۱۲۱	میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے	۲۰۹
۱۲۲	کہیں بچہ کی ماں رنجیدہ نہ ہو	۲۱۰
۱۲۳	کہیں اللہ تعالیٰ آپ سے مطالبہ نہ کر بیٹھیں	۲۱۲
۱۲۴	آپسی رشتہ کی بنیاد ایمان ہے	۲۱۳
۱۲۵	مظلوم مسلمان کا حق	۲۱۵

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۲۶	نفس وشیطان کا مظلوم	۲۱۶
۱۲۷	جزاءمن جنس العمل	۲۱۷
۱۲۸	سارادارومدارنیت ہی پرہے	۲۱۹
۱۲۹	نیت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے	۲۱۹

تَعْظِیْمِ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ
مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کرنا ۳

۱۳۰	اخوتِ اسلامی کے تقاضے	۲۲۲
۱۳۱	تقویٰ کا سرچشمہ دل ہے	۲۲۳
۱۳۲	انسان کی برائی کے لئے یہی کافی ہے	۲۲۴
۱۳۳	ایک دوسرے پر حسد نہ کرو	۲۲۵
۱۳۴	حسد کہاں تک پہنچا دیتا ہے؟	۲۲۷
۱۳۵	حسد کا علاج	۲۲۷
۱۳۶	نجش کی ممانعت	۲۲۸
۱۳۷	کسی کے سودے پر سودامت کرو	۲۲۹
۱۳۸	مَیں اپنے دل میں کسی کے متعلق کینہ نہیں رکھتا	۲۳۱
۱۳۹	پیٹھ مت دکھاؤ	۲۳۳
۱۴۰	معاشرت کا ایک زرّین اصول	۲۳۴
۱۴۱	یہ حدیث دین کا چوتھائی حصہ ہے	۲۳۵
۱۴۲	اسی کو ’’عصبیت‘‘ کہتے ہیں	۲۳۶
۱۴۳	ظالم کو ظلم سے روک دو	۲۳۷

صفحات	عنوانات	نمبر

تَعۡظِیۡمِ حُرُمَاتِ الۡمُسۡلِمِیۡنَ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کرنا ۴

۲۴۰	مسلمان کے حقوق	۱۴۴
۲۴۱	اسلام میں سلام کی اہمیت	۱۴۵
۲۴۱	سلام کے فضائل	۱۴۶
۲۴۲	تین تین دعائیں	۱۴۷
۲۴۵	پتہ نہیں کس کی دعا قبول ہوجائے	۱۴۸
۲۴۶	اللہ اس بندہ پر رحم کرے......	۱۴۹
۲۴۶	دعائیں لینے کا اہتمام	۱۵۰
۲۴۷	سلام کے آداب	۱۵۱
۲۴۸	شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول	۱۵۲
۲۴۸	سلام کا جواب کیسے دیں؟	۱۵۳
۲۵۰	مسلمان کا دوسرا حق؛ تیمارداری	۱۵۴
۲۵۱	عیادت کے فضائل	۱۵۵
۱۵۲	عیادت کے آداب	۱۵۶
۲۵۴	غلط رسم ورواج محرومی کا سبب	۱۵۷
۲۵۵	عیادت کا ایک اہم ادب	۱۵۸
۲۵۶	مسلمان کا تیسرا حق؛ جنازہ میں شرکت	۱۵۹
۲۵۷	مسلمان کا چوتھا حق؛ دعوت قبول کرنا	۱۶۰
۲۵۸	دعوت کے تین درجے	۱۶۱
۲۵۹	دعوت یا عداوت	۱۶۲

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۶۳	دعوت کا ایک نرالا انداز	۲۶۱
۱۶۴	میزبان کے بھی حقوق ہیں	۲۶۲
۱۶۵	دعوت قبول کرنے کے شرائط	۲۶۴
۱۶۶	غلط رسم ورواج ختم کرنے کے لئے ایک مفید مشورہ	۲۶۵
۱۶۷	مسلمان کا ایک حق؛ خیر خواہی کرنا	۲۶۶
۱۶۸	چھینکنے والے کا جواب	۲۶۶
۱۶۹	سات چیزوں کا حکم، اور سات چیزوں سے ممانعت	۲۶۷

سَتْرُ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ

پردہ دری کی ممانعت

نمبر	عنوانات	صفحات
۱۷۰	عام حالات میں عیب گوئی کی اجازت نہیں	۲۷۳
۱۷۱	بعض امور کی اشاعت سے بھی برائیاں پھیلتی ہیں	۲۷۴
۱۷۲	پردہ پوشی کا اہم فائدہ	۲۷۵
۱۷۳	...... مجھے تو کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا	۲۷۸
۱۷۴	یہ تو نہایت ہی بے شرمی کی بات ہے	۲۷۹
۱۷۵	دوسرے درجہ کی ڈھٹائی	۲۸۰
۱۷۶	کسی بھی حال میں طعن وتشنیع نہ کرے	۲۸۲
۱۷۷	زنا کی شرعی سزاؤں کی تفصیل	۲۸۳
۱۷۸	کسی پر زنا کی تہمت لگانے کی شرعی سزا	۲۸۴
۱۷۹	ایک اشکال اور اس کا جواب	۲۸۶
۱۸۰	اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کی مدد مت کرو	۲۸۷

نمبر	عنوانات	صفحات

قَضَآءِ حَوَائِجِ الْمُسْلِمِیْنَ

مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا

۱۸۱	ضرورت کے موقعہ پر کسی کے کام آنا	۲۹۰
۱۸۲	مسلمان مسلمان کا بھائی ہے	۲۹۱
۱۸۳	اللہ تعالیٰ کی مدد کو متوجہ کرنے کی تدبیریں	۲۹۲
۱۸۴	دلی سکون کے متلاشی متوجہ ہوں	۲۹۳
۱۸۵	عملی کوتاہی کی تلافی نسبی بلندی سے نہیں ہوسکتی	۲۹۴

اَلشَّفَاعَۃُ

سفارش کرنا

۱۸۶	سفارش کرنے والا برابر کا حصہ دار ہے	۲۹۷
۱۸۷	سفارش کی حیثیت	۲۹۷
۱۸۸	ہماری غلط فہمی	۲۹۸
۱۸۹	سفارش کے متعلق پہلا اُصول	۲۹۹
۱۹۰	ایسی سفارش بالکل درست نہیں ہے	۳۰۱
۱۹۱	نااہل کے متعلق سفارش مت کیجیے؛ ورنہ......	۳۰۲
۱۹۲	سفارش میں جانبین کی رعایت کریں	۳۰۳
۱۹۳	حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کا قصہ	۳۰۴
۱۹۴	ایک اہم مسئلہ	۳۰۷
۱۹۵	سفارش کے معاملہ میں ہونے والی کوتاہیاں	۳۰۸
۱۹۶	بہترین سفارش نامہ	۳۰۹
۱۹۷	خلاصۂ کلام	۳۱۰

نمبر	عنوانات	صفحات

الاصلاح بین الناس ۱

آپس کے تعلقات درست کرانا

۱۹۸	لوگوں کے تعلقات درست کرانے کی اہمیت	۳۱۲
۱۹۹	تعلقات کے بگاڑ پر وعیدیں	۳۱۳
۲۰۰	مجلس بازی میں کوئی خیراور بھلائی نہیں ہے	۳۱۵
۲۰۱	صلح؛ بھلائی کی چیز ہے	۳۱۵
۲۰۲	تعلقات کوخوش گوار بناؤ	۳۱۶
۲۰۳	مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں	۳۱۸
۲۰۴	انصاف کے ساتھ صلح کرانا صدقہ ہے	۳۱۹
۲۰۵	کسی کوسہارا دینا بھی صدقہ ہے	۳۲۱
۲۰۶	مختلف کام جوصدقہ کا ثواب دلاتے ہیں	۳۲۲
۲۰۷	راستہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی مختلف صورتیں	۳۲۳
۲۰۸	اپنا کام دوسرا کردے؛ تواس کاشکریہ ادا کرو	۳۲۴
۲۰۹	زمانہ میں کیسا تغیر آ گیا ہے؟	۳۲۵
۲۱۰	معاشقہ والے نکاح کا آپریشن	۳۲۶
۲۱۱	صحیح تربیت نہ ہونے کا اثر	۳۲۸
۲۱۲	پردے کا مسئلہ کتنا اہم ہے	۳۲۸
۲۱۳	کھیل کی اجازت کب ہے؟	۳۳۰
۲۱۴	عمدہ مثالیں	۳۳۱
۲۱۵	ایسے لوگوں سے بھی کبھی راحت پہنچ جاتی ہے	۳۳۲
۲۱۶	اُلٹی گنگا	۳۳۳

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۱۷	عصبیت ابھارنے کا شیطان کا عجیب انداز	۳۳۳
۲۱۸	عصبیت کمزوری کو چھپانے کے لئے آتی ہے	۳۳۴
۲۱۹	بدبودار نعرہ	۳۳۵
۲۲۰	غلط حمایت سے حضور ﷺ کی براءت	۳۳۶
۲۲۱	جانبین کے لئے معتدل رہنمائی	۳۳۷
۲۲۲	اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے ہم کتنے غافل ہیں	۳۳۸

الاصلاح بین الناس ۲

آپس کے تعلقات درست کرانا

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۲۳	وہ آدمی جھوٹا نہیں کہلائے گا	۳۴۱
۲۲۴	ایسے موقع پر بھی صریح جھوٹ سے بچو	۳۴۲
۲۲۵	ایسے جھوٹ کی اجازت ہے	۳۴۳
۲۲۶	گنجائش کے تین موقعے	۳۴۴
۲۲۷	معاملہ کو سلجھانے کا ایک انداز یہ بھی ہے	۳۴۵
۲۲۸	صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کے نمونے	۳۴۷
۲۲۹	اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارش	۳۴۹
۲۳۰	یہ ڈبل پیمانہ تو اچھا نہیں	۳۵۰
۲۳۱	پہلے تحقیق کرو؛ پھر عمل کرو	۳۵۰
۲۳۲	طلاق کیوں مشروع ہوئی؟	۳۵۱
۲۳۳	حسنِ معاشرت کا ایک رہنما اصول	۳۵۲
۲۳۴	عقلمند اور بے وقوف کے درمیان فرق	۳۵۳
۲۳۵	یہ نسخہ آزما کر تو دیکھو	۳۵۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۳۶	پھر تو اللہ تعالیٰ بھی جوڑ کر ہی دے گا	۳۵۵
۲۳۷	شریعت نے طلاق دینے کا طریقہ بھی بتلا دیا	۳۵۶
۲۳۸	ہمارے معاشرے کی دُکھتی ہوئی رگ	۳۵۶
۲۳۹	پکے دشمن کی بیٹی نکاح میں ہے لیکن......	۳۵۷
۲۴۰	کیا طلاق دینے کا بھی کوئی وقت ہے؟	۳۵۹
۲۴۱	اتنے انتظار کے بعد بھی ایک ہی دو	۳۶۱
۲۴۲	ایک طلاق دینے کا فائدہ	۳۶۱
۲۴۳	ایک ناسمجھ کا قصہ	۳۶۲
۲۴۴	نظام طلاق پر غیروں کے اعتراض کی اصل وجہ	۳۶۳
۲۴۵	اسلام نے طلاق کا عجیب وغریب قانون بتایا ہے	۳۶۴
۲۴۶	گمراہ رہبر	۳۶۵
۲۴۷	اصل حلالہ کیا ہے؟	۳۶۶
۲۴۸	بھاڑوتی بکرا	۳۶۷
۲۴۹	لوگوں کا ایک اشکال اور اس کا جواب	۳۶۸
۲۵۰	دوسرے کو دی گئی سزا خود پر لاگو ہوئی	۳۶۹
۲۵۱	طلاق کوئی کھیل تماشہ نہیں	۳۶۹
۲۵۲	ہماری غفلت کی انتہاء ہے	۳۷۰
۲۵۳	آمدم برسرِ مطلب	۳۷۱

الاصلاح بین الناس ۳

آپس کے تعلقات درست کرانا

۲۵۴	صلح کرانے والا اس بات کے انتظار میں نہ رہے	۳۷۴

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۵۵	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے یہ بڑی سعادت کی چیز تھی	۳۷۶
۲۵۶	امام سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے کس طرح متوجہ کیا جائے؟	۳۷۸
۲۵۷	ابوقحافہ کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ......	۳۷۹

فَضْلُ ضُعُفَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِیْنَ ۱

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۵۸	باب کا عنوان	۳۸۲
۲۵۹	یہی لوگ اہلِ مجلس قرار دیئے گئے	۳۸۳
۲۶۰	ان کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا	۳۸۳
۲۶۱	وہ بھی اسی مجلس میں آجاویں	۳۸۵
۲۶۲	حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا	۳۸۶
۲۶۳	مَیں بتلاؤں جنتی لوگ کون ہیں؟	۳۸۷
۲۶۴	کیا میری بہن ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟	۳۸۸
۲۶۵	ہوسکتا ہے کہ ڈھول کے اندر کوئی سوار چھپا ہوا ہو	۳۸۹
۲۶۶	مَیں بتلاؤں کہ جہنمی لوگ کون ہیں؟	۳۹۰

فَضْلُ ضُعُفَۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِیْنَ ۲

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۶۷	زمین بھر ایسوں کے مقابلہ میں وہ آدمی بڑھ کر ہے	۳۹۳
۲۶۸	کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے	۳۹۵
۲۶۹	اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ کے یہاں تم بے قیمت نہیں ہو	۳۹۶
۲۷۰	روح نکلتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی	۳۹۸
۲۷۱	جنت اور جہنم کا مناظرہ	۳۹۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۷۲	قیامت کی عدالت کا منظر	۳۹۹
۲۷۳	اعضاء کے بولنے پر دلیل اور نظیر	۴۰۰
۲۷۴	جہنم کا کلیکشن (Collection)	۴۰۱
۲۷۵	جنت کے حصہ میں کون؟	۴۰۱
۲۷۶	مسکنت الگ چیز ہے اور مسکینیت الگ چیز ہے	۴۰۲
۲۷۷	تکبر بڑی خطرناک بیماری ہے	۴۰۳
۲۷۸	آج کا ہمارا ایک اہم المیہ	۴۰۴
۲۷۹	بداعمالیوں کے مقابلہ میں بداخلاقیاں زیادہ مہلک ہیں	۴۰۴
۲۸۰	اخلاق کا مفہوم	۴۰۵
۲۸۱	شرک کے بعد روحانی بیماریوں سے بچنے کی وصیت	۴۰۵
۲۸۲	ہم اپنا علاج خود کرنے کے مجاز نہیں	۴۰۶
۲۸۳	دنیا اور آخرت میں سزا دلوانے والی بیماری	۴۰۶
۲۸۴	میرے اوپر ضروری ہے کہ تم دونوں کو بھروں	۴۰۷
۲۸۵	یہ سب فخر و تکبر کی چیزیں نہیں ہیں	۴۰۹
۲۸۶	ملنے جلنے والوں کے حالات کی خبر رکھنی چاہیے	۴۱۰
۲۸۷	ایسے لوگ قابلِ قدر ہیں	۴۱۲

فَضْلُ ضُعْفَةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِیْنَ ۳

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۸۸	بہت سے پراگندہ حال اونچے مقام والے ہوتے ہیں	۴۱۵
۲۸۹	ہم عملی طور پر کر دکھلاویں؛ تب کہا جاسکتا ہے کہ......	۴۱۷
۲۹۰	واقعتاً حدود اللہ کی رعایت کرنے والے یہی حضرات تھے	۴۱۸

نمبر	عنوانات	صفحات
۲۹۱	......پھر وہ اپنی مرضی نہیں چلاتے تھے	۴۱۹
۲۹۲	نصیب دار رو کے گئے تھے	۴۲۰
۲۹۳	جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی	۴۲۲
۲۹۴	لعنت واپس آ کر کہنے والے ہی کو لگتی ہے	۴۲۳
۲۹۵	کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں ہے	۴۲۴
۲۹۶	ماں کی گود میں بولنے والے تین بچے	۴۲۴
۲۹۷	کسی کی ظاہری حالت اچھی دیکھ کر دعا کرنے کی ضرورت نہیں	۴۲۹

مُلاطَفَةُ الْيَتِيمِ وَالْبَنَاتِ ۱

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

صفحہ	عناوین	نمبر شمار
۲۴	اداریہ	۱
۳۴	اقتباس	۲
۳۵	عنوان کا خلاصہ	۳
۳۸	مؤمنین کے سامنے بچھ جایئے	۴
۳۸	کسی یتیم پر چڑھ مت بیٹھیے	۵
۳۹	سوال کرنے والوں سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں	۶
۴۱	یتیموں کو دھکے دینا کافروں کا کام ہے	۷
۴۳	حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب	۸
۴۴	انسان بھی جانور ہے	۹
۴۶	انسانیت کے اصل جوہر	۱۰
۴۶	اخلاق کا تعلق قلب سے، اور ظہور افعال سے	۱۱
۴۸	انبیاء علیہم السلام کی صداقت کی ایک خاص علامت	۱۲
۴۹	غریبوں کو ہٹایئے	۱۳
۵۰	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دعوتی جذبہ	۱۴
۵۱	آپ غریبوں کو مت ہٹایئے	۱۵
۵۳	جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صہیب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے معافی مانگی	۱۶

مُلاطَفَۃُ الُیَتِیُمِ وَالُبَنَاتِ ۲

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

۱۷	یتیم کی پرورش کرنے والوں کے لئے بڑی بشارت	۵۷
۱۸	اسلام نے یتیموں کو ان کے حقوق دلوائے	۵۷
۱۹	قرآن کا حکم؛ آپ ﷺ کا عمل	۵۸
۲۰	حضورِ اقدس ﷺ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین طریقہ	۵۹
۲۱	اپنا یتیم	۵۹
۲۲	رسمیت نہ ہو	۶۰
۲۳	اپنے یتیم کی مختلف شکلیں	۶۱
۲۴	نیت درست کرلو	۶۲
۲۵	اصلی اور نقلی مسکین کی پہچان	۶۴
۲۶	مانگنا کب حرام اور کب جائز؟	۶۵
۲۷	حقیقی مسکین	۶۶
۲۸	ضرورت مند کی تحقیق کس کے ذمہ؟	۶۷
۲۹	زکوٰۃ بنام ہدیہ	۶۸
۳۰	زکوٰۃ کا اعلیٰ مصرف	۶۹
۳۱	یہ نکتہ ذہن میں رہے	۷۰
۳۲	ایک عارف کا عارفانہ قول	۷۰
۳۳	احسان سائل کا ہے	۷۱

۳۴	بیوہ اور مسکین کی مدد کرنے والا	۷۲
۳۵	دس سال کے اعتکاف کا ثواب	۷۳
۳۶	رشتہ داریوں کا پہچاننا	۷۴
۳۷	نسب اور عرب	۷۵
۳۸	ہر ایک کی اپنی اپنی ذمہ داری ہے	۷۵
۳۹	بدترین دعوتِ ولیمہ	۷۶
۴۰	صرف مالداروں کو دعوت نہ دیں	۷۷
۴۱	کھانا بھی خراب، خانہ بھی خراب	۷۸

مُلاطَفَۃُ الْیَتِیمِ وَالْبَنَاتِ ۳

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

۴۲	بچیوں کے بارے میں اہلِ عرب کا طرزِ عمل	۸۳
۴۳	''مِنْ اِمْلاقٍ'' اور ''خَشْیَۃَ اِمْلاقٍ'' کا فرق	۸۴
۴۴	بچیوں کو قتل کرنے کا جاہلانہ نظریہ	۸۶
۴۵	رائج الوقت گالیاں	۸۶
۴۶	غیر اختیاری چیز میں عورت ہی قصوروار کیوں؟	۸۸
۴۷	ہم تو زمین ہیں جو بیج ڈالا جاتا ہے اسی کو اُگا دیتے ہیں	۸۸
۴۸	بچیوں کے ساتھ کیسا ناروا سلوک	۸۹
۴۹	بچی کو زندہ درگور کرنے کا دردانگیز واقعہ	۹۰
۵۰	قیامت کے دن خود بچی سے پوچھا جائے گا	۹۲

۵۱	دو بچیوں کی پرورش کرنے والوں کے لئے بشارت	۹۳
۵۲	جہنم سے آڑ	۹۳
۵۳	ماں باپ کے لئے تمام اولاد برابر ہے	۹۴
۵۴	یہ دو پیمانے کیسے ہیں؟	۹۵
۵۵	ایک کھجور جنت میں جانے کا ذریعہ بنی	۹۶
۵۶	اس کا مددگار ''اللہ'' ہے	۹۷
۵۷	تمہارے کمزوروں کی وجہ سے مدد کی جاتی ہے	۹۸
۵۸	معاشرے کی دُکھتی رَگ	۹۹
۵۹	کھڑے کھڑے اور پڑے پڑے	۱۰۰
۶۰	تو پھنستا ہی چلا جاتا ہے	۱۰۰
۶۱	نوجوانوں کو ایک اہم نصیحت	۱۰۱
۶۲	ماں باپ کو اپنے ساتھ لو	۱۰۲
۶۳	مجھے کمزوروں میں ڈھونڈھو	۱۰۳

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۱

عورتوں کے بارے میں تاکید

۶۴	حقوق دو طرح کے ہیں	۱۰۷
۶۵	جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو جاتا ہے	۱۰۸
۶۶	کیوں ہمیں عبادات کا ثمرہ حاصل نہ ہوا؟	۱۰۹
۶۷	کہیں ہمارا ایمان تو ختم نہیں ہو رہا؟	۱۱۰

٦٨	شراب پینے سے زیادہ خطرناک ہے	١١١
٦٩	غیبت کی مثالی صورت	١١٢
٧٠	غیبت کو زنا سے زیادہ خطرناک کہنے کی وجہ	١١٢
٧١	......ہم اتنی اہمیت نہیں دیتے	١١٣
٧٢	احسان کی کیفیت	١١٣
٧٣	نماز میں اس کیفیت کا حاصل ہونا ابتدائی درجہ ہے	١١٤
٧٤	فَأَيْنَ اللهُ؟	١١٦
٧٥	بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے	١١٦
٧٦	قرآن وحدیث سے فقہی احکام کیسے نکلے؟	١١٧
٧٧	امت پر سب سے بڑا احسان کس کا ہے؟	١١٨
٧٨	مثال سے تقلید کی ضرورت کا اثبات	١١٩
٧٩	تقلید کی حقیقت کیا ہے؟	١٢١
٨٠	غیر مقلدین بھی درحقیقت مقلد ہی ہیں	١٢٢
٨١	فقہ اسلامی بڑی عظیم نعمت ہے	١٢٢
٨٢	احمقانہ سوال	١٢٣
٨٣	بندر کو ادرک کی گرہ مل گئی	١٢٣
٨٤	باب کا عنوان	١٢٤
٨٥	عورتوں کے حقوق میں بیداری اسلام کے بعد آئی	١٢٥
٨٦	تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی	١٢٦

۸۷	میانہ روی ہی اصل چیز ہے	۱۲۷
۸۸	عورتوں کے حقوق کا بیجا شور	۱۲۷

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۲

عورتوں کے بارے میں تاکید

۸۹	حسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارو	۱۳۱
۹۰	اللہ تعالیٰ کی سفارش	۱۳۱
۹۱	پھر سے علوم کا سلسلہ شروع ہوگیا	۱۳۳
۹۲	اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ایسے گھرانے پر کیسے اتریں؟	۱۳۴
۹۳	کام کیوں بگڑتے ہیں؟	۱۳۴
۹۴	ہماری نگاہ محدود ہے	۱۳۵
۹۵	قرآن کا انداز تو اصولی ہے لیکن......	۱۳۵
۹۶	گھر جنت یا جہنم	۱۳۷
۹۷	مغربی معاشرہ کا بڑا المیہ	۱۳۸
۹۸	اراکین دارالامراء کا رپورٹ	۱۳۸
۹۹	ان کے پاس کوئی حل نہیں ہے	۱۳۹
۱۰۰	وہ باریک بیں اور باخبر ہے	۱۳۹
۱۰۱	تعددِ ازواج پر اعتراض کیوں؟......	۱۴۰
۱۰۲	یہ کہاں کا انصاف ہے؟	۱۴۱
۱۰۳	ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ	۱۴۲

۱۰۴	محبت تو غیر اختیاری چیز ہے	۱۴۳
۱۰۵	اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے......	۱۴۴
۱۰۶	جیسا گناہ؛ ویسی سزا	۱۴۵
۱۰۷	’’کَالْمُعَلَّقَةِ‘‘ کی تفسیر	۱۴۶
۱۰۸	ازدواجی تعلقات کی درستگی کا راز	۱۴۶
۱۰۹	اپنی لڑکی کس کو دوں؟	۱۴۷
۱۱۰	انسانی فطرت کا لحاظ	۱۴۷
۱۱۱	یہ میری وصیت ہے	۱۴۸
۱۱۲	’’عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے‘‘ کا مطلب	۱۴۹
۱۱۳	عورت کا ٹیڑھا پن ہی اس کی خوبی ہے	۱۵۰
۱۱۴	ایک ہی چیز خوبی بھی اور عیب بھی	۱۵۱
۱۱۵	مرد کی خوبی الگ، عورت کی جدا	۱۵۱
۱۱۶	برائی کے انداز میں تعریف	۱۵۲
۱۱۷	ٹیڑھا پن تو اس کی فطرت ہی ہے	۱۵۳
۱۱۸	فطری کج ادائیوں کے ساتھ ہی زندگی بسر ہوگی	۱۵۴
۱۱۹	جیسا چل رہا ہے چلنے دو	۱۵۴
۱۲۰	ہر ایک ہی اپنے آپ کو اصلاحی کہتا ہے	۱۵۵

اَلْوَصِیَّةُ بِالنِّسَآءِ ۳

عورتوں کے بارے میں تاکید

۱۲۱	شرم کی بات ہے!	۱۵۹

۱۲۲	ایسی حرکت شریف انسان گوارا نہیں کر سکتا	۱۶۱
۱۲۳	بعض کام عورتیں ہی کر سکتی ہیں	۱۶۲
۱۲۴	نظام درہم برہم ہو جاتا ہے	۱۶۲
۱۲۵	میری آنکھوں میں آنسو آ گئے	۱۶۳
۱۲۶	اللہ اور اس کے رسول کی سفارش	۱۶۴
۱۲۷	اُلٹی چال	۱۶۵
۱۲۸	بس! اللہ تعالیٰ نے اسی پر میری مغفرت کر دی	۱۶۵
۱۲۹	بیوی کے ساتھ کبھی لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی	۱۶۶
۱۳۰	یہ حضور اکرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہیں	۱۶۷
۱۳۱	اپنی بیوی سے پوری زندگی میں پانی بھی نہیں مانگا	۱۶۷
۱۳۲	قومِ لوط کی ایک برائی	۱۶۸
۱۳	دنیا کی ساخت ہی اس انداز کی ہے	۱۶۹
۱۳۴	ہر چیز میں خیر اور شر کا پہلو ہے	۱۷۰
۱۳۵	تعلیمات بذریعہ دعوات	۱۷۱
۱۳۶	نفرت کو دور رکھنے کا بہترین طریقہ	۱۷۱
۱۳۷	اللہ کے رجال اور ان کا کمال	۱۷۲
۱۳۸	جس ہاتھ سے پوری زندگی میٹھی چیزیں کھاتا رہا	۱۷۳
۱۳۹	......تب ہی زندگی گذر سکتی ہے	۱۷۴
۱۴۰	وفاداری سے اونچی چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟	۱۷۵
۱۴۱	نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانہ میں	۱۷۶

اَلُوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۴

عورتوں کے بارے میں تاکید

۱۴۲	حجۃ الوداع کا مختصر پس منظر	۱۸۰
۱۴۳	نبی کریم ﷺ کو اندیشہ تھا	۱۸۱
۱۴۴	عورتیں تمہارے پاس قیدی ہیں	۱۸۲
۱۴۵	قابلِ غور مضمون	۱۸۲
۱۴۶	اپنے گھر سے کس کو تعلق نہیں ہوتا؟	۱۸۳
۱۴۷	......تو ہمارے دل پر کیا گذرے گی؟	۱۸۴
۱۴۸	ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے	۱۸۴
۱۴۹	کوئی بھی اس کا حمایتی نہیں	۱۸۵
۱۵۰	نکاح صرف ملکِ متعہ حاصل ہوتی ہے	۱۸۶
۱۵۱	کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے	۱۸۷
۱۵۲	نفل روزہ کے لئے شوہر کی اجازت لازم ہے	۱۸۷
۱۵۳	چاہے روٹی جل جائے	۱۸۸
۱۵۴	غیر اسلامی معاشرہ اور رسموں کی تباہی	۱۸۸
۱۵۵	سماج کی خطرناک صورتِ حال	۱۸۹
۱۵۶	صبح تک فرشتے لعنت کرتے ہیں	۱۹۰
۱۵۷	زنا کی سزا اتنی سخت کیوں؟	۱۹۱
۱۵۸	''ملکِ متعہ'' کا مطلب	۱۹۱
۱۵۹	نکاح کیوں کروایا جاتا ہے؟	۱۹۲

اَلْوَصِیَّۃُ بِالنِّسَآءِ ۵

عورتوں کے بارے میں تاکید

۱۶۰	کھانا پکانا عورت کے ذمہ نہیں	۱۹۵
۱۶۱	عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں	۱۹۵
۱۶۲	تب صرف اپنا کھانا پکائے گی	۱۹۶
۱۶۳	ساس خسر کی خدمت عورت پر فرض نہیں	۱۹۷
۱۶۴	حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ	۱۹۸
۱۶۵	دنیا میں جنت کی حوریں	۱۹۹
۱۶۶	یہ شوہر کا حق ہے	۲۰۰
۱۶۷	حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سبق آموز عمل	۲۰۰
۱۶۸	اگر بیوی کھلی نافرمانی کرے......	۲۰۱
۱۶۹	مرد کے حقوق عورتوں پر	۲۰۲
۱۷۰	عورتوں کے حقوق مرد پر	۲۰۲
۱۷۱	رہائش، آسائش، آرائش اور نمائش	۲۰۳
۱۷۲	کیا یہ بھی کبر ہے؟	۲۰۴
۱۷۳	نمائش ناجائز	۲۰۵
۱۷۴	بیوی کا کیا حق ہے؟	۲۰۵
۱۷۵	اس میں بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہے	۲۰۶
۱۷۶	تنبیہ وتادیب کا طریقہ	۲۰۷

۱۷۷	شوہر چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر نہیں رہ سکتا	۲۰۷
۱۷۸	سب سے کامل ایمان والا	۲۰۸
۱۷۹	ظاہرداری کا نام اخلاق نہیں ہے	۲۰۹
۱۸۰	اخلاق کی حقیقت	۲۱۰
۱۸۱	یہ اخلاق تھوڑے ہی ہیں	۲۱۱
۱۸۲	اللہ کی بندیوں کو مت مارو	۲۱۱
۱۸۳	خبرِ واحد کا حکم صحابہ کے حق میں	۲۱۲
۱۸۴	حضور ﷺ کے زمانہ میں ہونے کی تمنا	۲۱۳
۱۸۵	یہ عورتیں شیر بن گئیں	۲۱۴
۱۸۶	عورتوں کو مارنا سنت نہیں	۲۱۴
۱۸۷	وہ اچھے لوگ نہیں ہیں	۲۱۵
۱۸۸	دنیا لذت اندوزی کی چیز ہے	۲۱۵
۱۸۹	تین لفظوں کی تحقیق	۲۱۶
۱۹۰	نیک بیوی کی چار نشانیاں	۲۱۷

حَقُّ الزَّوۡجِ عَلیٰ الۡمَرۡأَۃِ

شوہر کے حقوق

۱۹۱	اسلام کا خاص انداز	۱۲۱
۱۹۲	اربابِ اموال اور عمال	۲۲۲
۱۹۳	وصول یابی کے لئے جانے والوں کو ہدایات	۲۲۴

۱۹۴	اربابِ اموال کو ہدایات	۲۲۵
۱۹۵	پھر تو دنیا میں کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہو	۲۲۶
۱۹۶	کیا ایسی کوئی انجمن قائم ہوئی؟	۲۲۶
۱۹۷	مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں	۲۲۷
۱۹۸	مرد کو حاکم کیوں بنایا گیا؟	۲۲۸
۱۹۹	کیا عورت اس سے دست بردار ہو جائے گی؟	۲۲۹
۲۰۰	آزادیٔ نسواں؛ صرف لیبل	۲۳۰
۲۰۱	خواتین پریشان ہیں	۲۳۱
۲۰۲	مرد کو عورت پر نگران مقرر کرنے کی ایک وجہ	۲۳۱
۲۰۳	دوسری وجہ	۲۳۱
۲۰۴	کسی ایک کو امیر ضرور بنایا جاتا ہے	۲۳۲
۲۰۵	امیر کی حیثیت اور مقام	۲۳۳
۲۰۶	مرد کی امارت جنت سے چلی ہے	۲۳۴
۲۰۷	ایسی عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں	۲۳۴
۲۰۸	فرشتوں کی لعنت کی وجہ	۲۳۵
۲۰۹	یہاں تک کہ شوہر راضی ہو جائے	۲۳۶
۲۱۰	شوہر کی اجازت ضروری ہے	۲۳۶
۲۱۱	ہر ایک اپنے ماتحت کا ذمہ دار ہے	۲۳۷
۲۱۲	اپنے اعضاء کا بھی ذمہ دار ہے	۲۳۸

۲۱۳	روٹی جلتی ہےتو جل جانے دے	۲۳۸
۲۱۴	وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے	۲۴۰
۲۱۵	جنت کا پروانہ	۲۴۰
۲۱۶	حورِعین کا خطاب	۲۴۱
۲۱۷	مردوں کے لئے سب سے زیادہ سخت فتنہ	۲۴۱

اَلنَّفَقَةُ عَلیٰ الْعِيَالِ ۱

اہل وعیال پر خرچ کرنا

۲۱۸	اہل وعیال کی کفالت	۲۴۵
۲۱۹	بیوی کے جیتے مرتے ساری ذمہ داری شوہر پر ہے	۲۴۶
۲۲۰	خرچہ دینے میں کس کی حیثیت کا اعتبار ہوگا؟	۲۴۷
۲۲۱	عورتوں کی کمائی کھانا	۲۴۸
۲۲۲	جیب خرچ بھی دو	۲۴۹
۲۲۳	جوخرچ کروگے؛اس کا بدلہ پاؤگے	۲۴۹
۲۲۴	گھر والوں کے لئے تھکنا	۲۵۰
۲۲۵	عورت کو حق ہے کہ وہ انکار کردے	۲۵۰
۲۲۶	ہمارے اور اسلاف کے درمیان بڑا فرق	۲۵۱
۲۲۷	وہ مشتبہ کھجور	۲۵۱
۲۲۸	اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر کرنی چاہیے	۲۵۲
۲۲۹	اکابر کا اہتمام	۲۵۳

۲۳۰	ایک ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے	۲۵۳
۲۳۱	لوحِ دل پرنقش کرنے کی بات	۲۵۴
۲۳۲	حرام لقمہ کا نقصان	۲۵۶
۲۳۳	اس کی کوئی نماز قبول نہیں	۲۵۶
۲۳۴	ایک سوال	۲۵۷
۲۳۵	تب ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں	۲۵۸
۲۳۶	جواب	۲۵۹
۲۳۷	امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شبہ والی چیز سے احتیاط	۲۶۰
۲۳۸	حرام آلود غذا زہر سے زیادہ خطرناک ہے	۲۶۱
۲۳۹	حلال اور حرام غذا کا طبعی اثر	۲۶۱
۲۴۰	اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟	۲۶۲
۲۴۱	نیک عمل کی توفیق نہ ملنے کا ایک بڑا سبب	۲۶۲
۲۴۲	دیوبند کا گھسیارا	۲۶۳
۲۴۳	ایک مشتبہ لقمہ کا ایک ولی پر اثر	۲۶۳
۲۴۴	فطری اصول	۲۶۴
۲۴۵	اللہ والوں پر بھی اثر ہوتا ہے	۲۶۵
۲۴۶	تقویٰ کا نبھانا	۲۶۵
۲۴۷	تقویٰ کا ہیضہ	۲۶۶
۲۴۸	ماتحتوں کی نافرمانی کا ایک سبب	۲۶۷
۲۴۹	پانچ لاکھ روپے صدقہ کردیے	۲۶۸

اَلنَّفَقَۃُ عَلیٰ الْعُیَالِ ٢

اہل وعیال پر خرچ کرنا

٢٥٠	جو کچھ بھی خرچ کروگے؛اس کا بدلہ پاؤگے	٢٧١
٢٥١	کون سا خرچ افضل ہے؟	٢٧١
٢٥٢	نیت درست کرلیں	٢٧٣
٢٥٣	نیت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے	٢٧٣
٢٥٤	فرق نیت سے ہوتا ہے	٢٧٤
٢٥٥	اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہی عبادت ہے	٢٧٤
٢٥٦	یہ بھی عبادت ہے	٢٧٦
٢٥٧	فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ہے	٢٧٦
٢٥٨	حدود کی رعایت ضروری ہے	٢٧٦
٢٥٩	اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا	٢٧٨
٢٦٠	بچوں کو اپنے ساتھ بٹھانا چاہیے	٢٧٨
٢٦١	حضور ﷺ کی نصیحت اور حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین	٢٧٩
٢٦٢	حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب	٢٨٠
٢٦٣	مال جیسا آرہا ہے؛ ویسا جارہا ہے	٢٨٢
٢٦٤	جنت سے ایک بالشت دور جہنمی	٢٨٣
٢٦٥	ایک لقمہ پر بھی ثواب ہے	٢٨٣
٢٦٦	صحبت پر ثواب	٢٨٤

۲۶۷	بیوی کے منہ میں لقمہ دینے پر ثواب کیوں؟	۲۸۴
۲۶۸	تو نے سب سے عمدہ کام کیا	۲۸۵
۲۶۹	یہ صرف طلاق ہی نہیں ہے	۲۸۶
۲۷۰	ایسا بیگانہ پن بھی کیا؟	۲۸۶
۲۷۱	نیت درست کر لی جائے	۲۸۷
۲۷۲	بیکار لوگ	۲۸۸
۲۷۳	روپیہ خرچ کرنے سے گھٹنے والا نہیں ہے	۲۸۹
۲۷۴	روپیہ بچانے والا خوش فہمی میں ہے حالانکہ......	۲۹۰
۲۷۵	کھڑکی کھولیے	۲۹۱
۲۷۶	اوپر والا ہاتھ اور نیچے والا ہاتھ	۲۹۱
۲۷۷	ایسی سخاوت مطلوب نہیں ہے	۲۹۲
۲۷۸	بہترین صدقہ	۲۹۳
۲۷۹	بچنے پر بچایا جائے گا	۲۹۴

اَلْاِنْفَاقُ مِمَّا یُحِبُّ وَمِنَ الْجَیِّدِ

محبوب اور عمدہ چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا

۲۸۰	محبوب اور عمدہ چیز اللہ کے راستہ میں دو	۲۹۷
۲۸۱	سلام پھیرنے کا انتظار نہ کیا	۲۹۷
۲۸۲	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل	۲۹۸
۲۸۳	حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۳۰۰

۲۸۴	حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی زریں نصیحت	۳۰۲
۲۸۵	آگے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا؟	۳۰۳
۲۸۶	دوسرے کے مال کی نگرانی	۳۰۳
۲۸۷	ایک حماقت	۳۰۳
۲۸۸	اصل بے وقوف تو یہ خود تھا	۳۰۴
۲۸۹	اللہ تعالیٰ طَیّب چیز ہی کو قبول فرماتے ہیں	۳۰۴
۲۹۰	ہمارا مزاج	۳۰۵
۲۹۱	حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا باغ	۳۰۶
۲۹۲	اپنا مال بڑوں سے خرچ کروائے	۳۰۸
۲۹۳	زہے عزوشرف	۳۰۹

وُجُوبُ أَمْرِهٖ أَهْلَهٗ وَأَوْلَادَهُ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد ا

۲۹۴	ترجمۃ الباب	۳۱۳
۲۹۵	نفقۂ جسمانی اور نفقۂ رُوحانی	۳۱۴
۲۹۶	تعلیم وتربیت	۳۱۵
۲۹۷	تعلیم وتربیت کی ایک بہترین مثال	۳۱۶
۲۹۸	دعوتِ غوروفکر	۳۱۷
۲۹۹	جیسے وہ فرض ہے؛ یہ بھی فرض ہے	۳۱۷
۳۰۰	کیا ہمارا دل ایسا ہی کڑھتا ہے؟	۳۱۸
۳۰۱	ہمارے زمانہ کا المیہ	۳۱۹

۳۰۲	ہم سے بڑا بے غیرت کون ہوگا	۳۲۱
۳۰۳	ہماری فکریں کیا ہیں؟	۳۲۱
۳۰۴	میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟	۳۲۲
۳۰۵	ہمیں کیا فکر رکھنی چاہیے؟	۳۲۳
۳۰۶	آج ہمیں یہ منظر بکثرت دیکھنے ملتا ہے	۳۲۴
۳۰۷	دین پر کوئی زد تو نہیں پڑ رہی ہے	۳۲۴
۳۰۸	تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے	۳۲۵
۳۰۹	......تب ہی اثر ہوگا	۳۲۵

وُجُوبُ أَمْرِهٖ أَهْلَهٗ وَأَوْلَادَهٗ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد ۲

۳۱۰	ماتحتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ضروری ہے	۳۲۹
۳۱۱	حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے مناقب	۳۲۹
۳۱۲	بچوں کے ساتھ محبت کا مطلب	۳۳۱
۳۱۳	خاندانِ بنو ہاشم کے لئے صدقات جائز نہیں	۳۳۲
۳۱۴	حضرت سلمان کی جانچ	۳۳۲
۳۱۵	موقع سے جو تعلیم دی جائے وہ بڑی مؤثر ہوتی ہے	۳۳۳
۳۱۶	حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا	۳۳۴
۳۱۷	محبت تعلیم وتربیت سے آڑے نہیں آئی	۳۳۵
۳۱۸	بچے کی ذہن سازی کا طریقہ	۳۳۶
۳۱۹	غفلت سے باز آیا تو جفا کی	۳۳۷

۳۲۰	بچوں کو اپنے ساتھ کھانے بٹھائیے	۳۳۸
۳۲۱	تین آداب	۳۴۰
۳۲۲	حضراتِ صحابہ کی ایک خصوصیت	۳۴۰
۳۲۳	ہر شخص ذمہ دار ہے	۳۴۱
۳۲۴	تربیت نہ کرنے پر سزا ہوگی	۳۴۳
۳۲۵	تعلیم و تربیت کی عمر	۳۴۴
۳۲۶	پھر اس سے چھٹی ملنے والی نہیں	۳۴۵
۳۲۷	پٹائی کے لئے بھی حدود متعین ہیں	۳۴۶
۳۲۸	اب ان کے بستر بھی الگ کر دو	۳۴۷
۳۲۹	بچوں کو نماز سکھاؤ	۳۴۷
۳۳۰	میرے والد کا طرز تربیت	۳۴۸
۳۳۱	حاجی یوسف صاحب کا عجیب وغریب معمول	۳۴۸
۳۳۲	یہ بہانے بازیاں فضول ہیں	۳۴۹

حَقُّ الْجَارِ وَالْوَصِيَّةُ بِهٖ

پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید

۳۳۳	انسانی فطرت	۳۵۳
۳۳۴	اسلام میں رہبانیت نہیں ہے	۳۵۴
۳۳۵	معاشرت	۳۵۴
۳۳۶	دین کے کل پانچ شعبے ہیں	۳۵۵
۳۳۷	اسلام کا اہم شعبہ	۳۵۶

۳۳۸	آیت کا ترجمہ وتفسیر	۳۵۷
۳۳۹	قریب اور دور کے پڑوسی	۳۵۸
۳۴۰	تین قسم کے پڑوسی	۳۵۸
۳۴۱	قرآن کی باریک بینی	۳۵۹
۳۴۲	پڑوسی کو وارث بنا ڈالیں گے	۳۶۰
۳۴۳	شوربہ میں پانی زیادہ ڈالو......	۳۶۱
۳۴۴	ہنڈیا کی بھاپ بھی چغلی کھاتی ہے	۳۶۲
۳۴۵	میاں صاحب کا عجیب طرزِ عمل	۳۶۳
۳۴۶	ہمارے اکابر دوسروں کا کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے	۳۶۵
۳۴۷	اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں	۳۶۶
۳۴۸	ایمان کے جانچنے کا اصل معیار	۳۶۷
۳۴۹	ایک نرالی تعلیم	۳۶۸
۳۵۰	پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا تقاضہ	۳۶۹
۳۵۱	پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانا ایمان کا تقاضہ ہے	۳۷۱
۳۵۲	جب رہبر ہی رہزن بن جائے	۳۷۱
۳۵۳	پڑوسی کو راحت پہنچانے کی کوشش کرو	۳۷۲
۳۵۴	کون سے پڑوسی کا حق زیادہ ہے؟	۳۷۳
۳۵۵	بہترین پڑوسی	۳۷۴
۳۵۶	......تو پڑوسی کے لئے کیسے پسند کروں؟	۳۷۴
۳۵۷	دعاء	۳۷۵

تفصیلی فہرست مضامین............جلد ششم

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرحَامِ ا

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	اداریہ	۲۳
۲	رشتے داریاں دو طرح کی ہوتی ہیں	۳۰
۳	صلہ رحمی کسے کہتے ہیں؟	۳۱
۴	صلہ رحمی کی مختلف شکلیں	۳۲
۵	باب کے عنوان کا خلاصہ	۳۲
۶	خصوصی تاکید کا ایک نرالا انداز	۳۴
۷	ڈبل پیمانے کیسے؟	۳۵
۸	عقل مندوں کے کچھ اوصاف	۳۶
۹	ماں باپ کے ساتھ اچھے سلوک کا تاکیدی حکم	۳۷
۱۰	ایمان افروز واقعہ	۳۷
۱۱	مسلمان ہر معاملے میں اللہ تعالیٰ کا حکم دیکھتا ہے	۳۸
۱۲	ایک بہترین مثال	۳۹
۱۳	جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو	۴۰
۱۴	والدین کے بوڑھاپے کا پورا لحاظ رکھو	۴۲
۱۵	ایک سوال، دو ردِّ عمل	۴۳
۱۶	ان کو اف تک نہ کہو	۴۴
۱۷	ماں باپ کی محبت ہی بے غرض ہوتی ہے	۴۴
۱۸	ماں نے تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلیں	۴۵

١٩	سب سے زیادہ پسندیدہ عمل	۴٦
٢٠	ہمارے اور صحابۂ کرام کے مزاج کا فرق	۴٧
٢١	سوال ایک جواب مختلف کیوں؟ ایک عمدہ مثال	۴٨
٢٢	نبی کریم ﷺ طبیب روحانی تھے	۴٩
٢٣	وقت کے تقاضے کو پورا کرنے کا نام دین ہے	٥٠
٢۴	اپنے معاملے میں فیصلے کا بہترین طریقہ	٥١
٢٥	خلاصۂ کلام	٥١

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرحَامِ ٢

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

٢٦	باپ کا حق ادا کرنے کی ایک صورت	٥٥
٢٧	جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو	٥٦
٢٨	صلہ رحمی کی مختصر تفصیل	٥٧
٢٩	صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ	٥٩
٣٠	روزی کی تنگی کا سب سے بڑا سبب	٥٩
٣١	کمزوروں کی وجہ سے روزی دی جاتی ہے	٦٠
٣٢	پہلا شیطانی حربہ	٦١
٣٣	دوسرا شیطانی حربہ	٦٢
٣۴	رشتے داری کی اپیل	٦٣
٣٥	رشتے داری کو زبردست گارنٹی ملی ہے	٦٦
٣٦	دولت اور کرسی کا نشہ	٦٧
٣٧	حسن سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون؟	٦٨

۳۸	وہ آدمی ہلاک و برباد ہو	٦۹
۳۹	ماں باپ کی تقسیم کا دردناک منظر	۷۰
۴۰	ایک افسوس ناک واقعہ	۷۱
۴۱	ایسے موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے	۷۲

بِرُّ الوَالِدَینِ وَصِلَةُ الأَرْحَامِ ۳

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

۴۲	کثیر الوقوع شکایت خدمت نبوی میں	۷۵
۴۳	اپنا فیصلہ کسی غیر جانب دار سمجھ دار آدمی سے کرایا جائے	۷٦
۴۴	اکابر کا طرز عمل	۷۷
۴۵	ان میں منہ میں گرم راکھ	۷۸
۴٦	ایک مددگار فرشتے کا ساتھ	۷۸
۴۷	مؤمن کی سوچ بڑا بدلہ ہونی چاہیے	۷۹
۴۸	جو آدمی روزی میں برکت کا طالب ہو	۸۱
۴۹	ایک سوال اور اس کا جواب	۸۱
۵۰	حضرت ابو طلحہؓ کا رشتے داروں کے ساتھ حسن سلوک	۸۲
۵۱	ماں باپ کی خدمت جہاد بھی ہجرت بھی	۸۵
۵۲	اہم سے روک کر غیر اہم میں ڈالنا شیطانی حربہ ہے	۸٦
۵۳	صلہ رحمی کرنے والا کون؟	۸۷
۵۴	ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے	۸۸
۵۵	ہارون رشید اور ایک غلام	۸۹
۵٦	پھر ایک وقت آئے گا	۸۹

۵۷	رشتے داری کی دعا	۹۰
۵۸	افضلیت موقع محل کے اعتبار سے ہوتی ہے	۹۱
۵۹	غیر مسلم رشتے داراور حسن سلوک	۹۲

بِرُّ الوَالِدَينِ وَصِلَةُ الأَرحَامِ ۴

والدین، رشتہ داراور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

٦۰	صدقہ اور ہدیہ میں فرق	۹۸
٦۱	زکوۃ اصل زیور ہی میں ہے	۹۹
٦۲	بنیادی تعلیمات میں سے صلہ رحمی بھی ہے	۱۰۰
٦۳	مصر والوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید	۱۰۳
٦۴	اسلام میں ذمی کے حقوق کی رعایت	۱۰۴
٦۵	مصر والوں کے ساتھ حسن سلوک کی وجہ	۱۰۵
٦٦	اپنے رشتے داروں کو ڈرایئے	۱۰۵
٦۷	رشتے داری کے حق کی ادائیگی میں کفر مانع نہیں	۱۰۸
٦۸	جنت اور جہنم والے اعمال	۱۰۸
٦۹	اس صدقے پر دوہرا اجر وثواب ہے	۱۰۹
۷۰	بیٹے سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کا کہہ سکتا ہے؟	۱۰۹
۷۱	زیادتیاں دونوں طرف سے ہوتی ہیں	۱۱۰
۷۲	جنت کا سب سے عمدہ دروازہ	۱۱۱
۷۳	خالہ بھی ماں کے درجے میں ہے	۱۱۲
۷۴	شان ورود	۱۱۲
۷۵	صلہ رحمی کا حکم شروع ہی سے دیا جاتا تھا	۱۱۳

تَحْرِيمُ عُقُوقِ الوالِدَيْنِ وَقَطِيْعَةِ الرَّحِمِ

والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے کی حرمت

٧٦	ماقبل سے ربط	١١٧
٧٧	ہر گناہ بڑا ہے	١١٨
٧٨	صغیرہ و کبیرہ اور ان کا حکم	١١٩
٧٩	ایک مثال	١٢٠
٨٠	ہر مسلمان کو یہ بھی معلوم کرلینا چاہیے	١٢١
٨١	سب سے بڑے دو گناہ	١٢١
٨٢	ایک اور سب سے بڑا گناہ	١٢٣
٨٣	چار بڑے گناہ	١٢٤
٨٤	قسم کھانے کے متعلق تفصیل	١٢٤
٨٥	یمین لغو	١٢٥
٨٦	والدین کو گالی دینا بڑا گناہ ہے	١٢٦
٨٧	معاشرے میں رائج ایک کبیرہ گناہ	١٢٧
٨٨	قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا	١٢٨
٨٩	ماں کے بارے میں خصوصی تاکید	١٢٨
٩٠	اولاد کو کسی کام کے لیے کس طرح کہیں؟	١٢٩
٩١	یہ چیزیں بھی حرام ہیں	١٣٠
٩٢	فضول بحث میں پڑنا بھی ناجائز ہے	١٣١
٩٣	بہت زیادہ سوال کرنا حرام ہے	١٣٢
٩٤	مال کو ضائع کرنا ناجائز ہے	١٣٣

٩٥	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ	١٣٤
٩٦	حضرت صحابہ اور ہمارے نظریے میں فرق	١٣٦

فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

٩٧	ماقبل سے ربط	١٣٩
٩٨	سب سے بڑی نیکی یہ ہے	١٤٠
٩٩	دوست کا دوست	١٤١
١٠٠	اسی سے ترقی ہوتی ہے	١٤١
١٠١	حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ	١٤٢
١٠٢	والدین کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ حسن سلوک کے طریقے	١٤٤
١٠٣	مرنے کے بعد بھی ثواب	١٤٥
١٠٤	اولاد کو ماں باپ کے لیے دعا کا اہتمام کرنا چاہیے	١٤٦
١٠٥	حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا طرز عمل	١٤٧
١٠٦	ایصال ثواب سے زیادہ دعا کا اثر ہوتا ہے	١٤٨
١٠٧	دعا آسان کام ہے	١٤٨
١٠٨	مغفرت کی دعا کا قاعدہ	١٤٩
١٠٩	والدین کے ساتھ حسن سلوک کی دوسری شکل	١٤٩
١١٠	والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تیسری شکل	١٥١
١١١	والدین کے ساتھ حسن سلوک کی چوتھی شکل	١٥١
١١٢	حضرت عائشہ کو حضرت خدیجہ پر غیرت	١٥٢
١١٣	ہمارے معاشرے کی ایک خرابی اور اس کا علاج	١٥٣

۱۱۴	کسی کی بدعملی تمھیں انصاف کے تقاضوں سے نہ ہٹاوے	۱۵۴
۱۱۵	بندہ طاقت انتقام نہ دارد	۱۵۵
۱۱۶	بیوی کے سہیلیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا	۱۵۶
۱۱۷	نسبت اور تعلق کی وجہ سے چھوٹوں کا اکرام کرنا	۱۵۷

اِکْرَامُ أَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَبَيَانِ فَضْلِهٖ

اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت

۱۱۸	اہل بیت کے اکرام کی فضیلت	۱۶۱
۱۱۹	اہل بیت سے کون مراد ہے	۱۶۲
۱۲۰	ہر سید علوی ہے لیکن ہر علوی کا سید ہونا ضروری نہیں	۱۶۳
۱۲۱	دلوں کے تقویٰ کی بات	۱۶۴
۱۲۲	نبی کریم ﷺ کی محبت ایمان کا جزو ہے	۱۶۵
۱۲۳	نبی کریم ﷺ کی محبت سب سے زیادہ ہونے کی دلیل	۱۶۵
۱۲۴	محبوب سے متعلق چیزوں کی محبت	۱۶۶
۱۲۵	مقام غدیرِ خم کا خطبہ	۱۶۷
۱۲۶	خطبۂ غدیرِ خم کا پس منظر	۱۷۰
۱۲۷	میں جس کا دوست علی بھی اس کے دوست	۱۷۱
۱۲۸	شیعوں کی تردید	۱۷۱
۱۲۹	اہل بیت کے بارے میں تاکید	۱۷۳
۱۳۰	اہل بیت کا مصداق	۱۷۴
۱۳۱	اگر نبی کریم ﷺ کی روحانی توجہات چاہئیں	۱۷۵
۱۳۲	آج ہم تمھاری عزت افزائی کرتے ہیں	۱۷۶

۱۳۳	سادات کا خیال رکھنے کا انعام	۱۷۹
۱۳۴	شریف زادی سیدانی کا دردانگیز واقعہ	۱۸۰
۱۳۵	سادات کے اکرام کے لیے نسبت ہی کافی ہے	۱۸۳
۱۳۶	اگر سید بدعمل ہو	۱۸۴
۱۳۷	نورٌ علیٰ نور	۱۸۵
۱۳۸	تبرکات کب کام آسکتے ہیں	۱۸۶

تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ ۱

علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

۱۳۹	باب کا عنوان	۱۹۱
۱۴۰	معاشرے میں خوبیاں اس طرح پھیلتی ہیں	۱۹۲
۱۴۱	معیار بدل گیا	۱۹۲
۱۴۲	اکرام کس کا کیا جائے	۱۹۳
۱۴۳	بچوں کا مزاج کیسے بنتا ہے؟	۱۹۴
۱۴۴	ایک عمدہ مثال	۱۹۵
۱۴۵	اچھائیوں میں تنزلی کی وجہ	۱۹۶
۱۴۶	کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟	۱۹۷
۱۴۷	منصب امامت کی تفصیل	۱۹۸
۱۴۸	امامت کا سب سے زیادہ حق دار کون؟	۱۹۹
۱۴۹	مہمان ازخود امامت نہ کرائے	۲۰۱
۱۵۰	کسی کی خاص بیٹھک پر مت بیٹھو	۲۰۱
۱۵۱	صفوں کی درستگی کا ایک بڑا دنیوی فائدہ	۲۰۲

١٥٢	امام کے قریب کون کھڑا رہے؟	٢٠٣
١٥٣	بزرگوں کی مجلس کے آداب	٢٠٤
١٥٤	سمجھ دار مجھ سے قریب رہیں	٢٠٥
١٥٥	زمین کا سب سے پسندیدہ ٹکڑا	٢٠٦
١٥٦	فارغ وقت گذارنے کی جگہ	٢٠٧
١٥٧	غزوۂ خیبر کا پس منظر	٢٠٨
١٥٨	ایک واقعہ	٢١٠
١٥٩	ایک فقہی مسئلہ	٢١١
١٦٠	کسی کے سامنے بات پیش کرنے کا ادب	٢١١
١٦١	تدفین میں بھی اہل قرآن کو فضیلت حاصل ہے	٢١٢

تَوْقِیْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْکِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ ٢

علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

١٦٢	جو عمر میں بڑا ہو اس کا لحاظ کیجیے	٢١٧
١٦٣	یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے	٢١٨
١٦٤	خاص دینی مزاج اعتدال	٢١٩
١٦٥	غلو سے بچانے کا اہتمام	٢٢١
١٦٦	خلاصۂ کلام	٢٢٢
١٦٧	اعتدال کی ایک اور مثال	٢٢٢
١٦٨	وہ ہم میں سے نہیں	٢٢٥
١٦٩	لوگوں کے مقام ومرتبہ کے مناسب معاملہ کیا جائے	٢٢٥
١٧٠	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس شوریٰ کے رکن	٢٢٦

١٧١	عالم بڑا ہے چاہے وہ چھوٹا ہو	٢٢٧
١٧٢	حضرت عمرؓ کا قرآن پر عمل کا اہتمام	٢٢٨
١٧٣	قصے کا سبق	٢٢٩
١٧٤	بڑوں کی مجلس میں ان کا لحاظ کرنا چاہیے	٢٣٠
١٧٥	بوڑھوں کا اکرام اور دنیوی انعام	٢٣٠
١٧٦	ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے	٢٣١
١٧٧	اگر عالم کوتاہی کرے تو؟	٢٣١
١٧٨	اگر عذاب دینا چاہتے	٢٣٣
١٧٩	اہل علم کے متعلق ایک نہایت اہم مضمون	٢٣٣
١٨٠	ہم لوگوں سے یہ عہد لیے گئے	٢٣٦
١٨١	چار قسم کے عذاب	٢٣٧
١٨٢	امت کے بے وقوف	٢٣٨
١٨٣	کفر کا اندیشہ	٢٣٨
١٨٤	قابل غور چند باتیں	٢٣٩

زِیارةُ أَھلِ الْخَیرِ وَمُجالَسَتُھُمْ وَصُحْبَتُھُمْ وَمُحَبَّتُھُمْ ا
نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

١٨٥	عنوان کی وضاحت	٢٤٩
١٨٦	قرآن میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے	٢٥٠
١٨٧	......اس ذات کی محبوبیت کا عالم کیا ہوگا!	٢٥١
١٨٨	حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب اللہ کا عتاب	٢٥٢
١٨٩	عزم پختہ ہو	٢٥٤

١٩٠	اپنی ذات پر اعتماد نہ ہو	٢٥٥
١٩١	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گوشمالی	٢٥٧
١٩٢	حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات	٢٥٨
١٩٣	تکوین	٢٥٩
١٩٤	شیاطین اور تکوینیات	٢٦٠
١٩٥	تشریع	٢٦١
١٩٦	حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینیات کا علم دیا گیا	٢٦٢
١٩٧	کامیابی تکوینیات کے علم پر موقوف نہیں	٢٦٣
١٩٨	آپ سے ضبط نہ ہو سکے گا	٢٦٤
١٩٩	سفر شروع ہوا	٢٦٥
٢٠٠	تختہ توڑ دیا	٢٦٥
٢٠١	یہ کیا کیا؟	٢٦٦
٢٠٢	جدائی کا وقت آ گیا	٢٦٧
٢٠٣	عین احسان شناسی	٢٦٨
٢٠٤	دوسرا راز	٢٦٩
٢٠٥	نیکی کی برکت پشتہا پشت تک	٢٦٩
٢٠٦	اولاد کے لیے کیا فکر کریں؟	٢٧٠
٢٠٧	یہ ہمارا موضوع نہیں ہے	٢٧١
٢٠٨	ایک خان صاحب کا واقعہ	٢٧٢
٢٠٩	تبصرے نہ کریں	٢٧٣
٢١٠	وہ مالک ہے جو چاہے کرے	٢٧٣

زِیارۃُ أَھلِ الْخَیرِ وَمُجَالَسَتُھُمْ وَصُحْبَتُھُمْ وَمُحَبَّتُھُمْ ۲
نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

۲۱۱	......تب سوچیں گے	۲۷۷
۲۱۲	ایسا نہیں ہوگا	۲۷۸
۲۱۳	حضور ﷺ کو صحبت صالحین کا حکم	۲۷۹
۲۱۴	ام ایمنؓ نے شیخین کو رُلا دیا	۲۸۰
۲۱۵	حضرت ام ایمنؓ کا ناز	۲۸۱
۲۱۶	بڑوں کا معمول ملحوظ رہے	۲۸۳
۲۱۷	پتے کی بات	۲۸۳
۲۱۸	اللہ کی نسبت پر ملاقات کا انعام	۲۸۵

زِیارۃُ أَھلِ الْخَیرِ وَمُجَالَسَتُھُمْ وَصُحْبَتُھُمْ وَمُحَبَّتُھُمْ ۳
نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

۲۱۹	جنت میں ٹھکانہ بنانے کا آسان نسخہ	۲۹۱
۲۲۰	ان اعمال کو معمولی مت سمجھو	۲۹۲
۲۲۱	نیک وبد ہم نشین کی مثال	۲۹۲
۲۲۲	مثالیں اور انبیاء کی تعلیمات	۲۹۳
۲۲۳	نیک ہم نشیں کی مثال	۲۹۴
۲۲۴	برے ہم نشیں کی مثال	۲۹۴
۲۲۵	صحبت کا کردار............ابو مسلم خولانیؒ کا قصہ	۲۹۵
۲۲۶	عجیب شیخ کامل کی صحبت کا اثر	۲۹۶
۲۲۷	کیا دیکھ کر لڑکی پسند کی جائے؟	۲۹۷
۲۲۸	آپ کیوں زیادہ نہیں آتے؟	۳۰۰

٢٢٩	دوستی صرف ایمان والوں سے کرو	٣٠١
٢٣٠	انسان اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے	٣٠٢
٢٣١	حشر بھی محبت والوں کے ساتھ ہوگا	٣٠٣
٢٣٢	محبت ہے لیکن عمل اس درجے کا نہیں	٣٠٣
٢٣٣	سب کا کام بن گیا	٣٠٤
٢٣٤	کوشش کرتا رہے	٣٠٥
٢٣٥	اوصاف فطری ہوتے ہیں	٣٠٥
٢٣٦	باہم مناسبت وعدم مناسبت پہلے دن سے ہے	٣٠٧
٢٣٧	حضرت اویس قرنیؒ کے مناقب	٣٠٧
٢٣٨	چٹھی نہیں لکھوائی	٣١١
٢٣٩	شہرت کی زندگی پسند نہ کی	٣١٢
٢٤٠	روایت کا سبق	٣١٣
٢٤١	بادشاہوں کا حال یہ تھا	٣١٤
٢٤٢	ہم کو بھی دعا میں نہ بھولیو	٣١٤
٢٤٣	بابرکت جگہوں کی زیارت کرنا	٣١٥
٢٤٤	توجہ نہ دی جائے	٣١٦
٢٤٥	مدینۂ منورہ میں روزانہ دوعمرے	٣١٧
٢٤٦	دعا	٣١٧

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ وِالحثِّ عَلَیہِ ا

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اوراس کی تاکید

٢٤٧	صلح حدیبیہ	٣٢١
٢٤٨	حضرات صحابہ کی خوبیاں	٣٢٨

۲۴۹	انصار کی مہاجرین سے للہ محبت	۳۲۹
۲۵۰	ایمانی حلاوت کے تین اعمال	۳۳۱

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ وِ الحثِّ عَلَیہِ ۲

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

۲۵۱	عرش کے سایے میں سات آدمی	۳۳۷
۲۵۲	سایے سے کیا مراد ہے؟	۳۳۸
۲۵۳	امام عادل عام ہے	۳۳۸
۲۵۴	نکیل خود پکڑ کر لائے	۳۴۰
۲۵۵	خود کھانا پکایا	۳۴۱
۲۵۶	کتنے بچے ضائع کر دیے	۳۴۱
۲۵۷	خواہشات کو رام کر کے	۳۴۲
۲۵۸	جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو	۳۴۳
۲۵۹	فرشتوں کی آمین کا کیا؟	۳۴۳
۲۶۰	سنن و نوافل کا مقصد	۳۴۵
۲۶۱	اللہ کے لیے باہم محبت	۳۴۶
۲۶۲	اس کی بڑی قدر و قیمت ہے	۳۴۶
۲۶۳	امت محمدیہ کے یوسف	۳۴۷
۲۶۴	......تب تک صدقہ قابل قبول نہیں	۳۴۹
۲۶۵	......اور آنسو آ گئے	۳۴۹

فَضلُ الحُبِّ فِی اللہِ وِ الحثِّ عَلَیہِ ۳

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

۲۶۶	آج میں ان کو سایہ دوں گا	۳۵۳

٢٦٧	جلال کا نکتہ	٣٥٣
٢٦٨	باہم محبت پیدا کرنے کا نسخہ	٣٥٤
٢٦٩	اللہ کی محبوبیت حاصل کرنے کا آسان عمل	٣٥٦
٢٧٠	انصار کی فضیلت	٣٥٧

فَضلُ الحُبِّ فِی اللّٰہِ والحثِّ عَلَیہِ ۴

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اوراس کی تاکید

٢٧١	انبیاء وشہداء رشک کریں گے	٣٦١
٢٧٢	بشارت سن لو	٣٦٢
٢٧٣	مشغول شخص کے انتظار کا ادب	٣٦٤
٢٧٤	ملاقات کا مناسب طریقہ	٣٦٤
٢٧٥	اللہ کی محبت کے حق دار	٣٦٤
٢٧٦	یہ وہ نغمہ ہے جو............	٣٦٦
٢٧٧	جب کسی سے اللہ واسطے محبت ہو	٣٦٧
٢٧٨	حدیث مسلسل بالمحبۃ	٣٦٧
٢٧٩	معمولات پر پابندی کی دعا	٣٦٨
٢٨٠	کیا تم نے ان کو بتادیا	٣٦٩

علاماتُ حبِّ اللّٰہِ تَعَالیٰ الْعَبْدَ وَالحثّ عَلَی التَّخَلُّقِ بِهَا ا

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اوراس کو حاصل کرنے کی ترغیب

٢٨١	محبت کی نشانی	٣٧٣
٢٨٢	مقام محبوبیت	٣٧٤
٢٨٣	اللہ تعالیٰ ایسی قوم لائے گا	٣٧٥

٢٨٤	دو کاموں پر اعلان جنگ	٣٧٦
٢٨٥	قبر سے تین پیغام	٣٧٧
٢٨٦	اُلٹی کیسے سیدھی ہوتی ہے؟	٣٧٨
٢٨٧	فوراً بدگمانی	٣٧٩
٢٨٨	حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے اسلام کا قصہ	٣٨١
٢٨٩	حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو کیوں منع فرمایا؟	٣٨٣
٢٩٠	اللہ والوں سے عداوت نہ رکھو	٣٨٤
٢٩١	اخبار لا اعتبار	٣٨٥
٢٩٢	تب بھی بدگمانی نہ کریں	٣٨٥
٢٩٣	معصوم کون ہے؟	٣٨٦

علاماتُ حبِّ اللهِ تَعَالیٰ الْعَبْدَ وَالحثّ عَلَی التَّخَلُّقِ بِهَا ٢

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب

٢٩٤	قرب بالفرائض	٣٨٩
٢٩٥	نفس وشیطان کا ایک دھوکہ	٣٩٠
٢٩٦	ایک مثال	٣٩٠
٢٩٧	نماز باجماعت کی تاکید	٣٩١
٢٩٨	دوسری مثال	٣٩٣
٢٩٩	قرب بالنوافل	٣٩٤
٣٠٠	اللہ تعالیٰ خود حفاظت کا انتظام کرتے ہیں	٣٩٤
٣٠١	شکر کس کو کہتے ہیں؟	٣٩٦
٣٠٢	سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں	٣٩٧

٣٠٣	ایسی خیرات سے کیا حاصل؟	٣٩٨
٣٠٤	مقبولیت ومردودیت کا معیار؟	٣٩٨
٣٠٥	مقبولیت یا فتنہ	٤٠٠
٣٠٦	اللہ تعالیٰ ظاہر فرمادیں گے	٤٠١
٣٠٧	دلوں پر حکومت	٤٠١
٣٠٨	ایک صحابی کی ادا	٤٠٣
٣٠٩	شان نزول	٤٠٤

اَلتَحْذِیْرُ مِنْ اِیْذَآءِ الصَّالِحِیْنَ وَالضُّعْفَةِ وَالْمَسَاکِیْنَ
نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا

٣١٠	بڑا بہتان کھلا گناہ	٤٠٩
٣١١	غلط پارکنگ	٤١٠
٣١٢	ٹیپ ریڈیو زور سے بجانا	٤١١
٣١٣	نماز سے تکلیف نہ دے	٤١١
٣١٤	جس کا کوئی نہیں	٤١٢
٣١٥	سائل کومت جھڑکو	٤١٣
٣١٦	اللہ کی تلواروں نے حق وصول نہیں کیا	٤١٥
٣١٧	جب صدیق رضی اللہ عنہ نے فاروق رضی اللہ عنہ سے معافی مانگی	٤١٨
٣١٨	اب وہ مجرم ہے	٤١٨
٣١٩	کیا تمھیں معافی پسند نہیں؟	٤٢٠
٣٢٠	میرے دوست کے معاملے میں میرا خیال نہ کروگے؟	٤٢١
٣٢١	کہیں اللہ تعالیٰ تم سے مطالبہ نہ کرلے	٤٢٢

اِجْرَآءُ أَحْكَامِ النَّاسِ عَلیٰ الظَّاهِرِ وَسَرَائِرُهُمْ عَلیٰ اللهِ

ظاہر کے مطابق معاملہ کرو۔ دل کا حال اللہ کے حوالے کرو

٣٢٢	شک شبہ کرنے کی اجازت نہیں	٤٢٧
٣٢٣	تو ان کا راستہ چھوڑ دو	٤٢٨
٣٢٤	مجھے قتال کا حکم دیا گیا ہے	٤٢٩
٣٢٥	مگر اسلام کے حق سے	٤٢٩
٣٢٦	کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں	٤٣١
٣٢٧	مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے	٤٣١
٣٢٨	ایک غلط طریقہ	٤٣٣
٣٢٩	اب اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے	٤٣٣
٣٣٠	عین لڑائی میں کلمہ پڑھ لیا تو؟	٤٣٤
٣٣١	لاڈلے، لاڈلے زادے	٤٣٦
٣٣٢	کیا تم نے اس کا دل چیرا تھا؟	٤٣٨
٣٣٣	صحابہ کی شان	٤٣٩
٣٣٤	کسی کا ساتھ نہ دیا	٤٣٩
٣٣٥	مجھے جرأت نہیں ہوتی	٤٤٠
٣٣٦	تب تم کیا جواب دو گے؟	٤٤١
٣٣٧	اب فیصلہ ظاہر پر ہوگا	٤٤٣

فہرست

ادار یہ 1

باب الخوف (مجلس ۱) 8

باری تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے 10

عبادت کے وقت ڈر کی کیفیت ہو 12

ہماری عبادتوں کی حقیقت 13

بارگاہِ قدس کا ادب سکھادیا 13

اس بارگاہ کا حق کہاں ادا ہوسکتا ہے 14

حضورِ اکرم (ﷺ) کی خشیت 15

ان میں بڑی عبرت ہے 17

قیامت کا منظر 18

قیامت کا زلزلہ 18

ایک رات میں جوان بوڑھا ہوگیا 19

انسانی پیدائش کی ترتیب 19
نئی فائل تیار کروائی 21
نوشتۂ تقدیر غالب آکر رہتا ہے 22
جہنم کا ایک منظر 23
سب سے کم عذاب 23
گلے تک آگ 25
کانوں تک پسینے میں 25
... تو ہنسو کم، اور روؤ زیادہ 26
سورج ایک میل دور ہو گا 27
اتنا زیادہ پسینہ نکلے گا کہ... 28
جہنم کی گہرائی 29
براہِ راست گفتگو ہو گی 30
... تم لذتیں اُٹھانا چھوڑدو 31

قیامت کے سوالات 32

بَابُ الخَوْفِ مجلس ۲ 35

زندگی ایک سرمایہ ہے 36

جامد سرمایہ 37

سیال سرمایہ 38

عمر مثل برف 40

وقت کی قیمت 41

سلیمانی سلطنت سے بہتر 42

ایک منٹ کی قیمت 43

ہماری اصل پونجی 44

حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہ) اور وقت کی قدر 45

دوسرا سوال 46

ایسی چالاکی ہلاکت ہے 46

مسائل معلوم کریں 47

اگر یہ لقمہ میری جان کے ساتھ نکلتا 48

خرچ کرنے میں کُل مختار نہیں 50

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا قصہ 50

زمین کی خبریں کیا ہیں ؟ 52

مَیں کیسے راحت پاسکتاہوں ؟ 53

وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا 55

معاملہ اتنا سخت ہو گا... 56

بابُ الرَّجَآءِ مجلس ا 58

امیداورخوف 59

دنیوی دستور بھی ہے 60

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی امیدوخوف 61

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی نصیحت 61

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا ارشاد 62

دودھ والی رات یاد ہے؟ 62

کتے پر ترس کھانا کام آگیا 64

گناہ کی حقیقت 65

کبیرہ اور صغیرہ کی بحث 65

بلی پر ظلم نے پکڑوادیا 66

نیکی کی مجھے بھی ضرورت ہے 67

معمولی گناہ سے بھی بچو 68

امید کسے کہتے ہیں ؟ 69

ایک مثال 69

مؤمن کے ایمان کا تقاضہ 70

امید رکھنا کسے کہتے ہیں ؟ 71

اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کے اصول 72

کس کے اعمال تولے جائیں گے؟ 74

کسی کو عمل جنت میں داخل نہیں کرائے گا 75

توفیق بھی اسی وقت ملتی ہے 76

كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ 77

اس پہلو پر بھی غور کیجیے 79

الہامی مثال 79

ایک اشکال اور اس کا جوب 80

ہمارا مزاج 81

اعمال کا ویلیوئیشن (valuation) 81

زندگی بھر کی محنت کی قیمت 83

زندگی بھر کے نقشوں کا نقشہ 84

یہاں اور وہاں کا تقابل 85

اپنے اعمال پر کبھی بھروسہ نہ کرو 86

با حضورِ دل نہ کردم طاعتے 87

اس دربار کے قابل ہیں یا نہیں ؟ 88

بابُ الرَّجَآءِ مجلس ۲ 90

فقیر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے 91

اِس کا احترام کیوں نہیں ؟ 92

ہمارے دئے ہوئے میں سے خرچ کرو 93

خرچ کرنے کے دو طریقے 94

امید کا صحیح طریقہ 95

امید کا مفہوم ،ایک مثال 95

ایک بزرگ اور ایک ڈپٹی کمشنر 96

مفت میں لینا چاہتا ہے 98

اسی کا نام امید ہے 99

کنوارے کو اولاد کا تعویذ چاہیے! 99

اپنے بس میں جتنا ہو؛ کرلو پھر... 100
یہ امید نہیں ؛ ہوس ہے 101
مؤمن کی شان 102
باب کا مقصد 103
جنت میں ضرور جائے گا 104
طلب سے زیادہ عنایت 106
واجب کرنے والے دو کام 108
بَابُ الرَّجَآءِ مجلس ۳ 109
نہایت ہی امید افزا روایت 110
روایت کرنے سے کیوں منع فرمایا؟ 112
اس روایت کا پتہ کیسے چلا؟ 113
عشق است وہزار بدگمانی 114
جنت کی خوشخبری سنادو 115

کہیں لوگ بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں 116

بات ایک ؛ اثر مختلف 117

طبیعتوں کا فرق ... ایک مثال 118

دوسری مثال 119

تیسری مثال 119

اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا 120

اہم اور قابلِ فہم بحث 121

ان دو چیزوں کو لے کر جائے 123

غزوۂ تبوک 126

کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا 128

صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کی قربانی 129

بابُ الرَّجَآءِ مجلس ۴ 131

سچے دل سے کلمہ طیبہ پڑھنے پر وعدہ 132

گھر کی مسجد بھی ہونی چاہیے 135

اللہ تعالیٰ کو بندوں سے ماں سے زیادہ محبت ہے 136

رحمت غضب پر غالب ہے 138

رحمت کے ایک حصہ کا کمال 139

میرے بندے کو معلوم ہے 141

آدمی نڈر نہ بن جائے 143

آدمی جب بھی توبہ کرے 143

توبہ کا مسئلہ بہت آسان ہے 145

اگر تم لوگ گناہ نہ کرو تو... 147

ایک غلط فہمی کا ازالہ 148

یہ کمال نہیں 149

توشانِ غفاری کا ظہور کیسے ہوتا؟ 149

سالہا سال کی عبادت وہ کام نہیں کرتی 150

بابُ الرَّجَآءِ مجلس ۵ 152

کلمہ پر جنت کی خوشخبری 153

ہم آپ کو راضی کردیں گے 154

میں راضی ہونے والا نہیں 157

بڑی بے مروتی کی بات 158

اللہ کا اور بندوں کا کیا حق ہے؟ 158

وہ ثابت قدم رہیں گے 161

نیکیوں کا بدلہ دنیا اور آخرت میں 162

نظامِ خداوندی 163

نعمتیں ملنے پر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی سوچ 164

قابلِ اصلاح تعبیر 165

اللہ کے مقبول بندوں کا حال 166

وجود ہی گناہ 166

پانچ نمازوں کی مثال 167

حضرت شیخ کے والدماجد (رحمۃ اللہ علیہ) کا ارشاد 168

جنازہ میں چالیس مؤمنوں کی شرکت کی فضیلت 169

جنت میں امتِ محمدیہ کا حصہ 171

کالے بالوں میں ایک سفید بال 172

جہنم میں مؤمن کا فدیہ 174

ہر ایک کے لیے دو دو جگہیں 176

درجات اور درکات 177

بابُ الرَّجَآءِ مجلس ۶ 178

جا! آج بھی تجھے معاف کردیا 179

باری تعالیٰ بھی ہنس دیں گے 180

نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی برکت 181

ایمان والے مطمئن ہیں 182

نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں 183

بس! تمہارا گناہ معاف ہو گیا 185

کیا اسلامی سزائیں وحشیت ہے؟ 186

ہم خُرما و ہم ثواب 189

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے 189

صلوۃ الوضوء کی فضیلت 191

نماز کے اوقات کی تعلیم 195

شیطان کا عجیب تماشہ 195

وضو کا طریقہ 197

مَیں کیوں جھوٹ باندھوں 198

جب رحم کرنا چاہتے ہیں 199

پیش رو کا مطلب 200

جب ہلاک کرنا چاہتے ہیں 201

فَضْلُ الرَّجَآءِ 202

تواللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا 203

جب دشمن سازشیں کرے 204

جیسی امیدویسا معاملہ 205

زبانی جمع خرچ نہیں چلے گا 207

جیسے دودھ پیتا بچہ 208

زندگی اسی دھوکہ میں گزرتی ہے 210

جب بھی وہ مجھے یاد کرے 210

اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں 211

اللہ تعالیٰ کو بندوں سے کتنا تعلق ہے! 212

ایسے دروازے پر ہم کیوں نہ جائیں ؟ 213

کسی کو موت نہ آئے مگر 215

شیطانی حربہ کا توڑ 216

دریائے رحمت کا کیا عالم ہو گا ! 218

مایوسی دور کرنے کا طریقہ 218

اَلْجَمْعُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ 220

دو بازو 222

تین زمانے؛ تین حالتیں 222

امید اور دھوکہ۔ فرق اور مثالیں 224

خوف اور امید یکساں ضروری 226

امید و خوف؛ معتدل تعلیم 229

اُمتِ محمدیہ کی سزا 230

بڑوں کی باتیں 230

سفید جسم میں ایک کالا بال 231

اہلِ ایمان کا فدیہ 232

اُمید افزا روایتیں 232

پھر میں آپ کو رسوا نہیں کروں گا 233

سب سے زیادہ اُمید والی آیت 233

اگر انسان سن لے 234

جوتے کے تسمے سے زیادہ قریب 235

فضل البکاء من خشیۃ اللہ تعالیٰ وشوقاً الیہ 236

یہ اہل اللہ کی عادت رہی ہے 237

اس کے بعد وہ نہیں ہنسے 238

حضرات ِ انبیاء کی کیفیت ِ خشیت 238

جو عالم اللہ کے خوف سے روتا نہ ہو 239

صدیقِ اکبر کا خوف ِ خدا 240

فاروقِ اعظم کا حال 241

دیگر صحابہ کی کیفیت 242

خشیت کیسے حاصل ہو؟ 242

کثرت سے رونے والے دو بزرگ 243

یہ اہم چیز ہے 244

آپ (ﷺ) کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے 245

ہنسو کم اور روؤ زیادہ 248

یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس جائے 249

اُمت کی پریشانیوں کی ایک وجہ 250

کام سیکھنے کا طریقہ 250

رونے پر ہی ملتا ہے 251

یہ چیز ختم ہوگئی 253

سات خوش نصیب 253

حضورِ اکرم (ﷺ) کے رونے کی کیفیت 255

حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) رونے لگے 255

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں 257

حضرت اُمّ ِ اَیمن (رضی اللہ عنہ) کا ناز 259

اپنے بڑوں کی نقل 260

فوائدِ حدیث 260

حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے رونے کی کیفیت 261

دولت نیکیوں کا بدلہ تو نہیں ؟ 263

دو قطرے اور دو نشان 266

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے دلوں کی کیفیت 268

فَضۡلُ الزُّهۡدِ فِي الدُّنۡيَا وَالۡحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنۡهَا وَفَضۡلُ الۡفَقۡرِ مجلس ۱ 269

حقیقی سکون وراحت کا راستہ 271

زُہد کیا ہے؟ 272

ہر بُرائی کی جڑ 272

رُخ صحیح کرلیں 273

حُبّ ِ دنیا کے کرشمے 274

حقیقی محبت اگر کسی سے کرتا 275

صدیقِ اکبر (رضی اللہ عنہ) کو نسبتِ اتحاد 276

دوسرا واقعہ 279

ایک وقت میں ایک ہی محبت 280

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دوں 281

ضرورت اور محبت 282

دنیا اور دل؛ پانی اور کشتی 283

محمود و ایاز 284

یہ دل میں اُتارنے کی چیز نہیں 285

چوٹ کر گیا 286

دل پر چوٹ لگ گئی 287

زُہد کی اہمیت 288

چار ملکوں کے گورنر کا مکان 289

فقر کا مطلب 290

دنیوی زندگی کی مثال 291

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ مجلس ۲ 293

باقیات صالحات 294

لہو ولعب 296

زندگی میں تین مرحلے 297

رقیم، متاع اور تبارک 298

استعمال کا سامان 300

دنیا کی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے 301

تم کو غفلت میں ڈال دیا 302

آخرت کا گھر ہی ہمیشہ کی زندگی ہے 303

حضور کو اندیشہ 304

فقر سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا 306

دنیا کی زیب وزینت کا ڈر 308

دنیا شیریں اور سر سبز ہے 309

بربادی لانے والی دو چیزیں 310

حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے 311

میت کے ساتھ تین چیزیں 311

جنت وجہنم کا غوطہ 313

دنیا اور آخرت کا موازنہ 314

دنیا کی حقیقت یہ ہے 316

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ مجلس ۳ 318

مال کے فتنہ سے بچنے کا علاج 319

مال ودولت کے بارے حضور (ﷺ) کا نظریہ 322

عمدہ اصول 323

پریشانی سے راحت ملی 325

ذہنی وفکری تشویش کا علاج 326

میرے پاؤں توسلامت ہیں 327

اب تومجھے حق الیقین حاصل ہوگیا 327

یقین کے تین درجے 328

چشم کشا حقیقت 329

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) کا تجویز کردہ علاج 330

قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکے ؟ 331

کروڑپتی کی قسمت میں دال کا پانی 332

ٹینشن کیوں ؟ 332

دنیا کی محبت والوں کا مزاج 333

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لباس 334

قیدخانہ اورجنت 336

ایک اشکال اوراس کا جواب 337

نادر مثال 338

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ مجلس ۴ 339

دنیا میں اس طرح رہو 340

جیسے راہ گیر 342

اعمال کیے بغیر ثواب 343

دنیا کا قیام 344

محبوب بننے کا نسخہ 345

حضور (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کی فقیری 346

حضورِ اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کے گھر کا حال 347

حضورِ اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا ترکہ 348

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے احوال 349

دنیا کی قدر و قیمت 350

دنیا ملعون ہے 351

جائیداد مت بناؤ 353

موت اس سے جلد دیکھتا ہوں 354

ذہن کی گردش 355

مقصد سے توجہ نہ ہٹے 356

نعمتوں کے متعلق سوال کیاجائے گا 357

عین حکمت کاتقاضہ 360

دور کی نہ سوچے 360

ایک بوڑھاتاجراوراس کے عزائم! 361

ایک مالدارکاعبرت ناک واقعہ 363

توکل پربصیرت افروز مضمون 364

یہ بھی دیکھا؛وہ بھی دیکھ 365

ٹینشن ؛ناشکری کی سزا 366

شکرگزاری کا نرالاانداز 367

ایک ہی سوال مالداراور غریب سے 368

اُمتِ محمدیہ کا فتنہ 369

مکان کے مختلف درجات 370

رہائش 371

آسائش 371

آرائش 372

نمائش 372

اس کے علاوہ کوئی حق نہیں 373

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ مجلس ۵ 375

انسان کا حقیقی مال 376

دوسروں کے مال کا محافظ 377

اصل ضرورت بہت ہی کم ہے 378

ضرورت کی توضیح 379

مال ودولت بری چیز نہیں 381

فساد کا ارادہ نہ کرو 382

حُبِّ نبوی کے لیے فقر لازمی 383

خوش ہونے کی چیز 384

حالات ؛ صحیح منزل کی علامت 385

آزمائش ناراضگی کی علامت نہیں 386

قابلِ اصلاح نظریہ 387

اسلاف کا طرزِ عمل 388

حُبِ مال وجاہ کی خطرناکی 389

دنیا ایک راہ گزر ہے 390

خلاصۂ کلام 391

پانچ سو سال پہلے جنت میں داخلہ 392

مال کی کمی؛ جنت میں لے جانے والی 393

اِس زمانہ کے ایک سوال کا جواب 394

عورتوں کی دوبری عادتیں 394

دنیاکے خوش بخت روکے جائیں گے 396

شاعر کی سچی بات 397

پورے باب کا نچوڑ 398

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ 401

عنوان کا خلاصہ 402

حضرت ابو عبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) کے مناقب 404

فاتحِ روم کی زندگی کا حال 406

مدائن کے گورنر کا حال 408

دنیاکے لیے قربانیاں ؛آخرت کے لیے کیوں نہیں ؟ 409

عقلمندی کا طریقہ 410

ناخَلَف اولاد کی دوبُری خصلتیں 411

حقیقی دولت یہ نہیں، وہ ہے 412
ہر نعمت کے متعلق سوال کیا جائے گا 413
ایک قصہ 414
دنیا کی وسعت اگر مطلوب ہوتی 418
اُمت کے لیے بھی پسندیدہ یہی ہے 420
حضور کا زمانہ یاد آگیا 421
حضورِ اکرم (ﷺ) کی غذا 422
ہمارے لیے نمونہ 424
بغیر چھنے آٹے کی روٹی 425
فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ مجلس ۲ 428
افضل ترین افراد کی زندگی 430
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں 431
ہر نعمت کا یہی حق ہے 433

سابقین اوّلین کی زندگیوں کا حال 434

بڑائی سے خدا کی پناہ 438

ایسے موقعہ پر آدمی خوش ہو 439

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے کھانے 440

اپنے گھر والوں کے لیے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا 442

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی بھوک کا حال 443

روایت سے مستنبط کچھ آداب 447

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ مجلس ۳ 450

بھوک کی وجہ سے بے ہوشی 451

بنیادی ضرورتوں کے لیے زرہ گروی رکھی 452

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھرانے کا دن ایسی حالت میں گزرتا... 453

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی سادگی کا ایک اور نمونہ 454

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بستر 455

بایں ہمہ ہیچ افسوس ندارد 456
ایسے لوگ آئیں گے 458
خرچ کرنے کی ترتیب 460
جس کو تین چیزیں ملیں 461
میری ضرورت کا مجھ تک پہنچ جاتا ہے 462
غورطلب حقیقت 462
کامیاب ترین آدمی 464
خوش خبری ہے اس کے لیے 465
حضور(ﷺ)اورآپ کے گھرانے کی راتیں 465
اہلِ صفہ کی بھوک پر حضور(ﷺ)کی تسلی 466
بھرا ہوا سب سے بُرا برتن 467
سادگی ایمان کا حصہ ہے 468
عنبر مچھلی کا قصہ 469

حضرت قیس بن سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) 471

قیصرِ روم کو دنداں شکن جواب 472

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کرتہ کی آستین 473

فَضْلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ مجلس ۴ 475

دورِ نبوت کا ایک اہم واقعہ 476

غزوۂ خندق کا پس منظر 483

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور ہم 489

برکت کا ایک قصہ 490

فہرست

اداریہ 1

القناعة و العفاف والاقتصاد فی المعیشة مجلس ۱..14

ترجمۃ الباب کا خلاصہ 15

نہ اسراف کی اجازت، اور نہ بخل کی 16

پھر آدمی بے صبری سے کیوں کام لے؟ 17

سوال کرنے کا ایک قدرتی اثر 18

مقصدِ زندگی 20

حقیقی مالداری؛ دل کی صفت 20

وہ آدمی کامیاب ہوگیا 21

بغیر سوال ملنے پر برکت کا وعدہ 22

عہد نبھانے کا سبق آموز نمونہ 25

چیتھڑوں والا غزوہ 27

صفتِ استغناء پر سندِ نبوی 29

القناعة والعفاف والاقتصاد فی المعیشة مجلس ۲ 32

جو آدمی سوال سے بچنا چاہتا ہے... 33

بے نیازی سے دینے کے دو مطلب 35

اوصافِ کمال حاصل کرنے کا طریقہ 36

سوال کرنے والوں کے لیے خاص ہدایت 38

سوال نہ کرنے پر نبی کریم (ﷺ) کی بیعت 40

مانگنے کی عادت پر سزا 42

اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ 43

وہ کیا جمع کر رہا ہے؟ 43

نصاب کی تین قسمیں 44

دوسرا نصاب 45

لایعنی کی ایک اور قسم 45

ضرورت کی چیز کیا ہے؟ 46

چوتھا بستر شیطان کا 47

جس کے یہاں ٹی وی ہو؛اس کو زکوٰۃ دینا 47

جس پر صدقۂ فطر واجب ؛اس پر قربانی واجب 48

تیسرا نصاب 49

یہ پیسے نہیں ، انگارے ہیں 49

سوال کرنا چہرہ پر خراش ہے 50

کن صورتوں میں سوال کی اجازت ہے؟ 51

فاقہ کہاں پیش کرنا چاہیے؟ 52

نہ مانگنے پر جنت کی ضمانت 53

سوال کرنا تین آدمیوں کے لیے جائز ہے 53

حقیقی مسکین کی پہچان 57

خرچ کرنے والوں کا فریضہ 59

اِدھر بھی توجہ دیں 59

جوازالاخذمن غیرمسألة ولاتطلع الیه 62

باب کا عنوان 63

بغیراشراف وسوال کے کچھ ملے تو؟ 64

یہ اشراف نہیں ہے 66

ایک اہم سبق 67

سلیقہ مندشاگردکی ذکاوت ...واقعہ 68

الحث علی الأکل من عمل یدہ والتعفف بہ عن السؤال والتعرض للأعطاء 70

روزی تلاش کرنے کی ترغیب 71

خودکام کرنابہترہے 72

نبی اوربادشاہ بھی ہاتھ سے کماتے تھے 73

حضرت زکریا (علیہ السلام) کاپیشہ 74

ہاتھ کی کمائی 75

الکرم والجود والانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ مجلس۱ 77

ترجمۃ الباب کا خلاصہ 78

حسد جائز نہیں ہے مگر... 79

مؤمن کا حقیقی مال تو یہی ہے؟ 81

اس سے بڑی حماقت کیا ہو گی؟ 83

ایک غلط سوچ ،اوراس کی اصلاح 84

کھجور کے ایک ٹکڑے کی تاثیر 85

آپ (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) نے کبھی ”نا“ نہیں کہا 86

حضورِ اکرم (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) کا چہرہ کھِل گیا 86

باوجود سخت ضرورت کے چادر دے دی 87

سخاوت کی برکت اور بخل کی نحوست 89

پہلے خالی کرو، تو بھری جائے گی 90

الکرم الجود والانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ مجلس۲ 92

اسلام کے اعمال میں بہترین عمل 93

یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے 94

مال خرچ کرنے کی تعلیم اور ترتیب 95

سخاوت سے اسلام محبوب بن جاتا 97

غیر حقدار کو دینے کی وجہ 99

حضور (ﷺ) کی سخاوت کا نمونہ 99

غزوۂ حنین 100

صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا 103

جو خرچ کیا وہ سب باقی ہے 107

تم روک کر مت رکھو؛ ورنہ... 108

سخی اور بخیل ؛ ایک مثال 109

الکرم والجود والانفاق فی وجوہ الخیر ثقۃ باللہ تعالیٰ مجلس ۳ 112

تو بخل کیوں ؟... 114

بغیر خرچ کئے سخاوت کا ثواب 115

دعا میں بھی سخاوت سے کام لو 116

پچھتّر ہزار مکاتب 117

غور و فکر کی بات 117

دل کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے 119

یہ شانِ کریمی کے خلاف ہے 120

حلال خرچ کرنے کی برکت 121

حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) کا مقولہ 122

جب کھجور کا ایک دانہ پہاڑ بن جاتا ہے! 123

ایک تہائی خرچ کرنے کی برکت 124

ہمارے اسلاف کا عمل 126

نفس کا مکر اور اس کی پکڑ 127

نیت کا اثر... سبق آموز قصہ 128

اَلنَّهْيُ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ 131

بخل و شح کا معنٰی 132

جہنم کا راستہ 133

نعمتیں صحیح جگہ استعمال نہ کرنے کی نحوست 133

ظلم وشح سے بچو 134

بَابُ الْإِيْثَارِ وَالْمُوَاسَاةِ 136

ایثاراور مواسات کا مطلب 137

ایثار کرنے پر اللہ تعالیٰ خوش ہوگئے 139

دو کا کھانا تین کو کافی ہے 141

ضرورت سے زائد کو خرچ کردو 142

ایثار کا عملی سبق 144

ایثار کرنے والوں سے حضور (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا اظہارِ تعلق 146

اَلتَّنَافُسُ فِى أُمُوْرِ الْآخِرَةِ وَالْإِسْتِكْثَارُ مِمَّا يُتَبَرَّكُ بِهٖ 149

باب کا عنوان 150

برکت حاصل کرنے کا اہتمام 151

برکت سے کوئی مستغنی نہیں 153

فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ 156

شکر گزار مالدار 157

شکر کی حقیقت 158

شکر کا پہلا درجہ 159

نیکی یا گناہ کے مراحل پر بھی اجر وزجر 160

یہ طرزِ عمل؛ شرافت کا جنازہ 162

شکر کا دوسرا درجہ 164

خرچ کرنے میں یہ بھی بہتر اور وہ بھی! 167

نیکی کا اعلیٰ درجہ 168

دو قابلِ رشک شخصیتیں 169

پہلی شخصیت 171

دوسری شخصیت 171

ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا 172

دوباتیں 173

حفظِ قرآن کاحق 174

فقراءِ مہاجرین کی کڑھن 174

بابُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وقَصْرِ الأمَلِ مجلس ۱ 177

گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ 179

ناقابلِ انکار حقیقت 180

مختصر سفر کی تیاری اور لمبے سفر سے غفلت! 181

آپ سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں 182

ساماں سو برس کا، پل کی خبر نہیں 184

حقیقی کامیابی 185

اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں 186

نہ جلدی، نہ دیر 187

وہی گھاٹے میں ہیں 188

وہی پرانی روش 189

حساب کتاب کا منظر 190

کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا؟ 192

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں 194

وقت آنے سے پہلے تیاری کرلو 195

وصیت لکھنے کا حکم اور طریقہ 196

زندگی، موت اور امیدیں 199

بابُ ذِکْرِ المَوْتِ وقَصْرِ الأمَلِ مجلس ۲ 201

سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو 202

امروز و فردا 203

نیکی کے داعیہ کی قدر کرو 204

بھلا دینے والا فقر 205

سرکش بنانے والی مالداری 206

مہلک بیماری 206

سٹھیا دینے والا بڑھاپا 207

اچانک کی موت 208

تم نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے 209

دجّال 210

قیامت 211

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے 211

موت کا مراقبہ 213

درود شریف کا فائدہ 214

بَابُ اسْتِحْبَابِ زِيَارَةِ القبورِ لِلرِّجَالِ وما يَقُوْلُهُ الزائر 216

قبرستان جانااوراس کے فائدے 217

کیاعورتیں قبرستان جاسکتی ہیں ؟ 219

قبرستان جانے کی دعااورآداب 220

قبرستان کس دن جائے؟مقاصدِ زیارت 221

زیارتِ قبور کی تعلیم 223

زیارت کی دعامیں ”ان شاء اللہ“کیوں ؟ 223

حسنِ خاتمہ اورسوءِ خاتمہ کے اسباب 224

قبرستان میں داخلہ کے وقت سلام 224

ایصالِ ثواب کاطریقہ 225

ثواب پوراپہنچتاہے،یاتقسیم ہوکر؟ 226

زندوں کوبھی ایصالِ ثواب کیاجاسکتاہے؟ 227

قبرکے پاس کس طرح کھڑارہے؟ 228

ثواب پہنچنے کے بارے میں مذاہبِ ائمہ 229

دعائے مغفرت یا ایصال ثواب؟ 230

دعائے مغفرت زیادہ مفید ہے 231

ایک مراقبہ 232

غفلت کا انتہائی درجہ، اس کا علاج 233

حاصلِ کلام 235

كَرَاهَةُ تَمَنِّي الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضُرٍّ نَزَلَ بِهِ وَلَا بَأْسَ بِهِ لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ فِي الدِّيْنِ 237

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا 238

اگر موت مانگنی ہی ہے تو؟ 239

دینی آزمائش کی وجہ سے موت مانگنا 240

موت کی تمنا کرنے کی کوئی وجہ نہیں 240

موت کی قطعی دعا نہ کرے 242

مانگی تھی تلے کو، ملی اوپر کو 243

عورتوں کی عادت 244

بد دعا کا خاصہ 245

حضرت فقیہ الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک مثال 246

احتیاط والی بات 247

اگر منع نہ ہوتا تو میں موت کی دعا کرتا 247

تعمیر میں خرچ ناپسندیدہ ہے 250

بَابُ الْوَرَعِ وَتَرْكِ الشُّبُهَاتِ 252

ورع کا مطلب 253

شبہ والی چیز کو چھوڑنا 254

تم اس کو معمولی سمجھتے ہو 254

یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ 256

کہیں رفتار کو قابو میں لانا پڑتا ہے 256

مشتبہ سے بچا تو دین وعزت محفوظ 258

شاہی چراگاہ 260

اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آگیا تو 262
نیت پر بنیاد کیوں ؟ 263
اس بات کا ڈر رہے گا 263
ایک نمونہ 264
امام صاحب کا ورع 264
ایک اور واقعہ 265
ناظمِ مطبخ کا ورع 266
مہتمم صاحب کا ورع 266
مُحشّی بُخاری کا ورع 267
طالبِ علمی کے زمانہ میں احتیاط 268
...پھر ایک خط نہ لیتے 268
پرہیز گاری برتنا ہر ایک کا کام نہیں 269
حضورِ اکرم (ﷺ) کا ورع 271

جس چیز پر دل کھٹکے ... 272

وہی ”دل“ کہلانے کے لائق ہے ... 273

احتیاطاً بیوی کو الگ کر دیا ... 274

ایک مسئلہ ... 275

شک والی چیز چھوڑ کر... ... 276

حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا قصہ ... 277

...تو بھی نکال کر رہتا ... 278

بیٹے کو دوسروں سے کم دیا ... 279

نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے ... 280

کوئی متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا... ... 281

لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنا دیتے ہیں ... 282

اِسْتِحْبَابِ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ اَوِ الْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّيْنِ وَوُقُوْعٍ فِىْ حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَنَحْوِهَا.. 283

زندگی گزارنے کے دو طریقے ... 284

اسلام میں رہبانیت نہیں 284

فتنہ کی حالت 286

گوشہ نشینی مستحب ہونے کی تین شکلیں 287

اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ 288

حضرت سعد (رضی اللہ عنہ) کی گوشہ نشینی 288

اصحابِ کہف کا قصہ 290

سب سے بہتر کون؟ 291

وہ زمانہ قریب ہے 292

ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں 293

بہترین زندگی 293

بَابُ فَضْلِ الْاِخْتِلَاطِ بِالنَّاسِ 295

کیا وہ زمانہ آگیا؟ 297

ماتحتوں کو نہ بخشے 298

احقاقِ حق یا تذلیل؟ 299

عذابِ الٰہی کو دعوت نہ دیں 300

یہ آیت شبہ میں نہ ڈالے 301

التَّواضُع وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ 303

ساری خوبیوں کی جڑ 304

حضرت آدم کا امتیازی وصف 306

ایک ”ع“ کی کمی 307

محبت جب پیوست ہو جاتی ہے 309

اُمُّ الامراض 310

تواضع کی حقیقت 311

نمائشی تواضع 311

حقیقی تواضع کی ایک علامت 312

حضورِ پاک (ﷺ) کی تواضع 313

مجبوری کی وجہ سے مسند بنوائی گئی 313

نعمتوں کو عطیۂ خداوندی سمجھے 315

خلیفۂ وقت کا سترہ پیوندی کرتہ 316

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تواضع 317

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی مجلس کی کیفیت 317

متکبر کی نقد سزا 318

نقشوں کو تم نہ جانچو 318

حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تواضع 319

دارالعلوم کے صدر مدرس کی تواضع 320

دَم نکلنے کے بعد ذائقہ آتا ہے 321

اللہ تعالیٰ کو تواضع ہی پسند ہے 322

... ذرا بند قبا دیکھ 322

کوئی کسی پر فخر نہ کرے 324

التَّواضُع وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ 326

صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا 327

معافی عزت بڑھاتی ہے 328

الیوم یوم المرحمۃ 329

تواضع کی زبردست خاصیت 330

جب عظمت الٰہی جاگزیں ہوتی ہے 331

کتے اور سور سے بھی گیا گزرا 331

تواضع کا اعلیٰ نمونہ 333

ایک اور نمونہ 334

گھر کے نبوی اعمال 334

جس وقت، جو فرض 336

پردیسی کے ساتھ متواضعانہ سلوک 337

انگلیاں چاٹنا؛ تواضع کی علامت 338

شیطان کو آرام نہ پہنچاؤ 339
شیطان لُچّاہے 340
ایک جزو بھی ضائع نہ جائے 341
قدرِ نعمت 342
...تب قدر ہوتی ہے 343
وہ ادا بہت پسند آئی 344
حضراتِ انبیاء کی تربیت 345
ایک بات یاد رہے 346
تو بھی قبول کرلوں گا 346
کوئی چیز جب سر اُٹھاتی ہے 348
تحریم الکبر والاعجاب 350
تکبر اور خود پسندی 351
جو بڑا بننا نہیں چاہتے 352

زمین میں اکڑ کر مت چلو 352

اترانے کا عبرتناک انجام 353

ذرّہ برابر تکبر کی سزا 354

ٹھیک ٹھاک اور ٹیپ ٹاپ 355

یہ تکبر نہیں 356

یہ کبر ہے 357

خبثِ باطن 358

کوئی برا نہیں۔ 359

عطاء اور بقاء کا مراقبہ 359

اتنی نہ بڑھا۔ 361

کبر سے ارتداد تک 362

دوسرا واقعہ 363

دینی کام کرنے والوں سے 366

پھر کبھی ہاتھ نہ اٹھاسکا 367

پھر جنت کے قابل بنے گا 368

جنت ودوزخ کا مناظرہ 369

جو چھوٹوں کو بڑا بنادے 370

جنت اور جہنم کا بھراوا 370

نظرِ رحمت سے محروم 371

تین مبغوض ترین 372

متکبر کو شدید دھمکی 372

خودپسندی کی نقد سزا 373

متکبر لکھ دیا جاتا ہے 374

بابُ حُسْنِ الخُلُقِ.. 375

صرف یہ اخلاق نہیں 376

جسم کی قدر روح سے ہے 377

روح سے متعلق بھی احکام 379

جسمانی اعمال میں فرائض 379

روحانی اعمال میں فرائض و محرمات 380

لینے کے دینے 382

حاصلِ کلام 383

خُلقِ عظیم 383

غصہ پینا،معاف کرنا 384

ازالہ نہیں ، امالہ 385

نفس پر قابوپانے کا واقعہ 386

اچھے اخلاق کی تکمیل 387

حضوراکرم (ﷺ) کے اوصاف واخلاق 388

مجسم خوشبو 389

خادمِ خاص کاتجربہ 390

اخلاق کی بلندی 392

نیکی اور گناہ کیا ہے؟ 393

بہترین لوگ 394

اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں 395

دو جنتی عمل 396

کامل ایمان والے 397

اچھے اخلاق والوں کا مقام 399

تین آدمی ، تین گارنٹی 400

حضور (ﷺ) کی نگاہوں میں محبوب اور قریب جگہ پانے والے 401

باب الحلم والاناءۃ والرفق 403

حلم ، وقار، نرمی 404

سب سے عمدہ گھونٹ 405

جا! تجھے آزاد کیا 405

کوئی بااعتدال، کوئی بدحال 406

سفارش بھی، تنبیہ بھی 409

اب معاملہ صاف کرلیجئے 410

ہمارامزاج ؟خداکی پناہ! 411

اور کوڑا رکھ دیا 412

اگر یہ طریقہ اپنائیں 415

لیک بعداز خرابیٔ بسیار 416

وہ سکتہ میں آگیا 417

ہمت کا کام 417

دوپسندیدہ خوبیاں 418

غصہ مت کرو 420

قصور گاہک کا، سزا بیوی کو! 421

جب وہ غصہ میں ہوتا ہے 422

مناظرہ میں کامیابی کا گُر 422

خوبیاں وہبی یا کسبی؟ 423

دونوں راہیں بتلادیں 423

باب الحلم والاناۃ والرفق 425

نرمی کا جادو 426

اگر طویل المیعاد فائدہ حاصل کرنا ہے ! 427

اس کام میں رونق آجاتی ہے 428

تم آسانی کرنے والا بناکر بھیجے گئے ہو 429

اَلْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ 430

روایت کا سبق 432

آسانی کو ترجیح دیجئے 433

تنفر مت کرو 435

جامع ترین نبوی اصول 435

جو نرمی سے محروم کر دیا گیا... 436
نبی کریم (ﷺ) کی مختصر ترین نصیحت 437
ایک زرّیں نصیحت 439
یہ بھی حکمت ہے 440
تقریرِ رسول حجت ہے 440
گناہ کے دو محرکات 442
شہوت و غصہ میں ایک فرق 442
غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر 444
غصہ کے شاخسانے 445
بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے 447
ہر کام اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے 448
بندہ بن کر رہے 450
ہمارا مزاج برعکس ہو گیا 452

جب مذہب پر حملہ ہو 452

جنتیوں کی چند صفات 454

باب العفو.. 456

والاعراض عن الجاھلین.. 456

چشم پوشی سے کام لینا 457

حضورِ اکرم (ﷺ) کا عفو 459

حضورِ اکرم (ﷺ) نے کسی کو نہیں مارا 462

یہی مساوات ہے 463

قیامت تک کے لیے یہی اصول ہے 464

ایک دیہاتی کا طرز اور آپ (ﷺ) کا عمل 466

بردباری کا عجیب امتحان 467

تکلیف دینے پر دعا دینے کا ایک نمونہ 470

حقیقی پہلوان 471

باب إحتمال الأذیٰ 472

گرم راکھ ڈال رہا ہے 473

فرشتہ گیا، شیطان آیا 474

بہادری یا بزدلی 475

الغضب إذا انتُهکت حرمات الشرع والانتصار لدین الله تعالی 476

غصہ کب کرسکتے ہیں ؟ 477

شعائر اللہ کی عظمت رضاءِ الٰہی کا ذریعہ 478

لوگوں کو دین سے متنفر نہ کرے 479

نماز کی مسنون قراء ت 480

احادیث کا غلط استعمال نہ کریں 481

جب مستحب چیز بدعت بنتی ہے 482

عملی بے اعتدالی بھی صحیح نہیں 483

قانون کو ہاتھ میں نہ لیں 484

اجتماعی کاموں کا ایک سنہرا اصول 485

حضور اکرم (ﷺ) کا غصہ 487

حدود اللہ میں رواداری نہیں 488

تو نے خرید کر مجھے انمول کر دیا 490

قبلہ کی طرف تھوکنے پر حضور (ﷺ) کی ناراضگی 493

فہرست

اداریہ 1

اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے : 10

حکمرانوں کا پورا سلسلہ: 11

جیتے جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ: 12

عنوان کا خلاصہ: 14

بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا: 15

مصلحت اور حاجت کا فرق: 16

ایک مثال : 17

موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر: 17

جامع آیت: 18

آیت کا اثر پوری قوم پر: 19

...میرا ایمان پختہ ہو گیا: 20

عدل: 21

احسان : 21

اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی: 22

فحش ،منکر،سرکشی: 22

ہرایک ذمہ دارہے: 23

ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا : 26

جن کے رتبے ہیں سوا...: 27

جیسابرتاؤ؛ ویسی دعا: 28

خردکانام جنوں رکھ دیا...: 29

حاکموں سے کئے ہوئے عہدکوپوراکرو: 30

جہاں کہیں فتنے رونماہوتے ہیں : 31

آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ: 32

وہاں دیرتوہے،اندھیرنہیں : 33

بدترین ذمہ دار کی نشانی:.. 34

ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے:........................ 35

الوالی العادل.. 37

باب کا عنوان: 38

دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف :........................ 39

سایہ دار سات گروہ...پہلا گروہ: 39

دوسرا گروہ:.. 42

تیسرا گروہ:.. 42

چوتھا گروہ:.. 43

پانچواں گروہ:.. 43

چھٹا گروہ:.. 44

ساتواں گروہ:.. 45

نور کے منبروں پر ہوں گے: 46

بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت: 47

نظامِ سلطنت کے بقاء کی اہمیت : 49

تین جنتی: 50

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ.. 52

حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہو جاتا ہے:.. 53

ماں باپ کے لیے اہم نصیحت: 53

سربراہ کی بات ماننے کے حدود: 54

نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں : 55

مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال: 56

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں : 57

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ...: 58

...جاہلیت کی موت مرے گا: 59

ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے ...: 60

ہر حال میں مانو: 62
...تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟: 63
وُجُوْبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْاُمُوْرِ فِیْ غَیْرِ مَعْصِیَةٍ وَتَحْرِیْمُ طَاعَتِهِمْ فِی الْمَعْصِیَةِ.. 65
بنیادی اصول: 66
اُمتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی: 67
فتنہ کسے کہتے ہیں ؟: 71
"فتنہ" کی تشریح بہ زبانِ نبی : 73
امیر کی اطاعت ضروری ہے : 73
اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر: 74
شریعت کا اصول: 76
اصل علاج یہ نہیں : 79
شفابخش علاج : 80
خلاصۂ علاج: 81

یہ سودے بازی نہیں ہے: 82
ایسے زمانہ میں کیا کرے؟: 83
وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْاُمُوْرِ فِیْ غَیْرِ مَعْصِیَةٍ وَ تَحْرِیْمُ طَاعَتِهِمْ فِی الْمَعْصِیَةِ 86
جس نے امیر کی اطاعت کی......: 87
ایک اہم اصول: 90
جاہلیت کی موت: 90
جس نے حاکم کی توہین کی: 92
اَلنَّهْیُ عَنْ سُوَالِ الْاِمَارَةِ 94
وَاِخْتِیَارُ تَرْکِ الْوِلَایَاتِ اِذَا لَمْ یَتَعَیَّنْ عَلَیْهِ 94
اسلامی اصول: 95
باصلاحیت آدمی کے لیے دوراستے ہیں : 96
اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں : 97
آخرت کا گھر کس کے لیے؟: 98

اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو: 99

عمدہ مثال:.. 100

بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا: 101

کسی دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا:.. 102

امارت سببِ ندامت: 103

حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِیْ وَغَیْرِھِمَا مِنْ وُلَاۃِ الْاُمُوْرِ 106

عَلٰی اِتِّخَاذِ وَزِیْرٍصَالِحٍ وَتَحْذِیْرِھِمْ مِنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ 106

صالح آدمی کو مشیر بناؤ: 107

دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں : 107

قاعدۂ کلیہ: 108

مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو: 110

اللہ تعالیٰ صاحبِ اختیار کے ساتھ جب بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں : 111

النھی عن تولیۃ الامارۃ والقضاء وغیرھما من الولایات لمن سألھا................................. 113

أو حرص عليها فعرّض بها 113
جو کوئی عہدہ مانگے یا اس کی لالچ رکھے اس کو عہدہ نہیں دیتے: 114
حیاء اور شرم کسے کہتے ہیں؟: 117
شرم تو ایمان کا حصہ ہے: 118
ایمان کی ایک شاخ: 120
حقیقی حیاء اور شرم: 121
بے حیائی کی منظّم سازش: 123
حضور اکرم (ﷺ) کی شرم وحیاء 125
باب حفظ السر 127
رازداری کے اصول: 128
صریح راز: 129
راز کا انداز: 129
یہ بھی راز ہے: 130

حضور (ﷺ) کے رازدار کی رازداری:........................ 131

رازامانت ہوتے ہیں :........................ 134

عہد کے بارے میں سوال ہوگا:........................ 134

اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص:........................ 135

رازداری کاایک واقعہ:........................ 136

نکاح کاپیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟:........................ 139

فوائدِ حدیث :........................ 141

حضور (ﷺ) کے مرض الوفات کاواقعہ:........................ 142

بعض بھیدہمیشہ کے لیے بھیدہوتے ہیں :........................ 146

الوفاء بالعھد وَاِنجاز الوَعد........................ 149

عہد و پیمان کوپوراکرنے کااہتمام :........................ 150

کامیاب اہلِ ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے:........................ 151

قرآنی ایک اصول:........................ 152

زندگی کے معاملات عہد وپیمان ہیں : 152

یہ بڑی خطرناک چیز ہے:.. 154

معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں :.. 155

منافق کی نشانی اور ہمارا معاشرہ:.. 156

باطن کچھ ،اور ظاہر کچھ: 159

منافق کی چار علامتیں :.. 160

وعدہ پورا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ: 160

عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ:.. 163

آج کے حالات کا موازنہ: 166

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک:.. 166

آج ضرورت ہے اس بات کی...:.. 168

وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ: 169

یہ عملی عہد وپیمان ہے:.. 171

الامر فی المحافظۃ علیٰ ما اعتادہ من الخیر 173

معمولات کی پابندی کیجئے: 174

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا: 175

اس سے نقصان پہنچتا ہے: 177

معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے: 177

اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا: 178

اس آیت کا صحیح مطلب: 179

نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے: 180

حضرت مولانا سعید احمد خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال: 181

تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو: 182

معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے: 183

رہبانیت کیسے شروع ہوئی: 184

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے: 185

دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے: 186

اے عبداللہ! فلاں جیسے مت بنیو: 187

مداومت کا نتیجہ: 189

ساری خرابی یہیں سے آتی ہے: 190

ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟: 191

خلاصہ باب: 191

استحباب طیب الکلام وطلاقة الوَجه عند اللقاء 193

ہر کس وناکس کو مسخر کرنے والا نسخہ: 194

یہ آپ (ﷺ) کا طریقہ ہے: 195

آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے: 196

میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں !: 197

یہ ہمارا مزاج ہے: 199

وہ اخلاق کس کام کے !: 200

اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا:.. 201

اگر آپ بدخُلق اور سخت دل ہوتے :.. 202

کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے:.. 203

اس پر بھی صدقہ کاثواب:.. 204

ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے:.. 204

استحباب بیان الکلام 207

وایضاحہ للمخاطب.. 207

وتکریرہ لیفھم اِذا لَمْ یفھم اِلا بذلک 207

گفتگو کے آداب:.. 208

کلام کاایک ادب:.. 209

آپ (ﷺ) کا کلام بھی ایساہی ہوتاتھا:.. 210

مجلس کے آداب:.. 213

لوگوں کوخاموش کردو:.. 214

باب الوعظ والاقتصاد فیہ 216

شریعت کی ایک اہم تعلیم: 217

حکمتِ تربیت یہی ہے: 218

فقاہت کی علامت: 220

وعظِ مختصر، مگر پُراثر: 221

کاہن نہیں تو عامل!: 224

غلط عقیدہ: 224

اگر ایسا کھٹکا پیدا ہوگیا: 225

باب الوقار والسکینۃ 227

زندگی کا اہم ادب: 228

ہر معاملہ میں تواضع : 229

رحمٰن کے بندوں کی صفت: 230

وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے: 232

الندب الٰی اتیان الصلاۃ والعلم ونحوھما من العبادات بالسکینۃ والوقار 234

وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں : 235

تقویٰ کی علامت: 235

دوڑنا؛وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے:................................ 236

حاصل شدہ کے لیے بھاگنا لاحاصل:.................................. 237

جلدبازی نیکی نہیں ہے: 238

باب اکرام الضیف.. 240

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل:.................................. 241

تب مجوسی ایمان لے آیا: 242

آیت سے مستفاد احکام:... 243

حضرت لوط علیہ السلام کا مہمانوں کا اکرام:.............................. 244

مہمان نوازی ؛ایمان کا تقاضہ: 245

مہمان اور میزبان کے لیے ہدایات: 247

اِستحباب التبشیر والتھنئۃ بالخیر 250

مبارک باددینا پسندیدہ ہے: 251

اگراس پر عمل ہوجائے!: 251

اسلامی معاشرے کوباہم جوڑنے والی: 252

ہمارے آداب اہلِ یوروپ نے اپنالئے: 253

اپنابنانے کاگُر: 254

قرآنی دلائل: 254

ایک موتی کے مکان کی خوشخبری: 257

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہاکے مناقب: 259

حضورِاکرم (ﷺ) نے جنت کی بشارتیں سنائیں: 260

میرے پہلے سفرحج کاواقعہ: 265

یقین سے کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت: 267

مختصرآپ بیتی ازحضرت عمروبن عاص رضی اللہ عنہ: 270

باب وداع الصاحب ووصیتہ عند فراقہ للسفر وغیرہ 275

والدعاء لَہٗ وطلب الدعاء مِنۡہُ 275

جدائی کے موقع کے چارآداب:.. 276

دوپیغمبروں کی اپنے بیٹوں کووصیت:.. 277

بیانِ واقعہ کانرالا انداز:.. 279

خاندانِ نبوت:.. 281

فکرکیاکرے؟: 282

آج کے دَورکی تصویرکشی:.. 283

نبی ٔکریم (ﷺ) کی وصیت: 286

مناسبِ حال معاملہ اورنصیحت: 287

اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو: 290

کسی کورخصت کرتے وقت کی دعائیں :.. 291

الاستِخارۃ والمشاورۃ.. 294

مشورہ کی اہمیت: 295

حضورِ اکرم (ﷺ) کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے: 296

غزوۂ اُحد کے مشورہ کا منظر: 296

غزوۂ بدر کا مختصر خاکہ: 297

افسوس کا تدارک: 298

غزوۂ اُحد کا مشورہ: 299

اس کو مشورہ کہتے ہیں: 302

اس کا نام مشورہ نہیں: 303

مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے: 303

عورتوں سے مشورہ: 304

آمدم بر سرِ مطلب: 306

صدیق کی رائے صادق: 307

استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت: 309

اہتمامِ استخارہ کی وجہ: 311

کہانت: 311

زَجر: 312

تَطَیُّراور طِیرہ: 313

اِسْتِقْسَام بِالْاُزْلَام: 314

ایک غلط رواج: 316

استخارہ کی لغوی تحقیق: 316

استخارہ کن کاموں میں کیا جائے؟: 317

مسنون استخارہ: 319

دعاکے آداب: 319

یہ سب حمدوثناءہی ہے: 320

دعائے استخارہ کی تشریح: 320

جب جیب کٹی: 322

دعائے استخارہ کی روح:.. 322

دعاکاعجیب وغریب انداز:.. 324

استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟:.. 327

استخارہ کتنے دن ؟:.. 328

دوسرے سے استخارہ کرایاجاسکتاہے؟.. 328

اِستحباب الذھاب الیٰ العید الخ.. 329

باب کاعنوان:.. 330

قیامت کی کچہری کے گواہ:.. 330

تطبیقِ آیات:.. 331

زمین وآسمان روتے ہیں :.. 333

زیادہ گواہ تیار کرلو:.. 334

عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی:.. 335

یہ اہتمام صرف عیدمیں نہیں :.. 335

آپ (ﷺ) کی ذات نمونہ ہے: 336

نبیٔ کریم (ﷺ) کا طرزِ عمل: 337

استحباب تقديم اليمين في كل ماهو من باب التكريم 339

عنوان کی وضاحت: 340

حضورِ اکرم (ﷺ) کی پسند: 343

حضورِ اکرم (ﷺ) کا عمل: 344

یہی تو کمالِ نبی ہے: 345

آج کل کی بدتہذیبی کی بڑی وجہ: 346

تربیت کا مؤثر ترین طریقہ: 347

شان کے خلاف نہیں: 348

آپ بیتی: 349

تربیت کا اصل طریقہ: 350

عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ہماری کوتاہیاں: 350

ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو: 352

کتاب آداب الطعام 356

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا.. 357

آدابِ زندگی: 357

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کا فائدہ: 358

کیاہم نے کبھی سوچا؟: 360

ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں : 362

مضطر کو روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام:.. 364

دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں :.. 365

چیونٹی کی روزی کا منظر:.. 366

روزی کا انتظام ؛ہمارے بس کی بات نہیں : 367

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت:.. 368

شروع میں نہیں تو جب یاد آئے:.. 370

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول: 372

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل: 373

مسنون دعائیں ؛حفاظت کا ذریعہ: 374

شیطانی اثرات کا توڑ: 376

خود ہی موقع دیں ؛ پھر پریشان ہوں ! 379

شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں : 381

فوائد حدیث : 382

شروع میں نہیں ؛ تو اخیر میں سہی: 384

بسم اللہ کی برکت: 386

دسترخوان اُٹھانے کی دعا: 387

گناہوں کی معافی کی بشارت: 388

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحہ 390

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں : 391

مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ:... 392

بچھو کے ذریعہ جان بچائی: 394

پاخانہ کے کیڑے سے علاج !: 395

یہ کس مرض کی دوا ہے؟:... 396

کھانے کی نعمت ،اور ہمارا طرز عمل: 397

نعمت کی قدردانی کا عجیب واقعہ: 398

جنوں کی خوراک کا نظام: 399

ایک گھونٹ پانی کی قدر:... 400

عبرت انگیز واقعہ :... 401

اکابر کی کڑھن: 403

پسند وناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم: 404

سرکہ بہت اچھا سالن ہے:... 405

سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں : 406

کھانے کی اور بنانے والے کی تعریف : 406

حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ: 408

معترض کا حال مکھی جیسا: 408

اس کا احسان اور ہمارا بخل!: 410

بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے: 410

ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!: 411

باب مَا یقولہ من حضر الطعام وھو صائم اِذَا لَمْ یفطر 413

دعوت قبول کرنا سنت ہے: 414

باب مَایقولہ من دُعِيَ اِلَی طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غیرہ 416

طفیلی کے احکام : 417

جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے: 418

گم راہ طفیلی کا قصہ: 419

دعاء 420

باب الأكل مِمَّا يليه ووعظه وتأديبه من يسيء أكله 422
کھانے کے آداب کی نصیحت: 423
النّهي عن القِرَانِ بين تمرتين ونحوهما إِذَا أكل جماعة إِلاَّ بإذن رفقته 425
ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اہم آداب: 426
مہذب گیر تعلیم: 429
ترقی کا راز: 430
شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ: 432
معاملہ کتنا سنگین ہے: 433
معمولی سی غفلت سے حرام کا ارتکاب: 434
اہلِ یوروپ کے یہاں اصول کی پابندی: 435
علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں: 436
مشترک کاروبار کی بدنظمی: 437
حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل: 438

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصیت نامہ:........................... 438

خلاصۂ روایت:.. 440

کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ کیا کرے؟ 441

الگ الگ کھانے کی نحوست:... 441

برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم 443

کھانے کا ایک اور ادب:.. 443

برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے:.. 444

ٹیک لگا کر کھانے کا ناپسندیدہ ہونا 446

کھانے کے لیے حضور اکرم (ﷺ) کی پسندیدہ بیٹھک:....................... 446

بیٹھک کا اصولی طریقہ:.. 449

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:.. 451

ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟:.. 452

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز:.. 452

کھانے کاایک ادب / تین انگلیوں سے کھانا:........................... 453

چھوٹے چھوٹے لقمے لینا:.. 454

انگلیاں چاٹ لینا: 454

پرانا عیب؛ آج کا فیشن / لطیفہ:................................ 455

فیشن کا حال !:.. 456

آنکھوں دیکھاواقعہ: 457

یہ دل و دماغ میں نوٹ کرلو:.................................... 458

ایک بزرگ کا عمل: 460

پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل:.......................... 460

ایک قصہ:... 461

انگلیاں چاٹنااورچٹوانا: 463

حصولِ مقاصدکانام برکت ہے: 464

حصولِ اسباب اصل نہیں : 466

یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟:.. 468

اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہو تو...:.. 469

لقمہ گر جائے تو اُٹھا لو:.. 469

حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کا اہتمام کرو:.. 471

''وُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّار''کامسئلہ:.. 472

تكثير الأيدي عَلَى الطعام 474

دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا:.. 474

ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں ؟:.. 476

نہایت عبرت آموز واقعہ:.. 477

یہ بات تو دل میں بٹھا ہی لو:.. 478

خلاصۂ کلام:.. 479

باب آدب الشرب.. 480

پینے کے آداب:.. 481

نہیٔ ارشاد اور نہیٔ تحریم: 483

میٹھے پانی کا عجیب وغریب قدرتی نظام: 484

شکر گزار بندہ کی دعائیں: 486

برتن میں سانس نہ لے: 487

اَلْاَیْمَنَ فَالْاَیْمَنَ: 488

ایک مسئلہ: 491

مشکیزہ اور بڑے برتن سے منھ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ: 492

حضور (ﷺ) نے مشکیزہ سے منھ لگا کر پیا: 494

روایتوں میں تطبیق: 496

پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے: 497

کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل: 500

چکی کا پاٹ: 502

زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل: 504

وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہو کر پی سکتے ہیں : 506

کھڑے ہو کر کھانا پینا؟:.. 507

پلانے والا خود اخیر میں پئے: 510

ایک واقعہ :.. 511

ترجمۃ الباب : 513

یہ غلط فہمی نہ رہے:.. 514

پتھر کے برتن کا استعمال:.. 515

پیتل کے برتن کا استعمال: 516

نہر میں منھ ڈال کر پینا: 517

یہ ان کے لیے دنیا میں ؛تمہارے لیے آخرت میں : 518

جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے: 519

فہرست

اداریہ 1

شیطانی دھوکہ 8

...تو برقعہ بھی پہن لیجئے 8

جب خاتون کی ڈاڑھی اُگی: 9

داغ؛ باطن کی خرابی کا اثر 10

اسلامی کٹ میں توسع ہے: 11

لباس کے دو مقصد 11

پہلا مقصد 12

مرد اور عورت کا ستر 12

ستر پوشی میں تین باتوں کی رعایت ضروری: 13

لباس ناقص نہ ہو 13

باریک نہ ہو 14

چست نہ ہو 15

لباس والی ننگی عورتیں 16

ان دروازوں کو بند کرو؛ورنہ... 18

فیشن کیا ہے؟ 19

دوسرا مقصد 19

زنانے مرد اور مردانی عورتیں 20

دو باتوں کا خیال رہے 21

پھر فقیروں کا سا بھیس کیوں ؟ 21

صحابہ اور ہمارے قلب کا حال 22

تشبہ اور مشابہت کا فرق 23

تشبہ کے درجات 24

قومی اور مذہبی شعار میں فرق 25

عام عادات میں تشبہ 25
لا!میں تجھے رنگ دوں 26
باوجود توجہ کے وہ ظلمت دور نہیں ہوئی 27
ایک عبرت ناک واقعہ 28
کوٹ پتلون کا مسئلہ 29
لباس کے اصول 30
ریشم اورآرٹ سلک کا حکم 31
کیااونچاپائجامہ عیب ہے؟ 32
لباس اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے 34
انگریز کے کہنے سے گھٹنے بھی کھول دیئے 34
کیامیری ذات میں نمونہ موجود نہیں ؟ 35
سنت طریقہ اوراس کی قسمیں 35
مسنون لباس کا اصول 36

باب کا عنوان 37

پسندیدہ رنگ کون سا؟ 37

لیکن تو چیزے دیگری 38

حضور اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا سرخ جوڑا پہننا 40

حضور اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا سبز جوڑا پہننا 43

حضور اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کے عمامہ کا رنگ 44

حضور اکرم ((صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ)) کا کفن اور اس کا رنگ 45

حضور اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا (Printed) منقش چادر استعمال کرنا 46

حضور اکرم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا اونی لباس 47

چمڑے کے موزوں پر مسح کا مسئلہ 49

خلاصۂ باب 49

بابِ إِسْتِحْبَابِ الْقَمِيْص 50

جسم ڈھانپنے کی دو شکلیں 51

قمیص سے کیا مراد ہے؟ 52

کرتہ زیادہ پسندیدہ ہے 53

کیا آپ (ﷺ) سے پائجامہ پہننا ثابت ہے؟ 54

باب صفة طُوْلِ القَمِيْصِ وَالْكُمِّ والْإِزَارِ وَطَرْفِ الْعِمَامَةِ 55

و تحريمِ إِسْبَالِ شيءٍ من ذٰلك على سبيْلِ الْخُيَلآءِ، و كراهته مِنْ غيْرِ خُيَلآءٍ 55

لباس کی لمبائی کتنی ہو؟ 56

عربی کرتہ کے شوقین متوجہ ہوں 57

اگر ٹخنے ڈھانکنا تکبر سے نہ ہوتو؟ 58

حضوراکرم (ﷺ) کی آستین کی لمبائی 60

نظرِ رحمت سے محروم 61

وہ... جہنم میں ہے 62

ناکام و نامراد لوگ 63

طعن و تشنیع سے نہ ڈریں 65

فیشن؛ ذہنیت کو مرعوب کرنے کا طریقہ 66

ہر وقت گناہ جاری رہتا ہے 67

لینے کے دینے 68

تیسرا آدمی 68

توحید تو یہ ہے 69

معاشرت کی اہم نصیحتیں 70

تو گفتار؛ وہ کردار 72

نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی مت سمجھنا 73

پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ہی تکبر کی علامت ہے 73

تم ایسا مت کرو 74

ٹخنوں سے نیچے کپڑا لٹکانے والے کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے 75

کوئی ایسی بات کہتے جایئے ! 76

خُرَیم اَسدی اچھے آدمی ہیں اگر... 80

اللہ تعالیٰ برائی کو پسند نہیں کرتے 81
پائجامہ آدھی پنڈلی تک ہونا چاہیے 81
عبداللہ! اپنی لنگی اونچی کرو 82
عورتیں کیا کریں ؟ 83
إستحباب ترك الترفع فی اللباس تواضعاً 84
قیامت کے روز ایمان کا جوڑا ملے گا: 85
إستحباب التوسّط فی اللّبَاس 87
وَلاَ يقْتصر عَلىٰ مَا يزْرى بِهِ لِغَيْرحاجةٍ وَلاَ مقْصودٍ شرْعى 87
نعمت کا اثر بندہ پر دِکھنا چاہیے: 88
باب تحريم لباس الحرير عَلَى الرجال وتحريم جلوسهم عَلَيْهِ 90
واستنادهم إِلَيْهِ وجواز لبسه للنساء 90
جو دنیا میں ریشم پہنے: 91

میری امت کے مَردوں پر یہ دونوں حرام ہیں 92
کسی عذر کی وجہ سے ریشم کا استعمال 94
چیتے کی کھال بچھا کر بیٹھنے کی ممانعت 95
مَا یقول إِذَا لبس ثوباً جدیداً أَوْ نعلاً أَوْ نحوہ 97
نیا لباس پہننے کی دعا 98
ہر نئی چیز استعمال کرنے کی یہی دعا ہے 99
آداب النوم والاضطجاع 100
حضور اکرم (ﷺ) کی تعلیمات عین شفقت و محبت کا تقاضا 101
عجیب و غریب دعا 102
یہ محبت کا تقاضہ ہے 104
...تو جینے کا مزہ آجائے 105
سونے کے آداب ... پہلا ادب 107
دوسرا ادب 107

تیسرا ادب اور خاص تاکید: 108
یہ ایک فطری امر ہے 108
تو دانی حساب کم و بیش را 110
امید و خوف: 111
کہ جز تو پناہے دگر نیستم: 111
ایک بچہ بھی یہ سمجھتا ہے: 112
دعا کے دو سبق؛ رجوع الی اللہ اور یادِ آخرت 113
تہجد کے بعد مسنون آرام کی کیفیت: 114
سونے اور اُٹھنے کی مسنون دعاؤں کا فلسفہ 115
لیٹنے کے چار طریقے 117
بچوں کو بھی اس کا عادی بنایا جائے 118
بغیر ذکر اللہ کی مجلس وبال ہے 119
قدرتی نظام؛ ایک عجیب نعمت 120

جواز الاستلقاء عَلَی القفا ووضع إحدی الرِّجلین عَلَی الأخری إِذَا لم یخف انکشاف العورۃ وجواز القعود متربعاً ومحتبیاً 122

پاؤں پر پاؤں رکھ کر سونا جائز ہے یا نہیں ؟ 124

تطبیق کی ایک شکل 125

شیخ الشیخ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے عالی 126

چہارزانو بیٹھنا 127

گوٹ مار کر بیٹھنا 128

باب فی آداب المجلس والجلیس 132

گنجائش نکال دو 133

پبلک مقامات کا حکم 134

دوسرے کی چپل ہٹا کر اپنی نہ رکھے: 135

ٹرین میں زیادہ جگہ روکنا: 135

اگر کوئی اپنی جگہ ہمارے لیے چھوڑ دے: 136

ایثار بالقُرَب: 137

پہلے بیٹھنے والا زیادہ حق دار ہے: 138

اپنی جگہ رکوانا: 140

بعد میں آنے والا مجلس کے کنارے بیٹھے: 140

لوگوں کو چیر کر آگے نہ بڑھے: 141

دو کے بیچ میں نہ گھسے: 142

حلقہ کے بیچ میں نہ بیٹھے: 143

آرام سے بیٹھیں : 144

کفارۂ مجلس: 145

غفلت کی تلافی: 146

مجلس میں پڑھنے کی دعا: 147

گناہ کیوں ہوتا ہے؟: 148

ٹینشن کی وجہ ؛یقین کی کمی: 149

مرتے دم تک تمام قویٰ سلامت رہیں : 150

دین پر مصیبت نہ آئے: 150

دنیاکی فکر غالب نہ ہو: 151

باعثِ حسرت مجلس: 152

جس مجلس میں ذکر نہ ہو: 152

دست بکار ،دل بیار : 153

دن کے شروع میں اللہ تعالیٰ سے عہد: 154

باب الرؤیا وما یتعلق بھا 156

اچھے خوابوں کی حیثیت: 157

جو زبان کا سچا ؛وہ خواب کا بھی سچا: 157

چھیالیسویں حصہ کا مطلب: 158

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے: 159

خواب شرعی حجت نہیں : 161

کیااچھاخواب دیکھنے کے بعد اعمال چھوڑدے: 161

اچھے خواب کااشتہارنہ دے : 162

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی کیفیت: 163

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر: 164

شیطان اور شیخ جیلان رحمۃ اللہ علیہ : 165

خواب میں حضوراکرم (ﷺ) کی زیارت کے لیے کوئی عمل کرنا: 167

زیارت کابہترین عمل: 168

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت: 169

اگر حضور (ﷺ) کودوسرے حلیہ میں دیکھا: 170

دینداری جانچنے کامعیار : 172

روضۂ اقدس کی زیارت نصیب ہوگی: 173

شیطان کا حضور (ﷺ) کی شکل نہ بناسکنے کی وجہ: 174

اچھایابراخواب دیکھے ؛توکیاکرے؟: 174

براخوب ؟پرواہ نہیں : 176

براخواب دیکھتے ہی آنکھ کھل جائے ؛توکیاکرے؟ : 177

سب سے بڑا بہتان: 178

کتاب السَّلاَم 181

اجازت لیے بغیر داخل نہ ہو: 182

استیذان کب؟اور کب نہیں ؟: 183

کیاتم یہ چاہتے ہو کہ...؟: 184

تب اجازت لیناضروری نہیں : 185

اجازت کیسے لے؟: 187

سب ہی ’’مَیں ‘‘ہیں : 188

جواب ملنے کاانتظار کیجئے: 188

ایسے بھی تھے: 189

گھنٹی(Door Bell)بجانے کاطریقہ: 191

دعالینے کی حرص: 192

ایک عمل، تین دعائیں : 193

سلام ہی جامع ہے: 194

سلام کا جواب اچھے طریقہ سے دو: 195

سلام کا طریقہ نیا نہیں ہے: 197

سلام حقِ اسلام : 198

سلام کی ابتداء: 199

سات چیزوں کا حکم : 200

سلام کا قدرتی اثر: 202

اہلِ معرفت کی دوربینی: 203

باب كيفية السلام.. 206

سلام کے الفاظ کی وضاحت: 207

دس ، بیس ، تیس: 209

جب کوئی سلام کہلائے: 210

جب بڑے مجمع کو سلام کرے: 212

جب نائمین کو سلام کرے: 213

کسی کی نیند خراب کرنا حرام ہے: 214

ہاتھ سے سلام : 215

علیک السلام کہنا: 216

سلام کے کچھ اور آداب : 218

سلام میں کون پہل کرے؟: 220

سلام اور شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ : 221

بار بار سلام کرے: 222

گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کا اہتمام مستحب ہے: 225

آسان قیمتی ہدیہ : 226

بچوں کو سلام کرنا: 227

خاندان کی بوڑھی عورتوں کو سلام کرنا: 229

فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو کسی بھی نامحرم کو سلام کا جواب دینا: 230

کیا غیر مسلموں کو سلام کرسکتے ہیں؟ 232

یا کسی ساتھی سے رخصت ہو؛ تو سلام کرنا چاہیے 236

باب الاستیذان وآدابه 238

جب فاروقِ أعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت أشعری رضی اللہ عنہ سے گواہ طلب کیے: .. 240

گواہ طلب کرنے کی تکوینی وجہ: 243

استیذان کے وقت تاک جھانک نہ کرے: 246

گھس سکتا ہوں، یا آسکتا ہوں: 247

یادگار تنبیہ 248

گھروالے کے پوچھنے پر جواب دینے کا مسنون طریقہ: 251

"مَیں" کہنا؛ صحیح جواب نہیں: 254

إستحباب تشميت العاطس اذا حمد الله تعالیٰ وكراهة تشميته اذا لم يحمد الله تعالیٰ
وبيان آداب التشميت والعطاس والتثاؤب 255
اسبابِ چستی پسندیدہ، اسبابِ سستی ناپسندیدہ: 256
ایک لطیفہ 258
چھینکنے اور جمائی لینے کے آداب 259
استحباب المصافحة عند اللقاء وبشاشة الوجه وتقبيل يد الرجل الصالح، وتقبيل
ولده شفقة ومعانقة القادم من سفر وكراهية الانحناء 263
مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا ہی سنت ہے: 264
مصافحہ کے موجد: 268
مصافحہ، معانقہ، بوسہ؛ کیا کرے، کیا نہیں؟ 269
دست بوسی وقدم بوسی 269
یہ جذبۂ شفقت کا ہی تقاضہ ہے 272

كتابُ عيادةِ الْمَرِيْض، وتشييع الميت،والصلاةعليه، وحضور دفنه، والمكث عند
274 ....

عیادت؛ حقِ مسلم سمجھ کر کریں،رواجِ سماج سمجھ کر نہیں : 275

نیت ٹٹول لیں : 276

بنیادوہی ہو: 277

ہمیں حضورنے حکم دیا...: 278

مسلمان کے مسلمان پرپانچ حقوق: 279

بندہ سے اللہ تعالیٰ کی شکایت: 280

بیمارکی عیادت کے فضائل: 282

دومنٹ میں سترہزارفرشتوں کی بارہ گھنٹوں کے لئے ڈیوٹی: 283

غیر مسلم کی عیادت: 284

پھوڑے پھنسی اورزخم کادم: 286

عیادت کی دعا: 287

نبوی پین کِلَر(Pain Killer): 289

تومریض کوشفاہوہی جائے گی: 290

ایک اور دعا: 291

روح الامین کاالصادق الامین پردَم : 291

تواسے جہنم نہیں کھائے گی: 292

اِدھر تعریف،اُدھر پذیرائی: 294

عیادت :نہ ہو شکایت: 295

اے اللہ!عیادت کاطریقہ سکھلا: 296

دروازہ باہر سے بند کردینا: 297

وفات کے دن صبح حضوراکرم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کی کیفیت : 298

جس کو اندازہ ہوجائے کہ اب میری موت کا وقت قریب آ چکا ہے؛ وہ کیا دعا کرے ؟.. 300

یہ موت مانگنا نہیں ہے: 301

ممانعت تواس کی ہے: 301

موت کی حالت شدت والی ہے: 302

سماج کے ایک غلط مزاج کی اصلاح : 304

حضور اکرم (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کا شدّتِ بخار: 309

صحابی کا اظہارِ مرض: 310

اُم المؤمنین رضی اللہ عنہا کا اظہارِ دردِ سر: 311

جس کی موت کا وقت قریب ہو 313

اس کو ”لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ“ کی تلقین کرنا 313

یہ بھی آداب اور مستحبات میں سے ہے۔ 313

باب ما یقوله بعد تغمیض المیت 315

موت کے وقت اور بعد کیا کرے؟ کیا نہیں ؟ 315

اس دعا کی برکت سے بہت بہتر بدل ملا: 318

بچہ کے انتقال پر صبر کی عظیم فضیلت: 322

ان تعلیمات کو عام کرو: 324

مصیبت کے وقت کا مراقبہ: 326

جو دیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ،اور جو لے گا وہ بھی اللہ ہی کا: 327

ایک عورت کے صبر کا عجیب قصہ: 328

رونے کی وجہ سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے؟: 334

عذاب تو زبان کی وجہ سے ہوتا ہے: 335

ہر انسان کے دل میں جذبۂ رحمت رکھا ہے: 336

غمگین ہونا اور آنسو نکلنا برا نہیں: 337

نمازِ جنازہ اور تدفین میں شریک ہونے کی فضیلت: 342

عورتوں کو قبرستان جانے سے روکا گیا: 345

سو آدمی جنازہ پڑھیں تو مغفرت: 348

چالیس آدمی جنازہ پڑھیں تو مغفرت: 349

جس کے جنازہ میں تین صفیں ہوں: 349

نماز جناہ کی دعائیں: 350

گنہگار کو چین نصیب نہیں ہوتا: 352

دیگر مختلف دعائیں : 353

میت کے قرض کی ادائیگی کا اہتمام 360

وراثت کی تقسیم کے احکام... پہلا حق: 360

بعض غلط رواج: 361

دوسرا حق: 362

دَین اور قرض میں فرق: 365

مقروض کو جنت میں داخلہ نہیں ملتا: 366

مَدیون شہید: 367

رات کا غم، دن کی شرم: 368

تیسرا حق 369

چوتھا حق 369

خلاصۂ کلام 370

مردہ سمجھ کر دفن کردیئے گئے مفسّر: 371

نمازِ جنازہ میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو: 372

مؤمن کی جان اپنے قرضہ میں لٹکی رہتی ہے: 372

مسلمان کی لاش کے لیے مناسب نہیں ہے کہ...: 373

قبر کے پاس وعظ ونصیحت کرنا 375

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سوال: 376

جب دفن کرچکو تو اتنی دیر قبر کے پاس ٹھہرنا: 382

باب الصدقة عن الميت والدعاء لَهُ 385

مفتی صاحب کا ایک آیت کا مطلب سمجھنے کے لیے 387

دیوبند سے گنگوہ کا رات میں پیدل سفر 387

باب ثناء الناس عَلَى الميت 392

روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ 393

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو 394

باب فضل من مات له اولاد صغار 397

جس کے تین بچے انتقال کر جائیں 398

جہاں اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے وہاں سے گزرنے کا طریقہ 404

یہ بڑی خطرناک روش ہے 405

کتاب آداب السفر 407

سفر کی تحقیق 408

بعض سفر ضروری ہیں 409

فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں : 410

طلبِ حلال کے لیے سفر: 411

جان ومال کی حفاظت کے لیے سفر: 411

سفر شرعی ،سفر غیر شرعی: 412

سفر شرعی کی مسافت: 413

قصر ضروری ہے: 414

سفر کے لیے کون سا دن اور وقت مستحب ہے؟: 415
امت کے لیے حضور (ﷺ) کی برکت کی دعا: 417
اکیلے سفر نہ کریں اور امیر مقرر کر لیں 419
اکیلے سفر کا جتنا نقصان مَیں جانتا ہوں 420
لفظ ''قافلہ'' نیک فال ہے: 421
'سَاعَةٌ' اور 'سَلِیْمٌ' بھی نیک فال ہے: 422
سفر کے ساتھی کم از کم تین ہوں : 423
چار، چار سو، چار ہزار اور بارہ ہزار کی فضیلت 424
دورانِ سفر اس بات کا بھی خیال رکھو: 429
دورانِ سفر اہلِ خانہ کو کھلاتے پلاتے چلو: 430
نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو؛ تو کیسے سوئے؟: 432
جب حضور اکرم (ﷺ) کی نماز قضا ہوئی: 433
رات کے وقت فاصلے لپیٹ دیئے جاتے ہیں : 434

قیام قریب کریں: 435
رحمتِ عالم (ﷺ) کی صفتِ رحمت کا ایک نمونہ: 436
نبیِ کریم (ﷺ) کی خدمت میں اونٹ کی فریاد: 438
حضورِ اکرم (ﷺ) کے مشابہ صحابی: 439
منزل پر پہنچتے ہی سواری سے سامان اتار دو: 440
ساتھی کی مدد کرنا 442
سفر میں ہر زائد چیز حاجت مند کو دیدے: 442
دوسروں کا بھی خیال رکھے: 444
امیر ہر رفیق کی فکر کرے: 445
سفر میں جب اپنی سواری پر سوار ہونے لگے؛ 447
تو کیا دعا پڑھے؟ 447
ان دعاؤں کا بھی اہتمام ہو 450
سفر کی دعا پر مغفرت: 451

سفر میں دعا کا مستحب ہونا 459

تین دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں : 460

جب کسی سے خطرہ ہو تو کیا دعا پڑھے: 462

پڑاؤ ڈالنے کی دعائیں : 465

کام جب مکمل ہو جائے تو گھر لوٹنے میں جلدی کرنا چاہیے 468

آدمی کا اپنے گھر دن کے وقت لوٹنا 470

اور بلا ضرورت رات کے وقت لوٹنے کا ناپسندیدہ و مکروہ ہونا 470

رات میں اچانک گھر نہ آئے: 473

بغیر اطلاع کے اچانک گھر پہنچنے کی خرابیاں : 474

جب سفر سے واپس لوٹے اور اپنے شہر کی عمارتوں پر نظر پڑے؛ تو کیا دعا پڑھے؟ 476

سفر سے واپس لوٹے تو پہلے قریب کی مسجد میں جائے، دو رکعات پڑھے 477

عورت کا اکیلے سفر کرنا حرام ہے 478

فہرست کتاب

کلماتِ بابرکات 31

اداریہ 38

کتَاب الفَضَائِل 42

قرآن کریم پڑھنے کی فضیلت 43

یہ محبت کی بات ہے 43

مسائل کا علم فرض ہے، فضائل کا نہیں 46

قرآن قیامت میں شفیع بنے گا 48

تم میں سے بہترین لوگ 49

اس نے قرآن کی ناقدری کی 50

قرآنِ پاک سیکھنے کے بعد کیا؟ 51

ابوعبدالرحمٰن سُلمی (رحمۃ اللہ علیہ) اور خدمتِ قرآن 52

ماہرِ قرآن کو دوہرا اجر.. 53

اٹکنے کی مشقت کا اجر 54

معنوی چیزوں کو محسوس چیزوں سے سمجھو 55

عزت دلانے اور ذلیل کرنے والی کتاب 57

قابلِ رشک آدمی 60

ٹینشن دور کرنے کا نسخہ 61

ہر ہر حرف الگ الگ عمل 63

ویران گھر 65

صاحبِ قرآن کون ہے؟.. 66

ترتیل کسے کہتے ہیں ؟.. 67

قرآنِ پاک کو یاد کرلینے کے بعد اس کو یاد رکھنے کا اہتمام کرنا 71

قرآن اونٹ سے جلدی چھوٹ جاتا ہے.................................. 72

قرآن کریم بھول جانے پر وعیدات.................................. 74

بوقتِ تلاوت یہ مراقبہ کیا جائے.. 78
لحنِ داودی عطا کیے ہوئے صحابی 79
حضور ﷺ کی تلاوت کا منظر 81
قرآن کو اچھی آواز سے پڑھنا چاہیے.. 82
دوسرے سے قرآن سننا 83
قرآنِ پاک کی بعض سورتوں اور آیتوں کے فضائل 86
قرآنِ پاک کی سب سے بڑی سورت.. 86
سلسلۂ چشتیہ کا ایک معمول 88
سورۂ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے 89
سورۂ اخلاص سے محبت جنت میں داخل کرائے گی 91
معوذتین کی فضیلت واہمیت.. 92
سورۂ تبارک کی فضیلت 94
اواخرِ سورۂ بقرہ کی فضیلت 95

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ.. 96

آیۃ الکرسی کی فضیلت 97

آیۃ الکرسی کی فضیلت بیان کرنے والے کا عجیب قصہ 98

دجّالی فتنوں سے حفاظت کا عمل..101

دونوراوردوروشنیاں..102

قرآنِ پاک کی تلاوت کے لئے جمع ہونے کا مستحب ہونا 103

درس وتدریس پر چارانعامات..103

وضو کی فضیلت کابیان 105

اعضاءِ وضوچمک دار ہوں گے..106

اچھی طرح وضوکرنے کی فضیلت..107

حضور ﷺ امتیوں کو قیامت میں کیسے پہچانیں گے؟..111

ناپسندیدہ حالات میں اچھی طرح وضوکرنے کی فضیلت 113

پاکی آدھا ایمان ہے 114

اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں 115

بَابُ فَضلِ الْاَذَانِ 118

اذان کی فضیلت کا بیان... 118

اذان کی ابتدا کیسے ہوئی؟ 119

اذان کا ثواب حاصل کرنے کے واسطے قرعہ اندازی........................ 121

قیامت کے روز مؤذنوں کا اعزاز.. 123

بلند آواز سے اذان دینا پسندیدہ ہے.. 124

اذان سے شیطان بھاگتا ہے 125

دو رکعت تو پوری کرلیتا... 126

میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ مانگو.. 127

اذان کا جواب کیا دیا جائے؟ 128

ایک اشکال اور اس کا جواب 129

حضور اکرم ﷺ کی اُمت سے ایک فرمائش................................... 130

مقامِ وسیلہ،ایک نکتہ..131
اذان کے جواب کی حیثیت کیاہے؟...132
کون شفاعت کامحتاج نہیں ؟ 133
ایک چھوٹاسا عمل؛اورگناہ معاف...134
یہ دربار کھلنے کا وقت ہے...135
بَابُ فَضْلِ الصَّلَوَاتِ 136
نمازوں کی فضیلت کابیان..136
نمازکی تاثیر /ایک عمدہ مثال 137
پانچوں نمازوں کی مثال 138
مثال ایک علمی قوت...139
صحبت ِاہل اللہ کی تاثیر/ایک واقعہ..140
نبیٔ کریم ﷺ کے پڑوس میں دفن ہونے کی درخواست..................142
خلاصہ ٔ کلام..144

نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں.................................145

حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا حال.................................146

پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام کفارۂ ذنوب.................................147

بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الصُّبْحِ والعَصْرِ.................................150

فجر اور عصر کی نماز کی فضیلت کا بیان.................................150

فجر اور عصر کی نماز کی فضیلت کا بیان.................................151

فجر پڑھنے والا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں.................................152

فجر اور عصر میں فرشتوں کی حاضری.................................153

دیدارِ باری تعالیٰ کی کیفیت و منظر.................................155

مسجدوں کی طرف چل کر جانے کی فضیلت کا بیان.................................157

اسلام میں مساجد کی اہمیت.................................157

مسجد جانے والے کا عند اللہ اکرام.................................158

گھر سے باوضو مسجد جانے کی فضیلت.................................159

مسجد سے دور گھر والے کے لیے خوشخبری 160

دورِ نبوی کا واقعہ 162

انفرادی تقاضہ پر اجتماعی مصلحت کو ترجیح 164

زیادہ ثواب پانے والے نمازی 165

نورِ کامل کی بشارت 166

کفارۂ سیئات ورفعِ درجات کے تین اعمال 167

اُس کے صاحبِ ایمان ہونے کی گواہی دو 169

نماز کے انتظار کی فضیلت 170

آدمی نماز ہی میں شمار ہوتا ہے 171

فرشتوں کی دعائے رحمت 171

نماز کے انتظار میں جو وقت گزرا 172

بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ 174

باجماعت نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان 174

باجماعت نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان 175
جماعت کی اہمیت اسلاف کی نظر میں 176
... پھر تو مسجد میں آؤ 180
ائمہ کی نظر میں جماعت کی اہمیت 182
جس کو یہ پسند ہو کہ قیامت میں ... .183
شریعت کی نگاہوں میں فرائض کی اہمیت..185
باجماعت نماز کا اہتمام شیطان سے حفاظت کا ذریعہ 186
بَابُ الْحَثِّ عَلٰی حُضُوْرِ الْجَمَاعَةِ فِیْ الصُّبْحِ وَالْعِشَاءِ..188
فجر اور عشاء کی جماعت میں حاضری کی ترغیب..188
فجر اور عشاء کی جماعت میں حاضری کی ترغیب..189
فجر اور عشاء منافقین پر بڑی شاق ہے..190
بَابُ الْأَمْرِ بِالْمُحَافَظَةِ عَلَى الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوْبَاتِ وَالنَّهْيِ الأَكِيْدِ وَالْوَعِيْدِ الشَّدِيْدِ فِيْ تَرْكِهِنَّ.........192
پنج وقتہ فرض نمازوں کی پابندی کی تاکید..192

اور ان کو چھوڑنے پر سخت وعید...192
پنج وقتہ فرض نمازوں کی پابندی کی تاکید اور چھوڑنے پر سخت وعید 193
سب سے افضل عمل کون سا؟..194
نبی کریم ﷺ کی حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) کو نصیحتیں 196
ترکِ نماز؛شرک وکفر تک پہنچنے کا سبب 197
تارکِ نماز کے متعلق صحابہ اور علماء کے نظریے 199
نوافل بھی بہت کارآمدہیں 200
بَابُ فَضْلِ الصَّفِّ الْاَوَّلِ وَالْاَمْرِ بِاِتْمَامِ الصُّفُوْفِ الْاُوَلِ وَتَسْوِيَتِهَا وَالتَّرَاصِّ فِيْهَا 203
پہلی صف کی فضیلت اوراگلی صفوں کو مکمل ودرست کرنا..............................203
اس میں خالی جگہ نہ چھوڑنا 203
اگلی صفوں کو مکمل کرنا اوراس میں خالی جگہ نہ چھوڑنا..............................204
اذان دینے اورپہلی صف کی فضیلت..204
بہترین صف کون سی؟ 205

جو پیچھے رہے گا؛اس کو پیچھے ہی رکھا جائے گا..................................206

صفوں کی عدمِ درستگی کا دنیوی نقصان 208

صفوں کی درستگی تکمیلِ نماز کا حصہ..................................209

صفیں درست کرو؛ورنہ... 210

اللہ تعالیٰ اوراس کے فرشتے اگلی صف والوں پر رحمت بھیجتے ہیں 212

بڑا وعدہ اور سخت وعید..................................213

شیطان صف کی درمیانی خالی جگہ میں گھس جاتا ہے..................................214

صفوں کی ترتیب..................................215

دائیں جانب کی صف والوں پر اللہ اوراس کے فرشتوں کی رحمت 217

سلام کے بعد امام صاحب کس طرف رخ کریں ؟ 218

یہ محبت کی بات ہے 219

امام کو بیچ میں رکھو،اور خالی جگہ پُر کرو 220

سننِ موکدہ کی تعداداوراس کی فضیلت 222

روزانہ بارہ رکعات سنتِ موکدہ پڑھنے پر جنت کا مکان 223

اذان واقامت کے درمیان سنتیں 225

فجر کی دوسنتوں کی تاکید 226

حضورِاکرم ﷺ کافجر کی سنتوں کااہتمام / ایک واقعہ 227

فجر کی دوسنتیں مختصر اورہلکی پڑھی جائیں 230

اس میں قراءت کیا ہو؟اس کا وقت کیاہے؟ 230

صبحِ صادق تا طلوعِ آفتاب صرف دو سنتیں اور دو فرض............................ 231

فجر کی دوسنتیں اوّل وقت پڑھناپسندیدہ ہے 233

فجر کی سنتوں کی مسنون قراءت... 234

اِسْتِحْبَابِ الْاِضْطِجَاعِ بَعْدَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ عَلٰى جَنْبِهِ الْاَيْمَنِ وَالْحَثُّ عَلَيْهِ سَوَاءٌ كَانَ تَهَجَّدَ بِاللَّيْلِ اَمْ لَا 236

فجر کی دوسنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹنے کا مستحب و پسندیدہ ہونااور اس کی ترغیب؛

چاہے رات کوتہجد پڑھی ہویا نہ پڑھی ہو 236

دوسنتوں کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹنے کا مستحب و پسندیدہ ہونا........................ 237

ظہر کی سنتوں کا بیان 242

ظہر سے پہلے اور بعد کی سنتوں کی پابندی پر فضیلت 244

اس وقت بھی آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں 245

ظہر سے پہلے کی سنتیں چھوٹ جائیں تو! 246

عصر کی سنتوں کا بیان 247

مغرب کے بعد اور پہلے کی سنتوں کا بیان 249

مغرب کی فرض سے پہلے دو رکعت سنت ہے یا نہیں ؟ 251

اصولِ فقہ کا ایک قاعدہ 252

عشاء کی نماز کے بعد اور اس سے پہلے کی سنتیں 256

جمعہ کی سنتوں کا بیان 257

نفل نمازوں کا گھر میں پڑھنا اور 259

فرض و نوافل کی جگہوں کو بدلنا 259

گھروں کو قبرستان مت بناؤ 261

گھر کی مسجد ہونی چاہیے 262

نیا گھر بنانے والے متوجہ ہوں 263

ہر آدمی یہ دو باتیں نوٹ کرلے 264

صحابی کا اہتمام / ایک واقعہ 264

فرض کے بعد سنت یا نفل اس جگہ سے ہٹ کر پڑھنی چاہیے 266

وتر کی نماز کی ترغیب، 269

وتر سنّتِ موکدہ ہے اور اس کے وقت کا بیان 269

وتر کے متعلق آپ ﷺ کا معمول 272

وتر کے متعلق آپ ﷺ کی تاکید 274

چاشت کی نماز کی فضیلت۔ اور اس کی پابندی کی ترغیب 277

محبوب کی تین وصیتیں 278

ہر جوڑ کی طرف سے صدقہ 279

چاشت کی کتنی رکعتیں ہیں ؟ 280

چاشت کے وقت کی تفصیل 282

اصلی صلاۃ الاوّابین 284

تحیۃ المسجد کی ترغیب اور، اس کے پڑھنے سے پہلے بیٹھنا ناپسندیدہ ہے ، 287

لاج رہ جائے 287

اس چیز کی طرف توجہ دی جائے 289

بَابُ اِسۡتِحۡبَابِ رَکۡعَتَیۡنِ بَعۡدَ الۡوُضُوءِ 290

وضو کے بعد دو رکعت مستحب ہے 290

وضو کے بعد دو رکعت مستحب ہے 291

ایک قابلِ اُمید عمل 291

یوم جمعہ کی فضیلت ،جمعہ کی نماز کا فرض اور ضروری ہونا، جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے غسل کرنا، خوشبو کا استعمال کرنا،جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد جلدی پہنچنا، جمعہ کے دن دعاؤں کا اہتمام کرنا ، نبیٔ کریم ﷺ پر درود شریف کا اہتمام،ساعتِ اجابت کا بیان،جمعہ کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ

کا کثرت سے ذکر کرنا یوم جمعہ کی فضیلت ،جمعہ کے دن دعاؤں کا اہتمام ،نبیٔ کریم ﷺ پر درود
شریف کا اہتمام،اورساعتِ اجابت کا بیان، 293

سب سے بہترین دن 295

جمعہ کے اہتمام پر دس دنوں کے گناہ معاف 296

جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں ،ورنہ 298

جمعہ کے غسل کا حکم..................................299

جمعہ کے غسل کاوقت..................................300

جمعہ کی سنتیں اور آداب 301

جمعہ کی تیاری اوراہتمام جمعرات سے کرنی چاہیے 303

ایسے بھی تھے 303

جمعہ کے لیے مسجد پہنچنے کے پانچ درجے 304

قابلِ اصلاح طرزِ عمل 306

جمعہ کے دن ایک گھڑی 307

جمعہ کے دن کثرت سے درود بھیجا کرو.................................309

سورۂ کہف کا بھی اہتمام ہو.................................310

اگر کوئی نعمت حاصل ہوئی یا کوئی مصیبت ٹل گئی ،.................................311

تو اس پر سجدۂ شکر پسندیدہ اور مستحب ہے.................................311

تہجد کی نماز کی فضیلت.................................315

”مقامِ محمود“ پر فائز فرمائیں گے.................................317

جب سے مجھے آدھی رات کی سلطنت ملی.................................321

ہماری بدبختی.................................323

حضرت مولانا الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا مقولہ.................................324

شریف کی شرافت کا تقاضہ یہ نہیں ….................................325

تم دونوں کیوں سوگئے ؟.................................326

عبداللہ بڑے اچھے آدمی ہیں ؛اگر رات کو نماز پڑھتے.................................328

اے عبداللہ !فلاں جیسا مت بنیو.................................329

تہجد کے اہتمام کے لئے شرائط 330

واردِ روحانی غیرت مند مہمان ہے.. 332

اس کے کان میں شیطان پیشاب کر دیتا ہے.. 334

شیطان کا منتر؛اور اس کا توڑ 335

حضراتِ انبیاء؛روحانی معالج 337

جنت میں لے جانے والے تین اعمال 337

افضل ترین نماز 338

تہجد دو دو رکعتیں ،اور اخیر میں وتر 339

حضور اکرم ﷺ کی رات کی نماز کی کیفیت 340

اُن کا حُسن !مت پوچھو.. 341

رات کی عبادت کی مختلف شکلیں 343

نفس سے بہلا پھسلا کر کام لو 345

ایک اور طریقہ 345

مَیں نے ایک بری حرکت کاارادہ کرلیا.................................346

حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) کا تجربہ...347

سب سے افضل نماز...349

صلوٰۃ وصومِ داؤدی...349

ہررات میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے.................................350

پہلی دورکعت ہلکی پڑھنی چاہیے.......................................351

اگرکسی کی تہجد فوت ہوگئ تو...352

اللہ تعالیٰ رحم کرے...354

ذاکرین اور ذاکرات میں شمار...355

جب نیندکاغلبہ ہوجائے...355

قیامِ رمضان یعنی تراویح مستحب ہے...................................357

ماہِ رمضان المبارک کی اہمیت...357

مراتبِ قرب کی کچھ منزلیں...359

ایمان ویقین کی قوت کے ساتھ قیام..................................360

اتنی بے توجہی اور بے رغبتی!....................................363

لیلۃ القدر میں عبادت کی فضیلت 364

اور کون سی رات کے متعلق شب ِقدر ہونے کی زیادہ امید ہے......................364

جو آدمی شب ِقدر کو تلاش کرنا چاہے 367

رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو....................................368

شب ِقدر دو ہوتی ہیں 370

ہمارے معاشرہ کی عام وبا 373

اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے....................................375

حضور اکرم ﷺ کا طرزِ عمل....................................376

شب ِقدر کی خاص دعا....................................376

مسواک کے فضائل اور فطرت کی باتیں 379

کن کن مواقع پر مسواک کی جائے؟ 380

مسواک وضو کی سنت ہے یا نماز کی؟.................................380

وضو میں مسواک کب کی جائے ؟ 381

مسواک کون سے درخت کی ہونی چاہیے؟ 382

مسواک کی مقدار کتنی ہونی چاہئے ؟.................................382

استعمال کا طریقہ کیا ہے؟.................................382

اگر امّت کے مشقّت میں پڑنے کا ڈر نہ ہوتا.................................384

حضور ﷺ کا نیند سے بیدار ہوتے وقت کا معمول.................................385

گھر میں داخل ہوتے وقت کا معمول.................................387

زبان پر بھی مسواک پھیرے 388

منہ کی صفائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ 389

پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں 389

ناخن کاٹنے کی ترتیب.................................391

بغل کے بال اُکھاڑنا 391

مونچھو ں کاکتروانا...392

دس چیزیں انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی سنّت ہیں 393

مونچھیں صاف کرو ،ڈاڑھی بڑھاؤ 395

میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے 396

زکوٰۃ کے واجب ہونے کامؤکد اورپختہ ہونا..............................398

زکوٰۃ کے بنیادی مسائل 399

تولہ کے سلسلہ میں ایک ضروری وضاحت 400

خلاصۂ کلام..401

سوناچاندی اورروپیہ کانصاب 402

تجارت اور بیوپارکاسامان..402

ایک غلط فہمی کی وضاحت 403

زکوٰۃ دراصل امتحان 405

گاہک کے دل میں داعیہ پیدا کرنے والا کون ؟..............................406

مدار اگر عقل پر ہوتا تو... / ایک واقعہ 407

عبادات کا فلسفہ 409

فقیر کا ویسا احترام کیوں نہیں ؟ 410

زکوٰۃ کے اسلامی نظام کا فائدہ 411

زکوٰۃ پر وعدے 411

صاحبِ نصاب کی چند ذمہ داریاں 412

اسلامی فاؤنڈیشن 414

اگر اپنی بات میں سچا ہے تو کامیاب ہے 414

مالداروں سے لے کر فقیروں کو دی جائے 416

وہ چیزیں جن پر جان ومال کی حفاظت کو موقوف رکھا گیا 417

نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرنے والے سے جنگ 420

اسلامی شعائر کے معاملہ میں کوتاہی کرنے پر حاکم کو یہ حق پہنچتا ہے 422

جنت میں لے جانے والے پانچ اعمال 423

چلتا پھرتا جنتی..423

زکوٰۃ ادانہ کرنے پر وعید..425

رمضان کے روزوں کا فرض ہونا، روزوں کی فضیلت اوراس سے متعلق دوسری چیزوں کا بیان
....432

ایک حدیثِ قدسی..444

ایک نومسلم کے ایمان لانے کا قصہ..............................445

شیطان کے حملوں سے حفاظت کی تدابیر.........................447

بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک نمونہ...................448

روزہ دار کوجنت میں باب الرّیّان سے بلایا جائے گا..................449

روزہ داروں کے فضائل..451

رمضان کے مہینہ میں نیکی کے کام اورسخاوت کی کثرت ہونی چاہیے۔..................453

خاص طورپر رمضان کے آخری عشرہ میں اورزیادہ ترقی ہونی چاہیے..................453

حضوراکرم ﷺ کی سخاوت کے نمونے.................................454

آپ ﷺ کے پرنواسے کے متعلق شاعر کی گواہی 455

نبیٔ کریم ﷺ کا ہر رمضان کا معمول 456

حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے آپ ﷺ کی سرگوشی 457

روایت کا سبق 458

اس سے بڑی حماقت کیا ہوگی؟ 459

نصف شعبان کے بعد رمضان سے پہلے روزے رکھنے کا ناپسندیدہ ہونا..461

عنوان کا خلاصہ 461

شریعت کے حدود کی رعایت ضروری ہے..462

اپنی مرضی پر چلنے کا نام عبادت نہیں 464

یوم الشک کے روزہ کا بیان..465

چاند دیکھ کر کیا پڑھنا چاہیے؟ 467

سحری کی فضیلت۔..469

جب تک کہ صبحِ صادق کے طلوع ہوجانے کاڈر نہ ہو وہاں تک سحری کو مؤخر کرنا۔ 469

برکت والا کھانا۔.. 469

ہمارے اوراہلِ کتاب کے روزہ میں فرق 472

لوگ بھلائی میں رہیں گے 473

شریعت میں دخل اندازی نہ کریں 474

یہ غلو ہے 475

چارپانچ منٹ احتیاط کی جائے 476

مسجد کی گھڑی ریڈیو ٹائم پر رکھیے 477

تقویم کے استعمال کاطریقہ 478

لطیفہ 479

ڈیڑھ دن کاروزہ میرے بس کا نہیں 480

عنداللہ محبوب بندہ 481

اب افطار کاوقت آگیا.. 482

ستوبنانے کی ترکیب(**RECIPE**).. 483

کھجور پانی سے افطار کی حکمت 484

رطب ، تمر، پانی.. 485

روزہ دار کو چاہیے کہ اپنی زبان اور دیگر تمام اعضاء کو آپس کے جھگڑوں اور گالی گلوچ وغیرہ سے محفوظ رکھے 487

روزہ کے آداب 487

بھول سے کھاپی لے تو؟ 490

بحالتِ روزہ کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کا طریقہ.............................. 491

بحالتِ جنابت روزہ شروع کرنا 492

محرم ،شعبان اوراشہر حرم کے روزوں کی فضیلت 494

ایک صحابی کے روزہ رکھنے کی ترتیب 495

ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں روزہ اور دوسرے اعمال کی فضیلت.................. 497

یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ اور محرم کی نویں اوردسویں تاریخ کے روزہ کی فضیلت 499

دسویں محرم کے روزہ کے ساتھ ایک روزہ ملانے کا حکم 501

شوّال کے چھ دن کے روزوں کا مستحب ہونا 503

پیر اور جمعرات کے روزوں کا مستحب ہونا 504

ہر مہینے میں تین روزوں کی فضیلت اور اس کا مستحب ہونا 507

روزہ دار کو افطار کرانے کی کی فضیلت اور کھلانے والے کو دعا کا طریقہ.................. 511

اعتکاف کا بیان.. 514

حضور اکرم ﷺ کا معمول 515

کتَاب الحَجّ 517

فضائلِ حج 518

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے 519

ایک اشکال اور اس کا جواب 520

زیادہ کھود کرید میں مت پڑو.. 521

بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت ہے 523

حجِ مبرور 524

حج میں قصداً جنایت کرنا..525
گناہوں سے پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے..526
حجِ مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ کچھ نہیں 527
عورتوں کے لیے بہترین جہاد...528
عرفہ کے دن جہنم سے آزادی کا پروانہ..528
رمضان کے عمرہ کی فضیلت...529
کیابار بار حج عمرے کرناغلط ہے؟ 530
حجِ بدل کی اجازت..532
بچوں کو بھی حج کے لیے لے جاسکتے ہیں 534
حضورِ اکرم ﷺ کی بوقتِ حج ایک ہی سواری 536
اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے 537

فہرست کتاب

اداریہ..35

کتَاب الجِھَاد 43

جہاد کا معنٰی اوراس کی قسمیں 45

پہلی قسم اوراس کے چار درجات ہیں 46

پہلا درجہ 46

دوسرادرجہ 48

تیسرادرجہ..49

چوتھادرجہ 49

دوسری قسم اوراس کے دودرجے....................................50

تیسری قسم اوراس کے چار مراتب ہیں...............................51

چوتھی قسم اوراس کے تین طریقے 52

قتال؛ مجبوری کا علاج ہے..........53
...اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہو..........54
قتال اور جہاد کے لئے نکلو..........55
یہی بڑی کامیابی ہے..........55
یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے..........56
عذاب سے بچانے والا کاروبار..........57
کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟..........59
اللہ کے راستے میں ایک صبح یا شام..........60
لوگوں میں بہتر کون ؟..........62
اللہ کے راستہ میں ایک دن پہرہ دینے کے فضائل..........63
پہرہ دینے پر اتنا بڑا اجر کیوں ؟..........64
جو عمل قیامت تک جاری رہے گا..........65

ایک دن کا عمل ہزار دنوں سے بڑھ کر..67
جہاداور شہادت کی اہمیت..67
رنگ خون کا؛خوشبو مشک کی..71
اپنے گھر کی ستر سال کی عبادت سے افضل ہے..73
جہاد کے برابر کوئی عمل نہیں..75
تلواروں کے سایہ میں..77
مجاہد کے لیے جنت کے سو درجے..78
تلواروں کی چھاؤں میں..80
جس نے اللہ کے راستہ کی دھول برداشت کی..81
دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی..82
بے جہاد مجاہد..83
بہترین صدقات..84

مجاہد کو اپنا سامان دیدینے کی فضیلت....................................85
مجاہد کے ثواب میں شرکت کی عمدہ ترتیب 87
عمل تھوڑا؛اجر بڑا....................................88
شہید ہی دنیامیں آنے کی تمنا کرے گا 89
شہید کے سب گناہ معاف ؛ سوائے....................................90
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی....................................93
دوعالم سے بیگانہ کرتی ہے دِل کو 94
جنہیں تونے بخشا ہے ذوقِ خدائی 96
یہ غازی یہ تیرے پُراَسرار بندے 98
غزوۂ احد؛ایک منظر 101
جنت کی خوشبو....................................103
جنت کی سیر؛چند مناظر....................................104

شہید کے لیے جنت الفردوس.................................107

فرشتوں کے پروں کے سائے میں 108

اگر صفیہ کا خیال نہ ہوتا 109

مثلہ دشمن کا بھی حرام ہے.....................................110

بستر پر شہادت 111

نیت عمل سے بہتر ہے 112

یا اللہ! پھر کبھی 113

عشقِ الٰہی کا کُلوروفارم 114

جنگ کے موقعہ پر آپ ﷺ کا ایک بیان ودعا.........................115

دو دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں.................................117

قتال کے موقعہ کی مسنون دعا...............................118

خوف کے وقت پڑھنے کی مسنون دعا 119

تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے..120
گھوڑوں کی پیشانیوں میں بھلائی 121
انمول بول وبراز 122
اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کم سے کم ثواب 123
سن لو! قوت تیر اندازی ہے 124
کوئی بھی اس سے عاجز نہ رہے 125
وہ ہم میں سے نہیں 125
جس نے تیر اندازی سیکھنے کے بعد غفلت کی.............................126
اے بنواسماعیل! تیر اندازی کرتے رہو 127
اللہ کے راستہ میں تیر چلانے کی فضیلت...................................128
جواللہ کے راستہ میں خرچ کرے 129
اللہ کے راستہ میں نفلی روزہ کی فضیلت 129

جس کے دل میں جہاد کی تمنا بھی پیدا نہ ہو 131

مجاہدِ بے جہاد 131

اللہ کے راستہ میں کون ؟...................................... 132

جس کو اعمال کا دنیامیں کچھ معاوضہ نہ ملا 133

میری اُمت کی سیر و تفریح 135

واپس لوٹنا جہاد میں جانے جیسا ہی ہے.................................... 136

واپس آنے والوں کا استقبال کرنا چاہیے 136

جہاد میں کسی نہ کسی طریقہ پر حصہ لیناضروری ہے.............................. 137

جہاد تینوں طریقوں سے ہو تا ہے.. 138

قتال کا مناسب وقت 139

تمنامت کرو،ہو جائے تو جم جاؤ.. 140

لڑائی تو ایک چال ہے 141

شہیدوں کی فضیلت اوراحکام 142

شہید کی دو قسمیں ہیں...142

شہید پانچ ہیں 144

جو مال کی حفاظت میں قتل کردیا جائے 147

کچھ اور شہید بھی...148

غلام کو آزاد کرنے کی فضیلت..151

ہم اس سے دھوکہ کھائیں گے 151

دشوار گزار گھاٹی 152

جہنم سے خلاصی کا پروانہ 153

کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟......................................154

غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی فضیلت 155

باب کا عنوان 155

رنگ و نسل کی بنیاد پر عار دلانا.......................................157

کرامت و شرافت کا معیار.......................................159

حضراتِ صحابہ کی خاص شان 161

روایت کا سبق 163

مروت کی تعلیم.......................................164

اللہ تعالیٰ اوراپنے آقا کا حق ادا کرنے والے غلام کی فضیلت 167

ایسے غلام کو دوہرا (ڈبل) ثواب ملے گا 168

تومَیں غلامی کی موت کو ترجیح دیتا 169

ڈبل ثواب پانے والے.......................................170

جیسی محنت ؛ویسی برکت.......................................172

باب فضل العبادة في الهرج وهو الاختلاط والفتن ونحوها 175

فتنوں اورحالات کے زمانہ میں عبادت کرنے کی فضیلت 175

ناموافق حالات میں معمولات کا اہتمام 176

فتنوں کے زمانہ میں عبادت کی فضیلت 177

علاج ہی ہم چھوڑ دیتے ہیں 178

یہی استقامت ہے 180

اس بیان میں کیا ہے؟ 182

ہمارے معاشرہ کی ایک بڑی کوتاہی 184

حضرت نواب صاحب کی دعوت 185

قرض اور دَین میں فرق 187

تنگ دست کو مہلت دیجئے 188

یہ بھی یاد رکھئے 189

ایک قدم آگے 189

یہ بڑی خطرناک چیز ہے 190

ہلاکت ہو ان لوگوں کے لئے..................................... 191

یہ بھی ڈنڈی مارنا ہی ہے... 192

تم میں بہتر آدمی وہ ہے 193

اللہ تعالیٰ رحم کرے اس آدمی پر 194

قیامت کی تکلیفوں سے نجات 195

ہم بھی تجھے چھوڑ دیتے ہیں 196

تاجر کیسے نجات حاصل کرے؟.................................. 198

عرش کا سایہ ایسے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے 200

کچھ جھکتا ہوا دیجیے 201

جھکتا ہوا تولو 202

میرے علم میں زیادتی فرما... 205

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد................................ 206

جاننے والوں کی ذمہ داری زیادہ ہے......................................206
جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ ہوتا ہے......................................208
حسد جائز نہیں ؛ مگر دو باتوں میں......................................208
حسد اور غبطہ کا مطلب......................................209
رشک کی چیز صرف مال نہیں......................................210
...صرف علم بھی نہیں......................................211
ہدایت وعلم سے فائدہ اُٹھانے والے......................................211
ایک آدمی کی ہدایت کا ذریعہ بن جاؤ......................................214
غزوۂ خیبر کا کچھ حال......................................215
دین کی ایک بات بھی دوسروں تک پہنچاؤ......................................217
اسرائیلیات بیان کرنے کا حکم......................................218
وہ اپنا ٹھکانا جہنم کے اندر بنالے......................................222

حدیث نقل کرنے کے معاملہ میں صحابہ کا حال 222

روایت بالمعنیٰ کا حکم.. 223

جنّت کا راستہ 224

اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ... 225

صدقہٌ جاریہ.. 226

نفع بخش علم.. 227

نیک اولاد 228

دنیا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے ؛سوائے 228

علم کی اہمیت اور فضیلت 230

وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے 231

مؤمن تھوڑی خیر سے مطمئن نہیں ہوتا 232

جیسے میری فضیلت تم پر 233

ہر مخلوق دعا کرتی ہے 234

فرشتے پَرَ بچھاتے ہیں 235

اس وجہ سے نبیوں کاوارث کہا گیا 236

اللہ تعالیٰ اس کو ترو تازہ اور خوش حال رکھے- 237

حدیث پڑھنے پڑھانے کی سب سے بڑی فضیلت 237

کبھی ایسا ہوتا ہے.. 238

آگ کی لگام پہنائی جائے گی 238

غیر ضروری سوالات کاجواب نہ دیاجائے 239

دوسرا رُخ 240

جنّت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا 241

علم اُٹھائے جانے کی شکل 243

صرف مطالعہ کافی نہیں 244

حاصلِ کلام...246
اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اور اس کے شکر کا بیان 248
مَیں تمہیں یاد کروں گا 249
شکر کا مراقبہ 250
یہی شکر کی حقیقت ہے...251
فرماں برداری نصیب ہوگی 252
"مقامِ شکر" کی تین شرطیں 253
بس! ذرا سا بخار ہوگیا ہے 254
قابلِ اصلاح کیفیت...255
حکمت کی بات...255
کہو: الحمدللہ 257
تعریف اور شکر؛ دونوں ہونا چاہیے 258

...تواُمت گمراہ ہوجاتی 259

...تووہ اَدھورارہتاہے.. 260

بیت الحمد 260

اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں 261

نبیٔ کریم ﷺ کا مقام و مرتبہ 263

ایک درود ؛دس رحمتیں 264

مجھ سے سب سے زیادہ قریب.. 265

تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے.. 266

اس کی ناک غبار آلود ہو 267

میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ 267

میں سلام کاجواب دیتاہوں.. 268

بخیل ہے وہ آدمی.. 269

اس نے جلد بازی کی 270
ہر عمل میں قبول اور رَد کا احتمال ہے؛ سوائے درود شریف کے 272
درود کس طرح بھیجیں ؟.. 273
درودِ ابراہیم کی تعلیم 275
درود شریف بہت ہی بابرکت عمل ہے.. 279
پریشانی ومصیبت سے نجات کا عمل 280
جس نے جو کچھ بھی پایا درود شریف کی کثرت ہی سے پایا........................ 281
خواب میں زیارت کا وظیفہ !.. 283
اکابر کا صلوٰۃ و سلام پیش کرنے کا معمول.. 284
میری طرف سے لوگوں کو بتلادو.. 285
مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہی لوگ ہیں 285
سب سے بڑی سعادت کی بات.. 286

ذکر کی فضیلت اور اس کی ترغیب.................................287

اللہ کا ذکرہی کائنات کی روح ہے.................................288

ہنوز نامِ تو گفتن.................................289

اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں.................................290

جن کا اوڑھنا بچھونا اور غذا ہی اللہ تعالیٰ کی یاد تھی.................................292

ذکراللہ کی حلاوت و لذت.................................293

اللہ تعالیٰ کی ہر" اطاعت "ذکر ہے.................................294

سب سے محبوب کلمات.................................296

چوتھا کلمہ شیطان سے حفاظت کا ذریعہ.................................296

چار عرب غلام آزاد کرنے کا ثواب.................................298

اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کلام.................................299

سبحان اللہ، الحمدللہ زمین و آسمان کے بیچ کے حصہ کو بھر دیتے ہیں.................................300

آدھا ایمان کیوں ؟ 300

مجھے کوئی کلام سکھلا دیجئے 302

نماز سے فارغ ہوکر پڑھے جانے والے مختلف کلمات 303

مختلف تعداد کی وجہ 308

تسبیحاتِ فاطمی 309

کبھی نقصان میں نہیں رہے گا 310

چندبری خصلتوں سے پناہ 311

حدیث مسلسل بالمحبة 313

قعدۂ اخیر میں پڑھی جانے والی مختلف دعائیں 314

رکوع اور سجدہ پڑھنے کے مختلف کلمات 316

ہر دن ہزار نیکیاں 320

ہر جوڑ پر روزانہ ایک صدقہ 321

چار کلمات تین تین مرتبہ 322

ذکر کرنے والا زندہ ،نہ کرنے والا مردہ 324

گمان کے مطابق معاملہ 325

شیطان دھوکہ نہ دے 326

کامیابی ہو ہی جائے گی 327

فرشتوں کا مجمع بہتر کیوں ؟ 328

اگر کوئی چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے یاد کرے 329

اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی کی علامت 329

مفَرِّدُوْن سبقت لے گئے 330

تمام اذکار میں سب سے افضل 331

زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تر و تازہ رہے 331

ذکر پر مداومت سے مقصدِ عبادت حاصل ہوتا ہے 332

جنّت میں کھجور کا ایک درخت 333

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتِ محمدیہ کو پیغام 334

اعمال میں بنیاد ذکر اللہ ہی ہے 336

تسبیح، تحمید و تکبیر کی کثرت کا آسان طریقہ 337

جنّت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ 338

بندوں کی خِلقت کا مقصد 342

ذکر اللہ کے لیے کوئی قید نہیں 343

شیطان بچہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا 344

شیطان کی محنت کا میدان آدمی کا دل ہے 345

سوتے اور بیدار ہوتے وقت کیا پڑھے؟ 348

مسنون دعائیں ہی اللہ تعالیٰ سے جُڑنے کا آسان طریقہ ہے 348

ذکر کے حلقوں کی فضیلت 351

اجتماعی طور پر اللہ کی یاد..........351
ذکر کے حلقوں کے متلاشی فرشتے اوران کی کارگزاری..........352
یہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا..........356
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے..........359
تین آدمیوں کا عمل اور اس پر فیصلہ..........360
بڑی سعادت..........361
صبح اور شام اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرنا..........365
ذکر کے چند طریقے..........366
اللہ کا پاک نام کتنی ہی غفلت سے لیا جائے؛اثر رکھتا ہے..........367
ذکرِ جہری درمیانی آواز سے ہی بتایا جاتا ہے..........369
غافلوں میں سے نہ بنو..........370
مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے..........371

حالات سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے.......................................373
ہر چیز اللہ کی یاد میں لگی ہوئی ہے.......................................374
اجتماعی ذکر کا ثبوت.......................................375
کوئی اس سے اچھا عمل لے کر نہیں آئے گا.......................................375
پوری رات حفاظت کی جائے گی.......................................376
یقین میں مضبوطی پیدا کرنے والی دعائیں.......................................377
ہر چیز کے شر سے محفوظ رہنے کے نسخے.......................................380
کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی.......................................382
افسوس ! ہم نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور.......................................383
صبح سونے کا مزاج؛ بڑی مصیبت.......................................385
بیعت ہونے والوں کو خاص طور سے کہتا ہوں.......................................386
سوتے وقت کے مسنون اذکار.......................................387

حقیقی عقل مند..........387

سوتے وقت کی دعا..........388

سوتے وقت کا عمل..........389

سونے کی ایک اور دعا..........391

کیا یہ قابلِ اعتراض ہے؟..........392

ایک عمل یہ بھی ہے..........394

تو ایمان پر موت آئی..........396

اگر سکون حاصل کرنا چاہے..........397

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی..........398

بستر پر جاکر نعمتوں کو سوچو..........399

سوتے وقت کی ایک دعا اور ادب..........400

کیا قبلہ رخ سونا ادب ہے؟..........401

کِتَابُ الدَّعَوَات 403

دعاؤں کا بیان 403

نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے منقول مختلف دعاؤں کی فضیلت اور ان کا حکم 404

کس سے مانگے؟ 404

دعا امّتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے 405

قبولیتِ دعا کی بنیادی شرط 406

دعامانگنے کا طریقہ 407

دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں 409

مضطر کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے 409

دعا عبادت ہی ہے 410

جامع کلمات اختیار کرنا پسندیدہ ہے 410

بڑی جامع دعا 411

ہدایت، تقویٰ، پاکیزگی، غنیٰ 413

جامع دعا 414

مانگی تھی تلے کو، مل گئی اوپر کو 415

دلوں کو پھیرنے والے 416

اللہ کی پناہ چاہو 417

دین دنیا اور آخرت کی جامع دعا 418

میرے حالات ٹھیک کردے 419

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں 420

امت کے افضل ترین فرد کو سکھائی گئی دعا 421

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے 423

نہ کئے کی سزا سے پناہ 424

کچھ اہم دعائیں 425

جہنم اوراس کے فتنوں ،مالداری وفقیری کے فتنوں سے پناہ 428
برے اخلاق ،برے اعمال اوربری خواہشات سے پناہ 429
اعضاء کے شرورسے پناہ... 430
بیماریوں سے پناہ 432
برے ساتھی اوربری خصلت سے پناہ.............................. 433
روزی کی آسانی اورادائیگیٔ قرض کے لیے مؤثردعا 434
نبیٔ کریم صَلَّیٰ اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی دودعائیں 435
اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو.. 436
میرے دل کواپنے دین پرجمائے رکھ 437
محبت کاسوال 438
دعامیں ’’یَاذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ‘‘ بھی کہاکرو.................................. 439
جامع ترین دعا... 440

ایک دعا 441

غائبانہ دعا کی فضیلت 443

آیاتِ قرآنیہ.. 443

قبولیت دعا کا گُر.. 444

اپنی غرض کا تقاضہ بھی یہی تھا.. 446

بَابٌ فِیۡ مَسَائِل مِنَ الدُّعَاء 447

دعا کے چند مسائل 447

احسان کا بڑا بدلہ 448

بہت کچھ دیا جس نے دل سے دعا دی.. 449

اولادواموال کے لیے بددعامت کرو.. 450

... پھر آدمی زندگی بھر روتا پھرتا ہے.. 452

بددعاکی مثال گیند (Ball) جیسی ہے 454

اسلاف اور بزرگوں کا طریقہ یہی رہا ہے.................................455

سجدہ کی حالت میں کثرت سے دعا مانگا کرو.................................456

ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے.................................457

اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا.................................459

اُو مصلحتِ تو از تو بہتر می داند.................................460

دربند آں مباش.................................461

قبول ست گرچہ ہنر نیستت.................................462

دو اَوقات کی دعا زیادہ سنی جاتی ہے.................................463

ہاتھ تواخیر میں پھیرا جاتا ہے.................................464

تین میں سے ایک چیز ضرور ہوتی ہے.................................465

دعائے کرب ؛نہایت مجرب.................................467

تعریف مانگنے کے لیے ہی کی جاتی ہے.................................467

دریں مژدہ گرجاں فشانم رواست 468

مصیبت وپریشانی اورناگہانی آفت کے وقت کی دعا 470

ایک اشکال اوراس کے جوابات 472

تعریف کا مطلب سوال ہی ہے 473

دعائے کرب کیوں نہیں پڑھتے؟.. 474

ان کاکوئی قصور نہیں 475

بیٹی ! کبھی کوئی تکلیف پیش آئے تو”دعائے کرب“ پڑھیو 476

نفرت محبت سے بدل گئی.. 476

نبیٔ کریم ﷺ کی سکھائی ہوئی ایک اوردعا 477

مَیں پسند کرتا ہوں.. 478

چند اوردعائیں.. 481

بَابُ كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ وَفَضْلِهِمْ 483

اللہ کے نیک بندوں کی کرامتیں اور ان کی فضیلتیں.......................... 483
کرامت کی وضاحت... 484
دوام ذکر وطاعت؟.. 485
سب سے بڑی کرامت 487
کھاؤ پیو.. 488
یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے.................................. 489
اصحابِ کہف کا قصہ.. 492
جب مہرِ سکوت ٹوٹی.. 493
ڈسٹرب نہ کریں.. 495
جب جاگے دنیا بدلی ہوئی تھی 498
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کرامت 499
امّت کے مُحدّث.. 504

وہ مستجاب الدعوات تھے 505

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت 507

ایک لطیفہ 512

مجھے سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی بددعا لگ گئی 514

چھ ماہ بعد بھی لاش جوں کی توں 517

غیبی لائٹ 519

تین صحابیوں کا واقعہ 520

مکھیوں کے جھنڈ اور سیلاب سے نعش کی حفاظت 524

اطمینان رکھو؛ مَیں ایسا نہیں کروں گا 526

بے موسم پھل؛ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت 529

مجھے کوئی پرواہ نہیں 530

"یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن" کی برکت 531

چہرہ بسوئے قبلہ 533
لاش کو زمین نے اندر لے لیا 533
حضرت زیدبن دثنہ رضی اللہ عنہ کا قصہ 534
وہ بے نیاز ذات ہے 536
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت 538

فہرست کتاب

بنام خدا 31

كِتَابُ الأُمُوْرِ الْمَنهِی عَنْها 37

غیبت کی حرمت اورزبان کی حفاظت 38

تمام گناہوں سے بچنانہایت ضروری ہے 39

کوئی کسی کی غیبت نہ کرے 40

غیبت کسے کہتے ہیں ؟ 40

یہ اندازبڑاخطرناک ہے 41

غیبت کی شناعت وقباحت 43

مجلسِ غیبت میں شرکت بھی غیبت ہے 44

لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑنا بڑاخطرناک 45

غیبت کی معافی کاایک مسئلہ 46

کان آنکھ اوردل کے متعلق سوال ہوگا 46

سماج میں پائی جانے والی ایک برائی 47

یہ حرام ہے 49
حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے جادو کرنے والے کا نام نہیں بتلایا.. 49
بلادلیل الزامات! 51
بڑا چوکس نگران 52
سلامتی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا 53
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ 54
بھلی بات کہے یا خاموش رہے.. 55
ہیرے جواہرات اور ڈھیلے پتھر 56
کون سا مسلمان افضل ہے؟.. 57
اپنے ایمان و اسلام کی سند کے واسطے یہ کافی نہیں.. 59
زبان سے تکلیف پہنچانا ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ آسان 60
جنّت کی گارنٹی.. 61
ایک جملہ جہنم میں دور پھینک دیتا ہے 62
پہلے تولو؛ پھر بولو.. 63
بہت سوچ سمجھ کر بولیں 64

ایک جملہ پر تاقیامت رضامندی یاناراضگی کافیصلہ 65

باتوں پر کنٹرول کرنے کی ایک تدبیر 66

نصیحت آموزبات 67

اس کا خطرہ سب سے زیادہ ہے 68

زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ 69

ضرورت اوربلاضرورت کلام کافرق 70

جرِم چھوٹا ؛جُرم بڑا 71

نجات کا راستہ 72

سارے اعضاء کی زبان سے منت وسماجت 73

زبان؛تمام دینی بنیادوں کی جڑ 74

جانتےہوغیبت کیا ہے ؟........................ 77

مسلمان کی جان ،مال اورعزت وآبرو کی اہمیت 78

نقل اتارنابھی غیبت ہے........................ 85

لوگوں کاگوشت کھانے والوں کی سزاکامنظر 87

اس کی بالکل اجازت نہیں 87

باب کا عنوان اور آیاتِ قرآنیہ 89

ایسی مجالس میں بیٹھنا جائز نہیں ہے 90

اس کے چہرہ کو آگ سے دُور رکھا جائے گا 91

چپ چاپ سنتے رہے 92

نبیٔ کریم ﷺ نے ڈیفینس کیا 93

تم نے بہت غلط بات کہی 95

کن صورتوں میں غیبت کی اجازت ہے؟ 97

غیبت کی اجازت کے چھ سبب ہیں 97

پہلا سبب؛ فریادرسی 97

دوسرا سبب؛ گناہ سے روکنا 99

تیسرا سبب؛ مسئلہ دریافت کرنا 100

چوتھا سبب؛ مسلمانوں کو کسی نقصان سے بچانا 103

اور اس کی مختلف شکلیں 103

پہلی شکل؛ جرح وتعدیلِ رواۃ 103

سسرالی رشتہ داری 108

موجودہ دَور کی ایک خرابی 108

یہ سب فتنوں کے اسباب ہیں.. 109

یہ بھی غیبت میں شمار نہیں 111

دارومدار نیت پر ہے 112

نیت بدل جائے گی تو حکم بدل جائے گا.. 113

علمی یا عملی عقیدہ کی حفاظت کی خاطر 113

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ.. 114

یہ بھی غیبت نہیں.. 115

پانچواں سبب؛علانیہ مرتکب گناہ 116

چھٹا سبب ؛پہچان کروانا 118

یہ اپنے قبیلے کا بڑا بُرا آدمی ہے.. 120

ایک اشکال اوراس کاجواب 122

بڑے آدمی کی یہ ذمہ داری ہے.. 123

بعض صورتیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی 124

دونوں دین کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے 124

تکلیف سے بچالیا.. 125

غزوۂ بنی المصطلق کاایک واقعہ 128

یہی تعصب ہے 131

آنحضور ﷺ کی حکمتِ عملی.. 138

اللہ تعالیٰ نے تیرے کان کی تصدیق کی 139

تب اس کو جانے دیا.. 140

ایک مسئلہ ؛لیکن غلط فہمی نہ ہو.. 141

چغلی حرام ہونے کا بیان 144

چغلی کسے کہتے ہیں ؟.. 144

چغلی کی مختلف شکلیں.. 146

چغلی براکام ہے 148

گناہوں سے روکنے کا موئثرترین ذریعہ.. 148

پھر اللہ تعالیٰ کہاں گیا ؟.. 150

چغل خورجنت میں نہیں جائے گا 151

عذاب قبر میں مبتلا کرنے والے دو گناہ 153

سلامتی اسی میں ہے کہ 155

میرا سینہ لوگوں کی طرف سے بالکل صاف ہو 158

دوچہرے والے کی برائی 160

سب سے برا آدمی 161

منافقت یہی ہے 163

جھوٹ کی حرمت کا بیان 165

سچائی کا ایک بہت بڑا فائدہ 167

آسان نسخہ 168

صرف جھوٹ چھوڑا تو سب گناہ چھوٹ گئے 169

اپنی اصلاح کا سرا ہمارے ہی ہاتھ میں ہے 170

خالص منافق کی چار خصلتیں 172

یہ بہت ضروری ہے 173

ہر مذہب میں جھوٹ کو برا سمجھا گیا 174

مَیں اپنی طرف جھوٹ کی نسبت پسند نہیں کرتا 176

بچوں کی تربیت میں بھی سچ کا اہتمام کیجئے 177

بچوں کو جھوٹ سے بچانے کا ایک نسخہ 178

مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں.. 179

بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی 180

سواری کے لیے اونٹ کا بچہ 180

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے 181

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ 182

ایک قصہ 183

کیرکٹر سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ).. 184

کیریکٹر سرٹیفکیٹ کب دیں ؟.. 185

جھوٹا خواب بیان کرنے کی وعید 186

گناہ بے لذت 188

سب سے بڑا جھوٹ 189

حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ایک لمبا خواب.. 189

پتھر سے سر کچلا جانا.. 194

آنکس سے منھ، ناک، آنکھوں کو چیرا جانا.. 195

تنور میں شور مچاتے ننگے مرد وعورتیں......196
خون کی نہر میں تیرتا ہوا آدمی......196
بھیانک شکل والا آدمی......197
گھنا پھول دار باغ اور بچے......197
جنتِ عدن......198
حضور کا گھر......199
عجیب وغریب مناظر کی تعبیر......199
غیر عامل حافظِ قرآن......200
جھوٹے پروپیگنڈے کرنے والا......200
زانی اور زانیہ......201
سود کھانے والا......201
جہنم کا داروغہ "مالک"......201
حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور بچپن میں فوت شدہ بچے......202
فطرت کا مطلب......202
گنہگار مؤمنین......203

اسی روایت کی مزید تفصیل 204

کن مواقع پر جھوٹ کی اجازت ہے؟.. 207

تعریض کاایک نمونہ 209

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہُ کاتوریہ 210

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہُ کاتوریہ 211

جان بچانے کے لیے جھوٹ کی اجازت 212

تین چیزوں میں جھوٹ کی اجازت 212

باب الحث علی الثبت فیمایقولہ ویحکیہ.. 214

جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے.. 214

جھوٹوں میں سے ایک 216

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہ) کی احتیاط 218

روایت بالمعنیٰ کی اجازت ہے یانہیں ؟ 220

حدیث بیان کرنے میں بے احتیاطیاں 221

آج کل کے وضاعین 222

جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا 224

جو وصف اپنے اندر نہ ہو؛اس کی بناوٹ نہ کرے.................................. 225

ایک وضاحت 227

جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان 229

آیاتِ قرآنیہ 230

بڑے گناہوں میں بھی بڑے گناہ 231

اولاد کو جائز کام کا حکم کیسے دیں ؟... 232

محبت کا تقاضہ 233

کسی متعین شخص یا جانور پر لعنت بھیجنا حرام ہے.............................. 234

کسی پر لعنت کرنا اس کو قتل کرنے جیسا ہی ہے................................ 234

اہلِ بیعتِ رضوان کی وجہ تسمیہ 235

جملہ کی تفصیل اور مسئلہ کا فرق... 238

جس چیز کا مالک نہیں ،اس کی نذر لازم نہیں.................................. 240

کثرت سے لعنت کرنے والا صدیق نہیں ہو سکتا 241

نہ شفیع ہوں گے ،نہ گواہ 242

ایک دوسرے پر لعنت نہ بھیجا کرو 243

مؤمن ایسا نہیں ہوتا 244

یہ طرز زیادہ بگاڑ نے کا ذریعہ 245

پھر لعنت کی اجازت کیونکر دی جاسکتی ہے؟ 246

فحش گو اور منہ پھٹ نہیں ہوتا 247

لعنت کے متعلق نہایت اہم مضمون 247

خود ہی بھگتنا پڑتا ہے 250

لعنت کی مثال گیند جیسی ہے 251

لعنت کی ہوئی چیز سے بچنے کا اہتمام 252

ایک بحث 254

نام لئے بغیر لعنت بھیجنے کے نمونے 257

سود کھانے والے پر اللہ کی لعنت 258

زمین کے نشانات بدل دینے والوں پر لعنت 259

چوروں پر اللہ کی لعنت ہو 260

ماں باپ کو گالی دینے والے پر لعنت 261

غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے والے پر لعنت 261

بدعتی پر لعنت 262
واقعۂ بیرِ معونہ اورواقعۂ رجیع 262
مرض الوفات میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے روکا.. 263
زنانے مرد اور مردانی عورتوں پر لعنت 264
خلاصۂ کلام.. 265
کسی مسلمان کوناحق گالی دینا حرام ہے 266
مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے.. 267
جملہ خود پر ہی لوٹتا ہے 268
ذمہ داری شروع کرنے والے کی ہے؛اگر 269
اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو.. 270
تہمت لگانے والے آقا کی سزا.. 272
مُردوں کوبُرا بھلامت کہو 273
وہ اپنے اعمال تک پہنچ چکے ہیں 274
مُردوں کی برائی سے زندوں کوتکلیف ہوتی ہے 275
مناقب عکرمہ 277

حاصل کلام 279
کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت 280
پہلا شعبہ :عبادات 280
دوسرا شعبہ :اخلاق 282
تیسرا شعبہ:معاملات 282
چوتھا شعبہ :معاشرت 283
دوسروں کو تکلیف پہنچنے کے کچھ نمونے 284
بیچ راستہ میں ٹھہر کر باتیں کرنا 285
بے تکی پارکنگ 285
راستہ میں پنڈال 286
زور سے ٹیپ بجانا 287
معاشرت کو درست کرنے والی تعلیم 287
اسلام کی بنیادی تعلیم 290
شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری 291
مَیں دعویدار بنوں گا 292

شرعی ہجرت 293

حقیقی ہجرت 295

جو آدمی یہ پسند کرتا ہو 296

معاشرت کو درست کرنے والی اصولی تعلیم 297

کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں حاصل کرے؟ 298

سب سے بڑا عبادت گزار 299

سب سے بڑا مالدار 300

تم مؤمن کہلاؤ گے 301

تم مسلمان کہلاؤ گے 301

زیادہ ہنسنا دل کو مار دیتا ہے 302

ائمۂ حدیث کی منظورِ نظر روایت 302

امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب 303

ایک درہم میں جنت 304

دین پر عمل کے واسطے چار حدیثیں کافی ہیں 305

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نور اللہ مرقدہُ کا مقولہ 307

سماج قابلِ رشک بن جائے 307

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل 308

دلِ دشمنانِ ہم نہ کردند تنگ 309

آپس میں بغض اور دشمنی ،کینہ اور قطع تعلق کی ممانعت 311

بڑے مبارک ہیں وہ لوگ 311

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے مختصر حالات 312

نبیٔ کریم ﷺ کی اپنے خادمِ خاص کو تاکیدی نصیحت 313

آیاتِ قرآنیہ 314

آپس میں بغض ودشمنی مت رکھو 315

دل ہی تو ہے ،نہ ہے سنگ و خشت 317

نہایت سخت وعید 318

ان دونوں کو ابھی چھوڑے رکھو 319

حسد کی حرمت کا بیان 321

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے 322

حسد کیا ہے؟ 322

اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض 324

حسد کے نتیجہ میں اور کیا کیا ہوتا ہے؟ 324

حسد کے تین درجات.................... 327

کبڑے کی تمنا.................... 328

حسد کیوں پیدا ہوتا ہے؟ 328

حسد کیسے دور ہو؟.................... 329

اسبابِ راحت کا نام راحت نہیں 333

لیکن پسر گرمی داراست 335

یہ سوچنا حماقت ہے 336

ذرا سا بخار 337

دوسروں کو دیکھنے کا طریقہ 338

سارے رنج و غم سے بچا لیا 339

حسد کا دوسرا علاج.................... 340

برائی کرنے والے کو مٹھائی 341

گھر کی دولت گھر ہی میں رہے 341

نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے 342

معاصرانہ رقابت ؛اوراس کاعلاج 342

آسان نسخہ 345

لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنے کی ممانعت 348

جاسوسی کی ممانعت 348

تحسُّس اور تجسُّس حرام ھے 349

دنیوی چیزوں میں ریس کرناممنوع ہے 353

بھائی بھائی بن کر رہو 355

گروہ بندیاں تعلیماتِ اسلام کے خلاف 355

نعرۂ جاہلیت 356

خاندان وقبائل کیوں ؟ 358

کسی کو حقیر نہ سمجھو 359

اس پر فخر کرنا کیا معنٰی رکھتاہے؟ 360

محض اللہ کا فضل 361

تم تو بڑے منحوس ہو 361

ذرا بندِ قبا دیکھ 363

یہ نصیحت خوب یاد رکھیے 365

”تحقیر“کاانجام بڑابراہوتا ہے.. 366

برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے.. 368

ہرایک کی ”جان ،مال، عزت “محفوظ ہے.. 369

دلوں کی کیفیت دیکھی جاتی ہے.. 370

یہ تو صریح دھوکہ بازی ہے 371

جاسوسی کروانا؛اخلاق کو خراب کرنے کاذریعہ 371

اندرونی حالات کوٹٹولنے سے ہمیں منع کیاگیا.. 372

مسلمانوں کے ساتھ بلاوجہ بدگمانی کرنا حرام ہے 374

مسلمانوں کوحقیر سمجھنا حرام ہے.. 375

اس لیے کہ ایک اندھاآیا 376

تکبر کیاہے 377

یہ تکبر نہیں.. 378

ایک رند اور ایک زاہد 379

کسی مسلمان کو تکلیف اور مصیبت پہنچنے پر خوش ہونے کی ممانعت 381
عربوں کی نیک فالی 382
خطابت کا نہایت بلیغ انداز 383
اسلام؛ پورا پریوار ہے 386
رشتۂ اسلامی 388
جذبۂ خیر خواہی 389
یہ صرف اسلام ہی کا خاصہ ہے 391
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے 392
ہمارا حال! 393
دنیا و آخرت میں دردناک عذاب 393
ایمان نہ ہونے کے مرادف ہے 394
بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو؛ورنہ 395
ہے یہ گنبد کی صدا 396
تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا 397
نفس وشیطان کے دھوکے سے نجات مل جائے گی 398

جو نسب شریعت کے ظاہری حکم کے مطابق ثابت ہو اس میں طعن کرنا حرام ہے 400

کبیرہ گناہ 401

دو باتیں کفر تک پہنچانے والی ہیں 401

ملاوٹ اور دھوکہ کی ممانعت 403

وہ ہم میں سے نہیں 403

امام ابو حنیفہ نور اللہ مرقدہُ کا طریقہٴ تجارت 405

یہ بھی دھوکہ ہے 406

امانت و دیانت کا تقاضہ 407

ہم میں سے نہیں 409

پھر کس سے توقع لگائی جا سکتی ہے؟ 410

عہد شکنی حرام ہے 412

عہد اور معاہدہ میں فرق اور شرعی حکم 412

معاہدہ کی قسمیں 414

معاہدہ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ 415

معاہدہ اپنی ذات کے ساتھ 416

منافق کی چار خصلتیں 417

ایمان کے تقاضے 419

انصاف کے تقاضے مت چھوڑو 420

حب وبغض میں اعتدال 420

انتہاء درجہ کی رسوائی 421

اس سے بڑی غداری اور کوئی نہیں ہوسکتی 423

ان کے خلاف مَیں خود مدعی بنوں گا 425

کسی کو کوئی بخشش یا ہدیہ وغیرہ دے کر اس پر احسان جتلانے کی ممانعت 427

ہمارے سماج کی عام وبا 427

مؤمن کا اپنی بیوی سے تعلق 428

احسان جتلانا کبیرہ گناہ 430

بڑے گھاٹے والے تین لوگ 433

فخر و غرور اور سرکشی کی ممانعت 435

خود کو اچھا سمجھنا بھی منع ہے 436

اہل عرب کا مزاج 437

اللہ تعالیٰ ہی باخبر ہے 439

جوزمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں 440

کوئی کسی پر فخر وغرور نہ کرے 440

وہی سب سے زیادہ ہلاکت میں پڑا ہوا ہے 441

وہ وعید میں داخل نہیں 442

تین دن سے زیادہ قطع تعلق حرام ہے.. 444

ہم توڈوبے ہیں صنم.. 445

قطع تعلق (کٹّی)مت کرو 446

شریعت کاکمال 447

کتنی بڑی محرومی.. 448

آپسی جھگڑے ،شیطانی اثر.. 449

وہ جہنم میں جائے گا.. 451

وہ قطع تعلق کے گناہ سے محفوظ ہو جائے گا.. 452

ایک کوچھوڑکرسرگوشی کی ممانعت.. 454

ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم 455

نبیٔ کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کے اہتمام کا نمونہ 456

کسی ایک کو اکیلا نہ چھوڑا جائے 458

غلام، جانور، عورت اور اولاد کو بغیر سبب شرعی کے سزا دینے کی ممانعت 459

خلاصۂ باب 459

حدودِ تعزیر و تادیب 460

بیوی کے لیے بھی یہی حکم ہے 461

مواقعِ تعزیر 461

ترتیبِ قرآنی اور حضور کا عمل 462

دنیا ہی میں بھگتنا پڑتا ہے 464

عنوان اور آیتِ قرآنی 466

جہنم میں داخلہ کا سبب 467

علمی فیض سے محروم ہونے کا سبب 468

کسی جاندار کو تکلیف پہنچانے پر لعنت 469

نشانہ بنانے کے لیے جانوروں کو باندھنے سے منع کیا ہے 470

انتقامی جذبہ سے ماتحتوں کو سزا دینا 471

جہنم کی آگ تم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی 472

بے کئے کی سزا دینے کا کفارہ 474

اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے روز عذاب دیں گے 475

جانوروں کو داغ دینے اور مارنے میں بھی رعایت 476

کسی بھی جاندار کو چاہے وہ چیونٹی ہو یا کوئی اور جانور، آگ کے ذریعہ عذاب دینے کی حرمت... 478

کسی آدمی کا مالی حق دوسرے پر ہو تو قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرنے کی ممانعت.......... 483

تمام ادائیگیاں امانت ہیں 484

قرض اور دَیْن میں فرق 484

یہ ظلم ہے 485

مقروض کی دعوت 486

ایک مسئلہ 488

ایک ذاتی واقعہ 490

ایک طریقہ اور اس کی اصلاح 491

ہدیہ دے کر واپس لینا 492

شوافع کی دلیل 493

احناف کی دلیل 494

جب آپسی محبتیں چلتی ہیں 495

بخشش واپس لینے کے سات شرائط 496

صدقہ واپس لینا 499

ہدیہ اور صدقہ میں فرق 500

باب کی روایتیں 501

یتیم کے مال کی حرمت کی تاکید 504

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں 504

یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ 506

ایک واقعہ 507

یتیم کے مال میں کسی کو ناحق تصرف کا حق نہیں 507

یتیم کے مال کے متعلق قرآنی مشورہ 508

یہ سب ناجائز ہے 510

ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو 511

سود کی سخت حرمت کا بیان 513

تمہارا جو سود باقی ہے وہ بھی چھوڑ دو 513
سود لینے دینے والے پر لعنت 514
اَحسن الفتاویٰ کا ایک مضمون 515
دیکھو مجھے 517
صدقہ کو اللہ تعالیٰ بڑھاتے ہیں 519
درسِ عبرت 520
کوٹھی نہیں جلی 520
اعلانِ جنگ 522
شرعی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، انسانی نقطہٴ نظر سے سنگین جرم 524
احادیث دربابِ سود 526
قابلِ توجہ بات 530
معاشی نقصانات 531
مرے کو مارے شاہ مدار 533
منہ بولتی شہادتیں 536
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں 537

ایک درد بھری کہانی 538

سود خور کی بہیمیت کے واقعات 539

علامہ کشمیری نور اللہ مرقدہُ کے خطبۂ صدارت کے اقتباسات 540

ہماری گردنوں کو پل نہ بنائے 541

عبرت انگیز واقعہ 542

چند واقعات 543

باب کا عنوان 545

باریک فرق 546

پہلی آیت 547

اپنے صدقات کو ضائع و باطل مت کرو 547

منافقین کا حال 548

تمام شریکوں میں سب سے زیادہ مستغنی 549

بعد میں ریاء شامل ہوگئی تو 551

لینے کے دینے پڑ گئے 552

ظاہر میں کچھ، باطن میں کچھ 556

جیسی کرنی ویسی بھرنی... 557

جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا.. 558

کسی عمل میں ریاکاشائبہ،حالاں کہ وہ ریانہیں ہے.................................... 560

مؤمن کو دی جانےوالی نقد بشارت... 560

تانہ بخشد خدائے بخشندہ... 562

فہرست کتاب

افتتاحیہ 36

اجنبی اور پرائی عورتوں کو دیکھنے 39

اور بے ریش لڑکوں کی طرف نظر کرنے کی حرمت 39

گناہ کے اسباب سے بچنا بھی ضروری ہے 51

گنہگاروں کے ساتھ مشابہت بھی منع ہے 52

ایک بہترین مثال 52

اسبابِ زنا پر پابندی 54

عفت (پاک دامنی) نبیٔ کریم ﷺ کی ایک بنیادی تعلیم 55

آپ ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ 57

سورۂ یوسف کا اہم سبق 58

تمہاری عورتیں بھی پاک دامن رہیں گی 58

قدرت کسی کی رعایت نہیں کرتی 59

ایک عبرت ناک واقعہ 59

دوسرا واقعہ 61

ماں باپ کی نافرمانی کا وبال ایک عبرت ناک واقعہ 62

اور نالے کے اندر پھینکا........ 63

ایک نوجوان کا قصہ اور حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شفقت 64

صحبت کی لذت سے محروم کر دیئے جاؤگے 65

اللہ تعالیٰ نے کِفل کی مغفرت فرمادی........ 65

یہ پیغمبرانہ صفت ہے 67

حضرت سلیمان بن یسار (رحمۃ اللہ علیہ) کا عجیب واقعہ 67

ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ........ 69

ایک اور نوجوان کا قصہ 71

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پاک دامنی........ 73

محرم اور نامحرم عورتیں........ 74

معاشرہ میں پھیلا ہوا ایک بڑا گناہ 75

جن کے شوہر سفر میں ہوں 75

یہ چیز پاکیزگی کا ذریعہ ہے 76
بدنظری کی وجہ سے چہرے کا نور ختم ہوجاتا ہے 77
بدنگاہی سے بچنا ہی پڑے گا 78
بدنظری کے ساتھ قلب کی اصلاح نہیں ہوسکتی 78
عبادت کی لذت کیوں حاصل نہیں ہوتی؟ 79
بڑا خطرناک روگ 79
اعضاءِ بدن اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں 80
بدنظری کیوں منع ہے؟ 81
آنکھ عجیب وغریب نعمت 83
نگاہِ محبت سے دیکھنے کی فضیلت 83
گھر بیٹھے حج مبرور کا ثواب 84
بدنظری کے حرام ہونے کی ایک مثال سے وضاحت 85
مردوں کے لیے سب سے بڑا فتنہ 85
... تو کیا حال ہو 87

گناہوں سے بچنے کا نسخہ 87

زہریلا تیر 88

یہ ایسا تیر ہے جو خود کو پہلے زخمی کرتا ہے 88

کتنا بڑا وعدہ ہے 89

طاعت کی لذت سے محروم 89

گناہ ایک آگ ہے 90

بے چینی سے بچنے کا سستا سودا 90

سالکین کو خاص ہدایت 91

نسبت کی تعریف او رایک مثال سے اس کی وضاحت 91

نسبت کے ختم ہونے کا ایک سبب 92

بدنگاہی سے دونوں پر لعنت ہوتی ہے 93

لعنت کتنی خطرناک چیز ہے؟ 94

انسان کو دھوکہ دے سکتے ہیں ؛ لیکن 94

کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے؟ 95

ایک عمدہ مثال 97

تیرا رب گھات میں ہے 97

حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا عمل 98

اکابرواسلاف کے واقعات وارشادات 99

آنکھوں سے زنا ٹپک رہاہوتاہے 100

اعلیٰ حضرت رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ 101

اور اس پر نگاہ پڑ جائے 101

عورت چھپانے کی چیز ہے 102

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی حیاء 103

ہماری غیرت کہاں چلی گئی؟ 104

ہر آدمی کے لیےزنا کاحصہ لکھ دیا گیا 104

قابلِ تقلید طرزِ عمل 105

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا تقویٰ 106

پہلی نظر معاف؛ مگر نقصان سے خالی نہیں 107

مخلوط ملازمت کے بارے میں ایک سوال 108
اور حضرت دامت برکاتہم کا تشفی بخش جواب 108
ایمان کے لیے ٹی بی 109
مزہ کی بنیاد عادت پر ہے 109
یہ بھی ایک مزہ ہے 110
تو زندگی بھر دودھ نہیں چھوٹے گا 111
نفس بھی بچہ کی طرح ہے 112
کنٹرول آسان ہو جائے گا 112
روزانہ صبح میں اُٹھنا کیا آسان کام ہے؟ 113
مصیبت کیوں سر لیتی ہے؟ 114
آخر کوئی مزہ تو آتا ہو گا 114
ہر انسان کے لیے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے 115
موَفَّق مِنَ اللہ ہی بچ سکتے ہیں 117
ان اعضاء کا زنا کب معاف ہو گا؟ 118

سرِراہ بیٹھنے کی اجازت نہیں 119
ایک اشکال اوراس کاجواب 120
راستہ کاحق اداکرو 121
ایسی بیٹھکوں کاحق یہ ہے 122
اچانک کی نظر کا حکم 123
ورنہ دل کاروگ بڑھتاہی رہے گا........ 124
حلال طریقہ سے ضرورت پوری کیجئے 124
آپ ﷺ کا عملی نمونہ 125
جسمانی وروحانی بربادی 126
نظر کی حفاظت عورتوں کے لیے بھی ضروری 126
ایک دوسرے کے ستر کونہ دیکھو؛اورایک ہی چادر میں نہ لیٹو 127
اجنبیہ کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا حرام ہے 130
یہ چیزدلوں کو پاک رکھنے والی ہے........ 130
دیورتو موت ہے 131

جنید ورابعہ بھی تنہائی اختیار نہ کریں 132
گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے 134
ہماری جہالت، معاشرہ کی ہلاکت 134
کوئی کسی نامحرم سے تنہائی میں نہ ملے 135
اللہ کی راہ میں نکلنے والوں کی بیویوں کی حرمت 136
مردوں کا عورتوں کے ساتھ اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ 138
لباس، حرکت و سکون اور دوسری تمام چیزوں میں مشابہت اختیار کرنا حرام ہے 138
ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور ایک باطن 138
ہر جنس کے مقاصد وفوائد الگ الگ 139
اس کا لحاظ دنیوی چیزوں میں بھی کیا جاتا ہے 140
مشابہت اختیار کرنے والے مرد وعورت پر لعنت 141
عجیب وغریب دھوکہ 142
قابلِ لعنت مرد وعورت 143
جہنمیوں کی دو قسمیں 144

کپڑا پہنے ہوئے ہونے کے باوجود ننگی 145
بختی اونٹوں کے کوہان 149
شیطان اور کفار کے ساتھ تشبہ اختیار کرنے کی ممانعت 150
بائیں ہاتھ سے کھانا شیطان کے ساتھ مشابہت ہے 151
غیروں کی مخالفت کا حکم 152
مرد ہو یا عورت؛ سیاہ خضاب کرنے کی ممانعت 154
سرخ سیاہی مائل رنگ کی مہندی کا حکم 155
کالی مہندی کا مسئلہ 156
ہیر ڈائی کا حکم، عورتیں متوجہ ہوں 156
"قزع" کی ممانعت کا بیان 158
بال کاٹنے کی اجازت صرف مَردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں 158
"قَزَع" کا مطلب 158
بچوں کے بالوں کی تراش خراش کی ذمہ داری والدین کی ہے 159
پورے سر کے بال مونڈے جاسکتے ہیں 160

حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) کے حالات.. 161

عورت سر کے بال نہ منڈوائے 163

بالوں کے ساتھ دوسروں کے بالوں کو جوڑنا، 165

گوندنا لگوانا، دانتوں کو نوکیلا بنانا 165

اللہ تعالیٰ کی خِلقت کو بدلنا شیطانی فریب ہے 165

بالوں کو جوڑنے والی اور جُڑوانے والی پر لعنت.. 167

بالوں میں بال جوڑنے کی وجہ سے بنو اسرائیل ہلاک ہوئے 169

علماءِ کرام کی ذمہ داری.. 170

گوندنا لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت 170

مَیں ان پر لعنت کیوں نہ کروں ؟.. 172

ڈاڑھی اور سر میں جو سفید بال ہوتے ہیں ان کو اُکھاڑنے کی ممانعت 175

اور بے ریش لڑکے کا اپنی ڈاڑھی پر آنے والے اِکّادُکّا بال کے اُکھاڑنے کی ممانعت.. 175

ایسا کام مردود ہے.. 176

داہنے ہاتھ سے استنجاء کرنے اور شرم گاہ کو بلاعذر دائیں ہاتھ سے چھونے کی کراہت 177

بلاعذر کے ایک جوتا،ایک موزہ پہن کر چلنا، 179

یا بلاعذر جوتے اور موزے کو کھڑے کھڑے پہننا ناپسندیدہ ہے........ 179

سوتے وقت (یا جب ہم پورے طور پر نگرانی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں)........ 182

آگ کو جلتا چھوڑے رکھنا منع ہے چاہے وہ چراغ کی شکل میں ہو یا اور کسی شکل میں ہو 182

احتیاطی تدابیر کی تاکید........ 183

جب سونے لگو تو آگ کو جلتا نہ چھوڑو........ 184

آگ تمہاری دشمن ہے 185

اَلنَّارُ عَدُوٌّ، لَا یَرْحَمُ........ 186

بہ غایتِ شفقت نبوی ہدایات........ 186

سال بھر کی کسی ایک رات میں بلائیں اُترتی ہیں........ 188

مغرب کے وقت بچوں کو گھروں میں لے لو 188

شیطانی تہذیب سے بچنے کی راہ؛اسلامی تعلیم وتربیت........ 189

جان،مال کی حفاظت کا آسان نسخہ........ 190

دو واقعات........ 191

گھروں میں اس بات کا ماحول بناؤ 192

تکلّف کی ممانعت کا بیان 193

حضراتِ صحابہ کی شان 194

مَیں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں 195

تکلّف وبناوٹ سے منع کیا گیا 195

اگر قناعت ہوتی تو مجھے اپنالوٹا بیچنانہ پڑتا 197

لاعلمی کااظہار کردیناعلم کا تقاضہ ہے 197

مفتی کے لیےپہلاادب 198

حضور ﷺ کالاعلمی ظاہر کرنا 199

حضرت امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) کاقول 200

مرنے والے کے اوپر رونا چلّانا، گالوں کو طمانچے مارنا، 201

گریبان پھاڑنا،بالوں کو نوچنا، بالوں کو منڈانا 201

اورکسی کی موت پر اپنے لیے ہلاکت وموت کی بددعا کرناحرام ہے 201

نوحہ کی وجہ سے میت کو عذاب ہوتاہے 202

ایک اشکال 203

پہلا جواب 203

دوسرا مطلب 205

تیسرا مطلب 206

چوتھا مطلب 206

روایتِ مذکورہ بالا کا مطلب 207

وہ ہم میں سے نہیں 209

مَیں اس سے بری ہوں 209

انہیں کرتوتوں کی وجہ سے عذاب ہو گا 211

ہم نوحہ نہ کریں گی 212

فرشتے کہتے ہیں :تو ایسا ہے؟ 213

روایت کے سبق 214

نوحہ کے جملوں کے مطلب 215

آنسواور غم سببِ عذاب نہیں 215

تارکول کا لباس اور خارش کا کرتہ 218

عورتوں سے بوقتِ بیعت چند کلمات 219

کیا تو ایسا ہی تھا؟ 220

دو بڑے گناہ 221

کاہنوں کا اپنا کاروبار چلانے کا نظام 222

کائنات کا نظام 224

نجومیوں کے بے بنیاد دعوے 225

عرّاف اور عامل 226

ہمارا معاملہ عجیب ہو گیا ہے 227

کہانت کی حقیقت 228

"لَیْسُوا بِشَیْءٍ" کا مطلب 230

اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی 231

عِیَافہ، طِیَرہ، طَرْق 232

علمِ نجوم سیکھنا جادو سیکھنا ہے 234

ایک صحابی کے سوالات اورآپ ﷺ کے جوابات 236

"حُلْوَانُ الکاہِن" کا مطلب اور حکم 238

بدشگونی کی ممانعت 239

پہلے اونٹ کو خارش کہاں سے لگی؟ 240

نیک فالی پسندیدہ ہے 241

اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی 242

آدمی کی خوش بختی کی تین علامتیں 244

حضوراکرم ﷺ بدشگونی نہیں لیا کرتے تھے 244

وسوسے دور کرنے کی دعا 245

کسی جاندار کی تصویر بنانے کی حرمت اور تصویر کو ختم کرنے کا حکم 247

قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب 248

ہر تصویر بنانے والا جہنم میں جائے گا 250

اس سے بڑا ظالم کون ہوگا 252

ایسی جگہ فرشتے داخل نہیں ہوتے 253

جس گھر میں کتا یا تصویر ہو 254

حضورِاکرم ﷺ کاخاص مشن 257

کتے کو پالنے کا حرام ہونا، سوائے یہ کہ 258

اعمال کے اجروثواب میں روزانہ کمی ہوگی 258

ثواب میں کمی کیوں آتی ہے ؟ 261

اونٹ یا دوسرے جانوروں کی گردن میں گھنٹی لٹکانے کی ممانعت 263

اور سفر میں کتے، یا گھنٹی لگے ہوئے جانور کو اپنے ساتھ رکھنے کی ممانعت 263

گھنٹی شیطان کی بنسری ہے 264

نجاست کھانے کے عادی جانور پر سواری کی کراہت 265

مسجد میں تھوکنا گناہ ہے 267

حضوراکرم ﷺ نے خوداہتمام فرمایا 269

مسجدیں گندگی کے لیے نہیں بنائی گئیں 270

سوال، دعاء، اور عمل 270

مسجد میں جھگڑنا، خرید فروخت کرنا؛ ناپسندیدہ ا ور ممنوع ہے 273

فرشتے کا غصہ 274

مسجدیں اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں 275

تیرا اونٹ تجھے نہ ملے 277

مسجد میں حمد ونعتیہ اشعار پڑھنا 277

مَیں تمہیں سزا دیتا 279

جس نے لہسن کھایا ہو 281

بیڑی، سگریٹ کا بھی یہی حکم ہے 282

منہ میں بدبو ہوتے ہوئے دینی مجمعوں میں نہ جائے 284

ایسا آدمی ہم سے الگ رہے 285

مسجد سے نکلوا دیتے 285

جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو، اس وقت گوٹ لگا کر بیٹھنا منع ہے؛ 287

جس کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو، وہ ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد اپنے ناخن اور بال نہ کٹوائے، 289

مخلوق کی قسم کھانے کی ممانعت کا بیان 291

غیر اللہ کی قسم کھانا گناہِ کبیرہ ہے 292

وہ ہم میں سے نہیں 294

جو یہ کہے: میں اسلام سے بری ہوں 295

جو غیر اللہ کی قسم کھائے 297

جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا بڑا سخت گناہ ہے 299

چاہے پیلو کی ایک لکڑی ہی کیوں نہ ہو 301

یمینِ غموس 302

جس کام کے نہ کرنے کی قسم کھائی ہے؛ اس کو کر لو 306

جو کام بہتر ہے وہ کر لے 306

میں جس کام میں بھلائی دیکھتا ہوں اس کو کر لیتا ہوں 307

اللہ کے نزدیک زیادہ گناہ کی بات 309

یمینِ لغو معاف ہے، اس میں کوئی کفارہ نہیں 311

قَسم کے کفارہ میں تین چیزیں ہیں 312

یمینِ لغو 313

خرید و فروخت میں قسم کھانے کی ممانعت؛ چاہے سچی ہو 315

اللہ تعالیٰ کاواسطہ دے کر جنت کے علاوہ کسی چیز کا سوال کرنا ناپسندیدہ ہے، 317
اور جس سے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر سوال کیا گیا اس کا سوال کو رَد کر دینا بھی ناپسندیدہ ہے 317
اگر احسان کابدلہ چکانے کی قدرت نہ ہو تو؟ 318
حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کا دائمی معمول 321
جو القاب حق تعالیٰ کے لیے خاص ہیں ان سے کسی بھی آدمی کو ملقب کرنا حرام ہے 322
ذلیل ترین نام 322
سماج میں رائج ایک خرابی 324
”میرے آقا“ کہہ کر پکارنے کی ممانعت 325
بخار کو برا بھلا کہنے کی کراہت و ممانعت 327
ہَوا کو برا بھلا کہنے کی ممانعت 329
اور جب ہَوا چلے تو اس وقت کیا پڑھنا چاہیے؟ 329
ہَوا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے 330
جب تیز ہَوا چلے اس وقت یہ دعا پڑھے 330
مرغ کو برا بھلا کہنے کی ممانعت 332

کسی انسان کا یہ کہنا کہ فلاں ستارہ اور نچھتر کی وجہ سے بارش ہوئی، یہ ممنوع ہے.................. 334
شرکیہ عقیدہ 334
کسی مسلمان کو ”اے کافر“ کہہ کر پکارنا حرام ہے... 337
ورنہ وہ بول کہنے والے کی طرف لوٹیں گے 338
نقصان کہنے والے ہی کو بھگتنا پڑے گا.. 339
ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا.. 340
بے حیائی اور بدزبانی کی ممانعت 341
مؤمن ایسا نہیں ہوتا.. 341
شرم وحیاء خوبی پیدا کر دیتی ہے 343
اپنی بات میں فصیح و بلیغ جملے بہ تکلف بولنے کا اہتمام کرنے کی ممانعت................................ 344
ایک لطیفہ 345
”مُتَنَطِّعْ“ ہلاک ہوئے.. 345
ٹی وی اور ڈرامے دیکھنے کی نحوست 346
اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو ناپسند کرتے ہیں 347

دربارِ نبوت میں محبوب ترین کون؛اور مبغوض ترین کون؟ 347
بَاب کراھة قوله: خَبُثَتْ نَفْسِی 349
تعبیر کے دوانداز 349
یہودیوں کی شرارتیں 351
انگور کو کرم کانام دینے کی ممانعت 353
کرم مؤمن کا دل ہے 354
کسی مرد کے سامنے کسی عورت کے اوصاف اور خوبیوں کو بغیر شرعی حاجت کے بیان کرنے کی ممانعت 356
یہ حرکت حرام کاری تک پہنچادیتی ہے 357
دعاکو مشیتِ الٰہی کے ساتھ مقید نہ کرے بلکہ پختگی سے مانگے 359
”اللہ تعالیٰ نے چاہااور فلاں نے بھی چاہا“ کہنا ناپسندیدہ ہے 363
عشاء کی نماز کے بعد بات چیت کی ممانعت 365
بعض باتیں جائز بھی ہیں 366
عشاء سے پہلے سونا اور عشاء کے بعد بات چیت کرنانا پسندیدہ ہے 367
عشاء کے بعد باتیں کرنے سے ممانعت کی وجہ 368

راتوں کے جلسوں میں غلو 368

نبیٔ کریم ﷺ کی ایک پیشین گوئی 369

آدھی رات کی تقریر 370

موضوعِ بحث نہیں بنانا چاہیے 371

روایت کے اسباق 372

جب شوہر کی طرف سے بیوی سے بستر پر آنے کا مطالبہ ہو، 373

تو اس کے لیے کسی عذرِ شرعی کے بغیر انکار کرنا حرام ہے 373

فرشتے صبح تک لعنت کرتے ہیں 374

نکاح کا فلسفہ 375

روٹی جل جائے تو جلنے دو 376

میاں بیوی کو تاکید 376

شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کے لیے نفل روزہ کی ممانعت 379

شوہر کے حقوق کی بے مثال تعلیمات 379

مقتدی کا امام سے پہلے رکوع وسجدہ سے سر اُٹھانا منع ہے 381

نہایت سخت وعید 381

عبرت آموز واقعہ 382

نماز کی حالت میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی کراہت 383

ممانعت کی وجوہات 383

کھانا موجود ہو اور طبیعت اس کی طرف مائل ہو، 385

یا پیشاب پاخانہ کا تقاضہ ہو رہا ہو؛ ایسی حالت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے 385

پھر اطمینان سے نماز پڑھیں گے 385

کھانا نماز بنے 386

کن صورتوں میں کھانا پہلے، اور کن صورتوں میں نماز پہلے 387

قضائے حاجت کے وقت کے احکام کی تفصیل 388

نماز میں نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھانے کی ممانعت 390

نماز کی حالت میں بغیر عذر کے اِدھر اُدھر دیکھنا مکروہ ہے 391

شیطان کا نماز میں سے اُچک لینا 392

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا ہلاکت ہے 393

قبر سامنے ہوتے ہوئے نماز پڑھنے کی ممانعت 394

سُترہ کے متعلق مسئلہ کی وضاحت 394

قبروں کی طرف چہرہ کرکے نماز مت پڑھو 395

نمازی کے سامنے سے گزرنے کی ممانعت 397

بڑی اور چھوٹی مسجد کی تحدید اور حکم 398

سامنے سے گزرنے والا گنہگار یا نمازی؟ 399

جماعت کھڑی ہوچکنے کے بعد مسجد ہی میں سنتیں یا نوافل پڑھنا مکروہ ہے 401

جمعہ کے دن خصوصیت سے روزہ رکھنا 403

اور شبِ جمعہ میں خصوصیت سے عبادت کرنا مکروہ ہے 403

آگے پیچھے ایک روزہ ملا لیا کرے 404

صومِ وصال کی حرمت کا بیان 406

میرا معاملہ تمہاری طرح نہیں ہے 407

قبر کے اوپر بیٹھنے کی ممانعت 409

قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر (قبہ، کمرہ وغیرہ) تعمیر کرنے کی ممانعت 411

غلام کا اپنے آقا کے یہاں سے بھاگ جانا سخت حرام ہے 412

کفر سے مراد کیا ہے؟ 412

شریعت کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کے متعلق سفارش حرام ہے.. 414

حدودِ اربعہ.. 414

حدود کے سلسلہ میں سفارش کرنا جائز نہیں.. 415

ایک شکل میں سفارش کی اجازت ہے 416

قرآنی آیت.. 417

اس معاملہ میں تم سفارش کرتے ہو؟.. 417

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قصہ 420

مشہور قیافہ شناس کی گواہی 422

میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں 423

تحقیر؛ فتنہ میں مبتلا کرتی ہے 423

”قانون کی نگاہوں میں سب برابر ہیں“ کا مطلب 424

لوگوں کے راستے میں یالوگ جہاں سایہ حاصل کرتے ہوں یاپانی کی جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنے کی ممانعت 426

لعنت والے دوکام 427

ایک اورمسئلہ 428

ٹھہرے ہوئےپانی میں پیشاب وغیرہ کرنے کی ممانعت 429

باپ کااپنی اولادمیں سے کسی کوبخشش اورہدیے کے معاملہ میں ترجیح اورفضیلت دینا 430

واقعۂ روایت کا پس منظر 432

روایت سے مستنبط مسئلہ اورحکم 434

ہمارے معاشرہ کارواج 435

اولاد کویکساں نہ دینے کے نقصانات 435

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے والوں کے لیے ہدایات 437

مخصوص حالات میں کمی بیشی کی اجازت ہے۔۔فطری کمزوری 438

دینی مشغولیت 439

دلی چاہت اوررائے 440

یہ سوچ بالکل ہی غلط ہے 441

سوچو؛کس کی ماننی چاہیے! 441

کون سی کمائی عمدہ ہے! 442

خلاصۂ کلام 443

کسی عورت کا کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا 444

(ترکِ زینت کرنا)حرام ہے،سوائے شوہر کے؛ 444

شوہر کی موت پر چار مہینے دس دن (ترک زینت کرکے) سوگ منانے کی اجازت ہے 444

سوگ منانے میں ہمارے معاشرہ کا طرز 445

تعزیت بھی تین دن تک ہی ہوسکتی ہے 446

حضرات اُمہات المؤمنین کا طرزِ عمل 447

روایت کے اسباق 448

یہی جذبہ مطلوب ہے 450

شہر کے رہنے والے کا دیہاتی کے لیے فروختگی کا معاملہ کرنا اور 451

جو قافلے مال لے کر شہر میں بیچنے کے لیے آرہے ہوں ان سے شہر سے باہر بالا ہی بالا سودا کرلینا 451

اوراپنے بھائی کے سودے پر سودا کرنا 451

اورکسی کے پیغامِ نکاح پر پیغامِ نکاح دیناان سب باتوں کی ممانعت 451

”غُرَر“اور ”ضَرَر“ 454

پھرتوحرج نہیں........ 455

ایجنٹ اور دلال نہ بنے 456

کسی بھی طرح نقصان پہنچانے سے منع فرمایا........ 457

”رِنگ (Ring)بنانا“کیساہے؟ 458

بھاؤبڑھانے کی دوشکلیں 460

اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے 460

اپنےبھائی کے بھاؤپر بھاؤ نہ کرے........ 461

ہاں !اس کی اجازت ہے 462

خریدنے پر خریدنابھی ممنوع ہے........ 462

پیغامِ نکاح پر پیغام دینے کی شکلیں 463

طلاق کا مطالبہ نہ کرے 464

اس کے لیے وہی ہے جو اس کی قسمت میں لکھا ہے 465
یہ بھی دھوکہ کی ایک شکل ہے 465
اگر وہ خود اجازت دے تو 466
شریعت نے جہاں مال خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی ہے وہاں مال خرچ کر کے ضائع کرنے کی ممانعت 468
وضو کے پانی میں بھی اسراف کا گناہ ہے 469
تمام فقہاء نے بالاتفاق حرام لکھا ہے 469
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ 470
اپنی چیز بھی سلیقہ سے استعمال کریں 471
بائیک پر دو سے زیادہ سواری منع ہے 472
پسندیدہ اور ناپسندیدہ تین باتیں 473
حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) کا خط 474
کسی مسلمان کی طرف ہتھیار یا اس جیسی کسی چیز سے اشارہ کرنے کی ممانعت 476
چاہے وہ واقعۃً ہو یا مذاق میں ہی ہو، 476
اور کھلی ہوئی تلوار کسی کو دینے کی ممانعت 476

شاید شیطان اس کے ہاتھ سے چھڑوادے 477

کھلی ہوئی تلوار دینا منع ہے 478

اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نکلنا منع ہے؛ مگر یہ کہ کوئی شرعی عذر ہو.................... 480

کوئی خوشبودار چیز (پھول وغیرہ) کوئی آدمی دے تو بلا وجہ اس کو نہ لینا ممنوع ومکروہ ہے................ 482

کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے کی کچھ شرائط کے ساتھ ممانعت 484

اس کی پشت ہی کاٹ دی.. 484

کسی کی تعریف کرنے کے متعلق معتدل تعلیمات.. 485

اس کے چہرہ پر مٹی ڈالو 487

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) کا تجزیہ 488

دلال اور گھوڑا... 490

معتدل بات.. 491

جن کو ہر دورازے سے پکارا جائے گا 491

شیطان بھی راستہ بدل لیتا ہے 493

تعریف کے مقاصد الگ ہوتے ہیں 495

جہاں وبائی بیماری پھیلی ہوئی ہو وہاں سے نکل بھاگنا یا وہاں جانا مکروہ ہے............................ 496
تم جہاں کہیں بھی ہو گے، موت تم کو پکڑ لے گی 496
ایک عبرتناک واقعہ 497
اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو 499
دَورِ فاروقی کا ایک واقعہ 502
مہاجرین اولین 507
طاعون.. 508
مناقبِ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح (رضی اللہ عنہ) 509
حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا الہامی جواب 510
تقدیر اور تدبیر 510
"اگر مگر" شیطان کا دروازہ کھول دیتا ہے 512
طاعون زدہ علاقہ سے نکلنے کی تین صورتیں 514
طاعون زدہ علاقہ کے متعلق حکم.. 515
جادو کے سخت حرام ہونے کا بیان 516

جادو کی حقیقت 516

شیاطین سے زیادہ احمق دوسری کوئی قوم نہیں........ 519

جادو سیکھنا سکھانا کفر ہے 520

جادو کے متعلق اسلامی حکم 521

ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو 522

جادو میں شعائر اللہ کی توہین کرنی پڑتی ہے 522

کیا قتل حلال بھی ہے؟ 523

پاک دامن پر تہمت لگانا 524

کفار کی سرزمین میں قرآنِ کریم لے کر جانے کا حکم 525

سونے چاندی کے برتن کو کھانے پینے 526

اور پاکی میں استعمال میں لینا حرام ہے 526

کافروں کے لیے دنیا میں اور ہمارے لیے آخرت میں 527

سر پھوٹ جاتا 528

برتن بدل دو........ 529

زعفران سے رنگا ہوا کپڑا مرد کے لیے پہننا حرام ہے 530

یہ کافروں کا لباس ہے 530

دن بھر خاموش رہنے کی ممانعت 532

عبادت سمجھ کر خاموش رہنا جائز نہیں 533

آدمی کا خود کو اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا 535

اور غلام کا اپنے آزاد کرنے والے آقا کے علاوہ 535

کسی دوسرے کی طرف آزاد کرنے والا ہونے کی نسبت کرنا حرام ہے 535

حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کا واقعہ 536

موجودہ دَور کا غلط دستور 539

اس نے کفر کیا 540

اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت 540

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے پاس مخصوص علم تھا؟ 542

کیا حرم مدینہ کا حکم حرم مکہ جیسا ہی ہے؟ 543

جسے کسی کی طرف سے بھی امان دیا گیا 544

یہ سراسر خیانت ہے 545

سخت وعید 545

اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ نے جن کاموں سے منع کیا ہے 547

ان کاارتکاب کرنے سے ڈرانے کابیان 547

ارشاداتِ ربّانی 547

اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے 548

قرآنی آیات 549

گناہ کی تلافی 551

فہرست کتاب

اداریہ 15

ظہورِ مہدی، فتنۂ ظہورِ دجّال، نزولِ حضرت مسیح 20

پانی آگ اور آگ پانی 31

ختمِ دجّال کے بعد کا منظر 33

دجّال مکہ ومدینہ میں داخل نہیں ہوسکے گا 37

دجّال کے لشکر میں ستّر ہزار یہودی ہوں گے 38

فتنۂ دجّال کے وقت اہلِ ایمان کا حال 38

دجّال سے بڑا کوئی فتنہ نہیں 39

ایک مؤمن اور دجّال کا مقابلہ 39

دجّال کے پاس روٹیوں کا پہاڑ اور پانی کی نہر ہوگی 41

ہر نبی نے دجّال سے ڈرایا ہے 42

وہ ایک بات جو کسی نبی نے نہیں بتائی 43

اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں عیب نہیں ہے 43

قیامت سے پہلے مسلمان اوریہودیوں کی جنگ ہوگی 44

قربِ قیامت ٹینشن انتہا کو پہنچ جائے گا 45

دریائے فرات میں سے سونے کا پہاڑ نمودار ہوگا 46

پالتوجانور بھی وحشی بن جائیں گے 47

مال کی کثرت ہوجائے گی 48

قربِ قیامت کی دو نشانیاں ؛ مال اور عورتوں کی کثرت 49

دلچسپ واقعہ 50

دلچسپ فیصلہ 51

نیک لوگ آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہوں گے 53

اصحابِ بدر کی فضیلت 54

عمومی عذاب کی لپیٹ میں سب ہی آجاتے ہیں 54

اسطوانۂ حنّانہ 55

جامع روایت 57

حضورِاکرم(ﷺ) کی نوش فرمائی ہوئی ایک غذا(ٹڈی) 58

ایمان والابڑا محتاط ہوتاہے 58

وہ تین آدمی جن سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتے ہیں.. 59
دو صور کے درمیان کا فاصلہ.. 62
جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو.. 63
امانت کے ضائع ہونے کا مطلب.. 65
ذمہ دار کی کوتاہی کا وبال اسی پر.. 66
بہترین لوگ.. 67
پابہ زنجیر جنت میں.. 68
حضرت ثمامہ بن اُثال (رضی اللہ عنہ) کے اسلام لانے کا واقعہ.. 69
وہ کہاں اور تم کہاں !.. 71
محبوب ترین اور مبغوض ترین جگہیں.. 72
بازار شیطان کا دارالسلطنت ہے.. 73
حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی امت کے لیے دعائے مغفرت.. 74
بے شرم بن، پھر جو چاہے کر.. 75
قیامت کا سب سے پہلا فیصلہ.. 76
کون کس چیز سے بنا؟.. 77

قرآنِ کریم کا عملی نمونہ........ 78

مؤمن اور کافر کی موت کا منظر........ 78

شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے........ 80

غزوۂ حنین........ 82

ابوسفیان بن حارث اور عبداللہ بن ابی اُمیہ کے اسلام کا قصہ........ 89

رزقِ حلال کی اہمیت........ 92

ناپاک کپڑا ناپاکی کے ذریعہ پاک نہیں کیا جاسکتا........ 94

غلط فہمی نہ ہو........ 95

حلال مال کھاؤ اور نیک عمل کرو........ 97

روزی کا قدرتی اثر........ 97

ایک لقمہ کا اثر........ 98

شاہ جی عبداللہ کا واقعہ........ 99

ظالموں کو اہل اللہ کا مال راس نہیں آتا........ 100

بہترین مثال........ 101

گناہ نہ چھوٹنے کا ایک اہم سبب........ 102

جو گوشت حرام غذا سے پرورش پائے 103

اجازت کے بغیر ذبح کی ہوئی بکری 103

آقا اور غلاموں کے احوال کا فرق 104

ایک اہم تعلیم 105

ہمارے اکابر اور نعمتوں کی قدر دانی 105

ظریفانہ مقولہ 106

میں اپنا تھوکا ہوا چاٹ بھی سکتا ہوں 107

حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا احتیاط 108

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا احتیاط 109

امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی احتیاط 111

جس کی غذا حرام ہو گی 112

تہامہ پہاڑ کے برابر نیکیاں ضائع 113

ایک زمانہ آنے والا ہے 113

دعا قبول نہیں 114

نماز قبول نہیں 114

ناقابلِ معافی تین گناہ 116

دنیامیں جنت کی چار نہریں ! 118

جنت کی نہروں کا مطلب 119

محققین کاراجح قول 120

کون سے دن کیاپیدا کیاگیا؟ 121

جنگ موئتہ اور حضرت خالدبن ولیدؓ 122

دوہرااجر؛ورنہ ایک ثواب 128

بخاراوراس کا علاج 129

میت کے ذمہ فرائض باقی ہوں تو؟ 130

حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے حضرت عائشہؓ کی ناراضگی کاقصہ 132

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی تمنا 138

حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنی امت کے بارے میں خدشہ 138

پوری امت کے لیےبڑی تسلی کی بات 142

حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نےپورے دن وعظ فرمایا 142

نیکی کی نذردرست ہے،گناہ کی نہیں 143

گرگٹ، چھپکلی کو مارنے میں نیکیاں ملیں گی 144

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے چھپکلی مارنے کے لیے بھالا رکھا 146

اخلاص سے دیا ہوا صدقہ فائدہ سے خالی نہیں [ایک قصہ] 146

قصۂ شفاعت درمیدانِ قیامت 150

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے توریہ کے تین واقعات 158

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اوران کے گھرانے کی قربانیوں کی تاریخ 164

کھمبی منّ کی قسم ہے 177

کھُمبی کا پانی آنکھ کے لیے شفاء ہے 179

استغفار کے متعلق آیاتِ قرآنیہ 181

عذاب الٰہی سے بچانے والی دو چیزیں 182

اللہ کے علاوہ کون معاف کرنے والا ہے 183

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا استغفار کا اہتمام 184

روزانہ ستّر سے زیادہ مرتبہ استغفار 185

انسانوں کی پیدائش کا ایک خاص مقصد 186

گناہ کا مادّہ رکھنے کی پہلی وجہ 188

دوسری وجہ 189

حضرت آدم (علیہ السلام) کی صفتِ عبدیت 190

صفتِ غفاریت کا ظہور اس طرح ہو گا 192

ایک مجلس میں سو مرتبہ استغفار 192

استغفار پر تین بڑے بڑے وعدے 193

جو وعدے تقویٰ پر وہی استغفار پر 194

استغفار کے ایک جملہ پر عجیب نتیجہ 194

سیّد الاستغفار 195

عبادات کے اختتام پر استغفار 197

زندگی کے آخری ایام میں استغفار کی کثرت 198

استغفار سے شرک کے علاوہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں 199

عورتوں کو کثرت استغفار کا حکم 201

جنت میں کدورت اور تھکاوٹ نہیں ہو گی 203

یہی وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنائے گئے 205

خوشحال آدمی کے لیے جو ہو سکتا ہے وہ سب جنت میں ہو گا 206

مقربین کے لیے جنت کا ایک چشمہ 207

جنتیوں کو قضائے حاجت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی 208

اللہ کا ذکر سانس کی طرح جاری رہے گا 209

آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان 210

جنت میں داخل ہونے والی پہلی دو جماعتوں کی کیفیت 211

جنت اور اس میں جنتیوں کے لیے تیار کردہ نعمتوں کا بیان 214

جنت کی نہروں ، پہاڑوں 216

یاجوج ماجوج کے خروج کے وقت ان نہروں اور قرآنِ کریم کے اُٹھنے کا بیان 218

جنت کے درختوں پھلوں اور ان پھلوں کا بیان 221

جو دنیا میں جنت کے پھلوں کے مشابہ پائے جاتے ہیں 221

جنت کے درخت اور نہریں ،جنت والوں کے کپڑے، گھوڑے اور اونٹنیاں بنائیں گے 225

جنت کے دروازے، ان کی تعداد،اور یہ کہ وہ کس کے ہوں گے، 227

ان کے نام کیا ہیں ؟ اور وہ کتنے کشادہ ہوں گے؟ 227

جنت کے درجات کا بیان اور یہ کہ مؤمن کو کون سا درجہ ملے گا 231

بالاخانوں اور اس کے مستحقین کا بیان 234

جنت کے محلّات،مکانات اور کمروں کا بیان.. 238
اور یہ کہ وہ مؤمنوں کو کس طرح حاصل ہوں گے.................................... 238
جنت کے خیموں اور بازاروں کا بیان.. 239
جنت میں کوئی شخص بغیر پاسپورٹ کے داخل نہ ہوسکے گا........................... 241
اہلِ جنت کے مراتب،عمریں ، لمبائی، شباب،بالاخانوں ، کپڑوں ، کنگھیوں،دھونی،بیویوں اور عورتوں وغیرہ کا بیان
.... 242
بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں ،ان کی گفتگو.. 246
اور عورتوں کا جواب اور ان کے حسن وجمال کا بیان.................................. 246
موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں کا مہر اعمالِ صالحہ ہے................................ 248
حوریں کس چیز سے پیدا کی گئیں.. 252
دنیامیں جو کنواری سے شادی کرے گا 253
وہ آخرت میں اس کی بیوی بنے گی 253
جنت میں ہر نعمت دائمی اور ابدی ہوگی... 255
نہ وہ پرانی ہوگی اور نہ اس کو فنااور زوال ہوگا....................................... 255
جنتی عورت دنیاوالے اپنے شوہر کو دنیا ہی میں دیکھتی ہے.............................. 255

جنت کے پرندوں ، گھوڑوں اور اونٹوں کا بیان 257

دنبے اور بکرے کا جنت کے چوپایوں میں سے ہونے کا بیان.............................. 259

جنت میں کم سے کم تر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر درجے والے کو کیا کچھ ملے گا؟........................... 259

اللہ جل شانہ ٗ کی رضا کا پروانہ جنتیوں کے لیے 262

جنت کی تمام نعمتوں سے افضل ہے 262

اللہ جل شانہ ٗ کا دیدار جنتیوں کو تمام نعمتوں سے زیادہ محبوب ہو گا 262

سب سے کم درجے والا اور سب سے اونچے درجے والا کون؟.............................. 265

سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والے جنتی کی جنت 267

’’One piece‘‘ جنت 269

جنت کا ایک درخت اور اس کا سایہ!.. 270

جنتیوں کا اپنا الگ بنگلہ ہو گا.. 271

جنت کی ایک کمان کی لکڑی کا آدھا حصہ دنیا سے بہتر ہے.. 272

جنت کا بازار اور اس کی کیفیت.. 273

ہر جنتی کا مکان دور دور ہو گا 274

جنت میں ایسی نعمتیں ہوں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، 275

نہ کسی کان نے سنی،نہ کسی کے دل میں خیال اوروسوسہ گزرا 275
جنتی ہمیشہ نعمتوں میں رہیں گے 275
جنتی تمناکرے گاوہ سب اور اس کا دوگنادیاجائے گا 276
اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی جس کے بعد کبھی ناراضگی نہیں 277
ہر ایک کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدارآسانی کے ساتھ ہوجائے گا 278
اللہ تعالیٰ کادیدار جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہوگا 278
تکمیل پر اظہارِ مسرت کی اصل 297
حضرات اکابر کا معمول 300
تکمیلِ بذل المجہود پرحضرت سہارن پوریؒ کااظہار مسرت اور دعوت 301
لامع الدراری کی تکمیل پر حضرت شیخ کی شادمانی 304
تکملۂ فتح الملہم کی تکمیل پر شیخ الاسلام کاسرور وابتہاج 305
کتاب کا پس منظر 308
تشکر وامتنان 309
اعتذار 313
آخری گزارش 315

جلد اول (۱) 316
جلد دوم (۲) 316
جلد سوم (۳) 317
جلد چہارم (۴) 318
جلد پنجم (۵) 319
جلد ششم (۶) 320
جلد ہفتم (۷) 321
جلد ہشتم (۸) 322
جلد نہم (۹) 324
جلد دہم (۱۰) 326
جلد یازدہم (۱۱) 328
جلد دوازدہم (۱۲) 329
جلد سیزدہم (۱۳) 330
جلد چہاردہم (۱۴) 332

عرضِ ناشر

حامداً ومصلیاً ومسلماً: —امابعد

تمام تعریفیں اس ذات وحدہٗ لاشریک لہٗ کے لئے ہیں جس کی طرف سے ہر زمانہ میں رشدو ہدایت اور رحمت کی ایسی لہریں چلتی ہیں جن کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنا؛ دنیوی واخروی فلاح و بہبود کا ذریعہ ہے۔اور ہر ہر لمحہ درودوسلام کی بارش نازل ہو نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس پر؛ جن کی زبان مبارک سے بہنے والا کلام کا مینھ جب دلوں کی مردہ کھیتیوں پر برستا ہے تو وہ کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں۔

اللہ رب العزت کا فضل وکرم ہے کہ اس نے ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کی پہلی جلد منظر عام پر آنے کی شکل وصورت پیدا فرمائی، ہر شب یکشنبہ کو بعد نمازِ عشاء، مسجد انوار، نشاط سوسائٹی سورت میں حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم ومدت فیوضہم کا عمومی درسِ حدیث کا مقبول سلسلہ پچھلے کئی سالوں سے جاری ہے، اس درس کا کتابی شکل میں اشاعت کا کام بھی ہورہا ہے جس کی اب تک دس قسطیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور تقریباً ختم ہو چکی ہیں۔قارئین کی طرف سے ان قسطوں کی دوبارہ اشاعت کا شدید تقاضہ ہورہا تھا، تو مناسب معلوم ہوا کہ اب قسط وار اشاعت کے بجائے جلدوار اشاعت کا کام کیا جائے۔اب تک کے شائع شدہ موضوعات میں جو حدیثیں ریکارڈ نہ ہونے کی وجہ سے شائع ہونے سے رہ گئی تھیں اور حضرت اقدس دامت برکاتہم نے ان احادیث کا تکملہ بھی فرمادیا ہے؛ ان کا بھی اس مجلد سلسلہ میں اضافہ کردیا گیا ہے۔اس سلسلہ کی یہ پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں پہلی تین قسطوں کو مع اضافہ جمع کردیا گیا ہے۔

قارئین دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ یہ سلسلہ جلد از جلد سہولت وعافیت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچائے اور حضرت اقدس دامت برکاتہم کے فیض کو عام وتام فرمائے۔آمین۔

﴿مختصر تعارف امام نووی﴾
(صاحبِ ریاض الصالحین)

امام حافظ شیخ الاسلام محی الدین ابوزکریا یحی بن شرف بن مری بن حسن بن حسین بن محمد بن جمعہ بن حزام نوویؒ محرم ۶۳۱ھ میں دمشق کے ایک گاؤں نویٰ میں پیدا ہوئے وہیں پلے بڑھے اور قرآن مجید حفظ کیا۔

یاسین بن یوسف مراکشیؒ کا بیان ہے کہ میں نے امام نوویؒ کو نویٰ میں دیکھا جب ان کی عمر دس سال کی تھی، بچے ان کو اپنے ساتھ کھیل میں شریک ہونے کے لئے مجبور کررہے ہیں اور امام ان سے بھاگ رہے ہیں اور بچوں کے مجبور کرنے کی وجہ سے رو رہے ہیں، اور ایسی حالت میں بھی قرآن کریم پڑھ رہے ہیں، یہ دیکھ کر میرے دل میں ان کی محبت بیٹھ گئی۔ان کے ابا نے ان کو ایک دکان میں رکھ دیا تھا مگر ان کا حال یہ تھا کہ ہر وقت قرآن پڑھنے میں لگے رہتے، دھندے کی طرف دھیان نہ دیتے جب میں نے اس چھوٹی عمر میں قرآن کریم سے ان کا یہ شغف دیکھا تو میں ان کے استاد کے پاس گیا، اور اُن کو اِن کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی اور کہا: کہ مجھے امید ہے کہ یہ اپنے وقت کا بڑا عالم اور بزرگ بنے گا،لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں گے،تو ان کے استاد مجھ سے کہنے لگے: کیا تم نجومی ہو،غیب کی خبریں بتانے والے ہو؟ میں نے کہا: نہیں! لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بات میری زبان سے کہلوائی ہے،ان کے استاد نے یہ بات امام نوویؒ کے والد سے کہی تو ان کو بھی شوق پیدا ہوا، اور پھر یکسوئی کے ساتھ ان کو قرآن کریم ختم کرنے کا موقع دیا، اب امام بلوغ کے قریب پہنچ چکے تھے۔

پھر آپ نے علم حاصل کرنے کے لئے دمشق کا سفر کیا امام نوویؒ کا بیان ہے: ''جب میری عمر ۱۹/سال کی ہوئی تو میرے والد مجھے ۶۴۹ھ میں دمشق لیکر آئے ، میں مدرسہ رواحیہ میں رہنے

لگا، دوسال ایسے گذرے کہ زمین پر کمر ٹیکنے کی نوبت نہیں آئی، اور مدرسہ سے جو وظیفہ ملتا تھا اسی پر گذران ہوتا تھا، تقریباً ساڑھے چار مہینے میں ''التنبیہ'' حفظ کر لی، سال کے باقی حصہ میں ''المھذب'' کے عبادات والے حصہ کا چوتھائی حفظ کیا اور اس کی شرح لکھنی شروع کر دی اور تصحیح کے لئے میں نے ہمارے شیخ کمال اسحاق مغربیؒ کا دامن پکڑ لیا، جب انہوں نے میرا علمی مشغلہ اور لوگوں سے بالکل نہ ملنا دیکھا تو مجھ سے بہت خوش ہوئے اور مجھے بہت زیادہ چاہنے لگے اور اپنے حلقۂ درس میں جماعت کے اکثر حصہ کے سامنے درس کو دہرانے کی ذمہ داری میرے سپرد فرمادی''۔

ایک مرتبہ مجھے خیال آیا کہ علم طب پڑھنا چاہئے، یہ خیال آتے ہی میں نے فن طب کی مشہور کتاب ''القانون'' خرید لی، اور علم طب پڑھنے کا پکا ارادہ کر لیا، لیکن ان دنوں میرے دل پر ایسی ظلمت چھائی کہ کسی بھی کام میں دل نہیں لگتا تھا، جب میں نے غور کیا کہ آخر یہ ظلمت کہاں سے داخل ہوگئی تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ یہ ظلمت علم طب میں مشغولی کی وجہ سے ہے، اسی وقت وہ کتاب میں نے بیچ دی، بلکہ میرے گھر میں علم طب سے متعلق جو کچھ تھا سب نکال دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ میرا دل پھر سے روشن ہوگیا اور اپنی اصلی حالت پر آگیا۔

ایک تذکرہ نویس نے مختلف فنون میں ان کی ۲۸ رتصنیفات کا ذکر کیا ہے ''شرح مسلم، ریاض الصالحین'' اور ''الاذکار'' ان کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہیں

تقویٰ اور زہد میں بھی بڑے مقام پر تھے۔ عیش وعشرت اور آسائش سے دوری، تقوی، قناعت، ورع اور خلوت وجلوت میں اللہ تعالیٰ کا دھیان، اچھے کپڑے، اچھے کھانے اور وضع قطع میں تکلف سے دوری ان کے خصوصی اوصاف تھے، معمولی سالن کے ساتھ روٹی کھانے کا معمول تھا، کچا کپڑا آپکا لباس تھا اور باریک عمامہ کا معمول تھا۔

علاء الدین بن عطارؒ کہتے ہیں کہ وہ دمشق کا میوہ نہیں کھاتے تھے میں نے اس بارے میں ان سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہے کہ ان میووں کے لین دین کی جو شکل دمشق کے بازاروں میں رائج ہے اس میں شرعی اعتبار سے قباحت ہے، باغات یا تو اوقاف کے ہیں یا ذاتی ملکیتیں ہیں دونوں صورتوں میں مالک ایسے لوگ ہیں جن پر معاملات کرنے کی شریعت کی طرف سے پابندی عائد ہے مثلاً بچے پاگل وغیرہ، ان باغات کے منتظمین ان کے اولیاء ہیں اور یہ لوگ سینچائی کرنے والوں کے ساتھ اس طرح معاملہ کرتے ہیں کہ باغات کے اصل مالک سراسر نقصان میں رہتے ہیں، نفع کے ہزار حصوں میں سے بچوں کا صرف ایک حصہ طے کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اولیاء کو شریعت ایسے تصرف کی ہرگز اجازت نہیں دیتی، جب مجھے یہ صورتِ حال معلوم ہے تو میں اپنے لئے پھل کھانا کس طرح صحیح سمجھوں؟

رشید الدین اسماعیل بن معلم الحنفیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے امام نوویؒ کو حمام میں داخل نہ ہونے اور گذران میں تنگی کرنے کے بابت عتاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ حمام میں کیوں داخل نہیں ہوتے ہیں، نیز اتنی تنگ زندگی کیوں گذارتے ہیں؟ مجھے ڈر ہے کہ کہیں آپ کو کوئی ایسی بیماری نہ لگ جائے جو آپ کو اپنے سوچے ہوئے کام انجام دینے سے روک دے، تو مجھ سے فرمانے لگے کہ ''فلاں آدمی نے کثرت سے روزہ رکھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت اتنی کثرت سے کی کہ اسکی ہڈیاں ہری ہوگئیں، میری عبادت اور مجاہدہ تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں ہے''، میں ان کے اس جواب سے سمجھ گیا کہ ان کو نہ دنیا میں کوئی دلچسپی ہے، اور نہ ہماری حالت کی طرف کوئی توجہ ہے۔

امراء اور بادشاہوں کے پاس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلہ میں جاتے ان کو نصیحت کے خطوط لکھتے کہ رعایا کے ساتھ انصاف کریں، ٹیکس کو ختم کریں، اہلِ حقوق کو ان کے حقوق ادا کریں۔

ابوالعباس بن فرحؒ کا بیان ہے کہ شیخ نوویؒ کو تین ایسے مقامات حاصل تھے کہ ان میں سے ایک مقام بھی اگر کسی کو حاصل ہوجائے تو وہ اس قابل ہے کہ اس کی زیارت وملاقات کے لئے مستقل سفر کیا جائے، ایک مقام علم، دوسرا زہد اور تیسرا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر۔

یونینی کا بیان ہے کہ امام نوویؒ نے ایک معاملہ میں بادشاہ کی مخالفت کی، تو بادشاہ غصہ ہوگیا اور ان کے ساتھ سختی کرنے کا ارادہ کیا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا اور بادشاہ بعد میں ان کا گرویدہ ہوگیا، ان کی تعظیم کرنے لگا، کہتا تھا کہ مجھے ان سے ڈر لگتا ہے

۶۷۶ھ میں لوٹ کر پھر سے نویٰ تشریف لائے، اوقاف کی جو کتابیں برائے استعمال لی تھیں سب واپس کیں، اپنے شیوخ کے مقبرہ کی زیارت کی، قرآن پڑھا، دعا کی اور روئے، جو احباب حیات تھے ان سے ملے، اور ان کو الوداع کہا۔

احباب کی ایک جماعت آپ کو دمشق کی طرف روانگی کے لئے رخصت کرنے باہر تک آئی، ان لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ پھر کب ملاقات ہوگی؟ تو آپ نے فرمایا: دوسو سال بعد۔ یہ لوگ سمجھ گئے کہ مراد قیامت ہے۔

اپنے والدِ محترم سے ملاقات کے بعد بیت المقدس کا سفر کیا پھر نویٰ آئے اور بیمار ہوگئے اور اسی بیماری میں ۲۴/ رجب بدھ کی شب میں عالمِ آخرت کو سدھار گئے۔ جب آپ کے انتقال کی خبر پھیلی تو دمشق اور اس کے اطراف میں کہرام مچ گیا، مسلمانوں کو سخت افسوس ہوا، دمشق سے قاضی القضاۃ عزالدین محمد بن صائغ اور ان کے ساتھیوں کی ایک جماعت نماز جنازہ میں شرکت کے لئے نویٰ روانہ ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے اور آپکا حشر انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین کے ساتھ فرمائے (آمین)

(ماخوذ از مقدمہ ریاض الصالحین، مطبوعہ دہلی)

تقریظ

حضرت اقدس سید مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری نور اللہ مرقدہٗ

(پیدائش شوال ۱۳۲۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۳ء ☆ وفات ۲/ رمضان ۱۴۲۲ھ مطابق ۱۸/ نومبر ۲۰۰۱ء)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دو آتشہ شراب اور سونے پر سہاگہ والی مثل مشہور ہے، اس درس پر جو آپ کے ہاتھوں میں ہے دونوں مثالیں پورے طور پر صادق آتی ہیں، درس حدیث کا ہو اور صاحبِ درس ایک صالح خداترس، پرہیزگار، وفا شعار اور عالم باعمل انسان ہو، جس کی طبیعت میں سادگی ہو، فکرِ آخرت ہو، دنیا سے دوری ہو اور امت وملت کا درد ہو یعنی عزیزِ مکرم مولانا مفتی احمد خانپوری ﴿سلمہٗ اللہ وزادہٗ علماً وعملاً﴾ تو اس درس میں جتنی خوبیاں جمع ہوں قرینِ قیاس ہے۔ سورت میں ہونے والے اس درس کا افادہ کھلے طور پر محسوس کیا جارہا ہے، مفتی صاحب کا طرزِ تفہیم بھی نرالا ہے کہ سامعین کی توجہ مکمل طور پر بیان ہونے والے مضمون پر مرکوز ہوجاتی ہے، سامعین تھوڑی دیر کے لئے ماحول سے بے خبر ہوجاتے ہیں، احادیثِ طیبہ کے مضامین کو الہامی مثالوں اور اسلافِ عظام اور بزرگانِ ملت کے واقعات کی مدد سے خوب کھول کر مخاطبین کے سامنے پیش کرنا مفتی صاحب کی خصوصیت ہے، اندازِ بیان ایسا ہے کہ سننے والا اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے، بہت قوی امید ہے کہ اس کی اشاعت سے ان لوگوں کو بھی فائدہ ہوگا جن تک پہنچے گی۔

عزیز موصوف سے قدیم شناسائی ہے، دارالعلوم اشرفیہ میں دورِ طالبِ علمی میں پابندی سے گھر پر آتے، جو وقت طلبہ کے قیلولہ کا ہوتا ہے یہ اُسمیں نقلِ فتاویٰ کا کام کرتے،

سالانہ تعطیلات میں زیادہ سے زیادہ ایام میرے پاس گذارنے کی کوشش کرتے، ایک مرتبہ تو تعطیل کا مکمل زمانہ بشمول رمضان المبارک میرے یہاں گذارا اور فتاویٰ کے کام میں ہاتھ بٹایا اپنے اساتذہ بالخصوص مولانا اجمیری صاحبؒ کے منظورِ نظر اور چہیتے شاگردوں میں سے رہے ہیں، حضرت مولاناؒ کی خاص نظر تھی ان پر۔ اللہ کرے کہ بقیہ قسطیں بھی جلد از جلد منظرِ عام پر آویں، اس راہ کی تمام رکاوٹیں عافیت کے ساتھ ختم ہوجائیں، اس قسط کو اور بقیہ اقساط کو قبولیت اور مقبولیت عطا فرمائے۔

﴿آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم تسلیما کثیرا کثیرا﴾

احقر سید عبدالرحیم لاجپوری غفر لہٗ (بقلم خادم)

۵/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

۲۸/ جولائی ۲۰۰۱ء

تقریظ

حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور دام اللہ فیوضہم بالعافیۃ التامۃ

﴿خادمِ خاص حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ﴾

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

بزرگوں کے ملفوظات اور مواعظ کو افادۂ عام کی غرض سے شائع کرنے کا دستور قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے اور اس کا نفع بھی ظاہر ہے۔

یادگارِ اسلاف جامعِ شریعت وطریقت حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ کے خلیفۂ اجل حضرت اقدس مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب زید مجدہم مفتی و استاذِ حدیث جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل گجرات کی ہفتہ واری مجلس درس حدیث شب یکشنبہ کو سورت میں ہوتی ہے اس کو مولانا عبدالمنان منیار صاحب زید احترامہٗ ٹیپ کے ذریعہ محفوظ کرتے رہے ہیں پھر انہوں نے مولانا سلمان منیار صاحب زید مجدہٗ کے ساتھ مل کر کتابی شکل میں جمع کیا اور اب اس کو طباعت کے ذریعہ منظر عام پر لانے کا ارادہ فرما رہے ہیں۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کا عجیب نظام ہے کہ جو بھی کام اخلاص کے ساتھ کیا جائے اس کے قبول ہونے کی علامت ایک یہ بھی ہے کہ اس کو مخلوق کے نفع اور ہدایت کے لئے عام کرنے کے اسباب آسان طریقہ سے پیدا بھی فرما دیتے ہیں اور خوش نصیب ہیں وہ حضرات جو اس میں حصہ لیتے ہیں اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو قبول فرما کر مخلوق کے لئے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

فقط

(مولانا) ابراہیم غفرلہٗ

۲۲/۶/۲۰ھ

تقریظ

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم بالعافیۃ التامۃ

[سرپرست دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر، مقیم ٹورنٹو۔کینیڈا]

☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین۔ وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

یہ بات مسلّم ہے کہ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، قیامت تک اب کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں، آپ ﷺ نے قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے دو مضبوط چیزیں چھوڑی ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قرن اول سے آج تک ہر دور اور ہر علاقہ میں ایسے علماء پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے دین کے ان دونوں ماخذوں کی تفسیر وتشریح میں اپنی عمریں تمام کردیں اور امّت کے لئے کتاب اللہ اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ سے استفادہ کو آسان بنادیا (فجزاہم اللہ عن المسلمین خیرا)

موجودہ دور میں دنیا کی مختلف زبانوں میں تفاسیر قرآنیہ اور شروحات حدیثیہ کا ایک بڑا ذخیرہ دستیاب ہے اور یہ سلسلہ برابر جاری وساری ہے۔

خدمتِ حدیث شریف کے سلسلے کی ایک کڑی یہ کتاب بھی ہے جو ''حدیث کے اسباق'' کے نام سے ہمارے دو نوجوان فضلاء مولوی عبدالمنان منیار صاحب زادہ اللہ علماً وفضلاً اور مولوی سلمان صاحب منیار سلمہ اللہ تعالیٰ وبارک فی علمہ شائع فرمارہے ہیں۔

یہ ''حدیث کے اسباق'' اُس درس کا خلاصہ اور نچوڑ ہیں جو مصلح العلماء حضرت مولانا

مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہ العالی ہر ہفتہ سورت میں منعقد اصلاحی مجلس میں دیتے ہیں، مولانا موصوف ایک جید الاستعداد اور حدیث وفقہ پر گہری بصیرت کے حامل عالم ہیں اور جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں سالہا سال سے درسِ حدیث وفقہ میں مشغول ہیں اور احادیث کے مفاہیم کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کا اللہ تعالیٰ نے اُن کو خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے، اس لئے ان اسباق کی طباعت ہر خاص وعام کے لئے مفید ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت اقدس مفتی صاحب مدظلہ کی اس عظیم دینی خدمت کو قبول فرمائے، اور اُمّت کو اس سے مستفید ہونے کی سعادت وتوفیق مرحمت فرمائے (آمین)

مولانا عبدالمنان صاحب اور مولانا سلمان صاحب سب اہل علم اور دینی ذوق رکھنے والوں کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ ان حضرات نے اس قیمتی افادات کو شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا، اللہ تعالیٰ ہم سب کی طرف سے ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

علامہ بوصیریؒ نے اپنے مشہور قصیدہ میں فرمایا ہے

دعا الی اللہ فالمستمسکون بہ مستمسکون بحبل غیر منقصم

یقیناً امتِ اسلامیہ کے لئے اس مضبوط رسی کو تھامنے کے علاوہ نجات کی اور کوئی راہ نہیں۔

مپندار سعدی کہ راہِ صفا تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے، اور حسن خاتمہ کی دولت سے مالامال فرمائے [آمین] والسلام

احقر عبداللہ غفرلہ کاپودروی

۹/ذی الحجہ ۱۴۲۳ھ

مطابق ۹/۲/ ۲۰۰۳ء

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

تقریب

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم بنارسی صاحب زید مجدہم

شیخ الحدیث ومفتی جامعہ اسلامیہ بنارس ورکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ امر بندہ کے لئے باعث اعزاز وافتخار ہے کہ بندہ کو اپنے رفیقِ درس اور مخلص دوست حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہم کے افادات بعنوان ''حدیث کے اسباق'' پر چند سطریں لکھنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

۱۳۸۷ھ کا زمانہ حضرت مفتی صاحب کے ساتھ رفاقت کے آغاز کا زمانہ تھا جب حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی قدس سرہ کی خدمت میں دارالافتاء دارالعلوم دیوبند میں رہتے ہوئے مشق افتاء اور استفادہ واستفاضہ کی توفیق حاصل تھی اس وقت بندہ جناب مفتی احمد صاحب کی علمی صلاحیت، استحضار اور اخذ واستنباط کے ملکہ سے مرعوب تھا اللہ تعالیٰ نے فراغت کے بعد جہاں موصوف سے افتاء اور درس حدیث کی خدمت لی؛ وہیں بندگانِ خدا کی ہدایت اور اصلاح کے لئے بھی قبولیت سے نوازا، بفضلہٖ تعالیٰ موصوف کے وابستگان ومستفیدین کا دائرہ گجرات تک محدود نہ رہتے ہوئے افریقہ، امریکہ، ری یونین، انگلینڈ اور بہت سے ممالک تک پھیلا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے علم میں برکت رکھی ہے کہ موصوف کی درس گاہ سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے، ہزاروں فتاویٰ آپ کے قلم سے صادر ہوئے اور وعظ وتذکیر سے بھی بہت بڑا طبقہ مستفید ہو رہا ہے۔

ربّ العزّت جب کسی سے کام لینا چاہتے ہیں تو اس کو مناسب ماحول اور اچھے رفقاء بھی مہیا فرما دیتے ہیں، خوش نصیب ہیں حضرت مفتی صاحب کے وہ خدام جن کو توفیق ہوئی کہ موصوف کے افاداتِ علمیہ کو مرتب فرما کر کتابی شکل میں شائع کرنے کا سلسلہ جاری کر رہے ہیں، اس طرح ان افادات کا دائرہ بھی وسیع ہوگا اور ان کی حفاظت بھی ہو سکے گی۔

خدا کرے یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے اور اس سے بیش از بیش نفع پہونچے، بندہ کا تأثر یہ ہے کہ ان اسباق سے احسان وسلوک کے شیدائیوں کے ساتھ طلبۂ حدیث کو بھی بہت نفع حاصل ہوگا، اپنی کم مائیگی کے سبب خود اگر چہ کچھ نہیں کر سکتا لیکن احباب کے کارناموں سے مسرت ضرور ہوتی ہے۔

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

ابو القاسم نعمانی غفرلہٗ

جامعہ اسلامیہ ریوڑی تالاب۔ بنارس

۱۵/ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ

تقریظ

حضرت مولانا محمد رحمت اللہ صاحب زید مجدہم

بانی و مہتمم دارالعلوم رحیمیہ باندی پورہ ضلع بارہ مولہ کشمیر

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ......امابعد

خوش نصیب ہیں وہ حضرات جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کے مقدس مشغلہ میں لگادیتے ہیں پھر اگر اس کے ساتھ ساتھ بندگانِ خدا کے تعلق کو خدائے برحق کے ساتھ جوڑنے کا عظیم کام بھی ان سے متعلق ہو تو سونے پر سہاگہ ہے، ہدایت کے وجود و بقا کی یہی صورتیں ہیں اور ان کے لئے من جانب اللہ ہی توفیق شامل حال ہوتی ہے ہمارے اکابر رحمہم اللہ تعالیٰ کو یہی امتیاز اللہ پاک نے عطا فرمایا ہے، اسی سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی ہمارے محترم و مخدوم مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری بھی ہیں جو سالہا سال سے مشہور اسلامی علمی مرکز (جس کی عظیم تاریخ وانتساب ہے یعنی جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل) میں بخاری شریف جیسی عظیم کتاب کا درس دیتے ہیں، نیز حضرت اقدس فقیہ الامت جامع شریعت وطریقت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے خلیفہ مجاز ہونے کی حیثیت سے مخلوقِ خدا کی باطنی وروحانی تربیت اور تزکیہ کے اہم فریضہ کو ادا کرنے میں مصروف ہیں ان کے اس درسِ حدیث (جو ایک ہفتہ وار مجلس میں عوام وخواص کے باذوق شائقین میں کئی سال سے مسلسل ہو رہا ہے) کو قدرداں دوستوں نے ضبط کر کے اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔

حدیثِ پاک خود مہتم بالشان ہے پھر اس کی تدریس میں مشغول شخصیت جب ظاہری و باطنی امتیاز سے متصف ہو؛ تو اس کی افادیت ظاہر و باہر ہے۔اس وقت افاداتِ حدیث کے سلسلے کا پہلا جزو ہمارے سامنے ہے جو ظاہری و باطنی خوبصورتی سے آراستہ و پیراستہ ہے، مضامین نہایت سلیس و عام فہم انداز میں بیان ہوئے ہیں جس سے عوام کیلئے بھی استفادہ آسان ہو گیا ہے۔

یہ ناکارہ دل سے دعا کرتا ہے کہ اللہ پاک اس سلسلہ کو مبارک فرمائے اور اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کو آسان بنائے امت کے لئے نافع بنے اور بارگاہِ خداوندی میں قبولیت کی اعلیٰ منزلیں صاحبِ افادات، اس کے جامعین، مرتبین اور ناشرین وقارئین کو اوران کے طفیل میں اس ناکارہ راقم الحروف کو بھی نصیب ہوں۔ وماذالك علیٰ اللّٰہ بعزیز

اس مبارک سلسلہ پر وقت کے مشہور و معروف جلیل القدر عالمِ دین حضرت مولانا مفتی سید عبدالرحیم صاحب لاجپوری نور اللہ مرقدہٗ اور خادم فقیہ الامت حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب دامت برکاتہم کی تقریظ کے بعد مزید کسی تقریظ کی حاجت نہیں، لیکن اپنے محبِّ مکرم مولانا محمد سلمان صاحب سورتی زادہم اللہ علما وعملا وعرفانا کے ارشاد کی بنا پر ان حضرات کی حوصلہ افزائی کے لئے یہ چند سطریں سپردِ قلم کرکے اس کارِ سعادت میں شریک ہوا؛ تاکہ اللہ پاک اس ناکارہ کو بھی اس سعادت سے فیضیاب فرمائے۔ آمین۔

وانا العبد الاواہ الیٰ عفو اللّٰہ

محمد رحمت اللہ عفی عنہ وعافاہ (قاسمی کشمیری)

خادمِ دارالعلوم رحیمیہ بانڈی پورہ کشمیر (واردِ حال جامعہ محمودیہ میرٹھ)

۱۳/ رمضان المبارک ۱۴۲۲ھ

پس منظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حامداً و مصلیاً مسلماً......اما بعد

سیدی ومولائی حضرت اقدس فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نوراللہ مرقدہ وبرد مضجعہ کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے سورت میں مقیم معتقدین و منتسبین خصوصاً محبِّ مکرم مولانا محمد علی صاحب منیار زید مجدہم (خلیفۂ مجاز حضرت اقدسؒ) کا تقاضہ اور اصرار ہوا کہ ہفتہ میں کسی ایک دن آپس میں مل بیٹھنے کی کوئی صورت نکالی جائے، کچھ عرصہ تک اس کو عملی جامہ پہنانے میں تردّد رہا اسی دوران حضرت اقدس مولانا قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی (نوراللہ مرقدہٗ) کی تشریف آوری ہوئی، اور احقر نے احباب کی اس خواہش اور اصرار کا تذکرہ بغرض استصواب کیا تو حضرتؒ نے بڑی حوصلہ افزائی کے ساتھ تاکید فرمائی کہ یہ سلسلہ ضرور شروع کیا جائے، چنانچہ شب یکشنبہ کو اس کے لئے تجویز کرتے ہوئے مسجد ابرار (شالیمار سوسائٹی سورت) میں جمع ہونا طے ہوا، جس کی ترتیب یہ رکھی گئی کہ مغرب کی نماز وہاں ادا ہو اور بعد نمازِ مغرب تا عشاء مجلسِ ذکر ہو اور عشاء کی نماز کے بعد حدیث کا درس ہو، اور اس کے لئے ریاض الصالحین کا انتخاب عمل میں آیا، چنانچہ اس پروگرام پر بنامِ خدا عمل شروع کردیا گیا، نیت یہ تھی کہ احباب کی معیت میں دین کی باتوں کے مذاکرہ سے خود بھی فائدہ اٹھانے کی توفیق ہو، اس طرح یہ سلسلہ بحمداللہ شروع ہوا اور دھیرے دھیرے اس میں شرکت کرنے والوں میں اضافہ ہوتا گیا یہاں تک کہ مسجد ابرار اس کے لئے تنگ پڑنے لگی، بالآخر اس مجلس کو مسجد انوار (نشاط سوسائٹی سورت) میں منتقل کیا

گیا، اور سننے والوں کے ساتھ احقر کو بھی اس سے بڑا فائدہ محسوس ہوا۔

اس مجلس میں ہونے والے درس حدیث کو کیسٹ میں ضبط کرنے کا اہتمام دوسری مجلس ہی سے عزیزِ مکرم مولوی عبدالمنان بن شیخ محمد منیار صاحب نے کیا، جس کا سلسلہ آج تک برابر جاری ہے اب تو اس کو ضبط کرنے والے بھی بہت سے احباب ہو چکے ہیں، عزیز موصوف ہی نے بعض رفقاء کی حوصلہ افزائی اور ترغیب پر ان مجالس کو کیسٹ سے کاغذ پر بذریعۂ قلم اتارنے کا سلسلہ شروع کیا، اور بغرض افادہ اس کی بالاقساط اشاعت کی اپنی خواہش کا انھوں نے احقر کے سامنے اظہار کیا جس کی ان کے دیگر رفقاء نے یہ کہہ کر تائید کی کہ ان شاء اللہ اس کی اشاعت سے بھی اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچنے کی قوی امید ہے، چنانچہ اس سلسلہ کو اپنے لئے باعث اجر وثواب اور ذریعۂ نجات سمجھ کر احقر نے بھی اس کی اشاعت کی اجازت دے دی۔

یہ کوئی باقاعدہ تصنیف وتالیف نہیں بلکہ احباب کی مجلس میں بہ نیت درس کی ہوئی باتیں ہیں جن کو انہی احباب نے تحریر کا جامہ پہنا کر پیش کیا، اس میں جو کچھ قصور اور کمی اور کوتاہی نظر آئے وہ احقر کا حصہ ہے، پڑھنے والے احباب سے اس کی اصلاح کی درخواست ہے ساتھ ہی دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان مضامین کو ہم سب کے لئے مفید اور نافع بنائے۔ ﴿ان أريد الا الاصلاح ما استطعت وما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه أنيب﴾

املاہٗ العبد احمد خانپوری عفی عنہٗ

شب ۲/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ

۲۵/ جولائی ۲۰۰۱ء

افتتاحیہ

حامداً ومصلیاً ومسلماً:-

ہمارے قارئین بخوبی جانتے ہیں کہ آج سے تقریباً ۱۱؍سال قبل حضرتِ اقدس جامع الشریعت والطریقت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے کچھ ہی دنوں بعد حضرت کے سلسلے کو رواں دواں، زندہ تابندہ اور درخشندہ رکھنے کی غرض سے حضرت کے متوسلین کی درخواست والتماس پر ہمارے حضرت الاستاذ مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری ﴿عافاهُ اللّٰه وحفظهُ ووفقنا للاستفاضة منه﴾ نے عنایت فرما کر حضرتِ اقدس صدیقِ عہد، سید قاری صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ سے استصواب اور آپ کے ایماء سے سورت میں ہفتہ واری درسِ حدیث کے لئے آمادگی ظاہر فرمائی۔ ﴿جزاه اللّٰه خيراً وبارك فيه﴾

ہر شب یکشنبہ کو مسجد ابرار میں اور بعد میں مسجد انوار میں بوقت مغرب تشریف لا کر بعد نماز مغرب ذکر جہری کی محفل جاری فرمائی اور بعد نماز عشاء درس ریاض الصالحین۔ عربی زبان کے مضمونِ احادیث کو انتہائی سادہ اور عام فہم زبان میں سامعین کے سامنے پیش فرما کر طالبین کے لئے راہِ عمل آسان فرماتے ہیں۔

مادیت سے آلوداس دور پرفتن میں حضرت اقدس دامت برکاتہم کی یہ قربانی ہم نالائق خدام کے لئے قابل قدر ہے، اپنی راحت اور آرام اور اوقاتِ عزیز کی یہ قربانی ہم سے اپنی قیمت مانگتی ہے؛ اور وہ ہے عمل۔ ہمیں احتساب کرنا چاہیے کہ گیارہ سالہ اس دور میں ہم نے اپنے اندر کیا اچھی تبدیلیاں کیں، ہم نے اپنی کیا اصلاح کی۔ اگر ہمیں اپنے اندر کچھ ایسا محسوس ہورہا ہو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور مزید ترقی کرنی چاہیے، اپنے حالات سے اپنے شیخ ومرشد کو باضابطہ تحریری

طور پر مطلع کرنا چاہیے۔ اور اگر ہمیں اپنے اندر کوئی خاص فرق محسوس نہیں ہوتا، جیسے تھے ویسے ہی ہیں، تو پھر یہ فکر کا موضوع ہے، ہمیں دن بہ دن بلکہ لمحہ بہ لمحہ اپنی باطنی حالت میں اصلاح وترقی حاصل کرنی چاہیے، اور اس کیلئے اپنے مرشدِ مکرم سے مؤدبانہ استفادہ کر کے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے، اس بات کا ہمیں ہر وقت خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری یہ نقل وحرکت محض رسم اور خانہ پری بن کر نہ رہ جائے۔ حالاتِ باطنہ بھی حالاتِ ظاہرہ کی طرح موقع بہ موقع بگڑتے جا رہے ہیں، ایسے میں اگر مسلمان کو کسی مرشدِ کامل کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو اس کے بھکنے اور بگڑنے کے خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ صحبتِ صالحین ہی آج کے پرفتن دور کے زہر کا تریاق ہے۔ ﴿وفقنا اللّٰہ﴾

حضرت اقدس دامت برکاتہم نے ریاض الصالحین از امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کو منتخب فرمایا، کیونکہ صاحبِ کتاب نے اس کتاب کی ترتیب کے وقت بطورِ خاص یہ بات مدنظر رکھی تھی کہ اسے علیٰ ترتیب اصلاح باطن مرتب کیا جائے، کہ پڑھنے والا پڑھتا جائے، عمل کرتا جائے، اور دن بہ دن اپنی حالت درست کرتا جائے۔ یہ کتاب درحقیقت سالک وطالب کے لئے ایک پورا مرتب عملی پروگرام ہے۔

اللہ رب العزت کی توفیق سے یہ درس آج بھی جاری وساری ہے اور ان دروس کو اولاً ''**حدیث کے اسباق**'' اور بعد میں ''**حدیث کے اصلاحی مضامین**'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، اور سالکین کی طرف سے توقع سے بڑھ کر اس کی قدردانی ہو رہی ہے۔ اولاً اقساط واجزاء کی شکل میں دس قسطیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور اب مختلف اقساط کو مکمل جلد کی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا۔ الحمد للہ ایک عرصہ ہوا کہ جلد اول شائقین کے ہاتھوں تک پہنچی، اب ''**جلد دوم**'' غیر معمولی تاخیر کی معذرت خواہی کے ساتھ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے دعا ہے کہ حق تعالیٰ اسے سابق سے زیادہ مقبولیت عطا فرمائے اور زندگیوں میں خوشگوار انقلاب پیدا ہونے کا ذریعہ بنائے۔ حدیث اور سنت کے نور سے پورا معاشرہ معطر ومنور ہو جائے۔ ﴿آمین﴾

اس جلد میں کل آٹھ موضوعات (Chapters) ہیں:-

﴿۱﴾ صدق ﴿۲﴾ مراقبہ ﴿۳﴾ تقویٰ ﴿۴﴾ یقین وتوکل ﴿۵﴾ استقامت ﴿۶﴾ خدا کی مخلوق میں غور وفکر ﴿۷﴾ نیکی کی طرف لپکنا ﴿۸﴾ مجاہدہ۔

﴿۱﴾ صدق یعنی سچائی:- ہمارے معاشرہ میں صرف زبان سے خلاف واقعہ و حقیقت بات نہ بولنے کو سچائی سمجھا جاتا ہے لیکن ہمیں یہ مضمون پڑھنے سے اس لفظ (صدق) کی جامعیت، گہرائی وگیرائی کا اندازہ ہوگا۔ اولیاء کے مختلف مراتب میں سب سے اعلیٰ مقام ''صدیقیت'' ہے۔ یہ مقام ہر انسان حاصل کرسکتا ہے۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ کیسے۔ صرف نیت میں صدق کی کیا برکات ہیں اور اس کی کیا اہمیت ہے۔ دورِ جاہلیت میں بھی کذب (جھوٹ) کو کتنا گندا سمجھا جاتا تھا۔ تجارت میں برکت لانے والی چیز کیا ہے، اور برکت کو ختم کردینے والی چیز کیا ہے؛ یہ متعلقہ احادیث، ان کے ترجمہ اور تشریحات پڑھنے سے معلوم ہوگا۔

﴿۲﴾ مراقبہ:- اس مضمون کے تحت اس کا لغوی واصطلاحی معنیٰ سمجھایا گیا ہے۔ مشہور حدیث جبرئیل مع ترجمہ وتشریح اسی عنوان کے تحت ہے۔ بقول حضرت شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہٗ: تصوف کی ابتداء ''أنما الأعمال بالنیات'' اور اس کی انتہاء ''أن تعبد اللہ کأنک تراہ'' ہے، ہمیں اپنے بارے میں فکرمند ہونے کی ضرورت ہے کہ ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں استحضارِ نیت و حسنِ نیت کا جو سلوک کی ابتداء ہے کتنا اہتمام کررہے ہیں؟ اور پھر انتہاء تک پہنچنے میں کہاں کامیابی حاصل ہوسکتی ہے اگر پہلا زینہ ہی اب تک نہیں چڑھ پائے۔

اسی عنوان کے تحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی ہے جس میں حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں چند مختصر مگر جامع الفاظ میں ایسی قیمتی نصیحتیں ارشاد فرمائی ہیں جو لوحِ دل پر آبِ زر سے نقش کرنے کے قابل ہیں۔

اسی کے تحت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بنی اسرائیل کے تین آدمیوں کا دلچسپ مگر عبرتناک قصہ بھی ہے، سلیم الطبع انسان اسے پڑھ کر محسوس کرے گا کہ میرے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہے، اس میں میرا بھی کہیں امتحان تو نہیں ہورہا ہے، اور اس امتحان میں مَیں کامیاب ہوں یا ناکام۔ کہیں میری حالت اس گنجے اور کوڑھی شخص سے مختلف تو نہیں جن کا قصہ حُدیث میں ذکر ہے

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی اسی میں ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ درحقیقت چالاک اور غبی کون ہیں۔ نیز ذخیرۂ احادیث کی جامع ترین روایات میں جس کا شمار ہوتا ہے وہ روایت بھی مع ترجمہ وتشریح اسی عنوان میں ہے۔ لایعنی کسے کہا جاتا ہے اور اس بارے میں اسلاف کا کیا طرزِ عمل رہا ہے؛ وہ بھی پڑھنے ملے گا۔

اور اخیر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وہ روایت بھی ہے جس کے تحت بیوی کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت ہے، اور کن وجوہات کی بناء پر سرزنش کی شریعت نے اجازت دی ہے؛ اس کی تفصیل ہے۔ اور ناشزہ کی اصلاح کی قرآنی ترتیب کیا ہے؟ حضرت دامت برکاتہم نے ان تمام پہلوؤں کے متعلق قابلِ مطالعہ تفصیلات ارشاد فرمائی ہیں۔ اس کے علاوہ علمی فوائد الگ ہیں۔

﴿۳﴾ تقویٰ:- اس عنوان کے تحت حضرتِ اقدس دامت برکاتہم نے حسبِ عادتِ شریفہ اس عربی لفظ کی جامع مانع اور آسان لغوی واصطلاحی تشریح فرما کر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کی پیش کردہ آیات وروایاتِ حدیث کی عام فہم توضیحات بیان فرمائی ہیں۔

اس عنوان کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا کہ تقویٰ کے کتنے درجات ہیں اور وہ کتنا ضروری ہے۔ اس کے فوائد وفضائل کیا ہیں اور تقویٰ اختیار کرنے سے کیسی برکتیں حاصل ہوتی ہیں موجودہ دور کا اہم مسئلہ روزی کا ہے؛ وہ بھی تقویٰ کی برکت سے کیسے حل ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوگا کہ عزت وشرافت اور ذلت ورذالت کا پیمانہ: مال ودولت، مرتبہ ومنصب نہیں، نہ شہریت وبدویت

ہے، بلکہ صرف اور صرف تقویٰ ہے جو ہر کس و ناکس اختیار کرسکتا ہے۔اوراس کو حاصل کرنے کا آسان طریقہ بھی معلوم ہوگا۔تقویٰ ایسی صفت ہے کہ حضوراکرم ﷺ نے اپنی دعاؤں میں اس کا خاص اہتمام فرمایاہے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں خاص طور پرتقویٰ عن الدنیااوراخص الخصوص طور پر تقویٰ عن النساء(جو موجودہ دور میں سارے فساد کی جڑ ہے) کو مرکز توجہ بنایا گیاہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک زریں رہنمااصول بابتِ یمین بیان کیا گیاہے۔اور اس باب کی آخری روایت میں دخولِ جنت کے موجب چنداعمال جونہایت آسان اور مختصر ہیں؛ محورِ بحث رہے ہیں۔

﴿۴﴾ **یقین وتوکل:**–بظاہر یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں لیکن درحقیقت بوجہ لازم ملزوم ہونے کے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا بہت مشکل ہے،یہی وجہ ہے کہ دونوں کو ساتھ بیان کیا ہے،اوراس کے ذیل میں متعلقہ آیات وروایات جمع فرمائی ہیں۔یقین کے درجات مع امثلہ واضح کئے گئے ہیں۔دنیادارالاسباب ہےلیکن اسباب کا درجہ کیا ہے،اوراس کے احکام کیا ہیں؟ تدبیر کی حیثیت کیا ہے اوراس کو ہم نے کیا درجہ دے رکھا ہے؟ توکل کی حقیقت کیا ہے؟اس کے تعلق سے پیداشدہ غلط فہمیوں کا ازالہ؛ یہ تمام اصلاح طلب امور سامانِ لذتِ خاطر ہیں۔اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ بزرگوں کے تجربات کی روشنی میں توکل حاصل کرنے کا بہت ہی سہل اور آسان نسخہ ہمارے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔بس ضرورت ہے کہ ہم اس کا مطالعہ کرکے اپنی زندگی کو اس صفت سے متصف کرلیں۔

امام السالکین واسوۃ الطالبین حضرت نبی اکرم ﷺ کے یقین وتوکل کی وہ جھلکیاں یہاں پڑھنے کو ملیں گی جوایمان کوتازہ اورروح کوشاداں کردیں۔غزوۂ خندق اورغزوۂ حمراء الاسد کے موقعہ

پر آپ کے جاں نثار صحابہ ﷺ نے کس اعلیٰ درجہ کے یقین وتوکل کا مظاہرہ فرمایا اور خود حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دو ذاتی واقعات جو آپ ﷺ کی قلبی کیفیت کے غماز ہیں؛ تفصیلی تشریحات کے ساتھ موجود ہیں۔

گھر سے نکلتے وقت اور رات کو سوتے وقت توکل وتفویض کی کیا کیفیت ہونی چاہیے، وہ ان اوقات کی ماثور دعاؤں سے معلوم ہوتا ہے۔ دعاؤں کا اہتمام کتنا مفید ہے، اور ہماری طرف سے اس میں کتنی کوتاہی ہے؛ وہ اس مضمون سے معلوم ہوگا۔ توکل کے فوائد وفضائل مزید برآں۔

ہمارے معاشرہ میں ایک عام ابتلاء یہ ہے کہ کمانے والوں کو علمی مشاغل میں منہمک افرادِ خاندان کے مقابلہ میں ترجیح واہمیت دی جاتی ہے، اور علمی ودینی امور میں وقت لگانے والوں کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے۔ اس میں ہماری کیا غلطی ہے؟ صحیح کیا اور کیوں ہے؟ ایک صریح حدیثِ پاک کی روشنی میں حضرت دامت برکاتہم نے اس گتھی کو بڑے خوبصورت انداز میں سلجھایا ہے۔ پڑھئے اور محظوظ ہوجئے۔

اس باب میں کل پانچ آیاتِ مبارکہ اور گیارہ احادیثِ طیبہ مع ترجمہ وتشریح ہیں۔

﴿۵﴾ **استقامت:** - سالک جب بتدریج منازلِ قرب طے کرتا ہے تو شیطان اسے ترقی سے روکنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے، تب ضرورت ہوتی ہے کہ سالک علمی و عملی مشاغل ومعمولات پر ثابت قدم رہے، ڈٹ کر نفس وشیطان کا مقابلہ کرے، ان دونوں کو خود پر غالب نہ ہونے دے۔ استقامت کا تعلق عقائد، اقوال اور افعال تمام سے ہے، دینی ودنیوی امور میں اس سے مفر نہیں۔ اور اس صفت کے حاصل ہونے سے کیا فائدے ہیں اور اس سے محروم کتنے خسارہ میں ہے۔ ہم لوگوں کو عبادات اور معمولات سے فائدہ کیوں نہیں پہنچتا؟ دورِ حاضر کا سب سے بڑا پرابلم (Problem) اور المیہ کیا ہے؟ استقامت کیسے حاصل ہو؟ غلو کیسے پیدا ہوتا ہے؟ یہ

تمام پہلو اس عنوان کے تحت آیات وروایات کی روشنی میں اجاگر کیے گئے ہیں۔حضورِ پاک ﷺ کو واسطہ بنا کرامت کو استقامت کا حکم صاف الفاظ میں بصیغۂ امر دیا گیا ہے۔

﴿۶﴾ **خدا کی مخلوق میں غور وفکر:**- اس میں عبادت کا پہلو کیا ہے؟ قرآنِ کریم میں کہاں کہاں اس کی طرف توجہ دہانی کی گئی ہے اور تفکّر فی عظیم مخلوقات اللہ کا طریقہ اور فائدہ کیا ہے؟ صاحبِ کتاب نے بطورِ نمونہ چار آیتیں درج کی ہیں۔حضرت کے ترجمہ وتفسیر کے ساتھ زینتِ کتاب ہے۔

﴿۷﴾ **نیکی کی طرف لپکنا:**- کبھی کبھی انسان تھوڑی سی سستی کی نحوست سے بڑی بڑی نیکیوں سے محروم رہ جاتا ہے،ضروری نہیں کہ انسان بدتوفیقی اور بے توفیقی کی وجہ سے ہی خیر سے محروم رہے،انسان کے مزاج کی سستی بھی اسے محروم کرتی ہے،اس معاملہ میں انسان کا مزاج مسابق (Competitive) ہونا چاہیے۔آج کا دور تو (Competition) اور مسابقت کا ہے،ہر شعبہ سے وابستہ افراد اس کے قائل ہیں اور خود بھی اس میں لگے ہوئے ہیں،فرق صرف اتنا ہے کہ ہماری یہ دوڑ اور مسابقت دنیوی امور میں ہے،اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دوڑ اور مسابقت اخروی امور میں تھی۔ہمیں کس طرح اپنے زاویۂ نگاہ کو بدلنا ہے؛ وہ اس مضمون کے مطالعہ سے پتہ چلے گا۔ بطورِ عبرت وتمثیل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کا ذکر ہے۔

کون سا صدقہ ایسا ہے جس میں ثواب زیادہ ملتا ہے؟ وصیت کے سلسلہ میں شریعت کے کیا قواعد اور (LAWS) ہیں؟ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے لئے ہماری جو ترتیب ہے وہ کس حد تک درست ہے؟ اور اسلاف کی ترتیب کیا تھی؟ یہ سب چیزیں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت دل نشین پیرایہ میں زیبِ قرطاس ہے۔

دنیا کے حالات دن بہ دن پرفتن ہونے والے ہیں، اس لئے آج کے وقت کو غنیمت سمجھو اور جو اعمالِ خیر انجام دینے کا موقعہ ہاتھ آجائے؛ اس کو ضائع مت کرو۔ اس موضوع پر چشم کشا کلام حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایات کے تحت ہے۔

غزوۂ احد میں حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے کیا نمایاں کارنامے تھے؟ غزوۂ خیبر اور حضرت حیدر رضی اللہ عنہ کے حالاتِ اطاعت، جنگ کی بنیاد کیا ہے؟ یہ سب باتیں اور بہت کچھ علمی جواہر پارے آپ اس عنوان کے تحت پائیں گے۔

﴿۸﴾ **مجاہدہ:-** کسی مقصدِ عظیم کی اہمیت کو علیٰ وجہ البصیرۃ سمجھتے ہوئے اس کے حاصل کرنے کے لئے اپنی تمام تر قوت و انرجی (Energy) کو استعمال کرڈالنا؛ مجاہدہ کہلاتا ہے۔ سالک کے سفر کی ابتداء ہی مجاہدہ سے ہوتی ہے: ؎

اندریں رہ می تراش و می خراش ❖ تا دم آخر دمے فارغ مباش

مجاہدہ کی شکلیں صورتیں تبدل زمان ومکان کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہیں، ہمارے اسلاف کو مجاہدہ کی جو اشکال پیش آئیں، ہم ان کی تاب بھی نہیں لاسکتے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں مجاہدہ سے چھٹی مل گئی۔ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا ضروری ہوتا ہے۔ کیا کھونا ہوگا؟ اس کے لئے وقتاً فوقتاً اپنے شیخ سے ربط کرتا رہے، انہیں حالاتِ ظاہرہ و باطنہ سے آگاہ کرتا رہے۔ ذہنی طور پر ان کی کامل اتباع واطاعت کے لئے خود کو تیار رکھے، اپنی اصلاح کے لئے ہر تلخی کو شیرینی سمجھے، بس لگا رہے: ع ''پیشِ مردے کاملے پامال شو'' کا منظر پیش کرے اور مجاہدہ پر وہ سب کچھ حاصل ہوگا جس کا آیات وروایاتِ مذکورہ درباب میں وعدہ کیا گیا ہے۔

نفس کیا ہے؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس کی کیا خاصیت ہے؟ اور اس کو کیسے قابو میں کیا جاسکتا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جوابات حضرت دامت برکاتہم نے عجیب انداز میں حل فرمائے ہیں۔

خلف کا سلف پر تنقید کا آج کل جو مزاج بنتا جا رہا ہے، اس کی اصلاح بھی اس مضمون میں کی گئی ہے

حضرت نے ایک بار سنایا کہ ایک صاحب بیعت ہونے کے لئے سوچ رہے تھے۔

نفس نے پوچھا: بیعت کسے کہتے ہیں؟ ارشاد: خود کو شیخ کے ہاتھ بیچ دینا۔

نفس: تجھے کیا ملے گا؟ ارشاد: خدا

نفس: کیا یہ پکا ہے کہ خدا مل ہی جائے گا؟ ارشاد: کم از کم اتنا تو پکا ہے کہ کل قیامت میں یہ کہنے کا منہ تو رہ جائے گا کہ آپ کو لینے نکلا تھا۔ نجات کے لئے تو اتنا بھی کافی ہے۔

دو محرومِ انصاف نعمتیں صحت اور فراغت والے مضمون کو پورا انصاف اس کتاب میں دیا گیا ہے منصف مزاج آدمی پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے۔ نبی کریم ﷺ باوجود مرحوم و مغفور ہونے کے کیسا مجاہدہ فرماتے تھے، اس کی جھلک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں قارئین کو دیکھنے ملے گی۔ حضورِ اکرم ﷺ کے خادمِ خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کے عمِ مکرم حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کی اللہ کے راستہ میں قربانی دینے کی تمنا و خواہش اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے صداقت کے سرٹیفکٹ کا واقعہ اسی مضمون کے تحت بالتفصیل موجود ہے۔

اور اخیر میں ایک قابل غور و فکر حدیثِ قدسی ذکر فرمائی ہے جس میں اللہ رب العزت کی عظمت، کبریائی، بڑائی اور جلالتِ شان کے مضامین ہیں؛ جن کے دل میں اتارنے سے ان شاء اللہ زندگی کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے تحت زوردار آیات و روایات کے حسن انتخاب کا نمونہ پیش فرما کر عمل پر آمادہ کرنے والا مواد فراہم کیا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مختصر اینکہ اس زمانہ کا سلوک نسبتاً بہت آسان ہے، لہٰذا انسان کو تسلیم و تفویض، اعتقاد، اطلاع، اتباع اور انقیاد اپنا کر اللہ کا نام لے کر سفر شروع کر دینا چاہیے۔ بقول امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ:

دنیا کی تھوڑی سی راحت وآرام کی قربانی ومجاہدہ کے عوض اللہ تعالیٰ کے یہاں جو مراتب ومقامات ملنے والے ہیں؛ اگرانسان ان کا تصور کرتا رہے تو پھر مجاہدہ بھی آسان ہو جاتا ہے۔

اخیراً مکرم قارئین اور کتاب کے درمیان حائل بنے رہنے کی معذرت خواہی اور اس گذارش کے ساتھ راقم الحروف قلم کو یہیں روک لگاتا ہے کہ ''شعبہ فیض محمود'' آپ کے ہر نوع کے تعاون کا بصمیم قلب خیر مقدم کرے گا۔ دعا فرمائیں کہ حق تعالیٰ اس کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے، استقامت کے ساتھ مزید کی توفیق ارزانی فرمائے، اس سلسلہ کے بعافیت جلد از جلد تکمیل تک پہنچنے کی شکلیں غیب سے پیدا فرمائے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم کے سایۂ عاطفت کو درازتر فرما کر فیوض کو عام وتام فرمائے۔ ﴿آمین﴾

ابوزاہر

۱۹/رجب المرجب ۱۴۲۹ھ

۲۳/جولائی ۲۰۰۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبہ أستعین

﴿افتتاحیہ﴾

اللہ ذوالجلال والاکرام کے فضل وکرم سے ”حدیث کے اصلاحی مضامین“ کی ﴿جلد سوم﴾ ناظرین کے ہاتھوں میں ہے اور قارئین جانتے ہیں کہ یہ سلسلہ ریاض الصالحین کے ان مبارک اسباق کی تحریری شکل ہے جو مجمع عام میں دیا جاتا ہے، حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری (دامت برکاتہم وعمت فیوضہم واطال اللہ بقائہٗ بالصحۃ والعافیۃ التامۃ) احادیث کا ترجمہ و تشریح فرماتے ہیں، لوگ پوری رغبت سے شریک ہوتے ہیں، انہماک سے سنتے ہیں اور فیضیاب ہوتے ہیں۔

درِ فیضِ محمد وا ہے، آئے جس کا جی چاہے

برادرانِ اسلام! حدیث کے اصلاحی مضامین کے مبارک سلسلہ سے وابستگی بڑی سعادت ہے، ادارہ کے لئے بھی اور قارئین کے لئے بھی اور مجلسِ درس میں شرکت کرنے والوں کے لئے بھی۔ ایسی بابرکت محفل میں پیار ومحبت سے دوسروں کو لانا اور ایسی کتابوں کی جانب دوسروں کو متوجہ کرنا؛ جہاں سعادتِ عظمیٰ ہے وہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ایک آسان طریقہ بھی ہے۔ بدی اور فتن کے ایسے دور میں جہاں ہر طرف برائیوں کا بول بالا ہو، اسی کی نشر واشاعت ہو رہی ہو، اور اسی کی لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہو، معروف سے روکا جا رہا ہو اور منکر کا حکم دیا جا رہا ہو، جس کی خبر ۱۴۰۰/سال پہلے ہی حضرت صادق ومصدوق ﷺ دے چکے ہیں؛ کسی صالح انسان سے خود کو منسلک کر دینا اور اس سے قرآن وحدیث کا درس

لینا؛ایسا گوہرِ نایاب ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس فانی جہاں سے رخصت ہونے کے بعد ہی معلوم ہوگی۔آج ضرورت ہے نبوی تعلیمات سے واقف ہوکرانہیں اپنی زندگیوں میں اتارنے کی اوراس کے انوار سے تاریک معاشرہ کومنور کرنے کی۔صالحین اوراہلِ دل کا یہ مقدس گروہ ہمارے لئے جائے پناہ ہے،ان کے دامنِ تربیت سے وابستہ ہوجانے سے شرور وفتن سے حفاظت ہوتی ہے،دل کوسکون واطمینان ملتا ہے۔آج دنیا جس راستہ پر جارہی ہے اور لے جارہی ہے وہ پریشانی اورڈپریشن(Depression)والا ہے۔ ہماہمی اور رواروی کے اس زمانہ میں اگر گھروں میں ایسی کتابوں کواجتماعی طور پربھی پڑھااورسنا جائے توانسان بہت حدتک شرعی تعلیمات سے واقفیت حاصل کرسکتا ہے۔

جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ مزاجِ شرع کو پہچانے بغیراس کے تقاضوں کو چاہتے ہوئے بھی پورانہیں کرسکتے؛ وہیں یہ بھی ایک سچائی ہے کہ علماء ربانیین،اہل اللہ،بزگوں کی مجالس اوران کی صحبتوں سے استفادہ کیے بغیرآدمی مزاجِ شرع کوکما حقہٗ سمجھ ہی نہیں سکتا۔ چونکہ آج کل اس کی ضرورت کااحساس نہیں رہا؛اس لئے ہرجگہ نقصان نظرآتا ہے۔

اگرکوئی شخص صحیح معنیٰ میں اسلام کےمزاج سے واقف ہوناچاہتا ہے،نیزاپنے مزاج میں اعتدال،استقامت،صبروتحمل وغیرہ امور پیدا کرناچاہتا ہے تواسے قرآن واحادیث میں ان مضامین کا،نیزان موضوعات پردستیاب کتابوں کا مطالعہ کرنااور بیانات سننے کے علاوہ ایسے حضرات اہل اللہ سے باقاعدہ عقیدت مندانہ وابستگی جملہ شرائط وآداب کی بجاآوری کے ساتھ قائم کرنی ہوگی؛جن کےفیضِ صحبت سے مزاج شناسی بھی حاصل ہوجائے اورطبیعت و مزاج میں اعتدال واستقامت بھی پیداہو،اوراستقامت درحقیقت اعتدال کالازمی ثمرہ ہے۔

ہمارے ملکی وملی ،سیاسی وسماجی ،انفرادی واجتماعی تمام مسائل کا حل تعلیماتِ نبویہ میں مضمر ہے،اسلامی تعلیمات کی برکات اورغیراسلامی نظام زندگی کی قباحت وشناعت سمجھاتے اور بتاتے ہوئے علماءِ امت کے گلے اورمفتیان کرام کے قلم خشک ہوگئے،علماء اپنے فرائض ادا کررہے ہیں اورجس کے مقدرمیں اسلامی تعلیمات کی مٹھاس چکھنا لکھا گیا ہےوہ اس کو گلے لگا کراپنے دامن کو بھرلیتے ہیں۔ وَالْفَضْلُ مَاشَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَآءُ .

جادو وہ جو سر چڑھ بولے

بڑی سٹپٹانے والی حالت تب ہوتی ہے جب اغیارہمیں تعلیمات اسلامی کی اہمیت اورفضائل بتاتے اورسمجھاتے ہیں،اس کواس کے علاوہ کیا تعبیر دی جائے کہ برسہابرس سے خزانوں کے مالک اورراز دار ہوکربھی ہم مفلسوں اورقلاشوں کی طرح زندگی گزاررہے ہیں۔ بجائے اس کے کہ شریعت وسنت کی پاکیزہ ہدایات سے اپنی انفرادی واجتماعی زندگیوں کومعطرو منور بنا کراغیار کومتأثر کرکے انہیں اپنے بارے میں جاننے اورمعلوم کرنے پرمجبور کرتے؛آج ہم خود ہی ان کے لٹو بن کران کی تھوکی ہوئی گندگیوں کوچاٹ کرخودکواورسماج کومتعفن وآلودہ بنارہے ہیں۔

آج ہماری بہوبیٹیاں جس تیزی سے بے پردگی کی جانب لپک رہی ہیں اس سے کئی گنا تیزی سے اسلام کے ازلی دشمن یہودونصاریٰ کی بیٹیاں-اوروہ بھی کوئی ناخواندہ یا سادہ لوح نہیں بلکہ پڑھی لکھی،سنجیدہ اورسمجھدار- پردہ کو گلے لگا کرخودکودامن اسلام سے وابستہ کرکے عزت وتحفظ کا ایک عجیب وغریب احساس کررہی ہیں۔اگرنومسلم خواتین کا سروے کیا جائے توشایدان میں کی اکثریت وہ ہوگی جواسلام کی ’’پردہ‘‘ کی تعلیم سے متأثر ہوکر

حلقہ بگوش اسلام ہوئیں۔

ہمارے لئے تو ایک ہی بات پلے باندھ لینے کے لئے کافی ہے جو خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے دوٹوک انداز میں کہی تھی: ﴿نَحْنُ قَوْمٌ أَعَزَّنَا اللهُ بِالْإِسْلَامِ، فَإِذَا ابْتَغَيْنَا الْعِزَّةَ بِغَيْرِهِ؛ أَذَلَّنَا اللهُ﴾ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے اسلام ہی سے عزت دی ہے، اگر ہم نے اسلام کے علاوہ کہیں اور عزت ڈھونڈی کہ قعر مذلت میں پڑے۔

آج ہمارا پورا نوجوان طبقہ احساس کمتری میں مبتلا ہے، وہ جس شعبہ میں بھی عزت دار بننا چاہتا ہے؛ وہاں غیروں کی نقالی کو اپنانا ضروری سمجھتا ہے، حالانکہ دوسروں کا طریقہ اگر ڈاڑھی منڈوانا ہے تو ہمارا طریقہ تو ڈاڑھی بڑھانا ہے، اپنے پاؤں صحیح سالم ہوتے ہوئے بیساکھی کون استعمال کرتا ہے؟ آج ہر ملک و مذہب کے ماڈل (MODEL) وقتاً فوقتاً بڑے طمطراق اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ نت نئے فیشن اور اسٹائل (STYLE) لانچ (LAUNCH) کرتے ہیں، تو ہم نے بھی کبھی جرأت و ہمت کے ساتھ اپنی کوئی اسٹائل لانچ کیوں نہیں کی؟ کیا ہمارے کسی طریقہ میں نعوذ باللہ کوئی خرابی یا کمی یا برائی ہے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن ہاں! ہم میں خود اعتمادی نہیں، ہم احساس کمتری کا شکار ہیں۔

آج شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ پوری ہمت و پامردی کے ساتھ ہدایاتِ اسلامیہ اور تعلیماتِ نبویہ کو اپنا کر سنتوں کا ایسا اسٹائل بھرے سماج میں لانچ کرے کہ جس کی نورانیت سے پورا معاشرہ جگمگا اٹھے، جنرل نالج کے طور پر اسلام کے مختلف پہلوؤں کا مطالعہ کر کے بصیرت پیدا کرے، علمی و عملی اعتبار سے مضبوط بن کر تعلیماتِ اسلامیہ میں حرف گیری کرنے والوں کو ایسا دنداں شکن جواب دے کہ وہ اسلام اس کی اعلیٰ تعلیمات کی

بالا دستی ماننے پر مجبور ہو جائیں۔

''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کا یہ سلسلہ بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہے، اس کتاب کا مطالعہ ان شاء اللہ تعالیٰ اسلام کے براہ راست سمجھنے کے لئے بہترین پلیٹ فارم ثابت ہوسکتا ہے، اسے غور سے پڑھئے اور ہر پہلو کو بخوبی سمجھئے، اس کی شفافیت (પારદર્શિકતા) کو دیکھئے، کوئی بھی پہلو ڈھکا چھپا اور گول مول نہیں ہے، سیدھی سادی باتیں ہیں، کوئی اینچ ہے نہ پیچ، کیونکہ مذہب اسلام فطری مذہب ہے ﴿فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا﴾

کسی موضوع پر ٹھوس مطالعہ کرنے سے انسان کو بصیرت حاصل ہوتی ہے، جب بصیرت حاصل ہوتی ہے تو خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور خود اعتمادی ہی اثر انداز ہوتی ہے۔ خود اعتماد شخص دوسروں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا، بقول حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ: ''تم دنیا کے اسٹیج کے ایکٹر نہیں ہو، تم تو دنیا کی تعمیر کے فیکٹر ہو۔'' (الفرقان جولائی ۲۰۰۷ء صفحہ ۱۲)

آج تو ہمارا نوجوان ایکٹر ہی نہیں ہے بلکہ ایکٹروں کا خوشہ چیں اور خاکپائے فاسقاں بننے میں فخر محسوس کرتا ہے، بس! فلاں خان کی ایک جھلک نصیب ہو جائے، اور فلاں کپور کا سایہ پڑ جائے، اس کے جیسے بال ہو جائیں، اور اس کے جیسے کپڑے اور چشمے پہن لوں:-

؎ کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا

نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

اس جلد کے موضوعات (Chapters) یہ ہیں:-

﴿۱﴾ اَلْحَثُّ عَلیٰ الْأَزْدِیَادِمِنَ الْخَیْرِفِیْ أَوَاخِرِالْعُمُرِ
اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت

﴿۲﴾ کَثْرَۃُطُرُقِ الْخَیْرِ
نیکی کے راستے بہت ہیں

﴿۳﴾ الاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَۃِ
عبادات میں درمیانی راہ

﴿۴﴾ الْمُحَافَظَۃُ عَلیٰ الْأَعْمَالِ
اعمال کی پابندی

﴿۵﴾ الْمُحَافَظَۃُ عَلیٰ السُّنَّۃِ
سنتوں کا اہتمام

﴿۶﴾ وُجُوْبُ الْاِنْقِیَادِلِحُکْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی
حکم الٰہی کی تابعداری

﴿۷﴾ اَلنَّھْیُ عَنِ الْبِدَعِ
بدعات سے ممانعت

﴿۸﴾ مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً أَوْسَیِّئَۃً
کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا

﴿۹﴾ اَلدَّلالَۃُعَلٰی خَیْرٍ
بھلائی کی طرف رہنمائی

﴿۱۰﴾ التَّعَاوُنُ عَلیٰ الْبِرِّوَالتَّقْوٰی
نیکی اور تقویٰ میں مدد و تعاون

﴿۱۱﴾ النَّصِیْحَۃُ
خیر خواہی اور بھلائی

﴿۱۲﴾ الأَمْرُبِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ
بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا

﴿۱۳﴾ قول اور عمل میں تضاد پر سخت سزا

﴿۱﴾ اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت:- امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے تحت ایک آیت کریمہ اور پانچ احادیث مبارکہ جمع فرمائی ہیں، آیت کریمہ دیکھنے کو ایک ہے لیکن ہزار باتوں پر حاوی ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم نے اس کی تفسیر کا حق ادا فرما دیا ہے، ضمناً علمی فوائد بھی آگئے ہیں، دلچسپ باتیں ہیں، دل کو چھو لینے والا مواد ہے۔ عمر کا وہ کونسا مرحلہ ہے

جب انسان پر حجت تام ہوجاتی ہے۔ یہ کہنے کا منہ نہ رہے کہ مجھے وقت نہیں دیا گیا تھا، اس باب کی پہلی حدیث میں اس سوال کا جواب ہے۔ واقعی جو ساٹھ کو پار کر چکے ہیں ان کے لئے غفلت کے کوئی معنٰی نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کو اخیر عمر میں کیا کرنے کی تاکید کی گئی، اور آنحضور ﷺ نے اس پر کس طرح عمل کیا، اسے اس باب کی دوسری اور تیسری روایت میں صاف کیا گیا ہے، ضمناً حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی منقبت حضرت فاروق اعظم کی نگاہ میں مفسر قرآن کی وقعت، سورۂ نصر کی تفسیر وغیرہ علمی فوائد ہیں۔

چوتھی روایت میں بتایا گیا ہے کہ وحی کی اکثریت آنحضور ﷺ کی عمر شریف کے کس مرحلہ میں نازل ہوئی۔ آخری روایت میں سفر آخرت کے لئے ہمہ وقت مستعد اور کمر بستہ رہنے کی طرف لطیف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿۲﴾ نیکی کے راستے بہت ہیں: -اس موضوع کا حاصل یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی کسی ایک ہی چیز میں محدود نہیں ہے، بہت سے راستے ہیں جن سے نیکی اور بھلائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس عنوان کے تحت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن اور احادیث میں سے منتخب کر کے وہ آیات و احادیث پیش فرمادی ہیں؛ جن کو خیر و طاعت بتایا گیا ہے۔

یہ درحقیقت شریعت کی جامعیت اور اس کے کامل و مکمل ہونے کا ایک حصہ ہے کہ خیر کو دو چار چیزوں میں محدود نہیں کردیا گیا۔ بعض مزاج تنوع پسند ہوتے ہیں، بعض ہر فن مولیٰ بھی ہوتے ہیں جو کسی میدان میں پیچھے رہنا نہیں چاہتے۔ نیز یہ بات بھی ہے کہ خیر کو اگر دو چار چیزوں میں ہی محدود کردیا جاتا تو بہت سے لوگ وہ ہوتے جو چاہتے ہوئے بھی انہیں انجام نہ دے سکتے، مثلاً صدقہ خیرات، کنواں کھدوانا، بور کروانا وغیرہ، اگر خیر کو انہی چیزوں

میں محدود کردیا جاتا تو ایک غریب شخص جو خود اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا گزارا ہی بمشکل کر پاتا ہے؛ اس کے لئے خیر کے ان کاموں میں حصہ لینا مشکل ہو جاتا۔ اس لئے شریعت نے بتادیا کہ راستہ سے کانٹا پتھر وغیرہ تکلیف دہ چیزوں کو ہٹا دینا بھی ایک نیکی ہے، کسی سے ہنس کر مل لینا بھی نیکی ہے، نرمی سے بات کرنا بھی نیکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس عنوان کے تحت ایک بہت ہی اہم بات یہ ہے کہ جب خیر کے راستے مختلف ٹھہرے تو کسی ایک راستے کو اختیار کرنے والے کو ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسرے راستے والے کو غلط سمجھے یا گمراہ کہے اور تنہا خود کو صحیح سمجھے، جیسا کہ آج کل بہت سے لوگوں سے یہ غلطی ہوتی ہے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم نے اس ذہنیت کی اصلاح کی جانب توجہ دلائی ہے۔

غرض یہ کہ خیر کیلئے شریعت کی طرف سے اتنے سارے راستے اور (Options) دیے گئے کہ ہر طبقہ کا انسان اپنی اپنی سہولت حیثیت اور فرصت کے مطابق خیر میں حصہ لے سکتا ہے، بشرطیکہ خود انسان کو اندر سے شوق و رغبت بھی ہو۔ اگر خود کو ہی شوق و رغبت نہ ہو؛ تو بہانے بنا لینا بہت آسان ہے: ؎

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعنِ اقرباء ❁ تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

تو آیئے! مضمون کو پڑھیں اور معلوم کریں کہ وہ کون کون سے کام ہیں؛ جو خیر ہیں اور ہم ان میں سے کن کن کو انجام دے سکتے ہیں۔

﴿۳﴾ **عبادات میں درمیانی راہ:-** طاعات کے معاملہ میں اعتدال اور میانہ روی سے کام لینا یعنی عبادات کو انجام دینے کے معاملہ میں نہ اتنی سستی دکھانا کہ سرے سے عبادت ہی حذف کر دی، اور نہ اتنا غلو ہو کہ چند ہی دنوں میں آدمی تھک جائے اور اکتا کر ایسا چھوڑ

بیٹھے کہ فرائض کا بھی خیال نہ رہے۔

شریعتِ اسلامی اپنا ایک مخصوص مزاج و مذاق رکھتی ہے جو وہ اپنے متبعین میں دیکھنا چاہتی ہے، اس مزاج و مذاق کا ایک پہلو طاعات وعبادات میں اعتدال کا ہے، شریعت کے اسی مخصوص مزاج کو اجاگر کرنے کے لئے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب (ألاقتصادُ فی الطاعة) قائم فرمایا ہے، اور متعلقہ آیات ونبوی ارشادات (علی صاحبھا الف الف تحیات) پیش فرمائے ہیں۔

قرآنِ کریم یہود ونصاریٰ کو ایک نہیں، دو دو جگہ خطاب کر کے فرماتا ہے: کہ تم اپنے دین کے معاملہ میں (بھی) غلومت کرو۔ (سورۂ نسآء آیت نمبر ۱۷۱، سورۂ مائدہ آیت نمبر ۷۷) سوچنے والی بات ہے کہ دین کے معاملہ میں غلو کی اجازت نہیں؛ تو پھر کسی اور چیز میں کہاں سوال رہ جاتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا مزاج اندھادھندی والا نہیں ہے کہ آؤ دیکھا، نہ تاؤ؛ بس کیے ہی جاؤ! بلکہ اسلام اعتدال پسند اور اعتدال طلب دستور العمل ہے۔ اس میں راز یہ ہے کہ جوشیلا، غالی اور اندھادھند آدمی معاشرہ کے سامنے شریعت کی شکل وصورت کو بگاڑ کر پیش کرتا ہے، جو سرسری سوچ رکھنے والوں کو دین سے متنفر کرتا ہے، ایسے شخص کو لوگ باوجود متشرع ہونے کے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

کسی رسالہ میں ایک قصہ پڑھنا یاد ہے کہ ایک عیسائی کسی عابد سے متأثر ہوکر مسلمان ہوگیا۔ عابد اُسے فجر کی نماز کے لئے اپنے ساتھ لے گیا، نماز سے فارغ ہونے کے بعد حسبِ عادت خود بھی اوراد وتسبیحات وغیرہ میں مشغول رہا اور اسے بھی اسی طرح مشغول رکھا، ظہر سے فارغ ہوکر طویل نفلوں کے بعد کھانے گئے، عصر سے عشاء تک پھر وہی مصلّٰی اور تسبیح، عشاء کے بعد طویل نفلوں کے بعد گھر گئے، ابھی اچھی طرح آرام بھی نہ کر پایا تھا کہ تہجد

کے لئے جگا دیا گیا، دوسرا دن بھی اسی طرح گذرا، اس کا نتیجہ جو آنا تھا؛ وہ ظاہر ہے۔ تیسرے ہی دن عیسائی نے عابد سے معذرت کر لی کہ اس سے تو میرا پہلا مذہب ہی بہتر ہے، اس طرح ایک نادان کی وجہ سے وہ ایمان کی دولت سے محروم ہو گیا۔

ضرورت ہے شریعت کے اس مزاج کو اچھی طرح سمجھنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی۔ آج کل ہمارے معاشرے میں اگر ایک بڑی جماعت ان غافلین کی ہے جو فرائض تک کے اہتمام کے روادار نہیں، دنیا بھر کی غفلتوں اور معاصی کا شکار ہیں؛ تو ان نادانوں کی بھی کمی نہیں؛ جو مزاجِ شرع کو سمجھے بغیر شریعت کے ٹھیکیدار بنے بیٹھے ہیں۔

﴿۴﴾ **اعمال کی پابندی:**۔ فرائض کے علاوہ اللہ رب العزت کا قرب حاصل کرنے کے لئے بندہ جن نوافل کو اپناتا ہے اگر ان نوافل کا فائدہ صحیح معنیٰ میں حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان کو پابندی کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک جگہ حضور اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ فرائض سے زیادہ کسی اور راستہ سے میری نزدیکی اور قرب حاصل نہیں کر سکتا، اور فرائض کی ادائیگی کے بعد قرب کے اعلیٰ مراتب حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا راستہ نوافل ہیں، جن کو ہماری عام زبان میں معمولات کہا جاتا ہے۔ جب ان نوافل کا اہتمام کرتا ہے تو حالت یہ ہو جاتی ہے کہ بندہ خدا سے قریب سے قریب تر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ خدا اس کا کان بن جاتا ہے جس سے وہ سنتا ہے، وہی اس کی آنکھ اور ہاتھ بن جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا اور پکڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی چیز سنتا نہیں، دیکھتا نہیں اور پکڑتا نہیں۔ یہ کیفیت معمولات کی پابندی کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔

اب چاہے یہ معمولات انسان نے اپنے طور پر خود پسند کیے ہوں یا کسی شیخ و مرشد

نے اس کے لئے تجویز کئے ہوں، اگر آدمی ان پر پابندی کرے گا؛ تب ہی جا کر تعلق مع اللہ اورقرب میں ترقی ہوگی، دنیا سے بے رغبتی آئے گی، آخرت کا شوق پیدا ہوگا، دنیا کی امیدیں آرزوئیں (Future Planning) مختصر سے مختصر تر ہوں گی، موت کا ڈر دل سے نکلے گا، اللہ تعالیٰ کی ملاقات کا شوق پیدا ہوگا، اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلہ پر راضی رہنے کی توفیق نصیب ہوگی، اخلاص اور (purity) میں اضافہ ہوگا، ریا اور دکھاوے کے جذبہ سے دوری ہوگی، خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ مضبوط ہوگا۔ پھر نماز میں بھی دل لگتا ہے، تلاوت میں مزہ آنے لگتا ہے، ذکر میں لذت محسوس ہونے لگتی ہے، قلب پر رقت طاری ہوتی ہے، تب "قُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ" (میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کی صحیح تفسیر سمجھ میں آتی ہے۔ کیونکہ خود اس انسان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہی نماز ہوجاتی ہے اور غنائے قلب حاصل ہوگا، یعنی روزی روٹی کے غیر ضروری ٹینشن سے چھٹکارا ملے گا، ان کے علاوہ وہ تمام ثمرات و برکات حاصل ہوں گے؛ جو صرف پابندئ معمولات کی بدولت ہی ملا کرتے ہے، جبکہ پابندی نہ کرنے والے کے لئے کسی بھی وقت طرح طرح کی آزمائشوں سے دوچار ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ آدمی دیکھا دیکھی یا جوشِ عقیدت میں یا کسی کی تشکیل پر کسی مرشد کے دستِ حق پرست پر بیعت تو ہوجاتا ہے لیکن اس بیعت کا نتیجہ (Result) ایک رسم اور رواداری سے زیادہ کچھ نہیں آتا، کیونکہ اس مرشد کامل کی طرف سے جن ہدایات و معمولات کا اسے مکلّف بنایا جاتا ہے؛ وہ انہیں کما حقہ عمل میں نہیں لاتا، غیر ضروری چیزوں کی طرف توجہ زیادہ ہوتی ہے، یعنی شیخ کے پاس کثرت سے آمد و رفت، ان کی نزدیکی حاصل کرنے کا

شوق، ان کے کام انجام دینے میں پیش پیش رہنا وغیرہ۔ لیکن اس سے اگر یہ پوچھا جائے کہ آپ کو جو ہدایات دی گئی تھیں اور جو معمولات بتائے گئے تھے؛ ان کا کیا حال ہے؟ تو جواب صفر ہوتا ہے۔ بعض مرتبہ تو اس کو یہ بھی یاد نہیں ہوتا کہ کونسے معمولات بتائے گئے تھے، کیونکہ کبھی ان معمولات کو ادا کرنے کی نوبت ہی جو نہیں آئی۔ اگر کوئی معمولات و ہدایات پر عمل کرنے والا مل جاتا ہے تو وہ پابندی کی دولت سے محروم ہوتا ہے۔

یہاں ''پابندی'' کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ویسے یہ کوئی ایسا لفظ نہیں جس کی توضیح کی ضرورت ہو، لیکن معلوم نہیں کیوں جب یہ لفظ معمولات کے ساتھ لگتا ہے تو لوگ اس آسان سے لفظ کا مطلب بھی بھول جاتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک دو بار کر لینے کو ''پابندی'' نہیں کہتے اور دس میں سے دو تین کی پابندی کو معمولات کی پابندی تو نہیں کہا جائے گا، جو پابندی صبح کے چائے ناشتہ کی ہے، دو وقت کھانے کی ہے، اتوار کی تفریح کی ہے، شبینہ (رات کی) مجلسوں کی ہے؛ وہ پابندی معمولات میں آئے تب کہا جائے گا کہ معمولات کی پابندی ہو رہی ہے اور یہی پابندی حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں ''ترقی کا زینہ'' ہے۔ انسان کو شروع ہی میں تھوڑی توجہ اور ہمت سے کام لینا پڑتا ہے، بعد میں تو یہ چیزیں حقیقی غذا بن جاتی ہیں، جن کو ادا کیے بغیر آدمی ایک نوع کی بے چینی محسوس کرتا ہے۔

حضرت اقدس مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ مولانا احتشام الحسن صاحب کے حوالے سے یہ واقعہ سناتے تھے کہ مولانا احمد شاہ صاحب نے ایک بار مجھ سے فرمایا: بھائی مولوی احتشام! مجھے کلکتہ جانا ہے، ایک صاحب نے بلایا ہے، وہ ایک مکان تعمیر کرنا چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ اس کی بنیاد میں رکھوں، میری خواہش ہے کہ تم میرے ساتھ چلو،

تمہارے ہاتھ سے بنیاد رکھوادوں گا۔مَیں نے کہا: اچھی بات ہے۔سفر شروع کرنے سے پہلے فرمایا: بھائی مولوی احتشام! تم امیر سفر ہوگے۔کلکتہ پہنچ کر شاہ صاحب کی طبیعت خراب ہوگئی، دست پر دست آنے لگے۔وہ ہمیشہ باوضو رہنے کے عادی تھے، رات کو اٹھتے، قضائے حاجت کے بعد وضو کرتے، کئی مرتبہ ایسا ہوا۔مولانا احتشام صاحب نے فرمایا: حضرت! آپ نے مجھے امیر بنایا ہے، آپ کا بنایا ہوا امیر آپ کی خدمت میں درخواست کرتا ہے کہ آج آپ تہجد کے لئے نہیں اٹھیں گے۔یہ سن کر بالکل خاموش ہو گئے، نہ ہاں کہی نہ نہیں، جیسے گہری سوچ میں پڑ گئے ہوں۔پھر جب صبح صادق ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ رہ گیا تو اس وقت مولانا احتشام صاحب کا انگوٹھا پکڑ کر ہلایا، وہ بیدار ہوئے تو دیکھا کہ شاہ صاحب بے تحاشا رو رہے ہیں۔پوچھا: حضرت کیا بات ہے؟ فرمایا کہ ستاون (۵۷) برس ہوئے مَیں نے حضرت گنگوہیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، اس وقت سے اب تک کبھی تہجد قضا نہیں ہوئی، تم نے منع کر دیا، تم امیر ہو، مَیں حضرت گنگوہی کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ مجھے اجازت دے دو۔ پس مولانا احتشام صاحب نے فرمایا: حضرت! آپ کو اجازت ہے، جس طرح آپ چاہیں کریں۔(ملفوظات فقیہ الامت قسط۳،ص،۶۷) یہ ہے پابندی اور یہ ہے اس کی برکت۔

﴿۵﴾ سنتوں کا اہتمام:- انسان روز مرہ کی زندگی کسی نہ کسی طرح تو گزارتا ہی ہے، کھانا ہے تو کسی نہ کسی طریقہ سے تو کھائے گا ہی، پینا ہے تو کسی نہ کسی طرح تو پئے گا ہی، شادی بیاہ ہے، موت میت ہے، معاشرہ اور سماج میں رہنا ہے، نماز وغیرہ عبادات انجام دینی ہیں، لین دین کرنا ہے، ماں باپ، بیوی بچوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوست احباب کے ساتھ سلوک کرنا ہی ہے، خوشی اور غمی کے مواقع بھی پیش آتے ہیں، غرض کہ ولادت سے لے کر

وفات تک کے ہر چھوٹے بڑے مرحلہ کو کسی نہ کسی سانچہ میں توڈھالنا ہی ہے۔ایک ایمان والے کے ایمان کا اور حضور اکرم ﷺ سے محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے لئے سنت والے سانچہ کو پسند کرے، اور اپنی پوری زندگی اس سانچہ میں ڈھال دے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں یہ روایت نقل کی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنا کام کرے اور اس میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور میری سنتوں کا لحاظ کرے؛ اس کی مثال اُمِ موسیٰ کی سی ہے کہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلائے اور اجرت بھی لے۔ (تفسیر ابن کثیر اردو، پ۲۰۔۴/۲۰)

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ ماجد حضرت اقدس مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: سنت کے مطابق استنجاء کرنا خلافِ سنت دو رکعت پڑھنے سے افضل ہے۔

ایمان والے بندہ کو اس کے فضائل وفوائد سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ محبت والا آدمی فائدے نہیں ڈھونڈا کرتا، اس کو تو ویسے ہی نقالی میں مزہ آتا ہے، دنیا ومافیہا سے بے پرواہ ہو جاتا ہے، کسی چیز کی محبت آدمی کو اندھا اور بہرہ بنا دیتی ہے۔

اس پرفتن دور میں جس تیز رفتاری سے مسلمان سنتوں سے تغافل برت کر غیروں کے طریقوں کی طرف جا رہے ہیں، خاص کر نوجوان طبقہ؛ یہ بڑے ہی دکھ اور افسوس کی بات ہے۔اتنی اتنی ذلتیں اٹھانے کے بعد اور وقتاً فوقتاً کے جانی ومالی نقصانات برداشت کرنے کے بعد بھی بیداری نہ آنا؛ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔آپ ﷺ کی سنتوں کو اپنا کر ہی ہم فتنوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں اگر آپ ﷺ کی نہیں مانی، اور مخالفت والے طرز پر ہی جمے رہے، تو دنیا میں آزمائشوں میں مبتلا ہونا یقینی ہے، اور آخرت میں دردناک عذاب انتظار کر رہا ہے۔ قرآن

کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ اللّٰهم احفظنا منه۔

ہم لوگوں کے لئے بڑے شرم کی بات یہ ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ جن کی نقالی کے جنون میں سنتوں سے (قال سے نہ سہی، حال ہی سے) اظہارِ نفرت کی، آج وہی لوگ روزانہ کی تحقیقات (Researches) سے ہمیں حضور پاک ومطہر ﷺ کے بابرکت طریقوں کی طرف متوجہ کررہے ہیں، جن کی تفصیلات اور نمونے آئے دن اخبارات، مجلّات اور کتابوں میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور دینی مجالس میں ہم سنتے رہتے ہیں۔ اگر اس طرح بھی سنتوں پر عمل کی نیت سے متوجہ ہوجائیں تو شاید غنیمت کہا جاسکے۔

﴿۶﴾ **حکم الٰہی کی تابعداری:-** جب کسی ایمان والے کو کسی معاملہ میں حکم الٰہی بتایا جائے یا اسے کسی بھلی بات کے کرنے کو یا بری بات سے بچنے کو کہا جائے تو اس کا کیا فرض ہے؟ اس عنوان کے تحت آیات وروایات لاکر اسی بات کو واضح کیا گیا ہے۔ مؤمن کے اندر ماننے والی صفت پیدا ہوجائے تو بندہ انمول ہوجاتا ہے۔ علم اور معلومات کی بہتات کے اس دور میں ایسے بندے بہت کم نظر آتے ہیں جنہیں حکم شرع بتایا جائے اور وہ اسے بے چون و چرا قبول کرلیں۔ احکام شرع کی علتیں پوچھتے پھرنے کا ایک عام مزاج بن گیا ہے۔ حضرت اقدس دام مجدہم نے اس کی قباحت وکراہت پر مدلل بحث فرمائی ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک بہترین تفسیری نکتہ بھی اس عنوان کے ذیل میں قارئین کے لئے دلچسپی کی چیز ہے۔

اس عنوان کے تحت جو روایت ہے اس میں حضور اکرم ﷺ کے عہد مبارک کے ایک

خاص قصہ کا ذکر ہے کہ صحابہ کرام ایک آیت کریمہ کے نزول پر متفکر ہوئے اور اپنی الجھن بارگاہ نبوی میں پیش کی تو حضور اکرم ﷺ نے اپنے جاں نثاروں کی کیسے تربیت فرمائی اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا صلہ ملا۔

ضمنی فوائد میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سعادت مندی واطاعت شعاری اور حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کی تسلیم ورضا کے عبرت آموز واقعات ہیں۔

﴿۷﴾ **بدعات سے ممانعت:**۔ بدعت کیا ہے، اور اس کی شناعت کتنی ہے؟ محدثانہ وفقیہانہ شان سے اس عنوان پر بے غبار بحث کی گئی ہے۔ بدعات ورسومات کے فرق کو جس باریک بینی سے واضح فرمایا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ آیات وروایات کی تشریح کی گئی ہے۔ ایصال ثواب میں ہونے والی غلطیوں پر تنبیہ کی گئی ہے۔ تیجہ، چالیسہ اور برسی وغیرہ کی شرعی حیثیت بتائی گئی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر علمی فوائد موجود ہیں۔

﴿۸﴾ **کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا:**۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کوئی کام کرتا ہے اور اس کام کی بنیاد پڑ جاتی ہے، اور اس کو خیال بھی نہیں ہوتا۔ اب اگر اس نے کوئی اچھا کام تھا تو پھر تو کیا کہنے۔ اور اگر کوئی برا کام تھا تو پھر خیر نہیں۔ اس عنوان کے تحت امام نوویؒ نے آیات واحادیث کو پیش فرما کر اپنے دعویٰ کو ثابت فرمایا ہے، بعض روایات میں قولاً یہ بات کہی گئی ہے، اور بعض میں اس کا عملی ثبوت مہیا کیا گیا ہے۔

ضمنی فوائد میں حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی قابل دید ہیں۔ ہابیل اور قابیل کا قصہ اس مناسبت سے آگیا ہے کہ دنیا میں قتل ناحق کی بنیاد ڈالنے والا قابیل ہے۔

﴿۹﴾ **بھلائی کی طرف رہنمائی:-** یہ شریعت کا بہت اہم شعبہ ہے، اس کی اہمیت اور اصول وشرائط اجاگر کرنے کے لئے حضرت مصنف نے متعلقہ آیات وروایات جمع فرمائی ہیں داعی کے لئے حکمت اور موعظۂ حسنہ کی ضرورت پر حضرت دامت برکاتہم نے خاص زور دیا ہے کہ اس کے فقدان سے دعوت ونصیحت کا الٹا اثر ہونے کے امکانات ہیں۔

فتح خیبر کے موقعہ پر حضور اکرم ﷺ کے اعلان سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک منقبت لوگوں کے سامنے آئی۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دعوت کی فضیلت ارشاد فرمائی۔

﴿۱۰﴾ **نیکی اور تقویٰ میں مدد وتعاون:-** نیکی وبھلائی دنیا کے اندر پھیلے اور اس کو ترقی ہو، بدی وبُرائی ختم ہو اور اس کی جڑ کٹے، اس لئے شریعت نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاون کا حکم دیا ہے۔ شریعت کی یہ بہت ہی اہم تعلیم ہے

عصبیت کیا ہے؟ یہ آپ کو اس مضمون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو آیات وروایات پیش فرمائی ہیں حضرت دامت برکاتہم نے ان پر مفصل کلام کیا ہے۔ سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بے مثال طرزِ عمل کا ایک واقعہ پڑھئے اور عبرت حاصل کیجئے۔ ضمن میں اور بھی بہت سارے مفید ترین مضامین آئے ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں جیسے امامت کا مفہوم، سورۂ عصر کی مختصر لیکن اہم تفسیر وغیرہ۔

اللہ کے راستے میں جانے والے کسی آدمی کو اس کے سفر کا سامان فراہم کرنے کی فضیلت کیا ہے وہ حضرت ابوعبدالرحمٰن زید بن حارث جہنی رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوگی۔

دوطرفہ سلیپنگ پارٹنرشپ (Sleeping Partner ship) کا بہترین طریقہ معلوم کرنا ہو تو اس عنوان کے تحت آنے والی حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت

ضرور مطالعہ کریں۔اوراس سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ روزی کس کی برکت سے ملتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ والی روایت سے اپنے نابالغ بچہ کو حج کرانے کی فضیلت بھی معلوم ہوتی ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ والی روایت سے سبق ملتاہے کہ خزانچی (Treasurer) میں کون کون سے اوصاف مطلوب ہیں۔

﴿۱۱﴾ **خیر خواہی اور بھلائی**:-معاشرت میں اس وصف کی بہت ہی زیادہ اہمیت ہے،اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقہ سے اس کی اہمیت بیان فرمائی ہے،کہیں مسلمانوں کے پورے معاشرے کو ایک جسم سے تعبیر کیا،اوراس تعبیر سے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ کسی دوسرے کی تکلیف کو اپنی ہی تکلیف محسوس کرتے ہوئے اس کے ساتھ بھلائی کا سلوک کیا جائے۔انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ان کی قوم بدسلوکی کرتی تھی اوران کی تعلیمات کو ٹھکراتے ہوئے ان کو برا بھلا کہتی تھیں لیکن وہ حضرات اس کے جواب میں یہی کہتے تھے ﴿أَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی روایت پیش فرمائی جس سے نصیحت کا عموم پتہ چلتا ہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے معلوم ہوگا کہ بیعت کے وقت کئے جانے والے عہد و پیمان پر کس طرح عمل کیا جانا چاہیے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث سے پتہ چلے گا کہ ہر مؤمن کو اپنے مؤمن بھائی کے ساتھ کیسا رشتہ و تعلق ہونا چاہیے۔

﴿۱۲، ۱۳﴾ بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا/ قول وعمل میں تضاد پر سخت عتاب:-

اچھے کاموں کا دوسروں کو حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا ،اور دوسرا موضوع درحقیقت پہلے ہی کا تتمہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ انسان جس اچھے کام کی دوسروں کو ترغیب دے، خود بھی اس پر عمل درآمد ہو،اور جس برائی سے دوسروں کو روکے خود بھی اس سے باز رہے

خیال رہے! یہ نہیں کہا جا رہا ہے کہ انسان دوسروں کو کسی نیکی کی دعوت تب ہی دے جب خود بھی اس پر عمل کر رہا ہو،اور کسی برائی سے اوروں کو تب ہی روکے جب خود بھی اس سے بچتا ہو۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی چیز کی ضرورت اور اہمیت یا اس کی شناعت وقباحت کو خوب سمجھتا ہے، جانتا ہے،لیکن کوئی وجہ ہوتی ہے کہ خود اس کے تقاضہ کے خلاف کرتا ہے۔سگریٹ اور تمباکو فروش کمپنیاں جہاں بڑے زور وشور سے اپنے مال کی ایڈورٹائیزنگ (Advertising) کرتی ہیں؛ وہیں ایک تنبیہ کرنا بھی کبھی نہیں چوکتیں کہ سگریٹ اور تمباکو نوشی مضرِ صحت ہے۔

یہیں سے وہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے جس کا سامنا عموماً ہمارے معاشرہ میں دینی کام کرنے والوں کو ہوتا ہے کہ خود تو کرتے نہیں اور دوسروں کو کہنے چلے ہیں۔

ہمارے حضرت دامت برکاتہم اکثر فرماتے ہیں کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ ہر آدمی کو اس کی اپنی ذمہ داری بتاتی ہے،دوسروں کی کیا ذمہ داریاں ہیں وہ اس کو نہیں بتاتی۔مثال کے طور پر داعی کو یہ تعلیم دی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اہتمام سے کرو کہ خود بھی اس پر عمل درآمد ہو۔اور مدعو کو یہ سکھایا کہ کوئی تمہیں اچھی بات بتائے تو اس کو قبول کرلو، یہ نہ دیکھو کہ وہ خود اس پر عمل کر رہا ہے یا نہیں؟ لیکن ہم لوگوں کا مزاج مزاجِ شرع کے بالکل برعکس ہے،

ہم خود اپنی ذمہ داری انجام دینے کے بجائے دوسروں کو ان کی ذمہ داریاں بتاتے ہیں۔ میاں اور بیوی میں جھگڑا ہوگا تو شوہر یہ کہے گا کہ بیوی میرے حقوق ادا نہیں کرتی اور بیوی کہے گی کہ شوہر میرے حقوق ادا نہیں کرتا، حالانکہ یہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ شریعت نے ان کے ذمہ ایک دوسرے کے جو حقوق رکھے ہیں ان کو ادا کرنے میں لگ جائیں، جب یہ ہوگا تو جھگڑا ہی کہاں رہے گا؟ ہمیں اپنی ذمہ داریاں تو انجام دینی نہیں ہیں، دوسروں کو ان کی ذمہ داریاں بتاتے پھرنا ہے۔''یہ درحقیقت نہ کرنے کا بہانہ ہے''۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ نصیحت کی کوئی بات اگر دیوار پر لکھی ہوگی تو کیا آپ دیوار کو یہ کہیں گے کہ خود تو عمل کرتی نہیں، مجھے کیوں کہتی ہے؟ اگر آپ یہ طے کر کے ہی بیٹھے ہیں کہ عمل نہیں کرنا ہے، تو نہ کریں۔ لیکن کہنے والے کو کیوں آڑ بناتے ہیں؟ انسان کا ایسا مزاج دراصل اس کی محرومی کی نشانی ہے۔ اور سالکین کے لئے تو سمِ قاتل ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوگا: امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید، فضائل، اہمیت، درجات، نیز اس کام کے شرائط و آداب، حدود و احکام، کرنے کے فوائد اور نہ کرنے کے نقصانات اور آخری حصہ میں قول و عمل میں تضاد پر کیا عتاب ہے، اس کی کیا شناعت و قباحت ہے، کیسی سخت وعیدیں ہیں اور ان سب کے علاوہ بہت سے ضمنی فوائد پڑھنے کو ملیں گے۔ مثلاً بعض صحابہ اور تابعین کے حالات و واقعات۔

محترم ناظرین! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت تو ہر زمانہ میں ہی رہی ہے لیکن فی زمانہ اس کی اہمیت جتنی بڑھ گئی ہے وہ ہر غیرت مند مسلمان سمجھ سکتا ہے۔ آج پرنٹ میڈیا اور الیکٹرک میڈیا کے توسط سے اسلامی احکام و تعلیمات پر کھلے عام بے جا

اعتراضات کئے جارہے ہیں، مضامین لکھے جارہے ہیں، کارٹون بنائے جارہے ہیں، فلمیں بنائی جارہی ہیں، غرضیکہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی جارہی ہے اسلام کی خوبصورت اور حسین ترین تصویر کو بگاڑ کر اور توڑ مروڑ کر پیش کیا جارہا ہے، ایسے مسموم ماحول میں ہم نے اپنی کیا ذمہ داری نبھائی؟ ہم نے اسلام کا اصلی رخ کس کو دکھایا؟

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا تھا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا جب اسلام پر قائم رہنا ایسا مشکل ہو جائے گا جیسے ہاتھ میں انگارا پکڑنا۔ بالکل حق اور سچ فرمایا۔ آج کل مسلمان ڈاڑھی منڈانے میں زیادہ عافیت محسوس کرتا ہے، ایمان والی بہن بے پردگی میں زیادہ امن سمجھتی ہے، لباس، کھانے پینے، شادی بیاہ میں اور زندگی کے کسی بھی چھوٹے بڑے اہم اور غیر اہم موڑ پر اسلامی طریقہ کو چھوڑنے میں سلامتی اور عزت محسوس کی جاتی ہے کہ نہ اسلامی طور طریقہ اپنائیں اور نہ کوئی اعتراض، لعن طعن و ملامت کرے، اور نہ ہی کوئی مذاق اڑائے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام بے یار و مددگاری کے عالم میں شروع ہوا، آخر میں پھر ایسا ہی ہو جائے گا، سو شاباش ہے (ایسے) بے کسوں کیلئے (جو ایسے ماحول میں بھی اسلام کو نہ چھوڑیں)۔

راقم اپنے مضمون کو یہیں ختم کرتے ہوئے مکرم قارئین سے دعا کی گذارش کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کاوش کو شرف قبولیت عطا فرمائے، استقامت کے ساتھ مزید کی توفیق عطا فرمائے اور اس سلسلہ کے بعافیت جلد از جلد تکمیل تک پہنچنے کی شکلیں غیب سے پیدا فرمائے۔ حضرت اقدس دامت برکاتہم کے سایۂ عاطفت کو دراز تر فرما کر فیوض کو عام و تام فرمائے، اور ہم دور افتادوں کو محرومی سے بچائے۔ ﴿آمین﴾

﴿ابوزاہر﴾

افتتاحیہ

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے کہ اب تک **"حدیث کے اصلاحی مضامین"** کی تین جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور یہ چوتھی جلد آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے جس کے زیورِ طبع سے آراستہ ہونے میں محض خدائے وحدہٗ لاشریک لہٗ کا فضل وکرم ہی شاملِ حال رہا ہے۔ اور یہ تو آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری ﴿دامت برکاتہم ومدت فیوضہم واعلیٰ اللہ مراتبہم﴾ ہر شبِ یکشنبہ کو بعد نمازِ عشاء سورت میں عمومی درس حدیث فرماتے ہیں جس میں پہلے کتاب **"ریاض الصالحین"** کا درس ہوتا تھا جو ۹/سال کے طویل عرصہ میں اختتام پذیر ہوئی، اور وہی دروس کتابی شکل میں **"حدیث کے اصلاحی مضامین"** کے نام سے آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہیں۔

اگر ہم اس کتاب کے عنوانات کی ترتیب کو دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب میں علامہ نوویؒ نے اسلامی معاشرہ کا پورا ایک خاکہ پیش فرمایا ہے، اور حقیقی بات تو یہ ہے کہ اگر آدمی ان اوصاف کو اپنا لے تو اسلامی معاشرت خود بخود قائم ہو جائے۔ اس لئے کہ غور کیجئے اگر معاشرہ کے ہر آدمی کے اندر امانتداری کا وصف موجود ہو، اور ہر ایک اپنی چیزوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی ہوئی امانت خیال کرتے ہوئے استعمال کرے، اور اگر کسی وقت کسی کو سماجی کاموں کی ذمہ داری سونپی جائے تو اس میں بھی ذرہ برابر خیانت سے کام نہ لے، اور جب ہر آدمی اس حد تک امانتدار بن جائے تو ان کی طرف سے کسی پر ظلم وزیادتی ہو جائے یہ بات بعید از قیاس ہے۔ پھر وہ نہ خود کسی پر ظلم کریں گے اور اگر کوئی کسی پر ظلم کر رہا

ہوگا تو اس کو بھی ظلم سے روکیں گے، اس لئے کہ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام ان کی سمجھ میں آچکا ہے، لوگ ہر ایک کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والے ہوں، اور اگر کبھی کسی کا کوئی عیب ان کو نظر بھی آجائے تو وہ اس کو پوری طرح سے چھپانے کا اہتمام کریں، چہ جائیکہ لوگوں کے عیوب ڈھونڈتے پھریں۔ اور پھر ان میں شفقت بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ جائے کہ وہ ہر مسلمان کی ضرورتوں کو پورا کرنا اپنا اہم فریضہ سمجھنے لگیں، اور اگر وہ خود اتنی استطاعت نہیں رکھتے کہ خود کسی کی ضرورت پوری کرسکیں تو وہ دوسروں کو متوجہ کریں اور دوسروں سے سفارش کر کے لوگوں کے کام نکلوادیں۔ اگر معاشرہ میں آپس میں لڑائی اور جھگڑے ہوں تو لوگوں کے درمیان صلح صفائی کروائیں، جو لوگ خستہ حال، فقیر و مسکین ہیں اور معاشرہ میں بھی جن کو لوگ قابلِ اعتناء نہیں سمجھتے، ایسوں کو وہ اپنے سینہ سے لگانے والے بن جائیں اور کبھی کسی کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ اگر معاشرہ کا ہر فرد ایسا بن جائے تو وہ سماج جنت کا نمونہ نہ ہوگا؟

"**حدیث کے اصلاحی مضامین**" کی یہ جلد انہیں آٹھ (۸) مضامین پر مشتمل ہے:-

﴿۱﴾ الأمر بأدآء الأمانة
ادائے امانت کی تاکید

﴿۲﴾ تحريم الظلم والأمر بردّ المظالم
ظلم کی حرمت

﴿۳﴾ تعظيم حرمات المسلمين
مسلمانوں کی عزتوں کا احترام

﴿۴﴾ سترُ عورات المسلمين
پردہ دری کی ممانعت

﴿۵﴾ قضآء حوائج المسلمين
مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا

﴿۶﴾ الشفاعة
سفارش کرنا

﴿۷﴾ الاصلاح بين الناس
آپس کے تعلقات درست کرانا

﴿۸﴾ فضل ضعفة المسلمين والفقرآء
خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

بہر حال! اس جلد کا ہر عنوان قابلِ مطالعہ ہے اور وہ تمام اوصاف جو ایک مسلمان کی زندگی میں نمایاں طور پر پائے جانے چاہئیں ان پر قاریٔ کتاب کو آسان پیرایہ میں سیر حاصل بحث پڑھنے کو ملے گی اور معاشرہ میں جو جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں حضرت دامت برکاتہم نے جا بجا اس کی بھر پور نشان دہی فرمائی ہے اور ان کو دور کرنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

﴿۱﴾ **ادائے امانت کی تاکید:**- امانت داری کتنا اونچا وصف ہے اور اس کی کیا اہمیت ہے، یہ گھپلوں اور گھوٹالوں کے اس زمانہ میں (جس میں پورے سال کو ’’گھپلوں کا سال‘‘ (Scandal's Year) کا نام دیا جاتا ہو) جتنا کھل کر سامنے آ گیا ہے؛ شاید آج سے پہلے اس کی اہمیت اتنی واضح نہ ہوئی ہو۔ اسلام نے تو پہلے ہی دن سے اس کی اہمیت کو نہ صرف تسلیم بلکہ اجاگر کیا ہے۔ مختلف انداز اور پہلوؤں سے اس کو واضح کیا گیا ہے جیسا کہ کتاب ہٰذا کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا۔ امانت کے مفہوم میں کتنی وسعت و پنہائی ہے؛ یہ بھی معلوم ہوگا۔ تقریباً روزمرّہ کے پیش آنے والے ناگفتہ بہ اور شرم سے سر جھکا دینے والے واقعات نے یہ بات آفتاب نیم روز کی طرح واضح کر دی ہے کہ امانت داری اتنی اونچی صفت ہے کہ اس کے نہ ہونے سے انسان ذلت کی کتنی گہری کھائی میں گر جاتا ہے، چاہے وہ اپنے آپ میں کتنا ہی بڑا ہو، اور اس صفت کے ہونے سے عزت کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے، خواہ وہ اپنے آپ میں کتنا ہی چھوٹا ہو۔ گویا اس کا نہ ہونا بڑوں کو چھوٹا اور اس کا ہونا چھوٹوں کو بڑا بنا دیتا ہے۔

انسان بعض اوقات کسی صفت کے حاصل کرنے میں خاطر خواہ دلچسپی اس لئے نہیں لیتا کہ اس کو اس کی اہمیت کا ٹھوس علم اور صحیح ادراک نہیں ہوتا، ایک ایمان والے کے لئے خدا

اوررسول کی بات سے بڑھ کر کچھ نہیں ہونا چاہیے۔سرکاری وغیرسرکاری دفاتراورتجارتی اداروں میں امانت دارانسان کی کتنی قدروقیمت اورڈیمانڈ ہے یہ ہرشخص جانتا ہے۔خیانت کرنے سے انسان کووقتی طورپردنیائے دَنی کا کوئی معمولی فائدہ ضرورہوجاتا ہے،لیکن جب رازفاش ہوتا ہےتوسرچھپانامشکل ہوجاتا ہے،جس کی وجہ سے دنیا کابھی دائمی نقصان بھگتنا پڑتا ہے۔

مذہبِ اسلام نے ایسے ایسے امین پیدا کئے ہیں جوبجائے خودایک قابلِ فخراورلائقِ اتباع امرہے۔سرکارِمدنی فداہ ابی وامی وروحی ﷺ کوبعثت سے پہلے ہی پوراملکی سماج نامِ مبارک سے زیادہ ’’الصادق الامین‘‘ سے پہچانتا تھا۔خلیفۂ اوّل یارِغارحضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کوبیت المال میں سےحق محنت لینا گوارانہیں،بوقت وفات اپناایک باغ اس حق محنت کی تلافی کے لئے بیت المال کووقف کرجاتے ہیں(کتاب الاموال بحوالہ فضائل اعمال ۱/۵۹)جوحضرت عمر اورحضرت عثمان رضوان اللہ تعالیٰ جیسے حضرات کی اجتماعی متفقہ رائے سے انتہاء درجہ کابقدرضرورت لیناشروع کیا تھا،جس میں مہینہ میں ایک مرتبہ میٹھا بننے کی بھی گنجائش نہیں تھی،الاّ یہ کہ روزکے انتہائی کفایتی خرچ میں سے کچھ کچھ کاٹا جائے۔دوسری جانب احساس ذمہ داری اتنا زبردست ہے کہ زکوٰۃ کے معاملہ میں ایک رتی کی رعایت کرنے کے لئے تیارنہیں ہیں۔یہ امانت ہی کااثرہے کہ آدمی کواحساس ذمہ داری ہو،سہولیات کامحدوداستعمال ہو،اصول و ضوابط اورآئین سے ہٹ کرکسی کی کسی طرح کی رورعایت کے لئے تیارنہ ہو۔اگریہ باتیں پیداہوجائیں اورملکی نیزبین الاقوامی سطح پراورذیلی سطح پرسرکاری اورغیرسرکاری شعبوں اور اداروں میں ان کااہتمام ہونے لگےتودنیابرسوں کی ترقی لمحوں میں کرجائے۔حکومت کی

گدیوں اور کرسیوں پر بیٹھ کر ترقی کے بڑے بڑے راگ الاپنے والے ہی اگر دنیا بھر کی ان خیانتوں کے ساتھ ترقی دلا سکتے تو آج ممالک قطعاً اس پوزیشن میں نہ ہوتے جس میں ہیں خصوصاً ہمارا ملک ہندوستان جہاں گھپلوں کی تاریخ ماشاء اللہ اتنی وسیع ہے کہ اگر کوئی صرف ان کی اجمالی فہرست ہی تیار کرلے تو کئی ضخیم جلدوں کا ایک ''قیمتی'' دستاویز تیار ہو جائے، اور تفصیلات کی نذر تو شاید کئی لوگوں کی زندگیاں ہو جائیں۔

اسلام کے زرّین ترین دور کی تاریخ، انتظامِ ملکی، رعایا کے تنعم، بیکاری کے فقدان، حاکموں کی امانت داری اور پبلک کی وفاداری وغیرہ وغیرہ امور کا موازنہ بعد کے زمانوں اور آج کے زمانہ سے کیا جائے؛ تو ہرگز ہرگز کوئی جوڑ نہیں بیٹھ سکتا۔ سابقہ حکمرانوں کی امانتداری کے سچے واقعات بتائے جائیں تو آج کوئی ان پر یقین کرنے کے لئے تیار نہ ہو، کیونکہ آج کے ماحول نے اس کو محال بنا دیا ہے۔

یہاں پہنچ کر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو باتیں ہمارے علمی و مذہبی حلقہ سے بھی کہی جائیں۔ ہر شخص اپنے طور پر فیصلہ کرلے کہ جس مسجد یا مدرسہ و مکتب سے وہ متعلق ہے، چاہے صدر کی حیثیت سے ہو، متولی و ممبر کی حیثیت سے ہو یا مدرس، امام و مؤذن کی شکل میں ہو؛ وہاں رہتے ہوئے امانت کے تقاضوں کو کتنی حد تک پورا کر رہا ہے۔ کام کے لئے جتنا وقت طے ہوا ہے؛ کیا وہ پورا وقت کام میں گذر رہا ہے؟ مساجد، مدارس و مکاتب کی جو اشیاء و سہولیات ہمارے لئے مہیا کی جاتی ہیں مثلاً کمرے، پنکھے، بجلی، تنخواہ وغیرہ ان کا ذاتی استعمال کرنے سے ہم کتنی احتیاط برتتے ہیں۔ بعض جگہ تو ایسے واقعات بھی پیش آئے کہ مدرس صاحب یا امام صاحب کا انتقال ہو گیا، یا کسی دوسری جگہ خدمت کرنے لگے لیکن مسجد، مکتب یا

مدرسہ کا گھر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، متولیان، اراکین شوریٰ وغیرہ بھی کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح ملوث ہوجاتے ہیں۔ان مواقع پر وارثین انبیاء علماء کا وقار جتنا بھی مجروح ہو؛ عین مناسب ہے۔پھر کیونکر ہمارے وعظ ونصیحت میں تاثیر پیدا ہوگی۔ہمارے اکابرو اسلاف کی جو زندگیاں کتابوں میں ہیں؛ کوئی ہماری زندگیوں میں ڈھونڈے تو کیا وہ کامیاب ہوگا؟ کیا مدارس میں عامۃً ایسا نہیں ہوتا کہ مدرس صاحب روزانہ یا اکثر دس پندرہ منٹ تاخیر سے پہنچتے ہیں؟ اگر روزانہ کے ان دس منٹوں کو جوڑا جائے تو ماہانہ ایک دن کی اور سالانہ دس دن کی غیر حاضری ہوتی ہے۔ہم ازخود تو ان کی تنخواہ کیا کٹواتے؛ منتظمین اگر ایسا کچھ کرنا چاہیں تو ہم آگ بگولہ ہوجاتے ہیں۔کیا امانت داری کا یہی تقاضہ ہے؟

امانت داری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم وہ کرتے جو حضرت مولانا مظہر صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہما وغیرہما کرتے تھے۔لیکن ایسا کہاں ممکن ہے؟ یہ مسائل ہمارے لئے تھوڑے ہی ہیں؟ یہ تو صرف انہی حضرات کے لئے تھے۔بڑے افسوس کی بات ہے کہ ان حضرات کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی ہمارے اندر ان حضرات کی اتباع کا تصور تک پیدا نہیں ہوتا۔ہمارا انداز اور ردّ عمل یہ بتاتا ہے جیسے یہ سچے واقعات نہیں؛ من گھڑت کہانیاں ہیں۔پھر کیونکر ہم یہ وصف تلامذہ اور عوام میں منتقل کرسکیں گے۔یہاں کوئی یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کی وجہ امانت کی اہمیت کی ناواقفیت ہے۔ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ امانت کی اہمیت ہمارے جن بزرگوں نے اپنے عمل سے اجاگر کی یا تو ہم نے ان کی زندگیوں کا مطالعہ نہیں کیا یا ہمیں ان حضرات سے عقیدت میں کمی ہے۔

ہمارا جو دوسرا طبقہ ہے یعنی تاجروں کا ہو یا ملازموں کا؛ ان سے بھی عرض ہے کہ آپ

کی تجارت وملازمت کے دوران امانت داری کے تقاضے آپ سے بھی کچھ امید رکھتے ہیں۔ معاملات کی صفائی، ناپ تول میں کمی نہ کرنا، وعدہ پورا کرنا،عیب دار مال نہ تھوپ دینا، اوقاتِ ملازمت کی پابندی کرنا، کام چوری نہ کرنا، سہولیات کا ذاتی استعمال نہ کرنا، حق سے زیادہ تنخواہ نہ لینا وغیرہ وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں۔

آیئے ! ہم سب مل کر عہد کریں کہ اب تک کی کوتاہیوں کی تلافی کریں گے، اور آئندہ امانت کے تقاضوں سے ہٹ کر کوئی کام نہیں کریں گے۔

﴿۲﴾ظلم کی حرمت:۔اس عنوان کے تحت معلوم ہوگا کہ بندوں کے حقوق کا معاملہ کتنا اہم اور نازک ہے اور اسلام نے روزِ اوّل سے اس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ کسی بھی انسان کا حق کسی طرح بھی ضائع ہو، جانی یا مالی نقصان ہو، یا جسمانی اور ذہنی طور پر اس کو تکلیف ورنج پہنچے؛ اسلام اس کو بالکل پسند نہیں کرتا۔ قرآن وحدیث میں ظالم کے لئے بڑی سخت سزائیں سنائی گئی ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے کسی بھی اہم موقع کو نہیں چھوڑا کہ اس میں امت کو اس بات کی تاکید نہ فرمائی ہو کہ کمزوروں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کیا جائے۔ خطبۂ حجۃ الوداع کو اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیجئے، یہاں تک کہ دنیا سے جاتے جاتے بھی کمزوروں کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی۔ اس سے اس بات کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز اپنی شانِ عدل کو اس طرح ظاہر فرمائیں گے کہ بغیر سینگ والی بکری کو بھی سینگ والی بکری سے اس کا حق دلوئیں گے۔ اور اگر دنیا میں کوئی آدمی کسی کو دبا کر اور اس پر ظلم کر کے خوب پھل پھول رہا ہو تو وہ اس بات سے خوش نہ ہو، اس لئے کہ خدا کے دربار میں دیر ضرور ہے لیکن اندھیر نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس سے بھی

چوکنّا کردیا کہ مظلوم کی بددعا سے بچو، اس لئے کہ اس کی بددعا کی قبولیت میں کوئی رُکاوٹ نہیں ہوتی۔

خیر! یہ موضوع بڑا قابلِ توجہ ہے اور اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کی اہمیت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائے گی، اور اگر خدانخواستہ ہم میں سے کوئی اس برائی میں مبتلا ہے تو ان شاء اللہ اس کو توبہ کی توفیق نصیب ہوجائے گی۔

﴿۳﴾ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام:- اس عنوان ہی سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ نوویؒ اس باب میں کتنی اہم چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ لفظ ''حرمت'' اپنے اندر کتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے وہ بھی معلوم ہوجائے گا۔ شعائر اللہ کی تعظیم بھی اس مفہوم میں شامل ہے، اسلام نے ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل سے تعبیر کرکے یہ پیغام دیا ہے کہ پوری انسانیت کس قدر قابلِ تعظیم ہے، یہی اسلام کی وہ تعلیم ہے جس کو بڑی وضاحت کے ساتھ کھل کر دنیا والوں کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے تاکہ نفرتوں کا وہ زہر جو اسلام و اہلِ اسلام کے خلاف لوگوں کے دلوں میں بھر دیا گیا ہے وہ دھل جائے اور پوری انسانیت کے لئے ایمان کی راہیں ہموار ہوجائیں۔

کہیں تو نبی کریم ﷺ نے مؤمنین کو ایک عمارت کی اینٹوں سے تشبیہ دی کہ ہر اینٹ دوسری سے بالکل جڑ ہوئی رہتی ہے، اور کہیں جسم کے مختلف اعضاء کے مجموعہ سے تشبیہ دے کر سمجھایا کہ ایک عضو کی تکلیف دوسرے کی تکلیف کا باعث ہوتی ہے؛ پھر کیا بات ہے کہ آج مسلمانوں میں یہ بات نہیں پائی جاتی؟

نبی کریم ﷺ نے تمام لوگوں کے ساتھ (جس میں بڑوں اور چھوٹوں میں، اپنے اور غیروں

میں کوئی فرق نہیں ہے) کس قدر شفقت ورحمت کی تعلیم دی ہے وہ بھی اس باب کے مطالعہ سے معلوم ہوگی، یہاں تک کہ ایک بچہ کے رونے آواز کی وجہ سے اپنی نماز کو بھی مختصر کردیا تا کہ اس کی ماں کو تکلیف نہ ہو، اوراماموں کو بھی تاکید فرمائی کہ وہ لوگوں کو ہلکی نماز پڑھائیں۔اس باب کی ہر حدیث کے ماتحت یہ سبق ملے گا کہ آپ ﷺ کو امت کی تکلیف کا کتنا زیادہ خیال تھا اوردراصل آپ ﷺ اپنے طرزِ عمل سے آنے والی امت کو یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی عزتوں کا احترام کس طرح ملحوظ رکھا جاسکتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث سے معلوم ہوگا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر کتنے حقوق ہیں اوراسی کے ذیل میں بزرگوں کے واقعات اوراقوال کی روشنی میں بہترین رہنما اصولِ زندگی نہایت بلیغ انداز میں سیکھنے کوملیں گے،اور یہ بھی پتہ چلے گا کہ غلط رسم ورواج سے کیسے بچا جائے۔دیگر علمی فوائد مزید برآں۔

﴿۴﴾ **پردہ دری کی ممانعت**:-اوپر کے باب میں جو پیغام دیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی عزتوں کا کس قدر احترام شریعتِ اسلامی میں ملحوظ ہے، یہ باب گویا اسی کے تکملہ کے طور پر پیش کیا ہے کہ بلا کسی شرعی وجہ کے کسی کے عیب لوگوں کے سامنے کھولے نہ جائیں، اور بعض مرتبہ کسی کے عیب کا لوگوں کے سامنے آنا ہی دوسروں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ بھی اس کام کو کریں۔اور پردہ پوشی کی ہر انسان کو قیامت میں ضرورت پیش آنی ہے، اگر اس نے دنیا میں دوسروں کی پردہ پوشی کی ہوگی تو اللہ تعالیٰ بھی قیامت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔اور یہ تو کتنی خطرناک بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تو کسی انسان کے عیوب پر پردہ ڈالے لیکن وہ خود ہی اپنی زبان سے کہتا پھرے کہ میں نے فلاں فلاں گناہ کئے ہیں، اس پر تو

بڑی سخت وعید آئی ہے۔اس عنوان کے تحت علامہ نوویؒ نے ایک آیت اور چار احادیث پیش فرمائی ہیں۔

﴿۵﴾ مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا:۔اس عنوان کے تحت علامہ نوویؒ نے ایک آیت اور دو احادیث ذکر فرمائی ہیں جن کی تشریحات تو اوپر کے ابواب میں گذر چکی ہیں لیکن اس باب میں بہت سے اصلاحی مضامین قابلِ مطالعہ ہیں۔

﴿۶﴾ سفارش کرنا:۔اس عنوان کے تحت بھی ایک آیت اور دو احادیث پیش فرمائی ہیں۔اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سفارش کی حیثیت کیا ہے؟ اور سفارش کے بھی حدود ہیں۔کہاں سفارش جائز ہے اور کہاں ممنوع ہے، اور کس کی سفارش کی جاسکتی ہے اور کس کی نہیں۔سفارش کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔اور جس سے سفارش کی جائے؛ کیا وہ اس سفارش کو مان ہی لے یہ ضروری ہے؟ یا اس کو اختیار ہے کہ مانے یا نہ مانے۔کسی پر بلاوجہ دباؤ ڈالنا کیسا ہے۔وغیرہ وغیرہ، بہت سی باتیں اس عنوان کے ذیل میں معلوم ہوں گی۔اور بہت سی مرتبہ کسی کی ہم سفارش کرتے اور کراتے ہیں لیکن ہمارا ذہن اس بات کی طرف نہیں جاتا کہ ایسی سفارش کرنے سے یا کرانے سے ہم خود حرام کام کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ بہر حال! یہ مضمون ان ساری اہم تفصیلات پر مشتمل ہے۔

﴿۷﴾ آپس کے تعلقات درست کرانا:۔آپس کے تعلقات کی خرابی معاشرہ کو تباہ و برباد کر دیتی ہے، اور اس کے کتنے زیادہ نقصانات ہیں یہ تو تھوڑی سی عقل رکھنے والا بھی بخوبی سمجھ سکتا ہے۔لیکن آج کل یہ معاملہ اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ اچھے اچھے سمجھدار لوگ بھی باوجود سمجھانے کے نہیں سمجھتے۔اس عنوان کے ذیل میں حضرت مدظلہ العالی نے پورے شرح وبسط

کے ساتھ بات کو نہایت واضح کر کے پیش فرمایا ہے، درحقیقت یوں کہنا چاہئے کہ ایک طبیب ِحاذق نے مریض معاشرہ کا پورا آپریشن کر کے بیماری کا مکمل علاج کر دیا ہے۔

اس عنوان کے تحت ایک خاص مضمون جو آپ کو پڑھنے ملے گا وہ طلاق والا مضمون ہے جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتا۔ آج کل چھوٹی چھوٹی باتوں پر لوگ بغیر سوچے سمجھے طلاق کی تین گولیاں چلا دیتے ہیں اور پھر روتے پھرتے ہیں۔ دراصل یہ وہ چیز ہے جو بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لئے شریعت نے رکھی ہے، جو قانونِ اسلام ہی کی خوبی ہے۔ حضرت دام مجدہٗ نے بڑی تفصیل سے اس موضوع کو پیش فرمایا ہے جو واقعتاً بے بہا خزینہ ہے۔ اسلام کے قانونِ طلاق پر غیروں کے اعتراض کی وجہ کیا ہے؟ ان کے اعتراض کا دنداں شکن جواب اس مضمون میں موجود ہے۔ ضرور پڑھئے اور لوگوں کو بھی سنائیے، اور زیادہ سے زیادہ اس کی اشاعت کیجئے۔ خدا کرے کہ لوگوں کی عقل میں یہ بات بیٹھ جائے۔

﴿۸﴾ **خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت:**- کسی بھی انسان کو حقیر سمجھنا نہایت خطرناک بات ہے، اس لئے کہ کس کا مقام عنداللہ کیا ہے وہ تو ہم معلوم کر ہی نہیں سکتے۔ آج کل دنیا والوں نے عزت کا معیار دنیوی ساز و سامان کو، ظاہری شان و شوکت اور وجاہت کو بنالیا ہے، حالانکہ اصل معیار یہ سب چیزیں بالکل نہیں ہیں، ایسے واقعات ہم بکثرت دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں کہ ایک آدمی کسی عہدہ اور کرسی پر تھا، لوگ اس کو سلام مارتے تھے اور اس سے ملاقات کو اپنے لئے عزت کی معراج سمجھتے تھے، لیکن چند دنوں بعد وہ جب اس عہدہ سے اترا، یا اتارا گیا؛ تو وہی لوگ جو اس کو سلام مارتے تھے، آج اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے، لہٰذا ہم کسی خستہ حال کے مقابلہ میں باوجاہت کو کس بنیاد پر ترجیح دے سکتے ہیں؟

اس لئے کہ اصل مرتبہ ومقام تو تقویٰ اور دینداری کی وجہ سے ہوا کرتا ہے،اور آج تک ایسا کوئی تھرمامیٹر نہ ایجاد ہوا ہے اور نہ ہوگا جو یہ بتلائے کہ کس کے دل میں کتنا تقویٰ ہے،اس لئے کسی کی ظاہری خستہ حالی ہمیں اس سے بدظن نہ کرے، بلکہ ایسوں کی تو نبی کریم ﷺ نے بڑی تعریف فرمائی ہے کہ بہت سے پراگندہ بال اور غبار آلود حال ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اگر کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اس کو ضرور پورا کردیں۔

اس عنوان کے تحت یہ بھی معلوم ہوگا کہ کسی کی ظاہری اچھی حالت کو دیکھ کر اس جیسا ہوجانے کی دعا نہیں کرنی چاہیے۔اور بہت سے دنیا میں اونچے مقام ومرتبہ والے مال دار قیامت کے دن جنت میں داخلے سے روک دیئے جائیں گے اور جن کی دنیا میں کوئی عزت نہیں تھی وہ ان سے کئی ہزار سال پہلے جنت میں پہنچ جائیں گے۔

خیر! ہر عنوان کے تحت بے شمار ذیلی فوائد آ گئے ہیں جن کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ تمام مضامین الہامی ہیں۔حق تعالیٰ شانہٗ حضرت والا کے سایۂ عاطفت کو بصحت وقوت و عافیت درازتر فرمائے،اور ہم سب کو حضرت کے علوم وفیوض سے مستفید فرمائے اور اس فیض کو تا قیامِ قیامت جاری وساری فرمائے، ہماری ناقدریوں پر قلم عفو پھیر کر ہمیں محرومی سے بچائے۔آمین۔

﴿ابوزاہر﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ-أَمَّابَعْدُ:-

جب انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ رہتا ہے تو بے شمار مسائل بھی ساتھ ہی جنم لیتے ہیں، اس طرح مختلف انسانوں اور خاندانوں کے ساتھ رہنے ہی کو ہم ''سماج'' کہتے ہیں، اسی سماج کو قرآن کی زبان عربی میں ''معاشرہ'' کہا جاتا ہے۔اور مذہب اسلام نے معاشرت کے جو آداب انسانیت کو سکھائے ہیں وہ یقیناً کوئی اور مذہب کبھی بھی نہیں سکھا سکتا۔

ہمارے درمیان ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو عبادات کو بہت اہتمام سے ادا کرتے ہیں اور معاشرت کو یکلخت نظر انداز کر دیتے ہیں،عبادات والے پہلو میں فرائض کے علاوہ نوافل بھی خوب انجام دیتے ہیں اور معاشرت کے پہلو میں فرائض ہی سے پہلو تہی کی جاتی ہے، حالانکہ جس شریعت نے عبادات کا اہتمام سکھایا ہے،اسی شریعت نے معاشرت پر بھی زور دیا ہے۔أفتؤمنون ببعض الکتاب......

''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کی اس **جلد خامس** میں جو مختلف عنوانات آپ کے مطالعہ میں آئیں گے،ان سب کو اگر ایک مجموعی عنوان دینا ہو؛ تو شاید **احکامِ معاشرت** بہت موزوں ہوگا کیونکہ اس کا:-

(۱) پہلا عنوان ہے **''یتیم اور لڑکیوں کے ساتھ نرم روی و مہربانی''**

(۲) دوسرا عنوان ہے **''عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید''**

(۳) تیسرا عنوان ہے **''بیوی پر شوہر کے حقوق''**

(۴) چوتھا عنوان ہے **''اہل و عیال پر خرچ کرنا''**

(۵) پانچواں عنوان ہے **"محبوب اور عمدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا"**

(٦) چھٹا عنوان ہے **"تعلیم وتربیتِ اولاد"**

(۷) اور ساتواں عنوان ہے **"پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید"**

حقوق کی دو قسمیں ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ میں اگر انسان سے کمی کوتاہی رہ جائے تو اسے معاف کرنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، انسان اس کے سامنے روئے گڑگڑائے، دو آنسو گرا دے؛ وہ مَن جاتا ہے اور معاف فرما دیتا ہے۔ لیکن جہاں تک بندوں کے حقوق کی بات ہے تو اسے جب تک خود صاحبِ حق بندہ معاف نہ کردے؛ تب تک اللہ تعالیٰ بھی اس میں دخل اندازی نہیں کرتے، اس معنیٰ کر حقوق العباد والا پہلو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

انسان اگر چاہتا ہو کہ اس کا گھر جنت کا نمونہ بن جائے، محلّہ اور پڑوس میں اپنائیت، پیار ومحبت کی فضا قائم رہے، کسی نوع کا کھچاؤ، تناؤ اور کشیدگی باقی نہ رہے، آدمی بلا جھجھک کہیں بھی چلا جائے، کہیں بھی ٹھہر جائے، کسی سے بھی مل لے؛ تو یہ سب تبھی ممکن ہے جب مذکورہ بالا تمام مضامین پر سو فیصد عمل پیرا ہوا جائے، ورنہ مصیبتیں گھر ہی سے شروع ہوجاتی ہیں۔ بیوی کو شوہر سے اور شوہر کو بیوی سے شکایتیں ہیں۔ جس بیوی کو اللہ تعالیٰ نے دلی سکون حاصل ہونے کا ذریعہ بنایا تھا وہی بے سکونی اور بے چینی کا سرچشمہ نظر آتی ہے، بیوی سے سکون تب حاصل ہوگا جب آپ اس کے ساتھ قرآن وحدیث کے مطابق برتیں گے، نہ کہ اپنی مرضی کے مطابق۔ حدیثِ پاک کا مفہوم ہے: کتنی شرم کی بات ہے کہ انسان اپنی بیوی کو جانور کی طرح مارے اور جب اس کی ضرورت پڑے تو اسے لپٹا لے۔

حضور پُرنور ﷺ نے آدمی کی بہتری کا تھرمامیٹر یہ بتایا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی اور

اہلِ خانہ کے لئے اچھا ہو، وہ تم میں سب سے اچھا ہے۔انسان آج سب کے لئے اچھا ہے اور بیوی ہی کو خاطر میں نہیں لاتا، جس کی سفارش اللہ تعالیٰ نے قرآنِ حکیم میں فرمائی ہے: ان (بیویوں) کے ساتھ دستور کے مطابق سلوک کرو۔آج انسان بیوی کی ناز برداری (نخرے اُٹھانے) کو اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے، جبکہ آنحضرت ﷺ اپنی چہیتی پاک بیوی حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حبشیوں کا کھیل دکھاتے ہیں اور جب تک ان کا جی نہیں بھر جاتا تب تک آپ بنفس نفیس پردہ اور آڑ کے طور پر کھڑے رہتے ہیں۔

حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی باری میں دوسری پاک بیوی کے گھر سے کوئی پکوان آپ ﷺ کے لئے آتا ہے، حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کی غیرت اسے برداشت نہیں کر پاتی اور وہ اس برتن کو زور سے ہاتھ مار کر گرادیتی ہیں، کھانا بھی گر جاتا ہے اور برتن الگ ٹوٹتا ہے، ایسے میں باوجود باندی کے موجود ہونے کے حضورِ پاک ﷺ خود گرا ہوا کھانا اُٹھاتے ہیں اور بجائے غصہ ہونے کے فرماتے ہیں ''تمہاری اماں کو غیرت آگئی''۔

آیئے! اب ذرا ہر عنوان کو الگ الگ دیکھیں:-

﴿۱﴾ **''یتیم اور لڑکیوں کے ساتھ نرم روی و مہربانی''**:- اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے مخلوقات کی سانسوں کی تعداد کے برابر ہیں، بے باپ کے بچوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا اور اپنی بیٹیوں سے شفقت کرنا بھی ان میں سے ہے۔اللہ تعالیٰ کی داد و دہش کا یہ عالم ہے کہ آپ صرف یتیم کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر دیں تو اس کے سر کے بالوں کے برابر نیکیاں ملتی ہیں، بیٹیوں کو پال کر بڑا کردیا، اچھی تربیت کر کے شادی کردی، جنت میں جانے کا سامان ہوگیا، جس کے یہاں مسلسل لڑکیاں پیدا ہوں اسے بددل ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یوں سمجھے کہ مجھے اللہ تعالیٰ جنت میں بھیجنا چاہتے ہیں۔

مصنفِ کتاب نے حسبِ عادت موضوع کی مناسبت سے ۴؍آیات اور ۱۳؍ روایات جمع فرمائی ہیں، حضرت اقدس دامت برکاتہم نے اس موضوع کے تحت خوب علمی فوائد، عملی نصائح اور روحانی نورانی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان کا لطف پڑھ کر ہی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

﴿۲،۳﴾ ''عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید'' اور ''بیوی پر شوہر کے حقوق''

یہ دونوں عنوانات ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں، امام نوویؒ نے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید والے مضمون کو مقدم رکھ کر قرآن کا اتباع کیا ہے، سورۂ بقرہ میں ارشادِ ایزدی ہے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ یعنی جیسے بیویوں کے حقوق ہیں، ان کے ذمہ بھی (شوہر) کے حقوق ہیں۔ جس میں شاید اس طرف لطیف اشارہ فرمایا ہے کہ ویسے تو میاں بیوی میں سے ہر ایک کے دوسرے پر حقوق ہیں، لیکن شوہر کی ذمہ داری تھوڑی زیادہ ہے یہیں سے ناز برداری والی بات نکالی جاسکتی ہے جو آنحضور ﷺ نے عملی طور پر انجام دے کر بتائی جس کی کچھ تفصیل پیچھے گذری۔ حاصل یہ ہے کہ مرد کو چاہیے کہ بیوی کی ناز برداری بھی کرے، صرف حقوق کی ادائیگی پر بس نہ کرے، اور یہ وہ نسخہ ہے جو دونوں کے آپسی تعلقات کو صرف قانونی اور (Formal) سے بڑھ کر خوشگوار اور پیار و محبت سے لبریز بنا دیتا ہے، پھر گھر جنت کا نمونہ نظر آتا ہے، اور یہی وہ بات ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے ایسا بندھا ہوا رکھتی ہے کہ پھر دل میں کسی اور کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی، اور اسی سے ایک پاکیزہ سماج تعمیر ہوتا ہے۔

ہمارے حضرت دامت برکاتہم کا یہ ارشاد شاید پہلے بھی کسی اداریہ میں لکھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترتیب یہ ہے کہ انسان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ تمہارے ذمہ

فلاں کا یہ حق ہے؛ تم اسے ادا کرو۔ اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ دوسرے سے کہتے ہیں کہ تمہارے ذمہ میرا یہ حق ہے تم ادا کرو۔ اور یہیں سے ساری بات بگڑتی ہے، ہر آدمی دوسروں سے اپنے حقوق مانگنے میں لگا ہوا ہے، اس کے ذمہ دوسروں کے کیا حقوق ہیں اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں۔

اور معاشرہ کی اصلاح فرد کی اصلاح سے ہوتی ہے، کیونکہ معاشرہ کئی افراد کے باہم رہنے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی اصلاح کرلے تو گویا پورا معاشرہ درست ہو گیا اور اصلاحِ معاشرہ کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آج سے ہم یہ معلوم کرنا شروع کردیں کہ ہمارے ذمہ دوسروں کے کیا حقوق ہیں، اور انہیں ادا کرنے میں لگ جائیں۔ دوسرا ہمارا حق ادا کرتا ہے یا نہیں، اس کی پرواہ ہی چھوڑ دیں۔ صحاح کی ایک حدیث میں صراحۃً یہ مضمون موجود ہے۔

آج کے دور کا ایک بڑا فتنہ غیر مقلدیت ہے، اس عنوان کے تحت غیر مقلدین کو منھ توڑ جوب دیا گیا ہے۔ حضرت والا دامت برکاتہم نے فقیہانہ شان سے آسان پیرایہ میں تقلید کی حقیقت کو الہامی مثال دے کر ایسے دلچسپ انداز سے سمجھایا ہے جس کے مطالعہ سے دماغ کی گتھی سلجھ جاتی ہے، اور بہت سے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔

اس باب کی پہلی روایت کی تشریح قابلِ مطالعہ ہے جس سے قاری کے ذہن سے ان شاء اللہ بہت سی غلط فہمیاں دور ہوں گی۔

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے تحت بیوی کے ساتھ حسنِ معاشرت کے انمول نمونے آپ کو دیکھنے ملیں گے، اس کو ضرور پڑھیے اور اپنی زندگیوں میں اس کو جگہ دیجیے؛ تا کہ ازدواجی زندگی کی حقیقی خوشیاں پاسکیں۔

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ کی روایت کے ذیل میں حضرت دام مجدہٗ نے عورت

کی قربانیوں کونہایت مؤثرانداز میں پیش فرماکر مردوں کے لئے ایک چشم کشا حقیقت بیان فرمائی ہے، تاکہ معلوم ہوجائے کہ ان کو بیویوں پر کتنا اختیار حاصل ہے، اوروہ ان پر کتنا رعب چلاتے ہیں، حالانکہ اس صنفِ نازک کی خدمات اس قابل ہیں کہ ان کو خوب خوب سراہا جائے۔

ان دونوں عنوانات کے ذیل میں علامہ نوویؒ نے کل ۳/آیات اور۱۶/احادیث پیش فرمائی ہیں، جن میں سے ہرحدیث کے ذیل میں بہت سارے فوائد ونصائح ہیں جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

﴿۴﴾ **''اہل وعیال پرخرچ کرنا'':-** بظاہر یہ دنیا کا دستور نظر آتا ہے کہ انسان اپنے بیوی بچوں کا ذمہ دار ہے، ان کا روٹی کپڑا اور مکان مرد کے ذمہ ہے اوراکثر لوگ اسے دستورِدنیا سمجھ کرہی - نیکی کا کام سمجھے بغیر - انجام بھی دیتے ہیں اور زندگی بھر لاکھوں روپیہ بیوی بچوں کے پیچھے خرچ کرنے کے باوجود آخرت میں وہ کسی بدلہ کے حقدار نہیں ہوتے۔اس مضمون کو پڑھنے سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ یہ دنیا کا دستور بعد میں ہے؛ شریعت کا حکم پہلے ہے۔شریعت نے باقاعدہ مرد پر ذمہ داری ڈالی ہے، اسے انجام دینے سے جہاں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا ہے، وہیں وہ فضائل کا مستحق بھی ہوتا ہے۔اور اس کے دلائل اس مضمون کے تحت بیان ہوئے ہیں۔

بہت سی وہ باتیں جنہیں ہم مرد کی ذمہ داری سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ اس پر فرض نہیں ہیں، کچھ وہ چیزیں جن کا ذمہ دار مرد کونہیں سمجھا جاتا لیکن وہ شریعت نے اس کے ذمہ رکھی ہیں، بعض وضاحت طلب امور ہیں مثلاً یہ کہ خرچ اعلیٰ دیا جائے، اوسط دیا جائے یاادنیٰ دیا جائے، اس کی تفصیلات ہیں، یہ ساری باتیں اس موضوع میں آگئی ہیں۔

علم میں اضافہ کرنے والی چیزیں، غلط فہمیاں دور کرنے والے امور ہیں، قرآن وحدیث سے بالواسطہ اور بلاواسطہ ان سب باتوں کی توضیح وتشریح ہے۔ المختصر! اسلامی شریعت وسنت کی وہ باتیں جن کو معلوم کرنے کے لئے سینکڑوں کتابیں کھنگالنی پڑتی ہیں اور بڑی باریک بینی اور حاضر دماغی سے جن باتوں کو سمجھنا پڑتا ہے؛ وہ ساری باتیں ''تیار حلوے'' کی طرح ہمیں گھر بیٹھے حاصل ہورہی ہیں۔ فجزیٰ اللّٰہ مرشدنا عنا خیراً۔

ایک بہت ہی اہم مضمون پورے اٹھارہ صفحات میں ضمناً آگیا ہے، جو انتہائی توجہ سے پڑھنے اور عمل کئے جانے کا حق رکھتا ہے؛ اور وہ ہے حلال وحرام والا مضمون۔ اس مضمون کو حضرت اقدس دامت برکاتہم نے جس تفصیل، وضاحت، سنجیدگی، فصاحت وبلاغت اور شفقت ومحبت سے سمجھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا آنحضرت دامت برکاتہم کو خصوصی عطیہ ہے۔ عمل کرکے اس کی قدر کی جائے؛ تب بات ہے۔ پہلے سے نیت کرکے پڑھیں تو ان شاء اللہ عمل کی توفیق بھی ضرور ہوگی۔

اس باب میں کل ۳؍آیات اور ۸؍روایات ہیں، ان میں سے ایک روایت حضرت ابوہریرہؓ کی ہے جس کا مضمون نہایت ہی قابلِ غور ہے کہ مال کو بچا بچا کر جمع کرنے والا مال بڑھانے کی فکر میں لگا ہوا ہوتا ہے، حالانکہ روزانہ ایک فرشتہ بددعا دیتا ہے؛ پھر مال میں برکت کہاں ہوگی؟

﴿۵﴾ **''محبوب اور عمدہ چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا'':**- خرچ کی ابتداء اہلِ خانہ سے ہونی چاہیے۔ ان کے حقوق ونوافل کی مکمل ادائیگی کے بعد دیگر مواقع میں خرچ کرنے کا مزاج ہونا چاہیے۔ عمومی مزاج یہ ہے کہ جب ہمارے پاس کچھ چیزیں ہماری ضرورت سے زائد جمع ہوتی ہیں، کسی چیز کو استعمال کرتے کرتے دل اس سے بھر جاتا ہے

توخیال آتا ہے کہ کسی کو دیدی جائے، بالکل نہ خرچ کرنے سے تو یہ اچھا ہی ہے،لیکن شریعت ہمارا مزاج ایسا بنانا چاہتی ہے کہ ہم اپنی پسندیدہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کریں۔

اس عنوان کے تحت بھی دیگر عناوین کی طرح اسلامی تعلیمات منفرد،ٹھوس اور نرالی ہیں۔اس کام کے لئے بندۂ مؤمن کو مختلف طریقوں سے ابھارا گیا ہے۔جذبۂ عمل کے ساتھ اگران فضائل کو سنا اور پڑھا جائے، نیز ایسے بندگان خدا سے خود کو وابستہ پیوستہ کیا جائے،جنہوں نے یہ وصف اپنے بزرگوں سے میراث میں پایا ہے،تو آہستہ آہستہ یہ وصف انسان میں آنے لگتا ہے۔ہمیں جب کسی کی طرف سے (Second Hand) چیز ملتی ہے تو ہم جس تأثر سے دوچار ہوتے ہیں،ٹھیک وہی تأثر اس انسان کا بھی ہوتا ہے جسے ہم کوئی ایسی چیز دیتے ہیں۔جو چیز ہم اپنے لئے پسند نہیں کرتے، وہ دوسرے کے لئے کیوں پسند کرتے ہیں؟ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان یہ بھی نہ کرے۔بالکل نہ خرچ کرنے سے تو یہ بہتر ہی ہے۔لیکن انسان کو ترقی کرنی چاہیے۔دھیرے دھیرے ہمت جمع کر کے پسندیدہ (Fresh) اور (Packed) چیزیں بھی خرچ کرنے کی ابتداء کرنی چاہیے۔اسلاف کی زندگیوں میں اس کی مختلف ترتیبیں ملتی ہیں جن سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔

یہ ان اوصاف میں سے نہیں ہے جو ایک مرتبہ کہنے سننے سے پیدا ہو جائے۔ اس کے حاصل کرنے کے لئے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کرنی پڑتی ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہؒ نے ۲/آیتیں اور ۱/روایت پیش کی ہے۔

﴿۶﴾ **"تعلیم وتربیتِ اولاد"**:- یہ حضرت اقدس دامت برکاتہم کا شاید سب سے پسندیدہ عنوان ہے۔اس مضمون کے تحت تقریباً ابتدائی ۱۴/صفحات تو حضرت والا کے بیان پر مشتمل ہیں جو درحقیقت پورے مضمون کا لبِ لباب اور نچوڑ ہیں۔ادارہ اس پر زیادہ کچھ

لکھنے کے بجائے صرف اتنا لکھنے کو ترجیح دیتا ہے کہ اس مضمون کی ایک ایک سطر کو بغور پڑھ کر اس پر صد فیصد عمل کریں۔ بچوں سے لاڈ پیار ضرور کرنا چاہیے لیکن حد میں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ آپ ان کی ہر جائز و ناجائز فرمائش پوری کریں، کوئی آپ کی اولاد کو تنبیہ کرے تو آپ ان کی بیجا جانبداری کریں اور آپ اور آپ کی اولاد کے حقیقی خیر خواہ سے جھگڑا مول لیں۔

اپنی تربیت بھی اللہ والوں سے کروائیں تاکہ ہماری خامیاں، نقائص وعیوب ہمارے بچوں اور ماتحتوں میں منتقل نہ ہوں، امام نوویؒ نے اس عنوان کے ذیل میں ۲/ آیات اور ۵/ احادیث کے حسنِ انتخاب کا بہترین نمونہ پیش فرمایا ہے، حضرت دامت برکاتہم نے ترجمہ وتشریح فرمائی ہے۔

﴿۷﴾ **"پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید"**:- مذہبِ اسلام کی جامعیت ومانعیت کا یہ ایک نمونہ ہے کہ انسان کو بیوی بچوں کے علاوہ پڑوسی کے بھی حقوق بتائے، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا، ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کو ہم سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

ہمارے اسلافِ عظام نے شریعت کی اس تعلیم پر کتنی باریکی سے عمل کیا، معاشرت کی کیا اہمیت ہے، قرآنی ونبوی ارشادات کو بزرگوں کے واقعات سے حضرت دام مجدہم نے سمجھایا ہے، علماءِ دیوبند کے واقعات پڑھنے سے دل ان کی عظمت وعقیدت سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اس باب میں کل ۱/ آیت اور ۹/ احادیث لائے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ابوزاہر

۸/ ذی قعدہ ۱۴۳۱ھ

۲۰۱۰/۱۰/۱۷ شب یکشنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ مذہب اسلام پر اگر سو جانوں سے بھی فدا ہوا جائے تو اس کا حق ادا نہیں ہوسکتا ایسی پاکیزہ تعلیمات، اتنے اعلیٰ اخلاق کوئی باطل مذہب بھلا کیونکر بتا سکتا ہے، اور پھر جامعیت اتنی ہر گوشہ اور جزئیہ کو کھول کر صاف اور دوٹوک بیان کر دیا گیا۔ معاشرے میں فرحت ومسرت کی لہریں دوڑیں تو کیسے دوڑیں؟ ایسے کہ انسان اپنے حقوق کو پس پشت ڈال کر دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں یکسوئی سے لگ جائے۔ سچ ہے! انسان اپنی دنیوی زندگی سے بھی اتباع شریعت وسنت کے بغیر لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔ فیشن پرستی، مال واسباب، زر و جائیداد سے کبر ونخوت تو حاصل ہوسکتا ہے، لیکن سکونِ قلب اور ماحول میں خوشگواری بغیر اتباع شرع کے پیدا نہیں ہوسکتی۔ آج لوگوں کے پاس سب کچھ ہے، کسی چیز کی کمی نہیں، مال دولت کی ریل پیل ہے، کوٹھیوں بنگلوں کی بہتات ہے، عہدوں اور ڈگریوں کی بھرمار ہے، اگر کمی ہے تو پاکیزہ تعلیمات اور اعلیٰ اخلاق کی، اور اسی وجہ سے زندگیوں سے چین وسکون رخصت ہو چکا ہے۔ بھائی بھائی سے بولنے کو تیار نہیں، ماں کو اولاد سے شکایت ہے، بیٹے کو والدین سے شکایت ہے، ہر ایک دوسرے کی شکایت کرتا ہے، لیکن اپنے گریبان میں جھانکنے کے لیے کوئی تیار نہیں۔ جس قوم کے پاس قرآن ہو وہ پریشان کیوں ہو۔ زندگی کا کونسا شعبہ ہے جس کے متعلق اسلام نے واضح رہنمائی نہیں کی۔ وہ کونسا سوال ہے جس کا جواب ہمارے مذہب نے نہیں دیا۔ وہ کونسی بیماری ہے جس کا علاج نہیں بتایا۔ وہ کونسی بحث ہے جسے تشنہ چھوڑ دیا۔ وہ کونسی الجھن ہے جس کو نہیں سلجھایا۔ حق یہ ہے کہ سارے مسائل ومشاکل ہماری ہی پیدا کردہ ہیں۔ قرآن وحدیث مکمل ہے، بس عمل کرنے کی دیر ہے۔

ہماری مثال اس آدمی کی سی ہے جسے اپنی بیماری کی دوا معلوم ہے،اور وہ اس کے پاس موجود بھی ہے،لیکن استعمال کرنے کے لیے وہ تیار نہیں ہے۔اس کا کوئی کیا علاج کرسکتا ہے؟ دوا تو استعمال کرتا نہیں، بد پرہیزی کر کے مزید بیماریاں اپنے ہاتھوں پیدا کرتا ہے۔قرآن کہتا ہے: ﴿أَنُلزِمُكُمُوهَا وَأَنتُم لَهَا كَارِهُونَ﴾ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم نہ چاہو اور ہم زبردستی تم پر تھوپ دیں؟ کرنا تو ہمیں ہی پڑے گا۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:تم تو دہکتی آگ میں کودنے کے چکر میں ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تم کو بچا رہا ہوں۔اس سے زیادہ کوئی ہمارے لیے کیا کرسکتا ہے۔

اسلامی نبوی مقدس تعلیمات کا جو گلدستہ امام نوویؒ نے تیار کیا تھا اس کو مہکانے اور اس کی خوشبو پھیلانے کا سلسلہ پچھلے کئی سالوں سے سورت میں حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دام مجدہم جاری رکھے ہوئے ہیں۔اللھم زد فزد۔اس عرصہ میں ’’ریاض الصالحین‘‘ مکمل ہو کر اب ’’الادب المفرد‘‘ کا درس جاری ہے۔فللہ الحمد. درس حدیث کی ان پُرنور مجالس میں احادیثِ رسول کے ترجمہ وتشریح کے ضمن میں علمی وعملی اور الہامی والقائی مضامین کا جو دریا بہتا ہے اس پر تبصرہ کرنا کسی کی بساط نہیں ہے۔

’’حدیث کے اصلاحی مضامین‘‘ کی پانچ جلدیں منظر عام پر آکر جو مقبولیت حاصل کرچکی ہیں وہ اس سلسلہ کی کامیابی اور قبولیت کی بین دلیل ہے۔اب اس سلسلۃ الذہب کی اگلی کڑی یعنی چھٹی جلد پیشِ خدمت ہے۔اس کے عنوانات یہ ہیں:

۱	بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ	والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید
۲	تَحْرِيمُ الْعُقُوقِ وَقَطِيعَةِ الرَّحِمِ	والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے کی حرمت

۳	فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ	والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید
۴	اِکْرَامُ أَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ	اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت
۵	تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ	علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا
۶	زِيَارَةُ أَهْلِ الْخَيْرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ	نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا
۷	فضلُ الحُبِّ فی اللهِ والحثِّ علیه	اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید
۸	علاماتُ حبِّ اللهِ تَعَالیٰ الْعَبْدَ	اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں
۹	اَلتَّحْذِيْرُ مِنْ اِيْذَآءِ الصَّالِحِيْنَ وَالضَّعَفَةِ وَالْمَسَاكِيْنَ	نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا
۱۰	اِجْرَآءُ أَحْكَامِ النَّاسِ عَلیٰ الظَّاهِرِ وَسَرَائِرُهُمْ اِلیٰ اللهِ	ظاہر کے مطابق معاملہ کرو۔ دل کا حال اللہ کے حوالے کرو

یہ کل دس موضوعات ہیں، انداز تو وہی حسب سابق ہے موضوع کے مناسب آیات وروایات اما نوویؒ منتخب فرما گئے ہیں جن کا ترجمہ وتشریح حضرت اقدس دامت برکاتہم انتہائی سادہ اور عام فہم انداز میں فرماتے ہیں۔ کیوں کہ مجمع میں علماء کے علاوہ عوام بھی خاصی تعداد میں ہوتے ہیں، مشکل سے مشکل اور دقیق سے دقیق بات بھی سمجھنا کسی کے لیے کچھ مشکل نہیں رہتا۔ بہت سی احادیث ایسی آتی ہیں جن کا ترجمہ وتشریح پہلی بار اتنا واضح اور صاف ستھرا سننے ملتا ہے، اور ضمنی علمی فوائد، مثالیں اور جواہر پارے اس کے علاوہ ہیں۔

ان دس موضوعات میں سے ہر موضوع سبق آموز نصائح وواقعات اور علمی وعملی فوائد پر مشتمل ہے، بہت سے نادرافادات ایسے ہیں جن کوالہامی والقائی قرار دینے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہتا، اور بات کومثالوں سے واضح کرنے کی جوخوبی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کے بعدان کے حقیقی ورثاء کوعطافرمائی ہے، اس کے بہت سے نمونے اس جلد میں نظر سے گزریں گے۔

جس شخص کوامت کافکر دامن گیر ہوتا ہے اس کی احوال امت پرنظر بھی ویسی ہی گہری ہوتی ہے۔نفسیات کی صحیح تشخیص اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت دام مجدہم کو خصوصی دین ہے، اس کا تجربہ طالب علمی کے زمانہ سے ہورہا ہے، اورالحمدللہ یہ ملکہ ترقی پذیرہی ہے۔اس مجموعہ میں بھی دوران مطالعہ اندازہ ہوگا کہ امت کی کتنی صحیح نباضی فرمائی ہے۔اولاد کی تربیت کے معاملہ میں آپ کی نگاہ کتنی دوررس اور باریک بیں ہے اس کا اشارہ ''توقیرالعلماء'' والے مضمون کے بعض ضمنی افادات میں ملے گا۔

اس کے علاوہ حضرت موسیٰ وخضر کے قصہ کے ضمن میں تکوینیات وتشریعیات کی تشریح بھی انوکھی ہے۔

صلہ رحمی کے تعلق سے ہم میں کیا کوتاہیاں درآئی ہیں، اس کے مقابلہ میں شریعت کی اعلیٰ تعلیمات کیا ہیں، ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کاحکم کتنا تاکیدی ہے، ان کی نافرمانی اورایذارسانی کتنی خطرناک چیز ہے، رشتہ توڑنے پرکیاوعیدیں ہیں؛ یہ اموراس جلد کے پہلے دومضامین میں پڑھنے ملیں گی۔عربی زبان کے مشکل مفردات کو آسان بناکرپیش کرنا بھی ایک خاص چیز ہے۔

کوئی والدین کا کماحقہ حق ادانہ کرسکا، اب وہ نہ رہے تو ان کے حق کی ادائیگی کی کیاشکل ہے؟ وہ بھی اسلام نے بتائی ہے۔یہ ہے مذہبِ اسلام کی جامعیت۔

شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لیے کیسے کیسے حربے آزماتا ہے، وہ بھی جگہ جگہ پڑھنے ملے گا۔

آیات وروایات کی تشریح کے ساتھ موقع ملتے ہی حضرت معاشرہ میں پنپ رہے منکرات پر تنبیہ بھی بحسن وخوبی فرماتے چلتے ہیں۔ایسے بھی کئی نمونے ملیں گے ''ماں باپ کی تقسیم کا دردناک منظر'' وغیرہ عنوانات کے تحت ایسی چیزیں موجود ہیں۔

امام نوویؒ کے انتخاب کی خوبی یہ ہے کہ باب سے متعلق قولی روایات کے علاوہ فعلی روایات بھی لی ہیں، یہ مہمیز بنتا ہے جذبۂ عمل کے لیے۔آنحضور علیہ السلام نے جن امور کی تاکید اپنے ارشادات سے فرمائی، ان پر عمل کرکے بھی بتایا، اس کا اپنا اثر ہے۔

سابقہ مجموعوں کی طرح اس مجموعہ میں بھی مضمون کی مناسبت سے فقہی مسائل منفرد شان سے بتاتے چلے ہیں۔ جہاں ضرورت محسوس فرمائی اپنی بات کی تائید میں اسلاف کے معمولات وواقعات پیش فرمادیئے۔گھریلو اور خاندانی امور میں ہونے والی کوتاہیوں پر نقد وتبصرہ کا حضرت کا اپنا ہی انداز ہے۔اس مجموعہ میں دیگر افادات کے علاوہ ہمارا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار کیوں ہے، اس کے باطنی اسباب کیا ہیں، علاج کیا ہے؛ خاص چیز ہے۔

عنوان ''اگر روحانی توجہات چاہئیں'' کے تحت سادات پر بات چلی تو حق ادا فرمادیا۔ پھر کئی سبق آموز واقعات سنائے۔

اس کے علاوہ اس مجموعہ میں جو خاص طور پر پڑھنے اور توجہ دینے کی چیزیں ہیں، وہ یہ ہیں:

(۱) توقیر العلماء کو اس مجموعہ کی روح کہا جاسکتا ہے۔ پورا ہی مضمون بہت دھیان سے پڑھنے کا ہے، کیوں کہ فیہ مافیہ۔

(۲)عنوان ’’صحبت کا کردار‘‘ اور ’’زندگی بھر روتے رہے‘‘۔

(۳)اخیر میں تصوف وسلوک کے مناسب انمول افادات طالب توجہات ہیں۔

(۴)عنوان ’’اسی سے ترقی ہوتی ہے‘‘ پڑھنے والی چیز ہے۔

(۵)موقعہ ملا تو ردِّ شیعیت سے بھی دریغ نہیں فرمایا۔ ’’خطبۂ غدیرِ خُم‘‘ کے ذیل میں موجود ہے۔

آپ کے اور کتاب کے درمیان اس سے زیادہ حائل نہیں بننا چاہتا۔ گستاخی کے لیے معافی خواہ ہوں۔ فقط

ابوزاہر

٦/جمادیٰ الاخریٰ۔۱۴۳۲ھ

۲۰۱۱/۵/۱۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ نے مجھے جو علم وہدایت لے کر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ موسلا دھار بارش کسی جگہ ہوئی، زمین کا ایک بہترین حصہ تھا جس نے اس پانی کو قبول کرکے بہت کچھ گھاس وسبزہ اُگا یا۔ بعض زمینیں سخت تھیں ، انہوں نے پانی جمع کرلیا پھر ان سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نفع پہنچایا، انہوں نے خود پانی پیا، جانوروں کو پلایا، کھیتوں کی سینچائی کی۔ یہی بارش بعض ایسی زمینوں پر برسا جو سپاٹ تھیں، نہ پانی جمع کیا، نہ گھاس پودے اُگائے۔ یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے علم دین حاصل کیا اس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نفع بخشا خود علم سیکھا، دوسروں سکھایا، اور اس شخص کی جس نے اس کی طرف توجہ نہ دی اور اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت لے کر مَیں بھیجا گیا ہوں اس کو اس نے قبول نہ کی۔

محترم قارئین ! یہ وہ دور ہے جس میں دھن دولت کے ساتھ ساتھ علوم کی بھی ریل پیل ہے ،نہ معلوم صبح سے شام تک کتنی کتنی اور کیسی کیسی تحقیقات جنم لیتی ہیں ،ان علوم کے حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپے خرچ کیے جاتے ہیں ،ان علوم کے حاملین کروڑوں روپے کماتے ہیں ،ان علوم کو پڑھنے اور پڑھانے کے مراکز دنیا بھر میں موجود ہیں ،

طلبہ اوراسکالرز کی بھی کوئی کمی نہیں ، نہ جانے لوگ کیسی کیسی ڈگریوں کے سپنے سجاتے ہیں ، محنتیں کرتے ہیں ، قربانیاں بھی دیتے ہیں؛ تب کہیں جاکروہ ڈگریاں حاصل کرپاتے ہیں۔ پھران حضرات کو اعزازت، تمغوں اورایوارڈزسے بھی نوازا جاتا ہے،دوسرے لوگ بڑی حسرت اور رشک سے دیکھتے اورکفِ افسوس مل کررہ جاتے ہیں۔ ان علوم نے دنیاکوکچھ بھی دیا ہو،مال ودولت،کوٹھی وبنگلے،عیش وعشرت،عزت و ثروت لیکن یہ علوم انسانیت کوجوچیز دینے سے عاجز ہیں ،وہ ہے"روحانیت"۔یہ علوم ان کے حاملین اوران کی حوصلہ افزائی کرنے والے -جبکہ علومِ الٰہیہ کونظرانداز کرتے ہوں - روحانیت اور نورانیت سے عاری ہیں۔بقول شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ:-

علمے کہ رہ بحق نہ نماید جہالت است

شایدیہ قدیم سے فطرتِ انسانی رہی ہے کہ جوچیز سہولت سے مل جاتی ہے اس کی قدر اسے نہیں ہوتی ؛چاہے وہ کتنی ہی قیمتی اورضروری ہو۔ اور جو چیز بمشکل ہاتھ آتی ہے اس کووہ بہت اہم مانتاہے؛چاہے وہ کتنی ہی مہمل وبے کار کیوں نہ ہو،لیکن خداتعالیٰ توبے نیاز ذات ہے،اس کی سنت ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ ضروری اوراہم چیز کوعام رکھتا ہے جو ہر کسی کوبسہولت میسر ہو جائے،چاہے وہ اس کی کتنی ہی ناقدری کرے۔اور غیرضروری و مہمل اشیاء کی وہ فراوانی اور بہتات نہیں کرتا،چاہے کوئی اس کے لیے کتناہی مرے۔

یہی معاملہ علوم کے معاملہ میں بھی رہاہے۔سب جانتے ہیں کہ علومِ دنیویہ کو انسانی باطن سے کوئی سروکار نہیں ،یہ علوم تعمیر باطن توکیا کرتے تخریبِ باطن ضرور کر رہے ہیں۔اورجن علوم و فنون کا محور عقلِ انسانی ہو،وہ کیاکچھ جنون کامظاہرہ کریں گے! لیکن ذوق مطالعہ رکھنے والوں کاحال یہ ہے کہ وہ اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے ایسی ہی بے روح،کھوکھلی کتابوں کاسہارالیتے ہیں۔بقول ہمارے حضرت دام مجدہم: یومیہ اخبارکو بار بار پڑھیں گےاور سنبھال کررکھیں گے،میگزین وغیرہ خریدکرپڑھیں گے، ناول، ڈرامے، لطائف پڑھیں گے،اس کے لیے پیسے بھی خرچ کریں گے،لیکن اگرکوئی بندۂ خدا مسجد کے دروازہ پر للہ فی اللہ کوئی دینی کتاب یاپمفلٹ مفت میں تقسیم کرے گا توبادلِ نا خواستہ قبول توکرلیں گے،لیکن گھرآکرجوایک کونہ میں رکھیں گےتو کبھی اس کی صورت دیکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کسی کاکیانقصان ہے،اپناہی کھو رہے ہیں۔

قرآنِ پاک اوراس کی تفسیر،حدیثِ مبارکہ اور اس کی تشریح:یہی ہیں وہ حقیقی علوم جو روحِ انسانی کوتروتازہ رکھتے ہیں۔بھلاعلومِ انسانیہ علومِ الٰہیہ کی برابری کب کرسکتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اصلی ضرورت اورغذایہی علومِ الٰہیہ ہیں، اور ان کے تنوع و تفنن کے بارے میں کیا کہاجائے کہ جس موضوع پر چاہیے بے نظیر مواد موجودہے۔

”ریاض الصالحین“ساتویں صدی ہجری میں لکھی گئی حدیثِ مبارکہ کی کتاب ہے جس کے عمومی درس کوکتابی شکل میں یہ ادارہ کئی سالوں سے جلددرجلد”حدیث کے اصلاحی

مضامین“ کے نام سے آپ حضرات کی خدمت میں نذر کرنے کی سعادت حاصل کررہاہے، اب تک ہم نے یکے بعد دیگرے مختلف مضامین پڑھے جن میں سے ہر ایک اپنے اندر بیش بہانصائح وحکم لیے ہوئے تھے ،اور جلد درکفِ قارئین کے مضامین کی بھی اپنی ہی اہمیت ہے،جس کا صحیح اندازہ تو اس کے مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے،تاہم معمول پورا کرنے کے لیے آیئے ہم اس جلد کے مضامین پر ایک نظر ڈالیں ، مجموعی طور پر ہم اس کو”خوف ورجاء اور زہد وقناعت“ سے معنون کرسکتے ہیں۔

۱: بَابُ الْخَوْف	یعنی	اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان
۲: بَابُ الرَّجَآءِ	یعنی	اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان
۳: بَابُ فَضْلِ الرَّجَآءِ	یعنی	اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کی فضیلت
۴: بَابُ الْجَمْعِ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ	یعنی	خوف اورامید کو جمع کرنا
۵: بَابُ فَضْلِ الْبُكَآءِ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ	یعنی	اللہ تعالیٰ کی خشیت اوراس کی محبت میں رونے کی فضیلت
۶: بَابُ فَضْلِ الزُّهْدِ	یعنی	دنیا سے بے رغبتی کی فضیلت
۷: بَابُ فَضْلِ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ	یعنی	بھوک وفاقہ برداشت کرنا اورسادہ زندگی بسر کرنا

(۱) اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان:-اس بیان میں امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے دس[۱۰] آیات اورپندرہ [۱۵]روایات پیش فرمائی ہیں۔تشریح آیات وروایات کے ضمن میں لاتعداد

افادات سے محظوظ ہوجئے، جنہیں بزرگوں کے ملفوظات اور اکابر کے حالات و واقعات نے چارچاند لگادیئے ہیں۔ ضمنی افادات میں وقت کی قدروقیمت کے تعلق سے بیش قیمت مضمون آپ سے اپنا قیمتی وقت اور خصوصی توجہ مانگتاہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ سے اُمیدرکھنے کابیان:-اس بیان میں آیات چار[۴]جبکہ روایات اٹھائیس [۲۸]ہیں،اس عنوان میں تفسیرآیات سے قبل ہی حضرت اقدس ادام اللہ ظلہ نے مختلف ذیلی عنوانات پر مشتمل ایک مفصل تمہیدبیان فرمائی ہے جس کامطالعہ ان شاء اللہ روح افزا ثابت ہوگا،الحمدللہ عنوان کے ہرگوشہ پر سیر حاصل بحث ہوئی ہے، احادیث ِمبارکہ کی علمی مباحث کوبھی بحسن وخوبی ''Cover'' کیا گیا ہے،راہ ِسلوک کے مسافرین کی عام اُلجھنوں اوران کے جوابات ِشافیہ سے بھی پہلوتہی نہیں کی گئی ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ سے اُمیدرکھنے کی فضیلت:-اس باب میں ایک [۱]آیت اور تین[۳] روایات ہیں۔

(۴) خوف اورامید کوجمع کرنا:-اس باب میں سات[۷]آیات اور تین[۳]روایات ہیں

(۵) اللہ تعالیٰ کی خشیت اوراس کی محبت میں رونے کی فضیلت:- دو[۲] آیات اور دس[۱۰] روایات مع ترجمہ تشریح اورافادات پر مشتمل ہے۔

(۶) دنیاسے بے رغبتی کی فضیلت:-زہدوفقر کے فضائل میں امام نووی(رحمۃ اللہ علیہ) نے آٹھ[۸] آیات اور بتّیس[۳۲]روایات جمع فرمائی ہیں۔یہ بہت غور اوریکسوئی سے پڑھنے کا

عنوان ہے۔ امام نووی(رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی اس کا خاص اہتمام فرمایا ہے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ آٹھ(۸) آیتیں اور بتّیس(۳۲) روایات منتخب فرمائی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مضمون پر قرآن وحدیث میں مواد بھی خوب ہے جو اس کی اہمیت وضرورت کی جانب مشیر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ'' ہر گناہ کی جڑ دنیا کی محبت ہے، یہ نکل جائے تو بیڑا پار ہے، لیکن یہ اتنی آسانی سے نکلتی بھی نہیں۔ اس عنوان کے تحت عجیب و غریب افادات ہیں جو پڑھنے ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب ہم خالی الذہن ہو کر اس مضمون کا مطالعہ کریں گے تو ہمیں اندازہ ہو گا کہ آج دشمنانِ انسانیت لوگوں کو اُلٹا ہی سبق پڑھا رہے ہیں۔ جس چیز کو بے حقیقت بتایا گیا ہے اسی کے فضائل بتائے جا رہے ہیں۔ ایسا ماحول بنا دیا گیا ہے کہ لوگ دنیا کو ضرورت سے زیادہ ہی اہمیت دینے لگے ہیں، لیکن ایک مؤمن کے لیے تو اللہ ورسول سے بڑھ کر کسی کی بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اور خالق سے بہتر سبق کون پڑھا سکتا ہے؟ ''أَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ''

(۷) بھوک وفاقہ برداشت کرنا اور سادہ زندگی بسر کرنا:- یہ باب کل چار [۴] آیات اور اکتّیس [۳۱] احادیث کا انتخاب ہے۔ پڑھتے ہیں تو دل پر اثر ہوتا ہے، اپنی حالت پر نظر ثانی کرنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

اس طرح سترہ(۱۷) مجالس کا یہ گلدستہ چھتّیس [۳۶] آیات اور ایک سو بائیس [۱۲۲] روایات کی تشریح وتفسیر کا خوبصورت مرقعہ ہے۔ اللہ پاک ہم سب کو پڑھ کر ان صفات

کواپنانے کی توفیق عطافرمائے۔حضرت اقدس دام مجدہم کو جزائے خیر دے،آپ کا سایۂ عاطفت بصحت و عافیت اوربسلامتیٔ اعضاء وقویٰ تادیر قائم ودائم رکھے، اورہمیں حقیقی استفادہ واضافہ کی توفیق بخشے۔((آمین))

کتاب کی تیاری میں اہم اورمشکل ترین مرحلہ مضمون کوسی ڈی ((CD)) سے کاغذپرمنتقل کرنےکاہواکرتاہے ،ہمارے بہت سے محسنین ہیں جنہوں نے آج تک بڑے ذوق وشوق سے یہ خدمت انجام دی ہے، اوران کی اسی محنت نے اصلاحی مضامین کی مختلف جلدوں کاروپ دھارا۔خصوصاًاس جلد ہفتم کے مواد کی فراہمی میں مرکزی کردار مولانامفتی محمدرفیق صاحب کوکنی زیدلطفہٗ(استاذِحدیث وصدرمفتی جامعہ حسینیہ،شری وردھن) اور مولانا مفتی عارف صاحب کنجری دام مجدہٗ (استاذِحدیث وتفسیرجامعہ قاسمیہ،کھروڈ)نے انجام دیاہے کہ ان حضرات نے اپنی نگرانی میں یہ کام کرواکر ہمارے لیے باقی مراحل کی تکمیل ممکن بنائی،ہم ان دونوں بزرگوں اوران کےرضاکاران کے ممنون وشکرگزارہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو بہترین بدلہ نصیب فرمائے،اوران کی علمی اوردینی و ملی خدمات کوقبول فرمائے اور مزیدکی توفیق عطافرمائے ((آمین))

ابوزاہر

۱۹/ صفرالمظفر ۱۴۳۳؁ھ

۱۴/۱/۲۰۱۲

اداریہ

بسم اللہ رُب البیت

ایک بات جو پہلے بار بار لکھی جاچکی ہے اس مجلد کے ابتدائی مضامین اس کا عمدہ نمونہ ہیں، وہ یہ کہ اسلام دینِ فطرت ہے ، کسی فرد، قوم ،قبیلہ یا ملک کی جاگیر نہیں ہے،تمام انسانوں کے لئے ہے۔

اس کی تعلیمات میں جو ہمہ گیری اور جامعیت ہے، آج دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ حضرات! تنقید اور پروپیگنڈہ سب سے آسان کام ہے۔ آج اسلام پر کیچڑ اچھالنے کے لیے میڈیا کا جس بے دردی سے اسراف کیا جارہا ہے ، یہ حقانیتِ اسلام کی جیتی جاگتی دلیل ہے۔ قرآن کہتا ہے:﴿ يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ. (الصفّ:۸)﴾ یہ لوگ اپنی پھونک سے نورالٰہی بجھانا چاہتے ہیں، جبکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ٹھان رکھی ہے کہ اپنے نور کو تام کر کے رہے گا؛ چاہے کافروں کو پسند نہ آئے:

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

مسلمانو!میڈیاکی ان شرارتوں اورہتھکنڈوں سے کبھی بددل نہ ہونا،نہ احساس کمتری (Inferiority Complex)کاشکاربننا۔

اس مجموعہ کے ابتدائی مضامین مالیات سے متعلق ہیں۔جب ہم دنیا میں ان قوموں کودیکھتےہیں جومالیات کے سلسلہ کی اسلامی تعلیمات سے ناآشناہیں،انہیں کچھ پتہ نہیں مال کیسے کمایاجائے؟کیونکرخرچ کیاجائے؟ تب ہمیں اپنے مذہب کی قدر ہوتی ہے۔اپنے مذہب کوجانوپہچانو،اس کی گہرائی میں جاؤ،تاکہ پتہ چلے کہ اس دین میں مخلوق کے لیے کیاخیرات وبرکات ودیعت ہیں۔

کیاآج اسلام کے علاوہ کوئی مذہب یہ بتانے کی پوزیشن میں ہے کہ مال کی کیا حقیقت ہے؟اس کوحاصل کیسے کیاجائے؟اس کوخرچ کیسے کیاجائے؟بچت کی جائےیا نہیں؟بچت کتنی کی جائے؟خودپرکتناخرچ ہو؟اوروں پرکتناخرچ ہو؟خرچ کرنے میں(Priority)کس کودی جائے؟ ثانوی درجہ کس کودیاجائے؟خداکے لیے خرچ کرنے پر دارین میں کیافوائد حاصل ہوں گے؟ خداکےیہاں سخی کاکیامقام ہے؟خداکےدربارمیں بخیل کی کیاحیثیت ہے؟فضول خرچی کیاہے؟ فضول خرچی کیا نہیں ہے؟سخاوت واسراف میں کیافرق ہے؟اگرآپ کے پاس ان سوالات کے جوابات نہیں،ولن تفعلوا؛توپھر آپ کو مذہبِ اسلام پر تنقید کاحق بھی نہیں۔

آج انسانوں کی اکثریت مال ومنال بڑھانے کے چکر میں نہ معلوم کن سنگلاخ وادیوں میں ماری ماری پھررہی ہے، رات دن ایک کررکھاہے، بے چین و پریشان ہے، کانفرنسیں نمائشیں (Exibitions) اسکیمیں اور نہ معلوم کیاکیاکررہی ہیں ، لیکن سب لاحاصل۔ مندی عالمی شکل اختیارکرچکی ہے، مہنگائی ہے کہ گھٹنے کانام نہیں لیتی، شریعتِ اسلام نے ایک چھوٹاسالفظ پانچ حروف کا انسانوں کودیا"ق، ن، ا، ع، ت" "قناعت": جو تمام جھمیلوں سے انسان کی چھٹی کردیتا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ تم کوجتنامل جائے، اس پر مطمئن بیٹھے رہو، کم ہوتو بھی، زیادہ ہو تب بھی۔ بسہولت بڑھے توالحمدللہ، نہیں تو سبحان اللہ۔

اس جلدمیں جومواد چناگیاہے یقیناًنایاب وبے نظیرہے، اس کااندازہ تو پڑھنے کے بعد ہی ہوگا۔ حق یہ ہے کہ ایسی (Guidelines) کوئی ایک انسان تو کیا؛ سارے ممالک مل کر عظیم ترین کانفرنس کاانعقادکرکے بھی مدوّن نہیں کرسکتے﴿فتبارک اللہ أحسن الخالقین﴾ اسلام دنیا کا واحد مذہب ہے جوہمیں بتاتاہے کہ ہم مال سے کیا کماسکتے ہیں، اور کیاگنواسکتے ہیں۔

پھراللہ رب العزت نے ہمارے استاذومرشد، مربی و محسن مشفق و محبوب حضرت اقدس دام مجدہم کواندازِبیان کے جن لطائف سے نوازاہے اس نے سامعین وقارئین کے لیے ان نورانی ہدایات وتعلیمات کا سمجھنااور سیکھناانتہائی آسان کردیا ہے۔ اللہ جل جلالہٗ کی جانب سے یہ ملکہ حضرت اقدس کوعنایت فرمایاگیاہے کہ مضمونِ درس کو "Live" بناکرپیش فرماتے ہیں جس

کی وجہ سے سامعین ،پھر قارئین کے لیے اکتاہٹ اور الجھن کے بغیر مضمونِ ارشادِ نبوی کی گہرائی تک پہنچنا سہل ہو جاتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عصرِ حاضر کے علماءِ حق کی طرف سے اصلاحی مضامین کو سندِ پسندیدگی وقبولیت الحمدللہ پیش کی جاچکی ہے،اس سے مراد وہ حضرات ہیں جو وقتاً فوقتاً حضرت اقدس زیدت معالیہم سے ملاقات کے موقعوں پر اظہارِ پسندیدگی فرما چکے ہیں۔

بہت سی مساجد ومجالس میں اس کتاب کا باقاعدہ اجتماعی مطالعہ ہورہا ہے، کہیں ماہِ مبارک رمضان میں وعظ وارشاد کے لیے اسی گلدستہ سے عطربیزی کی جاتی ہے، تو بہت سے خطباء و واعظین کے لیے یہ مجموعہ تقریر کے لیے تیار مواد (ReadyMade Material) فراہم کررہا ہے، جیسا کہ متعدد احباب کے بتانے سے معلوم ہوا۔

حضرت اقدس کی مجالس کی ایک اور خوبی یہ رہی ہے(واللہ زادہ فیہ)کہ بغیر شدید ترین ضرورت کے موضوع سے نہیں ہٹتے،ہاں!جب کوئی اہم بات چھڑ جاتی ہے تو پھر اسے پوری کیے بغیر چھوڑتے بھی نہیں۔

ایسا عموماًتب ہوتا ہے جب بات معاشرہ میں تعلیمات اسلامی کے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی نکل آتی ہے جیسا کہ اس جلد میں بھی آپ مطالعہ فرمائیں گے۔

یاکسی ایسے منکر کا تذکرہ چھڑ جائے جو سماج میں رواج کی شکل اختیار کر جاتا ہے، تب موضوع پر سکتہ (،) کر کے پہلے اس گناہ کی شناعت و قباحت کو قلوبِ سامعین میں خوب پیوست فرماتے ہیں، اور پھر موضوع پر آجاتے ہیں۔

ہماری یہ خوش نصیبی ہے کہ ہمیں عمومی درسِ حدیث ایک ایسی ہستی سے حاصل کرنے کا شرف مل رہا ہے جسے تدریس، تعلیم وتربیت، انتظام وانصرام اور راہ سلوک واحسان کا طویل ترین تجربہ حاصل ہے، کہتے ہیں: ''سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيْمَ'' یعنی تجربہ کار اور حکیم کی رائے میں تعارض ہو؛ تو ترجیح تجربہ کار کی بات کو دی جائے گی۔

ہمارے حضرت اقدس دام مجدہم کی فراغت دارالعلوم اشرفیہ راندیر سے ہے، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں دوسال گزارے، جس میں تکمیل فنون وافتاء وغیرہ کیا، اس ضمن میں حضرت اقدس فقیہ الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کے ٹچ ''Touch'' میں آئے، حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) سے باقاعدہ تلمذ کا شرف حاصل ہونے کے علاوہ حضرت قطب الاقطاب شیخ الحدیث (رحمۃ اللہ علیہ) سے بیعت و استرشاد اور حضرت کے ایماء پر حضرت اقدس فقیہ الامتؒ کی مخصوص تربیتی توجہ پھر شفقت وفیضان کے موردِ خاص بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

دیوبند سے فراغت کے بعد ڈابھیل میں تدریسی تقرر ہوا لیکن حضرت اقدس فقیہ الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کی حیاتِ طیبہ کے دمِ واپسیں تک ضابطہ ورابطہ رہا، جس کی نظیر ہمارے دور میں کم ملتی ہے۔

اپنے معمولات وحالات کی باقاعدہ خطوط کے ذریعہ اطلاع ،پھر حضرت کی ہدایات پر سختی سے عمل، نجی معاملات میں مشورہ لینا؛ ہمیشہ کا معمول رہا۔

حضرت اکثر سناتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت اقدس کو خط لکھا کہ معمولات چھوٹ رہے ہیں۔ جواب آیا کہ پھر وہ معمولات کہاں ہوئے، وہ تو متروکات ہوگئے۔ فرمایا: بس! اس جواب نے اتنا اثر کیا کہ پھر کبھی معمولات ناغہ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے جملہ اکابر میں ذکر بالجہر کا جتنا پابند چچاجان نور اللہ مرقدہٗ (مولانا الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ)) کو پایا؛ اتنا کسی کو نہیں پایا۔ ہمارے مرشد ومربی حضرت دامت برکاتہم کو بھی اللہ جل جلالہٗ نے اس نعمت سے حظِ وافر قابلِ رشک حد تک عطا فرمایا ہے۔ فللہ الحمد۔

راقم آثم کو یاد ہے کہ کبھی کوئی معمولی بات ہوئی تو فوراً پوسٹ کارڈ لکھ کر حضرت فقیہ الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام روانہ فرماتے۔ ربیع الاول کے بیانات کی دعوت کا سلسلہ شروع ہوا تو اپنے مرشد سے باضابطہ استفسار کرکے ہی آگے قدم بڑھایا۔

خلاصۂ کلام اینکہ کسی کو اپنے شیخ سے رابطہ کا تعلق ہوتا ہے، کسی کو ضابطہ کا الحمدللہ ہمارے حضرت کو اپنے حضرت سے دونوں تعلقات کاملاً حاصل تھے۔

تعطیلات کے زمانہ میں حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) جہاں ہوتے، ہمارے حضرت باقاعدہ اجازت حاصل کرکے وہ قیمتی زمانہ حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) کے ساتھ گزار کر مراحل سلوک طے فرماتے رہے۔ اس

زمانہ میں دو ہی بڑی تعطیلات تھی،ایک عیدالاضحی ،دوسری سالانہ۔حضرت فقیہ الامت(رحمۃ اللہ علیہ) کا معمول بقرعیدباندہ میں کرنے کا تھا۔ہمارے حضرت بھی اجازت حاصل کرکے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے۔

سالانہ جلسہ ہوتے ہی دیوبند پہنچ جاتے،اور عشرۂ اخیر میں بارشادِ حضرت ڈابھیل واپسی ہوتی۔ڈابھیل میں ششماہی تعطیلات ایک ہفتہ کاسلسلہ شروع ہوا تو یہ گویاحضرت دام مجدہم کے لیے اپنے شیخ سے استفاضہ کاایک اور سنہری موقع ہوگیا چناں چہ یہ تعطیلات بھی حضرت کے ساتھ گزرنے لگیں۔یہ توسفرنامۂ سلوک کے چند اشارات ہیں،پوراسفرنامہ تومسافرہی لکھ سکتاہے

جس شخصیت نے ایسی باضابطگی کے ساتھ اپنے مرشدسے تربیت حاصل کی ہو، وہ کن اوصاف کی حامل ہوگی ،کون اندازہ لگاسکتاہے۔

جہاں تک تدریسی تجربہ کاسوال ہے توالحمدللہ اس کی نصف صدی مکمل فرماکر اب درسِ نظامی کی سدرۃالمنتہیٰ صحیح بخاری جلداول کی کامیاب تدریس کا دوسراسال چل رہاہے۔اس طویل مدت میں کیاکیانشیب وفرازسے گزریں ہوں گے؟ اس عرصۂ دراز میں حضرت کایہ امتیاز رہا کہ درس طلبہ کوگھول کر پلادیتے ہیں،کوئی سبق بغیرتیاری کے نہیں پڑھاتے،حدیہ ہے کہ

شنبہ کے اس عمومی درس کی بھی باضابطہ تیاری فرماکر تشریف لاتے ہیں۔اس درس کی کیا کیفیت ہوتی ہے؟”عیاں راچہ بیاں“

ناظرین بزرگوار!بندہ کوچاپلوسی سے نفرت ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ بقول حضرت اقدس تھانویؒ:ہندوستان کے خمیر میں مردہ پرستی ہے،عموماًیہ دیکھاجاتا ہے کہ بزرگوں کی حیات میں ان کی طرف خاطرخواہ توجہ نہیں کی جاتی،ان سے تربیت حاصل نہیں کی جاتی ،پھر وفات کے بعدان کے گُن گائے جاتے ہیں،کیوں نہ ہم ان کی حیات ہی میں استفادہ کے ہر موقعہ کو غنیمت سمجھ لیں۔حضرت اقدس کے مفصل حالات زندگی کے لیے مقدمہ محمودالفتاویٰ کے مطالعہ کا مشورہ ہے۔

یہ توجملۂ معترضہ تھا،گوتھوڑاطویل ہی سہی ،اب ہم مضامین کتاب کی طرف لوٹتے ہیں ،ہدایات بہ سلسلۂ مالیات ہی کے بیان میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) ‘شکرگزارمالدار کی فضیلت’ کاعنوان قائم فرماکرشایداس جانب اشارہ فرمارہےہیں کہ مالدار ہونامطلقاً برانہیں ہے، جیسا کہ بعضوں کوغلط فہمی ہوتی ہے،مالداراگرشاکرہوتواس کے باقاعدہ فضائل واردہیں۔امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) کا مضمون جواس سے متعلق حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے فضائل صدقات میں نقل فرمایا ہے، قابلِ مطالعہ ہے

حدیث میں غنٰی سے مطلقاً پناہ نہیں مانگی گئی ہے، بلکہ ایسے غنٰی سے پناہ مانگی گئی ہے جو سرکش بنانے والا ہو۔ "وَأَعُوْذُبِكَ مِنْ كُلِّ غِنًى يُّطْغِيْنِيْ" (الحزب الاعظم) معتدل غنٰی کا سوال کیا گیا ہے۔ "وَأَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى" "أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ غِنَايَ وَغِنَا مَوْلَايَ" "أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ غِنَى الْأَهْلِ وَالْمَوْلٰى" اے اللہ! دنیا دے کر میرے دین پر مدد فرما "أَللّٰهُمَّ أَغِنِّيْ عَلٰى دِيْنِيْ بِالدُّنْيَا" (الحزب الاعظم) وجہ اس کی یہ ہے کہ مالدار ہونا؛ یہ ایک غیر اختیاری امر ہے، جیسے فقر۔ اور اسلام نے غیر اختیاری امور پر فی نفسہٖ کوئی فضیلت یا وعید بیان نہیں کی ہے۔

مالیاتی ہدایات کے معاً بعد حضرت مصنف (رحمۃ اللہ علیہ) نے موت کی یاد اور امیدوں کا اختصار عنوان قائم کرکے شاید ہیلپ لائن "Help Line" بتائی ہے کہ جو شخص ہر وقت موت کو یاد رکھے گا، امیدوں کو مختصر کرے گا، اس کے لیے سخاوت آسان، بخل مشکل، مانگنا مشکل، قناعت آسان، محنت مشقت کرکے حلال کمانا آسان، ایثار و مواسات سہل ہوجائے گا، اور دینی امور میں تنافس کا جذبہ قدرتی طور پر پیدا ہوجائے گا۔

حضرت سیدنا عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی انگوٹھی پر لکھوایا تھا "نصیحت کرنے کے لیے موت کافی ہے" "كَفٰى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا"

کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے	ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
موت آکر ہی رہے گی یاد رکھ	جان جا کر ہی رہے گی یاد رکھ

انسان کو مرنے کے بعد منوں مٹی کے نیچے دبادیاجاتاہے،اس طرح قبرستان وجود میں آتے ہیں،اب ان سے متعلق احکام کے جاننے کی ضرورت پڑے گی ، اس لیے مصنفِ علامہ نے سرخی قائم کی''مُردوں کے لیے زیارتِ قبور کا استحباب، زائر کیاپڑھے؟''اس ضمن میں بیش قیمت مواد موجود ہے۔

موت کی یاد کے فوائد پڑھ کرشاید کسی کوخیال ہوکہ موت کی دعا ہی کیوں نہ کرلوں۔ توفوراًامام (رحمۃ اللہ علیہ)نے بتادیاکہ ٹھہرو!ابھی موت کی تمنامت کرو،اس سلسلہ کی اسلامی ہدایات پڑھ لو، سمجھ لو؛تاکہ آپ کومعلوم ہوجائے کہ وہ کون سے اسباب وعوامل ہیں جن میں تمنائے موت کی اجازت ہے،اورنہیں ہے،پھران کواپنے ذاتی حالات پر منطبق کردیکھو، خود فیصلہ کرلوکہ آپ کے لیے تمنائے موت کی اجازت ہے یا نہیں۔

موت کااستحضارہونے کے بعد انسان کاقلب دنیاکی طرف سے قدرتی طورپر سرد ہو جاتاہے،اورورع وترک شبہات کی طرف طبیعت چلنے لگتی ہے، اس لیے صاحب ِکتاب نے عنوان شروع کیا''ورع وترک شبہات کابیان''اس سرخی کوحضرت اقدس نےکماحقہٗ تشریح فرما کر بے غبار فرمادیاہے۔ورع کامطلب کیاہے؟ اسلاف نےورع کاکیا نمونہ دیا۔واقعات کی شکل میں اسےبیان فرمایاہے۔

اس کے بعد والے عنوان میں مصنفِ ریاض الصالحین نے یہ بتایاہے کہ الوگوں اور زمانہ کے بگاڑکے وقت ۲دین کے اندر فتنہ میں مبتلاہونے کے اندیشہ کے وقت ۳اور حرام یامشتبہ امورمیں مبتلاہونے کے ڈرکے وقت آدمی کے لیے مستحب ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کرلے۔

لیکن کہیں اس کومطلقاًافضل نہ سمجھ لیاجائے،اس لیے بعد والے عنوان میں بتادیاکہ عام حالات میں لوگوں میں رہناہی پسندیدہ ہے۔

اب تواضع کانمبرہے۔انسان جب شریعتِ مطہرہ کی اتنی زبردست پابندی کرے گا تو ظاہرہے کہ شیطان ہاتھ پرہاتھ دیئے تونہیں بیٹھارہے گا،اب وہ کبر کے دام میں پھنساکر انسان کوبھی اپنی طرح راندۂ درگاہ کروانے کے فراق میں رہے گا۔اس لیے امام علام (رحمۃ اللہ علیہ) نے تواضع پرموادا کٹھافرمایا؛تاکہ آدمی آپے سے باہر نہ ہوجائے۔

حضرت اقدس تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کوایک صاحب نے لکھاکہ حضرت !ایک طویل عرصہ سے تہجد کی پابندی ہورہی تھی،ایک دن چھوٹ گئی،اس کابہت رنج ہے۔حضرت (رحمۃ اللہ علیہ) نے جواب دیا: ہوسکتاہے اس لیے چھڑوائی گئی ہوکہ آپ میں کبرنہ پیداہوجائے:

دلا گر تواضع کنی اختیار   شود خلق دنیا ترا دوست دار

اس عنوان کے تحت اصل کتاب کے علاوہ اس کی تشریحات میں بڑے نایاب مضامین ہیں۔

"وبضدھاتتبین الاشیاء"تواضع کو سمجھناہوتوتکبر سمجھ لیں ،تواضع خودبخود واضح ہوجائے گا،اسی لیے امام نووی(رحمۃ اللہ علیہ)نے تواضع کے بیان سے فارغ ہوکر ""تکبراورخودپسندی کی حرمت "کا باب قائم فرمایاہے۔اوراس کے تحت آیات و روایات پیش فرماکراس کی شناعت و قباحت بتانے کی کامیاب سعی فرمائی ہے۔اس مضمون کی تشریح طبیبِ حاذق کی زبان سے اگر سننے کو ملے توکیا لطف آجائے!

اب عنوان ہے:"اچھے اخلاق کابیان"اچھے اخلاق کالفظ جس کثرت سے ہمارے معاشرہ میں مستعمل ہے ،اتنی ہی اس کی حقیقت سے ناواقفیت بھی ہے۔حسن خلق اور اخلاق سے کیامراد ہے؟اس عنوان کے تحت ہمارے قارئین ان شاءاللہ ایسی تشریح پڑھ سکیں گے کہ مضمون پوری طرح نکھر کرسامنے آجائے گا۔

حسنِ خلق ایک درخت ہے جس کی مختلف شاخیں ہیں ؛بردباری ، وقار،اور نرمی عفوودرگزروغیرہ۔اس لیے امام ہمام(رحمۃ اللہ علیہ) نے ان مختلف شاخوں کومستقل عنوان دے کر متعلقہ آیات وروایات کو ان کے تحت جمع فرمادیاہے۔

موادکی فراہمی یعنی سی ڈی (CD)سے کاغذ پر مضامین لکھناکسی بھی درسی تقریر کی طباعت میں اہم ترین مرحلہ شمارہوتاہے،الحمدللہ ہمارے حضرت اقدس کے محبین، مسترشدین وتلامذہ کی تقریباًایک پوری ٹیم ہے جواس گھاٹی سے ہمیں گزارتی ہے، چاہے لکھ کر یااپنے تلامذہ

واحباب سے لکھواکر۔ہم ان سب ہی احباب کے ممنون ہیں۔اس جلد کے لیے مواد کی فراہمی میں بھی جناب مفتی رفیق صاحب کوکنی مدفیضہٗ اور ان کی ٹیم،حضرت مفتی عارف صاحب کنجروی زید فضلہ اور ان کے احباب کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔اسی طرح آئندہ جلدوں کے مواد کی تیاری میں بھی دیگر بہت سے احباب برضاورغبت بڑی عرق ریزی وخوش اسلوبی سے لگے ہوئے ہیں بہت سارا موادتو الحمدللہ ہم تک پہنچ چکاہے۔

اے اللہ !توان تمام احباب کواپنی شایان شان جزائے خیرعطافرماکر ان کے علوم واعمال، قرب الٰہی میں بےپناہ ترقی عطافرما۔دنیاوآخرت کی بھلائیاں نصیب فرما۔حاجات کا تکفل فرما۔ آئندہ مزید درمزید کی توفیق عطافرما۔آمین۔

ابوزاہر

۱۴۳۳/۱۱/۲۱

۲۰۱۲/۱۰/۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

الحمدللہ پھر ایک مرتبہ آپ حضرات کی خدمت میں "**حدیث کے اصلاحی مضامین جلد: ۹**" کا گلدستہ لے کر حاضر ہیں۔وہی روحانی نورانی مضامین جو نبوت کی مبارک زبان کے شایانِ شان ہیں۔

عہدہ، حکومت اور اقتدار کو آج ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں، جھوٹے وعدے، خیانت، غبن، الزام تراشی وغیرہ ہر گناہ انگیز کرلیا جاتا ہے، پھر جب کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کا جو ناجائز استعمال کیا جاتا ہے وہ نہ محتاجِ بیان ہے اور نہ قابلِ بیان۔جمہوری ملکوں میں اقتدار کے 'misuse' کی اگر تاریخ رقم کی جائے تو دفتروں کے انبار لگ جائیں۔آج ان ممالک میں بسنے والا ہر شخص پریشان ہے کیوں کہ تختِ حکومت پر انسانیت کا خون چوسنے والے درندے اڈہ جمائے ہوئے ہیں یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ اس سلسلہ کی خالق انسانیت کی طرف سے دی گئی تعلیمات سے واقفیت نہیں، یا پھر اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں۔اگر اس سلسلہ کی تعلیمات کو پڑھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ حکومت وعہدہ مانگنے کی نہیں ، بھاگنے کی چیز ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے متعلق ایسا نایاب انتخاب پیش فرمایا ہے کہ قابلِ داد ہے، عنوان ہے :✓ "اصحابِ اقتدار کو نرمی کا حکم":

ہمارے زمانہ میں اربابِ اقتدار تو درکنار؛ اُن کے ادنیٰ درادنیٰ ماتحتوں میں سے اگر کوئی ہمارے ساتھ نرم کلامی کرلے ،دل جوئی کا معاملہ کرلے؛ تو ہمیں حیرت ہوتی ہے، گویا اس نے کوئی انہونی کرلی ہو۔ترش روئی وبد کلامی کو ایک حصہ ٔ فرض سمجھا جاتاہے۔خیانت ، بدعہدی اور رشوت کا بازار الگ گرم ہے ؛جس سے ہر شہری پریشان ہے۔واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیوی زندگی کے مختلف الانواع شعبوں کے لیے جتنی ہدایات دی گئی ہیں ان کی مخالفت اور پریشانی لازم ملزوم ہے۔

اسلام عالم گیر مذہب ہے، پوری انسانیت کے لیے ہے ،خود اسلامی تعلیمات پر صدفیصد عمل کرکے دارین کی فلاح وبہبود حاصل کرنا ہماری سعادت ہے، پھر اس کا تعارف اپنوں اور دوسروں سے کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔پوری انسانیت کے ہر دکھ درد کا واحد علاج اسلام اوراسلامی تعلیمات میں ہے۔

جامعیت کی بات تو یہ ہے کہ ایک طرف حکام وسلاطین کو اگر رعایا سے حسنِ سلوک اور ہمدردی کا درس دیا، تو دوسری جانب رعایا کے گلے میں ''اطاعتِ حکام'' کا ایسا زبردست طوق ڈالا کہ انتشار وخلفشار اورانارکی انسانی معاشرہ کے قریب بھی نہ پھٹک سکے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عنوان کے ماتحت مندرجہ ٔ ذیل ضمنی عناوین قائم کئے ہیں :-

✅ انصاف سے پیش آنے والا حکمران:

✅ حاکموں کی اطاعت کے احکام:

✅ عہدہ طلب کرنے کی ممانعت:

✅ بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید:

✅ امارت وقضاء وغیرہ عہدے مطالبہ کرنے والوں یالالچ رکھنے والوں کو دینے کی ممانعت :

اس سے فراغت کے بعد صاحبِ کتاب نے آداب کا وہ سلسلہ شروع فرمایا جن کے اختیار کرنے سے انسان حقیقی انسان بنتا ہے اور چھوڑنے سے سرحدِ انسانیت سے نکل جاتا ہے، مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف عناوین قائم فرماکر آیات وروایات کا حسین گلدستہ حسبِ عادتِ شریفہ پیش فرمایا ہے۔

✅ شرم وحیاء کیا ہے ؟اوراس کی فضیلت۔اس کا اسلام میں کیا مقام ہے ؟

✅ رازداری کی اہمیت، کسی کے بھید کی حفاظت کرنا:

✅ عہدوپیمان اوروعدہ پورا کرنا:

✅ نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا:

✅ بوقتِ ملاقات خوش کلامی وبشاشت:

✅ بات چیت واضح اور صاف ستھری کرے۔ اگر ایک بار سے مخاطب نہ سمجھے تو دو تین بار دہرائے:

✅ اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا:

اسی طرح آدمی کے اندر وقار یعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جماؤ اور ٹھیراؤ ہونا چاہیے، یہ زندگی کا ایک اہم حصہ ہے جس کی وجہ سے آدمی کا سماج وسوسائٹی میں اثر و رسوخ قائم ہوتا ہے، اس سے متعلق معتدل تعلیم شریعتِ مطہرہ کے اندر موجود ہے جس کا مواد اس عنوان کے ماتحت قاری کو یکجا مل جائے گا۔

✅ سنجیدگی اور اطمینان کی عادت:

✅ نماز اور علمی مجالس میں سکون و وقار سے آنا:

✅ مہمان کا اعزاز واکرام کرنا:

✅ کسی کو اس کی خوشی کے وقت مبارک بادی دینا

✓ اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا، اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا:

✓ استخارہ کرنا اور مشورہ کرنا:

یہ عنوان انتہائی توجہ سے پڑھنے کا ہے۔ایسی نایاب باتیں اس عنوان کے تحت آئی ہیں جو کہیں اور بہت مشکل سے ملے گی، حضرت دامت برکاتہم نے بہت وضاحت سے سمجھایا ہے کہ استخارہ کا حکم کس پس منظر اور ماحول میں نازل ہوا، عربوں نے اپنی طرف سے کسی اہم معاملہ میں اپنا تذبذب دور کرنے کے لیے کیا طریقے گھڑ رکھے تھے، عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ استخارہ ایک سرسری عمل ہے، لیکن حضرت کے مضمون کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتنا گہرا اور نایاب عمل ہے جو اللہ رب العزت کی طرف سے بندوں کو دیا گیا ہے، اسی ضمن میں دعائے استخارہ کا نہ صرف ترجمہ؛ بلکہ دل نشین تشریح بھی پڑھنے کی چیز ہے۔

✓ عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا:

✓ ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے:

پھر ان سب کے ضمن میں دیگر علمی فوائد ،ارشاداتِ اکابر مختلف مثالوں کے ذریعہ مضمون کی تشریح وغیرہ امور ہیں ۔

اس کے بعد کھانے اور پینے کے آداب کا سلسلہ شروع فرمایا جو تقریباً سوا سو صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ ضرور پڑھیۓ اور دوسروں کو سنایئے، اگر بیوی بچوں کو ساتھ بٹھا کر اس کی تعلیم کی جائے گی تو ان شاء اللہ زندگیوں میں سلیقہ و تمیز پیدا ہو گی، اور ایسی ایسی باتیں سامنے آئیں گی کہ ایمان میں تازگی محسوس ہو گی۔

☜ کھانے کے آداب / کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا:

☜ کھانے میں عیب نہ نکالے۔ اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا:

☜ دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے؛ تو کیا کہے؟:

☜ کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟:

☜ اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا اور ادب سکھانا:

☜ مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے:

☜ کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ وہ کیا کرے؟:

☜برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم:

☜ٹیک لگاکر کھانے کاناپسندیدہ ہونا:

☜پینے کے آداب:

☜مشکیزہ اوربڑے برتن سے منھ لگاکرپینے کی ممانعت اوراس کی وجہ:

☜پینے کی چیزمیں پھونک نہ مارے:

☜کھڑے ہوکرپینے کی تفصیل:

☜پلانے والاخوداخیرمیں پئے:

☜کن برتنوں میں پیناجائز ہے اور کن میں نہیں :

حق تویہ ہے کہ جوں جوں ہم یہ مضامین پڑھتے جائیں گے توں توں ہمارے سامنے دینِ اسلام کے محاسن منکشف ہوں گے،تعلیمات کی قدر ہوگی،اور عمل کریں گے تو زندگی سنورے گی،ایک ایمان والے کے لیے تعلیماتِ نبوی انمول سرمایہ ہے۔حق تعالیٰ شانہ ٗ ہمیں توفیق عطافرمائے۔

اس جلد کے مواد کی فراہمی میں ہمیں مفتی محمد امین صاحب راجستھانی اور مولانا محمد ایوب صاحب مالیگانوی زید مجدہما اوران کے احباب کا تعاون حاصل رہا، ادارہ ان سب کا ممنون و مشکور ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کے علم و عمل، صلاح و تقویٰ میں برکت دے اوران سب کو خدمات کا دارین میں بہترین بدلہ عطا فرمائے۔

ابوزاھر

۱۸؍ جمادیٰ الثانیہ ۱۴۳۴ھ

۳۰؍ اپریل ۲۰۱۳ء

اداریہ

باسمہٖ سبحانہٗ وتعالیٰ

آج کل ”Manners“ اورآداب کے نام پر بہت کچھ بتایااور پڑھایا جاتاہے، لیکن جو جامعیت اور گہرائی اللہ تعالیٰ اوررسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے آداب میں ہے؛وہ کہیں اور نہیں ملتی۔اور ملے بھی کیوں کر؟کہاں انسان کا علم اور کہاں اللہ تعالیٰ کا علم! بہت سے لوگ تو ”Manners“ کے نام سے اسلامی آداب ہی لکھ دیتے ہیں لیکن اسلام کا حوالہ نہیں دیتے؛پتہ نہیں کیوں؟انسان کی طاقت ہی نہیں ہے کہ وہ وحی کی مدد کے بغیر محض اپنی عقل استعمال کر کے یہ آداب بتاسکے،یہ باتیں تو صاحبِ وحی ہی بتاسکتے ہیں،اب اگر انسان ان کو معلوم نہ کرے،یا عمل نہ کرے؛ تو پھر اس کے لیے کیا باقی رہ جاتا ہے؟

اسلام نے جن خطرات کو سوچ کر لباس کے سلسلہ میں انسانوں کو کچھ خاص ہدایات دی تھیں، انسانیت کے دشمنوں نے جان بوجھ کر دنیا میں ان ہدایات کے خلاف لباس کو مردوں اور عورتوں میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ”فیشن“ کا نام دے کر عام کیا؛تاکہ دینِ اسلام پورے معاشرہ وسماج میں جو پاکیزگی لانا چاہتا ہے اس سے وہ ہمیشہ محروم ہی رہے،اور جو بگاڑ ختم کرنا چاہتا ہے وہ خوب بڑھے۔

دینِ فطرت نے مردوں کو ٹخنہ چھپانے والے لباس سے منع فرمایا،اور عورتوں کو تاکید کی کہ ٹخنہ چھپانے والا لباس ہی پہنیں؛تو اب اعدائے اسلام نے باقاعدہ محنت کر کے دونوں میں ایسی فیشن ایجاد

کردی کہ مرد ٹخنے چھپانے کو اپنی عزت کی معراج سمجھنے لگے، اور عورتیں اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ ننگا کرنے میں فخر محسوس کرنے لگیں۔

ذرا سوچئے! اگر اسلام کی تعلیمات پر عمل کا عمومی ماحول ہوتا تو انسانوں کو کیا فائدہ ہوتا؟ مردوں کو یہ فائدہ ہوتا کہ ان کی طبیعت ومزاج میں کبر پیدا نہ ہوتا۔ یہ کبر ہی انسان کو کسی کی ماننے سے روک دیتا ہے "الکبر بطر الحق" کبر کا مطلب ہی "حق کو ٹھکرانا" ہوتا ہے۔ آج حال یہ ہوگیا کہ بیانات کرنے والے بیانات کرتے کرتے بوڑھے ہوگئے، درسِ قرآن میں کتنوں کی زندگیاں کھپ گئیں، درسِ حدیث دینے والے علماء نے بھی کوئی کمی نہیں چھوڑی، اور یہ بات بھی نہیں کہ لوگ بیانات میں شریک نہیں ہوتے، ضرور شریک ہوتے ہیں اور بصد شوق شریک ہوتے ہیں، لیکن زندگیوں میں خوشگوار انقلاب نظر نہیں آتا۔

سب عورتیں اگر اسلامی لباس کی پابند ہو جاتیں تو کتنے بڑے بگاڑ سے دنیا بچ جاتی، جس نے بڑی بڑی حکومتوں کے سر میں درد کردیا ہے، بے حیائی، فحاشی، عریانیت کے زہر سے آج خود اس کے موجدین ہی جاں بہ لب اور دم بخود ہو چکے ہیں۔ کوئی سمجھ دار انسان کسی کو بے وجہ کوئی ہدایت نہیں دیتا؛ تو پھر وہ ذات جہاں جا کر حکمت ختم ہو جاتی ہے وہ انسانوں کو بے وجہ کوئی حکم کیوں دے گی، یا کسی چیز سے کیوں روکے گی؟

اس جلد کے ابتدائی ۷۱ ؍صفحات در حقیقت تشریح ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے اسی انتخاب کی جو آپ نے آیاتِ قرآنی وروایاتِ نبوی کی شکل میں پیش فرمایاہے، خالی الذہن سلیم الفطرت انسان ان سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

اس کے بعد تقریباً ۲۰؍ صفحات کا مضمون سونے کے آداب کا ہے، جس کے ضمن میں اور بھی بہت سی چیزیں آگئی ہیں۔ سونا انسان کے لیے ناگزیر ہے، انسان بہر حال سوتا ہے چاہے آداب و مستحبات کی رعایت کرے یا نہ کرے، آداب و مستحبات کی رعایت سے سونے والا دونوں جہاں کا فائدہ حاصل کرتا ہے اوران کی رعایت نہ رکھنے والا اس سے محروم رہتا ہے۔

”آدابِ مجلس“ انسانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، اسی وجہ سے شریعت نے یہ بھی خاص طور سے سکھائے ہیں۔

پھر ”سلام کے احکام وآداب“ بیان ہوئے، نیز ”اجازت لینے کے آداب وہدایات“ اور ”ملاقات و مصافحہ کے آداب“ ہیں۔

بیمار کی عیادت کی تاکیدِ اکید کے ساتھ ہی ”آدابِ عیادت“ کی رعایت بھی اتنی ہی ضروری ہے، آداب کی عدمِ رعایت مریض کے لیے دردِ سر بن جاتی ہے، اس سلسلہ میں اسلامی ہدایات کو غور سے پڑھ کر ان کی رعایت کرکے حسنِ معاشرت کا ثبوت پیش کیا جاسکتا ہے۔

میت اور اہلِ میت کے ساتھ کن آداب کو برتنا چاہیے؟ تعزیت اور پسماندگان کو دلاسہ دلانے کی اہمیت پر بڑا موئثر مضمون بیان ہوا ہے۔ اسی ضمن میں "میت کے قرض کی ادائیگی اور اس کی تیاری میں جلدی کا اہتمام" نہایت ہی اہم اور عقدہ کشا مضمون ہے۔

انسانی زندگی میں سفر کے بغیر چارۂ کار نہیں، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کے انتخاب کی تشریح پڑھنے سے "آدابِ سفر" معلوم ہوں گے، ساتھ ہی ساتھ سفر کی اقسام کا علم ہو گا، قصر کے احکام ذہن نشین ہوں گے، دورانِ سفر کن کن باتوں کی رعایت کرنی چاہیے وہ سیکھنے ملیں گی اور سفر کی مختلف مسنون دعائیں بھی معلوم ہوں گی۔

خلاصہ یہ کہ " ادب " تو انسان کا طرۂ امتیاز ہے:-

ادب ہی سے انسان انسان ہے ادب جو نہ سیکھے وہ حیوان ہے

گویا اس جلد کا نام "آدابِ زندگی" رکھا جائے تو بیجا نہ ہو گا کہ اس پوری جلد میں مختلف آداب ہی کا تذکرہ ہوا ہے۔ یکسوئی کے ساتھ ان کے مطالعہ سے قارئین کو اس بات کا یقیناً اندازہ ہو گا کہ خالقِ کائنات نے اپنے نبیِ اُمی علیہ الف الف تحیۃ وتسلیم کی زبانِ مبارک سے انسانوں کو کتنے اعلیٰ ترین آداب کی تعلیم دلوائی ہے!

اس مجموعہ میں کُل دو سو گیارہ (۲۱۱) روایات پیش ہوئی ہیں۔

ہم مولانا مفتی محمد رضوان صاحب احمد آبادی زید مجدہٗ (ناظم مدرسہ ولی اللہ، کالوپور، احمد آباد) اوران کے رفقاء کے نہایت ہی ممنون و مشکور ہیں کہ انہوں نے حسبِ سابق اس جلد کے مواد کی فراہمی میں ہمیں بھرپور تعاون کیا۔ فجزاہم اللہ اَحسن الجزاء فی الدارین۔ اللہ تعالیٰ گلشنِ احمدی کی آبادی وشادابی کے لیے ان سب کو قبول فرمائے۔

ابوزاہر

کلماتِ بابرکات

از: حضرت مولانا مفتی محمد فاروق صاحب میرٹھی دامت برکاتہم العالیہ

جامع و مرتب فتاویٰ محمودیہ۔
خلیفہ و مجازِ حضرت اقدس فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی
وبانیٔ جامعہ محمودیہ، علی پور، ہاپوڑ روڈ، میرٹھ (یوپی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم ہمارے حضرت اقدس فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ کے بہت ہی اخص الخواص حضرات میں ہیں، بلکہ ہمارے حضرت اقدس مفتی صاحب (نوراللہ مرقدہٗ) کو تمام متعلقین میں جن پر بہت زیادہ اعتماد تھا؛ ان میں بندۂ عاجز کے ظن اور نظریہ کے مطابق دو حضرات سرِفہرست ہیں: ایک تو حضرت اقدس مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی دامت برکاتہم العالیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور دوسرے حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم العالیہ۔

ہمارے حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے یہاں ان دونوں حضرات کا جو احترام تھا وہ دوسرے تمام حضرات میں سب سے زیادہ تھا۔ حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) اپنے خطوط میں بھی ان دونوں حضرات کے لیے جو القاب لکھواتے تھے وہ بہت اونچے ہوتے تھے۔ حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) ان دونوں حضرات کے لیے عامۃً ”جامع الکمالات والمحاسن، مجمع الکمالات والمحاسن، مجمع البرکات

و الحسنات، جامع الکمالات الظاہرۃ والباطنۃ“ جیسے کلمات استعمال فرمایا کرتے تھے۔ حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کی طرف سے اتنے اونچے کلمات اور القاب سے نوازا جانا ظاہر ہے کہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ جب کہ حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے یہاں انتہائی اعتدال پسندی تھی، ہر کسی کے لئے انتہائی جچے تلے الفاظ ہی استعمال ہوتے تھے، نہ افراط تھی نہ تفریط۔

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم نے سب سے پہلے حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے مشورہ سے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی (نوراللہ مرقدہٗ) کے یہاں بیعت وسلوک کا تعلق قائم کرکے تربیتِ باطنی حاصل کی، اور حضرت شیخ (نوراللہ مرقدہٗ) سے مراسلت ومکاتبت کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا اور موقع بموقع حضرت شیخ (نوراللہ مرقدہٗ) کی خدمتِ بابرکت میں حاضری بھی دیتے اور قیام بھی فرماتے، اور اکثر وبیشتر ماہِ مبارک بھی حضرت شیخ الحدیث (نوراللہ مرقدہٗ) کی خدمت میں گزارتے۔ آٹھ نو سال برابر یہ سلسلہ رہا اور یہ سب فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے مشورہ مطابق ہوتا تھا، اس طرح حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے اعتماد کے ساتھ حضرت شیخ (نوراللہ مرقدہٗ) کے یہاں بھی اعتمادِ خاص کا درجہ حاصل تھا۔

ذٰلك فضل الله يؤتيه من يشآء والله ذو الفضل العظيم

حضرت شیخ الحدیث (نوراللہ مرقدہٗ) کے وصال کے بعد اصلاح وتربیت کا تعلق کامل طور پر حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے ساتھ قائم رہا، معمولات کی کامل پابندی کے ساتھ اپنی زندگی میں پیش آمدہ ہر ہر واقعہ کی اطلاع دے کر ہدایت حاصل کرنا اور اس ہدایت پر پورا پورا عمل کرنا برابر یہ سلسلہ

جاری رہا۔ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں تقرر، تدریس، دارالافتاء کا قیام، فتویٰ نویسی، تمرینِ افتاء، رسِ حدیث، کتابوں کی ترقی یا تنزلی، تبدیلی وغیرہ، فتویٰ نویسی میں کسی مسئلہ میں اشکال ہوا تو اس کو حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) سے حل کرنا، اور بھی اپنی ذات سے متعلق یا طلبہ کی تعلیم وتربیت سے متعلق پیش آمدہ ایک ایک جزئی کی اطلاع دے کر ہدایت حاصل کرنے کا مستقل معمول تھا۔ اپنے یہاں دارالافتاء سے فارغ ہونے والے طلبہ کو سالانہ امتحان کے لیے حضرت فقیہ الامت(نوراللہ مرقدہٗ) کی خدمت میں بھیجنا، خانقاہ کا قیام، اور خانقاہ سے متعلق ہر ہر امر میں مشورہ کرکے ہدایت حاصل کرنا، اور ڈابھیل کی خانقاہِ محمودی واحمدی کی ترقی اور استحکام کے لئے حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کا ماہِ مبارک میں ڈابھیل قیام فرمانا؛ یہ سب چیزیں سب کو معلوم ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب شاگردِ رشید اور مریدِ باصفا اس درجہ لائق اور کامل اتباع کرنے والا ہو، تو شیخِ کامل کی توجہ اس پر کس درجہ ہوگی، اور ایسے شیخِ کامل کی توجہاتِ عالیہ کی برکت سے ایسا لائق مریدِ باصفا کس مرتبہ پر پہنچ جائے گا! آج اس کو دنیا دیکھ رہی ہے۔ خواجہ مجذوب علیہ الرحمہ نے اسی کو فرمایا ہے:-

چار چیزیں لازمی ہیں استفادہ کے لیے	اطلاع واتباع واعتقاد وانقیاد

حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہم نے ان سب چیزوں کی پوری پابندی فرمائی، جس کی وجہ سے ان کو حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کے یہاں انتہائی قرب واختصاص بلکہ مقبولیت ومحبوبیت کا درجہ حاصل ہوا۔ جو اس طریق میں منتہائے مقصود ہے۔ ہمارے حضرت اقدس فقیہ

الامت مفتی صاحب (نوراللہ مرقدہٗ) کی خصوصی نظر ان کے اوپر ہمیشہ سے رہی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو علومِ ظاہری کے ساتھ ساتھ علومِ باطنی سے بھی خوب خوب نوازا۔

علومِ ظاہری کے اندر حدیثِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کیسی مہارت عطا فرمائی ہے، ایک طویل عرصہ سے حدیثِ پاک کی اہم کتابوں کا درس دے رہے ہیں جو طلبہ میں بیحد مقبول ہے اور اسی طرح ''حدیث کے اصلاحی مضامین''۔ریاض الصالحین سے متعلق جو منظرِ عام پر آرہے ہیں۔وہ اس کی گواہی دینے کے لیے کافی ہیں، جن سے آج ایک بڑا طبقہ فائدہ اُٹھارہا ہے۔اس کے مطالعہ سے پتہ چلتاہے کہ حدیثِ پاک کے مضامین کو آسان کرکے عوام کے سامنے کس طرح پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان پر ہونے والے اشکالات اوران کے جوابات، اور خوب صورتی کے ساتھ فرقِ ضالّہ کا رد، اوراپنے اکابر کے واقعات کابہت اچھاذخیرہ اس میں آگیاہے۔الحمدللہ ! اس جیسے اور بھی بہت اہم اصلاحی مضامین کامستند ذخیرہ جمع ہو گیاہے جن کو بے تکلّف کسی بھی جگہ سنااور سنایاجاسکتاہے، جن کو خانقاہوں کے لیے اصلاحی نصاب بھی کہاجاسکتاہے، بلکہ ایسے مفید و مستند مضامین کے سننے سنانے کا سلسلہ مساجد، مدارس، خانقاہوں میں اپنے اپنے مکانوں میں ہر ہر جگہ قائم کرناچاہیے۔ ہمارے مدرسہ جامعہ محمودیہ میرٹھ میں عصر کے بعد کی مجلس میں جس میں حضراتِ اساتذۂ کرام شرکت فرماتے ہیں ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کو بالترتیب پڑھوانے اور سنانے کااہتمام مَیں خود بھی کرتااور کرواتا ہوں، اور موقعہ بموقعہ دوسرے حضرات کو بھی اس بات کامشورہ دیتارہتاہوں۔

ریاض الصالحین امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تصنیف ہے جو مادرزاد ولی ہونے کے ساتھ عظیم محدّث اور مصلحِ اُمت بھی تھے، لوگوں کی اصلاح اور زندگیوں کو سیرت پاک ﷺ کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے حدیثِ پاک کے ذخیرے سے منتخب کرکے ریاض الصالحین کو مرتب فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں قبولیت عطا فرمائی، اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، دوسری زبانوں میں ترجمے کئے گئے جو بہت مقبول ہوئے۔

حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری زید مجدہم نے عوام وخواص کی اصلاح کے لیے ریاض الصالحین کو سامنے رکھ کر اپنے خطابات اور بیانات کا سلسلہ شروع فرمایا جس کو اللہ تعالیٰ نے بیحد مقبولیت عطا فرمائی۔ ان بیانات کو کیسٹ اور سی ڈی سے نقل کرکے ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کے نام سے شائع کیا جارہا ہے جس کی اب تک دس جلدیں شائع ہوچکی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے خاص قبولیت سے نوازا ہے، اور عوام وخواص اس سے مستفید ہورہے ہیں، اس طرح ریاض الصالحین کی بہترین آسان شرح تیار ہوگئی ہے، مگر اس کے نام ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' سے اس طرف ذہن نہیں جاتا کہ یہ باقاعدہ ریاض الصالحین کی شرح ہے بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ کیف ما اتفق حدیث کے مضامین بیان کردئے گئے ہیں، اس لیے اگر اس کا نام ''ارشاد السالکین الیٰ ریاض الصالحین'' یا ''مدارج السالکین فی ریاض الصالحین'' یا اس طرح کوئی اور نام تجویز کردیا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

فتاویٰ نویسی میں بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت مفتی صاحب زید مجدہم کو بڑی مہارت عطا فرمائی ہے۔ جدید اہم اور مشکل مسائل کو حل فرمانے کی کیسی عمدہ صلاحیت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازا ہے "محمود الفتاویٰ" اس بات کی شاہدِ عدل ہیں جس کی اب تک پانچ جلدیں طبع ہو کر قبولیتِ عام حاصل کر چکی ہیں، جن کو اکابر اربابِ فتاویٰ کا اعتماد حاصل ہے اور عوام وخواص ان سے استفادہ کر رہے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت فقیہ الامت (نوراللہ مرقدہٗ) کی خصوصی توجہ اور تربیت کی برکت سے آپ کو باطنی علوم سے بھی بڑا وافر حصہ نصیب فرمایا ہے۔ اخلاقِ فاضلہ، انتہاء درجہ کی تواضع، عبدیت وعاجزی، ہر کسی کے ساتھ شفقت ومحبت سے پیش آنا، ہر ایک کے لیے خیر خواہی کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا ہے، جس کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ نے مرجعیت اور مقبولیت کی خاص شان سے ان کو نوازا ہے اور عوام وخواص کا رجوع ان کی طرف برابر بڑھ رہا ہے اور حضرت والا زید مجدہم کا فیض ملک وبیرونِ ملک میں جگہ جگہ خوب پھیل رہا ہے۔

قابلیت تو بہت لوگوں میں ہوتی ہے، لیکن ایسی شخصیات بہت کم ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ فیض رسانی اور اپنے بندوں کی اصلاح وہدایت کے لیے منتخب فرماتے ہیں اور ان کو خاص توفیق سے نوازتے ہیں۔ الحمد للہ! حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس وقت امت کی ہدایت واصلاح اور فیض رسانی کے لیے بطورِ خاص منتخب فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور پوری امت کو حضرت کی قدردانی کی توفیق عطا فرمائے حضرت کے فیوض وبرکات کو بہت زیادہ عام وتام فرمائے۔ صحت وعافیت اور اخلاص واستقامت کے ساتھ

حضرتِ والا کا سایہ دراز فرمائے۔ اور حضرت کے فیوض اور برکات سے خلقِ کثیر کو فیضیاب و سیراب فرمائے، اور ہر نوع کے مکارہ سے پوری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

فقط (حضرت مولانا مفتی) محمد فاروق (صاحب میرٹھی) غفرلہٗ

خادم جامعہ محمودیہ علی پور، ہاپوڑ روڈ، میرٹھ (یوپی)

۱۳/۷/۱۴۳۵

بسم اللہ الفتاح وبہ أستعین

اداریہ

انسان اگراپنے مالک وخالق کے اوامر کوبجالائے تو یہ عین اس کی بندگی کا تقاضہ اوراس کی سعادت ہے۔نہ تواس کو یہ حق ہے کہ وہ اس پر خالق ومنعم، محسن ومولیٰ سے کچھ امید رکھے،نہ ہی خالق تعالیٰ پر یہ ضروری ہے،کیوں کہ جو کھلائے پلائے پہنائے،پالے پوسے،سب ہی کچھ جس کاہو؛اس کی جانب سے سپرد کیا گیاکام اگر انسان سے انجام پاجائے؛تویہی اس کی شانِ عبدیت ہے۔ اور اگر وہ ان امور کو انجام نہ دے تو پھر آخر وہ کس کام کے لیے ہے؟

توبرائے بندگی ہے یادرکھ

اوراس نافرمانی پر مولائے حقیقی کی طرف سے جوکچھ بھی سزادی جائے تو یہ اس کا حق ہے،یہ ساری باتیں تو"عدل"کی ہیں۔لیکن بات اگر "فضل"کی کی جائے،پھرتوبندہ جتنابٹور سکتاہواس میں ذرا بھی کمی نہ رکھے۔حضرت ایوب (علیہ السلام) کے باب میں صحیح حدیث میں ہے کہ غسل خانہ میں عین غسل کے دوران سونے کی ٹڈیاں گرنے لگیں اس کو حضرت ایوب (علیہ السلام) جمع کرنے لگے،وحی آئی: ایوب!کیاہم نے تم کواس سے بے ضرورت نہیں بنارکھاہے؟حضرت ایوب (علیہ السلام) نے کیاپیاراجواب

دیا: وَلٰكِنْ لَا غِنَىً بِيْ عَنْ بَرَكَتِكَ، رب کریم! تونے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے، جس کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت تو نہیں، لیکن تیری عطا اور برکت سے کبھی مستغنی (بے ضرورت) نہیں ہو سکتا:

جو اِس دَر کا بھکاری ہے، قسمت کا سکندر رہے

انسان محنت، مزدوری، صنعت و حرفت، کھیتی باڑی، ملازمت کے راستہ سے جو کچھ کماتا ہے، اسے "منفعت یا اجرت" کہا جاتا ہے، لیکن اعمالِ خیر کی بجاآوری پر اسے جو حاصل ہوتا ہے؛ اسے "فضیلت" کہا جاتا ہے۔ یہ خود اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ سب فضلِ خداوندی ہے حالاں کہ ان کو بھی "فوائد" یا "منافع" کہہ سکتے تھے، لیکن کوئی بھی اس کو نفع یا فائدہ نہیں کہتا، اس کی وجہ یہی ہے۔

"حدیث کے اصلاحی مضامین" کی گیارہویں جلد کیا ہے؟ بابِ کرم، جود وعطا و سخا ہے۔ محنت و مجاہدہ اور ہمت والے آئیں، اور اپنے جوہر دکھائیں "لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ ۔ وَ فِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ" طویل و عریض ہال میں بندہ کو چھوڑ دیا ہے، جہاں مختلف الانواع دسترخوان چنے ہوئے ہیں، میزبان کی جانب سے مکمل اختیار و آزادی ہی نہیں؛ بلکہ پیشکش ہے کہ جو چاہے، جب چاہے، جہاں چاہے، جتنا چاہے، جیسے چاہے؛ سمیٹ لے اور بٹور لے:-

ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں
راہ بتلائیں کسے رہروِ منزل ہی نہیں

جب پیغمبر ﷺ کے قدمِ مبارک پر نوافل پڑھتے پڑھتے ورم آجائے، جب وہ یہ فرمادیں کہ مَیں بھی نیکی اور ثواب کا اتنا ہی محتاج ہوں جتنے تم ہو؛ تو پھر محبت کا دَم بھرنے والے امتیوں کے لیے کیا عذر باقی رہ جاتا ہے!۔

امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی خوب دل کھول اور جی بھر کر روایات و آیات پیش فرمائی ہیں، جن کا آسان ترجمہ و تشریح علمی فوائد و نکات، بزرگوں اور اسلاف کے واقعات کے ساتھ ہمارے استاذِ مکرم و مرشد محترم دام مجدہم وزیدت معالیہم نے کی ہے جو اس وقت کتابی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

انسان ہوٹل میں جاتا ہے تو اس کے ہاتھ میں 'Menu' تھمادیا جاتا ہے، انسان اپنی بساط کے مطابق انتخاب کر کے آرڈر کرتا ہے، وہاں اسے خرچ کرنا ہوتا ہے، یہاں ایک 'Menu' ہمیں دیا گیا ہے لیکن یہ بٹورنے والا 'Menu' ہے، یہ پسند کروگے تو اتنا 'Balance'، وہ لوگے تو اتنا..... دراصل ہم لوگ زہد و قناعت اور حرص و طمع غلط جگہ کرنے کے عادی ہوگئے ہیں، جہاں ہم سے قناعت کا مطالبہ کیا گیا وہاں ہم حرص و طمع کرتے ہیں، اور جہاں حرص و طمع کو کہا گیا وہ ہمارے زہد و قناعت کا میدان ہوچکا ہے۔

یہاں سے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے حفظِ قرآن اور تلاوتِ کتاب اللہ، وضو، اذان، نماز اور اس میں بھی مختلف اوقات کی فرض، سنت و نوافل نمازوں، روزہ، اعتکاف اور حج کے فضائل کو الگ الگ عنوان دے کر نہایت شرح و بسط سے بیان فرمایا ہے، جس کا سلسلہ اس جلد کے بعد بارہویں جلد میں بھی چلے گا؛ لہٰذا اس جلد کو "**فضائلِ اعمال**" کا عنوان دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

گذشتہ جلدوں کی اشاعت کے بعد بہت سے قارئین کا تاثر وقتاً فوقتاً یہ سننے کو ملا کہ حضرتِ والا کی زبان سے بہت سے ایسے مضامین بیان ہوتے ہیں جن سے وہ گتھیاں سلجھ جاتی ہیں جس میں ہم عرصۂ دراز سے الجھے ہوئے تھے۔ "ذٰلك فضل الله، اللّٰهم زدفزد" اس جلد میں کل ۲۹۴/روایات ہیں۔

اس جلد کے مواد کی فراہمی میں حسبِ سابق مولانا مفتی محمد رضوان صاحب احمد آبادی زید مجدہ (ناظم مدرسہ ولی اللہ، کالوپور، احمد آباد) اوران کے رفقاء نے اپنی پوری ہمت صرف فرمائی تب جا کر یہ جلد آپ حضرات کے ہاتھوں میں ہے، ہم ان سب حضرات کے دل سے ممنون ومشکور ہیں اور دعا گو ہیں کہ باری تعالیٰ وہ تمام خصائل وفضائل سے ان سب کو آراستہ فرمائے جو احادیث کی نشرواشاعت پر دربارِ نبوی سے ارشاد فرمائے گئے ہیں۔

ابوزاہر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

فضائل کا جو سلسلہ جلد:۱۱/سے شروع ہوا تھا وہ جلد:۱۲ پر ختم ہورہا ہے، کل ملاکر تقریباً ۸۰۰ / صفحات ہوتے ہیں، ریاض الصالحین کے ایک نسخہ میں ص:۳۲۶ سے کتاب الفضائل کی ابتداء ہے، اور ص:۴۴۴ پر اس کی انتہاء ہے، یعنی متن متن ہی ۱۱۸/ صفحات ہیں، جن کی تشریحات حدیث کے اصلاحی مضامین کے تقریباً ۸۰۰/ صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں ۔

اگر دیکھا جائے تو یہی ہمارا زادِ راہ ہے، انسان کو اللہ تعالیٰ کا قرب دلانے والے سب سے پہلے نمبر پر فرائض ہیں ، اور اس کے بعد سب سے زیادہ مقرب بنانے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ نفلی اعمال ہیں ۔جب انسان ان کا اہتمام کرتا ہے تو وہ ترقی کرتا رہتا ہے، اُدھر اللہ تعالیٰ کی جانب سے قدردانی کا یہ عالَم ہے کہ بندہ ایک بالشت بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک ہاتھ بڑھتے ہیں، بندہ ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایک باع یعنی چار ہاتھ بڑھتے ہیں ۔اب کیفیت یہ ہوتی ہے کہ انسان سے خواہی نخواہی اللہ تعالیٰ کی مرضیات ہی کا صدور ہوتا ہے، نامرضیات کا صدور ہوتا ہی نہیں۔اسی کو حضرت نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یوں تعبیر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے

ہیں: میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، الخ۔ گویا اطاعت اس کی طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہے، اب بندہ کی اپنی کوئی مرضی اور خواہش باقی نہیں رہتی:-ع مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

اور

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود ۞ گوئے گشتن بہرِ اُو اولیٰ بود

اگر یہ کیفیت پیدا ہو جائے تو پھر کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے!۔

آج دنیا کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے، نہ آج کی سیاست سے خلقِ خدا کو کوئی فائدہ ہوا، اور نہ ذرائع ابلاغ (Media) سے، اور نہ خالی باتوں سے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب انقلاب آیا ہے اور انسانیت کو فیض پہنچا ہے، ان ہی نفوسِ قدسیہ سے پہنچا ہے۔

مؤرخِ اسلام مفکرِ ملت حضرت اقدس مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ تاتاری فتنہ کی ہولناکی کو مفصل بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

"آپ جانتے ہیں پھر تاتاریوں کو کس نے فتح کیا؟ کس نے تاتاریوں کو اسلام کا کلمہ پڑھایا؟ اُس نازک گھڑی اور گھٹاٹوپ اندھیرے میں اہلِ دل سامنے آئے جن کے اندر

روحانی طاقت تھی اور تقریباً نصف صدی کے اندر انہوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنالیا۔ قبولِ اسلام کے واقعات پوری تاریخ میں پھیلے ہوئے ہیں ،افراد کے قبولِ اسلام کے،خاندانوں کے قبولِ اسلام کے،شہروں کے قبولِ اسلام کے؛لیکن قوموں کے من حیث القوم قبولِ اسلام کی مثالیں ہمارے علم میں تین یا چار سے زیادہ نہیں ۔تاتاریوں اور ترکوں نے انفرادی طور پر نہیں ، من حیث القوم سوفیصدی اسلام قبول کیا۔تاریخ کا یہ معمہ ہے،اور میں بھی اس آزمائش سے گزر چکا ہوں ۔یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ یہ تاریخ ساز اور ساری دنیا کے مستقبل پر اثر ڈالنے والا واقعہ (تاتاریوں کے قبولِ اسلام کا واقعہ)پیش آئے اور ہمیں ان لوگوں کے نام بھی نہ ملیں جن کے سر تاتاریوں کے قبولِ اسلام کا سہرا ہے؛یہ کیا بات ہے ؟

مجھے بڑی تحقیق و جستجو کے بعد جب میں اس موضوع پر لکھ رہا تھا،دوآدمیوں کے نام ملے ہیں ،ایک درویش صفت وزیر امیر توزون کا نام جو عراق پر حکومت کرنے والی تاتاری نسل کے بادشاہ کے وزیرِاعظم تھے،وہ صوفی منش اور عابدوزاہد وزیر تھے۔تاتاری بادشاہ کے کان میں وہ اچھی بات ڈالتے رہے حتیٰ کہ بغداد والوں نے اچانک ایک دن یہ دیکھا کہ جمعہ کا مبارک دن ہے اور تاتاری حکمران سلطان غازان اوراس کے وزراء ہاتھ میں تسبیحیں لیے ہوئے مسجد کو جارہے ہیں ۔

دوسرا کارنامہ شیخ جمال الدین کا ہے جن کے خلوصِ بے پایاں ، سچی روحانیت اور دلی دردمندی کی برکت سے تاتاریوں کی چغتائی شاخ (کاشغر) میں اسلام پھیلا اور پوری شاخ مسلمان ہوگئی۔

واقعہ یہ ہے کہ شیخ جمال الدین کہیں جارہے تھے، ایرانی تاتاریوں کی نگاہ میں سب سے زیادہ بے وقعت تھے، وہ ان کو طعنہ دیتے اور چڑاتے تھے کہ: ایرانی بھی کوئی آدمی ہوتے ہیں؟ اتفاق سے وہ ایرانی بھی تھے۔ یہ تغلق تیمور شہزادہ کے شکار کا دن تھا جو چغتائی شاخ کا ولی عہد تھا اوراس کی تاج پوشی میں کچھ مہینے یا سال باقی تھے۔ شکار کے بہت سے توہمات ہوتے ہیں ، اور یہ لوگ سخت توہم پرست تھے۔ شیخ کو دیکھا کہ وہ شکار گاہ میں داخل ہوگئے، فوراً سپاہی نے پکڑا اور مشکیں باندھ کر شہزادہ کے سامنے لایا، شہزادہ بڑا ہی مکدر ہوا، اس نے کہا: آج تو میرا سارا شکار غارت گیا، کس منحوس کی میں نے صورت دیکھ لی، یہ ایرانی کمبخت یہاں آگیا۔ اس کا کتا پاس تھا، غصہ میں کہا کہ: تم اچھے ہو کہ میرا کتا؟ خیال کیجئے اور منظر کو سامنے لایئے اور دیکھئے کہ خدا کے بندوں نے کس طرح کام کیا ہے۔ ان کے چہرہ پر کوئی رنگ نہیں آیا۔ کوئی شکن پیشانی پر نمودار نہیں ہوئی، نہایت اطمینان کے ساتھ کہا: اس کا فیصلہ ابھی نہیں ہوسکتا، شہزادہ نے کہا: کیا مطلب؟ انہوں نے کہا کہ: اس کا انحصار کسی اور چیز پر ہے، اگر میرا خاتمہ ایمان پر ہوتا ہے تو میں اچھا ہوں ؛ ورنہ یہ کتا اچھا

ہے۔ تغلق تیمور کے پتھر دل پر ضرب لگی۔ محض کچھ کہہ دینے سے دل پر ضرب نہیں لگتی؛ لیکن:۔

ہر چہ از دل می خیزد، بر دل می ریزد

انہوں نے جس وقت یہ جملہ کہا ہوگا اس کے ساتھ کتنی دعائیں، کتنے آنسو، کتنی آہیں رہی ہوں گی۔ خدایا! کہنے کو تو میں جملہ کہتا ہوں، اثر تُو پیدا کر۔ یہ وقت ہے اسلام کی قسمت کے فیصلے کا۔ اگر اس شخص کے دل پر چوٹ لگتی ہے تو مسلمانوں کی قسمت بدل جاتی ہے۔

یہ واقعہ جو فارسی تاریخوں سے ماخوذ ہے، آرنلڈ کی کتاب ” Preaching Of Islam“ میں کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ لکھا گیا ہے۔

تغلق تیمور نے کہا: اس وقت تو میں کچھ نہیں کہتا، ولی عہدِ سلطنت ہوں، آپ کہیں بھی ہوں، جب یہ سنیں کہ میری تاج پوشی ہوگئی تو مجھ سے ملئے گا۔ اب وہ اللہ کے بندے دن گننے لگے کہ وہ ساعتِ سعید کب آتی ہے کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہو، اور مَیں خدا کا پیغام اس تک پہنچاؤں۔ ان کی قسمت میں نہیں تھا، وقتِ آخیر آگیا، مرضِ موت میں انہوں نے اپنے بیٹے شیخ رشید الدین کو بلایا اور پوری بات بتا کر کہا: جس وقت تم یہ سنا کہ تغلق تیمور کی تاج پوشی ہوگئی ہے اس تک میر اسلام پہنچانا اور کہنا کہ: آپ نے میرے والد

سے کچھ کہا تھا؟ چناں چہ وہ گئے، دربانوں نے ان کو روک دیا، یہ ایک درخت کے نیچے مصلیٰ ڈال کر وہاں بیٹھ گئے، جب نماز کا وقت ہوتا اذان دیتے اور نماز پڑھ لیتے۔ خدا کو منظور تھا ایک دن صبح کے وقت انہوں نے اذان دی، وہ آواز محل اور خوابگاہِ سلطانی میں پہنچی یا پہنچائی گئی۔ بادشاہ نے کہا: یہ کون باؤلا شخص ہے؟ داروغہ نے کہا: حضور! ایک دیوانہ سا آدمی آیا ہے، ہم نے بھی کوئی زیادہ تعرض نہیں کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا: اسے پکڑ کر لاؤ۔ بلایا گیا۔ بادشاہ نے کہا: تم کون ہو؟ شیخ نے کہا کہ: سرکار! آپ کو کچھ یاد ہے؟ پوری بات بتائی اور کہا: میں آپ کو یہ بتانے آیاہوں کہ اس کا فیصلہ ہو گیا۔ الحمدللہ! وہ ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے۔ بادشاہ نے سنا اور وزیرِ اعظم کو بلایا۔ کہا کہ: ایک راز ہے جو میرے سینے میں تھا۔ یہ واقعہ میرے ساتھ گزرا ہے، اُس کا اثر آج تک میرے دل پر باقی ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیاہے کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا؛ تمہاری کیارائے ہے؟ وزیر نے کہا: حضورِ والا! میں تو بہت دنوں سے مسلمان ہوں، میں تو اپنے اسلام کو چھپارہا تھا۔ میں ایک مرتبہ ایران گیا تھا، وہاں میں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور وزراء بلائے گئے اور جب بادشاہ کا منشاء معلوم ہوا تو سب مسلمان ہوگئے۔ اسی وقت تغلق تیمور مسلمان ہوا اور پورے ایران کے تاتاری چند دن میں مسلمان ہوگئے۔ جس طرح تسبیح کے دانے گرتے ہیں، تاتاری لاکھوں کی تعداد میں اسلام قبول کررہے تھے۔ یہ مسلمان دانشور مخلص علماءواعظین مبلغین اور سب سے بڑھ کر

اہلِ دل کا کارنامہ تھا۔اس حقیقت میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں،پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ان اہلِ دل نے اندر اندر کام کیا ہے اور تاتاری ان کے نامہ ٔاعمال میں ہیں۔یہ لاکھوں انسان (جنہوں نے تاریخ پر اثر ڈالا ہے) قیامت کے دن جب اُٹھیں گے تو انہیں کے حساب میں شمار ہوں گے۔ان اہلِ دل کا ذکر کرتے ہوئے اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا ایک شعر بے اختیار زبان پر آرہا ہے:ـ

اچھے وہی ہیں آج جو سوتے ہیں زیرِ گل
افسوس ہے انہیں کے ہزاروں گلے ہوئے

("نقوش" رسول نمبر:۱/۱۵تا۱۹)

دعا گو ہوں :-

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنادے — جو قلب کو تڑپادے،جو رُوح گرمادے
پھر وادئ فاراں کے ہر ذرّے کو چمکادے — پھر شوقِ تماشادے،پھر ذوقِ تقاضہ دے
محرومِ تماشا کو پھر دیدۂ بینادے — دیکھا ہے جو کچھ مَیں نے اوروں کو بھی دِکھلادے
بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل — اس شہر کے خُوگر کو پھر وسعتِ صحرادے
پیدادلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر — اس محملِ خالی کو پھر شاہدِ لیلادے

اس دَور کی ظلمت میں ہر قلبِ پریشاں کو
وہ داغِ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثُریا کر
خودداریٔ ساحل دے، آزادیٔ دَریا دے

بے لوث محبت ہو، بے باک صداقت ہو
سینوں میں اُجالا کر، دل صورتِ مینا دے

احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا
امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

مَیں بلبلِ نالاں ہوں اِک اُجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو دَاتا دے

(کلیاتِ اقبال)

ابوزاہر

بنام خدا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس جلد کے ساتھ ہمارا قرب خاتمہ کتاب سے کافی بڑھ گیا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے ہر دن اگتا سورج ہماری زندگی کا ایک دن کم کر کے ہمیں اپنی قبر سے قریب کرتا ہے:

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

حضرت اقدس فقیہ الامت نور اللہ مرقدہٗ کبھی کبھی بڑے درد سے یہ شعر پڑھتے تھے:

قدم سوئے مرقد، نظر سوئے دنیا
کہاں جارہا ہے؟ کدھر دیکھتا ہے؟

حضرت عبد اللہ بن رواحۃ (رضی اللہ عنہ) کا شعر ہے:

اللهم لولا أنت ما اهتدينا ولا تصدقنا ولا صلينا
فأنزلن سكينة علينا وثبت الأقدام إن لاقينا

اگر اللہ رب العزت اپنے آخری نبی ﷺ کو بھیج کر ہمیں علم کی روشنی نہ دیتے تو ہم ہدایت پر نہ آسکتے، نہ ہم صدقہ کرتے نہ نماز پڑھتے۔ اے اللہ! ہم پر سکینہ نازل فرما، اور اگر دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو ہمارے قدم جما دینا۔

جس شخص کو مذہب اسلام مل جائے اس کو کسی اَور چیز کا افسوس کرنا زیب نہیں دیتا، اس کو تو یکسوئی اور اہتمام سے مذہبی تعلیم کو مکمل طریقے سے حاصل کرنا چاہیے، اور مکمل شرعی واسلامی زندگی گزار کر اپنے دین ومذہب سے سچی محبت کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے۔

آج صورت حال کچھ ایسی کر دی گئی ہے کہ مسلمان اگر اپنے مذہب پر سنجیدگی اور مضبوطی سے عمل پیرا ہوتا ہے، تو اسے કટ્ટરવાદી ચુસ્તنہ دیا جاتا ہے، اسے جا و بے جا ذلیل کیا جاتا ہے، اس کے وقار کو مجروح کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے گنوایا نہیں جاتا؛ لیکن کسی اَور مذہب کا ماننے والا اگر مذہب پر عمل کی جانب ذرا سی توجہ کرتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کی ہر ممکن کوشش انجام دی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ بہت سے مسلمان باوجود جی چاہنے کے، سب کچھ معلوم ہونے کے اور مذہبی تعلیمات پر عمل کے بھرپور شوق کے، محض طعن وتشنیع کے ڈر اور ذلت ورسوائی کے اندیشے سے برسرِ عام اسلامی احکام وتعلیمات کو زندہ کرنے سے گریز کرتے ہیں، ایسے حضرات سے دست بستہ درخواست ہے کہ: ’’فخر سے کہو، ہم مسلم ہیں‘‘۔ اب وقت آگیا ہے کہ بہ بانگِ دہل ایمان و اسلام کا اور اس کی تعلیمات کا اعلان کیا جائے۔ ہمارے محسن آقا ﷺ نے شاید اسی صورت

حال کی پیش گوئی ان الفاظ میں فرمائی تھی کہ: ایک وقت آئے گا جب نیکی سے روکا جائے گا اور برائی کا حکم دیا جائے گا۔

آج جب پوری دنیا مادیت کی جانب اندھا دھند دوڑ لگا رہی ہے، معیار زندگی کو بلند سے بلند تر بنوایا جارہا ہے، جس کے نتیجے میں لوگ ہر جائز وناجائز طریقۂ آمدنی اختیار کرنے لگ گئے ہیں، ایسے میں ایک مسلمان کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ، وہ اپنے مذہب اور اس کی تعلیمات کے تحفظ کا اطمینان کرلے، دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے؛ لیکن میرے مذہب پر اور میری مسلمانیت پر آنچ نہ آنے پائے، کوئی مجھے ذلیل سمجھے، آرتھوڈکس کا لیبل لگائے، یا کوئی اَور طعنہ دے، میرا تو حال یہ ہو:

لوگ سمجھے مجھے محروم وقار وتمکین
پر وہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

تاکہ کل کو قیامت میں یہ کہنے کا منھ رہے کہ:

گو مَیں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تمھاری یاد سے غافل نہ رہا

اور

پتے بکھر رہے تھے بڑی تیز تھی ہوا
پھر بھی تمھاری یاد کا جلتا رہا دیا

آج کے مسلمان کو حضرت عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) کا یہ زریں ارشاد لوحِ قلب پر کندہ کرلینا چاہیے، جو آپ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ) سے اس وقت ارشاد فرمایا تھا جب انھوں نے سولہ پیوند والا لباس اتار کر قیمتی جوڑا زیب تن کر کے فتح بیت المقدس کے لیے آگے بڑھنے کی درخواست کی تھی: إِنَّا كُنَّا أَذَلَّ قَوْمٍ فَأَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّةَ بِغَيْرِ مَا أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِهِ أَذَلَّنَا اللّٰهُ(۱): ہمیں آج اللہ تعالیٰ نے جو عزت بخشی ہے وہ سب اسلام کا صدقہ ہے، قیمتی جوڑوں، ظاہری شان وشوکت اور مال ودولت سے نہیں۔ اور یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین کرلو، کہ جس دن ہم اسلام سے ہٹ کر عزت کی تلاش میں نکلیں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل وخوار کر کے رکھ دے گا۔ آپ ہی بتایئے! اسلام کے علاوہ کسی اَور مذہب والے کو غیبت کی ممانعت کا علم ہے؟ غیبت کی شناعت وقباحت کہیں اَور اتنی عمدگی سے سمجھائی گئی ہے؟ جھوٹ، بہتان، گالی، لعنت وملامت،

(۱) عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ، قَالَ: خَرَجَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِلَى الشَّامِ وَمَعَنَا أَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فَأَتَوْا عَلَى مَخَاضَةٍ وَعُمَرُ عَلَى نَاقَةٍ لَهُ فَنَزَلَ عَنْهَا وَخَلَعَ خُفَّيْهِ فَوَضَعَهُمَا عَلَى عَاتِقِهِ، وَأَخَذَ بِزِمَامِ نَاقَتِهِ فَخَاضَ بِهَا الْمَخَاضَةَ، فَقَالَ أَبُو عُبَيْدَةَ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْتَ تَفْعَلُ هَذَا، تَخْلَعُ خُفَّيْكَ وَتَضَعُهُمَا عَلَى عَاتِقِكَ، وَتَأْخُذُ بِزِمَامِ نَاقَتِكَ، وَتَخُوضُ بِهَا الْمَخَاضَةَ؟ مَا يَسُرُّنِي أَنَّ أَهْلَ الْبَلَدِ اسْتَشْرَفُوكَ، فَقَالَ عُمَرُ: أَوَّهْ لَمْ يَقُلْ ذَا غَيْرُكَ أَبَا عُبَيْدَةَ جَعَلْتُهُ نَكَالًا لِأُمَّةِ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم إِنَّا كُنَّا أَذَلَّ قَوْمٍ فَأَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالْإِسْلَامِ فَمَهْمَا نَطْلُبُ الْعِزَّةَ بِغَيْرِ مَا أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِهِ أَذَلَّنَا اللّٰهُ.

(المستدرك للحاكم ۱/۱۳۰)

دوسروں کو تکلیف پہنچانے کا مضمون، بغض، کینہ، دشمنی اور قطع تعلقات کی بات اتنی گہرائی اور گیرائی سے کہی گئی ہے؟ غرضیکہ جتنے مضامین اس جلد میں موجود ہیں، حق تو یہ ہے کہ انسانیت کو نقطۂ عروج پر کوئی اَور چیز ان تعلیمات کے علاوہ پہنچا ہی نہیں سکتی۔

حقوق انسانیت (માનવ અધિકાર) کے تحفظ کے خود ساختہ علم بردار چاہے کچھ بھی کرلیں ؛ لیکن معاشرے کو جنت کا نمونہ بنانے والی اور انسانوں کو حقیقی احترام بخشنے والی تعلیمات کے لیے تو ان کو اسلام ہی کی کاسہ لیسی کرنی پڑے گی۔

واقعہ یہ ہے کہ اگر انسانوں کو ان امور سے منع نہ کیا گیا ہوتا، تو امن وامان کا ماحول قائم کرنا اور سکون کا سانس لین دوبھر ہو جاتا۔فجزی اللہ عنا سیدنا ومولانا محمدا ما ھو أھلہ ﷺ.

نیز اللہ تعالیٰ ہمارے حضرت دام مجدہم کو اپنے شایان شان جزائے خیر دارین میں عطا فرمائے،اور ہمہ جہتی ترقیات وبرکات سے ہم کنار فرمائے، کہ آپ نے حضرت نبیٔ کریم ﷺ کی یہ پاکیزہ اور روحانی تعلیمات ہمیں آسان سے آسان تر کر کے سمجھائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے سایۂ عاطفت کو بہ صحت وسلامت وعافیت تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے، اور ہمیں اور کُل امت کو آپ کی حقیقی قدر دانی نصیب فرمائے۔ آمین

جلد ہٰذا کے مواد کی فراہمی میں مولانا امتیاز احمد صاحب مالیگانوی زید احترامہ کا قابلِ قدر تعاون حاصل رہا، ہم اہل ادارہ ان کے ممنون ومشکور ہیں، اور دعا گو ہیں کہ: اللہ پاک ان کو

اس خدمت کا بہترین بدلہ دارین میں نصیب فرمائے، اور ان کی تمام دینی وملی خدمات میں مزید ترقی عطا فرماکر شرف قبولیت سے نوازے۔ آمین

ابوزاہر

افتتاحیہ

کوئی بھی تربیتی کورس تب تک نامکمل مانا جاتا ہے جب تک اس میں کی جانے والی اشیاء کے ساتھ ساتھ نہ کرنے کی چیزیں بھی نہ بتادی جائیں ،ڈاکٹر جیسے مریض کو دوا بتاتا ہے، پرہیز بھی بتاتا ہے اور پرہیز کی اہمیت یہ ہے کہ وہ ہر دوا کی جڑ ہے، الحمية رأس كل دواء۔

یہ ممکن ہے کہ انسان دوا استعمال نہ کرے لیکن پرہیز مکمل کرے اور وہ اچھا ہو جائے، لیکن یہ (اسباب کے درجے میں) کبھی نہیں ہو سکتا کہ پرہیز ذرا بھی نہ کرے، دوا استعمال کرتا رہے اور وہ اچھا ہو جائے۔

انسان کو ایک مکمل انسان بنانے کے لیے جہاں خالق ومالک تعالیٰ نے کرنے کے امور بتائے، وہیں نہ کرنے کی چیزوں کی بھی رہبری فرمادی۔ اس جلد کے مضامین اسی موضوع پر ہیں، اس لیے اس جلد کو آپ ”ممنوعات ومنہیات کا انسائیکلوپیڈیا“ بھی کہہ سکتے ہیں ۔

امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترتیب قائم فرماکر سرخیاں لگائی ہیں، آیات و روایات کا کیا حسین گل دستہ ہے، بعض ممنوعات ایسے ہیں کہ وہ خالص انسان ہی کی حفاظت یا اس کی سہولت وراحت کی خاطر ہیں۔ مثلاً: رات کو گھر میں آگ جلتی چھوڑنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ یہی چیز گھر میں آگ لگنے کا سبب بن سکتی ہے۔ ایک پیر میں چپل اور ایک ننگا؛ ایسے چلنے سے منع فرمایا، کیوں کہ اس میں جہاں بے وقاری ہے، وہیں بیلنس کھو کر گرنے کا بھی اندیشہ ہے۔ کہانت کی ممانعت

فرما کر مخلوق کے مال کے ایک بڑے حصہ کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ بد شگونی: توہمات کا باب وا کرنے والی چیز ہے، اس سے روک دیا۔

الفاظ کا استعمال بہت نپا تلا ہونا چاہیے، یہ نہیں کہ کچھ بھی بول دیا۔ جی برا ہو رہا ہو تو بجائے 'خَبُثَتْ نَفْسِيْ' کے 'لَقِسَتْ نَفْسِيْ' کہنا چاہیے۔ انگور کے لیے عربی میں لفظ 'کرم' کے استعمال سے منع فرمایا، ارشاد ہوا کہ انگور کہاں سے 'کرم' ہو گیا؟ 'کرم'۔ تو مؤمن کا قلب ہے۔

یہ جملہ لا ابالی پن اور غفلت کی غمازی کرتا ہے کہ 'میں قرآن بھول گیا' ہمارے مؤدب و مہذب نبی ﷺ نے یہ تہذیب وادب سکھایا کہ یوں کہو 'قرآن بھلا دیا گیا'

اس میں کتنے اعلیٰ درجے کی نفاست ہے کہ انسان کھاتے وقت وہ ہاتھ استعمال نہ کرے جس سے غلاظت و نجاست دور کرتا ہے، یا غلاظت و نجاست دور کرنے میں وہ ہاتھ استعمال نہ کرے جو کھانے پینے کے لیے ہے کہ عین کھانے اور پینے کے وقت اگر اس گندی حالت کا تصور آگیا تو انسان کا کھانا پینا مشکل ہو جائے گا۔

بعض ممنوعات ایسے ہیں جو دوسروں کی خاطر رکھے گئے ہیں، مثلاً: کسی ایک بچے کے ساتھ داد و دہش میں ترجیحی معاملہ کرنا کہ یہ دوسرے بچوں کے لیے تکلیف و پریشانی کا باعث ہے۔

بعض چیزیں انسان کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت کی خاطر منع کردی گئیں، مثلاً: تصویر سازی۔ ذی روح کی تصویر سازی پر شدید وعیدیں اوراظہار ناراضگی فرمایا گیا کہ یہ چیز انجام کار شرک وبت پرستی کی راہ ہموار کرتی ہے۔

غرضیکہ جتنے بھی ممنوعات ہیں؛ اگر عقل سلیم کی روشنی میں ذراسا غورو فکر کیا جائے گا تو وہاں انسانوں ہی کا کوئی نہ کوئی بہت بڑا (دینی یادنیوی) فائدہ، یاان کی کسی بہت بڑے (دینی یادنیوی) نقصان سے حفاظت کا پہلو کسی نہ کسی زاویے سے نظر آئے گا۔ اور کیوں نہ ہو کہ آخر آنحضور سرورِ دوعالم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی ذات والاصفات کو ربُّ العالمین نے رحمۃ للعالمین بناکر جو بھیجا تھا۔ اب تو یہ ہے کہ "مَنۡ عَمِلَ صَالِحاً فَلِنَفۡسِهٖ وَمَنۡ أَسَآءَ فَعَلَيۡهَا" جو عمل کرے گا وہ نفع میں رہے گا، اور جو عمل نہ کرے گا وہ نقصان اُٹھائے گا۔

اس سب کے باوجود ہم آخر ہیں تو بندے ہی، لہٰذا کسی حکم کی کوئی حکمت ومصلحت ہمیں معلوم نہ بھی ہو تب بھی ہم اس پر عمل تو جی جان سے ہی کریں گے کہ اگر حکمت ومصلحت ہی تلاش کرتے رہے تو وہ بندگی ہی کیا ہوئی؟

ابوزاہر

۱۱/۱۱/۱۴۳۶ھ

باسمہٖ تعالیٰ

اداریہ

حضرات مصنفین کا زمانۂ قدیم سے یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی مصنفات میں مضامین کو ابوابِ مخصوصہ کے ذیل میں بیان کر کے جب فارغ ہو جاتے ہیں تو اخیر میں ''متفرقات'' کی ایک سرخی قائم کر کے ان میں ایسے مضامین ذکر فرماتے ہیں جن کو کسی ایک خاص عنوان کے تحت ذکر کرنا مشکل ہوتا ہے۔

فقہ و مسائل کی تو شاید ہی کوئی کتاب اس قسم کے عنوان سے خالی ہو، البتہ احادیث کے موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ بات نسبتاً کم ہے، لیکن ہمارے امام نوویؒ نے اپنی مقبول و متبرک کتاب ''ریاض الصالحین'' کے جھومر میں آخری دو نگینے ایسے جڑے ہیں کہ واقعۃً داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے، ایک نگینہ تو ''متفرقات'' کا ہے، اور دوسرا اور اس جھومر کا سب سے آخری نگینہ ''جنت کی منظر کشی'' کا ہے۔

متفرقات والے عنوان کے لیے علامہؒ نے ''منثورات وملح'' کی تعبیر اختیار فرمائی ہے، اس میں حضرت مصنف نے قیامت کی علامات کے علاوہ کچھ دلچسپ مضامین کی احادیث بھی ذکر فرمائی ہیں۔

انسان کے مزاج میں تنوع پسندی ہے، حضرت نبیٔ کریم (ﷺ) اپنی مجلس بابرکت میں گاہے بوقلموں مضامین بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے، لیکن ان کی خوبصورتی یہ ہے کہ انسان کے دل کو انتہائی چھونے والی باتیں ہیں، خالی لفاظی و لسانی نہیں، ان میں کہیں نہ کہیں پندوموعظت بھی ہے۔ سرِ دست صرف ایک مثال لیتے ہیں:-

آنحضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایک شخص نے دوسرے سے زمین خریدی، خریدار کو اس زمین میں سونا بھرا ہوا گھڑا ملا، اس نے بائع سے کہا: اپنا سونا لے لو، کیونکہ میں نے آپ سے زمین خریدی ہے، سونا نہیں خریدا۔ بائع نے کہا: میں نے زمین بھی بیچی اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب بیچ دیا۔ دونوں فیصلہ کے لیے ایک تیسرے شخص کے پاس گئے۔ اس نے فیصلہ بڑا دلچسپ کیا۔ اس نے پوچھا: تمہاری کوئی اولاد ہے؟ ایک نے کہا: میرا ایک لڑکا ہے۔ دوسرے نے کہا: میری لڑکی ہے۔ اس نے کہا: دونوں کا باہم نکاح کر دو اور ان کے نکاح میں یہ سونا خرچ کر لو، اور باقی صدقہ کر دو۔ (حدیث نمبر: ۱۸۲۶)

فیصلہ جتنا دلچسپ ہے؛ اس سے زیادہ تو جھگڑا دلچسپ ہے۔ کیا خیر وصلاح کا زمانہ رہا ہوگا! یہ صورت حال اگر آج پیدا ہو تو شاید نہیں □ یقیناً معاملہ بالکل برعکس ہو۔ الّا ماشاء اللہ۔ غرض کہ ایسے مضامین جو فرحت ونشاط انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ مہمیز بھی ہیں۔ کیا شان تھی ہمارے نبی (ﷺ) کی کہ لطائف وظرائف میں بھی امت کے لئے معارف چھوڑ گئے۔

جنت اوراس کی منظر کشی تو ایسی چیز ہے کہ اگر سلیقہ کے ساتھ تفصیل سے ہو تو انسان دنیا چھوڑنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے، مؤلف مکرم نے اپنی مبارک تالیف کو اسی عنوان پر ختم کیا ہے، شاید قارئین کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں:

جگ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشہ نہیں ہے

تذکرۂ جنت ہر مسلمان کا پسندیدہ موضوع ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ وہ دنیا سے دل کو سرد کرنے میں بڑا موثر ہے، اسی لئے ہمارے حضرت اقدس دامت برکاتہم نے خصوصی اہتمام فرماکر اس سلسلہ کے اضافی مضامین بھی سنائے۔ اسی پر ہماری یہ سیر مکمل ہو رہی ہے۔

محدث کبیر یحییٰ بن شرف نوویؒ نے ایک گلشن سجایا، اس کو ریاض الصالحین کا نام دیا، نیک لوگوں کی کیاریاں اور پارک۔ کتاب کے معنوی حسن وذائقہ کا تو کیا پوچھنا کہ اس میں تو آسمانی مضامین ہی ہیں ؛نیک بخت محدث نے نام بھی ہلکا پھلکا اور لطیف تجویز فرمایا، ایک طرح سے اشارہ دیدیا کہ مؤمن کی سیر و تفریح یہی ہونی چاہیے۔ ان ہی مضامین سے اس کا دل بہلنا چاہیے، ان ہی میں اس کو لطف آنا چاہیے ، مذاق کا پاکیزہ ہونا شرط ہے؛ ورنہ بھنگی کو مشک و عنبر دردِ سر پیدا کر دیتا ہے۔ سنا ہے کہ کوئی بھنگی عطر فروش کی دکان سے گزرا، ایک دم سے چکرا کر گر گیا، بے ہوش ہو گیا، اس کو ہوش میں لانے کے لیے بہتیرے جتن کئے، سب بے سود۔ اخیر میں ایک شخص جو اسے پہچانتا تھا اس نے نجاست سنگھانے کا مشورہ دیا، اسی سے اس کو ہوش آیا۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنے فضل سے دست گیری فرمائے، ورنہ آج

ہمارے عمومی احوال ناگفتہ بہ ہیں۔جو نوجوان نغمہ ،موسیقی اور سرود میں گھنٹوں گزار دیتا ہے، دینی وعلمی مجالس میں اسی کے لئے ایک منٹ ٹھہرنا دوبھر ہو جاتا ہے۔فالی اللہ المشتکی.

حقیقت یہ ہے کہ امام نوویؒ نے اپنی کتاب ریاض الصالحین تالیف فرماکر ہم پر بڑا احسان فرمایاہے،ہم تو ان کے احسان کا کیابدلہ دے سکتے ہیں ؟اللہ تعالیٰ ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ محدث مرحوم کو اپنی شایان شان بدلہ عطافرمائے اور بلند درجات نصیب فرمائے،ہمیں حق استفادہ اداکرنے کی توفیق عطافرمائے۔

ہمارے استاذ و مرشد، مشفق و منعم، محسن و مربی حضرت اقدس مفتی احمد صاحب خانپوری مد ظلہم العالی کے سایۂ عاطفت کو بصحت وسلامت ہم پر تادیر قائم رکھے،ہمیں قدردانی کی توفیق بخشے۔ حضرت کی سالہاسال سے ہر شنبہ کو (مسجد انوار، نشاط کالونی، اڈاجن پاٹیا، سورت) تشریف آوری ہوتی ہے،یکے بعد دیگرے مختلف کتابوں کے عمومی درس سے فیض رسانی فرمارہے ہیں،پہلے ریاض الصالحین، پھر الادب المفرد، پھر شمائل ترمذی ،اورآج کل صحیح بخاری شریف کی کتاب الرقاق زیر درس ہے۔اس ”ریاض الصالحین“ ہی کا درس کئی سالوں کے دورانیہ پر محیط رہا۔اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم شامل حال رہا،رفیق مکرم مولانا عبد المنان بن شیخ محمد منیار سلّمہ نے مخصوص توفیق ایزدی سے ریکارڈنگ سے لے کر ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزارا،اوراس پندرہویں جلد کی شکل میں ریاض الصالحین مکمل ہوئی۔فجزاہ اللہ خیراً وبارك فی علومه و أعماله وماله وأولاده.

یہ راقم آثم اداریہ کے صفحات سیاہ کرتا رہا، إن كان صوابا فمن الله الرحمٰن، وإن كان خطأً فمني ومن الشيطان والله ورسوله منه بريئان. ہر لغزش وخطا سے بندہ معافی کا خواستگار ہے۔ مکتبہ محمودیہ کے احباب کو اللہ تعالیٰ اپنی خصوصی برکتوں اور رحمتوں سے نوازے کہ اس کی نشر واشاعت کا بیڑا اٹھا کر ریاض الصالحین کی ایک جامع ومبسوط اردو شرح امت کو عطا کی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ .وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔

ابوزاہر

شب ۱۳ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

۲۴ دسمبر ۲۰۱۵ء

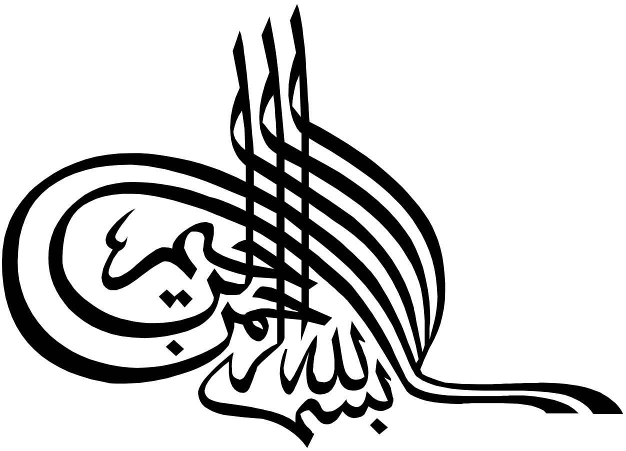

Copyright © http://www.muftiahmedkhanpuri.com/

اخلاص
و
استحضارِ نیت

﴿مجلس ۱﴾

اقتباس

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا:
جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، گوشت کا ٹکڑا ہے
جب وہ ٹھیک اور درست ہوتا ہے تو سارا جسم ٹھیک اور درست رہتا ہے، سارے اعمال ٹھیک اور درست ہوتے ہیں، اگر ہمارے قلب کے اندر صلاح آ گئی، ہمارا قلب ٹھیک ہو گیا، ہماری نیتوں کے اندر درستگی آ گئی تو سارے اعمال ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ بگڑ گیا تو اعضاءِ جسم سے جتنے بھی اعمال وجود میں آتے ہیں وہ سارے خراب اور بگڑے ہوئے وجود میں آئیں گے۔ اس لئے کہ جہاں سے عمل نکل رہا ہے، عمل کا سرچشمہ ہی بگڑا ہوا ہے تو پھر وہاں سے جو کچھ بھی آئے گا؛ وہ بگڑا ہوا ہی آئے گا۔ جیسے پانی ٹنکی سے سپلائی ہو رہا ہے اگر وہیں گڑبڑ ہے، وہاں سے پانی زہریلا نکل رہا ہے
تو سب جگہ ایسا ہی زہریلا پہنچے گا، اور وہاں اگر اچھا ہے تو دوسری جگہ اچھا ہی پہنچے گا۔

یہ مجلس تاریخ ۷؍جمادی الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۱؍ستمبر ۱۹۹۶ء کو ''مسجد ابرار'' سورت میں ہوئی

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُأَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُأَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلّٰی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراًکَثِیْراً.أمابعد. اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓااِلَّالِیَعْبُدُوْااللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَآءَ وَیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُواالزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ﴾

وقال تعالیٰ:﴿لَن یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَاوَلَادِمَآئُھَاوَلٰکِن یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ﴾

وقال تعالیٰ:﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْامَافِیْ صُدُوْرِکُمْ اَوْتُبْدُوْہُ یَعْلَمْہُ اللّٰہُ﴾

عن أمیرالمؤمنین أبی حفص عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ قال:سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یقول : اِنَّمَاالْأَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَالِکُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلیٰ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلیٰ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ لِدُنْیَایُصِیْبُھَاأَوِامْرَأَۃٍ یَّنْکِحُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلیٰ مَاھَاجَرَاِلَیْہِ .

﴿نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے پہلے باب کو اخلاص اور احضارِ نیت کے عنوان پر قائم کیا ہے کہ آدمی کو ہر عمل خالص اللہ کے واسطے کرنا چاہیے اور اپنے تمام اعمال، افعال، اقوال اور احوال میں نیت مستحضر رکھنی چاہیے ''نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو''۔

﴿دل کا مقام اور اس کی اہمیت﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے اور جو اعضاء انسان کو عطا فرمائے ہیں اس میں ہر عضو اپنی جگہ پر بہت زیادہ قیمتی، اہم اور اپنی اپنی حیثیت کے اعتبار سے بہت زیادہ مفید اور کار آمد ہے۔ آنکھ کو لے لیجئے، آنکھ اپنی جگہ پر بڑی مفید چیز ہے، اگر کوئی آدمی بینائی سے محروم ہوجائے تو اس سے پوچھئے کہ اسکے لئے پوری دنیا اندھیری ہوجاتی ہے۔ کان کی نعمت اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی یہ اپنی جگہ پر بہت قیمتی، اہم چیز اور بہت بڑی نعمت ہے۔ زبان بہت بڑی نعمت ہے، ناک بہت بڑی نعمت ہے، ہاتھ پاؤں اور دوسرے تمام اعضاء، یہاں تک کہ بال اور مسامات جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے پیدا فرمائے؛ وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا عضو بھی اگر اپنا عمل چھوڑ دے تو آدمی کا پورا نظامِ زندگی اس سے متأثر ہوتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں ان اعضاء کو پیدا فرمایا وہیں اس انسانی جسم میں ایک عضو قلب کے نام سے بھی پیدا فرمایا ہے جس کو ہم دل کہتے ہیں۔ اور نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دل سارے اعضاء کا رئیس اور سردار ہے ﴿أَلَاوَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً. اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَافَسَدَتْ فَسَدَالْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَاوَهِيَ الْقَلْب (مشکوٰۃ ص ۲۴۱ کتاب البیوع فصل اول بحوالۂ بخاری ومسلم)﴾ اس کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ اگر یہ ٹھیک اور درست ہے تو سارے اعضاء ٹھیک اور درست ہیں اور اگر اس میں فساد اور خرابی آگئی تو تمام اعضاء میں خرابی اور بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے۔

اب یہ درستگی وفساد یا اس کا ٹھیک ہونا اور بگڑنا، ظاہری اعتبار سے دیکھا جائے تو اور

باطنی اعتبار سے دیکھا جائے تو؛ دونوں ہی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگر کسی کے قلب پر حملہ ہو تو اس کی وجہ سے سارے اعضاء متأثر ہو جاتے ہیں اور لوگ کہتے ہیں کہ بھئی! اس کو تو قلب کا مرض ہے، ہر وقت آدمی خطرے میں رہتا ہے، حرکت بھی اس کے لئے مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ تو ظاہری اعتبار سے ہوا، لیکن حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے اس کے باطن کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ویسے اللہ تعالیٰ نے قلب کو جو ریاست اور سرداری کا مقام عطا فرمایا ہے اسی کا یہ تقاضہ ہے کہ انسانی جسم کا کوئی عضو قلب کے بغیر اپنا عمل انجام نہیں دیتا۔ آدمی جب کسی چیز کو دیکھنا چاہتا ہے تو پہلے اس کے دل میں اس چیز کے دیکھنے کا ارادہ اور خواہش پیدا ہوتی ہے پھر دل آنکھوں کو حکم کرتا ہے اور آنکھ دل کا اشارہ پانے پر اس چیز کی طرف متوجہ ہوتی ہے، گویا آنکھوں کے دیکھنے کا عمل دل کے ساتھ ہے۔

یہی حال زبان کا ہے، جب آدمی کسی کے ساتھ محبت کی یا بغض کی اچھی یا بری بات کرنا چاہتا ہے تو پہلے دل میں اس کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دل ہی کی طرف سے اشارہ اور حکم پا کر زبان حرکت میں آتی ہے اور پھر جو کچھ بولنا ہوتا ہے دل کے ارادے کے مطابق اپنا عمل ظاہر کرتی ہے۔

کانوں کو لے لیجئے، ہاتھوں کو لے لیجئے، پاؤں کو لے لیجئے، ہر عضو کے عمل کا یہ حال ہے۔ آپ کسی کو کوئی چیز دینا چاہیں اور اس کو لاکھ کہیں لیکن جب تک اس کا دل آمادہ نہیں ہوگا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر یہ چیز لے تو ہاتھ یوں ہی رکھے ہوئے ہیں جب تک اس کا دل نہیں چاہے گا اور دل اس کے ہاتھوں کو آگے بڑھنے کے لئے حکم نہیں کرے گا تب تک ہاتھ

آگے نہیں بڑھیں گے اور اس چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اسی لئے تو کبھی کسی کو ہم سمجھاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بھئی! تمہارا دل اگر آمادہ ہو جائے تو پھر معاملہ آسان ہے۔ جیسے کہ اردو میں کہتے ہیں کہ :-

تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

آدمی کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تو بہانے کرتا ہے اس وقت لوگ کہتے ہیں کہ تیرا جی نہیں چاہ رہا ہے، تیرا جی چاہتا تو یہ سب بہانے ایسے ہی رکھے رہ جاتے۔

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قلب کو وہ مقام عطا فرمایا ہے کہ جسم کے تمام اعضاء کے عمل اسی قلب کے اوپر موقوف ہیں، ظاہری اعمال جتنے بھی ہیں، آنکھوں کا دیکھنا، زبان کا بولنا، ہاتھوں کا پکڑنا، پاؤں کا چلنا، کانوں کا سننا، اور دوسرے تمام اعضاء کے اعمال سب دل پر موقوف ہیں، دل جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو متعلقہ عضو کو حکم کرتا ہے اور اُس کے حکم کی بجا آوری کے طور پر وہ عضو اس کام کو انجام دیتا ہے، گویا اللہ تبارک وتعالیٰ نے قلب کو تمام اعضاء کا سردار بنایا ہے، ریاست اور سرداری کا مقام عطا فرمایا ہے، یہ ظاہری افعال کے وجود میں آنے کے لئے ہے۔

اسی طریقے سے باطنی کام کا حال ہے۔ نیتوں کو دیکھا جائے۔ نیت کہتے ہیں دل کے ارادے کو۔ ہر کام کا مدار شریعت میں نیت کے اوپر رکھا گیا ہے وہ اس لئے کہ جتنے بھی کام ہیں ظاہری اعتبار سے بھی ان کا مدار دل اور قلب پر تھا اور باطنی وروحانی اعتبار سے بھی اس کی بنیاد قلب کے عمل ہی پر موقوف رکھی گئی۔

نیت پر مدار کیوں؟

چنانچہ اس قلب کے اندر جو جذبات ہیں اور قلب جن جذبات کو مدِ نظر رکھ کر کام انجام دلواتا ہے اسی کے مطابق کسی کام کی قدر و قیمت طے ہوتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کا معاملہ تو بہت اونچا ہے لیکن انسانوں کا حال بھی یہ ہے کہ اگر ایک آدمی آپ کو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ اپنے گھر لے گیا، کھانا کھلایا، چائے پلائی اور بڑے آرام سے رکھا، آپ کا خوب اعزاز واکرام کیا۔ آپ دیکھئے! اس کے سارے اعضاء آپ کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ہاتھ جو مناسب خدمت ہے وہ انجام دے رہے ہیں، پاؤں مناسب خدمت انجام دے رہے ہیں، آنکھیں اور کان بھی آپ کی طرف متوجہ ہیں گویا آپ کا ہر حکم بجالانے کے لئے وہ تیار ہے اور آپ کو ہر طرح کی راحت پہنچانے کے لئے اس نے اپنے آپ کو مشغول کر دیا ہے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اس کا دل اس کو کہہ رہا ہے کہ اس طرح کرو۔

اب نیت تو ارادے اور عزم کو کہتے ہیں۔ لیکن حدیث میں جہاں نیت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے وہاں مراد ہوتا ہے وہ مقصد اور غرض و غایت جس کے پیشِ نظر آدمی کام انجام دیا کرتا ہے۔ میں نے ابھی عرض کیا کہ ایک آدمی نے ہماری ساری خدمت کی، ہر طرح کی راحت پہنچائی، یہ دو حال سے خالی نہیں، اگر ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ اس آدمی کو ہمارے ساتھ دلی محبت ہے اور اس کے دل میں ہمارے واسطے مقام ہے اور اسی دلی محبت کا تقاضہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ اکرام کا اور راحت پہنچانے کا معاملہ کر رہا ہے تو اس کے اس عمل کی قدر و قیمت ہماری نگاہوں میں بہت بڑھ جائے گی اور ہم یوں سوچیں گے کہ دنیا میں ایسے کتنے لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ اس طرح محبت کا معاملہ کرنے والے ہیں، واقعتاً

یہ آدمی بڑا قابلِ قدر ہے کہ اس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا، آپ اس کے اس جذبے کے معلوم ہونے پر اُس کے اِس سلوک کی قدر کریں گے۔

لیکن اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اصل تو اس کی کوئی ضرورت اور کام ہے جو وہ ہم سے کروانا چاہتا ہے اس لئے اس نے یہ سارا کچھ کیا ہے، ہمیں لے آیا، دعوت کی، کھلایا پلایا؛ وہ محض اپنی ایک ضرورت کے واسطے تھا۔ تو بس! اس کی اتنی ساری محنت، ہمارے لئے اتنی مشقت برداشت کرنا اور تکلیف اٹھانا؛ اس کی قدر و قیمت ہمارے دل سے ختم ہو جائے گی کہ اپنی غرض کے واسطے میرے ساتھ یہ معاملہ ہے؟ میرے ساتھ محبت نہیں ہے یہ تو اپنا کام مجھ سے نکلوانا چاہتا ہے، چنانچہ آپ اگر اس کی شرما حضوری اور لحاظ میں اس کے سامنے کچھ نہ کہیں لیکن جب کوئی دوسرا آدمی کہے گا کہ حضرت! فلاں آپ سے تو بڑی محبت رکھتا ہے، دیکھئے! آپ کا کیسا اکرام کرتا ہے۔ تو آپ کہیں گے کہ بھئی! جانے بھی دو، دراصل اس کی ایک غرض ہے جس کے واسطے وہ یہ سب کر رہا ہے۔ یعنی آپ کی نگاہوں میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔

دیکھئے! اسی ایک عمل کی وہ غرض اور جذبہ جو اس کے پیچھے کارفرما تھا اور جو نیت کام کر رہی تھی وہ دوسری تھی تو آپ نے اس کے ساتھ معاملہ اس کے مطابق کیا، اور یہی عمل اور یہی کام اس کے پیچھے جو غرض کام کر رہی تھی اور جو جذبہ کارفرما تھا وہ دوسرا تھا تو آپ نے اس کے ساتھ دوسرا معاملہ کیا۔ عمل کی ظاہری شکل دونوں جگہ یکساں ہے لیکن آپ دونوں کے ساتھ معاملہ الگ الگ کرتے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی ہر عمل کے اندر اسی طرح ہے، ہر عمل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی نیت اور جذبے کو دیکھا جاتا ہے۔

علامہ نوویؒ یہاں ایک آیت پیش فرما رہے ہیں ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللہ

مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾ان اہل کتاب کواللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایک حکم تو یہ دیا گیا تھا ان کا حال بیان کر کے ہم کو یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت خالص اسی کے لئے کرو﴿ حُنَفَآءَ ﴾تمام چیزوں سے ہٹ کر، تمام اغراض سے الگ ہوکر، اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر﴿وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ ﴾ نماز پڑھو تو اس کی خاطر زکوۃ دو تو اس کی خاطر، اللہ تک پہنچانے والا سیدھا راستہ یہی ہے، گویا آپ اپنی دوسری اغراض کو چھوڑ کر جو کچھ کریں اللہ کے واسطے کریں، ظاہری عمل جو کچھ کررہے ہیں اللہ کے یہاں اصل نہیں ہے، اصل تو ان اعمال کو اُبھارنے والا جذبہ ہے، آپ کا دل جس غرض اور جذبے کے پیش نظر یہ اعمال وجود میں لارہا ہے؛ وہ جذبہ اللہ کے یہاں دیکھا جاتا ہے۔

﴿عمل کی قدر و قیمت نیت کے مطابق طے کی جاتی ہے﴾

اسی لئے علامہ نوویؒ نے دوسری آیت پیش فرمائی﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآئُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾ کہ قربانی کے جانور جو قربانی کے دن یا حج کے موقع پر ذبح کئے جاتے ہیں ان جانوروں کا گوشت اوران کا خون اللہ تک نہیں پہنچتا، خون یہیں رہ جاتا ہے اور گوشت تو تم کھا جاتے ہو لیکن تمہارے دل کے وہ جذبات جن کی بنیاد پر تم نے اللہ کے واسطے یہ قربانی دی ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچتے ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قدر ہے، اصل چیز اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی دیکھی جاتی ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے ﴿اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰى ﴾ کہ آدمی کے اعمال کا مدار نیتوں کے اوپر ہے، جیسی نیت ویسا ہی اس کا عمل، جس قسم کی نیت ہوگی عمل کی قدر و قیمت اسی کے مطابق طے کی جائے گی۔

﴿وَاِنَّمَالِکُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰی کی تشریح﴾

اور پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں: کہ ہر ایک آدمی کو وہی ملتا ہے جس کی اس نے نیت کی۔ بعض شراحِ حدیث نے تو دونوں کو ایک ہی مفہوم میں لیا ہے لیکن دوسرے حضرات فرماتے ہیں: ﴿وَاِنَّمَالِکُلِّ امْرِئٍ مَانَوٰی﴾ میں ایک بات اور بتلائی گئی ہے وہ یہ کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ عمل ایک ہوتا ہے، لیکن اس عمل کے پیچھے اگر بیسیوں نیتیں کام کررہی ہیں تو چونکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان نیتوں پر معاملہ کیا جاتا ہے اس لئے عمل کے ایک ہونے کے باوجود ان کئی نیتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ کو اُنہیں نیتوں کے مطابق بے شمار ثواب اور اجر دیا جائے گا۔

علامہ نواب قطب الدین دہلویؒ نے مظاہرِ حق میں اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک آدمی مسجد آتا ہے، تو مسجد آنے کا مطلب ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے، اب وہ نیت کرے کہ مسجد میں جاؤں گا، اللہ کے گھر میں حاضری ہوگی اور وہاں اعتکاف کروں گا، یہ بھی نیت کرلے کہ وہاں کوئی دین کی بات سننے کو ملے گی۔ وہاں مسلمانوں کے ساتھ ملاقات ہوگی تو سلام کریں گے، خیریت پوچھیں گے، ان کو محبت کی نظر سے دیکھیں گے، یہ بھی نیت کرلے کہ کوئی بیمار مل گیا تو اس کی عیادت کا موقعہ مل جائے گا، تو جتنی نیتیں آپ کرسکیں؛ کرلیں۔ آپ گھر سے مسجد میں آئے یہ ایک عمل ہے، لیکن اس ایک عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل میں جتنی نیتیں ہیں ان نیتوں کے مطابق اجروثواب ملے گا۔

﴿نیت عمل کی روح ہے﴾

اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کا مدار عمل پر نہیں ہے، عمل تو ظاہری ڈھانچہ ہے، عمل کی

روح تو وہ نیت، ارادہ اور اخلاص ہے جس کے پیشِ نظر عمل وجود میں لایا جارہا ہے۔ دنیا کی تمام چیزوں میں آپ دیکھتے ہیں کہ اس کا ایک ظاہری ڈھانچہ اور ظاہری شکل وصورت ہوتی ہے، اور ایک اس کی اندرونی روح ہوتی ہے، جیسے پنکھا چل رہا ہے، اس کے ہاتھے لگے ہوئے ہیں اور اندر مشین لگا ہوا ہے، سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن اس کی روح بجلی ہے، بجلی نہ ہو تو وہ بیکار ہے، پنکھا نہیں چلے گا۔ اسی طرح ہر چیز کے اندر اس کی ایک ظاہری شکل وصورت ہوتی ہے، ایک اندرونی روح ہوتی ہے، جب تک یہ روح ہے تب تک اس کی قدر و قیمت ہے، روح نہیں ہے تو معاملہ ختم ہوجاتا ہے۔ انسان جیسا انسان؛ کائنات کے اندر اس سے بڑی اور کون سی چیز ہوسکتی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو ساری کائنات کے اندر سب سے اشرف اور سب سے افضل بنایا اس کا حال بھی یہ ہے کہ اگر اس کی روح قبض ہوجائے تو اس جسم کو لوگ دو دن کے لئے بھی گھر میں نہیں رکھیں گے، اولاد کو ابا کے ساتھ بہت محبت ہے، بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ بہت محبت ہے، بھائیوں کو اپنے بھائی کے ساتھ بہت محبت ہے، لیکن انتقال کے بعد اس جسم کو کوئی رکھنے کے لئے تیار نہیں، اور نہ جسم رکھنے کے قابل ہے، روح نکل گئی تو اب لوگ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ جلدی سے جلدی اس کو دفن کردو، اگر رہنے دوگے تو سڑ جائے گا، بدبو ہوگی اور نفرت پیدا ہوگی اور دلوں میں محبت کے جو جذبات ہیں اس میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ تو روحِ حیوانی تھی تب تک اس کی قدر تھی، آؤ بھگت تھی اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، وہ نہیں رہی تو اس ظاہری جسم کی کوئی قدر نہیں۔ ہر عمل کا یہی حال ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی نیت، جذبہ اور وہ اخلاص جس کے پیشِ نظر عمل وجود میں لایا جاتا ہے وہ اس کی روح ہے۔ اسی لئے لکھا ہے کہ بڑے سے

بڑا عمل؛ اگر اس میں یہ روح نہیں ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس عمل کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

﴿بد نیتی کا وبال﴾

بلکہ ہوسکتا ہے کہ یہ عمل اپنی ظاہری شکل وصورت اور ظاہری اعتبار سے خوبی کے باوجود آپ کے لئے عذاب کا سبب بن جائے، احادیث میں قصے آتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے حساب و کتاب کے لئے تین آدمیوں کو بلایا جائے گا ان میں ایک تو شہید ہوگا، دوسرا قاری و عالم ہوگا اور تیسرا سخی ہوگا، اللہ تعالیٰ شہید سے پوچھیں گے کہ بھئی! کیوں؟ ہم نے آپ کو قوت عطا فرمائی تھی، جسمانی صحت عطا فرمائی تھی، ہماری اس نعمت کی کیا قدر کی؟ وہ جواب میں کہے گا: باری تعالیٰ! تیرے دین کے کلمے کو بلند کرنے کے واسطے میں نے بڑی محنتیں اور مشقتیں اٹھائیں یہاں تک کہ ایک وقت وہ آیا کہ اپنی جان تک دے ڈالی، اپنے آپ کو قربان کردیا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: یہ سب جو کچھ تو نے کیا تھا ﴿لیقال انہٗ شجاع﴾ یہ تو اس لئے کیا تھا کہ لوگ باتیں کریں کہ بڑا بہادر ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ دنیا میں جان دینے سے بڑھ کر اور کونسا عمل ہوسکتا ہے؟ لیکن وہ دی ہوئی جان بھی جبکہ نیت ٹھیک نہیں تھی تو کام نہیں آئی۔ باری تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے: جاؤ! اس کو گھسیٹ کر جہنم میں لے جاؤ۔ یعنی اس نیت کے درست نہ ہونے پر اتنا ہی ہوتا کہ اُس عمل پر کوئی ثواب نہیں ملتا؛ تب بھی غنیمت تھا۔ یہاں تو اس عمل پر جہنم میں بھیجا جارہا ہے۔

یہی حال سخی کا ہے سخاوت کے دروازے کھلے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے مال کی

نعمت عطا فرمائی تھی باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: ہم نے تمہیں دولت عطا فرمائی تھی اس کا کیا کیا؟ جواب دے گا: باری تعالیٰ! تیری دی ہوئی اس دولت کو میں نے نیکی کے کاموں میں جہاں آپ نے خرچ کرنے کے لئے کہا تھا، مثلاً مسجد میں، مدرسہ میں، فلاں فلاں اور فلاں، کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی جہاں خرچ کرنا نیکی کا کام بتلایا ہو، اور آپ کی طرف سے اس کی تاکید ہو اور میں نے خرچ نہ کیا ہو۔ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: یہ سب تو نے اس لئے کیا تھا تاکہ کہا جائے کہ بڑا سخی ہے، فرشتوں کو کہیں گے، لیجاؤ۔ مال خرچ کرنے سے بڑی چیز اور کونسی ہوگی لیکن وہاں بھی یہ حال ہے۔

ایک عالم اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم کو پھیلا رہا ہے باری تعالیٰ کی طرف سے اس سے پوچھا جائے گا: ہم نے علم دیا تھا؛ کیا کیا؟ وہ کہے گا: باری تعالیٰ! پڑھا پڑھایا اور اس کی خوب ترویج اور اشاعت کی اور لوگوں کو خوب سکھایا، دین کے قریب کیا، دعوتیں دیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: ﴿لیقال انک قارئ﴾ یہ اس لئے تھا کہ لوگ کہیں بڑا عالم اور بڑا قاری ہے۔ (مشکوۃ ۳۳ کتاب العلم فصل ثانی بحوالۂ مسلم)

تو دیکھئے! یہاں یہ کوئی دنیوی عمل نہیں ہیں بلکہ دینی عمل ہیں، اور اس وقت دنیا میں اونچے سے اونچے جو اعمال ہوسکتے ہیں؛ ان میں سے ہیں، لیکن نیت درست نہیں تھی اور جذبہ صحیح نہیں تھا اس لئے اس عمل کے اوپر بجائے اس کے کہ ثواب ملتا اور جنت کا فیصلہ ہوتا، جہنم کا فیصلہ کر دیا گیا۔ عمل ہے، ظاہری شکل وصورت ہے، سب کچھ ہے لیکن اندر کا معاملہ خراب تھا اس لئے اس کو بجائے ثواب ملنے کے سزا ہوئی۔

اچھی نیت بغیر عمل کے بھی باعثِ ثواب ہے

اس کے برعکس اگر عمل نہیں ہے اور نیت ہے، تو بہت سی مرتبہ عمل نہ ہونے کے باوجود نیت کے اوپر ثواب ملتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے گھر سے نکلا، اس کو معلوم ہے کہ یہاں مسجد ابرار میں عشاء کی جماعت ۸/۳۵ کو ہوتی ہے، حالانکہ گذشتہ کل سے وقت ۸/۲۰ ہو گیا ہے، اب وہ تو ۸/۳۵ کے حساب سے گھر سے نکلا، یہاں آکر کے دیکھا تو امام صاحب سلام پھیر چکے تھے۔ لیکن احادیث کے اندر ہے نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: کہ اس کو جماعت کا ثواب مل گیا، اس لئے کہ وہ تو یہی سمجھے ہوئے تھا کہ جماعت کا یہ وقت ہے اور اسی کے مطابق اس نے تیاری کی، اور اسی ارادے سے آیا اب وہ موقع نہ پاسکا تو کوئی حرج کی بات نہیں، نیت تھی اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اسی نیت کے اوپر اس کو ثواب مل جائے گا۔

یہ تو ایک عمل ہوا۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ ایک آدمی دوسرے مالدار آدمی کو دیکھ رہا ہے کہ اللہ کے راستے میں خوب خرچ کر رہا ہے اور یہ اپنے دل میں یوں سوچ رہا ہے کہ اگر اللہ نے مجھے بھی دولت عطا فرمائی ہوتی، اور یہ نعمت اللہ نے مجھے بھی دی ہوتی تو میں بھی اسی طرح نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا جس طرح یہ خرچ کر رہا ہے تو حدیث میں ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو بھی ویسا ہی ثواب ملے گا جیسا خرچ کرنے والے کو مل رہا ہے۔

اس کے برعکس ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال دے رکھا ہے، اور وہ اس کو غلط کاموں میں خرچ کر رہا ہے، اب ایک آدمی یوں سوچ رہا ہے کہ اوہو! میرے پاس بھی اگر

مال ہوتا تو خوب گل چھڑے اڑاتا اور خوب مزے لیتا اور خوب گناہ کے کام کرتا، یوں لاتا، ٹی-وی لاتا، اور فلاں فلاں کام کرتا، حالانکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، گھر پر ٹی-وی نہیں ہے اور پیسہ بھی نہیں ہے، لیکن دل میں یہ ارادے ہیں تو اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا دیکھئے! عمل نہیں ہے، صرف نیت ہے۔ تو نیت کے مطابق یہاں معاملہ ہے۔

اور عمل کے بغیر صرف نیت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ ہوتا ہے۔ اس مضمون کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو فضائلِ صدقات میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمائی ہے۔ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تین چیزیں میں قسم کھا کر بیان کرتا ہوں اور اس کے بعد ایک بات خاص طور سے تمہیں بتاؤں گا اس کو اچھی طرح محفوظ رکھنا۔ وہ تین باتیں جن پر قسم کھاتا ہوں ان میں سے اول یہ ہے کہ کسی بندے کا مال صدقہ کرنے سے کم نہیں ہوتا۔ اور دوسری یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اور وہ اس پر صبر کرے تو حق تعالیٰ شانہ اس صبر کی وجہ سے اس کی عزت بڑھاتے ہیں۔ اور تیسری یہ ہے کہ جو شخص لوگوں سے مانگنے کا دروازہ کھولے گا حق تعالیٰ شانہ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں۔ ان تین کے بعد ایک بات تمہیں بتاتا ہوں اس کو محفوظ رکھو، وہ یہ ہے کہ دنیا میں چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے علم بھی عطا فرمایا اور مال بھی عطا فرمایا، وہ اپنے علم کی وجہ سے اپنے مال میں اللہ سے ڈرتا ہے کہ اس کی خلافِ مرضی خرچ نہیں کرتا بلکہ صلہ رحمی کرتا ہے اور اللہ کے لئے اس مال میں نیک عمل کرتا ہے اس کے حقوق ادا کرتا ہے یہ شخص سب سے اونچے درجوں میں ہے۔ دوسرا وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے علم عطا فرمایا اور مال نہیں دیا اس کی نیت سچی ہے، وہ تمنا کرتا ہے کہ اگر میرے

پاس مال ہوتا تو میں بھی فلاں کی طرح سے نیک کاموں میں خرچ کرتا تو حق تعالیٰ شانہ اس کی نیت کی وجہ سے اس کو بھی وہی ثواب دیتا ہے جو پہلے کا ہے اور دونوں ثواب میں برابر ہو جاتے ہیں۔ تیسرے وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے مال عطا کیا مگر علم نہیں دیا وہ اپنے مال میں گڑبڑ کرتا ہے، بے محل لہو ولعب میں خرچ کرتا ہے، نہ اس مال میں اللہ کا خوف کرتا ہے، نہ صلہ رحمی کرتا ہے، نہ حق کے موافق خرچ کرتا ہے؛ یہ شخص قیامت میں خبیث ترین درجے میں ہوگا۔ چوتھا وہ شخص ہے جس کو حق تعالیٰ شانہ نے نہ مال عطا کیا، نہ علم دیا، وہ تمنا کرتا ہے کہ اگر میرے پاس مال موجود ہو تو میں بھی فلاں یعنی تیسرے کی طرح خرچ کروں تو اس کو اس کی نیت کا گناہ ہوگا اور وبال میں یہ اور تیسرا برابر ہو جائیں گے۔

(فضائل صدقات۔ص۷۰۔ مشکوٰۃ بروایت ترمذی۔ج۲ص۵۸)

﴿عادات کو عبادات بنانے کا نسخہ﴾

اور یہ باتیں تو تھیں ان چیزوں کی جو گناہ کے یا نیکی کے کام ہیں۔ بلکہ یہ نیت تو ایک ایسا عجیب وغریب نسخہ ہے کہ وہ کام جن کو ہم اپنی ضرورت کی وجہ سے انجام دیتے ہیں مثلاً ہماری طبعی ضرورتیں جو اللہ تعالیٰ نے ایک انسان اور جاندار ہونے کی حیثیت سے ہمیں عطا فرما رکھی ہیں کہ جب تک کھانا نہ کھائیں ہم زندہ نہیں رہ سکتے، بھوک کا تقاضہ ہوتا ہے؛ کھانا ہی پڑتا ہے۔ پیاس کا تقاضہ ہوتا ہے؛ پانی پینا ہی پڑتا ہے۔ آرام کا تقاضہ ہوتا ہے؛ نیند کچھ نہ کچھ تو لینی ہی پڑتی ہے۔ قضائے حاجت کا تقاضہ ہوتا ہے؛ استنجاء خانے اور بیت الخلاء میں، پیشاب خانے میں جانا ہی پڑتا ہے۔ یہ طبعی امور جو ہم انجام دیتے ہیں، کھانا، پینا، سونا، قضائے حاجت کے لئے جانا، حالاں کہ یہ تو ہمارے اپنے کام ہیں، اپنی

زندگی بسر کرنے کے واسطے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے طبعی طور پر ان امور کو انجام دینا ہے لیکن اگر کوئی اللہ کا بندہ اپنی نیتوں کو درست کرلے اور ان کاموں کو بھی صرف اس لئے نہیں کہ اپنی زندگی برقرار رکھنی ہے بلکہ کچھ اور نیتِ خیر اس کے اندر شامل کرلے، کوئی اچھا ارادہ ساتھ میں ملالے؛ تو یہی کام اس کے لئے عبادت بن جائیں گے۔

﴿ایک قصہ سے اس کی توضیح﴾

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے اپنے والد صاحب کے حوالہ سے فضائل صدقات میں ایک واقعہ لکھا ہے جو لوگ فضائل صدقات سنتے ہیں انہوں نے سنا ہوگا: ایک آدمی پانی پت کے اندر رہتا تھا اس کے خلاف کوئی قتل کا مقدمہ تھا، اس زمانے میں پانی پت کی تحصیل کرنال تھی اور سب کام انجام دینے کے لئے لوگوں کو کرنال جانا پڑتا تھا۔ حضرت فرماتے ہیں کہ معلوم نہیں اب تو کیا ہے اس وقت کرنال اور پانی پت کے درمیان دریائے جمنا بہتا تھا، اور دریائے جمنا کا حال یہ تھا کہ بارش کے زمانے میں تو خوب پانی ہوتا تھا، گرمی کے زمانے میں معمولی سا پانی رہ جاتا تھا کہ آدمی ویسے بھی نکل جاوے، جہاں پانی زیادہ رہتا تھا وہاں کشتی ہوتی تھی، ایک آدھ پیسہ دے کر وہ کنارہ کروس (cross) کرلیتا۔ فرماتے ہیں کہ اس آدمی کے خلاف قتل کا مقدمہ تھا، تاریخ پڑی ہوئی تھی، جب تاریخ آئی تو ایسا وقت تھا کہ دریا میں خوب پانی تھا، اور جب طغیانی ہوتی تو پھر کشتیاں بھی بند ہوجاتی تھیں اس لئے کہ اس صورت میں وہ کشتیاں چونکہ بادبانی ہوتی تھیں، الٹ جانے کا ڈر رہتا تھا تو کشتی والے بھی اپنی کشتیاں چلانے کا سلسلہ بند کردیتے تھے، اب اتفاق کی بات کہ اس کی مقدمہ کی جو تاریخ آئی اس روز وہ دریائے جمنا کے کنارے آیا، دیکھا کہ دریا طغیانی پر ہے، وہاں

کوئی کشتی نہیں تھی، آسانی سے جانا ناممکن تھا، بڑا پریشان ہوا اور کشتی والوں کے پاس گیا اور منھ مانگے دام ادا کرنے کی پیش کش بھی کی کہ جتنے پیسے مانگو گے، میں دینے کے لئے تیار ہوں، مہربانی کرو اور چلو۔ اگر آج میں نہیں جاؤں گا تو میرے خلاف ڈگری ہو جائے گی اور پھانسی کا حکم ہو جائے گا، میرے خلاف قتل کا مقدمہ ہے۔ وہ کشتی والے کہتے تھے: بھائی! تیرے خلاف قتل کا مقدمہ ہے لیکن ہم کشتی لے کر گئے اور کشتی الٹ گئی تو تیری خاطر ہم سب جائیں گے، ہم اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ آدمی بہت پاؤں پڑا، بہت گڑگڑایا لیکن کوئی تیار نہیں ہوا، اس کی اس پریشانی کو ایک آدمی نے دیکھا تو اس سے کہا: دیکھ! تجھے ایک علاج بتلاتا ہوں، میرا نام مت لینا، اسی دریا کے کنارے کے اوپر ذرا دور فلانی جگہ پر ایک جھونپڑا ہے، وہاں ایک بزرگ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے پاس جا کر اپنی یہ بات اور پریشانی رکھ، ہوسکتا ہے کوئی راستہ نکل آوے۔ اور دیکھنا وہ ڈانٹیں گے اور بھگانے کی کوشش کریں گے لیکن وہاں سے ہٹنا مت، ماریں تو مار کھا لینا لیکن جب تک اپنا کام نہ ہو وہاں سے نہ ہٹنا۔ خیر! وہ گیا۔ عربی میں کہاوت ہے: ﴿صَاحِبُ الْغَرَضِ مَجْنُونٌ﴾ غرض مند آدمی پاگل ہوتا ہے، وہ کسی کی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا خواہ کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ یہ وہاں پہنچ گیا اور بزرگ سے کہا: حضرت! یہ صورت حال ہے، کوئی راستہ نکالیے، انھوں نے کہا: بھئی! میرے پاس کیوں آیا؟ میں ایک دنیا دار آدمی ہوں، اپنے بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا ہوں۔ وہ کہنے لگا: نہیں حضرت! دعا کیجیے، کوئی راہ نکالیے۔ انہوں نے کہا: میں کوئی خدا ہوں کہ میرے پاس آیا ہے؟ بہت ڈانٹا ڈپٹا، لیکن اس نے تو وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ کہنے لگا: جاؤں گا ہی نہیں، یہیں رہوں گا۔ انھوں نے

بھی دیکھا کہ اب تو یہ پیچھا چھوڑے؛ ایسا ہے نہیں۔ مجبوراً انھوں نے یوں کہا: اچھا! ایک کام کر۔ جا! دریا کو جا کر یوں کہنا کہ اس آدمی نے بھیجا ہے جس نے کبھی کھانا نہیں کھایا اور جو کبھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا؛ مجھے راستہ دے۔ چنانچہ اس نے جا کر دریا کو یہ بات کہی اور اس کو راستہ مل گیا اور آسانی کے ساتھ پار ہو گیا۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ اس موقع پر تحریر فرماتے ہیں کہ بھئی! یہ اللہ والے جو ہوتے ہیں ان کی بیویاں بھی ''ڈیڑھ خصم'' ہوتی ہیں، کیونکہ وہ پٹائی وٹائی تو کرتے نہیں اور حقوق کا خیال رکھتے ہیں۔ اور عورتوں کا معاملہ ایسا ہے کہ جو آدمی حقوق کا خیال رکھنے والا ہو تو پھر وہ اس کے سر چڑھ جاتی ہیں۔ ویسے بھی ایک حدیث کے الفاظ ہیں ﴿یغلبهن اللئام ویغلبن الکرام﴾ جو شریف لوگ ہوتے ہیں ان پر یہ غالب آجاتی ہیں اور جو غیر شریف لوگ ہوتے ہیں؛ وہ ان پر غالب آتے ہیں۔ اور آج کل تو مَیں سمجھتا ہوں کہ سب ہی شریف ہیں۔

بہر حال! اس کے جانے کے بعد بیوی نے جھگڑا شروع کیا کہ آپ نے تو مجھے بدنام کر دیا اور ساری دنیا کے اندر رسوا کر دیا، لوگ مجھے زانیہ کہیں گے، اور یوں اور توں۔ اس نے شور مچا دیا۔ انھوں نے کہا: کیا بات ہے، کیوں شور مچا رہی ہو؟ تو اس نے کہا: ابھی آپ نے اس کو کہا تھا کہ جس نے کبھی کھانا نہیں کھایا اور جو کبھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا تو کھانے کا معاملہ تو آپ کا ہے لیکن یہ جو کہا کہ کبھی اپنی بیوی کے پاس نہیں گیا تو یہ جو سّتے کی دھاڑ ہے؛ یہ مَیں کہاں سے لائی؟ اور وہ تو یوں ہی کہے گا کہ دیکھو! بزرگ نے مجھے ایسا کہا تھا۔ پھر لوگ کیا کہیں گے؟ انھوں نے جواب میں یوں کہا: اللہ کی بندی! مَیں نے کب یہ کہا کہ یہ میرے بچے نہیں ہیں، یہ میرے بچے ہیں اور تو میری بیوی ہے۔ اس نے کہا: نہیں نہیں! اب چھوڑو۔ جب اس نے بہت شور مچایا، بہت روئی دھوئی تو بزرگ نے کہا: دیکھ!

ایک بات سن، مَیں نے بچپن میں ایک بزرگ عالم سے یہ بات سنی تھی کہ جو کام اللہ کے لئے کیا جاتا ہے وہ اپنے لئے نہیں ہوتا؛ وہ ثواب اور اجر والا ہوتا ہے اس میں نیکی لکھی جاتی ہے وہ دنیا نہیں ہوتا بلکہ آخرت بن جاتا ہے۔ یہ بات میں نے بچپن سے سن رکھی تھی اس کے بعد سے مَیں نے جب بھی کھانا کھایا؛ اپنا پیٹ بھرنے کی اور لذت حاصل کرنے کی نیت سے نہیں کھایا بلکہ اس لئے کھایا کہ یہ کھانا جو کھاؤں گا اس کے نتیجے میں جو قوت حاصل ہوگی اس سے اللہ کی عبادت کروں گا اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کروں گا۔ اور تیرے ساتھ شادی ہونے کے بعد تیرے ساتھ صحبتیں کیں اور خوب کیں، تجھے بھی معلوم ہے، لیکن مَیں نے اپنی شہوت پوری کرنے کی نیت سے نہیں؛ بلکہ تیرا حق ادا کرنے کی اور اللہ کا حکم بجالانے کی نیت سے کی تھیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بیویوں کے حق ادا کرنے کا جو حکم دے رکھا ہے اس میں یہ بھی ہے، لہٰذا یہ جو کچھ بھی تھا وہ دنیا نہیں تھا آخرت تھا، اپنے لئے نہیں تھا اللہ واسطے تھا، نیکی اور اجر کا کام تھا۔ اس لئے ایسا ہی ہوا۔

﴿ ایک اور واقعہ ﴾

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اس موقع پر (حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم (رحمۂ اللہ تعالیٰ) نے حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددی بھوپالیؒ کے جو ملفوظات نقل کئے ہیں اس کے حوالے سے) ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ دو بزرگ تھے، ایک دریا کے اِس کنارے آباد تھے، دوسرے دریا کے دوسرے کنارے آباد تھے، جو اِدھر رہتے تھے وہ بیوی بچوں والے تھے اور جو اُدھر رہتے تھے وہ تنہا (مجرد) تھے، ان بیوی بچوں والے بزرگ نے ایک مرتبہ خوان کے اندر کھانا تیار کرا کر اُن بزرگ کے پاس بھجوایا، اور اپنی بیوی سے کہا: جاؤ! ان

کے پاس پہونچا آؤ۔اب راستہ میں دریا تھا اور وہ پورا بھرا ہوا تھا۔بیوی نے کہا: جانے کا راستہ تو ہے نہیں، کس طرح جاؤں؟ تو کہا: جاؤ! دریا سے یوں کہنا کہ اگر میرے اور میرے شوہر کے درمیان وہ تعلق رہا ہو جو میاں بیوی کے درمیان ہوا کرتا ہے تو تو مجھے ڈبودے؛ ورنہ راستہ دیدے۔اس نے جب یہ کہا تو اس کو راستہ مل گیا۔ذرا ذرا سا پانی ٹخنوں تک آئے اتنا رہ گیا۔وہ گئی اوران بزرگ کی خدمت میں وہ خوان پیش کیا۔انھوں نے کھایا اور جتنا کھانا تھا سب چٹ کر گئے۔اب واپس آنے کا وقت آیا تو برتن لے کر اس کو خیال آیا کہ آنے کا وظیفہ تو معلوم ہو گیا تھا لیکن اب جانے کے لئے کیا کروں؟ اس کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار دیکھ کر ان بزرگ نے پوچھا: کیا بات ہے؟ کہا: ایسا ایسا ہوا تھا، آنے کے لئے تو انھوں نے یہ بتلایا تھا اور مَیں نے یہ جملے کہے تھے تو راستہ مل گیا تھا، اب میں پریشان ہوں کہ کس طرح جاؤں؟ ان بزرگ نے کہا: جا! دریا سے میرا نام لے کر کہنا کہ اس نے ایک لقمہ بھی اس میں سے کھایا ہو تو تو مجھے ڈبودے؛ ورنہ راستہ دے دے۔اس کو راستہ مل گیا، وہ آ گئی اور اپنے شوہر سے کہنے لگی کہ میری تو سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی۔آپ نے جو جملہ کہا، وہ بھی؛ اس لئے کہ آپ کے ساتھ جو میرا تعلق ہے وہ مجھے خوب معلوم ہے۔ اور انھوں نے جو جملہ کہا، وہ بھی؛ اس لئے کہ میرے سامنے تو پورا بھرا ہوا خوانچہ کھا گئے اور پھر کہتے ہیں ایک لقمہ بھی نہیں کھایا۔انھوں نے بھی وہی بات کہی کہ جو کام اللہ کے واسطے کیا جاتا ہے؛ وہ دنیا نہیں آخرت ہوتا ہے۔

حدیث کی گواہی

اس موقع پر حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں لکھا ہے اور مجلس میں بھی حضرت

سے بار بار سنا کہ مشکوۃ شریف میں ایک روایت موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر سبحان اللہ پڑھنے پر صدقہ کا ثواب ہے۔ ہر اللہ اکبر پر، ہر الحمد للہ، ہر لا الٰہ الا اللہ پر صدقہ ہے، کسی کو بھلی بات بتلادی وہ بھی صدقہ ہے، اگر کسی کو بری بات سے روک دیا وہ بھی صدقہ ہے، اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کی وہ بھی صدقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کہ انھوں نے فوراً نبی کریم ﷺ سے سوال کیا: یا رسول اللہ! اگر آدمی اپنی بیوی کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرتا ہے؛ تو کیا اس میں بھی اس کو صدقے کا ثواب ملے گا؟ جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: بتلاؤ! اگر وہ آدمی اپنی خواہش غلط اور حرام جگہ پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہیں ہوتا؟ کہا: ضرور ہوتا۔ فرمایا: اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس لئے صحبت کر رہا ہے کہ مَیں اپنے آپ کو گناہ سے بچاؤں؛ تو کیا یہ ثواب نہیں ہے؟ (مشکوۃ ص ۱۶۸ باب فضل الصدقۃ فصل اول بحوالہ مسلم)

نیت ایک پارس ہے

بہر حال! میں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ نیت تو ایک پارس ہے۔ پارس کسے کہتے ہیں؟ ایک پتھر ہوتا ہے جسے تانبے پر بھی پھیر دیتے ہیں تو وہ سونا بن جاتا ہے۔ تو نیت ایک ایسا پارس ہے کہ ہمارے لئے جو اعمال طبعی ہیں، کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا، استنجے کے لئے جانا آنا؛ جو ہم اپنی ضرورت کی وجہ سے کرتے ہیں، یہ سارے اعمال اگر ہم اللہ کے واسطے کریں تو اس حسنِ نیت کی بناء پر وہ عبادت بن جاتے ہیں۔ سوئیں تو اس نیت سے سوئیں کہ ابھی سونے کی وجہ سے طبیعت کے اندر نشاط ہو جائے گا تو میں اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کو مزید چستی اور مزید تندہی کے ساتھ کروں گا۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے سونا بھی عبادت سمجھنا چاہیے۔

﴿حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے عمل سے استدلال﴾

بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ اور حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا اور ایک ایک علاقے کے کچھ حصے کا کام سپرد کیا، آدھے علاقے کا امیر ایک کو بنایا، دوسرے آدھے علاقہ کا امیر دوسرے کو بنایا، اور دونوں کو تاکید کی کہ اپنے اپنے علاقے کی جانچ کے لئے اور اس کی دیکھ ریکھ کے لئے جب دورہ کرو تو ایک دوسرے سے ملاقات کرلینا۔ چنانچہ دونوں نے ایسا ہی معمول بنالیا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب دورے پر نکلے اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے علاقے کے قریب سے گزر ہوا تو سوچا کہ چلو! مل لیں۔ وہاں جاکر ان سے ملاقات کی، خیر خیریت لی، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: تم کس طرح قرآن پڑھتے ہو؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تو تھوڑا تھوڑا کر کے چوبیس گھنٹے کے مختلف اوقات میں اپنا قرآن کا مقررہ وظیفہ پورا کرلیتا ہوں۔

عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک منزل پڑھ لیا کرتے تھے، سات دن میں قرآن پاک پورا کیا کرتے تھے، عموم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول تھا۔

پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کا کیا معمول ہے؟ انھوں نے کہا: میں تو ایسا کرتا ہوں کہ رات کے ایک حصے میں سوتا ہوں اور ایک حصہ سونے کے بعد اٹھ جاتا ہوں اور تہجد کی نماز میں میرا جتنا قرآن پڑھنے کا معمول ہے وہ پورا کرلیتا ہوں، اس موقع پر بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿اِنِّـي أَحتَسِبُ نَوْمَتِي كَمَا أَحتَسِبُ قَوْمَتِي﴾ میں اپنی نیند میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے اسی طرح ثواب

کی امید رکھتا ہوں جس طرح نماز کے لئے کھڑے ہونے میں ثواب کی امید رکھتا ہوں۔ آدمی جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تب تو ہر ایک کو توقع ہوتی ہے کہ میرے اس کام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اجر و ثواب ملے گا، لیکن کسی سونے والے کو سونے پر کیا یہ توقع ہوتی ہے کہ اس سونے پر بھی اللہ تعالیٰ مجھے ثواب دیں گے؟ لیکن حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں سونے پر بھی ثواب کی اسی طرح امید رکھتا ہوں جس طرح نماز میں رکھتا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان کا سونا بھی اسی نیت سے ہوا کرتا تھا۔

بھئی! آدمی اگر مسلسل بیدار رہے تو اس کے اعضاء جواب دینے لگتے ہیں، قویٰ مضمحل ہوجاتے ہیں، پھر آگے وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا، اور آدمی جب سو لیتا ہے تو پھر اس کے قویٰ دوبارہ چست ہوجاتے ہیں، اس کی طاقت رینیو (**Renew**) ہوجاتی ہے اور وہ پھر دوبارہ کام میں لگ جاتا ہے۔

خلاصۂ کلام

کہنے کا مطلب یہ تھا کہ نیت کی درستگی اتنی اہم ہے کہ اسی کے اوپر سارے دین کا مدار ہے، جو کام عبادت کے ہیں ان میں تو نیت ہونی ہی چاہیے، اس کے بغیر وہ عبادت بنیں گے ہی نہیں اور ثواب بھی نہیں ملے گا، بلکہ اگر نیت گڑبڑ والی ہوئی تو سزا ملے گی۔ لیکن جو کام عبادت کے علاوہ ہم عادت کے طور پر کرتے ہیں، کھانا، پینا وغیرہ اس میں بھی اگر ہم نیت درست کرلیں گے تو پھر ہمارے اس اخلاص کی وجہ سے اور نیت کی درستگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ہم کو ان کاموں پر بھی وہی ثواب عطا فرمائیں گے جو عبادتوں پر عطا فرمایا کرتے ہیں۔ ورنہ جہاں نیت کا اہتمام نہ ہو تو پھر ہماری عبادتیں بھی عادتیں بن جاتی ہیں۔

دیکھئے! نماز جیسی عبادت میں بھی کیا ہوتا ہے؟ مَیں نے اگلی مجلس میں عرض کیا تھا کہ ہماری نمازیں آٹو میٹک(**Auto metic**)ہوتی ہیں،نیت باندھی،اللہ اکبر کہا وہاں سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہنے تک کیا ہوا اس کو پوچھو؟ کہے گا: بس! چار رکعت تو پڑھ لی،سب کچھ پڑھا،ایسا نہیں کہ کچھ نہیں پڑھا۔لیکن کیا ہوا؛ وہ پتہ نہیں۔ یہاں دیکھئے! نیت حاضر نہ ہونے کی وجہ سے ہماری نماز جیسی عبادت بھی ایک قدرتی عمل بن گیا،ایک عادت اور ایک آٹو میٹک(**Auto metic**)چیز بن گئی،عبادت کے لئے نیت کو ہر وقت حاضر رکھنا چاہیے۔

علامہ نوویؒ نے جو باب قائم کیا ہے(بَـابُ اِسْتِحْضَـارِ النِّيَّةِ)''نیت کا استحضار'' ہونا چاہیے کہ آدمی جب بھی کوئی کام کرے تو نیت کو پیشِ نظر رکھ کر کرے،تب ہی عبادت کے اندر بھی بات بنے گی،کیونکہ عبادت؛ اسی وقت عبادت کہلائے گی۔اور عادت کے اندر بھی اگر نیت کا استحضار رہے گا تو پھر اس صورت میں اللہ کے واسطے کرنے کا جذبہ کارفرما ہوگا

﴿ نیت کے معاملہ میں ہماری کوتاہیاں ﴾

اس درس میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آج کل ہمارے جو کام ہیں ان میں ہمارے اندر کیا کوتاہیاں ہورہی ہیں؟ کوتاہیوں میں ایک تو یہ ہے کہ ہم میں جو لوگ دین دار کہلاتے ہیں اور عبادتوں کو انجام دیتے ہیں،اپنے اپنے وقت پر پنج وقتہ نمازیں ادا کرتے ہیں روزے رکھتے ہیں،زکوۃ ادا کرتے ہیں،ان کی عبادتیں بھی عادت جیسی بن گئی ہیں یعنی عبادتوں میں نیتوں کا جو استحضار ہونا چاہیے؛ وہ کما حقہ نہیں ہو پاتا،اگرچہ وہاں ریاکاری تو نہیں ہے۔عام طور پر آدمی جب پنج وقتہ نمازیں ادا کرنے آتا ہے تو کوئی ایسی نیت نہیں

ہوتی، دل میں کوئی ریاکاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا، وہ اپنے کو کوئی بزرگ نہیں سمجھتا الّا شاذونادر۔ باقی یہ خرابی ہے کہ نیت کا استحضار نہیں ہوتا۔ ہاں! نوافل کا جہاں معاملہ آتا ہے تو کچھ دوسرے جذبات کارفرما ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم نے اوابین پڑھ لی، اشراق پڑھ لی چاشت پڑھ لی، تہجد پڑھ لی، تلاوتوں کا اہتمام کرلیا تو پھر شیطان دوسری راہ سے آتا ہے۔ ویسے بھی ان کی ادائیگی میں جو جی لگنا چاہیے اور جو استحضار ہونا چاہیے؛ وہ تو ہے نہیں، ساتھ میں پھر ریاکاری، نام ونمود، شہرت کا جذبہ ہوتا ہے کہ لوگ ہم کو بڑا کہیں گے، نیک سمجھیں گے، بزرگ سمجھیں گے، اللہ والا مانیں گے، یہ جذبات بھی آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح خرچ کرنا، اللہ کے راستے میں دینا اور دوسرے بڑے بڑے کاموں میں بھی یہ چیزیں آنے لگتی ہیں۔ اور ہماری جو عادتیں ہیں یعنی طبعی امور؛ اس میں تو ان چیزوں کا استحضار ہوتا ہی نہیں۔

﴿استحضارِ نیت حاصل کرنے کا ماثور طریقہ﴾

اب سوال یہ ہے کہ یہ چیز کیسے حاصل ہو؟ تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضور ﷺ سے ایک موقع پر جب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سوال کیا تھا: ﴿مَا الْإِحْسَانُ؟﴾ اللہ کے رسول! احسان کیا چیز ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ﴿أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ﴾ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو (مشکوۃ ص ۱۱ کتاب الایمان، فصل اول بحوالۂ بخاری ومسلم) کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہو تو کیسی عبادت کرے گا؟ کیسا خلوص، کیسی خوبی اس عمل کے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ جیسے کوئی نوکر دیکھ لے کہ اس کا سیٹھ کام کرتے ہوئے اس کو دیکھ رہا ہے تو پھر دیکھو! وہ نوکر کام میں کمی کرتا ہے؟ نہیں! بلکہ بہت عمدہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے، ذرا بھی کمی نہیں کرتا کیونکہ سیٹھ

صاحب دیکھ رہے ہیں۔اور ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہے ہیں، جان رہے ہیں، اتنا خیال تو حاضر رہنا ہی چاہیے،تو جب نماز پڑھتے وقت بھی ہم نے اس نیت کا استحضار کرلیا کہ میں اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہوں یا اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں،تو دھیرے دھیرے یہ کیفیت اعمال اور عبادات کے اندر بھی پیدا ہوگی اور جب عبادات کے اندر پیدا ہوجائے گی تو پھر اس کے بعد عادات کے اندر بھی پیدا ہوگی۔

اہل اللہ کے پاس آنا جانا کیوں؟

اسی کے لئے اہل اللہ کے پاس آنا جانا ہوتا ہے، ان کی صحبت میں بیٹھنا ہو، اور ان کی تصانیف کا مطالعہ ہو۔ان چیزوں کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔یہ چیزیں سیکھنے کی اور کرنے کی ہیں۔اگلی مجلس میں بھی میں نے بتلایا تھا کہ ہم ان چیزوں کی طرف سے غافل ہیں۔ آج کل کے اس ماحول میں ہم نے ایسی غفلتیں اختیار کرلی ہیں کہ اللہ کی پناہ۔ان چیزوں کی طرف کبھی بھولے سے خیال بھی نہیں جاتا، ہمارے دل میں کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ یہ چیز بھی ہے، اس کے لئے بھی کچھ محنت کرنے کی ضرورت ہے اور اس کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا۔

دعاؤں کا اہتمام بھی ضروری

اس کی بھی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ چیز ہمیں حاصل ہو، اگر نہیں ہوتی ہے تو اس کے لئے دعاؤں کا اہتمام ہو۔بھئی! اگر ہماری دکان نہیں چلتی، فیکٹری کے اوپر کوئی بَلا، آفت آگئی، کوئی رکاوٹ پیدا ہوگئی؛ تو اس کے لئے خود بھی دعائیں کرتے ہیں دوسروں سے بھی کرواتے ہیں اور درخواستیں کرتے ہیں اور جتنی کوشش ہوسکتی ہے؛ وہ کرتے ہیں۔

اسی طرح اس راستے کے لئے بھی خود بھی دعاؤں کا اہتمام ہو، دوسروں سے بھی درخواست ہو اور جتنی کوشش ہم کر سکتے ہوں؛ اس میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

بہرحال! یہ جو اخلاصِ عمل ہے یہ بہت اہم ہے، سارے دین کا مدار اس کے اوپر ہے۔

دل کی مثال ٹنکی کی سی ہے

اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جسم کے اندر ایک لوتھڑا ہے، گوشت کا ٹکڑا ہے جب وہ ٹھیک اور درست ہوتا ہے تو سارا جسم ٹھیک اور درست رہتا ہے، سارے اعمال ٹھیک اور درست ہوتے ہیں، اگر ہمارے قلب کے اندر صلاح آ گئی، ہمارا قلب ٹھیک ہو گیا، ہماری نیتوں کے اندر درستگی آ گئی تو سارے اعمال ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ بگڑ گیا تو اعضاءِ جسم سے جتنے بھی اعمال وجود میں آتے ہیں وہ سارے خراب اور بگڑے ہوئے وجود میں آئیں گے۔ اس لئے کہ جہاں سے عمل نکل رہا ہے، عمل کا سرچشمہ ہی بگڑا ہوا ہے تو پھر وہاں سے جو کچھ بھی آئے گا؛ وہ بگڑا ہوا ہی آئے گا۔ جیسے پانی ٹنکی سے سپلائی ہو رہا ہے اگر وہیں گڑبڑ ہے، وہاں سے پانی زہریلا نکل رہا ہے تو سب جگہ ایسا ہی زہریلا پہنچے گا، اور وہاں اگر اچھا ہے تو دوسری جگہ اچھا ہی پہنچے گا۔

بہرحال! اس کا اہتمام ہونا چاہیے، اس کے لئے کوشش بھی کریں، اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کریں، محنتیں بھی کریں، اور دوسروں سے دعاؤں کی درخواستیں بھی کریں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے

﴿اخلاص النیۃ واستحضارھا ۲﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُوْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہٖ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ امابعد.

عن أم المؤمنین أُمّ عبداللہ عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ ﷺ: یَغْزُوْ جَیْشٌ الْکَعْبَۃَ. فَاِذَا کَانُوْا بِبَیْدَآءَ مِنَ الْأَرْضِ، یُخْسَفُ بِأَوَّلِھِمْ وَآخِرِھِمْ. قَالَتْ: قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہ! کَیْفَ یُخْسَفُ بِأَوَّلِھِمْ وَآخِرِھِمْ وَفِیْھِمْ أَسْوَاقُھُمْ وَمَن لَّیْسَ مِنْھُمْ؟ قال: یُخْسَفُ بِأَوَّلِھِمْ وَآخِرِھِمْ، ثُمَّ یُبْعَثُوْنَ عَلٰی نِیَّاتِھِمْ .

یہ باب نیت کے استحضار کا ہے۔اس کی چند اور روایتیں ہیں۔

﴿حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی کنیت﴾

اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت مروی ہے۔ان کی کنیت امِ عبداللہ تھی۔ابوداؤد شریف کے اندر روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کی ازواج میں سے میری اور جتنی بھی ہم عصر اور برابر کی ہیں ان کی کوئی نہ کوئی کنیت ہے، میری کوئی کنیت نہیں ہے۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اچھا! عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جو تمہارے بھانجہ ہوتے ہیں (حضرت اسماءؓ جو حضرت عائشہؓ کی بہن تھی ان کے صاحبزادے تھے) انہیں کی نسبت سے اپنی کنیت ام عبداللہ رکھ لو۔علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے

اس روایت میں اسی کی طرف ﴿عن أُم المؤمنين أم عبدالله عائشة رضی اللہ عنہا﴾ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

﴿لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے﴾

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک لشکر کعبہ پر حملہ کرنے کے ارادہ سے چلے گا، جب وہ ایک چٹیل اور ہموار میدان کے اندر پہنچے گا جو مکہ مکرمہ کے قریب آس پاس میں واقع ہے، تو وہ سب کے سب زمین کے اندر دھنسا دیئے جائیں گے۔

اس سے کون سا لشکر مراد ہے؟ تو تمام شرّاح نے اس سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ پیشین گوئی ابھی تک عملی طور پر وجود میں نہیں آئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قربِ قیامت میں اس کی نوبت آئے گی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ فرماتے ہیں کہ اس مجمع میں جتنے بھی ہوں گے وہ سب ہی زمین میں دھنسا دیئے جائیں گے تو سب کو کیسے دھنسا دیا جائے گا؟ حالانکہ اس لشکر میں بازار والے بھی ہیں۔

یعنی عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب اس قسم کا لشکر کسی جگہ حملہ کے ارادے سے آگے بڑھتا ہے تو بہت سے لوگ تجارت کی غرض سے ان کے ساتھ ہو جاتے ہیں، ان لوگوں کی نیت وہ نہیں ہوتی جو لشکر کا مقصد ہوتا ہے، ان کا مقصد تو اپنے کاروبار کو فروغ دینا اور کمانا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ تو کعبۃ اللہ پر چڑھائی کے ارادے سے نہیں نکلے تھے پھر ان کو بھی کیسے دھنسا دیا جائے گا؟ اسی طرح بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو

راستے میں ساتھ ہو گئے۔ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مجمع جا رہا ہوتا ہے یا جلوس نکلتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سڑک کے اوپر جہاں سے وہ جلوس گذرتا ہے تو بہت سے لوگ جو اپنے کام سے جا رہے ہوتے ہیں وہ بھی تھوڑی دیر کے لئے ان کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کے ساتھ بھی بہت سے لوگ ایسے ہوں گے، آپ فرماتے ہیں کہ سب ہی دھنسا دیئے جائیں گے۔ جو کعبۃ اللہ پر چڑھائی کے ارادے سے جا رہے تھے ان کا دھنسا دیا جانا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن ساتھ ہی ان گذرنے والوں کو کیوں دھنسا دیا جائے گا؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: دنیا میں تو سب کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا، جو لوگ بازار والے تھے، کمانے والے اور بہت سے وہ لوگ جو ایسے ہی ساتھ ہو گئے تھے؛ وہ سب ہی دھنسا دیئے جائیں گے۔ یعنی دنیوی اعتبار سے جو عذاب ان پر بھیجا گیا تھا اس میں تو سب ہی شریک ہوں گے، البتہ قیامت کے روز وہ لوگ اپنی نیتوں کے مطابق اُٹھائے جائیں گے۔

بروں کے ساتھ رہنے کی نحوست

بہر حال! یہاں تو یہ بتلایا جا رہا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملہ نیتوں کے مطابق ہوگا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیوی اعتبار سے جب کوئی آدمی ایسے غلط لوگوں کے ساتھ پھنس جاتا ہے تو چاہے اس کا ارادہ اس برائی اور غلط کام کا نہیں ہوتا، لیکن ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے جو معاملہ قدرت کی طرف سے ان کے ساتھ کیا جاتا ہے؛ وہی معاملہ اس کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ قیامت کے روز چاہے اس کے ساتھ وہ معاملہ نہ ہو۔ اس لئے غلط لوگوں سے اپنے آپ کو بچانے کا بھی آدمی کو اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿جہاد اور نیت باقی ہے﴾

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت قال رسول اللہ** ﷺ: **لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ. وَإِذَا اسْتُنْفِرْتُمْ فَانْفِرُوْا.**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: فتحِ مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ کی طرف جو ہجرت کی جاتی تھی؛ وہ سلسلہ نہیں رہا۔ نبی کریم ﷺ کے مبارک زمانے میں مکہ مکرمہ کے رہنے والوں میں سے کوئی شخص اگر ایمان لاتا تو نبی کریم ﷺ کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد اس کو بھی اس بات کا مکلّف کیا گیا تھا کہ وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جائے تب ہی اس کا ایمان کامل سمجھا جائے گا، اس کے لئے ہجرت شرط تھی۔ لیکن یہ حکم اس وقت تک تھا جب کہ مکہ مکرمہ دارالاسلام نہیں بنا تھا جب مکہ فتح ہو گیا اور دارالاسلام بن گیا اب مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے بھی اسلام کے سارے احکام پر عمل کرنا ممکن ہو گیا تو وہ ہجرت والا حکم باقی نہیں رہا۔ پہلے تو اس لئے ہجرت کا حکم دیا گیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے اسلام کے احکام پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا اس لئے ان کو پابند بنایا گیا تھا، اب وہ بات نہیں رہی، چونکہ مکہ فتح ہو گیا اور اس پر بھی اسلام ہی کا جھنڈا لہرانے لگا اور اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن ہو گیا تو وہ ہجرت والا حکم جو ضروری تھا، باقی نہیں رہا۔ البتہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: جہاد کا سلسلہ اور عملِ خیر کی نیت باقی ہے۔ یعنی خدانہ کرے اگر کہیں ایسا موقع آ گیا کہ جہاں پر رہتے ہوئے اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو تو آج بھی یہی حکم ہے کہ وہ اس علاقے کو چھوڑ کر ایسی جگہ پر جائے جہاں پر اسلامی احکام کو بجا لا سکتا ہو۔ تو وہ نیت اور جہاد باقی ہے اور جب تم کو جہاد کے لئے نکالا جائے تو نکلو۔

وہ بھی چاہتے تھے

وعن أبی عبداللہ جابر بن عبداللہ الانصاری رضی اللہ عنہ قال: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي غَزَاةٍ فَقَالَ: اِنَّ بِالْمَدِيْنَةِ لَرِجَالاً مَا سِرْتُمْ مَسِيْراً، وَلَا قَطَعْتُمْ وَادِياً اِلَّا كَانُوْا مَعَكُمْ، حَبَسَهُمُ الْمَرَضُ. وفی روایۃ اِلَّا شَرِكُوْكُمْ فِي الْأَجْرِ.

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ شریک تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا: کہ مدینہ منورہ میں بعض لوگ ہیں کہ جب تم کوئی مسافت طے کرتے ہو اور جب کسی وادی میں سے گذرتے ہو تو وہ لوگ بھی حکماً تمہارے ساتھ ہی ہوتے ہیں، اجر وثواب کے اعتبار سے جتنا تم کو مل رہا ہے، اتنا ہی اجر وثواب ان کو بھی مل رہا ہے۔ یعنی یہاں وہ تمہارے ساتھ شریک ہوتے تو جتنا ثواب ملتا، وہاں بیٹھے بیٹھے بھی ان کو مل رہا ہے۔ بیماری نے ان کو وہاں روک دیا ہے یعنی ان کی نیت تھی، وہ بھی چاہتے تھے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے نہیں آ سکے۔

معذوری کی وجہ سے سابقہ معمولات ادا نہ کر سکے تو؟

اس لئے یہ بھی ہے کہ ایک آدمی تندرستی کے زمانے میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا برابر اہتمام کرتا رہا، اب بیماری کی وجہ سے ایسی معذوری آ گئی کہ جماعت میں شرکت نہیں کر پاتا تو اللہ تعالیٰ اس بیماری میں بھی اس کو جماعت کا ثواب عطا فرمائیں گے اسی طرح اور نیکیاں بھی ہیں کہ جن جن اعمالِ خیر کا وہ اہتمام کرتا تھا لیکن کسی عذر کی وجہ سے اب نہیں کر پاتا تو زمانۂ عذر میں اللہ تعالیٰ ان تمام اعمالِ خیر کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

﴿عذر نے ان کو روک رکھا﴾

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہی روایت منقول ہے جس میں تفصیل یہ ہے کہ ہم لوگ غزوۂ تبوک سے واپس لوٹ رہے تھے، اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہمارے پیچھے مدینہ منورہ میں ایسے لوگ ہیں کہ ہم جب بھی کسی درّے میں سے یا کسی وادی میں گذرے تو وہ ہمارے ساتھ تھے، ان کو عذر نے مدینہ منورہ میں روک رکھا تھا۔ مطلب یہ کہ وہ ثواب میں تمہارے ساتھ شریک رہے۔

﴿باپ کا صدقہ بیٹے کے پاس آیا﴾

وعن أبی یزید معن بن یزید الأخنس رضی اللہ عنہ وهو وابوهٗ وجدّهٗ صحابیون قال: كَانَ أَبِی یَزِیْدُ أَخْرَجَ دَنَانِیْرَ یَتَصَدَّقُ بِهَا. فَوَضَعَهَا عِنْدَ رَجُلٍ فِی الْمَسْجِدِ، فَجِئْتُ فَأَخَذْتُهَا، فَأَتَیْتُهُ بِهَا، فَقَالَ: وَاللّٰهِ مَا إِیَّاکَ أَرَدْتُ، فَخَاصَمْتُهُ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم۔ فَقَالَ: لَکَ مَا نَوَیْتَ یَا یَزِیْدُ، وَلَکَ مَا أَخَذْتَ یَا مَعْنُ.

حضرت ابو یزید معن بن یزید بن اخنس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے۔ علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ معن بن یزید خود بھی صحابی ہیں، ان کے والد یزید بھی صحابی ہیں اور ان کے دادا اخنس بھی صحابی ہیں، گویا تین نسل صحابی ہے۔ خیر! حضرت معن بن یزید فرماتے ہیں: میرے ابا نے کچھ پیسے صدقہ کرنے کے لئے الگ نکالے اور مسجد میں ایک آدمی کے حوالے کئے کہ کسی غریب کو صدقے کی یہ رقم دے دینا، اتفاق یہ ہوا کہ مَیں ہی مسجد پہنچا اور وہ رقم میں نے ہی لے لی اور گھر آیا، اب ابا نے پوچھا: یہ پیسے کہاں سے لائے؟ میں نے کہا: مسجد میں ایک صاحب نے دیئے۔ میرے والد نے کہا: میں نے ان کو

کسی اور غریب کو دینے کی نیت سے دیئے تھے، تم ہی لے آئے۔ حضرت معنؓ فرماتے ہیں کہ ہمارا باپ بیٹے کا یہ جھگڑا فیصلے کے لئے حضور ﷺ کے پاس گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَکَ مَانَوَیْتَ یَایَزِیْدُ وَلَکَ مَاأَخَذْتَ یَامَعْنُ﴾ میرے ابا سے کہا: اے یزید! تم نے جو نیت کی تھی اللہ تعالیٰ نے اس کا ثواب تم کو دے دیا اور بیٹے سے کہا: اے معن! تم نے جو لے لیا؛ وہ درست ہے۔

﴿وصیت کے متعلق سوال﴾

وعن أبی اسحاق سعدبن أبی وقاص مالک بن أهیب بن عبدمناف بن زهرة بن کلاب بن مرةبن کعب بن لؤی القرشی الزهری رضی اللہ عنہ أحدالعشرة المشهود لهم بالجنة. قال: جَآءَ نِیْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ یَعُوْدُنِیْ عَامَ حَجَّةِالْوِدَاعِ مِنْ وَجَعٍ اِشتَدَّبِیْ. فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللهِ اِنِّیْ قَدْبَلَغَ بِیْ مِنَ الْوَجعِ مَاتَریٰ. وَأَنَاذُوْمَالٍ وَلَایَرِثُنِیْ اِلَّاابْنَةٌ لِیْ. أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَیْ مَالِی؟ قَالَ: لَا. قُلْتُ: فَالشَّطْرُیَارَسُوْلَ اللهِ؟فَقَالَ: لَا. قُلْتُ: فَالثُّلُثُ یَارَسُوْلَ اللهِ؟قَالَ: اَلثُّلُثُ، وَالثُّلُثُ کَثِیْرٌ. أَوْکَبِیْرٌ. ،اِنَّکَ اَنْ تَذَرَوَرَثَتَکَ أَغْنِیَآءَ خَیْرٌمِنْ اَنْ تَذَرَهُمْ عَالَةً یَتَکَفَّفُوْنَ النَّاسَ وَاِنَّکَ لَنْ تُنفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِی بِهَاوَجْهَ اللهِ اِلَّااُجِرْتَ عَلَیْهَاحَتّی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِی امْرَأَتِکَ. قَالَ: فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللهِ! أُخَلِّفُ بَعْدَأَصْحَابِی؟ قَالَ: اِنَّکَ لَنْ تُخَلَّفَ فَتَعْمَلَ عَمَلاً تَبْتَغِیْ بِه وَجْهَ اللهِ اِلَّاازْدَدْتَ بِه دَرَجَةً وَرِفْعَةً، وَلَعَلَّکَ اَنْ تُخَلَّفَ حَتّٰی یَنْتَفِعَ بِکَ أَقْوَامٌ وَیُضَرَّبِکَ اٰخَرُوْنَ. أَللّٰهُمَّ اَمْضِ لِأَصْحَابِی هِجْرَتَهُمْ وَلَاتَرُدَّهُمْ عَلیٰ أَعْقَابِهِمْ، لٰکِنَّ الْبَائِسُ سَعْدُبْنُ خَوْلَةَ". یَرْثِی لَهٗ رَسُول الله ﷺ أَنْ مَاتَ بِمَکَّةَ.

یہ روایت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے جو ان دس حضرات میں سے ہیں جن کو دنیا ہی میں ایک ہی مجلس میں نبی کریم ﷺ نے جنت کی بشارت سنائی تھی۔ انہیں کو عشرہ مبشرہ کہتے ہیں۔ قبیلۂ بنوزہرہ جو نبی کریم ﷺ کی والدہ حضرت آمنہ کا قبیلہ ہے اس سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے حضور اکرم ﷺ کے رشتہ کے ماموں تھے، وہ فرماتے ہیں: حجۃ الوداع کے موقع پر مَیں بیمار ہوا۔ حجۃ الوداع یعنی ۱۰ھ میں نبی کریم ﷺ حضرات صحابہ کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے گئے تو مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد یہ بہت بیمار ہو گئے اور بیماری نے شدت اختیار کر لی، ان کو اپنے بچنے کی بھی امید نہیں رہی۔ میری اس بیماری کی شدت ہی کے دوران نبی کریم ﷺ میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میری بیماری جس حد تک پہنچ چکی ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید اس بیماری سے مَیں بچ نہ سکوں گا اور مَیں مالدار آدمی ہوں اور میری ایک ہی بیٹی ہے جو وارث ہے، یعنی اولاد میں ایک ہی بیٹی تھی، ورنہ عصبات میں دوسرے ورثاء تھے (اپنے یہاں گجراتی میں جس کو سیدھی لیٹی کے وارث دار کہتے ہیں؛ اس میں ایک ہی بیٹی تھی) اس لئے انہوں نے حضور سے عرض کیا کہ میں اپنے دو تہائی مال کا صدقہ کر دوں؟ مطلب یہ ہے کہ ایک تہائی بیٹی کے لئے رہے گا جو بہت کافی ہے، اس لئے دو تہائی مال کے صدقہ کرنے کی وصیت کر جاؤں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ اس پر انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! آدھے مال کے متعلق صدقہ کی وصیت کر جاؤں؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ اس پر پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایک تہائی کی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! ایک تہائی صحیح ہے اور وہ بھی بہت زیادہ ہے۔ ویسے ایک تہائی کی اجازت ہے۔

﴿وصیت کتنی نافذ ہوگی؟﴾

اسی لئے مسئلہ ہے کہ کوئی آدمی اگر وصیت کر جائے تو وصیت ایک تہائی میں سے ہی پوری کی جائے گی۔ اگر کسی نے یہ وصیت بھی کی ہو کہ میرا پورا مال فلاں جگہ مسجد، مدرسہ وغیرہ میں دے دیا جائے اور اس کے ورثاء موجود ہیں تو اس کی وصیت کے مطابق پورا مال صدقہ نہیں کیا جائے گا بلکہ صرف ایک تہائی دیا جاوے گا اور ایک تہائی کو بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ﴿والثُّلُثُ کَثِیر﴾ کہ تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے حنفیہ کے یہاں یہ حکم ہے کہ اگر وصیت کرے تو مستحب یہ ہے کہ پورے تہائی کی وصیت نہ کرے بلکہ تہائی سے کم کی کرے، تاکہ اس کی طرف سے ورثاء کے اوپر ایک احسان ہو۔ اس لئے کہ تہائی سے زیادہ کی وصیت کرتا تو جتنی زیادتی ہے وہ تو معتبر ہونے والی تھی ہی نہیں، اب اس کے اختیار میں ایک تہائی ہی رہ گیا ہے۔ اب اس کے اختیار میں تھا کہ ایک تہائی کی وصیت کر کے ورثاء کے ہاتھ سے اتنی مقدار کو نکال لیتا اور دوسری جگہ خرچ کرنے کے لئے کہتا، لیکن بجائے پورا ایک تہائی نکالنے کے کم نکالتا ہے۔ مثلاً ایک چھٹا حصہ وصیت میں نکالا تو گویا یوں سمجھا جائے گا کہ ایک تہائی کا آدھا بطورِ احسان کے ورثاء کے لئے چھوڑ دیا۔ ویسے اس کو پورے تہائی کو خرچ کرنے کا اختیار تھا، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک تہائی بھی زیادہ ہے اور حنفیہ کے یہاں یہی مستحب ہے کہ وصیت تہائی سے کم کی کرنا چاہیے۔

﴿وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ﴾

آگے حضور ﷺ نے ایک بات ارشاد فرمائی کہ آپ یوں سمجھتے ہیں کہ ایک بیٹی کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں ہے حالانکہ خاندان کے دوسرے لوگ جو عصبات کی فہرست

میں آتے تھے وہ وارث تھے۔ان کی طرف انہوں نے توجہ نہیں کی،اس پر حضور ﷺ فرماتے ہیں:تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ، یہ تمہارے لئے بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ تم ان کو غریب چھوڑ کر جاؤ اور وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائیں۔مطلب یہ ہے کہ تمہارے انتقال کے بعد تمہارا یہ مال بطورِ وراثت کے ان کے ہاتھوں میں پہنچے گا اور اس کی وجہ سے وہ مالدار بنیں گے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ جائیں گے، یہ تمہارے لئے اچھا ہے۔اور جو بھی چیز تم اللہ کو راضی کرنے کے لئے خرچ کرو گے اس پر تم کو ثواب ملے گا۔یہاں تو یہ روایت لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی اللہ کو راضی کرنے کی نیت سے جائز جگہوں پر جو بھی خرچ کرے گا اس پر اجر و ثواب ملے گا، یہاں تک کہ تم اپنی بیوی کے منہ میں جو لقمہ رکھو گے اس پر بھی اگر تمہاری نیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو، بیوی کا حق ادا ہو اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہو؛ تو اس پر بھی اجر و ثواب ملے گا۔

طبعی امور کو بھی عبادت بنایا جا سکتا ہے

اسی سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جو طبعی امور ہیں یعنی جو کام انسان اپنی طبیعت کے تقاضے کی بناء پر انجام دیتا ہے، جیسے بھوک لگنے پر کھانا کھانا یہ ایک طبعی تقاضہ ہے، پیاس کی وجہ سے پانی پینا ایک طبعی امر ہے، تھکاوٹ کی وجہ سے آرام کے لئے لیٹ جانا اور سو جانا یہ طبعی امر ہے، اسی طریقہ سے بیوی سے اپنی حاجت و شہوت کو پورا کرنا یہ طبعی امر ہے۔ان تمام طبعی امور میں بھی اگر آدمی یہ نیت کر لے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان حقوق کی ادائیگی کا حکم دیا ہے تو وہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔یہ ایک عجیب نسخہ ہے جو ہمیں بتلایا گیا کہ اس کے ذریعہ سے ہم اپنے طبعی امور اور طبعی ضروریات کو انجام دے کر ان کو اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ

بنا سکتے ہیں اور ان کو بھی عبادت بنایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لئے احتساب یعنی نیت کا استحضار اور دل میں یہ ارادہ لانا ضروری ہے۔ اور جب تک کہ آدمی اس کی مشق اور پریکٹس نہ کرے وہاں تک یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔ ورنہ استحضار اگر عبادتوں میں بھی نہیں ہوگا تو جو خالص عبادتیں ہیں وہ بھی بغیر نیت کے عبادت نہیں کہلاتی تو پھر یہ طبعی امور بغیر نیت کے عبادت کیسے بنیں گے؟

جس شہر کو اللہ کی نسبت پر چھوڑا؛ وہیں موت آئے؟

﴿فقلتُ یارسول الله! أُخلّفُ بعد أصحابی﴾ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ساتھیوں کے مکہ مکرمہ سے واپس چلے جانے کے بعد میں تو پیچھے رہ جاؤں گا؟ مطلب یہ ہے کہ اس وقت میری بیماری کی جو کیفیت ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکوں گا بلکہ شاید یہیں میری موت آئے گی۔ گویا ان کو اس پر افسوس تھا کہ واپس مدینہ نہیں پہنچ پاؤں گا۔

حضرات مہاجرین جنہوں نے مکہ مکرمہ کو اللہ کی خاطر چھوڑا تھا ان کو مکہ میں موت آنا ناگوار ہوتا تھا، ان کے حق میں یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا کہ جس شہر کو اللہ کی نسبت پر چھوڑا تھا اُسی شہر میں انتقال ہو اور وہیں دفن ہونے کی نوبت آئے۔ اسی لئے انہوں نے حضور ﷺ سے پوچھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم اس طرح اپنے ساتھیوں سے پیچھے رہ کر مکہ مکرمہ میں موت نہیں پاؤ گے بلکہ تم جب کوئی عمل اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے کرو گے تو اس کے ذریعہ تمہارے درجہ میں اضافہ ہوگا اور امید تو یہ ہے کہ تم اور زندگی پاؤ گے یہاں تک کہ تمہارے ذریعہ سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچے گا اور کچھ لوگوں کو نقصان پہنچے گا۔

﴿فاتحِ قادسیہ﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جو اسلامی فتوحات ہوئیں تو اہلِ فارس کے ساتھ مقامِ قادسیہ میں جو فیصلہ کن جنگ ہوئی تھی اور جس میں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی، اس جنگ میں سپہ سالار سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ گویا ان کے ذریعہ اہلِ اسلام کو بہت بڑا فائدہ پہنچا اور اہلِ کفر فارس والوں کو بہت ہی بڑا نقصان پہنچا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی، جو صادق آئی۔

اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: اے اللہ! میرے صحابہ اور رفقاء کی ہجرت کو مکمل کر لے یعنی ہجرت کی نسبت پر جس شہر کو چھوڑ کر گئے ہیں وہاں ان کی موت کی نوبت نہ آئے، اور ان کو پیچھے نہ لوٹا۔

﴿بے چارہ سعد بن خولہ﴾

﴿لکن البائس سعدبن خولة﴾ البتہ سعد بن خولہ قابلِ رحم ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں، اس لئے کہ ان کی موت مکہ مکرمہ میں اسی زمانۂ حجۃ الوداع میں واقع ہوئی تھی، ان کے متعلق مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ مکہ مکرمہ میں اسلام لائے تھے اور ہجرت کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی اور مکہ ہی میں وفات ہوئی۔ بعضوں نے کہا کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ گئے تھے اور غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں۔ چنانچہ شرکاءِ بدر میں ان کا نام ہے اور اس کے بعد کسی کام سے مکہ مکرمہ آئے تھے اور وہاں موت واقع ہوئی تھی۔ لیکن صحیح اور راجح قول یہی ہے کہ حجۃ الوداع ہی کے موقع پر مکہ مکرمہ میں ان کی موت واقع ہوئی تھی، اس لئے

حضور اکرم ﷺ ان کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال فرمارہے ہیں کہ قابلِ رحم ہیں، جس کو ہم اپنی عام بول چال میں بے چارہ کہتے ہیں۔ بائس بمعنی بے چارہ۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کی جو موت ہوئی وہ تو غیر اختیاری چیز تھی، ان کی موت کے اندر ان کے ذاتی ارادے کو دخل نہیں تھا بلکہ بیمار ہوئے اور انتقال کر گئے، تو اب یہ جملہ کیا معنی رکھتا ہے؟

اس کے متعلق حضرت مولانا تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے تکملۂ فتح الملہم میں لکھا ہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایک تمنا کرتا ہے اور جب وہ تمنا پوری نہیں ہوتی تو اس کو وہ خود بھی غم اور فکر کی چیز سمجھتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی حج کے ارادے سے چلا اور جاتے وقت لوگوں سے یہ کہتے ہوئے گیا کہ میں تو یہ امید لے کر جارہا ہوں کہ مدینہ منورہ میں دفن ہوؤں گا، لیکن بمبئی پہنچا اور اس کا انتقال ہوگیا تو اب لوگ کہتے ہیں کہ بے چارہ! ایک تمنا لے کر گیا تھا لیکن پوری نہیں ہوئی، وہ قابلِ رحم ہے۔ تو دیکھئے! اس کی موت میں اس کے ارادے کو دخل نہیں ہے پھر بھی لوگ اس کے لئے دل سوزی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اسی طریقہ سے وہ حضراتِ صحابہ جو اللہ کی خاطر مکہ مکرمہ کو چھوڑ کر مدینہ منورہ ہجرت کر کے گئے تھے، ان میں سے کوئی بھی اپنے ارادے اور اختیار سے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ نہیں آئے لیکن کسی ضرورت سے آنا ہوا اور بیمار ہو کر موت واقع ہوئی تو چونکہ یہ ایک ایسی چیز واقع ہوئی جو ان کی تمنا کے خلاف تھی، وہ یہ چاہا کرتے تھے کہ ہماری موت مکہ مکرمہ میں نہ آوے، جس

شہر کو ہم اللہ کی خاطر چھوڑ چکے ہیں وہاں موت نہ آوے اور وہاں موت آ گئی، اس لئے حضورِ اکرم ﷺ نے اس کو لفظ (البائس) سے تعبیر فرمایا کہ قابلِ رحم ہیں۔ اس سے ان کا گنہ گار ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

﴿ اللہ تعالیٰ جسموں اور صورتوں کو نہیں دیکھتے ﴾

عن أبی هریرة عبدالرحمن بن صخر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اِنَّ اللہَ لَایَنْظُرُ اِلیٰ أَجْسَامِکُمْ وَلَااِلیٰ صُوَرِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ اِلیٰ قُلُوْبِکُمْ وَأَعْمَالِکُمْ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے کہ تمہارے جسم کیسے تندرست ہیں، تمہاری صورتیں اور چہرے کیسے خوبصورت ہیں؛ اس کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ تمہارے دلوں کی نیتوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ اس لئے جس کا عمل اچھا ہے چاہے اس کی تندرستی کیسی ہی کمزور کیوں نہ ہو اور چاہے اس کا چہرہ کیسا ہی بدصورت کیوں نہ ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہے اور جس کے اعمال بُرے ہیں؛ چاہے اس کا چہرہ کیسا ہی حسین کیوں نہ ہو اور تندرستی کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو؛ وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہے۔ لہٰذا اصل تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا والے اعمال اختیار کرے

﴿ اللہ کے راستہ میں لڑنے والا کون ہوا؟ ﴾

وعن أبی موسیٰ عبداللہ بن قیس الأشعری رضی اللہ عنہ قال: سُئِلَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ عَنِ الرَّجُلِ یُقَاتِلُ شُجَاعَةً وَیُقَاتِلُ حَمِیَّةً وَیُقَاتِلُ رِیَاءً. أَیُّ ذٰالِکَ فِی سَبِیْلِ اللہِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللہِ هِیَ الْعُلْیَا فَهُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ.

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی اپنی بہادری اور شجاعت دکھلانے کے لئے جنگ میں لڑتا ہے اور مقابلہ کرتا ہے اور ایک آدمی اپنے قبیلے اور قوم کی حمایت اور طرف داری میں لڑتا ہے اور ایک آدمی ریا اور دکھلاوے کے لئے لڑتا ہے (شجاعت دکھلانے میں شہرت کے لئے تھا اور یہاں دکھلاوے کے لئے ہے، شہرت الگ چیز ہے اور ریا کاری الگ چیز ہے) تو ان میں سے کون سا آدمی اللہ کے راستے میں اللہ کے واسطے لڑنے والا ہوا؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو آدمی اس لئے لڑتا ہو کہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ سر بلند ہو، وہ ہے اللہ کے راستے میں لڑنے والا۔ اس نیت سے لڑنے والا اللہ کے راستے میں ہے، باقی دوسری نیتوں سے لڑنے والوں میں کوئی بھی اللہ کے راستے میں نہیں۔

قاتل و مقتول دونوں جہنم میں

وعن أبی بکرة نفیع بن حارث الثقفی رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِذَاالْتَقَی الْمُسْلِمَانِ بِسَیْفَیْھِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُوْلُ فِی النَّارِ. فقلت: یارسول اللہ! ھٰذَاالْقَاتِلُ فَمَابَالُ الْمَقْتُوْلِ قَالَ: اِنَّہٗ کَانَ حَرِیصًا عَلیٰ قَتْلِ صَاحِبِہٖ.

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب دو مسلمان اپنی تلوار لے کر ایک دوسرے کو مارنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں تو مارنے والا اور جس کو مارا جا رہا ہے؛ دونوں جہنم میں جائیں گے۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مارنے والے (قاتل) کا جہنم میں جانا تو سمجھ میں آتا ہے لیکن جو مارا گیا (مقتول) وہ کیوں جہنم میں جائے گا؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ بھی

تو اپنے ساتھی کو مارنے کے لئے پورے طور پر تُلا ہوا تھا، وہ تو وار چوک گیا؛ ورنہ اس نے بھی اپنی طرف سے ساتھی کو مارنے میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی کسی برے کام کے لئے اسباب اختیار کرتا ہے، اس کام کا پورا عزم وارادہ ہے اور عزم کے ساتھ ساتھ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آگے بڑھتا ہے لیکن ناکام ہوتا ہے، تو اس صورت میں اس کا گناہ تو اس کو ہوگا ہی۔ یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا کہ مرنے والا اسی لئے آگے بڑھا تھا کہ میں اس کو ختم کروں، یہ بات اور رہی کہ مارنے والا کامیاب ہوگیا اور یہ ناکام رہا، ورنہ دل کے ارادے اور نیت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وہ بھی جہنم میں اور یہ بھی جہنم میں جائے گا۔

اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

﴿اخلاص النیۃ واستحضارھا ۳﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صَلَاۃُ الرَّجُلِ فِیْ جَمَاعَۃٍ تَزِیْدُعَلٰی صَلَاتِہٖ فِیْ سُوْقِہٖ وَبَیْتِہٖ بِضْعًاوَّعِشْرِیْنَ دَرَجَۃً.

﴿نماز باجماعت کی فضیلت﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا؛ اس کا اپنے بازار، دکان میں اور مکان میں نماز پڑھنے کے مقابلے میں بیس سے اوپر درجات کا ثواب رکھتا ہے۔ لفظ ''بضع'' عربی زبان میں تین (۳) سے لے کر نو (۹) تک کے لئے بولا جاتا ہے۔ دوسری روایتوں سے مختلف تعداد معلوم ہوتی ہے ایک روایت میں پچیس (۲۵) گنا لکھا ہے، اور دوسری روایت میں ستائیس (۲۷) گنا ثواب لکھا ہے ایک آدمی جو گھر پر نماز پڑھے اس میں جو ثواب ملے گا اس کے مقابلے میں مسجد میں جا کر نماز پڑھے گا اس میں اس کو ستائیس (۲۷) گنا ثواب زیادہ ملتا ہے۔

﴿فرشتوں کی آمین کا کیا ہوگا؟﴾

ایک بزرگ امام محمد بن حسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں

ان کے شاگرد محمد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ نامی ہیں، ان کے متعلق لکھا ہے کہ جماعت کا بہت ہی زیادہ اہتمام کرتے تھے، ایک مرتبہ کسی وجہ سے جماعت چھوٹ گئی تو انھوں نے اس نماز کو ستائیس (۲۷) مرتبہ پڑھا۔ دیکھئے! ان کی نگاہوں میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی کتنی قدر و قیمت تھی۔ جن کا اللہ کے ساتھ جیسا تعلق ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی ان کے ساتھ اسی مناسبت سے ہوتا ہے۔ خواب میں دیکھا کہ ایک کہنے والا کہہ رہا ہے ﴿یا ابن سلمة! کیف بتأمین الملآئکة﴾ اے ابن سلمہ! فرشتوں کی آمین کا کیا ہوگا؟

﴿جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ مل گئی﴾

اس میں دراصل نبی کریم ﷺ کے ایک ارشاد کی طرف اشارہ ہے، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور امام سورۂ فاتحہ پوری کرتا ہے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْن فَقُوْلُوْا آمین. فَاِنَّ الْاِمَام یَقُوْلُهَا. فَمَنْ وَافَقَ تَأْمِیْنُهٗ تَأْمِیْنَ الْمَلآئِکَةِ غُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ﴾ کہ جب امام "غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْن" کہے تو تم بھی آمین کہو، اس لئے کہ امام بھی آمین کہتا ہے اور جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق پڑ گئی اس کے اگلے سارے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔ یعنی جس وقت امام "وَلَا الضَّالِّیْن" کہے گا اس وقت فرشتے بھی آمین کہیں گے اور آپ بھی آمین کہیں گے تو آپ کی آمین بھی فرشتوں کی آمین کے موافق پڑ جائے گی اور یہ فضیلت حاصل ہوجائے گی۔

بہرحال! ان کو خواب میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا کہ آپ نے ستائیس (۲۷) مرتبہ نماز تو پڑھ لی، لیکن یہ فضیلت کہاں سے حاصل کرو گے؟ اس لئے جماعت اپنی جگہ

پر جو اہمیت رکھتی ہے وہ تو ہے ہی، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خیر! جماعت کے ساتھ نماز کا ثواب اپنے گھر یا دکان میں پڑھنے کے مقابلے میں بیس سے زیادہ گنا کا ثواب رکھتا ہے۔

گھر سے وضو کر کے مسجد جانے کی فضیلت

اور اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ جب تم میں سے کوئی آدمی وضو کرتا ہے ﴿فأحسن الوضوء﴾ اور اچھی طرح سے وضو کرتا ہے یعنی وضو کے فرائض سنتیں، آداب وغیرہ کی پوری رعایت کرتے ہوئے وضو کرتا ہے، اس کے بعد مسجد میں آتا ہے اور اس کی نیت سوائے نماز کے اور کچھ نہیں ہے۔

بس! یہاں تو اس روایت کے ذریعہ یہی بتلانا ہے کہ خالص نماز کی ادائیگی کیلئے مسجد میں آیا۔ ایسا نہیں تھا کہ آج تو فلاں صاحب سے ملنا ہے اور وہ مسجد ہی میں ملیں گے اس لئے چلو آج ہم بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیں تاکہ ان سے ملاقات ہو جائے، یا مثلاً فلاں کے یہاں جماعت کے بعد نکاح رکھا گیا ہے تو چلیں مسجد میں جا کر نماز پڑھ لیں، اس کے یہاں نکاح نہ ہوتا؛ تو نہ آتا۔

اخلاصِ عمل پر یہ مقام عطا کیا گیا

﴿لا یرید الا الصلوٰۃ﴾ نماز ہی کے ارادے سے مسجد میں آیا۔ اور مزید تاکید فرماتے ہیں ﴿لاینهزه الا الصلوة﴾ کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا ہی اس کو آمادہ کر رہا ہے کہ گھر سے نکلے اور مسجد میں جائے۔ نماز کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں: وہ جب بھی ایک قدم اٹھاتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ایک درجہ بلند کیا جاتا ہے اور اس کا ایک گناہ معاف کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہو جائے یعنی گھر سے

مسجد تک آنے میں جتنے قدم ہیں، ہر ہر قدم پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔اور جب وہ مسجد میں آ گیا اور ابھی جماعت کھڑی ہونے میں دیر ہے لیکن چونکہ اسی نماز کے انتظار میں بیٹھا ہے اور یہی نماز اس کو مسجد میں روکے ہوئے ہے؛ تو وہ انتظار نماز ہی میں شمار ہوگا۔یعنی اس نے باقاعدہ نماز کی نیت نہیں باندھی ہے پھر بھی اس کو نماز کا ثواب ملے گا اور فرشتے اس کے لئے مغفرت اور رحمت کی دعا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اس طرح بیٹھا رہے جس طرح اس نے نماز پڑھی ہے۔یعنی نماز کے بعد جب تک وہاں بیٹھا رہے گا فرشتے اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔وہ فرشتے کیا دعا کرتے ہیں ﴿اللّٰھم ارحمہ اللّٰھم اغفر لہ﴾ اے اللہ! اس پر رحمت بھیج، اے اللہ! اس کے گناہوں کو معاف فرما ﴿اللّٰھم تب علیہ﴾ اے اللہ! تو اس کی توبہ کو قبول فرما، اس کی طرف توجہ فرما۔فرشتوں کی دعا کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک کہ وہ کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور جب تک کہ اس کا وضو ٹوٹ نہ جائے۔

بہرحال! اس آدمی کا خاص وضو کرکے اور نماز کا اہتمام کرکے اپنے گھر سے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے نکلنا، اس کے اس ارادے اور نیت پر اور اس کے اخلاصِ عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ مقام عطا کیا گیا۔

﴿نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا الٰہی نظام﴾

وعن أبی العباس عبداللہ عباس رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیما یروی عن رَبِّهٖ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّیِّئَاتِ ثُمَّ بَیَّنَ ذٰلِکَ. فَمَنْ ھَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا، کَتَبَھَا اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ عِنْدَہٗ حَسَنَةً کَامِلَةً. وَاِنْ ھَمَّ بِھَا فَعَمِلَھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ

عَشَرَ حَسَنَاتٍ اِلیٰ سَبْعِ مِائَۃِ ضِعْفٍ اِلیٰ أَضْعَافٍ کَثِیْرَۃٍ. وَاِنْ ھَمَّ بِسَیِّئَۃٍ فَلَمْ یَعْمَلْھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ تَعَالیٰ عِنْدَہٗ حَسَنَۃً کَامِلَۃً. وَاِنْ ھَمَّ بِھَا فَعَمِلَھَا کَتَبَھَا اللّٰہُ سَیِّئَۃً وَاحِدَۃً.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے نقل فرماتے ہیں یعنی حدیث قدسی ہے۔ اس میں فرمایا: اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا ایک نظام بنایا ہے، ایک طریقۂ کار اور پالیسی طے کی ہے یعنی نیکیاں اور برائیاں کیسے لکھی جائے گی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ طے شدہ پالیسی اور طریقۂ کار بتلایا۔ نیکیوں کے سلسلے میں یہ ہے کہ کسی نے نیک کام کرنے کا ارادہ کیا اور سوچا، لیکن کسی وجہ سے نہیں کیا؛ تب بھی اللہ تعالیٰ اپنے یہاں اس کے لئے پوری ایک نیکی لکھیں گے۔

یہاں ''عِنْدَہٗ'' کا لفظ ہے یعنی اپنے یہاں اس کے لئے نیکی لکھیں گے۔ شارحین نے لکھا ہے کہ لفظ ''عِنْدَہٗ'' اور ''کَامِلَۃً'' تاکید کے لئے آیا ہے یعنی پوری نیکی لکھی جائے گی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ صرف ارادہ تھا اس لئے شاید ثواب میں کمی ہوگی، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ پوری نیکی لکھی جائے گی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نیک کام کا ارادہ کرنا بھی نیکی ہے تو اس پر نیکی لکھی ہی جائے گی۔

اور اگر کسی نے نیک کام کا ارادہ کیا اور پھر اس کو کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیوں تک اور اس سے بھی کئی گنا زیادہ نیکیاں لکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب کوئی نیکی کا کام کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کم سے کم دس گنا ثواب تو دیا ہی جاتا ہے اور پھر جس کا جیسا اخلاص اور اس کے دل کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسا تعلق اور اس عمل کے لئے اس نے جیسی محنت و مشقت برداشت کی ہے، ان سب کے

پیشِ نظر اس کی نیکیوں میں دس سے زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ نیکی ملے۔

ارادہ کیا؛ لیکن گناہ نہیں کیا تو؟

اور اگر کسی نے کوئی گناہ کے کام کا ارادہ کیا لیکن اس گناہ کو نہیں کیا۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن اسباب کے میسر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ وہ گناہ کا کام اللہ کے ڈر کی وجہ سے نہیں کیا، اس کو خیال آ گیا کہ یہ تو گناہ کا کام ہے، مجھے نہیں کرنا چاہیے، ارادہ تو ہوا تھا، تیاری بھی کر لی تھی لیکن جہاں یہ خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے تو اس سے باز رہا؛ تو اللہ تعالیٰ پوری ایک نیکی لکھیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہے۔

اور اگر برائی کے کام کا ارادہ کیا اور وہ کر بھی لیا تو اللہ تعالیٰ ایک ہی برائی لکھیں گے دیکھئے! نیکی کے سلسلے میں قاعدہ یہ ہے کہ کم سے کم دس گنا ثواب ملتا ہے اور اس سے زیادہ کی کوئی حد نہیں، جیسا موقع، حالات اور اخلاص ہوگا اس کے مطابق بڑھ جائے گا، جبکہ گناہ کے اندر صرف ایک ہی گناہ لکھا جاتا ہے۔ یہاں تو بتلانا یہی ہے کہ اس کے نیکی کے ارادے پر بھی اللہ تعالیٰ نے نیکی لکھی ہے، معلوم ہوا کہ نیکی کا ارادہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔

اب یہاں ایک قصہ بیان فرماتے ہیں کہ تین حضرات کا عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لئے تھا، کوئی دوسری نیت نہیں تھی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا قبول ہوئی۔

تین شخصوں کا غار میں پھنسنا اور کراماتی انداز سے بچ نکلنا

وعن أبی عبدالرحمٰن عبداللہ بن عمر الخطاب رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول:

حضرت عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگلی امتوں کے تین آدمی سفر کے لئے چلے یہاں تک کہ شب باشی کیلئے ایک غار کے اندر پناہ لی۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بارش آئی تو پناہ حاصل کرنے کے لئے غار میں داخل ہوئے۔ دونوں صورتیں ہوسکتی ہیں، بارش بھی آئی اور رات بھی قریب ہوگی تو رات بھی وہیں گزارنا طے کرلیا، چنانچہ اس غار میں گئے تو پہاڑ کے اوپر سے کوئی پتھر لڑھک کر آیا اور اس نے غار کا جو دہانہ اور دروازہ تھا اس کو پورا بند کر دیا، مکمل فٹ ہوگیا، ذرہ برابر بھی جگہ نہیں چھوڑی، اب انہوں نے سوچا کہ باہر آواز بھی نہیں جاسکتی اور یہاں کون بچانے کیلئے آئے گا، اب کیا تدبیر اختیار کی جائے، تو انہوں نے آپس میں کہا: اس چٹان کی وجہ سے آنے والی مصیبت سے کوئی بچا نہیں سکتا؛ سوائے اس کے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے اپنے نیک اعمال کے وسیلے سے دعا کریں۔

اللہ کے نیک بندوں کا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو وسیلہ پیش کیا جاتا ہے اس میں بھی دراصل اعمالِ صالحہ ہی کا وسیلہ ہوتا ہے، ان کی شخصیتوں کا نہیں ہوتا۔ اللہ کے نیک بندوں کے ساتھ تعلق رکھنا بھی نیکی ہے یعنی اے اللہ! ہمیں تیرے ان نیک بندوں کے ساتھ جو تعلق ہے تو تیری اس رحمت کے وسیلے سے میں یہ سوال کرتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں بھی یہ ہے کہ نبی آخر الزماں اور اللہ کے محبوب کے ساتھ جو محبت اور تعلق ہے، وہ بھی ایک نیکی کا کام ہے تو گویا ایک نیک عمل کا وسیلہ اختیار کیا گیا کہ اے اللہ! تیری اس رحمت کے واسطے سے میں یہ سوال کرتا ہوں۔

﴿بوڑھے ماں باپ کا سعادت مند بیٹا﴾

خیر! ان تینوں نے کہا کہ اپنے اپنے نیک عمل یاد کرو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، چنانچہ ایک آدمی نے دعا شروع کی ﴿اللّٰھم کان لی ابوان شیخان کبیران﴾ اے اللہ! میرے ماں باپ بہت زیادہ بوڑھے تھے اور مَیں صبح یا شام کو ان سے پہلے دودھ نہیں پیتا تھا اور نہ اپنے گھر والوں کو پلاتا تھا اور نہ اپنے مویشیوں کو کچھ کھلاتا تھا، ایک روز بکریاں چرانے کے واسطے گیا تو بکریوں کیلئے چارے کی تلاشی میں دور پہنچ گیا اور شام کو جب لوٹا تو دونوں سو چکے تھے، مَیں نے ان کے لئے دودھ دوہا اور جب لے کر حاضر ہوا تو وہ سوئے ہوئے تھے، مَیں نے ان کو اٹھانا اور ان کی نیند خراب کرنا مناسب نہیں سمجھا، ایک طرف تو یہ صورتِ حال تھی اور دوسری طرف مَیں نے یہ بھی ناپسند کیا کہ مَیں یا میرے گھر والے ان سے پہلے دودھ پی لیں، یہ بھی مجھے گوارہ نہیں ہوا، اس لئے مَیں اسی حالت میں ان کے پاس دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لے کر انتظار کرتے ہوئے کھڑا رہا کہ وہ جاگیں گے تو مَیں ان کو پلاؤں گا اور میرے بچے میرے پاؤں کے پاس بھوک کی وجہ سے بلبلا رہے تھے لیکن مَیں نے ان کو بھی نہیں پلایا کہ جب تک ماں باپ نہیں پئیں گے وہاں تک ان کو بھی نہیں دوں گا، پوری رات گزر گئی یہاں تک کہ صبح طلوع ہوئی تو وہ بیدار ہوئے اور انہوں نے دودھ پیا، اے اللہ! اگر مَیں نے یہ عمل تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیا تھا اور تو جانتا ہے تو ہمارے اوپر سے اس چٹان کو کھول دے۔ چنانچہ اس دعا کی وجہ سے وہ چٹان کچھ کھسک گئی، لیکن اتنی نہیں کہ اس میں سے یہ حضرات باہر نکل سکیں۔ پھر بھی باہر کی کچھ ہَوا اور روشنی آنے لگی۔

یہاں تو یہی بتلانا ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کے واسطے جو عمل کیا تھا تو کوئی بہت

بڑا عمل نہیں تھا لیکن اللہ کے لئے کیا گیا تھا تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے دعا قبول کی اور ان کی جان بچائی۔

﴿پرہیز گار عاشق﴾

﴿وقال الاٰخر﴾ دوسرے نے دعا شروع کی: اے اللہ! میری ایک چچازاد بہن تھی اور وہ مجھے سب سے زیادہ محبوب تھی اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اپنی اس چچازاد بہن سے بہت جم کر محبت کرتا تھا جیسا کہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں۔ میں نے اس سے مطالبہ کیا کہ تو مجھے خواہش پوری کرنے دے تو اس نے انکار کیا، یہاں تک کہ ایک سال قحط آیا جس میں وہ محتاج اور ضرورت مند ہوئی، تو وہ میرے پاس آئی اور مجھ سے ضرورت طلب کی کہ مجھے پیسوں کی ضرورت ہے، میں نے اس کو ایک سو بیس دینار اس شرط پر دئے کہ تو اپنی ذات میرے حوالے کردے، مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنی خواہش پوری کرنے کا موقع دے، اس نے منظور کرلیا، یہاں تک کہ جب میں اس پر پورے طور پر قابو یافتہ ہوا اور مَیں اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے کہا: اللہ سے ڈر اور اس مُہر کو اس کے حق کے بغیر مت توڑ یعنی بغیر نکاح کے یہ حرکت مت کر۔ اس کا یہ جملہ سن کر مَیں اپنی حرکت سے باز آ گیا حالانکہ وہ مجھے بہت زیادہ محبوب تھی اور جو دینار دئے تھے وہ بھی چھوڑ دیئے اور معاف کر دیئے۔ اے اللہ! اگر یہ کام میں نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیا تھا؛ تو ہم اس وقت جس مصیبت میں گرفتار ہیں اس کو تو ہم سے دور کردے۔ چنانچہ چٹان کچھ اور کھسکی، لیکن ابھی بھی اتنی نہیں ہٹی تھی کہ جس میں سے ہم نکل سکیں۔

﴿اگر صدیقین کا مقام چاہیے تو؟﴾

اس موقع پر شراح بخاری نے لکھا ہے کہ آدمی کی خواہشات میں سب سے زیادہ غالب خواہش اپنی شرم گاہ کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو پورا کرنے کے واسطے آدمی بڑے سے بڑا جوکھم اٹھانے کے لئے بھی تیار ہوجاتا ہے۔ جو آدمی اللہ کے خاطر اپنی اس خواہش کو قابو میں رکھے گا؛ اللہ تعالیٰ اس کو صدیقین میں لکھتے ہیں۔ [اللہ اکبر]

﴿امانت دار سیٹھ﴾

تیسرے نے کہا: اے اللہ! میں نے کچھ کام کے لئے مزدور طے کئے تھے اور جب کام ہو چکا تو میں نے سب کی مزدوری چکادی، سوائے ایک آدمی کے کہ وہ اپنی مزدوری لئے بغیر چلا گیا، مزدوری کے طور پر کچھ چاول طے کئے تھے وہ تو بغیر لئے چلا گیا تھا، تو مَیں نے اس کے مزدوری کے چاول کو بویا اور اس کی پیداوار ہوئی، اس کو پھر بویا، اس سے جو آمدنی ہوئی اس سے گائے اور بکریاں خریدیں۔ مطلب یہ ہے کہ جانور خریدے، اور ان کو چرانے کے لئے غلام چرواہا بھی خریدا، یہاں تک کہ اس سے بہت سارے اموال حاصل ہوئے، جس کو آج کی زبان میں کہتے ہیں [Invest] کیا۔ ایک مدت کے بعد وہ میرے پاس آیا اور کہا: اے اللہ کے بندے! میری اجرت اور مزدوری لا۔ مَیں نے اس سے کہا: یہ اونٹ، گائے، بکریاں اور غلام؛ سب تیری مزدوری ہے، یہ سب لے جا۔ اس نے کہا: میرا مذاق مت اڑاؤ، میری مزدوری تو تھوڑے سے چاول تھے اور تم یہ سب بتلا رہے ہو؟ مَیں نے کہا: مَیں مذاق نہیں کرتا بلکہ تیری مزدوری کے جو چاول تھے ان کو بویا اس سے جو پیداوار ہوئی اس کو اسی طرح بڑھاتا رہا، بڑھتے بڑھتے یہ کیفیت ہوئی ہے۔

جب اس نے میری یہ بات سنی تو وہ سب لے گیا ایک چیز بھی نہیں چھوڑی۔ اے اللہ! اگر یہ کام مَیں نے تیری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کیا تھا اور تجھے راضی رکھنے کے خاطر ہی کیا تھا؛ تو ہم جس مصیبت میں گرفتار ہیں اس کو دور کردے۔ چنانچہ اس چٹان کا باقی حصہ بھی کھل گیا اور وہ تینوں حضرات باہر نکلے اور ان کی جان بچ گئی۔

دعا قبول کروانے کا ایک عمل

بہرحال! یہاں تو یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لئے کیا جاتا ہے چاہے وہ کیسا ہی معمولی سا کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس عمل کی بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے اور اس عمل کی برکت سے اللہ تعالیٰ دعائیں بھی قبول کرتے ہیں۔

چنانچہ دعا کے آداب میں ایک چیز یہ بھی لکھی گئی ہے کہ آدمی دعا کرتے ہوئے اپنے اعمال میں سے کوئی ایسا عمل جو خالص اللہ کے لئے کیا ہو؛ اس کا بھی واسطہ اور وسیلہ دے سکتا ہے، اس کے صدقہ و طفیل میں اللہ تعالیٰ دعا قبول کرتے ہیں، اگر کوئی ایسا عمل نہ ہو تو دعا سے پہلے کوئی ایسا عمل کرلے اور پھر دعا کرے؛ تب بھی دعا قبول ہوتی ہے۔

------دعا------

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ الْاَحَدُالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدًا. لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّہٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّہٗ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ اَللّٰھُمَّ لَآاُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا

وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِھَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَابِھَامِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئَآتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَاعِنْدَکَ اَعْلیٰ الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِھَآ اَقْصیٰ الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، نفس و شیطان کی شرارتوں سے ہماری پورے پوری حفاظت فرما، اے اللہ! ہماری تمام عبادتوں میں اور تمام اعمالِ خیر میں ہم کو اخلاص عطا فرما، نیتوں کی درستگی عطا فرما، اے اللہ! اس کے لئے محنتیں کرنے کی اور اس کی طرف متوجہ ہونے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اے اللہ! ان غفلتوں کے نتیجے میں ان چیزوں سے ہم بے پرواہ ہیں، عافیت کے ساتھ ان غفلتوں کو دور فرما کر اس کا احساس عطا فرما کر اس کے لئے کوشش کی توفیق عطا فرما، اور ہمارے لئے اس کو آسان فرما، اے اللہ! ہم تو کمزور ہیں، مجاہدے کی طاقت ہم میں نہیں، اے اللہ! ہم تو مجاہدوں کو برداشت بھی نہیں کر سکتے، اے اللہ! تو تو کریموں کا کریم ہے، تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں اے اللہ! بغیر مجاہدے کے بھی تو عطا فرما سکتا ہے، اے اللہ! ہمیں یہ نعمت محض اپنے فضل و کرم سے عطا فرما، اے اللہ! مجاہدوں والوں کو بھی جب تو دیتا ہے تو اپنے فضل ہی سے عطا فرماتا ہے ورنہ کوئی بھی اپنے مجاہدے سے کسی بھی چیز کا حقدار نہیں بنتا، اے اللہ! ہم تو بلا استحقاق محض تیرے فضل و کرم کے صدقے اس چیز کا تجھ سے سوال کرتے ہیں ہمیں اپنے تمام اعمال میں خلوص اور لِلّٰہیت عطا فرما، نیتوں کی درستگی عطا فرما، اے اللہ! ہمیں حبِ مال اور حبِ جاہ سے حبِ دنیا سے نجات عطا فرما اور ہر عمل تیری ذاتِ عالی کے

واسطے خالص طور پر انجام دینے کی توفیق عطا فرما اے اللہ! نفس وشیطان کی شرارتوں سے ہماری پورے پوری حفاظت فرما، ہر عمل کو صحیح طریقے سے انجام دینے کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی، اساتذہ ومشائخ کی، دوست واحباب کی، محسنین ومتعلقین کی، جنہوں نے ہم کو دعاؤں کے لئے کہا یا لکھا، یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں ان کی، اور تمام مؤمنین ومؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما، اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے ظاہر وپوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری سیئات کو حسنات سے مبدّل فرما، اے اللہ! نبی کریم ا کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما، اے اللہ! مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کی پورے پوری مغفرت فرما کر بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما، اور بھی جن لوگوں نے اپنے بیماروں کی صحت کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں اے اللہ! ان تمام کے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما، اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما، جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے ان کو صالح جوڑ عطا فرما جن کے لئے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما، جن کی اولاد نافرمان ہے ان کو مطیع وفرمانبردار بنادے جو لوگ نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما، اے اللہ! جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ایک مدت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ٹاڈا کے نام سے گرفتار ہے، اے اللہ! ان

تمام کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب فرما، اے اللہ! محض اپنے فضل سے سب کے لئے رہائی مقدر فرما، اپنا خصوصی فضل فرما، اس امت کے حال پر رحم فرما، اے اللہ! جن لوگوں پر مقدمات ہیں عافیت کے ساتھ ان کو بری فرمادے، اے اللہ! جن کی جو جو حاجتیں ہیں محض اپنے فضل وکرم سے پورا فرما اس مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما، اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہیں اے اللہ! ان سے ہماری حفاظت فرما اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

توبہ
و
تکمیل توبہ

مجلس ۱

اقتباس

توبہ ہی اصل ہے۔ دیکھئے! آدمی جب راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اہل اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتا ہے؛ تو سب سے پہلے وہ توبہ ہی کراتے ہیں۔ اَوَّلُ اَقْدَامِ المریدین، اہلِ ارادت کا اولین قدم توبہ ہے، بزرگوں کے پاس جب آپ بیعت ہونے کے لئے جاتے ہیں تاکہ ان کی نگرانی میں، ماتحتی میں اور سرپرستی میں اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کریں، چونکہ وہ اس راہ کو طے کئے ہوئے ہیں، اس راہ کے نشیب وفراز سے واقف ہیں۔ ایک آدمی جو راہ چل چکا ہو، اس کے ساتھ نئے لوگ چلنے کی کوشش کرتے ہیں؛ تاکہ ہمارے لئے آسانی رہے۔ لہٰذا ان کی نگرانی اور سرپرستی میں جب سلسلہ شروع کیا جاتا ہے تو سلوک کی سب سے پہلی منزل توبہ ہے۔ جب بیعت کرتے ہیں تو کیا کراتے ہیں؟ توبہ ہی کراتے ہیں کہ اب تک جو گناہ ہوئے ہیں، اس سے توبہ کرو اور آئندہ کے لئے پکا عہد کرو کہ اب میں ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یہی تکمیلِ توبہ ہے۔ یہ اولین منزل ہے۔ تو اصل توبہ ہے۔ ہم لوگ ابھی توبہ ہی کو مکمل کئے ہوئے نہیں ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کون سے بڑے بڑے مقامات کو حاصل کرنے کی حرص رکھتے ہیں۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں والا معاملہ ہے۔

یہ مجلس تاریخ ۱۵/ جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۸/ستمبر ۱۹۹۶ء کو بمقام مسجدِ ابرار، شالیمار سوسائٹی، سورت میں ہوئی

﴾باب التوبۃ﴿

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً . امابعد .

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ . بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ.

وَتُوْبُوْا اِلیٰ اللّٰہِ جَمِیْعاً. وقال تعالیٰ :یَآ اَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاتُوْبُوْا اِلیٰ اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحاً.

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرا باب توبہ کے سلسلہ میں قائم کیا ہے اس میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ توبہ کے متعلق بیان فرماتے ہیں کہ انسان پر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے ’’گناہ‘‘ یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے؛ ان کو بجا نہ لانا، اور جن چیزوں سے منع فرما رکھا ہے؛ ان کو کر لینا، یہ دونوں چیزیں گناہ کے اندر شمار ہوتی ہیں۔

﴾پورے عالم میں فساد کی وجہ ’’گناہ‘‘﴿

ان گناہوں ہی کی وجہ سے پورے عالم کے اندر فساد اور ابتری پھیلی ہوئی ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر نبی کریم ﷺ تک انبیاء کرام کا جو سلسلہ جاری فرمایا اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ لوگوں کو ان چیزوں سے واقف کیا جائے جن میں

اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری ہوتی ہے اور ان کو اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے آمادہ کیا جائے، اکسایا جائے۔ اور ان چیزوں سے بھی واقف کیا جائے جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی ہوتی ہے اور ان سے ان کو روکا جائے۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے اگلی امتوں کے واقعات اور ان کی نافرمانی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو سزائیں دی گئیں؛ ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

﴿معلم الملائکہ سے شیطان لعین تک﴾

ابلیس لعین کا ایک وقت وہ تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کثرتِ عبادت کے نتیجے میں اس کو اللہ کا اتنا زیادہ قرب اور نزدیکی حاصل تھی کہ فرشتوں کا استاذ اور ان کا سردار بنایا گیا تھا لیکن جب اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مردود کرکے راندۂ درگاہ بنا کر آسمان سے زمین کی طرف پھینک دیا گیا۔ آخر ابلیس کو اس طرح مردود بنانے والی کون سی چیز ہے؟ گناہ ہی تو ہے۔

﴿مختلف قوموں کے مختلف عذاب﴾

قومِ عاد پر اللہ تعالیٰ نے تیز اور تند ہَوا بھیجی جس کے نتیجے میں وہ سب ختم ہوگئے جیسا کہ قرآن پاک میں ہے ﴿كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ﴾ (سورۂ حاقہ پ۲۹) جیسے تیز ہوا اور آندھی آتی ہے تو درخت تنے سمیت اُکھڑ اُکھڑ کر زمین پر گر جاتے ہیں اس طرح قومِ عاد کے لوگ ہلاک اور برباد ہوئے، پٹخ پٹخ کر ان کو ختم کیا گیا حالانکہ وہ بڑے تنومند قوی اور توانا تھے، ان کو اپنی قوت اور توانائی پر ناز تھا اور قرآن میں بھی ان کی توانائی کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی اور معصیت کی وجہ سے ہَوا کا عذاب بھیج کر ان کو ختم کردیا۔

قومِ ثمود کے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چیخ اور چنگھاڑ بھیجی ایسی ہیبت ناک آواز جس کی وجہ سے ان کے کلیجے پھٹ گئے اور وہ سب کے سب ہلاک و برباد ہوئے، یہ بھی ان کی نافرمانی اور گناہوں کی وجہ سے ہوا۔ (تفسیر ابن کثیر۲/۲۲۹طبع بیروت)

قومِ نوح کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر پانی کا عذاب بھیجا، ایک طرف آسمان سے بارش کا سلسلہ اور دوسری طرف زمین کو حکم دیا گیا کہ اپنا پانی باہر نکالو یہاں تک کہ اتنا کثیر پانی ہوا کہ روئے زمین پر اہلِ ایمان کے علاوہ جتنے بھی تھے وہ سب ختم و برباد ہوگئے، خود حضرت نوح علیہ السلام کا صاحبزادہ ایمان نہیں لایا تھا؛ وہ بھی غرقاب ہوگیا۔

(سورۂ ھود۔ پ۱۲)

قومِ شعیب جنھوں نے ناپ تول میں کمی کی تھی اور اللہ کی نافرمانی اور معصیت میں مبتلا ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان پر آگ کا عذاب بھیجا، سات روز تک اتنی سخت گرمی پڑی کہ تالاب اور ندیوں کا پانی بھاپ بن کر اڑ گیا اور لوگ گرمی کی وجہ سے بے حد بے چین ہوگئے اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک کالا بادل بھیجا جس کو دیکھ کر لوگ یوں سمجھ کر کہ اس میں بارش ہوگی اس کے نیچے جمع ہوئے کہ بارش گرے تو ہم پر گرے اور سکون حاصل ہو، جب سب اس کے نیچے آگئے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی بادل میں سے ان پر آگ برسائی گئی جس کے ذریعہ سے ان کو ختم کردیا گیا قرآنِ پاک میں اس کو ﴿عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّةِ﴾ کہا گیا ہے ''سائبان والا عذاب''۔ (روح المعانی ۱۹/۱۴۰)

﴿رسول ﷺ کے خوفِ خدا کی کیفیت﴾

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بادل دیکھتے تھے تو

بے چین ہوجاتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے، حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ جب ہَوا چلتی ہے اور بادل آتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ بارش آئے گی اور میں آپ کو دیکھتی ہوں کہ بادل دیکھ کر آپ پر بے چینی کی کیفیات طاری ہوجاتی ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا معلوم؛ بادل کیا لے کر آرہا ہے اسی بادل کے ذریعہ سے ایک قوم پر اللہ تعالیٰ نے آگ کا عذاب برسایا تھا (ترمذی۲/۱۶۱۔ابواب التفسیر)

اس لئے اہل اللہ اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کو اللہ تعالیٰ کی خوب معرفت حاصل ہوتی ہے؛ وہ کسی ایک چیز پر مطمئن ہوکر نہیں بیٹھتے بلکہ ڈرتے ہیں۔

قومِ لوط کا عذاب

قومِ لوط پر ان کی نافرمانی اور گناہوں کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا عذاب بھیجا کہ ان کی بستیوں کو آسمان پر اٹھا کر اُلٹا کر پھینک دیا گیا اور اوپر سے ان پر پتھروں کی بارش برسائی گئی، آج بھی جو لوگ اس علاقے میں جاتے ہیں وہاں وہ زمین آج بھی ہے جس میں عبرت کا سامان موجود ہے، کہتے ہیں کہ وہاں مخصوص قسم کے اور خاص انداز کے پتھر آج بھی ہیں۔

عذاب کس چیز کی نحوست تھی؟

تو یہ کاہے کی وجہ سے ہوا؟ ان کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو برباد کیا۔ تو یہ جتنی قومیں برباد ہوئیں قرآن پاک میں ان کے واقعات بیان کئے گئے ہیں، قرآن پاک کوئی قصہ کہانی کی کتاب نہیں اور ان کے واقعات بیان کرنے والی ذات کس کی ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ واقعات بیان کئے اور یہ کوئی معمولی

قومیں نہیں تھیں، اپنے اپنے زمانے میں بڑی ترقی یافتہ، بڑی زبردست، بڑی تہذیب یافتہ قومیں تھیں، اورانہوں نے اپنی تہذیب وتمدن میں بڑی بڑی ترقیاں کی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی نافرمانی اور معاصی کی وجہ سے عین اس حالت میں کہ وہ اپنے تہذیب وتمدن کی ترقی کے اوجِ کمال پر پہنچے ہوئے تھے؛ ان کو ہلاک وبرباد کیا۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ ان کے اوپر ظلم نہیں کرتا؛ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ (سورۂ روم پ۲۱) ظاہر ہے کہ گنہگار آدمی گناہ کر کے کسی اور کے اوپر ظلم نہیں کرتا؛ اپنے ہی اوپر ظلم کرتا ہے۔

﴿حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کیوں غمگین تھے؟﴾

[۱] جب قبرص فتح ہوا تو جبیر بن نفیرؒ جو ایک تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو دیکھا جو جلیل القدر صحابی ہیں کہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کر رو رہے ہیں، میں نے جا کر کہا: حضرت! آج تو خوشی کا دن ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو اور اسلام کو عزت عطا فرمائی، فتح مندی اور کامیابی سے نوازا، اور یہ ملک فتح ہوا، یہ خوش ہونے کا وقت ہے۔ انہوں نے کہا: ہائے افسوس! اے جبیر! یہ قوم اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے کی وجہ سے اللہ کی نگاہوں میں ذلیل وخوار ہوئی ہے، کل تک یہ لوگ برسرِ اقتدار تھے اور ان کے ہاتھ میں حکومت تھی اور آج اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے ذلیل ورسوا ہوگئے۔ یہ تو رونے کا وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی حالت میں مبتلا ہونے سے بچائے۔

[۱] جزیرۂ قبرص ۲۸ھ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں فتح ہوا یہ ملک شام کے سمندر میں منفرد مغربی جزیرہ ہے، دمشق سے ملی ہوئی ایک لمبی پٹی پر واقع ہے، پھلوں اور کانوں کی بہتات والا علاقہ ہے، بہترین شہر ہے۔ (البدایہ والنہایہ ۷/۱۱۰)۔۱۲۔

﴿گناہ کی نحوست، روزی سے محرومی﴾

حدیث پاک میں ہے مسند احمد میں روایت موجود ہے: ﴿اِنَّ الرَّجُلَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيْبُهُ﴾ (۵/۲۸۰، حدیث نمبر ۲۲۴۶۶، راوی حضرت ثوبانؓ، ابن ماجہ ص ۳۳۰ باب العقوبات) آدمی اس گناہ کی وجہ سے جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے؛ اپنی روزی سے محروم ہوتا ہے۔

﴿زلزلہ کیوں آتا ہے؟﴾

مسند احمد ہی کی روایت ہے کسی نے حضرت عائشہ صدیقہؓ سے سوال کیا: زلزلہ کیوں آتا ہے؟ دھرتی کمپ (धरती कंप) کاہے کو آتا ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا: جب لوگ گناہ کو جائز کام سمجھ کر کرنے لگتے ہیں، شرابیں پیتے ہیں اور گانے بجانے کے آلات میں مشغول ہوتے ہیں؛ تو آسمان کے اوپر اللہ تبارک وتعالیٰ کو غیرت آتی ہے اور اللہ تعالیٰ زمین کو حکم دیتے ہیں کہ ان کو ہلا ڈال۔ اس کے نتیجے میں زمین حرکت میں آتی ہے اور ذرا سی دیر میں لوگ اِدھر سے اُدھر ہو جاتے ہیں اور چند سیکنڈوں کے اندر بڑی سے بڑی ہلاکت دنیا میں پھیلتی ہے۔

﴿جب میری نافرمانی کی جاتی ہے﴾

مسند احمد میں ہے کہ حضرت وہب فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے فرمایا: بیشک بندہ جب میری فرمانبرداری کرتا ہے تو میں اس سے خوش ہو جاتا ہوں اور جب میں اس سے خوش ہو جاتا ہوں تو اس کی چیزوں اور اس کے پیچھے رہنے والوں میں برکت ڈال دیتا ہوں اور میری برکت کی کوئی انتہا نہیں ہے، بے حساب دیتا ہوں۔ اور جب میری نافرمانی اور معصیت کی جاتی ہے تو میں غضب ناک ہوتا ہوں اور جب میں غضب ناک

ہوتا ہوں تو لعنت بھیجتا ہوں اور میری لعنت کا اثر سات پشتوں تک رہتا ہے

(الزواجر۔۱/۲۱)

﴿''جزاء الاعمال'' کا مطالعہ ضرور کیجئے﴾

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے ایک مستقل رسالہ تصنیف فرمایا ہے ''جزاء الاعمال''۔ جس میں گناہوں کے نقصان اور نیکیوں کے فوائد بیان کئے ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ باقاعدہ اس کے مطالعہ کی بڑی تاکید فرماتے تھے اور دوسرے اکابر بھی بڑی تاکید سے اس رسالے کے مطالعہ کی ترغیب دیا کرتے تھے کہ اس کا مطالعہ ضرور کرو، اس میں حضرت نے سرسری طور پر گناہوں کے ستائیس (۲۷) یا اٹھائیس (۲۸) بڑے بڑے نقصانات بتلائے ہیں۔

﴿گناہوں کے نقصانات﴾

ایک تو یہ بتلایا ہے کہ آدمی گناہوں کی وجہ سے علم سے محروم ہو جاتا ہے اور استدلال میں پیش کیا کہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ طلب علم کے لئے حاضر ہوئے، چند دن ان کی خدمت میں رہ کر واپس جانے لگے تو امام مالکؒ نے ان کو تاکید فرمائی کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے تمہارے دل میں علم کا نور ڈالا ہے ﴿فَلَا تُطْفِئْهُ بِالْمَعْصِيَةِ﴾ گناہوں کے ذریعہ سے اس نور کو بجھا مت دینا، مٹا مت دینا۔ گویا گناہوں کی وجہ سے آدمی علم سے محروم رہتا ہے۔ روزی سے بھی محروم ہوتا ہے، ابھی میں حضور ﷺ کا ارشاد نقل کر چکا کہ معصیت کے ارتکاب کی وجہ سے آدمی روزی سے محروم ہو جاتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات

سے اس کو وحشت اور گھبراہٹ ہونے لگتی ہے اور لوگوں سے بھی وحشت ہونے لگتی ہے، خاص کر جو لوگ نیک اور اہل اللہ ہوتے ہیں ان کے پاس جانے سے اس کے دل میں ایک خاص قسم کی وحشت سی پیدا ہوتی ہے، ان کی خدمت میں حاضری سے آدمی جو برکتیں حاصل کرتا ہے وہ اپنے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے اس سے بھی محروم رہتا ہے اور اس گناہ کی وجہ سے اس کے دل میں ظلمت چھا جاتی ہے اور اس ظلمت کا اثر اس کے چہرے اور آنکھوں پر آتا ہے۔ چنانچہ گنہگار آدمی کتنا ہی حسین وجمیل کیوں نہ ہو، اس کے چہرے پر ایک سیاہی سی معلوم ہوتی ہے۔ اور نیک آدمی کیسا ہی سانولا ہو؛ لیکن ایک نور اس کے چہرے پر معلوم ہوتا ہے۔

﴿ایک روایت﴾

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے ''الابواب والتراجم'' میں ایک روایت نقل کی ہے کہ آدمی سات پردوں کے اندر ایک نیکی کا کام کرے تو بھی اللہ تعالیٰ اس کے واسطے لوگوں کے دلوں میں محبت پیدا فرما کر اس نیکی کو ظاہر کر دیں گے۔ آخر یہ جتنے اہل اللہ اور نیک لوگ ہیں؛ ہم اور آپ ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہیں۔ کیا ہم کبھی ان کو عبادت کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے گئے؟ ہمیں تو معلوم بھی نہیں کہ وہ تنہائی میں کیا عبادت کرتے ہیں، کس قسم کے روزے رکھتے ہیں ان کے روزوں کی کیفیات کیا ہیں؟ ان کی تلاوت کی کیفیات کیا ہیں؟ ان کی تسبیحات وذکر کی کیفیات کیا ہیں؟ ان کی راتوں کی عبادت کی کیفیات کیا ہیں؟ ہم تو جانتے بھی نہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی طرف دلوں کا ایسا میلان رکھا ہے کہ لوگ ٹوٹے پڑتے ہیں۔ حضرت مولانا قاری صدیق صاحب باندوی دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ) تشریف لائے

تھے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ ٹوٹے پڑ رہے تھے۔اہل اللہ کا ہر جگہ یہی حال ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ قدرتی طور پر لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈالتے ہیں۔

﴿مقبولیت کا راز﴾

بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت فرماتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں؛ تم ان سے محبت کرو، چنانچہ آسمان والے ان سے محبت کرتے ہیں، اس کے بعد﴿ یُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِیْ الْاَرْضِ ﴾ زمین میں ان کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ (مشکوٰۃ از مسلم ص ۴۲۵ باب الحب فی اللہ فصل اول)

﴿مقبولیت اللہ کی طرف سے ہونے کی علامت﴾

اسی لئے کتابوں میں لکھا ہے کہ کس کی مقبولیت اللہ کی طرف سے ہے اور کس کی مقبولیت اور شہرت بطورِ استدراج اور ڈھیل کے ہے؟ اس کی علامت کیا ہے؟ بعض ایسے جو متبعِ شریعت نہیں ہوتے، بناوٹی باپوا ور اٹھاؤنی قسم کے لوگوں کو بھی مقبولیت حاصل ہوتی ہے تو کیا فرق ہے؟ یعنی یہ مقبولیت اللہ کی طرف سے ہے یا استدراج ہے؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جن لوگوں کی مقبولیت خواص سے چل کر عوام تک پہنچے، یعنی پہلے ان کی محبت اور مقبولیت خاص خاص اہلِ تقویٰ اور اہلِ صلاح لوگوں کے اندر ہو، اور ان کے ذریعہ سے پھر عوام تک پہنچے؛ تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہونے کی علامت ہے۔ اور جن کو ابتداء سے

عوام میں مقبولیت ہو، خواص یعنی اہل اللہ تو ان کو جانتے بھی نہیں؛ تو پھر یہ استدراج سمجھا جائے گا یعنی عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں۔ تو بہرحال یہ جو گناہ کی وجہ سے دل کے اندر سیاہی آتی ہے، اس کے اثرات چہرے پر بھی آتے ہیں۔

نیکیوں کے فوائد گناہوں کے نقصانات حِبرُ الامۃ رضی اللہ عنہ کی زبانی

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نیکی کی وجہ سے چہرے پر رونق، دل میں نور، روزی میں کشادگی، بدن میں قوت اور لوگوں کے دلوں میں محبت ڈالی جاتی ہے اور گناہ کی وجہ سے چہرے پر بے رونقی، دل اور قبر میں ظلمت واندھیری، روزی میں تنگی، بدن میں کمزوری اور لوگوں کے دلوں میں نفرت وعداوت ڈال دی جاتی ہے۔ بہت سے فساق و فجار ہیں جنھوں نے ہمارا کچھ بگاڑا نہیں، ہم نے تو کبھی ان کو دیکھا بھی نہیں ہے پھر بھی ان کے متعلق ہمارے دل میں ایک نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ کس نے ڈالا؟ یہ گناہوں کے اثرات ہیں اور اسی گناہ کے نتیجے میں آدمی کا دل بھی کمزور ہوتا ہے، جسم بھی کمزور ہوتا ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جسمانی قوت ان کے تقویٰ کا اثر تھی

آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات پڑھے ہوں گے کہ قیصر وکسریٰ کی فوجوں کے سامنے جب یہ حضرات پہنچے تو کیا قیصر وکسریٰ کی فوج کے پاس کھانے پینے کی کمی تھی؟ ان کو تو خوب خوراکیں ملتی تھیں، خوب کھاتے پیتے تھے، اور قوت کے سامان خوب تھے، جبکہ صحابۂ کرام کا حال یہ تھا کہ ان کو فاقے ہوتے تھے، اور کھانے کے لئے ان کے پاس روٹی موجود نہیں تھی، غذا موجود نہیں تھی، پھر بھی صحابہ کے پاس جو قوت تھی وہ ان کے پاس نہیں تھی اہل اللہ کو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی غذا بہت قلیل ہوتی ہے پھر بھی وہ ایسے اعمال میں مشغول

رہتے ہیں اور ایسے کام کر لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ جو اُن کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے اور چلنے پھرنے والے ہیں خود حیرت کرتے ہیں کہ اتنی ساری قوت ان میں آئی کہاں سے؟ لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نہ ان کو آرام کا وقت ملا، نہ کچھ کھا پی رہے ہیں؛ پھر یہ قوت کہاں سے آئی؟ دراصل یہ نیکی کا اثر ہوتا ہے۔اور گناہ کے نتیجے میں قدرۃً جسمانی طور پر بھی کمزوری آتی ہے اور روحانی وقلبی طور پر بھی کمزوری آتی ہے۔

﴿بعض گناہ جو لعنت کا سبب بنتے ہیں﴾

اسی طریقے سے گناہ کی وجہ سے آدمی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کی لعنت کا حقدار بنتا ہے بے شمار گناہ ایسے ہیں جن پر احادیث میں لعنت آئی ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی رشوت لینے والے اور رشوت دینے والے اور درمیان میں واسطہ بننے والے پر۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے سود کھانے والے پر، سود کھلانے والے پر اور اس کا حساب وکتاب لکھنے والے پر، اس میں جو دونوں گواہ بنتے ہیں ان کے اوپر۔شراب کے متعلق آیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی لعنت شراب کے سلسلے میں دس آدمیوں پر ہوتی ہے (۱) پینے والے پر (۲) پلانے والے پر (۳) نچوڑنے والے پر (۴) نچڑوانے والے پر (۵) خریدنے والے پر (۶) بیچنے والے پر (۷) جس کے لئے خریدا جارا ہے (۸) لانے والے پر (۹) جس کے لئے لایا جارہا ہے (۱۰) اُس کی قیمت کو استعمال کرنے والے پر۔ایسے کئی گناہ ہیں۔ (ابن ماجہ ص ۲۵۰۔باب الخمر علیٰ عشرۃ اوجہ)

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا ایک رسالہ ہے ''اسبابِ لعنت'' جس میں ایسے گناہوں کو جمع کیا گیا ہے کہ جن گناہوں کے ارتکاب کے نتیجے میں آدمی پر اللہ

کی لعنت پڑتی ہے، آدمی اللہ کی رحمت سے دور ہوجاتا ہے اور لعنت کا حقدار بنتا ہے آدمی کے ان گناہوں کی وجہ سے زمین میں سے برکتیں ختم ہوجاتی ہیں، پانی میں سے برکت ختم ہوجاتی ہے، غذا اور خوراک میں سے برکت ختم ہوجاتی ہے، ہر چیز سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔

﴿ گیہوں کا ایک دانہ کھجور کی گٹھلی کے برابر ﴾

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے مسند کے اندر لکھا ہے کہ بنوامیہ کے زمانے میں خزانے کے اندر گیہوں کا ایک دانہ تھا، جو اس لئے رکھا گیا تھا کہ یہ زمانۂ خیر کا ہے، نیکی کے زمانے کا ہے، وہ دانہ کھجور کی ایک گٹھلی کے برابر تھا۔ ویسے نبی کریم ﷺ کے ارشادات بخاری ومسلم اور دوسری کتبِ حدیث میں موجود ہیں کہ آخری زمانے میں جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے اور ساری دنیا میں لوگ ایمان لے آئیں گے اور سب جگہ نیکی کا دور دورہ ہوگا، کوئی کافر باقی نہیں رہے گا، ہر جگہ ایمان اور اہلِ ایمان کی برکتیں پھیلیں گی تو صرف ایک انار ایک بڑی جماعت کے لئے کافی ہوجائے گا اور اس ایک انار کے چھلکے میں ایک بڑی جماعت سایہ حاصل کرے گی، اتنا بڑا انار ہوگا، یہ نیکیوں کی برکت ہوگی، نیکیوں کی برکت کے نتیجے میں ہر چیز میں برکت ہوگی۔ (صحیح مسلم ۲/۴۰۲۔ باب ذکر الدجال)

﴿ پوری روئے زمین میں بے برکتی صرف ایک گناہ کا اثر ہے ﴾

قرآن پاک میں ہے: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ. (الروم آیت ۴۱ پارہ ۲۱) خشکی اور سمندروں میں لوگوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے فساد پھیل گیا تا کہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید کہ یہ لوگ تائب ہوجائیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں۔ اس آیت کی تفسیر

میں روح المعانی میں صاحبِ روح المعانی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو جب دنیا کے اندر بھیجا تو روئے زمین پر کوئی خطہ (ٹکڑا) بنجر نہیں تھا، پوری زمین سرسبز وشاداب تھی اور کوئی درخت بغیر پھل کا نہیں تھا، تمام درخت پھل والے تھے اور سمندروں کا پانی میٹھا تھا اور کبھی شیر نے گائے کو پھاڑا نہیں تھا اور بھیڑیے نے بکری پر کبھی حملہ نہیں کیا تھا، جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا، تو زمین میں ایک بھونچال سا آیا اور اس کے نتیجے میں سمندروں کا پانی کھارا اور کڑوا ہوگیا اور درختوں پر کانٹے آگئے اور جو برکتیں تھیں وہ اٹھالی گئیں، اس کے بعد ہی شیر نے گائے پر اور بھیڑیے نے بکری پر حملہ کرنا شروع کیا۔ یہ جتنی بھی بے برکتیاں ہیں؛ وہ سب اسی لئے ہوئیں۔

(روح المعانی ۲۱/۴۷)

﴿مُسْتَرِیحٌ أَوْمُسْتَرَاحٌ مِّنْهُ﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک جنازے کو جاتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ﴿مُسْتَرِیحٌ أَوْمُسْتَرَاحٌ مِّنْهُ﴾ یا تو خود راحت پانے والا ہے یعنی اگر اللہ تعالیٰ کا نیک بندہ ہے تو دنیا کے جھنجھال سے اور دنیا کی تکالیف و مصائب سے نجات پاکر دنیا سے جارہا ہے، یا دوسرے لوگ، اللہ کی بستیاں، اللہ کی مخلوق، چوپائے، انسان، درخت اور سب چیزیں اس کے جانے سے راحت پارہی ہیں اگر وہ گنہگار تھا، کیوں کہ اس کے گناہوں کی نحوست کی وجہ سے دنیا میں مصائب آرہے تھے، گویا اس کے گناہ کی نحوست کی وجہ سے سب لوگ مصیبت میں گرفتار تھے۔ اسی لئے آتا ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو تمام مخلوقات اس کے لئے بددعا کرتی ہیں کہ اس کے گناہوں کی وجہ سے سارے مصائب آرہے ہیں اور گناہ

کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر گناہ کی وجہ سے ایک قسم کی مایوسی سی چھا جاتی ہے۔

گناہ کی وجہ سے مایوسی کا ''ایک واقعہ''

چنانچہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہو رہا تھا اور اس وقت لوگ اس کو کلمہ بھی تلقین کر رہے تھے، مگر وہ گانا گا رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ساری زندگی تو گناہوں میں گذری؛ اب آخری وقت میں کلمہ پڑھ کر کیا ہوگا؟ جو گناہ کئے تھے اس کی وجہ سے اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ اب کلمہ بھی اس کو بے کار معلوم ہوتا ہے حالانکہ آخری وقت میں بھی آدمی سچے دل سے کلمہ پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتا ہے، لیکن گناہ مایوسی لانے والی چیز ہے۔

گناہ کی وجہ سے برے خاتمہ کا اندیشہ ''چند قصے''

اور جب آدمی کثرت سے گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ اس کے اوپر ایسا چھا جاتا ہے کہ آخری حالت تک یہ کیفیت باقی رہتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد عمر صاحب دامت برکاتہم (رحمۂ اللہ) کی تقریر میں سنا کہ ایک آدمی تالے بیچا کرتا تھا اس زمانے میں کئی طرح کے تالے آتے تھے، وہ آدمی ''جرمن جاپان، جرمن جاپان'' بولتا رہتا تھا، اخیر میں موت کا وقت آیا تو لوگ اس کو کلمہ تلقین کر رہے ہیں اور وہ کہہ رہا ہے ''جرمن جاپان، جرمن جاپان''

دوسرا قصہ

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی کی موت کا وقت تھا، لوگ اس کو کلمہ تلقین کر رہے تھے اور وہ کہہ رہا تھا: ایک پیالہ شراب کا تو بھی پی، مجھے بھی پلا، تو بھی پی مجھے

بھی پلا۔ زندگی بھر شراب پیتا رہا تو یہی کیفیت آخری وقت میں بھی باقی رہی۔

تیسرا قصہ

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے قصہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کپڑوں کی تجارت کرتا تھا اوراس میں ایسا مشغول رہتا تھا (تجارت کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اس کو ذریعہ سمجھے، آدمی اس میں مشغول ہوکراللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو جائے) کہ تمام فرائض و واجبات سے بے خبر تھا۔ اب وہ موت کے وقت کہہ رہا ہے ''وہ فلاں آدمی معاملہ کے اعتبار سے بڑا اچھا ہے، یہ کپڑا بڑا اچھا ہے'' لوگ اس کو کلمہ تلقین کررہے ہیں اوروہ یہ بولے جارہا ہے۔

چوتھا قصہ

ایک آدمی ناپ تول میں کمی کرتا تھا، لوگ کلمہ پڑھارہے ہیں لیکن وہ کہتا ہے: ترازو کا کانٹا زبان پر آتا ہے؛ بولنے نہیں دیتا۔ اوراس کی وجہ سے کلمہ پڑھنا چاہتا ہے تب بھی پڑھا نہیں جاتا۔ گناہ کی وجہ سے آدمی کلمہ نہیں پڑھ پاتا۔

دورِ نبوت کا عبرتناک واقعہ

احادیث میں دورِ نبوت کا قصہ موجود ہے۔ ایک صحابی کی والدہ ان سے ناراض تھیں، جب انتقال کا وقت آیا لوگ کلمہ پڑھارہے ہیں لیکن زبان پر کلمہ نہیں چڑھ رہا ہے، چاہتے ہوئے بھی زبان سے نکل نہیں رہا تھا۔ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں گئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ صورتِ حال ہے۔ حضور ﷺ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ ان کی والدہ ناراض ہیں، آپ نے ان کی والدہ کو بلوایا اورفرمایا: ان سے راضی ہو جاؤ، ان کو معاف

کردو۔اس نے کہا: میں تو معاف نہیں کرتی۔حضور ﷺ نے فرمایا: آگ جلاؤ، جب آگ تیار ہوگئی تو اس نے پوچھا: آگ کیوں جلائی جارہی ہے؟ کہا: ان کو اس میں ڈالنا ہے۔ کیوں کہ جہنم کی آگ کے مقابلے میں تو یہ ہلکی ہے۔ان کی والدہ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو کہا: مَیں نے معاف کردیا۔بس! اس کا یہ کہنا تھا اور اُدھر زبان پر ایک دم کلمہ جاری ہوگیا۔تو گناہ کی نحوستیں بے شمار ہیں، اندازے سے باہر ہیں یعنی آدمی اگر اس کو شمار کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔

صغیرہ کبیرہ کی تقسیم

اب گناہوں کے اندر بھی علماء نے تقسیم کی ہے۔ویسے آپ نے سنا ہوگا صغیرہ گناہ اور کبیرہ گناہ، چھوٹا گناہ اور بڑا گناہ۔کبیرہ گناہ کتنے ہیں ان کی تعداد کے سلسلے میں بھی کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں۔کسی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی کبیرہ گناہ ہے، کوئی گناہ چھوٹا نہیں۔ (معارف القرآن ۲/۳۸۴)

کوئی گناہ چھوٹا نہیں

اسی لئے گناہوں کی جو صغیرہ اور کبیرہ تقسیم ہے؛ تو واقعۃً ہے بھی یا نہیں؟ یہ مسئلہ بھی ائمہ وعلماء کے درمیان اختلاف کا ہے۔بعض حضرات تو اس طرف گئے ہیں کہ جتنے بھی گناہ ہیں وہ سب کبیرہ ہی کبیرہ ہیں؛ کوئی صغیرہ نہیں۔

ان حضرات کی دلیل

مشائخِ شافعیہ میں سے ایک بہت بڑے عالم اور جلیل القدر بزرگ ابواسحٰق اسفرائنی ہیں ان کا مسلک اس سلسلہ میں یہی ہے کہ سب گناہ کبیرہ ہیں؛ کوئی صغیرہ نہیں۔

اور قاضی عیاض مالکی نے بعض محققین کا بھی یہ قول نقل کیا ہے۔ ان حضرات نے دلیل یہ پیش کی ہے اور دلیل اپنی جگہ پر واقعۃً بڑی وزنی اور معقول ہے کہ جو بھی معصیت اور گناہ ہوتا ہے؛ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ عظمت و کبریائی کے مقابلے میں گستاخی اور اس کی نافرمانی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی ذات کو دیکھو۔ ہے کوئی اس کے مقابلے میں؟ اگر آج کوئی بہت بڑا بادشاہ آجائے، ملک کا صدر جمہوریہ یہاں آجائے اور کوئی آدمی اس کے سامنے آنکھ نکال دے، تو ساری دنیا کیا کہے گی؟ بہت بڑی گستاخی کردی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کا جلال اور اس کی کبریائی اور اس کی بڑائی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی ذرا سی بات بھی نافرمانی کی کرے گا تو وہ بہت بڑی کہلائے گی۔ اس لئے کوئی گناہ چھوٹا نہیں ہے، جتنے بھی گناہ ہیں؛ وہ کبیرہ ہیں۔

﴿ایک شیخ کا حکیمانہ جواب﴾

ایک مرید نے اپنے شیخ سے پوچھا: یہ بدنگاہی یعنی نامحرم کو دیکھنا: یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟ ان بزرگ نے جواب دیا: بھائی دیکھو! کوئی آدمی آگ کی چنگاری کو چھوٹی سمجھ کر اپنے کپڑوں کے بکس میں نہیں رکھتا، چنگاری چنگاری ہے، بڑی ہو تو بھی، چھوٹی ہو تو بھی، بڑی چنگاری جس طرح گھر جلانے کا کام کرتی ہے، چھوٹی بھی وہی کرسکتی ہے، آپ کپڑوں کے بکس میں بڑی چنگاری رکھو گے؛ تو وہ بھی اس کو جلا دے گی، اور چھوٹی سی رکھو گے؛ تو وہ بھی آگ لگانے کے لئے کافی ہے۔ اسی طرح گناہ بھی آدمی کے خرمنِ ایمان میں یعنی ایمان کے کھلیان میں اور ایمان کے مکان میں آگ لگانے والا ہے، لہٰذا اب چھوٹی چنگاری اور بڑی چنگاری دیکھنا؛ یہ کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

لیکن اس کے باوجود جو حضرات محققین ہیں انہوں نے لکھا ہے کہ گناہ دو قسم کے ہیں صغیرہ اور کبیرہ۔ چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں لکھا ہے کہ احادیث اور قرآن کے پیشِ نظر جمہور علماء کا مسلک یہی ہے کہ گناہ میں تقسیم ہے۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت اور اس کی کبریائی کے سامنے ہر گناہ کبیرہ ہے لیکن یہاں فی نفسہٖ اپنی ذات کے اعتبار سے گناہوں میں جو تقسیم دیکھی جائے تو بعضے گناہ بعض کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں اور بعض گناہ بڑے ہوتے ہیں اس لئے تقسیم کی گئی ہے، چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ، جن کو صغائر اور کبائر کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَاتُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (النساء۔ آیت ۳۱۔ پارہ ۵)﴾ کہ بڑے بڑے گناہ جن سے تم کو منع کیا گیا ہے اگر تم ان سے بچنے کا اہتمام کرو گے تو تمہارے دوسرے گناہ جو چھوٹے ہوں گے؛ ان کو ہم معاف کر دیں گے۔ احادیث میں بھی آتا ہے ﴿مَالَمْ يَغْشَ الْكَبَائِرَ (مشکوۃ بحوالہ مسلم ۳۸ بمعناہ)﴾ کہ جب تک بڑے گناہوں کا ارتکاب نہ کرے تو چھوٹے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے وضو کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، نماز کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، رمضان کے روزوں کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اور اسی طریقے سے چل کر مسجد میں نماز کیلئے جانے کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، عرفہ کا روزہ رکھا تو گناہ معاف ہو جاتے ہیں، عاشوراء کا روزہ رکھا تو گناہ معاف ہو جاتے ہیں، حج کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں عمرہ کی وجہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، آپ نے پڑھا ہو گا کہ بہت ساری عبادتیں ایسی ہیں کہ ان میں ہر قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک نیکی

ملتی ہے اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ تو یہ جتنے بھی معافی والے گناہ ہیں یہ سب صغائر اور چھوٹے چھوٹے گناہ ہیں، بڑے نہیں۔

ایک ظاہری مثال سے مضمون کی وضاحت

مثال سے یوں سمجھئے کہ آپ کا کوئی خادم، نوکر اور ملازم ہے، اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں غلطی کی ہوجاتی ہیں، لیکن بڑی غلطیاں کبھی نہیں کرتا اس صورت میں ان چھوٹی غلطیوں پر آپ اس کی پکڑ دھکڑ نہیں کریں گے، یوں سوچیں گے کہ ایک انسان ہے ذرا تولہ ماشہ ہو جاتا ہے، تھوڑی کمی بیشی ہو جاتی ہے، یوں کہہ کر چھوڑ دیں گے، لیکن اگر وہ چھوٹی نہیں بلکہ بڑی بڑی غلطیاں بھی کرتا ہے تو پھر آپ بڑی پر بھی پکڑ کریں گے اور چھوٹی پر بھی پکڑ کریں گے، آپ کہیں گے کہ یہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتا ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مع تشریح ''توبہ کی حقیقت''

بہرحال! گناہوں کے سلسلہ میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا: ﴿قال العلماء التوبۃ واجبۃ من کل ذنب﴾ ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے۔ توبہ کسے کہتے ہیں؟ توبہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ تاب- یتوب- توبۃً۔ اس کا معنٰی ہے رجوع کرنا اور لوٹنا، توبہ کا مطلب ہے کہ یہ بندہ اب تک اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا تھا اس نافرمانی کو چھوڑ کر وہ فرمانبرداری کی طرف لوٹ رہا ہے، اس لئے توبہ کو توبہ کہتے ہیں اور جو عربی جاننے والے ہیں ان کو معلوم ہے کہ توبہ کے ساتھ جب لفظ ''الیٰ'' آتا ہے، ''تاب الیہ'' تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوا، اس نے توبہ کی۔ اور توبہ کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے بھی بولا جاتا ہے مگر اس کا استعمال لفظِ ''علیٰ'' کے ساتھ ہوتا ہے ''تاب اللہ علیہ'' تو اس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہوا۔اس لئے کہ بندہ جب توبہ کرتا ہے اوراپنے گناہوں پر پچھتا تاہے تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے گناہوں کی وجہ سے اب تک اس کو اپنی رحمت سے محروم کردیا تھا،اب دوبارہ رحمت کا سلسلہ شروع کردیتاہے،اللہ تعالیٰ بھی رحمت لے کراس کی طرف لوٹتا ہے،اسی لئے وہاں بھی لفظِ توبہ استعمال کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہوایااللہ تعالیٰ نے اس کوتوبہ کی توفیق دی اوراس کی توبہ کوقبول فرمایا﴿ان اللہ ھو التوّابُ الرّحیمُ ﴾ تولفظِ توبہ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال کیا گیایعنی اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والااور مہربان ہے۔تو بہرحال توبہ کا مطلب ہے رجوع کرنا لہٰذا ہر گناہ سے توبہ واجب ہے۔

﴿گناہ کی دوقسمیں﴾

اب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس گناہ سے توبہ کی جارہی ہے وہ دوقسم کے ہیں۔ایک تو اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں ہم نے کوتاہی کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے،لیکن اس میں کسی بندے کا حق نہیں مارا۔مثلاً کسی نے شراب پی،تو شراب پینا؛ یہ کبیرہ اور بڑا گناہ ہے،لیکن اس کے شراب پینے کی وجہ سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوا ہاں! اس نے اللہ تعالیٰ کا ایک حکم توڑا اور بڑا گناہ کیا۔اب اگراس گناہ سے توبہ کرتا ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حق سے ہے تو اس کو تین چیزوں کا اہتمام کرنا پڑے گا؛ تب اس کی توبہ ''توبہ'' کہلائے گی اوران تینوں میں سے ایک بات بھی اگرنہیں ہوئی تو وہ توبہ نہیں

﴿توبہ کی شرطِ اول﴾

اول نمبر پرعلامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں﴿أن يقلع عن المعصية ﴾ وہ سب سے پہلا کام تو یہ کرے کہ جس گناہ سے توبہ کررہاہے اس سے باز آجائے اوراس کو چھوڑدے۔

گناہ میں مشغول ہے اور کہے کہ میں نے توبہ کی، تو اس کی مثال حضرت مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم دیتے ہیں کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ عورتوں کو دیکھتے جاتے ہیں اور کہتے ہیں ''توبہ توبہ توبہ'' دیکھو! بے پردہ جارہی ہے۔ایک تو خود دیکھتے جارہے ہیں، اس کا نام توبہ نہیں، یہ تو زبانی توبہ ہوئی۔توبہ تو یہ ہے کہ جس گناہ میں آدمی مبتلا ہے پہلے اس گناہ سے باہر نکلے۔مثلاً ایک آدمی کسی نجاست کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے، اب اگر وہ اس نجاست سے اپنے آپ کو پاک کرنا چاہتا ہے؛ تو یہ گڑھے میں رہ کر پاک نہیں ہوگا، ساری دنیا کے سمندر آپ اس پر بہا ڈالو؛ تب بھی پاک نہیں ہوگا، اس لئے کہ وہ تو نجاست کے اندر پڑا ہوا ہے، اس کو کہیں گے کہ پہلا کام تو یہ کر؛ کہ باہر نکل، تیرے کپڑے وغیرہ بعد میں دھوئیں گے، پہلے تو باہر نکل۔اسی طریقے سے گناہ کے گڑھے میں پڑا ہوا ہے تو جب تک کہ اس گناہ سے باہر نہیں نکلے گا؛ تب تک توبہ قبول نہیں ہوگی۔ویسے توبہ کہتے بھی ہیں لوٹنے کو، تو گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی چھوڑ کر فرمانبرداری کی طرف لوٹے؛ تب ہی تو توبہ ''توبہ'' کہلائے گی۔اسی لئے توبہ میں سب سے پہلا کام تو یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کر رہا ہے اس گناہ سے باہر آوے۔معلوم ہوا کہ اس گناہ پر باقی رہتے ہوئے؛ توبہ ''توبہ'' نہیں ہوگی اس صورت میں استغفار کرے گا تب بھی بے فائدہ ہوگا۔

﴿ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج﴾

ایک بزرگ کا مقولہ ہے ﴿اِسْتِغْفَارُنَا یَحْتَاجُ اِلیٰ اِسْتِغْفَارٍ کَثِیْرٍ﴾ ہمارا استغفار بھی بہت زیادہ استغفار کا محتاج ہے یعنی ہمارے استغفار میں بھی استغفار کی حقیقت پائی نہیں جاتی، اس کے لئے بھی استغفار کی ضرورت ہے، ایسے ہی ہماری توبہ بھی توبہ کی محتاج ہے۔

تو گناہ میں باقی رہتے ہوئے توبہ ''توبہ'' نہیں کہلائے گی۔لہٰذا توبہ میں تین چیزیں ضروری ہیں اگر وہ حقوق اللہ کے قبیل سے ہے۔ایک تو یہ کہ گناہ سے باہر آوے یعنی اگر شراب سے وہ توبہ کررہا ہے تو پہلے شراب پینا چھوڑ دے۔

دوسرے ﴿أَن يَنْدَمَ عَلىٰ فِعْلِهَا﴾ اب تک جو کیا اس پر اس کو ندامت اور پچھتاوا ہو ندامت کیا ہے؟ ﴿تَأَلُّمُ الْقَلْبِ﴾ دل میں درد اور تکلیف ہونا کہ ہائے! میں نے کیا کرڈالا کس کی نافرمانی کی؟ کس کو ناراض کیا؟ ظاہر ہے کہ اہلِ ایمان کو تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ محبت ہے۔دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی یہ محسوس کرے کہ میرا محبوب مجھ سے ناراض ہے؛ تو اس کو چین نہیں آتا، وہ بے چین ہو جاتا ہے اور محبوب کی ناراضگی کے تصور سے اس کی نیند حرام ہو جاتی ہے،اس کو کھانا اچھا نہیں لگتا، دسترخوان بچھایا ہے، بریانی اور زردہ اس کے سامنے ہے،لیکن اس کے ہاتھ نہیں چل رہے ہیں،محبوب کی ناراضگی کے تصور سے بھوک مرچکی ہے، نہ بیوی بچے اچھے لگتے ہیں، نہ اور کچھ۔کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔واقعہ یہی ہے، کیوں کہ محبت چیز ہی ایسی ہے۔

﴿جب مزاجِ یار......﴾

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم جب ڈابھیل تشریف لائے تھے تو خود انہیں سے سنا، مدرسہ کے دفتر میں ایک مرتبہ مجلس تھی تو چند اساتذہ سے فرمایا کہ فانؔی بدایونی ایک شاعر تھا، اپنی بیوی سے اس کو بڑی محبت تھی، اب بیوی ناراض ہوگئی، تو وہ کہتا ہے:

جب مزاجِ یار کچھ برہم نظر آیا مجھے	ہم نے فانؔی ڈوبتے دیکھی ہے نبضِ کائنات

کہ دوست کے مزاج میں ذرا برہمی دیکھی، تو صرف اپنی ہی نہیں بلکہ ساری کائنات کی نبض

ڈوبتی ہوئی معلوم ہوئی۔ ایک اپنی نبض کی بات کہتا تو بات بھی تھی، وہ تو پوری کائنات کو اپنی نگاہوں کے سامنے ڈوبتی دیکھ رہا ہے۔ تو محبوب کی ناراضگی کا جب کسی کو خیال آتا ہے؛ تو اس کو چین نہیں آتا۔

محبوب العالمین ﷺ کی خفگی اور صحابی کی شانِ فدائیت

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی اس کی وجہ سے جہاں ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ حضور ناراض ہیں تو ان کی بے کلی کا عجیب عالم ہوتا۔ آپ فضائلِ اعمال میں حکایاتِ صحابہ پڑھتے اور سنتے ہیں، ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کہیں تشریف لے جارہے تھے، گذرتے ہوئے دیکھا کہ ایک قبہ نما مکان ہے تو آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کس کا ہے؟ بتایا گیا کہ فلاں صحابی کا ہے، آپ آگے بڑھ گئے (وہ صحابی اس وقت ساتھ نہیں تھے) دوسرے کسی موقع پر وہ حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے، آکر انہوں نے سلام کیا تو حضور ﷺ نے رخ پھیر لیا، سلام کا جواب نہیں دیا۔ اب وہ سوچ رہے ہیں کہ معلوم نہیں کیا بات ہوئی؟ پریشان ہیں کہ حضور آخر مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟ لوگوں سے پوچھا: آج میں حضور اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو مجھ سے خفا محسوس کررہا ہوں؛ کیا بات ہے؟ کوئی بات میرے متعلق ہوئی ہے؟ لوگوں نے کہا: ہاں! ایک بات ہے، فلاں روز حضور تشریف لے جارہے تھے اور آپ کا گذر ہوا تو وہاں ایک قبہ نما مکان دیکھا، اس وقت حضور ﷺ نے پوچھا تھا کہ یہ کس کا ہے؟ ہم لوگوں نے بتلایا تھا کہ آپ کا ہے۔ بس! یہ سننا تھا کہ سیدھے گئے اور وہ مکان ڈھادیا۔ دیکھو! محبت کیسی تھی کہ آنے کے بعد بتایا بھی نہیں کہ میں ڈھا کر آیا ہوں۔ ہم جیسے ہوتے تو احسان جتلا دیتے کہ حضرت! آپ کی ناراضگی کا پتہ چلا تو ابھی وہ مکان ختم

کرکے آیا ہوں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اعلیٰ درجہ کے حسنِ ادب کا یہ ایک نمونہ ہے۔

محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی

غزوۂ بدر کے موقع پر جب قیدیوں کو پکڑ کر لایا گیا تو ان قیدیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چچا حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ بھی تھے، جن صحابی کے پاس ان کو رکھا گیا تھا انہوں نے ان کی رسی ذرا سخت باندھی تھی جس کی وجہ سے ان کو جب تکلیف ہوتی تو درد کی وجہ سے ٹیسیں اٹھتی تھی اور آہ آہ کی آواز نکلتی تھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح کو فرمایا: عباس کی آہوں کی وجہ سے مجھے رات کو نیند نہیں آئی۔ خیر! اب قیدیوں کے متعلق مشورہ ہوا اور مشورہ کے آخر میں یہ طے ہوا کہ ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے۔ جب یہ بات آئی تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے بھانجے کو آپ مفت چھوڑ دیجئے۔ ہمارے بھانجے بول کر اشارہ حضرت عباس کی طرف تھا۔ حضرت عباس ان کے بھانجے نہیں تھے اصل تو ان کے بھانجے ہوتے تھے حضرت عباس کے والد عبدالمطلب؛ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہوتے ہیں۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ عبدالمطلب ہاشم کے صاحبزادے تھے اور ہاشم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا تھے، چونکہ مکہ والوں کا دستور تھا کہ وہ تجارتی غرض سے آتے جاتے رہتے تھے، شام کا سفر کرتے تھے، تو مکہ سے شام جاتے ہوئے درمیان میں مدینہ منورہ آتا تھا، ان لوگوں کا قیام مدینہ منورہ رہتا تھا، اس زمانے میں مدینہ کے ایک خاندان کی سلمیٰ نام کی لڑکی اپنے اوصاف، خوب سیرتی اور خوبصورتی کی وجہ سے بڑی مشہور تھی۔ حضرت ہاشم نے ان کو پیغام بھیجا اس کے والد نے جب پیغام دیکھا تو قبول کرلیا اور یوں کہا کہ ہم اپنی لڑکی کو مکہ نہیں بھیجیں گے، شادی کے بعد ساری زندگی آپ چاہیں تو یہاں رہیں، وہ آپ کے ساتھ مکہ

نہیں آئے گی، اس شرط کے ساتھ انہوں نے نکاح کرلیا،لہٰذا شام آتے جاتے ہوئے حضرت ہاشم مدینہ ٹھہرتے تھے،انہیں سے عبدالمطلب پیدا ہوئے۔عبدالمطلب کا اصل نام شیبہ تھا،شیبہ بھی اس لئے کہ جب وہ پیدا ہوئے ہیں تو ان کے سر کے کچھ بال سفید تھے،سفید بالوں کو عربی میں شیبہ کہتے ہیں تو ان کا نام شیبہ تھا، جب ہاشم کا انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنے بھائی مطلب (مطلب کے علاوہ ان کے دو بھائی اور تھے نوفل بن عبد مناف،عبدشمس بن عبدمناف) سے یوں کہا کہ میرا بچہ وہاں ہے، کچھ بڑا ہو تو تمہارے گھر پر لے آنا، چنانچہ ہاشم کے صاحبزادے شیبہ جب تھوڑے بڑے اور سیانے ہوئے، ۵/ ۶ سال کی عمر ہوئی تو مطلب اپنے بھائی کی وصیت کے مطابق گئے اور ان کو اپنے ساتھ اونٹنی پر بٹھا کر مکہ لے آئے۔اس زمانے میں کوئی آدمی جب سفر پر گیا ہوا ہو،اور اپنے ساتھ کوئی چھوٹا بچہ لے آوے،تو لوگ یوں سمجھتے تھے کہ غلام خرید کرلایا ہے، لہٰذا مطلب جب وہاں سے آئے تو اپنے پیچھے ۵/ ۶ سال کے بچے کو بٹھا کر لائے تھے،لوگ یوں سمجھے کہ غلام لے کر آئے ہیں اس لئے عبدالمطلب،عبدالمطلب (مطلب کا غلام) پکارا۔لہٰذا ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا

خیر!اصل میں حضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب کی والدہ مدینہ منورہ کی تھیں اس لئے انصار نے یوں کہا کہ یہ ان کے بھانجے ہیں، حالانکہ حضرت عباس تو عبدالمطلب کے بیٹے تھے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی والدہ مدینہ کی نہیں تھیں اس کے باوجود انصار نے حضور ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یوں عرض کیا: یارسول اللہ! ہمارے بھانجے کو آپ مفت چھوڑ دیجئے۔اس موقع پر حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اصل تو انصار یہ چاہتے تھے کہ آپ کے چچا کو مفت چھوڑ دیا جائے،لیکن یوں نہیں کہا کہ آپ اپنے

چچا کو مفت چھوڑ دیجئے، یہ تو احسان ہوتا۔ یہ ان کا اعلیٰ درجہ کا حسنِ ادب تھا کہ انہوں نے یہ نہیں کہا بلکہ یوں کہا: یا رسول اللہ! ہمارے بھانجے کو مفت چھوڑ دیجئے۔ گویا اس درخواست کے جواب میں حضور ﷺ اگر فدیہ وصول نہ بھی کریں؛ تو احسان حضور ﷺ پر نہیں ہوگا، بلکہ ہم پر ہوگا۔ خیر! حضور ﷺ نے ان کی درخواست کو قبول نہیں کیا اور فرمایا: نہیں بلکہ ان سے ان کا فدیہ لیا جائے گا، اور دوسرے رشتہ داروں کا بھی فدیہ وصول کیا جائے گا۔

یہاں میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں ادب اعلیٰ درجہ کا تھا۔ تو وہ صحابی جنہوں نے اپنا قبہ گرا دیا تھا آ کر عرض بھی نہیں کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے قبہ گرا دیا ہے، کچھ دنوں کے بعد خود نبی کریم ﷺ وہاں سے گذرے تو پوچھا: یہاں ایک قبہ دیکھا تھا؛ وہ کیا ہوا؟ اب صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بعد میں وہ قبہ والے جب آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان کے سلام کا جواب نہیں دیا تو فوراً جا کر اس کو ڈھا دیا۔ میں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ دیکھو! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص محبت تھی، اس لئے ذرا سی بے رخی ان کے دل پر سانپ بن جاتی تھی اور وہ بے چین ہو جاتے تھے۔

عشق است و ہزار بدگمانی

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے حبشہ کی بھی ہجرت کی اور مدینہ کی بھی۔ جب حبشہ سے مدینہ آ رہے تھے یعنی مکہ سے حبشہ گئے تھے پھر حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے۔ جب مدینہ پہونچے اس وقت نبی کریم ﷺ نماز میں تھے۔ بات یہ ہوئی تھی کہ جس زمانے میں وہ ہجرت کر کے گئے تھے اس زمانے میں نماز میں اگر کوئی کسی کو سلام کرتا تو سلام کا جواب دینے کی اجازت تھی، نماز میں ضروری بات چیت

کرنے کی بھی اجازت تھی، سلام کا جواب دینا بھی جائز تھا۔اب وہ تو اسی خیال میں تھے کہ وہ حکم باقی ہے، جب حبشہ سے آئے تو عین اس وقت پہونچے کہ نبی کریم ﷺ کی نماز کی نیت بندھی ہوئی تھی اور آپ نماز میں مشغول تھے، انہوں نے آکر سلام کیا تو حضور نے سلام کا جواب نہیں دیا۔روایتوں میں ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے سامنے تو میری زندگی کے اگلے پچھلے سارے دن آگئے کہ حضور ﷺ نے جواب نہیں دیا، تو مجھ سے کون سا قصور ہوگیا؟ کیا بات ہوگئی؟ شاید یہ شاید وہ۔اس طرح ساری زندگی کا خاکہ اور سارے واقعات سامنے آگئے کہ کونسی بات حضور ﷺ کو ناپسند آئی، یہاں تک کہ حضور ﷺ نے سلام پھیرا، اس کے بعد صحابہ سے فرمایا: دیکھو! اللہ تعالیٰ اپنا حکم بدلتے رہتے ہیں پہلے نماز میں سلام کا جواب دینے کے اجازت تھی، اب نماز میں سلام کا جواب دینے کی اجازت نہیں رہی، اس لئے میں نے تمہارے سلام کا جواب نہیں دیا۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: تب مجھے اطمینان ہوا۔یہ محبت کی بات ہے۔

مؤمنین کی محبت قرآن کی زبانی

تو حقیقت یہ ہے کہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے، اور جب محبّ اور عاشق کو معلوم ہوجاتا ہے کہ میرا محبوب مجھ سے ناراض ہے؛ تو اس کو کسی کل چین نہیں آتا، اب اہل ایمان کو تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی شدید محبت ہوتی ہے ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (سورۂ بقرہ پ۲)﴾ جو ایمان والے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بڑی شدید محبت ہے۔ایمان نام ہی ہے محبت کا۔ اس لئے اگر کوئی آدمی گناہ کرتا ہے اور اس کو یہ معلوم ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہیں؛ تو پھر اس کو کیسے چین اور سکون حاصل ہوسکتا ہے؟ ویسے گناہ کی نحوست بھی یہ ہے کہ اس

کی وجہ سے دل میں بے چینی آتی ہے اور بے اطمینانی ہوتی ہے، جب تک کہ گناہ سے توبہ نہیں کرتا؛ تب تک قلب میں سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے کیسے سکون حاصل ہوسکتا ہے؟ آدمی کیسے بھی اسبابِ راحت حاصل کرے، عمدہ سے عمدہ مکان بنائے، عمدہ سے عمدہ بستر تیار کرے، ایرکنڈیشنڈ گھر ہوجائے؛ تب بھی گناہ کے ذریعہ سے دل میں جو آگ لگا رکھی ہے، اس کا کیا؟ یہ ایرکنڈیشن تو باہر کی کھال کو ٹھنڈا کرے گا، دل کی آگ تھوڑا ہی بجھائے گا۔ دل میں گناہوں کی جو آگ ہے وہ ایرکنڈیشن سے بجھنے والی نہیں ہے۔ وہ تو توبہ کر کے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے ہی ختم ہوگی، اس لئے آدمی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا؛ تب تک یہ بے چینی ختم نہیں ہوتی۔ لہٰذا توبہ کی دوسری شرط علامہ نوویؒ نے بیان فرمائی کہ اب تک اس نے جو گناہ کئے ہیں ان پر ندامت ہو، یعنی دل میں اس پر شرمندگی ہو کہ ہائے! میں نے کس کی نافرمانی کی؟ کس عظیم ذات کے ساتھ میں نے یہ معاملہ کیا؟ اس طرح سوچے۔ یہ دوسری شرط ہوئی۔

﴿ تیسری شرط ﴾

تیسری شرط فرماتے ہیں ﴿أَن يَّعْزِمَ أَن لَّا يَعُوْدَ اِلَيْهَا أَبَداً ﴾ پکّا ارادہ اور عزمِ مصمم کرے کہ اب دوبارہ کبھی بھی یہ کام نہیں کروں گا، مرجاؤں گا لیکن یہ کام نہیں کروں گا، مرجاؤں گا لیکن یہ گناہ نہیں کروں گا۔

﴿ حضرت حکیم الامت کا حکیمانہ نسخہ ﴾

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کو ایک صاحب نے لکھا کہ حضرت! جب کوئی حسین سامنے آتا ہے تو آنکھیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتی ہیں اور میں اپنی آنکھوں کو روک

نہیں سکتا، ان آنکھوں کو روکنے پر مجھے قدرت حاصل نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ بھئی دیکھو! تمہارا یہ کہنا کہ قدرت حاصل نہیں؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اہل فلسفہ کا قاعدہ ہے کہ آدمی کی قدرت متضادین سے متعلق ہوتی ہے یعنی جو کام آدمی کرسکتا ہے، اس کو نہیں بھی کرسکتا۔ مثلاً یہ انگلی مَیں اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے ہلا رہا ہوں، جب اپنے ارادہ سے ہلا رہا ہوں تو اپنے ارادے سے اس کو روک بھی سکتا ہوں۔ اور ایک بیماری ہوتی ہے جس میں آدمی کا ہاتھ خود بخود حرکت کرتا رہتا ہے، وہ آدمی اپنا ہاتھ روکنا چاہے؛ تب بھی نہیں روک سکتا، لہٰذا جب وہ اپنے ارادے سے ہلا نہیں رہا ہے تو اپنے ارادے سے روک بھی نہیں سکتا تو جس کام کے کرنے پر آدمی قادر ہے، یقیناً اس کے نہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے یہ کہنا کہ میں اس سے بچ نہیں سکتا، اس کو نہ کرنے کی قدرت نہیں؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ حضرت تھانویؒ نے لکھا تھا کہ تمہارا یہ لکھنا غلط ہے، قدرت کا تعلق دونوں طرف سے ہے، تب ہی تو قدرت ہے، ورنہ یہ تو غیر اختیاری چیز ہوئی۔

خیر! اس پر انہوں نے لکھا کہ جب میں نہیں دیکھتا ہوں تو قلب میں بہت زیادہ بے چینی ہوتی ہے کہ معلوم نہیں جس کو نہیں دیکھا وہ کیسا حسین ہوگا؟ کیسا خوبصورت ہوگا؟ معلوم نہیں آدمی کیا کیا سوچتا ہے۔ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ اچھا! نہ دیکھنے کی صورت میں جو بے چینی ہوتی ہے؛ وہ کتنی دیر تک رہتی ہے؟ لکھا کہ دو چار منٹ۔ حضرت نے لکھا کہ اچھا! دیکھ لیتے ہو تو؟ اس نے لکھا کہ تین دن تک بے چینی رہتی ہے۔ تب حضرت نے فرمایا کہ ۷۲ر گھنٹے کی بے چینی اگر دو تین منٹ کی بے چینی سے دور ہو سکتی ہے؛ تو یہ سودا بڑا سستا ہے۔

خیر! بتلانا یہ ہے کہ آدمی پختہ ارادہ کرے کہ مرجاؤں گا لیکن کبھی بھی یہ کام نہیں

کروں گا، کچھ بھی ہو جائے۔ تب یہ توبہ ''توبہ'' کہلائے گی۔

اگر کوئی ایک شرط نہ پائی گئی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تین شرطیں ہیں، ان میں سے اگر ایک بھی مفقود ہوگئی اور نہیں پائی گئی؛ تو اس کی توبہ درست نہیں ہوئی۔ تینوں باتیں پائی جائیں گی تب ہی توبہ ''توبہ'' کہلائے گی۔ اگر دل میں یہ بات ہے کہ پھر سے وہ کروں گا تو پھر توبہ کا مطلب ہی تھا ''لوٹنا'' تو وہ فرمانبرداری کی طرف کہاں لوٹا؟ ابھی تو فرمانبرداری کی طرف آیا ہی نہیں۔ اس لئے یہ پکا ارادہ کرنا پڑے گا کہ کچھ بھی ہو جائے؛ مَیں دوبارہ یہ کام نہیں کروں گا۔ جب یہ تینوں باتیں ہوں گی؛ تب توبہ مکمل ہوگی۔ یہ تو حقوق اللہ کا معاملہ ہوا۔

اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہو تو؟

اور جس کا تعلق بندوں کے حق سے ہے اس کے متعلق علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس میں ایک چیز زیادہ ہے، وہ یہ کہ جو حق والا ہے؛ اس کا حق ادا کردے۔ مثلاً کسی کے آپ نے پانچ ہزار روپے لے لئے اور مار لئے۔ اب ہر وقت آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے تنہائیوں میں یوں کہیں: کہ ''توبہ توبہ'' اب کسی کے پیسے نہیں ماروں گا، اور اس پر پچھتاویں اور پکّا ارادہ بھی کریں۔ سب کچھ ٹھیک ہے، لیکن چونکہ یہ بندے کا معاملہ تھا تو پانچ ہزار اس کو لوٹاؤ۔ یہ بھی توبہ کے واسطے شرط ہے۔

اجمالی معافی کافی نہیں

بندوں کے حق کو لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ بس! ایسے ہی معافی صافی کرلو، اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ کسی کی غیر حاضری میں اس کی برائی

کی اب اس سے کہا: بھئی! بولا چالا معاف کرنا، حالانکہ اس کو تو معلوم بھی نہیں کہ میری غیبت کی ہے۔

﴿حقوق العباد کی معافی کا طریقہ﴾

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ تفصیل بتلانی پڑے گی کہ میں نے تمہاری غیبت کی تھی، لہٰذا اب مہربانی کردو اور معاف کردو۔ بہرحال! یہ جو حقوق ہیں، مالی حق ہے تو مال دے دو، اس پر تہمت لگائی ہے تو اپنے آپ کو پیش کردو، اسلامی حکومت ہے اور کسی پر زنا کی تہمت لگائی تو اس تہمت لگانے والے کو سزا میں اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جاتے ہیں، یہ تہمت کی حد اور سزا ہے، وہ اپنے آپ کو سزا کے لئے پیش کردے یا پھر مال ہے تو دے دو، ورنہ معاف کراؤ۔

﴿قیامت میں اعزہ ہی ساتھ چھوڑ دیں گے﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: کسی کا کسی پر حق ہے تو دنیا میں معاف کرالے؛ ورنہ آخرت میں کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے، وہاں تو رشتہ دار اور اعزہ بھی معاف نہیں کریں گے، ماں بھی معاف نہیں کرے گی، باپ بھی معاف نہیں کرے گا، بھائی اور بیوی بھی نہیں ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيهِ (سورۂ عبس پ۳۰)﴾ انہیں رشتہ داروں سے آدمی بھاگے گا۔ اور بھاگنا بھی چاہیے۔ غیروں کے ساتھ زیادہ معاملہ پڑتا نہیں ہے، ماں کے ساتھ، باپ کے ساتھ، بھائی کے ساتھ، بیوی کے ساتھ، گھر والوں کے ساتھ، اعزہ واقارب کے ساتھ زیادہ معاملہ پڑتا ہے، لہٰذا انہیں کے لین دین تو باقی ہیں، کل قیامت کے روز حساب کتاب لینے کو وہی

تو اٹھیں گے، انہیں کو دیکھ کر آدمی بھاگے گا کہ وہ آئے۔ پرایوں کو دیکھ کر بھاگنے کا کوئی زیادہ سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال! اگر حق بندے سے متعلق ہے تو توبہ کے قبول ہونے کے لئے یہ چار شرطیں ضروری ہیں۔ مثلاً کسی کی غیبت کی۔ غیبت یہ بندے کا حق ہے، یاد رکھنا۔ شراب پینا تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے یعنی وہ ہے تو کبیرہ گناہ۔ لیکن اس میں یہ ہے کہ آپ رات کے اندھیرے میں اُٹھ کر آنسو بہا کر اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلیں اور پکا ارادہ کرلیں کہ آئندہ نہیں کریں گے اور جو ہوا اس پر ندامت کرلیں گے؛ تو توبہ قبول ہوگئی۔ اب کوئی چوتھی بات نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کی غیبت کی ہے تو ان تین کے ساتھ چوتھی بات یہ بھی ہے کہ جس کی غیبت کی ہے اس کے پاس جا کر معاف کرائیں، اس سے کہیں کہ مَیں نے آپ کی غیبت کی تھی، معاف کردو، اور وہ معاف کرے گا تو معاف ہوگا، ورنہ اس کے بغیر معاف ہونے والا نہیں ہے۔

﴿حاجی معافی کس طرح مانگے؟﴾

بعض لوگ حج میں جاتے ہیں اور پہلے سے کسی کے کچھ پیسے کھا رکھے ہیں، جانے سے پہلے جب اس سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: بھائی! کچھ لین دین باقی رہ گیا ہو؛ تو معاف کردینا۔ یہ درست نہیں ہے۔ باقاعدہ بات صاف کرے کہ تمہارا حساب کتاب اور کچھ لینا دینا باقی ہو تو بولو، یا رقم یاد ہو تو خود کہے کہ تمہارے اتنے پیسے باقی ہیں، مَیں ادا کرتا ہوں، یا مجھ میں ادا کرنے کی طاقت نہیں ہے، معاف کردو، اور وہ معاف کرے تب معاف ہوں گے۔ باقی ایسے ہی اوپر اوپر کہا تو اس سے معاف ہونے والے نہیں۔ ایسے ہی مالی حقوق

جتنے بھی ہیں وہ کسی کے شرما حضوری میں معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتے۔ حدیث پاک میں ہے ﴿لایَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبَۃٍمِّن نَّفْسِہٖ ﴾ کہ مسلمان کا مال حلال نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنی دلی خوشنودی کے ساتھ پیش نہ کرے، اس پر تو بہت سارے مسائل مرتب ہوتے ہیں۔

بہرحال! بعض لوگ بیوی کا مہر معاف کروالیتے ہیں، خوشی ناخوشی اس سے بلوالیتے ہیں کہ معاف کردے۔ حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ صرف اس سے معاف نہیں ہوتا ہے۔

بہرحال! یہ توبہ کی چار شرطیں ہیں جو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہیں۔ اسی پر آج اس مجلس کو ختم کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توبہ کی حقیقت سے مالامال فرمائے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تُعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراًکَثِیْراً. امابعد.

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: وَاللّٰہِ اِنِّی لَأَسْتَغْفِرُاللّٰہَ وَأَتُوبُ اِلَیْہِ فِیْ الْیَوْمِ اَکْثَرَمِنْ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم استغفار کیوں کرتے تھے؟

توبہ کے سلسلے میں کچھ روایتیں باقی رہ گئی تھیں ان کو پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ کی قسم! مَیں دن میں ستّر سے زیادہ مرتبہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اوراس کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

حضرت اغر بن یسار مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور توبہ کرو اور اپنے گناہوں سے معافی مانگو اس لئے کہ مَیں سومرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا عمل بتایا کہ ستّر (۷۰) سے زیادہ مرتبہ استغفار کرتا ہوں اور دوسری روایت میں سو (۱۰۰) مرتبہ بتلایا، تطبیق یہ ہوئی کہ ستّر (۷۰) سے زیادہ میں سو (۱۰۰) کا عدد آ ہی جاتا ہے ستر (۷۰)

سے زیادہ کتنی مرتبہ استغفار کرتے تھے، یہ سو(۱۰۰) والی روایت نے بتلا دیا۔

نبی کریم ﷺ تو معصوم تھے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ”قدغفر اللہ لک ماتقدم من ذنبک وماتأخر“ کی بشارت سنادی گئی تھی۔اس لئے درحقیقت آپ کو توبہ و استغفار کی ضرورت نہیں تھی لیکن نبی کریم ﷺ کے استغفار کرنے کی چندوجوہات ہیں۔ایک تو امت کے لئے عملی نمونہ پیش کرنا ہے۔اور دوسرا امت کو تعلیم دینا مقصود ہے کہ حضور اکرم ﷺ اپنی معصومیت اور مغفرت کی بشارت سنائے جانے کے باوجود بھی جب اتنا اہتمام فرماتے ہیں تو پھر امتیوں کو اس کا کتنا اہتمام کرنا چاہیے۔اور بعضوں نے یہ توجیہ بھی فرمائی ہے کہ چونکہ ہر آن آپ کے درجات میں ترقی ہوتی رہتی تھی اور ہر وقت آپ اوپر کے درجات کی طرف بڑھتے رہتے تھے،تو جب اوپر کے درجے پر پہنچتے تھے تو نیچے کے درجے کو کم سمجھتے ہوئے اس سے توبہ و مغفرت کی نوبت آتی تھی۔

﴿خادم رسول حضرت انس رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات﴾

وعن أبی حمزة أنس بن مالک الأنصاری رضی اللہ عنہ خادم رسول اللہ ﷺ قال قال رسول اللہ ﷺ: أَللّٰهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ مِنْ أَحَدِكُمْ سَقَطَ عَلٰى بَعِيْرِهٖ وَقَدْ أَضَلَّهُ فِيْ أَرْضٍ فَلَاةٍ

نبی کریم ﷺ کے خادم ابوحمزہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کی دس سال خدمت کی ہے۔جب نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوطلحہ سے فرمایا: تمہارے گھر کا کوئی چھوٹا بچہ ہو تو ہمارے گھر کے کام کاج کے لئے دے دو۔حضرت انس فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ مجھے سواری پر اپنے پیچھے بٹھا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور مجھے

آپ کے حوالے کیا کہ یہ آپ کی خدمت کے لئے ہے۔اس وقت حضرت انس کی عمر دس سال کی تھی اور دس سال انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت کی، نبی کریم ﷺ کی وفات کے وقت حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عمر بیس سال کی تھی۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے تھے، ان کے والد کا تو انتقال ہو گیا تھا اس کے بعد ان کی والدہ ام سلیم نے حضرت ابوطلحہ سے نکاح کیا تھا اس لئے وہ ان کے سوتیلے ابا ہوتے تھے۔

بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میری والدہ، خالہ، نانی وغیرہ گھر کی عورتیں مجھ سے پابندی کرواتی تھیں۔ چونکہ بچوں کی طرف سے غفلت تو ہو ہی جاتی ہے۔فرماتے ہیں کہ مجھے یہ عورتیں تاکید کر کے نبی کریم ﷺ کے پاس بھیجتی رہتی تھیں اگر مَیں ادھر اُدھر ہو جاتا تو میرا خیال رکھا جاتا تھا اور وہاں بھیجا جاتا تھا اور مَیں نے دس سال خدمت کی، نبی کریم ﷺ نے مجھ سے کسی کرنے کے لئے کہے گئے کام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں نہیں کیا۔اور نہیں کرنے کے لئے کہے گئے کام کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا۔ یہ نبی کریم ﷺ کی غایتِ شفقت اور اونچے اخلاق کا نمونہ تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دس سال کے بچے سے فروگذاشت ہونا اور خدمت کے معاملے میں کوتاہی ہونا؛ یہ تو فطری چیز ہے لیکن آپ ﷺ نے کبھی ٹوکا نہیں۔ بلکہ کبھی تو حضور ﷺ کسی کام کے لئے فرماتے تو حضرت انس فرماتے ہیں کہ مَیں بچہ ہونے کی وجہ سے کہہ دیتا تھا کہ نہیں جاؤں گا حالانکہ میرے دل میں ہوتا تھا کہ مَیں جاؤں گا، لیکن زبان سے یوں کہتا تھا۔

خیر! یہی حضرت انس جو نبی کریم ﷺ کے خادم تھے ان کی والدہ نے ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ آپ اپنے خادم انس کے لئے دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ

ان کی اولاد میں اور ان کے مال میں اور ان کی عمر میں برکت عطا فرمائے۔ چنانچہ ان کی عمر سوسال کے قریب ہوئی اور اخیر میں جن صحابہ کرام کی وفات ہوئی ان میں حضرت انس بھی ہیں۔اور انہوں نے اپنی زندگی میں اپنی کئی پشتیں دیکھیں اور اللہ تعالیٰ نے مال میں بھی اتنی برکت دی کہ ان کے باغات سال میں دو مرتبہ پھل دیا کرتے تھے۔ان کے باغ میں ایک پھول تھا جس کے اندر سے مشک کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

﴿بندہ کی توبہ پر اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوتے ہیں﴾

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی آدمی کا اونٹ سفر کے اندر گم ہوگیا، حالانکہ اس کے اوپر سفر کا توشہ، کھانے پینے کا سامان بھی موجود تھا، تلاش کیا لیکن نہیں ملا، پھر اچانک وہ اونٹ اس کو مل گیا تو اس کے ملنے پر اس کو جتنی خوشی ہوسکتی ہے؛ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

چنانچہ اسی چیز کو ایک اور روایت میں تفصیل سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی قسم! ''لَلّٰہُ'' کہا گیا، اس میں قسم کے الفاظ محذوف مانے جاتے ہیں۔عبارت یوں ہوجائے گی ﴿وَاللّٰہِ لَلّٰہُ﴾ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اپنے بندے کی توبہ سے، جب وہ اللہ تعالی کی طرف رجوع وتوبہ کرتا ہے، تم میں سے اس آدمی کی خوشی سے زیادہ جو کسی بنجر زمین وصحراء میں ہو اور اس کی سواری کا اونٹ گم ہوگیا، حالانکہ اس کا کھانے پینے کا سامان اسی کے اوپر تھا، اس کو تلاش بھی کیا، لیکن نہیں ملا اور اس کی طرف سے مایوس ہوگیا اور اب تو یہ سمجھ کر کے کہ موت ہی آنے والی ہے ایک درخت کے پاس آ کر اس کے سایہ میں سوگیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: وہ اسی طرح لیٹا ہوا تھا کہ اچانک کیا دیکھتا ہے کہ

وہ اونٹ اس کے پاس آ گیا اور فوراً اس نے اس کی نکیل پکڑ لی اور مارے خوشی کے کہنے لگا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ، مَیں تیرا پروردگار۔ اصل میں تو اُلٹا کہنا چاہیے کہ میں تیرا بندہ اور تو میرا پروردگار ہے۔ لیکن خوشی کی شدت کی بنا پر اس کی زبان قابو میں نہیں رہی۔ سوچئے! اس کی خوشی کا کیا عالم ہوگا۔ تو اسی طرح جب کوئی بندہ توبہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ خوش ہوتے ہیں۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی شفقت و رحمت کا کیا ٹھکانہ ہے۔ حالانکہ اللہ تو مالک الملک ہیں اور غنی ہیں، ان کو بندوں کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود بندہ جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کتنے خوش ہوتے ہیں۔ اب بندے کو خود کتنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے، اس کا اندازہ لگائیے۔

اللہ تعالیٰ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں

وعن أبی موسیٰ عبد اللہ بن قیس الأشعری رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِنَّ اللّٰہَ تَعَالیٰ یَبْسُطُ یَدَہٗ بِاللَّیْلِ لِیَتُوْبَ مُسِیُٔ النَّھَارِ وَیَبْسُطُ یَدَہٗ بِالنَّھَارِ لِیَتُوْبَ مُسِیُٔ اللَّیْلِ حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِن مَّغْرِبِھَا.

وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ تَابَ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِن مَّغْرِبِھَا تَابَ اللّٰہُ عَلَیْہِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جن کا نام عبداللہ بن قیس رضی اللہ عنہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ بیشک اللہ تبارک وتعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتے ہیں یعنی بندوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تا کہ دن کا گناہ کرنے والا رجوع کرے اور توبہ کرے، اور دن میں

اپنے ہاتھ کو بڑھاتے ہیں یعنی متوجہ ہوتے ہیں تا کہ رات کا گنہگار توبہ کرلے؛ یہاں تک کہ سورج مغرب کی جانب سے طلوع ہوگا۔

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورج کے جانب مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے جو بھی توبہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کریں گے۔ قیامت کے قریب سورج مشرق کی جانب سے طلوع ہونے کے بجائے جانبِ مغرب سے طلوع ہوگا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سورج جب غروب ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سربسجود ہوتا ہے، سجدہ ریز ہوتا ہے اور پھر آئندہ از سر نو چلنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے اجازت مانگتا ہے، جب اجازت دی جاتی ہے تو پھر وہ نیا دورہ شروع کرتا ہے، قیامت کے قریب جب وہ اجازت مانگے گا تو اس کو یوں کہا جائے گا کہ جدھر سے آیا ہے اس طرف ہی لوٹ جاؤ، تو وہ جانب مغرب سے طلوع ہوگا، اور جب وہ مغرب سے طلوع ہوگا تو کسی کی توبہ قبول نہیں ہوگی، وہاں تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور خود اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بندوں کی طرف خاص رحمت اور فضل وکرم کی عنایت وتوجہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ بندے کو فرماتے ہیں کہ توبہ کرلے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا غایت فضل ہے ورنہ دنیا میں کون ایسا ہے؟ اگر کسی کا بیٹا بار بار قصور کرے اور معافی مانگے تو باپ بھی کتنی مرتبہ معاف کرے گا؟ ایک مرتبہ، دو مرتبہ، تین مرتبہ، چھ مرتبہ، اگر بہت زیادہ نرم ہوگا تو دس یا پندرہ مرتبہ معاف کرے گا، اس کے بعد کہہ دے گا کہ بس بیٹا! اب تم جاؤ۔ ہمارا تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ دوسروں کا تو کیا کہنا، یہ حال انسانوں کا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ جب

تک بندہ توبہ کرتا رہے گا؛ وہ قبول فرماتے رہیں گے۔

﴿پھر اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی﴾

وعن ابی عبدالرحمن عبداللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِنَّ اللّٰہَ عَزَّ وَجَلَّ یَقْبَلُ تَوْبَۃَ الْعَبْدِ مَالَمْ یُغَرْغِرْ.

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ کو قبول کرتے ہیں جب تک کہ اس کی جان حلق میں نہ آئے۔ ''غرغرہ'' اصل میں کہتے ہیں کہ پانی کو حلق میں لے جا کر اس کو اوپر نیچے کرنا۔ اسی طرح سے آدمی کی روح نکلنے کا جب وقت آتا ہے تو روح حلق میں آتی ہے اس سے پہلے تک اللہ تعالیٰ آدمی کی توبہ کو قبول کرتے ہیں اور اخیر میں جب نزع والی کیفیت شروع ہو جاتی ہے اس کے بعد اگر کوئی توبہ کرے تو پھر اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

﴿طلب علم کی فضیلت﴾

وعن زر بن حبیش قال: أَتَیْتُ صَفْوَانَ بْنِ عَسَّال رضی اللہ عنہ: أَسْئَلُہُ عَنِ الْمَسْحِ عَلَی الْخُفَّیْنِ فَقَالَ: مَاجَاءَ بِکَ یَازِر؟ فَقُلْتُ: اِبْتِغَآءَ الْعِلْمِ. الخ

حضرت زر بن حبیشؒ جو تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں: میں حضرت صفوان بن عسّالؓ کے پاس موزوں پر مسح کے سلسلے میں معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ حضرت صفوانؓ نے ان کو دیکھ کر پوچھا کہ اے زر! کون سی چیز تم کو میرے پاس لائی؟ کیوں آئے؟ میں نے عرض کیا: علم حاصل کرنے کے لئے اور مسئلہ پوچھنے کے لئے آیا ہوں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: کہ فرشتے طالب علم کے لئے، وہ جو علم حاصل کرتا ہے اس پر خوشی اور رضا مندی کا

اظہار کرتے ہوئے اپنے پروں کو بچھاتے ہیں۔ لہٰذا دیکھئے۔ دین کا علم حاصل کرنا یہ کتنی بڑی چیز ہوگئی۔

﴿موزوں پر مسح ثابت ہے﴾

میں نے عرض کیا: پیشاب و پائخانہ کے بعد موزوں پر مسح کرنے کے بارے میں میرے دل میں کچھ تردد ہے کہ کرنا چاہیے یا نہیں اور چونکہ آپ حضور اکرم ﷺ کے صحابی ہیں اس لئے مَیں آپ کے پاس پوچھنے کے لئے آیا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ اس سلسلے میں آپ کے پاس کچھ معلومات ہوں۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں حضور کو کچھ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! جب ہم لوگ سفر میں ہوتے تھے تو حضور اکرم ﷺ ہم کو حکم دیتے تھے کہ تین دن اور تین رات تک ہم موزوں کو نہ نکالیں، سوائے اس کے کہ جنابت کے غسل کی حاجت ہو، البتہ پیشاب پائخانہ اور نیند کی وجہ سے وضو کرنے کے وقت ان کو نکالا نہیں جائیگا

﴿کوشش ہی علامت ہے محبت کے صحیح ہونے کی﴾

میں نے پوچھا: محبت کے سلسلے میں آپ نے حضور کو کچھ فرماتے ہوئے سنا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! ہم ایک مرتبہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے، اسی دوران ایک دیہاتی نے بلند آواز سے حضور کو پکارا: ﴿یا مُحَمَّدُ﴾ ویسے تو نام لے کر حضور اکرم ﷺ کو پکارنے سے منع کیا گیا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور کے جو آداب بتلائے ان میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ آپ کا نام لے کر نہ پکارا جائے بلکہ آپ کا لقب لے کر پکارا جائے جیسے یا نبی اللہ، یا رسول اللہ وغیرہ، لیکن دیہاتی لوگ ان آداب سے مستثنیٰ تھے، وہ آداب جانتے بھی نہیں تھے اور ان پر کوئی پکڑ دھکڑ بھی نہیں تھی، صحابہ کو البتہ اس کا پابند کیا گیا تھا۔ جب اس

نے آپ کا نام لے کر پکارا تو حضور نے بھی اتنی ہی بلند آواز سے جواب دیا: جی بولو۔ حضرت صفوان جو اس روایت کے راوی ہیں فرماتے ہیں: میں نے اس دیہاتی کو یوں کہا: ہلاکت ہو تیرے لئے! آواز کو ذرا نیچی کر، حضور کے سامنے اتنا زور سے کیوں بولتا ہے؟ حضور کے سامنے بلند آواز سے بولنے سے منع کیا گیا ہے، ﴿لَاتَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُم فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾ اس دیہاتی نے کہا: میں آواز نیچی نہیں کروں گا، مَیں تو زور سے ہی بولوں گا۔ پھر اس دیہاتی نے حضور سے سوال کیا کہ ایک آدمی ہے جس کو ایک جماعت کے ساتھ محبت ہے، نیک لوگوں سے اس کو تعلق اور دل میں ربط ہے لیکن ابھی اپنے اعمال کی وجہ سے ان کے درجے تک نہیں پہنچا، مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف سے کوشش جاری ہے، جن کے ساتھ تعلق و محبت ہے ان کے درجے تک پہنچنے کے لئے وہ کوشش تو کر رہا ہے لیکن ابھی تک وہاں پہنچا نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی طرف سے کوشش ہونا ضروری ہے، صرف محبت کافی نہیں، اور محبت اسی وقت معتبر ہے جب کہ ساتھ میں کوشش بھی ہو، کوشش ہی علامت ہے محبت کے صحیح ہونے کی، ورنہ تو دعویٰ ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: آدمی قیامت کے روز اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کو محبت ہے۔

﴿لمْ اور لمّا کا فرق﴾

(ولمايلحق بهم) عربی میں لفظ (لَمَّا) اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ کسی چیز کی نفی کی جارہی ہو لیکن آئندہ اس کے وجود کی توقع ہو۔ جیسے کسی نے پوچھا کہ زید آیا؟ (أجاء زيد؟) تو عربی میں اگر یوں جواب دیں ﴿لمايجئ﴾ ابھی تک تو نہیں آیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آنے کی امید ہے اور انتظار ہے لیکن آیا نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ

''نہیں آیا'' کہہ دیا جائے۔ اور ایک جملہ ہوتا ہے ابھی تک نہیں آیا۔ دونوں میں فرق ہے یہاں پر بھی ﴿لمایلحق بهم﴾ کہا گیا جس کا معنیٰ یہ ہے کہ ابھی تک ان کے درجہ کو پہنچا تو نہیں ہے لیکن آئندہ امید ہے۔

﴿توبہ کا دروازہ﴾

حضرت زر بن جبیش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ برابر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ہمارے سامنے بیان کرتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ایک دروازے کا تذکرہ کیا کہ جانبِ مغرب میں شام کی طرف ایک دروازہ ہے جس کی چوڑائی اتنی ہے کہ سوار آدمی چالیس یا ستّر سال تک اس کے اندر چلتا رہے؛ تب بھی وہ پورا نہیں ہوگا، اتنا چوڑا دروازہ ہے، جس دن سے اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو پیدا کیا اس دن سے اس دروازہ کو بھی پیدا کیا، اور وہ توبہ کے واسطے کھلا ہوا ہے، وہ دروازہ بند نہیں کیا جائے گا جب تک کہ سورج جانبِ مغرب سے طلوع نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کے لئے کوئی قید نہیں ہے۔ دنیا کے اندر تو ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا سخی ہو اس کے یہاں بھی درخواستوں کو قبول کرنے کے لئے اوقات مقرر ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کے لئے وقت کی کوئی تحدید نہیں، جس وقت بندہ اپنی درخواست لے کر پہنچ جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے؛ وہاں دروازہ چوبیس گھنٹے کھلا ہوا ہے۔

﴿مسئلہ پوچھنے کا ایک ادب﴾

وعن أبی سعیدسعدبن مالک بن سنان الخدری رضی اللہ عنہ أن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: كَانَ فِيمَنْ كَانَ قَبْلُكُمْ رَجُلٌ قَتَلَ تِسْعَةً وَّتِسْعِيْنَ نَفْسًا .. الیٰ آخر الحدیث.

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ان کا نام سعد بن مالک بن سنان ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ تم سے اگلی امتوں میں ایک آدمی تھا جس نے ننانوے آدمیوں کا قتل کیا اب اس کو دل میں خیال آیا کہ میں نے اتنے سارے قتل اور گناہ کئے ہیں، اس کے معاف ہونے کی کوئی تدبیر ہو۔لہٰذا اس نے معلومات حاصل کی کہ اس وقت روئے زمین پر سب سے بڑا عالم کون ہے۔چنانچہ اس کو ایک راہب کا پتہ دیا گیا۔اس نے اس راہب کے پاس آ کر کہا: ایک شخص نے ننانوے قتل کئے ہیں ﴿هل لهٔ من توبة؟﴾ کیا اس کے لئے توبہ کی گنجائش ہے؟ یہاں دیکھئے (هل لی) نہیں پوچھا، بلکہ (هل لهٔ) کہا۔ایسے موقع پر پوچھنے آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایسا کیا ہے، کیا حکم ہے؟ حالاں کہ خود نے ہی کیا ہوتا ہے لیکن خود کا نام لینے کے بجائے اس طرح پوچھتے ہیں، یہی طریقہ ہے اور آداب میں سے ہے۔ان الفاظ سے یہی ادب نکالا گیا ہے کہ یوں کہے کہ ایک آدمی نے ایسا بڑا جرم کیا ہے اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے۔

﴿عالم اور عابد کا فرق﴾

اس راہب نے کہا: اس نے ننانوے آدمیوں کا قتل کیا ہے اس کے لئے توبہ کیسی؟ لہٰذا اس شخص نے اس راہب کو بھی نمٹا دیا اور سو پورے کر دیئے۔اس کے بعد پھر اس کو خیال آیا تو اس نے پوچھا کہ روئے زمین پر کوئی بڑا عالم ہو تو بتاؤ۔لہٰذا اس کی ایک عالم کی طرف رہنمائی کی گئی۔دیکھئے! وہ پہلا صرف عابد تھا، اس نے پوچھا تو عالم کے متعلق تھا لیکن لوگوں نے پتہ دیا تھا راہب کا۔وہ عابد تھا نیک تھا راہب تھا لیکن عالم نہیں تھا۔اس لئے اس نے ایسا جواب دیا اور ایک آدمی کو مایوس کیا تو مایوسی کے اندر اس نے اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ

کیا۔روایت کے الفاظ ہیں کہ (فدل علی عالم)اب اس کو ایک عالم کا پتہ بتلایا گیا۔ چنانچہ وہ ان کے پاس پہنچا اور پوچھا: ایک آدمی نے سو آدمیوں کا قتل کیا ہے، کیا اس کے لئے توبہ ہے؟ عالم نے جواب دیا: جی ہاں! توبہ ہے۔ وہ کون ہے جو اس کے اور توبہ کے درمیان رکاوٹ بن سکتا ہے؟ توبہ تو ہے ہی اس کے لئے۔ سو قتل کئے تو کیا ہوا؟

توبہ کے لئے ایک تدبیر

ایک کام کر کہ فلاں سرزمین کے اندر اللہ کے نیک بندے رہتے ہیں اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں، تو وہاں چلا جا اور ان کے ساتھ تو بھی اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جا اور توبہ کرتا رہ؛ تیری توبہ قبول ہو جائے گی۔ گویا توبہ کے قبول ہونے کے لئے سازگار ماحول بھی ہونا چاہیے، اس لئے کہ توبہ میں اصل یہ بھی ہے کہ آدمی اس گناہ سے باز آ جائے اور اس کے اوپر ندامت بھی ہو کہ میں نے یہ کیا کیا اور آئندہ نہ کرنے کا پختہ عزم ہو، یہ تینوں باتیں توبہ کے اندر ضروری ہیں۔ اور جب تک کہ سازگار ماحول میں نہیں پہنچے گا یہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی، اس لئے کہ ظاہر ہے کہ اگر بُرے لوگوں کے ساتھ اسی ماحول میں پڑا رہا تو وہ گناہ ہی نہیں چھوٹے گا، اس ماحول میں رہتے ہوئے تو اس گناہ میں مبتلا ہو ہی جائے گا، گناہ کو چھوڑنے کے لئے اپنے آپ کو اس گندے ماحول سے نکالنا ضروری ہے۔

جہاں توبہ کے اقسام کی تفصیل بتلائی تھی وہاں بتلایا تھا کہ ایک آدمی نجاست کے گھڑے میں پڑا ہے اور وہ پاک ہونا چاہتا ہے تو گھڑے کے اندر پڑا ہوا ہونے کی حالت میں ساری دنیا کا پانی اس پر بہا دیں گے تب بھی وہ پاک ہونے والا نہیں ہے، اس کو کہا جائے گا کہ پہلے اس نجاست کے گھڑے میں سے باہر نکل، اس کے بعد دو بالٹی پانی بھی اس

پر ڈالیں گے؛ تو وہ پاک ہو جائے گا۔

بہر حال! پہلی شرط تو یہ ہے کہ اس گناہ کے ماحول سے اپنے آپ کو نکالے۔ تو اس کو نیک لوگوں کے پاس اسی وجہ سے بھیجا گیا کہ وہاں جاؤ، جب وہ ان نیک لوگوں کے ماحول میں پہنچے گا تو اس کو اپنے بُرا ہونے کا احساس بھی ہوگا کہ آج تک میں نے کیا کیا؟ جب کوئی آدمی بُرائی کے اندر مبتلا ہوتا ہے اور اس کے بعد نیک ماحول اس کو میسّر آتا ہے تو اس نیک ماحول کو دیکھ کے اپنے پرانے گناہ یاد آتے ہیں اور اس پر ندامت ہوتی ہے کہ دیکھو! یہ اللہ کے بندے تو ہر وقت اطاعت وفرمانبرداری میں مشغول ہیں اور ایک میرا حال تھا کہ میں گناہوں میں مبتلا رہا۔ اسی لئے اس عالم نے اس کو مشورہ دیا کہ فلانی سرزمین میں چلے جاؤ، وہاں اللہ کے نیک بندے اللہ کی عبادت میں مشغول ہیں، تم بھی ان کے ساتھ اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاؤ۔ اور جس سرزمین میں رہتا تھا اور جہاں یہ گناہ کئے تھے وہاں پھر تو جانا ہی مت، وہ بڑی بُری جگہ ہے۔ چنانچہ یہ آدمی وہیں سے چلا اس کے دل میں جذبہ تو تھا ہی، اس لئے گھر واپس نہیں گیا، یہاں تک کہ جب آدھے راستے پر پہنچا، تو اس کو موت آ گئی۔

﴿ندامت کے جذبے کی قدر و قیمت﴾

دیکھو! ابھی تو توبہ کے ارادے سے جا رہا ہے یعنی ایک ندامت کا جذبہ ہے اور اس ارادے سے آگے بڑھ رہا ہے کہ میں اپنے گناہوں سے وہاں جا کر توبہ کروں گا اور موت آ گئی، تب بھی رحمت کے فرشتے اور عذاب کے فرشتے اس کے لئے جھگڑ رہے ہیں عذاب والے فرشتے کہتے ہیں کہ ہم اس کو لے جائیں گے، رحمت والے فرشتے کہتے ہیں

کہ ہم لے جائیں گے، اس لئے کہ یہ تو اللہ کی طرف متوجہ ہوکر توبہ کے ارادے سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور عذاب والے فرشتے کہنے لگے کہ آج تک کبھی اس نے ایک بھی نیک عمل نہیں کیا۔ ان دونوں میں جھگڑا چل رہا تھا کہ انسانی شکل میں ایک فرشتہ ان کے پاس پہنچ گیا۔ ان دونوں نے اس کو اپنا فیصل اور حکم بنا دیا۔ اس نے فیصلہ یہ کیا کہ دونوں زمینوں کا ناپ لو، اس کی موت جہاں آئی ہے وہاں سے لیکر جہاں جارہا تھا۔ یعنی نیک لوگوں کی بستی کی طرف۔ وہاں تک کی زمین کتنی ہے اور جہاں سے وہ چلا ہے۔ یعنی اس کی اپنی بستی۔ وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟ دونوں کو ناپ لو کہ کس زمین سے قریب ہے، جس زمین سے قریب ہو اس کے مطابق تم لوگ لے جانا۔ چنانچہ ناپا گیا تو دیکھا کہ جس بستی کی طرف جارہا تھا اس سے تھوڑا قریب تھا، چنانچہ رحمت کے فرشتوں نے اس کو اپنے ساتھ لے لیا۔

ایک روایت میں ہے کہ وہ نیک لوگوں کی بستی کی طرف صرف ایک بالشت قریب تھا۔ دیکھو! ابھی توبہ نہیں کی تھی بلکہ صرف ارادہ کیا تھا اور اس طرف قدم اُٹھائے تھے، مگر یہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو گیا اور اس کی مغفرت ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ جب کسی کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو......

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ اصل میں تو بالکل بیچ ہی میں موت آئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے گناہ والی بستی کی طرف وحی بھیجی اور اس کو حکم دیا کہ دور ہو جا اور نیک لوگوں والی بستی کی طرف وحی بھیج کر حکم دیا کہ تو قریب ہو جا۔ اب جب ناپا گیا تو نیک لوگوں کی بستی کے قریب نکلا۔ اللہ تعالیٰ جب کسی کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو وہاں سے سارے اسباب مہیّا کئے جاتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگتے رہنا چاہیے۔ یہاں اس

کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے اسباب مہیا کئے گئے۔

گناہوں کی کیا حیثیت ہے؟

بہر حال! آدمی کا محض اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے پر اور توبہ کا ارادہ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ کیا گیا، اب اس کے بعد بھی کوئی آدمی اپنے متعلق یہ سوچے کہ میں تو بڑا گنہ گار ہوں تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ بھائی! تم کتنے بڑے گنہ گار ہو؟ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں کہ تم زمین سے آسمان تک کی فضا کے برابر گناہ لے کر آؤ؛ میں اس سے بڑی رحمت لیکر آؤں گا، اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مقابلے میں بندوں کے گناہوں کی کیا حیثیت ہے؟

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اجل خلفاء میں سے ہیں، کراچی میں رہتے تھے۔ ان سے کسی نے یہی کہا تو جواب میں فرمایا کہ یہاں کی اتنی بڑی آبادی ہے اور یہ سب پیشاب پائخانہ کرتے ہیں اور وہ سارا سمندر بحیرۂ عرب میں جاتا ہے اور یہ بحیرۂ عرب تو دنیا کے سمندروں میں چھوٹا شمار ہوتا ہے، اس سے بڑے بڑے سمندر اوقیانوس وغیرہ دنیا میں موجود ہیں۔ تو فرمایا کہ یہ سب وہاں جاتا ہے اور ایک موج آتی ہے تو وہ سب ناپا کی ختم ہو جاتی ہے۔ ایک کروڑ لوگوں کی ناپا کی کے اس سمندر کے اندر جانے کی وجہ سے کیا سمندر ناپاک ہوگیا؟ اس میں نجاست آ گئی؟ نہیں! بلکہ سمندر کی ایک موج نے اس سب کو پاک اور صاف کر دیا تو انسانوں کے گناہوں کی اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے، آدمی ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر لے۔

﴿شیطانی چال میں نہ آوے﴾

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ شیطان کی جو چالیں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گنہ گار بندہ جب توبہ کا ارادہ کرتا ہے تو اس وقت شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اتنے سارے گناہ تو تو نے گناہ کئے ہیں، کیا منہ لے کے جائے گا؟ تو جواب دو کہ یہی گنہ گار منہ لے کر جاؤں گا اور اپنے گناہوں کو بخشواؤں گا۔ضرورت اسی کی ہے کہ شیطانی چال میں نہ آوے۔اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب آدمی نیکوں کی صحبت اختیار کرے۔ نیک لوگوں کی صحبت کا کم سے کم اور ادنیٰ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں اپنے گناہوں کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد پھر توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور جب توبہ کر لیتا ہے تو پھر اللہ تعالی اس کو بھی نیک لوگوں میں شمار کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم کو توفیق عطا فرماوے

آمین

آہِ سحر گاہی

میں نور کے تڑکے میں جس وقت اٹھا سو کر
اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے پائے
آتی تھی صدا پیہم جو مانگنے والا ہو
ہاتھ اپنے عقیدت سے آگے مرے پھیلائے
جس جس کو گناہوں سے بخشش کی تمنا ہو
وہ اپنے گناہوں کی کثرت سے نہ گھبرائے
وہ مائل توبہ ہو میں مائل بخشش ہوں
میں رحم سے بخشوں گا وہ شرم سے پچھتائے
وہ کشتِ طلب بوئے، میں بارشِ رحمت ہوں
میں دیکھ نہیں سکتا کھیتی کوئی مرجھائے
یہ سن کے ہوئے جاری آنکھوں سے مری آنسو
قسمت ہے محبت میں رونا جسے آجائے
آقائے گدا پرور، سائل ہوں ترے در پر
میں اور تو کیا مانگوں تو ہی مجھے مل جائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد.

جنگ تبوک

توبہ کا بیان چل رہا ہے اور اسی مناسبت سے حضرت کعب بن مالکؓ کی روایت پیش فرمارہے ہیں۔ یہ بڑی لمبی روایت ہے، شاید پوری کتاب میں اتنی لمبی کوئی روایت نہیں ہوگی۔ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر پیش آیا تھا۔غزوۂ تبوک نبی کریم ﷺ کے غزوات میں آخری غزوہ ہے، ۹ سنہ ھ میں رجب کے مہینہ میں پیش آیا، شام سے نبطی جو زیتون کا تیل فروخت کرنے کے لئے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے ان کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ قیصرِ روم ہرقل نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے واسطے ایک فوج روانہ کی ہے اور اس کے متعلق لکھا کہ عرب میں جو نصرانی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے لخم، جذام، قین وغیرہ یہ وہ قبائل ہیں جو جزیرۃ العرب میں شام کی سرحد پر آباد ہیں، تبوک بھی ایک جگہ کا نام ہے، مدینہ منورہ سے دمشق جاتے ہوئے راستہ میں شام کی سرحد کے قریب یہ جگہ آتی ہے، اس زمانہ میں شام قیصر روم کی حکومت میں داخل تھا تو یہاں کے نصرانی عرب نے قیصر کو لکھا تھا کہ ہمارے یہاں جو نبی ظاہر ہوئے تھے ان کا انتقال ہو چکا

ہے اوران کے ماننے والے بڑی کشمکش میں مبتلا ہیں اوران پر حملہ کرنے کا یہ بڑا اچھا موقع ہے۔ان لوگوں کی اسی اطلاع کی بنیاد پر قیصر روم نے اپنا ایک لشکر چالیس ہزار کا ایک قباد نامی سپہ سالار کے ماتحت میں بھیجا اوران میں جوش وخروش پیدا کرنے کے لئے ان کو ایک سال کی پیشگی تنخواہ بھی دے دی۔

نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ قیصر روم نے ایک لشکر روانہ کیا ہے، حالانکہ اگلے ہی سال ۸ ؁ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا تھا اور آج تک قریش کے ساتھ جو مقابلے ہوتے رہے اس سے نبی کریم ﷺ یک گونہ فارغ ہوکر اطمینان کی سانس لے رہے تھے اور ادھر یہ اطلاع ملی۔ بہرحال! آپ ﷺ نے سوچا کہ وہ وہاں سے حملہ کرکے مدینہ منورہ پر آویں اس کے بجائے ہم ہی آگے بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مقابلے کی تیاری کرنے کا حکم دیا کہ ہم دشمن سے مقابلے کے لئے جارہے ہیں، اس لئے سفر کی تیاری کرلو۔

حضور ﷺ کی عادتِ شریفہ تو یہ تھی کہ جب کسی غزوہ میں جانا ہوتا تھا تو جہاں جانا ہوتا تھا اس کا تعین کے ساتھ تذکرہ نہیں کرتے تھے۔توریہ، اشارہ اور کنایہ میں کوئی بات ارشاد فرمادیا کرتے تھے اور تیاری کا حکم دیتے تھے اور جنگی مصلحتوں کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ آج بھی یہی ترکیبیں اختیار کی جاتی ہیں۔لیکن یہ غزوہ ایک ایسا غزوہ تھا کہ ایک بہت بڑے دشمن کے ساتھ مقابلہ تھا، اُس زمانے میں جو دو بڑی اور سوپر پاور طاقتیں سمجھی جاتی تھیں؛ وہ روم اور فارس کی تھی، اس میں سے رومیوں کا معاملہ تھا اوران کی فوجیں بھی بڑی تربیت یافتہ تھیں۔آج تک تو قریش اور قبائل عرب سے مقابلہ رہا، وہ کوئی پروفیشنل

(Professional) لوگ نہیں تھے، اس لائن کی تربیت یافتہ بھی نہیں تھے، لیکن اس کی یہ فوج تو تربیت یافتہ اور اس لائن کی ماہر تھی اور بڑی طاقتور تھی، ان کی تعداد بھی زیادہ تھی اور دور کا سفر تھا اس لئے نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو پہلے سے ہی بتلا دیا تھا کہ وہاں جانا ہے تاکہ اچھی طرح تیاریاں کرلیں۔

مدینہ منورہ کی صورت حال

اب اتفاق کی بات کہ یہاں مدینہ منورہ میں یہ صورتِ حال تھی کہ اگلا سال تو قحط کا گذرا تھا اور یہ گرمی کا زمانہ تھا اور اسی زمانہ میں کھجوریں پکا کرتی ہیں اور یہ حضرات اگلے سال کے قحط کی وجہ سے اس سال کے موسم کے منتظر بھی تھے اور مدینہ والوں کی عادت تھی اور جہاں کہیں بھی باغات ہوتے ہیں وہاں کے باغات والوں کی عادت ہوتی ہے کہ باغات کے پھلنے کا جب زمانہ آتا ہے تو وہ لوگ اپنے گھروں کی رہائش چھوڑ کر باغ کے گھروں میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی آم کے موسم میں باغ والے ایسا ہی کرتے ہیں۔ تو مدینہ والوں کی بھی عادت تھی کہ جب کھجوروں کے پکنے کا زمانہ آتا تھا تو وہ باغوں میں منتقل ہوجاتے تھے، وہاں سایہ بھی بڑا ٹھنڈا ہوتا تھا، پانی بھی ٹھنڈا ملتا تھا اور پھلوں کی بھی حفاظت ہوتی تھی۔ اب لوگ تو ویسے بھی اس وقت کے منتظر تھے اور عین ایسے وقت میں نبی کریم ﷺ نے تیاری کا حکم دیا کہ چلو۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے لئے تیاریاں شروع کردیں۔ بہت سے وہ جو صاحب استطاعت تھے انہوں نے اپنے طور پر تیاریاں کیں اور بہت سے وہ جن کی مالی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ سفر کے لئے تیاری کرسکتے تو ان کے لئے نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ اعلان کیا کہ اللہ کے راستے میں دو گویا چندہ کیا اور

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے برابر بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لیا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سخاوت

اسی زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک قافلہ دوسو اونٹ کا تجارت کی غرض سے بھیجا تھا وہ پورا دوسو اونٹ مع ساز وسامان کے اور ساتھ میں مزید دو ہزار دینار نقد رقم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش فرمائے۔سونے کے سکّے تھے،حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ہاتھ سے اُلٹ پلٹ کر فرمارہے تھے کہ آج کے بعد اگر عثمان کوئی نفل عمل نہ کرے تب بھی ان کے لئے کافی ہے۔ بہر حال ! اس موقع پر بہت سے صحابہ نے- جن کے پاس پیسے نہیں تھے-محنت مزدوری کی اور جو صاع، آدھا صاع کھجوریں مزدوری کے طور پر ملیں؛ وہ لاکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیں۔

منافقین کی پول کھول دی

منافقین کا تو کام، دھندا ہی مخلصین کے اوپر طعن وتشنیع اور اعتراض کرنا تھا۔چنانچہ جنہوں نے بڑی رقمیں پیش کی تھیں ان کے متعلق یہ طعنہ دیا کہ اللہ کے واسطے نہیں بلکہ یہ تو دکھلاوے کے واسطے ہے، تاکہ لوگ یوں کہیں کہ بڑے سخی ہیں۔اور جنہوں نے ایک صاع اور ایک مُد لاکر پیش کیا تھا ان کے متعلق یہ کہنا شروع کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ ان کے ایک مد یا آدھے صاع کا محتاج تھا ﴿الذین یلمزون المطوعین﴾ والی آیت سورۂ توبہ میں اسی غزوہ کے سارے حالات پر نازل ہوئی، جس میں منافقین کی مختلف چیزوں کو بیان کیا گیا ہے

اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اوپر رعب ڈال دیا

بہر حال ! یہ موقع تھا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک قول کے مطابق چالیس ہزار کا لشکر

لے کراور ایک قول کے مطابق ستر ہزار کا لشکر لے کر جس میں دس ہزار گھوڑے سوار تھے، اتنا بڑا لشکر مدینہ منورہ سے رجب کے مہینہ میں روانہ ہوئے اور راستہ لمبا تھا۔ تبوک جاتے ہوئے راستہ میں قومِ ثمود کی آبادیاں مقامِ حجر بھی آتی تھیں وہاں سے بھی گذر ہوا اور تبوک میں پہنچ کر نبی کریم ﷺ نے چند روز قیام کیا اور اس انتظار میں رہے کہ ان کا لشکر آوے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے اوپر رعب ڈال دیا۔ خود نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن خصوصیات سے نوازا گیا تھا اس میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ آپ کا رعب ایک مہینے کی مسافت تک پہنچتا تھا۔

بہر حال! دشمن تو مقابلہ پر آیا نہیں، چند روز وہاں قیام رہا اور اس کے بعد نبی کریم ﷺ رمضان المبارک میں واپس تشریف لائے۔ اسی غزوہ کے موقع پر چونکہ لمبا سفر تھا اس وجہ سے منافقین نے اور بعض دیہات کے رہنے والوں نے شرکت نہیں کی تھی۔ منافقین تو مختلف بہانے نکالتے تھے کہ ہمارے گھروں پر کوئی ہے نہیں، جو گھروں کو سنبھالے، اس لئے ہمیں اجازت دیجیے اور بھی قسم قسم کے بہانے تراش کر شریک نہیں ہوئے۔ اور بعض مخلصین مومنین بھی شریک نہیں ہو سکے، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معذور رکھا گیا۔

وہ تین جو جنگ سے غیر حاضر رہے

لیکن جن کے پاس سواری تھی اور سفر کی صلاحیت تھی اس کے باوجود وہ شریک نہیں ہوئے، ان کی ذرا پکڑ دھکڑ ہوئی، انہیں میں سے تین حضرات: حضرت کعب بن مالک، حضرت مرارہ بن ربیع اور حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہم تھے، انہیں تینوں کا یہ واقعہ ہے، انہیں

میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خود ہی اس روایت کے راوی ہیں اور وہ خود ہی اس واقعہ کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں توبہ والے باب میں اس مناسبت سے لائے ہیں کہ ان حضرات کی توبہ قبول ہوئی تھی۔

سرگذشت بزبانِ خود

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے عبداللہ اپنے والد کی خدمت میں رہتے تھے اور حضرت کعبؓ جب آخری عمر میں نابینا ہو گئے تھے تو ان کو لانے لے جانے کا کام انجام دیتے تھے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو بیان کرتے ہوئے سنا جب وہ غزوۂ تبوک کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پیچھے رہے یعنی شریک نہیں ہوئے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی غزوات فرمائے ان میں سے کسی میں بھی مَیں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے۔ البتہ غزوۂ بدر میں بھی مَیں حاضر نہیں تھا۔

یہاں دو غزووں میں غیر حاضری بتلائی اور دونوں کی غیر حاضری کو الگ الگ انداز سے بیان کیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر کی غیر حاضری قصداً نہیں تھی۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔ اور غزوۂ تبوک کی غیر حاضری قصداً ہوئی تھی اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ دھکڑ بھی ہوئی تھی، دونوں کی غیر حاضریوں میں فرق تھا اس لئے اس کو بیان کرنے کیلئے انداز بھی الگ الگ اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں بھی غیر حاضر رہا لیکن جو لوگ بھی غزوۂ بدر میں غیر حاضر رہے ان کو کوئی سرزنش نہیں کی گئی، اس پر کوئی ڈانٹ نہیں پڑی۔

بدر کی لڑائی

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ غزوۂ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ سے باقاعدہ غزوہ کے

ارادے سے نہیں نکلے تھے بلکہ غزوۂ بدر یوں پیش آیا کہ قریش کا ایک قافلہ ابوسفیان کی سرکردگی میں تجارت کے لئے شام گیا ہوا تھا، وہاں سے واپس لوٹ رہا تھا، جب نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ جزیرۃ العرب کی حدود میں داخل ہوا تو ایک مرتبہ آپ نے صحابہ کے مجمع میں اپنے ارادے کا اظہار فرمایا کہ قریش کا تجارتی قافلہ واپس لوٹ رہا ہے، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو ان پر قابو نصیب فرمائے، چلو! ہم اس کا تعاقب کریں۔ چنانچہ آپ نے جس مجلس میں یہ بات ارشاد فرمائی تھی اس میں جو لوگ موجود تھے وہ تیار ہوگئے، بہت سے لوگوں نے یوں کہا کہ ہم تیاری کر کے آتے ہیں تو حضور نے فرمایا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، جو تیار ہیں وہ ہمارے ساتھ چلیں۔ اسی وجہ سے اس غزوہ میں اونٹوں کی تعداد بھی کم تھی اور تلواریں بھی گنی چنی تھیں، لوگوں کے پاس تیر کمان اور بھالے وغیرہ تھے، ایسے حالات میں تین سو تیرہ کی تعداد روانہ ہوئی تھی اور اصل میں تو قافلہ کا تعاقب کرنے کے لئے گئے تھے لیکن وہاں قافلے والوں کو پتہ چل گیا کہ یہ لوگ مدینہ سے نکلے ہیں تو انہوں نے اپنی احتیاطی تدبیریں شروع کیں۔

ایک کام تو انہوں نے یہ کیا کہ مکہ مکرمہ کہلوا دیا کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے، اگر آپ اپنے سامان کو بچانا چاہتے ہو؛ تو مدد کے لئے آؤ۔ اس لئے کہ اس قافلے میں تجارت کا جو سامان تھا سارے مکہ والوں کی پونجی اس کے اندر لگی ہوئی تھی، مکہ کا کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا کہ جس کی پونجی اس قافلہ میں نہ ہو، اس لئے کہ اس زمانے میں عرب میں مضاربت کے طور پر کام کرنے کا رواج تھا، سب گھروں کا سرمایہ تھا اس لئے سب کو فکر تھی، چنانچہ جب وہاں اطلاع ملی تو ابوجہل نے سارے مکہ میں اعلان کروا دیا اور سب کو جمع کر کے مقابلہ

کرنے کے لئے نکالا، وہ سب مل کر ایک ہزار کا لشکر مکہ سے چلا۔سارا ساز وسامان اور ہتھیار ساتھ تھا اور یہ حضرات تو تین سو تیرہ تھے اور اس میں بھی کوئی تیاری نہیں تھی اس لئے کہ جنگ اور لڑائی ہوگی اس کا ان کو وہم وگمان اور خواب وخیال بھی نہیں تھا۔تجارتی قافلہ کی تعداد پچاس ساٹھ تھی اس لئے ان کے ساتھ مقابلہ ہوگا ایسا خیال نہیں تھا اور اگر ہوگا تب بھی ایسا زوردار ہوگا اس کی توقع نہیں تھی۔

بہر حال! قافلہ کے سردار ابوسفیان تھے انہوں نے احتیاطی تدبیر کرتے ہوئے راستہ بدل دیا۔ادھر نبی کریم ﷺ روانہ ہوکر بدر کے قریب پہنچے۔اور حالات نے ایسا رُخ اختیار کیا کہ قافلہ تو بچ بچا کر نکل گیا اور جو لشکر مکہ مکرمہ سے آیا تھا اس سے مقابلے کی نوبت آ گئی، گویا یہ سب اچانک ہوگیا اسی لئے بہت سے حضرات صحابہ کی خواہش یہ تھی کہ مقابلہ نہ ہو۔قرآنِ پاک میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے ﴿وَتَوَدُّوْنَ أَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللهُ أَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ﴾ کہ بہت سے لوگ یہ چاہتے تھے کہ جس میں کوئی تکلیف نہ ہو؛ ایسا معاملہ ہو یعنی قافلہ پر قابو پانے کی نوبت آئے لیکن اللہ تعالیٰ حق و باطل میں مقابلہ کروا کر حق کو غالب کرنا چاہتے تھے؛ اس لئے ان کے نہ چاہنے کے باوجود مقابلے کی نوبت آئی۔

﴿حضرت کعب رضی اللہ عنہ اور بیعتِ عقبہ﴾

پھر حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: کہ اس سے پہلے عقبہ والی رات میں مَیں حاضر تھا۔عقبہ والی رات سے مراد وہ واقعہ ہے کہ جب نبی کریم ﷺ ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف نہیں لے گئے تھے، اس زمانہ میں حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ حج کے

موقع پر جب مختلف قبائل کے لوگ حج کے لئے آتے تھے تو عرفات اور منیٰ میں آپ ﷺ ان کے اندر گھوم گھوم کر اسلام کی دعوت ان کے سامنے پیش کرتے تھے اور چونکہ مکہ والے آپ کی دعوت کو قبول نہیں کررہے تھے اور آپ کے کام میں رکاوٹیں ڈالتے تھے اس لئے آپ ﷺ یہ بھی فرماتے تھے: کون ہے جو میرے اس کام میں میری مدد کرے گا اور مجھے اپنے یہاں لے جائے گا؛ تاکہ مَیں اطمینان کے ساتھ وہاں اپنا کام کرسکوں۔

بہرحال! ہوا ایسا کہ نبوت کے گیارہویں سال نبی کریم ﷺ کی ملاقات مدینہ منورہ سے آنے والے حجاج سے ہوئی اور ان کے سامنے آپ نے دعوت پیش کی، انہوں نے کہا: اگلے سال ہم آئیں گے۔ دوسرے سال وہ پھر آئے، ان کی ایک جماعت نے اسلام قبول کیا اور نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر - جمرۂ عقبہ جہاں ہے اسی جگہ پر - بیعت ہوئے اسی لئے اس بیعت کو بیعت العقبہ کہتے ہیں۔ ان حضرات کے ساتھ گفتگو ہوئی، انہوں نے کہا: اگلے سال ہم بڑی تعداد میں آئیں گے، چنانچہ دوسرے سال پھر بڑی تعداد میں ستّر [۷۰] آدمی آئے اور سب نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی، آپ نے ان سے کہا: کہ اگر تم لوگ مجھے اپنے یہاں لے جاؤ تو میں وہاں لوگوں کو اسلام کی دعوت اطمینان سے پیش کرسکوں، اس لئے کہ مکہ والے تو میرا ساتھ نہیں دیتے۔ چنانچہ ان لوگوں نے درخواست کی کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لایئے اور ہم آپ کا ساتھ دیں گے، اگر کوئی دشمن آپ پر حملہ کرے گا تو ہم آپ کی طرف سے دفاع کریں گے، مگر یہ ساری شرطیں جو ہوئی تھیں وہ مدینہ میں رہتے ہوئے کرنے کی ہوئی تھی، باہر نکلنے کی بات نہیں ہوئی تھی۔

چنانچہ اس موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو آپ ﷺ کے چچا تھے وہ بھی آئے اور

انہوں نے مدینہ منورہ سے آئے ہوئے ان لوگوں کو متنبہ کیا کہ دیکھو! تم کس کو اپنے ساتھ لے جارہے ہو؟ ان کو اپنے ساتھ لے جا کر پورے عرب کو تم اپنا دشمن بنا رہے ہو، ذرا سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔ انہوں نے کہا: ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔

بہر حال! ان حضرات نے حضور اکرم ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی اور یہ سب باتیں طے بھی ہوئیں اور پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی مدینہ منورہ ہجرت کی اجازت ملی اور مسلمان ہجرت کر کے جانے لگے۔ گویا یہ سارا جو کچھ ہوا اور مدینہ میں اسلام پھیلا اور یہاں آکر اسلام میں جو قوت آئی اور آگے فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا؛ یوں کہا جاسکتا ہے کہ ان سب کی بنیاد اور جڑ، اس کا فاؤنڈیشن (Foundation) بیعتِ عقبہ تھی اسی لئے انصار میں سے جو لوگ اس بیعت میں شریک ہوئے تھے، یہ چیز ان کے لئے بہت خصوصیت اور اعزاز کی سمجھی جاتی تھی اور فخر کی چیز شمار کی جاتی تھی اور ان کے لئے یہ کہا جاتا تھا کہ یہ بیعتِ عقبہ والوں میں سے ہیں۔

اسی کو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیعت العقبہ میں بھی حاضر رہا تھا۔ جبکہ ہم نے آپ کے دستِ مبارک پر اسلام کے معاملہ میں عہد و پیمان کیا۔ اب وہ بیعتِ عقبہ کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ کہتے ہیں کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ اس کے بدلے میں مجھے بدر کی حاضری نصیب ہوئی ہوتی۔ گویا ان کی نگاہوں میں لیلۃ العقبہ والے واقعہ کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ بدر کو بھی وہ اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ حالانکہ نصوص کی اعتبار سے دیکھا جائے تو بدر کی فضیلت اس سے بڑھ کر ہے، وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ غزوۂ بدر لوگوں میں زیادہ مشہور ہے۔ خیر! فرماتے ہیں کہ اللہ نے مجھے اس کی بھی توفیق دی تھی۔

﴿تبوک کی لڑائی اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ﴾

اور فرماتے ہیں کہ جب غزوۂ تبوک میں مَیں غیر حاضر رہا تو اُس وقت کا میرا قصہ یہ ہوا کہ اس پہلے کبھی میں اس سے زیادہ مالی اعتبار سے مضبوط اور خوش حال نہیں تھا؛ جتنا غزوۂ تبوک کے موقعہ پر تھا۔ اس سے پہلے کسی غزوے میں میرے پاس سواری کے لئے دو اونٹنیاں جمع نہیں ہوئی تھیں ؛ اس غزوہ میں سواری کے قابل دو اونٹنیاں موجود تھیں گویا ایسی فراغت و وسعت اور ایسی خوش حالی کسی اور وقت مجھے نصیب نہیں ہوئی تھی، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی غزوے کا ارادہ کرتے تھے تو بطورِ توریہ و اشارہ کے ارشاد فرماتے تھے (جیسا کہ میں بتلا چکا ہوں) البتہ اس غزوہ میں آپ نے صاف صاف بتلا دیا تھا کہ فلاں جگہ جانا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ غزوہ سخت گرمی کے زمانے میں کیا اور لمبا سفر تھا، بڑے بڑے چٹیل میدان اور صحرا راستے میں پڑتے تھے اور آپ کو دشمن کی بڑی تعداد درپیش تھی، اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بات کو چھپانے کے بجائے بالکل کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا تھا؛ تاکہ وہ اس کے مناسب تیاری کرلیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو واضح طور پر بتلا دیا کہ تبوک جانا ہے اور قیصرِ روم کا مقابلہ کرنا ہے۔ اور اس غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اس لئے کہ آج تک جتنے غزوات ہوئے اس میں آخری فتح مکہ ہوا تھا اور اس موقعہ پر آپ کے ساتھ گیارہ یا بارہ ہزار صحابہ تھے اور اس غزوۂ تبوک کے موقعہ پر ایک قول کے مطابق کم سے کم تعداد چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) کی اور زیادہ سے زیادہ ستر ہزار (۷۰۰۰۰) کی آتی ہے، اور کوئی رجسٹر بھی نہیں تھا کہ جس میں باقاعدہ سب کے نام درج کئے جاتے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جس زمانے میں یہ روایت بیان کر رہے ہیں وہ تو بہت بعد کا زمانہ ہے، حضرت عمر نے اپنے دورِ خلافت میں حکومت کے ضوابط مقرر کئے تھے، اس سے پہلے رجسٹر وغیرہ کوئی چیز نہیں ہوتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب حضرت کعب یہ واقعہ بیان کر رہے ہیں اس وقت تو رجسٹروں کا رواج ہو چکا تھا، اسی لئے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں کوئی رجسٹر نہیں ہوتا تھا کہ ہر جانے والے کا نام اس میں درج کیا جاتا؛ تاکہ پتہ چلے کہ کون جا رہا ہے اور کون نہیں، اس لئے اگر کوئی غیر حاضر رہنا چاہتا تو اس کو یہ خیال ہوتا کہ میری غیر حاضری کا پتہ نہیں چلے گا۔ اِلّا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آ جائے اور حضور کو بذریعہ وحی بتلا دیا جائے کہ فلاں غیر حاضر ہے تو بات دوسری ہے، ورنہ تو اتنی بڑی تعداد تھی اور رجسٹر کا رواج نہیں تھا اس لئے کوئی غیر حاضر رہنا چاہے تو کسی کو پتہ نہ چلے۔

کہتے ہیں کہ یہ غزوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے زمانے میں کیا جب کہ پھل پکے تھے اور سائے بھی اچھے ہو رہے تھے، اور میری طبیعت کا رجحان ادھر زیادہ ہو گیا کہ باغات میں رہنے کا زمانہ آیا اور یہ سفر ہو رہا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام مسلمانوں نے سفر کی تیاری کی، مَیں بھی روزانہ صبح کو سوچتا تھا کہ تیاری کر لوں اور شام ہوتی تھی اور کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تھا۔ یعنی آج کل کرتا رہتا تھا اور مَیں اپنے جی میں یوں سوچتا تھا کہ جب بھی ارادہ ہو جائے گا؛ تیار ہو جاؤں گا، سارا سامان موجود ہے، دیر کیا لگتی ہے۔

جس کے پاس سامان موجود ہوتا ہے وہ بڑا بے فکر ہوتا ہے اور جس کے پاس نہیں ہوتا وہ جلدی سے فکر کرتا ہے۔

چنانچہ اسی طرح تاخیر ہوتی رہی یہاں تک کہ باقاعدہ جانے کا وقت آ گیا یعنی

اب تک تو باتیں ہورہی تھیں اب تو روانگی کا وقت آ گیا۔ چنانچہ آپ ﷺ روانہ ہونے لگے اور ساتھ میں مسلمان بھی روانہ ہوئے اور سامان کے سلسلے میں مَیں کوئی فیصلہ نہیں کر پایا یعنی تیاری نہیں کر پایا۔ پھر صبح ہوئی اور واپس گھر آیا اور کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔ اور اس زمانے میں سفر تیز نہیں ہوتا تھا اور پھر بڑا مجمع ہو تو اور دھیرے دھیرے جاتا ہے تو میں اپنے جی میں یوں سوچتا تھا کہ کل تیار ہو کر سواری پر نکلوں گا اور تیزی سے جا کر قافلے سے مل لوں گا۔

فرماتے ہیں کہ اسی طرح برابر تاخیر ہوتی رہی یہاں تک کہ وہ لوگ آگے نکل گئے اور غزوہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا یعنی اس میں حاضری نہیں ہوئی۔ بعد میں مجھے خیال آیا کہ مَیں نکلوں اور کسی بھی طرح جا کر ان کو پالوں، کاش کہ مَیں ایسا کرتا، لیکن یہ چیز میرے لئے تقدیر میں نہیں لکھی تھی۔

کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد جب مَیں مدینہ منورہ میں باہر نکلتا تھا تو یہ بات مجھے بڑی غمگین کرتی تھی کہ مَیں اپنے لئے کوئی نمونہ نہیں دیکھتا تھا یعنی میرے جیسا کوئی نظر نہیں آتا تھا کہ جس کو دیکھ کر اطمینان ہو کہ یہ بھی نہیں گیا اور میں بھی نہیں گیا؛ چلو! برابر ہے۔ فارسی میں کہاوت ہے: ''مرگِ انبوہ جشنے دارد'' کہ جماعتی شکل میں موت ہو تو وہ بھی ایک جشن کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ناگوار چیز جب کئی لوگوں کو پیش آتی ہے تو آدمی کے لئے اس کا برداشت کرنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

حضرت کعب فرماتے ہیں: مجھے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا کہ جس کو دیکھ کر میرے دل کو یوں ہو کہ یہ بھی نہیں گیا ہے، میں بھی نہیں گیا؛ چلو! کوئی حرج نہیں۔ ایسا کوئی نمونہ نہیں دیکھتا تھا سوائے اس کے کہ جن پر نفاق کی تہمت ہوتی تھی یا ایسا آدمی جس کو

اللہ تعالیٰ نے ضعف کی وجہ سے معذور قرار دیا ہو، دو ہی قسم کے لوگ مجھے نظر آتے تھے، ایک تو وہ جن کے اندر سفر میں جانے کی طاقت نہیں تھی یا ایسے جن کے متعلق سب جانتے تھے کہ یہ منافقین میں سے ہیں۔ چھپائیلا کاٹلا (છુપાયેલા કાટલા) ہے۔

فرماتے ہیں کہ پورے راستے میں نبی کریم ﷺ نے مجھے یاد نہیں فرمایا، یہاں تک کہ تبوک پہنچ گئے۔ اب تبوک میں تو کئی روز قیام رہا، بیس پچیس دن آپ تبوک میں ٹھہرے تھے، وہاں کوئی کام تو تھا نہیں، صرف اس کا انتظار تھا کہ دشمن آوے تو مقابلہ کریں گے، جب اور کوئی کام تھا نہیں؛ تو صبح سے شام کیا ہوتا؟ حضور ﷺ کی مجلس ہوا کرتی تھی۔ ایک مرتبہ مجلس لگی ہوتی تھی تو حضور نے فرمایا: کعب بن مالک کا کیا ہے، وہ نظر نہیں آتے؟ حضرت کعب رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلہ بنوسلمہ سے تعلق رکھتے ہیں تو انہیں کے قبیلہ کے ایک آدمی نے حضور کا یہ ارشاد سن کر کہا: یا رسول اللہ! اس کو اپنی چادروں کی خوبی نے روک لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تو اپنی خود پسندی میں ایسا مست ہے کہ اس کو یہاں آنے کی فرصت کہاں؟ وہ تو ٹھاٹ سے گھومتا پھرتا ہے، اس لئے وہ آ نہیں سکا۔ گویا اس آدمی نے ان کی کمزوری بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی، تو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فوراً اس آدمی کو ٹوکا کہ تو نے غلط بات کہی، یا رسول اللہ! ہم تو کعب بن مالک کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ اگر کسی مجلس میں کسی مومن کا تذکرہ برائی کے ساتھ ہو تو دوسروں کو چاہیے کہ اس طرف سے ڈفینس (Difence) اور دفاع کریں۔

مجلس میں کسی مومن کی برائی کی جائے تو کیا کرے؟

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: کسی مجلس میں مومن کا

برائی کے ساتھ تذکرہ ہو؛ تو دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ اس کا دفاع کریں، اگر طاقت ہوتے ہوئے بھی وہ دفاع نہیں کریں گے تو کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شاملِ حال نہیں ہوگی۔ گویا ایمانی رشتہ کا یہ تقاضہ ہے، لیکن آج کل یہ بات نہیں رہی۔ آج تو یہ مزاج بنتا جارہا ہے کہ اگر کوئی کسی کی برائی کرتا ہے تو ہمیں بھی بڑی اچھی لگتی ہے، ذرا اور ہوا دیتے ہیں اور اگر اس نے دو باتیں کہی ہوں تو چار اور اس کے منہ سے نکلواتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے۔

﴿تم تو اور کھولو گے﴾

حضرت عیسی علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنے حواریوں سے کہا: تمہارا بھائی سو رہا ہو اور ہوا کی وجہ سے اس کا کپڑا ہٹ جائے اور ستر کھل جائے؛ تو تم کیا کروگے؟ حواریوں نے کہا: ہم اس کو ڈھانپ دیں گے۔ حضرت عیسی علیہ السلام نے فرمایا: نہیں! تم تو اور کھولو گے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ فرمایا: تم ایسا کرتے ہو، تمہارے کسی بھائی کی کوئی چیز تمہارے کانوں میں پڑتی ہے تو اس کو چھپانے کے بجائے اور ہوا دے کر لوگوں میں پھیلاتے ہو کہ اس نے ایسا کیا، یہ اس کو ننگا کرنا نہیں ہوا تو اور کیا ہوا؟ ہمارا مزاج بھی ایسا ہی بن گیا ہے، ہم کو اس کے بغیر چین نہیں پڑتا، ہم کو وہی اچھا لگتا ہے۔ کسی کی بات ڈھکی چھپی رہے؛ اس کو ہم پسند نہیں کرتے۔

خیر! حضرت کعب فرماتے ہیں کہ اس مجلس میں حضرت معاذ بن جبل بھی تھے جو اسی بنوسلمہ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں انہوں نے فوراً اُس آدمی کو ٹوکا۔ خیر! یہ تو تذکرہ ہو گیا۔ یعنی گویا یہ یوں سمجھتے تھے کہ میں چھپا رہوں گا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ حضور کے سامنے آ گیا کہ

وہ آئے نہیں ہیں۔ خیر! حضور تو خاموش ہو گئے اور کچھ بولے نہیں۔

جنگ تبوک اور حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ

کہتے ہیں: حضور ﷺ وہاں تبوک میں قیام پذیر تھے کہ دور سے سفید لباس میں ایک آدمی کو آتا ہوا دیکھا جن کے آنے کی وجہ سے سراب ہٹ رہی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ چٹیل میدان یا ریتیلی جگہ ہوتی ہے اور تیز دھوپ پڑ رہی ہوتی ہے تو دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پانی بہہ رہا ہے اور اسی جگہ سے اگر کوئی آ رہا ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا اس پانی کو کاٹتے ہوئے آ رہا ہے؛ اسی کو سراب کہتے ہیں۔ تو دور سے ایک آدمی کو آتا ہوا جب دیکھا تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿كن أباخيثمة﴾ ابوخیثمہ ہو جاؤ۔

حضرت ابوخیثمہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں جو غزوہ میں نہیں آئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں غزوہ میں شریک نہیں ہوا تھا، ایک روز ایسا ہوا کہ میں اپنے باغ میں تھا اور پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا تھا، بیوی نے میرے سامنے کھانا رکھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں تھی کہ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ تو انصاف کی بات نہیں ہے کہ مَیں یہاں ٹھنڈی چھاؤں کے اندر اس طرح آرام سے بیٹھوں اور اللہ کے رسول ﷺ دھوپ کی تیزی میں اللہ کے راستے میں سفر کر رہے ہیں، بس! مَیں اسی وقت اُٹھا، سواری کا اونٹ لیا اور سوار ہو کر وہاں پہنچ گیا، یہ اکیلے پہنچے تھے۔ انھیں کو دیکھ کر حضور نے فرمایا: ﴿كن أباخيثمة﴾ ابوخیثمہ ہو جاؤ یعنی ابو خیثمہ معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ وہ ابوخیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ ہی تھے۔ یہ وہی صحابی تھے جنہوں نے ایک صاع کھجور چندہ میں دی تھی اور منافقین نے طعن و تشنیع کی تھی کہ کیا اللہ تعالیٰ ان کے ایک صاع کے محتاج ہیں۔

خیر! اب غزوہ تو ہوا نہیں اس لئے کہ دشمن نہیں آیا، پچیس روز قیام کے بعد حضور وہاں سے واپس لوٹے۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: جب مجھے اطلاع ملی کہ نبی کریم ﷺ تبوک سے واپس لوٹنے لگے ہیں تو مجھے میرا غم لاحق ہوا یعنی فکر ہوئی کہ آپ مدینہ تشریف لائیں گے تو مَیں کیا منہ دکھاؤں گا اور کیا جواب دوں گا؟ کہتے ہیں: میں اپنے جی میں جھوٹے بہانے سوچنے لگا کہ ایسا کون سا بہانہ ہوسکتا ہے کہ جس کی وجہ سے میں حضور ﷺ کی ناراضگی سے اپنے آپ کو بچاؤں اور اس معاملہ میں اپنے خاندان کے ہر ذی رائے سے مشورہ اور مدد بھی چاہنے لگا کہ بھائی! بتاؤ! میرا مسئلہ حل کرو۔

اور جب مجھے یہ بتایا گیا کہ بس! نبی کریم ﷺ آیا ہی چاہتے ہیں تو سارے غلط خیالات جو میرے دل ودماغ میں گھوم رہے تھے؛ وہ سب نکل گئے، یہاں تک کہ مجھے اپنے دل میں اس بات کا یقین ہوگیا کہ میں حضور کی ناراضگی سے کسی چیز سے بھی بچ نہیں سکتا اور نجات نہیں پا سکتا، اس لئے مَیں نے دل میں طے کرلیا کہ جو سچ سچ ہے وہی بتانا ہے، کوئی جھوٹا بہانہ نہیں کرنا ہے۔

﴿تبوک سے حضور ﷺ کی واپسی﴾

چنانچہ دوسرے روز صبح کو نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لے آئے اور حضور کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کسی سفر سے لوٹتے تھے تو عام طور پر طلوعِ شمس کے بعد چاشت کے وقت تشریف لاتے تھے اور سیدھے مسجد تشریف لے جاتے تھے وہاں دو رکعت نماز ادا فرماتے تھے اور اس کے بعد وہاں پر ہی بیٹھتے تھے تاکہ ملاقات کرنے والے ملاقات کرلیں، چنانچہ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ منافقین میں سے جو لوگ یہاں رہ گئے تھے وہ

آنے لگے اور اپنے اعذار آپ ﷺ کے سامنے پیش کرتے تھے کہ اے اللہ کے رسول! ایسا ہوا، ویسا ہوا؛ اس لئے میں تو نہیں آسکا اور قسمیں کھا کر اپنے عذر بیان کرتے، چنانچہ حضور کی عادتِ شریفہ بھی یہی تھی کہ جو کوئی جو بات کہتا آپ اندر کی کھود کرید نہیں فرماتے۔ وہ جو کہتا آپ مان لیتے۔ چنانچہ انہوں نے جو عذر پیش کئے حضور نے مان لئے کہ ٹھیک ہے اور بیعت کی تجدید بھی کر لی اور ان کے لئے دعائے مغفرت بھی فرمائی اور اندرونی معاملے کو اللہ کے سپرد کیا، ظاہر کو قبول کر لیا، دعا بھی فرمائی اور ہر ایک کو اس طرح رخصت فرمانے لگے، اور ایسے منافقین کی تعداد اسّی [۸۰] سے کچھ زیادہ تھی۔

﴿ناراضگی کی مسکراہٹ﴾

یہاں تک کہ مَیں آیا جب میں نے حضور اکرم ﷺ کو سلام کیا تو ایک ناراض آدمی جیسا مسکراتا ہے؛ آپ ایسے مسکرائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناراضگی کی مسکراہٹ بھی ہوتی ہے، وہ تو جس کے سامنے ہوتی ہے؛ وہ جان لیتا ہے کہ یہ کیسی ہے؟ کسی کو زبان سے بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی، وہ خود سمجھ لیتا ہے۔

﴿معاملہ تو آپ کا ہے﴾

(**ثم قال: تعال**) جب مَیں نے سلام کیا تو آپ نے فرمایا کہ ادھر آؤ، چنانچہ میں آگے بڑھا یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضور نے پوچھا: کیوں بھائی! کیوں نہیں آئے؟ کونسی چیز نے تمہیں غیر حاضر رکھا؟ کیا تم نے سواری کا جانور نہیں خریدا تھا؟ حضرت کعبؓ کہتے ہیں: یارسول اللہ! اللہ کی قسم! اگر آپ کے علاوہ دنیاداروں میں سے کسی کے سامنے بیٹھا ہوتا؛ تو مَیں اپنے آپ کو ایسا پاتا کہ کوئی نہ کوئی عذر بیان کر کے اس کی

ناراضگی سے اپنے آپ کو بچا لیتا، اور چونکہ شاعر تھے اس لئے فرماتے ہیں کہ مجھے چرب زبانی دی گئی ہے، اس لئے اگر کوئی دنیادار بادشاہ ہوتا تو مجھے کوئی فکر نہیں تھی، مَیں کوئی بھی بہانہ بنا کر اس کی ناراضگی سے بچ سکتا تھا۔ لیکن اللہ کی قسم! اے اللہ کے رسول! مجھے معلوم ہے کہ اگر آج آپ کے سامنے میں کوئی جھوٹ بات پیش کروں جس کو سن کر آپ مجھ سے راضی ہو جائیں؛ تو قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ میری حقیقت آپ کے سامنے ظاہر کر کے آپ کو مجھ سے ناراض کر دے۔ معاملہ تو آپ کا ہے، اللہ کے رسول کا ہے۔

دیکھئے! یہاں حضرت کعبؓ نے یوں نہیں فرمایا کہ میں جھوٹ بولوں گا تو آپ کو پتہ چل جائے گا بلکہ یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آگاہ فرما دیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ غیب نہیں جانتے تھے۔

﴿کوئی بہانہ نہیں ہے﴾

اور اگر آج میں آپ کے سامنے سچی بات بیان کر دوں جس کو سن کر آپ مجھ سے ناراض ہو جائیں گے، مجھے اس میں اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید ہے۔ بس! آپ سن لیجیے ﴿واللہ! مالی من عذر﴾ اللہ کی قسم! میرا کوئی عذر نہیں تھا، اب کی مرتبہ جو میں غیر حاضر رہا اس سے پہلے میں کبھی اتنا خوش حال اور میری مالی پوزیشن اتنی مضبوط نہیں تھی یعنی میرے پاس سفر کے سارے اسباب موجود تھے، اس کے باوجود مَیں نہیں آیا، کوئی بہانہ نہیں ہے سیدھی بات ہے۔

﴿قال رسول اللہ ﷺ: أما هذا فقد صدق﴾ حضور ﷺ نے فرمایا: بھئی! اس نے تو سچی بات بیان کر دی، لہٰذا تم اٹھو، یہاں تک کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف

سے کوئی حکم آوے۔ دیکھو ﴿أما هذا فقد صدق﴾ کہہ کر حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ پہلے جو لوگ بہانے پیش کر کے گئے تھے وہ حضور کو پسند نہیں آئے تھے۔

﴿لوگوں نے بہت اُکسایا﴾

فرماتے ہیں: مَیں حضور کی مجلس سے اُٹھا اور مسجد سے جب باہر نکلا تو خاندان بنوسلمہ کے کچھ لوگ بھی میرے ساتھ ساتھ باہر چلے اور میرے پیچھے آئے۔ ایسے موقعہ پر لوگ اپنے طور پر بھی بہت باتیں کرتے ہیں۔ انہوں نے جو اپنا حال سچ سچ بیان کر دیا تھا اس پر ان لوگوں نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا: اللہ کی قسم! ہمیں معلوم نہیں کہ اس سے پہلے تم نے کوئی جرم کیا ہو یعنی تمہاری زندگی میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ باوجود استطاعت کے اور حضور کی طرف سے غزوہ میں چلنے کی تاکید کے تم نہیں گئے، ٹھیک ہے؛ تمہاری طرف سے یہ قصور ہوا لیکن زندگی میں پہلی مرتبہ ہے، پھر جس طرح دوسرے لوگوں نے اعذار بیان کر دیئے تم بھی بیان کر دیتے، پھر تم اس بات سے کیوں قاصر رہے؟ اب رہا سوال یہ ہے کہ بہانہ بتلاتے تو وہ جھوٹ ہو جاتا تو اس کا تدارک یہ ہوتا کہ حضور نے ان لوگوں کے لئے دعائے مغفرت بھی تو کی تھی، تمہارے لئے بھی دعائے مغفرت فرما دیتے، تو تمہارا گناہ معاف ہونے کے لئے کافی ہو جاتی۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: وہ لوگ مجھے برابر اس پر ٹوکتے رہے، اور تنبیہ کرتے رہے یہاں تک کہ میرے جی میں خیال آیا کہ مَیں واپس جاؤں اور حضور کے سامنے اپنے آپ کو پہلی باتوں میں جھوٹا بتلاؤں یعنی ان لوگوں نے مجھے اتنا گرم کیا کہ دل میں ایسا خیال آنے لگا، لیکن پھر میں نے ان لوگوں سے پوچھا: میرے جیسا معاملہ کسی اور

کے ساتھ بھی پیش آیا ہے؟ ان لوگوں نے کہا: جی ہاں! دو آدمی ایسے ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے اسی طرح صحیح بات کہی، کوئی بہانہ نہیں بنایا بلکہ جو حقیقت تھی وہ پیش کر دی اور ان کو بھی جواب میں وہی بات کہی گئی جو آپ کو کہی گئی۔ مَیں نے پوچھا: وہ دو کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: مرارہ بن ربیع اور ہلال بن امیہ۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے قبیلے والوں نے جن دو حضرات کے نام لئے، وہ نیک آدمی تھے اور ایسے تھے کہ جو غزوۂ بدر میں شریک ہو چکے تھے، حالانکہ غزوۂ بدر میں شریک ہونے والوں کے لئے مخصوص فضائل بیان کئے گئے ہیں، وہ دونوں ان سارے فضائل کے حامل تھے۔ گویا ان دونوں کی شخصیتوں میں میرے لئے نمونہ موجود تھا کہ میرے جیسے وہ بھی ہیں، کوئی فکر کی بات نہیں ہے، جو حال اُن کا ہوگا؛ وہی میرا ہوگا، چنانچہ میں اپنی بات پر قائم رہا۔

تینوں سے بائیکاٹ کا حکم نبوی ﷺ

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ہم تینوں کے ساتھ خاص طور پر بات چیت کرنے سے لوگوں کو منع کر دیا، گرچہ غیر حاضر رہنے والے تو اور بھی بہت سارے لوگ تھے، لیکن ہم تینوں کے ساتھ لوگوں کو بات کرنے سے منع فرما دیا، گویا ہمارا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں: کہ حضور ﷺ کے اس حکم کے نتیجے میں لوگ ہم سے دور رہنے لگے اور ان کا سلوک ہمارے ساتھ بالکل بدل گیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ سر زمین ہی نہیں ہے جس میں ہم رہتے تھے، بلکہ دوسری بستی ہے۔ یہ حال اور کیفیت پچاس رات دن رہی۔ میرے وہ دونوں ساتھی تو تھک ہار کر گھروں میں بیٹھ گئے اور روتے رہے۔ ویسے بھی عمر کے اعتبار سے وہ میرے جیسے مضبوط نہیں تھے اور مَیں تو نوجوان آدمی تھا اور بڑا قوی و توانا تھا، مجھ سے

گھر میں بیٹھا نہیں جاتا تھا، میں تو روزانہ گھر سے نکلتا تھا، نماز کے وقت مسجد میں آتا تھا، لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتا تھا، بازاروں میں گھومتا تھا، لیکن کوئی بھی مجھ سے بات نہیں کرتا تھا اور نماز کے بعد جب نبی کریم ﷺ اپنی مجلس میں تشریف فرما ہوتے تو آپ کے پاس حاضر ہو کر سلام بھی کرتا تھا اور اپنے جی میں سوچتا تھا کہ میرے سلام کے جواب میں حضور اکرم ﷺ نے ہونٹ مبارک ہلائے یا نہیں، گویا حیا و شرم کے مارے اتنی جرأت و ہمت نہیں ہوتی تھی کہ حضور کے ہونٹ مبارک کو ہلتا ہوا دیکھیں۔ اور پھر میں حضور کے قریب ہی نفل نماز کی نیت باندھتا تھا اور نماز کے دوران نظریں چرا کر حضور کو دیکھ بھی لیا کرتا تھا، مَیں جب نماز میں مشغول ہوتا تھا تو نبی کریم ﷺ مجھے دیکھتے تھے اور جب نماز سے فارغ ہو کر حضور کی طرف متوجہ ہوتا تھا؛ تو آپ منہ پھیر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی بے رُخی بہت طویل ہوگئی۔

حضراتِ صحابہ کا حضور ﷺ کے حکم پر عمل کا جذبہ

پھر ایک دن میں چلا یہاں تک کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کے باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور جا کر اُن کو سلام کیا۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان کے چچازاد بھائی بھی تھے اور بہت محبوب دوست بھی تھے۔ یہاں دیکھئے! کہ ان حضراتِ صحابہ کا حضور ﷺ کے حکم پر عمل کا جذبہ کیسا تھا۔ آج کل اگر دنیا کا بڑے سے بڑا حکمران کوئی حکم دے تو کسی ایسی جگہ جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو؛ وہاں تو بات کر ہی لیں گے۔ لیکن وہ کہتے ہیں: میں دیوار پھلانگ کر اندر گیا اور سلام کیا تو اللہ کی قسم! انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا، حالانکہ وہاں اور کوئی نہیں تھا، ہم دو ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی دیکھنے والا نہیں تھا یعنی اگر صرف

دکھلاوے کے خاطر ہی حضور اکرم ﷺ کے حکم اور بات پر عمل کرنا ہوتا؛ تو یہاں تو کوئی بھی دیکھنے والا نہیں تھا، وہ بات کر لیتے، لیکن ایسا نہیں کیا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صحابہ کا معاملہ حضور ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کے سلسلے میں کیسا تھا۔ حضرت کعب کہتے ہیں کہ جب انہوں نے میرے سلام کا جواب نہیں دیا تو میں نے ان سے کہا کہ اے ابوقتادہ! میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ تمہیں معلوم ہے نا کہ میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں؟ اس کا بھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، اس پر بھی خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ اُن کو قسم دی، اس پر بھی وہ خاموش رہے۔ پھر تیسری مرتبہ میں نے قسم دے کر ان کو پوچھا تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا: ﴿اللہ و رسولهٗ أعلم﴾ یہ کوئی جواب نہیں ہے بلکہ یہ بار بار قسم دے کر دریافت کر رہے تھے تو ان سے پیچھا چھڑانے کے لئے یہ کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ حضرت کعب کہتے ہیں: ان کا یہ سلوک اور رویہ دیکھ کر بے اختیار میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں وہاں سے لوٹا یہاں تک کہ باغ کی دیوار پھاند کر باہر آ گیا۔

﴿شاہِ غسان کی آفر (OFFER)﴾

میں بازار کے اندر چل رہا تھا تو شام کے دیہات کے رہنے والوں میں سے ایک باشندہ جو وہاں سے غلہ لے کر مدینہ منورہ میں بیچنے آیا تھا وہ آواز لگا رہا تھا کہ کون ہے جو مجھے کعب بن مالک کا پتہ بتائے، اس طرح وہ زور زور سے اعلان کر رہا تھا۔ لوگ میری طرف اشارہ کر کے بتلا رہے تھے، کوئی زبان سے کچھ نہیں بولتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی میرے پاس آیا اور اس نے غسان کے بادشاہ کا خط مجھے دیا۔ شام کے علاقے میں جو حصہ

حجاز کی سرحدوں سے قریب پڑتا ہے وہاں ان کی حکومت تھی اور یہ علاقہ قیصر کے ماتحت تھا اور مَیں لکھنا پڑھنا جانتا تھا، چنانچہ وہ خط کھول کر میں نے خود ہی پڑھا تو اس خط میں لکھا ہوا تھا:۔ اما بعد! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تمہارے ساتھی (یعنی نبی کریم ﷺ) نے تمہارے ساتھ بے رُخی کا معاملہ کیا ہے اور تم کو اللہ تعالیٰ نے بے عزت اور ضائع ہونے کے لئے نہیں بنایا ہے، آپ ہمارے یہاں آ جاؤ، ہم آپ کی دل جوئی و اعزاز کریں گے۔

آفر (OFFER) کا منہ توڑ جواب

دیکھو! پوری حکومت کا بادشاہ ان کو اپنی طرف مائل کر رہا ہے اور کئی دن ایسے گذرے ہیں اور وہ خود بھی ایسے حالات سے دوچار ہیں کہ خود کہہ چکے ہیں کہ زمین بھی وہ نہیں رہی تھی اور اپنے محبوب دوست نے بھی سلام کا جواب دینا گوارہ نہیں کیا۔ لہٰذا سوچئے! کیا گذر رہی ہوگی۔ ایسے حالات میں یہ خط پہنچا ہے۔ فرماتے ہیں: کہ یہ بھی ایک آزمائش ہے، لہٰذا اس خط کو لے کر مَیں تنور کی طرف بڑھا اور اس میں ڈال کر جلا دیا اور اس کو بتا دیا کہ وہاں جا کر بتا دینا کہ یہ تیرے خط کا جواب ہے۔

ایک اور بڑی آزمائش

کہتے ہیں کہ جب چالیس دن پورے ہوئے اور وحی بھی نہیں آ رہی تھی کہ نبی کریم ﷺ کا قاصد میرے پاس آیا اور اس نے کہا: نبی کریم ﷺ حکم دے رہے ہیں کہ تم بیوی سے الگ رہو۔ آج تک تو بیوی ساتھ تھی، اب یہ حکم آیا۔ مَیں نے اس قاصد سے پوچھا: کیا طلاق دے دوں؟ اس نے کہا: نہیں! طلاق نہیں دینی ہے، بس الگ رہو، اس کے ساتھ مت رہو۔ اب دیکھئے! گھر میں انس کے لئے ایک شخصیت تھی اس کو بھی الگ کیا جا رہا

ہے۔ چنانچہ مَیں نے اپنی بیوی سے کہا: اپنے گھر جاؤ اور وہاں رہیو؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی فیصلہ آ جائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس روایت کو کتاب الطلاق میں یہ بتلانے کے لئے پیش فرمایا ہے کہ کوئی آدمی بیوی سے کہے کہ اپنے گھر چلی جا اور طلاق کی نیت نہ ہو؛ تو طلاق نہیں پڑتی ہے۔

غم کی کیفیت

حضور اکرم ﷺ کی طرف سے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی یہی کہلوایا گیا تھا تو ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور آ کر عرض کیا: اللہ کے رسول! ہلال بن امیہ بہت بوڑھے آدمی ہیں اور ان کا کوئی خدمت گذار بھی نہیں ہے، وہ خدمت کے محتاج ہیں، اگر ان کی خیر خبر نہیں لی گئی؛ تو وہ ضائع ہو جائیں گے، تو کیا آپ اس بات کو ناپسند کریں گے کہ مَیں ان کی خدمت کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: خدمت کرنے سے منع نہیں ہے؛ لیکن وہ تمہارے قریب نہ ہونے پائیں، تم سے صحبت نہ کرنے پائیں۔ اس کے جواب میں ان کی بیوی نے کہا: اللہ کے رسول! ان کو تو کسی چیز کا ہوش وحواس بھی نہیں ہے، جب سے یہ معاملہ پیش آیا ہے ان کا تو پورا وقت رونے میں ہی گذرتا ہے۔ خیر! حضور نے ان کے خاص حالات کے پیشِ نظر اجازت دی کہ بیوی خدمت کر سکتی ہے۔

حضرت کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میرے خاندان میں سے کسی نے مجھ سے کہا کہ ان کو اجازت مل گئی ہے، اس لئے تم بھی حضور ﷺ سے بیوی کے سلسلے میں اجازت لے لو۔ مَیں نے جواب میں کہا: مَیں حضور ﷺ سے اس سلسلے میں اجازت نہیں مانگوں گا، کیا پتہ مجھے کیا

جواب ملے، وہ تو بوڑھے تھے اور مَیں تو نوجوان ہوں، مجھے کسی کی خدمت کی ضرورت نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ اسی طرح دس راتیں اور گذریں اور جب سے ہمارے ساتھ بات چیت کرنے سے منع کیا گیا تھا؛ اس کو پورے پچاس دن گذر گئے۔

﴿اے کعب! خوش ہو جاؤ﴾

حضرت کعب فرماتے ہیں: پچاسویں رات کی صبح کو فجر کی نماز مَیں نے اپنے گھر کی چھت پر پڑھی اور اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق قرآن پاک میں بیان کیا ہے ﴿وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ أَنْفُسُهُمْ﴾ یہاں تک کہ زمین ان کے اوپر تنگ ہوگئی اور ان کی جانیں بھی ان پر تنگ ہوگئیں، وہ خود بھی اپنی جان سے عاجز آ گئے۔ آدمی پر جب حالات آتے ہیں تو وہ اپنی جان سے بھی عاجز آ جاتا ہے، یوں سوچتا ہے کہ اس سے بھی پیچھا چھڑا لوں۔ کہتے ہیں: وہی کیفیت میری تھی، اور اسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک آدمی جبلِ سلع پر- جو مدینہ منورہ کا ایک پہاڑ ہے- چڑھا ہوا تھا اور وہیں سے اس نے زور سے آواز دی: ﴿یا کعب بن مالک! أبشر﴾ اے کعب بن مالک! خوش ہو جاؤ، بشارت سن لو۔ مَیں سمجھ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری توبہ کی قبولیت کی اطلاع آ چکی ہے، اس کی آواز سنتے ہی مَیں سجدۂ شکر میں گر گیا اور مَیں سمجھ گیا کہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کشادگی آ گئی۔

﴿خوش خبری سنانے کے لئے جانا ثابت ہے﴾

بات یہ ہوئی تھی کہ فجر کی نماز کے بعد حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری توبہ قبول ہونے کی اطلاع دی تھی، اسی رات کو وحی آئی تھی۔ رات کے وقت

حضرت اُمِ سلمہؓ کے یہاں حضور اکرم ﷺ تھے اور حضرت ام سلمہ کو اطلاع دی تھی کہ ان لوگوں کے بارے میں وحی آ گئی ہے۔حضرت امِ سلمہؓ نے عرض بھی کیا: اللہ کے رسول! مَیں ان لوگوں کو بتادوں؟ آپ نے فرمایا: کوئی ان کو سونے نہیں دے گا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی ایسی اطلاع ایسے وقت میں آئی ہو کہ آرام کا وقت ہو اور اس کے ظاہر کرنے میں لوگوں کے آرام ضائع ہونے کا اندیشہ ہو؛ تو بعد میں دی جاسکتی ہے۔بہر حال! حضور ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد لوگوں کو ان کی توبہ کے قبول ہونے کی اطلاع دی اور جو آیتیں اتری تھیں؛ وہ بتلائی۔جیسے ہی لوگوں نے یہ سنا،ہم کو بشارت سنانے کے لئے دوڑے۔اس سے خوش خبری سنانے کے لئے جانا ثابت ہوتا ہے۔

﴿خوش خبری سنانے والے کو انعام دینا ثابت ہے﴾

چنانچہ میرے دونوں ساتھیوں کے پاس بھی خوش خبری سنانے والے گئے اور ایک آدمی میرے پاس آنے کے لئے گھوڑے پر سوار ہو کر نکلا، ایک اور آدمی پیدل چلا، تو اس پیدل چلنے والے نے دیکھا کہ مَیں اس گھوڑے والے سے پہلے پہنچ نہیں سکوں گا تو اس نے پہاڑ پر چڑھ کر وہیں سے آواز لگا دی، گویا فون کر دیا، لہٰذا وہ آواز گھوڑے سے زیادہ جلدی پہنچی، اور جو پہلی اطلاع ہو اسی کو تو بشارت کہتے ہیں۔اس کے بعد وہ پہاڑ سے اُتر کر میرے پاس آیا تو مَیں نے اپنے کپڑے ان کے لئے نکال دیئے اور وہی پہنے ہوئے کپڑے اتار کر ان کو انعام کے طور پر دے دیئے، اور اس دن ان دو کپڑوں کے علاوہ کوئی کپڑے میرے پاس نہیں تھے۔خیر! اس سے خوش خبری سنانے والے کو انعام دینا ثابت ہوتا ہے۔جیسے بچے کی خوش خبری سنانے والے کو دیا جاتا ہے۔

﴿وصال کی لذت﴾

اس کے بعد دو کپڑے مانگ کر لئے اور ان کو پہن کر مَیں حضور اکرم ﷺ کی ملاقات کی غرض سے آگے بڑھا۔ راستے میں لوگ جماعت در جماعت، ٹولی در ٹولی مجھے سے ملتے تھے اور توبہ کے قبول ہونے کی مبارک باد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا تمہاری توبہ کو قبول کرنا؛ مبارک ہو۔ یہاں تک کہ مَیں مسجدِ نبوی میں داخل ہوا۔ نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے اور لوگ آپ کے آس پاس بیٹھے تھے، حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ مجھے دیکھ کر اُٹھے اور مبارک باد دی، مصافحہ کیا۔ وہاں جو حضراتِ مہاجرین بیٹھے تھے ان میں سے کسی نے اس طرح لپک کر ملاقات نہیں کی تھی۔ ان کا یہ احسان مَیں کبھی نہیں بھولوں گا۔

﴿حضور اکرم ﷺ کی خوشی کی کیفیت﴾

اور جب مَیں نے نبی کریم ﷺ کو سلام کیا تو حضور اکرم ﷺ کا چہرۂ انور مارے خوشی کے چمک رہا تھا اور حضور کی اس کیفیت کو ہم لوگ سمجھتے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: جب سے تمہاری ماں نے تم کو جنا ہے اس کے بعد سے ایسا بہترین دن اللہ تعالیٰ نے تم کو دکھلایا؛ اس کی بشارت سن لو۔ اس پر مَیں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! یہ میری معافی کا اعلان آپ کی طرف سے ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور جب حضور اکرم ﷺ مسرور اور خوش ہوتے تھے تو آپ کا چہرہ ایسا روشن معلوم ہوتا تھا جیسا کہ چاند کا ٹکڑا ہو اور اس چیز کو ہم صحابہ کرام جانتے تھے۔ اس روز بھی یہی کیفیت تھی۔

﴿خوشی میں آدمی سارا مال نہ دے ڈالے﴾

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: جب میں حضور کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری توبہ کا تکملہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کے خاطر میں سارے مال سے نکل آؤں یعنی اللہ کے راستے میں دے دوں، تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: کچھ مال اپنے پاس رہنے دو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خوشی میں آدمی سارا مال نہ دے ڈالے، بلکہ اپنی ضرورت کے لئے تو رکھنا پڑے گا۔ خوشی میں سب دے ڈالے اور پھر لوگوں سے مانگنے لگے؛ ایسی نوبت نہ آنی چاہیے۔ مَیں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: خیبر میں مالِ غنیمت کے طور پر جو حصہ ملا تھا وہ رہنے دیتا ہوں، باقی سارا مال اللہ کے راستے میں صدقہ کرتا ہوں۔

﴿توبہ کا تکملہ﴾

پھر میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مصیبت سے نجات سچائی کی برکت سے عطا فرمائی ہے، اس لئے اب میری توبہ کا تکملہ یہ ہے کہ مَیں جب تک زندہ رہوں گا؛ ہمیشہ سچ بولوں گا، کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔

اور فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مسلمان کو اس کے سچ بولنے پر ایسا آزمایا ہو؛ جتنا کہ حضور ﷺ کے سامنے سچ بولنے پر مجھے آزمایا۔ ویسے ان کے دو ساتھی تھے؛ لیکن بیوی کے معاملے میں انہوں نے جو تکلیف اُٹھائی اس میں تو یہ تنہا ہی تھے۔ اور فرماتے ہیں: جب سے مَیں نے حضور ﷺ سے یہ وعدہ کیا ہے اس کے بعد سے آج تک میری زبان سے جھوٹ بات نہیں نکلی یعنی میں اپنے اس عہد پر قائم ہوں اور جب تک

مَیں زندہ رہوں گا اللہ تعالیٰ سے یہی امید ہے کہ وہ میری جھوٹ سے حفاظت فرمائیں گے۔

اور فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائی تھیں ﴿لَقَدْ تَابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا نبی کریم ﷺ کی طرف اور ان مہاجرین وانصار کی طرف؛ جنہوں نے سختی کی گھڑی میں نبی کریم ﷺ کا ساتھ دیا ﴿وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا﴾ اور اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا ان تین آدمیوں پر؛ جن کا معاملہ پیچھے ڈال دیا گیا تھا یعنی جن کی توبہ کو فوری طور پر قبول نہیں کیا تھا اور معاملہ موقوف رکھا گیا تھا یہاں تک کہ ان پر زمین باوجود کشادگی کے تنگ ہوگئی۔

﴿پھر بھی اللہ تعالیٰ تو راضی نہیں ہوگا﴾

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میرے خیال میں اللہ تعالیٰ نے جب سے مجھے اسلام کی ہدایت عطا فرمائی مجھ پر اس سے بڑی نعمت نہیں اتاری کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ سے سچ سچ کہا، اللہ تعالیٰ نے مجھے حضور کے سامنے جھوٹی بات کہنے سے بچالیا، ورنہ اگر میں نے بھی جھوٹا بہانہ تراش لیا ہوتا جیسا کہ منافقین نے تراشا تھا؛ تو میں بھی اسی طرح ہلاک ہوجاتا جیسے وہ ہلاک ہوئے۔ اس لئے کہ جنہوں نے جھوٹے بہانے پیش کئے تھے اللہ تعالیٰ نے جب اُن کے متعلق وحی نازل فرمائی تو ان کے لئے بہت خطرناک الفاظ استعمال فرمائے۔ باری تعالیٰ حضور ﷺ کو فرماتے ہیں ﴿سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ﴾ جب آپ لوٹ کر جاؤ گے وہ منافقین جو غزوہ میں حاضر نہیں رہے تھے، وہ آکر جھوٹی قسمیں کھائیں گے ﴿لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ﴾ یہ قسمیں اس لئے کھائیں گے تاکہ آپ ان سے درگذر کرو، ان کو چھوڑ دو، ان کی پکڑ نہ کرو ﴿فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے

ہیں: ٹھیک ہے ان کی پکڑ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ان سے اعراض کرو ﴿اِنَّھُمْ رِجْسٌ﴾ وہ تو گندے ہیں ﴿وَمَأْوَاھُمْ جَھَنَّم﴾ اور ان کا ٹھکانہ جہنم ہے ﴿جَزَآءً بِّمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْن﴾ ان کے کرتوتوں کی وجہ سے۔ ﴿یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ﴾ یہ تمہارے سامنے آ کر جھوٹی قسمیں اس لئے کھاتے ہیں کہ تم ان سے راضی اور خوش ہو جاؤ، ان کی طرف سے تمہارے دل میں کوئی میل نہ رہے ﴿فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِیْن﴾ اگر تم راضی ہو بھی گئے تو اللہ تعالیٰ تو ان گنہ گاروں سے راضی نہیں ہوگا۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر کا سارا حال بیان کر دیا۔ حضرت کعبؓ فرماتے ہیں: یہ غیر حاضر رہنے والے جنہوں نے آکر حضور کے سامنے جھوٹی قسمیں کھائیں تھیں اور حضور نے ان کا عذر قبول کر لیا تھا ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے ان تین کا معاملہ مؤخر کیا تھا اور جھوٹے بہانے والوں سے حضور نے دوبارہ بیعت بھی کر لی، ان کے لئے دعائے مغفرت بھی کی اور حضور نے ہمارے معاملے کو مؤخر کیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں یہ آیتیں نازل فرمائیں ﴿وَعَلَی الثَّلٰثَةِ الَّذِیْنَ خُلِّفُوْا﴾

بس! یہاں تو اس قصہ کو تفصیل سے اس لئے ذکر کیا کہ ان حضرات کی توبہ اس طرح قبول ہوئی۔

یہ مجلس تاریخ ۶/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۹/ اکتوبر ۱۹۹۶ء کو بمقام مسجد ابرار شالیمار سوسائٹی۔سورت میں ہوئی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہٖ اللہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْ لَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً .اما بعد .

﴿اسلامی سزاؤں کا اصلی چہرہ﴾

توبہ کا باب چل رہا تھا توبہ کے سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت ساری روایتیں پیش کی ہیں ان میں سے ایک روایت ہے۔حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوئی کہ زنا کی وجہ سے وہ حاملہ بن چکی تھی ،اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسے جرم اور گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو حد کو واجب کرنے والا ہے۔اسلام نے بعض مخصوص گناہوں پر جو سزائیں مقرر کی ہیں ان کو حد کہتے ہیں جیسے چور چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے کوئی زنا کرے اور زانی اگر غیر شادی شدہ ہے تو اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں اور اگر شادی شدہ ہے تو اس کو رجم یعنی سنگسار کیا جاتا ہے، پتھر مار کر اس کو ختم کیا جاتا ہے کوئی شراب پئے تو اس کو کوڑے لگائے جاتے ہیں۔اس عورت نے آکر کہا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسے

جرم اور گناہ کا ارتکاب کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد واجب ہوچکی ہے آپ وہ حد مجھ پر جاری کیجئے۔تو نبی کریم ﷺ نے اس عورت کے سرپرست اور ولی (વાલી) کو بلا کر کہا کہ اس وقت چونکہ وہ حاملہ ہے اس کے پیٹ میں بچہ ہے، جرم عورت نے کیا ہے، جو بچہ پیٹ میں ہے اگرچہ زنا کی وجہ سے حمل ٹھیرا ہوا ہے لیکن اس بچے نے تو کوئی جرم کیا نہیں ہے، اگر اس حالتِ حمل میں اس پر سزا جاری کی گئی اور پتھر مار کر ختم کیا گیا تو جو بچہ پیٹ میں ہے وہ ناکردہ گناہ کی سزا بھگتے گا،اس لئے قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے زنا کرایا ہے اور حاملہ ہے، چاہے وہ حمل اسی زنا کی وجہ سے ٹھیرا ہو،تو جب تک وہ حالتِ حمل میں ہے وہاں تک اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، بلکہ بچہ پیدا ہوجانے کے بعد جو نفاس کی حالت ہوتی ہے- یعنی بچے کی پیدائش کے بعد عورت کو اس کے رحم اور بچہ دانی سے چند روز تک خون جاری رہتا ہے جس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن کی ہے اور کم سے کم کے لئے کوئی حد نہیں، بعض عورتوں کو کبھی تھوڑا سا خون آکر معاملہ ختم ہوجاتا ہے اور بعضوں کو کئی دن تک یہ سلسلہ رہتا ہے-تو اگر وہ عورت غیر شادی شدہ ہے اور اس کی سزا کوڑے ہیں تو سو کوڑے اس کو لگائے جاتے ہیں لیکن حالتِ نفاس میں اس کو کوڑے نہیں لگائے جائیں گے، چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بیماری ہے، کمزوری کی حالت ہے،اس بیماری میں اگر کوڑے لگائے گئے ؛تو ہوسکتا ہے کہ وہ کوڑوں کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے انتقال کرجائے اور چونکہ شریعت نے اس کے لئے جو سزا مقرر کی ہے وہ موت کی نہیں ہے، صرف کوڑوں کی ہے، اس کو مارڈالنا مقصود نہیں ہے، اس لئے جب تک نفاس والی کیفیت ہے، اس پر یہ سزا جاری نہیں کی جائے گی، نفاس کا زمانہ گذرنے کے بعد اس کو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اور اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کا ارتکاب کریں تو اسلام میں ان کی سزا سنگساری ہے یعنی پتھر مار کر ان کو ختم کیا جائے، ویسے بھی زنا کے ثبوت کے لئے بڑے کڑے شرائط رکھے ہیں یا تو یہ کہ خود مجرم اس کا اقرار کرے اور اقرار بھی ایک مرتبہ کر لینا کافی نہیں ہے، بلکہ چار مرتبہ، وہ بھی ایک مجلس میں نہیں، الگ الگ مجلس میں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے پاک فرما دیجئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور اللہ سے معافی مانگو؛ وہ معاف کرنے والا ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے منہ پھیر لیا اور ان کو وہاں سے نکال دیا کہ چلے جاؤ۔ وہ گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد بے چینی بڑھی تو چونکہ آپ نے رخ پھیر لیا تھا اس لئے دوسری طرف سے واپس آئے، آپ کے چہرۂ انور کی طرف گئے اور پھر انہوں نے وہی بات عرض کی: یارسول اللہ! مجھے گناہ کی نجاست اور نحوست سے پاک کیجئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر ان کو وہاں سے نکال دیا اور یوں کہا: اپنے گناہوں کی معافی مانگو اللہ تبارک وتعالیٰ معاف کرنے والا ہے۔ چلے گئے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد پھر آئے۔ چار مرتبہ اس طرح ہوا، جب چوتھی مرتبہ انہوں نے آکر اس بات کا اقرار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کس چیز سے پاک کروں؟ عرض کیا: زنا سے۔ حاضرین سے آپ نے پوچھا: یہ پاگل تو نہیں ہیں؟ بتایا گیا: کہ نہیں۔ تب فرمایا: ٹھیک ہے۔

اس لئے کہ پاگل آدمی ایسا کوئی اقرار کرلے تو ویسے بھی اس پر کوئی سزا یا شریعت کا کوئی حکم جاری ہوتا نہیں ہے۔ شریعت نے تین آدمیوں کو اپنے احکام سے مستثنیٰ کر دیا ہے،

الگ رکھا ہے، حدیث میں آتا ہے: ﴿رُفِعَ الْقَلَمُ عَنْ ثَلاثَةٍ. عَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰى يَحْتَلِمَ وَعَنِ الْمَجْنُوْنِ حَتّٰى يُفِيْقَ وَعَنِ النَّائِمِ حَتّٰى يَسْتَيْقِظَ (اخرجہ الاربعۃ الا الترمذی من حدیث عائشۃ)﴾ تین آدمیوں سے شریعت کے احکام اٹھالئے گئے ہیں ان میں سے ایک تو بچہ ہے یہاں تک کہ وہ بالغ ہوجائے، دوسرے پاگل پر بھی نماز روزہ کچھ نہیں ہے یہاں تک کہ اس کا پاگل پن دور ہوجائے اور تندرست ہوجائے، سونے والے پر سونے کی حالت میں شریعت کا کوئی حکم لاگو نہیں پڑتا جیسے نیند میں جو بڑبڑاہٹ نکلتی ہے مثلاً ایک آدمی سورہا ہے، نیند کی حالت میں اس نے بڑبڑاہٹ میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی؛ تو طلاق نہیں پڑے گی۔ یہ تین آدمی ہوئے

بہر حال! اس لئے حضور ﷺ نے پوچھا کہ دماغ تو ٹھیک ہے نا؟ پاگل تو نہیں ہیں؟ پھر حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا: انھوں نے شراب پی رکھی ہے کہ اس کے نشہ میں ایسی بات کہہ رہے ہیں؟ ایک صحابی نے کھڑے ہوکر ان کا منہ سونگھا تو ان کو شراب کی بو نہیں آئی پھر آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کیا تم نے زنا کیا ہے؟ جواب دیا کہ جی ہاں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ان پر حد جاری کرو، ان کو پتھر مار کر ختم کرو، چنانچہ ان کو مسجد سے باہر ایک میدان میں کھڑا کیا گیا اور تمام صحابہ کو حکم دیا کہ ان کو پتھر مارو، چنانچہ ان کو پتھر برسا کر ختم کردیا گیا۔ (مشکوۃ ص ۳۱۰ فصل اول بحوالہ مسلم)

اس سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا کہ ایک مرتبہ کے اقرار سے نہیں بلکہ چار مرتبہ اور وہ بھی الگ الگ مجلسوں میں اگر زنا کا اقرار کرے؛ تو زنا کا ثبوت ہوگا، ورنہ نہیں۔ ایک جگہ کھڑے ہوکر چار مرتبہ کہے تو بھی نہیں۔ یا پھر یہ کہ گواہ اس کے خلاف موجود ہوں اور گواہ بھی چار، اور گواہوں کے لئے بھی شریعت نے بہت ساری کڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں کہ وہ

عادل ہونے چاہئیں، نیک اور دین دار ہونے چاہئیں، انھوں نے کبھی کسی پر تہمت نہ لگائی ہو، کسی پر تہمت لگانے کی وجہ سے ان کو سزا نہ ہوئی ہو، اور غلام نہ ہوں، مرد ہونے چاہئیں عورتیں نہیں، بالغ ہونے چاہئیں۔ مطلب یہ کہ بہت ساری شرطیں ہیں، ایسے چار گواہ ہوں اور پھر وہ یوں کہیں کہ ہم نے اس مرد کو اس عورت کے ساتھ اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھا جیسے سرمہ دانی میں سلائی ہوتی ہے، ویسے ہی دیکھ لیا کہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں؛ یہ کافی نہیں ہے۔ یہ سب شرطیں پائی جائیں تو پھر اس پر سزا جاری کی جاتی ہے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ شریعت کی طرف سے جو سزائیں مقرر ہیں ان میں بہت سارے قوانین ہیں، شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں کے متعلق جو غیر مذہب کے لوگ ہیں وہ تو اعتراض کریں لیکن مسلمانوں میں بھی بہت سے وہ ہیں جو ان سزاؤں سے واقف نہیں ان کی حقیقتوں سے واقف نہیں کہ ان میں شریعت نے کیسی کڑی کڑی شرطیں رکھی ہیں، ایسے ہی تو جاری نہیں ہوں گی، وہ بھی اعتراض کرتے ہیں۔ بلکہ چار مرتبہ اقرار کرنے کے بعد بھی سزا جاری نہیں کی گئی ہے اس سے پہلے اس نے اقرار ختم کر دیا کہ میں نے زنا نہیں کیا ہے تو سزا نہیں دیں گے، بلکہ وہ سزا دینے کے درمیان بھاگ گیا تو اس سے پوچھیں گے کہ کیوں بھاگا؟ اگر وہ اپنے اقرار سے پھر جائے کہ میں اپنا اقرار واپس لیتا ہوں؛ تو بھی سزا نہیں دیں گے، اور اگر یوں کہے کہ مار پڑی تو مجھے ذرا تکلیف ہوئی، اس وجہ سے بھاگا، ورنہ میں اپنے اقرار پر قائم ہوں؛ تو پھر سزا جاری کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی ایسی تفصیلات ہیں۔

ایک اہم اشکال

دیکھئے! یہاں ایک بات اور ہے بہت سارے اہل علم اور اہل ایمان یہاں موجود

ہیں۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، بہت سے بزرگوں کے حالات میں ہے کہ ان کو کبھی گناہ کا تصور بھی نہیں آیا ، اللہ کے ایسے مقبول بندے بھی گذرے ہیں۔ چنانچہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، جن کی قبر یہیں راندیر کے قبرستان میں ہے ، اصلاً دیوبند کے رہنے والے ہیں ، حضرت یہیں تشریف لائے ہوئے تھے، بیمار ہوئے اور انتقال فرمایا اور قبر یہیں بنی، ان کے نانا تھے منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ دار العلوم کی جب بنیاد پڑی تو پہلی اینٹ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے ہاتھ سے رکھوائی تھی۔ ان کے حالات میں لکھا ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ان کو کبھی صغیرہ گناہ کا تصور بھی نہیں آیا، کبیرہ کی بات تو دور کی رہی۔ اور بھی بہت سے اکابر اہل اللہ کے حالات میں لکھا ہے۔

ایک طرف اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ طے ہے۔ صحابی اس کو کہتے ہیں جس نے ایمان کی حالت میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا ہو۔ اور جنھوں نے ایمان کی حالت میں صحابی کو دیکھا ہو اس کو تابعی کہتے ہیں اور جس نے ایمان کی حالت میں تابعی کو دیکھا ہو اس کو تبعِ تابعی کہتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: زمانوں میں سب سے بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے اس کے بعد میرے بعد والا اور اس کے بعد اس کے بعد والا، اس لئے امت کے ان طبقوں کو ایک خاص مقام اور خاص فضیلت حاصل ہے جو بعد والوں کو نہیں۔ اسی کو خیر القرون کہا جاتا ہے۔ اسی طرح صحابہ میں بھی مختلف درجات ہیں چنانچہ صحابہ میں

عشرۂ مبشرہ یعنی وہ دس صحابۂ کرام ﷺ جن کو نبی کریم ﷺ نے دنیا ہی میں جنت کی بشارت ایک ہی موقع پر ایک ہی مجلس میں عطا فرمائی۔جن میں حضرت ابوبکر،حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ ،حضرت زبیر، حضرت سعید بن زید ،حضرت ابوعبیدہ بن الجراح،اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ۔ ان دس حضرات کو فضیلت حاصل ہے، پھر ان میں بھی خلفاء راشدین اربعہ اور سب میں افضل حضرت ابوبکر صدیق ﷺ ہیں۔عشرہ مبشرہ کے بعد وہ صحابۂ کرام ﷺ جنہوں نے غزوۂ بدر میں حصہ لیا جن کو بدریین کہا جاتا ہے ان کو دوسرے صحابۂ کرام ﷺ کے مقابلے میں ایک مخصوص مقام حاصل ہے اور بدریین کے بعد اہل بیعت رضوان کو فضیلت حاصل ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر جنہوں نے بیعت کی تھی جب کہ آپ عمرہ کے ارادے سے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تھے اور مکہ والوں نے آپ کا راستہ روکا اس وقت آپ ﷺ نے صحابۂ کرام سے بیعت کی کہ اگر لڑائی کی نوبت آئے گی تو ہم جان دے دیں گے لیکن قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے۔اس پر قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی خوشنودی کا پروانہ دیا گیا تھا﴿ لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْیُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ (الفتح پ۲۶)﴾ اللہ تعالیٰ خوش ہوگیا اور راضی ہوگیا ان ایمان والوں سے جبکہ وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ یہ بیعت رضوان والے ہوئے۔اس کے بعد دوسرے صحابہ ہیں ان میں بھی ترتیب ہے لیکن کوئی بھی صحابی کم سے کم درجے کا کیوں نہ ہو؛امت کا کوئی دوسرا آدمی صحابہ کے بعد والا چاہے وہ اپنے زمانے کا کتنا ہی بڑا شخص کیوں نہ ہو (غوث پاک سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے ،حضرت خواجہ

معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ تھے، اور بھی جتنے بڑے بڑے اہل اللہ گذرے ہیں) لیکن کوئی بھی چھوٹے سے چھوٹے اور معمولی صحابی کے درجے کو پہنچ نہیں سکتا ہے۔ یہ اہل سنت والجماعت کا متفقہ عقیدہ ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ؟

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا مقام بہت اونچا ہے لیکن وہ صحابی نہیں ہیں وہ خلفاءِ بنوامیہ میں سے ہیں اور ان کا دورِ خلافت ایسا شان دار اور عظیم تھا کہ لوگوں نے ان کے دورِ خلافت کو خلافتِ راشدہ سے تشبیہ دی ہے۔ گویا وہ خلافتِ راشدہ کا ہی ایک حصہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ صحابی نہیں ہیں۔

اس پوچھنے والے کو یہ جواب دیا گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جن غزوات میں حصہ لیا اور اس شرکت کے موقع پر ان کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار پہنچا، حضرت عمر بن عبدالعزیز اس کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اتنا اونچا مقام ہر صحابی کو حاصل ہے۔ (مکتوبات مجدد الف ثانی رحمہ اللہ ص ۲۰۵ دفتر اول مکتوب ۲۰۷ بحوالۂ فتاوی رحیمیہ ۴/۳۰)

میں یہ بات عرض کر رہا تھا کہ اہل اللہ میں سے بہت سوں کے حالات آپ نے بھی پڑھے ہوں گے اور میں نے ایک نمونہ بھی پیش کیا کہ انہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا بلکہ گناہ کا کبھی تصور بھی نہیں آیا، ایک طرف ان حضرات کا معاملہ ہے جو مفضول ہیں یعنی فضیلت میں کم ہیں اور ان کو یہ بات حاصل ہے، تو جو افضل حضرات تھے یعنی صحابہ ان کا ایسی چیزوں کا، ایسے امور کا اور ایسے افعال کا ارتکاب کرنا جس کی وجہ سے ان پر سزا ہو جائے اور

حد واجب ہو؛ یہ ایک اشکال کی چیز ہے، جو بہت سے لوگوں کو رہتی ہے۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ایک کتاب ہے ''شریعت و طریقت کا تلازم'' اس میں حضرت نے اس سوال کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ کبھی مجھے یہ اشکال پیدا ہی نہیں ہوا کہ ایسا کیوں؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام بہت اونچا ہے۔

﴿جواب﴾

دیکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو شریعتِ مطہرہ دے کر بھیجا تھا اور چونکہ آپ پر دین کی تکمیل ہوچکی تھی، اب کوئی نئے نبی آنے والے نہیں تھے، آخر میں یہ آیت نازل ہوئی ﴿اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْناً (المائدۃ۔پ۶)﴾ کہ یہ دین مکمل کیا جاتا ہے۔ اب دین کے متعلق ساری چیزیں جو امت کو تعلیم دینی تھیں نبی کریم ﷺ نے وہ امت کو بتلا دیں، یا تو صاف اور صراحۃً بتلا دیں یا ایسے اصول آپ کی طرف سے بتلائے گئے کہ جو واقعات نئے پیش آئیں؛ ان کے احکام بھی ان سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ تو شریعت کی تکمیل نبی کریم ﷺ کے ہی دور میں ہونی تھی۔

اور دیکھئے! خود نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بعض افعال خود نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے باری تعالیٰ کی طرف سے ایسے صادر کروائے گئے؛ جو شانِ نبوت کے خلاف نہیں تھے۔ جیسے لیلۃ التعریس والا واقعہ۔ کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ غزوۂ خیبر سے واپس لوٹ رہے تھے، گرمی کے دن تھے، عرب میں دستور یہ تھا کہ لوگ صبح چلتے تھے، دوپہر کو آرام کرتے تھے، شام سے رات کے ایک حصے تک چلتے تھے، اس کے بعد آخری رات میں

آرام کرتے تھے، فجر کے لئے اٹھ کر پھر چلتے تھے، یہ سلسلہ اسی طرح رہتا تھا۔غزوۂ خیبر سے واپسی میں اسی طرح ہوا، رات کے آخری حصے میں آرام کیلئے ٹھہرے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہم کونماز کے لئے کون اٹھائے گا؟ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کبھی آپ ایسا نہیں فرماتے تھے،اس روز یہ فرمایا۔حضرت فرماتے ہیں کہ انبیاءِ کرام اور جن کو انبیاءِ کرام کے ساتھ خصوصی ربط رہتا ہے جو جتنے قریب ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں ایسے واقعات کے متعلق جو پیش آنے والے ہیں ایسی چیزیں ڈال ہی دی جاتی ہیں۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہم کونماز کے لئے کون اٹھائے گا؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا:مَیں اٹھاؤں گا۔ٹھیک ہے،سب سو گئے۔حضرت بلال رضی اللہ عنہ بیٹھے رہے کہ جب صبح کی روشنی نمودار ہوگی اس وقت مَیں اٹھادوں گا۔چنانچہ کجاوہ (جو اونٹ کے اوپر رکھا جاتا ہے لکڑی کا ہوتا ہے) سے ٹیک لگا کر مشرق کی جانب رخ کر کے جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے؛ بیٹھ گئے اور دیکھتے رہے کہ جہاں صبح کا سفیدا نمودار ہوگا تو مَیں اٹھادوں گا، لیکن بیٹھے بیٹھے ان پر بھی نیند طاری ہوگئی یہاں تک کہ سورج نکل آیا اور اوپر چڑھا،اس کی تپش سے سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی آنکھ کھلی۔دیکھئے! یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے امت کو نمونہ پیش کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کی نماز قضا کروائی گئی۔اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِنِّیۡ لَااَنۡسٰی بَلۡ اُنۡسٰی لِاُسَنَّ﴾ میں بھولتا نہیں بلکہ مجھے بھلایا جاتا ہے تاکہ امت کیلئے ایک طریقہ معلوم ہو۔لہٰذا قضا نماز کس طرح پڑھی جائے یہ کس طرح معلوم ہوتا؟ اسی لئے جب اٹھے تو نبی کریم ﷺ نے ایک دوسری بات بھی ارشاد فرمائی کہ چلو! اس وادی سے آگے بڑھو، آگے بڑھ کر پھر وہاں وضو کیا اور باقاعدہ اذان و جماعت کے ساتھ نماز ادا فرمائی۔

دیکھئے! جس جگہ پر آنکھ لگ جانے کی وجہ سے نماز کے فوت ہونے کی نوبت آئی تھی؛ آپ نے اس وادی میں ٹھیرنا بھی پسند نہیں کیا۔اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور غفلت کے جو محرکات ہوتے ہیں ان سے بھی آدمی کو اپنا پیچھا چھڑانا ضروری ہے۔

اس سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا کہ اگر کئی آدمیوں کی نماز قضا ہوئی ہو تو جماعت کے ساتھ ادا کی جاسکتی ہے، اذان بھی دے سکتے ہیں، لیکن اتنی زور سے نہ ہو کہ دوسروں کو تکلیف ہو، جس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو۔

خیر! آپ نے امت کو ایک حکم بتلا دیا کہ ﴿لَيْسَ فِي النَّوْمِ تَفْرِيطٌ ،اِنَّمَا التَّفْرِيطُ فِي الْيَقْظَةِ (ترمذی ۱/۴۳ باب ما جاء فی النوم عن الصلوۃ)﴾ کہ سونے میں آدمی کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں، کوتاہی تو بیداری میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی نہ وہ بیچارہ خود اٹھ پایا اور نہ کوئی اٹھانے والے نے اٹھایا، اس نے پوری کوشش کی تھی، باقاعدہ اس کا انتظام کیا تھا، لوگوں کو بھی کہہ رکھا تھا کہ نماز کے وقت مجھے اٹھا دینا اور الارم بھی رکھ دیا تھا، لیکن اس کی آنکھ لگی ہی رہی، یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا، اس نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ دیکھئے! یہاں حضور ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تھا لیکن ان کی بھی آنکھ لگ گئی اور سب کی آنکھ لگی رہی تو آپ نے تسلی دی کہ بھئی! اگر آئندہ بھی کسی کو ایسا ہو جاوے تو چونکہ یہ غیر اختیاری چیز ہے اس پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم لوگوں کو کوئی جگائے اور پھر نہ جاگیں یا بیدار ہونے کے لئے کوئی انتظام ہی نہ کریں تو وہاں یہ بات نہیں چلے گی۔ البتہ بیداری میں کوتاہی کہلائے گی کہ آدمی جان رہا ہے کہ نماز کا وقت آیا پھر بھی اپنے مشغلے میں اور کام کاج میں لگا رہا یہاں تک کہ نماز کا وقت گذر گیا اور نماز قضا ہوگئی، یہ

غفلت کی بات ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔ دیکھئے! آپ ﷺ کی نماز قضا ہوئی اور امت کے لئے نمونہ بنا۔

غزوۂ خندق کے موقع پر آپ کی نمازیں ظہر عصر مغرب فوت ہوئیں آپ نے باقاعدہ ترتیب سے رات کو پڑھیں (ترمذی ۱/۴۳ باب الرجل تفوتہ الصلوات بایتھن یبداء) اس سے امت کو ایک اور مسئلہ معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ نمازیں چھوٹی ہوں تو اسی ترتیب سے پڑھی جائیں گی جس ترتیب سے چھوٹی ہیں۔ اور یہ بھی غیر اختیاری طور پر فوت ہوئی تھیں کہ دشمن کے مقابلے کی وجہ سے مہلت ہی نہیں ملی اور اس وقت تک صلوٰۃ الخوف کس طرح پڑھنی چاہیے؛ وہ حکم آیا نہیں تھا، لیکن اب اس کی وجہ سے فوت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

خیر! میں یہ عرض کررہا تھا کہ بعض وہ باتیں جس کی وجہ سے شانِ نبوت پر کوئی زد نہیں پڑتی؛ وہ تو خود آپ ﷺ سے کروائی گئیں تا کہ امت کو راستہ اور نمونہ ملے۔ حضور ﷺ نے باقاعدہ امت کی سہولت کے لئے سہولت کی چیزیں کرکے بتلائیں جیسے سفر میں آپ نے روزہ افطار کرکے بتلایا؛ تا کہ امت کو معلوم ہو کہ سفر میں روزہ نہ رکھنے کی شریعت کی طرف سے اجازت ہے۔ بلکہ جنہوں نے روزہ رکھا تھا اور اس کی وجہ سے دوسروں کی خدمت کے محتاج ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ (مشکوۃ ص ۱۷۷، از بخاری ومسلم، فصل اول، باب صوم المسافر)﴾ سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے اگر اس کی وجہ سے کوئی تکلیف پیش آتی ہو۔ ویسے علماء نے آج بھی لکھا ہے کہ اگر آسانی کے ساتھ رکھ سکتا ہے تو افضل یہی ہے کہ روزہ رکھے، لیکن نبی کریم ﷺ نے سارے طریقے بتلائے ہیں، اسی لئے جو سہولتیں آپ نے بتلائیں ان سہولتوں کو نہ برتنے پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم ﷺ کی

طرف سے باقاعدہ تنبیہ کی گئی اور عتاب فرمایا گیا۔

ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ کو معلوم ہوا کہ آپ نے فلاں کام امت کے لئے بطور سہولت کے کیا تھا لیکن اس کے باوجود کچھ لوگ ہیں جو اس عمل کے سخت پہلو پر ہی عمل پیرا ہیں تو باقاعدہ نبی کریم ﷺ نے ان صحابۂ کرام کو ڈانٹا اور تنبیہ فرمائی۔

احادیث میں آتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ جس طرح عزیمت پر عمل کیا جائے اسی طرح رخصتوں پر بھی عمل کیا جائے۔شریعت نے اسی لئے تو رخصتیں رکھی ہیں، آدمی کو بہادر بننے کی ضرورت نہیں۔ بیماری میں آپ کو کنسیشن ملا ہے تو کنسیشن سے فائدہ اٹھائیے، سیدھی بات ہے۔ بلکہ سفر کی حالت میں جو کنسیشن ملا ہے؛ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو اس کو ضروری قرار دیتے ہیں۔اگر کوئی آدمی نماز پوری پڑھنا چاہے تو پوری نہیں پڑھ سکتا، کنسیشن کے ساتھ ہی پڑھے۔لہٰذا شریعت نے جہاں جہاں کنسیشن دیا ہے اس کنسیشن کو بھی برتو، بہادر مت بنو۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ بیمار ہوتے تھے تو خوب شور مچاتے تھے کہ یوں ہو گیا اور سر میں درد ہو رہا ہے۔اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ سخت سے سخت بیماری میں بھی کبھی کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا تھا۔کسی نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! چھوٹی سی تکلیف ہوتی ہے، سر میں درد ہو گیا؛ تو آپ اتنا چلاتے ہیں؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تکلیف اسی لئے تو بھیجی کہ بندہ چلّائے، بیماری اسی لئے تو آتی ہے، ہم کاہے کو اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر بنیں۔

غرض کہ شریعت کا مزاج یہ ہے کہ نہ وہ انسان پر سخت حکم ڈالتی ہے اور نہ اس کو یہ

پسند ہے کہ انسان خود اپنے اوپر ایسی سختی کرے۔ اور جہاں شریعت نے دو پہلو بتائے ہوں انسان ان میں سے آسان پہلو کو اختیار کرے۔

بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر حیاء کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا کہ جب وہ قضائے حاجت کے لئے جاتے تھے تو استنجاء کے لئے ستر تو کھولنا ہی پڑتا ہے یا عورتوں کے ساتھ جماع کی نوبت آتی تھی تو مارے شرم کے وہ دوہرے ہو جاتے تھے جیسے ستر کھلا ہوا اور کوئی دیکھ رہا ہو تو آدمی چمٹ جاتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے ﴿اَلَآ اِنَّھُمْ یَثْنُوْنَ صُدُوْرَھُمْ لِیَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ﴾ وہ اپنے سینوں کو دوہرا کر لیتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ سے چھپے رہیں، یہ ان کی ایک خاص کیفیت تھی اور ان کا حال تھا لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جیسی عالی صفات ہستیوں کے لئے یہ حال پسند نہیں کیا گیا، چونکہ ان کو بھی امت کے لئے نمونہ بننا تھا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی کہ ضرورت کے موقع پر ستر کھولا گیا ہے تو یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں، اگر یہی بات ہے تو پھر تم جسموں پر کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہو؛ اس وقت بھی اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہوتے ہیں ﴿اَلَا حِیْنَ یَسْتَغْشُوْنَ ثِیَابَھُمْ یَعْلَمُ مَایُسِرُّوْنَ وَمَایُعْلِنُوْنَ ﴾ اس وقت کیا کرو گے؟ گویا ان کو تنبیہ کی گئی کہ ہر موقع کا ایک ادب ہوتا ہے، اس کا لحاظ اسی وقت تک کرنا ہے۔

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا اور بات یہاں سے چلی کہ بہت سے اہل اللہ ہیں جن کو گناہِ صغیرہ کا بھی تصور نہیں آیا اور یہاں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات میں یہ صحابیہ جن سے زنا کا صدور ہوا، اس کا کیا سبب ہے؟ تو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دیکھئے! اسلام نے جو سزائیں مقرر کی ہیں وہ سزائیں بھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں باقاعدہ جاری کی

جاتیں؛ تب ہی امت کو پتہ چلتا کہ یہ سزا ہے اور یوں جاری کی جاتی ہے۔ زنا کی سزا یہ ہے اور اس طرح کوڑے لگائے جائیں گے۔ شراب نوشی کی سزا یہ ہے اور یہ کوڑے اس طرح لگائے جائیں گے۔ زنا کے اوپر اس طرح سنگسار کیا جاتا ہے اور یہ سزا یوں دی جاتی ہے۔ مرد ہو تو اس کو یوں دی جائے گی اور عورت ہو تو اس کو اس طرح دی جائے گی۔ اب یہ چیزیں اگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے صادر نہ ہوئی ہوتیں تو امت کو یہ احکام کیسے معلوم ہوتے؟ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قربان جایئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم پر کہ جنہوں نے اپنے آپ کو شریعت کی تکمیل کے واسطے پیش کیا، گویا انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے زبانِ حال سے یوں کہا: ع "تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"

اور یہ گناہ ان سے صادر ہوئے اور شریعت کی سزا جاری کروانے کے واسطے انہوں نے اپنے آپ کو پیش کیا۔

جیسا کہ ابھی مَیں نے آپ کے سامنے قصہ پیش کیا۔ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ کو حضور دھکے دے کر نکلوا رہے ہیں اور وہ پھر آرہے ہیں، چار چار مرتبہ ایسا ہوا، وہ آئے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آج ہم میں سے کون ہے بڑے سے بڑا؛ جس کو گناہ کرنے کے بعد وہ بے چینی ہو؛ جو اُن حضرات کو ہوا کرتی تھی؟ جس بے چینی نے اُن کو ختم کروانے کے واسطے پیش کر دیا۔ کوئی ان کو پکڑ کر تو نہیں لایا تھا؟ اُن کے خلاف کوئی گواہ تو قائم نہیں کیئے گئے تھے؟ وہ تو از خود آئے تھے اور حضور بار بار لوٹا رہے ہیں، واپس کر رہے ہیں، پھر بھی وہ آرہے ہیں۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ جس وقت ان کو سنگسار کر دیا گیا تو دو صحابی آپس

میں بات کرنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہ کو چھپایا تھا، پردہ پوشی کی تھی، یہ خود بھی اگر اپنے گناہ کو چھپاتا اور توبہ کر لیتا تو کیا ہو جاتا؟ اس طرح کتے کی موت تو نہ مرتا؟ یہ جملہ حضور ﷺ نے سنا تو کچھ نہیں فرمایا، آگے بڑھ گئے۔ کچھ دور پہنچے تو دیکھا کہ ایک مرا ہوا گدھا پڑا تھا اور اس کا جسم پھول گیا تھا اور ٹانگ بھی اکڑ کر کھڑی ہوگئی تھی، حضور ﷺ نے فرمایا: کہاں گئے وہ دونوں؟ ان کو بلایا اور فرمایا کہ اس میں سے کھاؤ۔ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کوئی کھانے کی چیز ہے؟ اس کو کیسے کھایا جائے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے اپنے بھائی کا گوشت کھایا اور اس کی جو آبرو ریزی کی؛ وہ اس سے زیادہ خطرناک ہے۔ پھر حضور ﷺ نے قسم کھا کر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا: خدا کی قسم! وہ تو اِس وقت جنت کی نہروں میں غوطہ لگا رہا ہے (مشکوۃ ص ۳۱۶ از ابو داؤد۔ باب ما لا یدعی علی الحدود۔ فصل اول) دیکھئے! یہ ان حضرات کا مقام ہے۔

اور ان صحابیہ کا جو قصہ ہے اس کے متعلق حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عورت ہونے کے باوجود ان کی بے چینی دیکھئے۔ دوسری کتبِ حدیث میں روایت اس طرح بھی ہے کہ وہ آئیں اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے پاک کیجئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کیا ہوا؟ کہا: مَیں نے زنا کا ارتکاب کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: چلی جاؤ۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آ کر کہتی ہیں: یارسول اللہ! میرے پیٹ میں تو زنا کی وجہ سے بچہ بھی ہے، مجھے پاک کیجئے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو! تمہارے پیٹ میں بچہ ہے، جب تک وہ پیدا نہ ہو جائے؛ وہاں تک تجھ پر سزا جاری نہیں کی جاسکتی، اس لئے ابھی تو چلی جا۔ وہ چلی گئی، اس پر کوئی پہرہ مقرر نہیں کیا گیا، اس کے خلاف کوئی وارنٹ جاری نہیں کیا گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا

تو اس بچے کو لے کر آئی۔ کسی کو بلانے کے لئے نہیں بھیجا گیا اور اس نے کہا: یارسول اللہ! بچہ پیدا ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ابھی تو یہ تیرے دودھ کا محتاج ہے، اگر ابھی ماں کو سزا دے کر ختم کر دیا جائے تو بچے کا کیا ہو گا؟ بچہ بڑا کیسے ہو گا؟ ابھی دودھ پلاؤ جب وہ تیرے دودھ سے بے پرواہ اور مستغنی ہو جائے؛ تب آنا۔ ایک زمانے کے بعد وہ پھر آئیں ایسی حالت میں کہ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا اور وہ کھا رہا تھا، اور کہا: یارسول اللہ! اب تو یہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا۔ حضور ﷺ نے بچہ اس کے پاس سے لے کر تربیت کے واسطے ایک اور شخص کے حوالے کیا اور پھر ان کے اوپر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔

روایت میں آتا ہے کہ اس کے انتقال کے بعد نبی کریم ﷺ نے جنازہ کی نماز پڑھائی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ﴿تُصَلِّي عَلَيْهَا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَقَدْ زَنَتْ؟﴾ اے اللہ کے رسول! اس نے تو زنا کا ارتکاب کیا تھا اور آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھ رہے ہیں؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ سَبْعِيْنَ مِنْ أَهْلِ الْمَدِيْنَةِ لَوَسِعَتْهُمْ﴾ اس عورت نے ایسی زوردار توبہ کی ہے کہ اگر مدینہ کے ستّر (۷۰) آدمیوں پر تقسیم کی جائے تو ان کے لئے کافی ہو جائے یعنی ان کے گناہ معاف ہو جائیں۔ پھر آگے حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿وَهَلْ وَجَدْتَ أَفْضَلَ مِنْ أَنْ جَادَتْ بِنَفْسِهَا لله عَزَّ وَجَلَّ﴾ اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے واسطے قربان کر دیا۔ کوئی پکڑنے تو نہیں گیا تھا؟ اس نے اپنے آپ پر اللہ کے حکم کو جاری کرنے کے واسطے خود کو پیش کیا، اس نے کتنی اونچی توبہ کی؟

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ جس وقت اس کو سنگسار کر رہے تھے اس کے خون

کا کوئی قطرہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے جسم پر آ کر لگا تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کوئی سخت جملہ کہا، اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر چنگی کا ایسا افسر جو ظلم کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہو؛ وہ بھی اگر ایسی توبہ کر لیتا تو اس کی بھی معافی ہو جاتی۔

(مشکوۃ ص ۳۱۰ از مسلم کتاب الحدود فصل اول)

بہر حال دیکھئے! توبہ کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک شان تو یہ تھی، انہوں نے شریعت کی تکمیل کے لئے اور احکام کو لوگوں کے واسطے نمونہ بنا کر پیش کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا، یہ ان کی شان تھی، اس کی وجہ سے ان کے مقام اور مرتبے میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اہل سنت والجماعت کا یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ بڑے سے بڑا ولی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تمام امت میں افضل ہیں۔

﴿لالچ کسی حد پر نہیں ٹھہرتی ہے﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں ﴿لَوْ أَنَّ لِابْنِ اٰدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُوْنَ لَهُ وَادِيَانِ وَلَنْ يَّمْلَأَفَاهُ اِلَّا التُّرَابُ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰى مَنْ تَابَ﴾ کہ انسان کی حرص اور لالچ کا حال یہ ہے کہ اگر اس کے پاس ایک وادی سونے کی بھری ہوئی ہو۔ دو پہاڑیوں کے بیچ کا جو خلا اور سپاٹ زمین ہوتی ہے اس کو وادی کہتے ہیں جس کو گجراتی میں (ખાડી) بولتے ہیں، بہت بڑا خلا ہوتا ہے کوئی معمولی نہیں، بڑے بڑے مکانات اور بڑی بڑی عمارتیں بن جاتی ہیں۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس ایک وادی سونے کی بھری ہوئی ہو، کوئی دو چار کوڑیوں کا تذکرہ نہیں ہے، یا دو چار کنٹینر (container) کا تذکرہ نہیں ہے، دو چار اسٹیمر (steamer)

کا تذکرہ نہیں ہے، ایک وادی جس میں کئی سو اسٹیمر (steamers) آسکتی ہیں۔ تو کہتے ہیں کہ پوری وادی سونے کی ہو تو انسان کی لالچ کا حال یہ ہے کہ وہ یوں تمنا کرے گا کہ دو ہو جائیں، دو ہوں تو تیسری کا، تین ہوں تو چوتھی کا، یوں سلسلہ جاری رہے گا۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کے منہ کو مٹی ہی بھرتی ہے۔ قبر کی مٹی بھرے گی یعنی جب تک زندہ ہے وہاں تک تو اس کا لالچ ختم ہوتا نہیں ہے، اسی لالچ میں تو معلوم نہیں انسان کیا کیا کر ڈالتا ہے۔ حالانکہ آدمی کی ضرورت کے لئے تھوڑا سا کافی ہوتا ہے۔ آپ دنیا میں ایسے تو بہت سارے لوگوں کو دیکھیں گے کہ ان کی ضرورت کے لئے بہت کچھ موجود ہے، پھر بھی وہ اپنے آپ کو اور زیادہ حاصل کرنے کے واسطے کھپا رہے ہیں۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے۔

﴿لالچ کے نقصان سے اپنے آپ کو کیسے بچائے؟﴾

آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿ویتوب اللہ علیٰ من تاب﴾ اسی لئے یہ روایت لائے ہیں کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر مہربانی فرماتے ہیں یعنی اگر وہ اپنے آپ کو گناہوں اور نافرمانی سے بچائے، حرص اور لالچ میں آکر نافرمانی کا ارتکاب نہ کرے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرتے ہیں۔

﴿توبہ کا کرشمہ﴾

ایک اور روایت ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں ﴿یَضْحَکُ اللہُ سبحانہ وتعالیٰ اِلیٰ رَجُلَیْنِ یَقْتُلُ اَحَدُھُمَا الْاٰخَرَ، یَدْخُلَانِ الْجَنَّۃَ. یُقَاتِلُ ھٰذَا فِیْ سَبِیْلِ اللہِ فَیُقْتَلُ. ثُمَّ یَتُوْبُ اللہُ عَلَی الْقَاتِلِ، فَیُسْلِمُ فَیُسْتَشْھَدُ (مشکوۃ ص ۳۳۰)﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ دو آدمیوں کو دیکھ

کر بڑے خوش ہوتے ہیں اوران سے راضی ہیں کہ ان میں سے ایک نے دوسرے کو قتل کیا اور دونوں جنت میں جائیں گے۔یہ کیسے؟ ایک کافر تھا، دوسرا مسلمان۔دین کی خاطر دونوں میں جنگ ہوئی اوراس کافر نے مسلمان کو قتل کر دیا تو مسلمان شہید ہو گیا اور شہید ہو کر جنت میں چلا گیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کافر کو بھی ایمان کی توفیق دی اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں شہید ہوا اور وہ بھی جنت میں چلا گیا، دونوں جنت میں، قاتل بھی اور مقتول بھی۔دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو بھی ایمان کی توفیق مل جائے۔

تاریخ میں اس کی مثال

روایتوں میں ایک عجیب وغریب واقعہ آتا ہے۔حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے۔جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہوتے ہیں، حضرت انسؓ کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، ان کی والدہ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے دوسرا نکاح کیا تھا۔تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سوتیلے ابا سے کہا کہ کوئی چھوٹا بچہ ایسا ہو جو گھر کے کام کاج میں مدد کرے؛ تو لے آؤ۔حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مجھے اونٹ پر بٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گئے کہ یہ میرا بچہ ہے۔اُس وقت اُن کی عمر دس سال کی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد دس سال مدینہ منورہ میں رہے، انھوں نے دس سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی حضور کی وفات کے وقت بیس سال کی عمر تھی۔ان کے ماموں حرام بنِ مَلْحَان رضی اللہ عنہ تھے، غزوۂ بئرِ معونہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیجا تھا اس جماعت میں یہ بھی تھے۔اس قبیلے کے سردار کو دینے کے واسطے ان کو ایک خط بھی دیا تھا، وہ بڑا شریر تھا،

بعد میں کفر کی حالت میں ہی مرا، خط دینے کے لئے یہ پہنچے اور انھوں نے اس کو جب حضور ﷺ کا خط پیش کیا اور اس کو معلوم تھا کہ یہ لوگ آرہے ہیں تو اس نے پہلے سے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کر دیا تھا، یہ ادھر خط دے رہے تھے کہ پیچھے سے اس کے آدمی نے ان کو نیزہ مارا جس کی وجہ سے خون کا فوارہ نکلا، وہ صحابی اس خون کو ہاتھ میں لے کر چہرے پر مل رہے تھے اور بول رہے تھے ﴿فُـزْتُ وَرَبِّ الْـكَـعْبَةِ﴾ کعبہ کے رب کی قسم! میں کامیاب ہو گیا۔ سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہو گیا تو جس نے بھالا مارا تھا وہ تو کافر تھا، بعد میں وہ لوگوں سے پوچھتا ہے کہ یہ کیا کہہ رہے تھے؟ ﴿فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ﴾ یہ کامیابی کیسی؟ اس کو بتلایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شہید ہو گئے، اب تو سیدھے جنت میں جائیں گے۔ اس نے کہا: اچھا! پھر تو میں بھی ایمان لے آتا ہوں۔ وہ بھی مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

بہر حال! توبہ کا یہ کرشمہ ہے کہ کفر کی حالت میں ایک مؤمن کو قتل کیا تھا لیکن جب توبہ کر کے ایمان لے آئے اور اس کے بعد خود بھی شہید ہوئے تو وہ بھی جنت میں جائیں گے، دونوں جنت میں جائیں گے۔ یہ توبہ ہی کا کرشمہ بتلانا چاہتے ہیں۔

اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ توبہ کی وجہ سے آدمی کے گناہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معاف ہو جاتے ہیں۔

﴿گنہ گار کے خلاف چار گواہ﴾

دیکھئے! آدمی جب گناہ کرتا ہے تو علماء نے لکھا ہے کہ اس گناہ پر اللہ تعالیٰ کے یہاں چار گواہ قائم ہوتے ہیں، ایک تو جب وہ گناہ کرتا ہے تو زمین کے جس خطہ پر اس نے

گناہ کیا ہے، زمین کا وہ حصہ اس کے خلاف قیامت کے دن گواہی دے گا۔قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے﴿ یَوْمَئِذٍتُحَدِّثُ اَخْبَارَھَابِاَنَّ رَبَّکَ اَوْحٰی لَھَا﴾ کہ زمین اپنے سماچار(સમાચાર)اور خبریں دے گی۔ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ یہ آیت تلاوت فرمائی اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: جانتے ہو اس کی خبریں کیا ہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے روز زمین کا وہ حصہ جس پر آپ نے نیکی کا کام کیا ہے آپ کے حق میں گواہی دے گا اور گناہ کا کام کیا ہے تو آپ کے خلاف گواہی دے گا (ترمذی ۲/۱۷۳، ابواب التفسیر) جس زمانے میں یہ آیتیں اتری تھیں اس وقت یہ چیزیں عجیب سی معلوم ہوتی تھیں لیکن آج جب سائنس نے اتنی ترقیاں کی ہیں تو اب زمین کی گواہی کوئی بعید چیز معلوم نہیں ہوتی ہے۔آج کل تو ٹیپ ریکارڈ اور پتہ نہیں کیا کیا چیزیں ایجاد ہو چکی ہیں اور گناہ کا ثبوت پیش کرنے کے واسطے دیکھنے والے انسان ہی کا ہونا ضروری نہیں۔تو ایک گواہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ قائم کیا جاتا ہے۔

دوسرے گواہ فرشتے ہیں﴿کِرَامًا کَاتِبِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَاتَفْعَلُوْنَ ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے اعمال لکھنے کے واسطے کچھ باعزت فرشتے ہیں،آدمی کوئی بھی کام کرتا ہے نیکی کا یا برائی کا؛ وہ ان کو معلوم ہے، وہ لکھ لیتے ہیں۔

تیسرا اس کا نامۂ اعمال جو اسی لئے لکھا گیا ہے﴿وَاِذَاالصُّحُفُ نُشِرَتْ ﴾ قیامت کے روز جب انسانوں کے اعمال نامے پھیلائے جائیں گے۔ بلکہ قرآن پاک میں ہے کہ انسان کو اس کا نامۂ اعمال دے دیا جائے گا کہ تم خود اپنے عمل کو پڑھ لو کہ کیا ہے اور اس وقت جب اپنے نامۂ اعمال کو دیکھے گا تو چھوٹی چھوٹی باتیں جو دنیا میں خود کر کے

بھول گیا تھا؛اس میں موجود پائے گا،تو کہے گا﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّ لَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾کیا بات ہے یہ دستاویز اور ریکارڈ تو عجیب وغریب ہے، ہر چیز اس میں موجود ہے،چھوٹا گناہ کیا تھا؛وہ بھی اس میں موجود ہے، بڑا گناہ کیا تھا؛وہ بھی اس میں موجود ہے۔کوئی چیز اس نے تو چھوڑی ہی نہیں ہے۔آدمی یہ دیکھ کر پریشان ہوجائے گا۔

اور چوتھا گواہ اس کے اعضاء ہوں گے﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَ تُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ﴾قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کام کاج قانون کے مطابق ہوگا، دنیا میں بھی کوئی کیسا ہی بڑا گنہگار ہو، کھلم کھلا گناہ کیا ہو، ساری دنیا نے اس کو گناہ کرتے ہوئے دیکھا ہو، تب بھی جب معاملہ کورٹ کچہری میں جائے گا؛ تو باقاعدہ کیس چلے گا۔کام ہوتا ہے پانچ منٹ کا،لیکن گواہی اور ثبوت وغیرہ میں وقت لگ جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی کام قانون سے ہوگا۔

﴿قیامت کے دن کارروائیاں قانونی ہوں گی﴾

قیامت کے روز تو خود نبیوں کو جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تھا کہ لوگوں تک اللہ تعالیٰ کے پیغام پہنچائیں، ان سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مطالبہ ہوگا کہ تم نے ہمارا پیغام پہنچایا؟ جلیل القدر انبیاءِ کرام میں سب سے پہلے پیغمبر حضرت نوح جن کے متعلق حدیث میں اوّلُ رسولٍ آیا ہے ان کو بلایا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ ہم نے اپنا پیغام دے کر اپنے بندوں تک پہنچانے کے واسطے بھیجا تھا، رسول بنایا تھا، آپ نے پیغام پہنچایا؟ وہ کہیں گے: ہاں! پہنچایا تھا۔ان کی امت کو بلائیں گے، ان سے سوال کیا جائے گا کہ ان کو بھیجا تھا، انھوں نے ہمارا پیغام پہنچایا؟ وہ یوں کہیں گے: نہیں! ہمارے پاس

تو کوئی نہیں آیا ﴿مَا جَآءَ نَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ﴾ ہمارے پاس کوئی آیا ہی نہیں، ڈرانے والا، نہ خوشخبری سنانے والا، یہ کیسی بات کرتے ہیں۔ اب حضرت نوح علیہ السلام سے باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: یہ تو یوں کہتے ہیں، تمہارے پاس کوئی گواہ ہیں؟ وہ کہیں گے: ہاں! ہیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: کون ہیں؟ تو حضرت نوح علیہ السلام امتِ محمدیہ کو گواہ میں پیش کریں گے، امتِ محمدیہ کو بلایا جائے گا، وہ گواہی دے گی کہ ہاں! حضرت نوح علیہ السلام نے پیغام پہنچایا تھا۔ گواہ کے اوپر جرح کی جاتی ہے (ઉલટ તપાસ) کی جاتی ہے، تو امتِ محمدیہ سے کہا جائے گا کہ تم تو بہت دیر بعد دنیا میں آئے تھے؟ حضرت نوح کا زمانہ تو بہت پہلے کا ہے، پھر تم کیسے گواہی دیتے ہو؟ تو امتِ محمدیہ کہے گی کہ باری تعالیٰ! آپ نے اپنی کتاب قرآنِ پاک اپنے آخری نبی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور آپ کے اس کلام میں موجود ہے کہ نوح نے آپ کا پیغام اپنی قوم تک پہنچایا۔ آپ کے کلام ہی سے ہم کو معلوم ہوا، اس لئے ہم گواہی دے رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم امتِ محمدیہ کی تائید فرمائیں گے کہ ہاں! یہ صحیح کہتے ہیں، مَیں تائید کرتا ہوں۔ وہاں کام قانون سے ہوگا، کوئی بھی گنہ گار ہو، اس کے خلاف گواہ قائم کئے جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ یہ کفار جنہوں نے گناہ کے کام کئے تھے اور کفر کیا تھا یا مشرکین جنہوں نے شرک کیا تھا وہ جب دیکھیں گے کہ یہاں تو گواہوں سے کام چلتا ہے تو کہیں گے: اچھا موقعہ ہے، گناہوں سے انکار کردو، چنانچہ وہ کہیں گے: ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ خدا کی قسم! ہم نے شرک کیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے یوں کہیں گے، ہم نے کیا ہی نہیں تھا، بالکل صاف مُکَر جائیں گے، صاف انکار کردیں گے۔ اب وہ یوں سمجھ

رہے ہیں کہ ہمارے خلاف کون گواہی دے گا؟ باری تعالیٰ ان کی زبانوں اور ہونٹوں کو بند کردیں گے ﴿اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاهِهِمْ وَ تُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ﴾ آج ہم ان کی زبانوں پر مہر لگادیں گے اور ان کے ہاتھ ہم سے بات کریں گے اور ان کے پاؤں ان کے خلاف گواہی دیں گے اور دوسرے اعضاء گواہی دیں گے ۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بائیں ران سب سے پہلے بولے گی۔ انسان ان اعضاء سے کہے گا کہ تمہاری خاطر تو میں نے یہ سب کچھ کیا تھا، آج تم ہی میرے خلاف گواہی دے رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ گویائی کے لئے کسی عضو کا پابند نہیں ہے۔

﴿توبہ کی اسپرٹ﴾

بہرحال! یہ چوتھا گواہ ہے، انسان کے خلاف یہ چار گواہ ہیں، لیکن حدیث میں آتا ہے کہ جب انسان توبہ کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے وہ گناہ فرشتوں کو بھلا دیتے ہیں، زمین کے جس حصے پر وہ گناہ کیا تھا، اس حصے سے وہ علامتیں مٹادی جاتی ہیں، اور اس کے نامۂ اعمال میں سے بھی نکال دئے جاتے ہیں اور اس کے اعضاء سے بھی بھلا دئے جاتے ہیں، چاروں گواہ ختم ہوگئے، معافی لکھ دی گئی۔

﴿حاکمین اور احکم الحاکمین میں فرق﴾

ہمارے اکابرین نے لکھا ہے کہ دنیا میں تو یہ ہے کہ سرکار کی طرف سے اگر کسی کو معاف بھی کردیا جائے تب بھی ایک فائل محفوظ رکھی جاتی ہے، اس کا ریکارڈ محفوظ رکھا جاتا ہے کہ وقت پر کام آئے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بھی محفوظ نہیں۔ بس بھائی! توبہ کی کہ سارا ریکارڈ بھی ختم ہوگیا۔ وہ غنی ہے، اس کو کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ سارے زمین و

آسمان بھر کر گناہ لے کر جاؤ، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی مغفرت کر دیتے ہیں۔ توبہ تو کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ ان سب گواہوں سے گناہوں کو بھلوا دیتے ہیں۔

سچی توبہ کے بعد اس گناہ کا تذکرہ بھی نہیں کرنا چاہیے

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں ان کا مقولہ پڑھا۔ وہ فرماتے تھے: جب تم نے سچے دل سے توبہ کر لی، تو اب گناہ کو بھول جاؤ اب اس کو بار بار یاد مت کرتے رہو، سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد اس گناہ کو یاد کرنا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتِ مغفرت کی ناقدری ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرما دیا: سچے دل سے توبہ کرلو؛ مَیں معاف کر دیتا ہوں۔ اب پھر یاد کر کے گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے گرچہ بھلا دیا، لیکن مَیں تو یاد رکھوں گا۔ یہ کیسی بات ہے؟ شیطان ترقی کو ناپسند کرتا ہے آدمی کو کسی کل چین لینے نہیں دیتا۔ ایک تو وہ آدمی گنہ گار رہے، گناہ سے توبہ کر کے آیا، اب شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے کہ ارے! اتنے سارے تو گناہ کئے ہیں اب توبہ بھی کی؛ تو کیا ہوگا؟ وہ گناہ یاد دلواتا ہے۔

پلّے باندھنے کی بات

اس لئے کہتے ہیں کہ ماضی کو تو بھول جاؤ۔ توبہ کر لی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی سب معاملہ ختم کر دیا ہے، اب تو آپ کا کام نئے سرے سے چلے گا، حساب کتاب صاف ہو گیا، کلین (clean) ہو گیا۔ ماضی کو بھول جایئے، حال کو دھیان میں رکھئے اور درست کیجئے، مستقبل کا ابھی فکر نہیں کرنا ہے۔ اس وقت گناہوں سے بچیں۔ شیطان ماضی پر افسوس دلا کر اور مستقبل کا فکر ڈال کر حال سے غافل کر دیتا ہے۔ اور اصل تو حال ہے۔ یہ حال ابھی

کچھ دیر کے بعد ماضی بن جائے گا اور آنے والا مستقبل ہے، اس لئے اصلاً ہمیں فکر حال کی کرنی ہے کہ اس وقت جو موجودہ حالت ہے ہمیں اس میں یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے، اس میں کون سی کر رہے ہیں اور جس سے منع کیا ہے، اس میں سے کس سے بچ رہے ہیں۔ کوئی گناہ تو اس وقت نہیں ہو رہا ہے۔ دو ہی چیزیں ہیں گناہوں سے بچو اور طاعات اور نیکی کا اہتمام کرو۔ بس! پہنچ گئے۔ حال کو درست کرلیا، سب معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ یہ تو شیطان کی ایک چال ہے کہ آپ کو اِدھر اور اُدھر، پیچھے اور آگے میں پھانس کر حال سے غافل کر دے۔ وہ تو آپ کو ضائع کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے سچے دل سے توبہ کرلی، اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی آپ کے گناہ معاف کر دئے گئے، اب بھول جاؤ۔ اور حال کو درست کرو، مستقبل کی فکر مت کرو۔ یہی حال آگے بڑھتا رہے گا اور مستقبل حال میں تبدیل ہوتا رہے گا اور معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔

توبہ...... راہِ سلوک کا پہلا قدم

بہر حال! یہ توبہ ہی اصل ہے۔ دیکھئے! آدمی جب راہِ سلوک میں قدم رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اہل اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم کرتا ہے؛ تو سب سے پہلے وہ توبہ ہی کراتے ہیں۔ اَوَّلُ اَقْدَامِ المریدین اہل ارادت کا اولین قدم توبہ ہے بزرگوں کے پاس جب آپ بیعت ہونے کے لئے جاتے ہیں تاکہ ان کی نگرانی میں، ماتحتی میں اور سرپرستی میں اللہ تعالیٰ تک رسائی حاصل کریں، چونکہ وہ اس راہ کو طے کئے ہوئے ہیں، اس راہ کے نشیب وفراز سے واقف ہیں، تو ایک آدمی جو راہ چل چکا ہو، تو نئے لوگ چلے ہوئے کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہیں؛ تاکہ ہمارے لئے آسانی رہے۔ لہٰذا ان کی

نگرانی اور سرپرستی میں جب سلسلہ شروع کیا جاتا ہے تو سلوک کی سب سے پہلی منزل توبہ ہے۔ جب بیعت کرتے ہیں تو کیا کراتے ہیں؟ توبہ ہی کراتے ہیں کہ اب تک جو گناہ ہوئے ہیں، اس سے توبہ کرو اور آئندہ کے لئے پکا عہد کرو کہ اب میں ان گناہوں کا ارتکاب نہیں کروں گا۔ یہی تکمیلِ توبہ ہے۔ یہ اولین منزل ہے۔ تو اصل توبہ ہے۔ ہم لوگ ابھی توبہ ہی کو مکمل کئے ہوئے نہیں ہوتے ہیں اور معلوم نہیں کون سے بڑے بڑے مقامات کو حاصل کرنے کی حرص رکھتے ہیں۔ ایں خیال است ومحال است وجنوں والا معاملہ ہے۔

اجمالی توبہ اور تفصیلی توبہ

دیکھئے! شروع میں جب توبہ کی تفصیل بتلائی تھی تو ایک بات بتلانا بھول گیا تھا۔ وہ بھی بتلا دوں کہ توبہ میں ایک شکل تو یہ ہے کہ جب گناہوں سے مجلس میں بیٹھ کر توبہ کرنا چاہتے ہیں تو گناہوں کو یاد کر کے توبہ کریں، جیسے نمازیں چھوٹی ہیں، قضا ہوئی ہیں، ان سے توبہ کی۔ یہ سب تو اجمالی توبہ ہوئی۔ تفصیلی توبہ یہ ہے کہ ان میں سے جن کی تلافی ممکن ہے؛ ان کی تلافی میں لگ جایئے۔ بھئی! آج تک کی ہماری عمر تیس سال کی ہوئی، آج تک تو نمازیں نہیں پڑھیں، اب اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور توبہ کی اور آئندہ کے لئے پکا ارادہ کرلیا کہ نمازوں کا اہتمام کریں گے، لیکن یہ جو نمازیں چھوٹی ہیں، توبہ کی وجہ سے ان کا گناہ تو معاف ہوگیا، لیکن اس کی تلافی کرنی ہے، نمازیں ادا کرنی ہے۔ تفصیلی توبہ یہ ہے کہ آپ آج ہی اپنی ڈائری میں لکھ لیجئے کہ آج فلاں تاریخ کو میرے اوپر اتنے دنوں کی نمازیں قضا کرنی باقی ہیں، اس طرح حساب لگالو، آدمی بالغ اس وقت ہوتا ہے کہ اس کو احتلام ہوجائے یا لڑکی ہو تو اس کو حیض آجائے یا پندرہ سال کی عمر ہوجائے تو بالغ ہوگیا، وہیں سے

نماز کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اب تیس سال پر جا کر توفیق ہوئی؛ تو پندرہ سال کی نمازوں کی قضا کرنی ہے۔ لہٰذا آج تاریخ لکھ لیجئے کہ آج ۱۹/اکتوبر کو میرے اوپر پندرہ سال کی نمازوں کی قضا واجب ہے، اور مَیں اس کو شروع کر رہا ہوں، اگر اس کے پورا کرنے سے پہلے میری موت آجائے؛ تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال میں سے اس کا فدیہ ادا کیا جائے۔ یہ اس کے لئے ضروری ہے۔

﴿ حقوقِ واجبہ کی وصیت ضروری ہے ﴾

دیکھو! حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ وہ آدمی جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کے اوپر دو راتیں ایسی نہیں گذرنی چاہئیں کہ کوئی قابلِ وصیت چیز ہو اور اس کی وصیت لکھی ہوئی موجود نہ ہو (مشکوۃ ص ۲۶۵ باب الوصایا فصل اول از بخاری ومسلم) ہماری نمازیں باقی ہیں، روزے باقی ہیں، بہت سارے حقوق باقی ہیں، اتنی ساری تو وصیت کی چیزیں ہیں اور پھر بھی ہم وصیت تیار نہ رکھیں؟ وصیت تو ہمارے پاس ہر حال میں موجود رہنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے اور سچی پکی توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---دعا---

سُبْحَانَکَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰهَ غَیْرُکَ لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰہ اَلْاَحَدُالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدًا. لَااِلٰهَ اِلَّااللّٰہ اَلْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ. اَللّٰهُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّهٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّهٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّهٗ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّهٗ. اَللّٰهُمَّ

لَآاُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰیٓ اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍصَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِھَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئَاتِ وَتَرْفَعُنَابِھَاعِنْدَکَ اَعْلٰی الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِھَآ اَقْصٰی الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَالْمَمَاتِ. اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! ہم بے حد گنہ گار ہیں۔ گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اے اللہ! تو محض اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں کے دلدل میں سے نکال دے۔ اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی، اساتذہ ومشائخ کی، دوست واحباب کی، محسنین ومتعلقین کی، جنہوں نے ہم کو دعاؤں کے لئے کہا یا لکھا، یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں ان کی اور تمام مؤمنین و مؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے ظاہر وپوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری سیئات کو حسنات سے مبدّل فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کی پوری پوری مغفرت فرما کر بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اور بھی جن لوگوں نے اپنے بیماروں کی صحت کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں اے اللہ! ان تمام کے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی

ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہونچ چکی ہے ان کو صالح جوڑ عطا فرما۔ جن کے لئے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما۔ اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما۔ جن کی اولاد نافرمان ہے ان کو مطیع وفرمانبردار بنادے جو لوگ نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما۔ اے اللہ! جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ایک مدت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ٹاڈا کے نام سے گرفتار ہے؛ اے اللہ! ان تمام کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب فرما۔ اے اللہ! محض اپنے فضل سے سب کے لئے رہائی مقدر فرما، اپنا خصوصی فضل فرما۔ اس امت کے حال پر رحم فرما۔ اے اللہ! جن لوگوں پر مقدمات ہیں عافیت کے ساتھ ان کو بری فرمادے۔ اے اللہ! جن کی جو جو حاجتیں ہیں محض اپنے فضل وکرم سے پوری فرما۔ اس مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں، اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما۔ اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر وبھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہیں اے اللہ! ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلیٰ اللّٰہُ تُعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ...

﴿صدائے دردِ دل﴾

مجھے تعجب ہے اس شخص پر جو گناہ اس لئے کرتا ہے کہ میں توبہ کرلوں گا اور توبہ اس لئے نہیں کرتا کہ ابھی زندگی لمبی ہے حالانکہ یہ نہیں جانتا کہ میری زندگی بہت تھوڑی ہے۔ امام غزالیؒ ایک کتاب میں فرماتے ہیں۔ ’’ اے دوست! تجھے کیا معلوم! بازار میں وہ کپڑا پہونچ چکا ہو جس سے تیرا کفن بننا ہے‘‘۔ یقیناً یہ انسان دھوکہ میں پڑا ہوا ہے۔

غنیمت سمجھ زندگی کی بہار...... آنا نہ ہوگا یہاں بار بار

(خطبات ذوالفقار)

درد بھری دعاء

آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لئے
بادلو! ہٹ جاؤ دیدو راہ جانے کے لئے
اے دعا ! ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا رخ پھیر دے اب گردش ایام کے
خَلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے
خوار ہیں بد کار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں
رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

صبر

مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. امابعد .

﴿صبر کے کچھ فضائل﴾

وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ بِشَیْئٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِیْنَ (سورۂ بقرۃ ۱۵۵) باری تعالیٰ فرماتے ہیں: کہ ہم تم کو کچھ خوف اور ڈر اور بھوک اور مال وجان اور پھلوں میں کمی کے ذریعہ سے آزمائیں گے، اور اے محمد! آپ صبر کرنے والوں کو بشارت سنا دیجئے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (سورۂ زمر ۱۰) جو صبر کرنے والے ہیں ان کو پورے پورا ثواب بغیر حساب کے دیا جائے گا۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ﴾ کہ جو آدمی صبر سے کام لے اور درگزر کرے، اپنے ساتھ زیادتی کرنے والے کو معاف کردے ﴿اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ بیشک یہ بڑی ہمت کے کاموں میں سے ہے (سورۂ شوریٰ ۴۳)

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ (سورۂ بقرۃ ۱۵۳) صبر اور نماز کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی مدد طلب کرو، اللہ تبارک وتعالیٰ صبر کرنے

والوں کے ساتھ ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ (سورۂ محمد۔۳۱) ہم تم کو برداشت میں آزمائیں گے تاکہ جان لیں کہ تم میں سے کون لوگ جہاد کرنے والے اور صبر کرنے والے ہیں۔

یہ کچھ آیتیں صبر کے سلسلہ میں پیش کیں اور آگے احادیث کو پیش فرمائیں گے۔

﴿صبر کا صحیح مفہوم﴾

ہم لوگ صبر کا ایک مفہوم اپنے ذہنوں میں بٹھائے ہوئے ہیں کہ کسی کے اوپر کوئی مصیبت آجائے اور اس مصیبت میں وہ تحمل سے کام لے یا کسی بیماری میں گرفتار ہوگیا اور اس نے جزع فزع نہیں کیا یا کسی عزیز قریب کا انتقال ہوگیا اور دھاڑیں مار مار کر نہیں رویا تب ہم یوں سمجھتے ہیں کہ اس نے صبر کیا، یہ صحیح ہے، جن چیزوں کو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صبر ہے، یہ بھی صبر ہے۔ لیکن صبر کا مفہوم اور مطلب انہیں چیزوں تک محدود نہیں۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے ''مفردات القرآن'' میں صبر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے ﴿حَبْسُ النَّفْسِ عَلٰى مَا يَقْتَضِيْهِ الشَّرْعُ وَالْعَقْلُ﴾ کہ شریعت اور عقل جن چیزوں کا تقاضہ کرتی ہے ان کو انجام دینے کے لئے آدمی کا اپنے نفس کو جمانا اور ان کو کرنے کے واسطے اپنے نفس کو ثابت قدم رکھنا۔ مثلاً شریعت نے نماز کا حکم دیا، تو یہ نماز کی بجا آوری کوئی آسان کام نہیں ہے، مثلاً فجر کی نماز کے لئے آدمی کو بڑا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ آدمی اپنی نیند چھوڑ کر بستر کو خیر باد کہہ کر اُٹھے، سردی کا زمانہ ہے تو پھر وضو کی زحمت بھی برداشت کرے اس کے بعد پھر نماز میں مشغول ہو، نماز کے لئے کھڑا رہنا اور نماز پوری ہونے تک

اس میں متوجہ رہنا، نماز کے تمام ارکان، واجبات اور مستحبات وغیرہ کی ادائیگی کا اہتمام کرنا؛ یہ ساری چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ آدمی خوب صبر اور تحمل سے کام لے۔

﴿جلد بازی سے نماز ناقص رہ جاتی ہے﴾

بہت سے لوگ جلد بازی کے اندر جلدی جلدی ان چیزوں کو انجام دے کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے نماز ناقص رہ جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ ایک موقعہ پر مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے ایک اعرابی آئے، جلدی جلدی نماز پڑھی اور واپس جاتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کو دیکھا تو سلام کیا ﴿السلام علیک یا رسول اللہ﴾ حضور اکرم ﷺ نے جواب دیا ﴿وعلیک السلام﴾ اور یہ بھی فرمایا ﴿اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ﴾ متفق علیہ (مشکوۃ ۵۷) کہ واپس جاؤ اور اپنی نماز دوبارہ پڑھو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی کیونکہ عجلت سے کام لیا تو بہت ساری چیزیں چھوٹ گئیں، جس اطمینان اور سکون سے نماز کے افعال ادا کرنے چاہئیں؛ وہ آپ نے ادا نہیں کیئے۔

تو ظاہر ہے کہ آدمی کا نفس تو یہ چاہتا ہے کہ جلدی سے بھاگے، لہٰذا نفس کے تقاضے کو دبا کر نماز کی ادائیگی کے لئے جو محنت اور مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے اس کو برداشت کرنا اور اس کی ادائیگی کے لئے اپنے آپ کو جمانا، نفس کو روکنا، اور نفس کے تقاضے کو دبانا، یہی صبر ہے۔

﴿عقل کے تقاضے پر جمے رہنے کی مثال﴾

اسی طرح بعض مرتبہ عقل کا تقاضہ ہوتا ہے مثلاً آدمی بیمار ہے اور بیماری کے اندر کڑوی دوا استعمال کرنا، نفس تو نہیں چاہتا کہ کڑوی دوا کو استعمال کرے لیکن عقل اس کے

خلاف اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ ابھی اس تھوڑی سی کڑواہٹ کو برداشت کرلیجئے اس کے نتیجہ میں جب صحت حاصل ہوجائے گی، اللہ تبارک وتعالیٰ تندرست کردیں گے اس کے بعد بہت ساری مٹھاسیں استعمال کرنے کے قابل ہوجاؤ گے اوراگراس کڑواہٹ کو برداشت نہیں کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیشہ کے واسطے مٹھاس کے استعمال سے محروم ہوجاؤ، تو عقل نے جس کام کا تقاضہ کیا تھا اس کی انجام دہی کے واسطے نفس کو روکا اور جمایا۔

اسی طریقہ سے بعض چیزوں سے شریعت اور عقل رکنے کا تقاضہ کرتی ہے، ان چیزوں سے رکنے کے واسطے نفس کو جمانا، نفس ان چیزوں سے رکنا نہیں چاہتا لیکن مشقت برداشت کرکے تکلیف اٹھا کر نفس کو ان چیزوں سے رکنے کے لئے آمادہ کریں؛ اس کا نام بھی صبر ہے۔

تو مطلب یہ ہے کہ شریعت یا عقل جن کاموں کی انجام دہی کا تقاضہ کرتی ہے ان کی انجام دہی کے لئے یا جن کاموں سے باز رہنے کا تقاضہ کرتی ہے ان کاموں سے باز رہنے کے لئے نفس کو آمادہ کرنا اور نفس کو اس کے اوپر جمانا؛ یہ صبر ہے۔ لہٰذا میں نے صبر کا جو مفہوم آپ کے سامنے پیش کیا اس میں بڑی وسعت ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی حکمت افشانی

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ آدمی جن حالات سے گذرتا ہے ان کو اگر دیکھا جائے تو وہ دو قسم کے ہیں۔ بعض وہ حالات ہیں جو آدمی کی طبیعت کے موافق ہیں اور بعض حالات وہ ہیں جو آدمی کی طبیعت کے خلاف ہیں، ان دونوں حالات میں صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔

﴿موافق حالات میں صبر کی زیادہ ضرورت﴾

جو حالات طبیعت کے موافق ہیں مثلاً آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے تندرست جسم عطا فرما رکھا ہے، تندرستی ہے، سلامتی ہے، مال و دولت کی کثرت ہے، اولاد کی کثرت ہے، اور اہل خاندان کی کثرت ہے، ماننے والے، محبت رکھنے والے، عقیدت رکھنے والے ان کی بھی تعداد بڑی ہے، عہدہ بھی ہے، منصب بھی ہے، حکومت بھی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کے ہر طرح کے اسباب بھی موجود ہیں، کسی چیز کی کوئی کمی نہیں، یہ سارے حالات وہ ہیں جو آدمی کی طبیعت کے موافق ہیں، ان حالات میں بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ طبیعت کے موافق حالات کے اندر صبر کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے اور ان حالات میں آدمی کا صبر سے کام لینا یہ زیادہ سخت ہے اُن حالات کے مقابلہ میں جو طبیعت کے خلاف ہیں۔ اسی لئے احادیث میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ جملہ آتا ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا جملہ کتبِ حدیث میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں ﴿أُبْتُلِيْنَا بِالضَّرَّآءِ فَصَبَرْنَا وَ ابْتُلِيْنَا بِالسَّرَّآءِ فَلَمْ نَصْبِرْ﴾ (ترمذی شریف ۶۴۲/۴) کہ ہم تکلیفوں کے ذریعہ سے آزمائے گئے تو ہم نے صبر سے کام لیا اور ہم راحت و آرام اور نعمتوں کے ذریعہ سے آزمائے گئے تو ہم صبر نہیں کر سکے۔ تو آدمی یوں نہ سوچ لے کہ جو حالات طبیعت کے موافق ہیں ان کے اندر صبر کی ضرورت نہیں پڑتی۔

﴿مال میں صبر کی ضرورت﴾

اسی طرح مال موجود ہے تو اس وقت بھی صبر کی ضرورت ہے، اولاد ہے تو اس میں بھی صبر کی ضرورت ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ

وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ ﴾ اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تم کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کردیں۔ معلوم ہوا کہ مال بھی کبھی آدمی کو اللہ سے ہٹانے کا اور اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر جو سلاطینِ مغلیہ کے سب سے آخری تاجدار ہیں ان کا ایک شعر حضرت قاری طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی تقاریر میں بار بار سنا:

ظفر آدمی اس کو نہ جانیے ☆ ہو چاہے جیسا بھی صاحبِ فہم وذکاء
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ☆ جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

آدمی کیسا ہی سمجھدار، عقل اور ہوشیاری والا ہو لیکن اگر عیش وآرام کے حالات میں اس نے اللہ کو یاد نہیں رکھا، اللہ کو بھول کر حرکتیں کرتا رہا اور غصے اور طیش کی حالت کے اندر اللہ کا ڈر نہ رکھا تو ایسا آدمی آدمی کہلانے کے لائق نہیں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ﴾ تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے بعض تمہارے دشمن ہیں ان سے بچ کر اور ڈر کر رہنے کی ضرورت ہے۔ وہ اولاد اور ازواج جو آدمی کو اللہ کے حکم پر عمل کرنے سے مانع بن جائیں، رکاوٹ بن جائیں، ظاہر ہے وہ آدمی کے دشمن بنے۔ معلوم ہوا کہ نعمت یعنی وہ حالات جو آدمی کی طبیعت کے موافق ہیں ان میں بھی آدمی مطمئن ہوکر نہ بیٹھے کہ صبر کی ضرورت نہیں، بلکہ اگر کسی آدمی کو خوب پیسہ ملا ہوا ہو؛ تو اسے بہت زیادہ اپنے نفس کو ضبط کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، ایک آدمی بھوکا ہے اور اس کے پاس روٹی بھی موجود نہیں اس کے لئے صبر کرنا آسان ہے لیکن اگر اس کے سامنے لذت بھرے اور بالکل عمدہ

قسم کے کھانے موجود ہیں تو اس حالت میں اس کے لئے صبر کرنا مشکل ہے، اسی طرح آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی طبیعت کے موافق چیزوں سے نواز رکھا ہے، مال و دولت کی ریل پیل ہے، حکومت بھی ہے، منصب بھی ہے، اور بہت کچھ موجود ہے، اولاد بھی ہے، تو اس صورت میں آدمی کے لئے صبر کی ضرورت زیادہ ہے۔

مال میں صبر کیسے حاصل ہو؟

اور وہاں صبر کا مطلب یہ ہوگا کہ ان چیزوں کے جو حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے اور یوں سمجھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے مال عطا فرمایا، صحت وتندرستی عطا فرمائی، اولاد عطا فرمائی، خوبصورت بیوی عطا فرمائی، منصب اور عہدہ عطا فرمایا، دنیا کی راحت وآرام کے دوسرے اسباب بھی عطا فرمائے، یہ ساری چیزیں جو اللہ نے مجھے دے رکھی ہیں یہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اور معلوم نہیں یہ امانت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کب واپس لے لی جائے، جب تک یہ امانت میرے پاس موجود ہے اس کے مالک نے اس میں جتنا اختیار مجھے دے رکھا ہے اسی کے مطابق میں اس کو استعمال کروں اور اس سے زیادہ اس میں مشغول نہ رہوں یہ ہے اس امانت کا تقاضہ اور اس کے حق کی ادائیگی۔

اسراف منع ہے

مال تو بہت سارا ہے لاکھوں روپے اللہ تعالیٰ نے دے رکھے ہیں اب ان لاکھوں روپیوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ ان کو فضول اڑاتے رہیں، بے جا صرف کرتے رہیں، آپ کی کھانے پینے کی ضرورت دس روپے سے پوری ہوجاتی ہے، اور وہاں پر آپ ایک ہزار اور ایک لاکھ روپے خرچ کر دیں اس کی اجازت نہیں دی گئی، مال آپ کی ملکیت

ہے اس کے باوجود شریعت نے پابندی رکھی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کچھ حدود قائم کئے گئے ہیں۔

﴿وضو میں بھی اسراف ہے﴾

شریعت تو عبادتوں کی ادائیگی میں بھی حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتی آپ وضو کر رہے ہیں، ظاہر ہے کہ وضو جو نماز جیسی بڑی عبادت کا ایک ذریعہ ہے، وہ خود بھی عبادت ہے اگرچہ وہ عبادتِ مقصودہ نہیں غیر مقصودہ ہے لیکن ہے عبادت۔ اس وضو کرنے کے دوران ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی احادیث میں آتا ہے نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا وضو میں بھی فضول خرچی ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں ﴿وَاِنْ کُنْتَ عَلٰی نَھْرٍ جَارٍ﴾ (رواہ احمد وابن ماجہ، مشکوۃ ۴۷) چاہے بہنے والی نہر پر بیٹھ کر آپ وضو کر رہے ہیں تب بھی اگر آپ ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کریں گے تو اس کا نام فضول خرچی ہے۔ مثلاً وضو میں تین مرتبہ چہرہ دھونا چاہیے، آپ بجائے تین مرتبہ کے چار مرتبہ دھوئیں گے تو یہ سنت سے تجاوز ہے اور فضول خرچی میں شمار ہے، چار مرتبہ دھونے کی اجازت نہیں۔ شریعت نے ایک حد بتلا دی اس سے زیادہ آپ استعمال کریں گے تو یہ فضول خرچی میں شمار ہوگا۔ تو جو شریعت عبادات تک میں ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی اور فضول خرچی کرنے کی اجازت نہیں دیتی وہ مباحات میں اور ہماری جو فطری ضروریات ہیں ان کی ادائیگی اور انجام دہی میں ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی کیسے اجازت دے گی۔

خرچ کرنے اور نہ کرنے کا ایک بہترین اصول

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس گُر کو سمجھے ہوئے تھے، ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے بار بار یہ سنا کہ ایک مرتبہ ایک ضرورت مند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور اپنی ضرورت پیش کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس وقت کچھ تھا نہیں جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ضرورت پوری فرما سکتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے یوں کہا کہ عثمان کے پاس جاؤ اور ان سے کہنا وہ تمہاری ضرورت پوری کریں گے۔ وہ آدمی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا، رات کا وقت تھا جب یہ ان کے مکان کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس نے سنا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود اپنی اہلیہ سے کوئی بات تنبیہ کے لہجے میں کہہ رہے ہیں، وہ کھڑا رہ گیا اور سنا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کو تاکید کر رہے تھے کہ تم نے چراغ کی لو ذرا تیز کر رکھی ہے اور اس کی وجہ سے تیل زیادہ جل رہا ہے اس کو دھیما کرو، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس طرح ڈانٹ رہے تھے، اس بات پر اپنی اہلیہ کو تنبیہ فرما رہے تھے اور اہلیہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی تھیں، اس آدمی نے جب سنا تو سوچا کہ آدمی اپنی بیوی کے لئے تو سب کچھ قربان کرتا ہے اور یہاں یہ تو چراغ کی لو ذرا تیز ہے اس میں بھی بیوی کو ڈانٹ رہے ہیں اور تنبیہ کر رہے ہیں اور بیوی بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں، بھلا یہ میری ضرورت کیا پوری کریں گے؟ وہ بجائے اس کے کہ ان کے سامنے اپنی بات رکھتا لوٹ آیا، دوسرے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ملاقات ہوئی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: بھئی! کیا ہوا تمہاری ضرورت پوری ہوئی؟ وہ خاموش رہا، پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا میں گیا تو تھا لیکن ان کے سامنے اپنی بات نہیں رکھی۔ پوچھا: کیوں؟ اس نے وجہ بتائی۔ آپ نے فرمایا:

ایسا نہیں ہے تم جاؤ اور اپنی ضرورت ان کے سامنے رکھو، اب حضور ﷺ نے تاکید کی تو وہ دوبارہ گیا اور بات کی، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فوراً اس کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ بہت کچھ دیا، جب وہ دے چکے اس کے بعد اس نے کہا: حضرت! میں اس سے پہلے بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا لیکن یہ صورت پیش آئی اس لئے واپس ہو گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بھائی! تم سمجھے ہی نہیں، ہم کو جہاں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں سب کچھ خرچ کریں گے اور جہاں خرچ نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے وہاں آدھا پیسہ بھی خرچ کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔

دیکھئے! کیا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس مال و دولت کی کمی تھی؟ معلوم ہوا کہ مال اگر میرے پاس ہے، لاکھوں روپے موجود ہیں، میں مالک ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کو اُڑاؤں۔ میرا نفس تو چاہے گا کہ اُڑاؤ، خوب گل چھرے اُڑاؤ، لباس میں بھی فضول خرچی کرو، کھانے پینے میں بھی کرو، سامان میں بھی کرو، مکان بنانے میں بھی کرو، سب چیزوں میں فضول خرچی سے کام لو۔

﴿چیزوں میں بھی ''لایعنی'' ہے﴾

آج کل تو ''لایعنی'' کا باب بہت بڑھ گیا ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ساتھ افریقہ جانا ہوا تھا (آج کل تو مکانوں کے اندر بھی زینت کیلئے بہت کچھ ہوتا ہے) ایک صاحب کے گھر میں ایک بہت بڑا پوٹ (pot) تھا جیسے کہ آج کل گھروں میں ہوتے ہیں، حضرت نے پوچھا: یہ کس کام کا ہے؟ کہا: یہ ایسے ہی رکھا ہے تو حضرت نے کہا: ہاں! جیسے باتوں میں لایعنی ہوتی ہے اسی طریقے سے چیزوں میں بھی لایعنی ہے۔ اب

جوغریب آدمی ہے اس کے یہاں تو ایسا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس کے پاس تو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی پیسہ نہیں لیکن جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نواز رکھا ہے تو وہاں ہوتا یہ ہے کہ زینت کے لئے گھر میں یہ چیز لائے وہ چیز لائے، ویسے دیکھا جائے تو اس کے بغیر کوئی کام اٹکا ہوا نہیں۔ حضرت سے کسی نے عرض کیا: حضرت! اب علاج کیا ہے؟ حضرت نے فرمایا: روزانہ ایک ایک چیز نکالتے رہو تو لایعنی سے نجات مل جائے گی۔

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ صبر کے معنی ہیں نفس کو روکنا، ظاہر ہے کہ نفس بے تحاشہ خرچ کرنا چاہتا ہے، اب نفس کو روکنا اسی کا نام صبر ہے۔ دولت کی ریل پیل میں صبر کی ضرورت پیش آئی۔

آپ کے پاس منصب اور عہدہ ہے آپ کا منصب آپ کا عہدہ اور آپ کی کرسی آپ کو کچھ آگے بڑھنے کے لئے کہہ رہی ہے، حدود سے تجاوز کرنے کے لئے کہہ رہی ہے آپ کا نفس تقاضہ کر رہا ہے آپ اس کو دبایئے تو کہا جائے گا کہ آپ نے صبر کیا۔

صبر کی ضرورت ہر جگہ

تو حقیقت یہ ہے کہ صبر کی ضرورت ہر جگہ پڑتی ہے۔ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ صبر کی ضرورت صرف ناموافق حالات میں پڑتی ہے؛ ایسا نہیں ہے، موافق حالات میں بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے، پیسہ موجود ہے تو صبر کی ضرورت ہے، اولاد ہے تو صبر کی ضرورت ہے۔

اولاد میں صبر کی ضرورت

اولاد کے متعلق بھی یوں آیا ہے کہ اولاد کہیں آپ کو اللہ سے غافل نہ کردے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿الولدُ مَبْخَلَةٌ مَجْبَنَةٌ او کما قال علیہ الصلوۃ والسلام﴾ کہ اولاد آدمی کو بخیل

بنانے والی ہے، بزدل بنانے والی ہے۔ (رواہ احمد، مشکوۃ ۴۰۳)

آدمی کو جہاں میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھلانے چاہئیں وہاں کبھی آدمی بزدل بن جاتا ہے، کاہے کی وجہ سے؟ یہ سوچ کر کہ میں مرجاؤں گا تو میری اولاد کا کیا ہوگا، اسی کے خیال میں تو بزدلی آتی ہے؟ مال خرچ کرنا ہے لیکن سوچتا ہے کہ میں خرچ کرتا رہوں گا تو اولاد کا کیا ہوگا؟ تو اولاد بزدل بھی بناتی ہے اور بخیل بھی بناتی ہے۔

نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے، اس دوران آپ نے دیکھا کہ آپ کے نواسے، حضرت فاطمہؓ کے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ سرخ قمیص پہنے ہوئے اور لڑکھڑاتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں، خطبہ دیتے دیتے نبی کریم ﷺ نے ان کو اس حالت میں دیکھا، آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں گر نہ جائیں، آپ نیچے اترے اور ان کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے آئے، اپنے سامنے بٹھا لیا اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: ﴿اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَاَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ﴾ (رواہ الترمذی وابوداود والنسائی، مشکوۃ ۵۷۱) اور حضور اکرم ﷺ نے ایک موقع پر وہ جملہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ اولاد آدمی کو بخیل بنانے والی، بزدل بنانے والی ہے۔

﴿تندرستی کا صحیح استعمال﴾

بہرحال! نعمت والی حالت میں بھی صبر کی ضرورت پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے تندرستی اور صحت عطا فرما رکھی ہے تو اس تندرستی اور صحت میں آدمی معلوم نہیں کیا کیا کرنا چاہتا ہے، اس وقت اپنی اس تندرستی کو اللہ کی مخلوق کی خدمت کے لئے استعمال کرنے والا بنے کہ میں اپنی اس صحت کے ذریعہ سے اپنے اس بدن کے ذریعہ سے کسی کو اگر فائدہ پہونچا سکتا ہوں کسی کی خدمت کر سکتا ہوں تو مجھے کرنی چاہئے، دنیا میں بہت سارے کمزور ایسے ہیں جو

خدمت کے محتاج ہیں، میں ان کی جتنی بھی ہوسکے خدمت کروں، تو اپنے بدن کی صحت کو اور تندرستی کو مخلوق کی خدمت کے لئے استعمال کرنا چاہیے۔

﴿مال کا صحیح استعمال﴾

مال ہے تو اس مال کے حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام کرنا، اسی طریقہ سے اگر اولاد ہے تو ان کے حقوق پورے کرنا، اور ان کے ذریعہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے اس کا اہتمام کرنا یا اللہ تعالیٰ نے حکومت کے عہدہ اور منصب سے نواز رکھا ہے یا اور کچھ دنیوی اسباب آپ کے پاس موجود ہیں تو ان تمام چیزوں میں صبر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس میں آدمی بے قابو ہوجاتا ہے۔ ان ساری چیزوں میں آدمی یوں سمجھے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی میرے پاس امانت ہے کسی نے آپ کو پیسے دے رکھے ہیں اور ساتھ ہی اجازت بھی دے رکھی ہے کہ تمہیں ضرورت ہو تو ضرورت کے مطابق استعمال کرنا۔ چاہے ہمارے پاس لاکھوں روپے موجود ہوں لیکن یہ اللہ کی امانت ہیں اور ہمیں تو اس میں سے ضرورت کے مطابق ہی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، ضرورت سے زیادہ استعمال کریں گے اسی کا نام فضول خرچی ہے اور فضول خرچی کے متعلق قرآن وحدیث میں ممانعت آئی ہے ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْن﴾ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں، میں ابھی بتلا چکا کہ عبادات کی ادائیگی میں بھی قرآن وشریعت نے فضول خرچی کی اجازت نہیں دی تو پھر ہماری دوسری چیزوں میں یعنی طبعی اور فطری ضروریات کی ادائیگی میں کیسے فضول خرچی کی اجازت ہوگی؟

﴿حساب کیوں؟﴾

معلوم ہوا کہ ہم اگر یوں سمجھیں کہ یہ پیسہ میرا ہے میں جس طرح چاہوں استعمال کروں؛ یہ صحیح نہیں ہے، کل کو اللہ میاں کے یہاں حساب دینا ہوگا، یہ امانت تھی تب ہی تو حساب دینا ہے ورنہ حساب کی کیا ضرورت پیش آئی؟

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿لَاتَزُوْلُ قَدَ مَاابْنِ آدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ عِنْدَ رَبِّهٖ حَتّٰی یُسْئَلَ عِنْ خَمْسٍ﴾ کہ انسان کے قدم اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے سے قیامت کے روز ہٹ نہیں سکتے یہاں تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق اس کو سوال نہ کیا جائے ﴿عَنْ عُمُرِهٖ فِیْمَا أَفْنَاهُ﴾ ایک تو عمر کے متعلق کہ عمر کو کہاں خرچ کیا؟ ﴿وَعَنْ شَبَابِهٖ فِیْمَا أَبْلَاهُ﴾ جوانی کو کہاں لگایا، جوانی کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا، معلوم ہوا کہ صحت جوانی تندرستی یہ اللہ کی نعمت ہے ﴿وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ أَیْنَ اِکْتَسَبَهُ وَ فِیْمَا أَنْفَقَهُ﴾ اور مال کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ ﴿وَمَاذَاعَمِلَ فِیْمَا عَلِمَ﴾ اور جو علم اللہ نے دیا تھا اس پر کتنا عمل کیا۔ یہ پانچ چیزیں ہیں۔ لہٰذا مال کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔ (رواہ الترمذی، مشکوۃ ۴۴۳)

﴿حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور حساب کتاب﴾

نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر فرمایا: میں نے دیکھا کہ وہاں تم بہت دیر میں میرے پاس پہنچے، میں تو تمہارے متعلق ذرا اندیشہ میں پڑ گیا تھا اور خطرہ محسوس کر رہا تھا لیکن دیر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مال کا حساب وکتاب دینے میں لگے تھے۔ تو آدمی طبیعت کے موافق حالات میں بھی صبر کا محتاج ہے۔

اوران حقوق کی ادائیگی کا نام ہی شکر ہے اوران حقوق کی ادائیگی کے لئے صبر کی ضرورت ہے، تو شکراور صبر دونوں ساتھ ہی لگے ہوئے ہیں۔

﴿مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں﴾

مال میں صرف زکوٰۃ کی ادائیگی سے کام نہیں چلتا اگرچہ زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہے لیکن حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ اشادفرماتے ہیں ﴿اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوٰی الزَّکوٰۃِ﴾ (مشکوٰۃ ۱۶۹) کہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور حقوق بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں یہ زکوٰۃ تو فرض ہے لیکن اگر کوئی غریب کوئی محتاج آ گیا، آپ نے دیکھا کہ فوری طور پر اس کی امداد کی ضرورت ہے، امداد کردی، آپ کے پاس سواری ہے، کوئی آدمی اچانک کسی سے ٹکرا گیا اور ایکسیڈنٹ ہوگیا اب اس کو ہسپتال پہنچانا ہے، آپ اپنی سواری کے ذریعہ جلدی سے پہنچا دیجئے۔ تو مطلب یہ ہے کہ موافق حالات میں بھی آدمی کو صبر کی ضرورت ہے۔ نفس تو بہت کچھ حدود سے تجاوز کرنا چاہے گا، لذتوں میں مشغول ہونا چاہے گا، آگے بڑھنا چاہے گا، لیکن آپ اس کو ایسا کرنے نہ دیں۔

﴿صبر کی قسمیں﴾

اسی لئے صبر کے بھی مختلف حالات میں مختلف نام رکھے گئے ہیں۔ مثلاً مالداری کے اندر یہ نفس جو فضول خرچی کرکے آگے بڑھنا چاہتا ہے اس کو روکنا؛ اسی کا نام ''ضبط النفس'' ہے، اس صبر کو ''ضبطِ نفس'' سے تعبیر کیا اور اگر کوئی اس طرح نہ روکے بلکہ اتراہٹ اور فضول خرچی میں مبتلا ہو جائے تو اس کو ''بطر'' سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ پاک میں ہے:

﴿وَلَاتَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ خَرَجُوْامِنْ دِیَارِھِمْ بَطَرًاوَّرِئَآءَ النَّاسِ﴾

ترجمہ:- اورتم ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اپنے گھروں سے نکلے اتراتے ہوئے اورلوگوں کو دکھانے کے لئے۔

﴿ناموافق حالات کی تین قسمیں﴾

ناموافق کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت کے خلاف اوراس کی پسند کے خلاف جوحالات پیش آتے ہیں، ان کی تین قسمیں کردی ہیں ایک تو وہ جوآدمی کے اختیار میں ہے یعنی آدمی اپنے اختیار سے اس کوانجام دیتا ہے۔اوردوسرے وہ جس کا آنا تو اختیار میں نہیں لیکن دفاع آدمی کے اختیار میں ہے۔اورتیسری وہ صورت کہ جس کا آنا بھی آدمی کے اختیار میں نہیں اوردفاع بھی آدمی کے اختیار میں نہیں۔

آنا بھی آدمی کے اختیار میں نہیں اوردفاع بھی آدمی کے اختیار میں نہیں جیسے ''مصائب''۔کوئی مصیبت آگئی تو مصیبت کا آنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں اوراس کا ہم سے دورہونا بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔

''بیماری ہے'' اب بیماری اللہ تعالیٰ نے دے دی تو آئی۔جب اللہ تبارک وتعالیٰ تندرستی عطا فرمائیں گے تب جائے گی۔اس کا آنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور جانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔

اورمثلاً اعضاء کے اندر کوئی فساداور بگاڑ پیدا ہوگیا وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔مال کے اندر کوئی دوسری مصیبت آگئی وہ بھی اسی قبیل سے ہے۔تو یہ سارے حالات جن کا آنا بھی ہمارے اختیار میں نہیں اور جانا بھی ہمارے اختیار میں نہیں۔ بلکہ بعض مرتبہ تو آتی ہے پھر جانے کا نام نہیں لیتی، مثلاً کسی عزیز قریب کا انتقال ہوگیا، بیٹا تھا وہ مرگیا، یہ ایک مصیبت ہے، اب دوبارہ تو وہ آنے والا نہیں، وہ تو گیا، اسی طریقہ سے مثلاً کسی کی بینائی چھن گئی کوئی عضو ہی کٹ گیا یا ایسی کوئی مصیبت آگئی جس میں دوبارہ تندرستی کا کوئی سوال

ہی نہیں پیدا ہوتا؛ تو اس میں بھی آدمی کو صبر سے کام لینا چاہیے، مشقتوں کو برداشت کرنا چاہیے؛ یہ بھی صبر ہے۔ عام طور پر لوگ جو صبر کا لفظ استعمال کرتے ہیں وہ انہیں معنوں کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ ان حالات میں صبر کرنے کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

﴿دوسری قسم﴾

دوسری قسم وہ حالات جو آدمی کو غیر اختیاری طور پر پیش آتے ہیں، لیکن ان کا دور کرنا آدمی کے اختیار میں ہے، وہاں پر آدمی اپنے نفس کو قابو میں کرے۔ مثلاً کسی آدمی نے آپ کے ساتھ کوئی طبیعت کے خلاف بات کردی اس نے آپ کو گالی دے دی، تھپڑ مار دیا آپ کو جانی نقصان پہنچایا، مالی نقصان پہنچایا، یا آپ کے ساتھ کوئی اور نامناسب حرکت کردی؛ وہاں پر آپ اپنے انتقامی جذبے کو کام میں لا کر اس کا جواب دینے کی اگر طاقت رکھتے ہیں، تو اس کو دور بھی کر سکتے ہیں، وہاں پر بھی صبر کرنے کی تاکید ہے، آپ صبر سے کام لیجئے اور اس سے انتقام لے کر اپنے نفس کو تشفی نہ دیجئے۔

﴿حضور ﷺ کے صبر کا انداز﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ روایت پیش کریں گے، بخاری شریف میں بھی موجود ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس خمس کا کوئی مال آیا تھا، غنیمت میں سے پانچواں حصہ بیت المال کے لئے نکالا جاتا ہے وہ پانچواں حصہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا گیا آپ نے وہ چند ایسے لوگوں میں جو نئے نئے اسلام لائے تھے اور ان کی دلجوئی کی ضرورت تھی؛ تقسیم کر دیا، اس تقسیم پر ایک صاحب نے تبصرہ کرتے ہوئے یوں کہا کہ یہ ایک ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کو ملحوظ نہیں رکھا گیا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے جب یہ جملہ سنا تو کہا: میں حضور ﷺ کو اس کی اطلاع کروں گا، چنانچہ انہوں نے آکر نبی کریم ﷺ کو اطلاع دی، تو آپ کو یہ بات ناگوار ہوئی لیکن پھر فرمایا: حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس سے بھی زیادہ ایذاء پہنچائی گئی لیکن انھوں نے صبر سے کام لیا (بخاری ۴/۱۵۷۶) پھر حضور ﷺ نے بھی اس پر کوئی کارروائی نہیں فرمائی، آپ پر اس کا کوئی ری ایکشن (ردعمل) نہیں ہوا، آپ نے صبر سے کام لیا اور برداشت کیا۔

﴿صبر سے اوپر کا درجہ﴾

صبر سے اوپر کا درجہ یہ ہے کہ جس نے آپ کے ساتھ آپ کی طبیعت کے خلاف معاملہ کیا ہے اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے مثلاً کوئی رشتہ دار ہے اس نے آپ کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا تو یہ نہیں کہ آپ صرف برداشت ہی کرلیں بلکہ برداشت کرنے کے بعد آپ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئیے، شریعت یہ تعلیم دیتی ہے ﴿صِلْ مَنْ قَطَعَکَ﴾ (مجمع الزوائد ۸/۱۸۸) کہ جو رشتہ دار آپ کے ساتھ رشتہ داری قطع کرے، رشتہ داری کے تقاضہ کے خلاف کوئی کام کرے، آپ کو تکلیف پہنچائی، آپ کو گالی دی اور مالی جانی نقصان پہنچایا آپ اس سے صلہ رحمی کا معاملہ کیجئے یعنی آپ اس کے ساتھ احسان کا سلوک کیجئے۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿لَیْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُکَافِیْ﴾ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ ص۴۱۹) کہ جو آدمی برابر کا بدلہ دے وہ کوئی صلہ رحمی کرنے والا نہیں۔

﴿عام مزاج﴾

ہم لوگوں کا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ بھائی نے اگر ہمارے ساتھ کوئی اچھا سلوک کیا

تو ہم بھی بھائی کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے۔نہیں کیا تو نہیں کریں گے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر بھائی ہونے والے رشتے کا آپ نے کیا لحاظ کیا؟ اچھا سلوک تو کوئی پرایا آدمی کرے گا؛ تب بھی ہمارا جی یہ چاہتا ہے کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں، اس میں بھائی کی کیا خصوصیت رہی۔ بھائی کا مطلب تو یہ تھا کہ وہ چاہے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہ کرے بلکہ برا سلوک کرے لیکن چونکہ وہ بھائی ہے، اس کے ساتھ رشتہ داری ہے، نسبی تعلق ہے اس کا تقاضہ ہے کہ آپ معاف کرکے اس کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے؛ تب ﴿صِلْ مَنْ قَطَعَکَ﴾ پر عمل ہوا۔ یہاں یوں کہا گیا کہ بجائے اس کے کہ آپ بدلہ لیں احسان کیجئے۔

﴿حسن سلوک کا اثر......آج نہیں تو کل﴾

آج کل تو بدلہ لینے کا معاملہ بہت آگے بڑھ گیا۔ جہاں دیکھو! ذرا ذرا سی بات کے اندر آدمی بدلہ کو سوچا کرتا ہے، حالانکہ بدلہ لینے سے یہ معاملہ اور یہ حساب کتاب بیباق نہیں ہوتا، کھاتہ بند نہیں ہوتا بلکہ یوں سمجھئے گویا آپ نے بدلہ لے کر مستقل ایک الگ چوپڑا ہی قائم کر دیا، اس لئے کہ اگر آپ نے بدلہ لیا تو اب وہ بھی بدلے کی کوئی کاروائی کرے گا پھر آپ کریں گے، گویا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اس کی کوئی انتہاء نہیں، اب کچھ مدت کے بعد آپس کی اس عداوت اور دشمنی کے نتیجہ میں جب دونوں پریشان ہوں گے اس کے بعد اپنی اس پریشانی کو دور کرنے کے لئے معاملہ ختم کریں گے۔تو جو چیز اتنے سارے بگاڑ کے بعد آپ کرنے والے ہیں؛ اگر پہلے روز کر لی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا:-

آں چہ کند دانا کند ناداں ☆ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

کہ عقلمند آدمی جو کام کرتا ہے بیوقوف بھی وہ کام کرتا ہے لیکن بہت خرابی کے بعد یعنی بہت

معاملہ بگڑ گیا آخر میں پھر اس کو بھی عقل میں آتی ہے، اس کی کھوپڑی اور سمجھ میں بھی آتی ہے کہ یہ جھگڑے والا مسئلہ ٹھیک نہیں، چلو صلح کرلو۔ کب صلح کر رہے ہیں؟ اس وقت کر رہے ہیں کہ یہ بھی برباد ہو گیا وہ بھی برباد ہو گیا، اس کے بعد اب صلح کی نوبت آئی۔ ارے بھائی! پہلے سے معافی تلافی کا معاملہ کرلیا ہوتا اور اس نے چاہے آپ کے ساتھ برا معاملہ کیا، اگر آپ حسنِ سلوک سے پیش آئے ہوتے تو یہ ساری نوبت ہی نہ آئی ہوتی، چاہے نفس پر ذرا بھاری تو معلوم ہوتا ہے لیکن کل ایک وقت آئے گا کہ آپ جب اس کے ساتھ ﴿أَحْسِنْ اِلیٰ مَنْ أَسَآءَ اِلَیْکَ﴾ (جو تمہارے ساتھ برائی کرے آپ اس کے ساتھ اچھائی کا معاملہ اور احسان کا سلوک کیجئے) پر عمل کرتے رہیں گے تو آخر کب تک؟

ع... دل ہی تو ہے؛ نہ ہے سنگ وخشت

آدمی کا دل ہے، انسان کا دل ہے، اثر تو قبول کرتا ہی ہے، آج نہیں تو کل، وہ بہر حال ایک دن سوچنے پر مجبور ہوگا کہ میری طرف سے برابر اس کے ساتھ زیادتیاں ہو رہی ہیں اور یہ میرے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کر رہا ہے، تو آخر وہ بھی شرمائے گا اور پچھتائے گا؛ پھر آپ کے لئے پچھتانے کی نوبت نہیں آئے گی، ندامت کا جذبہ اس میں پیدا ہوگا، الحمدللہ آپ کا ہاتھ تو اوپر رہے گا۔

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جتنی قسمیں ہیں اس میں مصیبت تو غیر اختیاری طور پر آئی، تکلیف پہنچانے والے نے آپ کو تکلیف پہنچائی اس میں آپ کے اختیار کو دخل نہیں تھا، لیکن آپ جواب میں اپنے نفس کے جذبے کو تشفی دینے کے واسطے کوئی کاروائی نہیں کر رہے ہیں؛ یہ بھی صبر ہے۔ یہ دوسری قسم ہے۔

﴿تیسری قسم ’’صبر علیٰ الطاعات‘‘﴾

اور تیسری قسم بتلائی تھی وہ کام جس میں آدمی کے اختیار کو دخل ہے آدمی اپنے اختیار سے جن کاموں کو انجام دیتا ہے، وہ بھی دو قسم کے ہیں:-

(۱) ایک تو طاعات عبادات اور نیکیوں کے قبیل سے ہے۔

(۲) دوسرے معاصی، نافرمانیاں اور گناہوں کے قبیل سے ہے۔

تو طاعات یعنی نیکی کے کام کی انجام دہی کے اندر بھی آدمی کو صبر سے کام لینا پڑتا ہے، آدمی روزہ دار ویسے تو نہیں ہوتا، روزہ رکھنے کے واسطے آدمی کو کتنا تحمل اور صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ نماز کے متعلق جیسا میں شروع میں عرض کر چکا کہ جو آدمی نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اس کو بڑے صبر سے کام لینا پڑتا ہے، نفس کے تقاضوں کو دبانا پڑتا ہے، مثلاً نماز کا وقت آ گیا، ادھر خوب گاہک دکان کے اندر موجود ہیں، لیکن آپ یوں سوچ کر کہ میں جماعت کا ثواب لینے کے لئے جاؤں گا، چاہے گاہک چلے جائیں، گاہک بعد میں آنے والے ہوں گے تو آئیں گے، آپ ان کو چھوڑ کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے نکل پڑے، یہ مجاہدہ نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کو صبر سے کام لینا پڑا۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں بھی یہی بات ہے۔ نفس کو تو مال کی محبت لگی ہوئی ہے، وہ مال نکالنا نہیں چاہتا لیکن آپ اس کے باوجود بخل کے تقاضے کو دبا کر مال خرچ کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالا رہے ہیں تو یہ عبادات کی ادائیگی کے اندر جو مشقت ہوتی ہے اس کو آدمی جو برداشت کرتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ وہی ﴿**حبس النفس علیٰ مایقتضیه العقل أو الشرع**﴾ شریعت جس بات کا تقاضہ کرتی ہے اس کو انجام دینے کے واسطے ہم نے اپنے

نفس کے تقاضوں کو دبایا اور ختم کیا اور نفس کو اس کے اوپر آمادہ کیا، ثابت قدم رکھا، اس کو صبر علی الطاعات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

﴿نفس کی فطرت میں ربوبیت﴾

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے نفس میں فطری طور پر عبودیت اور بندگی مفقود ہے یعنی آدمی کے نفس کی طبیعت کے اندر بندگی اور عبدیت نہیں ہے بلکہ اس کی طبیعت کے اندر ربوبیت ہے یعنی وہ اپنے آپ کو بڑا بنانا چاہتا ہے۔ بعض عارفین فرماتے ہیں: فرعون نے دعویٰ کیا تھا ﴿أنا ربکم الاعلیٰ﴾ اس نے تو اس کو اپنی زبان سے ظاہر کیا تھا لیکن ہر انسان کا نفس اس دعویٰ کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے، فرعون کے پاس اسباب مہیا تھے، اس کے پاس موقع محل تھا، اس کی قوم اس کے سامنے سپر ڈالے ہوئی تھی اور مقابلہ نہیں کر رہی تھی؛ تو اس نے تو اپنے اس دعویٰ کا اظہار کر دیا۔ لیکن ہر آدمی کا نفس یہی دعویٰ کر رہا ہے اور اپنے اس دعویٰ کو چھپائے ہوئے ہے۔

﴿ربوبیت کا ظہور﴾

چنانچہ جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں، اس کے محبین، اس کے خادم، اس کے غلام، اس کے نوکر چاکر، ان کے ساتھ اس کا معاملہ کیا ہوتا ہے؟ اگر خدانخواستہ ان کی طرف سے ذرا سی بات طبیعت کے خلاف پیش آجائے تو دیکھو حضرت کا مزاج کیسا ہوتا ہے؟ وہی ''انا ربکم الاعلیٰ'' کا ظہور ہو جاتا ہے۔

تو فرماتے ہیں کہ یہ صبر علی الطاعات یعنی نیکی کے کاموں کے لئے آدمی کو مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، یہ بھی صبر ہے اور اس کی بھی بڑی فضیلت آئی ہے اور جہاد کے

اندر جو صبر کیا جاتا ہے، نماز کی ادائیگی میں کیا جاتا ہے؛ یہ بھی صبر کی ہی قسم ہے۔

صبر عن المعاصی

دوسری قسم کہ جس میں آدمی کے اختیار کو دخل ہے وہ ''صبر عن المعاصی'' ہے۔ یعنی گناہ کا کام کرنے کو آدمی کا جی چاہتا ہے، نفس تو زنا کے لئے بہت تقاضہ کرتا ہے، چوری کیلئے آمادہ ہے، شراب نوشی کے لئے آمادہ ہے، کسی کو گالی دینے کے لئے آمادہ ہے، کسی کو نقصان پہنچانے کے لئے آمادہ ہے، لیکن آپ اس کو روکیں، اس کے تقاضہ کو دباویں؛ تو یہ بھی صبر ہے۔ یہ صبر ''صبر عن المعاصی'' ہوا۔

تو جتنے بھی گناہ کے کام ہیں ان تمام کاموں کے کرنے کے لئے آدمی کا نفس تقاضہ کرتا ہے، آدمی اپنے نفس کے ان تقاضوں کو دباوے اور اس میں جو مشقت اور محنت برداشت کرنی پڑتی ہے اس محنت اور مشقت کو جھیلے؛ اسی کا نام ہے ''صبر عن المعاصی'' یعنی گناہوں کے مقابلہ میں صبر سے کام لینا۔

اب اس میں بھی وہ گناہ جس کا آدمی عادی بن چکا ہے اس میں صبر کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے۔ اس لئے کہ ایک تو عادت کی وجہ سے اس کا ایک فطری سا تقاضہ ہو گیا اور نفس کی شہوت تو تھی ہی؟ لہٰذا عادت اور شہوت نے مل کر اس شراب کو دو آتشہ بنا دیا اور اب تو ایسا شدید تقاضہ پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت صبر کرنا آدمی کے لئے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔

غیبت آسان گناہ ہے لیکن......تباہ کن

پھر خاص کر وہ گناہ کے کام جن میں کوئی زیادہ مشقت بھی برداشت نہیں کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً ''غیبت'' کہ اگر اس کی عادت پڑ گئی ہے۔

غیبت کس کو کہتے ہیں؟ کسی کی غیر حاضری میں اس کے متعلق ایسی بات کہنا جس سے اس کی تنقیص ہو، اس پر عیب لگتا ہو، اس کی ذات پر، اس کے متعلقات پر، اس کی بیوی، اس کے بچے، یا اس کی چیزوں کی کوئی برائی بیان کرنا کہ اگر وہ سن لے تو اس کو ناگوار معلوم ہو، یہ غیبت ہے۔ اب اس میں آدمی کو کیا مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اس کے علاوہ ہر گناہ کے لئے کچھ نہ کچھ محنت مجاہدہ کرنا پڑے گا، زنا کے لئے بھی کچھ اسباب اختیار کرنے پڑیں گے، سامنے والے فریق کو راضی کرنے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ لیکن غیبت کرنے کے لئے کیا ہے؟ دو چھدام کی زبان ہے اس کو ہلا دی اور جو چاہا بول دیا۔

''جھوٹ بولنا'' کہ اگر اس کی عادت ہے تو یہ گناہ بھی بڑا آسان ہے۔ اسی طریقہ سے جھگڑا کرنے کی عادت ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی بڑائی اور اپنی تعریفیں کرنے کی عادت ہوتی ہے، جب آپ ان کے پاس بیٹھیں گے تو وہ اپنا ہی تذکرہ کرتے رہیں گے اور اپنی ہی ہانکتے رہیں گے۔ اب یہ گناہ بھی ایسا ہے کہ جس میں کوئی زحمت نہیں بلکہ بس بک بک کئے جاتا ہے اور پھولا نہیں سماتا، اس کے اندر کیا مشقت ہے؟ حالانکہ یہ بھی گناہ ہے۔

بدنگاہی آسان لیکن ...... بڑی خطرناک

مثلاً ''بدنگاہی'' نامحرم کو دیکھنا، ایسی عورتیں جن کے ساتھ نکاح کرنا شریعت نے جائز رکھا ہے اور وہ آپ کے نکاح میں نہیں ہیں؛ وہ نامحرم کہلائیں گی، اب ایسی عورتوں کو دیکھنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی، اور اس گناہ میں کون سی تکلیف ہے؟ بلکہ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: یہ تو ایسا گناہ ہے کہ مولوی صاحب مولوی صاحب

رہے، قاری صاحب قاری صاحب رہے، مبلغ صاحب مبلغ صاحب اور متقی صاحب متقی رہے، اور کوئی زد پڑتی ہی نہیں، لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلتا یعنی اگر آپ بدنگاہی کرلیں گے تو کون دیکھنے آئے گا؟ کس کو پتہ چلے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں، ہماری نگاہیں کسی اور کو دیکھ رہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ ہماری نگاہ کو دیکھ رہے ہیں، اگر یہ تصور ہو تو بدنگاہی کی نوبت نہیں آئے گی، لیکن یہ بدنگاہی والا گناہ ایسا ہے کہ اگر اس کی عادت پڑ گئی ہے تو ایک تو یہ کہ اس میں کوئی زحمت بھی نہیں، بڑا آسان ہے اور پھر کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ نگاہ کا تیر جب نکلتا ہے تو سامنے والے کو تو بعد میں زخمی کرے گا تیر والے کو پہلے زخمی کرتا ہے، اور آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میں دیکھوں گا تو دیکھنے کی وجہ سے پیاس بجھے گی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ دیکھنے کی وجہ سے پیاس اور بڑھتی ہے اور دوبارہ سہ بارہ دیکھنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اور اس میں کوئی نوجوانوں کی ہی خصوصیت نہیں، نوجوان ہوں، ادھیڑ ہوں، بوڑھے ہوں؛ سب برابر ہیں۔ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: اس میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا، اس لئے کسی کی کوئی قید ہی نہیں، بوڑھے بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ گناہ ایسا خطرناک ہے۔

تو عرض یہ کر رہا تھا کہ اگر گناہ اور وہ بھی ایسا کہ جس کی عادت پڑی ہوئی ہو اور وہ بھی پھر ایسا کہ بہت آسان ہو، اس کے کرنے میں بالکل تکلیف نہ ہو؛ تو اس سے تو بچنا اور صبر کرنا بڑا سخت اور بڑا خطرناک ہے۔ اور ایسے گناہوں سے بچنے کے لئے آدمی کو زحمت برداشت کرنا پڑتی ہے۔

بدنگاہی سے کیسے بچا جائے؟

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے ایک مرید تھے انھوں نے حضرت کو لکھا کہ حضرت! مَیں نگاہ کو روک نہیں سکتا اور بدنگاہی سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتا۔ تو حضرت نے فرمایا: کہ بھائی دیکھو! جب تم کر سکتے ہو تو رُک بھی سکتے ہو، اس لئے کہ فلسفہ کا قاعدہ ہے کہ آدمی کی جو قدرت ہوتی ہے وہ دونوں چیزوں سے متعلق ہے، یعنی جو آدمی کسی کام کے کرنے کی طاقت رکھتا ہے تو اس سے رُکنے اور بچنے کی بھی طاقت رکھتا ہے، کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو بچنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا، جو کام اس سے غیر اختیاری طور پر سرزد ہوتا ہے وہاں بچنے کا سوال نہیں۔ جیسے یہ انگلی مَیں اپنے اختیار سے ہلا رہا ہوں تو اپنے اختیار سے روک بھی سکتا ہوں، اور اگر کسی آدمی کو بیماری ہے اور ہاتھ خود بخود ہل رہا ہے وہ اپنے ارادہ سے ہلا نہیں رہا ہے؛ تو وہ روک بھی نہیں سکتا۔ تو حضرت نے فرمایا کہ یہ کہنا کہ مَیں اپنی نگاہ کو روکنے پر قادر نہیں ہوں؛ یہ غلط ہے۔ پھر انہوں نے لکھا کہ حضرت! جب نہیں دیکھتا ہوں تو دل میں عجیب سی بے چینی پیدا ہوتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل بے چینی کی وجہ سے ختم ہو جائے گا اور موت آ جائے گی، دل میں یوں آتا ہے کہ معلوم نہیں کیسی حسین صورت ہوگی جو دیکھنے سے رہ گئی، اگر دیکھ لیا ہوتا تو اچھا ہوتا، ایسی بے چینی رہتی ہے کہ جس کو بیان نہیں کر سکتا۔ تو حضرت نے فرمایا: اچھا بتاؤ! یہ بے چینی کتنی دیر رہتی ہے؟ تو کہا: تین چار منٹ حضرت نے فرمایا: اچھا! اگر دیکھ لیتے ہو تو؟ اس صورت میں بھی بے چینی ہوتی ہے نا؟ جواب دیا کہ ہاں! اس صورت میں بھی بعد میں بے چینی تو ہوتی ہے۔ پوچھا: وہ کتنی دیر؟ جواب دیا: وہ تو تین دن تک رہتی ہے۔ حضرت نے فرمایا: دیکھو! اگر بہتر (۷۲) گھنٹے کی بے چینی دو تین منٹ کی بے چینی سے دور ہوتی ہے؛ تو سودا سستا ہے۔

بہر حال کہنے کی بات یہ ہے کہ دیکھئے! بدنگاہی سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اور اپنے نفس کو روکنے کے لئے کتنی زحمت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

﴿حقیقی بہادر﴾

ایک بہادر آدمی بڑے بڑے بہادری کے کام کر لیتا ہے، لیکن یہاں وہ بھی پھسل جاتا ہے، اس کی بہادری کام نہیں آتی۔ ہے یا نہیں؟ دیکھئے! یہ ہے اصل بہادری، بہادری اسی کا تو نام ہے۔ بھائی! کسی نے آپ کو گالی دی، اب گالی دی تو اس کا جواب آپ طمانچے سے دے سکتے ہیں، لیکن آپ ضبط کر گئے اور برداشت کر گئے۔

اسی کو نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام سے پوچھا: تم پہلوان کس کو سمجھتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم تو پہلوان اس کو سمجھتے ہیں کہ جو کسی کو کشتی کے اندر پچھاڑ دے یا میدانِ جنگ میں سامنے والے کو چت کر دے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ پہلوان وہ ہے جو اپنے غصہ پر قابو پالے۔ دوسرے کو پچھاڑنے کی بات تو بعد کی ہے، اپنے آپ کو پچھاڑو۔ ضرورت اس کی ہے۔ نفس ہمارا دشمن ہے ﴿اِنَّ اَعْدیٰ عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِی بَیْنَ جَنْبَیْکَ﴾ (ذکرہ الغزالی فی الاحیاء ۳/ ۵، قال العراقی فی ہامشہ حدیث اعدیٰ عدوک الخ اخرجہ البیہقی فی کتاب الزہد من حدیث ابن عباس وفیہ محمد بن عبد الرحمٰن بن غزوان احد الوضاعین) کہ تمہارا سب سے بڑا دشمن وہ نفس ہے جو تمہارے اندر ہے، اصل میں تو پچھاڑنے کی ضرورت اس کو ہے، اگر اس کو ہم نے پچھاڑ دیا تو ہمارے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے۔

بہر حال! یہ جو اپنے آپ کو گناہوں کے انجام دینے اور گناہوں کے کرنے سے روکنا ہے، اس میں بھی کتنی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے، یہ بھی صبر ہے، اس کے اوپر بھی

بے انتہا اجر ملے گا، جولوگ گناہوں سے اپنے آپ کو روکتے ہیں تو وہ ﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ﴾ کی بشارت میں شامل ہونے کی وجہ سے اجر کے مستحق ہیں

﴿صبر؛ ایک عجیب وصف﴾

خلاصہ یہ کہ اگر آپ دیکھیں تو صبر کا دائرہ پوری شریعت تک پھیلا ہوا ہے، اب کون سی چیز باقی رہ گئی۔ آپ عبادتیں انجام دے رہے ہیں، جو کرنے کے کام ہیں وہ کر رہے ہیں؛ اس میں صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جو رُکنے کے کام ہیں ان سے رُک رہے ہیں؛ ان میں بھی صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بلکہ جو کام ہمارے ارادے اور اختیار میں نہیں ہیں؛ وہاں بھی صبر کی ضرورت ہے جیسا کہ پیچھے معلوم ہوا۔ حالانکہ شریعت کا دائرہ تو فقط ارادے اور اختیار کے کاموں تک محدود ہے۔ لہٰذا اگر دیکھا جائے تو یہ صبر درحقیقت ایک ایسا عجیب وصف ہے کہ ہر جگہ اس کی ضرورت پیش آتی ہے، اسی لئے اگر کسی آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا؛ تو سمجھ جاؤ کہ وہ کامیاب ہے۔

﴿مقامِ رضا﴾

اب اس کے بعد اس سے بھی اعلیٰ ایک درجہ ''رضا'' کا ہے، اور اس سے بھی اعلیٰ درجہ ''محبت'' کا ہے۔ مصیبت آئی تو اس کو برداشت کرلیا یہ تو صبر ہوا۔ اس سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مصیبت بھیجی تو اس پر خوش ہیں کہ محبوب کی بھیجی ہوئی چیز ہے، یہ صبر سے بھی اعلیٰ درجہ ہے کہ صرف برداشت ہی نہیں کیا بلکہ اس مصیبت پر آپ خوش ہیں کہ مصیبت کس نے بھیجی؟ کس نے یاد کیا؟ اللہ تعالیٰ نے یاد کیا۔ تو یہ رضا ہے، اور پھر اس کو چاہیں تو یہ اس سے اعلیٰ مقام ہے۔ بہرحال! یہ صبر بھی بہت اونچا مقام ہے۔ اسی لئے اس پر بشارت

ہے ﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ کہ جولوگ صبر کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو جو اجر و ثواب دیا جاتا ہے وہ بے حساب ہے۔ اور واقعتاً جس آدمی کو صبر دیا گیا یوں سمجھئے اس کو سب کچھ مل گیا۔ اسی لئے فرمایا ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ﴾ صبر کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔

﴿حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کا خلاصہ﴾

دیکھئے! حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا قصہ سب جانتے ہیں کیسا آزمائش کا ہے، آخر میں ان کے سارے قصے کا خلاصہ قرآن میں مذکور ہے کہ ان کے بھائی ان کے پاس پہنچے اور بھائیوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ یوسف ہیں تو بھائیوں نے پوچھا: کیا آپ ہی یوسف ہیں؟ حضرت یوسف نے کہا: ﴿أَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا أَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا﴾ ہاں! میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر بڑا احسان کیا۔ اور آگے کیا فرماتے ہیں ﴿اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ جو آدمی تقویٰ کے کام کرے اور صبر اختیار کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نیکوکار کے اجر کو ضائع نہیں کرتا تو حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے قصہ کا خلاصہ دو چیزیں نکلیں ''تقویٰ اور صبر''۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر عظیم چیز ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرما رکھی ہے۔

﴿صبر روشنی ہے﴾

عن أبي مالك الحارث بن عاصم الأشعري رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيْزَانَ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَآنِ أَوْ تَمْلَأُ مَا بَيْنَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَالصَّلٰوةُ نُوْرٌ، وَالصَّدَقَةُ بُرْهَانٌ، وَالصَّبْرُ ضِيَآءٌ، وَالْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ، كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَائِعٌ نَفْسَهٗ، فَمُعْتِقُهَا أَوْ مُوْبِقُهَا.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پاکی آدھا ایمان ہے اب اس کی بہت ساری تفصیل محدثین اور حدیث کے شراح نے بیان کی ہیں ﴿وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَمْلَأُ الْمِيزَانَ﴾ اور الحمد للہ میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے حالانکہ الحمد للہ کہنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟

ہم یوں ہی بیٹھے بیٹھے اپنا وقت برباد کر دیتے ہیں، بہت سی مرتبہ تو بے کار بیٹھے رہتے ہیں یعنی ہماری خاموشی بھی غفلت ہوتی ہے، بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہوں ویسے ہی بے کار بیٹھے رہتے ہیں، حالانکہ آدمی بیٹھے بیٹھے ذکر کرتا رہے تو بہت کچھ فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ یہ دونوں زمین وآسمان کے درمیان کے حصے کو بھر دیتے ہیں اور نماز نور اور روشنی ہے۔ صدقہ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ صدقہ کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے محبت ہے، مال سے محبت نہیں ہے۔ اور صبر بھی روشنی ہے۔ بس! یہ روایت یہاں اسی لئے لائے ہیں ﴿الصَّبْرُ ضِيَاءٌ﴾ مخصوص قسم کی روشنی کے لئے لفظ ''ضیاء'' استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن میں سورج کو ''ضیاء'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور چاند کو ''نور'' سے تعبیر کیا گیا ہے ﴿وَالْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ﴾ اور قرآن آپ کے حق میں دلیل بن سکتا ہے یا آپ کے خلاف یعنی قرآنِ پاک پر اگر آپ نے عمل کیا تو کل کو قیامت میں وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سفارش کرے گا اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کی تو آپ کے خلاف دعویٰ دائر کرے گا۔ اور تمام لوگ صبح کو جب چلتے ہیں تو گویا وہ اپنی جان کو بیچ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے جان کا سودا کر رہے ہیں اب یا تو وہ نیکی کے کام کر کے اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے چھڑالیں، یا گناہ کے کام کر کے اور گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالیں۔

۔۔۔اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو صحیح توفیق عطا فرمائے۔۔۔

درد بھری دعاء

آہ جاتی ہے فلک پہ رحم لانے کے لئے
بادلو! ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

اے دعا ! ہاں عرض کر عرش الٰہی تھام کے
اے خدا! رخ پھیر دے اب گردشِ ایام کے

خَلق کے راندے ہوئے دنیا کے ٹھکرائے ہوئے
آئے ہیں اب تیرے در پر ہاتھ پھیلائے ہوئے

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلت میں ہیں
کچھ بھی ہیں لیکن ترے محبوب کی امت میں ہیں

رحم کر اپنے نہ آئین کرم کو بھول جا
ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا

حق پرستوں کی اگر کی تو نے دلجوئی نہیں
طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً . اما بعد .

اچھے اوصاف حاصل کرنے کا طریقہ

عن ابی سعید سعد بن مالک بن سنان الخدری رضی اللہ عنہ اَنَّ نَاسًامِنَ الْأَنْصَارِسَأَلُوْارَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَأَعْطَاھُمْ ثُمَّ سَأَلُوْہُ فَأَعْطَاھُمْ حَتّٰی نَفِدَمَاعِنْدَہٗ فَقَالَ لَھُمْ حِیْنَ أَنْفَقَ کُلَّ شَیْئٍ بِیَدِہٖ: مَایَکُنْ عِنْدِیْ مِنْ خَیْرٍفَلَنْ أَدَّخِرَہٗ عَنْکُمْ، وَمَنْ یَّسْتَعْفِفْ یُعِفَّہُ اللّٰہُ وَمَنْ یَّسْتَغْنِ یُغْنِہِ اللّٰہُ وَمَنْ یَّتَصَبَّرْ یُصَبِّرْہُ اللّٰہُ وَمَاأُعْطِیَ أَحَدٌعَطَاءً خَیْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ۔

پچھلی مجلس میں صبر کی حقیقت اور اس کی قسمیں تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پیش کئے ہیں ان میں سے ایک روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ہے کہ انصار کے کچھ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مال طلب کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو عطا فرمایا پھر دوسری مرتبہ انھوں نے مانگا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیا، یہاں تک کہ آپ کے پاس جو مال تھا وہ سب ختم ہو گیا، جب آپ نے اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب خرچ کر دیا تو ان حضرات سے آپ نے یہ ارشاد فرمایا:

کہ میرے پاس جو مال ہے میں تم سے اس کو روک کر نہیں رکھوں گا یعنی میرے پاس مال ہو اور آپ لوگ مطالبہ کریں تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں نہ دوں، بلکہ ضرور دوں گا، اب تو میرے پاس مال رہا نہیں، ختم ہوگیا اس لئے نہیں دے رہا ہوں، لیکن ایک بات خاص طور پر یاد رکھیے کہ جو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچائے گا، عفت اختیار کرے گا (عفت کہتے ہیں پاکدامنی کو۔ اور پاکدامنی کا اطلاق یہاں پر اپنے آپ کو سوال سے بچانے پر کیا گیا ہے) کہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا اور اپنے آپ کو پاکدامن بنائے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائیں گے یعنی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ سوال سے بچائیں گے۔ جو آدمی خود بچنے کی کوشش کرے گا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ بھی اس کو بچائیں گے۔ اور جو اپنے آپ کو مستغنی اور لوگوں سے اپنے آپ کو بے نیاز بنائے گا یعنی لوگوں کے سامنے اپنی ضرورتوں کے لئے ہاتھ نہیں پھیلائے گا، اپنے آپ کو بے نیاز رکھے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو غنی بنائیں گے، دل کا غنیٰ عطا فرمائیں گے اور جو آدمی صبر اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ بھی اس کو صبر عطا فرمائیں گے۔

نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں ہمارے لئے ایک بہت بڑی تعلیم ہے، عام طور پر جب ہم سے کسی اچھے وصف کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو اس وقت ہم یہ عذر کر دیتے ہیں کہ ہم سے یہ نہیں ہو پاتا۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس سلسلے میں قدرت کا جو قانون ہے اور اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ جو معاملہ ہے اس کو ارشاد فرما کر ہمارے لئے اچھے اوصاف کو حاصل کرنے کا ایک بہت بڑا دروازہ کھول دیا۔

مثلاً ایک آدمی ہے جو اپنے آپ کو گناہ سے بچانا چاہتا ہے لیکن کوشش نہیں کرتا، دل

میں ارادہ تو ہے اور اس کی تمنا اور خواہش بھی ہے کہ میں اپنے آپ کو گناہ سے بچالوں مثلاً بدنگاہی ہے، بدنظری سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے، عفت اختیار کرنا چاہتا ہے، پاک رہنا چاہتا ہے، سمجھتا ہے کہ یہ ایک بہت اچھا وصف ہے، اپنے آپ کو اس چیز سے بچانا چاہیے لیکن پھر وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرے لئے تو بچنا بہت مشکل ہے، ناممکن ہے، مَیں بالکل بے اختیار ہو جاتا ہوں، بے قابو ہو جاتا ہوں، مجھ سے یہ ہو ہی نہیں سکتا، حالانکہ اس سلسلے میں جو محنت اور کوشش کرنی چاہیے، اس کے لئے قدم آگے نہیں بڑھاتا، تمنا اور ارادے کی حد تک تو ہے، آگے ہمت کر کے جب عملی اقدام کرنے کا وقت آتا ہے، تو وہ پہلے ہی اپنے متعلق یوں سوچ لیتا ہے کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا، اور ہمت ہار جاتا ہے۔ یہاں نبی کریم ﷺ اس ارشاد میں فرماتے ہیں ﴿مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ﴾ جو آدمی پاکدامنی اختیار کرنے کی کوشش کرے گا، قدم آگے بڑھائے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائے گا۔ گویا آپ ﷺ کی طرف سے ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ جب آپ کسی اچھے وصف کو اختیار کرنا چاہیں تو صرف ارادے اور تمنا پر اکتفاء نہ کریں بلکہ عملی اقدام کرتے ہوئے اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے کوشش شروع کر دیجئے۔ پہلے سے اپنے متعلق یہ سوچ لینا کہ یہ تو مجھ سے ہو ہی نہیں سکتا میرے لئے ناممکن ہے، مجھ سے یہ کام بالکل مشکل ہو جائے گا؛ صحیح نہیں۔ اپنے متعلق اتنا زیادہ بدگمان ہونے کی یا اپنے متعلق اتنی ہمت ہار جانے کی ضرورت نہیں۔

دنیوی اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بڑے بڑے کام کے لئے قدم بڑھاتے ہیں، وہاں تو ہمت نہیں ہارتے، اور یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر مدد کا وعدہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کہ جو لوگ ہمارے راستے میں محنت

کریں گے، قدم آگے بڑھائیں گے؛ ہم اپنے راستے کے لئے ان کو ہدایت کریں گے یعنی ان کو راستہ بتلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی راہنمائی کی جائے گی، ان کی مدد کی جائے گی۔ اصل تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے قدم اٹھنا چاہیے۔

اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک بچہ کھڑا ہے، وہ ابھی چلنا پھرنا نہیں سیکھا، اب اس کو کھڑا کر کے باپ کہتا ہے کہ آؤ بیٹا آؤ! اب وہ وہیں کا وہیں کھڑا رہے گا تو نہیں بڑھ سکے گا، وہ جب ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو وہ ابھی آدھا قدم آگے بڑھائے اس سے پہلے باپ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ وہ کم سے کم آدھا قدم آگے تو بڑھائے وہ اگر آدھا قدم آگے نہیں بڑھائے گا تو بات نہیں بنے گی۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ ہے، جتنے بھی اوصاف اور خوبیوں کی چیزیں ہیں چاہے وہ پاک دامنی ہو، چاہے وہ غناءِ باطن ہو، چاہے وہ صبر ہو؛ یہ جتنے بھی اوصاف شریعت کے اندر مطلوب ہیں، ان کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کوشش کرنی چاہیے، ہماری طرف سے کوشش میں کمی نہ ہو، جہاں ہم نے قدم آگے بڑھایا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہماری مدد کی جائے گی۔

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم (نور اللہ مرقدہ) بڑی اچھی مثال دیتے ہیں کہ بھائی: آپ ایرپورٹ پر جاتے ہیں، آج کل تو بہت سے دفاتر میں بھی ایسا ہوتا ہے، سامنے دروازہ بند ہے، اب ایک آدمی سوچے کہ دروازہ بند ہے، میں کیسے جاؤں اور آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے تو کبھی بھی دروازہ نہیں کھلے گا، لیکن ایک آدمی آگے بڑھتا ہے، جب پہنچا خود ہی دروازہ کھل گیا، آپ ہی آپ آٹومیٹک (autometic) دروازہ کھلتا ہے۔ لیکن یہ آٹومیٹک بھی کب کھلے گا؟ جب آپ اس کے سامنے جائیں گے، قدم آگے بڑھائیں

گے؛ تب وہ کھلے گا۔ گویا آج کل کی ایجاد نے تو ہمارے لئے یہ مسئلہ سمجھنا بہت آسان کر دیا کہ آپ قدم تو آگے بڑھائیے پھر دیکھئے کہ آپ کے لئے راستہ کھلتا ہے یا نہیں؟

آپ سفر کرتے ہیں اور جو بڑی سڑک ہوتی ہے وہاں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سڑک کے دونوں طرف درخت لگے ہوتے ہیں اور درختوں کا یہ سلسلہ آگے جا کر آپس میں ملا ہوا نظر آتا ہے، اب ایک آدمی یوں سوچے کہ ہماری نگاہ جہاں پہنچ رہی ہے وہاں سڑک ختم ہو رہی ہے، اگر یوں سوچے کہ سڑک ختم ہوگئی اور یہیں بیٹھا رہے تو کبھی اس کا سفر پورا نہیں ہوگا، کبھی وہ اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچے گا۔ وہ آگے بڑھتا رہے گا تو آگے سڑک نظر آتی رہے گی، راستہ کھلتا رہے گا اور پوری دنیا کا سفر کر لے تب بھی کبھی راستہ بند نظر نہیں آئے گا۔ لہٰذا جو نہ چلنے والے ہیں ان کے لئے یہ بہانے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں ہم لوگوں کے لئے بڑی ہمت کی بات اور بڑی کام کی بات ہے یعنی گویا ہم ناکاروں کے لئے حضور ﷺ نے بہت عمدہ راستہ بتلا دیا، ہمارے لئے راہ کھول دی ﴿مَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ﴾ کہ جو آدمی عفت اختیار کرے گا، اپنے آپ کو بچائے گا، یہاں تو حضور ﷺ نے سوال سے بچانے کے متعلق کہا، لیکن عفت و پاکدامنی کا تعلق صرف سوال سے نہیں ہے بلکہ گناہوں سے بچانے کے اوپر بھی اس کا اطلاق ہوسکتا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے گا اور گناہوں سے بچنے کی کوشش کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائیں گے۔ اس لئے گویا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ آپ بچنے کی کوشش تو کیجئے پھر دیکھئے اللہ کی طرف سے کیسی مدد ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کچھ دنوں تک تو یہ کام ہمیں بتکلف کرنا پڑے گا، جب تک کہ کچھ دنوں تک بتکلف نہیں کریں

گے؛ تب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی عادت نہیں پڑے گی۔

میں کہا کرتا ہوں کہ دیکھو! یہ شراب پینے والے شراب کے کیسے عادی ہیں کہ اس کے بغیر چین نہیں اور شراب میں ان کو کیسی لذت آتی ہے، حالانکہ شراب کوئی لذیذ چیز نہیں ہے یعنی جو آدمی شراب کا عادی نہ ہو، آپ اس کو ذرا چکھا دیجئے، گرچہ ہم نے تو نہیں چکھی، لیکن کہتے ہیں کہ بہت خطرناک ہے یعنی اس کا مزہ بڑا بُرا ہے، بدبو دار اتنی ہوتی ہے کہ جب کوئی پیا ہوا قریب آکر بیٹھ جائے تو جو استعمال نہیں کرتے وہ اس کو بھی برداشت نہیں کر سکتے، اور کہتے ہیں کہ یہ کیسے پیتا ہے جس کی بدبو ہم برداشت بھی نہیں کر سکتے، اس کا مزہ بھی بڑا خطرناک ہے، لیکن اس کو کیسا لطف آتا ہے، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو اس کا عادی بنایا ہے۔

جو لوگ تمبا کو کھاتے ہیں ان کو تمبا کو کھانے میں کیسا لطف آتا ہے، حالانکہ جو عادی نہیں اگر اس کے منھ میں ذرا سا ڈال دیا جائے تو چکرا جائیں گے اور زمین پر گر جائے گا۔ تو حقیقت تو یہ ہے کہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے اس کی مشقت کو برداشت کرتے ہوئے کچھ تو اپنے آپ کو اس کے اندر ڈالنا پڑے گا۔

نمازوں کی لذت حاصل کرنے کے لئے، عبادات کا مزہ حاصل کرنے کے لئے اور ان اوصاف کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے بھی شروع میں تو بتکلف ہمارا جی چاہے یا نہ چاہے، ہم اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کریں جتنا بچائیں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی؟ اسی کو کہتے ہیں ﴿وَمَن يَتَصَبَّرْ يُصَبِّرْهُ اللهُ﴾ جو آدمی بتکلف صبر اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو صبر عطا فرمائیں گے۔ گویا صابر بننے کے لئے کچھ دنوں تک بتکلف یعنی

زبردستی، جی نہیں چاہتا، ہماری طبیعت آمادہ نہیں ہے؛ تب بھی اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرنا پڑے گا۔ کچھ دن ایسا کریں گے تو آپ ہی آپ یہ وصف پیدا ہوجائے گا۔ یہ ہر چیز میں ہے، اس کو آپ نوٹ کر لیجئے۔ اگر اس کو آپ گرہ میں باندھ لیں گے تو ان شاء اللہ شریعت پر عمل سے متعلق جتنی بھی مشکلات ہیں؛ وہ ساری آسان ہوجائیں گی، سب مشکلات دور ہوجائیں گی۔ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد میں اسی کو بتلایا گیا۔

اور فرماتے ہیں ﴿وَمَا أُعْطِیَ أَحَدٌ عَطَاءً خَیْراً وَّاَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو صبر سے اچھا اور صبر سے کشادہ عطیہ نہیں عطا کیا گیا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کسی کو صبر کی نعمت دی جائے تو بس یوں سمجھئے کہ اس کو سب کچھ مل گیا۔ صبر ایک ایسی چیز ہے کہ اب اس کے لئے پھر کوئی تکلیف رہے گی ہی نہیں، اس لئے کہ اصل مسئلہ اسی کا ہے۔ مصائب آتے ہیں تو صبر سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں جو مشقتیں اس کو اٹھانی پڑتی ہیں اس پر صبر سے کام لے گا۔ گناہوں سے بچنے میں جو مشقت ہوتی ہے اس میں صبر سے کام لے گا۔ گویا شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرنا اس کے لئے آسان ہے۔ روزی کے معاملے میں اپنے معاملات میں اپنی اور چیزوں میں بھی اگر صبر و قناعت اختیار کرے گا؛ تو فائدہ محسوس کرے گا۔

﴿قناعت کا نمک﴾

ایک صاحب تھے ان کو کھانا کھانے کے معاملے میں کوئی شکایت نہیں تھی۔ پوچھا: کیوں؟ تو کہا: میں قناعت کا نمک استعمال کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جو چیز مجھے مل جاتی ہے اس پر میں قانع ہوجاتا ہوں۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو جو مل جائے اسی کے

اوپر وہ اکتفا کرلے کہ بس میرے لئے کافی ہے، اپنے اندر آگے کی طلب باقی نہ رکھے پھر اس صورت میں جو بھی چیز ہوگی اس کے لئے کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ مسئلہ بہت آسان ہوجائے گا۔ بہرحال نبی کریم ﷺ نے صبر حاصل کرنے کا طریقہ بتایا کہ صبر اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔

﴿مؤمن کے دونوں ہاتھ میں لڈو﴾

وعن أبی یحیٰ صھیب بن سنان رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: عَجَباً لِأَمْرِالْمُؤْمِنِ اِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ لَهُ خَيْرٌوَلَيْسَ ذٰلِكَ لِأَحَدٍاِلَّالِلْمُؤْمِنِ،اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ،فَكَانَ خَيْراًلَّهُ وَاِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ،فَكَانَ خَيْراًلَّهُ.

حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مومن کا معاملہ بڑا تعجب خیز ہے کیونکہ اس کی ہر چیز میں خیر ہی خیر اور بھلائی ہے اور یہ بات مومن کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں ہے یعنی جو صاحبِ ایمان ہے اسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز دی گئی ہے۔ گویا یوں کہئے کہ اس کے دونوں ہاتھ میں لڈو ہیں ﴿اِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّآءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْراًلَّهُ﴾ اگر اس کو کوئی سکھ اور راحت کی چیز پہنچتی ہے، خوش حالی آتی ہے؛ تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس میں اس کے لئے خیر ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيْدَنَّكُمْ﴾ اگر تم شکر کروگے تو میں اپنی نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔ تو گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر نعمت ملی تو اس پر شکر کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرتا ہے ﴿وَاِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّآءُ صَبَرَ،فَكَانَ خَيْراًلَّهُ﴾ اور اگر اس کو دکھ پہنچتا ہے، تنگ حالی سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ صبر سے کام لیتا ہے؛ اس میں بھی اس کے لئے بھلائی ہے، گویا

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اس کے لئے دونوں راستے کھلے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ نعمتیں ملی تب ہی وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے، بلکہ اگر مصیبتیں اس پر آتی ہیں تو ان مصیبتوں پر صبر کر کے وہ اللہ کی رضاء اور خوشنودی حاصل کر کے اپنے لئے کامیابی کی راہ ہموار کرلیتا ہے۔ اور اگر نعمتیں حاصل ہوتی ہیں تو ان نعمتوں پر شکر کر کے وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاء حاصل کر کے اپنے لئے کامیابی کا راستہ ہموار کرلیتا ہے گویا اس کے لئے دونوں حالتوں میں کامیابی ہی کامیابی ہے۔ مصیبت ہو تو بھی اور نعمت ہو تو بھی، خوشی ہو تو بھی اور پریشانی ہو تو بھی؛ کسی صورت میں اس کے لئے کوئی معاملہ مشکل نہیں، ہر حال میں وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ شریعت کی تعلیم یہی ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اس حال سے متعلق شریعت کا جو حکم ہے؛ وہ بجالائے۔

ہر حالت سے متعلق ہم کو شریعت نے ایک حکم دے رکھا ہے۔ مثلاً اگر اس کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو شریعت نے حکم دیا کہ بیٹے کی پیدائش پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اس کا عقیقہ کرو اور اس کے لئے اولاد کے متعلق جو دوسری ہدایتیں دی گئی ہیں؛ اس کو انجام دو۔ لہٰذا جہاں خوشی کا موقع آیا تو شریعت نے خوشی کے اظہار کے طریقے بھی بتلادئے۔

اور اگر کسی کے بیٹے کا انتقال ہوجائے تو اس موقع پر شریعت نے اس کے متعلق کی بھی ہدایت فرمادی ہے کہ صبر سے کام لو، اس کے لئے دعاءِ مغفرت کرو، جنازہ کی نماز پڑھو، اس کو دفن کرو، اس کے جو طریقے ہیں وہ بھی بتلادئے۔

ہر حالت میں مؤمن کو کس طرح رہنا چاہیے، خوشی کی حالت کیسے گذارنی چاہیے؛ وہ بھی شریعت نے بتلادی، غمی کی حالت کیسے گذارنی چاہیے؛ وہ بھی شریعت نے بتلادی۔

شریعت کے بتلائے ہوئے طریقے پر جب ہم عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ راضی رہیں گے، چاہے جو بھی حالت ہو۔ اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مؤمن کے لئے ہر حالت میں خیر ہی خیر ہے، گویا اس کی ہر حالت اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے والی ہے۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: ایک بنئے کا قول ہے کہ مسلمانوں کے لئے تو خیر ہی خیر ہے، بھلائی ہی بھلائی ہے کہ وہ مرے تو شہید اور زندہ رہے تو غازی۔ ایسا معاملہ ہے۔ تو مسلمانوں کے لئے ہر حالت نعمت ہے، نعمت ملے تو شکر ادا کر کے اللہ تعالیٰ کو خوش کرے گا۔ اور مصیبت آ جائے تو صبر کر کے اللہ تعالیٰ کو خوش کرے گا۔ ایسا نہیں کہ جس پر مصیبت آئی وہ یوں سوچے کہ میں اللہ تعالیٰ کو کس طرح خوش کروں، مجھ سے اللہ تعالیٰ کس طرح راضی ہوں گے، میرے پاس اللہ تعالیٰ کو خوش اور راضی کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟ ایسا نہیں! وہ بھی شریعت نے بتلا دیا۔ مؤمن کی حالت دو حال سے خالی نہیں، دونوں حالتوں کی تقسیم شریعت نے بتلا دی۔ اس روایت میں صبر کا تذکرہ ہے؛ اس لئے لائے ہیں۔

آپ ﷺ کی بیماری اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بے چینی

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ لَمَّاثَقُلَ النَّبِيُّ ﷺ جَعَلَ يَتَغَشَّاهُ الْكَرْبُ، فَقَالَتْ فَاطِمَةُ رضی اللہ عنہا وَاكَرْبَ أَبَتَاهُ. فَقَالَ: لَيْسَ عَلٰى أَبِيكِ كَرْبٌ بَعْدَالْيَوْمِ. فَلَمَّامَاتَ قَالَتْ: يَاأَبَتَاهُ أَجَابَ رَبًّا دَعَاهُ. يَاأَبَتَاهُ! جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ. يَاأَبَتَاهُ! اِلٰى جِبْرِيْلَ نَنْعَاهُ. فَلَمَّادُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوْاعَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ التُّرَابَ؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ پر بیماری سخت ہوئی یعنی جس بیماری

میں آپ کی وفات ہوئی اس مرض الوفات میں جب بیماری کا حملہ تیز اور شدید ہوا تو آپ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی، آپ پر تکلیف کی شدت بڑھ گئی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کی اس تکلیف کو دیکھ کر رہا نہ گیا۔ وہ کہنے لگیں: ہائے میرے ابا کی تکلیف۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کو بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بہت زیادہ محبت تھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بھی نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ جب بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے پاس تشریف لاتی تھیں تو حضور ﷺ ان کے استقبال کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے تھے یہاں تک کہ اس مرض الوفات میں جس میں نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی آپ پر تکلیف کی شدت تھی اس وقت بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو ان کو دیکھ کر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿مَرْحَباً بِابْنَتِیْ﴾ کہ میری بیٹی آؤ، خوش آمدید، تمہارا آنا مبارک ہو۔ اسی لئے ایک روایت میں آتا ہے ﴿فَاطِمَةُ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ﴾ فاطمہ میرے جسم کا ایک ٹکڑا ہے جو اس کو تکلیف پہنچائے گا وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا۔ بہرحال! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کو اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو نبی کریم ﷺ سے بہت زیادہ محبت تھی لہٰذا حضور ﷺ کی اس بیماری کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو کر وہ بول پڑیں ﴿وَاکَرْبَ أَبَتَاہُ﴾ ہائے میرے ابا کی تکلیف کہ مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تمہارے ابا پر آج کے بعد کوئی تکلیف نہیں آئے گی، گویا حضور ﷺ کا اشارہ یہ تھا کہ یہ موت کی آخری تکلیف ہے۔ بس! اس کے بعد کوئی اور تکلیف تمہارے ابا پر آنے والی نہیں ہے، موت پر تکلیفوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ پھر جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہو گیا تو اس پر

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بولنے لگیں: ہائے میرے ابا! انھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہہ دیا یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلالیا تو حضور ﷺ وہاں تشریف لے گئے گویا انتقال فرما گئے ﴿ یَا أَبَتَاهُ! جَنَّةُ الْفِرْدَوْسِ مَأْوَاهُ ﴾ ہائے میرے ابا! کہ جنت الفردوس ان کا ٹھکانا ہے ﴿یَا أَبَتَاهُ! إِلیٰ جِبْرِیْلَ نَنْعَاهُ ﴾ ہائے میرے ابا! ہم جبرئیل کو ان کی موت کی خبر دیتے ہیں۔

﴿ طبعی تکلیف اور بناوٹی تکلیف ﴾

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جو باتیں فرمائی ہیں یہ نوحہ کے قبیل سے نہیں ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں نوحہ کا ایک طریقہ تھا یعنی کسی کے انتقال کے اوپر نوحہ کرنا اور بین کر کے رونا۔ دیہاتوں کے اندر یا ایسی جگہوں پر جہاں پرانا رسم ورواج ہوتا ہے وہاں دیکھا ہوگا کہ عورتیں اپنے چہرے کو نوچتی ہیں، سینہ کوٹتی ہیں اور بہت سی عورتیں ایک ساتھ مل کر خوب آواز کھینچ کر کے روتی ہیں جس کو نوحہ کہا جاتا ہے، اس کو تو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کسی کے انتقال کے بعد اس کی وہ خوبیاں جو اس کے اندر موجود تھیں، ان واقعی اوصاف اور خوبیوں کو بیان کرنے میں کوئی مبالغہ سے کام نہ لیتے ہوئے اس کی واقعی خوبیوں کو بیان کرتا ہے تو شرع میں اس کی ممانعت نہیں ہے، اور اس پر اگر آنسو آجائیں یا رونے کے اندر آواز ذرا بلند ہوگئی لیکن بین کے طور پر نہیں ہے، غیر اختیاری طور پر تو اس کی ممانعت نہیں ہے، اس کی اجازت ہے، نوحہ کرنا یعنی باقاعدہ یوں سمجھئے کہ پروفیشنل طریقہ سے رونا اس کی ممانعت ہے۔ جو نوحہ کیا جاتا ہے اس میں تو باقاعدہ ایک خاص انداز ہوتا ہے، اس میں کوئی طبعی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔ آدمی کو فطری غم ہو اور اس غم کا اظہار

غیر اختیاری طور پر زبان سے یا آنکھ سے ہو گیا اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اور ایک ہوتا ہے کہ غم تو کچھ بھی نہیں ہے، صرف زبان سے اظہار کیا جاتا ہے۔ رونے والی جو عورتیں ہوتی ہیں اور جنھوں نے ان کو دیکھا ہے ان کو معلوم ہے کہ جس کے یہاں رونے جارہی ہیں وہاں بس میں سے اتریں، آپس میں باتیں کرتی کرتی جارہی ہیں اور جہاں اس کا مکان قریب آیا کہ ایک ساتھ رونا شروع کر دیں گی، بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں وہ بھی گھبرا جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا، ایک دم کون سی مصیبت آ گئی؟ جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ اس چیز کو خوب جانتے ہیں۔ یہ رونا تو حقیقت میں بناوٹ ہے۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، اس کو حرام قرار دیا اور گناہِ کبیرہ کہا ہے۔

نبی کریم ﷺ جب عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو جن چیزوں سے منع فرماتے تھے اس میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ نوحہ نہیں کریں گی۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ ہوتا تھا کہ مرنے والا بھی باقاعدہ وصیت کر کے مرتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد خوب رونا تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ بڑا آدمی تھا۔ اس لئے حدیث میں آتا ہے کہ رونے والوں کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ہوتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے اس کا تذکرہ آیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ یہاں رونے والے رو رہے ہیں اس میں مرنے والے کا کیا قصور ہے؟ اس کو کیوں عذاب ہوتا ہے؟

اس پر علماء نے لکھا ہے کہ رونے والوں کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب اس وقت ہو گا جب کہ مرنے والے نے رونے کی وصیت کی ہو کہ میرے مرنے کے

بعد رونا، تب تو گویا ان کے رونے میں اس کا دخل ہے، اس لئے اس گناہ میں وہ بھی شریک ہوا تو اس کو عذاب ہوگا۔ یا یہ ہے کہ اس کو معلوم تھا کہ میرے مرنے کے بعد باقاعدہ نوحہ کریں گے، روئیں گے اور اس کے باوجود اس نے نہیں روکا، تو اس صورت میں بھی وہ گنہ گار ہوگا۔ اگر ان دو باتوں میں سے کوئی نہیں ہے تو پھر مرنے کے بعد کسی کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو کوئی عذاب نہیں ہوسکتا۔

باقی اگر کوئی آدمی غیر اختیاری طور پر روئے، مرنے والے کے ساتھ طبعی محبت تھی اس محبت کی وجہ سے غیر اختیاری طور پر آنسو بہہ رہے ہیں، یا غیر اختیاری طور پر منھ سے ہچکیاں نکل رہی ہیں تو اس پر کوئی ممانعت نہیں ہے، اس پر شریعت پابندی نہیں لگاتی ہے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہاں نبی کریم ﷺ کے اوصاف کو بیان کرنا بھی اسی قبیل سے ہے۔

﴿فَلَمَّادُفِنَ قَالَتْ فَاطِمَةُ رضی اللہ عنہا أَطَابَتْ أَنْفُسُكُمْ أَنْ تَحْثُوْاعَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ التُّرَابَ؟﴾

جب حضور اکرم ﷺ کو دفن کر کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو خطاب کر کے کہا: تمھارے دلوں نے اور تمہارے جی نے کیا اس کو پسند کیا کہ تم نبی کریم ﷺ کے جسدِ اطہر کے اوپر مٹی ڈالو؟ یعنی حضور کو تم دفن کر کے آئے؟ تمھارے دلوں نے کیسے گوارا کیا کہ تم حضور ﷺ کو مٹی میں رکھو، آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کے اوپر تم مٹی ڈالو؟ خیر! یہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنی شدتِ محبت کی وجہ سے کہا تھا، ورنہ آپ کو دفن کرنا بھی آپ ہی کے حکم سے تھا اور شریعت ہی کا ایک حکم ہے۔

یہاں اس روایت کو لانے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ اس طرح غیر اختیاری طور پر شدتِ محبت کی وجہ سے ایسی چیز اگر زبان سے نکل گئی تو اس کی وجہ سے صبر پر کوئی زد

نہیں پڑتی ہے، اور یہ صبر کے منافی نہیں ہے۔

﴿حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ﴾

عن أبی زید أسامة بن زید بن حارثة مولیٰ رسول الله ﷺ وَحِبِّهٖ وابْنُ حِبِّهٖ رضی اللہ عنہ قال: اَرْسَلَتْ بِنْتُ النَّبِیِّ ﷺ اِنَّ ابْنِیْ قَدِ احْتُضِرَ فَاشْهَدْنَا فَاَرْسَلَ یُقْرِئُ السَّلَامَ وَیَقُوْلُ اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطٰی وَكُلُّ شَیْئٍ عِنْدَهٗ بِأَجَلٍ مُّسَمًّی فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ. فَاَرْسَلَتْ اِلَیْهِ تُقْسِمُ عَلَیْهِ لَیَأْتِیَنَّهَا. فَقَامَ وَمَعَهٗ سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ وَمُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ وَاُبَیُّ بْنُ كَعْبٍ وَزَیْدُ بْنُ ثَابِتٍ وَرِجَالٌ رضی اللہ عنہم. فَرُفِعَ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الصَّبِیُّ، فَاَقْعَدَهٗ فِیْ حِجْرِهٖ وَنَفْسُهٗ تَقَعْقَعُ، فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ، فَقَالَ سَعْدٌ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا هٰذَا؟ فَقَالَ: هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللّٰهُ تَعَالٰی فِیْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ. وفی روایة: فِیْ قُلُوْبِ مَنْ شَآءَ مِنْ عِبَادِهٖ. وَاِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ.

آپ نے سنا ہوگا نبی کریم ﷺ کے اوپر سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے ان میں غلاموں میں سب سے پہلے ایمان لانے والے یہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہیں، یہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ کے حوالے کر دیا تھا پھر حضور ﷺ نے ان کو آزاد کر دیا۔ اصل تو یہ شریف خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ان کے خاندان کے اوپر دشمنوں نے چھاپہ مارا اور جن کو قید پکڑ لیا ان میں یہ بھی تھے، اور پھر وہ قبیلے والے ان کو لا کر مکہ مکرمہ میں فروخت کر گئے، یہ اس وقت بچے تھے، ان کے والد باقاعدہ اسی جستجو اور تلاش میں رہے کہ میرا بیٹا کہاں ہے، جب نبی کریم ﷺ کے پاس وہ رہے تو کسی نے ان کو دیکھا اور ان کے والد کو جا کر اطلاع دی کہ تمہارا بیٹا تو وہاں ہے،

چنانچہ ان کے والد اور ان کے چچا ان کو لینے کے واسطے آئے اور ان سے کہا کہ آپ کو لینے آئے ہیں، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے کہ ہمارا بیٹا آپ کے پاس ہے آپ جو قیمت بتائیں گے ہم دینے کے لئے تیار ہیں ان کو ہمارے حوالے کریں۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: اگر وہ آنے کے لئے تیار ہوں تو ایک پیسے کی بھی ضرورت نہیں ہے، لے جایئے، مگر آنے کے لئے وہ تیار ہوں، اور اگر وہ تیار نہیں ہیں تو میں کیسے بھیجوں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ ان کے والد کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کہا: یہ میرے والد ہیں، اور ان کے چچا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ کہا: یہ میرے چچا ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ تم کو لینے کے واسطے آئے ہیں اگر تم جانا چاہو تو میری طرف سے اجازت ہے اور اگر تم میرے پاس رہنا چاہو تو بھی اختیار ہے، انھوں نے کہا: یارسول اللہ! مَیں تو آپ کے پاس رہوں گا، ان کے والد نے کہا: ارے تم ان کے پاس غلامی والی زندگی گذارنا چاہتے ہو؟ لیکن انہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ جب انھوں نے جانے سے انکار کر دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم گواہ رہو، مَیں ان کو اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کو اپنا منھ بولا بیٹا بنالیا۔ اور اسی لئے بعد میں ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارا جاتا تھا پھر قرآنِ پاک میں جب یہ حکم آیا ﴿أُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ﴾ کہ جن کو تم اپنا منھ بولا بیٹا بناتے ہو وہ تمہارے سگے بیٹے نہیں ہیں ان کی نسبت ان کے باپ ہی کی طرف کرو، اپنی طرف مت کرو، اس کے بعد پھر ان کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔ تو بہر حال! یہ حضرت زید رضی اللہ عنہ ہیں، اور ان کے صاحبزادے ہیں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ۔

﴿حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے کچھ مناقب﴾

بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ران پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور دوسری ران پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور دعا فرمائی: اے اللہ! مَیں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں تو بھی ان سے محبت کر، اور جوان دونوں سے محبت کرے ان سے بھی تو محبت کر (بخاری ۵/۲۲۳۶) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی۔ یہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے محبوب تھے۔

بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر قبیلۂ بنومخزوم کی ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نے چوری کی تھی اور وہ چوری ثابت ہوگئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ فرمایا، بنومخزوم قبیلہ بہت بڑا قبیلہ تھا، عرب کا بڑا شریف قبیلہ سمجھا جاتا تھا، ابوجہل وغیرہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے تو قریش کا اتنا اونچا قبیلہ اور اس قبیلے کی عورت کا ہاتھ کاٹا جائے یہ تو قبیلے کے لئے بڑی سخت بات ہوجاتی تو لوگوں میں اس کا بڑا چرچا ہوا کہ کوئی شکل ہونی چاہیے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارش بھیجی جائے اور یہ ہاتھ کاٹنے کا سلسلہ رکوایا جائے۔ لیکن کہے کون؟ سب نے مشورہ کرکے کہہ دیا کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور آپ کے منہ لگے ہیں، اگر کوئی کہہ سکتا ہے اور سفارش کرسکتا ہے تو یہ کرسکتے ہیں۔ چنانچہ سب بڑوں نے ان کو کہا کہ آپ کہہ دو۔ انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ اونچے خاندان اور اونچے گھرانے کی عورت ہے، اس کا ہاتھ کٹے گا تو پورے خاندان کے لئے بدنامی ہے۔ اُس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنا غصہ ہوئے کہ کبھی اتنا غصے نہیں ہوئے تھے اور آپ نے فرمایا: ﴿أَتَشْفَعُ فِيْ

حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللہِ ﴾ اے اسامہ! کیا تم اللہ کے حدود اور اللہ کا حکم جاری کرنے کے معاملہ میں سفارش کرتے ہو؟ اگلی امتیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں کا کوئی کم درجے کا آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جاتی تھی، اور بڑے گھرانے کا کوئی آدمی جرم کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور پھر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: میری بیٹی فاطمہ بنت محمد (اعاذھا اللہ منھا) اگر چوری کرے گی تو اس کا بھی مَیں ہاتھ کاٹوں گا۔ (بخاری ۴/۱۵۶۶) بہر حال! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے محبوب تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس کچھ چادریں آئیں، کچھ کپڑے آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عمدہ قسم کا کپڑا دیا جس کا مطالبہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے - جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے تھے - بھی کیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو دینے کے بجائے اِن کو دیا۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے امیر المومنین! یہ کوئی مجھ سے بڑھ کر تو ہیں نہیں؟ آپ نے ان کو کیوں دیا؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ حضور ﷺ کے محبوب ہیں اور تم میرے محبوب ہو، لیکن مَیں حضور کے محبوب کو اپنے محبوب پر ترجیح دیتا ہوں۔ (رواہ الترمذی، مشکوۃ ۵۷۱)

بہر حال! یہاں جو لفظ حِبٌّ آیا - حضور ﷺ کے محبوب اور محبوب کے بیٹے - اس لئے یہ وضاحت کر دی۔

حضور ﷺ کا صاحبزادی کے نام تعزیت کا پیغام

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی ایک صاحبزادی کا بیٹا بیمار تھا، یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا ہیں۔ بعض روایتوں میں بیٹی کا بھی تذکرہ ہے۔ اور بالکل جاں کنی یعنی روح قبض ہونے کی

حالت تھی تو انھوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس آدمی بھیجا کہ یارسول اللہ! میرا بیٹا بالکل آخری حالت میں ہے آپ تشریف لائیے۔ یہ اس لئے کہلوایا تھا کہ آپ کے آنے کی وجہ سے تسلی بھی ہوگی، پھر حضور ﷺ دعا فرمائیں گے تو اس کی وجہ سے کچھ تخفیف اور آسانی بھی ہوجائے گی، دونوں مقصد تھے چونکہ آپ ﷺ کی طبیعت میں شفقت اور رحمت کا جذبہ بہت زیادہ تھا تو آپ اس منظر کو دیکھنے سے کترانا چاہتے تھے اس لئے اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے ان کے اوپر دوبارہ پیغام بھیجا کہ دیکھو! ﴿اِنَّ لِلّٰہِ مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطیٰ﴾ جو لے لیا؛ وہ بھی اللہ کا، اور جو دیا ہے؛ وہ بھی اللہ کا ہے۔ یعنی اس بچے کی جاں کنی کی حالت ہے اور بالکل آخری حالت ہے تو اس کی وجہ سے غمگین ہونے کی ضرورت نہیں، یہ اللہ کی دی ہوئی نعمت تھی، اس نے دی تھی اب وہی لے رہا ہے، اس لئے اس پر آپ پریشان نہ ہوں بلکہ یہ تو جس کی چیز تھی اس نے لے لی ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُّسَمّٰى﴾ اور ہر چیز کی اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک مدت اور وقت مقرر ہے، تمہارے بچے کے لئے بھی ایک وقت مقرر تھا، اب وہ وقت مقررہ پورا ہوا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وہ واپس لیا جارہا ہے، لہٰذا تم کو چاہیے کہ صبر سے کام لو اور اس صبر پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھو۔

﴿عادت اور عبادت میں فرق﴾

دیکھو! ہر نیکی کے کام کو انجام دیتے وقت یہ خیال بھی ہونا چاہیے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کررہا ہوں یعنی اللہ تعالیٰ کا حکم بجالا رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس کا اجر اور ثواب بھی ملے گا۔ اسی کو شریعت کی اصطلاح میں ''احتساب'' کہتے ہیں یعنی نیکی کا کام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا۔ یہی چیز ہے جو عبادت کو عبادت بناتی ہے

ورنہ اگر طبیعت میں یہ خیال نہ رہے تو پھر وہ عبادت نہیں رہے گی بلکہ عادت بن جائے گی یعنی آدمی عادت کے طور پر اس کام کو کرنے لگے گا۔ عبادت والا احساس باقی نہیں رہتا بہر حال! حضور ﷺ نے جانے کے بجائے یہ پیغام ان کو کہلوا دیا کہ صبر سے کام لو اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھو، جس کا جو وقت مقرر ہے اس پر وہ جاتا ہے، لہٰذا پریشان نہ ہو۔

﴿جوابی پیغام......صاحبزادی کا اصرار﴾

اس کے جواب میں آپ کی ان صاحبزادی نے قسم دے کر دوبارہ پیغام بھیجا کہ نہیں! آپ کو آنا ہی پڑے گا کہ میں آپ کو قسم دیتی ہوں کہ آپ ضرور تشریف لائیں۔ جب انھوں نے قسم دی اور دوبارہ اس طرح تاکیدی پیغام بھیجا تو نبی کریم ﷺ ان کے پاس جانے کے لئے اٹھے، جس وقت آپ اپنی ان صاحبزادی کے یہاں تشریف لے جانے لگے اس وقت آپ کے ساتھ حضرت سعد بن عبادہؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ اور دوسرے کچھ انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ یہ سب بڑے بڑے صحابہ ہیں۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کے سردار تھے۔ یہ حضرات بھی ساتھ میں ہو لئے۔ جب اپنی صاحبزادی کے پاس آپ پہنچے تو اس چھوٹے بچہ کو- جس کی جاں کنی کی حالت تھی- اٹھا کر آپ کے ہاتھ میں دیا گیا، آپ کے ہاتھوں میں اس بچے کو رکھا گیا۔ آپ ﷺ نے اس بچے کو اپنی گود میں لیا اس وقت اس کی جان بے چین تھی، سانس بہت تیزی سے چل رہی تھی، جس آدمی کی روح نکل رہی ہو اس وقت اس کی سانس تیزی سے چلتی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آ گئے، آپ ﷺ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بول پڑے: اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟ گویا نبی کریم ﷺ کی

مبارک آنکھوں میں آنسو آنے کو انھوں نے بظاہر نبی کریم ﷺ کی شان کے خلاف سمجھا کہ آپ کی آنکھوں میں آنسو کیسے؟ اس لئے انھوں نے سوال کیا: ﴿ما ھذا؟﴾ اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟ یعنی آپ تو اللہ کے پیغمبر ہیں، اللہ کے رسول ہیں، آپ کی آنکھوں میں آنسو؟ گویا وہ یوں سمجھے کہ یہ چیز شانِ پیغمبری کے خلاف ہے اس لئے انہوں نے سوال کیا۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿هٰذِهٖ رَحْمَةٌ جَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ قُلُوْبِ عِبَادِهٖ﴾ اے سعد! یہ تو جذبۂ رحمت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت فرمایا ہے یعنی آنکھوں کے اندر اس طرح آنسو کا آنا یہ کوئی شانِ رسالت اور شانِ پیغمبری کے خلاف نہیں ہے، یہ تو عین تقاضہ ہے اس جذبۂ رحمت کا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھا ہے۔ بھائی! ہر آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ نے وہ جذبۂ رحمت رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے جب کسی تکلیف زدہ کو دیکھتا ہے تو اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی اور اس کی تکلیف کی وجہ سے اس کی طبیعت پر بھی اثر ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس بچے کی جان نکل رہی تھی اور وہ بچہ تکلیف میں تھا لہٰذا اس کی اس تکلیف کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ کی مبارک آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور آنکھوں کے اندر آنسوؤں کا آنا یہ برا نہیں ہے۔ بلکہ ایک دوسری روایت میں یہ ہے ﴿فِىْ قُلُوْبِ مَنْ شَآءَ مِنْ عِبَادِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کے دل میں چاہتے ہیں یہ جذبہ ودیعت فرماتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اس جذبہ سے محروم ہوتے ہیں۔

﴿وَاِنَّمَا يَرْحَمُ اللّٰهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَآءُ﴾ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اس پر رحمت کا معاملہ کرتے ہیں جو دوسروں پر رحم کرنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی

طرف سے اسی کے ساتھ رحمت کا معاملہ کیا جاتا ہے جو دوسروں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتا ہے۔اسی لئے نبی کریم ﷺ کا ایک اورارشاد ہے: ﴿اَلرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِی الْاَرْضِ يَرْحَمُكُمْ مَنْ فِی السَّمَاءِ﴾ محدثین کے یہاں یہ روایت مسلسل بالاولیت کہلاتی ہے۔

﴿ دین دار لڑکے کی کرامت اور اس کی عجیب قربانی ﴾

ایک طویل روایت ہے اس لئے صرف ترجمہ کر دیتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: پہلی امتوں میں ایک بادشاہ تھا، اس کے پاس ایک جادوگر تھا، اس زمانے میں بادشاہ اپنے پاس جادوگروں کو بھی رکھتے تھے تا کہ ان کے ذریعہ لوگوں کے اوپر اپنا تسلط جمائے رکھیں، جب وہ جادوگر بوڑھا ہوا تو اس نے بادشاہ سے کہا: میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں کوئی نوعمر بچہ میرے حوالے کروتا کہ میں اس کو اپنا جادو کا یہ فن سکھا دوں۔ چنانچہ بادشاہ نے شاہی خاندان کے ایک بچے کو اس کے حوالے کیا تا کہ وہ اس کو اپنا جادو کا یہ فن سکھا دے۔ وہ بچہ اس جادوگر کے پاس جادو سیکھنے کے لئے روزانہ آنے جانے لگا، جس راستے سے وہ آتا جاتا تھا اس راستے میں ایک راہب بھی رہتا تھا ''راہب'' یعنی اللہ کا عبادت گذار بندہ۔ عیسائیوں میں جب تک کہ عیسائی مذہب کے اندر ابھی تحریف نہیں ہوئی تھی اور انجیل اپنی اسی اصلی حالت پر تھی جو حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی تھی تو اس وقت ان کے یہاں یہ رہبانیت کا سلسلہ بھی تھا، اس زمانے میں عیسائیوں کے ساتھ یہودیوں نے اور بت پرستوں نے بھی بڑے مظالم کئے۔ یہ ایک بت پرست بادشاہ تھا جو یمن کے علاقہ نجران میں تھا (آج کل یہ نجران سعودیہ میں ہے) ''ذونواس'' اس کا لقب تھا، یہ

''ذونواس'' اُس زمانے کے جو اہل ایمان تھے ان پر بہت زیادتیاں کرتا تھا۔ بہر حال! اس راستے میں ایک راہب تھا جو اپنی ذات کو چھپائے ہوئے تھا، وہ بچہ جب جادوگر کے پاس آتا جاتا تھا تو راہب کے پاس سے گذرتا تھا، ایک روز ایسا ہوا کہ وہ بچہ اس راہب اور عابد کے پاس بیٹھا جو اللہ کا نیک بندہ تھا، اس کی باتیں اس کو بھلی معلوم ہوئیں کہ یہ اچھی باتیں ہیں، اللہ کی باتیں کرتا ہے، لہٰذا اب اس کی عادت یہ ہوگئی کہ جب بھی وہ جادوگر کے پاس جاتا، راستے میں راہب آتا تو وہ اس کے پاس بیٹھ جاتا، اور جب وہ جادوگر کے پاس پہنچتا تو لیٹ ہو جاتا، تو اس لیٹ ہونے پر وہ اس کی پٹائی کرتا کہ تو کیوں لیٹ آیا؟ اس نے ایک روز اس راہب سے شکایت کی کہ مَیں آپ کے پاس بیٹھتا ہوں، آپ کی باتیں سنتا ہوں تو اس کی وجہ سے وہاں جہاں مجھے بھیجا جاتا ہے؛ لیٹ ہو جاتا ہوں، اور اس لیٹ ہونے پر وہ میری پٹائی کرتا ہے، اب آپ اس سے بچنے کی کوئی تدبیر بتایئے۔ اس پر اس راہب نے اس سے یوں کہا: دیکھو! جب تم اس کے پاس لیٹ پہنچو اور تمہیں یہ خطرہ ہو کہ وہ تمہاری پٹائی کرے گا تو تم یوں کہہ دینا: ﴿حَبَسَنِیْ أَهْلِیْ﴾ میرے گھر والوں نے مجھے روک لیا تھا، تم یہ بہانہ کر دینا تاکہ وہ تمہاری پٹائی نہ کرے، اور گھر دیر سے پہنچو تو گھر والوں کو یوں کہنا: جادوگر اور استاد جی نے مجھے روک لیا تھا۔ دونوں طرف اس طرح بہانہ کر لینا۔ چنانچہ اس کے بعد پھر یہی تدبیر اختیار کی اور پٹائی سے اپنے آپ کو بچا لیا۔ اب وہ برابر جادوگر کے پاس بھی جاتا تھا لیکن راستے میں اس عابد کے پاس ہمیشہ ٹھیرتا تھا اور اس سے اللہ کی سب باتیں سیکھ رہا تھا۔

اسی حالت پر تھا کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک بہت خطرناک اور بڑے اژدہے

نے لوگوں کا راستہ روک لیا، اس کے ڈر کی وجہ سے لوگ آنے جانے سے رُک گئے اور کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کو چھیڑے یا مارے۔ یہ بچہ وہاں سے گذرنے لگا تو اس نے دیکھا کہ یہاں ایک بہت بڑا اژدہا ہے جس نے لوگوں کا راستہ روک رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے جی میں کہا ﴿اَلْيَوْمَ أَعْلَمُ السَّاحِرُ أَفْضَلُ أَمِ الرَّاهِبُ أَفْضَلُ ؟﴾ آج مجھے پتہ چل جائے گا کہ ساحر یعنی یہ جادوگر بہتر ہے اور اللہ کے یہاں مقبول ہے یا یہ راہب اللہ کے یہاں مقبول ہے؟ آج میرے لئے اس کا امتحان کرنے کا وقت آ گیا۔ چنانچہ اس نے یہ کیا کہ ایک پتھر لے کر یوں کہا: اے اللہ! اگر یہ راہب تیرے نزدیک اس جادوگر کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے؛ تو اس پتھر کے ذریعہ سے تو اس اژدہے کو ختم کردے۔ یہ کہہ کر وہ پتھر مارا اور وہ مرگیا۔ بس! لوگوں کا راستہ کھل گیا۔ اس کے بعد وہ راہب کے پاس آ گیا تو اس پر راہب نے کہا: بیٹے! تو تو آج اللہ کے قرب میں مجھ سے بھی بڑھ گیا، تیرے ہاتھ پر یہ کرامت ظاہر ہوئی اور تیرا معاملہ لوگوں کے سامنے بھی آ گیا، اب اندیشہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیری آزمائش ہوگی اور کہیں ایسا نہ ہو کہ بادشاہ تجھے ایذائیں پہنچائے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے ایذائیں پہنچنے کا وقت آ جائے؛ تو میرا نام مت لینا یعنی بادشاہ اگر تجھ سے پوچھے کہ یہ ساری باتیں تجھے کس نے سکھائیں تو میرا حوالہ مت دینا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔

اس کے بعد تو معاملہ اتنا آگے بڑھ گیا کہ کوئی مادرزاد اندھا ہوتا یعنی ماں کے پیٹ سے اندھا پیدا ہوتا اور یہ بچہ اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا؛ تو وہ بینا ہو جاتا، اس کی بینائی ٹھیک ہو جاتی۔ کوئی کوڑھی ہوتا اور اس پر ہاتھ پھیر دیتا تو اس کی بیماری دور ہو جاتی اور جس کو جو بیماری ہوتی، بیمار لوگ اس کے پاس آتے تھے، یہ ہاتھ پھیر دیتا تھا؛ وہ ٹھیک ہو جاتے تھے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ بادشاہ کے وزیروں میں سے ایک وزیر اندھا ہوگیا، اس کو کسی نے بتلایا کہ فلاں صاحب ہیں جو ہاتھ پھیر دیتے ہیں تو بیمار ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ وہ بہت بڑے ہدیے لے کر اس کے پاس پہنچا اور کہا: اگر تو مجھے ٹھیک کردے تو یہ سب ہدیے تیرے لئے ہیں۔ اس نے کہا: مَیں تو کسی کو ٹھیک نہیں کرتا، شفا میرے ہاتھ میں نہیں، شفا دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، اس لڑکے کی عادت تھی کہ جب بھی کوئی بیمار کسی بیماری سے شفاء کی دعا کے لئے اس کے پاس آتا تو اس کے ساتھ شرط کر لیتا تھا کہ تو اللہ پر ایمان لائے تو تیرے لئے دعا کروں گا اور تو ٹھیک ہوجائے گا۔ اس طرح سے بہت سارے لوگ ایمان لے آئے۔ لہٰذا اس کے ساتھ بھی شرط کی کہ اگر تو اللہ پر ایمان لے آئے تو مَیں تیرے لئے اللہ سے دعا کروں گا؛ تو اللہ تعالیٰ تجھے تندرستی دے دیں گے چنانچہ وہ اللہ پر ایمان لے آیا اور ٹھیک ہوگیا، بینا ہوگیا۔

پھر جب وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تو بادشاہ نے پوچھا: تیری یہ بینائی کیسے ٹھیک ہوگئی؟ تو تو اندھا ہوگیا تھا؟ کس نے تجھے ٹھیک کیا؟ تو اس نے کہا؛ میرے پروردگار نے اچھا کیا بادشاہ نے کہا: میرے علاوہ بھی تیرا کوئی پروردگار ہے؟ تیرا پروردگار تو میں ہوں، اس نے کہا: نہیں! تیرا اور میرا دونوں کا پروردگار اللہ ہے۔ وزیر نے جب یہ کہا تو بادشاہ نے اس کو پکڑ کر ایذائیں دینا شروع کیں اور پوچھا کہ اس نے یہ کہاں سے سیکھا۔ اس نے پتہ دے دیا کہ فلاں لڑکے نے مجھے یہ سکھایا ہے۔ اب بادشاہ نے لڑکے کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ تیرا جادو تو بہت آگے نکل چکا ہے تو نابینا کو بینا کر دیتا ہے، اس نے کہا: مَیں کسی کو تندرست نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ تندرست کر دیتا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھی سزائیں

دینا اور تکلیف پہنچانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ اس نے اس راہب کا حوالہ دے دیا۔ حالانکہ وعدہ کر چکا تھا اور راہب نے اس کو کہا تھا کہ میرا نام مت لینا، لیکن راہب کا نام لے لیا۔

چنانچہ بادشاہ نے اس راہب کو پکڑ کر بلوایا اور اس سے یوں کہا کہ تو اپنا دین چھوڑ دے، وہ بادشاہ بت پرست تھا اور یہ راہب عیسائی تھا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں چھوڑ سکتا تو بادشاہ نے آرہ منگوایا اور زمین کے اندر اس آدمی کو ذرا سا گاڑ کر اس کے سر پر آرہ رکھ کر اس کے پورے دو ٹکڑے کر دئے اور اس کو چیر دیا۔ اس کے بعد وزیر کو بلایا اور اس کو بھی کہا کہ تو اپنا یہ دین چھوڑ دے۔ اس نے جواب دیا کہ میں نہیں چھوڑ سکتا، اس کے اوپر بھی آرہ رکھا اور اس کے بھی دو ٹکڑے کر دیئے اس کے بعد پھر لڑکے کو بلایا اور کہا کہ تو اپنے دین سے باز آجا اور چھوڑ دے۔ اس نے بھی انکار کیا تو اس کو آرہ سے چیرنے کے بجائے بادشاہ نے اپنے کچھ آدمیوں کے حوالے کیا اور کہا کہ اس کو پہاڑ پر لے جاؤ اور بالکل چوٹی پر لے جا کر اس سے پوچھ لینا کہ اپنے دین سے باز آتا ہے اور اس کو چھوڑتا ہے، اگر باز آجائے اور چھوڑ دے تب تو ٹھیک ہے، اگر باز نہ آئے اور نہ چھوڑے تو پھر اس کو وہاں سے گرا دینا تاکہ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ چنانچہ وہ لوگ اس کو لے گئے، اب اس نے وہاں جا کر دعا کی: اے اللہ! تو جس طرح چاہے میری طرف سے ان کو کافی ہو جا یعنی ان کا شر اور ان کی طرف سے جو ایذا مجھے پہنچ سکتی ہے تو جس طرح چاہے دور کر دے۔ چنانچہ پہاڑ میں ایک دم سے جھرجھری سی آئی اور جو لوگ اس کو لے کر گئے تھے؛ وہ سب چوٹی پر سے نیچے گر گئے اور مر گئے اور یہ لڑکا سلامت رہا اور چل کر بادشاہ کے پاس آیا۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ لوگ کیا ہوئے؟ اس نے

کہا: اللہ تعالیٰ نے ان کو ختم کردیا۔

پھر بادشاہ نے اس کو کچھ اور لوگوں کے حوالے کیا کہ اس کو کشتی میں لے جاؤ اور سمندر کے بیچ میں لے جانے کے بعد اس سے پوچھو اگر وہ اپنے دین سے باز آجائے تب تو ٹھیک ہے واپس لے آنا؛ ورنہ تو سمندر میں ڈال دینا۔ وہ اس کو کشتی میں لے گئے، وہاں پہنچنے کے بعد اس نے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ اس کی دعا کے نتیجے میں کشتی ڈوبی تو وہ سب ڈوب گئے اور یہ بچ کر پھر بادشاہ کے پاس آ گیا۔ بادشاہ نے پوچھا: کیا ہوا؟ اس نے کہا: ان سب لوگوں کو اللہ تعالیٰ میری طرف سے کافی ہو گیا، وہ سب ڈوب گئے۔

اب اس نے بادشاہ سے کہا: ﴿اِنَّکَ لَسْتَ بِقَاتِلِی حَتّٰی تَفْعَلَ مَا آمُرُکَ بِهٖ﴾ دیکھو! تم مجھے مار نہیں سکتے ہو، ہاں! مَیں ایک تدبیر بتلاتا ہوں اس تدبیر پر اگر تم عمل کرو؛ تو مَیں مروں گا، اس کے بغیر تم مجھے مار نہیں سکتے۔ بادشاہ نے پوچھا: وہ تدبیر کیا ہے؟ کہا: پہلا کام تو یہ کرو کہ ایک میدان میں تمام لوگوں کو جمع کرو، اس کے بعد مجھے درخت کے تنے کے اوپر لٹکاؤ، اس کے بعد میرے ترکش میں سے ایک تیر نکالو اور اس کو کمان کے بیچ میں رکھ کر کہو: ﴿بِسْمِ اللهِ رَبِّ الْغُلَامِ﴾ پھر مجھے وہ تیر مارو، جب تم اس طرح کروگے تو ہی مجھے مار پاؤگے۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا جیسا اس لڑکے نے کہا۔ اور تیر مارا تو وہ تیر اس کی کنپٹی میں لگا اور اس کا وہیں انتقال ہو گیا۔ اب جب یہ ہوا تو جتنے بھی لوگ تھے؛ وہ سب کہنے لگے کہ ہم اس لڑکے کا جو رب ہے اس پر ایمان لاتے ہیں گویا وہ سب بادشاہ سے ہٹ گئے اور ان کی سمجھ میں آ گیا کہ جو آدمی اس لڑکے کو قتل کرنے میں بھی محتاج ہے، جب تک کہ اُس نے اِس لڑکے کے رب کا نام نہیں لیا اُس وقت تک یہ بچہ اور لڑکا اُس سے نہیں مرا؛ تو اُس

کے ہاتھ میں ہے کیا؟ چنانچہ سب لوگ اللہ پر ایمان لے آئے۔اسی لئے اس نے یہ تدبیر اختیار کی تھی۔گویا اپنے آپ کو قربان کیا اور تمام لوگوں کو ایمان کی دولت سے مالا مال کرایا۔

اب بادشاہ کے جومشیر لوگ تھے انھوں نے کہا: دیکھو! تم کو جو ڈر تھا؛ وہی ہوا۔اس بچے کو تم اسی لئے قتل کرواتے تھے تاکہ اس کو دیکھ کر لوگوں کا دین خراب نہ ہو، عقیدہ نہ بگڑے۔لیکن اس نے مر کے سب کو مسلمان بنایا ہے۔بادشاہ نے کہا: دیکھو! ہر گلی اور ہر محلے کے کنارے پر خندقیں کھودو۔

چنانچہ اس کے حکم پر پوری بستی کے اندر ہر گلی اور ہر محلے کے اوپر خندقیں کھودی گئیں اور اس کے اندر آگ جلائی گئی، جب آگ آسمان کو چھونے لگی، تو پھر لوگوں کو پکڑ کر لایا جاتا تھا کہ اپنے دین سے باز آتے ہو یا اندر ڈالیں، لیکن کوئی بھی باز نہیں آیا، سب کہتے تھے کہ ہم تو باز نہیں آتے، ان کو ڈال دیا جاتا تھا، اسی طرح سب کو ختم کیا گیا۔

یہاں تک کہ ایک عورت کو لایا گیا اس کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا، اپنے بچے کی محبت کی وجہ سے اس عورت کو کچھ جھجک ہوئی تو بچہ اس کو کہنے لگا، چھوٹا سا دودھ پیتا بچہ تھا، اس نے اپنی ماں سے کہا: ماں کوئی بات نہیں، تو حق پر ہے، مرجا، اپنے آپ کو قربانی کے واسطے پیش کردے چنانچہ ماں کی جو جھجک تھی؛ وہ ختم ہوگئی، اور اس نے بھی انکار کیا کہ میں بھی اپنے دین کو نہیں چھوڑ سکتی، اور اس کو بھی ڈال دیا گیا۔قرآنِ پاک میں سورۃ البروج میں ہے ﴿قُتِلَ أَصۡحَابُ الۡأُخۡدُوۡدِ﴾ وہ یہی اصحاب الاخدود کا قصہ ہے۔

بہر حال! اُس بچے کا اور ان لوگوں کا جو صبر تھا کہ اس مصیبت پر اور بادشاہ کے مظالم پر صبر کیا لیکن اپنے دین کو نہیں چھوڑا اور ایمان پر قائم رہے، اسی بات کو بتلانے کیلئے اس روایت کو یہاں لائے۔

اقتبـــــــــاس

ان احادیث سے ایک بہت بڑا سبق ہمیں یہ بھی ملتا ہے
کہ کسی بھی چیز کے ہمارے ہاتھ سے نکل جانے پر ہمیں ایک تو
صبر سے کام لینا چاہیے اور یوں سوچنا چاہیے کہ یہ نعمت جو میرے ہاتھ
سے لے لی گئی ہے، اس کو لے کر مجھے آزمایا جارہا ہے، اور اس آزمائش میں اگر
مَیں کامیاب ہوگیا اور مَیں نے صبر سے کام لیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب
کی امید رکھی؛ تو یہ جو لیا گیا اس سے کئی گنا زیادہ اور اس سے کئی گنا اچھا بدلہ مجھے
اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ اس لئے جو بھی چیزیں ہمارے
ہاتھ سے جاتی ہیں؛ ان تمام چیزوں کے متعلق ہمیں ایک مؤمن ہونے کی
حیثیت سے یہ تصور رکھنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی ہمیں یہ تعلیم اور ہدایت ہے کہ
ہمارے ہاتھ سے کوئی چیز چلی جائے تو اس پر یوں سوچنا چاہیے کہ:-

''گیا کیا اور ملا کیا؟''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراًکَثِیْراً . اما بعد .

﴿صبر کا صحیح وقت﴾

عن انس رضی اللہ عنہ قَالَ مَرَّالنَّبِیُّ ﷺ بِامْرَأَۃٍ تَبْکِیْ عِنْدَقَبْرٍفَقَالَ:اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ فَقَالَتْ:اِلَیْکَ عَنِّیْ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِیْبَتِیْ.وَلَمْ تَعْرِفْہُ.فَقِیْلَ لَھَا اِنَّہُ النَّبِیُّ ﷺ.فَاَتَتْ بَابَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَمْ تَجِدْعِنْدَہٗ بَوَّابِیْنَ.فَقَالَتْ:لَمْ اَعْرِفْکَ. فَقَالَ:اِنَّمَاالصَّبْرُعِنْدَالصَّدْمَۃِ الْاُوْلٰی.(متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کا گذر ایک عورت کے پاس سے ہوا جو ایک قبر کے پاس بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلم کی روایت کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کا بیٹا انتقال کر گیا تھا اور وہ قبر اس کے بیٹے کی تھی اسی کے غم میں وہاں پر وہ رو رہی تھی، نبی کریم ﷺ نے جب اس کو روتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ﴿اِتَّقِی اللّٰہَ وَاصْبِرِیْ﴾ کہ اللہ سے ڈر اور صبر سے کام لے۔

پچھلی مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ غیر اختیاری طور پر کسی مصیبت کی وجہ سے اگر آنسو نکل آویں، آواز بھی نکل جائے اور رونا ہو تو اس پر کوئی پکڑ نہیں لیکن آدمی قصداً نوحہ والی شکل

اختیار کرے جیسا کہ میں نے تفصیل پہلے بتلا دی تھی تو شریعت نے اس کو منع کیا ہے اور نبی کریم ﷺ عورتوں سے جب بیعت لیتے تھے تو با قاعدہ تو بہ میں اس کو بھی شریک فرماتے تھے اور ان سے یہ وعدہ لیتے تھے کہ نوحہ نہیں کریں گی۔ یہ عورت جو اپنے بیٹے کی قبر کے پاس رو رہی تھی، ہوسکتا ہے کہ اس کا رونا اسی قبیل سے ہو، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو صبر کی تلقین فرمائی اور فرمایا: اللہ سے ڈر اور صبر سے کام لے، اس طرح رونے دھونے سے کوئی فرق پڑتا نہیں۔ اس عورت نے نبی کریم ﷺ کو پہچانا نہیں اس لئے اس نے جواب میں حضور اکرم ﷺ سے یوں کہا: ﴿اِلَیْکَ عَنِّیْ﴾ ہٹو یہاں سے! آپ پر وہ مصیبت نہیں پڑی ہے؛ جو مجھ پر پڑی ہے۔ اس نے یہ نہیں پہچانا کہ یہ کہنے والے نبی کریم ﷺ ہیں، اس نے یوں سمجھا کہ کوئی عامی آدمی ہے اور مجھے کسی بات کی نصیحت کر رہا ہے، اس لئے اس نے اس طرح کا جواب دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شان میں جس ادب کی رعایت کرنی چاہیے تھی؛ ناواقفیت کی وجہ سے وہ نہیں کر پائی۔ بہر حال! اس نے جواب میں بجائے اس کے کہ اس نصیحت پر عمل کرتی اور اس کو قبول کرتی حضور اکرم ﷺ کو یوں کہا: آپ یہاں سے چلے جائیے، آپ پر وہ مصیبت نہیں پڑی ہے؛ جو مجھ پر پڑی ہے ﴿وَلَمْ تَعْرِفْهُ﴾ روایت کے الفاظ ہیں کہ وہ عورت حضور ﷺ کو پہچان نہیں پائی۔ اب حضور ﷺ تو اس کو نصیحت فرمانے کے بعد وہاں سے تشریف لے گئے، آپ کے وہاں سے تشریف لے جانے کے بعد لوگوں نے اس عورت کو بتلایا کہ پگلی! تجھے معلوم نہیں کہ تو نے یہ جواب کس کو دیا؟ یہ حضور اکرم ﷺ تھے اور تو نے ان کو یہ جواب دیا ہے کہ آپ یہاں سے چلے جائیے آپ پر وہ مصیبت نہیں آئی ہے جو مجھ پر آئی ہے۔ جب اس نے یہ سنا کہ یہ نبی کریم ﷺ تھے تو بہت

سٹپٹائی اور اس کو بڑا خوف لاحق ہوا کہ اب کیا ہوگا چنانچہ معافی مانگنے کی غرض سے آپ ﷺ کے دولت کدے پر حاضر ہوئی۔ جب حضور ﷺ کے مکان پر پہنچی تو دیکھا کہ وہاں کوئی دربان نہیں ہے جیسے بڑے آدمیوں، بادشاہوں، سلاطین، حاکموں کے مکان پر دربان ہوا کرتے ہیں؛ وہاں ایسا کوئی دربان نہیں ہے۔ اس پر اس کو بڑا تعجب ہوا۔ پھر حضور اکرم ﷺ کے سامنے آئی اور معذرت کرتے ہوئے یوں کہا: ﴿لَمْ اَعْرِفْکَ﴾ اے اللہ کے رسول! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ گویا وہ اپنے جواب پر معذرت طلب کر رہی تھی کہ میں نے آپ کو جو جواب دیا وہ اس لئے تھا کہ میں آپ کو پہچان نہیں پائی۔

نبی کریم ﷺ نے اس کی اس بات سے صرف نظر کرتے ہوئے جو حقیقت تھی وہ بیان فرمائی: ﴿اِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰی﴾ دیکھو! صبر تو حقیقت میں وہی ہوتا ہے کہ آدمی پر مصیبت پڑے اس وقت صبر سے کام لے یعنی جس وقت ابتداءً آدمی کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے، آفت اور بلا میں گرفتار ہوتا ہے، شروع میں جب وہ آفت آتی ہے؛ تب اس کو جو صدمہ پہنچتا ہے؛ اگر اس وقت آدمی صبر سے کام لے تو وہ ہے صبر۔ باقی مدت گذر جانے کے بعد تو جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے جیسا کہ کہا گیا ہے ''وقت بہت بڑا مرہم ہے'' بڑے سے بڑا غم اور بڑے سے بڑا زخم بھی آدمی بھلا دیا کرتا ہے اور اس کو صبر آہی جاتا ہے، وہ صبر کافی نہیں ہے۔ اور اس صبر پر وہ وعدے نہیں ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صبر پر کئے گئے ہیں۔ وعدہ اس صبر کے اوپر ہے کہ آدمی کو اولاً مصیبت لاحق ہوئی یعنی شروع میں مصیبت پڑی اسی وقت وہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اجر اور ثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر سے کام لے، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو نوازا جاتا ہے

اور وہی حقیقی معنی میں صبر ہے۔ ورنہ زمانہ گذرنے کے بعد آدمی ٹھنڈا ہو جائے اور پھر ضبط اور صبر سے کام لے؛ تو ہر ایک کو یہ چیز حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں جو مطلوب ہے وہ یہ ہے۔ گویا حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تیرے اوپر وہ مصیبت آئی تھی اور میں نے تجھ سے کہا تھا اس وقت اگر تو صبر سے کام لیتی تو وہ فضیلت حاصل ہوتی، اب وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ صبر کا محل اور موقع کیا ہے اس کو بتلانا چاہتے ہیں۔ گویا جہاں اول وہلہ میں مصیبت آدمی کو پہنچتی ہے مثلاً کسی کا انتقال ہو گیا کوئی اور حادثہ پیش آیا کوئی مالی نقصان ہوا تو اسی وقت آدمی اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر سے کام لے؛ تو یہ ہے صبر۔ باقی اس وقت تو آہ واویلا کرتا رہا، چیختا چلاتا رہا، لوگوں کے سامنے شکوے اور شکایتیں کرتا رہا اور بعد میں پھر دھیرے دھیرے زمانہ گذرتا گیا اور آپ ہی آپ اس کو ذرا سکون حاصل ہوتا گیا تو اس کے بعد جو صبر آئے گا وہ کسی کام کا نہیں، اس سے وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

محبوب کے انتقال پر صبر کی فضیلت

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: يَقُوْلُ اللّٰهُ تَعَالىٰ: مَالِعَبْدِىْ الْمُؤْمِنِ عِنْدِیْ جَزَآءٌ اِذَاقَبَضْتُ صَفِيَّهٗ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَاثُمَّ أحْتَسَبَهٗ اِلَّا الْجَنَّة. (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں۔ پہلے بھی میں بتلا چکا ہوں کہ حدیثِ پاک میں جب نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمائیں تو وہ حدیثِ قدسی کہلاتی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ

میرے مؤمن بندے کے لئے اس چیز کا بدلہ جنت کے سوا کچھ نہیں ہے جب میں اس کے کسی محبوب کی روح قبض کرلوں، دنیا والوں میں سے اس کا محبوب اس سے لے لوں اور پھر وہ اس پر صبر کرتے ہوئے مجھ سے ثواب کی امید رکھے۔یعنی اگر کسی کے محبوب کا انتقال ہوجائے چاہے اس کا بیٹا ہو، باپ ہو، کوئی بھی عزیز ہو جس کے ساتھ اس کو محبت تھی، جتنی جتنی محبت جس درجے کی ہوگی اسی درجے کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اجر دیا جائے گا۔تو اگر کسی کا محبوب ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے محبوب کو لے لیں یعنی اس کے محبوب کا انتقال ہوجائے بیٹے کا انتقال ہوجائے یا اور کسی قریبی عزیز، رشتہ دار کا انتقال ہوجائے جو اس کے نزدیک بہت زیادہ محبوب تھا اور اس کے انتقال پر اگر وہ صبر سے کام لیتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے یہاں اس کا سوائے جنت کے کوئی بدلہ نہیں ہے۔

یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اکرام ہے۔اس لئے کہ وہ اس کا محبوب تھا اور اللہ نے لیا، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اللہ ہی کی ملک تھی اللہ تعالیٰ کی چیز تھی اللہ تعالیٰ نے لے لی، لیکن اس کے باوجود بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ انعام کیا، اگر اس لینے پر بندے نے صبر، تحمل اور بردباری سے کام لیا، آہ وواویلا نہیں کیا، شکوے شکایتیں نہیں کیں، رویا دھویا نہیں تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو بدلے کے طور پر جنت دی جاتی ہے۔

لہٰذا جس وقت کسی کے کسی محبوب کا انتقال ہو تو تصور کرے کہ میں اگر صبر سے کام لوں گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مجھے اس پر اجر اور ثواب دیا جائے گا۔ ﴿احتسبه﴾ کا یہی مطلب ہے۔

﴿ہر نیک عمل میں حصولِ ثواب کا استحضار ضروری ہے﴾

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں ہر کام میں آدمی یہ تصور کرے کہ میں جو کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس پر ثواب ملے گا یعنی اس کام کو اللہ کے واسطے ثواب حاصل کرنے کی نیت سے کرے۔ یہ تصور ہو تو اس صورت میں اس کام پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو ثواب ملے گا اور اجر دیا جائے گا۔ اور اگر یہ تصور نہیں ہے تو پھر وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ نماز بھی ویسے ہی بغیر احتساب کے پڑھ لی تو فریضہ تو ادا ہو جائے گا یعنی نماز جو اس کے ذمہ تھی وہ ذمہ پورا ہو جائے گا لیکن نماز پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو ثواب ملا کرتا ہے؛ وہ حاصل نہیں ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے ﴿مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًاوَّاِحْتِسَابًاغُفِرَ لَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ، مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِاِيْمَانًاوَّاِحْتِسَابًا﴾ جس نے ایمان کی حالت میں ثواب کی امید سے رمضان کے روزے رکھے اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے، جس نے شبِ قدر میں ایمان کی حالت میں ثواب کی نیت سے عبادت کی، اس کے اگلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ تو دونوں جگہ پر قید لگائی گئی ہے ''رمضان کے روزے یا لیلۃ القدر کی عبادت ایمان کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھتے ہوئے انجام دیں''۔ تو آدمی کوئی بھی کام کرے اس کے پیش نظر اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہونی چاہیے۔

شروع میں جہاں اخلاص کا تذکرہ آیا تھا وہاں بتلایا تھا کہ ہر کام میں یہاں تک کہ جو ہمارے طبعی کام ہیں اور ہم اپنے طبیعت کے تقاضے سے انجام دیتے ہیں ان میں بھی اگر احتساب ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھتے ہوئے ہم اس کام کو انجام

دیں گے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو اجر وثواب ملے گا۔

ہم رات کو اس لئے سوئیں کہ سونے سے ہم کو سکون ملے گا اور ہمارے بدن کو راحت پہنچ جائے گی اور ہم دوبارہ اس قابل ہوجائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں، اس کے احکام کو بجالائیں، گویا اپنے اس جسم کو آرام اس لئے دے رہے ہیں کہ دوبارہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے جسم کو استعمال کرسکیں۔ یہ مشین تھوڑی دیر کے لئے اس لئے بند رکھی ہے کہ دوبارہ چل سکے تو اس صورت میں یہ سونا بھی عبادت کہلائے گا اور اس پر بھی ثواب ملے گا۔

کھانا اس لئے کھا رہے ہیں کہ اس کھانے کے ذریعہ سے جو قوت حاصل ہوگی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں استعمال کریں گے تو اس صورت میں یہ کھانا بھی عبادت میں شمار ہوگا۔

ہر کام میں احتساب ضروری ہے یہاں پر بھی جو قید لگائی ہے کہ اپنے محبوب کے انتقال پر اگر صبر سے کام لیتے ہوئے اللہ سے اجر وثواب کی امید رکھے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو جنت سے کم کچھ نہیں دیں گے یعنی جنت جیسا بدلہ ملے گا۔ جنت بہت بڑی چیز ہے، بہت بڑا بدلہ ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو دیا گیا ہے۔

طاعون کافر کے لئے عذاب......مومن کے لئے رحمت

عن عائشة رضی اللہ عنہا اَنَّهَا سَأَلَتْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الطَّاعُوْنِ، فَاَخْبَرَهَا اَنَّهُ كَانَ عَذَابًا يَّبْعَثُهُ اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ، فَجَعَلَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى رَحْمَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ، فَلَيْسَ مِنْ عَبْدٍ يَقَعُ فِى الطَّاعُوْنِ فَيَمْكُثُ فِىْ بَلَدِهٖ صَابِرًا مُحْتَسِبًا يَعْلَمُ اَنَّهُ لَا يُصِيْبُهُ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ اِلَّا كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ الشَّهِيْدِ۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انھوں نے نبی کریم ﷺ سے طاعون (طاعون) کے متعلق پوچھا۔ طاعون ایک بیماری ہے اس وقت اس کی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہر شخص واقف ہے (کیوں کہ سورت شہر قریبی زمانہ میں اس کی زد میں آیا تھا۔م) ایک مخصوص قسم کا وبائی مرض ہے جس میں آدمی کے کسی جوڑ میں بغل میں یا اور کسی جوڑ کے اندر گلٹی اور گانٹھ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد جسم میں کچھ حرارت اور بخار سا ہوتا ہے، قے ہوتی ہے اور تھوڑے سے وقت کے بعد آدمی مرجاتا ہے اور یہ بہت خطرناک وبائی مرض ہے، جب پھیلتا ہے تو بہت بڑی مقدار میں آدمی اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

آپ ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کے متعلق دریافت کیا، حضور ﷺ نے فرمایا: دراصل اس کی ابتداء تو اس طرح ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اس کو اگلے لوگوں میں سے بعض کے گناہوں کی سزا کے طور پر عذاب دینے کے واسطے اتارا تھا لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اہلِ ایمان کے واسطے اس کو رحمت بنادیا یعنی آج بھی اگر کوئی مؤمن اس بیماری کے اندر مبتلا ہو تو اس صورت میں اس کے حق میں وہ عذاب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں ﴿فجعلهُ الله تعالیٰ رحمةً للمؤمنين﴾

﴿طاعون مؤمنین کے لئے رحمت کب بنتا ہے﴾

اہل ایمان کے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو رحمت کیسے بنایا؟ حضور ﷺ اس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ جو بندہ طاعون میں مبتلا ہو یعنی کسی شہر میں طاعون ہو گیا اور وہ آدمی اس شہر میں رہتا ہے اور طاعون پھیل جانے کے بعد بھی وہ اس شہر کو یہ سمجھ کر چھوڑ کر نہیں جارہا ہے کہ میرے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں جو مقدر رہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

اور اگر وہ یوں سوچے کہ میں شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا تو بچ جاؤں گا تو اس کا یہ سمجھنا غلط ہے، صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی قسمت میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ طاعون کی اسی بیماری سے موت پاوے تو اس صورت میں اس شہر میں رہے تب بھی موت آئے گی اور کہیں دوسری جگہ چلا جائے تب بھی اس کو موت آ کر کے رہے گی۔ تو ایمان والوں کا ایمان ان سے اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو مصیبت لکھ دی ہے وہ ہی مجھے پہنچے گی اس کے علاوہ اور کوئی مصیبت پہنچنے والی نہیں ہے ﴿قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے لئے تقدیر میں جو لکھ دیا ہے وہ ہی ہم کو پہنچے گا اس کے علاوہ اور کوئی چیز ہم کو پہنچنے والی نہیں۔ یہ سمجھ کر اور اللہ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے صبر سے کام لیتے ہوئے تحمل کرتے ہوئے وہ اسی شہر میں ٹھیرا رہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہید کا ثواب ملتا ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہاں جب موت اتنی عام ہوگئی ہے جہاں اس کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ ہوسکتا ہے کہ موت آجائے، اس صورت میں بھی اگر وہ صبر وضبط سے کام لیتے ہوئے اور ایمان کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے یوں سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے جو طے فرما دیا ہے وہی ہو کر رہے گا اس میں ذرہ برابر بھی کوئی فرق آنے والا نہیں ہے؛ اسی جگہ رہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو شہید کا ثواب ملے گا۔

﴿طاعون زدہ علاقہ کے بارے میں شرعی حکم اور اس کی حکمت﴾

لہٰذا جس بستی کے اندر طاعون پھیلا ہو، اس کا یہی حکم ہے کہ جو آدمی جس بستی میں رہتا ہو اس کو چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ اور اس میں کئی مصلحتیں بھی ہیں، ایک تو یہ کہ اس طرح

تندرست لوگ- جو ابھی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئے ہیں- شہر کو چھوڑ کر چلے جائیں گے تو جو بیمار ہیں ان کی تیمارداری کون کرے گا۔ اسی طرح اس بیماری کی وجہ سے جو لوگ موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں ان کی تجہیز و تدفین وغیرہ کا انتظام کون کرے گا۔ اس لئے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اور جو لوگ وہاں نہیں ہیں دوسری جگہ رہتے ہیں ان کو بھی یہ حکم دیا کہ اب وہ اس بستی میں نہ آویں اور اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ اگر وہ اس بستی میں آیا اور اس کو بیماری لاحق ہوئی اور انتقال کر گیا تو حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ آتا تب بھی یہ مصیبت اس کو لاحق ہونے ہی والی تھی لیکن یہاں آنے کے بعد لاحق ہوئی تو شاید وہ یہ سمجھے کہ میرے یہاں آنے کی وجہ سے میں اس بیماری میں مبتلا ہوا، اگر نہ آتا تو مبتلا نہ ہوتا گویا یہ عقیدہ خراب کرنے والی چیز ہے۔ اس لئے شریعت نے اس سے منع کیا کہ جہاں اس طرح کی وبائی بیماری پھیل چکی ہو اور وہاں اگر آپ نہیں ہیں تو نہ جائیں، اور ہیں تو وہاں سے ہٹنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ اس میں اور بھی بڑی بڑی مصلحتیں ہیں اور ہمارا یہ شہر (سورت) اس سے گذر چکا ہے اور یہ دونوں مصلحتوں سے بھی ہم ماشاء اللہ خوب واقف ہو چکے ہیں۔ جو گئے ان کو جانے کی وجہ سے کیا کیا مصیبتیں آئیں اور کیا کیا بھگتنا پڑا وہ بھی سب کو معلوم ہے اور جو یہیں رہے اس کی وجہ سے کیا آسانیاں ہوئیں وہ بھی مخفی نہیں۔

﴿بینائی نہ ہونے یا ختم ہو جانے کی فضیلت﴾

عن انس رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان اللہ عز وجل قال: اِذَا ابْتَلَيْتُ عَبْدِىْ بِحَبِيْبَتَيْهِ، فَصَبَرَ، عَوَّضْتُهٗ مِنْهُمَا الْجَنَّةَ. يُرِيْدُ عَيْنَيْهِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے

فرمایا: (یہ بھی حدیثِ قدسی ہے) جب میں اپنے بندے کو اس کی دو محبوب چیزوں کے ذریعہ سے آزماتا ہوں اور اس پر وہ صبر سے کام لیتا ہے تو میں اس کو اس کے بدلے میں جنت دیتا ہوں۔ دو محبوب چیزیں یعنی دو آنکھیں۔ یعنی اگر کسی آدمی کی بینائی چھن جائے یا یہ ہے کہ شروع سے بینائی ہے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اس کو بینائی دی ہی نہیں، مادرزاد اندھا پیدا ہوا یا پیدا ہوا تب دیکھتا تھا لیکن بعد میں کسی بیماری کی وجہ سے اس کی آنکھیں نہیں رہیں اور دیکھنے کی صلاحیت ختم ہوگئی اور اس پر اس نے صبر سے کام لیا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے بدلے میں اس کو جنت عطا فرمائیں گے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب یہ چیز لے لی گئی تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے جنت عطا فرمائی۔ اس لئے آدمی کو یوں سوچنا چاہیے کہ کوئی بھی چیز جب ہمارے پاس سے جائے، کوئی چھوٹی سی نعمت چھن جائے تو اس کے جانے پر پریشان نہ ہوں۔

﴿یہ نہ دیکھئے کہ کیا گیا، یہ دیکھئے کہ کیا ملا﴾

یہاں ہمیں یہ سبق دیا جارہا ہے کہ مصیبت پر ہمیں پریشان یا دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھئے! یہاں آنکھیں اللہ تبارک وتعالیٰ نے لے لیں، آنکھیں بہت عظیم نعمت ہیں لیکن بہرحال! آپ اس سے جنت کا مقابلہ تو نہیں کرسکتے، اس لئے کہ دنیا میں جو آنکھیں آپ کو حاصل ہوں گی وہ کب تک کام دیں گی؟ موت آئے گی تب تک۔ تو گویا یہ آنکھیں بھی فانی ہی ہیں، اس کے لئے تو ایک فانی چیز تھی اگرچہ اپنی جگہ پر بہت اہمیت کی حامل تھیں اور بہت عظیم چیز تھی لیکن تھی فانی، تو اس کو لے لینے کے بدلے میں جب اس نے صبر سے کام لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو جنت عطا فرمائی۔

ان احادیث سے ایک بہت بڑا سبق ہمیں یہ بھی ملتا ہے کہ کسی بھی چیز کے ہمارے ہاتھ سے نکل جانے پر ہمیں ایک تو صبر سے کام لینا چاہیے اور یوں سوچنا چاہیے کہ یہ نعمت جو میرے ہاتھ سے لے لی گئی ہے اس کو لے کر مجھے آزمایا جارہا ہے اور اس آزمائش میں اگر مَیں کامیاب ہوگیا اور مَیں نے صبر سے کام لیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب کی امید رکھی تو یہ جو لیا گیا اس سے کئی گنا زیادہ اور اس سے کئی گنا اچھا بدلہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا، اس لئے کہ آنکھوں ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ اور بھی جو چیزیں ہمارے ہاتھ سے جاتی ہیں ان تمام چیزوں کے متعلق ہمیں ایک مؤمن ہونے کی حیثیت سے یہ تصور رکھنا چاہیے۔ نبی کریم ﷺ کی ہمیں یہ تعلیم اور ہدایت ہے کہ ہمارے ہاتھ سے کوئی چیز چلی جائے تو اس پر یوں سوچنا چاہیے کہ ’’گیا کیا اور ملا کیا؟‘‘

بھائی! کوئی بچہ ہے اس کا دو روپئے والا ایک قلم گم ہوگیا، اب اس نے ابّا سے کہا کہ ابّا قلم گم ہوگیا، باپ نے لا کر اس کو دس روپئے والا قلم دے دیا تو اب وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ میں تو کچھ کھوٹ اور نقصان میں نہیں رہا بلکہ فائدے میں رہا کہ جو چیز گئی اس سے اچھی چیز مجھ کو ملی۔ ایسے ہی ہمارے پاس سے جو چیز جارہی ہے تو یہ نہ دیکھئے کہ کیا گیا، بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس کے اس جانے پر اگر میں صبر سے کام لوں گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟ اگر ہم یہ سوچیں گے اور یہ تصور کریں گے تو ان شاء اللہ اس جانے والی چیز پر ہمیں کوئی غم اور افسوس نہیں ہوگا، بلکہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں جو ہدایت فرمائی ہے اور جو تعلیم دی ہے اس کے مطابق ہم صبر سے کام لیں گے۔

حضرت عطاء رحمۃ اللہ علیہ کی سوچ

عن عطاء بن أبی رباح قال قال لی ابن عباس رضی اللہ عنہ: أَلاأُرِیکَ امْرَأَةً مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟فَقُلْتُ بَلیٰ .قَالَ:هَذِهِ الْمَرْأَةُ السَّوْدَاءُ.اَتَتِ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَتْ:اِنِّیْ أُصْرَعُ وَاِنِّی أَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰہَ تَعَالیٰ لِیْ قَالَ.اِنْ شِئْتِ صَبَرْتِ وَلَکِ الْجَنَّةُ.وَاِنْ شِئْتِ دَعَوْتُ اللّٰہَ تَعَالیٰ اَنْ یُّعَافِیَکِ.فَقَالَتْ:أَصْبِرُ.فَقَالَتْ:اِنِّیْ أَتَکَشَّفُ فَادْعُ اللّٰہَ اَنْ لَاأَتَکَشَّفَ.فَدَعَالَهَا.

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ بڑے جلیل القدر تابعی ہیں، کہتے ہیں کہ یہ بڑے بدصورت، سیاہ فام تھے،ان کے جسم کے کسی عضو کے اندر کوئی خوبی نہیں تھی یعنی ہر اعتبار سے رنگت کے اعتبار سے چہرے اور اعضاء کی ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے بڑے بدصورت تھے لیکن انہوں نے یوں سوچا کہ مَیں اپنی اس جسمانی کمی کو علم حاصل کر کے اور اچھے اخلاق اور اوصاف اپنے اندر پیدا کر کے پورا کرسکتا ہوں۔

ظاہری بدصورتی کی تلافی

آدمی میں دو چیزیں ہیں ایک تو باطنی اوصاف و اخلاق اور دوسری چیز ظاہری خوبصورتی۔تو ظاہری خوبصورتی کسی کام کی نہیں، ویسے اس کی وجہ سے دنیوی اعتبار سے کہیں بڑا فائدہ ہوسکتا ہے لیکن اخروی اعتبار سے اس پر نجات نہیں۔ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے کافر و مشرک بھی بڑے حسین و جمیل ہوا کرتے ہیں۔لیکن آدمی کو چاہیے کہ اپنے اندر باطنی اخلاق، باطنی اوصاف پیدا کرنے کا اہتمام کرے۔لہٰذا جو لوگ ایسے ہیں کہ جن کو قدرت کی طرف سے ایسا کوئی ظاہری حسن نہیں دیا گیا ہے ان کے لئے تو اور زیادہ

موقع ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان باطنی اوصاف اور اچھے اخلاق سے اور عملی اعتبار سے بھی مزین کرنے کی کوشش کریں تا کہ یہ ساری کمی پوری ہو جائے۔ چنانچہ حضرت عطاءؒ اپنے زمانے میں اہلِ مکہ کے سردار کہلاتے تھے، حالانکہ وہ سیاہ فام آزاد شدہ غلام تھے لیکن وہ اپنے اس علم اور عمل، اخلاق اور اوصاف کی وجہ سے اہلِ مکہ کے سردار تھے۔

ایک صحابیہ سے مرگی میں صبر کرنے پر جنت کا وعدہ

حضرت عطاء بن ابی رباح رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: میں ایک جنتی عورت تمہیں نہ بتلاؤں؟ میں نے کہا: ضرور بتلایئے، انہوں نے ایک سیاہ فام، کالے رنگ کی حبشی عورت کی طرف اشارہ کر کے بتلایا کہ یہ جنتی عورت ہے۔ وہ کیوں جنتی ہے اس کی وجہ بتلائی کہ ایک مرتبہ یہ عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور آ کر عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے مرگی کی بیماری ہے۔ ''مرگی'' وہ مرض ہے کہ جس میں آدمی پر ایک دم سے دورہ پڑتا ہے، اور آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے، منہ میں سے جھاگ نکلنے لگتی ہے۔ یہ بیماری اس عورت کو تھی۔ اور اس نے بتلایا کہ جس وقت مجھ پر یہ دورہ پڑتا ہے اور میں بے ہوش ہو کر کے گر جاتی ہوں تو میرا ستر بھی کھل جاتا ہے۔ اصل اس عورت کو یہ فکر لاحق تھا کہ اس بیماری کے نتیجے میں گویا غیر اختیاری طور پر ایک بری چیز میں مبتلا ہو جاتی ہوں کہ میرا ستر کھل جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کرنے کا مقصد یہ تھا کہ گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کریں تا کہ اس بیماری سے اللہ تعالیٰ نجات عطا فرمائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دیکھو! تمہیں اختیار ہے اگر تم چاہو تو اس بیماری پر صبر سے کام لو، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو جنت ملے گی، اور اگر تم چاہو تو میں

دعا کر دیتا ہوں اور بیماری اچھی ہو جائے گی۔ بولو کیا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ ایک صحابیہ تھیں، ان کے سامنے جب یہ دونوں صورتیں آئیں تو آخر کس کو اختیار کرتیں؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں صبر سے کام لوں گی۔

بس! یہاں بھی ایک تعلیم یہی دی کہ اگر کسی آدمی کو کوئی خطرناک سے خطرناک بیماری لاحق ہے تو اس کی وجہ سے دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یوں سمجھے کہ یہ بیماری اللہ تبارک وتعالیٰ نے دی ہے اس پر میں صبر کروں گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اس صبر کے بدلے میں جنت ملے گی۔ اس حدیث میں حضور ﷺ کی تعلیم یہی ہے۔

اس لئے کیسی ہی بیماری ہو اس میں صبر کرے، ویسے اس بیماری کے علاج کے طور پر کچھ تدبیریں کرنا چاہے تو کرسکتا ہے لیکن ان تدبیروں کے باوجود اگر اس بیماری میں کوئی فرق ظاہر نہ ہو، بیماری ٹھیک نہ ہو تو پھر اس کی وجہ سے لوگوں کے سامنے شکوے شکایات یا پریشان اور دل گرفتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صبر سے کام لے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیماری بھیجی ہے میں اس پر صبر کروں گا۔

چنانچہ جب نبی کریم ﷺ نے اس عورت کو دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا تو کہنے لگی کہ میں صبر کروں گی۔ گویا مجھے اس بیماری کے اچھا ہونے کے مقابلہ میں صبر کرکے جنت لینا منظور ہے۔ باقی یہ ہے کہ آدمی اپنی کمزوری کی وجہ سے برداشت نہ کرسکے؛ تو وہ دوسری بات ہے۔

ایک بیمار حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں

حضرت سید الطائفہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سلسلے کے تمام

بزرگوں کے شیخ ہیں۔ایک مرتبہ انھوں نے اپنی مجلس میں بیماری کے سلسلے میں ذرا تفصیل سے بیان کیا اور فرمایا کہ بیماری بھی اللہ کی نعمت ہے اور پھر اس بیماری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی عنایتیں کس کس حیثیت سے آدمی پر آتی ہیں وہ پورا تفصیل سے بتلایا۔اس مجلس کے بعد ایک آدمی نے آکر عرض کیا: حضرت! مجھے فلانی بیماری ہے، دعا کیجئے۔لوگ سوچنے لگے کہ ابھی تو انھوں نے پورا بیان کیا تھا اب دیکھیں کیا دعا کرتے ہیں؟ حضرت نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! بیماری بھی تیری نعمت ہے اور تندرستی بھی نعمت ہے،تو اپنی اس بیماری والی نعمت کو تندرستی والی نعمت سے بدل دے۔اے اللہ! ہم کمزور ہونے کی وجہ سے اس پر صبر کی طاقت نہیں رکھتے تو اب ہمیں تندرستی والی نعمت عطا فرما کر اس پر شکر کرنے کی توفیق عطا فرما۔

بہرحال!اس عورت نے یہ منظور کرلیا کہ میں صبر کروں گی لیکن اس بے ہوشی کی حالت میں چونکہ ستر کھل جاتا تھا اس کا بھی اس عورت کو فکر لاحق تھا اس لئے اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ میرا ستر نہ کھلے۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اس کے لئے دعا کروں گا کہ اے اللہ!اس کے ستر کے کھلنے کی نوبت نہ آئے، جب بیماری کا دورہ پڑے، بے ہوش ہو تو اس وقت ستر نہ کھلے۔بہرحال!اس نے اس بیماری سے اچھا ہونے کے مقابلہ میں بیماری میں مبتلا رہ کر صبر سے کام لے کر جنت کو منظور فرمالیا۔

﴿علاج کے سلسلہ میں ایک ہدایت﴾

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس حدیث سے بھی یہی سبق دینا مقصود ہے کہ کیسی ہی خطرناک سے خطرناک بیماری آدمی کو لاحق ہو اس پر آدمی صبر سے کام لے،اپنے طور پر جو تدبیریں ہوسکتی ہیں ان تدبیروں کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ویسے آج کل جو تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اس میں بھی بڑے غلو سے کام لیا جاتا ہے۔ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿یاعباداللہ تداووا. (سنن ترمذی ۴/۳۸۳)﴾ اے اللہ کے بندو! دوا اور علاج کرو، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر بیماری کی دوا ضرور پیدا فرمائی ہے لیکن اس کے معاملہ میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ شفا دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اگر کوئی آدمی یوں سمجھتا ہے کہ تندرستی دوا کی وجہ سے یا ڈاکٹر کی وجہ سے ہے؛ تو یہ غلط ہے۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں ڈاکٹر کے پاس فلاں فلاں گئے تو وہ سب اچھے ہوگئے، گویا آپ بھی جائیں گے تو آپ کو بھی وہ اچھا کر ہی ڈالے گا۔ اور میں یوں کہا کرتا ہوں کہ بڑے ماہر ڈاکٹر کے مقابلے میں کم ماہر ڈاکٹر کے پاس جانے میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد زیادہ رہے گا، بڑے ماہر کے پاس جانے میں اعتماد اس پر ہوجائے گا اور کم ماہر کے پاس جائیں گے تو اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر اس ڈاکٹر کے مقابلے میں زیادہ رہے گا۔ اور علاج بحیثیت سنت کے جو کر رہے ہیں؛ وہ مقصد بھی حاصل ہوجائے گا۔

خیر! یہ تو میں اپنی ایک بات بطور نکتہ کے عرض کرتا ہوں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ماہرین کو آپ چھوڑ دیں، ماہرین سے ضرور خدمات حاصل کریں۔ ڈاکٹر صاحب یہاں بیٹھے ہوں گے تو کہیں گے کہ بھائی کیا ہے؟ بہرحال! ماہرین سے آپ ضرور خدمات لیں، لیکن یہ ہے کہ ہمارا ایمان اور اعتماد اللہ کی ذات پر ہو۔

توکل کی حقیقت کیا ہے؟

توکل کس کو کہتے ہیں؟ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ اسباب اختیار کرنے کے بعد اسباب پر بھروسہ کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرے؛ اس کا نام ''توکل''

ہے۔ اسباب کو چھوڑ دینا؛ یہ کامل توکل نہیں ہے۔جس آدمی نے سبب اختیار نہیں کیا وہ تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرے گا ہی۔لیکن جس آدمی نے سبب اختیار کیا اور پھر سبب کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا، یہی حقیقی توکل ہے۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے پوچھا: یارسول اللہ! میں اپنی سواری کے اونٹ کو کھونٹے سے باندھوں پھر توکل کروں یا کھلا چھوڑ دوں اور توکل کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: باندھو اور توکل کرو (مجمع الزوائد، طبرانی ۱۰/ ۲۹۱، سنن ترمذی ۴/ ۶۶۸) یعنی باندھنے کے بعد بھی بھروسہ اس پر نہ ہو کہ اس سے میرا اونٹ محفوظ رہے گا، بھروسہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر ہو، یہ اعلیٰ درجہ کا توکل ہے۔ اسباب کو انجام دینے کے بعد بھی اعتماد اسباب پر نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو تو یہ اصل چیز ہے۔ ہر جگہ اسباب کے اندر اس کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔

﴿ایک نبی کے صبر کا انداز﴾

عن أبی عبدالرحمن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ: كَأَنِّىٓ أَنْظُرُ اِلىٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَحْكِىْ نَبِيًّا مِنَ الْأَنْبِيَاءِ صَلَوَاتُ اللّٰهِ وَسَلَامُهُ عَلَيْهِمْ ۔ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهٖ. يَقُوْلُ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِىْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں گویا نبی کریم ﷺ کو دیکھ رہا ہوں یعنی جس وقت وہ حدیث بیان کر رہے ہیں گویا یوں بتلانا چاہتے ہیں کہ اس وقت بھی میری نگاہوں میں وہ منظر ایک دم تازہ ہے۔ جیسے کوئی واقعہ کئی سال پہلے پیش آیا ہو لیکن بیان کرنے والا کہتا ہے کہ ابھی میری نگاہوں کے سامنے وہ منظر ہے۔ گویا اس سے یہ بتانا مقصود

ہوتا ہے کہ مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے۔ اسی طرح فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک نبی کا تذکرہ کررہے تھے کہ ان کی قوم نے ان کی پٹائی کی اور ان کے چہرے کو زخمی کردیا، اور وہ نبی اپنے چہرے پر سے اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے خون پونچھ رہے تھے، صاف کررہے تھے اور کہتے جارہے تھے ﴿اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ اے اللہ! میری قوم کو بخش دیجئے، معاف کردیجئے؛ وہ مجھے پہچانتے نہیں ہیں اور جانتے نہیں کہ میرا کیا مقام ہے، میرا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تعلق ہے، مَیں کون ہوں، اگر جانتے تو ایسا معاملہ نہ کرتے۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس نبی کے صبر کا تذکرہ کیا چونکہ نبی کے افعال قابلِ اتباع ہوتے ہیں، اس لئے یہ روایت یہاں لائے ہیں۔

اب یہ کون سے نبی مراد ہیں؟ تو علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔ اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں: کہ نہیں! یہ خود نبی کریم ﷺ اپنی ذات مراد لے رہے ہیں۔ سفرِ طائف کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا تھا آپ دعوت پیش کرنے کے واسطے طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں آپ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں اور آپ کو لہولہان کیا گیا اس موقع پر آپ نے یہ دعا فرمائی تھی ﴿اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾ اے اللہ! یہ مجھے جانتے نہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ غزوۂ احد کے موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو زیادتیاں ہوئیں تھیں اس موقع پر بھی آپ نے یہ دعا فرمائی تھی۔

﴿مؤمن کو پہنچنے والی معمولی تکلیف بھی ضائع نہیں﴾

عن أبی سعید رضی اللہ عنہ و أبی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مَا یُصِیْبُ الْمُسْلِمَ مِنْ

نَصَبٍ وَلاوَصَبٍ وَلاھَمٍّ وَلاحَزَنٍ وَلاأَذیً وَلاغَمٍّ حَتّٰی الشَّوْکَۃُ یُشَاکُھَا اِلَّا کَفَّرَاللّٰہُ بِھَامِنْ خَطَایَاہُ .

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مسلمان کو جب کوئی تھکن پہنچتی ہے یعنی کسی کام کے نتیجے میں جو تھکاوٹ لاحق ہوتی ہے یا کوئی بیماری اس کو لگتی ہے اور اسی طریقہ سے کوئی فکر لاحق ہوتی ہے، آئندہ پیش آنے والی کسی مصیبت کے تصور سے آدمی کو جو فکر لاحق ہوتی ہے؛ اس کو (ھَمّ) کہتے ہیں اور جو مصیبت پہلے پیش آچکی ہے اس پیش آچکی ہوئی مصیبت کی وجہ سے جو تکلیف ہوتی ہے اس کو (حُزْن) سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور جو کوئی ایذاء پہنچتی ہے، اور مؤمن کسی بھی طرح کی گھٹن محسوس کرتا ہے یہاں تک کہ کانٹا بھی اس کو چبھتا ہے تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کا کفارہ کردیتے ہیں اور گناہوں کو معاف کردیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ مومن کو معمولی سی تکلیف بھی اگر پہنچے تو وہ ضائع نہیں جاتی ہے، اس کو پہنچنے والی ہر تکلیف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے گناہوں کو معاف کیا جاتا ہے، اس لئے ہمیں جو چھوٹی چھوٹی تکلیفیں پہنچیں، ان پر بھی یہ خیال مستحضر ہونا چاہیے اور اس چیز کا ہر وقت تصور رہنا چاہیے کہ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے میرے گناہ معاف کئے جائیں گے۔

بلکہ حدیث میں یہاں تک آتا ہے کہ آدمی کے جیب میں پیسے اور رقم ہے، اور وہ اس نے خرچ کردئے، کسی کو دے دیے، بعد میں کسی موقع پر اس کو یاد نہیں تھا کہ مَیں فلاں کو یہ رقم دے چکا ہوں، وہ اس کو دے کر بھول گیا تھا، اور اب یوں سوچ کر کہ میرے پاس ہیں

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جب وہ رقم نظر نہیں آئی تو ایک دم سے اس کی طبیعت کے اوپر ایک غم آ گیا کہ پیسے تھے، کہاں گئے؟ تھوڑی دیر بعد پھر یاد آ گیا کہ میں تو فلاں کو دے چکا ہوں، تو یہ یاد نہ رہنے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے جو غم لاحق ہوا تھا؛ اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اجر وثواب ملتا ہے اور اس کے گناہ معاف ہوتے ہیں

اس لئے جتنی بھی مصیبتیں، تکلیفیں اور مشقتیں یا بیماریاں جو کچھ بھی ہمیں لاحق ہوں ہم یہ سمجھیں کہ اس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے، اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ بس! یہ تصور ہمیں ہر وقت رہنا چاہیے، جب یہ تصور اور خیال رہے گا تو ان شاء اللہ صبر کرنا بڑا آسان ہو جائے گا۔ ان چیزوں کو سوچتے رہیں۔

خاص بندوں کے ساتھ خاص معاملہ ہوتا ہے

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: دَخَلْتُ عَلٰی النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ يُوْعَكُ. فقلتُ: يارسولَ الله! اِنَّكَ تُوْعَكُ وَعْكاً شَدِيْداً. قَالَ: أَجَلْ! اِنِّیْ أُوْعَكُ كَمَا يُوْعَكُ رَجُلاَنِ مِنْكُمْ. فقلتُ: ذٰلِكَ اَنَّ لَكَ أَجْرَيْنِ؟ قَالَ: أَجَلْ ذٰلِكَ كَذٰلِكَ مَامِنْ مُسْلِمٍ يُصِيْبُهُ أَذًى شَوْكَةٌ فَمَافَوْقَهَا اِلَّا كَفَّرَ اللهُ بِهَا سَيِّئَاتِهِ وَحُطَّتْ عَنْهُ ذُنُوْبُهُ كَمَا تَحُطُّ الشَّجَرَةُ وَرَقَهَا.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کو بہت سخت اور شدید بخار تھا۔ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو تو بہت سخت اور بڑا شدید بخار ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ وہ اتنا شدید بخار تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو چادر اوڑھے ہوئے تھے اس کے اوپر سے بخار کی گرمی محسوس

ہورہی تھی۔تو حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! مجھے بخار کی اتنی شدت آتی ہے جتنی تم میں سے دوآدمیوں کو بخار میں ہوتی ہے۔یعنی عام انسانوں میں سے دوآدمیوں کے بخار کا جوحال ہوتا ہے مجھ اکیلے کو ایسا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے جو مخصوص بندے ہوتے ہیں ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے ﴿اِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ بَلآءً الْأَنْبِيَآءُ ثُمَّ الْأَمْثَلُ فَالْأَمْثَلُ﴾ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں سب سے زیادہ آزمائش ،ابتلاء اورمصائب انبیاءکرام پرآتے ہیں،اور پھر جوان کے طریقے سے زیادہ مشابہ ہوگا اتنا ہی اس کے اوپر یہ کیفیات زیادہ رہیں گی۔اس لئے بخار کا بھی یہی حال ہے کہ اوروں میں جو بخار دوآدمیوں کو آتا تھا ایسا بخار تنہا حضور ﷺ کو آتا تھا۔اس پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! یہ بات اس لئے بھی ہے کہ آپ کو ثواب بھی دوہرا اورڈبل ملتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! ثواب بھی ڈبل ملتا ہے یعنی اورلوگوں کو جتنا ثواب ملتا ہے اس سے زیادہ ملتا ہے۔

اسی لئے تو حدیث میں آتا ہے کہ آدمی اگر کھڑے ہوکر نماز پڑھے تو اس میں جو ثواب ملتا ہے بیٹھ کر پڑھنے میں اس سے آدھا ملتا ہے (بخاری ۱/۳۷۵) لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: مَیں بیٹھ کر پڑھوں گا تو آدھا نہیں بلکہ پورا ثواب ملے گا۔بات وہی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگرچہ بخار کی شدت آپ کو اورلوگوں کے مقابلے میں دوہری اور ڈبل ہے تو ثواب بھی تو آپ کو ڈبل مل رہا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔

﴿تکلیف پہنچنے پر آدمی کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے پت جھڑ میں پتے﴾

پھر حضور ﷺ نے فرمایا: دیکھو! کسی مسلمان کو جب کوئی بیماری لاحق ہوتی ہے، کوئی تکلیف پہنچتی ہے یہاں تک کہ کانٹا بھی چبھتا ہے یا اس سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اس کے گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اس کے گناہ ایسے جھڑتے ہیں جیسے پت جھڑ کے زمانے میں، موسمِ خزاں میں درخت اپنے پتوں کو جھاڑتا ہے یعنی موسمِ خزاں میں، پان کھر (પાનખર) کا جو موسم ہوتا ہے اس میں درخت کے پتے کیسے جھڑتے ہیں، اسی طرح بیماری کی وجہ سے آدمی کے گناہ جھڑتے ہیں۔

حدیث پاک میں بھی آتا ہے کہ بخار کی وجہ سے آدمی گناہوں سے ایسا پاک اور صاف ہو جاتا ہے جیسے اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا ہو۔ اور یہ بخار کے اندر جو حرارت ہوتی ہے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہنم کی آگ کی حرارت کا اثر ہے۔ (صحیح مسلم ۴/۱۷۳۱) گویا اس کا نمونہ ہے، تو اندر تک اس کے اثرات پہنچتے ہیں۔

﴿مقربین پر حالات کیوں آتے ہیں؟﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَن یُّرِدِاللّٰہُ بِہٖ خَیرًا یُّصِبْ مِنْہُ

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو مصیبت میں گرفتار کرتے ہیں۔

اب دیکھئے! بعض مرتبہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کے بعض ایسے مقرب بندے بھی ہوتے ہیں جن کے متعلق آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے ان کے پاس تو گناہوں کا زیادہ ذخیرہ نہیں ہے؛ پھر وہ بیماری ان کے پاس کاہے کے واسطے آئی؟

جواب یہ ہے کہ اصل میں ان کے پاس دوسری حیثیت سے آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے مشکوٰۃ شریف میں روایت موجود ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کسی بندے کے لئے جنت میں ایک درجہ متعین کیا گیا ہے کہ یہ درجہ اس کو دینا ہے، لیکن وہ بندہ اپنے عمل کے ذریعہ سے وہاں تک پہنچ نہیں سکتا، اس کے پاس ایسا کوئی عمل نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے وہ اس درجہ تک پہنچ پاوے، تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو مصیبت میں گرفتار کرتے ہیں اور پھر اس کو صبر کی توفیق عطا فرماتے ہیں اور جب وہ صبر کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ مقام اس کو عطا کیا جاتا ہے۔ (ابوداؤد ۳/۱۸۳) اللہ تعالیٰ کا کیسا معاملہ ہے۔ اس لئے اگر کسی کے اوپر کوئی مصیبت آئی ہے یا کسی تکلیف میں کوئی آدمی گرفتار ہے، تو پریشان نہ ہو، یہ نہ سوچے کہ معلوم نہیں کون سے گناہ کی سزا ہے۔

﴿ہمارا وجود ہی گناہ ہے﴾

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ تو حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں: ہمارا کون سا لمحہ اور کون سی گھڑی گناہوں سے خالی ہے کہ یہ جملہ منھ سے نکل رہا ہے کہ مَیں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ بلکہ ﴿وُجُوْدُکَ ذَنْبٌ لایُقَاسُ بِہٖ ذَنْبٌ﴾ ہمارا وجود ہی گناہ ہے۔ ہے یا نہیں؟ اس لئے یہ جملہ تو بہت غلط ہے کہ میں نے کون سا گناہ کیا ہے۔ باقی یہ ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگنی چاہیے۔

اور یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ گناہ کی وجہ سے کوئی مصیبت آئی ہو، مصیبت کبھی گناہ کے بغیر کسی اور مصلحت سے بھی آتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو کسی خیر سے نوازنا چاہتے

ہیں، بڑی خیر عطا فرمانا چاہتے ہیں تو اس کی وجہ سے بھی مصیبت میں اس کو مبتلا کیا جاتا ہے بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ اس بندے کو بھی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ یہ فلانی مصیبت آئی تھی اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس نعمت سے نوازا۔ بعض دفعہ بعض لوگوں کو اس کا خاص احساس ہوتا ہے۔ اس لئے کسی مصیبت کے آنے پر پریشان نہ ہو، بلکہ یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے میرے درجہ کو بلند کرنا چاہتے ہیں یا میرے گناہوں کو معاف کرنا چاہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ مصیبت کبھی گناہوں کی معافی کا ذریعہ بنتی ہے اور کبھی درجات کی بلندی کا ذریعہ بنتی ہے۔ جیسا جیسا آدمی ویسا ویسا اس کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے معاملہ کیا جاتا ہے۔ گنہگار پر اگر آئی تو اس کے ذریعہ سے گناہ معاف ہوں گے۔ کسی مقرب کے پاس آئی تو اس کے ذریعہ سے اس کے درجات بلند ہوں گے۔

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا مت کرو

عن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: لَايَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ الْمَوْتَ لِضُرٍّ أَصَابَهُ. فَإِنْ كَانَ لَابُدَّ فَاعِلاً. فَلْيَقُلْ: أَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مَاكَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْراً لِيْ وَتَوَفَّنِيْ إِذَاكَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْراً لِيْ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے کسی تکلیف کی وجہ سے جو اس کو پہنچی۔

بعض مرتبہ بعض لوگوں کو بیماری لاحق ہو جاتی ہے اور وہ بیماری طول پکڑ جاتی ہے، جلدی اچھی نہیں ہو رہی ہے تو وہ موت کی تمنا کرتے ہیں۔ یا کوئی خطرناک بیماری لاحق ہو جاتی ہے تو اُس پر موت کی تمنا کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: کسی بیماری کے لگنے

پر موت کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔

دیکھو! موت کی تمنا کرنے سے موت آجانے والی نہیں ہے۔ ہمارا آپ کا سب کا ایمان ہے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے، نہ اس سے پہلے آسکتی ہے نہ اس کے بعد۔ تو اگر اس بیماری کی وجہ سے تمنا کر بھی لی؛ تو اس سے کیا حاصل ہوا۔ موت تو اپنے وقت پر ہی آئے گی۔ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی بیماری کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے۔ یہ تو بے صبری کی علامت ہے۔ حق تعالیٰ کے فیصلے پر ایک طرح کی ناراضگی کا اظہار ہے اور یہ بڑی بری بات ہے۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَابُدَّ فَاعِلاً﴾ ہاں اگر کرنا ہی ہے یعنی کسی آدمی کو بہت تکلیف ہے اور اس کی وجہ سے بے چین ہے اور موت کی دعا کرنا ہی چاہتا ہے تو پھر یوں دعا کرے:

﴿اَللّٰهُمَّ أَحْيِنِیْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْراً لِیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْراً لِیْ﴾

اے اللہ! جب تک میرے لئے زندگی میں بہتری ہے؛ مجھے زندہ رکھ۔ اور جب میرے لئے موت بہتر ہو؛ مجھے موت عطا فرما۔ اگر موت کی دعا کرنی ہی ہے تو اس طرح کرے۔ یوں نہ کرے کہ اے اللہ! مجھے اٹھالے۔ بلکہ اس طرح کرے کہ اے اللہ! میرے لئے زندگی میں اگر خیر ہے تو مجھے زندہ رکھ اور اگر میرے لئے موت میں سلامتی اور خیر ہے تو مجھے موت دے دے۔ یوں دعا کر سکتے ہیں۔

﴿موت کی تمنا کرنے کی اجازت صرف ایک صورت میں﴾

ویسے علماء نے لکھا ہے کہ اگر دینی فتنے کا اندیشہ ہو یعنی ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ اس آدمی کو خطرہ لاحق ہو کہ میں دینی فتنے میں مبتلا ہوؤں گا، میرے ایمان پر زد پڑے گی

تواس صورت میں اگر وہ اپنے آپ کو اس دینی فتنے سے بچانے کے لئے موت کی تمنا کرے اور یہ دعا کرے کہ اے اللہ! میرے ایمان پر کوئی زد آئے اس سے پہلے پہلے مجھے دنیا سے اٹھا لے؛ تو اس کی گنجائش اور اجازت ہے۔(السنن الواردۃ فی الفتن) باقی اس کے علاوہ بیماری کی تکلیف سے پریشان ہوکر یا بیماری کی وجہ سے دل گرفتہ ہوکر موت کے مانگنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْ لَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً .اما بعد .

﴿ حالات کی سختی پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شکایت اور آپ علیہ السلام کی تنبیہ ﴾

عن أبی عبداللہ خباب بن الأرت رضی اللہ عنہ قال:شَکَوْنَااِلٰی رسولِ اللّٰہِ ﷺ وَھُوَ مُتَوَسِّدُبُرْدَۃًلَّہٗ فِیْ ظِلِّ الْکَعْبَۃِ.فَقُلْنَا:أَلَاتَسْتَنْصِرُلَنَا؟أَلَاتَدْعُوْلَنَا ؟فقالَ:قَدْکَانَ مَنْ قَبْلَکُمْ یُؤْخَذُالرَّجُلُ فَیُحْفَرُلَہٗ فِی الْأَرْضِ فَیُجْعَلُ فِیْھَا.ثُمَّ یُؤْتیٰ بِالْمِنْشَارِفَیُوْضَعُ عَلٰی رَأْسِہٖ فَیُجْعَلُ نِصْفَیْنِ.وَیُمْشَطُ بِأَمْشَاطِ الْحَدِیْدِ مَادُوْنَ لَحْمِہٖ وَعَظْمِہٖ مَایَصُدُّہٗ ذٰلِکَ عَنْ دِیْنِہٖ.وَاللّٰہِ!لَیُتِمَّنَّ اللّٰہُ ھٰذَا الْأَمْرَحَتّٰی یَسِیْرَالرَّاکِبُ مِنْ صَنْعَآءَ اِلٰی حَضْرَمَوْتَ.لَایَخَافُ اِلَّا اللّٰہَ.وَالذِّئْبَ عَلٰی غَنَمِہٖ. وَلٰکِنَّکُمْ تَسْتَعْجِلُوْنَ.

یہ ہجرت سے پہلے کا واقعہ ہے کہ مسلمان جب تک مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ نہیں گئے تھے اور مکہ والوں کی طرف سے ان پر بہت زیادتیاں، ایذا رسانیاں اور تکلیف دہی ہوا کرتی تھی تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مکہ والوں کی یہ ایذا رسانیاں جب انتہا کو پہنچ گئیں تو اس سے عاجز آ کر ایک مرتبہ ہم نے نبی کریم ﷺ سے شکایت کی، جس وقت ہم اپنی بات پیش کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت

آپ کعبۃ اللہ شریف کے سائے میں چادر سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے۔ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ سے مدد طلب نہیں کرتے اور ہمارے واسطے دعا نہیں کرتے؟ یہ کفار کی طرف سے ایذا رسانیاں حد سے تجاوز کر گئیں اب تو ضرورت ہے اس بات کی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے مدد چاہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شاملِ حال ہو اور ان کی ایذا رسانیوں سے ہم نجات پائیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے۔گویا ان کا صبر اب انتہاء کو پہنچ چکا تھا۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم پر ان کفار کی طرف سے ایذاؤں کا یہ سلسلہ ہے اس کی وجہ سے اتنی جلدی تم تنگ آ گئے اور تمہارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا؟ حالانکہ تم سے پہلی امتوں میں صورتِ حال یہ تھی کہ اگر کوئی آدمی ایمان لاتا تھا تو اس کو نبی کے نہ ماننے والے کفار کی طرف سے جو ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ ایمان لانے والے کو پکڑ کر لاتے تھے اور زمین میں ایک گڑھا کھود کر اس میں اس کو کھڑا کر کے مٹی پاٹ دیتے تھے، آدھا بدن زمین میں رہتا اور آدھا بدن باہر ہوتا، اس کے بعد آرہ لایا جاتا تھا اور اس کے سر پر رکھ کر اس کے جسم کو چیر کر دو ٹکڑے کر دئے جاتے۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ لوہے کے دانتوں والے کنگھے لا کر اس کے جسم کے اوپر چلائے جاتے جس کے نتیجے میں ہڈی ہڈی رہ جاتی تھی اور کھال اور گوشت اتر جاتا تھا۔ گویا انتہا درجے کی تکلیف ان کو پہنچائی جاتی تھی۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں: اس کے باوجود وہ لوگ اپنے ایمان سے باز نہیں آتے تھے۔یعنی اتنی زیادہ ان کو ایذائیں پہنچائی جاتی تھیں اور اتنی سخت تکلیفیں دی جاتی تھیں اور

ان تکلیف دینے والوں کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جو ایمان لائے ہیں اس سے ہٹ جائیں لیکن اتنی تکلیفوں کے باوجود وہ لوگ اپنے ایمان سے ہٹتے نہیں تھے، اتنے مضبوط اور ثابت قدم ہوا کرتے تھے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں: تم لوگ صبر سے کام لو جب اہلِ ایمان کی طرف سے مخالفین کی ایذا رسانیوں پر صبر کا مظاہرہ کیا جاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہدایت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اس لئے فرمایا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ دین کے معاملے کو تکمیل تک پہنچائے گا، یعنی دین کو مکمل کر کے رہے گا یہاں تک کہ اس کے نتیجے میں دنیا میں جو امن وامان قائم ہوگا، اس کا اثر یہ ہوگا کہ ایک سوار صنعاء سے لے کر حضر موت تک سفر کرے گا، اور راستے میں اس کو اپنی جان ومال کے متعلق کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

''صنعاء'' یہ یمن کا ایک بڑا شہر ہے اور حضر موت بھی یمن ہی کا ایک شہر ہے، لیکن بڑی دوری پر دوسرے کنارے پر واقع ہے۔ اس لئے کہ جس وقت حضور ﷺ یہ بات ارشاد فرما رہے تھے اس وقت حالت یہ تھی کہ کوئی بھی مسافر جب اپنے سفر پر نکلتا تھا تو اپنی جان ومال کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا تھا بلکہ تنہا آدمی کبھی سفر کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتا تھا۔ اس زمانے میں جب کوئی سفر کرنا ہوتا تھا تو قافلوں کی شکل میں کرتے تھے، تنہا آدمی تو نکلا کہ فوراً لُوٹ لیا جاتا تھا اور قافلوں کے متعلق یہ خطرے غالب رہتے تھے کہ معلوم نہیں یہ واپس آتا ہے یا نہیں۔

''قافلہ'' یہ عربی کا لفظ ہے، نیک فالی کے طور پر اس کا نام قافلہ رکھا گیا ہے۔ اہل عرب کے یہاں جو نام رکھے جاتے تھے تو اس میں نیک فالی کا اہتمام ہوتا تھا یعنی کوئی

اچھا مطلب لینا۔عربی زبان میں ’’قَفَلَ یَقْفُلُ ‘‘ کا معنیٰ ہے لوٹنا۔تو قافلہ کہتے ہیں کہ لوٹ کر واپس آنے والا۔تو جب یہ جماعت سفر میں جاتی تھی تب ہی سے اس کا نام قافلہ رکھا گیا گویا اللہ تعالیٰ سے اس بات کی امید کی جارہی ہے کہ یہ جاوے اور صحیح سلامت واپس آوے اسی لئے اس کا نام قافلہ رکھا جاتا تھا۔

جیسے جس آدمی کو سانپ ڈس لے اس کو عربی میں سلیم کہتے ہیں، حالانکہ ’’سلیم‘‘ تو اس کو کہتے ہیں کہ جو سلامت اور محفوظ رہے، چونکہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو سانپ نے ڈس لیا ہو؛ وہ بچتا نہیں ہے، مرجاتا ہے۔تو اہل عرب نے اس کے لئے نام لفظِ سلیم وضع کیا۔کسی کو سانپ نے ڈسا اور لوگ پوچھیں کہ بھائی! کیا ہوا؟ تو کہتے ہیں ﴿ هُوَ سَلِيْمٌ ﴾ تاکہ کسی کی زبان سے یہ جملہ نکلے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائے اور وہ بچ جائے۔ لہٰذا بہت سے ناموں میں ان لوگوں کے یہاں ایسا ہوتا ہے۔

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ بڑے بڑے قافلے اور بڑی بڑی جماعتیں بھی جب سفر میں جاتی تھیں تو ان کے متعلق بھی یہ نام اس لئے تجویز کیا گیا کہ ان کی واپسی بھی خطرے میں ہوا کرتی تھی کہ پورا قافلہ واپس سلامتی کے ساتھ آتا بھی ہے یا نہیں۔کبھی تو پورے قافلے پر شب خون مارا جاتا تھا اور سب ہی لوٹ لئے جاتے تھے۔بہت سے مارے جاتے تھے، بچے اور عورتوں کو گرفتار کر کے غلام اور باندی بنالیا جاتا تھا،اس لئے اِکَّا دُکَّا آدمی کے سفر کرنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر تم لوگوں نے صبر سے کام لیا تو خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ دین کے اس سلسلے کو مکمل کرے گا اور اس کے نتیجے میں دنیا میں امن وامان قائم ہوگا اور اس

کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تنہا ایک مسافر صنعاء سے حضر موت تک بڑے اطمینان سے بغیر خطرے کے جائے گا اور اس کو اپنی جان اور مال کے متعلق کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ بلکہ بعض روایتوں میں تو یہ آتا ہے کہ ایک عورت سفر کرے گی اور اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ہے کہ اس کو اپنی بکریوں کے متعلق بھیڑیے کا تو ڈر لگا رہے گا لیکن کسی انسان سے اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ لیکن تم لوگ بہت جلدی سے کام لے رہے ہو۔

گویا نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام کو صبر کی تلقین فرمائی کہ ان کفار کی طرف سے تم کو جو ایذائیں اور تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں ان میں کوئی عجلت اور جلد بازی سے کام لینے کی ضرورت نہیں، تم آکر مجھ سے جو درخواست کرتے ہو کہ اے اللہ کے رسول! آپ اللہ تعالیٰ سے مدد نہیں مانگتے، دعا نہیں کرتے؟ ایسی عجلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایذائیں سہتے رہو، تکلیفیں برداشت کرتے رہو۔ اللہ کے راستہ میں جو ایذائیں پہنچائی جائیں گی اور تکلیفیں سہی جائیں گی تو اس کے نتیجے میں ہدایت عام ہوگی، اور اس کا فائدہ پورے عالم کو پہنچے گا۔

حضور ﷺ کا سبق آموز طرزِ عمل

وعن بن مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ حُنَيْنٍ. اٰثَرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ نَاسًا فِي الْقِسْمَةِ. فَأَعْطَى الْأَقْرَعَ بْنَ حَابِسٍ مِائَةً مِنَ الْإِبِلِ. وَأَعْطَى عُيَيْنَةَ بْنَ حِصْنٍ مِثْلَ ذٰلِكَ. وَأَعْطَى نَاسًا مِنْ أَشْرَافِ الْعَرَبِ، وَاٰثَرَهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْقِسْمَةِ. فَقَالَ رَجُلٌ: وَاللهِ إِنَّ هٰذِهِ قِسْمَةٌ مَا عُدِلَ فِيهَا. وَمَا أُرِيدَ فِيهَا وَجْهُ اللهِ. فَقُلْتُ: وَاللهِ لَأُخْبِرَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ. فَأَتَيْتُهُ فَأَخْبَرْتُهُ بِمَا قَالَ. فَتَغَيَّرَ وَجْهُهُ حَتّٰى كَانَ كَالصِّرْفِ. ثُمَّ قَالَ: فَمَنْ يَعْدِلُ إِذَا لَمْ يَعْدِلِ اللهُ وَرَسُوْلُهُ. ثُمَّ قَالَ: يَرْحَمُ اللهُ مُوْسٰى قَدْ أُوْذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هٰذَا، فَصَبَرَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حنین کی جنگ ہوئی اور اس میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو بہت سارا مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ غزوۂ حنین کے موقعہ پر چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) بکریاں اور چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) اونٹ غنیمت میں ہاتھ آئے تھے اس زمانے میں جنگ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا تھا اس کا پانچواں حصہ الگ کرلیا جاتا تھا اور باقی چار حصے لشکر کے درمیان تقسیم کردئے جاتے تھے، یہ خمس جو الگ کیا جاتا تھا اس میں بہت سارے کام کئے جاتے تھے، اس میں خود نبی کریم ﷺ کو اختیار ہوتا تھا کہ آپ کسی کو دلجوئی کے طور پر عطا فرمانا چاہیں تو عطا فرما سکتے ہیں۔ چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) کا پانچواں بھی اگر دیکھا جائے تو چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) ہوجائے گا۔ اسی طرح بکریوں میں بھی آٹھ ہزار (۸۰۰۰) بکریاں خمس میں آئی تھیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے اس خمس میں سے جو نومسلم تھے ان کو عطا فرمایا۔ اس لئے کہ حنین کی جنگ فتحِ مکہ کے بعد پیش آئی ہے۔

سنہ ۸ ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور آپ ﷺ ابھی مکہ ہی میں تھے تو قبیلۂ بنوثقیف اور دوسرے وہ قبائل جو مکہ مکرمہ سے باہر کے علاقے میں آباد تھے ان کو جب معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے مکہ کو فتح کرلیا ہے تو انہوں نے سوچا کہ اب تو ہمارا نمبر ہے، اس لئے انہوں نے پہلے ہی یہ طے کرلیا کہ وہ حملہ آور ہوں اس سے پہلے ہی ہم تیاری کر کے ان پر حملہ کردیں چنانچہ ان لوگوں نے ایک بڑا لشکر وادئ حنین میں مسلمانوں سے مقابلے کے واسطے جمع کیا۔ وادئ حنین عرفات سے طائف جاتے ہوئے راستے میں پڑتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ ہم پر حملہ کریں اس سے پہلے ہم ہی جائیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ مسلمانوں کو لے کر ان کے مقابلے کے لئے تشریف لے گئے۔

حضور ﷺ جب مکہ مکرمہ فتح کرنے کے واسطے آئے تھے تو آپ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تھا اور پھر مکہ میں جو لوگ نئے مسلمان ہوئے اور دوسرے حضرات جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے لیکن اسلام کی طرف مائل تھے ان کی دو ہزار کی تعداد تھی، گویا بارہ ہزار کی جمعیت اور لشکر لے کر آپ ﷺ مکہ مکرمہ سے حنین کی طرف روانہ ہوئے، اتفاق کی بات کہ ایک آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلا ﴿لَنْ نُغْلَبَ الیومَ عَنْ قِلَّةٍ﴾ کہ آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔ گویا اس بولنے والے کے ذہن میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ تعداد کی کثرت ہی کامیابی کا ذریعہ بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایسی بات پسند نہیں۔ جب یہ حضرات حنین پہنچے تو جن قبائل کے ساتھ مقابلہ تھا وہ لوگ تیر اندازی میں بڑے مشہور تھے، انہوں نے ایسا کیا کہ اپنے جو مخصوص تیر انداز تھے ان کو پہاڑوں کے اندر کمین گاہوں میں چھپا دیا اور کچھ لشکر ان کا مقابلے پر آیا اور پیچھے ہٹا۔ مسلمان جب ان پر غلبہ پانے کے لئے آگے بڑھے تو اچانک وہ تیر انداز جو چھپے ہوئے تھے باہر آئے اور انہوں نے جو تیر چلانے شروع کئے تو مسلمانوں کا لشکر تتّر بتّر ہونے لگا اور پیچھے ہٹنا شروع ہوا۔ اسی موقعہ پر نبی کریم ﷺ اور کچھ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جم گئے۔ اس واقعہ کی بڑی لمبی تفصیل ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے حکایاتِ صحابہ میں بھی اس واقعہ کو تفصیل سے ذکر کیا ہے آپ حضرات سنتے ہیں اور پڑھا بھی ہوگا۔ بہر حال! پھر بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد آئی اور فرشتے بھی مدد کے واسطے آئے اور مسلمانوں کو آخر میں کامیابی ہوئی اور اسی لڑائی میں بہت بڑا مال غنیمت کے طور پر ہاتھ لگا جیسا کہ میں نے ابھی تفصیل عرض کی کہ چالیس ہزار (۴۰۰۰۰) بکریاں اور چوبیس ہزار (۲۴۰۰۰) اونٹ اور بھی سونا چاندی غلام باندیاں وغیرہ

بہت کچھ ملا۔ تو حضور ﷺ نے وہ جو پانچواں حصہ الگ کر کے نکالا گیا تھا اس کو ایسے لوگوں میں تقسیم فرمایا جو ابھی ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ ان کی دلجوئی ہو جائے اور ان کو اسلام کی طرف ذرا مائل کیا جائے، اس لئے ان کو انعام کے طور پر اس مال کے خمس میں سے بہت کچھ دیا، کسی کو پچاس اور کسی کو سو اونٹ دئے، چنانچہ اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ یہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ان کو آپ نے سو اونٹ دئے، اور عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ یہ بھی قبیلۂ بنو فزارہ کے سردار تھے؛ ان کو بھی سو اونٹ دئے۔ اور بھی عرب کے دوسرے سرداروں کو ان کے مرتبہ اور حیثیت کے مطابق انعام کے طور پر اونٹ اور بکریاں عطا فرمائیں، لیکن جو غانمین کا حصہ تھا اس میں سے نہیں بلکہ خمس میں سے دیا تھا۔

بہر حال! جب آپ نے ان کو زیادہ دیا تو اس پر ایک آدمی نے اعتراض کیا۔ ذوالخویصرہ تمیمی اس کا نام تھا اسی کی نسل سے بعد میں جا کر خوارج پیدا ہوئے جن کے متعلق نبی کریم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ ایک گمراہ جماعت پیدا ہونے والی ہے۔ وہ ذوالخویصرہ تمیمی نامی شخص اٹھا اور اس نے کہا: اس تقسیم میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے جو تقسیم فرمائی اس پر وہ یہ کہہ رہا ہے کہ برابر تقسیم نہیں کی گئی ہے اور اس تقسیم میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مدِ نظر نہیں رکھی گئی ہے۔ گویا اس کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے حضور ﷺ نے اتنے اتنے اونٹ دے دئے، اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیشِ نظر نہیں رکھا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کی یہ بات سنی، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں طے کیا کہ اس آدمی نے جو بات کہی ہے، مَیں جا کر حضور اکرم ﷺ کو بتلاتا ہوں کہ یہ آدمی ایسا بولا۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ بعد میں خود اس نے بھی

حضور ﷺ کے سامنے جا کر یہ جملہ بولا۔ خیر! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جا کر اس کے اس جملے کی اطلاع دی۔ دیکھئے! یہ کتنی بڑی ایذاء پہنچانے والی بات تھی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے جا کر جب اطلاع دی تو یہ سن کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا اور بالکل خالص سونے کی طرح سرخ ہوگیا، اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ اور اس کا رسول ہی انصاف نہیں کرے گا؛ تو دنیا میں اور کون انصاف کرے گا؟ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے کہ ان کو ان کی قوم کی طرف سے اس سے بھی زیادہ تکلیفیں پہنچائی گئیں لیکن انہوں نے صبر سے کام لیا۔ یہ فرما کر نبی کریم ﷺ نے بھی اس کے اس جملے کو برداشت کر لیا اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

کہنے کا حاصل یہ تھا کہ لوگوں کی طرف سے ایسی باتیں جو قلب کو دکھ اور تکلیف پہنچانے والی ہوں اس پر صبر کرنا چاہیے، چاہے اس کی طرف سے کیا جانے والا معاملہ ٹھیک ہی کیوں نہ ہو۔ کوئی صحیح کام کیا اس پر بھی لوگ اعتراضات کرتے ہیں، خاص کر جو ذمہ دار حضرات ہوتے ہیں جب ان کی طرف سے کوئی فیصلہ وجود میں آتا ہے تو چاہے انہوں نے عدل وانصاف کے تقاضوں کی پوری رعایت کیوں نہ کی ہو؛ اس کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں میں سے بعض ان چیزوں پر اعتراضات کرتے ہیں۔ اس حدیث میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے عملی طور پر ذمہ دار حضرات کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ ایسی باتیں اگر ان کی طرف سے کہی جائیں؛ تو اس پر صبر سے کام لینا چاہیے، ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ سلسلہ تو چلا آ رہا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف سے اس قسم کی تکلیفیں پہنچائی گئیں اور حضور ﷺ پر اس قسم کی باتیں کہی گئیں، جب حضور ﷺ پر کہنے والے ایسا کہہ سکتے ہیں کہ انصاف سے کام نہیں لیا تو پھر ہما شما کا کیا؟ اس لئے جو دین کا کام کرنے والے ہیں یا قوم کی ذمہ داریاں جن کے کاندھوں پر ہیں، ایسے لوگوں کی طرف سے جب کوئی فیصلے ہوں، چاہے انہوں نے اپنے فیصلوں میں حق وانصاف کی پوری رعایت کی ہو؛ اس کے باوجود ان کی باتوں پر اگر کوئی اعتراض کیا جاوے تو ان کو اس بات کی تعلیم دی جارہی ہے کہ ان کو صبر کا دامن اپنے ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ ایسی چیزوں کو برداشت کریں، صبر کریں۔ اور جن لوگوں نے ان کے صحیح طرزِ عمل پر بھی ایسی باتیں کہی ہیں، ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ ورنہ یہ ہوگا کہ جب انتقامی کارروائی شروع ہوگی تو بجائے نفع کے نقصان ہوگا اور اپنے اجر وثواب کو بھی غارت کردے گا۔ یہ تو شیطان کی طرف سے ایک سلسلہ جاری ہے۔

شیطان کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ شیطان کی اولین کوشش یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو نیکی کے کام سے روکتا ہے کہ جو نیکی کا کام کرنے جارہا ہے؛ وہ نہ کرپائے۔ اور یہ کوشش مختلف طریقوں سے کرے گا، اگر اس میں کامیاب ہوگیا تو اس کا مقصد حاصل ہوگیا۔ اور اگر اس میں کامیاب نہیں ہوا بلکہ وہ دیکھ رہا ہے کہ یہ تو کر رہا ہے تو اب دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کی نیت میں کچھ فتور ڈال دے، ریا میں مبتلا کردے، شہرت کی طلب اس کے دل میں پیدا کردے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل سے تو روک نہیں سکا تو اب اس عمل میں خرابی لانے

کے لئے دوسرا حربہ آزمارہا ہے کہ اب اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ میں یہ کام کروں گا تو لوگ میری تعریف کریں گے، خوش ہوں گے، ہدیے دیں گے، مطلب یہ ہے کہ ریا شہرت اور دکھلاوے والی بات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اگر اس میں بھی ناکام ہوگیا اور اس کا اس پر کوئی داؤ نہیں چلا تو دوسروں کو اس کے خلاف کھڑا کرتا ہے۔ کام کرنے والے نے کام کرلیا اور اخلاص کے ساتھ بھی کیا لیکن اب ایسے لوگ کھڑے کردئے جو اس کے خلاف اعتراضات کرتے ہیں کہ اس نے ایسا کیا۔ اب وہاں بھی اس کا امتحان ہے، اگر یہ ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا اور کوئی انتقامی کارروائی کرلی تو پھر اس کا مقصد حاصل ہوگیا، اور اگر یہاں بھی وہ صبر سے کام لیتا ہے اور کچھ نہیں کرتا تو پھر اور آگے وہ اقدام یہ کرتا ہے کہ کچھ لوگوں کو اس کے خلاف ایسے مسلط کردیتا ہے کہ جو مختلف طریقوں سے، زبان سے، ہاتھ سے، شیاطین کے ذریعہ سے، سحر وغیرہ کے ذریعہ سے ایذارسانی کا کام کرتے ہی رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان پیچھا تو چھوڑتا ہی نہیں، جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں لگتا ہے تو شیطان اخیر تک مختلف طریقوں سے اس کے پیچھے لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اخیر میں اس کا کوئی حربہ کامیاب نہیں ہوتا تب بھی کچھ لوگوں کو پیچھے لگا کر ایذا پہنچانے کے سلسلے جاری رکھتا ہے اور مختلف طریقوں سے آدمی کو مبتلا کرنا چاہتا ہے اس لئے آدمی کی سعادتمندی اور دانشمندی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر شیطان کے ان حملوں سے اپنے آپ کو بچانے کی اور محفوظ رکھنے کی کوشش کرے۔

اس لئے کہ بہت سے تو وہ ہوتے ہیں جو اول وہلہ ہی میں اس کے داؤ میں آجاتے ہیں اور نیکی کے کام ہی نہیں کرپاتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر وہ ہوتے ہیں کہ کرلیا تو ریا اور

شہرت کی طلب میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہاں اس نے بے کار کر دیا۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ اس میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں تو جو مخالفین آئے تو یہ اپنا کام چھوڑ کر ان کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو تیسرے نمبر پر ان کو ناکام کر دیا۔ اور پھر اگر اعتراضات کرنے والوں کے بھی جوابات نہیں دئے تو چوتھے نمبر پر سامنے آئے بغیر چھپ کر جو تکلیف پہنچاتے ہیں؛ ان کے اندر لگا دیتے ہیں۔ آدمی کو ان چاروں سے بچنے کی اور شیطان کے دوسرے حربوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔

﴿حاصلِ کلام﴾

بعض مرتبہ جو کام کرنے والے ہوتے ہیں وہ اپنے حالات پیش کرتے ہیں کہ ایسا ہو رہا ہے، فلاں پیچھے پڑا ہوا ہے اور یہ اعتراضات ہو رہے ہیں۔ تو بہت سی مرتبہ تو ان اعتراضات کی وجہ سے وہ آدمی کام کرنا ہی چھوڑ دیتا ہے۔ اور اگر نہیں چھوڑتا تو ان کے جواب میں پڑ جاتا ہے یا ان کی انتقامی کارروائی میں لگ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بتلایا کہ ایسی دوسری تیسری چیزوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، صبر کا ایک طریقہ یہ بھی ہے

﴿گناہوں کے باوجود عذاب نہ آنے کا مطلب کیا سمجھا جائے؟﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِذَاأَرَادَاللّٰهُ بِعَبْدِهٖ خَيْرًا عَجَّلَ لَهُ الْعُقُوْبَةَ فِي الدُّنْيَا، وَاِذَاأَرَادَاللّٰهُ بِعَبْدِهِ الشَّرَّ أَمْسَکَ عَنْهُ بِذَنْبِهٖ. حَتّٰى يُوَافِيَ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ عِظَمَ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ. وَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ اِذَااَحَبَّ قَوْمًاابْتَلَاهُمْ. فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ اپنے

بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کے اوپر دنیا ہی میں اس کو سزا دے دیتے ہیں اور اگر کسی بندے کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے گناہوں کے باوجود دنیا میں اس کو کوئی سزا نہیں دی جاتی، اس کا معاملہ موقوف رکھا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کو قیامت کے روز پوری پوری سزا دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ جیسے دنیا فانی ہے دنیا کی نعمتیں بھی فانی ہیں، اور دنیا کی عقوبتیں سزائیں اور تکلیفیں بھی فانی ہیں۔ اور جیسے دنیا کی ہر چیز کمزور ہے، اسی طرح دنیا کی خوشی بھی فانی ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور ہے، دنیا کی سزا بھی فانی ہونے کے ساتھ ساتھ کمزور ہے۔ اور آخرت میں جو کچھ بھی ہے وہ باقی رہنے والا اور قوی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اگر اس کی طرف سے گناہ صادر ہوئے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کی سزا دنیا ہی میں اس کو دے دیتے ہیں تاکہ آخرت میں جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے تو گناہوں سے پاک صاف ہو، نیکیاں ہی نیکیاں ہوں اور اس کا اجر اس کو دیا جائے۔ گناہوں کی سزا کا کوئی سلسلہ باقی ہی نہ رہے، حساب کتاب پہلے ہی صاف ہو چکا ہو۔ اور اگر کسی کے ساتھ برائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو گناہوں کے باوجود اس کو کوئی سزا نہیں دی جاتی۔

اسی لئے اہلِ علم نے لکھا ہے کہ کسی آدمی کے گناہوں اور معصیتوں پر اصرار کے باوجود اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی عذاب نہیں آرہا ہے، تو یہ کوئی خوش ہونے کی چیز نہیں ہے؛ بلکہ ڈرنے کی چیز ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ڈھیل دی جارہی ہے اللہ تعالیٰ جب پکڑیں گے تو اچانک پکڑلیں گے۔ اس لئے اصل یہ ہے کہ ایسی چیزوں سے آدمی خوش نہ ہو بلکہ حق تعالیٰ شانہ' سے ڈرتا رہے، گناہوں سے توبہ واستغفار کرتا رہے

مؤمن کی شان یہی ہوا کرتی ہے۔اور یہ بھی ہے کہ گناہوں سے توبہ واستغفار کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے عذاب وسزا سے بھی پناہ مانگتا رہے۔چاہے دنیا کی سزا ہو یا آخرت کی، دنیا کی سزا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر سزا ہے تو وہ بھی ہم لوگوں کے لئے ناقابلِ برداشت ہی ہے۔اس لئے آدمی کو عافیت ہی مانگنی چاہیے۔

﴿عافیت ہی مانگے﴾

ایک آدمی کو نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ وہ بخار میں ایسا مبتلا ہے کہ اس کی وجہ سے بالکل کمزور ہوگیا ہے، چہرہ بھی اس کا پیلا پڑ گیا ہے،اور جسم بھی بالکل کمزور ہو چکا ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا بات کیا ہے؟ کیا تم کوئی دعا کرتے ہو؟اس نے کہا: ہاں یا رسول اللہ! مَیں نے ایک دعا کی ہے کہ اے اللہ! تو مجھے جو سزا آخرت میں دینے والا ہے؛ وہ دنیا ہی میں دے دے۔حضور ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندے! یہ بھی تو دعا کرسکتا تھا کہ اے اللہ! معاف کردے۔(ترمذی ۵/۵۲۱) جب دعا ہی کرنے بیٹھے ہیں اور مانگنے ہی بیٹھے ہیں تو یہ کیوں نہیں مانگا جاتا۔اس لئے آدمی خود تو مصیبت مانگے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ سے عافیت ہی مانگے دنیا میں بھی یہی مانگے کہ اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف کر اور میرے گناہوں کی وجہ سے نہ مجھے دنیا میں سزا دے اور نہ آخرت میں پکڑ۔اللہ تعالیٰ سے آدمی کو مغفرت اور رحمت ہی کا سوال کرنا چاہیے۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ دنیا میں ہوگی تو اس کو بھی برداشت کرنے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔معلوم نہیں وہ پکڑ ہو اور کیا حالات پیش آئیں، بہت سی مرتبہ عقوبت اور سزا کے طور پر ایسے حالات پیش آتے ہیں کہ اس کی وجہ سے آدمی ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔زبان سے ایسی چیزیں نکال دیتا ہے جن کی وجہ سے ایمان ہاتھ سے چلا

جاتا ہے،اس لئے آدمی کو عافیت ہی مانگنی چاہیے۔لیکن خدانخواستہ اس کے باوجود اگر کوئی ایسے حالات آزمائش کے پیش آجائیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے اور تدبیر کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے۔

﴿بڑی آزمائش کا بدلہ بھی بڑا﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: بڑا اچھا بدلہ اس وقت ملتا ہے جب بڑی آزمائش ہو۔ جیسے امتحان بڑا ہو تو اس پر انعام بھی بڑا ہی ملتا ہے۔ چھوٹے امتحان پر انعام بھی چھوٹا ہی ملتا ہے۔تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اگر آزمائش بڑی کی گئی ہے تو جو بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعام کی شکل میں ملے گا؛ وہ بھی بڑا ہی ملے گا۔ یہ تو دنیا کا دستور ہی ہے۔

﴿محبتِ خداوندی کی ایک پہچان﴾

﴿وَاِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی اِذَا اَحَبَّ قَوْمًا ابْتَلَاھُمْ﴾ حضور ﷺ نے ایک دوسرا اصول بتلایا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو ان کو آزمائش میں ڈالتا ہے یعنی ان کے لئے حالات پیدا کردیتا ہے، جس کی وجہ سے ان کی آزمائش کی جاتی ہے۔

﴿فَمَنْ رَضِیَ فَلَهُ الرِّضَا﴾ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی گئی ان مصیبتوں اور آزمائشوں پر جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں جس حال میں رکھے ہم راضی ہیں، ہم تو اللہ کے بندے ہیں؛ تو پھر اللہ تعالیٰ ان کے لئے آسانیاں پیدا فرمادیتے ہیں اور راضی ہوجاتے ہیں۔

﴿رضا بالقضا حاصل کرنے کا نسخہ﴾

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے ایک مصیبت کے ساتھ دو راحتیں اور اسی طرح ایک تنگی کے

ساتھ دو آسانیاں رکھی ہیں۔ یہ قاعدہ ہے۔اس لئے نعمتوں کا سلسلہ مصیبتوں کے مقابلے میں وسیع اور زیادہ ہوا کرتا ہے۔لہٰذا آدمی کو یوں سوچنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی تکلیف پہنچی بھی ہے تو جس ذات کی طرف سے یہ تکلیف پہنچی،اس ذات کی طرف سے بے شمار نعمتیں بھی مجھے پہنچی ہیں،ان نعمتوں کا تقاضہ یہ ہے کہ اس تکلیف کو بھی مَیں خوشی خوشی برداشت کرلوں۔

شاید پہلے بھی مَیں نے بتلایا تھا کہ حضرت لقمان حکیم جب غلام تھے تو ان کی غلامی کے زمانے میں ایک مرتبہ ان کے آقا نے ان کو ککڑی کی ایک قاش کاٹ کر دی،انہوں نے کھالی،حالانکہ وہ کڑوی تھی لیکن چہرے سے ذرّہ برابر بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ وہ کڑوی ہے۔ جب دوسری قاش کاٹ کر آقا نے خود کھائی تو کڑوی نکلی۔اس نے کہا: تم نے بتلایا بھی نہیں، پتہ بھی چلنے نہیں دیا؟ انہوں نے جواب دیا: جس ہاتھ سے اب تک اتنی شیرنیاں کھائی ہیں اگر ایک آدھ تلخی پہنچے؛ تو کیا مَیں اس کا اظہار کروں گا؟

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہمیں بے شمار نعمتیں پہنچتی ہی رہتی ہیں،اللہ تعالیٰ نے کیا کم نعمتیں دی ہیں؟

﴿انسان کی نادانی﴾

بعض آدمی یوں سوچتے ہیں کہ کون سی نعمتیں ہیں؟ یہ بھی آدمی کی نادانی کی بات ہے۔ایک آدمی کسی بزرگ کے پاس گیا اور کہا کہ میں اس تکلیف میں ہوں اور اُس تکلیف میں ہوں۔میرے پاس کوئی نعمت ہے ہی نہیں۔انہوں نے کہا: تیرے پاس تو اللہ تعالیٰ کی بہت ساری نعمتیں ہیں۔تو کہتا ہے کہ کونسی نعمتیں ہیں؟ انہوں نے کہا: اچھا دیکھو! یہ تمہاری

آنکھیں ہیں، کیا تم ان دو آنکھوں میں سے ایک آنکھ پچاس ہزار روپے میں دینے کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ کان زبان ہاتھ پاؤں ہر ہر عضو کا تذکرہ کر کے پچاس ہزار اور لاکھ کی باتیں کہیں۔ وہ ہر ایک کے جواب میں انکار کرتا رہا۔ آخر میں ان بزرگ نے فرمایا: خود تیرے اقرار کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو لاکھوں کی ملکیت تیرے پاس ہے اور تو کہتا ہے کہ میں غریب ہوں، میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہ کیسی بات کرتا ہے؟

﴿ایک بزرگ کا قصہ﴾

حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کو استعمال کرتے ہیں ان کا ہمیں احساس ہی نہیں ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ مولانا احمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ سناتے تھے کہ کسی وجہ سے ان کی پیشاب رک گئی تھی، تو آپریشن کر کے ایک نلی بٹھا دی گئی اور وہ تھیلی میں پیشاب کر لیا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا: حضرت! یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ میرے گناہوں کی سزا ہے۔ پوچھا: کیا ہوا؟ فرمایا: زندگی بھر عافیت کے ساتھ پیشاب ہوتی رہی، کبھی چھوٹی زبان سے ایک مرتبہ بھی الحمد للہ نہیں کہا۔ یعنی پیشاب اپنے وقت پر اطمینان سے ہو جائے، یہ بہت بڑی نعمت ہے؛ جس کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے دعا سکھلائی کہ جب پیشاب سے فارغ ہو جائے تو آدمی یہ دعا پڑھے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ﴾ تمام تعریف اس اللہ کے لئے جس نے اس تکلیف پہنچانے اور گندگی والی چیز کو (جو میرے جسم میں تھی) مجھ سے دور کر دیا اور مجھے عافیت عطا فرمائی۔ آدمی سوچے کہ یہ پیشاب جو اطمینان کے ساتھ

ہوتی ہے، اگر کسی وقت رک جائے، تو کیا حال ہوگا؟ اس پیشاب کو نکالنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کی جائیں گی، اور معلوم نہیں کتنا خرچ کرنے کے لئے آدمی تیار ہوگا۔

پوری سلطنت کی قیمت

ہارون الرشید ایک مرتبہ بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا: اتنی بڑی سلطنت ہے، اس کی کیا قیمت ہے؟ اگر آپ کو سخت پیاس لگ جائے اور آپ سے یوں مطالبہ کیا جائے کہ یہ آدھا گلاس پانی ہے، اگر آدھی سلطنت دیں گے، تو آدھا گلاس پانی ملے گا؛ آپ کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا: دینے کے لئے تیار ہوں۔ پھر کہا: اچھا! اگر آپ کی پیشاب رک جائے اور آپ کو یوں کہا جائے کہ آدھی سلطنت دیں گے، تو آپ کی یہ پیشاب نکالی جائے گی؛ تو کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا: دوں گا۔ اس نے کہا: آپ کی سلطنت کی قیمت کا اندازہ لگا لیجئے۔

قابلِ عبرت بات

فضائلِ صدقات میں حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جا رہے تھے، ایک آدمی اپاہج اور معذور پڑا ہوا تھا، نہ اس کے ہاتھ تھے، نہ پاؤں تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے کہا: اس کو دیکھو اور بتاؤ! اس آدمی پر اللہ تعالیٰ کی کیا نعمتیں ہیں؟ لوگوں نے کہا: اس پر کیا نعمتیں ہیں؟ نہ اس کا ہاتھ ہے، نہ پاؤں ہے، نہ اور کچھ سامان ہے؟ تو فرمایا: کیا وہ عافیت کے ساتھ اپنے وقت پر اطمینان سے پیشاب کر لیتا ہے؛ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت نہیں ہے؟

قدرِ نعمت بعدِ زوال

یہ حقیقت ہے اور میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں۔ یہ

تو ہم ناشکرے ہیں کہ ہمارا دھیان اس کی طرف نہیں جاتا۔ جیسا کہ فارسی کا مقولہ ہے:۔ ’’قدرِ نعمت بعدِ زوالِ نعمت‘‘ آدمی کو نعمت کی قدر اس وقت ہوتی ہے؛ جب وہ نعمت نہیں ہوتی جب نعمت ہاتھ سے چھنتی ہے اس وقت آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اوہو! یہ کتنی بڑی نعمت تھی۔ ایک آدمی کے پاس لاکھوں روپے ہیں، لیکن وقت پر پیشاب ہی صحیح طریقے سے نہیں ہو پاتی، اور اس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا ہے؛ تو وہ لاکھوں روپے کیا کام آئے؟

دولت کس کام کی؟

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ ارشاد فرمایا کرتے تھے: ہمارے بچپن میں سنا تھا کہ ایک انگریز تھا، وہ اتنا رئیس اور مالدار تھا کہ اس کے متعلق مشہور تھا کہ جتنی دیر میں وہ ایک سگریٹ پیے؛ اتنی دیر میں اس کے خزانے میں ایک ہزار روپے جمع ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے ایک ہزار، آج کے نہیں۔ آج سے سو سال پہلے کی بات ہے۔ لیکن وہ ایسا بیمار تھا کہ ڈاکٹروں نے کہہ رکھا تھا کہ اس کو کھانے کے لئے صرف دال کا پانی دیا جائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی چیز استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ اب بتلایئے کہ اس کے پاس لاکھوں اور کروڑوں کی دولت بھی ہے؛ تو کیا کام کی؟

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، ہر ہر نعمت کا اندازہ اس کو دیکھ کر لگائے جس کے پاس وہ نعمت نہیں ہے، اور اپنی اس نعمت پر جو اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے؛ قدر کرے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوجاتے ہیں

مَیں اسی کو عرض کر رہا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی قوم سے محبت رکھتے ہیں تو

ان کو آزمائش میں ڈالتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَمَنْ رَضِيَ فَلَهُ الرِّضَا﴾ اللہ تعالیٰ کی اس آزمائش کے جواب میں جو شخص اپنی رضامندی کا اظہار کرتا ہے یعنی ناراضگی کی کوئی بات نہیں کرتا، شکوے شکایتیں نہیں کرتا، بلکہ اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اس پر وہ خوش ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رضامندی کا سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی اس سے خوش ہو جاتے ہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ بھی ناراض﴾

﴿وَمَنْ سَخِطَ فَلَهُ السُّخْطُ﴾ اور جو شخص اس آزمائش اور ابتلاء کے جواب میں بجائے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہنے کے ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، لوگوں کے سامنے شکوے شکایتیں کرتا ہے، روتا دھوتا رہتا ہے، کہ یہ مصیبت ہے اور فلاں ہے، گویا اس کا مقصد صرف اللہ تعالیٰ کی شکایتیں لوگوں کے سامنے کرنا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے لئے ناراضگی کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہمارے اوپر جو حالات آتے ہیں وہ ہمارا امتحان ہے۔ اب ہمیں سوچنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس امتحان میں ہم ناکام ہو جائیں۔ کامیاب ہونے کی کوشش کرنی ہے۔ اور کامیاب ہونے کی کوشش یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس حال میں ڈالا ہے اس میں آدمی خوش رہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور کرتے ہوئے اس کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرے، اور جو مصیبت ہے اس پر صبر کرنے کی کوشش کرے، کسی کے سامنے شکوہ شکایت نہ کرے۔

﴿مثالی صبر﴾

اسی کی مناسبت سے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا ایک چھوٹا بچہ

ڈیڑھ دو سال کا تھا، حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ماں شریک بھائی تھا، وہ بیمار تھا، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کسی سفر میں تشریف لے گئے، ابھی وہ سفر میں تھے اس دوران وہ بچہ انتقال کر گیا اور اس کو دفن بھی کر دیا گیا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اپنے سفر سے جب واپس آئے، شام کا وقت تھا، آتے ہی اپنی بیوی حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا (جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں) سے پوچھا: میرے بچے کا کیا حال ہے؟ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: پہلے سے زیادہ سکون اور بہت اطمینان ہے۔ ظاہر ہے پہلے زندہ تھا اور بیمار تھا تو اس وقت تو تکلیف میں تھا، اب انتقال کر گیا تو انتقال جیسا سکون تو کہیں ہے ہی نہیں۔ اس لئے کہا: ﴿هُوَ أَسْكَنُ مَا كَان﴾ پہلے جو حالت تھی اِس وقت اُس سے زیادہ سکون ہے۔ گویا اپنے اعتبار سے انہوں نے جو جواب دیا وہ بالکل درست تھا، لیکن اس کا مطلب حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ یوں سمجھے کہ بیماری میں تخفیف ہوگئی ہے اور ٹھیک ہے۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے مناسب نہیں سمجھا کہ بچے کے باپ کو سفر سے آتے ہی بچے کی موت کی اطلاع دی جائے۔

﴿عورتوں کے لئے ایک سبق﴾

آدمی کبھی سفر سے آتا ہے اور سفر کی تکلیفوں کی وجہ سے پریشان ہوتا ہے، اور آتے ہی ایسی کوئی صورتِ حال اس کے سامنے رکھی جائے تو اور زیادہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے عورتوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسے موقع پر شوہر کے سامنے ایسے حالات ایک دم سے نہ رکھیں، بلکہ پہلے دیکھ لیں کہ اس کا مزاج ٹھیک ٹھاک اور سکون پذیر ہے، اس کے بعد اطمینان دیکھ کر وہ بات پیش کی جاسکتی ہے۔

بہر حال! حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے یہ جواب دے دیا اور شام کا کھانا بھی پیش

کر دیا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو اطمینان ہو گیا تھا کہ بچہ سکون سے ہے تو انہوں نے کھانا بھی اچھی طرح کھالیا اور پھر سو گئے اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت بھی کی۔ اس لئے کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو یہ تو خبر ہی نہیں تھی کہ بچے کا انتقال ہو گیا ہے۔ کیونکہ حضرت ام سلیم نے ابھی اطلاع دی ہی نہیں تھی بلکہ مختصر سا جواب دے دیا تھا۔ جب صبح ہوئی اور وہ صحبت اور غسل وغیرہ سے فارغ ہو گئے تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے اطلاع دی کہ بچے کو تو لوگوں نے دفن کر دیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو بڑا غصہ آیا کہ آتے ہی مجھے اطلاع کیوں نہیں کی۔ مَیں نے پوچھا تو یہ جواب دیا کہ زیادہ سکون میں ہے۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے تو کھانا بھی کھالیا اور صحبت بھی کر لی۔ ایسے موقع پر آدمی کو افسوس یہ ہوتا ہے کہ ادھر میرے بچے کا انتقال ہو گیا تھا اور بے خبری میں مَیں نے یہ ساری حرکتیں کر لیں۔ افسوس اور ندامت سی ہوتی ہے، خاص کر کہ جب صحبت بھی کر لی تھی۔ اس لئے ندامت کے احساس کی وجہ سے صبح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور کے سامنے پورا واقعہ بیان کیا کہ یارسول اللہ! ایسا ہوا۔ میں سفر میں گیا تھا، بچہ بیمار تھا، جب میں واپس آیا تو میں نے بچے کے متعلق پوچھا: کیا حال ہے۔ اس نے کہا: پہلے سے زیادہ اطمینان ہے۔ میں تو یہ سمجھا کہ ٹھیک ہے اور تندرست ہے۔ اس نے کھانا پیش کیا، میں نے کھالیا اس کے بعد میں نے صحبت بھی کی۔ اب اس کے بعد وہ مجھے اطلاع دیتی ہے کہ بچے کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ام سلیم نے مناسب کام کیا یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: تم نے رات کو صحبت کی تھی؟ کہا: جی ہاں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کے لئے آج کی اس صحبت میں برکت عطا فرما۔ چنانچہ اسی صحبت

کے نتیجے میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو ایک بچہ پیدا ہوا۔

تحنیک کی سنیت اور اس کا طریقہ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کو نہلا دھلا کر ان کی والدہ نے میرے حوالے کیا کہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحنیک کروانے اور نام پوچھنے کے واسطے لے جاؤ، اور ساتھ میں کچھ کھجوریں بھی دیں۔ مدینہ والوں کا دستور ہی تھا کہ جب کبھی کوئی بچہ پیدا ہوتا تھا تو اس کو نہلا دھلا کر تحنیک کے واسطے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچاتے ان کو بھی حضور کی خدمت میں بھیجا۔ جب حضرت انس رضی اللہ عنہ بچے کو لیکر وہاں پہنچے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نومولود کو دیکھ کر پوچھا: کچھ ساتھ میں لائے ہو؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہاں! کھجوریں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کھجوریں لیں اور اپنے منھ سے چبا کر نرم کیا اور پھر اپنے دہن مبارک سے اس کو نکال کر اس بچے کے تالو میں چپکا دی، اسی کو تحنیک کہتے ہیں۔

تحنیک کیوں؟

یہ مستحب ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو اس کو نہلا دھلا کر اس کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے اور کسی صالح و نیک آدمی کے پاس اس کو لے جائیں وہ کھجور یا کوئی میٹھی چیز کو نرم کر کے اس کے تالو سے چپکا دے گا؛ اسی کو تحنیک کہتے ہیں، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے جسم میں ایک صالح آدمی کے ثمرات ہوں اور اس کی وجہ سے آئندہ اس کے اندر صلاح کی صورتیں پیدا ہوں، اسی کو گھُٹی (घुट्टी) دینا کہتے ہیں، اب ہمارے یہاں یہ ہوتا ہے کہ تیار گھُٹی (घुट्टी) بازار سے لے آتے ہیں۔ یہ صورت

بیکار ہے۔ گھُٹی (گھٹی) کا مقصد تو یہ ہے کہ اس کے لئے صلاح اور نیکی کے راستوں کو ہموار کرنا ہے، اسی لئے کسی صالح آدمی کے پاس ہو۔ آج کل اس کا اہتمام نہیں رہا۔ اس کا بڑا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے ایک ملنے والے نے بتلایا کہ ان کی بہن پیدا ہوئی تھی۔ اسپتال میں کسی ہندو عورت نے گھُٹی (گھٹی) دے دی تو اس کا اثر یہ ہوا کہ وہ گوشت ہی نہیں کھاتی۔ گوشت سے اس کو نفرت ہے۔ یہ اس کا اثر ہے۔

بہر حال! واقعہ یہ ہے کہ جس کے ذریعہ سے تحنیک کرائی جاتی ہے اس کے اثرات بچے میں آتے ہیں۔ اس لئے یہ مسنون قرار دیا گیا ہے۔ تو حضور ﷺ نے تحنیک کی اور اس کا نام عبداللہ رکھا۔

ایک انصاری صحابی کہتے ہیں کہ چونکہ حضور ﷺ نے دعا کی تھی کہ اللہ ان کے لئے برکت دیجیے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ یہ بچہ جس کا نام عبداللہ رکھا تھا اور حضور نے اس کی تحنیک کی تھی، ان عبداللہ کے بیٹوں میں ۹ ر بیٹوں کو میں نے دیکھا کہ سب کے سب بڑے عالم بنے۔ یہ حضور ﷺ کی دعا کا اثر تھا۔ اس صحبت سے جو بچہ پیدا ہوا اس بچے کی اولاد میں ۹ ر بیٹے اس زمانے میں عالم بنے۔

اور اسی حدیث میں مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کا بیٹا جو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوا تھا، اس کا انتقال ہوا۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ باہر تشریف لے گئے تھے، حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے خاندان والوں سے کہا کہ جب وہ واپس آئیں تو تم میں سے کوئی ان کو اطلاع مت دینا۔ بچے کے انتقال کی اطلاع میں خود دوں گی

آج کل تو حال یہ ہوتا ہے کہ ماں کی تو ہمت ہی نہیں ہوتی، ماں کا تو اس وقت کوئی نام ہی نہیں لے سکتا۔ اور وہاں دیکھئے کہ والدہ کتنا صبر کا اظہار کر رہی ہیں۔ جب وہ سفر سے واپس آئے تو حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کھانا پیش کیا، انہوں نے کھایا پیا، اور پھر حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے ان کے لئے بناؤ سنگھار کیا۔ ویسے بھی سفر سے آئے تھے طبیعت میں تقاضہ تھا تو صحبت بھی کی۔ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے جب دیکھا کہ کھا پی کر سیراب بھی ہو گئے، اور اپنی جو طبعی ضرورت تھی وہ بھی پوری کر لی، اب طبیعت پر کوئی تقاضہ نہیں ہے۔ اب غور کیجیے کہ وہ کیسے اچھے انداز سے بچے کے انتقال کے متعلق ان کو کہہ رہی ہیں۔ انہوں نے کہا: ابوطلحہ! اچھا ایک بات بتلائیے، میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھتی ہوں اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز امانت کے طور پر رکھنے کے لئے دی ہو، چیز تو دوسرے کی ہے اس نے استعمال کے واسطے دی ہے، اگر وہ اپنی چیز واپس مانگے تو کیا وہ گھر والے انکار کر سکتے ہیں؟ کہ نہیں دیں گے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے کہا: نہیں! کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ پھر کہا: اپنے بیٹے کی موت پر صبر سے کام لیجئے۔ اب اطلاع دی کہ بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ گویا یہ چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہم کو استعمال کے واسطے دی گئی تھی، ماں باپ کو اولاد دی جاتی ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان کا جی خوش ہو، اللہ تعالیٰ ایک وقتِ مقرر تک دیتے ہیں، جب وہ وقت پورا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ اس کے لینے پر دل سے ناراض ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا پر ناراض ہوئے، ناراض اس اطلاع پر نہیں ہوئے بلکہ اس بات پر ہوئے کہ پہلے ہی خبر کیوں نہ دے دی۔ تم نے کھانا دیا؛ میں نے کھایا۔ پھر میں نے صحبت بھی کی اس کے بعد اب تم کہہ رہی ہو۔ پھر

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے اور حالت بیان کی اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس صحبت کی وجہ سے حضرت ام سلیم کو حمل ٹھہرا۔

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تشریف لے گئے اس میں حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا بھی اپنے شوہر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شریکِ سفر تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب سفر سے واپس ہوتے تھے تو مدینہ میں رات کے وقت داخل نہیں ہوتے تھے بلکہ باہر ٹھہر جاتے تھے۔ چنانچہ اس سفر سے بھی جب واپس آئے اور باہر ٹھہرے اسی وقت حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا کو دردِزہ شروع ہوا۔ جب صبح ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو رفقاء کے ساتھ مدینہ کے لئے روانہ ہوئے، حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو تو بیوی کے دردِزہ کی وجہ سے وہیں رکنا پڑا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ جانے لگے تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: اے باری تعالیٰ! آج تک تو میرا معمول یہ رہا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفر میں تشریف لے جاتے تھے تو میں سفر میں ساتھ جاتا تھا، اور جب آپ مدینہ میں داخل ہوتے تھے تو میں آپ کے ساتھ ہی مدینہ میں داخل ہوتا تھا۔ لیکن اے اللہ! آج تو دیکھ رہا ہے کہ یہ بیوی کے ولادت کے درد کی وجہ سے مجھے یہاں رکنا پڑ رہا ہے۔ بس یہ دعا کی اور اسی وقت حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا نے کہا: اے ابوطلحہ! میں جو درد محسوس کر رہی تھی وہ درد اب نہیں ہے۔ چلو۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مدینہ میں داخل ہوئے۔ پھر دوسرے دن درد ہوا اور بچہ پیدا ہوا۔ یعنی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کی جو تمنا تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ واپسی ہو؛ وہ بھی پوری ہوئی۔

بہرحال! یہاں تو بتلانا یہ ہے کہ دیکھئے! بچے کی موت پر حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ عنہا نے کتنے بڑے صبر کا مظاہرہ کیا کہ اس بچے کی ماں ہونے کے

باوجود بچے کے باپ سفر سے واپس آئے توان کے سامنے فوراً اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی، بلکہ ان کے لئے صبر آسان ہو، اس کے لئے ایک مثال دے کر ایک مسئلہ پوچھا؛ تاکہ وہ آسانی کے ساتھ صبر کرسکیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی صحیح توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَ نَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً .اما بعد .

﴿حقیقی پہلوان﴾

عن أبی ہریرۃ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَالْغَضَبِ.

یہ بیان صبر کے سلسلہ میں جاری ہے یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا: ﴿لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرْعَۃِ﴾ ”صُرْعَۃ“ عربی زبان میں اس آدمی کو کہتے ہیں جولوگوں کومقابلے کےوقت پچھاڑدے یعنی پہلوان۔ پہلوان قوت والا آدمی نہیں ہے یعنی اس کے متعلق آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زورآور، بڑاقوی اور پہلوان ہے جولوگوں کو پچھاڑدے ﴿اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَہٗ عِنْدَالْغَضَبِ﴾ قوی اورتوانا آدمی تووہ ہے جو غصے کےوقت اپنے آپ کوکنٹرول میں رکھے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں توانااورقوی ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ جوآدمی اپنے نفس پرقابوپالے وہ حقیقی معنیٰ میں بڑاپہلوان کہاجائے گا، مقابلے کے وقت لوگوں کو پچھاڑ دینا؛ یہ کوئی اونچی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی غصے کے وقت اپنے آپ پر

کنٹرول کرے۔ ویسے بھی غصے کی وجہ سے عام طور پرآدمی کی غور وفکراور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے اور پھر وہ ایسے افعال اور ایسی حرکتیں انجام دیتا ہے جس کے نتیجے میں بعد میں اس کو بڑی ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے۔

﴿غصہ کے وقت کی دعا﴾

عن سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ كُنتُ جَالِساًمَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَرَجُلَانِ يَسْتَبَّانِ وَأَحَدُهُمَاقَدِاحْمَرَّوَجْهُهُ،وَانْتَفَخَتْ أَوْدَاجُهُ،فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ :اِنِّى لَأَعْلَمُ كَلِمَةً لَوْقَالَهَالَذَهَبَ عَنْهُ مَايَجِدُ.لَوْقَالَ أَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ذَهَبَ عَنْهُ مَايَجِدُ.فَقَالُوْالَهُ:اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ:تَعَوَّذْبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ .

یہ صحابی حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور دو آدمی آپس میں سخت کلامی کررہے تھے یعنی لڑ رہے تھے، زبانی لڑائی کررہے تھے گالی گلوچ اور دشنام طرازی سے کام لے رہے تھے، اور دونوں آپس میں ایک دوسرے کو سب وشتم کررہے تھے۔ان میں سے ایک کی کیفیت یہ تھی کہ اس کا چہرہ ایک دم لال اور سرخ ہو گیا تھا اور اس کی گردن کی رگیں غصے کی وجہ سے پھول گئی تھیں۔ان دونوں کی یہ کیفیت نبی کریم ﷺ دیکھ رہے تھے، خاص کر کہ وہ جس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور گردن کی رگیں پھول گئی تھیں۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ آدمی اُس کلمہ کو پڑھ لے تو اس کی غصے کی جو یہ کیفیت ہے وہ سب ختم ہو جائے گی۔اگر وہ ﴿**أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**﴾ پڑھ لے تو یہ غصے کی جو کیفیت ہے اور غصے کی وجہ سے اس کا جو مزاج بدل رہا ہے؛ وہ غصے کا سارا زور ٹوٹ جائے گا اور ختم ہو جائے گا۔

غصہ دور کرنے کی عارضی تدابیر حدیث کی روشنی میں......

غصے کو فرو کرنے اور دبانے کے واسطے مختلف تدبیریں احادیث میں آئی ہیں ان میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ غصے کے وقت آدمی تعوّذ پڑھے۔اعوذ باللہ کا مطلب یہ ہے کہ شیطان مردود کے شر اور اس کی شرارتوں اور برائیوں سے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی پناہ میں آتا ہوں۔اس لئے کہ آدمی کو غصے میں مبتلا کرنا یہ شیطانی وسوسے کے نتیجہ میں ہوتا ہے جب آدمی اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور پناہ میں آئے گا تو شیطان کے اثر سے غصے کے جو آثار اس کے اوپر پیدا ہوئے تھے؛ وہ ان شاءاللہ دور ہو جائیں گے۔ایک تدبیر تو یہ بتلائی ہے۔

دوسری تدبیر احادیث میں یہ آئی ہے کہ آدمی کو اگر غصہ آجائے اور وہ کھڑا ہے تو بیٹھ جائے یا بیٹھا ہو تو لیٹ جائے (رواہ احمد والترمذی، مشکوۃ ص۴۳۴) اس سے بھی فوری طور پر غصے کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔ایک ترکیب یہ بھی آئی ہے کہ آدمی وضو کرلے۔(ابوداؤد شریف) وضو کی وجہ سے بھی غصہ فرو ہو جاتا ہے، ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔اس لئے کہ غصہ کی حالت میں آدمی کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تھوڑی دیر کے لئے رخصت ہو جاتی ہے، اور اس حالت میں آدمی ایسی حرکتیں کر ڈالتا ہے کہ بعد میں خود اس کو اس پر ندامت اور پچھتاوا ہوتا ہے۔اس لئے آدمی کو غصے سے بچنے کے لئے جو تدبیریں بتلائی گئیں ہیں ان کو اختیار کرنا چاہیے۔

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ تدبیریں تو عارضی ہیں یعنی فوری طور پر تو غصے کی حالت کو ختم کردیں گی لیکن اس کی وجہ سے غصے کی عادت ختم نہیں ہوگی۔

غصہ دور کرنے کی دائمی تدبیر

غصے کی عادت ختم کرنے کے لئے آدمی کو یہ تدبیر بتلائی گئی کہ جس آدمی کو غصہ آتا

ہو؛ وہ یوں سوچے کہ مَیں کس پر غصہ کر رہا ہوں؟ بیوی پر، بچے پر، یا اپنے نوکر پر، یا کسی اجنبی آدمی پر؟ میں نے اس کو پیدا نہیں کیا، اس کی آنکھ کان ناک ہاتھ پاؤں وغیرہ میں نے نہیں بنائے، اس کو روزی میں نہیں دیتا، میں اس کا مالک نہیں ہوں، اور اس نے ایسی بات کر دی جو میری طبیعت کے خلاف ہے جس کی وجہ سے مجھے اس پر اتنا غصہ آ رہا ہے؟ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تو مجھے پیدا کیا، یہ سارے قویٰ اور ساری صلاحیتیں اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائیں، اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتیں میں استعمال کر رہا ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ ایسی حرکتیں کر رہا ہوں جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہیں۔ تو میرا اس آدمی کے اوپر اتنا احسان اور میری اس کے اوپر اتنی نعمتیں نہیں ہیں جتنی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کے احسانات میرے اوپر ہیں۔ اس کے باوجود میں اس کی معمولی بات پر ناراض ہو کر غصہ کا اظہار کر رہا ہوں، اور میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانیاں ہر گھڑی اور ہر وقت کرتا ہوں، ہر لمحہ مجھ سے ایسی باتیں سرزد ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑنے والی اور اس کے حکم کے خلاف ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی میرے ساتھ وہ معاملہ ہونے لگے جو میں اس کے ساتھ اس کی ذرا سی غلطی پر کر رہا ہوں؛ تو پھر میں تو کہیں کا نہیں رہوں گا؟ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے۔

حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ غصے میں آ کر اپنے غلام کی پٹائی کر رہے تھے، پیچھے سے ایک آواز سنی: ﴿اعلم أبا مسعود، اعلم أبامسعود﴾ اے ابو مسعود! آگاہ ہو جاؤ، خبردار ہو جاؤ، سن لو۔ جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آواز سن کر ان کا ہاتھ تو رک ہی گیا تھا۔ آگے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿لَلّٰهُ اَقْدَرُ عَلَيْكَ

مِنکَ عَلَیہِ ﴾ اے ابومسعود! تم کو اس غلام پر جتنی قدرت حاصل ہے یعنی تم اپنی قوت اور قدرت کی وجہ سے اس پر اپنا غصہ جتنا نکال رہے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ وہی معاملہ ہونے لگے جو تم اس کے ساتھ کرتے ہو؛ تو سوچو آخر کیا انجام ہوگا؟ حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں یہ سن کر لرز گیا اور فوراً میں نے کہا: یہ غلام اللہ کے واسطے آزاد ہے۔ یعنی مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی اس کی تلافی میں نے یوں کی کہ اس غلام کو آزاد کر دیا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابومسعود! اگر آپ اس کو آزاد نہ کرتے؛ تو جہنم کی آگ تمہیں اس حرکت کی وجہ سے اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ (صحیح مسلم ۳/۱۲۸۰)

تو بہر حال! یہ غصہ کی عادت کو دور کرنے کی دائمی تدبیر یہ ہے کہ آدمی روزانہ یہ سوچتا رہے، یہاں تک کہ یہ فکر اور سوچ اس پر غالب آجائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر کسی کے اوپر جب غصہ کرنے کے لئے طبیعت چاہے گی؛ تو یہ سوچ کر وہ باز رہے گا۔ اور اپنے آپ کو غصے سے روکے گا۔

﴿ غصہ بڑا عقلمند ہے ﴾

حضرت مولانا حکیم اختر صاحب دامت برکاتہم تو یوں فرماتے ہیں: بھائی! لوگ یوں کہتے ہیں کہ غصہ میں عقل نہیں ہے۔ پھر وہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ نقل کرتے ہیں کہ بھائی! غصہ بھی بڑا عقلمند ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ غصے میں عقل نہیں، ایسا نہیں ہے۔ غصہ بھی بڑا عقلمند ہے۔ آدمی غصہ اسی پر کرتا ہے جو اپنے سے کمتر اور کمزور ہو۔ اگر سیر کا سوا سیر سے مقابلہ ہو جائے، تو یہ دیکھتا ہے کہ سامنے والا سوا سیر ہے لہٰذا اس کے جی

میں غصہ آئے تب بھی اس کا اظہار نہیں کرتا۔اس لئے یہ کہنا کہ غصہ بے وقوف ہے، یہ بات بھی صحیح نہیں۔وہ بھی بڑا عقلمند ہے کہ وہ ایسے موقع پر ہی نمایاں ہوتا ہے جب سامنے والے کو اپنے سے کمزور دیکھتا ہے۔لیکن سامنے والا اگر اپنے سے قوی ہوتو اس نے چاہے اس سے زیادہ خطرناک بات کی ہو، گستاخی کا معاملہ کیا ہو؛ تب بھی سب پی کر رہ جائیں گے۔اس لئے آدمی یہ سوچ لے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو مجھے جواب دینا ہے تو اس صورت میں ایسی نوبت نہیں آئے گی۔

غصہ پی جانے کی فضیلت

عن معاذبن أنس رضی اللہ عنہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:مَنْ کَظَمَ غَیْظًاوَھُوَقَادِرٌعَلیٰ أَنْ یُنفِذَہٗ،دَعَاہُ اللّٰہُ سبحانہ وتعالیٰ عَلیٰ رُؤُوسِ الْخَلَائِقِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِحَتّٰی یُخَیِّرَہٗ مِنَ الْحُوْرِالْعِیْنِ مَاشَآءَ

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے غصہ کو دبالے حالانکہ وہ اپنے اس غصہ پر عمل کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو اپنے کسی ماتحت پر، کسی ایسے آدمی پر جو اس کے مقابلے میں کمزور ہے؛ غصہ آیا، اور وہ اپنے اس غصہ کے تقاضے کو پورا کرسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ سوچ کر کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے غصہ کرنے سے منع کیا ہے، اپنے غصے کو دبادے، اور غصے کے تقاضے پر عمل نہ کرے؛ تو قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو تمام مخلوق کے سامنے اختیار دیں گے کہ خوبصورت آنکھوں والی حوروں میں سے جس کو چاہو پسند کرلو۔گویا اللہ تعالیٰ کی خاطر اس نے اپنے اس غصہ کو دبایا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بدلے کے طور پر یہ نعمت عطا فرمائی۔حقیقت یہی ہے کہ آدمی جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا تصور کرے گا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب

دینا ہے تو اس صورت میں اس کے لئے غصہ کو فرو کرنا آسان ہو جائے گا۔

﴿امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ﴾

امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کا نام علی تھا، جو حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ نسب اس طرح ہے علی بن حسین بن علی۔ ایک مرتبہ ان کا غلام گرم پانی ان کو دینے کے لئے آیا، پانی ان کے بچے پر گر گیا، یہ دیکھ کر ان کو غصہ آ گیا اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ فوراً اس غلام نے آیت پڑھی ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ﴾ کہ وہ لوگ جو اپنے غصہ کو دبانے والے ہیں۔ فوراً سمجھ گئے اور غصہ کی ساری کیفیت اسی وقت ختم ہو گئی اور دور ہو گئی۔ پھر آگے اس نے پڑھا ﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ یعنی لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ تو انھوں نے کہا: مَیں نے تمہیں معاف کر دیا۔ پھر اس نے آیت پڑھی ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔ تو کہا: جا! میں نے تجھے آزاد کر دیا (شعب الایمان ۶/ ۳۱۷) یعنی آیت کے تینوں جزو پر انھوں نے اس طرح سے عمل کیا۔ اتنا ہی نہیں کہ اس سے انتقام نہیں لیا بلکہ معاف بھی کر دیا اور آزاد بھی کر دیا، حالانکہ وہ ان کا غلام اور ماتحت تھا، اس کو بڑی سے بڑی سزا دینا چاہتے تو دے سکتے تھے۔

﴿غصہ مت کرو﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِلنَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم: اَوْصِنِيْ. قَالَ: لَاتَغْضَبْ. فَرَدَّدَمِرَاراً. قَالَ: لَاتَغْضَبْ.. (رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی نصیحت فرما دیجئے؟ کوئی مخصوص نصیحت جو تاکید کے طور

پر کی جاتی ہے اس کو وصیت کہتے ہیں۔اس نے کہا: آپ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔تو حضوراکرم ﷺ نے فرمایا: غصہ مت کرو۔اس نے پھر بار بار اپنی یہ درخواست پیش کی یعنی دوسری تیسری مرتبہ بھی اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿ لاَ تَغْضَبْ ﴾ غصہ مت کرو۔جتنی مرتبہ اس نے پوچھا اتنی مرتبہ نبی کریم ﷺ نے یہی جواب دیا۔

﴿سوال ایک، جواب الگ الگ﴾

ایک بات یادرہے کہ احادیث میں مختلف مواقع پر ایسا آیا ہے کہ کسی آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ اللہ کے رسول! مجھے کوئی نصیحت کیجئے، تو آپ نے کوئی بات نصیحت کے طور پر ارشاد فرمائی۔مختلف لوگوں کو مختلف جوابات دئے۔یہاں جو آدمی آیا اس نے جب آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے اس کے جواب میں اس کو غصہ نہ کرنے کی تاکید فرمائی۔لہٰذا مختلف لوگوں کی طرف سے ایک ہی طرح کا سوال کیا گیا لیکن جواب میں نبی کریم ﷺ نے ہر موقع پر ہر آدمی کے مناسبِ حال بات ارشاد فرمائی، وہ اس لئے کہ آپ ﷺ توطبیبِ روحانی تھے، آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرمایا کرتے تھے۔جو جس قسم کا بیمار آیا اس کے مناسب اس کے لئے آپ ﷺ نے دوا تجویز فرمائی۔اس آدمی کو جس نے سوال کیا تھا اور آپ ﷺ سے نصیحت کی درخواست کی تھی، اس کے حالات کو دیکھ کر نبی کریم ﷺ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اس آدمی میں غصہ کی عادت ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو تاکید فرمائی کہ غصہ مت کرو۔بار بار اس نے درخواست کی، بار بار نبی کریم ﷺ نے یہی جواب ارشاد فرمایا۔

﴿حالات کی حکمت﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَا یَزَالُ الْبَلَاءُ بِالْمُؤْمِنِ وَالْمُؤْمِنَةِ فِیْ نَفْسِہٖ وَوَلَدِہٖ وَمَالِہٖ حَتّٰی یَلْقَی اللّٰہَ تَعَالٰی وَمَا عَلَیْہِ خَطِیْئَةٌ . (رواہ الترمذی)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آزمائشیں ایمان والے مرد اور ایمان والی عورت پر ان کی جان میں ان کی اولاد میں ان کے مال میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر آتی رہتی ہیں؛ یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملتا ہے کہ اس کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔

پہلے بھی بتلایا تھا پچھلی روایتوں میں بھی آیا کہ آدمی پر جو مختلف حالات و مصائب آتے ہیں، کبھی اس کی جان میں جیسے اس کو خود کوئی تکلیف پہنچی، بیماری لاحق ہوگئی، بخار آیا اور کسی بیماری میں مبتلا ہوا، کوئی عضو ٹوٹ گیا، ہڈی ٹوٹ گئی، کسی عضو کی صلاحیتوں سے محروم ہوگیا، یا اور کسی طریقے سے اس کی جان کو تکلیف پہنچی۔ یا اس کی اولاد بیمار ہوئی اولاد کو کوئی حادثہ پیش آیا، اولاد کی نعمت ہی چھن گئی، جو بھی شکل ہو، یا مال کے سلسلے میں کوئی مالی نقصان پہنچا، کاروبار میں کوئی کمی آگئی۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی پر جو حالات آتے ہیں وہ تین قسم کے آسکتے ہیں۔ جان پر، اولاد پر یا مال پر۔ تو ان تینوں چیزوں پر مختلف آزمائشیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ اللہ تعالیٰ یہ چیزیں اس پر بھیج کر اس کو گناہوں سے پاک صاف کرتے رہتے ہیں یعنی ان مصائب کی وجہ سے اس کے گناہ دھلتے ہیں، گناہوں کی صفائی ہوتی ہے، یہاں تک کہ جب موت کا اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا وقت آتا ہے؛ تو ان مصائب کی

وجہ سے وہ بالکل پاک صاف ہو کر اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے اور کوئی گناہ اس پر نہیں ہوتا۔ گویا ایسے حالات جب آدمی پر آئیں تو ان کی وجہ سے دل گرفتہ یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ یوں سمجھے کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر نعمت ہی نعمت ہے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، آدمی اس میں صبر کا اظہار کرے، اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے، اور جیسا موقع ہو اس کے مناسب حال اللہ تعالیٰ کے ان فیصلوں پر عمل کرتا رہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو صبر سے کام لے۔ کوئی نعمت ملی ہے تو شکر کا اظہار کرے۔ جیسا کہ پہلے بھی آگیا۔ یہ مصائب جو آتے ہیں وہ بے کار نہیں ہیں، ان کی وجہ سے آدمی گناہوں سے پاک صاف ہوتا رہتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں امورِ مملکت کے اندر اپنی جو شوریٰ یعنی مشورہ کے لئے کمیٹی بنائی تھی اس میں علماء اور قراء ہی کو (یعنی جو کتاب اللہ اور حدیث کے علوم کے ماہر تھے انہیں کو) شامل کیا تھا۔ حر بن قیس رحمہ اللہ ایک تابعی ہیں، بڑے عالم ہیں؛ وہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلس مشاورت کے ایک رکن تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے چچا عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ - جو صحابی ہیں لیکن ان کے مزاج میں کچھ ذرا اکھڑ پن تھا - اپنے بھتیجے حر بن قیس رحمہ اللہ کے یہاں مہمان ہوئے۔ اور انھوں نے کہا: دیکھو! امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا رسوخ ہے، تمہاری بات وہاں مانی جاتی ہے، تمہارا ایک مقام ہے، تم ان کی مجلسِ مشورہ کے

ایک رکن ہو، اس لئے مجھے بھی ان کی خاص مجلس میں حاضری کا جی چاہتا ہے، تم میرے لئے اجازت لے لو۔ ویسے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے ہر کس و ناکس کو اجازت تھی لیکن ان کی جو خصوصی مجلس مشورہ کے لئے ہوتی تھی اس میں ہر آدمی نہیں جا سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے بھتیجے کو جو اس مجلس کے رکن تھے یہ کہا: آپ کل کے دن میرے واسطے اس کی اجازت لے لو کہ میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ اس مجلس میں حاضر ہوسکوں۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کی: کہ امیر المؤمنین! میرے چچا میرے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ بھی کل میرے ساتھ آپ کی مجلس میں حاضر ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی کہ ٹھیک ہے، ان کو اپنے ساتھ لے آنا۔ وہاں پہنچنے کے بعد انھوں نے وہی اپنے مزاج کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کہا: اے ابن خطاب! تو ہمارے ساتھ کوئی اچھا معاملہ نہیں کرتا، احسان کا معاملہ نہیں کرتا اور انصاف سے ہمارے ساتھ پیش نہیں آتا۔ حالانکہ ان کی یہ بات غلط تھی ﴿فَغَضِبَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ حَتّٰى هَمَّ اَنْ يُّوْقِعَ بِهٖ﴾ ان کی اس نامناسب بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور وہاں تو فوراً سزا کے لئے ہاتھ میں کوڑا رہتا ہی تھا، سزا دینے کا ارادہ کیا کہ ایسی بے کار اور غلط بات کیوں کی۔ خواہ مخواہ ہی انھوں نے ایسا کہا تھا۔ جب حر بن قیس رحمہ اللہ نے دیکھا کہ اب تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ان کی خبر لے لیں، فوراً حر بن قیس رحمہ اللہ نے موقع کی نزاکت پا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا: اے امیر المؤمنین دیکھئے! قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو تاکید کی ہے ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ لوگوں کو معاف کرنے کا طریقہ اپنایئے، یعنی لوگوں کو معاف کر دیجئے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور لوگوں کو بھلی بات کا حکم کیجئے ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ اور ایسے ناواقف اور جاہل

لوگوں سے درگذر کیجئے۔ انھوں نے یہ آیت پڑھی اور اپنے چچا کی طرف اشارہ کر کے یہ بھی کہا: ﴿وَاِنَّ هٰذَامِنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ یہ بھی جاہلین میں سے ہیں، اس لئے آپ ان سے درگذر کیجئے۔ یہ آیت پڑھ کر انھوں نے یہ درخواست کی۔ (بخاری ۴/۱۷۰۲)

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک خاص مزاج اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قصہ﴾

تو دیکھئے! حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ ایک خاص مزاج تھا۔ پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جہاں ان کو کسی بھی حالت میں اسلام کی کسی تعلیم کا یا قرآن کی آیت کا یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کا حوالہ دے دیا جائے، پھر غصہ کیسا ہی کیوں نہ ہو؛ فوراً فرو ہو جاتا تھا۔ اور اسی وقت اس سے باز آ کر اس موقع کے مناسب جو حالت اختیار کرنی ہوتی تھی، فوراً وہ اختیار کر لیتے تھے، اس میں ذرہ برابر دیر نہیں کرتے تھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جب تہمت کا معاملہ پیش آیا اور بعد میں قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی برأت نازل ہوئی، اس معاملے میں جن لوگوں نے حصہ لیا تھا ان میں ایک حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بہن کے صاحبزادے بھی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کو وظیفہ دیا کرتے تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تو تاجر آدمی تھے، ان کے پاس مال تھا، تو وہ سب کو دیا کرتے تھے، ان کی بھی مدد کرتے تھے۔ بعد میں جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی برأت ظاہر ہوئی اور معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ جو اتہام کا معاملہ کیا گیا وہ غلط تھا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ ان کو اب نہیں دوں گا۔

دیکھو! ابھی تک تو انھوں نے قسم نہیں کھائی تھی۔ جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی طرف

سے برأت نازل نہیں ہوئی تھی تب تک انھوں نے کچھ نہیں کیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے برأت نازل ہوئی تو اب معلوم ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو اتہام کا معاملہ کیا گیا تھا؛ وہ غلط تھا، اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں ان پر جو خرچ کرتا تھا اب نہیں کروں گا اب ان کو نہیں دوں گا، وظیفہ بند کر دیا اور قسم بھی کھالی، قسم کھا کر کہا کہ نہیں دوں گا۔ اس پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُو الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ﴾ جو تم میں سے فضیلت والے ہیں، اہلِ فضل ہیں، وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے مال میں سے رشتہ داروں کو اور مسکینوں کو نہیں دیں گے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی کے لئے خاص یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں آخر میں ہے ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کریں؟ جوں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتیں سنائیں اسی وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ﴿بَلَىٰ! أُحِبُّ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لِي﴾ کیوں نہیں! میں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے۔ اسی وقت انھوں نے اپنی قسم توڑ دی اور کہا کہ میں جو وظیفہ دیتا تھا؛ وہ دیتا رہوں گا، بلکہ دوگنا کر دیا۔ اور اب تک جو روک رکھا تھا؛ وہ بھی دے دیا۔

یہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان تھی کہ ان کے سامنے جب ایسی کوئی بات ان کی کسی غلطی پر متنبہ کر کے قرآن یا حدیث کا حوالہ دے کر کہی جاتی تھی تو وہ فوراً عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے تھے۔

﴿ہمارا مزاج قابل اصلاح﴾

ہم لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ اگر ہم کو کبھی ایسا کوئی موقع پیش آجاوے اور کسی نے ہم کو قرآن کی آیت یا حدیث کے حوالے سے کوئی بات سمجھانی چاہی تو ہم فوراً جواب کے لئے تاویلات کرتے رہتے ہیں کہ اصل بات یوں ہے اور فلاں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت عمل کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے، تاویل کرنے کی گنجائش ہر ایک کے لئے رہتی ہے لیکن یہ حضرات کبھی کسی چیز میں اس کو گوارا نہیں کرتے تھے اور بھی بے شمار ایسے واقعات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہیں۔

یہاں دیکھئے! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے جب حر بن قیس رحمہ اللہ نے وہ آیت کریمہ پیش کی اور یوں کہا کہ یہ بھی جاہلین میں سے ہیں، آپ ان سے درگذر کیجئے، اللہ تعالیٰ قرآن میں ایسے لوگوں سے درگذر کا حکم دے رہے ہیں تو فرماتے ہیں ﴿وَاللّٰہِ مَا جَاوَزَھَا عُمَرُ حِیْنَ تَلَاھَا وَکَانَ وَقَّافًا عِنْدَ کِتَابِ اللّٰہِ تَعَالٰی﴾ جوں ہی انھوں نے یہ آیت پڑھی کہ فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اس سے ذرا بھی آگے نہیں بڑھے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب پر بڑی تاکید سے عمل کرنے والے تھے۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو جب اللہ اور اس کے رسول کی ہدایتوں کا حوالہ دیا جائے تو فوری طور پر عملی جامہ پہنانا چاہیے، اس میں تاویل کی کوئی گنجائش نہیں رکھنی چاہیے۔

﴿جب کھلی ناانصافی دیکھے تو کیا کرے﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِنَّھَا سَتَکُوْنُ بَعْدِیْ اَثَرَۃٌ وَاُمُوْرٌ تُنْکِرُوْنَھَا قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ فَمَا تَأْمُرُنَا؟ قال: تُؤَدُّوْنَ الْحَقَّ الَّذِیْ عَلَیْکُمْ وَتَسْأَلُوْنَ اللّٰہَ الَّذِیْ لَکُمْ (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ایسی صورتیں پیش آئیں گی کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے گی یا ایسی باتیں تم دیکھو گے جن کو تم اجنبی اور اُوپرا (ઓપરા) سمجھو گے یعنی اس سے پہلے ایسی صورتیں پیش نہیں آئی ہوں گی۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ ایک انصاری صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور آدمی کو کوئی کام سونپا تھا، کوئی منصب اور عہدہ دیا تھا، کسی جگہ کا ان کو عامل بنایا تھا۔ تو انھوں نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو تو یہ منصب دیا، مجھے نہیں دیا؟ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: دیکھو! ایسی بات نہیں ہے، میں ایسا نہیں کرتا۔ لیکن ایک بات یاد رکھو کہ بعد میں ایسے حالات پیش آنے والے ہیں کہ تمہارے مقابلے میں دوسروں کو ترجیح دی جائے گی اور ایسی صورتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے جو اس وقت نظر نہیں آرہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی تو کچھ نہیں ہوا، آگے ایسا ہونے والا ہے، اس وقت پھر ان حضرات نے پوچھا: اللہ کے رسول! اچھا! جب ایسے حالات پیش آئیں تو آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ یعنی ایسے حاکموں کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں؟ کیا تلوار لے کر ان کے مقابلے کے لئے میدان میں آجائیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں ﴿تُؤَدُّوْنَ الْحَقَّ الَّذِیْ عَلَیْکُمْ﴾ تمہارے اوپر ان کا جو حق ہے؛ وہ تم ادا کرتے رہو ﴿وَتَسْأَلُوْنَ اللہَ الَّذِیْ لَکُمْ﴾ اور تمہارا ان کے اوپر جو حق ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو۔

خوشگوار معاشرت کا راز

دیکھئے! اسلام کی تعلیمات میں یہ خاص بنیادی پوئنٹ(point)اور نکتہ ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسا کوئی معاملہ پیش آئے گا جن کا تعلق دوفریق سے ہو، کوئی بھی معاملہ جس میں دوگروہ ملوث ہوتے ہیں تو ایسے حالات میں نبی کریم ﷺ ہر فریق اور ہر گروہ کو دوسرے فریق کے حقوق سے متعلق کچھ ہدایتیں فرماتے ہیں اور ان کو اس کی تاکید کرتے ہیں کہ اس پر عمل کرو۔ اسی لئے اسلام نے کبھی یہ نہیں کہا کہ تمہارا فلاں پر یہ حق ہے۔ آپ تمام احادیث کا مطالعہ کرلیجئے، وہاں یہ آئے گا کہ تم پر فلاں کا یہ حق ہے۔ بیویوں کو یوں خطاب کیا کہ تم پر شوہروں کا یہ حق ہے۔ شوہروں کو یوں خطاب کیا کہ تم پر بیویوں کا یہ حق ہے۔ ماں باپ کو یوں کہا کہ تم پر اولاد کا یہ حق ہے۔ اور اولاد کو یوں کہا کہ تم پر ماں باپ کا یہ حق ہے۔ اولاد کو یوں نہیں کہا کہ تمہارا ماں باپ پر یہ حق ہے۔ یعنی اس پر دوسرے کا جو حق آتا ہے وہ تو بتایا۔ گویا اس کو یوں تاکید کی جارہی ہے کہ یہ حق اس کا تمہارے اوپر ہے؛ تم اس کو ادا کرو۔ اور تمہارا اس پر کیا حق ہے؛ وہ نہیں بتایا۔ گویا اسلام اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ تمہارے اوپر جو دوسروں کے حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا آپ اہتمام کیجئے، اور اس کی کوشش کیجئے۔ اور تمہارا حق جو دوسرے پر ہے اس کا مطالبہ مت کرو۔ اگر وہ نہیں ادا کرتا؛ تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔

آج کل جو جھگڑے چل رہے ہیں وہ اسی لئے ہیں کہ ادا کوئی کرتا نہیں، اور مانگ سب رہے ہیں۔ ہر ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ میرا تیرے اوپر یہ حق ہے۔ یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ مجھ پر تمہارا کیا حق ہے؟ لہٰذا لڑائی اور کھینچا تانی ہی ہوگی۔ جب ہر ایک یوں سوچے کہ میرے اوپر فلاں کا یہ حق ہے۔ باپ یوں سوچے کہ اولاد کا یہ حق ہے اس لئے میں

ادا کرتا ہوں۔شوہر یوں سوچے کہ بیوی کا یہ حق ہے لہٰذا مَیں ادا کرتا ہوں،لیکن میرا بیوی پر کیا حق ہے وہ اس سے مطالبہ نہ کرے؛تو کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہوگا۔

اسلام کی اہم تعلیم

اس لئے اسلام نے جو تعلیمات دیں ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں کہیں دو فریق ہوں،دو گروہ ہوں،دو پارٹی ہوں؛وہاں ایک کا دوسرے پر کیا حق ہے وہ بتلایا ہے دوسرے کا اس پر کیا حق ہے؛وہ نہیں بتلایا۔

اسی لئے حکومت کرنے والے جو حُکّام ہیں ان کے بارے میں رعایا کو تو یوں کہا کہ ان کا تمہارے اوپر حق یہ ہے کہ وہ تم کو جو حکم دیں اس کو بجالاؤ،ان کے احکام کی خلاف ورزی مت کرو،نافرمانی مت کرو،سمع اور طاعت کو شیوہ بناؤ۔یہاں تک کہ حدیث میں آتا ہے ﴿اِسْمَعُوْا وَأَطِيْعُوْا وَاِنِ اسْتَعْمَلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبْشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسُهُ زَبِيْبَة (رواہ البخاری (مشکوۃ ۳۱۹)﴾ تم حکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو،ان کی باتیں مانو،اس کے اوپر عمل کرو،ان کے حکم پر چلو؛چاہے تم پر حاکم بنایا جائے ایسا حبشی غلام کہ جس کا سر اتنا چھوٹا ہو جیسے کہ کشمش (منقیٰ) ہوا کرتی ہے۔اس لئے کہ حبشیوں کے سر ان کی جسامت کے مقابلے میں چھوٹے ہوتے ہیں،اور ایسا حبشی اور زیادہ کمزور سمجھا جاتا ہے،پھر بھی جب وہ تم پر حاکم بنا دیا جائے؛تو تم بات کو مانو۔گویا حاکموں کی اطاعت کی بڑی تاکید آئی ہے۔اور اگر ان کی طرف سے تم پر کوئی زیادتی ہو تو ان کے مقابلے پر نہ اترو،تمہارا ان پر جو حق ہے اس کو مانگنے کے لئے تم طاقت کا استعمال یا بغاوت کا ارادہ بھی مت کرو؛ بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے رہو۔اگر یہ سلسلہ رہے گا تو کبھی حکومت میں بدامنی نہیں

پھیلے گی۔ یہ اسلام کی اہم تعلیم ہے۔

اسی طرح مثلاً ایک سائل اور مانگنے والا ہے۔ حدیث پاک میں سائل کا کیا حق ہے وہ بھی بتادیا کہ اگر کوئی مانگنے والا سائل اور بھکاری آپ کے پاس آئے اور وہ آپ سے کچھ مانگے تو حدیث میں آتا ہے کہ مانگنے والے کو دو ﴿وَلَوْجَاءَ عَلٰی فَرَس﴾ چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر مانگنے کے واسطے آیا ہو۔ آپ اس سے یوں کہیں کہ ارے تو تو گھوڑا لے کر آیا ہے، تو کیا بھیک مانگتا ہے؟ آپ کو ایسا کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ معلوم نہیں اس کے کیا حالات ہیں اور وہ کیوں سوال کر رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ جس سواری پر سوار ہو کر آیا ہے، وہ اس کی نہ ہو، کسی اور کی لے کر آیا ہو۔ مطلب یہ کہ اس کی ظاہری حالت چاہے تم کو یہ بتلا رہی ہے کہ یہ بظاہر محتاج معلوم نہیں ہوتا لیکن جب وہ آپ سے سوال کر رہا ہے تو آپ دے دیجیے۔ یہ ایک بات ہوئی۔ تو دیکھو! جن سے مانگا جا رہا ہے ان کو تو یہ تاکید ہے۔

اور دوسری طرف حضور ﷺ نے فرمایا: جو آدمی سوال کرتا ہے، قیامت کے روز اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا (متفق علیہ (مشکوۃ ۱۶۲)) یعنی اس کا چہرہ بغیر گوشت کے ہوگا، گویا یہ سوال اس کے چہرے کی رونق کو ختم کرنے والا ہے۔ قیامت کے روز اس کے چہرے پر خراشیں لگی ہوئی ہوں گی (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی۔ مشکوۃ۔ص۔۱۶۲) اور یہ بھی فرمایا: جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کے لئے فقر کے دروازے کھولتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سوال سے بہت سختی کے ساتھ منع کیا گیا۔

بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے یہ درخواست کی: یارسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ آپ نے ان کو یہ نصیحت فرمائی ﴿لاتَسْئَل﴾ کسی سے سوال مت

کرنا۔آپ ﷺ کی اس نصیحت پر ان صحابی نے ایسا عمل کیا کہ اگر گھوڑے پر سوار ہوتے اور کوڑا اگر جاتا تھا تب بھی کسی سے نہیں مانگتے تھے کہ میرا کوڑا دے دو، خود گھوڑے سے اتر کر لے لیتے تھے۔

بہرحال دیکھئے! یہاں پر دونوں فریق سے تعلق ہوا۔سوال کرنے والے کو تو یوں کہا کہ سوال مت کرو، سوال کی وجہ سے یہ مصیبت اٹھانی پڑے گی۔اور اُدھر ان کو یوں کہا کہ اگر کوئی سوال کرنے والا آوے تو دو، چاہے گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔اب جو ہدایت اور حکم اس پیسے والے کو اور مسئول کو دیا گیا ہے، اگر اس کو سائل یاد کرلے، اور فقیر کو جو ہدایت کی گئی ہے اس کو مسئول یاد رکھے؛ تو کیا نتیجہ ہوگا؟

مثلاً کوئی مانگنے کے لئے آیا تو یہ اس کو دینے کے بجائے یوں سنا رہا ہے کہ بھائی! تو سوال کرتا ہے؟ حدیث میں تو سوال کرنے پر وعید آئی ہے۔حدیث میں تو یوں آیا ہے کہ جو سوال کا دروازہ کھولتا ہے؛ اس کے لئے فقر کا دروازہ اللہ تعالیٰ کھول دیتے ہیں۔یہ حدیث حضور ﷺ نے اس (مسئول) کے یاد کرنے کے لئے ارشاد نہیں فرمائی ہے۔یہ تو اس (سائل) کے لئے فرمائی تھی، یاد اُس نے کرلی۔اور جب فقیر اس کے پاس جاتا ہے تو فقیر اس کو یوں قرآن کی آیت سناتا ہے ﴿وأما السائل فلا تنهر﴾ مانگنے والے کو جھڑکو مت۔

﴿بھکاری مفسر﴾

ہمارے بھائی نے ایک قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ منشی اللہ دتہ مرحوم کے ساتھ جماعت میں گئے تھے (منشی اللہ دتہ حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے خلیفہ تھے) اور وہ بڑے تیز مزاج تھے ہمیشہ جماعتوں میں چلتے تھے۔ایک مرتبہ کسی جگہ جانا ہوا اور کوئی مانگنے کے لئے آیا۔اس کو

انھوں نے بھگانے کے واسطے ڈانٹ دیا تو اس پر اس نے یہ آیت پڑھی ﴿وأما السائل فلا تنهر﴾ مانگنے والے کو جھڑ کو مت۔ تو انہوں نے کہا: جا جا! تیرے جیسے بھکاری مفسر بہت دیکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے۔

مطلب یہ ہے کہ ﴿فلا تنهر﴾ والا حکم فقیر کو نہیں دیا ہے۔ اس کو یہ آیت ہدایت کے طور پر نہیں کی گئی۔ اِس کو تو اِس کی کہی گئی تھی۔ جس سے مانگا جا رہا ہے اُس کو یوں کہا گیا تھا کہ مانگنے والے کو جھڑ کو مت۔ یا کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر آوے تب بھی اس کو انکار مت کرو، اس کو دو۔ لیکن اب یہ دونوں باتیں وہ بھکاری یاد کر لے، اور آ کر کہے کہ دیکھو! حدیث میں یوں آیا ہے۔ تو اب اس صورت میں جھگڑے ہی ہوں گے۔ لہٰذا فقیر کو کہیں گے کہ یہ ہدایت تجھے نہیں دی گئی ہے۔ یہ ہدایت تو اُن کو دی گئی ہے؛ وہ سمجھیں۔ تجھے جو ہدایت دی گئی ہے، اگر اس پر تو عمل کرتا؛ تو ایسا کہنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

لہٰذا ہر مقام پر نبی کریم ﷺ نے خاص یہ انداز اختیار فرمایا ہے۔ جہاں کہیں معاملہ دو گروہ کا ہوا تو ہر ایک گروہ کو اس کی ذمہ داری بتلائی۔ اِس گروہ کو تو یوں کہا کہ اُن کا تم پر یہ حق ہے۔ اور اُن کو یوں کہا تم پر اِن کا یہ حق ہے۔ اب اگر ان میں سے ایک گروہ بھی اس کو دی گئی ہدایتوں کو عملی جامہ پہناوے؛ تو کبھی کوئی جھگڑا ہو گا ہی نہیں۔

سیٹھ کا ملازم اور نوکر پر کیا حق ہے، وہ ملازم کو بتایا، سیٹھ کو نہیں۔ اور ملازم کا کیا حق ہے وہ سیٹھ کو بتایا۔ آج کل سب نے سبق الٹا کر دیا۔ ہر گروہ سامنے والے گروہ کو جو تعلیم دی گئی ہے؛ وہ یاد کر لیتا ہے۔ اور خود کو جو تعلیم دی گئی ہے؛ وہ بھول جاتا ہے۔ نتیجے میں جھگڑے ہو رہے ہیں۔ یہ جھگڑے اسی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ اسلام کی تعلیم تو یہی ہے کہ تم پر

جو دوسروں کا حق ہے؛ وہ تم ادا کرو۔ اور تمہارا جو حق دوسروں پر ہے؛ وہ ان سے مانگو مت۔ اگر وہ ادا نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اللہ سے مانگو۔ اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دے۔ ان شاء اللہ معاملہ سلجھ جائے گا۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے یہاں بیان فرمایا ہے۔

﴿تم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے تو صبر کرو﴾

عن أبی یحییٰ أسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اَنَّ رَجُلًا مِنَ الْاَنْصَارِ قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَلَا تَسْتَعْمِلُنِیْ کَمَا اسْتَعْمَلْتَ فُلَانًا. فَقَالَ: اِنَّکُمْ سَتَلْقَوْنَ بَعْدِیْ أَثَرَۃً فَاصْبِرُوْا حَتّٰی تَلْقَوْنِی عَلَی الْحَوْضِ۔

انصار میں سے ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ مجھے کوئی منصب نہیں دیتے جیسا کہ فلاں کو دیا؟ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے بعد تم کو ایسی چیزیں پیش آئیں گی لیکن تم صبر سے کام لینا یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر مجھ سے ملاقات کرو۔

مطلب یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی صاحبِ اختیار لوگ ہوتے ہیں ان کے پاس کچھ اختیارات ہوتے ہیں۔ حکومت کا معاملہ ہے، کوئی عہدہ کسی کو دیا، دوسرے کو نہیں دیا، تو جس کو نہیں دیا گیا ہے اس کو گویا اس بات کی تاکید کی جارہی ہے کہ تم صبر سے کام لو اور مقابلہ پر اڑ مت جاؤ۔ اس لئے کہ وہ اگر مقابلے پر آئے گا تو فتنہ ہوگا، حالات خراب ہوں گے، بدامنی پھیلے گی۔ اور یہ چیز اسلامی حکومت کو ختم کرنے والی ہے۔ جہاں کہیں بھی ایسے حالات پیش آتے ہیں تو نتیجے میں بغاوتیں پھیلتی ہیں اور اس کی وجہ سے ایک بہت بڑی جماعت کا نقصان ہوتا ہے۔ ابھی تو ایک آدمی کا نقصان ہے، لیکن جب حالات خراب ہوں گے تو پوری قوم اور پوری جماعت کا نقصان ہوگا۔ اس لئے مصلحت کا تقاضہ یہی ہے کہ

آدمی اپنے نقصان کو برداشت کرتے ہوئے صبر سے کام لے۔ اور اسی میں دوسروں کے لئے خیر ہے۔ یہ خاص تاکید نبی کریم ﷺ نے امت کو ارشاد فرمائی۔

﴿نہ چھیڑو نہ چھوڑو﴾

عن أبی ابراهیم عبداللّٰہبن أبی أوفی رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِی بَعْضِ أَيَّامِهِ الَّتِیْ لَقِیَ فِيْهَا الْعَدُوَّ، اِنْتَظَرَ، حَتّٰی اِذَامَالَتِ الشَّمْسُ قَامَ فِيْهِمْ. فَقَالَ: يَآأَيُّهَا النَّاسُ! لَاتَتَمَنَّوْا لِقَآءَ الْعَدُوِّ. وَأَسْأَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ. فَاِذَا لَقِيْتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا. وَاعْلَمُوْا أَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ. ثُمَّ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: أَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِیَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْأَحْزَابِ، اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ.

آپ ﷺ کسی غزوے میں تشریف لے گئے تھے تو وہاں آپ ﷺ نے سورج کے ڈھلنے کا انتظار کیا۔ جب سورج ڈھلا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام کو ایک خطبہ دیا: اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا مت کرو یعنی کبھی یہ خواہش نہیں کرنی چاہیے کہ کاش ان سے مقابلہ ہوتا تو ہم بھی ان کو بتاتے، دو دو ہاتھ کرتے، دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہیں کرنی چاہیے، ایک تو یہ بات ارشاد فرمائی۔ کیوں کہ دشمن سے مڈبھیڑ ایک طرح کی آزمائش اور ابتلاء ہے اور آدمی کو چاہیے کہ اپنی زبان سے ایسا مطالبہ نہ کرے۔ ﴿وَأَسْأَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ﴾ مانگنا ہے تو اللہ سے عافیت مانگو۔

پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ ایک آدمی کو حضور ﷺ نے دیکھا کہ بہت کمزور ہو گیا ہے تو اس سے پوچھا: کیا بات ہے؟ ہمیشہ تجھ کو بخار رہتا ہے۔ تو نے کوئی دعا کی تھی؟ تو اس نے کہا: ہاں! میں نے یہ دعا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں جو سزا دینے والا ہے وہ

دنیاہی میں دے کر مجھے پاک کردے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جب تو یہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا نہیں کرسکتا کہ عافیت دے؟ عافیت مانگ، یہاں بھی عافیت رہے وہاں بھی عافیت رہے۔

مطلب یہ ہے کہ کبھی یہ سوال نہیں کرنا چاہیے کہ دشمن سے مڈبھیڑ کی نوبت آئے، اللہ تعالیٰ سے عافیت اور سلامتی مانگنی چاہیے، لیکن جس کی دشمن سے مڈبھیڑ ہوجائے، اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمائی تھی اور مڈبھیڑ کی نوبت آگئی تو پھر پیٹھ بھی نہیں پھیرنی چاہیے، پھر تو جم کر ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ گویا یہ خاص تاکید کی کہ صبر سے کام لو۔

اور حضور ﷺ فرماتے ہیں: جان لو کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب جہاد کا موقع آجائے تو پھر آدمی کو پیچھے ہٹ (ہٹ جانا) اور پسپائی اختیار نہیں کرنی چاہیے، لیکن اپنی زبان سے مقابلہ اور مڈبھیڑ کا سوال بھی نہ کرے، اور موقع آجاوے تو بزدلی سے بھی کام نہ لے، بہادری اختیار کرے۔

﴿ثم قال النبی ﷺ: أَللّٰهُمَّ مُنزِلَ الْكِتَابِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْأَحْزَابِ، اِهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ﴾ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے اللہ! جو قرآن پاک کو نازل کرنے والا اور بادلوں کو چلانے والا ہے، دشمن کے لشکر کو تو شکست دے دے اور ہماری ان کے خلاف مدد فرما۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ سے ایسے موقع پر مدد کی دعا بھی کرے۔

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ الْاَحَدُالصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدًا. لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ ذُوْالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ. اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کُلُّہٗ وَلَکَ الشُّکْرُ کُلُّہٗ وَلَکَ الْمُلْکُ کُلُّہٗ وَاِلَیْکَ یَرْجِعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ. اَللّٰھُمَّ لَآاُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلیٰ نَفْسِکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ وَّعَلٰیٓ اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِھَا مِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَا بِھَا جَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَا بِھَا مِنْ جَمِیْعِ السَّیِّآتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَا عِنْدَکَ اَعْلیٰ الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِھَآ اَقْصیٰ الْغَایَاتِ مِنْجَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔اے اللہ! ہم بے حد گنہگار ہیں۔گناہوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔اے اللہ! تو محض اپنے فضل وکرم سے ہمیں گناہوں کے دلدل میں سے نکال دے۔اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی،اساتذہ ومشائخ کی،دوست واحباب کی، محسنین ومتعلقین کی،جنہوں نے ہم کودعاؤں کے لئے کہا یا لکھا، یاجوہم سے دعاؤں کی توقع اورامید رکھتے ہیں ان کی اورتمام مؤمنین ومؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما۔اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے ظاہر وپوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری سیئات کوحسنات سے مبدّل فرما۔اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں کواپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔اے اللہ! مجلس میں

جتنے بھی موجود ہیں سب کی پوری پوری مغفرت فرما کر بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اور بھی جن لوگوں نے اپنے بیماروں کی صحت کے لئے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں، اے اللہ! ان تمام کے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے ان کو صالح جوڑ عطا فرما۔ جن کے لئے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما۔ اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما۔ جن کی اولاد نافرمان ہے ان کو مطیع وفرمانبردار بنادے جو لوگ نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما۔ اے اللہ! جو لوگ جیلوں میں بند ہیں، ایک مدت سے مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت ٹاڈا کے نام سے گرفتار ہے۔ اے اللہ! ان تمام کو عافیت کے ساتھ رہائی نصیب فرما۔ اے اللہ! محض اپنے فضل سے سب کے لئے رہائی مقدر فرما، اپنا خصوصی فضل فرما۔ اس امت کے حال پر رحم فرما۔ اے اللہ! جن لوگوں پر مقدمات ہیں عافیت کے ساتھ ان کو بری فرمادے۔ اے اللہ! جن کی جو جو حاجتیں ہیں محض اپنے فضل وکرم سے پوری فرما، اس مجلس میں جتنے بھی موجود ہیں سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما۔ اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر وبھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ وَصَلیٰ اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلیٰ خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ...

صدق

﴿سچائی﴾

اقتباس

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سب سے اونچا وصف تو ہے نبوت۔ نبوت اور رسالت وہ مقام ہے کہ جس میں آدمی کے کسب اور ریاضت کو دخل نہیں

نمبر دو پر جو مقام ہے وہ صدیقیت کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ اس میں آدمی کے کسب اور ارادے کو دخل ہے، آدمی محنت مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے اس مقام کو حاصل کرسکتا ہے۔ اس کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک کے لئے کھلا رہے گا اسی صدق کو جب ترقی ہوتی ہے تو آدمی صدیقیت کے مقام پر پہنچتا ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

سچائی یقیناً آدمی کی رہنمائی کرتی ہے نکوکاری کی طرف۔ یعنی آدمی سچ کا اہتمام کرتا ہے، اپنے بولنے میں بھی، اپنے کردار میں بھی اور اپنے کام میں بھی؛ تو سچ والی یہ صفت اس کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور نیکی اس کو جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی اپنے کردار میں، گفتار میں، اپنے عزم وارادہ میں سچائی کا اہتمام کرتا ہے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ''صدیق'' لکھا جاتا ہے

سچائی ہی ایک ایسی صفت ہے کہ اس کو آدمی اگر اختیار کرلے تو اس کے نتیجہ میں باقی تمام صفات آسانی کے ساتھ اس کو حاصل ہو سکتی ہیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً

امابعد. فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

یَااَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْااتَّقُوْااللّٰہَ وَکُوْنُوْامَعَ الصَّادِقِیْنَ. (التوبة. ۱۱۹)

وقال تعالیٰ: وَالصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ. (الأحزاب. ۳۵)

وقال تعالیٰ: فَلَوْصَدَقُوْااللّٰہَ لَکَانَ خَیْرًالَّھُمْ. (محمد. ۲۱)

صدق کی قسمیں

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے باب الصدق۔ ''صدق'' سچائی کو کہتے ہیں۔ علماء نے سچائی کی تقسیم کی ہے اوراس کی کچھ انواع بیان کی ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ آدمی بات میں سچا ہو جیسا کہ عام طور پر ہم جب اس لفظِ صدق اور سچائی کو استعمال کرتے ہیں اس وقت اسی معنٰی کو مراد لیا کرتے ہیں کہ وہ اپنی بات میں سچا ہے یعنی جو چیز واقعہ کے مطابق ہو اسی کو وہ اپنی زبان سے ادا کرے، واقعہ کے خلاف اگر کوئی آدمی اپنی زبان سے کوئی بات ادا کرے اور خبر دے تو اس کو جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے مثلاً کوئی شخص آیا ہے اس کے متعلق اگر آپ یہ اطلاع دیں کہ فلاں آدمی آ گیا تو چونکہ آپ نے جو خبر دی ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے اس لئے یوں کہیں گے کہ آپ نے سچی بات کہی، اور اگر وہ آیا ہے اس کے باوجود

کوئی آدمی یوں کہے کہ نہیں آیا، یہ واقعہ کے خلاف خبر دی جارہی ہے تو اس کو جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ یہ غلط اور جھوٹ بات ہے، لہٰذا ایک تو بات کے اندر سچائی ہوتی ہے۔

﴿عزم وارادہ میں سچائی﴾

دوسری قسم یہ ہے کہ آدمی اپنے عزم وارادہ میں سچائی سے کام لے، مثلاً ایک آدمی نے تجارت شروع کی، تجارت شروع کرتے وقت اس نے اپنے دل میں یہ ارادہ وعزم کیا کہ اگر میری اس تجارت میں اتنا منافع ہوا تو میں مال کی اتنی مقدار اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا یا مال کی اتنی مقدار حاصل ہونے پر مسجد تعمیر کردوں گا، مدرسہ میں اتنے پیسے دوں گا یا غریبوں کی امداد کے اندر اتنی رقم خرچ کروں گا، مطلب یہ ہے کہ عام طور پر آدمی جب کوئی تجارتی کام کرتا ہے یا اسی طریقہ سے کوئی اور معاملہ کرتا ہے تو اپنے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس سلسلہ میں ایک معاملہ کرتا ہے، ارادہ اور عزم کرتا ہے لہٰذا جس وقت وہ ارادہ کررہا ہے تو اتنی پختگی کے ساتھ یہ طے کرے کہ واقعۃً میری جو نیت ہے اگر اس کے مطابق ہوگیا تو مَیں اللہ کے راستہ میں اتنی رقم خرچ کروں گا تو یوں کہیں گے کہ یہ اپنے عزم وارادہ میں سچا اور پکا ہے، پھر جب اس کی نیت کے مطابق نفع ہوگیا تو اب اپنے اس ارادے کو پورا کرنے میں سچا ہونا چاہیے، ورنہ پھر وہ جھوٹا قرار دیا جائے گا۔

﴿منت کون سی صحیح ہے، کون سی نہیں؟﴾

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب اپنے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے اس قسم کا معاملہ کرتا ہے اور نیت کرتا ہے تو اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں، ایک شکل تو یہ ہے کہ زبان سے بولے؛ یہ منت اور نذر کہلاتی ہے، اس کو تو پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی ایسے کام کے متعلق

کسی نے منت اور نذر مانی ہے جس کی جنس کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پہلے سے واجب ہوا کرتا ہے مثلاً کسی نے منت مانی کہ میرا بیٹا بیمار ہے، اگر اچھا ہو گیا تو مَیں اتنی رکعات نماز پڑھوں گا تو گویا ایک ایسی چیز کی اس نے نذر اور منت مانی ہے جس کی جنس کا یہ فعل یعنی نماز اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پہلے سے فرض ہے ایسی چیز کی اگر منت مانتا ہے تو وہ منت درست ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی آدمی کسی ایسے کام کی منت مانے جس کی جنس کا کوئی کام اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فرض یا واجب نہیں ہے تو وہ منت درست نہیں ہے مثلاً کسی آدمی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو مَیں دھوپ میں اتنی دیر تک کھڑا رہوں گا، تو یہ منت اور نذر نہیں۔ ہاں! اگر نماز کی منت مانی، روزے کی مانی، اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ کرنے کی مانی، حج کی مانی تو یہ سب نذریں درست ہوجاتی ہیں۔ اسی لئے کوئی آدمی اگر کسی گناہ کے کام کی نذر مان لے؛ تو یہ درست نہیں۔ لہٰذا اگر غلطی سے گناہ کی منت مان لی ہو تو اس کو پورا نہ کرے اور قسم توڑنے کا کفارہ دے دے، اس لئے کہ نذر عبادت میں ہوا کرتی ہے

اگر زبان سے نہیں بولا، صرف دل سے ارادہ کیا تو؟

خیر یہ تو نذر کی بات تھی اس میں تو آدمی اپنی زبان سے بولتا ہے۔ ایک شکل اور ہے کہ زبان سے نہیں بولا بلکہ صرف دل میں اس کی نیت کرلی، دل میں ارادہ کرلیا تو یہ نذر کے طور پر واجب اور ضروری نہیں ہوتا، یعنی اگر زبان سے بولا ہوتا تو نذر اور منت کہلاتی، لیکن صرف دل میں ارادہ کیا ہے تو منت نہیں ہے۔

بہت سے لوگ سوال کرتے ہیں کہ میرے دل میں یہ نیت تھی کہ میری تجارت میں نفع ہوگا تو دو پرسنٹ (2%) اللہ کے راستے میں خرچ کروں گا تو کیا یہ منت ہو جائے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ منت نہیں کہلائے گی۔ ہاں البتہ اتنا ضرور ہے کہ ایک عزم اس نے کیا تھا تو اپنے عزم میں اس کو پختہ ہونا چاہیے اور اس کے مطابق تجارت کے اندر منافع ہوا، تو اپنے اس عزم کو پورا کرنے کے معاملے میں بھی اس کو سچا ہونا چاہیے۔ تو عزم میں سچا ہو اور وفا بھی ہو، یعنی اپنے اس عزم وارادہ کو پورا کرنے میں بھی سچا ہونا چاہیے۔

بہت سے لوگ تو جب عزم کرتے ہیں تب ہی سے ڈانواں ڈول (ડાંવાંડોળ) ہوتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ یا بہت سے لوگ جب عزم کرتے ہیں تب تو پختہ ہوتے ہیں لیکن جب اس کے مطابق منافع ہو گیا تو پھر دل میں کہتے ہیں کہ اوہ ہو! یہ دو پرسنٹ تو دو لاکھ کے قریب پہنچتا ہے، اب ڈانواں ڈول (ડાંવાંડોળ) ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ یہ دو لاکھ کیسے نکلیں گے: تو اپنے اس ارادہ کو پورا کرنے میں بھی پختہ ہونا چاہیے۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَامِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ بہت سے لوگ اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنے دل میں یہ معاہدہ کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں کچھ دیں گے، مالِ تجارت میں برکت ہوگی، ہمارے پاس مال آئے گا تو ہم اللہ کے راستے میں خرچ کریں گے، صدقہ کریں گے اور اپنے عمل کے اعتبار سے اپنے آپ کو نیکوکار ثابت کریں گے ﴿فَلَمَّا اٰتٰهُمْ مِنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ دیتا ہے تو پھر بخل سے کام لیتے ہیں یعنی انھوں نے اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد وارادہ کیا تھا؛ وہ پورا نہیں کرتے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے۔

آدمی کو جس طرح اپنے قول میں سچا ہونا چاہیے، اسی طرح اپنے عزم وارادہ کو پورا کرنے میں بھی سچا ہونا چاہیے۔ اسی طریقہ سے اپنے افعال میں اپنے کردار میں بھی آدمی کو سچا ہونا چاہیے۔ جیسے ہم بولتے ہیں کہ یہ آدمی اپنے کردار کا بڑا سچا اور پکا ہے۔

بہرحال! یہ سچائی وہ صفت ہے کہ جس طرح وہ قول اور باتوں کے اوپر بولی جاتی ہے؛ اسی طرح فعل اور کاموں کے اوپر بھی بولی جاتی ہے۔ جس طرح وہ گفتار کے اوپر بولی جاتی ہے؛ کردار کے اوپر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور یہ بہت اونچا وصف ہے۔

نبوت وہبی ہے اور صدیقیت کسبی ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سب سے اونچا وصف تو ہے نبوت۔ نبوت اور رسالت تو وہ مقام ہے کہ جس میں آدمی کے کسب اور ریاضت کو دخل نہیں یعنی آدمی اپنا کوئی عمل اور محنت کر کے نبوت کے درجے تک نہیں پہنچ سکتا، کوئی آدمی کتنی ہی محنت کرے کتنے ہی مجاہدے کرے وہ نبی نہیں بن سکتا۔ یہ تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہیں عطا فرمادیں۔ یہ وہبی چیز ہے، کسبی نہیں۔ یعنی آدمی کی کمائی، عمل اور محنت کو اس میں دخل نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔ یہ سب سے اونچا مقام ہے جو ایک انسان کو حاصل ہوسکتا ہے۔

نمبر دو پر جو مقام ہے وہ صدیقیت کا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ اس میں آدمی کے کسب اور ارادے کو دخل ہے، آدمی محنت مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ سے اس مقام کو حاصل کرسکتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہو تو یہ کوئی ایسا مقام نہیں ہے کہ جس کو آدمی حاصل نہ کرسکے۔ اس کا دروازہ آج بھی کھلا ہوا ہے اور قیامت تک کیلئے کھلا رہے گا۔ لہٰذا جو دوسرے نمبر کا مقام ہے جس کو ایک انسان حاصل کرسکتا ہے وہ یہی صدق کا ہے اور اسی صدق کو جب ترقی ہوتی ہے تو صدیقیت کے مقام پر آدمی پہنچتا ہے، اسی لئے اس کا بڑا اونچا مرتبہ ہے۔

صدق کے متعلق قرآنِ کریم کی آیتیں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی: ﴿یَـاَیُّهَـا الَّـذِیْـنَ اٰمَنُوْا

اتَّقُوْا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو یعنی جو اپنی بات کے بھی سچے، کام کے بھی سچے، ارادے کے بھی سچے ہوں، جن کی ہر چیز میں سچائی جھلکتی ہو، ایسوں کے ساتھ رہو؛ تو ان شاء اللہ تمہارے اندر بھی یہ وصف آجائے گا۔

دوسری آیت پیش کی: ﴿وَالصَّادِقِیْنَ وَالصَّادِقَاتِ﴾ یہ سورۂ احزاب کی آیت ہے ﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بعض اہلِ ایمان عورتوں کی طرف سے یہ شکوہ وشکایت کی گئی کہ قرآنِ پاک میں مردوں ہی کا تذکرہ ہوتا ہے عورتوں کا تو تذکرہ ہوتا ہی نہیں، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورتوں کی دلجوئی کیلئے یہ آیت نازل فرمائی جس میں ان اوصاف کو ذکر کیا گیا جو اللہ تعالیٰ کے یہاں آدمی کیلئے قرب ونزدیکی کا باعث ہوتے ہیں، اس میں اسلام وایمان کے ساتھ ہی صدق کا بھی تذکرہ ہے کہ سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والی عورتیں یا جو اپنے کام میں بھی سچے، ارادے وعزم کو پورا کرنے میں بھی سچے ہوں، ایسے مردوں اور ایسی عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کر رکھا ہے۔

تیسری آیت ہے: ﴿فَلَوْ صَدَقُوْا اللّٰہَ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ﴾ شروع میں جو میں نے کہا تھا کہ عزم اور ارادے کی سچائی بھی مطلوب ہے اسی کو ثابت کرتے ہیں۔ یہ آیت سورۂ محمد کی ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ بعض لوگوں نے تمنا کی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر جہاد کا حکم نازل ہوا، تو ہم اس حکم پر پورے طریقے سے عمل کریں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک عہد اور عزم کیا۔ لیکن جب جہاد کا حکم نازل ہوا تو پیچھے ہٹ شروع کر دی اور کمزور ثابت ہونے لگے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچا

عہد کرتے اور جو عزم کیا تھا اس کے مطابق عمل کرتے؛ تو یہ ان کے لئے بڑی اچھائی اور خوبی کی بات ہوتی۔

کون صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا؟

بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل میں کچھ عہد کرتا ہے جیسا کہ ابھی مَیں نے مثال کے طور پر بتلایا تھا کہ تجارت میں اگر اتنا نفع ہوگا تو اتنی رقم خرچ کریں گے یا بہت سی مرتبہ آدمی بیمار ہوتا ہے تب دل میں یوں ارادہ کرتا ہے کہ بہت سے دوستوں نے کہا تھا کہ چلہ میں نکلو اب جب بیمار ہوئے اور دیکھا کہ حالت بہت خراب ہے تو دل میں ارادہ کرلیا کہ جب مَیں تندرست ہو جاؤں گا تو چلہ ضرور دوں گا، اور جب تندرست ہوئے تو نہیں گئے۔ یا اسی طرح اور کوئی کارِ خیر کے متعلق ہوتا ہے۔ تو جتنے بھی اس طرح کے ارادے آدمی اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بھی مطالبہ ہوگا۔ اگر چہ ظاہری طور پر اس کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جائے گا، یہ کوئی واجب نہیں ہے، لیکن ایک آدمی جب خالص دل سے ارادہ کرے تو اس کو پورا کرنا چاہیے، اس عزم میں سچا ہونا چاہیے ورنہ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے اور ایسا آدمی کبھی صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔

مقام صدیقیت کیسے حاصل ہو؟

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ الصِّدْقَ یَھْدِیْ اِلیٰ الْبِرِّ، وَاِنَّ الْبِرَّ یَھْدِیْ اِلیٰ الْجَنَّةِ، وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللهِ صِدِّیْقًا.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سچائی یقیناً آدمی کی رہنمائی کرتی ہے نکوکاری کی طرف۔ یعنی آدمی سچ کا اہتمام کرتا ہے، اپنے بولنے میں

بھی، اپنے کردار میں بھی، اور اپنے کام میں بھی؛ تو یہ سچ والی یہ صفت اس کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے۔ اور نیکی اس کو جنت کی طرف لے جاتی ہے، اور آدمی اپنے کردار میں، گفتار میں، اپنے عزم وارادے میں سچائی کا اہتمام کرتا ہے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدیق لکھا جاتا ہے۔ یعنی صدیق کے مقام پر پہنچتا ہے۔

سچائی کے معاملہ میں برتی جانے والی غفلت

آج کل ہمارے معاشرے میں سچائی کے معاملہ میں بہت زیادہ غفلت برتی جاتی ہے، حالانکہ سچائی کا خوب خوب اہتمام ہونا چاہیے۔ آدمی کو جھوٹ سے بہت دور رہنا چاہیے، جھوٹ کا شائبہ تک بھی نہیں ہونا چاہیے۔

ایک مرتبہ ایک عورت نے اپنے بچے کو بلانے کے لئے کہا: آ! مَیں تجھے کچھ دیتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے سوال کیا: کیا واقعی تمہارا کچھ دینے کا ارادہ تھا؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! میرے پاس ایک کھجور کا دانہ ہے، مَیں نے دل میں یہ نیت کی تھی کہ وہ آئے گا تو مَیں اس کو دوں گی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا (ابوداود، ۴/ ۲۹۸، الحدیث ۴۹۹۱) بہت سی مرتبہ ہم ایسی باتیں کرتے ہیں۔

حضرت مولانا بدرعالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سچائی کے معاملہ میں احتیاط

حضرت مولانا بدرعالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ان کے صاحبزادے مولانا آفتاب عالم صاحب مدظلہ نے ایک مرتبہ سنایا کہ حضرت کے پاس کسی ملنے والے کا خط آیا جس میں انھوں نے اپنی ماں کے انتقال کی خبر لکھی تھی۔ حضرت نے جواب لکھوایا کہ آپ کا خط ملا، آپ کی والدہ کے انتقال پر بہت دکھ ہوا۔ مولانا آفتاب عالم صاحب فرماتے ہیں کہ

پھر حضرت نے کہا: ذرا ٹھیر جاؤ، تھوڑی دیر آنکھیں بند کیں، اور اس کے بعد کہا: ٹھیک ہے۔ مَیں نے پوچھا: کیا بات تھی؟ فرمایا: مَیں نے لکھوایا تھا کہ آپ کی والدہ کے انتقال سے بہت دکھ ہوا۔ تو ایک تو ہے دکھ ہونا، اور ایک ہے بہت دکھ ہونا۔ مَیں نے یہ سوچا کہ کہیں یہ جھوٹ تو نہیں لکھوا رہا ہوں۔ مَیں نے اپنے دل کا جائزہ لیا کہ واقعۃً کیا ان کی والدہ کے انتقال پر میرے دل میں دکھ کی جو کیفیت پیدا ہوئی وہ اتنی ہے کہ جس کو مَیں یوں تعبیر کر سکتا ہوں کہ بہت دکھ ہوا؟ جب مَیں نے سوچا تو معلوم ہوا کہ صحیح ہے اس لئے اب کہا کہ ٹھیک ہے، اس کو باقی رہنے دو اور آگے چلو۔

دیکھئے! یہ حضرات کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ ذرہ برابر بھی کسی چیز میں جھوٹ کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ اور آج کل معاملات کے اندر، کردار میں، گفتار میں سچائی کا ذرا بھی اہتمام نہیں رہا ہے۔ آدمی اپنی زبان سے کوئی بات نکال دیتا ہے، اور اس کو اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ میری زبان سے ایسی جھوٹی چیز نکل رہی ہے۔ حالانکہ اگر وہ جھوٹ بولا ہے؛ تو کبھی بھی صدیقیت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا۔

﴿جنت تک پہنچنے کا آسان گُر﴾

اور ایک آدمی اگر جنت کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو کتنا آسان ہے۔ حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اس کا ایک گُر اور ایسا پوئنٹ (point) بتلا دیا کہ بہت آسانی سے وہ نکوکاری اور جنت کے راستے تک پہنچ سکتا ہے۔ صرف ایک چیز کو لازم پکڑ لے؛ اور وہ ہے ''سچائی''۔ اگر کوئی آدمی صرف سچائی کو لازم پکڑ لے تو ان شاء اللہ وہ اس کے نتیجہ میں نیکوکاری تک اور اس کے بعد جنت تک پہنچ جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو اونچے مقام سے نوازیں گے۔

گویا ایک ہی چیز کا اہتمام آدمی کو ساری خیر دلوا دے گا۔ رسّی کا ایک سرا تھا جو نبی کریم ﷺ نے پکڑوا دیا کہ آپ اس کو اختیار کرلیں گے تو آگے کے تمام راستے حل ہو جائیں گے۔

﴿اعمالِ صالحہ پر مداومت حاصل کرنے کی سہل تدبیر﴾

ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً یُّصْلِحْ لَکُمْ أَعْمَالَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور درست بات کہو، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کردیں گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کردیں گے۔

حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: دیکھو! آدمی بہت کوشش کرتا ہے کہ اعمال میں صلاح آجائے یعنی اعمال صالحہ پر مجھے مداومت اور پابندی حاصل ہوجائے، میرے گناہ معاف ہوجائیں؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا بہت آسان راستہ بتلا دیا ﴿قُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْداً﴾ درست بات کہو۔ گویا یہ ”سچائی“ دیکھنے میں تو بہت معمولی چیز ہے لیکن اگر کوئی آدمی اس کو اختیار کرلے گا، تو اس کے نتیجہ میں وہ آخر تک پہنچ جائے گا۔

﴿ہر گناہ سے بچنے کی تدبیر﴾

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی کے اندر کئی برائیاں تھیں، وہ جھوٹ بھی بولتا تھا، چوری بھی کرتا تھا، زنا بھی کرتا تھا۔ اس نے آکر نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! مَیں ایک ہی برائی چھوڑ سکتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! جھوٹ مت بولنا۔ اس کے بعد جب اس کا چوری کرنے کا ارادہ ہوا تو اس نے سوچا کہ مَیں نے تو وعدہ کیا ہے کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جب چوری کروں گا اور بعد میں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے چوری کی ہے؟ اور مَیں کہوں گا کہ ہاں! کی ہے، تو میرا ہاتھ کٹے گا۔ لہٰذا چوری سے باز آگیا۔ اسی

طریقہ سے جب زنا کا ارادہ کیا تو یہی خیال آیا کہ مَیں جب اس کا اقرار کروں گا تو شریعت میں اس کی جو سزا ہے وہ جاری کی جائے گی۔ اس سے بھی بچ گیا۔

بہر حال! یہ سچائی ہی ایک ایسی صفت ہے کہ اس کو آدمی اگر اختیار کر لے تو اس کے نتیجہ میں باقی تمام صفات آسانی کے ساتھ اس کو حاصل ہوسکتی ہیں۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّ الصِّدْقَ یَھْدِیْ اِلیٰ الْبِرِّ﴾ سچائی آدمی کو نیکی کی طرف لے جاتی ہے ﴿وَاِنَّ الْبِرَّیَھْدِیْ اِلیٰ الْجَنَّةِ﴾ اور نیکی آدمی کو جنت تک پہنچاتی ہے ﴿وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَصْدُقَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللہِ صِدِّیْقًا﴾ اور آدمی ہمیشہ سچائی کے اوپر قائم رہتا ہے، اپنی بات میں، اپنے کام میں اور ہر چیز میں؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدیق لکھا جاتا ہے۔

﴿وَاِنَّ الْکِذْبَ یَھْدِیْ اِلیٰ الْفُجُوْرِ﴾ اور جھوٹ آدمی کو برائی، بدی اور بدکاری کی طرف لے جاتا ہے ﴿وَاِنَّ الْفُجُوْرَیَھْدِیْ اِلیٰ النَّارِ﴾ اور بدکاری آدمی کو جہنم تک پہنچا دیتی ہے۔ اس لئے کہ آدمی اگر ایک جھوٹ بولتا ہے تو اس جھوٹ کو نبھانے کے لئے دوسرا جھوٹ بول دیتا ہے اور اس کو نبھانے کے لئے تیسرا جھوٹ بولے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ چیز بڑھتے بڑھتے آدمی کو جہنم تک لے جائے گی۔ ﴿وَاِنَّ الرَّجُلَ لَیَکْذِبَ حَتّٰی یُکْتَبَ عِنْدَاللہِ کَذَّابًا﴾ اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کذّاب یعنی بڑا جھوٹا لکھا جاتا ہے۔

آج کل اس بارے میں جو غفلت برتی جاتی ہے، اگر ہم اسی ایک صفت کا اہتمام کرلیں؛ تو نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے نتیجہ میں کہا جاسکتا ہے کہ ان شاء اللہ ہمارے لئے راستہ آسان ہوجائے گا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿مذبذب امور کے لئے ایک رہنما اصول﴾

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد محفوظ اور یاد رکھا ہے: ﴿دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلىٰ مَالَا يُرِيبُكَ﴾ (الترمذی ۴/ ۶۶۸، الحدیث ۲۵۱۸) جو چیز شک والی ہے اس کو چھوڑ کر ایسی چیز اختیار کرو جس میں شک نہ ہو۔ اس لئے کہ سچائی اطمینان اور سکونِ قلب کا نام ہے، اور جھوٹ شک اور تردد کا نام ہے۔

آدمی اگر صفتِ ایمان سے متصف ہے تو حلال وحرام کے معاملہ میں کبھی تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ﴿اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ﴾ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے ﴿وَبَيْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَاتٌ﴾ اور اس کے بیچ میں بعض چیزیں ایسی ہیں جس میں آدمی کو کچھ شبہ اور تردد رہتا ہے۔ اب جو ایسی بیچ بیچ کی چیزیں ہیں اس کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے؟ یعنی آدمی کیا انداز اختیار کرے۔ اس کو کرے یا چھوڑے؟ تو نبی کریم ﷺ نے اس کے متعلق ایک رہنما اصول ہم کو بتلا دیا کہ جہاں کہیں تردد ہو؛ اس کو چھوڑ کر ایسی شکل اختیار کیجئے جس میں کوئی تردد نہ ہو، بس! یہ ہے سچائی اختیار کرنے کا آسان طریقہ۔

اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَإِنَّ الصِّدْقَ طَمَانِيْنَةٌ﴾ ''سچائی'' اطمینانِ قلب کا نام ہے۔ اس لئے کہ آدمی جب کوئی غلط حرکت کرتا ہے تو چاہے ساری دنیا کے سامنے وہ اپنی اس غلط چیز کی تاویلیں کرتا رہے اور لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا رہے لیکن اس کا دل اس کو ہمیشہ ملامت کرتا رہتا ہے۔ دل کو کبھی اطمینان نہیں ہوتا، اور اپنے دل کی اسی ملامت سے بچنے کیلئے لوگوں کے سامنے مختلف تاویلیں کرتا ہے، لیکن دل میں تو بے چینی رہتی ہی ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ سچائی دل کی طمانینت اور سکون کا نام ہے کہ آدمی

کو اپنے جس معاملہ کے اندر دل میں اطمینان اور سکون حاصل ہو جائے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ سچائی پر قائم ہے ﴿وَالْکِذْبَ رِیْبَۃٌ﴾ اور جھوٹ تردد کا نام ہے۔

﴿ابوسفیان؛ ہرقل کے دربار میں﴾

نبی کریم ﷺ نے قیصرِ روم ہرقل کے نام دعوتِ اسلام دیتے ہوئے خط لکھا تھا، جب وہ خط اس کے پاس پہنچا تو اس خط کو کھول کر پڑھنے سے پہلے اس نے اس بات کا اہتمام کیا کہ جس شخصیت کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے وہ کون ہیں؟ ان کے متعلق معلومات حاصل کرے۔ اس زمانہ میں قیصرِ روم شام آیا ہوا تھا اور اِدھر حجاز و مکہ مکرمہ سے اہلِ عرب کے قافلے تجارت کی غرض سے شام جایا کرتے تھے۔ اس نے اپنے درباریوں سے پوچھا کہ یہاں عربوں کا کوئی قافلہ آیا ہوا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا: ان کو بلاؤ۔ ابوسفیان جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے ایک تجارتی قافلہ لے کر شام گئے تھے اور اس زمانہ میں مسلمانوں کے مقابل قریش کا جو گروہ تھا اس کے سردار یہی ابوسفیان تھے۔ ہرقل نے ان کو بلوایا اور پوچھا کہ تم لوگ وہیں کے رہنے والے ہو جن کی طرف سے یہ خط آیا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں۔ پوچھا کہ تم ان کے حالات سے واقف ہو؟ جواب دیا: ہاں۔ پھر اس نے کہا کہ تم میں ان کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان بولے: مَیں۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کے پردادا حضرت ہاشم ہیں اور ہاشم کے والد عبد مناف پر جا کر ابوسفیان کا نسب بھی مل جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ ہاشم کی اولاد میں سے ہیں اور ابوسفیان عبد شمس کی اولاد میں سے ہیں۔ بہرحال! اس وقت قافلہ والوں میں نبی کریم ﷺ کے سب سے زیادہ قریبی یہی تھے، ان کو آگے بٹھایا اور دوسرے ساتھیوں کو پیچھے بٹھایا اور کہا: مَیں ان سے کچھ سوالات

کروں گا، اگر یہ ان سوالات کا درست جواب دیں؛ تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر غلط جواب دیں؛ تو تم بتا دینا۔

﴿نبوی تعلیمات کا خلاصہ﴾

چنانچہ نبی کریم ﷺ کے حالات کی تحقیق کے سلسلہ میں اس وقت اس نے جو مختلف سوالات کئے تھے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا ﴿فَمَاذَا یَأْمُرُکُمْ﴾ یہ نبی تم کو کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟ تم کو کیا سکھلاتے ہیں؟ ابوسفیان فرماتے ہیں: مَیں نے جواب میں کہا: ﴿أُعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِکُوا بِهٖ شَیْئًا﴾ یہ نبی ہمیں جن چیزوں کی تعلیم اور تاکید کرتے ہیں اور جن چیزوں کا حکم کرتے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ایک اکیلے اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ ﴿وَاتْرُکُوا مَا یَقُوْلُ اٰبَآئُکُمْ﴾ دوسرے یہ کہ تمہارے باپ دادا زمانۂ جاہلیت کے اندر جن عقائد کے قائل تھے ان سب چیزوں کو چھوڑ دو ﴿وَیَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ﴾ اور یہ نبی ہم کو نماز کا اور سچائی کا حکم دیتے ہیں۔

بس! یہاں تو یہ حصہ اسی لئے لائے کہ نبی کریم ﷺ کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ ابوسفیان ہرقل قیصرِ روم کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس میں خاص طور سے اس وصف ''سچائی'' کو بیان کیا۔

﴿وَالْعَفَافِ وَالصِّلَةِ﴾ اور پاکدامنی یعنی اپنے آپ کو برائیوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچانے کا اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں کہ رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کرو۔

تو یہ ''سچائی'' وہ وصف تھا جو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے اندر بنیادی اہمیت کا حامل

تھا؛اسی لئے ابوسفیان نے اس کا تذکرہ کیا۔

﴿غیر اختیاری مراتب بھی صدق کی بدولت حاصل ہوسکتے ہیں﴾

عن سھل بن حنیف رضی اللہ عنہ وھو بدری ان النبی ﷺ قال: مَنْ سَأَلَ اللّٰہَ تَعَالیٰ الشَّھَادَۃَ بِصِدْقٍ؛بَلَّغَہُ اللّٰہُ مَنَازِلَ الشُّھَدَآءِ وَاِن مَّاتَ عَلیٰ فِرَاشِہٖ.

حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ جو بدری ہیں فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تبارک وتعالیٰ سے شہادت کا سوال کرے یعنی اللہ کے راستہ میں شہید ہونے کی تمنا کرے ﴿بِصِدْقٍ﴾ سچائی کے ساتھ۔

بس! یہاں اسی لئے لائے۔جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا کہ سچائی کا ایک تعلق عزم و ارادہ سے بھی ہے۔بہت سی مرتبہ ایک چیز کی تمنا ہوتی ہے لیکن دل ڈانواں ڈول (ડાંવાંડોળ) ہوتا ہے،تو وہ سچی تمنا نہیں ہوئی۔ایک آدمی شہادت کی تمنا کرے اور سچے دل سے کرے یعنی ایسی دلی تمنا کہ اگر اس کو اس وقت شہادت مل جائے تو اس پر بہت خوش ہو۔بعض مرتبہ لوگ اپنی زبان سے تو اظہار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ مقام نصیب فرمائے،لیکن کبھی کوئی موقعہ آجائے جس میں احتمال پیدا ہو کہ شہادت ملنے والی ہے؛ تو پھر پاؤں پیچھے ہٹاتے ہیں،یہ سچی تمنا کی علامت نہیں ہے۔اسی لئے خاص طور پر فرمایا کہ جو آدمی شہادت کی تمنا سچے دل سے کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو شہیدوں کے مقام پر پہنچا دیتے ہیں؛ چاہے وہ اپنے بستر پر مرا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو مقامات و مراتب غیر اختیاری طور پر آدمی کو حاصل ہوتے ہیں،ان کی بھی کوئی آدمی اگر سچے دل سے تمنا کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو وہ مقام اور مرتبہ دیا جاتا ہے۔اور شہادت حاصل ہونے میں بھی آدمی کے

اختیار کو دخل نہیں ہے، یہ ایک غیر اختیاری مرتبہ ہے۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا ایک سفر

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کے نبیوں میں سے ایک نبی نے جہاد کی روانگی کا ارادہ فرمایا تو اپنے ساتھ وہ جس جماعت اور لشکر کو لے جا رہے تھے، اس کو انھوں نے تاکید کی کہ دیکھو! ہمارے ساتھ ایک تو وہ آدمی نہیں آ سکتا، جس نے ابھی نئی شادی کی ہے؛ اور وہ اپنی بیوی کو رخصت کر کے لانا چاہتا ہے۔ ایسا آدمی ہمارے ساتھ جہاد میں نہ آوے۔ اس لئے کہ جب وہ آئے گا؛ تو اس کا جی ادھر اٹکا ہوا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب کوئی عمل شروع کرے تو اس عمل کو بھی سچائی کے ساتھ شروع کرنا چاہیے۔ یعنی اس طرح شروع کرے کہ اس کا جی اس عمل کے علاوہ اور اس عمل کے تقاضے کے خلاف کسی دوسری چیز میں ذرہ برابر بھی، چند پرسنٹ بھی اٹکا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ گویا صد فیصد وہ اسی کام میں لگا ہوا ہو؛ تب اس کام کا حق ادا ہوا سمجھا جائے گا۔ اسی لئے اللہ کے اس نبی نے ایسے آدمی کو اپنے ساتھ جہاد کے لئے آنے سے منع کر دیا کہ ابھی اس کا نکاح ہوا ہے اور بیوی رخصت ہو کر نہیں آئی، اس لئے اگر وہ آدمی جہاد کے لئے آ بھی جائے گا؛ تب بھی اس کا بدن تو ساتھ ہوگا لیکن اس کا جی ادھر لگا ہوا ہوگا۔ تو اپنے عمل کے اندر جس قسم کی سچائی ہونی چاہیے؛ وہ نہیں پائی جائے گی۔

﴿وَلَا أَحَدٌ بَنَىٰ بُيُوتًا لَمْ يَرْفَعْ سُقُوفَهَا﴾ دوسرا وہ آدمی جس نے مکان تعمیر کیا اور ابھی اس کی چھت نہیں ڈالی، ایسا آدمی بھی ہمارے ساتھ نہ آئے۔ اس لئے کہ اس کے مکان کی تعمیر کا سلسلہ چل رہا ہے، اب اگر وہ جائے گا تو اس کا جی یہاں اٹکا ہوا ہوگا۔ لہٰذا اس عمل

کے لئے جس قسم کی سچائی اور پختگی چاہیے؛ وہ نہیں پائی جائے گی۔

یہاں بھی وہی بات ہے کہ آدمی جو بھی عمل اللہ تعالیٰ کے لئے کرے، وہ اس انداز سے کرنا چاہیے کہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس عمل میں مشغول کردے۔ اس کا جی کسی دوسری چیز میں ذرہ برابر بھی اٹکا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔

﴿وَلَا أَحَدٌ اِشْتَرىٰ غَنماً أَوْ خَلِفَاتٍ وَهُوَ يَنتَظِرُ أُوْلَادَهَا﴾ تیسرا وہ آدمی جس نے کچھ بکریاں یا گابھن اونٹنیاں خریدی ہیں اور ابھی اونٹنیوں کے بچے پیدا نہیں ہوئے، بچے پیدا ہونے کا انتظار ہے، ایسے آدمی کو بھی انھوں نے منع کر دیا کہ ہمارے ساتھ نہ آئے۔

یہاں اس قصہ کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسے آدمی جب بھی اس عملِ جہاد میں شریک ہوں گے، تو اس عمل میں شرکت کے لئے جس قسم کا پکا سچا ارادہ ہونا چاہیے؛ اس میں وہ پورے اترے ہوئے نہیں ہوں گے۔ ان کے جی میں کچھ دوسری طرف توجہ ہوگی۔

﴿خیانت کی نحوست﴾

اس کے بعد وہ نبی جہاد کے واسطے جس بستی پر جانا تھا اس پر چڑھائی کرنے کیلئے تشریف لے گئے۔ اس بستی کے قریب ایسے وقت پہنچے کہ عصر کا وقت تھا، اور سورج غروب ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی، اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم یہ تھا کہ آج دن پورا ہو؛ اس سے پہلے پہلے اس بستی کو فتح کرلو۔ لہٰذا انھوں نے سورج کو خطاب کرتے ہوئے یوں کہا: ﴿اِنَّکَ مَأْمُوْرَةٌ وَأَنَا مَأْمُوْرٌ﴾ اے سورج! تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم ہے یعنی تجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ بتلائے ہوئے حساب کے مطابق اپنا چکر پورا کرے۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ نے ایک حکم دیا ہے کہ تیرے غروب ہونے سے پہلے پہلے

اس بستی کو فتح کرلوں۔اب چونکہ وقت تھوڑا رہ گیا تھا اور اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سورج اس بستی کے فتح ہونے سے پہلے غروب ہو جائے، اس لئے انھوں نے دعا کی: اے اللہ! اس سورج کو روک لے اور جب تک کہ بستی فتح نہ ہو جائے تب تک سورج غروب نہ ہونے پائے ﴿فَحُبِسَتْ حَتّٰی فَتَحَ اللّٰہُ عَلَیْہِ﴾ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمالی اور ان کے لئے سورج کو روک لیا؛ یہاں تک کہ وہ بستی فتح ہوئی۔اس کے بعد سورج غروب ہوا۔یہ حضرت یوشع بن نون کا قصہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جانشین بنے تھے۔

﴿فَجَمَعَ الْغَنَائِمَ، فَجَاءَتْ -یَعْنِی النَّارَ- لِتَأْکُلَھَا فَلَمْ تَطْعَمْھَا﴾ بستی کے فتح ہونے کے بعد انھوں نے مالِ غنیمت جمع کیا۔اور اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ جو مالِ غنیمت ہوتا تھا اس کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جتنا بھی مالِ غنیمت ہو؛ وہ سب ایک جگہ رکھ دیا جائے۔اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آگ آتی تھی، اور اس کو جلا دیتی تھی۔آگ کا آکر اس مالِ غنیمت کو جلا دینا؛ یہ اس بات کی علامت اور نشانی سمجھی جاتی تھی کہ ان کا جہاد اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے۔

چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا کہ وہ سارا مالِ غنیمت جمع کیا جو لوگوں کے پاس سے لیا گیا تھا، اب آگ آئی لیکن آگ نے اس کو نہیں جلایا۔گویا یہ اس بات کی نشانی تھی کہ ابھی کچھ کمی رہ گئی ہے، اور اس کمی کو پورا کرنے اور ختم کرنے کی ضرورت ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ عمل قبول نہیں ہوا۔

لہٰذا انھوں نے کہا کہ معلوم کرو کسی نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہے، کسی نے کوئی چیز چھپا رکھی ہے اور سارا مالِ غنیمت لا کر جمع نہیں کیا ہے، اس لئے یہ آگ آرہی ہے لیکن

مالِ غنیمت کو جلا نہیں رہی ہے۔ اس لئے معلوم ہونا چاہیے کہ کس نے یہ حرکت کی ہے؟ چونکہ ان کی قوم کی مختلف جماعتیں اور قبیلے تھے اس لئے انھوں نے کہا کہ ہر قبیلے کا سردار آ کر میرے ہاتھ سے ہاتھ ملائے۔ چنانچہ ہر قبیلے کا سردار آ کر ان کے ہاتھ سے ہاتھ ملانے لگا۔ جس قبیلے کے آدمیوں نے خیانت سے کام لیا تھا اس قبیلے کے سردار نے جب ہاتھ ملایا تو اس کا ہاتھ اس نبی کے ہاتھ سے چپک گیا۔ انھوں نے کہا: تمہارے قبیلے میں کچھ گڑ بڑ ہوئی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کہا: تمہارے قبیلے کا ہر آدمی آ کر مجھ سے ہاتھ ملائے۔ چنانچہ اب اس قبیلے کے ہر ہر آدمی نے ہاتھ ملانا شروع کیا تو دو یا تین آدمیوں کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چپک گیا۔ انہوں نے کہا: بس! اصل گڑ بڑ والے یہ ہیں۔ یہ دو یا تین آدمی پکڑے گئے۔ ان کو کہا کہ تم نے جو چیز چھپائی ہے وہ لاؤ۔ چنانچہ گائے کی سری کے برابر سونے کا ٹکڑا انھوں نے چھپا رکھا تھا، وہ لے آئے؛ اور مالِ غنیمت میں رکھا۔ وہ رکھنا تھا کہ آگ آئی اور اس کو جلا دیا۔ یہ اس بات کا اعلان و علامت تھی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا عمل قبول ہو گیا۔

امتِ محمدیہ کی ایک خصوصیت

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم سے پہلے جتنی امتیں تھیں ان میں سے کسی کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ نے مالِ غنیمت کو حلال قرار نہیں دیا تھا۔ بلکہ وہی شکل ہوتی تھی کہ جہاد پورا ہونے کے بعد غنیمت کا سب مال ایک ڈھیر کی شکل میں جمع کیا جاتا تھا، آگ آتی تھی، اور اس کو جلا دیا کرتی تھی، لوگوں کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے امتِ محمدیہ پر یہ فضل فرمایا کہ اب امتِ محمدیہ کے لئے مالِ غنیمت کو استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ گویا نبی کریم ﷺ کو جن خصوصیات سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے نوازا تھا ان

خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی تھی ﴿أُحِلَّتْ لَنَا الْغَنَائِم﴾ (الترمذی ۴/۱۲۳، الحدیث ۱۵۵۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا گیا۔

﴿لین دین میں سچائی؛ برکت لانے والی ہے﴾

عن أبی خالد حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: اَلْبَیِّعَانِ بِالْخَیَارِ مَالَمْ یَتفرَّقَا

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب دو شخص آپس میں خرید و فروخت کا معاملہ کرتے ہیں تو جب تک انھوں نے اپنے معاملہ کو مکمل نہیں کیا۔ یعنی ایک نے کہا کہ مَیں نے یہ چیز آپ کو بیچی۔ جب تک دوسرے نے جواب نہیں دیا تب تک اس کہنے والے کو بھی اپنی بات میں اختیار رہتا ہے۔ جواب دینے والے کو تو اختیار رہتا ہی ہے۔ مثلاً مَیں نے آپ کو کہا کہ یہ کتاب مَیں نے آپ کو پانچ روپے میں بیچی۔ اب آپ کو تو اختیار رہے ہی کہ آپ چاہیں تو یوں کہیں کہ مَیں نے خریدی اور چاہیں تو یوں کہیں کہ مجھے تو نہیں لینی۔ لیکن جب تک آپ نے جواب نہیں دیا آپ کے جواب دینے سے پہلے پہلے مجھے بھی اختیار ہے۔ یعنی آپ نے ابھی منظوری نہیں دی، اس سے پہلے مَیں کہہ دوں کہ اب مجھے نہیں بیچنی، تو مَیں یہ کہہ سکتا ہوں لیکن میرے قولِ اول کے بعد اگر آپ نے منظوری دے دی؛ تو اب مَیں اپنی بات کو واپس نہیں لے سکتا۔

﴿فَإِنْ صَدَقَا﴾ اب اگر یہ خرید و فروخت کرنے والے دونوں سچائی سے کام لیتے ہیں ﴿وَبَیَّنَا﴾ اور اپنے اس خرید و فروخت میں کوئی عیب کی چیز ہے تو اس کو صاف صاف بتلا دیتے ہیں، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿بُورِکَ لَهُمَا فِیْ بَیْعِهِمَا﴾ ان کے اس سودے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے برکت ڈال دی جاتی ہے۔ گویا آدمی جب سودے کے

اندر سچائی سے کام لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں برکت ہوتی ہے۔

﴿وَإِنْ كَتَمَا وَكَذَبَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا﴾ اور اگر انھوں نے عیب کو چھپایا اور جھوٹ سے کام لیا؛ تو ان کے سودے کی برکت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اٹھالی جاتی ہے، یعنی اس میں کوئی خیر نہیں رہتی۔

﴿راز کی بات﴾

دراصل تجارت میں نفع تجارت کی کثرت سے ہوتا ہے۔ یعنی جتنی آپ کی تجارت بڑھے گی، اس میں جتنا فروغ ہوگا، جتنی ترقی ہوگی اتنا زیادہ منافعہ ہوگا۔ اور جب آپ اپنی تجارت کے اندر سچائی سے کام لیں گے، لوگوں کے ساتھ معاملہ ہمیشہ سچائی کا کریں گے اور کبھی ان کے ساتھ دھوکہ بازی نہیں کریں گے، تو آپ کی یہ سچائی اور دھوکہ بازی نہ کرنے کی وجہ سے لوگوں میں آپ کی ساکھ قائم ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کثرت سے آپ کے ساتھ معاملہ کریں گے، آپ ہی کی دوکان پر آکر خریدیں گے، آپ ہی سے معاملہ کریں گے کہ اس کے یہاں تو کبھی کوئی دھوکہ بازی نہیں ہوتی، جو بات ہوتی ہے وہ ٹھیک ٹھاک ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی تجارت کو خوب فروغ ملے گا، اور تجارت کا مقصد ''برکت اور منافعہ'' ہے؛ وہ حاصل ہوگا۔

اور اگر آدمی جھوٹ سے کام لیتا ہے اور تجارت میں دھوکہ بازی کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ وقتی طور پر اس دھوکہ بازی اور جھوٹ کی وجہ سے کچھ دو چار پیسے زیادہ مل تو جائیں گے، لیکن یہ حال چھپنے والا نہیں ہے۔ بعد میں جا کر لوگوں کے سامنے جب یہ بات آئے گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ کبھی اس کے ساتھ سودے بازی نہیں کریں گے، اس کی دوکان پر نہیں آئیں

گے، اوراس کے ساتھ تجارت نہیں کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی تجارت ٹوٹ جائے گی، اور تجارت کا جو مقصد ہے؛ وہ حاصل نہیں ہوگا۔ اور وہ آدمی گھاٹے اور نقصان میں رہے گا۔

﴿خلاصۂ کلام﴾

گویا جو آدمی سچائی کو اپنائے گا، چاہے سچائی کو اپنانے کے نتیجہ میں بظاہر کتنا ہی نقصان نظر کیوں نہ آتا ہو؛ لیکن یہ نقصان ظاہری ہے۔ یہی نقصان اس کو آگے پروان چڑھائے گا۔ لوگوں کو جب معلوم ہوگا کہ اس نے اپنی بات کو نبھانے کے واسطے اتنے لاکھوں کا نقصان برداشت کیا؛ تو یہی چیز اچانک اس کی تجارت کے لئے فروغ اور ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اور اس کے بالمقابل اگر وہ جھوٹ بول کر کچھ کرلے گا، تو وقتی فائدہ ضرور نظر آئے گا لیکن یہی چیز اس کے لئے ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو تاجر اپنے سودے اور تجارت کے اندر سچائی کو لازم پکڑے گا؛ تو اس کے لئے وہ خیر و برکت کا سبب ہے۔

﴿ہم نے بھی کسی کے ساتھ لین دین کیا ہے﴾

یہاں پر علماء لکھتے ہیں کہ دیکھو! ہم جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں، ہم نے بھی ایک تجارت کی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ﴾ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ان کے جان و مال کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔ گویا ہم نے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تجارت کی ہے، اب ہمیں بھی اپنی اس تجارت کے اندر سچائی سے کام لینا چاہیے کہ اپنی جان و مال کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے راستہ میں لگانے میں کوتاہی اور کمی نہیں کرنا چاہیے۔ گویا اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے آدمی اپنے آپ کو وقف کردے

تو پھر اس تجارت میں- جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کی ہے- خیر و برکت ہوگی۔اور اگر ایسا نہیں کرتا؛ تو پھر ظاہر ہے کہ وہ آدمی گھاٹے میں رہے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے

مراقبہ

مجلس ﴿۱﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿مراقبہ ا﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا

امابعد. فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

وقال تعالیٰ: اَلَّذِىْ يَرَاكَ حِيْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَكَ فِى السَّاجِدِيْنَ. (الشعراء. ۲۱۹، ۲۲۰)

وقال تعالیٰ: وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ. (الحدید. ۴)

وقال تعالیٰ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ. (آل عمران. ۶)

وقال تعالیٰ: اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ. (الفجر. ۱۴)

وقال تعالیٰ: يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ. (غافر. ۱۹)

﴿مراقبہ کا معنٰی﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے مراقبہ کا باب قائم کیا ہے ﴿راقب یراقب مراقبۃً﴾ کا معنٰی ہے نگرانی کرنا، کسی کا خیال رکھنا، کسی کی نقل وحرکت کو دیکھتے رہنا اور اس کی حفاظت کرنا، اس کو نوٹ کرنا۔ اگر ایک معشوق کے دو عاشق ہوں تو ان کو بھی اردو زبان میں ''رقیب'' کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کی نگرانی کرتا ہے، ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ کیا کر رہا ہے؟ شاعر کہتا ہے:۔

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعن اقرباء ✿ تو ہی اگر نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے بھی لفظِ رقیب صفت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی تمام نقل وحرکت کو، ان کے ہر قول وفعل کو دیکھ رہے ہیں اور اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے اقوال افعال، حرکات وسکنات کی نگرانی کیلئے کچھ فرشتے مقرر کئے گئے ہیں؛ ان کے لئے بھی قرآنِ پاک میں لفظِ رقیب استعمال کیا گیا ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ بندہ جو بھی بات کرتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نگران مقرر کر دیا گیا ہے؛ جو ہر چیز کی نگرانی کرتا ہے۔ تو یہاں مراقبہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس بات کا تصور کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ میرے ہر قول وفعل کو، میری ہر نقل و حرکت کو اور میری ہر چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ گویا میں اللہ تعالیٰ کی نگرانی میں اور اس کی نگاہوں کے سامنے ہوں۔ ہر وقت ہر لمحہ چوبیس گھنٹے آدمی اپنے آپ کو ایسا محسوس کرے اور یہ استحضار ہو۔ اسی استحضار کو "مراقبہ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث میں یہ لفظ عام طور پر اسی معنٰی میں استعمال ہوتا ہے۔

﴿رقیب کے تین اوصاف﴾

علماء نے لکھا ہے کہ مراقبہ کما حقہٗ اور حقیقی معنٰی میں اسی وقت ہوسکتا ہے کہ جب اس نگرانی کرنے والے میں تین اوصاف ہوں۔

(۱) ایک تو اس کو نگرانی اور حفاظت کا استحقاق حاصل ہو یعنی وہ اس کی نگرانی کا حق رکھتا ہو۔

(۲) دوسرا اس نگرانی کرنے والے کا علم ایسا کامل، محیط اور گھیرے ہوئے ہو کہ جس کی وہ نگرانی کر رہا ہے اس کی کوئی حرکت، اس کا کوئی قول، اس کا کوئی فعل اس نگرانی کرنے والے کی نگاہ

اورعلم سے چھپ نہ سکے؛ چاہے وہ کتنے ہی پردوں میں اور کتنے ہی چھپ چھپا کرکوئی حرکت کرنا چاہے۔

(۳) تیسرا یہ کہ جس کی وہ نگرانی کررہا ہے اس پر کامل طور پر اختیار اور قدرت حاصل ہو۔

اب اس نگرانی کی صورت میں دو ہی باتیں سامنے آسکتی ہیں، جس کی نگرانی کی جارہی ہے اس کی طرف سے یا تو کسی اچھے فعل کا صدور ہورہا ہے اور نیکی وجود میں آرہی ہے، یا اس سے کسی برے فعل کا صدور ہورہا ہے اور گناہ کا کام وجود میں آتا ہے۔ تو اس نگرانی کرنے والے کو اتنی قدرت اور ایسا اختیار حاصل ہے کہ وہ اس نیکی کرنے والے کو اس کی نیکی کا اچھا بدلہ، اور گناہ کرنے والے کو اس گناہ کی سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو؛ تب ہی یہ نگرانی پورے طور پر ہوسکتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں یہ تینوں اوصاف بکمالہ موجود ہیں جو مراقبہ کے لئے ایک لازمی چیز سمجھے جاتے ہیں کہ جب تک یہ اوصاف نہ ہوں مراقبہ کامل نہیں ہو پاتا۔ انسان کیا؛ بلکہ ساری کائنات کا پیدا کرنے والا خالق اور مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے، اس لئے بندے پر اس کو ہر طرح کا استحقاق حاصل ہے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم بھی محیط ہے، ہر وہ چیز جو دنیا میں وجود میں آرہی ہے، چاہے اندھیرے میں کسی درخت کا کوئی پتہ ٹوٹ کر گرتا ہے؛ تو وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کا علم بھی بڑا محیط اور تام ہے۔

اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت اور اختیار پر مؤمن کا ایمان ویقین ہے کہ اس کو ہر طرح کی قدرت واختیار حاصل ہے۔ یہ تینوں اوصاف مراقبہ کے مکمل ہونے

کے لئے لازمی سمجھے جاتے ہیں؛ جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں پورے طور پر موجود ہیں لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو نگرانی اور مراقبہ ہوگا؛ وہ کامل طور پر ہوگا۔

﴿مراقبہ کے تعلق سے آیاتِ قرآنی﴾

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ان آیات کو پیش کرتے ہیں جن سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہونے والی نگرانی کا پتہ چلتا ہے، اگرچہ ایسی آیتیں تو کئی ہیں لیکن انھوں نے چند آیتوں کو بطورِ نمونہ پیش کیا ہے: ﴿اَلَّذِیْ یَرَاکَ حِیْنَ تَقُوْمُ وَتَقَلُّبَکَ فِی السَّاجِدِیْنَ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جب آپ نماز کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو دیکھتا ہے، اور نمازیوں کے درمیان آپ کی جو نقل وحرکت ہوتی ہے، آپ جو رکوع وسجود کرتے ہیں؛ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کا علم آپ کی ہر نقل وحرکت کو محیط ہے۔

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ﴾ تم جہاں کہیں بھی ہو؛ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے ساتھ ہے، وہ ہر جگہ حاضر وناظر اور موجود ہے۔ وہ تمہاری ہر چیز کو دیکھ رہا ہے اور تمہاری ہر نقل و حرکت سے واقف ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخْفیٰ عَلَیْہِ شَیْئٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ زمین اور آسمان میں کوئی چیز بھی اللہ تبارک وتعالیٰ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ یعنی مراقبہ کے مکمل ہونے کے لئے جس علمِ تام کی ضرورت تھی؛ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات میں پایا جاتا ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہاری گھات میں لگا ہوا ہے۔ ''رصد'' گھات لگانے کو کہتے ہیں یعنی کسی کی ایسی نگرانی کرنا کہ اس کے بعد اس کے برے فعل پر پا

اس کی طرف سے جو زیادتی اور کوتاہی ہو رہی ہے؛ اس پر سزا بھی دے۔ اسی کو تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ گھات میں لگے ہوئے ہیں یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو تمہاری ہر نقل وحرکت پر بدلہ دینے اور سزا دینے کی پوری قدرت اور اختیار حاصل ہے۔

﴿نگاہِ انسانی؛ خدائی نگرانی میں﴾

﴿یَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْیُنِ وَمَاتُخْفِی الصُّدُوْر﴾ آدمی کی آنکھیں جن چیزوں میں خیانت کرتی ہیں یعنی ایسی چیز جس کے دیکھنے کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے، مگر آدمی اس کو دیکھتا ہے؛ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے بھی واقف ہے۔ آدمی کی یہ ایک ایسی حرکت ہے کہ عام طور پر اس سے دوسرے لوگ واقف نہیں ہوسکتے، بڑے سے بڑے مجمع میں بیٹھ کر بھی آدمی یہ کام بہت چوری سے کرسکتا ہے، کسی پاس بیٹھنے والے کو بھی پتہ نہ چلے؛ لیکن اللہ تعالیٰ انسان کی نگاہ کو بھی اپنی نگرانی میں رکھے ہوئے ہیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ آدمی اپنے دل میں جو خیالات سوچتا ہے اس سے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ واقف ہیں۔

﴿حدیثِ جبرئیل﴾

اس سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ والی وہ روایت پیش کی جو پہلے بھی گذر چکی ہے کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آپ کی مجلسِ مبارک میں حاضر تھے کہ ایک آدمی آیا، جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید تھے، اور اس کے بال بہت زیادہ سیاہ تھے، اور اس کے اوپر سفر کے بھی کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے، اور ہم میں سے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے حالات بڑے متضاد تھے۔ اس لئے کہ اس کے کپڑے بڑے سفید اور اس کے اوپر سفر کا کوئی اثر بھی نہیں، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ

کوئی مقامی آدمی ہے، حالانکہ مقامی ہوتا تو لوگ اس کو پہچانتے، لیکن ہم میں سے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ وہ آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس آکر اتنا قریب ہوکر بیٹھا کہ اس نے اپنے گھٹنوں کو نبی کریم ﷺ کے گھٹنہ مبارک کے ساتھ ملادیا اور اپنے ہاتھ نبی کریم ﷺ کی رانوں کے اوپر رکھ دیئے۔

﴿اسلام کیا ہے؟﴾

پھر اس نے سوال کیا: ﴿یَامُحَمّدُ! أَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ؟﴾ اے محمد! مجھے اسلام کے متعلق بتلائیے؟ اس لئے کہ دین کے دو اجزاء ہیں، عقائد اور اعمال۔ عقائد کا تعلق دل سے ہے؛ اس کو ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اعمال کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہے؛ جس کو اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ لفظِ اسلام پورے دین کے لئے بھی بولا جاتا ہے لیکن اس روایت میں انھوں نے جو سوال کیا تھا وہ اعضاء و جوارح کے اعمال کے متعلق ہی کیا تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْھَدَانْ لَّااِلٰـہَ اِلَّااللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَتُقِیْمَ الصَّلٰوۃَوَتُؤْتِیَ الزَّکٰوۃَوَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَیْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا﴾ اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ توحید و رسالت کا اقرار کرنا؛ یہ زبان کا عمل ہے۔ اور نماز کو قائم کرو اور زکوٰۃ کو ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو؛ اگر وہاں تک پہنچنے کی تمہارے اندر طاقت ہو۔ یعنی زاد و راحلہ، سواری و توشہ اور ساتھ ہی ساتھ خرچہ بھی موجود ہے؛ تو حج کرنا بھی ضروری قرار دیا گیا۔ یہ پانچ بنیادی چیزیں اعمال کے متعلق ذکر کی گئیں۔ اس آدمی نے کہا: ﴿صَدَقْتَ﴾ آپ نے ٹھیک جواب دیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿فَعَجِبْنَالَہٗ یَسْأَلُہٗ وَیُصَدِّقُہٗ﴾ ہمیں اُس آدمی کی اِس روش اور انداز پر بڑا تعجب ہوا کہ

سوال بھی کرتا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔ اس لئے کہ سوال کرنا تو اس بات کی علامت سمجھا جاتا ہے کہ آدمی جانتا نہیں ہے۔ اور تصدیق کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ واقف ہے، اسی لئے تو تصدیق کر رہا ہے۔

﴿ایمان کیا ہے؟﴾

﴿قَالَ فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ﴾ اس کے بعد اس آنے والے نے نبی کریم ﷺ سے دوسرا سوال ایمان کے متعلق کیا کہ آپ ایمان کی حقیقت بتلائیے۔ گویا جو چیزیں عقائد کے متعلق ہیں؛ وہ پوچھیں ﴿قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلَآئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَیْرِہٖ وَشَرِّہٖ﴾ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ایک تو اللہ کے اوپر ایمان ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق جو چیزیں ہیں ان پر تمہارا ایمان ہو، اور اللہ تعالیٰ کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر جو اس نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے واسطے اپنے نبیوں پر اتاری ہیں، اور اس کے رسولوں پر، اور قیامت کے دن پر، اور تقدیر پر ایمان ہونا چاہیے: چاہے وہ بھلی ہو یا بری۔ یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں بندے کو پیش آتی ہیں، چاہے وہ اچھائی اور نعمت کی شکل میں ہوں، یا برائی اور مصیبت کی شکل میں ہوں؛ اس پر ایمان ہونا چاہیے۔ یہ ایمان کی حقیقت بتلائی ﴿قَالَ صَدَقْتَ﴾ اس نے پھر یہی کہا کہ آپ نے ٹھیک جواب دیا۔

﴿احسان کیا ہے؟﴾

﴿قَالَ فَأَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ﴾ اس آدمی نے تیسرا سوال نبی کریم ﷺ سے احسان کے متعلق کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ﴿قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَأَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ بات تمہارے اندر پیدا کرنا مشکل ہو، اور ابھی یہ چیز تمہیں حاصل نہیں،

تو کم سے کم درجہ جو ہر ایک مؤمن کو حاصل ہے اور ہر مؤمن کا ایمان و یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ تو مجھے دیکھ ہی رہے ہیں۔ اسی کو مراقبہ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ بندہ ہر وقت یہ سمجھے کہ مَیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی نگرانی میں ہوں۔ جو آدمی اس تصور کو ہمیشہ قائم رکھے گا؛ کبھی بھی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔

قیامت کب آئے گی؟

پھر اس آدمی نے سوال کیا: ﴿فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ﴾ قیامت کے متعلق مجھے بتلائیے کہ کب آنے والی ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ﴾ جس سے سوال کیا جارہا ہے (یعنی مَیں) سوال کرنے والے (یعنی آپ) سے زیادہ نہیں جانتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح تمہیں معلوم نہیں کہ قیامت کب آئے گی، اسی طرح مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔

پھر اس نے کہا: قیامت کی کچھ نشانیاں ہوں تو اس کے متعلق اطلاع دیجیے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿اَنْ تَلِدَ الْأَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرىٰ الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَآءَ الشَّآءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ﴾ ایک تو یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ باندی اپنی آقانی کو جنم دے رہی ہے یعنی ماں نے جس کو جنم دیا ہے، آگے جاکر وہی بچی اس ماں پر حکومت چلاوے اور اس پر مالک بن کر بیٹھ جاوے اور تم دیکھو ایسے لوگوں کو جو برہنہ ہیں کہ جسم پر لباس نہیں اور پیروں میں جوتے نہیں ہیں اور ایسے فقیر جو بکریوں کے چرانے والے ہیں وہ عمارتوں کے بنانے میں آپس میں ایک دوسرے کا مقابلہ کریں۔ یعنی ایسے لوگ جو معاشرے میں نچلے درجے کے سمجھے جاتے ہیں ان کے پاس دولت کی ریل پیل ایسی ہوجائے کہ اس دولت کے نتیجہ میں وہ عمارتوں کی تعمیر میں آپس میں ایک دوسرے سے ریس کرنے لگیں۔

اسی لئے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جو نچلے درجے کے لوگ ہیں وہ اوپر پہنچ جائیں گے اور جو شرفا اور اونچے خاندان کے لوگ تھے وہ نیچے بن جائیں گے، اوران پر گھٹیا درجے والوں کی حکومت ہوگی۔

﴿سوال علم کا دروازہ﴾

﴿ثُمَّ انْطَلَقَ﴾ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ وہ آدمی یہ سوال کر کے چلا گیا ﴿فَلَبِثْتُ مَلِيًّا﴾ کچھ زمانہ بعد نبی کریم ﷺ نے مجھ سے پوچھا: ﴿أَ تَدْرِیْ مَنِ السَّائِلُ؟﴾ تمہیں معلوم ہے یہ سوال کرنے والے کون تھے؟ مَیں نے عرض کیا: ﴿اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمہارے پاس آئے تھے تا کہ تم کو دین کے متعلق کچھ تعلیم دیں۔ سوالات کے ذریعہ انھوں نے دین کا خلاصہ امت کے سامنے پیش کر دیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو انسانی شکل میں بھیجا تھا۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ عام طور پر اسلامی احکام اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں انسان کی ہدایت کے لئے بھیجی گئی تھیں؛ وہ سب مکمل ہوگئی تھیں، اب گویا دین کا خلاصہ چند الفاظ میں لوگوں کو بتلانا مقصود تھا، تو اس قسم کا سوال پیش کرنے کیلئے اور نبی کریم ﷺ کی زبان سے دین کی بنیادی چیزیں لوگوں کو معلوم ہوجائیں؛ اس لئے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا گیا تھا۔ گویا سوال بھی کبھی آدمی کیلئے علم کے دروازے کھولتا ہے، اسی لئے سوال کو آدھا علم قرار دیا گیا ہے۔

﴿دوسری روایت﴾

عن أبی ذر جندب بن جنادة وأبی عبدالرحمن معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ ﷺ قال: اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ.

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہاں کہیں بھی تم رہو؛ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ گویا اللہ تعالیٰ کا ڈر اور اس کے سامنے جواب دہی کا استحضار تمہارے اندر رہنا چاہیے، یہ احساس ہر وقت رہے کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کو جواب دینا ہے؛ تب ہی تو ڈر رہے گا۔

اور برائی کے بعد نیکی کرو، وہ نیکی اس برائی کو مٹا دے گی۔ ویسے تو ایک بندہ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب بالکل نہ کرے لیکن چونکہ آدمی کی سرشت اور طبیعت میں ایسا مادہ رکھا گیا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی صادر ہو ہی جاتی ہے یا برائی وجود میں آ ہی جاتی ہے، تو اگرچہ اس کا ارادہ تو نہیں تھا، نادانستہ طور پر، بشریت کے تقاضے کی بناء پر یا نفس کے تقاضے سے مغلوب ہو کر اگر کسی برائی کا صدور ہو گیا، کوئی گناہ کا کام ہو گیا تو نبی کریم ﷺ اس کی تلافی کی تدبیر بتلاتے ہیں کہ آدمی اس کے بعد کوئی نیکی کا کام کرلے، تاکہ وہ نیکی اس برائی کو مٹا دے۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ﴾ نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔ لہٰذا اگر کسی سے کوئی گناہ کا صدور ہو جائے تو اس گناہ سے توبہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے کہ نیکی کا کوئی کام کرلے، تاکہ اس کی تلافی ہو جائے۔ جیسے کبھی ہوتا ہے کہ کسی چھوٹے بچے کو ہم نے کوئی تکلیف پہنچا دی، اس کی پٹائی کر دی، تو جہاں اس کی تسلی کرتے ہیں، وہیں ساتھ ہی ساتھ چاکلیٹ بھی دے دیتے ہیں؛ تاکہ اس کی تلافی ہو جائے۔ اسی طرح آدمی کو عمل کرنا چاہیے۔

﴿ گناہ پر پینلٹی ﴾

احادیث میں بہت سے مواقع پر ایسا بتلایا گیا ہے۔ مثلاً زمانۂ جاہلیت میں جوے کا

رواج عام تھا، اس لئے عادی ہونے کی وجہ سے جہاں کچھ فراغت اور فرصت ملی، وہ ایک دوسرے کو دعوت دیتے تھے کہ آؤ! ذرا ایک دو داؤ کھیل لیں۔ پھر جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جوے کی حرمت آئی اور منع کیا گیا تو اس پرانی عادت کی وجہ سے آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکل جاتا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی کسی کو یہ کہہ دے کہ آؤ! ذرا ہم جوا کھیل لیں، تو اس کی تلافی یہ ہے کہ وہ صدقہ کرے۔ یعنی جب جیب میں ذرا پیسے ہوتے ہیں؛ تب ہی دل میں یہ امنگ اٹھتی ہے کہ جوا کھیلا جائے۔ اس لئے جیب میں پیسے ہونے کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ خیال آیا، اگر چہ بھول سے تمہاری زبان سے یہ نکل گیا لیکن اس کی تلافی یہ ہے کہ وہ پیسے جس کے متعلق تم نے یہ سوچا تھا اور جس کے ہونے کی وجہ سے تمہارے دل میں یہ تقاضہ پیدا ہوا تھا کہ جوا کھیلا جائے؛ ان پیسوں کو ہی اللہ کے راستے میں صدقہ کر دو

آدمی کے واسطے یہ ایک بہت عمدہ طریقہ ہے کہ جہاں کبھی کسی گناہ کا ارتکاب ہو گیا ہو، تو اس گناہ سے توبہ کا اہتمام کرنے کے ساتھ ساتھ کسی نیکی کا بھی اہتمام کرلے۔ ویسے توبہ خود بھی ایک نیکی ہی ہے اور وہ بھی گناہ کو مٹانے کا کام کرتی ہے لیکن اس کے بعد مزید الگ سے نیکی کر لی جائے؛ تو اور زیادہ اچھا ہے۔

پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آیئے یعنی لوگوں کے ساتھ تمہارا معاملہ، تمہارا سلوک اور برتاؤ بھلائی کا ہونا چاہیے۔ کسی کے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہ آیئے۔

﴿پیغمبرِ عالم ﷺ، ایک نونہال، اور بنیادی عقائد﴾

عن ابن عباس قال: کنتُ خَلفَ النَّبِیِّ ﷺ یوماً، فَقَالَ: یاغُلام! اِنِّی أُعَلِّمُکَ کَلِمَاتٍ، اِحفَظِ اللہَ یَحفَظْکَ، اِحفَظِ اللہَ تَجِدْہُ تُجَاھَکَ، وَاِذَا سَأَلْتَ فَاسْئَلِ اللہَ،

وَاِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ. وَاعْلَمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِاجْتَمَعَتْ عَلٰی اَن یَّنْفَعُوْکَ بِشَیْیءٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَیْیءٍ قَدْ کَتَبَھَا اللّٰہُ لَکَ، وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَن یَّضُرُّوْکَ بِشَیْیءٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْیءٍ قَدْ کَتَبَھَا اللّٰہُ عَلَیْکَ. رُفِعَتِ الْاَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ.

وفی روایۃ غیر الترمذی: اِحْفَظِ اللّٰہَ تَجِدْہُ اَمَامَکَ، تَعَرَّفْ اِلَی اللّٰہِ فِی الرَّخَاءِ یَعْرِفْکَ فِی الشِّدَّۃِ، وَاعْلَمْ اَنَّمَا اَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَکَ، وَمَا اَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ. وَاعْلَمْ اِنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَاِنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْکَرْبِ، فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا (وہ چھوٹے بچے تھے، زیادہ عمر نہیں تھی) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے بچے! مَیں تمہیں چند باتیں سکھلاتا ہوں۔

دیکھئے! یہ باتیں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو سکھلائی جارہی ہیں جو اس وقت بچپن ہی کے دور سے گزر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی چیزوں کا بچوں کو عادی بنانا چاہیے، اور لوگوں کو چاہیے کہ بچوں کو ایسی نصیحتیں کرتے رہیں؛ تاکہ ان کی ذہن سازی ہو شروع ہی سے وہ نیکی کے عادی بنیں اور اچھے اخلاق کی طرف ان کی توجہ ہو۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جن چیزوں کی تاکید فرمائی ان میں سے یہ بھی ہے ﴿اِحْفَظِ اللّٰہَ یَحْفَظْکَ﴾ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کا خیال رکھو یعنی اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے رہو، اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارا خیال رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری کوئی بھی ضرورت ہوگی تو باری تعالیٰ پوری فرمائیں گے۔ ویسے تو آدمی کی ضرورتیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہی پوری کرتے ہیں لیکن اگر آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے حقوق کا اہتمام کرے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیا جاتا ہے۔

﴿اِحْـفَـظِ اللّٰہَ تَـجِدْہُ تُجَاھَکَ﴾ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا لحاظ کرو اور اس کی نگرانی کا خیال رکھو؛ تم اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔ یعنی یہ تصور قائم رہنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اس تصور کے قائم رہنے کی وجہ سے کبھی کسی گناہ پر جرأت نہیں ہوگی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی حکم کو توڑنے کی نوبت نہیں آئے گی۔

﴿وَاِذَا سَـأَلْـتَ فَـاسْـئَلِ اللّٰہَ﴾ اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو، کوئی سوال کرنا ہو؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوال کرو، وہی دینے والے ہیں۔ لوگ بھی جو دیتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے۔ اسی میں سے دیتے ہیں، وہ ان کی اپنی ملک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں جذبہ ڈالا اور ان کو ذریعہ بنایا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سے سوال کرنا چاہیے۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں: تم سوال کرو تو اللہ تبارک وتعالیٰ سے سوال کرو۔

دیکھو! یہ بنیادی چیزیں ہیں اور نبی کریم ﷺ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو تعلیم کے طور پر ارشاد فرما رہے ہیں جو اس وقت بچے تھے۔ معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے بچوں کے دلوں میں یہ چیز ڈالنی چاہیے، ان کو اس بات کا عادی بنانا چاہیے، اور ان کو اس چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہیے

﴿وَاِذَا اسْتَعَـنْـتَ فَـاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ﴾ اور اگر کسی مصیبت میں اور ضرورت کے موقعہ پر مدد چاہنی ہو؛ تو کسی اور سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے چاہو۔

﴿وَاعْـلَـمْ اَنَّ الْاُمَّۃَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلیٰ اَنْ یَّنْفَعُوْکَ بِشَيْئٍ لَمْ یَنْفَعُوْکَ اِلَّا بِشَيْئٍ قَـدْ کَتَبَھَا اللّٰہُ لَکَ﴾ اور اس بات کا یقین رکھو کہ سارے لوگ اگر اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تم کو کسی چیز کے ذریعہ سے فائدہ پہنچائیں، تو وہ اتنا ہی فائدہ پہنچا سکیں گے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہاری تقدیر میں لکھ دیا ہے، اس سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔

﴿وَاِنِ اجْتَمَعُوْا عَلٰی اَنْ یَّضُرُّوْکَ بِشَیْئٍ لَمْ یَضُرُّوْکَ اِلَّا بِشَیْئٍ قَدْ کَتَبَھَا اللّٰہُ عَلَیْکَ﴾ اور اگر وہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تم کو کوئی نقصان پہنچائیں تو وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اتنا ہی جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر فرمایا ہے۔ اس لئے تمہاری نگاہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے، چاہے تمہیں مخلوق کی طرف سے نفع پہنچے یا نقصان پہنچے۔ اگر نقصان پہنچے تو بندے سے بدلہ لینے کے خیالات تمہارے دل میں پیدا نہیں ہونے چاہئیں، بلکہ یوں سوچے کہ اس کے دل میں جو نقصان پہنچانے کا جذبہ پیدا ہوا وہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کے پیدا کرنے کی وجہ سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ چیز آئی ہے، لہٰذا اس موقعہ پر استغفار کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے

﴿ایک دور اندیشانہ بات﴾

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

گر گزندت رسد ز خلق مرنج	کہ نہ راحت رسد ز خلق نہ رنج
از خدا داں خلافِ دشمن و دوست	کہ دلِ ہر دو درتصرُّفِ اوست
گرچہ تیر از کماں ہمی گذرد	از کماں دار بیند اہلِ خرد

(گلستاں سعدی، باب ا، صفحہ ۵۲)

اگر تم کو کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس کی وجہ سے تمہیں رنجیدہ و پریشان ہونے کی اور دکھ میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ مخلوق کا معاملہ تو ایسا ہے کہ اس کی طرف سے نہ تو تم کو راحت پہنچ سکتی ہے نہ دکھ پہنچ سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو رہا ہے، دوست یا دشمن کی طرف سے جو کچھ بھی ہو، اس کو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے سمجھو اس لئے کہ ہر ایک کا دل اسی کے قبضے میں ہے، اس کے دل میں تم کو نقصان پہنچانے کا جذبہ پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے، اور اس کے دل میں تمہیں راحت پہنچانے کا جذبہ پیدا کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ لہٰذا تمہاری نگاہ اس پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہی ہونی چاہیے۔

اسی لئے تیسرے شعر میں عجیب وغریب مثال دی کہ دیکھو! جب کمان میں سے تیر نکلتا ہے تو آنکھیں تو یہ دیکھ رہی ہیں کہ تیر کمان میں سے نکل کر ہم تک آیا، لیکن جو سمجھ دار لوگ ہیں وہ کمان کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں سمجھتے، بلکہ جو آدمی اس کمان کو استعمال کر رہا ہے، جس کے ہاتھ میں وہ کمان ہے، لوگ سمجھتے ہیں کہ اصل تو تیر چلانے والا وہ ہے۔ کمان تو ایک ذریعہ اور ایک آلہ ہے۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو ایک بنیادی چیز بتلا دی کہ اگر ساری مخلوق اس بات پر جمع اور متفق ہو جائے کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچائے تو وہ اس سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتے جتنا اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر فرما رکھا ہے۔ اور اگر ساری مخلوق اس بات پر متفق ہو جائے کہ تمہیں کچھ نقصان پہنچائے تو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مقدر فرما رکھا ہے۔ گویا مؤمن کی نگاہ تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہونی چاہیے۔ اسی لئے عام طور پر اگر کسی کی طرف سے کوئی راحت پہنچتی ہے تو بہت سے ظاہر بیں لوگ اسی کو مقصود بنانا شروع کر دیتے ہیں۔

ویسے شریعت کی تعلیم اپنی جگہ پر یہ بھی ہے کہ جو ذریعہ اور واسطہ بنا ہے اس کا بھی شکریہ ادا کیجئے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: جس نے لوگوں کا شکر ادا نہیں کیا اس نے اللہ تعالیٰ

کا بھی شکرادانہیں کیا، لہٰذا اس کا شکریہ ضرور ادا ہونا چاہیے۔لیکن آدمی یہ سمجھے کہ یہ چیز اس نے نہیں دی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات اس کے دل میں ڈالی۔

اسی طرح اگر کسی کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی تو اس تکلیف کو دور کرنے کی تدبیر ضرور کرنی چاہیے۔لیکن یہ نہ سمجھے کہ یہی کافی ہے، بلکہ سمجھے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی ہے۔ یہ چیز اگر آدمی یقین کے ساتھ سمجھنے لگے تو اس صورت میں بہت ساری مشکلات بھی حل ہو جاتی ہیں، اور بہت ساری پریشانیوں سے نجات بھی مل جاتی ہے۔

بعض لوگ ہمیشہ اسی اُدھیڑ بُن میں رہتے ہیں کہ فلاں نے مجھے گالی دی، فلاں نے مجھے یہ کیا اور فلاں نے یہ کیا۔ آج اِس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، کل اُس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اپنے سارے اوقات اسی میں لگا رہے ہیں اور اپنے آپ کو اسی میں برباد کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان لوگوں کا بجز اس کے اور کوئی عمل دخل نہیں کہ ایک ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ آدمی کو ایسے موقعہ پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، استغفار اور توبہ کا اہتمام کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ سے اس مصیبت کے دور ہونے کے لئے دعا و درخواست کرنی چاہیے۔ اور لوگوں سے تعرض کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ہاں! جو مناسب اور درست تدبیریں ہوں اور جن کی شریعت نے اجازت دی ہو؛ ان کو اختیار کرنا چاہیے۔

﴿کوئی نئی چیز ہونے والی نہیں ہے﴾

﴿رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجُفَّتِ الصُّحُفُ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: قلم اٹھالئے گئے اور صحیفے خشک ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو فیصلہ ہونا تھا وہ ہو چکا ہے، کوئی نئی چیز ہونے والی نہیں ہے، جو راحت یا جو تکلیف پہنچنے والی ہے وہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے طے ہوچکی ہے،اب اس میں کوئی کمی بیشی ہونے والی نہیں ہے۔اس لئے آدمی کو ہمیشہ اپنی نگاہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر رکھنی چاہیے۔

اسی کو ترمذی شریف کے علاوہ دوسری روایت میں یوں فرمایا گیا ہے:﴿وَاعْلَمْ اَنَّمَا أَخْطَأَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُصِیْبَکَ وَمَاأَصَابَکَ لَمْ یَکُنْ لِیُخْطِئَکَ﴾ جو چیز تم کو نہیں پہنچی یعنی کوئی مصیبت آرہی تھی لیکن دور ہوگئی؛ تو یہ پہنچنے والی بھی نہیں تھی۔اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں یہ طے تھا کہ یہ پہنچنے والی نہیں ہے،اسی لئے آپ اس سے محفوظ رہے۔اور جو مصیبت تم کو پہنچی؛اس سے تم بچنے والے بھی نہیں تھے۔

اسی لئے بہت سے لوگ بڑے افسوس سے یوں کہتے ہیں کہ مَیں یوں کرلیتا تو یہ ہوجاتا۔اور فلانی تدبیر کرتا تو ایسا ہوجاتا۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی کی نگاہ تقدیر پر نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی تدبیر بھی اختیار نہ کرے۔جب تک کہ تقدیر کا فیصلہ ہمارے سامنے نہیں آیا ہے؛ تب تک تو ہمیں ضرور تدبیر اختیار کرنی چاہیے۔کسی بیماری کے دفعیہ کے لئے،کسی راحت اور نعمت کو حاصل کرنے کے لئے تدبیریں ضرور اختیار کی جائیں،لیکن جب تقدیر کا فیصلہ سامنے آچکا اور جو چیز ہونے والی تھی وہ ہوگئی،اس کے بعد اب اس وسوسہ میں رہنا،اور اپنے آپ کو اس پریشانی مبتلا کرنا کہ مَیں یوں کرتا تو یوں ہوجاتا؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

﴿وہی ہوتا ہے؛ جو منظورِ خدا ہوتا ہے﴾

ایک مرتبہ کوئی پیالہ ٹوٹ گیا،اس پر کسی نے کوئی بات کہی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اب چھوڑو بھی۔اگر کوئی اور بات مقدر ہوتی؛ تو وہی ہوتی۔یعنی اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ بات طے ہوتی کہ پیالے کو نہیں ٹوٹنا ہے تو کیوں ٹوٹتا؟ لیکن جب ٹوٹا تو معلوم ہوا کہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہی بات مقدر تھی۔ لہٰذا جو ہوگیا اس کے متعلق آدمی کو اپنے دل میں یہ نہیں لانا چاہیے کہ میں یوں کرتا تو یوں ہوجاتا۔ ایسا ہونے والا تھا ہی نہیں۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقدر ہوتا ہے۔

ہاں! مستقبل میں آنے والی چیز کے بارے میں ضرور تدبیر اختیار کی جائے، کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ وہ کیا ہے۔ اس لئے تدبیروں کا حکم بھی دیا ہے اور اس کی اجازت بھی دی ہے، اس سے انکار نہیں ہے۔ لیکن جو چیزیں ہوچکیں، پھر ان میں آدمی کو زیادہ مشغول ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ خلاصہ ہے۔ ان چیزوں کو اگر آدمی محفوظ رکھے گا اور ان کا اہتمام کرے گا؛ تو بہت ساری مصیبتوں سے اپنے آپ کو نجات دلاسکتا ہے۔

تدبیروں کو بہت زیادہ اہمیت نہ دے

بہت سے لوگ ماضی کی چیزوں میں الجھے ہوئے رہتے ہیں اور مستقبل کی تدبیروں سے غافل ہوجاتے ہیں۔ یعنی مستقبل میں کچھ کرسکتے تھے اس سے بھی اپنے آپ کو محروم کردیتے ہیں۔ کہتے تو ہیں کہ یوں کرتا تو یوں ہوجاتا۔ ارے بھائی! جو ہونا تھا؛ وہ ہوگیا، اُس کا وقت تو باقی نہیں رہا۔ اب آنے والے وقت میں جو کچھ کرسکتے ہو، اِس افسوس میں مبتلا ہوکر اُس سے بھی اپنے آپ کو محروم کررہے ہو۔ بات تو وہی ہے، چونکہ اس سے بھی ان کو محروم ہی رہنا اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقدر ہے، اس لئے وہ اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی ایسی چیزوں میں اپنے آپ کو مشغول نہ کرے۔ یہ ایمان کا تقاضہ ہے۔ شریعت نے تقدیر پر ایمان کو جو ضروری قرار دیا ہے اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ آدمی تدبیروں کو زیادہ اہمیت نہ دے۔ یہ نہ سمجھے کہ جو کچھ بھی ہے؛ وہ تدبیریں ہی ہیں۔ بلکہ جو کچھ

بھی ہے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اصل ہے۔ تدبیر تو ایک ذریعہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے یہ نصیحت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو فرمائی اور جیسا کہ مَیں نے ابھی عرض کیا کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے یہ ارشادات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو فرمائے؛ اس وقت وہ بچے تھے۔ آٹھ دس سال کی عمر تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمیں بھی اپنی اولاد کی تربیت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ نہ سوچیں کہ چھوٹے بچے کو ابھی ہم یہ چیزیں کیا سمجھائیں؟ ان کو کیا بتائیں؟ یہ تو بڑی اونچی اونچی باتیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ بچپن کے اندر جو ایمان اور یقین بچے کے دل میں جم جاتا ہے اور جو چیز پیدا ہو جاتی ہے، بڑے ہونے کے بعد وہ کام آتی ہے۔ اس لئے عقائد سے تعلق رکھنے والی چیزیں بچپن ہی سے ان کے ذہن میں بٹھانی چاہئیں۔ بار بار اس کا تذکرہ ان کے سامنے آنا چاہیے، تاکہ بچے ان چیزوں سے واقف ہوں، اور اس طرح کا ان کا یقین بنے۔

﴿وَاعْلَمْ اِنَّ النَّصْرَ مَعَ الصَّبْرِ، وَاِنَّ الْفَرَجَ مَعَ الْكَرْبِ﴾ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مدد اور نصرت صبر کے ساتھ آتی ہے۔ اور جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے راحت بھی لگی ہوئی ہے، پھر نبی کریم ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا﴾ ہر تکلیف کے ساتھ راحت ہے۔ بلکہ مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک تکلیف کے ساتھ دو راحتیں اور ایک مصیبت کے ساتھ دو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہیں۔

﴿دیکھتے ہی دیکھتے زبردست انقلاب﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: اِنَّكُمْ لَتَعْمَلُوْنَ أَعْمَالًا، هِيَ أَدَقُّ فِيْ أَعْيُنِكُمْ مِنَ الشَّعْرِ، كُنَّا نَعُدُّهَا عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنَ الْمُوْبِقَاتِ (البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ اپنے زمانہ کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تم لوگ بعض اعمال ایسے کرتے ہو جو تمہاری نگاہوں میں تو بال سے بھی زیادہ کم حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی تم ان سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ ہم نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ان کو ہلاکت میں ڈالنے والا سمجھا کرتے تھے۔

یہ روایت لا کر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ خاص طور پر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی صحبتِ بابرکت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہر ایک کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ کیفیت پیدا کی تھی کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو ہر وقت اپنے سامنے حاضر سمجھتے تھے، اور چھوٹی چھوٹی نافرمانی کے کاموں سے بھی اپنے آپ کو ایسا بچانے کی کوشش کرتے تھے؛ گویا یہ ہمارے دین کو ہلاک کرنے والی ہیں۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ گناہ کی حیثیت تو ایسی ہے جیسے چنگاری۔ کہ اس میں چھوٹی بڑی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ آگ لگانے کا کام جیسا بڑی چنگاری کیا کرتی ہے؛ چھوٹی چنگاری بھی کرتی ہے۔ اور بڑی چنگاری سے جو ہلاکت آسکتی ہے؛ چھوٹی چنگاری سے بھی وہ آسکتی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کے دلوں میں باری تعالیٰ کا استحضار اور نگرانی کا خیال ایسا بیٹھا ہوا تھا کہ وہ چھوٹے چھوٹے گناہ کی بھی جرأت نہیں کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دور گذرنے کے بعد یہ تبدیلی

آ گئی، یعنی اسی قریب کے زمانہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد تابعین کا زمانہ آیا، حالانکہ وہ بھی "خیر القرون" کے بعد "ثم الذین یلونھم" کے اندر شمار ہوتا ہے؛ لیکن پھر بھی اتنی بڑی تبدیلی آ گئی۔ تو اب ہمارے اس دور کے بارے میں کیا امید کی جاسکتی ہے؟

بہر حال! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں باری تعالیٰ کی نگرانی کی جو کیفیت تھی؛ اس کا پتہ چلتا ہے۔

﴿اس باب کا خلاصہ﴾

اس باب کا خلاصہ یہی ہے کہ آدمی ہر وقت اس بات کا استحضار رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، مَیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگرانی میں ہوں۔ اس کی وجہ سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اور گناہوں میں مبتلا ہونے سے بچائے گا۔ اور جو کام اللہ تبارک وتعالیٰ نے کرنے کے لئے کہے ہیں، ان کے کرنے کا اہتمام نصیب ہوگا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں یہ کیفیت نصیب فرمائے

حضرت مولانا ابراہیم صاحب دامت برکاتہم حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے خادمِ خاص اور حضرت کے خصوصی فیض یافتہ؛ آج ہمارے درمیان میں موجود ہیں، آپ کی عنایت ہے کہ یہاں تشریف لائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آج آپ کے آنے کی وجہ سے حضرت اقدس مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی خصوصی برکات سے بھی ہمیں مالا مال فرمائے۔ اب دعا حضرت مولانا ہی فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے فیوض سے بھی ہم کو زیادہ سے زیادہ مستفیض فرمائے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ مراقبہ ۲ ﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد.

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَغَارُ وَغَيْرَةُ اللّٰهِ تَعَالٰى أَن يَّأْتِيَ الْمَرْءُ مَاحَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ.

باب کا عنوان قائم کیا ہے باب المراقبہ۔ جس کا حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں جو تعلیمات دی ہیں اور امت کی جو تربیت فرمائی ہے اس کے اندر یہ چیز مدنظر رکھی گئی ہے کہ ہر مؤمن کے دل ودماغ میں یہ تصور وخیال جم جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، میرے ہر حرکت وسکون پر اور میرے ہر کام پر اللہ تعالیٰ کی نظر ہے ﴿اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ اللہ تعالیٰ ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں ﴿أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾ کیا ان کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے ہر مؤمن کے لئے یہ صفت مطلوب ہے کہ آدمی اس بات کی کوشش اور محنت کرے اور ہر وقت اس تصور کو اپنے دل میں تازہ کرتا رہے یہاں تک کہ یہ خیال وتصور اس کے دل میں جم جائے جب یہ تصور دل ودماغ میں جم جائے گا تو پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی تنہائی میں ہو یا لوگوں کے سامنے ہو، خلوت میں ہو یا جلوت میں ہو، کسی بھی حالت میں ہو؛ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کا اہتمام کرے گا۔ اسی مناسبت سے یہ روایت پیش فرمارہے ہیں۔

﴿غیرت کا مطلب﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ غیرت رکھتے ہیں۔ غیرت کا مطلب اصل میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی کی طبیعت میں ان حالات میں خفگی اور ناراضگی کی کیفیت پیدا ہو جہاں وہ یہ دیکھے کہ جس چیز میں اس کی خصوصیت ہے اس میں دوسرا شرکت کر رہا ہے۔ جیسے کوئی دیکھے کہ اس کی بیوی کو کوئی آدمی غلط نگاہ سے دیکھ رہا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ میری بیوی کے معاملہ میں یہ شرکت کرنا چاہتا ہے۔ بس! اس تصور سے اس کے دل میں طبعی طور پر ایک ہیجان اور ناراضگی وغصہ کی کیفیت غیر اختیاری طریقہ سے پیدا ہوتی ہے؛ اسی کو غیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی لئے شوہر کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کی طرف کوئی غیر شخص دیکھے، اس سے بات کرے، اس کی بیوی کسی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ رکھے جو عورت کو شوہر کے ساتھ رکھنا چاہیے۔ اگر اس کی بیوی کی طرف سے ایسا معاملہ پیش آئے، اس وقت شوہر کی طبیعت میں ہیجان اور خفگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے؛ اسی کو غیرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ عورتوں میں بھی یہ مادہ ہوتا ہے اور بہت زیادہ ہوتا ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کی غیرت کا مطلب﴾

خیر! یہ غیرت دراصل ایک تأثر اور انفعالی کیفیت ہے۔ انفعالی کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر اس کے اثر میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات تأثر اور انفعال سے پاک ہے، اس لئے غیرت کا حقیقی معنیٰ تو وہاں نہیں پایا جائے گا، البتہ غیرت کا جو اثر ہے کہ اس غیرت کے نتیجہ میں آدمی یہ چاہتا ہے کہ یہ حرکت جو وجود میں آئی

ہے؛ وہ ختم ہو جائے ، اور یہ کام نہ ہونے پائے ۔تو اس کا فائدہ جہاں مرتب ہوتا ہے، وہاں پر اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے لفظِ غیرت کا استعمال کرتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کی غیرت یہ ہے کہ آدمی کوئی ایسا کام کرلے جو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ خاص طور پر بے حیائی کے کاموں کو اللہ تعالیٰ نے اسی صفت غیرت کی بناء پر حرام کیا ہے۔ جیسے ایک آدمی یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی، اس کی بہن، اس کی بیٹی کے ساتھ کوئی آدمی ایسا کوئی معاملہ کرے، اس کی غیرت برداشت نہیں کرتی، ویسے ہی اللہ تعالیٰ کی غیرت بھی یہ گوارا نہیں کرتی کہ اس کے بندے یا بندی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کیا جائے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور بے حیائی کا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب جوش میں آتا ہے۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ایسے کاموں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرے۔ گویا اس کو ہر وقت یہ تصور ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، اگر مَیں بے حیائی کا کام کروں گا تو اللہ تعالیٰ ناراض ہوں گے۔

آزمائش کیوں؟

وعن أبی هريرة رضی اللہ عنہ انَّهُ سَمِعَ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْل: ان ثلاثة من بنی اسرائيل ......الخ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ ایک لمبی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ بنو اسرائیل میں تین آدمی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے آزمانے کا ارادہ کیا۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ دلوں کی حقیقت سے بخوبی واقف ہے، لیکن دل میں جو کچھ ہے وہ لوگوں کے سامنے بھی ظاہر ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہے لیکن لوگ بھی دیکھیں اور محسوس کریں اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کو ایسے حالات میں مبتلا کیا

جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں دل میں چھپی ہوئی وہ کیفیات اور جذبات لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجاتے ہیں؛ اسی کو آزمائش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ امتحان کو بھی آزمائش اسی لئے کہتے ہیں کہ کچھ سوالات کے جوابات کے ضمن میں اندر کی پوشیدہ صلاحیت لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجاتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو مختلف حالات سے گذار کر بندوں کے اندر کی مختلف کیفیتوں کو ظاہر فرماتے ہیں۔ مثلاً مصیبت کے وقت صبر کرتا ہے یا بے صبری سے کام لیتا ہے؟ اللہ تعالیٰ دولت وثروت سے نوازتے ہیں تو اس کا حق ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری پر قائم رہتا ہے یا بہک جاتا ہے اور بے قابو ہوکر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوجاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ اس کے اندر کا کیا حال ہے لیکن جب تک دولت نہیں آئے گی وہاں تک لوگوں کو پتہ نہیں چلے گا۔ لوگوں کے سامنے بھی یہ چیزیں ظاہر ہوجائیں؛ اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو جن مختلف حالات سے گذارا جاتا ہے انہیں حالات کو عربی زبان میں ﴿بَلَآء﴾ اور اردو میں آزمائش سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر اس آزمائش کی بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں، کبھی کوئی مصیبت کے ذریعہ آزمایا جاتا ہے، اور کبھی کوئی نعمت دے کر آزمایا جاتا ہے۔

﴿کوڑھی، گنجے اور اندھے کا قصہ﴾

تو یہاں بھی بنواسرائیل کے تین بندے تھے، ان میں سے ایک ابرص تھا یعنی اس کا پورا جسم سفید داغ والا تھا جس کو کوڑھی کہتے ہیں اور دوسرا اقرع یعنی گنجا تھا، اور تیسرا اندھا تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو آزمانے کا ارادہ کیا تو ہر ایک کے پاس ایک فرشتہ بھیجا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ فرشتہ پہلے کوڑھی کے پاس آیا اور اس سے پوچھا: تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ جس کے پاس

جو چیز نہیں ہوتی اس کو وہی زیادہ پسند ہوتی ہے۔ لہٰذا اس نے کہا: میرے جسم کی رنگت اچھی ہو میری کھال خوبصورت ہو اور یہ بیماری جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن اور نفرت کرتے ہیں اور مجھ سے دور بھاگتے ہیں؛ دور ہو جائے۔ اس فرشتے نے اس کے جسم پر ہاتھ پھیرا تو وہ گھن والی بیماری دور ہوگئی اور اس کی خواہش کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو اچھی رنگت دے دی گئی۔

اس کے بعد اس فرشتے نے اس سے پوچھا: کون سا مال تجھے زیادہ پسند ہے؟ اس نے کہا: اونٹ پسند ہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے گائے کہا۔ راوی کو شک ہے۔ لیکن راجح یہی ہے کہ اونٹ کہا تھا۔ اس فرشتے نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حاملہ اونٹنی جو بچہ جننے کے لئے تیار تھی؛ دے دی اور اس کو دعا بھی دی: ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْھَا﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اس میں برکت دے۔

اس کے بعد وہی فرشتہ گنجے آدمی کے پاس گیا اور پوچھا: تمہیں کیا چیز پسند ہے؟ اس نے کہا: میرا جی چاہتا ہے کہ میرے سر پر اچھے بال آجائیں، اور یہ گنجا پن جس کی وجہ سے لوگ مجھ سے گھن کرتے ہیں؛ دور ہو جائے۔ اس فرشتے نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس کی وہ بیماری دور ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خوبصورت بال دے دئے گئے

اس کے بعد اس فرشتے نے اس سے پوچھا: کون سا مال تجھے پسند ہے؟ اس نے کہا: گائے پسند ہے۔ تو ایک حاملہ اور گابھن گائے اس کو دے دی اور دعا بھی دی ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکَ فِیْھَا﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت دے۔

اس کے بعد وہی فرشتہ اندھے کے پاس آیا اور پوچھا: تمہیں کونسی چیز پسند ہے؟ اس

نے کہا: اللہ تعالیٰ میری بینائی لوٹادے، تا کہ مَیں لوگوں کو دیکھ سکوں۔ اس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرا، اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی لوٹا دی۔

اس کے بعد اس فرشتے نے اس سے پوچھا: کون سا مال تجھے پسند ہے؟ اس نے کہا: بکری پسند ہے۔ تو ایک گابھن بکری؛ جو بچہ جننے کی تیاری تھی اس کو دے دی، اور اس کو بھی دعا دی: ﴿بَارَکَ اللہُ لَکَ فِیھَا﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں اس میں برکت دے۔

ان تینوں نے اپنے جانوروں کو بچہ جنوایا۔ جیسے عورت کو بھی جب بچہ پیدا ہوتا ہے اس وقت وہاں دوسری عورت ہوتی ہے جو بچہ جنواتی ہے، جس کو ''دایہ'' کہا جاتا ہے، وہی بچہ کو لیتی ہے۔ اسی طرح جانور کو جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا مالک وہاں موجود ہوتا ہے جو اس بچہ کو لیتا ہے۔ اس کو عربی زبان میں ﴿اِنْتَاج﴾ کہتے ہیں۔ تو اونٹ والے نے اور گائے والے نے اپنے اپنے جانوروں کو بچہ جنوایا یعنی جب بچہ پیدا ہوا تو اس کو لیا۔ اور اس بکری والے نے بھی بچہ جنوایا۔ اس کے بعد ان کے اموال میں اتنی برکت ہوئی کہ پورا میدان بھر گیا۔ دو پہاڑوں کے بیچ کا جو ہموار حصہ ہوتا ہے اس کو عربی اور اردو میں ''وادی'' کہتے ہیں اور گجراتی میں اس کو ﴿ખીણ﴾ کہتے ہیں۔ دو پہاڑوں کے بیچ کا خالی حصہ بہت بڑا ہوتا ہے، وہ پورا حصہ اونٹوں سے بھر گیا۔ اور دوسرے کے لئے گایوں سے وادی بھر گئی۔ اور تیسرے کی بکریوں میں اللہ تعالیٰ نے اتنی برکت دی کہ پورا میدان بکریوں سے بھر گیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ نعمتیں آزمانے کے لئے دی تھیں تاکہ دیکھیں کہ وہ ان نعمتوں کا کیا حق ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا وہی فرشتہ سب سے پہلے اس کوڑھی کے پاس اسی کوڑھ والے بیمار کی سی شکل وصورت بنا کر آیا جو اس کی پہلے تھی۔ اور اس سے کہا کہ مَیں ایک غریب آدمی

ہوں، اور سفر میں سارے اسباب میرے ہاتھ سے ختم ہو چکے ہیں، اب اس سفر کو آگے جاری رکھنے کا اور ضرورتوں کو پورا کرنے کا کوئی سامان میرے پاس نہیں ہے، اس وقت میرا حال یہ ہے کہ مَیں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ میرے اوپر نظر کرم فرمائے، اور پھر آپ کچھ توجہ کریں۔

علماء نے لکھا ہے کہ لوگوں کے سامنے مدد کا تذکرہ کرنا ہو؛ تو یہی تعبیر ادب کا تقاضہ ہے: ﴿لَابَلَاغَ لِیَ الْیَوْمَ اِلَّابِاللهِ، ثُمَّ بِکَ﴾ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پھر آپ کی توجہ سے میرا کام بن سکتا ہے۔ یہاں بھی اس نے یہی کہا۔

اور پھر کہا کہ جس اللہ تعالیٰ نے آپ کو اچھی رنگت عطا فرمائی، اچھی کھال اور چمڑی دی اور مال دیا، اس اللہ کے واسطے سے مَیں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ایک اونٹ دو؛ تاکہ اس کے ذریعہ سے مَیں اپنا سفر پورا کر کے منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں۔

﴿فَقَالَ: اَلْحُقُوْقُ کَثِیْرَةٌ﴾ اس نے کہا کہ میرے اوپر تو بہت سارے حقوق ہیں ان کی ادائیگی کرنی ہے، میرے پاس اتنا سارا مال نہیں ہے کہ تجھے دے سکوں۔ ﴿فَقَالَ: کَأَنِّیْ أَعْرِفُکَ﴾ جب اس نے دینے سے انکار کیا تو اس فرشتے نے کہا: شاید مَیں تم کو پہچانتا ہوں، آپ مجھے یاد پڑتے ہیں۔ تم تو ابرص اور کوڑھی تھے، اور لوگ بھی تم سے گھن کرتے تھے، تمہارے پاس مال بھی نہیں تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے تم کو اچھی کھال دی اور مال دیا۔ اس نے کہا: ارے نہیں! یہ مال تو باپ دادا کے زمانہ سے میرے پاس چلا آرہا ہے۔ اس پر فرشتے نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے تو پھر پہلے جیسا تھا ویسا ہی اللہ تعالیٰ تجھے بنادے۔ چنانچہ وہ پھر سے کوڑھی ہو گیا

اس کے بعد وہ فرشتہ گنجے کے پاس اسی جیسی صورت اور حالت بنا کر گیا۔ وہاں

جا کر بھی یوں کہا کہ ایک غریب اور مسکین آدمی ہوں، سفر کے سارے وسائل میرے پاس سے ختم ہو چکے ہیں، منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کوئی راہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کرم فرمائیں اور اس کے بعد تمہاری نظر ہو؛ تو کچھ کام بن سکتا ہے۔ لہٰذا مَیں تم سے ایک گائے مانگتا ہوں تا کہ میری ضرورت پوری ہو۔ اس نے بھی جواب میں وہی باتیں کہیں جو پہلے والے نے کہی تھیں۔ فرشتے نے کہا: یہ مال تم کو اللہ تعالیٰ نے نہیں دیا؟ اس نے کہا: نہیں! یہ تو میرے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ اس پر فرشتے نے کہا: اگر تو جھوٹا ہے، تو پھر پہلے جیسا تھا؛ ویسا ہی اللہ تعالیٰ تجھے بنا دے۔ چنانچہ وہ پھر سے گنجا ہو گیا۔

اس کے بعد وہ فرشتہ اندھے کے پاس اسی جیسی اندھی شکل وصورت بنا کر آیا اور اس سے بھی یہی کہا کہ غریب آدمی ہوں، مسافر ہوں، اور اس سفر میں میرے سارے اسباب ختم ہو چکے ہیں اور آج اس وقت اللہ تعالیٰ کی مدد اور اس کے بعد تمہاری توجہ کے بغیر مَیں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا ہوں۔ جس اللہ نے تمہاری بینائی لوٹائی اس کا واسطہ دے کر مَیں تم سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے ایک بکری دو، تا کہ مَیں اپنے سفر میں اس سے کام لوں اور میری ضرورت پوری ہو، اور مَیں آسانی سے منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں ﴿فَقَالَ: كُنْتُ أَعْمٰی، فَرَدَّاللّٰهُ اِلَیَّ بَصَرِیْ. فَخُذْمَاشِئْتَ وَدَعْ مَاشِئْتَ﴾ اس نے کہا: مَیں بھی اندھا تھا، اللہ تعالیٰ نے میری بینائی لوٹائی۔ آج میرے مال میں سے جتنا چاہے لے جا، اور جتنا چاہے چھوڑ جا، میری طرف سے تجھے اختیار ہے، آج اللہ کے نام پر تو جو بھی لے جائے گا، اس میں مَیں تجھے مشقت میں نہیں ڈالوں گا یعنی منع نہیں کروں گا۔ اس پر اس فرشتے نے کہا: تم اپنا مال رہنے دو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم لوگوں کو آزمایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو گیا، تم امتحان میں کامیاب ہو گئے اور تمہارے دونوں ساتھی ناکام ہو گئے۔

دیکھو! اس اندھے آدمی نے اپنی پہلی والی حالت کو یاد رکھا یہی مراقبہ ہے۔اس نے اس بات کا استحضار رکھا کہ مَیں پہلے کیسا تھا۔مَیں تومحتاج تھا،خود مدد کا مستحق تھا،آج ایک ضرورتمند آدمی آیا ہے،لہٰذا مجھے اپنی اس حالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہاں اس روایت کو پیش کرنے کا مقصد یہی تھا۔

﴿ہوشیار اور نادان﴾

عن أبی یعلیٰ شداد بن اوس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللهِ.

حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہوشیار، دانا، عقل منداور سمجھ دار شخص وہ ہے جو اپنی ذات کا محاسبہ کرے ﴿وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ﴾ اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لئے عمل کرتا ہے۔﴿دَانَ یَدِیْنُ﴾ قابو میں کرنا اور محاسبہ کرنا۔﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ روزِ جزاء کا مالک یا یومِ حساب کا مالک ہے حساب کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور بدلہ کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔یہاں بھی مراد یہی ہے کہ وہ اپنے نفس کا حساب لیتا ہے کہ آج کیا کیا اور کیا نہیں کیا۔اپنے فریضہ کو کتنا ادا کیا اور کتنا غفلت سے کام لیا۔گویا روزانہ وہ اپنی ذات کا خیال رکھتا ہے اور مراقبہ کرتا ہے۔

اور حقیقت میں ہوشیاری اسی کا نام ہے کہ آدمی آخرت کے لئے عمل کرے اور روزانہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔اگر نیکی کی ہے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔اور اگر گناہ ہوا ہے تو توبہ کرے اور آئندہ اس سے بچنے کا عزم کرے اور عہد کی تجدید کرے۔

﴿وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا﴾ اور عاجز، درماندہ اور بیوقوف وہ ہے جو اپنے نفس

کو اپنی خواہشات کے پیچھے چلاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے امیدیں باندھتا ہے۔ من چاہی کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہیں لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بھی نفس کا دھوکہ ہے۔ آدمی کا نفس اس طرح کہہ کر آدمی کو گناہ میں مبتلا کرتا ہے۔

اچھا! اگر آپ کا نفس آپ کو یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہیں، اور آپ سے گناہ کرواتا ہے، تو اگر کوئی کافر اس طرح کہے کہ اللہ تعالیٰ غفورٌ رَّحیم ہیں، لہٰذا مجھے اپنے کفر سے توبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تو آپ فوراً قرآن پاک کی آیت پیش کریں گے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لاٰیَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ﴾ اللہ تعالیٰ شرک کو تو معاف نہیں کرتے، اس کے علاوہ گناہوں کو جس کو چاہیں گے معاف کردیں گے۔ اس سے پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی مغفرت کے لئے اصول وضابطہ ہے اور اللہ تعالیٰ اسی ضابطہ کے مطابق معاملہ کریں گے۔ بندوں کے اعمال کے معاملہ میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ضابطہ بتلادیا: ﴿فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ. وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَأُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ ﴾ جس کے نامۂ اعمال کا ترازو نیکیوں سے بھاری ہوگیا؛ وہ جنت میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اصول بتلادیا ہے کہ نیکیاں اور گناہ دونوں ہورہے ہیں اور جس کی نیکیاں زیادہ ہیں، اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کریں گے اور اس کے گناہوں کو معاف کرکے جنت میں بھیجیں گے۔ اور اگر گناہ غالب ہوں گے تو اس کو سزا دیں گے یعنی جہنم میں بھیجیں گے۔ یہ اصول ہے۔

قدرت نے دنیا کو دارالاسباب بناکر تمام چیزوں کو اس کے ساتھ جوڑا ہے۔ مثال کے طور پر ایک طالب علم ہے، امتحان کا زمانہ آیا اس وقت تمام لوگ محنت کررہے ہیں اور وہ

کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کامیاب کردیں گے ۔محنت تو کی نہیں اور کامیابی کی امید رکھتا ہے، تو کامیاب کہاں ہوسکتا ہے۔

ایک کسان ہے جس نے نہ بیج ڈالا، نہ پانی پلایا، نہ کبھی ہل چلایا، اور نہ کچھ کیا، اور جب کٹائی کا وقت آیا اس وقت وہ بھی یوں سوچتا ہے کہ جس طرح دوسروں کے گھر میں غلہ آئے گا؛ اسی طرح میرے گھر میں بھی غلہ آئے گا۔ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟

دنیا کے معاملہ میں تو ہم یوں کہتے ہیں کہ اسباب اختیار کرنے چاہئیں، اسی طرح آخرت کے معاملہ بھی ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ فضل وکرم فرماتے ہیں۔ ویسے آخرت میں بھی ہمارے عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دیا جاتا ہے؛ وہ اس کا فضل وکرم ہی ہے۔

فضل الٰہی انجن ہے اور عمل صالح سگنل

اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿لَن یُّدخِلَ أَحَدَکُم عَمَلُهُ الجَنَّةَ﴾ تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں نہیں لے جائے گا۔ صحابہ نے پوچھا: ﴿وَلاأَنتَ یَارَسُولَ اللهِ؟﴾ یارسول اللہ! آپ کو بھی نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿وَلاَ أَنَا اِلَّاأَن یَّتَغَمَّدَنِیَ اللهُ بِرَحمَتِهِ﴾ مَیں بھی نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے۔ جو بھی جنت میں جائے گا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی سے جائے گا، البتہ علامت کے طور پر عملِ صالح ہے۔ جیسے سبز سگنل دیکھ کر گاڑی چلتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سبز سگنل کی وجہ سے اس میں حرکت آئی، بلکہ وہ تو ایک علامت ہے، ورنہ گاڑی میں حرکت تو انجن کی وجہ سے آئی ہے۔ اسی طریقہ سے آدمی کو جو کچھ بھی ملے گا وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم ہی سے ملے گا، البتہ اس کے لئے عملِ صالح علامت اور نشانی قرار دی گئی ہے۔ اگر عملِ صالح ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل وکرم کیا جائے گا۔

پوری زندگی کی پونجی کا حال

ورنہ ظاہر ہے کہ آدمی دنیامیں اپنے عمل کی قیمت دیکھ لے کہ کیا ہے؟ حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو اس دنیا کا دس گنا ملے گا۔اب کوئی آدمی دنیامیں کتنی ہی محنت کر لے،اورروزانہ کروڑہا کروڑ روپے کماوے۔دنیا کے سب سے بڑے مالدار کی ایک دن کی جتنی کمائی ہے،اوروہ دنیامیں پچاس سال زندہ رہے؛تو کتنا کمالے گا۔اتنی سب کمائی کو جمع کر کے بھی وہ آدمی کیا پورے امریکہ کوخرید سکتا ہے؟پوراہندوستان خرید سکتا ہے؟پوراہندوستان تو کیا،اس کا ایک صوبہ مہاراشٹر بھی خرید سکتا ہے؟پورامہاراشٹر تو کیا، بلکہ اس کا ایک شہر بمبئ خرید سکتا ہے؟پورا بمبئ تو کیا،اس کا ایک علاقہ نریمان پوئنٹ بھی نہیں خرید سکتا ہے۔یہ تو ہم نے اس آدمی کا جائزہ لیا جس کی محنت کا معاوضہ ساری دنیا کے لوگوں میں سب سے زیادہ ہےاوراس کی پوری زندگی کی پونجی کا حال یہ ہے کہ اس سے بمبئ شہر کا ایک علاقہ نہیں خریدا جاسکتا۔حالانکہ دنیا کا نقشہ اٹھا کر دیکھئے کہ پوراہندوستان کتنا چھوٹا نظر آتا ہے،اوراس میں بمبئ کا تو صرف ایک نقطہ ہی نظر آئے گا۔پھر بمبئ کے اس ایک علاقہ کا تو تذکرہ ہی کیا ہوا۔ہمارے عمل کی دنیامیں یہ حقیقت ہے،تو آخرت میں دنیا کا دس گنا جو ملے گا وہ کیا ہے؟محض اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے اللہ تعالیٰ دینا چاہتے ہیں تواس کے لئے بہانہ بنایا ہے۔

ایک اور مثال

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں:یہ تو ایسا ہی ہے کہ کوئی آدمی کسی سے یوں کہے کہ یہاں سے دس قدم چل کر جاؤ،ایک قدم پر ایک ہزار روپے دوں گا،دس قدم پر

دس ہزار روپے ملیں گے۔اب وہ یوں کہے کہ مجھ سے تو نہیں چلا جاتا، ایسے ہی دے دو۔اب جو بھی سنے گا وہ تو یہی کہے گا کہ جو دس ہزار دئے جارہے ہیں وہ دس قدم کا بدلہ نہیں ہے بلکہ صرف آزمائش کے لئے کہا گیا ہے۔ورنہ دراصل وہ تو دینا ہی چاہتا ہے، اس کو دینے کے لئے صرف ایک بہانہ چاہیے۔اور پھر یہ آدمی اس بہانہ کو بھی انجام دینے کے لئے تیار نہیں ہے؛ تو پھر ایسے آدمی کو کون دے گا۔

اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ جو کچھ دینا چاہتے ہیں وہ صرف اس کا فضل ہی ہے۔ ہمارے اعمال کی اس کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، وہ تو صرف ایک بہانہ کے طور پر ہیں۔اب ہم اس بہانہ کو بھی انجام دینے کے لئے تیار نہ ہوں؛ تو پھر اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا﴾ عاجز، بے وقوف، اور اپنے عمل سے قاصر آدمی وہ ہے؛ جو اپنے آپ کو خواہشات کے پیچھے چلائے اور اللہ تعالیٰ سے بڑی بڑی امیدیں لگائے۔کام تو کر رہا ہے اپنی خواہشات کے، من چاہی کرتا ہے، رب چاہی نہیں کر رہا ہے؛ اور امیدیں یہ لگاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے یہ دیں گے اور وہ دیں گے۔یہ نفس کا صریح دھوکہ ہے۔

لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت اس بات کا استحضار اور مراقبہ رکھے کہ مجھے وہی کچھ کرنا ہے؛ جو اللہ تعالیٰ مجھ سے چاہتے ہیں۔تب ہی اس کا کام بن سکتا ہے۔

اللّٰہ تعالیٰ ھمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿مراقبہ ۳﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰـہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً،أمابعد.

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ.

﴿آپ ﷺ کا رعب﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ترمذی شریف ابوداؤد شریف وغیرہ کتب میں موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی کو چھوڑ دے۔ یہ نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات میں سے ہے جن کو جوامع الکلم سے تعبیر کیا جاتا ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جن خصوصیات سے نوازا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ بخاری شریف میں ہے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: ﴿أُعْطِیْتُ خَمْساًلَمْ یُعْطَھُنَّ أَحَدٌقَبْلِیْ،نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِیْرَۃَشَھْرٍ وَجُعِلَتْ لِیَ الْأَرْضُ مَسْجِداًوَّطَھُوْراًوَاُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِم وَاُعْطِیْتُ الشَّفَاعَۃَ﴾ (بخاری شریف،۳۲۳) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئیں جو مجھ سے پہلے کسی اور نبی کو نہیں دی گئیں۔ ان میں سے ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری مدد رعب اور ہیبت کے ذریعہ سے ایک مہینہ کی مسافت سے کی گئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو ایسا رعب اور ایسی ہیبت عطا فرمائی تھی کہ آپ کا رعب ایک مہینہ کی دوری سے دشمن کے اوپر اثر انداز ہوتا تھا۔

چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ بڑے بڑے تندرست اور توانا دشمن بھی جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو آپ کو دیکھ کر لرز جاتے تھے۔ ایک موقعہ پر آپ ﷺ نے کسریٰ شاہِ ایران کے نام دعوتِ اسلام کا خط بھیجا اور حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی رضی اللہ عنہ اس خط کو لے کر گئے تھے، انہوں نے وہ خط کسریٰ کے ماتحت حاکم بحرین منذر بن ساویٰ کی خدمت میں پیش کیا اور اس نے وہ خط کسریٰ تک پہنچایا۔ اس خط میں نبی کریم ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت پیش کی تھی، اور اس کو ﴿عَظِيمُ فَارِس﴾ فارس کا بڑا آدمی کہہ کر مخاطب کیا تھا جب یہ خط پڑھا گیا تو اس کو اپنے کبر وغرور کی وجہ سے بڑا برا معلوم ہوا، کسریٰ نے یوں سوچا کہ وہ میری رعیت ہونے کے باوجود مجھے اس طرح خطاب کرتے ہیں، چنانچہ اس نے یمن کے حاکم باذان کو حکم دیا کہ دو توانا اور پہلوان آدمی بھیج کر ان کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیجو۔ چنانچہ کسریٰ کے حکم سے باذان نے دو طاقتور اور پہلوان آدمیوں کو مدینہ منورہ نبی کریم ﷺ کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجا۔ روایتوں میں ہے کہ جب وہ دونوں شخص نبی کریم ﷺ کے پاس پہنچے اور ان کی نگاہ نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑی تو وہ دونوں لرزنے لگے۔ یہ آپ ﷺ کا رعب تھا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا۔ تو ایک خصوصیت یہ تھی۔ (طبقات الکبریٰ لابن سعد، ۱/۲۶۰)

﴿پوری زمین مسجد بنادی گئی﴾

دوسری خصوصیت یہ تھی ﴿وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّطَهُوراً﴾ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو جائے نماز اور پاکی کا ذریعہ بنایا ہے۔ پچھلی امتوں میں یہ تھا کہ آدمی ہر جگہ نماز نہیں پڑھ سکتا تھا بلکہ جو مقامات اور جگہیں نماز پڑھنے کیلئے مخصوص کی جاتی تھیں وہیں آدمی نماز ادا کر سکتا تھا۔ جیسے اسلام میں مسجدیں ہیں، اس زمانہ میں کنیسے اور عبادت گاہیں ہوا

کرتی تھیں، وہیں نماز پڑھی جاسکتی تھی، عام جگہوں پر نماز نہیں پڑھی جاسکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ خصوصیت عطا فرمائی اور آپ کی امت کے لئے یہ حکم دیا کہ جب نماز کا وقت آجائے تو پوری زمین میں جہاں بھی نماز پڑھنا چاہیں؛ پڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ نماز کے لئے باقاعدہ جگہیں بنائی جاتی ہیں جس کو مسجد سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی میں نماز کو ادا کرنا افضل ہے اور ثواب کی زیادتی کا سبب ہے، اور اسی کا حکم بھی ہے، لیکن اگر کسی جگہ مسجد نہیں ہے اور نماز کا وقت آگیا؛ تو آدمی کہیں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔

اسی طرح پاکی حاصل کرنے کے لئے اصل تو پانی ہے، لیکن اگر پانی موجود نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کا قائم مقام قرار دیا ہے کہ مٹی کے ذریعہ سے تیمّم کرکے پاکی حاصل کرسکتا ہے۔ یہ بھی نبی کریم ﷺ کی خصوصیات میں سے ہے۔

﴿مالِ غنیمت، شفاعت اور عام بعثت﴾

تیسری خصوصیت یہ ہے ﴿وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمِ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لئے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا۔ پچھلی امتوں میں دشمنوں کے ساتھ جہاد کا سلسلہ جاری تھا، لیکن جنگ کے موقعہ پر دشمن کا جو مال غنیمت کے طور پر ہاتھ آتا تھا، خود شرکاء کو بھی اس مال کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی، بلکہ اس کو پہاڑی پر رکھ دیا جاتا تھا، آسمان سے آگ آکر اس کو کھاجایا کرتی تھی۔ یہی اس جہاد کے قبول ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو یہ خصوصیت عطا فرمائی کہ آپ کی برکت سے امت کے لئے مالِ غنیمت کو حلال قرار دیا۔

اور چوتھی خصوصیت ارشاد فرمائی ﴿وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ﴾ اللہ تعالیٰ نے مجھے

شفاعت عطا فرمائی۔ شفاعت کی مختلف اقسام ہیں۔ بعض دوسرے حضرات کو بھی شفاعت کی اجازت دی جائے گی، لیکن ایک مخصوص شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ ہی کو عطا فرمائی ہے۔

اور پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ پچھلے انبیاء اپنی قوم کی طرف خاص طور سے بھیجے جاتے تھے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا۔

﴿جوامع الکلم﴾

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں جن پانچ چیزوں کو بیان کیا گیا ہے اس میں جوامع الکلم کا تذکرہ نہیں ہے لیکن حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چھ ایسی چیزیں عطا فرمائیں جو مجھ سے پہلے کسی اور کو نہیں دی گئی، ان میں شفاعت کے علاوہ چار چیزیں تو وہی ہیں اور ایک چیز یہ ہے ﴿أُوتِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ﴾ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جامع کلمات دئے گئے۔ اور ایک چیز ارشاد فرمائی ﴿وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ﴾ اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ سے نبوت کے سلسلے کو مکمل کیا اور ختم کیا۔ (مسلم شریف، ۸۱۲) ان کے علاوہ بھی نبی کریم ﷺ کی اور بہت ساری خصوصیات ہیں جن کو علماء نے احادیث کے حوالوں سے جمع کیا ہے، اور اس پر مستقل رسالے لکھے گئے ہیں۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو خصوصیات عطا فرمائی تھیں ان میں سے ایک جوامع الکلم بھی ہے۔ جوامع الکلم یعنی الکلمۃ الجامعۃ۔ ایسی بات جو بہت جامع ہو کہ اس میں الفاظ کم ہوں اور معانی بہت سارے ہوں، مختصر لفظوں میں بہت ساری بات بتا دی جائے؛ اسے جوامع الکلم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بہت سے حضرات نے جوامع الکلم کے

نمونے بھی احادیث سے باقاعدہ جمع کر کے مستقل رسالے تصنیف کئے ہیں۔

آپ ﷺ کے جوامع الکلم میں سے ایک ارشاد یہ بھی ہے: ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ﴾ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیز کو چھوڑ دے۔ اس کو جامع اس لئے بھی کہا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث آدمی کی زندگی کے اندر ایک بہت ہی اہم رہنمائی کا کام کرتی ہے۔

﴿امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک درہم میں جنت خرید لی﴾

حدیث کی چھ مشہور بڑی کتابیں ہیں جن کو صحاح ستہ یعنی حدیث کی چھ صحیح کتابیں کہا جاتا ہے، ان میں بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف وغیرہ ہیں، اسی میں سنن ابوداؤد کا بھی شمار کیا جاتا ہے جس کے ترتیب دینے والے یہی امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث سجستانی ہیں۔ حدیث کے بڑے ماہر تھے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ بڑے متقی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حدیث کے اندر بڑا اونچا مقام عطا فرمایا تھا۔ ان کے متعلق امام شعبہ بن الحجاج کا قول نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امام ابوداؤد کے لئے حدیثِ پاک کو ایسا نرم کر دیا جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو نرم کیا تھا۔

ان کے حالات میں ایک عجیب واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بڑی کشتی میں سوار ہو کر جا رہے تھے، کنارہ پر کسی آدمی کو چھینک آئی تو اس نے الحمدللہ کہا۔ اب کوئی آدمی چھینک کر ﴿الحمدللہ﴾ کہے تو ہمیں حکم یہ ہے اس کے جواب میں ﴿یرحمک اللہ﴾ کہنا چاہیے۔ امام ابوداؤد کے کان میں اس کی آواز آئی اور جواب دینے کا وقت آیا تب تک ان کی کشتی آگے بڑھ چکی تھی، اگر جواب دیتے تب بھی اس تک آواز نہ پہنچتی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا

کہ مَیں اس کو جواب دوں تو ہوسکتا ہے کہ وہ ﴿یَھْدِیْکُمُ اللہُ﴾ کہے اور اس کی یہی دعا اللہ تعالیٰ میرے حق میں قبول کرلیں تو میرا کام بن جائے۔ بڑی کشتی میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں بھی بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا امام صاحب نے ایک درہم دے کر ایک چھوٹی کشتی کرایہ پر لی اور اس میں سوار ہوکر کنارے پر آئے اور اس آدمی کو جواب میں ﴿یَرْحَمُکَ اللہُ﴾ کہا، اس کے جواب میں اس آدمی نے ﴿یَھْدِیْکُمُ اللہُ﴾ کہا۔

دیکھئے! حدیث کے اتنے بڑے امام ہونے کے باوجود اس طرح دعا حاصل کرنے کے لئے وہ کتنے حریص تھے۔ روایتوں میں ہے کہ خواب میں کسی نے دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ امام ابوداؤد نے ایک درہم میں جنت خریدلی۔ نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کی یہ برکت ہے۔

﴿چار جامع ترین روایات﴾

خیر! اُس زمانہ میں حضراتِ محدثین مختلف علاقوں میں جاکر وہاں حدیث کے جو بڑے بڑے ماہرین محدث ہوا کرتے تھے، ان کی خدمت میں حاضری دے کر حدیثوں کی روایتیں حاصل کیا کرتے تھے۔ تو امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کی پانچ لاکھ (۵,۰۰,۰۰۰) حدیثیں جمع کیں اور ان میں سے انتخاب کرکے اپنی اس کتاب ''سنن ابوداؤد'' کے اندر چار ہزار آٹھ سو (۴,۸۰۰) حدیثیں میں نے لکھی ہیں۔ اور پھر فرماتے ہیں کہ کسی عقلمند آدمی کے عمل کرنے کے لئے ان سب میں سے صرف چار روایتیں کافی ہیں:-

(۱) پہلی روایت ہے: ﴿اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ، وَاِنَّمَا لِاِمْرِئٍ مَّا نَوٰی، فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَی اللہِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَی اللہِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ جس میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے، اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اس نے نیت کی، لہٰذا جس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو؛ تو وہ حقیقت میں بھی اللہ اور اس کے رسول ہی کے لئے ہوگی، اور جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہو؛ تو اس کی ہجرت اسی مقصد کے لئے شمار ہوگی۔

(۲) دوسری روایت ہے: ﴿لا یُؤْمِنُ أَحَدُکُم حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کیلئے بھی وہی چیز پسند نہ کرنے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

(۳) تیسری روایت یہی ہے: ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ﴾ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی چیزوں کو چھوڑ دے۔

(۴) چوتھی روایت ہے: ﴿اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَاتٌ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ؛ فَقَدِاسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ﴾ حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے بیچ میں کچھ چیزیں ایسی ہیں جو مشتبہ ہیں یعنی اس میں دونوں پہلو موجود ہیں، ایک طرف سے معلوم ہوتا ہے کہ ممکن ہے کہ حلال ہو اور دوسری طرف سے یوں لگتا ہے کہ ممکن ہے کہ حرام ہو۔ تو ایسی مشتبہ چیزوں سے جو اپنے آپ کو بچائے گا، وہ اپنے دین کی حفاظت کرلے گا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے یہ چار ارشادات ایک عقل مند آدمی کی پوری زندگی کی رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔ گویا یہ جامع کلمات ہیں۔

(سیر اعلام النبلاء، ۱۳/۲۱۰)

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی اگر دین کے اصول اور کلیات سے واقفیت حاصل کرلے، تو جزئی امور کے معلوم کرنے کے لئے اس کو کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات ہی اس کے لئے رہنما اور مرشد کا کام دیں گے۔

﴿حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد﴾

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں جہاں ان کا یہ مقولہ نقل کیا ہے، وہاں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آدمی کی عبادات کی درستگی کے لئے نیت کی درستگی کافی ہے۔ گویا عبادات کے واسطے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿أَنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ﴾ کافی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿لاَ يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَايُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ معاشرت کی درستگی کے لئے کافی ہے۔ اپنے پڑوسی، رشتہ دار، گھر والے، دوست اور ملنے جلنے والوں کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرنا چاہیے، اس میں بنیادی رہنمائی کے لئے یہ ارشاد (کہ تم میں سے کوئی آدمی مومن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے) کافی ہے۔ اگر کوئی آدمی کچھ زیادہ نہ جانتا ہو، اور وہ اسی ایک ارشاد کو اپنی زندگی میں اتار لے، اور پھر کبھی کوئی معاملہ آئے تو یہ سوچ لے کہ اگر اس طرح کا معاملہ میرے ساتھ کیا جاتا تو کیا مَیں اس کو گوارا کرتا؟ اگر نہیں کرتا تو پھر مَیں اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں کروں۔ آدمی اگر اس اصول کو اپنا لے، تو کبھی کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہیں پہنچ سکتی۔

اور آدمی کی زندگی میں اس کے عمرِ عزیز کے اوقات کو صحیح طریقہ سے استعمال کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهُ مَالَا یَعْنِیْهِ﴾ کافی ہے۔

اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن میں علماء کا اختلاف ہے، اور بہت سے معاملات ایسے ہیں جن میں دلائل دونوں قسم کے ہیں۔ ایسے امور میں نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد ﴿اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُّشْتَبِهَاتٌ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُهَاتِ؛ فَقَدِاسْتَبْرَأَ لِدِیْنِهٖ﴾ کافی ہے حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور درمیان میں مشتبہ چیزیں ہیں، ان سے بھی اپنے آپ کو اگر بچالے گا تو اس کے دین کی حفاظت ہوجائے گی۔

﴿لایعنی کیا ہے؟﴾

اب لایعنی کیا ہے؟ تو اقوال میں بھی لایعنی ہوتی ہے، اور عام طور پر زیادہ تر واسطہ بولنے میں ہی پڑتا ہے، اس لئے اسی کو لایعنی کہا جاتا ہے، لیکن افعال میں بھی لایعنی ہے اور ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ اشیاء میں بھی لایعنی فرمایا کرتے تھے۔

آج کل ہمارے اس زمانہ میں اشیاء کے اندر میں لایعنی بہت کثرت سے دکھائی دیتی ہے، آپ کسی کے گھر میں جائیں گے تو دیکھیں گے کہ کہیں کسی کونے میں پوٹ (POT) پڑا ہوا ہے، آپ پوچھیں کہ بھائی! یہ کس کام کا ہے؟ کیا اس میں پانی بھرتے ہیں؟ تو کہا: نہیں تو کیا اس میں غلہ بھرا ہوا ہے؟ تو کہا: نہیں، بلکہ صرف شو (SHOW) اور نمائش کے لئے ہے پورے گھر میں چاروں طرف جہاں دیکھو، کوئی نہ کوئی چیز لٹکائی ہوئی ہے، یعنی اگر ان ساری چیزوں کو جمع کیا جائے تو ہزاروں کی مالیت ہوجائے گی، اور وہ سب کسی کام کی نہیں ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ باتوں کے اندر لایعنی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر آپ وہ بات نہ کہیں اور خاموش رہیں تو اس پر آپ کو کوئی گناہ نہ ہو، اور حال و مستقبل کے اعتبار سے دین و دنیا کا کوئی نقصان و ضرر بھی نہ ہو؛ ایسی بات لایعنی کے قبیل سے ہے۔ اور جس بات کے بولنے میں گناہ ہے، وہ تو گناہ ہی ہے، اس کو تو چھوڑنا ہی ہے۔ لیکن جس بات میں دنیا و آخرت کا کوئی فائدہ نہ ہو، اور اس پر کوئی گناہ بھی نہ ہو؛ ایسی بات لایعنی ہے۔

چنانچہ مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ کہیں سفر پر گئے تھے، وہاں سے واپس آ کر وہاں کے حالات بیان فرماتے ہیں کہ فلاں جگہ گیا، وہاں یہ جگہ دیکھی، اور وہ مکان دیکھا اب اگر یہ سب نہ بیان کرتے تو کیا فرق پڑتا؟ یہ بھی از قبیل لایعنی ہے۔ ان باتوں میں مشغول رہ کر آپ نے اپنی زندگی کے قیمتی اوقات کو ضائع اور برباد کیا، اور جن اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کر کے آپ جنت میں اپنے لئے درخت لگوا سکتے تھے، محل بنوا سکتے تھے، وہ قیمتی اوقات ضائع ہو گئے۔ اس لئے کہ بہت سے اذکار وہ ہیں جن کے متعلق حدیثِ پاک میں فضیلتیں آئی ہیں کہ اس کے پڑھنے سے جنت میں محل بن جاتا ہے اور درخت لگ جاتے ہیں سبحان اللہ کہنے سے ایک درخت لگتا ہے۔ الحمد للہ کہنے سے ایک درخت لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے معراج کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ اپنی امت کو میرا سلام کہنا اور ان سے کہنا کہ جنت تو چٹیل میدان ہے، اس کے درخت سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر ہیں۔ یعنی آدمی جتنی مرتبہ ان کلمات کو کہے گا، اتنے درخت اس کے لئے لگ جائیں گے۔ اسی لئے ہمارے اسلاف اپنی زندگی کے ایک ایک

منٹ کو قیمتی سمجھا کرتے تھے، اور اس سے آخرت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اب آپ اپنے سفر کے جو حالات بیان کریں گے اس میں چاہے مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں، کوئی بڑائی بیان نہ کریں، جو چیزیں دیکھی ہیں صرف انہیں کو بیان کریں، یعنی اس میں گناہ کی کوئی بات نہیں ہو رہی ہے؛ تب بھی اپنے وقت کو اس میں استعمال کر کے آپ نے اپنا نقصان تو کیا۔

ایک آدمی اپنا دامن موتیوں اور ہیرے جواہرات سے بھر سکتا ہے، اس کے بجائے وہ اس میں ڈھیلے بھرتا ہو؛ تو اس کو نقصان نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے؟ ایسے ہی آپ ان اوقات کو قرآنِ پاک کی تلاوت کر کے، اللہ کے ذکر اور اس کی یاد میں مشغول ہو کر، نیکی کی باتوں اور کار آمد چیزوں میں مشغول ہو کر جن کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ اِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوْفٍ أَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ بہت کچھ نیکیاں حاصل کر سکتے تھے، اگرچہ ان باتوں میں گناہ کا ایک لفظ بھی نہیں ہے، اس کے باوجود اپنے آپ کو نقصان میں تو ڈالا ہی ہے۔ اسی لئے اس کو لایعنی کہا گیا ہے۔

ورنہ اگر کوئی گناہ کی بات ہے تو اس کے نقصان ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے مثلاً کوئی آدمی کسی کی غیبت کرتا ہے، کسی پر تہمت لگاتا ہے، کسی کے ساتھ جھگڑا کرتا ہے، تو اس میں تو گناہ ہونے ہی والا ہے۔ بلکہ غیر ضروری سوالات بھی گناہ تک پہنچانے والے ہیں۔

﴿تمہارا روزہ ہے؟ یہ سوال بھی لایعنی ہے﴾

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مثلاً آپ نے کسی سے عبادت کے متعلق سوال

کردیا کہ تمہارا روزہ ہے؟ تو یہ بھی لایعنی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر وہ جواب میں کہے گا: ہاں۔ تو ''ہاں'' کہنے میں ہوسکتا ہے کہ ریا کو دخل ہو جائے، گویا آپ اس کو ریا میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بنے اور ریا تو حرام کام ہے۔ ایک آدمی کو حرام کام میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن کر آپ بھی گناہ میں شریک ہوگئے۔ اور فرض کرلو کہ جواب دینے میں اس کے دل میں ریا نہیں آئی، تب بھی جو عبادت چھپ کر کی جاتی ہے، اس کے اندر ظاہر کر کے کئے جانے کے مقابلہ میں فضیلت زیادہ ہے۔ تو اس کی عبادت کے فضیلت والے پہلو کو تو آپ نے ختم ہی کردیا۔ یہ تو اس وقت ہے جب کہ اس کا روزہ ہے اور وہ جواب میں ''ہاں'' کہے۔

اور اگر اس کا روزہ ہے اور وہ ''نا'' کہے گا تو اس کو جھوٹ میں مبتلا کرنے والے بن جاؤ گے۔

اور اگر وہ جواب نہیں دیتا بلکہ خاموشی اختیار کرتا ہے تو گویا وہ آپ کے ساتھ استحقار کا (آپ کو معمولی سمجھنے کا) معاملہ کررہا ہے، کہ آپ سوال کررہے ہیں اور وہ جواب نہیں دیتا۔

اور اگر جواب دینے میں وہ یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا کہ میرا روزہ ہے، تو اس دفاع کے لئے بات بنانے میں اس کو مشقت میں ڈالو گے؛ تو یہ اس کو تکلیف دینا ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک عبادت کے لئے کیا جانے والا آپ کا ایک سوال بھی آدمی کیلئے مصیبت کا ذریعہ بن گیا۔ اسی لئے ہمارے اسلاف کے یہاں ان باتوں کا بڑا اہتمام تھا

﴿زبان کے متعلق اکابر کے خیالات﴾

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے منہ میں کنکر رکھ لیا کرتے تھے، تاکہ غیر ضروری بات زبان سے نہ نکل جائے۔ بہت سی مرتبہ وہ اپنی زبان کو کھینچ کر اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کرتے تھے کہ یہی ہے جس نے مجھے مصیبت میں ڈالا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں کہ طویل جیل میں ڈالے جانے کے سب سے زیادہ لائق تو یہ زبان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اگر قید میں رکھنے کے قابل ہے تو وہ زبان ہے، اسی کو کنٹرول کرنا چاہیے

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ﴿مَا النَّجَاۃُ یَا رَسُوْلَ اللہِ؟﴾ اے اللہ کے رسول! کیا چیزیں دنیا اور آخرت میں نجات کا ذریعہ ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین باتیں بتلائیں ان میں پہلی بات یہ ہے: ﴿أَمْلِکْ عَلَیْکَ لِسَانَکَ﴾ اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اس کو قابو میں رکھنے ہی کے واسطے تدبیریں اختیار کیا کرتے تھے۔

حضرت طاؤس رحمۃ اللہ علیہ تابعی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میری زبان تو درندہ ہے، مَیں اگر اس کو چھوڑ دوں گا تو یہ مجھے کھا جائے گا۔ ان حضرات کے یہاں زبان کی یہ خطرناکی تھی۔

حضرت منصور بن معتمر رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے محدث ہیں ان کے متعلق لکھا ہے کہ چالیس سال تک انہوں نے عشاء کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی۔

ایک اور بزرگ کے متعلق لکھا ہے کہ بیس سال تک انہوں نے دنیا کی کوئی بات نہیں کی۔ جب صبح ہوتی تھی تو قلم کاغذ اور دوات اپنے پاس رکھ لیا کرتے تھے، جو بولتے تھے اس کو لکھ لیتے تھے، اور شام کو وہ دیکھ کر اپنا محاسبہ کرتے تھے کہ آج مَیں نے کوئی غیر ضروری بات تو نہیں کی۔ لایعنی سے اپنے آپ کو بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے، بلکہ اگر کوئی غیر ضروری بات زبان سے نکل گئی تو وہ حضرات باقاعدہ اس پر اپنے آپ کو سزا دیا کرتے تھے

حسان بن ابی سنان رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں ان کے متعلق لکھا ہے

کہ وہ ایک جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں ایک نیا مکان بنا ہوا تھا، اس کو دیکھ کر پوچھا کہ یہ کب بنا؟ یہ بات بولنے کو تو بول گئے، اس کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یہ تو ایک غیر ضروری سوال ہے جو میری زبان سے نکلا ہے۔ پھر وہ اپنے نفس کو ملامت کرنے لگے کہ تجھے کیا پڑی ہے کہ یہ کب بنا؟ تو اس میں اپنے آپ کو کیوں ڈالتا ہے؟ تو نے ایک غیر ضروری بات کر کے اپنا نقصان کیا ہے۔ مَیں ایک سال تک روزے رکھ کر تجھے سزا دوں گا۔

رباح قیسی رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ گزرے ہیں وہ ایک دوسرے بزرگ کی ملاقات کے لئے عصر کے بعد ان کے گھر گئے۔ پوچھا: وہ ہیں؟ گھر والوں نے بتلایا کہ سو رہے ہیں تو انہوں نے کہا: یہ کوئی سونے کا وقت ہے؟ ابھی کیوں سو رہے ہیں؟ یہ کہہ کر واپس لوٹے۔ یہ بھی بڑے آدمی تھے اس لئے گھر والوں نے ان کے پیچھے آدمی دوڑایا کہ اگر آپ کہیں تو ہم ان کو جگا دیں۔ وہ آدمی بہت دیر کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا کہ وہ تو ایسی باتوں میں مشغول تھے کہ میری بات کی طرف توجہ ہی نہیں کی، وہ قبرستان کی طرف جا رہے تھے، مَیں پیچھے پیچھے تھا اور وہ اپنے نفس کو خطاب کر کے کہہ رہے تھے کہ تجھے کیا پڑی ہے کہ کوئی آدمی کس وقت سو رہا ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ کس کو کب سونے کی ضرورت ہے۔ تو نے کیسے کہہ دیا کہ یہ کوئی سونے کا وقت ہے۔ اور تجھے کس نے اختیار دیا تھا؟ ہر آدمی اپنے لئے فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس کو سونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تو نے بلاوجہ اپنے آپ کو ایک غلط چیز میں لگایا۔ اب مَیں ایک سال تک زمین پر نہیں لیٹوں گا۔

حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک صاحب آئے اور ان کے کمرہ کے اوپر نظر کی تو دیکھا کہ کمرہ کی کڑی (جس کو گجراتی میں (વળી) کہتے ہیں) ٹوٹی ہوئی تھی۔

انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ کب ٹوٹی ؟انہوں نے کہا کہ مَیں نے بیس سال سے اوپر دیکھا ہی نہیں ہے۔گویا انہوں نے ایسی فضول نظر سے بھی اپنے آپ کو بچایا تھا۔اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر ہمیں چلتا ہی نہیں ہے۔

یہ حضرات اپنے آپ کوایسی غیر ضروری چیزوں سے بچانے کا بڑا اہتمام کرتے تھے

بہر حال! ایسے اقوال، افعال اور اشیاء جن میں دنیا یا آخرت کا کوئی فائدہ نہیں ہے ان سب کو''لایعنی'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، ایسی چیزوں سے بچنا بھی بہت ضروری اور اہم ہے اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں:﴿مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَا یَعْنِیْهِ﴾

یہاں دیکھو! لایعنی کو عام رکھا ہے، یہ بھی نبی کریم ﷺ کے کلام کی بلاغت ہے کہ صرف بات کے ساتھ مخصوص نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ ''لایعنی'' کو چھوڑ دے۔اب لایعنی بات ہوتو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے، لایعنی فعل اور کام ہوتو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے، لایعنی چیز ہوتو اس کو بھی چھوڑنا چاہیے۔کوئی بھی لایعنی ہو اس سے اپنے آپ کو دور رکھنے کا اہتمام کیا جائے

بہر حال! یہ ارشاد نبی کریم ﷺ کے جامع کلمات میں سے ہے اور آپ ﷺ کی ان تعلیمات اور ارشادات میں سے ہے جس میں الفاظ بہت کم ہیں اور تعلیم بہت بڑی دی گئی ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر مجھے آپ کو عمل کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے

﴿اقتباس﴾

جو عورتیں تمہارا حکم نہیں مانتیں، تمہاری بات کے خلاف کرتی ہیں؛ ان کی اصلاح کے لئے کیا طریقہ اپنایا جائے؟

پہلے درجہ پر تو قرآنِ مجید فرماتا ہے: ﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ اس کو نصیحت کرو اور سمجھاؤ، فہمائش سے کام لو۔ اگر اس سے کام چل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر آگے اور کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اس سے کام نہیں چلا تو ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ بستر الگ کر دو۔ یہ بھی بڑا مؤثر علاج ہے۔

اور تیسرا درجہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ان کی پٹائی کر سکتے ہو۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے پٹائی کو پسند نہیں فرمایا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ:-

وہ آدمی کیسا ہے کہ دن میں تو اپنی بیوی کی پٹائی کرے، اور رات میں اسی کو اپنے پہلو میں لے کر اس سے سکون حاصل کرے۔ بھلا یہ کوئی شرافت کی بات ہے؟ یعنی ایک شریف آدمی کی شرافت اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ دن میں پٹائی کر کے جس کا دل دُکھایا ہے، رات کو اسی کو پہلو میں لے کر سو رہا ہے اور اس سے سکون حاصل کر رہا ہے اس لئے حضور ﷺ پٹائی کو پسند نہیں فرماتے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿مراقبہ ۴﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد.

عن عمر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لَایُسْأَلُ الرَّجُلُ فِیْمَاضَرَبَ اِمْرَأَتَہٗ. (رواہ أبوداؤد وغیرہ)

اس باب کاعنوان ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات کادھیان اوراستحضار رکھتے ہوئے اس بات اہتمام کرے کہ جس موقعہ پر جوحکم اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے؛اس کوبجالانے کی پوری کوشش ہو۔اوامر کوانجام دے،اورنواہی سے بچنے کااہتمام کرے۔گویا اس تصورکواپنے دل ودماغ میں ہروقت تروتازہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں؛اسی کو مراقبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ضمن میں یہ آخری روایت پیش کی ہے

﴿میاں بیوی کے آپسی معاملات میں دخل نہ دیا جائے﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاارشادنقل کیا ہے۔یہاں ابوداؤد شریف کے حوالے سے اس روایت کوپیش کیا ہے جومختصر ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس روایت کے نقل کرنے والے حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ ہیں جوصحابی ہیں۔

ابن ماجہ شریف میں یہ روایت تفصیل سے ہے۔حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں مہمان ہوا۔دیر گئے رات کودیکھا کہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بیوی کی پٹائی کررہے ہیں۔مَیں اٹھااوردونوں کا بیچ بچاؤ کردیا،معاملہ رفع دفع ہوگیا۔جب مَیں اپنے بستر کی طرف واپس آنے لگاتو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دیکھو! میری ایک بات سنو۔مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشادفرماتے ہوئے سنا ہے کہ کوئی آدمی اگر اپنی بیوی کی پٹائی کرے؛تواس سے وجہ نہ پوچھی جائے کہ آپ نے اپنی بیوی کی پٹائی کیوں کی۔(ابن ماجہ شریف،۱۹۷۶)

دراصل بات یہ ہے کہ میاں بیوی کے آپسی معاملات میں بہت ساری باتیں وہ ہیں جن کا دوسروں کے سامنے ظاہر کرنا؛حیاء اورشرم کے ساتھ ساتھ رازدارانہ تعلقات کے تقاضے کے بھی خلاف ہے۔شوہرکواپنی بیوی کی طرف سے ناگواری کی بعض باتیں ایسی پیش آسکتی ہیں جس کی وجہ سے اس کوناراضگی ہو،اوروہ اس پر بیوی کوتادیب اورسزادینا چاہتا ہے، لیکن وہ چیز ایسی نہیں ہے جس کا دوسرے کے سامنے اظہار کیا جاسکے۔اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ایک اصولی بات بتلادی کہ اگرشوہر بیوی کی پٹائی کررہاہےتواس سے یہ نہ پوچھاجائے کہ تونے اس کی پٹائی کیوں کی۔لیکن یہ تو ایک عام حکم ہے۔اگرمعاملہ آگے بڑھ جائے اوریہ بات حاکم کی عدالت میں پہنچےاورحاکم واقعہ کی تحقیق اورتفتیش کے طورپر پوچھنا چاہے؛تواس کی اجازت ہے۔

کیا بیوی کی پٹائی جائز ہے؟

رہامعاملہ پٹائی کا کہ شوہر بیوی کی پٹائی کرسکتا ہے یانہیں؟اوراگرکرسکتا ہےتو کب کرسکتا ہے؟اورکن صورتوں میں اس کواجازت ہے؟تواس سلسلے میں قرآنِ پاک ہی میں اللہ تعالیٰ نے پٹائی کرنے اورنہ کرنے والے مسئلے کوواضح کردیا ہے۔

ابوداؤد شریف ہی کی ایک دوسری روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿لاتَضرِبُوُا اِمَآءَ اللہِ﴾ اللہ کی بندیوں کی پٹائی نہ کرو۔ گویا عورتوں کی پٹائی کرنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمادیا۔ آپ ﷺ کی اس ہدایت پر کچھ وقفہ گذرا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: ﴿ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلٰی أَزْوَاجِهِنَّ﴾ (سنن ابوداؤد، حدیث نمبر ۱۸۳۴) عورتیں اپنے شوہروں پر جری اور بے باک ہوگئیں یعنی آپ نے پٹائی سے منع کردیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو معلوم ہوگیا کہ اب ہم کچھ بھی کریں، ہمارا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے، تو شوہروں کے ساتھ ان کو جو اطاعت وفرمانبرداری کا معاملہ کرنا چاہیے، اور ان کا جو ادب واحترام ملحوظ رکھنا چاہیے؛ وہ بات نہیں رہی۔

انسان کے مزاج کا تقاضہ ہے کہ وہ ہمیشہ اسی کی بات مانتا ہے، جس کی طرف سے کسی قسم کا دباؤ اور سختی کا اندیشہ ہو۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا؛ وہاں آدمی جری ہوجاتا ہے۔ بعد میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے پٹائی کی اجازت بھی ملی۔ خیر! یہ انسان کا ایک مزاج ہے۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ایک اللہ والے کا قصہ لکھا ہے، وہاں ضمناً ایک بات فرمائی ہے کہ اللہ والوں کی بیویاں ''ڈیڑھ خصم'' ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ یہ بے چارے ہمیشہ اسی فکر اور ادھیڑ بن میں ہوتے ہیں کہ ہماری طرف سے ان پر کوئی زیادتی نہ ہوجائے، اسی لئے ہمیشہ ان کی رعایت کا اہتمام کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سر پر سوار ہوجاتی ہیں۔ ویسے ایک روایت بھی ہے اگرچہ وہ قوی نہیں ہے جس میں یہ ہے: ﴿یَغْلِبْنَ الْکِرَامَ وَیَغْلِبُهُنَّ اللِّئَامُ﴾ (عنایہ شرح ہدایہ ۲/۱۵۴) شریفوں پر یہ غالب آتی ہیں اور کمینے ان پر غالب آتے ہیں۔ اور آج کل تو ماشاء اللہ سب ہی شریف ہیں۔ بہر حال! اللہ والوں کے یہاں ان کے حقوق کا بڑا اہتمام اور رعایت ہوا کرتی ہے اس لئے وہاں یہ بات پائی جاتی ہے۔

خیر! جب نبی کریم ﷺ کی طرف سے یہ ہدایت جاری کی گئی کہ ان کی پٹائی مت کرو تو ظاہر ہے کہ صحابہ کیسے پٹائی کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی طرف سے شوہروں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہونے لگی، اور جرأت و بے باکی کا مظاہرہ ہونے لگا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر نبی کریم ﷺ سے شکایت کی۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے ان کی پٹائی کی اجازت دی۔ دوسرے ہی دن حضراتِ ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے یہاں عورتوں کی بھیڑ لگ گئی۔ ہر ایک اپنے شوہروں کی شکایت لے کر حاضر ہوئیں اور بتلانے لگیں کہ مجھے یہاں مارا، یہاں مارا اور یہ ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہاں عام دستور یہی تھا کہ کسی عورت کو کوئی بات پیش کرنی ہوتی تو ازواجِ مطہرات میں سے کسی کے واسطے سے اپنی بات نبی کریم ﷺ تک پہنچایا کرتی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ کے پاس یہ شکایتیں پہنچیں تو آپ ﷺ نے اپنے بیان میں فرمایا: بھائی! آج تو ہمارے گھروں پر عورتوں کی بھیڑ لگ گئی، لہٰذا جو لوگ اپنی بیویوں کی پٹائی کرتے ہیں؛ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

﴿ بیویوں کی سرزنش کی قرآنی ترتیب ﴾

بہر حال! قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے اس مسئلے کو صاف کر دیا ہے: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ. فَاِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَاتَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ سَبِیْلاً﴾ جن عورتوں کی طرف سے زیادتی، نافرمانی اور سرکشی کا تمہیں اندیشہ ہے یعنی جو تمہارا حکم نہیں مانتیں، تمہاری بات کے خلاف کرتی ہیں؛ ان کے لئے کیا طریقہ اپنایا جائے؟

﴿ عورتوں کی اصلاح کا پہلا درجہ ﴾

پہلے درجہ پر تو قرآنِ مجید فرماتا ہے: ﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ اس کو نصیحت کرو اور سمجھاؤ،

فہمائش سے کام لو۔ اگر اس سے کام چل جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ پھر آگے اور کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ﴿اَلسَّیْفُ آخِرُ الْحِیَل﴾ سختی کا معاملہ تو آخر میں ہوا کرتا ہے، اگر اس سے کام چل گیا تو فبہا۔

﴿عورتوں کی اصلاح کا دوسرا درجہ﴾

اگر اس سے کام نہیں چلا تو ﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ بستر الگ کردو۔ یہ بھی بڑا مؤثر علاج ہے۔ عام طور پر مردوں سے یہ تو ہوتا نہیں ہے۔ اگر یہ علاج اپنائیں تو پٹائی کی ضرورت پیش ہی نہیں آئے گی۔ مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ اس علاج میں آدمی کو خود بھی کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے نا، اس لئے لوگ اس کو اختیار کرنا نہیں چاہتے۔ حالانکہ یہ بڑا مؤثر علاج ہے۔ اس لئے قرآنِ پاک کی جو ترتیب ہے اس کو اپنایا جائے۔ نبی کریم ﷺ نے خود بھی اس پر عمل کیا ہے۔

﴿حضورِ اکرم ﷺ کا ازواجِ مطہرات سے ناراضگی کا واقعہ﴾

بخاری شریف میں روایت موجود ہے۔ ازواجِ مطہرات میں سے بعضوں کی طرف سے بہت سارے معاملات جمع ہو گئے تھے۔ ایک موقعہ پر یہ ہوا تھا کہ سب نے مل کر اپنے نفقات میں زیادتی کا مطالبہ پیش کیا اور حضور ﷺ کے سامنے اپنی ڈیمانڈ کے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔ اسی درمیان حضور ﷺ کی آواز پر ان کی آواز بلند ہوگئی۔ اور بھی معاملات پیش آئے تھے۔ جب بہت ساری چیزیں جمع ہوگئیں؛ تو نبی کریم ﷺ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے قسم کھالی کہ مَیں ایک مہینہ تک تم میں سے کسی کے قریب نہیں آؤں گا۔ آپ کا ایک بالا خانہ تھا سب کو چھوڑ کر آپ اس میں چلے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ منورہ میں یہ افواہ پھیل گئی کہ

نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی۔ اس واقعہ سے مسلمانوں پر بڑا اثر ہوا تھا۔ بعضوں پر تو گریہ و بکا طاری ہو گیا تھا کہ اب کیا ہو گا۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۴۵۳۲)

علمی فوائد سے مستفید ہونے کا ایک طریقہ

بخاری شریف میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ واقعہ منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرا ایک پڑوسی تھا جس سے مَیں نے یہ معاملہ کر رکھا تھا کہ ایک دن تم نبی کریم ﷺ کی مجلس میں حاضری دو گے، اور وہاں جو باتیں حضور ﷺ سے سنو گے، وہ مجھے بیان کرو گے۔ اور ایک دن مَیں حاضری دوں گا، اور وہاں جو باتیں حضور ﷺ سے سنوں گا، وہ مَیں تم کو بتلاؤں گا۔ ایسا اس لئے کیا تھا تاکہ ہر ایک اپنا کام کاج بھی کر سکے، کسی کے کاروبار، کھیتی باڑی، تجارت وغیرہ کا بھی حرج نہ ہو، اور نبی کریم ﷺ کی تعلیمات و ارشادات بھی ہر ایک کو پہنچتے رہیں۔ علم حاصل کرنے اور علمی فوائد سے مستفید ہونے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز جب میرے پڑوسی کی باری تھی، رات کے وقت وہ آیا اور زور زور سے میرا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ مَیں نے پوچھا کہ بھائی! کیا بات ہے؟ کیا غسانی آ گئے؟

اس زمانہ میں شام کی طرف سے مدینہ منورہ پر حملہ کا اندیشہ تھا اور ہر وقت ہم سہمے ہوئے رہتے تھے کہ پتہ نہیں کب وہ آ کر حملہ کریں گے۔ جب وہ ساتھی زور زور سے میرا دروازہ ٹھوک کر پوچھ رہا تھا کہ عمر ہیں؟ تو اس کی اس بے صبری کے ساتھ دروازہ ٹھوکنے کی وجہ سے مَیں سمجھا کہ وہ آ گئے ہیں، اس لئے مَیں نے پوچھا کہ کیا غسانی آ گئے؟ تو اس نے کہا کہ اس سے بھی زیادہ اہم معاملہ پیش آ گیا ہے۔ مَیں نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

نبی کریم ﷺ نے اپنی بیویوں سے علاحدگی اختیار کرلی ہے۔مَیں نے پوچھا: کیا طلاق دے دی؟اس نے کہا: یہ تو معلوم نہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے پہلے ہی سے یہ اندیشہ تھا کہ ایسا کچھ ہوگا۔یہ اس لئے کہہ رہے ہیں کہ اس سے پہلے خود ان کا ایک معاملہ پیش آچکا تھا۔

﴿مکی مدنی عورتوں کے مزاج کا فرق﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم مکہ کے رہنے والے قریشی لوگ عورتوں کو کوئی زیادہ حیثیت دیتے نہیں تھے،اور نہ ان کو یہ حق تھا کہ وہ ہمارے معاملات میں دخل دیں اور نہ وہ ہمارے سامنے کچھ بول سکیں۔اس کے برخلاف جب ہم ہجرت کرکے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے تو یہاں دیکھا کہ عورتوں کا اپنے شوہروں پر بڑا اثر ورسوخ ہے۔جب ہماری عورتیں یہاں آئیں تو انہوں نے بھی اپنی سہیلیوں سے سیکھنا شروع کیا۔یہ تو ہوتا ہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں اپنے کسی معاملہ میں سوچ رہا تھا،اور میری بیوی کو پتہ تھا کہ مَیں کس سلسلے میں متفکر ہوں۔اس نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ یوں کرلو؛ تو مناسب ہے۔گویا اس نے بغیر پوچھے ہی مجھے رائے دی۔اس کے اس طرح بولنے پر مجھے طیش آگیا اور مَیں نے کہا: اچھا! تمہاری یہ جرأت ہوگئی کہ میرے معاملہ میں مجھے مشورہ دینے لگی؟ جب مَیں نے اس کو ڈانٹا تو اس نے کہا: اے عمر! تم بھی عجیب آدمی ہو،مَیں نے ایک بھلی بات کہی جو تمہارے خیر کی ہے؛اس پر تم ناراض ہورہے ہو؟اور نبی کریم ﷺ کی ازواج کبھی حضورِ اکرم ﷺ سے کسی بات پر ناراض ہوجاتی ہیں تو کئی کئی دن تک حضور سے بات نہیں کرتیں،کٹّی کرلیتی ہیں۔مَیں نے کہا: اچھا! ایسا ہوتا ہے؟ تب تو وہ بڑے خسارہ میں ہیں۔ ان کو تو سمجھانا چاہیے۔

میری بیٹی حفصہ بھی ازواجِ مطہرات میں سے تھی، اس لئے مجھے پہلے اس کی فکر ہوئی لہٰذا مَیں نے تو چادر لی اور فوراً بیٹی کے پاس گیا اور ان سے پوچھا کہ ایسا ہوتا ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ہوتا ہے۔ مَیں نے کہا: ایسا مت کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے رسول کی ناراضگی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں اور تمہارا بیڑا غرق ہو جائے۔ اگر تم کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دینا، مَیں لا دیا کروں گا۔ تم خود حضور ﷺ سے ایسا کوئی مطالبہ مت کیجیو۔

ان کو سمجھا کر مَیں ازواجِ مطہرات میں سے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا۔ ان سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کچھ رشتہ داری تھی۔ جب ان کے پاس جا کر مَیں نے سمجھانے کیلئے بات شروع کی تو انہوں نے تو میرے حوصلے ہی پست کر دیے۔ انہوں نے کہا: اے عمر! تمہارا بھی عجیب حال ہے؟ تم ہر چیز میں دخل دیتے ہو؟ کیا ہماری اصلاح اور درستگی کیلئے نبی کریم ﷺ کافی نہیں ہیں کہ آپ آ کر ہمیں نصیحت کرتے ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے ایسا سخت جواب دیا کہ مَیں تو وہاں سے لوٹ ہی آیا، آگے کسی اور کے پاس گیا ہی نہیں۔

کیا نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دی؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ سب ہوا تھا، جب اپنے ساتھی سے یہ سنا تو مَیں مسجدِ نبوی میں گیا۔ حضور ﷺ نے تو علاحدگی اختیار کر لی تھی۔ جب مَیں مسجدِ نبوی میں پہنچا تو دیکھا کہ کچھ صحابہ منبر کے پاس بیٹھے ہوئے اس واقعہ کی اہمیت کی وجہ سے رنج میں رو رہے ہیں۔ مَیں نے ان سے پوچھا: کیا نبی کریم ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی؟ انہوں نے کہا: ہمیں تو پتہ نہیں ہے لیکن حضور اکرم ﷺ بالاخانہ میں تشریف فرما ہیں۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مَیں وہاں گیا تو دیکھا کہ بالاخانہ کے دروازے پر ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا۔ مَیں نے

اس سے کہا کہ میرے لئے حضورِ اکرم ﷺ سے اجازت حاصل کرلو کہ عمر آئے ہیں اور اجازت چاہتے ہیں۔ وہ بچہ اندر گیا اور واپس لوٹ کر کہنے لگا کہ مَیں نے کہا لیکن حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مَیں وہاں سے لوٹ کر مسجد میں آیا اور ان لوگوں کے پاس کچھ دیر بیٹھا۔ لیکن میری طبیعت میں چین نہیں تھا اس لئے مَیں دوبارہ گیا اور اس بچہ سے کہا کہ میرے لئے اجازت چاہو۔ پھر اس نے آکر بتلایا کہ مَیں نے کہا لیکن حضورِ اکرم ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تیسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب چوتھی مرتبہ گیا تو اس نے آکر یہی کہا۔ جب مَیں لوٹ رہا تھا تو اس نے دوڑ کر آکر کہا کہ حضور ﷺ نے اجازت دے دی ہے، آپ اندر جا سکتے ہیں۔ مَیں اندر گیا اور آپ کے دروازے پر کھڑے ہو کر پہلا سوال تو مَیں نے یہ کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ مارے خوشی کے مَیں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ گویا یہ مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اس کے بعد مَیں نے حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر یعنی آپ کا مزاج اور موڈ دیکھ کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں کچھ بات کر سکتا ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ہاں! کر سکتے ہو۔ تو مَیں آگے بڑھا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے تو یہ ڈر ہی تھا کہ ایسا کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اور پھر وہ سارا واقعہ بیان کیا کہ پہلے مَیں نے اپنی بیٹی کو سمجھایا اور پھر جب حضرت ام سلمہ والا واقعہ سنایا اور ان کا جواب سنایا تو حضور بھی ہنسنے لگے۔ پھر اور بھی باتیں ہوئیں۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۲۸۸)

خیر! عورتوں کی اصلاح کا یہ دوسرا درجہ ہے۔ دیکھو! یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے علاحدگی اختیار کرلی۔ بستر الگ کرنے کی دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ گھر میں رہتے ہوئے ہی اپنا بستر الگ کرلے، اور دوسری شکل یہ ہے کہ گھر میں سوئے ہی نہیں بلکہ دوسری جگہ چلا جائے۔ جیسے

مسجد میں چلا جائے، یا دوسرے مکان میں اور دوسرے فلیٹ میں سونا شروع کر دے۔ اب یہ تو موقع اور محل کے اعتبار سے اسی کو فیصلہ کرنا ہے کہ گھر میں رہتے ہوئے علاحدگی اختیار کرنے میں زیادہ اثر ہے، یا دوسری جگہ چلے جانے میں زیادہ اثر ہے۔

﴿عورتوں کی اصلاح کا تیسرا درجہ﴾

باری تعالیٰ آگے تیسرا درجہ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ ان کی پٹائی کر سکتے ہو۔ یہ تو تیسرا اور آخری درجہ ہے۔ اسی لئے مَیں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ دوسرے نمبر کا علاج بستر الگ کرنے والا بہت مؤثر ہے، لیکن لوگ اس پر اپنی ہی کمزوری کی وجہ سے عمل نہیں کرتے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ اگر دوسرے پر عمل کیا اور اثر نہیں ہوا تو پھر تیسرے کا نمبر آتا ہے، لیکن لوگ اس ترتیب پر عمل نہیں کرتے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی کیسا ہے کہ دن میں تو اپنی بیوی کی پٹائی کرے، اور رات میں اسی کو اپنے پہلو میں لے کر اس سے سکون حاصل کرے۔ بھلا یہ کوئی شرافت کی بات ہے؟ یعنی ایک شریف آدمی کی شرافت اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ دن میں پٹائی کر کے جس کا دل دُکھایا ہے، رات کو اسی کو پہلو میں لے کر سو رہا ہے اور اس سے سکون حاصل کر رہا ہے۔ اس لئے حضور ﷺ پٹائی کو پسند نہیں فرماتے۔

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا﴾ اس کے بعد اگر وہ تمہاری اطاعت کر لیتی ہے اور تمہاری بات ماننے لگتی ہے؛ تو پھر آگے اور کوئی اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿معاشرتی امور میں نبی کریم ﷺ کا عملی نمونہ﴾

شراح فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی تشریح کے متعلق خود قرآنِ پاک نے یہ بتلایا

ہے:﴿وَأَنزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ قرآن کی تشریح نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ کا عمل ہے۔لہٰذا معاشرتی امور میں تو نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ عمل کر کے بتلایا۔یہاں بھی دیکھئے کہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی ترتیب پر آپ ﷺ نے کیسے عمل کیا۔ اس آیت میں تین باتیں کہی گئی ہیں۔نمبرایک ﴿فَعِظُوْھُنَّ﴾ اس پر بھی آپ نے عملی نمونہ پیش فرمایا۔اور نمبر دو ﴿وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ اس پر عمل کرنے کے معاملہ میں بھی آپ نے عملی نمونہ پیش فرمایا۔لیکن تیسری بات پر آپ نے کوئی عملی نمونہ پیش نہیں فرمایا۔ہاں!زبان سے اجازت دی ہے۔

مسلم شریف میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت حجۃ الوداع کے موقع کی موجود ہے اس میں یہ ہے کہ اگر نصیحت بھی کارگر نہ ہو اور بستر الگ کرنے سے بھی کام نہ چلے تو پھر ان کو ہلکی مار جس سے بدن پر نشان نہ آئیں؛ مار سکتے ہو۔(مسلم شریف،۱۶۲۸) آپ نے اپنے ارشاد سے وضاحت تو فرمائی،لیکن عملی طور پر ایسا کر کے نہیں بتلایا۔گویا آپ پٹائی والی شکل کو پسند نہیں فرماتے تھے۔

ویسے نبی کریم ﷺ کے پاکیزہ اخلاق کا تقاضہ بھی یہی تھا۔آپ ﷺ کے شمائل میں ہے کہ آپ نے کبھی کسی کو مارا نہیں ہے،نہ کسی عورت کو،نہ کسی غلام کو،نہ کسی جانور کو۔لہٰذا علماء فرماتے ہیں کہ پٹائی کی اجازت تو ہے لیکن نبی کریم ﷺ کی نگاہوں میں یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے۔اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو اس طرح اپنی بیویوں کی پٹائی کرتے ہیں؛ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد بھی ہے:﴿خَیْرُکُمْ خَیْرُکُمْ لِأَھْلِہٖ وَأَنَاخَیْرُکُمْ لِأَھْلِیْ﴾ تم

میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہوں، اور مَیں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب میں سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کے صبر وضبط کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ازواجِ مطہرات کے معاملہ میں بھی آپ نے یہ چیز کر کے دکھلائی۔

تمہاری ماں کو غیرت آ گئی

بخاری شریف میں ایک واقعہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کے یہاں تھے۔ اس روایت میں نام کی تصریح نہیں ہے۔ لیکن شراح نے لکھا ہے کہ غالباً حضرت عائشہ ہی کے یہاں تھے۔ دوسری زوجۂ مطہرہ کے یہاں سے کھانے کی کوئی چیز آئی۔ انہوں نے پکائی تھی، ان کی خادمہ دینے کے لئے آئی۔ حضور ﷺ جس زوجہ کے یہاں تھے ان کو بڑی غیرت آئی کہ میرے گھر کی باری میں انہوں نے یہ کیوں بھیجا؟ بس انہوں نے جو ایک جھاپٹ ماری تو وہ سب گر گیا، پیالہ بھی ٹوٹ گیا اور کھانے کی جو چیز بھیجی گئی تھی وہ بھی بکھر گئی۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ گرا ہوا جمع کر رہے تھے اور فرما رہے تھے: ﴿غَارَتْ أُمُّکُمْ﴾ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۴۸۲۴) تمہاری ماں کو غیرت آ گئی۔ آپ اندازہ لگائیے کہ کیسا موقعہ تھا۔ ہے کوئی بڑے سے بڑا صبر وضبط کرنے والا؛ جو اس موقعہ پر کچھ نہ کرے؟ کچھ نہ کچھ تو بولے گا، یا کچھ نہ کچھ سزا دے گا۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے کچھ نہیں کیا، بلکہ ان کی طرف سے معذرت کرتے ہوئے آپ یہ فرماتے ہیں کہ تمہاری ماں کو غیرت آ گئی۔

یہاں غیرت کا مطلب یہ ہے کہ ہر عورت کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میرے شوہر کے ساتھ میرا جو معاملہ ہے اس میں کسی دوسرے کی شرکت نہ ہو، یہاں تک کہ سوکن کی شرکت

کو بھی وہ گوارا نہیں کرتی۔ حالانکہ جیسے یہ اس کی بیوی ہے وہ بھی اس کی بیوی ہے۔

بہر حال! یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا کہ آدمی اپنی بیوی کی پٹائی کرے تو اس بارے میں اس سے پوچھا نہ جائے، بشرطیکہ اس نے ان حدود و قیود کی رعایت کی ہو جو شریعت نے اس سلسلے میں بتلائی ہیں۔ اگر ان سے ہٹ کر کچھ کیا ہو؛ تو پھر اس کی کوئی رعایت نہ کی جائے گی، بلکہ اس سے باز پرس ہوگی۔

بیویوں کی پٹائی کے حدود و قیود

اب وہ حدود و قیود کیا ہیں؟ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ میں یہاں فقہاء کی ہی بات کو آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ شوہر کو اپنی بیوی پر کن کن چیزوں میں اختیار حاصل ہے؟

شوہر کی عزت و آبرو اور خود اس کے نفس اور شوہر کے مال و زر کی حفاظت اور شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری کے معاملہ میں اگر عورت کی طرف سے کوئی کوتاہی ہو؛ تو شوہر تادیب یعنی معمولی سزا کے طور پر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔ اور وہ بھی اس صورت میں کہ بیوی کی طرف سے کوئی ایسا قصور پیش آوے کہ جس میں شریعت نے کوئی سزا مقرر نہ کی ہو۔ مثلاً عزت و آبرو کا معاملہ ہے کہ خدانہ کرے کہ عورت زنا کی مرتکب ہوگئی، اور زنا شرعی طور پر ثابت بھی ہوگیا تو وہاں شریعت کی طرف سے سزا مقرر ہے، وہی دی جائے گی۔ شوہر کو اپنی طرف سے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر شوہر مناسب سزا دے سکتا ہے۔ اس میں اتنا ضرور خیال رکھا جائے کہ سخت قسم کی پٹائی نہیں ہونی چاہیے۔

کن کن چیزوں میں شوہر بیوی کی پٹائی کر سکتا ہے؟ تو ان چیزوں میں سے ایک تو یہ

ہے کہ شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت اس کے لئے زیب وزینت کرے۔یعنی شوہر کے سامنے اچھے کپڑے پہن کر اور مزین ہو کر آوے، لیکن عورت اس کا اہتمام نہیں کرتی۔میلی کچیلی بھوتنی بنی رہتی ہے۔

﴿عورتوں کی اُلٹی چال﴾

عورتوں کا بھی عجیب مزاج ہے کہ اجنبیوں کے سامنے مزین ہو کر جائیں گی۔مثلاً گھر سے باہر نکلنا ہو تو کام دس منٹ کا ہوگا اور اس کے لئے تیاری ایک گھنٹہ تک کرے گی۔ اچھے کپڑے پہنے گی، زیورات سے آراستہ ہوگی، اور سب تیاری کرے گی۔بے چارہ شوہر؛ جس کے پیسوں سے یہ سب آیا ہے، کپڑے اور زیور اسی نے تو خرید کر دئے ہیں، زیب و زینت کا سامان بھی اسی کے پیسوں سے آیا ہے، وہ تو اس کا جلوہ دیکھنے کو ترستا ہی رہتا ہے، اور یہ عورت مزین ہو کر ساری دنیا کے سامنے آتی جاتی ہے۔یہ بھی عورتوں کی بڑی عجیب نفسیات ہے، جس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔شریعت نے عورت کو شوہر کے علاوہ کسی اور کے سامنے زیب وزینت کے ساتھ آنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

بلکہ حدیثِ پاک میں تو آتا ہے۔نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی عورت اگر خوشبو لگا کر اجنبیوں کے بیچ میں سے گذرتی ہے، تو وہ ایسی ایسی ہے یعنی زانیہ ہے۔(ترمذی ۲/۱۰۶) گویا اس کی خوشبو جب غیروں کی قوتِ شامّہ تک پہنچے گی، تو ان کے دل میں اس کی طرف شہوت کے جذبات بھڑکیں گے۔تو وہ عورت ان کے دلوں میں برے خیالات پیدا کرنے والی بنی، اس لئے اس پر اتنی سخت وعید ہے۔

اسی لئے عورت کو گھر سے باہر بے پردہ نکلنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ضرورت

کے موقع پر پردے اور حجاب کے ساتھ اور میلے کچیلے کپڑوں میں نکلنے کی اجازت ہے۔اس لئے مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ اگر شریعت کی ان ہدایتوں کا لحاظ کیا جائے تو عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا ہی بند ہو جائے۔اگر کوئی عورت گھر سے باہر نکلنے کی اجازت مانگے اور شوہر کہے کہ ان شرطوں کی رعایت کرتے ہوئے جانا ہو تو جاؤ۔تو عورت کہے گی کہ اگر ایسے ہی جانا ہے؛ تو پھر کون جاوے؟ چلو رہنے دو۔تو شوہر بھی کہہ دے کہ اچھا ٹھیک ہے، پھر تو باہر جانے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔

﴿ان صورتوں میں پٹائی کی اجازت ہے﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ عورت کو شوہر کے لئے زیب وزینت کرنا چاہیے، لیکن اگر وہ نہیں کرتی تو اس پر شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

دوسرا یہ کہ عورت اگر حیض ونفاس میں نہیں ہے، بلکہ پاک ہے۔اور بیمار بھی نہیں ہے۔اور شوہر چاہتا ہے کہ اس سے صحبت کرے لیکن وہ تیار نہیں ہوتی؛ تو اس صورت میں بھی شریعت نے اس کی پٹائی کرنے کی اجازت دی ہے۔

تیسرا یہ کہ کسی اجنبی کے سامنے اپنا چہرہ کھلا رکھ کر آتی ہے اور وہاں فتنہ کا اندیشہ ہے تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

چوتھے یہ کہ کسی معاملہ میں شوہر سے الجھ کر شوہر کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔اگر ایک دو لفظ ہی بولے ہیں تو کچھ نہ کرے۔لیکن زیادہ جری بن کر وہ لپٹ گئی اور اس نے شوہر کے کپڑے ہی پھاڑ ڈالے؛ تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

پانچویں یہ کہ کسی اجنبی سے بات کرتی ہے اور وہاں فتنہ کا اندیشہ ہے تو اس صورت

میں بھی شوہراس کی پٹائی کرسکتا ہے۔

چھٹے یہ کہ شوہر کے ساتھ کسی معاملہ میں الجھ رہی ہے اور جھگڑ رہی ہے اور زور زور سے بول رہی ہے۔یا شوہر سے اتنی زور سے بات کرتی ہے کہ اس کی آواز باہر اجنبیوں تک پہنچتی ہے؛ تو شوہر کو چاہیے کہ اس کو روکے۔اگر نہیں رکتی تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کرسکتا ہے۔

ساتویں یہ کہ کھانے پینے کی چیزیں اجنبیوں کو دیتی ہے۔اس میں ذرا تفصیل ہے، ایک تو یہ ہے کہ گھر میں کھانے کی جو چیزیں بنتی ہیں، وہ کسی مانگنے والے کو یا ضرورت مند کو دینے کا یا پڑوسی کے یہاں بھیجنے کا عرف اور رواج ہے۔مثلاً کچھ اچھا کھانا پکا، تو ایک پلیٹ پڑوسی کے یہاں بھی بھیج دی۔تو شریعت بھی اس کی تاکید کرتی ہے۔یا کوئی بھوکا فقیر اور مسافر آیا تو اس کو کچھ دے دیا۔تو عام طور پر جتنا دینے کا رواج ہے، اتنی ہی مقدار میں دیتی ہے تو اس کے لئے شوہر کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔یہ رواج اور عرف ہی شوہر کی طرف سے اجازت سمجھی جائے گی، الا یہ کہ شوہر نے اس سے بھی صاف لفظوں میں منع کر دیا ہو؛ تو پھر نہ دیا کرے۔ورنہ رواج کی وجہ سے اتنا دینے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ دینے کی اجازت نہیں۔لیکن اگر اس سے زیادہ دیتی ہے اور کہنے کے باوجود نہیں مانتی؛ تو اس غلطی پر بھی شوہر اس کی پٹائی کرسکتا ہے۔

آٹھویں یہ کہ چھوٹے ناسمجھ بچے کے رونے پر اس کی پٹائی کرتی ہے اور اس کو مارتی ہے۔شوہر منع کرتا ہے کہ مت مارو، پھر بھی مانتی نہیں ہے؛ تو اس غلطی پر بھی شوہر اس کی پٹائی کرسکتا ہے۔

نویں یہ کہ شریعت نے جہاں گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی، وہاں بلا وجہ شوہر کی بغیر اجازت کے گھر سے باہر نکلتی ہے؛ تب بھی شوہر اس کی پٹائی کرسکتا ہے۔

دسویں یہ کہ شوہر کے ساتھ بے ادبی اور گستاخی سے پیش آتی ہے، برا بھلا کہتی ہے گالیاں دیتی ہے، تو اس پر بھی شوہر اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔

گیارہویں یہ کہ نماز چھوڑتی ہے، یا غسلِ جنابت نہیں کرتی اور ناپاک ہی رہتی ہے تو اس پر بھی اس کی پٹائی کی جاسکتی ہے۔

گویا یہ وہ امور ہیں جن میں بطورِ تنبیہ کے شوہر بیوی کی پٹائی کر سکتا ہے۔

﴿یہ جائز نہیں﴾

خیر! یہاں بات اس پر چل رہی تھی کہ شوہر کو اپنی عورت پر کن چیزوں میں اختیار حاصل ہے۔عورت اپنے ذاتی مال میں اپنے طور پر کچھ تصرف کرتی ہے تو شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔اس میں اگر شوہر کی طرف سے کوئی جبر کیا جائے گا تو وہ شرعاً جائز نہیں ہے۔مثلاً باپ نے یا بھائی نے اس کو ہدیہ دیا ہے، یا وراثت میں اس کو کچھ ملا ہے؛ تو اس مال میں وہ جو چاہے تصرف کرے۔وہ اس کا ذاتی مال ہے۔

ہمارے سماج میں یہ ایک مصیبت ہے کہ لڑکی کو باپ کے یہاں سے کچھ مل رہا ہے اور وہ اس میں اپنی مرضی سے کچھ تصرف کرنا چاہتی ہے؛ تو شوہر اس میں آڑے آتے ہیں۔ تو شرعاً شوہر کو اس میں آڑے آنے کی اجازت نہیں ہے۔اگر شوہر ایسا کرتا ہے تو شریعت کی مقرر کردہ حدود کو توڑنے والا سمجھا جائے گا۔وہ اس عورت کا اپنا مال ہے، شرعی حدود میں رہ کر وہ جس طرح چاہے تصرف کر سکتی ہے۔ویسے اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اپنے مال کو کہیں اچھے کام میں خرچ کرنا چاہتی ہے تو شوہر سے مشورہ کر لے۔لیکن شوہر کو اس پر پابندی لگانے کا اور روک ٹوک کرنے کا حق نہیں ہے۔اس لئے کہ اپنے مال کی مالک وہ خود ہے۔اور شوہر اس سے وہ مال جبراً لے بھی نہیں سکتا۔

ہمارے سماج میں بہت سے لوگ زبردستی بیوی کا مال لے لیتے ہیں۔اس کے پاس اس کے باپ کے یہاں سے آیا ہے، یا وراثت میں ملا ہے تو شوہر یہ چاہتا ہے کہ مَیں لے لوں اور اس پر قبضہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں، اس بے چاری کو تصرف کرنے نہیں دیتے؛ یہ جائز نہیں ہے۔ یہ ظلم ہے۔اس کی رضا اور خوشنودی کے بغیر ایسا نہیں کر سکتے۔

﴿ گھر سے باہر نکلنے کے لئے کب شوہر کی اجازت کی ضرورت نہیں ﴾

اب یہ بات رہ گئی کہ کن صورتوں میں بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکل سکتی ہے؟ تو وہ درجِ ذیل ہیں:-

(۱) بیوی اپنے ماں باپ کی ملاقات کے لئے گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ ویسے شوہر کو چاہیے کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ ماں باپ کی ملاقات کے لئے جانے کی اجازت دے۔ اور عورت کو چاہیے کہ ملاقات کر کے خیر خیریت معلوم کر کے تھوڑی دیر میں واپس آجائے۔ وہاں ٹھہرے نہیں۔لیکن اگر شوہر اجازت نہیں دیتا تو بغیر اجازت کے بھی جا سکتی ہے۔لیکن جانے کی تمام شرطیں وہی ہیں کہ بے پردہ نہ جائے، زیب وزینت کر کے نہ جائے، پردے کے ساتھ حجاب کی رعایت کرتے ہوئے اور ایسا سادہ لباس پہن کر جو کسی لئے فتنہ اور کشش کا ذریعہ نہ بنے؛ ایسی ہیئت بنا کر جا سکتی ہے۔

(۲) ماں باپ کے علاوہ دوسرے جو محرم ہیں جیسے بھائی، چچا، ماموں وغیرہ ان کی ملاقات کے لئے سال میں ایک مرتبہ جانے کی اجازت ہے۔اگر شوہر جانے سے روکنا چاہے تو اس کو روکنے اجازت نہیں ہے، بلکہ جانے دینا پڑے گا۔اگر اجازت نہیں دیتا تو بغیر اجازت کے بھی جا سکتی ہے۔لیکن یہ یاد رہے کہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے۔صرف

ملاقات کر کے واپس آجائے۔

(۳)اسی طریقہ سے یہ لوگ اگر ملاقات کے لئے شوہر کے گھر پر آرہے ہیں تو شوہر انکار نہیں کرسکتا، اگر ہفتہ میں ایک بار آرہے ہیں۔لیکن اگر روزانہ آویں تو روک سکتا ہے۔ لیکن اپنے گھر میں ٹھہرنے سے روک سکتا ہے۔اگر وہ لوگ گھر میں آکر پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں تو منع بھی کرسکتا ہے کہ آپ ملاقات کر کے تشریف لے جایئے۔اگر چہ یہ اخلاق کے مناسب نہیں ہے،لیکن ضرورت کی وجہ سے منع کرنے کی نوبت آوے؛ تو اس کی گنجائش ہے۔

(۴)اسی طریقہ سے عورت کے ماں باپ میں سے کوئی بیمار ہے،اوراس عورت کے سوا ان کی خدمت کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے،تو اگر شوہر منع کرے؛ تب بھی اس کی اجازت کے بغیر ان کی خدمت کے لئے جاسکتی ہے۔اور جب تک ان کو ضرورت ہو تب تک وہاں ٹھہر بھی سکتی ہے۔اس سے شوہر روک نہیں سکتا۔ یہاں تک کہ اگر ماں باپ غیر مسلم ہیں تو ان کی خدمت کے لئے بھی اس کو جانے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

(۵)اسی طرح اس کا کوئی حق ہے جس کو وصول کرنے کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا پڑے۔مثلاً اس کے پیسے کہیں سے لینے باقی ہیں اوران کو وصول کرنے کے لئے کیس کیا گیا ہے،اس کی وجہ سے کورٹ میں جانا پڑے؛ تو اگر شوہر انکار کرے تب بھی اس کے لئے جایا جاسکتا ہے۔

(۶)حج فرض ہو چکا ہے،اوراپنا فرض حج ادا کرنے کے لئے محرم کے ساتھ سفر کررہی ہے تو شوہر کو روکنے کا حق نہیں ہے۔اگر شوہر منع کرے تب بھی وہ جاسکتی ہے۔اس لئے کہ یہ شریعت کا مقرر کردہ فریضہ ہے،فرضِ عین ہے۔اس کی ادائیگی سے شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔

(۷) کوئی دینی مسئلہ ضروری پیش آگیا جیسے حیض ونفاس سے متعلق کوئی مسئلہ پیش آیااور دریافت کرنا ضروری ہے، اور شوہر خود عالم بھی نہیں ہے اور عالموں سے پوچھ کر بتلاتا بھی نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ خود عالم ہے اور مسئلہ بتارہا ہے، پھر بھی وہ یوں کہتی ہے کہ مَیں تجھ سے نہیں بلکہ فلاں عالم سے پوچھوں گی؛ تو یہ درست نہیں ہے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ خود عالم تو نہیں ہے لیکن اس نے کہہ رکھا ہے کہ تم کو کوئی مسئلہ پوچھنا ہو تو لکھ کر مجھے دو، مَیں جواب لا کر دوں گا، لیکن وہ مانتی نہیں ہے اور باہر نکلنا چاہتی ہے تو اس صورت میں تو روک سکتا ہے۔ لیکن نہ تو وہ خود عالم ہے کہ بتا سکتا ہو، اور نہ کسی عالم سے پوچھ کر لا کر بتا تا ہے؛ تو اس صورت میں عورت مسئلہ پوچھنے کے لئے کسی دارالافتاء میں کسی مفتی کے پاس خود جانا چاہے؛ تو جا سکتی ہے۔ اب آج کل یہ ضرورت فون سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔

(۸) جس گھر میں رہتے ہیں وہ گھر گرنے کے بالکل قریب ہو گیا ہے۔ یا آگ لگ گئی، اگر اس گھر میں رہیں گے اور شوہر کی اجازت لینے کا انتظار کریں گے، تو گھر بھی جلے گا اور خود بھی جل جائے گی۔ یا سیلاب آگیا اور اس گھر کے گر جانے کا اندیشہ ہے، اگر اجازت کا انتظار کرے گی تو ڈوب جائے گی تو ان سب صورتوں میں شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلنا چاہے؛ تو نکل سکتی ہے۔

بہر حال! یہ سب وہ صورتیں ہیں جس میں شریعت نے عورت کے لئے شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

تقویٰ

مجلس ۱

اقتباس

ہم لوگ لفظِ تقویٰ سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو بہت بڑی بات ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔

تقویٰ کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے

رات بھر تہجد پڑھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے، بارہ مہینہ روزے رکھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے

عبادت اور نوافل کی کثرت کا نام تقوی نہیں ہے

بلکہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے

دیکھو! نیکی کے کام کر لینا بہت آسان ہے، لیکن گناہ سے بچنا بہت اہم چیز ہے

ابھی بڑی رات گذری تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی مسجد میں نہ آنے والے بھی پہلی صف میں ایسا قبضہ جما کر بیٹھ گئے کہ روزانہ کے پہلی صف والے بھی دیکھتے رہ گئے، ان کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ اور وہ لوگ مغرب سے لے کر آدھی رات تک برابر عبادت کے اندر لگے رہتے ہیں۔ رمضان المبارک کا مہینہ آئے گا تو برابر لگے رہیں گے۔

اگر آدمی ذرا سا ارادہ کر لے تو کچھ نفلیں پڑھ لینا، عبادت کے اندر مشغول ہو جانا، نیکی کے کام کر لینا؛ یہ سب بہت آسان ہے

لیکن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچ جانا؛ یہ اصل چیز ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئٰتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

فاعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

یَاأَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوااتَّقُوْااللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَاتَمُوْتُنَّ اِلَّاوَأَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ. (آل عمران. ۱۰۲)

یہ باب تقویٰ کے سلسلے میں قائم کیا ہے۔تقویٰ کے سلسلے میں قرآنِ پاک میں بہت ساری آیتیں ہیں۔اس کا حکم،اس کے فوائداور تقویٰ کی نسبت سے مختلف چیزیں قرآنِ پاک کے اندر کثرت سے بیان کی گئی ہیں۔قرآنِ پاک میں تقریباً دوسو سے زیادہ مواقع ہیں؛ جہاں تقویٰ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ڈر اور خوف کا آتا ہے۔بچنے اور پرہیزگاری کا معنٰی بھی آتا ہے۔جیسے بیماری میں پرہیز ہوتا ہے یعنی اس کے استعمال سے آدمی بچتا ہے اوراس کا ارتکاب کرنے سے ڈرتا ہے کہ اگر یہ کرلوں گا تو کہیں بیماری بڑھ نہ جائے۔اصل ڈراور خوف کے معنٰی میں آتا ہے۔اوراللہ تعالیٰ کے ساتھ لفظِ تقویٰ کا تذکرہ ہوتو وہاں اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے آدمی کی طبیعت میں جوڈر پیدا ہوتا ہے؛ وہ مراد لیا جاتا ہے۔مثلاً میں فلاں گناہ کا کام کرلوں تو اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔قرآنِ پاک

میں ہے:﴿وَأَمَّـا مَـنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰی فَإِنَّ الۡجَنَّةَ هِیَ الۡمَأۡوٰی﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے اور اللہ تعالیٰ کے حضور حساب دینے کے تصور سے ڈرا، اور اس نے اپنے نفس کو خواہشات سے روکا؛ تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔ آدمی کے نفس کے اندر بڑی سے بڑی مضبوط خواہش پیدا ہو، لیکن جب یہ سوچ لے کہ اگر مَیں اس کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کرلوں گا؛ تو مجھے اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اپنے کئے کا جواب دینا ہے، اس وقت کیا منہ دکھاؤں گا؟ یہی اللہ تعالیٰ کی عظمت کا تصور ہے۔

دیکھو! یہاں جہنم کی آگ کے ڈر سے یا عذاب کے ڈر سے بچنے کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے بچنے کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مدنظر رکھتے ہوئے بچا کہ اگر مَیں نے فلاں گناہ کا کام کرلیا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرلی؛ تو اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوکر کیا منہ دکھاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کی وجہ سے دل کے اندر خوف وڈر کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے آدمی گناہ اور نافرمانی سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

جہنم کی آگ اور عذابات وغیرہ سے ڈرنا بھی دراصل اسی وجہ سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مظہر ہیں۔ اصل تو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے، وہ ناراض ہوگا تو ہمیں عذاب دے گا اور جہنم میں ڈالے گا۔ ایک مؤمن کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ایسی عظمت ہونی چاہیے کہ اس کی ناراضگی سے اپنے آپ کو بچائے۔

جیسے اپنے بڑے، استاذ، باپ یا شیخ وغیرہ ہوتے ہیں کہ دل میں ان کی عظمت بھی

ہو اور محبت بھی ہو؛ تب ہی آدمی کوئی ایسی حرکت کرنے سے اپنے آپ کو روکتا ہے۔ سو بار سوچتا ہے کہ اگر ان کو پتہ چل گیا تو ان کے سامنے کیا منہ لے کر جاؤں گا؟ ان کو کیا جواب دوں گا؟ گویا ایسے کاموں کے کرنے کو ان کی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی عظمت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے بچانا اور نافرمانی سے اپنے آپ کو روکنا؛ اسی کا نام ''تقویٰ'' ہے۔

﴿حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مناقب﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا مقام حضراتِ صحابہ کے اندر بڑا اونچا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا: ﴿أَقْرَؤُهُمْ أُبَيٌّ﴾ (مستدرک، حدیث نمبر ۵۷۸۴) حضرات صحابہ میں قرآنِ پاک کے سب سے زیادہ اچھے پڑھنے والے اور علمِ قرآت کے ماہر حضرت ابی بن کعب ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ مَیں آپ کو ''سورۂ لم یکن الذین کفروا'' پڑھ کر سناؤں۔ انہوں نے عرض کیا: ﴿یَا رَسُوْلَ اللهِ! آللهُ سَمَّانِیْ؟﴾ کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا کہ آپ ابی کو سنایئے؟ اس لئے کہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یوں کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کسی کو یہ سورۃ پڑھ کر سنایئے اور آپ اپنے طور پر حضرت ابی بن کعب کا نام تجویز کرتے۔ گرچہ یہ شکل ہوتی تب بھی ان کے لئے بڑی سعادت اور فخر کی چیز ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلق کہا گیا اور حضور کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا اس لئے انہوں نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: جی ہاں! اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام لے کر فرمایا ہے۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آ گئے۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۳۵۲۵) خوشی کے آنسو بھی ہوا کرتے ہیں: ؎

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

بہر حال! یہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ہیں، ان کا لقب سید الانصار ہے، بڑے فقہاءِ صحابہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

﴿تقویٰ کی حقیقت﴾

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: تقویٰ کیا ہے؟ اس پر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ﴿أَسَلَكْتَ طَرِيْقاً ذَا شَوْكَةٍ﴾ کبھی کسی کانٹے دار راستہ پر سے گذرنے کی نوبت آئی ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں! ایسا تو بارہا ہوا ہے۔ کہا: اس وقت آپ نے کیا کیا؟ فرمایا: ﴿شَمَّرْتُ ثُمَّ اجْتَهَدْتُ﴾ اپنے کپڑوں کو خوب اچھی طریقہ سے لپیٹا اور بچ بچا کر نکل گیا۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿خَلِّ الذُّنُوْبَ كُلَّهَا، صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا؛ ذَاكَ التُّقٰى﴾ تمام گناہوں کو چھوڑ دو، چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں؛ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، ۱/۱۶۴)

﴿تقویٰ ڈرنے کی چیز نہیں، ڈرنے کا نام ہے﴾

ہم لوگ لفظِ تقویٰ سنتے ہیں تو ڈر جاتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو بہت بڑی بات ہے؛ لیکن ایسا نہیں ہے۔ تقویٰ کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے۔ رات بھر تہجد پڑھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے۔ بارہ مہینہ روزے رکھنے کا نام تقویٰ نہیں ہے۔ عبادت اور نوافل کی کثرت کا نام تقویٰ نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کا نام ہے۔ گناہ سے بچنا بہت اہم چیز ہے۔

﴿نیکی کے کام کر لینا بہت آسان﴾

دیکھو! نیکی کے کام کر لینا بہت آسان ہے۔ ابھی بڑی رات گذری تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ کبھی مسجد میں نہ آنے والے بھی پہلی صف میں ایسا قبضہ جما کر بیٹھ گئے کہ روزانہ کے پہلی صف والے بھی دیکھتے رہ گئے، ان کو بھی جگہ نہیں ملتی۔ اور وہ لوگ مغرب سے لے کر آدھی رات تک برابر عبادت کے اندر لگے رہتے ہیں، رمضان المبارک کا مہینہ آئے گا تو برابر لگے رہیں گے۔ اگر آدمی ذرا سا ارادہ کر لے تو کچھ نفلیں پڑھ لینا، عبادت کے اندر مشغول ہو جانا، نیکی کے کام کر لینا؛ یہ سب بہت آسان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچ جانا؛ یہ اصل چیز ہے۔

نفل کام کا حال ایسا ہے کہ آدمی اگر کرے گا تو ثواب ہے۔ اور اگر نہیں کیا تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال نہیں ہوگا کہ فلاں نفل کام آپ نے کیوں نہیں کیا۔ لیکن فرائض کے متعلق سوال ہوگا۔ اور گناہ سے بچنا ضروری اور فرض ہے، اور فرائض و واجبات کو انجام نہیں دے گا تو گناہ ہے۔ لہٰذا گناہ سے اپنے آپ کو بچانا ضروری اور فرض ہو گیا۔ اور گناہ کے متعلق لکھا ہے کہ اگر گناہ کا ارتکاب کر لیا، چاہے چھوٹا سا گناہ ہی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے اعتبار سے چھوٹا اور بڑا؛ دونوں برابر اور یکساں ہیں۔

﴿انگارہ اور چنگاری برابر﴾

ایک مرید نے اپنے شیخ سے پوچھا: بدنظری چھوٹا گناہ ہے یا بڑا؟ شیخ نے جواب میں کہا: کوئی آدمی چھوٹی سی چنگاری کو چھوٹی سمجھ کر اپنے کپڑوں کے باکس میں نہیں رکھتا۔ اس لئے کہ کپڑے کے باکس کو جلانے کے لئے بڑا انگارہ ہو یا چھوٹی چنگاری ہو؛ دونوں کافی ہیں، جب آگ لگ جائے گی تو آپ کے گھر کو پھونک کر جائے گی۔

اور پھر آدمی یہ سوچے کہ مَیں کس کی نافرمانی کررہا ہوں؟ کس کا حکم توڑ رہا ہوں؟ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور جلالت، اللہ تعالیٰ کی کبریائی اور بڑائی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یہ کام کیسے ہوسکتا ہے؟ کسی چھوٹے کے سامنے آپ نے کوئی نامناسب حرکت کرلی؛ تو یہ کوئی گستاخی نہیں سمجھی جاتی، لیکن کسی بڑے کے سامنے ذرا سی بے رُخی سے آدمی پیش آوے؛ تو یہ بھی بڑی گستاخی میں شمار ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی شان کے اعتبار سے چھوٹا سا گناہ بھی چھوٹا نہیں ہے؛ بلکہ بڑا ہی کہا جائے گا۔ اور پھر یہ ہے کہ آدمی چھوٹا گناہ بار بار کرتا رہے؛ تو وہ بھی کبیرہ بن جاتا ہے۔ بہر حال! گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا؛ اسی کا نام تقویٰ ہے۔

﴿ تقویٰ کے درجات ﴾

علماء نے لکھا ہے کہ تقویٰ کے تین درجے ہیں:-

ایک درجہ تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کفر و شرک سے بچائے، گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کفر و شرک ہے، وہ ایسا گناہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف نہیں کرتے جب تک کہ بندہ توبہ کرکے اس سے باز نہ آئے ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ یہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے جو ہر مومن میں پایا جاتا ہے۔ جو مسلمان اپنے آپ کو کفر و شرک سے بچا رہا ہے؛ وہ تقویٰ کے اس ادنیٰ درجہ پر فائز ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ہر چھوٹے بڑے گناہ سے اور اللہ تعالیٰ کی ہر نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائے۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی غیر اللہ کے تصور سے دل کو پاک و صاف رکھے۔ دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کا خیال آنے ہی نہ دے۔ دل اسی لئے بنایا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ ہی کو جگہ دے، کسی اور کو جگہ نہ دے۔ یہ تقویٰ کا اعلیٰ درجہ ہے۔ یہ مقام اور درجہ

اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔

بہر حال! تقویٰ کا خلاصہ اتنا ہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔اسی کو فرمایا: ﴿یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ اللہ تعالیٰ سے جیسے ڈرنا چاہیے؛ ایسا ڈرو۔ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو باز رکھو۔ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے باز رکھنا آدمی کے لئے ضروری ہے۔

﴿تقویٰ اختیار کرنے کے فوائد﴾

تقویٰ اختیار کرنے پر جو فوائد مرتب ہوتے ہیں وہ بے شمار ہیں۔ قرآنِ پاک میں ان کو بیان کیا گیا ہے، جن میں سے چند فائدے پیش فرماتے ہیں: ﴿وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیوی مصیبتوں سے بھی اور آخروی کی مصیبتوں سے بھی نجات کا راستہ نکالیں گے۔ اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

آج لوگوں کی نگاہ میں روزی کا مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اگر آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچالے تو اس کی ہر پریشانی دور ہو جائے گی۔ لوگ پریشانیوں کے شکار ہیں اور کہتے ہیں کہ میری فلاں پریشانی ہے، اس کے لئے کوئی نسخہ بتادو، کوئی وظیفہ بتادو۔ اس کا بہترین وظیفہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی بڑی نافرمانی سے بچنے کا اہتمام کرلے۔

﴿موجودہ دور کی بڑی مصیبت﴾

آج کل ایک بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ گناہ کیا ہے اس سے بھی لوگ واقف نہیں ہیں

بہت سے کام تو ایسے کرتے ہیں کہ کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہی نہیں کہ مَیں گناہ کر رہا ہوں حالاں کہ گناہ سے بچنے کا نام تقویٰ ہے اور جو گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے گا، اللہ تعالیٰ ہر پریشانی سے نجات کا راستہ نکالیں گے، غیب سے سامان پیدا کریں گے۔ اور ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔

ایک تاجر تجارت کرتا ہے، اگر اس میں وہ جھوٹ بول رہا ہے، خیانت کر رہا ہے۔ تو دنیوی اعتبار سے بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ وہ ذرا آگے پیچھے کرلے گا تو زیادہ منافع ملے گا، نفع کا پرسنٹیج (%) بڑھ جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جھوٹ بولنا، دھوکہ دینا، جھوٹی قسم کھانا اور تجارت کی لائن کے جتنے بھی گناہ ہیں، ان کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فائدہ زیادہ ہوگا، لیکن اگر وہ یہ سمجھ کر کہ یہ گناہ کے کام ہیں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اس لئے ان سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، تو اگر چہ بظاہر نفع کم مل رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس میں برکت دیں گے

کون فائدہ میں رہا؟

برکت کا مطلب کیا ہے؟ تھوڑی سی چیز سے اپنی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں؛ اسی کا نام برکت ہے۔ ایک آدمی رشوت لیتا ہے اور دوسرے غلط طریقے اپنا کر مہینہ کے پانچ ہزار کما کر لاتا ہے، لیکن اس کا حال یہ ہے کہ بیوی بیمار ہے، بچہ بیمار ہے، ڈاکٹر کے پاس گئے؛ تو دس طرح کے رپورٹ نکلوائے اور دو تین ہزار اسی میں چلے گئے۔ اور پھر اچانک کا کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا کہ اس میں ہزار چلے گئے۔ اب لے دے کر دو ہزار بچے۔

اور ایک آدمی ایسا ہے جو دو ہزار ہی کماتا ہے اور اس سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، کبھی کوئی تکلیف و پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ تو غور کرو کہ کون فائدہ میں رہا۔ برکت کا خلاصہ یہی ہے۔

بہر حال! اگر تاجر اپنے آپ کو جھوٹ اور خیانت سے بچاتا ہے، شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرتا ہے تو ظاہر کے اعتبار سے اگر چہ نفع کم نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت میں نجات کا راستہ نکالیں گے، اور اس کی روزی میں بھی برکت دیں گے۔

﴿تجارت میں سچائی؛ ایمان لانے کا سبب﴾

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ کپڑوں کا ایک تاجر تھا، اس زمانہ میں ایک مشہور دلال تھا جس کا نام احمد بن حبیب تھا۔ انہوں نے کپڑوں کا ایک بڑا تھان اس کو دیا اور کہا: اس میں فلاں عیب ہے جس کے ہاتھ بھی فروخت کرو، اس کو بتا کر دینا۔ احمد بن حبیب نے وہ تھان بیچ دیا اور عیب بتانا بھول گئے۔ جب قیمت حوالے کی تو انہوں نے پوچھا: وہ عیب بتا دیا تھا؟ اس نے کہا: وہ عیب بتانا تو مَیں بھول ہی گیا۔ پوچھا: کس کے ہاتھ بیچا ہے؟ کہا: ایک قافلہ بغداد کی طرف جا رہا تھا اس میں ایک شخص کے ہاتھ بیچا ہے، اور وہ قافلہ تو روانہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے ایک تیز رفتار گھوڑا لیا اور بغداد کا راستہ پکڑا، دو دن کے بعد اس قافلہ میں پہنچے اور اعلان کیا کہ فلاں قسم کے کپڑے کا تھان تم میں سے کس نے خریدا ہے؟ ایک آدمی نے بتلایا: مَیں نے خریدا ہے۔ کہا: دیکھو! مَیں نے وہ تھان جس آدمی کو فروخت کرنے کیلئے دیا تھا اس کو کہہ رکھا تھا کہ اس میں فلاں عیب ہے، بیچتے ہوئے بتا دینا لیکن وہ آپ کو بتانا بھول گیا تھا، اس لئے اپنی قیمت واپس لے لو اور تھان واپس کر دو؛ تا کہ دھوکہ نہ ہو۔ خریدار غیر مسلم تھا، اس نے ان کا یہ عمل دیکھ کر پہلے تو کلمہ پڑھا اور اس کے بعد یوں کہا: وہ پیسے مجھے واپس کرو، اس لئے کہ یہ پیسے جعلی ہیں اور اب میں تم کو اصلی پیسے دیتا ہوں۔ اور اتنی ہی رقم میں وہ تھان خرید لیا۔

دیکھئے! اگر یہ امانت داری سے کام نہ لیتے تو وہ خود دھوکہ کھا جاتے۔ جب آدمی تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتے ہیں؛ جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

تقویٰ اختیار کرنے کی برکت

بہت سی کتابوں میں ایک مشہور واقعہ لکھا ہے:-

اللہ کے ایک نیک بندے محمد بن عبدالباقی نامی تھے، حج کے لئے گئے ہوئے تھے، ان کے مصارف ختم ہو گئے، اور ان کے پاس کچھ نہیں بچا، فاقہ میں مبتلا ہوئے، پریشان تھے راستے میں ایک تھیلی پڑی ہوئی نظر آئی، اس کو اُٹھائی اور کھول کر دیکھا تو اس میں ہیروں کا ایک قیمتی ہار تھا، اس کو انہوں نے امانت داری سے اپنے پاس رہنے دیا۔ اسی دوران ایک آدمی کو اعلان کرتے ہوئے سنا کہ فلاں آدمی کے ہیرے کا ہار گم ہوا ہے، جس کو بھی ملا ہو؛ وہ اس آدمی تک پہنچا دے، وہ فلاں جگہ ٹھہرا ہوا ہے۔ پہنچانے والے کو دس ہزار درہم انعام کے طور پر دیئے جائیں گے۔ اس زمانہ کے دس ہزار درہم آج کے لاکھوں کے برابر ہوتے ہیں۔ بہر حال! یہ اللہ کے نیک بندے بتائی ہوئی علامت کے مطابق اس جگہ پہنچے اور خفیہ طور پر معلوم کر کے جس کا ہار تھا، اس تک پہنچا کر اپنے آپ کو ظاہر کئے بغیر چپکے سے وہاں سے چلے آئے؛ اور وہ انعام بھی حاصل نہیں کیا۔ اس لئے کہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس کا پہنچانا میری ذمہ داری اور میرا فریضہ ہے، اس پر انعام کیا معنٰی رکھتا ہے۔ چنانچہ اس مالک کو پتہ ہی نہیں چلا کہ کون پہنچا گیا۔ اس کی بڑی تمنا تھی کہ جس نے پہنچایا ہے اس کو انعام کی رقم دوں۔ اس نے بہت اعلان کیا کہ پہنچانے والا مجھ کو ملے، لیکن انہوں نے ظاہر نہیں کیا۔

خیر! وہ آدمی حج کے بعد اپنے وطن چلا گیا، یہ بھی اپنے وطن واپس جانے کے لئے کشتی میں سوار ہوئے۔ اتفاق کی بات یہ ہوئی کہ کشتی سمندر کے تھپیڑوں کی وجہ سے ٹوٹ گئی، ان کے ہاتھ میں ایک تختہ آ گیا، وہ اسی پر سوار ہو کر ایک جزیرے میں پہنچے، آبادی میں جا کر ایک مسجد میں گئے، وضو کر کے نماز پڑھی۔ لوگوں نے دیکھا کہ مسافر ہے، کھانے کا انتظام کیا صاحبِ کمال آدمی تھے، عالم بھی تھے۔ بستی والوں نے جب دیکھا کہ صاحبِ فضل و کمال ہیں تو ان سے کہا: ہمارے امام صاحب کا انتقال ہو گیا ہے، ہم کو آدمی کی ضرورت بھی تھی، آپ یہیں ٹھہر جائیے۔ ان کے کمالات کی وجہ سے تمام لوگ ان سے محبت کرنے لگے۔ پھر لوگوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ ایسا اچھا آدمی ہاتھ لگا ہے، کہیں نکل نہ جائے، اس لئے اس کے پاؤں میں بیڑی ڈال دو۔ لہٰذا ان سے کہا: آپ کا نکاح کرا دیں؟ انہوں نے کہا: صالحہ لڑکی ملے تو مَیں بھی تیار ہوں۔ لوگوں نے کہا: سابق امام صاحب کی ایک لڑکی ہے، بہت ہی نیک و صالحہ ہے اور بڑی حسین و جمیل بھی ہے، اس سے نکاح کر لو۔ انہوں نے کہا: مَیں دیکھ لوں۔ خیر! فیصلہ کر لیا اور نکاح ہو گیا۔ جب رخصت ہو کر وہ لڑکی آئی تو دیکھا کہ اس کے گلے میں وہی ہار ہے۔ انہوں نے پوچھا: یہ ہار کیسا ہے؟ اس نے کہا: یہ میرے والد صاحب نے میرے لئے میراث میں چھوڑا تھا۔

پھر اس نے کہا: میرے والد صاحب حج میں گئے تھے اور یہ ہار گم ہو گیا تھا، انہوں نے اعلان کیا تھا کہ جو یہ ہار پہنچا دے گا، اس کو دس ہزار درہم انعام دیں گے۔ لیکن ایک آدمی پہنچا کر چلا گیا اور انعام بھی وصول نہیں کیا۔ والد صاحب ہمیشہ تمنا کرتے تھے کہ کاش! وہ آدمی ملے تو مَیں اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کراؤں۔ انہوں نے کہا: مَیں وہی آدمی ہوں۔ اس نے کہا: میرے والد صاحب کی تمنا پوری ہوئی۔

خیر! اس کے بعد ان سے اولاد میں ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہوئیں، اس کے بعد اس عورت کا انتقال ہو گیا اور کچھ مدت کے بعد بیٹا اور بیٹی کا بھی انتقال ہو گیا اور یہ ہار ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ کے طور پر تقویٰ اختیار کرنے کی برکت سے وراثت میں ان کو مل گیا۔ ایسے بے شمار واقعات کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔ (ذیل طبقات الحنابلۃ، ۱/ ۷۹)

﴿بصیرت کا نور﴾

ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو گے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچو گے تو اللہ تعالیٰ ایک نور اور ایسی صلاحیت وطاقت تمہارے دل میں عطا فرمائیں گے؛ جس کے ذریعہ حق وباطل کے درمیان فرق وتمیز کر سکو گے ﴿فُرْقَان﴾ یعنی بصیرت کا نور۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کا کفارہ کر دے گا اور تمہاری مغفرت فرما دے گا اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔

بہر حال! قرآنِ پاک میں تقویٰ کے بے شمار فوائد بیان کئے گئے ہیں۔ تقویٰ ہی کی وجہ سے ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

﴿تقویٰ کیسے حاصل ہو؟﴾

اب تقویٰ کیسے حاصل ہو؟ تو اس کا طریقہ بھی قرآنِ پاک ہی کی ایک آیت میں بتلایا گیا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اس کی نافرمانی سے بچو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِيْنَ﴾ کا جو حکم دیا گیا ہے؛ اس میں تقویٰ حاصل کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

دیکھو! قاعدہ ہے کہ ہر چیز اپنے مرکز سے ملا کرتی ہے۔ اور تقویٰ کا مرکز اور کان

صالح اور نیک لوگوں کے قلوب ہیں ﴿لِكُلِّ شَيْئٍ مَعْدَنٌ وَمَعْدَنُ التَّقْوىٰ قُلُوبُ الصَّادِقِيْنَ﴾ ہر چیز کی ایک کان ہوکرتی ہے اور تقویٰ کی کان، یعنی جہاں سے تقویٰ ملے گا؛ وہ صلحاء کے قلوب ہیں، جو آدمی ان کی صحبت اختیار کرے گا اس کو تقویٰ ملے گا۔

ایک آدمی باورچی بننا چاہتا ہے تو اس کو کسی باورچی کے صحبت اختیار کرنی پڑے گی کھانا بنانے کے فن میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں، اگر وہ سب اس نے پڑھ لیں؛ تب بھی نمک ڈالنے کا طریقہ نہیں آئے گا؛ جب تک کہ کسی باورچی کی صحبت اختیار نہ کرلے۔

ایک آدمی درزی بننا چاہتا ہے تو خیاطی کے فن میں جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ ساری پڑھ لے گا؛ تب بھی جب تک درزی کی صحبت اختیار نہیں کرے گا وہاں تک سوئی کے اندر تاگا کس طرح پرویا جاتا ہے اور بٹن کا کاج کیسے بنایا جاتا ہے؛ وہ اس کو نہیں آئے گا۔

﴿صحبت کی تاثیر﴾

صحبت تو ایسی چیز ہے کہ بے جان چیزوں میں بھی اثر کرتی ہے۔ اردو میں کہاوت ہے:- ''خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے''۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں گلستاں اور بوستاں وغیرہ ہمارے یہاں مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں۔ گلستاں کے مقدمہ میں انہوں نے صحبت کی تاثیر کو بتلانے کے لئے بہت اچھے اشعار کہے ہیں:-

گلے خوشبوئے در حمام روزے ❁ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم مشکی یا عبیری ❁ کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ❁ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمالِ ہم نشین در من اثر کرد ❁ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

(گلستاں سعدی، دیباچہ، صفحہ ۶/۵)

ہم غسل کرتے وقت صابن کی ٹکیہ استعمال کرتے ہیں، پرانے زمانہ میں مٹی کو خوشبو میں بسایا جاتا تھا اور وہی مٹی نہانے کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ صابن بھی خوشبو میں بسی ہوئی مٹی کی طرح ہی ہے۔ تو فرماتے ہیں: کہ ایک خوشبودار مٹی کی ٹکیہ مجھے غسل خانہ کے اندر محبوب کے ہاتھوں مل گئی۔ مَیں نے اس سے پوچھا: تو مشک ہے یا عنبر ہے؟ کہ تیری دل کو لبھا لینے والی خوشبو کی وجہ سے میرے طبیعت میں ایک مستی سی آ گئی ہے۔ وہ کہنے لگی: مَیں تو معمولی مٹی تھی، لیکن ایک زمانہ تک پھول کی صحبت میں رہی، تو اس کی خوبصورتی نے میرے اندر اثر کر دیا؛ ورنہ مَیں تو وہی مٹی ہوں۔

اہل اللہ کی صحبت کی برکت

تو حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کو چھوڑنے کی کوئی آدمی اپنے طور پر لاکھ محنت کر لے، نہیں چھوڑ سکتا، جب تک کہ ایسے لوگ کی صحبت اختیار نہ کرے جو گناہوں کو چھوڑے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرمانبردار ہیں، اپنے آپ کو ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اہل اللہ اور صلحاء کی صحبت میں نہیں رہے گا؛ وہاں تک گناہ نہیں چھوٹیں گے۔ یہ بات یاد رکھئے۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ والوں کی صحبت کا ادنیٰ فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو گناہوں سے توبہ کی توفیق نصیب ہو جاتی ہے۔

گناہوں کے چھوٹنے کا نسخہ

دیکھو! باغ کے اندر جو کانٹے ایسے ہیں کہ پھولوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں، ان کو مالی کچھ نہیں کرتا۔ اور جو صرف کانٹے ہی کانٹے ہیں، ان کو اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ تو اگر ہم

کانٹے ہیں تو ہمیں ضرورت ہے کہ پھولوں کی صحبت میں رہیں، تب خلعتِ گُل سے نوازے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ دھیرے دھیرے پھول والی صفت پیدا کردے گا۔ ورنہ کم از کم نیک لوگوں کی صحبت کی برکت سے اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیتے ہیں، اور اس کی بدبختی نیک بختی سے، شقاوت سعادت سے بدل دی جاتی ہے: ﴿هُمُ الْقَوْمُ لَا يَشْقٰى بِهِمْ جَلِيْسُهُمْ﴾ اللہ کے رسول فرماتے ہیں: یہ لوگ ایسے ہیں کہ ان کے پاس بیٹھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔ تو گناہوں کو چھوڑنے کے لئے یہی ایک نسخہ ہے۔ اسی لئے کہا گیا: ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ سچوں کے ساتھ رہو اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔

﴿چنبیلی کا تیل﴾

البتہ ان کی صحبت اختیار کرنے سے فائدہ کب ہوگا؟ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے۔ حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی زبان سے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ سنا تھا (آج ہی اُن کے صاحب زادہ سے ملاقات بھی ہوئی تھی) حضرت فرماتے تھے: ہمارے یہاں جونپور میں چنبیلی کا تیل بنایا جاتا ہے، یہ چنبیلی کا تیل کیا ہے؟ چنبیلی کے پھول کو نچوڑنے سے تیل نکلتا ہے؛ ایسی بات نہیں ہے۔ بلکہ تیل تو تِل کا ہی ہوتا ہے۔ تل کے تیل کو چنبیلی کا تیل بنانے کے لئے کیا یہ جاتا ہے کہ تلوں کی ایک تہہ جمائی جاتی ہے، اس کے اوپر چنبیلی کے پھول بچھائے جاتی ہیں، پھر اس کے اوپر تلوں کی ایک تہہ ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر چنبیلی کے پھول کی ایک تہہ ہوتی ہے، اس طرح ان تلوں کو بچھا کر چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ کچھ دنوں تک رہنے دیتے ہیں۔ پھر کچھ دنوں کے بعد ان پھولوں کو ہٹا کر ان تلوں کو کولھو کے اندر پیس کر تیل نکالا جاتا ہے۔ اب یہ تیل تِل کا تیل نہیں رہا بلکہ چنبیلی کا تیل بن گیا۔

لیکن حضرت مولانا فرماتے تھے: کہ ان تلوں کے اندر چنبیلی کا اثر لانے کے لئے ان تِلوں کے اوپر ایک پتلی پرت اور جھلّی ہوتی ہے اس کو دور کرنا پڑتا ہے۔تو تیل بنانے والے ان تِلوں کو اچھی طرح دھو لیتے ہیں۔جیسے ڈائنگ مل کے اندر کپڑے کو رنگنے سے پہلے اچھی طرح دھوتے ہیں۔اس کے بعد اس کپڑے کو ڈائی کیا جاتا ہے، دھوئے بغیر ڈائی نہیں کرتے ورنہ رنگ برابر نہیں آتا۔اسی طریقہ سے ان تلوں کو اچھی طرح دھوتے ہیں، اس کے بعد اس کی گھسائی کرتے ہیں تاکہ اوپر کی باریک جھلّی دور ہو جائے اور وہی باریک جھلّی ہی دراصل کسی چیز کے مؤثر ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے۔جب جھلّی دور ہوگئی اس کے بعد ان تلوں کو پھولوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے تو پھولوں کا اثر آتا ہے۔اور پھر ان تلوں کو جب پیسا جاتا ہے تو جو تیل نکلتا ہے؛ وہ چنبیلی کا تیل کہلاتا ہے۔

اسی طریقہ سے اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے سے ان کا اثر اس وقت آئے گا؛ جب رکاوٹیں دور ہوں گی۔

رکاوٹیں کیا ہیں؟

اب رکاوٹیں کیا ہیں یہ معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔تو ایک رکاوٹ تو بدعقیدگی ہے۔اسی لئے جب بھی کسی اللہ والے کے پاس بیٹھے تو عقیدت کے ساتھ بیٹھے؛ تب ہی اثر ہوگا۔اگر انکار کے ساتھ بیٹھے گا یعنی دل میں اس پر اعتراض ہے کہ پتہ نہیں یہ کیا کرتے رہتے ہیں۔اگر اس طرح بداعتقادی کے ساتھ ان کے پاس زندگی بھی گذار دیں گے؛ تو ذرّہ برابر بھی فائدہ نہیں ہوگا۔عقیدت کے ساتھ ان کے پاس بیٹھے، دل میں ان پر ذرّہ برابر اعتراض نہ ہو۔

صحبتِ شیخ بجائے مفید ہونے کے مضر......

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک رسالہ ہے ''اعتقاد وانکار''۔ وہ مستقل اسی موضوع پر لکھا ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے مَیں نے ایک مرتبہ پوچھا تھا: شیخ کی صحبت میں کتنی مدت گذارنی چاہیے؟ تو حضرت نے فرمایا: آج کل اکثر لوگوں کے مزاج ایسے بن گئے ہیں کہ ان کے مزاج میں اعتراض ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے شیخ کے صحبت بجائے مفید ہونے کے مضر ہوجاتی ہے۔ وہاں جاتے ہیں تو دل ہی دل میں اعتراض لے کر جاتے ہیں اور اعتراض ہی کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کوئی فائدہ تو ہوتا نہیں ہے، البتہ اور زیادہ خطرناک اور مشکل حالت بنا کر آ جاتے ہیں۔ اگر کسی کو اپنے مزاج کے مطابق یہ اندیشہ ہو تو حضرت فرماتے تھے کہ ایسے آدمی کے لئے تو دور ہی دور رہ کر خط و کتابت کے ذریعہ ہدایات حاصل کرتے رہنا مفید ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ موانع اور رکاوٹ دور ہونے چاہئیں۔ موانع میں سے ایک مانع تو ''بداعتقادی'' ہے۔

دوسرا مانع اور رکاوٹ ''غذا'' ہے۔ غذا حلال ہونی چاہیے۔ حرام غذا کے ساتھ اہل اللہ کی صحبت کا اثر نہیں ہو پاتا۔ یہ بھی یاد رکھیے۔

تیسرا مانع اور رکاوٹ ''مجانستِ اضداد'' ہے یعنی اس لائن کے جو لوگ نہ ہوں ان سے تعلقات نہ بڑھائے۔ جو غلط صحبت والے ہیں ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ترک کردے۔ اگر ان کی صحبت چھوڑے بغیر اہل اللہ کی صحبت میں آ ؤ گے؛ تب بھی کما حقہ فائدہ نہیں ہوگا۔

اسی طرح ''بدنظری'' بھی خطرناک چیز ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں رہتے ہوئے بدنظری کا ارتکاب کرے گا؛ تب بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

مہمانِ خصوصی کے ساتھ طفیلیوں کا بھی اکرام

بہر حال! مَیں عرض کر رہا تھا کہ صحبتِ اہل اللہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ گناہوں کی عادت چھڑا دیتے ہیں۔ اس لئے اگر کوئی آدمی یہ چاہتا ہو تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اپنا ماحول چھوڑ کر نیک ماحول اختیار کرے۔ اور جب تقویٰ حاصل ہو جائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ انہی انعامات و احسانات سے اس کو بھی نوازے گا جن سے اپنے نیک بندوں کو نوازتا ہے۔ جیسے آپ کے یہاں کوئی بڑا مہمان یا بڑے بزرگ آئے ہوں اور ان کے ساتھ پانچ دس آدمی ہوں تو جو کھانا ان بزرگ کو کھلائیں گے؛ وہی ساتھیوں کو بھی کھلائیں گے۔ جس کمرہ میں ان کو ٹھہرائیں گے؛ اسی کمرہ میں ان کے ساتھیوں کو بھی ٹھہرائیں گے۔ کسی کو تقریر کے لئے بلاتے ہیں تو جس اسٹیج پر وہ بیٹھتے ہیں ان کے ساتھ آئے ہوئے بھی اسی پر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ اصل اعزاز تو مہمانِ خصوصی کا مقصود ہوتا ہے لیکن ان کے ساتھیوں کا بھی اعزاز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ہوتا ہے۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا بہترین اندازِ بیان

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو گلستاں کے اندر بہت اچھے انداز سے بیان کیا ہے:۔

دیدم گلِ تازہ چند دستہ ❁ بر گنبدے نہادہ از گیاہ بستہ
گفتم چہ بود گیاہِ ناچیز ❁ تا در صفِ گل نشیند او نیز
بگریست گیاہ و گفت خاموش ❁ صحبت نہ کند کرم فراموش
گر نیست جمال و رنگ و بویم ❁ آخر نہ گیاہِ باغِ اویم

(گلستاں سعدی، باب۲، صفحہ۱۰۴)

فرماتے ہیں کہ مَیں نے چند پھولوں کو ایک گھانس کے ساتھ بندھا ہوا دیکھا۔آپ نے گلدستہ دیکھا ہوگا کہ اس کو تیار کر کے گھانس سے باندھتے ہیں اور وہ گھانس بھی اسی باغ سے لی جاتی ہے۔تو فرماتے ہیں کہ مَیں نے ایک گلدستہ گھانس سے باندھا ہوا ایک گنبد پر رکھا ہوا دیکھا۔مَیں کہنے لگا: یہ معمولی گھانس بھی پھولوں کی صف میں جا کر بیٹھ گئی،اس کو بھی یہ مقام مل گیا۔میری بات سن کر گھانس رونے لگی اور کہنے لگی کہ چپ ہو جاؤ، جو شریف آدمی ہوتا ہے وہ صحبت کا فائدہ پہنچاتا ہے۔اگر چہ میرے اندر پھول جیسی خوب صورتی بھی نہیں ہے اس جیسا رنگ بھی نہیں ہے اور اس جیسی خوشبو بھی نہیں ہے۔لیکن مَیں اسی باغ کی ایک گھانس ہوں،اس لئے مجھے بھی وہی مقام دیا گیا ہے۔

بہر حال! آدمی اگر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانا چاہتا ہے؛ تو اس کا یہی طریقہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے جڑے ہوئے ہیں ان کے ساتھ جڑ جائے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے لئے پیش کر دے۔اس کا آسان طریقہ یہی ہے۔اسی کو فرمایا:

﴿یَاأَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوااتَّقُوْااللہَ وَکُوْنُوْامَعَ الصَّادِقِیْنَ﴾

﴿باری تعالیٰ کی گارنٹی﴾

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آج کل اہل اللہ ملتے کہاں ہیں؟ یہ اعتراض تو قرآنِ پاک پر ہوا۔اس لئے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿لَایُکَلِّفُ اللہُ نَفْسًااِلَّاوُسْعَھَا﴾ جو کام آدمی کے بس میں نہ ہو،اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں دیا جاتا۔معلوم ہوا کہ ہر زمانہ میں اور ہر علاقہ میں ایسے لوگ موجود رہیں گے جن کی صحبت اختیار کر کے آدمی اپنے آپ کو صالح بنا سکتا ہے،تب ہی تو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے۔

جیسے کوئی آدمی سخت بیمار ہو تو وہ یہ تو نہیں کہتا کہ مجھے کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ملتا، بلکہ اس کو تو ہر آدمی ڈاکٹر نظر آتا ہے۔ جسمانی بیماری میں ہمارا یہ حال ہے۔ اور روحانی بیماری کے اندر آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میرا کوئی ڈاکٹر ہی نہیں ہے۔ یہ کیسی بات ہے؟ اس خیال کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ھمیں توفیق وسعادت عطا فرمائے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَاوَمِنۡ سَیِّئَآتِ اَعۡمَالِنَامَن یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوۡلَانَامُحَمَّداًعَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡماً کَثِیۡراً کَثِیۡراً. أمابعد.

فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

یَاأَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ. (آل عمران:۱۰۲)

وقال تعالیٰ!فَاتَّقُوااللّٰہَ مَااسۡتَطَعۡتُمۡ (التغابن: ۱۶)

تقویٰ کا بیان چل رہا ہے،تقویٰ کی تشریح اور اس کے حصول کا طریقہ بتلایا جا چکا ہے۔اب یہاں چند آیتیں پیش کی ہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ سے جیسا ڈرنا چاہیے؛ ویسا ڈرو﴾

پہلی آیت ہے: ﴿یَاأَیُّھَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوااتَّقُوااللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ سے جیسا ڈرنا چاہیے؛ ویسا ڈرو۔اب اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق کیسے ادا ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے علوِشان کی وجہ سے اس آیت کو سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سہم گئے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حق تو ادا نہیں ہوسکتا اور ہمیں اس کا حکم دیا جارہا ہے۔لہٰذا اس کی تشریح کے طور پر دوسری آیت نازل ہوئی: ﴿فَاتَّقُوااللّٰہَ مَااسۡتَطَعۡتُمۡ﴾ تم سے جتنا ہوسکے اللہ تعالیٰ سے اتنا ڈرو، اپنے مقدور بھر ڈرنے کا اہتمام کرو۔اور مقدور بھر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے؛ ان کو بجالاؤ۔اور جن چیزوں سے منع کیا ہے؛ اس سے باز رہو۔

اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب سے ڈرنے کا حق ادا ہو جائے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے انہیں چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے جو آدمی کر سکتا ہے اور انہیں چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے جو آدمی کے مقدور میں ہے ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بتلایا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو فرمایا: ﴿ھذہٖ الآیۃ مبینۃ للمعنیٰ الاولیٰ﴾ پہلی آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا جیسا حق ہے؛ ویسا ڈرو۔ اس کی تشریح یہ آیت کرتی ہے۔

﴿حصولِ تقویٰ کا آسان طریقہ﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور درست بات کہو۔ یعنی ایسی بات کہو جو صحیح ہو، خطا نہ ہو۔ راہِ راست سے ہٹی ہوئی نہ ہو، معتدل ہو۔ اس آیت کو لا کر بتلایا کہ تقویٰ کا تعلق افعال اور اقوال دونوں سے ہے۔ یعنی کرنے کے کاموں میں بھی تقویٰ اختیار کرنا ہے اور اپنے کلام میں بھی تقویٰ کا لحاظ کرنا ہے۔ اگر تم ایسا کر لو گے، درست بات زبان سے نکالنے کی عادت ڈال لو گے؛ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو درست کر دیں گے اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔ گویا تقویٰ کے حصول کے لئے ایک آسان راستہ بتلا دیا کہ آدمی اقوال میں معتدل بات کرنے کی عادت ڈال لے، اس کی برکت یہ ہوگی کہ دوسرے اعمال بھی درست ہو جائیں گے اور اللہ تعالیٰ گناہوں کو بھی معاف کر دیں گے۔

﴿سب سے زیادہ عزت والا کون؟﴾

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قیل: یارسول اللّٰہ! مَنْ أَکْرَمُ النَّاسِ؟ قَالَ: أَتْقَاھُمْ.

فَقَالُوا: لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْأَلُكَ، قَالَ: فَيُوسُفُ نَبِيُّ اللّٰهِ بْنُ نَبِيِّ اللّٰهِ بْنِ نَبِيِّ اللّٰهِ بْنِ خَلِيْلِ اللّٰهِ قَالُوْا: لَيْسَ عَنْ هٰذَا نَسْأَلُكَ. قَالَ: فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْئَلُوْنِيْ؟ خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا. (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کے یہاں لوگوں میں سب سے زیادہ عزت والا کون ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو آدمی جتنا زیادہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے گا اور جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا؛ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ عزت والا ہے ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ﴾ عزت کا مدار اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے پر ہے۔ اس روایت کو پیش کر کے یہی بتلانا مقصود ہے کہ حضور ﷺ کا پہلا جواب یہی تھا: ﴿أَتْقَاهُمْ﴾

صحابہ نے عرض کیا: ہمارے سوال کا منشا یہ نہیں ہے کہ بلکہ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے عزت والا کون ہے؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا: حضرت یوسف علیہ السلام جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، اور وہ بیٹے ہیں اللہ کے نبی حضرت یعقوب کے، اور وہ بیٹے ہیں اللہ کے نبی حضرت اسحاق کے اور وہ بیٹے ہیں اللہ کے خلیل یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ گویا ان کے گھرانے میں نبوت چار پشتوں تک جاری رہی۔ اس سے زیادہ عزت والا اور کون ہوگا؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے سوال کا مقصد یہ بھی نہیں ہے۔

﴿ہر خاندان کے امتیازی اوصاف ہوتے ہیں﴾

تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿فَعَنْ مَعَادِنِ الْعَرَبِ تَسْئَلُوْنِيْ؟﴾ عرب کی کانوں

(خاندان، قبائل) کے متعلق مجھ سے سوال کر رہے ہو؟ قبیلوں کو معادن سے تعبیر اس لئے کیا کہ ہر قبیلہ کے اندر کچھ نہ کچھ امتیازی اوصاف اور خصوصیات ہوا کرتی ہیں کہ اس قبیلہ میں پیدا ہونے والا ان امتیازی اوصاف کو اپنے اندر لے کر آتا ہے۔ جیسے سونے کی کان میں سے سونا نکلے گا اور چاندی کی کان میں سے چاندی نکلے گی، پیتل کی کان میں سے پیتل نکلے گا۔ اسی طریقہ سے ہر قبیلے اور خاندان کی کچھ امتیازی خوبیاں ہوا کرتی ہیں۔ جب کوئی بچہ اس قبیلہ میں پیدا ہوتا ہے تو اس میں وہ خوبیاں اور امتیازی اوصاف قدرتی طور پر موجود ہوتے ہیں۔

حضور ﷺ نے پوچھا: اس کے متعلق پوچھتے ہو؟ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿خِيَارُهُمْ فِى الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِى الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوْا﴾ جو قبائل زمانۂ جاہلیت میں عمدہ اور اعلیٰ سمجھے جاتے تھے، اسلام میں بھی وہی اعلیٰ اور عمدہ ہیں۔ یعنی اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں جن قبائل کو دوسرے قبائل کے اوپر جو امتیاز اور فوقیت حاصل تھی اور اپنی خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے وہ دوسرے قبائل سے اونچے سمجھے جاتے تھے، اسلام کے بعد بھی وہی سلسلہ باقی ہے؛ بشرطیکہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں۔

﴿سونے پر سہاگہ﴾

اسی ارشاد کو سامنے رکھ کر علماء نے فرمایا ہے کہ کسی آدمی کو اگر خاندانی شرافت حاصل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر علم حاصل کرلے، فقاہت اور دینی سمجھ پیدا کرلے تو یہ خاندانی شرافت اس کے لئے کارآمد بن جائے گی۔ اور اگر صرف خاندانی شرافت ہے اور کوئی خوبی نہیں ہے، ایمان نہیں ہے، عملِ صالح نہیں ہے، فقاہت اور دین کی سمجھ نہیں ہے؛ تو پھر یہ خاندانی شرافت اس کے لئے کوئی کارآمد نہیں ہے۔ اگر خاندانی شرافت کے ساتھ یہ ساری

چیزیں بھی ہیں تو پھر چار چاند لگ جائیں گے۔سونے پر سہاگہ ہو جائے گا۔نور علیٰ نور والا معاملہ ہو جائے گا۔

اور ایک آدمی وہ ہے جس کو خاندانی شرافت حاصل نہیں، لیکن اس میں ایمان ہے، عملِ صالح ہے اور علم حاصل کیا ہے؛ تو پھر اس کی وجہ سے اس کا مقام بلند ہوگا۔لیکن جس کو تین چیزوں کے ساتھ چوتھی چیز بھی حاصل ہے تو اس کا مقام اس سے بھی بلند سمجھا جائے گا؛ یہ ایک بدیہی چیز ہے، جس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔

﴿دنیا بڑی شیرین اور سرسبز وشاداب ہے﴾

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ الدُّنیَا حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ وَاِنَّ اللہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا فَیَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ. فَاتَّقُوا الدُّنْیَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ. فَاِنَّ أَوَّلَ فِتْنَۃِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ کَانَتْ فِی النِّسَآءِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دنیا بڑی شیرین، میٹھی اور سرسبز وشاداب ہے۔حضور ﷺ دنیا کو مال ودولت اور ثروت کے فوائد کے پیشِ نظر میٹھی اور سرسبز وشاداب سے تعبیر فرما رہے ہیں۔دیکھنے میں بھی آدمی کا دل لبھاتی ہے، ہر آدمی اس کی طرف مائل ہوتا ہے، اسی کو ﴿حُلْوَۃٌ خَضِرَۃٌ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

﴿پھر اللہ تعالیٰ دیکھے گا کہ تم کیا کرتے ہو﴾

﴿وَاِنَّ اللہَ مُسْتَخْلِفُکُمْ فِیْھَا﴾ اللہ تعالیٰ اس میں تم کو جانے والوں کا جانشین بنائے گا یعنی پہلے یہ دنیا جن کے ہاتھوں میں تھی، ان سے لے کر تم کو دے گا۔پہلے جو لوگ برسرِ اقتدار تھے؛ اللہ تعالیٰ وہ اقتدار ان سے لے کر تم کو دے گا اور تم کو ان کا جانشین بنائے گا ﴿فَیَنْظُرَ کَیْفَ

تَعۡمَلُوۡنَ﴾ پھر اللہ تعالیٰ دیکھے گا اور تم کو آزمائے گا کہ تم اس میں کیا کرتے ہو؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا کی جو نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتیں ہیں، چاہے حکومت واقتدار ہو، منصب وعہدہ ہو، دولت وثروت ہو؛ یہ سب نعمتیں اس لئے دی جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو دے کر آزماتا ہے کہ ان نعمتوں کے ملنے کے بعد یہ کیا کرتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ شریعت کی پیروی کرتے ہیں یا نہیں؟ دولت وثروت میں پڑ کر اور عہدہ و منصب اور حکومت واقتدار حاصل کرنے کے بعد کیا نافرمانی میں مبتلا ہو جاتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنا شروع کرتے ہیں؟ گویا اللہ تعالیٰ تم کو یہ نعمتیں دے کر آزمائے گا۔

﴿فَاتَّقُوا الدُّنۡيَا وَ اتَّقُوا النِّسَآءَ﴾ لہٰذا دنیا سے بچیو اور عورتوں سے بھی ڈرتے رہیو۔ یعنی دنیا کی یہ دولت وثروت آوے تو اس کی وجہ سے اپنے ہوش وحواس مت کھو دینا، بلکہ اس دنیا کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایتیں دی گئی ہیں اس کا اہتمام کرنا۔

﴿خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی دو چیزیں﴾

حدیثِ پاک میں ہے کہ قیامت کے روز مال کے متعلق سوال ہوگا: ﴿مِنۡ اَيۡنَ اكۡتَسَبَهٗ وَ فِيۡمَا اَنۡفَقَهٗ﴾ (ترمذی شریف، حدیث نمبر ۲۳۴۰) کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ یہی دو چیزیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔ کمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کو توڑا نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق کماؤ، شریعت سے ہٹ کر، جھوٹ بول کر، دھوکہ دے کر نہیں بلکہ صحیح طریقہ سے کماؤ۔ اور جب مال صحیح طریقہ سے آجائے تو خرچ بھی اسی طرح کرو جیسا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ مال آیا تو ہم اس کے مالک نہیں ہیں بلکہ امانت دار ہیں۔

عورت؛ بڑی آزمائش کی چیز

اور عورتوں سے بھی ڈریو۔اس لئے کہ یہ بھی راہِ راست سے ہٹانے والی اور گمراہ کرنے والی چیز ہے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا سب سے پہلا فتنہ عورتوں کی وجہ سے تھا۔ یہ عورت بھی بڑی آزمائش کی چیز ہے۔اس لئے کہ عورتوں سے خلط ملط اور ان کے ساتھ بے محابہ ملنا، بے پردگی سے ان کے پاس آنا جانا یا شریعت کے بتلائے ہوئے اصول وحدود سے ہٹ کر ان کے ساتھ تعلقات قائم کرنا؛ یہ سب فتنہ میں ڈالنے والی چیزیں ہیں۔اس سلسلے میں شریعت نے جو ہدایتیں دیں ہیں، مثلاً اجنبی عورتوں کی طرف سے نگاہوں کو نیچی رکھا جائے،ان کے ساتھ بلاضرورت گفتگو نہ کی جائے، بوقتِ ضرورت گفتگو کی نوبت آوے تو شریعت نے جو اصول مقرر کئے ہیں ان کا لحاظ کرتے ہوئے بات چیت کی جائے، کوئی چیز مانگی جائے تو پردہ کی آڑ میں سے مانگی جائے، عورت بھی ایسے موقع پر آواز کو نرم نہ کرے بلکہ سخت رکھے، گھر سے باہر نہ نکلے، نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو پُرانے اور میلے کچیلے کپڑوں میں نکلے، خوشبو لگا کر نہ نکلے۔مطلب یہ ہے کہ ان سارے اصول وحدود کا لحاظ رکھا جائے گا، تب ہی اس کے فتنہ سے آدمی اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔اور جہاں آدمی نے ذرا چھوٹ چھاٹ لے لی اور اس کے سلسلے میں ذرا بھی بے پروائی سے کام لیا؛ تو آدمی فتنہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

تقویٰ کی دعا؛ حضور ﷺ کی زبانی

عن أبی مسعود رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ کان یقول: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْھُدیٰ وَالتُّقیٰ وَالْعَفَافَ وَالْغِنیٰ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی دعا میں یہ کلمات کہتے

تھے: اے اللہ! مَیں تجھ سے راہِ راست پر چلنے کا سوال کرتا ہوں اور تقویٰ یعنی تیرے ڈر کا سوال کرتا ہوں اور گناہوں سے حفاظت کا سوال کرتا ہوں، اور فواحش و بے حیائی کے کاموں سے بچنے کا سوال کرتا ہوں اور دل کی بے نیازی کا سوال کرتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جس کو مانگنے کا حضور ﷺ نے بھی اہتمام کیا ہے۔ یہ ایسی صفت ہے جس کو بذریعۂ دعا اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے۔ اس کے حصول کے لئے عملی طور پر تو ہمیں کوشش کرنا ہی ہے، اس کے ساتھ ساتھ دعا کا بھی اہتمام کرنا ہے۔

﴿ تقویٰ والا پہلو اختیار کرنا چاہیے ﴾

عن أبی طریف عدی بن حاتم الطائی رضی اللہ عنہ **قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ** ﷺ **يَقُوْلُ: مَنْ حَلَفَ عَلٰى يَمِيْنٍ ثُمَّ رَأَى أَتْقٰى لِلّٰهِ مِنْهَا، فَلْيَأْتِ التَّقْوٰى.** (رواہ مسلم)

یہ روایت حضرت عدی بن حاتم طائی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ وہ فرماتے ہیں: مَیں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کسی آدمی نے ایک چیز کی قسم کھالی اور پھر اس قسم کے علاوہ دوسرا کام محسوس کیا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف زیادہ ہے یعنی اس میں گناہ سے بچاؤ زیادہ ہے۔ تو اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے ڈر والی چیز کو ہی اختیار کرے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بات پر قسم کھالیتا ہے۔ مثلاً قسم کھالی کہ فلاں سے بات نہیں کروں گا، باپ ناراض ہوگیا تو بیٹے سے بات نہ کرنے کی قسم کھالی، پھر احساس ہوا کہ یہ تو قطع رحمی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! اگر بیٹے کی شرعی خلاف ورزی کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو گنجائش ہے۔ بہر حال! جس چیز کی قسم کھائی ہے اس کے بارے میں محسوس ہوا کہ اس قسم کی خلاف ورزی کرنا ہی شرعی اعتبار سے زیادہ مناسب ہے، تو پھر وہی کرنا چاہیے،

اور اپنی قسم توڑ کر اس کا کفارہ ادا کر دے۔

معلوم ہوا کہ قسم کھانے کے بعد بھی جب یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ تقویٰ والا پہلو دوسری بات میں ہو تو قسم توڑ دو۔ تو دوسرے کاموں میں بدرجہ اُولیٰ اس کا اہتمام کیا جائے گا۔

﴿"تقویٰ" بنیادی امور میں سے ہے﴾

عن أبی أمامة صدی بن عجلان الباھلی رضی اللہ عنہ قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَخْطُبُ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ. فَقَالَ: اِتَّقُوا اللّٰهَ، وَصَلُّوا خَمْسَكُمْ، وَصُومُوا شَهْرَكُمْ، وَأَدُّوا زَكَاةَ أَمْوَالِكُمْ، وَأَطِيعُوا أُمَرَاءَكُمْ، تَدْخُلُوا جَنَّةَ رَبِّكُمْ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح.)

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے اندر خطبہ دیتے ہوئے سنا جس میں آپ نے ارشاد فرمایا: ﴿اِتَّقُوا اللّٰهَ﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

یہاں تو اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ ظاہر ہے یہ ایک ایسا خطبہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ آج میرے سامنے اہلِ ایمان کا جو مجمع موجود ہے، آئندہ ایسا مجمع دوبارہ ملنے والا نہیں ہے۔ ایسے موقع پر جو اہم چیزیں ہوتی ہیں، انہیں کی آدمی اپنے ماتحتوں کو تاکید کرتا ہے۔ گویا یہ موقع بھی ایسا ہی تھا۔ اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے جس چیز کی تاکید فرمائی اور جس چیز کی طرف متوجہ کیا؛ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا حکم تھا۔

اور پانچ وقت کی نماز پڑھو، رمضان المبارک کے مہینہ کے روزے رکھو، اپنے مالوں کی زکوۃ ادا کرو اور اپنے حکام کی اطاعت و فرمانبرداری کرو؛ اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ گے

گویا یہ بنیادی امور ہیں جن کی طرف حضور اکرام صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا۔ اگر ان کا اہتمام کر لیا، تو ان شاء اللہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں تقویٰ والی صفت سے متصف فرمائے

”یقین وتوکل“

مجلس ﴿۱﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد.

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم.

وَلَمَّارَأَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْأَحْزَابَ قَالُوْاھٰذَامَاوَعَدَنَااللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہ.(الأحزاب)

یقین اوراس کے درجات

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیاعنوان ''یقین وتوکل'' کا قائم کیا ہے۔یہاں دو چیزیں الگ الگ ہیں،ایک ہے یقین اورایک ہے توکل۔یقین کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کاایسا پختہ علم ہوکہ اس میں کسی قسم کا کوئی ترددادرشک وشبہ نہ ہو،کسی بھی قسم کے شک کی کوئی گنجائش نہ ہو۔اگرکسی چیز کاایسا پختہ علم ہےتواس کویقین سےتعبیرکیا جاتا ہے۔مثلاً ہرمسلمان جانتا ہے کہ مکہ مکرمہ ایک شہرکا نام ہے،وہاں کعبۃ اللہ ہے۔تو مکہ مکرمہ کے وجودکاعلم ایسا پختہ ہے کہ اس میں کسی مسلمان کوکوئی تردداورشک وشبہ نہیں ہے،یہ یقین ہے۔

اوراس یقین کے مختلف درجات ہیں۔اس کاایک درجہ علم کاہے،اوریہی علم اگر مشاہدہ کی شکل اختیارکرلے؛تواس کوعین الیقین کہتے ہیں۔اوریہی علم اگرتجربہ کی شکل اختیار کرلے؛تواس کوحق الیقین سےتعبیرکیا جاتا ہے۔

جیسےآگ کےمتعلق ہرآدمی جانتاہےکہ وہ جلاتی ہے۔تو آگ کے جلانے کی صفت

کا ہر ایک کو یقین ہے، یہ تو علم الیقین کہلاتا ہے۔اور ایک شکل یہ ہے کہ ایک آدمی اپنی نگاہوں کے سامنے آگ کے اس عمل کو دیکھے کہ کہیں آگ لگی اور آگ نے کسی چیز کو خاکستر کر دیا، یہ جو یقین حاصل ہوا؛ وہ عین الیقین کہلاتا ہے۔اور اگر کہیں خود ہی آگ سے پالا پڑ گیا اور آگ میں ہاتھ یا پاؤں گر گیا اور اس کی وجہ سے ہاتھ یا پاؤں جل گیا تو اب اس یقین نے تجربہ کی شکل اختیار کر لی؛ تو اس کو حق الیقین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یقین کے یہ تینوں درجات ہیں۔

﴿شنیدہ کے بود مانند دیدہ﴾

ویسے علم الیقین میں بھی کسی قسم کے شک وشبہ اور تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن جب کسی چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے تو یقین ہونے کے باوجود آدمی کے دل کو ایک قسم کے اطمینان و سکون کی کیفیت حاصل ہوجاتی ہے۔جیسے قرآنِ پاک میں ہے: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے عرض کیا: ﴿رَبِّ أَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتیٰ﴾ اے پروردگار! مجھے دکھلایئے کہ آپ مردوں کو زندہ کس طرح کرتے ہیں؟ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا گیا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ کیا آپ کو اس کا یقین اور ایمان نہیں ہے؟ ﴿قَالَ بَلیٰ وَلٰكِن لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ﴾ کہا: کیوں نہیں لیکن میرے دل کو اطمینان ہوجائے۔ایک ایسی چیز کا جو عجیب وغریب ہو، جب خبر صادق کے ذریعہ سے یعنی ایسی اطلاع کے ذریعہ سے جس کو ہم جھٹلا نہیں سکتے؛ ہمیں یقین ہوجاتا ہے، اس یقین کے بعد پھر دل میں اشتیاق اور بے کلی کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ یہ چیز جس کا ہمیں یقین ہے؛ یہ کیسی ہوگی؟ جیسے ایک آدمی نے لوگوں کی زبان سے سنا کہ مکہ مکرمہ ایک بستی ہے اور وہاں کعبۃ اللہ آباد ہے، تو اس کا یقین ہے، لیکن اب دل میں اشتیاق، رغبت اور بے چینی کی کیفیت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس کی زیارت کروادے، اب یہ دعا کرتا ہے کہ

اے اللہ! وہاں کا منظر مجھے دکھلا دے، مدینہ پہنچادے۔شاعرلوگ اپنے کلام میں بھی اس کو پیش کرتے ہیں۔تو یہ جو دعائیں کی جارہی ہیں اور مطالبہ کیا جارہا ہے،اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ہونے کا یقین نہیں ہے، بلکہ اس کا یقین ہے تب ہی تو آگے اس کی زیارت کی تمنا کا اظہار کیا جارہا ہے۔تو حقیقت یہ ہے کہ آگے کا مطالبہ خود اس یقین ہی کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے۔اور ظاہر ہے کہ خبر کے سچے اور یقینی ہونے کے باوجود جو کیفیت مشاہدہ کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے؛ وہ مزید چیز ہے۔عربی میں مثل ہے: ﴿لَيسَ الْخَبَرُ كَالْمُعَايَنَةِ﴾ سننے کے نتیجہ میں کسی چیز کا جو یقین حاصل ہوتا ہے؛ وہ دیکھنے کی طرح نہیں ہے۔

اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جب یہ درخواست کی گئی کہ باری تعالیٰ مجھے دکھلائیے کہ آپ مردوں کو زندہ کس طرح کرتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس قدرت کا یقین تھا تب ہی آگے انہوں نے سوال کیا۔چونکہ ایک عجیب وغریب چیز تھی کہ ایک چیز جو جاندار ہے، وہ مرجائے اور گل سڑ جائے، پھر مٹی میں مل جائے،اس کے بعد دوبارہ زندہ ہو۔یہ عجیب چیز ہونے کی وجہ سے دل میں اشتیاق اور رغبت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے،اسی لئے سوال کیا۔

﴿انبیاء کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خصوصی معاملہ﴾

اب یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یقین تھا پھر باری تعالیٰ کی طرف سے یہ سوال کیوں کیا گیا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ اے ابراہیم! کیا آپ ایمان و یقین نہیں رکھتے؟

دراصل اللہ تعالیٰ کے یہاں حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے معاملہ میں بڑی احتیاط

برتی جاتی ہے، کوئی ایسی چیز جو ظاہری یا معنوی طور پر ان پر عیب لگنے کا ذریعہ بن سکتی ہو؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی ساری چیزوں سے ان کی ذات اور شخصیات کو پاک کرنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے۔

بنی اسرائیل کے یہاں یہ رواج تھا کہ وہ لوگ جب غسل کرتے تھے تو کپڑے نکال کر سب کے سامنے برہنہ غسل کیا کرتے تھے، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی تھے، ظاہر ہے کہ حیاء کی صفت ان میں کتنی کامل ہوگی۔ لہٰذا ان کو یہ چیز ناگوار تھی، اس لئے وہ بھی کپڑے اتار کر غسل کرتے تھے لیکن لوگوں کے سامنے نہیں، بلکہ چھپ کر کیا کرتے تھے، اس چیز کا بنی اسرائیل نے اُلٹا مطلب لے لیا، اور آپس میں کہنے لگے کہ یہ چھپ کر غسل کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کوئی بات ہے۔ ان میں کوئی ایسا عیب ہے جس کو یہ چھپانا چاہتے ہیں، یا کوئی ایسی بیماری ہے جس کو ظاہر ہونے دینا نہیں چاہتے، برص کا کوئی داغ ہوگا یا خصیتین پھول گئے ہوں گے، اس لئے یہ چھپ کر غسل کرتے ہیں۔

یہاں دیکھئے کہ لوگوں کے دلوں میں ایسی چیز آرہی تھی جو نبی کی ذات کے متعلق عیب کی تھی اور اس کے نتیجہ میں ہوسکتا ہے کہ ان کے دلوں میں جو وقعت وعظمت نبی کی ہونی چاہیے؛ وہ باقی نہ رہے، اور یہی چیز ایمان اور نبی کی اطاعت وفرمانبرداری کے معاملہ میں مخل اور رکاوٹ بن جائے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے دور کرنے کا انتظام ہوا۔

چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تنہائی میں کپڑے نکال کر ایک پتھر پر رکھ کر غسل کررہے تھے، غسل سے فارغ ہوکر جب کپڑے لینے کے لئے آگے بڑھے تو اس پتھر نے چلنا شروع کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس پتھر کے پیچھے

دوڑ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں:﴿ثَوْبِیْ حَجَرُ، ثَوْبِیْ حَجَرُ﴾ اے پتھر! میرے کپڑے لا، اے پتھر! میرے کپڑے لا۔ یہ اس کے پیچھے دوڑ رہے ہیں اور وہ پتھر بھی آگے آگے دوڑ رہا ہے۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں تھا کہ یہ پتھر مجھے کہاں لے جا کر کھڑا کرے گا۔ چنانچہ وہ پتھر ان کو ایسی جگہ لے گیا جہاں بنواسرائیل کی ایک جماعت بیٹھ کر باتیں کررہی تھی، وہ پتھر وہاں جا کر رکا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جلدی سے اپنے کپڑے لے کر پہنے اور اس پتھر پر لاٹھیاں بھی ماریں۔ حدیث میں ہے کہ لاٹھی کے نشان اس پتھر پر پڑ گئے، اب اتنی دیر میں ان لوگوں نے دیکھ لیا کہ ان کے جسم میں کوئی عیب نہیں ہے۔ دیکھئے! ان کی براءت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظام کیا گیا۔ قرآنِ پاک میں ہے:﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَاتَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی فَبَرَّأَهُ اللہُ مِمَّا قَالُوْا﴾ اے ایمان والو! تم ان کے جیسے نہ بنو جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تکلیف پہنچائی، پھر جن باتوں کا ان پر الزام لگتا تھا؛ اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بری کردیا۔

(مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۵۷۰۶/ بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۶۹)

﴿حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت﴾

تو حضرات انبیاء کی شخصیات پر کوئی الزام آتا ہو، وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی براءت کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے پوچھیں گے:﴿أَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَأُمِّیَ اِلٰھَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللہِ﴾ اس کی توجیہ حضراتِ مفسرین نے یہ کی ہے کہ ساری دنیائے عیسائیت حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم کو خدا مانتے ہیں اور ان کی پوجا کرتے ہیں۔ اب دوسرے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال آئے گا کہ جب سب ہی حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کی عبادت کرتے ہیں تو شاید حضرت عیسیٰ ہی نے اپنی قوم کو یہ کہا ہوگا کہ میری اور میری ماں کی پوجا کرو۔ ورنہ یہ

محال لگتا ہے کہ سب ہی ان کی عبادت کے اندر لگے ہوئے ہوں، تو عیسائیوں کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے نعوذ باللہ یہ الزام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر آسکتا تھا، حالانکہ ایک نبی جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب دی گئی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنا نبی اور رسول بنایا ہے؛ وہ کبھی بھی اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت کا حکم نہیں دے سکتا۔ قرآنِ پاک میں بھی اس کی صاف صاف صراحتاً نفی کردی گئی ہے۔ لیکن عیسائیوں کے طرزِ عمل کی وجہ سے دیکھنے والوں کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوسکتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز تمام اولین وآخرین کی موجودگی میں ان کی براءت اس طرح ظاہر فرمائیں گے کہ باری تعالیٰ ان سے پوچھیں گے: ﴿أَءَ نْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَأُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللهِ﴾ اے عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں کو کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب لوگوں کی موجودگی میں جواب عرض کریں گے: ﴿سُبْحٰنَکَ مَایَکُوْنُ لِیْ أَنْ أَقُوْلَ مَالَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ، اِنْ کُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ﴾ اے اللہ! تیری ذات پاک ہے، مَیں کیسے کہہ سکتا ہوں ایک ایسی بات جس کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر مَیں نے کوئی ایسی بات کہی ہے تو آپ تو جانتے ہیں۔ میرے اندر کی تمام باتوں کو آپ جانتے ہیں۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس الزام سے اپنے بری ہونے کا اعلان کریں گے یہ واقعہ تو قیامت کے روز ہونے والا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے قیامت میں پیش آنے والے واقعہ کو قرآنِ پاک میں نازل فرما کر دنیا میں بھی ان کی براءت ظاہر فرمادی۔ بہرحال! حضراتِ انبیاء کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ رہا ہے۔

﴿مزید توضیح﴾

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اے پروردگار! آپ

مجھے دکھلایئے کہ آپ مردوں کو کیسے زندہ کرتے ہیں؟ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے یہ سوال نہیں تھا کہ باری تعالیٰ! کیا آپ مردوں کو زندہ کرسکتے ہیں یا نہیں؟ بلکہ سوال یہ تھا کہ آپ کیسے زندہ کرتے ہیں۔ کیفیت پوچھی گئی تھی۔ خود زندہ کرنے کے متعلق کسی شک وشبہ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن جب کیفیت کے سلسلے میں سوال کیا جاتا ہے تو قرائنِ خارجیہ سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے، یعنی خارجی دلائل کو چھوڑ کر نفسِ سوال پر جب غور کیا جاتا ہے تو اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی آپ سے یوں کہے کہ مَیں ایک انگلی سے بیس مَن وزن اٹھا سکتا ہوں۔ یا ایک رسی باندھ کر کہے کہ مَیں اس رسی پر چل کر دکھلا سکتا ہوں۔ اب ایک آدمی کا رسی کے اوپر چلنا یا ایک انگلی سے بیس مَن وزن اٹھانا؛ یہ عجیب وغریب چیز ہے۔ اب جو آدمی یہ کہہ رہا ہے اس کے دیگر حالات کا سننے والے کو علم ہے، اور بھی بہت ساری عجیب وغریب چیزیں اس نے پہلے بھی کر کے دکھلائی ہیں، اور اس کے خارجی قرائن کو دیکھ کر اس بات کا یقین ہوجاتا ہے کہ جب وہ کہتا ہے اور پہلے بھی کر چکا ہے تو یہ بھی کرسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود ایسی چیز کا دعویٰ کر رہا ہے جو عجیب وغریب ہے۔ لہٰذا کوئی اس سے کہتا ہے کہ ذرا کر کے تو دکھاؤ۔ تو ''کر کے دکھاؤ'' کا جو سوال ہے وہ اس لئے نہیں کیا ہے کہ یہ نہیں کرسکتا ہے، بلکہ اس طرح پتلی رسی پر چلنا ایک عجیب وغریب کام ہے، اور اس کی بات کا سننے والے کو یقین ہے کہ یہ ایسا کرسکتا ہے، تب ہی اس کے دل میں دیکھنے کا اشتیاق اور رغبت پیدا ہوئی، اس لئے سوال کیا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ''کر کے دکھاؤ'' کا سوال تعجیز کے لئے کیا جاتا ہے۔ جیسے یہی دعویٰ ایک ایسا آدمی کرے، جس سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جاتا اور جس کی طرف سے آج

تک کوئی ایسی چیز نظر بھی نہیں آئی۔تو سننے والا سوچے گا کہ اس کی ٹانگوں میں طاقت تو ہے نہیں، سیدھا چل تو سکتا نہیں، اور پھر ایسا دعویٰ کررہا ہے۔تو اب سننے والا کہے گا کہ پتلی رسی پر چل کر تو ذرا دکھاؤ۔ یہاں سوال ہی بتلا رہا ہے کہ اس کا عاجز ہونا بتلانے کے لئے یہ سوال کیا گیا ہے، گویا اس کو یقین ہے کہ یہ چل نہیں سکے گا پھر بھی سوال یہ بتلانے کے لئے کررہا ہے کہ تو اس طرح چل کر نہیں بتلا سکتا۔معلوم ہوا کہ اس طرح کے سوال میں دونوں احتمال ہوتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی ہیں بلکہ ابوالانبیاء ہیں اور خلیل اللہ ہیں۔ظاہر ہے کہ ان کا یقین اللہ تعالیٰ کی قدرت پر جیسا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔لیکن ان کی شخصیت سے صَرفِ نظر کرتے ہوئے اس سوال میں دونوں احتمال تھے کہ شاید یہ سوال تعجیز کے لئے کیا گیا ہو، اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معاملہ میں یہ احتمال نہیں ہے، لیکن اوندھی کھوپڑیاں بھی ہوتی ہیں۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ خرابی دو وجہ سے آتی ہے، کج فہمی کی وجہ سے یا کم فہمی کی وجہ سے۔یعنی یا تو سمجھ ہی نہیں ہے اس وجہ سے اعتراض پیدا ہوتا ہے۔یا اُلٹی سمجھ کی وجہ سے سوال پیدا ہوتا ہے۔تو ہوسکتا تھا کہ کوئی کم فہم یا کج فہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کی وجہ سے اشکال کرے کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی اس قدرت پر یقین نہیں تھا اس وجہ سے یہ سوال کیا: ﴿رَبِّ أَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى﴾ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کی زبان سے اس کا جواب دلوا کر ایسے اعتراض کا دروازہ بند کردیا۔اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ سوال کیا گیا: ﴿أَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ اے ابراہیم! آپ یہ سوال کیوں کرتے ہیں؟ کیا آپ کو یقین نہیں ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود

جواب دے رہے ہیں: ﴿بَلیٰ﴾ کیوں نہیں! یہ یقین تو ہے، لیکن مزید اطمینان کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ دل میں اشتیاق ورغبت کی کیفیت ہے اور دل چاہتا ہے کہ ایسا عجیب وغریب منظر آنکھوں سے دیکھ لوں؛ تاکہ دل کو سکون ہوجائے۔

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ یقین کے تین درجات ہیں، علم الیقین، عین الیقین اورحق الیقین۔ علم الیقین کا اگر مشاہدہ ہوجائے؛ تو اسی کو عین الیقین کہتے ہیں۔ اور اگر اس کا تجربہ ہوجائے؛ تو اسی کو حق الیقین کہتے ہیں۔

﴿کفرِ جحود﴾

لیکن ایمان کے معاملہ میں صرف یقین کافی نہیں ہے، یقین کے ساتھ ماننا اور زبان سے اقرار کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر کسی کو یقین تو ہے جیسے مشرکینِ مکہ کو نبی کریم ﷺ کے اللہ کا رسول ہونے کا یقین تھا۔ اسی طرح یہودیوں کو نبی کریم ﷺ کے نبی آخر الزمان ہونے کا یقین تھا؛ لیکن وہ لوگ مانتے نہیں تھے اور زبان سے اقرار نہیں کرتے تھے۔ قرآنِ پاک میں موجود ہے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ﴾ مشرکین نے نبی کریم ﷺ کی نبوت اور اللہ تعالیٰ کی آیات ونشانیوں کا انکار کیا، حالانکہ ان کے دلوں کو اُس کا یقین تھا۔ اسی طرح اہلِ کتاب کے بارے میں ہے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ أَبْنَآئَهُمْ﴾ اہلِ کتاب نبی کریم ﷺ کو ایسا پہچانتے ہیں جیسا اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔ لیکن پھر بھی انہوں نے انکار کیا۔ اسی کو محدثین اور علماء کی اصطلاح میں کفرِ جحود کہتے ہیں یعنی ایسا انکار کہ دل کو یقین ہے پھر بھی زبان سے انکار ہے۔ دنیا میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

آپ کورٹوں میں دیکھیں گے کہ ایک مجرم ہے جس کے خلاف جرم عائد کیا گیا ہے،

پولیس نے اس کے خلاف کیس داخل کیا لیکن وہ جانتا ہے کہ پولیس کے پاس میرے اس جرم پر کافی ثبوت موجود نہیں ہیں۔اب اس کے دل کو یقین ہے کہ یہ جرم تو مَیں نے کیا ہے، اس کے باوجود سب کے سامنے وہ انکار کردیتا ہے کہ مَیں نے یہ نہیں کیا، مَیں نہیں مانتا۔کفر جحود میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔

تو ایمان کے لئے صرف یقین کافی نہیں ہے، ایمان صرف یقین سے نہیں آتا، بلکہ یقین کے ساتھ ساتھ ماننا اور پھر زبان سے اس کا اقرار کرنا بھی ضروری ہے۔

﴿یقین وتوکل﴾

بہرحال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے اندر یقین کا تذکرہ کیا ہے اور یقین کے ساتھ توکل کو بھی جوڑ دیا ہے۔اس لئے کہ لغت کے اعتبار سے ''توکل'' کہتے ہیں کسی چیز پر، کسی شخص پر یا کسی تدبیر پر بھروسہ کرنے کو۔اور شریعت کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کرنے کو ''توکل'' کہتے ہیں۔گویا آدمی یہ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی میرے کام بنانے والے ہیں۔اور توکل اسباب کے چھوڑنے کا نام نہیں ہے۔شریعت نے جہاں توکل کو اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں اسباب کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے۔اس لئے کہ دنیا میں جو بھی چیزیں وجود میں آتی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اسباب و وسائل کے ساتھ جوڑا ہے۔نفع و نقصان، کامیابی و ناکامی کے اسباب مقرر کردیے ہیں کہ یہ کرو گے تو اس کا نتیجہ فلاں شکل میں ظاہر ہوگا۔محنت کرو گے تو کامیاب ہو گے اور محنت نہیں کرو گے، سستی کرکے بیٹھے رہو گے تو ناکام ہو جاو گے۔تو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالاسباب بنایا۔اس لئے امورِ دنیا ہوں یا امورِ آخرت؛ تمام کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں، اور اسی لئے اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا

ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم دی کہ اس کے نتائج کو ظاہر کرنے میں اللہ تعالیٰ ان اسباب و وسائل کا محتاج نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿لِکُلِّ دَآءٍ دَوَآءٌ اِلَّاالْمَوْت﴾ (ابوداؤد شریف، ۳۳۵۷) ہر بیماری کی ایک دوا ہے سوائے موت کے۔ گویا آپ ﷺ نے بتلا دیا کہ جتنی بھی بیماریاں ہیں ہر ایک کی کوئی نہ کوئی دوا ہے اور شریعت کا حکم بھی ہے کہ علاج کرو۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿تَدَاوَوْا﴾ تم دوا کرو۔ (سنن ترمذی، ۴/۳۸۳)

اب کوئی آدمی بیمار ہو جائے تو وہ طبیب کے پاس جائے گا۔ طبیب بیماری کی تشخیص کرے گا، اس کے بعد علاج تجویز کرے گا اور پرہیز بتلائے گا، یہ طبیب کا کام ہے، بیمار کا کام یہ ہے کہ طبیب کی تجویز کے مطابق علاج معالجہ کرے، ساتھ میں پرہیز کا بھی اہتمام کرے۔ لیکن اس پر شفا کا ہو جانا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو تندرستی ہوگی اور اگر نہیں چاہیں گے تو تندرستی نہیں ہوگی۔ تو اسباب اختیار کرنا ضروری ہے؛ لیکن نتیجہ کا ظاہر ہونا اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔

﴿ترکِ اسباب کا نام توکل نہیں﴾

شریعت نے اسباب کا حکم دینے کے ساتھ ساتھ بندے کو یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے نتیجہ کے معاملہ میں تمہارے دل میں یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو نتیجہ مرتب ہوگا۔ بندہ تو محتاج ہے لیکن اللہ تعالیٰ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ اسباب موجود ہوں اور نتیجہ مرتب نہ ہو۔

جیسے آگ جلاتی ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے جب آگ میں ڈالا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دے دیا: ﴿کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰی اِبْرَاهِیْم﴾ اب ہر آدمی جانتا ہے کہ آگ

کی خاصیت جلانا ہے لیکن آگ اپنی اس خاصیت کے اندر اللہ تعالیٰ کے ارادے، اس کے حکم اور اس کی مشیت کی محتاج ہے۔ گویا مومن کو جہاں اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، وہاں ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا گیا کہ اسباب کو اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی پر بھروسہ کرنا ہے اسباب کو ضرور اختیار کیا جائے گا۔ شریعت ترکِ اسباب (جس کو علماء کی اصطلاح میں تعطّل کہا جاتا ہے، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جانا) کی اجازت نہیں دیتی۔ روزی دینے والی ذات اللہ کی ہے: ﴿اِنَّ اللهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ﴾ (معجم کبیر للطبرانی،۳/۸، نمبر۹۸۵۱) حلال روزی کو حاصل کرنا، اس کی جستجو میں لگنا؛ فرائض کے بعد ایک اہم فریضہ ہے۔ اسی طرح حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزی کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں رکھے ہیں۔ (المطالب العالیۃ،۴/۳۷۴)

ایک آدمی سوال کرنے کے لیے حضور ﷺ کے پاس آیا، حضور ﷺ نے اس سے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ایک پیالہ ہے۔ تو حضور ﷺ نے اس کا نیلام کر کے اس سے کلہاڑے کا پھل خرید کر اس میں دستہ لگا کر اس کو دیا کہ اس سے محنت کرو۔ (ابوداؤد شریف، حدیث نمبر ۱۳۹۸) تو دیکھو! تعطّل کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن اسباب اختیار کرنے بعد بھی بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ مومن اسباب کو انجام دیتا ہے لیکن وہ اسباب کا غلام اور اسیر وقیدی نہیں ہوا کرتا، اس کی نگاہ اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ہوتی ہے؛ اسی کا نام توکل ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے ترمذی شریف کی روایت ہے کہ ایک آدمی نے اپنے اونٹ کے متعلق پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا اس کے گھٹنے کو باندھوں پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں یا ایسے ہی کھلا ہوا چھوڑ دوں اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کروں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا

کہ باندھو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔ (مجمع الزوائد،طبرانی ۲۹۱/۱۰۔ سنن ترمذی، ۲۴۴۱) گھر کھلا ہوا رکھ کر بھروسہ مت کرو کہ مال محفوظ رہے گا، بلکہ تالا لگاؤ، پھر تالے پر بھروسہ مت کرو، بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے؛ اسی کا نام توکل ہے۔

شریعت میں تدبیر کو اہمیت دی گئی ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ دو آدمیوں کا معاملہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ ﷺ نے ان میں سے ایک کے حق میں فیصلہ کیا تو دوسرا جس کے خلاف فیصلہ کیا تھا وہ کہنے لگا: ﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل﴾ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿عَلَیْکَ بِالْکَیْس﴾ تمہیں سمجھداری اور تدبیر سے کام لینا چاہیے تھا ﴿فَاِنْ عَجَزْتَ وَغَلَبَکَ﴾ پھر اگر تم تدبیر سے عاجز آجاتے اور حالات تم پر غالب آجاتے؛ تو پھر تمہیں زبان سے کہنا چاہیے: ﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل﴾ اسباب اختیار کیے بغیر نہیں۔ (ابوداؤد شریف، حدیث نمبر ۳۱۴۳)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اسباب کی تفصیل بیان کی ہے جو آئندہ مجلس میں بتلائی جائے گی

اقتباس

ترکِ اسباب یعنی اسباب چھوڑنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ ترکِ اعتماد علی الاسباب یعنی اسباب پر اعتماد و بھروسہ چھوڑنے کا نام توکل ہے

شریعت نے جہاں توکل اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں اسباب اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے، اس لئے کہ دنیا میں جو بھی چیزیں وجود میں آتی ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے اسباب و وسائل کے ساتھ جوڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو دارالاسباب بنایا، اس لئے امورِ دنیا ہوں یا امورِ آخرت؛ تمام کے لئے اسباب مقرر کئے ہیں، اور اسی لئے اسباب و وسائل کو اختیار کرنے کا بھی حکم دیا ہے لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی تعلیم دی کہ اس کے نتائج کو ظاہر کرنے میں اللہ تعالیٰ ان اسباب و وسائل کا محتاج نہیں ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے توکل حاصل کرنے کا بہت آسان نسخہ بتلایا ہے۔ اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر اس پر عمل کریں گے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ توکل حاصل ہو جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ جب بھی کسی کام کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے جارہا ہو تو پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر دل میں یہ سوچ لے کہ اے اللہ! اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مَیں اس تدبیر کو انجام تو دے رہا ہوں، لیکن اس مقصد کا حاصل ہونا تیری مشیت اور تیرے ارادے پر موقوف ہے۔ تو اگر چاہے گا تو حاصل ہوگا، ورنہ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن میں یہ بات مستحضر کرلے اور پھر اس تدبیر کو انجام دے

اگر آدمی روزانہ اس کی عادت ڈال لے گا اور اسی سوچ کے ساتھ آگے بڑھے گا تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تھوڑے دنوں کے بعد اس کی کیفیت بدل جائے گی، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کی صفت آسانی سے حاصل ہو جائے گی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً.أمابعد.

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم.وَلَمَّارَأَی الْمُؤْمِنُوْنَ الْأَحْزَابَ قَالُوْاھٰذَامَاوَعَدَنَااللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَصَدَقَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ،وَمَازَادَھُمْ اِلَّآاِیْمَاناً وَّتَسْلِیْماً.(الأحزاب)

یقین وتوکل کا بیان چل رہا تھا، ویسے دونوں چیزیں الگ الگ ہیں جیسا کہ پہلے بتلایا جاچکا ہے لیکن وہ ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں کہ آدمی کا یقین جس قدر پختہ ہوگا اتنا ہی اس کو اللہ تعالیٰ کی کارسازی پر بھروسہ زیادہ ہوگا، اوروہ اللہ تعالیٰ پر توکل کرے گا، اس لئے دونوں کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے، اورتوکل کے بارے میں بتلادیا تھا کہ ترکِ اسباب یعنی اسباب چھوڑنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ ترکِ اعتماد علی الاسباب یعنی اسباب پر اعتماد وبھروسہ چھوڑنے کا نام توکل ہے۔آدمی اسباب تو اختیار کرے گا، البتہ دل سے اس بات کا پختہ یقین ہو کہ کام بنانے والی ذات تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

﴿اسباب کی تفصیل اوران کا حکم......یقینی اسباب﴾

علماء نے اسباب کے متعلق تفصیل بیان کی ہے کہ اسباب تین طرح کے ہیں۔ایک تو وہ اسباب، جو یقینی ہیں، ان کو تو اختیار کرنا شریعت نے ضروری قرار دیا ہے، اگر کوئی ان اسباب کو اختیار نہ کرے، تو وہ گنہ گار ہوگا۔جیسے بھوک کے لئے کھانا۔تو کھانا

کھانے کی وجہ سے آدمی شکم سیر ہوجاتا ہے اور اس کی بھوک ختم ہوجاتی ہے۔ تو شکم سیری کا سبب کھانا ہے۔ اسی طرح پیاس کے لئے پانی کا پینا۔ آدمی پانی پئے گا تو وہ سیراب ہوجائے گا۔ تو کھانے کے نتیجے میں شکم سیری کا حاصل ہونا اور پانی پینے کے نتیجے میں پیاس کا بجھنا؛ یہ یقینی اسباب میں سے ہے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ کبھی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اس کے خلاف کردیں وہ الگ بات ہے۔ جیسے ایک بیماری استسقاء (જલંદર) ہوتی ہے، جس میں آدمی پانی پیتا ہی رہے، اس کے باوجود اس کی پیاس بجھتی نہیں ہے۔ یا ایک بیماری جوع البقر کی ہوتی ہے کہ اس میں آدمی کھاتا ہی رہے اس کے باوجود بھوک مٹتی نہیں ہے۔ ویسے عام حالات میں یہی ہوتا ہے کہ کھانے کے نتیجے میں شکم سیری اور پینے کے نتیجے میں سیرابی حاصل ہوتی ہے۔ ان اسباب کو "یقینی اسباب" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ان کا اختیار کرنا شریعت ضروری قرار دیتی ہے ایک آدمی بھوکا ہے اور کھانا سامنے موجود ہے، تو شریعت اس کو حکم دیتی ہے کہ کھانا کھا کر اپنی بھوک مٹاؤ۔ اب اگر کھانا سامنے موجود ہونے کے باوجود نہ کھاوے، یہاں تک کہ بھوک کی وجہ سے موت آجاوے؛ تو وہ آدمی گنہگار رہوگا اور جیسے خودکشی کرنے والا نافرمان قرار دیا جاتا ہے، ایسا ہی حکم اس پر بھی لاگو پڑے گا۔ یہی حکم پیاسے کا ہے کہ پانی موجود ہے، اور شریعت حکم بھی دیتی ہے کہ پانی پیو، اس کے باوجود وہ پانی نہیں پیتا یہاں تک کہ پیاس کی وجہ سے موت آجائے تو گنہگار رہوگا۔ لیکن جس وقت وہ کھانا کھا رہا ہو یا پانی پی رہا ہو، اس وقت دل میں یقینی اسباب ہونے کے باوجود اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ اس کھانے کے ذریعہ سے شکم سیری کا حاصل ہونا اور پانی کے ذریعہ سے سیرابی کا حاصل ہونا؛ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور چاہت و ارادے پر موقوف ہے، اگر اللہ

چاہے گا تو میرا پیٹ بھرے گا، اور اگر اللہ نہیں چاہے گا تو نہیں بھرے گا۔ اگر اللہ چاہے گا تو اس پانی سے میری پیاس دور ہوگی اور اگر اللہ نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگی۔ دل میں یہ یقین ہونا چاہیے، یقینی اسباب کا یہی حکم ہے۔

﴿ظنی اسباب﴾

دوسرا درجہ ظنی اسباب کا ہے، یعنی ان اسباب کو اختیار کرنے کی وجہ سے اکثر حالات میں نتیجہ مرتب ہوتا ہے، اوراس کے بالمقابل کم حالات وہ ہیں جن میں نتیجہ ظاہر نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی آدمی بیمار ہے، تو اس کا علاج ومعالجہ کرنا۔ تو عام حالات میں علاج ومعالجہ کی وجہ سے تندرستی حاصل ہوتی ہے، لیکن صدفی صد نہیں۔ تو یہ سبب ''سببِ ظنی'' کہلاتا ہے۔ ایسے اسباب اختیار کرنے کو سنت قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے خود نبی کریم ﷺ نے بہت سی بیماریوں کے علاج بتلائے اور خود آپ ﷺ نے علاج کروائے۔ اور حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کوئی ایسی بیماری نہیں جس کی دوا اللہ تعالیٰ نے اتاری نہ ہو، سوائے بوڑھاپے کے۔ (ابوداؤد شریف، ۳۳۵۷) اور آپ نے حکم بھی دیا: ﴿یَا عِبَادَ اللّٰہِ اِتَدَاوَوْا﴾ (ترمذی، ۱۹۶۱) اے اللہ کے بندو! علاج کرو۔ اور خود حضور اکرم ﷺ نے اس کو اختیار کیا اور حضرات صحابہ یا آپ کے گھر کے افراد میں سے کوئی بیمار ہوتا تھا تو آپ ﷺ اس کا علاج کرواتے تھے۔ تو یہ سنت قرار دیا گیا ہے۔ لیکن وہاں بھی وہی بات پیش نظر رہے کہ طبیب کو چاہیے کہ وہ بیماری کی تشخیص کر کے اس کیلئے علاج تجویز کرے، یہ اس کا کام ہے۔ اور مریض کا کام یہ ہے کہ اس کے لیے طبیب کی طرف سے جو دوا تجویز کی گئی ہے اس کو استعمال کرے۔ لیکن یقین تو یہی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس سے شفاء ہوگی؛ ورنہ نہیں ہوگی۔ گویا یہ عقیدہ اور خیال رکھتے ہوئے ان ظنی

اسباب کو اختیار کرنا چاہیے۔ بندہ تو شفاء کے لیے علاج ومعالجہ کا محتاج ہے، لیکن اللہ تعالیٰ شفاء دینے کے لیے علاج ومعالجہ کا محتاج نہیں ہے۔ تو علاج ومعالجہ سنت ہے۔ اب کوئی آدمی بیمار ہے اور علاج ومعالجہ نہیں کرواتا، تو اس صورت میں وہ سنت کا چھوڑنے والا قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح کمائی کے اسباب اختیار کرنا بھی سنت ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی تاکید فرمائی ہے

﴿اسبابِ وہمیہ﴾

تیسرا درجہ اسبابِ وہمیہ ہے۔ مثلاً تعویذ وغیرہ کے طریقے۔ ان کو اسبابِ وہمیہ میں سے قرار دیا گیا ہے، ان کا اختیار نہ کرنا اور چھوڑنا؛ شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ اور مستحب ہے۔ توکل کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی ان کو اختیار نہ کرے۔ ویسے اگر کوئی آدمی ان اسباب کو شریعت کے بتلائے ہوئے حدود کے مطابق اختیار کرے گا؛ تو منع بھی نہیں ہے۔ اس کو اختیار کرنے کی اجازت ہے، لیکن اختیار نہ کرنا اچھا ہے۔ اسباب کی یہ تیسری قسم ہوئی۔

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت کی نگاہ میں اسباب کو چھوڑنے کا نام توکل نہیں ہے، بلکہ اسباب پر اعتماد کو چھوڑنے کا نام توکل ہے۔ ایک آدمی کمائی کے لیے دوکان کرتا ہے، کارخانہ کھولتا ہے، ملازمت کرتا ہے، کمائی کے واسطے یہ سارے اسباب ہیں، ان کو اختیار کرے، لیکن بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو، یہ سمجھے کہ روزی دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، بہت سے حضراتِ اکابر نے اسباب اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ اسباب پر اعتماد نہ کرنے کو اعلیٰ درجہ کا توکل قرار دیا ہے، اور اسباب چھوڑنے کو اس سے کم درجہ کا توکل قرار دیا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اپنی اونٹنی کا گھٹنہ باندھوں اور پھر اللہ پر توکل کروں یا اس کو کھلا ہوا چھوڑ دوں اور

پھر توکل کروں؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کو باندھو اور توکل کرو (مجمع الزوائد، طبرانی ۱۰/۲۹۱، سنن ترمذی، ۲۴۴۱)

گویا اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی نظر اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، یہ اعلیٰ درجے کا توکل ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ جو آدمی اسباب چھوڑتا ہے اس کو تو توکل کرنا ہی ہے۔ ویسے جن اہل اللہ کا یقین اعلیٰ درجے کا ہے اور کسی حال میں بھی ان کی نظر کسی اور طرف نہیں جاتی؛ ان کے حق میں اسباب چھوڑنے کو اعلیٰ درجہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک آدمی کارخانہ چلا رہا ہے اور اس کو یقین ہے کہ روزی دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، کارخانے سے روزی نہیں ملتی؛ تو یہ اصل توکل ہے۔ ہاں! ایک بات ہے کہ اسباب اختیار کرنے کے معاملہ میں غلو سے کام نہ لے۔ اسباب کے اندر اتر نہ جائے، آج کل جس کو ہم لوگ کہتے ہیں کہ ڈیپ (deep) میں نہ اترے۔ یعنی اسباب کے اندر اتنا زیادہ مشغول ہو جانا جس سے دیکھنے والا یوں سمجھے کہ اس کی نظر ہی اسباب کے اوپر ہے؛ شریعت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ اسی لیے فقہ کی کتابوں میں بھی جہاں علاج ومعالجہ کا حکم بتلایا گیا ہے، وہاں یہی لکھا ہے کہ آدمی اس یقین اور عقیدے کے ساتھ علاج کرائے کہ شفاء دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے؛ تب تو جائز ہے، اور اگر یہ یقین نہیں ہے تو علاج کرانے کی بھی اجازت نہیں ہے، ایسا علاج کرانا گناہ ہے۔

آج کل لوگوں کا عام مزاج یہی بنا ہوا ہے کہ فلاں ڈاکٹر صاحب کے پاس جاؤ، فلاں صاحب کو دکھلاؤ۔ اور یہ اس انداز سے کہتے ہیں کہ وہاں جائیں گے تو تندرستی ہو ہی جائے گی۔ گویا نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتی ہی نہیں ہے، اگر یہ حالت ہے تب تو علاج کرانے کی اجازت ہی نہیں ہے۔

اسی لیے مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ علاج کے معاملہ میں کسی اعلیٰ ڈاکٹر کے بجائے کسی چھوٹے ڈاکٹر کے علاج کو اختیار کیا جائے تاکہ نظر خود بہ خود اس کے علاج کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو جائے۔ یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ توکل کا حاصل ہی یہ ہے کہ آدمی کا بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔

پرندے اسکیم نہیں بناتے

توکل کے سلسلہ میں روایت میں آتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کے اوپر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے، تو اللہ تعالیٰ تم کو ایسی طرح روزی دے جیسا کہ پرندوں کو روزی دیتے ہیں کہ صبح کو اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو پیٹ بھرے ہوئے واپس لوٹتے ہیں۔ (ترمذی شریف، ۲۲۶۶)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں غور کیجیے کہ پرندوں نے بھی سبب تو اختیار کیا کہ اپنے گھونسلوں میں بیٹھے نہیں رہے بلکہ گھونسلوں سے باہر نکلے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہماری طرح کسی پلان کے ساتھ نہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کل صبح ہم کوئی تدبیر کرنے والے ہوتے ہیں، تو رات ہی سے اس کے آگے پیچھے کی ساری اسکیم ہمارے ذہن میں بنتی ہے، پرندے ایسی کوئی اسکیم نہیں بناتے کہ کل صبح ہم نکلیں گے تو فلاں جگہ جائیں گے اور ایسا کریں گے۔ جس وقت وہ نکل رہے ہوتے ہیں اس وقت بھی ان کے ذہن میں ایسا نہیں ہوتا کہ مجھے فلاں جگہ ہی جانا ہے۔ بس! وہ نکل کر جنگل میں پہنچتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے لیے روزی کا انتظام کر دیتے ہیں۔ اسباب کے معاملہ میں آدمی کا ذہن اسی طرح کا ہونا چاہیے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے دو قصے......ایک سبق

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان کو جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ وجانشین بنایا گیا، تو چونکہ کپڑوں کی تجارت ان کا پیشہ تھا، دوسرے دن معمول کے مطابق وہ اپنے کپڑوں کی گٹھری لے کر باہر نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: کہاں جارہے ہیں؟ کہا کہ مجھے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنا ہے، اس لیے تجارت کے لیے جارہا ہوں۔ (نصب الرایہ ۴/ ۲۸۷) غور کیجیے کہ ظاہر ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صدیقیت کے اعلیٰ مقام پر ہیں تو ایسا تو نہیں ہے کہ باری تعالیٰ کی ذاتِ عالی پر نگاہ نہیں ہوگی، لیکن وہ بھی اسباب اختیار کررہے ہیں، ایک موقعہ وہ بھی تھا کہ غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی تو گھر کا سب کچھ سمیٹ کر لے آئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا چھوڑا؟ تو کہا: اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں۔ اب دیکھئے! یہاں ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ گھر والوں کے لئے کوئی اسباب چھوڑا نہ جائے، بلکہ وہ جانتے تھے کہ مَیں تاجر آدمی ہوں اگرچہ سب لے آیا لیکن کسی دن بغیر کسی سرمایہ کے بازار میں چلا بھی جاؤں گا تو کوئی نہ کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ایسا کروادیں گے کہ میری ضرورت پوری ہوجائے گی۔

جو آدمی تجربہ کار اور ماہر ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے توقع وامید ہوتی ہے، جیسے ایک آدمی کوئی صنعت وحرفت جانتا ہے، ہنرمند آدمی ہے، تو اگرچہ آج اس کے پاس کوئی آرڈر نہیں آیا ہے لیکن وہ سمجھتا ہے کہ ایک ہنرمند آدمی ہوں، مجھے کوئی نہ کوئی کام مل ہی جائے گا۔ جیسے شہروں میں مزدوروں کو دیکھا ہوگا کہ صبح کو اپنا سامان وغیرہ لے کر آجاتے ہیں۔ اب ان کو یہ پتہ نہیں ہوتا ہے کہ ہمیں کون لے جائے گا، لیکن جب وہ نکلتے ہیں تو جانتے ہیں کہ کوئی

نہ کوئی مزدوری مل ہی جائے گی، اور ہمارا کام بن جائے گا۔ یہی اصل ہے اسباب کے معاملہ میں زیادہ گہرائی اختیار کرنا اور اسباب کو اس انداز سے برتنا کہ دیکھنے والا یوں سمجھے کہ اس کا سارا زور ان اسباب پر ہی لگا ہوا ہے؛ پسندیدہ نہیں ہے۔

﴿اپنی ذاتی ضرورت سے زیادہ کمانا﴾

اور پھر اسباب کے معاملہ میں بھی بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرنا چاہیے، اسی لیے کمائی کے اندر زیادہ مبالغہ آرائی کو بھی شریعت پسند نہیں کرتی۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ سے کسی نے ٹیکس کے متعلق پوچھا کہ اتنی کمائی پر حکومت اتنا سب ٹیکس وصول کر لیتی ہے۔ تو حضرت نے فرمایا کہ اتنا سب کماتے ہی کیوں ہو؟ آپ کی ضرورت تو اس سے کم میں پوری ہو جاتی ہے، پھر کاہے کو اتنا سارا کماتے ہو؟ اتنا سارا کمانا ہی شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے

ہاں! اگر کوئی یہ نیت کرے کہ مَیں کما کر اللہ کے راستے میں اور نیکی کے کاموں میں خرچ کروں گا تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت تو اس سے بہت کم میں پوری ہو رہی ہے تو پھر آگے کی شریعت کی طرف سے اجازت نہیں ملتی ہے۔ دونوں میں فرق ہے جس کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔

﴿توکل حاصل کرنے کا آسان نسخہ﴾

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے توکل حاصل کرنے کا بہت آسان نسخہ بتلایا ہے۔ اور بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اگر اس پر عمل کریں گے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ توکل حاصل ہو جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کسی بھی کام کے لیے آدمی تدبیر اختیار کرتا ہے، آدمی کا کام ہی تدبیر کرنا ہے۔ جیسے بچہ کا اسکول میں داخلہ کرانا ہے تو اس کے لئے کوئی تدبیر کرے گا، اور کوئی

ضرورت ہوگی تواس کے مناسب کوئی تدبیر کرے گا۔ توجب بھی کسی کام کے لیے کوئی تدبیر اختیار کرنے جارہا ہوتو پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر دل میں یہ سوچ لے کہ اے اللہ! اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مَیں اس تدبیر کو انجام تو دے رہا ہوں، لیکن اس مقصد کا حاصل ہونا تیری مشیت اور تیرے ارادے پر موقوف ہے۔ تو اگر چاہے گا تو حاصل ہوگا، ورنہ حاصل نہیں ہوگا۔ اپنے ذہن میں یہ بات مستحضر کرلے اور پھر اس تدبیر کو انجام دے۔ اگر آدمی روزانہ اس کی عادت ڈال لے گا اور اسی سوچ کے ساتھ آگے بڑھے گا تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ تھوڑے دنوں کے بعد اس کی کیفیت بدل جائے گی، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل و اعتماد کی صفت آسانی سے حاصل ہوجائے گی۔

﴿غزوۂ خندق اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا ایمان ویقین﴾

اب امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یقین وتوکل کے سلسلے میں چند آیتیں پیش کررہے ہیں

﴿وَلَمَّا رَأَى الْمُؤْمِنُونَ الْأَحْزَابَ قَالُوا هَٰذَا مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَصَدَقَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ﴾

سورۂ احزاب کی اس آیت میں غزوۂ خندق کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ۵ھ کا واقعہ ہے کہ مشرکینِ مکہ نے ایک بڑا لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کی تھی، اس کی ابتداء یوں ہوئی تھی کہ قبیلۂ بنو نضیر (جو یہودیوں کا ایک قبیلہ ہے) کو نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ سے جلاوطن کردیا تھا، وہ لوگ اپنی اسی دشمنی کی وجہ سے نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ قبیلۂ بنو نضیر اور بنو وائل کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ گئے جس میں حیی بن اخطب، ابن ابی الحقیق اور کچھ لوگ تھے۔ انہوں نے مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف ورغلایا کہ تم مدینہ منورہ پر حملہ کرو، ہم بھی تمہارا ساتھ دیں گے۔ ویسے تو مشرکینِ مکہ

مسلمانوں کے دشمن تھے ہی، ان کو مسلمانوں کے خلاف آمادہ کرنے کے لئے سمجھانے اور ورغلانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ لوگ تو ویسے بھی انہیں تدبیروں میں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں لگے ہی رہتے تھے۔ لیکن روایتوں میں آتا ہے کہ جب وہ لوگ اس طرح سمجھانے کے لئے گئے اور یوں کہا کہ ہم تمہارا ساتھ دیں گے تو ان کو خیال آیا کہ یہ اہلِ کتاب ہیں اور مسلمان جس طرح ہمارے دین یعنی بت پرستی کو برا سمجھتے ہیں، یہ لوگ بھی آسمانی دین کو ماننے والے ہونے کی وجہ بت پرستی کو اچھا نہیں سمجھتے ہوں گے، اس لئے مشرکین نے ان سے پوچھا کہ ہمارا دین بہتر ہے یا ان مسلمانوں کا؟ انہوں نے کہا: تمہارا۔ حالانکہ یہود کو اس بات کا یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ اللہ کے پیغمبر ہیں اور اسلام بت پرستی سے روکتا ہے، اور بت پرستی کے مقابلہ میں مسلمانوں کا دین بہتر ہے، اس کے باوجود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف انہوں نے یہ کہا، پھر بھی مشرکین کو یقین نہیں آیا تو کہا کہ چلو! ہم مسجد حرام میں جائیں۔ وہاں سے آئے ہوئے تقریباً بیس آدمی اور مکہ مکرمہ کے پچاس یا سو آدمی سب مل کر مسجد حرام میں گئے اور کعبۃ اللہ کا پردہ پکڑ کر اور کعبہ کی دیواروں سے اپنے سینے لگا کر آپس میں معاہدہ کیا کہ محمد ﷺ اور مسلمانوں کے خلاف ہم ایک دوسرے کا برابر ساتھ دیں گے یہاں تک کہ وہ لوگ دنیا سے ختم ہو جائیں یا ہم مارے جائیں۔

دیکھئے! یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا حلم ہے کہ اللہ کے دشمن اللہ ہی گھر میں، اس کی دیواروں سے سینے لگا کر اور اس کے پردے پکڑ کر اللہ کے محبوب رسول ﷺ کے خلاف سازشیں تیار کر رہے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ان کو مہلت اور ڈھیل دے رہے ہیں۔ ویسے اس معاہدے کا انجام جو ہوا؛ وہ تو ساری دنیا نے دیکھا۔

خیر! ان کو آمادہ کرنے کے بعد وہ لوگ قبیلۂ غطفان کے سرداروں کے پاس گئے، یہ قبیلہ مکہ مکرمہ کے آس پاس آباد تھا۔ ویسے ان کو تو مسلمانوں سے براہِ راست کوئی دشمنی نہیں تھی، لیکن ان کو مال کا لالچ دیا کہ خیبر میں کھجوروں کی پیداوار ہوتی ہے جس کا پورا یا آدھا حصہ ہم تم کو دیں گے، مکہ والے تیار ہوئے ہیں تم بھی ان کے ساتھ آجانا۔ وہ مال کے لالچ میں آگئے اور اس طرح طے کرلیا گیا۔ چنانچہ اسی معاہدے کے مطابق مکہ مکرمہ سے ابوسفیان کی سرداری میں چار ہزار کا لشکر نکل کر مقام مرالظہر ان میں آکر ٹھہرا، قبیلۂ غطفان کے جو قبائل تھے ان کو خبر دی گئی، تو وہ بھی آگئے۔ کل ملا کر دس یا بارہ یا پندرہ ہزار کا لشکر مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ روانہ ہوا

نبی کریم ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے مشورہ کے لئے صحابہ کرام کو جمع کیا کہ ایسی اطلاع ملی ہے، کیا کیا جائے؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو اس وقت نئے نئے اسلام لائے ہوئے تھے انہوں نے کہا کہ ہمارے یہاں فارس میں یہ طریقہ کار رہا ہے کہ اگر بڑا دشمن ہو کہ میدان میں کھل کر اس کا مقابلہ مشکل ہو تو خندق کھود کر اس کے راستہ میں رکاوٹ ڈال دی جاتی ہے، اور پھر خندق کے اِس طرف سے دشمن کا دفاع کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ان کی یہ رائے پسند کی گئی اور نبی کریم ﷺ نے اس کے مطابق فیصلہ فرمایا اور خندق کھودنے کے لئے دس دس آدمیوں کی ٹولیاں بنائی گئیں اور ہر جماعت کو ایک ایک حصہ مقرر کر کے بتلایا گیا کہ تمہیں اتنا اتنا حصہ کھودنا ہے۔ چنانچہ پانچ گز یعنی پندرہ فٹ چوڑی اور گہرائی میں اتنی کہ تری نکل آوے اور ساڑھے تین میل لمبی خندق تیار کی گئی۔ اتنی بڑی خندق کو ان حضرات نے صرف چھ دن میں مکمل کرلیا۔ جب خندق کھود کر تیار کرلی گئی تو معلوم ہوا کہ لشکر آگیا ہے، لیکن اس لشکر نے دیکھا کہ خندق ہے اور ادھر جا نہیں سکتے۔

اس لشکر کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا کہا؟ اس منظر کو باری تعالیٰ نے اس آیت میں بتلایا

ہے: ﴿وَلَمَّا رَاَى الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ ایمان والوں نے جب مختلف دشمنوں کا یہ مجمع دیکھا تو گھبرائے نہیں، بلکہ انہوں نے کہا کہ ارے! یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا۔ اللہ کے رسول نے ہمیں پہلے ہی بتلا دیا تھا کہ دشمن کی طرف سے تم پر اس طرح حملہ کیا جائے گا اور اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی مدد تمہارے شاملِ حال ہوگی۔ گویا یہ تو وہ وقت آ گیا۔ تو دشمن کو دیکھ کر بجائے پست ہمت ہونے کے یا گھبرانے کے وہ خوش ہو گئے کہ اب تو اللہ کے وعدہ کے پورا ہونے کا وقت آ گیا ﴿وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ واقعہ یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے سچ کہا۔ ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا﴾ دشمنوں کے لشکروں کے دیکھنے سے ان کے ایمان میں اور اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کرنے کے جذبے میں اور اللہ کے حکم کو ماننے میں اضافہ ہی ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دیکھ کر ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ گویا یہ اللہ پر توکل کی علامت تھی ورنہ اتنے بڑے لشکر کو دیکھ کر عام طور پر ہمتیں پست ہو جایا کرتی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی زبانی جو وعدے کئے گئے تھے، ان پر ان کا ایمان و یقین اور زیادہ بڑھ گیا

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی یقین وتوکل کا کمال نصیب فرمائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد.

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم. اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْجَمَعُوْالَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًاوَّقَالُوْاحَسْبُنَا اللّٰہُوَنِعْمَ الْوَکِیْلُ فَانْقَلَبُوْابِنِعْمَۃٍمِّنَ اللّٰہِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْھُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْارِضْوَانَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ ذُوْفَضْلٍ عَظِیْمٌ

یقین وتوکل کا بیان چل رہا ہے۔سورۂ آل عمران کی اس آیت میں ایک واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا تھا۔

غزوۂ حمراء الاسد......اجتماعی یقین کا ایمان افروز منظر

غزوۂ اُحد کے موقعہ پر جب مشرکین کو کامیابی اور مسلمانوں کو شکست ہوئی، اس موقعہ پر ابوسفیان نے- جو مشرکین کے سردار تھے- نبی کریم ﷺ سے کہا تھا کہ آئندہ سال موسم میں مقام بدر میں ہمارا مقابلہ ہوگا اور نبی کریم ﷺ نے اس کو منظور فرمایا تھا، چنانچہ اسی وعدے کے مطابق نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو تیاری کا حکم دیا۔اُدھر اپنے وعدے کے مطابق ابوسفیان نے بھی دو ہزار کا لشکر تیار کیا، اس میں گھوڑے سوار بھی تھے، مکہ مکرمہ سے چل کر مقام مرالظہر ان میں آکر قیام کیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ایسا رعب اور ہیبت ڈالی کہ آگے بڑھنے کی ہمت نہیں ہوئی، لیکن دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ہم

لوٹ جائیں گے تو لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ ملے گا کہ اپنے وعدے کے مطابق آئے نہیں، بزدلی اور پست ہمتی کا مظاہرہ کیا، اس لئے کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیے کہ ہم نہ جائیں، ہماری بات بھی رہ جائے اور سارا الزام مسلمانوں کے اوپر آئے۔ چنانچہ قبیلۂ اشجع کا ایک شخص نعیم بن مسعود عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ گیا ہوا تھا، واپسی میں ابوسفیان سے ملاقات ہوئی تو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ اگلے سال ہمارا جو وعدہ ہوا تھا اس کے مطابق ہم لوگ نکلے تو ہیں لیکن یہ قحط کا سال ہے، اور قحط کے سال میں لڑائی نہیں کی جاتی، لڑائی کے بڑے مصارف ہوتے ہیں، قحط والا سال ان کا متحمل نہیں، لیکن چونکہ ان کے ساتھ وعدہ ہوا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ہم پر کوئی آنچ نہ آوے، ہماری بزدلی اور پست ہمتی کا مظاہرہ بھی نہ ہو، اور الزام مسلمانوں کے سر آوے، تو آپ ایسا کریں کہ مدینہ منورہ جا کر مسلمانوں کو ڈرائیں کہ مکہ والوں نے تمہارے مقابلے کے لئے بہت بڑا لشکر تیار کیا ہے، اور وہ لوگ وہاں سے روانہ ہو چکے ہیں، ان کے مقابلے کے لئے تمہارا نکلنا مناسب نہیں ہے۔ اور ابوسفیان نے نعیم بن مسعود سے کہا کہ اگر تم یہ کام کرو گے تو مَیں تمہیں دس اونٹ بطور انعام کے دوں گا۔ چنانچہ نعیم بن مسعود اشجعی ابوسفیان کے کہنے کے مطابق مدینہ منورہ آیا اور مسلمانوں کو ڈرایا۔ آج کل کی زبان میں جس کو پروپیگنڈہ کہتے ہیں کہ جھوٹی بات کو اس انداز سے چلانا کہ لوگ اس کو سچ سمجھنے لگیں۔ اس نے مسلمانوں سے کہا کہ مکہ والے بہت بڑا لشکر اور بہت سارا ساز و سامان لے کر مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے ہیں اور دیکھو گذشتہ سال وہ لوگ یہاں تمہارے شہر میں آ کر تمہارا مقابلہ کر کے گئے ہیں اور تمہیں شکست ہوئی، تم کو بڑا نقصان پہنچایا تھا، اگر اب کے تم میدان بدر میں وعدے کے مطابق جاؤ گے تو کوئی بھی زندہ واپس نہیں آئے گا اس لئے

تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ تم لوگ نہ نکلو۔اس نے جب یہ بات کہی تو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں ایسا یقین وایمان پیدا فرمایا کہ اس کی بات سن کر کہنے لگے کہ نہیں بھائی! ہم تو ضرور جائیں گے:﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ہم یہاں نہیں رہیں گے بلکہ وعدے کے مطابق جائیں گے، ہم کو تو نکلنا ہی نکلنا ہے، اللہ تعالیٰ جو فیصلہ کرے گا؛ ہمیں منظور ہے۔اس نے نبی کریم ﷺ سے بھی کہا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی نہیں آئے گا تو مَیں اکیلا جاؤں گا۔اسی کو یہاں بیان کیا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْجَمَعُوْالَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ وہ اہل ایمان جن کو لوگوں یعنی نعیم بن مسعود نے کہا کہ تمہارے واسطے لوگوں یعنی مکہ والوں نے بہت بڑا لشکر اور بہت سارا ساز وسامان تیار کیا ہے، اس لئے ان سے ڈرو، اور نکلنے کا ارادہ ملتوی کرو﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا﴾ اس کی اس بات نے مسلمانوں کے ایمان میں اضافہ کردیا۔یہ بات سن کر بجائے اس کے کہ یہ پست ہمت ہوتے اور ان میں بزدلی آتی، ان کے ایمان میں اور اضافہ ہوگیا۔اور اپنی زبان سے کہنے لگے:﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ صحابہ کا لشکر لے کر نکلے اور مقام بدر میں پہنچے۔ان دنوں میں وہاں میلہ اور بازار بھی لگتا تھا، نبی کریم ﷺ نے وہاں آٹھ روز قیام کیا، دورانِ قیام صحابہ نے خرید وفروخت اور تجارت بھی کی، جس کی وجہ سے ان کو تجارت میں مالی نفع بھی ہوا۔اور ان آٹھ دنوں میں مکہ والے نہیں آئے۔بہرحال! بڑی کامیابی کے ساتھ نفع کما کر وہاں سے واپس لوٹے﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ﴾ یہ اہلِ ایمان اللہ تعالیٰ کی

نعمت اور اللہ کا فضل یعنی مالی نفع کما کر وہاں سے واپس لوٹے، ان کو کوئی گزند اور تکلیف نہیں پہنچی ﴿وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللهِ﴾ اور مزید برآں یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی انہوں نے حاصل کی ﴿وَاللهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٌ﴾ اللہ تعالیٰ بڑے فضل والے ہیں

﴿پروپیگنڈہ کسی بھی حال میں قابلِ قبول نہیں﴾

یہاں ان حضرات کے یقین کو بیان کرنا مقصود ہے، اسی لئے اس آیت کو پیش کیا ہے۔ اور اسی میں آگے ہے: ﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴾ شیطان کی تو عادت ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو اپنے دوستوں سے ڈرایا کرتا ہے، یعنی اس طرح کے پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں، اور ایسے پروپیگنڈوں سے شیطان اپنے دوستوں کی مدد کرتا ہے اور ایمان والوں کو اپنے دوستوں کا خوف دلاتا ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان سے مت ڈریو بلکہ مجھ سے ڈریو اگر تم ایمان والے ہو۔ اور اس طرح کے پروپیگنڈوں اور جھوٹی باتوں کے پھیلانے کی اسلام کسی بھی حال میں اجازت نہیں دیتا۔ یہاں تک کہ دشمن کے خلاف بھی جھوٹی بات کے پھیلانے کی اسلام میں اجازت نہیں ہے۔ پروپیگنڈہ کسی بھی حال میں قابلِ قبول نہیں ہے۔

﴿حضورِ اکرم ﷺ کو توکل کا حکم﴾

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِیْ لَا يَمُوْتُ﴾ پہلی دو آیتیں تو یقین سے متعلق تھیں اور اب چند آیتیں توکل سے متعلق پیش کر رہے ہیں۔ باری تعالیٰ قرآنِ پاک میں حکم دیتے ہیں کہ بھروسہ کرو اس ذات پر جو کہ زندہ ہے اور جس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ آدمی اپنے معاملات میں ایسی ذات پر بھروسہ کرتا ہے جس کے متعلق اس کو یقین ہوتا ہے کہ جس معاملہ

میں مَیں اس پر بھروسہ کرنے جارہا ہوں اس معاملہ کو مجھ سے بہتر طریقہ سے انجام دینے کی اس کے اندر قدرت ہے، اور اس معاملہ کو مجھ سے بہتر طریقہ سے وہ سمجھ رہا ہے اور اس معاملہ میں اس کو مجھ سے زیادہ علم حاصل ہے۔ گویا بھروسہ کرنے والا اس معاملہ کی انجام دہی میں جس پر بھروسہ کررہا ہے اس کو تمام خوبیوں اور اوصاف میں بہتر سمجھتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کا جو حکم دیا گیا اس میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص صفت ''حیات'' کو ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ذات جو ہمیشہ زندہ رہے گی جس کو کبھی موت نہیں آتی، ایسی ذات پر بھروسہ کرو۔ دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ جس پر بھروسہ کیا کہ وہ فلاں وقت ہمارے کام آئے گا اور وقت آنے سے پہلے ہی وہ دنیا سے چل دیا تو تمہارا کیا ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، وہاں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ جس معاملہ میں آپ نے اس پر بھروسہ کیا ہے، اس معاملہ کی انجام دہی سے پہلے نعوذ باللہ کوئی ایسی بات پیش آوے۔

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ اللہ ہی کے اوپر ایمان والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے

﴿مشورہ﴾

﴿فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے، اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ کا حکم دیا ہے۔ ویسے تو آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو جن علوم اور کمالات سے نوازا تھا اس کے پیشِ نظر بظاہر کوئی ضرورت نہیں تھی کہ آپ کو مشورہ کا پابند کیا جاتا، لیکن مشورہ ایک ایسی چیز ہے جس کے نتیجہ میں آپس میں تعاون وتناصر کا جذبہ بیدار ہوتا ہے، ایک دوسرے پر اعتماد پیدا ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں کام اچھے طریقے سے انجام دئے جاسکتے ہیں، اس لئے نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ نے حکم

دیا: ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ایسا کوئی معاملہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو کوئی صریح حکم نہیں دیا گیا ہے، ان میں آپ ان سے مشورہ کیجیے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے صریح حکم اور وحی آجاوے وہاں تو پھر مشورہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی کے مطابق کرنا ہے۔

گویا مشورہ ایک تدبیر ہے کہ آئندہ ان معاملات کو انجام دینے کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے، کیا تدبیریں کی جائیں، کیسے اسباب اختیار کئے جائیں۔ اسباب اختیار کرنے اور تدبیروں کے سلسلے میں مشورہ ہوتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ ہر موقعہ پر مشورہ کرنے کی تھی۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر جب آپ ﷺ قریش کے تجارتی قافلہ کے تعاقب کے لئے روانہ ہوئے اور راستے میں معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ سے ایک لشکر اس قافلہ کی حمایت وحفاظت کے لئے نکل چکا ہے، اب حالات بدل گئے، فوراً نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ غزوۂ احد کے موقعہ پر جب پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ سے ایک بڑا لشکر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے چلا ہے تو نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا۔ حدیبیہ کے موقعہ پر جب آپ روانہ ہوئے اور معلوم ہوا کہ مکہ والوں نے نبی کریم ﷺ کو روکنے کے لئے ساری تدبیریں کر لی ہیں کہ کسی حال میں ان لوگوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے نہیں دیں گے تو آپ ﷺ نے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ تو نبی کریم ﷺ ایسے مواقع پر جہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی صریح حکم بذریعۂ وحی نہیں ملتا تھا؛ مشورہ کیا کرتے تھے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ مشورہ تدبیروں کے سلسلے میں ہوتا تھا کہ یہ حالات ہیں اس موقعہ پر کون سی تدبیر اختیار کرنا مناسب ہے۔ اور جب یہ مشورہ ہو جائے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ﴾ اور اس مشورے کے نتیجے میں اے نبی جب آپ کوئی فیصلہ

کرلیں (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ تو سب سے کیا جائے گا، لیکن فیصلہ امیر کے ہاتھ میں ہوتا ہے، وہ جو مناسب سمجھے؛ فیصلہ کردے۔ اور مشورہ کے بعد جو تدبیر اختیار کرنے کا فیصلہ ہوا ہے اس پر بھروسہ نہیں کرنا ہے بلکہ) ﴿فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ واعتماد کرنا ہے۔ یہاں وہی بات آگئی کہ اسباب کو اختیار کرنا ہے لیکن ان اسباب پر بھروسہ نہیں کرنا ہے، بھروسہ تو اللہ تعالیٰ ہی پر کرنا ہے۔ یہی اصل توکل ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توکل کے سلسلے میں قرآنِ پاک میں بہت ساری آیتیں ہیں جو اہلِ علم کے سامنے واضح ہیں۔

﴿توکل پر کیا ملے گا؟﴾

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ جب توکل کا حکم دیا ہے، تو اب اگر آپ توکل کریں گے تو آپ کو کیا ملے گا؟ اس بات کو بتلانے کے لئے یہ آیت پیش کی ہے کہ باری تعالیٰ نے وعدہ فرمالیا ہے کہ جو آدمی کسی بھی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے اوپر بھروسہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوجائے گا۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ اہلِ ایمان کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل اللہ کے خوف سے لبریز ہوجاتے ہیں ﴿وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا﴾ اور جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو پڑھا جاتا ہے تو ان کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے ﴿وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ اور اپنے پروردگار ہی پر وہ بھروسہ کرتے ہیں۔

اب اس سلسلے میں روایتیں پیش کرتے ہیں:-

﴿بغیر حساب کے جنت میں جانے والے﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: عُرِضَتُ عَلَیَّ الْأُمَمُ، فَرَأَیْتُ النَّبِیَّ وَمَعَهُ رُهَیطٌ، وَالنَّبِیَّ وَمَعَهُ الرَّجُلُ وَالرَّجُلانِ، وَالنَّبِیَّ وَلَیْسَ مَعَهُ أَحَدٌ. اِذْرُفِعَ لِیْ سَوَادٌ عَظِیْمٌ، فَظَنَنْتُ أَنَّهُ أُمَّتِیْ، فَقِیْلَ لِیْ هٰذَامُوْسیٰ وَقَوْمُهٗ، وَلٰکِنِ انْظُرْاِلیٰ الْأُفُقِ، فَنَظَرْتُ فَإِذَا سَوَادٌعَظِیْمٌ، فَقِیْلَ لِیْ أُنْظُرْاِلیٰ الْأُفُقِ الْاٰخر، فَإِذَاسَوَادٌ عَظِیْمٌ، فَقِیْلَ لِیْ هٰذِهٖ أُمَّتُکَ. وَمَعَهُمْ سَبْعُوْنَ أَلْفاًیَّدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَیْرِحِسَابٍ وَلاعَذَابٍ. ثُمَّ نَهَضَ فَدَخَلَ مَنْزِلَهٗ، فَخَاضَ النَّاسُ فِیْ أُولٰئِکَ الَّذِیْنَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ بِغَیْرِحِسَابٍ وَلاعَذَابٍ. فَقَالَ بَعْضُهُمْ فَلَعَلَّهُمُ الَّذِیْنَ صَحِبُوْارَسُوْلَ اللهِ ﷺ. وَقَالَ بَعْضُهُمْ: فَلَعَلَّهُمُ الَّذِیْنَ وُلِدُوْافِی الْاِسْلَامِ وَلَمْ یُشْرِکُوْابِاللهِ شَیْئًا. وَذَکَرُوْاأَشْیَآء. فَخَرَجَ عَلَیْهِمْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَقَالَ: مَنِ الَّذِیْ تَقُوْلُوْنَ؟ فَأَخْبَرُوْهُ. فَقَالَ: هُمُ الَّذِیْنَ لَا یَرْقُوْنَ وَلَا یَسْتَرْقُوْنَ وَلَا یَتَطَیَّرُوْنَ، وَعَلیٰ رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ. فَقَامَ عُکَّاشَةُ بْنُ مِحْصَنٍ وَقَالَ: أُدْعُ اللهَ أَن یَّجْعَلَنِیْ مِنْهُمْ. فَقَالَ: أَنْتَ مِنْهُمْ. ثُمَّ قَامَ رَجُلٌ آخَرَوَقَالَ: أُدْعُ اللهَ أَن یَّجْعَلَنِیْ مِنْهُمْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: سَبَقَکَ بِهَاعُکَّاشَةُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے اگلی امتیں پیش کی گئیں، مَیں نے اس منظر میں دیکھا کہ ایک نبی ہیں اوران کے ساتھ ایک چھوٹی سی جماعت ہے۔ ﴿رُهَیطٌ﴾ کا اطلاق تین سے لے کر نو تک کے لئے ہوتا ہے۔ گویا ان کے ساتھ بہت کم لوگ ہیں۔ اور بعضے ایسے نبی بھی دیکھے کہ ان کے ساتھ ایک ہی آدمی یا دو آدمی ہیں۔ گویا ان پر ایمان لانے والوں کی تعداد صرف ایک یا دو تھی۔ اور ایک نبی ایسا بھی دیکھا کہ ان کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔

اِس زمانے میں جو دین کا کام کرنے والے ہیں ان کے لئے یہ بڑی عبرت والی روایت ہے۔ غور کیجئے کہ حضراتِ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جن کو اللہ تعالیٰ نے منصبِ نبوت پر فائز کیا کسی نبی سے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اپنے منصبِ نبوت کے فرائض کو ادا نہ کرے، وہ تو پوری تن دہی اور اخلاص واستقامت سے اپنے فرضِ نبوت کو ادا کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان پر ایمان لانے والے ایک یا دو آدمی ہیں۔ آج اس گئے گذرے دور میں بھی آپ اور ہم دین کا کام لے کر اگر چلتے ہیں اور محنت کرتے ہیں تو ہمارا ساتھ دینے والی ایک بڑی جماعت ہو جاتی ہے۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں یہ منظر دیکھتا جا رہا تھا کہ اسی دوران میرے سامنے ایک بہت بڑی جماعت پیش کی گئی۔ مَیں یہ سمجھا کہ یہ میری امت ہے۔ مَیں نے پوچھا کہ کیا یہ میری امت ہے؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ تو حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی قوم ہے۔ لیکن پھر کہا گیا کہ آپ آسمان کے کناروں کی طرف دیکھئے۔ وہاں دیکھا تو بہت بڑی جماعت تھی۔ پھر کہا کہ دوسرے کنارے کو دیکھو۔ چنانچہ وہاں بھی بہت بڑی جماعت تھی۔ گویا آسمان کے سارے کنارے بھرے ہوئے تھے۔ پھر مجھے بتلایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے۔ اور ان کے ساتھ ستر ہزار تو وہ ہیں جو جنت میں بلا حساب اور بغیر عذاب کے داخل ہوں گے۔

راوی حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ اتنی بات ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ اپنی مجلس سے اٹھے اور گھر میں تشریف لے گئے۔ وہ ستر ہزار کون ہیں اس کی تفصیل آپ نے ارشاد نہیں فرمائی۔ آپ کے گھر میں تشریف لے جانے کے بعد اس مجلس میں جو صحابہ بیٹھے ہوئے تھے ان میں بحث چل پڑی، چرچا ہونے لگا کہ یہ ستر ہزار لوگ جو بغیر حساب اور

بغیر عذاب کے جنت میں جائیں گے وہ کون ہیں؟ ان کے کیا اوصاف ہوں گے؟ ہر ایک اپنی اپنی سمجھ لڑا رہا تھا۔ بعضوں نے کہا کہ شاید یہ وہ لوگ ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی صحبت کی سعادت سے نوازا۔ بعضوں نے کہا کہ ٹھیک ہے آپ کی صحبت تو ملی لیکن انہوں نے کفر کا زمانہ بھی پایا اوران کی زندگی کا کچھ حصہ کفر وشرک کی حالت میں بھی گذرا، اگرچہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے لیکن کسی زمانہ میں کفر وشرک سے بھی کچھ ناتہ تو رہا، اس لئے شاید یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی ولادت اور پیدائش ہی اسلام میں ہوئی، گویا مسلمان ماں باپ کے یہاں ہی پیدا ہوئے اور انہوں نے کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کا ارتکاب نہیں کیا۔ بہرحال! یہ چیزیں آپس میں زیرِ بحث تھیں۔

نبی کریم ﷺ تک ان کی بحث اور چرچا کی آوازیں پہنچیں تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا کہ کاہے کا یہ شور ہے؟ کس چیز کا چرچا ہو رہا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے ابھی بتلایا تھا کہ ستر ہزار وہ ہیں جو بغیر حساب اور بلا عذاب کے جنت میں جائیں گے تو ہم آپس میں یہ چرچا کررہے ہیں کہ وہ خوش نصیب کون ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو جھاڑ پھونک نہ خود کرتے ہیں اور نہ کسی سے کرواتے ہیں اور نہ بدشگونی لیتے ہیں۔ یہ تین اوصاف ذکر کئے۔

﴿لَا یَرْقُوْنَ وَلَا یَسْتَرْقُوْنَ﴾ کے سلسلے میں حضراتِ شراح فرماتے ہیں کہ چونکہ نبی کریم ﷺ سے بھی جھاڑنا ثابت ہے، اس لئے ایسا رقیہ اور جھاڑنا تو جائز ہے کہ جس میں قرآنِ پاک کی آیات یا ایسے کلمات کے ذریعہ سے ہو کہ جس میں شرک نہیں ہے، یا وہ کلمات کہ جن کا مفہوم ہمارے سامنے ہے اور اس میں ایمان کے خلاف کوئی چیز نہیں ہے۔

اور اگر ایسے کلمات ہیں کہ جن کا مطلب ومفہوم ہم نہیں جانتے، کسی دوسری زبان کے کلمات ہیں اور پتہ بھی نہیں کہ اندر کیا کہا گیا ہے، ہوسکتا ہے کہ کوئی شرکیہ مفہوم ہو؛ ایسی جھاڑ اور رقیہ کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

اور بعضوں نے کہا کہ مطلق جھاڑنا اور جھڑوانا مراد ہے چاہے اجازت والا ہو؛ اس سے بھی جو لوگ بچتے ہیں۔ اب اشکال ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ سے بھی جھاڑنا ثابت ہے۔ تو اس کے متعلق وہ حضرات فرماتے ہیں کہ چونکہ آپ ﷺ پر شریعت کے احکام کو بیان کرنا بھی تھا، اس لئے آپ نے جو جھاڑا ہے، وہ جواز کو بتلانے کے لئے ہے۔ آپ تو متوکلین کے سردار ہیں، آپ کے لئے تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔ لیکن آپ کے علاوہ دوسروں کے لئے نفس جھاڑنا، چاہے جواز کی حد میں رہ کر ہی کیوں نہ ہو؛ اس کا چھوڑنا ہی توکل کا اعلیٰ درجہ ہے۔

﴿وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ﴾ اور بدشگونی نہیں لیتے۔ عرب میں بدشگونی کا بھی عام رواج تھا کوئی آدمی کسی مقصد کے لئے باہر نکلا اور کوئی پرندہ بائیں طرف سے آکر دائیں طرف کو نکل گیا تو سمجھتے تھے کہ کامیابی ہوگی۔ اور اگر دائیں طرف سے بائیں طرف کو گیا، تو سمجھتے تھے کہ ناکامی ہوگی۔ بلکہ بعض مرتبہ کوئی پرندہ اس طرح جاتا ہوا نہ ملتا، تو کسی بیٹھے ہوئے پرندے کو اُڑا کر شگون لیا کرتے تھے۔ شریعت نے کہا کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

بعض روایتوں میں ﴿لَا يَرْقُوْنَ﴾ کی جگہ پر ﴿لَا يَكْتَوُوْنَ﴾ ہے۔ ﴿لَا يَكْتَوُوْنَ وَلَا يَسْتَرْقُوْنَ وَلَا يَتَطَيَّرُوْنَ﴾ لوہا گرم کر کے داغ لگا کر علاج نہیں کرتے۔ زمانۂ جاہلیت میں علاج کا ایک طریقہ یہ بھی تھا، بعد میں بھی جاری رہا۔ بعض روایتوں میں اس کی ممانعت بھی آئی۔ لیکن ساری روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت اس کی اجازت ہے۔ تو جو داغ

والا علاج نہیں کراتے اور جھڑواتے نہیں ہیں اور بدشگونی نہیں لیتے۔﴿وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ بلکہ وہ لوگ اپنے تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا کرتے ہیں۔

عام طور پر کسی بڑی بیماری سے جب واسطہ پڑتا ہے اور آدمی اس بیماری سے تنگ ہوجاتا ہے، اور مصائب میں گھر جاتا ہے، تو ایسے موقعہ پر وہ جھاڑ پھونک کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس لئے ایسے مواقع پر کامل توکل یہ ہے کہ اس سے اپنے آپ کو بچایا جائے، لیکن اگر شریعت کے حدود وقیود کے مطابق کرتا ہے؛ تو جواز میں کوئی کلام بھی نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کی یہ بات سن کر حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ اٹھے اور کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان ستر ہزار میں سے بنادے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ آپ ان میں سے ہیں۔ پھر دوسرے آدمی کھڑے ہوئے اور انہوں نے بھی درخواست کی: دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان ستر ہزار میں سے بنادے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس بات میں عکاشہ تم سے سبقت لے گئے۔

اب یہ جواب حضور اکرم ﷺ نے کیوں دیا؟ اس پر بھی حضرات علماء اور حدیث کے شارحین نے تفصیلی کلام کیا ہے۔ بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ جن صفات پر بغیر حساب و بلا عذاب کے جنت میں جانے کے لئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا، آپ نے حضرت عکاشہ میں وہ صفات دیکھیں، اس لئے آپ نے ان کے لئے دعا فرمادی۔ اور دوسرے جو اٹھے تھے ان میں وہ چیز نہیں دیکھی اس لئے ان کے متعلق یہ فرمادیا﴿سَبَقَكَ بِهَا عُكَّاشَةُ﴾

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو اختیار دیا گیا ہو کہ اس مجلس میں سے کسی ایک کے حق میں آپ یہ فرمادیں گے وہ اس زمرہ میں

شامل ہوجائے گا۔جب حضرت عکاشہ نے پہلے درخواست کی اوران کے متعلق فرمادیا تو جس چیز کا اختیار دیا گیا تھا اس کو وہ لے اُڑے۔اب دوسرے کے لئے اس کی گنجائش ہی نہیں تھی،اس لئے آپ نے ﴿سَبَقَکَ بِهَا عُکَّاشَةُ﴾ فرمادیا۔

بعضوں نے یہ بھی کہا کہ اگراس کے متعلق فرمادیتے تو تیسرا اٹھتا، پھر چوتھا اٹھتا، اور یہ سلسلہ چل پڑتا اور آخر میں اس سلسلے کو منقطع کرنا ہی پڑتا؛اس لئے آپ نے پہلے ہی روک دیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰـہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَـہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً. امابعد.

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول: اَللّٰھُمَّ لَکَ أَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْکَ أَنَبْتُ وَبِکَ خَاصَمْتُ: أَللّٰھُمَّ أَعُوْذُ بِعِزَّتِکَ لَااِلٰہَ اِلَّاأَنْتَ أَنْ تُضِلَّنِیْ أَنْتَ الْحَیُّ الَّذِیْ لَاتَمُوْتُ وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ یَمُوْتُوْنَ.

﴿ماثور دعائیں......نبوی تعلیمات کا نچوڑ﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب یقین وتوکل کا قائم کیا ہے اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا نقل فرماتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں کے ذریعہ سے بھی اپنی امت کو تعلیم دیا کرتے تھے، آپ کی مانگی ہوئی دعاؤں میں اگر کوئی غور کرے تو ان کے ذریعہ سے امت کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنے کا ایک خاص نظام بنا کر دیا گیا ہے۔

مثلاً رمضان المبارک کا مہینہ ہے اس کے جو خصوصی فضائل ہیں اور اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی انعامات اپنے بندوں پر کئے جاتے ہیں اور جو خصوصی رحمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوتی ہیں ان خصوصی انعامات اور رحمتوں کو حاصل کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں خاص طور پر تاکید فرمائی اور اس مہینے کو

وصول کرنے کی خاص تاکید کی ہے، اس اہتمام کو ظاہر کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے دعاؤں میں کیسا اہتمام فرمایا کہ جب کوئی شخص رجب کا چاند دیکھے تو حضور ﷺ نے تاکید فرمائی کہ یہ دعا پڑھو: ﴿أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَافِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَااِلىٰ رَمَضَانَ﴾ اے اللہ! تو ہمارے لئے رجب اور شعبان کے مہینے میں برکت عطا فرما اور ہم کو رمضان تک پہنچادے یعنی جب رمضان کے مہینے کو زیادہ زمانہ باقی نہیں رہا، صرف دو مہینے آڑے رہ گئے ہیں، ایسا مبارک مہینہ آرہا ہے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس مبارک مہینے کی برکتوں کو حاصل کرنے سے پہلے موت آجائے۔ گویا حضور ﷺ نے رمضان المبارک کی طلب اور اس کو وصول کرنے کا جذبہ پیدا کرنے کا اہتمام رجب کے چاند کو دیکھ کر شروع فرمایا۔ جو لوگ اس دعا کو سمجھ کر اور اس کے معانی کو سامنے رکھ کر پڑھیں گے، تو ظاہر ہے کہ ان کے دلوں میں کیا کچھ اہتمام رمضان المبارک کی وصول یابی کے لئے پیدا ہوگا۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم نے سنایا تھا کہ ان کے یہاں سے ایک جماعت کیرالہ کے علاقے میں گئی تھی، وہ بتلا رہے تھے کہ رجب کے مہینے سے وہاں روزانہ ہر نماز کے بعد پوری مسجد ایک ساتھ یہ دعا پڑھتی ہے: ﴿أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَافِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ وَبَلِّغْنَااِلىٰ رَمَضَانَ﴾ گویا کسی نے ہر نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کر پوری مسجد کو اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ دیکھو! رمضان کا برکت والا مہینہ آرہا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں بھی رمضان المبارک کا اتنا زیادہ اہتمام ہے کہ ایک سال سے لے کر دوسرے سال تک جنت کو اس کے لئے مزین کیا جاتا ہے۔ گویا رمضان المبارک کے آنے سے دو مہینے پہلے سے نبی کریم ﷺ نے امت کو یہ دعا سکھلا کر اس کے وصول کرنے

کی طرف متوجہ فرمایا۔تو یہ دعا صرف دعا نہیں ہے؛ بلکہ ایک تعلیم ہے۔

﴿ایک اور نمونہ﴾

اسی طرح ہم کسی بستی میں جاتے ہیں تو اس بستی میں پہنچنے پر نبی کریم ﷺ نے ایک دعا سکھلائی ﴿اَللّٰھُمَّ حَبِّبْنَا اِلٰی اَھْلِھَا وَحَبِّبْ صَالِحِیْ اَھْلِھَا اِلَیْنَا﴾ اے اللہ! تو اس بستی والوں کے دل میں ہماری محبت ڈال دے اور اس بستی کے جو نیک لوگ ہیں ان کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔

دیکھئے! یہاں دو چیزیں غور کرنے کی ہیں کہ جہاں ہماری محبت ان کے دل میں ڈالنے کی دعا کی گئی، وہاں کوئی فرق نہیں کیا گیا کہ نیک لوگوں کے دلوں میں ہی ہماری محبت آئے، بلکہ تمام بستی والوں کے دلوں میں ہماری محبت ڈال دے۔ایک نئی بستی ہے ہم وہاں پہنچے ہیں، معلوم نہیں ہم کو کسی سے کیا گزند اور تکلیف پہنچ جائے۔لہٰذا اس بستی کے تمام لوگوں کے دل میں، چاہے وہ نیک ہوں یا بد ہوں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے محبت کے جذبات ڈال دئے جائیں گے؛ تو ہم ان شاء اللہ ان کے شر سے محفوظ رہیں گے، اور ان کا خیر ہم کو پہنچتا رہے گا۔تو اس دعا کے پہلے جز میں تو یوں کہا گیا ﴿اَللّٰھُمَّ حَبِّبْنَا اِلٰی اَھْلِھَا﴾ اے اللہ! ہماری محبت اس بستی والوں کے دلوں میں ڈال دے۔اور دوسرے جز میں یہ کہا گیا ﴿وَحَبِّبْ صَالِحِیْ أَھْلِھَا اِلَیْنَا﴾ اس بستی کے جو نیک لوگ ہیں ان کی محبت ہمارے دل میں ڈال دے۔اس دوسرے جز میں یہ نہیں کہا گیا کہ تمام بستی والوں کی محبت ہمارے دل میں ڈالی جائے، بلکہ اس بستی کے جو حضرات نیک اور صالح ہیں، ان کی محبت ہمارے دل میں ڈالی جائے۔اس لئے کہ اگر کسی برے آدمی کی طرف ہم مائل ہو گئے اور اس کی صحبت میں

بیٹھ گئے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی صحبت ہمارے ایمان کو لے اڑے اور اس سے ہم کو دینی نقصان پہنچ جائے۔ تو گویا دعا کروائی جارہی ہے کہ اس بستی کے جو نیک لوگ ہوں انہیں کی طرف ہمارا دل مائل ہو؛ تاکہ ان کے ذریعہ سے ہم کو نیکی اور بھلائی ہی پہنچے اور ان سے ہم فائدہ ہی اٹھائیں۔

اسی لئے اسلاف کا معمول تھا کہ جب وہ کسی بستی میں جاتے تھے تو خاص طور پر دعا کا اہتمام کرتے تھے کہ اے اللہ! کسی صالح ہم نشین اور نیک شخص کی صحبت میسر ہو۔ کسی نئی مسجد میں بھی پہنچتے تھے تو ان حضرات کا ایسی دعاؤں کا اہتمام رہتا تھا۔

﴿بروں کی طرف میلان مت رکھو﴾

بہر حال! اس دعا میں نبی کریم ﷺ نے جہاں ایک دعا بتلائی ہے وہاں ایک تعلیم بھی دی ہے کہ آپ نئی بستی میں جارہے ہیں تو وہاں آپ کو کیسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی ہے۔ برے لوگوں کی صحبت سے اپنے آپ کو بچانا ہے اور اچھے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہے، ان کی طرف مائل ہونا ہے، برے لوگوں کی طرف تمہارا میلان نہ ہو ﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: جو نافرمان لوگ ہیں اور جنہوں نے نافرمانی کے ذریعہ اپنے آپ پر ظلم کیا ہے، ایسوں کی طرف تم مائل نہ ہونا، کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی طرف ہونے والا یہ میلان اور کشش تم کو جہنم کی آگ تک پہنچادے۔ اسی لئے اعمال میں، افعال میں، لباس میں اور طور طریقوں میں برے لوگوں کی مشابہت اختیار کرنے کی حدیث شریف میں ممانعت فرمائی گئی۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ﴾

بہرحال! مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی دعاؤں میں جہاں امت کے لئے ساری خوبیاں مانگی؛ وہاں ان دعاؤں کے ذریعہ امت کو خاص تعلیم بھی دی اب اس دعا میں بھی جو آدمی غور کرے گا اس کے ذہن میں فوراً یہ بات آئے گی کہ برے لوگوں کی صحبت سے مجھے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

اسی لئے حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: احادیث کا خلاصہ اور نچوڑ نبی کریم ﷺ کی دعائیں ہیں، جو آدمی حضور ﷺ کی دعاؤں میں غور وفکر کرے گا، تو اس کو احادیث کی تعلیمات کا خلاصہ اپنی نگاہوں کے سامنے محسوس ہوگا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نبی کریم ﷺ کی ایک دعا نقل کی ہے۔ چونکہ انھوں نے باب ''یقین وتوکل'' کا قائم کیا ہے، اور اس دعا میں بھی توکل کی تعلیم دی گئی ہے، اس لئے اس دعا کو خاص طور پر نقل کیا۔

حضور اکرم ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: ﴿أَللّٰهُمَّ لَکَ أَسْلَمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ﴾ اے اللہ! مَیں نے تیری ہی اطاعت اختیار کی، اپنے آپ کو تیرے ہی سپرد کردیا اور تیرے ہی اوپر میں ایمان لایا۔

﴿وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ﴾ اور تجھ ہی پر میں نے بھروسہ کیا۔ گویا اس دعا میں نبی کریم ﷺ نے امت کو یہ تعلیم دی کہ جہاں امت توکل حاصل کرنے کے لئے عملی طور پر کوشش کرے؛ وہاں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کا بھی اہتمام کرے۔

﴿ایک عام کوتاہی﴾

یہ بھی عجیب وغریب چیز ہے۔ ہم لوگوں کا مزاج ہے کہ ہم دنیوی امور میں تو دعاؤں

کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔ اگر کوئی دکان شروع کی ہے تو خوب دعائیں کریں گے کہ برکت ہو اور تجارت میں نفع ہو، لیکن دین کے معاملہ میں اگر کسی کو کوشش کرنے کی توفیق ہوئی بھی، تو دعاؤں کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہیے، دینے والی ذات تو وہی ہے، ہماری کوشش وتدبیر تو ایک آلہ وذریعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اصل تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس لئے آدمی کو اس کا اہتمام ہو۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں علامہ شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اولاد کی تربیت کے سلسلے میں جہاں آدمی کو توجہ ومحنت سے کام لینا چاہیے؛ وہاں دعاؤں کا خاص اہتمام ہونا چاہیے، بلکہ دعاؤں کا اہتمام زیادہ مفید ہے۔ اولاد کے دنیوی امور میں تو ہم کچھ نہ کچھ دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ان کے دینی معاملہ میں اتنا اہتمام نہیں ہوتا۔ بہرحال! اصل ملتا تو اللہ تعالیٰ کے خزانے اور دربار سے ہے، اس لئے حضور اکرم ﷺ ہمیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

﴿ بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہو ﴾

﴿وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ﴾ اور تجھ ہی پر میں نے بھروسہ کیا۔ گویا اس دعا کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی کہ ہمارا توکل، اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہونا چاہیے۔

یہاں ''عَلَيْكَ'' کو پہلے لائے، عربی داں جانتے ہیں کہ اس سے حصر مراد ہے کہ تجھ ہی پر توکل و بھروسہ کیا، گویا اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی ایسی ذات دنیا میں ہے ہی نہیں جس پر اعتماد و بھروسہ کیا جاوے۔

﴿وَاِلَیْکَ اَنَبْتُ﴾ اور تیری ہی طرف مَیں نے رجوع کیا، ہر معاملے میں رجوع اللہ تعالیٰ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

﴿وَبِکَ خَاصَمْتُ﴾ اور اے اللہ! تیری ہی مدد سے مَیں نے دشمن کا مقابلہ کیا۔

﴿اَللّٰھُمَّ اَعُوْذُبِعِزَّتِکَ لَااِلٰہَ اِلَّااَنْتَ اَنْ تُضِلَّنِیْ﴾ اے اللہ! تیری ہی عزت کے واسطے سے مَیں پناہ حاصل کرتا ہوں (تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں) اس بات سے کہ تو مجھے گمراہ کرے۔

﴿اَنْتَ الْحَیُّ الَّذِیْ لَاتَمُوْتُ﴾ تو وہ زندہ رہنے والی ذات ہے کہ جس کو کبھی موت آنے والی نہیں ہے۔

﴿وَالْجِنُّ وَالْاِنْسُ یَمُوْتُوْنَ﴾ اور باقی تمام مخلوقات کو موت آنے والی ہے۔ خاص کر جو بڑی مخلوقات ہیں جن وانس، ان کا ذکر یہاں کیا۔ ورنہ تمام مخلوقات کو موت آنے والی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو موت آنے والی نہیں ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں اس دعا میں خاص طور پر ﴿وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ﴾ کے جملے سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہر معاملہ میں بندے کا توکل، اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر ہونا چاہیے۔

﴿تدبیر ضرور اختیار کرے﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قَالَ: حَسْبُنَااللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ قَالَھَااِبْرَاھِیْمُ علیہ السلام حِیْنَ اُلْقِیَ فِی النَّارِ. وَقَالَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم حِیْنَ قَالُوْا: اِنَّ النَّاسَ قَدْجَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا، وَّقَالُوْاحَسْبُنَااللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ.

وفی روایۃ لہٗ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَ آخِرُ قَوْلِ اِبْرَاھِیْمَ ﷺ حِیْنَ اُلْقِیَ فِی النَّارِ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ.

دوسری روایت بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ہی کے حوالے سے لائے ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ یعنی آدمی کو باری تعالیٰ کی کارسازی پر ہی بھروسہ و اعتماد ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا کارساز سمجھنا؛ یہی توکل ہے۔ آدمی کا اعتماد کسی اور چیز پر نہ ہو۔ تدبیر ضرور اختیار کرے۔ تدبیر کو انجام دینا توکل کے منافی نہیں ہے۔

بلکہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تدبیر کی تعلیم بھی دی ہے۔ ایک صحابی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ مَیں اپنی اونٹنی کا پاؤں باندھ کر توکل کروں یا کھلا چھوڑ کر؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: باندھو اور پھر توکل کرو۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی تدبیر اختیار کرے لیکن اعتماد و بھروسہ تدبیر پر نہ ہو۔ دکان ضرور کھولے، تجارت اور کاروبار کرے لیکن یہ نہ سمجھے کہ میری روزی یہ دکان دے گی، بلکہ اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو کہ روزی دینے والی ذات اللہ کی ہے۔

﴿حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مثالی توکل﴾

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ جملہ اس وقت کہا تھا جب وہ آگ میں ڈالے گئے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کے بتوں کو (جبکہ ان کی قوم اپنا تہوار عید اور جشن منانے کے لئے بستی سے باہر گئی ہوئی تھی اور یہ تنہا رہ گئے تھے، موقعہ دیکھ کر ان کے بت خانے میں جتنے بھی بت رکھے ہوئے تھے ان سب کو) توڑ دیا۔

خیر! واقعہ مشہور ہے۔ بعد میں جب قوم کو معلوم ہوا کہ انہوں نے یہ حرکت کی ہے تو ان لوگوں نے یہ کہا کہ ان کو آگ میں ڈال دو، چنانچہ انھوں نے بہت بڑا رقبہ (AREA) کھودا اور اس میں چالیس دن تک لکڑیاں جمع کرتے رہے، بہت بڑی مقدار میں لکڑیاں جمع کر کے اس میں آگ لگائی، اس آگ کی شدت اور تیزی اتنی زیادہ تھی کہ فضا میں کوئی پرندہ اگر اُڑ کر اس کے اوپر آجاتا تھا، تو جل بھن کر اندر گر جاتا تھا۔ اب ان کو آگ میں ڈالنے کا معاملہ آیا۔ اس لئے کہ ڈالنے والے بھی اگر قریب جائیں تو وہ بھی اس آگ کی شدت و تیزی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اب کیا کریں؟ تو شیطان نے ان کو ایک تدبیر سُجھائی کہ گوپھن میں ان کو رکھ کر پھینکو۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں باندھ کر گوپھن کے اندر رکھا اور اس کے ذریعہ سے پھینکا، جس وقت گوپھن کے ذریعہ ان کو پھینکا گیا، تو روایتوں میں آتا ہے کہ زمین و آسمان کے فرشتے اور ساری مخلوق چیخ پڑی اور اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنے لگی کہ اس وقت روئے زمین پر آپ کا نام لینے والی شخصیت یہی ایک تو ہے، اور ان کو اس طرح آگ میں ڈالا جارہا ہے؟ ہم ان کو مدد نہ پہنچائیں؟ باری تعالیٰ نے فرمایا: اگر وہ تمہاری مدد قبول کریں تو ٹھیک ہے، ہماری طرف سے اجازت ہے۔ چنانچہ پانی کا فرشتہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آیا اور عرض کیا: اگر آپ اجازت دیں تو میں پانی کے ذریعہ اس آگ کو بجھادوں۔ انھوں نے کہا: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ پھر ہوا کا فرشتہ آیا اور عرض کیا: اگر آپ اجازت دیں تو میں اس آگ کو اُڑا کر دوسری جگہ لے جاؤں۔ آپ نے فرمایا: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی آئے، انھوں نے کہا تو ان کو بھی کہا: مجھے آپ کی ضرورت نہیں۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے آگ کو حکم دیا: تو وہ باغ بن گئی۔

﴿اٹکے ہوئے کاموں کے لئے ایک قرآنی وظیفہ﴾

بہرحال! عین اس موقعہ پر جبکہ اور کوئی چارہٗ کار نہیں تھا، تمام نے اپنی مدد پیش کرنے کی درخواست کی، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں یہ جملہ فرمایا: ﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ اسی لئے آدمی کا کوئی خاص کام اٹکا ہوا ہو، اس وقت بھی یہ دعا پڑھنے کی تلقین کی جاتی ہے۔

حضرت علامہ انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے اساتذہ سے سنا کہ وہ اٹھتے بیٹھتے کثرت سے یہ جملہ پڑھا کرتے تھے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

حضرت مولانا مفتی عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے استاذ تھے، ان کو بھی دیکھا کہ وہ کثرت سے یہ پڑھا کرتے تھے۔ کوئی ضرورت مند آتا تو اس کو بھی یہی بتلایا کرتے تھے۔ اسی لئے لکھا ہے کہ کوئی بہت اہم کام ہو تو ہر نماز کے بعد سو مرتبہ پڑھنا مفید ہے۔

یہ جملہ اللہ تعالیٰ پر بڑا اعتماد وتوکل ظاہر کرنے والا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خاص آزمائش کے موقعہ پر فرمایا تھا۔ لیکن اس کا بھی خاص اہتمام ہو کہ صرف الفاظ ہی الفاظ نہ ہوں بلکہ اس کی حقیقت کو بھی اپنے دل میں پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ جملہ بولتے ہوئے اس بات کی کوشش ہو کہ ہمارا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو؛ پھر تو ان شاء اللہ وہ مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

﴿خوف کی خبر کے وقت پڑھنے کا وظیفہ﴾

وَقَالَ مُحَمَّدٌ صلی اللہ علیہ وسلم حِيْنَ قَالُوْا: اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ اس وقت

ارشاد فرمایا جب لوگوں نے (نعیم بن مسعود اشجعی نے) آکر آپ کو ڈرایا کہ ان لوگوں نے (مشرکین مکہ نے) آپ کے مقابلے کے واسطے بڑا لشکر اور بڑی فوجیں جمع کر رکھی ہیں، ان سے ڈرو اور ان کے مقابلے کے لئے جانے کا اپنا ارادہ ملتوی کر دو۔ ان کا یہ جملہ سن کر بجائے ڈر کر اپنا ارادہ ملتوی کرنے کے نبی کریم ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ایمان میں اور زیادہ قوت آگئی اور کہنے لگے: ﴿حَسْبُنَا اللّٰه وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾

یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا تھا اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اور اس واقعہ کو پہلے تفصیل سے بتلا چکا ہوں۔

﴿توکل پرندے سے سیکھے﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: يَدْخُلُ الْجَنَّةَ أَقْوَامٌ أَفْئِدَتُهُمْ مِثْلُ أَفْئِدَةِ الطَّيْرِ قِيْلَ: مَعْنَاهُ مُتَوَكِّلُوْنَ. وَقِيْلَ: قُلُوْبُهُمْ رَقِيْقَةٌ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایسے لوگ داخل ہوں گے جن کے دل پرندوں کے دلوں کی طرح ہوں گے۔ پرندوں کے دلوں کی طرح ہونے کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جیسے پرندے متوکل ہوتے ہیں اسی طرح یہ لوگ بھی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل رکھتے تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس طرح پرندے نرم دل ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی نرم دل لوگ تھے۔

پہلے مطلب کے اعتبار سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو یہاں اس باب میں ذکر کیا ہے۔ چونکہ توکل کا تذکرہ ہے اور پرندوں کے دلوں کے اندر اللہ تعالیٰ کی ذات

کے اوپر توکل ہوتا ہے، وہ کوئی زیادہ تدبیریں سوچتے نہیں ہیں۔اور ہمارا حال یہ ہوتا ہے کہ بہت سارے لمبے چوڑے پلان بناتے ہیں، تدبیریں کرتے ہیں، اوراس کے لئے بہت کچھ سوچتے ہیں کہ یہ کریں گے، وہ کریں گے، معلوم نہیں پہلے سے اس کے لئے کیا کیا تیاریاں کی جاتی ہیں، پرندے ایسی کوئی تیاری نہیں کرتے ہیں، جس موقعہ پر جو چیز سامنے آگئی اوراس کے مطابق جوصورت حال ہوتی ہے، اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔

آگے ایک روایت آنے والی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر جیسا توکل کرنے کا حق ہے ویسا توکل کروتو اللہ تعالیٰ تم کو اس طرح روزی دیں گے جس طرح پرندوں کو دیتے ہیں کہ وہ صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس لوٹتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ہم جیسا سوچتے ہیں کہ کل یوں کروں گا اور یہ کروں گا، پرندے کے دل میں ایسا تھوڑا ہی ہوتا ہے کہ کل فلاں بازار میں جا کر یوں کروں گا، بلکہ وہ صبح کو جس وقت اپنے گھر سے نکل رہا ہوتا ہے تو پہلے سے کوئی بنا بنایا پروگرام تیار نہیں ہوتا۔ ویسے ہمارے بنائے ہوئے پروگرام سے بھی کچھ ہوتا نہیں ہے، ہوتا تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہو۔اس لئے اصل تعلیم جو ہم کو دی جارہی ہے وہ یہی ہے۔ پروگرام بنانے کی مخالفت نہیں ہے۔لیکن تعلیم یہ دی جارہی ہے کہ اعتماد پروگراموں اوراپنی تدبیروں پر نہیں ہونا چاہیے؛ بلکہ اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے۔

﴿ہماری ایک غلطی﴾

ہمارا مزاج اس نوع کا بنا ہوا ہے کہ ہم جب کوئی تدبیر اختیار کرتے ہیں یا کوئی پروگرام بناتے ہیں تو ہمارا ذہن ادھر ایسا مائل ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھول کر سارا اعتماد اسی پروگرام پر ہو جاتا ہے۔اور جہاں جہاں جس قسم کا پروگرام ہوتا ہے وہاں اعتماد بھی اللہ تعالیٰ کی

ذات سے اتنا ہی ہٹا ہوا ہوتا ہے، اور پھر اسی کی مناسبت سے اتنی ہی ناکامی بھی آتی ہے اور جہاں تدبیر پر اعتماد جتنا کم ہوتا ہے؛ وہاں کامیابی بھی اسی مناسبت سے آتی ہے، اس لئے پرندوں کے ساتھ مشابہت دے کر جو تعلق بتلایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، جس طرح پرندے متوکل ہوتے ہیں کہ وہ پہلے سے کوئی تدبیریں اور بوجھ اپنے دل پر نہیں رکھتے۔

اور بعضوں نے کہا: جس طرح پرندوں کے دل نرم ہوتے ہیں اسی طرح ان کے دل بھی نرم ہوں گے۔ لیکن پہلے مفہوم ہی کے اعتبار سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

﴿حضور ﷺ کے توکل کا ایک واقعہ﴾

عن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّـهُ غَزَامَعَ النَّبِيِّ ﷺ قِبَلَ نَجدٍ. فَلَمَّاقَفَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَفَلَ مَعَهُمْ فَأَدْرَكَتْهُمُ الْقَائِلَةُ فِيْ وَادٍ كَثِيْرِ الْعِضَاهِ، فَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، وَتَفَرَّقَ النَّاسُ يَسْتَظِلُّوْنَ بِالشَّجَرِ وَنَزَلَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ تَحْتَ سَمُرَةٍ، فَعَلَّقَ بِهَاسَيْفَهُ، وَنِمْنَانَوْمَةً، فَإِذَارَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَدْعُوْنَا، وَإِذَاعِنْدَهُ أَعْرَابِيٌّ، فَقَالَ: اِنَّ هٰذَااخْتَرَطَ عَلَيَّ سَيْفِيْ وَأَنَانَائِمٌ، فَاسْتَيْقَظْتُ وَهُوَ فِيْ يَدِهِ صَلْتاً، وَقَالَ مَن يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ؟ قُلْتُ: اَللهُ–ثَلاَثًا. وَلَمْ يُعَاقِبْهُ وَجَلَسَ.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نبی کریم ﷺ کے توکل واعتماد کو بتلانے کے لئے یہ روایت پیش کی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نجد کے علاقہ کے ایک غزوہ میں شریک تھا، جب آپ ﷺ غزوہ سے واپس تشریف لا رہے تھے، تو ایک ایسی وادی میں دوپہر کے آرام کا وقت آیا؛ جہاں بکثرت کانٹے دار درخت موجود تھے۔

نبی کریم ﷺ وہاں اترے اور لوگ مختلف درختوں کے سایوں کے نیچے آرام کرنے کی غرض سے صحراء میں منتشر ہوئے۔ نبی کریم ﷺ بھی کیکر کے ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کیلئے تشریف فرما ہوئے، اور آپ نے اس درخت پر اپنی تلوار لٹکائی اور لیٹ گئے ﴿وَنِمْنَا نَوْمَةً﴾ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ مختلف درختوں کے سایوں میں پھیلے ہوئے تھے، ہم نے بھی ایک آدھ نیند لی کہ اچانک کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہم کو آواز دے رہے ہیں، اور آپ کے پاس ایک دیہاتی بیٹھا ہوا ہے چنانچہ جب ہم حضور کے پاس پہنچے تو آپ نے پوری تفصیل بتلائی: کہ مَیں سویا ہوا تھا، اس نے آکر میری تلوار۔ جو مَیں نے درخت پر لٹکا رکھی تھی۔ کھینچی، اور تلوار سونت کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، جب میری آنکھ کھلی تو مَیں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں تلوار سونتی ہوئی موجود ہے، اور وہ مجھ سے پوچھ رہا ہے: ﴿مَنْ يَمْنَعُكَ مِنِّيْ ؟﴾ کون ہے جو میرے ہاتھ سے آپ کو بچا سکتا ہے؟ یعنی گویا میرے ہاتھ میں تلوار کھلی ہوئی موجود ہے اور مَیں آپ کو قتل کرنے کے لئے تیار ہوں، اب کون سی طاقت ہے جو آپ کو میرے ہاتھ سے بچا سکتی ہے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں: مَیں نے اس کے جواب میں کہا: اللّٰہ اس نے تین مرتبہ آپ سے یہی سوال کیا آپ نے یہی جواب دیا۔ چنانچہ آپ ﷺ کے جواب کا اثر یہ ہوا کہ وہ آپ ﷺ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکا۔

دوسری روایت میں ہے، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ واقعہ غزوۂ ذات الرقاع میں پیش آیا (غزوۂ ذات الرقاع ایک غزوہ ہے جو نبی کریم ﷺ کو علاقۂ نجد میں پیش آیا تھا) ہم حضور ﷺ کے ساتھ تھے اور ہم لوگوں کی عادت یہ تھی کہ جب سفر میں بہت زیادہ سایہ دار درخت دیکھتے اور وہاں آرام کا موقعہ آتا تو ہم وہ درخت نبی کریم ﷺ کے لئے چھوڑ دیتے یعنی

ہم میں سے کوئی بھی اس درخت کے نیچے فروکش نہیں ہوتا بلکہ اس ارادے سے اس کو خالی چھوڑ دیتے کہ حضور ﷺ اپنے آرام کے لئے اس کو پسند فرمائیں۔ چنانچہ مشرکین میں سے ایک آدمی آیا اور نبی کریم ﷺ کی تلوار- جو ایک درخت سے لٹکی ہوئی تھی- اپنے ہاتھ میں لے کر سونتی اور آپ ﷺ سے سوال کرنے لگا: آپ مجھ سے ڈرتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں۔ اس نے پھر سوال کیا: کون آپ کو میرے ہاتھ سے بچائے گا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ۔

یہاں یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لئے لائے کہ جو صورتِ حال پیش آئی کہ دشمن کے ہاتھ میں کھلی ہوئی تلوار موجود تھی اور وہ انتقام لینے کے ارادے سے ہی آیا تھا، اور نبی کریم ﷺ کو تکلیف پہنچانا چاہتا تھا، عین اس حالت میں نبی کریم ﷺ کا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر توکل واعتماد ایک خاص اور نمایاں حیثیت رکھتا ہے کہ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری حفاظت فرمائیں گے۔ چنانچہ اس توکل واعتماد کا ثمرہ ونتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ اس کے ہاتھ لرز گئے اور تلوار اس کے ہاتھ سے گر گئی۔ اب نبی کریم ﷺ نے وہ تلوار اٹھا لی پھر آپ ﷺ نے اس سے سوال کیا: اب تو بتا کہ تجھ کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ چونکہ اس کو تو وہ کیفیت حاصل تھی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ہی نہیں تھا، تو توکل اور اعتماد تو کیا ہوتا؟ اس لئے اس نے جواب میں کہا: ﴿كُنْ خَيْرَ آخِذٍ﴾ آپ بہترین تلوار اٹھانے والے بن جایئے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی شرافت کو دیکھتے ہوئے امید وتوقع یہ ہے کہ آپ مجھے معاف کر دیں گے۔

خیر! حضور ﷺ نے اس کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے کہا: کیا تو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں اور مَیں اللہ کا نبی ورسول ہوں؟

اس نے کہا: نہیں۔ لیکن ہاں! آپ سے اس بات کا وعدہ کرتا ہوں کہ اب مَیں آپ کے ساتھ قتال وجنگ نہیں کروں گا اور جو لوگ آپ کے ساتھ جنگ کررہے ہیں؛ ان کا ساتھ بھی نہیں دوں گا۔ حضور ﷺ نے اس وعدے پر اس کو چھوڑ دیا۔ بعد میں وہ اپنے قبیلے والوں کے پاس آیا اور ان کے سامنے نبی کریم ﷺ کے اخلاق کی تعریف کی کہ مَیں ایک ایسی شخصیت کے پاس سے واپس آرہا ہوں؛ جو بہترین اخلاق والے ہیں۔ پھر اس نے اپنی قوم کو اسلام کی دعوت دی، تو وہ سب مسلمان ہوگئے۔

بہر حال! یہاں نبی کریم ﷺ کے اعتماد وبھروسہ ہی کو بتلانے کے لئے لائے ہیں۔ توکل کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ ایسے مواقع میں بھی آدمی کی نگاہ کسی اور طرف نہیں جانی چاہیے، اگر کسی کو حقیقی معنیٰ میں توکل کی کیفیت حاصل ہے؛ تو ایسے مواقع پر بھی اس کی نظریں اللہ تعالیٰ ہی کی طرف اٹھیں گی۔ جیسے نبی کریم ﷺ نے اِس موقع پر جواب میں کوئی اور بات فرمانے کے بجائے یہی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بچائیں گے۔

......مگر غلو نہ کرے

عن عمر رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ یقولُ: لَوْ أَنَّكُمْ تَتَوَكَّلُوْنَ عَلَى اللهِ حَقَّ تَوَكُّلِهٖ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ، تَغْدُوْ خِمَاصًا وَتَرُوْحُ بِطَانًا.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ پر اس طرح توکل وبھروسہ کرنے لگو جیسا کہ اس پر بھروسہ کرنے کا حق ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ تمہیں اسی طرح روزی دیں گے جس طرح پرندوں کو روزی دیتے ہیں۔ پرندوں کا حال یہ ہے صبح کو اپنے گھونسلوں سے خالی پیٹ باہر نکلتے ہیں اور شام کو جب وہ واپس

آتے ہیں تو شکم سیر لوٹتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ پرندے پہلے سے کوئی تدبیر اور لمبے چوڑے پروگرام نہیں بناتے کہ کل صبح فلاں بازار میں جائیں گے اور یوں سودا سلف لائیں گے اور فلاں کاروبار کریں گے، باقی تدبیر کے درجہ میں اتنا ضرور کرتے ہیں کہ گھونسلوں سے باہر نکلتے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرتے ہیں، گھونسلوں میں بیٹھے نہیں رہتے۔

بتلانا یہ ہے کہ آدمی اتنا ضرور کرے کہ کوئی تدبیر اختیار کرے، ہاتھ پاؤں چلائے، لیکن اعتماد و بھروسہ اپنی تدبیر پر نہ ہو، اور تدبیر کے معاملہ میں بہت زیادہ غلو بھی نہ کرے۔ بعض لوگ تدبیریں سوچتے ہیں اور بڑی بڑی اسکیمیں تیار کرتے ہیں کہ اس طرح کریں گے اس میں اس طرح کا سودا ہوگا، اس میں اتنا فائدہ ہوگا، پھر یوں کریں گے۔ حالانکہ بعض دفعہ وہ سارا پلان ایسا بکھرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے شیخ چلّی کا خواب تھا اور کچھ نہیں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے جتنے بھی معاملات ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے متعلق ہیں، اس لئے اس کو اللہ تعالیٰ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

یہاں نبی کریم ﷺ بھی یہی تعلیم دیتے ہیں کہ تدبیر کو تدبیر کی حیثیت سے ضرور اختیار کرنی چاہیے لیکن اتنی ہی جتنی پرندے اختیار کرتے ہیں کہ وہ اپنے گھونسلوں سے ضرور نکلتے ہیں لیکن تدبیر کے سلسلے میں بہت زیادہ غلو سے کام نہیں لیتے، بلکہ تدبیر کی حیثیت سے نکلتے ہیں۔ اور جس وقت نکل رہے ہوتے ہیں، اس وقت ان کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ ہم فلاں جگہ جائیں گے۔ بس باہر نکل پڑے اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق پہنچانے کی جو شکل پیش آئی، اس کے مطابق ان کو روزی میسر ہوئی۔ ایسے ہی انسانوں کو بھی چاہیے کہ

تدبیر کے معاملہ میں بہت زیادہ غلو اختیار نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کریں۔ اگر یہ صورت پیدا ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا؛ جو پرندوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اوران کو بھی اسی طرح آسانی سے روزی پہنچ جائے گی؛ جس طرح پرندوں کو پہنچ جاتی ہے۔

اور یہ بھی ہے کہ آدمی جب اپنے آپ کو تدبیروں میں ہوشیار سمجھنے لگتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس کواس کی ذات کے حوالے کردیتے ہیں کہ اب اپنی تدبیریں آزما کر دیکھ لے کہ کیا ہوتا ہے؟

﴿سونے سے پہلے سارے معاملات خدا تعالیٰ کو سونپ دے﴾

عن أبی عمارة البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :یافلانُ !اِذاأَوَیتَ اِلیٰ فِراشِکَ فقُلُ: ﴿أَللّٰهُمَّ أَسلَمتُ نَفسِیُ اِلَیکَ، وَوَجَّهتُ وَجهِیُ اِلَیک وَفَوَّضتُ أَمرِیُ اِلَیکَ،وَأَلجَأتُ ظَهرِیُ اِلَیکَ،رَغبَةًوَّرَهبَةًاِلَیکَ،لامَلجَأوَلا مَنجی مِنکَ اِلَّا اِلَیکَ، اٰمَنتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیُ أَنزَلتَ،وَنَبِیِّکَ الَّذِیُ أَرسَلتَ﴾ فَاِنَّکِ اِنُ مِتَّ مِنُ لَیلَتِکَ مِتَّ عَلیٰ الُفِطرَةِ وَاِنُ أَصبَحتَ أَصبتَ خَیرًا.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زید کواور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت براء کو فرمایا: اے فلاں! جب تم اپنے بستر کی طرف آرام کے واسطے پہنچو؛ تو اس وقت یہ دعا پڑھ لیا کرو: ﴿أَللّٰهُمَّ أَسلَمتُ نَفسِیُ اِلَیکَ﴾ اے اللہ! مَیں نے اپنی ذات کو تیرے حوالے کیا، اپنی ذات کے تمام معاملہ میں مَیں نے تیرے اوپر بھروسہ کرلیا

﴿وَوَجَّهتُ وَجهِیَ اِلَیکَ﴾ اورمَیں نے اپنا رخ تیری طرف پھیرلیا﴿وَفَوَّضتُ اَمرِیْ اِلَیکَ﴾ اورمَیں نے اپنا معاملہ تیرے حوالے کردیا﴿وَاَلجَأتُ ظَهرِیْ اِلَیکَ﴾ اورمَیں اپنی پشت کے لئے تیری پناہ حاصل کرتا ہوں﴿رَغبَۃً وَّرَهبَۃً اِلَیکَ﴾ تجھ ہی سے امید رکھ کراور تجھ ہی سے ڈرکر﴿لاَ مَلجَأَ وَلامَنجیٰ مِنکَ اِلَّا اِلَیکَ﴾ تیرے عذاب سے بچنے کے لئے پناہ نہیں حاصل ہوسکتی مگر تیری ہی طرف۔یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی پکڑ سے اگر کوئی بچنا چاہے تو اللہ تعالیٰ ہی بچا سکتے ہیں اورکوئی نہیں بچا سکتا﴿اٰمَنتُ بِکِتَابِکَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ وَنَبِیِّکَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ﴾ اے اللہ!مَیں تیری اس کتاب پر ایمان لے آیا جوتونے اپنے نبی پر اتاری اور تیرے نبی پر بھی ایمان لایا جن کوتونے نبی بنا کر بھیجا۔

فرماتے ہیں کہ اس دعا کو پڑھنے کے بعد اگر آپ سوگئے اوراسی میں انتقال ہوگیا تو ایمان کے اوپر مروگے۔اوراگر صبح کروگے تو بھلائی کو پہنچ جاؤگے۔چونکہ اس دعا میں بھی توکل کا سبق دیا گیا ہے اس لئے یہاں لائے ہیں۔

دیکھئے!مختلف مقامات پر مختلف انداز سے نبی کریم ﷺ اپنی امت کو یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر اعتماد کس طرح کرنا چاہیے،اورآدمی کس طرح اپنے ہر معاملہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حوالے کرسکتا ہے۔

﴿سفرِ ہجرت کا ایک واقعہ﴾

عن أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ عبداللہ بن عثمان بن عامر بن عمر بن کعب بن سعد بن تیم بن مرۃ بن کعب بن لؤی بن غالب القرشی التیمی وهو وأبوه وأمه صحابة رضی اللہ عنہم قال: نَظَرْتُ اِلیٰ أَقْدَامِ الْمُشْرِکِیْنَ وَنَحْنُ فِی الْغَارِ وَهُمْ عَلیٰ رُءُوْسِنا،فَقُلْتُ:یَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ أَنَّ أَحَدَهُمْ نَظَرَ تَحْتَ قَدَمَیْهِ لَأَبْصَرَنَا.فقال:مَاظَنُّکَ یَاأَبَابَکْرٍ بِاثْنَیْنِ،اللّٰهُ ثَالِثُهُمَا.

یہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ ہے، اوران کے والد بزرگوار کا نام عثمان ہے، کنیت ابوقحافہ تھی، اور بنوتیم سے ان کا تعلق ہے، جو قریش ہی کی ایک شاخ ہے، اس لئے ان کو تیمی کہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ بھی، ان کے والد بھی، ان کی والدہ بھی اوران کی اولاد بھی سب مسلمان تھے، اللہ تعالیٰ نے سب کو اسلام کی دولت سے مالا مال فرمایا تھا اور سب صحابی تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سفرِ ہجرت کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے لئے جب مکہ مکرمہ سے روانہ ہونے والے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو ہجرت کی اجازت ملی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچادیا کہ آپ ہجرت کے لئے نکل سکتے ہیں لہٰذا روانہ ہوجایئے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مطلع کیا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے ہجرت کی اجازت دے دی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے درخواست کی: یارسول اللہ! مَیں اس سفرِ ہجرت میں آپ کی رفاقت کی تمنا رکھتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسی لئے تو مَیں نے آپ کو اطلاع بھی کی پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! مَیں نے پہلے سے اس سفر کیلئے دو اونٹنیاں خرید کر پال پوس کر تیار کررکھی ہیں؛ ان میں سے ایک آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ مفت میں نہیں بلکہ قیمتاً لیتا ہوں۔ اس کے بعد یہ دونوں وہاں سے روانہ ہوئے۔

چونکہ یہ بات تو یقینی تھی کہ جب مشرکین کو پتہ چلے گا کہ یہ حضرات مکہ مکرمہ سے روانہ ہوچکے ہیں تو وہ ان کا پیچھا کریں گے، ان کو ڈھونڈیں گے، ان کے درپئے آزار ہوں

گے، اس لئے ضروری تھا کہ روانگی کے فوراً بعد سفر جاری نہ رکھا جائے، بلکہ کچھ زمانہ تک روپوش رہیں؛ یہاں تک کہ مشرکین کی طلب وجستجو کا سلسلہ ختم ہوجائے۔ اور وہ لوگ تھک ہار کر مایوس ہوکر جب بیٹھ جائیں اس کے بعد پھر یہ حضرات اپنا سفر شروع کریں۔ چنانچہ اسی کے پیشِ نظر یہ حضرات مکان سے نکلنے کے بعد مکہ مکرمہ سے باہر ''ثور'' نامی ایک پہاڑ کے غار میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے کہا: آپ ٹھہریئے، پہلے مَیں اندر داخل ہوتا ہوں؛ تاکہ جگہ ٹھیک اور صاف کرلوں۔ چنانچہ اندر جاکر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کو صاف کیا، اور زہریلے جانوروں کے جو سوراخ تھے ان کو بھی بند کردیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوراخ باقی رہ گیا اور اس کو بند کرنے کے لئے کوئی کپڑا نہیں تھا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاؤں کا انگوٹھا اس کے اوپر رکھ دیا پھر نبی کریم ﷺ کو آواز دی کہ آپ تشریف لایئے۔ حضور اکرم ﷺ اندر تشریف لائے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ران پر سر رکھ کر سوگئے۔ چونکہ چل کر آئے تھے، تھکے ہوئے تھے، اس لئے آنکھ لگ گئی۔

اِدھر مشرکین کو جب پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ روانہ ہوگئے ہیں تو وہ آپ کی جستجو اور تلاش میں نکلے، انہوں نے اپنے ساتھ ایک آدمی بھی لیا کہ جو نشانِ قدم دیکھ کر پہچان لے کہ یہ لوگ کہاں گئے ہیں، جس کو عرّاف کہا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ نشانِ قدم دیکھتے دیکھتے آگے بڑھے اور اسی پہاڑ کے پاس پہنچے۔ اس عرّاف نے وہاں نشانِ قدم دیکھ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قدموں کو بتلادیا اور حضور اکرم ﷺ کے قدموں کے متعلق بتلایا کہ یہ نشان وہی ہیں جو مقامِ ابراہیم کے اوپر ہیں۔

مقامِ ابراہیم پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشِ قدم ہیں، گویا حضور ﷺ کا نقشِ پا

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے نقشِ پا سے ملتا جلتا تھا۔ ویسے نبی کریم ﷺ کی شکل وشباہت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملتی جلتی تھی۔

وہ اور آگے بڑھے لیکن پھر قدموں کے نشان نظر نہیں آئے۔ اِدھر ان حضرات کے غار میں تشریف لے جانے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی حفاظت کا یہ انتظام ہوا کہ اس غار کے منہ پر ایک کبوتری نے آکر اپنا گھونسلہ بنالیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک مکڑی نے بھی اس کے اوپر ایک جالا تان دیا۔ جب یہ لوگ وہاں آئے اور دیکھا کہ ایک پرندے کا گھونسلہ ہے اور ساتھ ہی ساتھ مکڑی نے جالا بھی باندھ رکھا ہے، اگر کچھ لوگ اندر گئے ہوئے ہوتے تو یہ صورت نہ ہوتی اور غار کا منہ اس طرح بند نہ ہوتا۔ اب وہ لوگ وہیں غار کے منہ پر کھڑے ہوکر یہ باتیں کررہے ہیں اور غار نیچا تھا یعنی اس طرح سے کہ آدمی کھڑا ہو تو اندر جانے کے لئے سیدھا راستہ نہیں تھا بلکہ نیچے اترنا پڑتا تھا۔ نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں غار میں سے ان لوگوں کو دیکھ رہے تھے، وہ لوگ اِن حضرات کو غار میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھ پاتے تھے، وہ تو صرف غار کے منہ پر کبوتری نے جو گھونسلہ بنا رکھا تھا اور مکڑی نے جالا تان رکھا تھا اس پر بحث کررہے تھے۔ اندر کیا ہے وہ ان کو اندھیرے کی وجہ سے معلوم نہیں تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے مشرکین کے قدم اور پاؤں غار کے اندر سے دیکھے اور ہم لوگ غار میں تھے اور وہ لوگ بالکل ہمارے سروں پر غار کے دروازہ پر کھڑے تھے، اس لئے مَیں نے اس موقعہ پر اندیشہ ظاہر کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ سے یہ عرض کیا: ﴿لَوْاَنَّ اَحَدَهُمْ نَظَرَ تَحْتَ قَدَمَيْهِ لَاَبْصَرَنَا﴾ یارسول اللہ! یہ لوگ اس انداز سے کھڑے ہیں کہ ان میں کا کوئی بھی اگر اپنے پاؤں کی طرف دیکھے گا تو ہم اس کو نظر آجائیں

گے۔ گویا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ہم ان کی نگاہوں میں نہ آجائیں اور پکڑے نہ جائیں۔

اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اطمینان دلاتے ہوئے جو ارشاد فرمایا؛ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ عالی پر توکل واعتماد کو ظاہر کرتا ہے اسی لئے اس روایت کو یہاں لائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿مَا ظَنُّکَ یَا أَبَا بَکْرٍ بِاثْنَیْنِ، اللّٰہُ ثَالِثُھُمَا﴾ اے ابوبکر! تمہارا ان دو آدمیوں کے متعلق کیا خیال ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ ہو؟ یعنی جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت ومدد شاملِ حال ہو، ان کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے؟ کیا وہ دشمن کے ہاتھوں پکڑے جائیں گے؟ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے وثوق واعتماد اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے اوپر پورے توکل کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا۔ اس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توکل کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

﴿ایک معجزہ﴾

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کہیں یہ لوگ یہاں سے داخل ہوگئے تو؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم اِدھر سے نکل جائیں گے، آپ نے ایک طرف اشارہ فرمایا، اس وقت وہاں کچھ نہیں تھا، آپ کے اشارہ کرتے ہی اس دوسری طرف سے پہاڑ کا پورا حصہ ایک دم اس طرح کھل گیا کہ اگر آدمی وہاں سے نکلنا چاہے تو آسانی سے نکل جائے۔

﴿جب ساری تدابیر بے کار نظر آنے لگیں﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب آدمی اپنی ساری تدبیروں کی طرف سے مایوس

ہوجائے ایسے موقعہ پر بھی آدمی کو چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے اوپر اعتماد وتوکل کا سلسلہ قائم رکھے۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے راہیں کھولی جائیں گی ﴿وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُه﴾ جو آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر بھروسہ کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کافی ہوجاتا ہے اور ہر مشکل دور کردیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ موقعہ ایسا ہی تھا کہ یہاں کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی تھی۔

﴿گھر سے باہر نکلتے وقت حضور ﷺ کیا دعا مانگتے تھے﴾

عن أم المؤمنين أم سلمة واسمها هند بنت أبی أمية حذيفة المخزومية رضی اللہ عنہا ان النبی ﷺ كَانَ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ قَالَ: بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ. أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِکَ أَنْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ.

حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا اسم گرامی ہند بنت ابی امیہ تھا، ان کے والد کا نام حذیفہ اور کنیت ابوامیہ تھی، اور خود ان کی کنیت ام سلمہ تھی، قبیلۂ بنومخزوم سے تعلق رکھتی ہیں وہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے گھر سے باہر نکلتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ اس دعا میں بھی نبی کریم ﷺ نے امت کو توکل کا سبق سکھایا ہے جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا کہ ہر موقعہ پر نبی کریم ﷺ اپنی دعاؤں میں بھی اور دوسری تعلیمات میں بھی وہ ساری چیزیں بتلاتے ہیں؛ جو مطلوب ہیں اور جن صفات سے امتیوں کو اور بندوں کو آراستہ کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ پڑھتے تھے: ﴿بِسْمِ اللهِ﴾ اللہ کے نام سے مَیں نکل رہا ہوں ﴿تَوَكَّلْتُ عَلَى اللهِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر مَیں نے بھروسہ کیا۔

اس دعا میں بھی نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کا اظہار کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ عام طور پر آدمی اپنے آپ کو اپنے گھر میں محفوظ سمجھتا ہے، لیکن گھر سے باہر نکلنے

کے بعد کیا حالات پیش آنے والے ہیں؛ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ ان حالات کے اندر اگر آدمی کے لئے کوئی سہارا ہوسکتا ہے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ہی پر توکل واعتماد ہے، جو کارآمد ہے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے یہ سکھایا۔ اس لئے کم سے کم اتنا تو ضرور پڑھ لے۔ آگے مزید دعا تو آ ہی رہی ہے۔

بعض روایتوں میں اتنی مختصر دعا بھی آئی ہے اس لئے جب بھی گھر سے نکلے ﴿بِسْمِ اللہِ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللہِ، لاَحَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ﴾ پڑھ لیا کرے، ان شاء اللہ تمام چیزوں سے حفاظت ہوجائے گی۔

آگے حضور ﷺ یہ دعا پڑھتے تھے: ﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ﴾ اے اللہ! مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ مَیں گمراہی میں مبتلا ہووٴں، یا گمراہ کیا جاوٴں یعنی مَیں خود گمراہ ہووٴں یا کوئی مجھے گمراہ کرے ان دونوں باتوں سے مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں ﴿اَوْاَزِلَّ اَوْاُزَلَّ﴾ یا مَیں لغزش کروں یا مجھے لغزش میں ڈالا جائے ﴿اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ﴾ یا مَیں کسی پر ظلم وزیادتی کروں یا میرے اوپر ظلم وزیادتی کی جائے ﴿اَوْ اَجْھَلَ اَوْ یُجْھَلَ عَلَیَّ﴾ یا مَیں کسی کے ساتھ جہالت اور بدتمیزی سے پیش آوٴں، یا میرے ساتھ جہالت اور بدتمیزی کا سلوک کیا جائے۔

چونکہ عام طور پر گھر سے نکلنے کے بعد یہ صورتیں پیش آسکتی تھیں اس لئے خاص طور پر ان چار چیزوں کا تذکرہ کیا گیا۔ ویسے باقی تمام امور کے سلسلے میں جامع چیز فرمائی تھی ﴿تَوَکَّلْتُ عَلَی اللہِ﴾

یہ روایت لاکر بھی یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اپنی اس مبارک دعا کے ذریعہ سے بھی امت کو توکل کی تعلیم دی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات پر توکل کرو۔

﴿توکل کی بدولت ہدایت کفایت اور حفاظت کا وعدہ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ:مَنْ قَالَ يَعْنِیْ اِذَا خَرَجَ مِنْ بَيْتِهٖ :بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَىٰ اللهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ يُقَالُ لَهٗ:هُدِيْتَ وَكُفِيْتَ وَوُقِيْتَ وَتَنَحّٰى عَنْهُ الشَّيْطَانُ. وزادابوداؤد. فيقول يعنى اَلشَّيْطَانُ لِشَيْطَانٍ آخَرَ: كَيْفَ لَكَ بِرَجُلٍ قَدْ هُدِیَ وَكُفِیَ وَوُقِیَ؟

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: جب کوئی آدمی اپنے گھر سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھے:﴿بِسْمِ اللهِ تَوَكَّلْتُ عَلَىٰ اللهِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّابِاللهِ﴾ تو اس کواللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے﴿هُدِيْتَ﴾ تجھے راہِ راست دکھادی گئی﴿وَكُفِيْتَ﴾ اور تیرے کام میں تیری کفایت کردی گئی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے کاموں کی ذمہ داری لے لی گئی﴿وَوُقِيْتَ﴾ اور تیری حفاظت کردی گئی۔گویا تین چیزوں کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو وعدہ اور بشارت سنائی گئی کہ راہِ راست بھی تجھے دکھادیا گیا، تیرے تمام کاموں میں تیرے لئے کفایت بھی کردی گئی،اور تیری حفاظت بھی کی گئی﴿وَتَنَحّٰى عَنْهُ الشَّيْطَانُ﴾ اور یہ دعاجب پڑھ لیتاہےتواب شیطان بھی اس کے گمراہ کرنے کی تدبیر نہیں کرتا وہ بھی بھاگ جاتا ہے کہ اب میرا کوئی داؤاس کےاوپر چلنے والانہیں ہے۔

چنانچہ ابوداؤدشریف کی ایک روایت میں یہ زیادتی موجود ہے کہ جب یہ دعا پڑھ لیتاہےتوچونکہ ہرآدمی کے ساتھ شیطان لگاہواہے جوگمراہ کرنے کی تدبیریں اورکوششیں کرتا رہتاہے،لہٰذاایک شیطان اس دوسرے شیطان سے جواس کے پیچھے لگاہواہے؛اس کی تسلی کےطور پر یہ کہتاہے:﴿كَيْفَ لَكَ بِرَجُلٍ قَدْ هُدِیَ وَكُفِیَ وَوُقِیَ؟﴾ تو کیسے راہِ راست

سے ہٹا سکتا ہے اس آدمی کو جس کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رہنمائی کردی گئی اور اس کے کاموں کی کفالت لے لی گئی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کا وعدہ دے دیا گیا۔یعنی اب تیرا داؤ اس پر نہیں چل سکتا ہے،لہٰذا اگر تیری تدبیر ناکام ہوجائے؛تو اس پر پریشان مت ہونا۔اس دعا میں بھی نبی کریم ﷺ نے امت کو توکل کی تعلیم دی ہے،لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس دعا کا اہتمام کریں۔

﴿ہم خرما و ہم ثواب﴾

اور دیکھو!اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تین تین وعدے کئے گئے ہیں۔ویسے بھی ہم جن ارادوں اور عزائم اور جن کاموں کو لے کر نکلتے ہیں،ان کے متعلق ہم چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی اطمینان مل جائے کہ ہم جس کام کے لئے نکل رہے ہیں؛وہ ہوجائے گا۔لہٰذا﴿کُفِيتَ﴾ کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی کفالت وذمہ داری لے لی گئی ہے،اس لئے جس مقصد کے لئے نکل رہے ہو،وہ ان شاء اللہ پورا کردیا جائے گا۔ تو یہ دعا پڑھنے کی وجہ سے جہاں حفاظت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہِ راست دکھلائی جاتی ہے؛وہیں تمام کاموں کی ذمہ داری بھی لے لی جاتی ہے۔یہ تو گویا ''ہم خرما و ہم ثواب'' جیسا معاملہ ہوجائے گا۔نبی کریم ﷺ کی تعلیم پر عمل بھی ہوجائے گا دعا کی دعا بھی ہوجائے گی اور ساتھ ہی ساتھ تمام کام بھی بن جائیں گے۔

﴿دو بھائیوں کا قصہ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ:كَانَ اَخَوَانِ عَلٰى عَهْدِالنَّبِيِّ ﷺ،وَكَانَ أَحَدُهُمَايَأْتِي النَّبِيَّ ﷺ،وَالْاٰخَرُيَحْتَرِفُ.فَشَكَاالْمُحْتَرِفُ أَخَاهُ لِلنَّبِيِّ ﷺ.فَقَالَ:لَعَلَّكَ تُرْزَقُ بِهٖ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں دو بھائی تھے، ان میں سے ایک نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آتا تھا اور دوسرا کاروبار کرتا تھا۔ پہلا کاروبار میں نہیں لگا تھا، بلکہ علم کی تحصیل میں مشغول رہنے کی وجہ سے اس کو کاروبار کا موقعہ نہیں ملتا تھا۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو آدمی کاروبار کرتا ہے اس کو یہ غرہ وزعم ہوتا ہے کہ مَیں کما کر اس کو کھلا پلا رہا ہوں، یہاں پر بھی کاروبار کرنے والے بھائی نے نبی کریم ﷺ سے دوسرے بھائی کی شکایت کی کہ یارسول اللہ! یہ تو بالکل مفت خورہ ہے، مفت کی روٹیاں توڑتا رہتا ہے، مَیں کاروبار اور سب کام کرتا ہوں، یہ تو بس آپ کے پاس ہی بیٹھا رہتا ہے۔ حالانکہ اس اللہ کے بندے کو یہ خیال نہیں آیا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دینا اور علم حاصل کرنا؛ یہ بھی تو ایک وہ کام ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے امت کو مکلّف ومأمور بنایا ہے یہ بھی ضروری ہے۔ بلکہ اپنی روزی روٹی کی فکر کرنا اتنا ضروری نہیں؛ جتنا یہ ضروری ہے۔ اس لئے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد اور امت کی ذمہ داری ہی یہ ہے۔

وہ بھائی جو نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتا تھا اور آپ سے تعلیمات حاصل کرتا تھا وہ تو گویا اپنے مقصدِ تخلیق میں آگے بڑھ رہا تھا، اور اس ذمہ داری کو پورا کر رہا تھا، اور فرضِ کفایہ ادا کر رہا تھا، لیکن کاروبار کرنے والا یہ سمجھ رہا تھا کہ مَیں اس کو پال رہا ہوں اور یہ کچھ نہیں کر رہا ہے۔

حضور ﷺ نے اس کاروبار والے بھائی سے کہا: ﴿لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِہٖ﴾ آپ اس غرے میں نہ رہیے کہ آپ کما کر اِس کو کھلا رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ تم کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اِس کی وجہ سے روزی دی جا رہی ہو۔ دیکھنے کو تو آپ یوں سمجھ رہے ہیں کہ آپ کما رہے

ہیں اور آپ کھلا رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملہ اُلٹا ہے۔

دیکھئے! یہ شریعت کی تعلیم ہے۔ دنیا والوں کی نگاہ کیا دیکھتی ہے، اور شریعت کیا تعلیم دیتی ہے۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ کما رہا ہے اور وہ مفت میں کھا رہا ہے۔ اور شریعت یہ بتلاتی ہے اور نبی کریم ﷺ ہم کو یہ خبر دے رہے ہیں کہ نہیں! وہ اِس کو کھلا رہا ہے، اُس کی وجہ سے اِس کو بھی روزی مل رہی ہے۔ گویا جو کاروبار کر رہا ہے، اور اس کے کاروبار میں جو برکت ہوئی اور منافع حاصل ہوا؛ وہ اس لئے کہ یہ اُس کی ذمہ داری لئے ہوئے ہے۔ اگر اس سے ہٹ جائے گا، تو اس کا کام بھی فیل ہو جائے گا۔

روزی میں پریشانی آنے کا ایک گہرا سبب

آج کل عام طور پر لوگ اپنی پریشانیوں کی شکایتیں کرنے آتے ہیں اور روزی کے معاملہ میں تو بہت ہی زیادہ شکایتیں ہوتی ہیں۔ تو روزی کے معاملہ میں جو پریشانیاں ہوتی ہیں؛ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب ایک بھائی کاروبار میں لگا ہوا ہو، اور دوسرا بھائی پڑھنے پڑھانے میں لگا ہوا ہو، تو ہمارے سماج میں یہ ہوتا ہے کہ کاروبار والے بھائی کی بیوی یہ سمجھتی ہے کہ ہمارے میاں ہی سب بوجھ اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں۔ اب اس کی بیوی اس کا ذہن بگاڑتی ہے کہ آپ ہی سب کرتے ہیں، فلاں بھائی تو بیٹھے بیٹھے کھاتا ہے، صرف تبلیغ ہی میں جاتا رہتا ہے، وہ تو مدرسہ میں بیٹھ کر پڑھاتا ہے، اور امامت کراتا ہے، کمانے کا کام تو آپ ہی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھی یوں سمجھنے لگتا ہے کہ اچھا! مَیں اکیلا ہی کیوں کام کروں، مَیں ہی علیٰحدہ ہو جاتا ہوں، پھر ذرا دیکھیں، یہ کیسے کما لیتا ہے؟ لہٰذا وہ تو یہ دکھلانے کیلئے – کہ یہ

کیسے کھاتے ہیں- الگ ہوجاتا ہے، لیکن بعد میں جب اس کو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں، تو پھر باتیں ہوتی ہیں کہ پہلے کاروبار میں جو برکت تھی؛ وہ نہیں رہی۔ کاروبار خراب ہوتا جارہا ہے، گاہکی ٹوٹ رہی ہے، حالات بدل رہے ہیں۔اب اس کی نظر تو اِدھر ہے، لیکن اصل جو خرابی اس نے اختیار کی تھی، اور جس کی وجہ سے یہ گڑبڑ ہے؛ اُدھر تو دھیان ہی نہیں جاتا ہے۔

﴿تاجروں کی خدمت میں ایک قیمتی مشورہ﴾

ابھی مَیں ایک مدرسہ کے جلسہ میں ساؤتھ افریقہ گیا تھا، چونکہ وہاں کاروبار اور تجارت کا سلسلہ ہے، تو جو طلبہ فارغ ہوئے، ان کے اولیاء ماں باپ وغیرہ سے مَیں نے ایک بات کہی کہ آپ نے اپنے بچے کو دین کا علم پڑھنے کے واسطے فارغ کر دیا تھا، گویا آپ نے اس کو اللہ کے واسطے الگ کر دیا۔لہٰذا اب یہ تعلیم حاصل کر کے جب فارغ ہوا، تو اس کو آپ اپنے کاروبار میں جوئنٹ (Joint) نہ کیجیے، بلکہ آپ اس کو فارغ ہی رکھیے تاکہ اس کا یہ پڑھنے پڑھانے کا، تعلیم وتبلیغ کا سلسلہ جاری رہے۔اب رہا اس کے کھانے پینے کا انتظام؟ تو مَیں نے کہا: ویسے بھی آج کل تجارت کے اندر سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) ہوتا ہے کہ وہ کام نہیں کرتا لیکن اس کا حصہ ہوتا ہے۔آپ بھی اپنے اس بیٹے کو اپنی تجارت میں سلیپنگ پارٹنر کے طور پر رکھ لیجیے، کہ آپ کمائیں گے اور یہ کھاتا پیتا رہے گا اور چونکہ اس کے دینی مشاغل میں لگنے میں آپ کی محنت کو بھی دخل ہے، آپ کو بھی ان مشاغل کا پورا پورا اجر ملے گا۔لیکن یوں نہ سمجھنا کہ آپ لوگ اس کو کھلا رہے ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کے اس فیصلہ کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ آپ کی تجارت میں برکت دے، اور پھر اس کی وجہ سے آپ کو روزی ملے، جیسا کہ یہاں حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَعَلَّکَ تُرْزَقُ بِہٖ﴾

یہاں تو ”لَعَلَّکَ“ فرمایا۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شاید تم کو اس کی وجہ سے روزی مل رہی ہو۔ایک دوسری روایت میں ”لعل“ نہیں ہے بلکہ یقین کے ساتھ آپ نے فرمایا:
﴿اِنَّکُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ﴾ کہ تم لوگوں کو روزی تمہارے کمزوروں کی وجہ سے ملتی ہے۔

﴿آپ کے پاس اوروں کی روزی بھی ہے﴾

آج کل ہمارے سماج و معاشرے میں ایک زہر ہے کہ کمزوروں کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ مفت خورے ہیں، بیٹھے بیٹھے کھاتے ہیں، ہمارے خاندان اور گھر والوں کے اوپر بوجھ ہیں۔لیکن یہاں نبی کریم ﷺ ہمیں یہ فرمارہے ہیں کہ یہ بوجھ نہیں ہیں، بلکہ ان کی وجہ سے تمہیں روزی مل رہی ہے۔آدمی کو جو کچھ مل رہا ہے، وہ یہ نہ سمجھے کہ میری ہی روزی مجھے مل رہی ہے، بلکہ اور لوگوں کی بھی مل رہی ہے۔آپ کو تو دس لاکھ مل رہے ہیں، اور آپ کی ضرورت ایک لاکھ میں پوری ہورہی ہے، تو یہ نو لاکھ کاہے کے ملے؟ یہ نو لاکھ کے بارے میں یوں نہ سمجھنا کہ آپ کے ملے ہیں۔یہ نو لاکھ جو زائد ملے ہیں، وہ دوسروں کے ملے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان نو لاکھ کو اُن ہی لوگوں پر خرچ کئے جائیں؛ جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے دئے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائے

استقامت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراًکَثِیْراً.أمابعد:—

فأعوذباللّٰہمن الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَاسْتَقِمْ کَمَااُمِرْتَ (هود.۱۱۲)

وقال تعالیٰ:اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْارَبُّنَااللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْاتَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَن لَّاتَخَافُوْاوَلَاتَحْزَنُوْاوَاَبْشِرُوْابِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیَآؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَاوَفِی الْاٰخِرَۃِوَلَکُمْ فِیْھَامَاتَشْتَھِیْ اَنْفُسُکُمْ وَلَکُمْ فِیْھَامَاتَدَّعُوْنَ.نُزُلاًمِنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ.

(فصلت.۳۰،۳۱،۳۲)

وقال تعالیٰ:اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْارَبُّنَااللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ اُوْلٰئِکَ اَصْحَابُ الْجَنَّۃِ خَالِدِیْنَ فِیْھَا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ. (الأحقاف.۱۳،۱۴)

استقامت کی وضاحت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ باب قائم فرمارہے ہیں ’’باب الاستقامۃ ‘‘استقامت عربی لفظ ہے، جو قیام سے بنا ہے، جس کا ہم اردو میں ترجمہ کرتے ہیں: کسی چیز پر قائم ہونا اور مضبوطی کے ساتھ اس پر جم جانا۔

شریعت کی اصطلاح میں استقامت اس کو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جس دین اسلام کو لے کر آئے ہیں؛ اس دین پر عقیدے، عمل اور قول کے اعتبار سے پوری مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا۔

اور کبھی کبھار استقامت کا لفظ میانہ روی یعنی درمیانی راہ اختیار کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ جس میں نہ تو افراط ہو کہ آدمی حد سے آگے بڑھے، اور نہ تفریط ہو کہ اس میں کوتاہی کرے؛ بلکہ میانہ روی سے کام لے۔

صراطِ مستقیم کو صراطِ مستقیم اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ درمیانی راستہ ہے۔ نہ اس میں افراط ہے، نہ تفریط۔ نہ حد سے آگے بڑھنا ہے، نہ کمی کوتاہی ہے۔

استقامت بنیاد اور اصل ہے

استقامت کی خاص اہمیت بتلانے کے لئے انہوں نے قرآنِ پاک کی تین آیتیں پیش فرمائی ہیں اور بھی آیتوں میں استقامت کا تذکرہ موجود ہے۔ استقامت ہی سارے دین کی بنیاد اور اصل ہے، اس لئے کہ کوئی دنیوی معاملہ ہو یا اخروی، جب تک کہ آدمی استقامت سے کام نہ لے؛ تب تک وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

ایک آدمی دنیا میں اگر کوئی ذریعۂ معاش اختیار کرنا چاہتا ہے۔ مثلاً اس نے نجاری اور ستھاری کا پیشہ اختیار کیا، لیکن شروع کرنے کے بعد ابھی تو چند ہی روز ہوئے تھے، مہینہ دو مہینہ ہوئے تھے، نہ تو پورے طور پر اس کو تجربہ ہوا، نہ مہارت ہوئی اور نہ تو اس راہ کے نشیب وفراز سے کوئی واقفیت ہوئی، اس سے پہلے ہی یہ سوچ کر کہ اس میں تو کوئی زیادہ آمدنی معلوم نہیں ہوتی، کچھ کامیابی نہیں ملتی؛ اس نے اس پیشے کو چھوڑ دیا۔ اور آہن گری اور لوہاری کا پیشہ اختیار کرلیا اور اس کو ذریعۂ معاش کے طور پر شروع کیا، وہاں بھی یہی حال ہوا دو چار مہینے ہوئے تھے، نہ تو اس کو کوئی تجربہ ہوا، اور نہ مہارت کی نوبت آئی، اور نہ اس کے پورے حالات سے واقفیت ہوئی، اور اس میں بھی یہ سوچ کر کہ اس میں بھی کوئی زیادہ دم خم نظر نہیں آتا، کچھ

آمدنی بھی نہیں ہے، اس پیشے کو بھی چھوڑ دیا، اور کوئی تیسرا پیشہ اختیار کرلیا۔

مطلب یہ ہے کہ وہ دو چار مہینے تک کسی ایک پیشے کو اختیار کر کے اس میں کامیابی نظر نہ آنے پر اس کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار کرتا ہے۔ تو آپ ہی بتائیے کہ یہ آدمی پوری زندگی اس طرح کسی بھی ذریعۂ معاش میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے؟ نہیں کرسکتا۔ اور وہ جو چاہتا ہے کہ اچھے طریقہ سے ذریعۂ معاش پر اس کو قابو حاصل ہو اور ایسا ذریعۂ معاش اس کو میسر ہو، جس سے ساری ضروریات کی کفالت ہو جائے، اور اس کے نتیجہ میں اس کو اطمینان وسکون حاصل ہو، اگر ساری زندگی بھی اس طرح پیشے ادلتا بدلتا رہے گا؛ تو یہ حاصل ہونے والا نہیں ہے۔

اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک ہی پیشے کو ایک طویل زمانے تک کرتا رہے تاکہ اس پیشے کے نشیب وفراز سے واقفیت ہو، تجربہ ہو، مہارت ہو، اور لوگوں کو بھی ان کے اس تجربے اور مہارت سے کچھ اطمینان حاصل ہو۔ پھر لوگ بھی اس سے اس پیشے کے سلسلے میں کچھ مدد حاصل کریں گے، اور اس سے اپنے کام کروائیں گے، اور کئی سالوں کے بعد ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پیشے پر قابو پا کر اور اس کو اپنے ذریعۂ معاش کے طور پر طے کر کے ایسی کامیابی حاصل کرے گا کہ وہ اس لائن کا ماہر سمجھا جائے گا، اور پھر کہا جائے گا اور لوگوں میں بھی یہ بات معروف ومشہور ہو جائے گی کہ اس کام کے سلسلے میں اگر آپ کو رابطہ قائم کرنا ہے تو فلاں صاحب سے، فلاں کمپنی سے رابطہ قائم کیجئے؛ ان کا سالہا سال کا تجربہ ہے، اور اس سلسلے میں ان کا کام سو فیصد ایسا ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے۔

ایک ساکھ قائم ہوگئی

دیکھو! یہ چیز کاہے سے حاصل ہوئی؟ مضبوطی کے ساتھ، پورے عزم وارادے اور

قوت کے ساتھ ایک پیشے کے اوپر جمنے سے یہ بات حاصل ہوئی۔اس میں جوں جوں زمانہ گذرتا ہے،تو ظاہر ہے کہ حالات آتے ہیں، ناکامیابی بھی آتی ہے؛لیکن اس ناکامی سے ڈر کراُس نے اس کو چھوڑا نہیں، بلکہ اس راستہ کی جتنی بھی مشکلات اور دشواریاں تھیں،ان سب کو خوب اچھی طرح برداشت کرتا رہااوراس سلسلے میں جومختلف تجربے حاصل ہوسکتے تھے ان تجربوں کوعملی جامہ پہناتا رہا،تب جاکرسالہاسال کے بعداس کو یہ مقام حاصل ہوااوراس لائن میں اس کووہ حیثیت حاصل ہوئی،جس کوآپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ساکھ قائم ہوگئی۔ یہ کاہے سے ہوا؟ استقامت کے نتیجہ میں ہوا۔وہ ایک چیز پر جم گیا،اورڈرکر،گھبراکراور مایوس ہوکراس نے اس کوچھوڑا نہیں۔

معلوم ہوا کہ دنیوی اعتبار سے بھی آدمی اگرکسی چیز میں کامیابی حاصل کرنا چاہے؛تو استقامت ضروری ہے۔یعنی کسی چیز کے اوپر بہت پختگی سے جمنا،اورمضبوطی کے ساتھ اس پرقائم ہونا؛یہ لازم ہے۔جب تک کہ یہ بات حاصل نہیں ہوگی؛ تب تک کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔یہی حال دین کے اموکا بھی ہے۔

پہلے بہت ساری روایات گذریں۔اخلاص کے متعلق کچھ باتیں،توبہ اورصبر سے متعلق کچھ چیزیں،صدق،مراقبہ،تقویٰ اوریقین وتوکل سے متعلق بھی بہت ساری تفصیلات بتلائیں؛ یہ جتنے بھی اوصاف اورکمالات کا پچھلے ابواب میں تذکرہ ہوااورآئندہ جن کا ذکر آئے گا؛ان تمام چیزوں میں جب تک کہ آدمی کواستقامت حاصل نہ ہو،مضبوطی،اولواالعزمی اورارادے کی پختگی کے ساتھ ان چیزوں پر جمانہ رہے گا؛ تب تک وہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔

﴿استقامت کی کرامت﴾

ایک آدمی ہے دو چار دن، مہینے دو مہینے کے واسطے بہت بڑا بزرگ بن گیا، تقویٰ حاصل کرلیا، بہت کچھ عبادات کرنے لگا، اپنے آپ کو گناہوں سے بہت زیادہ بچانے لگا، ہر چیز میں بہت زیادہ پابندی کرنے لگا؛ لیکن دو تین مہینہ کے بعد پھر وہی پرانی ڈگر پر چلنے لگا تو کیا یہ تقویٰ، بزرگی اور عبادات اس کو کام دے گی؟ نہیں! بالکل کام نہیں دے گی۔

دیکھئے! آپ اور ہم سب یہ بات جانتے ہیں کہ ندی میں ریت ہوتی ہے، چھوٹے چھوٹے پتھر بھی ہوتے ہیں۔ یہ کہاں سے آتے ہیں؟ پہاڑ پر سے بہہ کر آتے ہیں۔ یہ پانی ہی ہے جو ایک زمانہ تک مسلسل بہہ بہہ کر پہاڑ کی ان چٹانوں کو توڑ توڑ کر چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی اور ریت کی شکل میں بدل دیا کرتا ہے۔ تو پانی جیسی نرم چیز جب ایک طویل زمانہ تک پہاڑ کی چٹانوں پر مسلسل گرتی رہتی ہے، تو اس کے نتیجہ میں پہاڑ کی چٹان بھی ٹوٹ کر پتھر کے ٹکڑوں کی اور ریت کی شکل میں بدل جاتی ہے۔ آخر یہ کاہے سے ہوتا ہے؟ ایک زمانہ تک کی استقامت یعنی ایک چیز اور ایک نہج پر قائم رہنے سے ہوتا ہے۔ دینی معاملہ میں بھی استقامت اسے ہی کہتے ہیں کہ آدمی اپنے ایمان پر اور عقائد سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

﴿خدائی امتحان میں کامیابی کا راز﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایمان کی بھی آزمائش ہوتی ہے۔ ایک آدمی جب دعویٰ کرتا ہے کہ مَیں ایمان لایا اور ایمانیات کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان ساری چیزوں کو وہ تسلیم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کو اکیلا و یکتا مانتا ہے، ساری صفات میں بھی اس کو

تنہا مانتا ہے، اور جتنی چیزیں وجود میں آتی ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرتا ہے، ایمانیات سے متعلق جتنے بھی امور ہیں، اس سب پر دل سے راضی ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی آزمائش بھی ہوگی۔ اس لئے کہ جب تک آزمائش نہ ہو، اس وقت تک کون مخلص ہے اور کون منافق ہے؛ اس کا کہاں پتہ چلتا ہے؟ اگر خالی دعوے ہی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نواز دیا جاتا، تو اس صورت میں معاملہ آسان تھا۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور ان میں بھی سید الانبیاء حضور اکرم ﷺ کو کتنا ستایا گیا۔ خود نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: مجھے ایسا آزمایا گیا اور ایسا مصائب میں ڈالا گیا کہ کسی اور کو ایسے مصائب میں آزمایا نہیں گیا: ﴿أَشَدُّ النَّاسِ بَلَآءً الأنبياءُ ثُمَّ الأمثلُ فالأمثلُ (الترمذی،۲۳۹۸)﴾ سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کرام علیہم السلام کی ہوتی ہے، اور اس کے بعد جو شخص جتنا زیادہ ان سے قریب اور جتنا زیادہ ان کے راستہ پر چلنے والا اور جتنی زیادہ ان کی مشابہت اختیار کرنے والا ہوتا ہے؛ اسی مناسبت سے اس کی آزمائش بھی ہوا کرتی ہے۔ آخر یہ کیوں؟

اس لئے کہ آدمی جب اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوپر ایمان کا دعویٰ کرتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمایا جاتا ہے۔ جب مختلف حالات پیش آئیں تو ان حالات و مصائب، تکالیف و آزمائشوں کے باوجود اپنے عقائد میں ذرّہ برابر بھی کوئی تبدیلی پیدا نہ کرنا اور اپنے ایمان پر شروع سے لے کر موت کی آخری گھڑی تک مضبوطی کے ساتھ جم جانا، یہاں تک کہ آدمی کا خاتمہ بھی ایمان کے اوپر ہو جائے؛ یہی اس امتحان کی کامیابی ہے۔

اسی کا نام استقامت ہے

اسی طرح بیماریاں آئیں اور ان میں مختلف طریقوں سے آزمایا گیا، اس کے باوجود

اس کا یقین اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی رہا کہ بیماری دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہے، اور شفا دینے والا بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے، ان حالات کے باوجود اس کے اندر کوئی فرق نہیں آیا۔ نبی کریم ﷺ کے لائے ہوئے دین اسلام کے اوپر- چاہے اس دین کا تعلق عقیدے سے ہو، اعمال سے ہو یا زبان سے کہی جانے والی باتوں سے ہو، ہر چیز میں- مضبوطی کے ساتھ قائم رہنا؛ اسی کا نام استقامت ہے۔

﴿عقیدہ میں استقامت﴾

استقامت کا تعلق عقیدے سے بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی کا اپنی زندگی میں مختلف حالات سے جب گذر ہوتا ہے، تو ان حالات میں اس کے عقیدے کی بھی آزمائش ہوتی ہے پھر دیکھا جاتا ہے کہ وہ مضبوطی کے ساتھ اس پر جما ہوا ہے یا نہیں۔ اگر اس میں کچھ فرق آیا تو سمجھ لو کہ ایمان سے اس کو جو فائدہ پہنچنا چاہیے؛ وہ نہیں پہنچا۔ یقین کی جو مضبوطی حاصل ہونی چاہیے؛ وہ حاصل نہیں ہوئی۔ اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ معلوم نہیں؛ دنیا میں کیسی کیسی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ایمان و یقین کی مضبوطی حاصل ہوتی؛ تو پھر ان ساری بداخلاقیوں اور برائیوں کی نوبت ہی نہ آتی۔

﴿اعمال میں استقامت﴾

اسی طریقہ سے عملی اعتبار سے دیکھا جائے۔ اعمال میں ایک تو ہے عبادات، اور دوسرے ہیں معاملات، اور پھر سارے احکامات۔ پھر عبادات میں بھی فرائض ہیں مثلاً پانچ وقت کی نماز ہے، اس میں استقامت کا مطلب یہ ہے کہ پانچوں وقت کی نماز اپنے اپنے وقت پر سنت کے مطابق جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا زندگی بھر اہتمام کرے۔ ایسا نہیں کہ

ایک مہینے دو مہینے کے لئے حالت ٹھیک کرلی، پھر حالت میں تبدیلی آگئی۔ بلکہ استقامت کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی کو زندگی میں مختلف حالات پیش آتے ہیں، بیماری آتی ہے، تندرستی آتی ہے، تونگری آتی ہے، غربت آتی ہے، اور سفر میں ہوتا ہے، حضر میں ہوتا ہے، غم ہے، خوشی ہے؛ ان سب حالات میں اس کے عمل میں کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔ بیمار ہے تب بھی، تندرست ہے تب بھی، مالداری ہے تو بھی، غریبی ہے تو بھی، سفر میں ہے تب بھی اور حضر میں ہے تب بھی؛ کسی بھی حال میں- شریعت کی طرف سے پانچ وقت کی نماز کا جو حکم دیا گیا اور اس کی ادائیگی جو اس پر فرض کی گئی ہے اس میں- اس کی طرف سے کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔

﴿سرِ مو فرق نہ آنا چاہیے﴾

اسی طرح عبادات میں جتنے بھی فرائض ہیں، ان میں استقامت کا مطلب یہ ہوا کہ مکمل طریقہ سے ان کو انجام دینا۔ رمضان شریف کے روزے ہیں، یا صاحبِ نصاب پر زکوٰۃ ہے تو چالیسواں حصہ نکالنا۔ زکوٰۃ نکالنے میں ذرّہ برابر بھی تأمل نہ ہو۔ ایسا نہیں کہ اس کے پاس دس بیس ہزار روپے ہیں، تب تو زکوٰۃ آسانی کے ساتھ نکال رہا ہے، دس بیس ہزار کا چالیسواں حصہ نکالنا آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب دس بیس کروڑ روپے آگئے، تو سوچتا ہے کہ بیس کروڑ روپے کی زکوٰۃ یعنی پچاس لاکھ روپے نکالنا پڑے گی، اب وہ سوچ رہا ہے کہ ابھی تھوڑے نکال لوں، بعد میں تھوڑے نکال لوں گا۔ یہ تھوڑے سے نکال لینا کافی سمجھ لے، اور پورا حساب نہ کرے؛ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ استقامت کا مطلب تو یہ ہے کہ بیس کروڑ تو کیا، اگر ہزار کروڑ بھی اس کے پاس آجائیں؛ تو زکوٰۃ کی ادائیگی کا اس کو جو حکم دیا گیا ہے، اس کے اندر سرِ مو فرق نہیں آنا چاہیے۔

حج اس پر فرض ہوگیا ہے، تو اس کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، یہ عبادات ہیں، ان کی ادائیگی میں کیسے ہی حالات آجائیں؛ کوئی فرق نہیں آنا چاہیے۔

رات کو نیند نہیں آئی تو فجر کی نماز پڑھنے چلے گئے، اور نیند آرہی ہے تو کہا کہ بعد میں پڑھ لیں گے؛ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ کیسی ہی کیفیت کیوں نہ ہو، نماز کی ادائیگی میں اس کی طرف سے کمی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ استقامت ہے۔

﴿استقامت کیسے حاصل ہو؟﴾

یہ تو فرائض کا معاملہ ہوا۔ عبادات میں نوافل کا معاملہ بھی ہے۔ ہر فرض نماز کے ساتھ کچھ نوافل بھی ہیں، اور آگے پیچھے سنتیں لگی ہوئی ہیں، ان کے علاوہ باقی نوافل اور بھی ہیں، تہجد اشراق چاشت اور اوّابین ہیں۔ ان نمازوں میں استقامت کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی ادائیگی کا جب ارادہ کیا اور شروع کر دیا؛ تو ان میں کبھی بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿أَحَبُّ الْأَعْمَالِ اِلیٰ اللهِ مَادَامَ وَاِنْ قَلَّ (البخاری، کتاب اللباس، ۵۸۶۱)﴾ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے۔ اسی لئے مَیں نے کہا تھا کہ آدمی میانہ روی اختیار کرے۔ جب کسی بھی کام میں درمیانی راہ اختیار کرے گا اور جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض نہیں کی گئیں، ان میں بھی میانہ روی سے کام لے گا؛ تو اس کو آپ ہی آپ استقامت اور جماؤ نصیب ہو جائے گا۔ اور اگر افراط سے کام لے رہا ہے؛ تو ممکن ہے کہ وہ پابندی نہ کر سکے۔ مثلاً ایک آدمی رات بھر جاگتا ہے تو ممکن ہے کہ وہ کسی روز سو بھی جائے۔

﴿...... یہ مجھے زیادہ پسند ہے﴾

ایک صحابی حضرت سلیمان بن ابی حثمہ نامی تھے، ایک روز فجر کی نماز میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو نہیں دیکھا، جب دن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے گھر کے پاس سے گذرے، تو ان کی والدہ شفا سے پوچھا: آج صبح کی نماز میں سلیمان نہیں تھے، کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا بات دراصل یہ ہوئی کہ وہ رات بھر عبادت میں مشغول رہے، صبح صادق کے قریب ان کی آنکھ لگ گئی؛ اس لئے وہ جماعت میں شریک نہیں ہوسکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَیں فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھوں، یہ مجھے اس کے مقابلہ میں زیادہ پسند ہے کہ رات بھر عبادت کروں اور فجر کی نماز غائب ہوجائے۔ (مؤطا للامام مالک، حدیث نمبر ۲۷۰)

﴿اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے﴾

دیکھئے! نوافل کا مطلب کیا ہے؟ نفل اس کو کہتے ہیں کہ اگر آپ کریں گے؛ تو ثواب ملے گا، اور نہیں کریں گے؛ تو اس پر کوئی گناہ یا پکڑ ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں فرض کا معاملہ ایسا ہے کہ اگر آپ نہیں کررہے ہیں؛ تو وہ بہت بڑا گناہ ہے۔ فرض نماز اگر آپ چھوڑیں گے، تو فرض نماز کا چھوڑنا کبیرہ گناہ ہے۔

نفل میں استقامت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ نفل کے لئے جو شرائط ہیں ان کا خیال رکھے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس میں اعتدال ومیانہ روی سے کام لیتے ہوئے پابندی کا اہتمام کرے، اور اس کی وجہ سے فرائض کی ادائیگی میں اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ فرائض بھی اپنے اپنے وقت پر پورے طریقے سے ادا کرنے کے ساتھ جن جن نوافل کا وہ اہتمام کررہا ہے، ان کو بھی پابندی سے ادا کرے

مثلاً آپ نے کوئی لمبا چوڑا عمل شروع کر دیا، لیکن وہ ایسا ہے کہ جس کے متعلق یہ اندیشہ وخطرہ ہے کہ آپ اس کی پابندی نہیں کر سکیں گے؛ تو اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔

﴿یہ میرا طریقہ ہے﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ تین صحابی رضوان اللہ علیہم اجمعین ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نبی کریم ﷺ کے معمولات کے متعلق سوال کیا۔ ام المؤمنین نے بتلایا کہ آپ ﷺ رات کے ایک حصہ میں آرام کرتے ہیں اور کچھ حصہ میں آپ عبادت کرتے ہیں۔

روزوں کے متعلق پوچھا تو بتلایا کہ مہینے میں تین دن آپ روزہ رکھتے ہیں، باقی دنوں میں افطار کرتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل بتلائی۔ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یوں سوچا کہ یہ تو نبی کریم ﷺ کا معاملہ ہے، آپ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بخشے بخشائے ہیں، ہم لوگ ہلاکت کی کگار پر کھڑے ہوئے ہیں، اس لئے ہمیں زیادہ کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے تو یہ طے کیا کہ مَیں رات بھر جاگوں گا؛ کبھی نہیں سوؤں گا۔ دوسرے نے یہ طے کیا کہ مَیں ہمیشہ روزہ رکھوں گا؛ کبھی افطار نہیں کروں گا۔ اور تیسرے نے یہ طے کیا کہ مَیں کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ جب نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو ام المؤمنین نے آپ کو بتلایا کہ ابھی ایسا ہوا۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو جمع کر کے فرمایا:

﴿وَاللهِ اِنِّی أَخْشَاکُمْ للهِ وَأَتْقَاکُمْ لَهُ وَلٰکِنِّی أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّی وَأَرْقُدُ وَأَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِی فَلَیْسَ مِنِّی (البخاری، کتاب النکاح، ۵۰۶۳)﴾ اللہ کی قسم! مَیں تم لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اللہ کا تقویٰ رکھنے والا ہوں، اس کے باوجود مَیں

رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ مَیں مہینہ کے کچھ دنوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور بقیہ دنوں میں افطار بھی کرتا ہوں۔ اور عورتوں کے ساتھ نکاح بھی کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے، اور جو میرے طریقے سے منہ موڑے گا؛ وہ مجھ میں سے نہیں ہے۔

یہاں نبی کریم ﷺ نے امت کو اعتدال والا راستہ بتلایا کہ آدمی اپنے مزاج کی بھی رعایت کرے، نوافل کا اہتمام ضروری اور اچھا ہے، لیکن نوافل کے اندر آدمی اگر اپنے مزاج کی رعایت نہیں کرے گا؛ تو اس پر پابندی نہیں کر سکے گا اور جم بھی نہیں سکے گا۔

﴿......اور سفر بھی مکمل نہیں ہوا﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿فَاِنَّ السَّائِرَ الْمُنبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا أَبْقىٰ﴾ (کنز العمال بروایت امام بزار، ۳/ ۳۶۔ کشف الخفا ۲۸۴۲) ایک آدمی سفر میں اپنی سواری کے جانور کو خوب دوڑاتا ہے، تاکہ جلدی سے سفر پورا ہو جائے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ وہ جانور زیادہ دوڑنے کے نتیجے میں مر جائے گا ﴿لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا أَبْقىٰ﴾ اب نہ تو وہ اپنا سفر پورا کر سکا، نہ اپنی سواری کا جانور باقی رکھ سکا۔ سواری کا جانور بھی ہاتھ سے گیا اور سفر بھی مکمل نہیں ہوا۔ اپنا جسم بھی ایک سواری کی حیثیت رکھتا ہے، اور ہم کو اسی سے کام لینا ہے، اگر آدمی نوافل میں غلو سے کام لے گا اور حد سے آگے بڑھے گا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جسم کی حفاظت نہیں کر سکے گا، اپنے مزاج کی، اپنی طبیعت کی اور اپنی صحت کی رعایت کرنا بھی لازم ہے۔ ایسی نفل عبادت کہ جس کے نتیجہ میں صحت خراب ہو جائے؛ شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔

﴿استقامت روح ہے﴾

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے اور اپنے ارشادات کے ذریعہ سے امت

کو خاص طور پر اس بات کی طرف متوجہ فرمایا کہ نوافل بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب اور پسندیدہ ہیں، اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہیں؛ لیکن اس میں بھی آدمی میانہ روی اختیار کرے نہ افراط سے کام لے، نہ تفریط سے۔ غلو کی ہرگز اجازت نہیں ہے، بلکہ ایسا طریقہ اختیار کرے جس میں استقامت کے ساتھ پابندی کا اہتمام ہو سکے۔

تو عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ استقامت یعنی شریعت کے اوپر جم جانا اور شریعت کے احکام پر پوری مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جانا بہت بڑی چیز ہے۔ یوں سمجھئے کہ ساری شریعت کی روح ہے۔ جب تک استقامت نہ ہو، کسی بھی چیز میں کمال پیدا نہیں ہوسکتا۔

﴿معاملات میں استقامت﴾

معاملات کے اندر استقامت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، ان کے ساتھ حلال والا معاملہ کرنا۔ اور جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان سے بچنے کا اہتمام کرنا۔ ایک آدمی کاروبار کرتا ہے تو اس میں دونوں صورتیں پیش آئیں گی۔ لہٰذا کاروبار میں حرام سے مکمل پرہیز کرتا ہے۔ کیونکہ حرام اللہ تعالیٰ سے دوری کا ذریعہ ہے۔ اگر حرام کی نوبت آتی ہے، تو اس سے دور بھاگتا ہے، اس کے ایک ذرّے کو بھی اپنے لئے پسند نہیں کرتا، بلکہ جہاں حرام کا شبہ بھی ہو، اس سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

﴿اتنا زیادہ اہتمام کیا﴾

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے، آپ کی کپڑوں کی تجارت تھی، آپ کہیں تشریف لے گئے تھے، آپ کا تجارت میں جو شریک تھا اس کو بتلا دیا تھا کہ فلاں تھان میں یہ عیب ہے، کوئی خریدار آوے تو اس کو بتلا کر معاملہ کرنا۔ جب آپ واپس تشریف لائے تو

معلوم ہوا کہ آپ کے شریک نے ایک بہت بڑا سودا کر لیا تھا اور اس سودے کے اندر وہ تھان بھی تھا؛ لیکن یہ بتانا بھول گیا تھا۔تو آپ نے اس پورے سودے میں جتنی رقم آئی تھی؛ وہ ساری صرف اس وجہ سے صدقہ کر دی کہ آپ کا وکیل یہ بتانا بھول گیا تھا کہ اس میں عیب ہے

(مناقب أبی حنیفہ للذہبی، ص ۴۱)

حالانکہ شریعت نے تو خیارِ عیب کی بھی اجازت دی ہے۔خیارِ عیب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی خریدار نے کوئی چیز خریدی اور اس خریدی ہوئی چیز میں کوئی عیب ہے، جب خریدار کو اس عیب کا پتہ چلے تو اس کو شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس عیب کی وجہ سے وہ واپس کرے، چاہے ایسی کوئی شرط نہ لگائی گئی ہو۔لیکن اس کے باوجود امام صاحب نے صرف اتنا ہی نہیں کہ اس سودے سے حاصل ہونے والے منافع کو صدقہ کر دیا، بلکہ پوری رقم کو صدقہ کر دینا ضروری سمجھا۔حرام سے اپنے آپ کو بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا۔

ہمارے اکابر کے ایسے حالات ہم پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ حرام سے بچنے کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قصہ

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات میں لکھا ہے۔آپ نے حکایاتِ صحابہ میں پڑھا اور سنا ہوگا۔آپ کا ایک غلام تھا جس کو آپ نے خراج کے اوپر چھوڑ رکھا تھا۔

خراج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ غلام کو کوئی ہنر یا فن آتا ہو؛ تو اس کو اجازت دی جائے کہ تم اپنے ہنر سے کما لو اور روزانہ اپنی کمائی میں سے اتنی رقم مجھے دے دینا۔

اسی طرح اس کو بھی آپ نے خراج پر لگا دیا تھا۔ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ دودھ لایا،

ویسے تو حضرت کی عادت تھی کہ روزانہ پوچھا کرتے تھے کہ کہاں سے لائے۔ اتفاق سے اس روز ہی نہیں پوچھا اور وہ دودھ پی لیا۔ اس غلام نے کہا: آقا! آپ تو روزانہ پوچھتے ہیں کہ یہ چیز کہاں سے لائے، آج آپ نے نہیں پوچھا؟ آپ نے کہا: ہاں بھئی بتادو۔ اس نے کہا: بات دراصل یہ ہوئی کہ زمانۂ جاہلیت میں مَیں کہانت یعنی غیب کی خبریں دینے کا کام کیا کرتا تھا، چونکہ اسلام نے اس کی اجازت نہیں دی ہے، اس لئے اسلام لانے کے بعد چھوڑ دیا، لیکن زمانۂ جاہلیت میں مَیں نے ایک آدمی کو اس طرح کی کچھ باتیں بتائی تھیں، آج اس سے ملاقات ہوئی، تو اس نے اسی بتائی ہوئی سابقہ باتوں کی بنیاد پر؛ بدلے میں یہ دودھ مجھے دیا تھا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ اکبر! اسی وقت حلق میں انگلی ڈالی اور وہ سارا دودھ -جو پی گئے تھے- قے کر دیا۔ (بخاری شریف، کتاب مناقب الانصار)

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ معاملات کے اندر شریعت کے احکام میں جائز اور ناجائز، حرام اور حلال کا پورا اہتمام ہو۔ پوری شریعت پر مضبوطی سے جم جانا؛ اسی کا نام استقامت ہے۔

﴿لیکن اس میں ہماری ہمت نہیں ہوتی﴾

آج ہم لوگوں کو عبادتوں اور معمولات سے فائدہ کیوں نہیں پہنچتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دکان میں تو اس چیز کا بڑا اہتمام کرتے ہیں کہ دس بجے دکان کھولنی ہے؛ تو دس بجے کھل جائے گی۔ فیکٹری کی پہلی پالی اگر دس بجے شروع ہوتی ہے؛ تو شروع ہو ہی جائے گی کبھی ایسا ہوا کہ فیکٹری کے ٹائم میں کوئی فرق آیا ہو، دکان کے وقت میں کوئی فرق آیا ہو؟

آپ جس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، اس میں آپ کی طرف سے جو اوقات مقرر کئے گئے ہیں، اس میں تو ذرّہ برابر فرق نہ آئے۔ اور آپ کی قرآنِ پاک کی تلاوت، نماز کی

جماعت اور تسبیحات وغیرہ چیزوں میں آپ یوں کہیں کہ آج چھوٹ گیا، فلاں روز ایسا ہوا۔

حضرت ہردوئی دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک مرتبہ فرمایا: ایک صاحب نے لکھا کہ اتنے دنوں سے تسبیحات چھوٹ گئیں ہیں۔ مَیں نے کہا: کبھی کھانا چھوٹا؟ دوپہر کا کھانا چھوٹا؟ شام کا کھانا چھوٹا؟ یا کبھی آپ کا ناشتہ چھوٹا؟ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اگر آج تسبیح چھوٹ گئی، تو ناشتہ مت کرو، کیونکہ آج تسبیح چھوٹ گئی۔ دیکھ لو پھر کیسی پابندی ہوتی ہے۔ لیکن اس میں ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

کھانے پینے وغیرہ کے جو ہمارے طبعی معمولات ہیں، ان میں ہم کبھی کوتاہی نہیں کرتے، اس میں ہمیں استقامت کا مقام حاصل ہے۔ اگر استقامت حاصل نہیں ہے تو شریعت کے معمولات میں نہیں ہے۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم ان چیزوں میں بڑی مضبوطی کے ساتھ ایسے جمے رہتے کہ ذرّہ برابر فرق آنے نہ دیتے۔ اصل چیز یہی ہے۔

﴿یہ کرامت سے بڑھ کر ہے﴾

بزرگوں نے لکھا ہے: ﴿الاسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ﴾ استقامت؛ کرامت سے بڑھ کر ہے۔ یعنی کسی کو اگر ہَوا میں اڑنے کی، پانی پر چلنے کی کرامت حاصل ہے، لیکن شریعت کے احکام پر مضبوطی سے جمنے میں کمی کوتاہی ہے؛ تو وہ کرامت کسی کام کی نہیں۔ اور اگر آدمی شریعت کے اوپر پابندی سے عمل کر رہا ہے، اس میں ذرّہ برابر کوتاہی سے کام نہیں لیتا؛ تو یہ بڑی سے بڑی کرامتوں سے بڑھ کر ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت امامِ ربانی مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مہینے دو مہینے تک رہے۔ جب جانے لگے تو حضرت سے کہنے لگے:

اب تک تو یہاں کوئی کرامت نظر نہیں آئی۔ حضرت نے کہا: اچھا بھائی! ایک بات بتاؤ! کبھی کوئی چیز شریعت اور سنت کے خلاف دیکھی، جو ہم سے صادر ہوئی ہو؟ انہوں نے کہا: شریعت اور سنت کے خلاف تو کوئی کام نہیں دیکھا۔ حضرت نے فرمایا: اور کیا کرامت دیکھنی ہے؟ سب سے بڑی کرامت تو یہی ہے، اور یہی اصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ استقامت پورے دین کی روح اور جان ہے۔ اسی لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے: ''باب الاستقامۃ'' یعنی آدمی کا دین پر مضبوطی کے ساتھ جمنا اور چلنا۔

﴿موجودہ دور کا سب سے بڑا پروبلم (المیہ)﴾

آج ہمارے اس دورِ حاضر کا سب سے بڑا پروبلم (Problem) اور المیہ یہی ہے۔ جو دین دار نہیں ہیں ان کو تو چھوڑیے، جو دین دار ہیں، اور جن سے دینی نسبت سے کوئی تعلق و رابطہ قائم ہوتا ہے، کچھ پڑھنے پڑھانے کی بات ہوتی ہے؛ وہاں بھی یہی بات آتی ہے کہ معمولات کی پابندی نہیں ہوتی اور معمولات چھوٹ جاتے ہیں۔

اور ہمارے پڑھنے والے بعض طلبہ اور اہل علم جو ہوتے ہیں ان کے یہاں تو تاویل کا دروازہ بھی خوب کھلا ہوا رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پابندی نہیں ہوتی، کچھ نہ کچھ کوتاہی ہو جاتی ہے۔ جب ان سے پوچھیں کہ کچھ کوتاہی کی آپ وضاحت کیجیے، تو وضاحت سننے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن ہوتا ہے، چھ دن نہیں ہوتا۔

﴿معمولات یا متروکات﴾

ایک دفعہ مَیں نے ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت! معمولات چھوٹ رہے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جب چھوٹ رہے ہیں تو وہ معمولات کہاں رہے؟ وہ

تو متروکات ہو گئے۔ معمول کا مطلب یہ ہے کہ جس پر آدمی کا عمل ہو، اور متروک کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز چھوڑی جائے۔ تو حضرت نے فرمایا: جب آپ یوں کہہ رہے ہیں کہ یہ چھوٹ رہے ہیں، اور پھر لکھ رہے ہیں کہ معمولات؟ یہ معمول تھوڑے رہے، یہ تو متروک ہو گئے۔ حضرت نے ایسا عجیب ایک جملہ لکھا کہ دل پر چوٹ لگی کہ واقعتاً اب ہم اس کو معمول سے کیسے تعبیر کر سکتے ہیں۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو دین دار طبقہ ہے، اور جو یہ چاہتا ہے کہ کچھ کریں، ان میں سب سے بڑا مرض؛ یہی عدمِ استقامت ہے۔ اور جب تک استقامت نہیں ہوگی، اور معمولات کی ادائیگی کا مضبوطی کے ساتھ اہتمام نہیں ہوگا، اور عبادات اور دین کے جتنے بھی شعبے ہیں، ان پر جمنے کی کوشش نہیں کرے گا؛ تب تک کبھی بھی دین پر عمل کا فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

مَیں آپ کو دنیا کی مثال پہلے بھی دے چکا ہوں کہ جو آدمی مہینے دو مہینے میں اپنا کاروبار بدلتا رہے، تو وہ آدمی کبھی بھی کاروباری لائن میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ وہاں کاروبار چھوڑا نہیں ہے، بلکہ بدلا ہے۔ اور یہاں تو یہ حال ہے کہ ہم چھوڑ دیتے ہیں۔

﴿شَيَّبَتْنِیْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا﴾

اسی لئے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ﴾ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ آپ جم جایئے جیسا کہ آپ کو حکم دیا گیا ہے۔ یہ سورۂ ھود کی ایک آیت کا ٹکڑا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ﴿شَيَّبَتْنِیْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا﴾ سورۂ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے مجھے بوڑھا کر دیا۔ (الترمذی، ۳۲۹۸)

اس سے کیا مراد ہے؟

دلیل الفالحین کے مصنف نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے انہوں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے یہ جو ارشاد فرمایا کہ مجھے سورۂ ھود اور اس جیسی دوسری سورتوں نے بوڑھا کردیا۔ تو سورۂ ھود میں پچھلی امتوں کے قصے، ان کی نافرمانیاں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر جو عذاب آیا؛ اس کا تذکرہ مراد ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! بلکہ یہ آیت مراد ہے ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جیسا حکم دیا گیا؛ ویسا آپ دین پر جم جائیے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بہت بڑا اور عظیم حکم ہے، اس حکم پر پورا اترنا معمولی بات نہیں ہے۔

﴿استقامت پر وعدے﴾

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لے آئے، اور پھر اس پر جم گئے، یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے جو تقاضے ہیں وہ پورے کئے، مضبوطی کے ساتھ اس پر قائم رہے ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ایسے لوگوں کے اوپر فرشتے نازل ہوتے ہیں، جو ان کو اطمینان دلاتے ہیں اور ان کی تسکین کرتے ہیں ﴿أَن لَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا﴾ کہ نہ تو تم ڈرو اور نہ غمگین ہو ﴿وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ اور اس جنت کی بشارت سن لو جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو وعدہ کیا جاتا تھا۔

پھر باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو کہا جاتا ہے ﴿نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ﴾ ہم تمہارے دوست اور کارساز ہیں دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔

﴿وَلَکُمْ فِیْهَا مَاتَشْتَهِیْ اَنْفُسُکُمْ﴾ اور تمہارے لئے وہ چیزیں اور نعمتیں ہیں جو تمہارے جی چاہیں گے ﴿وَلَکُمْ فِیْهَا مَاتَدَّعُوْنَ﴾ اور تم کو جنت کی وہ ساری چیزیں ملیں گی جو تم چاہو گے ﴿نُزُلاً مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ﴾ یہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے- جو معاف کرنے والا اور مہربان ہے- استقامت اور دین پر جمنے کے نتیجہ میں مہمانی کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے۔

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ﴾ جنہوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کیا اور پھر اس پر جم گئے، تو نہ تو ان کو کوئی خوف ہے، اور نہ وہ کسی غم میں ہوں گے ﴿اُوْلٰئِکَ اَصْحَابُ الْجَنَّةِ خَالِدِیْنَ فِیْهَا جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ﴾ وہ جنت والے ہیں، ہمیشہ اس میں رہیں گے، یہ ان کے اعمال کے بدلے میں ہے۔

﴿جامع نبوی نصیحت﴾

عن أبی عمرو وقیل أبی عمرة سفیان بن عبدالله رضی اللہ عنہ قال قلت: یَارَسُوْلَ اللهِ! قُلْ لِیْ فِیْ الْاِسْلَامِ قَوْلاً، لَا أَسْئَلُ عَنْهُ أَحَدًا غَیْرَکَ. قَالَ: قُلْ اٰمَنْتُ بِاللهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ.

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے دین اسلام کے بارے میں کوئی ایسی نصیحت کر دیجیے کہ آپ کے بعد کسی اور سے اس کے سوا کچھ نصیحت پوچھنی نہ پڑے۔ میری زندگی بھر کے لئے وہ نصیحت کافی ہو جائے۔ یعنی کوئی دوٹوک ایسی بات کہ اگر میں اس کو پلّے باندھ لوں، تو زندگی بھر میری کامیابی کے واسطے کافی ہو جائے؛ ایسی ایک آدھ بات بتا دیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایک مرتبہ کہہ لو کہ اللہ پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ- ایمان کے جو تقاضے ہیں ان کو مضبوطی کے

ساتھ پورے کرو، اوراس پر قائم رہو۔ یہ اصل ہے اوراس میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

غلو کیسے پیدا ہوتا ہے؟

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: قَارِبُوا وَسَدِّدُوا، وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَنْ يَنْجُوَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ بِعَمَلِهِ. قَالُوا: وَلَا أَنْتَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: وَلَا أَنَا إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللهُ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ میانہ روی سے کام لو، جیسا کہ پہلے بھی بتلا چکا کہ اعمال میں میانہ روی ہونی چاہیے، غلو نہیں برتنا چاہیے، افراط و تفریط نہیں ہونی چاہیے۔ اس لئے کہ آدمی اگر غلو سے کام لے گا تو کبھی جم نہیں سکے گا۔ ایک آدمی رات رات بھر عبادت کرتا ہے تو کب تک اس کو برداشت کرے گا؟ ہوسکتا ہے کہ مہینہ دو مہینہ، چار پانچ مہینے کے بعد وہ اس کو چھوڑ دے گا اور کسی قابل نہیں رہے گا۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ اس طرح کی چیزوں کو پسند نہیں فرماتے تھے بلکہ آپ اعتدال پر عمل فرماتے تھے

﴿وَسَدِّدُوا﴾ اور مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّهُ لَنْ يَنْجُوَ أَحَدٌ مِّنْكُمْ بِعَمَلِهِ﴾ اور یہ جان لو کہ تم میں سے کوئی بھی شخص اپنے عمل کی وجہ سے نجات نہیں پائے گا۔ نجات تو اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے ملے گی۔ عمل تو صرف ایک ذریعہ وآلہ ہے۔ اصل نجات دینے والا تو اللہ تعالیٰ ہے، اوراس کے حکم کے بغیر عمل کی توفیق بھی نہیں ہوسکتی، اگر اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق نہ دے تو آدمی کہاں عمل کرسکتا ہے۔

صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ بھی عمل سے نجات نہیں پائیں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: مَیں بھی نہیں؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت اور فضل سے ڈھانپ لیں مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل ہی کام آنے والا ہے، عمل سے آدمی نجات پانے والا نہیں ہے۔

جب بنیاد یہ ہے تو غلو اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آدمی عمل میں جو غلو کرتا ہے اور حد سے آگے بڑھتا ہے؛ وہ اسی لئے کہ اس کے ذہن میں یہ چیز بیٹھ جاتی ہے کہ عمل ہی سے یہ چیز حاصل ہونے والی ہے۔ حالانکہ وہ چیز اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے حاصل ہوتی ہے۔

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس پر عمل کی توفیق نصیب فرمائے

﴿دعا﴾

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍصَلٰوۃً تُنَجِّیْنَابِھَامِنْ جَمِیْعِ الْاَھْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِیْ لَنَابِھَاجَمِیْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَھِّرُنَابِھَامِنْ جَمِیْعِ السَّیِّئَآتِ وَتَرْفَعُنَا بِھَاعِنْدَکَ اَعْلیٰ الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَابِھَآاَقْصیٰ الْغَایَاتِ مِنْ جَمِیْعِ الْخَیْرَاتِ فِی الْحَیٰوۃِوَبَعْدَالْمَمَاتِ اِنَّکَ عَلیٰ کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْر.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ دینی امور کے اندر ہمیں استقامت عطا فرما، استقامت کی دولت سے ہمیں مالا مال فرما۔ اے اللہ! ہر طرح کی غیر مستقل مزاجی سے اور تلون مزاجی سے ہماری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ مرحومین کی مغفرت فرما۔ حاجتمندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ اے اللہ! جو بے روزگار ہیں ان کو روزگار عطا فرما اور جو روزگار کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں؛ ان کی پریشانیوں کو دور فرما کر سب کے روزگار میں خیر و

برکت اور وسعت مقدر فرما۔ ہماری تمام ضروریات کی خزانۂ غیب سے کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ فرما۔ اے اللہ! ایمان کی سلامتی کے ساتھ ہمیں دنیا سے اٹھا۔ اے اللہ! قبر کے عذاب سے ہماری حفاظت فرما۔ حشر کی ہولناکیوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اپنے عرشِ عظیم کا سایہ نصیب فرما۔ نبی کریم ﷺ کی شفاعت مرحمت فرما، حضور ﷺ کے مبارک ہاتھوں حوضِ کوثر کا جام نصیب فرما۔ جہنم کے عذاب سے پوری پوری حفاظت فرما کر جنت کے اندر دخولِ اوّلین نصیب فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ نے اور تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اور تیرے مقبول بندوں نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگیں؛ وہ سب ہم کو عطا فرما۔ انہوں نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہیں؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ،
وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ

التفکر فی عظیم

مخلوقات اللہ تعالیٰ

خدا کی مخلوقات میں غور و فکر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔ أمابعد:

خدا کی مخلوقات میں غوروفکر

اوپر استقامت کے باب کو ذکر کیا تھا، اب باب قائم کررہے ہیں کہ آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی جو بڑی بڑی مخلوقات ہیں، زمین وآسمان، چاند وسورج اور عرش وکرسی: ان کے سلسلے میں آدمی غوروفکر کرتا رہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسی بڑی بڑی مخلوقات کیسے پیدا فرمائیں، اس سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اس لئے کہ ان ساری مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لئے مسخر کردیا ہے، اور وہ اسی لئے بنائی گئی ہیں کہ انسانوں کی ضرورتیں پوری کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ آدمی یہ بھی تصور کرے کہ یہ دنیا ختم ہونے والی ہے، اور آخرت میں جو مختلف اہوال وپریشانیاں پیش آنے والی ہیں، اس کے متعلق بھی آدمی سوچتا رہے۔ گویا دنیا وآخرت کی تمام چیزوں کے متعلق غوروفکر کرتا رہے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی انجام دہی میں اب تک جو کوتاہیاں ہوتی رہیں، ان کو بھی سوچتا رہے، اور ساتھ ہی ساتھ ان احکام کی انجام دہی کے لئے نفس کو ابھارتا رہے، اور ان احکام کو بجالانے میں ثبات قدمی اور مضبوطی سے جما رہے۔ یہ باب اسی مقصد کے لئے لائے ہیں۔

اس باب میں کوئی روایت تو نہیں لائے ہیں، صرف تین چار آیتوں کی طرف اشارہ کردیا ہے

صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں

﴿اِنَّمَا اَعِظُکُمْ بِوَاحِدَۃٍ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰہِ مَثْنٰی وَفُرَادٰی﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں جگہ جگہ پر انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی، گویا انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی جو صلاحیت عطا فرمائی، عقل وفہم عطا فرمائی، اس سے کام لیتے ہوئے اور اس کو استعمال کرتے ہوئے آدمی کو غور وفکر کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عظیم مخلوقات بنائی ہیں، اور پھر سوچے کہ ان ساری مخلوقات کا مقصد کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم کو ارشاد فرمایا: آپ ان لوگوں کو کہہ دیجیے کہ میں تم کو ایک بات کی نصیحت وتاکید کرتا ہوں کہ تم اللہ تعالیٰ کے سامنے دو دو اور ایک ایک کر کے کھڑے ہو جاؤ یعنی اللہ تعالیٰ کے حضور میں تنہائی میں کھڑے رہ کر غور وفکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نبی کو تمہاری ہدایت کے واسطے بھیجا اور پھر تم کو اپنے احکام پر عمل کرنے کے واسطے قبول فرمایا۔

...... بڑی نشانیاں ہیں

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل فرمایا: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیَاتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں، رات اور دن کے آنے اور جانے میں (یہ پورا نظام اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا ہے اس میں) سوچنے والوں اور عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

قرآنِ پاک نے عقل مند کن لوگوں کو بتلایا؟ ﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾ جو اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے رہتے ہیں، کھڑے کھڑے اور بیٹھے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر یعنی لیٹے لیٹے۔ یعنی جو لوگ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں اور ذکر میں مشغول رہتے

ہیں، انہیں کو قرآنِ پاک نے عقل مند بتلایا ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ جو آدمی اپنی زندگی کے اہم مقصد کو صحیح طریقے سے حاصل کرلے؛ وہی عقل مند سمجھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی زندگی کو جو لوگ ضائع کر دیتے ہیں، اور مقصدِ زندگی کو پیشِ نظر نہیں رکھتے؛ ان کو کون عقل مند کہے گا؟

﴿وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور وہ زمین وآسمان کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں۔ اور جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بڑی بڑی مخلوقات کی عظمت آتی ہے تو وہ پکار اُٹھتے ہیں: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ اے ہمارے رب! تو نے یہ ساری مخلوق ایسے ہی بے کار پیدا نہیں فرمائی۔ تیری ذات ہر عیب سے پاک ہے۔ پس ہم کو جہنم کے عذاب سے بچا۔ مطلب یہ ہے کہ ان مخلوقات میں غور وفکر کے نتیجہ میں ان کو اللہ تعالیٰ کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ان کا دھیان جاتا ہے۔

﴿غور وفکر کا طریقہ﴾

آگے غور وفکر کا ایک طریقہ بھی بتلا دیا: ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ﴾ یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسے پیدا کیا؟ اس کے سر اور اعضاء کو دیکھو وہ کیسی عظیم مخلوق ہے، لیکن انسان کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسخر کر دیا اور تابع بنا دیا کہ وہ انسانوں کا بوجھ اٹھاتا ہے۔

﴿وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ﴾ اور آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کیسے اٹھایا گیا؟ اس کے لئے کوئی ستون نہیں ہے۔

﴿وَاِلَی الْجِبَالِ کَیْفَ نُصِبَتْ﴾ اور پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ زمین پر کیسے

بچھائے گئے۔ یعنی زمین پر کھڑے کر دئے گئے، اوراس طرح اللہ تعالیٰ نے زمین کو حرکت سے محفوظ کر دیا﴿وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ﴾ اورزمین کو اللہ تعالیٰ نے کیسے پھیلایا۔

﴿فَذَکِّرْ اِنَّمَااَنْتَ مُذَکِّرٌ﴾ آپ لوگوں کو نصیحت کرتے رہیے، آپ کا کام ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت کرنا ہے۔

﴿یہ انصاف کا طریقہ نہیں ہے﴾

بہرحال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح کی اور بھی بے شمار آیتیں قرآنِ پاک میں ہیں، جس میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو غور وفکر کی دعوت دی ہے کہ آدمی ان ساری چیزوں کو سوچ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ساری مخلوقات کو انسان کی خدمت اور ضرورت کے واسطے پیدا کیا ہے، اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے:؎

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند	تا تو نانے بکف آری وبغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار	شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

(گلستاں سعدی دیباچہ، صفحہ۲)

یہ بادل، ہوا اور سورج وچاند؛ سب کام میں لگے ہوئے ہیں، اوران سب کو اللہ تعالیٰ نے خدمت کے اندر لگایا ہے، اس لئے کہ آپ اپنی روزی اور روٹی حاصل کر کے اس کو غفلت سے نہ کھائیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ساری مخلوق ہمارے لئے سرگرداں ہیں، ہماری اطاعت وفرمانبرداری میں، ہمارے کام میں اور ہماری خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ انصاف کا تقاضہ نہیں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری نہ کرو، جب کہ اللہ تعالیٰ نے یہ ساری مخلوقات کو تمہاری اطاعت و

فرمانبرداری اور خدمت کیلئے مقرر کردیا اور مسخر وتابع بنادیا، اور تم کو اپنی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے پیدا کیا ہے۔ اب تمہیں اپنی ڈیوٹی بجانی ہے، اور اپنا فریضہ انجام دینا ہے۔

المبادرۃ الی الخیرات

نیکی کی طرف لپکنا

مجلس ﴿۱﴾

یکم/صفر المظفر ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۷/جون ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. اما بعد

نیکی کے کاموں میں دیر نہیں کرنی چاہیے

آدمی جب اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کو احساس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کیسی کیسی نعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ تمام مخلوقات اور ساری کائنات اللہ تعالیٰ نے اسی لئے پیدا فرمائی کہ وہ ہماری خدمت انجام دے اور ہماری ضرورتوں کو پورا کرے، پھر اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار ہوتا ہے اور اس استحضار کے نتیجہ میں آدمی یوں سوچتا ہے کہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا چاہیے، اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرنی چاہیے۔ اسی کو اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی کو نیکی کے کاموں میں سبقت کرنی چاہیے، اور جلدی سے کام لینا چاہیے۔

یعنی آدمی کا جب کسی نیکی کے کام کا ارادہ ہو، تو اس کام کو انجام دینے میں تاخیر نہ کرے، بلکہ جہاں نیک کام کا ارادہ دل میں آیا، فوراً اس کام کو انجام دینے کے لئے آگے بڑھے اور جلدی سے اس کام کو انجام دے۔ اس لئے کہ جو زندگی اللہ تعالیٰ نے ہم کو عطا فرمائی ہے اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اور نیکی کے کاموں میں زندگی کے اوقات کو خرچ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری زندگی کا کوئی لمحہ اللہ تعالیٰ کی

نافرمانی میں اور گناہوں و معصیتوں میں خرچ ہو جائے، اس سے اپنے آپ کو بچا کر اطاعت میں لگانا ہے۔ اب اگر کسی آدمی کے دل میں نیکی کا کوئی ارادہ پیدا ہوا، تو اس کو عملی جامہ پہنانے میں اور اس پر عمل کرنے میں ذرّہ برابر تاخیر سے کام نہیں لینا چاہیے؛ بلکہ فوری طور پر اس پر عمل کر لینا چاہیے۔

﴿شیطان کے داؤ ہر انسان کے ساتھ الگ الگ﴾

اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان انسان کا ازلی دشمن ہے: ﴿اِنَّـهُ لَـكُـمْ عَـدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ اور جیسا جیسا آدمی ہوتا ہے، اس کے مطابق وہ اس کے ساتھ اپنے داؤ آزماتا ہے، اور اپنے حربے استعمال کرتا ہے۔ مثلاً ایک کافر ہے، اس کو وہ جس طریقہ سے گمراہ کر کے راہِ راست سے ہٹاتا ہے؛ مسلمان کو راہِ راست سے ہٹانے کے لئے وہ طریقہ اختیار نہیں کرتا، بلکہ اس کے لئے کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی نیکی کا کام ہے تو مؤمن کو شیطان یہ وسوسہ نہیں ڈالے گا کہ یہ نیکی کا کام مت کرو۔ اس لئے کہ اس کو معلوم ہے کہ یہ ایک مؤمن ہے اور اس کو نیکی کا کام اچھا لگتا ہے، اس کے ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر وہ ایسی بات اس کو کہہ دے گا؛ تو وہ اس پر عمل نہیں کرے گا اور اس کی طرف توجہ نہیں کرے گا، اس لئے شیطان کبھی بھی مؤمن کو گمراہ کرنے کے لئے یہ حربہ نہیں آزماتا کہ تم یہ کام مت کرو بلکہ جب کسی مؤمن کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ فلاں نیکی کا کام مجھے کرنا چاہیے، تو شیطان اس نیکی کے کام سے اس کو روکنے کے لئے ایک تیسرا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ یوں کہتا ہے کہ واقعتاً بہت اچھا کام ہے، کرنا ہی چاہیے؛ لیکن ابھی ہی کیا ضروری ہے؟ کل کر لیں گے، گویا اس کو ٹلانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھئے! یہاں اس کو یہ وسوسہ نہیں ڈالا کہ یہ نیکی کا کام آپ

مت کیجئے۔اس لئے کہ اگراس طرح کا وسوسہ ڈالتا، تو یقیناً وہ ناکام ہوتا۔جو مؤمن ہے وہ اس کا مقابلہ کرکے اس پر غالب آجاتا، اس لئے یہاں دوسرا طریقہ اختیار کیا، اس کام کو مؤخر کرنے کے لئے اس کو آمادہ کیا کہ جلدی کیا ہے، آج نہیں ہوگا تو کل ہوجائے گا۔

﴿بازچوں فرداشود﴾

یا کبھی کسی اہل اللہ کی صحبت میں بیٹھنے کے نتیجہ میں اپنی گذشتہ زندگی پر اور گذشتہ کی کوتاہیوں پر اگر کسی کو پچھتاوا ہوا، اور خیال آیا کہ اب اس کی اصلاح کرنی چاہیے اور آئندہ مجھے اپنی اصلاح کے لئے آگے بڑھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی میں اور اطاعت وفرمانبرداری میں جو کوتاہیاں ہوئیں؛ ان سے باز رہ کر تلافی کرنی چاہیے، تو اب شیطان اس سے روکے گا نہیں۔ بلکہ یوں کہے گا کہ کل کریں گے، ابھی ذرا فرصت واطمینان سے فلاں کام سے فارغ ہوجائیں۔کل جمعہ کا دن آرہا ہے، غسل کرکے شروع کریں گے۔اس نے بدھ کے روز بات سن کر ارادہ کیا تھا تو اس کو یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ مت کرو، اس لئے کہا کہ جمعہ کا دن آرہا ہے، اس دن ذرا اطمینان سے غسل کرکے جمعہ کی نماز سے شروعات کریں گے، دو دن ٹھہر جاؤ۔ یوں کہہ کر وہ اس کو روک دیتا ہے۔ایسا ہر کام میں کرواتا ہے کہ کل یہ کریں گے، کل وہ کریں گے۔

اسی طرح اگر آپ کسی گناہ میں مبتلا ہیں مثلاً ٹی وی کے عادی ہیں اور دل میں خیال آرہا ہے کہ اس کو چھوڑنا ہے تو شیطان یوں کہے گا کہ آج ایک دن دیکھ لو، کل سے چھوڑ یو۔ شبِ برأت آنے دو، اس دن سے چھوڑنا۔اور جب شب برأت آئے گی تو کہے گا کہ پندرہ دن بعد رمضان آنے دو نا، پھر تو چھوڑ ہی دیں گے۔جیسا ایک شاعر نے کہا ہے:-

ہر شبے گویم کہ فردا ترکِ ایں سودا کنم ❁ باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

ہر رات مَیں یہ ارادہ کرتا ہوں کہ کل یہ ساری حرکتیں چھوڑ دوں گا، لیکن جب کل آتی ہے؛ تو وہ کل تو آج بن جاتی ہے، اور پھر آج کو کل پر ٹلا دیا کرتا ہوں اور روزانہ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے

کیا گارنٹی ہے؟

تو حقیقت یہ ہے کہ شیطان اس طریقہ سے آدمی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے، حالانکہ کل آنے والی ہے؛ اس کی کیا گارنٹی ہے؟ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ آدمی کی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں کہ مَیں کل تک زندہ بھی رہوں گا یا نہیں۔ اور پھر یہ ہے کہ اگر زندہ رہا تو نیکی کرنے کا جو داعیہ اِس وقت میرے دل میں پیدا ہوا ہے؛ وہ باقی بھی رہے گا یا نہیں۔ اور پھر اگر یہ داعیہ باقی بھی رہا، تو کل ایسے مواقع میسر آئیں گے اور اسباب مہیا ہو جائیں گے کہ نیکی کا وہ کام انجام دے سکوں، جیسا آج دے سکتا ہوں۔

''وارِدِ روحانی'' غیرت مند مہمان

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ جب کسی کے دل میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا ہو، تو یہ وارِدِ روحانی ہے۔ ''وارِدِ روحانی'' یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کے دل میں آپ کی بھلائی کے واسطے ایک چیز ڈالی گئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے اس مہمان کی قدر کرنی چاہیے۔ اور اس کی قدر یہ ہے کہ نیکی کے کام کا جو داعیہ ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے، اس پر فوراً عمل کرتے ہوئے نیکی کا وہ کام کرلیا جائے، اس میں ذرّہ برابر تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔ اگر ہم اس کی قدر نہیں کریں گے، اور دل میں نیک کام کرنے کا جو خیال آیا ہے، اس کو ہم ٹلا دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم نے اس کی

ناقدری کی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا مہمان بڑا باغیرت اور شریف ہوتا ہے، اور باغیرت وشریف مہمان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ آپ کے گھر آ جائے اور آپ اس کی طرف توجہ کرنے کے بجائے رخ پھیر لیں۔ مثلاً وہ تو آ کر بیٹھا ہوا ہے، اور آپ زنانے میں چلے گئے، یا گھر سے باہر نکلے ہی نہیں؛ تو پھر وہ دوبارہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ اسی طریقہ سے آپ نے اس وارِدِ روحانی کی یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے گئے اس مہمان کی قدر نہیں کی؛ تو وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ حالانکہ وہ تو اس لئے بھیجا گیا تھا کہ آپ کو نیکی کے کام کی طرف متوجہ کرے، اور نیک کام میں لگا کر آپ کی صلاحیتوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے استعمال کرے۔ ہماری خیرخواہی اور ہماری بھلائی ہی کے لئے اس کو بھیجا گیا تھا، اس کے باوجود ہم نے اس کی ناقدری کی؛ تو اب یہ مہمان ایسا جائے گا کہ دوبارہ نہیں آئے گا۔

ایک خاص بات

بہت سے لوگ رات کو نیت کر کے سوتے ہیں کہ تہجد کے لئے اٹھیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پورے طور پر مدد ہوتی ہے کہ جس وقت اس نے اٹھنے کی نیت کی تھی اس وقت آنکھ کھل ہی جاتی ہے۔ ایسا نہیں کہ نہیں کھلتی۔ یا مثلاً الارم لگا دیا تھا اور وہ بجا، اور اس سے واقعتاً اس کی آنکھ بھی کھل گئی، لیکن پھر شیطان نے اپنا کام کرنا شروع کر دیا۔ آنکھ کھلی تو گویا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لئے راستہ مہیا کر دیا گیا، آپ کی تو آنکھ کھول دی گئی اب آپ کو سُستی نہیں کرنا چاہیے۔

ہم لوگوں کا مزاج اور عادت یہ بنی ہوئی ہے کہ جب آنکھ کھلتی ہے تو سوچتے ہیں کہ

ذرا پانچ منٹ لیٹے رہیں، لیکن سو کر پھر جو آنکھ لگتی ہے، تو ایسی لگتی ہے کہ تہجد تو کیا؛ فجر کی نماز بھی قضاء ہو جاتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لئے ایک راستہ کھول دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک مہمان ''وارِدِ روحانی''، ہمیں نیکی کے کام کی طرف متوجہ کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن ہم نے اس کی ناقدری کی۔ اب دوسرے دن اگر آپ یہ چاہیں گے کہ اس وقت آنکھ کھلے؛ تب بھی نہیں کھلے گی۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگلے روز جو آنکھ کھلی تھی، اس سے آپ نے کیا فائدہ اٹھایا؟ اور اس کی کیا قدر دانی کی؟ جو ناقدری کی تھی، اس کی سزا یہ مل رہی ہے کہ اب چاہنے کے باوجود بھی آنکھ نہیں کھل رہی ہے۔ اب جب تک توبہ نہیں کریں گے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے نہیں گڑگڑائیں گے: کہ اے اللہ! تیرے بھیجے ہوئے اس وارِدِ روحانی کی مَیں نے ناقدری کی ہے، میرے اس قصور کو معاف کر دے وہاں تک دوبارہ اٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ دوبارہ اگر اٹھنا ہے تو پہلے صلوٰۃ التوبہ پڑھ کر توبہ کیجیے، اور آئندہ کے لئے یہ عزم کیجیے کہ اب تو آنکھ کھلے گی تو کبھی بھی سُستی نہیں کریں گے، بلکہ آنکھ کھلتے ہی اٹھ کر بیٹھ جائیں گے۔ یہ خاص بات ہے۔

تو یہ وارِدِ روحانی جو ہوا کرتا ہے، اس کی قدر اسی لئے ہونی چاہیے کہ معلوم نہیں دوبارہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز میسر ہوتی ہے یا نہیں؟ اگر ہم نے ناقدری کر لی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ اسی لئے یہ باب قائم کرتے ہیں: -''باب فی المبادرة الیٰ الخیرات''، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نیکی کے کاموں کی طرف آگے بڑھنا چاہیے جلدی کرنی چاہیے، سبقت کرنی چاہیے۔

﴿بَادَرَ، یُبَادِرُ، مُبَادَرَۃً﴾ کا معنیٰ ہے آگے بڑھنا اور سبقت کرنا۔ چودھویں رات کے چاند کو ''بدر'' اسی لئے کہتے ہیں ﴿لِمُبَادَرَۃِ طُلُوْعِہٖ غُرُوْبَ الشَّمْسِ﴾ اس کی وجہ تسمیہ بتلائی ہے کہ اس کو بدر نام اس لئے دیا گیا کہ چودھویں کا چاند سورج کے غروب ہونے سے پہلے طلوع ہوتا ہے۔ گویا اس کا طلوع سورج کے غروب سے سبقت کر جاتا ہے۔ پندرہویں کا چاند سورج کے غروب کے بعد طلوع ہوگا، وہ اس سے پہلے طلوع ہونے والا نہیں ہے۔ بہر حال! یہ باب قائم کیا ہے نیکی کے کاموں کی طرف آگے بڑھنا، لپکنا، جلدی کرنا اور سبقت کرنا۔

﴿......حاجتِ استخارہ نیست﴾

اور جو آدمی کسی نیکی کے کام کی طرف متوجہ ہو، اس کو بغیر کسی تردد اور پس و پیش کے اور بغیر کسی جھجک کے نیکی کا وہ کام کر ڈالنا چاہیے، اس میں جھجک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ درکارِ خیر حاجتِ استخارہ نیست۔ نیکی کے کام میں سوچنے کی اور استخارہ کی ضرورت نہیں ہے نیکی کا کام تو نیکی ہی کا ہے، اس کو تو کر ہی ڈالنا چاہیے۔

اسی لئے باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ﴾ نیکی کے کاموں میں آپس میں ریس کرو، مبادرت کرو، سبقت سے کام لو۔

دوسرا ارشاد لائے: ﴿وَسَارِعُوْا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّن رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ﴾ آگے بڑھو اور جلدی سے سبقت کرو اللہ تعالیٰ کی مغفرت کی طرف اور جنت کی طرف؛ جس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کے برابر ہے، اور وہ نیک لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

﴿ریس کرنے کی چیزیں یہ ہیں﴾

یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید کی جارہی ہے کہ آدمی کو نیکی کے کاموں میں مبادرت ومسارعت اور عجلت سے کام لینا چاہیے، اس میں دیر اور لیٹ نہیں ہونی چاہیے، اور ساتھ ہی ساتھ اس میں آپ مقابلہ کیجیے۔ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرَاتِ﴾ فرما کر اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا کہ ریس کرنے کی چیزیں نیکی کے کام ہیں، نہ کہ دنیا۔

کوئی آدمی یوں چاہے کہ فلاں نے اتنی دولت کما لی ہے، تو مَیں بھی اس سے زیادہ کما لوں۔ فلاں نے ایسا بنگلہ بنایا ہے، تو مَیں اس سے اچھا بنالوں۔ فلاں فلانی قسم کی کار لیکر آیا ہے، تو میں اس سے عمدہ کار حاصل کرلوں۔ اس نے ایک فیکٹری قائم کی ہے، تو مَیں اس سے زیادہ قائم کرلوں۔ یہ ریس اور مقابلہ دنیا کی چیزوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کی چیزیں اس قابل نہیں کہ اس میں آدمی ریس اور مقابلہ کرے؛ بلکہ آخرت کے امور مقابلہ کے قابل ہیں۔

﴿دنیا کے لئے مقابلہ؛ اور آخرت کے لئے؟﴾

ہمارا معاملہ اُلٹ گیا ہے۔ آج کل ہم اگر مقابلہ کرتے بھی ہیں؛ تو دنیا کے امور میں کرتے ہیں۔ دولت کمانے میں، عزت ووجاہت حاصل کرنے میں، جاہ ومرتبہ حاصل کرنے میں، اور دنیا کے سازوسامان کے لئے آپس میں مقابلہ ضرور کریں گے لیکن آخرت کے اور نیکی کے کاموں کے واسطے مقابلہ نہیں کریں گے۔ حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج ایسا تھا کہ وہ دنیا کے کاموں کے اندر کبھی سبقت کا تصور بھی نہیں کرتے تھے، اور آخرت کے اور نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔

غزوۂ تبوک کا پس منظر

غزوۂ تبوک ۹ ؁ھ میں پیش آیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ قیصرِ روم ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہا ہے، جب آپ ﷺ کو یہ اطلاع ملی، اور جو لوگ شام سے تجارت کے لئے آیا کرتے تھے، انہوں نے بھی بتلایا، اور یہ بھی کہا کہ اس نے اپنے لشکر کو ایک سال کی پیشگی تنخواہ دے دی ہے، اور اس کا ایک حصہ روانہ بھی ہو چکا ہے۔ جب نبی کریم ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس سے مقابلہ کے لئے تیاری کا حکم دیا اور آپ نے سوچا کہ وہ یہاں مدینہ تک آئے، اس سے پہلے ہم ہی آگے جا کر اس کا مقابلہ کر کے اس کا راستہ روکتے ہیں۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ ہمیں اس کے مقابلہ کے لئے جانا ہے۔ حالانکہ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تو یہ تھی کہ آپ اگر کسی بھی جگہ حملے کا ارادہ کرتے تھے یا کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے جانا چاہتے تھے تو بتلاتے نہیں تھے کہ کہاں جانا ہے۔ صحابہ کو صرف اتنا حکم دے دیا جاتا تھا کہ تیاری کرو اور وہ تیاری کرتے تھے، آپ ﷺ صاف صاف نہیں بتلاتے تھے کہ کہاں جانا ہے۔ اس لئے کہ جنگی مصلحتوں کا تقاضہ یہی ہوتا ہے کہ کہاں کا رخ کیا جانا ہے وہ معلوم نہ ہو؛ تاکہ دشمن اس حملے کے دفاع کی تدبیر نہ کر پائے لیکن غزوۂ تبوک کے موقعہ پر چونکہ دشمن بڑا مضبوط تھا، اور اس کی طرف سے بڑی تیاریاں تھیں؛ تو ضرورت تھی کہ اس سے مقابلہ کے لئے پورے طور پر تیاری کی جائے۔ اس لئے نبی کریم ﷺ نے اشارہ و کنایہ سے کام لینے کے بجائے صحابۂ کرام کو صاف صاف بتلا دیا تھا کہ لشکرِ روم کا مقابلہ کرنے کے لئے علاقۂ تبوک کی طرف جانا ہے، اس لئے اس کے مطابق تیاری کی جائے۔

ادھر حال یہ تھا کہ پچھلے سال کھجور کی پیداوار کما حقہٗ ہوئی نہیں تھی اور یہ کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا۔ یہ زمانہ وہاں شدید گرمی کا ہوتا ہے اور کھجوروں کے پکنے کا خاص موسم ہوتا ہے نیچے سے زمین آگ اگل رہی ہوتی ہے اور اوپر سے آسمان شعلے برسا رہا ہوتا ہے۔ اور پھر سب لوگ کھجور کے اپنے باغات کی دیکھ بھال میں مشغول تھے۔ اس لئے کہ ان کی آمدنی کی ساری بنیاد اور دارومدار کھجوروں کے انہیں باغات کے اوپر تھا، اور اس کے پھلوں کے لینے کا وقت آیا؛ تو اِدھر نبی کریم ﷺ کی طرف سے حکم ہوا کہ دشمن کے مقابلہ کے لئے جانا ہے، گویا بڑا آزمائش کا وقت تھا، لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس آزمائش میں بھی پورے اترے۔

حضرات شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی ریس

اس موقعہ پر سواریوں کی کمی تھی اور سازوسامان کی بھی کمی تھی۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ گویا چندے کا اعلان کیا کہ اللہ کے راستہ میں دو۔ آپ کے اس اعلان کو اور آپ کی طرف سے کی گئی اس اپیل کو سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں گھر آیا، اُس وقت میری حالت درست تھی، اس لئے گھر میں اپنے پاس جو کچھ بھی تھا؛ اس کے مَیں نے برابر دو حصے کئے، اور ایک حصہ لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ فرماتے ہیں: اس وقت مَیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی موقعہ پر مَیں ابوبکر سے آگے بڑھ سکتا ہوں؛ تو یہی ایک موقعہ ہے۔ اور میرا خیال یہی تھا کہ آج مَیں اس معاملہ میں ابوبکر سے آگے بڑھ جاؤں گا۔ چنانچہ آدھا مال لاکر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حالانکہ بہت سے واقعات پڑھے مگر ایسا یاد نہیں پڑتا کہ کسی اور موقعہ پر آپ ﷺ نے

پوچھا ہو کہ کتنا لائے۔ لیکن اس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نظام ہی تھا، اس لئے حضور ﷺ نے بھی پوچھا: اے عمر! اپنے گھر والوں کے واسطے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! جتنا لایا ہوں؛ اتنا ہی گھر والوں کے لئے چھوڑ کر آیا ہوں۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حاضر ہوئے، اور جو کچھ بھی تھا؛ وہ پیش کیا۔ ان سے بھی حضور ﷺ نے پوچھا گھر والوں کے لئے کیا چھوڑ کر آئے؟ انہوں نے کہا: اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ کر آیا ہوں، جو کچھ تھا؛ وہ سب لے کر آ گیا ہوں اور حاضرِ خدمت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ مَیں کبھی بھی حضرت ابوبکر سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

(مغازی الواقدی ۳/۹۹۱۔ ابوداؤد شریف، کتاب الزکوۃ، باب الرخصۃ فی الرجل یخرج من مالہ۔ حدیث نمبر ۱۶۷۸)

﴿کس چیز میں آگے بڑھنے کی کوشش؟﴾

مَیں بتلانا چاہتا ہوں کہ دیکھئے! یہ حضرات دین کے کاموں میں آپس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے، اگر کبھی ان کا مقابلہ اور ریس ہوتی تھی؛ تو نیکی کے کاموں میں ہوتی تھی۔ کبھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ مَیں دولت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے آگے بڑھ جاؤں، یا میرے تجارتی قافلے حضرت عثمان کے قافلوں سے زیادہ ہو جائیں۔ کبھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ میرے پاس حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے زیادہ پیسے ہو جائیں۔ حالانکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت عثمان اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بڑے مالدار سمجھے جاتے تھے۔ لیکن کسی صحابی کے دل میں یہ خیال آیا ہو کہ ان حضرات سے ہم دولت و ثروت میں یا مال اور پیسوں میں یا ساز و سامان میں آگے بڑھ جائیں؛ ایسا آپ کسی روایت میں نہیں پائیں گے۔ ہاں! یہ ضرور ملے گا کہ نیکی کے کاموں میں آگے بڑھنے کا ان حضرات میں جذبہ تھا۔

فقراءِ صحابہ کی ایک جماعت خدمتِ نبوی میں

آپ نے فضائلِ ذکر میں پڑھا ہوگا کہ ایک مرتبہ فقراء کی جماعت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں؛ یہ مالدار بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں؛ یہ مالدار بھی روزہ رکھتے ہیں۔ اس طرح نیکی کے سارے کام بتلائے۔ پھر عرض کیا کہ یہ لوگ اپنے مال کی وجہ سے صدقات بھی کرتے ہیں اور ہم سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آپ ہمیں کوئی ایسی تدبیر بتلایئے کہ ہم ان سے آگے بڑھ جائیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ، اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھتے رہو۔ چنانچہ اس کے مطابق انہوں نے عمل شروع کیا۔ ادھر مالداروں کو معلوم ہوا کہ یہ حضرات ایک نسخہ لے کر آئے ہیں؛ تو انہوں نے بھی اس پر عمل شروع کردیا۔ اب وہ غرباء وفقراء پھر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آئے کہ یا رسول اللہ! انہوں نے بھی اس پر عمل شروع کردیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء﴾ یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ (بخاری شریف۔ کتاب الاذان، ۸۴۳)

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ دیکھئے! ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ ہم کو مال مل جائے تو ہم بھی ان کی طرح صدقہ کریں، بلکہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی مشکل اور اپنا پیچیدہ مسئلہ پیش کیا تو یوں کہہ کر پیش کیا کہ یا رسول اللہ! ثواب میں یہ ہم سے بڑھ جا رہے ہیں۔ ان کے پاس مال ہے، اور اپنے مال کے ذریعہ سے صدقہ خیرات کرتے ہیں، اور ہم سے زیادہ ثواب حاصل کرتے ہیں۔ پھر یہ نہیں کہا کہ ایسی دعا کردیجئے کہ ہم کو مال مل جائے، بلکہ یوں کہا کہ یا رسول اللہ! کوئی ایسی تدبیر بتلایئے کہ ہم نیکی میں ان سے آگے بڑھ جائیں

بتلانا یہی ہے کہ ان حضرات کا مقابلہ اگر کسی چیز میں تھا، تو وہ نیکی کے کاموں میں تھا۔ کبھی مال ودولت اور ثروت میں یا جاہ وحشمت میں یا ساز وسامان میں یا دنیا کی کسی چیز کے اندر اُن کا مقابلہ ہوا ہو؛ ایسا نہیں ملتا۔ حالانکہ انسانی مزاج ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: انسان کو اگر ایک وادی سونے کی دی جائے تو وہ تمنا کرتا ہے کہ دو ہو جائیں اور دو ہوں تو تین کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس معاملہ میں ایسے نہیں تھے۔ (بخاری شریف، ۵۹۵۶)

سبقت کرنے کی چیز اگر کچھ ہے تو......

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں اس بات کی تعلیم دی گئی کہ سبقت کرنے کی چیز اگر کچھ ہے؛ تو وہ دنیا، دولت اور پیسہ یا ساز وسامان نہیں ہے، بلکہ سبقت کرنے کی چیز نیکی اور بھلائی کے کام ہیں، اسی کی طرف جلدی کرنے کی تاکید کی گئی ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ نیکی کے کاموں میں جلدی سے آگے بڑھو، اس میں ہماری طرف سے کبھی بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے

آپ زبردستی وقت نکال لیجیے

جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ نفس اور شیطان ہمارے دشمن ہیں، وہ تو ہمیں کسی نہ کسی طریقہ سے مختلف تدبیروں کے ذریعہ نیکی کے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں، لہٰذا اگر کسی نیک کام کا خیال پیدا ہو جائے، تو یوں نہ سوچنا چاہیے کہ یہ کام پورے ہو جائیں، اس کے بعد کریں گے۔ اس لئے کہ اس کی نوبت تو آنے والی ہی نہیں۔ کیونکہ آپ کا تو ایک نظام الاوقات بنا ہوا ہے، اگر آپ یہ سوچیں گے کہ اس کے بعد وقت ملے گا؛ تو کریں گے، تو وقت تو ملنے والا ہی نہیں ہے۔ آپ زبردستی وقت نکال لیجیے، یعنی جو دو کام پہلے سے کر رہے ہیں، اس میں تیسرا کام گھسا دیجیے، خود بخود وہ بھی ہو جائے گا۔ اور اگر اس انتظار میں رہیں

گے کہ ہمیں وقت ملے گا؛ تو کریں گے، تو ایسا وقت تو کبھی ملنے والا ہے ہی نہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہیے کہ نیکی کے کام میں خوب عجلت سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا زندگی کا یہ قیمتی سرمایہ دوبارہ ملنے والا نہیں ہے۔ اس لئے جتنے بھی زیادہ سے زیادہ نیکی کے کام کرسکتا ہو، اس میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے، اور ان کی انجام دہی میں عجلت سے کام لینا چاہیے

﴿نفس کو دھوکہ دو﴾

اگر نفس یا شیطان دھوکہ دے کر نیکی کے کام سے روکنے کی کوشش کرتے ہوں، تو حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جس طرح نفس ہمیں دھوکہ دیتا ہے ہمیں بھی نفس کو دھوکہ دینا چاہیے۔ وہ کس طرح؟ نفس ہمیں دھوکہ دیتا ہے کہ کریں گے، کریں گے؛ تو ہم نفس کو دھوکہ دے کر اس سے وہ کام کروالیں۔ پھر وہ اپنا قصہ بیان کرتے ہیں کہ:-

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ رات کو آنکھ کھلی، تہجد کا معمول تو تھا ہی، لیکن اس روز طبیعت بھی کچھ خراب تھی، اس کی وجہ سے جی میں یہ خیال آیا کہ آج طبیعت بھی خراب ہے اور اتنی مدت سے تو پڑھ ہی رہے ہیں اور تہجد کی نماز کوئی فرض اور واجب تو ہے نہیں، اگر کسی روز نہیں پڑھیں گے؛ تو کیا ہوجائے گا؟ گویا نفس یہ چاہتا تھا کہ آج سلائے رکھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ مَیں نے نفس سے یوں کہا کہ دیکھو! یہ بڑا قیمتی وقت ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس وقت خاص اعلان ہوتا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ رات کا آدھا حصہ جب گذر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمتیں دنیا والوں کی طرف متوجہ ہوتی ہیں، اور اعلان کیا جاتا ہے: ﴿هَلْ مِنْ مُّسْتَغْفِرٍ فَأَغْفِرَ لَهُ﴾ ہے کوئی مغفرت چاہنے والا کہ مَیں اس کی مغفرت کروں؟ ہے کوئی عافیت طلب

کرنے والا کہ مَیں اس کو عافیت دوں؟ (بخاری شریف، کتاب التہجد، ۱۱۴۵) اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ اس لئے کم سے کم بستر پر بیٹھ کر تھوڑی دیر دو چار منٹ دعا تو کرلیں۔ جب آنکھ کھلی ہے تو اس کو ضائع کیوں کیا جائے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس طرح سوچ کر مَیں بیٹھ گیا اور دعا کرنے لگا۔ دعا کرتے کرتے پھر یوں سوچا کہ اب اٹھ ہی گئے ہیں اور نیند کھل ہی چکی ہے، تو ذرا استنجاء اور قضائے حاجت بھی کرلیں۔ استنجاء کے لئے گئے۔ استنجاء کرنے کے بعد کہا کہ اب استنجاء کے لئے آئے ہیں تو وضو بھی کرلو۔ وضو کرنے کے بعد بستر پر آکر دعا کرنے کے لئے بیٹھے تو پھر یوں سوچا کہ جب وضو کرہی لیا ہے؛ تو اب یہاں بستر پر بیٹھ کر دعا کرنے کے بجائے اپنی روزانہ کی جگہ مصلےٰ پر جا کر دعا کیوں نہ کی جائے۔ چنانچہ وہاں پہنچے تو کہا کہ دو رکعت پڑھ لیں۔ جب دو پڑھ لی تو کہا کہ روزانہ جتنی پڑھتے ہیں؛ اتنی پوری ہی کرلیں۔

دیکھو! مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ ہمیں بہلا پھسلا کر نیکی کے کاموں سے روکنے کی کوشش کرتا ہے؛ ہم بھی بہلا پھسلا کر اور دھوکہ دے کر اس سے نیکی کے کام کروالیں، اس طرح معاملہ برعکس ہونا چاہیے۔

﴿ڈاکٹر صاحب نے اس طرح نفس کو آمادہ کیا﴾

حضرت ڈاکٹر صاحب نے اپنا ایک اور قصہ بیان کیا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ فجر کی نماز کے بعد ڈیڑھ، دو گھنٹہ تسبیحات وتلاوت وغیرہ میں مشغول رہتے تھے، اس کے بعد دوسرے کاموں میں لگتے تھے۔ ایک روز طبیعت میں کسل مندی ہونے کی وجہ سے جی چاہا اور نفس نے یوں کہا کہ نماز کے بعد تھوڑی تلاوت کرلی، اب آج تو سو ہی جائیں گے۔ حضرت فرماتے ہیں

کہ مَیں نے نفس سے یوں کہا: دیکھو! ٹھیک ہے، سو جائیں گے، لیکن اگر اس وقت ہمارے پاس سربراہِ مملکت اور وزیر اعظم کی طرف سے یہ پیغام پہنچے کہ ابھی اسی وقت ہمارے یہاں آجایئے، ہم آپ کو ایک انعام سے نوازنا چاہتے ہیں؛ تو کیا اس وقت بھی تو سُستی کرے گا؟ اور یوں کہے گا کہ ابھی تھوڑا سونا ہے، اور طبیعت آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ ایسا نہیں کہے گا بلکہ جب یہ معلوم ہوگا کہ سربراہِ مملکت اور وزیر اعظم کی طرف سے مجھے یہ پیغام دیا گیا ہے اور بلایا گیا ہے، تو اس وقت چاہے کتنی ہی سستی کیوں نہ ہو، سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً اس کے پاس پہنچ جائے گا کہ جب وہ مجھے نوازنا چاہتا ہے تو مَیں ہی کیوں انکار کروں۔ جب دنیا کے کسی سربراہِ مملکت کی طرف سے پہنچنے والے پیغام پر تم ساری سُستی چھوڑ کر فوراً حاضری کی کوشش کروگے تو یہ جو اللہ تعالیٰ کی تسبیحات پڑھی جائیں گی، یہ بھی گویا اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضری ہی ہے، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات سے نوازا جائے گا۔ کیا تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے انعامات؛ اس سربراہِ مملکت کے انعام جتنی بھی حیثیت نہیں رکھتے یوں کہہ کر اپنے آپ کو اس پر آمادہ کیا کہ مجھے روزانہ کے معمولات میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے

......اور آپ کو استقامت نصیب ہو جائے گی

بتلانا یہ چاہتا تھا کہ جس طرح ہمارا نفس کسی نہ کسی طریقہ سے ہمیں روکنے کی کوشش کرتا ہے، ہم بھی بہلا پھسلا کر اس کو آمادہ کر کے اس سے نیکی کے کام کروالیں۔ اگر اس طرح کا مزاج بنالیں گے تو ان شاء اللہ تعالیٰ آسانی ہو جائے گی، پھر آئندہ دھیرے دھیرے نفس و شیطان کی قوت کم ہوتی جائے گی اور ٹوٹتی جائے گی۔ پھر ایک وقت آئے گا کہ آسانی کے ساتھ آپ نیک کام کرسکیں گے اور آپ کو استقامت نصیب ہو جائے گی۔

باقی اگر نفس وشیطان کے مقابلہ میں اسی طرح چت ہوتے رہے، اوران کی بات مان کر سب کام چھوڑتے رہے؛ تو کبھی بھی استقامت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔اس لئے فرمایا کہ نیکی کی طرف سبقت کرنی چاہیے،اس میں سُستی نہیں کرنی چاہیے۔

﴿اندھیری رات کے ٹکڑے﴾

عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ، فَسَتَكُوْنُ فِتَنٌ كَقِطَعِ اللَّيْلِ الْمُظْلِمِ، يُصْبِحُ الرَّجُلُ مُؤْمِنًا وَيُمْسِي كَافِرًا، أَوْيُمْسِي مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا، يَبِيْعُ دِيْنَهُ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْيَا. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: نیک کام کرنے میں جلدی کرو،ان فتنوں کے آنے سے پہلے جواندھیری رات کے ٹکڑوں کی طرح ہوں گے۔ مثلاً رات جب شروع ہوئی اورآدمی کوئی کام کرنا چاہتا ہے،تواس وقت اگرکوئی یوں سوچے کہ ذرا اُجالا ہوجائے گا پھر کریں گے۔تو ظاہر ہے کہ رات کا ایک حصہ پورا ہونے کے بعد دوسرا جو حصہ آنے والا ہے اس میں اجالا تو کیا ہوگا، پہلے سے جواندھیرا ہے اس میں اوربھی اضافہ ہوجائے گا،اس کی سیاہی اور بڑھ جائے گی۔تو جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے ہوتے ہیں کہ ہر بعد میں آنے والا ٹکڑا اپنی سیاہی اوراندھیرے پن میں پہلے والے ٹکڑے کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہوتا ہے،ایسے ہی بعد میں آنے والا ہرفتنہ پچھلے فتنے سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے،ایسے فتنوں کے آنے سے پہلے پہلے نیک اعمال کے اندرجلدی کرنی چاہیے۔

اوروہ فتنے ایسے ہوں گے کہ آدمی صبح ایمان والی حالت میں کرے گا اورشام کے وقت وہی اپنا ایمان چھوڑ کر کافر ہوجائے گا﴿أَوْيُمْسِي مُؤْمِنًا وَيُصْبِحُ كَافِرًا﴾ یا شام ایمان کی حالت میں کرے گا اورصبح اٹھتے اٹھتے وہ کافر ہوجائے گا۔

﴿صبح کو مؤمن، شام کو کافر﴾

صبح کو مؤمن تھا اور شام کو کافر اور شام کو مؤمن تھا اور صبح ہوتے ہوتے کافر ہو جائے گا۔ یہ کیسے بنے گا؟ اتنا بڑا انقلاب اور تبدیلی کیسے آگئی؟ فرماتے ہیں: ﴿یَبِیعُ دِیْنَهٗ بِعَرَضٍ مِنَ الدُّنْیَا﴾ وہ اپنے دین کو دنیا کے کچھ سامان کی خاطر بیچ ڈالے گا۔

ایسا اسی وقت ہوتا ہے جب آدمی کے مزاج میں ٹال مٹول والی کیفیت ہوتی ہے، اور نیکی کے کاموں میں تاخیر اور دیر کرنے لگتا ہے، ٹال مٹول کرتا ہے؛ تو وہی مزاج ایسے موقعہ پر غالب آتا ہے۔ پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں ایسا لگ جاتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں حلال وحرام کی تمیز نہیں رہتی۔ چونکہ جب وہ نیکی کے کاموں کے بجائے دنیا کے ساز وسامان کے لئے ریس اور مقابلہ کرتا ہے؛ تو یہ بھی نہیں دیکھتا کہ مَیں دنیا کا جو کچھ سامان یا دولت حاصل کر رہا ہوں، وہ حلال طریقہ سے آ رہی ہے یا حرام طریقہ سے مل رہی ہے؟ اس لئے حلال وحرام کی تمیز کے بغیر اس میں لگ جاتا ہے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اگر آزمائش کا ایسا وقت آیا کہ اس کے سامنے دو راستے رکھے گئے کہ یہ چیز آپ کو دی جاتی ہے، بشرطیکہ آپ اپنے دین سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یا اگر دین کے اوپر قائم رہنا چاہتے ہیں تو یہ چیز آپ کو نہیں ملے گی، اس صورت میں جو ٹال مٹول والا مزاج بنا رکھا ہے، اس کی وجہ سے وہ یوں سوچتا ہے کہ ابھی تو موت آنے والی نہیں ہے، اور زندہ کر کے دوبارہ اٹھایا نہیں جا رہا ہوں ابھی مَیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش نہیں کیا جا رہا ہوں، ابھی تو بہت مہلت ہے، اس وقت یہ چیز لے لو، اگر دین میں کوئی کوتاہی آ رہی ہے تو بعد میں پھر اس کی تلافی کر لیں گے۔ وہی کل والے مزاج کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے جب ایمان پر بھی زد پڑی، تو وہ اس زد کو یوں سوچ

کر برداشت کرلیتا ہے کہ کل ہم اس کی تلافی کرلیں گے۔ابھی تک تو نیکی کے کام میں ٹال مٹول تھی؛اب ایمان پر آنے والی زد کو روکنے کی بھی اس میں ہمت نہیں ہے۔اور دنیا کا سامان دولت اور جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہتا تھا،اس کی لالچ میں پڑجاتا ہے،اور اس لالچ کے نتیجہ میں ایسا آگے بڑھتا ہے کہ اپنے دین کو ان چیزوں کے عوض میں فروخت کردیتا ہے۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان سے محروم ہوجاتا ہے۔

دنیا کی طلب اور حرص اور دنیا کے حاصل کرنے کے لئے جو مقابلہ اور ریس کی تھی، اس کے نتیجہ میں وہ اپنے آپ کو ایمان سے محروم کرلیتا ہے۔اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خاص تاکید کی گئی کہ مقابلہ اور ریس کی چیز دنیا کی چیزیں نہیں ہیں؛ بلکہ آخرت کے امور اور نیکی کے کام ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ھمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

۸/ صفر المظفر ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۴/ جون ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَاهَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

عن أبى سِرْوَعَةعقبة بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ: صَلَّيْتُ وَرَآءَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم بِالْمَدِيْنَةِ الْعَصْرَ، فَسَلَّمَ ثُمَّ قَامَ مُسْرِعاً، فَتَخَطّٰى رِقَابَ النَّاسِ اِلٰى بَعْضِ حُجَرِنِسَآئِهٖ، فَفَزِعَ النَّاسُ مِنْ سُرْعَتِهٖ، فَخَرَجَ عَلَيْهِمْ، فَرَأَى أَنَّهُمْ قَدْعَجِبُوْامِنْ سُرْعَتِهٖ. قَالَ: ذَكَرْتُ شَيْئاًمِّنْ تِبْرٍ عِنْدَنَا، فَكَرِهْتُ أَنْ يَحْبِسَنِيْ، فَأَمَرْتُ بِقِسْمَتِهٖ. (رواه البخاری)

وفی رواية له: كُنْتُ خَلَّفْتُ فِى الْبَيْتِ تِبْراًمِنَ الصَّدَقَةِ، فَكَرِهْتُ أَنْ أُبَيِّتَهٗ.

نیکی میں جلدی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا واقعہ

پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب اس بات کو بتلانے کے لئے قائم کیا ہے کہ آدمی کو نیکی کے کاموں میں سرعت اور جلدی سے آگے بڑھنا چاہیے، اور اس میں سبقت، مقابلہ اور ریس ہونی چاہیے۔ آدمی کو جب نیکی کے کام کا ارادہ وخیال آئے تو اس کو ٹلاوے نہیں، بلکہ جہاں ارادہ ہوا کہ فوری طور پر اس کو عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کرے، اور اس میں جتنی عجلت اور جلدی ہو سکے؛ کرنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ موقعہ ہاتھ سے نکل جائے اور جو ارادہ اللہ تعالیٰ نے دل میں ڈالا ہے، وہ دل سے ہٹ جائے یا وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے اس وقت عطا فرمائے ہیں؛ وہ میسر نہ آویں۔

حضرت ابوسروعہ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے مدینہ منورہ میں عصر کی نماز پڑھی، جب آپ نے سلام پھیرا تو آپ خلافِ عادت جلدی سے اٹھے اور لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے ازواجِ مطہرات میں سے کسی ایک کے حجرے میں تشریف لے گئے۔ یعنی لوگوں کے اٹھنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس جلدی اور تیزی کو دیکھ کر صحابۂ کرام گھبرائے۔ اس لئے کہ جب کبھی ایسی کیفیت دیکھتے تھے تو ان کو خیال آتا تھا کہ معلوم نہیں کیا صورت پیش آئی؟ ایسا کیوں ہوا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو بہت زیادہ محبت تھی، شدتِ تعلق اور شدتِ محبت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محسوس کیا کہ میرے اس طرح جلدی سے نکلنے کی وجہ سے صحابۂ کرام کو تعجب ہو رہا ہے کہ ایسا کیوں ہوا، اور کیا بات ہوئی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس پریشانی اور تعجب کو دور کرنے کے لئے فرمایا کہ اصل میں نماز کے دوران مجھے یاد آیا کہ گھر کے اندر سونے کے کچھ ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں، تو مَیں نے اس بات کو ناپسند سمجھا کہ سونے کے یہ ٹکڑے مجھے روک لیں۔ یعنی کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے خرچ کرنے میں تاخیر ہو جائے، لہٰذا سلام پھیرتے ہی مَیں جلدی سے اٹھ کر گھر میں گیا اور یہ کہہ کر آیا کہ اس کو جلدی سے اللہ کے راستہ میں صدقہ کر دو۔

دیکھئے! یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد آیا کہ گھر میں مال اور سونے کے ٹکڑے رکھے ہوئے ہیں اور ایک خیال آیا کہ ان کو صدقہ کر دینا چاہیے، چونکہ اس وقت تو آپ نماز میں تھے، اس حالت میں تو آپ نہیں جا سکتے تھے، اس لئے سلام پھیرتے ہی بلا کسی تاخیر کے لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے آپ وہاں سے تشریف لے گئے۔ کتنی عجلت سے کام لیا۔ ویسے تو

لوگوں کی گردنوں کو پھلانگنے کو پسندیدہ قرار نہیں دیا ہے۔

روایتوں میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن اگر کوئی آدمی آگے جگہ نہ ہونے کے باوجود لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتے ہوئے آگے بڑھے گا؛ تو کل قیامت میں اس کو جہنم کے اندر جانے کے واسطے پل بنایا جائے گا۔ (ترمذی شریف، کتاب الجمعۃ، ۵۱۳)

﴿......پھر اپنے دوسرے تقاضوں کو نہ دیکھے﴾

یہاں نبی کریم ﷺ نے اس کا بڑا اہتمام فرمایا کہ باوجود اس کے کہ ابھی لوگ اٹھے نہیں تھے، آپ نے تیزی سے گھر میں جاکر مال اور سونے کو خرچ کرنے کا حکم دیا۔ معلوم ہوا کہ آدمی کے دل میں جب نیکی کے کام کا خیال وارادہ پیدا ہو؛ تو پھر اپنے دوسرے تقاضوں کو نہ دیکھے۔ یوں نہ سوچے کہ فلاں کام سے فارغ ہوجاؤں، ابھی یہ کام نمٹ جائے اس کے بعد یہ کروں گا۔ یا آج کا دن گذر جائے؛ کل یہ کریں گے، پرسوں کریں گے۔ اس کام سے فراغت ہوجائے، ذرا مہلت مل جائے، پھر کریں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہاں ایسی مہلت کو نہیں دیکھا جاتا۔ وہ حضرات تو اپنے طبعی تقاضوں کو بھی پورا کرنے کو گوارا نہیں کرتے تھے، بلکہ طبعی تقاضہ سے پہلے اس نیکی کے تقاضہ پر عمل کرتے تھے؛ تاکہ اس میں ذرہ برابر تاخیر نہ ہو۔

پچھلی مجلس میں روایت آئی تھی: ﴿بَادِرُوا بِالْأَعْمَالِ﴾ جس میں بتلایا تھا کہ آدمی کو اعمالِ خیر میں سبقت اور جلدی کرنی چاہیے۔ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ اور ﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ﴾ بھی آیا تھا۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس پر ایک عملی نمونہ بھی پیش فرمادیا۔

﴿یہاں تک کہ شہید ہوگئے﴾

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ أُحُدٍ: أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ، فَأَيْنَ أَنَا؟ قَالَ: فِي الْجَنَّةِ. فَأَلْقَىٰ تَمَرَاتٍ كُنَّ فِي يَدِهِ، ثُمَّ قَاتَلَ حَتّٰى قُتِلَ.

دوسری روایت لاتے ہیں اس میں ایک صحابی کا عمل بتلایا گیا ہے۔

یہ واقعہ غزوۂ احد کے موقعہ کا ہے۔ ۳ھ میں مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان ایک جنگ ہوئی ہے۔ کفارِ قریش ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آئے تھے، نبی کریم ﷺ ان کے دفاع کے واسطے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر مدینہ منورہ سے باہر تشریف لائے، کفار کے لشکر کی تعداد تین ہزار تھی، تعداد کے لحاظ سے بھی یہ بڑھے ہوئے تھے، سازوسامان اور قوت وطاقت کے اعتبار سے بھی یہ بڑھے ہوئے تھے۔ جنگ کے موقعہ پر مسلمانوں میں سے ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر مَیں اس جنگ میں حصہ لوں اور دشمن کے ہاتھوں مارا جاؤں؛ تو میرا انجام کیا ہوگا، مَیں کہاں جاؤں گا؟

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وہ ایک سیاہ فام حبشی آدمی تھا اور اس نے آکر یہ بھی عرض کیا کہ میرا رنگ کالا ہے اور میرے جسم میں سے بدبو بھی آتی ہے، لیکن اگر مَیں اس جنگ کے اندر حصہ لوں، دشمنوں سے مقابلہ کروں اور مارا جاؤں؛ تو میرے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا بدلہ ہوگا؟ ﴿فَأَيْنَ أَنَا؟﴾ مَیں کہاں جاؤں گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿فِي الْجَنَّةِ﴾ راوی کہتے ہیں: جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت ان صحابی کے پاس کچھ کھجوریں تھیں جو کھا کر وہ اپنی بھوک مٹا رہے تھے، ایسا نہیں کہ شوقیہ کھا رہے تھے، بلکہ ان حضرات کو عام طور سے فقروفاقہ کی وجہ سے کوئی چیز میسر نہیں ہوتی تھی، جب ایسی کوئی چیز ہاتھ میں آجاتی تو اسی کے ذریعہ سے اپنی بھوک کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس بھی اس وقت کھجوریں تھیں اور ان کے ذریعہ سے وہ اپنی بھوک کو مٹا رہے تھے لیکن جب حضور ﷺ سے یہ سنا کہ تم جنت میں جاؤ گے، تو وہ کھجوریں جو ہاتھ میں تھیں، وہیں پھینک دیں اور دشمن کے مقابلہ میں آگے بڑھے؛ یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ (مستدرک حاکم، ۲۴۱۹)

اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کی

یہاں صحابی کا یہ جذبہ دیکھنے کے قابل ہے کہ بھوک ایک طبعی تقاضہ ہے، آدمی اس کی خاطر بہت سارے کام مؤخر اور لیٹ کر دیا کرتا ہے، سوچتا ہے کہ پہلے کھالیں پھر بعد میں دیکھی جائے گی۔ لیکن یہاں نبی کریم ﷺ کے اس جواب پر - کہ اگر تم اس جنگ میں مارے گئے تو جنت میں جاؤ گے - ان کے دل میں ایک کارِ خیر کا ارادہ پیدا ہوا، تو انہوں نے اتنی تاخیر بھی گوارا نہیں کی کہ ہاتھ میں جو دو چار کھجوریں ہیں، وہ کھا کر بھوک کو دور کرلیں، اس کے بعد آگے بڑھیں گے اور دشمن کا مقابلہ کریں گے۔

بلکہ بعض روایتوں میں یوں آتا ہے کہ ان کھجوروں کو پھینکتے ہوئے انہوں نے کہا: اگر مَیں ان کھجوروں کے کھانے میں رہوں گا تو یہ بڑے انتظار کی بات ہے یعنی جب نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں کہ اگر مَیں شہید ہو گیا تو جنت میں جاؤں گا، اب جنت حاصل کرنے کے لئے اتنی تاخیر اور انتظار کیوں کروں کہ پہلے کھجوریں کھالوں۔ چنانچہ وہ کھجوریں پھینک دیں، آگے بڑھے اور شہید ہو گئے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کو بتلایا گیا تو آپ ان کی نعش کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرا منہ سفید کر دے اور تیری بدبو کو خوشبو سے بدل دے۔ (مستدرک حاکم، ۲۴۱۹)

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ دیکھئے! ان صحابی کے دل میں کارِ خیر کا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کر کے اپنی جان کی قربانی پیش کرنے کا ایک جذبہ پیدا ہوا؛ تو جان قربان کرنے کے لئے بھی ایک منٹ کی تاخیر کو انہوں نے گوارا

نہیں کیا۔ حضور ﷺ کا جواب سنتے ہی فوراً وہ کھجوریں بھی پھینک دیں اور آگے بڑھے۔

یہ ان کا ایک حال تھا اور ایک ہمارا حال ہے کہ ہمارے دل میں جب کبھی کارِ خیر کا کوئی خیال آتا ہے، جذبہ و داعیہ پیدا ہوتا ہے؛ تو کیا اس داعیہ پر ہم اتنی عجلت اور جلدی سے عمل کر ڈالتے ہیں؟ یا ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس داعیہ کو دور کیا جائے؟ ٹلانے کی کوشش ہوتی ہے:۔

تھے تو وہ آباء تمہارے ہی مگر تم کیا ہو ۞ ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

دیکھئے! اوپر کی روایت میں نبی کریم ﷺ کا عمل بتلایا تھا۔ حالانکہ آپ کو تو کارِ خیر سے کوئی چیز نہیں روک سکتی تھی، آپ تو دنیا کے لئے نمونہ بنا کر ہی بھیجے گئے تھے، وہاں تو اس بات کا احتمال نہیں تھا کہ آپ جس کارِ خیر کا ارادہ کریں گے وہ رہ جائے گا اور آپ نہیں کر پائیں گے۔ اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے یہ بتلا دیا کہ نماز میں ایک چیز یاد آئی تو سلام پھیرتے ہی کسی اور چیز کا انتظار کئے بغیر فوراً تشریف لے گئے اور سونے کے ٹکڑوں کو خرچ کرنے کا حکم دے دیا۔ حضور ﷺ کا عملی نمونہ بھی ہمارے سامنے پیش کیا۔ اور اس کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عملی نمونہ بھی پیش کیا کہ ان حضرات کے دلوں میں جب کوئی نیکی کا داعیہ پیدا ہوتا تھا، کسی نیک کام کا جذبہ اور خیال آتا تھا تو اس پر عمل کرنے میں ذرہ برابر بھی تاخیر گوارا نہیں کرتے تھے، بلکہ جلدی کرتے تھے۔

جیسا کہ مَیں پہلے بتلا چکا ہوں کہ جلدی ہی کرنی چاہیے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہ یہ خیال و داعیہ اور ارادہ جو دل میں آیا ہے، وہ باقی رہتا ہے یا نہیں رہتا۔ یا اگر باقی بھی رہا تو بعد میں ہمارے لئے اس کے اسباب بھی مہیا ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ اس لئے نیکی کے کسی کام میں ذرہ برابر بھی تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

کون سے صدقہ کا ثواب زیادہ ہے؟

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال: جاءَ رَجُلٌ اِلیٰ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللہِ! أَیُّ الصَّدَقَةِ أَعْظَمُ أَجْراً؟ قَالَ: أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ، تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَأْمُلُ الْغِنَی، وَلَا تُمْهِلُ، حَتّٰی اِذَابَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ، قُلْتَ لِفُلانٍ کَذَاوَلِفُلانٍ کَذَاوَقَدْکَانَ لِفُلانٍ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! کون سا صدقہ ایسا ہے جس میں ثواب زیادہ ملتا ہے؟ یعنی اللہ کے راستہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس میں کون سا مال خرچ کرنا ایسا ہے جس میں ثواب زیادہ ملے گا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا: تم اللہ کے راستہ میں ایسی حالت میں مال خرچ کرو کہ تم تندرست ہو۔ یعنی تمہاری تندرستی برقرار ہے، صحت بحال ہے، جس کی وجہ سے آئندہ تمہیں امید ہے کہ مَیں ابھی جلدی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ اس لئے کہ آدمی کی صحت اور تندرستی ٹھیک ٹھاک ہوتی ہے تو اس کو غالب گمان یہ ہوتا ہے کہ مَیں اپنی عمرِ طبعی تک پہنچوں گا گویا ابھی کوئی ایسے آثار نظر نہیں آتے کہ مَیں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، تمہاری یہ تندرستی اس بات کی خبر دے رہی ہے اور تمہارے دل میں یہ خیال پیدا کر رہی ہے کہ تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساٹھ ستّر سال کی ایک عمرِ طبعی مقرر کی گئی ہے، وہ پوری کر کے رہو گے ایک تو تندرستی کی وجہ سے آدمی کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مَیں آگے زندہ رہنے والا ہوں، اور جب آدمی کو یہ خیال ہو کہ مَیں آئندہ زندہ رہوں گا تو پھر ساتھ ہی اس کے دل میں بخل بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔

جیسے ایک آدمی سفر میں گیا ہو اور کچھ رقم ساتھ لے گیا ہو اور اس کو معلوم ہو کہ ابھی مجھے

کچھ دن سفر میں گذارنے ہیں تو اس رقم کو استعمال کرنے میں وہ بڑی احتیاط سے کام لے گا، ادھر اُدھر ضائع نہیں کرے گا۔ اسی طریقہ سے آدمی کو جب خیال ہے کہ ابھی مَیں تندرست ہوں، مجھے اور زندہ رہنا ہے، ابھی تو میری زندگی کے بیس، پچیس سال ہوئے ہیں، گویا ابھی تو مجھے زندگی کے اور تیس چالیس سال نکالنے ہیں، تو اس صورت میں اس کا نفس اس کو ترغیب دیتا ہے کہ جب تمہیں زندہ رہنا ہے تو پھر پیسوں میں بچت کرو، آڑے وقت میں کام آئیں گے۔ اگر ابھی خرچ کرتے رہو گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پیسہ ہاتھ سے نکل جائے، اور پھر اگر ضرورت پیش آ گئی تو اس وقت پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی و دشواری کا سامنا ہو۔

﴿ہماری کفایت شعاری﴾

حضور ﷺ فرماتے ہیں: ﴿أَنْ تَصَدَّقَ وَأَنْتَ صَحِيحٌ شَحِيحٌ﴾ تم ایسی حالت میں صدقہ کرو کہ تندرست ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے دل میں اس تندرستی کی وجہ سے ایک داعیہ پیدا ہوا ہے کہ خرچ کرنے میں ذرا احتیاط اور کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔ ہم لوگ اس بخل کو کفایت شعاری سے تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرتے ہوئے کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔

﴿تَخْشَى الْفَقْرَ﴾ تم کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر خرچ کر دو گے؛ تو مال ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اور جب ابھی ہاتھ سے مال نکل جائے گا تو جب ضرورت پیش آئے گی اس وقت کیا کریں گے۔ ﴿وَتَأْمُلُ الْغِنٰى﴾ اور تم کو آئندہ امید و تمنا ہے کہ کچھ پیسہ پاس میں جمع ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ آدمی کو جب یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے اور زندہ رہنا ہے تو وہ اپنی آئندہ زندگی میں راحت و آرام حاصل کرنے کے لئے، عیش اور راحت کے اسباب مہیا کرنے کے

واسطے؛ زیادہ سے زیادہ پیسہ حاصل کرنے کی اور پیسہ جمع کر کے محفوظ کرنے کی کوشش کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے زمانہ میں اگر تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو گے کہ تمہارا نفس تم کو خرچ کرنے سے روک رہا ہے؛ تو ثواب زیادہ ہے۔

﴿جیسی ڈیمانڈ؛ ویسا بھاؤ﴾

ہم دنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ ہر چیز کے لئے ایک زمانہ ہوتا ہے۔ اس خاص زمانہ میں اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے، دوسرے زمانہ میں اس کی قدر و قیمت اتنی نہیں رہتی۔ مثلاً ریفریجریٹر اور ایرکنڈیشنر ہے۔ گرمی کے زمانہ میں اس کے بھاؤ بڑھ جاتے ہیں۔ اس لئے کہ اس کی ضرورت اور تقاضہ ہے۔ اور ایک موسم ایسا بھی آتا ہے کہ اس کی وہ قدر و قیمت نہیں رہتی جو گرمی کے زمانہ میں ہوتی ہے۔

اس کے برعکس گرم لباس ہے۔ سردی میں اس کا بھاؤ بڑھ جائے گا، گرمی میں اگر کوئی آدمی گرم سوئٹر لے کر آئے گا تو آپ اس کی طرف کوئی دھیان وتوجہ نہیں دیں گے۔ معلوم ہوا کہ دنیا کا بھی ایک دستور ہے کہ ہر چیز کی اپنے اپنے وقت پر قدر و قیمت ہوتی ہے، اور ایک خاص زمانہ میں اس کی قیمت بڑھ جایا کرتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا نیکی ہی کا کام ہے، اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ آپ جب بھی خرچ کریں گے اس پر ثواب مل کر رہے گا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بھاؤ کب زیادہ ملے گا۔

ویسے دنیا کے اندر ہمارا دستور تو یہ ہے کہ کوئی بھی چیز ہو، اس کو زیادہ بھاؤ کے لئے روکے رکھتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ہمارے پاس جو بھی چیز ہے اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت ملے۔ اب اگر ہم اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے اجر وثواب حاصل کرنا چاہتے

ہیں؛ تو پھر اس انداز سے خرچ کرنا پڑے گا کہ زیادہ سے زیادہ ثواب ملے۔ اور نبی کریم ﷺ نے اس کا طریقہ یہ بتلایا کہ اگر آپ اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے زیادہ ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں؛ تو اس کا زمانہ جوانی کا زمانہ ہے جبکہ تم تندرست ہو اور ساتھ ہی آئندہ زندہ رہنے کی تمنائیں تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہوں۔ ایسے موقعہ پر خرچ کرنے میں آدمی بخل سے کام لیتا ہے، حالانکہ ایسے وقت میں تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو گے؛ تو ثواب زیادہ ملے گا۔

﴿فلاں کو اتنا اور فلاں کو اتنا﴾

باقی خرچ کرنے کی ایک شکل وہ بھی ہے جو آگے بتلا رہے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿وَلَا تُمْهِلْ﴾ ڈھیل مت کرنا اور ٹلانا مت۔ یعنی اس زمانہ میں خرچ کرنے کے لئے حضور ﷺ نے بتلایا کہ جب تندرستی ہے اور تمہارے قویٰ بحال ہیں اور آئندہ زندہ رہنے کی توقعات تمہارے ساتھ لگی ہوئی ہیں؛ ایسے موقعہ پر خرچ کرنا چاہیے۔ اور خرچ کرنے میں ڈھیل مت کرنا اور ٹال مٹول مت کرنا؛ ورنہ آدمی کی روح نکلتے ہوئے جب گلے میں پہنچتی ہے تو پھر وہ وصیتیں کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں کو اتنا دیجیو، مدرسہ میں اتنا، اور مسجد میں اتنا، اور فلاں جگہ اتنا، اور فلاں جگہ اتنا دینا۔ حالانکہ وہ جن کا حق تھا ان کے لئے ہو چکا۔

﴿ایک ضروری مسئلہ﴾

ایک بات یاد رہے کہ آدمی جب مرض الوفات میں مبتلا ہوتا ہے تو اس بیماری میں پہنچتے ہی اس کے مال میں ورثاء کا حق لگ جاتا ہے۔ اگر چہ ورثاء ابھی تقسیم نہیں کر سکتے، لیکن اب وہ آدمی اپنا مال ہوتے ہوئے بھی اس مال کے ایک تہائی سے زیادہ میں تصرف نہیں کر سکتا اگر چہ پورے مال کا مالک ہے لیکن ایک تہائی سے زیادہ خرچ کرنا چاہے؛ تو نہیں کر سکتا۔ مثلاً

ابھی اسی بیماری میں -جوآگے چل کراس کے لئے موت کا ذریعہ بنی ہے- وہ کسی کو بخشش کے طور پر اپنا سارا مال دے دینا چاہے،اسی بیماری کے زمانہ میں اپنا سارا مال مسجد میں دے دے تو یہ معتبر نہیں ہے۔صرف ایک تہائی پر اس کو تصرف کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اور اگرابھی تصرف نہیں کرتا بلکہ آئندہ کے لئے وصیت کرنا چاہتا ہے؛تب بھی ایک تہائی (1/3rd) میں ہی کرسکتا ہے۔اگرایک تہائی سے زیادہ کی کسی نے وصیت کی؛تو شریعت نے اس کا اعتبار نہیں کیا ہے۔

﴿وصیت کا اسلامی قانون﴾

وصیت کے سلسلہ میں شریعت کی طرف سے کچھ مقررہ قواعد اور لو (LAWS) ہیں ایک تو یہ ہے کہ وصیت ایک تہائی یا اس سے کم ہی تک کی درست ہے،ایک تہائی سے زیادہ کی اگر وصیت کی ہے؛تو وہ پوری نہیں کی جائے گی۔اس لئے اگر کسی نے وصیت کی کہ میرے مرنے کے بعد میرا سب مال مسجد میں دے دینا،یا مدرسہ کے لئے دے دینا؛تو وہ معتبر نہیں ہے۔ایک تہائی دیں گے،باقی دو تہائی اس کے وارثوں کا ہوگا،اِلّا یہ کہ تمام وارث بشرطیکہ عاقل بالغ ہوں،اور رضامندی سے ایک تہائی سے زائد مال کو خرچ کرنے کی اجازت دیں؛ تو اس کی گنجائش دی گئی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ جس کے حق میں وصیت کی گئی ہے وہ خود وارث نہ ہو۔اگر کسی وارث کے حق میں وصیت کی ہے-بیٹا،بیوی،باپ،ماں-تو یہ وصیت بھی معتبر نہیں۔بعض مرتبہ باپ یوں کہتا ہے کہ میرے مال میں سے بڑے بیٹے کو اتنا دے دیجیو۔حالانکہ وہ بیٹا تو بیٹا ہونے کی وجہ سے وارث ہی ہے۔لہٰذا اس کے حق میں کی گئی یہ وصیت معتبر نہیں ہے۔

بعض مرتبہ آدمی وصیت کرتا ہے کہ میری بیوی کے پاس یہ گھر رہے گا، اس کو یہ گھر دے دینا؛ تو یہ وصیت بھی درست نہیں، اس لئے کہ بیوی اس کی وارث ہے۔ ہر وہ شخص جو اس کے مرنے کے بعد اس کے مال میں وارث بن رہا ہے، اگر اس کے حق میں کوئی وصیت کی ہے؛ تو وہ وصیت معتبر نہیں ہوگی اور اس پر عمل نہیں ہوگا۔

اور تیسرا یہ کہ کسی گناہ کے کام کی وصیت کی ہے تو اس کا بھی اعتبار نہیں کیا جاتا۔

بہرحال! وصیت کے صحیح ہونے کے لئے ان تین چیزوں کو شرط قرار دیا ہے۔

﴿حلوائی کی دکان پر نانی ماں کا فاتحہ﴾

نبی کریم ﷺ بتلاتے ہیں کہ زندگی بھر تو صدقہ نہیں کیا اور ٹلاتا رہا کہ کریں گے، کریں گے، کریں گے۔ اب جان جانے کا وقت آیا اور روح گلے کے اندر آکر اٹکی ہوئی ہے؛ تو اب جناب وصیت کر رہے ہیں کہ میرے مال میں سے دو لاکھ مسجد میں اور دو لاکھ مدرسہ میں اور ایک لاکھ واٹر ورکس (water works) میں، اور ایک لاکھ اسپتال میں دے دینا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: وہ تو فلاں کا ہوگیا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کے جو وارثین مقرر کئے ہیں، وہ مال تو ان کے نام چڑھ گیا ہے، اب اگر وہ ان کو ہٹا کر ایک تہائی سے زیادہ کسی کو دینا بھی چاہے؛ تو اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

﴿خلاصۂ کلام﴾

خلاصہ یہ ہوا کہ ایک وقت وہ تھا کہ اپنی زندگی میں، تندرستی کے زمانہ میں، جس وقت آپ کو یہ توقع بندھی ہوئی ہے اور امید لگی ہوئی ہے کہ میں ابھی زندہ رہنے والا ہوں، کوئی بیماری بھی نہیں ہے، اس وقت اگر آپ اپنا سارا مال خرچ کر دیتے؛ تو درست تھا، آپ کر سکتے

تھے، لیکن آپ نے نہیں کیا، اور اب جب کہ موت سر پر آ گئی ہے اور روح نکلنے کا وقت قریب ہے اس وقت آپ سارا مال خرچ کرنا چاہیں؛ تو بھی نہیں کر سکتے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ٹال مٹول مت کرو۔

ایک خرچ کرنا تو وہ تھا کہ جس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قدر و قیمت زیادہ تھی اور اس پر ثواب بھی زیادہ تھا۔ اگر چہ ابھی بھی ایک تہائی تک جو خرچ کیا جائے گا، اس میں بھی ثواب تو ملے گا۔ لیکن اتنا نہیں ملے گا؛ جتنا اس وقت ملتا ہے۔

﴿ہماری ایک بری عادت﴾

ویسے بھی انسان کی عادت ہے کہ وہ جب کسی چیز سے اپنی ضرورت پوری کر لیتا ہے پھر اللہ کے راستہ میں دینے کی اس کو سوجھتی ہے۔ اور ایک دوسری بات بھی ہے کہ جو گھٹیا چیز ہوتی ہے، وہی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ عمدہ چیز تو اپنے استعمال کے لئے رکھتا ہے اور گھٹیا چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تم حقیقی معنیٰ میں نیکی نہیں پا سکتے اور کامل ثواب اس وقت تک نہیں پا سکتے؛ جب تک کہ وہ چیز خرچ نہ کرو جس سے تمہیں محبت ہے۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج﴾

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے تو اس پر عمل کر کے بتلایا۔ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تھی اس وقت حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ جن کا ایک بہت عمدہ باغ بالکل مسجد نبوی کے سامنے تھا، آج کل تو وہ حصہ مسجد کے اندر ہی آ چکا ہے۔ اس باغ کا نام بیرحاء تھا، اس کے اندر بڑا میٹھا اور عمدہ پانی تھا۔ نبی کریم ﷺ بھی کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے تھے اور پانی نوش

فرماتے تھے اور وہاں تھوڑی دیر آرام بھی فرماتے تھے۔ جب یہ آیت اتری تو انہوں نے آ کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ہے اور اس وقت میرے پاس جتنا بھی مال ہے، اس میں سب سے بہترین مال یہی باغ ہے، اور مَیں وہ اللہ کے واسطے پیش کرتا ہوں، آپ جہاں مناسب سمجھیں؛ وہاں خرچ کر دیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج تو یہ تھا۔ (بخاری شریف، ۱۳٦۸)

مَیں اور آپ اس کو گوارا کریں گے؟

اور ہمارا معاملہ برعکس ہے۔ ہم جو گھٹیا چیز ہوتی ہے، اس کو خرچ کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کھانا کھا چکے اور بچ گیا تو کہتے ہیں کہ کسی فقیر کو دے دو، اللہ کے راستہ میں خرچ کر دو۔ اس لئے کہ معلوم ہے کہ یہ اب ہماری ضرورت کا نہیں رہا۔ اسی طرح کپڑا نیا آیا تو کہتے ہیں کہ جو پرانا ہے وہ دے دو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ اس پر بھی ثواب دیتے ہیں، ورنہ مَیں اور آپ کیا اس کو گوارا کریں گے؟

ایک آدمی کو ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس نے کھانا کھا لیا، اس کے بعد اس کے پاس دو روٹی بچ گئی، وہی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو غیرت مند آدمی اس کو قبول نہیں کرتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم واحسان ہے کہ یہ بچی ہوئی دو روٹیاں بھی اگر آپ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ ثواب دے رہے ہیں۔ ورنہ مَیں اور آپ ہوتے تو کیا کرتے؟

ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ہم کیا کر رہے ہیں؟ اللہ کے راستہ کے لئے ہماری جو ترتیب بن رہی ہے، وہ کہاں تک درست ہے؟ نیا کپڑا لائے تو کہا کہ پرانا کپڑا اللہ کے راستہ میں خرچ کر دو۔ ہر چیز میں ہمارا یہ مزاج بنا ہوا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں باری تعالیٰ نے

انسان کے اس مزاج کی نشان دہی کی ہے: ﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ تم اللہ کے راستہ میں ایسی چیز دیتے ہو کہ اگر تم کو دی جائے تو تم اس کو لے نہیں سکتے، الّا یہ کہ تم چشم پوشی سے کام لو؛ وہ بات دوسری ہے۔

﴿......تب جا کر مسجد میں آئے﴾

ہر چیز میں ہمارا مزاج ایسا ہی بنا ہوا ہے، یہاں تک کہ عمر کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ زندگی کا وہی حصہ ہم اللہ تعالیٰ کے لئے فارغ کرتے ہیں جو بالکل گھٹیا اور کم درجہ کا ہے۔ بچپن اور جوانی کو تو خوب دنیا کمانے میں لگایا، اب بڑھاپے کا زمانہ آیا، پچاس ساٹھ سال کے ہوئے، کسی کام کے نہیں رہے، بچوں نے بھی کہہ دیا کہ ابّا اب دکان پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، فیکٹری پر آنے کی ضرورت نہیں ہے، اب آپ اللہ اللہ کرو۔ جب ہر جگہ سے دھکے دئے گئے؛ تب جا کر مسجد میں آئے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زندگی اور عمر کا بھی وہ حصہ جو زندگی کے اعتبار سے گھٹیا سمجھا جاتا ہے، وہ ہم اللہ کے لئے فارغ کر لیتے ہیں۔ تو اللہ کے راستہ میں دینے کا مزاج بھی اگر بنا؛ تو ایسا بنا۔

نبی کریم ﷺ اس حدیث کے ذریعہ سے یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ تم جو بھی دوگے، اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ وہ قبول کر لیں گے، اور اس پر ثواب ملے گا، لیکن اگر تم زیادہ ثواب لینا چاہتے ہو، تو اس کا طریقہ یہ ہے۔

﴿خرچ کرنے کی ترتیب﴾

دیکھئے! خرچ کرنے کے معاملہ میں بڑی ترغیبیں آئی ہیں اور علماء نے خرچ کے لئے

ایک ترتیب بھی بتلائی ہے، اگر ہم اس ترتیب کو اختیار کرلیں؛ تو بہت آسان ہے۔ ویسے آدمی جب خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان یاد دلاتا ہے کہ خرچ کروگے؛ تو فقیر ہو جاؤگے اور پیسہ پاس نہیں رہے گا۔ شیطان اس طرح دل میں وسوسے ڈال ڈال کر بخل اور گناہ کے کام کا حکم کرتا ہے: ﴿یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَیَأْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے نہیں دیتا ہے۔ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

اسی لئے علماء نے خرچ کرنے کے لئے ایک تدبیر بتلائی ہے کہ آدمی کے لئے بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ پہلے سے طے کرلے کہ اب میرے پاس جو بھی مال آئے گا اس کا اتنا حصہ مَیں اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ مثلاً آپ نے طے کرلیا کہ مال کا دسواں حصہ، بیسواں حصہ، چالیسواں حصہ، سوواں حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اب آسان صورت یہ ہے کہ جہاں سو روپے آئے، فوراً اسی وقت ایک روپیہ الگ کر کے رکھ دو۔ ہزار روپے آئے، تو دس روپے الگ کر کے رکھ دو۔ دس ہزار روپے آئے تو اس کے اندر سے سو روپے الگ کر کے رکھ دو۔ لاکھ روپے آئے تو ایک ہزار روپے الگ کر کے رکھ دو۔ اور اس کا تھیلا بھی الگ ہی ہونا چاہیے۔ جب آپ اس طرح الگ کرتے رہیں گے؛ تو وہ تھیلا آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے واسطے الگ کئے گئے ہیں۔ پھر خرچ کرنے میں تاخیر نہیں ہوگی اور آسانی کے ساتھ خرچ کرسکوگے۔ ورنہ اگر الگ نہیں کئے ہیں تو اس صورت میں خرچ کرنا دشوار ہی رہے گا اور وقت پر شیطان نکالنے نہیں دے گا۔ اور اگر پہلے سے جوں جوں آتے گئے، توں توں ہم نکالتے گئے؛ تو اب خرچ کرنا آسان ہے۔

﴿ایک پائی خرچ کرنے والا اور ایک لاکھ خرچ کرنے والا؛ دونوں برابر﴾

ایک بات اور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں گنتی اور تعداد نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو جذبہ دیکھا جاتا ہے کہ آدمی جو خرچ کر رہا ہے وہ کس جذبے سے خرچ کر رہا ہے؟ مثلاً ایک آدمی کے پاس سو روپے آئے اور اس نے ایک روپیہ خرچ کیا۔ اور دوسرے آدمی کے پاس ایک لاکھ آئے اور اس نے پورے ایک ہزار روپے خرچ کئے، تو یہ دونوں برابر ہوئے اس لئے کہ سو میں سے ایک خرچ کرنے والے نے بھی ایک فیصد (1%) خرچ کیا ہے۔ اور لاکھ میں سے ایک ہزار دینے والے نے بھی اتنا ہی خرچ کیا ہے۔ ترتیب دونوں کی یکساں ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس نے ایک ہزار دئے، اور اس نے ایک روپیہ دیا۔ جو جذبہ ہزار والے کا تھا؛ وہی جذبہ اس کا بھی ہے۔ اس کے پاس بھی اگر لاکھ روپے ہوتے، تو یہ بھی سوواں حصہ نکال کر ایک ہزار خرچ کرتا۔

اسی لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا جو جذبہ تھا وہ سب لوگوں سے بڑھا ہوا تھا۔ ان کا اخلاص بڑھا ہوا تھا۔ اس لئے ان کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر تم میں سے کوئی آدمی اُحد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے، اور میرا صحابی ایک مُد یا اس سے بھی آدھا خرچ کرے؛ تب بھی تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے (البخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی، ۳۶۷۳) کیوں؟ اسی جذبے، نیت اور اخلاص کی وجہ سے وہ بڑھے ہوئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل جذبہ اور اخلاص دیکھا جاتا ہے۔

کوئی آدمی یہ نہ سوچے کہ میرے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ مال تو ہے نہیں، مَیں کیا خرچ کروں۔ ایک صاحب ایک بزرگ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے کہا: میرے پاس خرچ کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔ ان بزرگ نے کہا: تیرے پاس ایک

روپیہ بھی نہیں ہے؟ اس نے کہا: ایک روپیہ تو ہے۔ فرمایا: ایک روپیہ میں سے ایک پائی خرچ کرو۔ آپ کے پاس جو ہے اس میں سے خرچ کیجیے۔ اگر تم ایک روپیہ میں سے ایک پائی خرچ کروگے، اور لاکھ والا ایک ہزار خرچ کرتا ہے؛ تو تم اس کے برابر ہوگئے۔

آدمی یہ سوچے کہ میرے پاس جو ہے اس میں سے مَیں اپنی حیثیت کے مطابق اتنا خرچ کرسکتا ہوں۔ پہلے سے طے کرلے اور پھر اس پر عمل کرے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے بزرگوں میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں۔ ان کے صاحبزادے فرماتے ہیں: والد صاحب نے طے کرلیا تھا کہ میرے پاس جو مال بغیر محنت کے آئے گا۔ جیسے کسی نے ہدیہ میں دے دیا، کہیں سے وراثت میں مل گیا۔ اس کا دسواں حصہ یعنی (10%) اور جو مال مَیں محنت کر کے حاصل کروں گا اس کا بیسواں حصہ یعنی (5%) اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ لہٰذا ان کی عادت تھی کہ اگر ان کے پاس ایک روپیہ بھی آتا تو فوراً دکان پر بھیج کر اس کو تڑواتے اور ریزگاری کروا کر حساب کر کے ایک پاکٹ میں ڈلوادیتے، چاہے اس کا چلّر منگوانے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو۔ اور اس کے لئے پاکٹ الگ ہی رکھا تھا۔ اگر دس روپے آتے تو اسی وقت چھوٹے کروا کر ایک روپیہ اس میں ڈلواتے۔ ایسا نہیں کہ بعد میں چھوٹے کروائیں گے، بلکہ اسی وقت کرواتے تھے، اس کے بغیر اپنے جیب میں رکھتے ہی نہیں تھے۔ پہلے یہ کام کرواتے تھے، چھوٹے کرواتے، ڈبّے میں ڈالتے اور پھر اپنے جیب میں رکھتے۔ اگر انسان ایسی کوئی ترتیب بنالے اور ایسا ایک نظام بنالے؛ تو اس کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا آسان ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

باقی ہم یوں سوچیں کہ جب کام سامنے آئے گا تو دیکھیں گے۔ تو اس میں شیطان آدمی کو بہکاتا رہتا ہے، اور اس کو اس خیال میں مبتلا کرتا رہتا ہے کہ جب وقت آئے گا اس وقت کریں گے، اور جب وقت آتا ہے تو پھر آدمی کو خرچ کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگر اس طرح الگ کرلے گا؛ تو پھر وہ تھیلا ہی آپ کو یاد دلاتا رہے گا کہ یہ خرچ کرنے کے لئے ہی رکھے ہیں۔ اللہ کے راستہ میں جہاں خرچ کرنا ہے، اس میں سے نکالو۔ یہ ترتیب ہے جو بزرگوں نے بتلائی ہے۔

اللہ تعالیٰ ھمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً امابعد.

عن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم أَخَذَسَیْفاًیَوْمَ أُحُدٍ. فَقَالَ: مَنْ یَّأْخُذُمِنِّیْ ھٰذَا؟ فَبَسَطُوْاأَیْدِیَھُمْ، کُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْھُمْ یَقُوْلُ: أَنَاأَنَا. قَالَ: فَمَنْ یَّأْخُذُہٗ بِحَقِّہٖ؟فَأَحْجَمَ الْقَوْمُ،فَقَالَ أَبُوْدُجَانَۃَ رضی اللہ عنہ: أَنَااٰخُذُہٗ بِحَقِّہٖ. فَأَخَذَہٗ،فَفَلَقَ بِہٖ ھَامَ الْمُشْرِکِیْنَ. (رواہ مسلم)

اس باب کا عنوان ہے نیکی کے کاموں کی طرف آدمی کا آگے بڑھنا، اس کے لئے کوشش کرنا، اور نیکی کے کام کے لئے آدمی کو بغیر کسی پس وپیش کے فوراً تیار ہوجانا۔ یہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک میں ایک تلوار لی اور پوچھا: یہ تلوار مجھ سے کون لے گا؟

غزوۂ احد اور حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کے کارنامے

غزوۂ احد ۳ ؁ھ میں پیش آیا ہے۔ مشرکینِ مکہ ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے لئے آئے تھے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی کہ وہ لوگ مدینہ منورہ کے قریب آچکے ہیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا اور تیاری کی۔ اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قلبی رجحان تو یہی تھا کہ مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے ان کا مقابلہ کیا جائے لیکن بعض صحابہ کی خواہش اور اصرار پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فیصلہ فرمایا کہ مدینہ منورہ سے باہر جاکر ان کا مقابلہ کیا

جائے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ حضرات صحابہ کو ساتھ لے کر احد پہاڑ کی جانب روانہ ہوئے، جہاں اس پہاڑ کے قریب ہی مشرکین نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ جمعہ کے روز جمعہ سے پہلے آپ نے صحابہ کو ترغیب دی، جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد گھر میں تشریف لے گئے، اور تیاری کر کے عصر کے وقت باہر تشریف لائے، اور عصر کے بعد صحابہ کے لشکر کو لے کر روانہ ہوئے اور احد کے قریب مقامِ شوط میں آپ نے رات گذاری۔ اور سنیچر کے روز مقام احد میں دونوں لشکر مقابلہ کے لئے صف آرا ہوئے۔ اسی موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے ایک تلوار - جو آپ کے پاس تھی - اپنے دستِ مبارک میں لے کر حضراتِ صحابہ سے پوچھا: یہ تلوار مجھ سے کون حاصل کرے گا؟ اس کے جواب میں حضرات صحابہ میں سے ہر ایک نے ہاتھ آگے بڑھایا اور ان میں سے ہر ایک یہ کہہ رہا تھا کہ یہ تلوار میں لوں گا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے ایک قید لگائی کہ کون اس تلوار کو اس کا حق ادا کرنے کی شرط کے ساتھ لے گا؟ جب حق کی بات آئی تو لوگ رک گئے، اور اس لئے نہیں رکے کہ نعوذ باللہ ان کے جذبات میں کوئی کمی تھی اور ان کے حوصلے پست تھے، بلکہ اس ڈر کی وجہ سے ان کے ہاتھ رک گئے کہ پتہ نہیں اس کا کیا حق ہوگا؟ اور ہم حق ادا کر سکیں گے یا نہیں؟

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ ایک انصاری صحابی ہیں، جن کا نام سماک بن خرشہ ہے، وہ آگے بڑھے اور انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں اس تلوار کو لوں گا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اعلان فرمایا کہ یہ تلوار کون لے گا؟ لوگوں نے ہاتھ آگے بڑھائے، لیکن آپ ﷺ نے کسی کو نہیں دی۔ پھر جب حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ آگے بڑھے تو ان کو دی۔ گویا آپ ﷺ کو بذریعۂ وحی آگاہ کیا تھا کہ یہ اس کا حق ادا کریں گے۔ خیر! انہوں نے کہا: میں اس کا حق ادا کرنے کی شرط کے ساتھ لیتا ہوں۔

یہاں اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ ایک نیکی کے کام کے لئے دعوت دے رہے ہیں اور لوگ فوراً آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور جب حق کی ادائیگی کی بات آئی تو حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس کا حق ادا کرنے کی شرط کو منظور کرتے ہوئے سبقت کی۔

دوسری روایتوں میں آیا ہے کہ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اللہ کے رسول! اس کا حق کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کا حق یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کسی مسلمان کو کوئی گزند اور تکلیف نہ پہنچائی جائے، اور کسی کافر کو چھوڑا نہ جائے۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ اس کا حق یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے کافروں کی گردن اڑائی جائے۔ خیر! حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے اس کا حق ادا کرنے کی شرط کے ساتھ اس تلوار کو لیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے وہ تلوار لی اور اس کے ذریعہ سے مشرکین کی کھوپڑیوں کو پھاڑا۔ روایتوں میں ہے کہ حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کے موقعہ پر اپنے سر پر سرخ عمامہ باندھا اور بہت اتراہٹ کے ساتھ آگے بڑھے۔ جب ان کو اس طرح چلتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے دیکھا تو فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ چال ناپسند ہے مگر دشمن کے مقابلہ میں۔ اگر کوئی آدمی دشمن کے مقابلہ میں اس طرح چلے گا تو اس سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتے ہیں، اس لئے کہ دشمن کے مقابلہ میں اپنی جرأت اور بہادری کا اظہار پسندیدہ ہے۔

چنانچہ وہ یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

أَنَا الَّذِیْ عَاهَدَنِیْ خَلِیْلِیْ ❁ وَنَحْنُ بِالسَّفْحِ لَدَی النَّخِیْلِ

أَنْ لَا أَقُوْمَ الدَّهْرُ فِی الْکُیُوْلِ ❁ أَضْرِبُ بِسَیْفِ اللهِ وَالرَّسُوْلِ

(سیرۃ المصطفیٰ ج۲/ص۲۰۰۔ معرفۃ الصحابۃ لأبی نعیم، ۳۲۱۸)

مجھ سے میرے خلیل نے پہاڑ کے دامن میں نخلستان کے پاس یہ عہد لیا ہے اوراس عہد کو پورا کرنے کے واسطے مَیں آگے بڑھ رہا ہوں۔اور جو بھی مقابلہ پرآیا اس کا سر قلم کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے، یہاں تک کہ ایک موقعہ پر ہند بنت عتبہ سامنے آئی۔ یہ حضرت ابوسفیان کی بیوی اور حضرت معاویہ کی والدہ ہیں؛ جواس وقت اسلام نہیں لائی تھیں۔وہ بھی مشرکین کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔جنگِ احد کے موقعہ پر مشرکین کے حوصلے اور ہمتیں بلند کرنے کیلئے پندرہ عورتیں بھی ساتھ آئی تھیں۔جب یہ سامنے آئیں تو حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ نے تلوار اُٹھائی پھرفوراً تلوار کھینچ لی اور فرمایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار سے مَیں کسی عورت کو قتل نہیں کروں گا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ اس کے بعد ہندہ نے لوگوں کو مدد کے لئے دہائی دی اور آواز بھی دی۔لیکن حضرت ابودجانہ رضی اللہ عنہ کی بہادری کی وجہ سے کوئی بھی آگے نہیں بڑھا۔ بہرحال!اس موقعہ پرانہوں نے بڑی بہادری کے جوہر دکھلائے تھے۔

اسی موقعہ پر یہ بھی ہوا کہ ایک وقت جب مشرکین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بہت تیر چلانا شروع کئے تو یہ اپنی پیٹھ مشرکین کی طرف کرکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہوگئے اور سارے تیراپنی پیٹھ پر لئے۔یہاں تو یہ روایت لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے نیکی کے کام کی طرف سبقت کی اور آگے بڑھے۔

﴿عمل کے لئے زمانۂ حال غنیمت ہے﴾

عن الزبیر بن عدی قال: أَتَیْنَا أَنَسَ بْنَ مَالِکٍ رضی اللہ عنہ، فَشَکَوْنَا اِلَیْهِ مَانَلْقٰی مِنَ الْحَجَّاجِ. فَقَالَ: اِصْبِرُوْا، فَاِنَّهُ لَا یَأْتِیْ زَمَانٌ اِلَّا وَالَّذِیْ بَعْدَهٗ شَرٌّ مِّنْهُ حَتّٰی تَلْقَوْا رَبَّکُمْ. سَمِعْتُهٗ مِنْ نَّبِیِّکُمْ صلی اللہ علیہ وسلم. (رواہ البخاری)

زبیر بن عدی تابعی ہیں،صغار تابعین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ ہم

لوگ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حجاج کی طرف سے جو مظالم ہو رہے تھے اور لوگوں کو اس کی طرف سے جو تکلیفیں پیش آتی تھیں اس کی شکایتیں کی کہ حضرت! وہ بہت ظلم ڈھا رہا ہے۔ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان آنے والوں سے کہا: صبر سے کام لو، اس لئے کہ جو زمانہ اس کے بعد آ رہا ہے وہ اس سے بھی برا ہے۔ یعنی تم حجاج کے مظالم کی شکایت کرتے ہو، آگے جو حالات آنے والے ہیں وہ اس سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جا ملو یعنی موت آ جائے۔ پھر فرمایا: یہ چیز مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔

چنانچہ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ گذشتہ کل آج سے بہتر تھی۔ اور آج کا دن آنے والی کل سے بہتر ہے۔ گویا ہر آنے والا دن گذرے ہوئے دن کے مقابلہ میں برا ہے اس میں فتنے زیادہ ہیں، حالات ناسازگار ہیں۔

بعض لوگوں نے اس موقع پر یہ اشکال کیا ہے کہ ایسی صورتیں بھی پیدا ہوئی ہیں کہ بعد کے زمانے میں اللہ تعالیٰ نے خوبی اور خیر کی شکلیں پیدا فرمائیں۔ جیسے اسی حجاج کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ آیا جس میں عدل وانصاف بہت عام ہوا اور ظلم بالکل ختم ہو گیا تھا۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو ارشاد ہے وہ مجموعی اعتبار سے ہے، کہ مجموعی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو ہر بعد میں آنے والا زمانہ پچھلے زمانہ کے مقابلہ میں برا اور کمتر ہے۔ ہاں! کسی جگہ پر کہیں شخصی حالات انفرادی طور پر پچھلے زمانہ سے بہتر ہوں؛ تو وہ اس ارشاد کے منافی نہیں ہے۔

خیر! حضرت انس رضی اللہ عنہ کی نصیحت کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو زمانہ تم کو دیا ہے اس کو غنیمت سمجھ لو اور اس سے فائدہ اٹھا لو۔

﴿بھلانے والے فقر سے پہلے کچھ کرلو﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: بَادِرُوْا بِالْأَعْمَالِ سَبْعاً، هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْراً مُنْسِياً، أَوْغِنىً مُطْغِياً، أَوْمَرَضاً مُفْسِداً، أَوْهَرَماً مُفْنِداً أَوْمَوْتاً مُجْهِزاً، أَوِ الدَّجَّال فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَر، أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهىٰ وَأَمَرُّ! (رواه الترمذی. وقال: حديث حسن)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اعمال کو انجام دینے میں سات چیزوں سے سبقت کر جاؤ۔ یعنی آگے جو سات باتیں بیان کی جارہی ہیں، وہ پیش آویں؛ اس سے پہلے اعمال صالحہ کرلو اور اس موقعہ کو غنیمت سمجھ لو۔

﴿هَلْ تَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا فَقْراً مُنْسِياً﴾ کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلا دینے والا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ابھی تم کو موقعہ دیا ہے، وسعت دی ہے، ضرورتیں آسانی سے پوری ہورہی ہیں، راحت سے زندگی گذر رہی ہے۔ اب کیا تم اس حالت کا انتظار کرتے ہو اور یہ سوچ رہے ہو کہ ابھی تو ذرا اور عیش وعشرت کرلیں، ابھی ہی تو موقعہ ہے، آئندہ نیک اعمال کرلیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وسعت اور راحت کے دن ہاتھ سے نکل جائیں اور فقر وفاقہ پیش آجائے، ایسا فقر وفاقہ؛ جو تمہیں اپنے حال سے بھی بے خبر کردے۔ یعنی آدمی کبھی ایسی پریشانی میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ اس کو اپنے حال کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ تو بھلانے والے فقر کے آنے سے پہلے کچھ کرلو۔ ایسے حالات پیش آسکتے ہیں، کیا تم اس کا انتظار کرتے ہو؟ اس وقت تم اللہ کو یاد کروگے؟ کیا اس وقت نیکی کے کام کروگے؟ جب ابھی نہیں کررہے ہو؛ تو اُس وقت کیا کرسکوگے؟ اُس وقت تو بطریقۂ اولیٰ نہیں کرسکوگے۔ اس لئے اس موقعہ کو غنیمت سمجھو۔

﴿سرکش مالداری﴾

﴿أَوُ غِنىً مُطُغِياً ﴾ یا کیا تم انتظار کرتے ہو ایسی مالداری کا جو آدمی کو سرکشی میں ڈال دے۔ یعنی ابھی آپ کو اللہ تعالیٰ نے مالداری تو دی ہے لیکن کم درجہ کی ہے، اب آپ یوں سوچ رہے ہیں کہ ذرا اور وسعت ہو جائے گی اور مال آجائے گا تو اس وقت نیک اعمال کا اہتمام کریں گے، اور اطمینان سے بیٹھ کر اللہ اللہ کریں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مال کی کثرت اور غنیٰ کی زیادتی تمہیں سرکشی میں مبتلا کر دے، ابھی تمہارے اندر وہ بات نہیں ہے اِس وقت تم جو اعمال انجام دے سکتے ہو؛ اُس وقت انجام نہیں دے سکو گے۔

﴿کہیں بیماری میں مبتلا نہ ہو جاؤ﴾

﴿أَوُ مَرَضاً مُفُسِداً﴾ یا پھر کیا تم انتظار کرتے ہو ایسی بیماری کا جو تمہارے جسم کو خراب کرنے والی ہو۔ یعنی ابھی اللہ تعالیٰ نے صحت دے رکھی ہے، تندرستی ہے اور اچھی طرح اطمینان وسکون کے ساتھ زندگی گذر رہی ہے۔ کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ عیش وعشرت میں تھوڑے دن اور گذار لیں، پھر بعد میں نیک اعمال کا اہتمام کر لیں گے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو صحت دی ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے، بیماری میں مبتلا ہو جاؤ، اور بیماری بھی ایسی ہو جو تمہارے بدن کو بالکل بیکار کر دے اور تم کسی عمل کرنے کے قابل نہ رہو۔ جو لوگ بیمار ہیں ان سے پوچھو کہ وہ نماز بھی بڑی مشکل سے پڑھ پاتے ہیں، نیک اعمال کرنا ان کیلئے دشوار ہو گیا ہے۔ آدمی صحت اور تندرستی کی حالت میں جیسے اعمال انجام دے سکتا ہے؛ بیماری کی حالت میں ویسے اعمال نہیں کر سکتا۔ مثلاً گھٹنے درد کر رہے ہیں، ہاتھوں میں دم نہیں ہے، خود سے اٹھ نہیں سکتا، بیٹھ نہیں سکتا، اچھی طرح قیام، رکوع اور سجدہ نہیں کر سکتا، تلاوت کا

اہتمام نہیں کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسی بیماری میں مبتلا نہ ہو جاؤ کہ اس وقت تو وہ بھی نہ کرسکو؛ جو ابھی کر سکتے ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جو موقعہ دیا ہے؛ اس کو غنیمت سمجھو۔

﴿اور پھر اس کی نوبت نہیں آتی﴾

﴿أَوْهَرَمًا مُفْنِدًا﴾ یا پھر سٹھیا دینے والے بوڑھاپے کا انتظار کرتے ہو؟ یعنی ابھی تو اللہ تعالیٰ نے جوانی دی ہے، قوت دی ہے، جوانی میں اللہ تعالیٰ کے احکام بجالا سکتے ہو، اور اس کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو، بلند مراتب حاصل کر سکتے ہو، نیکیوں کا اہتمام کر سکتے ہو، اللہ تعالیٰ نے قویٰ کی سلامتی دی ہے۔ کیا ابھی یہ سوچ رہے ہو کہ جوانی کا زمانہ ہے، ابھی تو ہم نے دنیا دیکھی ہی کیا ہے، کچھ عیش وعشرت کے دن گذار لیں، اس کے بعد مسجد کا کونہ پکڑ لیں گے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی ایسا سوچتا ہے اور پھر اس کی نوبت نہیں آتی، اس لئے کہ آدمی ایسے بوڑھاپے میں مبتلا ہو جاتا ہے جو آدمی کے قویٰ کو بالکل بیکار بنا دیتا ہے، پھر وہ کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔ جب ابھی نہیں کرتے؛ تو اُس وقت کیا کرو گے؟ اُس وقت تو اور زیادہ نہیں کرسکو گے۔

﴿کیا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟﴾

﴿أَوْمَوْتًا مُجْهِزًا﴾ یا اچانک آنے والی موت کا تم انتظار کرتے ہو؟ یعنی ابھی اللہ تعالیٰ نے زندگی دی ہے، زندگی سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا اہتمام کر سکتے ہو، نیکیاں کر سکتے ہو، گناہوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہو۔ اس وقت جو کچھ ہوسکتا ہے؛ کرلو۔ موت کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں، آج کل تو اچانک کی موتیں زیادہ ہی ہوگئی ہیں۔ آدمی باہر نکلے تو پتہ نہیں کہ صحیح سلامت واپس پہنچتا بھی ہے یا نہیں۔ اس

لئے فرماتے ہیں کہ کیا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے کہ جو تم کو کسی بھی عمل کے قابل نہیں رکھے گی۔

کہیں دجال نہ آجائے

﴿أَوِ الدَّجَّال فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَر﴾ یا پھر دجال کے آنے انتظار ہے جو اَن دیکھی چیزوں میں سب سے بدترین چیز ہے۔ یعنی جو چیزیں ابھی تک دنیا میں پیش نہیں آئیں اور آئندہ جو حالات پیش آنے والے ہیں؛ ان میں دجال ایک بدترین چیز ہے۔اس زمانہ میں آدمی بڑے بڑے فتنوں میں مبتلا ہوگا۔تو دجال کے زمانہ کے مقابلہ میں ابھی خیر کا زمانہ ہے، اوراللہ تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے،اس وقت آپ کچھ کر سکتے ہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ دجال اچانک آجائے،اورتم کو جو کچھ نیکی اور خیر کا موقعہ ملا تھا؛ وہ بھی نہ مل پائے۔کیا اس کا انتظار ہے، اس لئے کچھ نہیں کررہے ہو؟

......بڑی بھیانک چیز ہے

﴿أَوِ السَّاعَةَ، فَالسَّاعَةُ أَدْهىٰ وَأَمَرُّ﴾ یا پھر قیامت کا انتظار ہے؟ اور قیامت تو بڑی بھیانک چیز ہے اور بڑا اکڑوا معاملہ ہے۔مطلب یہ ہے کہ کیا قیامت آئے گی اس وقت کچھ کروگے۔جیسے کہتے ہیں کہ ابھی کچھ نہیں کرتے ہو تو کیا مرنے کے بعد کروگے؟ ایسے ہی یہاں بھی کہا جارہا ہے کہ کیا جب قیامت آجائے گی اس وقت اعمال کروگے۔ابھی اللہ تعالیٰ نے موقعہ دیا ہے؛ اس سے فائدہ اٹھالو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا. مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد.

غزوۂ خیبر اور حضرت حیدر رضی اللہ عنہ

وعنه رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ يوم خيبر: لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ رَجُلًا يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ، يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلٰى يَدَيْهِ. قَالَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ: مَا أَحْبَبْتُ الْإِمَارَةَ إِلَّا يَوْمًا. فَتَسَاوَرْتُ لَهَا رَجَآءَ أَنْ أُدْعٰى لَهَا، فَدَعَا رسول الله ﷺ عليَّ بنَ أبي طالب رضی اللہ عنہ، فَأَعْطَاهَا إِيَّاهَا. وَقَالَ: اِمْشِ وَلَا تَلْتَفِتْ، حَتّٰى يَفْتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكَ. فَسَارَ عَلِيٌّ شَيْئًا، ثُمَّ وَقَفَ، وَلَمْ يَلْتَفِتْ، فَصَرَخَ؛ يا رسول الله! عَلٰى مَاذَا أُقَاتِلُ النَّاسَ؟ قَالَ: قَاتِلْهُمْ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رسول الله، فَإِذَا فَعَلُوْا ذَالِكَ، فَقَدْ مَنَعُوْا مِنْكَ دِمَائَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّهَا.

اس باب کا عنوان تھا نیکی کی طرف سبقت کرنا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مزاج اس سلسلے میں کیسا تھا، اس روایت کو لا کر اسی کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

غزوۂ خیبر ایک غزوہ ہے جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا۔ غزوہ یعنی وہ جنگ جس میں نبی کریم ﷺ نے بذاتِ خود شرکت فرمائی ہو۔ ۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی اور اس کے بعد ۷ھ میں محرم کے مہینہ میں غزوۂ خیبر پیش آیا۔ صلحِ حدیبیہ کے موقعہ پر اصل تو حضور اکرم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مکہ مکرمہ جا رہے تھے۔ اس وقت

آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں مکہ والوں کی طرف سے رکاوٹ نہ ڈالی جائے، اس لئے آپ کی کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ آپ کے ساتھ چلیں، لہٰذا مدینہ والوں سے بھی کہا اور دیہاتوں میں بھی اعلان کرایا۔ لیکن منافقین میں سے بعضوں نے بہانے کئے اور بعضوں نے تو ساتھ آنے سے صاف انکار کردیا۔ ان کو یہ ڈر تھا کہ کہیں مدبھیڑ نہ ہوجائے، اس لئے انہوں نے سوچا کہ اس میں پھنسنا نہیں ہے، لہٰذا بہانہ کردو۔

خیر! حضور اکرم ﷺ گئے اور مکہ والوں کی طرف سے رکاوٹ ہوئی، پھر اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آپ نے ان کے ساتھ صلح کی۔ جب صلح کر کے واپس لوٹ رہے تھے تو سورۂ فتح نازل ہوئی: ﴿اِنَّا فَتَحۡنَا لَکَ فَتۡحًا مُّبِیۡنًا﴾ اے نبی! ہم نے آپ کو کھلم کھلی فتح اور کامیابی عطا فرمائی۔ اسی سورت میں آگے ہے: ﴿وَعَدَکُمُ اللّٰہُ مَغَانِمَ کَثِیۡرَۃً تَاۡخُذُوۡنَہَا فَعَجَّلَ لَکُمۡ ہٰذِہٖ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس صلح کے بعد بہت سارے مالِ غنیمت کا تمہارے لئے وعدہ کیا ہے جو تم دشمن سے حاصل کروگے۔ اور اس میں بھی یہ خیبر وہ مالِ غنیمت ہے جو اللہ تعالیٰ تم کو فوری طور پر دینا چاہتے ہیں۔ مفسرین اور شراحِ حدیث نے لکھا ہے کہ اسی صلحِ حدیبیہ کے بدلہ میں انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فتحِ خیبر دی گئی تھی۔

خیبر مدینہ منورہ سے شام کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں باغات والا ایک بڑا علاقہ ہے، جہاں یہودی آباد تھے۔ جن یہودیوں کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا تھا وہ بھی وہاں آباد تھے، اور وہاں جانے کے بعد مسلمانوں کے خلاف مستقل سازشیں اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے، اور اس کے لئے کسی قسم کی کسر اور کوتاہی روا نہیں رکھتے تھے۔ لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنا ہی ان کا کام تھا۔ جب مکہ والوں سے

صلح کے بعد ان کی طرف سے اطمینان ہوا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ اب ان کی خبر لو۔ اور یہ کہا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیبر کے فتح ہونے کی بشارت سنائی گئی ہے، اس لئے منافقین بھی مالِ غنیمت میں حصہ لینے کے لئے ساتھ آنا چاہیں گے، لیکن ان کو ساتھ مت لینا، صرف انہیں لوگوں کو ساتھ لینا جو حدیبیہ میں ساتھ تھے۔ چنانچہ چودہ سو (۱۴۰۰) پیدل اور دو سو (۲۰۰) سوار؛ کل سولہ سو (۱۶۰۰) آدمیوں کا لشکر لے کر نبی کریم ﷺ خیبر روانہ ہوئے۔ رات کے وقت وہاں پہنچے۔ نبی کریم ﷺ کا دستور یہ تھا کہ حملہ کے ارادہ سے جب کسی بستی کے پاس پہنچتے تھے تو آپ صبح صادق کا انتظار فرماتے تھے۔ صبح صادق ہونے پر اگر وہاں سے اذان کی آواز آرہی ہوتی تو آپ حملہ نہیں کرتے تھے۔ اور اگر اذان کی آواز نہیں آرہی ہوتی تو حملہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی صبح کا انتظار کیا اور جب اذان کی آواز نہیں آئی؛ تو آپ نے حملہ کی تیاری شروع کردی۔ وہ لوگ کھیتی باڑی والے تھے، عادت کے مطابق صبح اپنے جانور اور کلھاڑے، پھاوڑے وغیرہ سامان لے کر کھیت جانے کے لئے نکلے تو باہر دیکھا کہ نبی کریم ﷺ لشکر کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں تو یہ لوگ پکارتے ہوئے بھاگے: ﴿وَاللهِ! مُحَمَّدٌ وَالْخَمِيسُ﴾ اللہ کی قسم! محمد اپنے لشکر کے ساتھ آگئے ہیں۔ قلعہ میں گھس گئے اور قلعہ کے دروازے بند کردئے۔

بہرحال! محاصرہ ہوا، کئی قلعے تھے، پہلا قلعہ تو آسانی سے فتح ہوا۔ دوسرے قلعہ کو قلعۂ قموص کہتے تھے۔ اس وقت نبی کریم ﷺ کو دردِ سر کی تکلیف تھی اس لئے خود آپ ﷺ لشکر کی کمان سنبھالنے کے لئے جا نہیں پاتے تھے، اس لئے آپ نے عَلَم صحابہ میں سے حضرت ابوبکر کو دیا کہ تم لشکر لے کر جاؤ، لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔ دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیا۔ اس طرح مختلف حضرات کو دیا، لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔

﴿زبانِ مبارک سے نکلنے والا سرٹیفکیٹ﴾

ایک رات نبی کریم ﷺ نے یہ اعلان فرمایا: ﴿لَأُعْطِيَنَّ هٰذِهِ الرَّايَةَ رَجُلاً يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ، يَفْتَحُ اللّٰهُ عَلىٰ يَدَيْهِ﴾ کل میں یہ جھنڈا ایک ایسے آدمی کے حوالے کروں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر قلعہ کو فتح کر دیں گے، چونکہ آپ ﷺ کے اس ارشاد میں دو باتیں تھیں۔ ایک تو قلعہ کا فتح ہونا؛ جو مسلمانوں کی کامیابی کی چیز ہے، اور اس سے بڑھ کر نیکی کا کام اور کیا ہوگا، لہٰذا جو اس میں آگے بڑھ کر حصہ لے گا؛ اس کے لئے ثواب کے ڈھیر ہوں گے۔ اور دوسری بات آپ ﷺ نے اس ارشاد میں یہ فرمائی کہ وہ آدمی اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے۔

یوں تو تمام صحابہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھنے والے تھے، کسی کے متعلق کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا لیکن جب اللہ کا رسول اس کے متعلق گواہی دے رہا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو گویا اللہ کے رسول ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلنے والا یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کیلئے صحابہ کے دلوں میں تڑپ پیدا ہوئی۔ یہ آگے بڑھنے کا جذبہ ہے۔ پھر تو پوری رات صحابہ نے ایسی گذاری کہ اسی بات کے چرچے ہوتے رہے کہ دیکھو! کل کس کے نام کی لاٹری نکلتی ہے۔ ہر ایک دل میں تمنا کرتا تھا اور دعا کرتا تھا، اور دل سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ تھا کہ کاش! یہ سعادت مجھے نصیب ہو جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ﴿مَا أَحْبَبْتُ الْإِمَارَةَ إِلَّا يَوْمًا﴾ سرداری اور امارت کو اس دن کے علاوہ کسی دن میں نے پسند نہیں کیا۔ سرداری بڑی ذمہ داری کا کام ہے، اور حضور ﷺ نے اس کے متعلق بڑی تاکید فرمائی ہے۔ اور اگر کوئی آدمی سرداری مانگے گا، اور اس کو سرداری

ملے گی؛ تو پھر اللہ تعالیٰ اس کے حوالے کر دیں گے، اور کوئی مدد نہیں ہوگی۔ اگر بغیر مانگے مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی مدد بھی ہوتی ہے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: سوائے اس دن کے زندگی میں کبھی مَیں نے سرداری کی تمنا نہیں کی۔ اور وہ بھی سرداری کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ یہ فضیلت حاصل ہونے والی تھی ﴿فَتَسَاوَرْتُ لَهَا رَجَآءَ﴾ مَیں نے بھی اس کیلئے اپنے آپ کو آگے بڑھایا۔ ﴿تَسَاوُر﴾ کا معنیٰ آگے بڑھنا اور سر اونچا کرنا۔

﴿اللہ کرے! ایسی دوا ہمیں بھی مل جاوے﴾

روایتوں میں آتا ہے کہ صبح کے وقت صحابہ چکر لگا رہے تھے، آنٹے پھیرے مار رہے تھے۔ کبھی کسی بڑے کی طرف سے کچھ ملنے والا ہو تو ہر ایک آدمی سر اونچا کر کے دیکھتا ہے کہ میری طرف اشارہ ہو جائے تو میرا کام بن جائے، اس لئے ہر ایک سر اونچا کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مَیں نظر نہ آؤں اور دوسرے کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اس لئے مَیں بھی سامنے آجاؤں تو اچھا ہے، تاکہ کل کو کہیں یوں نہ ہو کہ تم کو ڈھونڈا تھا لیکن تم ملے نہیں تھے، اس لئے فلاں کو بلا لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے مَیں نے بھی اپنے آپ کو اس امید پر پیش کیا کہ مَیں بلا لیا جاؤں۔ لیکن جن کو بلانا مقصود تھا؛ وہ وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ علی کہاں ہیں؟ لوگوں نے کہا: ان کی آنکھوں میں درد ہے، آشوبِ چشم کی شکایت ہے، آنکھیں آئی ہوئی ہیں، اس لئے وہ تو اپنے خیمہ میں آرام کر رہے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو بلا لاؤ۔ ان کو بلوایا گیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں میں ڈالا۔ حضرت علی فرماتے ہیں: اس کے بعد زندگی بھر کبھی میری آنکھوں میں تکلیف نہیں ہوئی۔ اللہ کرے! ایسی دوا ہمیں بھی مل جاوے۔

بہر حال! حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلوایا گیا اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھنڈا عنایت فرمایا۔ یہ جھنڈا لینا کوئی آسان کام نہیں تھا، بلکہ اپنی جان کی قربانی دینے کے لئے پیش کرنا تھا، لیکن تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جان کی قربانی دینے کے لئے بھی اسی خیر کی امید پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ جھنڈا دے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی: ﴿اِمْشِ وَلَا تَلْتَفِتْ، حَتّٰی یَفْتَحَ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْکَ﴾ آگے بڑھو، اِدھر اُدھر مت دیکھو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ پر قلعہ کو فتح کر دے۔

﴿اطاعتِ صحابہ کی ایک مثال﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: حضرت علی رضی اللہ عنہ جھنڈا لے کر کچھ آگے بڑھے، اور یاد آیا کہ کچھ پوچھنا ہے۔ اب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا تھا: ﴿وَلَا تَلْتَفِتْ﴾ دائیں بائیں مت دیکھو۔ اب یاد آیا ہے اور پوچھنا ہے تو ایسا نہیں کیا کہ پیچھے گھوم گئے، بلکہ جھنڈا پکڑ کر اسی ہیئت پر کھڑے ہو گئے، نہ دائیں دیکھ رہے ہیں، نہ بائیں دیکھ رہے ہیں، بلکہ وہیں سے زور سے آواز لگا کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ رہے ہیں۔ یہ نہیں سوچا کہ پوچھنا ہے تو چلو وہاں جا کر پوچھ لیتے ہیں۔ ایسا نہیں کیا۔ اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی تھی ﴿وَلَا تَلْتَفِتْ﴾ اگر واپس جائیں گے تو اس حکم کے خلاف ہو جائے گا اور یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہم اور آپ ہوتے تو سوچتے کہ میرا مقصود اللہ کے رسول کا حکم توڑنا تھوڑا ہی ہے، بلکہ ایک بات کی صفائی کرنا مقصود ہے، ورنہ آگے بڑھ کر جا رہے ہیں۔ لیکن صحابہ کرام کے یہاں ظاہری طور پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا تھا۔

﴿ایک اور مثال﴾

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد کی

طرف آرہے تھے، جہاں جوتے نکالے جاتے ہیں ابھی وہاں تک ہی پہنچے تھے اوران کے کان میں آواز آئی: ﴿اِجۡلِسُوۡا﴾ بیٹھ جاؤ۔ دراصل جواندر تھے ان کے لئے یہ کہا گیا تھا لیکن یہ آواز وہاں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے کان میں پہنچی، تو وہ اندر نہیں آئے، بلکہ وہیں بیٹھ گئے۔ انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اندر والوں کو کہا گیا ہے۔ مَیں اورآپ ہوتے تو یہی سوچتے۔ وہاں تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد کان میں پڑا؛ تو پھر اینچ پینچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

﴿جنگ کی بنیاد﴾

یہاں پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ وہیں اسی طرح کھڑے ہوگئے، نہ دائیں بائیں دیکھ رہے ہیں، نہ پیچھے دیکھ رہے ہیں، اب حضور تو دور ہو چکے تھے، اور پوچھنا ہے تو کیسے پوچھیں؟ اس لئے زور سے چلّا کر پوچھا: ﴿یارسول اللہ! عَلیٰ مَاذَا أُقَاتِلُ النَّاسَ؟﴾ اے اللہ کے رسول! مَیں ان سے کس بات پر اور کس بنیاد پر لڑوں اور جنگ کروں؟ ﴿قَالَ: قَاتِلۡهُمۡ حَتّٰی یَشۡهَدُوۡا أَن لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللہ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسول اللہ﴾ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے قائل ہو جائیں۔

﴿فَاِذَا فَعَلُوۡا ذَالِکَ، فَقَدۡ مَنَعُوۡا مِنۡکَ دِمَائَهُمۡ وَأَمۡوَالَهُمۡ اِلَّا بِحَقِّهَا﴾ جب وہ توحید و رسالت کا اقرار کرلیں گے اور ایمان لے آئیں گے؛ تو ان کی جان اور مال محفوظ ہوجائیں گے مگر اسی کلمہ کے حق کی وجہ سے۔ یعنی جہاں خود اسلام ہی جان یا مال لینے کا حق دیتا ہو؛ وہاں البتہ تعرض کیا جائے گا۔ مثلاً زکوٰۃ فرض ہونے کے باوجود کوئی آدمی ادا نہیں کرتا تو اس سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ یا کسی نے کسی کو قتل کیا تو مقتول کے بدلہ میں اس کی جان لی جائے گی۔ جہاں اسلام حکم دیتا ہے وہاں جان و مال لیا جائے گا؛ ورنہ ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔

﴿وَحِسَابُھُمْ عَلیٰ اللّٰہِ﴾ زبان سے اقرار کرنے کے بعد دل میں کسی چیز کے اندر خیانت کریں گے تو ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ دیکھو! حضور اکرم ﷺ کی طرف سے اعلان کے نتیجہ میں حضراتِ صحابہ کے دل میں آگے بڑھنے کے کیسے جذبات تھے۔

اللّٰہ تعالیٰ ھم سب کو توفیق عطا فرمائے

دعا

سُبُحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ

کَمَاتُحِبُّ وَتَرْضیٰ بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضیٰ

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔اے اللہ! تو ہمیں نیکی کی طرف زیادہ سے زیادہ سبقت کرنے کی اور اس کی طرف آگے بڑھنے کی توفیق عطا فرما اے اللہ! نیکی کے کاموں میں ٹال مٹول کا جو مزاج ہے، اس مزاج کی اصلاح فرما کر عافیت کے ساتھ نیکی کے کاموں کی طرف سبقت کرنے اور آگے بڑھنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات اور عمل کے ذریعہ سے جو طریقے ہمارے لئے پسند فرمائے ہیں، ان طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق نصیب فرما۔اے اللہ! نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور آپ ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔اے اللہ! ہم میں جو بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ

عطا فرما۔ جن بیماروں نے تندرستی کے لئے دعاؤں کی درخواست کی ہے ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو لوگ قید و بند میں محبوس ہیں خاص کر عنقریب جن کے فیصلے آنے والے ہیں، اے اللہ! عافیت کے ساتھ ان کی رہائی کا سامان پیدا فرما اور رہائی کا فیصلہ فرما۔ ہماری دعاؤں کو نبی کریم ﷺ کے صدقے اور طفیل میں قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

مجاہدہ

مجلس ﴿۱﴾

اقتباس

اللہ تبارک وتعالیٰ کے دشمن- چاہے وہ مشرکین ہوں یا ملحدین ہوں- ان کے مقابلہ میں جو کوشش کی جاتی ہے- چاہے تلوار کے ذریعہ سے ہو، یا زبان کے ذریعہ سے ہو، یا قلم کے ذریعہ سے ہو- اس کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے

اپنے نفس کے مقابلہ میں جو کوشش اور محنت کی جاتی ہے، اپنے اخلاق واعمال کو درست کرنے کے لئے اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچانے کے لئے جو محنت اور کوشش کی جاتی ہے اس کو مجاہدہ کہا جاتا ہے

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: جو آدمی نفس وشیطان کے سامنے کمزور پڑتا ہے، تو یہ دونوں اسی کے سامنے شیر بنتے ہیں، اور اگر کوئی آدمی ان کے مقابلہ کے لئے ڈٹ جائے، اور طے کرلے کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے، دل پر چاہے کیسے ہی آرے کیوں نہ چلنے لگیں؛ مَیں نفس کی خواہش پر چلنے والا نہیں ہوں تو پھر نفس وشیطان دونوں اس کے مقابلہ میں بھیگی بلّی بن جاتے ہیں

پھر دھیرے دھیرے ان کی طرف سے مقابلہ میں ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اوپر جم جاتا ہے

پھر جیسا ہم نے نفس کو گناہوں کا، لذات اور خواہشات کا عادی بنایا تھا اور اسی میں اس کو مزہ اور لطف آتا تھا، جب مقابلہ کرکے اور اس کے تقاضوں کو دبا کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اس کو لگائیں گے؛ تو پھر اس کو اسی میں لطف آئے گا اور لذت محسوس ہوگی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿المجاهدة ۱﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد

فاعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (العنکبوت،پ۲۱)

وقال تعالیٰ: وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْن (النحل،پ۱۴)

وقال تعالیٰ: وَاذْكُرِاسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلاً (المزمل،پ۲۹)

﴿جہاد اور مجاہدہ میں فرق﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں ایک باب قائم کیا ہے: ﴿باب فی المجاھدۃ﴾ مجاہدہ کے سلسلہ میں تفصیل بیان فرمارہے ہیں۔

مجاہدہ عربی زبان کا لفظ ہے جو جُھدٌ سے بنا ہے ﴿جَاهَدَ، يُجَاهِدُ، مُجَاهَدَةً، وجِهَادًا﴾ باب مفاعلہ سے آتا ہے۔ جہد ومشقت، محنت وکوشش اور تکلیف کے لئے بولا جاتا ہے، مجاہدہ کا معنٰی ہے محنت اور کوشش کرنا۔ جہاد بھی اسی سے بنا ہے، مجاہدہ بھی اسی سے بنا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کے دشمن - چاہے وہ مشرکین ہوں یا ملحدین ہوں - ان کے مقابلہ میں جو کوشش کی جاتی ہے - چاہے تلوار کے ذریعہ سے ہو، یا زبان کے ذریعہ سے ہو، یا قلم کے

ذریعہ سے ہو-اس کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اوراپنے نفس کے مقابلہ میں جو کوشش اور محنت کی جاتی ہے، اپنے اخلاق واعمال کو درست کرنے کے لئے اوراپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچانے کے لئے جو محنت اورکوشش کی جاتی ہے اس کو مجاہدہ کہا جاتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب اسی کی اہمیت کو بتلانے کے واسطے قائم کیا ہے کہ مجاہدہ کتنا اہم اورضروری ہے۔

﴿خواہشات کا نہ ختم ہونے والا ایک سلسلہ﴾

نفس کو اللہ تعالیٰ نے اس انداز سے بنایا ہے کہ وہ ہمیشہ لذت اورراحت کا خواہاں رہتا ہے، اس کو تو لذت مطلوب ہے، آپ نفس کو جن چیزوں کا عادی بنائیں گے، انہی چیزوں میں وہ لذت وراحت محسوس کرے گا۔ اس کے تقاضوں اورخواہشات کو آدمی کتنا ہی پورا کرے اوران تقاضوں اورخواہشات پر کیسا ہی عمل کرتا رہے؛ پھر بھی اس کی کوئی انتہا نہیں ہے زندگی بھر وہ اپنے نفس کے تقاضوں کو پورا کرتا رہے؛ تب بھی اس کے تقاضہ پورے ہونے والے نہیں ہیں۔ ایک تقاضہ پورا ہوا نہیں کہ دوسرا اس کی طرف سے آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی طرف سے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک قوت عطا فرمائی ہے جو اس کو عمل کی طرف ابھارتی ہے، اسی کو نفس سے تعبیر کرتے ہیں۔ اورنفس کا حال ایسا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی چیزوں کی طرف آگے بڑھتا ہے جس میں اس کو لذت اورراحت محسوس ہو۔ جس میں اس کو مزہ اورلطف آئے؛ ایسی چیزوں کو وہ ہمیشہ پسند کرتا ہے۔ اورجیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ آپ اس کی لذتوں اورراحتوں کو پورا کرتے رہیے، اوراس کے کہنے کے مطابق کیسا ہی چلتے رہیے؛ پھر بھی

اس کے مطالبے ختم ہونے والے نہیں ہیں، اس کے مطالبوں کا سلسلہ تو جاری رہتا ہے۔

……پھر آخر زنا بالجبر کیوں؟

آج کل مغربی ممالک واقوام کے یہاں ایک چیز خاص طور پر کہی جاتی ہے، جو اُن کے یہاں اصولِ موضوعہ کے قبیل سے ہے۔ ''ہیومن رائٹس'' (Human Rights) یعنی انسانی حقوق۔ انہی انسانی حقوق میں سے ایک چیز وہ یہ کہتے ہیں کہ آدمی کے اوپر کسی قسم کی پابندی نہیں لگنی چاہیے۔ آدمی اپنی ذات کے معاملہ میں آزاد ہو۔ گویا وہ اس طرح کی آزادی کے قائل ہیں کہ اس کے اوپر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے، نہ مذہب کے نام سے اور نہ معاشرے کے نام سے اور نہ اخلاق کے نام سے اور نہ قانون کے نام سے۔ بلکہ اس کی مرضی پر اس کو چھوڑ دیا جائے، وہ جس طرح چاہے اپنی مرضی کو پوری کر سکتا ہے۔ یہ ایک چیز ان کے یہاں بہت زیادہ عام ہوتی جارہی ہے۔ اس کو وہ حضرات بہت اہمیت دیتے ہیں اور اسی کے نتیجہ میں وہاں زنا بہت عام ہے۔ کوئی مرد یا عورت اپنی خواہش پوری کرنا چاہے، اور اپنی مرضی کے مطابق کسی کے ساتھ بھی تعلق قائم کرنا چاہے؛ تو وہاں قانونی طور پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ گویا زنا کی ان کو کھلی چھوٹ دی گئی ہے۔ اور اسی کو وہ ایک طرح کی آزادی سمجھتے ہیں اور اسی کے متعلق ان کا خیال یہ ہے کہ اس طریقہ سے انسانی حقوق کا تحفظ ہے۔ حالانکہ یہ بھی نفسانی خواہش کے پورا کرنے کی ایک راہ ہے؛ جو اُن کے لئے ہموار کی گئی ہے۔ لیکن جیسا کہ مَیں نے عرض کیا کہ اس کی خواہشیں کتنی بھی پوری کی جائیں، وہ ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

دیکھئے! وہاں اتنی زیادہ آزادی ہے، اس کے باوجود اخباروں میں ہم پڑھتے ہیں کہ زنا بالجبر ([illegible]) جس کثرت سے امریکہ ویورپ میں پایا جاتا ہے؛ اتنا ان ممالک میں

-جہاں پابندی اور قانون لگے ہوئے ہیں-نہیں ہے۔آخر وہاں جب قانونی طور پر مرد کو بھی اور عورت کو بھی اتنی آزادی دے دی گئی کہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہیں؛ چلیں، اپنی خواہش کو جس طرح چاہیں؛ پوری کریں پھر آخر یہ زنا بالجبر کے واقعات کیوں پیش آتے ہیں؟

مغربی تہذیب یا تعذیب

حقیقت یہ ہے کہ قانونی رکاوٹیں ساری ختم کر دی جانے کے باوجود-جب مرد اور عورت کو اس بات کی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ اپنی خواہشات جس طرح چاہیں پوری کریں-یہ جو واقعات پیش آتے ہیں؛ اس کی فلسفیانہ توجیہ کرتے ہوئے یہی حضرات یہ بات خاص طور پر لکھتے ہیں کہ قانون کی طرف سے دی گئی یہ آزادی اور معاشرے کی طرف سے دی گئی اس چھوٹ کے نتیجے میں اپنی خواہشات تو پوری کرتے رہتے ہیں، لیکن اس کے بعد اب ان کا نفس آگے یوں چاہتا ہے کہ زنا بالجبر کا بھی لطف حاصل کیا جائے۔ گویا وہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ بھی لطف اٹھانے کا ایک انداز ہے۔آج تک آزادی کے ساتھ تو زنا کرتے رہے، اب کسی پر زبردستی کر کے یہ کام کیا جائے تو اس میں کیا لطف آتا ہے؟ اس میں کیسا مزہ ہے؟ وہ بھی حاصل کرنا چاہیے۔ اب ان کا نفس ان سے یہ مطالبہ کرتا ہے تو وہ اس انداز سے چلتے ہیں۔ گویا نفس کی خواہشوں اور تقاضوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور قیامت تک ختم نہیں ہوگا۔ اور آپ نفس کے تقاضوں کو جتنا پورا کرتے رہیں گے؛ اتنی ہی بے چینی بڑھتی جائے گی۔ نفس کی خواہشات کو پورا کرنے کے نتیجے میں بے چینی میں کمی ہونے والی نہیں ہے۔

﴿یہ بے چینی کیوں؟﴾

یہی مغربی ممالک جہاں دولت کی ریل پیل ہے، پیسوں کی کوئی کمی نہیں، اسباب و سائل وہاں موجود ہیں؛اس کے باوجود ان حضرات سے اگر یوں پوچھا جائے کہ سکون و اطمینان ہے؟ توان کا جواب ہوگا کہ سکون واطمینان حاصل نہیں۔ بلکہ ان میں سے اکثروں کا یہ حال ہے کہ وہ نیند کے واسطے گولیاں استعمال کرتے ہیں،ٹیبلیٹ اور گولی نہ کھالیں؛ وہاں تک ان کو نیند نہیں آتی۔ آخر سارے اسبابِ راحت موجود ہونے کے باوجود ایسا کیوں؟ اور ان کے لئے نفسانی خواہشات پوری کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، اس کے باوجود یہ بے چینی کیوں؟

لہٰذا ماننا پڑے گا کہ حقیقت میں چین اور سکون اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہی ہے:﴿أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْب (الرعد، پ۱۳)﴾ اللہ تعالیٰ کی یاد سے ہی دلوں کو اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے۔نفسانی خواہشوں کے پیچھے آدمی کتنا ہی چلتا رہے، اوراس کے تقاضوں کو کیسے ہی پورا کرتا رہے؛اس میں وہ کبھی بھی سکھ اور چین نہیں پاسکتا۔

﴿نفس اور شیطان کی ایک خاصیت﴾

مجاہدہ کا باب قائم کرکے ہمیں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اوراپنے اخلاق واعمال کی درستگی میں؛اپنے نفس کے مقابلہ میں ہمیں جو محنت اورمشقت لاحق ہو؛اس کو برداشت کرنا چاہیے اورکوشش میں لگے رہنا چاہیے،اسی کوشش اور محنت کا نام ’’مجاہدہ‘‘ رکھا گیا ہے۔

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: جوآدمی نفس وشیطان کے سامنے کمزور پڑتا ہے، یہ دونوں اسی کے سامنے شیر بنتے ہیں۔اوراگرکوئی آدمی ان کے مقابلہ کے لئے ڈٹ

جائے، اور طے کرلے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، دل پر چاہے کیسے ہی آرے کیوں نہ چلنے لگیں مَیں نفس کی خواہش پر چلنے والا نہیں ہوں، اس کے تقاضے کو پورا کرنے والا نہیں ہوں؛ تو پھر نفس وشیطان دونوں اس کے مقابلہ میں بھیگی بلّی بن جاتے ہیں، پھر دھیرے دھیرے ان کی طرف سے مقابلہ میں ڈھیلا پن پیدا ہوتا ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے اوپر جم جاتا ہے، پھر جیسا ہم نے نفس کو گناہوں کا، لذات اور خواہشات کا عادی بنایا تھا اور اسی میں اس کو مزہ اور لطف آتا تھا، جب مقابلہ کر کے اور اس کے تقاضوں کو دبا کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں اس کو لگائیں گے؛ تو پھر اس کو اسی میں لطف آئے گا اور لذت محسوس ہوگی۔

﴿نفس کو سمجھنے کے لئے ایک مثال﴾

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ – جو بڑے بزرگ گذرے ہیں ان – کا ''قصیدہ بردہ'' کے نام سے ایک قصیدہ ہے، جس میں نبی کریم ﷺ کی تعریف اور اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اس قصیدے کو ترتیب دینے کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا اور آپ کی خدمت میں یہ قصیدہ پیش کیا؛ تو آپ ﷺ نے ان کو ایک چادر عنایت فرمائی، اسی وجہ سے اس کا نام ''قصیدہ بردہ'' ہے۔ عام طور پر ایک درود آتا ہے، فضائل درود شریف میں بھی ہے: ؎

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِماً أَبَداً ❁ عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

وہ بھی اسی قصیدے کا ایک شعر ہے۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائلِ درود شریف میں واقعات کے بعد کثرت سے اس شعر کو ذکر کیا ہے۔

بہر حال اسی ''قصیدہ بردہ'' میں نفس کی کیفیت اور حالت کو بیان کرنے کے لئے یہ

شعر بڑا عمدہ بیان فرمایا ہے:

اَلنَّفسُ کَالطِّفلِ اِنْ تُھمِلْہُ شَبَّ ❁ عَلیٰ حُبِّ الرَّضَاعِ وَاِنْ تُفطِمْہُ یَنفَطِمِ

نفس کا حال بچے کی طرح ہے، اگر ہم اس کو چھوڑ دیں گے، تو وہ دودھ پینے کی محبت کے معاملہ میں اور زیادہ تیز ہوگا، آگے بڑھے گا اور زیادہ قوت اختیار کرے گا۔ اور اگر اس کو زبردستی کر کے چھڑا دیں گے؛ تو وہ دودھ چھوڑ دے گا۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی غذا دودھ ہی ہوتی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کی خلقت اس انداز کی بنائی کہ ایک زمانہ تک دودھ پینے کے بعد اس کو خوراک پر لایا جاتا ہے دودھ کے لئے بھی شریعت نے مدتِ رضاعت دو سال مقرر کی ہے۔ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مدتِ رضاعت کے بعد بچے کو دودھ پلانا جائز نہیں ہے۔ (درمختار ص ۲۱۱، ج ۳۔ دارالفکر) اس لئے کہ دودھ انسان کا ایک جزو ہے، اور انسان کے جزو کو اسی قدر استعمال کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے؛ جتنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہے۔ اور رضاعت کی مدت دو یا ڈھائی سال (علیٰ اختلاف الائمہ) مقرر کی گئی ہے، اس سے زیادہ ماں دودھ نہیں پلاسکتی؛ ورنہ گنہ گار ہوگی

لیکن بچہ دودھ کا عادی ہوتا ہے اور جب دودھ چھڑانے کا وقت آتا ہے، تو وہ بہت زیادہ چلاتا ہے، روتا اور شور مچاتا ہے، بے چین رہتا ہے۔ نہ خود سوتا ہے، نہ ماں باپ کو سونے دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کون ماں باپ ہوں گے جن کو اپنے بچے کے ساتھ محبت نہ ہو۔ لیکن وہ اس محبت کے تقاضے کو سامنے رکھ کر اگر یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے جائیں گے تو اس کو بڑی تکلیف ہوگی، لہٰذا اس کی اس تکلیف کا اور شور مچانے اور چیخ وپکار کا لحاظ کر کے اگر دودھ چھڑانے کی کوشش نہیں کریں گے؛ تو ظاہر بات ہے کہ جوان ہونے تک اس کا یہی سلسلہ

جاری رہے گا، اور وہ کبھی دودھ نہیں چھوڑے گا۔ اور جب تک دودھ نہیں چھوڑے گا وہاں تک غذا کا عادی بننے والا نہیں ہے۔ اس کے سامنے کیسی ہی غذا پیش کی جائے لیکن وہ اس کو استعمال نہیں کرے گا؛ جب تک کہ دودھ چھڑایا نہ جائے۔ اس لئے ماں باپ اپنی اس محبت کے باوجود- جو بچے کے ساتھ ہے- کوشش یہی کرتے ہیں کہ وہ دودھ چھوڑ دے، چاہے وہ کتنی ہی چیخ وپکار کیوں نہ کرے۔ اگر وہ شور مچائے، خود بھی بیدار رہے، ماں باپ کو بھی بیدار رکھے، سب کچھ ہوتا رہے؛ پھر بھی وہ ایسا نہیں سوچتے کہ اس کا دودھ نہ چھڑایا جائے، اس کو تکلیف ہوجائے گی اور جب تک وہ دودھ نہیں چھوڑے گا وہاں تک غذا پر نہیں آئے گا۔ اور وہ دودھ اس وجہ سے نہیں چھوڑ رہا ہے کہ اس کو دودھ میں لذت اور مزہ آرہا ہے۔ لیکن اس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کا دودھ چھڑا کر اس کے لئے غذاؤں کا سلسلہ شروع کرنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ دودھ میں تو ایک ہی قسم کی لذت ہے، لیکن اس کے بعد جب غذائیں کھانا سیکھ لے گا اور غذاؤں پر اس کا گذارہ ہوجائے گا؛ تو عجیب وغریب قسم کی لذتیں اور قسم قسم کے ذائقے حاصل ہوں گے۔ لیکن چونکہ وہ ذائقے ابھی اس کے سامنے آئے نہیں ہیں، اس لئے یوں سمجھئے کہ وہ کنویں کا مینڈک ہے، اور ایک محدود دائرہ میں ہے، اسی لئے شور مچارہا ہے کہ مجھ سے میری لذت چھینی جارہی ہے۔ حالانکہ ایک لذت چھین کر اس کو سینکڑوں لذتیں دئے جانے کے اسباب مہیا کئے جارہے ہیں۔ یہی حال نفس کا ہے کہ گناہوں کا عادی ہوجانے کی وجہ سے آپ اس سے گناہ چھڑانے کی بات کریں گے؛ تو اس کو بڑا شاق گذرے گا۔

اگر نفس کو بدزبانی کے اندر؛ یا غیبت کے اندر مزہ آتا ہے کہ کسی موقعہ پر کسی مجلس میں کسی کا تذکرہ آگیا تو خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بدنگاہی کی عادت

پڑ گئی تو اس میں بھی بہت لطف آتا ہے۔ اگر رشوت لینے کی عادت ہے تو اس میں بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ اگر سود کھانے کی عادت ہے تو اس میں بھی بڑا اچھا لگتا ہے۔ جس جس گناہ کا وہ عادی بنا ہوا ہے، اس میں وہ بڑا لطف محسوس کرتا ہے۔ اور جب وہ گناہ چھڑانے کوشش کی جاتی ہے، تو اس کو بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے، اس لئے ان بری عادتوں کو چھوڑنے سے انکار کرتا ہے لیکن آدمی کو چاہیے کہ اس کے مقابلہ پر خوب ڈٹ جائے اور سوچے کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے ہمیں یہ کام نہیں کرنے ہیں تو پھر ان شاء اللہ اس کا یہ مطالبہ خود ہی ڈھیلا ہو جائے گا اور پھر دھیرے دھیرے اس مطالبے کو چھوڑ کر وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر راضی ہو جائے گا

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں ❁ اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم اپنے دل کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے قابل بنانا چاہتے ہیں، تو ہمیں جن گناہوں کی عادتیں پڑی ہوئی ہیں، ذرا تکلیف اٹھا کر؛ محنت اور کوشش کر کے گناہوں کی ان عادتوں کو چھوڑنا پڑے گا۔ اور ایک مرتبہ گناہوں کی عادتیں اگر ہم نے چھوڑ دیں اور نفس کا مقابلہ کر لیا اور اس کے مقابلہ میں ڈٹ گئے؛ تو پھر ان شاء اللہ بہت ہی آسانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کر سکیں گے۔

نفس عادت سے مجبور

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ نفس کو تو لذت اور مزہ چاہیے، وہ تو لذت اور مزہ کا خواہاں ہے، لیکن اس کے یہاں لذت اور مزہ کی کوئی شکل متعین نہیں ہے۔ ابھی چونکہ اس کو گناہوں کا عادی بنا رکھا ہے، اس لئے اس کو گناہوں میں لذت ومزہ آرہا ہے، جب ہم اس کا مقابلہ کر کے اور اس پر محنت اور کوشش کر کے گناہوں کی عادتیں

چھڑائیں گے، اور اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا عادی بنائیں گے؛ تو اسی میں وہ لذت محسوس کرے گا اور اسی میں اس کو مزہ آئے گا۔ جیسا ہم اس کو عادی بنائیں گے؛ ویسا اس کو مزہ آئے گا۔ لذت اور مزہ تو اس کی عادت پر موقوف ہے، چونکہ ہم نے اس کی عادت بگاڑ رکھی ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ کچھ محنت اور کوشش کر کے بگڑی ہوئی عادتوں کو سدھارا جائے اور اس کی اصلاح کی جائے۔ اور اس کا آسان راستہ یہی ہے کہ ذرا تکلیف اٹھا کر، محنت اور کوشش کر کے اس کے مقابلہ میں ڈٹ جائے، چاہے دل پر کیسے ہی آرے چلیں اسی کو ''مجاہدہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

بدنگاہی سے بچنے کی آسان تدبیر

مثلاً کوئی عورت گذر رہی ہے اور دل تقاضہ کر رہا ہے کہ اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ؛ اس وقت مضبوطی کے ساتھ جم جاؤ، اور سوچو کہ کچھ بھی ہو جائے؛ مَیں نگاہ نہیں اٹھاؤں گا، اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھوں گا، جو ہونا ہے؛ وہ ہو۔ ایک مرتبہ اگر ایسا کر لیا تو دوسری مرتبہ تقاضہ ہوگا لیکن اتنی شدت کے ساتھ نہیں ہوگا، اس میں کمی آئے گی اور پھر دھیرے دھیرے کمی ہوتے ہوتے معاملہ ختم ہو جائے گا اور پھر نفس اطاعت وفرمانبرداری کا عادی ہو جائے گا

تصوف کا حاصل

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ایک بات تصوف کا خلاصہ اور حاصل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی کسی عبادت واطاعت میں سُستی کرنے لگے؛ تو اس کا مقابلہ کر کے وہ اطاعت بجالائے۔ اور اگر کسی گناہ سے بچنے میں سُستی کرنے لگے؛ تو اس کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچ جائے۔ اگر اس کا مقابلہ کر کے اطاعت

بجالائیں گے، اور اس کا مقابلہ کر کے گناہ سے اپنے آپ کو بچالیں گے؛ اور چند دنوں تک اگر یہ سلسلہ برابر جاری رہا؛ تو اسی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔ اور جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں اضافہ ہوگا۔ اور جتنا محبت میں اضافہ ہوگا؛ اتنا ہی تکلیفوں کے اٹھانے میں مزہ آئے گا اور لذت محسوس ہوگی۔

محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے

جیسے ایک ماں ہے، سردیوں کا زمانہ ہے، اس کے پاس اس کا بچہ بھی لیٹا ہوا ہے، آدھی رات کو جبکہ خوب کڑاکے کی سردی ہو رہی تھی، اُس وقت بچے نے پیشاب کر دی، اس کے کپڑے بھیگ گئے، بستر بھیگ گیا، لحاف بھی بھیگ گیا۔ اب کیا ماں یوں سوچے گی کہ ایسی سردی میں کون اٹھے؟ نہیں! بلکہ ماں فوراً اٹھے گی، اس کے کپڑے بدل دے گی، اور جو کپڑا خراب ہوا ہے اس کو بھی دھو دے گی، بستر بھی تبدیل کر دے گی۔ حالانکہ سخت کڑاکے کی سردی میں آدھی رات کے وقت اس طرح اٹھنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، لیکن چونکہ اسے اپنے بچے کے ساتھ محبت اور تعلق ہے، اس وجہ سے وہ ساری مشقتوں اور تکلیفوں کو خوب لطف لے کر برداشت کرتی ہے۔

چنانچہ جس عورت کا بچہ نہیں ہے اس کو دیکھئے کہ وہ لوگوں سے درخواست کرتی ہے کہ میرے لئے دعا کرو کہ مجھے بچہ نصیب ہو جائے۔ جہاں تعویذ گنڈے ملتے ہیں وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔ خوب منتیں اور نذر و نیاز بھی مانتی ہے۔ ڈاکٹروں اور طبیبوں کے پاس بھی جاتی ہے کہ میرا کچھ علاج ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ بچہ ہو جائے۔ اب اگر کوئی اس سے یوں کہے کہ

اللہ کی بندی! کیا پاگل ہوگئی ہے کہ بچہ مانگ رہی ہے؟ جب بچہ پیدا ہوجائے گا تو سردی کے زمانہ میں راتوں کو تجھے اٹھنا پڑے گا، اس کو کپڑے بدلوانے پڑیں گے، بستر ٹھیک کرنا پڑے گا؛ محنت ومشقت اور سردی برداشت کرنی پڑے گی۔ تو وہ کہے گی کہ اس بچے کی محبت کے اندر مَیں سب برداشت کروں گی، اس کے واسطے تو ہزاروں راتیں قربان ہیں۔ جس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے بچے کے لئے دعا کر رہی ہے تو اس کو معلوم ہے کہ وہ کیا مطالبہ کر رہی ہے؟ گویا وہ ان تکلیفوں کو مانگ رہی ہے۔ لیکن چونکہ اس کے دل میں بچے کی محبت ہے، اس وجہ سے اس کو بچہ چاہیے، اور اس محبت کی وجہ سے وہ ان ساری چیزوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کرلیتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی جب آدمی کی محبت قائم ہوجاتی ہے؛ تو یہ ساری محنتیں اور مشقتیں آدمی کے لئے آسان ہوجاتی ہیں۔

اے شمع! تیری عمر طبیعی ہے ایک رات

ایک بات اور یاد رکھیں کہ مجاہدہ تو کرنا ہی ہے، تکلیف تو اٹھانی ہی ہے اور محنت و مشقت میں تو اپنے آپ کو ڈالنا ہی ہے، یہ بات تو طے ہے۔ جب آدمی دنیا کے اندر آتا ہے تو یہاں کا حال یہ ہے کہ کوئی بھی چیز محنت اور مشقت سے خالی نہیں ہے۔ آدمی یہ چاہے کہ صرف آرام مل جائے تو معلوم ہونا چاہیے کہ صرف آرام کی جگہ تو جنت ہے؛ جہاں آرام کے اندر کسی قسم کی مشقت یا تکلیف کی ذرّہ برابر بھی ملاوٹ نہیں: ؎

بہشت آں جا کہ آزارے نباشد　　کسے را با کسے کارے نباشد

لیکن دنیا کا کوئی آرام ایسا نہیں؛ جس میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

مثلاً آپ کھانا کھائیے، کتنی ہی لذت حاصل کیجیے، لیکن اس کھانے کے نتیجہ میں بعد

میں قضائے حاجت کا تقاضہ ہوگا۔ پیشاب پاخانہ کوئی رغبت کی چیز نہیں ہے۔ اسی طرح کوئی بھی لذت کا کام کر لیجیے، اس کے نتیجہ میں بعد میں کچھ نہ کچھ پریشانی اور مشقت تو آپ کو اٹھانی ہی پڑے گی۔ لہٰذا دنیا کی ہر لذت اپنے اندر کچھ نہ کچھ تکلیف لئے ہوئے ہے۔ آپ دنیا میں یوں چاہیں کہ خالص لذت حاصل ہو؛ یہ ممکن ہی نہیں۔ دنیا میں تکلیف تو اٹھانی ہی ہے۔ اب آپ کو اختیار ہے کہ اس تکلیف کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اٹھا کر اس کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کریں۔ یا پھر یہ ہے کہ مفت کی تکلیفیں بھی اٹھائیں اور اس کا کوئی فائدہ آخرت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی نزدیکی وقرب کی شکل میں حاصل نہ ہو۔ چاہیں تو یہ راستہ اختیار کریں، چاہیں تو وہ راستہ اختیار کریں۔

پھر ایک وقت آئے گا کہ............

جیسے کہ صبح نماز کا وقت ہوا، اذان کی آواز آئی، اب نیند کا مزہ چھوڑ کر تکلیف اٹھا کر مسجد جانا ہے۔ نفس نے سوچا کہ کون جائے، پڑے رہو۔ ٹھیک ہے نہیں گئے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ ایسا آدمی ہے کہ جس کی خاطر آپ انکار بھی نہیں کر سکتے، اس لئے اٹھنا ہی پڑا۔ ویسے تو آپ چاہتے تھے کہ راحت چھوڑ کر کہاں مسجد میں جائیں، لیکن یہاں ایک ایسا آدمی آ گیا کہ اس کی خاطر نیند کو قربان کر کے دروازہ کھولنا ہی پڑا۔ تو جو مشقت مقدر میں تھی وہ تو اٹھانی ہی پڑی۔ اگر اس مشقت کو اللہ تعالیٰ کے نام پر اٹھاتے تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی اور آخرت میں بھی کارآمد ہوتی، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا، لیکن دوسرے طریقہ سے اٹھائی تو اس کا کوئی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے نفس کے مقابلہ میں ہمیں جو محنت، مشقت اور تکلیف ہوتی ہے؛ اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کریں۔ ہمت سے

کام لیں اور جیسا کہ عرض کیا کہ اگر ہم ہمت سے مقابلہ کرتے رہیں گے اور ڈٹ جائیں گے؛ تو پھر ایک وقت آئے گا کہ نفس آپ ہی آپ مطیع اور فرمانبردار ہوجائے گا۔

﴿نفس کی قسمیں﴾

اسی لئے علماء نے نفس کی قسمیں بتلائی ہیں۔ایک نفس امّارہ کہلاتا ہے۔ایک نفس لوامہ ہے اور ایک نفس مطمئنّہ ہے۔امّارہ تو وہ ہے جو آدمی کو برائی کا حکم دیتا ہے،لیکن اسی امّارہ کا ہم ڈٹ کر مقابلہ کرتے رہیں گے؛تو پھر ایک وقت آئے گا کہ وہ ہم کو گناہ کے کاموں پر ملامت کرنے لگے گا۔نفسِ امّارہ اب نفسِ لوّامہ بن جائے گا۔اور پھر ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ نفس نیکی اور اطاعت کے اوپر جم جائے گا؛جس کو مطمئنّہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿انگلی پکڑ کے راستہ دکھائیں گے﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پہلی آیت پیش کی ہے:﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ باری تعالیٰ کا وعدہ نقل کیا کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں محنت ومشقت اٹھاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں؛تو ہم ان کو اپنے راستے بتلاتے ہیں۔

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ کا ترجمہ کیا ہے:''ہم اس کو انگلی پکڑ کر اپنے راستوں پر لے چلیں گے''یعنی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اگر ہم مشقت اٹھائیں گے تو گویا اللہ تعالیٰ ہی ہمیں وہ راستے آسانی سے طے کرا دیں گے۔ایک مرتبہ ہماری طرف سے کچھ ہمت ہوجانی چاہیے۔جب ہم ہمت کرلیں گے ؛تو آگے اللہ تعالیٰ معاملہ آسان فرمادیں گے۔﴿وَإِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾اور اللہ تعالیٰ نکوکاروں کے ساتھ ہیں۔

﴿عبادت کرو موت تک﴾

دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَأۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ مجاہدہ کی طرف ترغیب دی جارہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت اور فرمانبرداری اور اطاعت کا سلسلہ موت تک جاری رہنا چاہیے، اس میں کمی نہیں آنی چاہیے۔ ''اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہو؛ یہاں تک کہ موت آجائے'' (اس طرف بھی اشارہ کردیا کہ حقیقی بندگی کی ابتدا مجاہدہ کے بعد ہوتی ہے) مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ والا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہے؛ بلکہ موت تک اس کو جاری رکھنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول رہنا ہے۔

﴿وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلۡ اِلَیۡهِ تَبۡتِیۡلاً﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لو، اس کو یاد کرو؛ اور سب کو چھوڑ کر اسی کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ کرتے ہیں: ﴿اَیۡ اِنۡقَطَعَ اِلَیۡهِ﴾ سب لوگوں سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاؤ۔ سب سے کٹنے کے واسطے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے کے واسطے ہمیں کچھ محنت اور مجاہدے سے کام لینا پڑے گا۔

﴿محنت بے کار نہیں جائے گی﴾

﴿فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ (الزلزال پ۳۰)﴾ جو آدمی ذرہ برابر بھی نیکی کا کام کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ ملے گا۔

پیلے اور زرد رنگ کی ایک چیونٹی آتی ہے، اس کو عربی میں ''ذَرَّةٌ'' کہتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ اگر آپ کسی کا غذیا روٹی کا وزن کرلیجیے کہ کتنے گرام ہے، اور پھر ایسی کئی سو چیونٹیاں رکھ کر وزن کرلیجیے؛ تو وزن میں ذرہ برابر فرق آنے والا نہیں ہے۔ ایسا چھوٹا اور معمولی سا کام

بھی اگر نیکی کا کریں گے؛ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ ملے گا، اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر چیز موجود ہوگی۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے: ﴿فَمَن يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ. وَمَن يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ﴾ اگر نیکی کا چھوٹا سا کام کرو گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ ملنے والا ہے، اور برائی کا بھی چھوٹا سا کام کرو گے؛ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بدلہ بھی ملنے والا ہے۔

﴿حضرت سعد رضی اللہ عنہ اور فقیر﴾

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک سائل آیا، حضرت نے اس کو چند کھجوریں دیں، اس وقت آپ کے پاس اتنی ہی تھیں۔ جو تھیں؛ وہ دے دیں۔ بعض سائل ناراض ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی معمولی چیز دو؛ تو قبول نہیں کرتے۔ اس نے قبول کرنے میں انکار کیا۔ اس پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: قرآنِ پاک میں تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَمَن يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ﴾ معمولی اور چھوٹا سا ذرہ برابر بھی نیکی کا کام کریں گے، تو اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرتے ہیں، اور میں جو دے رہا ہوں اس میں تو کئی مثقال ہیں، وہ بھی قبول کرنے کے لئے تو تیار نہیں ہے۔ (قرطبی)

﴿اس کو کیا ہو گیا؟﴾

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو معمولی سا عمل بھی موجود ہوگا۔ ہمارے اعمال نامہ میں ساری چیزیں محفوظ ہیں: ﴿مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً اِلَّآ أَحْصٰهَا﴾ (الکہف، پ۱۵) جو گنہگار ہوں گے وہ قیامت میں دیکھیں گے کہ چھوٹا بڑا ہر کام اس میں لکھا ہوا ہے؛ تو ان کو تعجب ہوگا کہ اس میں تو ہر چیز کا ریکارڈ موجود ہے۔ وہاں ساری چیزیں محفوظ ہوتی ہیں اس لئے آدمی یوں نہ سمجھے کہ میں گناہ کا کام کروں گا تو وہ چھپ جائے گا۔ یا نیکی کا کام کروں

گا تو اس پر کوئی بدلہ نہیں ملے گا۔ دنیا میں تو ایسا ہو سکتا ہے کہ جس کو راضی کرنے کے لئے آپ کوئی کام کر رہے ہیں، ممکن ہے کہ اس کو یاد بھی نہ آئے، یا اس کی نگاہ میں وہ کام نہ آوے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں تو نیکی کے معمولی کام پر بھی بدلہ دیا جائے گا اس لئے نیکی کے کام میں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے کام میں آگے بڑھتے رہیے: ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللهِ هُوَ خَيْرًا وَّأَعْظَمَ أَجْرًا﴾ (المزمل، پ۲۹) تم جو کچھ بھی نیکی اپنے لئے آگے پیش کرو گے، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو پاؤ گے، وہ بہتر بھی ہے اور اجر کے اعتبار سے بھی بہت اچھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کا کوئی بھی کام ضائع ہونے والا نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ بھی ہے؛ اور اس کا بدلہ بھی ملنے والا ہے۔

﴿دو گناہوں پر لڑائی کا اعلان﴾

عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: اِنَّ اللهَ تَعَالىٰ قَالَ: مَنْ عَادىٰ لِیْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ. وَمَاتَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ أَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّاافْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَايَزَالُ عَبْدِیْ يَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی أُحِبَّهُ، فَاِذَاأَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِیْ يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِیْ يَبْطُشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِیْ يَمْشِیْ بِهَا. وَاِنْ سَأَلَنِیْ أَعْطَيْتُهُ، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِیْ لَأُعِيْذَنَّهُ.

یہ حدیثِ قدسی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: جو میرے کسی ولی کے ساتھ دشمناوٹ رکھے؛ اس کو میری طرف سے لڑائی کا اعلان ہے۔ بہت بڑی بات ہوگئی۔ دو چیزیں ایسی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ ایک کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ہے اور دوسرا اس حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سود کی حرمت کا جب حکم نازل ہوا اور جن لوگوں کے سود کے

معاملے پہلے ہو چکے تھے ان کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تاکید کی گئی کہ تمہارا جو سود لوگوں کے اوپر باقی نکلتا ہے، اس کو چھوڑ دو ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (البقرۃ، پ۳) اگر اس کو نہیں چھوڑو گے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا اعلان ہے۔ بقیہ سود چھوڑنے کا حکم دیا گیا اور نہ چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی کا اعلان قرآنِ پاک میں کیا گیا ہے۔ اور یہ دوسری چیز ہے جس کا تذکرہ حدیثِ پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: جو میرے کسی ولی اور دوست کے ساتھ دشمناوٹ رکھے تو میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے۔

﴿ولی کسے کہتے ہیں؟﴾

شرح عقائد کے اندر علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ نے ولی کی یہ تعریف بیان کی ہے:-

﴿اَلْعَارِفُ بِاللّٰهِ وَصِفَاتِهٖ وَالْمُوَاظِبُ عَلٰى طَاعَاتِهٖ وَالْمُنْصَرِفُ عَنِ الْمَعَاصِيْ وَالْاِنْهِمَاكُ فِي الْمُبَاحَاتِ﴾ (شرح عقائد ص ۱۴۵، ۱۴۴) اللہ کا دوست اور ولی وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی واقفیت رکھنے والا اور اس کو پہچاننے والا ہو، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری پر مواظبت اور ہمیشگی کرنے والا ہو، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے والا ہو، اور جو چیزیں مباح ہیں کہ جن میں مشغولی کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے غفلت پیدا ہوتی ہے؛ اس سے بھی اپنے آپ کو بچانے والا اور باز رکھنے والا ہو۔ معلوم ہوا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچا کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا اہتمام کرتا ہو؛ اسی کو ولی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے کسی ولی اور دوست کے ساتھ دشمناوٹ رکھتا ہے؛ تو میری طرف سے اس کو اعلانِ جنگ ہے۔

﴿ایک عام مزاج﴾

آج کل اس زمانہ میں جہاں اور فتنے ہیں وہاں ایک بہت بڑا فتنہ یہ بھی ہے۔ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی مجلس میں حاضری کی اللہ تعالیٰ نے سعادت عطا فرمائی۔ حضرت رمضان المبارک کے اندر بھی اکثر اس چیز کو خاص طور پر فرمایا کرتے تھے: کہ بھائی! یہ جو اہل اللہ ہیں ان کے ساتھ کسی بھی قسم کی گستاخی سے اپنے آپ کو بچانے کا بڑا اہتمام ہونا چاہیے۔

آج کل ایک عام مزاج بن گیا ہے، جو دنیا سے رخصت ہو گئے، ان کے معاملہ میں تو لوگ احتیاط کرتے ہیں؛ لیکن جو حیات ہیں یعنی ان کے زمانہ میں موجود ہیں، ان کے متعلق چونکہ مخالفین کی طرف سے غلط فہمیاں بھی پھیلائی جاتی ہیں، لوگوں کے دلوں میں بدگمانیاں ڈالنے کی کوششیں کی جاتی ہیں؛ ان کے متعلق بعض لوگ برائیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! اگر کسی کے متعلق آپ کے دل میں عقیدت نہیں ہے اور آپ ان سے بیعت نہ ہوتے ہوں؛ تو نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ سوال نہیں ہوگا کہ اس سے عقیدت کیوں نہیں رکھی، لیکن اس کے متعلق بدگمانی رکھنا یا اس کی برائیوں میں اپنے آپ کو مشغول کر دینا؛ بالکل صحیح نہیں ہے۔ اگر کسی بات میں اس کی طرف سے کوتاہی پائی بھی گئی، اور آپ نے اپنی آنکھوں سے اس کو کسی برائی میں دیکھ لیا، لیکن اس کے عام حالات نیکی کے ہیں؛ تو اس ایک برائی کی وجہ سے اس کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ رات کو تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے آنسو بہا کر اس برائی سے توبہ کر کے وہ تو اپنے آپ کو پاک کر لے؛ اور ہم اس کی برائی اور غیبت میں اپنے آپ کو مشغول کر کے اپنے نامۂ اعمال کو سیاہ کریں اور اس کے بعد توبہ کی توفیق بھی نہ ہو۔

آج کل ایک عام مزاج اہل اللہ کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے مقبول بندے ہوتے ہیں اور بعض لوگ ان کی برائیوں میں لگے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے رفعِ درجات کے لئے یہ انتظام بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو دوسروں کے دلوں میں بدگمانیاں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی باتوں کی طرف توجہ نہیں کرنی چاہیے۔ کوئی ایسی بات کرے تو اس کو سننا ہی نہیں چاہیے۔ یہ ہمارے لئے آزمائش ہوتی ہے، اور ان حضرات کے متعلق اپنے قلب کو پاک صاف رکھنا چاہیے۔ اگر ان کے متعلق ہمارے دل میں خدانخواستہ کوئی بدگمانی پیدا ہوگئی اور ہمارے دل میں عداوت کا جذبہ پیدا ہوگیا؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

﴿اندازہ لگایئے﴾

آپ اندازہ لگایئے کہ دنیا کا کوئی معمولی سا آدمی مثلاً سورت کا پی آئی (پولیس انسپکٹر) اگر کسی کو دھمکی دے دے کہ مَیں دیکھ لوں گا؛ تو اس کی رات کی نیند حرام ہوجائے گی جب اس کی طرف سے ملنے والی دھمکی کا یہ اثر ہے، حالانکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ذرا سے ایک اشارہ سے اس کا عہدہ چھن سکتا ہے اور اس کا معاملہ ختم ہوسکتا ہے، اس کے آگے پھر صوبائی طور پر پولیس کا جو بڑا ہے، اور ملک کا بڑا ہے، اس کا مقام تو بہت اونچا ہے، لیکن ان سب کی اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کے معمولی عہدے والے یہ لوگ جن کے پاس دنیا کا معمولی اقتدار اور حکومت ہے، ان کی طرف سے جب کسی کو دھمکی مل جاتی ہے؛ تو اس کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے اور بے چین ہوجاتا ہے، اور وہ اس فکر میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح مَیں اس کو خوش کروں اور اس کے عتاب سے اپنے آپ کو بچالوں؛ تو

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کسی کو دھمکی دے دی جائے تو پھر وہ کیسے آرام اور راحت سے رہ سکتا ہے؟ اس لئے ہمیں کسی بھی اہل اللہ کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے﴾

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کی زبانی بھی سنا اور حضرت نے آپ بیتی میں بھی لکھا ہے، حضرت کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جب انتقال ہوا تو ایک بزرگ تعزیت کیلئے تشریف لائے، ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کے لئے بھی گئے، ان کو کشفِ قبور ہوتا تھا، وہاں سے جب واپس آئے؛ تو انہوں نے کہا: مَیں نے مراقبہ کیا تو تمہارے والد سے گفتگو ہوئی، انہوں نے تمہیں تین باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ والوں سے ڈرتے رہنا کیونکہ ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ مَیں نے دل میں کہا کہ اُلٹی تو اُلٹی ہی ہوتی ہے، کوئی بھی ہو، اللہ والا ہو یا دنیا والا ہو، اُلٹی کو تو اُلٹی ہی کہا جائے گا، سیدھا کیسے کہیں گے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اس چیز کی بڑی تاکید کی تھی۔ پھر ایک طویل زمانہ کے بعد اس کا مطلب سمجھ میں آیا۔

ہوا یہ کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو جاتے وقت آپ نے مدرسہ مظاہر علوم کا سارا نظم ونسق حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے کیا جو حافظ صاحب سے مشہور ہیں یہاں ایک شخص تھا جو حافظ صاحب کا مخالف تھا، وہ حافظ صاحب کے متعلق یہاں سے حضرت سہارنپوری کے نام جھوٹی شکایتوں کے خطوط لکھتا رہتا تھا۔ بار بار وہاں خطوط پہنچ رہے ہیں، ہر آٹھ دس دن میں ایک خط پہنچ رہا ہے۔ اس زمانہ میں حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مدینہ منورہ میں موجود تھے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ

فرماتے ہیں کہ انہوں نے میرے اوپر کہلوایا کہ آپ حافظ صاحب سے کہیے کہ فلاں آدمی کے خطوط بار بار تمہاری شکایتوں سے بھرے ہوئے حضرت کے اوپر آتے رہتے ہیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ مَیں نے حضرت حافظ صاحب سے کہنے کے بجائے حضرت رائپوری کو خود ہی اس کا جواب لکھا کہ یہ تو جھوٹا آدمی ہے اور جھوٹی شکایتیں کرتا رہتا ہے؛ آپ کو تو معلوم ہے۔ اس پر حضرت رائپوری نے مجھے لکھا اور تاکید کی کہ حافظ صاحب سے کہیے کہ اس آدمی کو اس طرح جھوٹی شکایتیں لکھنے کا بھی موقع نہ دیں؛ اس لئے کہ جب حضرت کی خدمت میں بار بار یہ باتیں پہنچیں گی تو آپ تو جانتے ہیں کہ جھوٹی بات بھی جب بار بار کہی جاتی ہے؛ تو ایک زمانہ کے بعد آدمی کے دل پر وہ اثر کرتی ہے۔

گوبیل کا اصول ہے (ہٹلر کا وزیر اطلاعات تھا جس کا نام گوبیل تھا اس نے لکھا ہے) کہ جھوٹ کو جب بار بار بولتے اور دوہراتے رہیں گے تو لوگ اس کو سچ سمجھ جائیں گے۔ ایک جھوٹ کو جب دس بیس آدمی دوہرا رہے ہیں تو آدمی سوچے گا کہ یہ سب تو جھوٹے نہیں ہو سکتے آخر اس کے دل میں وہ اثر کرتا ہے۔ حضرت رائپوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ جھوٹا ہے، لیکن حافظ صاحب سے کہیے کہ وہ اس طرح سے بار بار لکھتا ہے، جس کی وجہ سے حضرت کے قلب پر اگر اس کا اثر ہوا اور کدورت آ گئی، اور دل میں میل آ گیا؛ تو اس کی وجہ سے حافظ صاحب فتنے میں مبتلا ہو جائیں گے۔

﴿ان کے لئے برے خاتمہ کا اندیشہ ہے﴾

معلوم ہوا کہ اللہ والوں کے دلوں کی زمین پر معمولی سی کدورت کا آ جانا؛ یہ بھی آدمی کے لئے خطرے کا باعث بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص بندوں کے معاملہ میں بڑے حساس ہیں اور ان کی بہت زیادہ حفاظت کا اہتمام فرماتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی معمولی

چیز بھی ان کی شان میں کسی کی طرف سے ایسی پائی گئی؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقت پر اس کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی لئے جو لوگ اہل اللہ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں؛ ان کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ ان کے لئے سوءِ خاتمہ اور برے انجام کا اندیشہ ہے۔

﴿نمبر اول پر یہ چیز ہے﴾

اس کے بعد باری تعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: ﴿وَمَاتَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ أَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّاافْتَرَضْتُ عَلَیْهِ﴾ مَیں نے اپنے بندے پر جو چیز فرض کر رکھی ہے، اس سے زیادہ کوئی چیز میری نزدیکی اور قرب حاصل کرنے کے لئے مجھے محبوب نہیں ہے۔ یعنی آدمی اللہ تعالیٰ کا جو قرب اس کی فرض کی ہوئی چیزوں سے حاصل کرتا ہے، اس سے زیادہ اللہ کو اور کوئی چیز پسند نہیں۔ اور بات بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو چیزیں لازم کی گئی ہیں ان کو تو انجام دینا ہی ہے۔ آدمی اگر فرائض کو ادا نہ کرے، اس میں کوتاہی کرے؛ تو گنہ گار ہوگا مثلاً نماز اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کی گئی ہے، اگر آدمی اس کو ادا نہیں کرتا، تو وہ فاسق وفاجر اور گنہ گار ٹھہرتا ہے، عذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ خاص اور اہم چیز ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج ہوتا ہے کہ وہ نوافل کا تو بہت اہتمام کرتے ہیں لیکن فرائض کو چھوڑ دیتے ہیں۔ رمضان کا مہینہ آیا تو تراویح پڑھنے جائیں گے؛ لیکن پانچ وقت کی فرض نماز نہیں پڑھیں گے۔ اور اگر تراویح کی برکت سے عشاء کی نماز پڑھ لی تو پڑھ لی؛ لیکن چار وقت کی نماز نہیں پڑھیں گے۔ عید کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن روزانہ کی پانچ وقت کی فرض نماز کو ادا نہیں کرتے۔ تو فرائض کا اہتمام بہت ضروری ہے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوسکتا۔ نمبر اول پر یہ چیز ہے۔

﴿پھر وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے﴾

اس کے بعد نمبر دو پر مزید قرب حاصل کرنے کے لئے فرماتے ہیں: ﴿وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ اِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ﴾ اور بندہ برابر نوافل کے ذریعہ میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مَیں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب مَیں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو مَیں اس کا کان بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ سنتا ہے۔ مَیں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ دیکھتا ہے۔ مَیں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ چھوتا اور پکڑتا ہے مَیں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں؛ جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے؛ تو مَیں عطا کرتا ہوں، اور اگر کسی چیز سے پناہ چاہتا ہے؛ تو مَیں اس کو پناہ دیتا ہوں۔

''مَیں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق جو چیزیں ہیں؛ انہیں کو وہ دیکھتا ہے، دوسری چیزوں کو وہ نہیں دیکھتا۔ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں فنا ہو کر اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنالیتا ہے، اسی کو تسلیم و رضا کہتے ہیں۔ یہ سب سے اونچا مقام ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کا تابع بنالے، اور جب یہ بات حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ مستجاب الدعوات بن جاتا ہے۔

اسی لئے فرماتے ہیں: ﴿وَاِنْ سَأَلَنِيْ أَعْطَيْتُهُ﴾ اس کے بعد اگر وہ مجھ سے کوئی چیز مانگتا ہے؛ تو مَیں اس کو عطا کرتا ہوں۔ یعنی مقامِ رضا و تسلیم پر پہنچنے کے بعد اس کی کوئی دعا اللہ تعالیٰ کے یہاں سے رد نہیں کی جاتی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائے

۲۱/ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۶/ جولائی ۱۹۹۷ء

﴿المجاهدة ۲﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً .أمابعد:

عن أنس رضی اللہ عنہ فيمايرويه عن ربّه عزوجل قال:اِذَا تَقَرَّبَ الْعَبْدُ اِلَيَّ شِبْراً تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعاً،وَاِذَا تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعاً تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعاً،وَاِذَا أَتَانِيْ يَمْشِيْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً. (رواہ البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جب بندہ میری طرف ایک بالشت قریب ہوتا ہے؛ تو مَیں اس کی طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہوں۔اور جب بندہ میری طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے، اور قریب ہوتا ہے؛ تو مَیں ایک باع یعنی چار ہاتھ قریب ہوتا ہوں۔اور جب وہ میری طرف چل کر آتا ہے؛ تو مَیں اس کی طرف دوڑ کر آگے بڑھتا ہوں۔

﴿بندہ کے عمل کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قدر دانی﴾

اللہ تعالیٰ کے یہاں بندہ کے عمل کو جو قبولیت حاصل ہے، اُس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک تشبیہ کے ذریعہ سے بتلایا ہے کہ جب بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی عمل کرتا ہے؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اُس کے عمل کی پذیرائی اور قبولیت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ بندہ جس جذبے اور جس سرعت وتیزی سے اللہ تبارک وتعالیٰ

کی طرف آگے بڑھتا ہے؛ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے اس آگے بڑھنے کو اُس سے دو گنے طریقہ سے قبول فرماتے ہیں۔اسی کو اس حدیث میں اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ اگر وہ ایک بالشت بڑھتا ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ ایک ہاتھ آگے بڑھتے ہیں۔ایک ہاتھ دو بالشت کا ہوتا ہے گویا وہ جس تیزی سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف بڑھا؛ اللہ تعالیٰ نے اُس کے اس بڑھنے کو اس سے دو گنے طریقہ سے قبول فرمایا۔اور ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مَیں چار ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔باع چار ہاتھ کو کہتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ اُس کے آگے بڑھنے کو اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک طرح کی قبولیت حاصل ہے۔

جب وہاں یہ حال ہے تو بندہ کو بھی چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اپنی مقدور بھر جتنی بھی کوشش ہوسکتی ہو، اور جتنی بھی محنت کرسکتا ہو، اُس کو بروئے کار لاوے۔چنانچہ اسی سلسلہ میں یہ باب باندھا تھا ﴿باب المجاهدة﴾ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے بندہ جو کوشش کرتا ہے، اور محنت ومشقت برداشت کرتا ہے، تو بندے کی یہ محنت، مجاہدہ اور کوشش؛ اللہ تعالیٰ کے یہاں رائیگاں اور بے کار نہیں جاتی بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں اس کو قبولیت حاصل ہوتی ہے۔

﴿دو محرومِ انصاف نعمتیں﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں کہ اُن کے معاملہ میں بہت سارے لوگ خسارے اور گھاٹے میں ہیں ﴿اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ﴾ تندرستی اور فرصت۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں عظیم نعمتیں ایسی ہیں کہ لوگ ان سے جس قدر فائدہ اُٹھانا چاہیے؛ کما حقہ فائدہ نہیں اٹھاتے۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی دی ہوئی ان نعمتوں سے اللہ تعالیٰ کا جتنا قرب اور نزدیکی حاصل کر سکتے ہیں اور اُس کی جتنی قیمت وصول کر سکتے ہیں، اُس کی قیمت کی وصول یابی میں کوتاہی کرتے ہیں؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

دیکھو! گھاٹا کہتے ہی ہیں اس بات کو کہ آدمی کے پاس ایک چیز کسی مخصوص مالیت کی ہے، وہ اس سے کم میں راضی ہو جائے۔ یعنی وہ جتنی مالیت کی ہے اگر اس کو دے کر اتنی ہی مالیت حاصل کرے؛ تو یوں کہا جائے گا کہ اس کا یہ معاملہ اور سودا برابر کا رہا۔ نہ نفع ہے، نہ نقصان ہے، نہ گھاٹا اور خسارہ ہے اور نہ اس میں کوئی فائدہ ہے۔ لیکن جتنی مالیت کی وہ ہے اگر اس چیز کو دے کر اس سے کم مالیت حاصل کرے، تو کہا جائے گا کہ گھاٹے کا سودا کیا۔

مثلاً آپ کے پاس ایک گھڑی ہے جس کی مالیت سو روپے ہے، اگر آپ وہ گھڑی سو روپے لے کر کسی کو دیں تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کا یہ سودا برابر کا رہا۔ نہ آپ کو نقصان ہے اور نہ آپ کو فائدہ ہے۔ گھاٹا بھی نہیں اور فائدہ بھی نہیں۔ اور اگر اس کی مالیت سے کم لے کر اس چیز کا سودا اور معاملہ کریں؛ تو یوں سمجھئے کہ یہ گھاٹے کا معاملہ ہے۔ فرض کر لیجئے کہ یہی سو روپے کی گھڑی اگر آپ نے کسی کو پچاس روپے میں حوالے کر دی؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کو گھاٹا اور نقصان ہے۔ اور جو مالیت آپ نے اس کے حاصل کرنے کے لئے صَرف کی تھی، یا اس کی جو مالیت آپ کے یہاں ہے، اُس سے زیادہ لے کر اگر کسی کو حوالے کریں؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کا یہ سودا نفع اور فائدے کا ہے۔ مثلاً یہی سو روپے والی گھڑی آپ

کسی کو ڈیڑھ سو یا دو سو میں فروخت کریں؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ پچاس روپے یا سو روپے آپ کو فائدہ اور نفع ہوا۔

یہاں نبی کریم ﷺ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی جن دو نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے، ان میں ایک تندرستی ہے اور دوسری فرصت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو وقت ہمیں عطا فرمایا، اور پھر اس وقت سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ہمیں جسمانی تندرستی عطا فرمائی؛ یہ دونوں نعمتیں ایسی ہیں کہ کسی کو یہ دونوں چیزیں مل جائیں تو ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے، لیکن نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی ان دو نعمتوں سے جس قدر فائدہ انسانوں کو اُٹھانا چاہیے، اس قدر اُس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ یعنی ان دونوں نعمتوں کی جتنی قیمت وصول کر سکتے تھے، اتنی قیمت وصول نہیں کرتے؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

بہت گنے چنے لوگ اور اللہ کے بعض شاذ و نادر بندے ایسے ہوتے ہیں جو ان دونوں نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اُس کی جو قیمت وصول کرنی چاہیے، وہ پوری وصول کرتے ہیں۔ لیکن اکثر لوگوں کا حال ایسا ہے کہ وہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔

﴿پانچ منٹ کی قیمت﴾

دیکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ جو وقت اور فرصت کی نعمت عطا فرمائی ہے، اور فرصت کے ساتھ ساتھ تندرستی عطا فرمائی ہے، اس دونوں سے آدمی کیا فائدہ اُٹھا سکتا ہے؟ مثلاً ہمیں پانچ منٹ کی فراغت اور فرصت ملی ہوئی ہے، اس پانچ منٹ کی ہم کیا قیمت وصول کر سکتے ہیں؟ دنیوی اعتبار سے دیکھا جائے تو ملازمت کرنے والا ایک آدمی جب اپنی ملازمت کے لئے کسی کے ساتھ معاملہ کرے گا اور اپنی تنخواہ اور معاوضہ مقرر کرائے گا کہ مجھے

مہینہ کی اتنی تنخواہ ملنی چاہیے؛ تو زیادہ سے زیادہ کیا تنخواہ پاسکتا ہے؟ فرض کر لیجئے کہ اگر کسی کو مہینہ کے دو لاکھ، پانچ لاکھ، تیس لاکھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ عموماً تو ایسا کم ہوتا ہے کہ کسی کو مہینہ کی تنخواہ تیس لاکھ روپے ملے گویا روزانہ کی ایک لاکھ تنخواہ ہوئی۔ لیکن فرض کر لیجئے۔ اب جیسا کہ عام طور پر ہمارے یہاں دستور ہے کہ دن میں آٹھ گھنٹے اُس کو حاضری دینی پڑتی ہے اور آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے؛ تو روزانہ کی ایک لاکھ یعنی آٹھ گھنٹے کی قیمت ایک لاکھ ہوئی، تو ایک گھنٹے کی قیمت اُس کا آٹھواں حصہ یعنی ساڑھے بارہ ہزار ہوئے، اس صورت میں ایک منٹ کا حساب لگالیا جائے کہ تو تقریباً دوسو روپے ہوئے، اور پانچ منٹ کے ایک ہزار ہوئے یہ تو مَیں نے آپ کو مثال کے طور پر سمجھانے کے لئے قیمت لگائی ہے جو بہت زیادہ ہے، شاید ہی مَیں نے اور آپ میں سے کسی نے دیکھا ہو کہ کسی کی ماہانہ تنخواہ تیس لاکھ روپے ہو۔ ایسا نمونہ تو شاید ہی ہمارے سامنے ہو لیکن فرض کر لیجئے کہ تیس لاکھ ہے، تو پانچ منٹ کی قیمت ایک ہزار روپے ہو جائے گی۔ یہ تو دنیوی اعتبار سے ہے۔ اب اگر یہ ہزار روپے کسی کے پاس آئے تو یہ دنیا کی ایک فانی چیز ہے، اگر اُس نے اس کو سنبھال کر رکھا بھی؛ تو جب وہ دنیا سے جائے گا تو ان ہزار کو یہاں چھوڑ کر جائے گا، اس کے مقابلہ میں اگر ان پانچ منٹ کو وہ اللہ کی یاد میں استعمال کرتا، سبحان اللہ پڑھتا؛ تو مَیں سمجھتا ہوں ایک منٹ کے اندر کم سے کم ساٹھ مرتبہ سبحان اللہ بڑی آسانی سے پڑھ سکتا ہے۔ اور اگر کوئی تیزی سے پڑھے تو اس سے بھی زیادہ ہو سکتے ہیں۔ ایسے ہی پانچ منٹ کے اندر تین سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھ سکتا ہے۔ اب اس سبحان اللہ کی قیمت اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کیا ہے؟ ہم غور کریں اور دیکھیں۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب آپ معراج میں

تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت ابراہیم نے نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ آپ کی اُمت کو میرا اسلام کہنا اور بتلانا کہ جنت چٹیل میدان ہے، اور اس کے درخت سبحان اللہ، الحمدُ للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر ہیں (مشکوۃ عن الترمذی، ص۲۰۲ ج۱) یعنی بندہ جتنی مرتبہ تسبیح پڑھے گا اتنے ہی درخت جنت کے اندر لگ جائیں گے۔ اگر ہم پانچ منٹ کے اندر تین سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھیں گے تو جنت کے اندر تین سو درخت لگ سکتے ہیں۔ دنیا کے اندر کسی کے پاس ایسا باغ موجود ہو جس میں تین سو درخت پھل دار ہوں؛ تو اس کی کتنی بڑی قیمت لگائی جاسکتی ہے؟ لاکھوں کے اندر لگائیں گے۔ اوران کا حال یہ کہ سال میں ایک مرتبہ پھل لائیں گے، یا زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ لا سکتے ہیں، اس سے زیادہ تو لانے والے نہیں ہیں۔ اور پھر وہ ختم ہونے والی چیز ہے۔

اور جنت کا حال تو یہ ہے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ سورج گرہن کی نماز پڑھارہے تھے، اس نماز میں آپ کچھ آگے بڑھے، جیسے کوئی چیز لے رہے ہوں، پھر پیچھے ہٹ گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ! ہم نے دیکھا کہ آپ نے ہاتھ اس طرح آگے بڑھایا جیسے کوئی چیز لے رہے ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اس نماز کے اندر میرے سامنے جنت پیش کی گئی تھی۔ مَیں نے چاہا کہ اس کا ایک خوشہ توڑلوں۔ اگر مَیں اس کا ایک خوشہ لے لیتا اور تم لوگ قیامت تک کھاتے رہتے؛ تب بھی کبھی ختم نہ ہوتا۔ (بخاری شریف ۷۰۳) اس لئے کہ جنت کے پھل اور خوشہ کا حال یہ ہے کہ اس میں سے اگر ایک دانہ توڑ لیا جائے تو فوراً اسی وقت اس کی جگہ پر دوسرا دانہ آجائے گا۔ جب ایک خوشہ کا یہ حال ہے تو یہاں تو جنت کے ایسے تین سو درخت ملیں گے۔ لہٰذا اندازہ لگائیے کہ کتنے زیادہ قیمتی ہوں گے

تو مَیں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ اگر کوئی آدمی اپنے یہ پانچ منٹ دنیا کے اندر لگاوے اور اس سے ہزار روپے حاصل کرے، یہ زیادہ فائدہ کی بات ہوئی؟ یا اس پانچ منٹ کو تسبیح کے اندر لگائے اور اس سے تین سو مرتبہ سبحان اللہ پڑھ کر آخرت کا فائدہ حاصل کرے، جو ہمیشہ باقی رہنے والا ہے؛ یہ زیادہ نفع کی بات ہے؟ اور اگر ہم اپنے اس وقت سے زیادہ سے زیادہ دنیا کما بھی لیں، تب بھی یوں کہا جا سکتا ہے کہ ہم گھاٹے ہی میں ہیں۔ نبی کریم ﷺ یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ اس وقت اور تندرستی کو آدمی اس طرح استعمال کرے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو۔

وقت کے چند صحیح قدردان

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ ان نعمتوں سے ایسا فائدہ نہیں اُٹھاتے جیسا اٹھانا چاہیے۔ لیکن اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جو اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں۔ فضائلِ ذکر میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے علی جرجانی کا واقعہ نقل کیا ہے، آپ نے پڑھا بھی ہوگا، ان کا حال یہ تھا کہ روٹی کھانے کے بجائے ستو پھانک لیا کرتے تھے۔ کسی نے کہا: آپ روٹی نہیں کھاتے، ستو پھانکتے ہیں؟ تو فرمایا: ہاں! روٹی کھانے اور ستو پھانکنے کے درمیان کا جو وقت بچتا ہے، اس کا فائدہ مَیں نے یہ محسوس کیا کہ مجھے ستّر مرتبہ سبحان اللہ کہنے کا موقع مل جاتا ہے ان کا یہ معمول چالیس سال سے تھا یعنی چالیس سال سے روٹی کھانا چھوڑ رکھا تھا اور ستو پھانک کر کام چلاتے تھے۔ یہ تھے جنھوں نے اپنے وقت کی قدر کی، اس سے فائدہ اُٹھایا اور اس کو صحیح استعمال کیا۔

فضائلِ صدقات کے اندر حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے داؤد طائی کے متعلق لکھا ہے کہ وہ

بجائے اس کے کہ روٹی چبا کر کھائیں، اس کو بھگو دیا کرتے تھے اور پھر اس کو گھول کر پی لیا کرتے تھے، سالہا سال سے ان کا یہ معمول تھا۔ کسی نے پوچھا: آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ تو انہوں نے بتلایا کہ دونوں کا مَیں نے اندازہ نکالا، تو اتنے وقت کے اندر مَیں قرآنِ پاک کی پچاس آیتوں کی تلاوت کرسکتا ہوں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ مَیں روٹی چبا کر کھاؤں، گھول کر پی لیا کرتا ہوں، اور مجھے جو وقت ملتا ہے اس میں مزید پچاس آیتیں پڑھ لیتا ہوں یہ وہ حضرات تھے جنہوں نے اپنے وقت کی صحیح قدر کی۔

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ کی ان دو نعمتوں سے جس قدر فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اس کی جو قیمت وصول کرنی چاہیے، اس قیمت کے وصول کرنے کے معاملہ میں بہت سارے لوگ غافل ہیں۔ اکثریت کا یہ حال ہے۔

﴿نقصان در نقصان﴾

یہ تو اس وقت ہے کہ دنیوی اعتبار سے بھی کچھ فائدہ اُٹھائیں۔ اور اگر ہم ایسے ہی اپنے اوقات کو ضائع کردیں کہ نہ دنیوی فائدہ اُٹھا رہے ہیں، نہ اخروی فائدہ اُٹھا رہے ہیں، تو پھر کیا کہا جائے گا۔ اور اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ دنیا کے اعتبار سے اتنی بھی قیمت وصول نہیں کررہا ہے بلکہ اپنے اس وقت کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، گناہوں اور خواہشات کے پورا کرنے میں لگادے؛ تو بجائے اس کے کہ یہ وقت اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ بنتا؛ اس کے لئے مزید وبال کا ذریعہ بنے گا۔ یہ تو صرف نقصان ہی نہیں؛ نقصان در نقصان ہوا۔ گویا اپنے آپ کو وہ ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾

اللہ تعالیٰ کی ان دونعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے معاملہ میں بہت سارے لوگ گھاٹے اور خسارے میں ہیں یعنی ان نعمتوں سے جس قدر فائدہ اُٹھانا چاہیے؛ اتنا فائدہ نہیں اُٹھاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دونعمتوں سے نواز رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صحت بھی دے رکھی ہے اور فرصت بھی دے رکھی ہے۔ اگر اپنے کام کاج میں لگے ہوئے ہیں، تو کاروبار کا وقت نکال دیں، اس کے بعد بھی بہت سارا وقت بچتا ہے، ہم اس وقت کے ذریعہ سے بہت کچھ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت، اللہ کی یاد اور اللہ کے ذکر میں مشغول رہ کر اپنے اس وقت کو بھی بہت قیمتی بنا سکتے ہیں، اور اس کی زیادہ سے زیادہ اور بڑی سے بڑی قیمت وصول کر سکتے ہیں؛ لیکن ہم اس معاملہ میں گھاٹے میں ہیں۔

﴿پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو﴾

نبی کریم ﷺ سے کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے نصیحت فرما دیجئے، آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ﴿اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ﴾ پانچ چیزوں سے پہلے پانچ چیزوں کو غنیمت سمجھو۔ (مشکوٰۃ عن الترمذی مرسلاً، ص۴۴۱، ج۲)

﴿شَبَابَکَ قَبْلَ هَرَمِکَ﴾ بڑھاپے سے پہلے جوانی کو غنیمت سمجھ لو۔ اس لئے کہ آدمی جوانی کے اندر اپنے قویٰ کے ذریعہ سے جتنا کام کر سکتا ہے، بڑھاپا آنے کے بعد قویٰ وہ کام نہیں کر سکتے، بڑھاپے میں وہ قوت باقی نہیں رہتی، اور وہ جوشِ عمل بھی باقی نہیں رہتا، اور بھی بہت ساری کمزوریاں آجاتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جوانی کے زمانہ میں جتنا کر سکتا ہے، بڑھاپے میں وہ طاقت نہیں رہتی۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جوانی کو بڑھاپے سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔

دوسری بات ارشاد فرمائی: ﴿غِنَاءَکَ قَبْلَ فَقْرِکَ﴾ اپنی مالداری کو فقیری سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔ معلوم نہیں، آج مالداری ہے؛ کل فقیری آسکتی ہے۔ لہٰذا آج مالداری کی حالت میں اللہ کی دی ہوئی اس دولت کے ذریعہ جتنی نیکیاں کما سکتے ہو، نیکیوں کے کاموں میں جتنا خرچ کر سکتے ہو؛ کرلو۔ اُس وقت نہیں کرسکو گے۔

تیسری چیز ارشاد فرمائی: ﴿وَصِحَّتَکَ قَبْلَ سُقْمِکَ﴾ اپنی تندرستی کو بیماری سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اس کا مطلب ہے کہ آدمی تندرستی کے اندر جو کچھ فائدہ حاصل کرسکتا ہے؛ بیماری میں وہ کام نہیں کرسکتا۔

پھر فرمایا: ﴿وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ﴾ اپنی فرصت کو مشغولی سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔

اخیر میں فرماتے ہیں: ﴿وَحَیَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ﴾ اپنی زندگی کو موت سے پہلے غنیمت سمجھ لو۔ زندگی تو کیسی ہی سہی، بڑھاپے والی ہو یا بیماری والی ہو؛ غنیمت ہے۔ ویسے تو بیماری کے مقابلہ میں تندرستی بہت اونچی چیز ہے، یا بڑھاپے کے مقابلہ میں جوانی بہت اونچی چیز ہے، لیکن اگر بڑھاپے والی بھی زندگی مل گئی، وہ موت کے مقابلہ میں بہر حال بہت غنیمت ہے۔ اس لئے کہ بڑھاپے کی حالت میں کمزوری کی وجہ سے آدمی اگرچہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت نہیں رکھتا، لیکن زبان تو ہلا سکتا ہے۔ اور ویسے بھی بڑھاپے میں زبان زیادہ ہی زوروں پر آجاتی ہے، اس وقت اگر تسبیح پڑھ لے، اللہ کا نام لے لے؛ تو بیماری کے اندر پڑے پڑے بھی بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔

﴿حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قابلِ اقتداء طرزِ عمل﴾

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ تشریف لے جا رہے تھے، کسی جگہ ایک قبر کو

دیکھا، اپنے اونٹ سے اترے اور دو رکعت نماز ادا کی۔ لوگوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ لوگ یوں سمجھے کہ شاید جس کی قبر ہے اُس کے ساتھ کوئی تعلق ہوگا، اس مناسبت سے یہاں پر انھوں نے دو رکعت پڑھی ہو۔ تو انھوں نے فرمایا: ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مرتبہ آپ ﷺ کا گزر ایک قبر کے پاس ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا: آدمی موت کے بعد تمنا کرے گا کہ کاش مجھے دو رکعت پڑھنے کا وقت ملتا۔ مَیں نے جب قبر کو دیکھا تو نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد یاد آ گیا تو مَیں نے یوں سوچا کہ آج تو مَیں زندہ اور سلامت ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے اور میرے پاس فرصت بھی ہے، کیوں نہ فائدہ اُٹھالوں اور دو رکعت ادا کرلوں۔ لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ان دونوں نعمتوں (تندرستی، فرصت) سے جتنا بھی فائدہ اُٹھا سکتا ہو؛ فائدہ اُٹھالے۔

یہاں پر جتنے بھی حضرات موجود ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہم سب کو ان دونوں نعمتوں سے نواز رکھا ہے، اگرچہ کاروباری اعتبار سے مشغولی ہوتی ہے، لیکن وہ اتنی زیادہ نہیں ہوتی کہ آدمی کو اللہ کی یاد کرنے کا اور دوسرے نیکی کے کام کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اس لئے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بہت سارے لوگ اس سے فائدہ اُٹھانے کے معاملہ میں خسارے میں ہیں۔

﴿آپ ﷺ کی جفاکشی﴾

عن عائشة رضی اللہ عنہا **أن النبی** ﷺ **كَانَ يَقُوْمُ مِنَ اللَّيْلِ حَتَّى تَتَفطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقُلْتُ لَهُ: لِمَ تَصْنَعُ هٰذَا يَا رَسُوْلَ اللهِ وَقَدْ غَفَرَ اللهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ: أَفَلاَ أَكُوْنَ عَبْدًا شَكُوْرًا.**

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات میں قیام فرماتے تھے یعنی تہجد کی نماز میں آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے رہتے تھے؛ یہاں تک کہ آپ کے دیر تک تہجد میں مشغول رہنے کی وجہ سے قدمِ مبارک پھٹ جاتے تھے۔ اگر آدمی دیر تک کھڑا رہے تو اس کے پاؤں پر ورم آجاتا ہے اور کبھی اس کی وجہ سے شگاف پڑ جاتے ہیں اور خون بھی بہنے لگتا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ایسا کیوں کرتے ہیں جبکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف فرمادیئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں تو آپ کے لئے کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کیا مَیں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ یعنی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے بھی چاہیے کہ خود اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے، جب اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمتوں سے نواز رکھا ہے تو اس کا شکرانہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زیادہ سے زیادہ عبادت کرے، اور اس میں مشغول رہے۔

یہاں بھی حضور اکرم ﷺ کے مجاہدہ کو بیان فرمارہے ہیں کہ آپ نبی آخر الزمان تھے اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو جیسا بھی نوازا گیا؛ ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ اس کے باوجود نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اور اس کی رضا جوئی میں، اللہ کا قرب اور نزدیکی حاصل کرنے میں اتنا زیادہ اہتمام اور مجاہدہ فرماتے تھے، اتنی زیادہ محنت اور کوشش کرتے تھے کہ رات کے قیام کی وجہ سے اور تہجد میں کھڑے رہنے کی وجہ سے آپ ﷺ کے پاؤں میں شگاف پڑ جاتے تھے۔ اب ہم لوگوں کو تو اور زیادہ ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿آخری عشرہ کو وصول فرمانے کا حضور ﷺ کا اہتمام﴾

عن عائشة رضی اللہ عنہا أنّها قالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إذا دَخَلَ الْعَشْرُ أَحْيَا اللَّيْلَ وَ أَيْقَظَ أَهْلَهُ وَ جَدَّ وَشَدَّ الْمِئْزَرَ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ آتا تھا تو نبی کریم ﷺ رات بھر بیدار رہتے تھے، پوری رات آپ عبادت کرتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگا دیا کرتے تھے، خوب محنت سے کام لیتے تھے اور لنگی باندھ لیتے تھے۔ ویسے تو نبی کریم ﷺ سال بھر قیام لیل کا اہتمام فرماتے تھے لیکن رمضان میں اور رمضان کے بھی آخری عشرہ میں -جس کے متعلق روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتی ہے- نبی کریم ﷺ عبادت کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے، یہاں تک کہ آخری عشرہ میں رات بھر آپ نہیں سوتے تھے اور عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ اور اتنا ہی نہیں کہ خود اس کا اہتمام فرماتے ہوں، بلکہ آپ اپنے گھر والوں کو بھی جگا دیا کرتے تھے۔ گویا آپ گھر والوں کو اور اپنے ماتحتوں کو اس کی طرف متوجہ فرماتے تھے کہ وہ بھی اس کا اہتمام کریں۔

آپ ﷺ نے اپنے عمل سے ہم لوگوں کو اس بات کی تعلیم دی کہ ہمیں خود بھی رمضان المبارک کے آخری عشرہ کے وصول کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے اور ساتھ ہی اپنے ماتحتوں کو بھی اس کی طرف متوجہ کرنا چاہیے اور سب کو مل کر اس عشرہ کو وصول کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

﴿وَشَدَّ الْمِئْزَرَ کے دو مطلب﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ﴿وَشَدَّ الْمِئْزَرَ﴾ کے دو مطلب بیان کئے ہیں۔ لنگی باندھ لیتے تھے یعنی نبی کریم ﷺ اپنی ازواجِ مطہرات کے پاس نہیں جاتے تھے یعنی خاص کر ان دس

دنوں میں ان سے صحبت نہیں کرتے تھے۔

دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ خوب محنت اور مجاہدہ سے کام لیتے تھے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کام میں اپنی زیادہ محنت کو تعبیر کرتا ہے تو یوں کہتا ہے کہ لنگی باندھ لی۔ مطلب یہ ہے کہ خوب محنت اور کوشش کی۔ اور اسی مطلب کو راجح قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ نبی کریم ﷺ عام طور پر رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا اہتمام فرماتے تھے، اور اعتکاف کی حالت میں ازواجِ مطہرات سے صحبت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ اعتکاف کی حالت میں یہ چیز ممنوع قرار دی جاتی ہے۔ لہٰذا دوسرے والے مطلب کو علماء اور شرّاح نے زیادہ بہتر قرار دیا ہے کہ حضور ﷺ اپنی محنت اور کوشش کو بڑھا دیا کرتے تھے اور بہت زیادہ مجاہدہ سے کام لیتے تھے۔ گویا آپ نے اپنے عمل کے ذریعہ سے اُمت کو اس بات کی تعلیم دی کہ اس کو بھی رمضان المبارک کا اور خاص کر اس کے آخری عشرہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿جو مجاہدہ زیادہ کر سکتا ہو؛ وہ محبوب بھی زیادہ﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَيْرٌ وَأَحَبُّ اِلیٰ اللهِ مِنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِيْفِ، وَفِیْ كُلٍّ خَيْر. اِحْرِصْ عَلیٰ مَايَنْفَعُکَ، وَاسْتَعِنْ بِاللهِ وَلَاتَعْجَزْ، وَاِنْ أَصَابَکَ شَيْئٌ فَلاَ تَقُلْ: لَوْأَنِّیْ فَعَلْتُ كَذَاوَ كَذَا، وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَاللهُ وَمَاشَآءَ فَعَلَ، فَاِنَّ لَوْتَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مضبوط ایمان والا اور مضبوط مسلمان کمزور مسلمان کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ محبوب اور اچھا ہے اگرچہ دونوں ہی میں خیر ہے۔ یعنی جو مضبوط ہے اس کے اندر بھی خیر اور بھلائی ہے، ایمان کی دولت سے وہ بھی مالا مال ہے، اور جو کمزور ہے وہ بھی ایمان کی دولت سے مالا مال ہے۔ لیکن

جومضبوط اورقوی، تندرست اورتوانا ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اورفرمانبرداری میں اوراس کے احکام کی بجاآوری میں جتنی زیادہ کوشش کرسکتا ہے، جتنی محنت اورمشقت برداشت کرسکتا ہے؛ کمزور آدمی اتنی محنت اور مشقت برداشت نہیں کرسکتا۔ لہٰذا جو آدمی اللہ کے واسطے جتنی زیادہ مشقت اُٹھائے گا، کوشش کرے گا اور تکالیف برداشت کرے گا؛ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مقام اور مرتبہ زیادہ ہوگا۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی لوگوں کے ساتھ ان کے درمیان میں رہتا ہے اوران کی طرف سے پہنچائی جانے والی ایذاؤں اور تکالیف پر صبر کرتا ہے، وہ اس شخص کے مقابلہ میں بہتر ہے، جو الگ رہتا ہے اوران کی ایذاؤں پر صبر نہیں کرتا۔ (مشکوۃ عن الترمذی وابن ماجہ ۲/۴۳۲) چونکہ اس آدمی نے لوگوں کی ایذارسانی پر صبر سے کام لیا اوران کے درمیان میں رہ کر ان کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کیا، تو اس نے اللہ کے واسطے اوراس کی فرمانبرداری اور اطاعت کے لئے اوراس کے احکام کی بجاآوری کے لئے زیادہ تکلیف اُٹھائی؛ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ محبوب بنا۔

یہاں مؤمنِ قوی اسی نسبت سے اللہ کا زیادہ محبوب اور بہتر قرار دیا گیا ہے، ورنہ ایک مؤمن ہونے کی حیثیت سے یا نفس ایمان کے اعتبار سے دونوں کا مقام برابر ہے، البتہ ایک آدمی مجاہدہ کی طاقت اور مجاہدہ پر قدرت زیادہ رکھتا ہے اوراپنی قوت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں زیادہ محنتیں برداشت کرتا ہے، اس لئے وہ اللہ کا زیادہ محبوب بنتا ہے۔

پھر نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: جو چیز تمہارے فائدہ کی ہے اس کے کرنے

میں اوراس کے انجام دینے میں حریص اور لالچی رہو۔یعنی جو چیز تمہارے لئے آخرت کے اعتبار سے جتنی زیادہ مفیداور کارآمد ہوسکتی ہے اوراس کام سے آپ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوسکتا ہے، یااگر دنیوی فائدہ متعلق ہے،اوراس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں ہے،تو ایسے کاموں کے حریص رہو۔

﴿وَاسۡتَعِنۡ بِاللّٰہِ وَلَاتَعۡجَزۡ﴾ اوراللہ تعالیٰ ہی سے مدد چاہو،اوراللہ کی اطاعت میں اور نیکی کے کاموں کے انجام دینے میں عاجز، درماندہ اور کمزورمت بنو،اللہ تعالیٰ کی اطاعت اورفرمانبرداری میں آدمی کو ہمت اورقوت سے کام لینا چاہیے۔

﴿تصوف کا خلاصہ﴾

جیسا کہ مَیں عرض کرچکا ہوں کہ حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: تصوف کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ آدمی کا نفس اگرکسی نیکی کے کام میں سستی کررہا ہے تو اس کا مقابلہ کرکے نیکی کے اس کام کوانجام دے۔اورکسی گناہ سے بچنے میں اگرسستی سے کام لے رہا ہے،تو نفس کا مقابلہ کرکے اس گناہ سے بچ جائے۔یہی تصوف کا خلاصہ ہے۔

اگرآدمی ہمت سے کام لے کرنیکی کے کاموں کوانجام دے اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے،یہی سارے مجاہدوں کا نچوڑ ہے۔اوراسی کے لئے بزرگوں کی خدمت میں آدمی وقت دیتا ہے،تاکہ ان کی خدمت کی وجہ سے آدمی اتنی قوت حاصل کرلے،اوراس میں اتنی ہمت آجائے،جس کے ذریعہ سے وہ اپنے نفس کا مقابلہ کرسکے۔

﴿مقدرات پیش آچکنے کے بعد حسرت مت کرو﴾

﴿وَاِنۡ اَصَابَکَ شَیۡءٌ فَلَا تَقُلۡ:لَوۡاَنِّیۡ فَعَلۡتُ کَذَاوَکَذَا،وَلٰکِنۡ قُلۡ: قَدَّرَاللّٰہُ، وَمَاشَآءَ فَعَلَ﴾

اگر تم کو کوئی مصیبت پہنچے تو یہ مت کہو: اگر مَیں ایسا کرتا، تو یوں ہوتا۔ بلکہ یوں کہو: اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی مقدر تھا اور اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہی کیا۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس کے پیش آچکنے کے بعد وہ یوں کہتے ہیں کہ مَیں ایسا کرتا، تو یوں ہوتا۔ فلاں ایسا کرتا، تو ایسا ہوتا۔ مثلاً ایک آدمی کو کہیں سفر میں جانا تھا، آپ سے مشورہ طلب کیا، آپ نے منع کیا کہ مت جاؤ، لیکن اس کے باوجود وہ گیا اور کوئی حادثہ پیش آ گیا۔ اب وہ یوں کہے کہ اگر مَیں نے اس کا مشورہ مان لیا ہوتا تو ایسا نہیں ہوتا۔ یا آپ یوں کہیں کہ مَیں نے تم کو جانے سے منع کیا تھا، اس کے باوجود تم گئے، میرا مشورہ مان لیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔ حالانکہ یہ چیز اس کے مقدر میں لکھی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز اس کے حق میں طے شدہ تھی، لہٰذا اس کو تو پیش آنا ہی تھا۔ اس لئے یوں کہنا کہ میرے کہے ہوئے پر آپ عمل کرتے۔ یا اس کا یوں سوچنا کہ مَیں فلاں کے مشورہ کو عملی جامہ پہناتا اور اس کی بات مان لیتا؛ تو ایسا نہ ہوتا۔ یہ تقدیر کو رد کرنے والی بات ہے۔ شیطان اس طریقہ سے آدمی کو ایمان بالقدر سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کبھی ایسا جملہ اپنی زبان سے نہ نکالے۔ یہ شیطان کو اپنے ایمان میں دخل اندازی کا موقعہ دینا ہے۔ اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَاِنَّ لَوْتَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ﴾ اس لئے کہ جو ''اگر، اگر'' والی بات ہوتی ہے؛ وہ شیطان کے لئے دروازہ کھولنے والی ہوتی ہے۔ جو تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے، وہ تو اپنی جگہ پر اٹل ہوتا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے اخلاق میں لکھا ہے کہ اگر کوئی چیز ٹوٹ جاتی یا کوئی نقصان ہونے پر جس کے ہاتھوں نقصان پیش آیا ہے اس کو کوئی شخص ملامت کرتا تو نبی کریم ﷺ فرماتے: بھائی چھوڑو! اگر کوئی دوسری بات ہوتی؛ تو وہی ہو کر رہتی۔ (مشکوۃ ص۵۱۹ ج۲ عن البیہقی)

مطلب یہ ہے کہ جو چیز ٹوٹی ہے، اگر اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ منظور ہوتا کہ نہ ٹوٹے؛ تو ایسا ہی ہوتا۔ جب اللہ تعالیٰ کے یہاں ٹوٹنا منظور ہو چکا تھا، اب اس پر اس کو ملامت کرنا مناسب نہیں ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ گھر والوں کو، بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے ہیں۔ ایسی ڈانٹ اچھی نہیں ہے۔ نصیحت کے طور پر آئندہ کے لئے احتیاط کی تاکید کر دینا الگ چیز ہے، لیکن آہ و واویلا کرنا اور اس کے اوپر شور مچانا، نقصان کے اوپر زجر و توبیخ کرنا، یہ غلط طریقہ ہے، جو مناسب نہیں ہے۔ بہر حال! جو معاملہ پیش آیا، اس کے متعلق یوں سوچنا کہ اگر یوں کرتا تو یوں ہوتا؛ یہ بری بات ہے۔

﴿ایمان بالقدر پر زد نہ پڑتی ہو؛ تو اس کی اجازت ہے﴾

البتہ کسی نیک کام کی تمنا کے طور پر یہ لفظ ''اگر'' کو استعمال کرتا ہے کہ جس میں تقدیر کا رد کرنا بھی لازم نہیں آتا؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو علم حاصل کرنے کا موقعہ نہیں ملا، اب وہ کہے: کاش! مَیں نے علم حاصل کیا ہوتا؛ تو اچھا تھا۔ ایسی تمنا کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اسی طرح یہ کہے: اگر ہمیں بھی مال ملتا؛ تو ہم بھی اللہ تعالیٰ کے راستے میں یوں خرچ کرتے۔ اگر کوئی آدمی یہ بول رہا ہے؛ تو یہ ''اگر'' تقدیر کو رد کرنے والی بات نہیں ہے، اور اس میں اس کے لئے کوئی حرج کی چیز نہیں ہے۔ لیکن کسی مصیبت کے موقعہ پر یا کسی واقعہ کے پیش آنے پر ''اگر'' اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس میں بظاہر تقدیر کی تردید معلوم ہوتی ہے؛ تو اس سے منع کیا گیا ہے، اس کی اجازت نہیں ہے۔

جنت اور جہنم کی باڑھ (Boundary)

وعنہ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ، وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جہنم کو نفس کی مَن پسند چیزوں یعنی خواہشات سے ڈھانپ دیا گیا ہے، اور جنت کو نفس کے خلاف امور سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔

یہی روایت سنن کے اندر ایک اور طریقے سے آئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب جنت کو پیدا فرمایا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا: جاؤ اور جنت اور اس کی نعمتوں کو دیکھ کر آؤ۔ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام گئے اور جب انہوں نے جنت اور اس کی نعمتوں کو دیکھا تو آ کر عرض کیا باری تعالیٰ! یہ تو ایسی نعمتیں ہیں کہ جو آدمی اس کو دیکھے گا، ضرور حاصل کرے گا یعنی کوئی بھی اس کو حاصل کئے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو نفس کے خلاف امور سے ڈھانپ دیا یعنی جو آدمی نفس کے خلاف کام کرے گا اسی کو جنت ملے گی۔ اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا: جاؤ دیکھ کر آؤ۔ جب وہ دیکھ کر آئے تو بتلانے لگے کہ اب تو یہ خطرہ ہے کہ شاید ہی کوئی اس کے اندر جا سکے۔ (جمع الفوائد ص ۶۰۷ ج ۴۔ عن أبی داود والترمذی والنسائی)

اس روایت کو لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ جب تک آپ نفس کے خلاف نہیں کریں گے، وہاں تک جنت اور اس کی نعمتوں کا حاصل ہونا مشکل ہے۔ جنت میں لے جانے والی جتنی بھی چیزیں ہیں؛ وہ وہی ہیں جن کے انجام دینے میں آدمی کو اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کچھ محنت اور کوشش سے کام لینا پڑتا ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خواب کا قصہ بیان فرما رہے ہیں کہ آپ

سے سوال کیا گیا: ﴿فِيْمَ يَخْتَصِمُ الْمَلَاءُ الْأَعْلٰى﴾ ملاءِ اعلیٰ والے کس چیز میں گفتگو اور بحث کررہے ہیں؟ یعنی کون سی چیز ان کے لئے موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے۔ اس کا جواب حضور ﷺ کو خواب ہی کے اندر یہ دیا گیا کہ درجات کے بلند کرنے والی چیزوں میں وہ لوگ گفتگو کررہے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے پوچھا: کون سی چیزیں درجات کو بلند کرنے والی ہیں؟ اس کے جواب میں ایک بات یہ بھی بتلائی گئی: ﴿اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلَى الْمَكَارِهِ﴾ آدمی وضو کو اپنی طبیعت کے خلاف پورے طور پر انجام دے۔ (ترمذی کتاب التفسیر، سورۃ الصّٰفّٰت)

مثلاً سردی کا زمانہ ہے اور طبیعت ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا نہیں چاہتی اور اگر کرنا پڑ جائے تو طبیعت جلدی سے آمادہ نہیں ہوتی، صبح ایک تو نیند سے اُٹھا، جلدی سے نل کھولنے کو بھی جی نہیں چاہتا، جلدی سے ہاتھ میں پانی لینے کو بھی جی نہیں چاہتا، ٹھنڈک کی وجہ سے طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، لیکن پھر بھی اگر کوئی اپنی طبیعت کے خلاف اور طبیعت کی ناپسندیدگی کے باوجود وضو کرلے گا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کے درجات بلند ہوتے ہیں اور گناہ معاف ہوتے ہیں۔ ایسے تمام امور جنت تک لے جانے والے ہیں۔ اسی کو حدیث میں فرمایا گیا کہ جنت کو طبیعت کے خلاف اُمور سے ڈھانپ دیا گیا۔

پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کو پیدا فرمانے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا جاؤ! دیکھ کر آؤ۔ تو جہنم کو اور وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب اور جو سزائیں تھیں ان کو دیکھ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر عرض کیا: باری تعالیٰ! جو کوئی بھی اس کو دیکھے گا یا اس کے عذابات کو سنے گا؛ تو کبھی اس میں نہیں جائے گا، سب ہی اس سے بچیں گے۔ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کو نفس کے مَن پسند امور یعنی خواہشاتِ نفس سے ڈھانپ دیا۔ پھر کہا:

اب جا کر دیکھ کر آؤ۔ جب دیکھ کر آئے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: باری تعالیٰ! اب تو شاید ہی کوئی اس سے بچے گا، سب ہی جہنم کے اندر جائیں گے۔ اس لئے کہ خواہشاتِ نفس سب کے ساتھ لگی ہوئی ہیں اور کوئی بھی آدمی ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو خواہشات سے بچائے۔ عام طور پر آدمی اس کے اندر پڑ جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں جہنم میں جائے گا، اسی کو اس حدیثِ پاک میں بیان کیا گیا: ﴿حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾ جہنم کو خواہشاتِ نفسانی سے یعنی نفس کی من پسند چیزوں سے ڈھانپا گیا ہے۔

اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو چیز نفس کو پسند ہو، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے، اور اس سے بچانے کے لئے اگر نفس کا مقابلہ کرنا پڑے، کچھ محنت برداشت کرنی پڑے، کچھ کوشش کرنی پڑے؛ تو اس کے لئے آدمی کو مجاہدہ کر لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس بات کی توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿المجاهدة ۳﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

عن أبی عبداللّٰہ حذیفۃ بن الیمان رضی اللہ عنہما قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَافْتَتَحَ الْبَقَرَةَ، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ عِنْدَالْمِائَةِ. ثُمَّ مَضَى. فَقُلْتُ: يُصَلِّيْ بِهَافِيْ رَكْعَةٍ. فَمَضَى، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ بِهَا. ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَآءَ. فَقَرَأَهَا. ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ، فَقَرَأَهَا. يَقْرَأُمُتَرَسِّلاً، اِذَا مَرَّبِآيَةٍ فِيْهَاتَسْبِيْحٌ؛ سَبَّحَ. وَاِذَا مَرَّبِسُؤَالٍ؛ سَأَلَ. وَاِذَامَرَّبِتَعَوُّذٍ؛ تَعَوَّذَ. ثُمَّ رَكَعَ. فَجَعَلَ يَقُوْلُ: ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ)) فَكَانَ رُكُوْعُهُ نَحْواًمِنْ قِيَامِهٖ. ثُمَّ قَالَ: ((سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَه، رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ)) ثُمَّ قَامَ قِيَاماًطَوِيْلاً قَرِيْباًمِّمَّارَكَعَ. ثُمَّ سَجَدَ. فَقَالَ: ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلٰى)) فَكَانَ سُجُوْدُهٗ قَرِيْباًمِنْ قِيَامِهٖ. (رواہ مسلم)

﴿حضور ﷺ کے رازدار﴾

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں جن کو صاحبُ سِرِّ رسول اللہ یعنی نبی کریم ﷺ کے رازدار بھی کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بعض مخصوص باتیں - خاص کر منافقین کے ناموں کی فہرست - ان کو بتلائی تھی؛ جو اور کسی صحابی کو معلوم نہیں تھی، چنانچہ دوسرے بڑے بڑے صحابہ بھی اس سلسلہ میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

عبداللہ بن ابی- جو منافقین کا سردار کہا جاتا ہے- جب اس کا انتقال ہوا، اس وقت تک منافقین کی نمازِ جنازہ کی ممانعت آئی نہیں تھی، اس کے فرزند جن کا نام بھی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا، وہ بڑے مخلص مؤمن تھے، انھوں نے آکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! میرے والد کا انتقال ہوگیا ہے، آپ ان کی نمازِ جنازہ پڑھائیے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور آپ نے عبداللہ بن ابی کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ جس وقت آپ نماز جنازہ پڑھانے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے؛ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑلیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ فلاں موقعہ پر اس نے یہ تکلیف پہنچائی، فلاں موقعہ پر اس نے یہ تکلیف پہنچائی۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی جو جو حرکتیں تھیں اور اس کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مسلمانوں کو جو ایذائیں پہنچائی گئیں؛ وہ ساری باتیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیں اور عرض کیا: اس کے باوجود آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھیں گے؟ حالانکہ باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا: ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ اگر آپ ان کے لئے ستّر مرتبہ بھی دعائے مغفرت کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ستّر مرتبہ سے زیادہ دعائے مغفرت کرنے سے ان کی مغفرت ہوجائے گی؛ تو مَیں اس سے زیادہ بھی ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے کے لئے تیار ہوں، پھر آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپ ابھی جنازہ کی نماز ادا فرما کر وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں یہ حکم نازل ہوا کہ آپ آئندہ کسی بھی کافر یا منافق کی نمازِ جنازہ نہ پڑھیں۔ (جمع الفوائد ص ۲۱۶ ج ۴، عن الشیخین والنسائی)

بہر حال! جب تک نبی کریم ﷺ صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے، وہاں تک تو اگر کسی منافق کا انتقال ہوتا اور صحابہ کو معلوم ہو جاتا کہ آپ ﷺ اس کے جنازہ کی نماز کے لئے تشریف نہیں لے گئے ہیں؛ تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی کہ وہ منافق ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ کے بعد کوئی ایسا ذریعہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس نہیں تھا جس سے وہ معلوم کرتے صرف حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ تھے جن کو حضور ﷺ نے منافقین کے ناموں کی فہرست بتلائی تھی، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے ایک ذریعہ تھے۔

اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ حضور ﷺ کے بعد اگر کسی کا انتقال ہو جاتا تو معلوم کراتے کہ دیکھو! اس کے جنازہ میں حضرت حذیفہ ہیں یا نہیں؟ اگر حضرت حذیفہ جنازہ میں آئے ہوتے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی کہ وہ منافق نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک ہو جاتے۔ اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بتلایا جاتا کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے ہیں؛ تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اس کے جنازہ میں نہیں جاتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خوفِ خدا کی کیفیت

یہاں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بات ضمناً یاد آ گئی، اس کو بھی عرض کر دوں کہ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت جن کا مقام یہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں، جن کے متعلق نبی کریم ﷺ نے یہاں تک فرمایا: ﴿لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ﴾ اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمر ہوتے (جمع الفوائد، ص ۵۰۹ ج ۲ عن الکبیر بضعف) ان کے اور بھی بڑے حالات ہیں۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: حضرت عمر جس گلی سے گذرتے ہیں تو شیطان

راستہ بدل دیتا ہے۔ (جمع الفوائد ص ۵۰۶ ج ۴) یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شیطان اتنا ڈرتا ہے۔اس کے باوجود ان حضرات کو اپنے اوپر اطمینان نہیں تھا۔

اسی لئے ایک مرتبہ تنہائی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کہا: اے حذیفہ! ذرا یہ تو بتلاؤ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو جن منافقین کی فہرست دی ہے، اس میں عمر کا نام تو نہیں ہے؟ اللہ اکبر (کنز العمال ۱۳/۳۴۴۔حدیث نمبر: ۳۶۹۶۲۔البدایہ والنہایہ ۵/۱۹)

یعنی یہ حضرات اپنے متعلق تو اتنی فکر کرتے تھے۔اور اگر ہم میں سے کوئی آدمی کوئی خواب دیکھ لے، تو پھر معلوم نہیں وہ اپنے متعلق کیا کیا سوچنے اور سمجھنے لگ جاتا ہے۔حالانکہ خواب تو خواب ہے۔اور ان حضرات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دنیا ہی میں جنت کی بشارتیں دی گئیں، اس کے باوجود ان حضرات کو اپنی ذات پر اطمینان نہیں تھا۔

﴿اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمنا کی اجازت ملے﴾

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا مقام اتنا اونچا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے کہا: اگر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمنا کرنے کی اجازت دی جائے اور کہا جائے کہ جو تمنا کرو گے وہ پوری کی جائے گی، تو مَیں اللہ تعالیٰ سے حضرت ابو عبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل اور حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جیسے لوگ مانگوں گا کہ اے اللہ! مجھے ایسے لوگ عطا فرماتا کہ مَیں ان کو حدودِ سلطنت کے مختلف علاقوں میں امیر مقرر کروں ﴿فاستعملهم فی طاعة الله﴾

(اسد الغابہ: ۱/ ۴۶۹، ترجمہ حذیفہ بن یمان)

﴿نوافل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طویل قیام کی ایک جھلک﴾

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابہ میں شمار ہوتے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ایک سال بعد ان کا انتقال ہوا۔وہ فرماتے ہیں:

ایک مرتبہ رات میں جب نبی کریم ﷺ تہجد کی نماز ادا فرما رہے تھے، تو مَیں بھی آپ کے ساتھ شریک ہوگیا۔ اگر کوئی نماز پڑھتا ہو، اور آپ اس کی اقتدا کرلیں؛ تو اس کی اجازت ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اپنی نماز میں سورۂ فاتحہ کے بعد قراءت میں سورۂ بقرہ شروع فرمائی۔ تو مَیں نے اپنے جی میں یوں سوچا کہ آپ شاید سو آیتوں کے بعد رکوع فرمادیں گے۔ یہ خود بھی لمبی لمبی نماز پڑھنے والے تھے، اس لئے انھوں نے سوچا بھی تو سو آیتوں کا سوچا، اس سے کم کا تو سوچا بھی نہیں۔ لیکن جب سو آیتیں پوری ہوئیں تو آپ ﷺ نے اور آگے سلسلہ جاری رکھا۔ جب آپ آگے بڑھ گئے تو مَیں نے اپنے جی میں یہ سوچا کہ شاید آپ اپنی اس رکعت میں سورۂ بقرہ پوری فرمائیں گے۔ لیکن جب سورۂ بقرہ پوری ہوئی تو آپ اور آگے بڑھے، اب آپ نے سورۂ نساء شروع فرمادی۔ مَیں نے یوں سوچا کہ شاید اس کو پوری کرنے کے بعد آپ رکوع فرمائیں گے۔ لیکن اس کو پوری کرنے کے بعد سورۂ آل عمران شروع فرمادی اور اس کو بھی پوری ختم فرمائی۔ یہ کل تقریباً سوا پانچ پارے ہوتے ہیں؛ جو آپ نے ایک رکعت میں تلاوت فرمائے ﴿یَقْرَأُ مُتَرَسِّلًا﴾ اور پھر آپ جو تلاوت فرمارہے تھے وہ جلدی جلدی نہیں، بلکہ بڑے اطمینان سے ٹھیر ٹھیر کر تلاوت فرمارہے تھے۔

ویسے بھی نبی کریم ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ نماز کے اندر جب آپ تلاوت فرماتے تھے تو ہر آیت پر وقف فرماتے تھے۔ (جمع الفوائد ۳/۲۸۹ عن اصحاب السنن) اور ساتھ ہی ساتھ دورانِ نماز آپ کوئی ایسی آیت تلاوت فرماتے جس میں تسبیح کا تذکرہ ہوتا، جیسے ﴿سَبَّحَ لِلّٰهِ، يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَافِي السَّمٰوٰتِ﴾ وغیرہ تو اس آیت کو پورا کرنے کے بعد آپ تسبیح یعنی سبحان اللہ بھی پڑھتے تھے۔ اور اگر کسی سوال کا تذکرہ ہوتا، جنت کا یا جنت کی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا، یعنی

ایسی چیزیں کہ جن کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا چاہیے، تو وہاں پر آپ ﷺ اس آیت کو پورا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کا سوال بھی کرتے تھے اور دعا مانگتے تھے۔ اور اگر کسی ایسی چیز پر سے آپ کا گذر ہوتا جس سے پناہ مانگنی چاہیے مثلاً جہنم کا یا جہنم کے عذاب کا، اس کی تکالیف کا تذکرہ ہوتا؛ تو وہاں آپ ﷺ ان سے پناہ چاہتے تھے۔ (جمع الفوائد ۳/ ۲۸۹ عن ابی داؤد)

مطلب یہ ہے کہ بڑے اطمینان سے اور ٹھیر ٹھیر کر اور قراءت کے آداب وحقوق کی پوری رعایت کرتے ہوئے آپ ﷺ نے ایک رکعت میں یہ تینوں سورتیں مکمل تلاوت فرمائیں پھر آپ رکوع میں تشریف لے گئے اور **سبحان ربی العظیم** پڑھتے رہے۔ آپ کا رکوع بھی تقریباً آپ کے قیام کے برابر تھا۔ بعضوں نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ جتنی دیر آپ نے قیام کیا اتنی ہی دیر آپ نے رکوع کیا۔ بعضوں نے فرمایا: جتنا لمبا قیام کیا، اسی مناسبت سے رکوع بھی لمبا کیا۔ اگرچہ رکوع قیام کے برابر تو نہیں تھا، لیکن ایسا بھی نہیں کہ قیام لمبا ہوا تو رکوع پانچ تسبیح پڑھ کر ختم کردیا۔ اس کے بعد آپ نے **سمع اللہ لمن حمدہ، ربنالک الحمد** کہا، پھر قومہ میں بھی آپ تقریباً اتنی دیر تک کھڑے رہے جتنی دیر رکوع میں تھے، اس کے بعد آپ سجدے میں تشریف لے گئے، اس میں بھی **سبحان ربی الاعلیٰ** کی تسبیح پڑھتے رہے، اور آپ کا سجدہ بھی اسی مناسبت سے طویل تھا۔

اس روایت کو لاکر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ باوجودیکہ تمام مخلوقات میں سب سے افضل تھے، اور تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سردار تھے، پھر بھی عبادت میں کتنا مجاہدہ کرتے تھے۔ جب آپ ﷺ مجاہدہ اور محنت کا اتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے؛ تو اب ہمیں کتنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے مناقب﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَيْلَةً، فَأَطَالَ الْقِيَامَ. حَتّٰى هَمَمْتُ بِأَمْرِ سُوْءٍ. قِيْلَ: وَمَاهَمَمْتَ بِهِ؟ قَالَ: هَمَمْتُ أَنْ أَجْلِسَ وَأَدَعَهُ. (متفق علیہ)

یہ روایت بھی اسی طرح کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک رات تہجد کی نماز میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مَیں بھی شریک ہوگیا اور آپ کی اقتداء کرلی لیکن آپ نے اتنا طویل قیام کیا کہ مَیں نے ایک بری چیز کا ارادہ کرلیا، میرے دل میں ایک برا خیال آ گیا۔

حالانکہ روایتوں میں آتا ہے کہ خود حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تہجد میں بہت دیر تک قرآن پڑھتے تھے۔ آپ ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ روزانہ عشاء کی نماز کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ مسلمانوں کے معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے، اور اس میں کبھی دیر بھی لگ جاتی تھی۔ ایک روز اسی طرح دیر ہوئی اور آپ فارغ ہوکر باہر نکلے، مسجد کی طرف بڑھے تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز میں کھڑے ہوئے قرآنِ پاک کی تلاوت کررہے ہیں، حضور ﷺ بھی دیر تک کھڑے ہوئے ان کا قرآن سنتے رہے اور اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّقْرَأَ الْقُرْآنَ رَطْبًا كَمَا أُنْزِلَ فَلْيَقْرَأْ عَلٰى قِرَاءَةِ بْنِ أُمِّ عَبْدٍ﴾ جو آدمی یہ خواہش رکھتا ہو کہ قرآنِ پاک کو اسی طرح تروتازہ پڑھے جس طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اتارا گیا ہے؛ تو اس کو چاہیے کہ ابن ام عبد کی قرأت کے مطابق پڑھے۔ ''ابن ام عبد'' یہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی کنیت ہے۔ (مسند احمد، مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ، حدیث نمبر:۱۷۰)

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کوفہ سے ایک آدمی آیا اور اس نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: مَیں ایک ایسے آدمی کے پاس سے آرہا ہوں جو لوگوں کو قرآنِ پاک زبانی لکھواتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا کہ وہ کون ہے؟ گویا اس چیز کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ناپسند فرمایا۔ آنے والے نے کہا: وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا اور فرمایا: اگر وہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں تو ان کو حق ہے کہ ایسا کریں؛ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے: ﴿مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَّقْرَأَ الْقُرْآنَ رَطْبًا كَمَا أُنْزِلَ فَلْيَقْرَأْ عَلَى قِرَآءَةِ بْنِ أُمِّ عَبْدٍ﴾ (مسند احمد، مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ، حدیث نمبر:۱۷۰)

﴿حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد پڑھی﴾

بہر حال! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود بھی نماز میں بڑے طویل قیام کے عادی تھے، اس کے باوجود فرماتے ہیں: ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد کی نماز میں مَیں بھی شریک ہوگیا اور آپ نے اتنا طویل قیام کیا کہ میرے دل میں برا خیال آنے لگا، مجلس میں جو شاگرد موجود تھے، ان میں سے کسی نے پوچھا: حضرت! کیا برا خیال آیا تھا؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی شخص کوئی بات مبہم بیان کرے، اور اس کی تشریح اس سے پوچھ لی جائے؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، بلکہ بجائے اس کے کہ خود کوئی قیاس آرائی کرے، صاحبِ معاملہ ہی سے دریافت کرلینا زیادہ مناسب ہے۔

یہاں برا خیال کیا آیا ﴿قال: هَمَمْتُ اَنْ أَجْلِسَ وَأَدَعَهُ﴾ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤں۔ اس خیال کو حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ تعبیر کرتے ہیں کہ برا خیال آیا۔ اس لئے کہ ظاہر ہے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تہجد میں انھوں نے شرکت اختیار کرلی اور آپ کی اقتداء کرلی، اب آپ کو چھوڑ کر بیٹھ جانا؛ یہ خلافِ ادب چیز تھی

حالانکہ اگر بیٹھ جاتے تب بھی مسئلہ یہ ہے کہ کوئی آدمی نفل نماز کسی کی اقتداء میں پڑھ رہا ہے اور تھک گیا کہ اب کھڑے رہنے کی طاقت نہیں ہے، تو بیٹھ بھی سکتا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ تو کھڑے کھڑے نماز پڑھیں اور ابن مسعود بیٹھ جائیں؛ یہ ایک خلافِ ادب چیز تھی۔ اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ایک برا خیال آیا۔

بڑوں کا ایک ادب

یہاں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ استنباط کیا ہے کہ جب بڑے کسی جگہ پر موجود ہوں، تو اقوال اور افعال میں ان کے ساتھ موافقت کرنا؛ یہی آداب کا تقاضہ ہے۔ (فتح الباری ۳/۱۹، مسلم ونووی ۱/۲۶۴) مثلاً کسی مجلس میں بڑا موجود ہو، اور وہ کھڑا ہو گیا ہے؛ تو چھوٹوں کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ بیٹھے رہیں۔ ان کو بھی چاہیے کہ کھڑے ہو جائیں، چاہے ان کو کھڑے ہونے کی ضرورت نہ ہو، اس لئے کہ بڑوں کے ساتھ موافقت کرنی چاہیے۔

اسی طرح اقوال کے اندر بھی موافقت کرنی چاہیے۔ مثلاً تلاوت کی مجلس ہے اور کسی بڑے نے تلاوت شروع کر رکھی ہے اور وہ اس میں مشغول ہے، تو چاہے آپ فارغ ہو جائیں، پھر بھی جب تک کہ وہ فارغ نہ ہو؛ وہاں تک بیٹھے رہنا چاہیے۔ یہی مناسب طریقہ ہے۔ یہ آداب میں سے بتلایا ہے۔ یہ ادب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حدیث سے مستنبط کیا ہے۔

اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے اندر کتنا زیادہ مجاہدہ، محنت اور کوشش فرماتے تھے: آپ نے اتنا طویل قیام فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا آدمی آپ کا ساتھ دینے سے عاجز ہو گیا۔

﴿اور اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں﴾

عن أنس رضي الله عنه عن رسول الله ﷺ قال: يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلاَثَةٌ، أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَعَمَلُهُ، فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَيَبْقىٰ وَاحِدٌ، يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ، وَيَبْقىٰ عَمَلُهُ. (متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں: کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں، ایک تو اس کے گھر والے، دوسرا اس کا مال اور تیسرا اس کا عمل۔ یعنی جب میت کا جنازہ اٹھا کر قبرستان لے جایا جاتا ہے تو تین چیزیں اس کے ساتھ جاتی ہیں، گھر والے، خاندان والے، اس کی اولاد، رشتہ دار اور متعلقین تو ہوتے ہی ہیں، اور مال بھی ہوتا ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں اور قدیم عربوں کے یہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی کا جنازہ اٹھایا جاتا تھا تو اس کا مال بھی اس کے ساتھ قبرستان لے جاتے تھے اور دفن کے بعد واپس لایا جاتا تھا۔ آج بھی بعض قوموں میں یہ رواج ہے کہ وہ مخصوص اموال ساتھ لے جاتے ہیں بلکہ اسلام سے پہلے مصر وغیرہ کے اندر یہ دستور تھا کہ مال کو بھی میت کے ساتھ قبر کے اندر رکھ دیا جاتا تھا۔ خیر! اگرچہ آج کل وہ دستور تو نہیں ہے لیکن اس کے مال میں سے کچھ نہ کچھ چیز تو ساتھ جائے گی۔ مثلاً جنازے کی چارپائی پر بچھانے کے لئے یا اس کو اوڑھانے کے لئے چادر ہوگی۔ تو مال کا کچھ حصہ تو ساتھ گیا۔

اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿فَيَرْجِعُ اِثْنَانِ وَيَبْقىٰ وَاحِدٌ﴾ دو چیزیں واپس آجاتی ہیں اور ایک باقی رہ جاتی ہے۔ کون واپس آتا ہے؟ ﴿يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ﴾ دفن کرنے کے بعد اس کے گھر والے اور مال تو واپس آجاتا ہے ﴿وَيَبْقىٰ عَمَلُهُ﴾ اور اعمال اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔

اس ارشاد کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تلقین فرمائی کہ جو چیز ساتھ رہنے والی ہے، قبر میں بھی ساتھ جائے گی اور حشر میں بھی ساتھ رہے گی؛ اس کے لئے ہم کو محنت کرنی چاہیے۔ آدمی مال و دولت جمع کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، اپنی صلاحیت کو اس کے اندر استعمال کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اگر اس نے بہت مال و دولت اور سرمایہ جمع بھی کرلیا، اور بہت روپے پیسے اکٹھے بھی کر لئے ؛ تو وہ اس کے ساتھ جانے والے نہیں ہیں۔ اس کو تو دنیا ہی میں چھوڑ کر جائے گا۔ ہاں! اگر اس نے اعمال پر محنت کوشش اور مجاہدہ کیا ہے، تو وہ اس کے ساتھ جانے والے ہیں۔

اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں لائے ہیں کہ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں، اللہ کے احکام کی بجا آوری میں اور نیک کاموں میں خوب محنت و کوشش کرنی چاہیے، تا کہ وہ سارے نیک کام اس کے ساتھ جائیں۔

معمولی مت سمجھو

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال النبی ﷺ: اَلْجَنَّةُ أَقْرَبُ اِلیٰ أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، وَالنَّارُ مِثْلُ ذَالِكَ. (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان کے چپل کا تسمہ اس سے کتنا قریب ہوتا ہے، جنت اس سے بھی زیادہ قریب ہے یعنی چپل بالکل آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے؛ جنت اس سے بھی قریب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹے سے نیکی کے کام کے ذریعہ سے جنت حاصل کر لیتا ہے، اس معنی کر فرمایا کہ جنت اتنی قریب ہے۔

علماء نے لکھا ہے اور حدیث کا بھی مفہوم ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ آدمی کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑے نہیں، اور کسی بدی کو چھوٹا سمجھ کر کرے نہیں۔ اس لئے کہ نیکی کا کوئی چھوٹا سا کام جس کو آپ نے چھوٹا اور معمولی سمجھ رکھا ہے، اور آپ نے کرلیا اور اسی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں مقبولیت حاصل ہوگئی اور وہی کام نجات کا ذریعہ بن گیا۔ اس لئے کہ اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو پسند آتا ہے اور کون سے عمل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں نجات مل جاتی ہے۔

﴿صرف دو رکعتیں کام آئیں﴾

بڑے بڑے اکابر کے واقعات ہیں کہ جب انتقال ہوا اور ان کو لوگوں نے خواب میں دیکھا تو انہوں نے بتایا کہ فلاں معمولی نیکی نے نجات دلوادی۔ حضرت جنید بغدادی کے متعلق لکھا ہے کہ کسی نے انتقال کے بعد خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ کون سا عمل کام آیا؟ فرمایا بڑے بڑے علمی نکات اور دوسری ساری چیزیں سب دھری کی دھری رہ گئیں؛ بس صرف وہ دو رکعتیں جو رات کے آخری حصہ میں ادا کرتا تھا، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے مغفرت فرمادی

(احیاء العلوم/طبقات الحنابلہ)

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لئے تو بہانہ چاہیے۔ اسی لئے کوئی بھی نیکی کے عمل کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ کرلیجیے، ہوسکتا ہے کہ جس اخلاص سے کیا ہے؛ وہ پسند آجائے، اور اسی پر مغفرت ہوجائے۔

﴿نجات ہوگئی﴾

ایک بدکار عورت ایک پیاسے کتے کو پانی پلاتی ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے زندگی بھر کی نافرمانیاں اور بدکاریاں معاف فرما کر اس کے لئے جنت کا فیصلہ ہوجاتا ہے

(مشکوٰۃ،۱/ ۱۶۸متفق علیہ) کتے کو پانی پلانا یہ کوئی بڑا عمل نہیں ہے، معمولی سی چیز ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ایسا پسند ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ معاف کردیا۔

ایک آدمی جارہا تھا اس نے دیکھا کہ ایک درخت کی ٹہنی راستے میں آڑ بن رہی ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو آنے جانے میں تکلیف ہوگی، اس نے کاٹ کر راستہ صاف کردیا، اللہ تعالیٰ نے اس پر اس کی مغفرت فرمادی۔ (مشکوٰۃ،۱/ ۱۶۸متفق علیہ)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: کسی نیک عمل کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت؛ ہوسکتا ہے کہ یہی تمہارے لئے مغفرت کا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا اور جنت میں جانے کا ذریعہ بن جائے۔ اور کسی گناہ اور برائی کے کام کو چھوٹا سمجھ کر کرومت؛ ہوسکتا ہے کہ وہ گناہ جس کو چھوٹا سمجھ کر کیا، اسی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوجائے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معمولی سی بات پر پکڑ ہوجاتی ہے اور وہی جہنم میں جانے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی کو حدیثِ پاک میں فرمایا گیا: ﴿وَالنَّارُ مِثْلَ ذَالِکَ﴾ جہنم بھی اسی طرح ہے۔ یعنی جس طرح جنت آپ کے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے، اسی طرح جہنم کا حال بھی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معمولی سے عمل اور چھوٹے سے گناہ کی وجہ سے آدمی جہنم میں پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے آدمی کو ہر نیکی کے کرنے کا - چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو - اور ہر بدی سے بچنے کا - چاہے وہ چھوٹی ہی کیوں نہ ہو - اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿مسجد کا ٹاٹ﴾

عن أبی فراس ربیعةبن کعب الاسلمی خَادِمِ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ وَمِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ رضی اللہ عنہ قَالَ: کُنْتُ أَبِیْتُ مَعَ رسولِ اللہِ ﷺ فَآتِیْهِ بِوَضُوْئِهِ وَحَاجَتِهِ فَقَالَ: سَلْنِیْ، فَقُلْتُ: أَسْأَلُکَ مُرَافَقَتَکَ فِی الْجَنَّةِ، فَقَالَ: أَوَغَیْرَ ذَالِکَ؟ قُلْتُ: هُوَ ذَاکَ. قَالَ: فَأَعِنِّیْ عَلٰی نَفْسِکَ بِکَثْرَةِ السُّجُوْدِ. (رواہ مسلم)

حضرت ابوفراس ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم تھے اور اہل صفہ میں سے تھے، سفر و حضر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتے تھے اور ان کا بستر بھی حجرۂ شریفہ کے باہر لگا کرتا تھا، تاکہ ذرا سی آہٹ محسوس ہو، اور حکم بجالاویں۔ وہ ہمیشہ منتظر ہی رہتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خدمت کا کوئی حکم ہو، اور مَیں بجالاؤں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب تہجد کے لئے اٹھتے تھے، تو فوراً پانی کا انتظام کرتے تھے، آپ کی دوسری ضرورت مصلّٰی کپڑا وغیرہ لاتے تھے، اور ہمیشہ مسجد کے اندر ہی رہتے تھے (المسند الجامع) اسی وجہ سے ان کا لقب ﴿حِلْسُ الْمَسْجِدِ﴾ ''مسجد کا ٹاٹ'' ہوگیا تھا۔ یعنی ٹاٹ جس طرح ایک ہی جگہ پڑا رہتا ہے، کہیں ادھر ادھر نہیں جاتا، اسی طرح وہ بھی مسجد ہی میں پڑے رہتے تھے، اس لئے ان کو مسجد کا ٹاٹ کہا جاتا تھا۔

﴿تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ﴾

اس روایت کے راوی یہی حضرت ابوفراس ربیعہ بن کعب اسلمی رضی اللہ عنہ ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہی رات گذارتا تھا، اور آپ کے لئے وضو کا پانی لادیا کرتا تھا اور آپ کی دوسری جو بھی ضرورت ہوتی تھی؛ وہ پوری کرتا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز فرمایا: ﴿سَلْنِیْ﴾ مانگو! کیا مانگتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب خدمت کی جاتی ہے تو مخدوم خوش ہوکر خادم سے کہتا ہے کہ کیا ضرورت ہے؛ بتاؤ۔ ہوسکتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیار دیا گیا ہو کہ آپ ان کے لئے جو مانگیں گے اللہ تعالیٰ ان کو دے دے گا، اس لئے آپ نے ان سے اس موقعہ پر کہا ہو: ﴿سَلْنِیْ﴾ مانگو۔ حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جنت میں آپ کا ساتھ مانگتا ہوں۔ دیکھئے! انہوں نے یہ نہیں مانگا کہ دنیا کی کوئی سلطنت مل جائے۔ کوئی بڑی جائیداد، کوئی بڑا سرمایہ یا کوئی بڑی

دولت نہیں مانگی، بلکہ آخرت کے متعلق سوال کیا کہ جنت کے اندر آپ کی مرافقت اور آپ کا ساتھ نصیب ہو جائے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مخصوص مقام عطا کیا گیا ہے جو کسی اور کو نہیں ملنے والا ہے۔ پھر یہ رفاقت کا کیا مطلب؟

تو اس رفاقت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ مقام تو حاصل نہ ہو، لیکن دنیا میں جس طرح نبی کریم ﷺ کے قریب رہتے تھے، اسی طرح باوجود اس مقام پر نہ پہنچنے کے ایسا کر دیا جائے کہ وہاں جب چاہیں نبی کریم ﷺ کی زیارت ہو جایا کرے۔

انہوں نے جب جنت میں آپ کی رفاقت کا مطالبہ کیا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: کچھ اور؟ مطلب یہ ہے کہ یہی چاہیے یا کچھ اور بھی مطالبہ ہے؟ مَیں نے کہا: یہی چاہیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اپنے نفس کے مقابلہ میں سجدوں کی کثرت کے ذریعہ سے تم میری مدد کیا کرو۔ یعنی تم نماز کثرت سے پڑھا کرو، خوب عبادت کیا کرو تو یہ چیز ان شاء اللہ حاصل ہو جائے گی، مَیں بھی تمہارے لئے دعا کروں گا۔ گویا میری دعا کے تمہارے حق میں قبول ہونے میں اور تمہارے لئے جو چیز مانگی جارہی ہے اس کے حاصل ہونے میں؛ تم بھی میرا ہاتھ بٹاؤ۔ اور اس کی شکل یہ ہے کہ تم بھی نمازوں کے ذریعہ سجدوں کی کثرت کا خوب اہتمام کرو۔

﴿سجدوں کی کثرت کا اہتمام کرو﴾

عن أبی عبداللّٰہ ویقال أبو عبدالرحمٰن ثوبان رضی اللہ عنہ مولیٰ رسول اللہ ﷺ قال: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ یَقُولُ: عَلَیْکَ بِکَثْرَةِ السُّجُودِ، فَإِنَّکَ لَنْ تَسْجُدَ لِلّٰہِ سَجْدَةً اِلَّا رَفَعَکَ اللّٰہُ بِھَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْکَ بِھَا خَطِیْئَةً. (رواہ مسلم)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ ہیں۔ان کے متعلق لکھا ہے کہ کسی قافلہ والوں نے ان کو گرفتار کرلیا تھا، نبی کریم ﷺ کا گذر ہوا، آپ ﷺ نے ان کو خرید کر آزاد کردیا۔ وہ فرماتے ہیں: مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ﴿عَلَیْکَ بِکَثْرَةِ السُّجُوْدِ﴾ تم سجدوں کی کثرت کا اہتمام کرو، سجدے کی کثرت کو لازم پکڑو۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے سوال کیا: کون سا عمل مجھے جنت تک پہنچانے والا ہے؟ تو حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَیں نے یہی سوال نبی کریم ﷺ سے کیا تھا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿عَلَیْکَ بِکَثْرَةِ السُّجُوْدِ﴾ کثرت سے سجدے کیا کرو۔ مطلب یہ ہے کہ خوب نماز پڑھا کرو۔ کیوں؟ ﴿فَاِنَّکَ لَنْ تَسْجُدَ لِلّٰهِ سَجْدَةً اِلَّا رَفَعَکَ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً وَحَطَّ عَنْکَ بِهَا خَطِیْئَةً﴾ اس لئے کہ تم جب بھی کوئی سجدہ کروگے تو اس پر اللہ تعالیٰ تمہارا ایک درجہ بلند کریں گے اور تمہارے ایک گناہ کو معاف فرمائیں گے۔ گویا ہر سجدہ تم کو اللہ تعالیٰ سے قریب کرے گا، اللہ تعالیٰ کے قرب میں ترقی ہوگی اور جب قرب میں ترقی ہوگی تو جو تم چاہتے ہو- یعنی جنت کا حصول- وہ آسانی سے حاصل ہوجائے گا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے (مسلم شریف ۱/۱۹۱) گویا نمازوں کی کثرت اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہے۔

علماء کے درمیان یہ بات موضوعِ بحث ہے کہ آدمی اگر نفل نماز پڑھے تو اس میں طولِ قیام زیادہ افضل ہے یا کثرت سجود؟ یعنی زیادہ رکعتیں پڑھے یا لمبی رکعتیں پڑھے؟ ایک شکل تو یہ ہے کہ ایک گھنٹہ میں آپ لمبی قراءت کرکے دو ہی رکعتیں پڑھیں۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ ایک گھنٹہ میں بیس پچیس رکعتیں پڑھ لیں۔ تو علماء کی دونوں طرح کی رائیں ہیں۔ جنہوں نے کثرتِ سجود کو افضل کہا ہے، انھوں نے اسی روایت سے استدلال کیا ہے۔

﴿یہ بات بھی مجاہدہ پر موقوف ہے﴾

عن أبی صفوان عبداللہ بن بسر الأسلمی رضی اللہ عنہ قال: قال رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم: خَیْرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمْرُہُ وَحَسُنَ عَمَلُہُ.

حضرت عبداللہ بن بسر اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ بچے تھے، ان کے والدان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: یہ بچہ سو سال زندہ رہے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بعض حضرات نے دمشق میں سب سے اخیر میں وفات پانے والے صحابہ میں ان کو شمار کیا ہے۔ (اسد الغابہ ۳/۱۸۶)

وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جس کی عمر بھی طویل ہو، اور اعمال بھی نیک ہوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ لمبی عمر بھی دیں اور نیک کام کی توفیق بھی دیں۔ ظاہر ہے کہ لمبی عمر کے ساتھ ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک اعمال کی توفیق بھی میسر آجائے؛ تو یہ بہت بڑی سعادت کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر لکھا جائے گا۔ یہ بات بھی مجاہدہ کر کے عملِ کثیر کرنے پر موقوف ہے۔ اس وجہ سے یہاں ذکر کیا ہے۔

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق نصیب فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿ المجاهدة ۴ ﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: غَابَ عَمِّىْ أَنَسُ بْنُ نَضَر رضی اللہ عنہ عَنْ قِتَالِ بَدْرٍ. فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! غِبْتُ عَنْ أَوَّلِ قِتَالٍ قَاتَلْتَ الْمُشْرِكِيْنَ. لَئِنِ اللّٰهُ أَشْهَدَنِىْ قِتَالَ الْمُشْرِكِيْنَ، لَيُرِيَنَّ اللّٰهُ مَاأَصْنَعُ. فَلَمَّاكَانَ يَوْمُ أُحُدٍ، اِنْكَشَفَ الْمُسْلِمُوْنَ. فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ أَعْتَذِرُاِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَآءِ-يَعْنِىْ أَصْحَابَه-وَأَبْرَأُاِلَيْكَ مِمَّاصَنَعَ هٰؤُلَآءِ-يَعْنِى الْمُشْرِكِيْنَ-ثُمَّ تَقَدَّمَ فَاسْتَقْبَلَهُ سَعْدُبْنُ مُعَاذٍ. فَقَالَ: يَاسَعْدُبْنُ مُعَاذ! اَلْجَنَّةُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ. اِنِّىْ أَجِدُ رِيْحَهَادُوْنَ أُحُدٍ. قَالَ سَعْدٌ: فَمَااسْتَطَعْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاصَنَعَ. قَالَ أَنَس رضی اللہ عنہ: فَوَجَدْنَابِهٖ بِضْعاً وَّثَمَانِيْنَ ضَرْبَةً بِالسَّيْفِ أَوْطَعْنَةًبِرُمْحٍ، أَوْرَمْيَةًبِسَهْمٍ. وَوَجَدْنَاهُ قَدْقُتِلَ وَمَثَّلَ بِهِ الْمُشْرِكُوْنَ. فَمَاعَرَفَهُ أَحَدٌاِلَّاأُخْتُهُ بِبَنَانِهٖ. قَالَ أَنَس رضی اللہ عنہ: كُنَّانَرٰى أَوْنَظُنُّ أَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ نَزَلَتْ فِيْهِ وَفِىْ أَشْبَاهِهٖ (مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْامَاعَاهَدُوْااللّٰهَ عَلَيْهِ). (متفق علیہ)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب مجاہدہ کے سلسلہ میں قائم کیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے لئے کوشش کرنا، محنت اور مشقت اٹھانا، اسی سلسلے میں یہ روایت بھی لائے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میرے چچا حضرت انس بن نضر غزوۂ بدر کے موقعہ پر حاضر نہیں ہوسکے تھے۔

﴿دشمن کے لئے اقتصادی رکاوٹیں کھڑی کرنا﴾

غزوۂ بدر ۲ھ میں پیش آیا ہے۔ دراصل نبی کریم ﷺ کو اطلاع ملی کہ قریش کا ایک تجارتی قافلہ جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کی طرف گیا تھا، وہ اپنی مہم پوری کر کے مکہ مکرمہ کی طرف لوٹ رہا ہے۔ اسی مجلس میں نبی کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا: ہم اس قافلہ کا تعاقب کریں۔ چونکہ مکہ والوں کا ارادہ ہی یہ تھا کہ اس تجارتی قافلہ سے جو منافع حاصل ہوں گے، اس کا بیشتر حصہ مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا۔

اس موقعہ پر ایک بات عرض کردوں کہ بعض مستشرقین کے اعتراض کی وجہ سے علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ نے سیرت النبی میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ قافلہ کے تعاقب کے لئے تشریف نہیں لے گئے تھے۔ اگرچہ ان کے اس موقف کی دیگر بعض حضرات نے تصدیق کی ہے، حالانکہ حقیقت یہی ہے کہ آپ ﷺ تجارتی قافلہ کے تعاقب میں تشریف لے گئے تھے۔ آج اس زمانہ میں بھی دشمن کے اوپر اقتصادی پابندی لگانا؛ یہ معمولی چیز ہے، اور اس فعل کو اس دورِ ترقی میں بھی معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ تو اگر اُس زمانہ میں بھی دشمن کی اقتصادی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا؛ تو یہ کوئی اعتراض کی چیز نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے کسی مسلمان کو مرعوب ومتأثر ہو کر دفاعی پوزیشن میں آکر جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ سیدھی سادی بات ہے۔

جب آج یہ لوگ معمولی معمولی چیزوں پر یہ کام کرسکتے ہیں کہ سوڈان جیسا چھوٹا سا ملک ہے، جب اس نے ایک ارادہ کیا کہ اسلامی طرز اور اسلامی قانون کو اپنے ملک میں نافذ کرے، تو امریکہ اور دوسری عیسائی طاقتوں نے مل کر اس ملک میں رہنے والے عیسائیوں کو

بلا وجہ حکومت کے خلاف کھڑا کر دیا اور پھر ساری دنیا میں شور مچا دیا کہ وہاں عیسائیوں پر مظالم ہو رہے ہیں، اور پوپ پال جو عیسائیوں کے یہاں مذہبی شخصیت سمجھی جاتی ہے، اس کی طرف سے اعلان کیا جا رہا ہے اور تمام عیسائی مملکتوں کو اُبھارا جا رہا ہے کہ اس ملک کے ساتھ اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے۔ یہ آج بھی ہو رہا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، محض پروپیگنڈہ ہے۔ تو اس دورِ ترقی میں جو لوگ انسانی حقوق کے علَم بردار سمجھے جاتے ہیں اور اس کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں؛ وہی لوگ یہ سب کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس کی کوئی حقیقت نہیں، وہاں عیسائیوں پر کوئی مظالم نہیں ہو رہے ہیں۔

غزوۂ بدر کا پس منظر

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اقتصادی طور پر دشمن کو کمزور کرنا؛ یہ ایک پرانی تدبیر ہے، جو دشمن کے مقابلہ میں اختیار کی جاتی ہے۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ نے قریش کے اس تجارتی قافلہ کے تعاقب کے لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ترغیب دی کہ معلوم ہوا ہے کہ قافلہ لوٹ رہا ہے اور میرا جی یہ چاہتا ہے کہ ان کا تعاقب کیا جائے۔ چنانچہ اس مجلس میں جتنے لوگ موجود تھے انھوں نے آمادگی ظاہر کی۔ بعض لوگ وہ بھی تھے جن کے پاس اس وقت سامان نہیں تھا انھوں نے نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم کچھ تیاری کر لیں۔ آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی اور فرمایا کہ جو موجود ہیں اور تیار ہیں؛ وہ چلیں، خاص طور پر جنگ کی کوئی تیاری بھی نہیں کی گئی تھی۔ اس لئے کہ وہ قافلہ جس کا تعاقب کیا جانا تھا؛ وہ بڑی تعداد میں نہیں تھا، ساٹھ ستّر آدمیوں پر مشتمل تھا، اس لئے کوئی زیادہ ساز و سامان یا ہتھیار جمع کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چنانچہ مسلمانوں کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کے تعاقب کے لئے روانہ ہوئی۔

روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس صرف چند گنی چنی تلواریں تھیں اور گھوڑے تو صرف دو ہی تھے اور تیر چلانے کے لئے کمان کے اندر تیر بھی پورے نہیں تھے۔

چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ جب جنگ کی صورت پیش آ گئی تو نبی کریم ﷺ نے تدبیر کے طور پر یہ فرمایا تھا کہ دشمن جب دور ہوں، اس وقت ہی تیر چلائے جائیں، جب قریب آئیں تو تیر چلانے کی ضرورت نہیں؛ نیزے سے کام لیا جائے کہ وہ خطا کرنے والا نہیں۔ (بخاری شریف ۲/ ۵۶۷)

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس وقت جو حضرات موجود تھے وہی نبی کریم ﷺ کی پکار اور دعوت پر لبیک کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔ تین سو تیرہ کی تعداد تھی۔ اور چونکہ پہلے سے کوئی تیاری نہیں کی گئی تھی، اس لئے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی موجود نہیں تھے اس لئے ان کی بھی شرکت کی نوبت نہیں آئی۔ اور بھی بہت سارے مسلمان — جو اس وقت موجود نہیں تھے وہ — غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو پائے۔

اب یہ حضرات تو قافلہ کے تعاقب میں گئے تھے لیکن قافلہ ہاتھ سے نکل گیا اور مکہ والوں کو قافلے والوں کی طرف سے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے، اس لئے ان کے دفاع اور حفاظت کے لئے مکہ والے ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ خدا تعالیٰ کو دشمن کی طاقت کو توڑنا منظور تھا اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ قافلہ تو صحیح سلامت نکل گیا اور کفار کے لشکر کے ساتھ مدبھیڑ ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان مکہ والوں کو ان کی سرگرمیوں کی خوب سزا چکھائی۔ ان کے بہت سارے آدمی مارے گئے اور بہت سارے قید پکڑے گئے۔

بہرحال! اس موقعہ پر یہ حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ — جو نبی کریم ﷺ کے خادم

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا ہوتے ہیں- موجود نہیں تھے، اس لئے ان کی شرکت کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جب غزوۂ بدر کا واقعہ ہو چکا اور بدر میں شرکت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے فضائل سے نوازا گیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو یہ افسوس رہ گیا کہ ہم کو شرکت کا موقعہ نہیں ملا۔ اسی لئے جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر جب مشرکین کا لشکر مدینہ کے اوپر چڑھ کر آیا اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دلی خواہش تو یہ تھی کہ مدینہ ہی میں رہ کر ان کا مقابلہ کیا جائے، باہر نکل کر مقابلہ نہ کیا جائے، لیکن جن لوگوں کو پہلے موقعہ نہیں ملا تھا، ان کا ہی اصرار تھا کہ باہر جا کر میدان ہی میں لڑیں گے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھا دیں گے

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقعہ نہیں ملا تھا، اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کا مشرکین کے ساتھ جو سب سے پہلا مقابلہ ہوا تھا اور میدان میں نکل کر دو بدو جنگ کی نوبت آئی تھی، اس میں مجھے شرکت کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ قصداً غائب رہے تھے بلکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا کہ اتفاقی بات تھی کہ وہ حاضر نہیں تھے، اس لئے شریک نہیں ہو پائے، لیکن اس پر ان کو بڑا افسوس تھا کہ میں اس سے محروم رہا۔ اب آگے کے لئے وہ اپنا ایک عزم اور ارادہ ظاہر کرتے ہیں: اگر آئندہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مشرکین سے مقابلہ کے لئے حاضری کی نوبت دی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھا دیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آئندہ کبھی مجھے موقعہ دیا اور مشرکین کے ساتھ جنگ کی نوبت آئی تو ان شاء اللہ لوگ دیکھ لیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اپنے عزائم کا انھوں نے کھلے الفاظ میں

اظہار نہیں کیا۔اس موقعہ پر شراح لکھتے ہیں کہ ہوسکتا ہے انھوں نے کوئی تدبیر سوچ رکھی ہو، لیکن احتیاط کے طور پر اپنے عزائم کو مبہم الفاظ میں بیان کیا ہو۔

غزوۂ احد اور حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ

چنانچہ جب احد کا دن آیا اور بھگدڑ شروع ہوئی تو مسلمانوں میں سے بہت سے لوگ میدان چھوڑ کر ہٹنے لگے۔جیسا کہ مَیں پہلے بتلا چکا ہوں کہ غزوۂ احد کے موقعہ پر ایسا ہوا کہ شروع میں تو مسلمانوں کو غلبہ ہوا،اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے نبی کریم ﷺ نے تقریباً پچاس آدمیوں کی ایک جماعت کو حفظ ماتقدم کے طور پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر بٹھا رکھا تھا،تا کہ دشمن اگر پیچھے کی طرف سے گھوم کر مسلمانوں پر حملہ کرنے کے واسطے آئے تو حفاظت ہو سکے۔اوران کو تاکید کردی تھی کہ ہم دشمنوں کے مقابلہ میں چاہے کامیاب ہوں یا ناکام ہوں،ہم جیتیں یا ہاریں؛تم اپنی جگہ مت چھوڑیو۔

اب یہاں یہ ہوا کہ لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہااور مسلمان غالب آنے لگے اور مشرکین میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے۔یہ منظر جب ان لوگوں نے دیکھا جن کو وہاں بٹھایا گیا تھا تو انھوں نے کہا کہ اب تو ہم بھی اپنی جگہ چھوڑ کر میدان میں جائیں۔ ان کے امیر نے ان کو بہت سمجھایا کہ نبی کریم ﷺ نے تاکید فرما رکھی ہے کہ ہم کامیاب ہوں یا ناکام؛آپ اپنی جگہ مت چھوڑنا۔انھوں نے کہا:اس کا مطلب یہ تھا کہ جب تک کہ جنگ جاری رہے،ہمیں اپنی جگہ نہیں چھوڑنی ہے۔اب تو جنگ کا فیصلہ ہو گیا اور مسلمانوں کو کامیابی ہوگئی؛اب کیا حرج ہے؟یہ ان کی ایک اجتہادی غلطی تھی اور وہ اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے۔اگرچہ ان کے امیر نے بہت سمجھایا کہ جگہ نہیں چھوڑنی ہے،لیکن اللہ تعالیٰ کو یہی منظور تھا۔

اس موقعہ پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ مشرکین کا ایک دستہ لے کر پیچھے سے گھوم کر آئے اور انھوں نے مسلمانوں پر پیچھے کی طرف سے حملہ کر دیا اور اسی کے نتیجے میں مسلمانوں میں افراتفری پھیلی۔ مسلمان ایک دم گھبرا گئے، بہت سے لوگ میدان چھوڑ کر پہاڑ کے اوپر بھاگنے لگے۔ اسی کو کہہ رہے ہیں کہ احد کے دن جب مسلمان میدان چھوڑنے لگے؛ تو یہ منظر دیکھ کر حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ -جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا- مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے: ﴿اَللّٰهُمَّ أَعْتَذِرُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَاءِ﴾ اے اللہ! مَیں آپ کے سامنے معذرت پیش کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں اس حالت سے جو انھوں نے اختیار کی۔ گویا مسلمانوں کے اس بھاگنے سے ان کو اتفاق نہیں تھا، اس کو وہ پسند نہیں کر رہے تھے؛ لیکن اس عدمِ پسندیدگی کے اظہار کے لئے انھوں نے یہ تعبیر اختیار کی: اے اللہ! مَیں معذرت پیش کرتا ہوں اور معافی چاہتا ہوں ان کی اس حرکت سے؛ جو انھوں نے کی، تاکہ ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معافی کی درخواست بھی ہو جائے۔ گویا ان کی اس حرکت سے بیزاری کا اظہار بھی کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے معافی کی درخواست بھی پیش کر دی۔

﴿وَأَبْرَأُ اِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَاءِ﴾ اور اپنی برأت کا اظہار کرتا ہوں اس حرکت سے بھی جو مشرکین نے اختیار کی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچائی۔ مشرکین کی حرکت سے بھی بیزاری ظاہر فرمائی، لیکن اس کے لئے جو تعبیر اختیار کی اس کے الفاظ کھلم کھلا استعمال کئے۔ گویا دونوں کی حرکتوں سے اپنے اتفاق کا اظہار نہیں کرتے ہیں؛ لیکن اس کے لئے تعبیر الگ الگ اختیار فرمائی۔ جیسی جس کے مناسبِ حال تھی۔ یہ بھی ان کی بڑی دانشمندی اور اتباعِ ادب کی بات ہے۔

خیر! یہ کہہ کر میدان میں آگے بڑھے۔ جس وقت آگے بڑھ رہے تھے تو ان کو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ملے جو انصار میں قبیلہ اوس کے سردار ہیں۔ ان کا مقام، ان کی جرأت و بے باکی کا حال انصار میں ویسا ہی ہے جیسا مہاجرین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔ (حادی الارواح) یعنی مشرکین کے معاملہ میں جو شدت مہاجرین میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اندر موجود تھی؛ وہی شدت انصار میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے اندر تھی۔ ان کو حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں اے سعد بن معاذ! رب کعبہ کی قسم! مجھے تو احد پہاڑ کے پاس جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

جنت کی خوشبو محسوس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب شہید ہو جائیں گے تو جنت نصیب ہوگی۔ گویا مجازی طور پر استعارہ کے الفاظ میں تعبیر کر رہے ہیں۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ہوسکتا ہے کہ واقعتاً ان کو جنت کی خوشبو آرہی ہو، اس لئے کہ وہ اسی موقعہ پر شہید بھی ہوئے ہیں۔ جس آدمی کی موت کا وقت قریب آتا ہے؛ تو آخرت کے احوال بھی اس کے سامنے منکشف ہوتے ہیں۔ بہرحال! حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جنت کی خوشبو آرہی ہے، اُدھر جا رہا ہوں۔

مجھ سے وہ نہیں ہو سکا

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ جب یہ واقعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کر رہے ہیں تو خود فرما رہے ہیں: اے اللہ کے رسول! مجھ سے وہ نہیں ہو سکا؛ جو انھوں نے کیا۔ یعنی اس وقت ان کی جرأت اس درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی کہ اگر چہ انھوں نے مجھے کہا کہ جنت کی خوشبو آرہی ہے، لیکن مَیں وہ جرأت نہیں کر سکا جو انھوں نے بتائی۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے جس کے لئے جو مقدر ہوتا ہے؛ اس کو اس کی توفیق بھی آسان ہو جاتی ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جواُن کے بھتیجے ہیں فرماتے ہیں: حضرت انس بن نضر شہید ہوگئے۔شہادت کے بعد جب ان کے جسم پر دیکھا گیا تو تلوار، نیزے اور تیر کے اَسّی (۸۰) سے زیادہ زخم تھے،اور ساتھ ہی ساتھ مشرکین نے مُثلہ بھی کر دیا تھا۔

غزوۂ احد کے موقعہ پر مشرکین نے ایک شرارت یہ بھی کی تھی کہ مسلمانوں کے جتنے حضرات شہید ہوئے تھے،ان کے اعضاء؛ناک کان وغیرہ کاٹ دئے تھے۔مثلہ کرنے کا مطلب یہی ہے کہ مقتول کے مختلف اعضاء کاٹ دینا، ناک،کان کاٹ دئے،آنکھیں پھوڑ دیں،شرم گاہ کاٹ دی۔حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا تھا۔ایک تو زخمی تھےاور ساتھ ہی یہ اعضاء بھی کاٹ لئے تھے؛اس وجہ سے پہچانے نہیں جاتے تھے،ان کی بہن حضرت رُبَیِّع بنت نضر رضی اللہ عنھا نے ان کی انگلیوں کے پوروے (اس پر کوئی نشانی تل یا اورکوئی ایسی چیز تھی جس) کے ذریعہ سے پہچانا کہ یہ میرے بھائی کی لاش ہے۔

﴿اوراپنے آپ کوشہید کرادیا﴾

یہاں اس روایت کے لانے کا مقصد یہی ہے کہ دیکھئے!انھوں نے اللہ کے راستہ میں،اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی حاصل کرنے کے واسطے کیسی مشقت اٹھائی اور کیسی محنت و کوشش کی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ یعنی صحابہ کرام یہ سمجھتے تھے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْامَاعَاهَدُوااللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نازل ہوا۔باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ایمان والوں میں سے بہت سے مردوہ ہیں جنہوں نے سچ کردکھلایاوہ عہدوپیمان؛ جوانھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا تھا

چنانچہ انھوں نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ مشرکین سے مقابلہ کی نوبت آئی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو دکھلائیں گے کہ مَیں کیا کرتا ہوں۔ لہٰذا انھوں نے ایسا کر کے بتلایا۔ ایسا مقابلہ کیا کہ جان کی بازی لگا دی اور اپنے آپ کو شہید کرا دیا۔

﴿تحصیلِ فضائل کے لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مجاہدہ﴾

عن أبی مسعود عقبة بن عمرو الانصاری البدری رضی اللہ عنہ قال: لَمَّا نَزَلَتْ آيَةُ الصَّدَقَةِ كُنَّا نُحَامِلُ عَلٰى ظُهُوْرِنَا. فَجَآءَ رَجُلٌ فَتَصَدَّقَ بِشَيْئٍ، فَقَالُوْا: مُرَآءٌ. وَجَآءَ رَجُلٌ آخَرَ فَتَصَدَّقَ بِصَاعٍ، فَقَالُوْا: اِنَّ اللهَ لَغَنِيٌّ عَنْ صَاعِ هٰذَا. فَنَزَلَتْ﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾

حضرت عقبہ بن عمرو ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں: جب صدقہ کی آیت نازل ہوئی جس میں ایمان والوں کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی تو اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کر کے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے واسطے ہمارے پاس کچھ نہیں تھا، لہٰذا ہم مزدوری کرتے تھے اور بوجھ اٹھاتے تھے اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہوتا تھا، وہ اللہ کے راستہ میں صدقہ کرتے تھے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی صدقہ کی ترغیب پر ہم عمل کر سکیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ کے حکموں کی بجا آوری کے لئے اپنے مقدور بھر پوری کوشش کرتے تھے، اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو جیسی طاقت عطا فرمائی تھی اور جس کی جیسی حیثیت تھی؛ ہر شخص اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پورا کرنا اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ چنانچہ بعض صحابہ جن کو اللہ تعالیٰ

نے دولت وثروت سے نواز رکھا تھا، وہ تو بہت کچھ لیکر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بہت سارا مال لیکر یہ کہتے ہوئے آئے کہ آج تو بڑی تجارت لیکر آیا ہوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بہت کچھ پیش کر دیا۔

﴿منافقین کی شرارت﴾

منافقین بھی موجود تھے، جن کا دھندھا اور کام ہی یہ تھا کہ اہلِ ایمان کے کاموں پر تنقید کریں، ان کی ہمتوں کو کسی نہ کسی طریقہ سے توڑیں اور ان کے حوصلوں کو پست کریں، یہ صحابی اتنی بڑی رقم لاکر پیش کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ خوش ہونے کی چیز تھی اور اس پر ان کی تعریف کرنی چاہیے تھی، اس کے بجائے یہ منافقین یوں کہتے ہیں: ﴿مُـرَآءٌ﴾ یہ تو دکھلانے کے واسطے ہے۔ اتنی بڑی رقم اس لئے پیش کی ہے کہ لوگ تعریف کریں۔ یہ تو ریا کاری کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ بڑی مقدار لانے والے کو یوں ٹوکا اور تنقید کی اور اس کے حوصلے یوں پست کئے۔

ایک اور صحابی نے جو غریب تھے، انھوں نے محنت مزدوری کر کے کچھ کھجوریں حاصل کیں اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صدقہ کے طور پر پیش کر دیں؛ تو اس پر منافقین کہنے لگے: کیا اللہ تعالیٰ کو اس کے ایک صاع (تقریباً ساڑھے تین کیلو) کھجور کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ تو ان کے اس ایک صاع کھجور سے بے نیاز ہیں۔ گویا جو زیادہ دے رہے تھے ان پر بھی تنقید کی اور جنھوں نے کم دیا ان پر بھی تنقید کی۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو کسی کل چین لینے نہیں دیتے تھے: ؎

ناوک نے تیرے کوئی صید نہ چھوڑا زمانہ میں ❁ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

ان کوتو حوصلے ہی پست کرنے تھے؛اس لئے زیادہ دینے والے کا یوں کہہ کردل توڑا کہ ریا کاری کررہا ہے۔اور جس نے محنت مزدوری کرکے اپنے مقدور بھر دیا؛اس کو یوں کہا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔منافقین کی اس تنقید اور حرکت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ براءت کے اندر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿اللہ تعالیٰ نے منافقین کا مذاق اڑایا﴾

سورۂ براءت میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کی بہت ساری ایسی حرکتوں کو واضح کیا ہے؛ جس کے ذریعہ سے وہ مسلمانوں کو تکلیفیں پہنچاتے تھے۔اسی لئے اس سورۃ کا ایک نام ''فَاضِحَة'' ہے۔''فَاضِحَة'' کا معنٰی ہے ''رُسوا کرنے والی''۔گویا اس سورۃ نے آ کر منافقین کی ساری حرکتیں کھول دیں اوران کو سب کے سامنے کھلا اوررسوا کردیا۔یہ آیت اسی سلسلہ میں نازل ہوئی ﴿اَلَّذِيْنَ يَلْمِزُوْنَ الْمُطَّوِّعِيْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فِي الصَّدَقَاتِ﴾ جولوگ تنقید کرتے ہیں اورعیب لگاتے ہیں ﴿لَمَزَ،يَلْمِزُ﴾ کا معنٰی ہے ''عیب لگانا،خوردہ گیری کرنا'' جو عیب لگاتے ہیں ان لوگوں پر ﴿الْمُطَّوِّعِيْنَ﴾ جو برضا ورغبت اللہ کے راستہ میں بہت کچھ دیتے ہیں۔﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ﴾ اوران لوگوں پر بھی عیب لگاتے ہیں جو اپنی مزدوری کی کمائی پاتے ہیں،یہ منافقین ان کا مذاق اڑاتے ہیں،اللہ تعالیٰ نے ایسے منافقین کا مذاق اڑایا اوران کے لئے دردناک عذاب ہے۔

﴿ایک اہم مشورہ﴾

اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ ایسے لوگ جو دین سے کوئی واسطہ نہ رکھتے ہوں،ان کی تنقیدوں کی وجہ سے آدمی کو اپنے عمل کے اندر کوئی کمی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص کا معاملہ کرتے ہوئے، جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہوجائے، بڑا کام ہوجائے، چھوٹا کام ہوجائے؛ اس کی انجام دہی میں کوئی کمی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، بولنے والے بولتے رہیں۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور مسافر اپنا سفر کرتے رہتے ہیں۔

یہاں تو اس روایت کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا، اس کو پورا کرنے کے واسطے انھوں نے محنت اور مزدوری کی اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ نے دیا؛ وہ اللہ کے راستہ میں لاکر پیش کردیا۔ کیسی مشقت اٹھائی۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں تھا، ان کے پاس نہیں تھا اور محنت نہ بھی کرتے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پکڑ نہ ہوتی کہ کیوں محنت مزدوری کرکے نہیں لائے۔ لیکن ان کو تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کے لئے تکلیفیں اٹھانا تھیں، کوشش ومجاہدہ کرنا تھا؛ اس لئے انھوں ایسا کیا۔

﴿قابلِ غور وفکر حدیث﴾

عن سعیدبن عبدالعزیزعن ربیعة بن یزیدعن أبی أدریس الخولانی عن أبی ذر جندب بن جنادة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیمایروی عن اللہ تبارک وتعالیٰ انهٗ قَالَ: یَاعِبَادِیْ! اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَجَعَلْتُهٗ بَیْنَکُمْ مُحَرَّماً، فَلَا تَظَالَمُوْا. یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّا مَنْ هَدَیْتُهٗ، فَاسْتَهْدُوْنِیْ أَهْدِکُمْ. یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّامَنْ أَطْعَمْتُهٗ، فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ. یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّامَنْ کَسَوْتُهٗ، فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ. یَاعِبَادِیْ! اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ، وَأَنَاأَغْفِرُالذُّنُوْبَ جَمِیْعاً، فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْلَکُمْ. یَاعِبَادِیْ! اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْاضُرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْانَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ. یَاعِبَادِیْ! لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَ

اِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْاعَلٰی أَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ،مَازَادَذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا.
یَاعِبَادِیْ!لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ قَامُوْافِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ،فَسَأَلُوْنِیْ،
فَأَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهٗ،مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّاعِنْدِیْ اِلَّاکَمَایَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَاأُدْخِلَ
الْبَحْرَ.یَاعِبَادِیْ!اِنَّمَاهِیَ أَعْمَالُکُمْ أُحْصِیْهَالَکُمْ،ثُمَّ أُوَفِّیْکُمْ اِیَّاهَا،فَمَنْ وَجَدَخَیْرًا،
فَلْیَحْمَدِاللهَ.وَمَنْ وَجَدَ غَیْرَذٰلِکَ،فَلَایَلُوْمَنَّ اِلَّانَفْسَهٗ .

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ نبی کریم ﷺ سے ایک حدیثِ قدسی نقل کرتے ہیں۔ مَیں پہلے بھی بتلاچکاہوں کہ حدیثِ قدسی اس حدیث کو کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمائیں۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد جو قرآن میں ہے، وہ تو قرآن ہی کہلاتا ہے۔ لیکن حدیث میں جہاں یہ آئے کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں؛ اسکو حدیثِ قدسی کہتے ہیں۔ یہ بھی حدیثِ قدسی ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! مَیں نے ظلم کو اپنے آپ پر ممنوع کردیا اور اس کو تمہارے درمیان بھی حرام ٹھہرایا؛ لہٰذا تم آپس میں ایک دوسرے پر ظلم مت کرو۔ یعنی ایک دوسرے کے حقوق مت مارو، کسی کی حق تلفی نہ کرو، کسی پر زیادتی مت کرو۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرتے اور بندوں کو بھی حکم دیا کہ آپس میں کسی پر ظلم مت کرو؛ یہ حرام ہے۔

ایک حدیث میں آتا ہے: ﴿اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ (مشکوٰۃ ۲/۴۳۴ متفق علیہ)
قیامت کے روز ظلم اندھیریوں کی شکل اختیار کرے گا، گویا ظلم کرنے والا اس روز اندھیریوں میں بھٹکتا پھرتا رہے گا، اس کو راہ نہیں ملے گی اور اس کے لئے روشنی نہیں ہوگی۔

﴿سب لوگ گمراہ ہیں سوائے......﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّامَنْ هَدَیْتُهٗ،فَاسْتَهْدُوْنِیْ أَهْدِکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہومگروہ جس کومَیں راہِ راست بتلاؤں۔جس کو اللہ تعالیٰ راستہ بتلائیں؛وہی راہ یاب ہے۔اگراللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کوراستہ نہ بتلایا جائے؛تووہ گمراہ ہوگا۔اسی کو فرماتے ہیں کہ تم سب گمراہ ہومگروہ جس کومَیں راستہ بتلاؤں،اس لئےتم لوگ مجھ سے ہدایت طلب کرتے رہو،سیدھاراستہ چلنےکی دعا کرتے رہو﴿اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ پڑھتے رہو؛مَیں تم کوسیدھا راستہ بتلاؤں گا۔ویسے راستہ اللہ تعالیٰ ہی بتلاتے ہیں،لیکن بندے کی سعادت مندی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نےحکم دیاہے کہ مجھ سے راہِ راست پانے کی دعابھی کرتے رہو،تووہ دعا کرتارہے۔اوریہ بات بھی طے ہے کہ جومقدرمیں ہے وہ توہوکررہے گا اگرمقدرمیں راہِ راست پرچلناہے توویسے بھی چلائیں گے۔لیکن یہاں ہمیں اپنے فرائضِ منصبی اداکرنے کی تلقین کی جارہی ہے۔ایک بندے کی شانِ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے وہ اپنی بندگی کااظہارکرے، اوراس کاطریقہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلاکرہدایت کی دعامانگے۔گویاوہ یوں ظاہرکرے کہ مَیں تیری رحمت اورہدایت سے مستغنی اوربے پرواہ نہیں ہوں؛ بلکہ مَیں ہروقت تیری ہدایت کامحتاج ہوں۔یہ مانگتارہے اورہاتھ پھیلاتارہے؛وہاں سے نوازاجاتارہے گا۔

﴿دربندِآں مباش......﴾

اوراگردعاکااثرمحسوس نہ ہو،تب بھی دعاکرنانہ چھوڑے۔یوں نہ سوچے کہ دعاتو قبول نہیں ہوتی۔حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ؎

حافظ! وظیفۂ تو دعا کردن است و بس ❁ در بندِ آں مباش کہ شنید یا نہ شنید

اے حافظ! تمہارا کام تو دعا کرنا ہے، اس فکر میں نہ رہو کہ سنی یا نہ سنی۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ مانگو؛ تو ہم نے مانگ لیا۔ اب ملا یا نہ ملا؛ اس کی طرف دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کردیا۔

﴿سب لوگ بھوکے ہیں سوائے......﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّامَنْ أَطْعَمْتُهٗ، فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب کے سب بھوکے ہو مگر وہی جس کو مَیں کھلاؤں۔ اللہ تعالیٰ جس کو کھانا دیں؛ اس کو ملتا ہے۔ اس لئے تم مجھ سے کھانا مانگو؛ مَیں تم کو کھلاؤں گا۔ جس کے مقدر میں جو روزی ہے؛ اللہ تعالیٰ وہ اس کو دے کر رہیں گے، لیکن جیسا کہ مَیں نے ابھی عرض کیا کہ ہم سے فرائضِ منصبی ادا کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو اپنی شانِ ربوبیت سے ہمیں دے ہی رہے ہیں، چاہے بندہ مانگے، یا نہ مانگے؛ لیکن ہماری سعادت مندی اسی میں ہے کہ مل رہا ہو تب بھی ہم ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہی رہیں؛ اور اس کے سامنے اپنی بندگی کا اور عجز و نیازی کا اظہار کرتے ہی رہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہی رہنا چاہیے﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّامَنْ کَسَوْتُهٗ، فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو مگر وہ جس کو مَیں کپڑا پہناؤں، اس لئے تم مجھ سے کپڑے مانگو؛ مَیں تم کو کپڑے پہناؤں گا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بندے کو اپنی تمام حاجتیں- چاہے وہ چھوٹی ہوں یا بڑی ہوں، یا بظاہر پوری ہوتی نظر آتی ہوں تب بھی- اللہ تعالیٰ سے مانگتے ہی رہنا چاہئیں۔ ایسا نہیں! آج کھانا مل رہا ہے اس لئے نہیں مانگا، کسی روز نہیں ملا؛ تو مانگا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے

چاہے ملے یا نہ ملے؛ آدمی اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہی رہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی راحت اور نعمت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ سے جب دعا کرتا رہتا ہے، پھر جب مصیبت کے موقعہ پر دعا کرتا ہے تو فرشتے اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں: اے اللہ! یہ جانی پہچانی آواز ہے (درمنثور، ۱/ ۲۸۷، البقرۃ آیت فاذکرونی اذکرکم۔ فضائل دعا مولانا عاشق الٰہی ص۸۴، حضرت سلمان کا ارشاد بہ حوالہ صفۃ الصفوۃ) یعنی یہ پہلے سے مانگتا تھا، ہم اس کو پہچانتے ہیں۔ بھائی! جو روزانہ ملتا ہو؛ اس سے جان پہچان ہو ہی جاتی ہے۔ یہ جب روزانہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے اور فرشتے اس کی آواز سنتے رہتے ہیں تو فرشتے باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ جانی پہچانی آواز ہے، اس کی مصیبت کو دور کر دیجیے۔

اور اگر راحت ونعمت کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اور پھر جب مصیبت آتی ہے اس وقت دعا کرتا ہے؛ تو فرشتے کہتے ہیں: باری تعالیٰ! یہ تو کوئی اجنبی آواز ہے۔

اس حدیث کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہماری یہ تمام ضرورتیں-جس کو ہم ضرورتیں سمجھ رہے ہیں، کھانا، پینا، کپڑا وغیرہ- چاہے پوری ہو رہی ہیں، تب بھی ہم ان کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے دستِ سوال پھیلاتے رہیں، دعا کرتے رہیں اور مانگتے رہیں، اسی میں ہماری بندگی وعبدیت کا اظہار ہے، اور اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہیں۔

﴿ گناہ ہو جائے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ﴾

﴿یَا عِبَادِیْ! اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْ لَکُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم رات اور دن گناہ کرتے ہو اور مَیں تمام گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو؛ مَیں تمہارے گناہ

معاف کروں گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلی چھوٹ دی جا رہی ہے۔ یہ نہیں کہا کہ گناہ کرو بلکہ تم سے گناہ ہوتے ہی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت اس قسم کی بنا رکھی ہے اور اس کا مزاج ہی ایسا ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی بچنا چاہتا ہے؛ تب بھی گناہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتلایا جا رہا ہے کہ گناہ ہو جاوے، تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھلا اعلان ہے کہ تم سے رات دن گناہ ہوتے ہی رہتے ہیں، اور مَیں تمہارے گناہ معاف کرتا ہی رہتا ہوں، اس لئے تم مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہی رہو؛ مَیں معاف کر دوں گا۔ لیکن جب آدمی معافی مانگے ہی نہیں؛ تو معاف کیسے ہوں گے؟ بغیر معافی مانگے معاف نہیں ہوں گے۔ ویسے اللہ تعالیٰ بغیر معافی مانگے بھی معاف کر سکتے ہیں، اسے اختیار ہے۔ لیکن معافی مانگنے پر تو اللہ تعالیٰ معاف کر ہی دیتے ہیں، اگر معافی نہیں مانگیں گے، تو اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے تو معاف کریں، چاہے تو نہ کریں۔

﴿یَاعِبَادِیْ! اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ، وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ﴾ اے میرے بندو! تم اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نقصان پہنچاؤ اور تم اس حیثیت تک نہیں پہنچ سکتے کہ مجھے نفع پہنچاؤ۔ یعنی بندہ نہ تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے۔ بندے میں وہ طاقت ہی نہیں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے، نہ نقصان پہنچانے کی طاقت ہے۔

﴿میری شان میں اضافہ نہ ہوگا﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! لَوْ أَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْا عَلٰی أَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ، مَازَادَ ذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئًا﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے،

جنات اور انسان، سب؛ تم میں کے سب سے بڑے متقی اور پرہیزگار آدمی جیسے بن جائیں۔ یعنی ساری دنیا کے سب لوگ؛ اس وقت دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ متقی اور ڈرنے والے شخص جیسے بن جائیں؛ تو اس کی وجہ سے میرے ملک میں اور میری شانِ عظمت میں ذرّہ برابر بھی زیادتی اور اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔ ساری دنیا نیک بن جائے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی شان بڑھنے والی نہیں ہے، اس کی شان میں کوئی زیادتی ہونے والی نہیں ہے، اس کی عظمت اور اس کی بڑائی اور اس کی شانِ کبریائی ابھی جس حال میں ہے؛ اُسی حال میں رہنے والی ہے۔

﴿میری شان میں کمی آنے والی نہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ!لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْاعَلیٰ أَفْجَرِ قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ،مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُّلْکِیْ شَیْئًا﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جنات اور انسان، سب کے سب؛ دنیا کے سب سے بڑے بدکار اور گنہگار آدمی جیسے دل والے ہو جائیں۔ یعنی دنیا میں جو سب سے بڑا اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے، ساری دنیا کے سب لوگ ایسے بن جائیں، تو اس کی وجہ سے میرے ملک میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت و بڑائی میں، اس کی شانِ کبریائی میں کوئی کمی آنے والی نہیں۔

سب اچھے ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان میں نہ کوئی اضافہ ہونے والا ہے۔ اور سب برے بن جائیں تو اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان میں نہ کوئی کمی آنے والی ہے یہ تو ہماری سعادت کی بات ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کریں۔

﴿تسبیح پڑھنے کی برکت﴾

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں ❁ پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

لوگ جس وقت میری تسبیح پڑھتے ہیں اور ﴿سبحان اللہ، سبحان اللہ﴾ کرتے ہیں، تو ان کے سبحان اللہ بولنے کی وجہ سے مَیں پاک نہیں ہوتا۔ ''سبحان اللہ'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تیری ذات پاک ہے۔ تو ہمارے یہ کہنے سے (اللہ تیری ذات پاک ہے) اللہ تعالیٰ کی پاکی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا؛ بلکہ اللہ تعالیٰ تو پاک ہی ہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں:-

پاک ہم ایشاں شوند و درفشاں

سبحان اللہ پڑھنے سے یہ خود پاک بنتے ہیں، ان کے کمال میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہماری یہ گندی زبان اگر اللہ کا ذکر کرلے، تو ہمارے ذکر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شان بڑھنے والی نہیں ہے۔ بلکہ ہماری پاکی میں اضافہ ہوجائے گا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہمیں کچھ مرتبہ حاصل ہوجائے گا۔ تو گویا سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے بھی جو کچھ ملا؛ ہمیں ہی ملا۔ اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے۔

دیکھو! اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کی عظمت وکبریائی کا کیسا ظہور ہورہا ہے۔

﴿میرے خزانے میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ! لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ قَامُوْافِیْ صَعِیْدٍ وَاحِدٍ فَسَأَلُوْنِیْ، فَأَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَسْأَلَتَهٗ، مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّاعِنْدِیْ اِلَّا کَمَایَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَاأُدْخِلَ الْبَحْرَ﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، جنات اور انسان، یعنی حضرت آدم سے لے کر قیامت تک جتنے انسان پیدا ہونے والے ہیں، سب اور تمام جنات؛ ایک کھلے میدان میں آجائیں اور جتنے ہیں وہ سب مجھ سے مانگیں اور اپنی حاجتیں پیش کریں اور جس کو جو مانگنا ہو؛ وہ مانگیں۔ جتنا مانگ سکتے ہوں؛ اتنا مانگیں، اپنے سب سوال اللہ تعالیٰ

کے سامنے پیش کریں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جس نے جو مانگا، مَیں ان کو اتنا دے دوں، تو اس دینے کے بعد بھی میرے پاس نعمتوں کے جو خزانے ہیں ان میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں ہے جتنی سمندر میں سوئی کو داخل کریں اور نکالیں تو اس سمندر میں کمی آئے؟

علماء لکھتے ہیں کہ سمندر چاہے کتنا ہی بڑا سہی، لیکن ہے تو فانی اور ختم ہونے والی چیز۔ اور سوئی جتنی بھی چھوٹی سہی لیکن اس کے اوپر ایک چھوٹا سا قطرہ جو آیا ہے، اس کو سمندر کے پانی سے کروڑویں، اَربویں یا اس سے زیادہ ہی سہی؛ کچھ نہ کچھ تو نسبت ہے؟ مطلب یہ ہے کہ سوئی کے اوپر جو قطرہ آیا اتنی تو سمندر میں کمی آئی۔ لیکن ان سب کو سب دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خزانے میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں ہے۔ اس لئے کہ یہ جو کچھ دیا گیا ہے وہ ختم ہونے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے خزانے میں جو ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ متناہی اور غیر متناہی میں کوئی نسبت ہو ہی نہیں ہوسکتی۔ دونوں میں کوئی جوڑ ہی نہیں ہے۔

﴿جو کچھ ہیں: تمہارے ہی اعمال ہیں﴾

﴿یَاعِبَادِی !اِنَّمَاھِیَ أَعْمَالُکُمْ،أُحْصِیْھَالَکُمْ ثُمَّ أُوَفِّیْکُمْ اِیَّاھَا﴾ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں، مَیں تمہارے واسطے ان کو ریکارڈ کرتا ہوں، کل کو میرے سامنے آکر ان کا جواب دینا پڑے گا اور سارے اعمال کا پورا بدلہ تم کو ملنے والا ہے۔ اچھے اعمال ہیں تو اچھا بدلہ ملنے والا ہے، اور برے اعمال ہیں تو برا ملنے والا ہے ﴿فَمَنْ وَجَدَ خَیْرًا فَلْیَحْمَدِ اللّٰہَ﴾ اس لئے اگر کسی بندے سے کوئی نیکی کا کام ہو جاوے تو اللہ کی تعریف کرے کہ: اے اللہ! تیرا شکر و احسان ہے کہ تو نے مجھے توفیق عطا فرمائی اور مجھ گنہگار سے نیکی کا کام ہو گیا۔ ورنہ جیسے ہم ناقص ہیں؛ ہم سے افعال بھی ناقص ہی وجود میں آئیں گے۔ بھائی! جو اَدھورا ہے، اس سے

اچھا کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی ہوسکتا ہے۔اس لئے اگر کسی سے کوئی نیک کام ہوجائے تو اس کو چاہیے کہ اللہ کی تعریف کرے کہ یہ اللہ کے توفیق دینے سے ہوا۔ اللہ کا شکرادا کرے ﴿لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِیْدَنَّکُمْ﴾ اگر شکرادا کروگے تو اللہ تعالیٰ نعمت میں اضافہ کریں گے، نیکی کا کام کرنے کی اور زیادہ توفیق ہوگی۔

﴿وَمَنْ وَجَدَ غَیْرَ ذٰلِکَ فَلاَ یَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَہٗ﴾ اور اگر کسی سے کچھ اور ہوجاوے یعنی گناہ کا کام ہوجاوے؛ تو پھر اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔اس لئے کہ کوتاہی والی جو بات ہوئی ہے، وہ ہم سے ہی ہوئی ہے۔

بہرحال! اس حدیث کے متعلق اس حدیث کے راوی حضرت سعید بن عبدالعزیز ؒ فرماتے ہیں: حضرت ابوادریس خولانی رحمۃ اللہ علیہ جو اکابر تابعین میں سے ہیں وہ جب یہ حدیث بیان کرتے تھے، تو بڑے اہتمام سے دوزانو بیٹھ جاتے تھے۔

اس حدیث میں جو مضامین ہیں، وہ واقعتاً اللہ تعالیٰ کی عظمت، کبریائی، بڑائی اور جلالتِ شان میں بہت انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں۔ اگر آدمی ان چیزوں کو غور سے سنے اور اپنے دل میں اتارلے، تو ان شاء اللہ زندگی کے بہت سارے مسائل حل ہوسکتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی رضا کی اور نیک کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے

﴿دعا﴾

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالٰی جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ
لَااِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ اَلْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدًا
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ
کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اے اللہ! تیری شان بے نیاز ہے، اے اللہ! ہم ہر لمحہ تیرے محتاج ہیں، ہمیں زیادہ سے زیادہ تیری اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق عطا فرما۔ نبی کریم ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس و شیطان کی شرارتوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اس مجلس میں جتنے بھی بیمار ہیں اور جن کے متعلقین بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو حاجت مند ہیں ان کی حاجتوں کو پوری فرما۔ اے اللہ! جنہوں نے اپنے جن جن مقاصد کے لئے اور جن مصیبتوں کے دور ہونے کے لئے اور جن بیماریوں سے شفا کے لئے ہم سے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں یا جن کے ہم پر حقوق ہیں؛ اے اللہ! ان تمام کی جائز مرادوں کو پورا فرما، پریشانیوں کو دور فرما، حاجتوں کو پورا فرما۔ اے اللہ! ان کی بیماریوں کو صحت و شفا سے بدل دے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور اکرم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ
وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ
بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

اَلْحَثُّ عَلٰی الازْدِیَادِمِنَ الْخَیْرِ

فِیْ أَوَاخِرِالْعُمُرِ

﴿اخیرعمرمیں نیکیوں کی کثرت﴾

﴿اقتباس﴾

زندگی کے آخری ایام میں جب یہ اندازہ ہو کہ دنیا سے جانے کا وقت قریب ہو رہا ہے، ان دنوں میں آدمی کو سارے کاروبار و مشاغل اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی یاد اور نیکی کے کاموں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:۔

﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْکُمْ مَایَتَذَکَّرُ فِیْهِ مَنْ تَذَکَّرَ وَجَآءَکُمُ النَّذِیْرُ﴾

کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں کوئی آدمی اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا؛ تو نصیحت حاصل کر سکتا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا اور وارننگ دینے والا بھی آیا تھا کہ اس زندگی کو ذرا غنیمت سمجھو اور غفلت میں نہ گذارو۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے محققین کا قول یہ ہے کہ اتنی عمر سے ساٹھ سال مراد ہے

اور بعض حضرت کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال مراد ہے

بعض حضرات نے چالیس سال کہا ہے

اور یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ مدینہ والوں میں سے جب کسی کی عمر چالیس سال ہو جاتی تھی تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کر لیتے تھے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا أما بعد.

فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.

اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ

﴿باب کا عنوان﴾

زندگی کے اخیر سالوں میں اور آخری ایام میں زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ ویسے تو آدمی کو چاہیے کہ پوری زندگی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں ہی استعمال کرے۔ چونکہ پوری ہی زندگی کے متعلق سوال ہوگا جیسا کہ حدیث پاک میں ہے کہ قیامت کے روز آدمی کے قدم اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ پانچ چیزوں کے متعلق سوال نہیں ہوگا (سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۳۴۱) اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جب تک چار چیزوں کے متعلق سوال نہیں ہوگا۔ ان میں سے پہلی چیز ہے ﴿عَنْ عُمُرِهٖ فِيْمَا اَفْنَاهُ﴾ زندگی کو کہاں گنوایا اور خرچ کیا۔

﴿بہت عظیم نعمت﴾

زندگی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بہت عظیم نعمت ہے، ساری نعمتیں اسی نعمت کے اوپر موقوف ہے، اگر زندگی نہ ہوتی تو باقی ساری نعمتیں کہاں حاصل ہوتیں؟ اسی لئے زندگی کی اس

نعمت کی قدر دانی کے متعلق قرآن وحدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔اور حضور اکرم ﷺ نے جہاں ایک موقع پر یہ فرمایا تھا کہ پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو،اس میں آخری چیز بتلائی تھی ﴿وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ﴾ اپنی زندگی کو اپنی موت سے پہلے غنیمت سمجھو

(ترمذی شریف،حدیث نمبر ۲۲۵۵)

﴿جب دنیا سے جانے کا وقت قریب ہوتو......﴾

یہاں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ زندگی کے آخری ایام میں جب یہ اندازہ ہو کہ دنیا سے جانے کا وقت قریب ہورہا ہے،ان دنوں میں آدمی کو سارے کاروبار ومشاغل اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی یاد اور نیکی کے کاموں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبی کریم ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں اسی کی ترغیب دی ہے اور اس کی طرف آمادہ کیا ہے۔یہ باب اسی لئے قائم کیا ہے: ﴿اَلْحَثُّ عَلَى الْأَزْدِيَادِمِنَ الْخَيْرِفِيْ أَوَاخِرِ الْعُمُرِ﴾ زندگی کے آخری دنوں میں خیر کے کاموں میں زیادہ مشغول ہونے کی ترغیب دی جارہی ہے،اور اس کا شوق دلایا جارہا ہے۔

﴿اتنی عمر نہیں دی تھی﴾

قرآنِ پاک کی یہ آیت پیش کی ہے: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَايَتَذَكَّرُفِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَ كُمُ النَّذِيْرُ﴾ جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں کوئی آدمی اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا؛ تو نصیحت حاصل کرسکتا تھا۔سُدھرنا چاہتا تو سُدھر سکتا تھا،اپنے حالات کو درست کرنا چاہتا؛ تو کرسکتا تھا۔اتنی عمر دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈرانے والا بھی آیا تھا،وارننگ دینے والا اور بتانے والا بھی آیا تھا کہ اس کو ذرا غنیمت سمجھو اور غفلت میں نہ گذارو۔

﴿اتنی عمر سے کتنی عمر مراد ہے؟﴾

اس آیت کے سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات محققین کا یہ مقولہ نقل کیا ہے کہ اتنی عمر سے کتنی عمر مراد ہے؟ باری تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی؟ اس سلسلے میں حضرات مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور دوسرے محققین کا قول یہ ہے کہ ساٹھ سال مراد ہے یعنی ہم نے تم کو ساٹھ سال کی عمر نہیں دی تھی؟ ساٹھ سال کی عمر گویا اتنی ہے کہ اس میں آدمی بہت کچھ حاصل کرسکتا ہے۔

چنانچہ صاحبِ کتاب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن عباس کی رائے نقل کرنے کے بعد یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے جس کو ہم نے اس باب میں نمبر اول پر ذکر کی ہے۔

﴿جس کو ساٹھ سال کی عمر ملی﴾

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت آنے والی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿أَعْذَرَ اللّٰهُ إِلٰى امْرِئٍ أَخَّرَ أَجَلَهُ حَتّٰى بَلَغَ سِتِّيْنَ سَنَةً﴾ اللہ تعالیٰ نے اس آدمی کا عذر ختم کردیا جس کی موت کو مؤخر کیا یہاں تک کہ ساٹھ سال کی عمر پالی۔ یعنی جس کو ساٹھ سال تک دنیا میں رہنے کا موقعہ ملا، قیامت کے روز اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی عذر کرنے کا موقعہ نہیں رہے گا۔ جیسے دنیا میں بھی ہوتا ہے، کسی ماتحت کو کوئی کام سونپا جاتا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ ذرا موقعہ دیجیے تو میں یہ کام کرلوں، مجھے مہلت دی جائے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے آدمی کو حکم دیا ہے کہ اطاعت وفرمانبرداری کرے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرے۔ تو جنہوں نے

اپنی زندگی گنوادی ہے، وہ قیامت کے روز اللہ کے حضور معذرت کرتے ہوئے یہ عذر پیش کریں گے کہ باری تعالیٰ! ہمیں موقعہ دیا جاتا تو ہم کچھ کر کے لاتے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کو ساٹھ سال زندہ رہنے کا موقعہ ملا، اس کو کل قیامت کے روز یہ کہنے کا منہ نہیں رہے گا کہ مجھے کچھ موقعہ دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ساٹھ سال تو دیئے تھے، اتنا زندہ رہا لیکن اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کیا، اپنی اصلاح نہیں کی، اپنی حالت درست نہیں کی، نصیحت حاصل نہیں کی، دینداری اختیار نہیں کی، اب کتنی زندگی دی جاتی جس میں تو سُدھرتا؟ یہ تو تیرا بہانہ ہے۔ جیسے کسی کو پڑھنے لکھنے کا موقعہ دیا جائے، پھر امتحان لیا جائے اور وہ کہے کہ مجھے ذرا موقعہ دیا جائے، تو اس کو کیا کہیں گے؟ اتنا زمانہ تو دیا تھا، اس کے بعد تجھے کیا چاہیے؟ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے۔

اور بعض حضرت کہتے ہیں کہ اٹھارہ سال مراد ہے۔ یعنی اٹھارہ سال کا کسی کو موقعہ مل جاوے، تو گویا اس کو اتنا موقعہ ملا ہے کہ وہ اپنے آپ کو درست کر سکتا ہے۔

اہلِ مدینہ کا معمول

بعض حضرات نے چالیس سال کہا ہے۔ چنانچہ حسن بصری، کلبی، مسروق وغیرہ حضرات فرماتے ہیں: جس کو چالیس سال زندہ رہنے کا موقعہ ملا، گویا اس کو دنیا میں اتنی عمر ملی ہے کہ وہ اپنے احوال درست کر سکتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی دوسرا قول اسی طرح کا منقول ہے۔

اور یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ مدینہ والوں میں سے جب کسی کی عمر چالیس سال ہو جاتی تھی تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کر لیتے تھے۔ یعنی چالیس سال عمر

پہنچنے کے بعد سارا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جاتے تھے۔

بعض حضرات یوں کہتے تھے کہ یہی (۴۰ سال) بلوغ کا زمانہ ہے۔ یعنی روحانی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کے لحاظ سے یہ بلوغ کا وقت ہے۔

اور بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ اہلِ مدینہ کی جب چالیس سال کی عمر ہو جاتی تھی تو بستر لپیٹ کر رکھ دیتے تھے کہ اب سونے کے دن گئے، اب تو محنت کا وقت آ گیا ہے۔ اسی بات کی طرف متوجہ کرنے کیلئے یہ باب قائم کیا جا رہا ہے کہ آدمی کی عمر کا ایک معتد بہ حصہ گذر جائے، اس کے بعد تو اس کو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کر ہی لینا چاہیے۔

ملک الموت سے مکالمہ

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ہے "التذکرۃ فی أحوال الموتیٰ والآخرۃ" اس میں انہوں نے علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "روضۃ المشتاق" کے حوالے سے ایک روایت نقل کی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے یہ واقعہ اپنے خطبات کے اندر ذکر کیا ہے کہ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ کسی نے ملک الموت سے یوں کہا کہ دنیا کی حکومتوں کا دستور ہے کہ کسی کے نام جب وارنٹ جاری کیا جاتا ہے، تو پہلے اس کو نوٹس دی جاتی ہے، اس کو آگاہ کیا جاتا ہے، جب دو تین نوٹس کے بعد بھی وہ توجہ نہیں کرتا تو پھر اس کے نام سرچ وارنٹ جاری کرتے ہیں کہ اس کو فوری طور پر گرفتار کر کے لایا جائے۔ لیکن آپ کا دستور تو عجیب ہے کہ آپ تو بس آ دھمکتے ہیں اور روح قبض کر کے چلے جاتے ہیں۔ ملک الموت نے کہا کہ میں اتنے نوٹس

بھیجتا ہوں کہ دنیا کی کوئی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہوگی۔ پوچھا: آپ کے نوٹس کیا ہیں؟ ملک الموت نے فرمایا: بالوں کا سفید ہو جانا؛ یہ میرا نوٹس ہے۔ بیماریاں اور امراض؛ یہ میرے نوٹس ہیں۔ شنوائی کی صلاحیت کا کمزور ہو جانا؛ یہ میرا نوٹس ہے کہ اب جانے کا وقت آ رہا ہے بصارت کا کمزور ہو جانا؛ یہ میرا نوٹس ہے۔ گھٹنوں میں درد شروع ہو گیا؛ یہ میرا نوٹس ہے۔ اولاد کی اولاد ہو گئی؛ یہ بھی میرا نوٹس ہے۔ مَیں تو اتنے نوٹس بھیجتا ہوں کہ دنیا کی کوئی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہوگی، پھر بھی لوگ میرے نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے؛ تو مَیں کیا کروں؟

حضرت مفتی تقی صاحب فرماتے ہیں: والد صاحب سے یہ قصہ سنا تھا، اس کا مأخذ تو معلوم نہیں ہے۔ لیکن بندہ کو یہ روایت ''التذکرۃ'' میں مل گئی جو علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کی اس موضوع میں بڑی معتبر کتاب ہے، اس میں یہ واقعہ دیکھا تو مَیں نے محسوس کیا کہ شاید مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی واقعہ کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہو۔

ملک الموت کے ایلچی

اس میں یہ ہے کہ ایک نبی نے ملک الموت سے کہا: آپ اپنی آمد سے پہلے ایلچی نہیں بھیجتے، تاکہ لوگ تیاری کر لیں؟ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! بہت سارے ایلچی بھیجتا ہوں بیماریاں، بوڑھاپا، غم، فکریں، بینائی کے اندر کمی آ جانا، سننے کی صلاحیت میں کمی کا آ جانا، یہ سب میرے ایلچی ہیں، میرے مخبر ہیں جو خبر دے رہے ہیں کہ میں آ رہا ہوں۔ جب کوئی آدمی ان ساری چیزوں سے بھی اپنے آپ کو نہیں سدھارتا، نصیحت حاصل نہیں کرتا اور توبہ نہیں کرتا؛ تو جب مَیں روح قبض کرنے کے لئے آتا ہوں، اس وقت اس کو یوں کہا کرتا ہوں کہ مَیں نے یکے بعد دیگرے تیرے پاس ایلچی نہیں بھیجے؟ ڈرانے والے نوٹس نہیں بھیجے؟

اب مَیں وہ ایلچی ہوں کہ میرے بعد کوئی ایلچی آنے والا نہیں ہے۔ مَیں ایسا ڈرانے والا ہوں کہ میرے بعد کوئی اور ڈرانے والا نہیں ہے۔ مَیں آخری نوٹس ہوں اور وارنٹ بن کر آیا ہوں

﴿ملک الموت کی روزانہ کی پکار﴾

اور جب بھی کوئی دن طلوع ہوتا ہے، تو ملک الموت آواز دیتا ہے: ﴿يَا أَبْنَآءَ الْأَرْبَعِيْن هٰذَا وَقْتُ أَخْذِ الزَّاد﴾ اے چالیس سال کی عمر والو! یہ توشہ تیار کر لینے کا زمانہ ہے ﴿أَذْهَانُكُمْ حَاضِرَةٌ وَّأَعْضَآءُ كُمْ قَوِيَّةٌ شِدَاد﴾ تمہارے ذہن حاضر ہیں، تمہارے اعضاء بڑے مضبوط اور قوی ہیں۔ گویا آخرت کے لئے توشہ حاصل کر سکتے ہو، فائدہ اُٹھالو۔

پھر یہ بھی آواز دیتے ہیں: ﴿يَا أَبْنَآءَ الْخَمْسِيْن ! قَدْ دَنَا وَقْتُ الْأَخْذِ وَالْحَصَادِ﴾ اے پچاس سال کی عمر والو! کھیتی کی کٹائی کا وقت آ چکا ہے، تیاری کر لو۔

اور یہ بھی آواز دیتے ہیں: ﴿يَا أَبْنَآءَ السِّتِّيْن! نَسِيْتُمُ اللِّقَآءَ وَغَفَلْتُمْ عَنْ رَدِّ الْجَوَابِ﴾ اے ساٹھ سال کی عمر والو! اللہ تعالیٰ کے عذاب کو بھول گئے، کل کو اللہ کے سامنے جواب دینا ہے، اس کی طرف سے غافل ہو گئے۔ تمہارا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اگر تم نے اس کے بعد بھی غفلت برتی تو اب تمہارا کوئی وکیل اور مددگار نہیں ہے۔

اور پھر یہ آیت پڑھتے ہیں: ﴿اَوَلَمْ نُعَمِّرْ كُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَ كُمُ النَّذِيْر﴾ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی کہ جس میں کوئی آدمی اگر نصیحت حاصل کرنا چاہتا تو نصیحت حاصل کر سکتا تھا اور ڈرانے والا بھی بھیجا۔

﴿...... یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے﴾

ڈرانے کے واسطے تو بہت ساری چیزیں ہیں۔ ہم روزانہ اپنے آس پاس اپنے

دوستوں میں سے، اپنے عزیزوں میں سے، اپنے پڑوسیوں میں سے بہت سے لوگوں کو دُنیا سے جاتا ہوا دیکھتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو غسل دیتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو کفن پہناتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کا جنازہ اُٹھاتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے ان کو قبر پر لے جاتے ہیں، جنازے کی نماز پڑھتے ہیں، قبر میں اُتارتے ہیں اور اپنے ہاتھوں سے دفن کر کے واپس آتے ہیں۔ یہ سب کرتے ہیں لیکن کبھی ہمیں بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے۔

روایتوں میں ہے کہ ملک الموت حضرت داؤد علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ کہا: مَیں وہ ہوں جو کسی بادشاہ سے نہیں ڈرا کرتا۔ مَیں وہ ہوں کہ کوئی قلعہ اس کو آنے سے روک نہیں سکتا۔ مَیں وہ ہوں کہ جو کوئی رشوت قبول نہیں کرتا کہ لے دے کر سیٹلمنٹ (Settlement) کر لیا جائے۔ دنیا میں تو بڑے سے بڑے معاملے میں سیٹلمنٹ (Settlement) بھی ہو جاتا ہے۔ اور آج کل تو بہت آسان ہو گیا ہے۔ لیکن میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔

تو حضرت داؤد علیہ السلام نے کہا: پھر تو آپ ملک الموت ہیں۔ انہوں نے کہا: جی ہاں! مَیں ملک الموت ہوں۔ کہا: مَیں نے ابھی کوئی تیاری نہیں کی۔ کہا: تمہارا فلاں رشتہ دار کہاں ہے؟ تمہارا فلاں پڑوسی کہاں ہے؟ تمہارا فلاں دوست کہاں ہے؟ کہا: وہ سب مر گئے۔ کہا: بس! ان سب کی موت کے بعد بھی عبرت حاصل نہیں کی اور اپنے لئے تیاری نہیں کی؟

حقیقت تو یہ ہے کہ جو دنیا سے جا رہے ہیں وہ ہمیں متنبہ کر رہے ہیں، ہمارے لئے عبرت کا سامان مہیا کر رہے ہیں کہ ہم تو جا رہے ہیں، آپ کے پاس وقت ہے، آخرت کے

لئے تیاری کر لیجیے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کا اہتمام کریں اور خاص کر عمر کی وہ منزل جس کے بعد عام طور پر یہ مراحل آتے ہیں، اس میں تو آدمی کو تیاری کرنے میں لگ ہی جانا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دربار میں

چنانچہ اس سلسلے میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔ پہلی روایت تو گزر چکی ہے، دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے۔

عن ابن عباس قال: كَانَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ يُدْخِلُنِیْ مَعَ أَشْيَاخِ بَدْرٍ، فَكَأَنَّ بَعْضُهُمْ وَجَدَفِیْ نَفْسِهٖ فَقَالَ: لِمَ يَدْخُلُ هٰذَا مَعَنَا وَلَنَا أَبْنَآءٌ مِثْلُهٗ؟ فَقَالَ عُمَر رضی اللہ عنہ: اِنَّهٗ مِنْ حَيْثُ عَلِمْتُم! فَدَعَانِیْ ذَاتَ يَوْمٍ فَأَدْخَلَنِیْ مَعَهُمْ، فَمَارَأَيْتُ أَنَّهٗ دَعَانِیْ يَوْمَئِذٍ اِلَّا لِيُرِيَهُمْ، قَالَ: مَاتَقُوْلُوْنَ فِیْ قَوْلِ اللهِ تَعَالٰی ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ؟﴾ فَقَالَ بَعْضُهُمْ: أُمِرْنَا نَحْمَدُ اللهَ وَنَسْتَغْفِرُهٗ اِذَا نُصِرْنَا وَفُتِحَ عَلَيْنَا، وَسَكَتَ بَعْضُهُمْ فَلَمْ يَقُلْ شَيْئاً. فَقَالَ لِیْ: أَكَذٰلِكَ تَقُوْلُ يَا ابْنَ عَبَّاسٍ؟ فَقُلْتُ: لَا. قَالَ: فَمَاتَقُوْلُ؟ قُلْتُ: هُوَ أَجَلُ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم، أَعْلَمَهٗ لَهٗ قَالَ: ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُ اللهِ وَالْفَتْحُ﴾ وَذَالِكَ عَلَامَةُ أَجَلِكَ ﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا﴾ فَقَالَ عُمَرُ: مَاأَعْلَمُ مِنْهَا اِلَّامَاتَقُوْلُ. (رواه البخاری)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے بدر میں شریک ہونے والے حضرات صحابہ کے ساتھ اپنے یہاں حاضری کی دعوت اور موقعہ دیا کرتے تھے۔ بادشاہوں، بڑے لوگوں اور حکام کے یہاں ہر ایک کو اس کے مرتبہ کے مطابق حاضری اور باریابی کا موقعہ دیا جاتا ہے۔ جیسے فلاں وقت اہلِ علم کی ملاقات کا ہے، فلاں وقت بوڑھوں کی

ملاقات کا ہے، فلاں بچوں کی ملاقات کا ہے۔ بڑوں کے یہاں اس طرح اوقات مقرر ہوتے ہیں، ہر ایک طبقے کے لئے مناسبِ حال وقت رکھا جاتا ہے، اور اس وقت میں دوسروں کو موقعہ نہیں دیا جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب یہ بڑے بڑے صحابہ کی حاضری کا وقت ہوتا تھا، اُس وقت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی - جوان کے بیٹوں کی عمر کے تھے - حاضری کا موقعہ دیا کرتے تھے۔ یہ چیز ان حضرات میں سے بعض کو ناگوار ہوئی کہ ہمارے بیٹے ان کی عمر کے ہیں، یہ ہمارے ساتھ کیوں آیا کرتے ہیں، ان کو دوسرے وقت موقعہ دیا جائے۔ گویا آپ فرقِ مراتب نہیں کرتے۔

﴿فقال عمر رضی اللہ عنہ: اِنَّهٗ مِنۡ حَيۡثُ عَلِمۡتُم﴾ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں وقتی طور پر تو یوں کہا: یہ جس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں؛ وہ تمہیں معلوم ہے۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اگر چہ عمر میں آپ جتنے نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے بلایا اور ان حضرات اکابر صحابہ جو اہلِ بدر تھے، ان کے ساتھ مجھے بھی اپنے پاس قریب کیا۔ اس دن جو باتیں ہوئیں اس سے میں سمجھ گیا کہ ان حضرات نے اس روز جو اعتراض کیا تھا، اس کا جواب دینے کے لئے مجھے بلایا ہے۔

﴿نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع﴾

اس روز واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب حضرات کے جمع ہونے کے بعد سوال کیا کہ قرآنِ پاک کی اس سورت ﴿اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ﴾ کے متعلق کیا رائے ہے؟ جس کا ترجمہ ہے: ''اے نبی! جب اللہ تعالیٰ کی مدد آ جائے، اور فتح بھی مل جائے، اور آپ لوگوں کو دیکھیں کہ وہ جماعت در جماعت گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں؛

تو آپ اپنے رب کی ثناء وحمد اور تسبیح بیان کیجیے اور اپنے گناہوں سے معافی مانگئے، استغفار کیجیے؛ یقیناً اللہ تعالیٰ قبول کرنے والا ہے''۔

ان میں سے بعض نے کہا: جب اللہ تعالیٰ کی مدد ہم تک آوے، اور اللہ تعالیٰ کسی ملک کو ہم سے فتح کرا دیوے، تو اُس وقت ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کریں اور استغفار کریں۔

بعض حضرات خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سب کا جواب سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یوں کہا: اے ابن عباس! آپ بھی یہی کہتے ہیں؟ مَیں نے کہا: نہیں! میرا جواب یہ نہیں ہے۔ کہا: ﴿فَمَا تَقُوْلُ؟﴾ تمہارا جواب کیا ہے؟ ﴿قُلْتُ: هُوَ أَجَلُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ﴾ مَیں نے عرض کیا: اس میں نبی کریم ﷺ کی وفات کی اطلاع دی گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا: اے نبی! جب اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے اور دشمن زیر ہو جائیں اور مکہ فتح ہو جائے ﴿ذَالِكَ عَلَامَةُ أَجَلِكَ﴾ یہ آپ کے وفات کے قریب آنے کی علامت ہے، اس لئے آپ اپنے رب کی حمد و ثنا بیان کریں اور استغفار کریں، اللہ تعالیٰ قبول کرنے والے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ﴿مَا أَعْلَمُ مِنْهَا إِلَّا مَا تَقُوْلُ﴾ اس سورت کا مطلب مَیں بھی یہی سمجھتا ہوں؛ جو آپ نے کہا۔

بس! یہاں تو اس لئے لائے کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں نبی کریم ﷺ کے وفات کا وقت قریب آنے کی ایک علامت بیان فرمائی ہے۔ اس کے بعد باری تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم دیا گیا کہ خاص طور پر اللہ کی حمد و ثناء اور تسبیح میں لگ جایئے۔ گویا جب آدمی کی موت کا وقت قریب ہو تو اس کو دوسرے سارے کاموں سے ہٹ کٹ کر ان کاموں

میں لگنا چاہیے۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد اسی بات کو بتلانا ہے کہ آدمی کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں نیکی کے کام زیادہ کرنے چاہئیں۔

﴿ آخری ایام میں آپ ﷺ کا عملِ مبارک ﴾

عن عائشۃَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: مَاصَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ صَلاۃً بَعْدَاَنْ نَزَلَتْ عَلَیْہِ ﴿اِذَاجَآءَ نَصْرُاللّٰہِ وَالْفَتْحُ﴾ اِلَّایَقُوْلُ فِیْھَا ﴿سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَاوَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ﴾ (متفق علیہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے۔ اس سے اگلی روایت میں یہ بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا تھا اور اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس سورت کے نازل ہونے کے بعد- کہ جس میں آپ کو جس کام کا حکم دیا تھا اور جس چیز کی طرف متوجہ کیا گیا تھا- آپ ﷺ نے اہتمام سے اس حکم پر عمل شروع کر دیا۔ وہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آیا تھا، اس سے باب کا عنوان ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اور اس روایت کو پیش کر کے خود حضورِ اکرم ﷺ کا جو عملِ شریف تھا، اس کے ذریعہ سے ان عنوان کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ گویا اس سورت کے نازل ہونے کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے بھی باقاعدہ اس کا اہتمام شروع کیا کہ جو بھی نماز آپ پڑھتے تھے اس کے رکوع اور سجدے میں آپ یہ تسبیحات یعنی ﴿سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَاوَبِحَمْدِکَ، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ﴾ پڑھا کرتے تھے۔ گویا جس چیز کا آپ کو حکم دیا گیا تھا آپ نے وہ شروع کر دیا۔ اب ایمان کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ آپ ﷺ کی اتباع میں اہلِ ایمان بھی زندگی کے آخری مراحل میں ان چیزوں کا اہتمام کریں۔

﴿ آخری دنوں میں کثرتِ وحی کی ایک وجہ ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنَّ اللّٰہَ عزوجل تَابَعَ الْوَحْیَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ قَبْلَ وَفَاتِہٖ، حَتّٰی تُوُفِّیَ أَکْثَرَمَاکَانَ الْوَحْیُ. (متفق علیہ)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں: اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی وفات سے پہلے آپ پر مسلسل وحی بھیجی، یہاں تک کہ جس وقت آپ ﷺ کی وفات ہوئی اُس وقت شروع کے مقابلے میں بہت کثرت سے وحی نازل ہوئی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ پہلی وحی نازل ہوئی تھی: ﴿اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ﴾ شروع کی پانچ یا چھ آیتیں نازل ہوئیں، اس کے بعد تین سال تک وحی کا سلسلہ منقطع رہا، پھر وحی جاری ہوئی، اس کے بعد بھی یہ ہوتا تھا کہ روزانہ وحی نہیں آتی تھی، لیکن آخری عمر شریف میں وحی برابر کثرت سے نازل ہوتی رہی۔

اس کے مختلف اسباب تھے، ایک سبب یہ بھی تھا کہ شروع میں صرف آخرت، جنت ودوزخ، توحید ورسالت اور عقائد کی درستگی کے متعلق اور اگلی قوموں کے ساتھ باری تعالیٰ کا جو معاملہ رہا؛ انہیں چیزوں کو بیان کیا جاتا تھا۔ گویا ایمان کی پختگی کو ذکر کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب لوگ ایمان لے آئے اور کثرت سے لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو اب احکام کے متعلق وحی آنا شروع ہوئی، اور لوگوں کی طرف سے کئے جانے والے سوالات کے جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نازل کی جاتی تھی۔ گویا بعد میں وحی کی کثرت ہوجانے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ لیکن یہاں تو اس روایت کو اس لئے پیش کیا کہ وحی کا آنا یہ بھی امت کے لئے ذریعۂ خیر ہے، اور نبی کریم ﷺ کی عمر شریف کے آخری سالوں اور دنوں کے مقابلہ میں وحی کثرت سے آئی۔ گویا یہ خبر لانے والا سلسلہ پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا، اور آخری عمر شریف میں بھلائی کی چیزوں میں اضافہ ہوا۔ اس سے عنوان ثابت ہوتا ہے۔

﴿جیسی زندگی؛ ویسی موت﴾

عن جابر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: یُبْعَثُ کُلُّ عَبْدٍ عَلٰی مَامَاتَ عَلَیْہِ. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی جس چیز پر وفات پاتا ہے اسی پر اُٹھایا جائے گا۔ ایمان کی حالت میں وفات پائی تو ایمان کی حالت میں اُٹھایا جائے گا۔ عملِ صالح کے ساتھ اور اچھے ارادوں کے ساتھ وفات پائی، تو اچھے ارادوں کے ساتھ اُٹھایا جائے گا: ﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ﴾ اسی لئے حکم دیا گیا کہ تمہاری موت ایسی حالت میں آوے کہ تم مسلمان ہو۔

موت کب آئے گی اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے، اس لئے آدمی کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اچھے اعمال ہی کے اندر مشغول کرے، تا کہ جب بھی موت آوے، تو اچھی حالت میں آوے، اور خاص کر موت کا وقت جب قریب آیا ہو؛ تو اس کا اور زیادہ اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک و تعالی ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

كَثُرَةُ طُرُقِ الْخَيْرِ

نیکی کے راستے بہت ہیں

مجلس ﴿۱﴾

﴿اقتباس﴾

صوفیا کے یہاں ایک مقولہ بڑا مشہور ہے:-

﴿طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلیٰ اللّٰہِ تعالیٰ بِعَدَدِ أَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ﴾

اللہ کی ذات تک پہنچنے کے راستے مخلوق کی سانسوں کی تعداد کی مقدار ہیں،
گویا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نہیں ہے؛
بلکہ بے شمار کام ایسے ہیں کہ جن کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی
حاصل کرسکتا ہے۔ اور آدمی کو اپنی حیثیت اور اپنی طاقت کے مطابق جتنا ہو سکے؛
ان سب کاموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اور یہ بات بھی خاص پیش نظر رہے کہ جو جس کارِ خیر میں لگا ہوا ہے، اس پر تنقید
سے بھی اپنے آپ کو بچائے۔

اگر کوئی نیکی کا کام نہیں کر سکتے تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ تمہاری ذات سے کسی کو کوئی
تکلیف، شر اور برائی نہ پہنچے، اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ اور مامون کرلو:-

ع طاقت نیکی نہ داری؛ بد مکن

یہ تمہاری طرف سے اپنی ذات کے اوپر صدقہ اور احسان ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّـئَاتِ أَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُأَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُأَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

أعوذباللّٰہ من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم

وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَيْرٍفَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ. وقال تعالىٰ: وَمَاتَفْعَلُوْامِنْ خَيْرٍيَّعْلَمْهُ اللّٰهُ.

وقال تعالىٰ: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍخَيْراًيَّرَهٗ. وقال تعالىٰ: مَنْ عَمِلَ صَالِحًافَلِنَفْسِهٖ

﴿نیکی کے کام بہت ہیں﴾

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں باب قائم کیا ہے ﴿كَثْرَةُطُرُقِ الْخَيْرِ﴾ نیکی کے راستوں کی کثرت اور زیادتی کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو نیک کام انجام دیتا ہے، ان میں بھی بڑا تنوع ہے اور وہ مختلف الجہات ہیں، یعنی کسی ایک چیز کے اندر منحصر نہیں ہیں بلکہ بے شمار ایسے کام ہیں جو نیکی کے کہلاتے ہیں اور ان کے ذریعہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرسکتا ہے۔ اور جس نیکی کے ذریعہ سے وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرلے اور اس کی خوشنودی حاصل کرلے اس میں اپنی طرف سے کمی و کوتاہی نہیں کرنی چاہیے؛ بلکہ جس کام کی بھی اس کو قدرت ہو، اس کا اہتمام کرنا چاہیے، چاہے نیکی کا وہ کام چھوٹا ہو، یا بڑا ہو۔

﴿اس کا بدلہ دیا جائے گا﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بھی نیکی کا کام تم کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا

ہے۔یعنی آدمی کو یہ سمجھ کرنیکی کا کام کرنا چاہیے کہ مَیں جو کام کررہا ہوں؛وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں ہے، چاہے وہ کام چھوٹا ہو یا بڑا؛ اللہ تعالیٰ میرے اس کام کا بدلہ دنیا اور آخرت میں مجھے عطافرمائے گا۔اس استحضار اور ثواب کی نیت کے ساتھ کام کرنا چاہیے:﴿وَمَاتَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللهُ﴾ جو بھی نیکی کا کام تم کروگے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔

ایک اور جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ جو آدمی ایک ذرّہ کے برابر بھی نیکی کا کام کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔یعنی چھوٹا سا نیکی کا کام ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں باقاعدہ اس کا ریکارڈ ہے، وہ لکھا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ دیا جائے گا۔

﴿ذَرَّةٌ﴾ عربی زبان میں زرد اور سرخ رنگ کی اس چیونٹی کو کہا جاتا ہے جو بہت چھوٹی سی ہوتی ہے۔اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ ذرّات جو ہوا کے اندر اُڑتے ہیں اور کھڑکی یا روشن دان میں سے دھوپ کی جو شعاع اندر آتی ہے اس میں نظر آتے ہیں؛ اسے بھی ذرات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔مطلب یہ ہے کہ ﴿مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ ایک ذرہ کے وزن کے برابر بھی ہو۔ حالانکہ ذرہ کا وزن کتنا ہوتا ہے؟ بعض حضرات نے روٹی کا پہلے وزن کیا، پھر اس کے اوپر اس طرح کی چیونٹیاں کثیر تعداد میں آئیں، پھر دوبارہ اس کا وزن کیا؛ تو کوئی بھی فرق نہیں پڑا، جو وزن پہلے تھا؛ وہی رہا۔مطلب یہ ہے کہ جس کو ہم کوئی حیثیت نہیں دیتے ایسی معمولی مقدار میں بھی نیکی کا کام اگر کوئی آدمی کرے گا؛ تو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں باقاعدہ محفوظ رکھا جائے گا اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اجر دیا جائے گا۔

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ﴾ جو آدمی بھی نیکی کا کام کرتا ہے، وہ اپنے لئے کرتا ہے یعنی اس کا فائدہ اس کی ذات کو پہنچتا ہے۔دوسروں کو بھی پہنچتا ہے لیکن اولین وہلہ میں اس کا

فائدہ اسی کے لئے ہے۔تو جو نیک کام کرے گا وہ اپنے لئے کرے گا اور برائی کرے گا تو وہ بھی خود اسے ہی بھگتنا ہے۔

﴿سب سے زیادہ فضیلت والا عمل﴾

اس سلسلہ میں پہلی روایت پیش کررہے ہیں:

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ جُنْدُبِ بْنِ جُنَادَۃَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَیُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَالْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِہٖ. قُلْتُ: أَیُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: أَنْفَسُھَا عِنْدَ أَھْلِھَا وَأَکْثَرُھَا ثَمَنًا قُلْتُ: فَاِنْ لَمْ أَفْعَلْ؟ قَالَ: تُعِیْنُ صَانِعًا أَوْ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ. قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَرَأَیْتَ اِنْ ضَعُفْتُ عَنْ بَعْضِ الْعَمَلِ؟ قَالَ: تَکُفُّ شَرَّکَ عَنِ النَّاسِ فَاِنَّھَا صَدَقَۃٌ مِنْکَ عَلٰی نَفْسِکَ.

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ جن کا نام جندب بن جنادہ ہے وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! اعمال کے اندر کون سا عمل سب سے افضل اور سب سے بڑھا ہوا ہے؟

﴿قَالَ: الْاِیْمَانُ بِاللّٰہِ وَالْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِہٖ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ کے اوپر ایمان لانا اور اس کے راستہ میں جہاد کرنا۔

اس لئے کہ جس کام کے اندر جتنی زیادہ مشقت اور تکلیف اٹھائی جاتی ہے، اس کے اوپر اتنا ہی اجر وثواب مرتب ہوتا ہے۔اللہ پر ایمان لانا یہ بہت مشقت اور مجاہدہ کا کام ہے۔ہم لوگ اہلِ ایمان ہی کے گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں، اس لئے ہمارے لئے اس میں بظاہر کوئی دشواری نظر نہیں آتی، لیکن جو لوگ ایسے ماحول میں پیدا ہوئے ہیں جو ایمان کے خلاف مشرکانہ ماحول ہے، اسی میں پلے اور بڑھے؛ اس کے بعد اگر ان کے سامنے ایمان

کی حقیقت پیش کی جائے اور اس کو سمجھنے کی دعوت دی جائے اور وہ اس کو صحیح بھی سمجھیں؛ لیکن پھر بھی اپنی طبیعت کے خلاف اور جس معاشرے کے اندر وہ زندگی بسر کر رہے ہیں اس ماحول کے خلاف جا کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرنا اور ایمان لے آنا، ایمان کے جو افعال ہیں ان کو انجام دینا؛ ان کے لئے کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اسی لئے ایمان کا بدلہ جنت قرار دیا گیا کہ ایمان لانے والا بہت مجاہدہ اور مشقت کا کام کر رہا ہے۔ اور ایمان کے بعد دوسرا درجہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے کا ہے، یعنی دشمن کے مقابلہ میں اپنی جان اور مال کو قربان کرنا۔

﴿کون سے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟﴾

﴿قُلْتُ: أَیُّ الرِّقَابِ أَفْضَلُ؟﴾ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مَیں نے سوال کیا کہ کون سے غلام کو آزاد کرنا افضل ہے؟ یعنی کیسے غلام کو آزاد کیا جائے تو اس میں اجر و ثواب زیادہ ملتا ہے؟

﴿قَالَ: أَنْفَسُهَا عِنْدَ أَهْلِهَا وَأَكْثَرُهَا ثَمَناً﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو غلام اس کے مالک کی نگاہ میں سب سے زیادہ عمدہ اور نفیس ہو، اور قیمت کے اعتبار سے سب سے زیادہ ہو؛ اس کا آزاد کرنا سب سے افضل اور زیادہ ثواب کا کام ہے۔ اس لئے کہ جو چیز جتنی نفیس، عمدہ، قیمتی اور محبوب ہوتی ہے اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کرنے پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب بھی زیادہ ملتا ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾.

﴿قُلْتُ: فَإِنْ لَمْ أَفْعَلْ؟﴾ اس پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اگر مَیں یہ نہ کر سکوں؟ یعنی ایمان تو ہے لیکن جہاد کی استطاعت نہیں ہے۔ یا جہاد کی استطاعت تو ہے، لیکن مالی حیثیت کمزور ہونے کی وجہ سے نفیس اور قیمتی غلام آزاد کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے؛ تو پھر میرے لئے کون سا طریقہ اختیار کرنا مناسب ہے؟

﴿مزدور کا ہاتھ بٹاؤ﴾

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿تُعِیْنُ صَانِعًا أَوْ تَصْنَعُ لِأَخْرَقَ﴾ اوپر بتلائے گئے نیکی کے کام اگر تم نہیں کر سکتے؛ تو پھر تم کسی کام کرنے والے کی مدد کرو۔ یعنی ایک آدمی محنت مزدوری کر کے اپنے لئے، اپنے ماتحتوں کے لئے، بیوی بچوں کے لئے اور جن کا نفقہ اس کے اوپر واجب ہے ان کے لئے کماتا ہے، محنت کرتا ہے، لیکن وہ اتنی محنت نہیں کر پاتا کہ جس کے ذریعہ سے اس کی ضرورت یا اس کے ماتحتوں کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں، کچھ ضرورتیں باقی رہ جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے وہ پریشانی اور تکلیف میں مبتلا رہتا ہے؛ تو آپ اس کی مدد کیجیے اور اس کے کمانے میں اتنا ہاتھ بٹائیے کہ جس کی وجہ سے وہ اتنا حاصل کر لے جو اس کے اور اس کے ماتحتوں کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو جائے۔

﴿بے ہنر کے لئے کماؤ﴾

یا دوسری شکل یہ ہے کہ ایک آدمی کوئی کام نہیں جانتا، پہلا تو وہ تھا جو کچھ کام جانتا تھا لیکن اس کے باوجود اس کام کے ذریعہ سے اتنی کمائی حاصل نہیں کر سکتا تھا جو اس کے اور اس کے ماتحتوں کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو۔ اور دوسری صورت وہ ہے کہ سرے سے وہ کوئی کام جانتا ہی نہیں، کمانے سے عاجز ہے، یا تو اپاہج ہے یا اور کوئی ایسی کمزوری اس کو لاحق ہے جس کی وجہ سے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا؛ تو آپ اس کے لئے کام کیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کما کر محنت مزدوری کر کے اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید فرمائی۔

﴿اپنی برائی لوگوں سے روک لو﴾

﴿قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَرَأَيْتَ اِنْ ضَعُفْتُ عَنْ بَعْضِ الْعَمَلِ؟﴾ پھر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ

نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر مَیں ان امور کو انجام دینے میں بھی کمزور پڑوں اور نہ کرسکوں تو؟ مطلب یہ ہے کہ یہ نیکی بھی مجھ سے نہیں ہوسکتی؛ تو اب میرے لئے کیا راستہ ہے؟

﴿قَالَ: تَکُفُّ شَرَّکَ عَنِ النَّاسِ فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ مِنکَ عَلیٰ نَفْسِکَ﴾ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنا شر اور اپنی برائی لوگوں سے روک لو۔ یہ تمہاری طرف سے اپنی ذات کے اوپر صدقہ اور احسان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم کوئی نیکی کا کام نہیں کر سکتے تو کم سے کم اتنا تو کرو کہ تمہاری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف، شر اور برائی نہ پہنچے۔ اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ اور مامون کرلو:۔ ع طاقت نیکی نہ داری؛ بدمکن

یعنی اگر ہم سے نیکی نہیں ہوسکتی تو اتنا تو ہم کر سکتے ہیں کہ اپنی برائی و شرارتوں سے اور اپنی ایذارسانیوں سے دوسروں کو محفوظ کرلیں؛ یہ بھی ایک بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔

اس موقعہ پر اس روایت کو پیش کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اعمالِ خیر میں جو عمل افضل تھے ان کی طرف بھی رہنمائی فرمائی، اور جو لوگ ان افضل اعمال کی انجام دہی سے عاجز اور قاصر ہیں ان کے لئے نبی کریم ﷺ نے جو طریقہ بتلایا؛ وہ بھی پیش کر دیا۔ اور آخر میں ایک آخری درجہ کے طور پر فرمایا کہ اگر کوئی نیکی کا کام نہیں ہوسکتا، بڑا بھی نہیں، چھوٹا بھی نہیں، کسی نیکی کے کام کرنے کی استطاعت نہیں، یا تو اپنی کاہلی اور کمزوری کی وجہ سے نہیں کر پا رہا ہے؛ تو پھر اس کے لئے کیا شکل ہے؟ وہ بھی بتلا دی کہ اپنے شر اور اپنی برائی سے لوگوں کو محفوظ کر لے۔

﴿اپنے حالات پر نظرِ ثانی کیجیے﴾

اس موقعہ پر ہمیں بھی اپنے حالات کے متعلق اور اپنے روزمرہ کے جو معمولات

ہیں، لوگوں کے ساتھ روزمرہ کی جو نشست و برخواست ہے اور لوگوں کے ساتھ جو معاملات ہیں؛ ان پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم دوسروں کو کتنا فائدہ پہنچا رہے ہیں؟ کسی کام کرنے والے کی ہم کتنی مدد کرتے ہیں؟ یا جو کام کرنے سے قاصر اور عاجز ہے اس کے لئے ہم کتنا کما کر دیتے ہیں؟ اور اگر یہ بھی نہیں ہوسکتا تو کم از کم ہم اپنے شر اور اپنی برائی سے لوگوں کو کتنا محفوظ رکھتے ہیں؟ ہمیں صبح سے شام تک کے اپنے سارے اعمال کا جائزہ لے کر یہ سوچنا چاہیے کہ ہم سے لوگوں کو کتنی برائی پہنچ رہی ہے۔ کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اپنی برائی سے ہم لوگوں کو محفوظ کر دیں، ہماری ذات سے کسی کو کسی نوع کی کوئی برائی اور تکلیف پہنچنے نہ پائے یہ بھی ایک طرح کا صدقہ اور نیکی کا کام ہوگا۔ لیکن ان سب میں نیت اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے کی اور اجر و ثواب کی ہونی چاہیے۔ یعنی اپنے شر سے دوسروں کو اسی نیت سے بچائے کہ اس پر بھی مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب ملے گا۔ اسی لئے فرمایا ﴿تَكُفُّ شَرَّكَ عَنِ النَّاسِ﴾ اپنے شر کو لوگوں سے روکے۔ گویا اس میں اس کے ارادہ کا دخل ہے، اور نیت پائی جا رہی ہے۔ اگر اس نیت سے وہ اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھے گا تب بھی ان شاء اللہ اجر و ثواب کا حقدار بنے گا۔ اور اس طریقہ سے بھی آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کر سکتا ہے۔

﴿ایک اصلاح طلب چیز﴾

صوفیا کے یہاں ایک مقولہ بڑا مشہور ہے ﴿طُرُقُ الْوُصُوْلِ اِلَی اللّٰہِ تعالیٰ بِعَدَدِ أَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ﴾ اللہ کی ذات تک پہنچنے کے راستے مخلوق کی سانسوں کی تعداد کی مقدار ہیں، یعنی ایک آدمی کی سانس کی تعداد کتنی زیادہ ہوتی ہے، اور پھر ساری مخلوق کی سانسوں کی تعداد

کتنی ہوگی؟ گویا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے اور اللہ تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ نہیں ہے؛ بلکہ بے شمار راستے اور بے شمار کام ایسے ہیں کہ جن کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی حاصل کرسکتا ہے، اور آدمی کو اپنی حیثیت اور اپنی طاقت کے مطابق جتنا ہوسکے ان سب کاموں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور یہ بات بھی خاص پیش نظر رہے کہ جو جس کارِ خیر میں لگا ہوا ہے، اس پر تنقید سے بھی اپنے آپ کو بچائے۔

آج کل ہم لوگوں کا ایک مزاج یہ بھی ہے کہ ہم اگر کسی کارِ خیر کو لے کر چل رہے ہیں تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ سب یہی کام کریں۔ اور ہم جو کام لے کر چل رہے ہیں؛ وہی نیکی کا کام ہے، باقی لوگ جو کر رہے ہیں وہ نیکی کا کام نہیں ہے۔ یہ مزاج شریعت سے میل کھانے والا نہیں ہے۔ جتنے بھی کارہائے خیر ہیں، ان تمام میں جوڑ کی شکل یہ ہے کہ خود جو کام کر رہا ہے، اس میں مشغول رہتے ہوئے، نیکی کے دوسرے کاموں میں مشغول حضرات کے ساتھ بھی ان کے مناسب معاملہ کرے، ان حضرات کی بھی ہمارے دل میں وقعت اور قدر دانی ہونی چاہیے کہ یہ بھی خیر کا ایک پہلو لے کر چل رہے ہیں۔

آدمی کے ہر ہر جوڑ کے اوپر صدقہ ہے

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ قَالَ: یُصْبِحُ عَلٰی کُلِّ سُلاَمیٰ مِنْ أَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ، فَکُلُّ تَسْبِیْحَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَحْمِیْدَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَھْلِیْلَةٍ صَدَقَةٌ، وَکُلُّ تَکْبِیْرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَھْیٌ عَنِ الْمُنْکَرِ صَدَقَةٌ، وَیُجْزِئُ مِنْ ذٰلِکَ رَکْعَتَانِ یَرْکَعُھُمَا مِنَ الضُّحیٰ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر آدمی کے ہر ہر جوڑ کے اوپر صدقہ واجب ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے

انسان کو پیدا فرمایا اور جسم عطا فرمایا، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مختلف جوڑ رکھے، آدمی اپنے ان ہی جوڑوں کے ذریعہ سے مختلف کام انجام دے سکتا ہے۔ لہٰذا ہمارے یہ جوڑ - جو کَل پُرزوں کا کام دیتے ہیں - اگر نہ ہوتے تو آدمی ایک پتھر کی طرح اپنی جگہ پر پڑا رہتا، ہاتھ، پاؤں اور دوسرے اعضاء سلامت ہیں تب ہی پاؤں کی وجہ سے چلتا ہے، ہاتھ کی وجہ سے دوسرے کام انجام دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر وقت جو حرکت میں لگا ہوا ہے، کسی نہ کسی کام میں مشغول ہے، یہ سب ان جوڑوں ہی کے طفیل اور صدقہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسم کی ساخت اس انداز سے تیار فرمائی ہے کہ اس میں مختلف جوڑ ہیں اور آدمی اپنے ان مختلف جوڑوں سے مختلف کام نکالتا رہتا ہے، لہٰذا ان جوڑوں کی سلامتی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا آدمی کے لئے واجب ہے۔

آگے روایت آرہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ پیدا فرمائے ہیں اور ہر جوڑ پر اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور ان کی سلامتی کے شکریہ میں اپنی طرف سے اللہ کے راستہ میں صدقہ کرنا چاہیے۔

﴿ہر بھلائی صدقہ ہے﴾

اب اگر کوئی سوچے کہ ہمارے جسم کے اندر تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور روزانہ تین سو ساٹھ صدقے کرنا بڑا مشکل کام ہے، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ﴾ نیکی کے ہر کام کو شریعت صدقہ سے تعبیر کرتی ہے۔ زبان سے ﴿سبحان اللہ﴾ کہنا بھی صدقہ ہے ﴿الحمدللہ﴾ کہنا بھی صدقہ ہے ﴿لاالٰہ الااللہ﴾ کہنا بھی صدقہ ہے ﴿اللہ أکبر﴾ کہنا بھی صدقہ ہے، کسی کو بھلی بات کا حکم کرنا اور بری بات سے کسی کو روکنا بھی صدقہ ہے۔ پھر

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان سب کی طرف سے دو رکعات کافی ہو جائیں گی جو آدمی دن چڑھے چاشت کے وقت ادا کرتا ہے۔ چاشت کی نماز ''صلوٰۃ الضحیٰ'' کے طور پر اگر دو رکعات ادا کرلے، تو ان سارے جوڑوں کی سلامتی کے وجہ سے اس پر جو صدقات واجب ہوئے تھے؛ وہ سارا حق ادا ہو جائے گا۔ اس سے چاشت کی نماز کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے۔

﴿راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا﴾

عَنْ أَبِیْ ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ: عُرِضَتْ عَلَیَّ أَعْمَالُ أُمَّتِیْ حَسَنُهَاوَسَیِّئُهَا، فَوَجَدْتُ فِیْ مَحَاسِنِ أَعْمَالِهَاالْأَذٰی یُمَاطُ عَنِ الطَّرِیْقِ. وَوَجَدْتُ فِیْ مَسَاوِیْ أَعْمَالِهَا النُّخَاعَةُ تَکُوْنُ فِی الْمَسْجِدِ لَا تُدْفَنُ.

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے ہی روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے میری امت کے اچھے اور برے اعمال پیش کئے گئے، مَیں نے ان کے اچھے اعمال کے اندر اس تکلیف دینے والی چیز کو بھی دیکھا جو راستہ سے ہٹائی گئی ہو۔ یعنی راستہ میں کوئی تکلیف دینے والی چیز پتھر، کانٹا یا اور کچھ پڑا ہوا تھا جسے آدمی نے وہاں سے ہٹا کر کنارے پر کر دیا، تاکہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے؛ یہ بھی نیکی ہے۔

اور مَیں نے اپنی امت کے برے اعمال کے اندر اس بلغم کو بھی دیکھا جو مسجد کے اندر پھینکا جاتا ہے اور دفن نہیں کیا جاتا۔ پہلے زمانہ میں مسجد کے اندر پختہ فرش یا قالین یا چٹائیاں بچھی ہوئی نہیں ہوتی تھیں، کنکر یا ریت بچھا ہوا رہتا تھا، اس لئے اگر کسی آدمی کو تھوکنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہیں تھوکنے کی اجازت تھی، البتہ یہ حکم تھا کہ تھوکنے کے بعد جو ریت یا مٹی ہے اس کو اٹھا کر اس کے اندر اپنے تھوک کو چھپا دے، تاکہ وہ کسی کے لئے ایذا اور تکلیف

کا باعث نہ بنے۔تو اگر کسی آدمی نے اپنا بلغم یا تھوک ڈالا لیکن اس کو نہیں چھپایا، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ بھی ایک گناہ کا کام ہوا، اور میرے سامنے میری امت کے جو اعمالِ شر یعنی گناہ کے کام پیش کئے گئے، ان میں مَیں نے یہ بھی دیکھا۔

یہاں بتلانا یہی چاہتے ہیں کہ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کا ہٹانا؛ ایک چھوٹا اور معمولی سا کام ہے، چلتے چلتے آپ اپنے ہاتھ سے بلکہ پیر سے ٹھوکر مار کر بھی اس کو کنارے پر کر سکتے ہیں، لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں اعمالِ خیر میں شمار ہوتا ہے اور نبی کریم ﷺ کو اپنی امت کے جو اعمالِ خیر دکھلائے گئے؛ ان میں آپ نے اس عمل کو بھی دیکھا۔

﴿تمہارے لئے بھی تو ایک راستہ رکھا ہے﴾

وَعَنْهُ أَنَّ أُنَاساً قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُوْرِ بِالْأُجُوْرِ، يُصَلُّوْنَ كَمَا نُصَلِّي وَيَصُوْمُوْنَ كَمَا نَصُوْمُ، وَيَتَصَدَّقُوْنَ بِفُضُوْلِ أَمْوَالِهِمْ. قَالَ: أَوَلَيْسَ قَدْ جَعَلَ اللهُ لَكُمْ مَا تَصَّدَّقُوْنَ بِهٖ. اِنَّ بِكُلِّ تَسْبِيْحَةٍ صَدَقَةً. وَكُلِّ تَكْبِيْرَةٍ صَدَقَةً. وَكُلِّ تَحْمِيْدَةٍ صَدَقَةً. وَكُلِّ تَهْلِيْلَةٍ صَدَقَةً. وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوْفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ. وَفِيْ بُضْعِ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَيَأْتِيْ أَحَدُنَا شَهْوَتَهٗ وَيَكُوْنُ لَهٗ فِيْهَا أَجْرٌ؟ قَالَ: أَرَأَيْتُمْ لَوْ وَضَعَهَا فِيْ حَرَامٍ، أَكَانَ عَلَيْهِ وِزْرٌ؟ فَكَذٰلِكَ اِذَا وَضَعَهَا فِي الْحَلَالِ كَانَ لَهٗ أَجْرٌ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ بعض غرباء نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مال و دولت والے سارا اجر اُڑا لے گئے یعنی ساری نیکیاں تو وہ لوگ ہی کما لیتے ہیں۔ جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں؛ وہ بھی پڑھتے ہیں، جس طرح ہم روزہ رکھتے ہیں؛ وہ بھی روزہ رکھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اعمالِ خیر میں وہ ہمارے ساتھ شریک رہتے ہیں، اور ان کو ایک مزید امتیاز ہمارے مقابلہ میں یہ حاصل ہے کہ

ان کے پاس ان کی ضرورت سے زائد مال ہے، اس کے ذریعہ سے وہ صدقہ کرتے ہیں اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں۔ یہ ایک مزید چیز ان کو حاصل ہے، گویا وہ اپنی دولت کے ذریعہ ہم سے آگے بڑھ گئے اور درجات پر قابض ہوگئے۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بھی تو ایک ایسا راستہ رکھا ہے کہ اس کے ذریعہ تم صدقہ کا ثواب حاصل کر سکتے ہو۔ کیسے؟ وہ اس طرح پر کہ ہر ﴿سبحان اللہ﴾ کہنے پر اللہ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملتا ہے، اور ہر ﴿اللہ أکبر﴾ کہنے پر صدقہ کا ثواب ہے، ہر ﴿ألحمد للہ﴾ کہنے پر صدقہ کا ثواب ہے، ہر ﴿لا الٰہ الا اللہ﴾ کہنے پر صدقہ کا ثواب ہے، کسی کو بھلی بات کا حکم کرنا بھی صدقہ ہے، اور بری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، اور اپنی بیوی کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرنے میں بھی صدقہ کا ثواب ہے۔

﴿......تو اس کو گناہ ہوتا یا نہیں؟﴾

اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تعجب ہوا اور انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرکے اپنی شہوت پوری کر رہا ہے؛ تو کیا اس میں بھی اس کو اجر اور ثواب ملے گا؟ یعنی یہ کون سا نیکی کا کام ہوا؛ جس پر اجر دیا جا رہا ہے؟

اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ! کوئی آدمی اپنی شہوت حرام جگہ میں پوری کرتا یعنی ایسی عورت کے ساتھ صحبت کرتا جو اس کے لئے حلال نہیں تھی، یعنی زنا کرکے اپنی شہوت پوری کرتا؛ تو کیا اس کو گناہ ہوتا یا نہیں؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں! ضرور گناہ ہوتا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب اپنی شہوت کو اس نے حلال طریقہ سے پورا کیا تو اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا۔

یعنی اس نیت سے کوئی آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرے کہ اس طرح مَیں اپنے آپ کو زنا کے گناہ سے بچا رہا ہوں، اپنی نگاہوں کی حفاظت کی غرض سے، عفت اور پاکدامنی کے ارادہ سے، بیوی کا حق ادا کرنے کے ارادہ سے، اللہ کے حکم کی بجا آوری کے ارادہ سے اگر بیوی کے ساتھ صحبت کر رہا ہے؛ تو ان ساری نیتوں سے صحبت کرنے پر اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب ملے گا۔

﴿نیکی عبادت ہی میں منحصر نہیں﴾

وعنه قال قال رسول اللهﷺ: لَا تَحۡقِرَنَّ مِنَ الۡمَعۡرُوۡفِ شَيۡئًاوَلَوۡأَنۡ تَلۡقٰى أَخَاکَ بِوَجۡهٍ طَلِيۡقٍ.

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی نہ سمجھو، یہاں تک کہ اپنے بھائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے چہرے سے ملنا بھی نیکی کا کام ہے۔ یعنی تھوڑا مسکرا کر اس کے ساتھ ملاقات کرنے کی وجہ سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اس کو ایک فرحت اور خوشی حاصل ہوگی۔ تو اس پر بھی تم کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب ملے گا۔ یہ بھی نیکی کا کام ہے۔

ان سب روایتوں کو پیش فرما کر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ نیکیوں کے کام صرف عبادتوں کے اندر ہی منحصر نہیں ہیں؛ بلکہ اس کے بے شمار طریقے اور مختلف انداز ہیں، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو نیکی کا کون سا انداز پسند آجائے اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا فیصلہ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ کسی بھی نیکی کے کام کو انجام دے کر- اگر وہ اللہ کے واسطے انجام دے رہا ہے تو- اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنی نجات کا فیصلہ کروایا جاسکتا ہے۔

﴿یہ بھی ایک صدقہ ہے﴾

عَنۡ أَبِیۡ هُرَیۡرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: كُلُّ سُلَامَیٰ مِنَ النَّاسِ عَلَیۡهِ صَدَقَةٌ كُلَّ یَوۡمٍ تَطۡلُعُ فِیۡهِ الشَّمۡسُ. تَعۡدِلُ بَیۡنَ الۡاِثۡنَیۡنِ صَدَقَةٌ، وَتُعِیۡنُ الرَّجُلَ فِیۡ دَابَّتِهٖ فَتَحۡمِلُهٗ عَلَیۡهَا أَوۡ تَرۡفَعُ لَهٗ عَلَیۡهَا مَتَاعَهٗ صَدَقَةٌ. وَالۡكَلِمَةُ الطَّیِّبَةُ صَدَقَةٌ. وَبِكُلِّ خُطۡوَةٍ تَمۡشِیۡهَا اِلَی الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ. وَتُمِیۡطُ الۡأَذٰی عَنِ الطَّرِیۡقِ صَدَقَةٌ.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: روزانہ آدمی کے ہر جوڑ پر جو صبح میں صحیح سلامت ہوتا ہے؛ ایک صدقہ واجب ہے۔ اور دو آدمیوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کرنا بھی صدقہ ہے۔ مثلاً دو آدمیوں میں جھگڑا ہے، انہوں نے آپ کو اپنا فیصل اور حَکَم بنایا اور آپ ان دونوں کے درمیان میں انصاف سے فیصلہ کردیں اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکم کے مطابق ان کے جھگڑے کو دور کردیں، ان کے اندر صلح صفائی کرادیں؛ یہ بھی ایک طرح کا صدقہ ہے۔

﴿ہم اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں﴾

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس گھوڑا ہے، لیکن وہ اس پر سوار نہیں ہوسکتا ہے۔ بوڑھے آدمی میں بعض مرتبہ اپنے بوڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے اتنی طاقت نہیں رہتی، وہ اتنا زور نہیں لگا سکتا کہ ذرا سا کود کر گھوڑے پر سوار ہوجائے، لہٰذا سواری پر سوار ہونے میں آپ اگر اس کی مدد کررہے ہیں؛ تو یہ بھی صدقہ ہے۔ یا اس کا سامان اٹھا کر اس کو دے رہے ہیں، تو یہ بھی ایک صدقہ ہے۔

یہ سب نیکی کے کام بتلائے جارہے ہیں۔ کیونکہ عنوان میں یہی بتلایا تھا کہ نیکی کے طریقے اور انداز مختلف ہیں۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو ہماری نگاہوں کے سامنے

ہوتے ہیں اور جس کے ذریعہ سے ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی حاصل کر سکتے ہیں، نیکیاں کما سکتے ہیں؛ لیکن ہم اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ لہٰذا آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جس طریقہ سے بھی نیکی حاصل کرلے، اجروثواب کمالے اور اللہ تعالیٰ کو خوش کرلے؛ یہ اس کے لئے سعادت کی بات ہے۔ کسی کو اچھی اور بھلی بات کہہ دینا بھی صدقہ ہے۔ آپ نماز کے لئے چل کر مسجد آرہے ہیں تو ہر قدم پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا۔ راستہ میں کوئی تکلیف دینے والی چیز- پتھر یا کانٹا- آپ ہٹارہے ہیں؛ اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿اس نے اپنے آپ کو جہنم سے محفوظ کرلیا﴾

حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اس موقع پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے:-أَنَّهٗ خُلِقَ كُلُّ اِنْسَانٍ مِّنْ بَنِىْ آدَمَ عَلٰى سِتِّيْنَ وَثَلَاثِ مِائَةِ مِفْصَلٍ. فَمَنْ كَبَّرَاللّٰهَ وَحَمِدَاللّٰهَ، وَهَلَّلَ اللّٰهَ وَسَبَّحَ اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَاللّٰهَ وَعَزَلَ حَجَراً عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ أَوْشَوْكَةً أَوْعَظْمًا عَنْ طَرِيْقِ النَّاسِ. أَوْأَمَرَ بِمَعْرُوْفٍ أَوْنَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ؛ عَدَدَالسِّتِّيْنَ وَالثَّلَاثِ مِائَةِ، فَإِنَّهٗ يُمْسِىْ يَوْمَئِذٍ وَقَدْزَحْزَحَ نَفْسَهٗ عَنِ النَّارِ.

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انسان کو اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ رکھے ہیں، پس جس نے ''اللّٰہ أکبر'' کہا، اور ''ألحمدللّٰہ'' کہا اور ''لاالٰہ الااللّٰہ'' کہا اور ''سبحان اللّٰہ'' کہا اور ''أستغفر اللّٰہ'' کہا، یا راستہ میں پتھر یا کانٹا پڑا ہوا تھا یا راستہ میں ہڈی پڑی تھی جو کسی کو لگ سکتی تھی اور زخمی کرسکتی تھی؛ وہ ہٹادی۔ یا کسی کو بھلی بات کا حکم کیا یا بری بات سے روکا؛ تو تین سو ساٹھ جوڑ کے بدلے میں شکرانے کے جو تین سو

ساٹھ صدقے اس پر واجب ہوتے ہیں، وہ اس طرح ادا ہو جاتے ہیں۔ اگر اس نے دن بھر میں نیکی کے مختلف کاموں کے ذریعہ سے تین سو ساٹھ جوڑ کا شکرانہ ادا کر دیا تو اس نے اپنے آپ کو جہنم سے دور اور محفوظ کر لیا۔

مہمانی تیار ہوگی

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ غَدَا اِلیٰ الْمَسْجِدِ أَوْرَاحَ؛ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُ فِی الْجَنَّةِ نُزُلاً كُلَّمَا غَدَا أَوْرَاحَ. (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی صبح کے وقت نماز پڑھنے کے واسطے مسجد کی طرف چلتا ہے، یا شام کو اپنے گھر سے مسجد کیلئے روانہ ہوتا ہے؛ اسی وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے جنت میں ایک دستر خوان تیار ہو جاتا ہے اور مہمانی کا انتظام ہو جاتا ہے، اگر اس وقت موت واقع ہو جائے تو اس کیلئے وہاں مہمانی تیار ہوگی۔ یا جب بھی وہ جائے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظام ہو جائے گا۔

اتنی معمولی چیز کیا دوں؟

وعنه قال قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: يَانِسَآءَ الْمُسْلِمَاتِ! لَاتَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا؛ وَلَوْفِرْسِنَ شَاةٍ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمان عورتو! تم میں سے کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے حقیر نہ سمجھے؛ چاہے بکری کی ایک کھری ہی کیوں نہ ہو۔

یہاں ایک پڑوسی کو دوسرے پڑوسی کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ خاص کر عورتوں کو کہا گیا کہ ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ

بھلائی اور حسن سلوک کا معاملہ کرے۔ مثلاً اگر کسی عورت کے پاس اپنی پڑوسن کو ہدیہ میں دینے کے لئے بکری کی ایک کھری کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے؛ تو اس کو بھی پڑوسن کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کرنے میں عار نہ سمجھے، اور یوں نہ سوچے کہ مَیں اتنی معمولی چیز کیا دوں؟

خواتین توجہ دیں

عام طور پر عورتوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو کوئی چیز دینے کی یا کھلانے کی نوبت آتی ہے، اور ان سے جب کہا جاتا ہے تو وہ انکار کرتی ہیں کہ یہ نہیں دے سکتے، بلکہ ان کا مزاج یہ ہوا کرتا ہے کہ اس کے لئے تو الگ سے کچھ بنایا جائے اور کوئی بڑی چیز ہونی چاہیے، وہ یوں سمجھتی ہیں کہ اگر کوئی معمولی چیز دی جائے گی؛ تو معلوم نہیں اس پر کیا تبصرہ کیا جائے گا۔

نبی کریم ﷺ نے خاص کر عورتوں کو اس بات کی تاکید فرمائی کہ تمہارے پاس اپنی پڑوسن کو پیش کرنے کے لئے بکری کی ایک کھری ہی ہے؛ تو اس کو بھی تم معمولی نہ سمجھو، بلکہ ہدیہ میں پیش کر دو۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ عمل بڑا ہے یا چھوٹا ہے؛ بلکہ وہاں تو اخلاص دیکھا جاتا ہے۔ لہٰذا اخلاص کے ساتھ آدمی اس کام کو انجام دے۔ اگر آپ اللہ کے رسولِ پاک ﷺ کے حکم اور فرمان کی بجا آوری کی نیت سے ایک معمولی سی چیز بھی پڑوسی کی خدمت میں اسی اخلاص کے ساتھ پیش کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہ قبول ہو جائے گی۔ اور اگر ریا کاری، دکھلاوے، نام ونمود اور اپنی بڑائی جتلانے کے لئے کوئی قیمتی سے قیمتی چیز بھی پیش کر دیں گے تو اس کے اوپر کوئی ثواب نہیں ملے گا؛ بلکہ وہ سب بے کار جائے گا۔

بہر حال! جو دینے والی پڑوسن ہے اس کو یہاں یہ تاکید کی جا رہی ہے کہ تمہارے پاس دینے کے لئے اگر بکری کی ایک کھری ہے تو اس کو بھی حقیر نہ سمجھو؛ بلکہ پیش کر دو۔ یہ

انتظار نہ کرو کہ کوئی قیمتی چیز یا بڑی چیز ہوگی تب ہی دیں گے۔ ایسا مت سوچو۔

ایک اور پہلو

اور بعض حضراتِ شرّاح نے اس کا ایک اور مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کی پڑوسن کے یہاں سے ہدیہ میں کوئی چیز آئی، چاہے بکری کی ایک کھری ہی ہو، تو اس کو چاہیے کہ اس ہدیہ کو حقیر نہ سمجھے بلکہ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھے۔

یہ بھی عورتوں کا ایک مزاج ہے اگر کسی کے پاس سے کوئی چیز ہدیہ میں آتی ہے، تو اس کے اندر خوردہ گیری کرتی ہیں اور عیب نکالتی ہیں کہ یہ ایسی ہے، پھر تبصرہ کرتی ہیں کہ اس کو لاج اور شرم نہیں آئی کہ دو ہی سموسے بھیجے، ایک روٹی ہی بھیجی، اتنا ہی کیا؟ یہ ان کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ تاکید فرما رہے ہیں کہ تمہاری پڑوسن نے ہدیہ کے طور پر تمہارے پاس اگر بکری کی کھری ہی بھیجی ہے؛ تو تم اس کو حقیر نہ سمجھو، اور یہ نہ دیکھو کہ اس نے کیا بھیجا ہے۔ اصل تو تمہیں یہ دیکھنا ہے کہ اس بکری کی کھری بھیجنے کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے، وہ تمہارے ساتھ محبت اور حسن سلوک کرنا چاہتی ہے؛ تب ہی تو اس نے یہ چیز بھیجی۔ لہٰذا یہ نہ دیکھا جائے کہ یہ چیز کتنی مقدار میں ہے؛ بلکہ جس جذبہ، نیت اور ارادے سے اس نے یہ چیز بھیجی ہے، اس کے اس ارادے کی قدر کرنی چاہیے کہ اس کے دل میں تمہارے واسطے جگہ اور مقام ہے؛ تب ہی تو اس نے تم کو یاد کیا؛ ورنہ آج کل کون کس کو یاد کرتا ہے۔

یہاں نبی کریم ﷺ کی طرف سے تاکید کی جارہی ہے کہ اگر پڑوسی کے یہاں سے معمولی سی چیز آوے تو اس پر بھی آپ کو ناک بھوؤں نہیں چڑھانا چاہیے، بلکہ اس کا احسان مند ہونا چاہیے اور شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اور آپ بھی اس کے بدلہ میں ہدیہ کے طور پر جو کچھ پیش کر سکتے ہوں؛ ضرور کریں، اس میں آپ کی طرف سے تأمل اور پس و پیش نہیں ہونا چاہیے۔

﴿ایمان کی ستّر سے اوپر شاخیں ہیں﴾

وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: أَلايْمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُوْنَ أَوْبِضْعٌ وَسِتُّوْنَ شُعْبَةً، فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَآءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْاِيْمَانِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایمان کے ستّر سے کچھ اوپر شعبے ہیں یا ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں ہیں۔

بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ ستّر کے کچھ اوپر فرمایا، یا ساٹھ سے کچھ اوپر فرمایا۔ اور بعض نے کہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ پہلے آپ ﷺ کو ساٹھ سے کچھ اوپر شاخیں بتلائی گئی تھیں؛ اس وقت آپ نے یہ ارشاد فرمایا تھا، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے علم میں مزید اضافہ فرمایا گیا اور بتایا گیا کہ فلاں فلاں چیزیں بھی ایمان کی شاخوں میں داخل ہیں؛ تو پھر آپ نے اضافہ فرمایا کہ ستّر کے بھی اوپر شاخیں ہیں۔

لفظ ''بِضْعٌ'' عربی میں تین سے لے کر نو تک بولا جاتا ہے، گویا تہتّر (۷۳) سے لے کر اناسی (۷۹) تک ایمان کی شاخیں ہیں۔ اس میں سب سے افضل ﴿لاالٰہ الااللہ﴾ ہے اور سب سے کمتر ﴿اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ﴾ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کا ہٹانا ہے۔ گویا یہ افضل اور ادنیٰ ہے، ان دونوں کے بیچ میں اور بہت سارے نیکی کے کام اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھے ہوئے ہیں، آدمی کو ان سب کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس موقعہ پر حدیث کی تشریح کرنے والوں نے قرآن پاک کی آیتوں اور احادیث کو سامنے رکھ کر ایمان کی یہ ساٹھ یا ستّر سے اوپر جو شاخیں ہیں، اور قرآن وحدیث میں جہاں کہیں بھی اس کو ایمان کا تقاضہ بتلایا گیا؛ اس کی تفصیل لکھی ہے۔ اگر آپ دیکھنا چاہیں تو

فضائلِ ذکر میں دیکھ سکتے ہیں، حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے علامہ ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایمان کی وہ ساری شاخیں وہاں تفصیل سے ذکر کر دی ہیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد:

عن أبى هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِىْ بِطَرِيْقٍ اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْعَطَشُ، فَوَجَدَ بِئْرًا، فَنَزَلَ فِيْهَا فَشَرِبَ. ثُمَّ خَرَجَ فَإِذَا كَلْبٌ يَلْهَثُ يَأْكُلُ الثَّرٰى مِنَ الْعَطَشِ، فَقَالَ الرَّجُلُ: لَقَدْ بَلَغَ هٰذَا الْكَلْبُ مِنَ الْعَطَشِ مِثْلَ الَّذِىْ كَانَ قَدْ بَلَغَ مِنِّىْ، فَنَزَلَ الْبِئْرَ، فَمَلَأَ خُفَّهٗ مَآءً، ثُمَّ أَمْسَكَهٗ بِفِيْهِ، حَتّٰى رَقِىَ فَسَقَى الْكَلْبَ، فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهٗ، فَغَفَرَ لَهٗ. قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اِنَّ لَنَا فِى الْبَهَائِمِ أَجْرًا؟ فَقَالَ: فِىْ كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ.

وفى روايةٍ للبخارى: فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهٗ، فَغَفَرَ لَهٗ، فَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ.

وفى روايةٍ لهما: بَيْنَمَا كَلْبٌ يُطِيْفُ بِرَكِيَّةٍ، قَدْ كَادَ يَقْتُلُهُ الْعَطَشُ، اِذْ رَأَتْهُ بَغِىٌّ مِنْ بَغَايَا بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ، فَنَزَعَتْ مُوْقَهَا، فَاسْتَقَتْ لَهٗ بِهٖ، فَسَقَتْهُ، فَغُفِرَ لَهَا بِهٖ.

رضا وخوشنودی والا عمل

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی سفر پر جا رہا تھا، اس کو پیاس کی شدت محسوس ہوئی، راستے میں اس نے ایک کنواں دیکھا، جس پر کوئی ڈول یا رسہ موجود نہیں تھا، وہ کنویں کے اندر پانی پینے کے لئے اترا، جب پانی پی کر باہر آیا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی وجہ سے اپنی زبان باہر نکال کر کنویں کے باہر جو گیلی مٹی پڑی

ہوتی ہے اس کو چاٹ رہا ہے، اس آدمی نے کتے کی یہ کیفیت دیکھی تو اپنے دل میں سوچا کہ پیاس کی وجہ سے کتے کی بھی وہی حالت ہو رہی ہے جو کچھ دیر پہلے میری تھی، یعنی پیاس کی وجہ سے جیسا مَیں بے چین تھا اور تکلیف محسوس کر رہا تھا؛ یہ کتا بھی بالکل اسی کیفیت میں ہے۔ اس نے کتے کی تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے یہ طے کیا کہ مَیں اس کو پانی پلاؤں گا۔ چنانچہ وہ دوبارہ کنویں میں اترا، پانی باہر لانے کے واسطے اس کے پاس کوئی برتن تو تھا نہیں، اس لئے اس نے اپنے چمڑے کے موزے میں پانی بھرا، اور باہر نکلنے کے واسطے دونوں ہاتھوں کو استعمال کرنا تھا اس لئے وہ پانی بھرے ہوئے موزے کو دانتوں سے پکڑ کر باہر آیا اور کتے کو پانی پلایا۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو قبول فرمالیا اور اس کی مغفرت فرمادی۔

﴿کتے کے ساتھ احسان کر کے جنت کمالی﴾

اس موقعہ پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ﴿يَا رَسُوْلَ اللهِ! إِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا؟﴾ جانوروں کے ساتھ اگر ہم حسنِ سلوک اور اچھا معاملہ کریں؛ تو اس پر بھی ہمیں ثواب ملے گا؟ اس لئے کہ کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کا فیصلہ ہوا، اس مناسبت سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ سوال کیا۔ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ﴿فِي كُلِّ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ﴾ ہر تر جگر والے کے ساتھ - چاہے وہ انسان ہو یا جانور - اگر حسنِ سلوک کا معاملہ کیا جائے؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب ملتا ہے۔ تر جگر والے سے مراد جاندار ہے، اس لئے کہ جب کوئی جاندار مر جاتا ہے، تو اس کے جگر کی تری ختم ہو جاتی ہے اور پھر جگر خشک ہو جاتا ہے۔ جب تک جگر میں تری موجود

ہے؛ وہاں تک جسم میں جان ہے۔

اس واقعہ کو بیان کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! اس آدمی نے کتے کے ساتھ احسان کر کے جنت کمالی، معلوم ہوا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی بہت آسان طریقے سے حاصل کر سکتا ہے۔

جیسا کہ شروع میں بھی بتلا دیا تھا کہ کسی بھی نیکی کے کام کو کم نہ سمجھے، اور نیکی کا جو بھی موقعہ ملے اور ہم سے نیکی کا جو کام بھی وجود میں آ سکتا ہو؛ اس کو کرنے میں ہمیں کوئی جھجھک نہیں ہونی چاہیے، اور ہمیں کاہلی اور سستی سے کام نہیں لینا چاہیے۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی کوشش کو قبول فرما کر اس کی مغفرت فرما دی اور جنت میں داخل فرما دیا (بخاری شریف، حدیث نمبر ۲۲۸۶) ایک اور روایت بخاری و مسلم میں موجود ہے جس میں یہ واقعہ کسی مرد کا نہیں بلکہ ایک عورت کا ذکر کیا ہے کہ ایک کتا ایک کنویں کے آس پاس پیاس کی وجہ سے بے چین ہو کر چکّر کاٹ رہا تھا، قریب تھا کہ پیاس کی وجہ سے مر جاتا۔ ایک زانیہ عورت -- جس کا پیشہ زنا کروا کر کمائی حاصل کرنا تھا، جس کو رنڈی کہتے ہیں -- نے دیکھا، چنانچہ اس عورت نے چمڑے کا موزہ نکالا (چمڑے کے موزے کے اوپر ایک اور آدھا موزہ پہنا جاتا ہے، اس کو "مُوق" کہتے ہیں) اور اس میں پانی نکال کر اس کتے کو پلایا؛ اس عمل پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی۔

(بخاری شریف، حدیث نمبر ۳۰۷۴/ مسلم شریف، حدیث نمبر ۴۱۶۳)

دیکھئے! اس عورت کا پیشہ ہی زنا کاری کا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس عملِ خیر پر اس کے لئے مغفرت کا فیصلہ فرما دیا۔

﴿نیکی کرنے میں کبھی سوچنا نہیں چاہیے﴾

اس سے پتہ چلا کہ آدمی کو کسی بھی عملِ خیر کرنے میں کبھی تأمل نہیں کرنا چاہیے، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کون سی نیکی پر بخشش کا فیصلہ فرمادیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ آدمی کون سے نیکی کے کام کو کس جذبے سے انجام دیتا ہے؛ یہ کس کو خبر ہے، اس لئے کہ آدمی کی حالت ہر وقت یکساں نہیں رہتی، ہوسکتا ہے کہ نیکی کے چھوٹے سے کام کو جس وقت ہم انجام دے رہے ہوں، اس وقت ہم میں اخلاص کی وہ کیفیت پیدا ہوجائے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا درجہ حاصل کرلے، اور کسی بڑے کام کو انجام دینے کے وقت وہ کیفیت پیدا نہ ہوئی ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مدار تو اخلاص پر ہے، آدمی کس نیت اور جذبے سے وہ کام کررہا ہے؛ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر فیصلہ ہوتا ہے۔ کام کیسا ہے، چھوٹا ہے یا بڑا؛ اس کو نہیں دیکھا جاتا۔

﴿بڑا عمل بھی چھوٹے کے برابر نہیں ہوسکتا﴾

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کرے، تب بھی وہ میرے صحابی کے ایک مُد کے برابر نہیں پہنچ سکتا (مسلم شریف،۲/۳۱۰) (ایک مُد کا وزن ۶۸/تولہ ۳/ماشہ، یعنی ۷۹۶/گرام ۶۸/ملی گرام کا ہوتا ہے) اس کی وجہ بھی یہی بتلائی گئی ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر جو اخلاص موجود تھا؛ وہ دوسروں کے اندر نہیں پایا جاسکتا، اسی قلبی کیفیت کی وجہ سے ان کے چھوٹے سے عمل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ قبولیت حاصل ہوئی کہ دوسروں کے بڑے عمل کو بھی وہ مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

بخشش کا فیصلہ ہو گیا

عن أبی هریرةَ رضی اللہ عنہ عنِ النبیِ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لَقَدرَأَیتُ رَجُلاً یتقلَّبُ فِی الجَنَّةِ فِیْ شَجَرَةٍ قطعَهامِنْ ظَهرِ الطَّرِیقِ کَانَتْ تُؤْذِی المُسلِمِینَ.

وفی روایةٍ: مَرَّرَجُلٌ بغُصْنِ شَجَرَةٍ عَلٰی ظَهرِ طَرِیقٍ. فَقَالَ: وَاللّٰهِ لَأُنَحِّیَنَّ هٰذَاعَنِ المُسلِمِینَ لا یُؤْذِیهِم، فَأُدْخِلَ الجَنَّةَ.

وفی روایةٍ لهما: بَینَمَارَجُلٌ یَمْشِیْ بِطَرِیقٍ وَجَدَغُصْنَ شَوْکٍ عَلٰی الطَّرِیقِ، فَأَخَّرَهُ فَشَکَرَاللّٰهُ لَهُ، فغفرَلَهُ.

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مَیں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ جنت میں اس ایک درخت کی وجہ سے چل پھر رہا ہے؛ جو راستہ کے اوپر تھا اور لوگوں کو اس کی وجہ سے آنے جانے میں رکاوٹ ہوتی تھی، اس نے اس کو کاٹ کر لوگوں کی اس تکلیف اور رکاوٹ کو دور کر دیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنت کا فیصلہ کر دیا۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ پورا ایک درخت بھی نہیں بلکہ درخت کی صرف ایک ٹہنی تھی جو راستہ پر لٹک رہی تھی، اور اس کی وجہ سے آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی تھی، اس نے یہ سوچا کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہو رہی ہے، مَیں اس کو دور کر کے لوگوں کی تکلیف ختم کر دوں۔ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی بخشش کا فیصلہ ہو گیا۔

یہاں پر بھی دیکھئے! یہ ایک چھوٹا سا عمل تھا لیکن اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے مغفرت کا فیصلہ ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ کوئی بھی نیکی اور بھلائی کا کام ہو؛ اس کو کر لینا چاہیے۔ معلوم نہیں! کون سے کام کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کی رضا مندی حاصل کر لیں۔ اس لئے ہر نیکی کے کام میں مؤمن کو حریص ہونا چاہیے، اس میں کبھی پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

﴿ہر عمل میں خوبی پیدا کرنے والی کچھ چیزیں ہوتی ہیں﴾

عن أبی هريرةؓقال:قال رسولُ اللهِﷺ:مَنْ تَوَضَّأَفَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ ثُمَّ أَتىٰ الْجُمُعَةَ فَاسْتَمَعَ وَأَنْصتَ،غُفِرَلَهُ مَابَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ وَزِيَادَةُ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ.وَمَنْ مَسَّ الْحصا؛فَقَدْ لَغَا.

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: جس آدمی نے وضوکیااوراچھاوضوکیا۔وضوکواس کے تمام ارکان کے ساتھ اوراس کی تمام سنتوں اورآداب کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے انجام دینا چاہیے۔بہت سی مرتبہ ہم جلد بازی میں آداب اور سنتوں کی رعایت نہیں کرتے،جس کی وجہ سے بہت بڑی فضیلتوں سے محروم رہ جاتے ہیں، حالانکہ ہر عمل میں خوبی پیدا کرنے والی کچھ چیزیں ہوتی ہیں؛جن کاخصوصی اہتمام کرنا چاہیے اسی لئے حضور فرماتے ہیں﴿مَنْ تَوَضَّأَفَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ﴾ جس نے وضوکیااوراچھے طریقہ سے وضوکیا۔

ہم لوگوں کامزاج یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سے ہر چیز میں اچھائی کو پسند کرتے ہیں جیسے لباس ہو؛تواچھاہو،لباس دُھلنے کے بعد بھی پہننے سے پہلے برابر پریس کرواتے ہیں۔ کھاناہو؛تواچھاہو۔مکان ہو؛تواچھاہو۔دنیوی استعمال کی ہر چیز میں اچھائی کے خواہش مند رہتے ہیں،توہم جب اخروی اعمال انجام دیں،چاہے وضوہو،غسل ہو،نماز ہو،قرآنِ پاک کی تلاوت ہویاتسبیح ہو؛ان تمام اعمال کے اندر بھی ہمیں اس کااہتمام کرنا چاہیے۔

﴿جتنی زیادہ محبت وعظمت ہوگی﴾

بعض لوگ یوں سمجھ کراہتمام نہیں کرتے کہ یہ تو مستحب ہے،آداب کے قبیل سے ہے،اس کامطلب یہ ہے کہ کوئی ضروری اورواجب تونہیں ہے۔نہیں کریں گے تب بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ٹھیک ہے؛نہیں کریں گے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے،لیکن غور

کریں کہ آپ دستر خوان پر بیٹھتے ہیں، اگر اچار نہیں رکھیں گے، چٹنی، کچومر، سلاد اور پاپڑ نہیں رکھیں گے؛ تو اس کی وجہ سے دستر خوان پر کوئی کمی آنے والی نہیں ہے، لیکن پھر بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، کیونکہ اس کی وجہ سے دستر خوان کی زینت ہے، اور اس میں خوبی پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا جب ہم دنیوی امور میں ان چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لئے ایک عمل انجام دے رہے ہیں؛ اس میں بھی اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ بہتر سے بہتر طریقہ سے اس کو انجام دیا جائے۔ جتنی بھی خوبی پیدا کی جاسکتی ہو؛ اس میں ہماری طرف سے کوئی کمی نہیں آنی چاہیے۔ یہی اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت اور عظمت کی علامت ہے۔ جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی جتنی زیادہ محبت وعظمت ہوگی؛ اسی مناسبت سے وہ ان چیزوں کا اہتمام کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کی عظمت ومحبت کی دلیل

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب مرض الوفات میں مبتلا تھے اور خود وضو نہیں کر سکتے تھے، کوئی خادم وضو کرا رہا تھا، وضو کے دوران وہ خادم انگلیوں میں خلال کرنا بھول گیا تو حضرت شبلی اشارے سے کہہ رہے تھے کہ خلال کرو۔ اس حالت میں بھی ایک مستحب کا اتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔ یہ چیز اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہو۔ چھوٹے چھوٹے آداب کی رعایت؛ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت کی دلیل ہے۔

عظمت والا جذبہ اگر دل میں ہے......

حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم (رحمہٗ اللہ) فرمایا کرتے ہیں کہ کھانے کے دوران اگر لقمہ گر جائے تو اس گرے ہوئے لقمہ کو اٹھالینا؛ یہی آداب میں سے ہے۔ جیسے

بادشاہِ وقت نے کوئی چیز آپ کو دی اور جس وقت اس کی دی ہوئی اس چیز کو آپ کھا رہے ہیں وہ خود بھی دیکھ رہا ہے تو آپ ادب کا کتنا زیادہ اہتمام کریں گے۔ اول تو اس میں سے کوئی چیز نیچے گرنے ہی نہیں دیں گے۔ اور اگر خدانخواستہ گر گئی، تو فوراً اٹھا کر صاف کر کے اس کو کھا لیں گے، اس لئے کہ جس نے دیا ہے، وہ دیکھ رہا ہے۔ آپ سوچیں گے کہ اگر مَیں ذرا برابر بھی اس کی طرف سے بے توجہی برتوں گا؛ تو اس کی شان کے خلاف ہو جائے گا۔ اب غور کیجیے کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہیں اور جس وقت ہم اس کو استعمال کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہوتے ہیں، لہٰذا ہمیں ان کے آداب کا کتنا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

بہرحال! مَیں تو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ عظمت والا جذبہ اگر دل میں ہے تو آداب کی ادائیگی بڑی آسان ہو جائے گی۔

جمعہ کے آداب میں سے ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا اس کے بعد جمعہ کی نماز کے لئے مسجد آیا۔

جمعہ کے لئے آنے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی پہلے سے آجائے، خصوصاً زوال سے پہلے آجانے کا اہتمام ہونا چاہیے، اور امام جمعہ کا خطبہ دے رہا ہو تو اس کی طرف کان لگائے، دھیان سے خطبہ سنے اور خطبے کے دوران خاموشی اختیار کرے، کسی کے ساتھ کوئی بات چیت اور گفتگو نہ کرے، اور کسی بھی طرح کے لغو کام میں نہ پڑے؛ اگر یہ سب کرے گا تو اس کے اس عمل کی وجہ سے اس دن سے لے کر آئندہ جمعہ تک اور مزید تین دن؛ گویا دس دن کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ ایک دن کا عمل تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں

ایک کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے۔

﴿وَمَنْ مَسَّ الْحصا، فَقَدْ لَغا﴾ چونکہ اس زمانہ میں مسجد کے فرش پختہ نہیں ہوتے تھے، اوراس پر چٹائیاں بھی نہیں ہوا کرتی تھیں، کنکریاں اور ریت بچھی ہوتی تھیں، اس لئے فرمایا کہ اگر خطبے کے دوران کوئی آدمی ان کنکریوں سے کھیلنے میں مشغول رہا تو اس نے لغو کام کیا اور جب لغو کام کیا؛ تو پھر اس کو وہ اجر وثواب نہیں ملے گا۔

یہاں تو یہ بتلانا تھا کہ جمعہ کے لئے حاضری ایک عمل ہے، اور جمعہ کے لئے حاضر ہونے کے بعد آداب کی پوری رعایت کرتے ہوئے اچھی طرح خطبہ سننا اور اس موقعہ پر خاموشی اختیار کرنے کا اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ مقام ہے کہ اس کے دس دن کے گناہ معاف کردیے گئے۔ اتنا زیادہ اجر وثواب دیا گیا۔

﴿وضو سے حاصل ہونے والے فائدے﴾

عن أبی هريرةؓ ان رسولَ اللهِ ﷺ قال: اِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ أَوِ الْمُؤْمِنُ، فَغَسَلَ وَجْهَهُ، خَرَجَ مِنْ وَجْهِهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ نَظَرَ اِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَآءِ أَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ. فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَآءِ أَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ. حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوْبِ. فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتْ كُلُّ خَطِيئَةٍ مَسَّتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَآءِ أَوْمَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَآءِ. حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوْبِ. (رواه مسلم)

وعنهُ عن رسولِ اللهِ ﷺ قال: الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ، والْجُمُعَةُ اِلَى الْجُمُعَةِ، وَرَمَضَانُ اِلَى رَمَضَانَ مُكَفِّرَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ، اِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ.

حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک اور روایت پیش کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مسلمان وضو کرتا ہے اور جس وقت چہرہ دھوتا ہے، تو وہ تمام گناہ جو اس کے

چہرے سے وجود میں آئے تھے؛ پانی کے آخری قطرے کے ساتھ دھل جاتے ہیں۔ مثلاً چہرے میں ایک عضو آنکھ ہے، تو آنکھ نے جن گناہوں کا ارتکاب کیا تھا؛ وہ سب معاف ہوجاتے ہیں۔ اور جب ہاتھوں کو دھوتا ہے تو ہاتھوں سے چھوکر جو گناہ کئے تھے؛ وہ سب پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ دھل جاتے ہیں۔ اور جب پاؤں دھوتا ہے؛ تو پاؤں کے ذریعہ چل کر جو گناہ کئے تھے؛ وہ سب پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ دھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ جب وضو کر کے فارغ ہوتا ہے تو گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہوجاتا ہے کہ کوئی گناہ اس کے اوپر باقی ہی نہیں ہوتا۔

﴿نیکیاں گناہوں کو مٹا دیتی ہیں﴾

دوسری روایت میں ہے کہ پانچوں نمازیں، ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک، اور ایک رمضان سے دوسرے رمضان تک، یہ تمام عبادتیں؛ درمیانی وقفہ میں جو گناہ ہوئے ہوں گے، ان کا کفارہ ہوجائیں گی۔ مثلاً فجر کے بعد جب ظہر کی نماز پڑھے گا، تو فجر سے لے کر ظہر تک جو گناہ ہوئے ہیں وہ معاف ہوجائیں گے۔ اس کے بعد پھر عصر کی نماز پڑھے گا تو ظہر سے عصر تک کے گناہ معاف ہوجائیں گے؛ اسی طرح ایک جمعہ سے لے کر دوسرے جمعہ تک اور ایک رمضان سے لے کر دوسرے رمضان تک جو عبادتیں کی گئی ہیں ﴿اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ﴾ نیکیاں آدمی کے گناہوں کو مٹا دیتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی جو معصیتیں ہوگئی تھیں؛ وہ سب ان عبادتوں کی وجہ سے معاف ہوجاتی ہیں۔

﴿......شرط یہ ہے کہ کبائر سے بچے﴾

لیکن آگے ایک قید لگائی ہے ﴿اِذَا اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ﴾ جب آدمی کبائر سے بچے۔

علماء نے اس کا مطلب یہ لکھا ہے کہ ان عبادتوں کی وجہ سے صغائر اور چھوٹے گناہ معاف ہوتے ہیں، اور چھوٹے بھی وہ جن کے اوپر اصرار نہ کرتا ہو۔ اس لئے کہ چھوٹے گناہ پر بھی آدمی جب اصرار کرے یعنی بار بار کرتا رہے، تو پھر وہ بھی چھوٹا نہیں رہتا، بلکہ بڑا بن جاتا ہے لہٰذا چھوٹے گناہ کئے ہیں اور ان پر اصرار نہیں کیا، تو وہ سارے گناہ ان عبادتوں کی وجہ سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اب رہے بڑے گناہ! تو ان کی معافی توبہ کے اوپر موقوف ہے، جب توبہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ غفورٌ رّحیم ہیں؛ وہ ان کو معاف کر دیں گے۔

یہ اس لئے بھی کہا گیا کہ مؤمن کی شان سے بعید ہے کہ کبائر کا ارتکاب کرے۔ رہے چھوٹے گناہ؛ تو وہ تو آدمی سے نادانستہ طور پر بھی وجود میں آجاتے ہیں، ان سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان چھوٹے گناہوں کی معافی اور ان سے پاکی و صفائی کے لئے بہت آسان سا عمل بتلا دیا کہ ان ساری عبادتوں کی برکت سے وہ معاف ہوتے چلے جائیں گے۔

کبائر کے معاملہ میں ایمان والے کی طرف سے پہلا اہتمام تو اس بات کا ہوتا ہے کہ وہ کرتا ہی نہیں۔ اور اگر ہو گیا تو جب تک توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کر لے؛ وہاں تک اس کو چین نہیں پڑتا ہے۔ شانِ ایمان کا تقاضہ یہی ہے۔ اس لئے اس سے قطعِ نظر صغائر کے متعلق فرمایا کہ وہ ان اعمالِ صالحہ کی وجہ سے معاف ہو سکتے ہیں۔

﴿ ...... یہ ہے سرحدوں کی حفاظت ﴾

عن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قالَ قالَ رسولُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم: أَلاأَدُلُّکُمْ علیٰ مَایَمْحُوااللہُ بِہِ الْخَطَایَا وَیَرْفَعُ بِہِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوْا: بَلیٰ یَارَسُوْلَ اللہِ. قَالَ: اِسْبَاغُ الْوُضُوْءِ عَلیٰ الْمَکَارِہِ. وَکَثْرَۃُ الْخُطَاإِلیٰ الْمَسَاجِدِ. وَانْتِظَارُ الصَّلاۃِ بَعْدَالصَّلاۃِ؛ فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ. (رواہ مسلم)

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَیں نہ بتلاؤں تم کو وہ باتیں اور وہ چیزیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرتا ہے اور درجات کو بلند کرتا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کیوں نہیں؛ ضرور بتلایئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ناپسندیدہ حالات میں بھی وضو کو پورے طور پر ادا کرنا۔

"مَـکَـارِہ" مکروہ کی جمع ہے۔ یعنی طبیعت نہیں چاہتی جیسے سخت سردی ہے اور پانی ٹھنڈا ہے، اب طبیعت تو یہ کہتی ہے کہ ایک مرتبہ چہرے پر پانی پھیر دیا؛ تب بھی وضو تو ہو ہی جائے گا۔ کیا ضروری ہے کہ دو یا تین مرتبہ دھوئیں۔ لیکن تین مرتبہ دھونا یہ وضو کو کامل طور پر ادا کرنا ہے، لہٰذا سردی کی وجہ سے طبیعت میں نہ کرنے کا تقاضہ ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے واسطے وہ کہتا ہے کہ اللہ کے رسول نے بتلایا ہے اور طریقہ یہی ہے کہ تین مرتبہ دھونا چاہیے، اگرچہ ایک مرتبہ دھونے سے بھی فرض ادا ہو جاتا ہے اور وضو صحیح بھی ہو جاتا ہے، لیکن وضو اسی وقت کامل طریقہ سے کیا ہوا سمجھا جائے گا جب کہ ہر عضو کو تین تین مرتبہ دھویا جائے؛ اس لئے سردی میں طبیعت کے نہ چاہنے کے باوجود تین مرتبہ دھو رہا ہے۔

﴿وَكَثْرَةُ الْخُطَا اِلىٰ الْمَسَاجِدِ﴾ اور مسجد کی طرف کثرت سے قدم اٹھانا۔ مطلب یہ ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا۔ اس لئے کہ مسجد اصالۃً خاص طور پر اسی لئے بنائی جاتی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ گویا جب آدمی پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کا اہتمام کرے گا؛ تو بار بار مسجد کی طرف قدم اٹھانے کی نوبت آئے گی۔

﴿وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ﴾ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ انتظار

یا تو مسجد میں بیٹھ کر ہی ہو، یا اپنے گھر پر، اپنی دکان پر، اپنے کاروبار اور دفتر میں ہو۔ یعنی وہ آدمی جہاں کہیں ہو؛ لیکن اس کا جی مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔ مثلاً ظہر پڑھ کر گیا تھا اور اپنے کاروبار میں لگ گیا، لیکن اس میں مشغول ہونے کے باوجود اور ظاہری طور پر اس کا جسم کاروبار میں ہے؛ لیکن اس کا دل اس انتظار میں ہے کہ کب عصر کا وقت ہو، اذان ہو اور مَیں مسجد میں جاؤں۔ یہ ﴿اِنْتِظَارُ الصَّلاۃِ بَعْدَ الصَّلاۃِ﴾ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار ہے۔

لہٰذا ایک تو شکل یہ ہوئی کہ ظاہری اور جسمانی طور پر بھی مسجد ہی میں بیٹھا ہے، یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ لیکن اگر مسجد میں نہیں بیٹھا ہے، اپنے گھر چلا گیا یا اپنے کام میں مشغول ہوا اور اپنی مشغولی میں رہتے ہوئے دل سے اس بات کا منتظر ہے کہ کب نماز کا وقت ہو، اور مَیں مسجد میں جاؤں۔ ایک مؤمن جو نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اور سنتوں کا پابند ہے، اس کا مزاج اسی نوع کا ہوتا ہے کہ اس کو ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار رہتا ہے۔ یہ فضیلت اس کو حاصل ہو جائے گی۔

﴿فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ہے سرحدوں کی حفاظت۔ ''رِباط'' اصل تو مملکتِ اسلامیہ کی سرحدوں کے اوپر پہرا دینے کو کہتے ہیں، تاکہ دشمن حملہ آور ہو کر مسلمانوں کی جان و مال کو نقصان نہ پہنچائے۔ لیکن یہاں ''رباط'' سے مراد یہ ہے کہ آدمی جب ان اعمال کا اہتمام کرے گا تو اس کا جو اَزلی دشمن ہے یعنی شیطان، اور اس کا ساتھی یعنی ہمارے اندر بیٹھا ہوا ہمارا اپنا نفس اور جی؛ ان دونوں دشمنوں کے شر اور حملوں سے بچاؤ ہوگا، ان سے بچاؤ کے واسطے یہ اعمال چوکی اور پہرے کا کام دیں گے۔

جو آدمی ان تین چیزوں کا اہتمام کرے گا (۱) وضو کامل طریقہ سے ادا کرنے کا

(۲)اور جماعت کے ساتھ نماز کے لئے مسجد میں جانے کا (۳)اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کے انتظار کا؛ تو اس کو نبی کریم ﷺ کی طرف سے یہ بشارت ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ نفس اور شیطان کے حملوں سے اس کی حفاظت ہوگی۔ گویا یہ چیزیں ان دشمنوں کے مقابلہ میں چوکی اور پہرے کا کام دیتی ہیں۔

فجر اور عصر کے اہتمام کی فضیلت

عَنْ أَبِیْ مُوْسٰی الأشعري رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله ﷺ: مَنْ صَلّٰی الْبَرْدَیْنِ؛ دَخَلَ الْجَنَّةَ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی دو ٹھنڈے وقتوں کی نماز پڑھے یعنی فجر اور عصر کی؛ تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

ویسے تو سب ہی نمازوں کا اہتمام کرنا چاہیے، لیکن ان دو نمازوں میں خصوصیت یہ ہے کہ فجر کی نماز ایسے وقت میں آتی ہے کہ آدمی سویا ہوا ہوتا ہے، نفس اور جی یہ چاہتا ہے کہ بستر میں پڑا رہے، اپنی میٹھی نیند کو قربان کر کے اٹھنا، وضو کرنا اور جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد جانا بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے۔ تو یہ خاص محنت و مجاہدے کا کام ہے۔

اور عصر کی نماز کا وقت خاص کاروبار کا ہوتا ہے کہ جتنے بھی کاروبار والے آدمی ہوتے ہیں وہ اپنا سارا حساب و کتاب جوڑنے کی فکر میں لگے ہوتے ہیں، دن بھر کے اٹکے ہوئے کاموں کو نمٹانے کی فکر ہوتی ہے کہ ان کو پورا کر کے آفس، دفتر اور دکان بند کریں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خاص وہ وقت ہوتا ہے کہ آدمی کا جی اپنے کاروبار کی طرف مشغول ہوتا ہے، ایسے موقعہ پر جب کہ یہ رکاوٹ موجود ہے اور اس کو نماز سے ہٹانے والے موانع ہیں؛ ان تمام کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی وہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرتا ہے۔ تو فجر کی نماز میں

طبعی طور پر اور عصر کی نماز میں قلبی طور پر یعنی دنیوی حیثیت سے پیش آنے والی ان رکاوٹوں کے باوجود جب اہتمام کرے گا؛ تو باقی نمازوں کا اہتمام کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا اسی لئے خصوصیت کے ساتھ یہاں ان دو نمازوں کی تاکید کی گئی ہے۔

عمل کئے بغیر ثواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ

وعنه قال قال رسول اللہ ﷺ: اِذَامَـرِضَ الْعَبْدُاَوْسَافَرَ کُتِبَ لَهُ مِثْلُ مَاکَانَ یَعْمَلُ مُقِیْماًصَحِیْحاً. (رواہ البخاری)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی جب بیمار ہوتا ہے یا سفر کرتا ہے تو جو نوافل اور نیک اعمال تندرستی کے زمانہ میں یا حالت ِاقامت میں انجام دیا کرتا تھا، بیماری یا سفر کی وجہ سے ان کو انجام نہیں دے سکتا۔ فرائض تو ہر حال میں انجام دینے ہی ہیں، لیکن نوافل، تلاوت، تہجد اور دوسرے نیک کام جن کا بطورِ نفل تندرستی کے زمانہ میں اہتمام کیا کرتا تھا؛ اب بیماری یا سفر کی وجہ سے نہیں کر پاتا؛ تو نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو ان اعمال کا اجر وثواب پورا پورا عطا فرمائیں گے، اس میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اس لئے عمل کئے بغیر ثواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آدمی تندرستی کے زمانہ میں نیکی کے کاموں کا خوب اہتمام کرے؛ تو بیماری کے زمانہ میں بھی ان اعمال کا ثواب عمل کئے بغیر ہی ملتا رہے گا۔ اسی طرح اقامت کے زمانہ میں اہتمام کرے؛ تو سفر کی حالت میں بھی مستقل ثواب ملتا رہے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاٰتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّآاللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : کُلُّ مَعْرُوْفٍ صَدَقَۃٌ.

وعنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : مَامِنْ مُسْلِمٍ یَغْرِسُ غَرْسًااِلَّا کَانَ مَااُکِلَ مِنْہُ لَہٗ صَدَقَۃً. وَمَاسُرِقَ مِنْہُ لَہٗ صَدَقَۃً. وَلَایَرْزَؤُہٗ أَحَدٌاِلَّا کَانَ لَہٗ صَدَقَۃً.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ ہر نیکی کا کام صدقہ کا حکم رکھتا ہے یعنی اس پر آدمی کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

جب مسلمان کوئی درخت بوتا ہے

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب مسلمان کوئی درخت بوتا ہے تو اس سے جو کچھ بھی کھایا جاتا ہے، چاہے انسان کھائے یا جانور کھائے؛ اس پر اس درخت بونے والے کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے، بلکہ اگر مالک نے اپنے باغ اور کھیت کے اندر درخت بویا اور دوسروں کے لئے اس سے فائدہ اٹھانے پر پابندی لگادی اور استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی؛ پھر بھی کسی نے اس میں سے کچھ چرالیا، تو اگرچہ وہ چرانے والا اپنے طور پر مجرم ہے؛ لیکن اس چرانے کے بعد بھی جب وہ کھائے گا، تو اس پر بھی اس درخت بونے والے کو صدقہ کا اجرو ثواب ملے گا۔ بلکہ کوئی بھی اس میں سے جس طرح بھی – بہ اجازت یا بغیر اجازت – کچھ بھی

کمی کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر بھی اس بونے والے کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔
ایک اور روایت میں یہاں تک ہے کہ اس میں سے کوئی انسان، کوئی جانور یا کوئی پرندہ جو کچھ بھی کھائے گا تو جب تک کہ وہ درخت موجود ہے؛ وہاں تک اس بونے والے کو صدقہ کا ثواب ملتا رہے گا۔

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ نیکی کے کام مختلف، گونا گوں اور متنوع ہیں، آدمی جس طرح بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنا چاہے، اس کے لئے مختلف راستے کھلے ہوئے ہیں، وہ آسانی سے خوشنودی حاصل کر سکتا ہے

دور سے چل کر مسجد آنے کی فضیلت

وعنہ قال: أَرَادَ بَنُوْ سَلِمَةَ أَنْ يَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ، فَبَلَغَ ذٰلِکَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ لَهُمْ: اِنَّهُ قَدْ بَلَغَنِیْ أَنَّكُمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ؟ فَقَالُوْا: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ أَرَادْنَا ذٰلِکَ. فَقَالَ: بَنِیْ سَلِمَةَ! دِيَارَكُمْ، تُكْتَبْ آثَارُكُمْ. دِيَارَكُمْ، تُكْتَبْ آثَارُكُمْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے۔ بنوسلمہ مدینہ منورہ میں ایک قبیلہ تھا اور جس محلّہ میں ان کے مکانات تھے وہ محلّہ مسجدِ نبوی سے دور تھا، ان کے لئے اپنے محلے اور اپنے مکانوں سے مسجدِ نبوی تک آنے میں دوری کی وجہ سے دشواری ہوتی تھی، جب مسجدِ نبوی کے قریب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ان کا ارادہ ہوا کہ وہاں سے یہاں منتقل ہو جائیں، نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ مجھے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم لوگ مسجد کے قریب منتقل ہونے کا ارادہ رکھتے ہو، مسجد کے قریب جگہ خالی ہوئی ہے تو تم اپنے محلّہ کو اور اپنے مکانات چھوڑ کر یہاں آنا چاہتے ہو؟ ٹرانسفر (Transfer) ہونا چاہتے ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں!

اے اللہ کے رسول! ہم نے ایسا ارادہ کیا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے بنوسلمہ! تم اپنے محلے اور اپنے گھروں کو لازم پکڑے رہو یعنی جہاں اس وقت رہ رہے ہو، وہاں سے مسجد کے قریب منتقل ہونے کی ضرورت نہیں ہے؛ بلکہ وہیں رہو۔ اور وہاں سے مسجد تک آنے میں تم کو جو دشواری ہوتی ہے؛ اس پر بشارت سنو کہ تمہارے قدم جو وہاں سے یہاں تک آنے کے لئے تم اٹھاتے ہو، وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں نیکی کے طور پر لکھے جاتے ہیں۔ اس لئے پھر دوبارہ حضور ﷺ نے یہی تاکید فرمائی کہ اپنے ان مکانات کو چھوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہیں رہو۔ اور تمہارا یہ سوچنا کہ اتنی دور جانا پڑتا ہے تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے مطابق اجر وثواب بھی تو زیادہ ملتا ہے، تمہاری یہ محنت، مشقت اور مجاہدہ اجر وثواب سے خالی نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اگر ایک آدمی کا مکان مسجد سے دور ہے اور مسجد کے قریب کوئی جگہ مل رہی ہے؛ تو وہاں منتقل نہیں ہوسکتا۔ یہاں نبی کریم ﷺ کے منع فرمانے میں ایک مصلحت اور تھی جیسا کہ شرّاح نے لکھا ہے کہ وہ قبیلہ جس جگہ پر آباد تھا، نبی کریم ﷺ یہ چاہتے تھے کہ وہ جگہ بھی مسلمانوں سے آباد رہے، تاکہ اس طرف سے دشمنوں کے حملے کا خطرہ نہ رہے۔ اگر اس وقت پورا قبیلہ اس جگہ کو چھوڑ دیتا تو اس طرف سے حملہ کا اندیشہ تھا۔ یہ ایک مصلحت تھی۔

اور ساتھ ہی ان کی جو دشواری تھی کہ یہ لوگ اپنے لئے مشقت محسوس کرتے تھے کہ دور ہونے کی وجہ سے تکلیف زیادہ ہوتی ہے؛ تو نبی کریم ﷺ نے اس کا علاج بھی بتلا دیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ خالی تکلیف ہی ہوتی ہے۔ تکلیف تو اگرچہ تمہیں ہو رہی ہے لیکن اس کا بدلہ

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تمہاری اس تکلیف کے مطابق ثواب کی شکل میں مل بھی رہا ہے، لہٰذا تمہاری یہ محنت اور مشقت ضائع نہیں جارہی ہے۔

ایک روایت میں حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا ﴿اِنَّ بِکُلِّ خَطْوَۃٍ دَرَجَۃً﴾ ہر وہ قدم جو تم اٹھا کر مسجد کی طرف آتے ہو، اس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں ایک درجہ کی ترقی ہوتی ہے۔ آدمی اپنی زندگی کی نمازیں اور ہر نماز کے لئے اٹھائے جانے والے قدموں کو شمار کرلے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنے بڑے درجات ملیں گے۔

﴿تمہارے لئے یہ دونوں چیزیں جمع کردیں﴾

عن أبی منذر أبی بن کعب رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَ رَجُلٌ لَا أَعْلَمُ رَجُلًا أَبْعَدَ مِنَ الْمَسْجِدِ مِنْہُ، وَکَانَ لَا تُخْطِئُہُ صَلاۃٌ، فَقِیْلَ لَہُ أَوْ فَقُلْتُ لَہُ: لَوِ اشْتَرَیْتَ حِمَارًا تَرْکَبُہُ فِی الظَّلْمَاءِ وَفِی الرَّمْضَاءِ؟ فَقَالَ: مَا یَسُرُّنِیْ أَنَّ مَنْزِلِیْ اِلیٰ جَنْبِ الْمَسْجِدِ، اِنِّیْ أُرِیْدُ أَنْ یُکْتَبَ لِیْ مَمْشَایَ اِلیٰ الْمَسْجِدِ، وَرُجُوْعِیْ اِذَا رَجَعْتُ اِلیٰ أَھْلِیْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: قَدْ جَمَعَ اللّٰہُ لَکَ ذٰلِکَ کُلَّہٗ. وفی روایۃ: اِنَّ لَکَ مَا أَحْتَسَبْتَ.

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی تھا جو مسجد نبوی میں نماز کیلئے آیا کرتا تھا اور میرے علم میں اس سے زیادہ کوئی آدمی مسجد سے دور نہیں رہتا تھا یعنی اس کا مکان اور قیام گاہ مسجد سے کافی دور تھی، اس کے باوجود کوئی نماز اس کی چوکتی نہیں تھی یعنی مسجد سے دور ہونے کے باوجود بھی ہر نماز میں بڑی پابندی سے حاضری دیتا تھا۔ حضرت ابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: لوگوں نے اس سے کہا یا میں نے ہی اس سے کہا کہ تم مسجد سے اتنا دور رہتے ہو اور ہر نماز میں بڑی پابندی سے آتے جاتے ہو؛ تو ظاہر ہے کہ تمہیں دشواری اور تکلیف ہوتی

ہوگی۔رات کی نمازوں میں یعنی عشاء اور فجر میں اندھیرے کے اندر آنا پڑتا ہے، یا دوپہر کے وقت گرمی میں -جب کہ زمین گرم ہوتی ہے اس وقت- تمہیں آنا پڑتا ہے، اس لئے اگر تم سواری کے طور پر کوئی گدھا خرید لو اور اسی پر سوار ہوکر مسجد آتے جاتے رہو، یا گرمی کے زمانہ میں جب زمین تپ جاتی ہے اور تمہارے پاؤں کو بھی تکلیف ہوتی ہوگی اس وقت زمین کی گرمی اور تپش سے بچنے کے لئے اگر سواری خرید لو؛ تو کیا ہی اچھا رہے۔ اس آدمی نے جواب میں کہا کہ یہ بات میرے لئے کوئی خوش کن نہیں تھی کہ میرا مکان مسجد سے قریب ہوتا یعنی مجھے اس پر کوئی خوشی نہیں ہوتی کہ میرا مکان مسجد کے پڑوس میں ہوتا، بلکہ مکان دور ہے اس پر مَیں خوش ہوں۔ اس لئے کہ مَیں یہ چاہتا ہوں کہ چل کر مسجد آتا رہوں اور چل کر مسجد سے واپس جاتا رہوں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں میرا یہ آنا اور واپس جانا؛ دونوں چیزیں لکھی جائیں اور اس پر مجھے اجر و ثواب ملے۔ جب نبی کریم ﷺ نے یہ سنا تو فرمایا ﴿قَدْ جَمَعَ اللّٰهُ لَکَ ذٰلِکَ کُلَّهٗ﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے یہ دونوں چیزیں جمع کر دیں یعنی مسجد آنے پر تو ثواب ملنا ظاہر ہے، لیکن فارغ ہونے کے بعد جب اپنے گھر واپس جائے گا تو اس پر بھی ثواب ملے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ثواب کے دینے میں کوئی کمی نہیں ہے، البتہ آدمی کو ثواب کے لئے حریص ہونا چاہیے اور اس کو چاہیے کہ ثواب حاصل کرنے کے جو مختلف انداز اور طریقے ہیں؛ ان کو اختیار کرتا رہے۔ بلکہ ایک روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّ لَکَ مَا احْتَسَبْتَ﴾ تم نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب کی جو امید رکھی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو وہ ثواب ملے گا۔

ثواب کی نیت اور امید ہونا ضروری ہے

ہمیں ایک خاص چیز ملحوظ رکھنی چاہیے۔ان تمام روایتوں میں- جو پہلے بھی گزریں اور آج بھی آئی -لفظِ ''احتساب'' آیا ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی طبعی امور ہیں اور ان پرثواب کے وعدے کیئے گئے ہیں،وہ ثواب اسی وقت ملے گا جب کہ ان کاموں کوانجام دیتے وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب کی امید بھی ہو۔اگران کو بوجھ سمجھ کر یا ثواب کا دل میں ارادہ کیئے بغیرانجام دیتا ہے یعنی ثواب حاصل کرنے کی طرف دل میں جو آمادگی ہوا کرتی ہے،اس کے بغیرایسے ہی طبعی کام انجام دے دیتا ہے؛ تواس پرکوئی ثواب نہیں ملتا۔یہ بات خاص طور پر یاد رہے۔

جیسے ایک آدمی اپنے بال بچوں کے لئے محنت ومزدوری کرتا ہے،ان کوکھلاتا پلاتا ہے،ان کے لئے کھانے پینے کا،رہائش کااورکپڑے کاانتظام کرتا ہے۔توایک تو یہ ہے کہ آدمی اس کو یہ سمجھ کرانجام دیتا ہے کہ یہ میرے سر پر بوجھ ہےاور مجھے اسے ڈھونااور برداشت کرنا ہی ہے،اگراس طرح سے انجام دے؛ تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔

اورایک شخص بوجھ سمجھ کرنہیں بلکہ یوں سمجھ کرکرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مجھےاس کا پابند کیا گیا ہے کہ ان کی ضرورتیں پوری کروں اوراس کاانتظام کروں۔اوران کاموں کوکرتے ہوئے یوں سوچتا ہے کہ اللہ کے اس حکم کو بجالانے پر مجھے ثواب ملے گا،مَیں اللہ کا حکم پورا کررہا ہوں؛ تواس صورت میں اس کا یہ کام یقیناً ثواب سے خالی نہیں ہوگا۔اسی طرح کھاناپینا،اٹھنابیٹھناوغیرہ تمام امورمیں احتساب یعنی ثواب کی نیت اورامید ہونی چاہیے

﴿یہ آرام بھی فائدہ اور ثواب سے خالی نہیں﴾

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا تھا: ﴿إِنِّي أَحْتَسِبُ نَوْمَتِي كَمَا أَحْتَسِبُ قَوْمَتِي﴾ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۳۹۹۶) میں جب سوتا ہوں تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے ثواب کی اسی طرح امید رکھتا ہوں جس طرح نماز کے لئے اللہ کے سامنے کھڑے ہوتے وقت رکھتا ہوں۔

ہم اور آپ جب مسجد میں آکر نماز کی نیت باندھتے ہیں، اس وقت تو ہر ایک کو یہ خیال ہوتا ہے کہ میں عبادت انجام دے رہا ہوں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے اجر و ثواب ملے گا۔ ظاہر ہے کہ ثواب کا احتساب ہوتا بھی ہے، بلکہ یہ کام انجام ہی اس لئے دئے جاتے ہیں کہ آدمی اس کے ذریعہ ثواب حاصل کرے۔

لیکن ایک آدمی جب اپنے بستر پر سونے کے لئے جاتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ میں اس لئے سو رہا ہوں کہ اس پر مجھے ثواب ملے گا۔ اگر اس وقت بھی آدمی یہ سوچ لے کہ میں نہیں سوؤں گا اور اپنے جسم کو آرام نہیں پہنچاؤں گا؛ تو پھر میں پوری چستی اور نشاط کے ساتھ، چاق و چوبند ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت نہیں کر سکوں گا، اس لئے میں جسم کو آرام دے لوں۔ اس لئے کہ یہ جسم اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے واسطے اور روحانیت کا راستہ قطع کرنے کے لئے ایک طرح کی سواری ہے۔ جیسے آدمی اپنی ظاہری سواری کو بقدرِ ضرورت آرام دیتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ آسانی سے منزل تک پہنچ جائے، اسی طرح میں بھی اپنے اس جسم کو- جو میرے لئے ایک مَرْکَبْ اور سواری کی حیثیت رکھتا ہے- آرام دے لوں؛ تو پھر میرے لئے آگے کی منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے، اور مجھ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

جو ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں ان کو میں اچھی طرح سے ادا کرسکوں گا۔اس نیت سے اگر آرام کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ آرام بھی فائدہ اور ثواب سے خالی نہیں ہے۔

﴿نیکی کے چالیس کام﴾

عن أبی محمدعبداللّٰہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: أَرْبَعُوْنَ خَصْلَةً ؛ أَعْلاَهَا مَنِيْحَةُ الْعَنْزِ . مَامِنْ عَامِلٍ يَعْمَلُ بِخَصْلَةٍ مِنْهَا رَجَآءَ ثَوَابِهَا، وَتَصْدِيْقَ مَوْعُوْدِهَا ؛ إِلَّا أَدْخَلَهُ اللّٰهُ بِهَا الْجَنَّةَ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ چالیس چیزیں ایسی ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی کام اگر آدمی کرتا ہے ﴿رَجَآءَ ثَوَابِهَا﴾ اس کام پر ثواب کی امید رکھتے ہوئے ﴿وَتَصْدِيْقَ مَوْعُوْدِهَا﴾ اور اس پر ثواب کا جو وعدہ کیا گیا ہے اس پر یقین رکھتے ہوئے کہ میں یہ کام کروں گا تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے کئے ہوئے ثواب کے اس وعدے کو پورا فرمائیں گے اور مجھے ثواب دیں گے؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی وجہ سے اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔

ان چالیس چیزوں میں حضور ﷺ نے فرمایا ﴿أَعْلاَهَا مَنِيْحَةُ الْعَنْزِ﴾ سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ دودھ دینے والی بکری کسی کو دودھ پینے کے واسطے دے دی جائے۔

جہاں مویشی اور جانور پالنے کا رواج ہوتا ہے، وہاں ایک رواج یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی کے پاس دودھ دینے والے جانور زیادہ ہیں تو ان میں سے ایک آدھ جانور کسی ایسے شخص کو جس کے پاس دودھ کا کوئی انتظام نہیں ہے؛ دے دیا جاتا ہے، جانور کا مالک نہیں بنایا جاتا بلکہ جب تک یہ جانور دودھ دیتا رہے تمہارے پاس رکھو اور اس کا دودھ استعمال کرتے

رہو، جب دودھ دینا بند کردے؛ تو ہمارا جانور واپس کر دینا۔ یہ ایک رواج ہوتا ہے۔ عربی میں ایسے جانور کو جو خاص دودھ پینے کے لئے کسی کو دیا جائے "مَـنِیْـحَةٌ" کہا جاتا ہے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اتنی بڑی فضیلت بیان فرمائی کہ اونٹنی ہو یا بکری ہو یا گائے ہو، اگر کوئی آدمی کسی کو اس طرح دودھ پینے کے واسطے دے (گجراتی میں جس کو (દૂધ ઝણી) دینا کہتے ہیں) اس کو اعلیٰ خصلتوں میں سے شمار کیا گیا اور اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ حالانکہ بکری میں زیادہ دودھ نہیں ہوتا لیکن چالیس خصلتوں میں سب سے اعلیٰ اس کو بتایا گیا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا وعدہ ہے۔

﴿ آدھی کھجور ہی سہی ﴾

عن عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قال سمعتُ النبیَّ ﷺ یقولُ: اِتَّقُوْا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمَرَةٍ.

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، چاہے آدھی کھجور کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اللہ کے راستہ میں دیا جانے والا صدقہ، اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز، چاہے وہ معمولی ہو، دینی چاہیے مثلاً کوئی شخص آدھی کھجور ہی اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہے؛ تو اس کے نتیجہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے جہنم سے حفاظت کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

دوسری کتابوں میں یہی روایت موجود ہے جس میں اس طرح ہے:-

مَـا مِـنْـكُـمْ مِـنْ أَحَدٍ اِلَّا سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ، فَيَنْظُرُ أَيْمَنَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلَّا مَـا قَـدَّمَ، وَيَـنْـظُـرُ أَشْـأَمَ مِنْهُ فَلَا يَرٰى اِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلَا يَرٰى اِلَّا النَّارَ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ، فَاتَّقُوْا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمَرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ. (بخاری شریف حدیث نمبر ۶۹۵۸)

تم میں سے ہر شخص سے اللہ تبارک وتعالیٰ براہِ راست بات کریں گے یعنی درمیان میں کوئی ترجمان اور (ઇન્ટરપ્રેટર) نہیں ہوگا، بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے بات ہورہی ہوگی، اس وقت وہ آدمی اپنی دائیں طرف نظر کرے گا تو صرف وہی اعمالِ صالحہ اس کو نظر آئیں گے جو اس نے آگے بھیجے تھے۔ اور بائیں طرف نظر کرے گا تو جو برے کام اس نے کئے تھے وہ نظر آئیں گے، اور جب سامنے دیکھے گا؛ تو وہاں جہنم نظر آرہی ہوگی۔ پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں: دیکھو! آگے جاکر جب جہنم سے واسطہ پڑنے والا ہے؛ تو اس سے اپنے آپ کو بچاؤ، چاہے آدھی کھجور کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

اور اگر اتنی بھی طاقت نہیں ہے؛ تو کسی کو بھلی بات کہہ دو، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اور صدقہ کی وجہ سے جو فضیلت حاصل ہوتی ہے؛ وہ اس پر بھی حاصل ہوگی۔

﴿ کھانا کھا کر بھی جنت حاصل کی جاسکتی ہے ﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال رسول اللہ ﷺ: اِنَّ اللهَ لَيَرْضٰى عَنِ الْعَبْدِ أَنْ يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا، أَوْيَشْرَبَ الشَّرْبَةَ فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بندے سے اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ جب کوئی لقمہ کھاوے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرے۔ یعنی ہر لقمہ پر **ألحمد للہ** کہے۔

﴿أُكْلَةٌ﴾ ایک لقمہ کو بولتے ہیں اور ﴿أَكْلَةٌ﴾ پورے کھانے کو کہتے ہیں۔ بعضوں نے اس کو ﴿أُكْلَةٌ﴾ پڑھا ہے یعنی ہر لقمہ پر الحمد للہ کہے۔ اور بعضوں نے کہا کہ پورا کھانا

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ﴿الحمدللہ﴾ کہے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔

ایک تو ہم نے اللہ تعالیٰ کی نعمت استعمال کی کہ کھانا کھایا؛ لیکن اس کھانے پر بھی جب اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے تو اس پر بھی وہ خوش ہوں گے، اور جب اللہ تعالیٰ خوش ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی کو جنت حاصل ہوگی۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کھانا کھا کر بھی جنت حاصل کرسکتا ہے۔ یہاں تو بتلانا یہی ہے کہ نیکی کے راستے بہت زیادہ ہیں۔

ایک آدمی یوں سوچے کہ مَیں گھر میں بیٹھا بیٹھا کھا رہا ہوں؛ اس سے مَیں کیسے جنت تک پہنچوں؟ تو حدیثِ پاک میں بتلایا گیا کہ کھانا کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اللہ کی تعریف بیان کرو، اس پر اللہ تعالیٰ راضی ہوں گے اور جنت میں بھیج دیں گے۔ معلوم ہوا کہ کھانا کھا کر بھی آدمی جنت میں جاسکتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ مشقت اور تکلیف اٹھا کر ہی جاوے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ اس پر بھی خوش ہوتے ہیں کہ بندہ کوئی چیز پیے اور اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرے، اس کی خوبیاں بیان کرے اور شکر ادا کرے۔

دیکھو! یہاں بظاہر ایک ایسا کام کیا جس کے ذریعہ سے ہم نے اپنے آپ کو اور اپنے جسم کو راحت پہنچائی، ہم نے فائدہ اٹھایا؛ لیکن اس کے باوجود اگر ہم اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رضامندی اور خوشنودی حاصل ہوگی، اور اس کے نتیجہ میں آدمی جنت میں جائے گا۔

صدقہ کرنے کے لئے مال نہیں ہے تو......

عن أبی موسیٰ رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: علی کُلِّ مُسلِمٍ صَدَقَةٌ. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَجِدْ؟ قَالَ: یَعْمَلُ بِیَدَیْهِ، فَیَنْفَعُ نَفْسَهُ وَیَتَصَدَّق. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ؟ قَالَ: یُعِیْنُ ذَاالْحَاجَةِ الْمَلْهُوْفِ. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ؟ قَالَ: یَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ أَوِالْخَیْرِ. قَالَ: أَرَأَیْتَ اِنْ لَمْ یَفْعَلْ؟ قَالَ: یُمْسِکُ عَنِ الشَّرِّ؛ فَاِنَّهَا صَدَقَةٌ. (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر مسلمان پر صدقہ کرنا ضروری ہے۔ حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ اگر کسی آدمی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے مال نہیں ہے؛ تو کیا کرے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ اگر مال موجود نہیں ہے، تو محنت مزدوری کرے اور اس کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو؛ اس کے ذریعہ خود بھی فائدہ اٹھائے اور تھوڑا بہت اللہ کے راستہ میں صدقہ بھی کرے۔ گویا صدقہ کی فضیلت یوں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اگر اس کی طاقت نہ ہو تو......

اس پر عرض کیا گیا کہ اگر کسی میں اس کی طاقت نہ ہو کہ محنت کر کے کماوے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی پریشان حال، حاجت مند کی مدد کردو؛ اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا۔

پھر عرض کیا گیا کہ اگر اس کی بھی کسی کو طاقت نہ ہو؟ ہاتھ پاؤں کام ہی نہیں کر رہے ہیں کہ کسی کی مدد کرے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو بھلی بات کا حکم کرے، اس میں تو ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہیں ہے، صرف زبان ہی ہلانی ہے، اور زبان ہلانے میں کوئی

مشقت بھی نہیں ہے۔ اپنی جگہ پر، اپنے بستر پر اور اپنی چارپائی پر ویسے ہی لیٹے لیٹے بھی آدمی زبان ہلاسکتا ہے۔ لہٰذا بھلی بات کا حکم کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں صدقہ کا درجہ رکھتا ہے اور اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

ہم سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے

پھر پوچھا گیا کہ اگر کوئی آدمی یہ بھی نہ کر سکے تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا ﴿یُمسِکُ عَنِ الشَّرِّ؛ فَاِنَّھَا صَدَقَۃٌ﴾ آدمی کو چاہیے کہ برائی سے رک جائے۔ یعنی خود بھی کوئی گناہ کا کام نہ کرے اور کسی کو کوئی تکلیف بھی نہ پہنچائے۔ ہمارے ہاتھ سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے؛ یہ بھی صدقہ کا درجہ رکھتا ہے۔ گویا آخری درجہ یہ ہے کہ اگر ہمارے ذریعہ سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نہ ذات سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے، نہ مال سے، نہ زبان سے؛ تو کم سے کم اتنا تو ہم سے ہوسکتا ہے کہ اپنے شر سے اور اپنی طرف سے پہنچنے والی ایذاؤں سے لوگوں کو محفوظ رکھیں۔ گویا ہم اپنے آپ کو اس بات کا پابند بنائیں کہ ہماری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے، یہ کم سے کم درجہ ہے، اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صدقہ کا ثواب ملے گا

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

اَلاقْتِصَادُ فِی الطَّاعَةِ

(عبادات میں درمیانی راہ)

مجلس ۱

﴿اقتباس﴾

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسلام نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔اس باب کا مقصد بھی یہی ہے کہ جو آدمی اپنی سواری کو اس لئے تیز دوڑاتا ہے کہ جلدی سے اپنا سفر پورا کرلوں اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیز دوڑانے کی وجہ سے سواری بھی تھک تھکا کر اپنی قوت ختم کرکے مر جاتی ہے، پھر نہ تو سواری باقی رہتی ہے اور نہ اس کا سفر پورا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ موقعہ بموقعہ آرام کرتے ہوئے درمیان میں ٹھہرتے ہوئے اور کچھ وقفہ دیتے ہوئے چلتا؛

تو منزلِ مقصود تک پہنچ بھی جاتا اور سواری کا جانور بھی اپنے پاس محفوظ رہتا۔
اسی طرح ہمارا یہ جسم بھی آخرت کی راہ اور روحانیت کا سفر طے کرنے کے لئے سواری کا کام دیتا ہے، اگر ہم اس سے اسی اصول کے مطابق صحیح ڈھنگ سے کام لیتے رہیں گے؛ تو منزلِ مقصود تک بھی پہنچ جائیں گے اور ہماری یہ سواری بھی محفوظ رہے گی۔اور اگر ہم نے غلط طریقہ اختیار کیا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف بیماریوں میں پھنس جائیں گے۔

یہ سواری بھی ہاتھ سے جائے گی اور منزلِ مقصود تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

۲۴/جمادی اول ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۷/ستمبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد

فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

طٰهٰ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى.

وقال تعالٰی: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ

﴿آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوجیے﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے ﴿الاقْتِصَادُ فِي الطَّاعَةِ﴾ عبادت میں میانہ روی اختیار کرنا؛ کہ نہ افراط ہو اور نہ تفریط ہو، نہ غلو سے کام لے اور نہ کوتاہی سے کام لے چنانچہ اسی سلسلے میں دو آیتیں پیش کی ہیں ﴿طٰهٰ مَا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لِتَشْقٰى﴾ اے نبی! ہم نے آپ پر قرآنِ پاک اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑیں اور تکلیف اُٹھائیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام قرآنِ پاک کی شکل میں دئے گئے ہیں اس کی وجہ سے آپ مشقت میں نہ پڑیں، اور قرآنِ کریم کا پیغام بندوں تک پہنچانے کے معاملہ میں آپ اتنی زیادہ پریشانی نہ اُٹھائیں کہ وہ قبول کیوں نہیں کرتے؟ نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے تسلی دی گئی کہ آپ کا کام تو اللہ تعالیٰ کے احکام کا لوگوں تک پہنچا دینا ہے، اب اگر وہ اس کو نہیں مانتے تو اس وجہ سے آپ رنجیدہ خاطر نہ ہوجیے۔

﴿اللہ تعالیٰ آسانی چاہتے ہیں﴾

دوسری آیت میں فرمایا﴿یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَلَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ رکھتے ہیں، دشواری اور تکلیف کا نہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف موقعوں پر مختلف ہدایتیں دے کر اور مختلف چیزوں سے بندوں کو آگاہ کر کے احکامِ شریعت کا مکلّف بنایا؛ اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو مشقت اور تکلیف میں ڈالنا چاہتے ہیں بلکہ تمہارے لئے آسانی چاہتے ہیں۔ چنانچہ عام طور پر عام حالات میں جو احکام دیئے گئے ہیں؛ اگر آدمی کے اُن حالات میں کچھ تبدیلی آتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی احکام کے سلسلے میں کچھ سہولت کر دی جاتی ہے۔

﴿......آپ تیمّم کر لیجیے﴾

مثلاً عام حالات میں آدمی کو اس بات کا مکلّف کیا گیا ہے کہ اگر نماز ادا کرنی ہے تو اس کے لئے وضو کر لیجیے۔ لیکن اگر پانی میسر نہ آنے کی وجہ سے کوئی آدمی وضو نہیں کر سکتا، یا پانی تو ہے؛ لیکن بیماری کی وجہ سے پانی کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا کہ بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، کسی عضو کے یا جان کے تلف ہو جانے کا اندیشہ ہے؛ تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تخفیف اور آسانی کر دی گئی کہ بجائے پانی استعمال کر کے وضو کرنے کے آپ تیمّم کر لیجیے۔ یہ اسی قبیل سے ہے۔ ایسا نہیں کہا گیا کہ جو بھی حالت ہو، آپ کو تو وضو ہی کرنا ہے؛ چاہے مر جائیں اور جان رہے یا نہ رہے۔ دیکھئے! کتنی آسانی کر دی گئی۔

﴿......تو روزہ نہ رکھے﴾

اسی طریقہ سے مثلاً عام حالات میں رمضان المبارک کے مہینہ میں اگر آدمی اپنے

گھر پر ہے اور تندرست ہے تو شریعت نے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، لیکن ایک آدمی سفر میں ہے، اور اس کے لئے روزہ رکھنے میں دشواری ہے، یا بیماری کی وجہ سے روزہ رکھنا اس کے لئے باعثِ مشقت و تکلیف ہے، تو اِن دونوں صورتوں میں شریعت نے باوجود اس کے کہ رمضان کا مہینہ ہے اور قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ جو آدمی رمضان کا مہینہ پالیوے؛ اس کو چاہیے کہ روزہ رکھے۔ لیکن یہ حکم عام حالات کا ہے۔ اگر کوئی آدمی مرض یا سفر کی وجہ سے اس حکم کی بجا آوری میں کلفت اور زحمت محسوس کرے؛ تو آسانی کردی گئی ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ اگر کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو؛ تو روزہ نہ رکھے، دوسرے دِنوں میں جب تندرست ہو جائے، یا سفر سے اپنے وطن میں واپس آجائے تو جو روزے چھوٹے ہیں ان کی قضا کرلے۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آسانی کردی گئی۔

﴿آسانی کردی گئی﴾

نماز میں بھی اسی طرح ہے کہ عام حالات میں حکم یہ ہے کہ آپ فرض نماز ادا کرتے ہیں تو آپ کے لئے کچھ چیزیں ضروری ہیں، مثلاً قیام ایک رکن ہے، اگر کھڑے نہیں رہیں گے؛ تو نماز صحیح نہیں ہوگی، لیکن بیماری کی وجہ سے آپ میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں ہے؛ تو شریعت نے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ یا بیماری کی وجہ سے آپ میں رکوع سجدہ کرنے کی طاقت نہ ہو؛ تو شریعت نے اشارہ سے رکوع وسجدہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ ایسا نہیں کہا کہ آپ کو ہر حال میں کھڑا ہی ہونا ہے، نماز کو اسی طرح ادا کرنی پڑے گی۔ ایسا کوئی جبر نہیں کیا گیا۔ یعنی عام حالات میں جو حکم دیا گیا تھا، جب انسانی حالت میں تغیر ہوا اور

تبدیلی آئی، جس کی وجہ سے وہ اس حکم پر عمل کرنے کے قابل نہیں رہا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بھی آسانی کردی گئی۔

﴿......تو کوئی پابندی نہیں﴾

اسی طرح عام طور پر سفر میں کچھ نہ کچھ دشواری پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز میں بھی تخفیف کردی گئی کہ چار رکعات والی نماز دو رکعات ادا کرلیں، یا کیفیات میں آسانی کردی کہ عام حالات میں آپ کو جن چیزوں کا اہتمام کرنا ہے مثلاً قراءت میں سنت طریقہ کے مطابق سورتیں پڑھیں اور وہ یہ ہے کہ فجر اور ظہر کی نماز میں طوالِ مفصل یعنی سورۂ حجرات سے لے کر سورۂ بروج تک، عصر اور عشاء میں اوساطِ مفصل یعنی سورۂ بروج سے لے کر سورۂ لم یکن تک، اور مغرب کی نماز میں قصارِ مفصل یعنی سورۂ لم یکن سے لے کر آخر تک۔ یہ حکم عام حالتوں میں ہے؛ لیکن اگر کوئی سفر میں ہے تو یہ پابندی نہیں ہے۔

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقعہ پر فجر کی نماز میں معوذتین یعنی ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ اور ﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ پڑھیں (نصب الرایہ۲/۴) تو حالتِ اقامت اور سکون واطمینان میں قراءت کے سلسلے میں خاص طریقہ بتلایا گیا ہے، سفر میں وہ بات نہیں ہے؛ اس لئے تخفیف کردی گئی۔

بہر حال! اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے شریعت کے بے شمار احکام میں بندوں کے لئے بہت ساری آسانیاں پیدا کردی گئیں ہیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ دین میں آسانی چاہتے ہیں ﴿يُرِيدُ اللهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ اللہ تعالیٰ مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتے، یہ مقصود نہیں ہے کہ بندہ بلاوجہ تکلیف میں مبتلا ہو؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کو یہ مقصود ہے کہ بندہ آسانی کے ساتھ ان احکام کو انجام دے سکے۔

اس کے ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا

بہر حال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب عبادات کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنے کے سلسلے میں قائم کیا ہے، اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے ذہن سے بلاوجہ یوں سوچ کر اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتا ہے کہ مَیں جتنی زیادہ مشقت اٹھاؤں گا، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کا قرب اور نزدیکی حاصل ہوگی؛ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس مشقت میں پڑنے کی وجہ سے پھر وہ کسی جسمانی بیماری میں یا کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ عام حالات میں جو عبادتیں ادا کر پاتا تھا ان کے ادا کرنے کے بھی قابل نہیں رہتا۔

مثلاً ایک آدمی نے پوری رات جاگنا شروع کر دیا، اب اس کی عادت تو پڑی نہیں ہے اور یوں سمجھ کر کہ مَیں پوری رات جاگوں گا تو میرے لئے زیادہ ثواب ہے۔ ٹھیک ہے! اگر آپ کے جسم میں طاقت ہے اور آپ اس کے عادی ہیں، آپ نے ریاضت و مجاہدہ کے ذریعہ سے اپنے آپ کو اس کا عادی بنالیا ہے؛ تو کوئی اشکال کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اپنے آپ کو اس کا عادی بنائے بغیر اگر پوری رات جاگیں گے تو نتیجہ یہ ہوسکتا ہے کہ فجر کی نماز بھی غائب ہو جائے یا جماعت چھوٹ جائے۔

یہ مجھے زیادہ پسند ہے......

مؤطا میں ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت سلیمان بن ابی حثمہ فجر کی نماز میں موجود نہیں تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فجر کے بعد نکلے، جب ان کے مکان کے پاس سے گذرے تو ان کی والدہ شفا سے پوچھا کہ آج فجر کی نماز میں سلیمان نظر نہیں آئے، کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا کہ بات دراصل یہ ہوئی کہ وہ رات بھر عبادت میں مشغول

رہے، بس! فجر کے قریب آنکھ لگ گئی اس لئے ان کی جماعت فوت ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیسی بہترین بات ارشاد فرمائی کہ میں رات بھر سویا رہوں اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھوں؛ یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس کے مقابلہ میں کہ رات بھر عبادت کروں اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ نہ پڑھوں (مؤطا امام مالک، ص ۴۶) دیکھئے! شریعت نے جو چیز بتائی ہے؛ اس میں آدمی کے لئے کتنی آسانی ہے۔

یہ راہ بھی کھلی رکھی ہے

حدیثِ پاک میں تو یہاں تک آتا ہے کہ اگر آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی اور فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو پوری رات کی عبادت کا ثواب مل جائے گا۔ کتنی آسانی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی تہجد کا اہتمام ہی نہ کرے، اہتمام کے باوجود اگر یہ موقعہ نہیں ملا تو کم سے کم ان چیزوں کا تو اہتمام کر لے۔ آدمی کے لئے یہ راہ بھی شریعت کی طرف سے کھلی رکھی گئی ہے۔ ہم لوگ ایسی چیزوں سے غلط نتیجے نکالتے ہیں۔

……اور نہ وہ خود منزلِ مقصود تک پہنچ سکا

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ آدمی اگر رات بھر جاگا اور عادت نہیں ہے جس کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ فجر کی نماز فوت ہوجائے یا جماعت فوت ہوجائے۔ چلئے! فجر کی نماز بھی پڑھ لی، لیکن رات بھر جاگنے کی وجہ سے بعد میں طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ بیمار ہوگیا اور دو چار نمازیں جماعت سے چھوٹ گئیں۔ تو دیکھئے! وہ کیا حاصل کرنا چاہتا تھا اور نتیجہ اس کو کہاں تک لے گیا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿فَاِنَّ السَّائِرَ الْمُنْبَتَّ لَا اَرْضًا قَطَعَ وَلَا ظَهْرًا اَبْقٰى﴾ (کنز العمال بروایت امام بزار، ۳/۳۶۔ کشف الخفا ۲۸۴۲) جو آدمی اپنی سواری کو اس لئے تیز

دوڑاتا ہے کہ جلدی سے اپنا سفر پورا کرلوں اور منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تیز دوڑانے کی وجہ سے سواری بھی تھک تھکا کر اپنی قوت ختم کر کے مرجاتی ہے، پھر نہ تو سواری باقی رہتی ہے اور نہ اس کا سفر پورا ہوتا ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ موقعہ بموقعہ آرام کرتے ہوئے درمیان میں ٹھہرتے ہوئے اور کچھ وقفہ دیتے ہوئے چلتا؛ تو منزلِ مقصود تک پہنچ بھی جاتا اور سواری کا جانور بھی اپنے پاس محفوظ رہتا۔ اب نہ جانور محفوظ رہا اور نہ وہ خود منزلِ مقصود تک پہنچ سکا۔

اسی طرح ہمارا یہ جسم بھی آخرت کی راہ اور روحانیت کا سفر طے کرنے کے لئے سواری کا کام دیتا ہے، اگر ہم اس سے اسی اصول کے مطابق صحیح ڈھنگ سے کام لیتے رہیں گے؛ تو منزلِ مقصود تک بھی پہنچ جائیں گے اور ہماری یہ سواری بھی محفوظ رہے گی۔ اور اگر ہم نے غلط طریقہ اختیار کیا؛ تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مختلف بیماریوں میں پھنس جائیں گے، یہ سواری بھی ہاتھ سے جائے گی اور منزلِ مقصود تک بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔

دین اسلام کی بڑی خوبی

اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اسلام نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ بلکہ اگلے ادیانِ سماویہ کے اندر جو احکام دئے گئے تھے ان میں بعض مذاہب وہ تھے جن میں بڑی سختیاں تھیں جیسے یہود کے یہاں بعض چیزوں میں بڑی سختیاں تھیں۔ اور بعض مذاہب وہ تھے جن کے یہاں بڑی آسانیاں تھیں جیسے نصاریٰ کے یہاں بعض چیزوں میں بہت ہی آسان پہلو اختیار کیا گیا تھا۔ مثلاً کسی نے کسی کو قتل کردیا تو مذہب یہود میں تو یہ تھا کہ اب مقتول کے اولیاء قصاص ہی لیں گے، وہ معاف کرنا چاہیں تب بھی

معاف نہیں کر سکتے، اور دیت بھی نہیں لے سکتے۔ نصاریٰ کے یہاں صرف دیت ہی لے سکتے تھے، قصاص کی اجازت نہیں تھی۔ اور اسلام میں اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی کہ دیت لینا چاہیں؛ تو صلح کر کے دیت لیں اور اگر قصاص لینا چاہیں؛ تو قصاص لیں، اور اگر معاف کرنا چاہیں؛ تو معاف کر دیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام راہیں کھلی رکھی گئیں۔ تو سابقہ مذاہب میں جو سختیاں تھیں نبی کریم ﷺ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر سے وہ ختم کر دیں ﴿وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡأَغۡلَالَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ﴾ وہ بوجھ اور قید و بند جو اگلے ادیان میں تھے؛ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی برکت سے یہ سب ختم فرمائے اور دین اسلام میں درمیانی راستہ اختیار کرنے کی تاکید کی گئی۔ لہٰذا آدمی کو اسی کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

﴿معمولات کیسے اور کتنے ہوں﴾

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيۡهَا وَعِنۡدَهَا امۡرَأَةٌ، قَالَ: مَنۡ هٰذِهٖ؟ قَالَتۡ: هٰذِهٖ فُلَانَةُ. تَذۡكُرُ مِنۡ صَلَاتِهَا. قَالَ: مَهۡ؛ عَلَيۡكُمۡ مَاتُطِيۡقُوۡنَ؛ فَوَاللّٰهِ لَايَمَلُّ اللّٰهُ حَتّٰى تَمَلُّوۡا. وَكَانَ أَحَبَّ الدِّيۡنِ اِلَيۡهِ مَادَاوَمَ صَاحِبُهٗ عَلَيۡهِ. (متفق علیہ)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لائے تو ان کے پاس ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی، حضور اکرم ﷺ نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نام بتایا کہ فلانی عورت ہے۔ اور اس کی نماز کا بڑا چرچا تھا لہٰذا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا بھی ذکر کیا کہ وہ رات بھر عبادت میں اور نماز میں مشغول رہتی ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ﴿مَهۡ؛ عَلَيۡكُمۡ مَاتُطِيۡقُوۡنَ﴾ یعنی چھوڑو؛ یہ طریقہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ تم ایسا طریقہ اختیار کرو جس کی تمہارے اندر طاقت ہو۔ انسان کو وہ

انداز اور روش اپنانی چاہیے کہ زندگی بھر جس پر مداومت اور پابندی کر سکے۔ اسی لئے فرمایا ﴿فَوَاللّٰہِ لَا یَمَلُّ اللّٰہُ حَتّٰی تَمَلُّوْا﴾ اللہ تعالیٰ اجر و ثواب دینے میں کمی نہیں کرتے اور اُکتاتے نہیں ہیں؛ یہاں تک کہ تم عبادت کرنے سے اُکتا جاؤ۔

﴿انسانی فطرت﴾

دیکھو! انسانی فطرت اور طبیعت ایسی بنائی گئی ہے کہ اچھی اچھی چیز سے بھی اُکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اچھا کھانا بھی اگر مسلسل کئی روز تک ملتا رہے تو طبیعت اس کی طرف سے اُوبنے اور اُکتانے لگتی ہے۔ لہٰذا عبادت کے معاملہ میں بھی اگر میانہ روی اختیار کرے گا؛ تب ہی پابندی کر سکے گا۔ اگرچہ عبادت بہت اچھی چیز ہے لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ بھائی! اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کو بھی ذرا دیکھو اور یوں سوچو کہ مَیں جس روش کو اپنا رہا ہوں، کیا ہمیشہ اس پر مداومت اور پابندی کر سکوں گا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ایک دو مہینے کے بعد اس طریقہ کو چھوڑ بیٹھوں۔ اس لئے درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ اسی کو فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے سے اکتاتے نہیں ہیں۔

﴿اللہ تعالیٰ کے اُکتانے کا مطلب﴾

یہاں اُکتاہٹ کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔ اصل تو اُکتاہٹ طبیعت کا ایک تأثر ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی کیفیات سے پاک اور منزہ ہے۔ تو دراصل یہاں اس کا ثمرہ اور نتیجہ جو ہوتا ہے اس کو بتلانا مقصود ہے۔ اُکتاہٹ کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کام چھوڑ بیٹھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ جب عبادت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نتیجے میں بندے کو ثواب دیا جاتا ہے، اِدھر بندے نے عبادت کی، اُدھر اللہ تعالیٰ

کی طرف سے ثواب ملا۔ پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ثواب دینے کا سلسلہ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے؛ جب تک تم عبادت کا سلسلہ نہ چھوڑو۔ جب بندہ اُکتا کر عبادت کا سلسلہ ختم کردے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب واجر دینے کا جو سلسلہ تھا؛ وہ بھی ختم ہوجائے گا، اس لئے کہ اجر وثواب تو اسی عبادت پر مرتب ہوتا تھا۔ لہٰذا اُکتاہٹ کا جو ثمرہ تھا -یعنی چھوڑ دینا- وہ بندے کی طرف سے پایا گیا۔ اسی کو حضور اکرم ﷺ نے تعبیر فرمایا: ﴿لایَمَلُّ اللهُ حَتّٰی تَمَلُّوْا﴾ اللہ تعالیٰ اُکتاتے نہیں یہاں تک کہ تم خود اُکتا جاؤ۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ اُکتا جائے تو نعوذ باللہ! اللہ تعالیٰ بھی اکتا جائیں گے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ بندہ اکتا کر جب عبادت چھوڑ دے گا تو اس عبادت کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجر وثواب دیا جاتا تھا؛ وہ بھی منقطع ہوجائے گا۔ اسی کو ﴿تَمَلُّوْا﴾ سے تعبیر کیا گیا۔

﴿مداومت ہی اثر دکھلاتی ہے﴾

﴿وَكَانَ اَحَبُّ الدِّیْنِ اِلَیْهِ مَادَاوَمَ صَاحِبُهٗ عَلَیْهِ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دین کے اندر وہ طریقہ سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے جس پر آدمی مداومت اور ہمیشگی کرے یعنی چاہیں تو آپ مختصر سا عمل شروع کیجیے؛ لیکن اس پر ہمیشگی اور پابندی ہونی چاہیے، اللہ تعالیٰ کو یہ زیادہ پسند ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو آگے جا کر اپنا اثر دکھلاتی ہے، گویا آپ نے جوش میں آکر دو تین رات تک رات رات بھر عبادت کی، اور پھر ایسا چھوڑا کہ فرض نماز بھی نہیں پڑھتے اس کے مقابلہ میں اگر روزانہ صرف دو رکعات پڑھتے لیکن اس پر مداومت کرتے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو بڑی اہمیت دی جاتی، اور اللہ تعالیٰ کو یہی زیادہ پسند بھی ہے۔

جیسے ایک قطرہ اگر پتھر کے اوپر ٹپکتا رہے؛ تو ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پتھر کے

اندر بھی سوراخ کردے گا۔اوراگر یکبارگی ایک گھنٹے تک کتنا ہی پانی ڈال دیا جائے تو چھوٹے سے پتھر پر بھی کوئی اثر ہونے والانہیں ہے۔

﴿جیسا تعلق اور جیسی محبت﴾

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہی عمل پسندیدہ ہے جس پر آدمی مداومت کرے۔اور مداومت ہی تعلق مع اللہ کی علامت ہے۔مثال کے طور پر آدمی کو کسی کے ساتھ محبت ہو تو اس تعلق اور محبت کی بنیاد پر ربط پیدا کرنے کے لئے اس نے یہ سبیل نکالی کہ روزانہ شام کو عصر کے بعد دس پندرہ منٹ کے لئے اس کے پاس بیٹھنے کے لئے جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جتنی محبت ہوگی؛ ویسا ہی معاملہ کرے گا۔محبت زیادہ ہوگی تو کبھی وہ اپنے معمول میں ناغہ نہیں کرے گا۔کہیں بھی گیا ہو؛ لیکن خیال رہے گا کہ ''مجھے تو وہاں جانا ہے'' کیونکہ اس کے دل میں ایک احساس ہے، اس کی قدر اور اہمیت کو وہ سمجھتا ہے، جس کے پاس بیٹھنے کے لئے جاتا ہے اس کے ساتھ دل میں اتنا زیادہ تعلق اور محبت ہے کہ وہ اس چیز کو گوارہ ہی نہیں کرسکتا کہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنے کی جو سعادت اور موقعہ ملا ہے؛ مَیں اس کو چھوڑ دوں وہ کہیں بھی گیا ہوگا؛ وہاں سے ضرور آئے گا۔اوراگر تعلق اتنا زیادہ نہیں ہے تو سوچے گا کہ آج نہیں گئے تو کیا ہوا، پھر چلے جائیں گے، دوسرے روز نہیں گئے، تیسرے روز چلے جائیں گے۔جیسا تعلق اور جیسی محبت ہوتی ہے؛ ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔

اسی طرح آدمی کا اپنے کسی عمل پر مداومت اور پابندی کا اہتمام کرنا؛ یہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق کی علامت اور نشانی ہے، اگر پابندی کرے گا؛ تب ہی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ ہمارے اکابر کے یہاں یہی کہا جاتا ہے۔حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے

کہ معمولات کی پابندی ترقی کا زینہ ہے، آدمی نے اپنا جو معمول طے کیا ہے؛ اس پر ہمیشہ پابندی کرے۔

متروکات

اور معمول کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اس پر پابندی ہو۔ ایک مرتبہ مَیں نے حضرت کو لکھا کہ معمولات پر پابندی نہیں ہو رہی ہے۔ تو حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا کہ پھر تو وہ معمولات نہیں رہے؛ متروکات ہو گئے۔ یعنی معمول کا مطلب ہی یہ ہے کہ جس پر عمل کیا جائے، جب عمل ہی نہیں رہا، تو وہ معمول کہاں ہوا؛ وہ تو متروک ہوا۔

خصوصی تعلق کی علامت

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کا جس کے ساتھ جتنا تعلق ہوتا ہے، اس کے بتلائے ہوئے کاموں کا وہ اتنا ہی اہتمام کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی وہ عمل پسندیدہ ہے جس پر مداومت کی جائے۔ اور وہ اسی لئے پسندیدہ ہے کہ چاہے وہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن جب آدمی اس پر پابندی کرتا ہے؛ تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس آدمی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ربط ہے کہ وہ اس چھوٹے سے عمل کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اگر دو رکعات پڑھنے کا معمول بنایا ہے کہ رات کو فلاں وقت پڑھوں گا؛ تو پھر وہ ہر حال میں پڑھے گا، چاہے کتنا ہی تھکا ہوا ہو، اور چاہے کیسی ہی حالت میں ہو، کہیں سے بھی آیا ہو؛ لیکن وہ دو رکعات جو پڑھنی ہے وہ تو پڑھنی ہی ہے۔ اور یہی اس بات کی علامت ہے کہ اس کو خصوصی تعلق اور ربط ہے۔

﴿نبی کریم ﷺ کے معمولات﴾

عن أنس رضی اللہ عنہ قال: جآءَ ثَلاثَةُ رَهْطٍ اِلیٰ بُيُوْتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُوْنَ عَنْ عِبَادَةِ النَّبِيِّ ﷺ. فَلَمَّا أُخْبِرُوْا كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا وقالوا: أَيْنَ نَحْنُ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ غُفِرَ لَهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَاتَأَخَّرَ. قَالَ أَحَدُهُمْ: أَمَّا أَنَا فَأُصَلِّي اللَّيْلَ أَبَداً. وَقَالَ الآخرُ: وَأَنَا أَصُوْمُ الدَّهْرَ أَبَداً، وَلاَ أُفْطِرُ. وَقَالَ الآخرُ: وَأَنَا أَعْتَزِلُ النِّسَآءَ فَلاَ أَتَزَوَّجُ أَبَداً. فَجَآءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِلَيْهِمْ. فَقَالَ: أَنْتُمُ الَّذِيْنَ قُلْتُمْ كَذَا وَكَذَا؟ أَمَا وَاللهِ اِنِّيْ لَأَخْشَاكُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاكُمْ لَهُ وَلٰكِنِّيْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُ وَأُصَلِّيْ وَأَرْقُدُ، وَأَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ. فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں سے ایک کے یہاں یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہاں گئے تاکہ حضورِ اکرم ﷺ کی عبادت کے متعلق سوال کریں کہ آپ ﷺ کے معمولات نماز روزہ وغیرہ میں کیا ہیں، آپ کی عبادت کی کیفیت کیا ہے۔ چنانچہ ان حضرات کو بتلایا گیا کہ حضورِ اکرم ﷺ رات کے ایک حصہ میں آرام فرماتے ہیں اور ایک حصہ میں عبادت کرتے ہیں۔ اور روزوں کے متعلق بتلایا کہ نبی کریم ﷺ مہینہ کے کچھ دن روزے رکھتے ہیں اور بقیہ دنوں میں افطار کرتے ہیں۔ جو بھی تفصیل تھی؛ وہ بتلائی گئی۔

﴿كَأَنَّهُمْ تَقَالُّوْهَا﴾ راوی کہتے ہیں کہ جب ان کو وہ تفصیل بتائی گئی تو چونکہ وہ حضرات پہلے سے اپنے ذہنوں میں نبی کریم ﷺ کی عبادتوں کے متعلق ایک خیال لے کر آئے تھے، اور یہ سوچ رکھا تھا کہ عبادتوں کی بڑی تفصیل سننے کو ملے گی، لیکن جب یہ سب سنا تو انہوں نے اس کو کم سمجھا یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی عبادتوں کے متعلق جو خیال کیا تھا؛ وہ بات سننے کو نہیں ملی۔ تو اب انہوں نے تاویل کی کہ حضورِ اکرم ﷺ کو زیادہ عبادت کی

ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ تو بخشے بخشائے ہیں، البتہ ہم گنہ گار ہیں اور ہمارا معاملہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ماتحت ہے، معلوم نہیں کہ ہمارے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا فیصلہ ہو؛ لہٰذا اگر ہم نے اہتمام نہیں کیا تو ہم ہلاک ہوسکتے ہیں۔

بعض روایتوں میں تینوں حضراتِ صحابہ کے نام موجود ہیں۔ مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے بعض حضرات نے یہ نام لکھے ہیں:- حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم۔ (فتح الباری ۹/۱۲۶)

اپنے طور پر تقویٰ کا معیار

اس کے بعد ان تین میں سے ایک نے یہ کہا کہ مَیں تو ہمیشہ راتوں کو نماز ہی پڑھتا رہوں گا، یعنی مَیں کبھی بھی رات کو سوؤں گا نہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک پورا وقت نماز ہی میں گزاروں گا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ مَیں ہمیشہ روزہ رکھوں گا؛ کبھی افطار نہیں کروں گا، یعنی شام کو تو افطار کیا جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی دن خالی جانے نہیں دوں گا، بلکہ روزانہ روزے رکھوں گا۔ تیسرے صحابی نے یوں کہا کہ مَیں ہمیشہ عورتوں سے الگ رہوں گا؛ کبھی نکاح نہیں کروں گا۔ گویا انہوں نے نکاح کرنے کو اور عورتوں سے مخالطت اختیار کرنے کو تقویٰ کے خلاف سمجھا۔ ان تینوں حضرات نے اپنے اپنے طور پر ایک ایک چیز کا عہد کیا اور اپنے عزم کا اظہار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے ہی کیا اور پھر چل دیے۔

تقویٰ کا اصل معیار

جب حضور اکرم ﷺ مکان پر تشریف لائے تو ام المؤمنین نے حضور کو بتلایا کہ آج تو ایسا ہوا کہ فلاں فلاں صاحب آئے تھے، انہوں نے آپ کی عبادتوں کے متعلق سوالات کئے،

مَیں نے ان کو بتلائے تو اس پر انہوں نے اپنے ارادوں کا اظہار کیا۔ جب حضور اکرم ﷺ کو یہ معلوم ہوا تو آپ بنفسِ نفیس ان تینوں حضرات کے پاس تشریف لے گئے۔ پہلے تو ان سے دریافت فرمایا کہ مجھ تک جو خبر پہنچی ہے کہ کسی نے ایسی باتیں کہی ہیں؛ تو کیا وہ تم ہی لوگوں نے کہی ہیں؟ انہوں نے جواب میں اس کا اقرار کیا کہ جی ہاں۔ تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

﴿أَمَاوَاللهِ اِنِّیْ لَأَخْشَاکُمْ لِلّٰهِ وَأَتْقَاکُمْ لَهٗ وَلٰکِنِّیْ أَصُوْمُ وَأُفْطِرُوَأُصَلِّیْ وَأَرْقُدُ، وَأَتزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ﴾ سنو! اللہ کی قسم! مَیں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف رکھنے والا ہوں لیکن مَیں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔ یعنی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شاید تم نے تقویٰ اور خشیت کا اعلیٰ درجہ یہ سمجھا ہے کہ آدمی رات بھر عبادت کرتا رہے، اور ہمیشہ روزہ رکھتا رہے، اسی لئے شاید تم نے یہ فیصلے کئے ہوں گے؛ لیکن یاد رکھو! مَیں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا ڈر رکھنے والا اور تقویٰ والا ہوں، اگر تقویٰ کا تقاضہ وہی ہوتا جس کا اظہار تم نے کیا؛ تو یقیناً یہ اعمال مَیں کرتا، یعنی مَیں رات بھر عبادت کرتا اور ہمیشہ روزے رکھتا اور مَیں کبھی کسی عورت سے نکاح نہیں کرتا۔

﴿اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں﴾

لیکن تقویٰ کا اعلیٰ درجہ وہی ہے جس کو مَیں بتلا رہا ہوں۔ مَیں نے تمہارے لئے جو طریقہ اختیار کیا اور مَیں تمہیں جس طریقہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہوں؛ اسی پر چلو۔ اور مَیں نے اپنا طریقہ بتلا دیا کہ مَیں کچھ دن روزہ رکھتا ہوں، کچھ دن افطار کرتا ہوں۔ کچھ وقت سوتا ہوں، کچھ دیر عبادت کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں، اس لئے میرے طریقہ پر چلو، جو آدمی میرے طریقہ سے ہٹے گا؛ اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿ دین اس کا نام نہیں ہے ﴾

حقیقت یہی ہے کہ دین اس کا نام نہیں کہ آدمی اپنے طور پر کوئی طریقہ تجویز کرلے، اپنے طور پر کوئی روش اختیار کرلے اور اسی کو پکڑے رہے اور یوں سمجھے کہ مَیں اس طرح اللہ کا قرب اور اس کی رضامندی حاصل کرلوں گا۔ بلکہ دین تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے جو چاہتے ہیں؛ ہم وہی کریں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے جو طریقہ ہمیں بتلادیا؛ وہی دین ہے، چاہے وہ طریقہ آسان ہو یا مشکل ہو۔ ویسے حضور ﷺ کا معمول یہی تھا ﴿مَاخُيِّرَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بَيْنَ أَمْرَيْنِ اِلَّا اِخْتَارَ أَهْوَنَهُمَا (بخاری شریف ۱/۵۰۳)﴾ آپ ﷺ کو دو چیزوں میں سے اگر ایک چیز کا اختیار دیا جاتا تھا؛ تو جو آسان چیز ہوتی تھی اسی کو آپ پسند فرماتے تھے۔

نعوذ باللہ! کیا آپ سہل نگاری کے طور پر یا عیش کوشی کے طور پر یا اپنے جسم کو آرام دینے کے واسطے آسان چیز اختیار کرتے تھے؟ نہیں! بلکہ آپ اپنے اس طریقہ سے امت کو ایک تعلیم دینا چاہتے تھے۔

بہرحال! جو طریقہ شریعت نے بتلایا اس کے مطابق چلنے کا نام ہی دین ہے۔ دین یہ نہیں کہ ہم اپنی مرضی سے ایک چیز تجویز کرلیں اور اس پر چلتے رہیں، اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانے کا نام دین ہے۔ اگر اس کا حکم یہ ہے کہ سوجاؤ؛ تو سوجانا ہی دین ہے۔ اور اگر حکم ہے کہ جاگو؛ تو پھر جاگنا دین ہے۔

﴿ آپ کی پکڑ ہوجائے گی ﴾

نماز سے بڑھ کر بڑی عبادت اور کونسی ہوسکتی ہے؟ لیکن شریعت نے بعض اوقات وہ بھی بتلائے جن میں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ سورج طلوع ہو رہا ہو، یا بالکل سر کے

اوپر ہو، یا غروب ہورہا ہو۔ یہ اوقات اور ٹائم کیوں رکھے؟ گویا تعلیم دی جارہی ہے کہ دیکھئے! یہ نماز اپنی جگہ پر بہت اونچی چیز ہے، لیکن ہم نے منع کردیا کہ اس وقت نماز نہ پڑھیے؛ اب اگر اس وقت آپ نماز پڑھیں گے، تو گنہ گار قرار دئے جائیں گے۔ ثواب ملنا تو دور کی بات رہی؛ اس پر گناہ ہوگا اور آپ کی پکڑ ہوجائے گی۔

روزہ ایک عبادت ہے لیکن شریعت نے کچھ ایام ایسے بھی رکھے ہیں کہ ان میں روزہ رکھنا منع ہے۔ عید کے دونوں دن اور ایام تشریق ۱۱، ۱۲، ۱۳/ ذی الحجہ۔ اگر کوئی شخص ان دنوں میں روزہ رکھے گا؛ تو گنہ گار ہوگا۔ دیکھئے! روزہ اپنی جگہ پر عبادت ہے، لیکن ایسے احکام کیوں دئے؟ یہ بتلانے کے لئے کہ آپ ان عبادتوں کی صورتوں کو یہ نہ سمجھئے کہ یہی اصل ہے؛ بلکہ اصل تو اللہ تعالیٰ کے حکم کو بجالانا ہے۔

حج میں کیا ہوتا ہے؟

حج میں کیا ہوتا ہے؟ آٹھویں ذی الحجہ کو آپ مکہ مکرمہ سے منٰی روانہ ہوجایئے، اب منٰی جاکر کیا کرنا ہے؟ کچھ کرنا نہیں ہے، وہاں ٹھہر کر صرف پانچ نمازیں پڑھنی ہیں۔ ارے بھائی! حرم شریف کو چھوڑ کر- جہاں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ کے برابر ہے، کعبہ اپنی نگاہوں کے سامنے ہے، اس کو چھوڑ کر- وہاں جائیں؟ حالانکہ وہاں کوئی کام بھی نہیں کرنا ہے، وہاں صرف ٹھہرنا ہے اور پانچ نمازیں- ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور دوسرے دن کی فجر- پڑھنی ہیں اور پھر نویں تاریخ کو عرفہ جانا ہے۔ تو آٹھویں تاریخ کو منٰی کیوں بھیجا گیا؟ یہی بتلانے کے لئے کہ آپ کو ہم نے اپنے گھر پر حج کے واسطے بلایا ہے، تو یہ نہ سوچئے کہ یہاں حرم کی نماز چھوڑ کر جارہے ہیں، بلکہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہے، اسی میں اس کی رضامندی اور خوشنودی ہے۔

بلکہ حج کے تو تمام افعال ہی ایسے ہیں کہ وہاں عشق کا مظاہرہ کرایا جارہا ہے۔ عاشق دوسرا کچھ نہیں دیکھتا ہے، وہ تو بس یہی دیکھتا ہے کہ محبوب مجھ سے کیا چاہتا ہے، محبوب جو کہے؛ اس کو کرنے کے لئے تیار ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ عبادت کسی خاص فعل یا خاص صورت کا نام نہیں ہے؛ بلکہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری کا نام ہے، جس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا گیا، اس حکم کو آپ بجالائیں؛ یہی عبادت ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی میانہ روی اسی وقت اختیار کرے گا؛ جب اس کا ذہن صاف ہوگا اور کسی خاص عمل میں یہ نہیں دیکھے گا کہ اسی عمل کے ذریعہ میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہوں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ یہ طریقہ نہیں تو اور سہی۔ آگے روایت لائیں گے، اس میں تفصیل آئے گی۔

بہر حال! مَیں یہ بتلانا چاہتا تھا کہ جو عنوان قائم کیا ہے ﴿الاقتصاد في الطاعة﴾ آدمی کو عبادت کے اندر درمیانی راہ اختیار کرنی چاہیے، وہ اسی لئے کہ آدمی اگر افراط وتفریط اور مبالغہ سے کام لے گا؛ تو پھر وہ کبھی بھی پابندی اور مداومت نہیں کرسکے گا، اور جب مداومت نہیں کرسکے گا؛ تو کبھی اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکے گا۔ اسی لئے شریعت نے درمیانی راہ اختیار کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿اللہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق نصیب فرمائے﴾

اقتباس

دو شکلیں ہیں ایک صورت تو یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی دین پر عمل کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے؛ تو اس کو تفریط سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ دین پر عمل کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی سے اور بہت زیادہ مبالغہ سے کام لے؛ اسی کو غلو سے تعبیر کیا گیا۔

جو آدمی دین کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے، اس کا غلط ہونا تو سب ہی جانتے ہیں، اس کو کوئی بھی اچھا نہیں سمجھتا، اور کسی کو اس کے متعلق یہ خیال نہیں ہوتا کہ یہ چیز دین میں پسندیدہ ہوگی

لیکن ایک آدمی دین کے معاملہ میں مبالغہ سے کام لیتا ہے، شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان سے آگے بڑھ کر اپنی ذات کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہے، اس کے متعلق لوگوں کو شاید یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ آدمی دین پر عمل کرنے کے معاملہ میں لوگوں سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا ہے اور ترقی کیئے ہوئے ہے، اور ہوسکتا تھا کہ کچھ لوگ اس کی اس روش کو پسندیدہ قرار دیں

تو نبی کریم ﷺ نے خاص طور پر ایسے لوگوں کے معاملہ میں فرمایا

"ایسے لوگ ہلاک ہو گئے"

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:

﴿ایسے لوگ ہلاک ہو گئے﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: هَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ. قَالَهَاثَلَاثاً. (رواہ مسلم)

((اَلْمُتَنَطِّعُوْنَ))اَلْمُتَعَمِّقُوْنَ الْمُشَدِّدُوْنَ فِیْ غَیْرِمَوْضِعِ التَّشْدِیْدِ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ "مُتَنَطِّعُوْن" ہلاک ہوگئے۔آپ نے تین مرتبہ یہ فرمایا۔"مُتَنَطِّعُوْن"کامطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جوایسی جگہ سختی کرتے ہیں جہاں سختی نہیں کرنی چاہیے، جولوگ تشدد سے کام لیتے ہیں اور غلوکرتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشادفرمایا۔گویاغلوآخری اورانتہا کادرجہ ہے۔

دوشکلیں ہیں اگرکوئی آدمی دین پرعمل کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے؛ تواس کو تفریط سے تعبیرکیاجاتا ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ دین پرعمل کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی سے اوربہت زیادہ مبالغہ سے کام لے؛اسی کوغلوسے تعبیرکیا گیا۔اورجوآدمی دین کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لے،اس کاغلط ہوناتوسب ہی جانتے ہیں،اس کوکوئی بھی اچھانہیں سمجھتا، اورکسی کواس کے متعلق یہ خیال نہیں ہوتاکہ یہ چیزدین میں پسندیدہ ہوگی۔مثلاًایک آدمی

نمازوں کا اہتمام نہیں کرتا، اس میں کوتاہی کرتا ہے۔ روزوں کی ادائیگی میں، زکوٰۃ کی ادائیگی میں، دوسری عبادات اور احکام کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے؛ اس کا برا ہونا تو سب ہی کو معلوم ہے۔ لیکن ایک آدمی ان چیزوں کی ادائیگی میں مبالغہ سے کام لیتا ہے، شریعت نے جو حدود مقرر کی ہیں، ان سے آگے بڑھ کر اپنی ذات کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتا ہے، اس کے متعلق لوگوں کو شاید یہ خیال ہوسکتا تھا کہ یہ آدمی دین پر عمل کرنے کے معاملہ میں لوگوں سے بہت زیادہ آگے بڑھا ہوا ہے اور ترقی کئے ہوئے ہے، اور ہوسکتا تھا کہ کچھ لوگ اس کی اس روش کو پسندیدہ قرار دیں؛ تو نبی کریم ﷺ نے خاص طور پر ایسے لوگوں کے معاملہ میں فرمایا کہ ایسے لوگ ہلاک ہوگئے۔

''ہلاک ہوگئے'' کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے دین پر عمل کے معاملہ میں اپنی ذات کے ساتھ سختی کی جو روش اختیار کر رکھی ہے؛ وہ ایسی ہے جو ہمیشہ باقی نہیں رہتی اور اس پر وہ پابندی نہیں کر سکتے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود اس کو نباہنے سے عاجز ہو جائیں گے اور یہی چیز ان کے لئے ہلاکت کا باعث ہوگی۔

دین آسان ہے

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُّشَادَّ الدِّيْنُ اِلَّا غَلَبَهٗ فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَأَبْشِرُوْا وَأَسْتَعِيْنُوْا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِّنَ الدُّلْجَةِ.

وفی رواية له: سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا، وَاغْدُوْا وَرُوْحُوْا وَشَيْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ. اَلْقَصْدَ اَلْقَصْدَ تَبْلُغُوْا.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دین آسان ہے یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کے اندر جن چیزوں کے کرنے کا بندوں کو مکلّف بنایا ہے؛ وہ ایسے ہی احکام ہیں کہ جن پر بندے آسانی سے عمل کر سکتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کے معاملہ

میں ان کے لئے کوئی دشواری یا تکلیف نہیں ہے۔ اور یہی دین کا خاص مزاج ہے کہ انسانوں کی طبیعتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے احکام کا مکلّف بنایا جائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی انسانوں کو پیدا کیا ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ جو پیدا کرنے والی ذات ہے؛ کیا بھلا وہی نہیں جانے گی؟ وہ تو بخوبی واقف ہے کہ جن کو پیدا کیا ہے، ان کا مزاج کیسا ہے اور ان کی طبیعتیں کتنی چیز کو برداشت کر سکتی ہیں۔ لہٰذا اللہ تبارک وتعالیٰ اتنی حد تک ہی بندوں کو حکم دیتے ہیں؛ جو ان کی برداشت کے اندر ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا﴾ اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی چیز کا مکلّف اور پابند نہیں بناتے؛ جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ لہٰذا شریعت کے جتنے بھی احکام ہیں، وہ تمام اسی انداز سے دیے گئے ہیں کہ بندے وہ آسانی کے ساتھ ان پر عمل کر سکیں۔ اسی کو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دین عمل کے اعتبار سے آسان ہے اور دین کے ساتھ زور آزمائی نہیں کی جائیگی؛ مگر یہ کہ دین ہی اس کے اوپر غالب آئے گا۔

﴿دین اس پر غالب آجاتا ہے﴾

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کے دوسرے الفاظ بھی نقل کئے ہیں۔ ﴿لَن يُّشَادَّ﴾ مجہول کا صیغہ ہے، عربی جاننے والے موجود ہیں جو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں ﴿الدِّينُ﴾ اس کا نائب فعل بنتا ہے۔ لیکن دوسری روایت میں ہے ﴿لَن يُّشَادَّ الدِّيْنَ أَحَدٌ﴾ کوئی آدمی اگر اس دین کے ساتھ زور آزمائی اور مقابلہ کرتا ہے؛ تو دین ہی اس کے اوپر غالب آجاتا ہے۔

"دین اس پر غالب آجاتا ہے" کا مطلب یہ ہے کہ دین اس کی اصل کے اعتبار سے تو آسان ہی ہے، لیکن یہ آدمی اپنے طور پر دین پر عمل کے معاملہ میں اپنے اوپر کچھ سختیاں

لاد کر یوں سمجھتا ہے کہ مَیں کچھ اور ترقی کر لوں گا، لیکن ان سختیوں کو اپنے اوپر لاگو کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ ان چیزوں کو نباہ نہیں سکے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے گئے ہیں اس میں بندوں کی طبیعتوں کا لحاظ کیا گیا ہے اور وہ اس سے آگے بڑھنا چاہتا ہے، گویا اس کی طبیعت جس چیز کو آگے تک برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس نے از خود اپنے اوپر اس کو لاگو کر دیا اور اپنے آپ کو اس کا پابند بنا دیا۔ اب ممکن ہے کہ چند دنوں تک تو اس کو نباہ سکے اور اس پر عمل کر سکے؛ لیکن ایک وقت آئے گا کہ وہ اس پر پابندی نہیں کر سکے گا، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ تھک ہار کر بیٹھ جائے گا۔ اس کو پہلے ہی سے کہا گیا تھا کہ یہ راستہ اختیار مت کرو، اس راستہ پر آپ آگے تک نہیں جا سکتے، لیکن اس نے نہیں مانا اور خود ہی اپنے اوپر پابندی عائد کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک حد تک جانے کے بعد وہ خود ہی تھک گیا اور عاجز آ گیا۔

﴿لِكَثْرَةِ طُرُقِهٖ﴾ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دین کے اندر کسی ایک عمل کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ دین میں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے طرف سے بیشمار چیزیں بندوں کو بتلائی گئی ہیں، روزہ بھی ہے، نماز بھی ہے، زکوٰۃ بھی ہے، حج بھی ہے؛ اور بیشمار ایسے راستے ہیں جن کی بندوں کو ہدایت اور رہنمائی کی گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ آدمی جو غلو کر رہا ہے اور اپنے آپ پر سختی کا جو معاملہ کر رہا ہے، یہ معاملہ تمام چیزوں میں تو نہیں کر سکتا۔

فرض کر لیجیے کہ ایک آدمی نے پوری رات نماز پڑھنے کی ٹھان لی، تو بس! وہ نماز تک اپنے اوپر سختی کرے گا، لیکن جب روزوں کا معاملہ آئے گا؛ وہاں یہ نہیں کر سکے گا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال خرچ کرنے کی بات آئے گی؛ وہاں یہ نہیں کر سکے گا۔ یعنی اگر اس کو آگے ہی بڑھنا تھا، تو پھر ان سب میں کرتا لیکن وہ نہیں کر سکے گا۔ اور یہاں پر بھی یہ رات بھر نماز پڑھنے

کا جو سلسلہ شروع کرے گا؛ اس کو بھی آگے جا کر اپنے مزاج اور طبیعت کی وجہ سے نباہ نہیں سکے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کا تفصیلی قصہ آگے آئے گا۔

﴿ اگر پہلے ہی سے اس پر عمل کرلیا ہوتا...... ﴾

خلاصہ یہ ہوا کہ دین کے کام اور نیکی کے راستے تو بیشمار ہیں، کوئی شخص اگر غلو کرے گا؛ تو کہاں تک کرے گا؟ ایک میں کرے گا، دوسرے میں کرے گا، لیکن کتنی چیزوں میں نباہ سکے گا؟ آخر تھک ہار کر بیٹھ جائے گا، اور پھر دین اس پر غالب آجائے گا۔ گویا دین نے پہلے روز سے جو حکم دیا تھا کہ اس طرح چلنا؛ آج اتنی ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ بات اس کی سمجھ میں آئی، اگر پہلے ہی سے اس پر عمل کرلیا ہوتا؛ تو اس کی نوبت نہ آتی۔

﴿ بہت اونچی اُڑان مت بھرو ﴾

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ﴿فَسَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَأَبْشِرُوْا﴾ اسی لئے میانہ روی اختیار کرو، نہ افراط سے کام لو، نہ تفریط سے کام لو۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ﴿سَدِّدُوْا﴾ کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ بلند پروازیاں مت کرو، بہت اونچی اُڑان مت بھرو؛ بلکہ شریعت نے جو حدود رکھے ہیں؛ ان کے اندر چلو۔ اور میانہ روی کا جیسا حق ہے؛ وہ تو تم پورا نہیں کرسکو گے، اس لئے کم سے کم میانہ روی کے قریب رہنے کی کوشش کرنا، اس سے بہت زیادہ دور مت جا پڑیو۔ ﴿وَأَبْشِرُوْا﴾ اور لوگوں کو بشارتیں سناؤ۔

﴿ یہ بھی ایک سفر ہے ﴾

اور صبح کی کچھ سیر اور سفر سے، اور شام کے سفر سے، اور رات کے سفر سے مدد حاصل کرو۔ اصل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی راہ چلنے والے کو مسافر سے تشبیہ دی ہے، چونکہ اس

زمانہ میں سواریوں کا یہ رواج جو آج ہمارے دور میں ہے؛ وہ تو تھا نہیں۔ جہاں بھی جانا ہوتا تھا تو عام طور پر قافلے والوں کے ساتھ اونٹوں کے اوپر جایا کرتے تھے اور مسافتیں طے کیا کرتے تھے۔ اور اس وقت نظام یہ ہوتا تھا کہ قافلے دن کے شروع میں سورج اُگنے کے بعد کچھ دیر چلتے تھے یعنی دو تین گھنٹے کا سفر کیا جاتا تھا اور پھر جب دھوپ تیز ہوتی تھی تو وہ لوگ چلنے کا سلسلہ منقطع کر کے کسی جگہ پڑاؤ ڈال دیتے تھے اور آرام کر لیتے تھے۔ پھر دوپہر کے بعد دھوپ کی تیزی کچھ کم ہونے لگتی تھی تو پھر سفر شروع ہوتا اور یہ سفر دن کے آخری وقت میں تین چار گھنٹے کا ہوتا، جب تھک جاتے تو پھر ذرا آرام کر لیتے۔ رات کے شروع حصہ میں آرام کیا اور پھر رات کے اخیر حصہ میں سفر شروع ہوتا تھا، چند گھنٹے کا وہ سفر ہوتا۔ اس طرح تین حصہ میں دن بھر کا سفر کیا جاتا تھا۔ اسی طرح مہینہ دو مہینہ کا سفر ہوتا تھا اور سفر قطع کرنے کی صورت یہی ہوتی تھی۔

ایسا نہیں کرتے تھے کہ صبح سات بجے سفر شروع کیا تو شام کے سات بجے تک چلتے ہی رہے۔ آج کل کی ہماری جو سواریاں ٹرین وغیرہ کی ہیں، یہ تو اپنے طور پر چلتی ہیں، جہاں ہمیں اترنا ہوتا ہے، وہاں پر ہم اتر جاتے ہیں، یہ ایک الگ نظام ہے۔ لیکن اُس زمانہ میں اونٹ اور دوسرے جانوروں کے ذریعہ یا پیدل سفر کیا جاتا تھا، لہٰذا وہاں تو ظاہر ہے کہ سواری کو بھی آرام دینا ہی پڑتا تھا۔

اعتدال: منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ تمہارا یہ جسمانی اور ظاہری سفر دن بھر کی تین قسطوں میں چلاتے ہو اور اس طرح دھیرے دھیرے اپنی منزل تک پہنچ جاتے ہو، یہ درمیانی اور معتدل

طریقہ ہے؛ اسی طرح روحانی سفر کو قطع کرنے کے لئے بھی یہی روش اختیار کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور عبادت کے معاملہ میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ کچھ دیر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہے، پھر جسم میں تھکاوٹ کا احساس ہونے لگا تو جسم کو کچھ آرام دے دیا، پھر طبیعت میں نشاط پیدا ہو گیا اور تازگی آ گئی، طبیعت کچھ فریش (Fresh) ہو گئی؛ تو پھر سے اپنا کام شروع کر دیا۔ اگر اسی طرح کرتے رہو گے تو پوری توجہ اور دل بستگی کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہے گا، کبھی طبیعت کے اندر اُکتاہٹ پیدا نہیں ہوگی، اور ہمیشہ پوری قوت اور اعتدال کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہو گے اور ایک وقت آئے گا کہ منزل تک پہنچ جاؤ گے۔ اور اگر کبھی جوش میں آ کر زور آزمائی کر لی اور ایک ساتھ زیادہ کام کر لیا؛ تو پھر تھک کر ایسے بیٹھ جاؤ گے کہ منزل تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

آپ کو لذت بھی محسوس ہوگی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور ﷺ کی اسی حدیث کو ایک اور طریقہ سے سمجھایا کہ دیکھو! تمہاری طبیعتوں کے بھی نشاط کے اوقات ہوتے ہیں جیسے کہ سفر کے لئے یہ تین وقت نشاط کے ہوتے ہیں کہ ان اوقات میں طبیعت کی تازگی کے ساتھ سفر کیا جاتا ہے، اسی طریقہ سے اپنے روحانی سفر اور اعمال کی ادائیگی کے لئے بھی نشاط والے اوقات کو پسند کرو، ان اوقات میں اگر ہم عبادت کریں گے؛ تو پورا دل لگے گا اور اس کا حق بھی ادا ہوگا اور پوری دل جمعی اور دل بستگی کے ساتھ عبادت کر سکیں گے اور اس میں لذت بھی محسوس ہوگی۔ اس لئے کہ آدمی جب نشاط کے ساتھ کوئی کام کرتا ہے تو لذت بھی محسوس ہوتی ہے۔ اور جو کام اکتاہٹ اور دل کی تنگی کے ساتھ کرتا ہے؛ وہ ایک بوجھ سمجھ کر کرتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس

طرح تم کرو گے تو اپنے مقصود تک اور اپنی منزل تک پہنچ جاؤ گے ﴿كَمَا أَنَّ الْمُسَافِرَ الْحَاذِقَ يَسِيْرُ فِي هٰذِهِ الأوْقَاتِ وَيَسْتَرِيْحُ هُوَ وَدَابَّتُهُ فِيْ غَيْرِهَا، فَيَصِلُ الْمَقْصُوْدَ بِغَيْرِ تَعَبٍ﴾ جیسے سمجھ دار مسافر ان تین اوقات میں چلتا ہے اور سفر جاری رکھتا ہے، باقی اوقات میں خود بھی آرام کرتا ہے اور اپنی سواری کو بھی آرام دیتا ہے اور اس طرح منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔

﴿ایک اصول﴾

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ الْمَسْجِدَ، فَإِذَا حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ بَيْنَ السَّارِيَتَيْنِ. فَقَالَ: مَا هٰذَا الْحَبْلُ؟ قَالُوْا: هٰذَا حَبْلٌ لِزَيْنَبَ. فَإِذَا فَتَرَتْ، تَعَلَّقَتْ بِهٖ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: حُلُّوْهُ لِيُصَلِّ أَحَدُكُمْ نَشَاطَهُ، فَإِذَا فَتَرَ فَلْيَرْقُدْ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دوستونوں کے بیچ میں آڑی (عرض میں) ایک رسّی بندھی ہوئی ہے۔ حضور ﷺ نے پوچھا: یہ رسّی کیسی ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ زینب کی باندھی ہوئی رسّی ہے۔ ایک صحابیہ عورت تھیں جو بڑی عبادت گذار تھیں۔ لوگوں نے بتلایا کہ جب وہ نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہیں تو رسّی کو پکڑ لیتی ہیں؛ تاکہ کھڑے رہنے میں مدد ملے۔ گویا اس کو پکڑ کر اپنے آپ کو کھڑا رکھتی ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو کھول دو۔ پھر حضور ﷺ نے ایک اصول بتلادیا کہ جب تک طبیعت میں تازگی، نشاط اور چُستی باقی رہے؛ وہاں تک عبادت کرو، جب تھک جاؤ تو کوئی زبردستی نہیں ہے کہ اس طرح رسّیاں باندھ کر اپنے آپ کو لگائے رکھو، بلکہ پھر آرام کرلو کیونکہ تھکنے کے بعد بھی اس طرح اپنے آپ کو زبردستی اسی میں لگائے رکھنا؛ یہ ایک طرح کا غلو تھا، اور غلو کو نبی کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا ہے۔

دورانِ عبادت جب اونگھ آئے

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنّ رسولَ اللهِ ﷺ قال: اِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّيْ فَلْيَرْقُدْ، حَتّٰى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَاِنَّهُ اِذَا صَلّٰى وَهُوَ نَاعِسٌ لَا يَدْرِيْ لَعَلَّهُ يَذْهَبُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبَّ نَفْسَهُ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی رات کے وقت نماز پڑھ رہا ہے یا اور کوئی عبادت کر رہا ہے، اس دوران اونگھ آنے لگے اور اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں (کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے بھی اونگھ آتی ہے) تو اس کو سوجانا چاہیے، یہاں تک کہ نیند کی وجہ سے جو سُستی تھی؛ وہ ختم ہوجائے اور کچھ آرام مل جائے۔ اس لئے کہ اگر اونگھتے اونگھتے نماز پڑھے گا تو شاید وہ اپنے لئے مغفرت کی دعا کرنا چاہتا ہوگا اور اونگھ کی حالت میں دُعا کے بجائے بددُعا کے الفاظ اس کے منہ سے نکل جائیں گے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اس لئے کہ اونگھ کی وجہ سے اپنے اوپر کنٹرول اور قابو تو رہتا نہیں، اور عبادت کا جو مقصد ہے؛ وہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا اونگھ آرہی ہو اس کے باوجود بھی لگے ہوئے رہنا؛ یہ طریقہ غلو کا تھا، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

یہ یاد رہے

اس جگہ پر ایک اور بات ہے کہ یہ حکم اس آدمی کے لئے ہے جو اپنے نشاط کے اوقات میں عبادت کو ادا کرتا ہے اور نوافل میں ایسی صورت پیش آتی ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو فرض نماز پڑھنے کے لئے آتے ہیں تب بھی ان کو اونگھ آنے لگتی ہے، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرض نماز چھوڑ دی جائے، بلکہ پھر تو ان کو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ ایک بیماری ہے جس کا ہم کو علاج کرانا چاہیے۔ لہٰذا اپنے اس مرض کے علاج کی طرف توجہ کرے اور اس

کو دور کر کے ایسی شکل اختیار کرے کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض اور احکام کی ادائیگی میں اس کا جی لگنے لگے، اور آئندہ ایسی سستی کی نوبت نہ آئے۔ ورنہ پھر تو لوگ اسی حدیث کو بہانہ بنا کر فرائض کو بھی چھوڑنے لگیں گے، حالانکہ کوئی بھی اس کی اجازت نہیں دے گا۔ یہ یاد رہے۔

﴿آپ ﷺ کی نماز اور خطبہ﴾

وعن أبی عبداللہ جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنْتُ أُصَلِّي مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الصَّلَوَاتَ فَكَانَتْ صَلاَتُهُ قَصْداً، وَخُطْبَتُهُ قَصْداً. (قَصْداً أَیْ بَيْنَ الطُّوْلِ وَالْقِصَرِ)

حضرت جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ نمازیں پڑھتا تھا تو آپ کی نماز بھی درمیانی ہوتی تھی اور آپ کا خطبہ بھی درمیانی ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نماز نہ بہت لمبی ہوتی تھی، نہ بہت مختصر۔ یہی حال خطبہ کا ہوتا تھا، نہ بہت طویل ہوتا تھا، نہ بہت مختصر ہوتا تھا؛ بلکہ درمیانی ہوتا تھا۔ یہاں اسی کو بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اُمت کے لئے نماز اور خطبات میں عملی طور پر بھی جو نمونہ پیش فرمایا؛ اس میں درمیانی شکل اختیار فرمائی۔

﴿بھائی چارگی کا رشتہ بھی ہوتا ہے﴾

وعن أبی جُحَيْفَةَ وهب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قَالَ آخَی النَّبِیُّ ﷺ بَيْنَ سَلْمَانَ وَأَبِی الدَّرْدَاءِ، فَزَارَ سَلْمَانُ أَبَا الدَّرْدَاءِ. فَرَأَى أُمَّ الدَّرْدَاءِ مُتَبَذِّلَةً. فَقَالَ: مَاشَأْنُكِ؟ قَالَتْ: أَخُوْكَ أَبُو الدَّرْدَاءِ لَيْسَ لَهُ حَاجَةٌ فِي الدُّنْيَا. فَجَاءَ أَبُو الدَّرْدَاءِ، فَصَنَعَ لَهُ طَعَاماً. فَقَالَ لَهُ: كُلْ فَإِنِّي صَآئِمٌ. قَالَ: مَاأَنَا بِآكِلٍ حَتّٰی تَأْكُلَ، فَأَكَلَ. فَلَمَّا كَانَ اللَّيْلُ ذَهَبَ أَبُو الدَّرْدَاءِ يَقُوْمُ. فَقَالَ لَهُ: نَمْ فَنَامَ، ثُمَّ ذَهَبَ يَقُوْمُ. فَقَالَ لَهُ: نَمْ. فَلَمَّا كَانَ آخِرُ اللَّيْلِ قَالَ سَلْمَانُ: قُمِ الْاٰنَ. فَصَلَّيَا جَمِيْعاً. فَقَالَ

لَہٗ سَلْمَانُ: اِنَّ لِرَبِّکَ عَلَیْکَ حَقّاً، وَاِنَّ لِنَفْسِکَ عَلَیْکَ حَقّاً، وَلِاَ ھْلِکَ عَلَیْکَ حَقّاً، فَأَعْطِ کُلَّ ذِیْ حَقٍّ حَقَّہٗ. فَأَتَی النَّبِیَّ ﷺ، فَذَکَرَ ذٰلِکَ لَہٗ. فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: صَدَقَ سَلْمَانُ.

حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے درمیان بھائی چارگی کا رشتہ کرادیا تھا۔ جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے، تو وہاں حضور ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپس میں دو دو کے درمیان تعلق قائم کرادیا تھا کہ یہ تمہارا بھائی ہے۔ مہاجرین اور انصار کے درمیان بھی اور ایک موقعہ پر خود مہاجرین مہاجرین کے درمیان بھی حضور ﷺ نے اس طرح بھائی چارگی کا رشتہ قائم کرایا تھا۔ تو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کو بھی ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ آپ ﷺ کے قائم فرمائے ہوئے اس رشتہ کا وہ حضرات اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے کہ ایک دوسرے کی پوری خبر گیری کرتے، جیسے اپنے حقیقی بھائی کی خبر گیری کی جاتی ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے ان کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب حضور ﷺ بھی تشریف فرما تھے، آپ کی وفات نہیں ہوئی تھی۔ جب حضرت سلمان رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے، اس وقت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ گھر پر نہیں تھے، ان کی اہلیہ ام درداء رضی اللہ عنہا بالکل معمولی لباس میں تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر کی موجودگی میں عورت کو جو اہتمام کرنا چاہیے؛ حضرت سلمان نے وہ بات ان میں نہیں دیکھی۔

زینت کس کے لئے ہے؟

اس لئے کہ عورت کو یہ حکم ہے کہ جب شوہر موجود ہو؛ اس وقت تو زینت کرے تا کہ

شوہر کا حق ادا ہو، اور شوہر کی غیر موجودگی میں عورت کو زینت کا لباس نہیں پہننا چاہیے۔ اور اگر کسی کام سے جب گھر سے باہر بھی جائے تو زینت کا لباس پہن کر نہ جائے بلکہ معمولی کپڑوں میں باہر نکلنا چاہیے، اور خوشبو بھی نہ لگائے۔

آج کل ہمارے معاشرے اور سماج میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے کہ شوہر کے سامنے تو عورتیں زینت اختیار کرتی نہیں، اور کسی کے یہاں شادی میں جانا ہو، یا کسی تقریب میں جانا ہو؛ تو اس وقت خوب زینت اختیار کی جاتی ہے۔

حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: بے چارہ وہ شوہر؛ جس نے کتنے پیسے خرچ کر کے جوڑا سلوایا اور زیور بنوایا؛ وہ تو دیکھنے سے محروم ہی رہ جاتا ہے یعنی زینت کا سامان لانے کے لئے پیسے تو شوہر نے ہی دیئے، لیکن زینت کا فائدہ وہ تو اٹھاتا نہیں۔ حقیقت میں معاملہ برعکس ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے جو آج کل نزاعات کی شکل میں دیکھنے ملتا ہے۔ حالانکہ شریعت نے تو اس کا خاص اہتمام کروایا تھا تاکہ یہ چیزیں پیش نہ آئیں۔

شوہر کو اپنے گھر بھی اچانک پہنچنے کی اجازت نہیں

دیکھئے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کا حال آپ احادیث میں پڑھیں گے، اس سے عام تأثر یہ ملے گا کہ شوہر کی عدم موجودگی میں وہ عورتیں کبھی زینت نہیں کرتی تھیں۔ اسی لئے وہ حضرات غزوات سے یا کسی سفر سے واپس آتے تھے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو تاکید تھی کہ سیدھے گھر مت چلے جائیو۔ اس زمانہ میں خبر پہنچانے کے وہ وسائل اور آلات بھی نہیں تھے؛ جو اس زمانہ میں ہیں۔ اگر کسی طویل سفر سے واپس آ رہے تھے تو وہاں ایسا تو تھا نہیں کہ ٹیلیفون کر دیا، یا ٹیلی گرام کر دیا، یا خط بھیج دیا کہ مَیں فلاں تاریخ کو فلاں وقت پر پہنچنے

والا ہوں۔ یہ بات تو وہاں ممکن ہی نہیں تھی، اور لمبے سفر سے ایک ایک مہینے، دو دو مہینے کے بعد آتے تھے اور اچانک ہی پہنچتے تھے، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے سیدھے گھر پہنچ جانے کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اجازت نہیں دی تھی۔

بخاری شریف میں بلکہ تمام کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ حضور ﷺ کی طرف سے ان کو اس بات کی تاکید تھی کہ گھر مت جاؤ، بلکہ ابھی ٹھہر جاؤ؛ تاکہ گھر والوں کو اطلاع ہو جائے ﴿وَتَسْتَحِدَّ الْمُغِيْبَةُ [بخاری شریف ۲/۷۶۰]﴾ اور اگر عورت پراگندہ بال اور حال ہے تو وہ اپنے بال اور اپنا حال ٹھیک ٹھاک کر لے، جسم کو صاف کر لے اور نہا دھو کر زینت کا لباس پہن لے۔ ایسا حکم کیوں ہے؟ اس لئے کہ شوہر اگر اچانک پہنچ جائے گا تو عورت تو اس کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے عام لباس میں رہتی تھی، زینت کا اہتمام نہیں کرتی تھی، اور بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی شخصیت کو آپ زینت کے لباس میں دیکھیں تو اس کی وجہ سے جی خوش ہوتا ہے، اور عام لباس میں دیکھیں تو دل میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ تو چونکہ عام لباس میں دیکھنے کی وجہ سے یہ احتمال تھا کہ کہیں شوہر کے دل میں نفرت کا جذبہ پیدا نہ ہو جائے اس لئے یہ حکم دیا گیا تھا

﴿اور یہاں تو قصداً ایسا ہوتا ہے﴾

دیکھئے! نکاح کے رشتہ میں کسی بھی لائن سے ذرا سی بھی خرابی اور چوک پیدا نہ ہونے پائے، اس کا شریعت نے کتنا اہتمام کیا کہ عام لباس میں بیوی پر نظر پڑ جائے گی تو ہو سکتا ہے کہ بیوی شوہر کے دل سے اتر جائے، اس لئے حضور ﷺ نے فوراً گھر جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ فرمایا کہ رات ٹھہر کر جانا؛ تاکہ اس کو اطلاع ہو جائے اور وہ کچھ تیاری کر لے، اب تم جاؤ گے تو وہ اس قابل ہو چکی ہے کہ تمہارے استقبال کے لئے تیار ہے اور اس صورت میں تم

اس کو دیکھو گے تو یہ ڈر اور اندیشہ نہیں رہا کہ وہ تمہاری نگاہ سے اور دل سے اتر جائے۔

تو دیکھئے! وہاں غیر اختیاری طور پر یہ چیز پیدا ہوسکتی تھی پھر بھی اتنا زیادہ اہتمام کروایا اور ہمارے سماج میں تو قصداً ایسا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں معاملہ اُلٹ گیا ہے، جیسا کہ مَیں کہا کرتا ہوں کہ عورتیں گھر میں قصداً عام لباس میں، میلے کچلے، پھٹے پرانے کپڑوں میں رہا کرتی ہیں، حالانکہ اس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ وہاں کبھی کبھار ایسی صورت غیر اختیاری طور پر پیش آتی تھی، اس کی بھی پیش بندی کردی گئی کہ ایسا نہ ہونے پائے، اور ہمارے معاشرہ میں قصداً ایسا کیا جاتا ہے، اور زینت والے لباس کو دوسروں کے لئے خاص کردیا گیا ہے۔ معاملہ بالکل اُلٹ گیا ہے۔ شریعت کی تعلیمات کو ختم کردیا گیا، اس پر عمل ہی نہیں ہورہا ہے، جس کا نتیجہ ہم بھگت رہے ہیں۔

﴿ خاص خاص ہدایات ﴾

ویسے تو عورت کے لئے حکم یہ ہے ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾ اپنے گھروں کے اندر رہو گھروں سے باہر نہ نکلو۔ قرآنِ پاک عورتوں کو خاص طور پر تاکید کرتا ہے کہ ان کو باہر نہیں نکلنا چاہیے، گھر ہی میں رہیں؛ لیکن اگر کسی ضرورت کی وجہ سے نکلنا پڑے؛ تو اس کے لئے بھی شریعت کی طرف سے خاص خاص ہدایات دی گئی ہیں کہ زینت کا لباس نہ ہو، خوشبو لگائے ہوئے نہ ہو، میلے کپڑے میں چادر اوڑھ کر نکلیں، راستہ کے کنارے چلیں۔ ان ہدایات کے ساتھ باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔ یہ صورت نہیں ہونی چاہیے کہ غیروں کے سامنے زینت کے ساتھ آئے اور شوہر کے سامنے عام سی صورت میں آئے۔

ترکِ زینت پر مارنے کی اجازت

اسی لئے شریعت نے جن جن چیزوں پر عورت کی پٹائی کرنے کی شوہر کو اجازت دی ہے؛ وہ چند ہی ہیں۔ اگر بیوی نماز نہیں پڑھتی ہے؛ تو مارنا چاہیے یا نہیں؟ تو اکثر علماء منع فرماتے ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کو سمجھایا تو جائے، تنبیہ بھی کی جائے؛ لیکن پٹائی نہ کی جائے۔ لیکن اگر بیوی شوہر کے لئے زینت نہیں کرتی؛ تو شوہر اس کی پٹائی کرسکتا ہے (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ۶/۲۷۳) اوراس کی وجہ بھی عرض کرتا چلوں کہ نماز تو اللہ تعالیٰ کا حق تھا اس لئے اس کو ادا کروانے کے لئے سمجھانے کی کوشش تو کرے؛ لیکن اس کے لئے پٹائی کی اجازت نہیں دی گئی۔ اور زینت کرنا خود شوہر کا حق ہے کہ بیوی اس کے لئے زینت کرے۔

......نگاہ غیر عورت پر نہیں اٹھے گی

تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے معاشرے میں معاملہ اُلٹ گیا ہے، اس کے جو نتائج برپا ہورہے ہیں؛ وہ ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ کسی آدمی کو گھر کے اندر پیٹ بھر کر کھانا ملتا ہو؛ تو کبھی وہ دردر کی بھات نہیں کھائے گا۔ اگر عورتیں اس کا اہتمام کرلیں کہ وہ اپنے شوہر کے لئے خوب زینت کریں؛ تو کبھی اس کے شوہر کی نگاہ غیر عورت پر نہیں اُٹھے گی۔ شریعت نے جو زینت کا حکم دیا ہے؛ اس کی خاص مصلحت یہی ہے۔ اگر گھر میں شوہر کی وہ ضرورت پوری ہوجاتی ہے جو اس کی نگاہ ڈھونڈتی ہے کہ کوئی چیز دیکھنے کو ملے، اور اس کی بیوی اس کی اس ضرورت کو پورا کررہی ہے؛ تو پھر شوہر کاہے کو گھر کے باہر بھٹکتا ہوا اِدھر اُدھر مارا مارا پھرے گا۔ جب گھر میں اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی؛ تو پھر وہ جھانکتا پھرتا ہے۔

دونوں پرابلم سول (Problem Solve)

آج کل عام طور پر باہر نظریں اُٹھتی ہیں؛ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورتیں کوتاہی کررہی ہے، اس لئے عورتوں کو ان تعلیمات کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور مردوں کو اس پر عمل کروانے کی کوشش بھی کرنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب عورتیں میلے کچیلے کپڑوں میں باہر نکلیں گی؛ تو پرائے آدمی کو اس کی طرف دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، اُدھر سے بھی حفاظت ہو جائے گی۔ اور اِدھر آپسی حقوق کی ادائیگی کا بھی اہتمام ہو جائے گا۔ دونوں پرابلم سول (Problem Solve) ہو جائیں گے۔ معاملہ اتنا آسان ہے لیکن ہم نے ہی اس کو اُلجھا دیا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب

بہرحال! بات اس پر چل رہی تھی کہ حضرت سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ اپنے دینی بھائی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے لئے ان کے گھر پر پہنچے؛ تو ان کی بیوی کو دیکھا کہ وہ بالکل میلے کچیلے لباس میں ہے۔ پوچھا کیا بات ہے؟ کیا ابوالدرداء گھر پر نہیں ہیں؟ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں، اس طرح کیوں رہ رہی ہو؟ انہوں نے کہا: آپ کے بھائی ابوالدرداء کو دنیا کی رغبت ہے ہی نہیں، وہ تو عبادت میں مشغول رہتے ہیں، دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے ہیں۔ گویا مَیں بھی دنیا ہی کا ایک حصہ اور فرد ہوں؛ اس لئے میری طرف بھی کچھ توجہ نہیں دیتے۔ انہوں نے اپنی بات اشارے میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو بتلا دی اب حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ تو باہر تھے، جب وہ آئے تو دیکھا کہ مہمان آئے ہیں اور وہ بھی دینی بھائی؛ جن کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رشتۂ اخوت کرایا ہے۔ چونکہ وہ تو روزے سے

تھے لیکن مہمان کے لئے خصوصی طور پر کھانا بنوایا، اور کھانا پیش کر کے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا: کھایئے، میرا تو روزہ ہے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جب تک آپ نہیں کھائیں گے؛ مَیں بھی نہیں کھاؤں گا، آپ پہلے کھایئے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کا روزہ تڑوایا، اس لئے کہ نفل روزہ تھا اور پہلے بتلا چکا ہوں کہ نفل روزہ مہمان کے لئے توڑ سکتے ہیں ﴿اَلضِّیَافَةُ عُذْرٌ لِلضَّیْفِ وَلِلْمُضَیِّفِ﴾ میزبانی اور مہمانی دونوں عذر ہے۔

مثلاً ولیمہ کی دعوت آئی اور آپ کا روزہ ہے تو دعوت قبول کرنی چاہیے یا نہیں کرنی چاہیے؟ یہ ایک مسئلہ ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ دعوت ضرور قبول کیجیے اور اس کے یہاں جایئے، اور صاحبِ دعوت کو بتلا دیجیے کہ میرا روزہ ہے۔ اگر وہ راضی ہو جائے؛ تو ٹھیک ہے، دُعا کر دیجیے اور واپس آجایئے، لیکن اگر وہ کہے کہ آپ کو کھانا ہی پڑے گا؛ تو آپ روزہ توڑ سکتے ہیں اور بعد میں قضاء کرنی پڑے گی۔

یہ نفل روزہ کے بارے میں بتلا رہا ہوں (رمضان کا روزہ، واجب یا قضاء کے بارے میں نہیں) اسی طرح آپ کے یہاں کوئی مہمان آیا اور اس کے سامنے آپ نے کھانا پیش کیا اور آپ نے کہا کہ میرا تو روزہ ہے، اور وہ کہتا ہے کہ مَیں تو نہیں کھاؤں گا جب تک آپ نہیں کھائیں گے؛ تو اس مہمان کو کھلانے کے لئے آپ روزہ توڑنا چاہیں تو شریعت نے اس کی اجازت دی ہے اور جائز ہے، آپ کے لئے بعد میں قضاء ضروری ہے، یہ یاد رہے۔

﴿حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اصلاح کر دی﴾

یہاں پر بھی یہی صورت ہوئی کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے- جو کہ مہمان ہیں- حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے- جو کہ میزبان ہیں- کہا کہ آپ جب تک نہیں کھائیں گے؛ مَیں بھی نہیں کھاؤں گا۔ کیونکہ وہ ان کی اصلاح کرنا چاہتے تھے کہ وہ غلو کی حد تک پہنچے ہوئے تھے

کہ روزانہ روزہ رکھ رہے ہیں اور رات بھر عبادت کر رہے ہیں، چنانچہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے کھایا، اس لئے کہ ان کو مہمان کو کھلانا ہی تھا۔ پھر جب رات ہوئی تو عشاء کی نماز کے بعد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے نماز کے واسطے مصلیٰ بچھایا تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا: حضرت! اس وقت سو جاؤ۔ وہ نماز کے لئے ارادہ رکھتے تھے لیکن ان کو سونے کا حکم دیا، لہٰذا وہ سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اٹھنا چاہا تو حضرت سلمان نے کہا: ابھی نہیں؛ اس وقت سو جاؤ، اور سلا دیا۔ جب رات کا آخری حصہ آیا- اور یہی مستحب اور مسنون طریقہ ہے- اس وقت حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اب اٹھو۔ ان کو اُٹھایا اور خود بھی اُٹھے اور دونوں نے تہجد پڑھی۔ عملی طور پر تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے سبق دے دیا تھا؛ پھر زبان سے بھی سمجھایا کہ تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے گھر والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ اپنے رب کا بھی حق ہے لہٰذا کسی دن روزہ رکھو۔ اور جان کا بھی حق ہے اس لئے کسی دن روزہ نہ رکھو۔ اور گھر والوں کا بھی حق ہے کہ کچھ دیر ان کے ساتھ آرام کرو۔ لہٰذا ہر حق دار کا حق ادا کرو، کسی ایک ہی چیز میں لگے رہنا؛ یہ ایک طرح کا غلو ہے، جس کی شریعت میں اجازت نہیں دی جاتی۔ پھر اتنا ہی نہیں کیا؛ بلکہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ ان کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قصہ بیان کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿صَدَقَ سَلْمَان﴾ سلمان نے سچ کہا یعنی ایسا ہی ہے۔ چونکہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روش غلو والی تھی اور ان کا طریقہ معتدل نہیں تھا؛ اس لئے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے اس کی اصلاح کردی۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں دین پر عمل کا اہتمام نصیب فرمائے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُبِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَاوَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَامَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوۡلَانَامُحَمَّداًعَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیۡہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡماًکَثِیۡراًکَثِیۡراً.

یہ معتدل طریقہ ہے

باب کا عنوان ہے کہ آدمی کو ہر کام میں درمیانہ روی اختیار کرنی چاہیے، اسی سلسلے میں پچھلے دو ہفتوں میں کچھ روایات پیش کی گئیں تھیں، آج بھی اسی سے متعلق روایتیں پیش کر رہے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی کہ مَیں یہ کہتا ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گا؛ دن میں روزہ رکھوں گا اور رات بھر نماز پڑھوں گا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا تم نے یہ بات کہی ہے؟ مَیں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان! مَیں نے ہی ایسا کہا ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم ایسا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ یعنی اس طرزِ عمل کو زیادہ نباہ نہیں سکو گے؛ اس لئے ہمیشہ روزہ مت رکھا کرو بلکہ کبھی روزہ رکھو اور کبھی مت رکھو اسی طرح رات بھر نماز پڑھنے کا جو تم سوچتے ہو؛ اس پر بھی مداومت نہیں ہو سکے گی، اس لئے کچھ سو جایا کرو اور پھر اُٹھ کر نماز بھی پڑھو۔ اور ایسا کرو کہ ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھا کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قاعدہ ہے کہ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا دیا جاتا ہے، لہٰذا ہر ماہ تین

روزے رکھو گے تو اس پر تیس روزوں کا ثواب دیا جائے گا اور اسی طرح ہر مہینے رکھتے رہو گے؛ تو یہ ایسا ہی ہو جائے گا گویا پورے سال روزے رکھے۔ مَیں نے عرض کیا کہ جتنا آپ نے بتلایا، مَیں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر ایسا کرو کہ ایک دن روزہ رکھو اور دو دن ناغہ کر دو۔ مَیں نے عرض کیا کہ مَیں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ پھر ایسا کرو کہ ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن افطار کر لیا کرو؛ یہ صومِ داؤد کہلاتا ہے۔ حضرت داؤد علیٰ نبینا علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ یہی تھا کہ ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔ اور روزے رکھنے کے اندر معتدل طریقہ یہی ہے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ یہ روزے سب سے زیادہ افضل ہیں۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر ۴۶۶۴)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا کہ مَیں اس سے زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس سے افضل روزے اور کوئی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر مَیں حضور اکرم ﷺ کے فرمان کے مطابق تین روزے والی بات مان لیتا؛ تو یہ مجھے اپنے اہل و مال سے زیادہ محبوب ہوتا۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ مَیں نے سنا ہے کہ تم دن میں روزے رکھتے ہو اور رات بھر نماز پڑھتے ہو، کیا صحیح سنا ہے؟ مَیں نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا مت کرو، بلکہ کبھی روزہ رکھو اور کبھی مت رکھو، کچھ سو جایا کرو اور پھر اٹھ کر عبادت کیا کرو۔ اس لئے کہ تمہارے بدن کا بھی تم پر حق ہے؛ لہٰذا اس کو آرام بھی دیا کرو۔ اور تمہاری آنکھوں کا بھی تم پر حق ہے؛ لہٰذا کچھ دیر سو جایا کرو، اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، اگر دن میں روزہ رکھو گے؛ تو اس کے پاس نہیں جا سکو گے اور جب

رات بھر عبادت کیا کروگے؛ تو اس کے حقوق کب ادا کروگے؟ اس کے حقوق کی رعایت بھی ضروری ہے۔ اور تمہارے مہمانوں کا بھی تم پر حق ہے۔ عام طور پر جو ملاقاتی آتا ہے اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ میزبان بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک رہیں، اس کی وجہ سے اس کی مسرت اور خوشی میں اضافہ ہوجاتا ہے، اور اس کی خوشی دوبالا ہوجاتی ہے۔

﴿مَیں نے سختی کی؛ تو مجھ پر سختی کی گئی﴾

﴿وَاِنَّ بِحَسْبِکَ اَنْ تَصُوْمَ مِنْ کُلِّ شَهْرٍ ثَلاثَةَ أَيَّامٍ﴾ اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر مہینہ میں تین روزے رکھ لو؛ یہ تمہارے لئے کافی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر نیکی کا اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں دس گنا بدلہ ملتا ہے۔ جب تین روزے رکھوگے تو تیس روزوں کا ثواب ملے گا، گویا یوں سمجھا جائے گا کہ آپ نے ہمیشہ روزے رکھے۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں: ﴿فَشَدَدْتُ فَشُدِّدَ عَلَيَّ﴾ مَیں نے اپنے معاملہ میں سختی کی تو میرے ساتھ سختی کا معاملہ کیا گیا۔ یعنی میرے لئے نبی کریم ﷺ نے ایک بہترین اور آسان شکل پیش فرمائی تھی اور فرما دیا تھا کہ اس پر بھی ہمیشہ روزے رکھنے کا ثواب ملتا رہے گا، اس کے باوجود مَیں نے اس پر قناعت نہیں کی، اور آپ کی اس پیشکش کو قبول نہ کرتے ہوئے صاف انکار تو نہیں کیا لیکن مزید کا اصرار کیا، چنانچہ مَیں نے عرض کیا ﴿يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنِّيْ أَجِدُ قُوَّةً﴾ آپ تو مہینہ میں تین ہی روزے رکھنے کی اجازت مرحمت فرمارہے ہیں؛ مجھ میں تو اس سے زیادہ طاقت ہے، یعنی مَیں تو زیادہ روزے رکھ سکتا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اچھا! حضرت داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھو یعنی ایک دن روزہ اور ایک دن افطار کرنا ﴿وَلَا تَزِدْ عَلَيْهِ﴾ اس سے زیادہ مت رکھنا۔

﴿دشواری پیدا ہوگئی﴾

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام والا روزہ کون سا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدھا سال۔ جب حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بوڑھے ہوگئے اس وقت کہا کرتے تھے ﴿یٰلَیْتَنِیْ قَبِلْتُ رُخْصَۃَ رَسُوْلِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم﴾ اے کاش! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی سہولت کو مَیں نے منظور کرلیا ہوتا یعنی اس وقت قبول کرلیتا؛ تو آج اس بوڑھاپے میں میرے لئے دشواری نہ ہوتی

اس روایت کو لانے کا مقصد یہی ہے کہ دیکھو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً ازخود جو طریقہ تلقین فرمایا تھا؛ اس میں جو اعتدال تھا وہ ایسا تھا جس کو وہ ہمیشہ آسانی کے ساتھ نباہ سکتے تھے۔ ویسے انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کر کے جو منظور کروایا اس کو بھی نبھایا، لیکن وہ خود فرماتے ہیں کہ میرے لئے بوڑھاپے میں دشواری پیدا ہوگئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا طریقہ وہ تھا جس میں بعد میں بھی کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی۔ آگے اس کی مزید تفصیل ایک اور روایت میں آرہی ہے۔

﴿قرآنِ پاک ختم کرنے کی ترتیب﴾

چنانچہ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم ہمیشہ روزے رکھتے ہو، پورے قرآنِ پاک کی ہر رات تلاوت کرتے ہو۔ مَیں نے کہا: جی ہاں! میرا مقصد تو اس سے نیکی حاصل کرنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت داؤد علیہ السلام والا روزہ رکھو، اس لئے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے تھے، اور مہینے میں ایک قرآن ختم کرو۔ مَیں نے کہا: اللہ کے رسول! مجھ میں اس سے زیادہ کی طاقت ہے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اچھا! بیس دن میں ایک قرآن ختم کرو۔ مَیں نے عرض کیا:

اللہ کے رسول! اس سے بھی زیادہ کی مجھ میں طاقت ہے۔ تو فرمایا: ہر دس دن میں قرآن ختم کرو۔ مَیں نے عرض کیا: اس سے بھی زیادہ کی مجھ میں طاقت ہے۔ تو فرمایا: اچھا! ہر سات دن میں قرآن ختم کرو؛ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔

قرآنِ پاک کی سات منزلیں

عام طور پر نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول یہی تھا کہ قرآنِ پاک کو سات دن میں ختم کیا کرتے تھے، اس لئے قرآنِ پاک میں جو سات منزلیں بنی ہوئی ہیں جس کا مجموعہ ہے ﴿فَمِیْ بِشَوْقٍ﴾ فٓ سے مراد ''الفَاتِحَة''، مٓ سے مراد ''المَائِدَة''، یٓ سے مراد ''یونس''، بٓ سے مراد ''بنی اسرآئیل''، شٓ سے مراد ''الشعرآء''، وٓ سے مراد ''الصّٰفّٰت'' اور قٓ سے مراد ''ق'' ہے۔ یہ سات منزلیں ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عام طور پر ان ہی سات منزلوں کے مطابق سات دن میں قرآنِ پاک ختم کرتے تھے، حضورِ اقدس ﷺ نے ان کو بھی یہی بات تلقین فرمائی کہ سات دن سے کم میں ختم کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

وہ مَیں نے منظور کرلی ہوتی

﴿فَشَدَّدْتُ فَشُدِّدَ عَلَیَّ﴾ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مجھے ایک مہینہ میں ختم کرنے کے لئے فرمایا تھا لیکن مَیں بار بار اصرار کرکے سات دن تک لے آیا میرے اس کہنے پر میرے ساتھ یہ معاملہ ہوا۔

اسی موقعہ پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا ﴿اِنَّکَ لَاتَدْرِیْ لَعَلَّکَ یَطُوْلُ بِکَ عُمُرٌ﴾ دیکھو! تمہیں معلوم نہیں! شاید تمہاری عمر طویل ہوجائے اور بوڑھاپے میں ان چیزوں کو نباہ نہ سکو۔ چنانچہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا ایسا ہی ہوا۔ میری عمر

بہت طویل ہوئی، جب مَیں بوڑھا ہوا؛ تو مَیں نے اپنے دل میں تمنا کی کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے جو رخصت اور سہولت عطا فرمائی تھی؛ کاش! مَیں نے وہ منظور کرلی ہوتی۔

﴿ گھر کا بڑا حالات سے باخبر رہے ﴾

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ابا نے میرا نکاح ایک شریف گھرانہ کی عورت سے کرادیا ﴿وَكَانَ يَتَعَاهَدُ كِنَّتَهُ﴾ اور وہ اپنی بہو کی یعنی میری بیوی کے حالات کی کبھی کبھی خبر لیا کرتے تھے، اس کو پوچھتے تھے۔

﴿يَتَعَاهَدُ﴾ کا معنٰی حالات پوچھتے تھے۔ یہاں پر علماء نے لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا گھر کا جو بڑا ہو، اس کو گھر کے حالات کی خبر رکھنی چاہیے اور پوچھتے رہنا چاہیے کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ بیٹے کا نکاح کرادیا تو ایسا نہیں کہ نکاح کرا کر اطمینان سے بیٹھ گئے، بلکہ دیکھتا بھی رہے کہ بیٹا اس کی بیوی کا حق برابر ادا کر رہا ہے یا نہیں؟ اس میں کوئی کوتاہی تو اس کی طرف سے نہیں ہو رہی ہے۔

چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اپنی بہو (بیٹے کی بیوی) سے شوہر کے متعلق پوچھتے رہتے تھے۔ بہو جواب میں کہتی تھی ﴿نِعْمَ الرَّجُلُ مِنْ رَجُلٍ﴾ عبداللہ بڑے اچھے آدمی ہیں ﴿لَمْ يَطَأْ لَنَا فِرَاشًا وَلَمْ يُفَتِّشْ لَنَا كَنَفًا مُنْذُ أَتَيْنَاهُ﴾ بڑے عبادت گزار ہیں، دن بھر روزے رکھتے ہیں، رات بھر عبادت کرتے رہتے ہیں اور جب سے ہم اس گھر میں آئے ہیں کبھی بھی وہ ہمارے بستر پر تشریف نہیں لائے ہیں۔ بہو کو جو بات کہنی تھی؛ اس نے اچھے انداز میں اپنے خسر کو بتلادی۔

﴿ ......تو باپ ایسا کرسکتا ہے ﴾

ان کے والد نے یوں سوچا کہ ٹھیک ہے، راہ پر آجائیں گے۔ کچھ دنوں کے بعد پھر

پوچھا تو یہی جواب ملا۔ دوسری مرتبہ جب ایسا ہوا؛ تو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے اس کا تذکرہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لڑکا جب بڑا ہو، اور ایسا ہو کہ باپ کو خیال ہو کہ میں اس کے سامنے خود یہ بات کہوں اور اس معاملہ میں میں خود براہِ راست اس سے گفتگو کروں اور اس کو سمجھاؤں؛ یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ بعض معاملے ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کے علم میں ہوتا ہے اور وہ چاہتا بھی ہے کہ معاملہ درست ہو جائے، لیکن وہ براہِ راست دخل اندازی کرنا مناسب نہیں سمجھتا، تو ایسے معاملہ میں باپ کا دوسروں کو بیچ میں ڈالنا، خاندان کے جو بڑے لوگ یا ذمہ دار ہوں، اور لڑکا بھی جن کو بڑا سمجھتا ہو، ایسے لوگوں کو بیچ میں ڈالنا کیسا ہے؟ اس روایت سے معلوم ہوا کہ باپ ایسا کرسکتا ہے۔

چنانچہ انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پوری بات بتلادی کہ یہ صورت حال ہے کہ میں نے ان کا نکاح ایک شریف گھرانے کی عورت سے کرادیا، لیکن ان پر تو عبادت کا ذوق وشوق اتنا زیادہ سوار ہے اور عبادت کے اندر ایسے مشغول ہیں کہ بس! دن بھر روزہ رکھتے ہیں، رات بھر عبادت میں مشغول رہتے ہیں، بیوی کی تو کوئی خیر خیریت پوچھتے ہی نہیں۔ میں بارہا معلوم کرچکا ہوں لیکن ابھی تک حالات میں کوئی اصلاح اور درستگی نہیں آئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ﴿أَلْقِنِيْ بِهٖ﴾ اچھا! ان سے کہنا کہ مجھ سے ملیں۔ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے آکر بتلادیا کہ حضور نے آپ کو بلایا ہے، اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا مل آنا۔

﴿ایسا مت کرو﴾

حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا،

حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا کہ معلوم ہوا ہے کہ تم روزے بہت رکھتے ہو،تمہارے روزوں کی ترتیب کیا ہے؟مَیں نے کہا:مَیں تو روزانہ روزے رکھتا ہوں۔حضور ﷺ نے کہا کہ اچھا! روزانہ قرآن کتنا پڑھتے ہو؟مَیں نے کہا:روزانہ رات بھر میں پورا قرآن ختم کر لیتا ہوں۔ ظاہر ہے شروع رات سے آخر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔اب حضور ﷺ نے ان کو بتلایا کہ دیکھو! یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے،ایسا مت کرو؛ بلکہ مہینہ میں ایک قرآن ختم کرو۔وہ کم کرتے کرتے سات دن پر آئے،چنانچہ اخیری عمر کے اندر وہ منزل جو رات کو پڑھنا ہوتی تھی،دن میں اپنے گھر میں کسی کو سنایا کرتے تھے تاکہ رات کو پڑھنا آسان ہو جائے۔

﴿ایسا کرتے تھے﴾

اور ایک دن روزہ،ایک دن افطار جو خود انہوں نے ہی اپنے سر لیا تھا اور حضور ﷺ سے اصرار کر کے منظور کروایا تھا؛ آخری عمر میں بوڑھاپے کی وجہ سے اس کی پابندی نہیں ہو پاتی تھی۔اس لئے ایسا کرتے تھے کہ جب طبیعت ذرا کمزور ہوتی تو تین چار روز تک مسلسل افطار کرتے یعنی روزہ نہیں رکھتے،اس کے بعد پھر طبیعت ذرا ٹھیک ٹھاک ہو جاتی؛ تو تین چار روز تک مسلسل روزہ رکھ لیا کرتے،تاکہ ایک دن روزہ،ایک دن افطار والا حساب برابر (Balance) ہو جائے۔اور اب وہ تمنا بھی کرتے تھے کہ کاش! حضور ﷺ کی دی ہوئی سہولت کو مَیں منظور کر لیتا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کام فرض اور واجب تو تھے نہیں،یعنی انہوں نے نبی کریم ﷺ سے گفتگو کر کے عرض کیا تھا اور انہی کے اصرار پر حضور ﷺ نے اجازت دی تھی،اب اگر وہ نہ بھی کرتے تو یہ کام تو نفل کا درجہ رکھتے تھے،کوئی اشکال اور گناہ تو تھا نہیں،

پھر کیوں یہ فرماتے ہیں کہ کاش! مَیں نے نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی سہولت قبول کرلی ہوتی؟ آج بھی اختیار تھا، نہ کرتے تو کونسی پابندی تھی؟ اس کا جواب خود ہی دیتے ہیں ﴿كَرَاهِيَةَ أَنْ يَتْرُكَ شَيْئًا فَارَقَ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ﴾

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک معمول یہ بھی تھا﴾

دیکھو! صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا ایک معمول تھا کہ حضورِ اکرم ﷺ دنیا سے جب تشریف لے گئے اُس وقت جو صحابی دینی اعتبار سے جس حال میں تھا (مطلب یہ ہے کہ عبادت، روزہ، نماز، تلاوت وغیرہ کا ان کا جو معمول تھا) اور حضورِ اکرم ﷺ ان کو عبادت کی جس حالت پر چھوڑ کر دنیا سے تشریف لے گئے؛ صحابہ اب یہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اس میں کچھ کمی آوے۔

جیسے ایک آدمی اپنے گھر والوں کو جس حال پر چھوڑ کر جاوے، تو وہ یہی چاہتا ہے کہ اس میں کوئی کمی آنی نہیں چاہیے، ہاں! اگر اضافہ ہو؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ دنیا کے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شریف آدمی جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے اور کوئی بات چیت طے ہو جاتی ہے، تو اس کی شرافت اور مروت اس بات کو چاہتی ہے کہ جو بات ہوئی ہے اس میں کمی نہ ہو۔ جیسے آپ نے کسی کو کہا کہ ہر مہینہ آپ کو دس روپیہ دیا کروں گا، اب آپ نے جس وقت وعدہ کیا تھا اس وقت آپ کی آمدنی اور آپ کی کمائی اس کی متحمل تھی، پھر بعد میں کمائی اتنی نہیں رہی پھر بھی ایک شریف آدمی سوچتا ہے کہ مَیں نے کہہ دیا ہے، وہ منتظر رہتا ہے، تو آپ کبھی اس میں کمی نہیں کرتے، حالانکہ یہ کوئی فرض اور واجب نہیں تھا۔ آپ چاہتے تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ پہلے مَیں نے اپنی کمائی کے اعتبار سے آپ سے وعدہ کیا تھا، آج

میری کمائی اس کی متحمل نہیں ہے؛ اس لئے مَیں یہ سلسلہ ختم کرتا ہوں، اس میں شرعی طور پر بھی گناہ نہیں مگر ایک آدمی شرافت کے پیشِ نظر ایسا نہیں کرتا۔

اسی طرح صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دینی اعتبار سے جس حال پر چھوڑا (کہ ان حضرات کے نماز روزہ تلاوت وغیرہ کے جو معمولات تھے) اس میں کوئی کمی آئے۔ گویا وہ یوں سوچتے تھے کہ کل کو جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے میدانِ حشر میں ملاقات ہوگی- اور ہم کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حال میں چھوڑا تھا اگر اس میں ہم نے کمی کی- تو کیا منھ دکھائیں گے۔ یہ ان کا خاص مزاج تھا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اسی لئے تمنا کیا کرتے تھے کہ وہ سہولت قبول کر لی ہوتی تو آج اس کے مطابق آسانی سے کام چلتا۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جس مقصد کے لئے یہ باب قائم کیا تھا کہ میانہ روی اختیار کرو اگر میانہ روی اختیار کروگے؛ تو آگے جا کر کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی اور آپ نے اپنے لئے ایک راہ جو پہلے سے پسند کی ہے؛ اس راہ پر آسانی سے چل سکوگے۔

﴿حضرت حنظلہ نامی دو صحابی ہیں﴾

وعن أَبِی رِبْعِیٍّ حنظلةَ بْنِ الرَّبِیْعِ الْأُسَیِّدِیّ الْکَاتِبِ أَحدِ کُتَّابِ رَسولِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَقِیَنِیْ أَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ۔ فَقَالَ: کَیْفَ أَنْتَ یَاحَنْظَلَةُ؟ قُلْتُ: نَافَقَ حَنْظَلَةُ. قَالَ: سُبْحَانَ اللہِ مَاتَقُوْلُ؟ قُلْتُ: نَکُوْنُ عِنْدَرَسُوْلِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یُذَکِّرُنَابِالْجَنَّةِ وَالنَّارِ کَأَنَّارَأْیُ عَیْنٍ، فَإِذَاخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِرَسُوْلِ اللہِ عَافَسْنَاالْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَوَالضَّیْعَاتِ نَسِیْنَا کَثِیْراً. قَالَ أَبُوْبَکْرٍ رضی اللہ عنہ: فَوَاللہِ اِنَّا لَنَلْقٰی مِثْلَ هٰذَا. فَانْطَلَقْتُ أَنَاوَأَبُوْبَکْرٍ حَتّٰی دَخَلْنَاعَلٰی رَسُوْلِ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقُلْتُ: نَافَقَ حَنْظَلَةُ یَارَسُوْلَ اللہِ! فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم وَمَاذَاکَ؟ قُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللہِ! نَکُوْنُ عِنْدَکَ، تُذَکِّرُنَا

بِالنَّارِ وَالْجَنَّةِ كَأَنَّا رَأْيَ عَيْنٍ، فَإِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِكَ عَافَسْنَا الْأَزْوَاجَ وَالْأَوْلَادَ وَالضَّيْعَاتِ نَسِيْنَا كَثِيْراً. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْتَدُوْمُوْنَ عَلٰى مَاتَكُوْنُوْنَ عِنْدِيْ، لَصَافَحَتْكُمُ الْمَلَآئِكَةُ عَلٰى فُرُشِكُمْ وَفِيْ طُرُقِكُمْ، وَلٰكِنْ يَاحَنْظَلَةُ سَاعَةً وَسَاعَةً. ثلاث مرات

حضرت ابوربعی حنظلہ بن الربیع اسیدی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی وحی کے لکھنے والے لوگوں میں سے ایک تھے۔ دیکھو! ایک تو حنظلہ بن ربیع ہیں اور دوسرے ایک حنظلہ اور ہیں جو غسیلِ ملائکہ سے مشہور ہیں۔ غزوۂ احد کے واقعہ میں آتا ہے کہ ایک صحابی جن کا نام حضرت حنظلہ تھا، تازہ تازہ ان کا نکاح ہوا تھا، پہلی ہی رات تھی اور صبح میں حضورِ اکرم ﷺ کی طرف سے اعلان ہوا، بیوی سے صحبت کی تھی اور غسل کی نوبت بھی نہیں آئی تھی اسی حالت میں نکل پڑے، میدانِ جنگ میں پہنچے اور شہید ہوگئے، چونکہ حالتِ جنابت میں شہید ہوئے تھے اور فرشتوں نے ان کو غسل دیا؛ اس لئے ان کا لقب غسیلِ ملائکہ ہے یعنی وہ جن کو فرشتوں نے غسل دیا۔ لیکن اس روایت کے راوی دوسرے صحابی ہیں۔ بہت سے لوگ ایک سمجھ کر حدیث کی کتابوں پر اعتراض کرتے ہیں۔

حکایاتِ صحابہ میں حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے یہ واقعہ ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ کہا کہ حضرت حنظلہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد میں، بیوی بچوں میں جاتے ہیں اور یہاں بچوں کی نوبت ہی کہاں آئی، شادی کے پہلے ہی روز تو شہید ہوگئے تھے، پھر یہ کیسی بات ہوئی؟ حالانکہ وہ ایک الگ شخصیت ہیں اور یہ ایک الگ شخصیت ہیں۔ دونوں کو ایک سمجھ لیا گیا؛ اس لئے اعتراض پیدا ہوا۔ آدمی کو اعتراض اپنی ناواقفیت اور جہالت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، جب پوری بات سامنے آجاتی ہے تو وہ اعتراض آپ ہی آپ ختم ہوجاتا ہے۔

﴿ کبھی یہ، کبھی وہ ﴾

یہ حضرت حنظلہ بن ربیع رضی اللہ عنہ ان حضرات میں سے ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی لکھنے کا کام کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری ملاقات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ہوئی، انہوں نے مجھ سے پوچھا: اے حنظلہ! تمہارا کیا حال ہے؟ قلب کا حال اور دل کا معاملہ کیسا ہے؟ مَیں نے عرض کیا: حنظلہ تو منافق ہو گیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا ﴿سُبْحَانَ اللّٰهِ مَاتَقُوْلُ؟﴾ تعجب کے موقع پر لفظ "سبحان اللہ" بولا جاتا ہے۔ تعجب ہے، سبحان اللہ! آپ کیا کہتے ہیں؟ منافق ہو گیا، منافق ہونا تو بہت بری بات ہے، یعنی کفر کی ایک بہت بری قسم ہے، تم مؤمن ہو کر یوں کہتے ہو کہ مَیں منافق ہو گیا، یہ کیسی بات ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ دیکھو! نفاق کا مطلب تو یہی ہے نا کہ آدمی ایک حال پر نہ رہے۔ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ۔ مَیں بھی جب اپنے حالات دیکھتا ہوں؛ تو یہی خطرہ معلوم ہوتا ہے، اس لئے مَیں تو ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ آپ ہی بتاؤ! ہم لوگ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں اور آپ کی صحبت میں موجود اور حاضر ہوتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو جب وعظ و نصیحت فرماتے ہیں، جنت اور جہنم کا تذکرہ فرماتے ہیں؛ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنت اور جہنم ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔

ظاہر ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس کا حال کیا ہوگا۔ آج جب بعض اہل اللہ کا یہ حال ہے کہ ان کی مجالس میں ہم بیٹھتے ہیں؛ تو دنیا کی طرف سے دل سرد ہو کر آخرت ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے، تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسِ بابرکات میں تو ظاہر ہے جنت اور جہنم کو آدمی اگر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہو؛ تو اس میں کوئی اشکال نہیں۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام یہی تو تھا۔

خیر! انہوں نے یہی کہا کہ جب حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اور آپ نصیحت فرماتے ہیں، جنت اور جہنم کا تذکرہ کرتے ہیں؛ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت اور جہنم ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، دنیا سے دل سرد ہو جاتا ہے، کاروبار سے دل بالکل اُٹھ جاتا ہے، پھر حضور ﷺ کی مجلس سے اُٹھ کر جب گھر آتے ہیں، اور اپنے کاروبار میں، کھیتی باڑی اور تجارت میں مشغول ہوتے ہیں؛ تو بہت سی باتیں جو نبی کریم ﷺ کی مجلس میں ہماری نگاہوں کے سامنے ہوتی تھیں؛ ان میں کی بہت سی ہم بھول جاتے ہیں یعنی وہ کیفیت باقی نہیں رہتی بلکہ اس میں فرق آجاتا ہے۔

ایک آدمی دینی مجلس میں ہو؛ اس وقت قلب کی کیفیت اور ہوتی ہے، اور اپنی تجارت میں دوکان پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے؛ اس وقت دل کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ آج بھی جب یہ باتیں محسوس ہوتی ہیں، تو ان حضرات کا مقام تو بہت اونچا تھا، اس لئے وہ اس کو بہت صاف طریقہ سے محسوس فرماتے تھے، حالانکہ وہ حضرات بیوی بچوں میں رہتے تھے؛ تب بھی کوئی غفلت کی نوبت آتی نہیں تھی لیکن نبی کریم ﷺ کی مجلس میں رہ کر جو کیفیت ہوتی تھی؛ وہ تو باقی نہیں رہتی تھی، اس میں تو کچھ نہ کچھ کمی آہی جاتی تھی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب ان کی یہ بات سنی تو کہا بھائی! ہمارا بھی یہی حال ہے، اگر اسی کا نام نفاق ہے؛ تو پھر یہی کیفیت میری بھی ہے یعنی حضور ﷺ کی مجلس میں ہوتے ہیں اس وقت بات الگ ہوتی ہے اور جب ہم اپنی تجارت میں اور گھر میں جا کر بیوی بچوں میں مشغول ہوتے ہیں؛ تو دل کی وہ کیفیت نہیں رہتی، لہٰذا اب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی اپنا فکر لاحق ہوا۔

حضرت حنظلہ فرماتے ہیں کہ مَیں اور حضرت ابوبکر اپنی مشکل لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چنانچہ وہاں جا کر حضرت حنظلہ نے ہی بات شروع کی اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! حنظلہ تو منافق ہوگیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کیا بات ہے؟ کیوں ایسی بات کررہے ہو؟ مَیں نے وہی بات جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کہی تھی؛ پھر دہرائی۔ اس کو سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْتَدُوْمُوْنَ عَلٰی مَاتَکُوْنُوْنَ عِنْدِیْ، لَصَافَحَتْکُمُ الْمَلآئِکَۃُعَلٰی فُرُشِکُمْ وَفِیْ طُرُقِکُمْ، وَلٰکِنْ یَاحَنْظَلَۃُ سَاعَۃً وَسَاعَۃً﴾ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے؛ اگر ہمیشہ تم اسی حالت میں رہو، جس حالت میں میری مجلس میں اور میرے سامنے ہوتے ہو، اور اس وقت تمہارے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے؛ وہی کیفیت اگر چوبیس گھنٹے اور ہمیشہ رہے؛ تو پھر تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں پر فرشتے تم سے آکر مصافحہ کریں گے، لیکن یاد رکھو! کبھی یہ، کبھی وہ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنایا ہے کہ وہ ایک حالت پر رہ نہیں سکتا، اس کی فطرت کا تقاضہ بھی ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آتی رہے؛ تب ہی اس کے مزاج میں اعتدال باقی رہے گا۔ اگر وہ چوبیس گھنٹے اسی طرح رہے، تو پھر بات نہیں بنے گی۔

﴿ بر پشتِ پائے خود نہ بینم ﴾

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ایک آدمی نے حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا۔ آپ حضرات کو قصہ تو معلوم ہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی لے گئے تھے اور کنوئیں میں ڈال دیا تھا، پھر وہاں سے قافلے والے نکال کر لے گئے اور مصر کے حاکم کے ہاتھ بیچ دیا، وہاں رہے، یہاں حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی یاد میں تڑپتے اور روتے رہے یہاں تک کہ ان کی بینائی بھی ختم ہوگئی، پھر بھی اخیری زمانہ میں جب دوسرے

بیٹے بنیامین بھی گم ہوئے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے بیٹوں سے کہا کہ جاؤ اور ان دونوں کو ڈھونڈو، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں کو ملا دے، حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو بھولے نہیں تھے، وہ لوگ کہہ رہے تھے کہ پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ خیر! وہ سب بھائی گئے اور حضرت یوسف علیہ السلام بھی مل گئے، اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے ان بھائیوں کو اپنا کرتہ دیا کہ جاؤ! اور والد صاحب کے چہرہ پر ڈال دینا، جس سے ان کی بینائی واپس آجائے گی۔ قرآنِ کریم میں یہ پورا قصہ موجود ہے، جس وقت یہ قافلہ مصر سے کرتہ لے کر نکلا اور ابھی کنعان پہنچا بھی نہیں تھا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کہنے لگے کہ مجھے تو یوسف کے کرتہ کی خوشبو آرہی ہے۔

تو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

زمصرش بوئے پیراہن شنیدی ❁ چرا در چاہ کنعانش نہ دیدی

تم نے مصر سے ان کے کرتہ کی خوشبو محسوس کرلی، اور شروع میں جب بھائیوں نے ان کو یہاں قریب ہی کنویں میں ڈال دیا تھا؛ اس وقت آپ کو پتہ بھی نہیں چلا؟ اُس وقت تو یہاں اپنی بستی کے قریب ہی صحرا کے کنوئیں میں ڈالا تھا، کہیں دور بھی نہیں تھے اور اِس وقت تو بہت دور ہیں۔ اور اُس وقت تو خود حضرت یوسف علیہ السلام ہی یہاں تھے، اس وقت تو آپ کو پتہ بھی نہیں چلا، اور اب وہاں سے کرتہ کی خوشبو آگئی؛ کیا بات ہے؟ تو جواب میں حضرت یعقوب علیہ السلام نے جو بات کہی، وہ یہ ہے:-

بگفت احوالِ ما برقِ جہان است ❁ دمے پیدا و دیگر دم نہان است
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم ❁ گہے بر پشت پائے خود نہ بینم
اگر درویش بر حالے بماندے ❁ سرِ دست از دو عالم برفشاندے

(گلستاں، ص۴۷۔ حکایت ۹)

ہمارے حالات تو کوندنے والی بجلی جیسے ہیں کہ پل بھر میں چمکتی ہے اور پھر پل بھر میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ملاءِ اعلیٰ پر پہنچ جاتے ہیں اور کبھی اپنے پاؤں کے پاس کیا ہے اس کا بھی ہم کو پتہ نہیں چلتا۔ پھر کہا: بھائی دیکھو! اگر سالک ایک ہی حالت پر رہتا تو دونوں جہاں سے ہاتھ دھو لیتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے۔ چونکہ انسان کے اوپر بیوی بچوں کے بھی حقوق رکھے ہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی؛ تو پھر بیوی بچوں کے حقوق کون ادا کرتا۔ اگر ہر وقت وہی کیفیت رہتی، گھر جانے کے بعد بھی اور دوکان پر جانے کے بعد بھی؛ تو پھر کون دکانداری کرتا، اور کون تجارت کرتا، کون بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو بنایا ہی اس انداز سے ہے کہ اس کی فطرت میں یہ ساری چیزیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کر سکے؛ اس کا بھی ایک جذبہ رکھا۔ بیوی بچوں کا حق بھی ادا کر سکے؛ اس لئے کچھ ان کی محبت بھی ڈال دی۔ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿ساعةً وساعةً﴾ اے حنظلہ! کبھی یہ، کبھی وہ۔ یہ ہے تب ہی انسان قائم ہے، اگر ایک حالت پر رہے تو پھر انسان جی نہیں سکتا۔

﴿حاصل کلام﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی میانہ روی اختیار کرے۔ یہ نہیں کہ بیوی بچوں میں ایسا پھنس گیا کہ بھول کر بھی اللہ کا نام نہیں لیتا، جیسا کہ آج کل ہم کر رہے ہیں۔ اور یہ بھی نہ ہو کہ ادھر ایسے مشغول ہو گئے کہ بیوی بچوں کے حق ضائع ہو رہے ہیں، اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت نے تو معتدل راستہ بتایا ہے۔

منت کس چیز کی صحیح ہوتی ہے؟

عَنِ ابْنِ عَبَّاس رضی اللہ عنہ قَالَ: بَيْنَمَا النَّبِيُّ ﷺ يَخْطُبُ اِذَا هُوَ بِرَجُلٍ قَائِمٍ. فَسَأَلَ عَنْهُ فَقَالُوْا: أَبُوْ اِسْرَائِيْلَ نَذَرَ أَنْ يَّقُوْمَ فِي الشَّمْسِ وَلَا يَقْعُدَ وَلَا يَسْتَظِلَّ وَلَا يَتَكَلَّمَ وَيَصُوْمَ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مُرُوْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ. وَلْيَقْعُدْ وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور ﷺ خطبہ دے رہے تھے، اس دوران ایک آدمی کو دیکھا کہ دھوپ میں کھڑا ہے، آپ نے پوچھا: بھائی! کیا بات ہے، وہ وہاں دھوپ میں کیوں کھڑا ہے؟ بتلایا گیا کہ یہ ابو اسرائیل ہے، جنہوں نے نذر اور منت مانی ہے کہ دھوپ میں ہی رہیں گے، کبھی چھاؤں میں نہیں جائیں گے، اور کھڑے ہی رہیں گے، بیٹھیں گے نہیں، اور خاموش ہی رہیں گے، کسی سے بات نہیں کریں گے، اور ہمیشہ روزہ ہی رکھیں گے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿مُرُوْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ﴾ ان سے کہو؛ بات کریں ﴿وَلْيَسْتَظِلَّ﴾ اور سائے میں بھی آویں ﴿وَلْيَقْعُدْ﴾ کھڑے نہ رہیں؛ بلکہ بیٹھ جائیں ﴿وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ﴾ ہاں! البتہ روزہ رکھیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

دیکھو! منت کس چیز کی صحیح ہوتی ہے؟ جو مسائل جانتے ہیں ان کو معلوم ہے اور یہاں علماء بھی موجود ہیں۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ جو چیز عبادت کے قبیل سے ہو، یعنی ایسی عبادت جو اللہ تعالیٰ نے فرض کر رکھی ہو، اسی کی جنس کی کسی چیز کی کوئی آدمی منت مانے؛ تو وہ منت صحیح ہو جاتی ہے۔ مثلاً کسی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنی رکعات نماز پڑھوں گا، یا اتنا صدقہ کروں گا یا حج کروں گا۔ یہ ساری وہ چیزیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے فرض کیا ہے، روزے فرض کئے ہیں، نماز فرض کی ہے، زکوٰۃ کی شکل میں مال نکالنا فرض کیا ہے؛ تو ایسی کسی چیز کی منت مانی جا سکتی ہے۔

اور اگر ایسی چیز کی منت مانی جس کے قبیل کی کوئی عبادت فرض نہیں ہے، تو پھر وہ منت صحیح نہیں ہوتی۔ مثلاً کوئی آدمی یوں کہے کہ میرا فلاں کام ہو گیا؛ تو مَیں دھوپ میں دو گھنٹے تک کھڑا رہوں گا۔ تو دھوپ میں کھڑا رہنا کوئی عبادت نہیں ہے، اس لئے آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ دھوپ میں کھڑے رہنے کی ضرورت نہیں، سائے میں آجائیں۔

یا مثلاً کسی نے منت مانی کہ میرا فلاں کام ہو گیا تو مَیں کسی سے بات نہیں کروں گا، تو کسی سے بات نہ کرنا کوئی عبادت نہیں ہے؛ اس لئے یہ منت ماننا بھی صحیح نہیں ہے۔ اس سے بھی آپ ﷺ نے منع فرمایا۔ لیکن ایک چیز کے بارے میں فرمایا کہ روزہ پورا کرلو، اس لئے کہ ان کی وہ منت صحیح تھی۔ انہوں نے جو چار پانچ چیزوں کی منت مانی تھی؛ ان میں سے ایک ہی چیز صحیح تھی، باقی سب غلط تھیں، اس لئے وہ سب ختم کر دیں۔

خلاصہ یہی نکلا کہ اعمال کے معاملہ میں آدمی کو میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ شروع ہی سے ایسا انداز لے کر چلے، جس پر آخر تک مداومت کر سکے اور وہ طریقہ وہی ہے؛ جو نبی کریم ﷺ نے عملی نمونہ کے طور پر ہم لوگوں کو بتلایا۔

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرماویں

دعا

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! ہم پر اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں

جاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ، عاجلہ، مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشان حالی کو دور فرما۔ اے اللہ! روزی کے معاملہ میں جو پریشان ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما کر روزیوں میں برکت اور کشادگی پیدا فرما۔ اے اللہ! کاروبار میں برکت عطا فرما۔ حرام سے حفاظت فرما، حلال کا اہتمام نصیب فرما اے اللہ! ہماری تمام ضروریات کی اپنے خزانۂ غیب سے کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ بنا۔ اے اللہ! ہمیں تیری ذات عالی پر اعتماد اور توکل کامل نصیب فرما۔ اے اللہ! تیرے غیروں کی طرف سے ہماری نگاہوں کو ہٹا لے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو تیری ذات ہی کے اوپر، اور صرف تجھ ہی سے متعلق فرمادے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی؛ وہ سب ہم کو عطا فرما۔ اور نبی کریم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔

ربنا تقبل منا انك أنت السميع العليم وتب علينا انك أنت التواب الرحيم

وصلّى اللّٰه تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا ومولٰنا محمد واٰله وأصحابه أجمعين

برحمتك يا أرحم الراحمين

اَلْمُحَافَظَۃُ عَلَی الْأَعْمَالِ

اعمال کی پابندی

مجلس ﴿۱﴾

۱۵؍جمادی الاخریٰ ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۸؍اکتوبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:

فأعوذباللّٰہمن الشيطان الرجيم. بسم الله الرحمن الرحيم

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِاللّٰهِ وَمَانَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

وَلَايَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ أُوْتُواالْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ

پابندی: اعتدال کی برکت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور عنوان قائم کیا ہے: "اَلْمُحَافَظَةُ عَلَى الْأَعْمَالِ" پچھلا عنوان یہ تھا کہ اعمال میں آدمی میانہ روی اور درمیانی راہ اختیار کرے اور اب یہ باب قائم کیا کہ اعمال کے اوپر مداومت، ہمیشگی اور پابندی کرے۔ ویسے آدمی جب درمیانی راہ اختیار کرے گا تو اس کے نتیجہ میں آپ ہی آپ اس کو پابندی بھی نصیب ہوگی۔

عام طور پر آدمی جب غلو کرنے لگتا ہے یا افراط سے کام لیتا ہے تو پھر وہ پابندی نہیں کر پاتا، پچھلے باب میں اور اس باب میں یہی مناسبت ہے، اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "الجامع الصحیح" میں اسی مناسبت سے باب کی ترتیب دی ہے۔ جہاں انہوں نے میانہ روی اختیار کرنے والا عنوان قائم کیا ہے اس کے بعد یہی عنوان ہے کہ آدمی اعمال کی پابندی اور اہتمام کرے۔

﴿دل میں قساوت پیدا ہونے کی ایک وجہ﴾

اس سلسلے میں قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ کیا ایمان والوں کے واسطے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے واسطے اور جو قرآنِ پاک اُترا ہے اس کے سامنے جھک جائیں اور گڑگڑائیں یعنی قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو چیزیں اور احکام اتارے ہیں اور جن چیزوں کے کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اس کے سامنے اہل ایمان کے دل جھک جائیں اور اس کے لئے مطیع، فرمانبردار اور تابع بن جائیں؛ کیا یہ وقت نہیں آیا؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ بن جائیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی، پھر ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن اعمال کے کرنے کے لئے کہا گیا تھا ان اعمال کی بجا آوری میں انہوں نے پابندی سے اور محافظت سے کام نہیں لیا، بلکہ اس میں کوتاہی کرتے رہے اور ان پر ایک زمانہ گذر گیا، جس کے نتیجے میں ان کے دل سخت ہو گئے۔

یہاں خاص طور سے یہی بتانے کے لئے لائے ہیں کہ اہل کتاب پر ایک زمانہ ایسا گذرا کہ ان لوگوں نے اعمال کا جو اہتمام اور پابندی کرنی چاہیے؛ وہ پابندی نہیں کی اور وقت گذرتا رہا، جس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں قساوت اور سختی آ گئی اور اس کے بعد وہ راہِ ہدایت سے ہٹ گئے۔ اس آیت کے لانے کا مقصد یہی ہے کہ آدمی جب عبادات کے اندر کوتاہی اور سستی کرنے لگتا ہے اور اعمال میں پابندی سے کام نہیں لیتا اور پابندی نہ کرنے والا زمانہ جوں جوں طول پکڑتا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کے قلب میں ایک قسم کی سختی پیدا ہو جاتی ہے۔

بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ معمولات جب چھوٹ جائیں اوراس پر ایک زمانہ گذر جائے تو پھر دوبارہ بڑی مشکل اور بہت مشقت اٹھانے کے بعد مداومت نصیب ہوتی ہے۔ وہ اسی لئے کہ ایک زمانہ تک چھوڑنے کے نتیجے میں اس کے دل میں ایک طرح کی قساوت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اوراس کی وجہ سے اس پر مداومت جلدی نصیب نہیں ہو پاتی۔

کسی معمول کو شروع کرنے کے بعد چھوڑنا مضر ہے

اس آیت کو لاکر اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا کہ آدمی جو بھی اعمالِ خیر اختیار کرے اس میں مداومت و ہمیشگی کرے۔ ایک تو فرائض ہیں، پنج وقتہ نمازیں رمضان المبارک کے روزے، زکوٰۃ کی ادائیگی اور جو جو چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض اور واجب کی گئی ہیں؛ ان کو تو انجام دینا ہی ہے، ان کو چھوڑنے کی صورت میں تو آدمی گنہگار ہوگا۔ لیکن ان کے علاوہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے، اس کی رضا مندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو نفل اعمال شروع کرے تو پھر ان پر پابندی بھی کرے۔ مثلاً اس نے ایک معمول بنالیا کہ روزانہ اشراق کی نماز پڑھے گا یا اوابین کا معمول بنالیا، یا تہجد کا معمول بنالیا، تو اگر چہ اوابین، اشراق، تہجد یا چاشت وغیرہ جتنی بھی نمازیں ہیں؛ یہ فرض اور واجب نہیں ہیں، لیکن جب اس نے ان اعمال کو شروع کیا تو مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ان کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جب تک شروع نہیں کیا تھا تب تک تو کوئی حرج کی بات نہیں تھی، لیکن شروع کرنے کے بعد پھر ان کو چھوڑ دینا مضر ہے۔

یہ تو ایسا ہی ہے جیسے آپ کوئی درخت لگائیں، بیج ڈالیں یا اس کی (پیوند) قلم لگائیں اوراس کے بعد اس کو پانی دینا چھوڑ دیں، اس کی حفاظت کرنا چھوڑ دیں؛ تو وہ سوکھ

جائے گا اور ختم ہوجائے گا۔ یا تو درخت ہی نہ لگاتے، لیکن جب لگایا ہی ہے؛ تو اب اس کی طرف توجہ کرنا اور اس کی حفاظت کا اہتمام کرنا بہت ضروری ہے۔

﴿دوسری آیت﴾

اسی مناسبت سے دوسری آیت پیش کی ہے ﴿وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ اس سے پہلے انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کے بھیجنے کا تذکرہ ہے، چند انبیاء کے نام لئے گئے ہیں، پھر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم نے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کو بھیجا؛ جو مریم کے صاحبزادے ہیں اور ہم نے ان کو انجیل دی جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بندوں کے واسطے ہدایتیں تھیں اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیروی کی؛ نرمی اور مہربانی ڈال دی۔ یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو پیروکار اور ان کے ماننے والے تھے اور ان پر ایمان لانے والے تھے؛ ان کے دلوں میں ہم نے نرمی اور شفقت کا جذبہ ڈال دیا۔

﴿رہبانیت کا پس منظر﴾

اور رہبانیت یعنی ترکِ دنیا۔ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ جائز لذات؛ جن کو اختیار کرنے کی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجازت دی گئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے اور اس کو راضی کرنے کے لئے اور اس مقصد سے کہ ان جائز چیزوں کو اختیار کرنے کی صورت میں کہیں حدود سے تجاوز کرتے ہوئے آگے نہ نکل جائے، اس لئے وہ ان جائز لذات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ تو یہ رہبانیت ہے۔

امم سابقہ میں خاص کر نصاریٰ کے اندر رہبانیت کا رواج پڑ گیا تھا اور اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب ان کے بادشاہوں میں اور پھر بادشاہوں کی دیکھا دیکھی رعایا کے اندر جو لوگ اہلِ ثروت اور مال و دولت والے تھے؛ ان کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور اس کی نافرمانی کا سلسلہ شروع ہوا، تو ان میں جو لوگ اللہ کے مطیع اور فرمانبردار تھے، انہوں نے نافرمانوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے روکنے کے لئے ان کا مقابلہ کیا اور قوت سے کام لیا، لیکن چونکہ نافرمانوں کے پاس قوت اور طاقت تھی اور ان کی تعداد بھی زیادہ تھی، لہٰذا جو لوگ ان کو نافرمانیوں سے روکنے کے لئے میدان میں آئے ان کو ان نافرمانوں نے قتل کردیا۔

اس کے بعد پھر ایک دوسری جماعت پیدا ہوئی جنہوں نے قوت سے روکنے کے بجائے انہیں کے درمیان میں رہتے ہوئے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو بجالانے کا اور اس کی خلاف ورزیوں اور نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا، اور ساتھ ہی ساتھ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑتے تھے اور نافرمانیوں میں مبتلا تھے؛ ان کو قوت سے نہیں بلکہ زبان سے روکنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ان نافرمان لوگوں نے اس کو بھی برداشت نہیں کیا اور حکومت وطاقت اور مال ودولت کے نشہ میں آکر ایسے لوگوں کو بھی قتل کردیا۔

اس کے بعد پھر جو لوگ آئے انہوں نے دیکھا کہ ان کے درمیان رہتے ہوئے زبان سے بھی ان کو روکتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا مشکل ہے، اس لئے کہ یہ لوگ قتل کردیتے ہیں، تو پھر انہوں نے ایک صورت یہ اختیار کی کہ چلو! لوگوں سے کٹ کر جنگلوں میں اور پہاڑوں کے اوپر چلے جائیں اور وہاں جا کر دنیا کی ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ دیں،

بیوی بچوں کو چھوڑ کر اپنے آپ کو سارے سماج اور معاشرے سے الگ کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اندر مشغول کر لیں؛ تاکہ ان کے درمیان میں رہ کر برائیوں میں پھنسنے کی بھی نوبت نہ آئے، اور جب الگ رہیں گے تو ان کی طرف سے جو اندیشہ اور خطرہ لاحق تھا اس سے بھی اپنے آپ کو بچا لیں گے۔ یہ جو تیسرا گروہ پیدا ہوا انہوں نے یکسوئی اور تنہائی اختیار کی اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا اہتمام کرنے ہی کے لئے اپنے آپ کو الگ کیا؛ اسی کو رہبانیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿اسلام میں رہبانیت نہیں ہے﴾

اسلام میں تو رہبانیت کے نظریہ کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ (مسند احمد ۶/۲۲۶)﴾ اسلام کے اندر رہبانیت نہیں ہے، بلکہ جہاد کو رہبانیت سے تعبیر کیا گیا ہے (مسند احمد ۳/۸۴) آدمی جب جہاد میں جاتا ہے تو اپنے سارے مشاغل و دنیاداری چھوڑ کر اللہ کی راہ میں نکلتا ہے، گویا جہاد میں آدمی اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں کو اپنے لئے ممنوع ٹھہرا دیا کرتا ہے۔

﴿حلال کو استعمال نہ کرنے کی شکلیں اور ان کا حکم﴾

ویسے اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزیں اگر کوئی آدمی اپنے اوپر حرام کر لے اور اس کے استعمال سے اپنے آپ کو روکنے لگے تو اس کے اندر تفصیل ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ عقیدے کے طور پر اس چیز کو حرام سمجھتا ہے۔ لہٰذا اگر اس حرام کی ہوئی چیز کا حلال ہونا کسی نصِ قطعی سے ثابت ہے اور وہ عقیدے کے اعتبار سے اس کو حرام ٹھہراتا ہے؛ تو اسلام میں باقی ہی نہیں رہے گا، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیز کو حرام قرار دینا کفر ہے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ عقیدے کے اعتبار سے تو وہ اس کو حلال سمجھتا ہے، لیکن عملی طور پر اس نے اپنے آپ پر اس کو حرام کرلیا؛ تو یہ بھی گناہ ہے، اس لئے کہ قرآن پاک کے اندر اس سے بھی منع کیا گیا ہے ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں پاک اور حلال ٹھہرائی ہیں ان پاکیزہ چیزوں کو اپنے اوپر حرام نہ کرلو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی حلال چیز کے استعمال میں آدمی کے لئے کوئی دینی یا دنیوی نقصان ہے اور اپنے آپ کو اس نقصان سے بچانے کے لئے اس سے پرہیز کرتا ہے۔ مثلاً کوئی بیماری ہوگئی، اور طبیب، ڈاکٹر یا معالج نے مشورہ دیا کہ فلاں چیز کا استعمال نہ کیجیے، نمک استعمال نہ کیجیے، شکر استعمال نہ کیجیے، گوشت استعمال نہ کیجیے، تو نمک، شکر اور گوشت اپنی جگہ پر حلال چیزیں ہیں لیکن چونکہ اس کے استعمال کے نتیجے میں ہم اپنی بیماری کی وجہ سے مزید نقصان میں پڑ جائیں گے، لہٰذا اپنے آپ کو جسمانی ضرر سے بچانے کے لئے اگر آدمی ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتا؛ تو اس صورت میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔

بہت سی چیزوں کا استعمال کرنا جس طرح جسمانی بیماری کے اندر مضر ہوتا ہے، اسی طرح کبھی روحانی بیماری کے اندر بھی نقصان دہ ہوتا ہے، مثلاً ایک آدمی کی طبیعت میں شہوت کا غلبہ ہے اور ابھی نکاح کا بھی انتظام نہیں ہوا اور اس کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر میں گوشت کھاؤں گا تو طبیعت میں مزید انتشار پیدا ہوگا اور ہوسکتا ہے کہ میں زنا کاری اور بدکاری میں مبتلا ہو جاؤں، لہٰذا اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کی نیت سے اگر وہ گوشت نہیں کھا رہا ہے؛ تو اس کی گنجائش ہے۔

یا مثلاً لوگوں کے اندر مل جل کر رہے گا تو غیبت میں ابتلاء ہو جائے گا، جھوٹ میں

مبتلا ہو جائے گا، لوگوں کے ساتھ لڑائی جھگڑے میں مبتلا ہونے کا ڈر ہے، اس لئے اپنے آپ کو لوگوں سے یکسو رکھتا ہے، ان کے ساتھ ملتا جلتا نہیں ہے؛ تو گنجائش ہے۔

بہر حال! دوسری صورت تو یہ ہوئی کہ حلال، مباح اور جائز چیز سے کسی جسمانی یا روحانی نقصان سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو بچاتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

یہ ایک طرح کا غلو ہے

تیسری صورت یہ ہے کہ ایسی چیزیں جو مباحات کے قبیل سے ہیں اور نبی کریم ﷺ نے خود استعمال کر کے عملی طور پر امت کو بتلا دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی رخصتوں کی طرف توجہ دلائی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے استعمال کرنے کی سہولتیں دی ہیں، پھر بھی کوئی آدمی ایسی چیزوں کے معاملہ میں اپنے آپ پر تشدد اور سختی کرتے ہوئے؛ سہولت کو اختیار کرنے کے بجائے کسی دشواری کے پہلو پر -جس کو عزیمت سے تعبیر کیا جاتا ہے- عمل کرے؛ تو یہ ایک طرح کا غلو ہے، اور اللہ تعالیٰ کو جس طرح یہ پسند ہے کہ اس کی عزیمت والے احکام پر عمل کیا جائے، اسی طرح اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو عملی جامہ پہنایا جائے، اور یہ آدمی نبی کریم ﷺ کے اس عمل کو جائز ٹھہرانے اور اس رخصت کو عملی طور پر بتلانے کے باوجود اس کو اختیار نہیں کرتا؛ جو ایک طرح کا غلو ہے، اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

بہر حال! کسی جائز کو استعمال نہ کرنے کی یہ تین صورتیں ہیں، اس میں دوسری صورت جس میں وہ اپنے آپ کو جسمانی یا روحانی نقصان سے بچانے کے لئے اگر احتراز کرتا ہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

﴿مقاصد کونظرانداز کردینا برا ہے﴾

اس آیت میں یہی بتلایا ہے کہ وہ گروہ جس نے رہبانیت کو اپنی طرف سے ایجاد کیا تھا﴿مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾ ہم نے ان پر اس کو لازم نہیں کیا تھا یعنی بنی اسرائیل کے اندر یہ تیسرا گروہ پیدا ہوا جنہوں نے یہ سمجھتے ہوئے کہ ہم لوگوں کے درمیان میں رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجانہیں لاسکیں گے، اس لئے انہوں نے لوگوں سے دوری اختیار کی اور پہاڑوں کے اوپر یا جنگلوں میں جا کر یکسوئی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوئے اور وہ ساری چیزیں جو اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی تھیں اُن کو انہوں نے چھوڑ دیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا کہ تم یہ طریقہ اختیار کرو بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ شروع کر رکھا تھا۔

خیر! ان کے اگلے لوگ جنہوں نے اس کو شروع کیا تھا ان کی نیت تو یہی تھی کہ اس طریقہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی احکام کی بجاآوری چاہتے تھے اور معاشرے کی برائیوں سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے تھے، لیکن پھر بعد میں یہی سلسلہ آگے بڑھا اور دوسری نسلیں آتی گئیں، جنہوں نے اس رہبانیت والے طریقہ میں ان مقاصد کو نظرانداز کر دیا جن کے لئے شروع کیا تھا۔ خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی کو چھوڑ کر دنیا کو اپنا مقصود بنالیا اور پھر اس رہبانیت کا جو تقاضا تھا اس کو انجام نہیں دیا۔ اسی کو بیان فرمایا ہے: ﴿فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ اس کا جیسا خیال رکھنا چاہیے؛ ویسا خیال نہیں رکھا۔

اور اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ ایک ایسی چیز تھی جس کو انہوں نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے ارادے سے اپنے طور پر شروع کی تھی، اگرچہ ان کی نیت بخیر تھی لیکن چونکہ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جاری نہیں کی گئی تھی، اس لئے اس کے جو تقاضے تھے ان کو وہ پورے نہیں کر سکے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو چیز ایسی ہو جس کو شریعت نے جاری نہ کیا ہو، اور کوئی آدمی اس کو نیتِ خیر سے شروع کرے؛ تب بھی اس کے تقاضے کو وہ پورا نہیں کر سکے گا، آگے جا کر اس میں کوتاہیاں سرزد ہونے ہی والی ہیں۔

اس آیت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ان لوگوں نے رہبانیت والا طریقہ اللہ تعالیٰ کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے شروع کیا تھا لیکن اس کو نباہ نہیں پائے اور اس کی پابندی نہیں کر سکے، اس پر ان کی برائی بیان کی گئی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کوئی بھی نفل کام شروع کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ پابندی کے ساتھ اس کو نبھائے، اور عملی طور پر باقی وجاری رکھے، اس کو چھوڑ نہ دے۔

﴿یہ مناسب نہیں ہے﴾

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنْكَاثًا﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ تیسری آیت لائے ہیں کہ اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جس نے اپنے سوت کو بڑی محنت سے کاتنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس آیت کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک عورت خفیف العقل تھی؛ جو دن بھر سوت کاتتی تھی اور پھر ہاتھ سے جو سوت تیار ہوتا تھا؛ شام کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی تھی، گویا اس نے اتنی محنت سے ایک چیز تیار کی اور پھر اپنے ہی ہاتھوں اس کو ضائع کر دیا۔ اسی طرح جو آدمی کوئی عمل شروع کرتا ہے اور چند روز کرنے کے بعد پھر اس کو چھوڑ دیتا ہے؛ یہ بھی ایسا ہی ہے کہ بڑی محنت سے ایک چیز شروع کی اور اس کے بعد اپنے ہی ہاتھوں اس کو ضائع کر دیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم ایسے مت بنو۔

چنانچہ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ جب اہلِ ایمان کی طرف سے بعض اعمال میں کوتاہی کا صدور ہونے لگا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس آیت کے ذریعہ سے ان کو متنبہ کیا گیا کہ تم اپنے اعمال میں جو کوتاہی کر رہے ہو؛ یہ مناسب نہیں ہے۔

دمے فارغ مباش

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد نقل کیا ﴿وَاعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ﴾ تم اپنے رب کی عبادت کرتے رہو؛ یہاں تک کہ موت آ جائے۔ "الیقین" یعنی موت۔ موت آنے تک تمہاری عبادت واطاعت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی جو بھی عمل شروع کرے، چاہے وہ نفل کے قبیل سے ہی کیوں نہ ہو؛ شروع کرنے کے بعد اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔ بلکہ آدمی اس پر پابندی کے ساتھ موت تک عمل کرتا رہے:

اندریں راہ می تراش ومی خراش ❁ تا دم آخر دمے فارغ مباش

اللہ تبارک وتعالیٰ کے راستہ میں آدمی کو تکلیف اور مشقت اٹھاتے ہی رہنا چاہیے اور آخری سانس تک آدمی کو فرصت اور اطمینان سے بیٹھنا نہیں چاہیے، گویا آدمی اپنے آپ کو موت تک اللہ کی اطاعت میں لگائے رکھے۔

وأما الأحاديث فمنها حديث عائشة رضی اللہ عنہا و كَانَ أَحَبُّ الدِّيْنِ مَادَاوَمَ صَاحِبُهُ عَلَيْهِ

احادیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی وہ حدیث ہے جو پہلے بھی بتلا چکے ہیں کہ دین میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ عمل وہ ہے جس پر آدمی مداومت، ہمیشگی اور پابندی کرے، آدمی ایک عمل شروع کرے اور پھر چھوڑ دے؛ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔

کوئی معمول قضا ہو جائے تو کیا کرے؟

عن عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهِ مِنَ اللَّيْلِ أَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ فَقَرَأَهُ مَابَيْنَ صَلاةِ الْفَجْرِ وَصَلاةِ الظُّهْرِ، كُتِبَ لَهُ كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد اس آیت کے ذیل میں پیش کیا ﴿وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن یَّذَّکَّرَ أَوْ أَرَادَ شُکُوراً﴾ ہم نے رات اور دن کو (عبادت کے باب میں) ایک دوسرے کا نائب بنا رکھا ہے اس آدمی کے لئے جو نصیحت حاصل کرنا چاہے، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہے۔ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی کہ اگر کسی آدمی کا رات کا معمول چھوٹ گیا، مثلاً آدمی نے تہجد کے اندر روزانہ قرآن کی ایک مخصوص مقدار پڑھنا مقرر کرلیا کہ مثلاً روزانہ تہجد میں ایک پارہ، دو پارے، تین پارے یا ایک منزل پڑھا کروں گا (قرآن کی ایک مخصوص مقدار کو ''حزب'' کہتے ہیں) لیکن کسی وجہ سے آنکھ لگی رہی اور نہیں کھل سکی، جس کی وجہ سے رات کا جو معمول تھا وہ نہیں پڑھ پایا، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ فجر اور ظہر کے درمیان۔ طلوع آفتاب کے بعد جب وقتِ مکروہ گذر جائے وہاں سے لے کر زوال سے پہلے تک۔ کا جو وقت ہے، اس میں اگر اپنا وہی معمول پڑھ لے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے نامۂ اعمال کے اندر ایسا ہی ثواب لکھا جائے گا جیسا کہ اُس نے رات میں پڑھا۔

ایسا ہوتا ہے جو لوگ اعمال کا اہتمام کرتے ہیں، پابندی بھی کرنا چاہتے ہیں، کبھی کسی وجہ سے بیماری یا زیادہ تھکن کی وجہ سے آنکھ نہیں کھلی تو گویا ان لوگوں کے لئے جن کا معمول تو اٹھنے کا ہے اور اٹھنے کے لئے انہوں نے ساری تدبیریں بھی کرلیں لیکن آنکھ لگی

رہی (ایسا نہیں کہ آنکھ کھلی اور پھر بھی نہ اُٹھا) اور اُٹھ نہیں پایا، پھر عین فجر کے وقت آنکھ کھلی، تو اب یہ آدمی اشراق سے لے کر چاشت تک کے وقت میں رات والے اس معمول کو پورا کرلے؛ تو اس کا پورا ثواب اس کو ملے گا۔

اس طریقہ سے نبی کریم ﷺ نے غیر اختیاری طور پر (یعنی ایک ایسے طریقہ سے جس میں آدمی کے ارادے کو دخل نہیں ہے) جو معمول چھوٹ گیا تھا؛ اس کی تلافی کی صورت بتلا دی۔ اس لئے کہ یہ ایک معمول ایسا ہے کہ جس کے غیر اختیاری طور پر چھوٹنے کا امکان موجود ہے، باقی دوسرے معمولات تو آدمی اچھے طریقہ سے اپنے وقت پر انجام دینا چاہے تو دے سکتا ہے، لیکن اِس معمول میں چونکہ نیند کا معاملہ رہتا ہے تو ہوسکتا ہے کہ آنکھ نہ کھل پائے اس لئے حدیثِ پاک میں اس کا بدل خاص طور پر تجویز کردیا گیا۔

فلاں جیسا مت بنو

عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول اللہ ﷺ: یَاعَبْدَاللہِ! لاتَکُنْ مِثْلَ فُلانٍ، کَانَ یَقُوْمُ اللَّیْلَ فَتَرَکَ قِیَامَ اللَّیْلِ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے عبداللہ! فلاں جیسا مت بنو؛ کہ وہ رات کو نماز کے لئے اٹھا کرتا تھا لیکن پھر اس نے یہ سلسلہ چھوڑ دیا۔

دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اس آدمی کی اس حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ گویا بتلا دیا کہ یہ مناسب نہیں ہے کہ آدمی ایک کام شروع کرے پھر اس کے بعد اس کو چھوڑ دے، آدمی نے جو معمول شروع کیا ہے؛ زندگی کے آخری لمحات تک اس پر پابندی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اسی لئے پہلے بھی جو روایت گذری تھی اس میں انہیں حضرت عبداللہ بن عمرو بن

العاص ؓ کا قصہ تھا کہ رات کی نماز میں قرآن پاک پڑھنے کے سلسلے میں اور دن میں روزے رکھنے کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ نے ان کو تخفیف کے لئے فرمایا تھا اور آخر میں ایک خاص مقدار پر بات طے ہوئی، لیکن وہ بوڑھاپے کے زمانے میں اپنی کمزوری کی وجہ سے جب اس کو کما حقہ' ادا نہیں کر پاتے تھے؛ تب بھی عملی طور پر اس کا بدل کر لیا کرتے تھے کہ مثلاً ایک دن افطار اور ایک دن روزہ کا معمول تھا لیکن کسی دن روزہ نہیں رکھ پاتے تھے تو کبھی مسلسل چار پانچ دن افطار کر لیا کرتے تھے اور اس کے بعد اس کے بدلے میں مسلسل چار پانچ دن روزے بھی رکھ لیا کرتے تھے۔ وہ ایسا اسی لئے کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ نے عمل کے متعلق تعلیم دی ہے کہ شروع کرنے کے بعد پھر اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، بلکہ اس پر مداومت اور ہمیشگی رہنی چاہیے۔

تہجد پر مداومت کا ایک طریقہ

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كان رسول الله ﷺ اِذَا فَاتَتْهُ الصَّلاةُ مِنَ اللَّيْلِ مِنْ وَجَعٍ أَوْغَيْرِهِ، صَلّىٰ مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَىْ عَشَرَةَ رَكْعَةً.

یہاں خود نبی کریم ﷺ کا معمول بھی بتلا دیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی رات کی نماز اگر کسی بیماری کی وجہ سے یا اور کسی وجہ سے چھوٹ جاتی تو دن میں (سورج کے طلوع ہونے کے بعد وقتِ مکروہ ختم ہونے کے بعد سے لے کر زوال سے پہلے تک) بارہ رکعتیں ادا فرما لیا کرتے تھے، گویا آپ ﷺ نے مداومت کا ایک طریقہ عملی طور پر بھی امت کو سکھلا دیا۔

جیسا کہ پہلے مَیں نے عرض کیا کہ یہی ایک عمل ایسا تھا کہ جس میں غیر اختیاری طور پر چھوٹنے کے امکانات موجود تھے، اب اس پر مداومت کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے؛ تو

نبی کریم ﷺ نے عملی طور پر بتلا دیا کہ اگر غیر اختیاری طور پر آنکھ لگی رہنے کی وجہ سے آپ نہیں اٹھ پائے؛ تو مداومت کی صورت یہ ہے کہ دن میں اتنی ہی رکعتیں آپ پڑھ لیجیے؛ تا کہ اس کی تلافی ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

اَلْمُحَافَظَةُ عَلٰی السُّنَّةِ

سنتوں کا اہتمام

مجلس ﴿ ۱ ﴾

۲۲/ جمادی الآخری ۱۸ ۱۴ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۲۵/ اکتوبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَ شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أما بعد

فأعوذ باللّٰہ من الشيطان الرجيم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحيم

مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

وقال تعالىٰ: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحىٰ.

وقال تعالىٰ: قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ.

وقال تعالىٰ: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ

قال تعالىٰ: فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُوْا فِيْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا.

باب قائم کیا ہے ﴿الأَمْرُ بِالْمُحَافَظَةِ عَلىٰ السُّنَّةِ وَاٰدَابِهَا﴾ نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنانے کی تاکید اور سنتوں کا اہتمام کرنا۔ کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔

پہلی آیت ہے ﴿مَا اٰتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ اللہ کے رسول تم کو جس چیز کا حکم دیں؛ اس کو لے لو یعنی اس کے اوپر عمل کرو اور جس چیز سے تم کو روکیں؛ اس سے باز آ جاؤ۔ نبی کریم ﷺ کے ذریعہ سے جتنے بھی احکام امت کو دیئے گئے، چاہے وہ از قبیلِ اوامر ہوں یعنی وہ چیزیں جن کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا از قبیل نواہی ہوں

یعنی وہ چیزیں جن سے بچنے کا اور رُکنے کا حکم دیا گیا ہے؛ دونوں کے متعلق اس آیت کے اندر امت کو تاکید کر دی گئی کہ آپ ﷺ کی طرف سے جن چیزوں کا حکم دیا جائے ان کو لے لو یعنی ان پر عمل کرو، اور جن چیزوں سے منع کیا جائے اس سے باز آ جاؤ۔

﴿اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر......﴾

بخاری شریف میں روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہے ان عورتوں پر جو اپنے بالوں میں دوسری عورتوں کے بالوں کے ذریعہ سے جوڑ لگاتی ہیں ﴿اَلْوَاصِلَۃَ وَالْمُسْتَوْصِلَۃَ﴾ جو عورتیں یہ کام کرواتی ہیں اور کرتی ہیں ﴿اَلْوَاشِمَۃَ وَالْمُسْتَوْشِمَۃَ﴾ گوندھنے لگانے والی اور گوندھنے لگوانے والی عورت؛ ان سب پر لعنت ہے۔ اس موقعہ پر ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سوال کیا کہ آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے طور پر اس کو بیان فرما رہے ہیں اور مَیں نے پورا قرآنِ پاک پڑھا، قرآن میں کہیں یہ چیز موجود نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا ﴿لَوْقَرَأْتِیْہِ لَوَجَدتِّیْہِ﴾ اگر غور سے قرآن پاک کو پڑھتی تو ضرور یہ چیز بھی مل جاتی۔ تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ﴿مَا اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھَاکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا﴾ اس میں تو ساری چیزیں آ گئیں۔

﴿مجھ سے جو سوال چاہو؛ کرو......﴾

ایک موقعہ پر امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے کہا کہ مجھ سے جو سوال چاہو کرو، مَیں اس کا حکم قرآنِ پاک سے بتلاؤں گا۔ چنانچہ سوالات کئے گئے، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے احادیث کے ذریعہ سے جواب دینے کے بعد یہ آیت پڑھ دی اور فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے

جو حکم دیا ہے اس کو عمل میں لاؤ اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے باز آجاؤ۔ قرآن میں یہ موجود ہے، اور نبی کریم ﷺ کے اقوال اور افعال سب قرآنِ پاک کی تشریح ہی ہیں ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَیْھِمْ﴾ نبی کریم ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھیجا ہی اس لئے ہے کہ قرآن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے بندوں تک جو چیزیں اتاری ہیں؛ آپ ﷺ اس کی تشریح اپنے اعمال، اقوال اور افعال سے فرماویں۔

﴿وحی متلو اور وحی غیر متلو﴾

اسی کو آگے دوسری آیت میں فرمایا ﴿وَمَایَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَاِلَّاوَحْیٌ یُّوْحٰی﴾ نبی کریم ﷺ کوئی چیز اپنی خواہش نفسانی سے اپنی زبان سے نہیں نکالتے بلکہ جو کچھ بھی آپ فرماتے ہیں وہ وحی ہی ہے جو آپ پر بھیجی جارہی ہے۔ یعنی نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو کچھ بھی نکل رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر اتارا گیا ہے؛ اسی کو قرآن کہا جاتا ہے، یہ وحی متلو ہے، یعنی وہ وحی جس کی باقاعدہ تلاوت کی جاتی ہے۔ الفاظ اور معانی دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارے ہوئے ہیں۔ اور بعض چیزیں وہ ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اوپر معانی کا القا کیا جاتا ہے، یعنی معانی اور مفہومات حضور ﷺ کو بتلائے جاتے ہیں اور آپ اپنی زبان سے اپنے الفاظ کے اندر لوگوں کے سامنے پیش فرماتے ہیں جس کو وحی غیر متلو کہا جاتا ہے۔ بہرحال! آپ ﷺ جو بھی فرمارہے ہوتے ہیں وہ اپنی خواہش نفسانی سے نہیں فرماتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی ہی ہے جو آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہورہی ہے۔

اس زبان سے حق کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے یہ معمول بنالیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے اس کو وہ لکھ لیا کرتے تھے، اور منضبط کرلیتے تھے، اس طرح ایک مجموعہ ان کے پاس جمع ہوگیا۔ بعض لوگوں نے اس پر ٹوکا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ بھی فرماتے ہیں اس کو آپ لکھ لیتے ہیں، حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انسان ہیں، کبھی غصے میں ہوتے ہیں، کبھی خوشی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ کہنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات لکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔ یہ چیز حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لکھ لیا کرو، اس لئے کہ اس زبان سے حق کے علاوہ اور کچھ نہیں نکلتا چاہے میں غصے کی حالت میں ہوؤں، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾ جو کچھ بھی آپ بولتے ہیں اپنی خواہش سے نہیں بولتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری ہوئی وحی ہے۔ (جامع بیان العلم، ۱/۷۶)

تمام چیزوں میں میری پیروی کرو

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد نقل کیا ﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي﴾ اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اور اتباع کرو، مَیں جس طرح کرتا ہوں اس طرح کرو، جس طرح چلتا ہوں اس طرح چلو، ساری چیزوں میں میری پیروی کرو؛ اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا۔

ظاہر ہے کہ محبت ایک ایسی چیز ہے کہ کوئی آدمی اس کو دیکھ نہیں سکتا، اس کا تعلق

قلب اور دل سے ہے، کس کے ساتھ محبت ہے، کس کے ساتھ نہیں ہے، اور اگر ہے تو کتنی مقدار میں ہے، زیادہ ہے یا کم ہے؛ وہ دیکھی نہیں جاسکتی، البتہ علامتوں، قرائن اور نشانیوں کے ذریعہ ہی آدمی اس کا اندازہ لگا سکتا ہے:

ٹپکتی ہے اداؤں سے، برستی ہے نگاہوں سے ۞ محبت کون کہتا ہے کہ پہچانی نہیں جاتی

کسی سے محبت ہو تو بھی، عداوت ہو تو بھی؛ آدمی کے آثار اور علامتوں سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تک نبی کریم ﷺ کے ذریعہ سے یہ پیغام پہنچایا گیا کہ اے نبی! جو لوگ میری محبت کا دعویٰ کرتے ہیں آپ ان لوگوں کو کہہ دیجیے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو پھر میری پیروی کرو۔ اگر واقعۃً تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت ہے تو پھر میری پیروی کروگے۔ اور اللہ تعالیٰ سے جتنی زیادہ محبت ہوگی، اتنی ہی مکمل پیروی آپ ﷺ ہوگی، اور جتنی محبت میں کمی ہوگی اسی حساب سے آپ ﷺ کی پیروی اور اتباع کے اندر کمی آئے گی۔ پھر آگے اس کا ثمرہ بھی بتا دیا ﴿یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ﴾ اگر تم میری پیروی کروگے تو اس کے نتیجے میں کیا ملے گا؟ اللہ تبارک وتعالیٰ تم سے محبت کرے گا ﴿وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

﴿......تو پھر خود اس ذات کا کیا حال ہوگا؟﴾

حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ جس کثرت سے جگہ جگہ موجود ہے کسی اور نبی کا تذکرہ اس کثرت سے نہیں ہے اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ باری تعالیٰ کے تعلق کا قرآنِ پاک میں اظہار کیا گیا ہے۔ دنیا میں تشریف فرما ہوئے وہاں سے لے کر نبوت سے سرفراز کیے

جانے تک اور اس کے بعد جو معاملہ ان کا اپنی امت اور اپنی قوم کے ساتھ رہا؛ وہ تمام واقعات تفصیل سے قرآنِ پاک میں موجود ہیں اور بعض واقعات تو مکرر سہ کرر مختلف الفاظ میں آئے ہیں۔ تو حضرت علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ اس کثرت کو دیکھ کر بار بار میرے دل میں خیال آیا کہ قرآنِ پاک میں ان کا ذکر عجیب وغریب طریقہ سے فرمایا گیا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام بڑا ہوگا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے سب کا سردار بنایا اس کے باوجود اتنی کثرت سے آپ کا تذکرہ موجود نہیں۔ ایسا کیوں؟ پھر فرماتے ہیں کہ جب اس آیت کے اوپر مَیں نے غور کیا تو میرے دل کو اطمینان ہوا کہ اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام لوگوں کو کھلم کھلا بتلا دیا ہے کہ اگر تم کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو میری (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی) پیروی کرو؛ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ تو جس کی شان یہ ہو کہ اس کے نقشِ قدم پر چلنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبوبیت کا مقام ان چلنے والوں کو حاصل ہوتا ہو؛ تو پھر خود اس ذات کا کیا حال ہوگا؟ یہ عام اعلان کیا گیا ہے، سب کو کہا کہ میرے راستے پر چلو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔

متبعِ سنت کو محبوبیت سے نوازا جاتا ہے

اگر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ میں ایسے بندے پیدا فرمائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لیکر آج تک یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اور آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کا اور آپ کی پیروی کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں؛ اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ ان کو اپنے یہاں بھی محبوبیت عطا فرماتا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ

کے یہاں کوئی محبوب بن جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ کی مخلوق میں بھی اس کو محبوبیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ پہلے بھی روایت گذری ہے اور وہاں یہ بتلا چکا ہوں۔

اہل اللہ کی مقبولیت کا راز

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جب کسی سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ تم ان سے محبت کرو، اس لئے کہ مَیں ان سے محبت کرتا ہوں، پھر حضرت جبرئیل آسمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم ان سے محبت کرو، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان سے محبت کرتے ہیں اور مَیں بھی ان سے محبت کرتا ہوں ﴿فَيُوضَعُ لَهُ الْقَبُولُ فِي الْأَرْضِ (بخاری شریف ۲۴۰۹)﴾ حدیث کے الفاظ ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے واسطے زمین کے اندر مقبولیت رکھ دی جاتی ہے۔ اہل اللہ کی مقبولیت کا یہی راز ہے۔ بہت سے ایسے بندے جنہوں نے ان اللہ والوں کو دیکھا بھی نہیں ہے، بہت سے اللہ والے ہمارے ملک ہی کے اندر ایسے ہیں کہ جن کے صرف نام ہم نے سنے ہیں، کبھی ان کی زیارت کی نوبت بھی نہیں آئی؛ اس کے باوجود ان کی محبت سے ہمارے دل بھرپور ہیں، ہمارے دلوں کے اندر یہ محبت کس نے ڈالی؟ اللہ تعالیٰ نے ڈالی۔

کون سی مقبولیت مطلوب ہے؟

اور یہی ایک بڑی علامت ہے کہ کس کی مقبولیت لوگوں کے اندر کیسی ہے؟ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ایک آدمی کا چرچا اور شہرت ہو جاتی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت کی علامت ہے یا نہیں؟ یہ جاننا ہو تو اس کی علامت یہی بتلائی گئی ہے کہ جس آدمی کی مقبولیت خواص سے شروع ہو کر عوام میں پھیلے، یعنی جو صلحاء ہیں پہلے وہ اس

سے محبت کریں اوراس کے بعد پھراس کی مقبولیت لوگوں میں اورعوام کی طرف بڑھے تو یہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے۔اوراگرعوام کے اندرتو خوب چرچا ہےلیکن خواص، اہل اللہ اورصلحاءِ زمانہ میں سے کوئی اس سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں،تو پھر چاہے عوام میں اس کا کتنا ہی چرچا کیوں نہ ہو؛ وہ عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں ہے۔

بہرحال!﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ ایک عجیب وغریب آیت ہے، نبی کریم ﷺ کی پیروی کی اہمیت بتلانے کے لئے یہی ایک آیت کافی تھی،اس کے باوجود علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے اورآیتوں کو پیش کیا ہے۔

﴿فَلَاوَرَبِّكَ لَايُؤْمِنُوْنَ الخ﴾ پس قسم ہے تمہارے رب کی! یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ آپ کو فیصل بناویں ان چیزوں میں جن میں ان کے آپس میں جھگڑا ہے پھروہ اپنے جی میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اس فیصلے سے جو آپ نے کیا﴿وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ اوراس فیصلے کو پورے پورا تسلیم کرلیں،دل سے مان لیں۔اس آیت کے متعلق تفصیل بعد میں عرض کرتا ہوں۔

﴿جو نبی کے فیصلہ پرراضی نہ ہو؛ اس کا فیصلہ......﴾

روایتوں کے اندراس آیت کا شانِ نزول بتلایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک منافق جو ظاہری طور پرمسلمان تھااس کے اورایک یہودی کے درمیان کسی معاملہ میں جھگڑا ہوگیا، دونوں اپنے اس جھگڑے کا فیصلہ کروانا چاہتے تھے۔وہ چونکہ سچا مسلمان تو تھا نہیں بلکہ منافق تھااور پھرجس معاملہ میں جھگڑا ہوا تھااس میں وہ حق پر بھی نہیں تھا،حق پر یہودی تھا،اس لئے یہودی کا اصرار یہ تھا کہ فیصلے کے لئے حضورِاکرم ﷺ کے پاس جائیں اوراس کو معلوم تھا کہ

اگرچہ مَیں مسلمان ہوں، اسلام کا دعویٰ کرتا ہوں لیکن چونکہ نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ جو حق پر ہو، اسی کے موافق فیصلہ فرماتے ہیں، اس لئے مَیں مسلمان ہوں اس مناسبت سے میری طرفداری تو کریں گے نہیں، آپ ﷺ تو حق کے مطابق فیصلہ کریں گے، اس لئے وہ یوں کہتا تھا کہ ہم اپنا فیصلہ کعب بن اشرف (منافقین کے سردار) کے پاس لے چلیں۔ بہرحال! یہ بات کچھ دنوں تک ان کے درمیان اٹکی ہوئی رہی، آخر وہ مسلمان (جو ظاہر میں مسلمان تھا اور حقیقت میں منافق تھا) نبی کریم ﷺ کے پاس فیصلہ لے جانے کے لئے تیار ہوگیا، جب آپ کی خدمت میں وہ بات پیش کی گئی تو دونوں کی باتیں سننے کے بعد آپ ﷺ نے اسی یہودی کے حق میں فیصلہ کر دیا اس لئے کہ وہ حق پر تھا۔ اس فیصلے کے بعد اس منافق نے یوں کہا کہ ہم اپنا فیصلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کروائیں۔ وہ یوں سمجھتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ غیر مسلموں کے بارے میں بڑے سخت ہیں، اس لئے شاید اس فیصلے کے اندر وہ میری طرفداری کریں گے۔ اس یہودی نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ دونوں گئے، وہاں پہنچنے کے بعد اُس یہودی نے سارا قصہ بیان کیا کہ ہمارے درمیان یہ جھگڑا ہے اور ہم اپنا فیصلہ حضور ﷺ کے پاس لے گئے اور آپ نے ہمارے درمیان یہ فیصلہ کیا ہے، اس کے بعد بھی اس کا اصرار یہ رہا کہ آپ کے پاس فیصلے کے لئے آویں؛ لہٰذا اب آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں، آپ ہمارے معاملہ کا فیصلہ کر دیجیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے پوچھا کہ یہ جو کہہ رہا ہے وہ ٹھیک ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھہرو! مَیں ابھی آتا ہوں، گھر میں گئے، تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا کہ جو آدمی نبی اکرم ﷺ کے فیصلے پر راضی نہ ہو؛ اس کا یہی فیصلہ ہے۔ اب منافق کے جو رشتہ دار اور خاندان والے تھے انہوں

نے اس پر بڑا شور مچایا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مسلمان، ایمان دار اور کلمہ گو کو قتل کر دیا اور پھر اس معاملے کو بہت بڑھا چڑھا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا کہ یا رسول اللہ! انہوں نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات سنی تو فرمایا کہ میں عمر کے بارے میں یہ گمان نہیں کرتا کہ وہ اتنی جرأت کریں کہ ایک مسلمان کو قتل کریں۔ چونکہ وہ ظاہری طور پر ایمان کا مدعی تھا اور نفاق کا تعلق تو دل سے ہے، اور نفاق کو کون ثابت کر سکتا ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں کوئی رہنمائی ہو۔ چنانچہ اسی موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی، گویا آیت نے آ کر یہ بتلا دیا کہ وہ مسلمان نہیں تھا، جب وہ مسلمان تھا ہی نہیں تو اس کے قتل پر یہ کہنا کہ حضرت عمر نے مسلمان کو قتل کر دیا؛ صحیح نہیں ہے۔

یہاں اسی کو فرمایا گیا ﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ﴾ قسم ہے تمہارے پروردگار کی! وہ لوگ مؤمن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ وہ آپ کو فیصل اور (ثالث) بناویں یعنی آپ کے ذریعہ سے فیصلہ کرائیں ان معاملات اور چیزوں میں جن میں ان کے آپس میں جھگڑا ہے ﴿ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ﴾ اور پھر جب آپ فیصلہ کر دیں تو اس فیصلے کے متعلق دل میں ذرہ برابر تنگی محسوس نہ کریں، یعنی دل میں ذرہ برابر یہ نہ آئے کہ ایسا فیصلہ کیوں کیا؟ ﴿وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾ اور اس فیصلے کو پورے پورا یعنی سچے دل سے تسلیم کر لیں؛ تب مؤمن ہوں گے۔ اور جب یہ بات پائی نہیں جاتی تو وہ اہل ایمان میں سے نہیں ہیں۔

آپسی جھگڑے کہاں حل کریں؟

علماء نے لکھا ہے کہ یہ چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، جب تک

نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے وہاں تک تو آپ کی خدمت میں براہِ راست فیصلہ لے جایا جاتا تھا، آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد آپ جس شریعت کو چھوڑ کر گئے ہیں، اس کا فیصلہ بھی وہی حکم رکھتا ہے جو آپ کا فیصلہ ہے۔ قرآنِ پاک اور احادیث کے ذریعہ سے فیصلے کا وہی حکم ہے۔ اس لئے آج بھی یہ آیت اپنی جگہ پر جوں کی توں موجود ہے۔ آج بھی ہر مسلمان کا فریضہ ہے کہ اگر آپس میں جھگڑے کا کوئی معاملہ پیش آوے تو اس معاملہ کو شریعت پر پیش کرے اور شریعت کا جو فیصلہ آوے اس کو دل سے تسلیم کرلے، ذرہ برابر اس کے متعلق دل میں تنگی محسوس نہ کرے۔ اگر اس کے دل میں اس کے متعلق ذرہ برابر بھی تنگی ہوگی تو وہ مؤمن نہیں کہلائے گا۔ اس آیت کے متعلق تمام مفسرین نے بالاتفاق یہ چیز لکھی ہے۔ گویا آج بھی اسی کے مطابق ہر مؤمن کا ایمان ہے۔

جو لوگ شریعت کے ہوتے ہوئے اپنے جھگڑوں اور مسائل کو دوسرے لوگوں کے پاس لے جاتے ہیں؛ ان کے متعلق بڑی وعیدیں سنائی گئی ہیں، ہر مسلمان کے ذمہ ہے کہ آپس میں جھگڑے کا کوئی بھی معاملہ ہو؛ اس کو شریعت ہی کے ذریعہ فیصل کرانے کی اور درست کرانے کی کوشش کرے، غیروں کے پاس لے جانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

﴿ہرگز بمنزل نخواہد رسید﴾

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ تمہارے لئے نبی کریم ﷺ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے، یعنی جس کے دل میں یہ ہے کہ قیامت آنے والی ہے، مجھے مرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، ایسے ہر آدمی کے لئے نبی کریم ﷺ کی ذات میں نمونہ موجود ہے، آپ ﷺ نے جس طرح جی کر بتلایا، اپنی زندگی کے ذریعہ سے

اپنے اقوال وافعال سے جونمونہ امت کے سامنے پیش کیا؛ وہی بہترین نمونہ ہے۔اب کوئی آدمی آپ ﷺ کے اس نمونہ کو--جس کو باری تعالیٰ کی طرف سے بہترین نمونہ کہا گیا ہے-- چھوڑ کر دوسرے طریقہ کواختیار کرے گا؛ تو ظاہر ہے کہ وہ کبھی ہدایت یافتہ نہیں ہوسکتا: ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید ❁ کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر ﷺ کے طریقہ کے خلاف جوبھی راستہ اختیار کرے گا کبھی منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکتا، اس لئے کہ وہ راستہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والا نہیں۔اللہ تک پہنچانے والا تو وہی ایک راستہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے بتلایا: ؎

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی ❁ کیں راہ کہ تو می روی بترکستان است

ایک آدمی مکہ مکرمہ جانا چاہتا ہے اور جا رہا ہے ترکستان کی طرف؛ تو وہ کہاں مکہ مکرمہ پہنچے گا؟ اس لئے جدھر منزلِ مقصود بنائی ہے اور اس کے لئے جو راہ ہے، اسی پر چلو گے، تو منزل پر پہنچو گے؛ ورنہ نہیں۔

﴿آخری فیصلہ﴾

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْئٍ فَرُدُّوْہُ اِلیٰ اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں جھگڑا اور نزاع ہو تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ اور ان کے سامنے پیش کرو۔ ''اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ'' کا کیا مطلب ہے؟ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس کی تشریح فرماتے ہیں ﴿قال العلماء معناہ الیٰ الکتاب والسنۃ﴾ مطلب یہ ہے کہ جھگڑے کا کوئی بھی معاملہ پیش آیا ہو تو اس کے فیصلے کے لئے قرآن اور حدیث موجود ہے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر اس کو پیش کرو اور وہاں سے اس سلسلے میں جو ہدایت اور فیصلہ ملے؛ اسی کو آخری فیصلہ سمجھ کر آدمی اس پر عمل کرے۔

﴿اطاعتِ رسول؛ اطاعتِ خدا﴾

﴿مَن يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ﴾ جو آدمی نبی کریم ﷺ کا اتباع اور اطاعت کرتا ہے؛ اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ یعنی حضور ﷺ کے احکام کو ماننا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو ماننا، اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی اطاعت کو بھی اپنی اطاعت قرار دیا، اس میں کوئی فرق نہیں کیا گیا یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت وہی ہے؛ جو حضور ﷺ کی ہو۔

﴿صراطِ مستقیم﴾

﴿وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾ باری تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: آپ لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف چلا رہے ہیں، راہ نمائی کر رہے ہیں اور لے جا رہے ہیں۔ گویا حضور ﷺ والا راستہ وہی صراطِ مستقیم ہے، اس میں کوئی تردد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو صراطِ مستقیم اختیار کرنا ہو، تو حضور ﷺ نے جس طریقہ پر چل کر بتلایا؛ اسی پر چلے۔

﴿ان کو ڈرنا چاہیے﴾

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهٖ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾ جو لوگ نبی کریم ﷺ کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں؛ ان کو ڈرنا چاہیے اس بات سے کہ کہیں ان کو کوئی آزمائش اور فتنہ یا دردناک عذاب پہنچ جائے۔ نبی کریم ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی صورت میں آدمی دین سے ہٹ جاتا ہے اور کبھی تو وہ دین سے ہٹنا یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ ایمان سے بھی محروم ہو جاتا ہے اور یہی چیز ہمیشہ کی ناکامی کا ذریعہ بنتی ہے

ازواجِ مطہرات رضوان اللہ تعالیٰ علیہن اجمعین کے متعلق باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ آيٰتِ اللهِ وَالْحِكْمَةِ﴾ تمہارے گھروں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی جو

آیتیں پڑھی جاتی ہیں؛ ان کو یاد کرو اور ان سے نصیحت حاصل کرو﴿الحکمة﴾ سے مراد نبی کریم ﷺ کا طریقہ اور آپ کی سنت ہے، اسی کو بتلانا مقصود ہے۔

اب اس سلسلے میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔

﴿زیادہ کھود کرید مت کرو﴾

عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قَالَ: دَعُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ، أَنَّمَا أَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَثْرَةُ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلافُهُمْ عَلٰی أَنْبِیَائِهِمْ. فَإِذَا نَهَیْتُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَاجْتَنِبُوْهُ، وَإِذَا أَمَرْتُکُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ.

حضرت ابوہریرہ رضی الله عنه فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم مجھے چھوڑے رکھو؛ جب تک مَیں تمہیں چھوڑے رکھوں۔

ایک موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو حج کی فرضیت کا حکم بتلایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے اوپر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے، اس موقعہ پر ایک صحابی نے کھڑے ہوکر سوال کیا ﴿أکُلَّ عامٍ یارسول الله؟﴾ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کا حج جو فرض کیا ہے تو کیا ہر سال فرض ہے؟ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے خاموشی اختیار فرمائی، انہوں نے پھر کھڑے ہوکر یہی سوال کیا جب تیسری مرتبہ سوال کیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مَیں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال تم پر حج فرض ہوجاتا اور پھر تم اس کو نباہ نہ سکتے، اور اس موقعہ پر آپ نے یہ فرمایا کہ تم بھی مجھے چھوڑے رکھو جب تک مَیں تمہیں چھوڑے رکھوں، یعنی جب مَیں نے اپنی طرف سے یہ بات نہیں کہی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر سال کے لئے حج فرض کیا گیا ہے تو پھر تم بار بار کیوں پوچھتے ہو؟ میری طرف سے جب یہ کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حج فرض کیا ہے تو بس! اتنا

سننے کے بعد عمل کرلو، زیادہ کھود کرید اور مزید تحقیقات کے اندر اترنے کی کوشش نہ کرو، یہی چیز کبھی مزید سختی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

﴿اگر وہ کھود کرید نہ کرتے﴾

حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں قتل کا ایک واقعہ پیش آیا تو مقتولین کے ورثاء نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ قاتل معلوم ہونا چاہیے، اس کیلئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایک گائے ذبح کرنے کے بعد اس کے جسم کا حصہ مقتول کے اوپر رکھ دو، تو وہ مرا ہوا آدمی خود بتلائے گا کہ کس نے قتل کیا ہے، اب اللہ تعالیٰ کا یہ حکم مطلق تھا، جونسی بھی گائے لاکر ذبح کرتے اور اس کے جسم کا حصہ مقتول کے اوپر رکھ دیتے؛ باری تعالیٰ کے ارشاد کے بموجب وہ مردہ بول دیتا اور بتلا دیتا کہ کس نے اس کو قتل کیا ہے۔ لیکن وہ لوگ مزید سوالات اور تفصیلات کے اندر پڑے کہ گائے کیسی ہونی چاہیے، اس کا رنگ کیسا ہونا چاہیے، جوں جوں پوچھتے گئے؛ توں توں پابندیاں ان کے اوپر عائد ہوتی گئیں اور پھر باری تعالیٰ کی طرف سے جیسی گائے بتلائی گئی، ویسی صفات پر ساری شرائط والی گائے ایک ہی تھی۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کو اس گائے کے مالک کی مدد کرنا منظور تھا اس لئے ان کو بھی سوالات کے اوپر آمادہ کیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ اس موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس کے متعلق زیادہ کھود کرید نہ کرتے اور شروع ہی میں جہاں اللہ کا حکم ملا، ویسے ہی فوراً جونسی بھی گائے کو لاکر ذبح کرتے اور اس کے جسم کا حصہ مقتول کے اوپر رکھتے؛ تو ان کا مقصد حاصل ہوجاتا، لیکن وہ لوگ گہرائی میں اترے اور کھود کرید کی؛ تو ان کے اوپر پابندی عائد ہوئی۔

(تفسیر مظہری،۱۲۴۲)

﴿کثرتِ سوال نے انہیں ہلاک کیا﴾

اسی کو یہاں فرمایا گیا ہے کہ تم لوگ مجھے چھوڑے رکھو، جب تک مَیں تمہیں چھوڑے رکھوں۔ مطلب یہ ہے کہ میری طرف سے جب کسی حکم کے معاملہ میں کوئی پابندی، شرائط اور تفصیلات نہ بتلائی جائیں تو تم بھی ان کے پوچھنے کے درپے مت رہو، اس لئے کہ جتنا پوچھو گے، اتنی شرطیں اور پابندیاں بڑھیں گی، اور اتنا ہی عمل تمہارے لئے دشوار اور مشکل ہوتا چلا جائے گا۔ گویا پوچھ پاچھ کر تم اپنے لئے مزید پابندیاں پیدا کر رہے ہو۔

﴿أَنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَثْرَةُ سُؤَالِهِمْ وَاخْتِلَافُهُمْ عَلٰى أَنْبِيَائِهِمْ﴾ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرتِ سوال نے ہی ہلاک کیا، یعنی اپنے نبیوں سے وہ احکامات کے سلسلے میں غیر ضروری سوالات کرتے رہتے تھے، ان کے غیر ضروری سوالات کے نتیجے میں جواب کے طور پر ان پر پابندیاں عائد ہوتی رہتی تھی اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی وجہ سے وہ ہلاک ہوئے۔

﴿فَاِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْئٍ فَاجْتَنِبُوْهُ وَاِذَا أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ بس! یہ آخری ٹکڑا ہے جس کی وجہ سے اس روایت کو یہاں لائے ہیں۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں جب تم کو کسی چیز سے روکوں تو تم اس سے باز رہو اور رک جاؤ، اور جہاں کسی چیز کا حکم دوں؛ تو جتنا تم سے ہو سکے اس پر عمل کرلو۔

﴿یہ بے کار باتیں ہیں﴾

شریعت میں جن چیزوں سے منع کیا ہے، وہاں کوئی قید نہیں لگائی ہے، بلکہ ان چیزوں سے باز رہنے کے لئے مطلق حکم دیا گیا ہے ﴿فَاجْتَنِبُوْهُ﴾ اس سے بچو۔ اور کسی کام کو

کرنے کے لئے آدمی کو کچھ زحمت اٹھانی پڑتی ہے اس لئے وہاں قید لگائی اور کہا ﴿مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ تم سے جتنا ہو سکے، اپنی طاقت کے مطابق اس کام کو انجام دو۔

مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے نہ کرنے کے لئے کونسی طاقت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا جن گناہ کے کاموں کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ ان سے بچا نہیں جاتا؛ وہ ایسی ہی بے کار بات ہے۔ اس لئے کہ اس سے نہ بچ سکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ کام تو تم کر رہے ہو۔ بھائی! کسی کام کے نہ کرنے کے لئے کونسی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے؟ ہاں! یہ ہے کہ ہمارا نفس نفسانیت کی وجہ سے اس کا عادی بنا ہوا ہے اور ہم نے بے جا طریقہ سے اپنے آپ کو اس کام کی عادت ڈال رکھی ہے، اس وجہ سے نفس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ باقی یہ کہنا کہ ''نہیں ہوتا'' اور ''مجھ سے نہیں ہوسکتا'' ''میں بدنگاہی سے بچ نہیں سکتا'' ''فلاں گناہ سے بچا نہیں جاتا'' یہ جو باتیں کی جاتی ہیں؛ وہ سب بے کار ہیں۔

﴿نوکیلے دانتوں سے مضبوط پکڑلو﴾

عن أبی نجیح العرباض بن ساریة رضی اللہ عنہ قال: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْب، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْن. فَقُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللهِ! كَأَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَأَوْصِنَا. قَالَ: أُوْصِيْكُمْ بِتَقْوىٰ اللهِ، وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ، وَاِنْ تَأَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبْشِيٌّ. وَاِنَّهُ مَن يَّعِشْ مِنْكُمْ فَسَيَرٰى اِخْتِلَافاً كَثِيْراً. فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْن، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ. وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْر، فَاِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ.

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ہم کو نصیحت فرمائی اور بہت مؤثر وعظ فرمایا جس کے نتیجے میں لوگوں کے دل دہل گئے اور آنکھیں

بھی بہہ پڑیں، تو ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آج آپ نے جو تقریر فرمائی اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے الوداع کہنے والا آدمی نصیحتیں کر رہا ہو۔ آپ کی اس تقریر کے سننے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آپ کا قیام اور ہمارے درمیان آپ کی تشریف فرمائی زیادہ دیر نہیں ہے، آخری آخری ہے؛ لہٰذا آپ ہم کو اور کچھ اہم باتوں کے متعلق نصیحت اور تاکید فرما دیجیے۔

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مَیں تم کو اللہ سے ڈرنے کی اور تقویٰ اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہوں اور تمہارے اوپر جو حاکم مقرر ہوں ان کی بات سن کر اس کو ماننے کی تاکید کرتا ہوں، چاہے تمہارا حاکم حبشی غلام ہی ہو۔ حبشی لوگ قومی اور نسلی اعتبار سے باقی نسلوں اور قوموں کے مقابلہ میں ذرا کم تر سمجھے جاتے تھے اور اس میں بھی پھر غلام ہو۔ گویا ایسا آدمی کہ جس کی امارت کو تمہارا دل قبول نہیں کرتا لیکن حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے اگر اس کو تمہارے اوپر مقرر کیا گیا ہے تو تم اس کی بات سنو اور اس پر عمل کرو۔

اور تم میں سے جو آدمی آئندہ زندہ رہے گا وہ بڑے اختلافات دیکھے گا۔ ایسے زمانہ میں جب بڑے اختلافات رونما ہوں تو تمہاری نجات کے لئے میرے طریقہ کو اور میرے بعد میرے نائبین خلفاء جو راہ یاب اور ہدایت پائے ہوئے ہیں (جن کو خلفاءِ راشدین اور خلفاء اربعہ کہا جاتا ہے) ان کے راستہ کو مضبوطی سے لازم پکڑنا ضروری ہے۔ ''نَاجِذَۃٌ''، نوکیلے دانت کو کہتے ہیں، جس کو کچلیاں کہتے ہیں۔ تو فرمایا کہ ان کو نوکیلے دانتوں سے مضبوط پکڑیو۔

کسی چیز کے متعلق کہنا کہ ''دانتوں سے پکڑ لو'' یہ ایک محاورہ ہے، کسی چیز کو مضبوطی سے تھامنے کے واسطے بولا جاتا ہے یعنی میرے اور میرے نائبین جو ہدایت یافتہ اور راہ یاب

ہیں ان کے طریقہ کو مضبوطی سے تھام لینا، اور دیکھنا! جو نئی باتیں دین کے اندر پیدا ہوں ان سے ضرور بچنا، اس لئے کہ ہر نئی بات گمراہی ہے۔ اس سے بھی سنت کی تاکید معلوم ہوتی ہے۔

لہٰذا ہمیں اس بات کا پورا اہتمام کرنا چاہیے کہ اپنی ہر چیز میں- چاہے وہ قول ہو، فعل ہو، روش ہو، رفتار ہو، گفتار ہو- نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر چلیں۔ زندگی کے ہر شعبے میں نبی کریم ﷺ نے ہمارے لئے نمونہ چھوڑا ہے، اگر ہم اس کو اختیار کرنا چاہیں، تو کوئی دشواری نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں سنتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے

۲۹ / جمادی الآخری ۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم یکم نومبر ۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد:

کون ہے انکار کرنے والا؟

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: كُلُّ أُمَّتِيْ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ أَبٰى. قِيْلَ: وَمَنْ يَّأْبٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ أَطَاعَنِيْ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ أَبٰى رواہ البخاری

گذشتہ مجلس میں بات ہوئی تھی کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کا اہتمام اور اس کے آداب کی رعایت کے بارے میں قائم کیا ہے۔ آج اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری پوری امت جنت میں جائے گی؛ مگر وہ آدمی جس نے انکار کیا۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ انکار کرنے والا کون ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اور میری بات مانی؛ وہ تو جنت میں جاوے گا اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے میرا انکار کیا اور وہ جنت میں نہیں جائے گا اس موقعہ پر شراح نے لکھا ہے کہ ﴿كُلُّ أُمَّتِيْ﴾ سے مراد امتِ دعوت ہے۔

امتِ دعوت اور امتِ اجابت

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جب نبی کریم ﷺ کو اللہ کا پیغام پہنچانے کا حکم دیا گیا اور وحی کا سلسلہ شروع ہوا؛ اس کے بعد سے لے کر قیامت تک جتنے بھی انسان روئے زمین

پر ہوئے یا ہوں گے؛ وہ سب امتِ دعوت کہلاتے ہیں۔ دعوت کا معنیٰ ہے بلانا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے نبی کریم ﷺ کو بھیجا گیا، ایسے تمام لوگوں کو امتِ دعوت کہا جاتا ہے، چاہے وہ آپ پر ایمان لاویں یا نہ لاویں۔ گویا روئے زمین کے سارے انسان جو نبی کریم ﷺ سے لے کر قیامت تک ہیں؛ وہ سب امتِ دعوت ہیں۔ اب ان میں سے جن لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی اس دعوت پر لبیک کہی اور آپ پر ایمان لائے وہ امتِ اجابت کہلاتے ہیں۔ اجابت کا معنی قبول کرنا۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی دعوتِ اسلام کو قبول کیا۔ تو یہاں اس روایت کے اندر ﴿كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جن کی طرف اسلام کی دعوت دینے کے لئے مَیں بھیجا گیا ہوں یعنی امتِ دعوت؛ وہ جنت میں جائے گی، سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے انکار کیا۔ انکار کرنے والے یعنی جنہوں نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ گویا امتِ اجابت جنت میں جائے گی۔ یہ روایت اس بات کو بتلانے ہی کے لئے لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور فرمانبرداری آدمی کو جنت تک پہنچانے والی ہے اور آپ کی پیروی اور اقتداء سے انکار جنت میں داخل ہونے سے روکنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

﴿اس کا وہ ہاتھ بے کار ہو گیا﴾

عن أبی مسلم وقیل أبی أیاس سلمة بن عمرو بن الاکوع رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً أَكَلَ عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ بِشِمَالِهِ. فَقَالَ: كُلْ بِيَمِيْنِكَ. قَالَ: لَا أَسْتَطِيْعُ. قَالَ: لَا اسْتَطَعْتَ. مَا مَنَعَهُ إِلَّا الْكِبْرُ، فَمَا رَفَعَهَا إِلَىٰ فِيْهِ. (رواہ مسلم)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے

پاس آپ کے دسترخوان پر آپ کے ساتھ کھانے میں شریک تھا اور بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کو فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔

یہاں ان روایتوں کو لانے کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ امور جن کا تعلق روزمرہ کی عادات سے ہے، کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے سے ہے؛ ان میں بھی نبی کریم ﷺ کا اتباع اور آپ کی پیروی کا اہتمام ہونا چاہیے اور جو آدمی ان چیزوں میں نبی کریم ﷺ کی پیروی نہیں کرتا بلکہ کبر و غرور کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ کی پیروی سے انکار کرتا ہے؛ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؛ وہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس سے یوں کہا کہ بھائی! دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ دائیں ہاتھ سے کھانا؛ یہ آداب میں سے ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ مَیں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا، اس نے جو یہ کہا کہ ”نہیں کھا سکتا“ یہ اس لئے نہیں کہ دایاں ہاتھ کام نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا یہ جواب کبر و غرور کی وجہ سے تھا۔ گویا نبی کریم ﷺ نے اس کو دائیں ہاتھ سے کھانے کے لئے جب کہا تو وہ آپ کی اس بات پر عمل کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا، اور آپ کے اس ارشاد کے جواب میں اس نے غرور و کبر کی وجہ سے منع کیا۔ اسی کو راوی کہتے ہیں ﴿مَا مَنَعَهُ اِلَّا الْكِبْرُ﴾ تکبر کی وجہ سے اس نے نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد اور حکم پر عمل کرنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ مَیں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا۔

ایک تو معذوری ہوتی ہے کہ دایاں ہاتھ کام نہیں کرتا، بیماری ہے، مثلاً دایاں ہاتھ فالج زدہ ہے جس کی وجہ سے وہ اٹھ نہیں سکتا؛ وہ دوسری بات تھی۔ لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔ جب اس نے یہ جواب دیا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿لَا اسْتَطَعْتَ﴾ ٹھیک ہے! تم آئندہ بھی

اس سے کام نہیں لے سکو گے یعنی اس نے کہا تھا کہ مَیں نہیں کھا سکتا تو آپ نے کہا کہ نہیں کھا سکو گے۔ اس نے یوں کہا تھا کہ مَیں نہیں اٹھا سکتا تو حضور ﷺ نے بھی کہا کہ نہیں اٹھا سکتے تو مت اُٹھاؤ، آئندہ بھی نہیں اٹھا سکو گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اس کے بعد سے اس کا وہ ہاتھ بے کار اور شل ہو گیا یعنی کسی کام کا نہیں رہا۔

سننِ ہدیٰ اور سننِ زوائد

معلوم ہوا کہ نبی کریم ﷺ نے ہر کام میں جو طریقے اور آداب بتلائے ہیں ان کو معلوم کرنے اور ان پر عمل کا اہتمام ہونا چاہیے، خاص طور پر شریعت کے وہ احکام جو شرائط و واجبات سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو سننِ ہدٰی کہا جاتا ہے کہ آدمی اگر ان پر عمل کا اہتمام کرے تو وہ ہدایت یافتہ اور راہِ راست پر چلنے والا ہے، اور اگر اس کے خلاف کرے تو وہ راہِ راست سے ہٹا ہوا ہے؛ ان میں تو آپ ﷺ کا اتباع اور پیروی ضروری ہی ہے، لیکن جو امورِ عادیہ ہیں یعنی عادت کے طور پر جو چیزیں نبی کریم ﷺ نے کر کے بتلائیں اور ان کی تاکید بھی فرمائی، مثلاً لباس، چلنا، اُٹھنا، بیٹھنا؛ ان میں بھی آپ نے جو طریقہ اختیار فرمایا؛ اس کا اہتمام ہونا چاہیے؛ انہیں سننِ زوائد کہتے ہیں۔

یہاں اسی بات کو بتلانے کے لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس روایت کو پیش کیا ہے کہ جو لوگ سنتوں کے متعلق یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ اس کا کرنا سنت ہے اور جب ان کے سامنے کسی بھی کام کے متعلق کہا جاتا ہے مثلاً سونے، کھانے پینے اور اُٹھنے بیٹھنے وغیرہ کے آداب اور سنتوں کو بیان کیا جاتا ہے؛ تو ان پر کبر و غرور کی وجہ سے نامناسب کلمات کہتے ہیں، اور نامناسب باتیں اپنی زبان سے نکالتے ہیں، ایسے لوگوں کے متعلق بڑا اندیشہ رہتا ہے کہ

کہیں یہ چیزیں ان کے حق میں مضر نہ ہو جائیں۔ پچھلی مجلس کے اندر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو آیتیں پیش کی تھیں ان میں ایک آیت یہ بھی تھی ﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ جو لوگ نبی کریم ﷺ کے ارشادات کے خلاف کرتے ہیں، ان کو ڈرنا چاہیے کہ آپ کے ارشادات اور آپ کے طریقوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے کہیں ان کو کوئی فتنہ لاحق ہو جائے یا دنیا کے اندر کوئی دردناک عذاب ان کو پہنچ جائے۔ دیکھو! اس آدمی نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کرنے سے محض کبر وغرور کی وجہ سے انکار کیا؛ تو نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا ہاتھ بے کار ہو گیا۔

﴿صفیں سیدھی ہونی چاہئیں﴾

عن أبی عبداللہ النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسولَ اللہِ ﷺ یقولُ: لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَكُمْ أَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوهِكُمْ. (متفق علیہ)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تم لوگ اپنی صفوں کو درست کرو؛ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے اندر اختلاف ڈال دے گا، تمہارے چہروں کو پھیر دے گا۔

چہروں کو پھیر دینے کا کیا مطلب ہے؟ بعضوں نے تو اس کو اس کے ظاہری معنیٰ ہی پر محمول کیا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایسے آدمی کا چہرہ بجائے سامنے رہنے کے پیچھے کی طرف ہو جائے۔ اور بعضوں نے کہا کہ جو صورت انسانی اللہ تبارک وتعالیٰ نے عطا فرمائی ہے اس کے بجائے اس کے چہرہ کی کوئی دوسری صورت بنا دی جائے۔ اور بعضوں نے اس کو معنوی معنیٰ پر محمول کیا ہے یعنی اگر تم نے صفوں کی درستگی کا اہتمام نہیں کیا تو اس کا دنیوی طور پر ایک اثر یہ ہوگا کہ تمہارے دلوں میں آپس میں اختلاف اور عداوت ڈال دی جائے گی۔

﴿آپسی اختلاف مٹانا بہت آسان﴾

علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے جو طریقے ہیں اور شریعت نے جو چیزیں بتلائی ہیں ان پر عمل کرنے کے نتیجے میں آدمی کو آخرت کا اور دین کا فائدہ تو ہوتا ہی ہے؛ لیکن دنیا کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ نمازوں کے اندر صفوں کے درست کرنے کا اور تمام مقتدیوں کے صف کے اندر بالکل برابر کھڑے رہنے کا دنیوی فائدہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں آپس میں محبت، میل ملاپ اور جوڑ قائم ہوگا اور اگر صفوں کو درست کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا اور آگے پیچھے رہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپس میں اختلاف اور عداوت پیدا ہو جائے گی۔

آج دنیا کے اندر آپس کے اتفاق اور اتحاد اور جوڑ پیدا کرنے کے واسطے کیسی کیسی کوششیں کی جاتی ہیں اور بڑی محنتیں کی جارہی ہیں اور اس کے لئے مختلف تنظیمیں قائم کی جارہی ہیں، اس کے لئے سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم کی جاتی ہیں کہ آپس میں جوڑ پیدا کیا جائے، لیکن مسجد میں آنے کے بعد نماز کے لئے جب کھڑے ہوں تو صفوں کی درستگی کا اگر اہتمام کرلیا جائے تو یہ چیز ویسے ہی مفت میں حاصل ہو جائے گی۔ شریعت کے ایک حکم پر عمل کی یہی کتنی بڑی برکت ہے۔

﴿صفیں سیدھی کروانے کا اہتمام﴾

مسلم شریف میں انہیں حضرت نعمان رضی اللہ عنہ سے یہ روایت دوسرے طریق سے آئی ہے، اس میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح درست کرتے تھے گویا ان کے ذریعہ سے آپ تیروں کو سیدھا کر رہے ہیں (مسلم شریف حدیث نمبر ۶۶۰) اُس زمانہ میں کمان کے ذریعہ سے تیر چلائے جاتے تھے، اور تیر جب تک سیدھا نہ ہو؛ وہاں تک صحیح نشانہ پر نہیں جاسکتا، تو

تیر جس لکڑی سے بنایا جاتا تھا اس لکڑی کو سیدھا کرنے کا بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ مثلاً آپ کیل کو ٹھوک رہے تھے، ٹھوکتے ٹھوکتے کیل ٹیڑھی ہوگئی تو اس کو سیدھا کرنے کے لئے جس جگہ آپ اس کو رکھیں گے وہ جگہ بھی سیدھی ہونی چاہیے، ٹیڑھی جگہ پر رکھ کر آپ اس کو سیدھا نہیں کر سکتے۔ تو راوی بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ ہماری صفوں کو اس طرح سیدھا کرتے تھے گویا اس کے ذریعہ سے آپ تیروں کو سیدھا کریں گے یعنی ہماری صفیں ایسی سیدھی ہوتی تھیں کہ اگر اس کے اوپر رکھ کر تیروں کی سیدھ کو معلوم کیا جائے تو وہ آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔

﴿حَتّٰی اِذَا رَاٰیٰ اَنَّا قَدْ عَقَلْنَا عَنْهُ﴾ یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے جب دیکھا کہ ہم لوگ یہ چیز سمجھ گئے ہیں یعنی چند دنوں تک تو آپ روزانہ بڑے اہتمام سے ہماری صفوں کو با قاعدہ درست کرتے رہے۔ ایک چیز جب سکھلائی جاتی ہے تو چند دنوں تک بتایا جاتا ہے پھر لوگ جب سیکھ لیتے ہیں اور خود ہی کرنے لگتے ہیں تو بتلانا چھوڑ دیا جاتا ہے، اسی طرح جب آپ نے دیکھا کہ ہمیں صفوں کی درستگی کا طریقہ آ گیا تو پھر آپ نے با قاعدہ اہتمام سے بتانا چھوڑ دیا، اس لئے کہ ضرورت نہیں رہی اور مقصد حاصل ہو گیا کہ لوگ تعلیم پا چکے تھے، اس کے باوجود آپ دیکھ لیتے تھے کہ صفیں ٹھیک ہیں یا نہیں، زبان سے بھی فرما دیا کرتے تھے ﴿سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ﴾ اپنی صفوں کو درست کیجیے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ آپ با قاعدہ ایک ایک کے پاس جا کر درست کیا کرتے تھے، جب لوگ سیکھ گئے تو آپ نے وہ سلسلہ بند کر دیا صرف زبانی کہنے پر اکتفا فرماتے تھے۔

تمہارے چہروں کو پھیر دے گا

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نماز کے لئے تشریف لائے، آپ مصلےٰ پر کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ نماز شروع کرنے کے لئے اللہ اکبر کہیں کہ اچانک ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کا سینہ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ذرا آگے کو نکلا ہوا ہے، تو آپ ﷺ نے اس وقت نماز شروع کرنا چھوڑ کر فرمایا ﴿یَاعِبَادَاللّٰہِ! لَتُسَوُّنَّ صُفُوفَکُمْ أَوْلَیُخَالِفَنَّ اللّٰہُ بَیْنَ وُجُوھِکُمْ﴾ اللہ کے بندو! صفوں کو درست کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو پھیر دے گا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صف کے درست کرنے کی بڑی تاکید فرمائی۔

دیکھو! صفوں کا درست کرنا سنت ہے، لیکن اس کی اتنی تاکید فرمائی اور اس سنت کو چھوڑنے کے نتیجے میں کتنا بڑا نقصان آدمی کو بھگتنا پڑتا ہے وہ اس ارشاد میں بتلایا گیا ہے۔ اس سے نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر عمل کا اہتمام معلوم ہوتا ہے۔

سونے سے پہلے آگ بجھا دیا کرو

عن أبی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال: اِحْتَرَقَ بَیْتٌ بِالْمَدِیْنَۃِ عَلیٰ أَھْلِہٖ مِنَ اللَّیْلِ، فَلَمَّا حُدِّثَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ بِشَأْنِھِمْ، قَالَ: اِنَّ ھٰذِہِ النَّارَ عَدُوٌّ لَکُمْ، فَاِذَا نِمْتُمْ فَأَطْفِئُوْھَا عَنْکُمْ.

یہاں نبی کریم ﷺ کی مختلف سنتیں بتلائی جا رہی ہیں جو معاشرت سے تعلق رکھتی ہیں اور اس سے بتلانا یہی چاہتے ہیں کہ یہ سنتیں ایسی ہیں کہ ان پر عمل چھوڑنے کے نتیجہ میں آدمی کو اخروی اور دنیوی دونوں طرح نقصان پہنچتا ہے۔ ویسے تو تمام سنتوں کا حال یہی ہے، لیکن چند سنتیں ایسی ہیں جن کا نقصان کھلم کھلا تھا اس لئے اس کو بتلایا جا رہا ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں ایک مکان

میں آگ لگ گئی اور اس کی وجہ سے مکان کے لوگ بھی سب جل گئے۔ جب نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا گیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! اصل میں ہوا یہ تھا کہ ایک چراغ تھا جس میں تیل تھا اور اس میں بتی تو ہوتی ہی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چوہا اس کی بتی کو کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اور اس زمانہ کے اندر چراغ کھلا ہوتا تھا اس کے اندر بتی ڈالی جاتی تھی اور اسی سے وہ آگ لگ گئی تھی اس وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿اِنَّ هٰذِهِ النَّارَ عَدُوٌّ لَكُم﴾ یہ آگ تمہاری دشمن ہے، اس لئے جب تم سونے کے لئے جاؤ تو آگ کو بجھا دیا کرو۔

نبی کریم ﷺ نے صرف دین ہی دین نہیں بتایا بلکہ دنیا میں آدمی کس طرح رہے، اور کس طرح زندگی بسر کرے؛ اس کو بھی بڑے اہتمام سے بتلایا ہے۔ اس زمانہ کے اعتبار سے چراغ کو اگر کھلا چھوڑ دیا جاتا تو یہی خطرہ رہتا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے اس کو بجھا دینے کی خاص تاکید فرمائی۔

معاشرت کے چند آداب

بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اور بھی جن جن چیزوں کی تاکید فرمائی ہے ان میں سے یہ ہے کہ دروازے بند کر دیا کرو، برتنوں کو ڈھانک دیا کرو، اگر ڈھانکنے کے لئے آپ کے پاس ڈھکن نہیں ہے تو بسم اللہ بول کر صرف ایک لکڑی ہی آڑی (عرض میں) رکھ دیا کرو۔ اور دروازہ بسم اللہ بول کر بند کرنا چاہیے، اس لئے کہ آدمی جب بسم اللہ بول کر دروازہ بند کرتا ہے، تو شیطان اس کو کھول نہیں سکتا۔ (بخاری شریف ۶۲۹۵)

جن اور بلاؤں سے بچنے کا آسان طریقہ

گھروں کے اندر خاص کر شریر جنوں کے آنے کی وجہ سے گھر والوں کو دشواریاں اور

پریشانیاں پیش آتی ہیں، اگر اس چیز کا اہتمام کیا جائے تو ان سے حفاظت ہو جائے گی۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی قدرت دے رکھی ہے لیکن آدمی اگر بسم اللہ بول کر دروازہ اور کھڑکی وغیرہ بند کر دے؛ تو اس کی طاقت نہیں ہے کہ اس کو کھول سکے۔ اگر بسم اللہ بول کر بند کیا گیا تو دوسرے راستہ سے بھی وہ نہیں آ سکتا۔

اسی طرح برتن کے اوپر ڈھکن اگر بسم اللہ بول کر آپ نے ڈھانک دیا، تو حدیث میں آتا ہے کہ سال میں ایک رات ایسی آتی ہے کہ جس میں بلائیں نازل ہوتی ہیں، امراض اور بیماریاں آتی ہیں، اگر کوئی برتن کھلا ہوا ہوتا ہے تو اس میں اس کا اثر آجاتا ہے اور اس کے استعمال کے نتیجہ میں گھر والے ان امراض، پریشانی اور بلاؤں میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لہٰذا اگر بسم اللہ بول کر ڈھکن ڈھانک دیا جائے، اور اگر ڈھکن نہ ہو تو بسم اللہ بول کر کم از کم ایک لکڑی ہی آڑی رکھ دی جائے؛ تو وہ بلائیں اس میں نہیں آ سکتیں۔ یہ روایت بخاری شریف میں موجود ہے (بخاری شریف، ۲۰۱۴) کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو ان چیزوں سے بچانے کے لئے کتنا اہتمام کیا ہے۔

اب دیکھئے! آج کل عام طور پر ہر شخص پریشانی کی شکایت کرتا ہے کہ سحر کا اثر ہو گیا، جن کا اثر ہو گیا۔ خاص طور پر سحر کے معاملہ میں تو ہر ایک دوسرے پر بدگمانیاں کرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ پریشانیاں اٹھاتا ہے، حالانکہ صبح وشام کی ان دعاؤں کا آدمی اگر اہتمام کرے جو نبی کریم ﷺ نے بتلائی ہیں یعنی رات کو سوتے وقت، صبح کو اٹھتے وقت، کھانے سے پہلے، پینے سے پہلے، استنجاء کے لئے جانے سے پہلے اور نمازوں کے بعد جو پڑھنے کے لئے فرمایا گیا ہے؛ ان کا اگر اہتمام کر لیا جائے تو اس میں حضور ﷺ نے شیطان سے حفاظت کے سارے طریقے بتلا دیے ہیں۔

جن اور جادو سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے

دیکھو! دنیا میں کسی سائنس داں نے آج تک کوئی ایسا آلہ ایجاد نہیں کیا کہ جس کے ذریعہ سے آپ اپنے پاس جن کو آنے سے روک سکیں یا کسی نے آپ پر سحر کرانا چاہا، یا سحر کردیا تو اس سحر کے اثرات سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ آج تک نہ سائنس نے ایسی کوئی ایجاد کی ہے اور نہ آئندہ کر سکے گی۔ اگر آدمی کو ان چیزوں سے بچنا ہے تو ان سے بچاؤ کے لئے وہی طریقے اختیار کرنے پڑیں گے جو حضور ﷺ نے بتلائے ہیں۔ اور ان دعاؤں کی برکات کا اثر لازمی ہے، آدمی ان چیزوں کا اہتمام کرے تو کبھی یہ چیزیں اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتیں۔ خیر! اس کی بڑی تفصیل ہے۔ مَیں تو اس وقت یہ کہنا چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے ہماری خیر خواہی کے واسطے ان چیزوں کو بھی بتایا ہے۔

گیس سلنڈر لاک (LOCK) کر کے سوئیں

یہاں مکان کا جو مسئلہ آپ کے سامنے بیان کیا گیا کہ مکان کو آگ لگ گئی تو آپ نے فرمایا کہ آگ بجھا کر سویا کرو۔ اس جگہ پر علماء نے لکھا ہے کہ اگر آگ یا ہر وہ چیز جو اس نوع کی ہے کہ اس کے باقی رہنے دینے میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے؛ تو اس کو بجھا دیا جائے، اور اگر ایسی چیز ہے جس کے باقی رہنے دینے میں آگ لگنے کا اندیشہ نہیں ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً اس کے بعد کے زمانہ میں جب کہ ابھی یہ بجلی کے قمقمے اور بلب وغیرہ ایجاد نہیں ہوئے تھے، اور قندیلوں کی ایجاد ہو گئی تھی، لٹکانے والے فانوس تھے، تو اس میں یہ خطرہ باقی نہیں رہا کہ چوہے اس کو کھینچ کر لے جائیں اور اس کی وجہ سے آگ لگے، ایسی چیز کو اگر جلا ہوا چھوڑ دیا جائے؛ تو اس کی اجازت ہے۔ اسی طرح آج کل بلب اور نائٹ لیمپ

ہیں ان کو اگر جلتا رہنے دیں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

لیکن اس تعلیم سے یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ ہر وہ چیز جس کے متعلق خطرہ اور اندیشہ ہو تو اس سے اپنے آپ کو بچانے کی تاکید ہے جیسے آج کل گیس کے سلنڈر ہیں، گیس سلنڈر والے تو تاکید کرتے ہی ہیں لیکن اس حدیث سے اس کا حکم صاف معلوم ہوتا ہے کہ گیس سلنڈر میں سے گیس کے لیک ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، تو اس کا لاک (Lock) بند کرنے کا اہتمام ضروری ہے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے چراغ کے بجھانے کی تاکید فرمائی کہ اس کے نتیجہ میں آگ لگ سکتی ہے، گیس سلنڈر میں سے بھی اگر گیس لیک ہوگئی تو وہ گھر والوں کے لئے مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ اور بھی اس طرح کی چیزیں جن سے غفلت برتنے کی صورت میں نقصان پہنچ سکتا ہو؛ ان تمام کا یہی حکم ہے۔ اس روایت سے یہ تعلیمات معلوم ہوتی ہیں۔

﴿ہدایت اور علم نبوی کی ایک مثال﴾

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ مَثَلَ مَابَعَثَنِی اللّٰهُ بِهٖ مِنَ الْهُدٰی وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ أَرْضًا. فَكَانَتْ مِنْهَا طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ، قَبِلَتِ الْمَآءَ، فَأَنْبَتَتِ الْكَلَأَ وَالْعُشْبَ الْكَثِيْرَ، وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَآءَ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوْا مِنْهَا وَسَقَوْا وَزَرَعُوْا. وَأَصَابَ طَائِفَةً مِنْهَا اُخْرٰی، اِنَّمَا هِیَ قِيْعَانٌ لَاتُمْسِكُ مَآءً وَلَا تُنْبِتُ كَلَاءً، فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِیْ دِيْنِ اللّٰهِ وَنَفَعَهُ بِمَابَعَثَنِی اللّٰهُ بِهٖ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ. وَمَثَلُ مَن لَّمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْسًا، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَی اللّٰهِ الَّذِیْ أُرْسِلْتُ بِهٖ. (متفق علیه)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس ہدایت کو لے کر مجھے بھیجا ہے یعنی وہ راستہ جس پر چل کر آدمی

اپنی دنیا اور آخرت کو سنوار سکتا ہے اس کی مثال اور اس علم کی مثال بارش جیسی ہے۔ اگر کسی علاقہ اور زمین میں بارش برسے تو زمینیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو عمدہ قسم کی زرخیز زمین ہوتی ہے جس کا حال تو یہ ہے کہ بارش کا پانی گرا تو اُس نے اس پانی کو اپنے اندر جذب کرلیا اور قبول کرلیا اور اس کے نتیجہ میں گھاس، سبزہ اور کھیتی باڑی اُگ نکلی اور وہ زمین لہلہا اُٹھی۔

دوسری قسم کی زمین وہ ہے کہ وہ خود تو فائدہ نہیں اٹھا سکتی، البتہ گھڑوں کی شکل میں ہونے کی وجہ سے اس نے پانی کو جانے نہیں دیا اور اپنے اندر روک لیا، اب جو پانی گھڑوں میں رہ گیا اس کی وجہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچا، لوگوں نے پیا اور اپنے جانوروں کو بھی پلایا اور اپنے کھیتوں کو بھی سیراب کیا۔

تیسری قسم کی زمین وہ ہے جو بالکل سنگلاخ اور پتھریلی زمین ہے کہ جو نہ خود فائدہ اٹھا سکتی ہے، اور نہ اس میں گھڑے ہیں کہ پانی اندر جمع رہتا ہو، بالکل سنگلاخ چٹیل زمین ہے کہ نہ وہاں پانی رک سکتا ہے اور نہ وہاں گھاس اُگ سکتی ہے۔ تو نہ خود اس زمین نے خود کوئی فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو اس سے کوئی فائدہ پہنچا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس ہدایت اور جس علم کو لے کر مجھے بھیجا ہے وہ بھی اسی بارش کی طرح ہے۔ مَیں نے ہدایت کی باتیں اپنی امت کو بتلائیں، اور جو علم ان کو دیا، اس علم کے معاملہ میں بعض وہ ہیں جنہوں نے علم کو حاصل کر کے دین کی سمجھ حاصل کی اور میرے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہدایت، علم اور کام کی باتیں جس سے لوگوں کو دنیا اور آخرت کا فائدہ پہنچے، اس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو فائدہ پہنچایا ﴿فَعَلِمَ وَعَلَّمَ﴾ لہٰذا انہوں نے خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھایا، خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا۔

بعض وہ ہیں جو علم سیکھتے ہیں لیکن خود عمل نہیں کرتے، البتہ ان کے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے تو وہ ایسے ہیں جیسے گھڑے والی زمین کہ اس میں سبزہ تو نہیں نکلا لیکن دوسروں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔

اور تیسرے لوگ وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم کی باتیں اور دنیا و آخرت کے فائدے کی چیزیں میرے ذریعہ سے بھیجیں اس کی طرف سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا یعنی دھیان ہی نہیں دیا، ان کی طرف توجہ بھی نہیں کی اور ان کو قبول نہیں کیا کہ اس سے نہ خود ان کو فائدہ ہوا اور نہ دوسروں کو اس کے ذریعہ سے فائدہ ہوا۔

گویا نبی کریم ﷺ کی سنتیں اور آپ کے طریقوں کا معاملہ تو بارش جیسا ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کو حاصل کرلے اور دوسروں کو بھی سکھانے کا اہتمام کرے تو اس سے دوہرا فائدہ اُٹھائے گا، اور اگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تو وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹ رہے ہو

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَثَلِیْ وَمَثَلُکُمْ کَمَثَلِ رَجُلٍ أَوْقَدَ نَاراً فَجَعَلَ الْجَنَادِبُ وَالْفَرَاشُ یَقَعْنَ فِیْھَا، وَھُوَ یَذُبُّھُنَّ عَنْھَا، وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِکُمْ عَنِ النَّارِ، وَأَنْتُمْ تَفَلَّتُوْنَ مِنْ یَدِیْ. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میری اور تمہاری مثال اس آدمی جیسی ہے کہ جس نے آگ جلائی تو پروانے اور کیڑے مکوڑے اُڑ کر اُس آگ کے اندر گرنا چاہتے ہیں اور وہ ان کو وہاں سے ہٹا رہا ہے۔ گویا اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے اسی طرح پُرکشش بنایا ہے اور دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ نے آدمی کے نفس کی چاہت کی چیزوں کو

پھیلا دیا ہے۔جیسا کہ پہلے بھی روایت آئی تھی ﴿وحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ﴾ (مسلم شریف ۵۰۴۹) جہنم کو اللہ تعالیٰ نے آدمی کی مَن پسند چیزوں کے ذریعہ سے ڈھانپ دیا ہے۔آدمی اُن مَن پسند چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے ان کی طرف لپکتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ مَیں اس کو حاصل کررہا ہوں لیکن اس کے نتیجہ میں وہ جہنم کے اندر گرتا ہے۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ پتنگے، کیڑے مکوڑے اور پروانے آگ کی چمک دمک دیکھ کر اس میں گرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ ان کو ہٹاتا ہے۔وہ یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارے لئے یہ اچھی چیزیں ہیں، حالانکہ جیسے ہی اندر گریں گے؛ ہلاک اور برباد ہوجائیں گے۔

اسی طریقہ سے یہ دنیا کی چمک دمک کو دیکھ کر لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کے اندر گرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ کر تم کو جہنم سے دور کرنے کی اور نکالنے کی کوشش کرتا ہوں اور تم میرے ہاتھ سے چھوٹے جارہے ہو۔مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایسا حال ہے جیسے کوئی بچہ گرنے جارہا ہو اور اس کو پکڑ لیا جائے لیکن وہ قابو میں نہ آوے اور چھوٹ کر بھاگ جائے اور گر جائے۔نبی کریم ﷺ اپنے ارشادات، اپنی ہدایات اور رہنمائی کے ذریعہ سے ہمیں ان چیزوں سے- جو جہنم میں لے جانے والی ہیں- تاکید کرکے بچا رہے ہیں، گویا آپ ﷺ ہمیں پکڑ رہیں ہیں، لیکن ہم ان چیزوں کی خلاف ورزی کرکے اور آپ ﷺ کی نافرمانی کرکے اپنے آپ کو اس ہلاکت کے اندر گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔

﴿کھانے کی دو سنتیں﴾

وَعَنهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَمَرَ بِلَعْقِ الْأَصَابِعِ وَالصَّحْفَةِ وَقَالَ: اِنَّكُمْ لاَ تَدْرُوْنَ فِيْ أَيِّهَا الْبَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آدمی جب کھانا کھانے سے فارغ ہو تو انگلیوں کے چاٹ لینے کا اور پلیٹ کے صاف کر لینے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے۔

ایک تو یہ کہ پلیٹ میں کھانا بچ گیا ہے پھر تو صاف کرنے کا کوئی سوال نہیں کیونکہ کھانا بچا ہوا ہے تو اس کو اس طرح کر دے کہ اگر کوئی دوسرا آدمی کھانا چاہے تو اسے گھن نہ آئے۔ اس کا مطلب یہ لینا کہ پلیٹ میں کھانا بچایا ہی نہ جائے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کھانا نہیں بچا اور کھا چکے ہیں تو اب پلیٹ میں جو اِدھر اُدھر لگا ہوا ہے؛ اس کو صاف کر لو۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں اس میں سے کون سے دانے میں اور کھانے کے کونسے حصے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت رکھی ہوئی ہے۔

﴿برکت کا حال لاٹری جیسا ہے﴾

برکت کا حال تو لاٹری جیسا ہے۔ جو لاٹری نکالنے والے ہوتے ہیں وہ اس امید میں نکالتے ہیں کہ ہمارا نام لگ جائے گا، اس کے لئے خوب پیسے لگاتے ہیں۔ اور یہاں اللہ کا رسول جب یہ فرما رہا ہے کہ کھانے کے کون سے حصے اور دانے میں برکت رکھی ہوئی ہے؛ یہ معلوم نہیں، اس لئے جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو چاٹ لو اور برتن کو صاف کر لو۔

﴿کیا انگلیاں اور برتن چاٹنا؛ خلافِ تہذیب ہے؟﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ روایت خاص طور پر اس لئے لائے ہیں کہ بعض لوگ نعوذ باللہ انگلیاں چاٹنے اور برتن صاف کرنے کو تہذیب کے خلاف سمجھتے ہیں، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے اندر تہذیب سکھانے کے واسطے آئے تھے۔

دیکھو! بندے کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ وہی ہے جو ایک غلام کا اپنے آقا سے ہوا کرتا ہے۔ اگر آقا سامنے موجود ہو اور وہ غلام کو کوئی چیز کھانے کے واسطے دے تو آپ اندازہ لگایئے کہ اس دی ہوئی چیز میں سے اگر ذرا سا بھی نیچے گر گیا تو کیا وہ غلام اس کو نیچے گرا ہوا رہنے دے گا؟ نہیں! بلکہ وہ یہ خیال کرے گا کہ جس آقا نے مجھے یہ چیز دی ہے، مَیں اس کے سامنے بیٹھ کر کھا رہا ہوں۔ اس لئے جو گرا ہوا ہوگا؛ اس کو اٹھا کر صاف کئے بغیر ہی کھا جائے گا، صاف کرنے کی بھی زحمت گوارہ نہیں کرے گا، اس لئے کہ اس کو تو اپنے آقا کی خوشنودی چاہیے۔ جب ہم اللہ کے بندے ہیں اور جو کچھ ہمارے پاس ہے؛ وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے اور اس کی نعمت ہے، اس لئے اس کو ہمیں پورے اہتمام سے استعمال کرنا چاہیے۔ جیسے ایک غلام اپنے آقا کے ساتھ معاملہ کرتا ہے، ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر معاملہ کرنا چاہیے۔ ہم تو بندے ہیں اور وہ خالق و مالک ہے۔ انگلیوں کے چاٹنے اور پلیٹ صاف کرنے کو جو لوگ خلافِ تہذیب سمجھتے ہیں وہ کبر کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔ بات وہی آ گئی جو ابھی دائیں ہاتھ سے کھانے والی گذری کہ کبر کی وجہ سے اگر آدمی کوئی بات خلافِ سنت کہتا ہے؛ تو وہ خود اپنا ہی دنیا و آخرت کا نقصان کرتا ہے۔

پھر بھی ہم ان کے دل دادہ ہیں

آج کوئی سائنس داں اگر یہ اعلان کر دے کہ انگلیاں چاٹنے کی وجہ سے یہ فائدہ ہے کہ کبھی کسی کو قلب کا دورہ نہیں پڑے گا، یا اگر کھا کر انگلیاں چاٹ لے تو کبھی اس کی کڈنی (Kidney) خراب نہیں ہوگی؛ تو مَیں سمجھتا ہوں وہ لوگ جو یوں کہتے ہیں کہ یہ کام تہذیب کے خلاف ہے، وہی لوگ سب سے پہلے انگلیاں چاٹنا شروع کر دیں گے، حالانکہ جس سائنس داں نے یہ تحقیق کی اور اعلان کیا اس کے علم کی حیثیت کیا ہے؟ ان کی تحقیقات کا عالم تو

یہ ہے کہ آج انہوں نے ایک تحقیق کی اور اعلان کیا تو دس سال کے بعد پھر اپنی اس تحقیق سے وہ رجوع کر کے دوسری بات بتلاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم ان کے دلدادہ ہیں اور ان کی چیزوں پر ہمیں اتنا یقین ہے اور اللہ تعالیٰ کے پاک رسول ﷺ جن کی اتباع اور پیروی ہمارے لئے سرخ روئی اور عزتوں کا سبب ہے، ان کے معاملہ میں ہمارا یہ حال ہے۔

ہمارا حال اتباعِ سنت میں وہی ہونا چاہیے تھا......

ہمارا حال تو اتباعِ سنت کے معاملہ میں وہ ہونا چاہیے جو حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کا واقعہ ہے، اس زمانہ میں فارس کی حکومت فتح ہو چکی تھی، ایران کا پورا علاقہ مسلمانوں کے ماتحت آچکا تھا اور قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں اس زمانہ کی دو بڑی سلطنتیں اور سپر پاور (Super Power) اور بڑی طاقتیں سمجھی جاتی تھیں، وہ بھی فتح ہو چکی تھیں اور ایرانیوں اور رومیوں کی تہذیب اس زمانہ کی اونچی تہذیب سمجھی جاتی تھی۔ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ کھانا کھا رہے تھے، کھاتے کھاتے لقمہ نیچے گر گیا تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھالیا۔ ان کے ساتھ ان کا خادم تھا جو ایرانی النسل تھا اس نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یوں کہا: آقا! آپ کیا کر رہے ہیں؟ گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھالیا؟ یہاں کے لوگ اس کو عیب سمجھتے ہیں۔ اس پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا ہے وہ ہمیں نوٹ کرنا چاہیے۔ فرمایا ﴿أَ أَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَاءِ الْحُمَقَاءِ؟﴾ ان بے وقوفوں کے واسطے کیا میں اپنے حبیبِ پاک ﷺ کی سنت چھوڑ دوں گا؟ انہوں نے کوئی خیال نہیں کیا کہ یہ لوگ کیا سمجھیں گے:

لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکین ❖ پر وہ نہ سمجھیں میری بزم کے قابل نہ رہا

ہمیں تو اللہ کو اور اس کے رسول کو اچھا دکھلانا ہے، وہ ہمیں اچھا سمجھ لیں؛ بس یہی کافی ہے، پھر دنیا چاہے جو سمجھنا ہو؛ سمجھتی رہے، اس سے ہمیں کیا مطلب ہے۔

اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوسکتی ہے؟

دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک آدمی اچھا سمجھے گا تو دوسرا شخص برا سمجھے گا، اور ان کے اچھا سمجھنے اور نہ سمجھنے سے ہمارا کون سا فائدہ ہو جانے والا ہے؟ آپ کی فیکٹری میں کوئی برکت ہو جائے گی، نفع کی شرح بڑھ جائے گی کہ آج پچاس فیصد نفع ہوتا ہے اور وہ اچھا سمجھیں گے تو سو فیصد ہو جائے گا؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان کی حیثیت ہی کیا ہے؟ تو جن کی خود ہی کوئی حیثیت نہ ہو، ان کے اچھا سمجھنے نہ سمجھنے سے ہم اپنے زندگی کے طریقوں کو بدلیں اور نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے طریقوں سے منہ موڑ لیں؛ اس سے بڑی حماقت اور کیا ہوسکتی ہے؟ واقعۃً حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا کہ ان بے وقوفوں کی وجہ سے کیا مَیں اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے طریقوں کو چھوڑ دوں گا؟ یہ بڑا ہی ایمان افروز اور عبرت آموز جواب ہے۔ کاش! ہماری سمجھ میں آجائے۔

بہر حال! حضور ﷺ نے فرمایا ﴿اَنَّکُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِیْ أَیِّهَا الْبَرَکَةُ﴾ یہ جملہ کتنا عمدہ ہے ”تمہیں معلوم نہیں کہ کون سے دانے میں اور کون سے جزو میں برکت رکھی ہوتی ہے“ یہ فرما کر آپ ﷺ نے ہمیں کیسی اچھی تعلیم دے دی۔ اب ہمارا حال یہ ہونا چاہیے کہ کھانے کا کوئی حصہ چھوٹنے نہ پاوے، اور برتن کو برابر صاف کر لیا کریں۔

کھانے کے متعلق دیگر تعلیمات

پھر دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اگر پلیٹ کو صاف کر لیں گے تو پلیٹ بھی آدمی کو

دعا دیتی ہے ﴿اِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أَحَدِکُمْ فَلْيَأْخُذْهَا﴾ جب کسی کا لقمہ کھاتے ہوئے نیچے گر جائے تو وہ اسے اُٹھالیوے ﴿فَلْيُمِطْ مَا کَانَ بِهَا مِنْ أَذًى﴾ اور نیچے گرنے کی وجہ سے غبار مٹی وغیرہ اگر کچھ لگ گئی ہے تو اس کو صاف کر کے کھالے، اس کو شیطان کے لئے نہ چھوڑے ﴿وَلَا يَمْسَحْ يَدَهُ بِالْمِنْدِيْلِ حَتّٰى يَلْعَقَ أَصَابِعَهُ﴾ بلکہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آپ ہاتھ دھونے کے بجائے رومال سے پونچھ رہے ہیں یا ہاتھ دھو رہے ہیں تو جب تک کہ انگلیوں کو چاٹ کر صاف نہ کرلیں وہاں تک ہاتھ نہ دھوئیں۔ اس لئے کہ اگر آپ انگلیاں چاٹے بغیر ہاتھ دھوئیں گے تو کھانے کے وہ ذرّات جو انگلیوں کے ساتھ لگے ہوئے ہیں، وہ دھلنے میں نکل جائیں گے اور اگر ان میں برکت ہوئی تو اس سے محروم رہ جائیں گے۔

﴿برکت کا ایک مطلب﴾

دیکھو! برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانے کا وہ حصہ جس کے بدن میں پہنچنے کے نتیجے میں پھر کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔ لہٰذا اب تو ہمیں اپنے جسم کو بیماریوں سے بچانے کے لئے بھی اس کا اہتمام کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ اگر یہی نیت کرلیں کہ برکت والا حصہ اندر چلا گیا تو کبھی کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے، تو اس کے نتیجے میں بھی اللہ تعالیٰ بہت ساری بیماریوں سے حفاظت فرمادیں گے۔

خیر! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تک انگلیاں چاٹ نہ لے وہاں تک اس کو رومال سے نہ پونچھے یا ہاتھ نہ دھوئے ﴿فَإِنَّهُ لَا يَدْرِيْ فِيْ أَيِّ طَعَامِهِ الْبَرَكَةُ﴾ پھر وہی بات آئی کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے وہ معلوم نہیں ہے۔

﴿شیطان نے قسم کھائی ہے﴾

ایک اور روایت میں ہے: ﴿اِنَّ الشَّیْطَانَ یَحْضُرُ اَحَدَکُمْ عِنْدَ کُلِّ شَیْئٍ مِنْ شَأْنِہٖ﴾ یہ اصل بات آئی کہ شیطان ہمارا ازلی دشمن ہے، پہلے روز سے اُس نے تو قسم کھائی ہے۔ جب اس کو ہمارے ابا حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس حکم کو اس نے نہیں مانا اور اس کے نتیجے میں ہی وہ مردود بنا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے نکالا گیا، تو اسی دن سے پوری انسانیت سے اس نے دشمنی کر لی، اور اس نے تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی کہا کہ مَیں ان کو گمراہ کروں گا ﴿لَاٰتِیَنَّھُمْ مِنْ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَائِلِھِمْ﴾ آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے ہر طرف سے مَیں ان کے اوپر اٹیک (Attack) اور حملہ کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کو مہلت دی گئی۔ بہر حال! شیطان تم میں سے ہر ایک کے پاس اس کے ہر کام میں حاضری دیتا ہے ﴿حَتّٰی یَحْضُرَہٗ عِنْدَ طَعَامِہٖ﴾ یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی شیطان آتا ہے۔

﴿یہ بسم اللہ کی برکت ہے﴾

دیکھو! شیطان انسان کی ہر ایک چیز میں حصہ لگاتا ہے۔ کھانے میں، پینے میں، سونے میں، مکان کے اندر رہنے میں، بیوی کے ساتھ صحبت کرنے تک میں حصہ لگاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں سکھائی ہیں، ہر دعا میں بسم اللہ ہے اور ساتھ میں ایک دعا ہے، تو ان دعاؤں کا مطلب کیا ہے؟ جب آدمی استنجاء اور قضائے حاجت کے لئے بیت الخلاء میں جاتا ہے تو وہاں بھی شیطان آدمی کی شرم گاہ سے کھیلتا ہے لیکن اگر آپ بسم اللہ بول کر اور یہ دعا ﴿بسم اللہ! اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَآئِثِ﴾ پڑھ کر گئے؛ تو بس! اس کے بعد

وہ آدمی کی شرم گاہ دیکھ بھی نہیں پاتا، اس کو کچھ نظر ہی نہیں آتا، اس کے اور آدمی کے درمیان پردہ اور آڑ ڈال دی جاتی ہے، پھر اس کو طاقت نہیں رہتی کہ کچھ کر سکے۔ دیکھئے! یہ بسم اللہ کی برکت ہے۔

پرانے زمانہ کی عورتیں ہر کام میں بسم اللہ کا بڑا اہتمام کرتی تھیں، کباٹ کا دروازہ کھولا تو بسم اللہ، نعمت خانے کا دروازہ کھولا تو بسم اللہ، چائے بنارہی ہیں تو بسم اللہ، ہر چیز میں اس کا بہت اہتمام کیا کرتی تھیں۔ اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ آج کل یہ سلسلہ بھی ہمارے گھروں سے رخصت ہو گیا ہے۔ پڑھنے پڑھانے کا سلسلہ ہے وہ اپنی جگہ پر رہا، آداب بھی سکھلائے جاتے ہیں لیکن عملی طور پر ان چیزوں کے بولنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے، وہ اہتمام نہیں رہا۔ اسی لئے جب دعائیں چھوڑی جارہی ہیں تو اس کے نقصانات ہم بھگت رہے ہیں بہرحال! کھانے میں بھی شیطان حاضر ہوتا ہے، اسی لئے بسم اللہ سکھلائی گئی کہ بسم اللہ بول کر کھاؤ، تاکہ شیطان تمہارے ساتھ کھانے میں شریک نہ ہو سکے۔

مؤمن کے شیطان کی کافر کے شیطان سے ملاقات

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ مؤمن کے شیطان کے ساتھ کافر کے شیطان کی ملاقات ہوئی، تو دیکھا کہ کافر کا شیطان تو بڑا تازہ اور بڑا مست، بڑا صحت مند اور لباس والا تھا اور مؤمن کا شیطان بہت کمزور، بھوکا پیاسا اور ننگا تھا۔ اس نے کافر کے شیطان سے کہا کہ تو بہت تروتازہ ہے، لباس پہنے ہوئے ہے اور مَیں تو بھوکا پیاسا ہوں اور ننگا ہوں، یہ مجھے تو موقعہ ہی نہیں دیتا، کھانے بیٹھتا ہے تو بسم اللہ، پانی پیتا ہے تو بسم اللہ، لباس پہنتا ہے تو بسم اللہ، مومن تو ہر چیز میں بسم اللہ بولتا ہے، اور جب وہ بسم اللہ بولتا ہے تو مَیں محروم ہو جاتا ہوں، نہ

کھانے میں میرا حصہ لگتا ہے، نہ پینے میں، نہ لباس میں حصہ لگتا ہے۔ اس لئے میں تو منتظر رہی رہتا ہوں کہ یہ بسم اللہ بھول جائے؛ تو میرا کچھ حصہ لگے۔ (المعجم الکبیر ۸۶۹۴)

﴿شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو؟﴾

اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ اگر کھانے کے شروع میں آدمی بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو شیطان شریک ہو جاتا ہے، جب درمیان میں یاد آ جائے تو حضور ﷺ نے ہم کو بتلایا کہ یوں پڑھ لو ﴿بِسْمِ اللهِ اَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ﴾ (مسند احمد، ۱۸۱۹۵) اس کا مطلب ہے کہ اللہ ہی کے نام سے شروع سے لے کر آخر تک۔ حالانکہ بیچ میں ہم بول رہے ہیں؛ لیکن اللہ کے رسول نے یہ طریقہ سکھلا دیا کہ شروع سے لے کر آخر تک بول دو؛ تو شیطان نے اب تک جو کھا لیا تھا وہ اس کو قے کر کے نکال دینا پڑتا ہے، وہ اس کے پیٹ میں نہیں رہ سکتا۔ حضور ﷺ کی کیا بہترین تعلیم ہے۔

﴿یہ کوئی دانشمندی ہے؟﴾

بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ شیطان تم میں سے ہر ایک کی ہر چیز میں آنا چاہتا ہے یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی وہ موجود رہتا ہے، اب بسم اللہ پڑھی تو کھانے میں تو شریک نہیں رہے گا، لیکن اگر تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے؛ تو وہ چوٹا (ٹالےڈ) تو تیار ہی بیٹھا ہے، اور انتظار میں ہے، ویسے تو کھانے میں شریک نہیں ہو سکا لیکن جب لقمہ گرے تو اس کو چھوڑ مت دینا؛ ورنہ وہ کھا جائے گا۔ اس کو تو بھوکا ہی رکھنا ہے، وہ تو ہمارا دشمن ہے، اس کو تو کوئی فائدہ پہنچانا ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس کے اندر اگر کچھ غبار دھول وغیرہ بھی لگی ہو تو اس کو دور کر و اور کھا لو اور اس کو شیطان کے لئے مت چھوڑ یو، اس لئے کہ شیطان کے

لئے چھوڑو گے تو وہ کھا کر آپ کے ہی مقابلہ کے لئے قوت حاصل کرے گا۔ یہ کوئی دانشمندی کی بات ہے کہ اپنے دشمن کو ہم ہی تقویت پہنچائیں، اس کو ہم جتنا بھی کمزور کر سکتے ہوں؛ اتنا کمزور کرنا چاہیے۔

﴿حشر کے دن کی نفسانفسی﴾

عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَامَ فِیْنَارسولُ اللّٰہِ ﷺ بِمَوْعِظَةٍ فَقَالَ: یَاأَیُّھَا النَّاسُ! اِنَّکُمْ مَحْشُوْرُوْنَ اِلیٰ اللّٰہِ تَعَالیٰ حُفَاةً عُرَاةً ﴿کَمَابَدَاْنَااَوَّلَ خَلْقٍ نُعِیْدُہٗ وَعْداً عَلَیْنَااِنَّا کُنَّا فَاعِلِیْنَ﴾ أَلَا! وَاِنَّ أَوَّلَ الْخَلَائِقِ یُکْسیٰ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِبْرَاھِیْمُ علیہ السلام. أَلَا! وَاِنَّہٗ سَیُجَآءُ بِرِجَالٍ مِنْ أُمَّتِیْ، فَیُؤْخَذُبِھِمْ ذَاتَ الشِّمَالِ، فَأَقُوْلُ: یَارَبِّ أَصْحَابِیْ؛ فَیُقَالُ اِنَّکَ لَاتَدْرِیْ مَاأَحْدَثُوْابَعْدَکَ، فَأَقُوْلُ کَمَاقَالَ الْعَبْدُالصَّالِحُ ﴿وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْداً مَّادُمْتُ فِیْھِمْ﴾ الیٰ قولہٖ ﴿العزیزُ الحکیمُ﴾ فَیُقَالُ لِیْ: اِنَّھُمْ لَمْ یَزَالُوْامُرْتَدِّیْنَ عَلیٰ أَعْقَابِھِمْ مُنْذُفَارَقْتَھُمْ.

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ہمارے درمیان ایک وعظ ارشاد فرمایا، ہم کو نصیحت فرمائی، تقریر کی اور خطبہ دیا۔ اس میں آپ ﷺ نے فرمایا: اے لوگو! تم اللہ تعالیٰ کی طرف دوبارہ زندہ کر کے ایسی حالت میں لے جائے جاؤ گے کہ تمہارے پیر ننگے ہوں گے، جسم برہنہ ہوں گے اور جیسا بچہ بغیر ختنہ کے پیدا ہوتا ہے ایسے غیر مختون ہوگے۔ یعنی قیامت کے روز دوسرا صور پھونکے جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو سب کو ایسی حالت میں اُٹھایا جائے گا کہ کسی کے پیر میں جوتا نہیں ہوگا، کھلے پیر اور کھلے بدن، کسی کے جسم پر لباس بھی نہیں ہوگا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا:

یارسول اللہ! جب برہنہ اور کھلے جسم ہوں گے تو ایک آدمی دوسرے کے ستر کو دیکھے گا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ معاملہ اس سے زیادہ سنگین ہوگا (مسلم شریف ۲۸۵۹) مطلب یہ ہے کہ اس وقت جو حالات درپیش ہوں گے اس کے پیش نظر کسی کو یہ فرصت اور موقعہ ہی کہاں ہوگا کہ دوسرے کی ستر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے۔

آدمی فرصت کے اوقات میں ایسی حرکتیں کرتا ہے، کوئی مصیبت آپڑی ہو اور جان کے لالے پڑ رہے ہوں تو ایسے وقت میں ایسی چیزوں کی طرف توجہ نہیں جاتی۔ جب لوگ دوبارہ پیدا کر کے اُٹھائے جائیں گے اس وقت برہنہ ہوں گے اس کے باوجود کوئی کسی کے ستر کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کرے گا اور غیر مختون ہوں گے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ ہم نے جس طرح تم کو شروع میں پیدا کیا تھا؛ اسی طرح دوبارہ تم کو پیدا کریں گے، یہ ہم پر ایک وعدہ کے طور پر ضروری ہے اور ہم اس کو کر کے رہیں گے۔

شروع میں جب بچہ ماں کے پیٹ سے دنیا کے اندر آتا ہے تو جوتے پہن کر نہیں آتا، کپڑا پہنا ہوا نہیں آتا، ختنہ کیا ہوا نہیں آتا۔ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو جس ہیئت وحالت میں ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز مردوں کو دوبارہ اسی حالت میں زندہ فرمائیں گے، بس! اتنا ہے کہ بچہ جسمانی اعتبار سے چھوٹا ہوتا ہے اور یہ اپنے قد میں ہوں گے

﴿سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جوڑا عطا کیا جائے گا﴾

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب سب ہی لوگ بغیر لباس کے ہوں گے تو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک

جوڑا عنایت ہوگا۔ اب سوال ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہے؟ تو بعضوں نے تو اس کی وجہ یہ بتلائی ہے کہ جس وقت نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ کے اندر ڈالا تھا تو آپ کا لباس اتروا کر ڈالا تھا۔ چونکہ اللہ کے راستہ میں آپ نے یہ تکلیف اُٹھائی تھی اور آدمی اللہ کے راستہ میں جیسا مجاہدہ کرتا ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بدلہ عطا کیا جاتا ہے۔ جب انھوں نے اپنے آپ کا برہنہ ہونا منظور کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام لوگوں کے سامنے سب سے پہلے جوڑا عطا کیا جائے گا۔

بدعت کی نحوست، آبِ کوثر سے محرومی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میری اُمت کے کچھ لوگوں کو لایا جائے گا، چونکہ اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اُمتیوں کو حوضِ کوثر سے پانی پلائیں گے، اس وقت کچھ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں گے جن پر آپ کے امتی ہونے کی علامت بھی ہوگی یعنی وضو کی وجہ سے چہرے اور ہاتھ، پاؤں پر روشنی ہوگی اور آپ کے پاس وہ پانی پینے کے واسطے آئیں گے اور آپ ان کو پانی پلانے کے لئے آگے بڑھیں گے، اس وقت ان کو بائیں طرف لے جایا جائے گا یعنی وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں اور حضور کی طرف سے ان کو پانی پلایا جائے اس سے پہلے ہی فرشتے بیچ میں آڑ ڈال دیں گے اور ان کو پکڑ کر لے جائیں گے، وہاں سے ہٹا دیں گے اور نکال دیں گے کہ یہاں سے ہٹو ﴿فَأَقُوْلُ: يَارَبِّ أَصْحَابِيْ﴾ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر مَیں اللہ تعالیٰ سے عرض کروں گا کہ یا اللہ! یہ تو میرے امتی ہیں اور میرے لوگ ہیں، کیوں ان کو یہاں سے ہٹایا جا رہا ہے؟ اور کیوں میری طرف سے دیے جانے والے آبِ کوثر سے ان کو محروم رکھا جا رہا ہے؟ اس وقت مجھ سے یہ کہا جائے گا کہ آپ کو معلوم

نہیں کہ آپ کے بعد انہوں نے کیا کیا نئی چیزیں ایجاد کیں۔

جو لوگ بدعتیں ایجاد کرتے ہیں اور دین کے اندر نئے طریقے جاری کرتے ہیں ان کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ وہ لوگ بدعت کی نحوست کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں جامِ کوثر سے محروم رکھے جائیں گے۔ (اَللّٰھُمَّ احْفَظْنَا مِنْہُ)

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت وہی آیت پڑھوں گا اور وہی بات کہوں گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہی ﴿وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ﴾

﴿حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حساب﴾

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو باری تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز نصاریٰ کے متعلق سوال کیا جائے گا ﴿أَ أَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَأُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ اے عیسیٰ! کیا آپ نے ان کو حکم دیا تھا اور تعلیم دی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میری اور میری ماں کی پوجا اور عبادت کرو؟ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم کو خدا مانتے ہیں، حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں۔ جو تین خدا کے قائل ہیں وہ ان کی پوجا کرتے ہیں اور لوگوں کو یہی بتلاتے ہیں کہ یہی ہمارا دین ہے۔ تو جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے ناواقف ہیں شاید ان کو تو یہی غلط فہمی ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی نے ان کو یہ تعلیم دی ہوگی، جب کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دین میں یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا مانا جائے اور ان کو معبود مانا جائے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں بہت باغیرت ہیں۔ اگر کسی نبی کی ذات پر ذرا سا شبہ بھی آرہا ہو تو اس کو فوراً دور کر دیا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کے مختلف نمونے موجود ہیں۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات کے متعلق ان کے ماننے والوں کی روش اور ان کے اس طرزِ عمل سے شبہ پیدا ہو سکتا تھا اور ممکن ہے کوئی ناواقف یوں

سمجھ بیٹھتا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ہی ان کو یوں کہا ہوگا؛ لہٰذا حضرت عیسیٰ پر آنے والے اس الزام اوران کے متعلق پیدا ہونے والی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز برسر محشر تمام لوگوں کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھیں گے کہ اے عیسیٰ! کیا آپ نے لوگوں کو یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ہماری پوجا اور عبادت کرو؟

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جواب

حضرت عیسیٰ علیہ السلام جواب میں اپنی براءت پیش کریں گے ﴿سُبۡحٰنَکَ مَایَکُوۡنُ لِیۡ اَنۡ اَقُوۡلَ مَالَیۡسَ لِیۡ بِحَقٍّ اِنۡ کُنۡتُ قُلۡتُہٗ فَقَدۡ عَلِمۡتَہٗ تَعۡلَمُ مَافِیۡ نَفۡسِیۡ وَلَاۤ اَعۡلَمُ مَافِیۡ نَفۡسِکَ﴾ باری تعالیٰ! تیری ذات تو پاک ہے، بھلا میں ایسی بات کیسے کہہ سکتا ہوں جسے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں ہے، اور میرے دل میں جو کچھ بھی ہے وہ سب تو بخوبی جانتا ہے، میرے اعمال سے تو بخوبی واقف ہے۔ یہ جواب حضرت عیسیٰ علیہ السلام میدانِ حشر میں اولین وآخرین تمام لوگوں کے سامنے دیں گے، گویا سب کو پتہ چل جائے گا، جو ناواقف تھے وہ بھی سمجھ جائیں گے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات نہیں تھی بلکہ ان لوگوں نے اپنے دین میں ایک چیز گھڑ لی تھی۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام براءت فرمائیں گے اور اس سے پہلے قیامت کے دن پیش آنے والے اس واقعہ کی اطلاع اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر اتار کر دنیا میں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی براءت پیش کردی۔ اس وقت تو ہوگی ہی؛ لیکن اس سے پہلے ہی قرآن کے ذریعہ سے ان کی براءت کا اعلان کردیا گیا۔

چونکہ نصاریٰ نے اپنے دین میں ایک ایسی چیز بڑھالی جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں سے نہیں تھی تو اسی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے ﴿وَکُنۡتُ عَلَیۡھِمۡ

شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ. فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ﴾ اے اللہ! جب تک کہ مَیں ان کے درمیان موجود رہا؛ مَیں ان کے حالات کی نگرانی کرتا رہا اور جب تو نے مجھے اُٹھالیا تو پھر تو ہی ان کے حالات سے واقف ہے جو انہوں نے کیا۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نصاریٰ کے اس عمل سے اور نصاریٰ نے ان کی تعلیمات میں جو تبدیلی کی اس سے اپنی براءت کا اظہار کر رہے ہیں۔

﴿تعلیماتِ نبوی کو پس پشت ڈالنے والوں کا میدانِ محشر میں کیا حشر ہوگا؟﴾

تو نبی کریم ﷺ بھی اس موقعہ پر عرض کریں گے جب کہ آپ کے ان امتیوں کو (جنہوں نے دین کے اندر نئی باتیں گھڑی تھیں اور ان کو دین کا ایک حصہ قرار دیا جس کو بدعت کہتے ہیں) آپ ﷺ کے پاس آنے نہیں دیا جائے گا، حالانکہ آپ ﷺ تو چاہیں گے کہ ان کو جامِ کوثر پلائیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ وہ آگے بڑھیں گے لیکن فرشتے آ کر ان کو پکڑ کر لے جائیں گے، اس وقت حضور ﷺ عرض کریں گے کہ یہ تو میرے امتی ہیں ان کو کہاں لے جایا جا رہا ہے؟ آپ کو جواب دیا جائے گا کہ انہوں نے دین میں نئی چیزیں گھڑ لی تھیں، اس لئے ان کو اس سے محروم رکھا جائے گا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کے بعد یہ لوگ برابر دین کے اندر پیچھے ہٹتے رہے اور آپ کی تعلیمات کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کرتے رہے۔

بس! یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی سنت کی پیروی اور اتباع اتنا ضروری ہے کہ اگر آپ کے طریقوں کو چھوڑ دیں گے تو قیامت کے روز نبی کریم ﷺ کے ہاتھوں حوضِ کوثر کا جام نصیب نہیں ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ حفاظت فرمائے اور ہمیں سنتوں کا اہتمام نصیب فرمائے

اور نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے حوضِ کوثر کا جام بھی ہمیں نصیب فرمائے

بیٹھے بیٹھے بلا وجہ کنکریاں پھینکنا

عن أبی سعید عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ قال: نَهٰی رسولُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْخَذْفِ. وقَالَ: اِنَّهُ لا یَقْتُلُ الصَّیْدَ وَلا یَنْکَأُ الْعَدُوَّ، وَاِنَّهُ یَفْقَأُ الْعَیْنَ، وَیَکْسِرُ السِّنَّ.

حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چھوٹی کنکری پھینک کر مارنے سے منع فرمایا۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بیٹھے بیٹھے فرصت کے موقعہ پر یوں (انگوٹھے پر رکھ کر) کنکری مارتے ہیں۔ اس کو عربی میں "خَذف" کہتے ہیں۔ تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹھے ہوئے اس طرح کنکری ماری اور اتفاقاً کوئی شخص وہاں سے گذر رہا تھا، اس کی آنکھ میں لگ گئی اور اس کی آنکھ پھوٹ گئی۔ یا کسی کے دانت کو لگ گئی اور اس کا دانت ٹوٹ گیا۔ اسی کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ شکار کرنے کے کام تو آتی نہیں، اور نہ دُشمن کو مار بھگاتی ہے، بلکہ کسی کی آنکھ پھوڑ دے گی یا دانت توڑ دے گی۔ اس لئے خاص کر آبادی کے اندر حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ کوئی آدمی آبادی سے باہر ہو تو وہاں کوئی اشکال نہیں، لیکن آبادی میں بیٹھے ہوئے اس طرح مارنا کہ پتہ نہیں کون کب گذر جائے؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔

عام گزرگاہوں میں کرکٹ وغیرہ کھیل کھیلنا

اسی لئے آبادی کے اندر ایسے کھیل کھیلنا جس میں کسی کو لگ جانے کا احتمال ہو؛ اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسے راستہ میں گِلّی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنا جس کی بال کسی کو

لگ جائے یا اور کوئی چیز آنے جانے والوں کو لگے۔ ویسے بھی راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنا کہاں جائز ہے؟ جہاں ایمان کے ستّر سے اوپر شعبے بتلائے گئے ہیں اس میں ایمان کا معمولی درجہ یہ بتلایا گیا ﴿اِمَاطَةُ الْاَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ﴾ لوگوں کو تکلیف پہنچانے والی چیز کو راستہ سے دور کرنا۔ کانٹا، پتھر یا کوئی اور چیز پڑی ہوئی ہے جس سے گذرنے والوں کو تکلیف ہوسکتی ہے؛ اس کو ہٹانا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ جب کوئی چیز پڑی ہو؛ اس کے ہٹانے کو ایمان کا ایک حصہ قرار دیا گیا تو پھر خود ہماری طرف سے ایسی صورتیں پیدا کرنا جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کے لئے رکاوٹیں پیدا ہوتی ہوں؛ اس کی کہاں اجازت دی جائے گی؟

﴿راستہ میں موٹر گاڑی کھڑی کر دینا﴾

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ اپنی گاڑی کو راستہ میں اس طرح کھڑی کر دینا کہ دوسری گاڑی والوں کو یا آنے جانے والوں کو تکلیف ہو؛ یا پارکنگ اس طرح کر دینا کہ جس کی وجہ سے گذرنے والوں کو تکلیف ہو؛ یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حرام لکھا ہے۔ اس لئے کہ یہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا ہے اور کسی کو تکلیف پہنچانا حرام اور ممنوع ہے۔ اسی لئے کوڑا کرکٹ راستہ میں ڈالنا بھی ممنوع ہے۔ یہ سب اسلام کی تعلیمات ہیں۔ ہم نے ان ساری چیزوں کو چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اس کی تکلیفیں بھگت رہے ہیں، اور یہی اسلامی تعلیمات غیروں نے اور یوروپ والوں نے اپنا رکھی ہیں؛ تو وہ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں، اور ان کی ظاہری زندگی پُرسکون ہے، چاہے ایمان کی دولت سے محروم ہونے کے وجہ سے اوپر جا کر بھگتیں گے، لیکن ظاہر میں دنیوی زندگی گذارنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے ہمیں جو اصول بتلائے تھے، وہ انہوں نے اپنائے؛ تو اس کا فائدہ بھی وہ لوگ محسوس کر رہے ہیں۔

صحابہ کے یہاں آنحضور ﷺ کی تعلیمات کی اہمیت

یہ روایت لاکر اصل قصہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ گذر رہے تھے تو ان کے خاندان کا کوئی بچہ جو اُن کا رشتہ دار تھا وہ اس طرح کنکریاں پھینک رہا تھا۔ انہوں نے اس کو کہا کہ دیکھو! اس طرح کنکری مت پھینکو، نبی کریم ﷺ نے اس طرح کنکری پھینکنے سے منع کیا ہے۔ اور یہی روایت سنائی کہ کنکری سے کوئی شکار تو ہوتا نہیں، کسی کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے، کسی کا دانت ٹوٹ جاتا ہے۔ پھر اس کے پاس سے چلے گئے۔ دوبارہ جب آئے تو دیکھا کہ وہ بچہ اسی میں مشغول ہے تو انہوں نے اس سے کہا کہ اچھا! مَیں نے تم کو نبی کریم ﷺ کا ارشاد سنایا کہ حضور ﷺ نے اس فعل سے منع کیا ہے، اور تمہارے علم میں یہ بات آجانے کے بعد بھی تم یہی کر رہے ہو؟ ﴿لَا أُكَلِّمُكَ أَبَداً﴾ انہوں نے قسم کھالی کہ زندگی بھر تم سے بات نہیں کروں گا۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا معاملہ نبی کریم ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کے بارے میں یہی تھا کہ ذرّہ برابر بھی اس میں کسی کی طرف سے کوئی مخالفت ہو، اس کو وہ برداشت نہیں کرتے تھے کسی کو اگر تنبیہ بھی کر دی گئی تو اس کا حال یہ ہوتا تھا کہ جس بات پر ایک مرتبہ تنبیہ فرمائی تو بس پھر زندگی بھر کے لئے ایسا سبق حاصل کر لیا کہ کچھ بھی ہو جائے لیکن اس میں وہ کبھی غفلت نہیں کرتے تھے۔

صحابی کا اہتمامِ عمل

ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿لَا تَسْئَلْ﴾ سوال مت کرنا۔ اس کے بعد ان کا حال یہ تھا کہ گھوڑے پر سوار ہیں اور کوڑا گیا

یا اُٹھانا بھول گئے تو کسی کو یہ نہیں کہتے تھے کہ مجھے یہ اُٹھا کر دیدو، بلکہ گھوڑے پر سے خود اُترتے اور لے کر پھر دوبارہ سوار ہوتے۔ نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے اوپر عمل کا اتنا زیادہ اہتمام تھا۔

﴿بچوں کی اطاعت شعاری﴾

حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ حضرت ام المؤمنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے صاحبزادے (ان کے پہلے شوہر کے بیٹے) چھوٹے تھے۔۳-۴/سال کی عمر ہوگی لیکن ذرا سمجھ دار تھے، جب اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی شادی ہوئی تو چھوٹے ہونے کی وجہ سے یہ بھی ساتھ میں آئے، اور حضور ﷺ کی تربیت میں رہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو پوری پلیٹ میں میرا ہاتھ گھومنے لگا۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر ہاتھ مارا، اُدھر ہاتھ مارا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اے بیٹے! جب کھانا کھاؤ؛ تو بسم اللہ پڑھو، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ حضرت عمر بن ابوسلمہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے اس ارشاد کے بعد سے آج تک میرا کھانا اسی طرح ہے۔ حالانکہ وہ بچے تھے۔ (بخاری شریف ۵۳۷۶)

بتلانا یہ ہے کہ صحابہ میں بچہ ہو یا بڑا؛ حضور ﷺ کی دی گئی ہدایت کو وہ پلے باندھ لیتے تھے اور اپنی زندگی میں اسی وقت سے ایسا عملی جامہ پہناتے تھے کہ پھر کبھی اس کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ ان کا عام مزاج تھا، اور بھی بہت سارے واقعات ہیں، بہرحال! مَیں تو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ سنت کے خلاف کوئی آدمی کبھی کچھ کرے یا بولے؛ اس کو وہ حضرات برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔

﴿امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی غیرتِ ایمانی﴾

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ جن کا شمار امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے شاگردوں میں ہوتا ہے، ایک مرتبہ انہوں نے یہ حدیث بیان کی کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک درزی نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کی، مَیں بھی ساتھ تھا، کھانے میں روٹی کے ساتھ گوشت کا سالن تھا اوراس کے اندر کدو (لوکی) بھی تھا۔ حضور ﷺ کدو کو پلیٹ میں تلاش کرر ہے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں اس میں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر آپ کے آگے بڑھاتا رہا اوراس کے بعد سے مجھے بھی کدو بہت مرغوب اور پسند ہوگئی۔ یہ روایت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے سنائی۔ کوئی صاحب مجلس میں بیٹھے تھے، اس حدیث کے سننے کے بعد انہوں نے یہ کہا: مجھے تو کدو پسند نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ نہ جانتے ہوئے ایسے ہی کوئی یوں کہے، اپنی پسند اور ناپسند بتلائے وہ اپنی جگہ پر الگ بات ہے، لیکن نبی کریم ﷺ کی بات سامنے آنے کے بعد ایسا بولنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے۔ حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ گھر میں گئے تلوار لے کر آئے اور کہا: اپنے اس جملے سے توبہ کر؛ ورنہ ابھی تیرا سر گردن سے الگ کردوں گا

کہنے کا حاصل ہے کہ یہ حضرات نبی کریم ﷺ کی سنت کے خلاف کسی کی طرف سے کوئی بات کہی جاتی تھی تو اس کو برداشت ہی نہیں کرتے تھے۔

﴿آج کا ہمارا المیہ﴾

آج تو ہمارا معاشرہ، سماج اور ہماری سوسائٹی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ سنتوں سے آگے فرائض اور واجبات کے معاملے میں بھی ان کے جی میں جو آتا ہے وہ زبان سے بولتے رہتے ہیں، اور کوئی انہیں ٹوکنے کے لئے تیار نہیں۔ اور اگر کوئی ان کو کچھ کہے تو وہ سننے کے لئے تیار نہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

﴿حجر اسود کا بوسہ﴾

عن عابس بن ربیعة رضی اللہ عنہ قال: رَأَیتُ عُمَرَبنَ الخَطَّابِ رضی اللہ عنہ یُقَبِّلُ الحَجَرَ–یعنی الأَسوَدَ–وَیَقُولُ: اِنِّیْ أَعلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ، مَاتَنفَعُ وَلَاتَضُرُّ، وَلَوْلَااِنِّیْ رَأَیتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ یُقَبِّلُکَ؛ مَاقَبَّلتُکَ.

حضرت عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ آپ حجر اسود کو بوسہ دے رہے تھے اور فرما رہے تھے ﴿اِنِّیْ أَعلَمُ اَنَّکَ حَجَرٌ مَاتَنفَعُ وَلَاتَضُرُّ﴾ چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات کی بہت کثرت ہوئی، بڑے بڑے علاقے فتح ہوئے اور بڑی تعداد میں غیر مسلم اسلام کے اندر داخل ہوئے اور وہ ایسے لوگ تھے جو اسلام لانے سے قبل بت پرستی کے عادی تھے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ خیال ہوا کہ وہ لوگ آئیں گے اور حجر اسود کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھ کر کہیں ان کو یہ غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کہ حجر اسود کو جو بوسہ دیا جا رہا ہے، یہ اُسی جیسا ہے۔ ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

پہلے میں یہ عرض کر دوں کہ استلام کے بارے میں حدیثِ پاک میں آتا ہے حجر اسود یمین اللہ ہے، اللہ تبارک تعالیٰ کا ہاتھ ہے اور جب کوئی آدمی حجر اسود کا استلام کرتا ہے تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ سے مصافحہ کیا (کنز العمال ۳۴۷۴۴) اسی لئے طواف کی ابتداء اسی سے کی جاتی ہے اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ جب بہت بھیڑ بھاڑ ہو تو اس وقت دور ہی سے اشارہ کر دے یا ہاتھ پہنچتا ہو تو ہاتھ لگا کر اس کو بوسہ دیدے، یا دور سے استلام کر لے، دھکا پیل کر کے اور دوسروں کو تکلیف پہنچا کر بوسہ دینے کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔

خیر! عابس بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوسہ دیتے وقت حجر اسود کو

خطاب کرتے ہوئے یہ جملہ فرمایا: اے حجر اسود! مَیں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے، تو نہ کوئی نفع پہنچا سکتا ہے، نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ چونکہ جو لوگ بت پرستی کے عادی تھے ان کے ذہنوں میں تو یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ بت پتھروں ہی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ نقصان و فائدہ پہنچاتے ہیں، اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے اسی نظریہ کی تردید کے لئے یہ جملہ فرمایا؛ تا کہ وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم حجر اسود کو بوسہ شاید اسی لئے دے رہے ہیں کہ یہ ہم کو کوئی فائدہ پہنچا دے گا، اور اگر بوسہ نہ دیں تو کوئی نقصان پہنچا دے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو خطاب کرتے ہوئے کہا: اگر مَیں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا؛ تو مَیں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا۔

﴿سنت میں حکمت کی تلاش﴾

بس! یہاں تو یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کو بوسہ دیا اگر چہ اس کو بوسہ دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوسہ دیتے ہوئے دیکھا تھا اور آپ نے اس کے بوسہ دینے کا حکم دیا ہے؛ اس لئے مَیں بوسہ دے رہا ہوں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جتنے بھی سنت طریقے ہیں اور شریعت نے بتلائے ہیں ان کے اندر آدمی کو کوئی فائدہ یا حکمت سمجھ میں آوے یا نہ آوے، بلکہ حکمت سمجھ میں آوے تب بھی حکمت کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے ان پر عمل اسی لئے کرنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا طریقہ ہے۔ لاکھوں حکمتیں ہوں وہ اپنی جگہ پر؛ لیکن ہمیں تو عمل اسی لئے کرنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرنے کو بتلایا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی لئے دنیا میں آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بھی بتلایا ہے وہ ہمیں کرنا ہے، اسی میں ہماری دنیا کی بھی بھلائی ہے اور آخرت کی بھی بھلائی ہے۔ جو

لوگ سنت طریقوں کے اندر اور نبی کریم ﷺ کے بتلائے ہوئے معمولات کے اندر حکمتیں تلاش کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس میں کیا فائدہ ہے، اور کہتے ہیں کہ یہ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا؛ یہ سب نادانی کی باتیں ہیں۔ آج کل بھی دنیا میں ایسا نہیں ہو رہا ہے کہ جو چیز سمجھ میں آوے، وہی ساری چیزیں کی جاتی ہوں۔

لگن اور عشق کی ضرورت ہے

آج کل تو فیشن کا ایسا رواج ہو گیا ہے کہ جس چیز کی فیشن چل پڑے، چاہے وہ کیسی ہی بے تکی چیز کیوں نہ ہو؛ لیکن لوگ اسی کو کرتے ہیں۔ وہاں کوئی یہ سوال نہیں کرتا کہ اس میں کیا حکمت ہے اور کیا فائدہ ہے۔

دیکھو! اُنگلیاں چاٹنا سنت ہے۔ اس کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنے میں کیا فائدہ ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور آج کل کھانے کا ایک طریقہ بوفے والا چل پڑا ہے کہ پلیٹ لے کر کھڑے ہیں اور گھومتے پھرتے جانوروں کی طرح کھا رہے ہیں، اگر یہی چیز پہلے زمانہ میں پُرانے لوگوں کو بتلا دی جاتی تو وہ کہتے کہ جانوروں جیسا کھانے کا یہ کیا طریقہ ہے؟ لیکن آج کل اس کا فیشن ہے اور اسی کو ترقی کی معراج سمجھا جاتا ہے۔ کوئی آدمی معذور اور مجبور ہو تو بات دوسری ہے، لیکن معذوری و مجبوری نہ ہونے کی صورت میں پھر وہی طریقہ ہمارے لئے تو مناسب ہے جو کتابوں میں آیا ہے اور نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے۔ ہر چیز کے اندر ہمیں سنت کا اہتمام کرنا چاہیے:-

لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکیں　　پر وہ نہ سمجھیں کہ میری بزم کے قابل نہ رہا

یعنی ہم سنت طریقہ کو اختیار کریں تو پھر لوگ چاہے کچھ بھی کہیں؛ اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے

مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ دیکھو! یہ یوروپین ٹورسٹ ہمارے ملک میں آتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کے بال آدھے کٹے ہوئے ہیں اور آدھے ہیں۔ کانوں کے اندر بالیاں پہن رکھی ہیں، اور گلے کے اندر مالا ڈال رکھی ہے۔ آدھا لباس عورتوں جیسا اور آدھا مردوں جیسا ہوتا ہے۔ مَیں نے خود دہلی میں دیکھا کہ دو آدمی ایسے تھے اور سب دکاندار ان کو دیکھ کر ہنس رہے تھے، لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ مجھے تو ان کے اس انداز کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوا کہ یہ ہے لگن، اور یہ ہے اپنے طریقے کے ساتھ عشق؛ کہ ساری دنیا ہنستی ہو تو ہنستی رہے، ہمارا کیا بگاڑ لے گی۔ وہ اپنی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہے؛ ہمارا کیا ہے، ہم جس چیز کو پکڑے ہوئے ہیں، اس کو کسی حال میں بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

کاش! ہم سنتوں کے معاملہ میں ایسے ہو جائیں

لیکن ایک مسلمان ہے کہ نبی کریم ﷺ کا بتلایا ہوا وہ طریقہ کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت کی بھلائی بتلا رکھی ہے؛ لوگوں کے معمولی طعن و تشنیع کی وجہ سے اور لوگوں کے معمولی جملے سن کر اختیار کیا ہوا طریقہ چھوڑ دیتا ہے۔ اس واقعہ سے ہمیں یوں عبرت لینی چاہیے کہ ایسی حرکت جو ہمیں کھلی ہوئی غلط معلوم ہوتی ہے، اس کے باوجود انہیں اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ پورا بازار ان کو دیکھ کر ہنس رہا تھا؛ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ان کا مذاق اُڑا رہا تھا؛ لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمیں اپنے طریقے کے ساتھ اسی نوع کی مضبوطی ہونی چاہیے۔ کاش! ہم سنتوں کے معاملے میں ایسے ہی ہو جائیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا سنت پر عمل

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کھانا کھا رہے تھے، لقمہ گر گیا تو اس کو اُٹھا کر صاف

کر کے کھالیا۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ ایسا کر رہے ہیں؟ یہاں تو اسے بدتمیزی سمجھی جاتی ہے۔ انہوں نے جواب دیا ﴿أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيبِي لِهٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ؟﴾ ان بےوقوفوں کے واسطے کیا مَیں نبی کریم ﷺ کا طریقہ اور سنت چھوڑ دوں؟

حقیقت تو یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جو طریقہ بتلایا ہے، ہمیں اسی کے مطابق چلنا ہے، جب ہم اس کے مطابق چلیں گے تو جیسے آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حبیب ہیں، اس طریقہ پر چلنے کے بعد ہم بھی اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جائیں گے ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ تم اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا۔ ہم اگر اللہ تعالیٰ کی محبت چاہتے ہیں تو اس کا واحد طریقہ یہی ہے۔

﴿اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں سنتوں کا اہتمام کرنے کی توفیق نصیب فرمائے﴾

وُجُوبُ الْاِنْقِیَادِلِحُکْمِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَمَایَقُوْلُہٗ مَنْ دُعِیَ اِلٰی ذٰلِکَ وَاُمِرَبِمَعْرُوْفٍ اَوْنُهِیَ عَنْ مُنْکَرٍ

﴿حکم الٰہی کی تابعداری﴾

اقتباس

جن لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کے احکام بیان کئے جائیں، نبی کریم ﷺ کے طریقے پیش کئے جائیں اور ان کے متعلق ان کے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو، یا زبان سے کوئی جملہ ایسا کہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کو ماننے کیلئے اور اس پر عمل کرنے کے لئے وہ پورے طور پر آمادہ نہیں ہے؛ اس آدمی کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے، اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان میں کمی ہے۔ شانِ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے، اس کو بے چون وچرا تسلیم کرلے۔

اور جہاں شریعت کے کسی حکم کے سلسلے میں بظاہر ہمارا دل ودماغ کوئی اشکال کھڑا کر کے یوں کہے کہ یہ حکم تو بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، فلاں کام تو نا قابلِ عمل ہے، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کیسے عمل ہوسکتا ہے؟ تو ہمیں یہ تعلیم دی جارہی ہے کہ ایسا تو بولو ہی مت۔ مؤمن کی زبان سے ایسا تو نکلنا ہی نہیں چاہیے۔ مؤمن کی زبان سے تو ہر حال میں ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہی نکلنا چاہیے۔

رجب المرجب ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم نومبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم

فَلاَ وَرَبِّکَ لا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْ مَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ.

وقال تعالٰی: اِنَّمَا کَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذَادُعُوْااِلَی اللہِ وَرَسُوْلِہٖ لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ أَن یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَاوَأَطَعْنَا وَأُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿وُجُوْبُ الْاِنْقِیَادِلِحُکْمِ اللہِ تَعَالٰی وَمَایَقُوْلُہٗ مَنْ دُعِیَ اِلٰی ذٰلِکَ وَأُمِرَبِمَعْرُوْفٍ أَوْنُھِیَ عَنْ مُنْکَرٍ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جارہا ہے اس کے لئے آدمی کا اپنے سرِ تسلیم خم کردینا اوراس کا ضروری ہونا۔ اور جس کو اللہ کے حکم کے لئے دعوت دی جائے تو اس کی طرف سے کیا جواب ہونا چاہیے۔ اور جس کو کسی بھلی بات کا حکم دیا جائے یا بری بات سے روکا جائے تو وہ جواب میں کیا کہے۔

﴿حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر دل میں تنگی محسوس نہ کرے﴾

سب سے پہلے یہاں پر بھی وہی آیت لائے جو اس سے پہلے باب میں لائے تھے ﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْ مَاشَجَرَبَیْنَھُمْ﴾ قسم ہے تمہارے پروردگار کی! یہ لوگ مؤمن نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ وہ آپ کو فیصل اور حَکَم قرار دیں ان باتوں

میں؛ جن میں آپس میں اختلاف، نزاع اور جھگڑے کی شکل پیدا ہو۔ یعنی وہ نبی کریم ﷺ کو اپنا معاملہ حوالہ کریں تا کہ آپ اس کے اندر فیصلہ فرماویں ﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ﴾ اس کے بعد جب آپ فیصلہ کردیں تو آپ کے فیصلے کے متعلق وہ اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ اور آپ کے اس فیصلے کو پورا پورا تسلیم کرلیں

اگلے باب میں یہ آیت گزر چکی ہے اور اس پر تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں، اس کے شانِ نزول کے سلسلے میں بھی جو باتیں ہیں وہ عرض کر چکا ہوں۔ یہاں تو اس لئے لائے ہیں کہ باب کا جو عنوان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس حکم کو ماننا ضروری ہے۔ اور اگر کسی آدمی کو بھلی بات کے لئے کہا جائے یا بری بات سے روکا جائے یا اللہ کے حکم کی اطاعت کے لئے اس کو دعوت دی جائے تو اس کو جواب میں کیا کہنا چاہیے؟ تو اس آیت میں ﴿وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے تمہارے آپس کے معاملات کے فیصلے کے واسطے جو بھی حکم صادر ہوا اور تمہارے اس نزاع اور جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے جو فیصلہ نبی کریم ﷺ فرمائیں، اس پر آدمی کو سرِ تسلیم خم کردینا چاہیے اور دل سے اس کو مان لینا چاہیے، اگر آدمی دل میں بھی ذرہ برابر تنگی محسوس کرے گا؛ تو وہ مؤمن نہیں ہوگا۔ یہودی اور منافق کا قصہ پہلے گذر چکا ہے کہ انھوں نے اپنا فیصلہ حضور ﷺ کے حوالے کیا تھا۔

﴿جسے شریعت کی طرف دعوت دی جائے؛ تو وہ کیا کہے؟﴾

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ ایمان والوں کو جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دی جائے تا کہ

اللہ کا رسول ان کے درمیان فیصلہ صادر کرے تو اس وقت ان کا جواب یہ ہونا چاہیے: ﴿سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ ہم نے اللہ اور اس کے رسول کی بات کو سنا اور دل سے اس کو قبول کرلیا۔

باب قائم کیا تھا: ﴿وَمَا يَقُوْلُهُ مَنْ دُعِيَ اِلٰى ذَالِكَ﴾ اللہ کی اطاعت کے لئے جس آدمی کو دعوت دی جائے اس کی طرف سے جواب کیا ہونا چاہیے؟ تو بتلاتے ہیں کہ اس کی طرف سے جواب یہ ہونا چاہیے کہ وہ آدمی دل سے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے پاک رسول کے فیصلے کو تسلیم کرلے، اپنے دل میں ذرہ برابر تنگی محسوس نہ کرے، اور زبان سے یوں کہے: ﴿سَمِعْنَا وَ أَطَعْنَا﴾ اللہ کے حکم کو اور اس کے رسول کے حکم کو ہم نے سنا اور ہم اس کے اوپر دل سے راضی ہیں، ہم نے دل سے مان لیا۔ گویا دل کی اندرونی کیفیت بھی یہ ہو کہ دل میں ذرہ برابر تنگی کا احساس نہ ہو، اپنے دل سے اس کو تسلیم کرے اور ساتھ ہی ساتھ زبان سے بھی اس کا اظہار کرنا چاہیے ﴿وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

﴿اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے﴾

اب جن لوگوں کے سامنے اللہ اور اس کے رسولِ پاک ﷺ کے احکام بیان کئے جائیں، نبی کریم ﷺ کے طریقے پیش کئے جائیں اور ان کے متعلق ان کے دل میں کوئی اعتراض پیدا ہو، یا زبان سے کوئی جملہ ایسا کہیں جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کو ماننے کے لئے اور اس پر عمل کرنے کے لئے وہ پورے طور پر آمادہ نہیں ہے؛ اس آدمی کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے، اور اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اس کے ایمان میں کمی ہے۔

﴿پہلی قوموں کی ہلاکت کے دو سبب﴾

وفيه من الاحاديث حديث أبي هريرة المذكورة في أول الباب قبله وغيره من الاحاديث فيه.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس باب کے اندر بھی بہت ساری روایتیں ہیں ان میں سب سے پہلی روایت وہ ہے جو اگلے باب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے گذر چکی ہے، اس کا حوالہ دیتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿دَعُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ اِنَّمَا أَھْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَثْرَۃُسُؤَالِھِمْ﴾ میں جب تک تم کو چھوڑے رکھوں تم بھی مجھے چھوڑے رکھو، یعنی جب تک میں اپنی طرف سے کسی چیز کے متعلق وضاحت نہ کروں اور کوئی تفصیل اپنی طرف سے بیان نہ کروں؛ وہاں تک تم بھی سوالات کر کے مجھ سے اس کی تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اس لئے کہ تم سے پہلے لوگوں کو ان کے کثرتِ سوال نے ہی ہلاک کیا۔ ان کے انبیاء کی طرف سے احکامات دئے جاتے تھے ان کے سلسلے میں وہ مختلف شقیں نکال کر بار بار سوالات کرتے تھے، جس کے نتیجے میں ان پر اور زیادہ سختیاں ہوتی تھیں ﴿وَاخْتِلَافُھُمْ عَلٰی أَنْبِیَآئِھِمْ﴾ اور ان کے انبیاء کی طرف سے جو باتیں ان کو پیش کی گئیں، ان سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ان کو ہلاکت میں پڑنا پڑا۔

﴿حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا﴾

﴿فَاِذَانَھَیْتُکُمْ عَنْ شَیْیءٍ فَاجْتَنِبُوْہُ﴾ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اگر کسی چیز سے تم کو روک دوں، تو تم اس سے باز آجاؤ ﴿وَاِذَاأَمَرْتُکُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوْا مِنْہُ مَااسْتَطَعْتُمْ﴾ اور اگر کسی بات کا حکم دوں تو جتنا تم سے ہو سکے اس پر عمل کرو۔ گویا اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس پر آدمی کو عمل کرنا چاہیے۔ جس چیز سے رکنے کے لئے کہا جائے؛ اس سے باز رہنا چاہیے۔

﴿غیر ضروری سوالات منع ہیں﴾

پہلے بتلا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ میں ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے

تم پر بیت اللہ کا حج فرض کیا ہے۔اس پر ایک صحابی نے کھڑے ہوکر سوال کیا ﴿أَفِیْ کُلِّ عَامٍ یَارَسُوْلَ اللهِ؟﴾ اللہ کے رسول! کیا ہر سال؟ آپ ﷺ نے اس کا جواب نہیں دیا۔ پھر آپ نے جب دوبارہ یہ فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تم پر بیت اللہ کا حج فرض کیا، تو پھر ان صحابی نے یہی سوال کیا۔ آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر آپ ﷺ نے تیسری مرتبہ فرمایا، اس پر ان صحابی نے تیسری مرتبہ سوال کیا، تو اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر مَیں کہہ دیتا کہ ہاں؛ تو تم پر ہر سال حج کا کرنا ضروری ہوجاتا اور تم اس کو نباہ نہ سکتے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿دَعُوْنِیْ مَاتَرَکْتُکُمْ﴾ جب تک مَیں تم کو چھوڑے رکھوں اور میری طرف سے کسی حکم کے سلسلے میں مزید تفصیلات بیان نہ کی جائیں؛ تم اس سلسلے میں مجھ سے مزید سوالات مت پوچھو، بلکہ اجمالی اور مختصر طور پر جو حکم دیا گیا اس پر اجمالی طور پر عمل کرلو، اسی میں تمہارے لئے فائدہ ہے۔ (نسائی شریف، مناسک الحج، ۲۶۱۹)

﴿شانِ عبدیت کا تقاضہ﴾

جس کو اللہ کی اطاعت کی دعوت دی جائے، کسی بھلی بات کا حکم کیا جائے، بری بات سے روکا جائے تو وہ جواب میں کیا کہے؟ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی طرف سے سوالات کھڑے نہ کرے، بلکہ جہاں کسی بات کا حکم کیا جائے فوراً اس پر عمل کے لئے تیار ہوجائے، دل سے تسلیم کرلے، زبان سے ﴿سَمِعْنَاوَ أَطَعْنَا﴾ کہہ کر اس تسلیم کا اظہار کرے اور عملی جامہ پہنانے کے اندر لگ جائے۔

﴿احکامِ شرع کی علت پوچھنا﴾

آج کل ہمارے معاشرہ میں لوگوں کا ایک مزاج بنا ہوا ہے کہ دین کی کوئی بات کہی

جاتی ہے تو اس کی علت کے متعلق سوالات کرتے ہیں۔ ارے بھائی! غلام کے لئے بس اتنی بات ہی کافی ہے کہ آقا نے حکم دیدیا۔ اگر آپ کا غلام ہو اور آپ اس کو کوئی حکم دیں اور اس کی طرف سے سوال کیا جائے کہ آپ ایسا حکم کیوں دے رہے ہیں اور اس میں کیا حکمت ہے؟ تو نوکر کی طرف سے کئے جانے والے اس سوال کو کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں؟ حالانکہ وہ تو ملازم اور نوکر ہے، تھوڑے سے وقت کے لئے کچھ رقم کے عوض اس نے اپنے آپ کو آپ کی خدمت کے لئے پیش کر رکھا ہے، اس سے زیادہ آپ کو اس کے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے، اس کے باوجود اس کی طرف سے ایسا کوئی سوال کیا جائے تو ہم اس کو برداشت نہیں کرتے۔ تو ایک بندہ اپنے رب کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس کی علتوں کے متعلق دریافت کرے اور حکمتیں پوچھے کہ اس میں کیا حکمت ہے؛ یہ کیسے برداشت کیا جائے گا؟ ایسا سوال بندگی کے خلاف ہے۔ شانِ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے، اس کو بے چون وچرا تسلیم کرلے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی فرشتوں پر برتری کا راز

مشہور تو یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کو فرشتوں کے سامنے ظاہر کیا گیا اور ان کی برتری کو ظاہر کرنے کے لئے فرشتوں سے کچھ سوالات کئے گئے کہ ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ وہ نہیں بتا سکے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو کہا تو انھوں نے بتلایا اور اس طرح ان کی برتری ظاہر ہوئی۔ لیکن حضرت علامہ انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی برتری کا اصل ظہور ان کی شانِ عبدیت سے ہوا۔ اور وہ اس طرح کہ اس وقت تین مخلوقات تھیں۔ ایک حضرت آدم، دوسرے فرشتے اور تیسرے شیطان۔ فرشتوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ نے اس کا اظہار کیا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً﴾ میں روئے زمین پر اپنا ایک نائب اور

خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔تو باری تعالیٰ کے اس ارادے کے سامنے فرشتوں نے یہ عرض کیا: ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ باری تعالیٰ! آپ زمین کے اندر ایسی مخلوق کو اپنا خلیفہ بنائیں گے جو فساد پھیلائے گی اور خون بہائے گی، حالانکہ ہم آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں آپ کی تقدیس بیان کرتے ہیں۔گویا یہ منصب تو ہمیں ملنا چاہیے۔باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو تو یوں کہہ کر خاموش کر دیا گیا: ﴿إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ مَیں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔وہ خاموش ہو گئے۔لیکن ابتداء سے ہی خاموشی نہیں رہی، شروع میں تو انھوں نے باری تعالیٰ کے سامنے اپنی بات کا اظہار کر ہی دیا۔

اور شیطان کو جب سجدہ کرنے کو کہا گیا تو فرشتوں نے حکم مان کر فوراً سجدہ کر دیا لیکن شیطان نے کہا: ﴿خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ﴾ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا گویا آگ کو مٹی کے مقابلہ میں بڑائی و سربلندی حاصل ہے، مَیں بھلا ان کو کیسے سجدہ کروں؟ اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانا تو وہ مردود ہوا۔

اور حضرت آدم علیہ السلام کا معاملہ یہ ہوا کہ جب ان کو جنت کے اندر رکھا گیا اور تاکید کی گئی کہ جنت کے اندر رہ کر کھاؤ اور پیو: ﴿وَلَا تَقْرَبَا هَٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ اس درخت کے قریب مت جائیو؛ ورنہ اپنے اوپر زیادتی کرنے والے بن جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ کو چونکہ دنیا کے اندر بھیجنا منظور تھا، لہٰذا وہ چیز پیش آ کر رہی۔شیطان نے ورغلایا اور اس درخت کے قریب پہنچ گئے اور اس کو کھا لیا۔باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی کہ ہم نے منع کیا تھا اور تم نے اس کام کا ارتکاب کیا۔حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے جواب میں

کچھ نہیں کہا۔ بلکہ روایتوں میں آتا ہے کہ اس درخت کے پھل کو کھا لینے کے بعد حضرت آدم سے اپنی توبہ کے لئے الفاظ کہنے کی بھی جرأت نہیں ہوئی، صرف روتے ہی رہے، چالیس سال تک آنسو بہا کر روتے رہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے توبہ کے کلمات القاء کئے گئے ﴿فَتَلَقّٰی آدَمُ مِن رَّبِّهٖ کَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ نے توبہ کے کلمات ان کو سکھائے کہ یوں کہو: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ﴾ اے اللہ! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اگر تو نے معاف نہیں کیا اور ہم پر رحم نہیں کیا؛ تو ہم بہت نقصان میں رہیں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کے یہ کلمات سکھائے گئے: تب حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کے کلمات بھی اپنی زبان سے ادا کئے، ورنہ کچھ نہیں بولے، کوئی جواب نہیں دیا۔ (فضائل ذکر ص ۹۶)

﴿حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مکالمہ﴾

حدیثِ پاک میں ایک قصہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جمع کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ ہی تو وہ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا اور جنت کے اندر آپ کو بسایا، اور آپ کو ایک چیز سے منع کیا تھا لیکن آپ نے وہ درخت کھالیا اور جنت سے نکالے گئے اور ہم کو مصیبت میں ڈالا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام نے جواب میں کہا: آپ ہی تو وہ موسیٰ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغامات بندوں تک پہنچانے کے لئے منتخب فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی خصوصی تربیت فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے شرفِ ہم کلامی سے آپ کو نوازا۔ اچھا! آپ کو اللہ تعالیٰ نے

توریت دی، اس کے اندر یہ لکھا ہوا نہیں ہے ﴿وَعَصٰی آدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی﴾ آدم اپنے رب کے حکم سے ہٹے۔ وہ توریت تو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ تو میری پیدائش سے بہت سالوں پہلے لوحِ محفوظ کے اندر لکھی جا چکی تھی۔ جب اس میں یہ بات لکھی جا چکی تھی تو بھلا میں کیسے نہ کرتا؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آ گئے۔

(مسلم شریف، کتاب القدر ۲۶۵۲/۱۵)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیکھو! حدیث میں یہ جو واقعہ بیان کیا گیا اس میں نبی کریم ﷺ نے یہ چیز اس لئے بیان فرمائی تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ حضرت آدم سے جو کوتاہی ہوئی اس کا کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا۔ جواب تو تھا اور ایسا کرارا جواب تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی خاموش ہو گئے، اور لاجواب ہو گئے، لیکن یہاں معاملہ بندے کا تھا۔ یعنی سوال کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے کہ آپ نے یہ کیا کیا؟ تو اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام نے بھی برابر کا جواب دیا۔ اور وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سوال کیا گیا کہ یہ کیا کیا؟ تو خاموش رہے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی شانِ عبدیت کا ایسا اظہار کیا کہ توبہ کے کلمات بھی ادا کرنے کی اس وقت تک جرأت نہ ہوئی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ بتائے اور سکھائے نہ گئے۔ جب وہ سکھائے گئے؛ تب بولے۔

﴿ہمارا ایک بڑا روگ﴾

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ جو آج کل عام مزاج بنتا جا رہا ہے کہ شریعت کے احکام جب بیان کئے جاتے ہیں تو لوگ اس کے اندر علت اور حکمت تلاش کرتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ اس کی حکمت کیا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات مناسب نہیں

ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا ہے ﴿فَلاوَرَبِّکَ لَایُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْ مَاشَجَرَبَیْنَهُمْ ثُمَّ لَایَجِدُوْافِیْ أَنْفُسِهِمْ حَرَجاًمِّمَّاقَضَیْتَ﴾ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جو حکم دیا گیا ہے اس کے سلسلے میں دل میں ذرہ برابر بھی تنگی کا احساس نہ ہو، اور دل سے آدمی اس کو تسلیم کرلے اور زبان سے اس کا اظہار بھی ﴿سَمِعْنَاوَأَطَعْنَا﴾ کہہ کر ہونا چاہیے کہ ہم نے اللہ کے حکم کو سنا اور دل سے مان لیا، جب تک یہ بات نہ ہوگی؛ وہاں تک کمالِ ایمان نصیب نہیں ہوگا۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بے چینی اور اشکال﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّانَزَلَتْ عَلیٰ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: ﴿لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوَاتِ وَمَافِی الْأَرْضِ وَإِنْ تُبْدُوْامَافِیْ أَنْفُسِكُمْ أَوْتُخْفُوْهُ یُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ﴾ اِشْتَدَّذَالِکَ عَلٰی أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَأَتَوْارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ بَرَكُوْاعَلَی الرُّكَبِ، فَقَالُوْاأَیْ رَسُوْلَ اللّٰهِ! كُلِّفْنَامِنَ الْأَعْمَالِ مَانُطِیْقُ، اَلصَّلَاةَوَالْجِهَادَوَالصِّیَامَ وَالصَّدَقَةَ، وَقَدْ أُنْزِلَتْ عَلَیْکَ هٰذِهِ الْآیَةُوَلَانُطِیْقُهَا. قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَقُوْلُوْاكَمَاقَالَ أَهْلُ الْكِتَابَیْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ سَمِعْنَاوَعَصَیْنَا؟ بَلْ قُوْلُوْا ﴿سَمِعْنَاوَأَطَعْنَا، غُفْرَانَکَ رَبَّنَاوَإِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ فَلَمَّااقْتَرَأَهَا الْقَوْمُ، وَذَلَّتْ بِهَاأَلْسِنَتُهُمْ، أَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالیٰ فِیْ أَثَرِهَا: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاأُنْزِلَ إِلَیْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُوْنَ، كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلآئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَانُفَرِّقُ بَیْنَ أَحَدٍمِّن رُّسُلِهِ، وَقَالُوْا سَمِعْنَاوَأَطَعْنَا، غُفْرَانَکَ رَبَّنَاوَإِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ فَلَمَّافَعَلُوْاذَالِکَ نَسَخَهَااللّٰهُ تَعَالیٰ؛ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عزوجل ﴿لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساًإِلَّا وُسْعَهَا، لَهَامَاكَسَبَتْ وَعَلَیْهَامَااكْتَسَبَتْ، رَبَّنَالَا تُؤَاخِذْنَاإِن نَّسِیْنَاأَوْأَخْطَأْنَا﴾ قَالَ: نَعَمْ ﴿رَبَّنَاوَلَا تَحْمِلْ عَلَیْنَاإِصْراًكَمَاحَمَلْتَهُ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِنَا﴾

قَالَ: نَعَمْ ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ قَالَ: نَعَمْ ﴿وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ﴾ قَالَ: نَعَمْ. (رواه مسلم)

جب نبی کریم ﷺ پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آسمان اور زمین اور جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین کے اندر ہے وہ سب اللہ ہی کی ملکیت ہے، اللہ ہی سب کا مالک ہے۔ اور مالک ہونے کی وجہ سے وہ جو چاہے حکم صادر کرے۔ اور تمہارے دلوں کے اندر جو چیز ہے اس کا اگر تم اظہار کرو، یا اس کو اپنے دل میں چھپائے رکھو اور زبان سے اس کو ظاہر نہ کرو؛ اللہ تعالیٰ اس کا تم سے حساب لے گا۔

﴿حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم بارگاہِ نبوی میں﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اوپر بڑی گراں گذری۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت کے ظاہری الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کے دل میں جو خیالات اور وساوس غیر اختیاری طور پر آتے ہیں، یعنی ان خیالات اور وساوس کے لانے کا آدمی خود قصد اور ارادہ نہیں کرتا؛ ان پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔ اب ظاہر ہے کہ جو چیز اپنے اختیار میں نہ ہو، اور اس پر بھی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے محاسبہ ہو، تو یہ چیز ایسی ہی ہے جو آدمی کو پریشان کرسکتی ہے۔ صحابہ کرام نے جب اس آیت کو سنا تو بے چین ہوگئے کہ اس پر ہم کیسے عمل کرسکیں گے، یہ تو ہمارے اختیار اور قابو سے باہر کی چیز ہے، اور ان حضرات کو یہ حکم بڑا بھاری معلوم ہوا۔ چنانچہ وہ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گھٹنوں کے بل، دوزانوں بیٹھے، اور بولے: اے اللہ کے رسول! ہم کو اس سے پہلے ایسے اعمال کا پابند بنایا گیا تھا جو ہمارے بس میں اور طاقت

میں تھے، اس لئے ہم نے ان کی بجا آوری میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، بلکہ برضاو رغبت ان پر عمل کرتے رہے، لیکن آج یہ آیت جو آپ پر نازل ہوئی اس کو سننے کے بعد تو ہم بے چین ہو گئے، اور اس کا ہمارے پاس کوئی حل نہیں ہے۔

ظاہری اور باطنی اعمال کی قسمیں

حالانکہ اس آیت کے اندر غور کرو کہ اگر دل کے خیالات، ارادے اور وساوس ہی مراد ہیں؛ تو وہ بھی دو قسم کے ہیں۔ جیسے آدمی کے اعضاء سے سرزد ہونے والے ظاہری اعمال بھی دو طرح کے ہوتے ہیں کہ ان میں بعض اعمال وہ ہیں جن کے سرزد ہونے میں آدمی کے ارادے اور اختیار کو دخل نہیں۔ مثلاً آپ جا رہے تھے، غیر اختیاری طور پر آپ کے کان میں گانے کی آواز پڑ گئی، آپ نے سنا نہیں، آپ تو اپنا راستہ طے کر رہے تھے اور کان میں آواز آ گئی۔ یا اچانک آنکھ اٹھی تو ایک دم غیر محرم پر پڑ گئی اور فوراً آپ نے ہٹا لی، لیکن ایک مرتبہ غیر اختیاری طور پر پڑ گئی۔ اور اسی طرح کے دوسرے کام کہ جس میں آدمی کے ارادے اور اختیار کو دخل نہ ہو؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی پکڑ اور مواخذہ نہیں ہے۔ اور یہی کام اگر کوئی آدمی ارادے اور اختیار سے کرتا، بالقصد انجام دیتا؛ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی پکڑ ہوتی اور مواخذہ ہوتا۔

اسی طرح خیالات اور وساوس جو آدمی کے دل میں آتے ہیں وہ بھی دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ کہ ان کے لانے میں آدمی کے ارادے اور قصد کو دخل نہیں، غیر اختیاری طور پر، بغیر ارادے اور قصد کے از خود آ رہے ہیں؛ ان کے اوپر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ نہیں ہوگی۔

لیکن خیالات وساوس کی دوسری قسم وہ ہے جن کو آدمی اپنے ارادے اور اختیار سے دل میں لاتا ہے یعنی خود سوچتا ہے تو جیسے اعضاء کے اندر جو اعمال تھے اور اس میں جو اختیاری اعمال تھے اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پوچھ تاچھ اور گرفت ہوتی ہے؛ ایسے ہی یہاں پر بھی خیالات اور نظریات میں آدمی کے ارادے اور اختیار کو دخل ہو، اور بالقصد و بالارادہ اس کو اپنے دل میں لاوے اور اس پر غور کرے؛ اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پوچھ تاچھ ہوگی اور مواخذہ ہوگا۔

﴿حضور ﷺ کی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو تنبیہ اور تعلیم﴾

لیکن بہر حال آیتِ کریمہ کے الفاظ عام تھے اور ظاہری الفاظ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں قسم کے خیالات اور وساوس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں پکڑ اور گرفت ہوگی اور نبی کریم ﷺ تو اگر چہ اس کا مطلب سمجھتے تھے لیکن جب تک وحی کی طرف سے اس کی تائید نہ ہو جاوے؛ آپ بھی اس سلسلے میں کچھ فرمانا نہیں چاہتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب اپنا یہ اشکال اور دشواری نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کی کہ اے اللہ کے رسول! اب تک جو اعمال کرنے کے لئے ہم کو کہا گیا، نماز، روزہ، جہاد، صدقہ؛ وہ تو ہمارے اختیار اور طاقت میں تھے، ہم کرتے رہے، اب ایک ایسی چیز کا حکم دیا گیا ہے جو ہماری طاقت سے باہر ہے، اب ہم کیا کریں؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم سے پہلے جو اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ گزرے ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جانے والے احکامات کے جواب میں یوں کہا: ﴿سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ہم نے سنا اور ہم نے انکار کیا، کیا تم بھی اس طرح جواب دینا چاہتے ہو؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم ایسا جواب مت دو، بلکہ تم تو جواب میں یوں کہو

﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ اے اللہ! ہم نے آپ کے احکام کو سنا اور دل سے مان لیا۔ پھر اللہ تعالیٰ سے سوال کرو ﴿غُفْرَانَکَ رَبَّنَا﴾ اے اللہ! ہم تجھ سے مغفرت کا سوال کرتے ہیں اور ہم ایسی چیز جو ہمارے اختیار میں نہیں، اس کے متعلق تجھ سے یہ طلب کرتے ہیں کہ تو اس پر ہمارا مواخذہ نہ فرمانا اور ہماری پکڑ مت کرنا، اور تیری ہی طرف ہمیں لوٹ کر آنا ہے۔

﴿مؤمن کا طرز یہی ہونا چاہیے﴾

گویا یہاں اس حدیث کو لانے کا مطلب یہ ہے کہ دیکھئے! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک آیت نازل ہوئی اور اس آیت کے ظاہری الفاظ سے جو مفہوم اور مطلب سمجھ میں آ رہا تھا اور اس سے جس چیز کا صحابہ کو پابند بنایا جا رہا تھا، بظاہر وہ ایک ایسی چیز تھی جو ان کے اختیار میں نہیں تھی، ان کی طاقت سے باہر کی چیز تھی، اس کے باوجود جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی اس دشواری اور بے چینی کا اظہار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس بات میں تصدیق یا تائید کرتے؛ یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب ایک بات آئی ہے تو تم ایسے مت بنو جیسے اگلی امت والے بنے تھے، بلکہ تم تو اللہ تعالیٰ کے احکام کے جواب میں یوں کہو: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ البتہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا سوال کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی بات ہوگی تو وہ خود ہی تمہارے اس مغفرت کے سوال کے جواب میں آسانی فرما دیں گے، لیکن تمہاری طرف سے تو یہی جواب ہونا چاہیے۔

بس! باب کا جو عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جب دعوت دی جائے تو مؤمن کا جواب یہی ہونا چاہیے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ جو احکام دیتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جو آدمی کے اختیار اور بس میں ہوں اور اس کی طاقت میں ہو۔ طاقت سے باہر کی چیز کا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا ہی نہیں جاتا۔ لیکن اگر کسی کو شریعت کا کوئی حکم بظاہر ایسا معلوم ہو کہ یہ تو ہماری طاقت سے باہر کا ہے؛ تب بھی دل سے اس کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ زبان سے اس کا اظہار کرنا چاہیے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو سنا اور دل سے مانا۔ البتہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس سلسلے میں آسانی کا بھی سوال کرے۔

گویا ایسے مواقع پر جہاں شریعت کے کسی حکم کے سلسلے میں بظاہر ہمارا دل ودماغ کوئی اشکال کھڑا کر کے یوں کہے کہ یہ حکم تو بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، فلاں کام تو ناقابلِ عمل ہے۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس پر کیسے عمل ہوسکتا ہے؟ یہاں یہی تعلیم دی جارہی ہے کہ ایسا تو بولو ہی مت۔ مؤمن کی زبان سے ایسا تو نکلنا ہی نہیں چاہیے۔ مؤمن کی زبان سے تو ہر حال میں ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا﴾ ہی نکلنا چاہیے۔

﴿صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی تعریف: قرآن کی زبانی﴾

چنانچہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ جواب بتلایا گیا، فوراً صحابہ نے یہی کہا: ﴿سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا، غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ، وَذَلَّتْ بِهَا أَلْسِنَتُهُمْ﴾ ان کی زبانیں اس کے سامنے منقاد اور تابع ہوگئیں یعنی انہوں نے اپنی زبانوں سے اس کا اقرار کرلیا۔ پھر اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیتیں نازل فرمائیں: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاأُنْزِلَ اِلَیْهِ مِن رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ الی آخرہ﴾ اللہ کی طرف سے رسول کی طرف جو کچھ اتارا گیا اس کو رسول نے بھی اور ایمان والوں نے بھی مان لیا اور وہ سب یعنی رسول بھی اور اہلِ ایمان بھی تمام کے تمام ایمان لے آئے اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ یہ کہتے ہوئے رسولوں پر ایمان لے آئے کہ ہم ایمان لانے کے معاملہ میں اللہ کے رسولوں

کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ ایسا نہیں کہ ایک رسول کو مانیں اور دوسرے رسول کا انکار کریں (جیسے یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو مانا لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کا انکار کیا۔ اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ اور سب کو مانا لیکن نبی کریم ﷺ کا انکار کیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے) بلکہ اس امت کے اہلِ ایمان کا حال یہ ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ پر بھی اور آپ سے پہلے کے تمام انبیاء سب پر ایمان لاتے ہیں، ایمان لانے کے معاملہ میں کسی نبی اور رسول میں فرق نہیں کرتے۔ ایمان سب پر لاتے ہیں۔ اور اللہ کے حکم کے جواب میں یوں کہنے لگے: اے اللہ! ہم نے تیرے حکم کو سن لیا اور دل سے اس پر راضی ہو گئے اے اللہ! ہم تجھ سے تیری مغفرت کا سوال کرتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ صحابہ کے اس جواب کو قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔

﴿فرمانبرداری پر آسانی کا حکم﴾

انھوں نے جب یہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے وہ اگلا حکم جس سے بظاہر کچھ ذرا سختی معلوم ہو رہی تھی اس کو ختم کر دیا اور یہ آیت نازل فرمائی ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ آدمی کو اللہ تعالیٰ کسی ایسی چیز کا پابند نہیں بناتا جو اس کی طاقت میں نہ ہو، بلکہ اتنی ہی چیز کا پابند بناتا ہے اور حکم دیتا ہے جو اس کی طاقت کے اندر ہو ﴿لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ﴾ آدمی جو اپنے ارادے اور اختیار سے کرے گا؛ اسی پر اس کو ثواب ملے گا، اور اپنے ارادے اور اختیار سے جو گناہ کرے گا اسی پر اس کو عذاب ہوگا۔ اور جو غیر اختیاری چیزیں ہیں کہ جس میں اس کے ارادے کو دخل نہیں ہے اس پر اس کی پکڑ بھی نہیں ہوگی۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو وہ جو بے چینی تھی اور اشکال پیدا ہوا تھا اور جب انھوں نے اس کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس آیت میں آسانی کر دی گئی۔

﴿ایک علمی اشکال کا حل﴾

ویسے علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں یہی مطلب تھا لیکن بظاہر اس کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ غیر اختیاری چیز پر بھی اللہ کی طرف سے پکڑ ہے، گویا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ابتلاء اور آزمائش کے لئے اور ان کے ایمان کے امتحان کے لئے اِس کے اُس مطلب کو مبہم رکھا گیا اور آگے والی آیت نے آکر اُس کو واضح کر دیا۔ اسی لئے وہ اشکال بھی نہیں ہوگا کہ نسخ کا تعلق تو احکام سے ہوا کرتا ہے اور یہ تو خبر سے تعلق رکھنے والی چیز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ایک خبر دی تھی اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خبر دی جاتی ہے وہ چیز تو باقی رہتی ہے اس میں تو بعد میں بھی کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہاں جو بات کہی گئی تھی وہ اجمالی طور پر کہی گئی تھی، آگے اس کی مزید وضاحت کر دی گئی جس سے صحابۂ کرام کی وہ بے چینی دور ہوگئی، لہٰذا یہ بات بھی نہیں رہے گی کہ نسخ کا تعلق احکام سے ہوتا ہے، اخبار سے نہیں ہوتا۔

﴿آسانی کی دعا﴾

اے ہمارے پروردگار! تو ہماری پکڑ نہ کرنا اگر ہم سے بھول ہوجائے یا ہم نے چوک کی ہو یعنی بھول چوک سے ہم سے کوئی کام ہوگیا ہو تو اس پر ہماری پکڑ مت کرنا۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: جی ہاں۔ ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا﴾ اے ہمارے رب! ہم پر وہ بوجھ یعنی ایسے سخت احکام نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں کے اوپر ڈالے تھے یعنی جن سخت احکام کا ہم سے پہلی امتوں کو پابند کیا گیا تھا ایسے سخت احکام ہم کو نہ دینا۔

اگلی امتوں میں کچھ ایسے احکام تھے جو ذرا سخت تھے، مثلاً کپڑے کو اگر نجاست لگ

جائے تو دھونے سے پاک نہیں ہوتا بلکہ اتنا کپڑا کاٹ دینا ضروری سمجھا جاتا تھا، کاٹ کر اس کو الگ کر کے پھینک دو۔ یہ نہیں کہ پانی سے دھولیا تو پاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے آسانی کر دی کہ کپڑے کو اگر ناپاکی لگ جائے تو اس ناپاکی کو پانی سے دھو کر دور کر دیا جائے تو کپڑا پاک ہو گیا۔ اگلی امت کے لوگوں کے لئے یہ حکم سخت تھا، ہمارے لئے آسانی ہے۔

ان لوگوں کے لئے ایک حکم یہ تھا کہ اگر گناہ کا صدور ہو جائے تو توبہ کا طریقہ یہی تھا کہ توبہ کے طور پر وہ اپنے آپ کو ختم کر دیں، قتل کر لیں۔ اب ہمارے لئے آسانی کر دی کہ آدمی زبان سے توبہ کر لے اور دل میں پختہ ارادہ کر لے کہ آئندہ اس کام کا ارتکاب نہیں کروں گا، اور جو کچھ ہوا اس پر ندامت کا اظہار کر دے؛ تو آدمی کی توبہ مکمل ہو جاتی ہے۔ گویا وہ احکام جو ان کے لئے سخت تھے؛ ہم پر نہ ڈال۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ اے ہمارے رب! تو ہم پر ایسے احکام کا بوجھ نہ ڈال جس کے اٹھانے کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ تو باری تعالیٰ نے فرمایا: جی ہاں۔ ﴿وَاعْفُ عَنَّا﴾ اور ہم سے ہماری کوتاہیوں کو درگذر کیجئے ﴿وَاغْفِرْ لَنَا﴾ اور ہمارے گناہوں کو معاف کیجئے ﴿وَارْحَمْنَا﴾ اور ہمارے ساتھ رحمت کا معاملہ کیجئے ﴿أَنْتَ مَوْلَانَا﴾ اے اللہ! آپ تو ہمارے آقا ہیں ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ﴾ اس لئے کافر لوگوں کے مقابلہ میں آپ ہماری مدد کیجئے۔ باری تعالیٰ نے فرمایا: جی ہاں۔

﴿اس روایت کا سبق﴾

اس حدیث کو لا کر یہ تعلیم دی گئی کہ شریعت کے کسی بھی حکم کے متعلق جب کسی مؤمن کو دعوت دی جائے تو اس کا جواب یہی ہونا چاہیے کہ اس حکم کو سن کر فوراً دل سے اس کو

مان لے۔اس کے دل میں اس کے متعلق کوئی ذرہ برابر خرخشہ اور کوئی اشکال پیدا نہ ہو اور زبان سے بھی اس کی اطاعت کا اظہار ان الفاظ میں ہونا چاہیے کہ ہم نے سنا اور اس کو مان لیا، اور ہم دل سے راضی ہوگئے۔کسی بھی بھلی بات کا حکم دیا جائے یا کسی بھی بُری بات سے روکا جائے، ہر موقعہ پر جب وہ شریعت کے حوالہ سے کہی جارہی ہے، کوئی آدمی ہم کو قرآن و حدیث کے حوالہ سے کسی بھلی بات کا حکم کررہا ہے تو ظاہر ہے کہ قرآن کے حوالہ سے کررہا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس چیز کا حکم دیا ہے۔یا قرآن کے حوالہ سے کسی بری بات سے ہم کو روک رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس چیز سے منع فرمایا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے آجانے کے بعد پھر ہماری طرف سے اس کے اندر کوئی فی نکالنی نہیں چاہیے، یا زبان سے کوئی اشکال یا اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے؛ بلکہ ہم فوراً اس کو مان لیں اور تسلیم کرلیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اطاعت شعاری

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مزاج اس سلسلے میں یہی تھا۔پہلے بھی قصہ گذر چکا ہے۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اوپر جب تہمت لگائی گئی اور بعد میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سے آیتیں نازل ہوئیں اور اس میں یہ بتلایا گیا کہ اُن پر جو تہمت لگائی گئی تھی؛ وہ جھوٹی تھی، وہ اس تہمت سے پاک ہیں۔اِس تہمت کے لگانے والوں میں حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔اِن کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن ہوتی تھیں اور حضرت مسطح رضی اللہ عنہ مہاجری بھی تھے اور غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے۔اور چونکہ وہ غریب تھے اس وجہ سے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اُن کو خرچہ دیا کرتے تھے۔گویا ان کے نفقہ اور ان کے گذارے کی

ذمہ داری حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اٹھا رکھی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائی جانے والی تہمت میں جب انھوں نے حصہ لیا تو اس میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی انصاف پسندی دیکھئے کہ جب تک حضرت عائشہ کی براءت کے سلسلے میں آیتیں نازل نہیں ہوئی تھی؛ وہاں تک انھوں نے ان کا نفقہ بند نہیں کیا۔ لیکن جب براءت کی آیتیں نازل ہوئیں تب انھوں نے نفقہ بند کردیا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہ کی پاکی کے سلسلے میں آیتیں نازل ہوگئیں تو اب بات صاف ہوگئی کہ یہ لوگ جھوٹے تھے۔ اور یہ معاملہ اس لئے نہیں کیا کہ وہ حضرت ابوبکر کی بیٹی ہیں بلکہ اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ مطہرہ ہیں، اس نسبت کی وجہ سے خرچہ بند کیا کہ اچھا! اُن کے ساتھ یہ معاملہ کیا؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ اب کبھی ان پر خرچ نہیں کروں گا، اس پر باری تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ تم میں جو لوگ فضیلت والے اور کشادگی والے ہیں یعنی صاحبِ فضیلت ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ نے مالی طور پر بھی ان کو وسعت سے مالامال کر رکھا ہے وہ اس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں کو اور غریبوں کو اور ہجرت کرنے والوں کو نہیں دیں گے ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا﴾ ان کو چاہیے کہ درگزر سے کام لیں اور معاف کردیں ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ﴾ کیا وہ لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کردے؟ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی، اُسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: ﴿بَلٰی﴾ کیوں نہیں! مَیں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میری مغفرت کرے۔ اُسی وقت ان کا وہ خرچہ جو بند کردیا تھا؛ پھر شروع

کردیا، بلکہ پچھلا جورہ گیا تھا وہ بھی دیا اور آئندہ کے لئے قسم کھائی کہ کبھی بند نہیں کروں گا۔

دیکھئے! ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے قرآن وحدیث کے دلائل سے ہماری غلطی واضح ہوجاتی ہے، اس کے باوجود بھی اس میں تاویلیں کرتے ہیں۔ یہ تاویل والی شان نہیں ہونی چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات جب پڑھتے ہیں تو اس میں یہ بات ہم کو واضح طور پر ملتی ہے کہ جب کوئی حکم آیا، پھر تو بس! اُسی حالت میں اس کو تسلیم کرلیا۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، انھوں نے اپنی بہن کا نکاح ابوالبدّاح بن عاصم نامی صحابی سے کرایا، انھوں نے ایک طلاق رجعی دی تھی، عدت کے اندر رجوع بھی کرسکتے تھے، لیکن رجوع نہیں کیا۔ عدت ختم ہوگئی، نکاح کا معاملہ ختم ہوگیا۔ اب لوگوں کی طرف سے ان کے پاس پیغام آنے لگے تو انھوں نے بھی پیغام دیا جنھوں نے طلاق دی تھی اور ان کی بہن بھی دوبارہ انھیں کے نکاح میں جانا چاہتی تھیں اور چونکہ ایک طلاق دی گئی تھی اس لئے عدت کے بعد دوبارہ نکاح بھی ہوسکتا تھا۔ حضرت معقل بن یسار کو غصہ آیا کہ مَیں نے ان کے ساتھ اکرام وتوقیر کا معاملہ کرتے ہوئے اپنی بہن ان کے نکاح میں دی تھی تو انہوں نے طلاق دے دی اور پھر رجوع کرسکتے تھے لیکن رجوع بھی نہیں کیا اور اب پھر پیغام بھیج رہے ہیں۔ لہٰذا قسم کھالی کہ مَیں اپنی بہن کا نکاح ان سے نہیں کراؤں گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا! ان کے سامنے آیت پڑھی، تو اُسی وقت انھوں نے ان صحابی کو بلایا اور اپنی بہن کا نکاح کرادیا۔ (المستدرک، ۲۶۶۸)

خلاصۂ کلام

حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ مزاج تھا کہ شریعت کا کوئی حکم جب ان کے سامنے بیان کیا جاتا تو وہ اس پر فوری عمل کرلیا کرتے تھے۔آج اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا کلام موجود ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ بھی ہمارے سامنے ہیں، جب قرآن وحدیث سے کوئی چیز ہمارے سامنے آجائے تو پھر ہمیں اپنے سابق رویہ کے اوپر ۔۔جس کا غلط ہونا قرآن وحدیث سے ہمارے سامنے واضح ہو چکا۔ اصرار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جہاں غلطی واضح ہو؛ اُسی وقت اس کو تسلیم کرلینا چاہیے۔

اللّٰہ تعالیٰ ھمیں عمل کی توفیق نصیب فرمائے

اَلنَّھُیُ عَنِ الۡبِدَعِ

وَ

مُحۡدَثَاتِ الۡأُمُوۡرِ

﴿بدعات سے ممانعت﴾

﴿اقتباس﴾

جو نئی بات ایجاد کی جائے اس کو عربی میں بدعت اور مُحدَث کہتے ہیں

لیکن شریعت کی اصطلاح میں جو بدعت کہی جاتی ہے وہ ذرا الگ ہے

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:۔

﴿مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ﴾

جو ہمارے دین میں کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو دین میں نہیں ہے یعنی جس کا مأخذ اور جس کی کوئی دلیل دین کے اندر موجود نہ ہو؛ تو وہ قابلِ رد ہے۔

ہاں! قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ثبوت ہو، یا حدیثِ پاک میں اس کا کوئی ثبوت ہو، یا صحابۂ کرام کے اجماع کے اندر اس کا کوئی ثبوت ہو، یا قیاس یعنی وہ دلیلِ عقلی جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہو، اس سے کوئی ثبوت ہو

تب تو وہ ایسی بات ہوئی جو نئی نہیں ہے، بلکہ دین کے اندر اس کی اصل اور بنیاد موجود ہے

لیکن جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت میں نہیں ملتا، یا جن کو دلائلِ شرعیہ کہا گیا ہے ان میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا

تو وہ دین کی اصطلاح میں بدعت اور نئی بات کہلاتی ہے

رجب المرجب ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم نومبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أمابعد.

فأعوذباللہ من الشيطان الرجيم بسم اللہ الرحمن الرحيم.

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَال

وقال تعالىٰ: مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتَابِ مِنْ شَىْءٍ

وقال تعالىٰ: وَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ

﴿بدعت کیا ہے؟﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے ﴿اَلنَّهْىُ عَنِ الْبِدَعِ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ﴾ ''بِدَعٌ'' یہ جمع ہے ''بِدْعَةٌ'' کی۔ اور ''مُحْدَثَاتٌ'' یہ جمع ہے ''مُحْدَثَةٌ'' کی۔ نئی بات جو ایجاد کی جائے اس کو عربی میں بدعت اور مُحدَث کہتے ہیں۔ تو عنوان ہوا ''دین کے معاملہ میں بدعتوں اور نئی چیزوں سے ممانعت کا بیان''

بدعت یہ عربی لفظ ہے اور جیسا کہ ابھی بتلایا کہ عربی زبان میں بدعت کا معنٰی نئی بات کے ہیں۔ ویسے لغت کے اعتبار سے تو ہر نئی بات کو بدعت کہہ سکتے ہیں لیکن شریعت کی اصطلاح میں جو بدعت کہی جاتی ہے وہ ذرا الگ ہے۔ جیسا کہ آگے روایت آتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ أَحْدَثَ فِىْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ﴾ جو ہمارے دین میں

کوئی ایسی بات ایجاد کرے جو دین میں نہیں ہے یعنی جس کا مأخذ اور جس کی کوئی دلیل دین کے اندر موجود نہ ہو؛ تو وہ قابلِ رد ہے۔ ہاں! قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ثبوت ہو، یا حدیث ِپاک میں اس کا کوئی ثبوت ہو، صحابۂ کرام کے اجماع کے اندر اس کا کوئی ثبوت ہو، یا قیاس یعنی وہ دلیلِ عقلی جس کی بنیاد قرآن وحدیث پر ہو اس سے کوئی ثبوت ہو؛ تب تو وہ ایسی بات ہوئی جو نئی نہیں ہے، بلکہ دین کے اندر اس کی اصل اور بنیاد موجود ہے۔ لیکن اگر آپ کوئی ایسی بات کرلیں جس کا کوئی ثبوت قرآن وسنت میں نہیں ملتا، یا جن کو دلائلِ شرعیہ کہا گیا ہے یعنی نبی کریم ﷺ کا عمل اور آپ کے خلفاءِ راشدین اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل اور ائمہ مجتہدین کے اقوال میں اس کا ثبوت نہیں ملتا؛ تو وہ دین کی اصطلاح میں بدعت اور نئی بات کہلاتی ہے۔ اور ایسی چیز سے منع کیا گیا ہے۔ چنانچہ اسی ممانعت کو بتلانے کے لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کو قائم کیا ہے اور کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔

﴿حق کے علاوہ سب گمراہی ہے﴾

پہلی آیت میں ایک ٹکڑا لائے ہیں ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ﴾ حق کے واضح ہونے کے بعد اب سوائے گمراہی کے اور کیا رہ گیا؟ یعنی نبی کریم ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ سے قرآنِ پاک نازل کیا اور اللہ کی اس کتاب کو نبی کریم ﷺ نے لوگوں تک پہنچایا اب اس میں جو چیزیں وضاحت طلب تھیں کہ اس کی کچھ تفصیل بیان کی جائے، عملی طور پر اس کا طریقہ امت کو بتلایا جائے، حضور ﷺ کا منصب ہی یہ تھا ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ قرآنِ پاک کے ذریعہ سے آپ کی طرف جو نازل کیا گیا، اللہ تعالیٰ کی جو بات پہنچائی گئی ہے، ان میں جو چیزیں وضاحت طلب ہوں، اور تفصیل کی ضرورت ہو، نبی کریم ﷺ اپنے

عملِ مبارک کے ذریعہ، اپنے ارشادِ پاک کے ذریعہ سے اس کی وضاحت فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ جو لے کر آئے اور آپ نے جو چیز امت کے سامنے پیش کی اس کے ذریعہ سے حق واضح ہوگیا، اب اس حق کے واضح ہونے کے بعد اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی چیز پیش کررہا ہے؛ تو وہ سوائے گمراہی کے اور کچھ نہیں ہے۔

﴿بدعتی زبانِ حال سے یوں کہنا چاہتا ہے......﴾

حجۃ الوداع کے موقعہ پر میدانِ عرفات میں جمعہ کے دن نبی کریم ﷺ پر یہ آیتِ کریمہ نازل کی گئی ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آج تمہارے لئے مَیں نے دین کو مکمل کردیا اور دین کی نعمت تمہارے لئے تام اور کامل کردی اور تمہارے واسطے اسلام کے دین ہونے پر مَیں راضی اور خوش ہوگیا، اس آیت نے آکر گویا یہ اعلان کردیا کہ جو کچھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ تک اور آپ کے ذریعہ سے لوگوں تک پہنچانا تھا؛ وہ سب آگیا، اور نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل اور اپنے پاک ارشادات کے ذریعہ سے اس کی وضاحت فرمادی، اب اس کے بعد اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی نئی چیز پیش کرتا ہے تو گویا وہ اپنی زبانِ حال سے یوں کہنا چاہتا ہے کہ دین مکمل نہیں ہوا، بلکہ کچھ رہ گیا تھا اب مَیں لوگوں کے سامنے پیش کررہا ہوں۔ تو جو آدمی دین کے اندر کوئی نئی چیز گھڑتا ہے وہ اپنی زبانِ حال سے دین کی تکمیل سے انکار کرتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دین کو مکمل فرمادیا، اسی کو ﴿فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا الضَّلَالُ﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَافَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ﴾ اور ہم نے کتاب یعنی لوحِ محفوظ میں کوئی چیز نہیں چھوڑی، سب چیز اس میں آگئی۔

﴿حق کی کسوٹی؛ کتاب وسنت﴾

﴿وَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ﴾ اے لوگو! اگر کسی بات میں تمہارے درمیان نزاع اور اختلاف ہو جائے کہ یہ معاملہ دین ہے یا نہیں۔ایک فریق کہتا ہے کہ یہ دین ہے اور دوسرا فریق اس کے دین ہونے سے انکار کرتا ہے تو اب ان کے اس جھگڑے کا فیصلہ کس طرح ہو؟ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ﴾ اپنے اس نزاع کو اللہ اور اس کے رسول کے سامنے پیش کر دو۔قرآن وحدیث جس کی تائید کر دے؛ وہ دین ہے۔اور قرآن وحدیث جس کی تردید کر دے؛ اس کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ کسی بھی چیز کے ثبوت کے لئے جب تک کہ قرآن وحدیث سے یا قرآن وحدیث سے ثابت شدہ دلائل سے کوئی آدمی اپنی بات واضح نہ کر دے؛ وہاں تک شرعی طور پر مستند نہیں کہیں گے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج تو اللہ کے رسول ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہیں آپ تو پردہ فرما چکے ہیں پھر کس طرح رسول کے سامنے پیش کریں؟ اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ﴿ اَیْ اَلْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ ﴾ اللہ ورسول کے سامنے پیش کرنے سے مراد قرآن وحدیث کے سامنے پیش کرنا ہے کہ اس سے ثبوت مہیا کرو۔

﴿صراطِ مستقیم کی وضاحت﴾

﴿وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْہُ﴾ اے محمد ﷺ! آپ کہہ دیجئے کہ یہ میرا سیدھا راستہ ہے تم لوگ اس کی پیروی کرو اور اس پر چلو ﴿وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ﴾ اور اِدھر اُدھر مختلف راستوں پر نہ چلو کہ وہ راستے تم کو اللہ تعالیٰ کے راستہ سے ہٹا دیں گے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک سیدھی لکیر اور خط کھینچا اور اس کے

بعد آڑی ٹیڑھی لائنیں کھینچیں اور فرمایا کہ یہ تو ہے صراطِ مستقیم اور سیدھا راستہ۔ جو اس پر چلے گا وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اور جو آڑے ٹیڑھے خط اور لکیریں تھیں ان کی طرف اشارہ فرمایا کہ یہ وہ گمراہی کی راہیں ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا ہوا ہے جو آدمی کو اس کی طرف دعوت دیتا ہے، راہِ راست سے ہٹانے اور گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ (مسند احمد، ۱/۴۶۵)

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ﴾ اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دے گا۔

﴿مختصر لفظوں میں دین کی حقیقت﴾

یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دین کی حقیقت کیا ہے؟ مختصر لفظوں میں اگر آپ سمجھنا چاہیں تو دین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی مرضی پر چلنا، اپنی مرضی کو چھوڑ دینا۔ وہ جس طرح کہیں اس طرح کرنے کا نام دین ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے سارے احکام تو اس کی صورتیں ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کیا ہے وہ بتلایا گیا ہے کہ اس طرح کرو، یہ اللہ و رسول کی مرضی ہے، اس طرح کرو گے تو گویا آپ اس کی مرضی پر چلے ہوئے کہلاؤ گے۔ اصل یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے حوالے کر دے، وہ جس طرح کہیں اس کے مطابق چلے، چاہے اپنا جی کچھ بھی چاہتا ہو۔

﴿نماز ممنوع بھی ہے﴾

دیکھو! نماز جیسی اہم عبادت کہ ایمان کے بعد عبادات میں سب سے اونچا درجہ ہے دین کی بنیاد اس کو قرار دیا گیا: ﴿اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ﴾ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے کچھ

اوقات ایسے بھی رکھے کہ جس میں نماز کو ممنوع قرار دیا گیا، جس وقت سورج طلوع ہو رہا ہو تو نماز مت پڑھو، سورج سر کے اوپر ہے اس وقت بھی نماز مت پڑھو، سورج ڈوب رہا ہو اس وقت نماز مت پڑھو۔ ان اوقات میں کوئی آدمی نماز پڑھے گا تو ثواب تو کیا ملتا؛ اُلٹا وہ گنہگار کہلائے گا، اور ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر عذاب ہو۔

اسی طرح روزانہ طلوعِ آفتاب کے بعد اشراق کی نماز پڑھی جاتی ہے لیکن عید کے روز عید کی نماز سے پہلے کوئی نفل نہیں ہے، اُس روز اشراق بھی نہیں پڑھ سکتے۔ ایک مرتبہ عید کے موقعہ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ عید گاہ تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک آدمی نماز پڑھ رہا ہے، آپ نے اس سے کہا: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نماز نہیں پڑھی، تمہیں اس نماز کے اوپر ثواب نہیں ملے گا، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب دے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ نماز جیسی اونچی چیز بھی اگر ہم اپنی مرضی سے کرنے لگیں گے؛ تو عبادت نہیں کہلائے گی، وہ بھی اُسی طرح اور اُنہیں اوقات میں اور اسی انداز سے ادا کرنا ہے جس انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے۔ اس میں ذرا سا بھی پھیر پھار (ہیرا پھیری) کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ چیز قبولیت کا مقام حاصل نہیں کرے گی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع اور آپ کی پیروی ہی بنیاد قرار دی گئی ہے۔

مسلمان متبع ہے، نہ کہ مبتدع

اصل میں ایک مسلمان کی شان یہی ہونی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کو مضبوطی سے تھام لے اور اسی کے مطابق چلے۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنائے گئے تو سب سے پہلی تقریر جو انھوں نے کی تھی اس میں فرمایا تھا: ﴿اِنِّیْ مُتَّبِعٌ لَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ﴾ (سبل الہدیٰ والرشاد) مَیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرنے والا ہوں، اپنی طرف سے کوئی

نیا طریقہ اور نیا فریضہ -جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی- ایجاد کرنے والا نہیں ہوں، جو کچھ بتلانا تھا وہ تو نبی کریم ﷺ کے ذریعہ بتلا دیا گیا، اب اس میں کوئی کمی بیشی ہونے والی نہیں ہے

﴿نماز میں آنکھیں بند کرنا﴾

دیکھئے! نماز کے آداب میں سے ہے کہ آدمی اگر قیام کی حالت میں ہو تو اس کی نگاہیں سجدے کی جگہ پر ہونی چاہئیں، رکوع میں ہو تو نگاہیں پاؤں کی پشت پر ہوں۔ نماز میں آنکھیں بند کرنے کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے، آداب کے خلاف ہے، لیکن اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ آنکھیں بند کئے بغیر اس کو خشوع وخضوع حاصل نہیں ہوتا، وساوس اور خیالات سے نجات نہیں ملتی، اپنے آپ کو وساوس اور خیالات سے نجات دلانے کے واسطے، خشوع و خضوع پیدا کرنے کے لئے اگر وہ آنکھیں بند کرے گا تو اس کو اجازت اور گنجائش ہے، لیکن طریقہ پھر بھی وہی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھ کر نماز پڑھے۔

نبی کریم ﷺ نے کوئی نماز آنکھیں بند کر کے ادا نہیں فرمائی۔ علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے زاد المعاد میں لکھا ہے: ﴿لَمْ يَكُنْ مِنْ هَدْيِهِ ﷺ تَغْمِيضُ عَيْنَيْهِ فِي الصَّلٰوةِ﴾ آپ ﷺ کا طریقہ نماز میں آنکھیں بند کرنے کا نہیں تھا۔ (زاد المعاد۔ ا/۲۸۳)

﴿ایک واقعہ﴾

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے تمام اکابر کے شیخ ہیں ان کے ملفوظات میں ایک واقعہ لکھا ہے: ایک بزرگ تھے، جب نماز ادا کیا کرتے تھے تو نماز میں خشوع وخضوع پیدا کرنے کی غرض سے آنکھیں بند کر لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی: باری تعالیٰ! مجھے معلوم ہو جائے کہ مَیں جو نماز ادا کرتا ہوں؛ اس کا تیری

بارگاہ میں کیا مقام ہے؟ قبول بھی ہے یا نہیں؟ اس کی کیا حیثیت ہے مجھے بتلادی جائے۔ تو کشف کے عالم میں ان کے اوپر ایک عورت پیش کی گئی جو بڑی حسین و جمیل تھی، اس کے سارے اعضاء بڑے متوازن تھے لیکن اندھی تھی۔ کہا گیا کہ یہ تمہاری نماز کی صورتِ مثالی ہے کہ اس کے پورے جسم میں اور اس کی پوری ساخت میں کوئی کمی نہیں ہے، سارے اعضاء بالکل سڈول اور موزوں ہیں، بس! صرف اندھی ہے۔ دریافت کیا: اندھی کیوں؟ تو جواب ملا: آپ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کا طریقہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے کا نہیں تھا۔

علماء نے لکھا ہے کہ چاہے آنکھیں کھلی رکھنے کی صورت میں وساوس اور خیالات آتے ہیں جو ہم اپنے اختیار سے تو نہیں لاتے، لیکن چونکہ ایسی نماز نبی کریم ﷺ کے طریقہ کے مطابق ہے، اس لئے اُس نماز سے اچھی ہی کہلائے گی جو آنکھیں بند کر کے پڑھی جائے؛ چاہے اس میں وساوس نہ آئیں۔

اسی کو بدعت کہتے ہیں

مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے طریقہ پر چلنے کا نام دین ہے، اپنی مرضی پر چلنے کا نام دین نہیں ہے۔ جس موقعہ پر حضور اکرم ﷺ نے جو کچھ بتلایا اس کو ہو بہ ہو کرو؛ تو وہ دین ہے۔ گویا اُس کے خلاف جو کرے گا وہ اپنی طرف سے ایک چیز ایجاد کر رہا ہے اور نئی چیز گھڑ رہا ہے؛ اسی کو بدعت کہا جاتا ہے۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی سلسلے میں روایت لاتے ہیں۔

بدعت کی تعریف (Definition) کی وضاحت

عن عائشة رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت: قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَرَدٌّ.

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے بدعت کی تعریف بیان کی ہے۔ تعریف کا مطلب وہ نہیں کہ کسی کی خوبی بیان کرنا، بلکہ بدعت کو پہچنوایا ہے کہ بدعت کیا ہے (آپ یہ نہ سمجھیں کہ مَیں بدعت کی تعریف کرر ہا ہوں) یہ ایک اصطلاحی لفظ ہے گجراتی زبان میں جس کو (વ્યાખ્યા) بولتے ہیں۔ تو اس حدیثِ پاک میں بدعت کی (વ્યાખ્યા) کی گئی ہے یعنی بدعت کیا ہے، بدعت کی وضاحت فرمائی ہے کہ جو آدمی ہمارے اس دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرے جو دین میں سے نہیں ہے؛ تو وہ چیز مردود ہے۔

بدعت کی شرعی تعریف (Definition)

معلوم ہوا کہ جو ایجاد دین سمجھ کر کی جائے حالانکہ اس کا ثبوت قرآن وحدیث میں اور خلفاءِ راشدین، صحابہ کے عمل میں موجود نہ ہو، ائمہ کے یہاں بھی اس کا ثبوت نہ ہو؛ تو ایسی چیز کو بدعت کہا جاتا ہے۔ شرعی طور پر بدعت وہی ہے۔

ویسے نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ کے بعد بہت سی نئی نئی چیزیں دنیا میں ایجاد ہوئیں، جیسے پنکھا، ٹیوب لائٹ، کرسی وغیرہ، یہ سب اس وقت کہاں تھا، اب کوئی کہے کہ مولوی صاحب! یہ بھی بدعت ہے؟ تو جواب دیا جائے گا کہ نہیں، اس لئے اس کو جب آپ اپنے گھر میں استعمال کرتے ہیں تو یہ سمجھ کر نہیں کرتے کہ کوئی عبادت انجام دے رہا ہوں اور اس کے استعمال کرنے پر مجھے ثواب ملے گا۔ یا آپ موٹر کی سواری کرتے ہیں تو کارِثواب اور دین سمجھ کر نہیں کرتے، لہٰذا بدعت تو وہ چیز کہلاتی ہے؛ جو دین سمجھ کر کی جائے۔

ایصالِ ثواب زندوں کو بھی کیا جا سکتا ہے

دیکھو! شریعت نے ایک حکم دیا ہے جو مطلق اور عام ہے، شریعت کی طرف سے اس کام کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا، بلکہ جس وقت آپ چاہیں اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اب آپ اگر اس کام کی انجام دہی کے لئے کوئی وقت مقرر کر لیں؛ تو یہ بدعت ہے۔ مثلاً ایصالِ ثواب کا معاملہ ہے۔ کسی کا انتقال ہو جائے اور آپ مرنے والے کو ثواب بخشنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے شریعت میں مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں کہ ہر نیکی کا کام جو آپ انجام دیں، اس کا جو ثواب آپ کو ملا ہے وہ کسی بھی مردے کو بخش سکتے ہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے دنیا میں آپ کوئی چیز محنت کر کے کمائیں اور جو پیسہ حاصل ہو، وہ آپ اپنے پاس جمع رکھنے کے بجائے کسی اور کو دے دیں، آپ کے کھاتے میں جمع شدہ کسی دوسرے کے کھاتے میں ٹرانسفر (Transfer) کر دیں، تو کہتے ہیں کہ بخشش کر دی۔ اسی طرح ثواب میں بھی ہے آپ نماز پڑھیں، تسبیح پڑھیں، قرآنِ پاک کی تلاوت کریں، درود شریف پڑھیں، نیکی کے کام میں پیسہ خرچ کریں، کسی غریب و مسکین کو کھانا کھلا دیں، کسی ننگے کو کپڑا پہنا دیں، یہ سارے نیکی کے کام ہیں، ہر نیکی کے کام پر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملے گا، اب آپ کو ملا ہوا یہ ثواب آپ کسی کو بھی بخش سکتے ہیں۔ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس کیلئے مردے کی بھی قید نہیں ہے، زندہ لوگوں کو بھی بخش سکتے ہیں یعنی یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں نے میرا ثواب فلاں کو دے دیا۔ اسی لئے کتابوں میں مردے کی کوئی قید موجود نہیں ہے۔

جیسے کوئی شخص بیمار ہو جائے اور اس کے اوپر حج فرض ہو لیکن حج کے لئے نہیں جا سکتا ہے، اور اپنی زندگی ہی میں وہ کسی دوسرے کو بھیج دے؛ تو بھیج سکتا ہے۔ اور اس حج کا ثواب بھیجنے والے کو ملتا ہے جو زندہ ہے۔ تو آخر یہ کیا ہے؟

ایصالِ ثواب کا آسان مطلب

بہر حال! ایصالِ ثواب کا حاصل یہ ہے کہ کسی بھی نیکی کے کام کے انجام دینے کی صورت میں جو ثواب ہمیں ملا؛ ہم اپنا وہ ثواب دوسرے کو دے رہے ہیں، بخش رہے ہیں، دوسرے کے نام ٹرانسفر (Transfer) کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ جو ثواب ہمیں ملا؛ وہ فلاں کو بخش دیجئے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس کو بھی ملے گا اور ہم بھی محروم نہیں رہیں گے۔ دنیا کی چیز کا حال تو یہ ہے کہ دوسرے کو دیں گے تو وہ اسی کے پاس چلی جائے گی، لیکن ایصالِ ثواب کے اندر پڑھنے والا بھی محروم نہیں رہتا۔

ایصالِ ثواب کی اجازت ہے

خیر! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت نے ہمیں اس کی اجازت دی کہ مرنے والے کو آپ دعائے مغفرت کر کے یا کچھ نیکی کا کام کر کے ثواب پہنچا سکتے ہیں، اس کے لئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ، کوئی خاص وقت، کوئی ہیئت اور کوئی خاص پوزیشن مقرر نہیں کی کسی بھی طریقہ سے پہنچا سکتے ہیں۔ کھانا کھلا کر بھی ثواب پہنچا سکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی آدمی یہ طے کر لے کہ مرنے والے کی موت کے تیسرے دن ہی کھانا پکائیں گے اور غریبوں کو کھلائیں گے اور وہی ثواب پہنچائیں گے۔ تو گویا شریعت نے ایک چیز ہمارے لئے (Open) رکھی تھی اور ہم نے اس کو تیسرے دن کے ساتھ مقید کر دیا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ کھلانے کا کام اپنی جگہ پر نیکی کا ہے، لیکن آپ نے اس کے اندر اتنا جو اضافہ کر دیا کہ وہ تیسرے دن ہی ہونا چاہیے، یہ تیسرے دن والی بات آپ نے جو پیش کی، اس کے لئے آپ کے پاس کیا ثبوت ہے؟ قرآنِ کریم میں کہیں ہے؟ حدیثِ پاک میں ہے؟ صحابہ کے

عمل سے یہ بات ثابت ہے؟ ائمہٴ مجتہدین نے آپ کو بتلایا ہے؟ اگر ہے تو اس کا ثبوت پیش کیجئے، مان لیا جائے گا۔ اور اگر کوئی ثبوت نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی طرف سے ایک چیز بڑھا دی۔ لہٰذا اگر یہی کھانا دوسرے روز کھلایا جائے، یا چوتھے روز کھلایا جائے؛ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں ثواب نہیں ہے۔

جہاں شریعت نے ہی قید لگائی

یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے عید کے روز شریعت نے دو رکعات پڑھنے کا ہمیں حکم دیا ہے۔ تو دیکھو! عید کی نماز وہ نماز ہے کہ آپ کو عید کے روز ہی پڑھنی ہے، اس کے علاوہ آپ نہیں پڑھ سکتے۔ شریعت نے اس کے لئے ایک خاص دن مقرر کیا ہے، اسی دن میں پڑھی جائے گی، اور پڑھنا ضروری ہے، اور اسی دن میں پڑھیں گے تو وہ ثواب ملے گا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ با قاعدہ حدیث میں موجود ہے، کتابوں میں صحابہ اور ائمہ کے عمل کے اندر موجود ہے۔

جمعہ کی نماز خاص جمعہ کے روز ہی پڑھی جاتی ہے۔ آپ جمعہ کے علاوہ کسی اور دن میں اس کو ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ کیوں؟ اس لئے کہ ان مواقع پر یہ قیدیں حدیثِ پاک میں آئی ہیں۔ اس طرح کی کوئی قید ہے تو سر آنکھوں پر۔ اور اگر کوئی قید نہیں ہے؛ تو پھر قبول نہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیز، جو عمل اور جو بات آپ پیش کر رہے ہیں اس میں ذرہ برابر بھی اپنی طرف سے ہونا نہیں چاہیے۔ ہاں! یہ ضروری سمجھے بغیر (کہ اگر نہیں کروں گا تو کوئی گناہ ہوگا) کوئی آدمی ویسے ہی اپنے طور پر اپنی مرضی سے کسی روز کھانا پکا لے اور غریبوں کو کھلا دے؛ تو کوئی حرج نہیں ہے۔

اور عام طور پر تو ہم یوں سمجھتے ہیں کہ نیکی حاصل کرنے کے لئے غرباء کو کھلاؤ اور یہاں تو معاملہ برعکس یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ حیثیت لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے۔

﴿میت کے گھر والوں کے لئے کھانا بھیجنا﴾

غزوۂ موتہ جو ۸ھ میں پیش آیا تھا، اس میں کئی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے؛ وہ بھی شہید ہوئے تھے، ان کی شہادت کی جب اطلاع آئی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿اِصْنَعُوْا لِأَهْلِ جَعْفَرَ طَعَاماً﴾ (ترمذی شریف۔کتاب الجنائز۔۹۹۸) جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا بنا کر بھیج دو، اس لئے کہ ان کے لئے ایک مشغول کردینے والی چیز پیش آئی ہے یعنی ان کی موت کی خبر آئی ہے۔ اور موت کی خبر کی وجہ سے وقتی طور پر آدمی حواس باختہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے کھانا کہاں سے بنائے اس کی سوجھ بوجھ بھی رہتی نہیں ہے۔ اسی لئے شریعت کا حکم یہ ہے کہ جس کے یہاں میت ہو گئی ہو؛ اس دن اس کے یہاں رشتہ دار، پڑوسی وغیرہ میں سے کوئی آدمی کھانا بھیج دے کہ اس کی وجہ سے اُن بیچاروں کو کھانا پکانے کی مہلت نہیں ملتی۔

﴿اُلٹی چال﴾

شریعت کا حکم تو وہ ہے جو اوپر گذرا، اور آج کل ہمارے یہاں معاشرے میں اس کے برعکس کیا جاتا ہے کہ جس کے یہاں میت ہو وہ میت کے کفن دفن کا انتظام کرے یا نہ کرے؛ دیگ ضرور چڑھائے، اور سب کو کھانا کھلائے۔

پھر یہ ہے کہ اس کے واسطے جو رقمیں خرچ کی جاتی ہیں وہ مرنے والے کے مال میں سے خرچ کی جاتی ہیں اور اس کے وارثوں کی اجازت نہیں لی جاتی۔ بعض مرتبہ وارثوں میں

نابالغ بچے بھی ہوتے ہیں تو اس کے متعلق علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ نابالغ بچہ اگر اجازت دے تب بھی اس کی اجازت معتبر نہیں ہے، اور اس کا دیا ہوا ہدیہ لینا بھی جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس کو اپنے مال میں اس طرح کا تصرف کرنے کا حق ہی نہیں ہے کہ اپنی ملکیت میں سے کوئی چیز نکالے۔ ہاں! اگر کوئی اس کو کچھ دے تو اس کو قبول کر سکتا ہے لیکن وہ کسی کو کچھ دے نہیں سکتا۔ تو کبھی وارثوں میں نابالغ بچے ہوتے ہیں۔ اسی طرح میت کے دوسرے حقوق بھی ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی بہت سی چیزیں گھڑ لی گئی ہیں؛ جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

﴿تیجہ، چالیسہ، برسی وغیرہ﴾

یہاں دیکھئے! ایصالِ ثواب کی اصل تو موجود ہے لیکن یہ کھانا جو موت کے دن کھلایا جاتا ہے؛ اس کی تو کوئی اصل ہی نہیں ہے۔ اور ایصالِ ثواب کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ آپ میت کی طرف سے فقیروں کو کھلائیں لیکن اس کیلئے کوئی دن مقرر کر دیں کہ تیسرا دن، دسواں دن چالیسواں دن یا برسی وغیرہ؛ وقت کی جو تعیین کر دی گئی ہے، یہ بغیر دلیل کے ہے۔ لہٰذا اس تعیین کے بغیر آپ کسی بھی دن کھلایئے، اور اس کے لئے کوئی ڈھنڈھورا (اعلان عام) پیٹنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جتنا اخفاء کے ساتھ یہ عمل کیا جائے گا؛ اتنا ہی اخلاص بھی زیادہ ہوگا، اور اس میں ثواب بھی زیادہ ملے گا اور جس کو ثواب پہنچایا جا رہا ہے اس کو فائدہ بھی زیادہ ہوگا۔

﴿پیسے دے کر قرآن خوانی کروانا﴾

بعض جگہ پر پیسے دے کر قرآن خوانی کرائی جاتی ہے۔ پیسے دے کر جو قرآن پڑھایا جاتا ہے، اس کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جو آدمی پیسہ لے کر قرآن پڑھتا ہے، خود اس پڑھنے والے کو ہی اس کا ثواب نہیں ملتا۔ اس لئے کہ قرآن کریم کا پڑھنا

عبادت ہے، اور عبادت اگر اللہ کے واسطے کی جائے؛ تب ہی اس پر ثواب ملتا ہے۔

اگر کوئی شخص یوں کہے کہ مجھے پانچ روپیہ دو، مَیں دو رکعات نماز پڑھتا ہوں، تو اندازہ لگائیے کہ جب آپ کے پانچ روپے کے لئے وہ دو رکعات نماز پڑھے گا تو اس کو اس پر ثواب ملے گا؟ اسی طرح جو آدمی پیسے لے کر قرآن پڑھے گا تو اس پڑھنے پر اس کو ثواب نہیں ملے گا۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب پڑھنے والے کو خود ثواب نہیں ملا تو وہ بخشے گا کیا؟ گجراتی میں کہاوت ہے: (કુવાં માં હોય તો હવાડા માં આવે) یعنی کنویں میں پانی ہو گا تو حوض میں آئے گا۔ جب پڑھنے والے کو خود ہی کوئی ثواب ملا نہیں؛ تو وہ آخر میت کو کیا بخشے گا؟ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر اس میت کے وارثوں کو معلوم ہو جائے کہ ہم اتنی بڑی رقم خرچ کر کے اس کو دے رہے ہیں لیکن اس کو خود ہی ثواب نہیں مل رہا ہے؛ تو ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔ لیکن لوگ ایسے ہیں کہ جاننے والے جب ان کو بتلاتے ہیں تب بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں؛ تو اب کیا کیا جائے؟ خود ہی اپنا نقصان کر رہے ہیں۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ خود کو جو کچھ بھی آتا ہے، سبحان اللہ، الحمد للہ وغیرہ اخلاص کے ساتھ پڑھ کر ثواب پہنچا دیں، تو وہ بھی پہنچ جائے گا۔

﴿بدعت اور رسم میں فرق﴾

ایک چیز مَیں یہ بھی عرض کرنا چاہتا تھا کہ ایک تو ہے بدعت اور ایک ہے رسم۔ رسم کی بھی کوئی اصل اور دلیل قرآن وحدیث میں موجود نہیں ہوتی، لیکن اس کو کرنے والا جب کرتا ہے تو ثواب کا کام سمجھ کر نہیں کرتا۔

اور بدعت کی بھی کوئی دلیل قرآن وحدیث میں اور شریعت میں موجود نہیں ہوتی، لیکن کرنے والا اس کو ثواب اور دین کا کام سمجھ کر کرتا ہے۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ شادی کے موقعہ پر عام طور سے جو کیا جاتا ہے جیسے سہرا پہن لیا یا اور جو کچھ بھی ہوتا ہے، تو اس میں کرنے والا بھی سمجھتا ہے کہ مَیں کوئی عبادت انجام نہیں دے رہا ہوں اور وہ دین سمجھ کر نہیں کرتا۔ اگر اس کا ثبوت قرآن وحدیث اور شریعت میں نہیں ہے؛ تو یہ رسم ہے اور یہ بھی غلط ہی ہے۔ اور اگر ثبوت ہے پھر کرتا ہے، مثلاً ولیمہ، تو یہ سنت ہے، رسم نہیں۔ لیکن جس کا ثبوت نہ ہو اور آپ کریں تو وہ رسم ضرور کہلائے گی لیکن وہ بدعت اس لئے نہیں ہے کہ اس کو دین سمجھ کر نہیں کیا جاتا۔ ہاں! اگر اس میں بھی کوئی چیز ایسی ہے کہ جس کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے؛ تو پھر وہ بدعت کہلائے گی۔

اور غمی کے موقعہ پر عام طور سے جو کیا جاتا ہے، وہ دین اور ثواب سمجھ کر کیا جاتا ہے؛ اس لئے اس کو بدعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دونوں چیزیں بغیر اصل اور دلیل کی ہیں۔ قرآن و حدیث میں اس کی کوئی دلیل نہیں ہے، لیکن کرنے والا پہلی چیز کو ایک رسم ورواج اور لوگوں کی وجہ سے کرتا ہے، اور دوسری چیز کو ثواب سمجھ کر کرتا ہے۔ تو اول رسم ہے اور ثانی بدعت ہے۔ دونوں گناہ ہیں۔ اور بدعت کا گناہ رسم سے بڑھ کر ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے بیان کی ایک جھلک

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا خَطَبَ اِحْمَرَّتْ عَيْنَاهُ وَعَلَا صَوْتُهٗ وَاشْتَدَّ غَضَبُهٗ حَتّٰى كَاَنَّهٗ مُنْذِرُ جَيْشٍ، يَقُوْلُ: صَبَّحَكُمْ اَوْ مَسَّاكُمْ وَيَقُوْلُ: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ، وَيَقْرُنُ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ؛ اَلسَّبَابَةُ وَالْوُسْطٰى. وَيَقُوْلُ: اَمَّا بَعْدُ فَاِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللهِ

وَخَیرَ الْھَدْیِ ھَدْیُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُھَا وَکُلَّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃ. ثُمَّ یَقُوْلُ: اَنَا اَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِہٖ، مَنْ تَرَکَ مَالاً فَلِأَھْلِہٖ، وَمَنْ تَرَکَ دَیْنًا اَوْضِیَاعًا فَاِلَیَّ وَعَلَیَّ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب خطبہ دیتے تھے اور تقریر فرماتے تھے تو آپ ﷺ کی مبارک آنکھیں سرخ ہوجاتی تھیں اور آواز بلند ہوجاتی تھی اور آپ کا جوش بڑھ جاتا تھا۔ یہ اس لئے کہ سننے والوں کو بھی کلام کی اہمیت معلوم ہو، جیسا موقعہ ہوتا ہے اس کے مطابق آواز اور انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ لوگوں کو کوئی آنے والے لشکر سے ڈرا رہے ہیں، گویا یوں کہنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! دشمن کا ایک لشکر آرہا ہے، ہوسکتا ہے کہ صبح کے وقت آکر آپ کو پکڑ لے اور حملہ آور ہوجائے یا شام کے وقت آکر حملہ آور ہوجائے، یعنی اس کے آنے کا وقت بالکل قریب ہے۔

یہ اہلِ عرب کا خاص انداز تھا، اس لئے کہ عرب میں آپس میں قبائلی چپقلشیں رہتی تھیں، ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی، لوٹ مار، حملہ کرنا چلتا رہتا تھا، کہیں اچانک پہنچ گئے اور اس کا مال لوٹ لیا، اس کے بیوی بچوں کو باندی اور غلام بنالیا۔ ہر وقت وہ ایک دوسرے سے خوف محسوس کرتے تھے اور ڈرے سہمے رہتے تھے کہ معلوم نہیں! کون کس پر کب حملہ آور ہوجائے اور جانی مالی نقصان پہنچادے۔ اس لئے اگر کوئی آکر ان کو اطلاع کردیتا کہ فلاں قبیلہ حملہ آور ہونے والا ہے تو وہ اس کا بڑا احسان مانتے تھے کہ تم نے ہم کو خطرے کے وقت سے پہلے ہی مطلع کردیا۔

تو گویا نبی کریم ﷺ بھی اپنے لوگوں کو آگاہ کررہے ہیں کہ قیامت آنے والی ہے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے، حساب وکتاب دینا ہے، اگر اعمال ٹھیک نہیں

ہیں تو جہنم میں جانا ہے، اسی کو ﴿کَاَنَّہٗ مُنْذِ رُجَیْشٍ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چنانچہ نبی کریم ﷺ کو جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کے ذریعہ حکم دیا گیا کہ آپ لوگوں کو ہماری دعوت پہنچائیں تو سب سے پہلی مرتبہ لوگوں کو آپ نے جمع کیا، آپ کوہِ صفا پر چڑھے اور قبیلوں کے نام لے لے کر بلایا، چونکہ آپ پہاڑی پر کھڑے تھے لوگ آپ کے سامنے تھے اور پہاڑی کا پچھلا حصہ آپ کی نگاہوں کے سامنے تھا لیکن لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں تھا، لہٰذا لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: اے لوگو بتلاؤ! مَیں اگر تمہیں یوں کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے ایک لشکر چھپا ہوا ہے اور وہ تم پر صبح یا شام کو حملہ آور ہونے والا ہے تو تم میری بات مانو گے؟ لوگوں نے عرض کیا: آج تک ہم نے آپ کو جھوٹا نہیں پایا، آپ تو صادق الامین ہیں، آپ کہیں گے تو ہم مانیں گے۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب آنے والا ہے اس سے مَیں تم کو ڈرا رہا ہوں۔

﴿حضورِ اکرم ﷺ کی بعثت: قیامت کی علامت﴾

پھر آپ نے فرمایا: مَیں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں، آپ نے اپنی شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی کو یوں (اشارہ) کر کے فرمایا کہ اتنے قریب بھیجے گئے، یا یہ ہے کہ دونوں میں جتنا فرق ہے؛ میرے بعد قیامت کے آنے میں اتنا ہی فاصلہ ہے۔

اب کوئی کہے کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کو تو چودہ سو سال ہو گئے، فاصلہ ایسا کتنا بڑا ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا؟

تو دیکھو! بات دراصل یہ ہے کہ دونوں کا فرق اس کی باقی مقدار کے معلوم ہونے پر

موقوف ہے۔دنیا جب سے پیدا ہوئی تب سے لے کر آج تک دنیا کی عمر کتنی ہوئی؛ وہ اگر معلوم ہوجائے تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اب آپ ﷺ کی تشریف آوری اور قیامت کے قائم ہونے کے بیچ فاصلہ کتنا ہے؟ اور دنیا کی عمر ہی ہمیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنے ہزاروں سال ہے، تو جتنی وہ ہوگی اسی مناسبت سے نبی کریم ﷺ کے دنیا میں تشریف لانے اور قیامت کے قائم ہونے میں فاصلہ سمجھا جائے گا۔ اسی لئے اگلے انبیاءِ کرام اپنی امتوں کو جب قیامت سے ڈراتے تھے اور قیامت کی نشانیاں بتلاتے تھے تو اس میں ایک نشانی نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری بھی بتاتے تھے کہ نبی آخرالزماں آنے والے ہیں، اس کے بعد قیامت آئے گی اس سے پہلے نہیں آئے گی۔ جیسے آپ ﷺ نے قیامت کی علامتوں میں ایک بات یہ بتائی ہے

ایک اور بات یاد رہے کہ قیامت کی جتنی بھی علامتیں بتلائی گئی ہیں وہ سب کے سب بُری ہی ہوں؛ یہ ضروری نہیں ہے۔ اچھی چیزیں بھی قیامت کی علامتوں میں سے ہیں جیسے حضرت مہدی علیہ السلام کا ظہور، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول، اور بھی بہت ساری چیزیں ہیں لہٰذا یہ غلط فہمی نہ ہو۔

حضور ﷺ نے جہاں قیامت کی علامتیں بتلائی ہیں اُن میں سے ایک علامت یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے۔ تو ایسے ہی اگلے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام حضور ﷺ کی تشریف آوری کو علامتِ قیامت کے طور پر بیان فرماتے تھے۔ گویا یہ پہلی علامت ہے جو دنیا میں ظاہر ہوئی، اسی لئے آپ ﷺ نے فرمایا: ﴿بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ﴾ مَیں دنیا میں نبی بنا کر بھیجا گیا اور قیامت بھی ساتھ ہی ہے۔ یہ دونوں اتنی قریب قریب ہیں کہ بس! اب میرے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے، مَیں آخری نبی ہوں، اب تو آگے قیامت ہی آنے

والی ہے ﴿وَيَقْرُنُ بَيْنَ اِصْبَعَيْهِ﴾ اور اپنی دونوں انگلیوں (انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی) کو ملاتے تھے۔

﴿بہترین طرزِ زندگی﴾

پھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہترین بات اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور بہترین طرزِ زندگی نبی کریم ﷺ کا بتلایا ہوا طرزِ زندگی ہے۔

دنیا میں زندگی گزارنے کے جتنے بھی طریقے رائج ہیں ان تمام طریقوں میں زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ اگر کوئی ہے تو وہ نبی کریم ﷺ والا طریقہ ہے۔ کوئی آدمی اگر یہ چاہتا ہو کہ وہ بہترین طریقہ سے زندگی گزارے تو حضور اکرم ﷺ والے طریقہ کو اختیار کرے بس! اس سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹ نہیں سکتا۔ دنیا میں آج بہت سارے طریقے رائج ہیں اور نئے نئے طریقے رائج ہوتے جارہے ہیں، لیکن بہترین طریقہ حضور ﷺ کا ہی ہے۔

اور دیکھئے! یہاں حضور اکرم ﷺ اپنے طریقہ کو بہترین طریقہ بتلارہے ہیں اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو پابند کیا گیا تھا کہ آپ لوگوں کو کہیں کہ مَیں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی گذارنے کا جو بہترین طریقہ ہے؛ وہ لوگوں کو بتلاؤں اور لوگوں تک پہنچاؤں۔

﴿بدترین گناہ بدعت کیوں؟﴾

﴿وَشَرَّ الْاُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا﴾ اور سب سے بری اور بدترین چیز وہ باتیں ہیں جو نئی ایجاد کی جائیں اور ہر وہ بات جو نئی ایجاد کی جائے؛ وہ گمراہی ہے، گویا بدعت کو نبی کریم ﷺ بدترین چیز فرمارہے ہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو یہاں اسی لئے لائے ہیں۔

اور بدعت کو تمام گناہوں میں بدترین چیز کیوں کہا گیا؟ چاہے زنا کاری ہو یا شراب نوشی ہو، اور جتنے بھی گناہ ہیں ان میں سب سے بدتر گناہ بدعت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ ہیں ان کا معاملہ تو ایسا ہے کہ جب کوئی آدمی ان گناہوں میں سے کسی کا ارتکاب کرتا ہے تو خود بھی یہ سمجھتا ہے کہ مَیں جو کچھ کررہا ہوں وہ گناہ کا کام ہے۔

ایک آدمی شراب پیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مَیں شراب پی رہا ہوں؛ یہ گناہ کا کام ہے ایک آدمی چوری کررہا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ مَیں چوری کررہا ہوں؛ یہ گناہ کا کام ہے۔ زنا کرنے والا سمجھتا ہے کہ مَیں زنا کررہا ہوں؛ یہ گناہ کا کام ہے۔ کرنے والا جب یہ سمجھ رہا ہے؛ تو کسی نہ کسی روز اس کو یہ توفیق بھی ہوجائے گی کہ اس کو اپنی ان حرکتوں پر ندامت ہوگی، اور جب وہ توبہ کرے گا اور اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے گا؛ تو معاف ہوجائے گا۔

لیکن ایک آدمی ایسا ہے کہ گناہ کررہا ہے اور یوں سمجھ رہا ہے کہ مَیں جو کررہا ہوں وہ گناہ نہیں ہے؛ بلکہ ثواب کا کام ہے۔ جب وہ اپنے اس عمل کو گناہ ہی نہیں سمجھتا تو آگے توبہ کرنے اور معافی مانگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بدعت کی نحوست یہی ہے کہ جو آدمی بدعت کرتا ہے وہ دین سمجھ کر کرتا ہے، اس لئے اس کو بدترین گناہ کہا گیا ہے۔ دونوں میں یہی فرق ہے۔ اسی لئے دوسرے گناہوں میں توبہ کی توفیق ہوتی ہے اور بدعت میں توبہ کی توفیق نہیں ہوتی، اِلاّ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے ہدایت مقدر ہو تو پھر توفیق ہوجاتی ہے۔

شیطان کو بدعت کی کیوں سوجھی؟

شیطان نے بدعت اسی لئے تو رائج کی ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شیطان نے انسانوں سے گناہ کے کام کرائے، اور اللہ تعالیٰ نے توبہ بھی رکھی ہے، انسانوں نے گناہ

کے کام کر کے توبہ کر لی، تو اس کی ساری محنت کے اوپر پانی پھر گیا۔ اب وہ رونے بیٹھ گیا کہ یہ کیا ہوا؟ مَیں دن بھر محنت کر کے ان کو گناہ میں مبتلا کروں، یہ دن بھر گناہ کرنے کے بعد رات کو سونے سے پہلے توبہ کر کے اپنے کو پاک صاف کر کے سو جاتے ہیں۔ لہٰذا میری تو ساری محنت کے اوپر پانی پھیر دیا، میرا تو ستیاناس ہو گیا۔ لہٰذا اس نے سوچا کہ کوئی ایسا طریقہ ہونا چاہیے کہ جس سے یہ توبہ ہی نہ کریں۔ پھر اس نے بدعت ایجاد کروائی تا کہ جب اس کو گناہ ہی نہیں سمجھیں گے، بلکہ دین سمجھ کر کریں گے؛ تو کبھی توبہ نہیں کریں گے (الترغیب والترہیب، ۸۹) اسی لئے بدترین چیز بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

نبی کریم ﷺ کو اہلِ ایمان سے کتنا تعلق ہے؟

پھر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿اَنَا اَوْلٰی بِکُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِہٖ﴾ مَیں ہر مؤمن کی جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہوں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ مَیں ہر مؤمن کے حق میں اس کی خیر خواہی اور بھلائی اس کی ذات سے بھی زیادہ سوچتا ہوں۔ ہم اپنی بھلائی اپنے حق میں اتنی نہیں سوچ سکتے جتنی نبی کریم ﷺ نے ہمارے حق میں سوچی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک نادان بچہ ہو جو اپنی بھلائی اپنے حق میں اتنی نہیں سوچتا جتنی اس کے ماں باپ اس کے حق میں سوچتے ہیں، وہ نادان تو آگ کو بھی چمکتی چیز سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے، ماں باپ جلدی سے ہاتھ مار کر اس کو وہاں سے دور ہٹاتے ہیں، اور وہ یوں سمجھتا ہے کہ یہ میرا نقصان کر رہے ہیں، میری بدخواہی کر رہے ہیں، حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ بدخواہی نہیں بلکہ عین خیر خواہی کر رہے ہیں، اگر اس کو اس طرح نہ ہٹایا جائے گا تو یہ آگ اس کے لئے ہلاکت کا ذریعہ بن جائے گی۔ تو نبی کریم ﷺ بھی ہر مؤمن کی جتنی خیر خواہی کرتے ہیں؛ وہ

مؤمن خود بھی اپنی نہیں کرتا۔اس لئے آدمی کو چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ کی باتوں ہی کو اپنے لئے رہنما اور مشعلِ راہ بنائے۔

﴿امت پر آپ ﷺ کی شفقت کا ایک نمونہ﴾

پھر آگے فرماتے ہیں کہ دیکھو! مَیں جو تمہاری خیر خواہی کرتا ہوں اس کے بدلے میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، بلکہ ﴿مَنْ تَرَکَ مَالاً فَلِأَهْلِهِ﴾ کسی کا اگر انتقال ہو جائے اور مال چھوڑ کر کے مرے، تو اس کا مال اس کے وارثوں کا ہے ﴿وَمَنْ تَرَکَ دَيْنًا اَوْ ضِيَاعًا فَاِلَيَّ وَعَلَيَّ﴾ اور اگر کسی کا انتقال ہو جائے اور اس نے کوئی قرضہ چھوڑا، یا چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے کہ اگر ان کی خبر نہ لی گئی تو وہ ضائع برباد اور ہلاک ہو جائیں گے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا دَین میرے اوپر ہے اور ان بچوں کو میرے پاس لاؤ؛ مَیں ان کو سنبھالوں گا۔گویا آپ ﷺ دین ہی کی نہیں؛ دنیا کی بھی خیر خواہی سوچتے ہیں۔

﴿مقروض کی نمازِ جنازہ﴾

چنانچہ ابتداءِ اسلام میں جب کہ ابھی فتوحات کی وجہ سے مالِ غنیمت کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا تو آپ ﷺ کا معمولِ مبارک یہی تھا کہ اگر کوئی میت لائی جاتی تو آپ سوال فرماتے تھے کہ اس پر کسی کا کوئی قرضہ ہے؟ اگر لوگ کہتے کہ ہاں! ہے، تو آپ ﷺ سوال فرماتے کہ اس نے قرضہ کو ادا کرنے کے لئے کچھ رقم چھوڑی ہے؟ اگر لوگ کہتے کہ ہاں! چھوڑی ہے تب تو آپ نمازِ جنازہ ادا فرماتے تھے۔اور اگر کہا جاتا کہ نہیں چھوڑی ہے، تو حضور صحابہ کو فرما دیتے تھے کہ تم اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔جس آدمی نے قرضہ چھوڑا ہو، اور قرضہ کی ادائیگی کے لئے رقم نہیں چھوڑی یا کوئی سامان زمین وغیرہ نہیں چھوڑی تو حضور ﷺ

اس کی نمازِ جنازہ اس وقت نہیں پڑھتے۔ صحابہ میں سے کسی کو خیال ہوتا کہ یہ بے چارہ حضور کی دعا سے محروم جا رہا ہے؛ تو وہ ذمہ داری لے لیتا کہ یارسول اللہ! مَیں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں؛ تو پھر آپ نمازِ جنازہ پڑھاتے۔ یہ تو شروع میں تھا۔

بعد میں جب فتوحات ہوئیں تو پھر اس کے دَین کی ذمہ داری خود حضور ﷺ لیتے تھے کہ اس نے دَین چھوڑا ہے؟ کہا جاتا کہ ہاں! چھوڑا ہے۔ مال ہے؟ ہاں! ہے، تب تو ٹھیک ہے، اس کے مال میں سے ادا کر دو۔ اور اگر دَین نہیں ہے تو مال ورثاء کو دے دو۔ اور اگر دَین چھوڑا ہے اور مال نہیں ہے تو حضور ﷺ فرماتے: لاؤ! مَیں اسے ادا کروں گا۔ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے ہیں اور کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا نہیں ہے، ان کے گذران کے لئے کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے؛ تو حضور ان کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کی کمالِ شفقت اور کمالِ رحمت ہے کہ آپ اپنے اُمتیوں کے ساتھ جہاں دینی طور پر رحمت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے اور خیر خواہی کرتے تھے؛ وہیں دنیوی طور پر بھی اس مرنے والے کے دَین کی ادائیگی اور اس کے ایسے بچوں کی نگرانی اپنے سر لے لیا کرتے تھے جن کی کوئی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے

--- آمین ---

مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً

کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا

۱۵/شعبان ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۶/دسمبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. أما بعد.

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے ”مَنْ سَنَّ سُنَّۃً حَسَنَۃً أَوْ سَیِّئَۃً“ کوئی آدمی اچھا طریقہ جاری کرے تو اس کے لئے کیا ثواب ہے اور کوئی آدمی بری رسم جاری کرے تو اس کے لئے کیا عذاب ہے؛ وہ بتلانا چاہتے ہیں۔ یعنی کسی نے کوئی ایسا طریقہ جاری کیا جس کی وجہ سے لوگ نیکی کی راہ پر لگ گئے تو اس کے اس عمل کی وجہ سے دوسروں کو جو ہدایت نصیب ہوئی اور نیکی کی راہ پر لگے؛ اس پر اس کو کیا ثواب حاصل ہوگا، اس کے مراتب بلند ہوں گے۔ اور اسی طریقہ سے کسی آدمی نے کوئی برا طریقہ جاری کیا اور اس کے اس عمل کی وجہ سے لوگ برائی میں مبتلا ہو گئے تو اس کے نتیجے میں اس آدمی پر کیا وبال پڑے گا؟ وہ بتلانا چاہتے ہیں۔

ازواج واولاد آنکھوں کی ٹھنڈک

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ أَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا﴾ اس سے پہلے جو آیتیں ہیں ان میں اہل ایمان کے کچھ اوصاف اور خوبیوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، انہیں خوبیوں اور اوصاف میں سے ایک خوبی اور عمدہ وصف یہ بتلایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار!

ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما اور ہم کو نکوکاروں کا رہنما بنا۔ یہاں آنکھوں کی ٹھنڈک کا مطلب یہ ہے کہ تو ہماری بیویوں اور اولاد کو اپنی اطاعت وفرمانبرداری کی توفیق عطا فرما، تاکہ ان کو اطاعت وفرمانبرداری کی راہ پر لگا ہوا دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ اس لئے کہ کسی آدمی کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد اور گھر والوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا مطیع اور فرمانبردار دیکھے۔ بخاری شریف کے اندر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی یہی تفسیر منقول ہے۔

(بخاری شریف، کتاب التفسیر، سورۃ الفرقان، حدیث ۴۷۶۰)

آیت کی تفسیر اور عنوان سے مناسبت

ظاہر ہے کہ جب اپنی اولاد کے لئے اور اپنی بیویوں کے واسطے ہدایت مانگ رہے ہیں اور یہ طلب کررہے ہیں کہ اے اللہ! ان کو اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کی توفیق عطا فرما، تو اس دعا کے ذریعہ سے وہ ان کے واسطے راہِ راست پر لگنے کا ذریعہ بنے۔ اور پھر جب دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی اس بات کی کوشش ضرور کریں گے کہ یہ بیوی اور اولاد راہِ راست کے اوپر لگ جائیں۔ ایک آدمی جب اپنے کسی کام اور مقصد کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دُعا کا اہتمام کرتا ہے، مثلاً تجارت میں برکت وترقی کے لئے دُعا کرتا ہے تو جہاں اس کے لئے دُعا کرے گا؛ وہاں اس کے لئے عملی طور پر کوشش بھی کرے گا۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ صرف دُعاؤں پر اکتفاء کرے۔ اگر وہ چیز ایسی ہے جو دُعا کے ساتھ ساتھ عملی کوشش کی بھی طلب گار ہے؛ تو جہاں یہ دُعا کا اہتمام کرے گا وہاں عملی سعی بھی کرے گا۔

اگر کسی کا بیٹا بیمار ہے تو اگر وہ اس کی تندرستی کے واسطے جہاں دُعا کرتا ہے وہاں اس

کے علاج ومعالجہ کا بھی اہتمام کرے گا۔ جب یہ اہلِ ایمان اپنی اولاد اور بیویوں کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دُعا کررہے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں ان کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک نصیب فرما یعنی ان کو تو اپنا مطیع اور فرمانبردار بنا، نیکی کی راہ پر چلنے والا اور برائی سے بچنے والا بنا۔ تو جہاں وہ دُعا کریں گے وہاں ان کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ بھی کریں گے؛ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والے بن جائیں۔ گویا وہ اس صورت میں اپنے بعد آنے والی نسلوں کی ہدایت کا اوران کے راہِ راست پر لگنے کا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے اندران کے مشغول ہونے کا ذریعہ بنیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ان کے لئے ہدایت اور راہِ راست پر لگنے کا ذریعہ بنے؛ تو عمل کرنے والوں کو جو ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملے گا، ان کو بھی ضرور حصہ ملے گا۔ گویا انہوں نے اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کرکے ایک اچھا طریقہ جاری کیا، ان کو راہِ راست پر لگانے کی کوشش کی۔

﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا﴾ اور یہ بھی دُعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہم کو نکوکاروں کا سردار بنا۔ یعنی جب ان کی بیویاں اور اولاد اللہ تعالیٰ کی مطیع وفرمانبردار بنیں گی تو ظاہر ہے یہ اہلِ ایمان اپنے گھر والوں کے اور اپنی اولاد کے سرپرست تو ہیں ہی، وہ لوگ ان کی ماتحتی میں ہیں، تو جب وہ نکوکار بنیں گے تو یہ ان نکوکاروں کے سردار بنیں گے۔

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل کیا: ﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِأَمْرِنَا﴾ ہم نے ان لوگوں کو رہنما اور سردار بنایا تاکہ وہ لوگوں کو ہمارے حکم سے راہِ راست دکھلائیں۔ گویا دوسرے لوگوں کے لئے راہِ راست کا دکھلانا اور ان کو ہدایت کی راہ پر لگانا؛ یہ ایک اچھا طریقہ ہے جو وہ جاری کررہے ہیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات

عن أبی عمرو جریر بنِ عبدِاللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا فِیْ صَدْرِ النَّهَارِ عِنْدَ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ فَجَآءَهٗ قَوْمٌ عُرَاةٌ مُجْتَابِی النِّمَارِ أَوِ الْعَبَآءِ، مُتَقَلِّدِی السُّيُوْفِ، عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ، بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ؛ فَتَمَعَّرَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ لِمَا رَأٰى بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ، فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ، فَأَمَرَ بِلَالًا فَأَذَّنَ وَأَقَامَ. فَصَلّٰى. ثُمَّ خَطَبَ. فَقَالَ: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ الی اٰخر الأیة إِنَّ اللہَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ والاٰیةُ الأُخْرٰى الَّتِیْ فِیْ اٰخِرِ الْحَشْرِ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِّنْ دِيْنَارِهٖ، مِنْ دِرْهَمِهٖ، مِنْ ثَوْبِهٖ، مِنْ صَاعِ بُرِّهٖ، مِنْ صَاعِ تَمْرِهٖ حَتّٰى قَالَ: ((وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ))، فَجَآءَ رَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ بِصُرَّةٍ كَادَتْ كَفُّهٗ تَعْجِزُ عَنْهَا، بَلْ قَدْ عَجَزَتْ. ثُمَّ تَتَابَعَ النَّاسُ حَتّٰى رَأَيْتُ كَوْمَيْنِ مِنْ طَعَامٍ وَثِيَابٍ، حَتّٰى رَأَيْتُ وَجْهَ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ يَتَهَلَّلُ كَأَنَّهٗ مُذْهَبَةٌ؛ فَقَالَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ: ((مَنْ سَنَّ فِی الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهٗ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْقُصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَیْءٌ. وَمَنْ سَنَّ فِی الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً كَانَ عَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ بَعْدِهٖ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَیْءٌ)) (رواہ مسلم)

حضرت ابوعمرو جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، قبیلہ بنو بجیلہ سے ان کا تعلق ہے یہ یمن کا ایک قبیلہ تھا۔ ۱۰ھ کے اندر یہ لوگ مسلمان ہوئے ہیں۔ یہ صحابی بڑے حسین و جمیل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے متعلق فرماتے تھے: ﴿یُوْسُفُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ﴾ اپنے حسن و جمال میں اس امت کے یوسف ہیں۔ ان کے حالات کے اندر لکھا ہے کہ قد و قامت کے اعتبار سے بھی بڑے طویل تھے، اونٹ کی کوہان جتنے اونچے تھے، اور ان کا جوتا ایک ہاتھ جتنا ہوتا تھا۔

یمن کے اندر ایک بت تھا، نبی کریم ﷺ نے ان کو اس کو ختم کرنے کے واسطے کچھ صحابہ کو ان کی ماتحتی میں کر کے خصوصی مہم کے اوپر بھیجا تھا اور ان کو دُعا دی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ سے لوگوں کو ہدایت دے، جس وقت ان کو بھیجا جا رہا تھا تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا: ﴿اِنِّیْ لاَ أَثْبُتُ عَلیٰ الْخَیْلِ﴾ نبی کریم ﷺ نے ان کے سینے کے اوپر ہاتھ مارا اور دُعا فرمائی۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد گرنے کی نوبت نہیں آئی۔

﴿قابلِ تقلید طرزِ عمل﴾

نبی کریم ﷺ نے ان سے بیعت میں ایک شرط یہ بھی لی تھی: ﴿وَالنُّصْحُ لِکُلِّ مُسْلِمٍ﴾ ہر مسلمان کی بھلائی اور خیر خواہی کا اہتمام کریں گے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر کئے گئے اس عہد و پیمان کا وہ اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ایک آدمی کو گھوڑا خریدنے کے لئے وکیل بنایا، اس آدمی نے گھوڑے کے مالک کے ساتھ تین سو درہم کے اندر سودا طے کیا اور گھوڑا لے آیا اور مالک کو بھی ساتھ لایا کہ ان کو تین سو درہم چکا دیئے جائیں۔ انہوں نے دیکھا کہ گھوڑا تین سو درہم سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے تو انہوں نے گھوڑے کے مالک سے کہا: تمہارا گھوڑا چار سو درہم کا معلوم ہوتا ہے، چار سو میں دو گے؟ ظاہر ہے جو تین سو میں دے چکا ہو؛ وہ چار سو میں کیوں نہیں دے گا؟ اس نے کہا: ٹھیک ہے۔ پھر ان کو خیال ہوا کہ اس سے بھی زیادہ قیمتی ہے تو پھر اس سے کہا: چار سو کا نہیں بلکہ پانچ سو کا معلوم ہوتا ہے، پانچ سو میں دینے کے لئے تیار ہو؟ اس نے اس پر بھی رضا مندی کا اظہار کیا یہاں تک کہ آٹھ سو درہم اس کو ادا کئے۔ حالانکہ جس آدمی کو گھوڑا خریدنے کے لئے وکیل بنایا

تھا اس نے تو مالک کے ساتھ تین سو میں سودا طے کر لیا تھا اور مالک نے برضا ورغبت اور خوشدلی کے ساتھ اپنا گھوڑا فروخت بھی کر دیا تھا، لیکن نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر جو عہدو پیمان کیا تھا کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی اور بھلائی چاہیں گے، اس کا اتنا لحاظ تھا کہ اس کے سامنے ان دراہم کی اور دنیوی دولت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔ چاہے ہمارے وکیل نے اس کے ساتھ تین سو درہم میں معاملہ کیا ہو لیکن جب مَیں یہ سمجھ رہا ہوں کہ اس کی یہ چیز اس سے زیادہ قیمت کی ہے تو اس کی خیر خواہی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے مال کے مطابق مجھے قیمت ادا کرنی چاہیے، اس لئے تین سو کے بجائے آٹھ سو درہم ادا کئے۔

﴿ کچھ مفلس حضرات خدمتِ نبوی میں ﴾

انہیں صحابی سے یہ روایت منقول ہے کہ ہم دن کے شروع حصہ میں یعنی اشراق کے بعد چاشت سے پہلے نبی کریم ﷺ کی مجلس مبارک میں آپ سے فیض حاصل کرنے کے لئے اور آپ کے ارشادات سننے کے لئے آپ کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے، کہ کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوئے کہ وہ سیاہ وسفید دھاریوں والی چادروں کو کاٹ کر اپنے گلے کے اندر پہنے ہوئے تھے۔ "نِمَارٌ" "نَمِرَۃٌ" کی جمع ہے۔ سیاہ اور سفید لکیر اور دھاری والی چت کبری چادر اور کملی کو "نَمِرَۃٌ" کہا جاتا ہے۔ ﴿مُجْتَابٌ﴾ کا معنیٰ کسی چیز کو کاٹ کر اپنے گلے میں ڈالنا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے پاس چادر بھی اتنی بڑی نہیں تھی کہ وہ اس کو اپنے جسم کے اوپر لپیٹ پاتے، اس لئے اس چادر کے بیچ میں سے سوراخ کر کے اس میں سے سر کو داخل کر کے چاروں طرف سے اس کو پہن رکھا تھا، اور جوں توں بڑی مشکل سے اپنے ستر کو چھپائے ہوئے تھے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ تلواریں لٹکائے ہوئے

تھے۔اس زمانہ میں عام طور پر یہی معمول تھا کہ ہر آدمی اپنے ساتھ تلوار رکھا ہی کرتا تھا جیسے دیہاتوں میں دیکھا ہوگا کہ عام طور پر ہر آدمی کے ہاتھ میں لاٹھی ہوا کرتی ہے۔یہ ویسے بھی بڑی مفید چیز ہے۔اور ان میں سے اکثر و بیشتر کا تعلق قبیلۂ مضر یعنی قریش سے تھا بلکہ سب ہی قبیلۂ مضر سے تعلق رکھنے والے تھے۔ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر یہ پتہ چل رہا تھا کہ وہ بڑی شدید محتاجی کے حالت میں مبتلا ہیں، بڑی شدید احتیاج کا شکار ہیں۔ان کی یہ حالت دیکھ کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا۔اور بدلا بایں معنٰی کہ ان کے اس شدید احتیاج کے باوجود کسی اہلِ وسعت واہلِ ثروت نے ان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

محتاج کی حاجت روائی فرض کفایہ ہے

اس لئے کہ معاشرے اور سماج کے اندر کوئی شخص محتاج اور ضرورت مند ہے تو اس سماج میں جو لوگ اہلِ ثروت اور اہلِ وسعت ہیں ان کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اس کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی طرف توجہ کریں۔چنانچہ اگر کوئی آدمی بھوکا ہے اور بھوک کی وجہ سے وہ بالکل قریب المرگ اور ہلاکت کے قریب ہے تو اس صورت میں فرضِ کفایہ کے طور پر پورے سماج کی ذمہ داری ہے کہ اس کی بھوک کو دور کر کے اس کو ہلاکت سے بچائیں، اگر کسی ایک نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی، یہاں تک کہ وہ بھوک کی وجہ سے مر گیا تو پورا سماج گنہگار ہوگا۔اسی کو فرضِ کفایہ کہتے ہیں۔فرضِ کفایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کام ہونا چاہیے، چاہے سب مل کر کریں یا کوئی ایک آدمی کرے۔اگر کسی نے بھی نہیں کیا تو سب گنہگار ہوں گے اور اگر کسی ایک نے بھی کر لیا یا سب نے کیا تو سب کی ذمہ داری پوری ہو جائے گی۔

نفس احتیاج کوئی بری چیز نہیں ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے اپنے لئے مسکنت کو پسند فرمایا تھا لیکن ان کی اس شدتِ احتیاج کی جو کیفیت تھی اس سے آپ نے اندازہ لگایا کہ ان کی اس شدتِ احتیاج کے باوجود ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، اس وجہ سے نبی کریم ﷺ کو ناگواری ہوئی۔ اور اس ناگواری کا ظہور نبی کریم ﷺ کے چہرۂ اقدس کے اوپر نمودار ہوا کہ آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

آپ ﷺ نے تعاون کی اپیل کی

راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے گھر میں تشریف لے گئے اور پھر باہر آئے۔ ممکن ہے کہ گھر میں اس لئے گئے ہوں کہ گھر میں کوئی چیز ایسی موجود ہو جس سے ان کی ضرورت پوری ہو جائے۔ بہر حال! جب واپس باہر تشریف لائے تو دن کا شروع حصہ تھا جیسا کہ اوپر بتلایا کہ چاشت کا وقت تھا، اس درمیان ظہر کا وقت آہی گیا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا۔ چنانچہ ظہر کے شروع وقت ہی میں انہوں نے اذان بھی دی اور جب لوگ آگئے تو اقامت ہوئی۔ جب اذان واقامت کا تذکرہ ہے تو نفل نماز تو مراد ہو نہیں سکتی، لامحالہ فرض نماز مراد ہے، اور وہ ظہر کی نماز تھی جو آپ نے لوگوں کو پڑھائی۔ نماز کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں میں ایک تقریر فرمائی اور خطبہ دیا، گویا لوگوں کو ان آنے والوں کی ضرورت کو پورا کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ آپ نے اس خطبہ اور تقریر میں ایک تو وہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی جو سورۂ نساء کی پہلی آیت ہے۔ جس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو عمومی خطاب کے ذریعہ سے کہا گیا ہے کہ اے لوگو! ڈرو اپنے اس پروردگار سے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا۔ یعنی حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے پیدا کیا

اور انہیں کی بائیں پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کیا۔ اور انہیں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے بہت سارے مرد اور عورتوں کو پیدا کر کے روئے زمین کے اوپر پھیلا دیا۔ اور تم ڈرو اس اللہ سے جس کا تم واسطہ دیا کرتے ہو یعنی آپس میں جب ایک دوسرے کی ضرورت پڑتی ہے اور اپنا کام نکلوانا ہوتا ہے تو تم اللہ کے نام کو استعمال کرتے ہو۔ لوگوں کو اللہ کا واسطہ دے کر اپنا کام نکلواتے ہو۔ تو جس اللہ کا واسطہ دے کر اور جس کا نام استعمال کر کے اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہو، اس اللہ سے ڈرو اور اس کے احکام کا خیال رکھو۔ اور آپس کی جو رشتہ داریاں ہیں ان کا بھی خیال رکھو، اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔

آپ ﷺ کا اس آیت کو پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ جو اس وقت آئے ہوئے ہیں اور شدید حاجت کے اندر مبتلا ہیں، وہ بھی تو تمہارے بھائی ہیں، بایں معنٰی کہ وہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، تو ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہونے کی وجہ سے اگرچہ اب یہ اخوت دور کی سہی، لیکن اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی ضرورتوں کی طرف توجہ کرو۔

اور دوسری آیت تلاوت فرمائی جو سورۂ حشر کے آخیر میں ہے: ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر آدمی دیکھ لے کہ وہ آئندہ کل کے واسطے کیا بھیج رہا ہے۔ یعنی دنیا میں رہ کر ہی آدمی کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ مَیں اپنی دنیا کی زندگی میں آخرت کی زندگی کے واسطے کیا تیاری کر رہا ہوں اور آخرت کے واسطے کیا بھیج رہا ہوں۔ ہر آدمی کو اس کی طرف خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو دنیا کی زندگی عطا ہی اس لئے فرمائی ہے کہ وہ یہاں آ کر آخرت کی تیاری کرے۔ دنیا کی زندگی خود مقصود نہیں ہے۔

﴿ایک مثال﴾

جیسے ایک آدمی ہے جس کو حج کا سفر درپیش ہے اور وہ جانتا ہے کہ وہاں مجھے خرچ کی ضرورت پڑے گی۔ اور یہاں حکومت مجھے کرنسی کے طور پر جو رقم دے رہی ہے وہ میرے لئے کافی نہیں ہے، تو وہ جانے سے پہلے ہی اس کا انتظام کرتا ہے۔ تاکہ وہاں جانے کے بعد اس کے مصارف میں کسی قسم کی کوئی تنگی نہ ہو۔ جب دنیا کے اندر ایسا ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک جانا ہوتا ہے تو اس سفر کے لئے آدمی پہلے ہی سے تیاری کرتا ہے اور اس کے مصارف اور وہاں ہونے والے خرچ کا وہ اپنے طور پر انتظام کرتا ہے، اسی طرح جب دنیا سے آخرت کے سفر پر جانا ہے اور وہاں ہمیشہ رہنا ہے تو وہاں پر بھی جو چیز کام آنے والی ہے اس کے واسطے دنیا میں رہتے ہوئے آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ تمنا و توقع رکھنا اور یہ اُمید کرنا کہ میرے مرجانے کے بعد میرے بعد والے کچھ کرلیں گے:۔

ع ایں خیال است و محال است و جنوں

جب آپ خود اپنے لئے اپنی تیاری کے طور پر کچھ کرنے کے روادار نہیں ہیں، اور اس کی طرف جب کچھ توجہ نہیں کررہے ہیں؛ تو پھر دوسروں سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟

﴿بعد والوں کے بھروسے پر نہ رہو﴾

مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ ایک باپ کا انتقال ہوا اور بیٹے کے واسطے دس لاکھ روپے چھوڑ کر مرا۔ اب اسی بیٹے سے اگر کہا جائے کہ کسی جگہ مسجد یا مدرسہ بن رہا ہے یا کوئی نیکی کا کام ہو رہا ہے اور ذمہ دار اس سے کہیں کہ تمہارے ابا کا انتقال ہوگیا، ان کے ایصالِ ثواب کے لئے دس ہزار روپے دے دو۔ تو جواب میں وہ کہے گا کہ دس ہزار روپے مانگتے ہو؟

بہت بڑی رقم ہے۔ حالانکہ دس ہزار اس کو اپنی کمائی میں سے نہیں دینا ہے۔ اس کا باپ دس لاکھ کما کر اس کے واسطے چھوڑ گیا ہے؛ اسی میں سے دینا ہے۔ تو جو باپ کی کمائی ہے، اس میں سے بھی وہ دینے کے لئے روادار نہیں ہے؛ تو پھر اپنی کمائی میں سے وہ کیا اور کتنا دے گا؟ اس سے کیا توقع رکھی جاسکتی ہے؟ بہر حال! اگر اولاد کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کی ہے اور وہ کچھ کر رہے ہیں تو اس آدمی کے لئے سعادت اور خوش بختی کی بات ہے۔ لیکن آدمی کو اپنے طور پر اپنے لئے کوشش کر لینا چاہیے۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے اس آیت کو پیش فرما کر لوگوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی طرف متوجہ کیا کہ لوگو! خرچ کرو، یہ جو کچھ بھی خرچ کرو گے؛ وہ سب تم آگے بھیج رہے ہو۔

﴿دوسرے کے مال سے محبت﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: کہ تم میں سے کون ہے جس کو دوسرے کا مال اپنے مال کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے؟ صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسا تو کون ہوگا؟ ہر ایک کو اپنا مال محبوب ہوتا ہے، دوسرے کا نہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنا تو وہی ہے جو تم اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے آگے بھیج چکے ہو، اور مرتے وقت جو اپنے پیچھے چھوڑ جاؤ گے، وہ تمہارا نہیں ہے، وہ تو دوسروں کا ہے۔ (بخاری شریف، کتاب الرقاق، حدیث ۶۴۴۲)

اور عام طور پر آدمی اس کو اپنا سمجھ کر اس سے محبت کرتا رہتا ہے، اسی کی طرف حضور ﷺ نے متوجہ کیا: ﴿وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ﴾ ہر آدمی دیکھ لے کہ کل کے واسطے یعنی آخرت کے واسطے اس نے کیا بھیجا۔ گویا اس آیت کے ذریعہ سے نبی کریم ﷺ صحابۂ کرام کو خرچ کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

جس میں جتنی طاقت ہو......

﴿تَصَدَّقَ رَجُلٌ مِّنْ دِيْنَارِهٖ، مِنْ دِرْهَمِهٖ، مِنْ ثَوْبِهٖ﴾ یہاں ”تَصَدَّقَ“ ماضی کا صیغہ ہے، لیکن شراح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد امر ہے ﴿لِيَتَصَدَّقَ رَجُلٌ﴾ نبی کریم ﷺ چونکہ تقریر فرما رہے ہیں اور صحابہ کرام کو خرچ کرنے کے لئے ترغیب دے رہے ہیں تو آپ فرما رہے ہیں کہ دیکھو! ہر آدمی دینار میں سے، درہم میں سے، کپڑے میں سے، گیہوں کے صاع میں سے اور کھجور کے صاع میں سے خرچ کرے، یہاں تک کہ کوئی آدمی اگر آدھی کھجور بھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرے گا تو وہ اس کے لئے کارآمد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کی جو حیثیت ہو، ہر ایک کو اسی حیثیت کے مطابق نبی کریم ﷺ تلقین فرما رہے ہیں اور متوجہ فرما رہے ہیں۔ کسی میں اگر دینار خرچ کرنے کی طاقت ہے تو وہ خرچ کرے۔ دینار سونے کا سکہ ہوا کرتا تھا۔ کسی میں اگر درہم خرچ کرنے کی طاقت ہے تو وہ اس کو خرچ کرے۔ درہم چاندی کا سکہ ہوتا تھا جو دینار سے کچھ کم ہوتا تھا۔

بعض مرتبہ لوگ سوچتے ہیں کہ ہمارے پاس خرچ کرنے کے لئے روپے پیسے تو ہیں نہیں۔ تو فرمایا کہ روپے ہونے ضروری نہیں ہیں، اگر آپ کے پاس سامان اور کپڑا ہے تو اس کو بھی اللہ کے راستہ میں دے سکتے ہو۔ اور کپڑا نہیں ہے بلکہ غلہ ہے۔ جیسے زراعت پیشہ آدمی ہے، کسان ہے، اس کے پاس تو عموماً نقد پیسہ ہوتا نہیں، لیکن گھر میں غلہ موجود ہوتا ہے، تو گیہوں کھجور جو بھی ہو؛ اس کو صدقہ کے طور پر خرچ کرے۔

یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ﴾ آدھی کھجور بھی ہو تو اس کو بھی اللہ کے راستہ میں دینے میں کوئی باک اور عار محسوس نہ کرے، یہ نہ سوچے کہ آدھی کھجور

کیا دوں۔ اس لئے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ''ذرّہ'' کس کو کہتے ہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ کھڑکی کے سوراخ میں سے سورج کی روشنی مکان کے اندر آرہی ہو، اس روشنی میں اُڑتے ہوئے جو اجزاء نظر آتے ہیں؛ ان میں سے ایک کو ذرّہ کہتے ہیں۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ پیلے رنگ کی چھوٹی چیونٹی ہوتی ہے اس کو ذرّہ کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اتنی بھی نیکی کرے گا تو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں پائے گا اور اس کا ثواب اس کو ملے گا۔ نیکی کے کام میں آدمی کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اتنی چھوٹی سی نیکی کیا کروں؟

﴿ذرّہ اور ٹکڑا﴾

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے پاس ایک مرتبہ ایک سائل آیا اور سوال کیا۔ ان کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا جو انہوں نے اس کو دے دیا۔ بعض سائل ایسے ہوتے ہیں کہ اس کو لینے میں تأمل کرتے ہیں، تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ارے! تو اس کو قبول کرنے میں تأمل کر رہا ہے؟ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں تو یہ قانون ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ﴾ ایک ذرّہ کے برابر نیکی کا بھی بدلہ ملے گا۔ اور مَیں روٹی کا اتنا بڑا ٹکڑا تجھے دے رہا ہوں، اور تو اس کو قبول کرنے میں تأمل کر رہا ہے۔ (تفسیر الدر المنثور۔ ۶/۶۴۹)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کے پاس کھجور ہو تو وہ بھی اللہ کے راستہ میں دے۔ بہر حال! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تقریر اور وعظ کے ذریعہ سے لوگوں کو خرچ کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ ظاہر ہے کہ متوجہ کرنے والے اور ترغیب دینے والے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور جن کو ترغیب دی جا رہی ہے وہ صحابہ کرام ہوں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق؛ تو پھر کیا پوچھنا۔

ایک نے پہل کی اور پھر......

راوی کہتے ہیں کہ آپ کی اس تقریر کو سن کر انصار میں سے ایک آدمی پیسوں کا توڑا یعنی تھیلی لے کر آیا اور وہ اتنی وزنی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہاتھ اس تھیلی کو اُٹھانے سے عاجز ہے۔ یعنی قریب ہے کہ تھک جاوے، بلکہ نبی کریم ﷺ کے قریب پہنچتے پہنچتے تو یوں سمجھو کہ وہ اس تھیلی کو نیچے رکھ چکا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تھیلی اتنی وزنی تھی اور اس میں اتنے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ اور انھوں نے وہ تھیلی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کردی۔ بس! سب سے پہلے لانے والے یہ صحابی تھے۔ اس کے بعد تو لوگوں کا ایک تانتا لگ گیا اور ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ان کو دیکھ کر دوسرے بھی گئے اور پھر جس کے پاس جو بھی تھا؛ وہ لے آیا۔ راوی کہتے ہیں کہ لوگوں نے اتنا سب لاکر دیا کہ مَیں نے کپڑوں کے اور کھانے کے دو ڈھیر دیکھے۔ اور مَیں نے نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھا کہ وہ ایسا چمک رہا ہے گویا کہ سورج کی طرح ایک دم چمکدار اور روشن ہے۔

جس نے اسلام میں اچھا طریقہ جاری کیا

چونکہ وہ صحابی جو سب سے پہلے تھیلی لے کر آئے تھے اور ان کو دیکھنے کے بعد لوگوں کے اندر بھی یہ جذبہ پیدا ہوا تھا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی نے اسلام کے اندر کوئی اچھا طریقہ جاری کیا تو اس کو اپنے کیے کا تو ثواب ملے گا ہی، اس کے بعد اس اچھے طریقہ کے اوپر جتنے لوگ بھی عمل کریں گے؛ ان سب کا ثواب اس کو بھی ملے گا۔ لیکن اس کو ان سب کا جو ثواب ملے گا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے ثواب میں کوئی کمی آئے گی، بلکہ کرنے والوں کو ان کے عمل کرنے کا ثواب ملے گا اور اس کے لئے ذریعہ یہ بنا؛ تو سبب ہونے کی حیثیت سے اس کو بھی ثواب ملے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کسی بھی نیکی کے کام کی ابتداء کرنے میں آدمی کو تأمل نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جہاں مجمع ہو اور کسی عمل کے لئے لوگوں کو کہا جائے، تو جو سب سے پہلے سبقت کرے گا اور پھر اس کے نتیجہ میں دوسرے لوگوں کو یہ توفیق نصیب ہوگی تو بعد والے سب لوگوں کے اجر میں اوّل آدمی بھی شریک رہے گا، اور ان کرنے والوں کو تو ان کے عمل کا ثواب اور اجر ملے گا ہی، ان کے ثواب میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ ایسا نہ سمجھا جائے کہ ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَاسَعٰی﴾ آدمی کو تو اپنے عمل ہی کا ثواب ملا کرتا ہے۔ یہاں بھی جو اس کو مل رہا ہے، ایک تو اس نے خود عمل کیا اس کا ثواب ملا، اور بعد میں دوسرے لوگوں نے جو عمل کیا، یہ ان کے لئے ذریعہ بنا، لہٰذا بحیثیت ذریعہ اور سبب کے اس کو ثواب ملے گا اور ان عمل کرنے والوں کو اپنے عمل کا ثواب ملے گا۔

﴿یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے﴾

اب اس پر کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تو سبب ہوا اور پھر وہ خود عامل ہوئے، عامل اور سبب کا ثواب برابر کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ اشکال نہیں ہونا چاہیے، اس لئے کہ کسی بھی عمل پر ثواب دینا؛ یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے اختیار کی بات ہے، ثواب اللہ تعالیٰ دیتے ہیں، کوئی بھی عمل اپنی ذات کے اعتبار سے ایسا نہیں کہ اس پر ثواب ملنا ہی چاہیے، اللہ تبارک وتعالیٰ جو دے ﴿ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ نے ان عمل کرنے والوں کو عمل کی بنیاد پر جو ثواب دیا اور اس کو سبب ہونے کی بنیاد پر اتنا ہی ثواب دے دیا؛ تو اس میں اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آئی، تو پھر کسی دوسرے کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی چیز تھی اس نے اپنے بندے کو دی، دینے والا اپنے خزانے کا مالک ہے، جس کو دینا چاہتا

ہے، جتنا دینا چاہتا ہے؛ دیتا ہے۔اب دوسروں کو اس پر کیوں اشکال ہوتا ہے؟ دوسرے کے پیٹ میں کاہے کو درد ہوتا ہے کہ اس کو اتنا ثواب کیوں ملا؟

﴿جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا﴾

﴿وَمَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً﴾ اور کسی نے کوئی برا طریقہ جاری کیا مثلاً کسی برادری میں کوئی بھی اپنے بیٹے کی شادی میں بینڈ باجا لایا ہی نہیں تھا، یہ پہلا آدمی ہے جو اپنے بیٹے کی شادی میں بینڈ باجا لایا، اس کے دیکھا دیکھی دوسروں کو بھی یہ سوجھی کہ فلاں صاحب بینڈ باجا لائے تھے تو اب ہم بھی اپنے یہاں کی شادی میں بینڈ باجا لائیں گے۔

اسی طرح آج تک کبھی کسی نے شادی میں ویڈیو کیسیٹ کیا ہی نہیں تھا، یہ صاحب پہلے ہیں جنہوں نے اپنی برادری میں یہ ہمت کی اور اپنے آپ کو یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم بڑا عمدہ کارنامہ انجام دے رہے ہیں، اس کے بعد اس کی برادری میں یہ سلسلہ چل پڑا، آج تک تو کسی کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اب دوسرے لوگ بھی ایسا کرنے لگے۔تو جس نے یہ کام کیا اس کو تو اپنے کام کا گناہ ہوگا ہی، لیکن جتنا گناہ اُن کو ہوا، اس اول کو بھی سبب ہونے کی وجہ سے اتنا ہی گناہ ہوتا رہے گا۔

﴿معاشرہ میں برائی کی پہل کرنے والے متوجہ ہوں﴾

بہت سی برادریوں کے اندر یا بعض خاندانوں کے اندر ایسا ہوتا ہے کہ ایک برائی وہاں نہیں کی جاتی، لیکن اسی خاندان کے اندر کوئی سر پھرا ایسا ہوتا ہے جو یوں سمجھتا ہے کہ مجھے کون کہنے والا ہے؟ مَیں تو ایسا کر کے رہوں گا، اور اپنے سر کے بل بوتے پر ایسی کوئی حرکت کرتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں جو بندھ لگا ہوا تھا، برادری میں ایسا کام کرنے کے معاملہ میں

جو رکاوٹ تھی؛ وہ رکاوٹ ختم ہو جاتی ہے، اور اس کے بعد دوسرے لوگوں کو بھی یہ غلط حرکت سوجھتی ہے۔ تو یاد رکھئے! وہ آدمی جو اپنے زعم میں یوں سمجھتا ہے اور اپنے زعم میں خوش ہے کہ مَیں نے بہت بہادری کا کام کیا ہے اور آج مجھے کہنے والا کون ہے۔ چاہے کوئی کہے یا نہ کہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا اس کو جواب دینا ہے، اور اس کے بعد جنہوں نے یہ حرکتیں کی ہیں؛ وہاں ان سب کا گناہ بھی اس کو بھگتنا ہے۔

اسلاف کی فضیلت اخلاف پر

دیکھو! نیکی کے معاملہ میں بھی یہ فرمایا اور برائی کے معاملہ میں بھی یہ فرمایا۔ لہٰذا نبی کریم ﷺ کے اجر وثواب کا کیا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آپ ﷺ قیامت تک آنے والی پوری اُمت کے لئے سبب اور ذریعہ بنے ہیں، اسی لئے پوری اُمت کے اعمال نبی کریم ﷺ کے عمل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور پھر آپ کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے دین کی یہ امانت آپ ﷺ سے حاصل کر کے آنے والی نسلوں تک پہنچانے کی محنت کی، لہٰذا قیامت تک جتنی نسلوں تک یہ دین پہنچے گا؛ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ان سب کے اعمال کے ثواب میں برابر کا حصہ ملے گا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلاف کو یعنی گذرے ہوئے لوگوں کو بعد والوں پر کیا فضیلت حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ بعد والوں کے ثواب کے اندر اسلاف کا حصہ تو ہے ہی، اور اگلے والوں کے ثواب میں بعد والوں کو حصہ نہیں ہے۔ اس سے اسلاف کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

ہابیل اور قابیل کا قصہ

عن بن مسعود رضی اللہ عنہ ان النبی ﷺ قال: لَيْسَ مِنْ نَفْسٍ تُقْتَلُ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلٰى ابْنِ آدَمَ الْأَوَّلِ كِفْلٌ مِّنْ دَمِهَا، لِاَنَّهٗ كَانَ أَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں جب کوئی آدمی ظلم کے طور پر ناحق قتل کیا جاتا ہے؛ تو اس پر جو گناہ اس قتل کرنے والے کو ہوتا ہے، اس گناہ کے اندر حضرت آدم علیہ السلام کا وہ بیٹا (جس نے سب سے پہلے دنیا کے اندر اس قتل کے سلسلے کو جاری کیا) بھی اتنا ہی گنہگار ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حضرت حوا کے ساتھ جب دنیا میں اُتارا تو چونکہ اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ انسانوں کی نسل قیامت تک کے لئے دنیا میں چلے اور روئے زمین پر پھیلے۔ حالانکہ حضرت حوا کو حضرت آدم ہی کی پسلی سے پیدا کیا گیا لیکن ان کو حضرت آدم کی زوجہ اور بیوی بنایا گیا، پھر حضرت آدم اور حضرت حوا کے آپس کے ملاپ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر یہ نظام بنایا تھا کہ ہر مرتبہ کے حمل سے دو بچے پیدا ہوتے تھے، ان میں سے ایک لڑکا ہوتا اور ایک لڑکی ہوتی۔ ایک مرتبہ کے حمل سے پیدا ہونے والا لڑکا اور لڑکی تو آپس میں نکاح نہیں کر سکتے تھے، لیکن دوسری مرتبہ کے حمل سے جو لڑکا اور لڑکی پیدا ہوتے، تو پہلے کے لڑکے اور دوسرے کی لڑکی کا نکاح کیا جا سکتا تھا اور پہلے کی لڑکی اور دوسرے کے لڑکے کا نکاح کیا جا سکتا تھا۔ جیسا آج کل دودھ کی رشتہ داریاں ہوتی ہیں۔ ویسے بھائی بہن تو نکاح نہیں کر سکتے، لیکن چچا زاد بھائی بہن ہوں تو ان کا آپس میں نکاح ہو سکتا ہے، اسی طرح وہاں حمل کے بدل جانے کی وجہ سے اس زمانہ کے اعتبار سے ضرورت کے پیشِ نظر اس کو دودھ ہی کی رشتہ داری کا حکم دیا گیا تھا۔ تو حضرت آدم کو حضرت حوا سے ایک بطن سے جو دو بچے پیدا ہوئے تھے ان میں سے لڑکے کا نام قابیل تھا اور اس کے ساتھ اس کی بہن تھی، دوسرے پیٹ سے جو پیدا ہوئے اس لڑکے کا نام ہابیل تھا اور اس کے ساتھ اس کی ایک بہن تھی۔ لہٰذا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے اس حکم کے مطابق مسئلہ یہ تھا کہ قابیل کی بہن کا نکاح ہابیل کے ساتھ اور ہابیل کی بہن کا نکاح قابیل کے ساتھ کیا جائے۔ اب قابیل کی بہن حسین تھی اور ہابیل کی بہن اتنی زیادہ حسین نہیں تھی، لہٰذا قابیل یہ چاہتا تھا کہ ہابیل کے نکاح میں وہ نہ دی جائے اور اسی بنیاد پر اس نے اس سے اختلاف کیا، اور جب وہ کامیاب نہیں ہوا تو اس نے اپنا مقصد پورا کرنے کے واسطے ہابیل کا قتل کر دیا۔ یہ سب سے پہلا ناحق، ظالمانہ بلاقصور قتل ہے جو دنیا کے اندر وجود میں آیا۔ روئے زمین پر بلاوجہ اور ناحق قتل کا طریقہ جاری کرنے والا حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا قابیل ہے جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا۔

تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ غلط طریقہ اس کے ہاتھوں جاری ہوا، لہٰذا اب قیامت تک جتنے بھی ناحق قتل دنیا کے اندر ہوں گے، ان ناحق قتل کرنے والے ہر قاتل کو اپنے مقتول کو قتل کرنے کا گناہ تو ہوگا ہی، لیکن اتنا ہی گناہ قابیل کو بھی ہوگا۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم کا وہ پہلا بیٹا جس نے قتل کو دنیا میں جاری کیا، اس پر اس قتل کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ ﴿لِاَنَّہٗ کَانَ اَوَّلَ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ﴾ اس لئے کہ دنیا کے اندر قتل کی اس برائی اور جرم کو شروع کرنے والا وہی قابیل ہے۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی کو یہ فکر کرنی چاہیے کہ وہ لوگوں کے لئے برائی کا ذریعہ نہ بنے، بلکہ بھلائی کا ذریعہ بنے۔ اس کا خاص اہتمام ہو۔ اور اگر اتنی طاقت نہیں ہے کہ بھلائی کا ذریعہ بنے تو کم سے کم اتنی کوشش تو آدمی کرے ہی کہ وہ برائی کا ذریعہ بننے سے اپنے آپ کو بچالے۔ ”طاقتِ نیکی نہ داری بد مکن“

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

اَلدَّلَالَةُ عَلٰی خَیْرٍ وَالدُّعَآءُ اِلٰی هُدًی أَوْضَلَالَةٍ

﴿بھلائی کی طرف رہنمائی﴾

اقتباس

بھلائی اور نیکی کے راستہ کی طرف لوگوں کو دعوت دینا؛ ایک ایسا کام ہے جس کیلئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود نبی کریم ﷺ کو حکم دیا اور اس کا آپ کو بھی پابند بنایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کے لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہو؛ تو ظاہر ہے کہ وہ کام آپ کی امت کو بھی کرنا ہی ہے

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک اچھی بات کے لئے لوگوں کو دعوت دے رہا ہے، لیکن اس کے لئے جو انداز اور طریقۂ کار اختیار کرتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بجائے اس کے کہ لوگ اس چیز کی طرف آویں؛ اس سے دور بھاگتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف جو دعوت دینے والا ہے اس کو اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ دعوت کے لئے جو طریقہ اور انداز اختیار کیا جائے وہ بھی ایسا ہونا چاہیے جو سوجھ بوجھ اور دانائی پر مبنی ہو

اور جس آدمی کو بلایا جا رہا ہے اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات اور ماحول اور اس کے حالات کو سامنے رکھ کر ایسا طریقہ اختیار کرے کہ وہ آپ کی طرف مائل ہو ایسا نہ ہو کہ آپ کی بات سن کر وہ آپ سے بھاگنے کی کوشش کرے

اسی کو "**حکمت**" کہا گیا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰـہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً.أمابعد.

أعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ﴾

وقال اللہ تعالٰی: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ﴾

وقال تعالٰی: ﴿وَتَعَاوَنُوْاعَلَی الْبِرِّوَالتَّقْوٰی﴾

وقال تعالٰی: ﴿وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ﴾

﴿دین کی دعوت دینے کا حکم﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿الدَّلالَۃُعَلٰی خَیْرٍ والدعاءُ الیٰ ھدیً أوضلالۃٍ﴾ بھلائی اور نیکی کے کام کی طرف رہنمائی کرنا اور ہدایت یا گمراہی کی طرف کسی کو دعوت دینا۔کوئی آدمی لوگوں کو ہدایت اور نیکی کے راستہ کی دعوت دے؛اس کے کیا فضائل ہیں اور اس پر اس کو کیا اجروثواب ملتا ہے۔اور اگر کوئی آدمی گمراہی اور ضلالت کی طرف لوگوں کو دعوت دے؛تو اس پر کیا عذاب وعقاب ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیتوں کے کچھ اجزاء پیش کئے ہیں ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ﴾ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اے نبی! آپ اپنے رب کی وحدانیت اور اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو دعوت

دیجیے۔ گویا بھلائی اور نیکی کا راستہ اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا؛ ایک ایسا کام ہے جس کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے خود نبی کریم ﷺ کو حکم دیا اور اس کا آپ کو بھی پابند بنایا۔ معلوم ہوا کہ جس چیز کے لئے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ہو؛ تو ظاہر ہے کہ وہ کام آپ کی امت کو بھی کرنا ہی ہے۔

﴿ داعی کے لئے سوجھ بوجھ اور دانائی ضروری ہے ﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾ اے نبی! آپ اپنے رب کے راستہ کی طرف لوگوں کو بلایئے اور دانائی وخوش اسلوبی کے ساتھ اور اچھے طریقہ سے نصیحت کرتے ہوئے دعوت دیجیے۔ گویا یہاں ایک مزید چیز کو شامل کرلیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف لوگوں کو جو دعوت دی جائے گی اس کے لئے ایک خاص انداز ہونا چاہیے اور اس انداز کے واسطے آدمی کو سوجھ بوجھ اور دانائی سے کام لینا چاہیے اور اس کے لئے لوگوں کو بھلے طریقہ سے نصیحت کرنی چاہیے۔

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی ایک اچھی بات کے لئے لوگوں کو دعوت دے رہا ہے، لیکن اس کے لئے جو انداز اور طریقۂ کار اختیار کرتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے بجائے اس کے کہ لوگ اس چیز کی طرف آویں؛ اس سے دور بھاگتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف جو دعوت دینے والا ہے اس کو اس بات کی بھی تاکید کی گئی کہ دعوت کے لئے جو طریقہ اور انداز اختیار کیا جائے وہ بھی ایسا ہونا چاہیے جو سوجھ بوجھ اور دانائی پر مبنی ہو۔ اور جس آدمی کو بلایا جارہا ہے اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات اور ماحول اور اس کے حالات کو سامنے رکھ کر ایسا طریقہ اختیار کرے کہ وہ آپ کی طرف مائل ہو اور

آپ کی دعوت پر لبیک کہہ دے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی بات سن کر آپ سے بھاگنے کی کوشش کرے۔ اسی لئے ﴿بِالْحِكْمَةِ﴾ فرمایا۔ گویا جو لوگ دعوت کا کام کرتے ہیں ان کے لئے بنیادی چیز ''حکمت'' ہے۔ لہٰذا اس کام کو انہیں خطوط اور طریقوں پر کرنا چاہیے جو نبی کریم ﷺ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار فرمائے۔

﴿نبی کریم ﷺ کا حکیمانہ انداز﴾

ایک مرتبہ ایک نوجوان آیا اور اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجیے۔ جب اس نے یہ بات کہی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کا یہ سوال سن کر طیش میں آ گئے اور ان کے چہروں کے رنگ بدل گئے۔ نبی کریم ﷺ نے اس نوجوان کو اپنے قریب بلایا اور کہا: اچھا! یہ بتلا کہ تو جس چیز کی اجازت مجھ سے طلب کر رہا ہے؛ کیا یہ کام تو اپنی ماں کے ساتھ کرنا پسند کرتا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے پھر پوچھا: اپنی بیٹی کے ساتھ، اپنی بہن کے ساتھ، اپنی خالہ کے ساتھ، اپنی پھوپھی کے ساتھ؟ نبی کریم ﷺ نے یہ سب سوالات کئے۔ اس نے ہر ایک کا جواب نفی میں دیا کہ مَیں اس کو پسند نہیں کرتا۔ تو پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تو جس کے ساتھ یہ حرکت کرے گا وہ بھی تو کسی کی بہن ہوگی، کسی کی خالہ ہوگی، کسی کی پھوپھی ہوگی، کسی کی بیٹی ہوگی، کسی کی ماں ہوگی۔ کیا وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے؟ جب تم اپنے لئے اس چیز کو پسند نہیں کرتے تو کیا ان کے لئے پسند کرو گے؟ جب اس نے یہ جواب سنا تو فوراً عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے لئے دعا کیجیے کہ میرے دل میں سے اللہ تعالیٰ اس خیال کو نکال دے، چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور اس کے لئے دعا کی۔ (مسند الامام أحمد، ۲۵۶/۵)

دیکھئے! اگر مَیں اور آپ ہوتے تو اس پر آگ بگولہ ہوجاتے اور غصہ ہوجاتے کہ ’’کیا بول رہا ہے؟ ایک حرام کام کی اجازت طلب کررہا ہے‘‘ لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کیلئے وہ طریقہ اختیار نہیں فرمایا، بلکہ بڑی محبت سے اس کام کی قباحت اور برائی اس نوجوان کے ذہن میں بٹھائی اور جب وہ اس کو سمجھ گیا تو پھر وہ آپ ہی آپ اس بات کا اقرار کرنے لگا کہ ہاں! یہ کام کرنے جیسا نہیں ہے۔ اسی کو بتلایا گیا: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ﴾ اپنے رب کے راستہ کی طرف دانائی، سوجھ بوجھ کے ساتھ اور بھلی نصیحت کے ساتھ لوگوں کو دعوت دو۔

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی﴾ نیکی اور اللہ سے ڈرنے کے کاموں میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرو، ایک دوسرے کو قوت پہنچاؤ۔

﴿ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے......﴾

﴿وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ﴾ تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، بھلائی کی طرف بلاوے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے۔ گویا ہر معاشرہ اور سماج میں، ہر علاقہ اور بستی میں ایک گروہ اور جماعت ایسی ہونی چاہیے، تاکہ اس کی وجہ سے اس معاشرے میں نیکی اور بھلائی کو فروغ ملے اچھائی پھلے پھولے اور برائی کے راستے بند ہوں، برائیوں سے لوگوں کو نفرت پیدا ہو۔ اگر کچھ لوگ یہ کام کرتے رہیں تو اس کے نتیجے میں اس معاشرے میں کبھی بھی کسی برائی کو پنپنے کا موقعہ نہیں ملے گا۔ اور بھلائیاں؛ جن کی طرف سے لوگ غفلت برت رہے ہیں یا کوتاہیاں کررہے ہیں؛ اس کی طرف لوگوں کی رغبت ہوگی اور اس کا شوق پیدا ہوگا۔

ان ساری آیتوں میں قدرِ مشترک بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ لوگوں کو بھلائی کی طرف بلاوے ﴿الدَّلالَۃُ عَلیٰ خَیرٍ﴾ نیکی کے کاموں کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔ اور آخری آیت کے اندر ایک مزید چیز ہے ﴿وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنکَرِ﴾ بری باتوں سے روکے۔

﴿دعوت الی الخیر کی فضیلت﴾

اس سلسلہ میں روایتیں پیش فرماتے ہیں:-

عن أبی مسعود عقبۃ بن عمرو الانصاری البدری رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ دَلَّ عَلیٰ خَیرٍ؛ فَلَہٗ مِثْلُ أَجْرِ فَاعِلِہٖ.

حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو انصاری بدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ ان کو بدری کیوں کہا گیا، اس کی دو وجہیں بتلائی گئی ہیں ایک تو یہ کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر جہاں پیش آیا تھا وہاں قیام پذیر تھے۔ لیکن راجح قول جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ہیں اس لئے بدری کہا جاتا ہے۔ اگرچہ محدثین کی ایک جماعت اس طرف بھی گئی ہے کہ ان کو بدری غزوۂ بدر میں شرکت کی وجہ سے نہیں بلکہ مقامِ بدر میں اقامت اختیار کرنے کی وجہ سے کہا جاتا ہے

وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی کسی نیکی کے کام کی طرف لوگوں کی رہنمائی کرے، نیکی کا راستہ بتلائے، اس کی دعوت دے تو جو لوگ اس نیکی کے کام کو کریں گے اور اس پر ان کو جتنا ثواب ملے گا، اللہ تعالیٰ اس رہنمائی کرنے والے کو بھی اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے۔

روایتِ بالا کا شانِ ورود

یہ روایت ایک دوسرے طریق سے بھی آئی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد فرمانے کی وجہ بھی بتلائی ہے۔اس روایت کا شانِ ورود ذکر کیا گیا ہے کہ ایک آدمی نے آکر آپ ﷺ سے عرض کیا: یارسول اللہ! میری سواری کا جانور ہلاک ہو گیا اور اب مَیں اپنا سفر آگے جاری رکھنے سے قاصر ہوں، آپ مجھے سواری دیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے پاس سواری کا کوئی جانور نہیں ہے۔حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں ایک ایسا آدمی بتلاتا ہوں جو اس کو سواری کا جانور دے گا۔اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی آدمی کسی نیکی کے کام کی طرف رہنمائی اور دلالت کرے، کسی بھلے کام کا راستہ بتلائے؛ تو کرنے والے کو جو ثواب ملے گا وہی اس راستہ بتلانے والے کو بھی ملے گا۔ (ترمذی شریف، کتاب العلم، حدیث ۲۶۷۱)

اسی کو بعض دوسری روایتوں میں ان الفاظ کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے: ﴿الدَّالُّ عَلیٰ الْخَیْرِ کَفَاعِلِہٖ﴾ نیکی کے کام کی طرف دلالت کرنے والا اس کام کے کرنے والے کی طرح ہے۔ گویا دونوں کو برابر کا ثواب ملے گا۔ (المعجم الکبیر، ۱۷/۲۲۸)

اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کی مقدار میں برابری بتلائی جارہی ہے، یا نفسِ ثواب میں شرکت بتلائی جارہی ہے؟ تو بہت سے حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ جس طرح کرنے والا ثواب پاتا ہے؛ اِس کو بھی ملے گا۔نفسِ ثواب میں دونوں کو شریک بتلایا گیا ہے، مقدار کے اعتبار سے نہیں۔ظاہر ہے کہ کرنے والے کو زیادہ ثواب ملے گا اور اس کی بھی اس میں شرکت رہے گی۔

لیکن علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ دیکھو! کسی بھی نیکی کے کام پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب کا دیا جانا؛ یہ اس کا فضل ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اگر اس بتلانے والے کو بھی اتنا ہی ثواب دیں جتنا کرنے والے کو دیتے ہیں؛ تو اس میں کونسی کمی کی بات ہے۔ ثواب تو اللہ تعالیٰ کے دینے سے ملتا ہے ﴿ذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ وہ اپنی مرضی سے جس کو جتنا دے۔ اس میں کوئی اعتراض کی بات تو ہے نہیں۔ اور چونکہ حدیث میں آیا ہے کہ اتنا ہی ثواب بتلانے والے کو ملتا ہے، اس لئے علامہ قرطبی نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

بہر حال! علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو عنوان قائم کیا تھا ﴿الدَّلالَۃُ عَلیٰ خَیْرٍ﴾ نیکی کا راستہ بتلانے پر کیا ثواب ملتا ہے، اس کو بتلایا کہ نیکی کا کام کرنے والے کو عمل پر جو ثواب ملے گا؛ اتنا ہی بتلانے والے کو بھی ملے گا۔ اب اگر آپ کے بتلانے کی وجہ سے ایک آدمی نے کیا تو اتنا ثواب، اور اگر دو آدمیوں نے کیا، چار نے کیا، دس نے کیا، آپ کے بتلانے کی وجہ سے اس عملِ خیر کو جتنے بھی انجام دیں گے؛ اتنا ہی آپ کے ثواب کے اندر اضافہ ہوتا رہے گا۔ راستہ بتلانے والے اور خیر کی طرف دلالت کرنے والے کی محنت کے اوپر موقوف ہے۔ لہٰذا ہم اگر زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کر سکتے ہیں تو پھر ہم کوتاہی کیوں کریں۔

ایک آدمی دنیوی اعتبار سے اگر زیادہ کمانے پر قادر ہے، زیادہ منفعت حاصل کر سکتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیوی اعتبار سے اس منافعہ میں کمی کرنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا، وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ جتنا زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہو؛ کرے۔ اس معاملہ میں ہم اپنے آپ کو حرکت میں رکھتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں؛ تو پھر اُمورِ

اخروی میں بھی ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہماری ذات سے کسی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے؛ تاکہ اس کے اجروثواب میں ہمیں حصہ ملے۔

﴿اگلے باب اوراس باب میں فرق﴾

دیکھو! اگلا باب گذرا تھا ﴿مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً أَوْ سَيِّئَةً﴾ جس نے اچھا طریقہ یا برا طریقہ جاری کیا۔ اور یہاں ہے ﴿الدَّلَالَةُ عَلٰى خَيْرٍ﴾ نیکی کے کام کا راستہ بتلانا۔ ان دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ اُس باب کا خلاصہ ہے کہ کوئی ضروری نہیں کہ وہ دعوت بھی دے کہ یہ کرو، جیسے کہ مَیں نے مثال بھی دی تھی کہ اگر کسی سماج میں کوئی برائی کا کام نہیں ہو رہا ہے اور کسی نے پہلی مرتبہ وہ کام کیا، اگرچہ وہ لوگوں کو کہتا نہیں ہے کہ آپ بھی ایسا کیجیے، لیکن اس کو اس طرح کرتا ہوا دیکھ کر دوسروں نے کیا؛ تو اس کو بھی دوسروں کے برابر گناہ ہوگا۔ یا اگر نیکی کا کام ہے تو ثواب ملے گا۔ وہاں تو ''سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً'' یا ''سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً'' ہے کہ اچھا یا برا طریقہ جاری کیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ طریقہ جاری کرتے وقت چاہے اس نے لوگوں کو دعوت نہ دی ہو، بلکہ خود ایک کام کر لیا اور اس کو وہ کام کرتا ہوا دیکھ کر دوسرے لوگ اس راہ پر پڑ گئے؛ تو اس کو بھی ان کے ثواب میں شریک کیا جائے گا۔ جبکہ یہاں اِس باب میں ایک چیز مزید آئی کہ ایک اچھا طریقہ پہلے سے چلا آ رہا تھا، اس نے جاری نہیں کیا، لیکن اس اچھے کام کی لوگوں کو دعوت دے رہا ہے اور آمادہ کر رہا ہے، تو اس صورت میں جتنے بھی لوگ اس کے دعوت دینے کے نتیجے میں اس کام کو کریں گے، ان کو جتنا بھی ثواب ملے گا؛ اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔

﴿اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں﴾

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَنْ دَعَا اِلیٰ هُدیً كَانَ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلُ أُجُوْرِ مَنْ تَبِعَهُ، لَایَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً. وَمَنْ دَعَا اِلیٰ ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْاِ ثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنْ تَبِعَهُ. لَایَنْقُصُ ذٰلِکَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئاً. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی بھلائی کے راستہ کی طرف لوگوں کو دعوت دے گا تو اس کے نتیجے میں جتنے بھی لوگ اس راستہ پر چلیں گے ان کو جتنا ثواب ملے گا؛ اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ اب اس کو جو ثواب مل رہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کرنے والے ہیں ان کے ثواب میں سے کٹوتی اور کمی کر کے اس کو دیا جائے گا۔ بلکہ کرنے والوں کو تو عمل کا ثواب ملے گا، مزید برآں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بتلانے والے کو انہیں کے برابر ثواب ملے گا، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ دَعَا اِلیٰ ضَلَالَةٍ﴾ اوپر کی روایت میں صرف ایک بات تھی کہ جس نے کسی بھلائی کی طرف دعوت دی، اس میں برائی والی بات نہیں تھی، اس روایت میں دونوں چیزوں کو جمع کر لیا ہے۔ چنانچہ دوسرا جزو یہ ہے کوئی آدمی لوگوں کو گناہ کے کام کی یا گمراہی کی دعوت دے اور اس کے دعوت دینے اور برائی کا راستہ بتلانے کے نتیجے میں جتنے بھی لوگ اس برائی کو اختیار کریں گے اور عملی طور پر اس برائی میں مبتلا ہوں گے؛ تو ان کو جتنا گناہ ہوگا، ان کے گناہوں کے برابر اس بتلانے والے کو بھی گناہ ہوگا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کرنے والوں کے گناہ میں کوئی کمی ہو جائے گی، بلکہ ان کو تو اپنے فعل کا اتنا ہی گناہ ملے گا۔

دیکھو! اس دعوت دینے میں تو براہِ راست لوگوں کو بلایا۔ اور اچھا یا برا طریقہ جاری

کرنے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ طریقہ جاری کرنے والا موجود بھی رہا ہو۔اگلے باب میں گذرا کہ حضرت آدم علیہ السلام کا بیٹا قابیل جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت تک جتنے بھی ناحق قتل وجود میں آئیں گے،ان سارے قتلوں کا گناہ اس کو ہوگا۔تو دیکھئے!بعد میں جتنے بھی لوگ قتل کررہے ہیں ان لوگوں کو اس نے دعوت نہیں دی کہ تم قتل کرو،البتہ یہ براطریقہ اس نے جاری کیا تھا۔

دونوں باب کے عنوان میں تھوڑا سا جوفرق ہے؛مَیں وہ بتلانا چاہتا ہوں۔اِس باب میں اس بات کا بیان ہے کہ دعوت دینے کے نتیجے میں لوگ کریں گے۔اورطریقہ جاری کر کے چلا گیا اور اب دوسرے لوگ اس طریقے پر چل رہے ہیں،اگلے باب میں اُس کا بیان تھا۔

﴿مدینہ منورہ میں اخیر میں وفات پانے والے صحابی﴾

عن أبی العباس سهل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ یَوْمَ خَیْبَرَ لَأُعْطِیَنَّ الرَّایَةَ غداً رَجُلاً یَفْتَحُ اللهُ عَلیٰ یَدَیْهِ،یُحِبُّ اللهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیُحِبُّهُ اللهُ وَرَسُوْلُهٗ.فَبَاتَ النَّاسُ یَدُوکُوْنَ لَیْلَتَهُمْ أَیُّهُمْ یُعْطَاهَا.فَلَمَّا أَصْبَحَ النَّاسُ غَدَوْا عَلیٰ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ،کُلُّهُمْ یَرْجُوْ أَنْ یُّعْطَاهَا،فقال:أَیْنَ عَلِیُّ بْنُ أَبِیْ طَالِبٍ؟فَقِیْلَ:یَارَسُوْلَ اللهِ!هُوَیَشْتَکِیْ عَیْنَیْهِ.قَالَ:فَأَرْسِلُوْا اِلَیْهِ،فَأُتِیَ بِهٖ فَبَصَقَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِیْ عَیْنَیْهِ وَدَعَالَهٗ،فَبَرَأَحَتّٰی کَأَنْ لَّمْ یَکُنْ بِهٖ وَجَعٌ فَأَعْطَاهُ الرَّایَةَ.فَقَالَ عَلِیٌّ رضی اللہ عنہ یَارَسُوْلَ اللهِ!أُقَاتِلُهُمْ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مِثْلَنَا؟فَقَالَ:اُنْفُذْعَلیٰ رِسْلِکَ حَتّٰی تَنْزِلَ بِسَاحَتِهِمْ،ثُمَّ ادْعُهُمْ اِلَی الْاِسْلَامِ،وَأَخْبِرْهُمْ بِمَایَجِبُ عَلَیْهِمْ مِنْ حَقِّ اللهِ تَعَالیٰ فِیْهِ،فَوَاللهِ لَأَنْ یَّهْدِیَ اللهُ بِکَ رَجُلاً وَاحِداً خَیْرٌلَّکَ مِنْ حُمُرِ النِّعَمِ. (متفق علیه)

حضرت ابوالعباس سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ انصار میں سے ہیں۔ مدینہ منورہ میں اخیر میں انتقال کرنے والے صحابی ایک قول کے مطابق یہی ہیں، ایک قول کے مطابق ۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سب سے اخیر میں مدینہ منورہ میں انتقال کرنے والے ہیں۔ اور ایک قول کے مطابق حضرت سہل بن سعد ساعدی ہیں۔ ان کا اصل نام حزن تھا، حزن عربی زبان میں سخت زمین کو کہتے ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام بدل کر سہل رکھ دیا۔ سہل نرم زمین کو کہتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم برے نام بدل دیا کرتے تھے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ بھی تھی کہ اگر کسی کا کوئی نام ایسا ہوتا کہ جس کا مطلب وترجمہ اچھا نہیں ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے نام کو بدل دیا کرتے تھے اور ایسا نام تجویز فرماتے تھے جو اچھا ہو۔ اس کو مشورہ دیتے تھے کہ اپنا نام بدل دو۔

حضرت سعید بن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ جو اکابرِ تابعین میں ہیں اور بہت سے حضرات نے تو ان کو افضل التابعین کہا ہے، ان کا بڑا اونچا مقام ہے۔ ان کے والد مسیّب صحابی ہیں اور ان کے دادا بھی صحابی ہیں۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے دادا سے پوچھا: تمہارا نام کیا ہے؟ انہوں نے کہا: حزن۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سہل کر دو۔ لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم کے طور پر نہیں فرمایا تھا بلکہ مشورہ کے طور پر فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے کہا: نہیں! میرا جو نام رکھا گیا ہے مَیں تو اسی پر باقی رہتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر ٹھیک ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں ہمارے خاندان میں مزاج کی سختی برابر رہی، اس لئے کہ حزن سخت زمین کو کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنا نام نہیں بدلا اس کا یہ اثر رہا۔

اسی لئے ہر آدمی کے نام میں اس کے نام کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ عربی میں کہا جاتا ہے ﴿لِکُلِّ مُسَمًّی حَظٌّ مِنْ اِسْمِهٖ﴾ ہر مسمّی کو اس کے نام میں سے کچھ نہ کچھ حصہ ملا کرتا ہے۔ اسی لئے نام بھی اچھے تجویز کرنے چاہئیں، اور اس میں بھی انبیاء کرام، اکابر کے ناموں سے آدمی کو برکت حاصل کرنی چاہیے۔

﴿کریکیٹروں اور ایکٹروں کے نام رکھنے کا شوق﴾

آج کل ایک مزاج یہ بھی بن گیا ہے کہ نام رکھنے میں دیکھتے ہیں کہ یہ نام کس کریکیٹر کا ہے یا سینما میں کام کرنے والے ہیرو یا ہیروئن کا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ نام رکھتے وقت ہی آپ کے ذہن میں یہ بات تھی تو اس کے اثرات تو آئیں گے ہی۔ اس لئے ان چیزوں سے بچنا چاہیے، کم سے کم اتنا اہتمام تو ہم کریں، اس میں کوئی زیادہ محنت تو نہیں کرنی پڑتی، نام رکھنے کا معاملہ ہے، اللہ کے نیک بندوں کو سامنے رکھ کر رکھو۔ آج کل یہ مزاج بنتا جا رہا ہے اور جب اس کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں تو پھر زندگی بھر روتے رہتے ہیں۔

﴿بارگاہِ نبوی سے اعلیٰ ترین سرٹیفکٹ﴾

نبی کریم ﷺ نے جنگِ خیبر کے موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ مَیں آئندہ کل جھنڈا ایک ایسے آدمی کو دوں گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں پر اس قلعہ کو فتح کرے گا۔ دوسری روایت میں تفصیل ہے کہ دو چار روز سے اس قلعہ کو فتح کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی لیکن کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک رات نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: آئندہ کل صبح مَیں ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں جھنڈا دوں گا کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھوں یہ قلعہ فتح کریں گے پھر اس آدمی کی شان اور اس کا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہے، اور اللہ اور

اس کا رسول اس سے محبت رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہر صحابی کی کیفیت اور شان یہی تھی لیکن یہاں خصوصیت سے یہ بات ارشاد فرمائی گئی۔

اب نتیجہ تو صبح کو ظاہر ہونے والا تھا کہ جھنڈا کس کو ملے گا۔ لیکن راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کو سننے کے بعد رات بھر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اسی چرچوں میں رہے کہ کس کے نام کی لاٹری نکلتی ہے، کس کی قسمت جاگتی ہے، جھنڈا کل کس کو ملے گا؟

دیکھو! ہر ایک کی تمنا تھی اور یہ تمنا اس لئے نہیں تھی کہ جھنڈا دیا جا رہا ہے اور سردار بنایا جا رہا ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس میں ایک خاص بات ارشاد فرمائی تھی ﴿یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ﴾ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرتے ہیں۔ تو اس جھنڈے کا اس کے ہاتھ میں دیا جانا؛ یہ ایک خاص وصف کی علامت بن گیا تھا جس کی تمنا ہر مومن کرتا ہے۔ اس لئے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے یہ بات رات بھر موضوعِ بحث بنی رہی کہ کون ہے جس کو یہ شرف ملے گا؟ جب صبح ہوئی تو سب حضور ﷺ کے سامنے آنے لگے۔

﴿حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام لاٹری لگی﴾

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے صحابہ بھی سامنے آ رہے تھے۔ اور ایسے موقعہ پر ہر آدمی چاہتا ہے اور سر اونچا کرتا ہے، تا کہ مجھے دیکھیں اور میرا نمبر لگ جائے، لہٰذا بڑے بڑے صحابہ بھی حضور کے سامنے اس تمنا اور امید میں آ رہے ہیں کہ شاید مجھے بلالیں اور میری قسمت کھلے۔

خیر! جن کو دیا جانا تھا وہ وہاں موجود نہیں تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: علی کہاں ہیں؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ بیمار تھے، ان کی آنکھوں میں تکلیف تھی، اس لئے وہ وہاں موجود نہیں تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب پوچھا کہ علی کہاں ہیں؟ تو بتلایا گیا کہ یا رسول اللہ! ان کی آنکھوں میں تکلیف ہے، آشوبِ چشم کی شکایت ہے اس لئے وہ یہیں نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان کو بلاؤ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا گیا، سب سے پہلے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیماری کا علاج کیا، آپ نے ان کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعابِ مبارک ڈالا اور ان کے لئے شفا کی دعا فرمائی چنانچہ اسی وقت ان کی آنکھیں اچھی ہوگئیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی درد ہی نہ ہو۔ بلکہ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد زندگی بھر کبھی ان کی آنکھوں میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ درد گیا تو ایسا گیا کہ پھر دوبارہ لوٹ کر نہیں آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی برکت تھی۔

(شرح مواہب اللدنیۃ۔ ۲/۷۷)

اسلام میں قتل وقتال بذاتِ خود مقصود نہیں ہے

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جھنڈا دیا۔ جب جھنڈا ہاتھ میں ملا تو چونکہ حضرت علی بہادر اور شجاع آدمی تھے اس لئے انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں لوگوں سے قتال کروں اور لڑوں یہاں تک کہ وہ ہمارے جیسے ہو جائیں یعنی جیسے ہم مسلمان ہیں وہ بھی اسلام لا کر مسلمان ہو جائیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ آپ آگے بڑھیے اور جب ان کے صحن یعنی آبادی کے کنارے (جس کو گجراتی میں پادر (પાદર) کہتے ہیں) پہنچ جائیں تو لڑائی میں عجلت سے کام نہ لینا۔ اگرچہ خیبر کے لوگ وہ تھے جن کو اسلام کی دعوت پہلے سے پہنچ چکی تھی اس کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو اس بات کا پابند کیا کہ پہلے ان لوگوں کو اسلام کی دعوت پیش کریں، تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام میں جہاد اور قتل وقتال بذاتِ خود مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اللہ کے بندے ہدایت پر اور سیدھے راستہ پر

آ جائیں، اور جولوگ اس میں رُکاوٹ اور روڑا بنتے ہیں؛ ان ہی کو دور کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ ان کو پہلے اسلام کی دعوت دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کو بتلایا جائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کیا کیا حقوق ہیں جو بندوں پر واجب ہوتے ہیں۔ اگر تمہاری اس دعوت کے نتیجے میں اس کو تسلیم کرلیں، اسلام لے آئیں، حقوق اللہ کی ادائیگی کے لئے آمادہ اور راضی ہو جائیں؛ تو پھر لڑائی کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

﴿کسی بندے کو ہدایت کا راستہ بتانے کی فضیلت﴾

﴿فَوَاللّٰہِ لَأَنْ یَّھْدِیَ اللّٰہُ بِکَ رَجُلاً وَاحِداً خَیْرٌ لَّکَ مِنْ حُمُرِ النِّعَمِ﴾ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ کسی کو راہِ راست دکھلائے اور کسی راہ بھٹکے ہوئے آدمی کو راستہ مل جائے، اگر ایک شخص کو بھی ہدایت مل جاتی ہے تو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے عرب میں اونٹ بڑا قیمتی مال سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ ان کا پیشہ ہی مویشی پالنا تھا اور مویشی میں سب سے اونچا مال اونٹ اور اونٹوں میں بھی سرخ اونٹ بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت کے مقابلہ میں یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

اس حدیث کے ذریعہ سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی کو دنیوی دولت حاصل کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی ذات سے اللہ تبارک وتعالیٰ لوگوں کو راہِ راست پر لائے۔ چاہے کافر اسلام قبول کرے، چاہے ایک مسلمان جو راستہ سے بھٹکا ہوا ہے، بدعملی میں مبتلا ہے، آپ کے سمجھانے اور فہمائش کے نتیجے میں وہ اپنی بدعملی چھوڑ دے۔ یا تو اس کی پوری زندگی بدعملی میں گذر رہی ہے اور آپ کے سمجھانے کی وجہ سے اس کی زندگی میں انقلاب آ گیا اور اس نے اپنے حالات کو درست کرلیا۔ یا کسی

ایک آدھ برائی میں مبتلا ہے جیسے شراب نوشی یا مخدرات اورنشہ آور اشیاء کا استعمال کرتا ہے، سنیما بینی میں، زنا کاری میں یا ٹی وی دیکھنے میں یا کسی بھی برائی میں مبتلا ہو، اور اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ہدایت دیں۔

ہدایت عام ہے۔ چاہے ہدایت کفر سے اسلام کی طرف ہو، یا بدعملی سے نیک عملی کی طرف ہو۔اس میں بھی پوری بدعملی سے نیک عملی میں آیا ہو، یا کسی ایک چیز میں۔ بہر حال! آپ کے سمجھانے اور فہمائش سے اور آپ کی کوششوں کے نتیجے میں اس نے کوئی برائی چھوڑ دی اور بھلائی کے راستہ پر آ گیا؛ تو یہ تمہارے لئے بڑی سے بڑی دولت کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہے۔اس لئے ہمیں اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿ہماری بھی کوشش ہونی چاہیے......﴾

ہمارے معاشرے میں، ہمارے دوستوں کے حلقوں میں بہت سے احباب ایسے ہوتے ہیں کہ جو کسی برائی میں مبتلا ہوتے ہیں اور ہمیں اس کا علم ہوتا ہے کہ اس میں فلاں چیز ہے، تو ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ وہ اپنی اس برائی کو چھوڑ کر اس کے مقابلہ میں جو بھلائی ہے اس کو اختیار کر لے، یہ دوستی کا حق ہے۔ اگر ہماری کوشش کے نتیجے میں بھلائی پر آ گیا تو پھر موت تک وہ نیکی کرتا رہے گا اور اس کو جتنا ثواب ملے گا اس میں ہمارا بھی حصہ ہو جائے گا ﴿لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِداً﴾ والی فضیلت کے ہم بھی مستحق ہو جائیں گے۔ اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کافر کو مسلمان بنایا جائے، اگر یہ کام ہو جائے تو بہت اونچا کام ہے، نور علیٰ نور۔ لیکن اگر کوئی شخص چھوٹی سی برائی میں مبتلا تھا اور اس پر آپ نے محنت کی جس کے نتیجہ میں وہ برائی سے بھلائی کی طرف آ گیا؛ تب بھی ان شاء اللہ یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ اس حکم میں عموم ہے جس میں ساری محنتیں داخل ہیں۔

عملی نمونہ

وعن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّ فَتىً مِّنْ أَسْلَمَ قَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! اِنِّیْ أُرِيْدُ الْغَزْوَ وَلَيْسَ مَعِیْ مَا أَتَجَهَّزُ بِهٖ؟ قَالَ: اِئْتِ فُلَانًا فَاِنَّهٗ قَدْ كَانَ تَجَهَّزَ، فَمَرِضَ. فَأَتَاهُ فَقَالَ: اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يُقْرِؤُكَ السَّلَامَ وَيَقُوْلُ: أَعْطِنِی الَّذِیْ تَجَهَّزْتَ بِهٖ. فَقَالَ: يَافُلَانَةُ! أَعْطِيْهِ الَّذِیْ تَجَهَّزْتُ بِهٖ وَلَاتَحْبِسِیْ مِنْهُ شَيْئًا، فَوَاللهِ لَاتَحْبِسِيْنَ مِنْهُ شَيْئًا فَيُبَارَكَ لَكِ فِيْهِ. (رواہ مسلم)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلۂ اسلم کے ایک نوجوان نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں جہاد وغزوہ میں شریک ہونا چاہتا ہوں لیکن غزوہ میں شریک ہونے کے لئے جس ساز وسامان کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے سواری کے لئے گھوڑا، لڑائی کے واسطے ہتھیار، بچاؤ کے لئے زرہ اور ضرورت کا جو بھی سامان ہوتا ہے؛ وہ میرے پاس موجود نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حالات کے سازگار نہ ہونے کی وجہ سے باوجود خواہش وتمنا کے مَیں جہاد میں شرکت پر قادر نہیں ہوں۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے اس نوجوان سے فرمایا: ایسا کرو کہ فلاں آدمی کے گھر چلے جاؤ، اس آدمی نے لڑائی وجہاد میں شرکت کے واسطے تیاری مکمل کر لی تھی، لیکن وہ بیمار ہوگیا جس کی وجہ سے شریکِ سفر نہیں ہوسکتا۔ اب اس نے جو سامان تیار کر رکھا ہے اس کے پاس جا کر مطالبہ کرو کہ جو تیاری تم نے کر رکھی ہے وہ میرے حوالے کر دو تاکہ مَیں شریک ہو جاؤں۔

صحابی کی فراخ دلی

چنانچہ وہ نوجوان نبی کریم ﷺ کے بتلانے پر اس آدمی کے پاس گیا اور ان صحابی سے یوں کہا کہ نبی کریم ﷺ نے تم کو سلام کہا ہے اور یہ فرمایا ہے کہ تم نے جہاد میں جانے کے

لئے جو تیاری کی تھی وہ میرے حوالے کر دو۔ چنانچہ جب حضور کا پیغام پہنچا تو ان صحابی نے اپنی بیوی سے کہا کہ میرے سفر کے واسطے جو سامان تیار کیا تھا وہ ان کو دے دینا، اور کوئی چیز اس میں سے روکنا مت۔ چونکہ عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ ایک آدھ چیز اس میں سے روک کر رکھ لیتی ہیں، یہ سوچ کر کہ ہمارے شوہر کی ضرورت کی یہ چیز تیار کی تھی ان کو تو اس کی عادت تھی، لیکن دوسروں کو اس کی کیا ضرورت پیش آئے گی، ان کو تو چل جائے گا۔ ایسا سوچنا مت۔ اس لئے ان صحابی نے خاص طور پر تاکید کی کہ میرے لئے جو سامان تیار کیا تھا اس میں سے کوئی چیز روک کر مت رکھیو، اس لئے کہ حضور ﷺ کے اس فرمانے کے بعد اگر کوئی چیز روک لوگی تو اس میں برکت نہیں ہوگی۔ اگر ایسا سوچ کر ایک آدھ چیز بھی تم نے روک لی تو اس میں کچھ برکت ہونے والی نہیں ہے، اور وہ تمہارے کام کی بھی نہیں رہے گی۔ تو ایک تو یہ ہوگا کہ وہ ادھر گئی بھی نہیں اس لئے ثواب سے بھی محرومی رہی، اور تمہارے کام بھی نہیں آئی۔ یہ تو ایسا ہی ہو گیا:-

نہ خُدا ہی ملا نہ وصالِ صنم ❖ نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

آپ ضرورت مند کی رہنمائی کر دیں

یہاں تو اس روایت کو لانے کا مقصد یہ ہے کہ ان صحابی کو جنگ میں کام آئے ایسا سامان نبی کریم ﷺ کے پاس موجود نہیں تھا لیکن آپ کے علم میں یہ بات تھی کہ فلاں صاحب نے تیاری کر رکھی تھی اور وہ بیماری کی وجہ سے جا نہیں پائے ہیں، ان کے پاس سب ساز و سامان موجود ہے، تو آپ ﷺ نے رہنمائی فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی ضرورتمند اپنی ضرورت لے کر آپ کے پاس آیا لیکن آپ کے پاس اس کی ضرورت پوری کرنے کی استطاعت نہیں ہے، اور آپ کے علم میں ہے کہ فلاں صاحب اس کی یہ ضرورت پوری

کردیں گے، لہٰذا آپ نے رہنمائی کردی کہ فلاں صاحب کے پاس جاؤ۔ اب وہ وہاں گیا اور ضرورت پوری ہوگئی تو اس صورت میں ان دینے والوں کو جتنا ثواب ملے گا اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔ چونکہ اس نے وہاں کا راستہ بتلایا تھا اور یہ ذریعہ بنا تھا۔ اس لئے کہ یہ اگر نہ کہتا تو وہ وہاں نہ جاتا اور وہ آدمی اس کی ضرورت پوری نہ کرتا۔

مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے

اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کسی کو مال عطا فرمایا ہو اور وہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور ایک دوسرا آدمی ہے جس کے پاس مال نہیں ہے لیکن اس مال والے کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہوا دیکھ کر اس کے دل میں واقعۃً یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی نیکی کے کاموں میں اسی طرح خرچ کرتا جس طرح یہ کر رہا ہے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی اس نیت کی وجہ سے اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے جتنا اس خرچ کرنے والے کو دیا کرتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ﴿نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ (المعجم الکبیر للطبرانی ۶/۱۸۵)﴾ مومن کی نیت اس کے عمل سے بڑھ کر ہے۔ اس لئے کہ نیت میں تو نفس نیت ہی کی وجہ سے ثواب ملا، لیکن عمل کے اندر تو ہوسکتا ہے کہ عملی طور پر اس کام کو انجام دینے میں ہم سے کوئی کوتاہی سرزد ہو جائے۔ نیت کے اندر تو کوئی کوتاہی نہیں ہوگی اگر اخلاص کے ساتھ ہے۔

روزہ افطار کرانے کی فضیلت

اسی لئے حدیث میں یہ بھی آتا ہے: ﴿مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا فَلَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ﴾ اگر کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو روزہ دار کو جو ثواب ملے گا اتنا ہی ثواب افطار کرانے والے کو ملے گا۔ (ترمذی شریف۔ کتاب الصوم۔ حدیث نمبر۔۷۰۸) رمضان کا مہینہ آرہا ہے، اس لئے اس بات کا بھی اہتمام

کرنا چاہیے، خاص طور پر غرباء جو مستطیع نہیں ہیں (ویسے تو ہر روزہ دار کو آپ افطار کرائیں گے تو یہ ثواب ملے گا لیکن) ایسے لوگوں کے واسطے اگر انتظام کریں گے تو دوہرا ثواب ملے گا اب اس افطار کرانے کے واسطے ضروری نہیں ہے کہ آپ لمبا چوڑا دستر خوان ہی سجائیں بلکہ آپ نے روزہ دار کو فالودہ کھلا دیا، شربت پلا دیا، یا ایک کھجور ہی کھلا دی؛ تب بھی یہ ثواب مل جائے گا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب جو قائم کیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ کسی نیکی کے کام کی طرف اگر کسی کی رہنمائی کی جائے اور چاہے آپ نے وہ کام نہیں کیا، دوسرے نے وہ کام کرلیا، تو اس کو جتنا ثواب ملے گا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ بتلانے والے کو بھی اتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے۔ اس لئے ہمیں اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور اس چیز میں ہمیں کوتاہی اور سستی کبھی بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے۔

دُعاء

اے اللہ! ہمیں نیکی کے کاموں کے لئے ذریعہ بنا اور اس کی دعوت دینے والا بنا، اور جو لوگ برائی کی دعوت دیتے ہیں اے اللہ! دانستہ یا نادانستہ اس گروہ میں شریک ہونے سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! آنے والے ماہِ مبارک کو کما حقہ وصول کرنے کی توفیق نصیب فرما۔ اس کی برکات سے ہمیں اور اہل وعیال و اہل خاندان اور سب متعلقین کو مالا مال فرما۔ اے اللہ! اس کی قدردانی ہمیں نصیب فرما، اس کے لئے پہلے سے تیاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! تیرے نیک بندوں نے جس طرح اس کو وصول کیا؛ اسی طریقہ سے وصول کرنے کا اہتمام کرنے کی توفیق عطا فرما۔

التَّعَاوَنُ عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

﴿نیکی اور تقویٰ میں مدد و تعاون﴾

شعبان ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم دسمبر ۱۹۹۷ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:—

فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

﴿آپس تعاون کی بنیاد کیا؟﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان قائم کیا ہے ''اَلتَّعَاوُنُ عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی'' نیکی اور گناہ سے بچنے کے معاملے میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ (تعاون) کا معنیٰ ہے آپس میں ایک دوسرے کو تقویت پہنچانا۔ کسی کام کو انجام دینے کے معاملے میں مدد کرنا۔

شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ نیکی و بھلائی دنیا کے اندر پھیلے اور اس کو ترقی ہو اور بدی و بُرائی ختم ہو اس کی جڑ کٹے۔ اس لئے شریعت نے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ہر اعتبار سے ایک دوسرے کے تعاون کا حکم دیا ہے۔ دنیوی اعتبار سے تعاون کی بنیاد کچھ اور ہوا کرتی ہے، جیسے فلاں آدمی ہمارے خاندان کا ہے اس لئے اس کا تعاون کرو، چاہے وہ بھلائی کا کام کر رہا ہے تب بھی، اور اگر ہم سمجھ رہے ہیں کہ وہ بُرائی میں ہے اور غلط ہے تب بھی؛ اس کا تعاون کرتے ہیں، اس کا ساتھ دیتے ہیں اور اس کو سپورٹ (Support) کرتے ہیں اسی کو شریعت کی اصطلاح میں عصبیت اور گروہ بندی کہتے ہیں کہ فلاں ہمارے خاندان کا ہے

ہماری برادری اور جماعت کا ہے، ہماری پارٹی کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی کوئی بھی دنیوی بنیاد کے اوپر آپ اس کو سپورٹ (Support) کر رہے ہیں، چاہے وہ حق پر ہو یا باطل پر ہو، چاہے جو کام وہ کر رہا ہے وہ صحیح ہو یا غلط ہو۔ ویسے صحیح اور درست کام ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن غلط کام کے اندر محض اس بنیاد پر آپ اس کا ساتھ دیں کہ اس کے ساتھ آپ کا کوئی تعلق ہے؛ تو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت تو یہ حکم دیتی ہے کہ نیکی اور بھلائی کا کام جہاں کہیں بھی ہو رہا ہے، جس کسی کے ہاتھ سے ہو رہا ہے، آپ کا کوئی تعلق والا کر رہا ہے یا کوئی غیر کر رہا ہے؛ آپ اس کا ساتھ دیں اور تعاون کریں۔

ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے ناطے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس بات کا مکلّف کیا گیا ہے کہ ہم دنیا کے اندر نیکی اور بھلائی کو فروغ دیں اور برائی اور گناہ کے کاموں کو ختم کریں۔ لہٰذا جو آدمی اس مشن کو لے کر چل رہا ہو، ہماری طرف سے دستِ تعاون دراز ہونا چاہیے، اس کے تعاون میں ہماری طرف سے جو کچھ بھی ہو سکتا ہو؛ ہم اپنی طرف سے دریغ نہ کریں۔ وہ کون ہے؛ اس کی طرف نظر نہ کریں۔ بلکہ وہ کس کے کام کو لے کر چل رہا ہے؛ اس کو دیکھیں۔ شریعت نے تعاون اور عدمِ تعاون کی بنیاد اسی پر رکھی ہے۔ اور اس کو علامہ نوویؒ یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ نیکی کے کاموں میں، اور گناہ سے بچنے کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو، اور گناہ، نافرمانی و سرکشی کے کاموں میں تم ایک دوسرے کی مدد مت کرو۔ اگر کوئی گناہ کا کام کر رہا ہے، چاہے وہ آپ کا کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔ بیٹا ہو، بھائی ہو، آپ کے خاندان

کا آدمی ہو، آپ کی برادری کا اور پارٹی کا ہو، آپ کے وطن کا ہو، اگر وہ برا کام لے کر چل رہا ہے تو آپ اس کا تعاون نہ کیجیے۔ ایک مومن ہونے کے ناطے آپ کا فرضِ منصبی ہے کہ اس کا تعاون نہ کریں۔ ہاں! اگر آپ اس کا تعاون کرنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس کو اس برائی سے روکیں۔

﴿اپنے مومن بھائی کی ہر حال میں مدد کرو﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿أُنْصُرْ أَخَاکَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوْماً﴾ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! ﴿أَنْصُرُهٗ مَظْلُوْماً، فَکَیْفَ أَنْصُرُهٗ ظَالِماً؟﴾ اگر وہ مظلوم ہے تو مَیں اس کی مدد کروں گا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہے تو مَیں اس کی کیسے مدد کروں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روکو۔ وہ ظلم کر کے اپنے آپ پر زیادتی کر رہا ہے، اپنا نقصان کر رہا ہے، آپ اس کو ظلم کرنے سے باز رکھیں گے؛ تو یہ اس کی مدد ہوئی۔ گویا آپ نے اس کی بھلائی چاہی اور اس کو ظلم کرنے سے روک کر دنیوی فائدہ بھی پہنچایا اور اُخروی فائدہ بھی پہنچایا۔

تو شریعت نے تعاون کی اور آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی بنیاد نیکی اور بھلائی پر رکھی ہے۔ لہٰذا نیکی اور بھلائی کا کام جو کوئی بھی لے کر اُٹھے اس کا تعاون کیا جائے گا۔ اور اگر کوئی برائی کر رہا ہے، تو اس کا آپ تعاون نہ کریں۔

﴿حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا بے مثال طرزِ عمل﴾

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کے آخری زمانہ میں کچھ لوگوں نے

افواہیں پھیلا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ایک ماحول تیار کیا تھا، چنانچہ باغیوں کی ایک جماعت سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اردگرد جمع ہوگئی اور آپ کا محاصرہ کرلیا اور آپ کو یہاں تک مجبور کیا کہ آپ مسجدِ نبوی تک بھی نہیں آسکتے تھے، مسجد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود تھے، انہوں نے ان باغیوں کو وہاں سے دور کرنے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی، باغی لوگ اس طرح محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ ان کے ساتھ قتال کئے بغیر ان کو وہاں سے ہٹانا مشکل تھا۔ چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امیر تھے اس لئے صحابہ نے آپ سے اجازت طلب کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: مَیں اپنی خاطر کسی مسلمان کا خون بہانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اب امیر کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ چونکہ مسجد نبوی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہی امام بھی تھے، خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کے زمانہ میں یہی سلسلہ رہا اور ان کے بعد بھی ایک مدت تک یہی رہا کہ جو حاکمِ وقت ہوتا تھا وہی مسجد کا امام بھی ہوتا تھا۔

امامت کا مفہوم

امامت کا لفظ دو چیزوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ امامتِ کبریٰ اور امامتِ صغریٰ۔ پورے ملک کی حکومت کو امامتِ کبریٰ کہتے ہیں اور مسجد کی امامت کو امامتِ صغریٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے زمانہ میں امامت کے سلسلے میں دونوں چیزیں جڑی ہوتی تھیں، جو حاکم ہوتا تھا وہی مسجد کے اندر امام بھی ہوتا تھا۔ مسجد کی امامت کا منصب بہت اونچا ہے۔

خیر! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ امام بھی تھے، اب باغیوں نے چونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا

محاصرہ کر رکھا تھا اور اس کی وجہ سے آپ مسجد میں تشریف نہیں لا سکتے تھے تو امامت بھی نہیں کرا پا رہے تھے۔ اور باغیوں کا جو سرغنہ تھا وہی مسجدِ نبوی کے اندر نماز پڑھاتا تھا۔ لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس سلسلہ میں مسئلہ پوچھا کہ آپ تو آ نہیں پاتے اور یہ نماز پڑھاتا ہے، اب کیا کریں؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو جواب دیا، میں وہ نقل کرنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا کہ نماز ایک بہترین عمل ہے اور یہ لوگ جو نماز پڑھ رہے ہیں یہ ایک اچھا کام کر رہے ہیں، لہٰذا اس میں ان کا ساتھ دیجیے۔ اور جو کام غلط کر رہے ہیں اس میں ان کا ساتھ نہ دیجیے۔ دیکھو! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ کا کتنا زیادہ اہتمام کیا۔

﴿سورۂ عصر، ترجمہ اور مختصر تفسیر﴾

﴿وَالْعَصْرِ. اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ. اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ. وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ اس سورت میں باری تعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھائی (عصر) کہتے ہیں زمانہ کو۔ زمانہ سے مراد حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کا زمانہ اور بعد میں بھی قیامت تک کا پورا زمانہ ہے۔ گویا پوری تاریخِ انسانی کی قسم کھائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں کو جو پیدا کیا اور ان کے جو حالات ہیں ان میں اگر آدمی غور کرے تو اس سے وہ حقیقت جو آگے بیان کی جا رہی ہے بالکل واضح، صاف اور کھل کر سامنے آسکتی ہے کہ ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ﴾ انسان بڑے خسارے میں ہے۔

اگر انسان اپنی ان صلاحیتوں کو جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے اور قوت و وقت کی شکل میں جو دولت و سرمایہ اس کو عطا کیا ہے اس کو اگر وہ یوں ہی ضائع کرتا ہے

تو وہ بڑے خسارے میں ہے۔ہاں! جو اس کو وصول کرتا ہے وہ البتہ خسارے میں نہیں ہے۔ اس کو آگے بیان کیا گیا ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ البتہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور اعمالِ صالحہ کئے تو گویا ایمان لاکر اور نیک اعمال کر کے انہوں نے اپنے آپ کو درست کرلیا ﴿وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ. وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ﴾ آپس میں حق اور بھلی بات کی ایک دوسرے کو تاکید کرتے ہیں۔ یہاں اسی نسبت پر اس سورۃ کو پیش کیا ہے۔تواصی کا معنیٰ کسی کو بڑی تاکید کے ساتھ کوئی کام کرنے کے لئے کہنا۔ وصیت خاص طور پر اس نصیحت کو کہا جاتا ہے جو کوئی شخص اپنے آخری وقت میں موت کے قریب اپنے متعلقین کو کیا کرتا ہے مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ ایک ایسی اہم بات ہے جو اخیر وقت میں جاتے جاتے بڑی تاکید کے ساتھ کہہ رہا ہے۔ تواصی کا لفظ ہر اس بات کے لئے بولا جاتا ہے جو کوئی آدمی کسی کو بڑی تاکید اور اہمیت کے ساتھ پیش کررہا ہو۔تو معنیٰ یہ ہوئے کہ وہ آپس میں تلقین وتاکید کرتے ہیں حق کی اور آپس میں ایک دوسرے کو تلقین وتاکید کرتے ہیں صبر کی۔نیکی کے کاموں میں آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا؛ یہ حق کی تاکید کرنے میں داخل ہے،اس نسبت سے یہاں لائے ہیں۔

﴿امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد﴾

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سورت کے سلسلہ میں ایک بات ارشاد فرمائی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر لوگ اس چھوٹی سی سورت کے اندر غور وفکر کرنے کے معاملہ میں بڑی غفلت برت رہے ہیں۔اگر آدمی اس سورت کے اوپر غور وفکر کرے اور سوچے تو وہ اپنی زندگی کے اوقات کو کار آمد بنا سکتا ہے۔اور اگر اس کی طرف سے غفلت برتے تو اللہ تعالیٰ نے وقت کی شکل میں جو دولت اور سرمایہ عطا فرمایا ہے اس کو یوں ہی ضائع کردے گا۔اکثر لوگ اس

معاملے میں غفلت برتتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے اس سرمایہ سے پورے طور پر فائدہ نہیں اُٹھاتے، اس لئے گھاٹے اور نقصان میں رہتے ہیں۔

﴿جہاد کا سامان فراہم کر دینا﴾

عن أبی عبدالرحمن زیدبن حارث الجهنی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مَنْ جَهَّزَ غَازِ یًافِیْ سَبِیْلِ اللہِ فَقَدْغَزیٰ. وَمَنْ خَلَفَ غَازِیًافِیْ أَهْلِهٖ بِخَیْرٍ فَقَدْغَزیٰ.

حضرت ابوعبدالرحمٰن زید بن حارث جہنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ کے راستے میں جہاد کے لئے جارہا ہے اس کو کوئی آدمی سامان تیار کر کے دے یعنی جہاد کے لئے جو جارہا ہے اس کے پاس جہاد کا سامان نہیں ہے، تلوار، ہتھیار اور جن چیزوں کی جہاد میں ضرورت پیش آتی ہے وہ اس کے پاس نہیں ہے، دوسرا آدمی صاحبِ حیثیت اور صاحبِ ثروت ہے وہ اس کی مدد کرتا ہے اور اس کے لئے جہاد کا سامان تیار کر دیتا ہے، تو خود اس نے بھی غزوہ میں شرکت کی۔ گویا کسی کو جہاد کا سامان تیار کر کے دینا ایسا ہی ہے جیسا خود جہاد کے اندر شرکت کرنا۔ نیکی کے کام میں اس نے مدد کی اور تعاون کیا اس لئے یہ بشارت ہے۔

﴿وَمَنْ خَلَفَ غَازِیًافِیْ أَهْلِهٖ بِخَیْرٍ فَقَدْغَزیٰ﴾ اور جو آدمی کسی غازی اور اللہ کے راستے میں نکلنے والے کے گھر والوں کی بھلائی کے ساتھ خبر گیری کرے، اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا جہاد میں شرکت کرنے والے غازی کو ملتا ہے۔ خلف کا حقیقی ترجمہ ہے اس کی جانشینی کرنا۔ یعنی صاحبِ خانہ موجود تھا تو اپنے گھر کی ضروریات پوری کرتا رہتا تھا کہ بازار جا کر ضروریات لاتا تھا یا اور کوئی ضروریات ہوتی تھی اس کو پورا کرتا تھا، اب اس کی عدم

موجودگی میں گھر والوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا وہ اہتمام کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر نیکی کے کام کے اندر یہی قاعدہ ہے کہ کوئی آدمی کسی بھی بھلائی کے کام کے اندر لگا ہوا ہو، اور اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے وہ اپنی بعض ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہے، اور کوئی دوسرا آدمی اس کا تعاون اور مدد کرتا ہے؛ تو بڑی فضیلتوں کو حاصل کرتا ہے۔

مثلاً ایک آدمی جو پڑھنے پڑھانے میں لگا ہوا ہے اور اس وجہ سے وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اب کوئی آدمی اس کا تعاون کر کے اس کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے اسی طرح کوئی آدمی ہے جو تبلیغ میں لگا ہوا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، اب کوئی دوسرا اس میں اس کا تعاون کر رہا ہے، تو اس عمل میں لگنے والے کو جتنا ثواب ملے گا؛ اتنا ہی اس مدد کرنے والے کو بھی ملے گا۔ ہر کارِ خیر میں یہ قاعدہ جاری ہوسکتا ہے

﴿ایک بھائی دین کا کام کرے اور دوسرا کاروبار﴾

عن أبی سعید ن الخدری رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بَعَثَ بَعْثًا اِلٰی بَنِیْ لَحْیَانَ مِنْ هُذَیْلٍ فَقَالَ: لِیَنْبَعِثْ مِنْ کُلِّ رَجُلَیْنِ أَحَدُهُمَا وَالْأَجْرُ بَیْنَهُمَا. (رواہ مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر قبیلۂ ہذیل کی ایک شاخ بنولحیان کی طرف بھیجا۔ بنولحیان نے مسلمانوں کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجے ہوئے بعض صحابہ کرام جو ایک دستہ کی شکل میں گئے تھے ان کو قتل کرنے میں بھی انہوں نے حصہ لیا تھا۔ ان کے ساتھ جہاد کرنے کے واسطے اور ان کے شر کو دفع کرنے کے واسطے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک لشکر تیار کیا۔ اس موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

دو آدمیوں کے درمیان ایک آدمی تیار ہو جائے یعنی گھر میں دو آدمی ہیں تو ایک آدمی گھر کے کام کاج کے لئے رہے اور دوسرا جہاد کے لئے جاوے۔ ثواب دونوں کو ملے گا۔ اس لئے کہ جو گھر پر رہ رہا ہے، وہ گھر کی ضروریات کی تکمیل کر رہا ہے، کاروبار کو سنبھال رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کاروبار ٹھپ ہو جاتا۔ اس معنیٰ کر یہ بھی اُس جانے والے کی مدد کر رہا ہے، لٰہذا جانے والے کو جتنا ثواب ملے گا؛ اتنا ہی ثواب اس کو بھی ملے گا۔ یہی قاعدہ ہر کارِ خیر میں آپ جاری کر سکتے ہیں۔ کسی بھی نیکی کے کام کے لئے کوئی آدمی اپنے آپ کو فارغ کر لے اور اس کی ضروریات کی تکمیل کیلئے دوسرا تعاون کرے۔

دوطرفہ سلیپنگ پارٹنر شپ (Sleeping Partner ship)

مثلاً ایک کاروبار ہے اور دو بھائی ہیں، اب ان دو میں سے ایک نے کاروبار کو سنبھال لیا، دوسرے کو تعلیم کے لئے یا تبلیغ کے لئے فارغ کر دیا۔ یا اور کسی کارِ خیر کے لئے فارغ کر دیا۔ لوگوں کی خدمت کے لئے ضرورت تھی تو اس کو کہا: تم اس میں لگے رہو؛ کاروبار کو مَیں سنبھال رہا ہوں۔ تو اس صورت میں اس خدمت کے نتیجے میں اس کو جتنا بھی ثواب ملے گا؛ وہ سارے ثواب میں اس کے ساتھ یہ بھی شریک رہے گا۔ یوں سمجھئے کہ آپ نے اس کو اپنے کاروبار میں سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) بنایا ہے، تو اس نے اپنے ثواب میں آپ کو سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) بنایا ہے۔ سیدھی بات ہے جیسے وہ کام کر رہا ہے تو اس کو جو ثواب مل رہا ہے، اس میں آپ اس کے پارٹنر ہیں۔ اور آپ کاروبار سنبھال رہے ہیں اور اس میں جو منافعہ ہو رہا ہے؛ اس میں وہ آپ کا پارٹنر ہے۔ اب کون بڑا بدلہ دے رہا ہے؛ یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔

کون کسے کھلاتا ہے؟

آج کل یہ معاملہ ایسا ہو چکا ہے کہ کوئی آدمی کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو، تو اس کے گھر کے وہ افراد جو کاروبار کو سنبھالے ہوئے ہیں، اس پر احسان بھی بہت جتلاتے ہیں اور ناراضگی کا اظہار بھی کرتے ہیں، منہ بھی چڑھاتے ہیں کہ یہ تو کچھ مدد نہیں کرتا۔ حالانکہ ان کو اِس کا احسان ماننا چاہیے کہ یہ کاروبار کو سنبھال کر اُس پر جتنا احسان کر رہے ہیں، اس سے زیادہ وہ اُس کام میں لگ کر اِن پر احسان کر رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ جو ثواب کما رہا ہے یہ لوگ تو کما نہیں سکتے، اور اس کا کام وہ کر رہے ہیں تو اِس کے ثواب میں وہ بھی پورے پورے شریک ہو رہے ہیں۔ یہ بڑی اونچی چیز ہے، اور اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

دیکھئے! نبی کریم ﷺ کی تعلیمات ایسی ہیں کہ ہماری عقلیں ان کو نہیں سمجھ سکتیں۔ مثلاً ایک گھر میں کوئی بچہ ہے، یا کوئی بیمار ہے، کمزور ہے، یا کوئی بوڑھا ہے، اور وہ بچہ ہونے کی وجہ سے یا بیمار و کمزور ہونے کی وجہ سے یا بوڑھاپے کی وجہ سے کمانے سے قاصر ہے، دوسرا کما رہا ہے اور اس کو کھلا رہا ہے۔ تو ظاہر میں تو ہم یوں سمجھ رہے ہیں کہ کمانے والا جو محنت مزدوری کر کے اس کی ضرورتیں پوری کر رہا ہے؛ وہ اس کو کھلا رہا ہے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے: ﴿اِنَّکُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ﴾ تم کو روزی ملتی ہے تمہارے کمزوروں کی وجہ سے۔ تو حضور اکرم ﷺ ہم کو یوں فرما رہے ہیں کہ تم اس کو نہیں کھلا رہے ہو بلکہ وہ تم کو کھلا رہا ہے، اگر یہ یقین پیدا ہو جائے تو پھر گھروں میں آپس کی نااتفاقیاں، ناچاقیاں، لڑائی جھگڑے جو عورتوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں؛ وہ سب ختم ہو جائیں۔ ہمارے یہاں معاشرے میں ایسا ہوتا ہے کہ دو بھائی ہیں، ایک زیادہ کام کرتا ہے تو اس کی بیوی اس کے

پیچھے لگی رہے گی اور یہ بھی تھوڑے دنوں کے بعد وہی بات شروع کر دیتا ہے۔ ہمارے سماج و معاشرے کے خاندانوں میں اکثر جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

حضرت شیخ کے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ

آپ بیتی میں حضرت شیخ نے لکھا ہے: حضرت کے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ جو حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے بڑے بھائی ہوتے ہیں، ان کا کتب خانہ ''کتب خانہ یحیوی'' کے نام سے آج بھی ہے، حضرت مولانا طلحہ صاحب کے یہاں جاتے ہیں تو راستہ میں پڑتا ہے۔ وہ مولانا یحییٰ صاحب کا قائم کیا ہوا کتب خانہ ہے۔ حضرت کتابیں چھپواتے تھے اور فروخت کرتے تھے اور دوسرے بھی کام کرتے تھے، تھوڑا سا وقت اس میں بھی لگاتے تھے، حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ کی عادت یہ تھی کہ کہیں سے آڈر آیا تو کتابوں کا پیکیٹ بھی بنا رہے ہیں اور قرآنِ پاک کی تلاوت بھی کر رہے ہیں اور حساب کتاب کے لئے ایک منشی صاحب کو رکھ رکھا تھا۔ مولانا الیاس صاحبؒ اس زمانے میں پڑھتے تھے، وہ وہیں کتب خانہ ہی میں کتاب لے کر بیٹھتے تھے اور کبھی ایسے ہی بیٹھتے تھے۔ اب مولانا یحییٰ صاحب پیکیٹ باندھ رہے ہیں لیکن مولانا الیاس صاحب اس میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں، یہ سب کام مولانا یحییٰ صاحب خود ہی نمٹاتے تھے۔ ایک مرتبہ منشی جی کی زبان سے نکل گیا: مولوی الیاس دیکھتے ہو کہ بڑے بھائی کام کر رہے ہیں، کبھی تو ایک آدھ پیکیٹ باندھنے میں حصہ لے لو۔ یہ جملہ جب مولانا یحییٰ صاحب نے سنا تو غصہ ہو گئے، اور اتنا غصہ ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا غصہ نہیں ہوئے تھے اور بہت سخت تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا: آئندہ کبھی ایسا جملہ تمہاری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے۔ یہ نہ سمجھنا کہ مَیں کوئی ان کے لئے کر رہا ہوں، بلکہ مَیں تو یوں

سمجھتا ہوں کہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہے ہیں۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿اِنَّکُمْ تُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ﴾

آج اگر یہ بات ہمارے ذہنوں میں آجائے تو ہمارے معاشرے میں جتنے بھی جھگڑے ہوتے ہیں اس میں سے آدھے پونے جھگڑے ختم ہو جائیں۔ یہ پارٹنر شِپ والی ایک چیز یاد رہے کہ دونوں ایک دوسرے کو سلیپنگ پارٹنر (Sleeping Partner) بنا رہے ہیں۔

﴿نابالغ کو حج کرانے پر والدین کو بھی ثواب﴾

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ لَقِیَ رَکْبًا بِالرَّوْحَآءِ، فَقَالَ: مَنِ الْقَوْمُ؟ قَالُوْا: اَلْمُسْلِمُوْنَ. فَقَالُوْا: مَنْ أَنْتَ؟ قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰہِ. فَرَفَعَتْ اِلَیْہِ امْرَأَۃٌ صَبِیّاً، فَقَالَتْ: أَلِھٰذَا حَجٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ وَلَکِ أَجْرٌ. (رواہ مسلم)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (یہ حجۃ الوداع ہی کا واقعہ ہے) نبی کریم ﷺ حج میں تشریف لے جا رہے تھے، مقامِ روحاء میں ایک قافلہ آپ سے ملا۔ حضور نے ان قافلے والوں سے پوچھا: ﴿مَنِ الْقَوْمُ؟﴾ تم کون لوگ ہو؟ یعنی تمہارا کونسے قبیلے سے تعلق ہے؟ یا تم کون لوگ ہو؟ مسلمان ہو یا مشرک ہو؟ انہوں نے کہا: ﴿اَلْمُسْلِمُوْنَ﴾ ہم تو مسلمان ہیں۔ وہ حضور ﷺ کو نہیں جانتے تھے اس لئے انہوں نے پوچھا: ﴿مَنْ أَنْتَ؟﴾ آپ کون ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے جواب دیا ﴿رسولُ اللہ﴾ میں اللہ کا رسول ہوں۔ وہ قافلہ بھی حج کے لئے جا رہا تھا، جب ان کو معلوم ہوا کہ یہ نبی کریم ﷺ ہیں تو اس قافلہ میں سے ایک عورت نکلی، جس کے پاس چھوٹا دودھ پیتا بچہ تھا۔ اس بچے کو اس عورت نے ہاتھ میں اُٹھا کر

نبی کریم ﷺ کی طرف بڑھایا اور پوچھا: ﴿أَلِهٰـذَا حَـجٌّ﴾ اے اللہ کے رسول! کیا اس کا بھی حج ہے؟ یعنی اس بچہ کا حج ہوسکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿نَـعَمْ وَلَکِ أَجْرٌ﴾ ہاں! اس کا بھی حج ہوسکتا ہے اور اس کو حج کراؤ گی اور اپنے ساتھ حج کے افعال میں اس کو شریک رکھو گی، طواف کروگی تو اپنے ساتھ اُٹھا کر کروگی، سعی کروگی تو اپنے ساتھ اُٹھا کر کروگی؛ تو اس صورت میں تم کو بھی اس کے حج کے اندر ثواب ملے گا۔ گویا نیکی کے کام میں حصہ لیا۔

﴿نابالغ کا حج معتبر ہے؟﴾

چھوٹے بچوں کا بھی حج ہوجاتا ہے اگرچہ فرض ادا نہیں ہوتا۔ بچپن میں کیا ہوا حج نفل ہوتا ہے، بالغ ہوجانے کے بعد اللہ تعالیٰ استطاعت دے تو پھر وہ حج فرض ادا کرنا پڑتا ہے۔ باقی اتنا ضرور ہے کہ بچپن میں کیا ہوا حج معتبر ہوجاتا ہے، اور اس کی بنیاد پر آپ اس کو حاجی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن ایسا حاجی ہے کہ اس کا فریضہ ابھی ادا نہیں ہوا، وہ نفل کا درجہ رکھتا ہے جیسے چھوٹے بچے نماز پڑھتے ہیں اور سات سال، دس سال کی عمر میں نماز کا حکم بھی دیا گیا ہے تو نمازی ضرور کہلائیں گے، لیکن ان پر ابھی فرض نہیں ہے۔

یہاں تو یہ روایت اس لئے لائے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اس عورت کو جواب میں فرمایا: ﴿نَـعَمْ وَلَکِ أَجْرٌ﴾ ہاں! اس کا بھی حج ہے یعنی افعال میں تم اس کو اپنے ساتھ شریک کرلوگی تو اس کا بھی حج ہوجائے گا اور تم کو بھی اس کی وجہ سے ثواب ملے گا۔

﴿خزانچی کو بھی چند شرائط کے ساتھ صدقہ کا ثواب ملتا ہے﴾

عن أبی موسیٰ الأشعری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ انـه قال: اَلْخَازِنُ الْمُسْلَمُ الْأَمِیْنُ الَّذِیْ یُنْفِذُمَاأُمِرَ بِه، فَیُعْطِیْهِ کَامِلاً مُوَفَّرًا طَیِّبَةً بِهٖ نَفْسُهُ، فَیَدْفَعُهُ اِلیٰ الَّذِیْ أُمِرَ لَهٗ بِهٖ أَحَدُاالْمُتَصَدِّقِیْنَ

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ خزانچی جو مسلمان ہے، امانت دار بھی ہے، اس کو سیٹھ اور مالک کی طرف سے جو حکم دیا جاتا ہے اس کو خوش دلی سے پورا کرتا ہے تو وہ بھی صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جس کو مالک اور سیٹھ کی طرف سے مال کا نگران بنایا جاتا ہے، تو مالک کی طرف سے دیئے جانے والے آرڈر و احکام ہوتے ہیں کہ بھئی! یہاں اتنا دینا ہے لیکن وہ پورا نہیں دیتا، کچھ نہ کچھ تو اس میں گڑبڑ، کوتاہی اور کمی کر دیتا ہے۔ مثلاً کوئی مانگنے والا آیا تو مالک نے کہا کہ اس کو سو دے دو، تو وہ سو کے بجائے پچاس دیتا ہے، یا مدرسے کی طرف سے کوئی لینے کے واسطے آیا تو مالک نے کہا کہ اس کو پانچ سو روپے دے دو، تو وہ خازن بجائے پانچ سو کے تین سو دے کر بات ترخانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسا ہوتا ہے۔ عام طور پر خازن کے مزاج اس نوع کے ہوتے ہیں، اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اس کو جو حکم دیا گیا اس کو نافذ کرتا ہے۔ ﴿فَيُعْطِيهِ كَامِلاً مُوَفَّراً﴾ کسی کارِ خیر میں جتنا دینے کے لئے کہا گیا وہ پورے پورا دیتا ہے ﴿طَيِّبَةً بِهِ نَفْسُهُ﴾ ساتھ میں خود بھی پوری خوش دلی کے ساتھ دیتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کبھی سیٹھ کے دباؤ کی وجہ سے دے دیتا ہے کہ مالک کہہ رہا ہے لیکن اس کا جی کڑھتا ہے، اس کے دل میں یوں آتا ہے کہ اس کو اتنا کیوں دے رہے ہیں لیکن تابع ہونے کی وجہ سے مجبور ہے، اس لئے دے رہا ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جتنا دینے کے لئے کہا گیا وہ پورے پورا دیتا ہے اور خوش دلی کے ساتھ دیتا ہے۔ تو اصل صدقہ کرنے والا تو سیٹھ اور مالک ہے جس نے دینے کے واسطے کہا، لیکن یہ بھی دو صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہے۔ یعنی جتنا ثواب سیٹھ کو ملا اتنا ہی اس کو بھی ملے گا، لیکن اس کے لئے چند قیدیں آئیں کہ اول تو یہ کہ وہ مسلمان اور امین ہو، دوسرا یہ کہ جو دینے کے لئے کہا گیا وہ پورے پورا

دیتا ہو، اور تیسری شرط یہ ہے کہ خوش دلی کے ساتھ دیتا ہو۔ یہ تین باتیں اگر اس کے اندر پائی جاتی ہیں تو اس صورت کے اندر اس کو بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا دینے والے مالک کو ملتا ہے اور ثواب دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، کوئی کہے کہ پیسہ تو اس مالک کا تھا لیکن خازن ہونے کی وجہ سے اس کو بھی گراں گذرتا ہے اور جب وہ خوش دلی کے ساتھ اس کارِ خیر میں شرکت کرے گا تو اصل کام کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ثواب دیا جاتا ہے وہ تو دل کی نیت کے اوپر ہوتا ہے، آدمی کے جذبے کے اوپر ہوتا ہے کہ کس جذبے سے دے رہا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب سیٹھ نے دیا اور یہ بھی اسی مقدار سے خوش دلی کے ساتھ ادا کر رہا ہے تو جو جذبہ سیٹھ کا وہی جذبہ تقریباً اس کا بھی ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اس کو بھی اتنا ہی اجر دیا جاتا ہے، اجر اللہ تعالیٰ کی دین ہے، جس کو جتنا چاہیں دیں۔ کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔ اِس کو مال دینے پر اور اُس کو جذبے اور نیت کی وجہ سے اتنا دیا گیا۔

یہاں تو اس لئے لائے ہیں کہ اس نیکی کے کام میں اس نے برابر کا حصہ لیا اس لئے اجر و ثواب کا حقدار ہوا۔ معلوم ہوا کہ نیکی کے کاموں میں آپ جتنا بھی تعاون کریں گے، ایک دوسرے کو تقویت پہنچائیں گے، سپورٹ کریں گے؛ تو آپ کو بھی اجر و ثواب کے اندر شرکت ملے گی۔

اللّٰہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

النَّصِيحَةُ

(خیرخواہی اور بھلائی)

اقتباس

اسلام نے جن اوصاف سے متصف ہونے کی تعلیم دی ہے اور جن چیزوں کو آپسی معاشرت کو قائم کرنے کے لئے ضروری قرار دیا ہے؛ ان میں سے ایک وصف نصیحت یعنی خیر خواہی بھی ہے

حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے پورے معاشرے کو ایک جسم سے تعبیر کیا ہے کہ جسم میں مختلف اعضاء ہوتے ہیں اور وہ اعضاء ایک دوسرے سے اس طرح منسلک اور جڑے ہوئے ہیں اور ہر عضو کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر کسی بھی عضو کو تھوڑی سی تکلیف پہنچ جائے تو دوسرے سارے اعضاء اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں

مؤمنین کا حال بھی آپس میں اسی طرح ہونا چاہیے

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

تم میں سے کوئی آدمی کامل مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد.

فأعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

قال اللہ تعالیٰ: ﴿اِنَّمَاالْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾

﴿ایک جامع لفظ﴾

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿بَابٌ فِي النَّصِيْحَةِ﴾ ”نصیحة“ عربی لفظ ہے۔ عام طور پر اردو میں اس کا ترجمہ خیر خواہی کرتے ہیں، کسی کے لئے بھلائی چاہنا۔ اگرچہ اردو میں جو تعبیر اختیار کی گئی ہے وہ اس لفظ کے پورے معنٰی کو ظاہر نہیں کرتی۔ جیسا کہ لفظ ”الفلاح“ ہے۔ اذان میں آتا ہے ”حی علی الفلاح“۔ آؤ کامیابی کے لئے۔ تو اس لفظ ”الفلاح“ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک جامع لفظ ہے۔

جامع کا مطلب یہ ہے کہ اس میں الفاظ کم ہوں اور معانی اور مفہوم بہت وسیع ہو۔ لکھا ہے کہ لفظِ فلاح ایسا جامع لفظ ہے کہ عربی یا کسی دوسری زبان میں کوئی دوسرا ایسا لفظ نہیں جو اس کے معنٰی کو پورے طور پر ظاہر کرے، بلکہ اس کے معنٰی اور مفہوم کو بتلانے کیلئے کئی الفاظ لانے پڑیں گے، ایک لفظ سے کام نہیں چلے گا۔ اسی طرح لفظِ ”النصیحة“ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ یہ کلمہ بھی بڑا جامع ہے، اس کے الفاظ بہت مختصر اور کم ہونے کے باوجود

اس کے معانی اور مفاہیم بہت وسیع ہیں۔اسی لئے کہا گیا ہے:﴿حِیَازَةُ الْخَیْرِ لِلْمَنْصُوْحِ لَهٗ﴾ یعنی جس کی خیر خواہی کر رہے ہیں اس کے لئے دنیوی، اخروی، ظاہری، باطنی ہر طرح کی بھلائی چاہنا۔ ''نصیحت'' کا یہ مفہوم ادا کیا گیا ہے۔اردو میں اس کے لئے جو لفظِ خیر خواہی استعمال کیا گیا ہے وہ اس لفظ ''نصیحت'' کے بہت محدود مفہوم کو ادا کرتا ہے۔

﴿معاشرت کو قائم کرنے والا ایک ضروری وصف﴾

اسلام نے جن اوصاف سے متصف ہونے کی تعلیم دی ہے اور جن چیزوں کو آپسی معاشرت کو قائم کرنے کے لئے ضروری قرار دیا ہے؛ ان میں سے ایک وصف نصیحت یعنی خیر خواہی بھی ہے۔اس بات کو واضح کرنے کے لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی آیتوں کے دو تین ٹکڑے پیش کئے ہیں۔ایک آیت ہے﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔گویا اخوت اور بھائی چارے کا تقاضہ یہ ہے کہ بھائی اپنے بھائی کے لئے خیر و بھلائی چاہے۔

بلکہ حدیثِ پاک میں تو حضورِ اکرم ﷺ نے مؤمنین کو ایک جسم کے اعضاء سے تعبیر کیا ہے۔(بخاری شریف، ۵۵۵۲) ایک جسم کے مختلف اعضاء ہوتے ہیں اسی طرح پوری ملت ایک جسم کے مانند ہے اور اس کے جتنے بھی افراد ہیں وہ ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہوتے ہیں۔اور حضور اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت کے طور پر فرمایا کہ جسم کے کسی عضو میں تکلیف ہو جائے مثلاً انگلی پر ورم آ گیا اور اس میں خون و پیپ بھر گیا تو یہ انگلی ایک چھوٹا سا عضو ہے اور دوسرے اعضاء آنکھ وغیرہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ وزنی بھی نہیں ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی تکلیف کی وجہ سے دوسرے اعضاء یہ نہیں سوچتے کہ یہ تکلیف تو انگلی کو ہے، ہمارا

کیا ہے، ہم تو آرام سے ہیں۔ وہاں ایسا نہیں ہوتا بلکہ جب انگلی کو تکلیف ہوتی ہے تو اس تکلیف کا اثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا پورا جسم پریشان ہوجاتا ہے ﴿اَلْجَسَدُ كُلُّهُ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى﴾ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کا پورا جسم اس ایک عضو کی تھوڑی سی تکلیف کی وجہ سے بیداری اور بخار میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ انگلی میں دنبل نکل آیا تو پورا جسم آرام سے رہے، اور آنکھ کہے کہ میں تو سوتی ہوں، انگلی کو تکلیف ہے تو وہ جانے، دانت کہے کہ مجھے کیا ہے۔ بلکہ اس چھوٹی سی تکلیف کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا جسم اس تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے مسلمانوں کے پورے معاشرے کو ایک جسم سے تعبیر کیا ہے کہ جسم میں مختلف اعضاء ہوتے ہیں اور وہ اعضاء ایک دوسرے سے اس طرح منسلک اور جڑے ہوئے ہیں اور ہر عضو کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تعلق اور رشتہ ہے کہ اگر کسی بھی عضو کو تھوڑی سی تکلیف پہنچ جائے تو دوسرے سارے اعضاء اس کی تکلیف کو محسوس کرتے ہیں۔ مؤمنین کا حال بھی آپس میں اسی طرح ہونا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک مؤمن کو کوئی تکلیف پہنچی، اس کے اوپر کوئی مصیبت آئی، تو دوسرے مؤمنین اس کی طرف سے بے التفاتی و بے توجہی برتیں کہ اس کے اوپر مصیبت آئی ہے، ہمارا کیا ہے۔ ایسا نہ ہو بلکہ وہ یوں سمجھیں کہ اس کی مصیبت ہماری مصیبت ہے۔ اس آیت کو اسی لئے لائے ہیں۔

﴿ہر ایک کی بھلائی چاہنا: نبیوں کے اوصاف میں سے ہے﴾

دوسرا ارشادِ باری پیش کیا: اِخْبَارًا عَنْ نُوْحٍ عليه السلام: ﴿وَأَنْصَحُ لَكُمْ﴾

اللہ تعالیٰ نے سیدنا حضرت نوح علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف سے قرآنِ پاک میں

ان کا قول نقل فرمایا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں، خیر خواہی کرتا ہوں۔ گویا اپنے خاندان، اپنے معاشرے اور اپنی ملت کی بھلائی چاہنا؛ یہ نبیوں کے اوصاف میں سے ہے۔ چنانچہ اسی خیر خواہی کا نتیجہ تھا کہ ساڑھے نوسو (۹۵۰) سال تک حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کو ایمان کی دعوت دیتے رہے، کوئی ایک دو دن کا مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارا معاملہ ہوتا تو ہم کیا کرتے، دوسروں کو چھوڑ یئے، اپنے گھر کے فرد کو دو چار وقت سمجھاتے ہیں پھر چھوڑ دیتے ہیں۔ کسی کے باپ کو کہا جاتا ہے کہ آپ کا بیٹا یہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ مَیں نے تو اس کو بہت سمجھایا؛ لیکن نہیں مانتا تو چھوڑ دیا۔ باپ بھی بیٹے کے معاملے میں ایسا بولتا ہے۔ حالانکہ اس نے دو چار دن، دو چار ہفتے، دو چار مہینے تک سمجھایا ہوگا، لیکن اس کے بعد وہ اس سے مایوس ہو کر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن ہر نبی کو اپنی امت کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے وہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لئے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ساڑھے نوسو (۹۵۰) سال تک سمجھایا، اس میں کوئی کمی کوتاہی نہیں برتی، بلکہ برابر سمجھاتے رہے، قرآنِ پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿لیلاً ونهاراً﴾ رات و دن سمجھایا۔ ایسا نہیں کہ کسی خاص وقت میں سمجھاتے ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر شراح لکھتے ہیں، مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہاں مضارع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، عربی داں جانتے ہیں کہ فعل حدوث کو بتلانے کے لئے آتا ہے، گویا حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے اپنے قوم کی خیر خواہی کا سلسلہ برابر چلتا رہا۔

اور حضرت ہود علیہ السلام کا جملہ نقل کیا: ﴿أَنَا لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ﴾ مَیں تمہارا خیر خواہ

ہوں اور امانت دار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام پہنچانے کے لئے دیے گئے؛ ان کو پوری امانت کے ساتھ تم تک پہنچا رہا ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ تمہاری خیر و بھلائی بھی چاہتا ہوں۔

﴿ دین کی حقیقت مختصر الفاظ میں ﴾

عن أبی رقیّة تمیم بن أوس الداری رضی اللہ عنہ ان النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ. قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: لِلّٰہِ وَلِکِتَابِہٖ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِأَئِمَّۃِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِہِمْ. (رواہ مسلم)

حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ یہ صحابہ میں سے ہیں، ۹ھ میں ایمان لائے ہیں اور مسلم شریف میں ایک روایت ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حوالے سے بھی ذکر فرمائی ہے۔ اسی لئے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ان کی ایک خصوصیت ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چیز ان سے نقل فرمائی ہے۔

وہ نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ﴿اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ﴾ دین نام ہے خیر خواہی کا۔ گویا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دین کو خیر خواہی سے تعبیر فرمایا ہے۔ پورے دین کی حقیقت کیا ہے؟ اگر کوئی آدمی دین کی حقیقت کسی کے سامنے مختصر الفاظ میں پیش کرنا چاہے اور ایک لفظ میں یہ بتلانا چاہے کہ دین کیا ہے؛ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں ﴿اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ﴾ دین نام ہے خیر خواہی کا۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس کی خیر خواہی؟ تو حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کس کیلئے خیر خواہی اور بھلائی چاہنا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے رسول کے لئے، اللہ کی کتاب کے لئے، اور مسلمانوں کے حکمرانوں کے لئے اور عوامِ مسلمین کے واسطے بھلائی چاہنا۔

اللہ تعالیٰ کے لئے خیر خواہی کا کیا مطلب؟

اللہ کے واسطے نصیحت و خیر خواہی کا مطلب کیا ہے؟ کتابوں میں اسے بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمان لانا، توحید کا اقرار کرنا، اوامر کو بجالانا، نواہی سے بچنا، اللہ ہی کے واسطے کسی کے ساتھ محبت رکھنا اور اللہ ہی کے واسطے دشمناوٹ رکھنا۔

دیکھئے! اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد آدمی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا رشتہ قائم ہوجاتا ہے کہ اس کی اپنی ذات کی کوئی حیثیت نہیں رہتی، وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے لئے نچھاور کر دیتا ہے اور ختم کر دیتا ہے۔ اب وہ جو بھی کرے گا اللہ تعالیٰ ہی کی کہی کرے گا۔ اس کی آنکھ وہی دیکھے گی جو اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کے لئے کہا ہے۔ اس کے کان وہی سنیں گے جو اللہ تعالیٰ نے سننے کے لئے کہا ہے۔ اس کے ہاتھ وہی کریں گے جو اللہ تعالیٰ نے پکڑنے کے لئے کہا ہے۔ اسی طریقہ سے کسی کے ساتھ دوستی دشمنی کا معاملہ آ گیا تو وہاں بھی اپنی ذات کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہی کی خاطر دوستی اور دشمنی کرے گا اسی لئے جو اللہ کے دوست ہیں انہیں کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں؛ ان کے ساتھ تعلق قائم نہیں کرتا۔ یہ ساری چیزیں ﴿اَلنُّصْحُ لِلّٰہِ﴾ میں داخل ہیں۔

علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے خیر خواہی کے اندر جو چیزیں بتلائی گئیں ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ ان سب کا فائدہ بندہ ہی کو ملتا ہے۔ گویا اپنے ہی فائدہ کے لئے کرتا ہے۔ جیسے جتنی بھی عبادتیں ہیں وہ کہنے کو تو یہی ہے کہ بندہ ساری عبادتیں اللہ تعالیٰ کے واسطے کرتا ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تو عبادت کا جو فائدہ اور ثمرہ ہے وہ اس عبادت کرنے والے کو ہی حاصل ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا

اسی طرح یہاں لفظِ ''نصیحۃ'' اللہ تبارک وتعالیٰ کے لئے استعمال کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خیر خواہی کے ذیل میں اس کی نسبت سے جو چیزیں کی جارہی ہیں؛ اس سے اللہ تعالیٰ کو فائدہ پہنچتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ تو ان سب سے بہت زیادہ بلند وبالا ہے۔ اس کے بدلے میں فائدہ تو انسان ہی کو پہنچے گا۔

﴿اللہ تعالیٰ کی کتاب کی خیر خواہی﴾

﴿وَلِكِتَابِهِ﴾ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے لئے خیر خواہی یعنی قرآنِ پاک کی خیر خواہی۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اس پر ایمان لائے، اس کی تلاوت کا جیسا حق ہے ویسی تلاوت کرے، ترتیل کے ساتھ، تصحیح حروف کا اہتمام کرے، اور ترتیل کے واسطے جو چیزیں ضروری ہیں ان سب کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرآنِ پاک کی تلاوت کرے۔ قرانِ پاک میں جن چیزوں کا حکم دیا گیا ہے ان کو بجالائے، جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچاوے۔ قرانی اعمال کو اپنا مطمح نظر بنائے، قرانی اخلاق سے اپنے آپ کو مزین کرنے کی کوشش کرے۔ قرآنی تعلیم کو لوگوں میں عام کرے، خود بھی سیکھے اور دوسروں کو بھی سکھائے، خود بھی پڑھنے کا اہتمام کرے، دوسروں کو بھی پڑھائے، یہ ساری چیزیں ﴿اَلنُّصْحُ لِكِتَابِهِ﴾ میں داخل ہیں۔

﴿حکمرانوں کی خیر خواہی﴾

﴿وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ اور مسلمانوں کے حکمرانوں کے ساتھ خیر خواہی کرنا۔ ائمہ امام کی جمع ہے، جس کا معنیٰ ہے پیشوا اور بڑے لوگ۔ ائمہ سے مراد اکثروں نے تو یہی لیا ہے کہ حکمران طبقہ۔ بعضوں نے علماء مراد لیا ہے۔ حکمران ہوں یا علماء ہوں؛ دونوں کی

خیر خواہی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حکمران ہونے کی حیثیت سے جو صحیح احکام جاری کئے جائیں ان کی بجا آوری، اوران کی اطاعت وفرمانبرداری کا معاملہ کرنا، ان کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا اوران کی کوئی ایسی تعریف نہ کرے جس کی وجہ سے وہ غلط فہمی میں پڑ کر کسی برائی میں مبتلا ہو جائیں، اورلوگوں کوان کی اطاعت وفرمانبرداری کی دعوت دیتا رہے کہ لوگ ان کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ یہ ساری چیزیں اس میں آجاتی ہیں۔

اورعلماء شریعت کے جن احکام کی طرف رہنمائی کریں ان کو ماننا اوران کی بتائی ہوئی باتوں پرعمل پیرا ہونا۔ علماء بھی مسلمانوں کے دلوں کے حکمراں ہیں۔

عام لوگوں کی خیر خواہی

﴿وَعَامَّتِهِمْ﴾ اورعام مسلمانوں کی خیر خواہی وبھلائی چاہنا۔ اب ہر مسلمان کی بھلائی کا کیا مطلب ہے؟ اگر وہ کسی دینی کمزوری میں مبتلا ہے تو آپ اس کو اس سے دور کرکے بھلائی کی طرف لانے کی کوشش کیجیے، اوردنیوی اعتبار سے کسی مصیبت میں مبتلا ہے تو اس کا تعاون کیجیے۔ بیماری میں مبتلا ہے تو علاج معالجہ میں مدد کیجیے۔ اس طرح کی ہر چیز اس میں آجاتی ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی بیعت

عن جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: بَایَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلٰی اِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ. (متفق علیہ)

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر نماز کے قائم کرنے پر بیعت کی (بیعت کا مطلب ہے عہد کرنا، کسی کو گواہ بنا کر ایک قسم کا عہد و

پیمان اور وعدہ کیا جاتا ہے؛ اس کو بیعت سے تعبیر کرتے ہیں) نماز کے لئے لفظ اقامت استعمال کیا جاتا ہے، نماز کو قائم کرنا۔ قرآنِ پاک میں بھی اسی لفظ سے حکم دیا گیا ہے ﴿أَقِيمُوا الصَّلٰوةَ﴾ "صَلُّوا الصَّلٰوةَ" نہیں کہا کہ نماز پڑھو، بلکہ جہاں بھی آیا ہے وہاں اقامتِ صلٰوۃ آیا ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مفسرین نے لکھا ہے کہ اقامت کا مطلب ہے کہ نماز کو کما حقہ ادا کرنا۔ نماز کے تمام ارکان، واجبات، سنن و مستحبات کی رعایت کرتے ہوئے اگر کوئی آدمی نماز ادا کرتا ہے؛ تو اس کو اقامت کہتے ہیں۔ تب ہی اس کا فائدہ بھی ہوگا۔

﴿وَإِيتَاءِ الزَّكٰوةِ﴾ زکٰوۃ کے ادا کرنے پر بیعت کی۔ اگر زکوۃ واجب ہے تو اس کو ادا کریں گے۔ ﴿وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ﴾ اور ہر مسلمان کی خیر خواہی و بھلائی کرنے کا عہد و پیمان کیا۔ نصیحت کا مطلب اوپر بتلا چکا ہوں۔

﴿نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر کئے گئے عہد و پیمان کا لحاظ﴾

ان صحابی نے نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر عہد کیا تھا کہ ہر مسلمان کی خیر خواہی کریں گے۔ وہ اس عہد کا اتنا پاس ولحاظ کرتے تھے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کسی کو ایک گھوڑا خریدنے کے لئے وکیل بنایا۔ وکیل تین سو درہم کے عوض میں گھوڑا خرید کر لایا۔ مالک کو بھی ساتھ میں لایا تاکہ اس کو رقم دلوائی جائے۔ انہوں نے گھوڑا دیکھ کر اس کے مالک سے یوں کہا: تمہارا گھوڑا تو تین سو درہم سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے، اس لئے تم بجائے تین سو کے چار سو کے عوض دینے پر راضی ہو؟ جب وہ تین سو پر راضی ہو گیا تھا تو چار سو پر کیوں راضی نہ ہوتا؟ اس نے کہا: ہاں! ٹھیک ہے۔ پھر کہنے لگے: تمہارا گھوڑا تو مجھے چار سو درہم سے بھی زیادہ قیمتی

معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح چھ سو کہا، چھ سو سے سات سو کہا اور آخر میں آٹھ سو درہم میں وہ گھوڑا خریدا۔ یعنی دوسروں کی خیر خواہی کا یہ حضرات اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ اپنا نقصان بھی اس کے لئے گوارا کرلیا جاتا تھا۔ یہ تھا وہ عہد و پیمان جو نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک پر کیا اور اس کا اتنا لحاظ کیا۔

یک جان، دو قالب

عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لَایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی کامل مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ یہ روایت پہلے بھی آ گئی ہے۔ یہاں بھی اسی نسبت سے لائے ہیں کہ گویا ہر مؤمن کو اپنے مؤمن بھائی کے ساتھ ایسا ہی رشتہ و تعلق ہونا چاہیے جیسے اپنی ذات کے ساتھ ہوتا ہے، اپنی ذات کی جیسی بھلائی چاہتا ہے، ہر وقت یہ سوچتا ہے کہ کس طرح میں اپنے آپ کو فائدہ پہنچاؤں؛ اسی طرح مؤمن بھائی کے لئے بھی خیر کا طلب گار رہے۔ گویا مؤمن کے ساتھ اس کا تعلق یک جان و دو قالب جیسا ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق وسعادت نصیب فرمائے

اَلأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْیُ عَنِ الْمُنْكَرِ

بھلائی کا حکم کرنا

اور

برائی سے روکنا

مجلس ۱

شوّال المکرّم ۱۴۱۸ھ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ فروری ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد.

وَلْتَکُن مِّنکُمْ اُمَّۃٌ یَّدْعُوْنَ اِلیٰ الْخَیْرِوَیَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَأُولٰئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

﴿امر بالمعروف کی تشریح﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے ﴿الْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ﴾ ”معروف“ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے جانی پہچانی چیز، جس سے سب واقف ہوں۔ اور ”منکر“ نکارت سے ہے جس کا معنٰی ہے انجانی چیز، اُوپری چیز، جس سے کوئی واقف نہ ہو۔ نئی چیز کے لئے منکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ تو معروف کا مطلب ہوا وہ کام جو شریعت کی نگاہ میں جانے پہچانے ہوں، جن کے کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے، چاہے فرض کے طور پر کرنے کا حکم دیا ہو، چاہے واجب کے طور پر یا سنت کے طور پر یا مستحب کے طور پر۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام شریعت کی نگاہ میں مطلوب ہیں کہ یہ ہونے چاہئیں، ان کا درجہ فرض واجب سنت مستحب جو بھی ہو، ایسے کاموں کے لئے لفظِ معروف استعمال کیا جاتا ہے۔ گویا یہ وہ کام ہیں جو شریعت کی نگاہ میں جانے پہچانے اور مشہور ہیں اور ہر وہ آدمی جو شریعت سے واقف ہے؛ اس کو جانتا ہے۔

اب امر بالمعروف کا مطلب یہ ہوا کہ بھلائی کی باتوں کا اور ایسی چیزوں کا حکم کرنا

جو شریعت کی نگاہ میں مطلوب ہیں، چاہے وہ عقائد کے قبیل سے ہوں اس کی لوگوں کو دعوت و ترغیب دینا؛ یہ بھی امر بالمعروف ہے۔ چاہے اخلاق کے قبیل سے ہوں، چاہے اعمال کے قبیل سے ہوں۔ نماز روزہ وغیرہ اس کی دعوت دینا؛ یہ بھی امر بالمعروف ہے۔ چاہے افعال کے قبیل سے ہوں، چاہے اقوال کے قبیل سے ہوں یعنی وہ چیز جو زبان سے کہی جاتی ہے اس کی طرف لوگوں کو دعوت دینا؛ یہ بھی امر بالمعروف ہے۔ پھر چاہے اس کا درجہ فرض کا ہو، واجب کا ہو، سنت کا ہو، مستحب کا ہو؛ یہ تمام چیزیں لفظِ معروف کے اندر آجاتی ہیں۔ ایسی چیزوں کی لوگوں کو دعوت دینا، ان کی طرف بلانا، اس کے لئے اس کے درجے کا لحاظ کرتے ہوئے آمادہ کرنا۔ فرض کے لئے فرض کے مطابق، واجب کے لئے واجب کے مطابق، سنت اور مستحب کے لئے اسی کے مناسب۔ ایسا بھی نہیں کہ کسی چیز کا شریعت میں جو درجہ مقرر ہے اس سے اس کو بڑھا دیا جائے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اسی درجے میں رکھتے ہوئے لوگوں کو اس کی ترغیب دینا، اس کے لئے آمادہ کرنا، اس کی دعوت دینا، اس کی طرف بلانا؛ اس کا نام امر بالمعروف ہے۔ اسی کو ''بھلی بات کا حکم کرنا'' کہتے ہیں۔

﴿نہی عن المنکر کا مطلب﴾

دوسری چیز نہی عن المنکر ہے۔ منکر کا مطلب ابھی بتلایا کہ جو چیز انجانی ہو، اوپری ہو نامعلوم شئی؛ جس سے کوئی واقف نہ ہو۔ منکر نکیر وہ دو فرشتے جو قبر کے اندر سوال وجواب کیلئے آئیں گے، چونکہ ان کے چہرے ایسے ہوں گے جو مردے نے کبھی دیکھے نہیں ہوں گے، اس لئے یہ شکل وصورت اس کی نگاہوں میں بالکل اجنبی، اوپری، انجان سی ہوگی؛ اس لئے ان کو منکر نکیر کہا جاتا ہے۔

شریعت کی نگاہ میں ''منکر'' وہ کام کہلاتا ہے جس سے شریعت میں منع کیا گیا ہے

اب اس ممانعت کا درجہ جو بھی ہو، چاہے حرام ہو، یا مکروہ ہو اور پھر مکروہ میں تحریمی ہو یا تنزیہی ہو یا خلافِ اولیٰ ہو، جو بھی ہو لیکن شریعت اس کے ہونے کو پسند نہیں کرتی بلکہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ یہ کام نہ ہو؛ وہ تمام چیزیں منکر کے اندر آ جاتی ہیں۔ اور پھر اس کا تعلق عقیدے سے ہو، اخلاق سے ہو، اعمال سے ہو، پھر اس میں بھی افعال سے ہو یا اقوال سے ہو۔ بہر حال! ہر وہ چیز جو شریعت کی نگاہ میں اس قابل ہے کہ اس سے منع کیا جائے، ممانعت کا درجہ جو بھی ہو، حرمت کا ہو، کراہیت کا ہو، عدمِ اولویت کا ہو؛ ایسی تمام چیزوں کے لئے منکر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ نہی عن المنکر کا مطلب یہ ہوا کہ جو چیزیں شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہیں ان سے لوگوں کو منع کرنا، روکنا، باز رکھنا۔ یہ نہی عن المنکر ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ دو چیزیں شریعت کی جان ہیں۔ پورے دین کا مدار اور بنیاد ہی ان دونوں پر ہے۔ جب تک یہ دو شعبے مکمل طور پر کام نہیں کریں گے وہاں تک دین باقی نہیں رہ سکتا، بلکہ وجود میں بھی نہیں آ سکتا۔ اسی لئے قرآن و حدیث کے اندر اس امتِ مسلمہ کی جو خصوصیت بیان کی گئی ہے اس میں اسی چیز کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلّف کون؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں پہلی آیت لائے ہیں: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ تمہارے اندر ایک جماعت ایسی ہو جو بھلائی کی دعوت دے، بھلائی کی طرف لوگوں کو بلائے۔ خیر کا لفظ بھی عام ہے۔ بھلی باتوں کا حکم دے اور بری باتوں سے روکے؛ وہی لوگ دنیا اور آخرت میں پورے طور پر کامیابی حاصل کرنے والے ہیں۔

اب ایک سوال ہے کہ کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ایک کے لئے ضروری

ہے یا کوئی مخصوص طبقہ اس کا مکلّف ہے؟ بعض حضرات اس طرف گئے ہیں کہ امت کا ہر ہر فرد اپنی اپنی حیثیت کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا مکلّف ہے۔ اس صورت میں "مِنْکُمْ" میں لفظِ "مِنْ" جو آیا ہے تو علامہ کاظم نے فرمایا کہ یہ "مِنْ" بیانیہ ہے، تبعیضیہ نہیں ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ امت کے اندر سب ہی کے لئے ایسا کرنا ضروری نہیں، کچھ افراد ایسے ہوں جو اس کام کو انجام دیتے ہوں اور اس ڈیوٹی کو بجالاتے ہوں۔ ایسا ایک طبقہ ہر زمانہ میں ہر علاقے میں، ہر بستی میں، ہر محلے میں، ہر معاشرے کے اندر ہونا چاہیے۔ اگر ایسے لوگ ہیں تو اور لوگوں کی طرف سے ذمہ داری پوری ہوجائے گی۔ اور اگر ایسا ایک طبقہ بھی نہیں ہے تو سب ہی گنہ گار ہوں گے۔

فرضِ عین اور فرضِ کفایہ

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ذمہ داری تو سب ہی کی ہے البتہ اس کے بعد بھی کچھ لوگ اگر اس ذمہ داری کو پورا کرلیں گے تو سب کی ذمہ داری پوری ہوجائے گی، جیسے فرضِ کفایہ میں ہوتا ہے کہ یہ چیز فرض ہے، یہ کام ہونا چاہیے، سب کریں تب بھی ادا ہوجائے گا، اور اگر کچھ افراد کریں تب بھی کافی ہے، جیسے نمازِ جنازہ۔ ایک مسلمان کا انتقال ہوگیا تو شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ یہ مسلمان بغیر جنازہ کی نماز کے دفن نہیں ہوگا۔ اس کے جنازے کی نماز پڑھنا تمام لوگوں پر ضروری ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ بغیر نمازِ جنازہ کے دفن نہیں ہونا چاہیے، ایک نے پڑھ لی، دس نے پڑھ لی، بیس نے پڑھ لی، لاکھ نے پڑھ لی، اگر نمازِ جنازہ کے بعد دفن کیا گیا تو سب کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ اور اگر کسی ایک نے بھی نہیں پڑھی یہاں

تک کہ بغیر نمازِ جنازہ کے ہی اس کو دفن کرنے کی نوبت آئی؛ تو تمام لوگ گنہ گار ہوں گے۔ فرضِ کفایہ کا مطلب یہی ہوتا ہے۔

اور فرضِ عین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ چیز ہونی چاہیے اور ہر ایک کو کرنا ضروری ہے، جیسے پانچ نمازیں؛ یہ ضروری ہیں اور ہر ایک کے لئے ضروری ہیں، اگر گھر کے اندر چار آدمی ہیں اور تین نے پڑھی ایک نے نہیں پڑھی تو نہ پڑھنے والا گنہ گار ہوگا۔ بہر حال! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے متعلق بھی علماء کے اندر دو رائیں ہیں۔

اس آیت میں لفظِ ''مِنْ'' سے چونکہ اشکال ہوتا تھا اس لئے مفسرین نے یوں کہہ کر حل فرمادیا کہ یہ ''مِنْ''، تبعیض کے لئے نہیں ہے بلکہ بیان کے لئے ہے، لہٰذا ﴿وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ کا مطلب یہ ہوا ﴿كُوْنُوْا أُمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ تم ایسی امت بن جاؤ جو بھلائی کی دعوت دے۔

چنانچہ جو حضرات سب کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں وہ دلیل میں دوسری آیت پیش کرتے ہیں جو آگے آرہی ہے: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ﴾ امتِ محمدیہ کو خطاب کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے فرمایا: تم بہترین امت ہو یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ نے عالَم کے اندر جتنی بھی امتیں پیدا فرمائی ہیں ان تمام میں سب سے بہتر امت محمدیہ ہے ﴿أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ان کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بھلائی کے واسطے پیدا فرمایا ﴿تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ بھلی باتوں کا حکم کرتے ہو ﴿وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

﴿امر بالمعروف کا حکم﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ درگذر کولازم پکڑ لیجئے۔ اگر کسی آدمی کی طرف سے آپ کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا جائے تو آپ بجائے اس کے کہ اس سے انتقام اور بدلہ لیں؛ اس سے درگذر کردیجیے۔ گویا ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ درگذر کی عادت بنالیجیے، آپ کا مزاج عَفْو و صَفْح کا ہونا چاہیے ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور بھلی بات کا حکم کیجیے۔ یہاں امر بالمعروف کا تذکرہ آیا اس معنیٰ کر یہ آیت لائے ہیں۔

﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْن﴾ اور ناواقف لوگوں سے آپ اعراض اور درگذر کیجیے اگر کسی نادان کی طرف سے کوئی بات ایسی پیش آجائے تو اس نے اس حرکت کا ارتکاب نادانی کی وجہ سے کیا ہے، لہٰذا آپ اسکے ساتھ نادانی والا معاملہ نہ کریں بلکہ اس سے اعراض کریں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے مددگار اور ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ یعنی امورِ خیر میں، بھلائی اور نیکی کی باتوں میں وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں، اس لئے ﴿أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ کہا گیا۔﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ بھلی باتوں کا حکم کرتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔

﴿بنی اسرائیل کی حرکتیں اور ان پر انبیاءِ وقت کی زبانی پھٹکار﴾

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ. كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوْهُ. لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کا ارتکاب کیا، ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام کی زبان سے لعنت کی گئی۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم یہ دیا گیا تھا کہ سنیچر کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں۔ ویسے بھی ان کے یہاں سنیچر کا دن عبادت کے واسطے خاص کیا گیا تھا اس لئے اس دن دوسرے کام نہیں کرنے چاہئیں، اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی آزمائش مقصود تھی، اس لئے قدرتی طور پر ہوتا یہ تھا کہ خاص سنیچر کے دن سمندر کے اندر جب جواڑ آتا تھا تو اس کے اندر خوب مچھلیاں آتی تھیں، دوسرے دنوں میں یہ بات نہیں ہوا کرتی تھی، اس وجہ سے یہ لوگ لالچ میں آگئے اور انھوں نے یہ تدبیر اختیار کی کہ جب پانی آتا تھا تو مچھلیاں آتی تھیں اور واپس لوٹنے کا جب وقت آتا تو وہ آڑ کر دیتے تھے تاکہ مچھلیاں جانہ سکیں، پھر اس دن نہیں پکڑتے تھے بلکہ دوسرے دن پکڑتے تھے، پہلے سے جب روکے رکھا ہے تو اب شکار آسان ہو گیا۔ انہوں نے یہ ایک حیلہ شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس زمانہ کے صلحاء نے ان کو منع بھی کیا کہ ایسا مت کرو، لیکن انھوں نے نہیں مانا؛ تو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کے لئے بددعا کی، اسی پر وہ لوگ بندر بنا دیئے گئے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بنو اسرائیل کے بعض لوگوں نے مطالبہ کیا کہ آپ دعا کیجیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں سے بنا بنایا تیار دسترخوان آئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اگر وہ آئے تو اس کا حق ادا کرنا پڑے گا، اگر اس کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی اور ناشکری کا تمہاری طرف سے صدور ہوگا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے گا۔ چنانچہ آپ کی دعا پر دسترخوان آیا اور ان لوگوں نے ناشکری کی، اس کا حق ادا نہیں کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان

کے لئے بددعا کی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ لوگ سور بنا دیئے گئے۔ اسی کو یہاں ذکر کیا ہے: ﴿ذَالِکَ بِمَا عَصَوْا وَکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ﴾ یہ اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی تھی اور وہ حد سے آگے بڑھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حدود مقرر کئے گئے تھے ان کی رعایت نہیں کرتے تھے۔ ﴿کَانُوْا لَایَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَاکَانُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾ جس برائی کا انھوں نے ارتکاب کیا، اس سے باز نہیں رہتے تھے۔ ایک دوسرے کو منع نہیں کرتے تھے بلکہ اصرار کرتے تھے۔

اگر کسی آدمی سے کوئی گناہ صادر ہو جائے اور پھر اس پر ندامت ہو، آئندہ کے لئے وہ اپنے آپ کو اس سے باز رکھے تو دوسری بات ہے۔ اور ایک یہ ہے کہ آدمی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور جانتا بھی ہے کہ میں ایک نافرمانی اور گناہ کا کام کر رہا ہوں، لیکن نہ اس کو اس پر کوئی ندامت ہے، اور نہ آئندہ کے لئے باز رہنے کا عزم ہے، اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو اس سے باز رکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ﴿لَبِئْسَ مَاکَانُوْا یَفْعَلُوْنَ﴾ وہ لوگ بہت بری حرکت کرتے تھے۔

﴿کفر کی ممانعت مخصوص لہجہ میں﴾

﴿قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّکُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْیَکْفُرْ﴾ باری تعالیٰ نے فرمایا: اے نبی! کہہ دیجیے کہ تمہارے رب کی طرف سے حق یعنی دین آچکا ہے، جب ایمان کے تقاضوں پر اور دین کے اوپر عمل کی طرف آنے کی دعوت دی جا چکی ہے، اب تم میں سے جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ یعنی اگر کوئی آدمی اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، بلکہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔

یہاں پر کفر کی اجازت نہیں دی گئی ہے بلکہ بطورِتہدید کے فرمایا ہے۔عربی زبان میں امر کا صیغہ مختلف معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔تو ایک معنی اور مقصد اس کا تہدید بھی ہے،کسی کو ڈرانے،دھمکانے کے لئے کہا جاتا ہے جیسے آپ کسی کو ایک مدت تک سمجھاتے رہیں کہ ایسا مت کرو،اس کے باوجود بھی وہ باز نہ آئے تو آپ کہتے ہیں!اچھا پھر کرو۔اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کام کے کرنے کی اجازت دی گئی، بلکہ دھمکانا مقصود ہوتا ہے کہ اب اگر کرو گے تو اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔اسی طرح یہاں پر بھی ﴿فَلْيَكْفُرْ﴾ آیا ہے، کہ جو چاہے کفر کرے۔اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں ہے کہ کفر کی اجازت دی جارہی ہے۔بلکہ بطور دھمکی کے کہا جارہا ہے کہ اگر کوئی کفر کا ارتکاب کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو سزا بھگتنی پڑے گی۔گویا یہ بھی ایک معنٰی کر نہی عن المنکر ہوا،اس لئے لائے ہیں۔

﴿لاگ لپیٹ اور مداہنت نہ ہو﴾

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ باری تعالیٰ نے فرمایا:اے نبی!جن چیزوں کا آپ کو بذریعۂ وحی حکم دیا گیا ہے ان کو لوگوں کے سامنے بالکل کھول دیجیے۔کھل کر صاف صاف اعلان کر دیجیے ﴿فَاصْدَعْ﴾ کا معنٰی کسی چیز کا صاف صاف اعلان کر دینا،اس میں کوئی لاگ لپیٹ نہ رکھنا۔مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو جن چیزوں کا لوگوں تک پہنچانے کے لئے حکم دیا گیا ہے ان کے پہنچانے میں آپ کی طرف سے نعوذ باللہ کوئی مداہنت اور کمی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ کھل کر ان کو لوگوں کے سامنے پیش کیجیے۔

﴿امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ؛عمومی عذاب سے محافظ﴾

﴿وَاَنجَینَا الَّذِینَ یَنہَونَ عَنِ السُّوٓءِ وَاَخَذنَا الَّذِینَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِیسٍ بِمَا کَانُوا یَفسُقُونَ﴾ باری تعالیٰ نے فرمایا: جولوگ برائی سے منع کرتے تھے اور روکتے تھے، ہم نے ان کو نجات دے دی۔ اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، گناہوں کا ارتکاب کیا تھا ان کو بڑے سخت اور دردناک عذاب کے ذریعہ سے پکڑا، ان کی اس بدکاری کی وجہ سے جو وہ کرتے تھے۔

دیکھو! ایک بات ہے کہ اگر معاشرہ میں کسی برائی کا ارتکاب ہو رہا ہو تو اگر اس برائی کے ارتکاب کے بعد اس برائی سے روکنے والے بھی موجود ہیں یعنی اس معاشرہ میں کچھ افراد وہ بھی ہیں جو لوگوں پر اس برائی کی قباحت واضح کر کے اس سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں تو اس صورت میں اس قوم اور معاشرہ پر کوئی عمومی عذاب نہیں آئے گا، جیسا کہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔

اور اگر کسی معاشرہ میں کسی برائی کا ارتکاب کیا جائے اور اس برائی سے روکنے کا اہتمام نہ ہو، تو اس برائی کے ارتکاب پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آئے گا وہ عمومی شکل میں آئے گا اور پھر کوئی اس سے بچ نہیں سکے گا۔ وہ لوگ جنہوں نے اس برائی کا ارتکاب نہیں کیا تھا وہ بھی عذاب میں تو مبتلا ہوں گے، البتہ قیامت کے روز وہ اس گناہ کے مرتکبین میں شمار نہیں ہوں گے، لیکن دُنیا میں باری تعالیٰ کی طرف سے عمومی شکل میں جو عذاب دیا جائے گا اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں گے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ امت کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ جاری رہے، تب ہی عمومی عذاب سے حفاظت ہوگی؛ ورنہ نہیں ہوگی۔

جو آدمی کوئی برائی ہوتی دیکھے؛ تو کیا کرے؟

عن أبی سعید ن الخدری رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یقُولُ: مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ، فَإنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ، فَإنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ، وَذَالِکَ أضْعَفُ الْإیْمَانِ

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے کوئی آدمی خلافِ شرع کوئی ناجائز کام ہوتا دیکھے تو اس کو چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو دور کرے اور درست کرے۔ اور اگر ہاتھ سے روکنے کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے اس کو منع کر دے کہ بھائی! یہ مت کرو۔ اور اگر زبان سے بھی منع کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اس کو اپنے دل سے برا سمجھے۔ اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو، اس کے باوجود زبان سے روکنے پر اکتفا کرے، تو پھر دھیرے دھیرے ادنیٰ درجے کی طرف بڑھتے بڑھتے ایمان کا جو ادنیٰ ترین درجہ ہے؛ اس سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو کوشش تو یہی کرنی چاہیے کہ وہ جہاں ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو؛ وہاں پر ہاتھ سے روکے۔

اب یہ ہے کہ ہاتھ سے روکنا، زبان سے روکنا، اور دل سے برا سمجھنا؛ یہ ہر ایک کے لئے ہے یا مخصوص طبقے کے لئے ہے؟ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ ہر ایک کے لئے ہے جو ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو وہ ہاتھ سے روکے، اگر ہاتھ سے روکنے کی صورت میں اس کو اپنی جان کا ڈر ہو، اپنے مال کا یا اپنے کسی عضو کے تلف ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس صورت میں بجائے ہاتھ سے روکنے کے زبان سے روکے اور اگر اس صورت میں بھی اندیشہ لاحق ہو؛ تو پھر دل سے برا سمجھے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ طبقوں کے اعتبار سے ہے۔ جو لوگ اہلِ سلطنت

اور اصحابِ اختیار ہیں جن کے پاس طاقت اور حکومت ہے وہ اس بات کے مکلّف ہیں کہ لوگوں کو ہاتھ سے روکیں اور اس کا ارتکاب نہ کرنے دیں۔ اور جو اہلِ علم ہیں وہ اس بات کے مکلّف ہیں کہ زبان سے منع کریں۔ اور بقیہ حضرات دل سے برا سمجھیں۔ بہرحال! دل سے برا سمجھنا یہ آخری درجہ ہے، اب اگر یہ بات بھی نہیں ہے تو آدمی کو اپنے ایمان کے متعلق فکر کرنی چاہیے کہ ایمان باقی بھی ہے یا نہیں۔

﴿برائی کرنے والوں کا مقابلہ﴾

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَامِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ أُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهُ مَنْ أُمَّتِهِ حَوَارِيُّوْنَ، وَأَصْحَابٌ يَّأْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهِ وَيَقْتَدُوْنَ بِأَمْرِهِ، ثُمَّ اِنَّهَاتَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ يَقُوْلُوْنَ مَالَا يَفْعَلُوْنَ، وَيَفْعَلُوْنَ مَالَا يُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَمُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَمُؤْمِنٌ، وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَمُؤْمِنٌ، وَلَيْسَ وَرَآءَ ذٰلِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ. (رواہ مسلم)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے کسی بھی امت میں اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ اس امت میں اس نبی کے کچھ مخصوص مددگار رہا کرتے تھے۔ ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جو اس نبی کے طریقہ کو مضبوطی سے پکڑے رہتے تھے اور اس نبی کی کہی ہوئی باتوں پر چلتے تھے، اس کی پیروی کرتے تھے۔ ﴿حَوَارِیْ﴾ اس آدمی کو کہتے ہیں جس کو خصوصی تعلق ہو اور خاص مدد کرنے والا ہو۔ پھر اس کے بعد جو طبقہ آتا تھا ان میں بعض ایسے ہوتے تھے جو ایسی باتیں کہتے تھے جس کو خود کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کرتے تھے جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ

ہے کہ ایسے لوگ جو شریعت کے اوپر پورا عمل نہیں کرتے تھے، ورنہ اس نبی کے زمانہ میں اکثر وہ حضرات ہوتے تھے جو اس نبی کے طریقہ پر چلتے تھے۔

ایسے خلافِ شرع امور کا ارتکاب کرنے والوں کا جو آدمی اپنے ہاتھ سے مقابلہ کرے؛ وہ مؤمن ہے۔ جو اپنے دل سے مقابلہ کرے؛ وہ مؤمن ہے۔ اور جو ان کا مقابلہ زبان سے کرے؛ وہ بھی مؤمن ہے۔ اب اگر ان تینوں میں سے کوئی بات نہیں ہے؛ تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ گویا ان تینوں میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے گی تو کہا جا سکتا ہے کہ ان میں ایمان کی رمق ہے؛ ورنہ پھر نہیں۔

کسی بھی حال میں شریعت کا دامن نہیں چھوڑیں گے

عن أبی الولید عبادۃ بن صامت رضی اللہ عنہ قال: بَایَعْنَا رسولَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلیٰ السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِیْ الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ، وَعَلیٰ اَثَرَةٍ عَلَیْنَا، وَعَلیٰ اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللہِ تَعَالیٰ فِیْهِ بُرْھَانٌ، وَعَلیٰ اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (متفق علیه)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اس بات کی بیعت کی کہ ہم آپ کے احکام کو سنیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ اور تنگی میں اور آسانی کے اندر آپ کی اطاعت کریں گے۔ یعنی حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں ہم آپ کے احکام پر عمل کریں گے۔ بعض مرتبہ جب موافق حالات ہوتے ہیں اس وقت تو آدمی شریعت پر عمل کرتا ہے، جب کچھ مخالف حالات ہوتے ہیں تو پھر دوسری چیزوں کی طرف نگاہ اٹھانے لگتا ہے۔ یہ طریقہ درست نہیں ہے۔ آدمی جب ایمان لے آیا تو اس کے لئے ضروری ہے کہ

ہر حال میں شریعت کا جو حکم ہو؛ اسی کو بجالائے۔

﴿وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ﴾ اور خوش حالی میں اور تنگی میں آپ کی بات مانیں گے یعنی حالات ٹھیک ہوں تب بھی اور مزاج کے خلاف ہو، غربت اور تنگی کا زمانہ ہو؛ تب بھی شریعت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔

﴿وَعَلٰى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا﴾ اور ہم شریعت کے احکام کو اس وقت بھی نہیں چھوڑیں گے جب ہمارے مقابلہ میں ترجیح دی جارہی ہو۔ مثلاً حاکم کی طرف سے ایسے امور میں جو سب کے لئے یکساں ہوا کرتے ہیں اور وہ باتیں جن میں سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں ایسے موقعہ پر اُس حق دینے والے کی طرف سے بجائے اس کے کہ سب کو یکساں حق دے؛ کسی کو زیادہ دیا جارہا ہے، اسی کو ترجیح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب وہ حاکم ہو چاہے کوئی اور ہو۔ مثلاً باپ ہے اس کے چار بیٹے ہیں تو باپ کے باپ ہونے کی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے کہ چاروں بیٹوں کے ساتھ یکساں سلوک کرے لیکن وہ اگر کسی ایک بیٹے سے اچھا سلوک کرتا ہے؛ اسی کو ﴿عَلٰى أَثَرَةٍ عَلَيْنَا﴾ سے تعبیر کیا جاتا ہے، ہاں! اگر ترجیح دینے کیلئے یا مزید مناسب سلوک کرنے کے لئے شریعت کی طرف سے کوئی دلیل اور حکم موجود ہو، تو اس کو ترجیح سے تعبیر نہیں کیا جائے گا۔

بہر حال! ایسے موقعہ پر بھی کہ جب ہمارے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دی جائے تو شریعت کے دامن کو نہ چھوڑے۔ اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی یا انتقام کے لئے کوئی تدبیر سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے اگر اپنا حق ادا نہیں کیا اور آپ کے حق کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہے؛ تو اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے حوالے کردو۔ ایسا نہیں کہ آپ اس کے مقابلہ پر اتر آئیں۔

﴿ اربابِ اقتدار سے اقتدار چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے ﴾

﴿وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ﴾ اور اس بات کی بھی بیعت کی جو لوگ حاکم اور اربابِ اقتدار ہیں ان سے اقتدار چھیننے میں ہم ان سے نزاع نہ کریں۔ عام طور پر جو بڑے فتنے ملکوں کے اندر یا شہروں اور آبادیوں کے اندر واقع ہوتے ہیں؛ اس کی بنیاد یہی اقتدار ہوتی ہے کہ ایک آدمی کے پاس اقتدار ہے اس سے اُس اقتدار کو حاصل کرنے کیلئے کچھ لوگ کوشش کرتے ہیں۔ جب کچھ لوگ آگے بڑھیں گے تو آپس میں ٹکراؤ ہوگا اور اس کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں آپس میں دو جماعتیں ہو جائیں گی، اختلافات ہوں گے اور یہی چیز بڑے فتنے کا باعث ہوگی۔ اگر ملک کا اقتدار ہے تو ملک کے اندر یہ صورت پیش آئے گی۔ جس درجے کا اقتدار ہوگا اس درجے کا فتنہ ہوگا۔ اگر مسجد کے متولی بننے کا معاملہ چل پڑا کہ ایک کو ہٹا کر دوسرے کو لایا جائے؛ تو اس صورت میں اسی مسجد کے مصلیوں میں دو گروہ ہو جائیں گے جماعت کی پٹیلائی (પટેલાઈ) اور چودھراہٹ کے اندر اختلاف ہوا کہ چودھری کون بنے؟ تو جماعت میں اختلاف ہو جائے گا۔

ایک اصول ہے کہ صاحبِ اقتدار سے اقتدار چھیننے کی اگر کوشش کی جائے گی تو آپس میں جھگڑے ہوں گے اور نزاع پیدا ہوگا۔ ہاں! اگر وہ آدمی اس کا اہل نہیں ہے اور اس کو آسانی کے ساتھ الگ کیا جا سکتا ہے اور اس کو الگ کرنے کے نتیجہ میں جماعت میں دو گروہ نہیں ہوتے بلکہ سب متفق ہیں؛ تب تو کوئی اشکال نہیں ہے۔ لیکن نا اہل ہونے کے باوجود کچھ لوگ اس کے ساتھ ایسے ہیں کہ اگر اس کو الگ کیا گیا تو جماعت میں تفریق کا اندیشہ ہے تو شریعت کہتی ہے کہ تفریق کے مقابلہ میں اس نا اہل کی نا اہلیت کو برداشت کرنا زیادہ مناسب ہے۔

﴿اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی فِیْہِ بُرْھَانٌ﴾ البتہ وہ صاحبِ اقتدار اگر کسی ایسی حرکت کا ارتکاب کر رہا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ کھلم کھلا کافر ہو جاتا ہے، اسلام پر باقی نہیں رہتا، اور اس کے لئے آپ کے پاس قرآن وحدیث سے دلیل موجود ہے کہ اس حرکت کا ارتکاب کرنے کی وجہ سے وہ اسلام پر باقی نہیں رہا؛ تو اس سے اقتدار کو چھیننے کے لئے اور اس کو اقتدار سے ہٹانے کے لئے ضرور کوشش کیجیے۔ اور جب تک یہ بات نہ ہو؛ وہاں تک ایسا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔

﴿اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے﴾

﴿وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ﴾ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس بات پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیعت لی، وعدہ لیا اور عہد کرایا کہ ہم حق بات کا اظہار کریں گے کہیں بھی ہوں، اللہ تعالیٰ کے معاملے میں اور حق پر عمل کرنے کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔

بھائی! آپ شریعت پر عمل کر رہے ہیں جس کی وجہ سے لوگ آپ کو ملامت کرتے ہیں۔ مثلاً آپ نے یہ کرتا کیوں پہن رکھا ہے؟ ایسا لباس کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ ایسی شکل صورت ڈاڑھی والی کیوں بنا رکھی ہے؟ لوگ آپ کا مذاق کرتے ہیں یا آپ کی ملامت کرتے ہیں؛ تو اس معاملے میں کسی ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کی بات ہے۔ جس آدمی کو جتنی محبت ہوگی اتنا ہی زیادہ وہ شریعت پر عمل کے معاملہ میں پختہ ہوگا۔ اور جتنا تعلق کم ہوگا اتنا ہی ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ کرتا رہے گا۔

محبت اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے

جیسے آج کل لوگوں کو ایکٹروں کے ساتھ محبت ہے تو ان کا طریقہ اپنانے میں وہ مست ہیں۔ نوجوانوں کو دیکھا ہوگا کہ ماں باپ بھی کہہ رہے ہیں، پورا گھر کہہ رہا ہے، ساری دنیا کہہ رہی ہے؛ پھر بھی اس کو کسی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ جیسا ایکٹر کر رہا ہے؛ ایسا ہی یہ بھی کرنے کے لئے تیار ہے، چاہے اس نے جو بھی کیا ہو۔ اگر اس نے کان چھدوا کر اس کے اندر بالی ڈال رکھی ہے؛ تو یہ بھی کان چھدوا کر بالی ڈالنے کے لئے تیار ہے۔ ویسے تو بال کٹوائے گا نہیں، لیکن اگر اس نے آدھا سر منڈوا رکھا ہے اور آدھے پر بال رکھے ہیں؛ تو یہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ آج یہ بھی فیشن ہے۔ ویسے کچھ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ اس کے ساتھ محبت اور تعلق کی بات ہے۔

اسی طرح کسی کو اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک رسول ﷺ کے ساتھ تعلق ہوگا تو ان کے طریقوں کو اپنانے میں اس کو کسی کی پرواہ نہیں ہوگی، چاہے ساری دنیا اس کو ملامت کرتی رہے اور اس کا مذاق اڑاتی رہے۔

کل ہم ٹرین میں آ رہے تھے تو بات چیت چل رہی تھی کہ مائیکل جیکسن کی وجہ سے پورا نوجوان طبقہ خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ایک اور صاحب ہمارے ساتھ تھے، انھوں نے سنایا کہ کسی جگہ پر اس نے ایک بچے کو بوسہ دیا تو اس بچے نے ایک سال تک غسل نہیں کیا، کیونکہ غسل کرتا تو اس کا منھ جہاں لگا ہے اس کا اثر زائل ہو جاتا، اس لئے ایک سال تک غسل نہیں کیا۔ تعجب ہوتا ہے۔ آج کل یہ ایک چیز چل پڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں، شریعت کے معاملہ میں کسی

ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔یہی اللہ اور اس کے پاک رسول ﷺ کے ساتھ محبت کی اصل علامت ہے۔ اور جتنا ملامت کی طرف دھیان دے گا معلوم ہوا کہ شریعت کے ساتھ تعلق اتنا کم ہے۔ورنہ محبوب کے معاملہ میں تو کوئی بھی آجاوے، ماں باپ بھی آجائیں، گھر کا کوئی بڑے سے بڑا فرد بھی آجائے؛ تب بھی اس کی کوئی پرواہ کرنے کے لئے وہ تیار نہیں ہوتا۔ ماں باپ زیادہ روک ٹوک کریں تو کہتا دیتا ہے کہ اچھا! گھر چھوڑ کر چلا جاتا ہوں۔نوجوانوں کو اگر زیادہ چھیڑا جاتا ہے تو وہ یہاں تک پہنچتے ہیں، پھر ماں باپ بھی صلح کر لیتے ہیں کہ ٹھیک ہے۔خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی ایمان کی حقیقت اور ایمان کی وہ پختگی عطا فرمائے کہ دین کے ہر باب میں، دین کے ہر معاملہ میں ہم کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی طرف توجہ نہ کریں۔آمین۔

دُعاء

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اے اللہ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام نصیب فرما، خاص کر اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کے معاملہ میں پورے طور پر سو فیصد عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اس میں ہر قسم کی مداہنت، کاہلی اور سستی سے ہماری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی مانگی، وہ ہمیں عطا فرما، اور جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔

۲۳/شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۱/فروری ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد.

داد و دہش کے معاملہ میں اولاد کے ساتھ برابری

عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قَالَ: مَثَلُ الْقَائِمِ فِى حُدُوْدِاللّٰهِ وَالْوَاقِعِ فِيْهَا كَمَثَلِ قَوْمٍ اِسْتَهَمُوْا عَلٰى سَفِيْنَةٍ، فَصَارَبَعْضُهُمْ أَعْلاَهَا وَبَعْضُهُمْ أَسْفَلَهَا، وَكَانَ الَّذِيْنَ فِىْ أَسْفَلِهَا اِذَا اسْتَقَوْا مِنَ الْمَآءِ مَرُّوْا عَلٰى مَنْ فَوْقَهُمْ. فَقَالُوْا: لَوْأَنَّا خَرَقْنَا فِىْ نَصِيْبِنَا خَرْقًا وَلَمْ نُؤْذِ مَنْ فَوْقَنَا، فَاِنْ تَرَكُوْهُمْ وَمَا أَرَادُوْا هَلَكُوْا جَمِيْعاً، وَاِنْ أَخَذُوْا عَلٰى أَيْدِيْهِمْ نَجَوْا وَنَجَوْا جَمِيْعاً.

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں اوران کے والد بشیر رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سب سے پہلے بیعت کرنے والے یہی بشیر رضی اللہ عنہ ہیں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر ثقیفہ بنوساعدہ کے اندر جب بیعت ہوئی تو سب سے پہلے اگرچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ آپ ہاتھ بڑھایئے تاکہ میں بیعت ہوؤں لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے ہاتھ پر بیعت کریں اس سے پہلے انھوں نے ہاتھ بڑھادیا تھا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے۔ یہ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ ان کے بیٹے ہیں۔ اور ان کی والدہ عَمْرَہ بنتِ رواحہ رضی اللہ عنہا ہیں جو حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔ حضرت عبداللہ انصاری تھے اور شاعر بھی تھے، غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے ہیں۔

حدیثِ پاک میں ان کا قصہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی والدہ نے ان کے والد بشیر سے کہا کہ آپ اپنا فلاں باغ میرے بیٹے کو- جو آپ سے ہے- ہدیہ میں دے دیجیے، چنانچہ ان کے اصرار پر ابا نے ان کو باغ ہدیہ میں دے دیا۔ان کی والدہ نے پھر کہا: اچھا! اس پر حضور اقدس ﷺ کو گواہ بنا لیجیے۔انھوں نے کہا: ٹھیک ہے۔ان کے والد ان کو لیکر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اللہ کے رسول! مَیں نے اپنے اس بیٹے کو اپنا فلاں باغ ہدیہ میں دیا ہے، آپ اس پر گواہ رہیے۔حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: تمہاری اور بھی اولاد ہے؟ کہا: ہاں ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: اُن کو بھی دیا جیسا اِن کو دیا؟ کہا: نہیں! ان کو نہیں دیا۔تو آپ ﷺ نے فرمایا: مَیں ایسی ظلم اور زیادتی اور بے انصافی والی بات پر گواہ نہیں بنوں گا۔ پھر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کو ہدایا اور بخشش میں کوئی چیز دینا چاہو؛ تو برابر دو۔ (مسلم شریف۔باب کراہۃ تفضیل بعض الاولاد فی الہبۃ، حدیث ۴۱۸۲) ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی کو دیا اور کسی کو نہیں دیا۔ یا کسی کو زیادہ دیا اور کسی کو کم دیا۔ بلکہ جب آپ ان کو اپنی اولاد ہونے کی حیثیت سے دے رہے ہیں تو جیسے یہ آپ کی اولاد ہے؛ دوسری بھی آپ کی اولاد ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنی زندگی میں اپنی اولاد کے درمیان اپنی جائداد تقسیم کرنا چاہتا ہے تو اس صورت میں لڑکا ہو یا لڑکی سب کو برابر دینا چاہیے۔ایسا نہیں کہ لڑکے کو زیادہ اور لڑکی کو کم۔ یا یہ کہ لڑکوں ہی کو دیا اور لڑکیوں کو نہیں دیا۔ کیوں کہ یہ جو آپ کی طرف سے دیا جا رہا ہے وہ ہدیہ کے طور پر ہے اور اولاد ہونے میں سب برابر ہیں۔

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اولیاء اور والدین کو یہ بھی تاکید فرمائی کہ تمہاری اولاد کی اطاعت اور فرمانبرداری کے اندر مدد کرو۔یعنی تمہاری اولاد تمہاری فرمانبردار بنے اس میں ان

کی مدد کرو، ایسا نہ کرنا کہ اپنی اولاد میں سے ایک کو تو آپ دے رہے ہیں اور دوسرے کو نہیں دے رہے ہیں۔ آپ کا یہ طرزِ عمل اور روش آپ کی اس اولاد کو جس کو نہیں دیں گے آپ سے کاٹنے کا کام کرے گی، اور اس صورت میں وہ آپ کی اطاعت اور فرمانبرداری ویسی نہیں کرے گی جیسے دوسری کرتی ہیں، گویا اس اولاد کو نافرمانی پر آمادہ کرنے کا کام آپ ہی کر رہے ہیں۔ آپ جیسے اُن کے والد ہیں اِن کے بھی والد ہیں۔ اب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے، کوئی نافرمانی کرتا ہے۔

﴿ہمارے سماج کا المیہ﴾

آج کل عام رواج ہو گیا ہے کہ بڑھاپے میں اگر کسی کے یہاں ماں باپ رہتے ہیں اور اس نے ذرا خدمت کی تو اب وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ مجھے کچھ صلہ مل جائے، اور ماں باپ بھی یوں چاہتے ہیں کہ ہم اس کا فائدہ کر کے جائیں۔ اب وہ جائیداد کے معاملہ میں کہتا ہے کہ مَیں نے یہ گھر اپنے اس بیٹے کو لکھ دیا جس نے میری خدمت کی۔

ہمارے پاس تو دارالافتاء میں سوالات آتے ہی رہتے ہیں۔ وہ بھی باپ کے انتقال کے بعد کہ ابا نے وصیت کی تھی۔ کیونکہ مَیں نے خدمت کی دوسرے بھائیوں نے نہیں کی۔ ان کو تو ہم یوں جواب دیتے ہیں کہ ان کی آپ نے جو خدمت کی تھی اس کا صلہ آپ ان سے کیوں مانگتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے مانگیے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ ماں باپ کی خدمت کرو۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر آپ نے عمل کیا، دوسرے بھائیوں نے عمل نہیں کیا، تو جس کے حکم پر آپ نے عمل کیا ہے وہ ان شاء اللہ آپ کے اس عمل کا بدلہ دے گا، اور جنہوں نے عمل نہیں کیا ہے ان کو وہ ثواب اور اجر نہیں ملے گا۔ دنیا کے اندر بھی جو فائدہ آپ کو ہوگا دوسروں کو نہیں ہوگا۔ آپ ماں باپ سے کیوں وصول کر رہے ہیں اور ان کو کیوں گنہ گار بناتے ہیں۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی اپنی پوری زندگی نیکی کا کام کرتا ہے یہاں تک کہ جنت کے قریب ہو جاتا ہے لیکن موت کے وقت ایسی وصیت کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وارثوں میں سے کسی کو محروم کر دیتا ہے اور جہنم میں جاتا ہے۔ آج کل عام طور پر یہ ہو رہا ہے، اس لئے ان صحابی کا نام دیکھ کر خیال آیا کہ اس کا تذکرہ کر دوں۔

اگر اس نے خدمت کی ہے تو آپ بھی کیوں اس کو صلہ دینے کی فکر کرتے ہیں، اس نے اولاد ہونے کی حیثیت سے اپنی فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کا ثبوت دیا؛ تو اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کیا۔

﴿ایک مثال سے وضاحت﴾

اس کو مَیں ایک مثال سے سمجھایا کرتا ہوں کہ اگر آپ کو بادشاہِ وقت یوں کہے کہ فلاں کا یہ کام کر دو۔ اس کے کہنے سے آپ اس کا وہ کام کر دیں۔ پھر جس کا کام کیا ہے اس سے آپ یہ مطالبہ کریں کہ میں نے آپ کا یہ کام کر دیا اس کا مجھے معاوضہ دو۔ تو یہ آپ کی حماقت کی بات ہوگی۔ آپ نے اس کا یہ کام اس کے کہنے سے نہیں کیا ہے بلکہ بادشاہِ وقت کے کہنے سے کیا ہے، تو آپ بادشاہ سے مطالبہ کیوں نہیں کرتے؟ اگر آپ اِس سے بدلہ لیں گے تو دے دے کر کیا دے گا؟ ایک معمولی آدمی ہے جو اپنی حاجت پوری نہیں کر سکتا تھا آپ کو کچھ دے گا بھی تو معمولی چیز دے گا، اور جس بادشاہ کے کہنے سے آپ نے یہ کام کیا ہے وہ جب بدلہ دے گا تو بہت کچھ دے گا۔ اس لئے جو خدمت کرنے والے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ اس طرح اصرار کر کے ان کو گناہ میں مبتلا نہ کریں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو خدمت کرتے ہیں وہی بعد میں دباؤ بھی ڈالتے ہیں کہ آپ ہمارے واسطے یوں وصیت کر جایئے اور اس طرح وِل [will] لکھ کر جایئے۔ آج کل

ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں پھیلتی جارہی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ باپ کی طرف سے اولاد کو جو کچھ دیا جاوے تو اس چیز کا اہتمام ہونا چاہیے کہ تمام کو یکساں دے؛ چاہے لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور مرنے کے بعد جو ملتا ہے وہ وراثت کے طور پر ملتا ہے اور وراثت باپ نہیں دے رہا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں، مرنے کی وجہ سے باپ کی ملکیت تو ختم ہوگئی اب اللہ تعالیٰ کہہ رہے ہیں کہ اِس کو اتنا دیا جائے

شریعت کے اندر وراثت کا جو حکم نازل کیا وہ اللہ تعالیٰ نے نازل کیا، بیٹے کو جوڈبل (Double) دے رہے ہیں یا بیٹی کو ایک گنا (single) دے رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں، اور اس میں بہت سی حکمتیں ہیں، لیکن اگر آپ کو اپنی زندگی میں دینا ہے تو پھر برابر دیجئے، شریعت نے یہی حکم دیا۔

﴿نہی عن المنکر نہ کرنے کا نقصان...ایک مثال﴾

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿مَثَلُ الْقَائِمِ فِی حُدُوْدِ اللہِ وَالْوَاقِعِ فِیْھَا کَمَثَلِ قَوْمٍ اِسْتَھَمُوْا عَلٰی سَفِیْنَۃٍ﴾ وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کی حدود کی رعایت کرتا ہے، حدود سے یا تو تمام احکام مراد ہیں یا پھر جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے اور حرام قرار دیا ہے وہ مراد ہے، تو جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے اس سے بچتا ہے اور دوسروں کو بھی ان میں مبتلا ہونے سے روکتا ہے ایسے آدمی کو ﴿اَلْقَائِمُ فِیْ حُدُوْدِ اللہِ﴾ سے تعبیر کیا گیا ﴿وَالْوَاقِعِ فِیْھَا﴾ دوسرا وہ ہے جو اس میں مبتلا ہوتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا اور حرام قرار دیا ان کا ارتکاب کرتا ہے اور ان گناہوں کے کاموں کو انجام دیتا ہے ان دونوں کو حضور اکرم ﷺ ایک مثال سے سمجھا

رہے ہیں، ان دونوں کا حال ایسا ہے جیسے کچھ لوگ ایک کشتی کے اندر سوار ہیں اور مسافر زیادہ ہیں، کشتی بھی دو حصوں میں ہے ایک اوپر کا حصہ ہے اور دوسرا نیچے کا حصہ ہے، اب ہر شخص چاہتا ہے کہ مَیں اوپر جاؤں ، دوسرا نیچے جائے۔اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے قرعہ اندازی کی کہ جس کا نام نیچے نکلے وہ نیچے رہے اور جس کا نام اوپر نکلے وہ اوپر رہے۔

اس کے بعد دریا کا سفر شروع ہوا (دریا وہی جس کو ہم گجراتی میں ندی کہتے ہیں جو میٹھے پانی کا ہوتا ہے اس کو اردو میں دریا کہا جاتا ہے، اور جس کو ہم دریا کہتے ہیں اس کو اردو میں سمندر کہا جاتا ہے اس کا پانی کھارا ہوتا ہے) اب اس طرح سفر ہو رہا ہے کہ کچھ لوگ کشتی کے نیچے حصے میں ہیں اور کچھ اوپر کے حصے میں ہیں، نیچے والوں کو استعمال کے لئے پانی کی ضرورت پیش آتی ہے، کشتی کے اندر پانی کا ذخیرہ موجود نہیں ہے، پانی اسی دریا میں سے لینا ہے، لہٰذا اوپر والے تو آسانی سے پانی لے سکتے ہیں لیکن نیچے والوں کو پانی حاصل کرنے کیلئے اوپر آنا پڑتا ہے اور برتن میں پانی بھر کر لے جانا پڑتا ہے۔ایک تو اوپر بار بار آنے کی وجہ سے اور دوسرے پانی بھر کر لے جانے کی وجہ سے اوپر والوں کو زحمت ہوتی ہے، پانی گرتا بھی ہے، اس لئے نیچے والوں نے سوچا کہ ہم ایسا کیوں نہ کریں کہ کشتی کے اندر نیچے سوراخ کر لیں؛ تاکہ نیچے سے براہِ راست ہم پانی حاصل کر سکیں اور ہمارے بار بار اوپر آنے جانے کی وجہ سے رفقاءِ سفر کو جو تکلیف ہوتی ہے وہ بھی اس سے بچ جائیں گے، اور ہم اوپر آنے جانے کی زحمت سے بچ جائیں گے، دونوں کو راحت ہوگی۔ان کی میٹنگ ہوئی اور یہ طے ہوا کہ اچھا! ہم سوراخ کر لیں گے جب اس مشورہ کا پتہ اوپر والوں کو چلے اور وہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیں اور انھوں نے جو پلان بنایا ہے اس میں ان کو آگے بڑھنے دیں اور کوئی اوبجیکشن

(Objection) نہ اٹھائیں تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ نیچے سوراخ کرلیں گے اور پانی کشتی کے اندر آجائے گا تو نیچے والے بھی برباد ہوں گے اور اوپر والے بھی۔ حالانکہ سوراخ کرنے کا کام اوپر والوں نے کیا نہیں تھا، تو اگر اوپر والے بے تعلق رہیں گے تو نتیجہ ظاہر ہے۔ اور اگر وہ ان کا ہاتھ پکڑیں گے کہ ایسا نہیں ہوگا، ہم آپ کو اس طرح سوراخ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی بچیں گے اور نیچے والے بھی جو ایسی نادانی کی حرکت کرنے جارہے ہیں ان کو بھی بچائیں گے۔

اسی طرح امت دنیا کے اندر زندگی گذار رہی ہے اس میں کچھ لوگ تو اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کو پامال کرتے ہیں، اس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ تو جو لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا لارہے ہیں وہ یوں سوچیں کہ ہم تو اعمال کررہے ہیں، وہ لوگ خلاف ورزی کرتے ہیں تو ان کو کرنے دو، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا ان کی اس نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے کی وجہ سے جب اللہ تبارک وتعالیٰ کا عذاب آئے گا اور ہلاکت ہوگی تو ایسا نہیں ہوگا کہ وہ لوگ جو نافرمانی میں مبتلا تھے وہی ہلاک ہوں گے بلکہ ان کے ساتھ ساتھ یہ لوگ جنہوں نے نافرمانی کا ارتکاب نہیں کیا تھا لیکن اُن کو روکا بھی نہیں تھا وہ بھی دنیوی طور پر تو ہلاک ہوجائیں گے، آخرت کی بات دوسری رہے گی۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی دستور ہے کہ کسی قوم میں، کسی معاشرے میں، کسی سوسائٹی کے اندر اگر کوئی برائی کا کام ہورہا ہو تو یہ نہیں کہ جو کررہے ہیں ان کو کرنے دیا جائے بلکہ جو اس کو دیکھ رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ برائی کا کام ہے ان کو چاہیے کہ برائیوں کے کام

کرنے والوں کو روکیں اور منع کریں۔ یہ نہ سوچیں کہ چھوڑو، ان کو کرنے دو، ہمیں ان کے معاملے میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے، ہم خود بچے ہوئے ہیں بس کافی ہے۔ نہیں! اگر ایسا کر کے اپنے آپ کو الگ کرلیں گے اور لاتعلق بنالیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب آئے گا وہ عمومی شکل میں آئے گا اور وہ عذاب سب کو لے ڈوبے گا۔

بدعمل حکام کے ساتھ رعایا کا ردِّ عمل کیا ہو؟

عن أم المؤمنين أم سلمة هند بنت أبی أمية رضی اللہ عنہا عن النبی ﷺ انہٗ قال: اِنَّهٗ يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمْ اُمَرَآءُ، فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ. فَمَنْ كَرِهَ فَقَدْ بَرِئَ، وَمَنْ اَنْكَرَ فَقَدْ سَلِمَ، وَلٰكِنْ مَنْ رَضِيَ وَتَابَعَ. فَقَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللهِ! أَلَا نُقَاتِلُهُمْ؟ قَالَ: لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ.

اُم المؤمنین اُمِ سلمہ بنت اَبو اُمیہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے آئندہ کی پیشین گوئی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: تم پر کچھ ایسے لوگ امیر بنائے جائیں گے کہ وہ جو حرکتیں کریں گے اور جن اعمال کو انجام دیں گے ان میں سے بعض تو وہ ہوں گے جن کو تم جانتے ہو یعنی شریعت کے مطابق ہیں (میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ نیکی کے کام کو شریعت میں معروف سے تعبیر کیا جاتا ہے اور گناہ کے کام کو شریعت میں منکر سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور بعض کام وہ ہوں گے جو شریعت کے خلاف ہوں گے۔ چنانچہ آپ ﷺ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف ثابت ہوئی، بنوامیہ کے زمانہ میں ایسے امراء آئے جنہوں نے اسی کے مطابق کیا جو نبی کریم ﷺ پہلے سے خبر دے چکے تھے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ان امراء کی حرکتوں پر تمہاری طرف سے جو (Response) اور تأثر دیا جائے گا وہ تین طرح کا ہوسکتا ہے۔ بعض لوگ وہ ہیں جو ان کی حرکتوں کو دل سے برا سمجھتے ہیں اگرچہ زبان سے منع نہیں کرتے؛ وہ

تو بری ہو گئے یعنی اس گناہ میں شریک نہیں ہوئے۔ اور بعض لوگ وہ ہیں جنھوں نے اتنا ہی نہیں کہ فقط دل سے برا سمجھا بلکہ زبان سے منع بھی کیا اور ٹوکا؛ تو وہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے محفوظ ہو گئے۔ البتہ جو لوگ ان کی اس حرکت کے اوپر خوش ہو گئے یعنی انھوں نے تسلیم کر لیا اور وہ بھی ساتھ دینے لگے؛ وہ ان کے ساتھ شریک ہیں۔

برائی سے روکنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

دیکھو! منع کرنے کے سلسلے میں ایک بات یاد رہے کہ منع کرنے کے لئے پتھر مارنا ضروری نہیں ہے کہ اس کے سر میں مارو۔ بعض لوگ منع نہیں کرتے تو بالکل ہی نہیں کرتے اور جو منع کرنے پر آتے ہیں تو ایسا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو اختلاف اور شقاق ڈالنے والا ہوتا ہے ۔

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

کبھی منع نہیں کرتے تو کچھ بھی نہیں کہتے اور منع کرنے پر آئے تو ایسا انداز اختیار کیا کہ لوگ نفرت کرنے لگے۔ آج کل ایسا ہوتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

بچوں کی تعلیم میں نرمی سے کام لیا جائے

ایک مرتبہ ایک جگہ پر کسی مولوی صاحب نے پوچھا کہ پہلے زمانہ میں پڑھاتے تھے تو پٹائی بھی کرتے تھے، لیکن والدین کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا اور تعلیم بھی اچھی طرح ہوتی تھی، اب تو والدین بھی آ کر لڑتے ہیں اور یہ کرتے ہیں وہ کرتے ہیں؛ اب کیا کیا جائے؟ ان کو پڑھایا جائے یا نہ پڑھایا جائے؟ مَیں نے کہا کہ پہلے والدین بھی اپنی اولاد کو کچھ کہتے تھے تو اولاد سامنے کچھ نہیں کہتی تھی، اب تو اگر والدین اولاد کو کچھ کہیں تو اولاد بھی

سامنے الٹا جواب دینے لگتی ہے، لہٰذا آپ اپنے بچوں کے معاملہ میں جو طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ نرمی سے سمجھاتے ہیں؛ وہی طریقہ یہاں بھی اختیار کیجئے۔ روکنے کے لئے ضروری نہیں کہ آپ سختی سے کام لیں۔

نہی عن المنکر کے لئے کوئی سخت طرز اختیار نہ کرے

اب ایک آدمی برا کام کر رہا ہے تو آپ محبت سے بلا کر یوں کہہ دیجئے کہ بھائی! آپ جو کام کر رہے ہیں وہ شریعت کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ بس! آپ کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔ یہ نہی عن المنکر ہوگیا۔ نہی عن المنکر کے لئے ضروری نہیں کہ آپ شور مچائیں اور ڈنڈا لے کر اس کی پٹائی شروع کردیں۔ آپ نے اس کو مطلع کردیا اور اس کی حرکت پر آپ نے کہہ دیا کہ باز رہیے؛ تو آپ نے نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے دیا۔ ہاں! اگر آپ کو ڈر یہ ہے کہ اتنا کہنے جاؤں گا تب بھی اس کی طرف سے جانی یا مالی نقصان پہنچ سکتا ہے، وہ شر پر آمادہ ہوسکتا ہے اور مجھے تکلیف دے ڈالے گا؛ تو پھر آپ رخصت پر عمل کرتے ہوئے دل سے برا سمجھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا چاہیں تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن دل سے برا سمجھنا تو ضروری ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہوا کہ نہی عن المنکر کے واسطے کوئی سخت طرز اختیار کرنا ضروری نہیں ہے۔

آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل... تین نمونے

نبی کریم ﷺ کے حالات میں سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آپ جب کسی کو منع کرتے تھے تو سخت طریقہ اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ ہمیشہ آپ نرمی کرتے تھے۔

پہلے بھی گذر چکا ہے کہ حضرت عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہ جو ام المؤمنین امِ سلمہ رضی اللہ عنہا

(جن کی یہ روایت ہے) کے اگلے شوہر ابوسلمہ سے تھے۔فرماتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھا رہا تھا، بچوں کی عادت ہوتی ہے اس طرح پلیٹ میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار رہا تھا، تو نبی کریم ﷺ نے کہا: بیٹا دیکھو! کھانے کے لئے جب بیٹھو تو بسم اللہ پڑھو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ، یہ تین باتیں ان کو بتلائیں تو حضرت عمر بن ابوسلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میرے کھانے کا طریقہ برابر یہ ہے۔ دیکھو! اس روایت میں یہ نہیں ہے کہ آپ نے اٹھا کر ایک طمانچہ مار دیا کہ یہ کیا کرتا ہے اور ہم کسی کو روکنے پر بھی آتے ہیں تو طمانچہ مارنے کی ہی بات کرتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

ایک صحابی فرماتے ہیں کہ مَیں نیا نیا اسلام لایا تھا، نماز میں شریک ہوا، کسی کو چھینک آئی، مَیں نے یرحمک اللہ کہا تو سب اپنی اپنی ران پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگے گویا روکنا چاہتے تھے۔ مَیں کہنے لگا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ وہ لوگ اور زیادہ آنکھیں نکالنے لگے اور تو کچھ بول نہیں سکتے تھے، جب نماز پوری ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے مجھے قریب بلایا اور فرمانے لگے: دیکھو! یہ نماز اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی یاد کے واسطے رکھی ہے، جب آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو تو اس میں قرآنِ پاک کی تلاوت کرے، تسبیح پڑھے، اللہ کا ذکر کرے، کسی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نہ مجھے ڈانٹا، نہ پیٹا، نہ کچھ کہا بلکہ بہت نرمی سے مجھے سمجھایا۔ یہاں بھی آپ نے سخت طریقہ اختیار نہیں کیا۔

(ابوداؤد۔ باب تشمیت العاطس فی الصلوۃ حدیث ۱۳۹)

ایک اور قصہ پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان نے آکر نبی کریم ﷺ

سے اجازت چاہی کہ اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ جب انھوں نے یہ سوال کیا تو صحابہ تیز تیز نگاہوں سے اس کو دیکھنے لگے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے کہا کہ اچھا! ایک بات بتاؤ، تمہاری ماں ہے؟ پھوپھی ہے؟ خالہ ہے؟ کہا! ہاں ہے۔ فرمایا: اگر کوئی آدمی تمہاری والدہ کے ساتھ، تمہاری پھوپھی کے ساتھ، تمہاری خالہ کے ساتھ ایسی حرکت کرے تو تم اس کو گوارہ کر سکتے ہو؟ کہنے لگا کہ مَیں اس کو گوارہ نہیں کر سکتا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: تم بھی جس کے ساتھ یہ کرنا چاہو گے وہ بھی کسی کی بیٹی، کسی کی پھوپھی، کسی کی خالہ، کسی کی ماں تو ہوگی؟ فوراً اس کی سمجھ میں آ گیا۔ پھر حضور ﷺ نے اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا اور دعا فرمائی کہ اے اللہ اس کے دل میں سے ایسی بات کو نکال دے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے مجھے کوئی سخت جملہ نہیں کہا۔ آپ ﷺ کی تعلیم کا طریقہ سیرت کی کتابوں میں آپ دیکھئے تو یہی ملے گا۔

(مسند احمد ۲۵۶/۵)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی بھی برائی کو روکنے کے لئے ضروری نہیں ہے کہ آپ خواہ مخواہ کوئی سخت طریقہ اختیار کریں۔ ہاں! اگر حاکم ہو تو الگ بات ہے۔ ورنہ عمومی طور پر لوگوں کو روکا جائے۔ مثلاً آپ مسجد میں آئے تو دیکھا کہ کسی کا بچہ شرارت کر رہا ہے، تو آپ اس کو محبت کے ساتھ سمجھا دیجئے کہ بیٹا! ایسا مت کرو۔ اب اس کی پٹائی کرنی ہے تو اس کا باپ کرتا رہے، آپ کو کیا تعلق ہے۔ آپ پٹائی میں نہ پڑیں، آپ تو اس کو صرف محبت سے سمجھا دیجیے۔ پھر دو تین مرتبہ کے بعد بھی نہیں مانتا تو اس کے باپ سے مشورہ کر لیجیے کہ آپ کے بیٹے کی یہ غلطی ہے، اس کو سدھارنے کی ضرورت ہے۔ یا اس کا کوئی مربی اور استاذ ہے جس کو باپ کی طرف سے تربیت کے معاملے میں سخت طریقہ اپنانے کی اجازت دی گئی ہے تو اس کو کہہ دیجیے۔ لیکن آپ کو اس کے ساتھ سخت رویہ اپنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا عام مزاج یہ ہے کہ یا تو کہتے ہی نہیں اور کہنے پر آتے ہیں تو ایسی روش اختیار کرتے ہیں جو بالکل ضروری نہیں۔ نہی عن المنکر کے لئے صرف آپ کا اس کو یوں کہہ دینا ہی کافی ہے کہ بھائی! یہ چیز ممنوع ہے، آپ مت کیجئے۔

﴿ ٹکراؤ کی شکل اختیار نہ کی جائے ﴾

خیر! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسے امراء، حکام (جس کو گجراتی میں (સત્તાધીશ) کہتے ہیں) اگر برسرِ اقتدار آجائیں جو بعض چیزیں شریعت کے خلاف کریں گے جیسا کہ آپ فرماتے ہیں تو ہم ان سے قتال اور لڑائی نہ کریں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ﴿لا﴾ لڑائی مت کرنا؛ جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ حکام کی طرف سے جو باتیں خلافِ شرع پیش آتی ہیں ان کے اوپر نکیر کے معاملہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ طریقہ بتلایا ہے کہ جس میں ٹکراؤ کی شکل اختیار نہ کی جاوے۔ ہاں! کوئی ایسا آدمی ہے کہ اس کو ہٹا دیا جائے تو کسی فتنے کا اندیشہ نہیں ہے تو گنجائش ہے، ورنہ نہیں۔

ہمارے معاشرے میں جو لوگ اربابِ اختیار ہوتے ہیں ان کے خلاف بھی جب باتیں شروع ہوتی ہیں تو وہاں پر بھی یہی شکل اختیار کرنی چاہیے کہ اگر فتنے کا اندیشہ ہو تو تدبیر سے کام لیا جائے تاکہ کھلم کھلا ٹکراؤ کی شکل پیدا نہ ہو۔ باقی یہ ہے کہ منع ضرور کرنا چاہیے۔

﴿ حضرت زینب بنتِ جحش رضی اللہ عنہا ﴾

عن أم المؤمنين أم الحكم زينب بنت جحش رضی اللہ عنہا ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلَ عَلَيْهَا فَزِعًا يَقُولُ: ((لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَيْلٌ لِلْعَرَبِ مِنْ شَرٍّ قَدِ اقْتَرَبَ، فُتِحَ الْيَوْمَ مِنْ رَدْمِ يَأْجُوجَ وَ مَأْجُوجَ مِثْلُ هٰذِهٖ)) وَحَلَّقَ بِأُصْبُعَيْهِ الاِبْهَامِ وَالَّتِيْ تَلِيْهَا. فَقُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنَهْلِكُ وَفِيْنَا

الصَّالِحُوْن؟قال: نَعَمْ!اِذَا کَثُرَ الْخَبَثُ.

ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے نبی کریم ﷺ کا ۵ھ میں نکاح ہوا تھا۔ یہ حضور ﷺ کی پھوپھی زاد بہن ہیں اور پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں جو حضور کے منہ بولے بیٹے تھے۔ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ جب نکاح کرانا چاہا تو اگرچہ جس وقت نکاح کیا جارہا تھا اس وقت آزاد تھے لیکن چونکہ ان پر غلامی کا داغ کسی زمانہ میں لگ چکا تھا، جس کی وجہ سے اِنھوں نے اور اِن کے بھائی وغیرہ نے اس کو پسند نہیں کیا تھا کہ اِن کا نکاح اُن کے ساتھ کیا جائے اسی پر قرآنِ پاک کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ﴾ اس آیت کا شانِ نزول یہ بھی بتلایا جاتا ہے۔ بہر حال! انھوں نے حضورِ اکرم ﷺ کو اختیار دے دیا کہ آپ جیسا چاہیں؛ ویسا کریں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زید رضی اللہ عنہ سے کرادیا۔ ان دونوں کے مزاج میں موافقت نہیں ہوئی۔ ایک وقت آیا کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے ان کو طلاق دے دی۔ ان کی عدت گذر جانے کے بعد خود اللہ تعالیٰ نے ان کا نکاح نبی کریم ﷺ کے ساتھ کرادیا، قرآنِ پاک میں آیت نازل ہوئی ﴿فَلَمَّا قَضٰی زَیْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰکَهَا﴾ اسی لئے ازواجِ مطہرات کے مقابلہ میں یہ فخر کیا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ تمہارا نکاح تو وَلیوں نے کرایا اور میرا نکاح اللہ تعالیٰ نے آسمان پر کرایا۔ ان سے خلوت اور شبِ زفاف کے بعد حضور ﷺ نے بڑا ولیمہ کرایا اور ازواجِ مطہرات میں سے سب سے اچھا ولیمہ اگر حضور ﷺ نے کرایا ہو؛ تو وہ انہیں کی رخصتی کے موقعہ پر کرایا۔

﴿پھر صلحاء کا وجود بھی نہیں بچا سکے گا﴾

انہی ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے یہ روایت ہے، فرماتی ہیں کہ

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ میرے یہاں تشریف لائے تو گھبرائے ہوئے تھے، آپ پر دہشت طاری تھی، خوف زدہ حالت میں تشریف لائے جیسے آئندہ کسی چیز کا خطرہ ہو اور یہ فرما رہے تھے: ﴿لا اله الا الله﴾ یہ جملہ کبھی تعجب کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ قومِ عرب کے واسطے ہلاکت ہو اس شر کی وجہ سے جو قریب آ گیا ہے۔ قومِ عرب سے مراد مسلمان ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں جتنے بھی مسلمان تھے سب کا تعلق قومِ عرب سے تھا، اور بعد میں بھی مسلمان جو دنیا میں پھیلنے والے تھے ان میں بڑی تعداد عرب کی تھی اس لئے نبی کریم ﷺ نے قومِ عرب فرمایا۔ پھر نبی کریم ﷺ نے انگوٹھے اور اپنی انگشتِ شہادت کا حلقہ بنا کر فرمایا کہ یاجوج ماجوج کی دیوار میں سے اتنا سوراخ ہو گیا۔ گویا وہ زمانہ قریب آ رہا ہے کہ یاجوج ماجوج دنیا والوں پر ظاہر ہوں گے، اور ان کی وجہ سے دنیا میں فتنہ وفساد پھیلے گا، یہ کہہ کر نبی کریم ﷺ نے انگوٹھے اور اپنی انگشتِ شہادت کے ذریعہ سے حلقہ بنایا۔ یہاں آگے جو بات آ رہی ہے اسی سے استدلال کرنا مقصود ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگ ہلاک ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے درمیان نیک لوگ موجود ہوں؟ یعنی جب معاشرہ میں صلحاء بڑی تعداد میں موجود ہیں ان کے ہوتے ہوئے بھی کیا ہمارے اوپر ہلاکت آ سکتی ہے؟ عمومی عذاب آ سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿نَعَمْ! اِذَا كَثُرَ الْخَبَثُ﴾ جب برائی بڑھ جائے۔ تعداد کمیّت اور پرسنٹیج (Percentage) بڑھ جائے تو یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمومی عذاب آوے اور اس کے نتیجے میں سب ہی ہلاک ہو جائیں ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے اس عام عذاب سے ڈرو جو صرف جن

لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے انہیں کو نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ یہ کب ہوگا؟ جیسا کہ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان برائیوں کے کرنے والوں کو اگر روکا نہ جائے، نہی عن المنکر کا سلسلہ ختم ہو جائے؛ تو یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر نہی عن المنکر کا سلسلہ باقی ہے تو پھر یہ صورت نہیں ہو سکتی۔

عام گذر گاہوں پر بیٹھنے کی مشروط اجازت

عن أبی سعیدالخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ عَلیٰ الطُّرُقَاتِ. فَقَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہ! مَالَنَامِنْ مَجَالِسِنَا بُدٌّ، نَتَحَدَّثُ فِیْھَا. فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ فَاِذَااَبَیْتُمْ اِلَّا الْمَجْلِسَ فَاعْطُوْا الطَّرِیْقَ حَقَّہٗ، فَقَالُوْا: وَمَاحَقُّ الطَّرِیْقِ یَارَسُوْلَ اللّٰہ؟ قَالَ: غَضُّ الْبَصَرِ وَکَفُّ الْأَذیٰ، وَرَدُّ السَّلَامِ، وَالْاَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ، وَالنَّھْیُ عَنِ الْمُنْکَرِ.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو فرمایا کہ تم راستوں پر بیٹھنے سے بچو۔ جو لوگ گھر کے باہر اوٹوں (اوٹلا) پر بیٹھتے ہیں وہ راستہ ہی پر ہوتے ہیں، انصار کے یہاں گھر تو چھوٹے چھوٹے ہوتے تھے، گھر کے باہر کا صحن ذرا کشادہ ہوتا تھا، ان کے یہاں مجلسیں وہیں لگا کرتی تھیں، تو حضور ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ وہاں مت بیٹھو۔ ان حضرات نے اپنی دشواری پیش کی کہ یارسول اللہ! اگر وہاں نہیں بیٹھیں گے تو ہمارے بیٹھنے کی جگہ ہی کہاں ہے؟ ہمارے پاس بیٹھنے کے لئے الگ جگہیں نہیں ہیں، ہمارے مکان اتنے کشادہ نہیں ہیں کہ ان میں الگ سے کوئی بیٹھک روم، نشست گاہ موجود ہو بلکہ چھوٹا سا مکان ہوتا ہے اور آپس میں کبھی بات کرنے کے لئے بیٹھنا ہوتا ہے تو وہیں صحن کے اندر ہی بیٹھتے ہیں، اس لئے اگر وہاں نہیں بیٹھیں گے تو کہاں بیٹھیں گے؟ حضور ﷺ نے

فرمایا: اچھا! اگر یہی تمہاری مجلسیں اور بیٹھکیں ہیں جو راستہ میں بنی ہوئی ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بیٹھ کر تم آپس میں باتیں کرسکو تو راستوں کا جو حق ہے وہ ادا کرو۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! راستوں کا حق کیا ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿غَضُّ الْبَصَرِ﴾ ایک تو یہ کہ نگاہوں کی حفاظت ہو کہ وہاں سے عورتیں بھی گذرتی ہیں، بعض لوگ تمہاری نگاہوں کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرتے ہیں، اگر ایسی کھلی جگہ بیٹھے ہوئے ہو تو نگاہیں نیچی ہوں، آنے جانے والوں کو دیکھتے مت رہو ﴿وَكَفُّ الْأَذىٰ﴾ دوسرا تکلیف دینے والی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی کو طعن و تشنیع نہ کرے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی گذرتا ہے تو اس کے اوپر کوئی جملہ چست کردیا۔ مثلاً کہا کہ دیکھو! حضرت جارہے ہیں، فلاں صاحب جارہے ہیں، کسی کو چڑانے کے واسطے ایسا کہہ رہے ہیں، تو ایسا نہیں ہونا چاہیے ﴿وَرَدُّ السَّلَامِ﴾ اور سلام کا جواب دینا کہ آنے جانے والا اگر آپ کو سلام کرتا ہے تو اس کو سلام کا جواب دیجیے، یہ بھی راستہ کا حق ہے ﴿وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ بھلی بات کا حکم کرنا (یہاں اسی لئے لائے) وہاں آپ بیٹھے ہوئے ہیں، کھلی جگہ ہے، تو کبھی بھلی بات کہنے کی نوبت آئے گی تو چوکیومت۔ ﴿وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ آپ کھلے میں بیٹھے ہیں، دِکھ رہا ہے کہ کوئی غلط کام کررہا ہے، تو آپ اس کو روکیے، بری بات سے روکنا بھی آپ کے ذمہ ہے۔ یہ سب کروگے تو راستوں کا حق ادا ہوگا اور تب ہی آپ کو بیٹھنے کی اجازت ہے؛ ورنہ نہیں۔

لیکن یہ جب کہ آپ کے پاس نشست گاہ کے طور پر اور کوئی جگہ نہ ہو، اگر دوسری جگہ ہو تو وہاں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے، علماء نے منع لکھا ہے۔ اور کوئی دوسری جگہ نہ ہونے کی

صورت میں اگر ایسی کھلی جگہ میں بیٹھیں گے تو پھر ان ساری چیزوں کی رعایت کرنی پڑے گی ورنہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسی جگہوں پر بیٹھنے والے انہیں غلط چیزوں کا ارتکاب کرتے ہیں، آنے جانے والی نامحرم عورتوں کی طرف نگاہیں بھی اٹھتی ہیں، لوگوں پر طعن و تشنیع ان پر جملے چست کرنا، ان کا مذاق اور ٹھٹھا اُڑانا، آنے جانے والوں کو چھیڑنا، تکلیف پہنچانا، پاس پڑوسیوں کو تکلیف میں ڈالنا، وغیرہ وغیرہ۔

﴿بات چھوٹی سی، لیکن فتنہ بڑا﴾

ایک مرتبہ ایک گاؤں سے رات کے وقت ہمارے یہاں فون آیا کہ یہاں بہت بڑی لڑائی ہونے کا اندیشہ ہے، کچھ لوگ حملہ کرنے کے واسطے آئے ہیں، آپ لوگ پہنچ جایئے؛ ورنہ بڑا فساد ہوگا۔ ہم لوگ گئے تو معلوم ہوا کہ وہاں روزانہ کچھ نوجوان ایک گھر کے اوٹے پر بیٹھ کر کیرم بورڈ کھیلا کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے گھر کے آس پاس رہنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن وہ غریب لوگ تھے اور یہ نوجوان منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتے تھے۔ اور پھر یہ نوجوان مالداروں کے بیٹے تھے تو ان کو کوئی کچھ کہتا بھی نہیں تھا، ان کے بڑوں تک بھی بات پہنچائی گئی لیکن انھوں نے نہیں مانا تو آخر وہ لوگ بہت تنگ آگئے۔ جس کے اوٹے پر کیرم چلتا تھا وہ ایک عورت کا گھر تھا اس کا قریب کے شہر میں کوئی رشتہ دار رہتا تھا اور وہ سر پھرا آدمی تھا۔ اس کی ایک بڑی جماعت تھی جس کا وہ سرغنہ بھی تھا۔ اس عورت نے جا کر اس کو اطلاع دی تو وہ اپنی پوری ٹولی لے کر آیا۔ اب ان کو خطرہ محسوس ہوا کہ ہماری خیر نہیں ہے تو فوری طور پر فون کرایا کہ یہ لوگ آئیں گے تب ہی ہمارا بچاؤ ہوگا۔ ہم پہنچے اور سب تفصیل سنی تو ان نوجوانوں کو ڈانٹا اور ان لوگوں سے بھی کہا کہ اب یہ توبہ کرتے ہیں، آئندہ باز رہیں

گے، ان کو معاف کردو۔

تو عام طور پر یہ فتنے کی چیز ہوا کرتی ہے، اس لئے سوسائٹی کے اندر، معاشرے اور سماج میں، کسی علاقے اور محلے میں اس طرح کا کوئی سلسلہ ہو تو بڑوں کو پہلے ہی اس کی روک تھام کردینی چاہیے؛ ورنہ بعد میں جاکر یہی چیز بڑے فتنے کا باعث بنا کرتی ہے۔

اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

﴿دعا﴾

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَامُحَمَّدِالنَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کَمَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَدِمَاتُحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف فرما، خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہمیں تو اپنے احکام پر زیادہ سے زیادہ چلنے کی توفیق عطا فرما، اے اللہ! تیری منع کی ہوئی چیزوں سے باز رہنے کا اہتمام نصیب فرما، اے اللہ! اگر کہیں برائی ہورہی ہو اور اس برائی کو روکنے کے لئے جو کوششیں کی جارہی ہیں ان کوششوں میں زیادہ سے زیادہ عملی اور قولی طور پر حصہ لینے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! برائیوں کو ہمارے معاشرے سے عافیت کے ساتھ دور فرما، اس کی شناعت اور قباحت معاشرے کے ہر ہر فرد کے دل میں بٹھادے، اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام نصیب فرما، خاص کر اپنے گھر والوں اور ماتحتوں کے معاملہ میں پورے طور پر سو فیصد عمل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اس

میں ہر قسم کی مداہنت، کاہلی اور سستی سے ہماری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم ﷺ کے طریقوں پر چلنے کی ہمیں توفیق نصیب فرما اور حضور ﷺ کے طریقوں کی محبت ہمارے دلوں میں ڈال دے۔ اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ، عاجلہ، مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشان حالی کو دور فرما۔ اے اللہ! روزی کے معاملہ میں جو پریشان ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما کر روزیوں میں برکت اور کشادگی پیدا فرما۔ اے اللہ! کاروبار میں برکت عطا فرما۔ حرام سے حفاظت فرما، حلال کا اہتمام نصیب فرما اے اللہ! ہماری تمام ضروریات کی اپنے خزانۂ غیب سے کفالت فرما، ہمیں کسی کا محتاج اور دست نگر نہ بنا۔ اے اللہ! ہمیں تیری ذات عالی پر اعتماد اور توکل کامل نصیب فرما۔ اے اللہ! تیرے غیروں کی طرف سے ہماری نگاہوں کو ہٹالے۔ اے اللہ! ہمارے دلوں کو تیری ذات ہی کے اوپر، اور صرف تجھ ہی سے متعلق فرمادے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی مانگی، وہ ہمیں عطا فرما، اور جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اَنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ وَنُوْرِ عَرْشِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ

بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ

شوال المکرّم ۱۴۱۸ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۲۸/فروری ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد.

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رَاٰی خَاتَمًا مِنْ ذَهَبٍ فِيْ يَدِ رَجُلٍ فَنَزَعَهٗ فَطَرَحَهٗ وَقَالَ: يَعْمِدُ أَحَدُكُمْ اِلٰى جَمْرَةٍ مِنْ نَارٍ فَيَجْعَلُهَا فِيْ يَدِهٖ، فَقِيْلَ لِلرَّجُلِ بَعْدَمَا ذَهَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم، خُذْ خَاتَمَكَ اِنْتَفِعْ بِهٖ. قَالَ: لَا وَاللّٰهِ! لَا آخُذُهٗ اَبَدًا وَقَدْ طَرَحَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم

مردوں کے لئے سونا اور ریشم منع ہے

آپ کو معلوم ہے کہ یہ باب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں چل رہا ہے، بھلی بات کی لوگوں کو تاکید اور حکم کرنا اور برائی اور گناہ کی چیز سے لوگوں کو روکنا۔ اسی سلسلے میں یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی۔ یہ اس زمانے کا قصہ ہے جب سونا مردوں کے لئے حرام ہو چکا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے ہاتھ سے انگوٹھی نکال کر پھینک دی اور ارشاد فرمایا کہ تم میں کا کوئی آدمی جہنم کا انگارا لے کر اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے یعنی اس کو پہنتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے کی انگوٹھی کو جہنم کے انگارے سے تعبیر فرمایا، چونکہ یہی چیز کل کو جہنم میں انگارے کی شکل اختیار کرے گی اور اس کے ذریعہ اس کو عذاب دیا جائے گا، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے شریعت محمدیہ میں مردوں کے لئے سونے اور ریشم کے

استعمال کو حرام قرار دیا، البتہ عورتوں کے لئے اس کی اجازت ہے اسی لئے حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے ہاتھ میں جو سونے کی انگوٹھی تھی اس کو خود اپنے دستِ مبارک سے نکال کر پھینک دیا یہاں تو صرف یہ بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ برائی کا کام جو حضور نے اپنی نگاہوں سے دیکھا اس کو اپنے ہاتھ سے دور کیا۔ چونکہ شروع میں روایت آچکی ہے کہ کوئی آدمی شریعت کے خلاف کوئی کام دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے دور کرے، نبی کریم ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے نکال کر اس کو پھینکا، اس مناسبت سے اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں کہ آپ نے اپنے فعل سے منکر پر نکیر فرمائی۔

اس موقعہ پر یہ چیز یاد رہے کہ آج کل ہمارے یہاں مردوں میں سونے کی انگوٹھی استعمال کرنے کا اور گلے کے اندر سونے کی چین استعمال کرنے کا رواج بڑھتا جا رہا ہے، خاص کر کے نوجوانوں میں یہ چیز بڑھتی جا رہی ہے، حالانکہ مردوں کے لئے اس کا استعمال حرام ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کو آگ کے انگارے سے تعبیر کیا۔ اسی لئے اپنے عزیزوں میں اگر کسی کو اس طرح استعمال کرتے ہوئے دیکھے تو اس کو محبت سے سمجھا کر دور کر دے۔ یہ بہت اہم چیز ہے، اس کی وجہ سے آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نظرِ رحمت سے دور رہتا ہے، شیطان کو اس سے قریب ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔

صحابہ کے جذبۂ اطاعت کی ایک مثال

اب نبی کریم ﷺ نے تو اس کے ہاتھ سے نکال کر اس لئے پھینک دیا تھا کہ آپ بتلانا چاہتے تھے کہ اس کا پہننا جائز نہیں ہے، باقی آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ آدمی بالکل اس کو چھوڑ دے۔ اگر وہ اس کو لے کر بیچتا اور اس کی قیمت اپنے کام میں لانا چاہتا، یا اس انگوٹھی کو

اپنے گھر کی عورتوں بہن ماں وغیرہ کو دیتا کہ وہ استعمال کرتیں؛ تو شریعت کی طرف سے اس کی کوئی ممانعت نہیں تھی۔

چنانچہ ایک اور روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کے ہاتھ پر سونے کی انگوٹھی دیکھی تو آپ نے فرمایا اس کو پھینک دو۔ بعد میں جب حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے پوچھا وہ انگوٹھی کیا ہوئی؟ اس نے کہا کہ آپ نے فرمایا تھا تو میں نے پھینک دی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا مقصد یہ تھا کہ تم اس سے فائدہ مت اٹھاؤ یعنی تم اس کو مت پہنو، باقی اس کو بیچ کر اس کی قیمت استعمال میں لانا چاہو؛ تو اس کی اجازت ہے۔ یہاں پر بھی چونکہ آپ ﷺ نے اس کو انگوٹھی پہنے ہوئے دیکھا تھا اور سونے کی انگوٹھی کا پہننا حرام ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے نکال کر پھینک دیا۔ گویا آپ اس کو اس برے کام سے روکنا چاہتے تھے، باقی آپ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ یہ آدمی اس انگوٹھی کو بالکل چھوڑ دے، اگر وہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت سے فائدہ اٹھانا چاہتا یا اپنے گھر کی عورتوں کو دیتا کہ وہ استعمال کرتیں؛ تو اس کی اجازت تھی۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ جب مجلس سے تشریف لے گئے تو لوگوں نے اس سے یوں کہا کہ یہ انگوٹھی جو حضور ﷺ نے تمہارے ہاتھ سے نکال کر پھینک دی ہے اس کو لے لو اور اس سے فائدہ اٹھاؤ، اپنے دوسرے کام میں لاؤ۔ لیکن صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ جو تعلق تھا اور جو محبت تھی اس کا نتیجہ یہی ہونا تھا کہ جس چیز کو حضور اکرم ﷺ پھینک دیا؛ بھلا وہ دوبارہ اس کو کیسے ہاتھ لگا سکتے تھے؟ لہٰذا ان صحابی نے کہا کہ اللہ کی قسم! اس انگوٹھی کو جب نبی کریم ﷺ نے پھینک دیا تو مَیں ہرگز اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

﴿حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ﴾

عن أبی سعیدالحسن البصری أن عائذبن عمرو رضی اللہ عنہ دَخَلَ عَلیٰ عُبَیْدِاللّٰہِ بنِ زِیَاد فقال: اَیْ بُنَیَّ! اِنِّی سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ: اِنَّ شَرَّ الرِّعَآءِ الْحُطَمَۃُ، فَاِیَّاکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنْھُمْ. فَقَالَ لَہُ: اِجْلِسْ فَاِنَّمَا أَنْتَ مِنْ نُخَالَۃِأَصْحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ. فَقَالَ: وَھَلْ کَانَتْ لَھُمْ نُخَالَۃٌ، اِنَّمَا کَانَتِ النُّخَالَۃُ بَعْدَھُمْ وَفِي غَیْرِھِمْ. (رواہ مسلم)

یہ اِس باب کی نویں روایت لائے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ جو اکابرِ تابعین میں سے ہیں اس کے راوی ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ حضرت ام المؤمنین امِ سلمہ رضی اللہ عنہا کی خادمہ تھیں، وہ کبھی کسی کام کے لئے گئی ہوئی ہوتیں تو ان کو حضرت امِ سلمہؓ کے پاس چھوڑ کر کے جاتیں اور حضرت حسن بصریؒ چھوٹے دودھ پیتے تھے، کبھی وہ روتے تو حضرت امِ سلمہ رضی اللہ عنہا ان کو اپنی چھاتی سے لگاتی اور اپنا پستان ان کو دیتیں تھیں، جو دودھ اترتا اس کو وہ پیتے تھے۔ چنانچہ بڑے فصیح و بلیغ تھے، ان کے خطبات اور فصاحت و بلاغت بڑی معروف ہے، کتبِ حدیث اور کتبِ تاریخ میں ان کے بلیغ کلمات کو مؤرخین نے نقل کیا ہے لکھا ہے کہ ان کی یہ فصاحت و بلاغت حضرت ام سلمہؓ کے اس دودھ کا اثر تھا اور تصوف کے بھی تمام سلسلے انہیں سے جا کر ملتے ہیں، ان کے واسطے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتے ہیں۔

﴿حضرت عائذ رضی اللہ عنہ کی نصیحت عبید اللہ بن زیاد کو﴾

حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ صحابی ہیں، ۶۱ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ایک مرتبہ یہ عبیداللہ بن زیاد کے پاس گئے جو یزید بن معاویہ کی طرف سے کوفہ اور عراق کا گورنر تھا، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ جس لشکر نے جنگ کی تھی تو یزید کی طرف سے اس لشکر کا سپہ سالار

یہی عبید اللہ بن زیاد تھا۔ تو ایک دن حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ اس کے پاس گئے اور اس سے کہا ﴿اَیْ بُنَیَّ!﴾ اے بیٹے! چونکہ وہ عمر میں چھوٹا تھا اور چھوٹوں کو کبھی بیٹے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: ﴿اِنَّ شَرَّ الرِّعَآءِ الْحُطَمَةُ﴾ بدترین چرواہے وہ ہوتے ہیں جو اپنے بھیڑوں کو، جانوروں کو اور بکریوں کو بہت سختی کے ساتھ ہانکتے ہیں۔ اگر بکریوں کو ہانکنے والا سختی کے ساتھ ان کو ہانکے، زور زور سے ڈنڈے مارے، تو وہ تیزی دکھلانے کے واسطے ایک دوسرے پر گرتی ہیں اور تکلیف اٹھاتی ہیں۔

یہاں حکمران طبقہ کو چرواہے سے تعبیر کیا گیا ہے کہ جیسے چرواہا بکریوں کا نگران ہوتا ہے اسی طرح حکمران بھی اپنے عوام اور پبلک کا نگران ہوتا ہے۔ کہنے کا حاصل یہ تھا کہ جیسے ان چرواہوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدترین چرواہا قرار دیا جو اپنی بکریوں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرتے ہیں اسی طریقے سے جو حکمران اپنے عوام کے ساتھ، ماتحتوں کے ساتھ، رعیت کے ساتھ سختی کا معاملہ کریں وہ بھی ایسے ہی ہیں۔ اسی لئے حضرت عائذ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت نقل کر کے اس کو تاکید کی: ﴿فَاِیَّاکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنْهُمْ﴾ تو ایسا مت بنیو۔ چونکہ یہ بھی ظلم و زیادتی کیا کرتا تھا۔ بس! یہاں نہی عن المنکر والی بات پائی گئی کہ وہ جس برائی میں اور ظلم و زیادتی میں مبتلا تھا اس کو یہ روایت سنا کر حضرت عائذ نے اس سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ یہ نہی عن المنکر پر عمل ہوا۔

﴿ایں خانہ ہمہ آفتاب است﴾

﴿فَقَالَ لَهُ: اِجْلِسْ فَاِنَّمَا اَنْتَ مِنْ نُخَالَةِ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم﴾ اس پر عبید اللہ نے حضرت عائذ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ بیٹھو! آپ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا بھوسہ ہو۔ آٹے کو چھلنی سے جب چھانا جاتا ہے تو جو چھلکے چھلنی کے اندر رہ جاتے ہیں، جس کو ہم بھوسہ کہتے ہیں اس کو عربی

زبان میں ﴿نُخَالَةٌ﴾ کہا جاتا ہے۔ تو وہ ان کو یوں کہتا ہے کہ تم نبی کریم ﷺ کے صحابہ کا بھوسہ ہو بیٹھ جاؤ۔ اس پر حضرت عائذ رضی اللہ عنہ نے کہا ﴿وَهَلْ كَانَتْ لَهُمْ نُخَالَةٌ؟﴾ صحابہ میں بھی کوئی بھوسہ تھا؟ بھوسہ تو آٹے کا ردی حصہ سمجھا جاتا ہے، گویا مجھے تم صحابہ کا بھوسہ کہہ کر جو تعبیر کرتے ہو، اس کا مطلب یہ ہوا کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت میں بھی کچھ ایسے لوگ تھے جن کو نعوذ باللہ گھٹیا درجے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اس لئے انھوں نے استفہامِ انکاری کے طور پر اس کی اس بات پر نکیر کرتے ہوئے کہا کہ کیا صحابۂ کرام میں بھی بھوسہ تھا؟ ﴿اِنَّمَا كَانَتِ النُّخَالَةُ بَعْدَهُمْ وَفِي غَيْرِهِمْ﴾ ارے یہ بھوسہ والی بات تو بعد میں آئی۔ صحابہ تو سب کے سب اعلیٰ درجے کے تھے۔

نبی کریم ﷺ کا صحابۂ کرام کے سلسلے میں ارشاد ہے ﴿أَصْحَابِي كَالنُّجُوْمِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ﴾ میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں کسی ایک کا بھی تم اتباع کرلو، کسی کو بھی چن لو، اس کے ذریعہ سے تم کو راہ مل جائے گی۔ گویا حضرت عائذ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ تم صحابۂ کرام کی جماعت کے سلسلے میں ایسے الفاظ جو استعمال کرتے ہو؛ بالکل غلط ہے۔

﴿ظالم حکام کیوں مسلّط ہوتے ہیں؟﴾

عَنْ حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهٖ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ أَوْ لَيُوْشِكَنَّ اللّٰهُ أَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِّنْهُ ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ.

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے تم لوگ بھلی بات کا حکم کرتے رہو اور بری بات سے روکتے رہو، یا تو پھر قریب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے اوپر اپنی طرف سے

کوئی سزا یا عذاب بھیجے، پھر تم اس کے دور ہونے کی دعا کرو لیکن تمہاری دعا قبول نہ کی جائے

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ امت کے اندر ہر معاشرہ اور ہر جماعت میں، ہر علاقے، بستی اور ہر محلے میں ہر جگہ باقی رہنا چاہیے۔ جہاں کہیں بھی کچھ مسلمان آباد ہوں وہاں سب نہیں تو کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہوں کہ جو ہر برائی کے اوپر نکیر کرتے ہوں اور ٹوکتے ہوں اور بھلائی کا حکم کرتے ہوں۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہے گا تب تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نہیں آئے گا۔

دیکھو! اگر کوئی آدمی برائی کا کام تنہائی میں کرتا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار ہے، لیکن برائی کا کام کھلّم کھلاّ کیا جائے اور لوگ دیکھ رہے ہیں اور کوئی اس کو ٹوکتا نہیں، اس پر نکیر نہیں کرتا، تو جو نکیر نہیں کرتا وہ بھی حکماً اس کے اندر شریک سمجھا جاتا ہے۔ گویا اس نے بھی سکوت اختیار کرکے اس کا ساتھ دیا۔ تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سب ہی اس گناہ میں شریک ہوئے، کوئی عمل کر کے، تو کوئی خاموشی اختیار کر کے۔ جب اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے عذاب آئے گا تو کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑنے کی صورت میں عام طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب مسلط کیا جاتا ہے؛ وہ ظالم حکمرانوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ آج کل ہر جگہ یہی شکایت ہے کہ حکمران ظلم وزیادتی کرتے ہیں۔ ہر آدمی یہی شکایت کرتا ہے اور پھر اس سلسلے میں دعائیں بھی ہوتی ہیں لیکن حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿ثُمَّ تَدْعُوْنَهٗ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ﴾ اس وقت تم اس مصیبت کے دور ہونے کے واسطے دعائیں بھی کروگے تو تمہاری دعائیں قبول نہیں ہوں گی۔ اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا سلسلہ باقی رہنا چاہیے اگر ہر جگہ یہ سلسلہ جاری رہے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمومی عذاب نہیں آئے گا۔

﴿افضل ترین جہاد﴾

عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: أَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ عَدْلٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ ....

عن عبداللہ طارق بن شهاب البجلی الاحمسی رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً سَئَلَ النَّبِيَّ ﷺ وَقَدْ وَضَعَ رِجْلَهُ فِي الْغَرْزِ أَيُّ الْجِهَادِ أَفْضَلُ؟ قَالَ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ....

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہترین جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی اور حق کی بات کرنا ہے۔ دوسری روایت اسی طرح کی ہے حضرت طارق بن شہاب بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ سواری پر سوار ہو رہے تھے اور رکاب میں پاؤں ڈال رہے تھے (جو گھوڑے کے دونوں طرف لٹکا ہوا رہتا ہے جس میں پاؤں ڈال کر آدمی سوار ہوتا ہے جس کو گجراتی میں પેગડા کہتے ہیں) اس وقت نبی کریم ﷺ سے کسی نے پوچھا: ﴿اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟﴾ کون سا جہاد سب سے بہتر ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ﴾ ظالم حکمران کے سامنے حق بات کہنا بہترین جہاد ہے۔

اس کو بہترین جہاد سے اس لئے تعبیر کیا کہ جو آدمی قتال اور جہاد کے واسطے کافروں کے لشکر کے مقابلہ میں نکلتا ہے تو وہاں یہ امکان بھی ہے کہ وہ کامیابی حاصل کر کے صحیح سلامت واپس آجائے، لیکن ظالم حکمران کے مقابلہ میں جب وہ حق بات کہے گا تو وہاں پر اس کی ہلاکت کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس کو افضل اس لئے قرار دیا گیا کہ جہاں یقین ہے کہ اس کو ظالم حکمران کی طرف سے تکلیف پہنچائی جائے گی، جان یا مال کا نقصان

ہے، اس کے باوجود حق بات کا اس کے سامنے اظہار کرتا ہے۔ اس لئے اس آدمی کے مقابلہ میں اس کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل میں بگاڑ کیسے شروع ہوا؟

عن ابن مسعودٍ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اِنَّ اَوَّلَ مَادَخَلَ النَّقْصُ عَلیٰ بَنِي اِسْرَائِيلَ اَنَّهٗ كَانَ الرَّجُلُ يَلْقَى الرَّجُلَ فيقول: ياهٰذَا! اِتَّقِ اللّٰهَ وَدَعْ ماتَصْنَعُ، فَاِنَّهٗ لايَحِلُّ لَكَ، ثُمَّ يَلْقَاهُ مِنَ الْغَدِ وَهُوَ عَلیٰ حَالِهٖ فَلا يَمْنَعُهٗ ذَالِكَ اَن يَّكُوْنَ اَكِيْلَهٗ وَشَرِيْبَهٗ وَقَعِيْدَهٗ، فَلَمَّا فَعَلُوْا ذَالِكَ ضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ. ثم قال: لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَائِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسٰى ابْنِ مَرْيَمَ ذَالِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَايَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ. تَرٰى كَثِيْرًا مِنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَبِئْسَ مَاقَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَااتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِنْهُمْ فَاسِقُوْنَ. ثُمَّ قَالَ: كَلَّا وَاللّٰهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، وَلَتَأْخُذُنَّ عَلٰى يَدِ الظَّالِمِ، وَلَتَأْطِرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ اَطْرًا، وَلَتَقْصُرُنَّهٗ عَلَى الْحَقِّ قَصْرًا، اَوْلَيَضْرِبَنَّ اللّٰهُ بِقُلُوْبِ بَعْضِكُمْ عَلٰى بَعْضٍ، ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ.

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے بنو اسرائیل کے اندر جو کمی آئی اور سب سے پہلا بگاڑ جو پیدا ہوا اس کی صورت یہ تھی کہ کوئی آدمی اگر برائی کا کام کر رہا ہے، گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، تو دوسرا آدمی جب اس سے ملاقات کرتا تھا جو اس گناہ میں مبتلا نہیں ہے وہ اس کو تنبیہ کرتا تھا اور نصیحت کرتا تھا ٹوکتا تھا

کہتا تھا: ارے بھلے آدمی! اللہ سے ڈرو، اور یہ جو تم کر رہے ہو، جس گناہ کے اندر تم مبتلا ہو اس کو چھوڑ دو، ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ شروع میں ایسا ہوتا تھا کہ اس کو دیکھا کہ شراب پی رہا ہے تو اس کو تنبیہ کردی کہ مت پیو۔ زنا کاری میں مبتلا ہے تو تنبیہ کردی کہ مت کرو۔ سود کھا رہا ہے تو اس کو تنبیہ کردی کہ مت کھاؤ، یہ گناہ کا کام ہے، حرام ہے۔ کسی بھی برائی کے اندر کوئی مبتلا ہوتا تو شروع شروع میں یہ ہوتا تھا کہ ایک دو روز کے لئے اس کو تنبیہ کرتا تھا کہ ایسا مت کرو۔ پھر دو چار دنوں کے بعد جب دیکھا کہ وہ نہیں مانتا تو اس کے باوجود اس کے ساتھ تعلق باقی رکھتا تھا یعنی بعد میں اس کو روکتا نہیں تھا، حالانکہ اس کے ساتھ کھا پی رہا ہے، اس کا ہم پیالہ ہے، ہم نوالہ ہے، اٹھنا بیٹھنا سب ساتھ میں ہے، ہم نشین ہے۔

پھر اس برائی کی برائی دل سے نکل جاتی ہے

﴿فَلَمَّا فَعَلُوْا ذٰلِكَ ضَرَبَ اللّٰهُ قُلُوْبَ بَعْضِهِمْ بِبَعْضٍ﴾ جب ان لوگوں نے ایسا کیا تو اس پر اللہ تعالیٰ نے بعض کے دلوں کو دوسرے بعض کے ساتھ خلط ملط کر دیا۔ یعنی وہ لوگ جو برائی میں مبتلا نہیں تھے گناہ کا کام نہیں کرتے تھے اور انھوں نے ان گناہ کا کام کرنے والوں کو شروع شروع میں روکا لیکن بعد میں روکنے کا سلسلہ بند کر دیا، اور ان کے ساتھ کھانے پینے کے تعلقات باقی رکھے تو اللہ تعالیٰ نے دلوں کو خلط ملط کر دیا۔ دیکھو! کسی اچھی چیز میں بری چیز کو خلط ملط کر دیا جائے تو وہ اچھی چیز بھی بری بن جاتی ہے، یعنی ان نہ کرنے والوں کے دلوں میں اس گناہ کے کام کی جو برائی، شناعت، قباحت اور اس کی جو گندگی تھی، اس کو جو برا سمجھتے تھے وہ برا سمجھنا ختم ہو گیا۔ اب وہ بھی اس کو برا نہیں سمجھ رہے ہیں یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان پر ایک وبال تھا۔

برائی سے اگر کوئی روکتا رہے، تو اس کی برائی اس کے دل میں بھی باقی رہے گی۔ اور اگر روکتا نہیں رہے گا بلکہ روکے بغیر اس کو دیکھتا رہے گا تو ایک وقت آئے گا کہ اس خاموشی کے نتیجے میں اس کے دل میں سے بھی اس برائی کی قباحت دور ہو جائے گی۔

مثال کے طور پر بیٹا ٹی وی لے کر آیا، باپ کو پسند نہیں ہے، اس نے منع کیا کہ بیٹا ٹی وی مت رکھیو، بہت گناہ ہے، حرام ہے۔ بہت سمجھایا لیکن بیٹا نہیں مانا، اس کے باوجود باپ نے اس کے ساتھ اپنا تعلق کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا سارا سلسلہ باقی رکھا، اب روزانہ جب اس کو کرتے دیکھے گا تو دھیرے دھیرے اس کے دل میں سے بھی ٹی وی کی برائی نکل جائے گی۔ یہ قدرتی عمل ہے اور ایک نفسیاتی چیز ہے کہ کسی برائی کو آپ بار بار دیکھتے رہیں تو پھر اس کی برائی دل میں سے نکل جاتی ہے۔

جیسے گوبیلس کا اصول ہے کہ ایک جھوٹ کو آپ بار بار دہراتے رہیے؛ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سننے والا اس جھوٹ کو بھی سچ سمجھنے لگے گا۔ اسی طرح یہ برائی بھی آپ کے سامنے ہوتی رہے اور آپ اس پر نکیر نہ کریں تو ایک وقت آئے گا کہ آپ کے دل میں سے بھی اس کی برائی نکل جائے گی۔ نکیر کا سلسلہ اگر قائم رکھیں یا اس سے آپ اپنا تعلق منقطع کر لیں؛ تب تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ آپ کے دل میں اس برائی کی برائی باقی رہے گی۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھی: ﴿لُعِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ ذَالِکَ بِمَا عَصَوْا وَکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ کَانُوْا لَایَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْکَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا کَانُوْا یَفْعَلُوْنَ. تَرٰی کَثِیْرًا مِّنْهُمْ یَتَوَلَّوْنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ أَنْفُسُهُمْ أَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ وَفِی الْعَذَابِ هُمْ خَالِدُوْنَ. وَلَوْ کَانُوْا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِیِّ وَمَا أُنْزِلَ اِلَیْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ أَوْلِیَآءَ وَلٰکِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ فَاسِقُوْنَ﴾ بنو اسرائیل میں سے جن

لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کا انکار کیا ان پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ السلام کی طرف سے لعنت کی گئی اور بددعا کی گئی، یہ اس لئے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی حدود سے آگے بڑھتے تھے، وہ جس برائی کے کام میں مبتلا تھے ایک دوسرے کو اس سے روکتے نہیں تھے اور بہت بری تھی وہ حرکت جس کا وہ ارتکاب کر رہے تھے۔ گویا برائی کے کام میں مبتلا ہونے کی صورت میں اگر روکنے کا سلسلہ نہیں رہے گا تو پھر یہی ہوگا۔ ان میں سے بہت سوں کو دیکھو گے کہ وہ اہلِ کفر کے ساتھ دوستی کئے ہوئے ہیں، بہت برا ہے وہ جو ان کے سامنے ان کا نفس اور جی پیش کر رہا ہے۔

ورنہ تمہارے ساتھ بھی بنی اسرائیل والا معاملہ ہوگا

﴿ثُمَّ قَالَ: كَلَّا وَاللّٰهِ لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ پھر حضور ﷺ نے اس مثال کو سنا کر اور بنو اسرائیل کا حال سنا کر اپنی امت کو تاکید فرمائی کہ دیکھو! پہلے ایسا ہو چکا ہے، اور اپنی امت کے متعلق حضور ﷺ نے ایک اور جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت پر بھی وہی حالات گذریں گے جو بنو اسرائیل کے اوپر گذرے ہیں ﴿حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ﴾ جیسا کہ ایک جوتا دوسرے جوتے کے بالکل مشابہ ہوتا ہے۔ جب یہ حال بتلایا تو اب اپنی امت کو تاکید فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! تم لوگ بھلی بات کا حکم کرتے رہیو اور بری بات سے روکتے رہیو، اور ظالم کے ہاتھ کو پکڑتے رہیو۔ کوئی آدمی اگر ظلم کر رہا ہے تو اس کو ظلم سے روکنے کی کوشش کرتے رہنا۔ اور حق کی طرف اس کو موڑتے رہیو، یعنی وہ حق سے ہٹنا چاہتا ہو تو اس کو پکڑ پکڑ کر حق کی طرف لاتے رہیو۔ اور حق پر اس کو جماتے رہیو۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں کو بھی بعض کے ساتھ خلط ملط کر دے گا۔ یعنی وہی معاملہ جو بنو اسرائیل کے ساتھ کیا گیا تھا تمہارے ساتھ بھی ہوگا۔ چونکہ انھوں نے بھی شروع میں تو

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا، بعد میں وہ سلسلہ چھوڑ دیا اور آپس کے تعلقات جوں کے توں باقی رکھے تو جس مصیبت اور بلا میں وہ گرفتار ہوئے تھے اسی میں تم بھی گرفتار ہو جاؤ گے ﴿ثُمَّ لَيَلْعَنَنَّكُمْ كَمَا لَعَنَهُمْ﴾ اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ تم پر بھی لعنت بھیجے گا اور تم کو اپنی رحمت سے دور کر دے گا جیسے ان کو اپنی رحمت سے دور کر دیا تھا۔

اس لئے آدمی یہ نہ سمجھے کہ ایک دو مرتبہ کہہ دیا اور وہ نہیں مانتا، تو ہمارا کام پورا ہو گیا۔ اگر وہ نہیں مانتا تو شریعت یہ حکم دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعلقات باقی نہ رکھیں۔ سمجھا کر دیکھ لیا اور نہیں مانتا تو تعلق قطع کر لیجئے، اس کی وجہ سے مان جائے گا۔ اگر نہیں مانے گا تو کم از کم اس صورت میں آپ تو اپنے کو اس برائی میں مبتلا ہونے سے بچا لیں گے۔

ترمذی شریف کی روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بنو اسرائیل گناہوں میں مبتلا ہوئے تو ان کے علماء نے ان کو ان گناہوں سے منع کیا لیکن وہ لوگ گناہوں سے باز نہیں آئے ﴿فَجَالَسُوهُمْ فِي مَجَالِسِهِمْ وَاكَلُوهُمْ وَشَارَبُوهُمْ﴾ اس کے باوجود بھی ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جاری رکھا، ان سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ایک کے دلوں کو دوسروں کے دلوں کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور ان پر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی لعنت بھیجی ﴿ذَالِكَ بِمَا عَصَوا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ﴾ یہ ان کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ جس وقت آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت نبی کریم ﷺ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، پھر آپ سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: ﴿لَا وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ حَتّٰى تَأْطِرُوْهُمْ عَلَى الْحَقِ اَطْراً﴾ اللہ کی قسم! تم بھی نہیں بچ سکتے جب تک کہ ان گناہوں میں مبتلا لوگوں کو موڑ نہ دو (ترمذی شریف، حدیث نمبر ۲۹۷۳) تمہاری طرف سے یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان گناہوں سے اُن کو ہٹایا جائے اور دور کیا جائے۔

﴿ہمارا متضاد طرزِ عمل﴾

دیکھو! یہ ساری روایتیں جو بھلی بات کا حکم کرنے اور بری بات سے روکنے کے سلسلے میں آئیں، تو پہلے بھی آچکا ہے کہ آدمی اگر اپنے ہاتھ سے روکنے کی طاقت رکھتا ہو، تو ہاتھ سے روکے۔ اگر نہیں تو زبان سے روکے، اور یہ بھی نہیں ہے تو دل سے اس کو برا سمجھے۔

ہم اپنے معاشرے میں دیکھیں تو بہت سے افراد وہ ہوتے ہیں جو اپنے ماتحت یعنی اپنی اولاد ہے، اولاد کی اولاد ہے، یا اگر خاندان میں بڑا ہے، صاحبِ اثر ورسوخ ہے، یا اپنی جماعت اور برادری کے اندر اس کا اثر ورسوخ ہے، تو ماتحتوں پر اس کو قدرت ہے کہ ان کو برائی سے روکے؛ تو پھر اس کی کوشش یہی ہونی چاہیے۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو بیٹے کو روکا لیکن کیا کریں، وہ نہیں رُکتا۔ نماز نہیں پڑھتا، ہم نے تو بہت کہا کہ بیٹا! نماز پڑھو، لیکن نہیں پڑھتا، کیا کریں؟ اس کو اس کی قبر میں سونا ہے ہم کو اپنی قبر میں سونا ہے۔ تو غور کیجیے کہ اگر وہی بیٹا کاروبار میں دھیان نہیں دیتا، دوکان پر نہیں بیٹھتا، اور اس سلسلے میں آپ کی طرف سے دی گئی ہدایتوں پر عمل نہیں کرتا، تو اس صورت میں بھی آپ یہی جواب دے کر بیٹھے رہتے؟ اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتے؟ اس کی طرف سے چشم پوشی کرتے؟ کیا اس کی غفلت، سستی اور کاہلی کو آپ چپ چاپ برداشت کرتے کہ ٹھیک ہے چلو! اب نہیں مانتا تو ہم کما کر کھلائیں گے؟ نہیں! اس صورت میں آپ کی طرف سے باقاعدہ وارننگ دی جائے گی کہ دیکھو! اگر کاروبار کی طرف دھیان نہیں دیتے، دوکان پر نہیں بیٹھتے، تو اتنے دنوں کی مہلت دیتا ہوں، پھر گھر چھوڑ دینا، تم اپنا نبھالینا، وہاں تو باقاعدہ دھمکی دی جاتی ہے، اور وہاں یہ معاملہ نہیں ہوتا، بلکہ

ناراضگی کا بڑی شدت کے ساتھ اظہار ہوتا ہے، اور اگر اس پر بھی نہ مانے تو اپنے دوسرے لوگوں سے کہہ کر اس کو تنبیہ کروائی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو طریقہ اُس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے، کیا نماز نہ پڑھنے کی صورت میں یا گناہوں میں مبتلا ہونے کی صورت میں یا کسی برائی کے ارتکاب پر تنبیہ کرنے کے معاملے میں بھی وہی طریقہ اختیار کرتے ہیں؟ ظاہر ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے، آسمان زمین کا فرق ہے۔ معلوم ہوا کہ ہماری طرف سے جس قسم کی روک تھام کی جانی چاہیے تھی اور اس کے لئے جس قوت کے ساتھ ہمیں اس کو روکنا تھا؛ وہ کرتے نہیں ہیں۔

ہاں! یہی معاملہ اگر کاروبار یا دوسری لائن میں پیش آتا، تو ہم جو تدبیریں اپنا سکتے تھے، وہی ساری تدبیریں اور طریقے اس کی اصلاح اور سدھارنے کے دینی معاملے میں یا گناہ کے ارتکاب کرنے کے معاملے میں آزمالئے، پھر بھی نہیں مانتا؛ تو بات دوسری ہے، آپ کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔

آپ کا بیٹا اگر حکومت کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، کسی ایسی جماعت میں شریک ہو گیا جس کے اوپر حکومت نے پابندی لگا رکھی ہے، آپ کو معلوم ہو جائے کہ اِس کا تعلق اُس جماعت سے ہے تو آپ لرز جائیں گے اور ڈر جائیں گے کہ اس کی وجہ سے ہمارے پورے گھر پر مصیبت نہ آجائے۔ آپ اس کو تنبیہ کر دیں گے کہ آج کے آج تمہارا یہ معاملہ صاف ہو جانا چاہیے؛ ورنہ میرا گھر چھوڑ دو۔ تمہاری وجہ سے ہمیں تکلیف اٹھانی پڑے گی، کہیں جیل نہ بھگتنی پڑے۔ تو ہمارا بیٹا دنیوی حکومت کی خلاف ورزی کرتا ہے یا اس کی بغاوت کرنے والوں کا ساتھ دیتا ہے، ان سے دوستی کرتا ہے تو اس صورت میں باپ ڈرا سہما

رہتا ہے، لرزاں رہتا ہے، تو پھر اگر بیٹا اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی کر رہا ہے اس کے باوجود ہمیں کوئی خوف نہ ہو؛ تو یہ واقعتاً سوچنے کی چیز ہے۔

﴿ایک ممکنہ غلط فہمی کا ازالہ﴾

عن أبی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ قال: یاأیھا الناس اِنَّکُمْ لَتقرَؤُوْنَ ھٰذِہِ الْاٰیَۃَ: ''یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ أَنفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُم مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ'' وَاِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ: اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَأَوُ الظَّالِمَ، فَلَمْ یَأْخُذُوْا عَلیٰ یَدَیْہِ، أَوْشَکَ أَن یَّعُمَّھُمُ اللّٰہُ بِعِقَابٍ مِنْہُ.

یہ روایت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ قرآنِ پاک کی ایک آیت ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی، اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو: ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنفُسَکُمْ لَایَضُرُّکُم مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ﴾ اے ایمان والو! تم اپنی فکر کرو، اپنی درستگی کی طرف توجہ کرو، اگر تم راہِ راست پر آ گئے تو جو راستہ سے ہٹا ہوا ہے، گمراہی میں مبتلا ہے، اس کا گمراہی میں ہونا؛ تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

اب اس آیت کی وجہ سے شاید کوئی یوں سمجھے کہ دنیا کچھ بھی کرتی رہے، میرا بیٹا کچھ بھی کرے، میری بیوی کچھ بھی کرے، میرے گھر والے کچھ بھی کریں، اگر میں نماز پڑھتا ہوں، اور شریعت پر عمل کرتا ہوں؛ تو بس کافی ہے، اس لئے کہ قرآن میں ہے ﴿لَایَضُرُّکُم مَنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ﴾ تم اگر راہِ راست پر آ گئے، اور سدھر گئے، تم نے اپنا معاملہ ٹھیک اور درست کرلیا، اب کوئی آدمی اگر گمراہی میں مبتلا ہے تو تمہارے لئے اس کا گمراہی میں مبتلا ہونا مضر نہیں ہے۔

اس آیت سے شاید کسی کو غلط فہمی ہو، اس لئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کہ اے لوگو! تم اس آیت کو پڑھتے ہو لیکن مَیں نے حضورِ اکرم ﷺ سے یہ بھی سنا ہے: ﴿اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَأَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَأْخُذُوا عَلٰى يَدَيْهِ أَوْشَكَ أَن يَّعُمَّهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابٍ مِنْهُ﴾ لوگ اگر ظالم کو اور اللہ تعالیٰ کے نافرمان کو دیکھیں کہ وہ نافرمانی میں مبتلا ہے اس کے باوجود اس کو روکتے نہیں ہیں تو اس صورت میں ڈر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب پر عذاب آجائے۔

اس سے معلوم ہوا آدمی راہِ راست پر اسی وقت کہلائے گا جب وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایتوں پر پوری طرح عمل کرے۔ اور اس نے ہی یہ حکم بھی دیا ہے کہ جب تم خود شریعت پر عمل کر رہے ہو، اور جو لوگ برائی میں مبتلا ہیں ان کو پوری کوشش کے ساتھ روک بھی رہے ہو، اس کے باوجود وہ برائی سے باز نہیں آرہے ہیں؛ اب تمہارے لئے کوئی نقصان کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسی بات نہیں ہے، آپ نے ان کو برائی سے نہیں روکا، یا معمولی درجہ میں روکا اور جتنی قوت استعمال کرنی چاہیے، وہ نہیں کی؛ تو پھر ﴿اِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾ پر عمل ہی نہیں ہوا۔ جب تم نے ہدایت پر عمل نہیں کیا تو پھر تمہارے لئے ﴿لَا يَضُرُّكُمْ﴾ والی گارنٹی نہیں ملے گی۔ یہ گارنٹی تو اُسی صورت میں مل سکتی ہے، جب ہم اللہ تعالیٰ اور رسولِ پاک ﷺ کی طرف سے دی گئی تمام ہدایتوں پر عمل کرلیں۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی انہیں ہدایتوں میں سے ہے۔ اگر ہم اس پر بھی عمل کرلیں تو پھر آگے کہا جا رہا ہے کہ اب تمہارے لئے کوئی نقصان نہیں ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اپنی رضامندی کی اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر والے فریضے کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے

﴿ آمین ﴾

تَغْلِيظُ عُقُوبَةِ مَنْ أَمَرَ بِمَعْرُوفٍ أَوْنَهٰى عَنْ مُنْكَرٍ وَخَالَفَ قَوْلُهُ فِعْلَهُ

﴿قول اور عمل میں تضاد پر سخت سزا﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّـئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد.

أَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّوَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ أَفَلاَ تَعْقِلُوْنَ

و قال تعالىٰ: يَاأَيُّهَاالَّذِيْنَ اٰمَنُوْالِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالاَتَفْعَلُوْنَ كَبُرَمَقْتًاعِنْدَاللّٰهِأَنْ تَقُوْلُوْامَالاَتَفْعَلُوْنَ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پچھلا باب قائم کیا تھا جس میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حکم بیان کیا تھا اور اسی سلسلے میں روایتیں پیش کی تھیں۔ اب ایک اور باب قائم کرتے ہیں جس میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جو آدمی بھلی بات کا حکم کرے اور بری بات سے روکے اور خود اس کا قول اس کے فعل کے خلاف ہو، یعنی وہ خود جو کہتا ہے اس کے مطابق کرتا نہیں ہے، بھلی بات کی لوگوں کو تاکید کرنے کے باوجود خود اس پر عمل نہیں کرتا، برائیوں سے لوگوں کو روکنے کے باوجود خود اس سے باز نہیں آتا؛ تو ایسے آدمی کے واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کیسی سخت سزا ہے۔

علماءِ یہود حضور ﷺ کی حقانیت سے واقف تھے

اس سلسلے میں سب سے پہلے آیتِ کریمہ لائے ہیں جس میں علماءِ یہود کو خطاب ہے۔ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں جو یہود مدینہ منورہ میں آباد تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا، وہ لوگ اپنی کتاب توریت میں نبی کریم ﷺ کی بعثت کے متعلق پڑھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آخری

زمانے میں ایک پیغمبر کو بھیجے گا جو آخری نبی ہوں گے، ان کی یہ یہ نشانیاں ہیں اور جو نشانیاں بتلائی گئی تھیں ان کو وہ جانتے تھے اور سمجھتے تھے اور ان کو معلوم تھا کہ جو علامتیں نبی آخر الزماں کی ہماری کتاب میں بتلائی گئیں ہیں وہ آپ ﷺ کے اندر پورے طور پر موجود ہیں۔ قرآن میں اسی کو ایک جگہ یوں فرمایا گیا ہے: ﴿یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَاءَهُمْ﴾ وہ نبی کو ایسا جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ جیسے آدمی کو اپنے بیٹے کے متعلق اپنا بیٹا ہونے کا یقین ہوتا ہے، ان علماءِ یہود کو اس سے بھی زیادہ یقین تھا کہ آپ ﷺ آخری پیغمبر ہیں اور ہماری کتاب میں جس نبی آخر الزماں کی آمد اور بعثت کی خبر دی گئی ہے، آپ ﷺ وہی ہیں۔

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے- جو پہلے یہودی تھے اور توریت کے عالم تھے- ایک مرتبہ پوچھا کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ (یہود) آپ ﷺ کو ایسا ہی جانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹے کو۔ یعنی ایک باپ کو اپنے بیٹے کے اپنا بیٹا ہونے کا جتنا یقین ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ کے نبی آخر الزماں ہونے کا ان کو ایسا ہی یقین ہے؛ اس کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔ تو اس کے جواب میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم کو اس سے زیادہ یقین تھا۔ اور اس کی وجہ بھی ہے کہ بیٹے کے بیٹا ہونے کا یقین تو اس لئے ہے کہ یہ ہماری بیوی کے پیٹ سے پیدا ہوا، لیکن یہاں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بیوی نے خیانت کی ہو، اور کسی اور کے ساتھ تعلق قائم کرلیا ہو، اور اس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہو۔ باپ یوں سمجھتا ہے کہ یہ میرا بیٹا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دوسرے کا بیٹا ہے۔ جیسے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر ہے ؎

پردہ دری کا یہ نتیجہ نکلا ❊ جس کو سمجھتے تھے بیٹا وہ بھتیجہ نکلا

بعض مرتبہ بے پردگی کی وجہ سے ایسی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

بہر حال! حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جواب میں کہا: ہم کو اپنی اولاد کے اپنی اولاد ہونے کا جتنا یقین تھا اس سے زیادہ یقین تھا کہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی اور پیغمبر ہیں۔ تو یہ لوگ اس چیز کو جانتے تھے اور جاننے کی وجہ سے دوسروں کو کہتے بھی تھے کہ ان پر ایمان لاؤ، لیکن خود ایمان نہیں لاتے تھے۔

ایک یہودی کا قصہ

چنانچہ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا تھا جس کا نام عبد القدوس تھا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آتا تھا اور آپ کا کام کاج کر دیا کرتا تھا، وہ بیمار ہوا، آخری گھڑی آ گئی، نبی کریم ﷺ کو اطلاع ہوئی کہ وہ لڑکا جو ہمارا کام کاج کیا کرتا ہے؛ بیمار ہے۔ آپ ﷺ اس کی خبر لینے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ نے دیکھا کہ اب وہ بچنے والا نہیں ہے، آخری گھڑی ہے تو حضور اکرم ﷺ نے اس سے کہا: کلمہ پڑھ لے اور ایمان لے آ، تا کہ آخرت میں تیری نجات ہو جائے۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے اس کو کلمہ پڑھنے کے لئے فرمایا تو وہ بچہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی اس کو ہدیہ بھی دے تو وہ باپ کی طرف نگاہ اُٹھاتا ہے کہ باپ کی طرف سے اجازت ملے تو مَیں قبول کروں۔ اس کے باپ نے کہا: ﴿أَجِبْ أَبَا الْقَاسِمِ﴾ (ابو القاسم نبی کریم ﷺ کی کنیت ہے) ابو القاسم جو فرما رہے ہیں اس کو مان لو۔ چنانچہ وہ بچہ ایمان لے آیا اور اس کے بعد اس کی وفات ہوئی۔ نبی کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم کے عذاب سے بچا لیا۔ (باب عیادۃ المشرک حدیث ۵۶۵۷)

خیر! اس کی موت ایمان پر آئی۔

اعتبار الفاظ کے عموم کا ہے، خاص موقعہ کا نہیں

یہ آیت انہیں علماء یہود کو خطاب کرتے ہوئے نازل ہوئی ہے، لیکن ایک اصول ہے جو تفسیر اور اصول فقہ کی تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ کوئی آیت کسی خاص واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہو، لیکن اس کا مضمون اگر عام ہے، تو اس کا حکم بھی عام ہوگا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ حکم خاص اسی واقعہ کے لئے ہو، بلکہ قیامت تک آنے والی دنیا اس آیت کی مخاطب سمجھی جائے گی اور اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا گیا ہے وہ تمام پر لاگو ہوگا۔

مثال کے طور پر ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کسی غزوہ کے سفر میں تھے، نماز کا وقت آ گیا، پانی نہیں تھا، نہ لوگوں کے پاس پانی تھا اور نہ جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہاں کوئی کنواں یا نہر تھی، اور نہ تالاب اور چشمہ تھا۔ اب نماز کا وقت گذر رہا تھا، لوگ پریشان تھے کہ کیا کیا جائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیمّم والی آیت نازل ہوئی کہ اگر تم سفر میں ہو اور پانی موجود نہیں ہے تو پھر مٹی سے تیمّم کرلو اور نماز ادا کرلو۔ (بخاری شریف کتاب التیمم، حدیث نمبر ۳۳۴)

دیکھئے! یہاں یہ آیت ایک خاص واقعہ کے متعلق نازل ہوئی جو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں پیش آیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس اسی وقت کے لئے یہ حکم تھا بلکہ اس میں الفاظ عام ہیں، ہر ایک کو خطاب کیا گیا ہے، اس لئے قیامت تک کے لئے اجازت ہوگئی کہ اب جب بھی کوئی آدمی سفر میں ہے، پانی نہیں ہے یا گھر پر ہے لیکن بیماری کی وجہ سے پانی کے استعمال پر قدرت نہیں ہے، تو وہ تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے۔

ایسے ہی دوسری آیات میں بھی جو کسی خاص واقعہ کے سلسلے میں نازل ہوئی ہوں، اس کا قاعدہ یہی ہے کہ اس کا مضمون عام ہوتا ہے، قیامت تک آنے والی دنیا کے لوگ اس

کے مخاطب ہیں۔ اسی طرح یہ آیت اگر چہ یہود کے علماء کو مخاطب بنا کر نازل ہوئی تھی اور ان کو کہا گیا ہے، لیکن اس کا مضمون عام ہونے کی وجہ سے ہر وہ آدمی جس میں یہ بات پائی جاتی ہو؛ وہ اس کا مخاطب ہے۔

﴿دوسروں کو نصیحت کرتے ہو؛ خود کو بھول جاتے ہو؟﴾

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اَتَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ﴾ کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو۔ یہ خطاب علماءِ یہود کو تھا کہ وہ لوگوں کو ایمان لانے کے لئے کہتے تھے کہ یہ نبی آخر الزمان ہیں، ان پر ایمان لاؤ۔ لہٰذا کہا گیا کہ تم تو لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرتے ہو ﴿وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ اور اپنی ذات کو بھول جاتے ہو، حالانکہ تم تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُتاری ہوئی آسمانی کتاب توریت کو پڑھتے ہو۔ تم کو تو آسمانی کتاب کا علم حاصل ہے۔ اور جس آدمی کو آسمانی کتاب کا علم حاصل ہو؛ وہ ایسی نادانی کی حرکت نہیں کیا کرتا۔ ﴿أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم عقل اور سمجھ نہیں رکھتے؟ یعنی کیسی نادانی والی بات ہے کہ آدمی جس کام کو اچھا سمجھتا ہے اور اچھا سمجھ کر دوسروں کو کرنے کے لئے کہتا ہے۔ اور کوئی آدمی جب کسی دوسرے کو کسی اچھے کام کا حکم دیتا ہے تو اس کا مقصد سامنے والے کی خیر خواہی ہوتی ہے، اس کی بھلائی چاہتا ہے کہ بھئی! یہ کرلو؛ تمہارا کام بن جائے گا۔ تو جو آدمی دوسروں کی بھلائی چاہے، اور اپنی بھلائی نہ چاہے، اور خود اس پر عمل نہ کرے؛ تو اس سے بڑی نادانی اور کیا ہوسکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی لوگوں کو بھلی بات کے لئے کہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ پہلے خود اس پر عمل کرے۔ جب تک خود عمل نہیں کرے گا وہاں تک اس کے کلام

میں تاثیر اور قوت پیدا نہیں ہوگی۔ جس کو یہ بات کہی جائے گی وہ یہ سوچے گا کہ اگر یہ ایسا ہی کام ہوتا جس میں کوئی فائدہ تھا تو جو مجھے کہہ رہا ہے، وہ خود کیوں نہیں کرتا۔ آپ کو دیکھ کر اس کے اندر عمل کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا، لیکن آپ کو کرتے ہوئے دیکھے گا تو اس کو بھی ترغیب ہوگی۔

ہمارے اسلاف اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ ایسی چیزیں جن کا تعلق اگرچہ شریعت کے حکم سے نہیں ہوتا لیکن اگر کبھی کسی کو بطورِ نصیحت کہنے کی نوبت آتی تو جب تک کہ خود اس پر عمل نہیں کرتے؛ وہاں تک کسی کو کہنا گوارہ نہیں کرتے تھے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر آئی اور حضرت امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ حضرت! میرا بچہ کھجور بہت کھاتا ہے، اس کو نصیحت کر دیجیے۔ کھجور گرم خوراک ہے، کثرت سے استعمال کرنے کی وجہ سے نقصان ہوسکتا ہے۔ حضرت نے کہا: اچھا! آٹھ دن کے بعد آنا، آٹھ دن کے بعد پھر وہ بچہ کو لے کر آئی۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بچہ سے کہا: بیٹا! کھجور زیادہ مت کھایا کرو۔ بس! اتنا ہی کہا۔ وہ عورت یوں سمجھ رہی تھی کہ آٹھ دن کے بعد بلایا ہے تو کوئی خاص بات ہوگی، اس نے جب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے اتنا ہی جملہ سنا تو اس نے اپنے دل کی بات عرض کر دی کہ حضرت! اگر اتنی ہی بات کہنی تھی تو اس میں آٹھ دن کا انتظار کیوں کروایا؟ یہ بات تو آپ اس وقت بھی کہہ سکتے تھے۔ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ جس وقت تو اپنے بچے کو لے کر آئی اور تو نے کہا کہ یہ زیادہ کھجور کھاتا ہے اس کو نصیحت فرما دیجیے، تو

مَیں بھی کھجور زیادہ کھاتا تھا، اب مَیں تو کھجور زیادہ کھاؤں اور بچے کو یوں کہوں کہ کھجور زیادہ مت کھاؤ۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ میری بات میں اثر نہیں رہتا، اس لئے مَیں نے مہلت مانگی کہ پہلے کم سے کم مَیں اپنی اصلاح کرلوں اور خود اس پر عمل کرنے کے بعد اس قابل بن جاؤں کہ یہ بات اس کو کہہ سکوں، اس لئے ان آٹھ دنوں میں مَیں نے اپنی وہ زیادہ کھجور کھانے کی عادت چھوڑ دی۔ آج اب مَیں اس پوزیشن میں ہوں کہ اس کو یوں کہوں کہ بیٹا! زیادہ کھجور مت کھاؤ۔ حالانکہ کھجور کھانا کوئی بری بات نہیں ہے، اور پھر وہ تو بچہ تھا، ممکن ہے کہ بچہ کو موافق نہ آئے لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا۔ ہماشما [ہم اور آپ] ہوتے تو یہ ساری مصلحتیں دیکھتے، وہ حضرات اس چیز کو نہیں دیکھتے تھے، وہ تو ایک ہی بات جانتے تھے کہ ہم جب دوسرے کو کوئی چیز کہہ رہے ہیں تو پہلے خود عمل کریں؛ پھر ہم اس قابل ہیں کہ دوسرے کو کہیں۔

بہرحال! اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ بھلا تم لوگ دوسروں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو اور تم تو اللہ کی آسمانی کتاب کی تلاوت بھی کرتے ہو، اور اس کے علم سے واقف بھی ہو؛ پھر بھی اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔

کیا نصیحت کے لئے خود عمل کرنا ضروری ہے؟

اب یہاں ایک مسئلہ اور ہے، کیا وہ آدمی جو خود نیکی کا کام نہیں کرتا: اس کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو اس نیکی کے کام کی ترغیب دے؟ یا ایک آدمی جس گناہ سے خود نہیں بچتا: کیا اس کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے کو اس گناہ سے بچنے کی تلقین کرے؟ مثلاً ایک آدمی نماز نہیں پڑھتا لیکن اب کیا اس کے لئے ناجائز ہے کہ وہ دوسروں کو یوں کہے کہ نماز پڑھو، یا ایک آدمی سینما دیکھتا ہے تو کیا اس کے لئے ناجائز ہے کہ دوسروں کو یوں کہے کہ سینما مت دیکھو؟

تو علماء نے لکھا ہے کہ بھلی بات کا حکم کرنا اور بری بات سے روکنا ہر آدمی کا فریضہ ہے، اگر وہ خود عمل نہیں کرتا تو وہ گنہ گار ہے۔ نماز نہیں پڑھتا تو نماز نہ پڑھنے کی وجہ سے گنہ گار ہے، لیکن اس کا بیٹا بھی نماز نہیں پڑھتا تو اس کو چاہیے کہ بیٹے کو تاکید کرے کہ بیٹا! نماز پڑھو۔ اگر بیٹے کو بھی تاکید نہیں کرے گا تو یہ دوسرا گناہ ہے۔ اب دو گناہ ہو گئے۔ خود بھی عمل نہیں کرتا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بیٹے کو بھی نماز کے لئے نہ کہے۔ بیٹے کو نماز کی تاکید کرنا الگ ذمہ داری اور الگ فریضہ ہے اور خود نماز پڑھنا الگ فریضہ ہے۔ اب اگر وہ ایک فریضہ انجام نہیں دیتا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دوسرا فریضہ بھی انجام نہ دے۔ ورنہ دو فریضے چھوڑنے کا گنہ گار ہوگا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسا کہ ایک آدمی روزہ رکھتا ہے لیکن نماز نہیں پڑھتا، تو کوئی اس کو یوں کہے بھلا آدمی نماز تو نہیں پڑھتا، روزہ کاہے کو رکھتا ہے؟ غور کیجیے یہ کوئی بات ہوئی۔ روزہ رکھتا ہے تو ایک نیکی کا کام کر رہا ہے اور ایک فریضہ ادا کر رہا ہے، اب دوسرا فریضہ ادا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ جو فریضہ ادا کر رہا ہے اس کو بھی چھوڑ دے۔

...... یہ انداز غلط ہے

یہیں سے اس بات کی غلطی بھی معلوم ہوگئی کہ لوگ جو کہتے ہیں وہ کتنا غلط ہے کہ ڈاڑھی رکھتے ہو اور ایسا کام کرتے ہو۔ یہ ایک جملہ ہے جو لوگ بولتے ہیں۔ لو! جماعت میں جاتے ہو اور ایسے کام کرتے ہو۔ یہ کہنا غلط ہے۔ ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا۔ اس نے ڈاڑھی رکھی یہ کوئی گناہ کا کام نہیں کیا۔ ڈاڑھی رکھنا الگ سے ایک واجب ہے جس کو وہ ادا کر رہا ہے۔ نماز نہیں پڑھتا یہ الگ چیز ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ نماز نہیں پڑھتا تو ڈاڑھی بھی منڈوا دے۔ فلاں کام نہیں کرتا تو جماعت میں جانا بھی چھوڑ دے۔ یہ جو ایک عام مزاج بنتا

جا رہا ہے؛ یہ غلط ہے۔ ایسی باتیں تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کو کسی کی طرف سے بھلی بات کہی جاتی ہے تو بری معلوم ہوتی ہے۔ ہماری طرف سے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہمیں کسی نے کوئی نصیحت کی بات کہی تو چاہے وہ اس نصیحت پر عمل نہ کرتا ہو لیکن ہمیں تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ دیکھو! اللہ کا بندہ اپنی اتنی خیر خواہی نہیں کر رہا ہے جتنی میری کر رہا ہے۔ ہمیں تو اس کا غلام بن جانا چاہیے، نہ کہ اس پر اعتراض کریں۔ (مجمع بہت محظوظ ہوا اور خوب ہنسا) اب اگر ہمیں عمل کی توفیق نہیں ملتی تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔ باقی یہ انداز اچھا نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس آیت میں جو کہا گیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ کوئی آدمی روزہ رکھتا ہے اور نماز نہیں پڑھتا تو اس کو جب یوں کہا جاتا ہے کہ روزہ رکھتا ہے، نماز نہیں پڑھتا؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ تو روزہ رکھنا چھوڑ دے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب روزہ رکھتا ہے تو نماز بھی پڑھ، اسی طرح یہاں اس آیت میں بھی ہے کہ جب تم لوگوں کو بھلی بات کا حکم کرتے ہو تو خود بھی تو عمل کرو۔ یہ نہیں ہے کہ خود عمل نہیں کرتے ہو تو دوسروں کو بھلی بات کا حکم مت کرو۔

اب اگر کوئی شخص آیت کا مطلب یہ نکالے کہ تم عمل نہیں کرتے تو ہم کو بھی مت کہو، تو یہ اس کی زبردست بھول ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کے بندے! جب بھلی بات کے لئے دوسروں کو تاکید کرتے ہو تو خود اپنی ذات کو کیوں بھول جاتے ہو؟ ﴿وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ﴾ خود دلیل ہے اس مطلب کی جو بیان کیا گیا۔ اپنے کو بھول جاتے ہو یعنی خود کیوں نہیں کرتے؟ یہ مطلب نہیں ہے کہ بھلی بات کا حکم کرنا چھوڑ دو۔

ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو خود کرتے نہیں؟

دوسری آیت ہے: ﴿یاأَیُّھاالَّذِیْنَ آمَنُوْالِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالاتَفْعَلُوْنَ کَبُرَمَقْتًاعِنْدَاللّٰہِ أَنْ تَقُوْلُوْامَالاتَفْعَلُوْنَ﴾ اے ایمان والو! کیوں ایسی بات اپنی زبان سے نکالتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بڑی ناراضگی کی بات ہے کہ تم اپنی زبان سے ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ دراصل اس آیت کا ایک خاص شانِ نزول ہے کہ کچھ مسلمان بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے کہ ہمیں معلوم ہوجائے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے تاکہ ہم وہ عمل کریں۔ بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کہا کہ کسی کو نبی کریم ﷺ کے پاس یہ سوال لے کر بھیجیں، لیکن ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے سورۂ صف کی یہ آیت نازل فرمائی جس میں آگے ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفّاً کَأَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْص﴾ اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ جو لوگ اللہ کے راستے میں ایسی صف بناکر جیسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو، اللہ کے دشمنوں سے لڑتے ہیں، یہ عمل اللہ کو بہت پسند ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ پسندیدہ عمل ہے۔ اب یہ حکم تو پہلے ہی آچکا تھا اور اس حکم پر عمل کے معاملہ میں بعض لوگوں نے کچھ کوتاہی کی تھی۔ غزوۂ اُحد اس سے پہلے پیش آیا تھا اور اس موقعہ پر بعض حضرات افراتفری کی وجہ سے میدان چھوڑ کر ہٹے تھے یا بعضوں نے تمنا کی تھی کہ اگر جہاد کا حکم آیا تو ہم عمل کریں گے۔ تو عمل تو ضرور کیا لیکن سنتے ہی اولین وہلہ میں طبیعت پر گرانی ضرور ہوئی تھی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یوں کہتا ہے اچھا! آپ کیا چاہتے ہیں؛ بتاؤ، آپ کی مانگ پوری کروں گا لیکن جب کہا جاتا ہے تو پھر اس کو شوک (Shock) لگتا

ہے، اگر چہ کیا ہوا وعدہ پورا تو کرتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی بعض لوگوں کو جہاد کا عمل ذرا بھاری معلوم ہوا، اگر چہ انہوں نے عمل تو کیا۔ لیکن روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکم کے آنے پر اولین وہلہ میں ان کو گرانی ہوئی تھی۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ باتیں تو ایسی کرتے تھے کہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوب ہے تو ہم وہ کریں، جب وہ حکم آیا تو پھر جھجک محسوس کرنے لگے۔ اسی کو کہا گیا: ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جو تم کرتے نہیں۔

﴿ اپنی ذات پر نگاہ نہ ہو ﴾

دیکھو! کوئی آدمی اگر اچھا کام کرنے کی تمنا کرے تو یہ اچھی بات ہے۔ دو درجے ہیں، کسی اچھے کام کے کرنے کا ارادہ جب آدمی ظاہر کرتا ہے تو کبھی تو اس ارادے کو دعویٰ کی شکل میں ظاہر کرتا ہے جیسے اگر ہمیں معلوم ہو جائے تو ہم کریں گے۔ اور ایک بات یاد رہے کہ کسی بھی کام کو آدمی دعوے کی شکل میں ظاہر کرے؛ یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ کیونکہ دعوے کے طور پر جب کوئی بات آدمی زبان سے نکالتا ہے تو اس وقت عام طور پر اس کی نگاہ بجائے اللہ تعالیٰ کے اپنی ذات پر ہوا کرتی ہے، اور یہی خطرناک پہلو ہے۔ جہاں کہیں کسی کام میں آدمی کی نگاہ اپنے آپ پر ہوگئی، اس کو بھروسہ اپنی ذات پر ہوگیا، اپنی قوتِ بازو پر ہوگیا تو گڑبڑ ہوگی۔ چھوٹے سے اور معمولی سے کام میں بھی وہ گڑبڑی میں پڑ جائے گا۔ اور بڑے سے بڑا کام ہو لیکن اس کی نگاہ اپنی ذات پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس کی ذات سے انجام ہو کر رہے گا۔ اس لئے یہ ہونا چاہیے۔ ایسے واقعات قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام کا قصہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب حضرت خضر کی ملاقات کے لئے گئے، جس کا قصہ سورۂ کہف میں موجود ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ ان سے ملاقات کہاں ہوگی؟ علامت کیا ہے؟ تو باری تعالیٰ نے کہا تھا کہ جہاں دو دریا ملتے ہیں، اور ساتھ میں ایک مچھلی تل کر لے جاؤ، جہاں وہ مچھلی زندہ ہو کر پانی کے اندر چلی جائے وہاں ہمارے اس بندے سے ملاقات ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب چلے تو ان کے ساتھ خادم حضرت یوشع بن نون علیہ السلام بھی تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد نبی بنائے گئے تھے۔ جب وہاں پہنچے جہاں دو دریا ملتے ہیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام تھکے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ میں تو سوتا ہوں تم ذرا اس مچھلی کا خیال رکھنا۔ اس پر حضرت یوشع نے کہا کہ یہ کوئی بڑی بات تھوڑے ہی ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے، چھوٹا بچہ بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے۔ لیکن جس وقت یہ جملہ ان کی زبان سے نکلا اس وقت اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونے کے بجائے اپنی ذات پر ہو گیا، تو نتیجہ کیا نکلا؟ وہ بیٹھے ہوئے ہیں، ان کے سامنے وہ مچھلی زندہ ہوئی اور دریا میں داخل ہوئی۔ انہوں نے یہ سارا منظر دیکھا اور سوچا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب نیند سے بیدار ہوں گے تو بتا دوں گا۔ لیکن جب وہ نیند سے اٹھے تو یہ بھول گئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: چلو! آگے بڑھیں۔ ان کو تو معلوم نہیں تھا کہ یہ واقعہ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور چلتے رہے، یہاں تک کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھوک لگی تو انہوں نے کہا: کھانا لاؤ۔ اب ان کو یاد آیا کہ اوہو! وہ مچھلی تو زندہ ہو کر دریا میں داخل ہو گئی تھی ﴿وَمَا اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ﴾ یہ شیطان ہی کی حرکت ہے کہ میں آپ سے اس کا ذکر کرنا بھول گیا۔ (بخاری شریف۔ کتاب العلم، حدیث ۴۴)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی آنکھ لگی رہ گئی

اسی طرح روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ ایک غزوہ سے واپس آرہے تھے، رات بھر آپ نے سفر کیا، آدھی رات کے بعد آپ آرام کے لئے اترے۔ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ رات کے ابتدائی حصہ میں سفر جاری رکھتے تھے اور آدھی رات کے بعد آرام فرماتے تھے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: ہم کو کون اٹھائے گا؟ اس لئے کہ آدھی رات کے بعد آرام کر رہے ہیں اور سب تھکے ہارے ہیں، ایسا نہ ہو کہ سب کی آنکھ لگی رہ جائے، اور نماز فوت ہو جائے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں اُٹھاؤں گا، یہ کون سی بڑی بات ہے۔ سب سو گئے اور ان کو کام حوالے کر دیا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں اونٹ کے کجاوے کے ساتھ ٹیک لگا کر سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا کہ جہاں پو پھٹے گی اور صبح کا اجالا نمودار ہوگا؛ سب کو اٹھا دوں گا۔ اور برابر دیکھ رہے ہیں۔ جب پو پھٹنے کا وقت قریب آیا تو ان کی بھی آنکھ لگ گئی اور ایسی لگی کہ سورج طلوع ہو گیا اور سب کی نماز قضا ہو گئی۔ جب سورج بلند ہوا اور تپش آنے لگی تو سب سے پہلے نبی کریم ﷺ کی آنکھ کھلی۔

نبی کریم ﷺ کی بھی نماز قضا ہوئی اس کی وجہ سے کسی کو کوئی اشکال نہ ہو، یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قضا کروائی گئی تھی، کیونکہ قضا کس طرح پڑھی جاتی ہے یہ بھی تو امت کو بتلانا تھا ورنہ یہ حکم کیسے معلوم ہوتا۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے آپ ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِنّی لاَ أَنسیٰ بَلْ أُنسیٰ لِأَسَن﴾ آپ کو نماز میں کبھی سہو بھی ہوا، اور آپ نے سجدۂ سہو بھی کئے، ایسے کئی واقعات ہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں بھولتا نہیں ہوں بلکہ بھلا دیا جاتا ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھول ڈال دی جاتی ہے؛ تاکہ لوگوں کو طریقہ معلوم ہو۔

(مسلم شریف۔ باب قضاء الصلوۃ الفائتۃ حدیث ۶۸۰)

﴿عہدہ طلب کرنا اسی لئے منع ہے﴾

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ کام چھوٹا سا ہو اس میں بھی اگر آدمی اپنی ذات پر اعتماد کرے تو وہ کام گڑبڑ میں پڑتا ہے، اس لئے کبھی بھی دعوے والی شکل پیدا نہ ہو اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں روکا گیا ہے کہ کوئی عہدہ مت مانگو، کیونکہ آدمی جب عہدہ مانگتا ہے تو یہ اس کی دلیل ہے کہ وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ مَیں اس عہدہ کا حق ادا کروں گا۔ یہ ایک طرح کا دعویٰ ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں آتی۔ یہاں اس آیت میں اس پر تنبیہ کی گئی کہ ایسا دعویٰ کیوں کرتے ہو جس پر بعد میں تم سے عمل نہیں ہو پاتا، یہ بات اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی ناراضگی کی ہے کہ تم اپنی زبان سے ایسی بات نکالو۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ دعویٰ الگ ہے، دعوت الگ ہے۔ دعوت کے طور پر کہے، دعوے کے طور پر نہیں۔ لوگوں کو کام کا کہے اور پھر اگر اس سے خود کوتاہی ہو گئی تو اس میں تلافی کی ضرور کوشش کرے۔

﴿بے عمل علماء اور واعظوں کا انجام﴾

بہر حال! کوئی آدمی دوسروں کو نیکی کا حکم کرے اور خود نہ کرے تو اس پر وعیدیں آئی ہیں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شبِ معراج میں آپ ﷺ کا گذر کچھ ایسے افراد کے اوپر سے ہوا کہ جن کے ہونٹ اور زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی تھیں۔ آپ ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتلایا کہ یہ آپ کی امت کے وہ علماء اور واعظ ہیں جو لوگوں کو بھلی بات کا حکم کرتے تھے لیکن خود عمل نہیں کرتے تھے (مسند احمد، حدیث نمبر ۱۲۳۹۱) یہ بڑی خطرناک چیز ہے، آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد﴾

﴿وَمَا أُرِيدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهَاكُمْ عَنْهُ﴾ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسری آیت بھی پیش کی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا قول اور ان کا جملہ نقل کیا، وہ اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں ایسا نہیں کرتا کہ جس چیز سے تم کو روکوں؛ وہ خود کروں۔ یعنی بتوں کی پوجا سے تم کو روکوں، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے تم کو روکوں اور پھر میں خود اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کروں، ایسا میں نہیں کرتا، کوئی نبی ایسا نہیں کرسکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی لوگوں کو بھلی باتوں کا حکم کرے، اس کو اس بات کا اہتمام اور کوشش کرنی چاہیے کہ پہلے خود اس پر عمل کرے اور پھر لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے؛ تو ان شاء اللہ یہ چیز مؤثر ہوگی۔ یہ چیز اس کے کلام میں تاثیر پیدا کرتی ہے اور لوگوں کو عمل کے لئے ابھارتی ہے اس کی وجہ سے کلام میں قوت آتی ہے۔

﴿حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے مناقب﴾

عن أبی زید أسامة بن زید بن حارثة رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُولُ: يُؤْتَىٰ بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُلْقَىٰ فِي النَّارِ، فَتَنْدَلِقُ أَقْتَابُ بَطْنِهِ، فَيَدُورُ بِهَا كَمَا يَدُورُ الْحِمَارُ فِي الرَّحَا، فَيَجْتَمِعُ إِلَيْهِ أَهْلُ النَّارِ فَيَقُولُونَ: يَا فُلَانُ! مَالَكَ؟ أَلَمْ تَكُ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ؟ فَيَقُولُ: بَلَىٰ، كُنْتُ آمُرُ بِالْمَعْرُوفِ وَلَا آتِيهِ، وَأَنْهَىٰ عَنِ الْمُنْكَرِ وَآتِيهِ.

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضرت خدیجہ کے غلام تھے، بعد میں ان کو آزاد کر دیا گیا تھا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا تھا۔ (تفسیر قرطبی۔ ۱۴/۱۱۸)

اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ اصل میں تو یہ آزاد تھے، اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے کے اوپر حملہ کرتا تھا اور اس دوران اس قبیلے کی عورتیں پکڑ لی گئی تو ان کو باندی بنالیا، بچے پکڑے گئے تو ان کو غلام بنالیا، ایسا ہوتا رہتا تھا۔ یہ بھی کہیں سفر میں تھے کسی قافلے والوں نے ان کو پکڑ کر غلام بنالیا اور مکہ میں لاکر بیچ دیا، حضرت خدیجہ نے خرید لیا۔ بعد میں جب حضرت خدیجہ کے ساتھ حضور ﷺ کا نکاح ہوا تو انہوں نے حضور کے حوالے کردیا، آزاد ہوگئے۔ ان کے والدان کی تلاش میں تھے، لوگوں کو پوچھتے رہتے تھے۔ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے تھے، انہوں نے ان کو دیکھ لیا، معلوم ہوا کہ یہ وہی ہیں۔ انہوں نے جاکر ان کے والد کو بتلایا کہ تمہارا بیٹا تو وہاں ہے۔ اب ان کے والد اور چچا ان کو لینے کے واسطے آئے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہمارا بیٹا آپ کے پاس ہے اور ہم اس کو لینے کے واسطے آئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر وہ جانا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے، لیکن اگر وہ نہ چاہتا ہو؛ تو مَیں زبردستی نہیں بھیجوں گا۔ اس کے بعد حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلوایا اور ان سے کہا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ انہوں نے کہا: ہاں! یہ میرے ابا ہیں۔ ان کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں! یہ میرے چچا ہیں۔ آپ ﷺ فرمایا: دیکھو! یہ تم کو لینے کے واسطے آئے ہیں، تم کو اگر جانا ہو تو میری طرف سے اجازت ہے اور میرے پاس رہنا ہو تو اس کی بھی اجازت ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا: مَیں تو آپ کے پاس رہوں گا۔ اب ابا اور چچا کہتے ہیں کہ عجیب لڑکا ہے، غلامی کو آزادی کی زندگی پر پسند کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مَیں تو یہاں ہی رہوں گا۔ خیر! وہ واپس نہیں گئے۔ انہوں نے حضور ﷺ کے پاس رہنا پسند کیا تو حضور کو ان کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ آپ نے فرمایا: آج سے تم میرے

بیٹے ہو۔ اس وقت تک قرآن میں منہ بولا بیٹا بنانے کی ممانعت آئی نہیں تھی اور عرب میں دستور یہ تھا کہ اگر کوئی کسی کو منہ بولا بیٹا بنا لیتا، جس کو (متبنّیٰ) کہتے ہیں اور انگریزی میں (Adopted) کہتے ہیں؛ تو اس کی اسی کی طرف نسبت کرتے تھے، چنانچہ لوگوں نے ان کو زید بن محمد کہنا شروع کر دیا، پھر بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعت آئی کہ کسی کو اس طرح منہ بولا بیٹا بنانا کہ اس کو اس کے باپ کے بجائے دوسرے کی طرف نسبت کرو؛ اس کی اجازت نہیں ہے، اس کے حقیقی باپ ہی کی طرف نسبت کرو؛ لہٰذا پھر ان کو زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

ان کے اور بھی بہت سارے مناقب ہیں، وہ حضور ﷺ کو محبوب تھے، آپ ﷺ ان سے بہت محبت فرماتے تھے، ان کو حِبُّ الرسول کہا جاتا ہے، اور ان کے ہی صاجزادے حضرت اسامہ ہیں۔ حضرت زید بن حارثہ کا نکاح حضرت امِ ایمن سے ہوا تھا، وہ جنہوں نے حضور کو بچپن میں کھلایا تھا، حضور کے والد کی باندی تھیں، ان سے یہ حضرت اسامہ پیدا ہوئے تھے۔ حضرت زید گورے چٹّے تھے اور حضرت اسامہ ذرا سانولے تھے، چونکہ ان کی والدہ ام ایمن حبشی تھیں، اس لئے ان میں سانولا پن آیا تھا، ان کے سانولے ہونے کی وجہ سے بعض لوگ ان کے نسب میں شک کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ یہ دونوں باپ بیٹا یعنی حضرت زید اور حضرت اسامہ مسجد نبوی کے صحن میں چادر اوڑھے سوئے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے ڈھکے ہوئے تھے اور پیر کھلے ہوئے تھے، اس وقت عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس (قائف: جو نشانیاں دیکھ کر بتلائے کہ یہ اس کا باپ یا بیٹا ہے) وہاں سے گذرا، اس نے دونوں کے پاؤں دیکھے، چہرے نہیں دیکھ سکا، اس نے دونوں کے پاؤں دیکھ کر کہا:

﴿اِنَّ هٰذِهِ الْأَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ﴾ یہ باپ بیٹے کے پاؤں معلوم ہوتے ہیں، یہ سن کر حضور ﷺ کو بہت خوشی ہوئی، واپس تشریف لاکر حضرت عائشہ سے کہا: دیکھو! مُجَزِّز نے یہ بات کہی ہے۔ (ابوداؤد۔ باب فی القیافہ حدیث ۲۲۶۷) مطلب یہ کہ عرب لوگ جس کی بات کو مانتے ہیں اس نے بھی کہہ دیا، اب تو کسی کو کوئی اشکال نہیں رہے گا۔ ویسے تو ان کا نسب ثابت ہی تھا۔

بہرحال! حضرت زید کے انتقال کے بعد حضور ﷺ ان سے بہت محبت فرماتے تھے یہاں تک کہ حدیث میں آتا ہے کہ ایک ران پر حضور ﷺ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھلاتے تھے اور دوسری ران پر ان کو بٹھلاتے تھے اور دعا فرماتے تھے: اے اللہ! مَیں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو اس آدمی سے محبت کرنا جو ان دونوں سے محبت کرے۔ (بخاری شریف۔ باب مناقب الحسن والحسین حدیث ۳۷۴۷) اسی وجہ سے ان کو حِبُّ رسول اللہ یعنی ''حضور ﷺ کے لاڈلے'' کہا جاتا تھا۔ صحابہ کو کوئی بات پیش کرنی ہوتی تھی تو جہاں کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی وہاں ان کو آگے کیا جاتا تھا۔

﴿مساوات کا اسلامی قانون﴾

فتح مکہ کے موقعہ پر ایک واقعہ پیش آیا۔ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ نامی تھی۔ (قبیلۂ مخزوم جس سے ابوجہل تعلق رکھتا تھا، یہ قریش کا بڑا باعزت قبیلہ سمجھا جاتا تھا) یہ فاطمہ مسلمان تھی، لیکن ان کی عادت ایسی تھی کہ کسی سے کوئی چیز مانگ کرلی؛ پھر دیتی نہیں تھی۔ فتح مکہ کے موقعہ پر انہوں نے کسی کا کوئی سامان چرالیا تھا اور چوری ثابت ہوگئی، اور چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، اس لئے حضور ﷺ نے اس کا حکم دے دیا۔ جب حضور ﷺ نے یہ حکم دیا تو سنّاٹا چھا گیا، سب ایک دم سے گھبرا گئے کہ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت کے ہاتھ اگر کاٹے گئے تو قریش کی ناک کٹ جائے گی، یعنی ایک باعزت قبیلے میں ایسا ہوگا تو یہ تو بڑی بدنامی کی بات

ہوگی۔ اب سب مشورہ کررہے ہیں کہ اس سلسلے میں حضور ﷺ سے بات کی جائے۔ لیکن حضور کو کہے کون کہ آپ ذرا رعایت فرمائیے۔ مشورہ میں یہ طے ہوا کہ حضرت اسامہ کو بھیجا جائے کیونکہ وہ حضور کے لاڈلے تھے۔ (میں یہی بتلانا چاہتا ہوں) اس لئے لوگوں نے یہ طے کیا کہ اگر یہ جاکر کچھ کہیں تو امید ہے کہ رعایت ہو جائے۔ جب بڑے لوگوں نے ان کو تیار کیا تو یہ کہاں انکار کر سکتے تھے، حضورِ اکرم ﷺ کے پاس گئے اور سفارش کی؛ تو نبی کریم ﷺ بہت غصہ ہوگئے۔ اتنا غصہ ہوئے کہ آپ کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا اور فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ ان میں کا کوئی کمزور آدمی جب شریعت کے خلاف کوئی کام کرتا تھا تو اس کو تو سزا دیتے تھے اور جب بڑے گھرانے کا ایسا کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیتے تھے۔ اور پھر حضور ﷺ نے قسم کھا کر فرمایا: ﴿وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوْأَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا ، اعاذھا اللہ منھا﴾ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی (اعاذھا اللہ کہنا چاہیے) معاذ اللہ چوری کرے گی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹوں گا اور پھر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پر بہت بگڑے، آئندہ کے واسطے حضرت اسامہ تو ڈر ہی گئے۔ (بخاری باب کراھیۃ الشفاعۃ فی الحد، حدیث ۶۷۸۸) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام پر عمل کے معاملہ میں کسی کی کوئی رعایت نہیں ہونی چاہیے۔ یہی قانون کی مساوات ہے۔

آج کل لوگوں نے مساوات کا مطلب ہی بدل دیا۔ حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے بزرگوں میں سے ہیں، دارالعلوم دیوبند کے مدرس تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ جو قانون مرد کے لئے ہو وہی قانون عورت کے لئے ہو، لوگوں نے اس کا نام مساوات سمجھ لیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ مساوات کا اصل مطلب یہ ہے کہ قانون پر عمل کرنے کے

معاملے میں کسی کی رورعایت نہ کی جائے۔ باقی بڑے کے لئے جو قانون بنائیں گے تو کیا چھوٹے کے لئے بھی وہی قانون بنائیں گے؟ وہاں کیوں مساوات کا نام نہیں لیتے؟ بچوں کے لئے الگ بات ہوتی ہے، بڑوں کے لئے الگ ہوتی ہے۔ خود جو لوگ مساوات کے قائل ہیں وہ بھی بہت سی چیزوں میں عورتوں کے لئے الگ قانون بنا رہے ہیں۔ اس کی تفصیل کا ابھی موقعہ نہیں ہے، پھر کسی موقعہ پر بات کی جائے گی۔ خیر! تو قانون میں مساوات اور برابری ہونی چاہیے۔ یہ ایک جملہ ہے جس کا لوگوں نے غلط مطلب لے لیا ہے، مساوات کا مطلب اتنا ہی ہوتا ہے کہ جب ایک قانون بنتا ہے تو اس پر عمل کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہ کی جائے، جو بھی اس قانون کی زد میں آئے گا وہ اس سے نہیں بچ سکتا۔

لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز ایک آدمی لایا جائے گا (ایک آدمی کا مطلب ایک آدمی ہی نہیں ہے، بلکہ ایک جنس مراد ہے، اس میں اس طرح کے بہت سارے لوگ آتے ہیں) اور اس کو جہنم میں ڈالا جائے گا، جہنم میں گرنے کے بعد اس کی انتڑیاں باہر نکل آئیں گی اور وہ ان انتڑیوں کے اردگرد ایسے چکر لگائے گا اور گھومے گا جیسے کولھو کا بیل گھومتا ہے۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر جہنم والے سب اس کے پاس جمع ہو جائیں گے، عجیب و غریب خطرناک منظر ہوگا اور اس کو پوچھیں گے: ﴿یَا فُلَانُ! مَالَکَ؟﴾ ارے بھائی! تم تو ہمیں بھلی بات کا حکم کیا کرتے تھے، بری باتوں سے روکا کرتے تھے، تم یہاں کہاں؟ وہ جواب میں کہے گا کہ جی ہاں! مَیں تم کو تو بری باتوں سے روکتا تھا، بھلی باتوں کا حکم کرتا تھا؛ لیکن خود عمل نہیں کرتا تھا اس لئے مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔

(بخاری شریف۔ باب الفتنۃ اللتی تموج کموج البحر، حدیث ۷۰۹۸)

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ بعض جنت والے کسی کو جہنم میں دیکھیں گے اور کہیں گے: ارے فلاں! تیری باتیں سن کر تو ہم جنت میں آنے والے کام کرنے لگے اور جنت میں آ ئے؛ اور تو جہنم میں کیسے؟ وہ کہے گا: ہاں بھائی! جو باتیں مَیں تم کو کہتا تھا خود اس پر عمل نہیں کرتا تھا، اس لئے مَیں جہنم میں آیا اور تم نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے تم کو جنت میں بھیجا۔ اس لئے آدمی کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اگر وہ اس فریضہ کو انجام دے رہا ہے تو پہلے خود بھی بھلی باتوں پر عمل کرنے کا اہتمام کرے اور بری باتوں سے اپنے آپ کو بچائے۔ یہی چیز تاثیر بھی پیدا کرتی ہے، اور اسی میں برکت بھی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے کہ نیکی کی ہر چھوٹی بڑی بات جو ہم کسی کو کہیں؛ اس پر پہلے عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور برائی کی ہر چھوٹی بڑی بات جس سے ہم کسی کو روکیں؛ اللہ تعالیٰ اس سے بچنے کا اہتمام ہمیں نصیب فرمائے۔

دُعاء

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ وَبَارِکْ عَلیٰ سَیِّدِنَامُحَمَّدِالنَّبِیِّ الْاُمِّیِّ کَمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی بِعَدَدِمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی

رَبَّنَاظَلَمْنَااَنْفُسَنَاوَاِن لَّمْ تَغْفِرْلَنَاوَتَرْحَمْنَالَنَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! امورِ خیر میں سبقت کرنے والا اور جتنے بھی نیکیوں کے طریقے ہیں ان کو اختیار کرنے والا ہمیں بنا۔ اے اللہ! ہمیں ایسی توفیق عطا فرما کہ ہم لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھیں، اے اللہ! اپنے شر کو محدود کرنے کی

اور لوگوں کو اپنے شر سے بچانے کا اہتمام کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس وشیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اپنی رضا اور خوشنودی عطا فرما، اپنی معرفت اور محبت کے انوار سے ہمارے قلوب کو منور فرما۔ اے اللہ! اپنی یاد اور ذکر سے ہمارے دلوں کو آباد فرما۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی؛ وہ ہم کو عطا فرما اور نبی کریم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی؛ ان سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہمارے بیماروں کو صحت کاملہ، عاجلہ مستمرہ عطا فرما، مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، پریشان حالوں کی پریشان حالی کو دور فرما، حاجت مندوں کی حاجتوں کو پورا فرما، ہماری دعاؤں کو نبی کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل میں قبول فرما۔

ربنا تقبل منا انك أنت السميع العليم وتب علينا انك أنت التواب الرحيم

وصلّى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا ومولٰنا محمد واٰله وأصحابه أجمعين

برحمتك يا أرحم الراحمين

اَلْاُمُرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَةِ

ادائے امانت کی تاکید

﴿مجلس ۱﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراً کَثِیْراً.أمابعد:

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوْا الْأَمَانَاتِ اِلیٰ أَھْلِھَا.

قال اللّٰہ تعالیٰ: اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَۃَ عَلیٰ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَیْنَ أَن یَّحْمِلْنَھَا وَأَشْفَقْنَ مِنْھَا وَحَمَلَھَا الْاِنْسَانُ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلاً.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نیا باب قائم کررہے ہیں ''الْأَمْرُ بِأَدَآءِ الْأَمَانَۃِ'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت کے بارے میں جو تاکید کی گئی ہے، اس سلسلہ میں آیتیں پیش کی ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُکُمْ أَنْ تُؤَدُّوْا الْأَمَانَاتِ اِلیٰ أَھْلِھَا﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ تم کو حکم کرتے ہیں کہ امانتیں ان کے حق دار تک پہنچاؤ۔ اس آیت کے شانِ نزول کے سلسلے میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی جس کی تھوڑی تفصیل اس طرح ہے۔

﴿فتح مکہ کا ایک منظر﴾

قریش ایک بڑا قبیلہ ہے اس کی مختلف شاخوں میں کچھ مناصب وعہدے تقسیم شدہ تھے، ان میں ایک عہدہ ''سقایہ'' کا تھا، جس شاخ کو یہ عہدہ ملا تھا، ان کی ذمہ داری حاجیوں کو پانی پلانے کی تھی اور اس کو یہ حضرات باعثِ فخر سمجھتے تھے، چنانچہ یہ منصب بنوہاشم کے اندر چل رہا تھا۔ اسی طرح ایک عہدہ تھا ''علم''۔ جنگ کے موقعہ پر علم اور جھنڈا ایک اور

خاندان کے پاس رہا کرتا تھا۔اور اسی میں سے ایک عہدہ ''حجابہ'' کا تھا کہ کعبہ شریف کی چابی اور کنجی ایک اور خاندان کے پاس رہتی تھی، جس خاندان کے پاس یہ منصب تھا وہ بنوشیبہ ہے جو قریش کی ایک شاخ تھی، یہ لوگ شیبی کہلاتے تھے۔ نبی کریم ﷺ جب فتحِ مکہ کے لئے تشریف لائے تو اس زمانہ میں کلید بردار عثمان نامی تھے، ان کو بلا کر نبی کریم ﷺ نے کعبہ شریف کی چابی منگوائی، چنانچہ وہ لے کر آئے اور کعبہ کا دروازہ کھولا۔ نبی کریم ﷺ اندر تشریف لے گئے، اس کے اندر جو بت اور تصویریں تھیں پہلے وہ نکالی گئیں، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے اندر نماز ادا فرمائی اور اس کے مختلف کونوں میں تسبیح و تہلیل فرمائی۔ کعبہ شریف کے اندر دعا و عبادت وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے دروازے پر تشریف لائے۔ مکہ مکرمہ میں جتنے بھی مشرکین و کفار تھے وہ سب اس درمیان میں مسجدِ حرام میں مطاف میں جمع ہو چکے تھے۔ پورے مکہ کے تمام باشندے اس بات کے انتظار میں تھے کہ دیکھئے! اب ہمارے لئے کیا فیصلہ ہوتا ہے؟ اس لئے کہ اب تک تو ان کی زندگی نبی کریم ﷺ کی مخالفت میں اور آپ کو تکلیفیں پہنچانے میں اور آپ جس دعوت کو لے کر تشریف لائے تھے اس کے خلاف محنت کرنے میں گذری تھی، یہاں تک کہ آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں بھی انہوں نے آپ کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ بہرحال! یہ لوگ اس بات کے منتظر تھے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے؟ چنانچہ نبی کریم ﷺ کعبہ شریف کے دروازے پر تشریف لائے اور آپ نے خود ہی سوال کیا کہ تم لوگ کیا خیال کرتے ہو کہ مَیں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ اس موقعہ پر حضرت سہیل بن عمرو نے۔ جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ کہا: ﴿أَخٌ كَرِيمٌ

وَابنُ أَخٍ كَرِيمٍ﴾ آپ تو ہمارے شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ ہمیں آپ سے اچھے سلوک ہی کی امید اور توقع ہے چنانچہ نبی کریم ﷺ نے اس کے جواب میں فرمایا﴿اِذْهَبُوْا أَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ﴾ جاؤ! تم سب آزاد ہو، یعنی تمہاری کوئی گرفت نہیں ہے، سب کو معاف فرمادیا۔اس موقعہ پر آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں کعبہ شریف کی چابی بھی تھی، روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ چابی بھی آپ ہمیں عطا فرمادیجیے تاکہ سقایہ کے ساتھ حجابہ کا منصب بھی بنو ہاشم کو مل جائے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی بنو ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، خود نبی کریم ﷺ بھی قریش کی اسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی امید پر کہ آپ بھی بنو ہاشم سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اگر یہ درخواست رکھی جائے گی تو قبول ہوجائے گی انہوں نے کھڑے ہوکر یہ درخواست پیش کی نبی کریم ﷺ نے چابی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دینے کے بجائے جو اس کے کلید بردار عثمان تھے انہی کو بلا کر ان کے ہاتھوں میں دی، اتنا ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی فرمایا﴿خُذْهَا خَالِدَةً تَالِدَةً﴾ آپ یہ چابی ہمیشہ کے واسطے لیجیے۔مطلب یہ ہے کہ قیامت تک کے لئے یہ چابی آپ کے خاندان ہی میں رہے گی، کوئی ظالم ہی اس کو تمہارے ہاتھ سے لے گا۔اتنا ہی نہیں کہ صرف چابی دی بلکہ یوں سمجھئے کہ چابی دینے کے ساتھ یہ بشارت بھی سنادی کہ قیامت تک یہ خاندان باقی رہے گا۔اس لئے کہ نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ نکلا کہ یہ ہمیشہ تمہارے پاس رہے گی، ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں رہ سکتی ہے جب کہ خاندان کے افراد بھی موجود ہوں۔

﴿امام مہدی جب ظاہر ہوں......﴾

اسی لئے ہمارے اکابر میں حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ ایک بزرگ گذرے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو انہوں نے ایک تلوار جو آپ کے پاس تھی اسی خاندان کے ایک فرد کو جو اس زمانے میں کلید بردار تھے یہ کہہ کر حوالے کی کہ امام مہدی جب ظاہر ہوں تو یہ تلوار ان کے حوالے کی جائے تاکہ وہ اس کو جہاد میں استعمال کریں، کیونکہ آپ کا خاندان تب تک باقی رہے گا۔ گویا انہوں نے اس سے یہ فائدہ اٹھایا۔ بہر حال! یہ آیت اس وقت نازل ہوئی، جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آپ کو یہ حکم دیا گیا کہ جو لوگ امانت کے حقدار ہیں، ان حقداروں تک امانت پہنچائی جائے۔ امانت سے کیا مراد ہے اور امانت کا مفہوم کیا ہے؛ وہ ابھی پیش کرتا ہوں (فتح الباری ۸/۲۴)

﴿بڑی بڑی مخلوقات نے بوجھ اُٹھانے سے انکار کردیا﴾

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَان اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْماً جَهُوْلاً﴾ (پارہ۲۲، ع۶) باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے دین کی اور شریعت کی یہ امانت آسمانوں پر، زمینوں پر اور پہاڑوں پر پیش کی، تو اللہ کی بڑی بڑی مخلوقات نے اس امانت کو اٹھانے سے انکار کردیا، اپنے عجز اور بے چارگی کا اظہار کیا کہ ہم امانت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے:۔

آسماں بارِ امانت نتواند کشید ❁ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

آسمان یہ بوجھ اٹھا نہیں سکتا تھا تو یہ قرعۂ فال ہمارے یعنی انسانوں کے نام آیا، آسمان زمینوں اور پہاڑوں پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے امانت کو پیش کیا تو انہوں نے اس کو اُٹھانے سے

انکار کیا﴿وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ اور یہ بڑی بڑی مخلوقات ڈر گئیں۔آسمان جیسی بڑی مخلوق، زمین جیسی بڑی مخلوق اور پہاڑوں جیسی بڑی اور مضبوط مخلوق امانت کے اس بوجھ کو اُٹھانے سے ڈر گئے اور سہم گئے لیکن انسان نے اس کو اُٹھالیا، بے شک انسان بڑا ظالم اور جاہل ہے۔

امانت سے کیا مراد ہے یہ بھی عرض کر دیتا ہوں۔ہمارے یہاں عرف میں اور عام بول چال میں امانت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کچھ رقم آپ نے کسی کے ہاتھ میں دی کہ یہ میری امانت ہے، حفاظت سے رکھیو۔جب یہ امانت دینے والا اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے تو اس کو واپس دے دو، اسی کو امانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اگر واپس نہ دے اور خرچ کر دے تو اس کو خیانت سے تعبیر کرتے ہیں، گویا ہمارے یہاں امانت کا یہی ایک مفہوم ہے۔ٹھیک ہے، یہ بھی امانت کے اندر داخل ہے۔

امانت کی وسعت

لیکن عربی زبان کے اعتبار سے امانت کا مفہوم صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ عربی زبان میں امانت ایک وسیع معنٰی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں یہ بھی آجاتا ہے۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ کسی بات یا کسی کام کی انجام دہی میں کسی پر اعتبار اور بھروسہ کرنا؛ اس کا نام ''امانت'' ہے۔اب بھروسہ کرنے والے نے جس کام کی انجام دہی میں اور جس ذمہ داری کو پورا کرنے میں جس آدمی پر اعتماد اور بھروسہ کیا ہے، وہ اس کو پورے طور پر بجالاتا ہے، تو یوں کہا جائے گا کہ اس نے امانت داری سے کام لیا۔گویا ایک امانت اس کے حوالے کی اور وہ آدمی اس کے اعتماد پر پورا اترا، اور اس پر جو بھروسہ کیا گیا تھا اس کے مطابق اس کو انجام دیا، اس میں ذرّہ برابر کمی اور کوتاہی نہیں کی؛ تو کہا جائے گا اس نے امانت کی ادائیگی کی۔اور اگر

اس نے اس کام کی انجام دہی میں کوتاہی کی اور اس پر پورا نہ اترا تو اس کو خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کو ہم اپنی زبان میں وشواس (વિશ્વાસ) کہتے ہیں کہ اگر سامنے والا اس کو پورا نہ کرے، وشواس گھات (વિશ્વાસ ઘાત) کرے؛ اس کو خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور کسی بھی کام میں کسی کے اوپر وشواس (વિશ્વાસ) اور اعتماد کرنا اسی کو امانت کہتے ہیں۔ عربی زبان میں امانت کا یہی مفہوم ہے۔

﴿ آیتِ امانت کی تفسیر ﴾

﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ﴾ والی آیت میں امانت سے کیا مراد ہے؟ کہ ہم نے امانت کو آسمانوں اور زمینوں پر پیش کیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مخلوقات کو یہ پیش کش کی کہ ہم تم کو ایک دستورِ حیات اور شریعت دینا چاہتے ہیں، شریعت کے احکام کا آپ کو پابند کیا جائے گا۔ کچھ چیزیں کرنے کے لئے کہا جائے گا اور کچھ کاموں سے باز رہنے کے لئے کہا جائے گا۔ اگر تم ہمارے مامورات کو بجالاؤ گے، جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کو پورا کروگے اور جن سے باز رہنے کے لئے کہا گیا ہے ان سے بچوگے، تو تم کو ہماری رضامندی اور خوشنودی حاصل ہوگی اور اس کے بدلے میں جنت کی دائمی نعمتیں تم کو دی جائیں گی، اور اگر تم نے ہمارے ان احکام کو انجام نہیں دیا، جو چیزیں کرنے کے لئے کہا گیا ہے ان کو بجا نہیں لائے اور جن چیزوں سے باز رہنے کے لئے کہا جائے گا ان سے باز نہیں رہے، اس کے خلاف کیا؛ تو ہمارا غضب اور ناراضگی تم پر اترے گی، اور اس کے بدلے میں تم کو جہنم کا دائمی اور ہمیشہ کا عذاب بھگتنا پڑے گا۔ اس آیت میں امانت سے یہی مراد ہے۔

چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے زمینوں، آسمانوں اور پہاڑوں کے سامنے یہ پیش کش کی۔

اب ایک سوال ہوسکتا ہے کہ آسمان زمین پہاڑ میں سوجھ بوجھ اور عقل وادراک کہاں ہے کہ جس کی وجہ سے ان کے سامنے یہ بات پیش کی جائے اور یہ جواب دیں؟

اس سلسلے میں علماء مفسرین نے لکھا ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ پیش کش کی تو ظاہر ہے ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی سمجھ اور شعور اور اتنا ادراک بھی عطا فرمایا تھا، جس کی وجہ سے ان کو کی جانے والی پیش کش کا مقصد وہ سمجھ سکیں کہ آئندہ کیا ذمہ داری عائد ہونے والی ہے، اور وہ یہ بھی سمجھ سکیں کہ کچھ احکام دیئے جائیں گے، تم چاہو اپنی مرضی سے انجام دو، تم چاہو انجام نہ دو۔ انجام دو گے تو ہماری خوشنودگی حاصل ہوگی، انجام نہیں دو گے تو ہم ناراض ہوں گے۔ گویا کسی بھی کام کو کرنے میں تم پر زبردستی نہیں ہوگی، بلکہ اختیار ہوگا کہ چاہو تو کرو، اور چاہو تو نہ کرو۔ کرو گے تو ہم خوش ہوں گے اور جنت ملے گی۔ نہیں کرو گے؛ تو ہم ناراض ہوں گے اور جہنم میں بھیجے جاؤ گے، اسی کو شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا شریعت چند احکام کے مجموعے کا نام ہے، اسی کے متعلق ان کے سامنے پیش کش کی گئی تھی۔ اور ان کو جواب دینے کے لئے اختیار بھی تھا۔ ایسی زندگی تم کو چاہیے؟ انہوں نے کہا: اس پر عمل کرنے کی صورت میں تو جنت ملے گی اور عمل نہ کرنے کی صورت میں جہنم میں جانا پڑے گا۔ تو جہنم کے ڈر سے انہوں نے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا کہ ہم یہ بوجھ نہیں اٹھا سکتے اور ہماری ہمت نہیں۔ آسمانوں نے بھی انکار کر دیا، زمینوں نے بھی انکار کردیا اور پہاڑوں نے بھی انکار کردیا، اور انسان نے اٹھالیا۔

کہتے ہیں کہ حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ پیش کش کی کہ ہم تم کو کچھ احکام دینے والے ہیں، اور تم کو اختیار رہے گا، تم چاہو تو عمل کرو اور

چھوڑنا چاہو تو چھوڑ بھی سکو گے۔ لیکن کرو گے تو ہم راضی ہوں گے اور نہیں کرو گے تو ہم ناراض ہوں گے۔ اس پر انہوں نے پوچھا کہ ہم کریں گے تو کیا ملے گا؟ کہا کہ جنت ملے گی انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، ہمیں منظور ہے (روح المعانی ۲۲/ ۹۸) حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو قبول کرلیا، وہ اس کے لئے ہی پیدا کئے گئے تھے، اس لئے قبول کرنا ہی پڑا۔ بہرحال! یہی ہے وہ ذمہ داری اور امانت جس کو ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ﴾ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دین پورا ہی امانت ہے

اور اس امانت سے مراد پورا دین ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ دین انسانوں کے لئے نازل کیا ہے، جو پورا امانت ہے، دین کا ایک ایک حکم امانت ہے، اس کی بجا آوری انسان کو کرنی چاہیے، اگر اس کو ادا کر رہا ہے تو گویا امانت ادا کر رہا ہے، اور اگر ادا نہیں کر رہا ہے تو گویا امانت کی ادائیگی میں خیانت کر رہا ہے۔

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ انسان کا پورا جسم امانت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ زندگی عطا فرمائی، ہمارا وجود اور ہر ہر عضو؛ کان، ناک، زبان، ہاتھ، پاؤں اور آنکھ؛ یہ سب امانت ہے۔

آنکھ کی خیانت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آنکھ کی نعمت ایک خاص مقصد کے لئے عطا فرمائی ہے۔ آنکھ کی نعمت عطا فرما کر حکم دیا کہ کن کن چیزوں کو دیکھ سکتے ہو اور کن کن چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے۔ چند چیزوں کے متعلق فرمایا کہ ان کو آپ نہیں دیکھ سکتے، ان میں سے نامحرم بھی ہے۔ اور بہت سی چیزوں کو دیکھنے کی اجازت دی ہے۔ اب آنکھ کو اسی طرح سے استعمال کرنا جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا ہے؛ یہ تو ہے امانت۔ اور اگر اس کے مطابق استعمال نہ کرے، اس

کے خلاف استعمال کرے تو اس کو خیانت سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی کو قرآن پاک میں فرمایا ہے ﴿یَعۡلَمُ خَآئِنَةَ الۡأَعۡیُنِ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے۔ اسی کو حدیث کے اندر بھی اشارۃً کہا گیا ہے ﴿أَللّٰھُمَّ طَھِّرۡ قَلۡبِیۡ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیۡ مِنَ الرِّیَآءِ وَلِسَانِیۡ مِنَ الۡکِذۡبِ وَعَیۡنِیۡ مِنَ الۡخِیَانَةِ﴾ (کنز العمال حدیث نمبر ۳٦٦٠) اے اللہ! تو میرے دل کو نفاق سے اور میرے عمل کو ریاکاری سے اور میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کردے۔ دیکھو! قرآنِ پاک کی اس آیت میں اور حدیثِ پاک کی اس دعا میں خیانت کے لفظ کو کس لئے استعمال کیا گیا ہے؟ آنکھ کو جہاں استعمال کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کے خلاف دوسری جگہ میں استعمال کرنے کو قرآن وحدیث میں خیانت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس نعمت کو اگر اسی جگہ استعمال کریں گے جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اجازت دی ہے تب ہی سمجھا جائے گا کہ ہم نے امانت ادا کی، اور اگر نامحرموں کو دیکھیں گے، ٹی وی دیکھیں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنے سے منع کیا ہے، اور حرام بتلایا ہے ان کو دیکھیں گے؛ تو یہی خیانت کہلائے گی، اور غور کیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ آنکھ کی نعمت عجیب وغریب عنایت فرمائی ہے کہ انسان برابر پیدا ہونے سے لے کر موت تک استعمال کرتا ہے، لیکن اس میں فرق نہیں آتا۔

﴿زبان اور کان بھی امانت ہے﴾

اسی طرح سے زبان بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت ہے اور یہ بھی ایک امانت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو استعمال کرنے کے لئے بھی بتلایا کہ کہاں کہاں ہم استعمال کرسکتے ہیں، اور کچھ چیزیں ایسی بتلائیں کہ وہاں اس کو استعمال نہیں کرسکتے۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح

میں، تہلیل میں، تمحید میں، قرآن پاک کی تلاوت میں، نیکی کے کاموں میں، بھلی باتوں کا حکم دینے میں، برائی سے روکنے میں اس کو استعمال کیا جائے۔ اور کسی کی غیبت میں، کسی پر بہتان تراشی میں، گالی گلوچ میں، برے الفاظ کو ادا کرنے میں اور لغوگوئی میں، طعن و تشنیع میں استعمال نہ کیا جائے۔ لہٰذا زبان ایک امانت ہوئی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہاں جہاں اس کو استعمال کرنے کا حکم دیا اور اجازت دی اگر وہاں استعمال کریں گے تو یہ سمجھا جائے گا کہ ہم نے امانت ادا کی۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے جہاں استعمال کرنے سے منع فرمایا اگر وہاں استعمال کریں گے تو یوں سمجھا جائے گا کہ ہم نے خیانت کی۔

کان کا بھی یہی حال ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کان سے سننے کی نعمت عطا فرمائی، اس میں بھی کچھ چیزوں کو سننے سے منع کیا، باقی چیزوں کی اجازت دی۔ اب جہاں اجازت دی وہاں استعمال کریں گے تو ٹھیک ہے اور جہاں اجازت نہیں دی وہاں استعمال کریں تو یہ ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح جتنے بھی اعضاء ہیں، ہمارا پورا وجود اور پورا جسم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں، ایسا نہیں ہے۔ ہم اس کے مالک نہیں ہیں

﴿ آدمی اپنی جان کا مالک نہیں ہے: امین ہے ﴾

دیکھو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ زندگی امانت کے طور پر ہمیں عطا فرمائی ہے۔ اسی لئے اگر کوئی آدمی خودکشی (આપઘાત) کرے تو اس کو حرام قرار دیا ہے یعنی انسان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنے ہاتھوں اپنی زندگی ختم کرے، اس لئے کہ ہم اس کے مالک ہی نہیں، اگر ہم مالک ہوتے تو ہمارے ہاتھوں اس کو ختم کرنے کی اجازت دی جاتی۔

اسی طرح اگر کوئی آدمی اپنی آنکھ پھوڑ لے تو وہ گنہگار ہوگا، جس طرح کوئی دوسرا

آدمی آنکھ پھوڑ دے تو وہ گنہگار ہے اسی طرح یہ آدمی خود اپنی آنکھ پھوڑے گا؛ تب بھی گنہگار ہوگا، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو جواب دینا پڑے گا۔ یہ بات اور ہے کہ دوسرا پھوڑتا تو اس کو سزا دی جاتی، اور اس نے خود پھوڑی ہے تو اس کو دنیوی قانونی سزا نہیں دی جائے گی، لیکن وہ گنہگار تو ہوگا۔

بہرحال! ان چیزوں کے ہم مالک نہیں ہیں اسی لئے کوئی آدمی اگر ہمیں یوں کہے کہ مَیں تمہیں اجازت دیتا ہوں کہ تم مجھے قتل کردو۔ مَیں اجازت دیتا ہوں کہ تم میری آنکھ پھوڑ دو؛ تب بھی جس کو اجازت دی ہے اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جو اجازت دے رہا ہے وہ خود مالک ہی نہیں ہے، جب مالک نہیں تو اس کو کیا اختیار ہے کہ دوسرے کی چیز پر تصرف کروائے۔

ایک آدمی نے ہمیں گھڑی دی کہ ابھی رکھو، بعد میں مَیں لے لیتا ہوں، اب ہم دوسرے کو کہیں کہ اس کو پھوڑ دو۔ تو ہمارے کہنے سے دوسرے کے لئے گھڑی کا توڑنا جائز نہیں ہوگا۔ بہرحال! یہ جتنے بھی اعضاء ہیں وہ سارے ہمارے لئے امانت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں امانت کے طور پر عنایت فرمائے ہیں اور ان اعضاء کے متعلق اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص خاص احکام بھی دیے ہیں۔

﴿دولت بھی امانت ہے﴾

بلکہ یہ اعضاء ہی کیا اور بھی جتنی چیزیں ہیں، دولت و پیسہ وغیرہ؛ یہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے امانت ہیں، آدمی یوں سمجھتا ہے کہ پیسوں کا مَیں مالک ہوں، مَیں جس طرح چاہوں، استعمال کروں، مَیں چاہوں تو ٹی، وی لے آؤں، مَیں چاہوں تو سنیما

دیکھوں، مَیں چاہوں تو اس کے ذریعہ سے فلاں چیز خریدوں؛ تو اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ دولت بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی امانت ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں دی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو طریقہ بتلایا اگر اس کے مطابق استعمال کیا تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر اس کے خلاف استعمال کریں گے تو یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

بلکہ اپنی ضرورتوں میں بھی جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے استعمال کرنے کی اجازت دی؛ وہاں ایک حد مقرر فرمادی ہے۔ پیسہ ہمارے پاس ہے، اس کو ہم کھانے میں، جائز کپڑا پہننے میں استعمال کریں، جائز مکان بنانے میں استعمال کریں؛ سب جائز ہے۔ لیکن اپنی ان ضرورتوں میں بھی ایک حد مقرر کی ہے کہ اُس مقررہ حد سے تجاوز نہ کریں؛ جس کا نام فضول خرچی ہے، اس لئے کہ وہ بھی گناہ ہے، اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ معلوم ہوا یہ دولت بھی ہمیں دی گئی ہے، اس کے ہم مالک نہیں ہیں بلکہ یہ بھی ہمارے ہاتھ میں امانت ہے۔ یہ وقت، زندگی اور تمام چیزیں امانت ہیں۔ امانت کا مفہوم بہت عام ہے۔ یہ تو ہماری زندگی کے متعلق ہوا۔

﴿ملازمت میں خیانت﴾

زندگی کے دوسرے شعبے بھی ہیں جن میں امانت کا اطلاق ہوتا ہے۔ مَیں نے ابھی بتلایا تھا کہ اگر کوئی ہم پر اعتماد کرے اور ہم اس کے خلاف کریں تو یہ خیانت کہلائے گی مثلاً آپ کسی کے یہاں ملازم اور نوکر ہوگئے، اب دونوں کے درمیان جتنے وقت کا معاہدہ اور ایگریمنٹ (Agreement) ہوا؛ اتنا وقت آپ نے اپنے اوقات میں سے طے کرلیا، مثلاً

روزانہ صبح آٹھ بجے سے لے کر شام کو چھ بجے تک کے دس گھنٹے اور درمیان میں دو گھنٹے کی چھٹی ہے تو آٹھ گھنٹے آپ نے مالک، آقا اور سیٹھ کو فروخت کر دیے۔ اب سیٹھ نے آپ کو کام سونپا کہ تمہیں فلاں کام کرنا ہے۔ تو گویا ان آٹھ گھنٹوں کے اب آپ مالک نہیں ہیں بلکہ وہ مالک ہے جس کے یہاں آپ ملازمت کر رہے ہیں، اس کا معاوضہ آپ کو ملنے والا ہے۔ اب یہ آٹھ گھنٹے آپ وہیں استعمال کریں گے جہاں وہ مالک آپ کو بتلا رہا ہے۔ اب اگر کچھ وقت ایسا ہے کہ جس میں آپ کا کوئی دوست آ گیا اور آپ اس کے ساتھ بات کر رہے ہیں یا اس میں آپ اخبار پڑھ رہے ہیں یا اس میں آپ کہیں دور دوسری جگہ چلے گئے؛ تو یہ آپ نے خیانت کی۔ اس لئے کہ یہ آٹھ گھنٹے آپ کے نہیں تھے، آپ تو تنخواہ کے بدلے میں یہ آٹھ گھنٹے بیچ چکے ہیں، یہ وقت آپ کا نہیں ہے، یہ وقت تو آپ تنخواہ کے بدلے میں سیٹھ اور مالک کو دے چکے ہیں، اب اس نے آپ کو جہاں استعمال کرنے کا پابند کیا ہے اسی میں استعمال کریں، اگر اس میں سے ایک منٹ بھی آپ ضائع کریں گے؛ تو یہ خیانت کہلائے گی۔

﴿ملازمین کے لئے سبق آموز طرزِ عمل﴾

''اکابر کا تقویٰ'' نامی ایک کتاب ہے اس میں اس قسم کے بہت سے واقعات آپ پڑھیں گے۔ ہمارے اکابر دیوبند میں سے ایک بزرگ ہیں ان کے حالات میں لکھا ہے کہ درس کے درمیان کوئی ملنے والا آ گیا تو گھڑی دیکھ کر اس کو نوٹ کر لیتے تھے کہ آٹھ بجے یہ آدمی آیا، اب ان کی کوشش تو یہ ہوتی تھی کہ جلدی سے اس کو نمٹا دیں، جب وہ واپس چلا جاتا تو وقت دیکھ کر اس کو بھی نوٹ کر لیتے کہ آٹھ بج کر پانچ منٹ پر گیا۔ اس طرح کا کوئی بھی

وقت ہوتا تو اس کو ڈائری میں نوٹ کر لیتے اور مہینے کے اخیر میں اس کو جوڑ کر ایک دن کے برابر ہو جاتا تو اس کی تنخواہ وصول نہیں کرتے۔اس لئے کہ جب ہم نے یہ وقت وہاں لگایا نہیں جس کا ہمیں کہا گیا تھا، تو اتنی تنخواہ بھی ہم نہیں لیتے۔خود ہی لکھ کر اطلاع کر دیتے کہ آدھے دن کی یا پورے دن کی تنخواہ نہ دی جائے اس لئے کہ اتنا وقت دوستوں کی ملاقات میں یا دوسرے آنے جانے والوں کی ملاقات میں خرچ ہوا ہے۔اس بات کا خاص اہتمام کرتے یعنی ان حضرات کے یہاں یہ چیز بہت اہم تھی۔حالانکہ ان کی تنخواہ کتنی ہوتی تھی، مہینہ کی دس پندرہ روپیہ تنخواہ ہوتی تھی۔اس میں بھی یہ حال ہوتا تھا۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کی تنخواہ دس روپے تھی۔ جب آپ کی عمر زیادہ ہوئی تو شوریٰ والوں نے طے کیا کہ تنخواہ بڑھائی جائے، اس میں اضافہ کیا جائے اور پندرہ روپے کی جائے۔کمیٹی والوں نے طے کر کے پندرہ روپے کر دی اور شوریٰ میں پاس کر دیا۔حضرت کو معلوم نہیں تھا۔جب مہینہ ختم ہوا اور تنخواہ دینے کے لئے آدمی آیا تو اس نے پندرہ روپے دیئے۔حضرت نے واپس کر دیئے کہ میری تنخواہ تو دس روپے ہی ہے۔اس نے کہا کہ کمیٹی والوں نے اضافہ کر دیا ہے، اور بجائے دس کے پندرہ روپے کر دی ہے، آپ قبول کر لیجیے۔تو حضرت نے کہا کہ یہ کیا بات ہوئی، پہلے مَیں جوان تھا تو دس روپے تنخواہ تھی، اب تو مَیں بوڑھا ہو گیا اور بوڑھا ہونے کی وجہ سے وہ بات بھی نہیں رہی، اس لئے تنخواہ میں کمی ہونی چاہیے تھی نہ کہ زیادتی۔شوریٰ والوں نے بہت کہا لیکن آپ نے زائد پانچ روپے قبول نہیں کیے، بلکہ وہی دس روپے تنخواہ لیتے رہے۔

پھر تو دنیا میں جھگڑے ہی ختم ہو جائیں

بہر حال! امانت والا وصف بہت اونچا وصف ہے۔آج کل تو مزاج یہ بن گیا ہے کہ ملازمین کی طرف سے مطالبات ہوتے ہیں کہ ہماری تنخواہ بڑھائی جائے، ہمارے حقِ رخصت میں اضافہ کیا جائے اور پھر نعرے بازی، جلسے اور یونین قائم کی جاتی ہے۔ان کے اوپر کیا ذمہ داری ہے،ان کے فرائض کیا ہیں؛اس کی ادائیگی کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ہاں! ہر جگہ یہ نعرہ ہے کہ ہمیں یہ حق دو، ہمیں وہ حق دو۔تم پر دوسروں کا جو حق ہے وہ ادا کرنے کی بات نہیں رہی۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے ﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا﴾ تم پر جو حق ہے،تم پر جو ذمہ داری ہے؛ وہ ادا کرو۔اب تمہارا حق دوسرے پر جو ہے اس کے مطالبہ کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا۔لیکن یہاں معاملہ اُلٹ گیا۔ ہمارے معاشرے میں ہم دیکھ رہے ہیں، گھروں میں خاندانوں میں،محلوں میں، بستیوں میں جھگڑے اور لڑائیاں ہیں،اس کی بنیاد ہی یہ ہے کہ ہر ایک اپنا حق مانگ رہا ہے لیکن دوسرے کے حق کو دینے کی فکر نہیں کر رہا ہے۔

ہم لوگوں نے سبق ہی الٹا پڑھنا شروع کر دیا ہے۔سیدھا سبق تو یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ نے شوہر کو بیوی کے حقوق بتلائے ہیں کہ تمہاری بیوی کے تم پر یہ حقوق ہیں،اور بیوی کو شوہر کے حقوق بتلائے کہ تم پر تمہارے شوہر کے یہ حقوق ہیں۔اسی طرح باپ کو بیٹے کے حقوق بتلائے کہ آپ باپ ہیں تو آپ پر بیٹے کے یہ حق ہیں،اور بیٹے کو باپ کے حقوق بتلائے کہ تم بیٹے ہو تو تم پر باپ کے یہ حقوق ہیں۔شریعت نے ہر ایک کو دوسرے کا حق کیا ہے وہ بتلایا اور کہا کہ اس کو ادا کرو۔لیکن اب کیا ہو گیا کہ شوہر کو جو سبق پڑھنا چاہیے تھا کہ بیوی کا میرے اوپر کیا حق ہے،وہ پڑھنے کے بجائے وہ پوچھتا ہے کہ میرا حق بیوی پر کیا ہے۔اگر مولویوں سے

سوال کرے گا، مفتیوں سے فتویٰ پوچھے گا تو یہ نہیں پوچھے گا کہ بیوی کا حق مجھ پر کیا ہے، بلکہ یہ پوچھے گا کہ میرا حق بیوی پر کیا ہے۔ دوسرے کا جو سبق تھا وہ پوچھتا ہے، اپنا سبق بھول گیا۔ یہی حال بیوی کا ہے کہ بیوی پوچھتی ہے کہ شوہر پر میرا حق کیا ہے۔ یہ نہیں پوچھتی کہ شوہر کا حق میرے اوپر کیا ہے۔

بھائی! سیدھی بات تو یہ ہے کہ آدمی کو وہی چیز پوچھنی چاہیے جو خود کرنے کی ہے۔ شوہر کو بیوی کے حق ادا کرنے ہیں، اس لئے وہ یہی پوچھے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اب رہے شوہر کے حق؛ تو وہ تو بیوی ادا کرے گی، لہٰذا شوہر اس کے بارے میں پوچھ کر کیا کرے گا۔ اسی طرح بیوی کو شوہر کا حق ادا کرنا ہے، لہٰذا وہ یہ پوچھے کہ شوہر کا حق میرے اوپر کیا ہے۔ وہ یہ کیوں پوچھتی ہے کہ میرا حق شوہر پر کیا ہے۔ وہ تو شوہر کو ادا کرنا ہے تو وہ پوچھے۔

اسلام نے تمہارے اوپر دوسرے کے جو حق ہیں وہ بتلائے ہیں۔ شوہر کو بتلایا کہ بیوی کا یہ حق ہے، اور بیوی کو بتلایا کہ شوہر کا یہ حق ہے۔ اب جو سبق خود کا تھا وہ بھول گیا اور جو دوسرے کا تھا وہ رٹنا شروع کر دیا؛ تو جھگڑے شروع ہو گئے۔ اگر ہر ایک اپنا اپنا سبق یاد کرنے لگے اور اس کو ادا کرنے کی کوشش کرے؛ تو دنیا میں جھگڑے ہی ختم ہو جائیں۔

اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے کہ آقا کا حق کیا ہے یہ غلام سیکھے۔ ملازم یہ سیکھے کہ میرے اوپر آقا کا کیا حق ہے۔ اور آقا یہ سیکھے کہ میرے اوپر ملازم کا کیا حق ہے۔ دونوں اپنی اپنی ذمہ داری کو سمجھیں اور اس کو ادا کرنے کا اہتمام کریں تو پھر ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی جھگڑا ہی نہیں ہوگا۔

دفتری سامان بھی امانت ہے

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ امانت کا مفہوم بہت وسیع ہے۔جیسا کہ مَیں نے کہا کہ ملازمت کا وقت بھی امانت ہے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ یہ دفتری سامان بھی امانت ہے مثلاً آپ سرکاری کھاتے میں نوکری کرتے ہیں۔آپ کلکٹر ہیں، گورنر ہیں، افسر ہیں۔آپ کو سرکاری کوئی شعبہ دیا گیا ہے، آپ اس میں انچارج ہیں۔اس کے لئے آپ کو آفس دی گئی، آفس میں ٹیبل، کرسی، فون، گاڑی اور بہت ساری چیزیں آپ کو اس لئے دی گئی ہیں تاکہ آپ کو ڈیوٹی انجام دینے میں سہولت ہو، لہٰذا اس کے لئے تو آپ یہ ساری چیزیں استعمال کرسکتے ہیں، اسی میں سے ایک کاغذ اور پینسل ہے اس کو بھی آپ اسی کام میں استعمال کرسکتے ہیں جس کے لئے وہ دیا گیا ہے۔اگر اس کے علاوہ کام میں آپ استعمال کریں گے؛ تو یہ خیانت میں شمار ہوگا۔اسی طرح گاڑی آپ خود استعمال کرنے کے بجائے آپ کے دوست کو دیں۔وہ فون جو آپ کو آفس کے کام کے لئے دیا گیا ہے، اس کو آپ دوسری جگہ پر لگائیں گے؛ تو یہ خیانت کہلائے گی۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ مدرسہ میں بیٹھنے کے لئے چھوٹا سا گدا دیا جاتا ہے ایک مرتبہ آپ اس گدے پر تشریف فرما تھے اور سبق پڑھا رہے تھے، جب سبق سے فارغ ہوئے تو کوئی دوست ملنے کے لئے آیا، اس سے گفتگو کرنا شروع کی تو اس گدے سے ہٹ گئے۔انہوں نے کہا کہ آپ کیوں ہٹ گئے؟ تو جواب دیا کہ مدرسہ والوں نے اس پر بیٹھ کر سبق پڑھانے کے لئے یہ گدی دی ہے، دوستوں سے باتیں کرنے کے لئے نہیں دی ہے۔

بہرحال! یہ دفتری سامان بھی امانت ہے، اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہم امانت کے بارے میں کتنا اہتمام کرتے ہیں۔ حالانکہ اس کا بھی آدمی کو بڑا اہتمام ہونا چاہیے۔

﴿ایک ضروری مسئلہ﴾

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ کسی دوسرے کی چیز جو آپ کے یہاں عاریت کے طور پر آئی ہے وہ بھی امانت ہے، اس کی ادائیگی کا پورے طور پر آپ کو اہتمام کرنا چاہیے۔ کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ پلیٹ کے اندر کسی کے یہاں سے آپ کے یہاں کھانے کی کوئی چیز آئی۔ تو وہ پلیٹ اتنی دیر کے لئے آئی ہے کہ وہ کھانے کی چیز اس کے گھر سے آپ کے گھر تک پہنچ جائے۔ اس لئے نہیں آئی کہ وہ پلیٹ ہی رکھ کر اسی میں سے آپ کھانا شروع کردیں۔ اب چلئے وہ تو کھالیا اس کے بعد بھی پلیٹ بھیجنے کا نام ہی نہیں لے رہے ہیں۔ اس کی کہاں اجازت ہے، اس کو منع لکھا ہے۔

کسی نے آپ کو راز کی کوئی بات یہ سمجھ کر کہی کہ آپ اس کی بات کو بھید رکھیں گے، لیکن آپ نے دوسرے کو بتلا دیا۔ اس نے آپ پر جو اعتماد کیا تھا اس کو مجروح کیا؛ تو یہ بھی خیانت کہلائے گی۔

بہرحال! امانت کا مفہوم بہت عام اور بڑا وسیع ہے بلکہ یوں سمجھئے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر جزو اس عموم مفہوم میں آجاتا ہے۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَّا أَمَانَةَ لَهٗ (مسند احمد، حدیث نمبر ۱۲۵۶۷)﴾ جس آدمی کے اندر امانت کا وصف اور امانت والی خوبی نہیں تو یوں سمجھو کہ وہ کامل مؤمن ہی نہیں۔ کامل مؤمن اسی وقت بن سکتا ہے جب اس میں جذبۂ امانت ہو۔ جب اس کے اندر یہ وصف ہوگا تو کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، کوئی کہے یا نہ کہے، کوئی ٹوکے یا نہ ٹوکے؛ وہ اپنی طرف سے ہی امانت کو ادا کرنے کا اہتمام کرے گا۔

۱۳؍محرم الحرام ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۹؍مئی ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد.

وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: آیۃُالْمُنَافِقِ ثلاثۃٌ:اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَاوَعَدَأَخْلَفَ وَاِذَااؤْتُمِنَ خَانَ. وَفِی رِوَایۃٍ: وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّہٗ مُؤْمِنٌ.

جیسا کہ آپ حضرات کومعلوم ہے کہ یہ باب امانت کی ادائیگی کے سلسلے میں چل رہا ہے۔امانت سے کیا مراد ہے؟ وہ مَیں آپ حضرات کے سامنے عرض کرچکا ہوں۔اس سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو آیتیں پیش فرمائی تھیں ان کی تشریح آپ کے سامنے آچکی ہے۔اب ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ منافق کی نشانیاں تین ہیں،جب بات کرے تو جھوٹ بولے،جب کسی سے وعدہ کرےتو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔یہاں اس روایت کواسی تیسرے جزو کی وجہ سے لائے ہیں۔

ایک روایت میں ایک زیادتی اور بھی ہے کہ جس میں یہ تین باتیں ہوں تو یہ منافق کی علامت ہے،پھرچاہے وہ روزہ رکھتا ہو،نماز پڑھتا ہواوراپنے متعلق یہ سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان ہوں؛ پھربھی وہ کامل مسلمان نہیں ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ منافق ہے۔

﴿منافقین؛اوران کا پس منظر﴾

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایک مستقل گروہ تھا جن کو منافقین سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے مؤمن کی صفت ہے ایمان، کافر کی صفت ہے کفر، مشرک کی صفت ہے شرک؛ اسی طرح منافق ہے جس کی صفت ہے نفاق۔

حضور اکرم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ میں تین قسم کے لوگ تھے۔ وہاں قبیلے اور خاندان کے اعتبار سے پہلے سے دو جماعتیں آباد تھیں۔ ایک تو وہ حضرات تھے جن کی دعوت پر نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لے گئے تھے، اور وہ نبی کریم ﷺ پر ایمان لائے؛ وہی حضرات انصار کہلائے۔ ان کے دو قبیلے تھے ایک اوس اور دوسرا خزرج۔ یہ لوگ مذہب کے اعتبار سے مشرک اور بت پرستی میں مبتلا تھے۔ دوسرا گروہ یہودیوں کا تھا، ان کے بھی دو بڑے مشہور قبیلے تھے، بنوقریظہ اور بنونضیر۔ یہودیوں کے دونوں قبیلوں میں آپس میں ٹکراؤ، لڑائیاں اور مقابلے ہوتے رہتے تھے۔ اسی طریقے سے مشرکین کے جو دو قبیلے تھے اوس اور خزرج؛ ان میں بھی زمانۂ جاہلیت میں آپس میں ٹکراؤ ہوتا رہتا تھا، بعد میں اوس اور خزرج میں بھی اسلام آیا۔

چونکہ یہ لوگ زمانۂ جاہلیت کی رسم کے مطابق مکہ مکرمہ حج کے لئے جایا کرتے تھے اور حج کے زمانہ میں نبی کریم ﷺ اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق عرب کے مختلف قبائل جو حج کے لئے وہاں آتے تھے ان میں اسلام کی دعوت پیش فرماتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے مدینہ والوں کے سامنے بھی اسلام کی دعوت پیش کی، شروع میں ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائے، بعد میں اس میں اضافہ ہوتا رہا۔ چونکہ نبی کریم ﷺ کے لئے مکہ مکرمہ میں آزادی کے ساتھ

اسلام کی دعوت پیش کرنا مشکل تھا، مکہ والوں اور قریش کی طرف سے بہت سخت رکاوٹیں ڈالی جاتی تھیں، اس لئے حضور اکرم ﷺ چاہتے تھے کہ آزادی کے ساتھ اسلام کی دعوت پیش کرنے کا موقعہ ملے۔ چنانچہ عرب کے جو قبائل حج کے موقعہ پر آتے تھے ان کے سامنے اپنی بات پیش کیا کرتے تھے کہ یہاں میرے لئے مشکلات اور رکاوٹیں ہیں، مجھے اپنے یہاں لے چلو، تاکہ میں اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اسلام کی دعوت لوگوں کے سامنے آزادی کے ساتھ پیش کرسکوں۔ چنانچہ اوس اور خزرج کے سامنے بھی آپ نے اپنی یہ بات رکھی۔ چونکہ ان کے کچھ لوگ اسلام لا چکے تھے۔

منیٰ میں جہاں جمرۂ عقبہ ہے جس کو بڑا شیطان کہتے ہیں وہاں سب سے پہلے اسلام پر بیعت ہوئی تھی، یہی پہلی بیعت ''بیعتِ عقبۂ اولیٰ'' کہلاتی ہے۔ ''عقبہ'' اصل میں گھاٹی کو کہتے ہیں، اسی گھاٹی میں یہ جمرہ واقع ہے، اس لئے اس کو جمرۂ عقبہ کہا جاتا ہے۔ خیر! وہ لوگ شروع میں تو تھوڑے تھے، لیکن بعد میں ان میں اضافہ ہوا اور وہ ستّر [۷۰] سے زیادہ آدمی ہوگئے تھے اور بعد والی بیعت ''بیعتِ عقبۂ ثانیہ'' کہلاتی ہے۔

بہرحال! ان کے سامنے جب حضور اکرم ﷺ نے اپنی بات رکھی تو ان لوگوں نے آپ کی اس پیشکش کو قبول کیا اور کہا کہ ہم آپ کو اپنے یہاں لے جاتے ہیں اور آپ کی حفاظت کا وعدہ کرتے ہیں اور ہم آپ کے اس کام میں آپ کا پورا تعاون کریں گے اور ہاتھ بٹائیں گے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس موقعہ پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے چچا ہیں، انہوں نے ان لوگوں سے۔ جو بعد میں انصار کہلائے۔ کہا کہ اے انصار کی جماعت! دیکھو! ہم نے ان کی پوری پوری حفاظت کی ہے، جس کی وجہ سے یہ بڑی عزت وحفاظت کے

ساتھ مکہ میں ہیں، اگر تم ان کو اپنے یہاں بلا کر وہ عدے پورے کرو گے جو تم ابھی کر رہے ہو اور مخالفین سے ان کی حفاظت کرو گے؛ تب تو ٹھیک ہے، اور اگر ان کو لے جا کر دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو پھر ان کو یہیں رہنے دو، اس لئے کہ یہ اپنی قوم اور اپنے وطن میں عزت وحفاظت کے ساتھ رہ رہے ہیں۔اس پر انہوں نے کہا کہ ہم اپنا وعدہ پورا کریں گے۔اسی میں ایک بات یہ طے ہوئی تھی کہ مدینہ منورہ میں رہ کر ہم نبی کریم ﷺ کا پورا تعاون کریں گے اور آپ کی حفاظت کریں گے۔ (سیرۃ ابن ہشام،۲/۱۸۹)

خیر! بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو ہجرت کی اجازت ملی اور آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو اوس اور خزرج کے جو لوگ اسلام لے آئے تھے وہ تو مؤمن اور مسلمان کہلاتے تھے اور ان کے جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے وہ مشرک کہلاتے تھے اور تیسرا گروہ یہودیوں کا تھا۔تو گویا مذہب کے لحاظ سے تین جماعتیں تھیں (۱) مؤمنین (۲) مشرکین (۳) یہود۔یہ تینوں مدینہ منورہ میں آباد تھے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کے کارنامے

چنانچہ بخاری شریف میں روایت موجود ہے (بخاری جلد۲، صفحہ ۶۵۵، کتاب التفسیر) کہ ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ - جو قبیلۂ خزرج کے سردار تھے - بیمار ہوئے، نبی کریم ﷺ ان کی عیادت کے لئے سواری پر تشریف لے جا رہے تھے اور حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو اپنے پیچھے بٹھا رکھا تھا، راستہ میں دیکھا کہ ایک جگہ چند لوگ جمع ہیں جن میں مسلمان، مشرکین اور یہود تھے، ان میں عبداللہ بن ابی بھی تھا جو مشرک تھا اور ابھی اس نے اسلام کا اظہار نہیں کیا تھا اور دوسرے لوگ بھی تھے۔آپ گذر رہے تھے تو سواری کی وجہ سے غبار اُڑ رہا تھا اور وہ غبار مجلس

والوں پر بھی آرہا تھا تو عبداللہ بن ابی نے چادر سے اپنی ناک ڈھانپ دی اور کہنے لگا کہ ہم پر غبار نہ اُڑایا جائے۔دراصل وہ نبی کریم ﷺ سے یوں بھی جلا ہوا تھا کہ آپ کے تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اس کو اپنا سردار بنانا تجویز کیا تھا،لیکن اسلام کی دعوت جب مدینہ منورہ میں پھیلی تو یہ سارا پروگرام جو پہلے سے طے شدہ تھا وہ عمل میں نہیں آسکا۔اسی لئے اس کو آپ ﷺ سے جلن تھی اور حسد تھا۔

بہرحال!حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ بھی تھی کہ جب کوئی مجمع دیکھتے تو مجمع کی مناسبت سے اللہ کا پیغام ان کے سامنے پیش فرماتے تھے،لہٰذا حضور اکرم ﷺ نے تو یہ مجمع دیکھ کر آگے بڑھنا موقوف کیا،اپنی سواری سے اترے اور ان کے سامنے قرآن پاک کی کچھ آیتیں تلاوت فرمائیں اور اسلام کی دعوت پیش کی۔اس پر عبداللہ بن ابی نے کہا کہ آپ ہماری مجلس میں آکر اس طرح کرتے ہیں اور ہماری باتوں کے بیچ میں دخل اندازی کرتے ہیں،آپ کی باتیں اپنی جگہ پر ٹھیک ہیں،لیکن کوئی آپ کے پاس آپ کے گھر آوے تو اس کے سامنے دعوت پیش کیا کیجیے،ہماری مجلسوں کو اس طرح نہ بگاڑیئے۔اس پر وہاں جو مؤمنین موجود تھے ان میں اور اس میں کچھ تو تو میں میں بھی ہوئی۔اس کی اس روش سے نبی کریم ﷺ کو دُکھ پہنچا،آپ آگے بڑھے اور حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے پاس عیادت کے لئے پہنچے اور وہاں ان سے تذکرہ کیا کہ عبداللہ بن ابی (ابوحباب اس کی کنیت تھی) ابوحباب نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا۔اس پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول!آپ اس کو چھوڑ دیجیے،اس لئے کہ یہاں والوں نے اس کو اپنا سردار بنانا تجویز کیا تھا لیکن آپ جب ہجرت کر کے یہاں تشریف لائے اور اسلام کی دعوت پھیلی تو یہ سارا بنا بنایا

نظام رکھا رہ گیا، اس لئے اس کے دل میں آپ کے متعلق جلن ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے اسی وجہ سے کرتا ہے، آپ اس سے درگذر فرمائیے۔ ویسے بھی جب تک جہاد کا حکم نازل نہیں ہوا تھا وہاں تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ کو تاکید تھی کہ ان اہلِ کتاب و مشرکین کی طرف سے جو ایذائیں اور تکلیفیں آپ کو پہنچائی جاتی ہیں ان پر صبر سے کام لیجیے۔ اس کے بعد جب جہاد کا حکم نازل ہوا اور قریش کے ساتھ بدر میں مقابلہ ہوا اور اس میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے تو اس واقعہ کے پیش آنے تک تو عبداللہ بن ابی اور دوسرے لوگ کُھلّم کُھلاّ مشرک تھے لیکن بدر کے واقعہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو جو کامیابی اور فتح عطا فرمائی اور اس کے حالات مدینہ منورہ پہنچے کہ مشرکین کے ستّر لوگ مارے گئے جن میں بڑے بڑے سردار بھی تھے اور ستّر آدمی قید ہوئے، تو اس کی وجہ سے ایک خوف اور ہیبت سی چھا گئی اور عبداللہ بن ابی نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب کھل کر ان لوگوں کی مخالفت کرنا مناسب نہیں ہے، ہمیں اپنی روش اور طریقہ بدلنا چاہیے، اگرچہ دل میں جو دشمنی تھی وہ ختم نہیں ہوئی تھی، اس لئے اس نے کہا کہ اب ہم ایسا کریں کہ ظاہر میں تو اسلام کا لبادہ اوڑھ لیں، اور اندرونی طور پر جو عداوتیں کر رہے ہیں وہ کرتے رہیں گے، تاکہ ظاہری مسلمانی کی وجہ سے ان کی طرف سے ہمیں کوئی مشکل و تکلیف نہیں پہنچے گی، اور ہماری جان و مال محفوظ رہیں گے۔ چنانچہ اس طرح یہ ایک نئی جماعت شروع ہوئی جنہوں نے اپنی زبان سے اسلام کا اظہار کیا اور دل میں مسلمان نہیں تھے بلکہ وہ اپنے پرانے عقیدوں کے اوپر قائم تھے اور مشرک تھے ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ جب ایمان والوں کے ساتھ ملاقات کرتے تھے تو یوں

کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور جب اپنے سرکش لوگوں سے ملتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں، ہم تو ان لوگوں کا ٹھٹّھا کر رہے ہیں اور ظاہری طور پر ان کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ اب تک تین جماعتیں تھیں، اب یہ چوتھا گروہ پیدا ہوا جو ظاہری اعتبار سے تو مؤمنین کے اندر شامل تھا لیکن حقیقی طور پر مشرکین کا گروہ تھا، یہاں سے نفاق کی ابتداء ہوئی۔ عبداللہ بن ابی اس کا سردار کہا جاتا ہے اور اس کے ہمنوا بھی بہت سارے لوگ تھے، جو اسی برائی میں مبتلا تھے جس کو قرآن پاک میں نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کی طرف سے اسلام کو بہت نقصان پہنچا اور نبی کریم ﷺ کی وفات تک یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور عبداللہ بن ابی کا انتقال غزوۂ تبوک کے بعد ہوا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر زنا کی تہمت لگائی گئی تھی اس میں بھی اس کا بڑا حصہ اور ہاتھ تھا اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لئے بھی وہ بہت کوشش کرتا رہتا تھا، اہلِ اسلام کو مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچانا اس کا شیوہ تھا

منافقین کے ساتھ آنحضور ﷺ کا برتاؤ

اس کے باوجود نبی کریم ﷺ اس کے اس ظاہری ایمان کی وجہ سے اس کے ساتھ وہی معاملہ فرماتے تھے جو اہل ایمان کے ساتھ کیا جاتا تھا۔ بعض مرتبہ مخلصین صحابہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض بھی کیا کہ اس کا ایسا معاملہ ہے، اس لئے اس کے قتل کی ہمیں اجازت دیجیے، لیکن نبی کریم ﷺ نے کبھی اجازت نہیں دی، بلکہ آپ فرماتے کہ یہ لوگ جب اپنے آپ کو ایمان والا کہتے ہیں، اس کے باوجود مَیں ان کے قتل کی اجازت دے دوں اور قتل کراؤں تو دوسرے لوگ کہیں گے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کراتے ہیں، اور یہ چیز لوگوں کو ایمان سے برگشتہ کرنے کا اور اسلام سے دور رکھنے کا سبب بنے گی (بخاری شریف، ۳۵۱۸) بہرحال!

نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ بڑے اخلاق ومحبت سے پیش آتے رہے اوران کے ساتھ ایمان والوں جیسا ہی معاملہ ہوتا تھا، اگرچہ آپ بھی جانتے تھے کہ یہ لوگ منافق ہیں۔

بلکہ غزوۂ تبوک سے واپسی میں توان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کے قتل کی سازش بنائی تھی (نعوذ باللہ من ذالک) آپ ﷺ ایک گھاٹی میں سے گذر رہے تھے، اس وقت ان لوگوں نے قتل کرنا چاہا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی اور جن لوگوں نے یہ اسکیم اورسازش تیار کی تھی ان کے نام سے بھی حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے واقف کیا، حضور ﷺ نے اُن لوگوں کے یہ نام حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو بتلائے تھے، اسی لئے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ صاحبُ سرالرسول ''حضور کے راز دار'' کہلاتے تھے۔ (مجمع الزوائد۔١٠٣٢٩)

غزوۂ تبوک کے کچھ دنوں کے بعد عبداللہ بن ابی بیمار ہوا اوراس کا انتقال ہوا، اس کے ایک بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا وہ مخلص مؤمن تھے، اس کے انتقال کے بعد وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے، آپ اس کے جنازہ کی نماز پڑھائیے اوراس کے کفن کے واسطے اپنا کرتہ بھی عنایت فرمایئے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مَیں آتا ہوں۔آپ نے اس کے جنازہ کی نماز پڑھنا منظور فرمالیا اور کفن کے لئے کرتہ بھی عنایت فرمایا۔ (بخاری شریف۔١٢٦٩)

غزوۂ مریسیع اور عبداللہ بن اُبی کی فتنہ انگیزی

غزوۂ بنوالمصطلق کے موقعہ پرعبداللہ بن ابی نے نبی کریم ﷺ کے خلاف انصار کو بھڑکانے کی کوشش کی تھی۔ ہوایوں تھا کہ غزوۂ بنوالمصطلق (جس کا نام غزوۂ مریسیع بھی ہے) سے جب مسلمان واپس آرہے تھے، اوراسی میں حضرت عائشہؓ کے اوپرتہمت والا واقعہ بھی

پیش آیا تھا۔اس غزوہ سے واپسی میں ایسا ہوا کہ ایک جگہ پر مسلمانوں کے لشکر نے قیام کیا۔ وہاں پانی کی قلّت تھی کچھ گڑھوں میں بارش کا تھوڑا سا پانی موجود تھا تو جو لوگ پہلے پہنچے انہوں نے پانی کے ان گڑھوں کے اوپر اپنا چمڑہ، ڈھال وغیرہ ڈال کر قبضہ کرلیا۔اسی میں ایک انصاری اور مہاجری کا تھوڑا سا جھگڑا ہوگیا تو ایک مہاجری نے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خادم تھا ایک انصاری کو دھپّہ ماردیا اور ان دونوں میں لڑائی تیز ہوگئی تو دونوں نے اپنی اپنی جماعت کو مدد کے واسطے پکارا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔انصاری نے پکارا ﴿یَالَلْأَنْصَار﴾ اے انصار! میری مدد کے لئے آؤ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گوشِ مبارک میں جب یہ آواز پہنچی تو آپ نے ارشاد فرمایا ﴿مَابَالُ دَعْوَی الْجَاهِلِيَّةِ﴾ یہ جاہلیت والا نعرہ کون لگا رہا ہے؟ یعنی گروہ، قبیلے اور جماعت کی بنیاد پر کسی کو مدد کے واسطے پکارنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا (بخاری شریف۔۳۵۱۸) اسلام تو حق کی بنیاد پر حمایت کرنے کا حکم دیتا ہے ﴿اَلْمُسْلِمُ أَخو الْمُسْلِمِ، لايَظْلِمُهُ وَلايَسْلِمُهُ (بخاری،۲۴۴۲)﴾ ایک مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ خود اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرتا ہے اور نہ اس کو ظالم کے حوالے کرتا ہے، بلکہ ہر حال میں اس کی مدد کرتا ہے۔اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ﴿أُنْصُرْ أَخاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً﴾ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ایک صحابی نے سوال کیا ﴿يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ مَظْلُوماً فَكَيْفَ أَنْصُرُهُ ظَالِماً؟﴾ اگر وہ مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کروں یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے لیکن ظالم ہوتے ہوئے اس کی کیسے مدد کروں؟ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ﴿أَنْ تَمْنَعَهُ عَنِ الظُّلْمِ﴾ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دو (بخاری شریف۔۲۴۴۳) یعنی ظلم کر کے وہ دوسرے کسی کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اپنے ساتھ بھی زیادتی کر رہا ہے اور اپنا نقصان کر رہا ہے، اس کو ظلم سے روکو؛ یہ اس

کی مدد ہوئی۔ بہرحال! اسلام قبیلے، برادری یعنی جماعت یا پارٹی کی بنیاد پر کسی کی حمایت کرنے کی اجازت نہیں دیتا، اسی کو تعصب سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تحزّب اور تعصّب کیا ہے؟

بھائی! یہ ہماری جماعت کا آدمی ہے، ہماری برادری کا آدمی ہے، اب وہ حق پر ہو یا ناحق پر؛ آپ اس کی حمایت کریں، اسلام اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ یہ تو اہل باطل کا شیوہ اور طریقہ ہے۔ اسلام تو یہ کہتا ہے کہ آپ حق کا ساتھ دیجیے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اور مظلوم کی حمایت کیجیے۔ اسلام کی تعلیمات یہی ہیں۔

بہرحال! جب یہ نعرہ بلند ہوا کہ اے مہاجرین، اے انصار، اور حضور ﷺ کے گوشِ مبارک میں یہ آواز پڑی تو آپ نے پوچھا کہ کیا بات ہے مَیں جاہلیت والا نعرہ سن رہا ہوں، پھر فرمایا کہ یہ بدبودار نعرہ ہے، اسلام میں اس کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں ہے۔

بہرحال! آپس میں تکرار بھی ہوئی، حضور ﷺ فوراً پہنچے اور دونوں کو ٹھنڈا کیا اور دونوں سے ایک دوسرے کو معاف کرایا۔ یہ قصہ تو رفع دفع ہوگیا۔ عبداللہ بن ابی کو معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہوا ہے، چونکہ لشکر بڑا ہوتا ہے اور پڑاؤ ڈالے ہوئے ہوتا ہے، تو بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہوتا ہے، ایک حصہ میں واقعہ پیش آیا اور یہ اس وقت حاضر نہیں تھا بلکہ دوسرے حصہ میں تھا۔ اس کو بعد میں معلوم ہوا تو اس کو موقعہ مل گیا اور اس نے اپنے قبیلے والوں سے کہا کہ دیکھو! اچھا اچھا کھلا کر تم لوگوں نے ان کو بڑا کیا ہے، اب یہ تمہارے ہی خلاف کھڑے ہوگئے ہیں، اب تو ایسا ہی ہوتا رہے گا، ان سے کوئی اچھی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ پھر اس نے کہا کہ اگر ان کو کھلانا پلانا چھوڑ دو، تو یہ آپ ہی آپ یہاں سے بھاگ جائیں گے ﴿لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى

مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا﴾ سورۂ منافقون میں یہ آیت ہے۔ان پر خرچ نہ کرو، کھلاتے پلاتے ہو اس لئے پڑے ہوئے ہیں،کھلانا پلانا چھوڑ دو گے تو آپ ہی آپ یہاں سے چلے جائیں گے۔اور پھر یہ بھی کہا کہ جب ہم مدینہ پہنچیں گے تو جو عزت والا ہے وہ ذلیلوں کو نکال دے گا۔عزت والا بول کر اس نے اپنی ذات مراد لی،اور ذلیل بول کر نعوذ باللہ حضور اکرم ﷺ کی طرف اشارہ تھا۔

جس وقت وہ یہ باتیں کر رہا تھا تو وہ یوں سمجھتا تھا کہ سننے والے سب میرے ہمنوا ہیں،لیکن ان میں ایک صغیر السن (کم عمر) صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی تھے،انہوں نے جب یہ سنا تو اسی وقت کہا کہ مَیں تیری یہ بات حضور اکرم ﷺ تک پہنچاؤں گا۔اب یہ بھی سٹپٹایا کہ یہ کیا ہو گیا،حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ چونکہ چھوٹے تھے،اس لئے براہِ راست حضور تک پہنچنے کے بجائے انہوں نے جا کر اپنے رشتہ کے جو چچا تھے ان سے کہا۔انہوں نے حضور تک یہ بات پہنچائی۔حضور اکرم ﷺ نے ان کو بلایا اور عبداللہ بن ابی کو بھی بلایا اور پوچھا کہ تم نے ایسی بات کہی ہے؟اس نے قسم کھا کر انکار کر دیا کہ میں نے نہیں کہی۔اب لوگ حضرت زید کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں کہ بچہ ہو کر بڑے آدمی کے خلاف ایسی بات کر رہا ہے۔حضرت زید کہتے ہیں کہ میرے لئے تو منہ چھپانا مشکل ہو گیا،حالانکہ اس نے ایسی باتیں کہی تھیں۔ بڑے آدمی کے مقابلہ میں کوئی چھوٹا ایسی بات کہے تو لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔اسی طرح حضرت زید کے ساتھ بھی معاملہ ہوا کہ سب ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہیں اور یہ منہ چھپاتے پھر رہے تھے۔لیکن وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے جی میں سوچا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری بات کی ضرور تائید اور تصدیق کی جائے گی۔اس کے بعد ہی سورۂ منافقون

نازل ہوئی اوراس میں سارا قصہ بیان ہوا۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سفر کے دوران میرے قریب آئے اور میرا کان پکڑ کر ملا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے کان کی تصدیق فرمائی ہے۔ جب یہ ساری آیتیں نازل ہوئیں تو روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اجازت دیجیے اس کی گردن اُڑا دوں۔ حضور نے اجازت نہیں دی۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ جواس کے بیٹے تھے وہ مخلص مؤمن تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ میرے باپ کا ایسا معاملہ ہوا تو وہ خود حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے باپ کے قتل کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر ایسا ہے تو آپ مجھے کہیے، مَیں اس کا سر لا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، کسی اور کو نہ کہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کسی اور کو کہیں اور وہ میرے باپ کو قتل کر دے اور بعد میں پھر بیٹے والی غیرت پیش آجائے اور میں اس کے ساتھ ویسا معاملہ کرلوں۔ اس لئے اگر آپ کا ارادہ اس کے قتل کا ہے تو مجھے ہی کہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! ہم تو تمہارے باپ کے ساتھ اچھا ہی سلوک کرنا چاہتے ہیں، ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ (مسند الحمیدی۔۱۲۴۰)

خیر! اس کے بعد جب مدینہ منورہ قریب آیا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کی سواری کے اونٹ کو روک لیا، اور اس کی نکیل پکڑ کر اونٹ کو بٹھا دیا اور اس پر پیر رکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ جب تک کہ تو اس بات کا اقرار نہیں کرے گا کہ مَیں ذلیل ہوں اور نبی کریم ﷺ عزت والے ہیں اور پھر جب تک حضور ﷺ اجازت نہیں دیں گے؛ مَیں تجھے مدینہ میں داخل ہونے نہیں دوں گا۔ یہ دیکھ کر سب لوگ جمع ہو گئے اور عبداللہ بن ابی اپنے بیٹے سے کہہ رہا ہے کہ مَیں تو عورتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، بچوں سے بھی زیادہ ذلیل

ہوں۔لیکن حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہہ رہے ہیں کہ جب تک حضور اجازت نہیں دیں گے؛مَیں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔حضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ تشریف لائے اور ان سے کہا کہ اس کو چھوڑ دو اور جانے دو،تب انہوں نے جانے دیا۔

بہرحال!یہ مخلص مؤمن تھے انہوں نے آ کر درخواست کی تو ان کے اس اخلاص کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے درخواست منظور فرمائی کہ ٹھیک ہے،مَیں جنازہ کی نماز بھی پڑھاؤں گا اور کرتہ بھی عنایت فرمایا (بخاری شریف،حدیث نمبر ۴۹۰۷۔کتاب التفسیر،سورۂ منافقون،حدیث نمبر ۴۹۰۵)

بلکہ روایتوں میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس کا سر اپنے گود میں لے کر اپنا لعابِ دہن بھی اس کے منہ میں ڈالا اور پھر اس کی نماز جنازہ پڑھائی (بخاری شریف۔۱۲۷۰) جب نمازِ جنازہ پڑھانے کیلئے آپ آگے بڑھے اور کھڑے ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کا کرتہ پکڑ لیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول!اس کی نمازِ جنازہ آپ پڑھا رہے ہیں؟اس نے فلاں موقعہ پر ایسا کیا تھا،فلاں وقت یوں تکلیف پہنچائی تھی وغیرہ وغیرہ۔اس کے سارے کارنامے گنوار ہے ہیں اور پھر باری تعالیٰ نے تو قرآنِ پاک میں یہ فرمایا ہے ﴿اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَن يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ﴾ اگر آپ ان کے لئے ستر مرتبہ بھی دعاءِ مغفرت فرمائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان منافقین کو معاف نہیں کریں گے،پھر بھی آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستّر سے زیادہ مرتبہ دعاءِ مغفرت کرنے سے اس کی معافی ہوسکتی ہے تو مَیں اس کے لئے بھی تیار ہوں (بخاری شریف۔۱۳۶۶) یہ حضور ﷺ کے اخلاق تھے،اسی کا نتیجہ ہوا کہ سینکڑوں کی تعداد میں ایسے منافقین تھے جو مخلص بن گئے،یعنی انہوں نے دل سے ایمان واسلام کو قبول کرلیا۔

بہرحال! مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ منافقین کی جماعت کے پیدا ہونے کا پس منظر کیا تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اسلام قوت پکڑ رہا ہے اور مسلمانوں کی طاقت بڑھتی جارہی ہے تو وہ مشرکین جو کھل کر ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے انہوں نے اپنا طریقۂ عمل بدلتے ہوئے یہ روش اپنائی کہ ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا اور بباطن وہ کافر ہی رہے، انھیں کو منافق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نفاق ظاہر و باطن کے اختلاف کو کہتے ہیں۔

شرّاحِ حدیث نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ لفظ نفاق ''نافقہ'' سے بنا ہے۔ یربوع نامی ایک جانور آتا ہے، جس کو پہاڑی چوہا (چوہا) کہتے ہیں۔ اس کی عادت یہ ہوتی ہے کہ زمین کے اندر بل بناتا ہے اور اس میں اپنے آنے جانے کے لئے ایک سوراخ بناتا ہے، لیکن اس بل میں دوسری طرف ایک سوراخ اور بھی بناتا ہے جس کو کھلا نہیں رکھتا بلکہ نرم مٹی سے بند رکھتا ہے تاکہ دیکھنے میں معلوم ہو کہ وہاں کوئی سوراخ نہیں ہے، بالکل ہموار زمین معلوم ہوتی ہے۔ جب شکاری اس کو پکڑنے کے لئے اس کے عام آنے جانے کے راستے میں گھات لگاتا ہے اور اس کو دیکھتا ہے کہ اس راستے سے اندر داخل ہوا ہے، جب باہر نکلے گا تو اس کو پکڑوں گا۔ لیکن وہ اس دوسرے سوراخ سے باہر نکل جاتا ہے۔ تو یہ دوسرا سوراخ جس کو اس نے چھپا کر بنا رکھا تھا اسی کو عربی زبان میں ''نافقہ'' کہتے ہیں اور جس سوراخ سے عام طور پر آتا جاتا ہے اس کو ''قاصعہ'' کہتے ہیں۔ گویا ایک راستے سے داخل ہوا اور دوسرے راستے سے نکل گیا۔ اسی طرح منافق بھی ایک راستے سے ایمان میں داخل ہو کر دوسرے راستہ سے نکل گیا، اسی لئے اس کو منافق کہتے ہیں۔ حقیقی منافق تو یہی ہے کہ دل میں کفر ہو اور زبان کے اوپر ایمان ہو۔ حقیقی نفاق نفاقِ اعتقادی ہے۔

﴿نفاقِ عمل﴾

لیکن علماء نے نفاق کی ایک دوسری قسم بیان کی ہے اور وہ نفاقِ عمل ہے۔آدمی دل سے تو ایمان والا ہی ہے، ایمان کے معاملہ میں کوئی دوسری بات نہیں ہے، اس نے سچّے دل سے نبی کریم ﷺ کی دعوت کو قبول کیا ہے، اور اپنے آپ کو جو مسلمان ظاہر کیا ہے؛ وہ صحیح معنٰی میں ظاہر کیا ہے؛ لیکن ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے معاملہ میں وہ ڈھیلا پڑتا ہے۔ ایک آدمی جب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتا ہے اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرتا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ کے وہ احکام جو نبی کریم ﷺ کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں؛ ان کو وہ قبول کرتا ہے، اور گویا وعدہ کرتا ہے کہ مَیں اس پر عمل کروں گا، اپنی زندگی اسی کے مطابق درست کروں گا۔تو یہ دل سے تو ایسا ہی ہے لیکن عملی طور پر اپنی کمزوری کی وجہ سے پورے طور پر اپنے آپ کو ان اعمال اور اخلاق میں ڈھال نہیں پاتا۔نفس کے دھوکہ میں آ کر جھوٹ بول دیتا ہے۔جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا ہے ان کو نہیں کرتا، جن کاموں سے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے اپنے آپ کو نہیں بچاتا۔تو گویا اس نے ایمان کے ذریعہ جن چیزوں کا اقرار کیا تھا کہ مَیں اپنے اعمال واخلاق کو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کے مطابق درست کروں گا، لیکن نہیں کرسکا، تو گویا اس نے اپنے ظاہر کو دل کے اقرار کے خلاف بنایا؛ اسی کو نفاقِ عمل کہتے ہیں، اگرچہ یہ شرک کے برابر نہیں ہے۔

جو حقیقی اور اصلی منافق ہیں ان کا حکم تو یہ ہے ﴿اِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ وہ تو جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے یعنی مشرکین سے بھی زیادہ خطرناک عذاب میں ہوں گے۔لیکن نفاقِ عمل کا حکم یہ ہے کہ وہ آدمی اپنی جگہ پر مؤمن ہے

لیکن عملی طور پر اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اپنے اعمال واخلاق کو اس طرح کے نہیں بنا پایا جیسے ایک مؤمن کے اعمال واخلاق ہونے چاہئیں، اس لئے وہ اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے گا، یا اگر توبہ کرلی اور اللہ تعالیٰ نے قبول کرلی تو پھر پہلے ہی جائے گا۔

﴿یہ منافقین کے اعمال ہیں﴾

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جس میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے ﴿آيَةُ الْـمُـنَافِقِ ثَلاثَةٌ﴾ منافق کی نشانیاں تین ہیں۔ گویا جس آدمی کے اندر یہ تین باتیں- جو آگے کہی جارہی ہیں- موجود ہوں تو وہ اپنے آپ کو اگر یہ سمجھتا ہے کہ میں مؤمن ہوں؛ لیکن ایسا نہیں ہے، یہ ایمان کی خصلتیں نہیں ہیں بلکہ منافق کی عادتیں ہیں، یعنی یہ وہ باتیں ہیں جو اُس زمانہ میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے اندر پائی جاتی تھیں، اہلِ ایمان میں یہ باتیں نہیں ہوتی تھیں گویا حضور اکرم ﷺ اس ارشاد کے ذریعہ سے ایمان والوں کو اس بات کی تلقین کرنا چاہتے ہیں اور تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچاؤ، یہ اہلِ ایمان کے اعمال نہیں ہیں بلکہ یہ تو منافقین کے اعمال ہیں اور جب تم اپنے آپ کو اہلِ ایمان بتلاتے ہو اور حقیقت میں مؤمن ہو؛ تو پھر اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچانا ضروری ہے۔

اسی وجہ سے آگے فرمایا ﴿وَاِنْ صَلّٰى وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّهُ مُؤْمِنٌ﴾ چاہے وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور یوں سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کا معاملہ صرف عبادات تک محدود نہیں ہے، ہم نے اپنے ناقص علم کی وجہ سے اسلام کو عبادات کے اندر محدود کر رکھا ہے۔ ایک آدمی نماز وروزہ کا اہتمام کرتا ہے، تلاوت کا اہتمام کرتا ہے، ذکرو اذکار کی پابندی کرتا ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ مَیں پکا مسلمان ومؤمن ہوں، چاہے وہ بازار

میں جا کر کسی کے ساتھ سودا کرنے میں جھوٹ کا ارتکاب کرتا ہو، یا کسی کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہو، اس کو پورا کرنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو، یا کسی نے اس کے پاس کوئی امانت رکھ دی تو وہ اس کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھتا بلکہ اس میں خیانت سے کام لیتا ہے۔ یہ سب ہو رہا ہے لیکن چونکہ وہ نماز اور روزہ کا پابند ہے تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ مَیں سو فیصد دین پر عمل کر رہا ہوں، حالانکہ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ چاہے وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور یوں سمجھتا ہو کہ مَیں مسلمان و مؤمن ہوں، پھر بھی وہ کامل مسلمان نہیں ہے؛ اگر اس میں یہ تین باتیں موجود ہیں۔

وہ تین باتیں کونسی ہیں؟ ﴿اِذَاحَدَّثَ کَذَبَ﴾ جب بات کرے تو جھوٹ بولے ﴿وَاِذَاوَعَدَاَخْلَفَ﴾ جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے ﴿وَاِذَااؤْتُمِنَ خَانَ﴾ اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت سے کام لے۔ حضور ﷺ بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ تین کام مؤمن کے نہیں ہیں بلکہ منافقین کے ہیں۔ مؤمن کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ان سے بچانے کا اہتمام کرے۔

﴿بہترین مثال سے وضاحت﴾

ایک آدمی کو کھانسی بھی ہو رہی ہے، ناک بھی بہہ رہی ہے، آنکھوں میں سے پانی بھی جاری ہے اور پھر وہ یوں کہے کہ مَیں تندرست ہوں، مجھے کوئی بیماری نہیں ہے؛ تو لوگ کہیں گے کہ بھائی! تیرے اندر نشانیاں اور علامتیں تو بیماروں والی پائی جا رہی ہیں اور پھر تو اپنے آپ کو تندرست ظاہر کرتا ہے؛ یہ بات غلط ہے۔ اسی طریقہ سے جو اوصاف اور برائیاں منافقین کی ہیں یا کفر والوں کی ہیں وہ اعمال ہم کر رہے ہیں اور پھر یوں کہیں کہ ہم مسلمان

ہیں اور ایمان والے ہیں تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک ایمان والے کو یہ بات زیب نہیں دیتی۔ یہ کام کرتے ہوئے اپنے آپ کو مؤمن سمجھنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ ان سے بچنے کا اہتمام کرے۔

جھوٹ کی شناعت......ابوسفیان کا قصہ

جھوٹ کے متعلق تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ بری چیز ہے، ہر مذہب وملت میں اور ہر زمانہ میں جھوٹ کو بُرا سمجھا گیا اور اس کو ایسی خصلت اور وصف قرار دیا گیا جس سے بچنا ہر شخص اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے، اور جو آدمی اس میں مبتلا ہو اس کو برا سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ زمانۂ جاہلیت میں یعنی حضور اکرم ﷺ کی آمد سے پہلے عرب کے اندر جو دور چل رہا تھا کہ جس میں وہ لوگ ہر قسم کی برائی میں مبتلا تھے، لیکن وہ بھی اپنی طرف جھوٹ کی نسبت کو بہت برا سمجھتے تھے، کوئی ان کو جھوٹا کہے؛ یہ ان کو گوارا نہیں تھا۔

آپ ﷺ نے ۸ھ میں دنیا کے مختلف بادشاہوں کے نام اسلام کی دعوت کے خطوط بھیجے تھے، تو اس میں قیصرِ روم کے نام بھی ایک خط بھیجا تھا۔ حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ اس خط کو لے کر گئے تھے۔ بُصریٰ جو شام کے علاقے میں واقع ہے، وہ ریاست تھی، اس کا حاکم قیصر کے ماتحت تھا، حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے وہ نامہ مبارک اس کے حوالے کیا تاکہ وہ قیصر تک پہنچائے، اس نے حضرت دحیہ کو قیصر تک پہنچایا۔ جس زمانے میں حضور اکرم ﷺ کا یہ نامۂ مبارک قیصر کے نام بھیجا گیا تھا؛ قیصر اپنے دارالسطنت قسطنطنیہ سے چل کر منت کو پورا کرنے کے واسطے بیت المقدس آیا ہوا تھا، یہ بھی خط لے کر وہیں پہنچے۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ خط ایک ایسی شخصیت کی طرف سے بھیجا گیا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کا بھیجا ہوا نبی بتلاتی

ہے،تو اس نے اپنا دربار سجایا اور لوگوں سے کہا کہ کیا ایسے کچھ لوگ یہاں مل جائیں گے جو اس آدمی کے حالات سے واقف ہوں جنہوں نے یہ خط بھیجا ہے؟ اتفاق کی بات کہ اسی زمانے میں حضرت ابوسفیان جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے وہ ایک تجارتی قافلہ لے کر شام پہنچے ہوئے تھے۔درباریوں نے جستجو کی کہ عرب کا کوئی شخص یہاں ہے،تو معلوم ہوا کہ عرب کا ایک تجارتی قافلہ آیا ہوا ہے،چنانچہ انہیں کو پکڑ کر لے گئے۔قیصر نے ان سے پوچھا کہ فلاں شخص سے آپ لوگ واقف ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں۔اس نے کہا کہ میں ان کے متعلق تم سے کچھ سوالات کروں گا،تم اس کا صحیح جواب دینا۔اور پھر قیصر نے یہ انتظام کیا کہ ابوسفیان کو آگے بٹھایا اور ان کے ساتھیوں کو پیچھے بٹھایا اور بیچ میں ترجمان کو بٹھایا اور ان کے ساتھیوں سے یوں کہا کہ اگر یہ غلط بات کہیں تو مجھے بتلا دینا،اور پھر سوالات کئے۔بات لمبی ہے جس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ان کا خاندان کیسا ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ خاندان تو بڑا اعلیٰ و اشرف ہے،اونچے حسب ونسب والے ہیں۔پھر اس نے اور کچھ چیزیں پوچھیں،ان سب کے جوابات انہوں نے صحیح صحیح دیئے۔چونکہ اس زمانے میں ابوسفیان حضور ﷺ کے دشمن تھے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میرا دل چاہا کہ حضور کے خلاف جواب دوں لیکن پھر میرے دل میں آیا کہ میرے ساتھی کہیں گے کہ انہوں نے جھوٹ بولا،اس نسبت کو میں نے اپنے لئے گوارا نہیں کیا۔

اس قصہ کو سنا کر میں یہی بتلانا چاہتا ہوں کہ غور کیجیے کہ زمانۂ جاہلیت میں کفر وشرک کی حالت میں بھی اور ساری برائیوں میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی اپنی طرف جھوٹ کی نسبت کو وہ لوگ گوارا نہیں کرتے تھے۔

(فتح الباری، باب کتاب النبی ﷺ الی کسریٰ وقیصر، کتاب المغازی۔ص۸/۱۰۴۔کتاب التفسیر ۲/۶۵۳۔بخاری حدیث نمبر ۷)

﴿جھوٹ صرف زبان سے ہی نہیں ہوتا﴾

جھوٹ ایک بہت بری خصلت ہے، اسلام میں بھی اس سے بچنے کی بڑی تاکید آئی ہے، نبوت کے بعد سب سے اونچا مقام صدیقیت کا ہے۔صدیق یعنی سب سے زیادہ سچا۔ گویا اس کے اندر بھی اسی وصف کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔اور ہم یوں سمجھتے ہیں کہ صدق کا تعلق صرف زبان سے ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ صدق وصفا کا تعلق اعمال، اقوال، اخلاق ساری چیزوں سے ہے، آدمی صرف بات کا سچا ہو یہی مطلوب نہیں بلکہ عمل کا بھی سچا ہو، اس کے لئے بھی صدق کا استعمال ہوتا ہے، اور عمل میں اگر وہ خلاف واقعہ ظاہر کر رہا ہے تو اس کو بھی جھوٹ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حدیث پاک میں آتا ہے﴿اَلْمُتَشَبِّعُ بِمَالَمْ يُعْطَ كَلَابِثِ ثَوْبَىْ زُوْرٍ (ابوداؤد۔۴۹۹۷)﴾ کسی کو اللہ کی طرف سے کوئی چیز ملی نہ ہو، اور وہ اپنے عمل سے ظاہر کرے کہ یہ چیز مجھے ملی ہے؛ تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے جھوٹ کے دو کپڑے پہن رکھے ہوں یعنی وہ سر سے پاؤں تک جھوٹ کے اندر لدا ہوا ہے۔جیسے ایک آدمی کے پاس دولت وثروت نہیں ہے لیکن اپنے آپ کو لباس سے ایسا ظاہر کرتا ہے کہ میں بہت مالدار ہوں؛ تو یہ جھوٹا ہے۔

ایک عورت نے آکر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ میرے شوہر کی دوسری بیوی بھی ہے، تو مَیں کبھی کوئی چیز جو میرے شوہر نے مجھے نہیں دی ہے بلکہ کہیں اور سے میرے پاس آئی ہو، اس کے متعلق اپنی سوکن کو یوں کہوں کہ یہ چیز ہمارے شوہر نے مجھے دی ہے، تاکہ اس کو جلاؤں؛ تو ایسا کرسکتی ہوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں۔(مسند احمد۔۲۵۳۴۰)

یہاں پر علماء نے لکھا ہے کہ یہ اسی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ آدمی کے حقیقت

میں جو حالات ہیں اس کے خلاف ظاہر کرے؛ یہ بھی جھوٹ ہے۔ جیسے ایک شخص مالدار نہیں ہے اور اپنے آپ کو مالدار ظاہر کر رہا ہے، عملی طور پر ایسا لباس اور ایسی سجاوٹ و بناوٹ کر کے ایسا انداز اختیار کرے کہ لوگ یوں سمجھیں کہ یہ بڑا کروڑ پتی ہے؛ وہ بھی اسی میں داخل ہے۔

اسی طرح ایک آدمی عالم نہیں ہے اور اپنے آپ کو عالم ظاہر کر رہا ہے؛ وہ بھی اس میں داخل ہے، یعنی عملی طور پر یہ جھوٹ کے اندر شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ صدق کا تعلق صرف زبان سے نہیں ہے بلکہ اعمال و اخلاق وغیرہ سے بھی ہے۔

بہر حال! مَیں تو یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جھوٹ ایک ایسی خصلت ہے جس کو زمانۂ جاہلیت میں بھی سب سے برا سمجھا جاتا تھا حالانکہ اس زمانہ میں بہت ساری برائیاں پائی جاتی تھیں۔ اب ہمارے زمانہ میں جھوٹ کی بہت ساری شکلیں ایسی رائج ہوگئیں ہیں کہ سمجھدار دین دار اور پرہیزگار لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں اور اس کے باوجود یہ نہیں سمجھ رہے ہیں کہ مَیں جھوٹ کے اندر مبتلا ہوں، آئندہ مجلس میں ان شاء اللہ اس سلسلہ میں عرض کروں گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ وَنَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:

عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ قال: آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلاثَةٌ: اِذَاحَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَاوَعَدَ أَخْلَفَ وَاِذَااؤْتُمِنَ خَانَ. وفی رواية: وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ اَنَّهٗ مُؤْمِنٌ.

گذشتہ مجلس میں بھی یہ روایت آ چکی تھی، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ منافق کی علامت اور نشانی تین باتیں ہیں، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ ایک روایت میں یہ زیادتی بھی موجود ہے کہ چاہے وہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور اپنے آپ کو یوں سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں؛ لیکن وہ منافق ہے۔ گذشتہ مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ نفاق کیا چیز ہے، اور نبی کریم ﷺ کے زمانے میں جو مختلف گروہ تھے، اہل ایمان، اہلِ کفر، یہود اور منافقین؛ ان کی تفصیل بھی کر چکا ہوں۔

یہ جو تین علامتیں بتلائی گئی ہیں ان میں سے ایک ہے ﴿اِذَاحَدَّثَ كَذَبَ﴾ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جھوٹ کے سلسلے میں بتلایا تھا کہ جھوٹ ایک ایسی قبیح اور شنیع حرکت ہے کہ تمام مذاہب و ملل میں اس کو بُرا سمجھا جاتا رہا ہے۔ دنیا میں جتنے بھی مذاہب اور ملّتیں گذری ہیں یا اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے کسی بھی مذہب میں جھوٹ کو اچھی صفت نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو ایک بُرا وصف قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ جیسا کہ

بتلا چکا ہوں کہ زمانۂ جاہلیت میں نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے جب لوگ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے اور ہر برائی ان لوگوں میں رچی اور بسی ہوئی تھی، لیکن وہ بھی جھوٹ کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے۔اس سلسلے میں ابوسفیان کا قصہ بھی تفصیل سے عرض کر چکا ہوں۔

آپ ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولا

نبی کریم ﷺ نے جھوٹ سے منع فرمایا ہے یہاں تک کہ مذاق میں بھی جھوٹ کے ارتکاب کی اجازت نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ کبھی کبھار خوش طبعی اور مزاح فرمالیا کرتے تھے۔ لیکن آپ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ مزاح میں بھی کبھی اپنی زبانِ مبارک پر جھوٹی بات نہیں لاتے تھے،اور نبی کریم ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹ سے منع فرمایا ہے۔

ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت آئی اور اس نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! دعا کر دیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں بھیجے۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی۔اس بوڑھیا نے جب نبی کریم ﷺ کی زبان مبارک سے یہ بات سُنی تو مایوس ہو کر روتے ہوئے واپس جانے لگی۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو واپس بلاؤ اور فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ جنت کے اندر بوڑھیوں کو بھی جب بھیجے گا تو جوان بنا کر بھیجے گا، قرآن پاک میں موجود ہے ﴿اِنَّـآ اَنْشَـأْنَـاهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنَاهُنَّ اَبْكَاراً﴾ ہم عورتوں کو ایک نیا وجود عطا کریں گے اور ان کو نوجوان اور کنواری لڑکیاں بنا کر جنت میں بھیجیں گے۔ گویا کوئی بھی بوڑھی عورت بوڑھی ہونے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، بلکہ جوان بن کر جائے گی۔تو نبی کریم ﷺ نے خوش طبعی بھی فرمائی لیکن اس میں بھی کوئی غلط بات آپ نے نہیں کہی۔جب یہ سُنا تو وہ بڑھیا خوش ہوگئی۔ (حدیث نمبر۲۴۱۔باب ماجاء فی مزاح رسول اللہ ﷺ۔شمائلِ ترمذی۔ص۱۱۳)

اسی طرح روایتوں میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست

کی کہ اے اللہ کے رسول! سواری کے لئے اونٹ دیجیے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہم آپ کو اونٹنی کا بچہ دیں گے۔ اس پر اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اونٹنی کا بچہ میرے کیا کام آئے گا؟ اس پر مَیں سفر کیسے کروں گا؟ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ﴿هَلْ تَلِدُ الْإِبِلُ إِلَّا النُّوقَ﴾ اونٹ کو بھی تو اونٹنی ہی جنتی ہے یعنی جس اونٹ کا تم مطالبہ کر رہے ہو وہ بھی آخر اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔ (باب ماجاء فی مزاح رسول اللہ ﷺ۔ شمائلِ ترمذی۔ص ۱۱۳)

بہر حال! نبی کریم ﷺ بھی خوش طبعی فرمایا کرتے تھے، لیکن اس میں بھی کبھی اپنی زبانِ مبارک سے کوئی ایسی بات جو خلافِ واقعہ ہو، نہیں نکالتے تھے۔

ایک مرتبہ کسی عورت نے اپنے بچے کو قریب بلانے کے لئے کہا کہ ادھر آؤ، مَیں تمہیں کچھ دیتی ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے پوچھا کہ جس وقت تم نے اس بچہ کو بلانے کے لئے یہ جملہ استعمال کیا کہ مَیں تمہیں کچھ دوں گی؛ تو کیا اس وقت کچھ دینے کا ارادہ تھا، یا ایسے ہی بہلانے کے لئے اور قریب بلانے کے واسطے یہ جملہ کہہ دیا تھا؟ اس عورت نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے پاس کھجور کا ایک دانہ تھا، مَیں نے دل میں یہ نیت کی تھی کہ جب یہ بچہ قریب آئے گا تو یہ کھجور دوں گی۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہارے دل میں کسی چیز کے دینے کا ارادہ نہ ہوتا؛ تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

(حدیث نمبر ۴۹۹۱۔ ابوداؤد۔ التشدید فی الکذب)

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکٹ جھوٹی گواہی ہے

حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جھوٹ سے بچنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور جھوٹ ہے بھی بہت بری صفت۔ ہم لوگ بھی اس کو برا سمجھتے ہیں اور اس سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن ہمارے زمانہ میں جھوٹ کی بعض صورتیں و شکلیں ایسی رائج ہوگئی ہیں کہ

جس وقت آدمی اس کا ارتکاب کررہا ہوتا ہے؛ اس وقت اس کو خیال بھی نہیں آتا کہ مَیں جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔

حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے پاس تشریف لائے، دین دار تھے، نماز وروزہ کے پابند، ذکر وتلاوت کا اہتمام کرنے والے، بزرگوں کے ساتھ تعلق اورنسبت رکھنے والے تھے، وہ سعودیہ میں رہتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کب واپس جارہے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ مَیں نے میڈیکل سرٹیفکٹ بھیج دیا ہے، مزید آٹھ روز رہوں گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکٹ بھیجنے کا کیا مطلب ہے؟ کہا کہ ڈاکٹر کے پاس یہ لکھوا کر بھیجا ہے کہ یہ شخص اس قابل نہیں ہے کہ سفر کرسکے (سب جانتے ہیں کہ میڈیکل سرٹیفکٹ کی حقیقت کیا ہے) اس طرح مزید آٹھ روز یہاں ٹھہرنے مل جائے گا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مَیں نے ان سے کہا کہ آپ دین دار آدمی ہیں، صوم وصلوۃ کے پابند ہیں، بزرگوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہیں اور اس طرح جھوٹ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس چھٹیاں نہیں تھیں تو آپ کو ملازمت پر واپس چلے جانا چاہیے تھا، اور اگر مزید رکنا ہی تھا تو تنخواہ کٹوا کر آپ رُک سکتے تھے۔ آپ نے یہ کیا طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح میڈیکل سرٹیفکٹ بنوا کر بھیج دیا اور اپنی چھٹیوں کے اندر وسعت کروالی یہ تو صریح جھوٹ ہے۔ وہ کہنے لگے کہ مولانا! آج تک کبھی اس کی طرف توجہ نہیں گئی کہ مَیں اس طرح کرکے جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔ تو دیکھئے! آج کل اس طرح سے میڈیکل سرٹیفکٹ بنوا کر استعمال کیے جاتے ہیں؛ واقعہ یہ ہے کہ یہ صریح جھوٹ ہے۔

﴿جھوٹی گواہی کی شناعت﴾

اورسرٹیفکٹ تو ایک طرح کی گواہی ہے۔نبی کریم ﷺ نے جہاں جھوٹ سے منع فرمایا ہے وہاں جھوٹی گواہی کو تو بہت ہی بڑا گناہ قرار دیا ہے۔بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا﴿أَلا أُخبِرُكُم بِأَكبَرِ الْكَبَائِرِ﴾ میں تم کو بڑے گناہوں سے آگاہ نہ کروں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ ضرور کیجیے۔تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا﴿أَلاِشْرَاكُ بِاللهِ﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا﴿عُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ﴾ ماں باپ کی نافرمانی کرنا﴿وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ﴾ اور جھوٹی گواہی دینا۔جو صحابی اس روایت کو نقل کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ جب آپ ﷺ نے پہلی دو باتیں ارشاد فرمائیں اس وقت آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ سیدھے بیٹھ گئے اور بار بار فرمانے لگے﴿أَلاَ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ﴾ سنو! یہ جھوٹی گواہی بھی بڑا گناہ ہے۔راوی کہتے ہیں کہ ہم تمنا کرنے لگے﴿لَيْتَهُ سَكَتَ﴾ کاش! آپ خاموش ہو جائیں (بخاری شریف۔حدیث نمبر ۵۹۷۶۔عقوق الوالدین من الکبائر) مطلب یہ ہے کہ اس جملے کو ہمارے سامنے بار بار دہرانے سے آپ کا مقصد یہ ہے کہ جھوٹی گواہی کی قباحت واضح ہو جائے، وہ تو الحمدللہ واضح ہو چکی ہے، اب آپ بار بار یہ جملہ دہرانے کی زحمت کیوں فرما رہے ہیں۔نبی کریم ﷺ جھوٹی گواہی کی قباحت کو بتلانے کے لئے ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور اس چیز کو بار بار بتلایا۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتنی خطرناک چیز ہے۔

اب جھوٹا سرٹیفکٹ جو جاری کیا جاتا ہے؛ یہ تو صریح جھوٹ ہے۔اس کے اندر جھوٹ کا ایک گناہ تو ہے ہی؛ لیکن ساتھ ہی اس میں دوسرا گناہ بھی ہے کہ گواہی دے کر دوسرے کو دھوکہ میں ڈالا جا رہا ہے۔

﴿کیریکٹر سرٹیفکٹ کب دیا جاسکتا ہے﴾

اسی طرح کبھی کیریکٹر سرٹیفکٹ دیا جاتا ہے۔حالانکہ کیریکٹر سرٹیفکٹ دینے والے کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔آج کل تو میڈیکل سرٹیفکٹ دیناڈاکٹروں کا ایک پیشہ بن گیا ہے۔ایک ڈاکٹر صاحب آئے اور مجھے کہنے لگے کہ ملازمت کرنے والوں کودس پندرہ روپیہ کے اندراس طرح سے لکھ کر دینا پڑتا ہے۔تو کیا یہ دس پندرہ روپے حلال ہیں؟مَیں نے کہا کہ دس پندرہ روپیہ کے اندر آپ اپنا دین بیچ رہے ہیں۔یہ تو بہت خطرناک گناہ ہے،اس سے تو بچنے کی سخت ضرورت ہے۔

بہرحال!اس طرح کی چیزیں اب اتنی عام ہوتی جارہی ہیں کہ آدمی کا ذہن بھی اس طرف نہیں جاتا کہ مَیں ایسی حرکت کر کے جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔بہت سوں کے متعلق کریکٹر سرٹیفکٹ بھی جاری کیا جاتا ہے کہ مَیں اس سے واقف ہوں،حالانکہ اس کے حالات سے پورے طور پر واقفیت نہیں ہوتی۔کریکٹر سرٹیفکٹ جاری کرنے کے لئے جس قسم کی واقفیت ضروری ہے جب تک کہ وہ پورے طور پر نہ ہو؛ وہاں تک کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کا اخلاقی سرٹیفکٹ دے۔

﴿اخلاق ومزاج ناپنے کا تھرمامیٹر﴾

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کسی سے کسی کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسا آدمی ہے؟ اس نے کہا کہ بڑا اچھا آدمی ہے۔آپ نے پوچھا کہ کیا کبھی کوئی لین دین کا معاملہ ان کے ساتھ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ لین دین تو کبھی نہیں کیا۔پھر آپ نے پوچھا کہ کبھی اس کے ساتھ سفر کرنے کی نوبت آئی ہے؟ کہا کہ یہ بھی نہیں آئی۔تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کسی

کے اخلاق و عادات اور اس کے اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے دو ہی شکلیں ہیں، یا تو تم اس کے ساتھ کوئی لین دین کرو جس سے پتہ چلے کہ اس کا مزاج کیسا ہے اور شریعت پر برابر عامل ہے یا نہیں۔ یا اس کے ساتھ سفر کی نوبت آئے۔ جب تم نے ان دونوں میں سے کوئی بھی تجربہ اس کے ساتھ نہیں کیا تو تمہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ تم یہ کہو کہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ اور آگے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو جملہ ارشاد فرمایا وہ سننے کے قابل ہے ﴿لَعَلَّکَ رَأَیْتَہٗ یَرْکَعُ وَیَسْجُدُ﴾ شاید تم نے اس کو رکوع، سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا؟ مطلب یہ ہے کہ کسی کے اخلاق سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے صرف اس کا نمازی ہونا کافی نہیں ہے۔ بہرحال! یہ بہت اہم چیز ہے۔ ہمارے سماج میں ایسی چیزوں کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔

﴿سفارش کب کی جائے؟﴾

سفارش کے معاملہ میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہ العالی ہی فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ جدہ میں تھا، ایک دین دار شخص نے میرے پاس ایک آدمی کو سفارشی خط لے کر بھیجا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس خط لے کر آرہے ہیں، اصل میں ہندوستان کے باشندے ہیں، آپ ان کے لئے پاکستانی سفارت خانے کے اندر سفارشی خط لکھ دیجیے کہ ان کے لئے پاکستانی پاسپورٹ بن جائے۔ اب ہوا یہ تھا کہ وہ صاحب پاکستان جانا چاہتے تھے تو انہوں نے پاکستانی سفارت خانہ میں یہ درخواست دے رکھی تھی کہ میں اصل میں پاکستان کا باشندہ ہوں اور میرا پاسپورٹ گم ہوگیا ہے، میرے لئے نیا پاسپورٹ جاری کر دیا جائے اور حقیقت کچھ دوسری تھی، اب ان سفارت خانے والوں نے مطالبہ کیا کہ

کوئی جان پہچان والا ایسا ہے جو تمہارے متعلق یہ شہادت اور گارنٹی دیتا ہو کہ تم اصالتاً پاکستان کے رہنے والے ہو۔ اور مولانا فرماتے ہیں کہ ایک دین دار قسم کے بڑے آدمی تھے جنہوں نے اس طرح خط لکھ کر بھیجا تھا۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ اس قسم کی تصدیق یا سفارش نامہ لکھ کر دینا؛ ایک بڑا جھوٹ ہے ﴿اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ کسی کے متعلق اگر آپ تصدیق جاری کر رہے ہیں تو اس کے متعلق واقفیت ہونا بھی ضروری ہے۔

ہمارے حضرت مفتی محمود صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ مدرسہ والا کوئی آتا تھا اور تصدیق نامہ لکھوانا چاہتا تھا تو اگر حضرت وہاں تشریف لے گئے ہوتے تو پھر اس مدرسہ کو جس پوزیشن میں دیکھا ہوتا اس کی وضاحت کر دیتے تھے کہ مثلاً میرا وہاں جانا ہوا اور رجسٹر کے اندر اتنے طلباء کے نام دیکھے اور اتنے طلبہ کی زیارت ہوئی۔ اپنی آنکھوں سے جو حال دیکھا ہوتا وہ لکھ دیتے تھے۔ اور اگر کہیں جانا نہ ہوا ہوتا تو پھر وہ مدرسہ والے لاکھ کوشش کرتے کہ حضرت تصدیق نامہ لکھ دیں لیکن آپ معذرت فرما دیا کرتے تھے۔

﴿تصدیق نامہ لکھنے کے شرائط﴾

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی کو تصدیق نامہ لکھ دینا ایک طرح کی شہادت ہے، جب تک اس جگہ کو دیکھا نہ ہو؛ وہاں تک اس کی اجازت نہیں ہے میرے لئے بھی یہ بڑی مصیبت ہوگئی ہے، بہت سے چندہ والے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سورت سے حاجی ابرہیم صاحب دادا نے کہا ہے کہ ڈابھیل سے مفتی احمد خانپوری اگر تصدیق لکھ دیں تو ہم آپ کی مدد کریں گے، وہ وہاں آ کر میرے سر پڑ جاتے ہیں کہ آپ لکھ دیجیے، مَیں کہتا ہوں کہ دیکھو! مَیں نے آپ کا مدرسہ دیکھا نہیں ہے، پھر کیسے لکھ دوں؟ اگر آپ کے

مدرسہ میں گیا ہوتا تو جو کیفیت دیکھی ہوتی؛ وہ ضرور لکھ دیتا، لیکن آپ کے یہاں آنا ہوا نہیں ہے تو کیا لکھوں؟ اب مدرسہ والے بڑے ناراض ہوتے ہیں کہ آپ مدرسہ کی مدد کروائیے، تو مَیں کہتا ہوں کہ بھائی! مجھ سے جتنی ہوسکتی ہے، مَیں اتنی مدد کردیتا ہوں، باقی تصدیق نامہ نہیں لکھ دوں گا، پھر کہتے ہیں کہ آپ نے مدد کی ہے تو ہم آپ کی یہ رسید دکھلائیں؟ مَیں کہتا ہوں کہ وہ آپ کی مرضی کی بات ہے۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! فلاں صاحب نے بھی اتنے پیسے دیئے ہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ میرے پیسے دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ میں نے یہ مدرسہ دیکھا ہے، مَیں تو آپ پر اعتماد کرتے ہوئے مدد کررہا ہوں۔ مجھے اس میں کوئی اشکال نہیں، آپ چاہیں تو بتلاتے رہیں۔ باقی میں تحریری طور پر لکھ کر نہیں دوں گا کہ یہ مدرسہ اس طرح کا ہے۔ اس لئے کہ مَیں نے دیکھا ہی نہیں ہے۔ اگر دیکھا ہوتا تو تصدیق لکھ دیتا۔

بہرحال! ﴿اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ﴾ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ نبی کریم ﷺ اس کو منافق کی علامت اور نشانی قرار دے کر اہلِ ایمان کو اس بات کی طرف متنبہ فرمارہے ہیں کہ ایک مؤمن کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کلام وگفتگو میں جھوٹ کا استعمال کرے۔ مؤمن کے لئے تو ضروری ہے کہ اپنے آپ کو جھوٹ سے بچاوے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بندہ جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منہ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ اس کی وجہ سے فرشتے اس سے دور چلے جاتے ہیں۔ (رواہ الترمذی۔مشکوٰۃ،۲/۴۱۳)

﴿وعدہ خلافی﴾

﴿وَاِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ﴾ منافق کی علامت کے طور پر دوسری چیز بتلائی ہے کہ جب وہ

وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے۔ کسی سے اگر وعدہ کیا جائے تو شریعت اس بات کی تاکید کرتی ہے کہ اس وعدہ کو پورا کیجیے اور نبھائیے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کیجیے۔

اگر کسی کے دل میں یہ بات ہے کہ وعدہ کہاں پورا کرنا ہے؛ تو اس کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے اگر آپ کے دل میں اس بات کے پورا کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو وعدہ بھی نہ کیجیے، ورنہ یہ نفاق ہے۔ مثلاً آپ نے کسی سے وعدہ کیا کہ آئندہ مہینہ سو روپے دوں گا تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔ البتہ اگر وعدہ کرتے وقت آپ کے جو حالات تھے، اس کے پیشِ نظر آپ نے وعدہ کرلیا تھا، مثلاً آپ کے کاروبار کی آمدنی کو دیکھتے ہوئے آپ کو یقین تھا کہ مَیں آئندہ مہینہ اس قابل ہو جاؤں گا کہ اس کی سو روپے کی مدد کروں گا اور اسی بنیاد پر آپ نے وعدہ کیا تھا۔ لیکن جب وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو آپ کی وہ پوزیشن باقی نہیں رہی، حالات میں تبدیلی آ گئی اور کچھ ایسی شکلیں اور رکاوٹیں پیدا ہو گئیں کہ جن امیدوں پر آپ نے وعدہ کیا تھا وہ باقی نہیں رہی؛ تو اس صورت میں شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ آپ اس سے معذرت طلب کر لیجیے۔ اس سے کہہ دیجیے کہ جس وقت میں نے وعدہ کیا تھا اس وقت میری یہ پوزیشن تھی اور مجھے توقع تھی، میرا کاروبار اچھے انداز سے جا رہا تھا اس لئے میں یہ سمجھا تھا کہ آئندہ ماہ آپ کی مدد کر سکوں گا، لیکن حالات نے ایسا رُخ بدلا اور پلٹا آیا کہ کاروبار میں نقصان ہو گیا اور رکاوٹیں ایسی پیدا ہو گئیں کہ آپ سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے سے اب مَیں معذور ہوں۔ اگر واقعتہً ایسے اعذار ہوں تو پھر معذرت کی جا سکتی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر یہ وعدہ خلافی سمجھی جائے گی جس پر وعید سنائی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات وعدے کو پورا کرنے کے معاملہ میں بہت تاکید کرتی ہیں

ایسے حالات میں کہ ہمارے تمہارے جیسا آدمی اس وعدے کو پورا کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا، لیکن نبی کریم ﷺ اس کی تاکید فرماتے ہیں۔

نہایت کڑے وقت میں بھی آپ ﷺ نے وعدہ خلافی نہیں فرمائی

غزوۂ بدر کے ذیل میں روایتوں میں ایک واقعہ لکھا ہے، جو سیرت کی کتابوں میں موجود ہے (الاصابہ، ۳۳۱/۱، ابن جابر۔ رواہ مسلم، ۱۷۸۲۔ الوفاء بالعھد۔ اباب الجھاد) حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ جو صاحب سِرّ الرسول کہلاتے ہیں، وہ اور ان کے والد دونوں اسلام قبول کرتے ہوئے سفر کرکے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ جا رہے تھے۔ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب ابو جہل ایک ہزار کا لشکر لے کر مکہ مکرمہ سے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔ یہ باپ بیٹے (حضرت حذیفہ اور ان کے والد یمان) دونوں کی ملاقات ابو جہل سے ہوئی، اس نے ان سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم مدینہ منورہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے جا رہے ہیں، ہم اسلام قبول کر چکے ہیں۔ تو ابو جہل نے کہا کہ تم وہاں جاؤ گے تب تو ان کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف لڑائی میں حصہ لوگے، اس لئے ہم تمہیں جانے نہیں دیں گے۔ چنانچہ ان دونوں کو گرفتار کرلیا اور اپنے پاس روک لیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تمہارے خلاف لڑنے کے لئے نہیں جا رہے ہیں، ہم تو حضور کی ملاقات و زیارت کے لئے جا رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ اگر تم اس بات کا وعدہ کرو کہ وہاں جانے کے بعد ہمارے مقابلہ میں حصہ نہیں لوگے اور شرکت نہیں کروگے تو مَیں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ ان دونوں نے وعدہ کرلیا تو ابو جہل نے ان دونوں کو چھوڑ دیا۔ جب یہ دونوں مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حضور اکرم ﷺ لشکر لے کر اس طرف آ رہے ہیں۔ ان حضرات نے حضور کو تمام

تفصیل بتلائی اور جب معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ مشرکین کے مقابلہ کے لئے جا رہے ہیں تو انہوں نے درخواست پیش کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں بھی اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیجیے، اگرچہ ہم سے اُن لوگوں نے وعدہ تو لیا ہے لیکن یہ وعدہ تو مجبوری کے حالات میں زبردستی لیا گیا ہے۔ گویا گردن پر تلوار رکھ کر لیا گیا ہے، ایسے وعدے کا کیا اعتبار کیا جائے لیکن نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا کہ تم نے وعدہ کر لیا ہے کہ میری ملاقات وزیارت کے لئے جا رہے ہو، ہمارے ساتھ مل کر ان کے مقابلے کے لئے نہیں آؤ گے، اس لئے تم کو ہمارے ساتھ چلنے کی اجازت نہیں ہے۔ حالانکہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کتنا کڑا وقت تھا، مشرکین کا لشکر ایک ہزار کی تعداد میں تھا، مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی اور وہ بھی نہتّے۔ اسّی (۸۰) اونٹ اور صرف دو (۲) گھوڑے تھے، چھ (۶) یا آٹھ (۸) تلواریں تھیں اور دوسروں کے پاس تو ہتھیار بھی نہیں تھے۔ کسی کے پاس ڈنڈا، کسی کے پاس کچھ اور تھا، ایک ایک آدمی مسلمانوں کی اجتماعی طاقت میں اضافہ کر سکتا تھا، ایسے حالات میں بھی حضور ﷺ نے ان دونوں کو اپنے ساتھ آنے کی اجازت نہیں دی۔ ہمارے تمہارے جیسا ہوتا تو یوں سوچتا کہ یہ تو بڑی معذوری کا وقت ہے، دشمن کا مقابلہ ہے اور انہوں تو زبردستی وعدہ لیا ہے، اس کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا۔

بھائی! اصل میں جہاد کاہے کے لئے ہے؟ جہاد تو اعلاءِ کلمۃُ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمے کی سر بلندی اور اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنے کے لئے مشروع ہوا ہے۔ اگر وعدہ خلافی کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، لہٰذا شریعت کا ایک حکم توڑ کر جہاد کرنا کیا معنٰی رکھتا ہے۔

مصلحت کے نام سے احکامِ شرع کی خلاف ورزی

آج کل ایک عام مزاج بنتا جارہا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ مصلحت کا تقاضہ ہے اس لئے یوں کرلیا جائے۔ایک مرتبہ ایک مدرسہ سے ہمارے پاس استفتاء آیا کہ ہمارے مدرسہ کے ایک بڑے معاون ہیں جو فلاں ملک میں رہتے ہیں اور وہ لاکھوں کی مقدار میں مدد کرتے ہیں،ان کا مطالبہ یہ ہے کہ مدرسہ میں جب درس ہورہا ہو،اس کی ویڈیو کیسٹ اُتار کر ہمارے پاس بھیجی جائے،جس میں مدرس صاحب اور طلبہ کو بتلایا گیا ہو؛تو کیا اس کی گنجائش ہے؟ ہم نے اس کا جواب دیا کہ آپ نے یہ مدرسہ کیوں قائم کیا ہے؟اسی لئے قائم کیا ہے کہ دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاری کیا جائے،اس کی ترویج واشاعت ہو،اللہ تعالیٰ راضی ہوں اور اللہ کے احکام پر لوگ عمل پیرا ہوں،اب اگر آپ اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کو توڑ کر مدرسہ چلا رہے ہو؛تو ایسا مدرسہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب نہیں ہے۔اس پر تو پکڑ ہوگی۔اس لئے ایسی چیزوں کی اجازت نہیں ہے۔

بعض مرتبہ لوگ کہتے ہیں کہ اس وقت مصلحت کا تقاضہ ہے کہ ایسا کرلیا جائے،لیکن سمجھ لینا چاہیے کہ مصلحت کے نام سے شریعت کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔حضرت حذیفہ اور ان کے والد کا جو واقعہ ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا اس میں ان دونوں سے جبراً وعدہ لیا گیا تھا،پھر بھی نبی کریم ﷺ اس وعدہ کو توڑنے کی اور اس کے خلاف کرنے کی کسی حال میں اجازت نہیں دے رہے ہیں،حالانکہ اس وقت مسلمانوں کے جو حالات تھے وہ سب کے سامنے عیاں ہیں۔

بہرحال! آج کل لوگوں کے اندر ایک مزاج بنتا جارہا ہے کہ دینی مصلحت کے نام

سے دینی احکام کو توڑنا؛ اس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔لہٰذا اس سے بھی بچنے کا خاص اہتمام کیا جائے۔

ملکی قوانین کی خلاف ورزی بھی وعدہ خلافی ہے

بہرحال! وعدہ خلافی کو بھی نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا اور کسی حال میں بھی وعدہ کی خلاف ورزی کرنے کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔بعض چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے سماج میں رائج ہیں اور کوئی بھی اس کو وعدہ خلافی نہیں سمجھتا، مثلاً ہم اس ملک میں رہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم اپنے آپ کو اس ملک کا شہری قرار دیتے ہیں اور اس حیثیت سے ہم نے اس ملک والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم یہاں کے قانون کا احترام کریں گے اور اس پر چلیں گے، بشرطیکہ کسی گناہ کا حکم نہ ہو۔اب اگر ہم یہاں کے کسی قانون کو توڑتے ہیں تو یہ اس ملک والوں کے ساتھ کئے گئے وعدے کی خلاف ورزی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

ایک بات یاد رہے کہ اگر کسی ملک کا کوئی قانون ایسا ہے کہ جس میں کسی گناہ کا کام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ تو کوئی ملک ہی کیا بلکہ اگر ماں باپ یا کوئی اور بڑا بھی کوئی ایسا کام کرنے کا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو؛ تو اس پر عمل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔شریعت نے ایک اصول بتلا دیا ہے ﴿لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ (کنز العمال، ۶۲۲۵)﴾ لیکن ملک کا کوئی قانون ایسا ہے کہ اس پر عمل کرنے میں شریعت کے خلاف نہیں ہوتا ہے اور وہاں پر اگر ہم قانون کی مخالفت کر رہے ہیں تو گویا ہم نے یہاں کے شہری ہونے کی حیثیت سے اس ملک والوں سے جو وعدہ کیا ہے اور اطمینان دلایا ہے کہ

یہاں کے قانون کا احترام کریں گے اور اس پر چلیں گے؛ اس کو توڑ رہے ہیں۔ یہ وعدہ خلافی کہلائے گی۔

مثلاً ٹریفک کا قانون ہے تو ملک کا قانون ہونے کی حیثیت سے اس کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے۔ ٹریفک کے قانون پر چلنے کی وجہ سے شرعی طور پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، ٹریفک کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لئے ملک میں ایک قانون بنایا ہے، اس پر عمل کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی تو لازم نہیں آرہی ہے۔ جب ہم اس ملک کے شہری ہیں تو اس قانون پر عمل کرنا ہمارے لئے ضروری ہے کہ بائیں طرف گاڑی چلائیں، جب سگنل ریڈ (RED) ہو تو گاڑی روک دیں، اس میں بہت سارے فائدے بھی ہیں۔ اگر آپ اس قانون کی پابندی کریں گے تو بہت سی جانیں بھی محفوظ رہیں گی، اور بہت سا نقصان جو ہوسکتا ہے اس سے بھی حفاظت ہو جائے گی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے صراحتاً لکھا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والی کوئی بات نہ ہو، یا حد سے زیادہ ظلم نہ ہو؛ تو پھر اس قانون پر عمل کرنا شہری ہونے کی حیثیت سے ضروری ہے۔ آج کل مسلمان اس چیز میں بھی بڑی کوتاہی کرتے ہیں، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے متعلق اور اسلام کے متعلق لوگوں کے دلوں میں بڑے شکوک وشبہات اور بدگمانیاں پھیلتی جارہی ہیں۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا مذہب ان کو یہ تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

اسی طرح کسی اور ملک میں چلے جائیں تو وہاں پر بھی وعدہ لیا جاتا ہے کہ جب تک ہم آپ کے ملک میں رہیں گے، یہاں کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کریں گے اور قانون

کا احترام کریں گے؛ تو وہاں بھی اس کے خلاف نہیں کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں عملی طور پر ایک طرح کا وعدہ ہے۔ جس طرح زبانی وعدہ ہوتا ہے اسی طرح عملی وعدہ بھی ہوتا ہے، اس کا بھی پاس ولحاظ رکھنا چاہیے، ورنہ وعدہ خلافی پر جو وعیدیں آئی ہیں؛ ہم ان میں داخل ہوجائیں گے

﴿وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ﴾ تیسری چیز بیان فرمائی کہ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ امانت اور خیانت کی ساری تفصیل پہلے عرض کرچکا ہوں۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے یہ تین باتیں ایسی ارشاد فرمائیں ہیں کہ ان کو منافق کی علامت قرار دے کر ایمان والوں کو متنبہ کیا اور اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ ایک مؤمن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچائے۔ یہ باتیں مؤمن کا طریقہ اور شیوہ نہیں ہیں۔ یہ تو منافق کا شیوہ ہے۔ ان سے بچنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:

۲۰۰. عن حذیفۃبن الیمان قَالَ: حَدَّثَنَارَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ حَدِیْثَیْنِ قَدْرَأَیْتُ أَحَدَھُمَا وَأَنَا أَنْتَظِرُالْاٰخَرَ...........الیٰ اٰخرہٖ

امانت ایک فطری وصف ہے

امانت کے سلسلے میں یہ باب چل رہا تھا، یہ روایت حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو دو باتیں ارشادفرمائیں، ان میں سے ایک تو مَیں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں اوردوسرا جو ارشاد اور پیشین گوئی فرمائی ہے اس کے آنے کاانتظار ہے۔پہلی بات امانت کے متعلق آپ نے ارشادفرمائی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر آدمی کے اندرفطری طور پرامانت کاوصف رکھا ہے، جتنے بھی اوصافِ حمیدہ یعنی خوبیاں ہیں ہر انسان کے اندران کا کچھ حصہ فطری طور پر رکھا ہوا ہوتا ہے۔ اگرآگے چل کروہ آدمی ودیعت کی گئی اس خوبی کو بڑھاوادے اوراس وصف کوترقی دینے کے لئے ان طریقوں کواختیارکرے جواللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبی کریم ﷺ نے احادیثِ مبارکہ میں ارشادفرمائے ہیں؛ تواس میں ترقی اوراضافہ ہوگا، اوراگروہ اس کی طرف توجہ نہیں کرے گا تو ہوسکتا ہے کہ آہستہ آہستہ اس کا وہ وصف ختم ہوجائے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس وصفِ امانت کے سلسلے میں

ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کے اندر طبعی طور پر یہ وصف رکھا جاتا ہے جیسے اور طبعی امور ہوتے ہیں کہ غصہ بھی طبعی امر ہے جو ہر انسان کے اندر کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے، اسی طرح یہ امانت والا وصف بھی فطری طور پر آدمی کے دل میں ڈالا جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک نازل کیا اور اس میں بھی امانت کے سلسلے میں کچھ باتیں ارشاد فرمائی گئیں جیسا کہ شروع میں تذکرہ آیا تھا ﴿اِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ اِلٰى أَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت تک پہنچاؤ اور ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰاتِ﴾ میں بھی امانت کا تذکرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ امانت کے سلسلے میں قرآن پاک کے اندر بھی تاکید آئی ہے۔ گویا قرآن نے بھی اس کی اہمیت کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا اور امانت کے تقاضوں کو بجالانے کی تاکید فرمائی۔ جس طرح قرانِ پاک میں امانت کے بارے میں تاکید آئی ہے اسی طرح نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور طریقوں میں بھی اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے ایک حدیث بھی گذر چکی ہے کہ امانت کے تقاضوں کو چھوڑنا اور امانت میں خیانت کرنا مؤمن کا وصف نہیں ہے بلکہ یہ تو منافق کی شان ہے، مؤمن کی خوبی تو یہ ہے کہ وہ امانت کے تقاضوں کو بجالائے، گویا سنت میں بھی اس کی تاکید آئی ہے۔ تو ایک تو فطری طور پر یہ چیز لوگوں کے قلوب میں موجود تھی، پھر قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تاکید فرمائی گئی، جس کی وجہ سے اس میں مزید روشنی پیدا ہوئی، اور پھر سنت کے اندر اس کی تاکید آئی تو اور اضافہ ہوا، تو گویا لوگوں میں یہ چیز عام ہوئی۔

﴿آناً فاناً تبدیلی﴾

﴿ثُمَّ حَدَّثَنَا عَنْ رَفْعِ الْأَمَانَةِ﴾ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس

طرح آپ ﷺ نے امانت کے وصف کے لوگوں کے اندر موجود ہونے اور اس میں ترقی کرنے کے متعلق ہمیں آگاہ فرمایا، اسی طریقہ سے یہ وصفِ امانت لوگوں کے اندر سے اُٹھالیا جائے گا، اس کی پیشین گوئی بھی آپ ﷺ نے فرمائی۔ چنانچہ اس کے اُٹھانے کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس کو بتلایا کہ آدمی جب سوئے گا اُس وقت اس کے قلب کے اندر یہ جذبۂ امانت موجود ہوگا، لیکن جب اُٹھے گا تو اس میں تبدیلی آچکی ہوگی کہ امانت کا جذبہ جس مقدار کے طبیعت میں موجود تھا؛ وہ کم ہوگیا ہوگا۔

اب یہ کم کیوں ہوا؟ یہ اس روایت میں نہیں بتلایا ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دی گئی نعمتوں سے محروم کیا جاتا ہے، جیسے دنیوی اور ظاہری نعمتیں ہیں، اسی طریقہ سے یہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کے اندر پیدا کئے جاتے ہیں وہ روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں، جس طرح معصیت، گناہ اور نافرمانی کا اثر ظاہری نعمتوں پر پڑتا ہے، اور گناہوں کی وجہ سے ظاہری نعمتوں سے محروم کردیا جاتا ہے، اسی طرح نافرمانیوں، معصیتوں اور گناہوں کی وجہ سے باطنی اوصاف جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی روحانی اور معنوی نعمتیں ہیں؛ ان سے بھی محروم کردیا جاتا ہے۔

﴿جذبۂ امانت ختم ہونے کی حسی کیفیت﴾

خیر! اس امانت کے اُٹھائے جانے کی شکل کیا ہوگی وہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی جب سویا تھا اس وقت اس کے دل میں یہ چیز موجود تھی لیکن جب اُٹھا تو اس کے اندر سے یہ جذبہ تھوڑا سا کم کردیا گیا، وہ نعمت جس مقدار میں دی گئی تھی اس میں کمی آگئی ﴿فَيَظِلُّ أَثَرُهَا مِثْلَ الْوَكْتِ﴾ پس اس کا اثر چھوٹے سے نشان کی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ آدمی کے جسم کی

کھال کی جو رنگت ہوتی ہے تو کبھی کبھی اس میں دوسرے رنگ کا چھوٹا سا داغ پڑ جاتا ہے؛ اسی کو عربی زبان میں ﴿وَكْتٌ﴾ سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا اس وصفِ امانت کی کمی کا اثر اس طرح نمایاں ہوگا۔

﴿ثُمَّ نَامَ النَّوْمَةَ فَقُبِضَ الْأَمَانَةُ مِنْ قَلْبِهِ﴾ پھر انہیں نافرمانیوں اور گناہوں کی وجہ سے، یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وصف کے اٹھا لئے جانے کا وقتِ مقررہ آ پہنچا ہے، اور تقدیر تو وجود میں آ کر ہی رہتی ہے اس لئے بھی یہ ہوتا ہے کہ پھر جب دوبارہ سوتا ہے تو پھر امانت اس کے اندر سے نکالی جاتی ہے ﴿فَيَظِلُّ أَثَرُهَا مِثْلَ أَثَرِ الْمَجَلِ﴾ اور اس کا اثر ایسا نمایاں ہوتا ہے جیسے محنت ومشقت کا کام انجام دینے کے بعد آدمی کی کھال میں پڑ جاتا ہے۔ آدمی محنت ومشقت کا کام کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کی کھال سخت ہو جاتی ہے۔ پہلے والا اثر تو صرف رنگ پر پڑا تھا، کھال کی نرمی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ اور دوسرا اثر جو آیا تو اس نے کھال کی جو کیفیت تھی یعنی اس کی نرمی میں بھی اثر پیدا کر دیا یعنی وہ بجائے نرم رہنے کے سخت ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ امانت کے وصف کے اٹھائے جانے کا جو اثر دوسری مرتبہ آیا وہ پہلے والے اثر کے مقابلے میں زیادہ ہوگا۔ اس طرح دھیرے دھیرے یہ ہوگا کہ ایک وقت وہ آئے گا کہ جذبۂ امانت لوگوں میں سے بالکلیہ ختم ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وصف سے دھیرے دھیرے محروم کیا جائے گا اور یہ نعمت چھین لی جائے گی، اس کی کیفیت کیا ہوگی اس کو نبی کریم ﷺ ایک مثال سے سمجھا رہے ہیں ﴿كَجَمْرٍ دَحْرَجْتَهُ عَلَى رِجْلِكَ﴾ کہ کھال میں اثر ایسا ہوتا ہے جیسے کہ آگ کا انگارہ پاؤں پر ڈال کر لڑھکاویں تو کھال پھول جائے گی، اور اگر انگارہ وہیں رہے تو کھال کو جلا دے گا۔ لیکن جب انگارہ لڑھک جائے گا تو کھال پھول جائے گی اور اُبھری ہوئی محسوس ہوگی،

حالانکہ اندر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور انگارہ کس طرح لڑھکتا ہے اس کو نبی کریم ﷺ نے حسی اور مشاہداتی طور پر سمجھانے کے لئے ایک کنکر ہاتھ میں اُٹھایا اور اپنے پاؤں پر لڑھکا کر بتلایا کہ یہ کنکر کس طرح لڑھکتا ہے، اس طرح سے انگارہ لڑھکتا ہے۔

رائے کے دانہ کے برابر بھی امانت نہ ہوگی

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب جذبۂ امانت اُٹھالیا جائے گا اور یہ اچانک نہیں ہوگا بلکہ دھیرے دھیرے ختم ہوگا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگ آپس میں معاملات کریں گے، لیکن ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہوگا جو اس وصفِ امانت میں پورا اترتا ہو۔ یہاں تک کہ خال خال لوگوں کے متعلق نام لے کر یہ کہا جائے گا اور ایسی باتیں ہوں گی کہ فلاں بستی میں فلاں قبیلے میں ایک آدمی امانت دار موجود ہے۔ یہاں تک کہ بعض آدمیوں کے متعلق لوگ باتیں کریں گے کہ کیسا بہادر اور جری آدمی ہے، کیسا سنجیدہ ہے، کیسا دانا اور سمجھ دار ہے، سب کچھ ہے لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ان ساری تعریفوں کے باوجود اس کے دل میں ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی امانت نہیں ہوگی۔ بہت تعریفیں ہوں گی کہ بڑا سمجھ دار ہے لیکن وصفِ امانت نہیں ہے۔ حالانکہ امانت ہی پر ساری بنیاد ہوتی ہے۔

جس سے چاہو معاملہ کرلو

دیکھئے! حضور ﷺ نے دو باتیں ارشاد فرمائیں، ایک تو یہ کہ امانت کیسے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر یہ چیز پیدا فرمائی، پھر قرآن وسنت کی تعلیمات سے اس میں اضافہ اور بڑھوتری ہوتی ہے اور اس وصف میں جلا پیدا ہوتا ہے۔ اور دوسری یہ بات بھی بتلا دی کہ

امانت کیسے اُٹھائی جائے گی۔ گویا ان دو باتوں کے متعلق حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں۔ ان میں سے ایک تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لی اور دوسری کا انتظار ہے۔ کیا بات دیکھ لی وہ بتلاتے ہیں کہ ایک وقت ایسا تھا کہ کسی سے بھی معاملہ کرنا چاہتا تو آنکھ بند کر کے کر لیتا تھا، یہ نہیں سوچتا تھا کہ مَیں جس کے ساتھ معاملہ کرنے جا رہا ہوں وہ کیسا ہے؟ وہ امانت کے تقاضوں کو پورا کرے گا یا نہیں؟ ایسا کچھ سوچنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پورا معاشرہ امانت کے وصف سے ایسا مزین تھا کہ جس سے چاہو معاملہ کرلو، ہر ایک کے اندر یہ وصف موجود تھا۔ اسی کو فرماتے ہیں ﴿وَلَقَدْ أَتىٰ عَلَيَّ زَمَانٌ وَمَا أُبَالِيْ أَيُّكُمْ بَايَعْتُ﴾ میرے اوپر ایک زمانہ ایسا آیا کہ میں اس بات کی پرواہ نہیں کرتا تھا کہ مَیں کس کے ساتھ سودا کر رہا ہوں، اس لئے کہ اس زمانہ میں معاشرہ کے اندر مسلمان ہوں یا غیر مسلم ایسے لوگ تھے، اگر مسلمان ہے تو اس کی دین داری اس کو حق لوٹانے کی طرف مجبور کرتی تھی، یعنی اس میں دین داری اتنی عام تھی اور جذبۂ امانت قائم تھا اور اس کی دین داری اس کو خیانت کا ارتکاب کرنے نہیں دیتی تھی، ہر مسلمان کا حال ایسا ہی تھا۔

﴿وَاِنْ كَانَ نَصْرَانِيًّا﴾ اور اگر وہ نصرانی یا یہودی ہوتا تو ان کے ساتھ بھی آنکھ بند کر کے معاملہ کر لیتا تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ اس میں دین داری تو نہیں تھی لیکن ان کے ذمہ دار اور بڑے (والی) لوگ ایسے تھے کہ ان کی وجہ سے وہ حق ادا کرنے پر مجبور ہوتا تھا۔

اب اس زمانہ میں آپ دیکھئے کہ دھیرے دھیرے معاشرہ پر سے بڑوں کی پکڑ بھی ختم ہو گئی ہے، بڑوں کی پکڑ بھی ماتحت کو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی پر مجبور کرتی ہے۔ تو فرماتے ہیں کہ اگر غیر مسلم ہوتا تو اس میں اگرچہ دین داری تو نہیں ہوتی تھی لیکن اس کے

بڑوں کی وجہ سے وہ میرا حق دینے پر مجبور ہوتا تھا۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ جس وقت یہ حدیث بیان کررہے ہیں اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک عرصہ گذر چکا تھا اس وقت فرماتے ہیں کہ آج تو حال یہ ہوگیا ہے کہ گنے چنے لوگ باقی ہیں جن کے متعلق آدمی کو اعتماد ہوتا ہے کہ یہ میرا حق برابر ادا کریں گے اور خیانت سے کام نہیں لیں گے، اس لئے چند ہی لوگ ایسے ہیں جن سے مَیں معاملہ کرتا ہوں۔

اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ انتظار کس چیز کا ہے؟ جواب یہ ہے کہ ابھی بھی امانت باقی ہے، انتظار اس بات کا ہے کہ وہ بچی ہوئی امانت بھی بالکلیہ ختم ہوجائے گی۔

آپ اندازہ لگایئے جب کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ موجود تھے۔حضرات صحابہ کا دور ختم نہیں ہوا تھا اور یہ سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔اور آج ہمارا دَور جو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے صدیوں دور ہوچکا ہے، آج جذبۂ امانت کتنا باقی رہ گیا ہوگا؟ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جنت کا دروازہ کون کھلوائے گا؟

امانت کی اہمیت بتلانے کیلئے ایک اور روایت پیش کرتے ہیں۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ساری دنیا ختم کردی جائے گی اور قیامت قائم ہوجائے گی اور اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ پیدا کرکے جمع کریں گے، اُس وقت مومنین اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوں گے، یہاں تک کہ ان کو جنت کی نعمتیں بتلانے کے واسطے جنت کو ان سے قریب کیا جائے گا اور ان کے داخلے کا وقت قریب ہوگا، لیکن جنت کے دروازے بند ہوں گے، اور دروازوں کے کھلوانے کا مسئلہ ہوگا۔اہل ایمان جن کے حق میں جنت کا فیصلہ ہوا ہے وہ منتظر ہوں گے کہ دروازہ کھلے تو ہم جنت میں جائیں، سب اہل

ایمان حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور کہیں گے کہ اے ابا حضور! آپ جنت کا دروازہ کھلوا دیجیے تاکہ ہم اندر چلے جائیں۔اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کہ تم کو جنت سے تمہارے ابا کی غلطی نے ہی تو نکالا ہے، مَیں یہ کام نہیں کرسکوں گا۔یعنی جنت کا دروازہ کھلوانا میرا کام نہیں ہے، وہ معذرت کردیں گے۔ یہ ان کی تواضع کی بات ہے بات یہ ہے کہ جنت کا دروازہ کھلوانا کسی اور کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ بہرحال! تواضع کے طور پر معذرت پیش کردیں گے اور کہیں گے کہ میرے بیٹے ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جاؤ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل ایمان جنت کا دروازہ کھلوانے کی درخواست لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور ان سے کہیں گے کہ حضرت! آپ دروازہ کھلوایئے۔ حضرت ابراہیم جواب میں عرض کریں گے کہ مَیں اس کا اہل نہیں ہوں، جنت کا دروازہ کھلوانا میرا کام نہیں ہے، مَیں اللہ کا خلیل ضرور تھا لیکن دور دور سے تھا، یعنی بالکل قرب کا جو مقام ملنا چاہیے وہ بات نہیں تھی۔حضرت ابرہیم علیہ السلام کے کہنے کا حاصل یہ تھا کہ باری تعالیٰ کے ساتھ براہِ راست کلام کرنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔اچھا ایسا کرو کہ تم حضرت موسیٰ کے پاس جاؤ جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست کلام کیا، اللہ تعالیٰ سے شرفِ مخاطبت سے مشرف ہیں ان کو اللہ تعالیٰ نے یہ فضیلت عطا فرمائی ہے، گویا ان کو اتنا قرب تو حاصل ہوا، یہ ایک طرح کی فضیلت ہے۔اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام ان سے بڑھ کر ہے جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔خیر! تمام لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور ان سے عرض کریں گے کہ آپ سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا، آپ کو شرفِ مخاطبت سے نوازا، آپ دروازہ کھلوایئے وہ عرض کریں گے کہ مَیں اس کا اہل نہیں ہوں، یہ کام میرا نہیں ہے، بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

پاس جاؤ، وہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ ہیں یعنی ان کا وجود ہی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نتیجے میں ہوا کہ بغیر باپ کے اللہ تعالیٰ کے کلمہ ''کُــنْ'' کے نتیجے میں پیدا ہوئے اس لئے ان کو ''کلمۃُ اللہ'' کہا جاتا ہے اور ''روح اللہ'' اس لئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو احیاءِ موتیٰ کا معجزہ عطا فرمایا تھا۔ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے تو وہ بھی جواب میں عرض کریں گے کہ مَیں اس کا اہل نہیں ہوں۔ حضور ﷺ کے پاس جاؤ، چنانچہ لوگ حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوں گے۔

شراح لکھتے ہیں کہ پہلے ہی سے یہ ہوسکتا تھا کہ لوگوں کے دلوں میں یہ ڈالا جاتا کہ وہ اولاً ہی نبی اکرم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اور اپنی درخواست پیش کرتے لیکن اس صورت میں حضور اکرم ﷺ کی یہ فوقیت اور آپ کی یہ امتیازی شان جو دوسرے انبیاء کرام کے مقابلہ میں ہے وہ ظاہر اور نمایاں نہ ہوتی۔ سب کے پاس بھیج کر بتلا دیا گیا کہ یہ کام سوائے حضور اکرم ﷺ کے کسی اور سے ہوسکنے والا نہیں ہے، اس لئے یہ سب کرایا گیا۔

امانت دار کے لئے پل صراط پر آسانی

نبی کریم ﷺ اُٹھیں گے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت دی جائے گی کہ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں خصوصی مقام پر جا کر اللہ تعالیٰ کی ایسی خوبیاں بیان کریں گے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اُسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے دل میں القاء کیا جائے گا جو اِس وقت مَیں نہیں جانتا، اُس وقت باری تعالیٰ بتلائیں گے اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی خوبیاں بیان کروں گا اور دیر تک سجدے میں رہوں گا۔ پھر باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ کہیے؛ آپ کی بات سنی جائے گی۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ امانت اور رحم یعنی رشتہ داری جو پیدائشی اور نسبی رشتہ داری ہوتی ہے وہ دونوں کھڑے رہیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو خاص شکل عطا کی جائے اور پھر یہ دونوں پُل صراط کے دونوں طرف دائیں اور بائیں کھڑے رہیں گے

بس! یہاں تو یہ روایت اسی اہمیت کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ ہر ایک کو پل صراط پر سے گذرنا ہے اس کے لئے آدمی اگر مدد حاصل کرنا چاہتا ہے تو امانت اور صلہ رحمی ان دونوں چیزوں کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ جتنا زیادہ ان چیزوں کا خیال رکھیں گے اتنی ہی وہاں آسانی پیدا ہو جائے گی۔

آج کل جس طرح امانت کے معاملہ میں کوتاہی برتی جاتی ہے اسی طرح صلہ رحمی کے اندر بھی کوتاہی ہوتی ہے۔ حالانکہ صلہ رحمی کوئی مشکل کام نہیں ہے، لیکن آپس کی لڑائیاں، نااتفاقیاں اور آپس کی کدورتیں اتنی عام ہوگئی ہیں کہ بس اللہ کی پناہ۔ خاندانوں میں، بھائیوں میں، رشتہ داروں میں آپس میں صلہ رحمی یعنی رشتہ داری کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام بالکل باقی نہیں رہا۔ صلہ رحمی کے سلسلے میں آگے باب آئے گا۔

خیر! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ پل صراط پر سے گذر کر جنت میں جانا ہے، تم میں سے سب سے پہلے ایک جماعت بجلی کی طرح گذرے گی۔ راوی کہتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول! بجلی کی طرح گذرنے کا کیا مطلب ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ بجلی کو نہیں دیکھا کہ جب وہ کوندتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی آئی اور پلک جھپکنے میں آسمان سے لے کر زمین تک کا کروڑوں میل کا اتنا بڑا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیزی کے ساتھ گذر جائیں گے۔

اس کے بعد ایک جماعت وہ بھی ہوگی جو ہوا کی طرح تیزی سے گذر جائے گی یعنی پہلے والوں سے کچھ کم رفتار سے گذریں گے۔ پھر ایک جماعت پرندوں کی طرح گذرے گی اور اس کے بعد والی جماعت تیز رفتار اونٹ کی طرح گذرے گی۔

﴿تَجْرِیْ بِهِمْ أَعْمَالُهُمْ﴾ مختصر یہ کہ ان کو ان کے اعمال چلائیں گے۔مطلب یہ ہے کہ جس کے اعمال جس درجے کے ہوں گے اسی طرح کی تیزی اس کے اندر آئے گی۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے نبی پل صراط پر کھڑے رہیں گے، جس وقت امت پل صراط سے گذر رہی ہوگی اُس وقت نبی کریم ﷺ نگرانی فرما رہے ہوں گے اور اُس وقت اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں گے ﴿رَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ﴾ اے اللہ! سلامتی سلامتی۔مطلب یہ ہے کہ میری اُمت سلامتی کے ساتھ پار ہو جائے۔

یہاں تک کہ بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے اعمال پل صراط پر سے ان کو پار کرانے سے عاجز ہوں گے، ان کے اعمال میں اتنی قوت نہیں ہوگی کہ وہ اگلوں کی طرح سے پل صراط سے گذ جائیں۔بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ بچہ جس طرح سرین کے بل گھسٹتا ہوا چلتا ہے ایسے گھسٹ کر پل صراط پر سے جائیں گے۔ اور پل صراط کے دونوں طرف آنکس لگے ہوئے ہوں گے (آنکس یعنی وہ لوہا جو دونوں طرف سے مُڑا ہوا ہو، جس کو ہم آنکڑا کہتے ہیں) اور ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کے گرانے کا حکم دیا جائے گا، اہل کفر اور وہ جن کا جہنم میں جانا اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے ہے، ان کو یہ آنکس کھینچ کر جہنم میں گرا دیں گے۔اور جن کو جہنم سے بچانا مقصود ہے وہ کسی بھی طرح سے گذر جائیں گے، تیزی کے ساتھ ہو یا گرتے پڑتے؛ لیکن پار ہو جائیں گے۔اور بعض ایسے ہوں گے کہ مخدوش اور زخمی ہو کر

بھی نجات پا جائیں گے اور بعض وہ بھی ہوں گے کہ جو پچھاڑ کر جہنم میں گرا دیئے جائیں گے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں وہ قسم کھا کر کہتے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ جہنم کی گہرائی ستر سال کی ہے، یعنی جہنم اتنی گہری ہے کہ گرنے والا مسلسل ستر سال تک گرتا رہے؛ تب اس کی تہہ میں پہنچے گا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ادائے قرض کا فکر

ایک قصہ پیش کرتے ہیں کہ ایک صحابی کی طرف سے امانت کا کتنا لحاظ واہتمام کیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ جن کی کنیت ابوخبیب تھی وہ فرماتے ہیں کہ جنگِ جمل (یہ ایک جنگ ہے جو حضرت علیؓ کے دورِ خلافت میں ہوئی) کے دن جب میرے والد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ میدان میں کھڑے ہوئے تو انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ مَیں ان کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے فرمایا ﴿یَابُنَیَّ! اِنَّہٗ لَا یُقْتَلُ الْیَوْمَ اِلَّا ظَالِمٌ اَوْ مَظْلُوْمٌ﴾ اے میرے بیٹے! آج کوئی بھی نہیں قتل ہوگا مگر ظالم یا مظلوم ہو کر۔ یعنی جو حق پر ہے وہ مظلوم بن کر قتل ہوگا اور جو ناحق ہے وہ ظالم بن کر قتل ہوگا، اور میں یوں سمجھتا ہوں کہ مَیں مظلومیت کے ساتھ قتل کیا جاؤں گا اور میرا سب سے بڑا بوجھ میرے قرضے کا ہے۔ یہاں اس روایت کو لا کر یہی بتلانا مقصود ہے کہ عین اپنی موت کی گھڑی کے اندر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو جس فکر نے گھیر رکھا تھا وہ ادائے امانت کا جذبہ تھا کہ لوگوں کے جو مطالبے میرے اوپر ہیں وہ کس طرح سے ادا ہوں اور انہوں نے اس کے لئے کتنا اہتمام کیا کہ عین میدانِ جنگ میں جبکہ صفِ قتال میں کھڑے ہوئے ہیں، اپنے صاحبزادے کو بلا کر اس سلسلے میں تاکید فرما رہے ہیں اور اپنے بیٹے سے

کہتے ہیں کہ ہمارا قرضہ ہمارے مال میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑے گا۔یعنی قرضہ اتنا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ملکیت میں سے کچھ باقی نہیں رہے گا،ساری ملکیت قرضہ ادا کرنے میں ختم ہوجائے گی۔پھر وصیت کے طور پر کہا کہ دیکھو! میرے مرنے کے بعد ہماری ملکتوں کو بیچ دینا اور سب سے پہلے میرا قرضہ ادا کرنا اور قرضہ ادا کرنے کے بعد جو بچ جائے اس کے تہائی کے سلسلے میں وصیت کرتا ہوں اور اس تہائی کا تہائی تمہارے بیٹوں کو یعنی میرے پوتوں کو دینا۔چونکہ بیٹے موجود تھے اس لئے پوتے وراثت میں سے حصہ نہیں پاتے، اس لئے حسن سلوک کے طور پر یہ وصیت فرمائی۔

ہشام کہتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی بعض اولاد حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی بعض اولاد اور بیٹوں کی ہم عمر تھیں یعنی بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ چچا بھتیجوں کی عمر میں زیادہ فرق نہیں ہوتا اور اس وقت حضرت زبیر کے نو(۹) بیٹے اور نو(۹) بیٹیاں تھیں۔

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ میرے والد حضرت زبیر اپنے قرضہ کے متعلق مجھے تاکید کرتے رہے اور انہوں نے مجھے یہ کہا کہ اے میرے بیٹے! اگر میرے دین کی ادائیگی سے تم عاجز ہوجاؤ تو پھر میرے مولیٰ سے مدد چاہنا۔لفظ مولیٰ عربی زبان میں آقا کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔دوست کے لئے بھی بولتے ہیں اور اس زمانہ میں غلام ہوا کرتے تھے اگر کسی نے غلام کو آزاد کیا ہو تو آزاد کئے ہوئے غلام کو بھی مولیٰ کہتے ہیں۔حضرت زبیر نے جب لفظِ مولیٰ استعمال کیا تو حضرت عبداللہ کہتے ہیں کہ واللہ! مَیں نہیں سمجھا کہ انہوں نے لفظِ مولیٰ بول کر کیا مراد لیا ہے،اس لئے مَیں نے پوچھا ﴿يَا أَبَتِ! مَنْ مَوْلَاكَ؟﴾ اباجان! آپ کا مولیٰ کون ہے؟ ﴿قَالَ: أَللّٰهُ﴾ فرمایا: اللہ تعالیٰ۔

دیکھئے! ان حضرات کا یقین کیسا تھا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بعد میں جب بھی دین کی ادائیگی کے سلسلے میں کوئی رکاوٹ اور دشواری پیش آتی تھی تو فوراً مَیں دعا کرتا ﴿یَامَوْلیٰ الزُّبَیْرِ! اِقْضِ عَنْهُ الدَّیْنَ﴾ اے زبیر کے آقا! زبیر کا دین ادا کر دیجیے تو فوراً سہولت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

انہوں نے یہ وصیت کی اور میدانِ جنگ میں شہید ہو گئے، روپیہ پیسہ نہیں چھوڑا، بلکہ چند زمینیں چھوڑی تھیں، ان میں سے ایک غابہ میں تھی۔ غابہ مدینہ منورہ کے قریب ایک علاقہ ہے، اس میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے ایک زمین چھوڑی تھی اور مدینہ منورہ میں گیارہ مکان اور بصرہ میں دو مکان اور کوفہ میں ایک مکان اور مصر میں ایک مکان چھوڑا تھا، انہوں نے پیسے نہیں چھوڑے تھے بلکہ یہ ملکتیں تھیں۔

اوران کے قرضے کی نوعیت کیا تھی؟ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہوتا یہ تھا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بڑے سخی تھے اور کوئی بھی ان کے پاس امانت رکھنے کے واسطے آتا تو وہ کہتے کہ یہ بطورِ امانت نہیں بلکہ بطورِ قرض دو، اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ضائع ہو جائے۔

﴿امانت اور قرض میں فرق﴾

دیکھو! امانت کسی کے پاس رکھو تو مسئلہ یہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ روپیہ امانت رکھی تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اس نے آپ کے اس ایک لاکھ روپے کی حفاظت میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کی، جس طرح وہ اپنے مال کی حفاظت کرتا ہے، ہو بہو اس نے آپ کے ایک لاکھ روپے کو بھی محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ جس طرح اپنے پیسے تجوری میں رکھتا ہے اسی طرح آپ کے پیسے بھی تجوری میں رکھے، تالا لگایا اور پوری احتیاط کی، لیکن اس کے

بعد بھی خدانخواستہ چوری ہوگئی؛ تو اس صورت میں اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ جس کے پاس پیسہ رکھوایا تھا اس کے پاس سے آپ ایک روپیہ بھی تاوان کے طور پر لے نہیں سکتے۔ جو گیا وہ آپ کا گیا۔ ہاں! اگر وہ اس کی حفاظت میں کوتاہی کرتا اور ضائع ہوجاتا تو آپ وصول کر سکتے ہو۔ امانت کا یہ حکم ہے۔

اس کے برخلاف وہی ایک لاکھ روپے آپ کسی کو دیں اور کہیں کہ یہ امانت نہیں ہے بلکہ قرض ہے؛ تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کو وہ استعمال کر سکتا ہے۔ امانت میں تو جوں کا توں رہنے دینا پڑے گا لیکن قرض میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور آپ جب بھی مانگیں اس کو ایک لاکھ پورے واپس دینے پڑیں گے۔ اگر وہ اس کے پاس ہلاک بھی ہوگئے، چاہے استعمال نہ کئے ہوں، محفوظ رکھے ہوں لیکن وہ قرض کے نام سے تھے تو واپس کرنے پڑیں گے۔ قرض کا حکم یہ ہے۔

امانت کا دوسرا حکم بھی سن لیجیے۔ وہ حکم یہ ہے کہ آپ نے اس کو جو دیا ہے، ہو بہو اسی کو محفوظ رکھنا ضروری ہے، اس میں ذرّہ برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں کر سکتے۔ جو نوٹ اور گڈی اور جو روکڑی (રોકડી) دی ہے؛ وہی محفوظ رکھنا پڑے گا۔ اس میں سے ایک نوٹ بھی بدلنا چاہے تو نہیں بدل سکتے۔ مثلاً آپ کا دیا ہوا نوٹ پُرانا ہے، اس کی جگہ وہ نیا نوٹ رکھنا چاہتا ہے تو اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ جو دیا ہے وہی واپس کرنا ہے، یہ امانت کا حکم ہے۔ تو امانت کے اندر یہ دو باتیں ہیں جو قابل لحاظ ہیں۔

خیر! حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی شخص امانت رکھنے کے واسطے آتا تھا تو اس کی خیر خواہی کرتے ہوئے یوں کہتے تھے کہ مَیں پوری حفاظت کروں گا لیکن اگر ضائع

ہوجائیں گے تو تم وصول نہیں کرسکو گے، اس لئے مجھے قرض کے نام سے دے دو، مَیں خرچ کرتا رہوں گا، جب تم کو ضرورت ہو، مجھ سے مانگ لینا، مَیں واپس دے دوں گا۔ تو قرض میں یہ آسانی ہے کہ جس کے پاس رکھی گئی ہے وہ استعمال بھی کرسکتا ہے اور دینے والے کو فائدہ یہ ہے کہ وہ سینہ ٹھوک کراس کے پاس سے واپس لے سکتا ہے۔ اس لئے حضرت زبیر بھی اس سے قرض کے نام سے لیتے تھے۔ گویا اس طرح لوگوں کے پیسے آتے تھے اور وہ سخاوت میں خرچ کرڈالتے تھے۔ اسی طرح کی امانتوں میں ان کا قرضہ بہت بڑھ گیا تھا۔

راوی کہتے ہیں کہ حالانکہ کبھی کوئی عہدہ انہوں نے نہیں لیا اور کسی جگہ صدقات کی وصولیابی کے لئے بھیجا جاتا تھا وہ ذمہ داری بھی قبول نہیں کی اور کوئی اور چیز بھی نہیں تھی۔ تو پھر ان کی آمدنی کیا تھی؟ کسی غزوے میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ یا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کے ساتھ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان کے ساتھ جاتے تھے، مطلب یہ ہے کہ ان کی آمدنی کسی اور طریقے نہیں تھی، مالِ غنیمت کے طور پر جو مال مل جاتا تھا؛ وہی ان کے پاس تھا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے انتقال کے بعد جب مَیں نے ان کا قرضہ گنا تو بائیس لاکھ درہم نکلا۔ اُس زمانے کے بائیس لاکھ درہم تھے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ جو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے رشتہ کے چچازاد بھائی تھے، وہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے ملے اور پوچھا کہ اے بھتیجے! میرے بھائی کا کتنا قرضہ ہے؟ حضرت عبداللہ نے سوچا کہ اگر پورا قرضہ بتلاؤں گا تو معلوم نہیں وہ کیا سوچیں گے، اس لئے مَیں نے ابا کا قرضہ چھپانے کے لئے کہا کہ ایک لاکھ ہے۔ اب ان کے جواب کو جھوٹ پر

محمول نہ کیا جائے، اس لئے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ایک لاکھ کے علاوہ نہیں ہے، بلکہ ایک لاکھ کہا تو ایک لاکھ قرضہ تو تھا ہی۔ بائیس لاکھ میں ایک لاکھ آ ہی جاتا ہے۔ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں نہیں سمجھتا کہ تمہاری ملکتوں سے یہ ادا ہو جائے گا یعنی اِس وقت تمہارے پاس جتنی ملکتیں ہیں یہ بھی تمہارے اس ایک لاکھ کے قرضے کو ادا کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس پر حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے ان سے کہا کہ اچھا! اگر بائیس لاکھ ہوں تو؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو تمہاری طاقت سے باہر کی چیز ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اچھا! ٹھیک ہے اگر تم سے یہ قرضہ ادا نہ ہو تو مجھ سے مدد مانگنا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے معذرت کردی۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے غابہ والی زمین ایک لاکھ ستر ہزار میں خریدی تھی، اس کو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے سولہ لاکھ میں بیچا۔ ایک لاکھ ستر ہزار کے سولہ لاکھ ملے۔ پھر انہوں نے اعلان کیا کہ جن کے قرضے ہمارے ابا کے اوپر ہیں وہ فلاں جگہ آ کر مجھ سے ملو اور وصول کرلو۔

دیکھو! یہاں اصل میں یہ بات بتلانا چاہتے ہیں کہ چونکہ ان کے دل میں لوگوں کا قرضہ ادا کرنے کا اور امانت کی ادائیگی کا جذبہ موجود تھا تو جو زمین ایک لاکھ ستر ہزار میں خریدی گئی تھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے کتنے گُنے دلوائے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے اس اعلان پر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے، ان کا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر چار لاکھ دَین تھا، انھوں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

سے کہا کہ اگر تم چاہو تو مَیں یہ دین معاف کردیتا ہوں۔حضرت عبداللہ بن زبیر نے جواب میں فرمایا:نہیں۔پھر عبداللہ بن جعفر نے کہا کہ اگر تم چاہو تو اپنے اس مطالبہ کو تم جب تک کہو وہاں تک مَیں مؤخر کر دیتا ہوں۔حضرت عبداللہ بن زبیر نے جواب میں فرمایا:نہیں۔تو عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے پھر اس زمین کا ایک ٹکڑا مجھے دے دو۔عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہاں سے لے کر وہاں تک کا حصہ لے لو۔

پھر حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے اس زمین کا کچھ حصہ بیچ کر والد کا سارا قرضہ ادا کردیا، پھر بھی اس زمین کے ساڑھے چار پلاٹ بچ گئے۔اس کے بعد حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے،اس وقت ان کے پاس عمرو بن عثمان منذر بن زبیر اور عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہم بھی موجود تھے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ غابہ والی زمین کی کیا قیمت لگائی گئی ہے؟ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ ایک پلاٹ کی قیمت ایک لاکھ درہم ہے۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کتنے پلاٹ بچ گئے ہیں؟ عبداللہ بن زبیر نے جواب میں کہا کہ ساڑھے چار پلاٹ۔اس پر منذر بن زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس کا ایک پلاٹ مَیں ایک لاکھ میں خریدتا ہوں۔عمرو بن عثمان نے کہا کہ مَیں نے اس کا ایک پلاٹ ایک لاکھ میں خریدلیا۔عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں نے بھی اس کا ایک پلاٹ ایک لاکھ میں خریدلیا۔اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اب کتنے بچ گئے؟ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ ڈیڑھ پلاٹ۔حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے اس کو ڈیڑھ لاکھ میں خریدلیا۔

راوی کہتے ہیں کہ پھر حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے بعد میں اپنے حصہ میں آئی

ہوئی زمین حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو چھ لاکھ میں بیچی۔

جب حضرت عبداللہ بن زبیر اپنے والد کا سارا دین ادا کر چکے تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی اولاد نے کہا کہ اب ہماری میراث ہمارے درمیان تقسیم کرو۔تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم !جب تک چار سال تک موسمِ حج میں یہ اعلان نہ کرلوں کہ جس کا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے اوپر قرضہ ہو، وہ ہم سے آکر وصول کرلے؛ وہاں تک میراث تقسیم نہیں کروں گا۔ چنانچہ ہر سال موسمِ حج میں یہ اعلان کرتے تھے، جب چار سال اس طرح پورے ہوئے تب وصیت کے مطابق ایک ثلث نکالا اور باقی مال ورثاء کے درمیان تقسیم کیا۔

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی چار بیویاں تھیں، ہر ایک کے حصہ میں بارہ لاکھ درہم آئے، اس حساب سے ان کا پورا مال پانچ کروڑ دو لاکھ ہوا۔

اس وقعہ کو بیان کرکے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ حضرات امانت کی ادائیگی کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ میدانِ جنگ میں مرتے مرتے بھی اسی کی فکر فرمائی اور وصیت کی، پھر ان کے بیٹے نے بھی اتنا اہتمام کیا کہ سب کو بلا بلا کر امانت لوٹائی، اور چار سال تک موسم حج میں اعلان کرواتے رہے؛ تاکہ امانت حق والے تک پہنچ جائے۔

اس روایت سے یہ سبق بھی ملا کہ اگر امانت اور قرض کی ادائیگی کا سچا جذبہ موجود ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی کیسی مدد ہوا کرتی ہے، اور پھر برکتیں بھی کیسی ہوتی ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی امانت کی ادائیگی کا اہتمام کرنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

تَحرِيمُ الظُّلمِ وَالأُمُرُبِرَدِّالمَظَالِمِ

ظلم کی حرمت

﴿مجلس ۱﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

قال اللّٰہ تعالیٰ: مَالِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَاشَفِیْعٍ یُّطَاعُ

وقال اللّٰہ تعالیٰ: وَمَالِلظّٰلِمِیْنَ مِن نَّصِیْرٍ

﴿قابلِ توجہ بات﴾

اس باب میں ظلم کی حرمت کو بتلایا گیا ہے یعنی کسی کی حق تلفی، کسی کا حق مارنا، کسی کا حق ادا نہ کرنا، اور کسی کے ساتھ زیادتی کرنا حرام ہے "وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ" "مَظَالِم، مَظْلِمَۃٌ" کی جمع ہے۔ بندوں کا جو حق مارا جاتا ہے اس کو ﴿مَظْلِمَۃٌ﴾ کہتے ہیں۔ اگر کسی کا جانی یا مالی حق مارا ہے، تو اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔

عام طور پر جب ہم لوگ اپنے آپ کو شریعت کا پابند بنانے کا اہتمام کرتے ہیں، تو ہماری کوشش یہ ہوتی ہے کہ نوافل کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے۔ اشراق اور چاشت پڑھیں، تہجد پڑھیں، تلاوت وتسبیحات خوب شروع کردیں۔ یقیناً یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کے قرب کا ذریعہ ہیں، لیکن ان نوافل کے مقابلہ میں فرائض اور واجبات اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی؛ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ نوافل کا حال تو یہ ہے کہ اگر آپ نوافل کو اس کی شرطوں کے ساتھ ادا کریں گے تو آپ کو اجر وثواب حاصل ہوگا اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل

ہوگا، اور اس کی شرط یہ ہے کہ ان نوافل کے ساتھ ساتھ فرائض و واجبات کا اہتمام کیا جائے، اگر کوئی آدمی صرف نوافل پر اکتفا کرتا ہے، اور فرائض و واجبات کا اہتمام نہیں کرتا، تو ایسے نوافل اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول نہیں ہیں۔ تو فرائض و واجبات اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح دوسری چیز جو بہت ضروری اور اہم ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچانا، بندوں کی حق تلفی اور ظلم و زیادتی سے بچانا۔ اس لئے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چند چیزوں کی خصوصیت کے ساتھ ان کو تلقین فرمائی تھی، اس میں ایک یہ بھی تھا ﴿اِتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان سے بچو؛ سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے (ترمذی شریف، ۲۳۰۵) تو سب سے بڑی عبادت تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئیں چیزوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔

نفس کا بڑا دھوکہ

ہمارا نفس ہم کو بہت زیادہ دھوکہ میں رکھتا ہے۔ نوافل کی طرف ہمیں جھکا کر اس کی مشغولی کو ہمارے لئے کافی قرار دیتا ہے، اور اس کے بعد آدمی یوں سمجھتا ہے کہ اب فرائض، واجبات اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے، حالانکہ یہ طریقہ اس کے لئے آخرت کے اعتبار سے بربادی کا ذریعہ ہے۔ نوافل کا درجہ تو فرائض کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اور فرائض کے اندر جو کمی ہوگی اللہ تعالیٰ ان نوافل کے ذریعہ پوری فرمائیں گے

یہ خاص چیز ہے کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں بہت زیادہ اہتمام،

توجہ اور دھیان دینے کی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاتھوں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔خاص کر وہ لوگ جن سے ہمیں دن رات واسطہ پڑتا ہے جیسے ماں، باپ، بیوی، بچے، بھائی، بہن اور دوست واحباب یا اگر کوئی کاروبار کرتے ہیں تو آپ کے ماتحت کام کرنے والے ملازمین؛ ان سب کے حقوق کی ادائیگی کی طرف بہت زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ذراسی حق تلفی آدمی کو لے ڈوبتی ہے۔اس لئے لوگوں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی سے کام لینا، اور حق تلفی کو حرام قرار دیا ہے۔اور اگر کسی کی حق تلفی ہوئی ہے، تو چاہے سو سال پہلے ہوئی ہو، اور اس کے بعد آپ سو سال تک عبادتیں کرتے رہے ہوں، تب بھی اس حق تلفی کی تلافی ہونے والی نہیں ہے جب تک کہ وہ معاف نہ کرے۔ یہ بات یاد رہے۔

﴿باب کا عنوان﴾

اسی لئے عنوان میں یہ جملہ لائے ''وَالْأَمْرُ بِرَدِّ الْمَظَالِمِ'' یعنی بندوں کے جو حقوق ہم سے ضائع ہوئے ہیں ان کو ادا کرنے کا اہتمام کرنا۔مثلاً کسی کو ہم نے گالی دے کر تکلیف پہنچائی، کسی کو تہمت لگا کر تکلیف پہنچائی، کسی کو جسمانی اذیت اور تکلیف پہنچائی، کسی کو اور کسی انداز سے پریشان کیا اور ستایا؛ تو ان سب چیزوں کے متعلق جب تک صاحبِ معاملہ کے ساتھ صفائی نہیں ہوگی ؛ وہاں تک بات بننے والی نہیں ہے۔ہم اللہ تعالیٰ کے سامنے کتنے ہی روئیں اور گڑ گڑائیں، رات رات بھر عبادتیں کریں اور اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ اے اللہ! مَیں نے تو تیرے بندوں کو بہت ستایا ہے، تو معاف کر دے۔ وہاں سے بھی جواب مل چکا ہے کہ جب تک کہ بندہ معاف نہیں کرے گا وہاں تک معاف نہیں ہے۔سارا معاملہ اسی پر موقوف ہے۔

اسی طرح اگر مالی اعتبار سے کسی کا کوئی حق ہم پر باقی ہے، تو اس کی ادائیگی کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے۔ اگر دنیا میں ہم نے یہ معاملہ صاف نہیں کیا تو پھر آخرت میں جب تک کہ یہ حقوق ادا نہیں ہوں گے؛ وہاں تک جنت میں جانے کی اجازت نہیں ملے گی۔ جنتیوں تک کے متعلق بھی یہ صراحت ہے کہ جن کے متعلق جنت کا فیصلہ ہو گیا ہوگا، ان کو بھی جب تک بندوں کے حقوق کی صفائی نہیں ہوگی وہاں تک پل صراط پر روک دیا جائے گا، اور جب تک یہ معاملہ صاف نہیں ہوگا وہاں تک آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہوگی اور جنت میں جانے نہیں دیا جائے گا۔ یہ بڑا اہم معاملہ ہے، اسی اہمیت کو یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

کوئی دوست اور سفارشی نہیں ہوگا

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ﴿مَالِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلاشَفِیْعٍ یُّطَاعُ﴾ ”حَمِیْمٌ“ قریبی دوست کو کہتے ہے، جس کو ہم اپنی زبان میں لنگوٹیا (یار) کہتے ہیں تو جن لوگوں نے ظلم سے کام لیا ہے اور حق تلفی کی ہے، لوگوں کے جانی یا مالی حقوق ضائع کیے ہیں، تو قیامت کے دن ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا، اور نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کی سفارش مانی جائے یعنی ان حقوق کے معاملہ میں ان کی کوئی سفارش بھی نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق کے معاملہ میں درگذر سے کام لیں گے، لیکن بندوں کے حقوق کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ دخل نہیں دیں گے۔

مَیں ہمیشہ ایک مثال دے کر بتلاتا ہوں کہ اگر کسی کے بیٹے کو آپ نے مارا، پھر آپ اس کے باپ کے پاس جا کر کہیں کہ مَیں نے آپ کے بیٹے کو مارا ہے، آپ مجھے معاف کر دو، تو وہ کیا جواب دے گا؟ وہ یہی کہے گا کہ بھائی! تم اسی سے معافی مانگو، وہ میرا بیٹا ہے تو کیا ہوا،

آپ کا معاملہ اس سے ہے، آپ نے جب معاملہ اس کے ساتھ کیا ہے، تو اب مجھے معاف کرنے کا کیا حق ہے، مَیں معاف نہیں کروں گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی بندوں کے سارے معاملات انہیں پر چھوڑ رکھے ہیں۔ لہٰذا دنیا میں جب تک اللہ تعالیٰ نے جسم میں جان باقی رکھی ہے، آدمی کو چاہیے کہ سوچ کر اور غور وفکر کرکے ان سارے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرلے۔ یہ بہت اہم ہے۔ جب تک کہ یہ معاملہ صاف نہیں ہوگا، وہاں تک دوسری عبادتوں میں بھی برکت آنے والی نہیں ہے۔

یہاں باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا کہ قیامت کے روز ان کا کوئی دوست نہیں ہوگا اور کوئی ایسا سفارشی بھی نہیں ہوگا جس کی سفارش قبول کی جائے۔ بلکہ اس دن تو یہ معاملہ اپنے اعمال اور نیکیوں کے ذریعہ چکانا پڑے گا۔

﴿وَمَا لِلظَّالِمِيْنَ مِن نَّصِيْرٍ﴾ اس آیت میں تو بالکل ہی نفی کردی کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں حق تلفی کرنے والوں کا کوئی مددگار ہی نہیں ہوگا۔ حضور ﷺ بھی اس کی سفارش نہیں کریں گے۔ سیدھی بات ہے۔

﴿نہایت اہم روایت﴾

اس سلسلے میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اپنی عادت کے مطابق روایتیں پیش کرتے ہیں۔ ایک روایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی ہے جو پہلے گذر چکی ہے، اسی کا حوالہ انہوں نے یہاں دیا ہے۔ لیکن بڑی اہم روایت ہے اس لئے مَیں اس کو پھر سے بیان کردیتا ہوں۔

عن سعیدبن عبدالعزیزعن ربیعةبن یزیدعن أبی ادریس الخولانی عن أبی ذر جندب بن جنادة رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ فِیْمَا یَرْوِیْ عَنِ اللهِ تَبَارَکَ وَتَعَالیٰ أَنَّهٗ قَالَ:..........

ربیعہ بن یزید ایک بڑے تابعی ہیں، وہ ابوادریس خولانی سے نقل کرتے ہیں، اور حضرت ابوادریس خولانی حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے، اور وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ارشادات ایک تو قرآن میں ہیں جس کو وحی متلو کہا جاتا ہے۔ اور جب حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا کوئی ارشاد نقل کریں کہ باری تعالیٰ نے یوں فرمایا تو وہ ''حدیث قدسی'' کہلاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ظلم کو حرام قرار دیا

تو باری تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا ﴿یَاعِبَادِیْ اِنِّیْ حَرَّمْتُ الظُّلْمَ عَلٰی نَفْسِیْ وَجَعَلْتُهٗ بَیْنَکُمْ محرماً فَلَا تَظَالَمُوْا﴾ اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات کے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا، اللہ تعالیٰ تو سب کے مالک ہیں، وہ جو چاہیں کریں، مالک اور آقا اپنے غلام کے ساتھ جو معاملہ چاہے کرسکتا ہے، اس کا مختار کل ہوتا ہے۔ مثلاً آپ کا کپڑا ہے، اور آپ مالک ہیں، آپ اپنے اس کپڑے کا جو چاہیں کریں، کاٹ کر پھینک دیں، آگ لگا دیں، آپ سے کوئی پرشش نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف اگر اسراف ہوا ہے، تو وہاں پوچھ ہوگی وہ الگ بات ہے، لیکن دنیا میں اگر کوئی آدمی پوچھے گا تو آپ یہی کہیں گے کہ میں مالک ومختار ہوں، آپ کو مجھے کہنے کا کیا حق ہے؟ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ساری چیزوں کے مالک ہونے کے باوجود فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ پر ظلم کو حرام کر دیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی ظلم کا صدور نہیں ہوتا۔ اور تمہارے درمیان بھی ظلم کو حرام قرار دیا ہے یعنی تم آپس میں ایک دوسرے کی حق تلفی کرو اور زیادتی کرو، اس کی بھی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی۔

﴿عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ......﴾

﴿یَاعِبَادِیْ کُلُّکُمْ ضَالٌّ اِلَّامَنْ هَدَیْتُهٗ فَاسْتَهْدُوْنِیْ أَهْدِکُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم سب گمراہ ہو مگر وہ جس کو مَیں ہدایت دوں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دیں گے؛ وہی راہِ راست پر آ سکتا ہے۔ اور جب تک اللہ تعالیٰ کسی کو ہدایت نہ دیں وہ راہِ راست پر نہیں آ سکتا ہے۔ اسی کو کہتے ہے کہ تم سب گمراہ ہو لیکن میں جس کو ہدایت دوں وہ راہِ راست پر آئے گا، لٰہذا تم مجھ سے ہدایت مانگو، مَیں تم کو راہِ راست پر چلاؤں گا اور ہدایت دوں گا۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے لئے ہدایت مقدر ہے، تو وہ ہدایت یاب ہوگا اور راہ راست پر چلے گا۔ لیکن اس کے باوجود بندوں کی بندگی اور عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا سوال کرتے رہیں۔ آپ راہ راست پر چل رہے ہیں آپ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہ راست مقدر ہے، لیکن اس کے باوجود ہمیں حکم دیا گیا کہ تم ہدایت مانگو، اسی لئے روزانہ ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ میں یہ دعا ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ﴾ پڑھی جاتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ سے راہ راست پر چلنے کا سوال کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر استقامت عطا فرمائے۔ گویا عبدیت کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے سوال کرتے رہیں، اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوتا۔

﴿ہمیشہ مجھ سے مانگتے رہو﴾

﴿یَاعِبَادِیْ کُلُّکُمْ جَائِعٌ اِلَّامَنْ أَطْعَمْتُهٗ فَاسْتَطْعِمُوْنِیْ أُطْعِمْکُمْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندو! تم سب بھوکے ہو مگر وہ جس کو مَیں کھانا دوں۔ ظاہر ہے کہ

اللہ تعالیٰ جس کو کھانا نہ دیں، اس کو کھانا کون دے سکتا ہے۔ اسی لئے تم مجھ سے کھانا مانگو، مَیں تم کو کھانا دوں گا۔ گویا بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ بندوں کو اپنی ساری حاجتیں چھوٹی اور بڑی اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہئیں۔ حاجتیں پوری ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں کھانا دے رہے ہیں تب بھی ہماری عبدیت اور بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ سے روزی مانگتے رہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مل رہا ہے تو یہ سوچیں کہ ابھی مانگنے کی ضرورت نہیں ہے، جب نہیں ملے گا تو مانگیں گے۔ بلکہ جب مل رہا ہے اسی زمانہ میں مانگنے کی عادت ڈالو۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب کسی آدمی پر کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، تو اگر آرام کے زمانہ میں بھی اس کی دعا کا سلسلہ جاری تھا تو اس آواز کو سن کر فرشتے باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ! جانی پہچانی آواز ہے۔ اور اگر کوئی آدمی راحت و آرام کے زمانہ میں اللہ کو یاد نہیں کرتا، اور جب تکلیف آتی ہے تو دعا مانگتا ہے، تو فرشتے باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ کوئی اجنبی آواز ہے، آج تک تو کبھی سننے میں نہیں آئی۔ (شعب الایمان، ۱۱۴۰)

مثلاً ایک آدمی آپ سے ملتا رہتا ہے، حالات ٹھیک ہیں تب بھی ملاقات کرتا رہتا ہے، پھر کوئی مصیبت آئی تب بھی ملا اور تکلیف میں آپ سے آ کر درخواست کی، تو آپ فوراً دھیان دیں گے اور سوچیں گے کہ یہ تو اپنا ملنے والا ہے۔ اور اگر حالات ٹھیک رہے اس زمانہ میں تو کبھی بھول سے سلام بھی نہیں کیا، اب جب مصیبت آئی، تو آپ کے پاس آیا تو آپ کیا کہیں گے؟ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمیں عبدیت کا معاملہ رکھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہمارے سلام کا محتاج نہیں ہے، بلکہ بندے ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ روزی مل رہی ہے تب بھی

ہم اللہ تعالیٰ سے روزی مانگتے رہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم مجھ سے کھانا مانگو؛ مَیں تمہیں کھانا دوں گا۔

﴿یَا عِبَادِیْ کُلُّکُمْ عَارٍ اِلَّا مَنْ کَسَوْتُہٗ فَاسْتَکْسُوْنِیْ أَکْسُکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم سب ننگے ہو یعنی تمہارے پاس کپڑا نہیں مگر مَیں جس کو کپڑا دوں، لہٰذا تم مجھ سے کپڑا مانگو؛ مَیں تم کو کپڑا پہناؤں گا۔ گویا بندوں کو اپنی ساری ضرورتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرتے رہنا چاہئیں اور یہ مانگتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ! تو ہماری تمام ضرورتوں کی کفالت فرما، ہمیں کھانا دے، ہمیں کپڑا دے، ہماری ساری ضرورتیں پوری فرما۔ پوری ہورہی ہوں تب بھی مانگتا رہے۔

﴿ہم تو سراپا گناہ ہیں﴾

﴿یَا عِبَادِیْ اِنَّکُمْ تُخْطِئُوْنَ بِاللَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَأَنَا أَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعاً فَاسْتَغْفِرُوْنِیْ أَغْفِرْ لَکُمْ﴾ اے میرے بندو! تم رات اور دن گناہ کرتے ہو، مَیں سارے گناہوں کو معاف کرتا ہوں، لہٰذا تم مجھ سے گناہوں کی معافی مانگو، مَیں تمہارے گناہوں کو معاف کردوں گا۔ ہم سے دانستہ نادانستہ گناہ تو سرزد ہوتے ہی رہتے ہیں، حدیثِ پاک میں ہے ﴿کُلُّکُمْ خَطَّاؤُوْنَ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ﴾ تم سب خطا کار اور گنہ گار ہو، اور بہترین گنہ گار وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرتا رہے۔ انسان کی سرشت، مزاج اور طبیعت میں یہ بات رکھی ہوئی ہے، اس لئے نافرمانی کا صدور اس سے ہوتا ہی ہے، لہٰذا اس کو چاہیے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی مانگنے کا اہتمام کرتا رہے۔ ایسا نہیں جیسا بعضوں کا حال ہوتا ہے کہ جب کوئی حالات آگئے تو کہتا ہے میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جناب سے کوئی گناہ ہی

نہیں ہوا ہے۔حالانکہ ہمارا وجود ہی گناہ ہے ﴿وُجُوْدُکَ ذَنْبٌ لایُقَاسُ بِہٖ ذَنْبٌ﴾ تمہارا وجود ہی گناہ ہے۔ہم تو سراپا گناہ ہیں۔

بہرحال! ہماری عبادتوں کا حال بھی ایسا ہی ہے کہ اگر ہم ان کا جائزہ لیں تو سمجھ میں آجائے کہ ہماری عبادتیں، عبادتیں نہیں ہیں بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ ہمیں سزا نہیں دیتے یہی اس کا بڑا احسان ہے۔ہم نماز پڑھتے ہیں تو کیا ہمارا پورا دل نماز میں لگا ہوا ہوتا ہے؟ جس وقت ہم تلاوت کررہے ہوتے ہیں، تو کیا ہماری پوری توجہ تلاوت کی طرف ہوتی ہے؟ اس تلاوت پر ہمیں ثواب ملے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہو؟

کوئی بچہ آپ سے بات کررہا ہو اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا ہو تو آپ کیا کریں گے؟ ایک طمانچہ ماریں گے اور کہیں گے کہ کیا کرتا ہے؟ مجھ سے بات کرتا ہے اور اِدھر اُدھر دیکھتا ہے، تیرا دھیان کدھر ہے؟ ہم اپنے ماتحتوں کی ذرا سی غفلت کو برداشت نہیں کرتے۔اور جب ہم خود اللہ کے حضور کھڑے ہوتے ہیں تو کیسا دل لے کر اور کیسی توجہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری عبادتیں بھی ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر ہمیں سزا نہیں دیتے یہی کافی ہے۔اس پر ثواب دینا اور انعام ملنا تو بڑی بات ہے۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مَیں گناہوں کو معاف کرتا ہوں، تم مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہو؛ مَیں تمہارے گناہوں کو معاف کروں گا۔لہٰذا آدمی کو ہمیشہ استغفار کا اور گناہوں کی معافی مانگنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔بلکہ نبی کریم ﷺ تو فرماتے ہیں کہ مَیں دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔حالانکہ حضور ﷺ تو گناہوں سے پاک اور معصوم تھے لیکن آپ کا یہ عمل امت کی تعلیم اور سکھلانے کے لئے ہے۔

﴿یہ ہمارے بس میں ہے ہی نہیں﴾

﴿یَاعِبَادِیْ اِنَّکُمْ لَنْ تَبْلُغُوْا ضُرِّیْ فَتَضُرُّوْنِیْ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! تم اس مرتبے تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم مجھے نقصان پہنچاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ ساری دنیا کے لوگ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچانا چاہیں تو ان میں طاقت ہی نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کو نقصان پہنچا سکیں۔

﴿وَلَنْ تَبْلُغُوْا نَفْعِیْ فَتَنْفَعُوْنِیْ﴾ اور تم لوگ مجھے فائدہ اور نفع پہنچانے کے درجے تک نہیں پہنچ سکتے کہ تم سب فائدہ پہنچاؤ۔ سب بندے چاہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچائیں، تو یہ ہمارے بس میں ہے ہی نہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ پہنچائیں۔ ہم میں وہ استطاعت ہی نہیں ہے۔ ساری چیزوں کا مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

﴿من نہ گردم پاک از تسبیح شاں﴾

یَاعِبَادِیْ لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْاعَلیٰ أَتْقٰی قَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍ مِّنْکُمْ مَازَادَذٰلِکَ فِیْ مُلْکِیْ شَیْئاً

اے میرے بندو! تمہارے اگلے اور پچھلے، تمہارے انسان اور جنات، تم میں سے سب سے زیادہ پرہیزگار آدمی جیسے دل والے ہو جائیں۔ یعنی سارے انسان، سارے جنات، اولین و آخرین سب؛ دنیا میں سب سے زیادہ اللہ کی اطاعت کرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کے فرمانبردار بندے جیسے بن جاویں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے میری سلطنت اور میرے ملک میں ذرہ برابر بھی زیادتی نہیں ہوگی۔ اللہ کی عظمت میں، اللہ کی بڑائی میں، اللہ کی کبریائی میں اس سے کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔

سب لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر رہے ہیں، نیک بن گئے ہیں تو اس کی وجہ سے

اللہ تعالیٰ کی شان بڑھ گئی، ایسا نہیں ہے۔اس کی وجہ سے اللہ کی شان میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ بندوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے محتاج نہیں ہیں۔بندوں کو خود ہی اپنی فرمانبرداری اور اطاعت کا فائدہ پہنچتا ہے، اور اپنے گناہوں کا نقصان بھی خود انہیں کو پہنچتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

من نہ گردم پاک از تسبیح شاں ❁ پاک ہم ایشاں شوند و در فشاں

بندے جو سبحان اللہ کہتے ہیں اس کی وجہ سے میں پاک نہیں ہوتا۔**سبحان اللہ** کا ترجمہ ہے کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے۔ہم یوں کہتے ہیں کہ اے اللہ تیری ذات پاک ہے، تو ہمارے یہ کہنے سے اللہ کی ذات میں پاکی نہیں آتی، بلکہ اس سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے ہم خود ہی پاک ہوتے ہیں۔ہماری زبانوں کی گندگی سبحان کہنے سے دور ہوتی ہے، سبحان اللہ کہنے سے اللہ کی ذات اور شان میں کوئی زیادتی نہیں ہوتی ہے۔یہ تو ہمارا فائدہ ہے۔

يَاعِبَادِیْ لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ کَانُوْاعَلیٰ أَفْجَرِقَلْبِ رَجُلٍ وَاحِدٍمِّنْکُمْ
مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِنْ مُّلْکِیْ شَيْئاً

اس حدیث پاک میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا کیسا ظہور ہو رہا ہے۔فرماتے ہیں کہ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے تمہارے انسان اور جنات تم میں سب سے زیادہ بدکار آدمی جیسے بن جاویں تو اس کی وجہ سے میری کبریائی اور سلطنت میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔ساری دنیا کے لوگ؛ دنیا کے سب سے بدترین آدمی اور سب سے زیادہ اللہ کے نافرمان بندے جیسے بن جاویں، تو اللہ تعالیٰ کی کبریائی، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی شان میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کے لامحدود خزانے﴾

﴿یَاعِبَادِیْ لَوْأَنَّ أَوَّلَکُمْ وَآخِرَکُمْ وَاِنْسَکُمْ وَجِنَّکُمْ قَامُوْافِیْ صَعِیْدٍوَاحِدٍ، فَسَأَلُوْنِیْ،فَأَعْطَیْتُ کُلَّ اِنْسَانٍ مَسْأَلَتَہٗ،مَانَقَصَ ذٰلِکَ مِمَّاعِنْدِیْ اِلَّاکَمَایَنْقُصُ الْمِخْیَطُ اِذَاأُدْخِلَ الْبَحْرُ﴾ اے میرے بندو! اگر تمہارے اگلے اور پچھلے، انسان اور جنات؛ ایک میدان میں بیک وقت کھڑے ہو جائیں، اور مجھ سے اپنی ساری حاجتیں، سوالات اور جو جو تمنائیں ہوں؛ وہ سب مانگیں، اور ہر آدمی نے جو جو مانگا، وہ سب کا سب مَیں سب کو دے دوں؛ تو میرے دینے کی وجہ سے میرے خزانوں میں اتنی بھی کمی نہیں آئے گی جتنی سمندر کے اندر ایک سوئی ڈبونے کی وجہ سے آتی ہے۔ یہ مثال بھی صرف سمجھانے کے لئے دی ہے، ورنہ سمندر کتنا ہی بڑا سہی، لیکن ختم ہونے والی چیز ہے۔ اور سوئی اس کے مقابلہ میں کتنی ہی چھوٹی سہی، لیکن وہ بھی فانی ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا نہیں ہے

تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ساری دنیا اپنی ساری حاجتیں بیک وقت مانگیں، اور وہ سب مَیں پوری کر دوں، تو میرے خزانوں میں اتنی کمی نہیں آئے گی جتنی سوئی ڈبونے سے سمندر میں آئی ہے۔ حالانکہ سوئی چکنی اور لوہے کی ہونے کی وجہ سے اس پر بہت معمولی پانی آتا ہے، اور سمندر کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت بھی نہیں ہے۔ لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے خزانے اتنے ہیں کہ یہ سب پورا کر دوں تب بھی اس میں اتنی بھی کمی آنے والی نہیں ہے۔

﴿بھلے عمل کا بھلا نتیجہ﴾

﴿یَاعِبَادِیْ اِنَّمَاھِیَ أَعْمَالُکُمْ أُحْصِیْھَالَکُمْ،ثُمَّ أُوَفِّیْکُمْ اِیَّاھَا﴾ اے میرے بندو!

یہ تمہارے اعمال ہیں جن کو میں تمہارے لئے رکارڈ اور محفوظ کرتا ہوں۔آدمی دنیا میں جو کچھ کرتا ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ ہوتا ہے۔قیامت کے روز جب نامۂ اعمال میں سب کچھ نظر آئے گا تو بندہ کہے گا ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا أَحْصَاهَا﴾ اس نوشتے کا کیا حال ہے کہ کوئی چیز اس نے چھوڑی ہی نہیں ہے، سب کچھ اندر موجود ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں، ہم تو کر کے بھول جاتے ہیں لیکن ہمارے نامۂ اعمال میں سب کچھ لکھا ہوا ہے، قیامت کے دن ہمارے سامنے پیش کیا جائے گا، اور کہا جائے گا کہ یہ تمہارے وہی اعمال ہیں جن کو مَیں تمہارے لئے ریکارڈ کرتا تھا آج مَیں تم کو اس کا بدلہ دوں گا، اچھے اعمال کا اچھا بدلہ اور برے اعمال کا برا بدلہ ملے گا ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ جس نے ذرّہ برابر نیکی کی، وہ اس کو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی دیکھ لے گا، اور جس نے ذرّہ برابر برائی کی، وہ بھی اس کو دنیا میں اور آخرت میں دیکھ لے گا۔

آدمی کوئی عمل کرے اور یوں سمجھے کہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں آنے والا ہے، یہ اس کی حماقت ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر نتیجہ مرتب ہو کر رہے گا، اسی لئے فرمایا ﴿فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ﴾ کوئی آدمی اگر اپنے نامۂ اعمال میں بھلے اعمال کو دیکھتا ہے، یعنی اگر کسی سے نیک اعمال وجود میں آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے کہ اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے نیک عمل کی توفیق دی، مَیں تو اس لائق نہیں تھا۔گویا نیک اعمال کا ہم سے سرزد ہونا بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی کی وجہ سے ہے، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، لہٰذا آدمی اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی تعریف کرے۔

﴿وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهٗ﴾ اور اگر کچھ دوسرا نظر آرہا ہے یعنی غلط

اعمال سرزد ہورہے ہیں، تو اپنے علاوہ کسی اور کو ملامت نہ کرے بلکہ اپنے آپ کو ہی کوسے کہ اس میں ہماری ہی کمی وکوتاہی ہے۔

﴿بار بار پڑھتے رہنے کے قابل روایت﴾

اس روایت کو ربیعہ بن یزید سے نقل کرنے والے سعید بن عبدالعزیز ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ربیعہ یوں کہتے تھے ﴿كَانَ أَبُوْاِدْرِيْسَ اِذَاحَدَّثَ بِهٰذَاالْحَدِيْثِ حَث عَلٰى رُكْبَتَيْهِ﴾ جب حضرت ابوادریس خولانی اس روایت کو بیان کرتے تھے تو اس روایت کی عظمت کی وجہ سے دوزانو بیٹھ جاتے تھے۔

یہ ایسی روایت ہے کہ آدمی اس کو کاغذ پر لکھ لے، اور بار بار اس کا مطالعہ کرتا رہے اور دیکھتا رہے، تو اس کی وجہ سے ایمان میں اضافہ ہوگا اور نیک اعمال کی توفیق ہوگی۔ بزرگوں کے یہاں اس کا معمول رہا ہے، ہمارے یہاں بھی اس قسم کی چیزوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت امام احمد بن حنبل سے یہ روایت سنی ہے کہ اہل شام کے پاس اس سے بہتر حدیث نہیں ہے۔ یعنی اس کا مضمون عجیب وغریب ہے۔

﴿ظلم سے بچو﴾

۲۰۳۔ وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: اِتَّقُوْا الظُّلْمَ، فَاِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَّوْمَ الْقِيَامَةِ، وَاتَّقُوْا الشُّحَّ، فَاِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، حَمَلَهُمْ عَلٰى اَنْ سَفَكُوْادِمَآءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ.

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ظلم سے، کسی کا حق مارنے سے اور کسی پر زیادتی کرنے سے بچو، اس لئے کہ ظلم قیامت کے دن اندھیریوں کی شکل اختیار

کرے گا۔جس نے بھی ظلم کیا ہے قیامت کے روز اس کو راستہ نہیں ملے گا، وہ اندھیریوں میں بھٹکتا پھرے گا۔ جو اہل ایمان ہیں ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی وجہ سے نور کا راستہ دکھلائیں گے، لیکن جن کے اعمال بد ہیں، وہ اعمال بد ان کے لئے اندھیریوں کی شکل اختیار کریں گے۔

﴿اگلوں کو ہلاک کرنے والی صفت﴾

﴿وَاتَّقُوا الشُّحَّ﴾ اور حرص وبخل سے بچو۔ ''شُح'' کہتے ہیں ایسا بخل جس میں حرص اور لالچ بھی ملا ہوا ہو۔جس کے مزاج میں لالچ بھی ہے اور اس لالچ کی وجہ سے بخل بھی ہے تو وہ حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیتا ہے، اور اسی بخل نے جو لالچ کے ساتھ ملا جلا ہوتا ہے؛ تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کیا ہے۔

﴿حَمَلَهُمْ عَلٰى اَنْ سَفَكُوْا دِمَآءَ هُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ﴾ اس کے نتیجے میں وہ آپس میں ایک دوسرے کا خون بہاتے تھے۔مال کی لالچ ہی ہوتی ہے جس کی وجہ سے سامنے والے کے ساتھ خیانت بھی کرتا ہے اور اس کا قتل بھی کرتا ہے۔اور اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو اسی بخل اور لالچ کے نتیجے میں حلال قرار دیتے تھے۔یعنی اس کے ساتھ حلال کا سا معاملہ کرتے تھے۔

﴿اللہ تعالیٰ کی شانِ عدل کا نمونہ﴾

۲۰۴. وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوْقَ اِلٰى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم لوگ حق والوں کا حق ادا کرو۔ اگر یہاں نہیں

کیا تو قیامت کے دن تم کو ان کے حقوق ادا کرنے پڑیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت کے روز بغیر سینگ والی بکری کے لئے سینگ والی بکری سے بدلہ لیا جائے گا۔یعنی اگر دنیا میں سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سینگ والی بکری کا سینگ نکلوا کر بغیر سینگ والی بکری کو دیں گے اور کہا جائے کہ تم اپنا بدلہ لے لو۔حالانکہ جانور شریعت کے احکام کے مکلّف نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنی شانِ عدل وانصاف ظاہر فرمائیں گے اور اس طرح فیصلہ ہوگا تو پھر اگر انسانوں نے کسی کی حق تلفی کی ہے، یا کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے؛ تو بھلا ان کو کیسے چھوڑا جائے گا؟ اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دنیا کے اندر حقوق ادا کرلو، ورنہ پھر وہاں تو یہ معاملہ پیش آنے والا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

۲۰۵. وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہما قَالَ: كُنَّانَتَحَدَّثُ عَنْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ وَالنَّبِىُّ ﷺ بَيْنَ أَظْهُرِنَاوَلاَنَدْرِىْ مَاحَجَّةُالْوَدَاعِ،حَتّٰى حَمِدَاللّٰهَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ،وَأَثْنٰى عَلَيْهِ،ثُمَّ ذَكَرَ الْمَسِيْحَ الدَّجَّالَ فَأَطْنَبَ فِىْ ذِكْرِهٖ وَقَالَ: مَابَعَثَ اللّٰهُ مِن نَّبِيٍّ اِلَّاأَنْذَرَهُ أُمَّتَهٗ:أَنْذَرَهٗ نُوْحٌ وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ بَعْدِهٖ،وَأَنَّهٗ أَن يَّخْرُجَ فِيْكُمْ فَمَاخَفِىَ عَلَيْكُمْ مِنْ شَأْنِهٖ فَلَيْسَ يَخْفٰى عَلَيْكُمْ، اِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ،وَأَنَّهٗ أَعْوَرُعَيْنِ الْيُمْنٰى،كَأَنَّ عَيْنَهٗ عِنَبَةٌطَافِيَةٌ.اَلاَاِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ دِمَآءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ كَحُرْمَةِيَوْمِكُمْ هٰذَا،فِىْ بَلَدِكُمْ هٰذَا،فِىْ شَهْرِكُمْ هٰذَا.اَلاَ هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ.قَالَ: أَللّٰهُمَّ اشْهَدْ،ثَلاثًا.وَيْلَكُمْ أَوْوَيْحَكُمْ أُنْظُرُوْا،لاتَرْجِعُوْابَعْدِىْ كُفَّاراً يَضْرِبُ بَعْضُكُمْ رِقَابَ بَعْضٍ. (رواه البخارى)

چونکہ باب قائم کیا تھا کہ کسی کی حق تلفی اور ظلم کا حرام ہونا،اس بات کو بتلانے کے لئے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت پیش کررہے ہیں۔

حجۃ الوداع کا مطلب

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ ہم لفظ حجۃ الوداع اپنی زبان سے بولتے تھے اوراس کا تذکرہ کرتے تھے، درانحالیکہ نبی کریم ﷺ ہمارے درمیان تشریف فرما

تھے یعنی آپ بقیدِ حیات تھے، لیکن ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ عنقریب نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے جانے والے ہیں۔

حضور اکرم ﷺ نے ۱۰ سنہ ھ میں جو حج کیا تھا وہ حج کی فرضیت کے بعد پہلا ہی حج ہے جو آپ نے کیا، اور جب آپ حج کے لئے تشریف لے جانے والے تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں میں باقاعدہ اعلان کرایا کہ میں حج کے لئے جانے والا ہوں تم لوگ بھی میرے ساتھ حج کے لئے تیاری کرو۔ چنانچہ بہت بڑی مخلوق نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کے لئے چلی، اسی حج کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے جو خطبے دیے تھے اس میں ایک موقعہ پر یہ بھی فرمایا ﴿لَعَلِّی لاأَرَاکُمْ بَعْدَعَامِیْ ھٰذَا﴾ شاید اس سال کے بعد میں تم کو دیکھ نہ پاؤں گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ لفظ حجۃ الوداع اسی سے نکلا ہے، گویا حضور اکرم ﷺ نے لوگوں کو الوداع کہا، لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنھما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں آپ کی موجودگی میں ہم لوگ اپنی زبان سے لفظ حجۃ الوداع تو بولتے رہتے تھے لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لے جانے والے ہیں۔

اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر یہ کہہ رہے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو اکابر صحابہ تھے جیسے کہ حضرات شیخین اور دوسرے حضرات صحابہ؛ وہ بھی اس کا مطلب نہیں جانتے تھے۔ یہ تو ممکن ہے کہ جو بڑے حضرات تھے وہ نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا مطلب سمجھتے ہوں، لیکن ان کے مقابلہ میں جو چھوٹے حضرات تھے وہ اس لفظ کو اپنے کلام میں اور اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے اور ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ ہمارے

درمیان زیادہ باقی رہنے والے نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی فقاہت

جیسا کہ حجۃ الوداع ہی کے موقعہ پر سورۂ نصر نازل ہوئی تو اس سورت کے متعلق روایتوں میں ایک قصہ آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس حاضری دینے کے معاملہ میں اکابر صحابہ کے ساتھ ساتھ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے پاس آنے کی اجازت دیتے تھے، حالانکہ عمر کے اعتبار سے ان اکابر صحابہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے درمیان بڑا فرق تھا، وہ بڑے بڑے حضرات جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات؛ ان کی اولاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہم عمر تھیں۔ اسی لئے ایک موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بات کہی کہ جس وقت ہم لوگ آپ کی خدمت میں موجود ہوتے ہیں اس وقت آپ ان کو بھی آنے کی اجازت دیتے ہیں (فرق مراتب کا تقاضہ یہ تھا کہ ہر ایک کے لئے اس کے مرتبہ کے مطابق وقت الگ کیا جائے بڑوں کی حاضری کا جو وقت ہے اس میں چھوٹوں کو وہاں حاضری کی اجازت نہ دی جائے، اس کے پیش نظر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ عرض کیا کہ جب ہم موجود ہوتے ہیں اس وقت آپ ان کو حاضری کی اجازت دیتے ہیں) حالانکہ ہمارے بیٹے ان کی عمر کے ہیں اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ان کا تعلق کس گھرانے سے ہے۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی ہیں، اس وقت تو یہ جواب دے دیا، لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک دوسرے موقعہ پر جب کہ سب حضرات موجود تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجلس میں یہ سوال قائم کیا کہ ''سورۂ نصر'' کے متعلق آپ

حضرات کیا کہتے ہیں؟ وہاں جو اکابر صحابہ موجود تھے ان میں سے کسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت میں ہمیں تعلیم اور تلقین دی ہے کہ جب فتوحات کا سلسلہ ہو تو اس وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس میں لگ جانا چاہیے۔ کسی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اس طرح مختلف جوابات دیے گئے، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا کہ اے ابن عباس! آپ کیا کہتے ہیں؟ مَیں نے عرض کیا کہ اس کے متعلق میرے دل میں ایک اور چیز ہے۔ کہا: بتلاؤ، بڑوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو کم محسوس کرتے ہوئے شرمانے کی اور خاموش رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو مَیں نے عرض کیا کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کی خبر دی ہے کہ جب مکہ فتح ہو جائے اور لوگ گروہ در گروہ اسلام میں داخل ہونا شروع ہوں، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا دنیا سے رخصتی کا وقت قریب آ چکا ہے، اب آپ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور استغفار میں اپنا وقت لگائیے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ جواب سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں بھی یہی سمجھتا ہوں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس روز حضرت امیر المؤمنین نے یہ مجلس اسی لئے قائم کی تھی کہ گویا ان لوگوں کو بتایا جائے کہ میں ان کو قریب کیوں رکھتا ہوں۔

(المعجم الکبیر، ۱۰۶۷۰)

خیر! حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ دیکھو "سورۂ نصر" کے متعلق یہ چیز کہ اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر دی گئی ہے؛ وہ سب حضرات نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح لفظ حجۃ الوداع کو اپنے کلام اور گفتگو میں تمام صحابہ استعمال تو کرتے تھے لیکن ان کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کا وقت قریب آ چکا ہے، اور آپ ہمارے درمیان زیادہ رہنے والے نہیں ہیں۔

﴿خطبۂ حجۃ الوداع﴾

خیر! نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں (جو خطبہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر دیا) اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور پھر آپ نے اسی خطبہ میں دجال کا تذکرہ کیا اور تفصیل سے اس کی علامتیں اور اس کے احوال اور کوائف بتلائے۔اور پھر اپنے اسی خطبہ میں آپ نے یہ بات بھی ارشاد فرمائی ﴿مَابَعَثَ اللّٰهُ مِن نَّبِيٍّ اِلَّاأَنْذَرَهُ أُمَّتَهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے جتنے بھی نبی بھیجے، ہر نبی نے اپنی امت کو دجال کے فتنے سے ڈرایا ہے

﴿أَنْذَرَهُ نُوحٌ وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ بَعْدِهٖ﴾ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ڈرایا اور آپ کے بعد جتنے بھی نبی آئے سب نے اپنی اپنی امتوں اور قوموں کو دجال سے ڈرایا کہ وہ بڑا فتنہ ہے اور اس سے ایمان پر زد پڑ سکتی ہے۔اور ظاہر ہے کہ آپ ﷺ آخری نبی ہے اور اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، لہٰذا دجال کے ظہور کے متعلق یہ بات تو طے ہو چکی کہ آپ کی امت ہی میں وہ ظاہر ہوگا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ اگر دجال کے حالات اور اس کے متعلق تفصیلات تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوں اور تم اس کے متعلق ساری معلومات جان نہ پائے ہو، تو مَیں تمہیں ایک کھلی ہوئی علامت بتلا دیتا ہوں جس کے بعد دجال کی دوسری تفصیلات جاننے کی ضرورت نہیں ہے، اور اسی ایک علامت ذریعہ سے تم کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ خدا نہیں ہے، اس لئے کہ وہ خدائی کا دعویٰ کرے گا، وہ کہے گا کہ مَیں خدا ہوں ﴿اِنَّ رَبَّكُمْ لَيْسَ بِأَعْوَرَ وَأَنَّهُ أَعْوَرُعَيْنِ الْيُمْنٰى﴾ حالانکہ اللہ تعالیٰ میں کوئی عیب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ بھینگا نہیں ہے یا اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں کوئی عیب نہیں ہے، اور دجال کی دائیں آنکھ عیب دار ہے۔اس کی آنکھ میں کیا ہے؟ ﴿كَأَنَّ عَيْنَهُ عِنَبَةٌطَافِيَةٌ﴾ اس کی آنکھ ایسی باہر نکلی ہوئی ہوگی جیسے انگور کے خوشے

میں سے باہر نکلا ہوا دانہ ہوتا ہے۔ آپ حضرات نے انگور کا خوشہ دیکھا ہوگا کہ اس کا پورا خوشہ بالکل ترتیب سے ہوتا ہے لیکن اس میں سے ایک آدھ دانہ باہر نکلا ہوا ہوتا ہے، اسی طرح اس کی داہنی آنکھ باہر نکلی ہوئی ہوگی۔ گویا یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ یہ دجال ہے، بلکہ اس کی پیشانی پر بھی ﴿ک،ف،ر﴾ لکھا ہوا ہوگا جس کے متعلق حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی جو پڑھا لکھا ہو وہ بھی، اور جو اَن پڑھ ہو وہ بھی؛ اس کو پڑھ لے گا۔

﴿مسلمان کی جان، مال اور عزت اُسی طرح محفوظ ہے......﴾

﴿اَلاِانَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیۡکُمۡ دِمَآءَ کُمۡ وَأَمۡوَالَکُمۡ کَحُرۡمَۃِ یَوۡمِکُمۡ ھٰذَا، فِیۡ بَلَدِکُمۡ ھٰذَا، فِیۡ شَھۡرِکُمۡ ھٰذَا﴾ اسی خطبے میں نبی کریم ﷺ نے حضرات صحابہ کو ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی جیسا کہ دوسری روایتوں میں اس کی تفصیل ہے، حضور اکرم ﷺ نے پہلے سوال یہ کیا کہ یہ کون سا شہر ہے؟ صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ نبی کریم ﷺ شاید مکہ مکرمہ کے لئے کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے؛ خاموشی اختیار کی، بلکہ یوں کہا ﴿أَللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ أَعۡلَم﴾ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿أَلَیۡسَتِ الۡبُلۡدَۃُ؟﴾ جیسے "المدینۃ" مدینہ منورہ کے ناموں میں سے ہے، اسی طرح "البلدۃ" مکہ مکرمہ کا نام ہے ﴿وَھٰذَا الۡبَلَدِ الۡأَمِیۡن﴾ حضور نے پوچھا کہ کیا یہ مکہ مکرمہ نہیں ہے؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا: یہ کون سا مہینہ ہے؟ صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ شاید اور کوئی نام تجویز فرمائیں گے جواب میں یہ عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں، تو اس پر حضور نے سوال کیا ﴿أَلَیۡسَ ذُوالۡحِجَّۃِ؟﴾ کیا یہ ذوالحجہ کا مہینہ نہیں ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: کیوں نہیں۔ پھر حضور ﷺ نے پوچھا آج کون سا دن ہے؟ صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ شاید کوئی اور نام تجویز فرمائیں گے جواب میں عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں۔ تو حضور

نے فرمایا ﴿أَلَيْسَ يَوْمُ النَّحْرِ؟﴾ کیا یہ ذی الحجہ کی دسویں تاریخ نہیں ہے؟ صحابہ نے کہا: کیوں نہیں۔

یہ سوالات کیوں کیے تھے؟ دراصل زمانہ جاہلیت میں بھی جب کہ ابھی اسلام نہیں آیا تھا اور ایمان و اسلام کی وجہ سے لوگوں کی جان و مال کے محفوظ ہونے کا لوگوں کو حکم نہیں ہوا تھا، اور کسی کی جان، مال، عزت اور آبرو محفوظ نہیں تھیں، اس زمانہ میں بھی ان علاقوں میں یعنی مکہ میں اور اس مہینے میں اور اس دن میں لوگوں کی جان مال، اور عزت و آبرو کا لحاظ کیا جاتا تھا مطلب ہے کہ کوئی آدمی اگر حرم میں آگیا (ویسے تو یہ لوگ کسی کو بخشتے نہیں تھے اور کسی کی جان اور مال کو نہیں چھوڑتے تھے، مال لوٹ لینا، غلام بنالیا اور قتل کردینا اور عزت و آبرو پر ہاتھ ڈال دینا ان کی عام عادت تھی) تو حرم کی وجہ سے اس کا احترام کیا جاتا تھا، اس کی جان و مال پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا تھا، اسی طریقہ سے حرمت والے چاروں مہینوں میں بھی کسی کو چھیڑا نہیں جاتا تھا، اسی طرح یوم النحر کو بھی بڑا باعظمت سمجھا جاتا تھا۔ تو یہ خاص تین چیزیں ہیں ایک تو مقام یعنی مکہ مکرمہ، دوسرا مہینہ یعنی ذی الحجہ اور تیسرا دن، ان اوقات ان ایام اور ان جگہوں میں جیسے جان و مال کی حرمت ان لوگوں کے دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی اور یہ سمجھتے تھے اس جگہ میں اور اس مہینے میں اور اس دن میں کسی کی جان اور مال پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا ہے، یہ چیز ان کے دل و دماغ میں جمی ہوئی تھی، تو گویا حضور اکرم ﷺ نے ان تینوں کو تازہ کرکے پھر ان سے کہا کہ جیسے اگر کوئی آدمی دسویں ذی الحجہ کو مکہ مکرمہ میں جمع ہوجائے تو کیا اس کی جان اور مال پر ہاتھ ڈالا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ نہیں ڈالا جائے گا، تو ایک مسلمان کے اسلام اور ایمان لانے کی وجہ سے اس کی جان، مال اور عزت و آبرو اسی طرح محفوظ ہوگئی جیسے کہ اس شہر میں

اس دن میں اور اس مہینے میں۔

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس عنوان کے ماتحت اس روایت کو لائے چونکہ بتلا رہے ہیں کہ کسی کی حق تلفی یا کسی کے ساتھ زیادتی اور ظلم کرنا حرام ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے جان، مال اور عزت وآبرو کے لئے حرمت کا حکم لگایا کہ ہم کسی کے جان و مال پر شرعی وجہ کے بغیر ہاتھ نہیں ڈال سکتے ہیں۔

﴿أَلاَ هَلْ بَلَّغتُ؟﴾ یہ ارشاد فرما کر حضور ﷺ نے ان حضرات صحابہ سے جو اس وقت موجود تھے پوچھا کہ سنو! کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا حکم تم تک پہنچا دیا؟ ﴿قَالُوْا نَعَمْ﴾ اس پر صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں۔اس پر حضور ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی کر فرمایا ﴿أَللّٰهُمَّ اشْهَدْ﴾ اے اللہ! تو گواہ رہیو کہ یہ لوگ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ میں نے تیرے احکام ان تک پہنچا دیے۔

﴿میرے بعد تم بھی ایسے نہ بن جانا﴾

آگے حضور ﷺ نے فرمایا ﴿وَيْلَكُمْ أَوْوَيْحَكُمْ أُنْظُرُوْا، لاتَرْجِعُوْا بَعْدِيْ كُفَّاراً﴾ تم پر افسوس ہے، دیکھو! میرے دنیا سے جانے کے بعد کافروں جیسے نہ بن جائیو کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ کافروں کے یہاں ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت وآبرو کا کوئی احترام نہیں ہے، وہ ہر ایک پر ہاتھ ڈالتے رہتے ہیں، تم بھی ایسے نہ بن جانا، بلکہ تمہارے یہاں تو ہر مومن کی جان و مال اور اس کی عزت وآبرو قابل احترام ہے، اس پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا ہے۔اب جو آدمی کسی کی حق تلفی کرتا ہے، اور ظلم اور زیادتی کرتا ہے وہ گویا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔

جس نے ایک بالشت کے برابر کسی کی زمین ناحق دبالی

۲۰۶. وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ ظَلَمَ قِيْدَ شِبْرٍ مِّنَ الْأَرْضِ طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرْضِيْنَ. متفق علیہ..

حضرت عائشہ فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جس نے ایک بالشت کے برابر کسی کی زمین ناحق لے لی، اپنے پڑوسی کی زمین میں سے ایک بالشت کے برابر چھین لی، ناپ میں گڑبڑ کرادی، کورپوریشن والے کو پیسے کھلا کر اپنی طرف کروادی، یادادا گری کرکے اپنا حق نہیں تھا پھر بھی راستہ میں سے دبالی جیسا کہ عام طور پر لوگ کرتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سزا کے طور پر سات زمینوں کا طوق اس کے گلے میں پہنائیں گے۔ یہ بہت خطرناک چیز ہے۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ معمولی چیز کی خاطر زمین پر ناحق قبضہ کرلیتے ہیں اور دنیا سے ان کے رخصت ہونے کے بعد بھی ان کا ناحق قبضہ باقی رہتا ہے، ان کے ورثاء اس کو باقی رکھتے ہیں اور یہ ہمیشہ کے لئے اپنی عاقبت برباد کرتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے

۲۰۷. وعن أبی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اِنَّ اللهَ لَيُمْلِي لِلظَّالِمِ فَإِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْهُ ثُمَّ قَرَأَ "وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهٗ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ"

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والے کو مہلت دیتے ہیں۔ دنیا کے اندر بہت سی مرتبہ لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی ظلم وزیادتی کررہا ہے، تب بھی اس کا کچھ بگڑ نہیں رہا ہے۔ لیکن ایسا دیکھنے کی وجہ سے دھوکے

میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھیل دی جارہی ہے، اور اس ڈھیل سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کے اس ظلم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت ہونے والی نہیں ہے۔ سمجھدار لوگوں سے نادانستگی میں ہو جائے تو وہ فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں اور اپنی حرکتوں سے باز آجاتے ہیں اور لوگوں کا حق ادا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

کئی لوگ دوسروں کے حقوق کھا کر اور پیسے یا زمین دبا کر یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ ہونے والا نہیں ہے، ان کا ایسا سمجھنا غلط ہے، اس لئے کہ دنیا کا دستور یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈھیل دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اعمال کا بدلہ دینے کے لئے آخرت کو مقرر کیا ہے، نیک اعمال کا پورا بدلہ وہیں ملے گا اور برے اعمال کا بدلہ بھی وہیں ملے گا۔ اصل سزا وہیں ہوگی۔ کبھی کبھی دنیا کے اندر اس کے نمونے بتا دیے جاتے ہیں۔

﴿فَاِذَا أَخَذَهُ لَمْ يُفْلِتْه﴾ جب اللہ تعالیٰ پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں ہے۔ پھر حضور ﷺ نے قرآن پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ اِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ اِنَّ أَخْذَهُ أَلِيْمٌ شَدِيْدٌ﴾ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی گرفت آتی ہے جب اللہ تعالیٰ کسی بستی والوں کو پکڑتا ہے ایسی حالت میں کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی نافرمانی کی، ظلم و زیادتی کی اور حدود سے تجاوز کیا اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور گرفت بڑی دردناک اور سخت ہوا کرتی ہے، پھر کوئی چھڑا نہیں سکتا، ساری دنیا مل کر بھی اس کا مداوی نہیں کر سکتی ہے۔

﴿نبی کریم ﷺ کی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نصیحتیں﴾

۲۰۸۔ وعن معاذ رضی اللہ عنہ قال بَعَثَنِیْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فقال: اِنَّکَ تَأْتِیْ قَوْمًا مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَادْعُهُمْ اِلٰى شَهَادَةِ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَأَنِّیْ رَسُوْلُ اللهِ، فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ اِنَّ اللهَ

قَدِافْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ،فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوْالِذٰلِكَ، فَأَعْلِمُهُمْ اِنَّ اللهَ قَدِافْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً،تُؤْخَذُمِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّعَلٰى فُقَرَائِهِمْ،فَاِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ،فَاِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ.وَاتَّقِ دَعْوَةَالْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَاوَبَيْنَ اللهِ حِجَابٌ.

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ایک علاقہ کا حاکم اور امیر بنا کر بھیجا تھا، جس وقت ان کو روانہ کیا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ ہدایتیں اور نصیحتیں فرمائی تھیں۔ چنانچہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ تم اہل کتاب کی قوم کی طرف جارہے ہو، یعنی تم جس جگہ جارہے ہو وہ لوگ اہل کتاب یعنی نصاریٰ اور یہودی ہیں مشرکین میں سے نہیں ہیں (اہل کتاب وہ لوگ ہیں جو سابقہ آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں) اس لئے جب تم ان کے پاس پہنچو تو پہلے دعوت دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر تمہاری اس دعوت کو وہ لوگ قبول کرلیں تو پھر ان کو بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے فرائض سے بتدریج ان کو واقف کرنا۔ چنانچہ پہلے ان کو نماز کی طرف متوجہ کرنا۔

پھر جب تمہاری اطاعت کرلیں اور ان چیزوں کو بجالائیں تو پھر ان کو بتائیو کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو مالداروں سے وصول کی جائے گی اور غریبوں کو دی جائے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ میں افضل یہی ہے کہ اسی علاقے کے فقیروں کو دی جائے، الّا یہ کہ وہاں ضرورت نہ ہو یا اس کے مقابلہ میں دوسری جگہ کے فقراء زیادہ محتاج ہوں تو پھر دوسری جگہ بھی اس کو منتقل کیا جاسکتا ہے۔

پھر جب یہ زکوٰۃ دینے کے لئے تیار ہوجائیں- مال کی زکوۃ میں مویشی اور جانور بھی ہوا کرتے ہیں جو زکوۃ کے طور پر دئے جاتے ہیں- تو اس وقت ان کے عمدہ مال کو زکوۃ

کے طور پر لینے سے بچنا۔ مطلب یہ ہے کہ زکوۃ کے طور پر جو جانور وصول کیا جاتا ہے اس کے متعلق احادیث میں تصریح ہے کہ نہ بہت بڑھیا اور عمدہ ہو اور نہ بہت گھٹیا اور کمتر ہو بلکہ درمیانی قسم کا ہو۔ بہت بڑھیا اور عمدہ لیں گے تو صاحبِ مال کے معاملہ میں حق تلفی ہوگی، اور گھٹیا اور کمتر لیں گے تو فقراء کے معاملہ میں حق تلفی ہوگی اس لئے درمیانی قسم کا لیا جائے گا۔ اعلیٰ درجے کا لینا بھی ایک طرح کی زیادتی ہے۔

مظلوم کی بددعا سے بچنا

اور مظلوم کی بددعا سے بچنا اس لئے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں ہوا کرتی ہے۔ گویا مظلوم کی بددعا سیدھی اللہ تعالیٰ کے یہاں پہنچتی ہے، بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن ❁ اجابت از درحق بحر استقبال می آید

مظلوموں کی بددعا سے بچنا کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو قبولیت اس کا استقبال اور سواگت کرنے کے لئے سامنے سے آتی ہے۔ یہاں اس روایت کو اسی لئے پیش کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً.أمابعد:—

۲۰۹. وعن أبی حمیدعبدالرحمن بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ قال: اِسْتَعْمَلَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم رَجُلا مِنَ الْأَزْدِیُقَالُ لَہٗ اِبْنُ اللُّتْبِیَّۃِعَلیٰ الصَّدَقَۃِ،فَلَمَّاقَدِمَ قَالَ:ھٰذَالَکُمْ وَھٰذَاأُھْدِیَ اِلَیَّ،فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلیٰ الْمِنبَرِفَحَمِدَاللّٰہَ وَأَثْنیٰ عَلَیْہِ ثُمَّ قَالَ:أَمَّابَعْدُ!فَاِنِّیْ اَسْتَعْمِلُ الرَّجُلَ مِنْکُمْ عَلیٰ الْعَمَلِ مِمَّاوَلَّانِیَ اللّٰہُ،فَیَأْتِی فَیَقُوْلُ:ھٰذَالَکُمْ وَھٰذَاھَدِیَّۃٌ أُھْدِیَتْ اِلَیَّ،أَفَلاجَلَسَ فِیْ بَیْتِ أَبِیْہِ أَوْأُمِّہِ حَتّٰی تَأْتِیَہٗ ھَدِیَّتُہٗ اِنْ کَانَ صَادِقاً.وَاللّٰہِ لایَأْخُذُأَحَدٌمِّنْکُمْ شَیْئاًبِغَیْرِحَقِّہٖ،اِلَّالَقِیَ اللّٰہ تَعَالیٰ یَحْمِلُہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ،فَلاأَعْرِفَنَّ أَحَداًمِّنْکُمْ لَقِیَ اللّٰہ یَحْمِلُ بَعِیْراًلَہٗ رُغَآءٌ،أَوْبَقَرَۃًلَھَاخُوَارٌ،أَوْشَاۃً تَیْعَرُ،ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْہِ حَتّٰی رُؤِیَ بَیَاضُ اِبِطَیْہِ،وَقَالَ: ((أَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ)) ثلاثًا.

لوگوں کے حقوق کوضائع کرنا،حق تلفی کرنااورکسی پر زیادتی کرنے کی حرمت کوبتلایا جارہاہے،اوراگرکسی کاحق ماراہےتواس کواداکرنے کااہتمام کرناچاہیے۔

حضرت ابوحمیدعبدالرحمٰن بن سعدساعدی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد(یہ عرب کاایک قبیلہ ہے)کے ایک آدمی کوصدقات کی وصول یابی کے لئے مقررکیاجس کانام ابن اللتبیہ تھا۔

بیت المال کا اسلامی نظام

اُس زمانہ میں جو لوگ صاحبِ اموال اور صاحبِ نصاب ہوا کرتے تھے، خاص کر جن کے پاس مویشی اور جانور ہوتے تھے اور وہ نصاب کو پہنچے ہوئے ہوتے تھے جن کی زکوۃ ان پر واجب ہوتی تھی، ان کی زکوۃ کی وصولیابی کے لئے اور اسی طرح مالِ تجارت کی زکوۃ کی وصولیابی کے لئے نبی کریم ﷺ کی طرف سے آدمی مقرر کئے جاتے تھے، اور ہر ہر علاقہ میں ان لوگوں کو بھیجا جاتا تھا۔ وہ حضرات وہاں سے مالوں کی زکوۃ وصول کر کے لایا کرتے تھے۔ یہ ایک نظام تھا کہ زکوۃ حکومت کے بیت المال میں جمع ہو اور پھر وہیں سے مستحقین حضرات کے درمیان تقسیم کی جائے۔ جب اسلامی حکومت ختم ہوگئی اور بیت المال کا نظام مختل ہو گیا تو یہ ساری چیزیں بھی ختم ہو گئیں۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ زکوۃ کی وصولیابی کے لئے اپنی طرف سے مختلف حضرات کو مقرر فرماتے تھے۔ تو ایک صحابی تھے جن کا نام عبداللہ تھا، ابن اللُّتبیہ کے نام سے مشہور تھے۔ بنولتب یہ قبیلۂ ازد کے خاندان کی ایک شاخ ہے۔ ان کو نبی کریم ﷺ نے کسی علاقہ کی زکوۃ کی وصولیابی کے لئے مقرر فرمایا۔ چنانچہ وہ گئے اور لوگوں سے ان کے مالوں کی زکوۃ وصول کی، اسی دوران کچھ لوگوں نے ان کو ہدیہ کے نام سے بھی کچھ دیا، حالانکہ جس علاقہ میں بھیجے گئے تھے اس علاقہ سے ان کا خاندانی، نسبی یا دوستانہ تعلق نہیں تھا کہ پہلے سے کوئی راہ و رسم، دوستی اور تعلق ہو، جس کی وجہ سے ان سے ہدیہ کے لین دین کا سلسلہ جاری ہوا اور اسی بنیاد پر دیا گیا ہو، ایسا نہیں تھا، بلکہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ خاص اسی کام کے واسطے ان کو وہاں بھیجا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہوا کہ جن لوگوں نے ان کو ہدیے دے تھے، ان لوگوں نے اس لئے نہیں دے تھے

کہ ان لوگوں سے کوئی تعلق اور دوستی ہے، بلکہ یہ اس کام کے لئے مقرر کئے گئے تھے، تو جس کام کی ذمہ داری ان کو سونپی گئی تھی اس معاملہ میں ذرا تساہل اور ڈھیل سے کام لیں اور ان کی رعایت کریں، اس لئے یہ ہدیے کا معاملہ ہوا تھا۔

﴿یہ تمہارا؛ اور یہ میرا﴾

جب وہ اس علاقہ سے اپنی ڈیوٹی پوری کر کے واپس لوٹے تو کچھ مال تو وہ تھا جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ تو آپ کا ہے یعنی مجھے جس کام کے لئے بھیجا گیا تھا اس سلسلے میں وصول کیا گیا مال آپ کے سامنے دیا جا رہا ہے، اور کچھ مال وہ بھی تھا جو انہوں نے الگ سے رکھا تھا جس کے متعلق یہ بتلایا کہ یہ مال لوگوں کی طرف سے مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔

جب حضور ﷺ کے علم میں یہ بات آئی تو نبی کریم ﷺ منبر پر تشریف لے گئے اور ایک خطبہ دیا جس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور اس کے بعد فرمایا کہ مَیں تم میں سے کسی آدمی کو اپنی طرف سے تجویز کرتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ نے جو کام میرے حوالے کئے ہیں ان کو وہ انجام دے۔ اس لئے کہ حضور اکرم ﷺ جہاں اللہ کے نبی تھے وہیں آپ حاکم بھی تھے، اور جیسے ایک حاکم کا دائرۂ اختیار ہوتا ہے کہ اس کو بہت سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور اربابِ حکومت کی طرف سے کاموں کو انجام دینے کے لئے باقاعدہ اشخاص اور لوگوں کو مقرر کیا جاتا ہے، اسی طرح جو کام اور اختیار اللہ تعالیٰ نے مجھے دے ہیں ان کو انجام دینے کیلئے مَیں تمہیں میں سے بعض لوگوں کو مقرر کرتا ہوں کہ فلاں جگہ صدقات کی وصولیابی کیلئے جاؤ، فلاں جگہ جا کر یہ کام کرو اور فلاں جگہ وہ کام کرو۔ اب جس کو مقرر کیا ہے جب وہ اپنی ڈیوٹی

پوری کر کے واپس آتا ہے۔ مثلاً صدقات کی وصولیابی کے لیے مقرر کیا ہے تو وہاں سے جب واپس لوٹتا ہے۔ تو یوں کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہے یعنی تم نے جس کام کے لئے بھیجا تھا، اسی مد میں وصول ہوا ہے جو آپ کو دے رہا ہوں، اور کچھ الگ کر کے یوں کہتا ہے کہ یہ مجھے ہدیہ میں ملا ہے۔

ہدیہ کے نام سے رشوت

پھر حضور فرماتے ہیں کہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھا رہتا تو پتہ چلتا کہ کون ہدیہ دیتا ہے۔ یہ ہدیہ واقعۃً محبت، دوستی اور تعلق کی وجہ سے ملا ہے، تو وہ تو گھر رہتے ہوئے بھی ملتا، ذرا تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ہدیہ نہیں ہے بلکہ ہدیہ کے نام سے رشوت دی گئی ہے کہ جو کام سونپا گیا ہے اور ان سے وصولیابی کا جو معاملہ کیا جانے والے ہے اس میں ذرا تساہل اور ڈھیل دی جائے۔

جیسے کوئی انکم ٹیکس آفیسر یا سیل ٹیکس آفیسر کو کوئی دکان والا ہدیہ دے، ساڑی دے، یا کپڑا دے؛ تو وہ ہدیہ کے نام سے ہی دیتا ہے لیکن ظاہر ہے اور سب جانتے ہیں کہ وہ تو اس لئے دے رہا ہے کہ اس سے جو وصولیابی کرنی ہے اس معاملہ میں ذرا رعایت برتی جائے۔

یہاں پر بھی حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنے باپ یا ماں کے گھر میں کیوں نہ بیٹھا رہا کہ اس کا ہدیہ وہاں پہنچ جاتا اگر اپنی بات میں سچا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیز جو ہدیہ کے نام سے ملی ہے، اگر واقعۃً ہدیہ ہی ہے تو پھر یہ تو میرے اس کام کے لئے مقرر کرنے پر موقوف نہیں تھا اپنے گھر رہتے ہوئے بھی یہ چیز ملتی ہے یا نہیں ہم دیکھتے۔

﴿ناحق چیز اپنے ہی کندھے پر﴾

پھر آئندہ کے لئے ایسے معاملات میں تنبیہ فرماتے ہوئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی آدمی کوئی چیز ناحق نہ لے، اور اگر ناحق لے گا تو پھر کل کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں ایسی حالت میں آئے گا کہ جو چیز ناحق لی ہے وہ اس کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوگا۔ میدانِ حشر میں وہ چیز اس پر لادی گئی ہوگی اور ساری دنیا دیکھے گی کہ ساڑی اور کپڑے کے تھان لدے ہوئے ہیں، یہ وہی ہوں گے جو ناحق لئے گئے تھے، گویا پورے میدانِ حشر میں اس کے لئے رسوائی کا سامان ہوگا۔

اب ان صحابی کو جن صدقات کی وصولیابی کے لئے بھیجا گیا تھا وہ تو مویشی یعنی اونٹ گائے، بکری وغیرہ تھے، اس لئے ظاہر ہے کہ وہی چیزیں ہدیہ میں بھی دی گئی تھیں، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو مَیں ایسی حالت میں نہ پاؤں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مل رہا ہے اور وہ اپنے اوپر اونٹ کو اٹھائے ہوئے ہو جو بول رہا ہو ﴿رُغَآءٌ﴾ اونٹ کی آواز کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ وہ اونٹ جو اس پر لادا جائے گا وہ چپ ہوگا۔ اگر چپ رہے تو اس سے زیادہ رسوائی نہیں ہوتی، لیکن وہ اونٹ تو بولے گا اور چلائے گا، لوگ سوچیں گے کہ کہاں سے آواز آرہی ہے؟ جب دیکھیں گے تو کہیں گے کہ ارے دیکھو! اس کے کندھے پر تو اونٹ لدا ہوا ہے، اور وہ ایسی آواز کر رہا ہے۔ لوگ پوچھیں گے کہ کیوں لدا ہوا ہے؟ تو کہا جائے گا کہ اس نے خیانت کی تھی۔

یا وہ اپنے اوپر گائے کو اٹھائے ہوئے ہوگا جو آواز نکال رہی ہوگی۔ یا بکری کو اٹھائے ہوئے ہوگا جو بول رہی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں میدانِ حشر میں اس کے لئے

رسوائی کا سامان ہوں گی۔مطلب یہ ہوا کہ جو چیز کسی نے ناحق اور ظلم کے طور پر لی ہے وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ وہ چیز اس کے اوپر لدی ہوئی ہوگی اور سارے میدانِ حشر کے لوگ اس کو دیکھیں گے۔قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿وَمَن يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَاغَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ جس آدمی نے کسی چیز میں خیانت کی، وہ اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے روز لے کر آئے گا۔ ﴿غَلُوْلٌ﴾ مالِ غنیمت میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں۔اس زمانہ میں جنگ اور لڑائیوں میں دشمن کی طرف سے جو مال حاصل ہوتا تھا، اور تقسیم ہونے سے پہلے کبھی کوئی ایسا کرتا تھا کہ اس میں سے کوئی چیز لے لی، تو قرآنِ پاک میں کہا گیا کہ جس نے اس طرح خیانت کی ہے وہ اپنی خیانت کی ہوئی اور چرائی ہوئی چیز کو لے کر قیامت کے روز آئے گا، اور سارے لوگ اس کو دیکھیں گے، اور یہی چیز اس کے لئے رسوائی کا سامان ہوگی۔

پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے ہاتھ اتنے اونچے اٹھائے کہ آپ کے بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی اور آپ نے تین مرتبہ فرمایا ﴿اَللّٰھُمَّ ھَلْ بَلَّغْتُ﴾ اے اللہ! مَیں نے تیرا حکم پہنچا دیا گویا کل کو کسی کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ ہمیں تو یہ مسئلہ معلوم ہی نہیں تھا، ہم نے تو بے خبری میں واقعۃً ہدیہ سمجھ کر ہی قبول کیا تھا۔لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ حضور ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہدیہ کے نام سے جو چیز دی جارہی ہے وہ درحقیقت ہدیہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک طرح کی رشوت ہی ہے۔

﴿ظالموں کے لئے اپنے کئے کی تلافی کا موقعہ آج ہی ہے﴾

۲۱۰. عن أبی هريرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَتْ عِنْدَهُ مَظْلِمَةٌ لِأَخِيهِ، مِنْ عِرْضِهِ أَوْمِنْ شَيْئٍ، فَلْيَتَحَلَّلْهُ مِنْهُ الْيَوْمَ قَبْلَ أَنْ لا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَلا دِرْهَمٌ؛ إِنْ كَانَ لَهُ عَمَلٌ صَالِحٌ أُخِذَمِنْهُ بِقَدْرِ مَظْلِمَتِهِ، وَإِن لَّمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَاتٌ أُخِذَمِنْ سَيِّئَاتِ صَاحِبِهِ فَحُمِلَ عَلَيْهِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس اس کے بھائی کا کوئی حق ہے جو اس نے ناجائز طور پر دبا رکھا ہے، یا اپنے بھائی کے ساتھ اس کی عزت و آبرو پر کوئی زیادتی اور ظلم کر رکھا ہے، تو آج ہی اس سے معاف کروالیں، اس سے پہلے کہ نہ دینار ہوگا اور نہ درہم۔ اس دن اگر نیکیاں ہوں گی تو اس نے دوسرے پر جتنا ظلم کیا ہے اسی کے برابر اس کی نیکیاں لے کر اس کو دی جائیں گی، اور اگر نیکیاں نہیں ہیں تو جس کا حق ہے اس کے گناہ لے کر اس پر ڈالے جائیں گے۔

آج ہم دوسرے لوگوں کی برائیاں کرتے ہیں، دوسروں کے متعلق تہمتیں گھڑتے ہیں اور لوگوں کے درمیان اس کو برا مشہور کرتے ہیں کہ فلاں نے ایسا کیا۔ یہ درحقیقت اس کی عزت کے اوپر ایک حملہ ہے اور اس کی عزت کے معاملہ میں اس کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن یہ حق دلوائیں گے۔

یا مثلاً کسی کا مال لے لیا، کسی کی کوئی اور چیز لے لی، پیسہ دبالیا، زمین دبالی، کسی کے ساتھ ناحق طریقہ سے معاملہ کیا اور زیادتی کی؛ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بندوں کے جو بھی حقوق ہیں اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کی گئی ہے، آج جب دنیا میں زندہ ہے، اس سے معاف کروالیں۔ ﴿فَلْيَتَحَلَّلْهُ﴾ حلال کروالے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس جا کر معافی مانگ کر اس سے اس حق کو ساقط کروالے۔

﴿قَبْلَ أَنْ لا يَكُوْنَ دِيْنَارٌ وَلا دِرْهَمٌ﴾ اس سے پہلے کہ وہ دن آئے کہ جس دن نہ تو دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا۔ اس لئے کہ وہاں مال ودولت اور پیسہ نہیں ہوگا جس کے ذریعہ سے آپ دوسروں کے حقوق کو ادا کرسکیں گے۔ وہاں کا سرمایہ، کرنسی اور وہاں کا سکہ تو نیکیاں ہیں

﴿ایک دانگ کے بدلہ ستر مقبول نمازیں﴾

اگر کسی کو گالی دی تھی اور دنیا میں معاف نہیں کرایا اور معاملہ صاف نہیں کیا، یا کسی پر بہتان لگایا تھا، تہمت لگائی تھی اور دنیا میں اس سے معافی نہیں مانگی، یا کسی کا پیسہ کھالیا تھا، دنیا میں نہ پیسہ ادا کیا اور نہ معاف کرایا؛ یہ سب حقوق والے کل میدان حشر میں اللہ کے حضور فریاد کریں گے۔کوئی کہے گا کہ میرے اوپر تہمت لگائی تھی، کوئی کہے گا کہ مجھے گالی دی تھی، کوئی کہے گا کہ میرے پیسہ لے لئے تھے، کوئی کہے گا کہ میری زمین دبالی تھی، کوئی کہے گا کہ میرے ساتھ یہ زیادتی کا معاملہ کیا تھا۔اب اگر نیکیاں ہوں گی تو اس نے دوسرے کا جتنا حق دبایا ہے دوسرے کے ساتھ جتنا ظلم کیا ہے، جتنی حق تلفی کی ہے، اسی کے برابر اس کی نیکیاں لے کر اس کو دی جائیں گی۔جیسا جیسا حق ہوگا اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔

حدیث میں کوئی صراحت اور تفصیل نہیں آئی ہے، لیکن بعض کتابوں میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ہمارے یہاں ایک کتاب ''الاشباہ والنظائر'' پڑھائی جاتی ہے، اس میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے ایک دانگ (درہم جو چاندی کا سکہ ہوتا تھا اس کا چھٹا حصہ) کسی کا حق دبایا ہے تو اس کے بدلہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی ستر مقبول نمازیں حق والے کو دیں گے۔

(الاشباہ والنظائر، ۱/۱۶۰)

اور بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے پاس اتنی نیکیاں نہیں ہوں گی، یا نیکیاں تو تھیں لیکن بعض حق والوں کا حق ادا کرنے میں پوری ہوگئیں اور حق والے ابھی باقی ہیں اور نیکیاں نہیں رہیں تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کا حق ہے اس کے گناہ لے کر اس پر ڈالے جائیں گے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا اہتمام

باب کا عنوان قائم کیا تھا کہ کسی کا کوئی حق ہے تو اس کو موت سے پہلے پہلے ادا کرنے یا معاف کروانے کا اہتمام کیا جائے، خدا نہ کرے اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو قیامت میں سارا معاملہ بھگتنا پڑے گا۔

غور کیجئے کہ خود نبی کریم ﷺ اس کا کتنا اہتمام فرماتے تھے، روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ آپ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ کسی کا کوئی مالی حق میرے اوپر ہے، تو مَیں یہاں کھڑا ہوں، وہ بتلادے، مَیں اس کا مالی حق ادا کردوں گا۔ یا مَیں نے کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے تو وہ اپنا بدلہ لے لے۔ (المعجم الاوسط، ۲۶۲۹)

بہرحال! لوگوں کے حقوق کے معاملہ میں آج کل بہت زیادہ کوتاہی کا ارتکاب کیا جارہا ہے۔ کسی کا حق مارنا عیب کی چیز رہی ہی نہیں ہے، لوگ بڑی جرأت کے ساتھ اس کا ارتکاب کرلیتے ہیں۔ بلکہ بعضوں کو جب کہا جاتا ہے کہ قیامت میں حساب کتاب دینا ہے، تو کہہ دیتے ہیں کہ ہاں ہاں! ہم وہاں حساب دے دیں گے۔ ایسی جرأت کی باتیں کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے اور توفیق دے کہ ہم ان حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کریں۔

۲۵/صفر ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۰/ جون ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً أمابعد:

۲۱۱۔ عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِن لِّسَانِہٖ وَیَدِہٖ. وَالْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَانَھَی اللّٰہُ عَنْہُ. (متفق علیہ)

﴿حدیثِ باب اور اس کی تشریح﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا تھا ﴿باب تحریم الظلم﴾ یعنی کسی کے حق مارنے کا حرام ہونا اور اگر کسی کا کوئی حق مارا ہے تو اس کا حق واپس کرنا ضروری ہے، یا صاحب حق سے اس حق کو معاف کرالینا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کامل مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

اسلام لفظ کا مادّہ ﴿س، ل، م﴾ ہے جس کا ترجمہ سلامتی اور امن ہوتا ہے، گویا جس آدمی نے اسلام قبول کیا اور وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتا ہے تو اس کی زبان کا خاصہ اور اس کا عمل یہ ہونا چاہیے کہ اس کی زبان اور ہاتھ سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

یہاں زبان اور ہاتھ کو خاص طور سے ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ

دوسرے اعضاء کے ذریعہ سے تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے، بلکہ عام طور پر ایک انسان دوسرے کو جو ایذا پہنچاتا ہے اس میں انہیں دو اعضاء کو استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے اس کو خاص طور پر ذکر کیا، ورنہ مقصود یہ ہے کہ جس کی ایذا رسانیوں سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں، ایسا آدمی حقیقی معنٰی میں مسلمان کہلانے کا حق رکھتا ہے۔

اور اس میں بھی زبان کو خاص طور پر مقدم کیا، اس لئے کہ زبان کا ایذا پہنچانے کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ جو لوگ موجود ہیں ان کو بھی زبان سے ایذا پہنچائی جاسکتی ہے، اور جو موجود نہیں ہیں ان کے متعلق بھی غیبت یا بہتان یا گالی گلوچ کی شکل میں یا دوسرے طریقوں سے ایذا رسانی کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح سے زندوں پر بھی کی جاسکتی ہے اور مردوں پر بھی کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ دنیا سے جاچکے ہیں اور قبر میں پہنچ چکے ہیں ان پر بھی بعض مرتبہ آدمی اپنی زبان سے کلام کر دیتا ہے مثلاً اس کا باپ ایسا تھا، فلاں ایسا تھا۔ اور جب ان پر کلام کرے گا تو اس کی وجہ سے زندوں کو بھی تکلیف پہنچے گی۔

عکرمہ بن ابی جہل بارگاہِ نبوت میں

اسلام تو اس معاملہ میں اتنا حساس ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر جب مکہ والوں کو عام معافی عطا فرمائی تھی، اس وقت مردوں میں سے گیارہ اور عورتوں میں سے چار اس طرح کل پندرہ اشخاص ایسے تھے جن کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا تھا ان کے لئے معافی نہیں ہے، انہیں میں سے ایک عکرمہ بن ابی جہل تھے۔ مکہ فتح ہونے پر وہ شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے، انہوں نے ارادہ کیا کہ جزیرۃ العرب ہی کو چھوڑ دوں، چنانچہ وہ یمن کے ساحل پر پہنچ کر کشتی پر سوار ہوئے، جب کشتی چلی تو بھنور میں پھنسی، اس وقت وہ لات وعزیٰ کو

پکارنے لگے۔ کشتی والوں نے کہا کہ لات وعزی یہاں کام نہیں دیں گے، اللہ کو پکارو۔ یہ کہنے لگے کہ اگر سمندر کے اندر نجات دینے والا اللہ ہی ہے، تو خشکی میں بھی نجات دینے والا وہی ہے، لہٰذا پھر تو ہر وقت اسی کو پکارنا چاہیے۔ اسی وقت انہوں اپنے جی میں یہ طے کرلیا کہ اگر مَیں اس مصیبت سے نجات پا گیا تو اللہ پر ایمان لے آؤں گا۔ چنانچہ اس سے نجات ملی کشتی والے کنارے پر آ گئے۔

ان کی بیوی اُم حکیم تھیں، ادھر وہ ایمان لے آئی تھیں اور نبی کریم ﷺ کے پاس اپنے شوہر کے لئے امان کی درخواست کی کہ ان کو امان دی جائے۔ نبی کریم ﷺ نے کہا: ٹھیک ہے ان کو ہماری طرف سے امان ہے۔ گویا ان کے متعلق جو اعلان ہوا تھا وہ حکم نبی کریم ﷺ نے واپس لے لیا۔ جب امن دے دیا گیا تو ان کی بیوی ان کو تلاش کرنے کے لئے چلی۔ معلوم تھا کہ وہ کس طرف گئے ہیں اور ان کا ارادہ یمن کی طرف جانے کا ہے۔ وہاں ان سے ملاقات کی۔ بیوی نے کہا کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ سے آپ کے لئے امان حاصل کرلی ہے، لہٰذا آپ واپس چلئے اور ایمان لے آیئے۔ چناچہ وہ واپس آنے لگے۔ راستے میں انہوں نے چاہا کہ بیوی سے صحبت کریں، تو بیوی نے انکار کردیا اور کہا تم کافر ہو اور مَیں مسلمان ہوں۔ اس پر انہوں نے سوچا کہ کوئی بڑی بات ہے جو اس کو اس تنہائی میں بھی مجھے صحبت پر قدرت دینے سے روک رہی ہے۔ اس سے اسلام کی اہمیت ان کے دل میں اور بڑھ گئی۔

خیر! وہ ان کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے گئیں۔ میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ جس وقت وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پہنچنے والے تھے، تو ان کے آپ کی مجلس میں پہنچنے سے پہلے حضور ﷺ نے حاضرین مجلس سے یوں کہا کہ عکرمہ آرہے ہیں، ان کے باپ کو

بُرا بھلا مت کہنا، کیونکہ مردوں کو برا بھلا کہنے سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

حالانکہ ان کا باپ کون ہے یہ ساری دنیا جانتی ہے اور اس کا کفر پر مرنا بھی سب کو معلوم ہے۔ اسلام کا سب سے بڑا دشمن تھا اور جس کو حضور ﷺ نے اس امت کا فرعون کہا ہے اس کے متعلق حاضرین مجلس کو آپ ﷺ منع فرما رہے ہیں کہ اس کی برائی مت کرنا، اس لئے کہ اگر تم اس کی برائی کرو گے تو وہ تو دنیا سے جا چکا ہے اور اپنے اعمال کا پھل بھگت رہا ہے، لیکن اس کی برائی کی وجہ سے زندوں کو تکلیف ہوگی، اسلام کی یہی تعلیم ہے۔

(اسد الغابہ فی ترجمۃ عکرمہ بن ابی جہل)

زبان سے ایذا رسانی کا دائرہ وسیع ہے

تو کسی مسلمان کو زبان سے تکلیف پہنچانے کا دائرہ ہاتھ کے ایذا پہنچانے کے دائرہ سے وسیع ہے۔ دوسری بات یہ کہ ہاتھ سے ایذا پہنچانے کے لئے تو آدمی کے اندر بھی کچھ ہمت وطاقت اور گٹز (Guts) ہونے چاہئیں، ہر کس و ناکس پر تو آپ ہاتھ نہیں اُٹھا سکتے، بلکہ سامنے والے کو ذرا دیکھنا پڑے گا، کہیں ایسا نہ ہو کہ سیر کا کوئی سوا سیر مل جائے، جبکہ زبان سے کچھ کہنے کے واسطے اس کی ضرورت ہی نہیں ہے، کمزور آدمی بھی قوت والے کے سامنے زبان تو ہلا دیتا ہے، اور غائبانہ تو سب ہی بولتے ہیں۔ اس لئے زبان کو ہاتھ پر مقدم کیا اور فرمایا کہ حقیقی معنٰی میں مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

یہاں دوسرے مسلمانوں کا تذکرہ کیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفار کو تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے، بلکہ وہ کفار جو جزیہ دے کر دار الاسلام میں شہری ہونے کے حیثیت سے رہتے ہیں ان کے متعلق قرآن و حدیث اور کتابوں میں صراحت موجود ہے کہ جان و مال،

عزت و آبرو کی حفاظت کے اعتبار سے ان کا بھی وہی رتبہ ہے جو ایک مسلمان کا ہے۔اس لئے جو حکم مسلمانوں کے لئے ہے؛ وہی حکم ان کفار کے لئے بھی ہے۔ہاں! جن کے ساتھ لڑائی ہے،ان کا معاملہ البتہ الگ ہے۔

بہر حال! یہاں یہ روایت اسی نسبت سے لائے ہیں کہ دیکھو! اس باب کا عنوان ظلم کے حرام ہونے کا قائم کیا تھا،اور کسی کو زبان سے تکلیف پہنچانا، یا ہاتھ سے تکلیف پہنچانا؛ یہ بھی ظلم کا ایک شعبہ ہی ہے،اور اسی کے متعلق نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔

﴿حقیقی معنٰی میں مہاجر کون؟﴾

اس حدیث کا دوسرا جزو ہے ﴿وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَانَهٰى اللّٰهُ عَنْهُ﴾ حقیقی معنٰی میں ہجرت کرنے والا وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرما رکھا ہے۔

"مُهَاجِر" عربی زبان کا لفظ ہے جو ہجرت سے بنا ہے ﴿هَجَرَ، يَهْجُرُ﴾ کا اصل معنٰی ہے کسی چیز کو چھوڑ دینا۔ہجرت کہتے ہیں کہ آدمی اپنے وطن کو یا کسی ایسی جگہ کو جہاں رہ کر دین پر کماحقہ، عمل نہیں کرسکتا ہو چھوڑ کر دوسری ایسی جگہ میں منتقل ہو جائے جہاں پر اطمینان کے ساتھ دین پر پورے طور پر عمل کر سکے۔مثلاً آپ جہاں آباد ہیں وہ علاقہ ایسا ہے کہ وہاں نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے،روزہ رکھنے کی اجازت نہیں،دین پر عمل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔آج کل تو ایسا بہت ہی کم ہو گیا ہے، جو لوگ اسلام کے کھلم کھلا دشمن ہیں ان کے علاقے میں اور وہاں کے اسٹیشن پر جا کر بھی اگر آپ نماز پڑھنا چاہیں تو کوئی منع نہیں کرتا۔

بہر حال! اگر کوئی علاقہ ایسا ہے جہاں اس طرح کی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور آدمی اسلامی احکام کو بجا نہیں لاسکتا اور فرائض کو ادا نہیں کرسکتا؛ تو ایسے مسلمان کو شریعت کی

طرف سے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ایسے علاقے کو چھوڑ کر دوسرے ایسے علاقے میں رہائش اختیار کرلے جہاں فرائض اسلامیہ پرامن اور اطمینان کے ساتھ عمل کر سکے۔

ابتدائے اسلام میں مکہ پر کفار کا قبضہ تھا اور ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا اور وہاں جو آدمی ایمان لاتا اس کیلئے مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ جانا ضروری تھا بلکہ ایمان کا ایک جزو تھا، اس لئے کہ وہ مکہ میں رہتے ہوئے اسلامی احکام پر عمل نہیں کرسکتا تھا۔ بعد میں جب مکہ فتح ہوا اور مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اب یہ بات نہیں رہی، اس لئے اب تو یہاں رہ کر بھی پورے طور پر اسلامی فرائض پر عمل ہوسکتا تھا، لہٰذا ہجرت والا حکم جو مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لئے تھا وہ ختم ہوگیا۔ اسی لئے حدیث پاک میں آتا ہے ﴿لا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ﴾ (بخاری ۲۷۸۳) فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے۔ یعنی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جو ہجرت کی جاتی تھی وہ باقی نہیں رہی، لیکن دنیا میں کسی اور علاقے میں رہتے ہوئے آدمی کے لئے اسلامی احکام پر عمل کرنا دشوار ہو تو اس علاقے کو چھوڑ کر دوسرے ایسے علاقے کی طرف منتقل ہونا جہاں وہ آسانی کے ساتھ اسلامی احکام پر عمل کر سکے؛ یہ حکم اب بھی باقی ہے۔ اور یہ ہجرت قیامت تک باقی رہے گی۔ حدیثِ پاک میں ہے ﴿لا تَنْقَطِعُ الْهِجْرَةُ حَتّٰى تَنْقَطِعَ التَّوْبَةُ (ابوداؤد، ۲۴۸۱)﴾ ہجرت ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ توبہ ختم ہوجائے گی یعنی توبہ کا دروازہ جب بند ہوگا وہاں تک ہجرت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ دوسری ہجرت ہے۔

بہرحال! اس روایت کا دوسرا ٹکڑا یہی ہے ﴿وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ﴾ یہ ہجرت اسی لئے کی جاتی ہے کہ ایک خطے میں رہ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام پر پورے طور پر عمل نہیں کرسکتا تھا اس لئے وہ دوسرے علاقے میں جاتا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

اگر کوئی آدمی ظاہری طور پر زمین کے ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے کی طرف منتقل ہوا، لیکن باطنی طور پر اس نے اپنے آپ کو اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا عادی نہیں بنایا اور جن چیزوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع کیا ہے، ان کو نہیں چھوڑا؛ تو یہ ہجرت کیا معنیٰ رکھتی ہے۔ ظاہری طور پر زمین کے ایک خطے سے دوسرے خطے کی طرف منتقل ہونا یہ اصل مقصود نہیں ہے، بلکہ اصل مقصود تو شریعت پر عمل ہے۔

﴿ایک چادر کی خیانت جہنم میں جانے کا سبب بنی﴾

۲۱۲. وعنه رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ عَلىٰ ثَقَلِ النَّبِيِّ ﷺ رَجُلٌ يُقَالُ لَهُ كِرْكِرَةُ، فَمَاتَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ هُوَفِي النَّارِ. فَذَهَبُوْا يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ، فَوَجَدُوْا عَبَاءَةً قَدْغَلَّهَا. (رواه البخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے ہی یہ روایت بھی منقول ہے کہ کسی سفر میں حضور اکرم ﷺ کے سامان کی نگرانی کے لئے ایک صاحب مقرر تھے، جن کو "کرکرہ" کہا جاتا تھا، جب ان کا انتقال ہوگیا تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا کہ وہ جہنم میں ہے، اب حضور ﷺ کسی کے متعلق فرمائیں کہ یہ جہنمی ہے تو لوگ سوچنے لگے کہ کیوں جہنمی ہے؟ جب لوگوں نے اس کا سامان دیکھا اور اس کی تلاشی لی تو اس کے اندر سے ایک چادر ملی جو اس نے مالِ غنیمت میں سے چرائی تھی۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں ہے۔ مالِ غنیمت میں سے کوئی چیز اگر لی جائے تو چاہے وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو؛ حرام ہے۔ اسی وجہ سے حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ اس حرام فعل کے ارتکاب کی وجہ سے جہنم میں ہے۔

اب بات یہ ہے کہ وہ مسلمان تھا اس لئے اپنے گناہ کی سزا بھگت کر ایک وقت آئے گا کہ وہ جنت میں جائے گا۔ اس روایت کو پیش کر کے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ایک چادر جو

ناحق طریقہ سے اس نے لی تھی اس کے لئے جہنم میں جانے کا سبب بنی۔لہٰذا کسی بھی ایسے ناحق فعل سے بچنا نہایت ضروری ہے۔

۲۱۳۔اس کے بعدوالی روایت حضرت ابوبکرہ نفیع بن الحارث رضی اللہ عنہ کی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ والی ہے، پہلے بھی دو تین مرتبہ آچکی ہے،اوراس کی پوری تفصیل وہاں بیان کی جاچکی ہے؛اس لئے اس روایت کو چھوڑ رہا ہوں۔

جھوٹی قسم کے ذریعہ کسی کا حق ہضم کرنے پر وعید

۲۱۴.وعن أبی أمامة ایاس بن ثعلبة الحارثی اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ:مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِهٖ فَقَدْاَوْجَبَ اللهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ.فَقَالَ رَجُلٌ:وَاِنْ کَانَ شَیْئًا یَسِیْرًا یَارَسُوْلَ اللهِ؟فَقَالَ:وَاِنْ کَانَ قَضِیْبًا مِّنْ أَرَاکٍ.

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ کوئی آدمی کسی مسلمان کا کوئی حق جھوٹی قسم کے ذریعہ ناحق طریقے سے دبالے،تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جہنم واجب کردی اوراس پر جنت میں داخلہ حرام کردیا،کسی نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول!چاہے معمولی چیز ہو؟تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشادفرمایا کہ چاہے پیلو کی لکڑی ہی کیوں نہ ہو۔

پہلے ایک مسئلہ سمجھ لیجئے کہ شریعت کا حکم یہ ہے اگرکسی نے کسی دوسرے کی کوئی چیز چھین لی اورغصب کرکے رکھ لی،مثلاً آپ کی گھڑی کسی نے چھین لی،اورآپ حاکم کے پاس جاکر یہ دعوی دائر کریں کہ اس نے میرے گھڑی چھین لی ہے، مجھے دلوائی جائے۔تو حاکم اس کو بلائے گا جس کے خلاف آپ دعوی پیش کررہے ہیں اورآپ کے اس دعوے پر حاکم

اس مدعیٰ علیہ سے مطالبہ کرے گا کہ یہ آپ کے متعلق جو دعویٰ کر رہے ہیں وہ درست ہے؟ اگر مدعیٰ علیہ کہے کہ ٹھیک ہے تو قاضی اس سے کہہ دے گا کہ اس کو واپس دے دو۔اس نے اپنے جرم کا اور اس کے حق کا اقرار کر لیا لہٰذا قاضی اس کو دلوادے گا۔اور اگر نہیں دے گا تو قاضی جبراً قوت کے زور سے اس کو دلوائے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ کہے کہ نہیں! یہ گھڑی اس کی نہیں ہے بلکہ یہ تو میری ہے، تو اس صورت میں قاضی مدعی سے مطالبہ کرے گا کہ آپ اس بات پر گواہ پیش کیجیے کہ یہ گھڑی آپ کی ہے اور اس نے آپ کے پاس سے چھین لی ہے۔اب مدعی کو شرعاً دو گواہ پیش کرنے ضروری ہیں جو اس بات کی گواہی دیں کہ یہ گھڑی آپ کی ہے۔اب جو لوگ واقف ہیں کہ یہ گھڑی آپ کی ہے ،وہ آپ کے حق میں گواہی دے سکتے ہیں۔اگر آپ نے گواہ پیش کر دیئے اور گواہوں سے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا کہ یہ چیز میری ہے تو اس صورت میں قاضی فیصلہ کر دے گا اور وہ چیز آپ کو دلوادے گا۔

اور اگر آپ یوں کہیں کہ میرے پاس اس بات کے گواہ تو نہیں ہیں لیکن یہ گھڑی میری ہی ہے،تو اب قاضی اس سے -یعنی جس کے خلاف آپ نے دعویٰ کیا ہے اور جس کے پاس ابھی گھڑی ہے- مطالبہ کرے گا اور اس سے کہے گا کہ قسم کھا کر کہو کہ یہ گھڑی اس کی نہیں ہے بلکہ تمہاری ہے۔اس سے قسم کھلوائے گا۔اگر اس نے قسم کھالی تو قاضی اس گھڑی کا اسی کے حق میں فیصلہ کر دے گا۔اب گھڑی آپ کو نہیں دلوائے گا۔اس لئے کہ آپ تو اپنا دعویٰ ثابت نہیں کر سکے،اور دعویٰ ثابت کئے بغیر تو کوئی فیصلہ ہو نہیں سکتا۔اور ابھی اس وقت قبضہ اس کے ہاتھ میں تھا،اس لئے قبضہ ہونے کی وجہ سے اس کا پہلو مضبوط تھا اور قسم اس کو کھلائی

گئی اوراس نے قسم کھالی۔

تو بہرحال! یہاں گھڑی آپ کی ہونے کے باوجود اس نے قسم کھائی ہے۔اس لئے کہ اگر وہ قسم نہ کھاتا تو پھر یہ چیز مالک کو دلوادی جاتی، لیکن اس نے قسم کھا کر اس دعویٰ کو جو اصل مالک نے اس پر کیا تھا رد کردیا۔گویا یہ جھوٹی قسم ہوئی۔تو یہ جھوٹی قسم ایک مسلمان کے مال کو ناحق طریقے سے غصب کرنے کا ذریعہ بنی۔اسی کی فرماتے ہیں ﴿مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِیَمِیْنِهٖ﴾ جو آدمی کسی مسلمان کا کوئی حق جھوٹی قسم کے ذریعہ سے دبالے۔

﴿فَقَدْأَوْجَبَ اللّٰهُ لَهُ النَّارَ﴾ اب چاہے دنیا میں اس کی جھوٹی قسم کی وجہ سے قاضی نے اس کے حق میں فیصلہ کردیا اور یہ چیز اصل مالک کو نہیں دِلوائی، لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس نے جو جھوٹی قسم کھا کر کوئی چیز اپنے پاس دبالی ہے، تو اس نے اپنے لئے جہنم واجب کرلی ﴿وَحَرَّمَ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ﴾ اور اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام کردے گا۔

دیکھو! یہاں اس چیز کی کوئی تعیین نہیں کی ہے کہ کتنی قیمت کی ہو کہ ۶۰ / روپے کی ہو یا ایک لاکھ کی ہو، یا دس لاکھ کی ہو، یا دو پیسے کی چیز ہو۔ایک عام بات بیان فرمائی ہے ﴿حَقَّ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ﴾ کسی مسلمان کا حق اس نے اپنی جھوٹی قسم کی وجہ سے لے لیا۔اس میں اتنا عموم ہے کہ چاہے قیمتی ہو یا معمولی درجہ کی ہو۔لہٰذا جو لوگ اس طرح دوسروں کی معمولی معمولی چیزوں پر ناحق طریقہ سے قابض ہو جاتے ہیں اور قسمیں کھا کر ان دعووں کو رد کردیتے ہیں، ان کو سوچنا چاہیے کہ وہ کتنا خطرناک سودا کررہے ہیں۔دو پیسے کی چیز لے کر جہنم خرید رہے ہیں اور جنت کو اپنے اوپر حرام کررہے ہیں۔

﴿فَقَالَ رَجُلٌ: وَاِنْ کَانَ شَیْئًایَسِیْرًایَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟﴾ حضور ﷺ نے جو فرمایا تھا اس

کا معنٰی اور مفہوم تو عام تھا، پھر بھی ایک آدمی نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے جو ارشاد فرمایا کہ کسی نے کسی مسلمان کا کوئی حق جھوٹی قسم کے ذریعہ سے دبالیا تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم واجب کر دیتا ہے اور جنت کو حرام کر دیتا ہے، تو چاہے وہ چیز معمولی سی دو پیسے کی ہو تب بھی؟ حضور ﷺ نے فرمایا ﴿وَاِنْ کَانَ قَضِیْباً مِنْ أَرَاکٍ﴾ چاہے پیلو کی ایک لکڑی ہو، اگر وہ بھی قسم کھا کر ناحق دبالی ہے کہ تو اس پر اللہ تعالیٰ جہنم کو واجب کر دے گا اور جنت کو حرام کر دے گا۔اس میں اتنا عموم ہے، اب اس کے بعد آگے کیا باقی رہ جاتا ہے۔

بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ معمولی معمولی چیزوں کے اندر تو زیادہ کچھ نہیں ہوتا، اور ان کی نگاہ میں اس کی اتنی زیادہ اہمیت بھی نہیں ہوتی، حالانکہ یہ معمولی چیزیں ہی آدمی کو ہلاک کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔اس لئے لوگوں کے حقوق کے بارے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔آدمی کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ اس میں اگر اپنا کچھ چھوڑنا پڑتا ہو تو چھوڑ دے، لیکن کسی کی کوئی چیز ناحق اپنے پاس نہیں آنی چاہیے۔اس کا بہت اہتمام کرنا چاہیے۔

﴿یہ بھی ایک طرح کی خیانت ہے﴾

۲۱۵. وعن عدی بن عمیرة ؓ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ مِنْكُمْ عَلٰی عَمَلٍ، فَكَتَمَنَا مِخْيَطاً فَمَا فَوْقَهُ، كَانَ غُلُوْلاً يَّأْتِیْ بِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فَقَامَ اِلَيْهِ رَجُلٌ أَسْوَدُ مِنَ الْأَنْصَارِ، كَأَنِّیْ أَنْظُرُ اِلَيْهِ، فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! اِقْبَلْ عَنِّیْ عَمَلَكَ، قَالَ: وَمَالَكَ؟ قَالَ: سَمِعْتُكَ تَقُوْلُ كَذَا وَكَذَا، قَالَ: وَأَنَا أَقُوْلُهُ الْآنَ: مَنِ اسْتَعْمَلْنَاهُ عَلٰی عَمَلٍ فَلْيَجِیْءْ بِقَلِيْلِهٖ وَكَثِيْرِهٖ، فَمَا أُوْتِیَ مِنْهُ أَخَذَ، وَمَا نُهِیَ عَنْهُ انْتَهٰی. (رواہ مسلم)

حضرت عدی بن عمیرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے کسی کو کسی کام کے لئے مقرر کیا جائے (جیسا کہ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اُس زمانہ میں صدقات کی وصولیابی کے لئے عامل مقرر کئے جاتے تھے) تو اس کو جو ڈیوٹی اور ذمہ داری حوالے کی گئی تھی اس میں سے ایک سوئی چھپا دی، یا (چھوٹا ہونے میں) اس سے بڑھ کر، یعنی سوئی سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز چھپائی۔ شراح نے ﴿فَمَا فَوْقَهُ﴾ کا مطلب یہی لکھا ہے کہ سوئی یا اس سے بھی کم قیمت کی کوئی چیز ہو۔ تو یہ ایک طرح کی خیانت ہے، قیامت کے دن وہ اس کو لے کر آئے گا۔

اس روایت کو نقل کرنے والے صحابی فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر ایک انصاری سیاہ فام، کالے رنگ کا آدمی کھڑا ہوا۔ راوی کہتے ہیں گویا اس وقت میں اس کو دیکھ رہا ہوں یعنی وہ منظر میری آنکھوں میں بالکل تازہ ہے، یوں سمجھئے کہ اب تک میرے دل و دماغ میں وہ آدمی ہے۔ اس نے کھڑے ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے جو ڈیوٹی میرے حوالے کی تھی اس کو واپس قبول فرمالیں یعنی میں اس ذمہ داری کو ادا کرنے سے قاصر ہوں، چاہتا ہوں کہ آپ اس کو واپس لے لیں۔ کیونکہ آپ نے بہت بڑی وعید سنائی کہ جو کام حوالے کیا گیا اور اس کی ادائیگی میں اور اس کا حساب دینے میں ہمارے پاس کوئی سوئی یا اس سے بھی کم درجہ کی کوئی چیز رہ گئی تو وہ خیانت میں شمار ہوگئی اور اس کو بھی قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ اب کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی چھوٹی چیز ادھر ادھر گر گئی اور وہ نہیں پہنچی، اس لئے وہ آدمی کہتا ہے کہ آپ نے جو ذمہ داری دی ہے؛ مہربانی کر کے واپس لے لو۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ کیوں واپس کر رہا ہے؟ تو وہ آدمی کہتا ہے کہ اللہ کے رسول! مَیں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ہم کسی کو کوئی کام حوالے کریں اور پھر اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اور اس کا حساب وکتاب دینے میں وہ اگر ایک سوئی یا اس سے کم مقدار میں بھی خیانت کرے گا؛ تو قیامت کے دن اس کو لے کر آئے گا۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! بالکل میں نے یہ کہا ہے اور تو ذمہ داری واپس کر رہا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مَیں نے جو بات کہی ہے اس میں کچھ چھوٹ چھاٹ دوں گا، بلکہ اب بھی مَیں یہی کہتا ہوں کہ ہم اگر کسی کو کوئی ڈیوٹی حوالے کریں، تو جب وہ ہمارے پاس اس کام کو انجام دینے کے بعد واپس آئے، یا ذمہ داری واپس کرے تو اس کا حساب وکتاب، کم وبیش جتنا بھی ہو، قلیل ہو یا کثیر ہو، کم ہو یا زیادہ ہو؛ پورے پورا دینا ضروری ہے۔

ہاں! حساب وکتاب کے بعد اگر اس کو کوئی چیز دی دے جائے؛ تو لے لے، اور جو نہ دی جائے؛ نہ لے۔ لیکن حساب وکتاب تو پورا دینا پڑے گا۔

﴿تمام ذمہ داریاں امانت ہیں﴾

اس بات میں عموم ہے، نبی کریم ﷺ اپنے زمانہ میں کوئی کام حوالے کرتے تھے وہ بھی اس میں شامل ہے اور آج کل عوامی کام کی جتنی بھی ذمہ داریاں جس پر بھی عائد کی جاتی ہیں یا خصوصی طور پر جو ذمہ داریاں عائد کی جاتی ہیں؛ وہ سب اس میں داخل ہیں۔ مثلاً مسجد کا کام کسی کے حوالے کیا، مدرسے کا کام کسی کے حوالے کیا، انجمن کا کام حوالے کیا، کسی سوسائٹی کا کام حوالے کیا، اس طرح کے جتنے بھی کام ہیں؛ سب میں یہ بات عائد ہوتی ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی فرم میں، کسی فیکٹری میں، کسی کمپنی میں ملازم ہے اور اس

کمپنی کی طرف سے اسی طرح کی کوئی ڈیوٹی اس کے حوالے کی گئی ہو کہ مثلاً ہماری وصولی (ઉઘરાણી) کر کے لاؤ، یا اور کوئی کام سپرد کیا ہو؛ تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

جو بھی کام کسی کے حوالے کیا جاتا ہے، وہ امانت کے قبیل سے ہے۔ اگر وہ اس کے اندر ایک سوئی یا اس سے کم درجہ کی چیز کو چھپائے گا تو وہ خیانت میں داخل ہے اور ﴿وَمَن يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ جو آدمی خیانت کرے گا وہ خیانت کی ہوئی چیز کو قیامت کے دن لے کر آئے گا۔ پہلے بھی یہ بات آچکی ہے۔ اس لئے جس کے پاس جس نوعیت کی ذمہ داری ہو، اس کی ادائیگی میں ذرّہ برابر بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، اور اگر خدانخواستہ کوتاہی ہوئی ہے تو اس کی تلافی ضرور کر لے۔

﴿انفرادی معاملہ تو آسان ہے لیکن......﴾

اب اگر شخصی معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہو تو تلافی آسان ہے، لیکن اگر اجتماعی معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے تو پھر معاملہ گمبھیر ہے۔ جیسے آپ کسی فیکٹری میں کسی سیٹھ کے یہاں کام کرتے ہیں اور ملازم ہیں، اس نے آپ کو کوئی کام حوالے کیا تھا اور آپ سے کوتاہی ہوئی، تو ہاتھ جوڑ کر سیٹھ سے معافی مانگ لو کہ صاحب! معاف کر دو، دو چار پیسے کا معاملہ ذرا اِدھر اُدھر ہو گیا تھا، اگر اس نے معاف کر دیا تو معاملہ ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ لیکن کسی مسجد یا مدرسہ کا حساب وکتاب آپ کے پاس ہے، یا کسی اجتماعی کام کی ذمہ داری ہے جس میں عوام کے پیسے آتے ہیں، امیر غریب، چھوٹے بڑے؛ سب شریک ہوں، کہ کوئی ایک روپیہ دیتا ہے، کوئی دو روپیہ دیتا ہے، کوئی لاکھ دیتا ہے اور کوئی دو لاکھ بھی دیتا ہے۔ ایسے معاملات میں ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ بڑے حضرت رائپوری شاہ عبد الرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کیا کرتے تھے کہ

''مدرسوں کے مال میں مجھے بڑا ڈر لگتا ہے''۔

مدرسہ کی تو ایک مثال دی ہے، لیکن ایسے جتنے بھی اجتماعی کام ہوتے ہیں، جس میں عام چندہ آتا ہے، اس میں بڑا ڈر لگتا ہے۔ اس لئے کہ کسی ایک آدمی کا پیسہ ہو اور وہ معاف کردے تو معاملہ صاف ہوجاتا ہے، لیکن اجتماعی کام میں کس سے معاف کرائیں گے۔ مدرسہ کا مہتمم، مدرسہ کی کمیٹی اور شوریٰ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوگا۔ وہ لوگ اگر مدرسہ کے مفاد کے پیشِ نظر اس سے صرفِ نظر کرتے ہوئے چشم پوشی کرلیں؛ اور مدرسہ کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر انہوں نے کچھ کیا ہے تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کی معافی ہوجائے، لیکن جس نے گڑ بڑ کی ہے اس کی تو معافی نہیں ہوگی، اس لئے کہ جن کا پیسہ ہے وہ تو نامعلوم افراد ہیں۔ لہٰذا عوامی جتنی ذمہ داریاں ہیں ان میں معاملہ اور زیادہ گمبھیر ہوجاتا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

معمولی خیانت شہادت جیسی قربانی کو ضائع کردیتی ہے

۲۱٦۔ وعن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّا كَانَ يَوْمُ خَيْبَرَ أَقْبَلَ نَفَرٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ، وَفُلَانٌ شَهِيدٌ؛ حَتّٰى مَرُّوا عَلٰى رَجُلٍ فَقَالُوا: فُلَانٌ شَهِيدٌ. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ كَلَّا إِنِّي رَأَيْتُهُ فِي النَّارِ فِي بُرْدَةٍ غَلَّهَا — أَوْ عَبَاءَةٍ.

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر کے دن صحابہ کی ایک جماعت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا کہ فلاں فلاں شہید ہوگئے، یہاں تک کہ شمار کرواتے ہوئے ایک آدمی کے بارے میں عرض کیا کہ فلاں بھی شہید ہوگیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہرگز نہیں! اس کو تو میں نے جہنم میں دیکھا ہے، اس لئے کہ اس نے

ایک ٹاٹ کی خیانت کی تھی۔ایک روایت میں چادر کا تذکرہ ہے۔

معلوم ہوا کہ اجتماعی اموال میں سے معمولی خیانت بھی شہادت جیسی قربانی کو ضائع کردیتی ہے،اس لئے اس بات کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔اوپر بھی اسی طرح کی ایک روایت گذر چکی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً أمابعد:—

۲۱۷۔عن أبی قتادۃالحارث بن ربعی رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَنَّہٗ قَامَ فِیْھِمْ،فَذَکَرَ لَھُمْ اَنَّ الْجِھَادَفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالْاِیْمَانَ بِاللّٰہِ أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ.فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ:یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ،تُکَفَّرُعَنِّیْ خَطَایَایَ؟فَقَالَ لَہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم:نَعَمْ!اِنْ قُتِلْتَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَأَنْتَ صَابِرٌمُحْتَسِبٌ،مُقْبِلٌ غَیْرُمُدْبِرٍ،ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم:کَیْفَ قُلْتَ؟ قَالَ:أَرَأَیْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ، أَتُکَفَّرُعَنِّیْ خَطَایَایَ؟فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم:نَعَمْ!وَأَنْتَ صَابِرٌمُحْتَسِبٌ،مُقْبِلٌ غَیْرُمُدْبِرٍاِلَّاالدَّیْنَ،فَاِنَّ جِبْرَئِیْلَ قَالَ لِیْ ذٰلِکَ.

شہادت کی فضیلت کے حصول میں دَین رکاوٹ ہے

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے واسطے صحابہ کے درمیان کھڑے ہوئے،آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تقریر میں صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو بتلایا کہ اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے واسطے جہاد کرنا تمام اعمال میں سب سے افضل اور بڑے عمل ہیں۔جب آپ نے یہ بات ارشاد فرمائی تو ایک آدمی سوال کرنے کے واسطے کھڑا ہوا اور اس نے پوچھا:یارسول اللہ! آپ نے یہ باتیں بتلائیں کہ اگر میں اللہ کے راستے میں نکلا اور شہید کردیا گیا تو کیا اس شہادت کی وجہ سے میرے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے؟اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جی ہاں!اگر تو اللہ کے راستہ

میں اس طرح شہید کیا جائے کہ تو جنگ کے دوران صبر سے کام لینے والا ہے اور اللہ سے اپنے اس عمل پر ثواب کی اُمید بھی رکھتا ہے، ﴿مُحتَسِبٌ﴾ یعنی اللہ کے واسطے یہ عمل کر رہا ہے، ریاء اور دکھلاوے کے واسطے نہیں کر رہا ہے، ﴿مُقبِلٌ غَیرُ مُدبِرٍ﴾ اور ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ لڑائی کے میدان میں تو آگے بڑھ رہا ہو، پیٹھ دکھا کر بھاگ نہ رہا ہو۔ یعنی اگر کوئی آدمی لڑائی کے میدان سے بھاگ رہا ہے اور پیچھے سے دشمن کے وار نے اس کو ختم کیا ہے تو اس کو یہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ آگے بڑھتے ہوئے، پیٹھ دکھائے بغیر اگر تجھے شہادت کا یہ مقام میسر ہوا اور اس میں بھی اللہ کے واسطے یہ عمل کیا تھا، جم کر صبر سے کام لیتے ہوئے لڑ رہا تھا؛ تو تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

حضرت ابوقتادہ فرماتے ہیں کہ یہ جواب دے چکنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے اس آدمی سے پھر سے پوچھا کہ تم نے کیا کہا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر اس درمیان میں وحی اتری تھی اور وحی کے ذریعہ سے حضور ﷺ کو کوئی اور بات بتلائی گئی تھی اس لئے آپ ﷺ نے ان صحابی کو جنہوں نے یہ سوال کیا تھا اور جس کا آپ جواب دے چکے تھے پھر سے پوچھا کہ تم نے کیا پوچھا تھا؟ انہوں نے اپنا سوال دہرایا کہ اللہ کے رسول! آپ بتلایئے کہ اگر مَیں اللہ کے راستہ میں شہید کر دیا جاؤں تو کیا میرے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے؟ اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! اللہ کے راستہ میں تمہارے شہید ہو جانے پر تمہارے تمام گناہ معاف کر دیئے جائیں گے، بشرطیکہ تم جم کر صبر سے کام لیتے ہوئے، اللہ واسطے اور ثواب کی نیت رکھتے ہوئے اور میدان میں آگے بڑھتے ہوئے، بغیر پیٹھ دکھلائے ہوئے مارے گئے ہو؛ تو تمہارے گناہ معاف ہو جائیں گے ﴿اِلَّا الدَّین﴾ لیکن کسی سے قرضہ

لیا ہے، یا بندوں کا اور کوئی حق تم پر ہو؛ تو وہ معاف نہیں ہوگا۔

لفظ دَین صرف قرضہ کے لئے نہیں بولا جاتا بلکہ بندوں کے جتنے بھی حقوق ہیں چاہے وہ جانی ہوں یا مالی، یا عزت وآبرو سے تعلق رکھنے والا ہوں؛ تمام کو لفظ دِین شامل ہے

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ابھی حضرت جبرئیل نے آکر یہ بات بتلائی کہ شہادت کی وجہ سے تمام گناہ معاف ہوجائیں گے، لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے، حالانکہ حضور ﷺ پہلے ہی جواب دے چکے تھے کہ سب گناہ معاف ہوجائیں گے، اس وقت یہ قید نہیں لگائی تھی اور بندوں کے حق کو اندر سے الگ نہیں کیا تھا لیکن حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر بتلایا کہ شہادت سے بھی حقوق العباد معاف ہونے والے نہیں ہیں۔

تو باب کا عنوان ہے کہ کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی ہو تو اس کو واپس کرو، یا اس سے معافی مانگو اور معاملہ صاف کرو۔ یہاں یہ روایت لاکر بتلایا گیا کہ اللہ کے راستہ میں لڑتے ہوئے اپنی جان دے دینا کتنا اونچا اور کیسا بڑا عمل ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی وجہ سے تمام گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔

﴿مفلس کون ہے؟﴾

۲۱۸. وعن أبی هریرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: أَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلَسُ؟ قَالُوْا: اَلْمُفْلِسُ فِيْنَا مَنْ لَّادِرْهَمُ لَهٗ وَلَا مَتَاعٌ. فَقَالَ: اِنَّ الْمُفْلِسَ مِنْ أُمَّتِیْ مَنْ يَّأْتِیْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاةٍ وَصِيَامٍ وَزَكوٰةٍ وَيَأْتِیْ قَدْشَتَمَ هٰذَا وَقَذَفَ هٰذَا وَأَكَلَ مَالَ هٰذَا وَسَفَکَ دَمَ هٰذَا وَضَرَبَ هٰذَا، فَيُعْطىٰ هٰذَامِنْ حَسَنَاتِهٖ، وَهٰذَامِنْ حَسَنَاتِهٖ، فَاِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهٗ قَبْلَ أَنْ يَقْضِیَ مَاعَلَيْهِ، أُخِذَمِنْ خَطَايَاهُمْ، فَطُرِحَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

سے سوال کیا کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ صحابہ کرام نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! ہمارے درمیان تو مفلس وہ آدمی سمجھا جاتا ہے جس کے پاس پیسے اور مال وسامان کچھ بھی نہ ہو، جو کسی چیز کا مالک نہیں ہے ایسے آدمی کو ہم لوگ مفلس کہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ اور زکوٰۃ لے کر آئے گا، یعنی فرض اور نفل نمازیں بھی بہت پڑھی ہیں، فرض اور نفل روزے بھی بہت رکھے ہیں، زکوٰۃ اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا سلسلہ بھی برابر رہا ہے اور دوسرے تمام واجبات بھی ادا کر چکا ہے، لیکن کسی کو گالی دے دی ہے، کسی پر تہمت لگا رکھی ہے، کسی کا مال کھا رکھا ہے، کسی کا خون بہا رکھا ہے، کسی کی پٹائی کر رکھی ہے۔ مطلب یہ کہ لوگوں کے مالی یا جانی یا عزت وآبرو سے تعلق رکھنے والے حقوق مار رکھے ہیں۔ اس لئے کہ گالی میں سامنے والے کی تنقیص ہوتی ہے، تو گالی دے کر یا عیب لگا کر اس کی عزت خراب کی ہے۔ اور تہمت میں تو کسی آدمی پر بٹہ لگانا ہے ہی۔ یہ دونوں حقوق وہ ہیں جو عزت و آبرو سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ کسی کا مال کھایا ہے یا کسی کا خون بہایا ہے یا کسی کی پٹائی کی ہے۔ یہ مالی اور جانی حق ہوئے۔ اس طرح کل تین قسم کے حق ہیں۔

پہلے بھی یہ روایت آچکی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر یہ ارشاد فرمایا تھا ﴿إِنَّ أَمْوَالَكُمْ وَدِمَآءَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِيْ شَهْرِكُمْ هٰذَا فِيْ بَلَدِكُمْ هٰذَا﴾ تمہارے مال اور تمہاری جان اور عزت وآبرو اسی طرح باعزت وباکرامت ہے اور اس پر ہاتھ ڈالنا اسی طرح حرام ہے جیسا اس دن میں اور اس مہینہ میں اور اس شہر میں۔ اس روایت میں تین چیزیں بتلائی ہیں جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے۔

ہمارے سماج میں یہ عام مزاج بنا ہوا ہے کہ کسی کا مال لے لیا ہو یا کسی کے اوپر ہاتھ اُٹھایا ہو اور پٹائی کی ہو؛ اس کو تو بندوں کا حق سمجھا جاتا ہے، لیکن کسی کو گالی دے دی یا کسی کی عزت وآبرو کے متعلق کوئی جملہ کہہ دیا ہو تو اس کی کچھ پرواہ ہی نہیں کی جاتی اور اس کو بہت ہلکا سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی بہت خطرناک چیز ہے۔ ہمارے کسی عمل سے یا ہمارے کسی قول سے کسی آدمی کی عزت وآبرو پر دھبّہ آتا ہو اور کسی کی عزت وآبرو گھٹتی ہو تو یہ اس کا عزت والا حق ہے، اور اس کے متعلق قیامت کے روز پوچھ ہوگی، اور وہ اس وقت تک معاف ہونے والا نہیں ہے جب تک کہ بندہ خود معاف نہ کردے۔ غیبت بھی اسی قبیل سے ہے۔

﴿غیبت؛ زنا سے زیادہ سخت کیوں؟﴾

اور اسی لئے تو غیبت کو زنا سے زیادہ سخت قرار دیا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ﴿اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا﴾ غیبت زنا سے زیادہ سخت ہے۔ صحابہ کرام نے عرض کیا کہ غیبت زنا سے زیادہ سخت کیسے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ کسی نے اگر زنا کیا ہو اور وہ تنہائی میں ندامت کے ساتھ اللہ کے سامنے توبہ کرلے اور آئندہ کے لئے پختہ عزم کرلے کہ اب کبھی بھی نہیں کروں گا تو وہ معاف ہوجائے گا، اس کا کسی اور سے تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کی غیبت کی ہے تو تنہائی میں اللہ کے سامنے رونے اور توبہ کرنے سے معاف نہیں ہوگا جب تک کہ جس کی غیبت کی ہے وہ معاف نہ کردے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ اس کی عزت وآبرو سے تعلق رکھنے والا حق ہے، اس کے متعلق آپ ﷺ نے اتنا سخت ارشاد فرمایا۔

تو یہاں حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ اعمالِ صالحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ لے کر آئے گا، بعض روایت میں یہ الفاظ ہیں ﴿کَأَمْثَالِ الْجِبَالِ﴾ پہاڑوں

کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا،لیکن اس ذخیرے کے باوجود یہ سب گناہ کیئے تھے اور بندوں کے حق مارے تھے؛تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جن کے حق ہیں وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں دعوی دائر کریں گے،ایک کہے گا کہ مجھے گالی دی تھی،دوسرا کہے گا کہ مجھ پر تہمت لگائی تھی،تیسرا کہے گا کہ میرا مال لے لیا تھا،چوتھا کہے گا کہ مجھے قتل کیا تھا،پانچواں کہے گا کہ میری پٹائی کی تھی۔لہٰذا ہر ایک کو اس کی نیکیاں دی جائیں گی۔جتنے بھی حق والے ہیں سب کو اس کی نیکیاں دی جارہی ہیں،اگر سب کے حق ادا کرنے میں اس کی نیکیاں ختم ہوگئیں اور ابھی بھی لوگوں کے مطالبے باقی رہ گئے ہیں تو ان کے گناہ اس کے اوپر ڈال دیئے جائیں گے،اب نیکیاں تو اس کے پاس رہی نہیں اور گناہ ہی گناہ ہوگئے،تو ظاہر ہے کہ گناہوں کا پلڑا بھاری ہوجائے گا،لہٰذا ان گناہوں کی وجہ سے وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میری امت کا اصل مفلس تو یہ ہے۔اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اس سے بڑھ کر مفلس اور کون ہوسکتا ہے؟ وہ تو یوں سمجھتا ہے کہ مَیں بہت کچھ لے کر جارہا ہوں،لیکن وہاں جاکر پتہ چلا کہ کچھ بھی نہیں ہے،جو کچھ بھی تھا وہ سب ہاتھ سے نکل گیا۔اسی کو نبی کریم ﷺ نے مفلس کہا ہے۔

﴿چرب زبانی سے کسی کا حق ہڑپ کرنے پر وعید﴾

۲۱۹.وعن امِّ سلمة رضی اللہ عنہا أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ:اِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وَاِنَّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ اِلَيَّ، وَلَعَلَّ بَعْضَكُمْ أَنْ يَّكُوْنَ أَلْحَنَ بِحُجَّتِهِ مِنْ بَعْضٍ،فَأَقْضِيَ لَهُ بِنَحْوِ مَا أَسْمَعُ،فَمَنْ قَضَيْتُ لَهُ بِحَقِّ أَخِيْهِ،فَاِنَّمَا أَقْطَعُ لَهُ قِطْعَةً مِّنَ النَّارِ. أَلْحَنَ (اَىْ)أَعْلَمَ.

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں ایک انسان ہوں اور تم میرے پاس نزاع اور جھگڑے لے کر آتے ہو۔اور یہ عین ممکن ہے کہ تم میں

سے کوئی اپنی حجت بیان کرنے میں دوسرے کے مقابلہ میں چرب زبان واقع ہوا ہو، اور مَیں جو سنوں اس کے مطابق اس کے حق میں فیصلہ کردوں، سو مَیں جس کے لئے اس کے بھائی کے حق کا فیصلہ کروں تو سمجھ لو کہ درحقیقت مَیں اس کے لئے آگ کا ایک انگارہ کاٹ رہا ہوں

قصہ دراصل یہ ہوا تھا کہ دو فریق نبی کریم ﷺ کے پاس میراث کا بہت پرانا جھگڑا لے کر آئے، حالانکہ ان میں سے کسی کے پاس بھی اپنے دعوؤں کے سلسلے میں کوئی گواہ نہیں تھا بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً پچاس ساٹھ سو سال پہلے کا دادا اور پردادا کے زمانہ کا وراثتی کا جھگڑا ہو، اور اب پوتوں میں لڑائی ہے؛ تو کون گواہ ہوگا؟ اس لئے کہ بڑے لوگ تو سب مر مرا گئے۔ اسی طرح یہ بھی ایسا ہی ایک جھگڑا تھا جو حضور ﷺ کے پاس آیا تھا۔

ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے کہ کسی کے پاس کوئی گواہ نہیں تھا، سب نے آکر اپنی اپنی باتیں پیش کیں (ابوداؤد، ۳۵۸۵) اور ایسے موقعہ پر عام طور پر جب کوئی شرعی گواہ موجود نہیں ہوتا اور دونوں فریق اپنے دعوے پیش کرتے ہیں تو دونوں کی باتیں سن کر سننے والا اپنی صوابدید سے جس کی بات حق اور درست معلوم ہوتی ہے اس کے مطابق فیصلہ کردیتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس کی بات ٹھیک معلوم ہورہی ہے وہی حق پر بھی ہو، اس لئے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی حق پر ہوتا ہے لیکن وہ اپنی بات عمدہ طریقہ سے پیش نہیں کرسکتا، اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی صحیح صحیح بات دوسرے کو بہتر طور پر بتلا سکے۔ اس کے برخلاف ایک دوسرا آدمی چرب زبان ہے، بولنے کی بڑی اچھی صلاحیت ہے، اپنا جھوٹا دعویٰ بھی سامنے والے کے سامنے ایسے انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ بھی مرعوب ہوجائے، اور یہ سمجھے کہ یہی ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ تو اب ظاہر ہے کہ فیصلہ تو بات سننے پر کیا گیا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات میں کون سی چیز وزن رکھتی ہے، یہ آدمی اپنی سوجھ بوجھ، تجربہ اور

مہارت کی وجہ سے، اپنی چالاکی اور ہوشیاری کی وجہ سے جانتا ہے کہ یہ بات مضبوط ہے، حالانکہ وہ حق پر نہیں ہے لیکن پھر بھی اس نے بات اچھی طریقے سے پیش کردی، اور دوسرا بیچارہ بھولا بھالا ہے اس کو پتہ ہی نہیں کہ کونسا پوائنٹ (POINT) کہنا چاہیے، حالانکہ یہ دوسرا ہی حق پر ہے لیکن وہ اپنے بھولے پن اور بات کے ادا کرنے اور پیش کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے مار کھا گیا۔

جیسا کہ میں نے بتلایا کہ بات پرانی ہونے کی وجہ سے گواہ کسی کے پاس بھی نہیں تھے، تو ان کی بات سن کر آپ ﷺ نے ایک کے حق میں فیصلہ کردیا۔ فیصلہ کے بعد باہر جا کر دونوں فریق پھر سے جھگڑنے لگے، ان کی آواز نبی کریم ﷺ کے گوش مبارک میں پڑی، تو حضور بھی باہر تشریف لے گئے اور اسی موقعہ پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مَیں ایک انسان ہوں اور تم لوگ میرے پاس اپنا جھگڑا لے کر آتے ہو، اور ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی ایک دوسرے کے مقابلہ میں اپنی بات کو اچھے طریقے سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ کیسے انداز میں بات کروں گا تو بات بنے گی اور دوسرا وہ پوائنٹ نہیں سمجھتا۔ اس کی زبان سے جو بات مَیں نے سنی اسی کے مطابق اس کی بات ٹھیک معلوم ہوئی تو مَیں نے فیصلہ کردیا، لیکن دونوں فریق تو جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے، سچا کون ہے اور جھوٹا کون ہے۔ جس نے اپنی بات بناوٹ سے پیش کی وہ بھی جانتا ہے کہ میں جھوٹا ہوں، لیکن بات اس نے اچھی پیش کردی اور دوسرا بیچارہ سچا تھا اور وہ اپنے آپ کو سچا جانتا ہے اور ہے بھی وہی سچا، لیکن بات نہیں پیش کرسکا۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقی حالات سے دونوں واقف ہیں اگرچہ فیصلہ کرنے والا واقف نہ ہو۔

﴿غلط فیصلہ کروا لینے سے دوسرے کی چیز حلال نہیں ہو جاتی﴾

تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگرچہ تمہاری بات سن کر تم میں سے جس نے اپنی بات عمدہ طریقہ سے پیش کی اس کے متعلق مَیں فیصلہ کر دوں اور واقعہ یہ ہے کہ وہ چیز اس کی نہیں ہے، اب وہ یوں سمجھے کہ جب حضور نے میرے حق میں فیصلہ کر دیا، لہٰذا اب تک چاہے وہ چیز میرے لئے حلال نہیں تھی لیکن اب تو شاید حلال ہو جانی چاہیے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے اس فیصلے کی وجہ سے وہ اس غلط فہمی میں نہ رہے اور یوں نہ سمجھے کہ میرے لئے حلال ہوگئی بلکہ مَیں اس کیلئے جہنم کا ایک ٹکڑا کاٹ دے رہا ہوں یعنی اصل مدار تو حقیقت پر ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور ﷺ غیب نہیں جانتے تھے، تبھی تو آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔

بہرحال! یہاں حضور ﷺ نے کتنی اہم بات ارشاد فرمائی کہ کسی مسلمان بھائی کی چیز کو اپنی چرب زبانی سے اپنی بتا کر اپنے حق میں غلط فیصلہ کروا لینے سے دوسرے کی وہ چیز اپنی نہیں بن جاتی۔ اور حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر قیامت تک کے لئے ایک اصول جاری کر دیا کہ حاکم کے پاس اگر کسی معاملہ کا فیصلہ گیا اور حاکم نے فیصلہ صادر کر دیا اور واقعہ یہ ہے کہ جس کے حق میں فیصلہ کیا گیا ہے وہ چیز اس کی نہیں ہے۔ تو حدیث بتلا رہی ہے کہ اس فیصلہ کی وجہ سے وہ چیز اس کی نہیں بن جاتی اور اس کے لئے اس کا لینا درست نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ تو جہنم کا ایک ٹکڑا ہے۔

﴿جیسا آپ کا سوال؛ ویسا ہی مفتی صاحب کا جواب﴾

آج کل یہ چیز عام ہو چکی ہے کہ آپس کا کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو لوگ مفتیوں سے فتویٰ

پوچھتے ہیں اور سوال کو ترتیب دینے والے خود وہی ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک سوال کسی مفتی کو دیا تو جو حقیقت آپ نے پیش کی ہے، مفتی تو جانتا نہیں ہے کہ اصل معاملہ کیا ہے، اس کے سامنے تو آپ کے سوال کا کاغذ رکھا ہوا ہے، لہٰذا آپ نے تحریر میں جو حقائق پیش کئے ہیں انہیں کو سامنے رکھ کر وہ جواب دے گا۔ اگر آپ نے صحیح بات پیش کی ہے تو جواب صحیح ملے گا، اور اگر غلط بات پیش کی ہے تو جواب تو اسی بات پر موقوف ہے۔ اب جو لوگ غلط حقائق پیش کر کے جواب حاصل کرتے ہیں اور پھر سامنے والے فریق کو یوں کہتے ہیں دیکھو! مفتی صاحب کا فتویٰ یہ ہے۔ تو مَیں کہتا ہوں کہ یہ مفتی صاحب کا فتویٰ نہیں ہے، بلکہ یہ تو آپ کا خود کا ہی فتویٰ ہے، اس لئے کہ جو جواب ہے وہ تو آپ کے سوال ہی کا ہے، جیسا آپ کا سوال تھا؛ ویسا ہی مفتی صاحب کا جواب ہے۔

جیسے زید یوں کہتا ہے کہ مَیں نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی ہے تو مفتی صاحب کہیں گے کہ بیوی حرام ہوگئی۔ اور اگر اس نے طلاق تو تین دی ہیں اور مفتی صاحب کو یوں کہتا ہے کہ مَیں نے ایک ہی طلاق دی ہے، تو جواب میں مفتی صاحب کہتے ہیں کہ ایک پڑ گئی، اگر آپ عدت میں رجوع کرنا چاہو تو کر سکتے ہو، اگر عدت میں رجوع کر لو گے تو وہ تمہاری بیوی باقی رہے گی۔ اب وہ لوگوں کو یوں بتلائے کہ دیکھو! فتویٰ میں آیا ہے اس لئے مَیں رجوع کر سکتا ہوں اور یہ میری بیوی ہے۔ تو یہاں سب یہی کہیں گے کہ ارے بھائی! فتویٰ میں یہ جواب اس لئے آیا کہ تم نے یوں ہی لکھا تھا کہ ایک طلاق دی ہے۔

کسی مفتی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں

بعض مرتبہ لوگ آ کر یوں کہتے ہیں کہ آپ نے ایسا جواب دیا۔ تو مَیں مفتیوں کیلئے

ایک اصول بتلاتا ہوں کہ آپ ان سے کہو کہ بھائی دیکھو! کوئی بھی فتویٰ لے کر آپ کے سامنے آئے تو اس کا جواب بعد میں دیکھنا، پہلے سوال دیکھو۔ سوال کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ برابر دیکھو، جواب کی فکر میں مت رہو، پہلے سوال دیکھو۔ سوال ٹھیک ہے اور واقعہ کے مطابق ہے تو پھر اب آپ جواب کو دیکھو، کسی مفتی کو برا بھلا کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوال ہی آپ کو بتلا دے گا، آگے جواب میں جانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی اور آپ کو فتویٰ کے انکار کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ آپ کو تو سیدھے یوں ہی کہنا ہے کہ آپ نے سوال غلط کیا ہے، اس لئے جو جواب ہے وہ حقیقت کے خلاف ہے۔

آج کل ہمارے معاشرے اور سماج میں یہی ہوتا ہے، لوگ اپنے معاملات میں اس طرح کرتے ہیں کہ اِدھر سے ایک نے فتوی منگوایا اور اُدھر سے دوسرا فتوی منگوایا۔ اب جس نے جیسا لکھا اس کے مطابق اس کو فتویٰ ملا۔ پھر لوگوں کو بتلایا کہ دیکھو یہ مفتی لوگ کیسے ہیں، اِدھر سے یہ فتوی دیا اور اُدھر سے یہ فتوی دیا۔ آخر میں گالی تو مفتی کے نام ہی جاتی ہے۔ حالانکہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ سوال کیسا ہے۔ جیسا سوال ہے اسی کے مطابق جواب ہے۔

نزاعی معاملات میں قابلِ تقلید طرزِ عمل

ہمارے پاس اس طرح کا کوئی سوال آتا ہے تو اب ہم یہ کرتے ہیں کہ جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ جھگڑا کن کن لوگوں میں ہے، وہاں تک اس کا جواب ہی نہیں دیتے۔ جب دوسرے فریق کی طرف سے سوال آتا ہے تو پھر ہم یہ کہتے ہیں اس سلسلے میں پہلے فریق نے یہ سوال کیا تھا، ابھی تو نقل بھی نہیں کیا ہے، اب معلوم ہوا کہ آپ بھی پوچھ رہے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ کچھ جھگڑے کا مسئلہ ہے، لہٰذا اب آپ کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ دونوں فریق مل کر سوال تیار کر و اور پہلے سے طے کر لو کہ جو جواب آئے گا اس پر ہم دونوں عمل کریں گے؛

تب ہی ہم جواب دیں گے۔اس طرح جھگڑا ختم ہوجائے گا۔باقی آپ جواب منگوار ہے ہیں، اگر آپ کو جواب دے دیا گیا تو ہمارا یہ فتویٰ آپ کا جھگڑا ختم نہیں کرے گا۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جھگڑے میں ایک فریق نے فتویٰ منگوایا اب دوسرا فریق بھی فتویٰ منگوائے گا، تواب یہ فتویٰ تیل چھڑ کنے کا کام کرے گا۔ یعنی یہ فتویٰ جھگڑا ختم نہیں کرے گا بلکہ اور بڑھائے گا۔ پہلا کہے گا میرے پاس فتویٰ ہے، تو دوسرا کہے گا کہ میرے پاس بھی فتویٰ ہے۔ پہلا کہے گا کہ مَیں راندیر سے لایا ہوں تو دوسرا کہے گا کہ مَیں ڈابھیل سے لایا ہوں۔ایک کہے گا کہ مَیں بھروچ سے لایا ہوں تو دوسرا کہے گا کہ مَیں ترکیسر سے لایا ہوں۔اس طرح یہ جھگڑا چلتا ہی رہے گا اور کبھی ختم نہیں ہوگا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ فتوؤں کا حال بھی یہی ہے۔لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس طرح غلط سلط باتیں بنا کر فتویٰ پوچھ لیا اور جواب حاصل کرلیا تو یہ چیز ہمارے لئے حلال ہوگئی۔تو ان کو سمجھ لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ وہ چیز ان کے لئے حلال نہیں ہوتی۔جیسے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں نے فیصلہ کردیا تو میرے فیصلے کی وجہ سے یوں مت سمجھنا کہ وہ چیز اس کی ہوگئی، بلکہ مَیں تو اس کو جہنم کا ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔جب حضور ﷺ نے اپنے متعلق یہ ارشاد فرمایا تو پھر مفتیوں کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اس پر مَیں تو کہتا ہوں کہ مفتی کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ صرف ایک ٹکڑا کاٹ کر نہیں دے رہا ہے بلکہ پوری جہنم ہی دے رہا ہے۔

﴿......جب تک کہ حرام خون کا مرتکب نہ ہو﴾

۲۲۰ .وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :لَنْ یَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِیْ فُسْحَۃٍ مِّنْ دِیْنِہٖ مَالَمْ یُصِبْ دَماً حَرَاماً. (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مومن اپنے دین

کے بارے میں بڑی کشادگی رکھتا ہے جب تک کہ حرام خون کا مرتکب نہ ہو جائے، یعنی جب تک کہ کسی کو قتل نہیں کیا وہاں تک اس کے دوسرے گناہ معاف ہونے کی پوری امید ہے، لیکن جہاں کسی کو قتل کیا تو اس کا معاملہ پھنس جاتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے جب کوئی آدمی کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے تو اس کے لئے لکھ دیا جاتا ہے کہ اب اس کے لئے توبہ کا دروازہ بند ہے، اس کے لئے مہر لگ گئی (المعجم الکبیر،۱۲۳۱۴) یہ بہت سخت وعید ہے۔ کسی مسلمان کا قتل اتنا سخت گناہ ہے کہ کفر کے بعد کسی گناہ پر اتنی سخت وعید نہیں ہے۔

﴿اللہ تعالیٰ کے مال میں بے جا تصرفات پر وعید﴾

۲۲۱. وعن خولة بنت عامر الانصارية وهي أمرأة حمزة رضی اللہ عنہ قالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ رِجَالاً يَتَخَوَّضُوْنَ فِيْ مَالِ اللهِ بِغَيْرِ حَقٍّ؛ فَلَهُمُ النَّارُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

حضرت خولہ بنت عامر جو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی زوجہ ہیں وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کے بعض مال میں ناحق طریقہ پر تصرف کرتے ہیں ان کے لئے قیامت کے دن جہنم ہے۔

جو چیزیں عام امانت کی سمجھی جاتی ہیں جیسے مسجد اور مدرسہ کا کاروبار اور عوام المسلمین کے جتنے بھی بیت المال ہیں؛ یہ سب اللہ کے مال میں شمار ہوتا ہے۔ تو جو لوگ ایسے اموال میں ناحق تصرف کرتے ہیں یعنی جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں نہیں کرتے، یا جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے وہاں کرتے ہیں، یہ سب ناحق تصرف ہے؛ تو ان کے لئے قیامت کے دن جہنم ہے۔ یہ بھی چونکہ اجتماعی مال ہے، اس لئے اس میں اتنی سخت وعید آئی ہے۔ یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو لوگوں کے حقوق سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس باب میں جتنی بھی روایتیں آئی ہیں ان سب کا خلاصہ یہی ہے کہ بندے کا کوئی بھی حق ہو، چاہے اس کا تعلق اس کی جان سے ہو یعنی اس کو مارا پیٹا اور اس کا کوئی عضو کاٹ دیا یا اس کا تعلق مال سے ہو جیسے کسی کی کوئی چیز دبالی۔ یا اس کی عزت وآبرو سے ہو جیسے کسی کو گالی دی، کسی کی غیبت کی، کسی پر تہمت لگائی؛ یہ سب حق ایسے ہیں کہ جب تک صاحب حق سے معافی نہ مانگ لے، یا اس سے معاملہ صاف نہ کرلے؛ وہاں تک معافی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اوپر آیا کہ شہادت جیسا بڑا عمل بھی ان گناہوں کو معاف نہیں کرا سکتا ہے۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں ان چیزوں کا اہتمام نصیب فرمائے

دُعاء

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، اے اللہ! جو اس طوفان سے متاثر ہوئے ہیں ان مرحومین کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! جو بیمار ہیں انہیں صحت عطا فرما۔ اے اللہ! جتنے بھی تیرے بندے مصیبت زدہ ہیں اپنے فضل وکرم سے ان کی مصیبتوں کو دور فرما۔ اے اللہ! جن کے نقصانات ہوئے ہیں اپنے خزانہ غیب سے پورے فرما۔ اے اللہ! بیماروں کو صحتِ عاجلہ کاملہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتوں کو پورا فرما۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر اور بھلائی مانگی ہے وہ ہم سب کو عطا فرما اور جن چیزوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما

تَعْظِيمُ حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِينَ
وَبَيَانِ حُقُوقِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ وَرَحْمَتِهِمْ

مسلمانوں کی عزتوں کا احترام
اور ان کے حقوق کا بیان
اور ان کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنا

مجلس ﴿۱﴾

۲/ربیع الاول ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۷/جون ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ أما بعد:—

فأعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم.

قال اللہ تعالیٰ: وَمَن یُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ (الحج ۳۰)

وقال تعالیٰ: وَمَن یُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (الحج ۳۲)

وقال تعالیٰ: وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ (الحجر ۸۸)

وقال تعالیٰ: وَمَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَیْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِی الْأَرْضِ فَکَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا، وَمَنْ أَحْیَاھَا فَکَأَنَّمَا أَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا (المائدۃ ۳۲)

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے ﴿تَعْظِیْم حُرُمَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ وَبَیَانِ حُقُوْقِھِمْ وَالشَّفْقَۃِ عَلَیْھِمْ وَرَحْمَتِھِمْ﴾ ”حُرُمَات“ ”حُرْمَۃٌ“ کی جمع ہے۔ حرمۃ کا مطلب ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جس کا احترام کرنے کا حکم دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جن چیزوں کے احترام کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا لحاظ کرنا اور ان کے حقوق کو ادا کرنا اور مسلمانوں کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آنے کی کیا اہمیت ہے؛ وہ اس باب میں بتلاتے ہیں۔

اس سلسلے میں پہلے آیت لائے ہیں ﴿وَمَن یُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ﴾

لفظ حرمات اپنے اندر بڑا عام مفہوم رکھتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے، اور اللہ تبارک تعالیٰ نے جن چیزوں کی حرمت اور احترام کو ملحوظ رکھنے کا حکم دیا ہے اس پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں ان کی جو آدمی تعظیم کرتا ہے، ان کا لحاظ رکھتا ہے، ان کا ادب کرتا ہے اور ان کے حدود کی رعایت کرتا ہے؛ تو اس کا یہ طریقۂ عمل اور روش اللہ تعالیٰ کے یہاں بھلائی اور خیر کا درجہ رکھتی ہے اور اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں ملے گا۔

﴿شعائر اللہ کی تعظیم تقویٰ کی علامت ہے﴾

دوسری آیت پیش کی ہے ﴿وَمَن يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوىٰ الْقُلُوْبِ﴾ ”شعائر“ ”شعیرة“ کی جمع ہے، ”شعیرة“ اصل تو علامت کو کہتے ہیں، لیکن ہر علامت کے لئے یہ نہیں بولا جاتا بلکہ کوئی مخصوص علامت جو کسی قوم یا مذہب کے لئے امتیازی حیثیت رکھتی ہو کہ اس علامت کے ذریعہ وہ قوم پہچانی جاتی ہو؛ تو ایسی علامت کے لئے لفظِ ”شعیرة“ بولا جاتا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن چیزوں کو دین کی علامت کی حیثیت قرار دی ہے جیسے بیت اللہ، کتاب اللہ ہے، اور کچھ احکام بھی ایسے ہیں جیسے اذان ہے اور اسی طرح کچھ چیزیں ہیں جو اسلام کے ساتھ خصوصی تعلق رکھتی ہیں اور جو دین کا شعار اور دین کی خصوصی علامت سمجھی جاتی ہے، جسے گجراتی میں (ઓળખ ચિન્હ) کہتے ہیں یعنی جس کے ذریعہ وہ قوم پہچانی جاتی ہے اور وہ مذہب پہچانا جاتا ہے، اب چاہے اس کا تعلق دین پر عمل کی جانی والی چیزوں سے ہو یا اور دوسری چیزوں سے ہو، مثلاً ختنہ بھی دین کا شعار ہے کہ اس کے ذریعہ بھی مسلمان کی پہچان قائم ہے۔ اذان کو بھی شعار قرار دیا ہے۔ ایسے ہی بیت اللہ کو بھی دین کا

شعار قرار دیا ہے، اور ایسی تمام چیزیں اس میں آجاتی ہیں جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی شریعت پر عمل کے لئے علامت قرار دیا ہے۔ تو جو آدمی اس کی تعظیم کرتا ہے، اس کے ادب کا لحاظ کرتا ہے، اس کی اہمیت کو ملحوظ رکھتا ہے؛ تو یہ اس کے دل کے تقویٰ کی علامت ہے۔ یعنی جس کے دل میں صفتِ تقویٰ موجود ہے اس کی یہ علامت ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے شعائر کے احترام کو وہ بجالاتا ہے اور اس کی تعظیم کرتا ہے۔

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہاں نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا کہ آپ اپنا پہلو مومنین کے واسطے جھکائے رکھئے یعنی ایمان والوں کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کیجیے اور ان کے ساتھ تواضع اور نرمی سے پیش آیئے گویا نبی کریم ﷺ کو خصوصیت کے ساتھ تاکیدی حکم دیا جارہا ہے۔

﴿......یہ پوری انسانیت کا قتل ہے﴾

﴿وَمَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا، وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا﴾ اگر کوئی آدمی کسی جان کو بغیر کسی جان کے بدلہ میں قتل کرے، یعنی شریعت نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی نے کسی کو ناحق قتل کیا ہے تو اس جرم کی پاداش میں قصاص کے طور تو قاتل کو مقتول کے بدلہ میں قتل کیا جائے گا، اس طرح اگر قتل کیا جارہا ہے تب تو ٹھیک ہے۔

﴿أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ﴾ یا زمین میں کسی قسم کا فساد اور نقصان پھیلائے بغیر کسی کی جان لیتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی قتل وغارت گری کا ارتکاب کرتا ہے، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کرتا ہے تو یہ بھی ایک طرح کا فساد ہی ہے اور ڈاکہ زنی کے بدلہ میں اسلام کے

اندر قتل کی سزا ہے۔

یا کوئی آدمی ارتداد اختیار کرتا ہے یعنی دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد اس کو چھوڑ دیتا ہے؛ تو اس کو بھی فساد کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اگر ایسی بات نہیں ہے یعنی کسی نے کسی کی جان بھی نہیں لی اور کسی طرح کا فساد بھی نہیں پھیلایا؛ پھر بھی کوئی آدمی کسی کی جان ناحق طریقہ سے لیتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ﴿فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا۔اور یہ اس لئے کہ گناہ اور سزا کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے،جس طرح کسی ایک آدمی کے قتل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں جو سزا مقرر ہے؛ تمام لوگوں کے قتل پر بھی وہی سزا ہے۔اور جس طرح تمام انسانوں کا قتل کرنا اللہ تعالیٰ کے یہاں جرم ہے ؛ویسے ہی ایک انسان کا قتل کرنا بھی جرم ہی ہے۔اور جب آدمی ایک جان کو ناحق قتل کرنے کی جرأت کرتا ہے تو وہ اپنے اس طرزِ عمل سے دوسرے لوگوں کو ایسی حرکت کرنے کے لئے آمادہ کررہا ہے،یعنی اس نے ایک جان کو ناحق قتل کر کے ایک غلط طریقہ لوگوں کے اندر جاری کردیا،اب اور لوگوں کو بھی جرأت ہوگی اور ان کی ہمت بھی کھلے گی۔

﴿کسی ایک کی بیجا جرأت دوسروں کو حوصلہ بخشتی ہے﴾

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جو دوسرے لوگ نہیں کرسکتے ہیں،حالانکہ ان لوگوں کے دلوں میں بھی تقاضے ضرور ہوتے ہیں لیکن اس طرح کا ماحول بنا ہوا ہے یا معاشرہ کے اندر اس طرح کا ضابطہ ہے جس کی وجہ سے ان لوگوں کی جرأت نہیں ہوتی،لیکن جب ایک آدمی بیجا جراءت کا ارتکاب کرتے ہوئے اس غلط کام کو انجام دے

دیتا ہے تو پھر دوسروں کے لئے بھی راستہ کھل جاتا ہے۔تو یہاں بھی ایک جان کے قتل کرنے کو کئی جانوں اور تمام انسانوں کے قتل کے برابر اسی لئے قرار دیا کہ اس نے ناحق قتل کر کے ایسے لوگوں کو جرأت و ہمت بخشی اور حوصلہ دیا، دوسرے لوگوں کو قتل کرنے کی راہ ہموار کر دی، اس لئے اس کو ﴿فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ سے تعبیر کیا ہے۔

جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا﴾ جو آدمی کوئی غلط طریقہ جاری کرے گا تو اس پر اس کا وبال ہے اور آئندہ اس غلط طریقہ کو جتنے بھی لوگ اختیار کریں گے ان تمام لوگوں کا گناہ اس کو بھی ہوگا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب دنیا کے اندر کوئی ناحق قتل کا کیس وجود میں آتا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے قابیل جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوتا ہے، اس لئے کہ اسی نے ناحق قتل کا طریقہ دنیا میں جاری کیا۔ (بخاری شریف، ۶۸۶۷) اس لئے اس کو ﴿فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ سے تعبیر کیا۔

ویسے اس آیت سے پہلے کی آیتوں میں حضرت آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا اسی قصہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ آیت آتی ہے۔

﴿......اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی﴾

﴿وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيعًا﴾ اور جس نے کسی جان کو زندہ کیا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندگی بخشی۔اس کا مطلب یہ ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے بخاری میں اس کی تفسیر میں منقول ہے ﴿مَنْ أَحْيَاهَا اى مَنْ حَرَّمَ قَتْلَهَا (بخاری شریف، ۶۸۶۷)﴾ یعنی جو آدمی ناحق قتل کو حرام سمجھے۔ظاہر ہے کہ جو حرام سمجھے گا وہ اسی حرمت کا لحاظ کرتے

ہوئے ناحق قتل کا ارتکاب بھی نہیں کرے گا۔گویا اس نے حرام سمجھ کر اس سے اپنے آپ کو بچایا، تو اپنے اس طرزِ عمل اور اپنی اس روش سے اس نے تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

یا دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح سے اپنے آپ کو غلط طریقہ سے روک کر ناحق قتل کا جو راستہ کھل رہا تھا اس کو کھلنے کا موقعہ نہیں دیا، اگر خدانخواستہ یہ غلط حرکت کرڈالتا اور ناحق قتل کا مرتکب بنتا تو اس کی یہ حرکت دوسروں کے لئے بھی راہ کھولتی، اور دوسروں کی جان جانے کا ذریعہ بنتی، لیکن اس نے ناحق قتل کو حرام سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے روک کر تمام لوگوں کی جان بچائی، اسی کو ﴿مَنْ أَحْيَاهَا﴾ سے تعبیر کیا ہے۔ ورنہ زندہ کرنا کسی انسان کے بس کی چیز نہیں ہے۔

اسی حدیث کا دوسرا جزو ہے ﴿مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا﴾ کوئی آدمی اچھا طریقہ دنیا کے اندر جاری کرے تو اس پر اس کو ثواب ملے گا اور آئندہ اس طریقہ پر جتنے لوگ بھی عمل پیرا ہوں گے، ان کے ثواب میں بھی اس کا برابر حصہ رہے گا۔
(صحیح مسلم، ۲۳۹۸)

﴿ مؤمنین باہم ایک عمارت کے مانند ہیں ﴾

۲۲۲. وعن أبی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهَا بَعْضًا. وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ.

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے دیوار جیسا ہے، جیسے دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کے لئے تقویت کا باعث ہوتی ہے، اگر آپ ایک اینٹ کو بیچ سے نکال لیں تو اس کی وجہ سے اس کے قریب والی اینٹ ڈھیلی پڑجائے گی اور اس کا اثر دھیرے دھیرے دوسری اینٹوں کو پہنچے گا،

تو ایک اینٹ کا نکلنا باقی تمام اینٹوں کی کمزوری کا باعث ہے، یہ ایک اینٹ دوسری تمام اینٹوں کو تھامے ہوئے ہے اور ایک دوسرے کی تقویت کا ذریعہ ہے، اسی طریقہ سے مومنین کا حال ہوا کرتا ہے کہ ہر مؤمن دینی اعتبار سے بھی اور دنیوی اعتبار سے بھی اپنے دوسرے تمام مؤمن بھائیوں کے لئے تقویت، تائید اور مدد کا ذریعہ ہوتا ہے۔

﴿وَشَبَّکَ بَیْنَ أَصَابِعِهٖ﴾ یہ ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ نے اپنی انگلیوں میں تشبیک دی یعنی انگلیوں کو انگلیوں میں داخل کیا۔ اس بات کو سمجھانے کے لئے ایک ظاہری مثال دی کہ اس طرح اینٹیں ایک دوسرے میں داخل کر کے دیوار تعمیر کی جاتی ہے۔

﴿نادانستہ طور پر پہنچنے والی تکلیف سے بچانے کا اہتمام﴾

۲۲۳۔ وعنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ مَرَّ فِیْ شَیْءٍ مِنْ مَسَاجِدِنَا أَوْ أَسْوَاقِنَا وَمَعَهٗ نَبْلٌ. فَلْیُمْسِکْ، أَوْلِیَقْبِضْ عَلیٰ نِصَالِهَا بِکَفِّهٖ أَنْ یُّصِیْبَ أَحَدًا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْهَا بِشَیْءٍ.

اس روایت کو پیش کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی جان کی تو اپنی جگہ پر بڑی قیمت ہے ہی، لیکن کسی مسلمان کو نادانستہ طور پر معمولی تکلیف بھی پہنچنے نہ پائے، اس کا بھی نبی کریم ﷺ نے کتنا زیادہ اہتمام فرمایا ہے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی ہماری مسجد یا بازار سے۔ یعنی کسی ایسی جگہ سے جہاں لوگوں کا مجمع ہو۔ تیروں کو لے کر گذرے۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ تیر میں نیچے لکڑی ہوتی ہے اور اوپر لوہے کا نوک دار حصہ ہوتا ہے جس کو گجراتی میں (ભાલો) کہتے ہیں۔ جس طرح چاقو میں لکڑی کا ایک دستہ ہوتا ہے اور آگے لوہے کا دھار دار حصہ ہوتا ہے، اس کو چاقو کا پھل کہا جاتا ہے۔ اور تیر میں بھی نیچے لکڑی

ہوتی ہے اور اس کے اوپر لوہے کا نوکیلا حصہ لگا ہوا ہوتا ہے، اس کو پھل کہا جاتا ہے۔

تو اُس زمانہ میں لوگ تیر اور کمان اپنے پاس رکھتے ہی تھے، اور جب بازار کھلا ہوا ہو اور کوئی آدمی مجمع میں سے اس طرح کھلے ہوئے تیر لے کر گذرے تو وہاں احتمال موجود ہے کہ بے خبری میں اس کے تیر کسی کو لگ جائے۔ اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی مساجد یا بازاروں میں سے گذرے اور اس کے پاس تیر ہوں، تو وہ تیروں کے پھلوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ لے، کھلے ہوئے نہ رکھے۔ یعنی پھل والا حصہ ہاتھ میں رکھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی مسلمان کو نادانستہ طور پر لگ جائے اور اس سے اس کے جسم کو خراش ہو جائے اور وہ زخمی ہو جائے، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ چاہے اس کو نہ لگے، لیکن اس کو کھلا ہوا دیکھ کر سامنے والا ڈر اور خوف سا محسوس کرتا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا ہم ان کے قریب سے کھلے تیر لے کر گذریں گے تو یہ نادانستہ طور پر خوف دلانے کا ذریعہ بنے گا، اس سے بھی نبی کریم ﷺ نے منع کیا ہے۔ گویا ایک مسلمان کا اتنا زیادہ حق ہے۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو لوگ دانستہ اور جان بوجھ کر اور ان کو اس بات سے منع کرنے کے باوجود کہ تمہاری اس حرکت سے لوگوں کو ایذا اور تکلیف پہنچ رہی ہے؛ پھر بھی تکلیف پہنچاتے ہیں، تو یہ تو اور زیادہ قبیح اور بری حرکت سمجھی جائے گی۔ اس لئے اس سے تو بہت ہی زیادہ بچنا ضروری ہے۔

مسلمان ایک جسم کے مختلف اعضاء کی طرح ہیں

۲۲۴۔ وعن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ وَتَرَاحُمِهِمْ وتَعَاطُفِهِمْ مَثَلُ الْجَسَدِ، اِذَااشْتَكٰى مِنْهُ عُضْوٌ تَدَاعىٰ لَهٗ سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى. (متفق علیہ)

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کی مثال آپس میں محبت اور آپس میں ایک دوسرے کی ہمدردی کے اندر ایک جسم کی سی ہے کہ جسم کا ایک عضو بیمار ہوتا ہے تو تمام جسم بخار اور بیداری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے پورے جسم میں کان الگ عضو ہے، ناک الگ عضو ہے، آنکھ الگ عضو ہے، دانت الگ عضو ہے، اسی طرح تمام اعضاء اپنی اپنی جگہ پر ہیں، مختلف اعضاء کے مجموعہ سے ہمارا یہ جسم تیار ہوا ہے، لیکن ان اعضاء کے مختلف ہونے کے باوجود ایک جسم میں پائے جانے والے ان اعضاء میں آپس کا جوڑ اور تعلق ایسا ہے کہ اگر آپ کی انگلی کے اندر زخم لگا اور پک کر اس میں پیپ ہو گیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رات کو پورا جسم تکلیف محسوس کرے گا، پورا جسم بخار میں مبتلا رہے گا، پورا جسم بیدار رہے گا اور نیند نہیں آئے گی۔ کبھی آنکھ ایسی بات نہیں کرے گی کہ تکلیف تو انگلی میں ہے، اور وہ تو مجھ سے بہت دور ہے، مجھے اس سے کیا تعلق؟ مَیں تو آرام سے سوتی ہوں۔ اسی طرح آدمی کا پیر کبھی یہ نہیں سوچتا کہ انگلی کے کونے میں تکلیف ہے تو مجھے کیا؟ بلکہ اس کی وجہ سے پورے جسم میں بخار آجاتا ہے اور اسی زخم کی وجہ سے پورا جسم بیدار رہتا ہے اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔

تو دیکھو! ایک جسم میں پائے جانے والے مختلف اعضاء میں سے ہر ایک کا کام اپنی اپنی جگہ پر الگ الگ ہے، اس کے باوجود ایک جسم میں ہونے کی وجہ سے ان میں آپس میں ایسا جوڑ اور تعلق ہے کہ کسی چھوٹے سے چھوٹے عضو کو اگر تکلیف ہو جائے تو بڑے سے بڑا عضو بھی اس کیلئے بے چین ہو جاتا ہے، پورا جسم بخار اور بیداری میں مبتلا رہتا ہے، پورے جسم کو نیند نہیں آتی، اور بخار کا اثر پورے جسم پر ہوتا ہے، بے چینی پورے جسم پر طاری ہوتی ہے

اسی طرح سے اہلِ ایمان جتنے بھی ہیں یوں سمجھئے کہ ایمان اور اسلام کی نسبت نے ان سب کو ایک جسم جیسا بنادیا ہے، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں آپس میں اسی طرح تعلق و محبت اور ایک دوسرے پر شفقت و مودّت کا اتنا غلبہ ہونا چاہیے کہ جیسے ایک جسم کے کسی چھوٹے سے عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس کے لئے بیدار رہتا ہے۔اسی طرح کوئی مؤمن چاہے کتنا ہی دور رہتا ہو، اس کے باوجود اس کو اگر تکلیف پہنچے تو ایمانی تعلق، ایمانی نسبت اور ایمانی رشتہ کا تقاضہ یہ ہے کہ دوسرے مؤمن کو دل میں وہی کسک محسوس کرنی چاہیے، یعنی اس کو دکھ پہنچا تو گویا ہمیں ہی دکھ پہنچا، اور اس کے اس دکھ کو دور کرنے کے لئے جو سعی ہوسکتی ہو اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں رکھنی چاہیے۔تمام مؤمنین کا آپس میں ایسا ہی تعلق ہونا چاہیے۔

جذبۂ رحم کا تقاضہ

۲۲۵. وعن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قَبَّلَ النَّبِیُّ ﷺ الْحَسَنَ بْنَ عَلِیٍّ رضی اللہ عنهما، وَعِنْدَهُ الْأَقْرَعُ بْنُ حَابِسٍ، فَقَالَ الْأَقْرَعُ: اِنَّ لِیْ عَشَرَةً مِنَ الْوَلَدِ؛ مَاقَبَّلْتُ مِنْهُمْ أَحداً. فَنظَرَاِلَیْهِ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: مَنْ لا یَرْحَمُ لا یُرْحَمُ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے نواسے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا۔حضرت حسن چھوٹے تھے اور حضور ﷺ کو بڑے محبوب تھے۔جیسا کہ روایت آرہی ہے جس میں حضور ﷺ نے ان کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار فرمایا ہے۔تو حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ان کو بوسہ دیا۔بچوں کو بوسہ دیا ہی جاتا ہے۔اس وقت حضور ﷺ کے پاس دیہات کے رہنے والے ایک صحابی اقرع بن حابس موجود تھے، قبیلہ بنو تمیم سے ان کا تعلق ہے۔جب حضور ﷺ نے حضرت حسن کو بوسہ دیا تو یہ دیکھ کر انہوں نے کہا کہ میرے

دس بچے ہیں لیکن آج تک میں نے کسی ایک کو بھی بوسہ نہیں دیا اور آپ بوسہ دے رہے ہیں؟ گویا ان کو نبی کریم ﷺ کے اس طرز پر تعجب ہو رہا تھا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ لَّا یَرْحَمُ لَا یُرْحَمُ﴾ میں بچے کو جو بوسہ دے رہا ہوں یہ میرے دل میں رکھے ہوئے جذبۂ رحم کا تقاضہ ہے، اور جو آدمی کسی کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا؛ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اور لوگوں کی طرف سے بھی اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ بھی محبت وشفقت، ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ کیا جائے تو آپ بھی لوگوں کے ساتھ شفقت ومحبت، ہمدردی اور خیر خواہی کا معاملہ کیجیے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ چاہیں کہ لوگ آپ کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کریں اور آپ کسی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ نہ کریں۔

﴿تطفیف ہر چیز میں ہوا کرتی ہے﴾

ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے قرانِ پاک میں وعید سنائی گئی ہے ﴿وَیْلٌ لِّلْمُطَفِّفِیْنَ. اَلَّذِیْنَ اِذَا اکْتَالُوْا عَلَی النَّاسِ یَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا کَالُوْھُمْ اَوْوَّزَنُوْھُمْ یُخْسِرُوْنَ﴾ ان کی طبیعت اور مزاج یہ ہے کہ لوگوں سے جب وصول کرنے کا وقت آتا ہے تو پورے پورا وصول کرتے ہیں، اور جب دینے کا وقت آتا ہے تو گھٹا کر اور کم کر کے دیتے ہیں۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں ﴿لِکُلِّ شَیْءٍ وَفَاءٌ وَتَطْفِیْفٌ (موطا امام مالک،۲۲)﴾ تطفیف صرف ناپ تول میں نہیں ہوا کرتی کہ جو دکان لے کر بیٹھا ہے وہی کرتا ہے بلکہ تطفیف ہر چیز میں ہوا کرتی ہے۔ اس لئے آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ محبت اور شفقت کا معاملہ کیا جائے، آپ مصیبت میں گرفتار ہوں تو لوگ ہمدردی کریں، تو آپ کو بھی چاہیے کہ کوئی دوسرا جب مصیبت میں گرفتار ہو تو آپ بھی اس کے ساتھ ہمدردی اور شفقت کا معاملہ کیجئے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ

آپ تو مصیبت آنے پر یہ چاہتے ہوں کہ لوگ ہماری مدد کریں، ہمارے ساتھ شفقت کا معاملہ کریں اور لوگوں پر جب مصیبت آرہی ہے تو آپ ان پر نہ دھیان دے رہے ہیں، اور نہ ان کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ کرتے ہیں ﴿مَنْ لا یَرْحَمْ لا یُرْحَمْ﴾ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے امت کو یہ تعلیم دی کہ یہ جذبۂ رحمت آپ کے دل میں ہر مؤمن کے لئے ہونا چاہیے اور اس جذبۂ رحمت کا ظہور موقع بموقع ہوتے رہنا چاہیے۔

چھوٹی اولاد جب بھی سامنے آئے گی تو وہ چھوٹی ہے اس وجہ سے جذبۂ رحمت جوش مارتا ہے اور آدمی اس کو گود میں اٹھالیتا ہے، اس کو بوسہ دیتا ہے اور چومتا ہے، تو نبی کریم ﷺ نے حضرت حسن کے ساتھ یہ معاملہ کیا، گویا آپ فرمارہے ہیں کہ یہ اسی جذبۂ رحمت کا تقاضہ تھا اور یہ ہر مؤمن میں ہونا چاہیے اور جس میں نہیں ہے اس کو اپنی خیر منانا چاہیے، اس کو چاہیے کہ اس جذبہ کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

﴿جذبۂ رحمت اگر تمہارے دل میں نہیں؛ تو میں کیا کروں؟﴾

۲۲۶۔ وعن عائشةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَدِمَ نَاسٌ مِنَ الْأَعْرَابِ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ فَقَالُوْا: أَتُقَبِّلُوْنَ صِبْیَانَکُمْ؟ فَقَالَ: نَعَمْ. قَالُوْا: لٰکِنَّا وَاللّٰہِ مَا نُقَبِّلُ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: أَوَ أَمْلِکُ اِنْ کَانَ اللّٰہُ نَزَعَ مِنْ قُلُوْبِکُمُ الرَّحْمَةَ؟ (متفق علیہ)

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ دیہات کے رہنے والے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور پوچھا کہ تم اپنے بچوں کو بوسہ دیتے ہو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ تو انہوں نے کہا: اللہ کی قسم! ہم تو کبھی اپنے بچوں کو بوسہ نہیں دیتے۔ کیونکہ عام طور پر دیہات کے رہنے والوں کے اندر اکھڑپنا ہوتا ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿مَنْ

سَکَنَ الْبَادِیَةَ جَفَا﴾ جو دیہات میں رہتا ہے اس کی طبیعت میں اکھڑ پن، درشتگی اور سختی ہوتی ہے۔ اس کا یہ اثر ہے کہ وہ کہتے ہیں اللہ کی قسم! ہم تو بوسہ نہیں دیتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ﴿أَوَأَمْلِکُ اِنْ کَانَ اللّٰہُ نَزَعَ مِنْ قُلُوْبِکُمُ الرَّحْمَةَ؟﴾ اللہ تعالیٰ نے جب تمہارے اندر سے جذبۂ رحمت نکال دیا ہے تو پھر میرے بس کی چیز نہیں ہے، مَیں کہاں سے لاکر دے سکتا ہوں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کی چیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ یہ معاملہ کرنا جذبۂ رحمت کا تقاضہ ہے، اگر وہ تمہارے دل میں نہیں؛ تو مَیں کیا کروں؟ میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بہرحال! نبی کریم ﷺ کی طرف سے خاص طور پر یہ چیز قابلِ تنبیہ ہے۔

﴿جذبۂ رحمت کا ظہور موقعہ بموقعہ ہوتا رہنا چاہیے﴾

باب کا عنوان قائم کیا تھا ﴿وَبَیَانِ حُقُوْقِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَیْهِمْ وَرَحْمَتِهِمْ﴾ جس کے اندر بھی یہ جذبۂ رحمت ہوگا اس کا ظہور ہر اہلِ ایمان کے ساتھ موقعہ بموقعہ ہوتا رہے گا۔ لہٰذا اگر یہ صفت موجود ہے تو پھر ضروری نہیں کہ صرف اپنی اولاد کے ساتھ ہی محبت ہوگی، اس کا ظہور اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہوگا، رشتہ داروں کے ساتھ بھی ہوگا، اجنبیوں کے ساتھ بھی ہوگا، انسانوں کے ساتھ بھی ہوگا اور جانوروں کے ساتھ بھی ہوگا۔

اسی لئے حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے قصہ بیان کیا ہے کہ ایک بدکار عورت جارہی تھی، اس کو پیاس محسوس ہوئی، ایک کنوئیں سے پانی نکال کر پیا، باہر نکل کر دیکھا کہ ایک کتا مٹی چاٹ رہا ہے، اس نے محسوس کیا کہ پیاس کی جو کلفت مجھے محسوس ہورہی تھی اسی میں یہ بھی مبتلا ہے، اس نے اپنے موزے سے پانی نکال کر اس کو پلایا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔ اس وقت صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول!

کیا ان جانوروں اور چوپایوں کے ساتھ ہم اچھا سلوک کریں تو اس پر بھی ہم کو اجر وثواب ملے گا؟ حضور ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ہر تر جگر والے کے ساتھ آپ اچھا سلوک کریں تو اس پر اجر وثواب ملے گا (مسلم شریف، ۵۹۹۷/ بخاری شریف، ۵۶۶۳) تر جگر والا بول کر جاندار مراد لیا ہے، اس لئے کہ جب تک جگر میں تری رہتی ہے؛ وہ زندہ رہتا ہے اور جب جگر خشک ہو جاتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔

یہاں جاندار بول کر حضور ﷺ نے بتلا دیا کہ انسان کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ اس میں ہر جاندار شامل ہے، اور مثال میں بھی ایسا جانور پیش کیا جو دھتکارا جاتا ہے اس کو لوگ اپنے دروازے سے بھگاتے ہیں یعنی کتا۔ اسی پر تو صحابہ نے سوال کیا تھا، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر جاندار کے ساتھ آپ اچھا برتاؤ کریں گے، اس کے ساتھ احسان کا معاملہ کریں گے؛ تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر وثواب ملے گا۔

۱۸/ربیع الاول ۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۴/جولائی ۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ، وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلاَنَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماًكَثِيْراًكَثِيْراً. أمابعد:—

جو دوسروں کے ساتھ رحم نہیں کرتا

۲۲۷. وعن جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَن لَّا يَرْحَمُ النَّاسَ لا يَرْحَمُهُ اللّٰهُ

حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی لوگوں کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ بھی پھر اس کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں فرماتے۔ اوپر بھی اسی طرح کی روایت گذر چکی ہے وہاں تفصیل بتلا چکا ہوں۔

امام کو مقتدیوں کی رعایت کا حکم

۲۲۸. وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال: اِذَاصَلّٰى أَحَدُكُمْ لِلنَّاسِ فَلْيُخَفِّفْ، فَاِنَّ فِيْهِمُ الضَّعِيْفَ وَالسَّقِيْمَ وَالْكَبِيْرَ، وَاِذَاصَلّٰى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهٖ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَآءَ. (متفق علیه) وَفِىْ رِوَايَةٍ : وَذَا الْحَاجَةِ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی لوگوں کو نماز پڑھائے یعنی وہ امام بنے تو اس کو چاہیے کہ لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے ہلکی نماز پڑھائے یعنی سنت قراءت کا اہتمام کرے۔ کیونکہ ان میں کمزور، بیمار اور بڑی عمر والے بھی ہوتے ہیں، ہاں جب تنہا نماز پڑھے تو جتنی چاہے لمبی پڑھے۔

اس حدیث کے پیش نظر فقہاء نے فجر اور ظہر میں طوالِ مفصل یعنی سورۂ حجرات سے لے کر سورۂ بروج تک۔ اور عشاء اور عصر کی نماز میں اوساطِ مفصل یعنی سورۂ بروج سے لے کر سورۂ لم یکن تک اور مغرب کی نماز میں قصارِ مفصل یعنی لم یکن سے والناس تک کی سورتوں میں سے قراءت کرنے کو مسنون قرار دیا ہے۔ ویسے آیتوں کی مقدار کی بھی فقہاء نے تعیین کر کے بتلائی ہے۔ تو جب آدمی سنت قراءت کا اہتمام کرے گا تو اس کو یوں نہیں کہا جائے گا کہ اس نے تطویل کی یعنی قراءت کو لمبا کیا، بلکہ وہ ایک معتدل مقدار ہے جو نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ ہاں! امامت کی حالت میں اس سے زیادہ طویل قراءت نہیں کرنی چاہیے، اس لئے نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آدمی امام بنے تو وہ ہلکی نماز پڑھائے یعنی زیادہ لمبی قراءت نہ کرے، بس! سنت قراءت پر اکتفاء کرے۔

کیوں؟ ﴿فَاِنَّ فِیهِمُ الضَّعِیفَ وَالسَّقِیمَ وَالْکَبِیرَ﴾ اس لئے کہ جو لوگ جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں آئے ہوئے ہیں اس میں بعض لوگ پیدائشی طور پر ایسے کمزور ہیں کہ زیادہ لمبی قراءت کا تحمل نہیں رکھ سکتے، اور ان میں کچھ لوگ بیمار بھی ہوں گے جو اپنی بیماری کی وجہ سے اس بات کا تحمل نہیں رکھتے کہ لمبی قراءت کی جائے، اور کچھ بڑی عمر کے بوڑھے ہوتے ہیں کہ بوڑھاپے کی وجہ سے ان کے قویٰ کمزور ہو چکے ہیں، وہ بھی طویل قراءت کا تحمل نہیں رکھ سکتے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے ﴿وَذَالْحَاجَةِ﴾ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو حاجتمند یعنی کام والے ہیں۔ جیسے کسی کو بس یا گاڑی پکڑنی ہے اور وہ اپنا ایک نظام لے کر آیا ہے کہ فلاں جگہ اتنے وقت پر جماعت کھڑی ہوتی ہے، اب اگر امام صاحب سنت قراءت کے

مطابق نماز پڑھائیں گے تو دس منٹ میں نماز ہو جائے گی اور میں اطمینان سے اپنی بس یا گاڑی پکڑلوں گا اور یہاں پر امام صاحب نے سورۂ بقرہ شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا جی اُدھر اٹکا ہوا ہے، یہاں قراءت ہو رہی ہے اور وہ بیچارہ پریشان ہو رہا ہے۔ لہٰذا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جماعت میں شریک ہونے والے مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں جن کی رعایت بہت ہی ضروری ہے۔

اس سے زیادہ شفقت اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس روایت کو لانے کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ مختلف قسم کے ضرورت مند، کمزور یا بیمار لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے نماز کے اندر بھی امام کو حکم دیا کہ ہلکی قراءت کرے۔ مسلمانوں کے ساتھ اس سے زیادہ شفقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ نماز میں بھی امام کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ زیادہ لمبی قراءت نہ کرے۔ مختلف قسم کے لوگ آتے ہیں، اگر آپ لمبی قراءت کریں گے تو ان کے ساتھ زیادتی ہو جائے گی، شفقت اور مہربانی کا تقاضا یہی تھا جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اور اسی تقاضہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے امام کو اس بات کا پابند کیا کہ زیادہ لمبی قراءت نہ کرے۔

بخاری شریف میں قصہ موجود ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں دن رات حاضر رہتے تھے، رات کو اپنی مسجد میں آجاتے تھے، اور اپنے محلے کی مسجد میں عشاء کی نماز وہی پڑھایا کرتے تھے، ایک روز ذرا دیر سے پہنچے، لوگ انتظار میں تھے جب نماز پڑھائی اور قراءت ذرا طویل کر دی تو ایک آدمی نے نماز توڑ کر اپنی الگ پڑھ لی۔ بعد میں لوگوں نے حضرت معاذ سے کہا کہ جب آپ نے لمبی قراءت کی تو فلاں صاحب نماز

توڑ کر اپنی علیحدہ نماز پڑھ کر چلے گئے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ منافق معلوم ہوتا ہے، اس آدمی کو بھی معلوم ہوا کہ ان کے متعلق یہ کہا گیا ہے، تو اس نے کہا کہ میں کل حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کروں گا۔ دوسرے روز ان صحابی نے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم کام کاج والے آدمی ہیں، دن بھر اپنی کھیتی اور باغات کے اندر پانی پلاتے ہیں اور دوسرے کام کرتے ہیں، دن بھر کے تھکے ہوئے جب رات کو دیر سے آئے تو امام صاحب نے قراءت لمبی شروع کردی، اس لئے میں نے اپنی نماز توڑ دی اور الگ پڑھ لی، اس پر وہ مجھے کہہ رہے ہیں کہ منافق ہوگیا۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ پر بہت زیادہ ناراض ہوئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اتنے زیادہ ناراض ہوئے کہ اس سے زیادہ ناراض پہلے نہیں دیکھا گیا اور مارے غصہ کے چہرہ سرخ ہوگیا اور آپ نے فرمایا ﴿أَفَتَّانٌ أَنْتَ يَامُعَاذُ؟﴾ اے معاذ! کیا آپ لوگوں کو فتنہ اور آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ ان کے اس طریقہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو بہت سخت تنبیہ فرمائی۔ (بخاری شریف، ۷۰۵)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا اس روایت کو پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ باب کا عنوان ''مسلمانوں کے ساتھ شفقت و رحمت'' کا قائم کیا ہے۔ اس روایت سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم امام کو مقتدیوں کے ساتھ شفقت کی تعلیم دے رہے ہیں اس لئے کہ جب امام لمبی قراءت کرے گا تو بیچارے لوگ پریشانی اور دقت میں پڑ جائیں گے، ان لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے امام تک کو یہ تاکید کی گئی کہ قراءت مختصر کرے۔

﴿وَاِذَا صَلّٰى أَحَدُكُمْ لِنَفْسِهِ فَلْيُطَوِّلْ مَاشَآءَ﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہاں! اکیلے اپنی نماز پڑھو تو جتنی چاہو قراءت لمبی کرو، اپنی نفلوں میں سورۂ بقرہ پڑھو؛ اس میں کوئی

حرج کی بات نہیں ہے، کسی دوسرے پر اس کا بار پڑنے والا نہیں ہے، اس کی وجہ سے کوئی دوسرا پریشانی میں مبتلا ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن آج کل معاملہ برعکس ہوگیا ہے، ہم اپنی پڑھتے ہیں تو جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں اور جب کسی کو پڑھانے کی نوبت آتی ہے تو قراءت طویل کرتے ہیں حالانکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب لوگوں کو نماز پڑھاوے تو ہلکی پڑھاوے۔

ایک لطیفہ

ہلکی کے اوپر ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہلکی یعنی سنت قراءت کی رعایت کرتے ہوئے مختصر قراءت کرنا۔ کسی جگہ پر امام صاحب بہت ہل ہل کر نماز پڑھا رہے تھے۔ جب سلام پھیرا تو کسی نے پوچھا کہ آپ بہت ہل رہے تھے، کیا بات ہے؟ تو امام صاحب نے کہا کہ کتاب میں لکھا ہے کہ کسی کو نماز پڑھائے تو ہلکے پڑھائے۔ اس میں یاء مجہول لکھی تھی، اور پرانے زمانہ کی کتابوں میں یاء لمبی لکھتے تھے۔ یعنی لکھا ہوا تھا ''ہلکی'' لیکن امام صاحب اس کو ''ہلکے'' پڑھ رہے تھے۔ اس لئے کہا کہ کتاب میں ہے کہ ہلکے نماز پڑھاؤ، اس لئے مَیں نے ہلکے نماز پڑھائی۔

ذمہ دارانِ مسجد کے لئے ایک زرّین مشورہ

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے نماز کو مقتدیوں کی رعایت کرتے ہوئے مختصر پڑھانے کی تعلیم دی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جب نماز میں اتنا اہتمام کیا گیا تو دوسری چیزوں میں کیوں نہ کیا جائے؟ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض جگہوں پر اس معاملہ میں خاص طور پر جمعہ کی نماز میں بہت زیادہ کوتاہی ہو رہی ہے۔

مثلاً جمعہ کی نماز کے لئے آپ نے اپنے بورڈ پر وقت مقررہ لکھا ہوا ہے کہ جمعہ ڈیڑھ

بجے ہوگا۔اب مقرر صاحب کی تقریر ہو رہی ہے،اور تقریر کرتے کرتے پونے دو ہو گئے اور خطبہ شروع نہیں ہوا۔اب ایک آدمی جب مسجد میں آیا تھا تو اس نے بورڈ پر لکھا ہوا دیکھ لیا تھا کہ یہاں خطبہ ڈیڑھ بجے ہوتا ہے،اور اس کی گاڑی کا وقت سوا دو بجے ہے،چنانچہ اس نے سوچا کہ یہاں نماز پڑھ کر رکشہ پکڑلیں گے اور ان شاء اللہ گاڑی مل جائے گی،لیکن یہاں تقریر لمبی ہو رہی ہے،اور درمیان سے اٹھ کر جانا بھی مشکل ہے،اس لئے کہ اگر درمیان سے اُٹھ کر جائے تو کوئی کہے گا کہ منافق ہے،نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ پریشانی میں مبتلا ہوگا۔

آج کل اس کی رعایت نہیں کی جاتی ہے،یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔اگر ایسا ہی ہے تو میں کہا کرتا ہوں اور فتویٰ میں بھی لکھا کرتا ہوں کہ آپ بورڈ پر لکھ دیں کہ جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر رکھی ہے،مقرر صاحب جب تقریر ختم کریں گے؛اس وقت خطبہ شروع ہوگا،اس لئے وقت کی کوئی تعیین نہیں ہے۔اور اگر آپ نے وقت متعین کیا ہے تو مقرر صاحب کو پابند کیجیے کہ آپ کو تقریر اس سے پہلے ختم کرنی ہے،اس سے زیادہ آپ تقریر نہیں کریں گے۔ایسا ہونا چاہیے،ورنہ بڑی پریشانی ہوتی ہے،جب نبی کریم ﷺ فرض نماز کو مختصر کرنے کا حکم دے رہے ہیں اور اس میں اتنی تاکید فرما رہے ہیں تو پھر تقریر کی کیا بات ہے۔

نبی کریم ﷺ کی امت پر شفقت کا ایک نمونہ

۲۲۹۔وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: اِنْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَيَدَعُ الْعَمَلَ، وَهُوَ يُحِبُّ أَن يَّعْمَلَ بِهٖ، خَشْيَةَ أَن يَّعْمَلَ بِهِ النَّاسُ، فَيُفْرَضَ عَلَيْهِمْ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کبھی کبھی کوئی نفل کام اپنے لئے شروع کرتے تھے اور آپ کو دیکھ کر صحابہ کرام بھی اس نفل کام کو کرنے لگ جاتے تھے،اب

آپ خود دل سے تو یہ چاہتے تھے کہ اس کام کو کریں، لیکن پھر آپ دیکھتے کہ مجھے دیکھ کر صحابہ نے بھی شروع کیا ہے، تو اس وقت آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوتا تھا کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کام فرض نہ کر دیا جائے۔ کیونکہ لوگ کرنے لگیں گے اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم کر دیا گیا تو پھر اس کی پابندی نہیں کر سکیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوگوں کے کرنے پر کیسے فرض ہوگا؟ فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ نبی کی موجودگی میں نبی جب کوئی عمل شروع کرتے ہیں اور امتی بھی نبی کے اس عمل کو دیکھ کر شروع کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو وہ عمل ایسا پسند آ جاتا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس عمل کو لازم کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے نبی جب تک موجود ہیں تب تک تو اس کا احتمال ہے، اور یہ بات ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو واجب اور فرض قرار دیا جائے لیکن نبی کی دنیا سے تشریف بری کے بعد اس کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال! یہاں پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی آپ جو عمل کرتے تھے اور آپ کا بھی جی چاہتا تھا کہ میں یہ عمل کروں، لیکن آپ کو دیکھا دیکھی صحابہ نے یہ عمل شروع کر دیا تو آپ چھوڑ دیتے تھے، اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم ہو جائے اور پھر عمل نہ ہو پائے۔ چنانچہ اس کا نمونہ موجود ہے۔

تراویح کا واقعہ

رمضان المبارک کے مہینہ میں نبی کریم ﷺ اعتکاف میں تھے، اعتکاف کے لئے آپ نے چٹائی کا حجرہ بنایا تھا یعنی چٹائی کو کھڑا کر دیا تھا اور اس میں آپ نے رات کے وقت نفلیں شروع کیں، کسی نے حجرہ میں دیکھا کہ آپ نفلیں پڑھ رہے ہیں، پہلے روز کچھ لوگ

موجود تھے، انہوں نے دیکھا تو وہ بھی آپ کے ساتھ جماعت میں شریک ہوگئے۔ لوگوں میں تو نئی بات کا چرچا ہوتا ہی ہے۔ پہلے روز گنے چنے لوگ تھے، ان کی وجہ سے دوسروں کو بھی پتہ چلا، دوسرے روز کچھ اور لوگ بھی آ گئے اور وہ بھی شریک ہوگئے اور تیسرے روز تو اور زیادہ شہرت ہوگئی، مزید کچھ لوگ آ گئے اور مجمع بڑھ گیا۔ اور چوتھے روز تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی کو پتہ چلا ہوگا تو سب ہی آ گئے، لیکن اس روز آپ ﷺ باہر نکلے ہی نہیں، تین روز پر معاملہ ختم ہوگیا۔ اب چوتھے روز سب لوگ آئے تھے لیکن جب آپ ﷺ باہر تشریف نہیں لائے تو لوگوں نے کھنکھارنا شروع کیا اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں دروازے پر مار رہے تھے تاکہ آپ کو اطلاع ہوجائے کہ ہم آ گئے ہیں، لیکن حضور ﷺ نکلے ہی نہیں۔ دوسرے روز آپ نے فرمایا کہ مَیں تم لوگوں کی سب حرکتیں دیکھ رہا تھا لیکن مَیں اس لئے نہیں نکلا کہ مجھے یہ ڈر ہوا کہ کہیں صلوٰۃ اللیل تم پر فرض کردی جائے اور پھر تم اس کو نباہ نہ سکو، اور اگر تم اس پر عمل نہ کرسکو گے تو پھر بڑی پریشانی میں مبتلا ہوجاؤ گے۔ (بخاری شریف، ۷۲۹۰)

بعد میں تکلیف ہو، مَیں یہ نہیں چاہتا

یہاں بتلانا یہ ہے کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان قائم کیا تھا کہ مسلمانوں کے ساتھ شفقت، رحمت اور ہمدردی کا معاملہ کرنا چاہیے، تو دیکھو! حضور ﷺ کو امت کے ساتھ کتنی ہمدردی تھی۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عبادت فرض کی جائے گی تو کوئی مفت میں تو نہیں کرائی جائے گی، اس کا اجر وثواب بہت زیادہ ملنے والا ہے اور بندوں کے لئے تو اللہ کی عبادت کرنا سعادت مندی کی بات ہے، لیکن پھر بھی اگر وہ فرض کردی جاتی ہے اور کوئی ایک بندہ بھی نہیں کرتا تو اس پر تو مصیبت آ جائے گی۔ گویا اس عبادت کے نہ کرنے پر جو سزا اور

عتاب ہونے والا ہے اس سے بچانے کے لئے نبی کریم ﷺ فرما رہے ہیں کہ بعد میں تکلیف ہو، مَیں یہ نہیں چاہتا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کو امت کے ساتھ کتنی شفقت تھی، آپ ﷺ کی ذات ہمارے لئے نمونہ واسوہ ہے اور آپ کا عمل ہمارے سامنے موجود ہے، تو ہمیں بھی ہر مسلمان کے ساتھ اسی طرح شفقت ورحمت اور محبت کا معاملہ کرنا چاہیے۔

صومِ وصال سے ممانعت بوجہ شفقت علیٰ الامۃ

۲۳۰. وعنہا قالت: نَهَاهُمُ النَّبِيُّ ﷺ عَنِ الْوِصَالِ رَحْمَةً لَهُمْ، فَقَالُوا: اِنَّکَ تُوَاصِلُ؟ قَالَ: اِنِّیْ لَسْتُ کَهَیْئَتِکُمْ، اِنِّیْ أَبِیْتُ یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو صومِ وصال سے منع فرمایا۔

صومِ وصال روزہ کی ایک قسم ہے۔ یعنی اس طرح روزہ رکھنا کہ درمیان میں افطار نہ کرے۔ مثلاً آپ نے پہلی تاریخ سے روزہ رکھنا شروع کیا تو پانچ تاریخ تک مسلسل اس طرح روزے رکھے کہ درمیان میں افطار کیا ہی نہیں۔ ہم لوگ جو روزے رکھتے ہیں تو مغرب کے بعد افطار کا انتظام کرتے ہیں اور اگر دوسرے دن بھی روزہ رکھنا ہے تو دوسرے دن سحری کھا کر صبح صادق کے بعد سے کھانا پینا بند کرتے ہیں اور غروب تک اس طرح سے رہتے ہیں گویا صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک روزہ ہوتا ہے، تو اتنے ہی وقت میں کھانے پینے سے رکنا ہے اور غروبِ آفتاب کے بعد صبح صادق تک کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ لیکن صومِ وصال کا مطلب یہ ہے کہ غروب تا صبح صادق جتنا وقفہ ہوتا ہے اس میں بھی کچھ کھاوے پیوے نہیں پہلے روز آپ نے سحری کی تو مسلسل روزہ ہی رکھا، درمیان میں نہ کچھ کھایا، نہ کچھ پیا۔ اس

طرح مسلسل روزے رکھتے چلے جانے کو صومِ وصال کہتے ہیں۔ حضور ﷺ اس طرح روزے رکھتے تھے، آپ کو دیکھا دیکھی صحابہ بھی رکھتے تھے، جب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ صحابہ بھی ایسا کر رہے ہیں تو آپ نے منع فرمادیا کہ تم صومِ وصال مت رکھو۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ تو صومِ وصال رکھتے ہیں؟ ان کا یہ کہنا بطور اعتراض نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ آپ تو معصوم ہیں آپ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو قرب حاصل ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں، آپ اتنے اونچے مقام پر فائز ہونے کے باوجود اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے اور ثواب حاصل کرنے کے لئے اس طرح روزے رکھ رہے ہیں، تو ہم تو بہت دور ہیں، اور گناہوں میں ملوث رہتے ہیں اور ہم کو وہ مقامِ قرب بھی حاصل نہیں؛ اس لئے ہم کو تو آپ سے بھی زیادہ محنت کرنی چاہیے؛ لہٰذا جب آپ رکھ رہے ہیں تو ہم کو کیوں منع فرماتے ہیں؟ یہ سوال اعتراض کے طور پر نہیں تھا۔

﴿ میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے ﴾

اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿اِنِّی لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ﴾ یعنی مَیں جو صوم وصال رکھتا ہوں تو میرا معاملہ تمہارے جیسا نہیں ہے، تم اگر اس طرح مسلسل روزے رکھتے چلے جاؤ گے، تو اس کو برداشت نہیں کرسکو گے، تمہاری قوت پر اثر پڑے گا اور تم کمزور ہو جاؤ گے، لیکن میرا معاملہ ایسا نہیں ہے، اس لئے کہ مَیں تو ایسی حالت میں رات گذارتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

کھلانے پلانے کا مطلب یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی کو کھانا کھانے اور پانی پینے سے قوت حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ مجھے وہ قوت بغیر کھائے پیئے ہی عطا فرما دیتے ہیں

اس لئے اگر میں کھاتا پیتا نہیں ہوں اور میری دیکھا دیکھی تم بھی ایسا کرنے جاؤ گے تو تم کمزور پڑ جاؤ گے، اور اس طرح مجاہدہ کرنے اور مسلسل روزے رکھنے کی وجہ سے جو تکلیف ومشقت پیش آئے گی؛ تم اس کو برداشت نہیں کرسکو گے۔ پھر آگے چل کر کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا یہ مجاہدہ دوسری ضروری عبادتوں سے رکنے کا ذریعہ بن جائے۔

''میرا رب مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے'' اس کا مطلب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں ﴿یَجۡعَلُ فِیَّ قُوَّۃَمَنۡ أَکَلَ وَشَرِبَ﴾ جیسے کوئی آدمی کھاتا پیتا ہے، اس سے اس کو جو قوت حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے وہ قوت بغیر کھائے پئے بھی عطا فرمادیتے ہیں، اس لئے میں تو ایسا کرتا ہوں، لیکن تم ایسا مت کرو۔

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام کو صومِ وصال سے کیوں منع فرمایا؟ اسی حدیث کے اندر اس کی وجہ بھی موجود ہے ﴿رَحۡمَۃً لَھُمۡ﴾ ان کے ساتھ شفقت ومہربانی کرتے ہوئے اور ان کا خیال کرتے ہوئے۔ جیسے ہمارا بچہ کوئی ایسا کام شروع کردے جو اس کے تحمل سے اونچا ہو تو ماں باپ منع کردیتے ہیں کہ بیٹا ایسا مت کرو۔ جیسے بچہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا ہے تو ماں باپ زبردستی سلادیتے ہیں، ویسے اس کا پڑھائی کے اندر محنت کرنا ماں باپ کو بھی پسند ہے لیکن پھر بھی وہ کہتے ہیں کہ آرام کرو۔ اسی طرح یہاں پر بھی نبی کریم ﷺ نے شفقت اور رحمت کے طور پر امت کو منع فرمایا۔

﴿کہیں بچہ کی ماں رنجیدہ نہ ہو﴾

۱۲۳۱. وعن أبی قتادۃ الحارث بن ربعی رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: اِنِّی لَأَقُوۡمُ اِلَی الصَّلٰوۃِ، وَأُرِیۡدُ أَنۡ أُطَوِّلَ فِیۡھَا، فَأَسۡمَعُ بُکَآءَ الصَّبِیِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِیۡ صَلٰوتِیۡ کَرَاھِیَۃَ أَنۡ أَشُقَّ عَلٰی اُمِّہٖ.

نماز کے سلسلہ میں مَیں نے اوپر جس روایت کا حوالہ دیا تھا وہ روایت یہی ہے۔
حضرت قتادہ حارث بن ربیع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کبھی میں نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہوں تو میرے جی میں ایسا ارادہ ہوتا ہے کہ نماز ذرا لمبی پڑھاؤں گا یعنی طویل قراءت کروں گا، لیکن نماز شروع کرنے کے بعد جب بچے کے رونے کی آواز آتی ہے تو میں اپنی نماز کو مختصر کردیتا ہوں (چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں بھی نماز کے لئے مسجد میں حاضری دیتی تھیں) مطلب یہ ہے کہ میں نے جس چیز کا یعنی طویل قراءت کا ارادہ کیا ہوتا ہے اس کو چھوڑ دیتا ہوں اس بات کو ناپسند کرتے ہوئے کہ کہیں لمبی قراءت کر کے میں اس کی ماں کو مشقت میں ڈال دوں؛ اس لئے نماز کو مختصر کردیتا ہوں۔

شرّاح لکھتے ہیں کہ اوپر کی روایت میں نمازیوں کی اور ان کے مصالح کی رعایت کی تھی کہ جو نمازی آئے ہیں وہ ضعیف ہیں، یا بیمار ہیں یا بوڑھے ہیں۔ تو ان کی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے امام کو کہا گیا تھا کہ نماز کو لمبی مت کرنا۔ اور یہاں تو ایک ایسی شخصیت کی رعایت کی جارہی ہے جو نماز میں بھی نہیں بلکہ نماز کے باہر ہے یعنی جو بچہ رو رہا ہے وہ نماز کے باہر ہے، اس کی آواز سن کر محض اس کی وجہ سے کہ اس کی ماں کو تکلیف نہ پہنچے اور اس کے لئے یہ نماز مشقت کا باعث نہ بن جائے کہ وہ سوچے گی کہ کب نماز پوری ہو کہ میں اپنے بچے کے پاس جاؤں؛ اس وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں نماز کو مختصر کردیتا ہوں کہ کہیں میں نماز کو طویل کر کے اس کی ماں کو رنجیدہ کروں۔

اسی طرح روایات کے اندر آتا ہے کہ کبھی آپ پہلی رکعت کے اندر طویل سورت تلاوت کرتے تھے اور دوسری رکعت کے اندر بچہ کے رونے کی آواز آتی تو تین آیات پڑھ کر

رکوع کر دیتے یعنی بہت مختصر قراءت فرماتے (صحیح مسلم،۱۰۸۳) آپ ﷺ نے اپنے عمل سے امت کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شفقت ورحمت کی تعلیم دی ہے۔

بہرحال! بچہ تو نماز کے باہر ہے، اس کی بھی اتنی رعایت فرمائی کہ اس کی آواز پر نماز مختصر کر دی، اگرچہ پانچ سو نمازیوں میں سے وہ بچہ کسی ایک ہی کا ہے، لیکن پھر بھی اس ایک کی بھی اتنی رعایت فرمائی۔ اس سے یہی تعلیم دینی مقصود ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ شفقت اور رحمت یعنی رحم وکرم کا معاملہ کرو۔

﴿کہیں اللہ تعالیٰ آپ سے مطالبہ نہ کر بیٹھیں﴾

۲۳۲۔ وعن جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ صَلّٰی صَلاۃَ الصُّبْحِ فَهُوَ فِيْ ذِمَّةِ اللهِ، فَلا يَطْلُبَنَّكُمُ اللهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ، فَاِنَّهُ مَن يَّطْلُبُهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ، ثُمَّ يَكُبُّهُ عَلٰى وَجْهِهِ فِيْ نَارِ جَهَنَّم.

حضرت جندب بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی فجر کی نماز پڑھے گا یعنی فجر کی نماز اپنے وقت میں باجماعت ادا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی امان میں آجاتا ہے۔ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ فجر کی نماز پڑھنے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت اور عہد و پیمان میں آگیا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ وہ امان اور حفاظت میں رہے گا۔ حضور ﷺ دوسروں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جس آدمی نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ اپنے وقت پر پڑھی اور وہ آدمی اللہ کی حفاظت اور امان میں ہے، اب کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے ذمہ کے توڑنے کے معاملہ میں کسی چیز کا مطالبہ کرے۔ یعنی حضور ﷺ دوسرے مسلمانوں کو خطاب کر رہے ہیں کہ دیکھو!

جس نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی تو وہ اللہ کے امان میں ہے، اب اگر تم اس کو کچھ گزند اور تکلیف پہنچاؤ گے تو گویا جس آدمی کو اللہ نے امان دے رکھی ہے اس کو تم تکلیف پہنچا رہے ہو، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم سے مطالبہ ہوگا کہ میں نے جس کو امان دی تھی تم نے اس کو کیوں تکلیف پہنچائی؟ ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ تم سے اپنے ذمہ کے معاملہ میں مطالبہ کرے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ کے بارے میں جب کسی سے مطالبہ کرے گا تو پھر وہ آدمی اللہ کی پکڑ سے وہ چھوٹ نہیں سکتا، پھر اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا، گویا مسلمانوں کو تاکید کی جا رہی ہے کہ جس آدمی نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی ہو، ایسے آدمی کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ نہ کریں کہ جس کی وجہ سے اللہ کی طرف سے دی گئی امان کو توڑنے والے شمار ہو جائیں۔

آپسی رشتہ کی بنیاد ایمان ہے

۲۳۳۔ وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال: اَلْمُسْلِمُ أَخُوالْمُسْلِمِ، لایَظْلِمُهُ وَلایُسْلِمُهُ، مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ أَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَةً؛ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا کُرْبَةً مِّنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَمُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ یعنی ایمان لانے کی وجہ سے اس ایمان کے دائرے میں آ کر سب بھائی بھائی ہو گئے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات)﴾ قرآن پاک میں بھی کہا گیا کہ اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جیسے ایک ماں کے پیٹ میں سے جو دو شخصیتیں وجود میں آئیں تو وہ دونوں بھائی کہلاتے ہیں؛ یہ نسبی رشتہ ہے، اسی طرح سے ایمان لانے کے نتیجے میں بھی

دونوں آپس میں بھائی بھائی بن جائیں گے، گویا یہ رشتہ ایمان کی نسبت پر قائم ہوا۔ اس لئے کہ ایک ایمان والے نے ایمان لا کر اپنا رشتہ اللہ سے جوڑا، اور دوسرا بھی ایمان لایا تو اس نے بھی اپنا رشتہ اللہ سے جوڑا، اور اس رشتہ کے جڑنے کے نتیجہ میں دونوں ایمان کے اعتبار سے بھائی بھائی ہوئے، اور یہ قرب بھی ایمان کی وجہ سے ہے۔

مَیں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ جیسے آپ کے یہاں فون لگا ہوا ہے جس کا کنکشن (Connection) ایکسچینج (Exchange) کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی آپ کے پڑوس ہی میں رہتا ہے، اس کا بھی فون ہے جس کا کنکشن ایکسچینج کے ساتھ ہے۔ اب آپ اس کے یہاں جب فون جوڑیں گے تو وہ سیدھا اس کے وہاں نہیں جائے گا، بلکہ پہلے ایکسچینج میں جائے گا اور وہاں سے اس کے یہاں جڑے گا، گویا جب آپ نے اپنا تعلق ایکسچینج کے ساتھ جوڑ لیا اور اس نے بھی جوڑ دیا تو دونوں کا تعلق آپس میں جڑ گیا۔

تو جو آدمی ایمان لاتا ہے وہ اپنا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ جوڑتا ہے اب دوسرا آدمی بھی جب ایمان لایا اور اپنا تعلق اللہ کے ساتھ قائم کرلیا؛ تو نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کا آپس میں ربط قائم ہو گیا اور ایک تعلق پیدا ہو گیا۔ تو جیسے بندہ ایمان لا کر اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے، اسی تعلق کے بناء پر وہ ساری مخلوقات سے تعلق رکھتا ہے، اور اسی تعلق کی بناء پر وہ سارے حقوق بھی ادا کیا کرتا ہے۔ ماں باپ کا حق بھی وہ اسی نسبت سے ادا کرتا ہے۔ بھائی بہنوں کا حق بھی اسی نسبت سے ادا کرتا ہے۔ بیوی کا بھی ادا کرتا ہے۔ بیوی بھی اس کا حق اسی نسبت سے ادا کرتی ہے۔ اسی طرح پڑوسی کا حق، اور دوسرے تمام مسلمانوں کا حق بھی اسی تعلق کی وجہ سے ادا کرتا ہے۔ سارے حقوق ادا کرتا ہے اس وجہ سے کہ وہ ایمان لایا ہے اور

اللہ تعالیٰ نے اس کو حکم دیا تو یہ سارے حقوق ایمان کے نتیجے میں اس پر لاگو پڑ جاتے ہیں۔

اسی طرح جتنے بھی حقوق ہیں سب کا ادا کرنا ضروری ہے۔تمہارے اوپر ماں باپ کی بات ماننا واجب ہے، لیکن وہاں بھی یہ قاعدہ آجائے گا کہ اگر وہ کسی ایسی بات کا حکم کریں کہ جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی ہو تو ﴿لاَ طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَةِ الْخَالِقِ﴾ مخلوق کے کہنے پر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا کہ ماں باپ کی بات مانو، اس لئے یہ مان رہا ہے، جب اللہ تعالیٰ کے کہنے سے اس کی بات مان رہے تھے اب اگر وہی ہم کو ایسی بات کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آرہی ہے؛ تو پھر ہم ان کی بات نہیں مانیں گے۔

جیسے کسی کے ساتھ آپ کا تعلق کسی کی وجہ سے ہو، اور وہ کہے کہ اس سے تعلق مت رکھو، تو ہم کہیں گے کہ تیرے ساتھ تعلق تو اس کی خاطر ہی رکھا ہے، اب تو ہی اس سے تعلق رکھنے کو منع کر رہا ہے؛ تو یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تجھ سے ٹوٹ سکتا ہے لیکن اس سے نہیں ٹوٹ سکتا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے۔

﴿مظلوم مسلمان کا حق﴾

مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو ایمان لانے کی وجہ سے دنیا میں جتنے بھی مؤمن ہیں سب کے ساتھ رشتہ قائم ہوگیا۔ اب اس تعلق کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود بھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا، کسی کا کوئی حق نہیں مارے گا، کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی نہیں کرے گا اور کسی کو کسی دشمن کے حوالے نہیں کرے گا۔ یعنی کوئی دشمن اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ زیادتی کر رہا ہو اور ایک مسلمان بھائی دیکھ رہا ہے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ اس کو بچا سکتا ہے پھر بھی نہ بچائے۔ ایک مسلمان

بھائی کا فرض ہے کہ دشمن کے مقابلہ میں اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرے، وہ اس کو دشمن کے حوالہ کبھی نہیں کرسکتا، بلکہ اس کے ظلم سے بچائے گا اور اس کی طرف سے ہونے والی زیادتی سے مسلمان کو بچانا ضروری ہے۔

اسی لئے دنیا کے کسی بھی حصہ میں مسلمانوں کے ساتھ اگر زیادتی ہو رہی ہو تو پہلے نمبر پر تو یہ حکم ہے کہ وہ مسلمان جن کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، وہ خود طاقت رکھتے ہوں تو خود اس زیادتی کو دور کرنے کی کوشش کریں، یعنی ان کے اندر اتنی طاقت ہے کہ ان کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو خود دور کر سکتے ہیں تو پھر دوسروں پر لازم نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ اس پر قادر نہیں ہیں کہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کو دور کریں تو آس پاس رہنے والے لوگوں پر ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ وہ ان پر ہونے والے ظلم کو ختم کریں۔ اگر آس پاس کے لوگ ان کو بچانے پر قادر نہیں ہیں، یا قادر تو ہیں لیکن توجہ نہیں کر رہے ہیں اور مدد بھی نہیں کرتے؛ تو اب یہ ذمہ داری ان کے قریب والوں پر یعنی اس کے بعد والوں پر آئے گی، یہاں تک کہ ہوتے ہوتے دنیا کے دوسرے کونے تک کے رہنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور اگر کوئی بھی ان کی مدد نہیں کرتا تو سب کے سب گنہگار ہوں گے۔ کتابوں میں صراحتاً یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ اسی لئے فرماتے ہیں ﴿لا یَظْلِمُهُ وَلا یُسْلِمُهُ﴾ یعنی نہ خود اس پر ظلم کرے گا، نہ اس کو کسی دشمن کے حوالے کرے گا کہ وہ اس پر ظلم کرے۔

نفس و شیطان کا مظلوم

اسی طرح لکھا ہے کہ اپنے نفس کی طرف سے ہونے والی زیادتیاں اور شیطان کے طرف سے ہونے والی زیادتیوں سے بھی اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔ اس لئے کہ نفس بھی

ہمارا دشمن ہے ﴿اِنَّ أَعْدیٰ عَدُوِّکَ نَفْسُکَ الَّتِیْ بَیْنَ جَنْبَیْکَ﴾ تمہار بڑا دشمن تمہارا نفس ہے جو تمہارے پہلو کے اندر ہے۔اور شیطان بھی تمہارا دشمن ہے ﴿اِنَّ الشَّیْطَانَ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾ شیطان تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔تو جب شیطان بھی دشمن ہے اور نفس بھی دشمن ہے، تو اپنی ذات کو ان کے بھی حوالے نہیں کرنا چاہیے۔

﴿جزاء من جنس العمل﴾

﴿مَنْ کَانَ فِیْ حَاجَةِ أَخِیْهِ کَانَ اللّٰهُ فِیْ حَاجَتِهٖ﴾ حضور ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آدمی بھی اپنے مسلمان بھائی کی حاجت روائی میں اور اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہوتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس حاجت پورا کرنے والے کی حاجت پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں، یعنی اس کی حاجت پوری کر دیتے ہیں۔

﴿وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَةً؛ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا کُرْبَةً مِّنْ کُرَبِ یَوْمِ الْقِیَامَةِ﴾ اور جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیف کو دور کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی آخرت کی تکلیفوں میں سے بڑی تکلیف کو دور کریں گے۔

شراح نے لکھا ہے ﴿مَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ کُرْبَةً﴾ میں جو تنوین ہے وہ تحقیر کے لئے ہے اور ﴿فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا کُرْبَةً﴾ کے اندر جو تنوین ہے وہ تعظیم کے لئے ہے۔مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی دنیا کی معمولی سی تکلیف کو آپ دور کریں گے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے بڑی تکلیف کو دور کریں گے۔

اسی لئے حدیث میں آتا ہے ﴿اَلْخَلْقُ کُلُّهُمْ عَیَالُ اللّٰهِ﴾ مخلوق اللہ کا کنبہ ہے ﴿فَأَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰهِ أَنْفَعُهُمْ لِعَیَالِهٖ﴾ مخلوق میں سب سے زیادہ پسند اللہ تعالیٰ کو وہ آدمی

ہے جو مخلوق کو فائدہ پہنچائے۔ (المعجم الکبیر، ۱۰۰۳۳)

جیسے آپ کسی کے بیٹے کی تکلیف کو دور کریں تو جب اس کو معلوم ہوگا تو وہ بھی آپ کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کرے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ اس سے زیادہ محبت ہے جتنی باپ کو اپنے بیٹے سے ہوتی ہے۔ تو جب آپ اپنے مسلمان بھائی کی تکلیف و پریشانی کو دور کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی آپ کی تکلیف کو دور کرے گا۔

﴿وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا یعنی اس کے عیب کو چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی پردہ پوشی کریں گے، یعنی آپ کو اپنے کسی مسلمان بھائی کا کوئی عیب معلوم ہوا، کوئی کمزوری اور کوئی فالٹ (fault) آپ کے علم میں آیا تو آپ اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کریں، اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے اور مؤمن ہے، اللہ کے ساتھ اس کا ایک تعلق ہے، اگر اس تعلق کا خیال کرتے ہوئے آپ نے اس کی پردہ پوشی کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز آپ کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ اور اگر اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا اور رسوا کرنے کی کوشش کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو رسوا کرے گا اور جس کو اللہ تعالیٰ رسوا کردے تو پھر وہ بچ نہیں سکتا، لہٰذا یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج اور عادت ہوتی ہے کہ لوگوں کے پیچھے ہی پڑے رہتے ہیں، اور لوگوں کے فالٹ تلاش کرتے رہتے ہیں، کمزوریوں کی جستجو میں لگے رہتے ہیں کہ اس میں کیا کمزوری ہے، اور جہاں ان کے علم میں کوئی بات آئی کہ بس پھر دنیا میں اس کو پھیلانا شروع کردیتے ہیں، ایسے آدمیوں کے لئے خطرناک وعید ہے۔ اس سے اپنے آپ کو بچانا بہت ہی ضروری ہے۔

سارا دارومدار نیت ہی پر ہے

البتہ کسی آدمی کے اندر ایسا عیب ہے کہ اس کی وجہ سے لوگوں کو نقصان پہنچتا ہے اور وہ برابر اس برائی میں مبتلا ہے اور آئندہ بھی اس سے نقصان پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے تو اس کے نقصان سے دوسروں کو بچانا بھی ضروری ہے۔ جیسے ایک آدمی میں چوری کی عادت ہے اور کئی لوگوں کو نقصان پہنچ چکا ہے، اور وہ کسی کے یہاں جاکر مہمان بنا ہوا ہے، تو ایسے آدمی کے بارے میں آپ اس سے کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! اس سے ذرا چوکنّا رہنا۔

یا کسی آدمی کو قرض لینے کی عادت ہے اور پھر وہ ادا نہیں کرتا، آپ بھی اس کی اس عادت کا شکار ہو چکے ہیں، اور آپ نے دیکھا کہ وہ کسی دوسرے کے ساتھ محبت بڑھا رہا ہے تو آپ نے کہا کہ فلاں سے قرض کے معاملہ میں بچ کر رہنا؛ تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ لیکن نیت اس کے عیب کو کھولنے کی نہ ہو، بلکہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو اس کی طرف سے پہنچنے والے نقصان سے بچانے کی نیت ہو۔ نیت کے اوپر ہی سارا دارومدار ہے۔ اس نیت سے کہو گے تب ہی اجازت ہے۔ اور اگر اس کی تنقیص کی نیت سے کہو گے اور اس کا عیب کھولنے کی نیت سے کہو گے تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

نیت بدلنے سے حکم بدل جاتا ہے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک ہی کام میں نیت بدل جانے کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے۔ جیسے آپ کہیں جا رہے تھے اور راستہ میں گھڑی پڑی ہوئی دیکھی، تو اگر اس گھڑی کو آپ اس نیت سے اٹھاتے ہیں کہ اس کے مالک تک پہنچائیں گے تب تو اٹھانا جائز ہے۔ بلکہ کسی ایسی جگہ پڑی ہوئی ہو کہ اس جگہ کے بارے میں آپ کو خیال ہو کہ مَیں تو اتفاقی طور پر

یہاں آ گیا، ورنہ تو یہ ایسی جگہ ہے کہ شاید ہی کوئی دوسرا یہاں آئے گا اور اگر مَیں نہیں اٹھاؤں گا تو یہ گھڑی یہیں پڑی پڑی ضائع ہو جائے گی؛ تو ایسی صورت میں مسلمان کی چیز کو ضائع اور برباد ہونے سے بچانے کے لئے اٹھانا ضروری ہو جاتا ہے۔

بہر حال! اس نیت سے گھڑی اٹھانا کہ مالک تک پہنچا دوں گا تو یہ جائز ہے، اور اگر آپ اس نیت سے اٹھائیں کہ مَیں استعمال کروں گا تو حرام اور ناجائز ہے۔

اسی طرح اگر کسی آدمی کی کمزوری اور بری عادت سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس کے نقصان سے بچانے کے لئے کسی سے کہیں تو یہ جائز ہے، لیکن صرف اسی شخص کو کہنے کی اجازت ہے۔ ایسا نہیں کہ پوری دنیا میں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہیں۔ لیکن اگر اس کی عادت اور عیب کو پھیلانے کی نیت سے لوگوں کے سامنے کہو گے تو پھر اس وعید کے اندر داخل ہو جاؤ گے۔

اللہ تعالیٰ تمام بری عادتوں سے ہماری حفاظت فرمائے

۔آمین۔

۱۵/ربیع الاول ۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۱/جولائی ۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّآاللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

﴿اخوتِ اسلامی کے تقاضے﴾

۲۳۴.وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ:اَلْمُسْلِمُ أَخُوالْمُسْلِمِ لَایَخُوْنُہٗ،وَلَایَکْذِبُہٗ،وَلَایَخْذُلُہٗ،کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلیٰ الْمُسْلِمِ حَرَامٌ؛عِرْضُہٗ وَمَالُہٗ وَدَمُہٗ، اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا،بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِّنَ الشَّرِّأَن یَّحْقِرَأَخَاہُ الْمُسْلِمُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے،اسی اخوت اور بھائی ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ خیانت سے پیش نہ آئے،اگراس نے امانت کے طور پراس کوکوئی چیز دی ہےتو جس معاملہ میں اس پر اعتماد کیا ہےتواس امانت میں خیانت نہ کرے،یاجواعتماد اس نے کیا ہے اس کو مجروح نہ کرے۔ امانت اورخیانت کامفہوم مَیں پہلےتفصیل سے بتلاچکاہوں۔

دوسری چیز یہ ہے﴿ولایَکْذِبُہٗ﴾کہ اس کے ساتھ دروغ گوئی نہ کرےیعنی اس سے جو کچھ بھی کہے سچ سچ کہے،جھوٹی بات نہ کہے۔نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی کے لئے بہت بڑی خیانت ہے کہ وہ کسی کوکوئی بات کہہ رہاہوتو سننے والاتواس کواس کی بات میں سچاسمجھ رہاہواورحقیقت یہ ہوکہ وہ اس کوجھوٹ بول رہاہو۔یہ بہت بری چیز ہے۔

﴿وَلَا یَخْذُلُہٗ﴾ اور اپنے اس مسلمان بھائی کو بے یارو مددگار نہ چھوڑے۔ یعنی اگر کوئی موقعہ ایسا آوے جہاں اس کو مدد کی ضرورت ہو، ظالم اور دشمن اس کے ساتھ زیادتی کرر ہا ہے، یا اور کوئی زیادتی کرر ہا ہے، تو اس صورت میں مسلمان بھائی ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی مدد کرے، اپنی طاقت کے مطابق اس کی مدد کرسکتا ہو تو کرے، اس میں کوتاہی نہ کرے۔

﴿کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ﴾ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ مسلمان پورا کا پورا دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ ''پورا کا پورا'' اس کا مطلب یہ ہے ﴿عِرْضُہٗ وَمَالُہٗ وَدَمُہٗ﴾ تین چیزیں ہوتی ہیں ایک تو جان ہے، دوسری چیز اس کی عزت وآبرو ہے اور تیسری چیز اس کا مال ہے۔ گویا مسلمان کی ہر چیز دوسرے پر حرام ہے، نہ تو اس کی جان میں اس کو کوئی تکلیف یا نقصان پہنچا سکتا ہے، نہ اس کی عزت وآبرو میں کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ اس کے مال میں۔ پہلے بھی یہ چیزیں تفصیل سے آچکی ہیں۔

﴿تقویٰ کا سرچشمہ دل ہے﴾

پھر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿اَلتَّقْوٰی ھٰھُنَا﴾ تقویٰ یہاں پر ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے سینہ میں قلب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تقویٰ یہاں ہے۔

تقویٰ اصل تو کہتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ آدمی کے دل میں اللہ کا خوف ہو۔ اگر دل میں اللہ کا خوف وخشیت موجود ہے تو وہ ان تمام چیزوں سے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے؛ اپنے آپ کو بچائے گا۔ تو تقویٰ کا منبع اور تقویٰ جس چیز کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے وہ اللہ کا خوف ہے۔

اس لئے کہ تقویٰ اصل میں تو خارج میں اپنے اعضاء وجوارح کو اور اپنے تمام جسم کو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں سے اور اللہ کی نافرمانی سے بچانے کا نام ہے، اور آدمی اللہ کی نافرمانی سے اسی وقت بچتا ہے جبکہ اس کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا خوف ہو ﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى﴾ جو آدمی اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا یعنی اس نے سوچا کہ کل کو حشر کے میدان میں اللہ کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اعمال کا جواب دینا ہے، اگر میں آج اللہ کی منع کی ہوئی چیزیں کروں گا تو کل کیا جواب دوں گا ﴿وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى﴾ اور نفس کو خواہشات سے روکا؛ تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔

تو نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ آدمی کا اپنے آپ کو اللہ کی نافرمانی سے بچانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس کے دل میں اللہ کا خوف ہو۔ تو حضور فرماتے ہیں کہ تقویٰ یہاں ہے یعنی دل میں ہے۔ اگر اللہ کا خوف ہوگا تو یقیناً اس کا اثر اس کے جسم اور اس کے اعضاء پر ظاہر ہوگا، اپنی آنکھ کو، کان کو، ہاتھ کو، پاؤں کو، شرم گاہ کو، زبان کو، اور تمام اعضاء کو اللہ کی نافرمانیوں سے بچائے گا۔

﴿انسان کی برائی کے لئے یہی کافی ہے﴾

﴿بِحَسْبِ امْرِءٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمُ﴾ کسی آدمی کی برائی کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اور خاص کر مسلمان کو باعزت بنایا ہے ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ اور ایمان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمام ایمان والوں کو مکرم اور باعزت بنایا ہے۔ تو جو آدمی اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے گا گویا اس

نے ایک ایسی ذات اور شخصیت کو حقیر سمجھا جس کو اللہ تعالیٰ نے باعزت بنایا ہے۔اور کسی کو حقیر سمجھنا کبر کی علامت ہے۔

نبی کریم ﷺ سے کبر کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا ﴿بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ (مسلم شریف،۲۷۵)﴾ حق کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔کسی کی طرف سے کوئی حق بات پیش کی جائے اور اس کو قبول کرنے سے جب آدمی انکار کرتا ہے تو یہ اس کے تکبر کی علامت ہے،اور لوگوں کو حقیر سمجھنا بھی کبر کی علامت ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جس کے دل میں ذرّہ برابر کبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

بہرحال! کسی بھی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھنا بہت بری چیز ہے۔حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ میں فی الحال ہر مسلمان کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں،اور فی المآل ہر انسان کو اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں،مطلب یہ کہ کافر کو بھی آئندہ کے اعتبار سے اپنے سے اچھا سمجھتا ہوں۔اس لئے کہ کافر کے متعلق امکان ہے کہ آگے چل کر اللہ تعالیٰ اس کو بھی ایمان کی توفیق دے دیں،اور اپنے متعلق کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ ہم اپنے ایمان کے ساتھ ہی دنیا سے جائیں گے۔اس لئے جب تک اپنے متعلق اطمینان نہ ہو جائے،آدمی دوسرے کو حقیر کیسے سمجھ سکتا ہے۔لہٰذا کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔کسی کو حقیر سمجھنا؛ بڑی خطرناک چیز ہے۔

﴿ایک دوسرے پر حسد نہ کرو﴾

۲۳۵۔ وعنه قال قال رسول الله ﷺ: لا تَحَاسَدُوْا ولا تَنَاجَشُوْا ولا تَبَاغَضُوْا وَلا تَدَابَرُوْا،وَلا يَبِعُ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ. وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا. اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لايَظْلِمُهُ وَلايَحْقِرُهُ وَلايَخْذُلُهُ، اَلتَّقْوٰى هٰهُنَا— وَيُشِيْرُ اِلٰى صَدْرِهٖ ثَلاثَ مَرَّاتٍ—بِحَسْبِ امْرِئٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِم. كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ؛ عِرْضُهُ وَمَالُهُ وَدَمُه.

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے پر حسد مت کرو۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا فرما رکھی ہے اس کے متعلق یہ تمنا کرنا کہ اس سے وہ نعمت چھین جائے، اس کے پاس وہ نعمت نہ رہے؛ اس کا نام حسد ہے۔ باقی اگر کسی صاحبِ نعمت کو دیکھ کر یوں خواہش اور تمنا کرنا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ایسی نعمت عطا کرے؛ اس کو حسد نہیں کہتے، بلکہ اس کو غبطہ یعنی رشک کرنا کہتے ہیں۔ اور غبطہ جائز ہے۔

حسد میں آدمی یوں تمنا کرتا ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت نہ رہے، چاہے اپنے پاس آئے یا نہ آئے، لیکن اس کے پاس یہ چیز نہیں رہنی چاہیے۔ حقیقت میں حسد کرنے والا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرتا ہے، گویا اپنے دل میں نعوذ باللہ وہ یہ سوچ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ نعمت کیوں دی۔ اس کو یہ نعمت نہیں ملنی چاہیے۔

یہ تو ایسا ہی ہوا کہ آپ اپنے ماتحتوں میں سے کسی کو اپنی کوئی چیز بلا استحقاق دیں، آپ نے اپنی طرف سے احسان کرتے ہوئے اس کو ایک چیز دی ہے، اور دوسرا شخص بھی آپ ہی کے ماتحت ہے جو یوں سوچے کہ آپ نے یہ چیز اس کو کیوں دی؟ اب اگر آپ کو معلوم ہو جائے کہ فلاں ایسا سوچتا ہے تو کیا آپ اس کے اس خیال کو برداشت کریں گے؟ آپ کہیں گے کہ میری چیز تھی، مَیں جو چاہے کروں۔ اور پھر وہ دوسرا میرا ماتحت ہو کر میرے فیصلے پر اعتراض کرتا ہے۔

اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿أَمْ يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ﴾ جو چیز اللہ تعالیٰ نے کسی کو اپنے فضل اور مہربانی سے عطا فرمائی تو ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے، جس کو چاہے؛ دے۔ جتنی بھی نعمتیں ہیں، وہ

سب اللہ کی ملک ہیں، اس لئے اس کی مرضی کی بات ہے جس کو چاہے دے۔ اب اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا فرمائی تو اس کے متعلق یوں سوچنا کہ اس کے پاس نہ رہے گویا اس نے اللہ کے اس فیصلہ پر اعتراض کیا۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

حسد کہاں تک پہنچا دیتا ہے؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس حسد والے جذبے کے نتیجہ میں آدمی نہ جانے کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی اسی حسد کی وجہ سے کفر تک پہنچ جاتا ہے آدمی دوسروں کو جب نقصان پہنچانے پر آتا ہے تو بعض مرتبہ ایسی ایسی تدبیریں اور ایسے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جو اس کو کفر تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ اسی جذبہ کی وجہ سے وہ سحر کرتا ہے اور سحر کی بہت ساری صورتوں میں کفر لازم آتا ہے۔ اسی لئے حسد سے خاص طور پر پناہ مانگی گئی ہے۔ یہ سب سے خطرناک چیز ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

حسد کا علاج

اور اگر کسی کے دل میں حسد کا خیال پیدا ہو تو اس کو دور کرنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جس کے متعلق یہ جذبہ پیدا ہو رہا ہے اس کے لئے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اور زیادہ دے۔ جب اپنے نفس کے خلاف ایسا کرے گا تو انشاء اللہ دھیرے دھیرے یہ چیز ختم ہو جائے گی۔ اور دوسرا کام یہ کرے کہ جب وہ ملے تو اس کے ساتھ احسان کرے، سلام کرے، اس کو ہدیہ دے تا کہ اس کے متعلق ہمارے دل میں جو جذبہ ہے وہ خود بخود ہی دور ہو جائے۔ بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ حسد مت کرو

نجش کی ممانعت

﴿وَلاتَنَاجَشُوْا﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے خود آگے اس کی تشریح کی ہے کہ جس چیز کے خریدنے کا ارادہ نہ ہو، اس کی قیمت بڑھاتا رہے؛ تاکہ دوسرے لوگ دھوکہ میں پڑ جائیں

یہاں پر ایک چیز ہے کہ کوئی آدمی کوئی چیز بیچ رہا ہے، تو بیچنے کی دو صورتیں ہیں، ایک تو بیع من یزید یعنی نیلام ہوتا ہے۔ نیلام کے اندر تو یہ ہوتا ہے کہ دوسرا آدمی زیادہ قیمت دے کر لے سکتا ہے۔ جیسے آپ نے کہا کہ قیمت بولو، تو ایک آدمی نے کہا کہ مَیں دس روپے میں لینے کے لئے تیار ہوں۔ دوسرا کہتا ہے کہ گیارہ، اور تیسرا کہتا ہے کہ بارہ۔ تو اگر اس کا ارادہ لینے کا ہے، یعنی زیادہ قیمت بتلا کر واقعۃً وہ خریدنے والا ہے؛ تب تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، یہ جائز ہے۔ اور اس طرح بیچنے کی تمام علماء نے اجازت دی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے خود ایک مرتبہ اس طرح سے بیع فرمائی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابی آئے اور نبی کریم ﷺ سے کچھ سوال کیا تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ تمہارے پاس کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ ایک پیالہ اور ایک ٹاٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ لے آؤ۔ چنانچہ وہ لے آئے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو کون خریدے گا؟ ایک صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہ! مَیں ایک درہم میں خریدتا ہوں، حضور ﷺ نے فرمایا کہ اور زیادہ دینے والا کوئی ہے؟ دوسرے صحابی نے کہا کہ مَیں دو درہم دوں گا۔ تو آپ نے ان کو دو درہم میں وہ چیز بیچ دی، اور ایک درہم ان کو دے کر یوں کہا کہ تو اس سے اپنے گھر والوں کے کھانے کی ضرورت پوری کر، اور دوسرے درہم سے کلہاڑی کا پھل- جو لوہے کا ہوتا ہے- خرید کر ایک لکڑی منگوا کر اس میں لگائی اور ان کو دی۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ! جنگل میں جا کر لکڑیاں کاٹو اور اس کو لا کر

بازار میں فروخت کرو۔ چنانچہ وہ جنگل میں گیا اور لکڑیاں کاٹ کر لایا، بازار میں فروخت کی، اس سے دھیرے دھیرے کچھ جمع ہو گیا۔ پھر آ کر حضور ﷺ سے عرض کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب تو ہی بتلا کہ یہ تیرے لئے بہتر ہے؟ یا وہ بہتر ہے کہ تو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے، اور پھر ان کی مرضی کی بات ہے کہ تجھے دیں یا نہ دیں۔ (سنن أبی داؤد، ۱۶۴۱)

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور ﷺ نے خود بھی اس طرح سے بیع فرمائی ہے۔ تو نیلام کے طریقے سے جو بیچا جاتا ہے اس میں اگر خریدنے کا ارادہ ہے تو اس کی قیمت بڑھائی جاسکتی ہے۔ لیکن ایک آدمی مجمع میں ایسا موجود ہے کہ جس کا ارادہ خریدنے کا نہیں ہے، بلکہ وہ محض اس لئے زیادہ بولتا ہے کہ دوسرا آدمی دھوکے میں آ کر اس سے زیادہ قیمت بتلا کر لے لے؛ تو اس کو نجش کہتے ہیں۔ اور ایسا کرنا جائز نہیں ہے، یہ حرام ہے۔

﴿کسی کے سودے پر سودا مت کرو﴾

﴿وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ﴾ تم میں سے کوئی آدمی دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔ سودے پر سودا نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً مَیں اپنی کتاب بیچنا چاہتا ہوں تو ایک آدمی میرے پاس آیا اور میرے ساتھ قیمت کی گفتگو کر رہا ہے، لیکن ابھی قیمت طے نہیں ہوئی اور ہم دونوں کسی بات پر آئے نہیں تھے۔ مثلاً دوسرے نے کہا کہ سات روپے میں مجھے دے دو۔ ابھی یہ بات پوری نہیں ہوئی تھی اور ہم دونوں متفق بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس سے پہلے تیسرے نے کہا کہ مَیں دس میں خریدتا ہوں۔ تو مَیں نے کہا کہ اچھا! تم لے لو۔ تو تیسرے کے لئے اس طرح قیمت زیادہ بتلانا جب تک کہ پہلے والا ابھی کسی بات پر جما نہیں تھا، اور دونوں متفق نہیں ہوئے تھے؛ یہ جائز ہے۔

لیکن اگر پہلے کے ساتھ میری گفتگو ہورہی تھی اور بات طے ہوگئی تھی کہ دس روپے میں طے ہے، اب آگے صرف سودا پکا کرنے کی دیر ہے کہ مَیں کہوں کہ خریدا اور آپ کہیں کہ مَیں نے بیچا۔ قیمت دونوں نے طے کرلی اور دونوں اس پر راضی ہوچکے۔ اب دوسرے کی دخل اندازی جائز نہیں کہ مَیں اس سے زیادہ قیمت دوں گا۔ اس سے پہلے بڑھانے کی اجازت تھی لیکن بڑھانے کی اجازت اس وقت ہے جب کہ خریدنے کا ارادہ ہو، اور اگر خریدنے کا ارادہ نہیں ہے، تو اس طرح سے بڑھا کر بتلانا حرام اور ناجائز ہے۔ اس لئے کہ اس کے اندر دوسرے مسلمان بھائی کو دھوکے میں ڈالنا ہے، اس کی بدخواہی ہے۔

اب یہ تیسرا آدمی جو بڑھا کر بتلا رہا ہے، اس میں دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ بیچنے والے نے اس کو پہلے سے ایسا کہنے کے لئے تیار نہیں کیا ہے، بلکہ یہ تیسرا اپنے طور پر ایسا کررہا ہے؛ تو یہ اکیلا گنہگار ہوگا۔

اور اگر بیچنے والے نے بھی پہلے سے اس کے ساتھ سمجھوتہ کررکھا ہے جیسا کہ بازاروں میں فٹ پاتھ پر ہوتا ہے، کہ وہاں بیچنے والے پہلے سے مجمع کے اندر اپنے آدمی چھوڑتے ہیں۔ اب بیچارہ کوئی سیدھا سادہ وہاں پر پہنچ گیا اور خریدنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا کہ پندرہ میں دے دو، تو دوسرا آیا اور کہنے لگا کہ مجھے بیس میں دو، پھر تیسرا آیا اس نے پچیس کہا۔ یہ سب اسی کے چھوڑے ہوئے آدمی ہیں؛ تو اس صورت میں یہ دونوں– بیچنے والا اور قیمت بڑھانے والا– گنہگار ہوں گے۔ اس لئے کہ اسی کے کہنے پر یہ سب کچھ ہورہا ہے؛ اسی کو نجش کہتے ہیں۔ خریدنے کا ارادہ نہ ہو اور قیمت بڑھانا یہ جائز نہیں ہے۔

﴿مَیں اپنے دل میں کسی کے متعلق کینہ نہیں رکھتا﴾

﴿وَلَاتَبَاغَضُوْا﴾ اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغض مت رکھو۔ بغض کا معنٰی عداوت اور دشمناوٹ۔ کسی کے متعلق دل میں دشمنی رکھنا، کسی کے متعلق دل میں بغض اور کینہ رکھنا؛ اس سے بھی منع فرمایا ہے۔ اپنے مسلمان بھائی کے بارے میں دل صاف ہونا چاہیے۔

مشہور قصہ ہے حدیث پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابھی ایک جنتی آدمی آئے گا، صحابہ منتظر تھے، اتنے میں ایک صحابی آئے جنہوں نے تازہ وضو کیا تھا جس کا پانی ٹپک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں جوتے تھے، انہوں نے سلام کیا اور آ کر بیٹھ گئے۔ سب نے ان کو دیکھ لیا۔ ان کو معلوم نہیں تھا کہ حضور ﷺ نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے۔ دوسرے روز اسی طرح سے حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرماتے تھے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے، اس روز بھی آپ نے پھر فرمایا کہ ایک جنتی آدمی ابھی آنے والا ہے، دوسرے روز بھی وہی صحابی اسی ہیئت میں آئے، تازہ وضو کئے ہوئے جس کا پانی ٹپک رہا تھا، اور بائیں ہاتھ میں جوتے تھے، آئے اور بیٹھ گئے، ان کو معلوم نہیں کہ میرے متعلق یہ فرمایا ہے۔ تیسرے روز بھی نبی کریم ﷺ نے اسی طرح فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب تین روز تک مسلسل یہ بات پیش آئی، تو میرے جی میں آیا کہ آخر کس وجہ سے نبی کریم ﷺ نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے؛ مَیں معلوم تو کروں۔ جب مجلس ختم ہوئی، سب باہر نکلے تو مَیں ان کے پاس گیا اور

یوں کہا کہ میرے گھر والوں کے ساتھ میری تھوڑی ناگواری پیش آ گئی ہے اور مَیں نے تین دن تک گھر نہ جانے کا ارادہ کیا ہے، اگر آپ اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دیں تو آپ کے ساتھ رہوں۔انہوں نے کہا: ضرور آئیے۔

خیر! ان کے ساتھ تین دن رہے، اور چوبیس گھنٹے برابر ان کا پروگرام دیکھتے رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے دن اور رات غور سے دیکھا لیکن کوئی خاص بات دکھائی نہیں دی، بلکہ تہجد کے لئے بھی اٹھتے ہوئے میں نے نہیں دیکھا، فرائض وغیرہ کا اہتمام برابر ہو رہا تھا۔ہاں اتنا دیکھا کہ جب رات کو سونے کے لئے آتے تھے تو تھوڑی دیر استغفار کرتے تھے اور پھر سو جاتے تھے، لیکن کوئی نئی ایسی بات دکھائی نہیں دی کہ جس کی وجہ سے دل میں یہ آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر جنت کی بشارت دی ہوگی۔

جب تین دن پورے ہوئے تو میرے دل میں آیا کہ پوچھوں۔تو مَیں نے کہا کہ دیکھو! گھر والوں کے ساتھ میری کوئی ایسی ناگواری کی بات پیش نہیں آئی تھی بلکہ میں تو صرف اس لئے آیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن تک مسلسل آپ کے بارے میں یہ فرمایا، تو میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کا ایسا کون سا عمل ہے۔میں تین دن سے آپ کے ساتھ ہوں لیکن میں نے کوئی ایسی بات نہیں دیکھی کہ جس کی وجہ سے میرے دل میں آئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر یہ بشارت دی ہوگی، اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کا کون سا خصوصی عمل ایسا ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے۔انہوں نے کہا کہ میں جو کچھ عمل کرتا ہوں وہ آپ نے دیکھ ہی لئے، اور تین دن سے دیکھ رہے ہو، میرے اعمال آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں؛ اس کے سوا میرے پاس کوئی عمل نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں جانے لگا تو پھر انہوں نے مجھے بلا کر کہا کہ ایک بات ہے، میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے متعلق کینہ اور بغض نہیں رکھتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بس! یہی بات ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے متعلق یہ بشارت سنائی ہے۔ (شعب الایمان للبیہقی، ۶۶۰۵)

حقیقت تو یہی ہے کہ آدمی کو اپنا دل ایسی چیزوں سے پاک اور صاف رکھنا چاہیے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے دل اس لئے بنایا ہے کہ اس میں کسی کے متعلق دل میں کینہ و بغض رکھے؟ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے دل تو اپنی یاد کے لئے بنایا ہے، اللہ تعالیٰ کی محبت اس میں رہے۔ ایسی بے کار چیزیں اس میں نہیں رکھنی چاہئیں۔

﴿پیٹھ مت دکھاؤ﴾

﴿وَلَا تَدَابَرُوْا﴾ ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ۔ مطلب یہ کہ آپسی تعلقات کے کشیدہ ہونے کی وجہ سے ایک ادھر کو منہ پھیرتا ہے دوسرا اُدھر کو منہ کر لیتا ہے، ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاتے ہیں؛ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا اسی وقت ہوگا جب کہ آپس کے تعلقات درست نہ ہوں۔ ﴿وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَيْعِ بَعْضٍ﴾ ایک آدمی کے سودے پر دوسرا آدمی سودا نہ کرے۔

﴿وَكُوْنُوْا عِبَادَ اللهِ اِخْوَانًا﴾ اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو، یعنی تمہارا تعلق آپس میں ایسا ہونا چاہیے جیسے دو سگے بھائیوں کا ہوتا ہے۔ لیکن آج تو سگے بھائی بھی اس طرح لڑ رہے ہیں کہ یہ مثال دینا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ ویسے آج بھی لوگ بولنے کو تو بولتے ہیں لیکن آپس کے تعلقات کی خرابی اتنی عام ہوتی جا رہی ہے اور بھائیوں کی لڑائیاں بھی اتنی

کثرت سے ہوگئیں کہ بس اللہ کی پناہ۔ بلکہ اب تو میں سمجھتا ہوں کہ ''بھائی بھائی بن کر رہو'' یہ مثال اگر دیں تو شاید کوئی یوں سمجھے کہ مولوی صاحب آپس میں لڑائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

معاشرت کا ایک زرّین اُصول

۲۳۶. وعن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، یعنی جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرے۔

ایک مسلمان بھائی کے لئے دوسرے مسلمان کا وہی جذبہ ہونا چاہیے جو اپنے لئے ہوتا ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے لئے ایک جسم کی طرح ہے، دوسرا مسلمان بھائی کوئی اجنبی نہیں ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ اور میں ایک ہی ہیں۔ یک جان دو قالب کہ ایک جان ہے لیکن دو جسم الگ الگ ہیں۔ ہم ایک جسم کے مانند ہیں۔ جو میں ہوں وہ آپ، جو آپ ہیں وہ میں ہوں۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کے ساتھ یہی تعلق ہونا چاہیے۔ جب جسدِ واحد یعنی ایک جسم کے مانند ہوئے تو جو چیز اپنے لئے سوچے دوسرے کے لئے بھی سوچے اور جو اپنے لئے بری سمجھے وہ اپنے بھائی کے لئے بھی بری سمجھے۔ آپس کے معاشرت اور معاملات کی درستگی کے لئے یہ ایسا زرّین اصول ہے کہ اگر کوئی آدمی اس کو اپنا لے؛ تو ساری معاشرت درست ہوجائے۔

﴿یہ حدیث دین کا چوتھائی حصہ ہے﴾

اسی لئے امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ جو حدیث کی بہت بڑے امام ہیں، بڑے محدث ہیں اور حدیث کی چھ مشہور کتابیں جن کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں ایک کتاب سنن ابوداؤد ہے جو انہوں نے ہی جمع کی ہے۔ ایک بہت بڑے محدث غالباً امام شعبہ کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ امام ابوداؤد کے لئے علمِ حدیث کو ایسا نرم کر دیا تھا جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے لوہے کو نرم کیا تھا۔

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھی اور ان پانچ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) حدیثیں اپنی اس کتاب ''سنن ابوداؤد'' میں لیں ہیں اور چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) حدیثوں کا خلاصہ صرف چار حدیثیں ہیں (۱) اِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ (۲) اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا أُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ (۳) لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ (۴) مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ. (تاریخ بغداد۔۹/۵۷)

بہت سے حضرات کہتے ہیں بقول امام داؤد کہ یہ حدیث ﴿لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ دین کا چوتھائی حصہ ہے۔ تم میں کوئی آدمی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ جو سلوک ہم اپنے لئے پسند کریں وہی اپنے مسلمان بھائی کے لئے پسند کریں۔ اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو پوری معاشرت درست ہو جائے گی۔

﴿اسی کو ''عصبیت'' کہتے ہیں﴾

۲۳۷. وعنه قال قال رسول الله ﷺ: أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْمَظْلُوْمًا. فَقَالَ رَجُلٌ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ اِذَا كَانَ مَظْلُوْمًا، أَرَأَيْتَ اِنَ كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ؟ قال: تَحْجُزُهُ -أَوْتَمْنَعُهُ- مِنَ الظُّلْمِ، فَاِنَّ ذٰلِكَ نَصْرُهُ. (رواه البخاری)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو، چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، یعنی اس پر ظلم کیا جارہا ہو یا وہ کسی پر ظلم کر رہا ہو۔

اب اگر مسلمان بھائی مظلوم ہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ لیکن اگر وہ ظالم ہے پھر بھی اس کی مدد کرنا ایسی چیز تھی جو سمجھ میں نہیں آتی تھی، اس لئے ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے سوال کیا ﴿يَارَسُوْلَ اللهِ! أَنْصُرُهُ اِذَا كَانَ مَظْلُوْمًا، أَرَأَيْتَ اِنَ كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ؟﴾ اگر میرا مسلمان بھائی مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کروں یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہے تو اس کی مدد کیسے کی جائے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کو ظلم کرنے سے روک دو، یہی اس کی مدد اور خیر خواہی ہے۔

زمانۂ جاہیت میں عرب کا ایک مشہور شخص تھا جس کا یہ جملہ ہے ﴿أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْمَظْلُوْمًا﴾ تم اپنے بھائی کی مدد کرو؛ چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ اس نے تو اس جملہ کو اسی معنٰی میں لیا تھا جو ہم سمجھ رہے ہیں کہ بھائی کی مدد کرنی چاہیے، چاہے بھائی حق پر ہو یا باطل پر ہو، سچا ہو یا جھوٹا ہو۔ اس لئے کہ ہمارا عمل بھی یہی ہے اور ہم ایسا ہی کرتے ہیں؛ اسی کو ''عصبیت'' کہتے ہیں۔

تعصب کا مطلب گروہ بندی اور طرف داری۔ یعنی آپ کسی کی مدد اس بنیاد پر

کررہے ہیں کہ یہ میرا بھائی ہے، میرے خاندان والا ہے، میری برادری والا ہے، میرے محلے والا ہے، میری بستی والا ہے، میری پارٹی والا ہے، میری جماعت والا ہے،اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ حق پر ہے یا باطل پر۔تو اپنے والا ہونے کی بنیاد پر اگر مدد کی جائے گی؛اسی کو ''عصبیت'' کہا جاتا ہے،اوراس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔اسلام ''عصبیت'' کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔

﴿ظالم کو ظلم سے روک دو﴾

بہرحال!زمانۂ جاہلیت کے عرب نے تو یہ جملہ اسی عصبیت کے اصول پر کہا تھا کہ اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے ظالم ہو یا مظلوم ہو۔لیکن ظاہر ہے کہ صحابہ کرام جو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو خوب سمجھتے تھے ان کو اشکال ہوا کہ بھلا نبی کریم ﷺ ایسی تعلیم کیوں دیتے کہ بھائی اگر ظالم ہو پھر بھی اس کی مدد کرو۔اس لئے انہوں نے پوچھ لیا کہ مظلوم ہو تو مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے،ظالم ہو تو کیسے مدد کروں؟حضور ﷺ نے اس کو کیسا اچھا موڑ دیا،آپ نے فرمایا کہ ﴿تَحْجُزُهُ أَوْقَالَ تَمْنَعُهُ﴾ اس کو ظلم سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔اس لئے کہ دوسروں پر ظلم کرکے وہ اپنے آپ پر ظلم کررہا ہے اور اپنا ہی نقصان کررہا ہے۔اوراس میں کیا شبہ ہے جیسا کہ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے:-

به پنداشت ستمگر که جفا بر ما کرد ❁ از ما گذشت و بر وے بماند

مفہوم یہ ہے کہ ظالم یوں سمجھتا ہے کہ اس نے ہمارے اوپر زیادتی کی،ہم پر تو جو گذرنی تھی؛وہ گذر گئی،لیکن اس پر باقی رہ گئی ہے،یعنی اس کو تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے ظلم کا حساب دینا ہے جو بڑی خطرناک چیز ہے۔

اور ظلم کا نتیجہ ظالم کو دنیا میں بھی بھگتنا پڑتا ہے اور آخرت میں تو بھگتنا ہی ہے، اس لئے جو آدمی ظلم کر رہا ہے در حقیقت وہ اپنے آپ پر ہی ظلم کر رہا ہے۔ جیسے آپ کے بچے کے ہاتھ میں پستول ہو اور وہ اپنے ہی سینے کی طرف تاکے، تو آپ کیا کریں گے؟ فوراً اس کو روکیں گے کہ یہ کیا کر رہا ہے، اپنے اوپر زیادتی کر رہا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ ظلم کرنے والا بھی دوسرے پر ظلم کر کے اپنے اوپر ہی زیادتی کر رہا ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ اس کو ظلم سے روک دیجیے، اس کا ہاتھ پکڑ لیجیے، اس کو آگے بڑھنے مت دیجیے۔ بس! یہی اس کی مدد ہے کہ آپ نے اس کو ظلم کرنے نہیں دیا۔ وہ بھی آگے چل کر آپ کا شکریہ ادا کرے گا کہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ بروقت مجھے روک دیا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ مدد کا یہ طریقہ اگر مسلمان اختیار کر لیں؛ تو کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے

دعا

اے اللہ! ایک مسلمان بھائی کے ساتھ کس طرح رہنا چاہیے اور اس کے حقوق کیسے ادا کرنے چاہئیں اس کی توفیق عطا فرما۔ اور اس میں ہم سے جو بھی کوتاہیاں ہو رہی ہیں۔ اے اللہ! ان کو دور فرما کر آئندہ اس کی تلافی کی ہمیں توفیق عطا فرما۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

﴿مسلمان کے حقوق﴾

۲۳۸.وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ ﷺ قال:حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلیٰ الْمُسْلِمِ خَمْسٌ،رَدُّ السَّلامِ،وَعِیَادَۃُالْمَرِیْضِ،وَاِتِّبَاعُ الْجَنَائِزِوَاِجَابَۃُ الدَّعْوَۃِ،وَتَشْمِیْتُ الْعَاطِسِ.

وفی روایۃلمسلم:حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلیٰ الْمُسْلِمِ سِتٌّ:اِذَالَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ،وَاِذَا دَعَاکَ فَأَجِبْہُ،وَاِذَااسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَہُ،وَاِذَاعَطَسَ فَحَمِدَاللّٰہَ فَشَمِّتْہُ،وَاِذَامَرِضَ فَعُدْہُ،وَاِذَامَاتَ فَاتْبَعْہُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔گویا اسلامی رشتے اور اسلامی اخوت اور بھائی چارگی کی وجہ سے اس کو چاہیے کہ ان پانچ چیزوں کا اہتمام کرے﴿رَدُّ السَّلامِ﴾سلام کا جواب دینا۔ مسلم شریف کی جس روایت کا حوالہ دیا ہے اس میں چھ حقوق بتلائے ہیں اور اس میں یہ ہے﴿اِذَالَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ﴾ جب تم ملاقات کرو تو تم اس کو سلام کرو۔اُس روایت میں سلام کے جواب کو بتایا گیا ہے،اور اِس میں خود سلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿اسلام میں سلام کی اہمیت﴾

سلام یہ ملاقات کے آداب میں سے ہے۔اسلام نے بڑی اہمیت کے ساتھ اس کی تعلیم دی ہے، بلکہ نبی کریم ﷺ نے بڑے اہتمام سے جن چیزوں کی طرف امت کو متوجہ کیا ان میں افشاء السلام بھی ہے،سلام کو عام کرنا اور پھیلانا۔گویا اس کا رواج عام کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، یہودیوں کے بڑے عالم تھے، جب نبی کریم ﷺ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کو آپ ﷺ کی آمد کا پتہ چلا تو لوگ گروہ در گروہ، جماعت در جماعت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے چل پڑے، مَیں بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جیسے ہی میری نگاہ آپ ﷺ کے چہرۂ انور پر پڑی ﴿فَلَمَّا رَأَيْتُهُ عَرَفْتُ اَنَّهُ لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ﴾ میرے دل نے اس بات کا یقین کرلیا اور گواہی دی کہ یہ جھوٹے آدمی کا چہرہ نہیں ہے۔ ﴿وَسَمِعْتُهُ يَقُوْلُ﴾ پھر اسی مجلس میں حضور اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ﴿أَيُّهَا النَّاسُ! أَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَأَفْشُوا السَّلَامَ، وَصِلُوا الْأَرْحَامَ وَصَلُّوْا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَام، تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِالسَّلَامِ﴾ اے لوگو! لوگوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو عام کرو اور پھیلاؤ، اور رشتہ داری کے حقوق ادا کرو اور راتوں کو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں اس وقت نماز پڑھو، سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ (سنن ترمذی، ۲۴۸۵)

﴿سلام کے فضائل﴾

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا ﴿مَنِ الْكَفَّارَاتُ وَالدَّرَجَاتُ﴾ کونسی چیزیں اور کونسے اعمال ایسے ہیں جو لوگوں کے گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں

اور کونسے اعمال وہ ہیں جس کی وجہ سے درجات بلند ہوتے ہیں؟ وہاں بھی یہی اعمال بتائے گئے ہیں ﴿اِطْعَامُ الطَّعَامِ، وَاِفْشَآءُ السَّلامِ، وَلِيْنُ الْكَلامِ وَالصَّلاةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ﴾ کھانا کھلانا، سلام کا پھیلانا، نرم بات کرنا اور لوگ سوئے ہوئے ہوں ایسی حالت میں رات کے وقت نماز پڑھنا۔ (سنن ترمذی، ۳۲۳۳)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ وہ کون سا عمل ہے جس کے ذریعہ سے مَیں جنت میں داخل ہو جاؤں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ﴿أَفْشِ السَّلَامَ، وَأَطْعِمِ الطَّعَامَ، وَصِلِ الْأَرْحَامَ، وَقُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ﴾ مطلب یہ ہے کہ سلام کے پھیلانے کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بڑا اہتمام تھا۔ (مستدرک حاکم، ۷۱۷۴)

چنانچہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سلام کو ان حقوق میں سے بتلا رہے ہیں جو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر اسلامی اخوت و بھائی چارگی اور اسلامی نسبت پر ہیں۔ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب تم ملو تو سلام کرو، اور اگر اس نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دو۔ ویسے اپنی طرف سے سلام میں ابتداء کرنا سنت ہے، اور جواب دینا واجب ہے۔ اور سلام میں ابتداء کرنا افضل ہے۔

فقہاء نے فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یہ ایسی سنت ہے کہ ابتداء کرنا جواب دینے کے مقابلہ میں افضل ہے، یعنی یہ عمل سنت ہے لیکن اس کا جواب دینا واجب ہے، اور واجب عمل کے مقابلہ میں اس سنت والے عمل کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

﴿تین تین دعائیں﴾

بہرحال! جب وہ سلام کرے تو تم اس کے سلام کا جواب دو۔ آپس میں جب ایک

آدمی دوسرے آدمی سے ملاقات کرتا ہے تو تمام مذاہب میں اس کے ساتھ اظہارِ محبت کا کوئی نہ کوئی طریقہ بتلایا گیا ہے۔ اب اگر ''ہیلو'' کر دیا، یا ''گڈ ایوننگ'' اور ''گوڈ مورننگ'' کہا؛ تو اس کا دنیا یا آخرت میں کیا فائدہ ہوا؟ جبکہ اسلام نے جو طریقہ بتلایا وہ بہترین طریقہ ہے کہ جب ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملاقات کرتا ہے تو وہ اس کو دعا دے رہا ہے ''السلام علیکم'' تم پر سلامتی ہو ''ورحمۃاللہ'' اللہ کی رحمتیں تم پر نازل ہوں ''وبرکاتہ'' اور اللہ کی برکتیں تم پر نازل ہوں۔ ایک آدمی تین تین دعائیں دے رہا ہے۔ اس میں اس کا دنیا کا بھی فائدہ ہے اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔ اور پھر یہ بھی بات ہے کہ وہاں گوڈ مورننگ اور گوڈ ایوننگ کو اگر دعا پر محمول کیا جائے تو وہ مخصوص اور محدود وقت کی دعا ہے۔ صبح بخیر، شام بخیر، آپ کی صبح سلامتی کے ساتھ ہو۔ اور آپ کی شام سلامتی کے ساتھ ہو۔ لیکن یہاں تو سلامتی مکمل اور ہر حال میں ہو، ایسی عمومی انداز میں دعا دی جارہی ہے کہ آپ پر سلامتی ہو، گویا ہر حال میں ہر لمحہ ہر گھڑی آپ سلامت رہیں۔ صرف صبح اور شام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، یہ کتنا بڑا فائدہ ہے کہ ایک مومن دوسرے مومن سے ملاقات کر رہا ہے تو وہ اس کو تین تین دعاؤں سے مالا مال کر رہا ہے، دنیا اور آخرت کی بھلائیوں کی اس کے لئے دعا کرتا ہے۔

اور سلام کرنے والے کے لئے حدیث میں کتنا بڑا ثواب آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ تشریف فرما تھے، ایک آدمی نے آکر ''السلام علیکم'' کہا، تو حضور نے فرمایا: دس۔ دوسرا آدمی آیا اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' تو حضور نے فرمایا: بیس۔ اس کے بعد تیسرا آدمی آیا اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' تو حضور نے فرمایا: تیس۔ (الادب المفرد، ۹۸۶) گویا جس نے صرف ''السلام علیکم'' کہا اس کو دس نیکی ملی۔ اور جس نے ''ورحمۃ اللہ'' ساتھ میں ملایا

تو اس کو بیس نیکیاں ملیں۔اور اگر ''وبرکاتہ'' کا ساتھ میں اضافہ کر دیا تو تیس نیکیاں ملیں۔اگر آپ دن میں سو آدمیوں سے ملاقات کرتے ہیں اور سب کو ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہتے ہیں تو آپ کے نامہ اعمال میں تین ہزار نیکیوں کا اضافہ ہو جائے گا۔آپ اندازہ لگائیے کہ سلام کا یہ کتنا بڑا فائدہ ہے، اور سلام کا اہتمام نہ کر کے ہم کتنے بڑے اخروی اجر وثواب سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ نے سلام تو باقاعدہ نبی آدم کے لئے بطور تحیّہ کے مقرر کیا ہے، بخاری شریف میں کتاب الاستیذان کے شروع میں باب ہے ﴿باب کیف بدء السلام﴾ سلام کی ابتداء کیسے ہوئی؟ یہ باب قائم کر کے روایت بیان کی ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو پیدا فرمایا تو حضرت آدم سے فرمایا کہ فرشتوں کے مجمع میں جاؤ اور ان کو سلام کرو، وہ تم کو کیا جواب دیتے ہیں وہ سنو۔جب حضرت آدم نے فرشتوں کو سلام کیا تو فرشتوں نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔باری تعالیٰ نے فرمایا یہ تمہاری امت کا تحیہ ہے۔(بخاری شریف،جلد۲/ ۵۹۸۶،۳۲۱۶/صفحہ۹۱۹) قرآنِ پاک میں ہے ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَا اَوْ رُدُّوْهَا﴾ جب تم کو سلام کیا جائے تو اس سے بہتر لفظ کہو۔کسی نے ''السلام علیکم'' کہا تو آپ جواب میں ''وعلیکم السلام'' پر اکتفاء نہ کریں بلکہ اس سے بڑھ کر ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' کہیے۔اور اگر اس نے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' کہا تو آپ جواب میں اضافہ کے ساتھ ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کہیے۔اور کم سے کم اس سے بہتر نہیں تو پھر جو اس نے کہا ہے اسی کو اس پر لوٹانا چاہیے؛ یہ اس کا حق ہے۔

پتہ نہیں کس کی دعا قبول ہوجائے

تو سلام کے متعلق حدیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ ویسے سلام کرنے کو سنت قرار دیا گیاہے اور سلام کا جواب دینے کو واجب قرار دیا ہے، اس لئے اگر کسی نے سلام کیا ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہوجاتا ہے۔ اور یہ دعا ہے، آپ اسی نیت سے سلام کر لیجئے کہ مَیں اس کو سلام کروں گا تو وہ اس کے جواب مجھے ''وعلیکم السلام'' کہے گا، اور پتہ نہیں کس کی دعا میرے حق میں قبول ہوجائے۔

حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جو سید الطائفہ ہیں اور ہماری جماعت کے شیخ المشائخ ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ؒ کو ترکی کے بادشاہ نے بلایا تھا، جب وہ مکہ مکرمہ واپس پہنچے تو حضرت حاجی صاحب سے انہوں نے اجازت چاہی کہ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں سلطان ترکی امیر المؤمنین کے سامنے آپ کے کچھ مناقب بیان کروں۔ حضرت حاجی صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اگر آپ میرے مناقب ان کے سامنے بیان کریں گے تو بہت سے بہت تو وہ مجھے بھی اپنے یہاں بلائیں گے جیسے آپ کو بلایا تھا، اور مَیں مکہ مکرمہ چھوڑنا نہیں چاہتا، اور یہ بھی نہیں کہوں گا کہ ان سے دعا کی درخواست کریں، البتہ حدیثِ پاک میں ہے کہ سلطانِ عادل کی دعا قبول ہوتی ہے، اور وہ سلطانِ عادل ہیں، اس لئے آپ سے یہ ضرور کہوں گا کہ آپ میرا سلام ان کو پہنچادیں، وہ اس کے جواب میں ''وعلیکم السلام'' کہیں گے تو وہ دعا اللہ تعالیٰ میرے حق میں قبول کرے گا۔ معلوم ہوا کہ اسی امید پر سلام کرنا کہ پتہ نہیں کون اللہ کا بندہ ایسا ہو اور کس کی دعا ہمارے حق میں قبول ہوجائے۔

اللہ اس بندہ پر رحم کرے......

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ الشیخ اور دادا پیر ہیں، اس لئے کہ حضرت معروف کرخی کے مرید اور خلیفہ حضرت سری سقطی تھے، اور ان کے خلیفہ حضرت جنید بغدادی تھے۔ حضرت سری سقطی حضرت جنید بغدادی کے ماموں بھی ہوتے ہیں۔ خیر! حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ایک مرتبہ جارہے تھے، ایک سقہ (پانی بیچنے والا) آواز لگا رہا تھا کہ اللہ اس بندہ پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پیے۔ انہوں نے پیسے دے کر اس سے پانی لے کر پیا۔ ان کے ساتھ ان کا مرید تھا اس نے کہا کہ حضرت آپ کا تو روزہ تھا، آپ نے پانی پی لیا؟ انہوں جواب میں کہا کہ وہ ایک آواز لگا رہا تھا کہ اللہ اس بندہ پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پیے، لہٰذا میں نے اسی امید پر پانی پی لیا کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے حق میں اس کی دعا قبول فرمالیں اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمادیں۔ کیسے کیسے لوگ تھے اور ان حضرات کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا

دعائیں لینے کا اہتمام

امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث تھے۔ ان کے واقعات میں لکھا ہے ایک مرتبہ کشتی میں جارہے تھے، کسی نے کنارے پر چھینک آنے پر "الحمدللہ" کہا۔ چھینک کھانے والا جب "الحمدللہ" کہے تو جواب میں "یرحمک اللہ" کہنا چاہیے، جب "یرحمک اللہ" کہیں گے، تو وہ جواب میں کہے گا "یھدیکم اللہ وعافاکم" اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تم کو عافیت نصیب فرمائے۔ تو حضرت امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کشتی میں جارہے تھے اور یہ سنا (وہ بڑی کشتی میں تھے جو آگے نکل گئی، اور بحری کشتیوں میں چھوٹی کشتیاں بوقتِ ضرورت استعمال کرنے کے لئے ہوا کرتی ہیں)

تو ایک درہم دے کر چھوٹی کشتی لی اور اس میں بیٹھ کر کنارے پر آئے اور اس آدمی کو کہا ''یرحمک اللہ''۔ کسی نے کہا کہ آپ نے اتنی زحمت کیوں برداشت کی؟ تو حضرت نے کہا کہ اس امید میں کہ وہ جواب میں مجھے کہے گا ''یھدیکم اللہ و عافاکم'' اور ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی دعا میرے حق میں قبول کرلیں۔ اسی واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ بعد میں کس نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے کہ امام ابوداؤد نے ایک درہم میں جنت خرید لی۔

(فتح الباری، ۱۰/۶۱۰)

اتنا بڑا محدث؛ جس کے بڑے بڑے اعمال ہیں وہ بھی دعائیں لینے کا اِس قدر اہتمام کررہا ہے اور ہمارا حال یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم نیکیاں کرکر کے سیر ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور حفاظت فرمائے۔

سلام کے آداب

حاصل یہ ہے کہ سلام ویسے بھی اسلام کا تحیہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے کی ملاقات کے وقت یہی ادب بتلایا ہے اور ایک مسلمان کا حق ہے کہ اس کو سلام کیا جائے، اور اس کے آداب بڑے تفصیل سے بتائے گئے ہیں کہ اگر کوئی آدمی سوار ہے تو وہ پیدل چلنے والے کو سلام کرے، اسی طرح اکیلا جماعت کو سلام کرے، جو چل رہا ہے وہ بیٹھے ہوئے کو سلام کرے، چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ اگر سامنے والے نے سلام نہیں کیا تو ہم بھی نہ کریں، بلکہ یہ تو ایک طریقہ اور ادب ہے کہ ابتداء اس کو کرنی چاہیے تھی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے ابتداء نہیں کی تو ہم بھی سلام نہ کریں، ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اس کی طرف سے ابتداء نہ ہو تو ہم ابتداء کریں۔

شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا اعزاز علی صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ گذرے ہیں جو شیخ الادب کے نام سے مشہور ہیں، علماء ان کو جانتے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے اور ان کے بہت سے شاگردوں سے براہ راست بھی سنا کہ سلام میں کوئی بھی ان سے ابتداء نہیں کرسکتا تھا، کوئی چھوٹے سے چھوٹا بچہ ہو یا شاگرد ہو؛ وہی پہلے سلام کرتے تھے، لوگ بہت چاہتے تھے کہ ہم پہلے سلام کرلیں لیکن کبھی اس کی نوبت نہیں آنے دیتے تھے۔ ہمارے ایک استاذ نے بتایا کہ مَیں ایک مرتبہ چھپا رہا اور اچانک نکل کر ان کو سلام کیا تو اس طرح مَیں ابتداء بالسلام کرسکا۔

مقصد یہ ہے کہ اتنے بڑے بڑے حضرات ان چیزوں کا اہتمام کرتے تھے، لیکن ہماری نگاہوں میں حضور ﷺ کی تعلیمات اور اسلام کی ہدایتوں کی جو قدر و قیمت ہونی چاہیے وہ نہیں رہی، اس لئے ان پر عمل کا وہ اہتمام بھی باقی نہیں رہا جو اللہ کے ان مخصوص بندوں کے یہاں تھا، ورنہ اگر ہمارے دلوں میں بھی وہ قدر و قیمت ہوتی اور ہم بھی وہ سمجھتے جو وہ حضرات سمجھ رہے تھے؛ تو ان باتوں پر عمل کے معاملے میں ہم آخر کیوں کوتاہی کرتے۔

سلام کا جواب کیسے دیں؟

بہرحال! یہ بتلا رہا تھا کہ اُس حدیث میں ’’اِذَا لَقِیْتَہٗ فَسَلِّمْ عَلَیْہِ‘‘ ہے اور اِس حدیث میں ’’رَدُّ السَّــــلَامِ‘‘ ہے، یعنی سلام میں ابتداء کرے یا اگر اس نے سلام کیا ہے تو پھر سلام کا جواب دے۔

اور اگر کسی نے زبانی سلام کہلوایا، تو جب آدمی آکر کہے تو اس کے جواب میں یوں کہنا

چاہیے ''علیھم وعلیکم السلام'' جس نے کہلوایا ہے اس پر اور آپ لے کر آئے ہیں تو آپ پر بھی سلامتی ہو۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر ان سے آپ کہیں کہ فلاں کو سلام کہنا تو وہ فوراً کہتے ہیں ''وعلیکم السلام''۔ اس طرح کہہ کر یہیں سے جواب نمٹا دیتے ہیں، پھر وہاں جا کر کیا کہیں گے۔ لہٰذا اگر کسی نے سلام کہلوایا ہو تو صرف ''وعلیکم السلام'' نہ کہو۔ اس لئے کہ اس صورت میں تو جو سلام لایا ہے صرف اسی پر آپ سلام بھیج رہے ہیں، اور جس نے بھجوایا ہے اس پر تو سلام ہوا ہی نہیں۔ لہٰذا اس کا طریقہ یہی ہے کہ ''وعلیھم وعلیکم السلام'' کہنا چاہیے، یعنی لانے والے کو بھی شریک کر لیا جائے؛ تب جواب مکمل ہوگا۔

اسی طرح اگر کسی نے خط کے اندر تحریری سلام لکھا تو بعض علماء فرماتے ہیں کہ خط کا جواب دینا واجب نہیں ہے، اس لئے کہ خط کے جواب دینے میں پیسے خرچ کرنے پڑیں گے اور ہر کوئی پیسے خرچ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا ہے، اس لئے جب خط کا جواب دینا واجب نہیں ہوا تو تحریری سلام کا جواب بھی تحریر میں ضروری نہیں ہوا، ہاں! خط پڑھتے وقت زبانی دے دینا چاہیے۔ آج ہم بہت سے خطوط پڑھتے ہیں اور اس میں سلام ہوتا ہے، لیکن نہ تحریری جواب دینے کی نوبت آتی ہے اور نہ زبانی دیتے ہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

بہرحال! ایک چیز ''رَدُّ السَّلامِ'' ہے، یعنی سلام کا جواب دینا۔ ایک مسلمان کے پانچ حقوق میں سے ایک یہ بھی ہے، یا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے ''اِذَا لَقِیْتَهٗ فَسَلِّمْ عَلَیْهِ'' جب تم ان سے ملو تو تم ان کو سلام کرو۔

﴿مسلمان کا دوسرا حق : تیمارداری﴾

دوسرا حق ہے ﴿عِیَادَةُ الْمَرِیْضِ﴾ بیمار کی خبر گیری، تیمارداری کرنا یعنی اگر کوئی آدمی بیمار ہو گیا تو اس کی عیادت کے لئے جانا۔ یہاں ایک بات اور ہے، ہمارے معاشرے میں بیمار کی خبر گیری کے لئے جایا جاتا ہے، لیکن شیطان نے ایک عجیب گمراہی کے انداز میں ہمیں اپنا تختۂ مشق بنا رکھا ہے کہ جو عبادتیں ہیں ان میں بھی ایسی کوشش کرتا ہے کہ ان عبادتوں کا ثواب اور اجر ہم کو نہ ملے، اور اس سے ہمیں محروم کر دے، لہٰذا اس نے عبادتوں میں بھی رسم ڈال دی۔ ہم کسی بیمار کی خبر گیری کے لئے جاتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اگر نہیں جائیں گے تو وہ برا مانے گا، جب ہم بیمار ہوئے تھے تو وہ ہماری خبر لینے کے لئے آیا تھا، لہٰذا جب وہ بیمار ہوا ہے تو ہمیں بھی جانا چاہیے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت ہے، آپ نے اس کی تعلیم دی ہے؛ یہ جذبہ تو دل میں ہوتا ہی نہیں۔ بس! ہم ایک رسم کو پورا کرنے کی غرض سے جاتے ہیں، اس طرح یہ چیز عبادت نہیں رہتی۔ اور رسم کے طور پر جو کیا جائے اس میں ثواب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گویا ہم جو عبادت کر رہے ہیں، شیطان اس کے اجر وثواب سے دور کر رہا ہے، ہماری نگاہ بھی کتنی محدود اور تنگ ہو گئی ہے:۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ❁ ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

ہمیں تو یوں سوچنا چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، اور اللہ کے رسول نے اس کو سنت قرار دیا، بس پھر تو ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے۔ میں بیمار ہوا تھا تو وہ میری خیریت پوچھنے کے لئے نہیں آیا تھا، اس لئے اب مَیں کیوں جاؤں؟ یہ ایک مزاج بن گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ اس نے اللہ کی خوشنودی حاصل نہیں کی، تو اب مَیں کیوں کروں؟

یہ سب تو عبادتیں ہیں، اگر کسی نے نہیں کی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم بھی نہ کریں مثلاً آپ نماز پڑھنے جاتے ہیں، اور آپ کا دوست نماز پڑھنے نہیں جاتا، تو آپ یوں کہیں گے کہ وہ تو نماز پڑھنے نہیں جاتا؛ اس لئے میں بھی نہیں جاؤں گا؟ ایسا کبھی آپ نے سوچا؟ نماز پڑھنے والا کبھی یہ نہیں سوچتا کہ فلاں آدمی نماز نہیں پڑھتا اس لئے میں بھی نہیں پڑھوں گا، اسی طرح بیمار کی عیادت اور خبر گیری، اور سلام یہ ساری عبادتیں ہیں، کیا عبادتوں میں ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ وہ مجھے سلام کرے تو میں سلام کروں یا وہ میری خبر گیری کے لئے آتا تو میں اس کی خبر گیری کے جاتا۔ یہ سوچنا غلط ہے، یہ تو جہالت کی باتیں ہوئی۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کہ وہ اللہ کو راضی کرتا تو میں بھی کرتا، اس نے اللہ کو راضی نہیں کیا تو میں بھی نہیں کرتا۔ جب کہ ہمیں تو اس کا اجر وثواب اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ اس نے نہیں کیا تو اپنا نقصان کیا، اس کی وجہ سے ہم اپنا نقصان کیوں کریں؟

عیادت کے فضائل

مسلم شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی مسلمان کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتا ہے تو وہ جنت کے باغیچوں کے اندر سیر کرتا ہے۔ (صحیح مسلم، ۶۷۱۹)

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ جب کوئی آدمی بیمار کی عیادت اور خبر گیری کے لئے اگر صبح کے وقت جاتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں اور شام کے وقت جاتا ہے تو صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک باغیچہ مقرر کر دیتے ہیں (ترمذی شریف، ۹۶۹) اتنی بڑی فضیلت ہے، اس کے بعد بھی یہ سوچنا کہ فلاں نے یہ کام نہیں کیا، اس لئے میں نہیں

کروں گا، اس کا کیا مطلب ہوا؟

عیادت اور بیمار کی خبر گیری ویسے تو سنت کا درجہ رکھتی ہے، لیکن بعض اوقات ضروری ہو جاتی ہے، جیسے ماں باپ بیمار ہیں تو ماں باپ کی خبر گیری اولاد کے لئے ضروری اور واجب ہے۔ کوئی پڑوسی ہے اور اس کی خبر لینے والا کوئی نہیں ہے تو آپ پر ضروری ہو جائے گا۔ یا کوئی مؤمن ہے اور کوئی دوسرا خبر لینے والا نہیں ہے اور اگر اس کی خبر گیری نہیں کی جائے گی تو وہ ہلاک ہو جائے گا، یا نقصان میں پڑ جائے گا، تب بھی قریب کے لوگوں پر اس کی خبر لینا ضروری ہو جاتا ہے۔

﴿عیادت کے آداب﴾

اور مریض کی عیادت کے آداب بھی ہیں، ان آداب کی رعایت ضروری ہے، جب بیمار کی عیادت کے لئے آدمی جائے، تو حضور ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ عَادَ فَلْيُخَفِّفْ﴾ جو آدمی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو مختصر وقت کے لئے جائے۔

ایک روایت میں ہے ﴿اَلْعِيَادَةُ فُوَاقَ نَاقَةٍ﴾ عیادت: اونٹنی کے دو ہنے کے دو دودھوں کے درمیان کا وقت ہے (شعب الایمان، ۹۲۲۲) یعنی جب بھینس کا دودھ دوہتے ہیں تو اس کے تھن کے سرے کو انگوٹھے سے دباتے اور پمپنگ کرتے ہیں، ایک مرتبہ دبایا، اس میں سے دودھ نکلا پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں، اگر نہیں چھوڑیں گے تو دوسرا دودھ نہیں آئے گا، اس طرح دباتے اور چھوڑتے رہنا پڑتا ہے، تا کہ دودھ آتا رہے۔ ایک مرتبہ دبانے کے بعد چھوڑ کر دوسری مرتبہ دباتے ہیں اس درمیان میں جو قلیل وقفہ ہوا؛ اس کو "فُوَاقٌ" کہتے ہیں۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ عیادت اتنے مختصر وقت کے لئے ہے کہ اس کے پاس گئے، سلام کیا، خیریت پوچھی کہ

کیا حال ہے؟ جب وہ بتائے تو اس کے لئے صحت کی دعا کی جائے اور واپس ہو جائے۔ یہ بھی آداب میں سے ہے کہ اس کے لئے دعائے صحت کی جائے۔

بیمار کو یہ دعا دینا بھی ثابت ہے ﴿أَذْهِبِ الْبَأْسَ، رَبَّ النَّاسِ، اِشْفِ، أَنْتَ الشَّافِيُ، لاشِفَآءَ اِلَّاشِفَآؤُکَ، شِفَآءً لایُغَادِرُ سَقَماً﴾ اے لوگوں کے پروردگار! اس کی بیماری کو دور کر دے، تو ہی شفا دینے والا ہے، تیرے علاوہ اور کسی کی شفا کارگر نہیں ہوتی ہے، ایسی تندرستی دے کہ کوئی بیماری باقی نہ چھوٹے۔ (سنن أبی داود، ۳۸۸۳)

اور حدیث میں آتا ہے کہ آدمی اگر کسی بیمار کی عیادت کے لئے جائے تو سات مرتبہ یہ کہے ﴿أَسْأَلُ اللهَ الْعَظِيْمَ، رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، أَنْ يَّشْفِيَکَ﴾ میں عظمت والے پروردگار سے جو عظمت والے عرش کا مالک ہے؛ سوال کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو شفا دے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اس کی موت نہیں آئی ہے تو وہ بیماری سے ضرور شفا پائے گا کتنی بڑی فضیلت ہے۔ (ترمذی شریف، ۲۰۸۳)

اور پھر زیادہ دیر نہ ٹھہرے، اس لئے کہ اجنبی کے آنے کی وجہ سے بیمار اپنے اوپر ایک حجاب محسوس کرتا ہے، اور ہر آدمی اپنے آپ کو بے تکلف رکھنا چاہتا ہے، یعنی ہر آدمی چاہتا ہے کہ اپنے اٹھنے، بیٹھنے، باتوں اور گفتگو میں اور چال ڈھال میں بے تکلف رہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ میں پیر لمبے کر کے بیٹھوں، اور کوئی عیادت کے لئے آیا، تو وہ اس کی وجہ سے پیر سمیٹ لے گا، اور ذرا سنبھل کر بیٹھنا پڑے گا۔ اب آپ دیر تک بیٹھے رہیں گے تو اس بے چارے کو آپ نے تکلیف میں ڈال دیا، ایک تو بیماری ہے اور آپ نے اس کے اوپر اضافہ کر دیا۔ اور وہ آدمی اپنے گھر والوں سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوگا اور آپ وہاں بیٹھ گئے ہیں تو نہیں کر سکے گا۔ اس

لئے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ فیوی کول (FEVICOL) لے کر جائے کہ وہاں چپک گئے، بلکہ تھوڑی دیر میں خیریت پوچھ کر وہاں سے نکل جائے، ورنہ اس کو زحمت میں ڈالنا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث، فقیہ اور صوفی گذرے ہیں، کتابوں میں لکھا ہے کہ ہر ایک کے متعلق کسی نہ کسی نے نقد کیا ہے، لیکن ان کی شخصیت کے متعلق کسی نے کوئی نقد نہیں کیا۔ ایسی عظیم شخصیت تھی۔ ایک مرتبہ وہ بیمار ہوئے، جب کوئی بڑا آدمی بیمار ہوتا ہے تو سینکڑوں لوگ اس کی عیادت کے لئے آتے ہیں۔ ان کی عیادت کے لئے بھی لوگ آرہے تھے، ایک آدمی آیا تو وہ ایسا بیٹھا کہ جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ حضرت اس کی وجہ سے پریشان تھے، جب بہت دیر ہوگئی تو حضرت فرمانے لگے کہ لوگ بھی عجیب ہیں کہ ان کو عیادت کے آداب سے واقفیت نہیں ہیں، آتے ہیں اور بیمار کا خیال ہی نہیں رکھتے۔ تو اس نے کہا کہ ہاں حضرت! اگر آپ فرمائیں تو مَیں دروازہ بند کردوں تاکہ کوئی آئے ہی نہیں۔ حضرت نے کہا کہ ہاں ایسا کرو! باہر نکل کر دروازہ بند کردینا۔

بہرحال! عیادت بھی مسنون ہے اور بیمار کے لئے دعا کرنا بھی مسنون ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

غلط رسم ورواج محرومی کا سبب

اب ہمارے یہاں عیادت میں بدعت جاری ہوگئی ہے یعنی ایک رواج پڑ گیا ہے کہ کوئی کھانے کی چیز فروٹ وغیرہ لے کر جاؤ۔ اس کی نحوست یہ ہوتی ہے کہ اگر آپ کے پاس کچھ لے جانے کی استطاعت نہیں ہے تو آپ نہیں جائیں گے۔ کسی حدیث میں ایسا نہیں آیا ہے کہ بیمار کے لئے فروٹ یا کچھ لے کر جاؤ۔ اصل تو یہ ہے کہ وہاں جاکر دعا دینی ہے، اور

آپ کے جانے سے اس کے گھر والوں کو تسلی ہوگی۔

یہاں تک کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے ﴿بَابُ عِيَادَةِ مُغْمٰى عَلَيْهِ﴾ یعنی کوئی آدمی کوما (coma) میں بے ہوش ہے، اس کی عیادت کے لئے بھی جانا چاہیے۔ اب وہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ تو بے ہوش ہے، اس حالت میں ہم جائیں گے تو اس کو تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کون میری خبر گیری کے لئے آیا ہے، اس کی عیادت کے لئے جانے سے کیا فائدہ ہوگا؟ تو محدثین نے لکھا ہے کہ جب آپ اس کی عیادت کے لئے جائیں گے اس کو تو پتہ نہیں چلے گا، لیکن اس کے گھر والوں کو آپ کے جانے سے تسلی ہوگی، اور ایک مؤمن کے دل میں سرور کو داخل کرنا؛ یہ بھی بہت اہم اور بڑی چیز ہے۔

خیر! مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ ایک رواج پڑ گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ یہ سوچ کر نہیں جاتے کہ ابھی ہمارے پاس پیش کرنے کے واسطے کچھ نہیں ہے، جب انتظام ہوگا تب جائیں گے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتنا بڑا ثواب جو ایک بیمار کی عیادت کا حدیث میں آیا ہے اس سے اپنے آپ کو محروم رکھتے ہیں۔ یہ تو خالص عبادتیں ہیں، ان میں بھی رسموں کو اور زائد چیزوں کو داخل کر کے ہم نے اپنے آپ کو بہت بڑے اجر و ثواب سے محروم کر رکھا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سے بچنے کا اہتمام کیا جائے۔

﴿عیادت کا ایک اہم ادب﴾

اور ایک اہم بات یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت کے لئے جائے تو اس کے لئے وقت بھی مناسب ہونا چاہیے، کسی ایسے وقت میں نہ جائے کہ وہ وقت بیمار کے گھر والوں کے لئے گرانی کا باعث ہو، جیسے آدھی رات کو یاد آ گیا تو اسی وقت پہنچ گئے، دوپہر

کو آرام کا وقت ہوتا ہے، اس وقت پہنچ گئے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ عام طور پر جن اوقات میں ملاقات کے لئے جایا جاتا ہے، اور جن اوقات کے بارے میں یہ خیال ہو کہ ان اوقات میں میرا جانا نہ اس بیمار کے لئے گرانی کا باعث ہے، اور نہ اس کے گھر والوں کے لئے؛ ایسے ہی وقت ہی جانا چاہیے۔تو ایک ادب یہ ہے کہ وقت کا انتخاب صحیح ہونا چاہیے۔کسی مشغولی کا وقت نہ ہو، آرام کا وقت نہ ہو۔بلکہ جب کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے اور لوگ اس کی عیادت کے لئے آتے ہیں تو جو اوقات عرف میں ملاقات کے لئے ہوتے ہیں اور عام طور پر گھر والے بھی انہیں اوقات میں منتظر ہوتے ہیں کہ کوئی ملاقات کے لئے آئے گا؛ ایسے وقت ہی جایا جائے، تا کہ آپ کا جانا حقیقتاً بیمار کے لئے راحت رسانی کا ذریعہ ہو، تنگی اور پریشانی میں ڈالنے کا ذریعہ نہ ہو۔

﴿مسلمان کا تیسرا حق: جنازہ میں شرکت﴾

﴿وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ﴾ اور دوسری روایت میں ہے ﴿وَاِذَامَاتَ فَاتَّبِعْهُ﴾ کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازہ میں شرکت کرنا یہ بھی ان حقوق میں سے ہے جو ایک مسلمان ہونے کے ناطے سے دوسرے مسلمان پر ہیں، یعنی یہ کوئی رشتہ داری اور صلہ رحمی نہیں ہے بلکہ اسلامی حقوق میں سے ہے۔اس لئے ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ رشتہ دار ہے تب ہی گئے ورنہ نہیں گئے۔اگر رشتہ داری یا دوستی ہے تو مزید تاکید ہو جاتی ہے لیکن ایک مسلمان کے حقوق میں سے ہے کہ اس کے جنازہ میں شرکت کی جائے، اس کے لئے دعائے مغفرت کی جائے، جنازہ کی نماز میں اگر شرکت کریں گے تو اس میں دعائے مغفرت ہو ہی جاتی ہے۔اور پھر اس کے جنازہ کے ساتھ جانے کی اور دفن میں شریک ہونے کی بھی حدیثِ پاک میں تاکید آئی

ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ کوئی آدمی صرف جنازہ کی نماز پڑھ کر واپس ہوجاتا ہے اور دفن میں شریک نہیں ہوتا تو اس کو ایک ہی قیراط ثواب ملتا ہے، اور اگر دفن میں بھی شریک ہوتا ہے تو اس کو دو قیراط ثواب ملتا ہے (مسند احمد) اور ایک قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے۔

ویسے اگر کسی وجہ سے دفن میں شرکت کی نوبت نہ آوے تو مرنے والے کے اولیاء سے اجازت لے کر واپس ہونا چاہیے، ان کو بے خبر رکھ کر نہیں۔ الّا یہ کہ عرف کی وجہ سے اجازت ہو تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

مسلمان کا چوتھا حق: دعوت قبول کرنا

﴿وَاِجَابَۃُ الدَّعْوَۃِ﴾ اور دعوت کو قبول کرنا بھی ان حقوق میں سے ہے جو ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر ہیں۔ ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ کی رویت ہے کہ جب کوئی مسلمان دعوت کرے تو اس کو قبول کرو، اور اس کے یہاں جاؤ، پھر اگر تم روزہ سے ہو تو وہاں جاکر اس کے لئے دعا کردو، اور روزہ نہیں ہے تو کھانے میں بھی شریک ہوجاؤ۔ تو دعوت دینا بھی محبت کا تقاضہ ہے، جب اس نے اخلاص اور محبت کے ساتھ دعوت دی ہے تو اخلاص اور محبت کے ساتھ ہی قبول بھی کرنی چاہیے، اس میں اس کی دل جوئی بھی ہے۔

اور پھر ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ جس دعوت کے متعلق گمان ہو کہ وہاں عمدہ کھانا ملے گا وہاں تو شریک ہوجائے اور جہاں سادہ کھانا اور دال روٹی ملنے کا گمان ہو؛ وہاں نہ جائے۔ دعوت کے قبول کرنے کا یہ حق مالدار اور غریب دونوں کے لئے ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿لَوْ دُعِیْتُ اِلٰی کُرَاعٍ لَاَجَبْتُہٗ﴾ اگر مجھے کھری یا پائے کی دعوت دی جائے تو اس کو قبول

کروں گا (بخاری شریف، ۵۱۷۸) ہمارے زمانے میں تو پائے عمدہ چیز سمجھی جاتی ہے، اس لئے کہ عمدہ طریقہ سے پکائے جاتے ہیں اور عمدہ طریقہ سے کھائے جاتے ہیں، اُس زمانہ میں اس طرح نہیں پکتے تھے، کیونکہ اس وقت تو آگ پر سیک لیا جاتا تھا، آج بھی آپ پائے آگ پر سیک لیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا لذت آتی ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اس زمانہ میں پائے ایک کمتر چیز سمجھی جاتی تھی، اس لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کی مجھے دعوت دی جارہی ہے وہ گھٹیا چیز ہے۔ کبھی داعی کا حال ہی دلالت کرتا ہے کہ اس کے یہاں معمولی چیز ہی پیش کی جائے گی تب بھی انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اس کی دعوت کو قبول کرنا یہ اس کا حق ہے، اس نے محبت کے ساتھ دعوت پیش کی تو اس کا جواب بھی محبت اور اخلاص ہی سے دینا چاہیے۔

دعوت کے تین درجے

البتہ دعوت کے متعلق حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ دعوت صرف دعوت ہی ہونی چاہیے، دعوت عداوت نہیں ہونی چاہیے۔ بعض لوگ دعوت کے معاملہ میں ایسا اصرار کرتے ہیں کہ جس کو دعوت دی جارہی ہے اس کی راحت کا خیال ہی نہیں رکھتے، اس لئے کہ دعوت کا مقصد تو سامنے والے کو راحت پہنچانا ہے، لہٰذا اس کی راحت کا پورا اہتمام کرنا چاہیے

اسی لئے حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ دعوت کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اعلیٰ یعنی (1st Class) کا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جس کی دعوت کرنا چاہتے ہیں اس کو نقد رقم دے دیجئے، اگر اس کو نقد رقم دے دی تو وہ اس رقم کے ذریعہ جب چاہے گا اور جہاں چاہے گا اور جو چاہے گا کھالے گا۔ گویا آپ نے دعوت کے ذریعہ اس کو کسی مخصوص وقت اور

مخصوص جگہ پر جانے کا اور کسی مخصوص چیز کے کھانے کا پابند نہیں بنایا۔ آپ اگر کھانا تیار کر کے اس کو اپنے گھر بلائیں گے تو اس میں اس پر تین پابندیاں آتی ہیں، ایک تو یہ کہ وہ وہی چیز کھائے جو آپ نے اس کے لئے بنائی ہے، اور دوسری یہ کہ آپ کے گھر آ کر ہی کھاوے، اور تیسری یہ کہ اس وقت میں آئے جو آپ نے متعین کیا ہے۔ لیکن جب آپ نے اس کو نقد رقم دے دی تو گویا آپ نے اس کو تینوں پابندیوں سے آزاد کر دیا۔ اور پھر وہ اس رقم کو اپنے کسی دوسرے کام میں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ یہ اعلیٰ قسم کی دعوت ہے۔

درمیانی درجہ (Middal Class) دعوت یہ ہے کہ آپ کھانا پکا کر اس کے گھر بھیج دیں، اپنے گھر بلانے پر اصرار نہ کریں۔ اس میں ایک پابندی ہوگئی کہ آپ نے اس کے لئے جو پسند کیا وہی وہ کھائے گا، اس معاملہ میں اس کی پسند باقی نہیں رہی، لیکن اس کے گھر بھیج دیا تو وہ اپنی مرضی کے مطابق جس وقت چاہے گا کھائے گا۔ گویا اس میں ایک طرح کی آزادی اور راحت ہے۔

اور دعوت کا تیسرا درجہ (3rd Class) یہ ہے کہ آپ کسی کو اپنے گھر بلانے پر اصرار کریں، گویا اس پر تینوں قسم کی پابندیاں عائد کر رہے ہیں، کھانے کے معاملہ میں بھی اپنی پسند اس کے سر پر تھوپ رہے ہیں اور وقت اور جگہ کے سلسلہ میں بھی اس کو پابند بنا رہے ہیں۔

دعوت یا عداوت

اور خاص کر اس زمانہ میں لوگ دعوت کے سلسلہ میں بڑا اصرار کرتے ہیں، حالانکہ آج کل کا زمانہ لوگوں کے لئے بڑی مشغولیت کا زمانہ ہے، عام طور پر ہر آدمی کے پاس وقت کی بڑی قلت ہے، ہر ایک اپنے اپنے کاروبار اور کاموں میں ایسا مشغول ہوتا ہے کہ شاید ہفتہ

میں فرصت کا کچھ وقت مل جائے، وہ خود اپنے گھر والوں کے لئے اور اپنی بیوی بچوں کے لئے وقت نہیں نکال پاتا اور آپ دعوت پر اصرار کر کے اس کو اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں تو آپ ہی اندازہ لگائیے کہ آپ اس کو راحت پہنچا رہے ہیں یا تکلیف پہنچا رہے ہیں؟

اور دوسری بات یہ ہے کہ آبادی کی کثرت کی وجہ سے کسی کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا کتنا مشکل ہے۔ مثلاً ایک آدمی نوساری میں رہتا ہے، اور آپ یہاں سورت میں رہتے ہیں، اور آپ نے اس کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، تو ظاہر ہے کہ آپ کی دعوت کا جو وقت ہے اس پر پہنچنے کے لئے وہ دو، ڈھائی گھنٹہ پہلے سے اپنی جگہ سے نکلے گا، اس کے لئے پچاس سو روپے خرچ کرے گا؛ تب آپ کے یہاں پہنچ سکے گا، تو اب آپ ہی سوچئے کہ یہ دعوت ہوئی یا عداوت ہوئی؟

اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہم نے دعوتوں کو بھی رسموں کا پابند بنالیا ہے۔ دعوت تو ایک ایسی چیز تھی کہ جو خالص محبت کا تقاضہ تھا جو اخلاص کے ذریعہ پورا کیا جاتا تھا، اب ہم نے اس کو اپنی تقریبات کے ساتھ مخصوص کر دیا، گویا اسی موقعہ پر ہماری طرف سے اصرار ہوتا ہے کہ آپ کو تو آنا ہی پڑے گا، وہ بے چارہ مجبوری ہونے کے باوجود آتا ہے۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ شیطان نیکی کے کام پہلے تو کرنے نہیں دیتا اور اگر کوئی آدمی نیکی کا کوئی کام کر لیتا ہے تو اس میں شیطان اپنی طرف سے کچھ ایسی ملاوٹ کر دیتا ہے کہ اس کو ثواب نہ ملے۔ یہ دعوت تو خالص مؤمن کا دل خوش کرنے اور سنت کو ادا کرنے کے لئے ہوا کرتی تھی، جب وہاں سنت ہی ادا نہیں ہوگی تو پھر ثواب بھی نہیں ملے گا۔

بہر حال! اگر کوئی دعوت کرنے کا اعلیٰ درجہ اختیار کرے تو بہت ہی اچھا ہے۔

دعوت کا ایک نرالا انداز

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو سیرت المصطفیٰ کے مصنف ہیں، تین جلدوں میں بڑی مشہور کتاب ہے، وہ بھی بڑے عالم تھے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بڑی گہری دوستی تھی، مولانا ادریس صاحب لاہور میں رہتے تھے اور مفتی محمد شفیع صاحب کراچی میں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا ادریس صاحب کراچی تشریف لائے تو مفتی صاحب کے پاس ملاقات کے لئے گئے، مفتی صاحب نے بڑی خوشی کا اظہار کیا کہ آپ تشریف لائے۔ پھر دریافت کیا کہ آپ کا قیام کہاں ہے؟ فرمایا کہ تاج کالونی میں میرا قیام ہے۔ دریافت کیا کہ واپسی کب کی ہے؟ فرمایا کہ کل صبح کی واپسی ہے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ آپ یہاں آئے ہیں اور ہمارا پرانا تعلق ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کی دعوت کروں لیکن کل آپ کی واپسی ہے، اور پھر آپ کا جہاں قیام ہے وہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے، اگر مَیں اصرار کروں کہ آج شام کو آپ کو میرے یہاں کھانے کے لئے آنا ہی پڑے گا تو یہ آپ کے لئے بجائے راحت کے ایک زحمت سی ہو جائے گی، اس لئے مَیں آپ کی خدمت میں سو روپے دعوت کی جگہ پر پیش کرتا ہوں، آپ جب چاہیں جو چاہیں کھالیں۔ مولانا نے بھی وہ نوٹ لے کر اپنے سر پر رکھے، اور بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ وہاں مفتی صاحب نے ایسا اصرار نہیں کیا کہ اتنی دور سے آئے ہیں اور بڑی مدت کے بعد آئے ہیں اور ہمارا تو پرانا تعلق ہے، آپ کو تو میں اپنی دعوت کھائے بغیر جانے ہی نہیں دوں گا، چاہے ریزرویشن کینسل کرنا پڑے؛ تو کرو۔ اور مولانا نے بھی یوں نہیں کہا کہ آپ نے مجھے سو روپے دے دئے، کیا میں آپ کے سو روپے کا بھوکا ہوں۔ اس لئے

اصل تو یہ ہے کہ جس کی خدمت میں دعوت پیش کی جارہی ہے اس کی راحت رسانی مقصود ہو۔

بہرحال! ہم نے اپنے معاشرے اور سماج میں کچھ ایسی شکلیں اختیار کرلی ہیں کہ جس کی وجہ سے دعوت میں بھی رسم ورواج کو داخل کر کے دعوت کو اپنے لئے بجائے راحت کے زحمت کا سامان بنالیا ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔ یہی چیز ملحوظ خاطر رہے کہ جس کو دعوت دی جارہی ہے اس کی راحت رسانی مقصود ہو، ہماری یہ دعوت اس کے لئے راحت اور خوشی کا ذریعہ بنے، زحمت کا ذریعہ نہ بنے۔ اس کا اہتمام کیا جائے۔

میزبان کے بھی حقوق ہیں

اور ایک بات یہ ہے کہ جس کے یہاں دعوت دی گئی ہے اس میزبان کے بھی حقوق ہیں، جیسے آپ کو اگر دعوت دی گئی ہے اور آپ کو اجازت بھی دی ہے کہ آپ اپنے ساتھ دو چار ساتھیوں کو بھی لاسکتے ہیں تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر آپ کو تنہا دعوت دی گئی ہے اور آپ چار پانچ آدمیوں کو لے کر پہنچ گئے، تو یہ درست نہیں ہے، بلکہ ضرورت ہے کہ پہلے سے صاحبِ خانہ کو اطلاع دیں۔

حدیثِ پاک میں صراحت ہے کہ ایک مرتبہ کسی نے نبی کریم ﷺ کی دعوت کی، ایک آدمی آپ کے ساتھ ہولیا، جب آپ داعی کے گھر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ دیکھو! یہ آدمی ہمارے ساتھ ہولیا ہے، اگر تم اجازت دو تو وہ کھانے میں شریک ہوگا، ورنہ ہم اس کو کہہ دیتے ہیں کہ تم واپس چلے جاؤ۔ اس نے کہا کہ وہ شریک ہوجائے۔ (مسند احمد، ۱۷۱۲۶)

ایک حدیث میں آتا ہے کہ کوئی کسی کے یہاں بغیر دعوت کے شریک ہوا تو چور بن کر داخل ہوا اور لٹیرا بن کر نکلا (شعب الایمان، ۱۴۳۲۳) یہ اس وقت ہے کہ اجازت نہیں دی گئی ہے، ورنہ

اگر اجازت دی ہے تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

پھر یہ ہے کہ مہمان کو بھی میزبان کا خیال رکھنا چاہیے، اگر آپ کسی کے یہاں مہمان بن کر جارہے ہیں تو آپ اس کو پہلے سے اطلاع کردیں کہ میں فلاں وقت پہنچوں گا تاکہ وہ آپ کے لئے اس کے مطابق تیاری کرلے۔ اور اگر بلا اطلاع کے جارہے ہیں تو پھر ایسے وقت پہنچئے کہ اس کو آپ کی میزبانی کے لئے کچھ تیاری کا موقعہ ملے، اور کوئی دشواری نہ ہو۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ کوئی مہمان اپنے میزبان کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے (ترمذی شریف،۷۸۹) اس لئے کہ اگر آپ کسی کے یہاں مہمان بن کر گئے اور آپ نے اس کو بتلائے بغیر ہی روزے کی نیت کرلی، اب اس بے چارے نے محنت کرکے آپ کے لئے ناشتہ اور کھانا تیار کیا، اور جب وقت پر اس نے پیش کیا تو آپ نے کہا کہ میرا تو روزہ ہے، تو آپ نے اس کا وقت اور پیسہ دونوں ضائع کیا اور اس کو تکلیف بھی پہنچائی، تو جیسے چوری کرنا، زنا کرنا، شراب پینا؛ یہ سب حرام کام ہیں، ایسے ہی کسی مؤمن کو تکلیف اور ایذاء پہنچانا بھی حرام ہے، اور خاص کر اس طرح کرکے اپنے میزبان کو تکلیف میں ڈالنا تو بہت ہی زیادہ برا ہے۔

اور پھر میزبان کے کھانے کا جو وقت ہے اس کی رعایت بھی مہمان کے لئے ضروری ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے میزبان کے یہاں گیارہ بجے کھانا کھایا جاتا ہے، اور مہمان صاحب کہیں ملاقات کے لئے ایسے نکل گئے کہ وہ بے چارہ چاروں طرف آدمی دوڑا رہا ہے، اور دسترخوان بچھا کر مہمان کے انتظار میں پریشان ہے اور یہ مہمان صاحب کہیں ایسے گئے کہ میزبان کو پتہ ہی نہیں چل رہا ہے، اب ظہر کے بعد آئے، پوچھا کہ کہاں رہ گئے

تھے، تو کہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے ملنے کے لئے گیا تھا، انہوں نے بڑا اصرار کیا کہ چلو ذرا فلاں جگہ گھوم کر آتے ہیں، تو ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔ بھائی! آپ تو گھومنے چلے گئے اور اس بے چارے کو تو زحمت میں ڈال دیا اور پریشان کر دیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کہیں جانا ہے تو پہلے سے اطلاع کر دیجئے، اور اگر کھانے کا ارادہ نہیں ہے تو پہلے سے کہہ دیجئے کہ آج کھانے کا ہمارا ارادہ نہیں ہے یا بھوک نہیں ہے۔ یا اگر دیر سے کھانے کا ارادہ ہے تو کہہ دیجئے کہ آپ اپنے وقت پر کھالینا، اور میرا کھانا رہنے دینا، مجھے ایک ضرورت سے جانا ہے، مَیں وہاں سے آ کر اپنے طور پر کھالوں گا۔ اس طرح کرنے سے میزبان کو بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ بہرحال! دعوت کے اندران ساری چیزوں کی رعایت کرنا بہت ضروری ہے۔

دعوت قبول کرنے کے شرائط

اب دعوت قبول کرنے کو ایک حق قرار دیا گیا ہے تو اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ کوئی شرعی مانع نہ ہو۔ جہاں دعوت کی جارہی ہے وہاں شریعت کے خلاف کوئی کام ہو رہا ہے مثلاً وہاں ناچ گانا ہو رہا ہے، یا وہاں تصویر کشی ہو رہی ہے، یا وہاں اور کوئی ایسی شکل ہے جس سے شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی ہے، اور اس کو معلوم ہے کہ اگر مَیں اس دعوت میں شرکت کروں گا تو مجھے بھی اس گناہ میں مبتلا ہونا پڑے گا، تو اس صورت میں دعوت کا حق باقی نہیں رہتا۔ پھر وہ اس دعوت میں نہ جائے۔

اور اگر ایسی بات ہے کہ وہاں وہ حرام کام تو ہو رہا ہے اور میرے مبتلا ہونے کی نوبت نہیں آئے گی، جیسے تصویر کشی ہو رہی ہے لیکن اس کی تصویر کوئی نہیں کھینچے گا، تو اس صورت میں اگر عامی آدمی ہے تو اس کے لئے تو جانے کی گنجائش ہے۔ لیکن اگر وہ دینی مقتداء ہے، جیسے مولوی صاحب یا امام صاحب ہیں اور ان کے وہاں جانے سے لوگوں پر غلط اثر پڑے گا، تو پھر

چاہے خود ان کے مبتلا ہونے کی نوبت نہ آتی ہو، تب بھی ان کے لئے ایسی دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں ہے۔

آج کل دعوتوں میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط مجمع ہوتا ہے، یہ مخلوط مجمع بھی حرام ہے، لہٰذا ایسے مخلوط مجمع والی دعوتوں میں شرکت کرنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اگر ایسے مجمع والی دعوت میں آپ جائیں گے تو آپ اس حرام میں مبتلا ہوں گے۔

﴿غلط رسم ورواج ختم کرنے کے لئے ایک مفید مشورہ﴾

اب اگر آپ ہتھیار ڈال دیں اور یوں کہنے لگیں کہ کیا کریں، ان کے یہاں تو جانا ہی پڑے گا، اگر نہیں جاؤں گا تو سوسائٹی میں نکّو بن جاؤں گا اور تنہا رہ جاؤں گا۔ اگر اس طرح آپ ہتھیار ڈالتے رہیں گے تو پھر دھیرے دھیرے شریعت کی ساری چیزیں ختم ہوکر غلط رسم ورواج جگہ پاتے رہیں گے۔ اس لئے سماج میں ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو ان کو یہ کہیں کہ اگر آپ ہمیں دعوت دینا چاہتے ہیں تو ہمارے اصول یہ ہیں جو ہمارے گھر کے بنائے ہوئے نہیں ہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی بتلائی ہوئی ہدایات پر مبنی ہیں، اگر آپ ان کا خیال رکھتے ہیں تو ہم آپ کے یہاں دعوت میں شریک ہوں گے؛ ورنہ ہم نہیں آئیں گے۔ اگر کچھ لوگ ایسا کریں گے تو پھر وہ برائیاں جو ہمارے معاشرے اور سماج میں دن بہ دن پھیلتی جارہی ہیں ان پر ان شاء اللہ روک لگ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ﴾ اور چھینک کھانے والے کو جواب دینا۔

مسلم شریف کی روایت میں چھ حقوق بتلائے گئے ہیں ﴿إِذَا لَقِيتَهُ فَسَلِّمْ عَلَيْهِ﴾ اوپر کی روایت میں تو سلام کا جواب دینا بتلایا تھا، اور اس روایت میں بتلاتے ہیں کہ جب تم اس سے ملو

تو اس کو سلام کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سلام کرنا بھی حق ہے اور سلام کا جوب دینا بھی حق ہے لیکن جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ سلام کرنا سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے۔

﴿وَاِذَادَعَاکَ فَأَجِبْهُ﴾ جب وہ دعوت دے تو قبول کرو۔

﴿مسلمان کا ایک حق: خیر خواہی کرنا﴾

﴿وَاِذَااسْتَنْصَحَکَ فَانْصَحْ لَهُ﴾ اور جب وہ آپ سے خیر خواہی چاہے تو آپ اس کی خیر خواہی کیجئے، مطلب یہ ہے کہ کسی بات میں وہ آپ سے مشورہ طلب کرے تو اس میں اس کے لئے جو خیر ہو؛ وہی مشورہ دینا چاہیے، اس میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، اور جس کو مشورہ دیا جارہا ہے وہ بھی یہی سمجھے۔ آج کل تو مشورہ دینا بھی مشکل ہو گیا ہے، کسی کو کسی کام کا مشورہ اس کے حالات کے پیش نظر دیا جاتا ہے، اور جو بات اس کے لئے خیر خواہی کی ہوتی ہے وہی بتلائی جاتی ہے، تو پھر وہ سارے لوگوں میں یوں کہتا پھرتا ہے کہ مجھے فلاں صاحب نے یہ کہا ہے، گویا وہ اپنے اوپر آنے والے اعتراض کو ٹالنے کے لئے مشورہ دینے والے کا نام استعمال کرتا ہے، اور اس طرح اپنی ساری بلا کو مشورہ دینے والے کے سر ڈال رہا ہے۔ مشورہ دینے والے نے اپنی بھلائی کے ارادہ سے ایسا مشورہ تھوڑا ہی دیا تھا۔ اس لئے یہ طریقہ بھی غلط ہے۔

﴿چھینکنے والے کا جواب﴾

﴿وَاِذَاعَطَسَ فَحَمِدَاللّٰهَ فَشَمِّتْهُ﴾ جب کسی کو چھینک آوے اور وہ الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چھینک کھانے والا اگر الحمد للہ کہے تب ہی ہمیں جواب میں یرحمک اللہ کہنا ہے۔ اگر وہ الحمد للہ نہیں کہتا تو پھر ہمیں جواب

میں یرحمک اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے چھینک کھائی اور الحمدللہ کہا، نبی کریم ﷺ نے اس کے جواب میں یرحمک اللہ فرمایا، پھر دوسرے کو چھینک آئی اور اس نے الحمدللہ نہیں کہا تو آپ نے جواب میں یرحمک اللہ نہیں کہا، اس پر اس دوسرے نے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے اس کو یرحمک اللہ سے دعا دی اور مجھے نہیں دی؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس نے الحمدللہ کہا تو میں نے یرحمک اللہ کہا، اور تم نے الحمدللہ نہیں کہا تو میں نے جواب نہیں دیا۔ (بخاری شریف، ۵۸۷۱)

﴿وَاِذَامَرِضَ فَعُدْهُ﴾ اور جب بیمار ہو تو اس کی عیادت کرو۔

﴿وَاِذَامَاتَ فَاتْبَعْهُ﴾ اور جب انتقال کر جائے تو اسکے جنازے کے ساتھ جایا جائے

﴿سات چیزوں کا حکم، اور سات چیزوں سے ممانعت﴾

۲۳۹. وعن أبی عمارة البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِسَبْعٍ، وَنَهَانَا عَنْ سَبْعٍ أَمَرَنَا بِعِيَادَةِ الْمَرِيْضِ، وَاتِّبَاعِ الْجَنَازَةِ، وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ، وَاِبْرَارِ الْمُقْسِمِ، وَنَصْرِ الْمَظْلُوْمِ، وَاِجَابَةِ الدَّاعِیْ، وَاِفْشَآءِ السَّلامِ. وَنَهَانَا عَنْ خَوَاتِيْمَ، أَوْتَخَتُّمٍ بِالذَّهَبِ، وَعَنْ شُرْبٍ بِالْفِضَّةِ، وَعَنِ الْمَيَاثِرِ الْحُمْرِ، وَعَنِ الْقَسِّیِّ، وَعَنْ لُبْسِ الْحَرِيْرِ وَاسْتَبْرَقِ وَالدِّيْبَاجِ.

وفی رواية: وَاِنْشَادِ الضَّالَّةِ فِی السَّبْعِ الْأُوَلِ.

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو سات چیزوں کا حکم دیا اور سات چیزوں سے منع کیا۔

﴿۱﴾ ایک تو بیمار کی عیادت اور خبر گیری کا حکم دیا ﴿۲﴾ اور جنازے کے ساتھ جانے کا حکم دیا ﴿۳﴾ اور چھینک کھانے والے کے جواب دینے کا حکم دیا۔

﴿۴﴾ اور قسم دینے والے کو اپنی قسم میں بری کرنے کا حکم دیا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی معاملے پر یا کسی بات پر قسم کھالے، اور اس نے جس چیز کی قسم کھائی ہے وہ شریعت کے اعتبار سے ممنوع نہیں ہے، تو اس کو چاہیے کہ وہ اس کام کو کرنے کا اہتمام کرے اور اس طرح اپنی قسم سے بری ہو جائے، تاکہ قسم ٹوٹ کر کفارہ واجب نہ ہو اور گنہ گار ہونے کی نوبت نہ آئے۔ اب کسی نے کسی بات پر قسم کھائی اور اس کے بری ہونے کا دارومدار آپ پر ہے، مثلاً وہ آپ کو اپنے گھر لے جانا چاہتا ہے، اور اس نے یوں کہہ دیا کہ اللہ کی قسم! مَیں آپ کو اپنے گھر ضرور لے جاؤں گا، اب آپ یوں کہیں کہ مَیں تو نہیں آؤں گا، جا تجھ سے جو ہو وہ کر لے ویسے اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن اس نے اگر قسم کھالی ہے تو ظاہر ہے کہ اگر آپ اس کے گھر چلے جائیں گے تو وہ بے چارہ اپنی قسم میں حانث ہونے سے بچ جائے گا، اس کی قسم پوری ہو جائے گی اور وہ گنہ گار نہیں ہوگا اور کفارہ بھی واجب نہیں ہوگا اور آپ کے لئے بھی کوئی دشواری نہیں ہے، کوئی شرعی رکاوٹ بھی نہیں ہے، اور آپ کے کسی کام میں کوئی خلل بھی نہیں پڑ رہا ہے، آپ آسانی سے اس کی ڈیمانڈ اور تقاضہ کو پورا کر سکتے ہیں، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ اس کا خیال کیجئے، اور اس کے گھر چلے جائیے۔ یہ تو ابرار المقسم کی ایک مثال دی ہے

﴿۵﴾ اور جو آدمی مظلوم ہے اس کی مدد کرنا، کسی کی حق تلفی ہوئی ہے تو آپ اس کی مدد کر کے اس کا حق دلوائیے، اور ظالم کو اس پر ظلم کرنے سے روکئے، جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِمًا أَوْ مَظْلُوْمًا﴾ اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو، تو ایک صحابی نے پوچھا ﴿يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُوْمًا، أَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ ظَالِمًا فَكَيْفَ أَنْصُرُهُ؟﴾ اگر میرا مسلمان بھائی مظلوم ہے تو مَیں مدد

کروں گا، یہ تو سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن آپ بتلائیں گے کہ اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیسے کی جائے گی؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روک دو، کیونکہ یہ ظلم اس کے لئے ہلاکت کا ذریعہ ہے، یہ نادانی سے ظلم کر کے اپنے آپ کو اللہ کے غضب کا مورد بنا رہا ہے، اور اپنے آپ پر آفت لا رہا ہے، آپ اس کو ظلم سے روکئے، یہی اس کی مدد ہوئی۔ ایسا نہیں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ بھی اس کے ظلم میں اس کا ساتھ دیں۔

﴿۶﴾ دعوت دینے والے کی دعوت کا قبول کرنا ﴿۷﴾ اور سلام کو پھیلانا۔ یہ سات چیزیں وہ ہیں جن کے کرنے کا حکم دیا۔

اور جن سات چیزوں سے منع فرمایا وہ یہ ہیں:-

﴿۱﴾ سونے کی انگوٹھی کے استعمال سے منع فرمایا۔ مرد کے لئے سونے کی انگوٹھی پہننا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، اور چاندی کی انگوٹھی اگر ساڑھے چار ماشہ سے کم کی ہو تو اس کی اجازت دی گئی ہے، البتہ عورتوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال جائز ہے، چونکہ یہ دونوں زیور کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن مردوں کے لئے تو سونے کی انگوٹھی پہننا بالکل جائز نہیں ہے، چاندی کی ہو تو ساڑھے چار ماشہ سے کم کی ہو تو اس کی اجازت دی گئی ہے۔ اور اُس زمانہ میں انگوٹھی کو مُہر لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اس لئے جن لوگوں کو مُہر لگانے کی ضرورت پیش آتی ہے جیسے قاضی، مفتی، حاکم وغیرہ؛ ان کے لئے مناسب سمجھا گیا ہے، اور جن کو ضرورت پیش نہیں آتی ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو استعمال نہ کریں۔ آج کل بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ چاندی کی اجازت ہے تو وہ چار چار پانچ پانچ انگوٹھیاں ہاتھ میں لگائے رہتے ہیں؛ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔

﴿۲﴾ اور چاندی کے برتن کے اندر کسی چیز کے پینے سے منع کیا ہے۔ چاندی اور سونے کے برتنوں کا استعمال حرام ہے، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ کافروں کے لئے یہ دنیا میں ہیں اور ہمارے لئے آخرت میں ہیں۔ عورتوں کے لئے سونے چاندی کا استعمال زیورات کے طور پر تو جائز ہے لیکن چاندی سونے کے برتنوں کا استعمال مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے حرام ہے۔

﴿۳﴾ اور سرخ گدڑی کے استعمال سے منع کیا ہے۔ ریشمی کپڑے سے ایک گدڑی سی بنائی جاتی تھی جس میں روئی وغیرہ بھری جاتی تھی اور اس کو گھوڑے کی زین پر رکھی جاتی تھی چونکہ زین چمڑے کی ہوتی ہے اور سخت ہوتی ہے، اس لئے آدمی براہِ راست زین پر سوار نہیں ہوتا بلکہ کوئی نرم کپڑا اور گدڑی وغیرہ اس پر بچھایا جاتا ہے، تو اُس زمانہ میں گھوڑے کی زین پر رکھنے کے لئے ریشم کے کپڑے میں روئی بھر کر گدڑی تیار کی جاتی تھی اور سرخ رنگ کی ہوا کرتی تھی، تو وہ ریشمی ہونے کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

﴿۴﴾ اور قسّی کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ قسّی ایک قسم کا کپڑا ہوا کرتا تھا جو ریشم اور کتان دونوں کو ملا کر تیار کیا جاتا تھا، گویا اس میں ریشم ہونے کی وجہ سے اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ اور قس ایک شہر کا نام ہے جو ساحل سمندر پر آباد ہے، وہاں سے یہ کپڑے تیار ہو کر آتے تھے، اس لئے ان کو قسّی کہتے ہیں۔

﴿۵﴾ اور ریشم کا لباس پہننے سے منع فرمایا ہے۔ یہ بھی مردوں کے لئے ہے، عورتوں کے لئے اس کی اجازت ہے۔

﴿۶﴾ اور استبرق کے استعمال سے منع فرمایا۔ حریر تو مطلق ریشم کو کہتے ہیں لیکن

استبرق موٹے قسم کے ریشم کو کہا جاتا ہے۔

﴿۷﴾ اور دیباج کے استعمال سے منع فرمایا۔ دیباج میں بھی ریشم کی ملاوٹ ہوتی تھی بہرحال! ان سات چیزوں کے استعمال سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن سات چیزوں کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک چیز یہ ہے کہ کسی کی گم شدہ کوئی چیز ملی ہو تو اس کا اعلان کر کے اس کے مالک تک پہنچانے کا اہتمام کیا جائے۔

سَتْرُ عَوْرَاتِ الْمُسْلِمِیْنَ وَالنَّهْیُ عَنْ اِشَاعَتِهَا لِغَيْرِ ضَرُوْرَةٍ

مسلمانوں کے عیوب چھپانے کا حکم
اور
بے وجہ انہیں عام کرنے کی ممانعت کا بیان

۱۴؍ربیع الاوّل ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۸؍اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أمابعد.

عام حالات میں عیب گوئی کی اجازت نہیں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کے اندر کوئی عیب ہو یا اس کی کوئی عادت ایسی ہو جو لوگوں کے سامنے اگر ظاہر ہو جائے تو اس کی بدنامی کا باعث ہو؛ تو ایسی چیزوں کو چھپانے اور بلا شرعی ضرورت کے ایسی چیزوں کو ظاہر کرنے کی ممانعت کو بیان کیا جاتا ہے یعنی کوئی ایسی عادت کسی مؤمن کے اندر پائی جاتی ہے کہ اگر اس کو ظاہر کیا گیا تو اس پر عیب لگتا ہے، تو ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن کے ساتھ جو سلوک ہونا چاہیے اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ اس کو چھپایا جائے اور لوگوں کے سامنے ظاہر نہ کیا جائے۔ البتہ اگر کوئی شرعی ضرورت اس بات کی متقاضی ہو کہ اس کو ظاہر کیا جائے تو ان تمام حدود وشروط اور قیود کی رعایت کرتے ہوئے جو ایسے موقعہ پر شریعت نے عائد کی ہیں؛ اس کو اسی حد تک ظاہر کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً وہ عیب ایسا ہے کہ اس سے دوسروں کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو اس نقصان سے دوسروں کو بچانے کی حد تک اس کو ظاہر کرنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

بہر حال! چاہے واقعی طور پر کسی مسلمان میں کوئی ایسی بات پائی جاتی ہو تو اس کو

چھپانے کا اور پردہ پوشی کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ پردہ دری یعنی اس کے عیب کو کھولنے سے منع کیا ہے۔ البتہ اگر وہ آدمی اپنی اس برائی میں بہت زیادہ آگے بڑھ چکا ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ حاکم کی طرف سے اس کو تنبیہ کی جائے یا سزا دی جائے اس کے بغیر وہ اپنی اس برائی سے باز نہیں آئے گا تو ایسے موقعہ پر پھر اللہ تعالیٰ کا حق ملحوظ رکھتے ہوئے اس پر شرعی سزا جاری ہو جائے اس مقصد سے حاکم کے سامنے کوئی آدمی اس چیز کو ظاہر کرے تو اس کی اجازت ہے۔

﴿بعض امور کی اشاعت سے بھی برائیاں پھیلتی ہیں﴾

یہاں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باری تعالی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے ﴿اِنَّ الَّـذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْـعَ الْـفَـاحِشَـةُ فِی الَّـذِیْنَ اٰمَنُوْالَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَاوَالْاٰخِرَةِ﴾ بیشک جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ایمان والوں کے درمیان (فاحشہ) برائی کے کام پھیلیں تو ایسے لوگوں کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ جیسے زنا کاری یا بے حیائی کے کام کا لوگوں کے درمیان اظہار، یا ایسی چیزیں جو بے حیائی تک لے جاتی ہیں ان کی اشاعت، یا مثلاً کسی نے زنا کا ارتکاب کیا ہے، یا ارتکاب تو نہیں کیا ہے لیکن اس پر الزام لگا کر لوگوں کے درمیان اس کو پھیلایا جا رہا ہے؛ یہ سب اشاعتِ فاحشہ کا مصداق ہے۔

یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی جانے والے واقعہ کے موقعہ پر نازل ہوئی تھی۔ گویا ایسی باتوں کو پھیلانے سے بھی شریعت نے منع کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسے واقعات اگر پیش آئے ہیں اور ان کو لوگوں کے درمیان ظاہر کیا جائے گا تو بہت سے طبعیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ایسی چیزوں کو سن کر وہ بھی ان

برائیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں اوران کی طبیعتوں کے اندرایسا جذبہ بیدار ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ بھی ان برائیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔لہٰذا ایسے واقعات کولوگوں کے درمیان ظاہر نہ کرنا چاہئے،واقعتاً پیش آئے ہوں تب بھی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی بلکہ ان کو چھپایا جانا چاہیے۔

ہاں!اگرکسی سے اس جرم کا صدورنفسانی خواہش میں آکر ہوگیا ہے اوراس سے پہلےکبھی اس سے کوئی ایسی صورت پیش نہیں آئی تھی اورتنبیہ کرکے اس کوآئندہ اس سے بچایا جاسکتا ہےتو پھر حاکم کے سامنے اس کوظاہر نہ کیا جائے،بلکہ خودہی تنہائی میں نصیحت کردی جائے۔اوراگروہ اپنی اس برائی کے اندرآگے بڑھ چکا ہے کہ جب تک سزانہ پاوے تب تک وہ اپنی اس برائی سے بازنہیں آسکتا ہے،تو پھر حاکم کواطلاع دی جاسکتی ہے۔

بہرحال!اس آیت کولانے کا مقصد یہ ہے کہ ایسے واقعات اگرمعاشرہ وسماج میں پیش آئے ہیں تو ان کا اظہار نہ کیا جائے،لوگوں میں پھیلایا نہ جائے،اس لئے کہ لوگوں میں پھیلانے میں جہاں ایک مؤمن کے عیب کوظاہر کرنا ہے،وہیں دوسرے ایسے لوگ جواس چیز سے بچے ہوئے ہیں لیکن ان کی طبیعتوں میں کجی ہے اورشیطان کے پھندے میں پھنس جانے کا اندیشہ ہے؛ایسے لوگوں کوبھی برائی میں مبتلا کرنے کا ذریعہ ہے۔اس لئے اس سے منع کیا ہے۔

﴿پردہ پوشی کا اہم فائدہ﴾

۲۴۰.عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال:لَایَسْتُرُعَبْدٌعَبْدًافِی الدُّنْیَاإِلَّاسَتَرَاللهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کے اندر کوئی بندہ اگر کسی دوسرے کے عیب کو چھپاتا ہے تو اللہ تبارک وتعالی قیامت کے روز اس کے عیب کو چھپائیں گے۔

ویسے ایک چیز یہ بھی ہے کہ کوئی آدمی کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے مناسب اس کو بدلہ دیا جاتا ہے، ایسے ہی کوئی برائی اور گناہ کا کام کرتا ہے تو سزا بھی اس کے مناسب دی جاتی ہے، جیسے حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿مَنْ نَظَرَ اِلیٰ مَحَاسِنِ اِمْرَأَةٍ یُلْقیٰ الْاٰنُکُ فِیْ عَیْنَیْہِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (نصب الرایہ)﴾ کسی آدمی نے کسی عورت کی خوبصورتی کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں قیامت کے روز سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔ گویا جو گناہ کیا تھا اس کے مناسب اس کو سزا دی گئی کہ آنکھوں کے ذریعہ دیکھ کر اس نے لذت حاصل کی تھی اور گناہ آنکھوں کے ذریعہ کیا تھا؛ تو قیامت کے روز اسی کے مناسب سزا اس کے لئے تجویز کی گئی۔

یا جیسے کوئی آدمی گانا سنے تو اس کے کان کے اندر سیسہ ڈالنے کا تذکرہ روایت میں آتا ہے (سلسلة الاحادیث الضعیفة،۴۵۴۹) وہاں بھی آدمی کان کے ذریعہ لذت حاصل کر کے گناہ کرتا ہے، اسی کے مناسب اس کو سزا دی جاتی ہے۔

تو عام طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی گناہ پر آخرت میں جو سزا مقرر کی گئی ہے یا کسی نیکی پر آخرت میں جو بدلہ مقرر کیا گیا ہے اس میں مناسبت بھی دیکھی گئی ہے۔ جیسا گناہ ویسی سزا، جیسی نیکی ویسا بدلہ۔

تو یہاں بھی ایسا ہے کہ دنیا میں ایک نیکی کی تھی کہ اپنے مسلمان بھائی کا عیب چھپایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے آخرت میں اس کے لئے جو بدلہ تجویز فرمایا اس میں اس کی اس نیکی کے

مناسب اس کو بدلہ دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کے عیب لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کریں گے، بلکہ چھپائیں گے۔

عیب کو چھپانے کی دو شکلیں ہیں یا تو اس کا تذکرہ ہی نہیں آئے گا اور اللہ تعالیٰ ابتداءً ہی اس کو معاف فرمادیں گے۔ اور دوسری صورت یہ بھی ہے کہ اس کو اللہ تعالی اپنے قریب بلا کر اس طرح سے کہ دوسرے لوگ نہ سن سکیں اس کے سامنے اس کے گناہ کا تذکرہ کریں گے اور وہ اقرار کرے گا، پھر اللہ تعالی فرمائیں گے کہ جاؤ! تم نے دنیا میں فلاں کا گناہ چھپایا تھا، یہاں مَیں بھی تمہارے گناہ چھپاتا ہوں اور معاف کرتا ہوں۔

اس روایت سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جو آدمی اس بات کا خواہش مند ہو کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے گناہ، عیوب اور اس کی برائیوں کو چھپایا جائے، اور اس کو معاف کردیا جائے؛ تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دنیا میں وہ اپنے مسلمان بھائیوں کے عیوب کو چھپائے۔

ہم میں سے کون ہے جس میں کوئی عیب نہ ہو، کوئی گناہ اور برائی نہ ہو، ہم میں سے ہر شخص اپنے عیوب سے واقف ہے اور وہ خود اپنے حالات کو بخوبی جانتا ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ مجھ میں کیا کیا برائیاں ہیں اور ہر ایک کی یہ تمنا اور خواہش بھی ہوتی ہے کہ ان کو چھپایا جائے۔ بلکہ حضرت مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے ایک موقعہ پر حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ نقل کیا کہ دیکھو! قیامت کے روز اگر اللہ تبارک وتعالیٰ کسی سے یوں کہہ دیں کہ تو نے جتنی برائیاں اور گناہ کئے تھے وہ سب ایک شرط کے ساتھ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ اور وہ شرط یہ ہے کہ تیرے گناہوں کی ایک فلم تیار کر کے تیرے ماں

باپ، مشائخ اور تیرے بڑے چھوٹوں کو دکھائی جائے اور یہ سب لوگ دیکھیں کہ تو نے یہ یہ کام کئے ہیں اور پھر تجھے معاف کیا جائے گا، تو کیا تو اس کے لئے تیار ہے؟ تو وہ تیار نہیں ہوگا

بہر حال! ہم میں ہر شخص کسی نہ کسی برائی، عیب اور کسی نہ کسی گناہ میں مبتلا ہے اور ہر ایک کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا لوگوں کے سامنے اظہار نہ ہو اور یہ چیز چھپی ہی رہے۔ جب ایسا ہے تو پھر اس کا آسان طریقہ نبی کریم ﷺ نے بتلا دیا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے تو آپ بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیجیے۔ یہ تو عجیب معاملہ ہے کہ ہم تو لوگوں کے عیوب کو کھولنے کے درپے رہیں اور دل میں خواہش یہ رکھتے ہیں کہ ہمارے عیوب کو چھپایا جائے۔ یہ کیسی بات ہے، یہ تو نادانی والی بات ہے۔

اس لئے ہر آدمی اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے ایک بہترین تدبیر اختیار کرسکتا ہے کہ اپنی زبان بند رکھے۔ لوگوں کے عیوب نادانستہ طور پر آپ کے علم میں آجائیں، تب بھی ان کا کسی کے سامنے اظہار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

......مجھے تو کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا

اللہ کے جو مقبول اور مخصوص بندے ہوا کرتے ہیں ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ ایسی بصیرت وفراست عطا فرماتے ہیں کہ بعض مرتبہ ان کے سامنے لوگوں کے عیوب اور گناہ کھل جاتے ہیں لیکن وہ کسی کے سامنے ظاہر نہیں کرتے بلکہ وہ تو اس کو پسند بھی نہیں کرتے کہ لوگوں کے عیوب ہمارے سامنے کھلیں۔ بعض بزرگوں کے حالات میں لکھا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے تھے تو اپنے سر اور چہرے کے اوپر نقاب ڈال دیتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو فرمایا کہ کیا کیا جائے؟ مجھے تو کوئی انسان نظر ہی نہیں آتا، کوئی سور نظر آتا ہے، کوئی بندر نظر آتا

ہے،کوئی کتا نظر آتا ہے۔لوگوں نے جیسے جیسے گناہ کئے ہوتے ہیں،اس کے مناسب صورتیں نظر آتی ہیں۔تو لوگوں کے عیوب جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیر اختیاری طور پر ان کے سامنے آتے ہیں ان کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے، چونکہ پھر ان کو چھپانا پڑے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کے عیوب چھپے رہیں تو اس کا یہ بہت آسان طریقہ ہے۔نبی کریم ﷺ نے بہترین علاج بتلایا ہے۔

﴿یہ تو نہایت ہی بے شرمی کی بات ہے﴾

۲۴۱.وعنه قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: كُلُّ أُمَّتِيْ مُعَافىً اِلَّا الْمُجَاهِرِيْنَ وَاِنَّ مِنَ الْمُجَاهَرَةِ أَن يَّعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلاً ثُمَّ يُصْبِحُ وَقَدْسَتَرَهُ اللهُ عَلَيْهِ فَيَقُوْلُ:يَافُلانُ عَمِلْتُ الْبَارِحَةَ كَذَاوَكَذَا،وَقَدْبَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ،وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَاللهِ عَنْهُ. (متفق عليه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری امت کے تمام گنہ گاروں سے درگذر کا معاملہ کیا جائے گا یعنی ان کے گناہوں کو معاف کردیا جائے گا،مگر وہ لوگ جو مجاہر ہیں یعنی کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرنے والے ہیں،اور یہ بھی کھلم کھلا کرنے ہی کے برابر ہے کہ آدمی رات کو کوئی گناہ کرے پھر صبح ایسی حالت میں کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اس کی پردہ پوشی فرمائی تھی لیکن وہ خود ہی دوسروں کو کہتا پھرتا ہے کہ میں نے تورات میں یہ یہ کیا،حالانکہ رات بھر اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرمائی،اور یہ صبح میں اللہ تعالیٰ کے پردہ کو کھول دیتا ہے۔

کھلم کھلا ارتکاب کی ایک شکل تو یہ ہے کہ وہ گناہ لوگوں کے دیکھتے ہوئے کررہے ہیں،ایسوں سے اللہ تعالیٰ درگذر سے کام نہیں لیتے۔ایک آدمی گناہ کرے اور ڈرتے ڈرتے

چھپ چھپ کر کرے تو اللہ تبارک وتعالیٰ بھی پھر اس کو معاف کر دیتے ہیں کہ اگرچہ گناہ کا ارتکاب کیا لیکن اتنا تو کیا کہ چھپ کر کیا۔ جیسے ایک آدمی آپ کا ماتحت ہے اور وہ آپ کے سامنے آپ کی نافرمانی کر رہا ہے، کھلم کھلا ایسی چیزوں کا ارتکاب کرتا ہے جس سے آپ نے روکا ہے؛ تو پھر بھلا اس کو آپ کیسے چھوڑ دیں گے؟ آپ کہیں گے کہ اس کو دربدر کر دو۔ اور دوسرا ایسا ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ اُلٹا سیدھا کرتا ہے لیکن چھپ کر کرتا ہے، تو بہت سی مرتبہ آپ بھی اس سے چشم پوشی کر جاتے ہیں۔

بہرحال! جو لوگ کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان کے ساتھ درگذر کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔ جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے شرماتا ہے تو ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے بھی حیا رکھے اور شرمائے اور حیا کا تقاضہ یہ ہے کہ اس طرح کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب نہ کرے۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ اندر باہر کے تمام حالات سے واقف ہے لیکن ایک آدمی جب کھلم کھلا گناہوں کا ارتکاب کرتا ہو، تو یہ اعلیٰ درجہ کی ڈھٹائی، بے شرمی اور بے حیائی ہے۔ ایسوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف نہیں کیا جاتا۔

دوسرے درجہ کی ڈھٹائی

اب مجاہرہ اور کھلم کھلا گناہ کرنے کی ایک شکل اور بتلائی جا رہی ہے کہ گناہ تو کیا چھپ کر لیکن پھر خود اپنی زبان سے اس کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ بھی کھلم کھلا کرنے کی ہی ایک شکل ہے۔ اسی کو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿وَانَّ مِنَ الْمُجَاهَرَةِ﴾ ایک آدمی رات میں چھپ کر کوئی کام کرتا ہے یعنی کرتے وقت تو اس نے اس کا اظہار نہیں کیا اور جب اس نے چھپ کر کیا تھا

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اس کا معاملہ چھپا رکھا تھا، کسی کو پتہ چلنے نہیں دیا تھا اور کسی کو دیکھنے کا موقعہ نہیں دیا۔

دیکھو! نبی کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا اس امت پر یہ بڑا انعام ہے۔ پچھلی امتوں کا حال یہ تھا کہ وہ گناہ کرتے تھے تورات کو گناہ کیا اور صبح ان کے دروازے پر لکھا ہوا ہوتا تھا کہ آج اس نے یہ گناہ کیا، یعنی کوئی آدمی گناہ کا کام چھپ کر کرتا تھا تب بھی ظاہر ہو جاتا تھا اور سب لوگ اس کے دروازے پر پڑھ لیتے تھے کہ آج اس نے یہ حرکت کی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہم پر کرم فرمایا ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے یہ چیز نقل کی ہے (درمنثور) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل اور آپ کی برکت سے امتِ محمدیہ کے ساتھ یہ معاملہ فرمایا کہ کسی نے اگر چھپ کر گناہ کیا ہے تو وہ ظاہر نہیں ہوتا، بلکہ گھر والوں کو بھی پتہ نہیں چل پاتا کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے۔

خیر! اس نے چھپ کر کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی چھپایا اور ظاہر نہیں کیا، لیکن پھر خود یہ آدمی ہی لوگوں کے سامنے اپنی زبان سے اظہار کرتا ہے، کسی کو کہتا ہے کہ کل تو میں نے فلاں فلم دیکھی، اور ٹی وی دیکھا، کل میں نے شراب پی۔ نعوذ باللہ! کل میں نے فلاں کام کیا۔ یعنی کسی کو پتہ تو تھا نہیں لیکن اب وہ اپنی ہی زبان سے اس کا اظہار کرتا ہے؛ تو یہ بھی کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کرنے کی ایک شکل ہوئی۔

کچھ لوگ تو وہ ہیں جو گناہ کھلم کھلا کرتے ہیں، لیکن ایسے لوگ ہمارے معاشرے و سماج میں تعداد کے لحاظ سے اقل قلیل ہوا کرتے ہیں، لوگ بھی ان کو بے حیا اور ڈھیٹ کہا

کرتے ہیں،لیکن ان کے مقابلہ میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو چھپ کر گناہ کرتے ہیں اور پھر لوگوں کے سامنے اپنی زبان سے اس کا اظہار کرتے ہیں؛ یہ بھی ''مجاہرۃ'' میں داخل ہیں اور ایسوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف نہیں کیا جاتا۔

﴿کسی بھی حال میں طعن و تشنیع نہ کرے﴾

۲۴۲. وعنہ عن النبی ﷺ قال: اِذَازَنَتِ الْأَمَۃُفَتبیَّنَ زِنَاھَافَلْیَجْلِدْھَاالْحَدَّ، وَلایُثَرِّبْ عَلَیْھَا،ثُمَّ اِنْ زَنَتِ الثَّانِیَۃَفَلْیَجْلِدْھَاالْحَدَّ،وَلایُثَرِّبْ عَلَیْھَا،ثُمَّ اِنْ زَنَتِ الثَّالِثَۃَ فَلْیَبِعْھَا،وَلَوْ بِحَبْلٍ مِّنْ شَعْرٍ. ((اَلتَّثْرِیْبُ)):اَلتَّوْبِیْخُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کی باندی زنا کرے، پھر اس کا زنا ثابت ہوجائے تو آقا اس پر حد جاری کرے،لیکن اس کو طعن و تشنیع نہ کرے، پھر اگر دوبارہ زنا کرے تو پھر اس پر حد جاری کرے،لیکن اس کو طعن و تشنیع نہ کرے، پھر اگر سہ بارہ ایسا کرے تو اسے بیچ دے چاہے بالوں کی ایک رسی کے بدلے ہی سہی

یہاں پہلے ایک بات سمجھ لیجئے۔پہلے زمانہ میں کفار کے ساتھ جنگ ہوا کرتی تھی جس کے نتیجہ میں جو مرد و عورت قید ہوا کرتے تھے ان کے لئے سزا کے طور پر یہ ہوا کرتا تھا کہ ان کو غلام اور باندی بنالیا جاتا تھا، آج کل تو یہ سلسلہ نہیں ہے۔گھروں میں کام کرنے والیاں جو ہوتی ہیں ان کو کوئی آدمی باندی نہ سمجھے، یہ عورتیں تو آزاد ہیں اور آپ کے یہاں اجیر اور مزدور کے طور پر ہوا کرتی ہیں، باندیاں نہیں ہوتیں۔ باندی تو وہ عورتیں ہوتی ہیں جس کا وہ شخص پورا مالک ہوتا ہے۔

اب دیکھو! وہ آقا اس باندی کا پورا مالک ہے اس کے باوجود نبی کریم ﷺ آقا کو یہ

تعلیم دے رہے ہیں کہ اگر زنا ثابت ہو گیا تو اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے وہ جاری کر دو، لیکن طعن و تشنیع نہ کرو۔

زنا کی شرعی سزاؤں کی تفصیل

بعض گناہ وہ ہیں کہ ان پر شریعت کی طرف سے باقاعدہ سزا مقرر کی گئی ہے، اسی میں سے زنا بھی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زنا کرنے والا اگر محصن یعنی شادی شدہ ہو، مسلمان اور آزاد ہو، اور اس کا نکاح بھی کسی مسلمان آزاد عورت کے ساتھ ہوا ہو، اور رخصتی بھی ہو چکی ہو اور آپس میں ملے بھی ہوں، اس کے بعد اس نے زنا کا ارتکاب کیا؛ تو اس کی سزا یہ ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے یعنی پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے۔ چونکہ شادی ہو چکی ہے، اس کے لئے زنا سے بچنے کے اسباب مہیا ہیں، اس کے باوجود اس نے زنا کا ارتکاب کیا؛ تو ایسے آدمی کے لئے بڑی سخت سزا مقرر کی گئی ہے۔

اور دوسرا غیر محصن ہے یعنی جس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور اس نے زنا کا ارتکاب کیا؛ تو اگر وہ آزاد ہے تو پھر شریعت نے سزا کے طور پر سو کوڑے مقرر کئے ہیں۔ اور اگر وہ غلام یا باندی ہے تو اس کی سزا آدھی یعنی پچاس کوڑے ہیں۔

تو دیکھو! یہاں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی کی باندی نے زنا کا ارتکاب کیا اور وہ زنا ثابت ہو گیا تو آقا کو چاہیے کہ اس پر زنا کی جو حد ہے وہ حاکم کے ذریعہ جاری کروائے۔ اب حاکم کوڑے لگوائے یا خود وہ لگائے؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ خود آقا ہی پچاس کوڑے مارے، اور بعض ائمہ فرماتے ہیں کہ آقا خود سزا جاری نہ کرے بلکہ حاکم کے پاس لے جائے اور وہ اس پر سزا جاری کروائے۔

بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ باندی کا زنا ثابت ہو جائے تو اس پر حد جاری کی جائے ﴿وَلَا یُثَرِّبْ عَلَیْھَا﴾ لیکن اس کی توبیخ نہ کرے یعنی اس کو طعن و تشنیع نہ کرے۔یعنی اس گناہ پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے وہ تو جاری کرنی چاہیے، وہ معاف نہیں ہے۔

اس باب میں اس روایت کو لانے کا اصل مقصد یہی ہے کہ دیکھو! باندی اور آقا کا معاملہ ہے، پھر بھی اس مالک کو شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ باندی جب زنا کر چکی تو اس زنا پر طعن و تشنیع کرے، اور اس کو یوں پکارے کہ اے زانیہ، اے چھینال (بدکار) اے بدکار وغیرہ۔ایسا نہ کہے۔آقا کو بھی یہ حق نہیں دیا حالانکہ وہ مالک ہے اور یہ اس کی مملوکہ ہے، اور اس نے زنا کیا ہے، ایسا نہیں کہ گناہ نہیں کیا لیکن پھر بھی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ برائی کے لئے شریعت کی مقرر کردہ سزا دے دو، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ زندگی بھر اس کو طعنہ دیتے رہو۔جب آقا کو اس کی اجازت نہیں ہے تو اگر کسی ایسے آدمی نے زنا کا ارتکاب کیا ہو جس سے تعلق آقا والا بھی نہیں ہے اور اس کو لوگ زانی، زانیہ کہتے ہیں؛ تو اس کی کہاں اجازت ہوگئی؟

﴿کسی پر زنا کی تہمت لگانے کی شرعی سزا﴾

آج کل تو معاشرہ میں یہ برائی عام ہو چکی ہے۔حالانکہ شریعت میں تو اس کی بہت بڑی سزا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی عورت کو کہہ دے ''اے زانیہ'' اور اس عورت پر زنا ثابت نہیں ہے، تو اس کہنے والے کو اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ سزا مقرر ہے؛ ان میں سے ایک کسی پر زنا کی تہمت لگانا بھی ہے، چاہے مرد ہو یا عورت ہو۔

اب غور کیجئے کہ ہمارے معاشرے میں ایسی گالیاں بہت عام ہوگئی ہیں جن میں زنا کی تہمت لگتی ہے۔ حالانکہ اسلامی حکومت ہوتی تو ایسی گالی دینے والے کو اسّی کوڑے لگائے جاتے۔ اتنا ہی نہیں کہ اسّی کوڑے لگیں گے بلکہ اس کے بعد ایک اور سزا بھی اس کے لئے ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لئے اس کی گواہی قبول نہیں ہوگی۔ ایسے آدمی پر مہر لگ گئی کہ وہ آدمی کسی بھی معاملہ میں گواہ بن کر آئے تو اس کو ردّ کر دیا جائے گا۔ شریعت کی طرف سے کتنی سخت سزا ہے کہ کوڑے تو لگوائے، ساتھ ہی ساتھ اس کو مردود الشہادۃ کر دیا۔ اگر توبہ کرلے تب بھی حنفیہ کے یہاں تو وہ قابل قبول نہیں۔ دوسرے ائمہ توبہ کے بعد قابلِ قبول مانتے ہیں۔

بہرحال! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کا اس روایت کو یہاں لانے کا مقصد یہی ہے کہ دیکھو! شریعت نے اس کے اس عیب کو چھپانے کی اتنی زیادہ تاکید کی ہے کہ آقا کو بھی یہ اختیار اور اجازت نہیں دی کہ اپنی باندی کو ایسے الفاظ سے خطاب کرے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ اس عیب کا کبھی اظہار نہ کیا جائے، اگر گناہ ہوگیا تو اس پر سزا جاری ہوگئی، بس اب معاملہ ختم کرو، آئندہ تمہاری زبان پر اس کا تذکرہ نہیں آنا چاہیے۔

اس کے بعد حضور ﷺ اس آقا سے فرماتے ہیں کہ اگر وہ باندی دوبارہ زنا کرے تو دوبارہ سزا دو، لیکن پھر یہی بات ہے کہ طعن و تشنیع نہیں ہونی چاہیے، بلکہ سزا دے کر معاملہ ختم کردو۔ یہ دوسری مرتبہ میں حکم ہے۔

اور اگر تیسری مرتبہ بھی زنا کا ارتکاب کرے تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سزا دے کر اس کو بیچ ڈالو۔ آقا سے کہا جارہا ہے کہ یہ باندی زنا سے باز نہیں آرہی ہے تو اب تم اس کو اپنی ملکیت میں مت رکھو، اس کو بیچ ڈالو چاہے بالوں کی ایک رسّی کے بدلے میں ہی کیوں نہ ہو

یعنی دو پیسے بھی آئیں، معمولی قیمت آتی ہو؛ تب بھی اس کو بیچ دو۔

﴿ایک اشکال اور اس کا جواب﴾

حدیث کی شرح کرنے والوں نے یہاں ایک سوال قائم کیا ہے کہ زنا کی عادت ایک عیب ہے اور اس عیب کے ساتھ اس کو اپنے یہاں رکھنے کو پسند نہیں کیا گیا، اور ایک حدیث میں یہ آیا ہے ﴿لایُؤْمِنُ أَحَدُکُم حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیهِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِهٖ﴾ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ تو جب اس باندی کا اپنی ملکیت میں رہنا پسند نہیں کیا گیا تو پھر دوسرے کو بیچنا کیوں پسند کیا گیا؟

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ دوسرے کو بیچتے وقت بتلا دے کہ یہ باندی ایسی ہے کہ میرے یہاں تین مرتبہ زنا کا ارتکاب کرچکی ہے اور اسی لئے مَیں بیچ رہا ہوں، اب خریدار اس عیب کو جانتے ہوئے بھی خریدے تو یہ اس کی مرضی کی بات ہے۔ اور یہ بات بھی یاد رہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے یہاں جانے کے بعد بھی وہ زنا کروائے۔

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت کسی کے نکاح میں ہے، وہاں بدکاری میں مبتلا ہے، اس نے طلاق دے دی اور دوسرے کے نکاح میں گئی تو سدھر گئی۔ ایسے ہی یہاں بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کے یہاں زنا کراتی تھی تو دوسرے کے یہاں جا کر بھی زنا کرائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں اس کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تھی اس لئے اس کی نوبت آتی تھی، اور وہاں وہ ضرورت پوری ہوجائے تو ایسی نوبت ہی نہ آئے۔ یا وہ صاحب ذرا ڈھیلے ڈھالے تھے یعنی ان کا اتنا رعب نہیں تھا اور یہ ایسا خطرناک آدمی ہے کہ اس کی آنکھ

دیکھتے ہی دبتی ہے۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نوکر کو چوری کی عادت ہے، ایک سیٹھ کے یہاں چوری کرتا تھا، لیکن دوسرے سیٹھ کے یہاں جا کر سدھر گیا۔ ایسے واقعات ہم دیکھتے رہتے ہیں۔

ہمارے یہاں مدرسوں میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک طالب علم یہاں سے بھاگ کر دوسری جگہ گیا اور سدھر گیا۔ بہت سے مدرسوں کے مہتمم صاحبان اس کو مطلقاً پسند نہیں کرتے کہ اس کا دوسری جگہ بھی داخلہ ہو، اس لئے کہ یہاں ایسا کرتا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ تمہارے یہاں بگڑا ہوا تھا تو کیا ضروری ہے کہ وہاں جا کر بھی بگڑا ہوا ہی رہے، ہوسکتا ہے کہ وہاں جا کر سدھر جائے۔

بہرحال! یہاں حضور ﷺ نے اس کو بیچنے کا جو حکم دیا اس سے کوئی اعتراض لازم نہیں آتا۔ ہاں! اتنی بات ضروری ہے کہ خریدار کو یہ بتلا دے کہ اس میں یہ عیب ہے۔ اگر بتلائے بغیر بیچا اور اس کو معلوم ہو گیا تو وہ لوٹا سکتا ہے۔ شریعت نے خریدار کو اس کا اختیار دیا ہے۔

اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کی مددمت کرو

۲۴۳. وعنه قَالَ أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَدْشَرِبَ خَمْراً. قَالَ: اِضْرِبُوْهُ. قَالَ أَبُوْهُرَيْرَةَ: فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهِ، وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهِ. فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ: أَخْزَاكَ اللهُ. قَالَ: لَا تَقُوْلُوْا هٰكَذَا، لَا تُعِيْنُوْا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ. (رواه البخاری)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک شخص کو لایا گیا جس نے شراب پی تھی، حضور اکرم ﷺ نے اپنے پاس جو لوگ موجود تھے ان سے کہا کہ اس کو مارو۔ شراب پینے کی سزا شریعت میں اسّی کوڑوں کی شکل میں دی جاتی ہے، یہ واقعہ اس حکم سے پہلے کا ہے۔ خیر! تو کسی نے اس کو ہاتھ سے مارا، کسی کے پاس جوتے تھے

تو اس نے جوتوں سے مارا، کسی نے کپڑے سے مارا، اس طرح حضور ﷺ کے حکم پر سب نے عمل کیا۔ جب اس کو پیٹ چکے اور وہ شخص جانے لگا تو حاضرین میں سے کسی نے اس کو کہا ﴿أَخْـــزَاکَ اللّٰہُ﴾ اللہ تجھے رسوا کرے۔ تو حضور ﷺ نے اس کہنے والے سے فرمایا کہ ایسا مت کہو، اور اس کے مقابلہ میں شیطان کی مددمت کرو۔ یعنی آپ اس کو بددعا دے رہے ہو کہ اللہ تجھے رسوا کرے، اس کا مطلب تو نعوذ باللہ یہ ہوا کہ وہ پھر سے ایسا کام کرے؟ گویا آپ ایسا جملہ کہہ کر اپنے مسلمان بھائی کے مقابلہ میں شیطان کو سپورٹ (Support) کر رہے ہو۔ ارے! تم کو تو اپنے بھائی کا سپورٹ کرنا چاہیے اور اس کو یہ دعا دینی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ تجھے اس کام سے بچائے اور تیری حفاظت کرے، ایسا کیوں کہتے ہو کہ اللہ تجھے رسوا کرے۔

دیکھو! حضور ﷺ نے اس کو سزا تو دلوائی لیکن ایسا جملہ کہنے کی اجازت نہیں دی۔ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو یہاں پیش کر کے یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کی پردہ پوشی کرنی چاہیے اور بلا ضرورت اس کے کسی فعل کی اشاعت نہیں کرنی چاہیے، زبان سے اس کا تذکرہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اس نے کوئی ایسا جرم کیا ہے جو سزا کے قابل ہے تو ٹھیک ہے، اس کو سزا دے دو۔ شریعت میں جو سزائیں مقرر ہیں وہ معاف نہیں ہو سکتیں، لیکن سزا دینے کے بعد وہ چیز وہیں بند ہو جانی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ مل رہے ہیں تو اسی کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ ایسا ہوا اور ویسا ہوا۔ اس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ یہ ایک مؤمن کی حق تلفی ہے اور اس کے عیب کو ظاہر کرنا ہے، اس لئے شریعت کہتی ہے کہ اس کے عیب کو چھپاؤ۔

اللہ تبارک تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے

قَضَآءِ حَوَائِجِ الْمُسْلِمِیْنَ

مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا

۲۱/ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۵/اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

أعوذباللہمن الشّيطان الرّجيم. بسم اللہالرّحمٰن الرّحيم

وَافْعَلُواالْخَيْرَلَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

ضرورت کے موقعہ پر کسی کے کام آنا

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا یعنی کسی مسلمان کی ضرورت کے موقعہ پر اس کے کام آنا، چاہے جس طرح بھی ہو، اپنے مال سے، اپنی جان سے یا اپنے عہدہ اور منصب کے ذریعہ سے، کسی کو کہہ کر سفارش کے ذریعہ سے، اپنی زبان سے، اپنے ہاتھ سے، جس طرح بھی کسی مسلمان کی ضرورت آپ پوری کر سکتے ہوں؛ اس کی مدد کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ دعا کے ذریعہ سے کر سکتے ہو تو اس سے ہی اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ہمارے اکابر کے حالات پڑھتے ہیں تو اس سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ وہ حضرات لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے معاملہ میں ان سے جو کچھ سعی ممکن ہوسکتی تھی اس سے دریغ نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ دعا جو آخری درجہ ہے کہ اگر کچھ نہیں کر سکتے تھے تو اللہ تعالیٰ سے دعا کر دیا کرتے تھے، اس پر بھی بڑا وعدہ ہے، بلکہ یہ تو حاجت کے پورا ہونے کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں ایک آیت اور دو روایتیں پیش کی ہیں جو ماضی کے ابواب میں گذر چکی ہیں اور اس سے متعلق جو تفصیلات ہیں وہ بھی مَیں بتلا چکا ہوں، اس لئے ان کا صرف ترجمہ کر دیتا ہوں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ تم نیکی اور بھلائی کا کام کرو؛ شاید کہ کامیاب ہو جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم سے نیکی اور بھلائی جس طرح بھی ہو سکتی ہو، اس کو انجام دینے میں کوئی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ اسی میں لوگوں کی ضرورتیں اور حاجتیں پوری کرنا بھی داخل ہے۔

﴿مسلمان مسلمان کا بھائی ہے﴾

۲۴۴۔عن ابن عمر رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال: اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يُسْلِمُهُ، مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ أَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهِ، وَمَنْ فَرَّجَ عَنْ مُسْلِمٍ كُرْبَةً؛ فَرَّجَ اللّٰهُ عَنْهُ بِهَا كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِماً سَتَرَهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ خود اس کی حق تلفی کرتا ہے اور اس پر ظلم کرتا ہے، اور نہ کسی ظالم کے حوالے کرتا ہے۔ جو آدمی اپنے بھائی کی ضرورت کو پورا کرنے میں مشغول ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کو پورا کریں گے۔ بس! یہاں تو اسی جملہ کی وجہ سے اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں۔ پہلے اس کی تشریح پیش کر چکا ہوں۔

اور جو شخص کسی مسلمان کی کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے ایک بڑی تکلیف کو دور کریں گے۔ اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔

﴿اللہ تعالیٰ کی مدد کو متوجہ کرنے کی تدبیریں﴾

۲۴۵. عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ الدُّنْيَا، نَفَّسَ اللهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِّنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ يَسَّرَ عَلَىٰ مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ، وَاللهُ فِي عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ أَخِيْهِ، وَمَنْ سَلَكَ طَرِيْقًا يَلْتَمِسُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللهُ لَهُ طَرِيْقًا إِلَى الْجَنَّةِ. وَمَا اجْتَمَعَ قَوْمٌ فِيْ بَيْتٍ مِّنْ بُيُوْتِ اللهِ تَعَالَىٰ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللهِ؛ وَيَتَدَارَسُوْنَهُ بَيْنَهُمْ إِلَّا أُنْزِلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِيْنَةُ، وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ، وَحَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ، وَذَكَرَ اللهُ فِيْمَنْ عِنْدَهُ. وَمَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے کسی تکلیف کو دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف کو دور فرمائیں گے۔ ویسے دنیا کی تکلیف کے مقابلہ میں قیامت کی تکلیفیں بہت زیادہ ہیں اور بہت بڑی ہیں اور ایسی ہیں کہ ختم ہونے والی نہیں ہیں۔

شراح نے لکھا ہے کہ پہلے لفظ (کُربَةً) میں تنوین تحقیر کے لئے ہے اور دوسرے (کُربَةً) میں تعظیم کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی دنیا کی تکلیفوں میں سے معمولی تکلیف کوئی شخص دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی تکلیفوں میں سے بڑی تکلیف کو دور فرمائیں گے۔

اور جو آدمی کسی تنگ دست کے لئے آسانی کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے دنیا و آخرت کے اندر آسانی فرمادیں گے۔ تنگ دست کے لئے آسانی کرنے کا مطلب یہ ہے

کہ اگر کسی آدمی کو آپ نے قرض دے رکھا ہے اور وہ آدمی اپنی تنگ دستی کی وجہ سے قرض کی ادائیگی سے قاصر ہے، اور مزید مہلت طلب کر رہا ہے تو اس صورت میں اگر آپ جانتے ہیں کہ وہ تنگ دستی کی وجہ سے اِس وقت قرض ادا نہیں کر سکتا تو آپ کو چاہیے کہ اس کو کچھ مہلت دے دیں، گویا یہ آپ نے اس کے لئے آسانی کر دی۔ اور ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کا قرض کم کر دیں یا پورا ہی معاف کر دیں۔

اور جو شخص کسی کی پردہ پوشی کرے گا اور عیب کو چھپائے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کے اندر اس کے عیب کو چھپائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں لگے رہتے ہیں جب تک کہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ یعنی ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ہمارے شاملِ حال رہے تو اس کا آسان اور بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے بھائی کی مدد میں لگے رہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ہماری شاملِ حال ہوگی۔

﴿ دلی سکون کے متلاشی متوجہ ہوں ﴾

اور جب کوئی قوم اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہوتی ہے یعنی مسجد میں یا کوئی ایسی جگہ جو خاص تربیت کے لئے یا اللہ کی کتاب کو پڑھانے کے لئے یا نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو سکھلانے کے لئے بنائی گئی ہے۔ یہاں مسجد کی تخصیص نہیں ہے بلکہ مدرسہ و مکتب بھی اس میں داخل ہے۔ اور وہ قوم جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں ایک دوسرے کو سناتی ہے۔ ﴿يَتَدَارَسُوْنَ بَيْنَهُمْ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ ایک پڑھتا ہے اور دوسرے سنتے ہیں۔ دوسرا پڑھتا ہے اور پہلے والا سنتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے یعنی ان کے دلوں کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے طمانینت و سکون کی

کیفیت نازل کی جاتی ہے۔

آج کل عام طور پر لوگ اپنے قلب کی پریشانیوں کی وجہ سے ایسے بے چین ہیں کہ ہر ایک کے اوپر بے چینی اور پریشانی طاری ہے، اور ہر شخص اس بات کا خواہش مند ہے کہ اس کے دل کو سکون وطمانینت حاصل ہو؛ تو اس کا ایک آسان طریقہ یہی بتلایا جاتا ہے۔

﴿وَغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے ﴿وَحَفَّتْهُمُ الْمَلائِكَةُ﴾ اور فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ ایسے فرشتے مقرر ہیں جو ذکر اللہ کی مجالس، کتاب اللہ کی تلاوت کی مجالس کی تلاش میں لگے رہتے ہیں، جب ان کو ایسی مجلسیں مل جاتی ہیں تو وہ ایک دوسرے کو دعوت دیتے ہیں کہ آجاؤ! یہی وہ جگہ ہے جس کی تلاش میں تم لوگ پھر رہے ہو، اور پھر وہ چاروں طرف سے اس مجلس کو گھیر لیتے ہیں۔

﴿وَذَكَرَاللهُ فِيمَنْ عِنْدَهُ﴾ اور جب یہ لوگ آپس میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے پاس جو ہیں یعنی فرشتوں کے درمیان ان کو یاد فرماتے ہیں۔

﴿عملی کوتاہی کی تلافی نسبی بلندی سے نہیں ہوسکتی﴾

اور جس کو اس کا عمل پیچھے رکھے اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی اپنے عمل کی کمی اور کوتاہی کی وجہ سے پیچھے رہ گیا تو چاہے شرافتِ نسب کی وجہ سے وہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو؛ اس کی نسبی شرافت اس کی عملی کوتاہی کی تلافی نہیں کرسکتی۔

بہت سے لوگ اپنی نسبی شرافت کی وجہ سے، علوِّ نسبی کے گھمنڈ کے اندر رہتے ہیں اور عملی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس ارشاد سے ایسے لوگوں کو متنبہ کردیا کہ عملی کوتاہی کی تلافی نسبی بلندی سے نہیں ہوسکتی، جس کو اس کا عمل پیچھے رکھے گا؛ نسب کبھی

آگے نہیں بڑھا سکتا۔خود نبی کریم ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو صاف طور پر بتلا دیا تھا کہ تمہارا عمل تمہارے ساتھ رہے گا اس لئے تم خود ہی عمل کرلو (مسلم شریف، ۵۲۵) مطلب یہ ہے کہ عمل ہی آدمی کو آگے بڑھا سکتا ہے۔البتہ اگر کسی کے اندر عمل کے ساتھ ساتھ نسبی شرافت بھی موجود ہے تو پھر سبحان اللہ۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ﴿اَلنَّاسُ مَعَادِنٌ كَمَعَادِنِ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ لوگوں کا حال ایسا ہے جیسے سونے چاندی کی کانیں یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فطری طور پر کچھ جگہوں پر سونا چاندی پیدا کردیا جاتا ہے، اسی طرح لوگوں کا حال بھی ہے کہ کسی میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے جیسے سونے میں ہوا کرتی ہے، کسی میں ایسی صلاحیت ہوتی ہے جیسے چاندی میں ہوتی ہے۔سونے چاندی میں رکھی ہوئی یہ صلاحیتیں خود ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ودیعت فرمودہ ہیں۔اسی کو آگے فرمایا ﴿خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقُهُوْا (بخاری شریف، ۳۳۵۳)﴾ جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں اپنے خاندان اور نسب کے اعتبار سے بہتر اور اچھے سمجھے جاتے تھے، اسلام لانے کے بعد بھی وہ بہتر ہی ہیں، بشرطیکہ وہ علمِ دین حاصل کرلیں اور فقیہ بن جائیں۔

نبی کریم ﷺ نے ﴿فَقُهُوْا﴾ کی قید لگائی، اس سے معلوم ہوا کہ آدمی علمی اور عملی اعتبار سے ترقی کرلے اور پھر اس کو نسبی شرافت اور بلندی بھی حاصل ہے تو نورٌ علیٰ نور ہے، یہ اس کے لئے مزید ترقی کا باعث ہوتی ہے۔لیکن اگر کوئی آدمی صرف نسبی شرافت کو لے کر بیٹھ جائے اور عملی اعتبار سے کوتاہی سے کام لے؛ تو پھر وہ نسبی شرافت عملی کوتاہی کی تلافی نہیں کرسکتی۔

اَلشَّفَاعَةُ

سفارش کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

﴿سفارش کرنے والا برابر کا حصہ دار ہے﴾

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب سفارش کے سلسلہ میں قائم کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا﴿مَن یَّشْفَعْ شَفَاعَۃً حَسَنَۃً یَّکُنْ لَّہٗ نَصِیْبٌ مِّنْھَا (النسآء)﴾ جوآدمی کسی اچھی بات کے لئے سفارش کرے گا تو اس کے لئے بھی اس کے اندر حصہ ہے یعنی اس کو بھی اس پر اجر و ثواب ملے گا۔کام تو وہ کرے گا جس سے سفارش کی گئی ہے لیکن اس کام کے پورا ہونے میں یہ سفارش کرنے والا بھی ذریعہ بنا؛ اس لئے اس کو بھی ثواب ملے گا۔

سفارش کے سلسلہ میں بھی علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دو روایتیں پیش کرتے ہیں۔

﴿سفارش کی حیثیت﴾

۲۴۶.عن أبی موسیٰ الأشعری رضی اللہ عنہ قال: کَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَاأَتَاہُ طَالِبُ حَاجَۃٍ أَقْبَلَ عَلیٰ جُلَسَائِہٖ،فَقَالَ: اِشْفَعُوْاتُؤْجَرُوْا،وَیَقْضِیَ اللّٰہُ عَلیٰ لِسَانِ نَبِیِّہٖ مَاأَحَبَّ. (متفق علیہ)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس جب کوئی حاجت مند آتا تھا تو آپ اپنے پاس مجلس میں روزانہ کے حاضر باش صحابہ سے فرماتے تھے کہ ضرورت مندوں کی سفارش کرو اور ثواب پاؤ۔باقی یہ ہے کہ سفارش کے نتیجہ میں اس کا

کام ہو ہی جاوے اور مَیں تمہاری سفارش مان کر اس کا کام کر ہی دوں ؛ یہ ضروری نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی زبانِ مبارک سے وہی بات کرواتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہے؛ وہی ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ میں تو وہی کروں گا جو اللہ تعالیٰ کو منظور ہے، باقی یہ ہے کہ تم کو سفارش کرنے کا اجر وثواب ملے گا۔

دیکھو! اس ارشادِ مبارک میں نبی کریم ﷺ نے ایک تو سفارش کرنے کی ترغیب دی اور دوسری بات یہ کہ سفارش کی حیثیت بھی بتلادی کہ اصل سفارش کیا ہے؟

ہماری غلط فہمی

آج کل ہمارے معاشرے میں سفارش کا مفہوم بہت الگ سمجھ لیا گیا ہے۔ شریعت نے سفارش کو جو حیثیت دی ہے وہ الگ ہے اور ہم نے اپنے معاملات اور لین دین کے اندر سفارش کا درجہ اس سے بہت زیادہ بڑھا دیا ہے۔ سفارش کی حقیقت کسی ضرورت مند کی ضرورت کی طرف کسی کو صرف متوجہ کرنا ہے۔ ایک آدمی کسی کی ضرورت پوری کرسکتا ہے اس کو آپ توجہ دلا دیں کہ بھائی! یہ ضرورت مند ہے۔ بس! آپ جو توجہ دلا رہے ہیں اس کا نام سفارش ہے۔ آج کل ہم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ سفارش کرنا یعنی دوسرے پر دباؤ ڈالنا۔ اسی لئے جب کسی سے سفارش کروانی ہوتی ہے تو پہلے سوچا جاتا ہے کہ اس کے پاس سفارش کروانے کے لئے کون سا آدمی زیادہ مناسب رہے گا۔

حالانکہ حضرت اقدس تھانوی نوراللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ سفارش کے اندر یہ ہوتا ہے کہ اس آدمی کو یوں کہہ دیا جائے کہ دیکھو! یہ ضرورت مند ہے، اگر آپ کے نزدیک اس کی ضرورت کو پورا کرنا قرینِ مصلحت ہے اور آپ کے اصول کے خلاف نہیں ہے تو آپ اس کی

ضرورت پوری کر دیجیے۔ یہ سفارش ہے، اس سے زیادہ اور کوئی حقیقت نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ کسی پر اصرار کیا جائے اور اتنا دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مجبور ہو جائے؛ اس کا نام سفارش نہیں ہے۔ یہ تو غلط طریقہ ہے۔ خود نبی کریم ﷺ نے سفارش کا جو طریقہ بتلایا وہ یہی ہے کہ اللہ کا ایک بندہ حاجت مند ہے، اس کی حاجت کو پورا کرنے میں آپ بھی ثواب حاصل کرنے کی غرض سے شریک ہو رہے ہیں اور جس کے ذریعہ سے اس کی حاجت پوری ہو سکتی ہے اس کو آپ متوجہ کر رہے ہیں۔

سفارش کے متعلق پہلا اُصول

اب سفارش میں پہلے تو یہ طے کرنا ہے کہ یہ کام جس میں آپ سفارش کرنا چاہتے ہیں وہ کام جائز بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے کہ اگر ایسی جگہ ہے کہ جہاں سفارش کرنا جائز ہی نہ ہو اور آپ سفارش کریں تو ایسی سفارش کرنے سے تو آپ خود گنہ گار ہوں گے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک عورت فاطمہ مخزومیہ کی عادت یہ تھی کہ ضرورت کے موقعہ پر لوگوں سے چیزیں مانگ کر بعد میں مُکر جایا کرتی تھی اور انکار کر دیتی تھی اور کبھی کبھی چوری بھی کر لیتی تھی۔ فتح مکہ کے موقعہ پر چوری کی تو وہ پکڑی گئی، گواہوں سے چوری کا ثبوت بھی ہو گیا۔ اب ان کا تعلق قریش کے قبیلہ مخزوم سے تھا اور یہ قبیلہ بڑا معزز سمجھا جاتا تھا ابوجہل بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا، جب چوری کا ثبوت ہو گیا تو لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا، سب لوگ بے چین اور پریشان ہو گئے کہ ایسے بڑے قبیلے کے ایک فرد کا ہاتھ جب کٹے گا تو قبیلے کی ناک کٹ جائے گی، لہٰذا انہوں نے سوچا کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں سفارش کی جانی چاہیے تاکہ یہ معاملہ رُک جائے اور سزا کے طور پر ہاتھ کٹنے کی

نوبت نہ آئے۔اب یہ مرحلہ آیا کہ حضور ﷺ کی خدمت میں سفارش کون کرے؟ لوگوں نے غور وفکر کے بعد حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا نام لیا۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے اور حضور ﷺ کے بڑے لاڈلے تھے ان کے یہ صاحب زادے ہیں اور یہ بھی حضور ﷺ کی نگاہوں میں ویسے ہی لاڈلے تھے۔اسی لئے ان کا لقب حِبُّ رسولِ اللہ ﷺ تھا ''نبی کریم ﷺ کے محبوب''۔صحابہ کے درمیان بھی اسی لقب سے پہچانے جاتے تھے۔لوگوں نے سوچا کہ حضور کی خدمت میں سفارش پیش کرنے کے واسطے ان سے بڑھ کر اور کون ہوسکتا ہے۔چنانچہ سب لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ حضور ﷺ سے درخواست کیجیے کہ ان کا ہاتھ نہ کٹے اور کوئی دوسری سزا ہوجائے تو بہتر ہے۔چنانچہ جب بہت سارے لوگوں نے ان پر دباؤ ڈالا تو یہ حضور ﷺ کی خدمت میں گئے اور سفارش کی؛ تو حضور اکرم ﷺ کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا، آپ بہت غصّے ہوئے۔روایتوں میں آتا ہے کہ آپ اتنے غضبناک ہوئے کہ اس سے پہلے کبھی اتنا غضبناک نہیں ہوئے تھے اور فرمانے لگے ﴿يَا أُسَامَةُ ! أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِاللهِ؟﴾ اے اسامہ! کیا تم اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزا کے بارے میں سفارش لے کر میرے پاس آئے ہو؟ اس کے بعد آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے ایک تقریر فرمائی تاکہ آئندہ ایسی سفارش کی نوبت نہ آئے۔حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلی امتیں اسی لئے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے کوئی شریف گھرانے کا آدمی اگر جرم کرتا تھا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا اور کوئی غریب خاندان کا آدمی اگر جرم کرتا تھا تو اس کو سزا دی جاتی تھی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿لَوْأَنَّ فَاطِمَةَبِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ (أَعَاذَهَااللهُ مِنْهَا) لَقَطَعْتُ يَدَهَا﴾ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے گی (أعاذھا اللہ منھا) تو

میں اس کا ہاتھ بھی کاٹوں گا (بخاری شریف، ۳۴۷۵) گویا آئندہ کے لئے نبی کریم ﷺ نے ایک اصول بتلا دیا کہ حدود اللہ ایسی چیز نہیں ہے کہ جس میں سفارش کی جائے۔ مَیں یہی عرض کرنا چاہتا تھا کہ پہلے تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ چیز ایسی ہے کہ اس میں سفارش کی جائے۔

فقہاء نے بھی مسئلہ لکھا ہے کہ حدود کے اندر سفارش نہیں ہوا کرتی۔ ایک آدمی اپنے کرتوت کی وجہ سے واجب التعزیراور واجب الحد ہے، حاکم کے پاس جب معاملہ پہنچ گیا اب وہاں سفارش نہیں ہوسکتی۔ ہاں! وہ معاملہ حاکم کے پاس پہنچنے سے پہلے اندر اندر سیٹنگ ہوجائے کہ وہاں معاملہ مت لے جانا؛ تو وہ بات دوسری ہے۔ لیکن وہاں پہنچنے کے بعد سفارش کی گنجائش نہیں رہتی۔

خیر! مَیں تو یہ عرض کررہا تھا کہ یہاں ایک ناجائز کام میں سفارش کی گئی تھی جو بالکل درست نہیں تھی اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس پر اتنی زیادہ ناراضگی کا اظہار فرمایا۔

ایسی سفارش بالکل درست نہیں ہے

ہمارے معاشرہ میں سفارش کا جو سلسلہ چلتا ہے اس میں بھی پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ جس چیز میں سفارش کے لئے کہا جارہا ہے، وہ چیز قابلِ سفارش ہے بھی یا نہیں؟ مثلاً امتحان کے پرچے جانچے جارہے ہیں اور کسی کو معلوم ہوا کہ ہمارے بیٹے کا پرچہ فلاں صاحب کے پاس ہے، تو اب تلاش کیا جاتا ہے کہ کون کون ان کا قریبی تعلق والا ہے اور پھر ان کے پاس جاتے ہیں، یہ بالکل جائز نہیں ہے۔ یہ ایسا معاملہ نہیں ہے جس میں سفارش کی جائے۔ اس نے جوابات جیسے لکھے ہیں اس کے مطابق نمبرات کا وہ حقدار ہے، اور اگر کسی کی سفارش کی وجہ سے اس کو زیادہ نمبر دیئے گئے تو دوسروں کا حق مارا گیا۔ اس لئے یہ سفارش بالکل درست

نہیں ہے۔

اسی طرح سے کسی معاملہ کا فیصلہ کسی کے پاس پیش کیا گیا تو وہاں فیصل کے سامنے اس فیصلے سے متعلق جو شہادتیں اور باتیں اور جو معلومات پہنچیں گی، ان ساری چیزوں کو مدِ نظر رکھ کر وہ فیصلہ کرے گا۔ اب وہاں یہ جائز نہیں ہے کہ کسی کی سفارش کی جائے اور کہا جائے کہ ان کا ذرا خیال رکھنا۔

نااہل کے متعلق سفارش مت کیجئے؛ ورنہ......

کسی منصب کے سلسلہ میں سفارش کرنا، مثلاً کسی جگہ کوئی پوسٹ خالی ہے، اور اس پر تقرر کے اختیارات جس کے ہاتھ میں ہیں وہ افسر آپ کی جان پہچان والا ہے، اور کوئی ایسا آدمی آپ کو سفارش کے لئے مجبور کر رہا ہے جس میں اس کی اہلیت نہیں ہے، اور آپ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ اس پوسٹ کا اہل نہیں ہے؛ پھر بھی اگر آپ اس کی سفارش کریں گے اور اس کے نتیجہ میں خدانخواستہ اس کا تقرر ہو گیا؛ تو آئندہ اس سے جتنی بھی غلطیاں اور بے اصولیاں ہوں گی؛ ان سب جرموں میں آپ بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

دیکھئے! یہ عہدے اور مناصب بھی اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں۔ پہلے امانت کا تذکرہ گزر چکا ہے، اور وہاں میں بتلا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے ﴿اِنَّ اللہَ یَـاْمُرُکُمْ اَنْ تُـؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ اِلیٰ أَھْلِھَا (النسآء)﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم کرتا ہے کہ تم امانتیں اس کے حقدار کے حوالے کرو۔ اس موقعہ پر لکھا ہے کہ یہ منصب بھی امانت ہے۔ اسی لئے جب حضور اکرم ﷺ سے قیامت کی علامتیں پوچھی گئیں تو آپ نے ایک علامت یہ بھی بتلائی ﴿اِذَاضُیِّعَتِ الْأَمَانَۃُ﴾ جب امانت ضائع کی جائے، پوچھا گیا ﴿یَارَسُوْلَ اللہِ! مَا اِضَاعَتُھَا؟﴾ امانت کے ضائع

کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا﴿إِذَا أُسْنِدَ الْأَمْرُ إِلَىٰ غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ (سنن کبریٰ، ۲۰۸۶۰)﴾ جب کوئی کام، کوئی عہدہ ومنصب نا اہل کے حوالے کیا جائے؛ تو یہ امانت کا ضائع کرنا ہے، اس وقت قیامت کا انتظار کرو۔

﴿سفارش میں جانبین کی رعایت کریں﴾

ہاں! جو آدمی آپ سے سفارش کروا رہا ہے اس میں اس منصب کی پوری صلاحیت موجود ہے، اور آپ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اس عہدے کے لائق ہے؛ تو پھر گنجائش ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس سے کہہ دیا جائے کہ آپ کے اصول اور ضوابط اور آپ کی مصلحت کے خلاف نہ ہو؛ تو آپ اس کی طرف توجہ فرمائیے۔

آج کل تو معاملہ عجیب ہو گیا ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک صاحب میرے پاس آئے، اور ان کو ان الفاظ کے ساتھ سفارش لکھ دی، تو وہ کاغذ لے کر کہتے ہیں کہ یہ کوئی سفارش ہے۔ گویا ان کے نزدیک سفارش یہ ہے کہ یہ کام آپ کو ضرور کرنا ہی ہے، اگر نہیں کریں گے تو ہمارے اور آپ کے تعلقات آئندہ کے واسطے خراب ہو جائیں گے، اگر آپ ایسا لکھ کر دیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سفارش ہے، حالانکہ یہ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ اور جو ایسی سفارش کرتے ہیں وہ بڑا ظلم کرتے ہیں۔

کوئی کہے گا کہ یہ ظلم کیسے ہوا؟ تو مَیں آپ کو ظلم کی حقیقت بتلاتا ہوں۔ ظلم اس طرح ہوا کہ ایسی طرح سفارش کر کے جو حاجت مند ہے اس کی تو آپ نے رعایت کر رہے ہیں لیکن جس سے سفارش کر رہے ہیں اس کی رعایت نہیں کر رہے ہیں، اس کو اپنا اصول توڑنے پر اور اپنی مصلحت فوت کرنے پر مجبور کر کے اس کا نقصان کر رہے ہیں۔ یہ کیسی بات ہوئی۔

انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ آپ ایک کی طرف نظر نہ کریں۔جس کی سفارش کر رہے ہیں اس کو تو دیکھ رہے ہیں، لیکن جس سے سفارش کر رہے ہیں اس کو نہیں دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے اس دباؤ کی وجہ سے اس کا کتنا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔آپ یہ تو سوچئے کہ اگر اس کی جگہ پر آپ ہوتے اور آپ کے پاس اس طرح کی سفارش آتی تو آپ پر کتنا دباؤ پڑتا؟ آج تو وہ بیچارہ سوچنے پر مجبور ہے، وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے اس کی سفارش قبول نہیں کی اور اس پر دھیان نہیں دیا تو وقت آنے پر یہ بھی بدلہ لیں گے، لہٰذا وہ بے چارہ مارے ڈر کے اور طبیعت کے نہ چاہتے ہوئے بھی سفارش قبول کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔حالانکہ اس کی مصلحت کا تقاضہ نہیں ہے اور اس کے اصول کے بھی خلاف ہے؛ پھر بھی بادلِ ناخواستہ سفارش قبول کر رہا ہے۔اس لئے آپ کے لئے ایسی سفارش کرنا جائز نہیں ہے۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کا قصہ

دیکھو! سفارش کا طریقہ تو وہ ہے جو آنے والی روایت میں بتلا رہے ہیں، حالانکہ اپنی ذات سے تعلق رکھنے والے کام میں بھی سفارش کا کیا طریقہ ہونا چاہیے؛ نبی کریم ﷺ نے اس کی ہم کو تعلیم نے دی ہے، اور وہی ہمارے لئے نمونہ ہے۔

۲۴۷۔عن ابن عباس رضی اللہ عنہما فِيْ قِصَّةِ بَرِيْرَةَ وَزَوْجِهَا. قَالَ: قَالَ لَهَا النَّبِيُّ ﷺ: لَوْ رَاجَعْتِيْهِ؟ قَالَتْ: يَارَسُوْلَ اللهِ! تَأْمُرُنِيْ؟ قَالَ: اِنَّمَا أَشْفَعُ. قَالَتْ: لاحَاجَةَ لِيْ فِيْهِ.
(رواہ البخاری)

حضرت بریرہ نامی ایک باندی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت کیا کرتی تھی۔ دراصل وہ کسی اور خاندان والوں کی باندی تھی اور انہوں نے ان کے ساتھ عقدِ کتابت کر رکھا تھا یعنی اگر وہ کچھ رقم ادا کردیں تو ہم آزاد کردیں گے۔غلام باندیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا

بھی چاہیے۔اب ان کے پاس تو رقم نہیں تھی تو اس کی ادائیگی کے سلسلہ میں تعاون حاصل کرنے کی غرض سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوئیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ایسا کیوں نہ ہو کہ مَیں ہی تمہیں خرید کر آزاد کردوں۔انہوں نے کہا کہ ایسا سہی۔ چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان لوگوں سے گفتگو کی تو انہوں نے ایک شرط رکھی، جو ایک دوسرا مسئلہ ہے۔بہرحال! حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو خرید کر آزاد کردیا۔اب معاملہ یہ تھا کہ یہ جس زمانہ میں باندی تھی اس زمانہ میں ان کے آقا نے ان کا نکاح ایک صحابی سے کردیا تھا جن کا نام مغیث تھا، وہ بھی غلام تھے۔اور مسئلہ یہ ہے کہ آقا اپنی باندی کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف جہاں چاہے کرسکتا ہے، کیونکہ وہ اس کا مالک ہے۔اب حضرت بریرہ حسین وجمیل تھیں اور حضرت مغیث رضی اللہ عنہ شکل وصورت کے لحاظ سے ان کے درجے کے نہیں تھے، ذرا سیاہ فام بھی تھے، اگرچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کو پسند نہیں کرتی تھیں لیکن آقا کا اختیار تھا اس لئے اس نے نکاح کرادیا تھا اور وہ ان کے نکاح میں تھیں، اور اسی نکاح کے دوران بچے بھی پیدا ہوئے تھے، لیکن جب ان کی آزادی ہوگئی تو ان کو اس نکاح کے باقی رکھنے اور نہ رکھنے کا پورا اختیار حاصل ہوگیا، کیونکہ مسئلہ یہی ہے کہ اگر کسی باندی کا نکاح اس کے آقا نے اس کی غلامی کے زمانہ میں کرادیا ہو، تو جب اس کو آزادی حاصل ہوگی تو اس کو اختیار رہتا ہے کہ آقا نے اس کے باندی پنے میں اس کا جو نکاح کرایا تھا اس کو باقی رکھے، اور چاہے تو فسخ اور ختم کردے۔چنانچہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا جب آزاد ہوئیں تو اپنے اسی اختیار اور پاور کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے کہہ دیا کہ مَیں اس نکاح کو فسخ اور ختم کرتی ہوں۔حضور ﷺ نے فرمایا ﴿لَکِ بُضْعُکِ فَاخْتَارِیْ﴾ تو انہوں نے کہا ﴿اِخْتَرْتُ

نَــفْسِــیْ﴾ اس طرح انہوں نے اپنا نکاح کینسل کر دیا۔ جب ان کے شوہر حضرت مغیث کو معلوم ہوا کہ انہوں نے تو نکاح ختم کر دیا ہے، تو وہ بے چین ہو گئے۔ چونکہ حضرت مغیث کو ان کے ساتھ بڑی محبت تھی؛ اس لئے ان کی جدائی کی وجہ سے پریشان ہو گئے۔

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے کہ وہ منظر میری نگاہوں کے سامنے ہے کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا مدینہ کی گلیوں میں آگے جارہی ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے حضرت مغیث رضی اللہ عنہ رو رہے ہیں، اور ان کی داڑھی پر آنسو ہیں اور وہ ان کو منانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مجھے منظور کرلو، دوبارہ نکاح کرلو اور وہ انکار کر رہی ہیں۔

(بخاری شریف، ۵۲۸۳)

بہر حال! حضرت مغیث رضی اللہ عنہ نے ان کو منانے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی، لیکن دیکھا کہ بریرہ کا دل پسیج نہیں رہا ہے اور وہ نہیں مانتی ہیں تو حضرت مغیث رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تو ان کا حال معلوم ہو چکا تھا۔ انہوں نے آکر حضور سے درخواست کی اور عرض کیا: یارسول اللہ! میری سفارش کر دیجیے اور اس کو کچھ سمجھائیے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور فرمایا ﴿لَوْ رَاجَعْتِیْهِ بِأَنَّهٗ أَبُوْ أَوْلَادِكِ﴾ اگر تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرلو اور ان سے رجوع کرلو اور دوبارہ ان کے نکاح میں آجاؤ؛ تو اچھا ہے، کیونکہ یہ تمہارے بچوں کے باپ ہیں، ان کے نکاح میں رہ کر تمہیں اولاد بھی ہوئی ہے۔

اولاد کی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ باوجود حالات اور طبیعت کے نہ چاہنے کے بھی عورت آمادہ ہو جاتی ہے۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی طرح ان کو سمجھانا چاہا۔ وہ بھی بڑی سمجھ دار عورت تھی، انہوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا ﴿یَارَسُوْلَ اللهِ! تَأْمُرُنِیْ؟﴾ کیا آپ مجھے حکم دے رہے ہیں؟ یعنی اگر آپ کا حکم ہے تو سر آنکھوں پر، انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿اِنَّمَا أَشْفَعُ﴾ مَیں حکم نہیں دے رہا ہوں بلکہ صرف سفارش کررہا ہوں۔ تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا ﴿لَا حَاجَةَ لِیْ فِیْهِ﴾ تب تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، اور انہوں نے نہیں مانا۔

دیکھئے! حدیثِ پاک کا یہ واقعہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو سفارش کے سلسلہ میں بڑا درس دیتا ہے۔ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کی حیثیت کیا تھی؟ وہ حضور ﷺ کی زوجۂ مطہرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی آزاد کردہ باندی تھیں لیکن ان کی طبیعت اور مصلحت کا تقاضہ یہی تھا اس لئے انہوں نے حضور ﷺ کی سفارش کو قبول نہیں کیا اور حضور ﷺ نے بھی ذرّہ برابر ناگواری اور گرانی کا اظہار نہیں فرمایا۔ آپ نے ایسا نہیں کہا کہ واہ بھئی واہ! ہمارے گھر کی باندی تھی، اور آزادی تو ہمارے گھر کے طفیل نصیب ہوئی اور ہم کہہ رہے ہیں پھر بھی ہماری بات کو ٹھکرا رہی ہے، تیری یہ حیثیت کہ میری بات کو ٹھکرائے۔ حضور نے ذرہ برابر بھی ناراضگی ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمایا، اس وقت بھی نہیں اور بعد میں بھی نہیں۔ ان کے اور بھی قصے حدیثوں میں موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قصہ کے بعد بھی وہ برابر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر آتی جاتی رہتی تھیں۔

﴿ ایک اہم مسئلہ ﴾

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نبی کریم ﷺ گھر تشریف لائے اور پوچھا کہ کھانے کے واسطے کچھ ہے؟ روٹی وغیرہ پیش ہوئی۔ حضور ﷺ نے دیگچی میں گوشت دیکھا تو فرمایا کہ گوشت رکھا ہوا ہے وہ پیش نہیں کیا؟ تو کہا گیا ﴿قَدْ صُدِّقَ عَلٰی بَرِیْرَةَ﴾ بریرہ کو صدقہ میں ملا ہے اور آپ تو صدقہ نوش نہیں فرماتے۔ حضور ﷺ نے فرمایا ﴿هِیَ لَهَا صَدَقَةٌ، وَلَنَا هَدِیَّةٌ﴾ یہ ان کے لئے

صدقہ ہے، وہ جب ہمیں دے گی تو ہمارے لئے ہدیہ ہوجائے گا (بخاری شریف،۱۴۹۳) یہاں سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہوگیا۔ خیر! مَیں یہ عرض کررہاہوں کہ نبی کریم ﷺ نے ذرہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ سفارش کے معاملہ میں یہ واقعہ آنے والی امت کے واسطے بہت بڑا معیار ہے۔

﴿سفارش کے معاملہ میں ہونے والی کوتاہیاں﴾

ہمارے معاشرے میں سفارش کی کیا حیثیت ہوگئی ہے، ہم اور آپ خوب جانتے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ، دین دار، پڑھے لکھے، علماء وصلحاء بلکہ بعض جگہوں پر مشائخ تک کا یہ حال ہے کہ وہ اگر کسی کی سفارش کریں اور اس پر توجہ نہیں دی گئی؛ تو ان کو ناگواری ہوجاتی ہے۔ حالانکہ معلوم ہونا چاہیے کہ سفارش تو ایک طرح کا مشورہ ہے۔

مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اس ارشاد میں بھی فرمایا﴿اِشْفَعُوْا تُؤْجَرُوْا﴾ سفارش کرو؛ تم کو ثواب ملے گا۔ بس! آدمی تو اسی نیت سے سفارش کرے کہ اللہ کے ایک بندہ کا کام میرے کہنے سے ہوجاتا ہے تو مجھے ثواب ملے گا۔ لیکن اگر نہیں ہوگا تب بھی سفارش کا ثواب تو ملنے ہی والا ہے، یہ تو کہیں گیا ہی نہیں۔

باقی یہ کہ تم سفارش کرو اور مَیں مان ہی لوں اور اس کا وہ کام کرہی دوں، یہ میرے لئے ضروری بات نہیں ہے۔ اللہ تعالی اپنے نبی کی زبان پر جو چاہے فیصلہ کروالے یعنی چاہے تو اس کا کام ہوجائے، چاہے تو نہ ہو، باقی آپ کا کام یہ ہے کہ سفارش کیجیے۔

سفارش کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آپ نے اس کا معاملہ اوپر تک پیش کردیا اس لئے کہ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے چارہ اپنے مقام اور اپنی حقیقت کے کم تر ہونے کی وجہ

سے اپنی ضرورت کسی بڑے کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہے اور جھجک رہا ہے، اس کی وہاں تک پہنچ نہیں ہے تو آپ اتنا کر رہے ہیں کہ اس کو وہاں پہنچا رہے رہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا ایک کام ہے، اگر آپ کی مصلحت، اصول وضابطہ کے خلاف نہ ہو؛ تو کر دیں؛ ورنہ آپ پر کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر آپ اس فکر میں نہ رہیے کہ اس کا وہ کام ہوا یا نہیں۔ اگر نہیں ہوا تو آپ دعا کر دیجیے، دوسری کوئی جگہ اس کا یہ کام ہو سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آپ خواہ مخواہ یہ سوچنے لگیں کہ اس نے کیوں نہیں کیا؟

ایک بزرگ کے پاس ایک صاحب آئے اور کہا کہ میرا یہ کام ہے، فلاں صاحب سے سفارش کر دیجیے۔ ان بزرگ نے کہا کہ وہ تو میرا پکا دشمن ہے، اگر مَیں سفارش کروں گا تو وہ آپ کا کام کرتا ہوگا تب بھی نہیں کرے گا۔ اس نے کہا کہ آپ تو بس سفارش کر دیجیے، اور بہت اصرار کیا۔ انہوں نے سفارش لکھ دی، وہ لے کر گیا تو اس نے پڑھتے ہی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ اس نے آ کر بتلایا کہ میرا کام تو نہیں کیا لیکن آپ کو بھی بہت برا بھلا کہا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ میں تو پہلے کہتا تھا، خیر! کوئی بات نہیں، مَیں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کا کام کسی اور جگہ سے کروا دے، اور تمہاری ضرورت پوری ہو جائے۔

بہترین سفارش نامہ

ایک صاحب ایک بزرگ کے پاس آئے کہ فلاں صاحب کے پاس سفارش نامہ لکھ دیجیے۔ انہوں نے اس میں لکھا کہ ان صاحب کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں، اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان کا کام کر دیجیے، اور کام کرنے والی اصل ذات تو اللہ تعالیٰ کی ہے (وَأَنْتَ الْمَأْجُوْرُ) اور تمہیں ثواب ملے گا۔ اور اگر آپ ان کا کام نہیں کریں گے تو روکنے والی ذات بھی

اللہ تعالیٰ ہی کی ہے (وَأَنْتَ الْمَعْذُوْرُ) اور تم معذور ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حقیقت میں سب چیزوں کا فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اگر کسی کے دل میں کرنے کے لئے ڈالیں تو وہ کرے گا، تو کرنے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں، اور روکنے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔ لہٰذا آپ اس سے کیوں ناراض ہوتے ہیں، بس! آپ تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کیجیے۔

خلاصۂ کلام

بہرحال! سفارش کی حقیقت صرف اتنی ہی ہے ''کسی کی توجہ کسی کام کی طرف دلانا'' آج کل ہمارے معاشرے میں سفارش کا معاملہ اس کے حدود سے بہت زیادہ تجاوز کر چکا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سفارش کے سلسلہ میں شریعت نے جو حدود و قیود قائم کئے ہیں ان کا لحاظ کیا جائے اور یہ بھی کہ سامنے والے کو اپنے اصول و ضوابط کے خلاف یا اپنی مصلحت کے خلاف کام کرنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ تو یکطرفہ فیصلہ ہے، آپ کو تو دونوں فریق کو دیکھنا ہے، حاجت مند کو بھی اور جو اس حاجت کو پورا کرنے جارہا ہے اس کو بھی کہ اس کی بھی مصلحت فوت ہونی نہیں چاہیے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ اور توفیق نصیب فرمائے

الاصلاح بین الناس

آپس کے تعلقات درست کرانا

مجلس ۱

۲۸/ربیع الآخر ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۲/اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

فأعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم.

لَاخَیْرَفِیْ کَثِیْرٍمِّنْ نَجْوَاھُمْ اِلَّامَنْ أَمَرَبِصَدَقَۃٍأَوْمَعْرُوْفٍ أَوْاِصْلَاحٍ بَیْنَ النَّاسِ.(النساء ۱۱۴)

وقال تعالیٰ:وَالصُّلْحُ خَیْرٌ. (النساء ۱۲۸)

وقال تعالیٰ:فَاتَّقُوْااللّٰہَ وَأَصْلِحُوْاذَاتَ بَیْنِکُمْ. (الأنفال ۱)

وقال تعالیٰ:اِنَّمَاالْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌفَأَصْلِحُوْابَیْنَ أَخَوَیْکُمْ. (الحجرات ۱۰)

لوگوں کے تعلقات درست کرانے کی اہمیت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے ”اَلاِصْلَاحُ بَیْنَ النَّاسِ“ لوگوں کے درمیان تعلقات کودرست کرانا یعنی اگر دومسلمان بھائیوں میں آپس میں تعلقات خراب ہوچکے ہیں اور بگڑ چکے ہیں، اُن کے آپس کے بگاڑ کودرست کراکے ان کے تعلقات کواستوار کرانا؛ یہ ”اِصْلَاحُ ذَاتِ الْبَیْنِ“ کہلاتا ہے اور اس باب میں اسی کی اہمیت کوبتلایا ہے۔ اگر یہ معلوم ہوجائے کہ آپس کے تعلقات کی نااستواری و بگاڑ کتنی خطرناک چیز ہے، توان تعلقات کودرست کرانے کے لئے کی جانے والی کوشش کی اہمیت بھی معلوم ہوسکتی ہے۔

﴿تعلقات کے بگاڑ پر وعیدیں﴾

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز، روزہ اور صدقہ سے آدمی کبھی وہ بات حاصل نہیں کر پاتا جو اصلاحِ ذات البین سے یعنی آپس کے تعلقات کو درست کرنے سے حاصل کر لیتا ہے، اور پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آپس کے تعلقات کے بگاڑ سے اپنے آپ کو بچاؤ ﴿بِأَنَّهَاهِيَ الْحَالِقَةُ﴾ اس لئے کہ یہ مونڈنے والی چیز ہے۔
(الادب المفرد۔۳۹۱)

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈتی ہے بلکہ دین کو مونڈ دیتی ہے، یعنی آدمی کا دین اس کی وجہ سے برباد اور ختم ہو جاتا ہے (الادب المفرد۔۲۶۰) اس لئے کہ اگر کسی کے ساتھ تعلقات میں بگاڑ آیا اور کسی دو میں آپس میں جھگڑا ہو گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کے درپئے آزار رہیں گے، ایک دوسرے کی عزت و آبرو ختم کرنے میں اور برائی میں لگے رہیں گے۔

حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بدترین سود کسی مؤمن کی آبروریزی ہے یعنی کسی مؤمن کی عزت کو دھچکا پہنچانا اور اس کو زک پہنچانا، ایسی کوئی حرکت یا معاملہ یا بات کرنا کہ جس سے کسی مؤمن کی عزت پر زد پڑے؛ یہ سب سے بدترین سود ہے۔
(سنن ابی داؤد۔۴۸۷۶)

اور آپس کے تعلقات کے بگاڑ کو دور کرنا اتنا ضروری ہے کہ اگر دو آدمیوں نے آپس میں تین دن سے زیادہ تک گفتگو نہیں کی، اپنے تعلقات کو بگاڑے رکھا اور اس کے بعد ان میں کسی کی موت واقع ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

ایسے ہی روایت میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر پیر اور جمعرات کو

اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں بندوں کے اعمال پیش ہوتے ہیں اور ان اعمال کو دیکھ کر ان کے ایمان کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کی مغفرت کا فیصلہ ہوتا ہے، مگر ایسے دو آدمی جو آپس میں لڑے جھگڑے ہوں اور آپس میں دونوں کے تعلقات بگڑے ہوئے ہوں، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا معاملہ ابھی رہنے دو، یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کرلیں (مسند احمد۔۶۳۹۷) جب تک وہ صلح نہیں کریں گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا فیصلہ نہیں ہوگا۔

اور بھی بے شمار روایتیں اس طرح کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپس کا جھگڑا، تعلقات کی ناگواری، نا استواری اور بگاڑ بڑی خطرناک چیز ہے۔

بلکہ جھگڑے کی وجہ سے آدمی ہر طرح کی برکتوں سے بھی محروم ہوجاتا ہے، روحانی نعمتیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو حاصل ہوسکتی ہیں ان سے بھی آپس کے جھگڑے کی وجہ سے محرومی ہوتی ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اپنے حجرۂ شریفہ سے نکلے تاکہ لوگوں کو بتلائیں کہ لیلۃ القدر کب ہے، لیکن آپ نے دیکھا کہ دو آدمی آپس میں جھگڑ رہیں ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں اس لئے باہر آیا تھا لیکن ان کے جھگڑے کی وجہ سے اس کی تعیین اُٹھالی گئی، یعنی کون سی رات لیلۃ القدر ہوتی ہے اس کا علم آپ کو دیا گیا تھا مگر اس جھگڑے کی وجہ سے ختم کردیا گیا۔ (بخاری شریف۔ حدیث نمبر ۴۹)

بہر حال! یہ بڑی خطرناک چیز ہے اور اسی جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے کسی کی بھی طرف سے جو کوشش کی جائے گی، اسی کو ''اصلاح ذات البین'' یعنی ''آپس کے تعلقات درست کرانا'' کہا جاتا ہے۔

﴿مجلس بازی میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے﴾

حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باری تعالیٰ کے ارشادات نقل کئے ہیں ﴿لا خَیْـرَ فِیْ کَثِیْـرٍ مِّـنْ نَـجْـوَاهُـمْ﴾ لوگ آپس میں جو سرگوشیاں کرتے ہیں اور راز دارانہ طریقہ سے جو گفتگو کرتے ہیں، اپنی مجلس میں بیٹھ کر جو باتیں کرتے ہیں، باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب مجلس بازی ہوتی ہے اور باتیں چلتی ہیں تو خیر اور بھلائی کی باتیں تو کم ہی ہوتی ہیں اور گاڑی پٹڑی سے اتر ہی جاتی ہے اور آدمی دوسروں کی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ باری تعالی نے فرمایا کہ ان کی مجلس کی گفتگو اور سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہے، البتہ ﴿اِلَّا مَـنْ أَمَـرَ بِـصَـدَقَةٍ﴾ اگر کوئی آدمی کسی کو صدقہ کرنے کا حکم کرے ﴿أَوْ مَعْرُوْفٍ﴾ یا بھلی بات کا حکم کرے ﴿أَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ﴾ یا لوگوں کے آپس کے تعلقات کو درست کرنے کے لئے کوئی کوشش کرے، ان تین امور کے لئے مجلسیں منعقد ہوں تو ان میں بھلائی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کے کاموں کے لئے اگر کچھ لوگ بیٹھ کر گفتگو کر رہے ہیں تو باعثِ خیر ہے، ورنہ چاہے گناہ کی کوئی بات نہ ہوئی ہو، ویسے ہی لغو باتیں ہوئی ہیں، تب بھی وہ لایعنی میں شمار ہوگا اور وقت ضائع ہوا تو اللہ تعالی کے یہاں اس کی پوچھ ہوگی۔

﴿صلح؛ بھلائی کی چیز ہے﴾

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا گیا ﴿وَالصُّـلْحُ خَيْرٌ﴾ صلح؛ بھلائی اور خیر کی چیز ہے۔ یہ سورۂ نساء کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس میں میاں بیوی کے تعلقات کے سلسلہ میں کچھ

ہدایتیں دی گئی ہیں اور وہیں یہ بھی بتلایا گیا کہ میاں بیوی اپنے تعلقات کو درست کرنے کے لئے ان میں سے کوئی ایک اگر اپنے حقوق سے درست بردار ہوجائے تاکہ نکاح باقی رہے، اور اس طرح اگر صلح کرنا چاہتے ہیں تو باری تعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔ اور آگے اس کے متعلق فرمایا گیا ﴿وَالصُّلۡحُ خَيۡرٌ﴾ صلح ہی بھلائی کی چیز ہے۔ چاہے صلح کو اپنے کچھ حقوق کو چھوڑ کر ہی کیوں حاصل نہ کرتے ہوں یعنی اس صلح کے واسطے اگر اپنے کچھ حقوق چھوڑنا بھی پڑیں تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ بھلائی کی چیز ہے۔

ویسے صلح ہوتی ہی اس وقت ہے جب آدمی اپنے کچھ مطالبات چھوڑنے پر آمادہ ہوجائے، ورنہ پھر صلح کیا ہوگی۔ جب دونوں کی طرف سے مطالبات ہوا کرتے ہیں اور دونوں فریق اپنے جن مطالبات پر مصر ہوتے ہیں، تو ان میں سے ہر فریق کو اپنے کچھ مطالبات چھوڑنے پڑتے ہیں، تب ہی صلح وجود میں آتی ہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے فرمایا گیا کہ اگر اپنے کچھ مطالبات چھوڑ کر بھی صلح حاصل ہوتی ہو؛ تو اس کو حاصل کرنا چاہیے، اس لئے کہ اس میں خیر ہے۔

تعلقات کو خوش گوار بناؤ

اور باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَصۡلِحُوا ذَاتَ بَيۡنِكُمۡ﴾ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات کو خوش گوار بناؤ اور درست کرو۔

سورۂ انفال کی یہ آیت دراصل غزوۂ بدر کے وقت نازل ہوئی تھی، جب غزوۂ بدر کے اندر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی، تو لڑائی شروع ہونے سے پہلے نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو اُبھارنے کے واسطے کچھ انعام مقرر کئے تھے کہ جو اس طرح کرے گا اس کو یہ

انعام دیا جائے گا۔ اگر کوئی دشمن کے کسی آدمی کو قتل کرے گا تو اس کا سب سامان اُس قتل کرنے والے کو بطورِ انعام کے دیا جائے گا ﴿مَنْ قَتَلَ قَتِيلاً فَلَهُ سُلُبُهُ (مسند أحمد، ۲۲۸۱۴)﴾ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اعلانات کی وجہ سے نوجوانوں نے خوب آگے بڑھ چڑھ کر دشمنوں کا پیچھا کیا اور ان کو قتل کیا، جب مالِ غنیمت آیا تو سب نے اپنے مطالبات رکھے کہ ہم نے بہت سے کارنامے انجام دیئے ہیں، ہم کو انعام ملنا چاہیے۔ اس موقعہ پر جو بوڑھے تھے انہوں نے کہا کہ میدان کی جو مرکزی جگہ تھی، ہم اس کی حفاظت کرتے رہے، یعنی ہم نے مرکز کو سنبھالے رکھا تب ہی تو آپ لوگوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا، ورنہ اگر ہم اس مرکز کی حفاظت نہ کرتے اور لشکر کے پاؤں اُکھڑ جاتے، تو کسی بہادر کو اپنی بہادری دکھلانے کا موقعہ ہی نہیں ملتا گویا ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ بھی کچھ کم نہیں ہے، اس لئے ہمیں بھی ملنا چاہیے۔ دونوں فریق میں آپس میں گفتگو ہوئی۔ اس وقت باری تعالیٰ کی طرف سے سورۂ انفال کی کچھ آیتیں جو مالِ غنیمت کے احکام پر مشتمل ہیں نازل ہوئیں اور انہیں آیتوں کے بعد اخیر میں ایک بات فرمائی گئی کہ مالِ غنیمت کی وجہ سے آپس کے تعلقات کو خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے ﴿فَاتَّقُوا اللهَ﴾ آپس کے تعلقات کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یعنی وہ بگڑنے نہ پائیں اور ان کو درست کرو۔ یہ مال کتنے روز کے واسطے ہے؟ چند دن رہنے والی چیز ہے، یا تو وہ خود آدمی کی موجودگی میں زندگی ہی میں ہاتھ سے نکل جائے گا، یا خود اس کو مال چھوڑ کر جانا پڑے گا، بہر حال باقی رہنے والی چیز نہیں ہے، اس کی وجہ سے اپنے مؤمن بھائیوں کے ساتھ یا حقیقی بھائیوں کے ساتھ یا خاندان کے لوگوں کے ساتھ جھگڑا کرنا اور آپس کے تعلقات کو بگاڑنا؛ کوئی دانشمندی کی چیز نہیں ہے۔

بلکہ اس پر تو بڑی خوش خبری سنائی گئی ہے کہ ایک آدمی کا حق ہو اور وہ جھگڑا ختم کرنے کے واسطے اپنے حق کو چھوڑ دے، ایسے آدمی کے لئے نبی کریم ﷺ نے وسطِ جنت یعنی جنت کے بیچ میں جگہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔اس کے لئے بڑے وعدے ہیں۔

بہر حال! یہ ایک چیز ہے جو آج کل بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔عام طور پر میراث کے معاملہ میں ایسا بہت زیادہ ہوتا ہے کہ صاحبِ مال کا انتقال ہوا تو ورثاء میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ویسے غریب مرتا ہے تو وہاں تو جھگڑے کا سوال ہی نہیں ہوتا، اس لئے کہ اللہ کا احسان ہے اس نے جھگڑے کی چیز چھوڑی ہی نہیں ہے، لیکن جب مالدار کا انتقال ہوتا ہے تو وہ مال و دولت چھوڑ کر جاتا ہے، وہ جھگڑے کی چیز چھوڑ کر گیا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وارثوں میں آپس میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اور تعلقات بگڑتے ہیں اور معلوم نہیں پھر اس کا نتیجہ کہاں کہاں تک پہنچتا ہے، اس لئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔اور آپس کے تعلقات کو ٹھیک رکھو، اس کے بگڑنے کو نوبت نہ آئے۔

مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں

ایک اور آیت ذکر کی جو سورۂ حجرات کی ہے ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ مؤمنین آپس میں بھائی بھائی ہیں، اس لئے اگر دو مؤمنوں کے درمیان جھگڑا ہے یا زیادہ آدمیوں کے درمیان کوئی جھگڑا ہے، تو تمام اہلِ ایمان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان کا وہ جھگڑا ختم ہو جائے۔﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤ، چاہے وہ سامنے چل کر آپ کو کہنے آویں یا نہ آویں، آپ کو اگر اس بات کا یقین ہے کہ آپ کے بیچ میں پڑنے سے، اور آپ کی کوشش سے ان کا جھگڑا ختم ہوسکتا ہے؛ تو یہ

سوچ کر کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص طور پر اس کا حکم دیا ہے، آپ کو اپنے طور پر کوشش کرنی چاہیے، اللہ کے اس حکم کو بجالانے ہی کی نیت سے آدمی کوشش کرے، اگر کامیابی مل گئی تو اجرو ثواب بھی ہوگا اور ساتھ ہی ساتھ جھگڑا بھی ختم ہوجائے گا، دونوں طرح فائدہ ہوگا۔ اور اگر کامیابی نہیں بھی ہوئی تب بھی اجروثواب سے خالی نہیں ہے۔

بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم دوسروں کے جھگڑے میں کاہے کو پڑیں۔ یہ پڑنے کا سوال نہیں ہے، بلکہ نیک نیتی کے ساتھ ان کے تعلقات درست کرنے کے لئے جو کوشش ہوسکتی ہے، وہ ہر مؤمن کو انجام دینی چاہیے، اس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کرنی چاہیے خود نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ بھی یہ تھی کہ آپ کو اگر معلوم ہوجاتا کہ کہیں دو آدمیوں کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں تو آپ اس کو درست کرنے کے لئے کوشش کرتے۔ حضور ﷺ سے بڑھ کر اور کون باعزت ہوسکتا ہے؟ آپ سے اونچا مقام اور کس کا ہے؟ آپ یوں نہیں سوچتے تھے کہ وہ لوگ میرے پاس آئیں گے تو میں سمجھاؤں گا، بلکہ آپ خود تشریف لے جاتے تھے اور ان کے تعلقات کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

انصاف کے ساتھ صلح کرانا صدقہ ہے

۲۴۸۔ عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: كُلُّ سُلامٰی مِنَ النَّاسِ عَلَيْهِ صَدَقَةٌ كُلَّ يَوْمٍ تَطْلُعُ فِيهِ الشَّمْسُ، تَعْدِلُ بَيْنَ اثْنَيْنِ صَدَقَةٌ، وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَآبَّتِهٖ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا، أَوْتَرْفَعُ لَهُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ، وَالْكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ، وَبِكُلِّ خَطْوَةٍ تَمْشِيْهَا اِلَى الصَّلٰوةِ صَدَقَةٌ، وَتُمِيْطُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ صَدَقَةٌ. (متفق علیہ)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر دن

جب سورج طلوع ہوتا ہے اور آپ زندہ سلامت موجود ہیں، اس وجہ سے انسان کے اوپر اپنے ہر جوڑ کی سلامتی کے بدلہ میں شکرانے کے طور پر صدقہ واجب ہے۔

﴿سُلامیٰ﴾ اصل تو انگلیوں کے پوروں کو کہتے ہیں، ویسے ہر جوڑ کا موڑ والا جو حصہ ہوتا ہے؛ یہاں وہی مراد ہے۔ گویا ہر جوڑ کی سلامتی پر شکرادا کرنا واجب ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ انسان کے بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، جب آدمی صبح کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کو زندگی کا ایک نیا دن سلامتی کے ساتھ عطا فرمایا، اس کے شکرانے میں ہر جوڑ پر ایک صدقہ واجب ہے۔ اور اگر کوئی آدمی چاشت کی دو رکعت نماز پڑھ لے؛ تو سب شکرانے کی طرف سے کافی ہو جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون ہے جو دن بھر میں تین سو ساٹھ صدقہ کرے؟ یہ تو بڑا مشکل کام ہو گیا۔ تو نبی کریم ﷺ نے صدقہ کے مفہوم کو بہت عام کر دیا، ہر نیکی کے کام کو حضور ﷺ نے صدقہ میں داخل فرما دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ﴿تَعدِلُ بَینَ اِثنَینِ صَدَقَةٌ﴾ آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے ﴿تُصلِحُ بَینَهُمَا بِالعَدلِ﴾ دو آدمیوں کے درمیان جھگڑا ہے، تو انصاف کے ساتھ آپ ان کے درمیان میں صلح کرا دیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ صلح کے موقعہ پر انصاف کے تقاضے بھی چھوٹنے نہیں چاہئیں، کسی کا حق ختم ہو جائے ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی آپ دونوں فریق کو راضی کر کے، ترغیب دے کر آمادہ کیجیے، اور اس طرح اپنا مطالبہ چھوڑنے پر راضی کر کے صلح ضرور کرائیے، لیکن جب فیصلہ آپ کے حوالے کیا گیا ہو، تو پھر کسی کا حق مارنے کی اجازت نہیں ہے۔ انصاف کے ساتھ دونوں کے درمیان میں صلح کرائیں یا دونوں کا جھگڑا ختم کرائیں؛ تو پھر یہ صدقہ کے حکم

میں ہے۔بس! یہاں تو اسی لئے لائے کہ نبی کریم ﷺ نے جھگڑا ختم کرانے کو بھی صدقہ کے حکم میں شمار کیا ہے۔

﴿کسی کو سہارا دینا بھی صدقہ ہے﴾

﴿وَتُعِيْنُ الرَّجُلَ فِيْ دَآبَّتِهٖ فَتَحْمِلُهُ عَلَيْهَا، أَوْتَرْفَعُ لَهُ عَلَيْهَا مَتَاعَهُ صَدَقَةٌ﴾ آدمی کی اس کے جانور اور سواری کے سلسلہ میں مدد کرنا۔اس زمانہ میں عام طور پر سواری کے لئے اونٹ یا گھوڑا استعمال کیا جاتا تھا۔اگر جوان آدمی مشاق اور تجربہ کار ہے تو گھوڑا ہو یا اونٹ ہو، آسانی کے ساتھ اس پر سوار ہو سکتا ہے۔لیکن اگر تجربہ کار اور مشاق نہیں ہے یا کمزور اور بوڑھا ہے تو وہ خود آسانی سے سوار نہیں ہو سکتا بلکہ اس کو سوار کرانے کے لئے سہارا دینا پڑتا ہے، اور اس کی اس زمانہ میں بہت کثرت سے نوبت آتی تھی، اس لئے کہ کوئی بوڑھا سواری لے کر چلا ہو اور کہیں اترنے کی ضرورت پیش آئی یا کہیں چڑھنے کی نوبت آئی تو وہ راستہ چلنے والوں سے درخواست کرتا تھا یا لوگ ہی دیکھ کر مدد کے لئے آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔اس پر نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کسی کو اس کی سواری کے جانور پر آپ سوار کرا دیں؛ یہ بھی صدقہ ہے، یعنی اس میں بھی آپ کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔حالانکہ کوئی بڑا کارنامہ انجام نہیں دیا، ذرا سا ہاتھ لگا دیا اور سہارا دے دیا، لیکن اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔

یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سواری پر ہے، اور اس کا سامان نیچے گر گیا تو آپ نے اُٹھا کر اس کو دے دیا تا کہ اس کو اترنا نہ پڑے۔یا کوئی آدمی اپنے سر پر یا پیٹھ پر سامان لے کر جا رہا ہے یا لے جانا چاہتا ہے اور اس کو سر پر چڑھانے کے لئے دوسرے شخص کی ضرورت پڑی جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مرتبہ گھاس کاٹنے والے گھاس کاٹ کر گٹھڑ باندھ کر

بیٹھے ہوتے ہیں کہ کوئی آئے اور سر پر چڑھادے تو ہم آگے چلیں، اب آپ گذر رہے ہیں، اوراس نے آپ سے درخواست کی یا درخواست نہیں کی لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ آدمی انتظار میں ہے یا خواہش مند ہے؛ تو آپ بغیر اس کے کہے ہوئے بھی آگے بڑھ کر اس سے کہیں کہ لاؤ ذرا اس کو تمہارے سر پر چڑھا دیتا ہوں، پیٹھ پر لاد دیتا ہوں، اس طرح اگر آپ ذرا سا ہاتھ لگا دیں گے؛ اس پر بھی صدقہ کا ثواب ملے گا۔ کتنے چھوٹے چھوٹے نیکی کے کام ہیں جن کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، اس کی بھی نبی کریم ﷺ کی طرف سے تاکید کی جارہی ہے

﴿مختلف کام جو صدقہ کا ثواب دلاتے ہیں﴾

﴿وَالْکَلِمَۃُ الطَّیِّبَۃُ صَدَقَۃٌ﴾ کسی کو آپ بھلی بات کہہ دیں تو یہ بھی صدقہ ہے۔

﴿وَبِکُلِّ خَطْوَۃٍ تَمْشِیْهَا اِلَی الصَّلٰوۃِ صَدَقَۃٌ﴾ اور ہر قدم جو آپ نماز کے واسطے مسجد کی طرف چل کے جاویں یعنی آپ گھر سے مسجد آنے کے لئے چلے تو آپ کو ہر قدم پر صدقہ کا ثواب ملے گا۔

﴿وَتُمِیْطُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ صَدَقَۃٌ﴾ اور راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا بھی صدقہ کا حکم رکھتا ہے۔ ویسے راستہ سے تکلیف دہ چیز کو دور کرنے پر جہاں صدقہ کا ثواب ملتا ہے وہاں اس کی بڑی اہمیت بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا ﴿اَلْاِیْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَۃً، أَعْلَاهَا کَلِمَۃُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَأَدْنَاهَا اِمَاطَۃُ الْأَذٰی عَنِ الطَّرِیْقِ وَالْحَیَآءُ شُعْبَۃٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ﴾ ایمان کی ستر سے کچھ زیادہ شاخیں ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ ساٹھ سے کچھ اوپر شعبہ ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ شاخ اور اعلیٰ قسم کلمۂ طیبہ ''لا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ'' ہے اور سب سے ادنیٰ شاخ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرنا ہے۔

راستہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی مختلف صورتیں

ویسے ہی نادانستہ طور پر کوئی چیز گرگئی ہو، یا کسی نے جان بوجھ کر ڈال دی ہو اور آپ ہٹا دیں؛ تو اس کو ایمان کی ایک شاخ قرار دیا گیا ہے۔لیکن اگر ہم ہی لوگوں کی تکلیف کا باعث بن جائیں، جیسے راستہ میں سکوٹر کھڑا کر دیا، موٹر سائیکل کھڑی کر دی، جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کا راستہ رُکا ہوا ہے، راستہ میں سائیکل لے کر کھڑے ہوگئے اور پیچھے سے ٹرافک رُکی ہوئی ہے اور آپ اطمینان سے باتیں کر رہے ہیں اور کوئی پرواہ نہیں کر رہے ہیں؛ یہ بھی تکلیف پہنچانا ہے جو گناہ کا کام ہے۔

یا مثلاً محلّہ میں کھیل رہے ہیں اور آنے جانے والے خطرہ محسوس کرتے ہیں، اور کبھی بچوں کو کہا جاتا ہے کہ ذرا ہٹ جاؤ، تو داداگیری سے جواب دیں گے کہ یہاں سے چلے جاؤ، راستہ تو کھلا ہوا ہے۔ارے ہاں! راستہ کھلا ہوا ہے لیکن چونکہ تو گیند ڈال رہا ہے اس لئے جانے والا خطرہ محسوس کرتا ہے کہ کہیں مجھے لگ نہ جائے، اس کی وجہ سے بیچارہ ڈرا سہما ہوا ہے

آپ پہلے روایت سن چکے ہیں کہ مسلمانوں کے مجمع میں سے کھلے ہوئے تیر ہاتھ میں رکھ کر گذرنے کی بھی نبی کریم ﷺ نے اجازت نہیں دی۔ وہ اسی لئے تاکہ اس طرح کھلے ہوئے تیر لے کر گذرے گا تو اگرچہ کسی کو مار نہیں رہا ہے، لیکن اس کو کھلا ہوا دیکھ کر مجمع کی بھیڑ کی وجہ سے شاید کسی کو خطرہ محسوس ہو کہ کہیں مجھے لگ نہ جائے؛ تو اس پر بھی نبی کریم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔اور ایک آدمی کو تو سختی سے منع کیا اور ٹوکا۔تو پھر دانستہ طور پر اس طرح کرنے کی کیسے اجازت ہوگی۔

﴿اپنا کام دوسرا کردے؛ تو اس کا شکریہ ادا کرو﴾

یا مثلاً کسی کے سونے کا وقت ہے، دو پہر کے دو بجے ہیں جو عام طور پر قیلولہ کا وقت ہوتا ہے، رات کے گیارہ بجے ہیں جو سونے کا ہی وقت ہے، اس موقعہ پر کھیل رہے ہیں، بچے تو بچے ہی ہیں، اب تو بڑوں نے بھی کھیلنا شروع کر دیا ہے۔ اور اگر بچوں کو تنبیہ کرتے ہیں تو بڑے لوگ ان کی حمایت کرنے سامنے آ جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کو تو شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا کہ اگر چہ میں تو اس قابل نہیں رہا کہ اپنے بچے کو تنبیہ کرسکوں، اور اس کی اصلاح کی مجھ میں تو طاقت رہی نہیں تھی، لیکن آپ کی بڑی مہربانی ہوئی کہ آپ نے اس کو کہہ دیا، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ اس کو تو ایسا کہنا چاہیے۔

اس لئے کہ ذمہ داری تو ان کی اپنی تھی ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ نَارًا﴾ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو، اپنے ماتحتوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، برائی کے کاموں سے روکو۔ اور حدیثِ پاک میں ہے ﴿كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ﴾ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر ایک کو اپنے ماتحت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ ہماری اولاد جو ہماری ماتحت ہیں ان کی طرف سے کسی کو تکلیف پہنچ رہی ہے تو ہماری اخلاقی ذمہ داری کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہم خود ان کو متنبہ کریں یعنی ہم مقدور بھر ایسی کوشش کریں کہ وہ دوسروں کو تکلیف نہ پہنچائے۔ ہماری پوری کوشش کے بعد بھی وہ نہ مانے؛ تو بات دوسری ہے۔

لیکن یہاں تو حال یہ ہے کہ خود تو کہنے سے رہے، خود میں تو اتنی طاقت اور ہمت رہی نہیں، بلکہ اب تو باپ بیٹے سے ڈرتا ہے جیسے میاں صاحب بیوی سے ڈرتے ہیں، یہ عام ہو گیا ہے۔ اب تو اگر باپ سے کہو کہ اپنے بیٹے کو تنبیہ کرو تو وہ تیار نہیں ہوتا، جیسے استاذ بھی

شاگردوں سے ڈر رہے ہیں کہ تنبیہ کردی تو کہیں ہماری پٹائی نہ ہو جائے۔ ایک دو روز پہلے اخبار میں دیکھا کہ اسکول کے استاذ نے ایک بچہ کو کسی اخلاقی بات پر تنبیہ کی، شام کو جب وہ جارہے تھے تو جس کو تنبیہ کی گئی تھی اس نے ماسٹر صاحب کی پٹائی کردی۔ ایسا زمانہ آہی گیا ہے، اس لئے اگر وہ ڈرتا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

زمانہ میں کیسا تغیر آ گیا ہے؟

بہرحال! آپ ڈرتے ہیں اور آپ کہنے کی طاقت نہیں رکھتے تو کم سے کم اللہ کے جو بندے باہمت ہیں اور کہہ رہے ہیں، آپ ان کو کیوں روک رہے ہیں۔ آپ کو تو چپکے سے ان کی خدمت میں مٹھائی بھیجنی چاہیے کہ آپ کا شکریہ اور مہربانی ہوئی کہ آپ نے اس کو تنبیہ کی اور آپ آئندہ بھی اس کو تنبیہ کرتے رہیے، اور مناسب طریقہ سے اس کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیے، مَیں آپ کا ممنون ہوؤں گا، آپ کا احسان ہوگا اور دعائیں بھی دیتا رہوں گا اور ہدیے بھی دیتا رہوں گا۔

آپ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے آپ بچے کی حمایت میں لڑائی کے واسطے کھل کر میدان میں نکل آتے ہیں کہ ہمارے بچے کو کیوں کہا۔ وہ سامنے والا کہتا ہے کہ آپ کے بچے کو ہم نے مارا پیٹا نہیں ہے، صرف اتنا ہی کہا ہے کہ ابھی مت کھیلو۔ تو کہتے ہیں کہ کیا محلّہ تمہارے اکیلے کا ہے؟ محلے میں ہمارا بھی حق ہے، ہمارا بچہ کھیلے گا۔ پھر بچے سے کہتے ہیں کہ بیٹا برابر کھیلو اور بارہ بجے تک کھیلو۔ دیکھئے! زمانہ میں کیا تغیر آ گیا ہے کہ نہ تو خود کچھ کہنے کے لئے تیار ہیں اور جب دوسرے اصلاح کے لئے کوشش کرتے ہیں تو اس کو برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ اب آپ ہی اندازہ لگایئے کہ جب ہمارے

معاشرے اور سماج کا یہی حال ہوگا تو پھر تربیت کیسے ہوگی؟ اور آگے سماج دن بدن انحطاط پذیر ہوکر ایسی حالت پر پہنچ جائے گا کہ پھر وہ اصلاح کے قابل ہی نہیں رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اصلاح کے لئے دوسری شکلیں پیدا کریں گے تو وہ برداشت نہیں ہوگی۔

معاشقہ والے نکاح کا آپریشن

جیسے آج کل معاشقہ کے قصوں میں ہو رہا ہے جو ہم سب دیکھتے اور سب سنتے رہتے ہیں۔ کہ شروع میں نہ باپ روکتا ہے، نہ ماں روکتی ہے، نہ دوسرے روکتے ہیں، اور جب اندر کی بات اندر نہیں رہی اور باہر والوں کے ساتھ معاملہ پیش آیا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو جو مسلط کیا تو اب پوری قوم بھگتتی ہے۔

دیکھو! ایک بات یاد رہے، کوئی لڑکی اپنے طور پر اسلام کی حقانیت اور اسلام کی خوبیوں سے متأثر ہوکر اسلام لائی اور اس کے بعد اس کے ساتھ کسی نے نکاح کا معاملہ کرلیا، تو یہ دوسری چیز ہے۔ لیکن یہاں تو پہلے معاشقہ ہوا اور اب لڑکی دیکھ رہی ہے اور لڑکا بھی دیکھ رہا ہے کہ میں اس کو اپنے ساتھ رکھوں اس کے لئے میرے گھر والے یا میرا سماج اور برادری تیار نہیں ہے جب تک کہ یہ اسلام نہیں لائے گی، تو اب وہ دونوں محض اپنا کام نکالنے کے لئے یہ طے کرتے ہیں کہ اچھا! تو کلمہ پڑھ لے۔

چلئے! اس نے کلمہ پڑھ لیا تو ہم انکار نہیں کرتے، ہم اس کے اندر کی نیت پر شبہ نہیں کرتے، لیکن آپ کو تو اپنے کے سماج کی بچیوں کے متعلق بھی یہ تاکید کی گئی تھی کہ اگر آپ شادی کے لئے خواہش رکھتے ہیں تو ایسی بچی تلاش کیجیے جس کے اندر دین داری ہو، اور پیدائشی دین دار گھرانے کی بچی ہونا بھی کافی نہیں تھا، اس لئے کہ اسلامی گھرانوں میں پیدا

ہوکر بھی وہ بے دین ہوسکتی ہیں، لہٰذا اگر اس میں بے دینی ہے تو ایسی بچیوں کو بھی نکاح کے لئے اختیار کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی، بلکہ یوں کہا کہ ان میں بھی دین داری کو دیکھنا چاہیے۔ تو پھر آج جس نے صرف زبان سے کلمہ پڑھ لیا ہے اور اس کو کسی چیز سے کوئی واسطہ نہیں ہے، اور نہ آپ کو واسطہ ہے (جو کلمہ پڑھا رہے ہیں ان سے کہہ رہا ہوں، آپ لوگ بُرا نہ مانیں) اب ایسی عورت سے آپ نکاح کریں گے اور اس کے نتیجہ میں جو اولاد پیدا ہوگی؛ ان کی تربیت کون کرے گا؟

ہمارے سامنے ایسے بے شمار واقعات آئے کہ نکاح کے بعد بھی وہ عورت اپنے گھر میں باقاعدہ ہندوانہ طرز پر ہی رہتی ہے۔ اس لئے کہ اب تو اس کا گھر وہی ہوگیا جو اس کے شوہر کا ہے۔ اسی گھر میں طاقچہ میں مورتی اور فوٹو رکھ کر اس کی پوجا کر رہی ہے اور شوہر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، لیکن ایک مرتبہ سماج کو بتلا دیا کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا ہے، اس لئے اب اس کو کوئی فکر نہیں ہے، اس لئے کہ اب سماج میں بھی کوئی کہنے والا نہیں ہے، نہ اس کو کوئی تنبیہ کرنے کے واسطے آئے گا کہ تم نے غیر مسلم کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ اور اگر کوئی کہے گا تو یہ جواب میں کہے گا کہ اس نے کلمہ پڑھ لیا ہے، فلاں صاحب کو پوچھو، فلاں تاریخ کو فلاں مولوی صاحب کے سامنے اسلام قبول کیا تھا، اور یہ سرٹیفکٹ بھی موجود ہے۔ لیکن اس کو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسے سرٹیفکٹ پیش کرنے سے اس کی زندگی تو سدھرنے والی نہیں ہے۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان چیزوں کی طرف توجہ کی جائے۔ آج کل اس بارے میں بہت غفلت برتی جارہی ہے۔

صحیح تربیت نہ ہونے کا اثر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں با قاعدہ ایک حکم جاری کیا تھا۔قرآن نے اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ (یعنی یہوداور نصاریٰ جو اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے سچے یہودی اور نصرانی ہیں) نکاح کرنے کی اجازت دی ہے، یعنی حلال قرار دیا ہے۔لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِخلافت میں باقاعدہ سرکاری فرمان جاری کیا تھا کہ ایسی عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کیا جائے، اس لئے کہ اس کا اثر بچوں پر پڑے گا، اور یہ ان کی تربیت کا معاملہ ہے۔ (احکام القرآن للجصاص الرازی۔۲/۳۲۴)

بلکہ میں تو یوں کہتا ہوں کہ اس کا اثر صرف آپ کے بچوں پر ہی نہیں بلکہ آپ کے پورے گھرانے پر پڑے گا۔اس سے صرف آپ کے آنے والے بچے ہی نہیں، بلکہ آپ کی گھر کی عورتیں اور آپ کا خاندان اور آپ کا سماج پورا متأثر ہوگا۔ہمارے سماج میں شادی کے اور موت میت کے اور دوسرے مواقع کے ہندوانہ رسم و رواج جو چلے آرہے ہیں اور ہمارے یہاں ہورہے ہیں، یہ سب دراصل اسی کا ثمرہ اور نتیجہ ہے کہ جو لوگ وہاں سے آئے تھے، ان کی صحیح تربیت نہیں ہوئی تھی، اسلام کا کلمہ پڑھنے کے بعد بھی اسی ڈگر اور اسی راستہ پر چلتے رہے، تو آج ان کے طریقوں کو بھی دین کی شکل دے دی گئی، اور پھر آج کوئی کہتا بھی ہے تو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی چیزوں کی طرف ہمیں خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

پردے کا مسئلہ کتنا اہم ہے

تو بات اس پر چل رہی تھی کہ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو ہٹانا چاہیے، اس کو

بھی صدقہ شمار کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ابھی دو تین ہفتے پہلے ہی ہمارے سننے والوں میں سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ محلے میں آدھی رات کو کرکٹ کھیلتے ہیں اور گیند ہمارے گھر کی کھڑکی پر لگتی ہے، کھڑکی کے شیشے بھی ٹوٹتے ہیں اور اگر گیند گھر میں آجائے تو بڑے دھڑلے سے بغیر پوچھے ہوئے گھر میں گھس جاتے ہیں، اور اگر کوئی روکتا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہماری گیند اندر آگئی ہے، وہ لینے آئیں ہیں۔ گویا یوں سمجھتے ہیں کہ اس کے لئے اجازت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

پردے کا مسئلہ کتنا اہم ہے، یہ بھی ذرا دیکھئے۔ فقہ کی کتابوں میں ایک مسئلہ لکھا ہے کہ ایک آدمی کے پڑوس میں دوسرے کا مکان ہے اور اس کا شہتوت کا درخت ہے، اب اگر وہ اس درخت پر شہتوت کے پھل توڑنے کے لئے چڑھتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اوپر چڑھنے سے پہلے پڑوس میں اطلاع کرے اور خبر بھیجے کہ ہم شہتوت کے درخت پر پھل توڑنے کے لئے چڑھ رہے ہیں، آپ کے گھر والوں سے پردہ کرالیجیو، تاکہ کہیں نادانستہ طور پر اور بے خبری میں بے پردگی نہ ہو جائے۔

یہ آدمی اپنے گھر میں، اپنے باڑے میں، اپنے درخت پر چڑھ رہا ہے لیکن چونکہ اس کے چڑھنے کی وجہ سے پڑوس میں بے پردگی ہو سکتی ہے، اس لئے اطلاع دینا ضروری ہے۔ اگر وہ بغیر اطلاع کے چڑھے تو پڑوسی اس کو متنبہ کرے گا۔ ابھی یہ مسئلہ ہی چل رہا ہے، میں مسئلہ کو تفصیل کے ساتھ بتلا رہا ہوں کہ بغیر اطلاع کے چڑھ گیا اور بے پردگی ہوئی تو ایک مرتبہ پڑوسی اس کو وارننگ دے گا کہ آپ غلط کر رہے ہیں، آئندہ اگر آپ کو اپنے درخت کے پھل توڑنے کے لئے چڑھنا پڑے تو پہلے سے اطلاع دیجیو تاکہ ہمارے گھر میں بے پردگی نہ ہو،

اگر دوسری مرتبہ بھی وہ نہیں مانتا تو پڑوسی کو حق ہے کہ حاکم کے سامنے یہ بات پیش کرے اور حاکم اس کا درخت کاٹ دے، کہ نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری۔ جھگڑا ہی نہیں چاہیے۔ فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے، اور بھی بہت سارے مسئلے ہیں۔

غور کیجئے! یہاں اپنے گھر میں اپنے درخت پر اپنے کام سے چڑھ رہا ہے، کسی دوسرے کے گھر میں داخل بھی نہیں ہوا، پھر بھی یہ احتیاط کروائی جارہی ہے، لیکن ہمارے یہاں بچے جو معاملہ کرتے ہیں ان کے بارے میں ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کھیل کی اجازت کب ہے؟

اور پھر کھیلنے والے ایسا شور مچاتے ہیں کہ اللہ کی پناہ! صرف یہی محلّہ ہی نہیں جس میں کھیل رہے ہیں، اس لئے کہ یہاں کے رہنے والے تو بے چارے تنگ ہیں ہی، دوسرے محلے والے بھی پریشان ہوتے ہیں۔ اور مَیں پہلے بھی یہ عرض کرچکا ہوں کہ اسلام تو سونے کے اوقات میں زور سے اس طرح ذکر کرنے کی اور قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتا جس سے کسی دوسرے کی نیند خراب ہوتی ہو۔ اور یہ بھی بتلا چکا ہوں کہ خود نبی کریم ﷺ رات کو جب گھر میں تشریف لاتے تھے، تو ایسی آواز سے سلام کرتے تھے کہ اگر کوئی سویا ہوا ہو تو اس کی نیند خراب نہ ہو، اور جو بیدار ہو وہ سن لے۔ یہ طریقہ نبی کریم ﷺ نے بتلایا ہے۔ اسلام نے تو یہ تعلیم دی ہے اور لوگوں کو تکلیفوں سے بچانے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ اور اب جو طریقے اختیار کئے جاتے ہیں ان کا اسلام سے کہاں میل کھاتا ہے؟ اور پہلی بات تو یہ ہے کہ رات کا وقت یہ کون سا کھیل کا وقت ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اب تو یہ کھیل کھیل رہا ہی نہیں ہے، مقصدِ زندگی بن گیا ہے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ اسلام نے تو

صرف انہیں کھیلوں کی اجازت دی ہے جس میں ورزش کا پہلو موجود ہو،اور وہ کھیل بھی اپنے حدود میں رہ کر ہوں؛ تب تک ہی اجازت ہے۔

عمدہ مثالیں

بھائی! زندگی کی حفاظت کے لئے کھانا کھانا اچھی چیز ہے،اس سے کون انکار کرسکتا ہے، لیکن آپ صبح بھی کھارہے ہیں، آٹھ بجے بھی کھارہے ہیں، نو بجے بھی کھارہے ہیں، دس بجے بھی کھارہے ہیں، بارہ بجے بھی کھارہے ہیں، چار بجے بھی کھارہے ہیں، رات کو بھی کھارہے ہیں، آدھی رات کو بھی کھارہے ہیں؛ تو نتیجہ کیا ہوگا؟ موت آئے گی۔تو کیسی ہی اچھے سے اچھی چیز ہو،اس کے لئے بھی اوقات رکھے گئے ہیں۔

نماز سے اچھی چیز اور کون سی ہوسکتی ہے؟ لیکن اسلام نے تین اوقات ایسے بتلائے ہیں کہ ان میں نماز پڑھی ہی نہیں جاسکتی۔ پہلا جب سورج طلوع ہورہا ہو، دوسرا جب سورج بالکل سر پر ہو اور تیسرا جب سورج غروب ہورہا ہو؛ ان تینوں اوقات میں فرض اور نفل کسی بھی طرح کی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔اور دو وقت ایسے ہیں کہ ان میں نفل پڑھنے کی اجازت نہیں ہے، فجر کے بعد اور عصر کے بعد۔آخر یہ مسئلے کاہے کو رکھے ہیں؟ علماء نے لکھا ہے کہ ان مسائل اور ان تعلیمات کے ذریعہ یہی بتلایا جاتا ہے کہ مؤمن کی شان تو یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کو عبادت سمجھے۔نماز اپنی ذات کے اعتبار سے عبادت نہیں ہے بلکہ اللہ اور رسول کے فرمان کو پورا کررہے ہیں اس لئے عبادت ہے۔اگر بے وقت پڑھ رہے ہیں تو پھر یہ نماز بھی عبادت نہیں ہے،اس پر ثواب نہیں ملے گا بلکہ گناہ ہوگا۔

روزہ عبادت ہے لیکن عید کے دن روزہ رکھنا حرام ہے،اس دن اگر کوئی روزہ رکھے

گا تو گنہ گار ہوگا۔تو عبادت کے کاموں کے لئے بھی شریعت نے ایسے اوقات بتلائے کہ ان میں نہیں کئے جاسکتے ہیں۔اور ہمارا کھیل ماشاء اللہ ایسا ہے کہ کسی بھی وقت کھیل لو، چار بجے کھیل لو، رات کے وقت کھیل لو؛ ہم اس میں کوئی حرج ہی نہیں سمجھتے۔

﴿ایسے لوگوں سے بھی کبھی کبھی راحت پہنچ جاتی ہے﴾

اسی سال رمضان کے بعد لکھنؤ وغیرہ کا سفر ہوا تھا۔تو ہمارے ساتھیوں کو معالجہ کے لئے بریلی کے حکیم صاحب کو دکھلانا تھا۔میں نے کہا کہ میں تو مرادآباد کا ٹکٹ لے کر مرادآباد اُتر جاتا ہوں، آپ لوگ بریلی سے نمٹ کر فلاں ٹرین میں دہلی کے لئے سوار ہو جانا، جب بریلی سے ٹرین چلتی ہے تو دہلی جانے والی ٹرین مرادآباد ہو کر ہی گذرتی ہے، مَیں مرادآباد سے بیٹھ جاؤں گا، میری نیت یہ تھی کہ مرادآباد میں حضرت مولانا رشید الدین صاحب دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ) اور دوسرے حضرات سے ملاقات ہو جائے گی اور میرا بریلی میں کوئی کام بھی نہیں تھا۔ میں نے ان ساتھیوں کو حکیم صاحب کا پتہ بتلا دیا تھا۔اب اتفاق کی بات کہ وہ ٹرین مرادآباد رات میں تین بجے پہنچتی تھی، رات میں تین بجے رکشہ لے کر مدرسہ پہنچا تو میرے لئے یہ آسانی ہوگئی کہ وہاں رات کے تین بجے مسلمان بچے کرکٹ کھیل رہے تھے، انہوں نے ہی دروازہ ٹھوک کر مدرسہ کا دروازہ کھلوایا اور میں آسانی سے پہنچ گیا۔اس پر میں نے کہا کہ چلئے! ایسے لوگوں سے بھی کبھی کبھی راحت پہنچ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ان کی ان ہی خدمات کو قبول کرلے، اور نجات کا ذریعہ بنادے۔اللہ تعالیٰ کسی کو بھی نیکی کی توفیق دے دے اور قبول فرمالے؛ لیکن یہ چیزیں بہت ڈرنے کی ہیں۔

اُلٹی گنگا

ہمارے سماج میں یہ طریقے چل رہے ہیں جو بڑے خطرناک ہیں،شریعت ان کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔اور یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے بڑے موجود ہوتے ہیں،اگر بڑے ان چھوٹوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں،تو مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ خود چاہے اصلاح نہ کرسکتے ہوں تب بھی اللہ تعالیٰ دوسرے ایسے بندے ضرور پیدا کردیتا ہے جوان کی اصلاح کریں اوران کو تنبیہ بھی کریں۔لیکن ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ نہ تو خود اصلاح اور تنبیہ کرتے ہیں،نہ دوسروں کو اصلاح کا موقعہ دیتے ہیں اور نہ تنبیہ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، بلکہ اُلٹا ان کی حمایت کرتے ہیں؛ یہ تو غلط حمایت ہوگئی جس کو عصبیت کہتے ہیں اوراسلام میں عصبیت پر بڑی بڑی وعیدیں آئی ہیں۔

عصبیت کا مطلب کیا ہے؟ فلاں میری پارٹی کا ہے،فلاں میرے خاندان کا ہے، فلاں میرا بھائی ہے۔چاہے ناحق ہی ہولیکن میرا بھائی ہے اس لئے مَیں اس کا ساتھ دوں گا۔ اگرکسی کا ساتھ آپ اس کے حق ہونے پر دیں تو اسلام اس کی تاکید کرتا ہے۔اسلام میں رشتہ داری اصل نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم اصل ہے،اسلام تو حق اور باطل کو دیکھتا ہے،لیکن ہمارے یہاں یہ نظریہ ہوگیا کہ وہ کتنا ہی غلط ہو،لیکن ہمارا بھائی ہے، ہمارے خاندان کا آدمی ہے،ہماری برادری کا ہے، ہمارے محلے کا ہے، ہماری بستی کا ہے؛اس لئے ہم اس کا ساتھ دیں گے۔

عصبیت کو ابھارنے کا شیطان کا عجیب انداز

جیسی جگہ ہوتی ہے ویسی عصبیت بڑھتی ہے۔ہم لوگ جب دیو بند میں پڑھتے تھے

تو گجراتی سب ایک کہلاویں، اس لئے کہ وہ دوسرے صوبے میں ہیں؛ تو یہاں صوبائیت والی عصبیت آئی۔ وہاں کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ کہاں کا ہے، احمد آباد کا ہے، سورت کا ہے، بھروچ کا ہے، بلکہ وہاں گجراتی سب ایک ہیں اس لئے مل جل کر برابر اچھی طرح رہتے ہیں۔ اور وہی لوگ جب گجرات میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ سورتی، یہ بھروچی، یہ احمد آبادی ہے، اب یہاں سورتی سب ایک ہیں۔ اور پھر جب وہی لوگ اپنے یہاں آئیں گے تو کہتے ہیں کہ یہ راندیر کا ہے اور یہ سگرام پورہ کا ہے۔ پھر جب محلے میں آئیں گے تو یہ منیار والوں کا ہے اور داداوالوں کا ہے اور یہ چوکسی والوں کا ہے۔ عصبیت کو اُبھارنے کا شیطان نے عجیب انداز پیدا کر رکھا ہے۔ باہر کے ملکوں میں دیکھا کہ مدینہ منورہ میں پڑھ رہے ہیں یا کسی اور جگہ گئے تو وہاں ہندوستانی سب ایک ہیں، چاہے یوپی کا ہو یا گجرات کا ہو۔ اپنے یہاں سے آئے ہوئے لوگوں سے ملاقات کرواتے ہیں کہ ہمارے یہ ساتھی ہندوستان میں فلاں جگہ کے رہنے والے ہیں۔

﴿عصبیت کمزوری کو چھپانے کے لئے آتی ہے﴾

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ عصبیت دراصل اپنی کمزوری کو چھپانے کے واسطے آتی ہے۔ ہوتا کیا ہے؟ جب کسی معاملہ میں دو آدمیوں میں صلاحیت کا مقابلہ ہوتا ہے، جیسے کوئی منصب ہے، یا کوئی چیز ایسی ہے جو صلاحیت کی بنیاد پر کسی کو دینا چاہیے، تو اب دونوں میں سے ایک نے دیکھا کہ مَیں اپنی صلاحیت کی بنیاد پر اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا ہوں، تو پھر وہ عصبیت کو چھیڑتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دیکھو! یہ فلاں محلے کا ہے، فلاں بستی کا ہے، فلاں جگہ کا ہے، یہ یوپی والا ہے، مَیں گجراتی ہوں، اور آپ بھی گجراتی ہیں، لہٰذا مجھے دیدو تو برابر رہے گا۔

یوپی والے کوکاہے کودیتے ہو۔میرے اندر صلاحیت نہیں تھی،تو میں نے اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے یہ بہانہ پیش کیا۔دراصل یہ شیطانی حربے ہیں،حالانکہ اسلام تو صلاحیتوں کو دیکھتا ہے۔

﴿بدبودار نعرہ﴾

مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ اسلام بے جا حمایت کی اجازت نہیں دیتا۔شاید پہلے بھی قصہ آچکا ہے اور مَیں بتلا چکا ہوں۔غزوۂ بنوالمصطلق کے موقعہ پر ایک مرتبہ راستہ میں پانی نہیں تھا،جب بارش ہوئی تو چھوٹے چھوٹے گھڑے سب بھر گئے۔اب جہاں پانی نہیں ہوتا وہاں لوگ گھڑوں پر قبضہ کرلیتے ہیں۔اسی طرح وہاں گھڑوں پر انہوں نے قبضہ کرلیا،کسی نے اس پر اپنا چمڑا ڈال دیا،کسی نے ڈھال ڈال دی۔ایک انصاری نے ایک مہاجری کے روکے ہوئے گھڑے میں جو پانی تھا وہ اپنے جانوروں کو پلانا چاہا،تو انہوں نے روکا،اسی میں دونوں کی ذرا تُو تُو مَیں مَیں ہوئی تو ایک نے دوسرے کو مار دیا،اس نے کہا﴿یَا لَلْمُهَاجِرِیْنَ﴾ اے مہاجرین کی جماعت!مدد کے واسطے آؤ۔دوسرے نے کہا﴿یَا لَلْاَنْصَار﴾ اے انصار کی جماعت!میری مدد کے واسطے آؤ،حضور اکرم ﷺ کے گوشِ مبارک میں یہ آواز پہنچی تو آپ نے فرمایا﴿مَا بَالَ دَعْوَی الْجَاهِلِیَّةِ،اُتْرُکُوْهَا؛فَاِنَّهَا مُنْتِنَةٌ﴾ کیا بات ہے کہ مَیں جاہلیت کی پکار اور جاہلیت کا نعرہ سن رہا ہوں یعنی قبیلے اور خاندان یا بستی کی بنیاد پر کسی کو اپنی مدد کی دعوت دینے کو جاہلیت کا طریقہ بتلایا۔اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس سب کو چھوڑو؛ یہ بدبودار چیزیں ہیں (الروض الانف) حضور ﷺ نے اس کو بدبودار قرار دیا۔آدمی کی روش تو یہ ہونی چاہیے کہ اپنا بھی ہو اور اس نے غلط کیا ہے تو اس کی حمایت نہیں کرنی چاہیے،غلط کی حمایت کرنا اللہ تعالیٰ کے

عذاب کو دعوت دینا ہے۔ اگر آپ روک نہیں سکتے تو کم از کم چپ چاپ تو بیٹھے رہو، لیکن غلط کام میں حمایت کرکے اللہ کی پکڑ کو اپنی طرف متوجہ کیوں کرتے ہو۔

﴿غلط حمایت سے حضور ﷺ کی براءت﴾

حضور اکرم ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو فتح مکہ کے بعد ایک مقام پر لوگوں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے بھیجا تھا، وہ گئے اور ان کو دعوت دی، انہوں نے قبول نہیں کیا، پھر دوبارہ پیش کی تو انہوں نے کہا ﴿صَبَوْنَا، صَبَوْنَا﴾ عربی زبان میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم پھر گئے، ہم اپنے دین کو بدل چکے۔ اصل میں ان کو یوں کہنا چاہیے تھا ﴿أَسْلَمْنَا﴾ ہم اسلام لے آئے۔ لیکن دیہات کے رہنے والے تھے، اپنے اسلام کا اظہار کرنے کے لئے وہ اپنے دل کی بات کو صحیح طریقہ سے پیش نہ کر سکے، اور ''ہم اسلام لائے'' کہنے کے بجائے انہوں نے یوں کہا کہ ''ہم اپنا دین بدل چکے''۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ اسلام کا لفظ ان کو بھاری معلوم ہوتا ہے، اس لئے یہ ''صبونا'' کہہ رہے ہیں کہ ہم پھر گئے، اس لئے انہوں نے ان کے قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ اس کے بعد کچھ قتل کئے گئے، کچھ قید پکڑے گئے اور راستہ میں ان کو بھی حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے قتل کرنا چاہا، لیکن صحابہ نے اس پر عمل نہیں کیا جب حضور ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے باوجود قتل کرا دیا تو حضور ﷺ بہت ناراض ہوئے، اتنے ناراض ہوئے کہ آپ ﷺ نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھالئے ﴿اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَبْرَأُ اِلَیْکَ مِمَّا صَنَعَ خَالِدٌ﴾ اے اللہ! خالد نے جو کچھ کیا ہے اس سے مَیں بری ہوں (بخاری شریف۔ ۷/۱۸۹) چونکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے بھیجے ہوئے تھے، لیکن انہوں نے ایک بے اصولی کی تو اس پر حضور ﷺ ڈر گئے کہ ان کی اس حرکت پر اگر مَیں

نے اس کو سپورٹ (Support) دیا اور اللہ تعالیٰ کا عذاب آ گیا اور تو مَیں بھی کہیں اس کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤں اس لئے آپ نے پہلے ہی اپنی براءت ظاہر فرما دی۔

جیسے سگا بیٹا بھی اگر قانون کے خلاف غلط بات کر دے اور باپ کو ڈر ہے کہ حکومت کی جاسوسی ایسی سخت ہے بس مت پوچھو۔ تو بیٹے کی حمایت کی وجہ سے کل باپ کو بھی ہتھکڑی ڈال کر لے جائیں گے، تو باپ کہتا ہے کہ سب سن لو، میرے بیٹے نے جو کیا ہے، مَیں اس سے بری ہوں۔ یہ اس لئے کہہ رہا ہے کہ جانتا ہے کہ ذرا بھی پتہ چلا کہ باپ نے بھی بیٹے کا ساتھ دیا ہے تو باپ کو بھی ہتھکڑی لگ جائے گی، بیٹے کا تو جو ہونا ہے؛ وہ ہو گا اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی ذات کا معاملہ ہے۔

جانبین کے لئے معتدل رہنمائی

اس لئے اگر ہمارے کسی عزیز نے غلط حرکت کی ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہی اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے، اور اصلاح کے لئے مار پٹائی ضروری نہیں ہے، بلکہ پیار ومحبت سے اس کو سمجھایئے۔ لیکن اگر اللہ کے کسی بندے نے تنبیہ کی ہو، تو اس کے ساتھ بھی لڑنے جانے کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔

ہاں! تنبیہ کرنے والوں سے بھی درخواست ہے کہ وہ بھی تنبیہ کے واسطے اچھا انداز اور محبت والا طریقہ اختیار کریں۔ اور اگر تنبیہ کرنے والے نے نامناسب طریقہ سے تنبیہ کی ہے تو آپ ان کو بچے کے سامنے تو ہرگز کچھ نہ کہیں، البتہ تنہائی میں کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! آپ کی مہربانی ہوئی کہ آپ نے میرے بچے کو ٹوکا، لیکن ذرا مناسب طریقہ سے ٹوک دیتے تو اچھا تھا، اور آئندہ بھی ضرور ٹوکئے گا، مَیں آپ کا شکرگذار رہوں گا، لیکن مناسب طریقہ

اختیار کرنا۔اور اس کو بھی برا نہیں ماننا چاہیے، اس کو احساس ہونا چاہیے کہ ہاں! مَیں نے غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کہنے کہنے والوں کا فرق ہوتا ہے۔ایک ہی بات ایک آدمی کہتا ہے تو لوگ مان لیتے ہیں اور وہی بات دوسرا کہتا ہے تو لوگ نہیں مانتے۔اب آپ ان سے پوچھئے کہ اس کی کیوں نہیں مانی؟ تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے دیکھا نہیں کہ وہ کیسے بولتا ہے۔اس لئے جو لوگ کہنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ وہ اچھا اور مناسب طریقہ اختیار کریں۔شریعت نے اس کے بھی طریقہ بتلائے ہیں۔

اسلام کی اعلیٰ تعلیمات سے ہم کتنے غافل ہیں

بہرحال! بات یہ چل رہی تھی ﴿تُمِیطُ الْأَذىٰ عَنِ الطَّرِیقِ صَدَقَةٌ﴾ ہمارے جن بھائی نے ہم سے مسئلہ پوچھا تھا وہ بھی اس تفصیل میں آ گیا۔راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کرو، یہ بھی صدقہ ہے۔شریعت نے تو لوگوں کو تکلیف سے بچانے کا اتنا خیال کیا ہے کہ ایک آدمی بیمار ہے، اس کو زخم ہو گیا اور اس میں پیپ ہو گیا اور پیپ کی وجہ سے بدبو پھیلتی ہے، اگر وہ مسجد کی جماعت میں حاضری دیتا ہے تو اس بدبو سے نمازیوں کو تکلیف ہوتی ہے، تو حاکم اس کو کہے کہ بھائی! تم اپنے گھر جاؤ اور وہیں نماز پڑھو، تم کو گھر پر جماعت کا ثواب مل جائے گا۔بلکہ ایسے آدمی کے گھر سے باہر آنے کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہو تو حاکم اس کے کھانے پینے کا بھی انتظام کرے گا کہ تم کمانے کی فکر مت کرو، کھانا تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔کھانے کمانے کا انتظام حکومت کی طرف سے کر دیا اور لوگوں کو تکلیف سے بچا لیا۔

بلکہ آپ غور کیجئے کہ حضور ﷺ نے تو کچی پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں اور مجلس میں

آنے کی اجازت نہیں دی کہ منہ کی بدبو سے فرشتوں کو یا مسلمان بھائیوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ ایسی چھوٹی چھوٹی تکلیفوں کو تو آج کل کون دیکھتا ہے؟ ہم تو ان چیزوں کو خاطر میں بھی نہیں لاتے، یعنی کسی کو تصور بھی نہیں آتا کہ یہ بھی تکلیف دہ بات ہے۔ سگریٹ پینے والے کو کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میرے سگریٹ پینے کی وجہ سے میرے منہ کی بدبو سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہوگی؟ وہ تو اس بارے میں کچھ سوچتا بھی نہیں۔ اور یہ سامنے پینے کی بات نہیں ہے، سگریٹ پی کر فارغ ہو چکا ہے، اور دھویں بھی ختم ہو چکے ہیں، پینے کا صرف اثر منہ میں ہے کہ بدبو محسوس ہو رہی ہے، تب بھی جب تک کہ منہ صاف نہ کرلے شریعت اجازت نہیں دیتی کہ آپ مسجد میں جائیں، یا مسلمانوں کے کسی مجمع میں جائیں۔ اس لئے کہ آپ کے منہ کی بدبو سے تکلیف ہوتی ہے۔ تو جو لوگ سب کے درمیان میں پیتے ہیں اور دھواں نکالتے ہیں، وہ کتنی تکلیف کا باعث بنتے ہوں گے۔

بہرحال! شریعت کی ایسی اونچی اور عمدہ عمدہ تعلیمات ہیں۔ آج ہم نے شریعت کی تعلیمات کو چھوڑا؛ تو اس کو بھگت رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا اہتمام کیا جائے۔ ایسی چیزوں کو اور زیادہ نمایاں کر کے لوگوں میں عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس سے آپس کے جھگڑے بھی آپ ہی آپ ختم ہو جائیں گے۔ ایسی چیزوں سے ہی جھگڑے ہوتے ہیں، جب یہ نہیں ہوں گی تو آپ ہی آپ جھگڑے بھی ختم ہوں گے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق نصیب فرمائے

۶/جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۲۸/اگست ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً .أمابعد:—

وہ آدمی جھوٹا نہیں کہلائے گا

۲۴۹. وعن أم كلثومٍ بنتِ عقبةَ بنِ أبی معیط رضی اللہ عنہا قَالَتْ:سَمِعْتُ رسولَ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْلُ:لَیْسَ الْکَذَّابُ الَّذِیْ یُصْلِحُ بَیْنَ النَّاسِ فَیَنْمِیْ خَیْراًأَوْیَقُوْلُ خَیْراً. (متفق علیه)

یہ باب ''الاصلاح بین الناس'' کا چل رہا ہے۔لوگوں کے درمیان کے تعلقات درست کرانااور صلح کرانا۔اسی سلسلہ میں حضرت ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط رضی اللہ عنہا کی روایت لائے ہیں۔یہ صحابیہ ہیں،ان کے والد عقبہ بن ابی معیط نبی کریم ﷺ کے بڑے پکے دشمن تھے،غزوۂ بدر کے موقعہ پر جو لوگ قید پکڑے گئے تھے ان میں یہ بھی تھے اور راستہ میں نبی کریم ﷺ نے ان کے قتل کا حکم دیا تھا،یہ ان کی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہیں جو صلحِ حدیبیہ کے بعد اسلام لائیں،اُس وقت ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اسلام لا کر تنِ تنہا مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کر کے آئیں۔وہ فرماتی ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور ان کے تعلقات کو درست کرانے کے لئے، آپس کے بگاڑ کو درست کرانے کے لئے کوئی بھلی اور اچھی بات دو گروہوں میں سے ایک کی طرف منسوب کر دے؛ تو وہ جھوٹا نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دو پارٹیوں میں آپس میں عداوت اور دشمنی ہے، تعلقات کشیدہ ہیں، ان کے بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرانے اور سدھارنے کے لئے اگر کوئی آدمی کوشش کر رہا ہے اور اپنی اس کوشش میں اگر وہ ان دو میں سے ایک کی بھلائی اور اس کے متعلق اچھے جذبات دوسرے دل میں پیدا کرنے کے لئے اور دوسرے کے دل میں اس کے متعلق جو نفرت اور عداوت ہے اس کو کم کرنے اور دور کرنے کے لئے کوئی اچھی بات دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے، مثلاً خالد اور محمد میں لڑائی چل رہی ہے، دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، اب زید دونوں میں صلح کرانا چاہتا ہے، اس لئے اس نے خالد سے یوں کہا کہ بھائی محمد تو آپ کے لئے دعا کر رہا تھا، مَیں نے خود سنا، وہ آپ کے لئے بھلائی کی دعائیں کر رہا تھا، حالانکہ محمد نے خالد کا نام لے کر دعا نہیں کی تھی۔ لیکن زید خالد سے جو یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے خود کانوں سے سنا کہ محمد آپ کے لئے دعا کر رہا تھا، وہ اپنی بات کی تاویل کر رہا ہے تاکہ خالد کے دل میں محمد کے متعلق جو عداوت ہے وہ کم ہو جائے اور وہ اس کی طرف مائل ہو جائے۔ پھر یہی بات محمد سے بھی کہی کہ خالد تمہارے لئے دعا کر رہا تھا، اس طرح دونوں میں صلح کرانے کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی جھوٹا نہیں ہے۔

ایسے موقع پر بھی صریح جھوٹ سے بچو

البتہ علماء نے لکھا ہے کہ ایسے موقعوں پر صریح اور صاف جھوٹ نہ بولے بلکہ تعریض اور کنایہ سے کام لے۔ تعریض اور کنایہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ استعمال کرے کہ اُن کو سن کر سننے والے کا ذہن اُن الفاظ کے ظاہری مطلب کی طرف جائے اور وہی معنٰی وہ

مراد لے، لیکن کہنے والا ذرا دور کا مطلب لے رہا ہو۔ مثلاً زید کا یہ کہنا کہ خالد تمہارے لئے دعا کر رہا تھا، مَیں نے خود سنا۔ تو ہر مسلمان تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرتا ہی ہے کہ اللہ پوری امت کا بھلا کر دے، تمام مسلمانوں کو معاف کر دے، ان کی مصیبتیں ٹال دے۔ کون مسلمان ہے جو تمام مسلمانوں کے لئے عمومی انداز میں ایسی دعائیں نہ کرتا ہو، اور عام طور پر جب مجمع ہوتا ہے تو سب کے لئے عمومی دعا کرتے ہی ہیں۔ اب بولنے والا کہہ رہا ہے کہ فلاں تمہارے لئے دعا کر رہا تھا، تو سننے والا یوں سمجھ رہا ہے کہ میرا نام لے کر دعا کر رہا تھا اور کہنے والے کی نیت یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے دعا کی تھی، اس میں یہ بھی آ ہی گیا ہے۔ تو دیکھئے! یہاں پر صاف جھوٹ نہیں ہے، بلکہ ایک معنٰی کر اس کی بات سچی ہی ہے۔

اسی طرح ایک آدمی مسلمانوں کی تعریف اور خوبیاں بیان کر رہا ہے، تو جب وہ مسلمان کی خوبیاں بیان کر رہا ہے تو وہ محمد جو اس کا دشمن ہے یا خالد جو اُس کا دشمن ہے وہ مسلمان ہونے کے ناطہ سے اس تعریف میں آ ہی گئے؛ اسی کو تعریض کہا جاتا ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا نام لے کر دعا کی ہوگی یا تعریف کی ہوگی، اور بولنے والے کی نیت ہے کہ مسلمانوں کے لئے عمومی انداز میں دعا اور تعریف کی، اور یہ بھی اس میں آ ہی گیا۔ اب اس کی نیت تو صرف یہ ہے کہ اُس کے دل میں اِس کے متعلق جو نفرت ہے وہ کم ہو جائے، نفرت محبت میں بدل جائے، دوری نزدیکی سے بدل جائے، اور اس طرح کوشش کر کے وہ دو مسلمانوں کو ملانا چاہتا ہے؛ تو وہ جھوٹا نہیں کہلائے گا۔

﴿ ایسے جھوٹ کی اجازت ہے ﴾

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ”دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیٔ فتنہ انگیز“ کوئی

بات حقیقت میں بالکل سچی ہوتی ہے، لیکن اس کے کہنے میں تعلقات بگڑتے ہیں تو اس سچی بات کا کہنا آپ پر واجب اور فرض تو ہے نہیں، اس لئے آپ کو چاہیے کہ اس کو چھپالیں، اس کو بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کوئی ایسی ذو معنیٰ بات کہ جس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں، آپ دور والا پہلو لے کر اُس کے سامنے بیان کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اُس کے دل میں عداوت کم ہوتی ہے؛ تو یہ اچھا کام ہے۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی جھوٹا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر تعریض اور کنایہ سے کام لے کر بگڑے ہوئے تعلقات کو درست کرانے کی کوشش کرنا پسندیدہ چیز ہے۔

تو دیکھو! دو مسلمانوں میں اگر تعلقات بگڑے ہوئے ہیں، لڑائی جھگڑا ہے، تو اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے شریعت نے جھوٹ کی اجازت دی ہے۔

گنجائش کے تین موقعے

وفی روایۃ لمسلم زیادۃ: قالت: وَلَمْ أَسْمَعْهُ يُرَخِّصُ فِيْ شَيْءٍ مِمَّا يَقُوْلُهُ النَّاسُ اِلَّا فِيْ ثَلاثٍ تَعْنِيْ: اَلْحَرْبَ، وَالْاِصْلاحَ بَيْنَ النَّاسِ، وَحَدِيْثَ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَحَدِيْثَ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا.

میں نے نہیں سنا کہ نبی کریم ﷺ لوگوں کی بعض ایسی باتیں جو حقیقت سے دور ہوا کرتی ہیں اس کی اجازت دیتے ہوں مگر تین موقعوں پر۔ وہ تین موقعوں میں سے ایک تو لڑائی کے موقعہ پر دشمن کو زیر کرنے کے لئے اس طرح کہنا کہ ''ابھی ہمارا لشکر آرہا ہے''، ''ہماری طرف سے ابھی حملہ ہوگا'' تاکہ دشمن مرعوب ہو جائے اور اس کی قوت کچھ گھٹ جائے یا مرعوب ہو کر مقابلہ پر آنے کی جراءت نہ کرے؛ تو ایسے موقعہ پر جھوٹ کی اجازت ہے۔

﴿وَالْاِصْلَاحَ بَیْنَ النَّاسِ﴾ اور لوگوں کے آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے۔

﴿وَحَدِیْثَ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَحَدِیْثَ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا﴾ اور میاں بیوی کے تعلقات کو درست کرنے کے لئے۔ جیسے بیوی مزاج کی ذرا تیز ہے یا بدمزاج ہے تو اُس سے کہنا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ کپڑے سلوادیں گے، ایسا کریں آپ کو سسرال لے چلیں گے، اور وہاں رہنے کا موقعہ بھی دیں گے۔ ایسا کہتے وقت دل میں یہ نیت کرے کہ اللہ تعالیٰ اگر استطاعت دیں گے تو لے جائیں گے، اس سے انکار بھی نہیں ہے، لیکن فوری طور پر اس کا جو مطالبہ اور لڑائی ہے وہ دور ہو جائے؛ تو اس کی گنجائش ہے۔

﴿معاملہ کو سلجھانے کا ایک انداز یہ بھی ہے﴾

۲۵۰. وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: سَمِعَ رَسول اللہ ﷺ صَوْتَ خُصُوْمٍ بِالْبَابِ عَالِیَةٌ أَصْوَاتُهُمَا، وَإِذَا أَحَدُهُمَا یَسْتَوْضِعُ الْاٰخَرَ وَیَسْتَرْفِقُهُ فِیْ شَیْءٍ وَهُوَیَقُوْلُ: وَاللهِ لاأَفْعَلُ، فَخَرَجَ عَلَیْهِمَا رسولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: أَیْنَ الْمُتَأَلِّیْ عَلَی اللهِ لایَفْعَلُ الْمَعْرُوْفَ؟ فَقَالَ: أَنَا یارسولَ اللهِ! فَلَهُ أَیُّ ذٰلِکَ أَحَبَّ. (متفق علیه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے دروازے کے پاس دو جھگڑا کرنے والوں کی آواز سنی، دونوں کی آواز بلند ہو رہی تھی، اُن میں سے ایک کا دوسرے پر قرضہ تھا اور وہ اُس کا مطالبہ کرتا تھا کہ میرے پیسے لاؤ۔ اور جس سے مطالبہ کیا جارہا تھا وہ اس کو سمجھا کر اپنے اس قرضے میں کچھ کم کرنے کی اور سہولت کرنے کی درخواست کر رہا تھا کہ آپ کے پانچ ہزار روپے ادا کرنے میری طاقت سے باہر ہیں، اس میں سے کچھ کم کردو، آپ کی مہربانی ہوگی، نرمی کا معاملہ کرو اور کچھ چھوڑ دو۔ پانچ ہزار کے بدلے تین ہزار لے لو،

اور باقی معاف کردو۔ وہ ایسی درخواست کررہا تھا کہ ابھی میرے پاس نہیں ہیں، ایک مہینے کی مہلت دے دو، ایک مہینے کے بعد میں ادا کروں گا۔ اور قرض خواہ کہہ رہا تھا﴿وَاللهِ لاَ أَفْعَلُ﴾ اللہ کی قسم! مَیں ایسا نہیں کروں گا بلکہ میں تو لے کر رہوں گا اور ابھی ہی لوں گا۔ حضور اکرم ﷺ نے دونوں کی آواز سنی تو آپ باہر تشریف لائے اور فرمایا﴿أَیْنَ الْمُتَأَلِّیْ عَلٰی اللهِ لاَیَفْعَلُ الْمَعْرُوْفَ؟﴾ کون ہے جو ایسی قسم کھاتا ہے کہ نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ سامنے والے نے جو درخواست کی تھی وہ تو یہی تھی کہ ذرا کم کردو۔ جیسے آپ کا کسی سے قرضے کا مطالبہ ہے، آپ پانچ ہزار مانگتے ہیں لیکن اس میں سے پانچ سو کم کردیں گے؛ تو یہ کم کردینا نیکی کا کام ہے۔ یا وہ یہ کہتا ہے کہ ابھی ادائیگی کی میری طاقت نہیں ہے، ایک مہینے کی اور مہلت دے دو، ذرا نرمی سے کام لو؛ تو مہلت دینا اور نرمی سے کام لینا بھی نیکی کا کام ہے۔ اور وہ یہی درخواست کررہا تھا لیکن دوسرا کہہ رہا تھا کہ اللہ کی قسم! میں ایسا نہیں کروں گا۔ تو حضور ﷺ نے باہر تشریف لاکر جو فرمایا اس کا انداز دیکھئے، آپ کس انداز سے اُس کو نصیحت کررہے ہیں کہ وہ کون ہے جو نیکی کا کام نہ کرنے کی قسم کھارہا ہے؟ حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکلے اور سننے والے بھی صحابی تھے جو نبی کریم ﷺ پر اپنی جان چھڑکتے تھے، اب کیا باقی رہ گیا تھا۔

گویا معاملہ کو سلجھانے کا یہ بھی ایک انداز اور طریقہ ہے جو نبی کریم ﷺ نے امت کو سکھلایا۔ جب حضور کی زبانِ مبارک سے یہ بات سنی، تو وہ صحابی فوراً کہنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! میں نے کہا۔ اس کے بعد وہ صحابی کہنے لگے کہ اب وہ جو چاہے، اُس کو میری طرف سے چھوٹ ہے، یعنی وہ جتنا کم کرنا چاہے؛ مجھے منظور ہے۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اطاعت شعاری کے نمونے

تو دیکھئے! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ اطاعت شعاری ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مقابلہ میں ان کی یہ خاص شان تھی کہ جب کسی بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ٹوکا جاتا، تو وہ اسی وقت اُس کی اصلاح کر لیتے تھے، اس میں ذرا بھی دیر نہیں کرتے تھے۔ اُن میں اور ہم میں یہی فرق ہے۔ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے ارشادات کو سنتے ہیں، اگر ہم سے کوئی غلط بات ہوگئی اور کسی نے حدیث سنا دی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشادات سنا دیا تو ہم فوراً باتیں بناتے ہیں، اینچ پینچ باتیں کرنے لگتے ہیں کہ وہ تو یوں ہے اور فلاں ہے لیکن وہ حضرات اِس چیز کو جانتے ہی نہیں تھے۔ بس! ایک بات سامنے آ گئی اسی وقت اپنا سر جھکا دیتے تھے:- ؎ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

مَیں آپ کو دو واقعات سناتا ہوں جو آپ نے پہلے بھی سنے ہوں گے۔ ایک واقعہ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے کا واقعہ پیش آیا، منافقین نے تہمت لگائی تھی اور اس کی وجہ سے ایک مہینہ تک لوگوں میں افواہیں چلتی رہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بڑی تکلیف ہوئی۔ اصل میں یہ سازش تو منافقین نے ہی کی تھی لیکن مؤمنین میں چند گنے چنے بھولے بھالے لوگ تھے، جو ان کے داؤ میں آ گئے تھے اور انھوں نے بھی ان کی اِس بات کو سچا سمجھ لیا اور اپنی زبان سے وہ بھی ایسا ہی بولنے لگے۔ انہیں میں سے حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اور حضرت مسطح بن اثاثہ مہاجرین میں سے تھے، غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ وہ غریب آدمی تھے اور ان کا سارا خرچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی اُٹھاتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والا یہ واقعہ جب پیش آیا تو اس میں یہ بھی بیچارے ناواقفیت کی وجہ سے منافقین کی چال میں پھنس گئے اور انھوں نے بھی تہمت والی بات اپنی زبان سے لوگوں میں کہنا شروع کردی۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سماج اور معاشرے میں کچھ لوگ ایسی چیزیں چلاتے ہیں تو بعض سادہ قسم کے لوگ جن کا اس سازش سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بھی پھنس جاتے ہیں

بہرحال! ایک مہینہ کے بعد اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براءت نازل ہوئی کہ جو تہمت لگائی گئی ہے وہ غلط ہے اور تہمت لگانے والوں کے لئے بڑی وعیدیں نازل ہوئیں۔ تو گویا قرآن پاک میں آیتوں نے نازل ہو کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس تہمت سے بری کردیا۔ اب تو بات صاف ہوگئی۔ جب ان کی براءت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح کے متعلق قسم کھالی کہ اب ان کا خرچہ بند کردیتا ہوں۔

دیکھو! یہ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی بات ہے کہ جب تک آیتیں نازل نہیں ہوئیں اس درمیان پورا ایک مہینہ گزرا، پھر بھی اُن کا خرچہ بند نہیں کیا۔ ہمارے جیسا ہوتا تو پہلے ہی دن معاملہ نمٹ گیا ہوتا۔ ہم کہتے کہ میری بیٹی کو ایسا کہتا ہے۔ سیدھی بات ہے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، جب تک کہ بات صاف نہ ہوجائے اور یہ طے نہ ہوجائے کہ یہ جو کہہ رہے ہیں وہ صحیح ہے یا غلط ہے؛ وہاں تک کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیتیں نازل ہوگئیں اور یہ بات صاف ہوگئی کہ جو کچھ کہا جارہا تھا وہ سب غلط تھا، تو اب ان کا قصوروار ہونا ثابت ہوگیا، اس لئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے قسم کھائی کہ میں ان کو نفقہ نہیں دوں گا۔

اور حدیث کی شرح کرنے والوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ قسم بھی اس لئے نہیں کھائی تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان کی بیٹی ہیں، بلکہ یہ فیصلہ اس لئے کیا کہ نبی کریم ﷺ کی زوجہ مطہرہ کے ساتھ یہ معاملہ ہوا، اس حیثیت سے قسم کھائی۔ خیر! قسم کھالی کہ اب خرچہ اور نفقہ نہیں دوں گا۔

وہ تو بیچارے ناواقفیت کی وجہ سے پھنس گئے تھے، پھر انہوں نے توبہ بھی کرلی تھی۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کو صحابہ کی دل جوئی بھی منظور رہتی ہے اس کے بھی بہت سارے واقعات ہیں، ابھی میں صرف یہی آپ کو سنا رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے سفارش

جب یہ ہوا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آیتیں نازل ہوئیں ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ﴾ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ''اولوا الفضل'' فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کو ''اولوا الفضل'' کہہ دے، اس کے مقام کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ تم میں جو فضیلت والے اور کشادگی والے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے فضیلت والا بھی بنایا اور مال ودولت بھی دے رکھا ہے وہ اِس بات کی قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں پر خرچ نہیں کریں گے، اور غریبوں کو اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں، ان کو معاف کردیں اور درگذر سے کام لیں۔ چونکہ حضرت مسطح رشتہ دار بھی ہوتے تھے، غریب بھی تھے اور مہاجر بھی تھے۔

﴿یہ ڈبل پیمانہ تو اچھا نہیں﴾

اللہ تبارک وتعالیٰ کا انداز تو دیکھئے۔کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کردے؟ اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کردے؛ تو پھر تم بھی دوسروں کی غلطیوں کو معاف کردو۔یہ ڈبل پیمانہ تو اچھا نہیں ہے کہ ہم تو یہ چاہیں کہ لوگ ہماری غلطیاں معاف کردیں اور ہم کسی کی غلطی کو معاف کرنے کے لئے تیار نہ ہوں۔دنیا میں بھی ایسا نہیں چلتا۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک سوال قائم کیا﴿أَلَا تُحِبُّوْنَ أَن يَّغْفِرَ اللهُ لَكُمْ﴾ تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کردے؟

یہ آیت نازل ہوئی اور نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بلا کر پڑھ کر سنائی، اُسی وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا﴿بَلیٰ! أُحِبُّ أَن يَّغْفِرَ اللهُ لِيْ﴾ کیوں نہیں! مَیں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو بھی معاف کردے۔اور اُسی وقت اعلان کردیا کہ جو بند تھا وہ بھی ملے گا اور آئندہ سے ڈبل (DUBBLE) دوں گا۔دیکھو! انہوں نے کوئی ایچ پیچ نہیں کی اور ذرا دیر بھی نہیں کی۔

﴿پہلے تحقیق کرو؛ پھر عمل کرو﴾

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں انہوں نے اپنی بہن کا نکاح ایک صحابی سے کرادیا جن کا لقب ابوالبداح تھا، انہوں نے اپنی بیوی کو ایک طلاقِ رجعی دی۔اور مسئلہ یہ ہے کہ ایک طلاقِ رجعی دی تو اگر وہ چاہے تو عدت کے اندر اندر رجوع کرکے عورت کو اپنے نکاح میں باقی رکھ سکتا ہے، لیکن عدت پوری گزر گئی اور انہوں نے رجوع نہیں کیا، اب تو وہ طلاق پکی ہوگئی، اور اس عورت کے لئے دوسرا نکاح کرنا جائز ہوگیا۔اس لئے کہ پہلا نکاح

ختم ہوگیا، لیکن پہلے شوہر پر بالکل حرام نہیں ہوئی، بلکہ وہ دوبارہ نکاح کرسکتا ہے۔ ہاں! اگر تین طلاق دے دی؛ تو پھر وہ حرام ہو جاتی ہے۔

طلاق کے معاملہ میں بھی آج کل ہمارے معاشرے میں لوگ بہت غفلت برتتے ہیں۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ آدمی کو جو بھی کام کرنا ہو تو پہلے معلوم کرلے کہ شریعت اس سلسلہ میں کیا ہدایتیں دیتی ہے۔ جیسے نماز پڑھنی ہے تو معلوم کرلے کہ کیسے پڑھنی چاہیے اور پھر پڑھے۔ نکاح کرنا ہے تو کس طرح نکاح کرنا چاہیے وہ معلوم کرلے۔ اسی طرح جب کوئی آدمی طلاق دینا چاہتا ہے تو طلاق کے سلسلہ میں شریعت نے کیا ہدایتیں دی ہیں؛ وہ معلوم کرنا چاہیے، لیکن آدمی اس کا حکم معلوم کئے بغیر سیدھے طلاق دینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے، طلاق کب دینی چاہیے؟ کن چیزوں پر دینی چاہیے؟ کب درست ہے؟ یہ سب معلوم کرنا چاہیے۔

طلاق کیوں مشروع ہوئی؟

اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ضرورت کی وجہ سے طلاق دینے کی اگرچہ اجازت تو دی ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا، ابوداؤد شریف کی روایت ہے ﴿اِنَّ أَبْغَضَ الْحَلالِ اِلیٰ اللهِ الطَّلاق﴾ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال کی ہیں ان میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔ حلال تو ہے لیکن ضرورت کی وجہ سے حلال کی ہے۔

(سنن ابی داؤد۔ ۲۱۸۷)

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مرد وعورت کے درمیان نکاح ہوگیا، نکاح تو اس لئے ہوا کہ مرد نے بھی اپنے طور پر دیکھا تھا اور اس کو یقین تھا کہ ان شاء اللہ اس عورت کے ساتھ مل کر ہماری زندگی بڑے آرام، سکھ اور چین سے گذرے گی۔ عورت کے گھر والوں نے بھی تحقیق کی تھی اور سب رپورٹ اچھی ملی تھی اور نکاح ہوگیا۔ اس کے بعد جب دونوں آپس

میں ملے اور چند روز ساتھ رہے تو اندازہ ہوا کہ اِس کا مزاج اور ہے اور اُس کا مزاج دوسرا ہے، اب دونوں کا مزاج میل ہی نہیں کھا رہا ہے، اور دونوں میں جھگڑے شروع ہو گئے، مثلاً عورت کی نافرمانی کی وجہ سے کوئی بات پیش آئی، یا عورت میں کوئی عیب اور قصور ہے، تو اب شریعت یہ کہتی ہے کہ عورت کے عیب کی وجہ سے فوراً طلاق دینے کی جراءت مت کرو، اس میں کوئی عیب و نقص اور کمی ہے تو اس کے ایک نقص کو سامنے رکھ کر طلاق دینے کے لئے آپ تیار کیوں ہو جاتے ہو؟

﴿حسنِ معاشرت کا ایک رہنما اصول﴾

مسلم شریف کی روایت ہے کہ کوئی مؤمن کسی ایمان والی عورت سے (یعنی اپنی بیوی سے) اپنے دل میں بغض نہ رکھے، اگر اس کی کوئی بات آپ کو ناپسند ہے تو اس کی کوئی دوسری بات پسند بھی آئے گی (مسلم شریف۔ ۳۷۲۱) آپ کو عورت کی ایک بات اگر ناپسند ہے، تو اس ناپسند بات کو مت دیکھو، اس میں اور بھی بہت ساری باتیں ہیں۔ یہی ایک عیب تو ہے نہیں بلکہ بہت ساری خوبیاں بھی تو ہیں۔ لہٰذا اس کی خوبیوں کو سوچو کہ اس کی خوبیوں کے مقابلہ میں یہی ایک عیب تو ہے، لہٰذا آپ کو چاہیے کہ اس سے درگذر کریں اور برداشت کریں۔ شریعت یہی تعلیم دیتی ہے ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ قرآن پاک کہتا ہے کہ عورت کے ساتھ حسنِ معاشرت اور اچھی زندگی گذارنے کی کوشش کرو، اگر تم ان کو ناپسند کرتے ہو، تو ہوسکتا ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اسی میں بہت زیادہ بھلائی رکھی ہو۔ اس آیت میں غور کیجئے کہ ﴿خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ کہا ہے۔

بہرحال! ایک عیب کی وجہ سے اس کی دس خوبیوں کونظرانداز کردینے کی اسلام اجازت نہیں دیتا، بلکہ اگر یہی حال ہوتو دنیا میں انبیاء کے سوا جتنے بھی انسان ہیں، ان میں کوئی بھی معصوم اور بے گناہ نہیں ہے۔ نبی ہی معصوم و بے گناہ اور تمام عیبوں سے پاک ہوتے ہیں باقی سب انسانوں میں کوئی خوبی ہے، تو کوئی عیب بھی ہے۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، بلکہ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوگا۔ اسی طرح سے ایسا بھی نہیں کہ برائیاں ہی برائیاں ہوں، اس میں کوئی نہ کوئی خوبی تو ضرور ہوگی۔

انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ جو گھڑی بند ہوگئی ہو، وہ بھی چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ صحیح وقت بتاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کی گھڑی گیارہ بجے بند ہوگئی تو دن کو جب گیارہ بجیں گے تو اس میں بھی گیارہ بجیں گے، اور اتنی دیر تو وہ صحیح وقت بتائے گی۔ اسی طرح رات کو جب گیارہ بجیں گے تو اس وقت بھی وہ صحیح وقت بتائے گی۔ کہاوت کا حاصل یہ ہوا کہ کوئی بھی عیب والی چیز ہو، اس میں کچھ نہ کچھ خوبی ضرور ہوا کرتی ہے۔

عقلمند اور بے وقوف کے درمیان فرق

لہٰذا آپ کو دنیا میں کوئی عورت ایسی ملنے والی نہیں ہے جس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں اور کوئی عیب نہ ہو۔ اگر اس کے کسی عیب کی وجہ سے خدانخواستہ آپ اس کو طلاق دے کر دوسری کو پسند کر کے لائے، تو قاعدہ تو وہی ہے کہ اس میں بھی کچھ نہ کچھ عیب تو ہوگا۔ اب اس دوسری میں بھی عیب ہے تو اس کے ساتھ آپ کیا کریں گے؟ خدانخواستہ اگر دوسری کو بھی کسی عیب کی وجہ سے الگ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور تیسری لاتے ہیں تو یہاں بھی وہی مسئلہ آئے گا کہ عیب تو اس میں بھی ہوگا۔ اب آپ سوچیں گے کہ چلو! درگذر کرو اور عیب ہے تو

عیب کے ساتھ ہی سہی، آخر کب تک بدلتے رہیں گے؟ اب یہ فیصلہ کریں گے نا؟ اور اب تو ویسے بھی مجبور ہوں گے، اس لئے کہ تیسری مل تو گئی ہے، کتنوں کو تو دوسری ہی حاصل کرنے میں پسینہ نکل جاتا ہے، تیسری تو بڑی مشکل سے ملتی ہے، اور اگر طلاقوں کا یہ سلسلہ رہا ہے تو چوتھی تو کوئی دے گا ہی نہیں۔ جب آپ دو، تین کو طلاق دینے کے بعد اس فیصلے پر آئے؛ اگر یہی فیصلہ آپ پہلے سے کر لیتے تو پہلی کو الگ کرنے کی نوبت ہی نہ آتی۔ فارسی کا مقولہ ہے:

آں چہ کند دانا کند ناداں ❁ لیک بعد از خرابی بسیار

عقلمند اور بے وقوف کے درمیان میں اتنا ہی فرق ہے کہ عقلمند جو کام پہلے سے کرتا ہے؛ بے وقوف وہی کام بہت بعد میں کرتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ شریعت نے ایک دو قصور کی وجہ سے طلاق دینے کی اجازت نہیں دی ہے۔ اگرچہ طلاق دے گا تو پڑ جائے گی لیکن شریعت منع کرتی ہے، اگر اس میں کوئی عیب ہے تو اس کی اصلاح کی کوشش کرو۔

﴿یہ نسخہ آزما کر تو دیکھو﴾

قرآنِ پاک کی آیتوں میں اس کی اصلاح کے لئے صاف صاف احکام دئے ہیں اگر اس میں کوئی قصور ہے اور اس کی اصلاح کی آپ نے پوری کوشش کی اور اس کو سمجھایا، اس کے بعد بھی اگر وہ نہیں مانتی ہے، تو پھر شریعت نے اس کے لئے آپ کو ایک سزا بتائی ہے کہ اب اس کا بستر الگ کر دو۔ دیکھو! یہ سزا قرآنِ کریم میں ہے۔ اور یہ سزا اللہ تعالیٰ بتلا رہے ہیں۔ انسان کی فطرت سے اس کا خالق اور پیدا کرنے والا جتنا واقف ہوسکتا ہے؛ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ بستر الگ کرنے والا علاج جو اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے کہ اس کے ساتھ مت سوؤ،

اس سے الگ سوؤ؛ یہ نسخہ آزما کر تو دیکھو۔ اگر وہ شریف ہے اور اس کو آپ کے ساتھ محبت ہے تو بستر الگ کرنے کو وہ برداشت ہی نہیں کرے گی اور سدھر جائے گی۔

لیکن بستر الگ کرنے والا نسخہ ایسا ہے کہ اس میں خود شوہر صاحب کو بھی اپنے اوپر کنٹرول (Control) کرنا پڑتا ہے، اس لئے لوگ اس نسخے کو استعمال نہیں کرتے، کیونکہ اس میں خود بھی بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔

پھر تو اللہ تعالیٰ بھی جوڑ کر ہی دے گا

بہرحال! اگر اس پر بھی اصلاح نہ ہو تو پھر مارنے کی اجازت دی۔ اور اس کی بھی تفصیل ہے جو اپنی جگہ پر ان شاء اللہ آئے گی۔ اب یہ سارے نسخے آپ نے آزما لئے، پھر بھی اصلاح نہیں ہوتی، تو اب شریعت یہ کہتی ہے کہ ان تعلقات کو ٹھیک کرنے کے لئے مرد کے خاندان میں سے ایک وڈیل (ﷺ) اور بڑا آدمی، اور عورت کے خاندان میں سے ایک وڈیل (ﷺ) اور بڑا آدمی آئیں اور مل کر دونوں کے حال احوال کو درست کرنے کی کوشش کریں۔

اور دیکھو! قرآن نے کیسے اچھے الفاظ استعمال کئے ہیں ﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا، إِنْ يُّرِيْدَا إِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾ اگر یہ دونوں (یعنی میاں بیوی بھی اور جن وڈیلوں اور بڑوں کو بیچ میں ڈالا گیا ہے وہ بھی) ان کے حالات اور تعلقات کو درست کرنے کی نیت دل میں رکھتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ بھی جوڑ کر ہی دے گا۔ لیکن وڈیلوں کے بیچ میں پڑنے کے بعد بھی اگر جوڑ نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی کے دل میں نیت خراب ہے، وہ پہلے سے یہ طے کر کے میدان میں آیا ہے کہ ان کو الگ ہی کرانا ہے۔ میاں

بیوی کی نیت بھی اصلاح کی ہو اور صلح کرانے کے لئے جو بیچ میں پڑے ہیں ان کی بھی نیت اصلاح کی ہو تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے ﴿یُوَفِّقِ اللّٰہُ بَیْنَھُمَا﴾ اللہ تعالیٰ دونوں میں جوڑ کر ہی دے گا۔ معلوم ہوا کہ جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں کوئی خرابی اور کمی ہوتی ہے۔ یہ بات پکی ہے، اور طے شدہ حقیقت ہے۔

﴿شریعت نے طلاق دینے کا طریقہ بھی بتلا دیا﴾

ان سارے مرحلوں کے بعد بھی میاں بیوی کے آپس کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا تو پھر شریعت نے طلاق دینے کی اجازت دی ہے، لیکن طلاق دینے کا طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں طلاق دینا تو آتا ہے لیکن کس طرح دینی چاہیے وہ نہیں آتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے باقاعدہ پوری ایک سورت طلاق کا طریقہ سکھلانے کے لئے اتاری ہے کہ اگر کسی کا ارادہ طلاق دینے کا ہے تو کس طرح طلاق دینی چاہیے ﴿یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّۃَ﴾ کیا آدھی رات کو طلاق دینے کا ارادہ ہوا تو دے ڈالے گا؟ ایسا نہیں ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ پہلی بات تو یہ دیکھنا ہے کہ وہ قصور کیا ہے؟

﴿ہمارے معاشرے کی دُکھتی ہوئی رگ﴾

میری بات جو چلی تھی اس میں ایک بات کہنا تو مَیں بھول ہی گیا کہ بعض مرتبہ تو بے چاری کا کوئی قصور بھی نہیں ہوتا۔ مثلاً میاں صاحب باہر کسی سے لڑ کر آئے، اپنی آفس میں نوکر یا ملازم کے ساتھ کھٹا کھٹ ہوگئی، اور دماغ کا پارہ چڑھا ہوا ہے، گھر میں بے چاری بیوی کو تو کچھ پتہ بھی نہیں ہے کہ کس بات پر ناراض ہو کر آئے ہیں۔ یا بیوی کے ابا کے ساتھ

لڑائی ہوگئی، بیوی کے بھائی کے ساتھ لڑائی ہوگئی، اپنے پڑوسی کے ساتھ لڑائی ہوئی، اپنے ابا کے ساتھ لڑائی ہوئی، اور لڑائی میں بھی بیوی کا کوئی تعلق نہیں ہے، وہ تو بے چاری اس معاملہ سے بالکل الگ ہے، اس کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق بھی نہیں ہے، بیوی کے ابا کے ساتھ جائیداد کا جھگڑا ہے، کبھی دو بھائیوں کے بیٹا بیٹی میں نکاح ہوتا ہے، چچا چچا کے یہاں رشتہ ہوتا ہے، تو وہ جھگڑا آتا ہے۔ اب وہاں جھگڑا دوسرا ہے اور کچھ ہوا تو کہتا ہے کہ طلاق دے دیتا ہوں۔ بوڑھے بوڑھے لوگ دھمکیاں دینا شروع کر دیتے ہیں، ساری زندگی گذاری، اولاد جوان ہوگئی اور کبھی کچھ ایسا ہوا تو بڈّھا دھمکی دیتا ہے کہ چلتی کر دوں گا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

ارے بھائی! قرآن وحدیث میں اس کی کوئی دلیل ہے؟ دیکھو! کتابوں میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ ان بنیادوں پر شریعت نے طلاق دینے کی بالکل اجازت نہیں دی ہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے؟ یعنی ہم نے شریعت کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ طلاق کا تعلق کس سے ہے، اور ہمارا جھگڑا کس سے ہے۔ اگر آپ کا جھگڑا دوسرے سے ہے تو اس سے اس کے انداز میں نمٹ لو، اپنی بیوی کو کیوں بیچ میں لاتے ہو۔ کیا اس کا یہی قصور ہے کہ جس سے آپ کا جھگڑا ہوا ہے؛ یہ اس کی بیٹی، یا اس کی بہن، یا اس کی رشتہ دار ہے؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

پکے دشمن کی بیٹی نکاح میں ہے لیکن......

ارے بھائی! شروع اسلام میں تو جن کے نکاحوں میں جو بیویاں تھیں ان کا باپ ہی پکا دشمن ہوتا کرتا تھا، خود حضور ہی کا قصہ ہے۔ ام المؤمنین حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ نبی کریم ﷺ کا نکاح ہوا، ان کے باپ ابوسفیان تھے اس وقت ایمان نہیں لائے تھے اور تمام

قریش کے سرداراور مسلمانوں کے اول نمبر کے دشمن تھے۔وہاں حضور ﷺ نے ایسا تونہیں کہا کہ میرے دشمن کی بیٹی میرے نکاح میں کیسے رہ سکتی ہے۔بلکہ حضور ﷺ نے ان کے ساتھ اخلاق کا وہ نمونہ بتایا کہ خود بیٹی اپنے باپ کو حضور کے بستر پر بیٹھنے دینے کے لئے تیار نہیں ہے

قصہ یہ ہوا کہ صلح حدیبیہ کے بعد ایک موقعہ ایسا آیا کہ ابوسفیان کو مدینہ منورہ آنے کی ضرورت پیش آئی، صلح ٹوٹنے والی تھی،اس کو دوبارہ درست کرنے کے واسطے آئے،جب مدینہ منورہ پہنچے تو اپنی بیٹی کے یہاں آئے۔اور بیٹی کون تھی؟ نبی کریم ﷺ کی زوجۂ مطہرہ، پاکیزہ بیوی تھی،جب وہاں پہنچے تو حضور کا بستر کھلا ہوا تھا،جا کر اس پر بیٹھنا چاہا توام حبیبہؓ نے جلدی سے بستر لپیٹ دیا۔اب یہ باپ ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ بستر کھلا ہوا تھا جب مَیں نے بیٹھنا چاہا تو میری ہی بیٹی بستر لپیٹ رہی ہے۔پوچھا کہ بیٹی!بستر لپیٹ رہی ہو،یہ کون سا طریقہ ہے؟ یہ کوئی دانشمندی کی بات ہے؟ کیا یہ بستر میرے لائق نہیں ہے،یامَیں اس کے لائق نہیں ہوں؟ دوہی وجہیں ہوسکتی ہیں۔دیکھو!اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے فعل کو ایک ہی وجہ پرمحمول کرنا درست نہیں ہے جب تک کہ پوچھ نہ لو۔یہ بھی ان کی دانشمندی کی بات تھی کہ انھوں نے یہ سوال کیا۔حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا کہ یہ بستر اللہ کے پاک رسول ﷺ کا ہےاورتم مشرک ہو،لہٰذا تم کوحق نہیں ہے کہ اللہ کے پاک رسول کے بستر پر بیٹھو(سیر اعلام النبلاء) میں تو یہ بتلانا چاہتا تھا کہ دیکھو!وہاں تو یہ معاملہ تھا۔

اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات بھی دیکھو کہ رشتے کیسے ہیں،کسی کے نکاح میں ایسی عورت ہے کہ جس کا بھائی پکا دشمن ہے۔وہاں توان لوگوں نے کبھی یہ نہیں کیا کہ ان کی دشمنیوں کی وجہ سے طلاق دے دی ہو،حالانکہ یہ تو اللہ واسطے کی دشمنی تھی،اگرایسا کرتے تو ان

کو حق تھا۔اور ہماری دشمنیاں تو دنیا کی خاطر ہوتی ہیں اور ہم ایسا کر ڈالتے ہیں۔طلاق کے لئے تو خود عورت کے ساتھ آپ کا معاملہ کیا ہے وہ دیکھا جائے گا،دوسروں کو بیچ میں مت لاؤ

کیا طلاق دینے کا بھی کوئی وقت ہے؟

بہر حال!بات اس پر چل رہی تھی کہ اگر طلاق دینی ہی ہے تو پھر شریعت نے اس کا طریقہ بتلایا ہے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ تمہارے دل میں آدھی رات کو آیا کہ طلاق دوں تو دے دی۔ بلکہ باری تعالیٰ نے فرمایا ﴿یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْھُنَّ لِعِدَّتِھِنَّ﴾ طلاق دینا چاہو تو اس کے وقت میں دو۔کیا طلاق دینے کے لئے بھی کوئی وقت ہے؟جی ہاں! وقت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں،انھوں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، ان کے والد ناراض تھے کہ اس کو نکاح میں مت رکھو،اس لئے طلاق دیدی،لیکن اس وقت بیوی حالتِ حیض میں تھی اور حیض کی حالت میں طلاق دینے سے شریعت نے منع کیا ہے، لیکن انہوں نے دے ڈالی۔جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے جا کر حضور سے شکایت کی کہ صاحبزادے عبداللہ نے اپنی بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر پوچھا کہ تم نے ایسا کیا؟انہوں نے کہا کہ جی ہاں۔تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رجوع کرو۔پھر اگر طلاق دینے کا ارادہ ہو تو حیض سے پاک ہو جائے، پھر اس کے بعد دوبارہ حیض آئے اور پھر پاک ہو جائے تو اس پاکی کے زمانہ میں صحبت کئے بغیر طلاق دینا۔ (ابوداؤد شریف۔۲۱۷۹)

دراصل شریعت کیا چاہتی ہے وہ دیکھو۔شریعت یہ طے کرنا چاہتی ہے کہ واقعتاً اس

کوطلاق دینے کی ضرورت ہے، یا خالی جذبات کے بہاؤ میں آ کر طلاق دے رہا ہے۔اگر واقعتاً حالات کے پیشِ نظر ضرورت ہوگی اورسوچ سمجھ کر طلاق دینے کا فیصلہ کیا ہے؛ تو شریعت کہتی ہے کہ اگر حیض چل رہا ہے تو ابھی انتظار کرو، حالتِ حیض میں طلاق مت دے دیجیو، یہ اس کا وقت نہیں ہے۔اور حیض کے زمانہ میں صحبت کرنے پر تو پابندی تھی، لیکن جب حیض سے پاک ہوئی تو فطری طور پر آدمی کا رجحان عورت کی طرف ہوتا ہے، خاص کر جوانوں کی طبیعت میں تقاضہ زیادہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی طبیعت میں بھی صحبت کرنے کا تقاضہ ہوتا ہے۔اس لئے شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر طلاق دینی ہے تو اب یہ پاک ہوئی ہے، اس سے صحبت مت کرنا، صحبت کئے بغیر طلاق دو۔اب اگر واقعتاً طلاق دینے کی ضرورت ہوگی، تب ہی دے گا؛ ورنہ نہیں دے گا۔

دیکھو! شریعت نے اس کے لئے کیسا وقت رکھا ہے کہ حیض میں مت دینا، جب حیض سے پاکی میں آئے اور اس میں بھی صحبت نہ کی ہو؛ تو طلاق دے سکتے ہو، اور اگر صحبت کر لی ہے تو اب اس پاکی کے ایام میں بھی طلاق نہیں دے سکتے۔اگر طلاق دینی ہے تو اب پھر انتظار کرو، جب یہ پاکی کے دن گذر جاویں اور پھر سے حیض آوے اور وہ بھی گذر جاوے پھر پاکی آوے؛ تو اس پاکی میں صحبت کئے بغیر دے سکتے ہو۔شریعت نے ایسا نظام اس لئے رکھا ہے تاکہ آدمی جذبات سے بے قابو ہو کر طلاق نہ دے ڈالے۔ہاں! جس کو واقعتاً ضرورت ہوگی وہی دے۔جذبات والا آدمی تو رات کو طلاق دے کر صبح کو رونے بیٹھ جاتا ہے بلکہ ایک گھنٹے کے بعد کہتا ہے کہ مولوی صاحب! میرے لئے کوئی راستہ نکالو یعنی گھنٹہ بھی پورا نہیں گذرتا اور جناب کے مزاج ٹھکانے آجاتے ہیں۔

اتنے انتظار کے بعد بھی ایک ہی دو

بہر حال! شریعت اتنی دیر تک انتظار اس لئے کروا رہی ہے تا کہ کچھ تو شان ٹھکانے آجائے، لیکن اس کے بعد بھی اگر طلاق دینی ہی ہے تو پھر شریعت کہتی ہے کہ ایک ساتھ دو یا تین طلاق دینے کی اجازت نہیں ہے، صرف ایک طلاق دو۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب واقعتاً سوچ سمجھ کر ہی دے رہا ہے تو پھر بھی ایک ہی کیوں دلوائی؟ جواب یہ ہے کہ جب آپ کی ضرورت ایک طلاق سے بھی پوری ہو جائے گی تو خواہ مخواہ کیوں زیادہ میں پڑتے ہو، آپ کا مقصد تو صرف اتنا ہی ہے کہ اس کو اپنے نکاح سے نکالنا ہے، اب اگر آپ نے ایک طلاق دی تو شریعت یوں کہتی ہے کہ ایک پڑ جائے گی، لیکن جب تک عدت چل رہی ہے وہ عورت آپ کے نکاح سے نکلی نہیں ہے۔ یہ بات ایک یا دو طلاق کی چل رہی ہے، تین طلاق کا حکم دوسرا ہے، اس کو ابھی بیان نہیں کر رہا ہوں، کوئی بھی آدمی کسی غلط فہمی میں نہ رہے۔

ایک طلاق دینے کا فائدہ

اب عدت کتنی ہے؟ تو عدت تین حیض ہے، یعنی جس پاکی میں ایک طلاق دی، اس کے بعد ایک حیض آیا، پھر پاکی آئی، پھر دوسرا حیض آیا، پھر پاکی آئی، اور پھر تیسرا حیض آیا یہاں تک عدت چل رہی ہے۔ اس درمیان میں بھی اگر وہ رجوع کرلے تو کر سکتا ہے، یعنی اگرچہ اس نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا تھا، عورت کے حالات کے پیشِ نظر سوچ سمجھ کر طلاق دی تھی، لیکن اب دیکھا کہ طلاق دینے کے بعد تو اس میں بڑا زبردست انقلاب آ گیا ہے اور ایک دم تبدیلی آ گئی ہے، دوسرے لوگ بھی آ کر کہنے لگے کہ آپ نے خواہ مخواہ ہی اس کو طلاق دی۔ اب وہ کہتا ہے کہ اچھا! ایسا ہے۔ پھر اس نے بھی دیکھا اور دل نے بھی گواہی دی

کہ ہاں! لوگوں کی بات تو برابر ہے؛ تو اب شریعت نے موقعہ دیا ہے کہ عدت پوری ہو اس سے پہلے دو گواہوں کے سامنے وہ آدمی یوں کہہ دے کہ مَیں نے اس سے رجوع کرلیا۔ یا اس سے صحبت کرلے؛ تو رجوع ہوجائے گا اور وہ نکاح سے نہیں نکلے گی۔ البتہ ایک طلاق تو پڑ چکی ہے، اس لئے ایک کا حق تو ختم ہوگیا، اور دو کا حق باقی رہا۔

دیکھو! یہ کتنا اچھا طریقہ بتلایا ہے کہ اگر اس میں پچھتاوا بھی ہو تو اس کا علاج موجود ہے، ایک علاج تو کسی کو پوچھے بغیر ہی ہے، اگر عورت نہ چاہے تب بھی آپ رجوع کرسکتے ہیں۔ ہاں! عدت گذر جائے تو پھر نکاح سے نکل جائے گی۔ لیکن اس کے بعد بھی اگر دونوں ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو نئے سرے سے نکاح ہوسکتا ہے۔ حلالے کا سوال نہیں ہے۔ پھر سے نیا نکاح کرلو۔ اتنا ہے کہ اگر نیا نکاح کرنا ہے تو پھر بیوی سے رضامندی لینی پڑے گی کہ وہ بھی تیار ہے یا نہیں۔ وہ اگر منع کرے کہ مَیں تو اب اس کے پاس نہیں جاؤں گی، بلکہ کسی اور سے نکاح کروں گی؛ تو پھر اس پر زبردستی نہیں کرسکتے۔ اور اگر راضی ہو اور دوبارہ نکاح ہو تو پھر الگ سے مہر بھی دینا پڑے گا۔ یہ حکم عدت کے بعد کا ہے۔ عدت کے اندر تو اس کو پوچھنے کا بھی سوال نہیں ہے۔ شریعت نے کتنی سہولت دی ہے، لیکن لوگ نادانی کی وجہ سے نہ تو وقت دیکھتے ہیں اور نہ کچھ؛ بس! جی میں آیا تو طلاق دے ڈالی؛ پھر روتے پھرتے ہیں۔

ایک ناسمجھ کا قصہ

احمد آباد میں اقتصادیات پر ایک سیمینار ہوا تھا، میرا بھی اس میں جانا ہوا تھا، مسلمان ایک بڑے آفیسر بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ کسی بات پر مسلم معاشرے کی بات چلی، تو انہوں نے ایک قصہ سنایا کہ ایک میاں بیوی ایک بس میں جارہے تھے، لمبا سفر تھا، ان کے

ساتھ میں ایک چھوٹا سا بچہ بھی تھا، کسی وجہ سے وہ بچہ رونے لگا، بیوی اس کو خاموش کرنے کی کوشش میں تھی۔ اور آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بچہ کبھی مچل جاتا ہے تو باپ کی تو کیا طاقت کہ اس کو خاموش رکھ سکے، ماں بھی اس کو خاموش نہیں کرسکتی۔ بچوں کی تربیت اور ان کو پالنا بھی بہت بڑا کام ہے، اگر باپ کو سونپ دیں تو دو طمانچہ مار کر ختم کردے۔ خیر! جب وہ بچہ رونے لگا تو ماں اس کو خاموش کررہی ہے، لیکن وہ چپ نہیں ہورہا ہے، تو میاں صاحب غصہ میں آگئے اور تین طلاق دے ڈالی۔ لوگوں نے کہا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ تو وہ کہنے لگا کہ تم لوگ خاموش رہو، یہ تو میرا حق ہے۔ ارے اللہ کے بندے! ٹھیک ہے تیرا حق ہے لیکن تجھے اپنے منہ سے یہ کہنے کا حق نہیں ہے؟ تو نے اپنا حق تو سمجھ لیا کہ میرا حق ہے لیکن کہاں اور کس طرح استعمال کرنا چاہیے وہ تو تو جانتا نہیں ہے۔ اس لئے میں یہ عرض کررہا تھا کہ شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کیا ہیں ان کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

نظام طلاق پر غیروں کے اعتراض کی اصل وجہ

غیر مسلموں کو مسلمانوں کی طلاقوں پر جو اعتراضات ہوتے ہیں وہ درحقیقت اسلام کے طلاق کے نظام پر نہیں ہوتے بلکہ ہم لوگوں کی نادانیوں پر ہوتے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ اسلام نے یہی طریقہ بتلایا ہے۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو تو حسد بھی ہے، اور وہ بھی اس لئے ہے کہ ان کے مذہب میں ان کو طلاق دینے نہیں ملتی۔ ہندوؤں کے مذہب میں طلاق نہیں ہے۔ اسی طریقہ سے عیسائیوں میں بھی ایک مرتبہ نکاح ہوگیا تو بس وہ عورت ہمیشہ اس کی بیوی رہے گی، یہاں تک کہ شوہر مرجاوے تب بھی اس کی بیوی ہی ہے۔

ہندوؤں کے یہاں پہلے زمانہ میں تو یہ ہوتا تھا کہ کسی کا شوہر اگر مرگیا تو بیوی بھی

شوہر کے ساتھ ساتھ جل جاتی تھی؛ جس کو ''ستی ہونا'' کہتے ہیں۔انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اس ''ستی'' والے طریقہ پر تو پابندی لگادی،لیکن ان کے یہاں بیواؤں کا دوسرا نکاح نہیں ہوتا اس کی اصل وجہ ان کا وہی عقیدہ ہے کہ شوہر کے مرجانے بعد بھی وہ عورت اسی کے نکاح میں رہتی ہے۔اوراب وہ نادانی مسلمانوں میں بھی آئی اور ہمارے سماج میں بھی بیواؤں کا نکاح نہیں کرتے ،حالانکہ وہ توان کا مذہب تھا،ہمارا مذہب تھوڑا ہی ہے۔ہمارے یہاں تو شوہر کا انتقال ہوا تو نکاح ختم ہوگیا،اور جب عدت پوری ہوگئی تو وہ دوسرا نکاح بھی کرسکتی ہے

﴿اسلام نے طلاق کا عجیب وغریب قانون بتایا ہے﴾

مُدُگل کیس جو چلا تھا اس میں کیا تھا؟ بیوی کے ساتھ شوہر کا جوڑ نہیں ہو پارہا تھا، لیکن وہ طلاق بھی نہیں دے سکتا تھا،اور دوسری عورت کے ساتھ تعلقات تھے،اب زندگی بھر اس کے ساتھ بغیر نکاح کے دوستی کے نام سے آنکھیں لڑاتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جس عورت کے ساتھ دوستی کے نام سے زندگی گذار رہا ہے اور سکون حاصل کرر ہا ہے،اس بیچاری کو بیوی کے حقوق حاصل نہیں ہوتے ،اور مال میں سے وراثت بھی نہیں ملتی،اوراس سے بچے پیدا ہوتے تو وہ جائز بچے بھی نہیں کہلاتے۔تواب سوچو کہ کیا بات ہوئی۔یہ تو اسلام کا احسان ہے کہ آپ کو دوسرے نکاح کی ضرورت ہے تو اس نے اجازت دی کہ ہاں! کرسکتے ہو،اوراس کو بھی بیوی کے حقوق حاصل ہوں گے۔اوراگر شوہر مرجائے گا تو جیسے پہلی بیوی کو وراثت ملے گی،اس دوسری کو بھی ملے گی۔اوراس سے جو بچے پیدا ہوں گے وہ جائز اولاد ہوگی تو اس سے بھی جائز اولاد ہی ہوگی۔اب بتاؤ! کہ دانشمندی کس میں ہے؟ یہ تو ہم لوگ اسلامی احکام سے واقف ہی نہیں ہیں۔

پھر اُس کیس کا کیا ہوا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ پھر تنّور والا واقعہ پیش آیا۔شوہر نے بیوی کو تنّور میں کیوں جلایا تھا؟ اس لئے کہ جب تک وہ مرے گی نہیں، اُن کے مذہب کے مطابق اس کے زندہ رہتے ہوئے دوسری عورت سے نکاح کر ہی نہیں سکتے۔اور یہ بات بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ مرد دوسری سے دوستی تو کرسکتا ہے لیکن نکاح نہیں کرسکتا۔اِس واقعہ کی وجہ سے بعض لوگ اسلام لے آئے تھے،اور مدگل والے کیس میں اس کا شوہر مسلمان ہو گیا تھا۔ چونکہ مسلمانوں کے لئے مسلم پرسنل لاء کے نام الگ لو(LAW) ہے،اور اس لو(LAW) کی بنا پر ہندوستان کے دستور نے مسلمان کو اجازت دی ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی کر سکتے ہیں پھر جب وہ خود مرد اسلام لے آیا تو اُس پر ان لوگوں نے کیس کیا،اور اس کا جو فیصلہ آیا تھا مَیں اس وقت اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

خیر! مَیں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ اسلام نے طلاق کا ایسا عجیب وغریب قانون بتایا ہے کہ اگر لوگ اس سے واقفیت حاصل کریں اور اس کے مطابق چلیں تو پھر کوئی اعتراض ہی پیدا نہیں ہوگا۔جو اعتراضات ہو رہے ہیں وہ ہماری کوتاہیوں کی بنا پر ہیں،ہم ہی اس قانون کا غلط طریقہ سے استعمال کرتے ہیں۔

گمراہ رہبر

لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جب تک تین طلاق نہ دیں، وہاں تک طلاق پڑتی ہی نہیں ہے۔تو بھائیو! سن لو،ایک طلاق دینے سے بھی طلاق پڑ جاتی ہے۔یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بعض جگہ تو بیچارہ مسئلہ پوچھتا ہے کہ ایسے حالات ہیں اور مجبور ہو گیا ہوں اور طلاق دینی ہے تو کیا کروں اور کس طرح دوں؟ جب اس کو طریقہ بتایا جاتا ہے کہ اگر طلاق دینی ہی ہے تو ایک

دواوراس طرح دو۔اب وہ اس کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہےتو سماج میں وڈیل (ویڈیل) بھی ایسے لوگ بن گئے ہیں کہ اللہ کی پناہ! وہ کہتے ہیں کہ تین دو، ایک نہیں پڑتی، اور وہ زبردستی کرکے تین دلواتے ہیں، یہ تو ایسا حال ہوگیا ہے:۔

اذاکان الغراب دلیل قوم ❁ یھدیھم الیٰ طریق الھالکینا

کہ جب کوا کسی قوم کو راستہ بتائے گا تو ہلاکت کے گھڑے میں ڈال دے گا۔ایسے وڈیل ملیں گے جو مسئلے سے واقف نہ ہوں، تو پھر قوم کا کباڑا ہوجائے گا۔اس لئے وڈیلوں کو بھی چاہیے کہ مسئلوں سے واقفیت حاصل کریں، اپنے طور پر فیصلے نہ کریں، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔اور جب وڈیل زبردستی کرکے تین طلاق دلواتے ہیں، اور سب راستہ بند ہوجاتے ہیں تو پھر مفتیوں کے پاس دوڑتے ہیں اور حلالے کے بہانے نکالتے ہیں (نعوذ باللہ من ذلک)۔ حالانکہ ایسے حلالے کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔

اصل حلالہ کیا ہے؟

لوگ حلالہ کا مطلب بھی نہیں سمجھتے، اس لئے اس کی بھی تفصیل بتادوں کہ دراصل حلالہ کیا ہے؟ دیکھو! جس شوہر نے تین طلاق دی تو شریعت اس عورت سے یوں کہتی ہے کہ اب اس مرد کے ساتھ تیرا نکاح نہیں ہوسکتا۔گویا اس عورت کو بتلادیا کہ وہ اگر تیرے ساتھ محبت رکھتا ہوتا، تو اپنا راستہ کیوں بند کردیتا؟ محبت تھی تو طلاق ہی نہ دیتا۔یا اگر دیتا تو ضرورت کی وجہ سے ایک دیتا۔لیکن جب تین دے دی تو اللہ تعالیٰ نے اس عورت سے کہہ دیا کہ اب یہ مرد تیرا شوہر بننے کی صلاحیت کھوچکا ہے، اس لئے اب اس مرد کے ساتھ تیرا نکاح نہیں ہوگا اصل مسئلہ تو یہی ہے۔

اب اس کے ساتھ نکاح نہیں کرے گی تو دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے گی، اس لئے کہ اس کے ساتھ تو نکاح ہونے کا ہی نہیں ہے، اس لئے اس نے دوسرے مرد سے نکاح کرلیا اور دونوں بالکل الگ ہوگئے۔ جب نکاح ہوتا ہے تو اس میں باقاعدہ دستخط کی جاتی ہے۔ اب آپ لوگ ایک بات بتاؤ کہ نکاح کا ہے کے واسطے کیا جاتا ہے؟ کیا طلاق دینے کے واسطے کیا جاتا ہے؟ نہیں! بلکہ ساتھ مل کر زندگی گذارنے کے لئے کرتے ہیں۔ جتنے بھی نکاح ہوتے ہیں اس میں نکاح کرنے والے کی نیت کیا یہ ہوتی ہے کہ ایک رات گزار کر طلاق دے دوں گا؟ اگر ایسی نیت ہے تو یہ نکاح تھوڑا ہی ہے، یہ تو دھوکہ دینا ہے۔ تو اب اس نے بھی نکاح اسی نیت سے کیا کہ اس دوسرے شوہر کے ساتھ زندگی گزارے گی، اور دولہے صاحب نے بھی اس کے ساتھ نکاح اسی نیت کیا تھا۔ دونوں نے کچھ زندگی تو میاں بیوی کی طرح گذاری، لیکن اتفاق کی بات کہ بیگم صاحبہ کو دولہے صاحب راس نہیں آئے، یا میاں صاحب کو بیوی راس نہیں آئی، جو بھی ہو، انھوں نے بھی اس کو طلاق دے دی۔ یہ سب اتفاقاً ہوا۔ اب سوال پیدا ہوا کہ وہ دونوں تو پھر سے خالی ہوئے ہیں۔ اب مرد یوں کہتا ہے کہ ویسے تو یہ میرے لئے حرام ہوگئی تھی، لیکن اُس نے دوسرا شوہر کیا تھا اور وہ بھی نمٹ گیا ہے۔ اب ہم دوبارہ جڑ سکتے ہیں یا نہیں؟ تو شریعت کہتی ہے کہ ہاں! اب تم دونوں جڑ سکتے ہو۔ یہ اصل حلالہ ہے۔ حلالہ کا اصل مطلب یہ ہے کہ وہ طریقہ جس سے وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجاتی ہے۔

بھاڑوتی بکرا

لیکن پہلے سے باقاعدہ اسکیم بنا کر کسی کو ٹھوک ٹھاک کر تیار کرنا اور اس سے کہنا کہ

دیکھ! نکاح کے بعد ایک مرتبہ صحبت کرکے اس کو طلاق دیدیجیو۔ تو ایسے حلالہ پر تو حدیثِ پاک میں لعنت آئی ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ (ابوداؤد ۲۰۷۶)﴾ حلالہ کرنے والا اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا یعنی پہلا شوہر؛ دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے اس حلالہ کرنے والے دوسرے شوہر کو جس کے ساتھ شرطیں کرکے حلالہ کروایا جاتا ہے ''بھاڑوتی بکرا'' کہا ہے۔ اور بزرگوں سے یوں سنا ہے کہ اس طرح سے جو شرطی حلالہ کرنیوالے ہوتے ہیں یعنی محلل بنتے ہیں تو عام طور پر آخری زندگی میں ان کو جنون کی نوبت آتی ہے۔ ایسے واقعات بھی سنے ہیں۔

خیر! لیکن اگر کسی نے شرطی حلالہ کرلیا تو اگرچہ اس نے غلط کام کیا اور وہ گنہگار ہوگا لیکن مسئلہ کی رو سے وہ عورت پہلے شوہر کے لئے حلال ہوجائے گی۔ جیسے حیض کی حالت میں طلاق دینے کی ممانعت ہے، تمام ائمہ منع کرتے ہیں، قرآن میں ہے، حدیث میں آیا ہے، لیکن اگر کسی نے دے دی تو پڑ جائے گی۔ ابھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا واقعہ آیا تھا۔

﴿لوگوں کا ایک اشکال اور اس کا جواب﴾

بہرحال! ہمارے سماج میں جو حلالے کئے جاتے ہیں، اس کی شریعت نے تعلیم نہیں دی ہے۔ اور انہیں حلالوں کو دیکھ کر لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ ہندو تو کرتے ہی ہیں، مسلمانوں میں بھی پڑھے لکھوں کو سوال ہوتا ہے، اور ہونا بھی چاہیے۔ شریعت نے کیا حکم دیا ہے وہ تو آپ نے سن لیا، اور لوگ جو کرتے ہیں وہ کتنا غلط ہے؛ وہ بھی آپ کو معلوم ہوگیا۔

اب بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس میں عورت کا کیا قصور ہے کہ اس کو دوسرے کے نکاح میں جانے دیا جائے اور وہ صحبت کرے اور اس کے بعد طلاق دیوے؟ تو ہم کہتے

ہیں کہ عورت کا کوئی قصور نہیں ہے۔اس عورت کو تو اللہ تعالیٰ نے یوں کہا ہے کہ اس نالائق کے نکاح میں مت رہنا، ہم تو منع کرتے ہیں، لیکن اسی کو دوبارہ اس کے پاس جانا ہے تو ہم کیا کریں؟ اللہ تعالیٰ نے تو منع کیا تھا اور اس کے لئے اِس کو حرام کر دیا تھا، لیکن وہی تیار ہے کہ مجھے تو اس سے نکاح کرنا ہے۔

دوسرے کو دی گئی سزا خود پر لاگو ہوئی

اور جب بات آئی ہے تو پوری ہی کر دوں۔شریعت نے طلاق کوئی سزا دینے کے لئے نہیں رکھی ہے، بعض لوگ طلاق انتقامی جذبے سے دیتے ہیں، عورت کو سزا دیتے ہیں۔تو حقیقت تو یہ ہے کہ وہ سزا اس کو نہیں دیتے، اپنے آپ کو دے رہے ہیں۔اس کا پتہ کچھ دنوں کے بعد چلتا ہے۔جب مارا مارا پھرتا ہے اس وقت پتہ چلتا ہے اور اس وقت کھوپڑی میں آتا ہے کہ اوہ ہو! مَیں تو اس کو سزا دینا چاہتا تھا، سزا تو خود مجھ پر ہی لاگو ہوگئی۔

طلاق تو ضرورت کی چیز ہے، ضرورت ہو تب ہی دو۔جب دونوں کو معلوم ہوجائے کہ ہماری زندگی کی گاڑی کسی حساب سے چل سکتی نہیں ہے، ہم ایک ساتھ رہ کر زندگی گذار نہیں سکتے۔شوہر کو بھی اور عورت کو بھی یہ یقین ہوجائے؛ تو اب ان دونوں کو نکاح میں باقی رکھنا بھی ایک طرح کی ناانصافی ہوگی۔جن مذاہب میں طلاق کا قانون نہیں ہے وہ اسی مصیبت میں مبتلا ہیں، پھر تنّور والے واقعات پیش آتے ہیں۔تو شریعت نے یوں کہا کہ اس کی ضرورت ہے تو طلاق دو، اور طلاق کا ایک طریقہ بھی بتا دیا۔

طلاق کوئی کھیل تماشہ نہیں

اب لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ طلاق تین دینے سے ہی پڑے گی، ایک دینے سے نہیں

پڑے گی۔ تو میں اپنے سبق کے دوران طلباء سے کہا کرتا ہوں کہ اب تو جو اسلامی تنظیمیں ہیں وہ اور مدرسے والوں کو، اور دارالافتاء والوں کو، یا اصلاح معاشرہ کی کوشش کرنے والوں کو چاہیے کہ پبلی سیٹی بورڈ کرائے پر لے کر اس پر یہ لکھوائیں کہ:۔

''ایک طلاق بھی پڑ جاتی ہے، تین کی ضرورت نہیں، اور ایک کی بھی ابھی نہیں''

تاکہ مسلمانوں کے ذہنوں میں بیٹھے کہ طلاق کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے، بلکہ یہ تو ایک ضرورت کی وجہ سے رکھی گئی ہے۔

بہرحال! طلاق کی نسبت سے بات آئی تو میں نے مناسب سمجھا کہ کچھ باتیں کہہ دی جائیں، تاکہ آپ حضرات کو اصل مسئلہ سے واقفیت حاصل ہو جائے، اور کبھی کوئی آدمی آپ کے سامنے اس بارے میں اعتراض کرے تو آپ پریشان نہ ہو جائیں۔ یہی ہے طلاق کے احکام کا خلاصہ جو مختصر طور پر بیان کیا گیا اور آپ نے سنا۔ اب یہ سب باتیں آپ کے ذہنوں رہنی چاہئیں، اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی کسی بھی موقعہ پر ضرورت پیش آسکتی ہے۔

ہماری غفلت کی انتہاء ہے

آج کل تو حال یہ ہو چکا ہے کہ غیر مسلمین اعتراض کرتے ہیں، گاڑی میں سفر کے دوران کوئی مل جاتا ہے اور پوچھتا ہے کہ طلاق کا تمہارے مذہب میں کیا درجہ ہے؟ تو جناب کو معلوم نہیں ہوتا۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اچھا بھائی! اپنے بڑوں سے پوچھ کر بتائیو۔ جب اس نے کہہ رکھا ہے پھر بھی پوچھنے کی فرصت نہیں ہے۔ بھائی! آپ پوچھ کر اس کو بتاؤ، ہوسکتا ہے کہ کوئی بات سامنے آجائے۔ وہ سامنے چل کر اس سے پوچھتا ہے، لیکن یہ پوچھ کر بتاتا ہی نہیں

ہے۔ارے بھائی! یہ فریضہ تو ہمارا تھا کہ اسلام کی خوبیاں اور اسلام کی دعوت لے کر ہم جاتے اور جب وہ کسی نسبت سے سامنے چل کر پوچھنے آیا تو اس کو بتانا ہمارا دوہرا فریضہ ہو گیا۔اور جب اس نے مہلت دی اور کہا کہ نہیں جانتے تو اپنے علماء اور مفتیوں سے پوچھ کر بتانا؛ تب بھی ہم فائدہ نہیں اٹھاتے۔تو یہ ہماری بہت بڑی کوتاہی ہے۔اگر یہ ساری چیزیں ان کے سامنے رکھیں گے تو سمجھ لیجئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے،ان شاء اللہ تعالیٰ اس میں کوئی انگلی رکھنے کی گنجائش نہیں ہے،لیکن ہماری ناواقفیت، نادانی، جہالت اور غفلت کے نتیجے میں ان کو اسلامی قانون پر اعتراض کا موقعہ ملتا ہے۔

آمدم برسرِ مطلب

خیر! تو مَیں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کرر ہا تھا کہ انھوں نے اپنی بہن کا نکاح ایک آدمی سے کیا، انہوں نے ایک طلاق دی، عدت کے اندر رجوع کر سکتے تھے لیکن رجوع نہیں کیا یہاں تک کہ عدت پوری ہوگئی اور وہ ان کے نکاح سے نکل گئی تو اب وہ دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی تھیں، اس لئے ان کے لئے پیغام آنے لگے۔اِنہوں نے بھی پیغام دیا، چونکہ ایک طلاق دی تھی، اس لئے عدت کے بعد بھی نکاح کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے دھیان نہیں دیا۔ان کی بہن کا جی بھی ادھر ہی مائل تھا اور وہ بھی یہی چاہتی تھیں کہ ان کے ساتھ ہی نکاح ہو۔لیکن حضرت معقل رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ اس سے تو نکاح کراؤں گا ہی نہیں۔ چونکہ مَیں نے اپنی بہن اس کے نکاح میں دی تھی تو طلاق کیوں دی، اور پھر رجوع کر سکتے تھے لیکن نہیں کیا، پھر دوبارہ جب نکاح کا وقت آیا تو اب پیغام دیتے ہیں؟ ان سے تو نکاح کرانے کا ہی نہیں، انہوں نے منع کر دیا۔لیکن شریعت نے

اجازت دی تھی اور نکاح ہوسکتا تھا، اور اللہ تعالیٰ کو یہ بات قیامت تک آنے والوں کو بتلانی تھی اس لئے یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ﴾ اللہ تعالیٰ نے اس میں کہا کہ جب وہ عورت پہلے شوہر سے نکاح کرنا چاہتی ہے اور شریعت میں بھی اس کی اجازت ہے تو آپ آڑ مت بنو، اور مت روکو بلکہ پھر سے نکاح کرادو۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے حضرت معقل رضی اللہ عنہ کو بلایا اور یہ آیت پڑھ کر سنائی، اسی مجلس میں اسی وقت ان کو بلا کر نکاح کر دیا، ذرّہ برابر بھی ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں کی۔ (المعجم الکبیر ۲۔۱۶۸۷)

بہر حال! یہ حضرات صحابۂ کرام تھے، یہاں بھی حضور اکرم ﷺ نے جب ان صحابی سے یہ سوال کیا کہ کون ہے جو اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ مَیں نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ ایک صحابی حضور کی زبانِ مبارک سے یہ سن لے، تو پھر کیا دیر لگتی تھی۔ فوراً انھوں نے کہا کہ اللہ کے رسول! میں نے یہ کہا تھا، لیکن اب وہ جو چاہے اس کے لئے وہ ہے یعنی وہ میرے قرضے میں سے جتنا معاف کرانا چاہے؛ میری طرف سے اجازت ہے۔ انہوں نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہیں لگائی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان حضرات جیسے جذبات کا کوئی حصہ نصیب فرمادے
اور اسلامی ہدایات کی صحیح فہم وسمجھ عطا فرمادے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

صلح کرانے والا اس بات کے انتظار میں نہ رہے

۲۵۱. عن أبی العباس سهل بن سعدالساعدی رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ بَلَغَهُ أَنَّ بَنِىْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ كَانَ بَيْنَهُمْ شَرٌّ،فَخَرَجَ رسولُ اللهِ ﷺ يُصْلِحُ بَيْنَهُمْ فِىْ أُنَاسٍ مَعَهُ،فَحُبِسَ رسول اللهِ ﷺ،وَحَانَتِ الصَّلَاةُ،فَجَآءَ بِلَالٌ اِلٰى أَبِىْ بَكْرٍ رضی اللہ عنہ فَقَالَ:يَاأَبَابَكْرٍ!اِنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَدْحُبِسَ وَحَانَتِ الصَّلَاةُ،فَهَلْ لَكَ أَنْ تَؤُمَّ النَّاسَ؟قَالَ:نَعَمْ اِنْ شِئْتَ،فَأَقَامَ بِلَالٌ الصَّلَاةَوَتَقَدَّمَ أَبُوْبَكْرٍفَكَبَّرَوَكَبَّرَالنَّاسُ،وَجَآءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَمْشِىْ فِى الصُّفُوْفِ حَتّٰى قَامَ فِى الصَّفِّ،فَأَخَذَالنَّاسُ فِى التَّصْفِيْقِ،وَكَانَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ لَايَلْتَفِتُ فِىْ صَلَاتِهٖ، فَلَمَّاأَكْثَرَ النَّاسُ التَّصْفِيْقَ؛اِلْتَفَتَ،فَاِذَارَسُوْلُ اللهِ ﷺ،فَأَشَارَاِلَيْهِ رسول الله ﷺ،فَرَفَعَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ يَدَهُ فَحَمِدَاللهَ،وَرَجَعَ الْقَهْقَرِى وَرَاءَهُ حَتّٰى قَامَ فِى الصَّفِّ،فَتَقَدَّمَ رسولُ اللهِ ﷺ،فَصَلّٰى لِلنَّاسِ،فَلَمَّافَرَغَ أَقْبَلَ عَلٰى النَّاسِ فَقَالَ:أَيُّهَاالنَّاسُ مَالَكُمْ حِيْنَ نَابَكُمْ شَىْءٌ فِى الصَّلَاةِ أَخَذْتُمْ فِى التَّصْفِيْقِ؟اِنَّمَاالتَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ.مَنْ نَابَهُ شَىْءٌ فِى صَلَاتِهٖ فَلْيَقُلْ:سُبْحَانَ اللهِ، فَاِنَّهُ لَا يَسْمَعُهُ أَحَدٌحِيْنَ يَقُوْلُ:سُبْحَانَ اللهِ،اِلَّااَلْتَفَتَ.يَاأَبَابَكْرٍ!مَامَنَعَكَ أَنْ تُصَلِّىَ بِالنَّاسِ حِيْنَ أَشَرْتُ اِلَيْكَ؟فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ:مَاكَانَ يَنْبَغِىْ لِاِبْنِ أَبِىْ قُحَافَةَ أَنْ يُصَلِّىَ بِالنَّاسِ بَيْنَ يَدَىْ رسولِ اللهِ ﷺ. (متفق عليه)

بیان چل رہا تھا کہ اگر لوگوں میں تعلقات بگڑے ہوئے ہیں، آپس میں جھگڑا اور نااتفاقی ہے تو ان کے جھگڑے کو ختم کرانا اور ان کے درمیان اتفاق اور صلح کرانے کے لئے کوشش کرنے کی کیا فضیلت ہے۔ کچھ روایتیں پیش کی تھیں، آج ایک اور روایت لائے ہیں جس میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ جھگڑے کو ختم کرانے کے لئے بنفس نفیس تشریف لے گئے۔

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی کہ بنوعمرو بن عوف کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا ہے۔ یہ قبیلہ قباء میں آباد تھا، مسجدِ نبوی- جہاں نبی کریم ﷺ قیام فرماتے تھے وہاں- سے ایک میل دور ہے۔ اُس زمانہ میں وہ ایک الگ محلّہ اور الگ آبادی تھی جبکہ آج کل تو وہ مدینہ منورہ ہی کے اندر شامل ہو چکا ہے۔ جب حضور ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہاں جو قبیلہ آباد ہے اس کے درمیان کچھ جھگڑا ہو گیا ہے تو نبی کریم ﷺ کچھ آدمیوں کو اپنے ساتھ لے کر وہاں تشریف لے گئے تاکہ ان کے درمیان صلح کرائیں۔

یہاں اس روایت کو صرف اسی نسبت سے پیش کیا ہے کہ دیکھو! جب آپ ﷺ کو یہ معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے درمیان آپس میں جھگڑا ہوا ہے تو نبی کریم ﷺ باایں جلالتِ شان اور بلندیٔ مرتبہ اس جھگڑے کو ختم کرانے اور ان کے درمیان صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے۔ آپ کو دعوت نہیں دی گئی تھی اور آپ کو بلانے کے لئے بھی کوئی نہیں آیا تھا، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی بڑا آدمی ہو اور اس کو جب یہ معلوم ہو کہ مسلمانوں کی دو جماعتوں کے درمیان جھگڑا ہوا ہے اور اس کا خیال یہ ہو کہ میرے کوشش کرنے سے اور ان کے درمیان کے اختلاف کو دور کے لئے میرے سعی کرنے سے جھگڑا ختم

ہو جائے گا تو اس کو چاہیے کہ اس بات کے انتظار میں نہ رہے کہ اگر کوئی مجھے بلانے کے لئے آوے گا؛ تب ہی مَیں جاؤں گا، بلکہ اس کو بذاتِ خود جا کر اس کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ بھی تشریف لے گئے، آپ نے وہاں جا کر جھگڑا ختم کر دیا اور صلح کرا دی۔

ان لوگوں نے نبی کریم ﷺ کو میزبانی کے لئے روک لیا۔ جیسے جب کوئی بڑا آدمی کہیں جاتا ہے تو وہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ ذرا ٹھہر جائیے اور خاطر تواضع کرتے ہیں، اسی طرح حضور اکرم ﷺ وہاں روک لئے گئے، وہاں والوں نے آپ کی خاطر تواضع کی نیت سے آپ کو روک لیا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں جو معنٰی بیان کیا ہے وہ یہی ہے ﴿حُبِسَ: أَمْسَكُوْهُ لِيُضِيْفُوْهُ﴾ انہوں نے میزبانی کے واسطے حضور ﷺ کو ٹھہرالیا اور نماز کا وقت آ گیا۔

﴿حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لئے یہ بڑی سعادت کی چیز تھی﴾

آپ ظہر کے بعد تشریف لے گئے تھے اور جاتے وقت حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو تاکید بھی فرما گئے تھے کہ اگر عصر کا وقت آ جائے اور مَیں نہ پہنچوں تو ابوبکر سے کہنا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں۔ چنانچہ جب نماز کا وقت آیا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے مطابق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ اے ابوبکر! نبی کریم ﷺ روک لئے گئے ہیں اور ابھی تک تشریف نہیں لائے اور نماز کا وقت ہو چکا ہے، کیا آپ لوگوں کو نماز پڑھائیں گے؟ اور یہ بھی بتا دیا کہ حضور ﷺ تاکید فرما کر گئے ہیں کہ نماز کا وقت آوے اور مَیں نہ پہنچوں تو ابوبکر سے کہنا کہ وہ نماز پڑھا دیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ٹھیک ہے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے نماز کے لئے اقامت اور تکبیر کہی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ امامت کے لئے آگے بڑھے اور اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرا دی۔ لوگوں نے بھی اللہ اکبر کہا اور نماز شروع ہو گئی۔

اب نماز شروع ہوئی اور نبی کریم ﷺ تشریف لائے، حضرت ابوبکر تو نماز شروع کروا چکے تھے، حضور اکرم ﷺ صفوں کو چیرتے ہوئے اگلی صف میں آکر کھڑے ہوگئے، جب حضور ﷺ تشریف لے آئے تو حضرت ابوبکر نماز پڑھانے میں مشغول تھے، اوران کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ تشریف لاچکے ہیں تو لوگوں نے تالیاں بجانا شروع کردی۔ اس لئے کہ لوگوں یہ معلوم نہیں تھا کہ نماز کے درمیان امام کو کسی بات کی طرف توجہ دلانے کے لئے کیا شکل اختیار کی جائے، لوگوں کو اپنے طور پر اپنے خیال میں یہی طریقہ مناسب معلوم ہوا تو انہوں نے تالی بجا کر حضرت ابوبکر کو متوجہ کرنا شروع کیا، گویا وہ یہ بتلانا چاہتے تھے کہ نبی کریم ﷺ تشریف لا چکے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی عادت یہ تھی کہ نماز میں اِدھر اُدھر بالکل نہیں دیکھتے تھے۔ جب لوگوں نے تالی بجانا شروع کیا تب بھی انہوں نے کوئی دھیان نہیں دیا لیکن جب لوگوں نے بہت زیادہ تالیاں بجائیں اور یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا تو انہوں نے ایک نظر دوڑائی تب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ تشریف فرما ہیں۔ حضور ﷺ نے بھی دیکھا کہ ابوبکر دیکھ رہے ہیں اور اب پیچھے آئیں گے اس لئے حضور ﷺ نے اشارہ کیا۔ گویا آپ ﷺ یہ بتلانا چاہتے تھے کہ وہیں کھڑے رہو اور نماز پوری کراؤ۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے یہ بڑی سعادت اور شرف کی بات تھی کہ حضور ﷺ نے خود تشریف فرما ہونے کے باوجود ان سے یوں کہا کہ آپ نماز پوری کرا دیجیے، اس لئے حضرت ابوبکر نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر الحمدللہ کہا یعنی اللہ تیرا شکر ہے کہ تیرے حبیب کو مجھ پر اتنا اعتماد ہے کہ خود تشریف فرما ہوتے ہوئے مجھے نماز پوری کرانے کے لئے فرما رہے ہیں۔ گویا یہ ایک سعادت اور فخر کی چیز تھی جس پر اللہ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرنا ہی چاہیے، اس لئے انہوں نے الحمدللہ کہا اور پھر پیچھے ہٹنا شروع کیا، یہاں

تک کہ صف میں آ کر کھڑے ہوگئے۔ جب وہ پیچھے آ گئے تو نبی کریم ﷺ آگے بڑھے اور آپ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے، اس لئے کہ جب نئے نئے مسائل پیش آتے ہیں تو ان میں رہنمائی کی جاتی ہے اور آج یہ پہلا موقعہ تھا کہ نماز کے دوران ایسا معاملہ پیش آیا اور لوگوں نے امام کو متوجہ کرنے کے لئے اپنے طور پر یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ تالیاں بجائیں، اب آئندہ کے لئے کیا ہدایت دی جائے تو نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو بتایا کہ اے لوگو! کیا بات ہے کہ نماز میں جب کوئی بات پیش آتی ہے تو تم تالیاں بجانا شروع کرتے ہو، جب کوئی معاملہ پیش آئے اور امام کو متوجہ کرنا ہو تو تالیاں بجانا عورتوں کے لئے ہے۔

امام سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے کس طرح متوجہ کیا جائے؟

نبی کریم ﷺ نے ﴿اِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ﴾ جو فرمایا یہ دوسری روایت میں بھی ہے ایک اور روایت میں ہے ﴿اِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ وَالتَّسْبِيْحُ لِلرِّجَالِ﴾ مردوں کے لئے تو تسبیح یعنی سبحان اللہ کہنا ہے، جب نماز کے دوران کوئی معاملہ پیش آوے اور امام سے کوئی غلطی ہو جائے اور اس کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنا ہو مثلاً امام کو بیٹھ جانا چاہیے تھا لیکن وہ کھڑا ہو گیا، یا قراءت میں کوئی غلطی ہو گئی، اب امام کو اس طرف متوجہ کرنا ہو تو نبی کریم ﷺ نے بتلایا کہ مردوں کو سبحان اللہ کہنا چاہیے۔ اور عورتوں کے لئے فرمایا کہ وہ تالی بجائیں۔

اب ایک مسئلہ ائمہ کے درمیان زیر بحث آیا کہ اگر امام کو متوجہ کرنا ہو تو اس کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ تو تمام حضرات ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ سب اس پر متفق ہیں کہ مرد تو اس کے لئے سبحان اللہ کہے، لیکن

عورت کیا کہے تو اس معاملہ میں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ عورت بھی سبحان اللہ کہے یعنی وہ بھی تسبیح کے ذریعہ سے ہی امام کو اس کی غلطی پر متنبہ کرے۔ اور دوسرے حضرات ائمہ فرماتے ہیں کہ عورت تالی بجائے اور تالی کے لئے بھی یوں نہیں (ہتھیلی کو ہتھیلی پر نہ مارے) بلکہ یوں بجایا جائے (ایک ہاتھ کی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی پشت پر مارے) اس طرح تالی بجائے کہ آواز پیدا ہو، اور امام کو اس کے ذریعہ متوجہ کر دیا جائے۔

امام مالکؒ اپنی بات کی توجیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ روایت میں ﴿اِنَّمَا التَّصْفِيْقُ لِلنِّسَآءِ﴾ آیا ہے، اور حضور ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ تالیاں بجانا عورتوں کا کام ہے یعنی مردوں کے لئے یہ انداز اختیار کرنا ایک عیب کی چیز ہے، جیسے کہتے ہیں کہ بزدلی عورت کا کام ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت بزدلی اختیار کرے۔ ایسے ہی یہاں بھی کہا گیا ہے کہ تالیاں بجانا عورتوں کا کام ہے۔ امام مالکؒ یہ فرماتے ہیں کہ عورت بھی نماز میں تالی نہیں بجائے گی، بلکہ سبحان اللہ ہی کہے گی۔ خیر! پھر حضور ﷺ نے آگے فرمایا کہ اگر کسی کو نماز میں کوئی بات پیش آجائے اور امام کو متوجہ اور باخبر کرنا ہو تو سبحان اللہ کہے، جب نمازی سبحان اللہ کہے گا تو جس کو وہ متوجہ کرنا چاہتا ہے وہ متوجہ ہو جائے گا۔

﴿ابو قحافہ کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ......﴾

حضور ﷺ نے لوگوں کو یہ نصیحت فرمائی پھر نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر کی طرف متوجہ ہوئے، کیونکہ حضرت ابوبکر کو بھی تو حضور نے اشارہ فرمایا تھا کہ نماز پوری کرا دیجیے، اس کے باوجود وہ پیچھے ہٹ گئے تھے اور نماز پوری نہیں کرائی تھی۔ تو حضور ﷺ نے ان سے پوچھا کہ اے ابوبکر! جب مَیں نے تم کو اشارہ کے ذریعہ سے بتلا دیا تھا کہ نماز پوری کرا دو پھر تم نے نماز

پوری کیوں نہیں کی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں عرض کیا کہ ابوقحافہ کے بیٹے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لوگوں کو نماز پڑھائے۔ اگرچہ آپ نے تو فرمادیا تھااورآپ کا یہ فرمانا میرے لئے سعادت وخوش بختی اور فخر کی چیز تھی، لیکن آپ کے ہوتے ہوئے مَیں لوگوں کی امامت کراؤں؛ یہ میرے لئے مناسب نہیں ہے،اس لئے میں نے امامت نہیں کرائی۔ حضرت ابوبکر بھی سمجھ گئے تھے کہ آپ کا یہ اشارہ واجب کے طور پر نہیں تھا، بلکہ صرف اجازت دی تھی کہ نماز پوری کرادیجیے۔ جب وجوبی حکم نہیں تھا اس لئے پیچھے ہٹ گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جگہ خالی کردی۔

بہرحال! یہاں تو یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ دیکھئے! قبیلہ بنوعمرو بن عوف کے درمیان جو معاملہ پیش آیا تھا کہ ان کے درمیان جھگڑا ہوا تھا، اس جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے اور صلح کرانے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لے گئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی قوم، سماج، برادری اور بستی میں کوئی ایسا بڑا آدمی ہو اور اس کو یہ معلوم ہو کہ بستی کے کچھ لوگوں میں جھگڑا ہوا ہے اور اس کے جانے سے وہ ختم ہوجائے گا اور صلح ہوجائے گی تو اس کو چاہیے کہ خود جاوے اور جھگڑے کو ختم کرانے کی کوشش کرے۔ اُن کی طرف سے بلائے جانے کا انتظار نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حضور پاک کی ہدایات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے

فَضْلُ ضُعُفَةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْفُقَرَآءِ وَالْخَامِلِيْنَ

خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت

مجلس ﴿۱﴾

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَا مَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَامُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً. أمابعد:—

أعوذباللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

وَاصْبِرْنَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِوَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَاتَعْدُعَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا. (الکھف . ۲۸)

باب کا عنوان

یہ باب قائم کر کے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کمزور اور غریب قسم کے ایسے لوگ جن کی سماج کے اندر کوئی حیثیت نہیں ہوتی، عام طور پر لوگ ان کو حقیر سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے ساتھ تحقیر کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ یہ بات کوئی ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت وثروت عطا فرمائی، عزت وشہرت عطا فرمائی یا کوئی منصب و عہدہ عطا فرمایا؛ وہی بڑا ہو گیا۔ اور بے چارہ جس کے پاس یہ چیزیں نہیں، نہ دولت ہے، نہ عزت ہے، نہ شہرت ہے نہ کوئی منصب وعہدہ ہے؛ تو وہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس کو کیا قبولیت حاصل ہے اس کو کوئی نہیں جانتا۔ اس لئے جو دنیوی اسباب کسی کے لئے بڑائی کے اور اونچا مقام ہونے کے ہو سکتے ہیں اگر کسی کو وہ میسر نہیں ہیں تو اس کی وجہ سے ان کے ساتھ تحقیر کا اور معمولی سمجھنے کا اور ذلت کا معاملہ

نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کے متعلق بھی دل کے اندر اکرام وعزت کے جذبات ہونے چاہئیں اوران کے ساتھ بھی عزت واحترام کا معاملہ کرنا چاہیے۔

یہی لوگ اہلِ مجلس قرار دیئے گئے

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْهُمْ تُرِیْدُ زِیْنَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا﴾ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خاص طور پر حکم دیا کہ اے نبی! آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھیے جو صبح وشام اللہ کو یاد کرتے اور پکارتے ہیں اوران کا مقصد اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، اور آپ کی آنکھیں ان سے اِدھر اُدھر نہ ہوں یعنی یہ سمجھ کر کہ یہ معمولی لوگ ہیں دوسرے لوگ جو دنیوی اعتبار سے اہلِ ثروت، اہلِ منصب اور اہلِ شہرت ہیں ان کی طرف آپ کی نگاہیں آگے بڑھنے لگے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ آپ دنیوی زندگی کی زیب وزینت کے خاطر ان سے اپنی نگاہیں نہ پھیرلیں۔ گویا اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو تاکید فرمائی کہ آپ اپنے آپ کو ایسے لوگوں کے اندر لگائے رکھیے اور آپ کو ایسے ہی لوگوں میں رہنا چاہیے۔ گویا آپ کے لئے اللہ تبارک وتعالی نے اہلِ مجلس ان لوگوں کو قرار دیا۔

ان کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا

ایک اور جگہ پر ارشاد ہے ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو صبح وشام پکارتے ہیں اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے؛ آپ ایسے لوگوں کو اپنی مجلس سے نہ نکالیے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ مشرکین مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کو یہ کہلوایا کہ اصل

میں ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کے پاس آویں، آپ کی خدمت میں حاضری دیں اور آپ کی باتیں سنیں، لیکن آپ کے پاس بیٹھنے والے یہی کمزور، غریب غرباء اور مسکین لوگ ہیں، آپ کی مجلس میں ہمیشہ وہی لوگ بیٹھے رہتے ہیں اور حلقہ جمائے رہتے ہیں، اس لئے ہم اگر آویں اور ان کے ساتھ بیٹھیں تو اس میں ہماری ذلت وتوہین اور بے عزتی ہے، اس لئے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے سامنے دین کی کچھ باتیں پیش کریں، تو ایسا کیجیے کہ ہمارے لئے الگ مجلس مقرر کیجیے، جس میں ایسے لوگوں کو آنے کی اجازت نہ ہو، اُن کے لئے الگ مجلس ہو۔ اگر آپ ایسا کریں تو ہم آپ کی مجلس میں حاضری کے واسطے اور آپ کی باتیں سننے کے واسطے تیار ہیں، اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ اے نبی! یہ فقراء، مساکین اور غریب وکمزور لوگ جو اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبح وشام اس کو پکارتے ہیں؛ ان کو اپنی مجلس سے نہ نکالنا (مسلم شریف۔ ۶۳۹۴) ان مالداروں، رؤساء اور ان بڑے بڑے لوگوں کو جو قوم کے پٹیل اور چودھری سمجھے جاتے ہیں اگر آپ سے فائدہ حاصل کرنا ہے اور آپ سے وہ لوگ استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو اِن کی موجودگی میں ہی وہ لوگ بھی آویں، طلب لے کر یہ بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور وہ بھی بیٹھے ہوئے ہوں۔ اُن کی خاطر اِن کمزوروں غریبوں اور مساکین کو اپنی مجلس سے نکالنے کی آپ کو اجازت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منع فرما دیا۔

گویا اسلام نے قیامت تک کے لئے ایک اصول بتلا دیا کہ دین کے معاملہ میں جو طلب لے کر آئے گا بس وہ حقدار ہے، چاہے وہ کوئی غریب ہو یا مالدار ہو، چاہے وہ کم مرتبہ کا

ہو یا اونچے مرتبے کا ہو، چاہے وہ قوم کا سردار ہو یا اس کو سرداری وریاست حاصل نہ ہو، وہ جیسا بھی ہو، یہاں تو سب کے لئے یکساں حق ہے۔اصل تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ اندر طلب موجود ہو، محض اپنی بڑائی دکھلانے کے لئے اگر کوئی ایسا کرنا چاہتا ہے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اس وقت اگر ہما شما ہوتے تو کہتے کہ اس میں کیا حرج ہے، فائدہ ہے، دین کی بات پہنچانے کا ہمیں موقعہ ملے گا، اور کیا ضروری ہے کہ یہ لوگ بھی موجود رہیں، ان کے لئے دوسری مجلس قائم کر کے ان کو تو ہم موقعہ دے ہی رہے ہیں، اس لئے ان مالداروں کے لئے الگ مجلس قائم کی جائے تو کوئی اشکال کی بات نہیں ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو منع فرما دیا۔

وہ بھی اسی مجلس میں آجاویں

اسی لئے حضرات علماء اور اکابر واسلاف کے حالات جب ہم پڑھتے ہیں تو اس میں یہی بات ہمیں ملتی ہے۔حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو ہارون رشید کی طرف سے کہلوایا گیا کہ آپ میرے بیٹوں کو مؤطا کا درس دیں اور اس کی سند عطا فرمائیں اور ان کے لئے الگ مجلس قائم کریں، حالانکہ ہارون رشید بادشاہ خود بھی دیندار آدمی تھے، بادشاہِ وقت تھے اور ان کی سلطنت کتنی بڑی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادل گذر رہا تھا تو اس بادل کو خطاب کرتے ہوئے ہارون رشید نے یوں کہا کہ اے بادل! تو کہیں پر بھی جا کر برس، تیرے پانی سے جو کھیتی پیدا ہوگی اس کا خراج میرے خزانے میں ہی آنے والا ہے۔اتنی بڑی سلطنت کے مالک نے اپنے دونوں بیٹوں کے متعلق امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو کہلوایا

کہ آپ میرے بیٹوں کو مؤطا کا درس دیں اور مؤطا کی سند عطا فرمائیں اور ان کے لئے الگ مجلس قائم کریں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اگر وہ چاہتے ہوں تو اور لوگ جس مجلس میں آتے ہیں وہ بھی اسی مجلس میں آجاویں، مَیں ان کے لئے الگ سے کوئی مجلس قائم نہیں کروں گا۔

حضور اکرم ﷺ نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا

اور دیکھئے! اللہ تبارک وتعالیٰ کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو تعلق اور محبت تھی اور آپ پر جو عنایتیں تھیں؛ کسی اور پر اتنی نہیں تھیں، بلکہ آپ ﷺ تو وجہ تخلیق کائنات تھے، اور آپ کے اوصاف قرآنِ پاک میں جگہ جگہ بیان فرمائے گئے ہیں۔ اس کے باوجود جو لوگ قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہیں ان کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو جن دو تین موقعوں پر عتاب وتنبیہ فرمائی ہے ان میں سے ایک موقعہ وہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس قریش کے کچھ بڑے بڑے سردار آئے ہوئے تھے اور آپ ان کے سامنے دین کی دعوت پیش فرما رہے تھے، اسی درمیان میں ایک صحابی عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ آئے جو نابینا تھے، چونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم ﷺ کچھ اہم لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہیں اس لئے انہوں نے آکر حضور اکرم ﷺ سے کچھ پوچھنا شروع کردیا۔ وہ تو معذور تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو یہ ناگوار گذرا اور اس ناگواری کا نبی کریم ﷺ نے جو اظہار فرمایا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی أَنْ جَآءَہُ الْأَعْمٰی وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی أَوْیَذَّکَّرُ فَتَنْفَعَہُ الذِّکْرٰی﴾ تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اتنی سی بات پر کہ ایک اندھا آگیا اور تمہیں کیا معلوم کہ شاید وہ نصیحت حاصل کرتا، یا وہ پاکی حاصل کرلیتا

اور اپنی اصلاح کر لیتا، یا وہ نصیحت حاصل کرتا جس سے اس کو فائدہ ہوتا ﴿أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی فَأَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰی﴾ جو آپ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا، جن سے آپ بات کر رہے ہیں، ان کے اندر تو طلب نہیں ہے لیکن آپ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، اور یہ تو طلب لے کر آیا ہے اس سے رخ پھیرتے ہو حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ان کی طرف سے جو رخ پھیرا تھا وہ نعوذ باللہ! اس لئے نہیں کہ وہ کم درجے کے تھے اور انہیں معمولی سمجھ کر اعراض کیا ہو، بلکہ آپ یوں سمجھتے تھے کہ یہ تو اپنے ہی ہیں دوسرے موقعہ پر ان سے گفتگو کر لیں گے اور ان کو سمجھا دیں گے، لیکن یہ اچھا موقعہ ہے جو اللہ نے دیا ہے کہ ایسے بڑے بڑے لوگ یہاں آئے ہوئے ہیں، ان کے سامنے بات رکھ دی جائے، اگر وہ قبول کر لیں تو آئندہ اس کی وجہ سے اسلام کی ترقی کی راہیں اور دعوت کے پھیلنے کے راستے کھل سکتے ہیں۔ یہ سوچ کر آپ نے ان کی طرف سے بے توجہی برتی تھی۔ ان کو کمزور اور معمولی سمجھ کر ایسا نہیں کیا تھا بلکہ اپنا سمجھ کر ایسا کیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ بھی گوارا نہیں ہوا اور حضور اکرم ﷺ کو بڑے عجیب اور سخت انداز میں تنبیہ فرمائی، اسی لئے ان آیتوں کے نازل ہونے کے بعد جب بھی وہ صحابی نبی کریم ﷺ کے پاس آتے تھے تو نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے ﴿مَرْحَباً بِّمَنْ عَاتَبَنِیْ فِیْهِ رَبِّیْ﴾ خوش آمدید ہو اور تشریف لائیے وہ صاحب جن کے متعلق میرے رب نے مجھے عتاب فرمایا۔

(روح المعانی)

حاصل یہ ہے کہ وہاں تو طلب دیکھی جاتی ہے، مقام اور منصب نہیں دیکھا جاتا۔ جو طلب لے کر آئے، چاہے وہ بڑا ہو یا چھوٹا، آپ اس کی طرف توجہ فرمائیے۔

﴿میں بتلاؤں جنتی لوگ کون ہیں؟﴾

۲۵۲. وعن حارثة بن وهب رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: أَلَا أُخْبِرُكُمْ

بِـأَهْـلِ الْـجَنَّةِ؟ كُلُّ ضَعِيفٍ مُتَضَعِّفٍ، لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ. أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟ كُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ. (متفق علیه)

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ مَیں بتلاؤں جنتی لوگ کون ہیں؟ وہ جو کمزور ہیں یعنی جسمانی، مالی، منصب اور عہدے، مقام اور مرتبہ کے اعتبار سے کمزور ہیں اور ﴿مُتَضَعِّفٍ﴾ یعنی لوگ بھی اس کو کمزور سمجھ رہے ہیں، اور ان کے ساتھ کمزوروں والا معاملہ کررہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسے لوگ جنت کے اندر جائیں گے۔ کمزور ہونے اور لوگوں کے ان کو معمولی سمجھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا وہ مقام ہے کہ اگر کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کو بری کردیں یعنی ان کی قسم کو پورا کردیں۔

﴿کیا میری بہن ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟﴾

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک عورت ربیع بنت نضر جو حضرت انس رضی اللہ عنہ کی پھوپھی ہوتی ہیں، ایک مرتبہ ان کی کسی قریبی کے ساتھ لڑائی ہوگئی، تو انہوں نے اس کا دانت توڑ دیا۔ اب قرآنِ پاک میں ہے ﴿اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ﴾ دانت کے بدلے میں دانت۔ اگر کوئی قصداً کسی کا دانت توڑ دے تو بطورِ قصاص، بدلے اور سزا کے طور پر اس کا بھی دانت توڑا جائیگا۔ اب وہ لڑکی جس کا دانت توڑا گیا تھا اس کے گھر والوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں تو بدلہ اور قصاص چاہیے، ہم بھی ان کا دانت توڑیں گے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے چچا انس بن نضر تھے۔ انہوں نے اور سب گھر والوں نے چاہا اور اس لڑکی کے گھر والوں کو سمجھایا کہ مان جاؤ، معاف کردو اور پیسے لے کر چھوڑ دو۔ لیکن ان لوگوں نے کہا کہ نہیں! ہم تو ان کا دانت توڑیں گے۔ معاملہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس کے گھر والوں نے آپ کے سامنے بھی وہی بات دہرائی

کہ ہم تو ان کا دانت توڑیں گے۔حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے اس پر کہا کہ اے اللہ کے رسول!﴿أَتُكْسِرُ سِنَّ الرُّبَيِّعِ؟﴾ کیا میری بہن ربیع کا دانت توڑا جائے گا؟﴿وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا تُكْسِرُ ثَنِيَّتُهُ﴾ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے اس کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ﴿يَا أَنَسُ! كِتَابُ اللهِ الْقِصَاصُ﴾ اے انس! قرآن پاک میں تو حکم آیا ہے کہ دانت کے بدلے میں دانت ہے۔اس لئے سزا تو وہی ہونی چاہیے اور انہوں نے قسم کھا کر یہ کہا کہ اللہ کی قسم! ان کا دانت نہیں ٹوٹے گا۔اس کا مطلب نعوذ باللہ یہ نہیں تھا کہ وہ نبی کریم ﷺ کے فیصلے کو رد کرنا چاہتے تھے، بلکہ وہ اللہ تعالی کے اعتماد پر یہ بات کہہ رہے تھے کہ مجھے یقین ہے اس اللہ کی ذات پر جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے کہ وہ لوگ مان جائیں گے اور دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئے گی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔جب دوبارہ ان کو سمجھایا گیا تو انہوں نے معاف کر دیا۔اس وقت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿رُبَّ أَشْعَثَ أَغْبَرَ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللهِ لَأَبَرَّهُ﴾ بہت سے پراگندہ بال، غبار آلود کپڑے والے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ جب کسی کے دروازے پر آویں تو لوگ دھکا مار کر نکال دیں، گھر میں بھی آنے کی اجازت نہ دیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کے اعتماد پر قسم کھالیں تو اللہ تعالی ان کی قسم کو پورا کر دیں۔(المعجم الکبیر۔۷۶۸)

دیکھو! حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر کہا تھا کہ دانت نہیں ٹوٹے گا اور نتیجہ یہی ہوا کہ جس کا دانت توڑا گیا تھا اس کے گھر والے راضی ہو گئے اور ان کی بہن کو معاف کر دیا اور دانت ٹوٹنے کی نوبت نہیں آئی۔

﴿ہوسکتا ہے کہ ڈھول کے اندر کوئی سوار چھپا ہوا ہو﴾

یہاں پر بھی یہی فرماتے ہیں کہ ظاہری شکل وصورت دیکھ کر آپ فیصلہ نہ کیجیے:۔

خاکساراں جہاں را بحقارت منگر ❁ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے دارد

دنیا کے اندر جو خاکسار اور معمولی قسم کے لوگ ہیں ان کو آپ حقارت کی نظر سے نہ دیکھئے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہ غبار کے اندر کوئی سوار ہو۔ جب دھول اڑتی ہوئی نظر آتی ہے کہ چاروں طرف دھول ہی دھول ہو اور صرف دھول سمجھ کر کوئی اس کو معمولی سمجھے تو یہ اس کی حماقت ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی سوار چھپا ہوا ہو۔

اسی طریقہ سی معمولی ہیئت کے اندر جو لوگ نظر آتے ہیں ان کی اس معمولی سی ہیئت اور اس ظاہری کمزوری کی وجہ سے ان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے کس کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے؛ یہ کوئی بتلا نہیں سکتا۔ ایک آدمی جس کو یہاں اونچا سمجھا جا رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کوئی مقام نہ ہو، اور وہ آدمی جس کو یہاں معمولی اور کمزور سمجھا جا رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ مقبولیت کا مقام پائے ہوئے ہو۔

﴿میں بتلاؤں کہ جہنمی لوگ کون ہیں؟﴾

﴿أَلاَ أُخْبِرُكُمْ بِأَهْلِ النَّارِ؟﴾ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو بتلاؤں کہ جہنمی کون ہے؟ ﴿كُلُّ عُتُلٍّ﴾ اکھڑ قسم کا شخص ﴿عُتُل﴾ یعنی کھردرے مزاج کا آدمی، جس کی طبیعت کے اندر اکھڑپنا ہو، کھردراپن ہو، کہ بس! کسی کے ساتھ بات کرتا ہے تو ایسے کہ جیسے لٹھ مار کر بات کر رہا ہو، اور ہر ایک کو حقیر سمجھتا ہے۔ درشت خو، سخت مزاج لوگ ﴿جَوَّاظ﴾ اور ناک چڑھا، یعنی جو کسی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا، ہر ایک کو حقیر سمجھتا ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ﴿جَوَّاظ﴾ کے معنی بیان کئے ہیں ﴿هُوَ الْجَمُوعُ الْمَنُوعُ﴾ وہ آدمی جو کثرت سے مال جمع کرے لیکن اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرتا ہو یعنی

کثرت سے مال جمع کرنے کے ساتھ ساتھ بخیل بھی ہو۔اور بعضوں نے کہا کہ ایسا موٹا آدمی جس کی چال کے اندر غرور ہو۔

بہرحال! اصل تو یہ ہے کہ جو لوگوں کے ساتھ اپنے کبر وغرور کی وجہ سے حقارت کا اور ذلت کا سلوک کرتا ہو ﴿مُستَکبِر﴾ جو تکبر کرنے والا ہو۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس قسم کے ہیں کہ جو دنیا میں دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں لیکن اپنی برائیوں اور بدخوئی کی وجہ سے اور کبر وغیرہ کی وجہ سے اور مزاج کی درشتی اور کھردرے پن اور اکھڑ پن کی وجہ سے اور لوگوں کے ساتھ بدخلقی کے نتیجے میں جہنم کے حق دار ہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہوا کہ کسی کی ظاہری شکل وصورت، ظاہری کمزوری، مالی قلت کی وجہ سے یا کسی کے لباس کی بوسیدگی کو دیکھ کر کسی کو حقیر سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ معلوم نہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کس کا مقام اونچا ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان عادتوں سے اجتناب کی توفیق عطا فرمائیں

﴿دعاء﴾

اے اللہ! وہ خرابیاں اور وہ رزائل اور وہ برائیاں جس کے نتیجے میں تو ناراض ہوتا ہے اور جس کے نتیجے میں آدمی جہنم کا حقدار بنتا ہے، اے اللہ! ان سے ہمیں محفوظ فرما۔ اے اللہ! اخلاقِ حمیدہ اور اخلاقِ حسنہ جس کی نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے ان کو اختیار کرنے اور اپنانے کی اور اپنے اندر ان کو پیدا کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔

۱۹/ جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۲/ ستمبر ۱۹۹۸ء

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَ نَسْتَعِيْنُهُ وَ نَسْتَغْفِرُهُ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَيْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

زمین بھر ایسوں کے مقابلہ میں وہ آدمی بڑھ کر ہے

۲۵۳. عن أبی العباس سهل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ قال: مَرَّ رَجُلٌ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ لِرَجُلٍ عِنْدَهُ جَالِسٌ: مَارَأْيُكَ فِیْ هٰذَا؟ فقال: رَجُلٌ مِّنْ أَشْرَافِ النَّاسِ، هٰذَا وَاللّٰهِ حَرِیٌّ اِنْ خَطَبَ أَنْ يُّنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ أَنْ يُّشَفَّعَ. فَسَكَتَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ، ثُمَّ مَرَّ رَجُلٌ آخَرُ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَارَأْيُكَ فِیْ هٰذَا؟ فَقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! هٰذَا رَجُلٌ مِّنْ فُقَرَآءِ الْمُسْلِمِيْنَ هٰذَا حَرِیٌّ اِنْ خَطَبَ اَنْ لَّايُنْكَحَ وَاِنْ شَفَعَ أَنْ لَّايُشَفَّعَ. وَاِنْ قَالَ أَنْ لَّايُسْمَعَ لِقَوْلِهٖ. فَقَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ: هٰذَا خَيْرٌ مِّنَ الْأَرْضِ مِثْلَ هٰذَا. (متفق علیه)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب میں کمزور اور گمنام مسلمانوں کی فضیلت بتلانا چاہتے ہیں کہ جو کمزور، غریب اور گمنام ہوں ان کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے؟

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک آدمی کا گذر ہوا تو آپ کے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک آدمی سے نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ یہ آدمی جو جا رہا ہے اس کے سلسلہ میں تمہارا کیا خیال ہے؟ جس سے پوچھا گیا تھا اس نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! بڑے لوگوں میں سے اور شرفاء میں سے ہے، معاشرے میں جن کا اونچا مقام سمجھا جاتا ہے ایسے لوگوں میں سے ہے۔ اللہ کی قسم!

اگر یہ آدمی کسی جگہ نکاح کے واسطے پیغام دیدے تو ضرور اس کا نکاح وہاں کرادیا جائے اور اگر وہ کسی کی سفارش کرے تو ضرور اس کی سفارش قبول کرلی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا آدمی ہے کہ اس کی بات کہیں بھی رد نہیں کی جائے گی۔ راوی کہتے ہیں کہ جن سے سوال کیا گیا تھا ان کا جواب سن کر نبی کریم ﷺ خاموش ہوگئے۔

اس کے بعد ایک اور آدمی وہاں سے گذرا تو حضور اکرم ﷺ نے اسی آدمی سے پوچھا کہ ان کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ تو انہوں نے کہا! یا رسول اللہ! یہ تو غریب اور معمولی درجہ کا آدمی ہے۔ یہ ایسا آدمی ہے کہ اگر کسی جگہ نکاح کے واسطے پیغام دیدے تو وہاں اس کا نکاح نہ کیا جائے یعنی جہاں نکاح کا پیغام بھیجا گیا ہے وہ لوگ اس کی معمولی حالت کی وجہ سے اس کا پیغام رد کردیں گے اور اگر وہ کسی کی سفارش کردے تو اس کی سفارش بھی قبول نہیں کی جائے گی۔ معمولی درجہ کے آدمی کی بات پر کون دھیان دیتا ہے اور کون توجہ کرتا ہے۔ اور اگر وہ کوئی بات بھی کرے تو اس کی بات کی طرف کوئی کان بھی نہیں دھرے گا۔ اب حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿هٰذَا خَيْرٌ مِّنَ الْأَرْضِ مِثْلَ هٰذَا﴾ وہ جو پہلے گیا تھا جس کے متعلق تم نے کہا تھا کہ وہ شرفاء میں سے ہے اور اس کی بات کہیں بھی رد نہیں جائے ایسے آدمی زمین بھر کر ہوں تب بھی ان سب کے مقابلہ میں یہ آدمی سب سے بڑھ کر ہے۔

بخاری شریف میں جہاں یہ روایت آئی وہاں اس کی تشریح میں فیض الباری میں (جو حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی درسی تقریر ہے) حضرت علامہ کشمیری نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اتنا بڑا مبالغہ حدیثِ پاک میں بہت کم نظر آتا ہے۔ یعنی حضور ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا کہ اُس جیسے زمین بھر کر ہوں تب بھی یہ اُن سب سے اچھا ہے۔

اس سے اس آدمی کے مقام کا اندازہ لگاؤ جس کو لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ کوئی قابلِ توجہ شخص نہیں ہے، کہیں اس کی بات نہیں سنی جاسکتی، لیکن اس کے متعلق نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ شخص پہلے والے زمین بھر کر ہوں ان سب سے اچھا ہے۔اس سے گمنام لوگوں کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے

اور اس سے نبی کریم ﷺ یہ تعلیم بھی دے رہے ہیں کہ کسی کی ظاہری حالت کو دیکھ کر اس کے متعلق ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس کا کیا مقام و مرتبہ ہے۔اگر کوئی آدمی ظاہری اعتبار سے، مالی اور جسمانی اعتبار سے، رُتبہ و مقام کے اعتبار سے کمزور نظر آتا ہے، اور لوگوں نے جس طرح کے بھی پیمانے اور معیار بنا رکھے ہوں کہ مثلاً اتنے پیسے والا ہو، اتنے بنگلے ہوں، اتنی کاریں ہوں، اتنی فیکٹریاں ہوں تو وہ اس کیٹیگری (Category) کا ہے، فلاں اس کیٹیگری کا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔یہاں لوگ کسی کو چاہے کتنی ہی اونچی کیٹیگری اور درجے کا سمجھتے ہوں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مقام ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے اس پاک ارشاد کے ذریعہ ہمیں یہ تعلیم دی کہ کسی کی ظاہری کمزوری کو دیکھ کر آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔کسی کے متعلق آپ کو فیصلہ کرنے کا حق ہی نہیں ہے۔دلوں کے بھید کا جاننے والا تو اللہ تعالیٰ ہے، وہی جانتا ہے کہ کس کے دل میں کیا دولت رکھی ہوئی ہے۔اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ پیمانہ نہیں ہے کہ کسی کے پاس کتنی کاریں ہیں، کتنے بنگلے ہیں، کتنی دولت ہے اور اس کا بینک بیلنس کیا ہے۔یہ چیزیں وہاں نہیں دیکھی جاتی۔

قرآنِ پاک میں سورۂ زخرف کے اندر باری تعالیٰ نے فرمادیا کہ اگر یہ خطرہ اور

اندیشہ نہ ہوتا کہ کمزور ایمان والے مؤمنین ڈگمگا جائیں گے تو اللہ تعالی ان کافروں کے مکان کی چھتیں، ان کے چڑھنے کی زینے اور سیڑھیاں اور ان کے پلنگ ومسہریاں سونے اور چاندی کی بنا دیتے۔ لیکن چونکہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان ظاہری چیزوں کو دیکھ کر کسی کا معیار و درجہ متعین کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کمزور ایمان والوں کا خیال رکھتے ہوئے اور ان کے ایمان کی حفاظت کرنے کے پیشِ نظر کافروں کو اتنی دولت نہیں دی، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کافروں کو اتنا کچھ دے دیتا۔ معلوم ہوا کہ کسی کی ظاہری حالت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ کے یہاں تم بے قیمت نہیں ہو

ظاہر میں کوئی بدصورت ہو تو بعض لوگ اس سے دل میں نفرت کرتے ہیں۔ بھائی! اس کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے؛ یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ زاہر نامی ایک صحابی تھے، دیہات کے رہنے والے تھے، مدینہ منورہ آیا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، حضور اکرم ﷺ ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، جب دیہات سے آتے تھے تو وہاں کی کچھ چیزیں گھی اور سبزیاں وغیرہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے لاتے تھے، جیسے گاؤں والے شہر آتے ہیں تو وہاں کے مناسب کوئی چیز شہر والوں کے لئے تحفے کے طور پر لے کر آتے ہیں۔ اور جب وہ واپس جاتے تھے تو شہر کی چیزیں نبی کریم ﷺ ان کے ساتھ کر دیا کرتے تھے، ان کی جھولی اور تھیلی میں ڈال دیا کرتے تھے اور حضور ﷺ فرمایا کرتے تھے ﴿زَاهِرٌ بَادِيَتُنَا وَنَحْنُ حَاضِرُهُ﴾ زاہر؛ ہمارا دیہات ہیں اور ہم ان کا شہر ہیں (مسند احمد۔ ۱۲۶۴۸) مطلب یہ ہے کہ شہر والا دیہات سے جو چیزیں حاصل کیا کرتا ہے، زاہر ہمارے

لئے اس کا انتظام کر کے لے آیا کرتے ہیں اور ایک دیہات کا رہنے والا شہر سے جو چیزیں لے جانا چاہتا ہے، ہم اس کا انتظام ان کے لئے کر دیتے ہیں۔ بہر حال! حضور ﷺ کے ساتھ ان کا بڑا گہرا تعلق تھا۔

ایک مرتبہ وہ دیہات کی کچھ چیزیں لائے تھے اور مدینہ کے بازار میں بیٹھ کر بیچ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ وہاں سے گذر رہے تھے، ان کو دیکھا کہ بازار میں بیٹھے ہوئے کچھ بیچ رہے ہیں تو پیچھے سے جا کر نبی کریم ﷺ نے ان کی آنکھیں بند کر دیں وہ چھڑانے کی کوشش کرتے رہے، جب ان کو اندازہ ہو گیا کہ نبی کریم ﷺ ہیں تو چھڑانے کی کوشش چھوڑ دی اور اپنے آپ کو اور زیادہ حضور کے سینۂ مبارک سے چمٹانے لگے تاکہ برکت حاصل ہو جائے۔ پھر حضور ﷺ نے مزاح کے طور پر ایک آواز لگائی ﴿مَنْ يَّشْتَرِیْ هٰذَا الْعَبْدِ؟﴾ کون اس غلام کو مجھ سے خریدے گا؟ اس پر وہ کہنے لگے ﴿اِذًا لَتَجِدُنِیْ كَاسِدًا یارسول الله﴾ اللہ کے رسول! اگر آپ مجھے غلام بنا کر فروخت کریں گے تو بڑا کم قیمت پائیں گے یعنی میری قیمت کون لگائے گا۔ اس لئے کہ وہ بدصورت تھے، اور غلام اگر خوب صورت اور باصلاحیت ہو تو لوگ اس کی قیمت ادا کرتے ہیں، اس پر حضور اکرم ﷺ نے جو جواب دیا وہ اصل میں سنانا مقصود ہے ﴿وَاللهِ اِنَّکَ لَسْتَ عِنْدَ اللهِ كَاسِدًا﴾ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ کے یہاں تم بے قیمت نہیں ہو آپ اندازہ لگاؤ جب بازار لگتا ہے تو بڑے بیوپاری بھی ہوتے ہیں، چھوٹے بیوپاری بھی ہوتے ہیں، ہر قسم کے آدمی ہوتے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کی نظر انتخاب جس پر پڑی وہ یہی حضرت زاہر تھے جو شکل وصورت کے اعتبار سے حسین وجمیل نہیں تھے۔

بہر حال! کسی کی ظاہری شکل وصورت کو دیکھ کر آپ کوئی فیصلہ نہ کریں۔ اگر حسین و

خوب صورت نہیں ہے تو اس کا مرتبہ گھٹا دیں، کسی کے کپڑے معمولی ہیں، لباس فاخرہ زیب تن نہیں کر رکھا ہے، کوئی آدمی پیدل جا رہا ہے تو اس کو کمتر سمجھ لیا؛ یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے حضور اکرم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ ایسا معیار بنالینا مؤمن کا شیوہ نہیں ہے۔ اصل تو یہ دیکھنا ہے کہ وہاں کیا فیصلہ ہونے والا ہے۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے۔

روح نکلتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی

ایک بزرگ تھے، پوری زندگی کبھی نہیں مسکرائے، کبھی کسی نے ان کو ہنستے ہوئے دیکھا ہی نہیں۔ لوگوں نے پوچھا! حضرت آپ کو کبھی مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے یہ پڑھ رکھا ہے ﴿فَرِيْقٌ فِى الْجَنَّةِ وَفَرِيْقٌ فِى السَّعِيْرِ﴾ قیامت کے روز ایک جماعت وہ ہوگی جس کو جنت میں بھیجا جائے گا اور ایک جماعت وہ ہوگی جس کو جہنم میں بھیجا جائے گا۔ اور مجھے معلوم نہیں ہے کہ میرا شمار کس جماعت کے اندر ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مَیں جنت والوں میں سے ہوں تو مجھے ہنسنے کا حق ہے، لیکن جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے تو مَیں کس بنیاد پر ہنسوں۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو روح نکلتے ہی ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔

جنت اور جہنم کا مناظرہ

۲۵۴۔ عن أبى سعيد الخدرى رضی اللہ عنہ عن النبى ﷺ قال: اِحْتَجَّتِ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ، فَقَالَتِ النَّارُ: فِيَّ الْبَارِزُوْنَ وَالْمُتَكَبِّرُوْنَ وَقَالَتِ الْجَنَّةُ! فِيَّ ضُعَفَآءُ النَّاسِ وَمَسَاكِيْنُهُمْ. فَقَضَى اللهُ بَيْنَهُمَا اِنَّكِ الْجَنَّةُ رَحْمَتِيْ؛ أَرْحَمُ بِكِ مَنْ أَشَآءُ، وَاِنَّكِ النَّارُ عَذَابِيْ؛ أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أَشَآءُ، اِلَيْكُمَا عَلَيَّ مِلْؤُهَا.

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت اور جہنم کے درمیان گفتگو ہوئی اور مناظرہ ہوا یعنی ہر ایک نے اپنی بڑائی بیان کی کہ میں ایسی ہوں، دوسرے نے کہا کہ میں ایسی ہوں۔ دونوں اپنی اپنی بڑائی جتلانے لگے۔

اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں مناظرہ ہوا تو یہ دونوں کیسے بولے؟ اس کا جواب دیتے ہوئے تمام شرّاح نے یہی لکھا ہے کہ یہ کوئی بعید چیز نہیں ہے، جس طرح اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اعضاء کو بولنے کی صلاحیت عطا فرمائیں گے، اسی طرح ان کو بھی بولنے کی طاقت دی ہو اور انہوں نے بات چیت کی ہو۔

قیامت کی عدالت کا منظر

قیامت کے روز تمام کارروائی گواہی کے ساتھ ہوگی تو مشرکین دیکھیں گے کہ سب چیزوں پر گواہ طلب کئے جارہے ہیں تو مشرکین آپس میں کہیں گے کہ انکار ہی کردو ﴿وَاللهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ اللہ کی قسم! ہم نے تو کبھی شرک کیا ہی نہیں تھا، کون ہمارے خلاف گواہی دے گا۔ چنانچہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے کفر کا انکار کردیں گے کہ اے اللہ! ہم نے تو کفر کیا ہی نہیں ہے۔ باری تعالیٰ ان کی زبانوں پر مہر لگادیں گے، پھر ان کے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء بولیں گے اور گنہگاروں کے گناہوں کو بھی گنوائیں گے، قرآنِ پاک میں بھی موجود ہے ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ﴾ اب بعض لوگوں کو باوجود اپنے آپ کو مؤمن کہنے کے قرآن وحدیث کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں اور پھر بیجا جرأت کرتے ہوئے اعتراض کرتے ہیں۔

اعضاء کے بولنے پر دلیل اور نظیر

حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ سفر میں تھے، کسی نے کہا کہ قرآن میں یہ ہے کہ ہاتھ، پاؤں بولیں گے؛ یہ کیسی بات ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ ان کے لئے دلیل وثبوت چاہیے یا نظیر چاہیے؟ دلیل کا مطلب تو یہ ہے کہ آدمی کہہ دے کہ جیسے زبان بولتی ہے یہ اعضاء بھی بول سکتے ہیں، اللہ تعالی کو اس پر قدرت ہے، اس سے بڑی دلیل کیا ہوسکتی ہے۔ یہ تو دلیل کی بات ہوئی اور نظیر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات ہمارے سمجھ میں اور کھوپڑی میں آتی ہی نہیں، ہماری عقل اتنی اونچی نہیں ہے کہ کوئی چیز آسانی سے سمجھ لیں، یا بہت زیادہ اونچی ہے اس لئے سمجھ میں نہیں آتی۔ لہٰذا سمجھانے کے لئے مثال دیتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا! اچھا! زبان بولتی ہے یہ تو تمہاری سمجھ میں آتا ہے؟ تو آخر یہ زبان بھی تو گوشت کا ایک لوتھڑا ہی ہے، اور ہاتھ پاؤں وغیرہ بھی گوشت کے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں اور اس میں کیا فرق ہے؟ زبان کیوں بولتی ہے؟ جس ذات نے زبان کو بولنے کی طاقت عطا فرمائی، وہ ہاتھ پاؤں کو بھی بولنے کی طاقت عطا فرمائیں گے؛ یہ کوئی قابلِ تعجب چیز تو نہیں ہے۔

جیسے حدیث پاک میں آتا ہے کہ قرآنِ پاک میں ہے کہ بعض جہنمی لوگوں کو اللہ تعالی اوندھے منہ جہنم میں ڈالیں گے اور وہ جہنم کی طرف سر کے بل جائیں گے۔ تو کسی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! سر سے کیسے چلیں گے؟ تو حضور ﷺ نے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی کہ جس قدرت والی ذات نے اس کو پاؤں سے چلایا، وہی ذات سر سے چلانے پر بھی قدرت رکھتی ہے۔

اور میں تو کہتا ہوں کہ اس سے اور آسان بات یہ ہے کہ سانپ وغیرہ بھی تو چلتے ہیں

ان کے کہاں پاؤں ہیں؟ اگر ان کا نچلا حصہ دیکھا جائے تو وہ پیٹ سے ہی تو سر کتے ہیں۔ان کے پاؤں تو ہیں نہیں کہ وہ قدم رکھتے ہوں، تو اللہ تعالی اسے سر سے اسی طرح سر کائیں تو اس میں کونسی بعید بات ہے۔

جہنم کا کلیکشن (Collection)

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جہنم اور جنت کے درمیان مناظرہ اور گفتگو ہوئی، اگر واقعتاً دونوں کو اللہ تعالی نے بولنے کی طاقت عطا فرمائی اور وہ بولے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔جہنم کہنے لگی کہ میرے اندر تو بڑے بڑے سر پھرے اور تکبر کرنے والے لوگ ہیں۔فرعون، ہامان، ابوجہل، فلاں فلاں ہیں یعنی دنیا کے بڑے بڑے نامور لوگ جس لسٹ میں آتے ہیں وہ سارا کلیکشن (Collection) تو میرے پاس ہے، بڑے بڑے تکبر کرنے والے جو اپنی حکومتوں پر، سلطنتوں پر، منصبوں پر، مال و دولت پر اور اپنے حسن و جمال پر تکبر کرنے والے گذرے ہیں اور ایمان نہیں لائے، وہ سب میرے اندر ہی ہیں۔گویا اس کے اپنی بڑائی بیان کرنے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو لوگ قابلِ ذکر سمجھے جاتے ہیں وہ تو سب میرے حصہ میں آئیں گے۔جیسے آج کسی کے گھر پر اگر کوئی ایکٹر، یا کسی پارٹی کا کوئی لیڈر آ جائے تو وہ اس کو اپنے لئے بڑا قابلِ فخر سمجھتا ہے کہ فلاں وزیر اور فلاں ایکٹر میرے یہاں آیا، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا کیا مقام ہے، خاص کر اگر وہ کافر ہے تو ظاہر ہے۔

جنت کے حصہ میں کون؟

پھر جنت نے کہا کہ میرے اندر تو کمزور کمزور قسم کے لوگ ہیں۔جسمانی اعتبار سے، مالی اعتبار سے، ظاہری چیزوں کے اعتبار سے جن کو معاشرہ میں کوئی قابل توجہ نہیں سمجھتا ہے،

لیکن اہلِ ایمان واہلِ دل ہیں؛ وہ سب میرے اندر ہیں۔

یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو صرف اسی لئے لائے ہیں کہ دیکھو! آدمی اگر کمزور ہے، اس میں مسکنت ہے؛ تو وہ جنت میں جائے گا۔ اس سے کمزوروں کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

﴿مسکنت الگ چیز ہے اور مسکینیت الگ چیز ہے﴾

مسکنت: طبیعت کے عجز کو کہتے ہیں۔ بعض مرتبہ ایک آدمی صاحبِ دولت ہوتا ہے لیکن اس کی طبیعت کے اندر مسکنت ہوتی ہے۔ مسکنت الگ چیز ہے اور مسکینیت اور فقیری الگ چیز ہے۔ نبی کریم ﷺ نے دعا فرمائی ﴿أَللّٰهُمَّ أَحْيِنِيْ مِسْكِيْناً وَأَمِتْنِيْ مِسْكِيْناً وَاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنَ﴾ جہاں یہ دعا فرمائی ہے، وہاں یہ دعا بھی فرمائی ہے ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُبِکَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ﴾ معلوم ہوا کہ فقر اور مسکنت یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں مسکنت مال کے ساتھ بھی جمع ہو سکتی ہے، یعنی طبیعت میں سادگی ہو، کوئی بڑائی نہ ہو، تو مسکنت والی فضیلت وہ آدمی بھی حاصل کر سکتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نواز رکھا ہو، مالدار آدمی بھی مساکین میں سے ہو سکتا ہے۔

اور کبھی تو بعض فقیر ایسے ہوتے ہیں کہ جیب کے اندر چونّی بھی نہیں ہوتی لیکن ان کا دماغ کبر و غرور سے آسمان پر ہوتا ہے؛ ایسے لوگ مسکین نہیں ہیں۔ جن تین آدمیوں پر اللہ تعالیٰ بہت زیادہ سخت ناراض ہوتے ہیں ان میں ایک وہ ہے کہ جو فقیر ہو اور متکبر ہو۔ دوسرا وہ بوڑھا جو زانی ہو۔ یعنی فقر کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اس کی طبیعت میں مسکنت ہوتی، ظاہری حالت تو تکبر کی ہے نہیں، پھر بھی تکبر کرتا ہے یعنی معاملہ اُلٹا ہے۔ اسی طرح بوڑھا زانی یعنی

بڑھاپے کا تقاضہ تو یہ تھا کہ زنا نہ کرتا، جو فاحشہ رنڈی بوڑھی ہو جاتی ہے تو وہ بھی توبہ کر لیتی ہے لیکن اس کو بوڑھاپے کے اندر زنا کرنے کی سوجھی یعنی عمر کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اگر جوانی میں ایسی بری عادت ہوتی تب بھی بوڑھاپے میں آ کر تو اس سے تائب ہو ہی جانا چاہیے تھا، لیکن پھر بھی وہ اس میں مبتلا ہے۔اس کا معاملہ بھی اُلٹا ہے۔

تکبر بڑی خطرناک بیماری ہے

اور تکبر کو اللہ تعالیٰ ویسے بھی پسند نہیں کرتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس کے دل کے اندر ذرّہ برابر بھی تکبر ہو تو وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اور دیکھو! یہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔اب اس بیماری کو کون پرکھے گا، اور کیسے پرکھے گا؟ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی یوں سمجھتا ہے کہ مَیں تندرست ہوں لیکن جب ڈاکٹر کے یہاں خون ٹیسٹ کرواتا ہے یا ایکسرے نکلواتا ہے، سونوگرافی کرواتا ہے یا معلوم نہیں آج کل کیا کیا گرافیاں نکل رہی ہیں۔ بہر حال! وہ یوں سمجھ رہا تھا کہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہے اور جب رپورٹ آئی تو معلوم ہوا کہ ذیابیطس (Diabetes) ہے، بی پی ہے، یا دِل کا بیمار ہے، ایڈز ہے، کینسر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ڈاکٹر جانچنے کے بعد بتلاتا ہے، ورنہ اس سے پہلے تو وہ اپنے آپ کو بیمار سمجھتا ہی نہیں تھا۔اسی طرح ہم میں سے بہت لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ روح کی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں، اندرونی بیماریاں بڑی خطرناک ہیں، اسی میں تکبر بھی ہے جو سب سے خطرناک ہے، علماء نے اس کو ''اُمُّ الامراض'' یعنی تمام بیماریوں کی جڑ لکھا ہے۔ تمام روحانی بیماریوں کے ماں تکبر ہے، جب یہ سب روحانی بیماریاں ہیں تو اس کو پرکھنے والے روحانی طبیب ہیں اور اس کا علاج بھی وہی بتلائیں گے۔

آج کا ہمارا ایک اہم المیہ

آج کل ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ روحانی علاج بولتے ہیں تو لوگوں کا دھیان تعویذ گنڈوں کی طرف جاتا ہے۔ روحانی علاج کا مطلب یہ نہیں ہے، بلکہ روحانی علاج کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ جنہوں نے اپنے آپ کو پاک وصاف بنایا، ان کے قلوب پاکیزہ ہیں اور جو کسی شیخ کے صحبت وتربیت میں رہے ہیں اور ایک زمانہ کے بعد ان بزرگوں نے بھی ان پر اس اعتماد کا اظہار کیا کہ یہ اب اس قابل ہیں کہ لوگوں کی روحانی بیماریوں کا مثلاً تکبر وغرور، خود پسندی اور خود بینی، بغض وکینہ اور حسد وغیرہ بیماریوں کا علاج کر سکتے ہیں۔ آج کل تو ان بیماریوں کا نام بھی لوگوں نے نہیں سنا ہے اور ان بیماریوں کو بیماری ہی نہیں سمجھتے۔

بداعمالیوں کے مقابلہ میں بداخلاقیاں زیادہ مہلک ہیں

دیکھو! چوری کرنا، شراب پینا، زنا کرنا؛ یہ سب بداعمالیاں ہیں، اور ان پر گناہ ہوگا، لیکن چوری کی اور عمل ختم ہوگیا۔ اس کے نامۂ اعمال میں وہ گناہ لکھا گیا لیکن اب اگر وہ مسجد میں آکر بیٹھا ہے تو اس وقت اس کو ثواب مل رہا ہے، چوری والا گناہ اس وقت چل نہیں رہا ہے۔ لیکن جو بداخلاقیاں ہیں انہیں میں سے تکبر بھی ہے، تو جو متکبر ہوتا ہے جس کی طبیعت میں غرور وبڑائی ہے وہ مسجد میں ہو تب بھی، نماز پڑھ رہا ہو تب بھی، گھر میں ہو تب بھی؛ جہاں بھی ہو ہر حال میں تکبر تو ساتھ میں لگا ہوا ہی ہے۔

اسی طرح مثلاً حسد ہے تو یہ تھوڑا ہی اس کا پیچھا چھوڑتا ہے۔ یہ تو اندر کی بیماری ہے جو ہر وقت ساتھ رہتی ہے۔ یہ کوئی وقتی کام نہیں ہے۔ اسی لئے اندر کی بیماریاں بہت خطرناک ہیں۔ بداعمالیوں کے مقابلہ میں بداخلاقیاں بہت مہلک وخطرناک ہیں۔

اخلاق کا مفہوم

ہمارے یہاں تو بداخلاقی کا مفہوم و مطلب بھی محدود ہوکر رہ گیا ہے۔کوئی کسی سے مسکرا کر بات کرے تو کہتے ہیں کہ بڑے اچھے اخلاق والا ہے،اور اگر کوئی اصول کے مطابق کسی سے ذرا ڈانٹ کر بات کرے تو کہتے ہیں کہ بڑا بدخلق ہے۔اصل تو اخلاق کا مطلب یہ ہے دل کا ان گندگیوں اور روحانی بیماریوں (تکبر،غرور،خود پسندی،کینہ،بغض،عداوت،حسد وغیرہ) سے پاک وصاف ہونا؛ یہ تمام بداخلاقیاں کہلاتی ہیں۔اگر کسی میں حسد ہے تو معلوم نہیں وہ اس کو کہاں کہاں پہنچائے گا،اس کی وجہ سے وہ کیا کیا کرے گا،کتنوں کی جانیں لے گا،کتنوں کے کاروبار کو برباد کرے گا۔یہ ایک بیماری ہے لیکن اتنی بداعمالیاں کرواتی ہے کہ اندازہ نہیں لگا سکتے۔

شرک کے بعد روحانی بیماریوں سے بچنے کی وصیت

بہرحال! آج کل ہمارے معاشرے میں ان تمام بیماریوں کو بیماریاں ہی نہیں سمجھا جاتا۔قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے ولی عالم اور بڑے محدث گذرے ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں تھے۔حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ جو سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے بزرگوں میں سے ہیں ان کے مجازین میں سے ہیں،تفسیر مظہری انہیں کی ہے۔انہوں نے اپنے شیخ کے نام پر اس کا نام مظہری رکھا۔انہی کی ایک کتاب ہے ’’مالا بدمنہ‘‘ اس میں آخیر میں جہاں انہوں نے نصیحتیں کی ہیں اس میں شرک کے بعد جن چیزوں سے سب سے زیادہ بچنے کا اہتمام کرنے کی وصیت کی ہے؛ وہ انہی روحانی بیماریوں سے بچنے کی وصیت کی ہے۔اعمال کا درجہ اس کے بعد کا ہے۔

ہم اپنا علاج خود کرنے کے مجاز نہیں

تو مَیں تکبر کے متعلق کہہ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور علماء نے تکبر کو ''اُم الامراض'' لکھا ہے۔ ہم غور کریں جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ جسمانی بیماریوں کا ہمارا حال یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن معلوم نہیں ہوتا، بعد میں ڈاکٹر صاحب بتلاتے ہیں کہ فلاں بیماری ہے۔ اسی طرح ہماری روحانی بیماریاں بھی ہیں۔ بہت سی مرتبہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ مجھ میں غرور نہیں ہے لیکن وہ تو آپ اپنے متعلق فیصلہ کر رہے ہیں۔ میں اپنے متعلق فیصلہ کر رہا ہوں کہ مجھ میں تکبر نہیں ہے، اس لائن کا کوئی ماہر طبیب اگر رپورٹ دیتا ہے کہ اس کے اندر یہ بیماری نہیں ہے؛ تب تو بات ہے، باقی ہم اپنے متعلق خود فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں اس کو تو وہی لوگ جانتے بھی ہیں اور پرکھتے بھی ہیں اور پھر اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مریدین حالات پیش کرتے تھے، حضرت مشورہ بھی دیتے تھے۔ ایک صاحب میں کبر تھا، حضرت نے علاج تجویز کیا کہ خانقاہ کے دروازے پر بیٹھو اور لوگوں کے جوتے سیدھے کرو۔ ظاہر ہے اس سے علاج تو ہو ہی جائے گا۔ بہر حال! علاج کے مختلف طریقے ہیں۔

دنیا اور آخرت میں سزا دلوانے والی بیماری

خیر! جہنم میں لے جانے والی جو سب سے خطرناک چیز ہے بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی جو بہت سی برائیوں میں ڈالنے والی ہے؛ وہ تکبر، بڑائی اور غرور ہے۔ اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھنا، دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھنا۔ کسی کو حقیر سمجھنا؛ یہ بہت ہی خطرناک بیماری ہے

اور یہی بیماریاں جہنم میں لے جانے والی ہیں، اس لئے ان چیزوں کا بھی جائزہ لینا چاہیے، اور ان کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے، ورنہ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ﴿مَنْ قَالَ لاَ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ﴾ پوچھا گیا ﴿وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ﴾ تو آپ ﷺ نے فرمایا ﴿وَاِنْ زَنیٰ وَاِنْ سَرَقَ﴾ زنا اور چوری کے متعلق تو نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں کہ اس کے باوجود بھی جنت میں جائے گا، لیکن تکبر کے متعلق فرمارہے ہیں کہ کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا تو جب تک کہ جہنم میں ڈال کر سزا بھگت کر تکبر کے اثرات سے پاک وصاف نہیں کرلیا جائے گا اور جب تک علاج نہیں ہوجائے گا؛ وہاں تک جنت میں نہیں جائے گا۔

اسی لئے بعض علماء نے لکھا ہے کہ وہ جنت میں نہیں جائے گا یعنی ﴿مَادَامَ مُتَكَبِّرًا﴾ جب تک کہ وہ متکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ سزا دے کر اس کو پاک وصاف کرلیں گے پھر کہیں گے کہ اب جنت میں جاؤ۔ اگر دنیا ہی میں اس نے اپنے آپ کو اس بیماری سے پاک وصاف کرلیا ہے تو سبحان اللہ بہت اچھا ہے، ورنہ پھر وہاں پاک وصاف کرنے کے لئے دوسرا طریقہ اپنایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

﴿میرے اوپر ضروری ہے کہ تم دونوں کو بھروں﴾

خیر! جنت وجہنم میں جو مناظرہ ہورہا تھا ان کے درمیان اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کردیا۔ جنت سے فرمایا کہ اے جنت! تو میری رحمت کا مظہر ہے، مَیں جس پر رحمت کرنا چاہتا ہوں تیرے ذریعہ سے رحمت کرتا ہوں یعنی جس کے ساتھ میں آخرت میں نعمتوں کا معاملہ کرنا چاہوں گا اس کو تیرے اندر بھیجوں گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا مظہر جنت ہے۔

اور جہنم سے فرمایا کہ اے جہنم! تو میرا عذاب ہے، یعنی میری صفتِ غضب کا مظہر

ہے، تیرے ذریعہ سے میں جس کو چاہوں گا عذاب دوں گا۔ پھر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اوپر ضروری ہے کہ تم دونوں کو بھروں۔

اللہ تعالیٰ جہنم کو بھی بھریں گے اور جنت کو بھی بھریں گے۔اللہ تعالیٰ نے دونوں سے وعدہ کیا ہے۔اب ہم لوگوں کے لئے یہ سوچنے کا مقام ہے اور ہمارے لئے یہ ڈرنے کی بات ہے کہ معلوم نہیں کون سے بھراوے میں ہم جاتے ہیں؟ اسی لئے ان بزرگ کے مطابق بتلایا تھا کہ ان کے چہرے پر اسی ڈر سے مسکراہٹ نہیں آئی کہ معلوم نہیں ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔آدمی کو اگر یہ فکر لگ جائے تو کبھی کوئی گناہ اور نافرمانی نہیں کرے گا

اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ حکومت کی طرف سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں اور ٹاڈا میں کچھ لوگوں کے نام آئے ہیں کہ سو(۱۰۰) آدمیوں کو قید کیا جائے اور ان میں سے کچھ کے نام ٹاڈا میں ہیں اور کچھ کے نہیں (اللہ تعالی اس قانون کو واپس کبھی نہ لائے) ایک مثال کے طور پر کہہ رہا ہوں، اب جن سو(۱۰۰) کا نام ہے ان میں سے ہر ایک اپنے متعلق ڈرے گا جب تک کہ معلوم نہ ہو جائے۔تو دنیا کی حکومتوں کی معمولی سزاؤں کا یہ حال ہے کہ جب لوگ سنتے ہیں تو ان کے ہوش اُڑ جاتے ہیں، وہ حالات بھی لوگوں نے دیکھے ہیں، اللہ تعالیٰ پھر کبھی نہ دکھائے

اللہ تعالیٰ کی جہنم کا عذاب کوئی معمولی چیز ہے؟ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ انسانوں میں ایک جماعت جنت میں جائے گی اور ایک گروہ جہنم میں جائے گا۔اب کسی کو معلوم تو ہے نہیں کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں جائے گا؛ تو پھر کیوں ہم لوگ بے فکر رہیں۔ اپنے متعلق ہر ایک کو ڈرتے رہنا چاہیے اور یہ کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ جنت والوں کے صفات ہم اپنے اندر پیدا کریں اور جہنم والوں کی برائیوں سے ہم اپنے آپ کو بچائیں۔

﴿یہ سب فخر وتکبر کی چیزیں نہیں ہیں﴾

۲۵۵.عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن رسولِ اللہِ ﷺ قَالَ: اِنَّهُ لَيَأْتِی الرَّجُلُ السَّمِيْنُ الْعَظِيْمُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لاَ يَزِنُ عِنْدَاللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ. (متفق علیہ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں لمبا تڑنگا، موٹا تازہ قدآور آدمی آئے گا لیکن اللہ تعالی کے جہاں مچھر کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہیں ہوگا۔

دنیا میں بہت سے ایسے ہیں جو اپنی صحت وتندرستی پر اور اپنی بوڈی (body) پر ناز کرتے ہیں، لیکن حدیثِ پاک میں بتایا گیا کہ یہ کوئی فخر کی چیز نہیں ہے۔ بوڈی (body) ظاہری حسن وجمال، صحت وتندرستی یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور شکر کی چیزیں ہیں، لیکن فخر وتکبر کی چیزیں نہیں ہیں۔ کوئی آدمی پستہ قد اور کمزور ہے، اس وجہ سے اس کو حقیر سمجھنا غلط ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مقام ہے؛ یہ ہم نہیں جانتے، وہاں بوڈی ناپ کر فیصلہ ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے ظاہری حسن وجمال پر اچھی شکل وصورت پر فخر کرنا مؤمن کو زیب نہیں دیتا، بلکہ اندرون کو درست کرنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ یہ تو قدرت کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، کسی کو ملی، کسی کو نہیں ملی۔ اگر آپ کو ملی ہے تو اللہ کا شکرادا کیجیے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دوسروں کو کمتر وکمزور اور حقیر سمجھیں۔ ایسی چیز پر حقیر کیا سمجھنا جو ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ حسن وجمال کیا ہمارا کمایا ہوا ہے؟ جس میں ہمارے اختیار کو دخل ہے ہی نہیں، اس پر فخر کرنا کیا معنٰی رکھتا ہے۔ اللہ تعالی نے دی ہے، ذرا سی دیر میں وہ لینے پر قادر ہے۔ اچانک کوئی بیماری آ گئی، کسی نے ایسڈ ڈال دیا، دست لگ گئے اور سو دیڑھ سو ایک

ساتھ ہو گئے تو چہرے پر بھی جھریاں آ جائے گی، اور چہرہ جو چمکتا دمکتا تھا وہ کالا نظر آنے لگے گا۔اور بوڑی کہاں جائے گی وہ پتہ بھی نہیں چلے گا۔اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی کو ڈرتے رہنا چاہیے۔اللہ تعالی کی نعمتوں کا شکرادا کرے۔اس کی وجہ سے کسی کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔اصل تعلیم یہی ہے۔دولت ومنصب ہے، عہدہ ہے، بوڑی، حسن وجمال ہے؛ یہ سب اللہ تعالی کی نعمتیں ہیں۔

﴿ملنے جلنے والوں کے حالات کی خبر رکھنی چاہیے﴾

۲۵۶. وعنه أَنَّ امْرَأَةً سَوْدَآءَ كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ،أَوْشَابًّا فَفَقَدَهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فَسَأَلَ عَنْهَا أَوْعَنْهُ،فَقَالُوْا:مَاتَ. قَالَ:أَفَلا كُنْتُمْ آذَنْتُمُوْنِيْ،فَكَأَنَّهُمْ صَغَّرُوْا أَمْرَهَا،أَوْأَمْرَهُ. فَقَالَ:دُلُّوْنِيْ عَلٰى قَبْرِهٖ. فَدَلُّوْهُ فَصَلّٰى عَلَيْهَا،ثُمَّ قَالَ:اِنَّ هٰذِهِ الْقُبُوْرَ مَمْلُوْءَةٌ ظُلْمَةً عَلٰى أَهْلِهَا،وَاِنَّ اللهَ تَعَالٰى يُنَوِّرُهَا لَهُمْ بِصَلاتِيْ عَلَيْهِمْ. (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک سیاہ فام عورت مسجدِ نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی۔حضور اکرم ﷺ دیکھتے تھے کہ وہ مسجد کی صفائی کا خیال رکھتی ہے، پھر چند دنوں تک نظر نہیں آئی تو حضور ﷺ نے اس کے متعلق دریافت فرمایا۔بعض روایتوں میں ایک نوجوان لڑکے کا تذکرہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی ہمارے حلقہ احباب میں سے ہو، ملنے والوں میں سے ہو یا جو امورِ خیر کے اندر لگا ہوا ہو جس کے ساتھ ہمارا ربط ہو تو اس کے ایک دو دن نظر نہ آنے کے اوپر آدمی کو تحقیق کرنی چاہیے۔آج کل تو ایسے مزاج بنتے جارہے ہیں کہ لیا دیا اور ختم: پھر حال احوال کا پتہ ہی نہیں رکھتے۔ہمارے یہاں کلاس میں طلبہ میں سے کوئی غیر حاضر ہوتا

ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ فلاں کہاں ہے؟ کسی نے جواب دیا کہ بیمار ہے۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ کیا بیماری ہے؟ تو کسی کو کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔ ان طلباء سے ہم کہتے ہیں کہ دو تین دن ہو گئے اور وہ آپ کا ساتھی ہے لیکن آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ بیماری کیا ہے، اللہ کے بندو! اس کی خبر بھی لینے نہیں گئے۔

ہمارا بھی حال ایسا ہی ہو گیا ہے، دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی مسجد میں پابندی کے ساتھ نماز کے لئے آتا ہے اور دو دن سے نظر نہیں آتا تو نبی کریم ﷺ کا عمل ہمیں یہ تعلیم دی رہا ہے کہ ہم کو چاہیے کہ پوچھیں کہ فلاں صاحب نظر کیوں نہیں آتے۔ بڑے پابند تھے، معلوم کرو، بیمار تو نہیں ہیں۔ اگر بیمار ہے تو جاؤ اس کی خیر خبر لو۔ کوئی ضرورت میں ہے کسی مصیبت میں گرفتار ہے، کہیں ان کو گرفتار کر کے لے تو نہیں گئے ہیں۔ جب آپ کو پتہ چلے گا کہ اس پر کیا گذر رہی ہے تو اس کی کچھ مدد کرنے کا اور اس کو سہولت پہنچانے کا اہتمام کیا جائے گا۔ ایسے علاقے ہیں جہاں ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں کہ وہاں پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب کس کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

بہر حال! نبی کریم نے پوچھا کہ فلاں نظر نہیں آرہا ہے۔ لوگوں نے بتلایا کہ اس کا تو انتقال ہو گیا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اطلاع دی ہوتی اور بتلا دیا ہوتا۔ کیوں نہیں بتلایا؟ بعض روایتوں میں ہے کہ جواب دیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! ہم نے آپ کو زحمت دینا گوارہ نہیں سمجھا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ رات کے وقت اس کا انتقال ہو گیا تھا، ہم نے مناسب نہیں سمجھا کہ آپ کے آرام و راحت کے اندر خلل ڈالیں۔ بہر حال! بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس کی موت کی اطلاع حضور اکرم ﷺ کو دی

جائے۔اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس کی قبر بتلاؤ۔چنانچہ آپ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور نمازِ جنازہ پڑھی۔ویسے مسئلہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کو بغیر نمازِ جنازہ پڑھے دفن کیا گیا ہو تو جب تک کہ اس کا جسم پھولا پھٹا نہ ہو وہاں تک اس کی قبر پر بھی نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے، اور اگر نماز پڑھ کر دفن کیا گیا ہے تو پھر نہیں۔لیکن یہ حضور اکرم ﷺ کی خصوصیت ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ قبریں قبر والوں پر اندھیریوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ میری نماز کے ذریعہ سے ان پر نور بھیجتا ہے اس لئے آپ نے نماز پڑھی۔

ایسے لوگ قابلِ قدر ہیں

بہر حال! یہاں تو یہ بتلانا ہے کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ نے اس کی اہمیت لوگوں کو بتلائی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے لوگ جو اپنے طور پر اس قسم کی رضا کارانہ خدمتیں کیا کرتے ہیں ان کا خیال رکھنے کی نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی۔وہ عورت بھی کوئی تنخواہ نہیں لیتی تھی۔ہمارے یہاں بھی ایسے لوگ ہوتے ہیں، اور ہم بھی جانتے ہیں کہ فلاں آدمی مسجد کا بڑا خیال رکھتا ہے، مسجد میں جلدی آجایا کرتا ہے، کھڑکیاں کھول دیتا ہے، صفیں ٹھیک ٹھاک کرلیا کرتا ہے، حالانکہ وہ تنخواہ دار نوکر نہیں ہوتا؛ ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو مختلف خدمتیں انجام دیتے ہیں۔نبی کریم ﷺ نے اپنی اس تعلیم کے ذریعہ ہمیں یہ نصیحت فرمائی کہ ایسے لوگ قابلِ قدر ہیں، اور ان کا مقام بہت اونچا ہے۔

بہر حال! ایسے لوگ معاشرے میں، برادری اور سماج میں ہمارے محلوں اور علاقوں میں ہوتے ہیں جو ایسی رضا کارانہ خدمت انجام دیتے ہیں، ظاہری ہیئت اور شکل وصورت کے اعتبار سے لوگ ان کو قابلِ التفات وتوجہ نہیں سمجھتے، لیکن ایسی اونچی خدمت انجام دے

رہے ہوتے ہیں کہ بعد میں جب یاد آتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ ہاں وہ ایسے کام کرتا تھا پھر ان کا تذکرہ بھی کر لیتے ہیں۔خیر ایسے لوگوں کا بھی خیال رکھا جائے اور ایسے لوگ جب نظر نہ آئیں تو ان کے متعلق تحقیق بھی ہونی چاہیے کہ کہاں گئے، کیا ہوا۔اگر انتقال ہو گیا تو ان کے گھر والوں کے پاس جا کر تعزیت کر آویں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

۲۶/ جمادی الاولی ۱۴۱۸ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۹/ ستمبر ۱۹۹۸ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ ،وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنْ لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًاعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد:—

﴿بہت سے پراگندہ حال اونچے مقام والے ہوتے ہیں﴾

۲۵۷. وعنه قال قال رسول الله ﷺ رُبَّ أَشْعَثَ مَدْفُوْعٍ بِالْأَبْوَابِ لَوْأَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُ.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے جس میں مسلمانوں میں کمزور، فقراء، مساکین اور گمنام لوگوں کی فضیلت اور اہمیت کو بتلانا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بہت سے پراگندہ بالوں والے جن کو دروازوں پر سے دھکے دیئے جاتے ہیں یعنی وہ اگر کسی کے دروازے پر پہنچ جائیں تو ان کی ظاہری کمزوری کی وجہ سے اور ان کے گمنام ہونے کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام کیا ہے یہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ان کو اپنے دروازوں پر کھڑا رکھنا پسند نہیں کرتے، بلکہ ہٹا دیتے ہیں ایسے لوگ اگر اللہ کے نام کی کسی بات پر قسم کھالیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی اس قسم کو پورا کریں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ان کا مقام اتنا بلند ہے اور اللہ تعالیٰ کی یہاں ان کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کا نام لے کر قسم کھالیں اور یوں کہہ دیں کہ ایسا ہی ہوگا تو اللہ تعالیٰ ان کے کہنے کے مطابق وہ چیز کر دیتے ہیں۔

حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کا قصہ پہلے بھی گذر چکا ہے، حضرت انس جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص تھے ان کے چچا حضرت انس بن نضر تھے، ان کی بہن حضرت رُبیع بنتِ نضر نے ایک مرتبہ ایک انصاری لڑکی کا دانت توڑ دیا۔ اس کے گھر والوں نے قصاص کا مطالبہ کیا یعنی دانت کے بدلے میں دانت توڑا جائے۔ مسئلہ یہی ہے کہ اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر کسی کا دانت توڑ دے تو اس صورت میں اگر پورا دانت توڑ دیا ہے تو توڑنے والے کا دانت ہی توڑا جائے گا۔ بعض زیادتیاں وہ ہیں کہ جن کا بدلہ دلوانا ممکن ہے، مثلاً کسی کا ہاتھ کاٹ دیا تو اس کا بھی ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اس سلسلہ میں مستقل تفصیلات ہیں جو فقہ کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بہرحال! یہاں انہوں نے دانت توڑا تھا اور اس کا بدلہ دینا ضروری تھا تو لڑکی کے گھر والوں نے مطالبہ کیا کہ ہماری لڑکی کا دانت توڑا ہے اس لئے ان کا بھی دانت توڑا جائے اور حضرت ربیع کے گھر والوں نے چاہا کہ وہ لوگ معاف کر دیں یا معاوضہ لے کر کے چھوڑ دیں، لیکن وہ لوگ نہیں مانے۔ یہ معاملہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو حضور نے بھی یہی فرمایا کہ ﴿كِتَابُ اللهِ الْقِصَاصُ﴾ ان کا بدلہ دلوایا جائے۔ اس موقعہ پر حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ اے اللہ کے رسول! کیا میری بہن رُبیع کا دانت توڑا جائے گا؟ اللہ کی قسم! ایسا نہیں ہوگا انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ ایسا نہیں ہوگا، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بھائی! قرآن پاک میں یہی حکم ہے۔ ان کے قسم کھانے کا منشا نعوذ باللہ یہ نہیں تھا کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کو رد کرنا چاہتے تھے، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہونے دیں گے اور امید یہی ہے کہ وہ لوگ راضی ہو جائیں گے۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا کہ ان کو سمجھایا گیا اور وہ راضی ہو گئے۔ اس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بہر حال! اس روایت کو لا کر علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! بہت سے لوگ ظاہری حالت اور ہیئت اور ظاہری اعتبار سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا لباس اور چہرہ مہرہ دیکھ کر لوگ ان کو معمولی سمجھتے ہیں اور ان کے ساتھ تحقیر کا یا کم از کم تحقیر کا نہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو ہم اپنی مجلس میں جگہ دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام ایسا بلند ہوتا ہے کہ وہ اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر اللہ کا نام لے کر کوئی بات کہہ دیں تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا کر دیتے ہیں۔

ہم عملی طور پر کر دکھلا ویں؛ تب کہا جا سکتا ہے کہ......

ویسے ہم لوگ بھی جب اس قسم کی باتیں پڑھتے پڑھاتے ہیں اور بولتے سنتے ہیں تو ہماری زبانوں پر یہ جملہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی غریب کو یا کسی معمولی ہیئت والے کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے یہاں امیر و غریب سب برابر ہیں، مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، کسی کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے یہ ہم نہیں جانتے۔ یہ سب جملے ہم اپنی زبان سے بول لیتے ہیں، کانوں سے سن بھی لیتے ہیں اور کبھی موقعہ آتا ہے تو اس کا تذکرہ بھی کر لیتے ہیں؛ لیکن اصل تو یہ ہے کہ جب عمل کا وقت آوے اُس وقت ہم عملی طور پر کر دکھلاویں، تب کہا جا سکتا ہے کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ارشادات کی اہمیت کو سمجھتے ہیں۔

بہت سے ایسے لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے معاشرتی اعتبار سے ہمارے ماتحت کر دیا ہے یا مالی اعتبار سے ان کی حیثیت ہم سے کم ہے، ہم کو مال و دولت سے اللہ تعالیٰ نے نوازا ہے اور ان کے پاس اتنی مال و دولت نہیں ہے، یا اللہ تعالیٰ نے ہم کو کسی منصب پر بٹھا رکھا ہے اور وہ اس منصب پر نہیں ہیں، یا اور کوئی خصوصی و امتیازی حیثیت ہمیں حاصل ہے، یا مثلاً ہم

فیکٹری یا دُکان چلاتے ہیں اور ہمارے ماتحت کئی ملازم ایسے بھی ہیں جو نیک اور صالح ہیں یا کسی دفتر میں ہم افسر اور انچارج کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہمارے ماتحت کام کرنے والے ہیں؛ تو اس وقت یہ نہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالی نے ہم کو جو اونچا منصب عطا فرمایا ہے، دولت و ثروت عطا فرمارکھی ہے یا کوئی امتیازی شان سے نواز رکھا ہے تو ہم اپنے ماتحتوں کو یا ان لوگوں کو۔جن کو ایسی کوئی امتیازی شان وحیثیت حاصل نہیں ہے۔کمزور سمجھیں اور ان کے ساتھ تحقیر کا معاملہ کریں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔اللہ تبارک وتعالیٰ کے جو مخصوص بندے ہوا کرتے ہیں وہ ایسے مواقع پر بھی اللہ تعالی کے مقرر کردہ حدود کا خاص اہتمام کرتے ہیں۔

واقعتاً حدود اللہ کی رعایت کرنے والے یہی حضرات تھے

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ کے ایک خادم بھائی نیاز نامی تھے، اور حضرت کے منہ چڑھے تھے۔ حضرت کی خانقاہ میں جو لوگ آیا کرتے تھے وہ کبھی کبھی ان سے بھی بھڑ جاتے تھے اور ان کے ساتھ بول چال کی نوبت بھی آجاتی تھی۔ایک مرتبہ ان کے ساتھ کسی کا جھگڑا ہو گیا، انہوں نے حضرت سے شکایت کردی کہ فلاں صاحب ایسا معاملہ کرتے ہیں۔حضرت تک ان کی اور بھی شکایتیں پہنچی تھی تو حضرت نے ان کو بلا کر سب کے سامنے ڈانٹنا شروع کیا کہ تمہاری کیا حرکتیں ہیں؟ جب حضرت نے ان کو ڈانٹا تو انہوں نے فوراً اپنی زبان میں کہا کہ ”جھوٹ مت بولو، اللہ سے ڈرو“ جیسے ہی انہوں نے یہ کہا تو حضرتؒ فوراً خاموش ہو گئے اور استغفر اللہ، استغفر اللہ پڑھنے لگے۔ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ حضرت جھوٹ بول رہے ہیں، بلکہ ان کا

مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ تک شکایتیں پہنچائی ہیں وہ غلط ہیں اوران کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے اوراللہ سے ڈرنا چاہیے، لیکن شدت جذبات میں آ کرانہوں نے براہِ راست حضرت کو یہ کہہ دیا۔ حضرت نے اس پر کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموشی اختیار فرما کراستغفار پڑھنے لگے اور پھر فرمایا کہ حقیقت میں غلطی میری ہی ہے، اس لئے مجھے چاہیے تھا کہ جب ان کو میں نے بلایا تو پہلے ان سے پوچھ لیتا کہ آپ کے متعلق اس قسم کی شکایتیں پہنچی ہیں، کیا آپ نے ایسا معاملہ کیا ہے؟ ان کا جواب اور موقف اس سلسلہ میں کیا ہے وہ مجھے معلوم ہوجاتا پھر میں کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا، لیکن میں نے ان کو صفائی کا موقعہ دیئے بغیر اور ان کا موقف معلوم کئے بغیر ہی ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا، تو حقیقت میں غلطی میری ہی ہے، اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہوں۔ یہ حضرات واقعتاً حدود اللہ کی رعایت کرنے والے تھے، حالانکہ وہ حضرت کے خادم اور ماتحت تھے، لیکن ایسی بات آئی کہ جس میں حضرت کو بھی احساس ہوا کہ اس معاملہ میں میری طرف سے تساہل ہوا ہے تو فوراً برسرِ مجلس اس کا اقرار کرلیا

……پھر وہ اپنی مرضی نہیں چلاتے تھے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک مرتبہ حضرت حر بن قیسؒ جو تابعی ہیں، عالم بھی تھے اور قرآنِ پاک کی قاری بھی تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اہلِ مشورہ میں سے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جو لوگ اہلِ علم ہوا کرتے تھے ان کو اپنا اہلِ مشورہ بنالیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا حضرت حر بن قیس کے چچا عیینہ بن حصن رضی اللہ عنہ۔ جو صحابی تھے اور دیہات کے رہنے والے تھے۔ مدینہ منورہ آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت تھا اوران کو معلوم تھا کہ میرے بھتیجے کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یہاں اثر ورسوخ حاصل ہے، اس

لئے انہوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جو خصوصی مجلس ہوتی ہے اس میں حاضری کے واسطے میرے لئے اجازت حاصل کرلو۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ وہ حاضر ہوئے، مشورہ ہورہا تھا اس موقعہ پر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ انصاف سے کام نہیں لیتے اور مال جس طرح تقسیم کرنا چاہیے اس طرح تقسیم نہیں کرتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ فوراً کوڑے پر گیا اس لئے کہ یہ بات صریح غلط تھی۔ حضرت حر بن قیسؓ نے دیکھا کہ معاملہ بگڑ جائے گا اس لئے انہوں نے فوراً قرانِ پاک کی یہ آیت پڑھی ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ آپ درگذر سے کام لیں اور بھلی باتوں کا حکم دیں اور نادان لوگوں سے درگذر کریں اور ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ کریں۔ یہ آیت پڑھ کر کہا کہ یہ میرے چچا بھی نادانوں میں سے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ وہیں رک گیا اور سزا دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن موقوف کردیا۔ بخاری شریف میں روایت ہے ﴿كَانَ وَقَّافاً عِنْدَ كِتَابِ اللهِ﴾ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے سامنے بہت ٹھہرنے والے تھے، یعنی جہاں اللہ تعالی کا حکم آ گیا پھر وہاں اپنی مرضی نہیں چلاتے تھے۔

بہرحال! یہ ایک خاص چیز ہے جس کا ہمیں بھی اہتمام کرنا چاہیے جب ہم احادیث کے اندر اس قسم کی باتیں سنتے ہیں تو شوق ودلچسپی سے سنتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو اس میں ہماری طرف سے کوتاہی ہوتی ہے۔

﴿نصیب دار روکے گئے تھے﴾

۲۵۸۔عن أسامة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: قُمْتُ عَلىٰ بَابِ الْجَنَّةِ، فَإِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنُ، وَأَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ، غَيْرَ أَنَّ أَصْحَابَ النَّارِ قَدْ أُمِرَ بِهِمْ إِلىٰ النَّارِ. وَقُمْتُ عَلىٰ بَابِ النَّارِ فَإِذَا عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا النِّسَآءُ. (متفق عليه)

جب آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے تھے تو آپ کو جنت و دوزخ کی سیر کرائی گئی تھی، دوسرے اوقات میں بھی آپ کو جنت و دوزخ دکھلائی گئی تھی جیسے نماز کے واقعہ میں آتا ہے۔ اس طرح آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف مواقع پر جنت و دوزخ کے حالات سے واقف کرایا گیا ہے۔

خیر! حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں جنت کے دروازے پر کھڑا تھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس میں جانے والے اکثر لوگ مساکین کمزور اور مسکنت والے ہیں یعنی ایسے لوگ جن کو لوگ زیادہ اہمیت نہیں دیتے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جب بھی بھیجا گیا تو عام طور پر ان کی دعوت کو قبول کرنے والے زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہوا کرتے تھے، تو ظاہر ہے کہ جنت میں جانے والوں میں انہیں کی کثرت بھی ہوگی۔ ﴿وَأَصۡحَابُ الۡجَدِّ مَحۡبُوۡسُوۡنَ﴾ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ خوش بخت لوگ جس کو ہم اپنی زبان میں نصیب دار کہتے ہیں، تو خوش بخت لوگ روکے گئے تھے، یعنی ان کو جنت میں جانے کی اجازت نہیں ملی تھی۔

ان کو جنت کے دروازے پر جو روکا گیا تھا، یا تو ان کے لئے بھی جنت میں جانے کا فیصلہ تو ہو چکا تھا لیکن اس وقت فوری طور پر اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی، اس لئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مال و دولت عطا کیا گیا تھا اس کا جب تک حساب و کتاب مکمل نہ ہو جائے وہاں تک کیسے جائیں گے۔ جیسے جن لوگوں کا بیرون کا سفر ہوا کرتا ہے ان کو معلوم ہے کہ جو لوگ وہاں سے خریداری کر کے سامان لے کر آتے ہیں تو جب تک ان کا کسٹم نہیں ہو جاتا وہاں تک وہ نہیں نکل سکتے۔ لیکن جو لوگ خالی ہاتھ ہوتے ہیں وہ فوراً نکل جاتے ہیں،

ان کے لئے کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

بہرحال! دنیا میں جنہیں خوش بخت کہا جاتا ہے، مال دار لوگ یا نصیب دار لوگ ان کو جنت میں داخلہ سے روکا ہوا تھا۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ فقراء سے پانچ سو سال کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔

جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی

اور حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ مَیں جہنم کے دروازے پر کھڑا تھا تو دیکھتا ہوں کہ جہنم میں جانے والوں میں اکثریت عورتوں کی ہے یعنی جہنم میں جانے والوں میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

اس کی وجہ بھی روایتوں میں آتی ہے، نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ عورتوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ مجھے دکھلایا گیا کہ تم (یعنی عورتیں) جہنم میں زیادہ ہو۔ تو عورتوں نے سوال کیا یا رسول اللہ! یہ کس وجہ سے ہے؟ اس پر نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ﴾ تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری زیادہ کیا کرتی ہو۔

(بخاری شریف۔۳۰۴)

حضور ﷺ نے یہ دو باتیں صاف طور پر فرمائیں۔ ایک تو یہ کہ عورتیں زبان چلانے میں بہت زیادہ آزاد ہوتی ہیں، لعنت ملامت کرنا، کسی کو بددعا دینا اور ایسی کڑوی باتیں زبان سے نکالتی ہیں کہ اللہ کی پناہ! یعنی دل تو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ بعض مرتبہ عورت کی زبان سے ایسی باتیں نکلتی ہیں کہ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔

بہرحال! یہ بات عورتوں میں عام ہوتی ہے کہ وہ لعنت زیادہ کرتی ہیں۔ اللہ کی رحمت سے دور کرنے کو لعنت کہتے ہیں۔ اور لعنت کے سلسلہ میں ایک چیز خاص طور پر حدیث

سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جو آدمی کثرت سے لعنت کرتا ہے وہ ہمیشہ پریشان حال رہتا ہے

لعنت واپس آ کر کہنے والے ہی کو لگتی ہے

بعض لوگوں کو عادت ہوتی ہے کہ بات بات پر بددعا دیتے ہیں، سامنے والا بددعا کا اہل ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ لعنت کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب کوئی کسی کے اوپر لعنت کرتا ہے تو اس کے بول آسمان پر جاتے ہیں اور اپنے لئے جگہ تلاش کرتے ہیں، لیکن جب وہاں جگہ نہیں ملتی تو وہ بول زمین پر آتے ہیں اور یہاں جگہ تلاش کرتے ہیں، یہاں بھی جب کوئی جگہ نہیں ملتی تو جس کے متعلق کہے گئے ہیں اس کا رُخ کرتے ہیں، اگر وہ اس کا اہل ہے یعنی اس کے حالات ایسے ہیں کہ لعنت کا حقدار ہے تب تو وہ بول اس کو پہنچ جاتے ہیں، اور اگر وہ اس کا اہل نہیں ہے تو جس نے کہے ہیں اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ گویا وہ لعنت واپس آ کر اس کہنے والے ہی کو لگتی ہے۔ (ابوداؤد شریف، ۴۹۰۵)

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ جیسے ایک گیند (Ball) ہوا کرتی ہے، اس کو آپ سامنے ماریں تو جس جگہ پر مارا گیا اگر وہ چیز نرم ہے یعنی وہ اس قابل ہے کہ اس گیند کو اپنے اندر اخذ کر لے تو وہ وہیں رہ جائے گی، اور اگر وہ جگہ سخت ہے یعنی وہ جگہ اس گیند کو اخذ کرنے کی اہل نہیں ہے تو جس نے پھینکی ہے اسی کی طرف پوری قوت کے ساتھ لوٹتی ہے۔ اس لئے لعنت کے سلسلہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

جو لوگ کثرت سے لعنت و ملامت کرتے ہیں وہ لوگ عام طور پر خود ہی پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں، اس کی وجہ ان کی اپنی ہی لعنت و ملامت ہوتی ہے، اس لئے کہ ظاہر ہے جب اس کی عادت ہے تو وہ ایسے لوگوں پر بھی لعنت و ملامت کرے گا جو اس کے اہل نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوگا

کہ وہ اُسی پر لوٹے گی اور اس کو ہی بھگتنا پڑے گا۔

﴿ کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں ہے ﴾

حضور ﷺ نے دوسری چیز ارشاد فرمائی ﴿وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ﴾ شوہر کی ناشکری کرتی ہے، ایک اور روایت میں ہے کہ ان عورتوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی کے ساتھ اگر تم زندگی بھر احسان کرتے رہو اور پھر کبھی کوئی بات طبیعت کے خلاف ناگواری کی پیش آئی تو وہ یوں کہے گی، حدیث کے الفاظ ہیں حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿مَارَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ﴾ وہ شوہر سے یوں کہے گی کہ تم سے تو میں نے کبھی کوئی بھلائی دیکھی ہی نہیں ہے۔

حضرت اقدس گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ وہ یوں کہے گی کہ اس گھر میں آ کر میں نے کیا دیکھا، ایک چیتھڑا اور ایک ٹھیکرا۔ کپڑے کو چیتھڑے سے تعبیر کرے گی اور برتن کو ٹھیکرے سے تعبیر کرے گی۔ تو ناشکری کا بھی ان کا ایک مزاج ہوتا ہے، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ دو باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے وہ کثرت سے جہنم میں جائے گی۔ لہٰذا ان سے بھی بچنے کا اہتمام ہونا چاہیے۔

﴿ ماں کی گود میں بولنے والے تین بچے ﴾

۲۵۹. عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لم يتكلم من المهد الا ثلاثة.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ماں کی گود میں تین بچوں نے بات کی ہے، ایک تو عیسیٰ بن مریم کہ جب ان کی والدہ حضرت مریم ان کو لے کر قوم کے پاس آئیں تو لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی شادی نہیں ہوئی ہے، پھر یہ بچہ کیسا ہے؟ تو وہ خاموش رہیں اور بچہ کی طرف اشارہ کر دیا، اس پر وہ بچہ یعنی حضرت عیسیٰ نے

جواب دیا تھا۔ یہ قصہ قرآنِ پاک میں تفصیل سے موجود ہے۔

اور دوسرا بچہ جس نے ماں کی گود میں دودھ پینے کے زمانہ میں بات کی، وہ جریج والا ہے یعنی وہ بچہ جس نے جریج کی وجہ سے بات کی تھی، اس لئے اس کو صاحب جریج کہا گیا ہے۔ یہ جریج کون ہے؟

بنواسرائیل کے اندر ایک عبادت گذار آدمی تھا، اس نے ایک کنیسا اور چرچ بنا رکھا تھا ﴿صومعة﴾ ایسے گھر کو کہتے ہیں جو منارہ کی شکل کا ہوتا ہے اور اوپر سے نوکیلا ہوتا ہے اور اندر ایک چھوٹا حجرہ ہوتا ہے اور اس میں کوئی کمرہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ اس زمانہ میں بنواسرائیل کے اندر جو لوگ اپنے آپ کو دنیا کے جھمیلوں سے الگ کر لیتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے واسطے فارغ کر لیتے تھے؛ وہ اسی میں رہتے تھے اور اللہ کی عبادت میں مشغول رہا کرتے تھے۔

بہرحال! جریج نے بھی ایک عمارت بنا رکھی تھی اور اسی کے اندر وہ رہتا تھا، اس کی ماں تھی جو اس کے ساتھ بات چیت کرنے کے لئے وہاں آیا کرتی تھی، جب وہ نیچے سے آواز دیتی تو جریج اپنی عبادت گاہ کے سوراخ میں سے سر نکال کر اپنی ماں کے ساتھ بات کر لیا کرتے تھے اور ماں کا جب تک جی چاہتا اپنے بیٹے کے پاس رہتی، پھر واپس چلی جاتی۔ ایک روز ایسا ہوا کہ ان کی ماں ملاقات کے لئے آئی اور نیچے سے آواز دی، اس وقت وہ نماز میں مشغول تھے، اس لئے معاملہ پیچیدہ ہو گیا کہ نماز توڑ کر اور اللہ کی عبادت سے ہٹ کر ماں کی آواز کا جواب دیں، یا عبادت میں ہی مشغول رہیں اور ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیں۔ گویا ان کو اپنی نماز کا فکر لاحق ہوا، چنانچہ وہ نماز میں مشغول رہے اور ماں کی آواز کا جواب نہیں دیا، ماں آواز دیتی رہی اور تھوڑی دیر بعد واپس چلی گئی۔ دوسرے روز پھر آئی تو اتفاق

کی بات کہ اس روز بھی ایسا ہی ہوا کہ جس وقت ماں ملاقات کے واسطے آئی تو یہ نماز میں مشغول تھے، ماں نے نیچے سے آواز دی، لیکن اس روز بھی انہوں نے یہی سوچا کہ اے رب! ایک طرف میری نماز ہے اور دوسری طرف میری ماں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نماز توڑ دوں، چنانچہ وہ نماز میں ہی مشغول رہے۔ پھر تیسرے روز بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اپنی نماز میں مشغول رہے۔ جب تین روز تک مسلسل ایسا ہی ہوا تو ان کی ماں نے بددعا دے دی کہ اے اللہ! اس کو اس وقت تک موت نہ دیجیو جب تک کہ وہ زناکار عورتوں کا چہرہ دیکھ نہ لے۔ یعنی جب تک کہ تو اس کو زانیہ عورتوں کے فتنے میں نہ ڈالے؛ وہاں تک اس کو موت نہ آئے۔ ان کی ماں نے یہ کہا اور چلی گئی۔

پھر ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ جہاں رہتے تھے وہاں کے لوگ ان کا اور ان کی عبادت کا تذکرہ کرنے لگے کہ یہ اللہ کے مخصوص بندوں میں سے ہیں، اللہ کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں، اس مجلس میں ان کی خوبیاں بیان ہو رہی تھیں۔ وہاں ایک بدکار عورت بھی تھی جو ایسی حسین وجمیل تھی کہ اس کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا لیکن وہ بدکار تھی۔ جب لوگ جریج کی خوبیوں کا تذکرہ کر رہے تھے تو اس نے یوں کہا کہ تم اگر چاہو تو میں اس کو آزمائش میں ڈالوں یعنی اس کو آزمایا جائے کہ وہ کتنا پکا ہے اور اللہ کی عبادت میں کیسا مشغول ہے؟ ایسا تو نہیں کہ ڈگمگا جائے۔ لوگوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ لہٰذا وہ ان کو آزمانے کے لئے ان کی عبادت گاہ پر پہنچی اور ان کے سامنے آئی اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے اور اس کی تدبیر کامیاب نہیں ہوئی۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں ہو رہے ہیں تو اس نے ان کو بدنام کرنے کا ارادہ کیا۔

وہاں ایک چرواہا تھا جس کی عادت یہ تھی روزانہ اپنی بکریاں چرا کر فارغ ہونے کے بعد جریج کی عبادت گاہ کے پاس آ کر رات گذارا کرتا تھا، جب اس عورت نے جریج کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا اور اپنے ساتھ ملوث کرنا چاہا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئے تو اس نے چرواہے سے منہ کالا کیا، اس کے ساتھ زنا کیا اور اس سے حمل بھی ٹھہر گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس سے لوگوں نے کہا کہ یہ بچہ کہاں سے آیا، تیری تو شادی نہیں ہوئی ہے؟ تو اس نے کہہ دیا کہ یہ جریج کا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اچھا! یوں تو وہ لوگوں کو بتلاتا ہے کہ بڑا عبادت گذار ہے اور اس کی اس طرح کی حرکتیں ہیں۔ چنانچہ لوگ اس کی عبادت گاہ پر آئے اور اس کا گھیراؤ کیا آوازیں دیں کہ نیچے اُتر، تو ایسی حرکت کرتا ہے۔

دوسری روایتوں میں ہے کہ لوگوں نے نیچے اُترنے کے واسطے بہت آواز دی لیکن وہ اپنی عبادت میں ایسے مشغول تھے اس لئے انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا، جب لوگوں نے دیکھا کہ وہ نیچے اُتر ہی نہیں رہے تو پھاوڑے لے کر ان کی عبادت گاہ کو نیچے ہی سے توڑنا شروع کیا۔ چنانچہ وہ نیچے اُترے اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تو لوگوں نے اُن کی پٹائی شروع کردی۔ انہوں نے کہا کہ بھائی! بات کیا ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ جانتا ہے پھر بھی انجان بنتا ہے؟ تو نے اس کے ساتھ زنا کیا اور اس سے یہ بچہ پیدا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا! وہ بچہ کہاں ہے؟ چنانچہ اس بچہ کو لایا گیا۔ جریج نے کہا کہ مجھے کچھ موقعہ دو یہاں تک کہ مَیں کچھ رکعت نماز پڑھ لوں۔ چنانچہ انہوں نے نماز پڑھی، جب فارغ ہوئے تو اس بچہ کے پاس آ کر اس کے پیٹ پر انگلی رکھ کر کہا کہ اے بچے! تو ہی بتلا! کہ تیرا باپ کون ہے؟ بچہ نے کہا کہ فلاں چرواہا ہے۔ جب لوگوں نے دیکھا اور ان کی یہ کرامت ظاہر ہوئی تو لوگوں نے ان

سے معافی مانگی، اوران کے ہاتھ چومنے لگے اور برکت حاصل کرنے لگے اور کہا کہ تمہارا عبادت خانہ جو ہم نے توڑ دیا ہے اس کو سونے کا بنا دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ سونے کا بنانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ پہلے جیسا تھا ویسا ہی بنادو۔ چنانچہ بنادیا گیا۔

یہ دو بچے ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ تین بچوں نے ماں کی گود میں بات کی تھی۔ایک حضرت عیسیٰ، دوسرا یہ جریج والا بچہ جس نے جریج کی براءت کی گواہی دی تھی۔

حضور ﷺ تیسرے بچہ کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا، اچانک دیکھا کہ ایک نوجوان وہاں سے گذرا جو ایک عمدہ اور قیمتی گھوڑے پر سوار تھا اور اس نے بہت ہی نفیس اور قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ماؤں کی عادت ہوتی ہے کہ کسی کو اچھی حالت میں دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں کہ اللہ میرے بیٹے کو ایسا بنائے، تو اس عورت نے بھی اس نوجوان کو عمدہ لباس میں، قیمتی اور اچھے گھوڑے پر سوار دیکھا تو دعا کی کہ اے اللہ! میرے اس بیٹے کو بھی اس نوجوان جیسا بنائیو۔ بچہ اس کی گود میں دودھ پی رہا تھا، اس نے دودھ چھوڑ دیا اور اس سوار کی طرف گھور کر دیکھا اور کہنے لگا کہ اے اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنائیو اور پھر دوبارہ ماں کا پستان منہ میں لے کر دودھ پینا شروع کر دیا۔

راوی کہتے ہیں کہ حضور ﷺ جس وقت یہ قصہ بیان فرما رہے تھے تو حضور ﷺ نے با قاعدہ اپنی انگلی منہ میں لے کر بتایا کہ بچہ نے اس طرح ماں کا پستان منہ میں لے کر دودھ پینا شروع کر دیا اور پستان چوسنے لگا۔اب وہ بچہ دودھ ہی پی رہا تھا کے اس درمیان میں دیکھا کہ چند لوگ ایک لڑکی کی پٹائی کرتے وہاں سے گذرے، اس کو مارتے جارہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ تو نے زنا کرایا اور چوری بھی کی، لیکن وہ لڑکی کہہ رہی تھی ﴿حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ

الْوَکِیْلُ﴾ اللہ تعالیٰ ہی میرے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ وہ جواب میں صرف اتنا ہی جملہ بولتی تھی۔

اس لڑکی کی یہ حالت دیکھ کر ماں نے یوں دعا کی کہ اے اللہ! میرے بچے کو ایسا نہ بنائیو۔ پھر بچے نے دودھ پینا چھوڑ کر منہ پھیر کر اس لڑکی کی طرف دیکھا اور کہنے لگا کہ اے اللہ! مجھے ایسا ہی بنائیو۔

''ایسا ہی بنائیو'' کا مطلب یہ ہے اس لڑکی پر زنا اور چوری کا جو الزام لگایا جا رہا تھا وہ غلط تھا، اگرچہ اس کو بے قصور مارا جا رہا تھا۔ اس بچے کے جملے ''ایسا ہی بنائیو'' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے یہ دعا مانگ رہا ہے کہ میری بھی اس طرح پٹائی ہو۔ اس لئے کہ آدمی کو اپنے واسطے آزمائش کی دعا نہیں مانگنی چاہیے لیکن اگر آزمائش آئے تو ثابت قدم رہے۔ اس بچے کی دعا کا مطلب تو اتنا ہی تھا کہ اے اللہ! جس طرح لوگ اس لڑکی پر زنا اور چوری کی تہمت لگا رہے ہیں اور حقیقت میں وہ ایسی نہیں ہے بلکہ پاک دامن ہے تو ایسی طرح مجھے بھی پاک دامن بنانا۔

﴿کسی کی ظاہری حالت اچھی دیکھ کر دعا کرنے کی ضرورت نہیں﴾

جب بچے نے یہ دعا کی تو ماں نے اس سے کہا کہ تو بھی عجیب ہے؟ ایک عمدہ لباس میں عمدہ گھوڑے پر ایک عمدہ آدمی جا رہا تھا اور تیرے لئے میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بیٹے کو ایسا بنائیو، تو تو نے کہا کہ مجھے ایسا نہ بنائیو۔ اور اس لڑکی کی پٹائی کرتے ہوئے لوگ گذر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ تو نے زنا کیا اور چوری کی، اور میں نے تیرے لئے یہ دعا کی کہ میرے بیٹے کو ایسا نہ بنائیو، تو تو یوں کہتا ہے کہ مجھے ایسا بنائیو۔ یہ کیا بات ہے؟

تو اس بچے نے یوں کہا کہ وہ آدمی بڑا متکبر تھا، کبر وغرور میں مبتلا تھا اس لئے میں نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے ایسا متکبر نہ بنائیو۔ اور اس لڑکی نے نہ چوری کی اور نہ زنا کرایا اور لوگ اس کے متعلق یہ کہہ رہے تھے حالانکہ وہ کمزور اور مسکینہ لڑکی ہے اور اس کی معمولی حالت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا رہا تھا، اس لئے میں نے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے پاک دامن اور عاجزی وانکساری والا بنائیو۔

بس! یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ روایت اسی لئے پیش کی ہے کہ دیکھو! اس کی ماں نے اس کی ظاہری اور اچھی حالت دیکھی تو دعا کر ڈالی کہ میرے بیٹے کو ایسا بنائیو، اور اس لڑکی کی ظاہری حالت معمولی تھی اس لئے ماں نے دعا کر ڈالی کہ میرے بیٹے کو ایسا نہ بنائیو حالانکہ کسی کی ظاہری حالت اچھی دیکھ کر دعا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور کسی کی ظاہری حالت معمولی دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ یہ معمولی ہے، یہ بھی درست نہیں ہے۔ واقعتاً اندر کا حال کیا ہے؛ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں کسی کی تحقیر سے محفوظ فرمائے اور دین کی صحیح فہم نصیب فرمائے

آمین

مُلاطَفَۃُ الْیَتِیْمِ وَالْبَنَاتِ

یتیم اور بچیوں کے ساتھ مہربانی

مجلس (۱)

اقتباس

(۱)اس باب میں خاص طور پر جن افراد کو شمار کیا گیا ہے ان میں یتیم لڑکیاں، تمام کمزور مسکین وشکستہ دل لوگ ہیں؛ ان تمام انواع کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیے، بھلائی و احسان کا سلوک کرنا چاہیے، شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے، تواضع وانکساری کے ساتھ پیش آنا چاہیے، بلکہ ان کے سامنے بچھ جانا چاہیے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو یتیم ہوتا ہے، لوگ اس کے مال وجائداد پر قبضہ کر لیتے ہیں اس کے حقوق مارنے کی کوشش کرتے ہیں، جو آتا ہے اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس پر تسلط جمانے کی، اس پر غالب آنے کی اور اس پر چڑھ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو یہ تعلیم دی جارہی ہے، اور جو شخص یتیمی کے دور سے گذر چکا ہو، اس کو اگر کہا جائے کہ بھائی! یتیموں کے اوپر چڑھ مت بیٹھو، اس کے ساتھ زیادتی مت کرو؛ تو وہ اس کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔

(۲) نبی کریم ﷺ کی جب بعثت ہوئی اس وقت لڑکیوں کے ساتھ جو نازیبا اور ناروا سلوک کیا جاتا تھا وہ ناقابلِ بیان ہے، قرآنِ پاک میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ان میں سے کسی کو جب بچی کی پیدائش کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو یہ سن کر ان کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے دم کو اندر ہی اندر گُھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اور وہ اپنی قوم سے منہ چھپائے پھرتا ہے گویا اس کو لوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے اور پھر سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ اس بچی کو اپنے گھر میں رہنے دے یا مٹی میں دبا دے اور زندہ دفن کر دے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَامُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

أعوذباللہ من الشّيطان الرّجيم. بسم اللہ الرّحمٰن الرّحيم

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ. (الحجر.۸۸)

وقال اللہ تعالیٰ: وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِوَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَاتَعْدُعَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُزِيْنَةَالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا(الكهف . ۲۸)

وقال اللہ تعالیٰ:فَأَمَّاالْيَتِيْمَ فَلَاتَقْهَرْ،وَأَمَّاالسَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ. (الضحیٰ.۹،۱۰)

وقال اللہ تعالیٰ:أَرَأَيْتَ الَّذِىْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِىْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَلَايَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (الماعون)

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا نیا عنوان قائم کیا ہے ﴿مُلَاطَفَةِ الْيَتِيْمِ وَالْبَنَاتِ﴾ یتیم کہتے ہیں اس بچے کو جس کے باپ کا انتقال ہوگیا ہو، چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی؛ بشرطیکہ وہ نابالغ ہو۔ جب تک کہ وہ نابالغ ہے وہاں تک شریعت نے اس کو یتیم کہا ہے اور جب بالغ ہوجائے گا تو پھر اس کو یتیم نہیں کہیں گے، چاہے لوگ اس پر لفظ یتیم بولیں، لیکن حدیث پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ﴿لایتم بعد احتلام (ابوداود شریف۔ ۲۸۷۳)﴾ بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں ہے۔اس لئے وہ نابالغ بچہ جس کے باپ کا

انتقال ہوگیا ہو؛اس کو یتیم کہا جائے گا،اور وہی بچہ جب بالغ ہوگیا تو اب وہ یتیم نہیں رہا۔

دوسرا لفظ ہے(اَلْبَنَات)چونکہ زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا تھا،گویا لڑکیوں کو وہ اپنے لئے عیب سمجھتے تھے،اگر کسی کے یہاں بچی پیدا ہوئی تو اس کا کیا حال ہوتا تھا قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا نقشہ کھینچا ہے ﴿وَاِذَابُشِّرَاَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّاوَهُوَكَظِيْم،يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْءِ مَابُشِّرَبِهٖ،اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ﴾ان میں سے جب کسی کو بچی کے پیدا ہونے کی بشارت سنائی جاتی ہے تو اس خبر کو سن کر اس کا چہرہ مارے شرم اور غیظ کے کالا ہو جاتا ہے،اور وہ اپنے غصہ و ناراضی کو دباتا ہے،آج کل کی زبان میں کہیں تو وہ اپ سیٹ(upset) ہو جاتا ہے۔گویا وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ اس خبر پر اس کو اتنی زیادہ شرم آتی ہے،اور وہ ایسی عار محسوس کرتا ہے کہ لوگوں سے اپنا منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ لوگ کہیں گے کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔گویا کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔پھر وہ اس لڑکی کے متعلق یہ سوچتا ہے کہ اس ذلت کے ساتھ کیا اس لڑکی کو زندہ رہنے دے یا پھر مٹی کے اندر دبا دے؟ باری تعالیٰ نے لفظ استعمال فرمایا﴿يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ﴾ ”دسَّ، يدُسُّ“ کا معنیٰ ہے کسی کو دبا دینا۔زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ جب بچی پیدا ہوتی تھی تو اسے زندہ درگور کر دیا جاتا تھا،گویا وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں بچیوں کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا تھا،یتیم بچے کے حقوق مارے جاتے تھے۔آج بھی ہمارے سماج میں ایسا ہی ہو گیا ہے، یتیموں اور بچیوں کے ساتھ ناروا سلوک ہوتا ہے،اسی لئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان میں بچی کو بھی پیش کیا۔

﴿وَسَائِرِ الضَّعَفَةِ وَالْمَسَاكِيْنَ وَالْمُنْكَسِرِيْنَ﴾ پچھلے باب میں گذر چکا ہے کہ کمزور سے کیا مراد ہے۔جسمانی، مالی، یا عہدہ ومنصب کسی بھی کے اعتبار سے کمزوری ہو،تمام کمزوروں، مسکینوں اور منکسرین یعنی شکستہ حال وشکستہ دل لوگوں کے ساتھ ملاطفت اور نرمی کا معاملہ کرنا اور اچھا سلوک کرنا۔

یہاں نرمی کے ساتھ بات کرنے کے لئے کہا گیا،اس لئے کہ عام طور پر ایسوں سے جب بار بار ملنا ہوتا ہے تو ان کو دیکھ کر طبیعت میں طیش آ جاتا ہے،اور بلا وجہ ان پر ناراض ہوتے ہیں اور غصہ کرتے ہیں جیسے کوئی غریب مانگنے آ گیا تو بس تیوری ہی چڑھ جاتی ہے۔اسی طرح بعض لوگوں کا حال ہوتا ہے کہ لڑکی جب سامنے آتی ہے تو اس کو دیکھ کر غصہ ہو جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس بے چاری نے کوئی جرم کر دیا ہے۔ اس لئے پہلی بات تو یہ بتلائی کہ ایسوں کے ساتھ نرمی سے پیش آئے،اور مزید ترقی کرتے ہوئے کہا﴿وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ﴾ ان کے ساتھ احسان اور اچھا سلوک کرو۔یہ ایک قدم اور آگے ہے کہ ان پر محبت وشفقت کا معاملہ ہو ﴿وَالتَّوَاضُعِ مَعَهُمْ﴾ اور آگے بڑھ کر کہا جا رہا ہے کہ ان کے ساتھ تواضع وانکساری کا سلوک کرنا۔بہت سے لوگ نرمی سے بھی پیش آتے ہیں اور احسان بھی کرتے ہیں لیکن ان کے ساتھ تواضع کیا معنٰی رکھتا ہے؟ ﴿وَخَفْضِ الْجَنَاحِ لَهُمْ﴾ یہ اور آگے کی چیز ہے کہ ان کے لئے بازو کا جھکانا، گویا ان کے لئے اپنے آپ کو بچھا دینا، جیسے وہ ان کے لئے بچھتے ہیں، یہ بھی ان کے لئے بچھ جائیں۔

اس باب میں خاص طور پر جن افراد کو شمار کیا گیا ہے ان میں یتیم لڑکیاں، تمام کمزور، مسکین وشکستہ دل لوگ ہیں؛ ان تمام انواع کے ساتھ نرمی سے پیش آنا چاہیے، بھلائی واحسان کا سلوک کرنا چاہیے،شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے، تواضع وانکساری کے

ساتھ پیش آنا چاہیے، بلکہ ان کے سامنے بچھ جانا چاہیے۔

مؤمنین کے سامنے بچھ جایئے

آگے قرآنِ پاک کی آیتیں اور احادیث پیش کرتے ہیں ﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ﴾ یہ ایک آیت کا آخری ٹکڑا ہے، اس میں باری تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے کہا گیا۔ پوری آیت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مختلف قسم کے مشرک: یہود ونصاریٰ، مشرکین وہنود، اللہ ورسول کو نہ ماننے والے اور ایمان نہ لانے والے؛ ان سب پر دنیا کی زیب وزینت کھول کر رکھ دی ہے اور ان کو نواز رکھا ہے، آپ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ پھر فرمایا کہ ایمان والوں کے سامنے آپ اپنے بازو کو جھکا دیجیے اور ان کے سامنے بچھ جایئے۔ ﴿للمؤمنین﴾ ایمان والوں میں سب آ گئے، چاہے یتیم ہوں، کمزور ہوں، مسکین ہوں؛ سب ہی اس میں آ گئے۔

﴿وَاصۡبِرۡ نَفۡسَکَ﴾ الی آیت اگلے باب میں آ چکی ہے اور اس کی تفصیل بھی وہاں گذر چکی ہے۔

کسی یتیم پر چڑھ مت بیٹھیے

﴿فَأَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَاتَقۡهَرۡ﴾ نبی کریم ﷺ کو باری تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر خطاب کر کے کہا گیا ﴿أَلَمۡ یَجِدۡکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی وَوَجَدَکَ ضَالًّا فَهَدٰی وَوَجَدَکَ عَائِلًا فَأَغۡنٰی﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یتیم پایا تو آپ کو پناہ دی، آپ کو مال ودولت کا ضرورت مند اور محتاج پایا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو غنی کر دیا۔ اسی پر آگے آپ کو تاکید کی جا رہی ہے ﴿فَأَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَلَاتَقۡهَرۡ﴾ "قَهَرَ" کا معنیٰ کسی کے اوپر مسلط ہو جانا، غالب

آ جانا اور چڑھ بیٹھنا۔ تو معنیٰ ہوئے کہ آپ کسی یتیم پر چڑھ مت بیٹھیے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جو یتیم ہوتا ہے، لوگ اس کے مال و جائداد پر قبضہ کر لیتے ہیں، اس کے حقوق مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو آتا ہے اس کے ساتھ زیادتی کرتا ہے، اس پر تسلط جمانے، اس پر غالب آنے اور اس پر چڑھ بیٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو باری تعالیٰ نبی کریم ﷺ کو خطاب فرماتے ہیں اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ پہلے آپ کو اپنی یتیمی یاد دلائی گئی کہ اے نبی! آپ تو یتیمی کا دور دیکھ چکے ہیں اور جو آدمی کسی حالت سے گذر چکا ہو اس کو بخوبی معلوم ہوتا ہے اور اس کو اس سلسلہ میں کوئی بات کہی جاتی ہے تو اچھی طرح سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جو شخص یتیمی کے دور سے گذر چکا ہو، اس کو اگر کہا جائے کہ بھائی! یتیموں کے اوپر چڑھ مت بیٹھو، اس پر غالب نہ آ جاؤ، اس کے ساتھ زیادتی مت کرو۔ تو وہ اس کی اہمیت کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خطاب فرما کر پوری امت کو اس بات کی تعلیم دی کہ یتیموں پر چڑھ مت بیٹھیو، ان کی حق تلفی نہ کیجیو، اور ان کی جائیداد پر قبضہ نہ کر لیجیو، ان کے حقوق نہ ماریو۔

سوال کرنے والوں سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ اور سوال کرنے والے کو جھڑکیے مت۔ ''نَهَرَ، يَنْهَرُ'' کا معنیٰ جھڑکنا۔ سائل سے کیا مراد ہے؟ مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی ضرورت کی وجہ سے مال کا سوال کرتا ہے اور مانگتا ہے تو اس کو جھڑکا نہ جائے، اگر آپ کے پاس ہے تو دیجیے اور اس کی ضرورت پوری کیجیے، اور اگر آپ کے پاس نہیں ہے اور اس کی ضرورت پوری نہیں کر سکتے تو کم از کم اچھے الفاظ کہہ اس کو رخصت کر دیجیے، اس

کے ساتھ ناروا سلوک کرنے اور اس کو جھڑکنے اور ڈانٹنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

بلکہ سائل کے متعلق تو حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ سوال کرنے والے کا تم پر حق ہے ﴿وَاِنْ جَآءَ عَلیٰ فَرَسٍ (ابوداود شریف۔۱۶۶۵)﴾ چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آیا ہو۔ جیسے آج کل اگر کوئی آدمی ماروتی کار میں بیٹھ کر آوے یا موٹر بائک پر سوار ہو کر مانگنے کے واسطے آوے، تو سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے کہ سواری پر آیا ہے اور سوال کرتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ میں اعلیٰ سواری گھوڑا ہی تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر سوال کرنے آیا ہے تب بھی اس کا تم پر حق ہے، اس نے آپ سے مانگا ہے تو اس کو دیجیے، اس لئے کہ کیا ضروری ہے کہ وہ گھوڑا اسی کا ہو۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی سے مانگ کر لایا ہو۔ آپ اس کی ظاہری شکل وصورت دیکھ کر فیصلہ نہ کیجیے۔

یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سفر میں نکلا ہو اور اس کا مال چوری ہو گیا ہو۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی صاحبِ حیثیت ہے، لیکن سفر کر رہا تھا اور ٹرین میں اس کا سب سامان چوری گیا، پیسے بھی گئے، بلکہ نائٹ ڈریس پہن کر سویا تھا، صرف وہی سوٹ بدن پر رہ گیا۔ کبھی ایسے حالات حوادث کے موقعوں پر پیش آتے ہیں کہ جو لوگ کل تک دینے والے تھے وہ آج لینے والے ہو جاتے ہیں، اس لئے شریعت نے اصولی طور پر ایک تعلیم دی ہے کہ آپ کو اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کو مانگنا چاہیے یا نہیں، بلکہ جب آپ کے پاس آیا اور ہاتھ پھیلایا، تو اب آپ پر حق ہو گیا کہ اس کو دیجیے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ آپ لاکھ دو لاکھ روپے دیجیے، یا وہ ہزار کا مطالبہ کر رہا ہے، تو آپ ہزار ہی دیں، اگر وہ تعین کرتا ہے تو وہ اس کی زیادتی ہے، جیسے بعض مانگنے والے

کہتے ہیں کہ بھائی! سوروپے کا سوال ہے، اس سے کم لئے بغیر نہیں جائیں گے، تو ان کو بھی شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بس! آپ تو اپنی حیثیت کے مطابق دے دیجیے، باقی آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس سے اُلجھیں، اس کو جھڑکیں اور ڈانٹیں، اگر آپ کے پاس دینے کے لئے نہیں ہے تو محبت کے ساتھ اس کو رخصت کر دیجیے، اس کے بعد بھی وہ نہیں جاتا تو آپ کو اس سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر آپ ان کو نہ دیں تو زور زور سے کہتے ہیں کہ دیکھو تو سہی، اتنا بڑا مکان ہے، اور صرف دو روپے ہی دیتے ہیں، صاحبِ مکان بھی بے چارہ شرمندہ ہو جاتا ہے۔ ایسے سائل کے ساتھ اُلجھنا تو اپنے آپ کو اور زیادہ رسوا کرنا ہے، اسلئے آپ اپنا کام کر کے اس سے علاحدہ ہو جایئے۔ بہر حال! سوال کرنے والے کو نہ جھڑکیے۔

اسی طرح یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی آدمی کسی عالم اور جاننے والے سے کوئی علمی سوال کرتا ہے تو اس کو بھی چاہیے کہ اس کو نہ جھڑکے، اگر اس کی بات جواب دینے کے قابل ہے تو جواب دیدے، اور اگر اس قابل نہیں ہے تو محبت سے سمجھا کر کے رخصت کر دے۔

بہر حال! یہاں یتیم کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ کمزور و مسکین ہوتا ہے، اس لئے اس سے نرمی سے پیش آنا چاہیے۔ اور سائل کو جھڑکنے سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کہ وہ بھی کبھی کمزور اور مسکین ہوتا ہے۔

یتیموں کو دھکے دینا کافروں کا کام ہے

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿أَرَأَيتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلىٰ طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾ آپ نے اس کو دیکھا جو اللہ تعالیٰ

کی طرف سے بدلہ دئے جانے والے دن کو جھٹلاتا ہے۔ہم سورۂ فاتحہ میں پڑھتے ہیں ﴿مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ روزِ جزا، بدلے کے دن یعنی قیامت کے دن کا مالک ہے۔ تو ظاہر ہے کہ جو آدمی اس بات کا یقین وایمان رکھتا ہو کہ دنیا میں جو کچھ کیا ہے اگر اچھا کیا ہے تو، اور برا کیا ہے تو؛ سب کا بدلہ کل قیامت کے روز ملنے والا ہے، تو وہ آدمی کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچے گا، اور ایسا آدمی کبھی بھی کوئی کام ناعاقبت اندیشی سے نہیں کرے گا۔اسی لئے حضور ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ آپ نے اس کو دیکھا جو بدلے کے دن کا انکار کرتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت میں اعمال کا بدلہ ملنے والا ہے اس کو نہیں مانتا۔ یہ ایک مشرک تھا جس کا نام کتابوں میں عاص بن وائل بتلایا گیا ہے۔

﴿فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی ہے وہ شخص جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکینوں کو کھانا کھلانے پر لوگوں کو ابھارتا نہیں ہے۔گویا اس کی یہ سب حرکتیں ہیں۔ یہاں تو اس برے وصف کی وجہ سے یہ آیت پیش کی ہے کہ وہ یتیم کو دھکے دیا کرتا تھا۔لہٰذا ایک ایمان والے کو چاہیے کہ ایسے اوصاف سے اپنے آپ کو بچائے۔

جیسے کہ تین باتیں منافق کی نشانیاں اور علامت بتلائی گئی ہیں کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے اور امانت میں خیانت کرے۔ گویا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ تین باتیں مؤمن کی شان کے خلاف ہیں اور منافقوں کے کام ہیں، یہ کہہ کر آپ ﷺ امت کو تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ مؤمن کو چاہیے کہ ان تین کاموں سے اپنے آپ کو بچائے، اس لئے یہ ایمان والوں کے کام نہیں ہیں۔ جیسے بچوں کو سمجھاتے ہیں کہ بیٹا! یہ ہمارا کام نہیں ہے، اسی طریقہ سے اہلِ ایمان کو تعلیم دینے کے لئے ایک انداز یہ بھی اختیار کیا گیا کہ یتیم کو دھکے دینا تو کافروں کا کام ہے، اگر کوئی

آدمی مسلمان ہوکرایسا کرتا ہےتو اس کی وجہ سے اگر چہ ایمان سے نہیں نکلتا، لیکن اس کی یہ حرکت ایمان کا تقاضہ نہیں ہے۔

اور ایک وصف یہ ہے کہ مساکین کو کھلانے پر ابھارتا نہیں ہے، یعنی خود تو اتنا بخیل ہے کہ کھلاتا نہیں ہے لیکن دوسروں کو بھی کھلانے پر ترغیب نہیں دیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جیسے یتیموں اور غریبوں کو خود کھلانا نیکی کا کام ہے اسی طرح دوسروں کو ان امور کی طرف متوجہ کرنا اور ترغیب دینا بھی بڑی نیکی کا کام ہے۔

اب اس سلسلہ میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب

۲۶۰۔عن سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ قال: كُنَّا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ سِتَّةَ نَفَرٍ، فَقَالَ الْمُشْرِكُونَ لِلنَّبِيِّ ﷺ، أُطْرُدْ هٰؤُلَاءِ لَا يَجْتَرِئُونَ عَلَيْنَا، وَكُنْتُ أَنَا وَابْنُ مَسْعُودٍ وَرَجُلٌ مِّنْ هُذَيْلٍ وَبِلَالٌ، وَرَجُلَانِ لَسْتُ أُسَمِّيهِمَا، فَوَقَعَ فِي نَفْسِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مَا شَاءَ اللّٰهُ أَنْ يَّقَعَ، فَحَدَّثَ نَفْسَهُ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَلَا تَطْرُدِ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ.

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھے، مشرکین نے حضور ﷺ سے کہا کہ ان کو یہاں سے نکالئے، ہم ان کو اپنے خلاف جرأت کا موقعہ نہیں دیں گے۔ ایک تو مَیں تھا، ایک ابن مسعود تھے، قبیلۂ ہذیل کے ایک آدمی تھے، ایک حضرت بلال تھے اور دو آدمی اور تھے مَیں ان کا نام نہیں لیتا۔ نبی کریم ﷺ کے دل میں بھی وہ بات آگئی جو اللہ تعالیٰ نے سجھائی تو آپ نے جی میں کہا کہ ٹھیک ہے۔ تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اے نبی! آپ اپنی مجلس سے ان لوگوں کو نہ ہٹائیے جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی چاہنے والے ہیں۔

افادات:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان دس صحابہ میں سے ہیں جن کو بیک وقت ایک ہی مجلس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت سنائی تھی۔ دیکھئے! جنت کی بشارت دوسرے صحابہ کے متعلق بھی ہے۔لیکن جن کوعشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی موقعہ پر ایک ہی مجلس میں کسی مناسبت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دس حضرات کا نام لے کر جنت کی بشارت سنائی تھی۔تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور قبیلہ بنوزہرہ سے ان کا تعلق ہے،اوراسی قبیلہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا تعلق بھی ہے،اسی لئے ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموں یعنی رشتہ کے ماموں بھی کہا جاتا ہے، ماں جس خاندان سے ہوتی ہے اس خاندان کے تمام مرد اس بچہ کے ماموں کہلاتے ہیں، بڑے جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں اور یہ ان لوگوں میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لائے تھے،ان کے اور بھی فضائل ہیں۔

خیر! حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم چھ آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ یہ ابتدائی زمانہ کی بات ہے، یہ چھ آدمی کون تھے، آگے ان ناموں کو بتلارہے ہیں کہ ایک تو مَیں تھا، ایک ابن مسعود تھے، قبیلۂ ہذیل کے ایک آدمی تھے، ایک حضرت بلال تھے اور دو آدمی اور تھے لیکن مَیں ان کا نام نہیں لیتا۔ بعضوں نے کہا کہ وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر تھے۔تو ہم چھ آدمی تھے اور سب ایسے تھے جو ظاہری اعتبار سے زیادہ مال ودولت کے حامل نہیں تھے۔

انسان بھی جانور رہے

دیکھئے! ایک بات یادرہے کہ ہمیشہ سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ دنیا کے اندر

مال و دولت اور ظاہری اسباب و سامان کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا،انسان کی ایک حیثیت تو جاندار ہونے کی ہے جیسے انسان جان رکھنے والا ایک جسم ہے ایسے ہی دوسرے جانور بھی ہیں۔اورایک جاندار ہونے کی حیثیت سے جو ضرورتیں دوسرے جانداروں کو پیش آتی ہیں؛وہی ساری ضرورتیں انسان کو بھی پیش آتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انسان اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بہت ترقی کئے ہوئے ہے،باقی تمام جاندار بھی ان ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ایسا کونسا جاندار ہے جس کو کھانے،آرام کرنے اور قضائے حاجت کی ضرورت نہیں پڑتی؟ تمام جاندار چاہے بیل بھینس ہوں چاہے پالتو جانور ہوں یا جنگلی ہوں؛ سب کو یہ ضرورتیں پیش آتی ہیں۔تو انسان کی ایک حیثیت تو جاندار ہونے کی ہے۔اور دوسری حیثیت اس کی انسان ہونے کی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ونائب ہونے کی ہے۔

اب قدیم زمانہ سے دنیا میں بسنے والے انسانوں میں اکثریت (majority) ایسے لوگوں کی ہے جو یوں سمجھتے ہیں کہ ہماری زندگی کا نصب العین اور مقصد ہی یہ ہے کہ جو ضرورتیں ایک جاندار ہونے کی حیثیت سے ہیں؛بس ان ہی کو پورا کرنا ہے۔چنانچہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وہ خوب محنت ومشقت اٹھاتے ہیں اوران ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو اسباب مہیا ہونے چاہئیں، مال و دولت اور دوسرے ساز و سامان وغیرہ انہیں کو جمع کرنے کی فکر کرتے ہیں،اور جب وہ سارے اسباب میسر آجاتے ہیں تو وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اب ہم نے اپنی زندگی کا مقصد حاصل کرلیا،اور پھر اسی پیمانے پر لوگوں کو ناپنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کے پاس مال ودولت اور ضرورتیں پورا کرنے کے اسباب وسامان زیادہ ہیں؛ انہیں کو وہ اہمیت دیتے ہیں۔

انسانیت کے اصل جوہر

حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے اندر انسان کو ان ضرورتوں کے واسطے نہیں بھیجا طبعی ضرورتیں ہونے کی وجہ سے ان کا پورا کرنا ضروری ہے اوران کو پورا کرنے کے لئے انسان کو کوشش کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت بھی دی ہے، لیکن انسان کو پیدا کرنے کا مقصد یہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی انسانیت کے اصل جوہر ایمان ویقین، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ ہیں، دراصل یہی وہ چیزیں ہیں جو انسان کے انسانیت والے جوہر کو جِلا بخشتی ہیں اوران کی وجہ سے انسانیت کی ترقی ہوتی ہے۔ تو انسان ہونے کی حیثیت سے یہی اوصاف حاصل کرنا مقصدِ زندگی ہے، اسی لئے قرآنِ پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمادیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس کا مرتبہ ومقام کیا ہے؟ ﴿اِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾ وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس کے پاس مال ودولت زیادہ ہے، زندگی کے اسباب، ساز وسامان اور راحت کی چیزیں زیادہ ہیں، کس کے پاس بنگلہ ہے، کس کے پاس فیکٹری ہے، کس کے پاس کاریں ہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور باعزت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔

اخلاق کا تعلق قلب سے، اورظہور افعال سے

اخلاق کا تعلق تو آدمی کے قلب سے ہے، تواضع وانکساری اور دوسرے جتنے بھی اخلاق ہیں ان تمام کا تعلق دل سے ہے، اوران کا ظہور آدمی کے اعمال سے ہوتا ہے، جیسے سخاوت ہے، یہ صفت آدمی کے چہرے پر یا اس کی پیشانی پر اور ہاتھ پر نظر نہیں آئے گی بلکہ وہ تو اس کے دل کی ایک صفت ہے، اوراس سخاوت کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ

آدمی اپنے مال کو لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق خوب خرچ کرتا ہے، روکتا نہیں ہے، جہاں جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں اس کے خرچ کرنے میں ذرّہ برابر بھی تامل نہیں کرتا، تو سخاوت دل کا وصف ہے اور اس کا صدور مال خرچ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اسی طرح بہادری کا وصف ہے جو قلب کے اندر رکھی ہوئی ایک خوبی ہے، جس کا ظہور افعال سے ہوتا ہے۔ میدانِ جہاد میں جب جان کی بازی لگا کر اسلام کی حفاظت کرتا ہے اور اپنی بہادری کے جوہر دکھلاتا ہے اُس وقت لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں کے اندر اتنی بہادری ہے۔ اسی طرح دوسرے اوصاف تواضع و انکساری، ایمان ویقین وغیرہ کا بھی حال ہے، یہ سب نظر آنے والی چیزیں نہیں ہیں بلکہ جب اس سے افعال صادر ہوتے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں کے اندر کتنا ایمان و یقین مضبوط ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جن صفات پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت ملتی ہے وہ لوگوں کے اندر چھپی ہوئی ہیں، ان کا فیصلہ ظاہری حالت کو دیکھ کر نہیں کیا جاسکتا مثلاً ایک آدمی ظاہری اعتبار سے کمزور ہے، اس کے کپڑے پھٹے پرانے اور میلے کچیلے ہیں، ہیئت ٹھیک نہیں ہے، چہرہ حسین وجمیل نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ اوصاف جو عنداللہ مقبولیت کا مدار ہیں وہ بھی اس کے اندر نہیں پائے جاتے۔ ہوسکتا ہے کہ جس کے کپڑے بہت زیادہ اجلے اور استری کئے ہوئے ہیں اور چہرہ بھی زیادہ حسین وجمیل ہے، اُس آدمی کے مقابلہ میں اِس میں یہ اوصاف زیادہ موجود ہوں۔ اسی بات کو یہاں بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی کی ظاہری حیثیت دیکھ کر فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

انبیاءؑ کی صداقت کی ایک خاص علامت

اور ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے کہ نبی کی دعوت کو قبول کرنے والے شروع میں اسی طرح کے لوگ رہے ہیں، اور اخیر میں جب پانی سر سے اوپر جاتا ہے تو پھر سب آتے ہیں لیکن اولین وہلہ میں غرباء اور مساکین قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بلکہ یہ تو صداقت کی خاص علامت سمجھی گئی ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جب دنیا کے مختلف بادشاہوں کے نام خطوط بھیجے تو روم کے بادشاہ ہرقل کو بھی ایک خط لکھا جس میں آپ نے اس کو اسلام کی دعوت دی، قیصرِ روم اپنے زمانہ کا کتبِ سابقہ کا بڑا عالم بھی تھا، اس زمانہ میں دینِ نصاریٰ کا جو سب سے بڑا پادری تھا، قیصرِ روم بھی اسی جیسا بڑا عالم تھا۔ جب اس کو یہ بتایا گیا کہ تمہارے نام ایک آدمی نے ایک خط بھیجا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے اور وہ اپنے آپ کو اللہ کے بھیجے ہوئے نبی و رسول بتاتے ہیں تو اس نے وہ خط کھولا نہیں، بلکہ پہلے پوچھا کہ جس نے یہ خط بھیجا ہے کیا اس کے حالات سے واقفیت رکھنے والے کچھ لوگ ہمارے علاقہ میں ہیں؟ اس وقت وہ بیت المقدس کی زیارت کو آیا ہوا تھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ ملکِ شام میں عرب سے تجارتی قافلے آتے ہی رہتے ہیں، ہم تلاش کرتے ہیں۔ اتفاق کی بات کہ وہ زمانہ صلحِ حدیبیہ کے بعد کا تھا اور ابوسفیان جو اس وقت مکہ کے سردار تھے اور اسلام کے خلاف جو قوتیں اُس وقت سرگرمِ عمل تھیں ان سب کے رئیس بھی وہی تھے، جیسے آج کل امریکہ کا کلنٹن ہے۔ آج کل اسلام کے خلاف جتنی قوتیں سرگرمِ عمل ہیں ان میں نمبر اول پر امریکہ ہے۔ تو اُس وقت ابوسفیان کی حیثیت بالکل مدِ مقابل کی

تھی، اور وہی ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں گئے ہوئے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ ایک قافلہ آیا ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کو بلاؤ۔ ان کو بلایا گیا اور چونکہ ہرقل عربی زبان نہیں جانتا تھا اس وجہ سے ترجمان (ا ے ڈ ا ا ہ ع) کے ذریعہ سے ان کے ساتھ بات چیت کی، ابوسفیان کو آگے بٹھایا اور دوسرے ساتھیوں کو پیچھے بٹھایا اور ساتھیوں سے کہا کہ دیکھو! مَیں ان سے کچھ سوالات کروں گا، اگر یہ غلط بات کہیں تو مجھے بتا دینا۔ اس نے کئی سوالات کئے، ایک سوال یہ کیا کہ ان پر ایمان لانے والے کون ہیں؟ قوم میں جو کمزور سمجھے جاتے ہیں وہ ہیں، یا رؤسا اور بڑے لوگ ہیں؟ ابوسفیان نے کہا کہ ہم میں جو گھٹیا اور کمزور قسم کے لوگ ہیں وہی ان پر ایمان لاتے ہیں۔ ابوسفیان نے یہ سوچ کر یہ جواب دیا کہ شاید اس کی وجہ سے ان کے خلاف اثر پڑے گا لیکن سب سوالات کر چکنے کے بعد ہرقل نے اس کا تجزیہ کیا اور اس سوال کے جواب پر ہرقل نے یوں کہا کہ تم نے یوں کہا کہ ان پر ایمان لانے والے اور ان کی دعوت پر لبیک کہنے والے اور ان کی طرف لپکنے والے کمزور لوگ ہیں، تو تمام انبیاء کرام کا یہی حال رہا ہے کہ جب ان کی دعوت شروع ہوتی ہے تو اولین وہلہ میں اس پر لبیک کہنے والے کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں۔ مَیں یہی عرض کر رہا تھا کہ یہی بات صداقت کی علامت سمجھی گئی ہے۔

غریبوں کو ہٹایئے

بہر حال! حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم کمزور قسم کے چھ آدمی تھے، اور ان مشرکین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں کہا کہ آپ ہم کو اسلام کی دعوت دیتے ہیں اور آپ کے پاس بیٹھنے والے تو ایسے گرے پڑے کمزور قسم کے لوگ ہیں، بھلا ان

لوگوں کے آپ کے قریب ہوتے ہوئے ہم کہاں آ سکتے ہیں، اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی بات سنیں اور اس کی طرف توجہ کریں اور اس کو لائقِ اعتناء سمجھیں اور آئندہ اس کو قبول کرنے کے سلسلہ میں کچھ سوچیں؛ تو پھر ان لوگوں کو پہلے رخصت کیجیے، ہم اکیلے ہی آپ کی مجلس میں ہوں گے۔ جیسے بڑے لوگ کمزور لوگوں کو قریب بھی آنے نہیں دیتے، وہ یہی سوچتے ہیں کہ ان کی جرأت بڑھ جائے گی۔ ان لوگوں نے بھی یہی کہا کہ اگر ان کے ہوتے ہوئے ہم آپ کی مجلس میں شرکت کریں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ان کو اپنے خلاف جرأت کا موقعہ دیں گے۔ لہٰذا ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

بعض روایتوں میں ہے کہ مشرکین نے آپ ﷺ کے چچا ابو طالب سے کہا کہ آپ کے بھتیجے ہم کو دعوت تو دیتے ہیں لیکن ان کے آس پاس بیٹھنے والے یہی لوگ ہیں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کی بات کی طرف توجہ کریں تو پھر ان کو چاہیے کہ ان لوگوں کو وہاں سے ہٹادیں، ہم جس وقت پہنچیں تو ہم ہی ہم ہوں، ان میں کا کوئی نہ ہو؛ تب تو ان کی بات سنیں گے؛ ورنہ نہیں۔ (روح المعانی)

آپ ﷺ کا دعوتی جذبہ

دیکھو! داعی جو ہوتا ہے اس کو بڑا شوق و جذبہ ہوتا ہے کہ میری دعوت کو سب لوگ قبول کرلیں، اس کی کوشش یہی ہوتی ہے، وہ یوں سوچتا ہے کہ کس طرح لوگ میری سنیں اور کس طرح میں اپنی بات لوگوں کے دل میں اتاروں، جس طرح بھی ہو وہ اس کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ بہر حال! روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ کو مشورہ دیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ایک مجلس ان کے لئے الگ سے قائم کیجیے،

اس میں کیا حرج ہے، اوراس میں ہم لوگ نہیں آئیں گے، اور پھر یہ سب تو اپنے ہی ہیں، ان کو اگر اس مجلس میں شرکت کا موقعہ نہیں دیا جائے گا تو کوئی بھی برا نہیں مانے گا، لہٰذا آپ ایسا کرلیں۔ اگر ہم کو فیصلہ کرنے کا موقعہ آجائے تو وہی فیصلہ کریں گے جیسا حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا تھا۔ ہم سوچیں گے کہ یہ تو ہماری بات قبول کرچکے ہیں، اور یہ تو گھر کے ہی لوگ ہیں، اگر ان کو ایک مجلس سے نکال بھی دیں تو کیا حرج ہے، ان کو اس مجلس میں آنے دو۔ اگر اس طرح بھی ان کے سامنے بات رکھ دی جائے اور وہ غور کریں تو ہوسکتا ہے کہ وہ قبول کرلیں اور اسلام کو ترقی ہو جائے گی۔ حضرت عمر نے بھی یہی سوچا اور حضور ﷺ کے جی میں بھی آ گیا کہ ایسا کرلیں، کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن باری تعالیٰ نے فرمایا کہ نہیں! اس طرح ان کے آپ کی مجلس میں آنے سے اور ان کے اس نظریہ کے ساتھ آپ کی دعوت قبول کرنے سے اسلام کو ترقی ہونے والی نہیں ہے، اسلام روپے پیسے اور ساز وسامان کا نام نہیں ہے، آپ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ آئیں گے تو ترقی ہوگی؛ ایسا نہیں ہے، بلکہ اسلام کو ترقی تو اُنہی اوصاف کے ذریعہ سے ہوگی جن کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ (ذکرہ الواحدی فی اسباب النزول۔ التحریر والتنویر۔ سورۂ انعام، ۶/ ۱۱۵)

آپ غریبوں کو مت ہٹایئے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بعض ہی مواقع ہیں جہاں باری تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو عتاب کیا گیا ہے ان میں سے ایک موقع یہ بھی ہے ﴿وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ﴾ اے نبی! آپ اپنی مجلس سے ان لوگوں کو نہ ہٹایئے جو صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، وہ خالص اللہ تعالیٰ کی

رضامندی چاہنے والے ہیں یعنی وہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف خلوص کے ساتھ متوجہ رہتے ہیں، یہاں دونوں چیزیں جمع ہوگئیں، بہت سی مرتبہ آدمی ذکر اللہ میں مشغول ہوتا ہے لیکن اخلاص نہیں ہوتا لیکن اس آیت میں ﴿یُرِیْدُوْنَ وَجْھَهُ﴾ کا لفظ بتلاتا ہے کہ وہ اللہ کو اخلاص کے ساتھ پکارتے ہیں، اور یہی تو اصل مقصود ہے۔

﴿مَا عَلَیْکَ مِنْ حِسَابِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ﴾ یہاں اہلِ علم موجود ہیں جو جانتے ہیں کہ ﴿مِنْ حِسَابِھِمْ﴾ میں ﴿ھُمْ﴾ کی ضمیر دونوں کی طرف لوٹائی گئی ہے ﴿اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ﴾ کی طرف بھی اور ان مشرکین کی طرف بھی جنہوں نے مطالبہ کیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اے نبی! ان مشرکین کے ایمان نہ لانے کی وجہ سے ان کا حساب آپ سے نہیں لیا جائے گا جب کہ آپ نے اپنی دعوت ان تک پہنچادی ﴿وَمَا مِنْ حِسَابِکَ عَلَیْھِمْ مِنْ شَیْءٍ﴾ اور آپ ان کی پیش کش کو قبول نہیں کریں گے تو ان پر کوئی زد پڑنے والی نہیں ہے ﴿فَتَطْرُدَھُمْ فَتَکُوْنَ مِنَ الظَّالِمِیْنَ﴾ اگر آپ ان کو اپنے پاس سے ہٹادیں گے تو آپ زیادتی کرنے والے ہوجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو صاف طور پر سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔

اس آیت کو لاکر یہی بتانا مقصود ہے کہ دیکھو! جتنے بھی کمزور، یتیم، مسکین اور ایسے شکستہ حال ہیں، ان کی ظاہری حالت کی وجہ سے فیصلہ نہ کیا جائے، اس لئے کہ ظاہری حالت کی وجہ سے آپ کیسے فیصلہ کرسکتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس مقام پر ہیں، قبولیت کے لئے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ تو دلوں کے اندر پوشیدہ ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی ان سے بخوبی واقف ہے۔

جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صہیب رضی اللہ عنہ وغیرہ سے معافی مانگی

۲۶۱. عن أبی هبيرة عائذ بن عمرو المُزَنِي وَهُوَمِنْ أَهْلِ بَيْعَةِ الرِّضْوَان رضی اللہ عنہ أَنَّ أَبَاسُفْيَانَ أَتٰى عَلٰى سَلْمَانَ وَصُهَيْبٍ وَبِلَالٍ فِيْ نَفَرٍ،فَقَالُوْا:مَاأَخَذَتْ سُيُوْفُ اللهِ مِنْ عَدُوِّ اللهِ مَأْخَذَهَا.فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ: أَتَقُوْلُوْنَ هٰذَاالِشَيْخِ قُرَيْشٍ وَسَيِّدِهِمْ؟فَأَتٰى النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم فَأَخْبَرَهُ،فَقَالَ:يَاأَبَابَكْرٍ! لَعَلَّکَ أَغْضَبْتَهُمْ؟ لَئِنْ كُنْتَ أَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْأَغْضَبْتَ رَبَّکَ. فَأَتَاهُمْ، فَقَالَ: يَااِخْوَتَاهُ!آغْضَبْتُكُمْ؟ قَالُوْا: لا،يَغْفِرُاللهُ لَکَ يَاأُخَيَّ.

حضرت ابوہبیرہ رضی اللہ عنہ جو اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں، ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ ابوسفیان حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور دوسرے فقراء کے پاس سے گزرے، ان کو دیکھ کر یہ حضرات کہنے لگے کہ اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں سے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم قریش کے ایک بڑے آدمی اور سردار کو ایسی بات کہتے ہو؟ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اطلاع دی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! شاید تم نے ایسا جملہ کہہ کر ان حضرات کو ناراض کر دیا، اگر تم نے ان کو ناراض کر دیا تو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً ان کے پاس گئے اور کہا اے بھائیو! کیا میں نے تم لوگوں کو ناراض کر دیا؟ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں اے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔

افادات: -حضرت ابوہبیرہ رضی اللہ عنہ اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں، ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ صلحِ حدیبیہ کے زمانہ میں ابوسفیان کا مدینہ منورہ آنا ہوا۔ حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور دوسرے فقراء مسلمان ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے، ابوسفیان وہاں سے گزرے تو ان کو دیکھ کر یہ حضرات کہنے لگے کہ اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں سے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا ہے۔ ان کی یہ بات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اچھی نہیں لگی۔ ابوسفیان اگرچہ اسلام نہیں لائے تھے لیکن قریش کے سردار اور بڑے آدمی تھے، اور

حدیثِ پاک میں حضور اکرم ﷺ نے قوم کے بڑے کا اکرام کرنے کا حکم دیا ہے۔

بہرحال! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے یوں کہا کہ تم قریش کے ایک بڑے آدمی اور سردار کو ایسی بات کہتے ہو؟ گویا انہوں نے ان کی بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ تم نے یہ اچھی بات نہیں کہی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اطلاع دی کہ یارسول اللہ! آج ایسا ہوا کہ ابوسفیان گذر رہے تھے، تو فلاں فلاں نے یہ جملہ کہا اس پر مَیں نے ان کو تنبیہ کی کہ ایسا نہیں بولنا چاہیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! شاید تم نے ایسا جملہ کہہ کر ان حضرات کو ناراض کر دیا، اگر تم نے ان کو ناراض کر دیا تو اللہ تعالیٰ کو ناراض کر دیا۔ دیکھئے! یہ جملہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کہا جا رہا ہے، حضور ﷺ ان کو تنبیہ کر رہے ہیں۔

یہ حضراتِ صحابہ ہی کی شان تھی کہ حضور ﷺ نے جہاں یہ جملہ کہا فوراً حضرت ابوبکرؓ ان کے پاس گئے، اور کہا اے بھائیو! کیا مَیں نے اپنا وہ جملہ کہہ کر تم لوگوں کو ناراض کر دیا؟ اگر ایسا ہو تو مَیں معافی مانگنے آیا ہوں۔ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں حضرت! اگر آپ ایسی بات کہیں تو اس پر ہم کہاں ناراض ہو سکتے ہیں۔ پھر کہا کہ اگرچہ ہم ناراض نہیں ہوئے ہیں پھر بھی ہم آپ کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔

دیکھئے! حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جن کو تنبیہ کی تھی وہ حضرات سلمان، صہیب وبلال وغیرہ رضی اللہ عنہم تھے۔ اب ایک امکان ہے کہ اگر یہی جملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہوتا تو کیا حضرت ابوبکرؓ ان کو بھی تنبیہ کرتے؟ ممکن ہے کہ نہ کرتے، اس لئے کہ وہ قوی اور صاحبِ حیثیت آدمی تھے، اور یہ حضرات سلمان وصہیب وبلال وغیرہؓ کمزور سمجھے جاتے تھے اور ان کو حضرت ابوبکرؓ نے تنبیہ کی، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو متوجہ کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس کو بڑی سنجیدگی سے قبول کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیان چل رہا تھا کہ یتیم بچوں، لڑکیوں اور تمام کمزوروں کے ساتھ نرمی، احسان اور شفقت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اسی سلسلہ میں روایتیں پیش کرتے ہیں۔

یتیم کی پرورش کرنے والوں کے لئے بڑی بشارت

۲۶۲. وعن سهل بن سعد رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ فِي الْجَنَّةِ هٰكَذَا. وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطىٰ وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا.

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے۔ اور آپ نے اپنی درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔ اور دونوں کے بیچ میں تھوڑی جگہ رکھی۔

۲۶۳. عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: كَافِلُ الْيَتِيمِ لَهُ أَوْلِغَيْرِهِ أَنَاوَهُوَ كَهَاتَيْنِ فِي الْجَنَّةِ. وَأَشَارَ الرَّاوِي وَهُوَمَالِكُ بْنُ أَنَسٍ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطىٰ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے یا دوسرے کے یتیم کی پرورش کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح ہوں گے، پھر راوی حدیث (حضرت امام مالک) نے درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا۔

افادات:- اس روایت میں ایک زیادتی ہے ﴿كَافِلُ الْيَتِيمِ لَهُ أَوْلِغَيْرِهِ﴾ یعنی چاہے وہ یتیم اس کا اپنا ہو یا دوسرے کا ہو۔

اسلام نے یتیموں کو ان کے حقوق دلوائے

یتیموں کے ساتھ زمانۂ جاہلیت میں بہت زیادتیاں کی جاتی تھیں کہ ان کے مال کو ہضم کر لیتے تھے، ان کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنا عام دستور تھا اور کوئی بھی یتیم کے ساتھ حقوق کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کرتا تھا، اسلام نے آکر جہاں اللہ تعالیٰ کے حکم سے

حق والوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ دلائی، وہیں خاص طور پر وہ طبقہ جس کو کمزور سمجھا جاتا تھا اور ان کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر زورآور اور طاقتور لوگ ان کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت وکوتاہی برتتے تھے، ایسے لوگوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی، اور انہیں میں سے ایک طبقہ یتیموں کا ہے۔ کمزوروں کا تذکرہ پہلے آچکا ہے، آج یتیم کی بات آئی ہے۔

پہلے بتلا چکا ہوں کہ یتیم اس بچے کو کہتے ہیں جس کے والد کا انتقال ہو چکا ہو اور وہ ابھی نابالغ ہو۔ جب تک وہ نابالغ ہے وہاں تک اس کو یتیم کہا جائے گا اور جب وہ بچہ بالغ ہو گیا تو اب شرعی طور پر وہ یتیم نہیں رہا۔ یہ بات اور رہی کہ لوگ اس کو عرف میں بعد میں بھی ایک زمانہ تک یتیم سے تعبیر کرتے رہتے ہیں۔

قرآن کا حکم؛ آپ ﷺ کا عمل

خیر! چونکہ زمانۂ جاہلیت میں یتیموں کے حقوق کی ادائیگی میں بڑی کوتاہی برتی جاتی تھی، اس لئے ضرورت تھی کہ اس طرف متوجہ کیا جاتا، لہٰذا اس سلسلہ میں قرآنِ پاک نے ہدایت دی۔ پچھلے ہفتہ گذر چکا ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ یتیم کے اوپر چڑھ مت بیٹھو۔ دوسری آیتوں میں بھی یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید آئی ہے۔ تو جہاں اللہ تعالیٰ نے یتیموں کے سلسلہ میں خاص تاکید فرمائی؛ وہیں نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات میں بھی بڑی تاکید فرمائی ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ خود اپنی طرف سے کچھ نہیں فرماتے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب اللہ میں جو احکام نازل کئے جاتے تھے انہیں کی تشریح اپنے عمل اور اپنے ارشادات سے فرماتے تھے۔ گویا جو قرآن پاک کا حکم ہے؛ وہی آپ ﷺ کا عمل ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں یہی فرمایا ﴿کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآن﴾ نبی کریم ﷺ کے اخلاق قرآن ہی ہیں یعنی اگر آپ کے اخلاق معلوم کرنے ہوں تو قرآن کا مطالعہ کرلو، آپ کی ذاتِ اقدس قرآنِ پاک کا عملی نمونہ تھی اور قرآن ہی کی تشریح کے لئے آپ کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا تھا۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَانُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی ہدایت کے واسطے جو وحی بھیجی گئی ہے آپ ﷺ اس کو ان کے سامنے کھول کھول کر واضح کر کے بیان کردیں۔

حضورِ اقدس ﷺ کا قرب حاصل کرنے کا بہترین طریقہ

یتیم کی پرورش کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کھلانے پلانے اور اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری اپنے سر لے لے، یہاں تک کہ وہ خود کفیل ہوجائے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہوجائے تو نبی کریم ﷺ نے اس کو کتنا بڑا مقام عطا فرمایا کہ یتیم کی پرورش کرنے والا اور مَیں جنت میں ساتھ ساتھ ہوں گے۔ اگرچہ کچھ فرق ہے لیکن جو قرب اور نزدیکی اس کو حاصل ہوگی اس کو حضور اقدس ﷺ اس انداز سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

جن حضرات کے دل نبی کریم ﷺ کی محبت سے بھرے ہوئے ہیں ان کے لئے تو یہ چیز بہت بڑی بشارت اور بڑی خوشی کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا قرب حاصل کرنے کے جہاں اور طریقے ہیں؛ ان میں ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہے۔ کسی ایک یتیم کے ساتھ بھی ایسا معاملہ کرلیا تو یہ فضیلت حاصل ہوجائے گی۔

اپنا یتیم

دوسری روایت نے تو معاملہ اور زیادہ آسان کردیا، اس لئے کہ عام طور پر ہم

لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ یتیم وہی ہے جو پرایا ہو، حالانکہ اپنے گھروں میں بھی یتیم ہوا کرتے ہیں مثلاً کسی کے والد کا انتقال ہوگیا، بڑا بھائی بالغ ہے، چھوٹے بھائی نابالغ ہیں تو چھوٹے بھائی یتیم ہیں، اب یہ بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائیوں کی نگرانی اور پرورش کرے گا، ان کی خیر خبر رکھے گا تو قرآن وحدیث میں یتیم کی پرورش پر جو وعدے بیان فرمائے ہیں ان سب کا وہ حقدار ہوجائے گا، یہ اپنا یتیم ہوا۔ اپنے یتیم کی اور بھی کئی صورتیں ہیں ان میں سے ایک صورت یہ ہے

رسمیت نہ ہو

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ والد کے انتقال کے وقت بھائی بہن چھوٹے ہوتے ہیں تو بڑا بھائی ہی ان کی ذمہ داری نبھاتا ہے۔ لیکن ہم لوگ بہت سی چیزیں معاشرے کے رسم ورواج اور دستور کی وجہ سے کرتے ہیں۔ دیکھو! ہمارے معاشرے کی بنیاد اسلامی تعلیمات پر ہی پڑی ہوئی ہے، لیکن ہم لوگ جب ان چیزوں کو انجام دیں تو صرف معاشرے کی رسم ورواج ہمارے پیشِ نظر نہ ہو، بلکہ اس وقت ہماری نگاہوں کے سامنے اللہ تبارک وتعالیٰ اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات ہوں، اس لئے کہ یہ کام تو کرنا ہی ہے، جب بڑے بھائی کے سر پر یہ ذمہ داری اور بوجھ آیا تو وہ لامحالہ کرے گا، لیکن ایسے موقعہ پر جو اہلِ علم ہیں ان کو چاہیے کہ اس کی توجہ اس طرف دلائیں کہ تم جو کام کررہے ہو وہ رسمی نہیں ہے بلکہ قرآنِ پاک میں اس کی تاکید اور اس پر اتنی فضیلتیں آئی ہیں، نبی کریم ﷺ نے اس پر یہ وعدے اور بشارتیں سنائی ہیں، لہٰذا جب تم یہ کام کررہے ہو؛ تو یہ سمجھ کر کرو کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے احکام کو بجالا رہا ہوں۔

دیکھو! کسی کام کو کرنا ایک تو رسم ورواج کے طور پر ہوتا ہے اور ایک اللہ ورسول

کے حکم کو بجالانے کی نیت سے ہوتا ہے، اور جو ثواب کے وعدے ہیں وہ تو درحقیقت اس دوسری صورت میں ہی پورے طور پر حاصل ہوں گے۔ ویسے ثواب سے تو پہلی صورت میں بھی محروم نہیں رہے گا لیکن جب اللہ ورسول کے حکم کو پورا کرنے کی نیت سے انجام دیں گے تو بہت اونچا مقام حاصل ہوگا اور اس پر تو ہر چیز میں ثواب ہی ثواب ہے۔

اپنے یتیم کی مختلف شکلیں

خیر! اپنے یتیم کی ایک شکل تو یہ تھی جو اوپر گذری۔ ''اپنے یتیم'' کی دوسری شکلیں بھی ہیں کہ بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا اور اس کے بچے چھوٹے ہیں، عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ خاندان کے اندر دوسرے چھوٹے بھائی ان کے بچوں کی تعلیم وتربیت اور دوسری تمام ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی اپنا ہی یتیم ہے۔

اسی طرح ایک شکل یہ ہے کہ باپ کی موجودگی میں بیٹے کا انتقال ہو گیا اور وہ شادی شدہ تھا، اس نے دو چار نابالغ چھوٹے بچے چھوڑے، ان کی ذمہ داری دادا کے سر آ گئی؛ یہ بھی اپنا ہی یتیم ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ اپنے داماد کا انتقال ہو گیا اور اس نے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے، اب نانا کے سر پر ان بچوں کی ذمہ داری آ گئی۔ یا بہن کا انتقال ہو گیا اور اس کے بچے ہیں تو ماموں کے سر پر ذمہ داری آ گئی۔ عام طور پر ہمارے معاشرے میں یہ سب ہوتا ہے اور یہ سب ذمہ داریاں لوگ نبھاتے ہیں، لیکن یتیم کی کفالت کی نیت سے نہیں کرتے، بلکہ رسمی طور پر انجام دیتے ہیں۔

ہم لوگ یتیم کی کفالت کا مطلب صرف اسی کو سمجھتے ہیں کہ کوئی بچہ پرایا ہو، جس

کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہ ہو اور اس کی ذمہ داری ہم اپنے سر لیں؛ تب ہی یہ فضیلت حاصل ہوگی ایسا نہیں ہے۔ دیکھو! یہاں صراحت موجود ہے۔ نبی کریم ﷺ صاف صاف فرما رہے ہیں کہ اپنا یتیم ہو یا دوسرے کا ہو۔ اپنے یتیم کا مطلب کتابوں میں تمام علماء نے یہی لکھا ہے کہ گھر کے اندر کوئی بچہ یتیم ہو گیا ہو، چاہے وہ بھائی ہو یا بھائی کا بچہ ہو، یا بہن کا بچہ ہو، پوتے پوتیاں ہوں، نواسے نواسیاں ہوں؛ یہ سب اپنے یتیم ہیں۔

نیت درست کرلو

اور عام طور پر ہر معاشرہ میں سب لوگ یہ ذمہ داریاں نبھاتے ہیں، لیکن اس وقت یہ چیز ذہنوں میں نہیں ہوتی؛ حالانکہ اسی کو احتساب کہتے ہیں اور ہر کام میں شریعت نے یہ چیز خاص طور پر ملحوظ رکھی ہے، جیسے حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿مَنْ صَامَ رَمْضَانَ اِیْمَانًاوَّ احْتِسَاباً غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ﴾ جس نے رمضان کے روزے ایمان کی حالت میں اور احتساب یعنی ثواب کی امید رکھتے ہوئے رکھے یعنی یہ سمجھ کر رکھے کہ جو کچھ کر رہا ہوں اس پر مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملے گا؛ تو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف ہوں گے۔ اسی طرح اکثر کاموں میں لفظِ احتساب آتا ہے، اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ جب آدمی وہ کام کر رہا ہو، اُس وقت اس کے ذہن میں یہ نیت ہو؛ تب ہی اللہ تعالیٰ کے لئے کیا ہوا کہلائے گا ہم جو کام انجام دے رہے ہیں وہ کس کے لئے ہے ، اللہ تعالیٰ تو دلوں کے حال سے بخوبی واقف ہے، وہ دانا و بینا ہے، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ کام کس کے لئے کر رہا ہے۔ اگر کوئی آدمی وہ کام اس لئے انجام دے رہا ہے کہ نہیں کروں گا تو لوگ طعن و تشنیع کریں گے اور برا بھلا کہیں گے کہ دیکھو! ابا کا انتقال ہو گیا

لیکن چھوٹے بھائیوں کی ذرا بھی دیکھ بھال نہیں کرتا، یعنی سماج کے طعن و تشنیع کے ڈر سے کرے گا؛ تو یہ ایک رسمی کام ہو جائے گا اور اس پر وہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔ اس لئے وہ یہ سوچ کر کرے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور نبی کریم ﷺ نے اس کی ترغیب دی ہے۔

مثلاً ایک آدمی کا آپ کے ساتھ تعلق ہے، اب آپ کا بیٹا اس کے یہاں گیا تو اس نے آپ کی وجہ سے اس کی بہت خاطر مدارت کی اور بہت عزت کا مقام دیا کہ تم ہمارے دوست کے بیٹے ہو اور بڑا اکرام کیا، حالانکہ اس بچے کی تو کوئی حیثیت نہیں تھی، بعد میں بیٹے نے آکر آپ کو بتلایا کہ فلاں صاحب کے یہاں گیا تھا اور ان کو جب معلوم ہوا کہ مَیں آپ کا بیٹا ہوں تو پھر کیا کہنا، وہ تو بچھ گئے اور میری بہت خاطر مدارت کی؛ تو اب آپ ہی بتلائیے کہ آپ کے دل میں اس کے متعلق کیا جذبہ ہوگا؟ جب ہمارا یہ معاملہ ہے کہ کوئی ہماری وجہ سے کسی کے ساتھ کوئی اچھا سلوک کرتا ہے تو ہم زندگی بھر اس کو نہیں بھولتے، تو پھر اللہ تعالیٰ کا معاملہ کیا ہوگا؟ جب ایک انسان کی شرافت یہ گوارا نہیں کرتی کہ میری وجہ سے کسی کے ساتھ عزت کا معاملہ ہوا تو میں اس کو بھول جاؤں، تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات جس نے سب کو پیدا کیا، سارے انسانوں کا وہ مالک ہے، اس کے کہنے کی وجہ سے کسی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور احادیث کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اچھا سلوک کرنے والے کے مقام کا اندازہ لگاؤ۔ اسی لئے ان کاموں کو کرتے وقت یہ چیز خاص طور پر ملحوظ رکھنی چاہیے۔

قدیم زمانہ میں بہت سے کام ہمارے آباء واجداد نے اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر کئے تھے اور ہمارے معاشرے میں آج بھی وہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اب ہم اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ یہ کام سماج کا دستور ہے

اس لئے ہم کررہے ہیں، لیکن یہ سمجھ کرنہیں کرتے کہ یہ اسلام کی تعلیم ہے، خداورسول کا حکم ہے، اس وجہ سے اس میں بڑا فرق ہوجاتا ہے۔ لہٰذا یہ چیز بھی ہمارے مدِّ نظر رہنی چاہیے۔

جب بھی کوئی نیا معاملہ پیش آئے اور آپ نہیں جانتے تو کم ازکم پوچھ لیجیے کہ ایسی صورتِ حال ہے، کیااس سلسلہ میں شریعت میں کچھ حکم ہے؟ آپ کومعلوم ہوجائے گا، اور پھر آپ بہت سی نیتیں کرسکتے ہیں ایک ہی کام کومختلف نیتوں سے کرنے پر ثواب میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ بہرحال! نبی کریم ﷺ نے یتیموں کی پرورش کی خاص تاکید فرمائی ہے۔

اصلی اور نقلی مسکین کی پہچان

٢٦٤. وعنه قال قال رسول الله ﷺ: لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِىْ تَرُدُّهُ التَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ وَلَا اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ. اِنَّمَا الْمِسْكِيْنُ الَّذِىْ يَتَعَفَّفُ. (متفق عليه)

وفى رواية فى الصحيحين:- لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِىْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ، تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ. وَلٰكِنَّ الْمِسْكِيْنَ الَّذِىْ لَا يَجِدُ غِنًى يُّغْنِيْهِ، وَلَا يُفْطَنُ بِهِ؛ فَيُتَصَدَّقَ عَلَيْهِ، وَلَا يَقُوْمُ؛ فَيَسْأَلَ النَّاسَ.

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی مسکین نہیں ہے جس کوایک یا دوکھجوریں یا ایک دو لقمے واپس کردیتے ہوں، بلکہ مسکین تو وہ ہے جو اپنے آپ کو سوال سے بچاتا ہے۔ صحیحین کی روایت میں ہے کہ وہ آدمی حقیقی مسکین نہیں ہے جو لوگوں کے دروازوں پر جاکر مانگتا ہے، اور ایک دو لقمے یا ایک دوکھجوریں اس کو وہاں سے واپس لوٹا دیتی ہیں، بلکہ حقیقی مسکین تو وہ ہے جس کے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے، اور کسی کو اس کی حالت کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ وہ لوگوں سے مانگنے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔

افادات:- مزید تشریح فرماتے ہیں کہ جوآدمی لوگوں کے دروازوں پر جاتا ہے اور مانگتا ہے کہ بھوکا ہوں، کچھ دیدو، اوراس کوایک دو لقمے یاایک دو کھجوریں وہاں سے واپس لوٹا دیتی ہیں؛ توایسا دردر گھومنے والا حقیقی مسکین نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی مسکین اور محتاج تووہ ہے جس کے پاس کوئی چیز بھی موجودنہیں ہے،اس کے پاس اس دن کی روزی بھی نہیں ہےاور کمانے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے،اوروہ اپنی حالت بھی ایسی نہیں بناتا کہ لوگ اس کے حالات سے واقف ہوکراس پرصدقہ کریں،اوروہ لوگوں سے سوال کرتا بھی نہیں پھرتا۔

مانگنا کب حرام اور کب جائز؟

دراصل شریعت نے سوال کرنے سے منع فرمایاہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جوآدمی لوگوں سے سوال کرتاہے،وہ قیامت کے روزایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پرخراشیں ہوں گی، گویااس نے سوال کرکے اپنے چہرے کوبھدّا بناڈالا۔بعض روایتوں میں ہے کہ قیامت کے روزایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پرگوشت نہیں ہوگا۔(شعب الایمان۔۳۵۱۰/۳۵۰۹)

البتہ علماء نے مسئلہ کے طورپرلکھاہے کہ ایک آدمی کے پاس دوسودرہم یعنی چھ سوبارہ اعشاریہ تین پانچ گرام چاندی یااس کی قیمت کازیور،یااتنے پیسے یااتنی مقدارکا تجارت کاسامان موجودہے؛تویہ زکوٰۃ کانصاب ہے۔اوراگرکسی کے پاس تجارت کااتنا سامان تونہیں ہےلیکن ضرورت سے زائداتنی مقدارکی چیزیں گھرمیں موجودہیں تواگرچہ اس کےاوپرزکوٰۃ توواجب نہیں ہےلیکن قربانی اورصدقۂ فطرواجب ہے،اورایسے آدمی کے لئےسوال کرناحرام لکھاہے۔

بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ لینا جائز ہے اس لئے مانگتے ہیں، حالانکہ ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ زکوٰۃ لینا جائز ہونا الگ چیز ہے اور مانگنے کی اجازت ہونا الگ چیز ہے، جس کے پاس ضرورت مند والا نصاب نہ ہو اور اس کو زکوٰۃ دیں گے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ مانگنے کی اجازت تو صرف اسی صورت میں ہے جب اس کے پاس اپنے اور بال بچوں کے لئے اس دن کے دو وقت کے کھانے کا سامان موجود نہیں ہے؛ تو اس صورت میں بھی شریعت نے اتنا ہی مانگنے کی اجازت دی ہے جس سے اس دن کی ضرورت پوری ہو جائے۔

حقیقی مسکین

خیر! تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ مسکین نہیں ہے یعنی حقیقی اور کامل درجہ کا مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے دروازوں پر جا کر سوال کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تو لوگوں سے کہہ سن کر اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، اگرچہ اس کے پاس اپنا کچھ نہیں ہے لیکن جب لوگوں کے دروازے پر جا کر کہے گا کہ کچھ دے دو، میرے پاس رات کے کھانے کے لئے نہیں ہے اور لوگ دے دیں گے تو وہ بھوکا تو نہیں رہے گا، اس لئے کہ مانگنے والے کو آپ ایک روٹی دیدو تو وہ لے کر چلا جاتا ہے، یہی ایک دو لقمے اس کو آپ کے دروازے سے پھیر دیتے ہیں؛ لہٰذا یہ کامل درجہ کا مسکین نہیں ہے۔

بلکہ حقیقی معنٰی میں مسکین تو وہ ہے کہ اس کے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے واسطے کچھ بھی نہیں ہے، اپنے اور گھر والوں کے آج کے کھانے کا سامان بھی موجود نہیں ہے اور وہ اپنے آپ کو سوال سے بچا رہا ہے یعنی اپنی حالت دوسروں کے سامنے ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ فاقہ چل رہا ہے لیکن قریب والوں کو بھی پتہ نہیں چل رہا ہے کہ ان

کے گھر میں فاقہ ہے، اپنی صورت ایسی بنا کر رکھتا ہے کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے۔ سوال سے تو بچ ہی رہا ہے لیکن صورتِ سوال سے بھی بچ رہا ہے، کسی کو خبر ہی نہیں ہونے دیتا؛ اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں کسی کو اس کی حالت کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ مدد کر دے۔

ایک تو یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی سے مانگتا نہیں ہے لیکن اس کی شکل وصورت سے پتہ چل جاتا ہے۔ یہاں تو اس کی حالت کا بھی پتہ نہیں چلایا جا سکتا کہ اس پر صدقہ کیا جائے، اور وہ خود بھی لوگوں کے سامنے سوال نہیں کرتا؛ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اب مالداروں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں کو تلاش کریں اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کریں۔

ضرورت مند کی تحقیق کس کے ذمہ؟

آج کل ہمارے سماج میں یہ بھی ایک خرابی آ گئی ہے۔ مانگنے والوں کا سامنے سے جا کر مانگنے کا جب مزاج بنتا گیا تو نتیجہ یہ ہوا کہ جس کو شریعت نے مکلّف کیا تھا کہ تم پر زکوٰۃ واجب ہے، اور تم کو اپنی زکوٰۃ محتاجوں کے اندر تقسیم کرنی ہے؛ وہ بھی اپنی ذمہ داری سے غافل ہو گئے۔ اس لئے کہ شریعت نے یہ نہیں کہا کہ محتاج تمہارے دروازے پر آئیں تو تم ان کو زکوٰۃ دینا بلکہ ﴿آتُوا الزَّكوٰةَ﴾ کہا کہ تم اپنی زکوٰۃ دو۔

اور مَیں پہلے بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ باقاعدہ حکومت انتظام کرتی تھی کہ تمام حالات سے باخبر رہ کر ہر ایک کی ضرورت پوری کی جائے، جب بیت المال کا نظام نہیں رہا تو اب جو لوگ اپنی زکوٰۃ نکالتے ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے پاس پڑوس میں، اپنی برادری میں، اپنے محلے اور اپنی بستی میں ایسے لوگوں کا پتہ کریں جو واقعتاً ضرورت مند ہیں لیکن لوگوں کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار نہیں

کرتے، بلکہ اگر حالات کا پتہ چل جاوے تو وہ اس کو اپنے لئے عیب سمجھتے ہیں۔اب زکوٰۃ نکالنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ ایسے لوگوں کا پتہ نکال کران کی ضرورتیں پوری کریں۔ بلکہ شریعت نے تو یہاں تک بتلایا ہے کہ جن کو آپ دے رہے ہیں وہ ضرورت منداور حقدار ہیں ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، گھر میں فاقہ ہے، مقروض اور پریشان ہیں، لیکن اگران کو یہ کہا جائے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے تو وہ نہیں لیں گے، اگرچہ ان کے لئے زکوۃ لینا جائز ہےاوران کوشریعت نے اجازت بھی دی ہے۔ اگراس نے مانگا نہیں ہے، اور وہ حقدار ہےاورکوئی دے رہا ہے؛ تو لینے کی گنجائش ہے، اور لینے سے انکار کرنا بھی ایک مبالغہ ہی ہے۔ دیکھو! ان کو بھی مانگنے سے تو منع کیا، لیکن کوئی دینے کے لئے آوے تو لینے سے منع نہیں کیا۔

زکوٰۃ بنامِ ہدیہ

بہر حال! شریعت دینے والے کو یہ کہتی ہے کہ جب آپ نے تحقیق کر لی تو اب آپ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کہہ کر دیں کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت تو اُس وقت پیش آتی ہے جب معلوم نہ ہو کہ جس کو دیا جا رہا ہے وہ حقدار ہے یا نہیں؟ اگر معلوم نہیں ہے تو آپ یہ بول کر دیجیے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے۔ اگر وہ حقدار نہیں ہے تو کہہ دے گا کہ مَیں حقدار نہیں ہوں، آپ کسی دوسرے کو دے دیں۔ لیکن آپ کو جب معلوم ہے، آپ نے تحقیق کر لی ہے، اس کے حال سے بخوبی واقف ہیں کہ حقدار ہے پھر کیوں کہتے ہیں کہ یہ زکوٰۃ کے پیسے ہیں۔ آپ کو دینے کا حکم ہے اوراس کو لینے کا حکم ہے۔ آپ اس کو یوں کہیں گے کہ یہ زکوٰۃ کی رقم ہے تو وہ نہیں لے گا، حالانکہ پریشانی اُٹھا رہا ہے۔ بلکہ اگر آپ کو اندازہ ہو کہ اس کو بھنک بھی لگ جائے گی کہ یہ

زکوۃ کا ہے تو آپ یوں کہہ کر بھی دے سکتے ہیں کہ ہدیہ کی رقم ہے، جب آپ نے دل میں زکوٰۃ کی نیت کر لی تو آپ کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ غور کیجئے کہ ضرورت مند کی عزت کا بھی شریعت نے کتنا زیادہ خیال رکھا ہے۔

زکوٰۃ کا اعلیٰ مصرف

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ مسکین وہ نہیں ہے بلکہ مسکین تو یہ ہے۔ یہ ارشاد فرما کر نبی کریم ﷺ زکوۃ نکالنے والوں کو اس بات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ آپ جب یہ کام انجام دے رہے ہیں تو اعلیٰ طریقے سے انجام دیجیے۔ جیسے آپ مکان بنانا چاہتے ہیں تو آپ کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ عمدہ سے عمدہ بنائیں۔ کھانا تیار کرنا چاہتے ہیں تو خواہش ہوتی ہے کہ بہترین قسم کا تیار کریں۔ تو جب آپ اپنا پیسہ خرچ کرنا چاہتے ہیں تو شریعت نے اس کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ مصرف رکھا ہے اس کو کیوں تلاش نہیں کرتے؟ گھر میں کیوں بیٹھے رہتے ہو؟ یہ سوچنا کہ کوئی میرے پاس آئے گا تب مَیں دوں گا؛ یہ غلط نظریہ ہے۔ بلکہ ہمیں زیادہ حقداروں کو تلاش کرنا چاہیے ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ، تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (البقرۃ. ۲۷۳)﴾ وہ محتاج جو اللہ کے راستہ میں روک دیئے گئے جو زمین میں اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی جا نہیں سکتے۔ اور اصل بات یہی ہے کہ جو ناواقف آدمی ہے، جس کو اس کی حالت کی خبر نہیں ہے وہ اس کو دیکھ کر مالدار سمجھتا ہے، کیوں کہ وہ مانگتے بھی نہیں ہیں اور مانگنے والی صورت بھی نہیں بناتے، اور وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال بھی نہیں کرتے۔ قرآنِ پاک میں کہا گیا کہ ایسوں کو دو۔

یہ نکتہ ذہن میں رہے

اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دوسروں کو دینے سے منع کیا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ایسے لوگوں کو ڈھونڈ کر دیں گے تو حق ادا ہوا سمجھا جائے گا۔ اس لئے ہمارے سماج و معاشرہ میں یہ جو کوتاہی ہو رہی ہے اس کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ جو صدقات و خیرات نکالنے والے ہیں اور زکوۃ کی ادائیگی کا اہتمام کرنے والے ہیں ان کو یہ پوئنٹ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے، اور کچھ حصہ ایسا بھی رکھیں جو اپنے طور پر ایسے لوگوں کو تلاش کر کے ان کی خدمت میں بھیجیں۔ وہ نہ آتے ہوں تو ان کے گھر جا کر دیں۔ یہی تعلیم حضور ﷺ نے دی ہے۔

بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ جب محتاج ہیں تو کیوں گھر میں بیٹھے رہتے ہیں؟ باہر کیوں نہیں نکلتے؟ تو دیکھو! زکوٰۃ کی ادائیگی اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کی ہے، کیا آپ نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں نہیں آتے؟ جس طرح نماز آپ پر فرض ہے، اسی طرح زکوٰۃ کی ادائیگی بھی آپ پر فرض ہے، لہٰذا زکوۃ ادا کرنے کے لئے بھی آپ گھر سے نکلو، اور جو نہیں آتا اس کے گھر جا کر دے آؤ۔

ایک عارف کا عارفانہ قول

آج کل ہم لوگ اپنی زکوٰۃ ادا تو کرتے ہیں لیکن ان غریبوں اور مسکینوں کا جو احترام ہمارے دلوں میں ہونا چاہیے وہ نہیں ہے۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری نور اللہ مرقدہٗ عجیب بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! آپ مسجد کا احترام اور تعظیم کیوں کرتے ہو؟ اسی لئے احترام کرتے ہو کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا ایک فریضہ

ادا کیا جاتا ہے اور اسی لئے ہم اس کو اللہ کا گھر کہتے ہیں اور اس کا احترام وتعظیم کرتے ہیں، اس کے لئے اپنے سر بھی کٹوا دیتے ہیں؛ حالانکہ وہ تو اینٹ اور پتھر سے بنائی ہوئی ایک عمارت ہے۔اسی طرح ایک غریب انسان بھی تو اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کا محل اور جگہ ہے وہاں بھی تو آپ اپنا ایک فریضہ ادا کر رہے ہیں اور پھر وہ کوئی اینٹ و پتھر نہیں بلکہ انسان ہے،تو جس طرح آپ مسجد کا احترام کرتے ہو؛اسی طرح اس غریب کا بھی احترام کیجیے۔دیکھئے! کیسی عجیب بات اور کیسا قابلِ توجہ نکتہ ارشاد فرمایا۔

احسان سائل کا ہے

اس باب کے عنوان میں یہ بھی ہے کہ غرباء کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا جائے، اس کی غریبی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کا مقام ومرتبہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا نہیں ہے،اس کی تفصیل پہلے بتلا چکا ہوں کہ آپ کو اس کے مقام ومرتبہ کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک صاحب مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے ہر طواف میں یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اے اللہ! مجھے لباس کی ضرورت ہے۔ایک صاحب نے دیکھا تو انہوں نے ان کو لباس کے لئے رقم دیدی۔پھر دوسری مرتبہ دیکھا تو وہ آدمی بہت عمدہ لباس پہن کر آئے ہوئے ہیں۔دینے والے کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ آدمی ایسے ہی سوال کرتا ہے۔ان کے خیال پر مطلع ہوکر انہوں نے اس کو اپنے ساتھ لیا اور کہا کہ نیچے دیکھو۔اس نے جب نیچے دیکھا تو سارے مطاف میں ہیرے جواہرات بکھرے پڑے ہیں۔پھر انہوں نے کہا کہ اللہ کے بندے! یہ سارے اللہ تعالیٰ کے خزانے ہیں لیکن ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کسی کو کچھ ثواب دیدے۔اللہ کے ایسے بھی بندے

ہوتے ہیں، اس لئے کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے ارے بھائی! اس کا آپ پر احسان ہے کہ اس نے آپ کو خدمت کا موقعہ دیا۔ جس روز مال خرچ کرنے والوں میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو پھر دیکھنا کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا کیا عطا یا ہوتی ہیں، آج کل ان اعمال پر ہمیں جو کچھ ملنا چاہیے وہ نہیں ملتا، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ اس لئے اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

بیوہ اور مسکین کی مدد کرنے والا

۲۶۵. وعنه عن النبی ﷺ قال: اَلسَّاعِیُ علیٰ الْأَرْمَلَةِ وَالْمِسْکِیْنِ کَالْمُجَاهِدِفِیْ سَبِیْلِ اللهِ. وَأَحْتَسِبُهُ قَالَ: وَکَالْقَائِمِ الَّذِیْ لَا یَفْتُرُ، وَکَالصَّائِمِ لَا یُفْطِرُ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے یہ روایت بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی بیوہ اور مسکین کے لئے کوشش کرتا ہے (یعنی ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں لگا ہوا ہے) اس کا حال ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا۔ (راوی کہتے ہیں) میرا خیال یہ ہے کہ یہ بھی فرمایا: وہ آدمی ایسا ہے کہ رات بھر نماز پڑھتا ہے اور تھکتا نہیں، اور دن بھر روزہ رکھتا ہے کبھی افطار نہیں کرتا۔

افادات:- دیکھو یہ بھی کتنی بڑی فضیلت ہے! بیوہ کے معاملہ میں کوشش کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ بعض مرتبہ بیوہ مالی اعتبار سے تو مضبوط ہوتی ہے لیکن اس کی ضرورتیں پوری کرنے والا گھر میں کوئی موجود نہیں ہوتا، تو جو آدمی اس کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا وہ اس ثواب کا حقدار ہوگا۔ اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بیوہ مالی اعتبار سے بھی کمزور ہوتی ہے تو اس صورت میں دونوں طرح کی باتیں پائی گئیں۔

حدیثِ پاک میں ﴿اَلسَّاعِیُ﴾ کا لفظ آیا ہے جس کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے

کہ ان کی ضرورتوں کے لئے کمانے اور دوسری حوائج پوری کرنے کا اہتمام کرنے والا۔ اس لئے کہ یہ کام ایسا ہے کہ اس پر مداومت اور ہمیشگی کوئی آسان چیز نہیں ہے، ایک دو دن، چار دن، اور ہفتہ تو سب کر ڈالتے ہیں، لیکن ﴿اَلسَّاعِیُ﴾ کا مطلب ہے برابر لگے رہنا؛ یہ ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جن کو توفیق دے، وہی ان چیزوں کا اہتمام کر سکتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جن کو توفیق دی ہو، ان کو اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ادا کرتے رہنا چاہیے کہ ان کو یہ کام عطا فرمایا۔ یہ بہت اونچی چیز ہے۔ ان کاموں کی طرف حضور اکرم ﷺ نے متوجہ کیا ہے جو بہت اہم اور ضروری ہیں، اگر یہ چیزیں نہیں کی جائیں گی تو معاشرہ کا نظام قائم نہیں رہے گا

دس سال کے اعتکاف کا ثواب

آج کل ہم لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و قرب حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ سمجھ لیا ہے کہ مسجد میں آؤ اور نماز پڑھو، لیکن معاشرے کے دوسرے افعال جیسے حاجتمندوں کی حاجتوں کو پورا کرنے کی طرف توجہ دینا، کمزوروں کی مدد کرنا، یتیموں، بیواؤں کی خبر گیری کرنا وغیرہ؛ یہ کام بہت کم لوگ کرتے ہیں، حالانکہ یہ چیزیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں، اس لئے کہ دیکھو! فرائض تو اپنی جگہ پر ہیں، لیکن ایک آدمی نفل نماز پڑھنے کے مقابلہ میں کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کرنے کے لئے جاتا ہے، تو کیا اس کا مقام کم ہے؟

آپ نے فضائلِ رمضان میں روایت پڑھی اور سنی ہوگی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ اعتکاف میں تھے، ایک آدمی اپنی ضرورت لے کر آئے۔ اور ضرورت کیا تھی؟ فلاں صاحب کے یہاں آپ میری سفارش کر دیں۔ جب وہ آدمی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ نے اعتکاف کی پرواہ نہیں کی اوران کے ساتھ باہر نکل گئے۔حالانکہ اعتکاف کی کتنی بڑی فضیلت ہے کہ کوئی آدمی ایک دن کا اعتکاف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان میں تین خندقیں آڑ فرما دیتے ہیں جن کی مسافت زمین وآسمان کے درمیان کے فاصلہ کے برابر ہوتی ہے۔تو دریافت کرنے پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک مسلمان کی حاجت کو پورا کرنے کا ثواب دس سال کے اعتکاف کے برابر ہے۔(أخرجه الطبرانی والبیهقی. حیاةالصحابة، جلد ۲. جزء ۲۹۳/۳. الترغیب والترهیب ۹۶/۲)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ چیز ہمارے مزاجوں میں پیدا ہونی چاہیے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کا اثر ہمارے معاشرے اور سماج کے ہر شخص کے دل ودماغ میں پیوست ہو جانا چاہیے۔ہمارے پرانے لوگوں کی باتیں جب ہم سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں حسنِ سلوک، خبر گیری اور رفاہی کاموں کا بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، اور اب ہمارا یہ دور آیا جس میں ان چیزوں کی طرف سے بہت زیادہ غفلت برتی جاتی ہے۔

رشتہ داریوں کا پہچاننا

اسلام نے تو یہاں تک تعلیم دی کہ آدمی کو اپنی رشتہ داریوں کو بھی پہچاننا چاہیے۔ آج کل کے نوجوانوں کا حال تو یہ ہے کہ وہ رشتہ داریوں کو بھی نہیں پہچانتے، قریب کی بات تو تھوڑی بہت جان لیتے ہیں کہ یہ چچا ہیں اور یہ ماموں ہیں اور اس کے بعد آگے کا کچھ پتہ ہی نہیں ہوتا۔بعضوں کو جب سمجھاتے ہیں کہ یہ تمہارے پھوپھا ہوتے ہیں اور یہ ان کے بھائی کے لڑکے ہیں اور فلاں کی یہ رشتہ داری ہے تو ان کی سمجھ میں ہی نہیں آتا۔حالانکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔

نسب اور عرب

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نسب کے بڑے ماہر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حج کے موقعہ پر جب قبیلوں میں دعوتِ اسلام دینے کے لئے چلتے تھے تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ساتھ ہوتے تھے، اور سارے قبیلوں کا تعارف کرواتے تھے (أخرجہ ابونعیم فی الدلائل۔ حیاۃ الصحابۃ ۱/ ۸۸) اور عرب میں تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہی نہیں بلکہ اپنے گھوڑوں کے نسب بھی یاد رکھتے تھے کہ میرا گھوڑا کہاں کس گھوڑے سے پیدا ہوا ہے، اور آج ہمارے یہاں اپنے نسبوں کا کسی کو علم نہیں ہوتا۔ آج کل کے بچوں کو پوچھئے تو بعضوں کو تو دادا کا بھی نام یاد نہیں ہوتا۔ مگر پردادا کا نام تو یاد ہی نہیں ہوتا۔ یہ واقعہ ہے، آپ بھی تجربہ کر لیجیے۔ پرانے لوگوں میں یہ ہوتا تھا کہ یہ فلاں صاحب ہمارے دادا کی اولاد میں سے ہیں، پردادا کے بھائی کی اولاد میں سے ہیں، اور آج کل بھائی کی اولاد کی طرف دھیان نہیں ہوتا تو دادا اور پردادا کے بھائی کی اولاد کی طرف کون دھیان دے گا، حالانکہ معاشرہ کا قیام اسی کے اوپر موقوف ہے۔

ہر ایک کی اپنی ذمہ داری ہے

ہمارے یہاں جو برائیاں پھیل رہی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان چیزوں کا خیال نہیں رکھا جاتا اور ضرورت مند کی ضرورت پوری نہیں کی جاتی، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ پریشانی میں زندگیاں گذارتے ہیں، اگر ہر ضرورت مند کی ضرورت اس کی اپنی جگہ اور اپنے گھر بیٹھے پوری ہو جایا کرے، تو کوئی بھی پریشان حال نہ رہے۔ بھائی! آپ زیادہ نہ دیجیے، مہینہ میں سو روپے ہی دیجیے، آپ جیسے دس آدمی سو سو روپے دیں گے تو اس کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ جیسے دادا کے بھائی کی اولاد ہے یا پردادا کے بھائی کی اولاد ہے اور اس میں سب تو غریب نہیں ہوتے، دو چار ہی غریب ہوتے ہیں، تو اب دادا اور پردادا کی اولاد

میں جتنے حیثیت والے ہیں ان میں سے سب اگر سوسو روپے دیں گے، تو دو چار افراد کی ضرورتیں تو پوری ہو ہی جائیں گی، اور آج کل سو روپے کی حیثیت ہی کیا ہے؟ آپ یہاں سے اسٹیشن جائیں اور واپس آئیں تو رکشہ والا ہی پچاس ساٹھ روپے لے لیتا ہے۔

اور پھر سب لوگ اس کو اپنی ذمہ داری سمجھیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ فلاں نہیں دیتا تو مَیں کیوں دوں؟ یا فلاں صاحب خیال رکھ رہے ہیں، تو مَیں کیوں دوں؟ ارے بھائی! وہ کتنا خیال کرتے ہیں وہ تو پہلے معلوم کرو۔ بعض مرتبہ یہ بھی ایک مصیبت ہو جاتی ہے کہ کوئی کسی کا خیال رکھتا ہے تو اس کی وجہ سے دوسرے لوگ بے فکر ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ اتنا نہیں دیتا جس سے اس کی ساری ضرورتیں پوری ہو جائیں، اور وہ بے چارہ پریشان ہی رہتا ہے۔ اس لئے بھائی! اگر وہ خیال رکھتا ہے تو وہ اپنا کام کر رہا ہے، اور اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے، اب ہمیں اپنا فریضہ ادا کرنا چاہیے؛ سیدھی سادی بات تو یہ ہے۔ اس لئے مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ چیزیں بڑی اہم ہیں، اس کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔

بدترین دعوتِ ولیمہ

۲۶۶۔ وعنه عن النبی ﷺ قال: شَرُّ الطَّعَامِ طَعَامُ الْوَلِيمَةِ يُمْنَعُهَا مَنْ يَأْتِيهَا، وَيُدْعىٰ إِلَيْهَا مَنْ يَأْبَاهَا، وَمَنْ لَمْ يُجِبِ الدَّعْوَةَ؛ فَقَدْ عَصَى اللهَ وَرَسُولَهُ. (رواه مسلم)

وفی روایة فی الصحیحین: —عن أبی هریرة من قوله: بِئْسَ الطَّعَامُ طَعَامُ الْوَلِيمَةِ يُدْعىٰ إِلَيْهَا الأَغْنِيَآءُ، وَيُتْرَكُ الْفُقَرَآءُ.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ بدترین کھانا اس دعوتِ ولیمہ کا کھانا ہے کہ جو آ سکتا ہے اس کو تو بلایا نہیں جاتا، اور جو انکار کرتا ہے اس کو دعوت دی جاتی ہے۔ اور جو آدمی دعوت قبول نہ کرے، اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔ صحیحین کی روایت میں ہے: بدترین کھانا اس دعوتِ ولیمہ کا کھانا ہے، جس میں مالداروں کو دعوت دی جاتی ہے اور فقیروں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔

افادات:- ظاہر ہے کہ فقیر کو دعوت دی جائے گی تو وہ ضرور آئے گا، اور مالدار کو دعوت دو، اور پھر اس کو یاددہانی کراؤ، اور چار مرتبہ وعدہ لو؛ تب بھی بھول جاتا ہے، اور دوسرے روز پوچھو تو کہتا ہے کہ بھول گیا تھا یعنی اس دعوت کا بھی عجیب دستور ہے کہ جو نہیں آرہا ہے اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں اور جو بے چارہ قدردان ہے اس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی جب دعوت کرے تو اس کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جس طرح مالداروں کو بلاکر کھلانے کا اہتمام کرتا ہے اسی طرح فقیروں اور غریبوں کو بلانے کا بھی اہتمام کرے۔

صرف مالداروں کو دعوت نہ دیں

اب جب غریبوں کی بات آئی ہے تو میں آپ کو بتلادوں کہ ہم لوگ کس غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ دیکھو! ہمارے یہاں دعوتیں مختلف حیثیتوں سے دی جاتی ہیں، مثلاً آپ کے یہاں شادی ہے تو رشتہ داری کے لحاظ سے دعوت دیں گے، کاروباری لائن کے لوگ اس لائن کے لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، کہیں برادری کا سوچ کر دعوت دی جاتی ہے، کوئی آدمی محلّہ کا ہے اس لئے اس کو دعوت دی جاتی ہے۔ لہٰذا جب آپ رشتہ داری کے لحاظ سے دعوت دینے کا سوچ رہے ہیں تو رشتہ داروں میں سے فقط مالداروں کا انتخاب نہ کیجیے، آپ کے رشتہ داروں میں غریب بھی ہیں، اور شریعت یوں کہتی ہے کہ آپ رشتہ داروں میں جہاں مالداروں کو بلائیں وہیں آپ ڈھونڈیں گے تو غریب بھی مل جائیں گے، لہٰذا آپ ان غریبوں کو مت چھوڑیے۔

اگر آپ کاروباری تعلق کی وجہ سے دعوت دے رہے ہیں تو اس لائن میں بھی

دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یا کسی ادارے میں کام کر رہے ہیں تو آپ کے ساتھ اس ادارے میں کام کرنے والے بھی دونوں قسم کے لوگ ہوں گے۔ آپ جس حیثیت سے بھی دعوت دے رہے ہو، ہر ایک میں صرف بڑے لوگوں کو اور مالداروں کو مدعو مت کیجیے، بلکہ کمزور اور غریب لوگوں کو بھی یاد رکھیے۔ اور ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو تب بھی اسے ضرور بلاؤ۔ ہاں! اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے کسی غریب کو غریب ہونے کی حیثیت سے بغیر کسی تعلق کے بھی دعوت دیں؛ تو بہت ہی اچھا ہے۔

ہمارے یہاں عام طور پر یہ مزاج بنتا چلا جا رہا ہے کہ جب دعوت کا موقعہ آتا ہے تو غریب کو بھول جاتے ہیں۔ محلّہ والوں کو دعوت دیتے ہیں تو کیا محلے میں صرف مالدار لوگ ہی رہتے ہیں؛ کوئی غریب نہیں رہتا؟ اگر محلے والا ہونے کی حیثیت سے دعوت دے رہے ہیں تو جو حیثیت محلے کے مالدار کو حاصل ہے؛ وہی حیثیت محلے کے غریب کو بھی حاصل ہے؛ تو پھر غریب کو بھی دعوت دیجیے۔

کھانا بھی خراب، خانہ بھی خراب

اور جو لوگ صرف ایک ہی طبقہ والوں کو یعنی مالدار طبقہ کو دعوت دیتے ہیں تو مَیں یہ کہا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نقد سزا دلواتے ہیں کہ جس کو بلایا تھا ایک تو وہ آیا نہیں، جس کی وجہ سے دل دکھا۔ تو یوں کہنا چاہیے کہ کھانا بھی خراب ہوا اور ساتھ ہی خانہ بھی خراب ہوا۔ گویا یہ نقد (ہاتھ کے ہاتھ) سزا ملی۔ اگر وہ صحیح طرح سے دعوت کا اہتمام کرتا تو کھانا بھی صحیح مصرف میں جاتا اور جب بات نکلی ہے تو ایک اور بات یاد آ گئی۔ پرانے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ مرحوم کے ایصالِ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے تھے، تو

خاص طور پر فقیروں کو کھلایا جاتا تھا، لیکن اب وہ جگہ بھی مالداروں نے لے لی ہے، گویا مالدار لوگ اس میں بھی غریبوں کا حق مارنے لگے ہیں

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ غریبوں کے معاملہ میں آج کل جو ہماری طرف سے کوتاہی برتی جاتی ہے، یہ روایت ہمیں اس کوتاہی کو دور کرنے کی تعلیم دیتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ باب کا عنوان قائم کیا گیا تھا یتیموں، لڑکیوں اور تمام کمزوروں، مسکینوں اور شکستہ دلوں کے ساتھ نرمی کرنا اور ان کے ساتھ احسان وشفقت سے پیش آنا۔ یتیموں اور کمزوروں پر شفقت کرنے کا بیان گذر چکا۔ آج جو روایت پیش کرتے ہیں اس میں لڑکیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید آئی ہے۔

بچیوں کے بارے میں اہلِ عرب کا طرزِ عمل

۲۶۷. وعن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا، جَآءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَنَا وَهُوَ كَهَاتَيْنِ، وَضَمَّ أَصَابِعَهُ. جَارِيَتَيْنِ اَیْ بِنْتَیْنِ.

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی دو بچیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو میں اور وہ قیامت کے دن اس طرح آئیں گے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا دیا۔

پہلے بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب بعثت ہوئی اس وقت لڑکیوں کے ساتھ جو نازیبا اور ناروا سلوک کیا جاتا تھا وہ ناقابلِ بیان ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے اس کی طرف شروع باب میں آیات کے ذیل میں اشارہ کر چکا ہوں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ، اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ﴾ ان میں سے کسی کو جب بچی کی پیدائش کی خوش خبری سنائی جاتی ہے تو یہ سن کر ان کا چہرہ کالا پڑ جاتا ہے اور وہ اپنے دم کو اندر ہی اندر گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ان کو جو خبر دی گئی اس کی برائی کی وجہ سے وہ اپنی قوم سے منہ چھپائے پھرتا ہے۔

گویا اس کو لوگوں کے سامنے آتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کوئی کہے گا کہ اس کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی اور پھر سوچتا ہے کہ ذلت کے ساتھ اس بچی کو اپنے گھر میں رہنے دے یا مٹی میں دبا دے اور زندہ دفن کر دے۔

"مِنْ اِمْلَاقٍ" اور "خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ" کا فرق

قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ مظہری میں اس موقعہ پر علامہ بغویؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عرب کے قبائل میں سے مضر، خزاعہ اور بنو تمیم کے یہاں دستور یہ تھا کہ ان کے یہاں جب لڑکیاں پیدا ہوتی تھیں تو وہ لوگ بچیوں کو زندہ در گور کر دیا کرتے تھے۔ اور وہ ایسا دو وجہ سے کرتے تھے، ایک تو فقر و فاقہ کا ڈر لگتا تھا کہ ہم ان کو کیا کھلائیں گے، گویا ان کو بچیوں کے بارے میں ڈر لگا رہتا تھا کہ ان کی وجہ سے ہم فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور بعضوں کو یہ خیال ہوتا تھا کہ ہمارے کھانے کا تو انتظام ہے نہیں، ان کے لئے کہاں سے انتظام کریں گے۔ (تفسیر البغوی، ۵/ ۲۵۔ تفسیر الخازن، ۴/ ۹۶)

چنانچہ قرآنِ پاک میں ایک جگہ فرمایا ہے ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ﴾ تم اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل مت کرو کہ اولاد کی کثرت کی وجہ سے ہم غریب ہو جائیں گے اور ان پر خرچ کرنے کے نتیجہ میں ہماری دولت گھٹ جائے گی۔ گویا اتنا تو ان کے پاس موجود ہے کہ وہ اپنی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں لیکن ان کو ڈر یہ ہے کہ آنے والی اولاد کو کہاں سے کھلائیں گے، گویا فقر و فاقہ موجود نہیں ہے لیکن آئندہ کا ڈر ہے۔

قرآنِ پاک میں دوسری جگہ ہے ﴿لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِنْ اِمْلَاقٍ، نَحْنُ

نَـرۡزُقُـكُـمۡ وَ اِيَّـاهُمۡ﴾ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل مت کرو، ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ دونوں جگہ دو الگ الگ جملے استعمال کئے گئے ہیں۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک جگہ ہے ﴿لَا تَـقۡتُـلُوۡٓا اَوۡلَادَكُمۡ مِّـنۡ اِمۡـلَاقٍ﴾ تم اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل مت کرو۔ گویا فقر و فاقہ پہلے سے موجود ہے، اور اب آنے والی اولاد کے بارے میں ڈر ہو رہا ہے کہ ہمارے خود ہی لالے پڑ رہے ہیں اور فقر و فاقہ ہم پر سوار ہے، ہم کو ہی دو وقت کا کھانا میسر نہیں آ رہا ہے تو ان کو کہاں سے کھلائیں گے، تو اس کے جواب میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فقر و فاقہ کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو ﴿نَـحۡـنُ نَـرۡزُقُـكُـمۡ وَ اِيَّاهُمۡ﴾ جو عربی جاننے والے ہیں وہ غور کریں کہ باری تعالیٰ پہلے فرما رہے ہیں کہ ہم تم کو بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔ یہاں (كُـمۡ) یعنی ''تم کو'' پہلے بیان کیا گیا ہے، اس لئے کہ فقر و فاقہ موجود ہونے کی وجہ سے وہ یوں سوچتے تھے کہ ہمارا ٹھکانہ نہیں ہے، تو ان کو کہاں سے کھلائیں گے۔ چونکہ پہلی فکر اپنی تھی تو باری تعالیٰ نے دلاسہ دلایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، تم کو بھی روزی ہم ہی دیں گے اور ان کو بھی ہم ہی دیں گے۔

جب کہ بعض لوگ وہ ہوتے تھے کہ ان کے پاس اپنا کھانا موجود ہے لیکن وہ یوں سوچتے تھے کہ جب اولاد ہوگی تو ان کو کہاں سے کھلائیں گے، ان کے بارے میں کہا گیا ﴿لَا تَـقۡتُـلُـوۡٓا اَوۡلَادَكُـمۡ خَشۡيَـةَ اِمۡلَاقٍ﴾ گویا فقر و فاقہ اس وقت نہیں ہے، لیکن اولاد زیادہ ہونے کی وجہ سے آئندہ اس کا خطرہ ہے، تو ان کے جواب میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل مت کرو تم یوں سوچتے ہو کہ اولاد آئے گی تو خرچ بڑھ جائے گا؛ پھر ہم ان کو کہاں سے کھلائیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں

﴿نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِیَّاكُمۡ﴾ ہم ان کو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی دیں گے۔اس آیت میں پہلے بچوں کا تذکرہ کیا گیا، کیونکہ فکر بچوں کا تھا، اپنا کام تو چل رہا تھا۔پھر آگے فرمایا ﴿اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِیۡراً﴾ اولاد کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔تو بچیوں کو قتل کرنے کی ایک وجہ قرآن نے یہ بیان فرمائی ہے۔

بچیوں کو قتل کرنے کا جاہلانہ نظریہ

اور احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ بچیوں کو قتل کرنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ غیر کفو میں رشتہ دینا پڑے گا اور وہ لوگ اپنے آپ کو خاندان کے اعتبار سے بڑا سمجھتے تھے۔قبیلۂ مضر جس سے قریش کا خاندان بھی تھا۔خزاعہ اور بنو تمیم وغیرہ دوسرے قبائل کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اونچا سمجھتے تھے،اس لئے وہ یہ خیال کرتے تھے کہ اپنے گھر لڑکی پیدا ہوئی، جب یہ بڑی ہوگی اور اس قابل ہوگی کہ اس کا نکاح کیا جائے تو پھر اس کو کسی ایسے خاندان میں بیاہ کر دینا پڑے گا جو ہمارے درجہ اور ہماری کیٹیگر ی (category) کا نہیں ہوگا، یہ ہماری بے عزتی ہے۔تو ایسے خاندان میں لڑکی کو بیاہ کر نہ دینا پڑے اس لئے وہ لڑکی کو قتل کر دیا کرتے تھے، گویا اس کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے کہ کوئی لڑکا ہمارا داماد بنے گا اور لڑکی والا رشتہ پیدا ہوگا۔

رائج الوقت گالیاں

ہمارے سماج میں بعض گالیاں جو رائج ہیں در اصل وہ بھی اسی لڑکی والے رشتہ کی وجہ سے ہیں، مثلاً بیوی کے بھائی کو ’’سالا‘‘ کہتے ہیں اور گالی کے طور پر بھی بولتے ہیں۔ بیوی کے باپ کو سسر کہتے ہیں اور گالی کے طور پر ’’سسرا‘‘ بول دیتے ہیں، یہ سب رشتے

نکاح کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔تو نکاح کے نتیجہ میں لڑکی کے رشتہ داروں کو جولقب ملا اس کو اُس زمانہ میں گالی سمجھا جاتا تھا،اورآج کل بھی اسی زمانۂ جاہلیت کی یادگار کے طور پر گالی کی شکل میں جاری ہے۔حالانکہ اسلام تو زمانۂ جاہلیت کی یادگار کو ختم کرتا ہے۔ جن تین آدمیوں پر اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ غصہ ہوگا ان میں حضور اکرم ﷺ نے اس کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ جو اسلام میں آنے کے بعد جاہلیت کے طریقہ کو پسند کرے۔(بخاری شریف/حدیث نمبر،۶۸۸۲)

اور اُس زمانہ میں یہ دستور بھی تھا کہ جب کسی کا نکاح ہوتا تو اس وقت اس کو جو دعا دی جاتی تھی اس کے بارے میں حدیث کی کتابوں میں لکھا ہے کہ یوں کہا جاتا تھا ﴿بِالرِّفَآءِ وَالْبَنِیْنَ﴾ (روضۃ المحدثین،حدیث نمبر۱۷۹۹۔بحوالہ فتح الباری،۲۲۲/۹) یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں خوش حالی عطا فرمائے اورلڑکے دے،یعنی لڑکوں کی دعا دی جاتی تھی۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے نکاح کے موقعہ پر جو دعا سکھلائی اس میں مطلق برکت کا تذکرہ ہے ﴿بَارَکَ اللّٰہُ لَکُمَا وَبَارَکَ عَلَیْکُمَا وَجَمَعَ بَیْنَکُمَا فِیْ خَیْرٍ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے اندر برکت دے یعنی اولاد پیدا ہو،اورتمہارے اوپر بھی برکت نازل فرمائے اورتمہارا جمع ہونا بہتر ہو(روضۃ المحدثین،حدیث نمبر۱۷۹۸۔بحوالہ فتح الباری،۲۲۲/۹) حدیث میں یہ دعا بھی آئی ہے ﴿عَلَی الْأُلْفَةِ وَالْخَیْرِ وَالْبَرْکَةِ وَالطَّیْرِ الْمَیْمُوْنِ وَالسَّعَةِ فِی الرِّزْقِ﴾ خیر وبرکت اورمحبت کے ساتھ تمہارا جوڑا قائم رہے،اورتم اچھے نصیبے اور قسمت والے بنو،اورتمہاری روزی میں بھی اللہ تعالیٰ خوب کشادگی دے(روضۃ المحدثین، حدیث نمبر۱۷۹۷۔بحوالہ فتح الباری،۲۲۲/۹) تو زمانۂ جاہلیت میں جولفظ ﴿اَلْبَنِیْنَ﴾ بولا جاتا تھا اس کو اسلام نے ختم کیا۔

غیر اختیاری چیز میں عورت ہی قصوروار کیوں؟

اولاد میں لڑکوں اور لڑکیوں کا پیدا ہونا آدمی کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔ اگر کسی پر کوئی عیب لگایا جائے تو وہ چیز ایسی ہونی چاہیے جس میں اس کے اختیار کو دخل بھی ہو، لیکن جس میں اس کے اختیار کو دخل ہی نہ ہو؛ اس میں بھلا کیا عیب لگانا۔ قرآنِ پاک میں خود باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿یَهَبُ لِمَن یَّشَآءُ اِنَاثاً وَّیَهَبُ لِمَن یَّشَآءُ الذُّکُوْر اَوْیُزَوِّجُهُمْ ذُکْرَاناً وَّاِنَاثاً وَّیَجْعَلُ مَن یَّشَآءُ عَقِیْماً﴾ اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے صرف لڑکیاں دیتا ہے اور جسکو چاہتا ہے اکیلے لڑکے ہی دیتا ہے یا پھر دونوں دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ جسکو چاہتا ہے بغیر اولاد کے رکھتا ہے۔

دیکھو! جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عطیہ کا تذکرہ کیا وہاں پہلا نام لڑکی کا لیا۔ اس آیت کے پیشِ نظر بعض علماء نے فرمایا ہے کہ جس عورت کو پہلے بچی پیدا ہو؛ وہ بابرکت ہے۔ اور ہمارے سماج میں اُلٹا سمجھا جاتا ہے، کسی کو پہلے لڑکی پیدا ہوئی تو بس ختم ہو گیا، ساس تو معلوم نہیں کیا کیا کہہ ڈالتی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے لڑکی کا تذکرہ کیا کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اکیلی لڑکیاں دیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے اکیلے لڑکے دیتا ہے، یا دونوں دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بغیر اولاد کے رکھتا ہے۔ گویا جو چار صورتیں ہو سکتی ہیں ان چاروں میں اول نمبر پر لڑکی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خیر! کسی کے یہاں لڑکی کا پیدا ہونا اس کے اختیار کی چیز تو تھی نہیں، پھر اس بے چاری کو کیوں قصوروار گردانا جائے۔

ہم تو زمین ہیں جو بیج ڈالا جاتا ہے اسی کو اُگا دیتے ہیں

کسی شاعر نے اشعار کے اندر ایک قصہ لکھا ہے، وہ اشعار بڑے اچھے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ ایک آدمی کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تو شوہر نے اس پر ناراض ہو کر بیوی کو

طلاق تو نہیں دی لیکن اس کو معلق چھوڑ رکھا تھا اور علیحدگی اختیار کر کے دوسری بیوی کر لی، اور اس کو دوسرے گھر میں رکھا، ایک مرتبہ اس لڑکی کا باپ وہاں سے گذر رہا تھا تو ماں بچی کو دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر کھیل لگا رہی تھی اور جھولا جھلاتے ہوئے یہ اشعار پڑھ رہی تھی:-

مَا لِأَبِیْ حَمْزَةَ لا یَأْتِیْنَا ۞ یَظَلُّ فِی الْبَیْتِ الَّذِیْ یَلِیْنَا
غَضْبَانَ أَن لَّا نَلِدَ الْبَنِیْنَا ۞ تَاللهِ مَا ذٰلِکَ فِیْ أَیْدِیْنَا
وَإِنَّمَا نَأْخُذُ مَا أُعْطِیْنَا ۞ وَنَحْنُ کَالْأَرْضِ لِزَارِعِیْنَا
نُنْبِتُ مَا قَدْ زَرَعُوْهُ فِیْنَا

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوحمزہ کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں لیکن ہمارے پاس نہیں آتے؟ وہ اس بات پر ناراض ہیں کہ ہم نے لڑکا کیوں نہیں جنا، حالانکہ اللہ کی قسم! یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ ہم تو اسی چیز کو اپنے اندر محفوظ کرتے ہیں جو ہمیں دی جاتی ہے، ہماری مثال تو زمین جیسی ہے، ہمارے اندر جو بیج ڈالا جاتا ہے اسی کو ہم اُگا دیتے ہیں، اب اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ (البیان والتبیین للجاحظ۔ ۱/ ۱۰۸)

غور کیجئے کہ اس نے بات تو بالکل درست کہی، اور یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ مردوں نے عورتوں پر اپنا تسلط جمانے کے لئے لڑکی پیدا ہونے کی صورت میں بھی ماں کو ہی قصوروار ٹھہرایا، حالانکہ بیج تو خود مردوں کا ڈالا ہوا ہے اور عورتیں تو زمین ہیں، اگر قصوروار مانا جائے تو دونوں کو ماننا چاہیے، صرف عورت کو ہی قصوروار کیوں ٹھہرایا جائے؟ یہ تو صریح ناانصافی ہے بلکہ ناانصافی کی بھی انتہاء ہے۔

بچیوں کے ساتھ کیسا ناروا سلوک

بہرحال! اُس زمانہ میں یہ قبائل لڑکیوں کے وجود کو اپنے لئے عیب سمجھتے تھے،

اس لئے ان کو اپنے یہاں زندہ رہنے ہی نہیں دیتے تھے، اور اگر کسی لڑکی کو زندہ رکھنا مقصود بھی ہوتا تو یہ کرتے کہ اس کو بکری کے بالوں کا لباس پہنا کر اونٹ اور بکریاں چرانے کے لئے متعین کر دیتے اور کہہ دیتے کہ تجھے وہیں رہنا ہے، اونٹ اور بکریاں چراتے رہنا، ہمارے یہاں مت آنا۔ اور اگر اس کو باقی رکھنا منظور نہ ہوتا تو اسے پانچ سال تک رہنے دیتے تھے، جب چھ سال کی عمر ہوتی تو باپ بچی کی ماں سے کہتا کہ اس کو بناؤ سنگھار کر کے تیار کر دینا اور پہلے سے صحراء میں جا کر ایک گڑھا کھود کر آتا اور پھر اپنے ساتھ بچی کو لے جاتا، وہاں پہنچ کر بچی سے کہتا کہ اس گڑھے کے اندر دیکھو، اس بیچاری معصوم بچی کو تو کچھ پتہ بھی نہ ہوتا، جب وہ اندر جھانکتی تو باپ پیچھے سے دھکا دے کر اندر گرا دیتا اور اس پر مٹی ڈال دیتا۔

بچی کو زندہ در گور کرنے کا دردانگیز واقعہ

ایک مرتبہ ایک قبیلہ کے سردار نے آ کر نبی کریم ﷺ کے سامنے اپنا قصہ سنایا کہ میری بیوی حمل سے تھی، اتفاق کی بات کہ جب بچہ جننے کا وقت آیا تو مَیں سفر میں تھا، اس دوران بیوی کو ولادت ہوئی اور لڑکی پیدا ہوئی، ماں نے سوچا کہ باپ اس کو مار ڈالے گا، اس لئے اپنی لڑکی کو اپنی بہن کے یہاں بھیج دیا۔ جب مَیں سفر سے واپس آیا اور مَیں نے پوچھا تو بیوی نے بتلایا کہ ایک مردہ بچہ پیدا ہوا تھا۔ مجھے یہ نہیں بتایا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ جب مَیں کہیں باہر جاتا تو ماں اس بچی کو اپنی بہن کے پاس سے منگواتی، اس سے محبت اور پیار کرتی، اسی طرح وہ بچی کچھ بڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ میں کہیں باہر گیا ہوا تھا، اس نے بچی کو اپنے پاس بلوا رکھا تھا اور وہ واپس جائے اس سے

پہلے ہی مَیں پہنچ گیا،مَیں نے اس بچی کو دیکھا تو مجھے وہ اچھی لگی اور مَیں نے بھی اس بچی کے ساتھ پیار ومحبت کا معاملہ کیا۔مَیں نے پوچھا کہ یہ کس کی بچی ہے؟مَیں نے اس کے ساتھ محبت و پیار کا جو معاملہ کیا تھااس کی وجہ سے اس کی ماں یہ سمجھی کہ شاید خون کی محبت اثر کررہی ہے،اس لئے اب حقیقت کو ظاہر کرنے میں کوئی خطرے کی بات نہیں ہے،اس لئے اس نے بتلادیا کہ یہ تو آپ کی ہی بچی ہے،اور پھر پورا قصہ سنایا۔خیر!اس وقت مَیں نے کچھ نہیں کہا اور اس کو اپنے پاس رہنے کی اجازت دیدی۔

پھر اس نے اپنا قصہ بتاتے ہوئے کہا کہ میرے یہاں وہ بڑی ہوئی،اور مجھ سے بہت پیار کرتی تھی،میں بھی اس سے بڑی محبت کرتا تھا،لیکن ایک روز مجھ پر جاہلانہ جنون سوار ہوا کہ میرے گھر لڑکی ہے۔بس!مَیں اس کو اپنے ساتھ لے کر جنگل گیا اور پہلے سے کوئی تیاری بھی نہیں کی تھی۔وہاں جاکر میں نے اس کے لئے ایک گڑھا کھودنا شروع کیا،جب میں گڑھا کھودرہا تھا اس کی وجہ سے میرے کپڑوں کے اوپر مٹی گررہی تھی تو وہ بچی ابا ابا کہہ کر مٹی صاف کرتی تھی،لیکن میرے اوپر تو جاہلیت والا جنون ایسا سوار تھا کہ اس کے پیار بھرے جملوں کا بھی مجھ پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا۔جب گڑھا تیار ہوا تو میں نے اس بچی کو اٹھا کر اس گڑھے میں ڈال دیا۔وہ اندر سے چلارہی تھی کہ اباجی!آپ یہ کیا کررہے ہو؟لیکن مَیں نے اس پر مٹی ڈالنا شروع کی،وہ ابا ابا پکارتی رہی یہاں تک کہ اس کی آواز آنا بند ہوگئی۔جب اس نے یہ قصہ سنایا تو نبی کریم ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔بعض روایتوں میں ہے کہ آپ کی ڈاڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہوگئی اور آپ نے فرمایا﴿وَاللهِ!اِنَّ هٰذِهٖ لَقَسْوَةٌ ، مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ﴾ اللہ کی قسم!یہ تو بڑی سخت دلی کی بات ہے،جو آدمی کسی کے ساتھ رحم نہیں کرتا اس کے

ساتھ بھی رحم کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔ (التذكرة الحمدونية. ١/١٩٦)

قیامت کے دن خود بچی سے پوچھا جائے گا

اور جیسا کہ مَیں نے عرض کیا تھا کہ ہمارے معاشرہ میں آج بھی اس کے اثرات موجود ہیں، حالانکہ حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے دور کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی تعلیمات میں اس بات کی طرف بہت زیادہ متوجہ فرمایا ہے، اس لئے کہ ہر نبی اپنی قوم کے اندر جو برائیاں اور بیماریاں ہوتی ہیں ان کو دور کرنے کی اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے، اسی لئے بچیوں کو زندہ درگور کرنے اور ان کے ساتھ ناانصافی کے معاملہ کو ختم کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے بہت تاکیدی ارشادات فرمائے ہیں۔

اور قرآنِ پاک میں بھی اس سلسلہ میں باقاعدہ تاکید کی گئی ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے ﴿وَاِذَا الْمَوْؤُدَةُ سُئِلَتْ﴾ عدالت کا طریق کار تو یہ ہوتا ہے کہ مجرم سے اس کے جرم کے متعلق پوچھا جاتا ہے کہ تو نے ایسا کیوں کیا؟ لیکن یہاں اس کا جرم اتنا زیادہ شنیع تھا کہ خود اس کو خطاب کے قابل ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ جس بچی کو زندہ درگور کیا گیا تھا قیامت کے روز اسی سے پوچھا جائے گا ﴿بِأَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ﴾ کس جرم کی پاداش میں تجھے قتل کیا گیا تھا۔ دیکھئے! قرآنِ کریم نے کیسا انداز اختیار کیا ہے۔ اس بیچاری معصوم سے پوچھا جائے گا کہ تیرا کیا قصور تھا کہ تجھے زندہ درگور کر دیا گیا؟ ظاہر ہے کہ اس بیچاری کا کوئی قصور ہی نہیں ہے۔ قرآنِ پاک میں اس پر خاص تاکید فرمائی ہے اور اس بیماری کو دور کرنے پر خاص زور دیا گیا ہے اور احادیث میں بھی خاص تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ اسی میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے۔

دو بچیوں کی پرورش کرنے والوں کے لئے بشارت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی دو بچیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ سنِ بلوغ کو پہنچ جائیں تو مَیں اور وہ قیامت کے دن اس طرح آئیں گے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں انگلیوں کو ملا دیا۔ چونکہ وہ لوگ تو بچیوں کو بالغ ہونے ہی نہیں دیتے تھے، اس سے پہلے ہی معاملہ ختم ہو جاتا تھا اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بشارت ارشاد فرماتے ہیں۔ اس مجمع میں جن لوگوں کی دو یا زیادہ بچیاں ہیں اور ان کی پرورش کر رہے ہیں اور وہ بچیاں بلوغ کو پہنچ چکی ہیں ان سب کے لئے یہ بشارت ہے۔ اور غور کیجئے کہ کتنی بڑی بشارت ہے! اور یہ بشارت اُس زمانہ کے لئے خاص نہیں تھی، بلکہ قیامت تک آنے والے تمام مسلمانوں کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت ارشاد فرمائی ہے۔

جس ماحول میں لڑکیوں کے ساتھ زیادتیاں کی جاتی تھیں اس ماحول میں اس بشارت کا آپ اندازہ لگائیے۔ جو بچیوں کے ساتھ اس طرح کا اچھا سلوک کرے گا وہ قیامت کے روز میرے ساتھ اس طرح ہوگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت ہو اور پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود اتنی بڑی بشارت سنا دیں؛ تو پھر ظاہر ہے کہ کون ہے جو اس کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔

جہنم سے آڑ

۲۶۸. عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: دَخَلَتْ عَلَيَّ امْرَأَةٌ وَمَعَهَا ابْنَتَانِ لَهَا تَسْأَلُ، فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِي تَمْرَةً غَيْرَ وَاحِدَةٍ، فَأَعْطَيْتُهَا إِيَّاهَا، فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا، وَلَمْ تَأْكُلْ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ میرے پاس ایک ضرورت مند عورت آئی اور اس کے ساتھ اس کی دو بچیاں تھیں اور اس کے پاس کھانے کے واسطے کچھ نہیں تھا، اس نے میرے پاس آ کر سوال کیا، اس وقت

مِنْهَا، ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ،فَدَخَلَ النَّبِیُّ ﷺعَلَیْنَا، فَأَخْبَرْتُهُ فَقَالَ:مَنِ ابْتُلِیَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ،فَأَحْسَنَ اِلَیْهِنَّ، کُنَّ لَهٗ سِتْرًامِنَ النَّارِ.

میرے پاس بھی سوائے ایک کھجور کے کچھ نہیں تھا، اس لئے مَیں نے وہ ایک کھجور اس عورت کو دے دی۔اس عورت نے اس کھجور کے دو حصے کئے،اور دونوں کوایک ایک حصہ دیا،اور خود نے کچھ نہیں کھایا۔ پھر وہ اُٹھی اور چلی گئی۔جب نبی کریم ﷺ مکان پر تشریف لائے تو مَیں نے آپ کو یہ قصہ سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی ان لڑکیوں میں سے کسی کے ذریعہ سے آزمایا گیا، پھر اس نے ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا؛تو وہ اس کے لئے جہنم کی آگ سے آڑ بن جائے گی۔

افادات:- یہاں لفظ ''شَیْءٌ'' آیا ہے،جس میں ایک لڑکی بھی آ گئی،یعنی کسی کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی لڑکی دی ہو،یا ایک سے زیادہ دی ہو،اور وہ اس کے ذریعہ آزمایا گیا۔ اس لئے کہ کسی کے یہاں لڑکیاں آتی ہیں تو عام طور پر وہ اس کو اپنے لئے بوجھ سمجھتا ہے،تو اللہ تعالیٰ کا کسی کے یہاں لڑکیاں دینا اس کے لئے ایک طرح کی آزمائش ہے۔

ماں باپ کے لئے تمام اولاد برابر ہے

دیکھو! پہلے بتلا چکا ہوں کہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے؛ اولاد ہونے کی حیثیت سے ماں باپ کے لئے دونوں کا رشتہ برابر ہے،ان میں سے کسی کے ساتھ امتیازی سلوک اور ترجیحی معاملہ کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی،سب کے ساتھ یکساں معاملہ کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج میں صرف مرد ہی نہیں بلکہ مائیں بھی یہ زیادتیاں کرتی ہیں کہ لڑکوں کو صبح ناشتہ میں بالائی اور انڈے دیں گی،اور بیچاری لڑکی کو نہ بالائی ملتی ہے اور نہ انڈا۔اسی طرح کوئی مٹھائی یا کوئی اچھی چیز گھر میں آئی جو تھوڑی سی ہے تو ماں ہی یہ زیادتی کرتی ہے کہ لڑکے کو دیتی ہے اور لڑکی کو محروم رکھتی ہے؛ حالانکہ یہ سب ''أَحْسَنَ

اِلَیْهِنَّ" کے خلاف ہے۔ جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ سب سوچ لیں کہ مَیں جو بات کہہ رہا ہوں وہ غلط ہے؟ اگر غلط ہو تو مجھے بتلائیے۔ ہمارے سماج میں یہ سب ہو رہا ہے۔

اور مَیں تو سمجھتا ہوں کہ باپ تو لڑکیوں کے ساتھ برابری کا معاملہ کرے، لیکن یہ ظلم وزیادتیاں ماں ہی کی طرف سے ہو رہی ہیں، حالانکہ ماں سے شفیق اور مہربان اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن لڑکی خود یہ معاملہ ماں ہی کی طرف سے دیکھ رہی ہے کہ ماں مجھے تو بالائی نہیں دیتی اور بھائیوں کو دیتی ہے، اور ناشتہ میں مجھے انڈا نہیں دیتی اور بھائیوں کو مل رہا ہے۔ اس لئے باپ کو چاہیے کہ جب ایسی بات سامنے آئے تو بیوی کو سمجھائے کہ یہ معاملہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور پھر جب اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ نہیں ہوتا اور وہ لڑکی آپ کے گھر میں بیٹی ہونے کی حیثیت سے رہ کر یہ سب دیکھ رہی ہے کہ اس کے ساتھ یہ سب ناانصافی روا رکھ رہے ہیں، اور یہ بے چاری بچی اس گھر میں اسی طرح پرورش پا رہی ہے اور اس کی نشو نما اسی طرح ہو رہی ہے تو ابتداء ہی سے اس کی ذہنیت یہ بن رہی ہے کہ ماں کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ لہٰذا وہ بھی بڑی ہو کر اپنی بچیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتی ہے۔ یہ دراصل غلط تربیت کا نتیجہ ہوتا ہے جس کا وبال ماں باپ ہی پر ہوگا۔

یہ دو پیمانے کیسے ہیں؟

بلکہ آپ غور کیجئے کہ بیٹی کے ساتھ جب آپ ہی ایسی ناانصافی کریں گے اور پھر جب آپ اسی بیٹی کا نکاح کر کے کسی کی بیوی بنا کر رخصت کریں گے اور اُس گھر میں جا کر بھی اس کے ساتھ امتیازی معاملہ اور ترجیحی سلوک کیا جائے گا تو پھر آپ کو ہی اشکال ہوگا اور اس وقت آپ یوں کہیں گے کہ ہماری بیٹی کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہو رہا ہے۔ بھائی! جب آپ کے گھر میں اس کے ساتھ ایسا معاملہ ہو رہا تھا تو آپ نے کبھی اس

کو روکنے کی کوشش نہیں کی ،اور جب ایسا معاملہ دوسرے کے گھر میں جا کر اس کے ساتھ ہو رہا ہے تو آپ سماج اور محلّہ میں ،مسجد میں اور اپنی مجلسوں میں اس کا چرچا کر رہے ہیں کہ میری بیٹی کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا رہا ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ بھائی! یہ دو پیمانے کیسے ہیں؟ جب وہ آپ کے گھر میں تھی اس وقت تو یہ معصوم اور چھوٹی سی بچی تھی اور اس پر شریعت کی تکلیف بھی نہیں تھی اس وقت سے اس کے ساتھ یہ معاملہ ہو رہا تھا، جب آپ کی طرف سے کیا گیا تو درست تھا اور ایسا معاملہ جب سسرال والوں کی طرف سے ہو رہا ہے تو آپ اس کو برا کہہ رہے ہیں؟

حالانکہ اس حدیثِ پاک میں تو حضور ﷺ نے ماں باپ کو خاص تاکید فرمائی ہے کہ جو لڑکیوں کے ذریعہ آزمایا گیا اور اس نے ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک اور احسان کا معاملہ کیا؛ تو یہی لڑکیاں اور بیٹیاں اس کے لئے جہنم سے آڑ بن جائیں گی اور ماں باپ کو جہنم کی آگ بھی نہیں لگنے دیں گی۔ ہمارے گھروں میں بہت آسان علاج موجود ہے، اس کے لئے کہیں باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اس کے لئے کچھ کمانے کی بھی ضرورت نہیں ہے، بس! ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیجیے، ترجیحی اور امتیازی سلوک مت برتیے ، جیسے ہی وہ بچیاں بالغ ہو جائیں گی ؛ تو خود بخود ہی یہ فضیلت آپ کو حاصل ہو جائے گی۔

ایک کھجور جنت میں جانے کا ذریعہ بنی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت لاتے ہیں جس میں اوپر جیسا ہی قصہ ہے بس ذرا سا فرق ہے۔

۲۶۹. عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: جآءَ تنِیْ مِسْکِیْنَۃٌ تَحْمِلُ ابْنَتَیْنِ لَھَا، فَأَطْعَمْتُھَا ثلاثَ تَمَرَاتٍ، فَأَعْطَتْ کُلَّ وَاحِدَۃٍ مِّنْھُمَا تَمْرَۃً وَ رَفَعَتْ اِلیٰ فِیْھَا تَمْرَۃً لِتَأْکُلَھَا فَاسْتَطْعَمَتْھَا ابْنَتَاھَا، فَشَقَّتِ التَّمْرَۃَ الَّتِیْ کَانَتْ تُرِیْدُ أَنْ تَأْکُلَھَا بَیْنَھُمَا، فَأَعْجَبَنِیْ شَأْنُھَا، فَذَکَرْتُ الَّذِیْ صَنَعَتْ لِرَسُوْلِ اللہِ ﷺ، فقال: اِنَّ اللہَ قَدْ أَوْجَبَ لَھَا بِھَا الْجَنَّۃَ، أَوْ أَعْتَقَھَا بِھَا مِنَ النَّارِ.

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مسکین اور غریب عورت اپنی دو بچیوں کو لے کر آئی، مَیں نے اس کو تین کھجوریں دیں، اس نے ایک ایک کھجور ایک ایک لڑکی کو دی اور تیسری کھجور کھانے کے لئے اپنے منہ کی طرف اُٹھائی، اسی دوران ان دونوں بچیوں نے اپنی اپنی کھجوریں نمٹا کر اپنے ہاتھ بڑھائے۔ تو اس عورت نے اپنی اس کھجور کے بھی دو ٹکڑے کئے اور آدھی آدھی ان دونوں بچیوں کو دیدی اور خود کچھ نہیں کھایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس کے اس معاملہ پر مجھے بڑا تعجب ہوا، مَیں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے اس کے اس حسنِ سلوک کی وجہ سے اس کے لئے جنت واجب کردی۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم سے آزاد کر دیا۔ دیکھو! ایک کھجور جنت میں لیجانے کا ذریعہ بنی۔

اس کا مددگار ''اللہ'' ہے

۲۷۰. عن أبی شریح خویلد بن عمرو الخُزَاعِیّ رضی اللہ عنہ قال: قال النبی ﷺ: اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أُحَرِّجُ حَقَّ الضَّعِیْفَیْنِ؛ اَلْیَتِیْمِ وَالْمَرْأَۃِ.

حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دعا کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ اے اللہ! دو کمزوروں کے حق کے ضائع کرنے کے بارے میں مَیں اعلان کرتا ہوں؛ یتیم اور عورت۔

افادات:- عورت میں تمام نوع نسواں آ گئی، بیٹی بھی اور بیوی بھی۔ چونکہ

عام طور پر جب ان کے حقوق ضائع کئے جاتے ہیں تو ان بے چاریوں میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی قوت کے ذریعہ اپنا حق وصول کرسکیں۔اس روایت سے معلوم ہوا کہ کسی بھی کمزور کا حق ضائع کرنا بڑا خطرناک گناہ ہے،اوراس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی غیرت جوش میں آجاتی ہےاور ایسے آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص عتاب وعقاب کا معاملہ کیا جاتا ہے۔اس لئے یہ سمجھ کر کسی کا حق ضائع کرنے کی کبھی جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ اس کا تو کوئی بھی مددگار نہیں ہے،اس لئے کہ جس کا کوئی مددگار نہیں ہوتا اس کا مددگار اللہ تعالیٰ خود ہوجاتا ہے۔

تمہارے کمزوروں کی وجہ سے مدد کی جاتی ہے

۲۷۱. وعن مصعب بن سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ قال: رَأىٰ سَعْدُ أَنَّ لَهُ فَضْلاً عَلىٰ مَنْ دُوْنَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: هَلْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ اِلَّا بِضُعَفَآءِ كُمْ.

حضرت مصعب بن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کوئی ایسی بات کہی جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کمزوروں کے مقابلہ میں ان کو فضیلت حاصل ہے،اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔

افادات:- عام طور پر جب کسی کمزور کا معاملہ آتا ہے تو قوی لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ہم اس کی مدد کررہے ہیں اور ہم اس کی حفاظت کررہے ہیں،ہم کما کر اس کو کھلارہے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ بالکل الگ ہی تعلیم ارشاد فرمارہے ہیں،اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم جو نظر آرہا ہے اس کے خلاف ہے۔دیکھنے والے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس کے گھر کے اندر بوڑھی ماں ہے،کمزور دادی ہے جو چلنے پھرنے سے عاجز ہے،بچہ ہے جو پیدائشی طور پر معذور ہے۔تو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کی کفالت کرتا ہے،یہ محنت

مزدوری کر کے کماتا اور ان کو کھلاتا ہے، یہ ان کو روزی پہنچاتا ہے، یہ ان کی مدد کرتا ہے، لیکن نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ تمہاری مدد ان کی وجہ سے کی جاتی ہے، تم کو ان کی وجہ سے روزی ملتی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم ان کو روزی پہنچا رہے ہو۔

معاشرے کی دُکھتی رَگ

آج کل عام طور پر ہمارے دل و دماغ میں یہی بیٹھا ہوا ہے اور گھروں میں لڑائیاں بھی یہیں سے آتی ہے۔ دیکھو! ترتیب تو یہی ہے کہ شروع میں کاروبار تو باپ ہی جماتا ہے، اور جب بیٹوں کا نمبر آتا ہے، تو پہلے بڑا بیٹا آکر باپ کا ساتھ دیتا ہے، ابھی چھوٹوں کا وقت نہیں آیا ہے، ان میں سے کوئی اسکول جا رہا ہے، کوئی مدرسہ پڑھ رہا ہے، کوئی اور بھی چھوٹا ہے جب سے باپ ریٹائرڈ (Retired) ہوا ہے، ان کے کاروبار کو بڑے بیٹے نے سنبھال رکھا ہے، اس طرح کاروبار بڑے بیٹے کے ہاتھ میں آتا ہے۔

پھر اس کی شادی بھی ہوگئی اور بڑی بہو گھر میں آئی، اور عام طور پر ماں باپ کو چھوٹی اولاد کے ساتھ محبت زیادہ ہی ہوتی ہے، اور ابھی انہوں نے دیکھا بھی کیا ہے؟ بڑے کو محبت سے محروم نہیں رکھا جاتا، بلکہ اس کو تو بہت محبت مل چکی ہے، اور یہ فطری چیز ہے، اور عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ بڑا جو ہوتا ہے وہ ماں باپ کا پہلا ہی بچہ ہوتا ہے، اس لئے ماں باپ کو اس کے ساتھ محبت آخر تک برابر رہتی ہے۔

خیر! بات یہ چل رہی تھی کہ باپ کے بعد کاروبار بڑا ہی سنبھال لیتا ہے، جب بہو آتی ہے تو وہ یوں کہتی ہے کہ تم محنت مزدوری کرتے ہو اور تھکتے ہو، اور اس کو تو دیکھو، وہ تو برابر اسکول و مدرسہ بھی نہیں جاتا، اِدھر اُدھر تفریح کرتا پھرتا رہتا ہے، اس کو ابا کھلاتے

پلاتے رہتے ہیں، اور تم صبح سے دکان پر جاتے ہو اور دو پہر کا کھانا بھی پتہ نہیں آپ برابر کھاتے ہو یا نہیں، پھر رات کو دیر سے آتے ہو۔ ان سب باتوں کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ ہم ہی الگ ہو جائیں، اس لئے کہ وہ یوں سمجھتی ہے کہ میرا شوہر ہی کما کر سب کو کھلا رہا ہے۔

کھڑے کھڑے اور پڑے پڑے

اور اس کی باتوں کی تاثیر بھی بڑی عجیب وغریب ہوتی ہے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ساس اور بہو میں جھگڑا ہوا۔ ساس نے کہا کہ اچھا! میرے بیٹے کو آنے دو، پھر مَیں تجھے بتلاتی ہوں، مَیں اس کو کہوں گی تو وہ تیری برابر خبر لے گا۔ بہو نے کہا کہ مَیں بھی ان سے کہوں گی، اور وہ میری سنیں گے، تمہاری نہیں سنیں گے ساس کہتی ہے کہ میرا بیٹا ہے، اس لئے میری سنے گا۔ تو بہو کہنے لگی کہ وہ تو میری ہی سنیں گے، تمہاری نہیں سنیں گے۔ پوچھا کہ ایسا کیوں؟ تو بہو کہنے لگی کہ تم کھڑے کھڑے کہو گی، اور میں پڑے پڑے کہوں گی۔ اور بات یہی ہے کہ اس کی باتوں میں ایسی تاثیر رہتی ہے کہ مرد اس کی باتوں کے چکر میں آجاتا ہے۔

تو پھنستا ہی چلا جاتا ہے

خیر! پھر بھائیوں سے علیٰحدگی ہو جاتی ہے، ماں باپ کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہو جاتے ہیں۔ پھر آگے یہ ہوتا ہے کہ آج تک تو کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا، اب گردش میں آتا ہے، پھر وہ یوں سمجھتا ہے کہ ہاں! ماں باپ سے الگ ہوئے اس لئے انہوں ہی نے کچھ کرایا ہے۔ ارے کم عقل! یہ مصیبت تو تیری بدعملی اور قطع رحمی کی وجہ سے آئی ہے، اب بھول سدھارنے کے بدلے تو شیطان کے چکر میں اور اندر گھستا چلا

جارہا ہے۔آدمی جب دلدل میں پھنستا ہے تو پھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ دراصل کاروبار میں یہ گردش تو ماں باپ کا حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے آئی تھی ،اور آپ کو جو کچھ مل رہا تھا وہ ان کی وجہ سے مل رہا تھا،لیکن ان سے تو آپ الگ ہو گئے ہیں،لہٰذا اب ان کا حصہ تمہارے پاس کہاں سے آئے گا۔

پھر جب کاروبار بھی چکر میں آیا تو اب شیطان دوسری سُجھا تا ہے اور عاملوں کے پاس لے جاتا ہے، پھر لوگ عملیات والوں کے پاس جاتے ہیں۔آج کل کے عاملوں سے اللہ بہت زیادہ بچائے ،وہ ایسے خطرناک ہوتے ہیں کہ اللہ کی پناہ۔وہ لوگ تو ایسے ایسے وسوسے ڈالتے ہیں کہ شیطان تو کیا ڈالتا؟ جب وہاں پہنچا تو عامل صاحب کہتے ہیں کہ کسی نے کچھ کردیا ہے، پہلے سے اس کے دل میں ایسا خیال تو تھا ہی ،اب اس عامل نے اس کو اور زیادہ پختہ کردیا۔حالانکہ گھر والوں سے جب لڑائی ہوتی ہے تو چند دنوں میں ناچاقی ختم ہو جاتی ہے،لیکن یہ عامل لوگ زیادہ پانی پہنچاتے ہیں،اور اکثر یہی کہتے ہیں کہ اندر کا ہی کوئی ہے جس نے کچھ کیا ہے،اور یہ سمجھتا ہے کہ بھائی کے ساتھ لڑائی ہوئی ہے،لہٰذا اسی نے کچھ کرایا ہوگا۔اب بھائی بھائی میں اور زیادہ دوری ہوگئی، اور یہی جھگڑے بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتے ہیں کہ پھر دونوں زندگی بھر کبھی نہیں ملتے۔ بس! یہ ساری خرابی کی جڑ ہے۔

نوجوانوں کو ایک اہم نصیحت

دیکھو! نوجوان طبقہ سے میں خاص طور پر یہ کہوں گا کہ بیوی کی ضرورتیں ضرور پوری کرو،اور اس سے کہہ دو کہ تجھے جو چاہیے مجھ سے کہنا، زیورات بھی بنا دوں گا اور

تیری ساری باتیں سنوں گا، لیکن اس موضوع پر کبھی بھی زبان مت کھولیو، اس کو پہلے ہی روز حدود بتلا دینے چاہئیں کہ تیری حد یہاں تک ہے، اس سے آگے تجھے نہیں بڑھنا ہے، اس کو صاف صاف بتا دینا چاہیے؛ پھر ان شاء اللہ جھگڑوں کی نوبت نہیں آئے گی۔

بہر حال! میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد ہوتی ہے اور تمہیں روزی بھی انہیں کی وجہ سے دی جاتی ہے، اسی لئے یوں نہ سمجھو کہ ہم انہیں کھلا رہے ہیں، بلکہ ان کا احسان سمجھو کہ وہ ہمیں کھلا رہے ہیں۔

ماں باپ کو اپنے ساتھ لو

انگلینڈ میں قانون ہے کہ وہاں بچوں اور بوڑھوں کو بھی وظیفہ ملتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہاں یہ ہوتا ہے کہ کبھی میاں بیوی میں نا اتفاقی ہوتی ہے تو بچوں کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ان کے درمیان جھگڑا ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ بچے جس کے پاس رہیں گے ان کا وظیفہ بھی اسی کے پاس جائے گا۔ اور بچے تو کیا کھائیں گے ؛ سارا وہی کھائے گا۔

اور مَیں کہتا ہوں کہ اگر کبھی کسی مصلحت کی وجہ سے بھائیوں کا چولہا الگ کرنے کی نوبت آوے تو بھائیوں کو اس لئے لڑنا چاہیے کہ ماں باپ کو مَیں اپنے حصہ میں لوں گا۔ آج کل تو معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ ان کو ساتھ لینے کے لئے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ حالانکہ میں تو کہتا ہوں کہ ان کو اپنے ساتھ لو؛ تاکہ ان کا حصہ بھی تمہارے پلڑے میں آوے۔ ناسمجھی اور بے خبری میں لوگ ایسا کر رہے ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ کے خبر دینے کے بعد تو ہمیں اس کی حرص ہونی چاہیے۔

مجھے کمزوروں میں ڈھونڈو

۲۷۲. عَنْ أَبِي الدَّرْدَآءِ عُوَيْمِر رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: اِبْغُوْنِي الضُّعَفَآءَ؛ فَاِنَّمَا تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَآءِ كُمْ. (رواه أبو داود باسناد جيد)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرے لئے کمزوروں کو تلاش کر کے لاؤ، اس لئے کہ تمہارے کمزوروں کی وجہ سے تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے۔

افادات: -''میرے لئے کمزوروں کو تلاش کر کے لاؤ'' گویا مَیں ان کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں۔ بعض روایتوں میں ہے کہ مجھے کمزوروں میں ڈھونڈو، مَیں وہیں ملوں گا۔ اسی لئے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جہاد اور جنگ کے موقعوں پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کمزوروں کو اپنے پاس رکھتے تھے؛ تاکہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کی جائے، اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنی بات اور دعا پیش کرنے کے لئے ان کو ہی واسطہ بنایا جائے۔ لہٰذا ان سب باتوں کا اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ

عورتوں کے بارے میں تاکید

مجلس (١)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللهُ وَحْدَهٗ لاَشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلاَنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أما بعد:- أعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم.

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (النسآء. ۱۹)

وقال تعالیٰ:- وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْحَرَصْتُمْ فَلا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ، وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللهَ كَانَ غَفُوْراً رَّحِيْماً . (النسآء. ۱۲۹)

حقوق دوطرح کے ہیں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے ”اَلْوَصِيَّةُ بِالنِّسَآءِ“ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی تاکید۔آگے کچھ ابواب تک علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ حقوق کو بیان فرمارہے ہیں۔

حقوق دوطرح کے ہیں،ایک تو اللہ تعالیٰ کے حقوق ہیں اوردوسرے حقوق بندوں کے ہیں،یہاں حقوق العباد کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں حقوق العباد کی طرف جیسی توجہ دینی چاہیے وہ نہیں دی جاتی ،ہم لوگوں نے عملی طور پر دین کو عبادتوں ہی کے اندر محدود کررکھا ہے،نماز روزہ، حج زکوٰۃ، تلاوت وتسبیحات اورجن چیزوں کا تعلق عبادات سے ہے ان کو ادا کرنے کے بعد ہم مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہم نے سوفیصد دین پر عمل کرلیا،اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبادات دین کا

بہت اہم شعبہ ہے، عبادات ہی ہیں جن کے ذریعہ سے بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ مضبوط کر سکتا ہے، اور اسی کے ذریعہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آدمی کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے اور آگے چل کر یہی چیز پوری شریعت پر عمل کرنے کے لئے معین ومددگار ثابت ہوتی ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ کی بعثت کے بعد اسلام کے ابتدائی زمانہ میں زیادہ تر اسی کی طرف متوجہ کیا گیا۔ اور حقوق العباد؛ معاشرت اور معاملات کے احکام کو شروع میں نازل نہیں کیا گیا، اس لئے کہ جب تک بندوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مضبوط نہ ہو، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بندوں کے دل میں اتنی زیادہ نہ آجائے کہ اس کے لئے ہر چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جائیں؛ تب تک ان کو احکام کا مکلّف بنانا اور پابند کرنا قرینِ مصلحت نہیں ہے، اس لئے ابتداء میں عقائد کے درست کرنے اور اس کے بعد عبادات کی ادائیگی پر زیادہ زور دیا گیا بعد میں جب ان چیزوں کے اندر پختگی آگئی اور لوگ دعوت قبول کر چکے، اور ایمان ویقین کی مضبوطی کے نتیجہ میں اس قابل ہو چکے کہ اب ان کو حقوق العباد معاشرت اور معاملات کے متعلق احکام دیئے جائیں اور ان کی ادائیگی کے لئے جس ایثار وقربانی کی ضرورت ہے اس کے لئے تیار وآمادہ ہو گئے؛ تب ان کو وہ احکام بھی دیئے گئے۔

جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو جاتا ہے

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ مَیں جب مکہ معظّمہ میں تھی اس وقت چھوٹی بچی تھی اور کھیلا کرتی تھی، اس وقت یہ آیتیں نازل ہوئیں ﴿بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهٰى وَأَمَرُّ﴾ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے اور یہ بڑی مصیبت اور کڑوی چیز ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ شروع میں یہی چیزیں (جن میں عقائد،

آخرت اور ایمان کے متعلق زیادہ تر احکامات بتلائے گئے ہیں اور قرآن کی وہ سورتیں جو اواخر کہلاتی ہیں) نازل ہوتی تھیں، اگر شروع ہی سے وہ چیزیں نازل ہوتیں جن میں کہہ دیا جاتا کہ شراب مت پیو اور زنا مت کرو تو وہ لوگ کہہ دیتے کہ ہم سے تو یہ سب نہیں ہو سکے گا، اس لئے پہلے وہ چیزیں نازل کی گئیں جن کے ذریعہ عقائد، ایمان و یقین کو مضبوط کیا گیا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کو مضبوط کیا گیا اور اس کے بعد سارے احکام نازل ہوئے۔ (بخاری شریف۔۴۹۹۳)

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ عبادات کا شعبہ اس معنٰی کر بڑا اہم اور ضروری ہے کہ اس کے ذریعہ ہی آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ اور تعلق مضبوط کر سکتا ہے، اور اسی تعلق کی استواری و مضبوطی کے نتیجہ میں آدمی اس قابل بنتا ہے کہ شریعت میں دیئے گئے دوسرے تمام احکام کی ادائیگی کے لئے جس ایثار و قربانی کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے وہ تیار ہو جاتا ہے، بندوں کے حقوق آسانی سے ادا کرتا ہے، اپنی خواہشات اور من پسند چیزوں کو قربان کر دیتا ہے، معاملات کی صفائی بھی پیدا ہوتی ہے۔ عبادات کے ذریعہ سے جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے دل میں پیدا کر لیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط کر لیتا ہے تو پھر یہ سارے مراحل اس کے لئے بہت آسان ہو جاتے ہیں۔

کیوں ہمیں عبادات کا ثمرہ حاصل نہ ہوا؟

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ عبادات کا شعبہ بڑا بنیادی اور اہم شعبہ ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ہم لوگوں نے اپنی ناواقفیت اور شریعت سے جہالت اور اپنے محدود علم کی وجہ سے یوں سمجھ لیا کہ سارا دین صرف عبادات ہی کے اندر منحصر ہے، ایک آدمی نمازوں کا اہتمام کرتا ہے، رمضان المبارک کے روزے بڑے اچھے طریقہ سے

رکھتا ہے، زکوۃ بھی ادا کرلیتا ہے، حج بھی کرتا ہے، تلاوت تسبیحات اور نوافل کا اہتمام بھی کرتا ہے؛ تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے سو فیصد (۱۰۰%) دین پر عمل کرلیا، اس کے بعد جب ماں باپ کے، بیوی بچوں کے، بھائی بہنوں کے اور پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی کا وقت آتا ہے، یا خرید وفروخت اور تجارت کے معاملات کا جب وقت آتا ہے اور اس میں اپنے دل کی چاہت کو قربان کرنے کی ضرورت پڑتی ہے؛ تو وہ اس کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے محدود علم کے نتیجہ میں ہم پر اثر یہ ہوا کہ ہم نے دین کو عبادتوں تک محدود کردیا اور ان عبادتوں کا جو اصل ثمرہ اور فائدہ ہونا چاہیے تھا؛ وہ ہمیں نہیں ہوا، یعنی عبادات کا شعبہ اس لئے رکھا گیا تھا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ بندوں کا تعلق اتنا مضبوط ہوجاتا کہ اس کے نتیجہ میں دوسرے سارے احکام کی ادائیگی کے ہم قابل بن جاتے، لیکن ہم قابل نہیں بنے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری عبادتیں بھی ناقص ہیں اور اس شعبہ سے ہمیں جو فائدہ حاصل کرنا چاہیے تھا، وہ بھی ہم نے حاصل نہیں کیا۔

کہیں ہمارا ایمان تو ختم نہیں ہو رہا؟

علماء نے دین کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ عقائد کا ہے۔ آج کل ایک مصیبت یہ ہوگئی کہ عقائد کی درستگی کا بھی اہتمام نہیں رہا، بہت سے ایسے لوگ ہیں جو نماز، روزہ زکوۃ کا اہتمام کرنے والے ہیں؛ وہ بھی عقائد کے سلسلہ کی بنیادی چیزوں سے ناواقف ہیں اور بہت سی مرتبہ ان کی زبان سے ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جو کفر تک پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ حالانکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک مسلمان کے لئے یہ جاننا بھی ضروری اور فرضِ عین ہے کہ وہ کون سے کام ہیں اور کون سے کلمات اور باتیں ہیں کہ

جن کے کرنے کے نتیجہ میں اور جن کلمات کے زبان سے نکالنے کے نتیجہ میں آدمی اسلام سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے، تاکہ وہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بچا سکے اور اپنے ایمان کی حفاظت کر سکے۔

شراب پینے سے زیادہ خطرناک ہے

دوسرا شعبہ عبادات کا ہے، تیسرا شعبہ اخلاق کا ہے، چوتھا شعبہ معاملات کا ہے اور پانچواں شعبہ معاشرت کا ہے۔ معاشرت: جس میں بندوں کے حقوق آتے ہیں اس کی طرف سے بے انتہا غفلت برتی جاتی ہے اور اس میں ہونے والی کوتاہیوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، مثلاً ایک آدمی شراب پیتا ہے تو اس کو پورا سماج برا سمجھتا ہے اور وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ مَیں ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہوں، اس کے برخلاف ایک آدمی اگر کسی کی غیبت کرتا ہے تو نہ خود غیبت کرنے والا اس کو برا سمجھتا ہے، اور نہ سننے والے اس کو اہمیت دیتے ہیں، حالانکہ غیبت کرنا بھی ویسا ہی بڑا گناہ ہے جیسا شراب پینا ہے، بلکہ گناہ کی حیثیت اور مرتبہ کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو غیبت کرنا شراب پینے سے زیادہ خطرناک ہے، اس لئے کہ غیبت کو قرآنِ پاک میں جو تشبیہ دی گئی ہے وہ بڑی خطرناک ہے ﴿أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَّأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوْهُ﴾ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم بہت برا سمجھتے ہو۔ گویا قرآنِ پاک میں یہ بتلایا گیا کہ مردار بھائی کا گوشت کھانا جتنا گھناؤنا اور قابلِ نفرت فعل ہے، اپنے مسلمان بھائی کی غیبت کرنا بھی ایسا ہی قابلِ نفرت اور گھناؤنا فعل ہے، بلکہ معنوی اور روحانی طور پر غیبت کرنے کو اسی میں شمار کیا گیا ہے۔

غیبت کی مثالی صورت

آپ نے فضائلِ رمضان میں سنا ہوگا کہ دو عورتوں کو روزہ کی حالت میں بھوک کا بڑا احساس ہوا، جس کو ہم ''روزہ لگنا'' کہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کو اطلاع کی گئی، آپ نے ان کے پاس پیالہ بھیجوایا کہ اس میں قے کرو، قے کی گئی تو اس میں گوشت نکلا، انہوں نے بتلایا کہ ہم نے گوشت تو کھایا بھی نہیں ہے، تو آپ ﷺ نے بتلایا کہ ان دونوں نے غیبت کی تھی (مسند ابو یعلیٰ ۳/۱۴۶) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی برکت سے غیبت کی حقیقت کو لوگوں کے سامنے ظاہر فرمادیا۔ ہر چیز کی شریعت میں ایک صورتِ مثالی ہوا کرتی ہے، ہمارے ظاہری افعال کی جو معنوی تشریح کی جاتی ہے اور اس کی جو صورتِ مثالی بیان فرمائی جاتی ہے اس کو نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں بہت سی مرتبہ ظاہر فرمادیا جاتا تھا۔

غیبت کو زنا سے زیادہ خطرناک کہنے کی وجہ

خیر! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ غیبت کی کتنی خطرناک تشبیہ دی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ دونوں میں ایک فرق بھی ہے کہ شراب پینا اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے ہے، اگر شرابی کو اپنی اس غلطی اور کوتاہی کا احساس اور اس پر ندامت ہو، اور تنہائی میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے آنسو بہالے اور توبہ کرلے؛ تو شراب پینے کا گناہ معاف ہوجائے گا، اس کی صفائی کے لئے بندوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں توبہ کی تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا حساب وکتاب صاف ہو چکا ہے۔ لیکن غیبت کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں بندے کا بھی حق ہے، اس لئے جب تک اس کے ساتھ بات صاف نہ کی جائے، اس سے معافی نہ مانگی جائے؛ تب تک غیبت کا گناہ

معاف نہیں ہوتا، اسی لئے غیبت کو حدیثِ پاک میں زنا سے زیادہ خطرناک کہا گیا ہے

﴿اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا﴾ (شعب الایمان، ۶۷۴۲)

......ہم اتنی اہمیت نہیں دیتے

بہر حال! ہمارے معاشرہ میں بندوں کے حقوق کے معاملہ میں بہت کوتاہی برتی جاتی ہے، اور ان کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی جاتی جتنی دی جانی چاہیے، حالانکہ شریعت نے اس کی طرف جتنا متوجہ کیا ہے اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ اس کی جتنی زیادہ تاکید کی ہے اور ہمارے ذہنوں میں اس چیز کو بٹھانے کی جتنی کوشش کی ہے، ہم نے اتنی سنجیدگی اور قوت سے نہیں لیا ہے، شریعت نے اس کو جتنی اہمیت دی ہے، ہم اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔

احسان کی کیفیت

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے، کراچی میں مقیم تھے، اب تو انتقال ہو چکا ہے، اُس علاقہ میں حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں آخر میں انتقال کرنے والے یہی تھے، اب تو حضرت حکیم الامتؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا ابرار الحق صاحب دامت برکاتہم ہی کی شخصیت موجود ہے، اللہ تعالیٰ ان کے سایۂ عاطفت کو باقی رکھے (اب تو وہ بھی چل بسے) خیر! حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس آکر ایک آدمی نے کہا کہ حضرت! مجھے احسان کی کیفیت حاصل ہوگئی۔

نبی کریم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری زمانہ میں ایک مرتبہ حضورِ اکرم ﷺ صحابۂ کرام کے درمیان تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی سفید لباس میں ملبوس آیا، صحابۂ کرام کہتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی اس کو نہیں پہچانتا تھا گویا اجنبی شخص تھا، لیکن اس کے جسم پر سفر کے

کوئی آثار بھی نظر نہیں آتے تھے۔ اُس زمانہ میں جب کوئی آدمی سفر کر کے آتا تو اس کے کپڑے اور اس کا حلیہ ہی بتلا دیتا کہ یہ مسافر ہے، آج کل جیسا تو تھا نہیں کہ شتابدی یا راجدھانی میں سفر کر کے آوے اور کپڑے بھی میلے نہ ہوں، اُس زمانہ میں تو سواری پر یا پیدل ہی سفر کیا کرتے تھے، اگر کوئی آدمی دو تین کیلومیٹر سے بھی آتا تھا تب بھی اس کا اثر نمایاں ہوتا تھا کہ یہ باہر سے آیا ہے

بہر حال! اس کے کپڑے بھی صاف شفاف تھے، سفر کا کوئی اثر بھی نہیں تھا اور راوی کہتے ہیں کہ صحابہ میں سے کوئی پہچانتا بھی نہیں تھا، وہ شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آکر بالکل قریب بیٹھ گیا اور نبی کریم ﷺ کے مبارک گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا دیئے، اور کچھ سوالات شروع کیئے، پہلا سوال تھا ﴿مَاالْاِسْلَامُ؟﴾ اسلام کیا ہے؟ دوسرا سوال تھا ﴿مَاالْاِیْمَانُ؟﴾ ایمان کیا ہے؟ اور تیسرا سوال تھا ﴿مَاالْاِحْسَانُ؟﴾ احسان کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿أَنْ تَعْبُدَاللهَ کَأَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاکَ﴾ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت ایسی کیفیت کے ساتھ کرو گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو تو ہر مؤمن کا یہ یقین تو ہے ہی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔ (مسلم شریف، ۱۰۲) یہی کیفیت ہمارے دل ودماغ پر طاری ہو جائے؛ اسی کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

نماز میں اس کیفیت کا حاصل ہونا ابتدائی درجہ ہے

خیر! اس آدمی نے آکر حضرت ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ مجھے یہ صفت حاصل ہو گئی ہے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے، بہت اچھی بات ہے، لیکن ذرا یہ تو بتلاؤ کہ یہ چیز صرف نماز ہی میں ہے یا اور معاملات میں بھی حاصل

ہے؟اس نے کہا کہ ہم نے تو حدیث میں یہی پڑھا ہے﴿أَنْ تَعْبُدَاللهَ﴾ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو۔اس لئے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ نماز میں یہ کیفیت حاصل ہوجائے تو کافی ہے۔حضرت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اسی لئے تو مَیں نے پوچھا تھا،اس لئے کہ نماز میں اس کیفیت کا حاصل ہونا تو ابتدائی درجہ ہے،اس کے بعد یہ کیفیت بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھے کہ ہر وقت یہ تصور ہوجائے،آپ گھر میں ہوں،بیوی بچوں کے ساتھ ہوں کسی کے ساتھ کوئی معاملہ ہو رہا ہو،اس وقت بھی یہ کیفیت تمہارے دل و دماغ پر طاری ہو،یہ خیال غالب ہو کہ تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو یا اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔تم فیکٹری میں یا دفتر کے بڑے ہو اور ماتحتوں کے ساتھ کوئی معاملہ کر رہے ہو؛اس وقت بھی یہ تصور تمہارے دل و دماغ پر حاوی ہو۔یا تم اپنی دکان پر بیٹھ کر کسی کے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کر رہے ہو؛اس وقت بھی یہ چیز غالب ہو۔اپنے پڑوسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آجاوے اس وقت بھی یہ خیال غالب ہو۔مطلب یہ ہے کہ ہر ہر لمحہ اور ہر ہر جگہ یہ کیفیت تمہارے دل و دماغ پر طاری ہوجاوے،اور یہ تصور تم پر غالب آجاوے،اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذاتِ پاک کا استحضار اتنا حاوی ہوجائے جتنا نماز میں ہے،تو پھر ظاہر ہے کہ کون کس کے حق کو مارے گا،پھر تو کوئی بھی بیوی کے اوپر کبھی ظلم نہیں کرے گا،بچوں کے ساتھ زیادتی نہیں کرے گا،کوئی استاذ اپنے شاگرد کے ساتھ برا سلوک نہیں کرے گا،آقا غلام کے ساتھ،سیٹھ نوکر کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کرے گا،کوئی بیچنے والا خریدنے والے کے ساتھ کسی قسم کی دھوکہ بازی نہیں کریگا،اس لئے کہ اس کو یہ بات پتہ ہے کہ اگرچہ یہ بات سامنے والے کو معلوم نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے۔

فَأَیْنَ اللہ؟

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ سفر کے لئے نکلے، ایک چرواہا ملا، اس سے کہا کہ تھوڑا سا دودھ دو۔ اس نے کہا کہ مَیں ان بکریوں کا مالک نہیں ہوں، مَیں تو غلام ہوں، مالک کی طرف سے بکریاں چرانے کا حکم ہے، دودھ نکالنے کا مجھے اختیار دیا نہیں گیا ہے، اس لئے مَیں نہیں دے سکتا۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے امتحان کی غرض سے اس سے کہا کہ ایسا کرو کہ ایک بکری مجھے دیدو اور قیمت لے لو، اگر آقا پوچھے تو اس سے کہہ دینا کہ بکری کو بھیڑیا کھا گیا، میرا کام بن جائے گا کہ دودھ پیتا رہوں گا اور پھر ذبح کر کے گوشت استعمال کرلوں گا اور اس کی قیمت تمہارے کام آجائے گی، اس کے جواب میں چرواہا آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿فَأَیْنَ اللہ؟﴾ اللہ تعالیٰ کہاں جائیں گے؟ یعنی آقا اس وقت نہیں دیکھ رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے؟ مَیں اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دوں گا؟ (الدر المنثور. جزء. ۸/۲۷۳)

دیکھو! اُس زمانہ میں ایک چرواہے پر بھی یہ کیفیت غالب تھی اور یہ مقام اس کو بھی حاصل تھا۔ اُس دور میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجہ میں اور آپ کی برکت سے یہ چیز عام تھی، اسی لئے اس کو خیر القرون قرار دیا گیا۔ آج یہ چیز بازاروں میں کتنوں کو حاصل ہوگی؟

بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑی اہمیت کا حامل ہے

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ حقوق کی ادائیگی میں جو کوتاہیاں ہمارے سماج میں کی جاتی ہیں، وہ اسی لئے ہیں کہ ان کو اتنی سنجیدگی سے برتا نہیں جاتا جتنی عبادات کو اہمیت دی جاتی ہے، حالانکہ یہ بھی اہمیت کی چیز ہے۔ اسلئے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ صحابہ کرام

رضی اللہ عنہم نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! ایک عورت ہے جو نماز، روزہ، تہجد وغیرہ کا بڑا اہتمام کرتی ہے، لیکن پڑوسیوں کو تکلیف دیتی ہے؛ اس کے متعلق آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گی۔ اس کے مقابلہ میں دوسری عورت کے متعلق سوال کیا گیا کہ وہ زیادہ نوافل کا اہتمام تو نہیں کرتی، فرض نمازیں اور روزے وغیرہ بجالاتی ہے، اور تھوڑا بہت صدقہ بھی کرتی ہے، البتہ اس کے پڑوسی اس سے خوش ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہ جنت میں جائے گی (مسند احمد، ۹۶۷۵) بندوں کے حقوق کا معاملہ اتنا زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

قرآن وحدیث سے فقہی احکام کیسے نکلے؟

بلکہ آپ اگر فقہ اسلامی کو دیکھیں یعنی قرآن وحدیث کے احکام اور اسلامی قانون پر نظر دوڑائیں تو قرآن میں اگلوں کے قصے بھی ہیں، اوامر اور نواہی بھی ہیں، نصیحتیں بھی ہیں، عقائد بھی بیان کئے گئے ہیں اور بہت ساری چیزیں ہیں۔ اسی طرح احادیث کے اندر بھی ہیں، علماء نے احادیث کے آٹھ ابواب بتلائے ہیں اور آٹھوں قسم کی احادیث جس کتاب میں موجود ہوں؛ اس کو جامع کہتے ہیں جیسے بخاری شریف جامع ہے۔ خیر! مختلف موضوعات کی احادیث آتی ہیں تو ان احادیث میں اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے جو احکامات دیئے اور نبی کریم ﷺ نے جو چیزیں بتلائی ہیں وہ بہت پھیلی ہوئی ہیں اور اس زمانہ میں تربیت کا سلسلہ جاری تھا، اس لئے تدریجی طور پر شریعت کے احکام نازل ہوئے جیسا کہ شروع میں مَیں نے تفصیل سے بتلایا، اس وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ کبھی شروع میں ایک حکم دیا گیا اور بعد میں جب اس پر عمل کے نتیجہ میں لوگوں میں صلاحیت پیدا ہوگئی اور وہ اس قابل ہوگئے کہ اس کے بعد والا حکم قبول کریں تو پہلے والے حکم کو ختم کر کے دوسرا

حکم جاری کیا گیا؛ جس کو نسخ کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ بھی جاری تھا۔اسی لئے قرآن وحدیث کو براہِ راست پڑھ کر شریعت کے احکام کو الگ کرنا اور نکالنا؛ ہرکس وناکس کا کام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فقہاء کرام اور ائمہ عظام کو جزائے خیر دے کہ ان حضرات نے قرآن وحدیث کے تمام ذخائر پر غور وفکر کر کے اسلام کے احکام کو قانونی شکل میں الگ کر دیا۔

قانونی شکل کا مطلب یہ ہے کہ عملی طور پر متشکل کر دیا مثلاً نماز کے متعلق جو احکام قرآن میں دیئے گئے ہیں ان کو قرآنِ پاک کھول کر سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک آپ ڈھونڈنا چاہیں؛ تو آپ کو نہیں ملیں گے، وہاں تک ہرکس وناکس کی رسائی نہیں ہوسکتی، یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں ہے، پڑھے لکھے بھی اس میں مات کھا جائیں گے۔سب چیزیں مخلوط تھیں، ان حضراتِ فقہاءِ کرام نے ایسا کیا کہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے احکام کو الگ الگ جمع کیا، عبادات، معاملات میں خرید وفروخت، اجارہ، حوالہ وغیرہ چیزوں کے احکام اور معاشرت میں نکاح، طلاق وغیرہ کے احکام کو مفصل بیان کیا (حوالہ سے مراد ہمارے یہاں جو بولا جاتا ہے وہ نہیں ہے، بلکہ ایک کا دَین دوسرے کی طرف منتقل کرنا مراد ہے) یہ سارے احکامات کتابوں میں تفصیل سے لکھے ہوئے ہیں۔حضراتِ فقہاءِ کرام کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ انہوں نے آنے والی امت کے واسطے بہت آسانی کردی، ساری مشقت اور بوجھ انہوں نے اُٹھالیا۔

امت پر سب سے بڑا احسان کس کا ہے؟

نماز کی مثال لے لیجئے، نماز کیلئے پاکی ناپاکی، طہارت، وضو اور اس کے بعد فرائض، واجبات، ارکان، سنن، مستحبات وغیرہ کی لمبی چوڑی تفصیل کتابوں میں موجود ہے، اس کے بعد نماز کی پوری ترتیب، اس کو ادا کرنے کا پورا طریقہ جس کو ترتیبِ صلوٰۃ کہا جاتا

ہے اور پھر کونسی چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے اور کونسی چیزوں سے ایسا نقص آتا ہے جس کو سجدۂ سہو سے پورا کیا جا سکتا ہے، ان ساری تفصیلات کو الگ الگ کر کے بیان کیا ہے۔ آج ہمارے لئے کتنی آسانی ہوگئی کہ اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ کونسی چیز کا کیا حکم ہے؛ تو آسانی سے ہمیں مل جاتا ہے۔ یہی چیزیں ان حضرات نے قرآن و حدیث میں بڑی مشقت سے غور کر کے نکالی ہیں۔ جو حضراتِ علماء ہیں اور کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ پورے قرآن وحدیث کا ذخیرہ کھنگالنے کے بعد انہوں نے یہ چیزیں نکالی ہیں، یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ یہ ان کا ہم پر بڑا احسان ہے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سب سے بڑا احسان امت پر اگر کسی کا ہے تو وہ حضراتِ فقہاء کا ہے، ان حضرات نے دین کے تمام شعبوں کو منقح کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا، اب ہمیں عمل کرنے میں بڑی آسانی ہوگئی ہے، اگر کسی چیز کی خرید و فروخت کرنی ہے تو کتاب اٹھا کر دیکھ لو کہ کس طرح خرید وفروخت کرنی چاہئے، کیسے معاملہ کریں گے تو جائز ہوگا اور کونسی صورت میں ناجائز ہو جائے گا، یہی چیز انہوں نے قرآن وحدیث میں غور وفکر کر کے سمجھائی ہے۔

مثال سے تقلید کی ضرورت کا اثبات

آج کل جہاں اسلاف کے کارناموں پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس میں ایک بہت بڑا المیہ یہ بھی ہے کہ حضرات ائمۂ اربعہ (امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ) کو بھی نہیں چھوڑا جاتا، حالانکہ انہوں نے بڑی مشقت اٹھا کر احکام کو حدیث و قرآن سے واضح کیا ہے، ہر ایک کا اپنا اپنا طریقہ اور انداز تھا جس کو کچھ فرق کے ساتھ ترتیب دیا گیا، جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں، مَیں آپ کو ایک مثال سے سمجھاؤں۔

ہمارا ملکی قانون اور دستور پورا موجود ہے اور تمام اصول با قاعدہ ترتیب دیئے گئے ہیں دستور کی کسی دفعہ کی تشریح اور اس قانون کی وضاحت کرنے کا حق مجھے اور آپ کو نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے مستقل ایک جماعت ہے جس کو وکلاء کہا جاتا ہے اور ان کے اوپر جج ہوتے ہیں اور پھر ججوں کے بھی الگ الگ درجے ہوتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے کہ گجرات ہائی کورٹ کا ایک اہم ریفرنس آیا ہے، کوئی اہم اور خاص فیصلہ اور ججمنٹ آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ملک کے دستور میں یہ چیز ذرا مبہم تھی (مبہم کو گجراتی والوں نے (ચાાઁ ઘાચા) بنا دیا ہے) اور ہر مبہم چیز کی وضاحت کرنی پڑتی ہے، جب کورٹ کے اندر کوئی کیس جاتا ہے اور کیس چلتا ہے تو دونوں طرف سے دلائل چلتے ہیں اور دونوں کے دلائل سننے کے بعد جج اپنے فیصلے کے اندر ایک بات طے کرتا ہے، ایسے فیصلے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور آئندہ جا کر وہ بھی قانون کا ایک جزو بن جاتے ہیں، قانون کے ماہرین اس چیز کو سمجھیں گے، پھر آئندہ جب دوسرے کیس لڑے جاتے ہیں تو وکیل اسی فیصلہ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ فلاں سن میں فلاں ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا اور اس کا یہ مطلب بیان کیا تھا لہٰذا اب یہی مطلب ماننا پڑے گا۔

خیر! مَیں یہ سمجھا رہا تھا کہ انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے اندر جب اتنے مختلف پہلو اور مطلب نکل سکتے تھے اور ان میں سے کونسا مطلب قابلِ قبول اور کونسا مطلب قابلِ رد ہے، اس کا فیصلہ ہر آدمی کے ہاتھ میں نہیں دیا گیا، بلکہ اس کے لئے مخصوص ادارے قائم کئے گئے اور ان اداروں میں جو شخص تیار ہو، اسی کو یہ حق دیا گیا کہ وہ اس میں کوئی کلام کرے۔ اب وہاں مَیں اور آپ یہ نہیں کہتے کہ کیا ہم انسان نہیں؟ ہم یہاں کے شہری نہیں؟ کیا ہم پر یہ قانون اور دستور لاگو نہیں پڑتا؟ کیا ہمیں یہ حق نہیں ہے کہ ہم

اس کی تشریح کریں؟ وہاں کسی کی ہمت نہیں ہوتی، بڑے بڑے دانشور بھی وہاں خاموش رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی! یہاں تو جج صاحب ہی بول سکتے ہیں، سب بھیگی بلّی کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ اور جب قرآن وحدیث کی بات آتی ہے تو ہر ایک کی زبان کھل جاتی ہے، حالانکہ قرآن وحدیث سے مسائل کو نکالنے کے لئے کن کن علوم وفنون سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے وہ کتابوں میں تفصیل سے بتلایا گیا ہے، اس سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا؛ پھر بھی کہتے پھرتے ہیں کہ کیا ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس بارے میں کچھ کہیں؟

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ حضراتِ ائمہ کرام کا ہم سب پر بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں زندگی کے تمام مسائل کو الگ الگ کرکے بتلادیا، اگر صرف نماز ہی ہمارے حوالہ کی جاتی کہ اپنے طور پر سمجھ کر نماز پڑھو، تو پتہ نہیں ہم نماز کی کتنی مٹی پلید کرتے۔

تقلید کی حقیقت کیا ہے؟

اِس زمانہ میں چند لوگ آئے جو یہ کہتے ہیں کہ ائمہ کرام کی تقلید تو بڑا ظلم ہے۔ تقلید کی حقیقت کیا ہے؟ تقلید کا مطلب صرف اتنا ہی ہے جیسے جج کے فیصلہ کو بنیادی حیثیت دی جاتی ہے اور اس کی قانونی مہارت کی وجہ سے اس کو تسلیم جاتا ہے، وہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ تقلید ہے اسی طرح یہاں پر بھی ہم نے ان حضراتِ فقہاء کی مہارت پر اعتماد کیا۔

ایک شکل تو یہ تھی کہ قرآن وحدیث میں ہم براہِ راست غور کرتے اور نماز کا طریقہ نکالتے، اور اس کے مطابق نماز پڑھتے۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ جو حضرات اس کے ماہرین تھے اور پھر تقویٰ وطہارت، اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق کی مضبوطی میں آگے بڑھے ہوئے تھے، ایسے لوگ جن کو ہر چیز میں خوفِ خدا دامن گیر تھا، انہوں نے قرآن وحدیث

میں غور وفکر کر کے جس بات کو قانونی حیثیت دی، اب ہم ان پر اعتماد کریں۔ بس! اسی اعتماد کا نام تقلید ہے۔ اور اسی کو اِس زمانہ میں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ گناہ اور شرک ہے۔

غیر مقلدین بھی درحقیقت مقلد ہی ہیں

اور جو تقلید چھوڑنے کی بات کرتے ہیں ان لوگوں کے پاس ہے بھی کیا؟ جو تقلید کے معاملہ میں اعتراض کرتے ہیں ان کے پاس مسائل بھی گنے چنے ہیں، امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ رفعِ یدین کرنا چاہیے یا نہیں؟ ایسے چند مسائل ہیں جن کے اندر وہ لوگ ناواقفوں کو الجھاتے رہتے ہیں، انہیں لوگوں سے اگر خرید وفروخت کا کوئی مسئلہ پوچھ لو، تو ہدایہ اٹھا کر بتلائیں گے۔ یہ بات مَیں اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ انہی لوگوں کا اقرار ہے۔

حضرت علامہ ابراہیم صاحب بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ جو دار العلوم دیو بند کے صدر مدرس تھے، پہلے مسجد فتح پوری کے مدرسہ میں تھے، وہ فرماتے ہیں کہ کچھ غیر مقلدین سے ہم نے سوالات کیے تو انہوں نے اقرار کیا کہ ہم بھی ان مسائل میں ہدایہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، ہدایہ میں اگر کسی حدیث کا حوالہ دیا ہو تو پھر نصب الرایہ وغیرہ میں دیکھ کر لوگوں کو بتاتے ہیں کہ فلاں کتاب میں یوں لکھا ہے۔

فقہ اسلامی بڑی عظیم نعمت ہے

تو درحقیقت ان فقہاءِ کرام اور ائمۂ عظام کا بڑا احسان ہے، یہ تو ایک چیز ضمناً آ گئی تو سمجھدار لوگوں کے سامنے مَیں اسلیئے پیش کرتا ہوں تاکہ اس کی اہمیت کو سمجھیں کہ فقہ اسلامی بڑی عظیم نعمت ہے، اس فقہ اسلامی کی وجہ سے امت کا رشتہ ایک ڈور میں

بندھا ہوا تھا اور مضبوطی کے ساتھ اس پر عمل ہوتا تھا، مخالفین نے جب یہ چاہا کہ امت کو منتشر کیا جائے تو انتشار پیدا کرنے کے لئے انہوں نے جو مکائد اور تدابیر سوچیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ائمۂ عظام سے ان کو کاٹ دو، لہٰذا انہوں نے یوں کہنا شروع کیا کہ تم لوگ اللہ ورسول پر ایمان لائے ہو، یا امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ وغیرہ پر؟

احمقانہ سوال

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ آپ حنفی ہیں یا مسلمان؟ اولاً تو ان کا یہ سوال ہی غلط ہے، یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی یہ کہے کہ آپ ہندوستانی ہیں کہ گجراتی؟ اگر آپ سے یہ سوال کیا جائے تو آپ اس سوال کو کیا کہیں گے؟ یہ تو حماقت در حماقت ہے۔ گجراتی تو ہندوستانی کی ایک شاخ ہے۔ ہاں! یہ سوال ہوسکتا ہے کہ آپ گجراتی ہیں یا مہاراشٹرین؟ لیکن حنفی شافعی ہیں یا محمدی ومسلمان؟ یہ سوال ہی بے کار ہے۔ وہ لوگ ایسی بات کر کے عوام کو دھوکہ دیتے ہیں۔

بندر کو ادرک کی گرہ مل گئی

بات یہ چل رہی تھی کہ اسلامی فقہ میں حضراتِ فقہاء نے قرآن وحدیث میں جتنی قانونی چیزیں تھیں ان کو الگ الگ کر کے جمع کر دیا اور کتابی شکل میں مدون کر دیا اب ہمارے لئے بڑی آسانی ہوگئی کہ کسی بھی مسئلہ کا حکم معلوم کرنا ہو تو کتابوں کو کھول کر دیکھ لو، اسی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد کو بھی کتابوں میں الگ کر کے بتلایا ہے۔ اب مثلاً ہم فقہ حنفی پر عمل کرتے ہیں تو مدارس میں انہی مسائل کو پڑھایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن وحدیث میں غور وفکر کر کے مسائل کو وضاحت کے ساتھ پیش

کیا ہے، انہی پر اعتماد کرتے ہوئے ہم عمل کرتے ہیں۔

فقہ حنفی کی ایک مشہور کتاب ہے جس کا نام ''ہدایہ'' ہے، جو عالم بننے والوں کو پڑھائی جاتی ہے، اس کتاب کے بڑے ضخیم چار حصے ہیں، ان چار حصوں میں سے صرف ایک ہی حصہ میں عبادات کا ذکر ہے، باقی تین حصوں میں معاشرت معاملات اور حقوق العباد کی چیزیں بیان کی گئی ہیں۔ حدود حقوق اللہ میں آتی ہیں لیکن وہ تھوڑا سا حصہ ہے، لہٰذا یوں سمجھئے کہ دین کے مسائل میں سے پونا حصہ حقوق العباد سے تعلق رکھتا ہے اور پاؤ حصہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شریعت کے اندر حقوق العباد کی اتنی زیادہ اہمیت ہے کہ گویا پونا دین حقوق العباد ہے۔ اب ہم صرف عبادات کو پکڑ لیں اور اس پر عمل کر کے یوں سمجھیں کہ ہم سو فیصد مسلمان ہیں۔ پاؤ حصہ پر عمل کرتے ہیں، پونے حصہ پر عمل نہیں کرتے اور اپنے کو پورا مسلمان سمجھتے ہیں، یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے کسی بندر کو ادرک کی گرہ مل گئی تو وہ اپنے آپ کو پنساری سمجھنے لگا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بندوں کے حقوق سے تعلق رکھنے والے احکام کو بھی عملی جامہ پہنایا جائے۔

باب کا عنوان

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب حقوق العباد کے متعلق قائم کیا اور اس میں سب سے پہلے عورتوں کے حقوق بیان کرنا چاہتے ہیں، اس لئے باب کا عنوان قائم کیا ہے ''اَلْوَصِیَّةُ بِالنِّسَآءِ'' اور مَیں عرض کر چکا ہوں کہ بندوں کے حقوق میں سب سے زیادہ کوتاہی عورتوں کے سلسلہ میں کی جاتی ہے، عورتوں کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا، مثلاً ہمارے سماج میں بھی مردوں کے لئے بولتے ہیں کہ دو آدمی آئے۔ تو کیا عورت آدمی نہیں ہے؟ آدمی یہ آدم کی طرف نسبت ہے یعنی حضرت آدم کی اولاد۔ مرد ہو یا عورت؛ دونوں کو آدمی کہیں گے۔

لیکن ہمارے عرف میں بھی آدمی کا لفظ فقط مردوں کے لئے ہی بولتے ہیں، عورتوں کے لئے نہیں بولا جاتا، یہ بھی دراصل زمانۂ جاہلیت کی خوبو ہے جو آج تک چلی آرہی ہے کہ عورتوں کو انسانیت سے الگ چیز سمجھا جاتا تھا۔ آدمی بولنے والے گویا یہی سمجھتے ہیں۔

عورتوں کے حقوق میں بیداری اسلام کے بعد آئی

خیر! عورتوں کے حقوق میں سب سے زیادہ کوتاہی برتی جاتی تھی، اس لئے اسلام نے آکر عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا اور عورتوں کے وہ حقوق بتلائے جن کی وجہ سے ان کو ایک خاص مقام عطا ہوا۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اُس زمانہ میں عورتوں کو کیا سمجھا جاتا تھا مثلاً باپ نے دوسری بیوی سے شادی کی تو باپ کے انتقال کے بعد بیٹے جہاں باپ کی جائیداد، مال و دولت کے مالک بنتے تھے، وہیں باپ کی دوسری بیوی کے بھی مالک سمجھے جاتے تھے گویا وہ بھی باپ کی وراثت میں شامل سمجھی جاتی تھی ﴿لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا﴾ کی تفسیر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہی منقول ہے جو بخاری شریف کے اندر موجود ہے۔ (بخاری شریف، ۴۳۰۳)

ہمارے ہندوستان کے اندر بعض علاقوں میں آج بھی ایسے قبائل موجود ہیں۔ بھرواڑ قوم کے اندر بھی عورتوں کے معاملہ میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ مرنے والے کے مال و جائیداد کے ساتھ اس کی بیوی بھی میراث میں تقسیم ہوتی ہے، کیونکہ اس کو بھی پیسے خرچ کر کے لایا گیا ہے اور جتنی چیزیں پیسے خرچ کر کے آئی ہیں ان کو میراث میں شمار کرتے ہیں۔

مَیں یہ عرض کرر ہا تھا کہ اُس زمانہ میں عورت کو انسان کا مقام ہی نہیں دیا جاتا تھا اسلام نے آکر عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی۔ تمام مؤرخین اس بات کو لکھتے آئے ہیں خاص طور پر تاریخ کی بنیادی حکمتوں پر غور کرنے والے حضرات لکھتے ہیں کہ عورتوں

کے حقوق کے باب میں بیداری اسلام کے بعد آئی ہے، سب سے پہلے اسلام نے عورتوں کے حقوق کی طرف متوجہ کیا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ یوروپ اور برطانیہ والوں کے یہاں اٹھارہویں صدی تک عورت ایک مال سمجھی جاتی تھی، اور شوہر کو یہ اختیار رہتا تھا کہ وہ بیوی کو فروخت کرنا چاہے تو کردے، یہ تو اسلام کی برکت ہے کہ یوروپ کا علاقہ اس سے آشنا ہوا۔ اسپین کے اندر اسلامی قانون آیا اور اسی سے یوروپ کے اندر ترقیاں آئیں اور پھر دھیرے دھیرے ان میں بیداریاں آئیں۔

تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

اب جب عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بیداری آئی تو ایسے بیدار ہوئے کہ سب کی نیندیں خراب کرڈالی، حقوق کے نام پر حد سے آگے بڑھ گئے:- ؎

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

جیسا معاملہ ہوگیا ہے۔ ایک تو وہ حال تھا اور اب عورتوں کو آزادی دینے پر آئے تو ایسی آزادی دی کہ ان کی معاشرتی زندگی تباہ و برباد ہوگئی، ازدواجی اور معاشرتی زندگی کے نام پر وہاں کچھ ہے ہی نہیں۔ ہمارے یہاں جو خاندانی نظام ہے اور ماں باپ کے حقوق کا اہتمام ہے اور میاں بیوی کے آپس کے حقوق کا معاملہ ہے، اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر ہے، یوروپ وغیرہ میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ شوہر بھی کمانے کے واسطے جاتا ہے اور بیوی بھی جاتی ہے، اولاد کو "بچہ گھر" (Children home) کے حوالہ کردیا جاتا ہے، ماں باپ بوڑھے ہوں تو ان کو "بڈھا گھر" (Nursing home) کے حوالہ کردیا جاتا ہے۔

ابھی ایک دو ہفتہ پہلے گجرات متر (ગુજરાત મિત્ર) اخبار میں ایک خط پڑھا تھا جو امریکہ سے کسی صاحب نے لکھا تھا، وہ سورت کا رہنے والا تھا، اپنے زمانہ میں ٹی بی

کا بڑا مشہور ڈاکٹر تھا، اس نے اپنے بچوں کو بھی ڈاکٹر بنایا اور امریکہ بھیجا، پھر ان کے اصرار پر جب میاں بیوی وہاں گئے تو بچوں نے ان کے ساتھ ایسی ذلت و تحقیر کا معاملہ کیا کہ ان کا کوئی بھی سہارا نہ رہا۔

میانہ روی ہی اصل چیز ہے

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان کے یہاں آزادیاں ایسی آئیں کہ پورا معاشرتی نظام تباہ و برباد ہو گیا۔ اسلام ایک معتدل مذہب ہے، اور میانہ روی ہی اصل چیز ہے، کسی کے حق کے معاملہ میں اتنی زیادتی کرنا کہ دوسرے کی حق تلفی ہو، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ بھائی! آپ بخار کا ایسا علاج کریں کہ ایک دم ٹھنڈے ہو جائیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بخار کی آئی ہوئی گرمی کو دور ضرور کرنا چاہیے لیکن اتنی بھی ٹھنڈک پیدا نہیں کرنی ہے کہ آدمی پورا ہی ٹھنڈا ہو جائے، آدمی کی طبیعت میں گرمی اور ٹھنڈی اعتدال کے ساتھ ہونا مطلوب ہے۔

عورتوں کے حقوق کا بیجا شور

خیر! آج کل ان لوگوں نے عورتوں کے حقوق کے نام سے جو بیجا شور مچا رکھا ہے اور امریکن ایمبیسی (Embassy) والے بھی جو چاہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ تو مَیں اور آپ سب جانتے ہیں۔ درحقیقت مردوں کا طبقہ زمانۂ جاہلیت کے اندر بھی عورتوں کا استحصال کرتا رہا، جس کو گجراتی میں (NttuMtKt) کہتے ہیں، اور اب اس دورِ ترقی میں بھی یہی کر رہا ہے۔ اور پھر مساوات کا نعرہ لگاتے ہیں کہ مرد جو کام کر سکتا ہے وہ عورت کیوں نہیں کر سکتی، اس لئے جو کام بھی کریں دونوں مل کر کریں۔ مَیں کہا کرتا ہوں کہ

ایسا ہی ہے تو پھر بچے جنوانے کا کام صرف عورت سے ہی کیوں لیا جاتا ہے؟ مردوں کو بھی اس میں شریک کرو۔ لیکن دراصل یہ قدرت کی بنی ہوئی ایسی چیز ہے، اس میں وہ لوگ کچھ بھی نہیں کر سکتے، یہ فطری نظام ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے اور اسی کے نتیجہ میں گھریلو ذمہ داریاں بھی آتی ہیں اب گھریلو ذمہ داریوں میں ان لوگوں نے چکر ڈال دیا، لیکن اِس میں وہ کیا کر سکتے ہیں؟ لامحالہ بچے تو عورت ہی کو جننے ہیں اور اس کی وجہ سے دوسری دشواریاں پیش آتی ہیں، اس وقت مَیں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

وقت بہت ہو چکا ہے اس لئے بقیہ مضمون ان شاءاللہ آئندہ مجلس میں بیان کروں گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارو

جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا ہے کہ عورتوں کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے کیا کیا تاکیدیں فرمائی ہیں۔ پہلے اللہ تعالیٰ کا ایک ارشاد پیش کیا ہے ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ یہ سورۂ نسآء کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ اور حسنِ اخلاق کے ساتھ زندگی گزارو۔ جیسا کہ پہلے بتلا چکا ہوں کہ چونکہ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کے حقوق کے معاملہ میں بہت زیادہ بے پروائی برتی جاتی تھی اس لئے اسلام نے اس سلسلہ میں خاص تاکید فرمائی ہے۔ گویا عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور حسنِ معاشرت یعنی اچھے طریقہ سے زندگی گزارنے کی اللہ تبارک وتعالیٰ نے خاص تاکید فرمائی بلکہ حکم دیا۔ ﴿عَاشِرُوْا﴾ امر کا صیغہ ہے جس کے ذریعہ حکم دیا جاتا ہے۔ معاشرت کا معنٰی دو افراد کا ایک ساتھ رہ کر زندگی گزارنا، چونکہ شوہر اور بیوی ایک ساتھ مل کر زندگی گزارتے ہیں، اس لئے حدیثِ پاک میں شوہر کو ﴿عَشِیْرٌ﴾ کہا گیا یعنی وہ آدمی جس کے ساتھ زندگی گزاری جائے، اسی کو گجراتی میں (BJtltmtt:te) اور اردو میں ''رفیقِ حیات'' کہتے ہیں۔

خیر! حسنِ معاشرت کی اللہ تعالیٰ نے خاص تاکید فرمائی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنے ارشادات میں اس موضوع پر خصوصیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی سفارش

یہاں ایک چیز خاص طور پر غور طلب ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے

متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تاکید فرمائی گئی ہے۔حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب دامت برکاتہم ایک مثال سے اس بات کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کسی کا نکاح کسی لڑکی کے ساتھ ہوا اور جب رخصتی کا وقت آیا اور وہ لڑکی اس کے گھر آئی تو اس علاقہ کا کلکٹر، یا انسپکٹر یا آئی جی پی کہنے لگا کہ دیکھو! یہ ہمارے دوست کی لڑکی ہے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرنا، جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لڑکی جو ہمارے گھر میں دولہن بن کر آئی ہے، اس کا باپ آئی جی پی، یا ڈی ایس پی کا دوست ہے، تو یہ سن کر دولہے صاحب کا پسینہ چھوٹ جائے گا، جب وہ لڑکی رخصت ہوکر اس کے گھر میں آجائے گی اور کبھی کوئی معاملہ ہوگا تو وہ ہمیشہ ڈرتا رہے گا، اس کے دل ودماغ اور تصور میں یہی رہے گا کہ فلاں نے اس کی طرفداری کی تھی، ڈی ایس پی کا چہرہ ہی ہر وقت اس کے سامنے گھومتا رہے گا کہ اگر اس کے ساتھ کہیں کوئی ناروا سلوک ہوگیا اور وہاں اطلاع مل گئی تو ہمارا حلیہ بگڑ جائے گا اور جواب دہی مشکل ہوجائے گی۔

تو دیکھئے! دنیا کی حکومت کے ایک کارندے کی طرف سے اگر کسی لڑکی کی سفارش آپ تک پہنچ گئی تو آپ کو اس کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کا سلوک کرنا پڑتا ہے، اس کے ساتھ شفقت اور ہمدردی والا رویہ اپنانا پڑتا ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر تاکید کی جائے کہ یہ ہماری بندیاں ہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیجیو، اور بھلائی کے ساتھ زندگی گزاریو؛ تو ایک مؤمن کو مؤمن ہونے کے ناتے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی تاکید پر کیسی توجہ دینی چاہیے؟ یہ سوچنے کی چیز ہے۔اور جب ایک فوجدار کا اتنا ڈر لگا ہوا ہے کہ اگر اس کی سفارش کی طرف توجہ نہیں کی گئی تو اس کا انجام کیا ہوگا؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تاکید کی گئی ہے اگر اس کا خیال نہیں رکھا گیا تو اس کا انجام بھی سوچنا چاہیے۔

پھر سے علوم کا سلسلہ شروع ہوگیا

حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے یہاں پورا نظام الاوقات بنا ہوا تھا، اسی کے مطابق سارے کام ہوتے تھے، صبح کو تفریح کے لئے تشریف لے جاتے تھے، وہاں سے واپسی کے بعد بیان القرآن کی تالیف کا کام فرماتے تھے۔ ایک روز ایسا ہوا کہ حضرت کی اہلیہ محترمہ کو کسی جگہ جانا تھا اور انہوں نے گھر میں کچھ مرغیاں پال رکھی تھیں، جاتے ہوئے انہوں نے حضرت سے کہہ دیا کہ فلاں وقت مرغیوں کو کھول دینا اور دانہ پانی دیدینا۔ چنانچہ فجر کے بعد حضرت تو اپنے معمول کے مطابق چلے گئے اور عادت نہیں تھی اس لئے یاد بھی نہیں رہا، تفریح کے دوران قرآنِ پاک کی تلاوت کا بھی معمول تھا، وہاں سے آنے کے بعد دارالتصنیف میں بیان القرآن کی تالیف کے لئے تشریف لے گئے، حضرت فرماتے ہیں کہ جب مَیں لکھنے کے لئے بیٹھا تو کوئی بھی چیز ذہن میں نہیں آرہی تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھوں، دیر تک سوچتا رہا لیکن ایک لفظ بھی نہیں لکھ پایا پھر مَیں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ میرے کس گناہ کی وجہ سے اس وقت مَیں کچھ نہیں لکھ پارہا ہوں؛ تاکہ مَیں اپنے اس گناہ سے توبہ کروں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل میں ڈالا گیا کہ ہماری ایک مخلوق مرغیاں ڈربے میں بند پڑی ہیں، ابھی تک ان کو دانہ پانی نہیں ملا ہے؛ پھر تم پر علوم کی بارش کیسے ہو؟ حضرت فوراً اُٹھے، جاکر ان مرغیوں کو نکالا، دانہ دیا، ان کے پاس پانی رکھا، اس سلسلہ میں جو کوتاہی ہوئی اس سے توبہ کی، پھر دارالتصنیف میں جاکر بیٹھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ بیٹھتے ہی علوم کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ایسے گھرانے پر کیسے اتریں؟

تو دیکھئے! یہاں حضرت سے قصداً ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ نادانستہ طور پر بھول سے ایک ایسی مخلوق جو انسان نہیں ہے اس کے ساتھ اس کے حق کی ادائیگی میں غفلت ہوئی، اس کا نتیجہ ایک شیخِ وقت اور اپنے وقت کے سید العلماء کے ساتھ یہ ہوا کہ علوم کا فیضان جو باری تعالیٰ کی طرف سے ان کے قلب پر ہوتا تھا وہ منقطع ہوگیا۔ اب اگر اشرف المخلوقات کے ساتھ اور اس میں بھی کمزور صنف عورت کے ساتھ جو بے چاری بہت کچھ قربانی دے کر تمہارے گھر آئی ہوئی ہے، اس کے ساتھ کسی گھر میں زیادتی ہو اور وہ بھی نادانستہ نہیں، بلکہ دانستہ اور قصداً؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ایسے گھرانے پر کیسے اتریں؟ اس کے بعد بھی اگر لوگ اس بات کی توقع اور امید رکھیں کہ ہمارے کام بنیں؛ تو یہ محال ہے۔

کام کیوں بگڑتے ہیں؟

بہت سی مرتبہ گھرانے والوں کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے ساتھ قدرت کی طرف سے یہ جو معاملہ ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ روٹھے ہوئے ہیں اور ہمارے کام بگڑ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل وکرم کا معاملہ نہیں ہو رہا ہے؛ اس کی وجہ کیا ہے؟ اس طرف دھیان ہی نہیں جاتا اور اس کو اپنا قصور سمجھا ہی نہیں ہے، اس کو قابلِ اعتناء، قابلِ اہتمام اور قابلِ توجہ چیز سمجھا ہی نہیں ہے کہ اس کی طرف دھیان جائے۔ ہر وقت پریشان رہتے ہیں اور پھر مزید نحوست یہ آتی ہے کہ دوسروں پر بدگمانیاں کرتے ہیں کہ کسی نے کچھ کرادیا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مزید عذاب ہے کہ دوسری پگڈنڈی پر چل پڑتا ہے، اب معلوم نہیں کہاں پہنچے گا، اصل بیماری کی طرف توجہ کرے تو اس کا علاج بھی ہو، اور صحیح علاج ہو تو پھر شفا بھی ہو۔

ہماری نگاہ محدود ہے

خیر! یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر تاکید کی گئی ہے ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰىٓ اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا﴾ یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا ٹکڑا ہی پیش کیا ہے لیکن میں نے اس کے آگے کا دوسرا ٹکڑا بھی اس لئے پڑھا کہ آگے جو روایتیں آرہی ہیں ان میں اس سے روشنی ملے گی۔ اگر تم شادی کر کے کسی عورت کو لے آئے اب تم ان کو ناپسند سمجھتے ہو، وہ تمہیں اچھی نہیں لگتی؛ تو ان کے ساتھ ناروا اور غلط سلوک کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرتے ہو اور نتیجہ کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھی ہے۔ ہم تو ناقص ہیں، اس دیوار کے پیچھے کیا ہے یہ بھی ہمیں معلوم نہیں ہے، بلکہ اگر دیوار ہٹا دی جائے اور سامنے افق تک کھول دیا جائے، تب بھی ہماری نگاہ محدود ہے، ہماری آنکھوں کا یہ حال ہے کہ کھلا ہوا ہونے کے باوجود ایک حد سے آگے نہیں دیکھ سکے گی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں خاص طور پر تنبیہ فرما دی۔

قرآن کا انداز اصولی ہے لیکن......

بہرحال! قرآنِ پاک میں میاں بیوی کے تعلقات کے متعلق بڑی تفصیلات ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ نماز جیسی اہم عبادت کے متعلق قرآنِ پاک میں تقریباً تہتر (۷۳) جگہ پر حکم دیا گیا ہے، لیکن بس اجمالی طور پر فرما دیا کہ نماز قائم کرو اور جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں ان کا یہ مقام ہے، لیکن نماز کے متعلق تفصیلات نہیں ہیں کہ مثلاً کتنے

وقت کی نماز پڑھیں اور فجر ظہر عصر وغیرہ کی کتنی رکعتیں ہیں، نماز میں کتنے فرض ہیں، کن چیزوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے نماز کا طریقہ کیا ہے وغیرہ وغیرہ؛ ایسی کوئی تفصیل قرآنِ پاک کے اندر موجود نہیں ہے، نبی کریم ﷺ نے اپنے افعال کے ذریعہ اس کی تفصیل بتلائی ہے، حدیثِ پاک میں آتا ہے ﴿صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي﴾ جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھو، اسی طرح تم بھی نماز پڑھو (سنن کبریٰ، ۴۰۲۲) حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات سے اور اپنے عمل سے نماز کی تفصیلات بتلائی ہیں۔ تو نماز جیسی اہم عبادت کے بھی جزئیات یعنی چھوٹے چھوٹے مسائل قرآنِ پاک میں نہیں بتلائے، اس لئے کہ قرآن کا انداز تو اصولی ہے، وہ تو بنیادی چیزیں بتلاتا ہے اور اس کی طرف متوجہ کردیتا ہے۔ یہی حال زکوٰۃ کا ہے۔ زکوٰۃ کس پر واجب ہے، کتنا نصاب ہونا چاہیے، کتنی مقدار میں زکوٰۃ نکالنی چاہیے، کون کون سے مال میں زکوٰۃ لی جائے گی، کب دی جائے، ایسی کوئی تفصیل نہیں ہے۔ گویا ان سب چیزوں کے متعلق قرآنِ پاک اصولی ہدایتیں دیتا ہے۔ لیکن سوچنے کی چیز یہ ہے کہ میاں بیوی کے مسائل کے متعلق قرآنِ پاک میں چھوٹی چھوٹی باتوں کو بھی بیان کیا گیا ہے، میاں بیوی کے تعلقات سے مختلف جزئیات قرآنِ پاک میں موجود ہیں مثلاً اگر دونوں میں ناگواری پیدا ہوجائے تو کیا کرنا چاہیے، بیوی ناپسند ہے تو کیا سلوک کرو، اگر عورتوں کی طرف سے نافرمانی ہو تو کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے ﴿وَالّٰتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوهُنَّ﴾ یہ پورا مضمون قرآنِ پاک میں موجود ہے۔ اور بھی بہت ساری تفصیلات ہیں جو علماء جانتے ہیں۔

گھر جنت یا جہنم

میاں بیوی سے متعلق فروعی مسائل کو قرآنِ پاک میں کیوں ذکر کیا گیا ہے؟ اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات اگر ٹھیک ، درست اور استوار ہیں تو پورا معاشرہ، پوری سوسائٹی اور پورے سماج کی بنیاد اس پر قائم ہے، میاں اگر بیوی کے حقوق ادا کر رہے ہیں، بیوی اگر میاں کا حق ادا کر رہی ہے تو گھر جنت کا نمونہ ہے، بچے بھی ماں باپ کی محبت پائیں گے، تعلقات کی استواری کی وجہ سے دونوں میں سے ہر ایک اپنے فرائضِ منصبی اور ذمہ داری ادا کرے گا، بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف توجہ کی جائے گی۔ اگر تعلقات ٹھیک ہیں تو یہ سب کچھ ہوگا۔

اور اگر میاں بیوی کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں، جہاں شوہر گھر میں آیا کہ لڑائی شروع ہوئی ، نہ سلام نہ کلام، جتنی دیر میاں گھر میں ہے جھگڑا ہو رہا ہے، نہ شوہر بیوی کے حقوق ادا کر رہا ہے، اور نہ بیوی شوہر کے حقوق ادا کرتی ہے؛ تو ان سے جو اولاد ہوگی آپ اندازہ لگائیے کہ ان پر کیا گزرے گی اور وہ کیا تأثر لیں گے؟ چھوٹے چھوٹے بچوں کی نفسیات پر کیا اثر ہوگا؟ بچے جن کی گود میں پل رہے ہیں وہ اپنے بڑوں کو لڑتے ہوئے اور ایک دوسرے کو گالی دیتے ہوئے اور ایک دوسرے پر حملہ کرتے ہوئے، ایک دوسرے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے اور ایک دوسرے کی تذلیل وتحقیر کرتے ہوئے دیکھیں گے؛ تو ان بچوں پر کیا اثر پڑے گا؟ نہ وہ باپ کی شفقت پا سکتے ہیں اور نہ ماں کی محبت ان کو ملے گی، روزانہ کی اس جھک جھک میں وہ بڑے ہوں گے، نہ ان کی تعلیم کی طرف کسی کی توجہ ہے، اور نہ تربیت کی طرف۔ جب یہی بچے بڑے ہوں گے تو چونکہ انہیں کے ذریعہ سماج تشکیل پا رہا ہے اور انہیں سے سوسائٹی بنتی ہے، معاشرہ انہیں سے قائم ہوتا ہے، جب معاشرہ میں ایسے ہی بچے

جمع ہوں گے؛ تو پھر کیا ہوگا؟ سارا معاشرہ جہنم کدہ بن جائے گا۔

مغربی معاشرہ کا بڑا المیہ

آج یوروپ اور امریکہ کا المیہ اور سب سے بڑا پروبلم یہی ہے۔ وہاں معاشرتی اور گھریلو زندگی نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ ماں بھی صبح سویرے گھر سے کمانے کے واسطے نکلتی ہے، اگر اپنی گاڑی ہے تو خود ہی ڈرائیو کرتے ہوئے اور اگر اپنی گاڑی نہیں ہے تو سواری بدلتے ہوئے ملازمت پر آفس پہنچتی ہے۔ گویا روزانہ دو گھنٹے اپنے دفتر پہنچنے میں اور واپسی میں دو گھنٹے لگتے ہیں، کل چار گھنٹے اسی میں نکلتے ہیں، اور ملازمت کا چھ یا آٹھ گھنٹے کا جو وقت ہوتا ہے وہ الگ رہا، گویا دس یا بارہ گھنٹے ماں کے اس طرح گزرتے ہیں، اور یہاں بچوں کو ''بچہ گھر'' (Children Home) میں رکھ دیا جاتا ہے، وہاں کی ماہانہ ایک، ڈیڑھ ہزار ڈالر فیس ہوتی ہے، وہ ادا کر دیجئے اور بچے کو ان کے حوالہ کر دیجئے۔ وہاں جو عورتیں تنخواہ لے کر کام کاج کریں گی، وہ ماں کی شفقت کہاں دیں گی؟ محبت اور توجہ سے تربیت تھوڑے ہی کریں گی، اس طرح بچے اپنے ماں باپ کی شفقت و محبت سے محروم رہتے ہیں۔

اراکین دارالامراء کا رپورٹ

حضرت مولانا عبداللہ صاحب کاپودروی دامت برکاتہم نے بتلایا کہ انگلینڈ میں ابھی تازہ شمارہ میں انہوں نے پڑھا کہ وہاں کی دارالامراء (راجیہ سبھا) کے کچھ اراکین کی ایک کمیٹی وہاں کی معاشرت کا جائزہ لینے کے لئے بنی تھی، انہوں نے جو رپورٹ پیش کی اس میں انہوں نے سفارش کی ہے کہ ہمارے یہاں یہ قانون لازمی طور پر پاس کیا جائے

کہ ماں ہفتہ میں کم سے کم چار دن گھر میں رہے، وہ اگر گھر میں رہے گی تو بچوں کو محبت ملے گی اوران کی تعلیم وتربیت میں کچھ حصہ ملے گا؛ ورنہ پھر ہمارے معاشرہ میں آئندہ اور زیادہ بگاڑ آئے گا جس کا بہت بڑا خطرہ ہے۔

ان کے پاس کوئی حل نہیں ہے

ایک صاحب جو ہمارے محبت والے ہیں انہوں نے کل ہی بتلایا کہ امریکہ میں اس وقت بہت غور وفکر کرنے کے بعد یہ طے ہوا کہ چونکہ بیوی بھی کمارہی ہے اور شوہر بھی اپنا کمارہا ہے، اس لئے دونوں اپنا اپنا گھر بنائیں، بیوی اپنے گھر میں رہے اور شوہر اپنے گھر میں رہے، آٹھ دن شوہر بیوی کے گھر جا کر رہے اور دوسرے آٹھ دن بیوی شوہر کے گھر جا کر رہے۔ ایسی تدبیریں چلتی رہتی ہیں، لیکن معاشرت کو درست کرنے کا کوئی حل ان کے پاس نہیں ہے، اور کوئی حل کبھی ملنے والا بھی نہیں ہے۔

وہ باریک بیں اور باخبر ہے

خالقِ کائنات جس نے سب کو پیدا کیا وہی سب سے زیادہ واقف ہے ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ جو پیدا کرنے والا ہے وہ سب کچھ جانتا ہے۔ مثلاً آپ نے کوئی چیز بنائی، اس میں کیا خوبی اور کمال ہے اور کیا کمی اور کمزوری ہے، اس کو آپ بخوبی جانتے ہیں جب بنانے والا ہی جانتا ہے تو وہی اس کا علاج بھی کرے گا اور وہی اس کا صحیح طریقہ استعمال بھی بتلائے گا، اگر اس کے مطابق آپ نے اس چیز کو استعمال کیا تب تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر گڑبڑ شروع ہو جائے گی۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، انسان کی دو صنف ہیں، مرد اور عورت، دونوں کو پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور دونوں

میں کیا خوبیاں اور کیا نقائص ہیں کس میں کیا کمال ہے اور کس کی کیا کمزوری ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں، اسی کے مطابق اس نے احکامات دیئے ہیں ﴿وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ یہاں اللہ تعالیٰ کی جو صفت بیان فرمائی ہے اس کو سوچ کر وجد آجاتا ہے۔ فرمایا کہ وہ باریک بیں اور باخبر ہے۔ انسانی مشین میں کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور اسی کے مطابق اس نے حکم دیا ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق چلو گے تب تو سب کچھ برابر رہے گا؛ ورنہ پھر گڑبڑ شروع ہو جائے گی۔

بہر حال! اسلام نے جو طریقۂ زندگی پیش کیا ہے اور معاشرت کا جو انداز انسانیت کو بتلایا ہے؛ وہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اگر اس کے مطابق معاشرت ہوگی، تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ پھر تکالیف پیش آئیں گی۔

تعددِ ازواج پر اعتراض کیوں؟......

دوسری آیت میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ، وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً﴾ اگر کسی آدمی نے ایک سے زیادہ بیویاں کی ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ان کے حقوق میں برابری ضروری ہے۔ درمیان میں ایک بات یاد آئی تو مناسب سمجھتا ہوں کہ اس کو پیش کر دوں۔

دیکھئے! اسلام نے چار بیویاں کرنے کی اجازت دی ہے، اسلام کا یہ حکم بھی آج کل لوگوں کے لئے اعتراض کی چیز بن گئی ہے کہ اسلام میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت ہے۔ حالانکہ تنور کیس اور مدگل کیس وغیرہ جو سپریم کورٹ میں چلے اور مسلم پرسنل لاء کا معاملہ زیرِ غور آیا تو اس میں ان کو تسلیم کرنا پڑا کہ یہ ایک فطری حکم ہے، اس لئے کہ

اگر دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور پہلے سے جو بیوی ہے اس کو چھوڑنے کی بھی اجازت نہیں دی گئی؛ تو پھر شوہر اس کو تنور میں نہیں جھونکے گا تو اور کیا کرے گا؟

اور اسلام معاشرہ میں زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ بتلاتا ہے۔ بعض مرتبہ ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں کہ دوسری بیوی کی ضرورت پیش آتی ہے مثلاً عورت ایسی بیماری میں مبتلا ہوگئی کہ اب وہ مرد کے لئے فائدہ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تو اب شوہر کیا اس عورت کو چھوڑ دے؟ اس کو ایسے حالات میں چھوڑ دینے کو بھی شرافت گوارا نہیں کرتی، لہٰذا اس کو رہنے دو، لیکن مرد کی ضرورت کا اب کیا کیا جائے؟ تو شریعتِ مطہرہ نے اس کے لئے دوسرا نکاح کرنے کی اجازت دی ہے۔

یہ کہاں کا انصاف ہے؟

لیکن ان کے یہاں تو کسی بھی حیثیت سے دوسرے نکاح کی اجازت ہی نہیں ہے ہاں! ان کے یہاں ایک شکل ہے کہ کسی عورت کے ساتھ friendship قائم کرلیجئے یعنی دوستی کا معاہدہ کرلیجئے، لیکن اس عورت کو بیوی ہونے کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ وہ عورت اس مرد کے ساتھ زندگی گزارے گی اور یہ مرد اس سے فائدہ بھی اٹھائے گا، اور اگر اس سے بچے پیدا ہوں گے تو ان بچوں کو وراثت بھی ملے گی، لیکن اگر یہ مرد مرجائے گا تو اس عورت کو وراثت میں حصہ نہیں ملے گا۔ اب غور کیجئے کہ یہ کونسے انصاف کی بات ہے۔ یہ عورت بھی آخر اس مرد کو راحت پہنچارہی ہے، ایک عورت کی طرف سے مرد کو جو ضرورتیں ہوتی ہیں وہ تمام یہ مہیا کررہی ہے، اس سے پیدا ہونے والی اولاد بھی اس کی شمار ہوتی ہے، پھر ان کو سگی اولاد کی طرح وراثت میں حصہ بھی مل رہا ہے؛ تو پھر آخر اس عورت کو کیوں حصہ نہ ملے؟ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام قوانین کا یہی حال ہوتا ہے، حالانکہ اسلام کے

قوانین پر اعتراضات کرتے ہیں لیکن ان کے پاس جو مشکلات ہیں ان کا کوئی بھی حل ان کے پاس ہے ہی نہیں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ علیہ) نے احمد آباد میں مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اجلاس میں کسی فرانسیسی عورت کا نام لیا تھا جس نے عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بہت کچھ مطالعہ، تحقیق اور اسٹڈی کی تھی، اس عورت نے کہا کہ یہ فطرت کا تقاضہ ہے اور اس میں عورتوں کا بھی فائدہ ہے کہ مرد کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت قانونی طور پر دی جائے۔ اور بھی بہت تفصیل فرمائی تھی، یہ ساری چیزیں تسلیم کرنے کے باوجود بھی اسلامی قوانین پر اعتراض ہے، تو اب کسی کو کیا کہا جائے۔

ایک مغالطہ اور اس کا ازالہ

بہر حال! اسلام میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ انصاف سے کام لو، عدل و مساوات اور سب کے ساتھ برابری ہونی چاہیے اب برابری کا جو حکم دیا ہے اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھنے کی جو تاکید کی گئی ہے، اسی سلسلہ میں ایک بات کی طرف قرآنِ پاک نے اشارہ کر دیا چونکہ وہ بھی انصاف و برابری کے ذیل ہی میں آتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر تم چاہو تب بھی پورے طور پر عورتوں کے درمیان انصاف اور برابری نہیں کر سکتے۔ اس آیت سے بعض نادان جو اپنے آپ کو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت زیادہ اسٹڈی کرنے والے ہیں، انہوں نے ایک اور بات نکالی کہ دیکھو! قرآن میں یوں ہے کہ تم چاہو تب بھی عورتوں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتے، اور ایک سے زیادہ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ انصاف کرو اور چونکہ انصاف کر ہی نہیں سکتے لہٰذا ایک سے زیادہ بیویاں کرنا جائز نہیں ہے۔

انہوں نے توڑ پھوڑ کر یہ مطلب نکال لیا، لیکن قرآنِ کریم جو بات صاف کہہ رہا ہے وہ ان کو نظر نہیں آتی، قرآن ہی میں یہ آیت بھی ہے ﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ یہ آیت ان کو نظر نہیں آئی۔

حالانکہ اُس آیت کا مطلب کیا ہے وہ مَیں عرض کرتا ہوں کہ شوہر بحیثیت شوہر کے عورت کو جو کچھ دیتا ہے اور اس کے جو حقوق ادا کرتا ہے، وہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ ہیں جن میں طبعی اور فطری طور پر شوہر انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے مثلاً نان نفقہ کسوہ سکنٰی جس کو ہم اردو میں کھانا پینا، کپڑا لتہ، رہائش کا انتظام، تحفہ اور ہدیہ دینا وغیرہ وغیرہ کہتے ہیں، ان تمام چیزوں میں برابری ہوسکتی ہے، اس میں کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔ جیسا گھر ایک کو دیا، دوسری کو بھی ویسا ہی دے سکتے ہیں۔ جیسا فلیٹ ایک کو بنا کر دیا؛ ویسا ہی دوسری کو بھی بنا کر دیجئے۔ جو فرنیچر ایک کو دیا؛ دوسری کو بھی دو۔ ایک ہی انٹیریر کو آرڈر دو کہ ایک ہی طرح کا فرنیچر (Same to Same) دونوں فلیٹوں میں لگا دیجیو۔ یہ سب ہوسکتا ہے۔ اسی طرح کپڑوں میں بھی ہوسکتا ہے کہ ایک جیسے دونوں کے لئے سلوا دیئے، یا برابر رقم دونوں کو دیدی کہ اپنی اپنی پسند سے بنا لینا۔ یہ اور اس جیسی چیزیں تو وہ ہیں جن میں کوئی آدمی اگر برابری کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، اور اگر نہ کرنا چاہے تو پھر دوسری بات ہے۔

محبت تو غیر اختیاری چیز ہے

اور بعض چیزیں ایسی ہیں جو آدمی کے اختیار کے ساتھ تعلق نہیں رکھتیں، بلکہ اس کی طبیعت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، مثلاً کسی کے ساتھ محبت کا زیادہ ہونا اور کسی کے ساتھ کم ہونا، کوئی آدمی چاہے کہ دونوں کے ساتھ محبت برابر رکھے؛ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔

اس لئے کہ محبت تو غیر اختیاری چیز ہے، دل کا کسی کی طرف مائل ہونا اختیار کی چیز نہیں ہے۔ اور محبت کی کمی بیشی جن بنیادوں پر ہوا کرتی ہے وہ بنیادیں بھی ہمارے اختیار میں نہیں ہیں۔ کسی کی خوبی کی وجہ سے، کسی کے حسن کی وجہ سے، کسی کے کمال کی وجہ سے، کسی کے اچھے اخلاق کی وجہ سے محبت زیادہ ہوتی ہے۔ کسی میں کوئی کمال ہوتا ہے اور کسی میں کوئی دوسری خوبی ہوتی ہے۔ جس طرح سب کے چہرے یکساں نہیں؛ اسی طرح سب کے اوصاف بھی یکساں نہیں۔ سب کی خوبیاں ایک طرح کی نہیں۔ ہر ایک کی عادتیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے کسی کے ساتھ محبت زیادہ ہوتی ہے، اور کسی کے ساتھ کم ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کے اختیار کو دخل ہی نہیں۔ وہ اگر چاہے تب بھی برابری نہیں کرسکتا۔ یہ سیدھی سادی بات ہے۔

اسی طرح صحبت کرنے کا معاملہ آتا ہے، تو صحبت کا تعلق بھی آدمی کی طبیعت کے نشاط سے ہے، گزشتہ کل جس کی باری تھی اس وقت طبیعت میں نشاط تھا اور آپ کو بھی ضرورت محسوس ہوئی تو اس کے ساتھ صحبت کی۔ اب ضروری تو نہیں ہے کہ دوسرے روز دوسری کی باری کے وقت بھی طبیعت کے اندر نشاط ہو، اگر ضرورت محسوس نہیں ہوتی تو آج کل جو گولی ویا گرا ([illegible]) نکلی ہے، وہ لینا ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ تو طبیعت کی آمادگی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ (اس جملے سے حاضرینِ مجلس بہت محظوظ ہوئے)

اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے......

بہر حال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھنے والی بعض چیزیں تو وہ ہیں جن کے اوپر آدمی کا بس نہیں چلتا اور وہ آدمی کے اختیار میں بھی نہیں ہیں۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ ازواجِ مطہرات کے حقوق کی ادائیگی

میں برابری کرنے کے ساتھ ساتھ دعا بھی فرماتے تھے ﴿أَللّٰھُمَّ ھٰذَاقَسْمِیْ فِیْمَا أَمْلِکُ، فَلا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تمْلِکُ وَلاأَمْلِکُ﴾ اے اللہ! یہ میری تقسیم ہے ان چیزوں میں جو میرے اختیار میں ہیں اور جن کا مَیں مالک ہوں یعنی جن میں مَیں برابری کرسکتا ہوں، پس تو میری پکڑ نہ کیجیو ان چیزوں میں جن کا تو مالک ہے (یعنی محبت) اور وہ میرے اختیار میں نہیں ہے (ابوداود شریف، ٢١٣٦)

اسی بات کو اس آیت کے اندر بیان کیا گیا ہے ﴿وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا أَنْ تَعْدِلُوْا بَیْنَ النِّسَآءِ وَلَوْحَرَصْتُمْ﴾ اور عورتوں کے درمیان ہرگز تم پورا پورا انصاف نہیں کرسکو گے اگرچہ تم خود چاہو جیسا کہ ابھی مَیں نے تفصیل سے ذکر کیا کہ تم چاہو تب بھی ان چیزوں میں برابری نہیں کرسکو گے، اس لئے کہ وہ غیر اختیاری چیزیں ہیں۔آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿فَلاتَمِیْلُوْا کُلَّ الْمَیْلِ فَتَذَرُوْھَا کَالْمُعَلَّقَةِ﴾ اس لئے ایسا نہ کیجیو کہ ایک ہی طرف پورے پورے جھک جاؤ یعنی ایک کی محبت کے نتیجہ میں سب کچھ اسی کے حصے میں آرہا ہے، اور دوسری بے چاری کا معاملہ بالکل معلق کرر کھا ہے، اگر میلان ومحبت میں انصاف نہ ہوسکے تو کوئی بات نہیں، لیکن کھانے پینے، کپڑے، نفقہ میں اور دوسری چیزوں میں تو انصاف کرو۔

جیسا گناہ؛ ویسی سزا

آخرت میں جو سزائیں ہیں ان میں گناہ کی نوعیت کو مدِ نظر رکھا جائے گا، جیسا گناہ ہوگا ویسی ہی سزا ہوگی۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اگر کسی آدمی کی دو بیویاں ہوں گی اور ان میں سے ایک کی طرف جھک گیا اور دوسرے کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، تو قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کا آدھا دھڑ (بدن کا آدھا حصہ) لقوہ

(فالج) شدہ ہوگا (ابوداود شریف، ۲۱۳۳) یعنی وہ ایک کی طرف مائل ہوا تھا تو میدانِ حشر میں اس طرح آئے گا کہ بدن کے آدھے حصے پر لقوہ ہو جائے گا، پھر آگے کی سزا تو الگ رہے گی۔

"كَالْمُعَلَّقَةِ" کی تفسیر

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ﴿كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ کی تفسیر بخاری شریف میں منقول ہے کہ اس بے چاری کو ایسا بنا دیا کہ نہ تو اس کو بغیر شوہر کا کہہ سکتے ہیں، اس لئے کہ اگر بغیر شوہر کی ہوتی تو وہ نکاح کر سکتی تھی، لیکن وہ تو ایک شوہر کے نکاح میں ہے اس لئے بغیر شوہر کی بھی نہیں ہے۔ اور نہ شوہر والی کہی جا سکتی ہے یعنی شوہر والی عورت کا تو شوہر حق ادا کرتا ہے اور اس کو محبت دیتا ہے، یہ بے چاری اس سے بھی محروم ہے۔ تو اس کو نہ تو شوہر والی کہہ سکتے ہیں اور نہ بغیر شوہر والی کہہ سکتے ہیں۔ (بخاری شریف، ۴۶۰۰)

ازدواجی تعلقات کی درستگی کا راز

آیت کا یہ ٹکڑا پوری بات کا مین پوئنٹ (Main Point) ہے ﴿وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا﴾ تم حالات کو ٹھیک کرو، حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرو اور درستگی کا خیال رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ نکاح والی زندگی میں ازدواجی تعلقات کی درستگی کے لئے جو خاص تاکید فرمائی ہے وہ یہی ہے۔ نکاح کے خطبہ میں جو تین آیتیں پڑھی جاتی ہیں ان میں بھی یہی بات ہے ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ﴾ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا﴾ ان تینوں جگہوں پر تقویٰ کا حکم اور اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی تاکید فرمائی ہے، جب دل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہوگا تو وہ تمام حقوق ادا کرے گا۔

اپنی لڑکی کس کو دوں؟

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ مَیں اپنی لڑکی کس کو دوں؟ آپ نے جواب میں فرمایا کہ ایسا لڑکا ڈھونڈو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو، اس لئے کہ اگر وہ اس کے ساتھ محبت کرے گا تو اس کا حق ادا کرے گا ہی۔ لیکن اگر وہ اس لڑکی کو پسند نہیں کرے گا اور اس سے محبت نہیں کرے گا؛ تب بھی اللہ کے ڈر کی وجہ سے اس کی حق تلفی بھی نہیں کرے گا۔ نکاح کے اندر دینداری کو اختیار کرنے کی تاکید اسی وجہ آئی ہے۔ بہرحال! تقویٰ بنیادی چیز ہے۔

میاں بیوی کے تعلقات کے اندر بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لوگوں کے سامنے کھولی نہیں جاسکتیں، بلکہ گھر والوں کے سامنے بھی نہیں کھولی جاسکتیں، خاندان والوں کے سامنے بھی ان کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ جب ماں باپ کے سامنے بھی زبان نہیں کھلتی، تو پھر باہر والوں کی بات تو دور رہی، اس لئے جب تک تقویٰ نہیں ہوگا؛ تب تک بات نہیں بنے گی۔

انسانی فطرت کا لحاظ

دیکھو! شریعت نے انسانی فطرت کا کتنا لحاظ کیا ہے۔ ابوداود شریف کی روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شوہر اپنی بیوی کی کسی بات پر اگر ناراض ہوا اور بیوی کی پٹائی کی؛ تو اس سے یوں مت پوچھنا کہ کیوں مارا (ابوداود شریف، ۲۱۴۹) حضور ﷺ نے یہ تاکید فرمائی کہ اس سے پوچھا نہ جائے، اس لئے کہ کوئی ایسی بات ہوسکتی ہے جو بیان کرنے کے قابل نہ ہو۔ کوئی بچے کی پٹائی کرے اور پوچھا جائے تو اس کی وجہ بتلائی

جا سکتی ہے، لیکن بیوی کی پٹائی کی ہے اور وجہ بتائی جائے یہ ضروری نہیں ہے۔ وہاں ہر چیز بتانے کی نہیں ہوتی، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اپنی تعلیمات میں فطری تقاضوں کا اتنا زیادہ لحاظ کیا ہے کہ شوہر بیوی کی پٹائی کرے تو اس سے پوچھا نہ جائے۔

﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾ اگر تم درستگی کا خیال رکھو اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو یعنی محبت کے فطری طور پر کم اور زیادہ ہونے کے باوجود تمام بیویوں کے ساتھ خرچہ وغیرہ میں اور حقوق کی ادائیگی میں مساوات کا اہتمام کرتے رہو اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہتے رہو، پھر بھی اگر غیر اختیاری طور پر تمہارا دل کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہے؛ تو اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں۔

آیتوں کے بارے میں یہ کچھ تفصیل تھی، آگے روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

یہ میری وصیت ہے

۲۷۳. عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا، فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ مَا فِي الضِّلَعِ أَعْلَاهُ. فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيْمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں میری طرف سے حسنِ سلوک اور بھلائی کی تاکید اور نصیحت قبول کرو، اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں بھی سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہوتا ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو توڑ ڈالو گے اور اگر اس کو یوں ہی چھوڑ دو گے تو اور زیادہ ٹیڑھی ہوتی چلی جائے گی، اس لئے عورتوں کے معاملہ میں میری طرف سے حسنِ سلوک کی تاکید اور وصیت قبول کرو۔

وفی روایة فی الصحیحین: اَلْمَرْأَةُ کَالضِّلَعِ ، اِنْ أَقَمْتَهَا کَسَرْتَهَا ، وَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، اِسْتَمْتَعْتَ وَفِیْهَاعِوَجٌ.

صحیحین کی روایت میں ہے کہ عورت پسلی کی طرح ہے، اگر تم نے اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کی تو توڑ ڈالو گے، اور اگر ٹیڑھے پن کے ساتھ ہی اس سے فائدہ اُٹھایا تو خوب فائدہ اُٹھاؤ گے۔

وفی روایةلمسلم : اِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ ، لَنْ تَسْتَقِیْمَ لَکَ عَلیٰ طَرِیْقَةٍ ، فَاِنِ اسْتَمْتَعْتَ بِهَا، اِسْتَمْتَعْتَ وَفِیْهَاعِوَجٌ ، وَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِیْمُهَا کَسَرْتَهَا وَکَسْرُهَاطَلَاقُهَا.

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ یقیناً عورت پسلی سے پیدا ہوئی ہے، ہر وقت تمہارے ساتھ ایک ہی طریقہ سے پیش نہیں آتی، اس لئے اگر ٹیڑھے پن کے ساتھ ہی اس سے فائدہ اُٹھایا تو خوب فائدہ اُٹھاؤ گے، اور اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو توڑ ڈالو گے، اور توڑنا طلاق ہے۔

افادات:- اس روایت میں حضورِ اکرم ﷺ مردوں کو عورتوں کے ساتھ بھلائی اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے کی خاص تاکید فرما رہے ہیں۔ اور وہ نصیحت جو بڑی تاکید اور اہمیت کے ساتھ کی جاوے؛ اس کو وصیت کہتے ہیں۔ ویسے یہ بھی نصیحت کا ہی ایک حصہ اور قسم ہے، لیکن بڑے اہتمام کے ساتھ جو نصیحت کی جاتی ہے اس کو وصیت کہتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ عورتوں کے معاملہ میں بھلائی سے پیش آنے کی تاکیدی نصیحت قبول کرو۔

''عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے'' کا مطلب

اس لئے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ پسلی سے پیدا ہونے کا مطلب شراح حدیث نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی بائیں پسلی سے پیدا کیا تو گویا تمام عورتوں کی بنیاد حضرت حوا ہیں جو پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ اور پسلی

میں بھی سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہوتا ہے (فتح الباری) یکھو! کوئی بھی ٹیڑھی چیز ہو، اس کا ٹیڑھا پن اس کے اخیری حصہ پر سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، گجراتی میں کہاوت ہے (પાઘડી નો વળ છેડે) کسی چیز کا ٹیڑھا پن بتلانے کے لئے یہ جملہ بولا جاتا ہے، کسی بھی چیز کا اگر درمیانی حصہ ٹیڑھا ہو تو سیدھا کرنے سے کچھ دیر کے لئے وہ سیدھا ہو جائے گا، لیکن اوپر جا کر اس کی کجی سب سے زیادہ نمایاں ہوگی۔

خیر! عورت پسلی سے پیدا ہوئی اور اس کا سب سے ٹیڑھا حصہ اوپر والا ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ انسان کے جسم میں اوپر کا حصہ چہرے کا ہے، وہ مراد ہے، گویا عورت کی زبان کے اندر ٹیڑھا پن بہت زیادہ ہوتا ہے۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا دماغ مراد ہے یعنی ٹیڑھے دماغ اور ٹیڑھی کھوپڑی کی ہوتی ہیں۔ تو پسلی کے اندر سب سے زیادہ کجی والا حصہ اوپر والا ہے۔

عورت کا ٹیڑھا پن ہی اس کی خوبی ہے

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿فَاِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ﴾ اگر تم اس کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو توڑ ڈالو گے۔ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب اس حدیث کو کہتے اور سنتے ہیں کہ حضور ﷺ نے عورت کو ٹیڑھی پسلی فرمایا تو اس وقت گویا ہم اس کو عیب کے طور پر بیان کرتے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ نے دراصل اس کی فطرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی دو صنفیں اور دو قسمیں پیدا کی ہیں؛ مرد اور عورت۔ مرد کی کچھ مزاجی کیفیتیں اور خصوصیتیں ہیں اور عورت کی بھی کچھ مزاجی خصوصیتیں ہیں گویا اللہ تعالیٰ نے مرد کی فطرت الگ بنائی ہے اور عورت کی فطرت الگ بنائی ہے۔ یہاں نبی کریم ﷺ عورت کی فطرت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں

اوراس کو پسلی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، گویا پسلی کا ٹیڑھا ہونا یہ اس کا عیب نہیں ہے بلکہ فطری ہے، اور یہی اس کا حسن ہے۔ اور پسلی کو سیدھا کرنے کے لئے اگر توڑا گیا تو پھر دوبارہ جوڑنے کے لئے اس کو ٹیڑھا ہی کرنا پڑے گا، اس کو سیدھی کر کے جوڑنا چاہیں گے تو وہ نہیں جڑے گی۔ جیسے گاڑی کے اندر اسپرنگ (Spring) ٹیڑھی ہی ہوتی ہے، اور اس کا ٹیڑھا ہونا ہی اس کی خوبصورتی ہے، اگر اس کو سیدھی کرنا چاہو گے؛ تو وہ بے کار ہو جائے گی، گویا پسلی کے ساتھ تشبیہ دے کر اس کی خصوصیت کی طرف اشارہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا گیا کہ اس کا ٹیڑھا پن اس کے لئے عیب کی چیز نہیں ہے، بلکہ خوبی کی چیز ہے۔

ایک ہی چیز خوبی بھی اور عیب بھی

کوئی چیز ایک صنف کے لئے خوبی کی ہوتی ہے اور وہی چیز دوسری صنف کے لئے عیب کی ہوتی ہے۔ ہمارے مدرسوں کے اندر فارسی کا ایک جملہ بولا جاتا ہے کہ جو شاگرد استاذ کے سامنے نہ بولے؛ اس کو مدرسہ سے نکال دو، اور جو مرید شیخ کے سامنے بولے؛ اس کو خانقاہ سے نکال دو۔ پڑھنے والے طالبِ علم کے لئے کمال یہ ہے کہ وہ بولے اور سوالات ہی کرتا رہے کہ یہ کیوں اور ایسا کیوں؟ چپ چاپ بیٹھا رہے یہ اس کے لئے بری صفت ہے اور مرید کا شیخ کے سامنے بولنا بری صفت ہے، یہ اس کے حق میں عیب اور گستاخی شمار ہوتا ہے۔ اس لئے ایسا ہوتا ہے کہ کوئی چیز ایک کے حق میں خوبی ہو اور وہی دوسرے کے حق میں عیب ہو۔

مرد کی خوبی الگ، عورت کی جدا

مرد کو دنیا کے اندر کاروبار کرنا ہے، معاملات کو سنبھالنا ہے، اس لئے مرد کے حق

میں غافل ہونا اور جاہل ہونا یہ عیب ہے، کیونکہ دنیا کے حالات سے بے خبر ہوگا تو معاملات کو کیسے سنبھالے گا، لیکن عورتوں کے حق میں غافل ہونا خوبی کی چیز ہے، قرآنِ پاک میں موجود ہے ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغَافِلاتِ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ وہ لوگ جو تہمت لگاتے ہیں ان عورتوں پر جو پاک دامن ہیں اور غافلات یعنی بے خبر ہیں اور ایمان والیاں ہیں۔ معلوم ہوا کہ عورتوں کو بے خبر ہونا چاہیے یعنی دنیا کے معاملات سے بے خبر ہونا اور گھر کے اندر کے معاملات سے باخبر ہونا چاہیے جیسے بچوں کی تربیت اور پرورش وغیرہ امور سے تو واقف ہونا چاہیے، لیکن باہر کی چیزوں سے بے خبر ہونا ان کے حق میں خوبی کی بات ہے، جو عورت باہر کے معاملات اور چیزوں سے جتنی زیادہ باخبر ہوگی، اتنا ہی اس کے حق میں عیب کی بات ہے، اور شوہر کے لئے بھی دردِ سر ہے۔ دیکھو! قرآنِ پاک نے عورتوں کے لئے ﴿غَافِلاتٌ﴾ کا وصف خوبی کے طور پر استعمال کیا ہے، مرد کے لئے یہ وصف استعمال نہیں کیا۔

برائی کے انداز میں تعریف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر جب تہمت لگائی گئی تھی تب نبی کریم ﷺ نے لوگوں سے مشورہ کیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ گھر کی باندی سے پوچھ لیجئے، وہ ان کے بارے میں زیادہ واقف ہوگی۔ لہٰذا حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں آیا کرتی تھیں، ان سے حضورِ اکرم ﷺ نے پوچھا، انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے متعلق جو جملہ کہا، میں وہ بتلانا چاہتا ہوں، انہوں کہا کہ بس! ان کا حال تو یہ ہے کہ آٹا گوندھ کر روٹی پکائے بغیر سو جاتی ہیں اور بکری آکر آٹا کھا جاتی ہے یعنی ایسی غافل ہیں اور کوئی چیز ان میں قابلِ گرفت نہیں ہے۔ (بخاری شریف، ۳۹۱۰)

یہ بات جو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے بیان کی وہ حقیقت میں عیب کے طور پر بیان نہیں کی، بلکہ مدح بمایشبہ الذم کے قبیل سے ہے یعنی کبھی کسی کی تعریف ایسے انداز میں کی جاتی ہے جس سے اس کی مذمت معلوم ہوتی ہو، جیسے کسی کی سخاوت کے بارے میں یوں کہا جائے کہ فلاں میں کوئی عیب نہیں ہے، بس! لوگوں پر اتنی سخاوت کرتا ہے کہ ہمیشہ کڑکا ہی رہتا ہے، یہاں اس کو "کڑکا" کہہ کر قائل نے اس کی برائی بیان کی لیکن درحقیقت وہ اس کی برائی بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ برائی کے انداز میں اس کی تعریف کر رہا ہے۔ جیسے عربی کا ایک شعر ہے:-

لَاعَیْبَ فِیْهِمْ غَیْرَ أَنَّ سُیُوْفَهُمْ ❁ بِهِنَّ فُلُوْلٌ مِنْ قِرَاعِ الْكَتَائِبِ

شاعر کسی قبیلہ والوں کی تعریف کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ان میں عیب نہیں ہے، بس اتنا ہے کہ ان کی تلواروں کے اندر دشمن کے لشکر سے لڑنے کی وجہ سے دندانے پڑے ہوئے ہیں۔ ویسے تو تلوار کے اندر دندانہ ہونا اور تلوار کا کند ہونا اور اس کی دھار کا ٹوٹا ہوا ہونا عیب کی بات ہے، لیکن اس قبیلہ والوں کی تلوار کی دھاریں اس لئے ٹوٹی ہوئی ہیں کہ وہ ہمیشہ دشمن کے لشکروں سے ٹکراتی ہی رہتی ہیں۔ گویا یہاں تعریف ایسے انداز میں کی گئی ہے جو برائی معلوم ہوتی ہے۔

ٹیڑھا پن تو اس کی فطرت ہی ہے

بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ یہ جو فرمایا ہے کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی تو درحقیقت یہ اس کے لئے خوبی کی چیز ہے، اب مرد کو یہ تاکید کی گئی کہ تم یہ نہ سوچنا کہ یہ میرے جیسی بن جاوے۔ گڑبڑ یہیں سے پیدا ہوئی کہ یہ وصف عورت کے حق میں برائی کے طور پر بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ ایسا نہیں

ہے۔اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو توڑ ڈالو گے یعنی جدائی کی نوبت آجائے گی، یہ ٹیڑھا پن تو اس کی فطرت ہی ہے، پسلی کی فطرت ہی ٹیڑھی ہوتی ہے، پسلی کو سیدھا کرنے جائیں گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، اگر اس کو درست کرنا ہے تو ٹیڑھی رکھتے ہوئے ہی درست کرو؛ تب ہی درست ہوگی۔

فطری کج ادائیوں کے ساتھ ہی زندگی بسر ہوگی

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اس کو یوں ہی چھوڑ دو گے تو اور زیادہ ٹیڑھی ہوتی چلی جائے گی، اس لئے اس پر نگرانی تو ضرور کرنی پڑے گی، اس کو ایک دم سے اس کے حال پر بھی نہیں چھوڑ دینا ہے، لیکن ایک دم سیدھا بھی کرنے کی کوشش نہیں کرنی ہے؛ ورنہ معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔اس لئے آپ یوں نہ سوچئے کہ مَیں جیسا ہوں ویسی ہی یہ بھی بن جائے، بلکہ اس کی فطری کج ادائیوں کو برداشت کرتے ہوئے آپ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہیں گے؛ تب ہی زندگی بسر ہوگی۔ ورنہ جب آپ سے کج ادائیاں برداشت نہیں ہوتیں تو پھر یہ طے کر لیجئے کہ ہمیں شادی کرنی ہی نہیں ہے۔﴿فَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ﴾ حضور ﷺ پھر سے فرماتے ہیں کہ عورتوں کے حق میں میری طرف سے بھلائی کی تاکیدی نصیحت قبول کرو۔

جیسا چل رہا ہے چلنے دو

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث سے ایک اور اشارہ مستنبط کیا ہے، بڑی حکمت کی بات فرمائی ہے۔اور یہ مَیں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ آج کل یہ بھی ایک بیماری عام ہے کہ دنیا کے اندر کوئی اچھا بھلا نیکی اور بھلائی کا نظام چل رہا ہے

اوراس میں کچھ کمی بھی ہے مثلاً کوئی ادارہ اور مدرسہ ہے، مکتب یا مسجد کا مینجمنٹ (Management) ہے، یہ سب کام چل رہے ہیں، لیکن ان میں کچھ کمی بھی ہے، اب اگر آپ اس کمی کو بالکل دور کرنا چاہیں گے تو یہ جس طرح چل رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جس طرح چل رہا ہے اسی طرح اس کو چلتے رہنے دو؛ تاکہ اس سے جو فائدہ ہو رہا ہے وہ ہوتا رہے، آپ اصلاح کے جذبہ میں آکر اور درستگی کا علَم اُٹھا کر میدان میں آئیں گے اور اس نظام کو ختم کر دیں گے، تو تھوڑا بہت جو کام ہو رہا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا۔

ہر ایک ہی اپنے آپ کو اصلاحی کہتا ہے

بہت سی مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ صرف لیبل اصلاح کا ہوتا ہے، حالانکہ ہر اصلاح قابلِ قبول بھی نہیں اور ہر اصلاح مطلوب بھی نہیں۔ قرآنِ پاک میں آیا ہے، منافقین کہا کرتے تھے ﴿وَاِذَاقِيْلَ لَهُمْ لَاتُفْسِدُوْافِى الْأَرْضِ قَالُوْااِنَّمَانَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ جب منافقین سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فسادات مت پھیلاؤ اور گڑبڑ مت کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرتے ہیں ﴿اِنَّمَانَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿أَلَاۤ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِن لَّايَشْعُرُوْنَ (سورۂ بقرہ:۱۲)﴾ سنو! وہی اصل میں فساد مچانے والے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے، وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ہم اصلاح کر رہے ہیں۔ دنیا میں کون ہے جو اپنے متعلق یہ کہتا ہو کہ مَیں فسادی ہوں، ہر ایک ہی اپنے آپ کو اصلاحی کہتا ہے، لیکن اس کا فیصلہ اپنی ذات سے نہیں کرنا چاہیے، بلکہ فیصلہ تو اہلِ صلاح اور سمجھ دار لوگ کریں گے۔ یہ دیکھو کہ اہل اللہ اور نیک لوگ ان کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، انہیں کی رائے معتبر ہے، ورنہ دنیا میں اپنے متعلق کوئی بھی برائی کا خیال نہیں رکھتا۔

بہرحال! عورتوں کے سلسلہ میں شریعت نے یہ تاکید تو فرمائی کہ ان کو ایسے ہی نہیں چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کی نگرانی ہوتی رہے، لیکن اتنا زیادہ تشدد بھی نہ ہو کہ توڑ کی نوبت آجائے۔

آج یہیں بات کو ختم کرتے ہیں، باقی باتیں ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے اور نیکی کی توفیق عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خصوصی تاکید کے سلسلہ میں یہ بیان چل رہا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی خصوصی تاکید فرمائی ہے۔

شرم کی بات ہے!

۲۷۴. عن عبداللہ بن زمعة رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ يَخْطُبُ، وَذَكَرَ النَّاقَةَ وَالَّذِي عَقَرَهَا، فَقَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ﴿اِذِانبَعَثَ أَشْقَاهَا﴾ اِنبَعَثَ لَهَارَجُلٌ عَزِيزٌ، عَارِمٌ مَنِيعٌ فِي رَهْطِهِ. ثُمَّ ذَكَرَ النِّسَآءَ، فَوَعَظَ فِيهِنَّ، فَقَالَ: يَعْمِدُ أَحَدُكُمْ فَيَجْلِدُ امْرَأَتَهُ جَلْدَ الْعَبْدِ، فَلَعَلَّهُ يُضَاجِعُهَا مِنْ آخِرِيَوْمِهِ ثُمَّ وَعَظَهُمْ فِي ضِحْكِهِمْ مِنَ الضَّرْطَةِ، وَقَالَ: لِمَ يَضْحَكُ أَحَدُكُمْ مِمَّا يَفْعَلُ؟ (متفق علیه)

حضرت عبداللہ بن زمعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو وعظ فرماتے ہوئے سنا، آپ نے اپنے اس وعظ میں حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا اور جس نے اس کی کوچیں کاٹ ڈالی تھیں تذکرہ فرمایا۔ اس وقت اس قوم کا سب سے زیادہ بدبخت، بڑا شریر قسم کا آدمی جو اپنے قبیلہ میں بڑا مضبوط اور قوت والا سمجھا جاتا تھا وہ اس اونٹنی کو ختم کرنے کے لئے تیزی سے اُٹھا۔ راوی کہتے ہیں کہ اسی وعظ میں حضور ﷺ نے عورتوں کا بھی تذکرہ فرمایا، چنانچہ عورتوں کے بارے نصیحت فرمائی کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کو پیٹنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو غلام کی طرح پٹائی کرتا ہے، اس وقت اس کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ بعد میں اسی کو پہلو میں لے کر سونا ہے۔ اسی وعظ میں کسی کی ریح خارج ہونے پر لوگوں کے ہنسنے کے بارے میں نصیحت فرمائی کہ کوئی آدمی ایسی چیز پر کیوں ہنستا ہے جو خود کو بھی پیش آتی ہے؟

افادات:۔ حضرت صالح علیہ السلام قومِ ثمود کی طرف بھیجے گئے تھے، ان لوگوں نے معجزہ کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے چٹان سے ایک اونٹنی پیدا کی اور اس اونٹنی کے متعلق ایک تاکید یہ فرمائی کہ اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہ کیا جائے۔ وہ اونٹنی قدرت کی خاص

نشانی تھی۔ان لوگوں کے یہاں پانی کی تنگی تھی ، ویسے بھی اونٹنی کو پانی کی زیادہ ضرورت پڑتی ہے، لہٰذا یہ طے کیا گیا کہ ایک روز اونٹنی پانی پیئے گی اور دوسرے روز گاؤں والے پانی لیں گے۔اس اونٹنی کو اتنا پانی درکار تھا کہ سارا پانی ختم کردیتی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کی یہ ایک آزمائش تھی لیکن وہ لوگ اس اونٹنی کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکے، انہیں میں سے ایک آدمی نے پہلے اس کی کوچیں کاٹ دیں اور پھر اس اونٹنی کو قتل کردیا، قرآنِ پاک میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے ﴿اِذِانبَعَثَ اَشقَاهَا﴾ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس وقت اس قوم کا سب سے زیادہ بدبخت بڑا شریر قسم کا آدمی جو اپنے قبیلہ میں بڑا مضبوط اور قوت والا سمجھا جاتا تھا وہ اس اونٹنی کو ختم کرنے کے لئے تیزی سے اُٹھا۔

﴿یَعمِدُ اَحَدُکُم فَیَجلِدُ امرَأَتَهُ جَلدَ العَبدِ، فَلَعَلَّهُ یُضَاجِعُهَا مِن آخِرِ یَومِه﴾ تم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کو پیٹنے کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو غلام کی طرح اس کی پٹائی کرتا ہے ’’غلام کی طرح پٹائی کرنا‘‘ یہ تمثیل کے لئے بولا جاتا ہے، جس سے پٹائی کے بہت زیادہ سخت ہونے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جیسے ہم اپنی بول چال میں ’’جانور کی طرح مارنا ‘‘بولتے ہیں تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی اپنی بیوی کو بے رحمی سے پیٹتا ہے اور جس وقت وہ اس کی پٹائی کررہا ہوتا ہے اس کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس طرح بے رحمانہ پٹائی کرکے مَیں جس شخصیت کا دل توڑ رہا ہوں اور جس کو تکلیف پہنچا رہا ہوں، اسی سے پھر مجھے ایک طرح کی راحت اور سکون حاصل کرنا ہے۔حالانکہ کسی ایسے آدمی سے جب ہمارا کوئی معاملہ پڑتا ہے تو ہم اس کی بہت زیادہ رعایت کرتے ہیں، اس کے مزاج کا خیال رکھتے ہیں یہاں بیوی سے بھی راحت وسکون حاصل کرنے کا بہت بڑا کام ہم لے رہے ہیں، اس کو پہلو میں لے کر سوتے ہیں ﴿یُضَاجِعُهَا﴾ کا مطلب یہی ہے کہ

اس کے ساتھ سوکر راحت حاصل کرتے ہیں، اب جس نے دن میں تو اس کی پٹائی کی اور پھر رات کو اسی کو لے کر سوتا ہے، تو کیا اس کو ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ اس کی شرافت کہاں چلی گئی؟ مروت کا تقاضہ کہاں رخصت ہوگیا؟ اس طرح ارشاد فرما کر حضور اکرم ﷺ عورتوں کی پٹائی کرنے سے رُکنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

ایسی حرکت شریف انسان گوارا نہیں کرسکتا

حضور ﷺ نے خصوصی انداز میں عجیب وغریب طریقہ سے سمجھایا کہ جس شخصیت سے تم راحت پا رہے ہو، اسی کو تم پیٹو! یہ مناسب نہیں ہے۔ ایک آدمی آپ کی پٹائی کرے اور پھر تھوڑی دیر بعد آپ ہی سے اپنی کوئی ضرورت پوری کرنا چاہے تو آپ اس کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؟ آپ کے دل میں اس کے متعلق کیسے جذبات موجزن ہوں گے؟ یہاں حضور ﷺ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی غلام کی طرح بے رحمی سے اپنی بیوی کی پٹائی کرتا ہے اور پھر اسی کے ساتھ سوتا ہے اور راحت حاصل کرتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی حرکت ہے کہ جس کو شریف انسان گوارا نہیں کرسکتا۔

اور واقعہ بھی یہی ہے کہ عورتوں کے ذریعہ سے ہم شوہروں کو جو راحت ملتی ہے اور جو آرام پہنچتا ہے؛ وہ اتنا زیادہ ہے کہ جس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ یوروپ اور امریکہ میں ایسا کوئی نظام ہی نہیں ہے کہ بیوی شوہر کی خدمت کرے، اس کو راحت پہنچانے کا انتظام کرے، دونوں اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، قانونی طور پر کوئی ایک دوسرے کو راحت پہنچانے کا پابند نہیں ہے، اور اخلاقی طور پر بھی اس کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ وہاں تو ہر چیز کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ ہمارے یہاں اخلاق ومروت کے تقاضوں کے مطابق ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم ہوا ہے کہ جس کے پیشِ نظر عورتیں

خدمتیں کرتی ہیں اور راحتیں پہنچاتی ہیں، اوران کی طرف سے پہنچنے والی راحتیں بے انتہاء ہیں۔

بعض کام عورتیں ہی کرسکتی ہیں

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی تفسیر میں اس آیت ﴿وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً﴾ کے تحت لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے ہی اندر سے تمہارے لئے جوڑے پیدا فرمائے یعنی عورتیں پیدا فرمائیں، تاکہ تم ان کے ذریعہ سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور شفقت کے جذبات پیدا فرمادئے۔

﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے لکھا ہے کہ عورتیں گھر کے ایسے ایسے کام انجام دیتی ہیں کہ اگر وہ کام مردوں کو کرنے پڑیں تب پتہ چلے، بچوں ہی کو لے لیجئے کہ بچوں کی پرورش اور ان کی نگرانی کرنا، ان کو سنبھالنا؛ یہ عورتوں کا کام ہے اور وہ بڑے صبر وضبط کے ساتھ اپنے اس فریضہ اور ذمہ داری کو انجام دیتی ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ بچہ جب ضد کرتا ہے، اس وقت اس کو بڑی محبت سے سمجھاتی ہے، یہی معاملہ اگر ہمارے حوالہ کیا جائے، تو معلوم نہیں ہم کیا کریں۔

نظام درہم برہم ہو جاتا ہے

ایک صاحب کی بیوی کسی ضرورت سے کہیں گئی ہوئی تھی اور بچے کو شوہر کے حوالہ کر گئی تھی، وہ بچہ چھوٹا چار پانچ مہینے کا تھا، جب وہ اس سے کسی طرح نہیں بہلا تو اس نے پٹائی شروع کردی۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم سے تو صبر وضبط نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیتی ہیں، گھریلو کاموں میں کھانا

پکانا وغیرہ بھی بہت بڑا کام ہے، اگر ایک دن کے لئے عورت گھر میں موجود نہ ہو تو پھر دیکھو کہ نظام کیسا درہم برہم ہو جاتا ہے۔ بستر ٹھیک کرنے کی بھی صلاحیت ہمارے اندر نہیں ہے۔ بہرحال! جتنے بھی کام عورتوں کے ہیں وہ اس انداز کے ہیں کہ ان کے ذریعہ آدمی ایک طرح کا سکون حاصل کرتا ہے۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے

حضرت قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ جب بھی غسل کر کے کپڑے بدلنے ہوتے تھے تو ہمیشہ اہلیہ محترمہ کا یہ معمول تھا کہ نواڑ پائجامہ میں ڈال کر تیار کر دیتی تھی۔ ہمارے یہاں یہ رواج نہیں ہے، یوپی میں رواج ہے کہ پائجامہ جب دھوتے ہیں تو نواڑ نکال دیتے ہیں اور جب پہننے کا وقت آتا ہے تو نواڑ ڈالی جاتی ہے، ہمارے یہاں تو نواڑ ڈالی ہوئی ہی رہتی ہے، اس لئے ہمیں اس بات کا اندازہ نہیں ہے۔

بہرحال! حضرت فرماتے ہیں کہ جب بھی مَیں غسل کر کے فارغ ہوتا تو اہلیہ کپڑے لاتی اور اس میں نواڑ ڈالی ہوئی ہوتی تھی اس لئے زندگی بھر کبھی احساس نہیں ہوا، اہلیہ کے انتقال کے بعد پہلی مرتبہ جب غسل کر کے کپڑے بدلنے کی نوبت آئی اور بہو نے کپڑے بھیجے تو پائجامہ کے اوپر نواڑ رکھی ہوئی تھی، یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ یہ معمولی سی چھوٹی خدمت زندگی بھر وہ انجام دیتی تھی، پوری زندگی جس کام کی نوبت ہی آنے نہیں دی، آج وہ کام مجھے خود ہی کرنا پڑ رہا ہے۔ چھوٹی سی خدمت کی آدمی کو قدر نہیں ہوتی یا اس کی طرف خیال نہیں جاتا۔ غور کیجئے کہ اس چیز کا آدمی کی طبیعت پر کیسا اثر پڑتا ہے اور کیا کیفیت طاری ہوتی ہے۔ تو واقعہ یہ ہے کہ عورتیں ہماری جو خدمات انجام دیتی ہیں، معمولی معمولی خدمتیں ہوتی ہیں جو بڑی قابلِ قدر ہوتی ہیں لیکن ہمیں

ان خدمات کی قدر نہیں ہوتی، جب وہ ہاتھ سے نکل جاتی ہے اس وقت پتہ چلتا ہے کہ یہ چھوٹی سی تھی لیکن بڑی عجیب وغریب چیز تھی اوران کی قدر بعدِ زوالِ نعمت ہوتی ہے۔

اللہ اوراس کے رسول کی سفارش

اب ان خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی طرف سے کوئی بات کجی کی یا طبیعت کے خلاف پیش آئے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پٹائی کردی جائے، بلکہ حدیثِ پاک کے پیش نظر اس کے ساتھ رحم وکرم کا اور شفقت کا معاملہ کیجئے۔ باری تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں ﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ اور حضور ﷺ بھی ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی کے اوپر کا حصہ سب سے زیادہ ٹیڑھا ہوا کرتا ہے، اگر تم اس کو سیدھا کرنے جاؤ گے تو وہ ٹوٹ جائے گی، لہٰذا اس سے اسی حالت میں فائدہ اٹھاتے رہو، اور اگر ناگواری کی کوئی بات اس سے سرزد ہوجائے تو درگذر سے کام لو۔ جیسے کسی کا بچہ کم عقل ہو اور عمر بڑی ہونے کے باوجود اس کی سمجھ اتنی نہیں ہے جتنی عام طور پر ہوا کرتی ہے، ایسا بچہ اگر کوئی ایسی حرکت کرتا ہے، تو ہم درگذر کردیتے ہیں کہ اس کی سمجھ کم ہے، اس سے نادانی کی بات سرزد ہوجایا کرتی ہے، ہمیں اس کے ساتھ شفقت اور رحم وکرم کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ایک ناسمجھ ہے، اس کے ساتھ بھی شفقت اور رحم وکرم کا معاملہ کرنا چاہیے۔

اور یہ بھی سوچو کہ اگر ہماری بیٹی ہو اور اس کی سمجھ اور عقل میں کچھ کمی ہو اور ایسی بیٹی کی شادی کرکے ہم کسی کے یہاں بھیجیں تو ہم کتنا خیال کریں گے، سسرال والوں کو خاص تاکید کریں گے کہ اس کی طبیعت میں ذرا کمزوری ہے، اس کا خیال رکھنا۔ دیکھئے! یہاں اللہ تعالیٰ سفارش کررہے ہیں اور نبی کریم ﷺ اس کا مزاج بتلارہے ہیں، اس کے بعد اگر اس کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آجائے؛ تو ہمیں درگذر سے کام لینا چاہیے۔

اُلٹی چال

اور مَیں تو کہا کرتا ہوں کہ جہاں درگذر کرنی چاہیے ہم وہاں نہیں کرتے اور جہاں نہیں کرنی چاہے وہاں کرتے ہیں، مثلاً آپ کے کھانے میں نمک کم پڑ گیا تو یہ غلطی معاف نہیں ہوتی، مرچ زیادہ کیوں ہوگئی؟ ہمارے کپڑے برابر کیوں نہیں دھلے؟ وہاں تو پٹائی کا معاملہ کرتے ہیں۔ اور اگر نماز نہیں پڑھتی تو بھولے سے بھی اس کو کچھ نہیں کہیں گے، جہاں کہنا چاہیے؛ وہاں نہیں کہتے اور جہاں درگذر سے کام لینا چاہیے؛ وہاں درگذر سے کام نہیں لیا جاتا

بس! اللہ تعالیٰ نے اسی پر میری مغفرت کردی

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے ملفوظات میں ہے کہ دار العلوم دیوبند جو قائم ہوا اس کی تاریخ میں لکھا ہے کہ اس کے سب سے پہلے استاذ بھی محمود اور سب سے پہلے شاگرد بھی محمود تھے۔ ملا محمود میرٹھ کے رہنے والے عالم تھے، قدیم زمانہ میں عالم کے لئے ''مُلاّ'' کا لفظ لگایا جاتا تھا، آج بھی سرحد کے علاقہ میں یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ تو پڑھانے والے مُلاّ محمود تھے اور ان کے پاس پڑھنے والے حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ تھے جو بعد میں ''شیخ الہند'' کہلائے۔ تو حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مُلاّ محمود کو انتقال کے بعد کسی نے خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کہ ایک روز ایسا ہوا کہ کھچڑی میں نمک کم تھا، دل میں تو آیا کہ بیوی کو تنبیہ کروں کہ نمک کم ہے لیکن پھر مَیں نے سوچا کہ انسان ہے، اندازے سے جو چیز ڈالی جاتی ہے کبھی کم اور کبھی زیادہ

ہوجاتی ہے، کمی بیشی کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس پر مَیں ناگواری کا اظہار کروں اور اس کو کچھ کہوں، اس لئے مَیں نے صبر سے کام لیا، بس! اللہ تعالیٰ نے اسی پر میری مغفرت کردی۔ انہوں نے صرف تنبیہ کا ارادہ کیا تھا، پٹائی کا نہیں۔

دیکھو! اتنے بڑے عالم تھے اور عملی بڑی بڑی خدمات انجام دی تھیں، لیکن ان میں سے کسی چیز کا وہاں تذکرہ نہیں آیا۔

بیوی کے ساتھ کبھی لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے خلفاء میں سے ہیں، حضرت کے مجازین میں کراچی میں سب آخر میں انہیں کا انتقال ہوا۔ ان کے متعلق حضرت مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ انہوں نے مجلس میں فرمایا کہ آج ہماری ازواجی زندگی کے تریپن سال (۵۳) سال ہوئے، کبھی بیوی کے ساتھ لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ اندازہ لگائیے کہ پٹائی کرنا اور سخت سست کہنا تو دور کی بات رہی، صرف لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔

حضرت مفتی محمد تقی صاحب نے اس پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ واقعۃً ہم سب لوگوں کے لئے قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں کہ لوگ کرامتیں ڈھونڈتے ہیں، پانی پر چلنا اور آسمان پر اڑنا؛ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے، یہ ہے مشکل کام کہ تریپن سال (۵۳) کی میاں بیوی کی زندگی میں کیا کبھی کوئی ایسے حالات ہی پیش نہیں آئے ہوں گے؟ ان کی بیوی کوئی آسمان سے اُتری ہوئی حور تو تھی نہیں، اور وہ بھی فرشتہ تو نہیں تھے، ان کے درمیان ناگواری کی باتیں ضرور پیش آئی ہوں گی، اس کے باوجود لہجہ بدل کر بھی بات نہیں کی۔ اس سے ان کے اخلاق واوصاف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حقیقت میں خوش اخلاقی یہی ہے۔

یہ حضور اکرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہیں

روایتوں میں آتا ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کی دس سال خدمت کی، کوئی کام مَیں نے کیا ہو اس کے متعلق حضور ﷺ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں کیا؟ اور اگر نہیں کیا تو یہ نہیں فرمایا کہ یہ کیوں نہیں کیا (بخاری شریف، ٦٠٣٨) حدیثِ پاک کی تشریح کرنے والے علماء اس موقع پر لکھتے ہیں کہ یہ دراصل حضور اکرم ﷺ کے اخلاق بتلائے جا رہے ہیں، اس لئے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ تو نوعمر لڑکے تھے، دس سال کی عمر میں خدمت میں لگے اور دس سال خدمت کی، ظاہر ہے کہ ان کی طرف سے تو ایسی بے شمار باتیں پیش آئی ہوں گی جن پر تنبیہ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن حضور ﷺ نے کبھی ٹوکا نہیں۔ گویا یہ حضور اکرم ﷺ کے اعلیٰ اخلاق ہیں۔

تو حضرت ڈاکٹر صاحب نے ترپین (۵۳) سال کی زندگی میں کبھی لہجہ بدل کر بات نہیں کی، اس سے ہمیں ان کے اعلیٰ اخلاق کا اندازہ لگانا چاہیے، ورنہ ظاہر ہے کہ بیوی کی طرف سے کوئی نہ کوئی بات تو ضرور پیش آئی ہی ہو گی۔

اپنی بیوی سے پوری زندگی میں پانی بھی نہیں مانگا

ایک اور قدم آگے بڑھاتے ہوئے ان کی اہلیہ خود فرماتی ہیں کہ انہوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے پانی دو (اپنی بیوی سے پوری زندگی میں پانی بھی نہیں مانگا) جب ہم نے محسوس کیا کہ ان کو پانی کی ضرورت ہے اور خود پانی لا کر ان کو پیش کیا، وہ دوسری بات ہے، لیکن انہوں نے کبھی مطالبہ نہیں فرمایا۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ خود ہی پوری کر لیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مَیں تو یوں سمجھتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے

اپنے بندوں کی خدمت کے لئے پیدا کیا ہے، مَیں تو خادم ہوں، مخدوم نہیں ہوں، مجھے تو بڑوں کی، چھوٹوں کی، بیوی کی، مریضوں کی سب کی خدمت کرنی ہے۔ انہوں نے کسی سے کبھی خدمت کا مطالبہ نہیں کیا غور کیجئے کہ جس آدمی کا نظریہ ہی ایسا ہو؛ کیا وہ کبھی کسی سے تکلیف محسوس کرسکتا ہے؟

مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اللہ کے ایسے بندے دنیا میں ہیں جو نبی کریم ﷺ کے ان ارشادات کو عملی جامہ پہنا کر ہمارے لئے نمونہ چھوڑ گئے۔ اگر آپ یوں کہیں کہ آپ تو صحابہ کے قصے بیان کرتے ہیں، تابعین کے قصے سناتے ہیں، ہم کہاں ان کی حرص کر سکتے ہیں، ابھی تو یہ دور چودھویں صدی کا آیا ہے، تو مَیں نے جو حضرت ڈاکٹر صاحب کا واقعہ سنایا، یہ کوئی پرانے زمانہ کی شخصیت نہیں ہیں، ابھی ماضی قریب میں گزرے ہیں۔ لٰہذا یہ چیز بڑی قابلِ توجہ ہے، اس کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔

قومِ لوط کی ایک برائی

﴿ثُمَّ وَعَظَهُمْ فِيْ ضِحْكِهِمْ مِنَ الضَّرْطَةِ، وَقَالَ: لِمَ يَضْحَكُ أَحَدُكُمْ مِمَّا يَفْعَلُ؟﴾

اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اسی وعظ وخطبہ میں ایک تیسری نصیحت یہ بھی فرمائی کہ کبھی کسی کی ریح زور سے خارج ہو جاتی ہے، تو لوگ ہنستے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی کہ یہ ہنسنے کی چیز نہیں ہے، اس لئے کہ جو لوگ ہنس رہے ہیں، کیا ان کو ریح خارج نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ہر ایک کو پیش آتی ہے، تو پھر اس پر ہنسنا کیا معنٰی رکھتا ہے؟ یعنی نبی کریم ﷺ اس بات پر غور وفکر کی دعوت دے رہے ہیں کہ یہ کیا فعل ہے؟ اگر کسی کی طرف سے کوئی ایسا عیب کا کام صادر ہوتا ہے جو دوسرے میں نہ ہو، اور اس پر کوئی ایسی بات کہی جائے، تو سمجھ میں بھی آنے

والی چیز ہے، لیکن ریح کا خارج ہونا تو ہر ایک کو پیش آتا ہے، پھر کسی پر ہنسنا کیا معنٰی رکھتا ہے؟ یہ نامناسب فعل ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے، اور قوم لوط کی بری عادتوں کے سلسلہ میں کتابوں میں لکھا ہے ﴿وَتَـأْتُـوْنَ فِـیْ نَـادِیْـكُـمُ الْمُنْكَر﴾ اپنی مجلسوں میں جو نامناسب حرکتیں کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ بھی لکھا ہے کہ وہ لوگ زور سے ریح خارج کرکے ہنسا کرتے تھے، گویا یہ قوم لوط کی برائیوں میں سے ہے۔ (الدرالمنثور)

دنیا کی ساخت ہی اس انداز کی ہے

۲۷۵. عَنْ أَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: ﴿لَا یَـفْـرَکْ مُؤْمِنٌ مُؤْمِنَةً، اِنْ كَرِهَ مِـنْـهَـا خُـلُـقـاً؛ رَضِـیَ مِـنْـهَـا آخَرَ﴾ أَوْقَالَ ﴿غَیْرَهُ﴾ (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی ایمان والا مرد ایمان والی عورت سے بغض نہ رکھے، اگر کوئی عادت اس کو ناپسند ہے تو اسی کی کوئی دوسری بات اس کو اچھی بھی لگتی ہے۔

افادات: - یہاں ایمان والی عورت سے اپنی بیوی مراد ہے یعنی کوئی شوہر اپنی بیوی سے بُغض اور دشمنی نہ رکھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ دیکھو! جب دو آدمی ساتھ مل کر زندگی گذارتے ہیں تو یہ ایک طبعی چیز ہے کہ دونوں میں ہر ایک کی طرف سے دوسرے کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، اس میں کبھی کوئی بات ضرور پیش آئے گی جس کی وجہ سے اس کو ناگواری اور تکلیف ہو، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دنیا کے اندر جتنی بھی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، ان سب میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں، خیر ہی خیر ہو، ایسا نہیں ہے، بلکہ دنیا کی ساخت اور بناوٹ ہی اس انداز کی رکھی ہے کہ اس میں خیر اور شر، بھلائی اور برائی، خوبی اور نقص یہ دونوں ملے جلے ہیں، کہیں کوئی ایسا نظر نہیں آئے گا کہ اس میں خوبی ہی خوبی ہو، نقص نہ ہو۔ بھلائی ہی بھلائی ہو، اس میں

برائی نہ ہو۔ خیر ہی خیر ہو، اس میں شر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی بناوٹ ہی ایسی رکھی ہے۔

ہر چیز میں خیر اور شر کا پہلو ہے

نبی کریم ﷺ نے جو دعائیں مختلف چیزوں کے استعمال کے واسطے سکھلائیں ہیں ان سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً لباس کے سلسلہ میں دعا آتی ہے کہ جب آدمی کوئی نیا لباس پہنے، کرتہ، پائجامہ یا نئی چادر استعمال کرے، تو اسے یہ دعا پڑھنی چاہیے ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ خَیْرَہٗ وَخَیْرَمَاصُنِعَ لَہٗ، وَأَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّہٖ وَشَرِّمَاصُنِعَ لَہٗ﴾ اے اللہ! اس لباس کے اندر جو خیر و بھلائی تو نے رکھی ہے اور جن مقاصدِ خیر میں یہ لباس استعمال کیا جاتا ہے اس کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں، اور اے اللہ! اس لباس کے اندر جو شر و برائی تو نے رکھی ہے اور جن بری چیزوں میں یہ استعمال میں آتا ہے، اس سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں (ابوداود شریف، ۴۰۲۰)

آج تو ہم نے یہ دعائیں پڑھنا بھی چھوڑ دی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ چیزوں کا نقصان ہمیں برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً سواری کے لئے کوئی گھوڑا خریدا تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اس گھوڑے کی پیشانی کے بال پکڑ کر یہ دعا پڑھو ﴿أَللّٰهُمَّ اِنِّیْ أَسْأَلُکَ خَیْرَہٗ وَخَیْرَمَاجُبِلَ عَلَیْہِ﴾ اے اللہ! اس کے اندر جو خیر و بھلائی ہو اس کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور جس خیر و بھلائی پر وہ پیدا کیا گیا ہے اس کا سوال کرتا ہوں (سنن النسائی، ۱۰۰۶۹)

تو ہم جب کوئی بھی چیز خرید کر لائیں مثلاً گاڑی لائیں، نئی ماروتی لائیں، تو اس میں بیٹھنے سے پہلے اس پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھ لینی چاہئے، اس کی برکت یہ ہوگی کہ اس گاڑی کے شر سے حفاظت ہوگی۔ بہت سی مرتبہ نئی گاڑی ہوتی ہے اور حادثہ کا شکار ہو جاتی ہے، تو گاڑی تو جاتی ہے، ساتھ میں مالک کو بھی لے جاتی ہے، یہ اس کا شر ہی تو ہے، یہ گاڑی

کی برائی ہی تو ہوئی کہ اس میں سواری کے نتیجہ میں آپ کو تکلیف پہنچی، اُس سے جہاں راحت پہنچ رہی ہے، وہاں تکلیف بھی پہنچ سکتی ہے۔ ہر چیز کا حال ایسا ہی ہے۔ اسی طرح مثلاً یہ کرسی ہے، اس میں خیر بھی ہے اور اگر یہ الٹ گئی تو اسی پر بیٹھنے کے نتیجہ میں آپ بھی الٹ گئے اور چوٹ آئی، یہ اس کا شر ہوا۔ ہر چیز میں غور کرو گے تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ ہر چیز میں خیر کا پہلو بھی ہے اور شر کا بھی پہلو ہے۔

تعلیمات بذریعہ دعوات

تو نبی کریم ﷺ نے ہر چیز کے استعمال کے وقت جو دعائیں بتلائی ہیں اگر ان دعاؤں کا ہم اہتمام کریں تو بہت بڑا فائدہ حاصل ہو، لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ہم اپنے فائدے کی چیزوں میں بھی سنتوں کا اہتمام نہیں کرتے۔ اگر ہماری زندگی میں سنتوں کا اہتمام آجائے؛ تو خیر ہی خیر اور برکت ہی برکت ہو۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات کی روح اس کا نچوڑ اور خلاصہ مسنون دعائیں ہیں، آپ ﷺ نے اپنی دعاؤں کے ذریعہ لوگوں کو بڑی اہم تعلیمات دی ہیں۔ خیر! ابھی مَیں اس کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

نفرت کو دور رکھنے کا بہترین طریقہ

میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ ہر چیز کے اندر خوبی بھی ہے اور برائی ہے۔ عورت بھی دنیا کی ایک مخلوق ہے، اس کے اندر بھی کوئی برائی ہے تو کوئی خوبی بھی ہے، دونوں باتیں موجود ہیں، اب اس کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے اور اس سے کس طرح سے فائدہ اٹھانا چاہیے؟ حضور اکرم ﷺ اس کا طریقہ بتلا رہے ہیں کہ بھائی! جب اس کی طرف سے کوئی

ایسی بات پیش آئے جو آپ کے لئے تکلیف دہ ہے، آپ اس کی اس عادت کو پسند نہیں کرتے، تو اس وقت آپ اس ناپسندیدہ عادت سے اپنا دھیان ہٹانے کے لئے اس کی پسندیدہ چیزوں کا تصور کیجئے، نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی ناپسندیدہ عادت کی وجہ سے آپ کے دل میں اس کے متعلق ناگواری کے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں وہ رک جائیں گے۔ اور اگر ہم یہ طریقہ نہیں اپنائیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ دھیرے دھیرے کینہ اور بغض بڑھتا جائے گا اور ازواجی زندگی جہنم بن جائے گی اور پھر جدائی کی نوبت آجائے گی۔ عورت کے متعلق اپنے دل میں پیدا ہونے والی نفرت کو دور رکھنے کے لئے یہ بہترین طریقہ ہے۔

اللہ کے رجال اور ان کا کمال

درحقیقت انسان بڑا ناشکرا ہے، اور ناشکری کا انداز یہ ہے کہ وہ ایک ہی چیز کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، کسی ساتھی میں سو خوبیاں ہوں لیکن اگر اس کا ایک عیب اور برائی سامنے آئے گی تو اس کا تذکرہ بار بار کرے گا اور جو سو خوبیاں ہیں ان کا تذکرہ ہی نہیں کرے گا۔ اگر انسان کا یہ مزاج رہا تو کبھی بھی شکر کی عادت نہیں بنے گی۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں) کو بہت سخت بخار تھا، مَیں نے پوچھا کہ حضرت! کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ الحمدللہ! میری آنکھیں صحیح سلامت ہیں، کان سے بھی اچھی طرح فائدہ اٹھا رہا ہوں، ہاتھ پیر برابر کام کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ؛ ہر چیز گنوانے کے بعد فرمایا کہ بس! ذرا سا بخار ہے حالانکہ اس وقت ایک سو چار ڈگری بخار تھا لیکن دیکھو کہ کتنا شکر ادا کر کے بیان کیا۔ بیان کا یہ بھی ایک انداز ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتنی ساری نعمتیں ہیں اور یہاں تو مزاج کا سوال کیا گیا تھا اگر اس کے جواب میں شکوہ وشکایت کے طور پر نہیں بلکہ اظہارِ واقعہ کے طور پر بولتے: تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں تھی، مسئلہ اپنی جگہ پر یہی ہے، لیکن اللہ کے ان مخصوص بندوں کا یہ کمال ہے کہ ایسی حالت میں بھی وہ یہی کہتے ہیں کہ اللہ کا یہ بھی احسان ہے اور یہ نعمت بھی حاصل ہے، اور سب ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، ایک لمبی فہرست شمار کرانے کے بعد آخر میں فرماتے ہیں کہ بس! ذرا سا بخار ہے۔ اور ہمارا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

جس ہاتھ سے پوری زندگی میٹھی چیزیں کھاتا رہا

ایک آقا نے ککڑی کی قاش کاٹ کر اپنے غلام کو دی، اس نے اس کو کھائی، لیکن کوئی ایسا تأثر نہیں دیا اور اپنے چہرے سے بھی ذرہ برابر ظاہر ہونے نہیں دیا کہ یہ کڑوی ہے، حالانکہ وہ بہت کڑوی تھی، جیسے میٹھی ککڑی کھائی جاتی ہے ایسی ہی رغبت سے اس کو کھایا۔ اور دوسری خود اپنے منھ میں رکھی تب پتہ چلا کہ یہ تو بہت کڑوی ہے، اس نے اپنے اس غلام سے کہا کہ اللہ کے بندے! تو نے بتلایا کیوں نہیں کہ یہ ککڑی اتنی کڑوی ہے۔ اس کا جواب ہم لوگوں کے لئے بڑا قابل عبرت ہے۔ اس نے کہا کہ جس ہاتھ سے اب تک پوری زندگی میٹھی چیزیں کھاتا رہا؛ اگر ایک چیز کڑوی مل گئی تو کیا میں اس کا اظہار کروں؟ واقعہ یہی ہے کہ ہم لوگوں کا مزاج ناشکری والا بن گیا ہے، جس کو ٹھیک کرنا بہت ضروری ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیکھو! اگر کسی نے آپ کو آدھا گلاس پانی دیا تو اس کی تعبیر کے دو انداز ہیں، جس کی طبیعت میں ناشکری ہے وہ یوں کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے، اور جس کی طبیعت میں شکر ہے، وہ کہے گا کہ آدھا گلاس بھر کر دیا ہے۔

......تب ہی زندگی گذر سکتی ہے

بہرحال! حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر اپنی بیوی سے کوئی بات ناگواری کی اپنی طبیعت کے خلاف دیکھے، تو اس کے ساتھ بغض نہ رکھے، اس لئے کہ اگر اس کی ایک بات ناپسند آئی ہے، تو دوسری کوئی بات پسند آئے گی، ہمارا یہی انداز ہونا چاہیے؛ تب ہی زندگی گذر سکتی ہے۔ ورنہ اگر کسی ایک ایسی بات کو کوئی آدمی لے کر بیٹھ جاتا ہے جو اس کی طبیعت کے خلاف ہوئی ہے؛ تو پھر ایسے آدمی کو چاہیے کہ نکاح کا ارادہ ہی ترک کر دے، اس لئے کہ کوئی بھی عورت آئے گی اس میں کوئی نہ کوئی بات تو ایسی ضرور ہوگی، جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ کسی میں یہ خرابی دیکھی تو اس کو الگ کر دیا، پھر دوسری لائے، ویسے پہلی کو الگ کر دینے کے بعد دوسری عورت جلدی سے ملنے والی نہیں ہے، اور اگر مل گئی تو اس میں بھی وہی بات ہوگی، اب اس کے ساتھ بھی اسی طرح کیا تو تیسری کا معاملہ تو اور زیادہ سنگین ہو جائے گا۔ اور مان لو کہ اگر مل بھی گئی تو اس میں بھی وہی بات ہوگی۔ تو اب سوال پیدا ہوگا کہ اس کو بھی الگ کر دے گا؟ نہیں! بلکہ اب تو سوچے گا کہ اس کو تو ایسے ہی چلالو، اس کے ساتھ تو خدا واسطے سمجھوتہ کرلو۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ بھائی! یہ سمجھوتہ والی بات آج آپ کی سمجھ میں آئی؟ یہی معاملہ پہلی والی کے ساتھ کرتے تو دو دو کو طلاق دینے کی نوبت آتی؟

آں چہ کند دانا کند ناداں ❁ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ جو کام عقل مند کرتا ہے وہی کام بیوقوف بھی کرتا ہے، لیکن بیوقوف وہ کام بہت ساری خرابی پیدا ہونے کے بعد کرتا ہے، اور عقل مند آدمی پہلے ہی دن وہ کام کر لیتا ہے۔ بہرحال! نبی کریم ﷺ نے ہم کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کی ایک

بات اگر آپ کو ناپسند ہے، تو دوسری آپ کو پسند آئے گی۔

وفاداری سے اونچی چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟

حضرت اقدس تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ایک بزرگ کا قصہ بیان فرمایا ہے کہ ان کی بیوی بڑی جھگڑالو تھی، وہ جب بھی گھر میں آویں تو جھگڑا شروع کر دیتی تھی۔ وہ بڑے صبر سے کام لیتے تھے۔ کسی نے کہا کہ یہ کیا روز روز کی جھک جھک ہے، اس کو طلاق دے دو، انہوں نے کہا کہ بھائی! اس کو الگ کرنا تو بہت آسان ہے، جب چاہوں الگ کر دوں، اس میں کیا دیر لگتی ہے، یہ تو میرے ہاتھ کا معاملہ ہے، لیکن اس کے اندر ایک ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے مَیں اس کو الگ کرنا نہیں چاہتا۔ پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ بڑی وفادار ہے، اگر آج حکومت مجھے گرفتار کر لے، تو جاتے وقت مَیں اس کو جس جگہ چھوڑ کر جاؤں گا، اگر دس سال کے بعد بھی واپس آؤں گا تو وہ وہیں بیٹھی ہوئی مجھے ملے گی۔ اور واقعی بات ایسی ہی ہے۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی عورتوں میں وفاداری والا وصف بڑا قابلِ رشک ہے، یہ تو آپ یوروپ و امریکہ جا کر پوچھو، وہاں یہ جنس گراں مایہ آپ کو نہیں ملے گی، وہاں تو یہ چیز بالکل ہی مفقود ہے، اور اب تو وہ برائیاں ہمارے سماج میں بھی آرہی ہیں، ہمارے یہاں بھی دیکھو گے تو ایسے لوگ آپ کو ملیں گے۔ تو ان کی وفاداری سے اونچی چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ اس وصف کی خاطر تو سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے، اس کی دوسری ساری کمی کوتاہیوں کو برداشت کیا جا سکتا ہے، اسی لئے عورت کی اس خوبی کو مدِنظر رکھنے کی تاکید کی جارہی ہے۔ بگڑی ہوئی بند گھڑی کا حال مَیں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانہ میں

حضرت مفتی محمد تقی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ جو گھڑی بند پڑی ہے، وہ بھی چوبیس گھنٹے میں دو مرتبہ صحیح وقت بتلاتی ہے، مثلاً نو (۹) بجے بند ہوگئی ہے، تو جب رات کے نو (۹) بجیں گے تو اس میں بھی نو (۹) بتائے گی، اور اسی طرح دن میں بھی ہوگا، تو چوبیس گھنٹے میں دو وقت وہ بھی صحیح وقت بتلاتی ہے۔ اس مثال کا حاصل صرف اتنا ہی ہے کہ کسی بھی چیز کو بالکل بے کار اور مہمل نہ سمجھو، یہ نہ سمجھو کہ اس میں کوئی خوبی ہے ہی نہیں، جس کو تم بالکل بے کار سمجھ رہے ہو؛ اس میں بھی کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوگی۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانہ میں ❁ کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانہ میں

(اقبال)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عورتوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے جو تاکید فرمائی ہے اسی کا بیان چل رہا ہے۔ آج ایک روایت پیش کرتے ہیں۔

۲۷۶. وَعَنْ عَمْرِو بْنِ الْأَحْوَصِ الْجُشَمِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ النَّبِيَّ ﷺ فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ يَقُولُ بَعْدَأَنْ حَمِدَاللهَ تعالىٰ وَ أَثْنٰى عَلَيْهِ وَذَكَّرَوَوَعَظَ، ثُمَّ قَالَ: أَلَاوَاسْتَوْصُوابِالنِّسَآءِ خَيْراً، فَاِنَّمَاهُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئاً غَيْرَ ذٰلِكَ، اِلَّاأَن يَّأْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ، فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ، وَاضْرِبُوهُنَّ ضَرْباًغَيْرَمُبَرِّحٍ، فَاِنْ أَطَعْنَكُمْ فَلَاتَبْغُواعَلَيْهِنَّ سَبِيْلاً؛ أَلَا اِنَّ لَكُمْ عَلىٰ نِسَآئِكُمْ حَقًّا وَلِنِسَآئِكُمْ عَلَيْكُمْ حَقًّا؛ فَحَقُّكُمْ عَلَيْهِنَّ أَن لَّا يُوطِئْنَ فُرُشَكُمْ مَنْ تَكْرَهُوْنَ، وَلَا يَأْذَنَّ فِي بُيُوتِكُمْ لِمَنْ تَكْرَهُوْنَ، أَلَا وَحَقُّهُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ تُحْسِنُوْا اِلَيْهِنَّ فِي كِسْوَتِهِنَّ وَطَعَامِهِنَّ.

(رواه الترمذی وقال حديثٌ حسنٌ صحيحٌ)

حضرت عمرو بن احوص جشمی رضی اللہ عنہ سے فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو حجۃ الوداع میں فرماتے ہوئے سنا جس میں آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت بھی فرمائی، آپ نے فرمایا: سنو اور آگاہ ہو جاؤ! عورتوں کے سلسلہ میں میری طرف سے بھلائی اور حسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو، یہ عورتیں تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں، اس کے علاوہ اور کسی اور چیز کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ البتہ اگر وہ کھلّم کھلاّ کسی فاحشہ کا ارتکاب کریں، اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو پھر اصلاح کے لئے ان سے بستر الگ کرلو، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر ان کی ایسی پٹائی بھی کرسکتے ہو جو سخت نہ ہو۔ پھر اگر وہ تمہاری بات ماننے لگیں تو پھر آگے کوئی سخت اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے سنو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جس کے آنے کو تم پسند نہیں کرتے، اور تمہارے گھر میں بھی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جن کا آنا تمہیں

گوارا نہیں ہے۔ سنو! اوران کا حق تم پر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے لباس اوران کے کھانے پینے کے معاملہ میں اچھائی اور بھلائی کا سلوک کرو۔

حجۃ الوداع کا مختصر پس منظر

حجۃ الوداع یعنی ۱۰ھ میں نبی کریم ﷺ نے جو حج فرمایا تھااور حج کی فرضیت کے بعد یہی ایک حج نبی کریم ﷺ نے کیا ہے اور آپ نے پہلے ہی سے اعلان فرما دیا تھا کہ مَیں اس سال حج کرنے والا ہوں، تم لوگ بھی میرے ساتھ چلو، چنانچہ صحابہ کرام کی بہت بڑی تعداد اور بہت بڑا مجمع نبی کریم ﷺ کے ساتھ حج کے لئے چلا، اور اسی موقع پر آپ نے صحابہ کرام سے یہ بھی فرمایا تھا کہ شاید آئندہ مَیں تم کو نہ دیکھ سکوں اور تم سے ملاقات نہ ہو سکے، گویا آپ نے ایسا انداز اختیار فرمایا جیسے کوئی رخصت ہونے والا اور الوداع کہنے والا اختیار کرتا ہے، گویا یہ ایک الوداعی پروگرام تھا اسی لئے اس حج کو حجۃ الوداع سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ گویا آپ کو معلوم تھا کہ اتنا بڑا مجمع جس کے سامنے مَیں اپنی باتیں پیش کر رہا ہوں، دوبارہ جمع ہونے والا نہیں ہے، اور پھر ایسی باتیں کہنے کا دوبارہ موقع ملنے والا نہیں ہے۔ اس میں آپ ﷺ نے اپنی امت کو ان کی زندگی میں پیش آنے والی اہم اہم چیزوں کی طرف رہنمائی فرمائی، اور جہاں جہاں آپ کو اندیشہ تھا کہ امت کا پاؤں پھسل سکتا ہے، یا اس معاملہ میں امت راہِ راست سے ہٹ سکتی ہے، گمراہی میں مبتلا ہوسکتی ہے؛ ایسے امور کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے بڑے اہتمام سے رہنمائی فرمائی۔

اس حج میں نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ دیا تھا، جو بڑا عظیم الشان ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو ان خاص خاص چیزوں کی تاکید و وصیت فرمائی تھی جن کے متعلق آپ کو خطرہ تھا کہ امت ان کی وجہ سے فتنوں میں مبتلا ہوسکتی ہے، یا امت کی

طرف سے ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی واقع ہوسکتی ہے، ایسی اہم اہم چیزیں ارشاد فرمائی تھیں، اور ایسے موقع پر آدمی اہم چیزوں کو ہی بیان کیا کرتا ہے۔ ویسے تو یہ خطبہ بڑا لمبا ہے، اس میں بہت ساری چیزیں ہیں لیکن حضرات محدثین موضوع کی مناسبت سے اس کے مختلف اجزاء کو اپنی کتابوں میں پیش کرتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کو اندیشہ تھا

حضرت عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت بھی فرمائی۔ چونکہ اس خطبہ میں نبی کریم ﷺ نے اور بھی بہت ساری باتیں ارشاد فرمائی تھیں اور راوی ان چیزوں کا تذکرہ چھوڑ رہے ہیں اس لئے انہوں نے اجمالی طور پر کہا ﴿ذَكَّرَ وَوَعَظَ﴾ اور پھر راوی آپ کے خطبہ کے اس اہم جزو کو نقل فرماتے ہیں جس کو اس بیان سے مناسبت ہے۔

اس خطبہ میں نبی کریم ﷺ نے عورتوں کے حقوق کے متعلق بڑی اہمیت کے ساتھ امت کو متوجہ کیا، جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عورتوں کے حقوق کی ادائیگی کا معاملہ بھی ان امور میں سے تھا جن کے متعلق نبی کریم ﷺ کو یہ اندیشہ تھا کہ امت کی طرف سے اس کی ادائیگی کے معاملہ میں کوتاہی کا صدور ہوسکتا ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اپنے اس خطبہ میں بڑی اہمیت کے ساتھ جو چیزیں ارشاد فرمائیں ان میں اس کو بھی شامل فرمایا۔

چنانچہ فرمایا ﴿أَلَا وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا﴾ کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے عربی زبان میں لفظ ﴿أَلَا﴾ استعمال کیا جاتا ہے، سنو اور آگاہ ہو جاؤ، عورتوں کے سلسلہ میں میری طرف سے بھلائی اور حسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو، مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھائی کا سلوک کرو۔ عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید دوسرے موقعوں پر

بھی فرمائی ہے لیکن اس موقع پر بھی نبی کریم ﷺ نے اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس بات کی وصیت و نصیحت فرمائی۔

عورتیں تمہارے پاس قیدی ہیں

پھر نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے واسطے ان کا ایک ایسا عجیب و غریب وصف بیان فرمایا کہ اگر آدمی اس وصف پر غور کرے تو یقیناً کبھی بھی عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کے معاملہ میں کوتاہی نہیں کرے گا ﴿فَإِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ﴾ علامہ نوویؒ نے اسی کو فرمایا ہے ﴿عَوَانٍ أَیْ أَسِیْرَاتٌ جَمْعُ عَانِیَةٍ .شَبَّهَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَلْمَرْأَةَ فِیْ دُخُوْلِهَا تَحْتَ حُكْمِ الزَّوْجِ بِالْأَسِیْرِ﴾ "عَوَانٍ" "عَانِیَةٌ" کی جمع ہے، عربی زبان میں "عَانِیْ" قیدی کو کہتے ہیں، اس کا مؤنث "عَانِیَةٌ" ہے، یعنی قیدی عورت ہو تو اس کو "عَانِیَةٌ" کہا جائے گا۔

گویا نبی کریم ﷺ حسنِ سلوک کی جو تاکید فرما رہے ہیں اس میں آپ نے ان کا ایک ایسا وصف بیان کیا کہ آدمی اگر اس وصف کو سوچے تو کبھی اس کے ساتھ زیادتی اور بے انصافی کا معاملہ نہیں کر سکتا، اور وہ وصف بیان کیا ﴿فَإِنَّمَا هُنَّ عَوَانٍ عِنْدَكُمْ﴾ یہ عورتیں تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں یعنی نکاح کے بعد وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کی حیثیت تمہارے یہاں قیدی جیسی ہوگئی، یہ وہ شخصیت ہے کہ جس نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کر دیا ہے۔

قابلِ غور مضمون

سوچنے کی چیز ہے کہ ایک نادان اور ناتجربہ کار لڑکی جس نے ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے اس کی پیدائش گھر میں اپنے ماں باپ کے یہاں ہوئی، وہیں پلی بڑھی، وہیں اس کی

تعلیم و تربیت ہوئی، وہیں اپنے بھائی بہنوں میں، رشتہ داروں اور سہیلیوں میں پروان چڑھی، اپنے ملنے والوں میں بڑے آرام وراحت سے زندگی گذار رہی تھی، جب عمر کی اس منزل میں پہنچی جس میں عورت کو نکاح کے بعد خاوند کے حوالہ کیا جاتا ہے، اس وقت اس کے ماں باپ نے اس کا رشتہ تمہارے ساتھ طے کر کے نکاح کر کے تمہارے حوالہ کر دیا، اب تمہارے یہاں اس کے لئے بالکل اجنبی ماحول ہے، اس نے بالکل اجنبی گھر میں ایک اجنبی شخص کے حوالہ اپنے آپ کو کر دیا ہے۔ ہم اگر کسی اجنبی ماحول میں ایک دو دن کے لئے پہنچ جاتے ہیں اور اجنبی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، تو وہاں ہم پر جو کچھ گذرتی ہے اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیسی مشقت اور تکلیفیں لاحق ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے کیسی مصیبتوں میں گرفتار ہونا پڑتا ہے۔ لیکن یہ عورت زندگی بھر کے لئے اپنے اصلی ماحول کو چھوڑ کر آئی ہے۔ غور کیجئے کہ اس نے کتنی بڑی قربانی دی ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر شوہر عورت کی صرف اسی ایک قربانی پر غور کرے تو کبھی بھی اس کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی ماں کو چھوڑا، باپ کو چھوڑا، اپنے اُس گھر کو چھوڑا؛ جہاں پیدا ہوئی، پلی بڑھی، اپنے بھائی بہنوں کو چھوڑا، اگر دادا دادی، نانا نانی ہیں؛ تو ان کو چھوڑا، دوسرے تمام رشتہ داروں کو چھوڑا، اپنے بچپن کی سہیلیوں کو چھوڑا۔

اپنے گھر سے کس کو تعلق نہیں ہوتا؟

اپنے وطن اور پیدائش والے گھر کے ساتھ کس کو تعلق نہیں ہوتا؟ ہم لوگ اپنی عمر کی جس منزل میں ہیں، وہاں پہنچنے کے بعد بھی اگر ہم وطن سے دور ہو جائیں تو کچھ دنوں تک تو ہوسکتا ہے کہ صبر وتحمل سے کام لیں، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ آدمی کو وطن کی یاد آتی ہی ہے۔

ہجرت کے موقعہ پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مدینہ منورہ کی آب و ہوا ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے باہر کا کوئی آدمی جب وہاں جاتا تھا تو وہ ایک مخصوص قسم کے بخار میں مبتلا ہو جاتا تھا، یہ حضرات بھی وہاں جانے کے بعد اسی بیماری میں مبتلا ہوئے، ان بیمار ہونے والوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت موجود ہے کہ جب مَیں اپنے والد حضرت ابوبکر کی عیادت کے لئے اور تیمارداری کے لئے پہنچی تو وہ مکہ مکرمہ کی یاد اور فراق میں اشعار پڑھ رہے تھے، اسی طرح حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ بھی مکہ مکرمہ کی یاد میں اشعار پڑھ رہے ہیں (بخاری شریف، ۳۹۲۶) معلوم ہوا کہ اپنے وطن اور گھر کی یاد فطری چیز ہے۔

......تو ہمارے دل پر کیا گذرے گی؟

اب یہ لڑکی جو اپنے والدین کے یہاں سے سب چھوڑ چھاڑ کر، سب کچھ قربان کر کے رخصت ہو کر آپ کے یہاں آگئی، آخر کس بنیاد پر؟ حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر ہم سے یہ کہا جائے کہ تمہارا نکاح ہونے والا ہے اور نکاح کے بعد آپ کو اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور اپنا گھر جس میں آپ پیدا ہوئے، پلے بڑھے اور پروان چڑھے، اس سب کو چھوڑ کر دوسرے گھر منتقل ہونا ہے اور ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو کر رہنا ہے، تو سوچو! ہمارے دل پر کیا گذرے گی؟

ہمارے لئے بہت بڑا سبق ہے

اللہ تعالیٰ نے شریعتِ مطہرہ کے ذریعہ سے نکاح کے واسطے جو طریقہ مقرر فرمایا

ہے اس میں صرف دو بول رکھے ہیں، ایک طرف سے کہا جاتا ہے کہ نکاح میں دیا، دوسری طرف سے اس کو منظور رکھا جاتا ہے کہ قبول کیا۔ چاہے پہلے لڑکی کی طرف سے کہا جائے، اورلڑکا جواب میں قبول کرے، یا پہلے لڑکا کہے اور جواب میں لڑکی قبول کرے۔ پہلا جو جملہ بولا جاتا ہے اس کو فقہاء کے یہاں ایجاب کہتے ہیں اور جواب میں جو جملہ بولا جاتا ہے اس کو قبول سے تعبیر کرتے ہیں۔ خیر! ان دو بولوں کی اس صنفِ نازک اور ایک کمزور و نادان لڑکی نے اتنی لاج رکھ لی کہ اپنا سب کچھ قربان کر کے وہ آپ کی ہو کر رہ گئی۔

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اس میں ہم لوگوں کے لئے بہت بڑا درس اور سبق ہے کہ ایک کمزور مخلوق ان دو بولوں کا اتنا خیال، اتنا لحاظ اور اتنی رعایت کرتی ہے کہ اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے اور آپ کی بن جاتی ہے، اور ہم بھی دو بول کہتے ہیں ﴿لاالٰہَ اِلَّااللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ﴾ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرتے ہیں اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں؛ اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے احکام اور نبی کریم ﷺ کے طریقوں کو اپنانے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، اُن دو بولوں کی خاطر جو قربانی اُس لڑکی نے دی، کیا اِن دو بولوں کی خاطر ایسی قربانی ہم دیتے ہیں؟

کوئی بھی اس کا حمایتی نہیں

اور واقعہ یہ ہے کہ عورت کی حیثیت شوہر کے یہاں قیدی کی سی ہے، نبی کریم ﷺ نے بہت عمدہ تعبیر فرمائی ہے، آپ ﷺ سے زیادہ بلیغ اور کون ہوسکتا ہے۔ ایسی عمدہ تعبیر ہے کہ عورتوں کی اس حیثیت کو جو شوہر کے یہاں ہے، اس سے اچھے انداز میں پیش نہیں کیا جاسکتا ﴿فَاِنَّمَاھُنَّ عَوَانٍ عِنْدَ کُمْ﴾ وہ تمہارے پاس قیدی ہیں۔ اور پھر کمال تو یہ ہے کہ اس کا کوئی سپورٹر (Supporter) بھی نہیں ہے یعنی اگر اس کے ساتھ شوہر کی طرف

سے، ساس کی طرف سے خسر کی طرف سے، نند کی طرف سے، دیور کی طرف سے، جیٹھ کی طرف سے، اور اگر گھر میں دوسرے افراد موجود ہیں جیسے دادی ساس، دادا خسر، نانی ساس، نانا خسر وغیرہ جتنا بڑا کنبہ ہوگا اسی مناسبت سے افراد بھی بڑھتے جائیں گے؛ ان میں سے کسی کی طرف سے کوئی زیادتی، کوئی طعن وتشنیع یا اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوجائے تو اس کا کون ہے؟ کوئی بھی اس کا حمایتی نہیں ہے، حضورِ اکرم ﷺ یہ جملہ ارشاد فرما کر عورت کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمارہے ہیں کہ جیسے قیدی کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جاتا ہے، اسی طرح آپ بھی اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کیجیے۔

نکاح سے صرف ملکِ متعہ حاصل ہوتی ہے

اب آگے ایک اہم سوال ہے کہ شوہر جب نکاح کر کے بیوی کو اپنے گھر میں لاتا ہے تو اس کو اس نکاح کے نتیجہ میں بیوی کے اوپر کتنا اختیار اور کتنی (اتھارٹی) حاصل ہوتی ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿لَیْسَ تَمْلِکُوْنَ مِنْهُنَّ شَیْئًا غَیْرَ ذٰلِکَ﴾ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی عجیب بات ارشاد فرمائی ہے کہ یہ تمہارے گھر میں رہے، باہر نہ جائے؛ بس! اس کے علاوہ اور کسی چیز کے تم مالک نہیں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ نکاح جس مقصد کے لئے کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ شوہر اپنی فطری ضرورت پوری کرے، توالد وتناسل، اولاد کی پیدائش کا سلسلہ جاری رہے، شریعت نے نکاح کو صرف اسی لئے مشروع کیا ہے۔ نکاح کا یہی ایک مقصد ''عورت سے استمتاع'' ہے، اس نکاح کے ذریعہ سے شوہر کو عورت سے صحبت، مجامعت اور وطی کر کے فائدہ اٹھانے کا اختیار شریعت نے دیا ہے۔ چنانچہ فقہاء اسی کو ایک خاص لفظ ''ملکِ متعہ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ ''متعہ'' فائدہ اٹھانے کی چیز کو کہا جاتا ہے۔ گویا ایک مخصوص قسم کا فائدہ صحبت، مجامعت اور وطی کر کے

ایک مرد عورت سے حاصل کرتا ہے، صرف اور صرف اسی ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے شریعت نے نکاح کو مشروع کیا ہے۔ چنانچہ تمام کتب فقہ اٹھا کر آپ دیکھ لیجیے کہ نکاح کے نتیجہ میں شوہر کو عورت کے اوپر جو ملکیت و اختیار حاصل ہوتا ہے، تو وہ کون سی ملکیت ہے؟ یہی فائدہ اٹھانے کی ملکیت ملتی ہے۔

کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے

پہلے زمانہ میں باندیاں بھی ہوا کرتی تھیں، کوئی اس کو خرید کر لاتا تو اس کو "ملکِ رقبہ" کہا جاتا تھا یعنی آقا اس کی ذات کا مالک ہوا کرتا تھا اور اس کے اختیارات تو بہت ہوتے تھے لیکن یہاں ایسا نہیں ہے۔ یہ تو ایک آزاد عورت ہے۔ جب نکاح کر کے اس کو اپنے یہاں لائے تو اس نکاح کے نتیجہ میں آپ کو اس پر شریعت نے صرف اور صرف اتنا ہی اختیار دیا کہ آپ اس سے فائدہ اٹھانے کے مالک بنے؛ اسی کو "ملکِ متعہ" کہتے ہیں۔ چونکہ یہ فائدہ اٹھانے کے لئے اس کی طبیعت چوبیس گھنٹے میں کسی بھی وقت آمادہ ہو سکتی ہے، اس کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے، معلوم نہیں طبیعت میں کب انتشار پیدا ہو اور کب عورت کی طرف رجحان و میلان پیدا ہو اور یہ فائدہ اٹھانے کی کب ضرورت پیش آ جائے؛ اس لئے عورت کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ چوبیس گھنٹے تم کو گھر میں ہی رہنا ہے۔

نفل روزہ کے لئے شوہر کی اجازت لازم ہے

اور جس مقصد کے لئے یہ نکاح کیا گیا ہے اس کی شریعت نے اتنی رعایت کی کہ شوہر کہیں سفر پر نہیں ہے اُس زمانہ میں عورت اگر نفل روزہ رکھنا چاہتی ہے تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر نفل روزہ نہیں رکھ سکتی، اس کو پہلے سے

پرمشن (Permission) لینی پڑے گی، پہلے شوہر سے پوچھ لے کہ کل روزہ رکھنے کا میرا ارادہ ہے رکھوں؟ شوہر کہے کہ ٹھیک ہے، رکھ سکتی ہو؛ تو روزہ رکھے۔ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کو روزہ نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر شوہر کو اطلاع کر دی اور اس نے خاموشی اختیار کی اور اس کا وطیرہ اور انداز ایسا ہے کہ خاموشی بھی اجازت سمجھی جاتی ہے؛ تو اس کی خاموشی بھی اسی حکم میں شمار ہوگی۔ تو دیکھو! اگر شوہر نے کہا کہ مجھے صحبت کی ضرورت ہے اور وہ کہے کہ میرا تو روزہ ہے، تو رکاوٹ آجائے گی، اس لئے شریعت نے نفل روزہ کے لئے شوہر کی اجازت کو لازم قرار دیا ہے، کیونکہ روزہ کی وجہ سے شوہر اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

چاہے روٹی جل جائے

اور عورت کو چوبیس گھنٹے گھر میں رہنے کا جو پابند بنایا ہے اس کی بھی وجہ دراصل یہی ہے کہ شوہر کا جب جی چاہے اس سے فائدہ اٹھائے۔ اور شوہر کا سب سے بڑا حق یہی ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر عورت گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، اس لئے کہ اگر وہ باہر گئی اور ادھر شوہر کو ضرورت پیش آئی تو؟ اس لئے شوہر کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتی۔

بلکہ شوہر کی اس ضرورت کا اتنا لحاظ کیا گیا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ عورت روٹی پکا رہی ہے اور روٹی توے پر ڈال دی ہے اور شوہر کو ضرورت پیش آئی اور اس نے مطالبہ کیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس بات کی پرواہ مت کرو کہ روٹی جل جائے گی، پہلے شوہر کی ضرورت پوری کرو۔ (المعجم الکبیر، ۸۲۴۰)

غیر اسلامی معاشرہ اور رسموں کی تباہی

شریعت کی نگاہ میں عفت وعصمت اور پاکدامنی کا بہت زیادہ اہتمام ہے۔

ہمارے ماحول میں غیر اسلامی رسمیں گھس جانے اور غیر اسلامی معاشرتی آداب جو خود ہم نے گھڑ رکھے ہیں ان کی وجہ سے ہم لوگوں کو یہ باتیں قابلِ تعجب معلوم ہوتی ہیں جیسے ماں باپ گھر میں ہوں تو بیوی سے کیسے صحبت کی جاسکتی ہے۔ بہت سی جگہ پر تو- جہاں مشترک فیملی والا بڑا خاندان ہوتا ہے- بیچارہ شوہر کئی کئی دن تک ترس کر رہ جاتا ہے، اس کو ملاقات کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اب آپ ہی بتلائیے کہ اس آدمی کی جب ضرورت پوری نہیں ہوگی تو آخر اس کے لئے وہ کوئی نہ کوئی راستہ تو تلاش کرے گا ہی۔ شریعت نے نکاح کے بعد اپنے لئے کم سے کم ایک الگ کمرہ ہونے کا کہا ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ جب اس کے دل میں تقاضہ پیدا ہو تو وہ اپنی ضرورت پوری کر سکے اور بیوی کو بھی پابند بنایا کہ تم کو اسی لئے اس کے یہاں بھیجا ہے۔

اور اگر وہ عورت اپنی طبیعت کی کمزوری کی وجہ سے، بیماری کی وجہ سے، یا (Health) کی وجہ سے اس کی متحمل نہیں ہے، اور آدمی کی طبیعت میں قوت زیادہ ہے تو اسی کی رعایت کرتے ہوئے شریعت نے مزید دو، تین، چار تک نکاح کرنے کی اجازت دی ہے؛ لیکن زنا کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں دی، اس کو بالکل حرام قرار دیا ہے۔

سماج کی خطرناک صورتِ حال

آج ہمارے سماج و معاشرہ میں لوگوں نے دوسرا نکاح کرنا عیب بنا رکھا ہے، حالانکہ وہی آدمی برائیوں میں، بدکاریوں میں، زناکاریوں میں مبتلا ہے، گھر والے سب جانتے ہیں، خاندان والوں کو معلوم ہے، بیٹے بڑے ہو چکے ہیں، ان کو بھی معلوم ہے کہ باپ بدراہی پر آچکا ہے، لیکن اگر بیٹوں سے بھی کہتے ہیں کہ والد صاحب کی دوسری شادی کرادو؛ تو وہ منع کریں گے۔ کیوں؟ اس لئے کہ نئی بیوی آئے گی تو املاک

کے اندر حصہ دینا پڑے گا۔ ہمارا ذہن کہاں جاتا ہے، اللہ کی پناہ۔ بات تو اصل اتنی ہی ہے اور کچھ نہیں۔ اس کے نتیجہ میں کہاں کہاں کیا کیا ہو رہا ہے۔ وہ عورت بھی نادان ہے، وہ خود تو اپنی کمزوری، اپنی بیماری اور اپنی عمر کے تقاضہ کی وجہ سے حق ادا کرنے سے قاصر ہے، اس کے باوجود اجازت نہیں دیتی، حالانکہ اس کی اجازت شریعت نے ضروری نہیں رکھی ہے۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے، لیکن پھر بھی وہ رکاوٹیں ڈالنے کی کوششیں کرتی ہے، پھر اگر شوہر دوسری راہ تلاش کر لے اور پتہ چلے تو اس کو مان لے گی، یہ اس کو گوارہ ہے، اس پر خاموشی اختیار کر لے گی۔ ہم تو چونکہ دارالافتاء لے کر بیٹھے ہیں اس لئے ہمارے پاس تو ایسے بے شمار کیس آتے ہیں۔

بلکہ مَیں آپ کو بتاؤں کہ اب تو یہاں تک ہو گیا ہے کہ مثلاً خوش حال گھرانہ ہے، شوہر کو اللہ تعالیٰ نے مال وثروت دے رکھا ہے، اس کو خیال آتا ہے کہ مَیں دوسری بیوی کو نبھا سکوں گا، اب جیسے ہی بیوی کو یہ اندیشہ ہوتا ہے تو وہ کام کاج کے لئے نوجوان اور پُرکشش نوکرانی رکھتی ہے اور اس کو خوب پیسے دیتی ہے اور پھر صبح کے وقت اس سے کہتی ہے کہ جاؤ! بھائی کو اٹھا کر آؤ۔ بیوی جانتی ہے کہ یہ وہاں جائے گی تو کیا ہونے والا ہے، لیکن کچھ بھی نہیں ہمارے سماج میں ایسے قصے ہو رہے ہیں اور ہمارے پاس تو آتے ہیں۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟

صبح تک فرشتے لعنت کرتے ہیں

شریعت نے جو یہ کہا ہے کہ عورت شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی؛ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ اور شریعت نے شوہر کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا اتنا زیادہ اہتمام کرایا کہ حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ اگر شوہر نے عورت کو اپنی

ضرورت پوری کرنے کے لئے بلایا لیکن وہ نہیں آئی اور شوہر اس کی وجہ سے صبح تک ناراض رہا؛ تو ایسی عورت پر فرشتے صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔ (بخاری شریف، ۳۲۳۷) کتنا سخت ارشاد ہے!!

اور بھی سن لیجیے۔ تین آدمی ایسے ہیں جن کی نماز قبولیت کے لئے ان کے سر سے اوپر نہیں جاتی، ان میں ایک وہ عورت بھی ہے جس کا شوہر اس سے ناراض ہو (مصنف بن ابی شیبہ، ۴۱۰۹) ایسی بے شمار احادیث ونصوص آخر کیوں بیان کئے گئے ہیں؟ آپ صرف اس کے ظاہری اسباب کو نہ دیکھئے، دراصل آدمی کی پاک دامنی اور عفت وعصمت کی حفاظت کے لئے شریعت نے ایک نظام بنایا ہے، اور شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس نظام میں ذرہ برابر رخنہ اندازی نہیں ہونی چاہیے، اگر رخنہ پڑا تو پھر سب معاملہ گڑ بڑ ہو جائے گا۔

زنا کی سزا اتنی سخت کیوں؟

اسی لئے عفت وعصمت کی خلاف ورزی پر سخت سے سخت سزائیں مقرر کی ہیں مثلاً کوئی آدمی زنا کر لے، تو اگر شادی نہیں ہوئی ہے تو سو کوڑے مارے جائیں گے، اور اگر شادی شدہ ہے اور زنا کرے، تو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے گا کہ شادی ہو گئی ہے اور اس کے بعد بھی ایسا کیا؟ یعنی تیرے لئے تو اس گناہ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا، تیری ضرورت پوری کرنے کے لئے تو جگہ موجود تھی، اس کے باوجود تو نے ایسا کیوں کیا؟

''ملکِ متعہ'' کا مطلب

بہرحال! مَیں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ نکاح کے نتیجہ میں شوہر فقط اس سے فائدہ اٹھانے کا مالک ہوتا ہے۔ جہاں مسئلے بتلائے جاتے ہیں وہاں اسی کو فقہاء ''ملکِ متعہ''

سے تعبیر کرتے ہیں۔اب مصیبت تو یہ ہے کہ ہمارے پڑھنے والے طلبہ بھی لفظ ’’متعہ‘‘ کا حقیقی مطلب نہیں سمجھتے، پتہ نہیں کیا سے کیا سمجھتے ہیں۔حالانکہ ’’متعہ‘‘ کا مطلب تو صرف اتنا ہی ہے کہ فائدہ اٹھانے کی چیز۔اور فائدہ اٹھانے کا جو حق دیا گیا اسی کو ’’ملکِ متعہ‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے،اور نکاح اسی لئے کیا جاتا ہے۔

نکاح کیوں کروایا جاتا ہے؟

اب ہمارے سماج میں اس کے علاوہ دوسرے مقاصد کیا ہیں وہ بھی دیکھئے۔مثلاً نکاح اس واسطے کرر ہے ہیں کہ گھر میں کوئی کام کرنے والی نہیں ہے،اس لئے بیٹے کا نکاح جلدی کرادو،نکاح کراتے وقت ہی یہ جذبہ کارفرما ہے۔خیر!وہ بھی ضمناً ہو،اور دونوں طرف سے تعاون ہو؛ تو کوئی گناہ بھی نہیں ہے،لیکن بعض ماں باپ اسی لئے نکاح کروا کر لاتے ہیں حالانکہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ بیٹا نامرد ہے،پہلے بھی ایک شادی ہو چکی تھی، عورت کے حق ادا کرنے کی اس میں طاقت ہی نہیں ہے،ڈاکٹروں سے معاینہ کروایا جاچکا ہے،تمام ڈاکٹروں نے متفقہ طور پر رپورٹ دے دی ہے کہ وہ عورت کا حق ادا کرنے کے قابل نہیں ہے،پھر بھی یہ چیز لڑکی والوں سے چھپا کر نکاح کروادیتے ہیں،اس کے بعد کتنے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں؛ یہ ہم اور آپ سب جانتے ہیں،جس کی تفصیل میں جانے کی اس وقت ضرورت نہیں ہے۔حالانکہ شریعت نے نکاح تو عفت و پاکدامنی کے لئے رکھا تھا،لیکن ایسا نکاح تو زنا کا دروازہ کھولتا ہے،اور ایسے واقعات ہورہے ہیں،اس لئے مَیں بہت واضح طور پر یہ بات پیش کررہا ہوں۔لہٰذا ماں باپ کو اس طرف بھی خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عورتوں کے متعلق نبی کریم ﷺ نے جو تاکید فرمائی ہے اسی کا بیان چل رہا ہے، اس سلسلہ میں کچھ باتیں گذر چکی ہیں آج اس سے آگے کچھ اور باتیں پیش کی جاتی ہیں۔

کھانا پکانا عورت کے ذمہ نہیں

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ سنو! عورتوں کے سلسلہ میں میری طرف سے بھلائی اور حسنِ سلوک کی نصیحت قبول کرو، اس لئے کہ وہ تمہارے ماتحت قیدی کی حیثیت سے ہیں۔

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿لَیسَ تَملِکُونَ مِنهُنَّ شَیئاً غَیرَ ذٰلِکَ﴾ یہ تمہاری ماتحتی میں ہیں، اور ایک مرد ایک عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے اسی کے لئے نکاح ہوا ہے، بس! اس کے علاوہ اور کوئی اختیار تم کو ان پر حاصل نہیں ہے۔

فقہاء اور شراحِ حدیث نے اس جملہ کی جو تشریح کی ہے، مردوں کے مجمع میں جب اس کو بیان کیا جاتا ہے تو مردوں کے تیور بدل جاتے ہیں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ تمہاری ماتحتی میں ہیں اور ایک مرد عورت سے جو فائدہ اٹھاتا ہے وہ تم اس سے اٹھا سکتے ہو اور اسی لئے اس کو گھر میں رہنے کا پابند کیا گیا ہے، بس! یہ اس کی ذمہ داری ہے، باقی اس کے علاوہ اس کے متعلق جو کچھ سمجھا جاتا ہے، ایسی کوئی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی، یہاں تک کہ کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی شرعاً عورت کی نہیں ہے۔

عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں

ویسے فقہاء نے لکھا ہے کہ دو قسم کی عورتیں ہیں، ایک تو وہ عورت ہے جو بیوی بن کر آپ کے گھر میں آئی اس سے پہلے اپنے گھر میں جہاں رہتی تھی وہاں بھی کھانا پکایا

نہیں کرتی تھی بلکہ اس کے ماں باپ کے یہاں اس کو پکا پکایا کھانا ملا کرتا تھا؛ تو اس صورت میں شوہر پر دیانۃً یعنی فیما بینہ وبین اللہ اور قضاءً یعنی فیما بینہ وبین الناس یہ لازم ہے کہ پکا پکایا کھانا لا کر مہیا کرے، اگر شوہر عدالت میں جائے گا تو وہاں سے بھی یہی حکم دیا جائے گا کہ اس عورت کو پکا پکایا تیار کھانا لا کر دیا کرو، اور عورت اس کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

آپ لوگ کہیں گے کہ عورتوں تک آواز جا رہی ہے اور وہ سن رہی ہیں، اب تو ہمارے لئے مسائل کھڑے ہو جائیں گے۔

ہمارے ایک دوست پوچھ رہے تھے کہ اتوار کا دن آتا ہے تو بیوی کہہ دیتی ہے کہ آج تو مَیں کھانا نہیں پکاؤں گی، باہر سے تیار کھانا منگوا دو؛ اس کا یہ کہنا کیسا ہے؟ مَیں کیا کروں؟ مَیں نے کہا کہ وہ صرف ایک دن کہتی ہے یہی غنیمت ہے، شکر ادا کرو، اگر آج کا بیان سن لے گی تو پتہ نہیں وہ کیا کہے گی۔

خیر! فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر وہ پکا پکایا کھانے کا مطالبہ کرے تو اس کے لئے وہ مہیا کیا جائے گا، آپ کا اور آپ کے بچوں کا کھانا پکانے کی بھی ذمہ داری اس کی نہیں ہے۔

تب صرف اپنا کھانا پکائے گی

اور دوسری عورت وہ ہے کہ جو اپنے ماں باپ کے یہاں تھی تو کھانا خود پکایا کرتی تھی تو اس صورت میں بھی قضاءً یعنی فیما بینہ وبین الناس پکانے کی ذمہ داری اس کی نہیں ہے، یعنی عدالت کے ذریعہ حکم صادر کروا کر تو یہ کام اس سے کروایا نہیں جا سکتا، ہاں! دیانۃً یعنی فیما بینہ وبین اللہ اور اخلاقی اعتبار سے وہ کھانا پکائے گی، لیکن وہ بھی صرف اپنا ہی، کہ آپ کچا سامان لا کر اس کو دے دو کہ اپنا کھانا پکا کر کھا لو۔ یہاں بھی آپ کا اور بچوں کا کھانا پکانے کی ذمہ داری اس کی نہیں ہے۔

ساس خسر کی خدمت عورت پر فرض نہیں

لیکن ہمارے سماج میں تو گویا سارے حقوق کی بنیاد ہی یہ سمجھی جاتی ہے، جو ہم اپنے طور پر سمجھ رہے ہیں۔ اگر کھانے میں نمک بھی کم ہو گیا تو پیالہ اٹھا کر ماردیں گے گویا یہ اس کی طرف سے بہت بڑی کوتاہی ہے، حالانکہ اس نے کھانا پکا کر دیا یہی اس کا بڑا احسان ہے۔ اسی طرح دوسری خدمتیں ہیں، یہی حال شوہر کے ماں باپ یعنی ساس سسر کی خدمت کا ہے۔

ہمارے معاشرے و سماج میں تو مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ شوہر کے ماں باپ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ اپنے شوہر کی خدمت کرے یا نہ کرے؛ ہماری خدمت تو اس کو کرنی ہی ہے، اس پر ہمارا حق اس کے شوہر سے بھی زیادہ ہے۔ حالانکہ کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ وہ تو شوہر کے ماں باپ ہیں، ان کی خدمت کی ذمہ داری تو شوہر کی ہے، اگر وہ بیمار بھی ہیں تو شوہر کے لئے ضروری ہے کہ ان کی خدمت کرے، اگر یہ عورت اپنے شوہر کے ساتھ تعلق کی وجہ سے اخلاقاً شوہر کے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرتی ہے اور ان کی خدمت کرتی ہے تو شوہر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ اس کا احسان ہے۔ ہمارے یہاں معاشرہ سماج و سوسائٹی میں ساس بہو کے اور نند بھاوج کے جو جھگڑے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت سارے گھر برباد ہو جاتے ہیں؛ وہ اسی وجہ سے ہوتے ہیں۔ حالانکہ کتابوں میں یہ مسئلہ صاف لکھا ہے کہ شوہر کے ماں باپ بیمار بھی ہوں تو ان کی خدمت کی ذمہ داری شوہر کی ہے، وہ اگر نہیں کر سکتا تو اس کے لئے ملازم کا انتظام کرے، اگر ماں کا معاملہ ہے تو نوکرانی اور خادمہ رکھ دے؛ لیکن شوہر اپنی بیوی پر جبر نہیں کر سکتا۔ ہاں! اگر وہ خوشی سے یہ سمجھ کر کہ شوہر کا کام ہے، اور اس کے ماں باپ کی بھی خدمت

کرنی چاہیے، اور گھر کا ماحول بھی درست رہے، اس لئے اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہوئے شوہر کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرتی ہے تو دوسری بات ہے اور یہ اس کا بڑا احسان ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں بیوی یہ سب کام کرتی ہے پھر بھی کبھی اس کا احسان نہیں سمجھا جاتا، شوہر کے دل میں یا اس کے ماں باپ کے دل میں یا شوہر کے بھائی بہنوں کے دل میں بھولے سے بھی کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ سب کام جو کر رہی ہے وہ اس کا احسان ہے بلکہ وہ لوگ تو یوں سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا فریضہ ہے، اس میں اس نے کون سی دھاڑ ماردی؟ اور کون سا کمال کر دیا؟ حالانکہ یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ وہ ایک قصہ بیان کیا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کی دعوت کی، وہ حضرت سے بیعت تھے اور ان کی گھر والی بھی حضرت سے بیعت تھی، آپ وہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے، آپ کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گھر والوں کا شکریہ ادا کیا کرتے تھے کہ آپ نے کھانا پکایا، ماشاء اللہ بڑا لذیذ اور اچھا پکا تھا۔ جب کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگے تو چونکہ گھر والی بھی بیعت تھی اس لئے پردہ کے پیچھے سے اس نے سلام کیا، حضرت نے سلام کا جواب دینے کے بعد شکریہ کے کلمات کہے کہ آپ نے کھانا بڑا عمدہ پکایا، بہت پسند آیا (اور ایسا کہنا چاہیے تاکہ ان کا حوصلہ بڑھے اور دلجوئی بھی ہو جائے) حضرت ڈاکٹر صاحب کے اس کہنے پر اندر سے رونے اور سسکیوں کی آواز آئی تو حضرت فرماتے ہیں کہ میں گھبرا گیا کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، کیا میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آئی۔ مَیں نے کہا کہ کیا

میری طرف سے کوئی تکلیف پیش آئی ؟ اندر سے کہا کہ نہیں حضرت ! یہ جو آپ کے ساتھ کھڑے ہیں نا، چالیس سال سے کھانا پکا کر ان کو کھلا رہی ہوں، ایک دن بھی انہوں نے یہ جملہ نہیں کہا کہ تم نے کھانا بہت اچھا پکایا، آج آپ کی تو ہم نے پہلی مرتبہ دعوت کی اور آپ یہ کہہ رہے ہیں؛ اس لئے میرا جی بھر آیا۔ اور حضرت فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنا حق سمجھے گا وہ کبھی شکریہ کی بات نہیں کرے گا، اور جو آدمی یہ سمجھے گا کہ اس کا احسان ہے؛ وہ البتہ ممنون ہوگا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔

دنیا میں جنت کی حوریں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہندوستان و پاکستان اور ایشیائی ممالک کی عورتیں تو جنت کی حوریں ہیں، یہ ہماری خدمت کرتی ہیں اور شوہر جب تک گھر آ کر کھانا نہیں کھالیتا وہاں تک یہ بے چاری کھانا تک کھانے کے لئے تیار نہیں ہوتیں۔ جب تک شوہر کو کھلا نہیں دیتی وہاں تک حلق سے ایک لقمہ نہیں اتارتی۔ یوروپین ممالک کی اقوام میں میاں بیوی کے جو تعلقات ہیں اور وہاں آپس کے جو معاملات ہوتے ہیں، ان سے آپ واقفیت حاصل کریں گے تو آپ کو اندازہ ہوگا۔ اور اب تو یہ چیزیں دھیرے دھیرے ہماری طرف بھی آتی جا رہی ہیں۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ جب بیوی آپ کی خدمتیں کرتی ہے تو آپ کو اس کا احسان بھی ماننا چاہیے اور اس احسان کے مطابق ان کے ساتھ سلوک بھی کرنا چاہیے لیکن ہمارے معاشرہ میں ایسا نہیں ہوتا، اسی کے نتیجہ میں گھر برباد ہوتے ہیں۔ اسی کو نبی کریم ﷺ فرمارہے ہیں ﴿لَيْسَ تَمْلِكُوْنَ مِنْهُنَّ شَيْئاً غَيْرَ ذٰلِكَ﴾ عورت پر تم کو اس کے علاوہ اور کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

یہ شوہر کا حق ہے

لیکن جہاں مردوں کے لئے یہ ہدایات ہیں؛ وہیں عورتوں کے لئے بھی یہ حکم ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکل نہیں سکتیں۔ یعنی محلّہ میں کسی کے یہاں تھوڑی دیر کے لئے بھی جانا ہو، تب بھی اس کے لئے شوہر کی اجازت لینا ضروری ہے، شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنا عورت کے لئے کسی حال میں بھی درست نہیں ہے، یہ شوہر کا حق ہے اس میں بھی کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ اِدھر ہوتی ہیں تو اُدھر بھی ہو رہی ہیں۔ ہمارے سماج میں عورتیں شوہر سے اجازت لینے کو ضروری ہی نہیں سمجھتیں، حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سبق آموز عمل

بخاری شریف میں روایت موجود ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت والا واقعہ جب پیش آیا اور لوگوں میں اس کا چرچا ہو رہا تھا، ایک مہینہ تک حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیمار تھیں اس وجہ سے ان کو اس بات کا پتہ ہی نہیں تھا کہ ان کے متعلق باہر ایسی باتیں ہو رہی ہیں، ایک مرتبہ وہ قضائے حاجت کیلئے جا رہی تھیں، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خالہ زاد بہن حضرت ام مسطح رضی اللہ عنہا ساتھ تھیں، راستہ میں ان کو ٹھوکر لگی تو انہوں نے اپنے بیٹے حضرت مسطح کے لئے کچھ بد دعائیہ کلمات استعمال کئے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو ٹوکا کہ ایسا مت کہو۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تمہاری وجہ سے تو مَیں ان کو بد دعا دے رہی ہوں۔ پوچھا کہ کیا بات ہوئی؟ انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم نہیں؟ اور پھر انہوں نے پورا قصہ سنایا کہ تمہارے متعلق لوگ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فوراً گھر واپس لوٹیں اور انہوں نے جو بات کہی تھی اس کے متعلق معلوم کرنا چاہتی تھی کہ کیا

واقعۃً لوگوں میں ایسی باتیں ہورہی ہیں یا نہیں؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ گھر میں تشریف لائے تو میں نے اجازت چاہی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں (بخاری شریف،۳۹۱۰) حالانکہ جو لوگ مسجدِ نبوی گئے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ خوخہ ابوبکر مسجد کے اُس کنارے پر ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا حجرہ مسجد کے اِس کنارے پر ہے، گویا نبی کریم ﷺ کے مکان سے حضرت ابوبکر کا مکان اتنا ہی دور تھا جتنا یہ جماعت خانہ اِدھر سے اُدھر ہے۔ بس اتنا ہی دور جانا تھا اور صرف یہی معلوم کرنا تھا کہ واقعۃً لوگوں میں ایسی باتیں ہورہی ہیں یا نہیں، اور نبی کریم ﷺ کے آنے سے پہلے ہی چند منٹ میں معلوم کرکے آسکتی تھیں، لیکن وہ نہیں گئیں، چونکہ شریعت کا یہی حکم ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر عورت گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی، اور یہ شوہر کا حق ہے لیکن اس میں عورتوں کی طرف سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔

اگر بیوی کھلی نافرمانی کرے......

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہیں ان پر اس کے علاوہ اور کوئی اختیار حاصل نہیں ہے ﴿اِلَّا أَن يَّأْتِينَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ البتہ اگر وہ کھلّم کھلاّ کسی فاحشہ کا ارتکاب کریں۔ ''فاحشہ کا ارتکاب'' سے کیا مراد ہے؟ بعضوں نے کہا کہ زنا کا ارتکاب کرے، یا شوہر کی نافرمانی میں مبتلا ہو ﴿فَاِنْ فَعَلْنَ فَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ اگر وہ ایسا کرتی ہیں کہ شوہر کی نافرمانی کرتی ہیں تو پھر اصلاح کے لئے ان سے بستر الگ کرلو۔ اس کی تفصیل پہلے بتا چکا ہوں ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْباً غَيْرَ مُبَرِّحٍ﴾ اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو پھر ان کی ایسی پٹائی بھی کرسکتے ہو جو سخت نہ ہو۔ ﴿غَيْرَ مُبَرِّحٍ: اَلضَّرْبُ الْمُبَرِّحُ هُوَ الشَّاقُّ الشَّدِيْدُ﴾ امام نوویؒ اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ضرب مبرح ایسی پٹائی کو کہتے ہیں جو بہت سخت ہو،

اور جس سے جسم پر نشان پڑ جائے، یعنی اگر پہلی تدبیر سے کام نہ چلے تو پھر غیر مبرح پٹائی کرو۔

﴿فَاِنْ أَطَعْنَکُمْ فَلاتَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلاً﴾ اگر تمہارے سمجھانے سے یا بستر الگ کردینے سے یا ایک آدھ مرتبہ معمولی پٹائی کرنے سے وہ تمہاری بات ماننے لگیں اور نافرمانی سے باز آجائیں تو پھر آگے کوئی سخت اقدام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مرد کے حقوق عورتوں پر

﴿أَلااِنَّ لَکُمْ عَلیٰ نِسَآئِکُمْ حَقًّا﴾ سنو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے ﴿وَلِنِسَآئِکُمْ عَلَیْکُمْ حَقًّا﴾ اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے۔

﴿فَحَقُّکُمْ عَلَیْھِنَّ أَن لاَّیُوْطِئْنَ فُرُشَکُمْ مَنْ تَکْرَھُوْنَ﴾ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جس کے آنے کو تم پسند نہیں کرتے ﴿وَلایَأْذَنَّ فِیْ بُیُوْتِکُمْ لِمَنْ تَکْرَھُوْنَ﴾ اور تمہارے گھر میں بھی ایسے آدمی کو آنے نہ دیں جن کا آنا تمہیں گوارا نہیں ہے، چاہے وہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر میں کوئی نہ آئے، چاہے عورت کے ماں باپ، بھائی بہن ہی کیوں نہ ہوں۔ اگر شوہر کو ان کا آنا ناپسند ہے تو ان کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، اگر وہ ملنے بھی آویں تو باہر کھڑے رہ کر مل سکتے ہیں شوہر کے کہے بغیر گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمارے سماج میں اس بات کو سمجھنے میں بھی بڑی کوتاہی ہوتی ہے۔

عورتوں کے حقوق مرد پر

﴿أَلاوَحَقُّھُنَّ عَلَیْکُمْ أَنْ تُحْسِنُوْا اِلَیْھُنَّ فِیْ کِسْوَتِھِنَّ وَطَعَامِھِنَّ﴾ سنو! اور ان کا حق تم پر یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ ان کے لباس اور ان کے کھانے پینے کے معاملہ میں یعنی ان کے نفقہ اور کسوہ میں اچھائی اور بھلائی کا سلوک کرو۔ ویسے تو شوہر ان کے لئے لباس

اور کھانے پینے کا انتظام کرتے ہیں لیکن حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ حدیثِ پاک میں صرف کھانے پینے کے انتظام کا حکم نہیں ہے بلکہ ﴿تُحۡسِنُوا﴾ کا حکم ہے کہ ان کے ساتھ کھانے پینے اور لباس کے معاملہ میں احسان، اچھائی اور عمدگی کا سلوک ہونا چاہیے۔ بعض لوگ بقدرِ ضرورت کھانے اور لباس کا انتظام کردیتے ہیں اس سے نبی کریم ﷺ کی اس ہدایت اور حکم کا حق ادا نہیں ہوتا، بلکہ کھانے پینے اور لباس کے علاوہ عورت کو جیب خرچ کے نام سے کچھ رقم الگ سے بھی دینی چاہیے، تاکہ وہ اپنی کوئی ضرورت آزادانہ طور پر پوری کرسکے، اس لئے کہ بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کا زبان سے اظہار نہیں کیا جاسکتا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آدمی کی جیسی جیسی مالی پوزیشن بنائی ہو، اس کے مطابق ان کے ساتھ فراخی اور کشادگی کا معاملہ کیا جانا چاہیے۔ اور کھانے پینے کے معاملہ میں بھی جس کا جیسا جیسا زندگی کا معیار ہو اس کے مطابق سلوک ہونا چاہیے، مثلاً ایک غریب آدمی ہے تو اس کے کھانے پینے کا اور لباس کا انتظام کرے۔ متوسط آمدنی والا آدمی اپنے گھر والوں کے لئے اسی کے مناسب انتظام کرے اور اعلیٰ آمدنی والا خوشحال صاحبِ ثروت آدمی اس کی حیثیت کے مناسب گھر والوں کے لئے انتظام کرے، اسی کی شریعت ہدایت دیتی ہے۔

رہائش، آسائش، آرائش اور نمائش

اور رہائش کا انتظام بھی ضروری ہے جیسا کہ دوسری روایتوں سے ثابت ہوتا ہے، اور کتبِ فقہ میں اس کی تفصیلات موجود ہیں کہ نفقہ میں تین چیزیں آتی ہیں، کھلانا پلانا، کپڑا، اور رہائش۔ اور جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ اس میں وسعت سے کام لے، بخل اور تنگی سے کام نہ لے، بلکہ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے مالی اعتبار سے جو حیثیت دے رکھی ہے، اس کا لحاظ کرتے ہوئے بیوی پر خرچ کرنا چاہیے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں بڑی عجیب وغریب بات ارشاد فرمائی ہے کہ ایک تو آدمی کی ضرورت ہوا کرتی ہے جیسے مکان رہنے کی ضرورت کے لئے ہے، تو ایک تو رہائش کا درجہ ہے، اس کے لئے تو آدمی ایک جھونپڑا ڈال دے تو اس کے ذریعہ بھی سردی گرمی سے بچاؤ ہو جائے گا اور رہنے کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔

لیکن اس سے آگے کا ایک درجہ آسائش کا ہے کہ ایسا انتظام کیا جائے کہ ذرا راحت اور آرام ملے جیسے پختہ کمرہ ہو اور اس میں جھونپڑے کے مقابلہ آدمی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھے اور راحت زیادہ محسوس کرے، تو آسائش کی بھی شریعت اجازت دیتی ہے۔

اس کے بعد اس سے آگے آرائش اور زینت کا درجہ ہے یعنی ذرا اچھا لگے جیسے آدمی نے مکان پختہ بھی بنوالیا اور پلاسٹر بھی کروالیا اور اندر بجلی، پنکھا وغیرہ بھی موجود ہے، اس میں رہائش اور آسائش دونوں ہیں لیکن ابھی رنگ روغن نہیں کروایا، اگر رنگ روغن کروالے گا تو ذرا اچھا لگے گا؛ تو یہ آرائش ہے اور اس کی بھی اجازت ہے۔

لباس کے معاملہ میں بھی ان تینوں درجات کی شریعت اجازت دیتی ہے کہ ایسا لباس پہنا جائے جو اچھا ہو اور گھر والوں کو بھی پسند آوے، اگر کوئی آدمی لباس میں اس کا اہتمام کرتا ہے تو اس میں شرعی اعتبار سے کوئی قباحت نہیں ہے۔

کیا یہ بھی کبر ہے؟

حدیثِ پاک میں بھی آتا ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ﴿لَایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ﴾ جس آدمی کے دل میں کبر کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ جنت میں نہیں جاسکے گا، اس پر ایک آدمی نے پوچھا ﴿یَارَسُوْلَ اللهِ! یُحِبُّ الرَّجُلُ أَنْ یَّكُوْنَ ثَوْبُهٗ حَسَنًا وَنَعْلُهٗ حَسَنًا﴾

اے اللہ کے رسول! ایک آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کا کپڑا اچھا ہو اور اس کا جوتا اچھا ہو؛ تو کیا یہ بھی کبر ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کبر اس کا نام نہیں ہے بلکہ ﴿اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ﴾ کبر تو یہ ہے کہ آدمی حق وانصاف کی بات نہ مانے، اس کو ٹھکرا دے اور لوگوں کو دل سے حقیر سمجھے (ترمذی شریف، ۱۹۹۹) باقی اگر اپنا اور اپنے گھر والوں کا اور دوستوں کا جی خوش کرنے کے لئے اچھا لباس پہنتا ہے؛ تو اس کا نام کبر نہیں ہے۔

نمائش ناجائز

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد چوتھا درجہ نمائش اور دکھلاوے کا آتا ہے کہ آدمی اچھا مکان اس لئے بناتا ہے اور عمدہ لباس اس لئے پہنتا ہے تاکہ لوگ دیکھ کر یہ سمجھیں کہ بڑا مالدار اور بڑی حیثیت والا ہے، لوگوں میں نام اور شہرت ہو، اگر یہ جذبات ہیں تو پھر شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ بہرحال! عورتوں کا بھی ان کے کھانے پینے، لباس اور ضرورتوں کے معاملہ میں اپنی حیثیت کے مطابق خیال رکھنا چاہیے اور ان کی ضرورت پوری کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بیوی کا کیا حق ہے؟

۲۷۷. وَعَنْ مُعَاوِيَةَ بْنِ حَيْدَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ يَارَسُولَ اللهِ! مَاحَقُّ زَوْجَةِ أَحَدِنَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: أَنْ تُطْعِمَهَا اِذَاطَعِمْتَ، وَتَكْسُوَهَا اِذَااكْتَسَيْتَ، وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ، وَلَا تُقَبِّحْ، وَلَاتَهْجُرْاِلَّا فِي الْبَيْتِ. (حديث حسن. رواه أبوداؤد)

حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کسی کی بیوی کا اس پر کیا حق ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب تم کپڑے پہنو تو اس کو بھی کپڑے پہناؤ اور اس کو چہرہ پر مت مارو، اور اس کو کوسنا مت دو، اور ان کو نہ چھوڑو مگر گھر ہی میں۔

افادات:- ”جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب تم کپڑے پہنو تو اس کو بھی کپڑے پہناؤ“ کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نفقہ یعنی کھلانے پلانے اور کسوہ یعنی لباس کا انتظام کیجیے، جس کو ہمارے یہاں گجراتی میں (ભરણપોષણ, ખાધા ખોરાકી) کہتے ہیں۔

﴿وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ﴾ اور اگر کسی وجہ سے تادیب کے طور پر مارنے کی ضرورت پیش آئے تو چہرے پر نہ ماریو۔ ویسے جانور کے چہرے پر بھی مارنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے تو پھر ظاہر ہے کہ انسان کے چہرے کا کیا حکم ہونا چاہیے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ چہرہ محاسن کا مجموعہ ہے، اور حواس یعنی جن سے آدمی کام لیتا ہے جیسے آنکھ کان زبان وغیرہ یہ سب چہرے ہی میں واقع ہیں، اس لئے کہیں ایسا نہ ہو کہ چہرہ پر مارنے کی وجہ سے ان میں سے کوئی ضائع اور برباد ہو جائے اور پھر تکلیف کا باعث ہو۔

اس میں بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہے

﴿وَلَا تُقَبِّحْ﴾ اور اس کو کوسنا مت دو یعنی طعن و تشنیع مت کرو، اس سے حدیث پاک میں بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے، کسی کو بھی طعن و تشنیع کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، بلکہ بعض روایتوں میں تو یہاں تک ہے کہ اگر کسی کو کوئی گناہ کا کام کرتے ہوئے دیکھا اور پھر اپنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہوئے اس کو طعن کیا تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ خود جب تک اس گناہ میں مبتلا نہیں ہوگا تب تک اس کو موت نہیں آئے گی (ترمذی شریف، ۲۵۰۵) اس لئے طعن و تشنیع، کوسنے دینا اور برا بھلا کہنے کا معاملہ بڑا سخت ہے۔ عام طور پر گھروں میں ساس اپنی بہوؤں کے ساتھ یہی معاملہ کرتی رہتی ہیں، یا نندیں اپنی بھاوج کو ایسی باتیں سناتی رہتی ہیں، یہ بڑا خطرناک طریقہ ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمایا ہے۔ باندیاں اور غلام جن کے آقا مالک ہوا کرتے ہیں ان

کے معاملہ میں بھی نبی کریم ﷺ نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ ان کو کسی بھی بات پر کوسنے نہ دئے جائیں (الادب المفرد،۱۷۲) اس لئے یہ طریقہ آج کے اس زمانہ میں تو اور زیادہ مضر ہے، اور اس میں بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ ہے۔

تنبیہ وتادیب کا طریقہ

﴿وَلاَ تَهْجُرْ اِلاَّ فِيْ الْبَيْتِ﴾ اور ان کو نہ چھوڑ و مگر گھر ہی میں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی کسی حرکت پر تنبیہ وتادیب کے لئے اور کسی غلطی سے باز رکھنے کے لئے اگر سزا دینے کی ضرورت پیش آوے تو پہلے تو اس کو بھلے طریقہ سے سمجھایا جائے، اگر اس سے وہ اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرلے تو بہت اچھا ہے، ورنہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس سے بستر الگ کرلیا جائے۔ اس دوسرے طریقہ کے سلسلہ میں اس روایت میں یہ بات بتلائی ہے کہ گھر ہی میں بستر الگ ہو یعنی آپ الگ کمرہ میں آرام کریں، یا اسی کمرہ میں رہیں لیکن الگ بستر پر سوئیں لیکن آپ گھر چھوڑ کر چلے جائیں ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اور اسی سے فقہاء نے یہ بھی کہا ہے کہ بستر تو الگ کیا جائے گا لیکن سلام کلام کا سلسلہ بند نہیں کیا جائے گا۔ عام طور پر مکمل قطع تعلق کرلیا جاتا ہے کہ کسی سوال کا جواب نہیں دیتے یا سلام کا جواب نہیں دیا جاتا اور کوئی بات چیت نہیں کی جاتی؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

شوہر چار مہینے سے زیادہ گھر سے باہر نہیں رہ سکتا

اور اسی حدیث کی وجہ سے فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ شوہر کو چاہیے کہ اپنی بیوی کو گھر میں چار مہینہ سے زیادہ کے لئے چھوڑ کر نہ جاوے، اگر چار مہینہ سے زیادہ کے لئے جانا ہے تو بیوی کی اجازت لینا اور اس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے، اگر اس کی

اجازت ورضامندی حاصل کئے بغیر جائے گا؛ تو شرعاً ایسا کرنا درست نہیں ہے اور گنہ گار ہوگا۔ ہاں! اگر چار مہینے یا اس سے کم کا سفر چاہے دینی یا دنیوی ہو جیسے کاروبار کے لئے ہو، یا حج کے لئے ہو، یا جہاد کے لئے ہو، یا طلبِ علم کے لئے ہو، یا دعوت وتبلیغ کے لئے ہو، یا کسی اور کام کے لئے ہو؛ تو اس میں اجازت لینا ضروری نہیں ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے قلمرو اور اپنی حدودِ مملکت میں باقاعدہ اس بات کا اعلان کرایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادتِ شریفہ تھی کہ رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے مدینہ منورہ میں رات کے وقت گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ رات کو گشت کر رہے تھے، کسی مکان میں سے کچھ اشعار کی آواز آئی، آپ نے کان لگا کر دھیان سے سنا تو معلوم ہوا کہ کوئی عورت اپنے شوہر کے فراق وجدائی میں اشعار کہہ رہی ہے۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر جہاد میں گیا ہوا ہے، آپ نے اپنی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ ایک عورت بغیر شوہر کے زیادہ سے زیادہ کتنا زمانہ رہ سکتی ہے؟ انہوں بتلایا کہ چار مہینے۔ تو آپ نے یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی بھی آدمی جہاد کے لئے جاوے تو چار مہینے سے زیادہ باہر نہیں رہ سکتا یعنی چار مہینے پورے کرنے سے پہلے اس کو گھر واپس آجانا چاہیے (کنز العمال، ۴۵۹۲۴) اسی بناء پر فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ اگر چار مہینے سے زیادہ کیلئے جانا چاہتا ہے تو بیوی کی اجازت ورضامندی لے کر جاسکتا ہے، اس کی اجازت ورضامندی کے بغیر اگر جائے گا تو شرعاً گنہگار ہوگا۔

سب سے کامل ایمان والا

۲۷۸. عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيْمَاناً

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمام مؤمنین میں ایمان کے اعتبار

أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَآئِهِمْ. سے سب سے زیادہ کامل وہ آدمی ہے جو اخلاق کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں۔

ظاہر داری کا نام اخلاق نہیں ہے

اخلاق کا مطلب کیا ہے؟ کسی سے صرف ہنس کر پیش آنا جیسے آج کل مزاج بن گیا ہے، یہ مکمل اخلاق نہیں ہیں۔ حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ آج کل ہر چیز اُلٹی ہوگئی ہے، پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور آج کل بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے، اسی طرح لوگوں نے اخلاق کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ کوئی آدمی کسی سے ہنس کر پیش آوے اور یہ جملہ کہہ دیا کرے کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور بہت اچھا لگا، چاہے اس کے متعلق دل میں نفرت وعداوت اور بغض بھرا ہوا ہو، لیکن زبان سے صرف اتنا کہہ دینے کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔

بلکہ آج کل تو یہ ایک فن ہوگیا ہے کہ لوگوں سے کس طرح بات کی جائے تا کہ اس کی وجہ سے ان کو اپنا گرویدہ وفدائی بنایا جاسکے، ایسے انداز سے لوگوں سے بات کرنا جس کی وجہ سے لوگ ہماری تعریف کریں کہ فلاں بڑے اچھے اخلاق سے پیش آنے والا ہے، اپنی بڑائی اور خوبی کے متعلق لوگوں کے دلوں میں اس طرح کی بات پیدا کرنا اور باقاعدہ اس کو فن کی حیثیت سے سیکھنا؛ یہ اخلاق نہیں ہے، بلکہ یہ تو صرف دکھلاوا اور ریاکاری ہے اور حبِ جاہ کے قبیل سے ہے۔ اور اب تو اس کے متعلق کتابیں بھی چھپتی ہیں کہ کس آدمی سے کس انداز سے بات کی جائے۔ شریعت کی اصطلاح میں اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔

اخلاق کی حقیقت

بلکہ اخلاق تو دل کے اندر کی کیفیت ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں آدمی غیر اختیاری طور پر اپنے اعضاء وجوارح سے سامنے والے کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتا ہے، اور وہ کیفیت یہ ہے کہ اللہ کی ہر مخلوق کے متعلق دل میں یہ جذبہ ہو کہ یہ میرے اللہ، میرے خالق اور میرے مالک کی مخلوق ہے، مجھے اس کے ساتھ محبت رکھنی چاہیے، مجھے اس کے ساتھ خیر خواہی اور دل سوزی کا معاملہ کرنا چاہیے۔

جیسے اپنے بھائی کے متعلق دل میں یہ جذبہ ہوتا ہے کہ یہ میرا بھائی ہے، مَیں جن ماں باپ کی اولاد ہوں یہ بھی انہی ماں باپ کی اولاد ہے تو جیسے ایک آدمی اپنے سگے بھائی کی خیر خواہی کرتا ہے، اس کے ساتھ اسی رشتہ کی وجہ سے محبت کا سلوک کرتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق کے ساتھ ہمیں ایک رشتہ ہے کہ ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمارا رب جس کے انعامات ہم ہر گھڑی استعمال کرتے ہیں، اس کا حق یہ ہے کہ اس کی ہر مخلوق کے ساتھ محبت، حسنِ سلوک اور خیر خواہی و دل سوزی سے پیش آیا جائے، اسی کیفیت کے نتیجہ میں آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کی بھلائی بھر دی جاتی ہے اور پھر اس سے بے اختیار ایسے افعال سرزد ہوتے ہیں جن سے سامنے والوں کو راحت پہنچتی ہے؛ اصل اخلاق یہ ہیں۔ صرف ظاہری طور پر زبان سے یہ کہہ دینا کہ مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور بڑا اچھا لگا اس کا نام اخلاق نہیں ہے۔

اور درحقیقت تصوف وسلوک کے اندر انہی اخلاق کی درستگی پر محنت کی جاتی ہے، اور اہل اللہ کی صحبت میں رہ کر انہی کو سیکھا جاتا ہے، صرف کسی کتاب کے پڑھ لینے سے یہ چیزیں حاصل نہیں ہوا کرتیں۔ بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ

اِیْـمَاناً أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً﴾ ایمان والوں میں سب سے زیادہ کامل ایمان کے اعتبار سے وہ آدمی ہے جس کے اخلاق سب سے بہتر ہوں۔

یہ اخلاق تھوڑے ہی ہیں

﴿وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآئِهِمْ﴾ نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں، ایک آدمی کے اخلاق اور حسنِ سلوک کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے لیکن اس کے گھر والوں کو اس کی طرف سے شکایت ہے؛ تو یہ کون سے اخلاق ہوئے؟ گجراتی میں کہاوت ہے:-

Dth ltt Atufht Dtkxe attxu, WvttDgttgt ltu ytxtu

ساری دنیا میں سخاوت ہورہی ہے اور گھر میں بچے بھوکے مر رہے ہیں، اگر آپ کے اخلاق کی ساری دنیا تعریف کررہی ہے کہ بڑے اچھے، اور بیوی کو آپ کی طرف سے تکلیف پہنچ رہی ہے؛ تو یہ اخلاق تھوڑے ہی ہیں، اسی لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿وَخِیَارُکُمْ خِیَارُکُمْ لِنِسَآئِهِمْ﴾ تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہوں، اسی لئے دوسری روایت میں یہ بھی ہے ﴿وَأَنَا خَیَارُکُمْ لِنِسَآئِیْ﴾ اور میں اپنی بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہوں۔ اور کسی آدمی کے متعلق بالکل صحیح رائے اس کے گھر والے ہی قائم کرسکتے ہیں، وہی بتلائیں گے کہ اخلاق کے اعتبار سے وہ کس درجہ میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ گھر والوں کے ساتھ آدمی حسنِ سلوک سے پیش آوے۔

اللہ کی بندیوں کو مت مارو

۲۷۹. عن أیاس بن عبداللہ بن أبی ذباب رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: لاتَضْرِبُوْا اِمَآءَ

حضرت ایاس بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے صحابہ کو خطاب کرتے

اللہِ. فَجَآءَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ اِلیٰ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ فَقَالَ: ذَئِرْنَ النِّسَآءُ عَلیٰ أَزْوَاجِهِنَّ، فَرَخَّصَ فِیْ ضَرْبِهِنَّ، فَأَطَافَ بِاٰلِ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ نِسَآءٌ کَثِیْرٌ یَشْکُوْنَ أَزْوَاجَهُنَّ، فَقَالَ رسولُ اللہِ ﷺ لَقَدْ أَطَافَ بِاٰلِ بَیْتِ مُحَمَّدٍ نِسَآءٌ کَثِیْرٌ یَشْکُوْنَ أَزْوَاجَهُنَّ، لَیْسَ أُولٰئِکَ بِخِیَارِکُمْ. (رواہ أبوداؤد)

ہوئے فرمایا کہ اللہ کی بندیوں کو مت مارو۔ ایک مدت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! عورتیں اپنے شوہروں کے مقابلہ میں شیر اور جری بن گئیں۔ تو حضور ﷺ نے پھر اجازت دی کہ ضرورت ہو تو مار سکتے ہو۔ پھر تو یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں یعنی ازواجِ مطہرات کے پاس بہت ساری عورتوں نے چکر لگانا شروع کر دیا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ محمد کے گھر والوں کے پاس بہت ساری عورتیں چکر لگا رہی ہیں اور اپنے شوہروں کی شکایتیں کرتی ہیں، جو لوگ اپنی بیوی کی پٹائی کرتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

خبرِ واحد کا حکم صحابہ کے حق میں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے براہِ راست یہ سن لیں کہ ان کو مت مارو، تو پھر اس بات پر عمل کیسے نہ ہو۔ دیکھئے! شریعت کے جو دلائل ہیں ان میں ایک تو قرآنِ پاک ہے، اس کا حکم تو قطعی ہوا کرتا ہے۔ اور جو حدیثیں تواتر کو پہنچی ہوئی ہیں ان کا حکم بھی قطعی ہے۔ یہاں علماء موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ تواتر کس کو کہتے ہیں، لیکن خبرِ واحد کا حکم ظنی ہوتا ہے، اس میں ظنیت اس وجہ سے آئی کہ حضور کا یہ ارشاد بہت سارے واسطوں سے ہم تک پہنچا، ہم نے براہِ راست نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ بات نہیں سنی ہے، بلکہ صحابہ نے سنی ان سے تابعین نے سنی اور ان سے تبع تابعین نے سنی، اور پھر ان سے ان کے شاگردوں نے سنی، اس طرح پانچ دس بیس واسطوں سے ہم تک پہنچی، اب بیچ میں جو واسطے آئے تو ہوسکتا ہے کہ ان سے سننے میں کوئی غلط

فہمی ہوگئی ہو، حضور ﷺ نے کیا فرمایا ہو، اور انہوں نے کیا سنا ہو، یہ ایک امکان ہے ان واسطوں کی وجہ سے اس حدیث میں ظنیت آئی، لیکن حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کا کوئی ارشاد کسی واسطہ سے نہیں بلکہ براہِ راست سنتے تھے، ان کے لئے تو حضور ﷺ کا ہر ارشاد وہی درجہ رکھتا تھا جیسے قرآنِ پاک کی آیت ہو، اُس ارشاد سے جو حکم ثابت ہوتا تھا وہ لازمی اور قطعی ہوا کرتا تھا، اس حکم کی ذرہ برابر بھی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی، یہ تو ایمان اور کفر کا معاملہ ہو جاتا ہے۔

حضور ﷺ کے زمانہ میں ہونے کی تمنا

بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ بہت سی مرتبہ ہم لوگ تمنائیں کرتے ہیں کہ کاش ! ہم اُس زمانہ میں ہوتے۔ حالانکہ اُس زمانہ کے تقاضے بڑے سخت تھے، وہاں تو ذرا سی بات میں آدمی ایمان سے کفر میں پہنچ جاتا تھا۔ اُس زمانہ کے اندر جو مطالبے تھے معلوم نہیں ہم اپنی عافیت پسندی اور راحت پسندی کی وجہ سے ان تقاضوں پر پورے اترتے یا نہیں۔ اس لئے اس میں اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لئے جن حضرات کو منتخب کیا وہ اپنی ان قربانیوں اور ایثار و جان نثاریوں کی وجہ سے اس کے اہل تھے اور ہم تو صرف تمنائیں کرنے والے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے جس کو جس زمانہ میں پیدا کیا وہی اس کے لئے بالکل مناسب ہے۔

بہرحال! حضراتِ صحابہ جب براہِ راست نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ایک بات سن رہے ہیں تو اس میں ذرہ برابر بھی خلاف ورزی نہیں ہوسکتی تھی، وہ حضرات تو فوراً اس پر عمل کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ حضراتِ صحابہ کو خطاب فرما رہے تھے اور فرمایا ﴿اِجۡلِسُوۡا﴾ بیٹھ جاؤ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ مسجد سے باہر تھے، ان

کے کان میں آواز پہنچی تو وہیں بیٹھ گئے، اس لئے کہ انہوں نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا ﴿اِجْلِسُوْا﴾ تو انہوں نے یہ تاویل نہیں کی کہ اندر جا کر بیٹھنے کے لئے کہا ہے، اس لئے کہ ان کے یہاں تاویل کا کوئی دروازہ تھا ہی نہیں۔ جب نبی کریم ﷺ نے ان کو دیکھا تو کہا کہ اندر آجاؤ۔ (ابوداود،۱۰۹۱)

یہ عورتیں شیر بن گئیں

خیر! جب نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے حضرات صحابہ نے یہ سن لیا کہ اللہ کی بندیوں کو مت مارو، تو بس! بات ختم ہوگئی، تمام صحابہ نے یک لخت ان کو ہاتھ لگانا بھی چھوڑ دیا، اس کے بعد کوئی کچھ نہیں کہتا تھا۔ جب یہ سلسلہ ہوا تو ایک مدت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے منع فرما دیا کہ عورتوں کو مارو مت، آپ کے اس ارشاد پر سب نے ان کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تو اب یہ عورتیں اپنے شوہروں کے مقابلہ میں شیر اور جری بن گئیں، شوہروں کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہیاں کرتی ہیں، ان کے ساتھ زیادتیاں کرنے لگیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر یہ حقیقتِ حال بیان کی تو حضور ﷺ نے پھر اجازت دی کہ ضرورت ہو تو مار سکتے ہو۔

عورتوں کو مارنا سنت نہیں

ویسے قرآنِ پاک نے بھی اجازت دی ہے ﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ یہاں علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بھی اجازت تو دی لیکن مارنے کو پسند نہیں فرمایا اور آپ نے خود کبھی کر کے بھی نہیں بتایا اس لئے عورتوں کو مارنا سنت نہیں ہے۔

نسائی شریف کی روایت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے نہ اپنی کسی بیوی کی کبھی پٹائی کی اور نہ اپنے خادم کی، بلکہ آپ نے اپنے دستِ مبارک سے کسی کو نہیں مارا سوائے جہاد کے۔ (نسائی شریف، ۹۱۶۴) ہاں! جہاں اللہ تعالیٰ کے حکموں کو توڑا جاتا تو وہاں آپ نے غصہ کا اظہار فرمایا، ورنہ کبھی آپ نے کسی کو ہاتھ نہیں لگایا، حضور ﷺ کا طریقہ یہی ہے ویسے بوقتِ ضرورت اگرچہ اجازت دی گئی ہے لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کو پسند نہیں فرمایا ہے

وہ اچھے لوگ نہیں ہیں

خیر! جب اجازت مل گئی تو پھر کیا تھا، پھر تو یہ ہوا کہ نبی کریم ﷺ کے گھر والوں یعنی ازواجِ مطہرات کے پاس بہت ساری عورتوں نے چکر لگانا شروع کر دیا، چونکہ عورتیں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اپنی باتیں ازواجِ مطہرات یعنی امہات المؤمنین کے واسطہ سے ہی پیش کیا کرتی تھیں اس لئے وہاں آکر شکایتیں کرنے لگیں کہ ہمارے شوہر ہماری پٹائی کرتے ہیں۔ جب یہ معاملہ ہونے لگا تو اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ محمد کے گھر والوں کے پاس بہت ساری عورتیں چکر لگا رہی ہیں اور اپنے شوہروں کی شکایتیں کرتی ہیں، جو لوگ اپنی بیوی کی پٹائی کرتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔ اور جیسا کہ پہلے تفصیل سے مَیں بتلا چکا ہوں کہ بوقتِ ضرورت مارنے کی اجازت ہے لیکن سخت مار نہیں بلکہ ہلکی مار ہو، اور ہلکی مار وہ ہے کہ جس کے ذریعہ جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔

دنیا لذت اندوزی کی چیز ہے

۲۸۰. عن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال: اَلدُّنیا مَتاعٌ	حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا؛ فائدہ اٹھانے،

وَخَیْرُ مَتَاعِهَا الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ. (رواہ مسلم) لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کی چیز ہے، اور دنیا کی تمام چیزوں میں سے فائدہ اٹھانے، لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کے لحاظ سے بہترین چیز نیک بیوی ہے۔

افادات:- یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا اور اس کی چیزوں کو اسی لئے پیدا کیا کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھاویں اور اپنی ضرورتیں پوری کریں اور لذت حاصل کریں، گویا دنیا کام میں لانے کی چیز ہے۔ ''مَتَاعٌ'' عربی زبان کا لفظ ہے اور وہ ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ جو زیادہ قیمتی نہ ہو لیکن اس کے بغیر کام بھی نہ چلتا ہو۔

تین لفظوں کی تحقیق

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ صاحب بن عباد کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے قرآنِ پاک کے تین لفظوں کی تحقیق مطلوب تھی، ایک تو لفظ ''رَقِیْمٌ'' جو سورۂ کہف میں آیا ہے۔ دوسرا لفظ ''تَبَارَکَ'' جو سورۂ فرقان اور سورۂ ملک میں ہے اور تیسرا لفظ ''مَتَاعٌ''۔ اور ان کی عادت تھی کہ وہ دیہاتوں اور اعراب کے علاقوں میں پہنچ جاتے اور ان کی زبان سنتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مَیں ایک جگہ پہنچا تو دیکھا کہ گھر والے نہیں ہیں اور ایک بچہ بیٹھا ہوا ہے، اتنے میں ایک کتا آیا اور وہ کپڑا جو چولہے پر ہنڈیا وغیرہ پکڑنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس کو اپنے منہ میں اٹھا کر چلا گیا اور قریب ہی پہاڑ کی چوٹی تھی اس پر جا کر پاؤں پھیلا کر اچھی طرح سے براجمان ہو کر بیٹھ گیا، اس کے بعد جب گھر والے آئے تو اس بچے نے سارا منظر جو دیکھا تھا وہ اس طرح بیان کیا ﴿جَآءَ الرَّقِیْمُ وَأَخَذَ الْمَتَاعَ وَتَبَارَکَ الْجَبَلَ﴾ رقیم یعنی کتا آیا اور متاع یعنی وہی کپڑا (صافی، جو قیمتی نہیں ہوا کرتا لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا) اُٹھایا اور پہاڑ کی

چوٹی پر چڑھ کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ (تفسیر حقی ۷/۳۲۲)

نیک بیوی کی چار نشانیاں

خیر! معلوم ہوا کہ جو چیز زیادہ قیمتی نہ ہو اور اس کے بغیر کام بھی نہ چلے اس کو متاع کہتے ہیں، اور دنیا کی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، دنیا ہے تو بے قیمت چیز، لیکن فائدہ اٹھانے کی چیز ہے اور اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا۔ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿اَلدُّنْیَامَتَاعٌ وَخَیْرُ مَتَاعِ الدُّنْیَاالْمَرْأَۃُالصَّالِحَۃُ (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۳۷۱۶)﴾ دنیا: فائدہ اٹھانے، لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کی چیز ہے، اور دنیا کی تمام چیزوں میں سے فائدہ اٹھانے، لذت اندوزی اور ضرورت پوری کرنے کے لحاظ سے بہترین چیز نیک بیوی ہے۔ نیک بیوی کو نبی کریم ﷺ نے ﴿خَیْرُ الْمَتَاعِ﴾ یعنی دنیا کی چیزوں میں سے فائدہ اٹھانے کی سب سے بہترین چیز ارشاد فرمایا۔ چنانچہ اسی نیک بیوی کی تشریح خود نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے اندر ابوداود وغیرہ میں موجود ہے ﴿اِذَانَظَرَ اِلَیْھَاسَرَّتْہُ﴾ شوہر جب اس کو دیکھے تو اس کا جی خوش ہو جائے اور مسرت حاصل ہو ﴿وَاِذَاأَمَرَھَا أَطَاعَتْہُ﴾ اور شوہر اس کو کسی بات کا حکم دے تو وہ اس حکم کو بجالاوے، فرمانبرداری کرے (سنن ابوداود، ۱۶۶۶) اور ابن ماجہ کی روایت میں یہ بھی ہے ﴿وَاِذَاغَابَ عَنْھَاحَفِظَتْہُ فِیْ نَفْسِھَاوَمَالِہٖ﴾ اور جب شوہر گھر سے غیر حاضر ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال کی حفاظت کرے یعنی اپنی ذات کے معاملہ میں کوئی خیانت نہ کرے، کسی کے ساتھ برائی میں ملوث نہ ہو، اور شوہر کے مال کی بھی پوری امانتداری کے ساتھ حفاظت کرے (سنن ابن ماجہ، ۱۸۵۷) اگر کسی عورت میں یہ صفات ہیں تو اس کو نبی کریم ﷺ نے بہترین عورت ارشاد فرمایا ہے اور ایسی عورت کے ساتھ نکاح کرنے کی نبی کریم ﷺ نے ترغیب دی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان تمام ارشادات پر عمل کرنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

حَقُّ الزَّوْجِ عَلٰی الْمَرْأَةِ

شوہر کے حقوق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد:—

أعوذباللہمن الشیطان الرجیم بسم اللہالرحمن الرحیم

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے معاشرت کے متعلق احادیث کو بیان کرنا شروع کیا ہے، پہلے ایک عنوان گذر چکا تھا جس میں شوہر پر بیوی کے کیا کیا حقوق ہیں ان کو بتلایا تھا، آج دوسرا عنوان قائم کیا ہے جس میں بیوی پر شوہر کا کیا حق ہے اس کو بتلائیں گے۔

اسلام کا خاص انداز

مَیں پہلے بھی یہ بتلا چکا ہوں کہ اسلام کی تعلیمات میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ جس پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اسی کو سامنے رکھتے ہوئے خطاب کیا جاتا ہے کہ تم پر فلاں کے یہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی کا تمہیں اہتمام کرنا ہے، گویا جس پر حق واجب ہے اس کو مخاطب بنا کر اور اسی کو حکم دے کر بتلایا جاتا ہے کہ تمہارے اوپر فلاں فلاں کے یہ حقوق ہیں جن کی ادائیگی کا تم اہتمام کرو۔ جن کے حقوق ہیں ان کو یہ نہیں کہا جاتا کہ فلاں پر تمہارے حقوق ہیں، بلکہ جن پر حقوق عائد ہوتے ہیں جنہیں ادائیگی کرنی ہے ان کو مخاطب بنا کر یوں کہا جاتا ہے کہ تمہارے اوپر فلاں فلاں کے یہ حقوق ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہے اور ان کی طرف توجہ کرنا ہے، اگر ان

حقوق کوادانہیں کروگے تو تمہیں یہ سزادی جائے گی۔

مثلاً باپ کو یوں کہا جائے گا کہ بیٹے کا تمہارے اوپر یہ حق ہے، اگر تم اس حق کوادانہیں کرتے تو تمہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں سزادی جائے گی۔ اور بیٹے کو یہ کہا جائے گا کہ تمہارے اوپر باپ کا یہ حق ہے، تمہیں اس کوادا کرنا ہے، اگر تم نے اس کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزادی جائے گی۔

اسی طرح شوہر کو خطاب کر کے کہا جائے گا کہ تم پر بیوی کے یہ حقوق ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہے۔ بیوی کو مخاطب بنا کر یوں کہا جائے گا کہ تم پر شوہر کے یہ حقوق ہیں، تمہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ہے۔ یہی شریعت کا ایک خاص مزاج ہے کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دو فریق سے ہو، دو الگ الگ شخصیتوں سے ہو، یا دو الگ الگ جماعتوں سے ہو، وہاں شریعت جس جماعت پر حق ہوا کرتا ہے اسی کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ تمہیں یہ کرنا ہے۔ شریعت دوسری جماعت کو یہ کہے گی کہ تم پر پہلی جماعت کا یہ حق ہے، اس کوادا کرو۔ دوسری کو یہ نہیں کہے گی کہ پہلی جماعت پر تمہارا یہ حق ہے؛ اس کو وصول کرو۔ یا پہلی کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ دوسری جماعت پر تمہارا یہ حق ہے؛ وصول کرو۔

اربابِ اموال اور عمال

مثلاً نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں اربابِ اموال ہوا کرتے تھے اور ان کے اموال میں زکوٰۃ واجب ہوا کرتی تھی، اور اس زمانہ میں عرب میں عام طور پر مال مویشیوں کی شکل میں ہوا کرتا تھا، کسی کے پاس بھیڑ بکریاں ہوتیں، کسی کے پاس گائیں ہوتیں اور کسی کے پاس اونٹ ہوتے تھے، تو ان کے لئے بھی شریعت نے نصاب مقرر کیا ہے

جیسے سونے چاندی کے لئے ساڑھے سات تولہ سونا یا چھ سو بارہ اعشاریہ تین پانچ گرام چاندی نصاب ہے، اس پر زکوۃ واجب ہو جائے گی، اور اس کا چالیسواں حصہ ادا کرنا فرض ہے۔ اسی طرح جانوروں کا بھی نصاب مقرر ہے مثلاً کسی کے پاس پانچ اونٹ ہیں تو ایک بکری، دس اونٹ ہیں تو دو بکریاں، پندرہ ہیں تو تین بکریاں زکوۃ کے طور پر واجب ہوتی ہیں، اسی طرح آگے تفصیل ہے۔ اور اگر کسی کے پاس چالیس بکریاں ہیں تو ایک بکری واجب ہوتی ہے، پھر آگے تفصیلی حساب بتلایا گیا ہے۔ تو مویشیوں میں بھی ایک نصاب ہے۔ اور نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں آپ ﷺ کی طرف سے زکوۃ کی وصولیابی کے لئے باقاعدہ آدمی مقرر کئے جاتے تھے جن کو ''مُصَدِّق'' یعنی ''زکوۃ وصول کرنے والے'' کہا جاتا تھا۔ خلفاءِ راشدین کے زمانہ میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور بعد کے زمانہ میں جو حاکمِ وقت ہوتا تھا وہ ہر علاقہ کے لئے آدمی مقرر کیا کرتا تھا۔ یہ تو ''مُصَدِّق'' یعنی ''زکوۃ وصول کرنے والے'' ہوئے۔ اور دوسری طرف وہ اربابِ اموال تھے جن کے پاس یہ لوگ زکوۃ وصول کرنے کے لئے جاتے تھے۔ اب ظاہر ہے کہ کوئی آدمی جب کسی کے پاس جا کر مالی مطالبہ کرے گا، چاہے وہ شریعت کا فرض اور واجب کیا ہوا ہی ہو، تب بھی جب آدمی کے پاس سے مال جاتا ہے، تو وہاں سے نکلنے کے لئے کچھ پس و پیش تو کرتا ہی ہے، ایسے لوگ بہت ہی کم ہوں گے جو پوری خوش دلی کے ساتھ واجب کردہ مقدار اضافہ کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کریں۔

بہر حال! جب ''مُصَدِّق'' حضرات زکوۃ کی وصول یابی کے لئے جاتے تھے تو اربابِ اموال کے ساتھ کچھ نہ کچھ کشمکش کی شکل پیدا ہو ہی جاتی تھی، یہ لوگ کہتے کہ تمہیں اتنا دینا ہے اور وہ لوگ کہتے کہ نہیں بلکہ صرف اتنا ہی واجب ہوتا ہے، جیسے آج

کل ٹیکسوں کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ وصول کرنے والے کہتے ہیں اتنا دینا ہے، اور دینے والے کہتے ہیں کہ نہیں! بلکہ اس سے کم اتنا ہی ہوتا ہے، اس طرح دونوں کے حساب میں فرق ہو ہی جاتا ہے۔

وصول یابی کے لئے جانے والوں کو ہدایات

تو نبی کریم ﷺ نے ''مُصَدِّق'' حضرات کو ہدایتیں دیتے ہوئے یہ فرمایا ﴿اِیَّاکُمْ وَکَرَائِمَ أَمْوَالِھِمْ﴾ ان کے جو بہترین مال ہیں ان کو زکوٰۃ کے طور پر وصول نہ کیا جائے یعنی جو جانور تم زکوٰۃ کے طور پر وصول کرو؛ وہ نہ بالکل اعلیٰ درجہ کا ہو، اور نہ بالکل گھٹیا درجہ کا ہو، بلکہ درمیانی قسم کا جانور وصول کیا جائے گا۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جو وصیت فرمائی تھی اسی میں یہ بھی تھا ﴿اِتَّقِ دَعْوَۃَ الْمَظْلُوْمِ﴾ مظلوم کی بددعا سے بچیو، اس لئے کہ ان پر جتنی مقدار واجب ہے اس سے زیادہ اگر وصول کروگے تو یہ تمہاری طرف سے ایک طرح کا ظلم اور زیادتی ہوگی، اور اس صورت میں وہ اگر بددعا کرے گا تو تمہارا نقصان ہے ﴿فَاِنَّہٗ لَیْسَ بَیْنَھَا وَبَیْنَ اللہِ حِجَابٌ﴾ اس لئے کہ مظلوم کی بددعا اور اللہ تعالیٰ کے درمیان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، وہ سیدھی پہنچتی ہے۔ (شعب الایمان، ۸۸)

اسی طرح زکوٰۃ وصول کرنے والوں سے یہ بھی کہا گیا کہ ان کے گھروں پر جا کر وصول کرو، ان کو اپنے یہاں نہ بلاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ ایک جگہ آفس قائم کردی، ٹینٹ لگا دیا اور اعلان کردیا کہ سب اپنے جانور لے کر یہاں آؤ، میں دیکھ کر حساب کردوں گا۔ اب جانور والوں کو اپنے جانور یہاں پیش کرنا بڑا مشکل کام ہے، اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو بلکہ ان کے وہاں جا کر وصول کرو۔

اور یہ بھی فرمایا ﴿اَلْمُعْتَدِیْ فِی الصَّدَقَةِ كَمَانِعِهَا﴾ حاکم کی طرف سے مقرر کیا ہوا آدمی یعنی ''مُصَدِّق'' زکوٰۃ کی وصول یابی میں اگر حد سے آگے بڑھتا ہے تو وہ گناہ کے اعتبار سے ایسا ہی ہے جیسا کہ وہ آدمی جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا (ابوداؤد شریف، ۱۵۸۵) گویا ان حضرات کو تو یہ ہدایتیں دیں۔

اربابِ اموال کو ہدایات

اور دوسری طرف اربابِ اموال کو یہ ہدایت دی کہ جب ہمارے بھیجے ہوئے آدمی تمہارے پاس زکوٰۃ وصول کرنے آویں تو تمہارے پاس سے خوش اور راضی ہو کر جانے چاہئیں، اگر وہ خوش ہو کر نہیں گئے تو تمہاری زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ (ابوداود شریف، ۱۵۸۸)

دیہات کے کچھ لوگوں نے آکر نبی کریم ﷺ سے یہ شکایت کی کہ یارسول اللہ! زکوٰۃ کی وصول یابی کے لئے جو لوگ آتے ہیں وہ ہمارے اوپر جتنی مقدار واجب ہوتی ہے اس سے زیادہ وصول کرتے ہیں، تو کیا ہم اپنا کچھ مال چھپالیں؟ اور ہمیں معلوم ہے کہ اس کے بعد بھی وہ لوگ جو لیں گے وہ اتنا ہی ہو جائے گا جتنا ہم پر واجب ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! تمہیں چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! اگر چہ وہ ہم پر ظلم کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر چہ وہ تم پر ظلم کریں تب بھی تم کو چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ (ابوداود شریف، ۱۵۸۶)

بہر حال! اربابِ اموال کو یہ تاکید فرمائی کہ ان کی رعایت کرو اور ''مُصَدِّق'' حضرات کو یہ ہدایت دی کہ ان کی رعایت کرو اور ان کا حق ادا کرو۔ اسی طرح ہر معاملہ میں شریعت کا یہی طرز ہے۔ ماں باپ اور اولاد کا معاملہ ہے تو اولاد کو یہ تاکید کی ہے کہ والدین کا حق ادا کرو، اور ماں باپ کو کہا کہ ان کا خیال رکھو۔ شوہر کو بتلایا کہ بیوی کے تم

پر یہ حقوق ہیں اور بیوی کو بتایا کہ شوہر کے تم پر یہ حقوق ہیں۔

پھر تو دنیا میں کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہو

اب اگر جس پر جو ذمہ داری شریعت نے عائد کی ہے وہ اس کو ادا کرے گا، تو تمام کے حقوق ادا ہو جائیں گے اور کسی کو مطالبہ کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ جس پر حق ہے اس سے یوں تو کہا کہ تم ادا کرو، لیکن جس کا حق ہے اس سے یہ نہیں کہا کہ تم اپنا حق مانگو، بلکہ بعض روایتوں میں تو صراحت ہے کہ تمہارا حق اگر کسی پر ہے تو تم اس سے مطالبہ مت کرو، تم پر اس کا جو حق ہے اس کو ادا کرو۔ ہر شخص اگر اس ہدایت پر عمل کرنے لگے پھر تو دنیا میں کبھی کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔

تو حقیقت یہ ہے کہ شریعت نے ایک طریقہ بتلایا ہے کہ دوسرے کا حق ادا کرو۔ لیکن آج کل دنیا میں ایک طریقہ جاری ہے، وہ کیا ہے؟ اپنے حق کا مطالبہ کرو۔ جب ہر ایک اپنا حق مانگے گا اور دوسرا اس کو ادا کرے گا تو اس کا نتیجہ اگر چہ یہی نکلے گا کہ حقوق ادا ہوں گے لیکن اِس میں نزاع اور جھگڑا پیدا ہوتا ہے، اور اُس میں جھگڑے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔ جب کوئی مطالبہ نہیں کرتا اور صاحبِ حق خود ادا کرتا ہے تو امن وامان اور سکون قائم ہوتا ہے، کسی کو کسی سے کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ بات وہی ہے لیکن شریعت نے طریقہ بدل دیا ہے۔

کیا ایسی کوئی انجمن قائم ہوئی؟

آج کل دنیا میں جتنے بھی جھگڑے ہیں آقا اور مالک کے درمیان، باپ اور بیٹے کے درمیان، میاں اور بیوی کے درمیان؛ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہر ایک اپنا حق

مانگتا ہے کہ میرا حق لاؤ۔ اور حق کے مطالبوں کے لئے یونینیں قائم کی جاتی ہیں، مثلاً انجمنِ تحفظِ حقوقِ نسواں کہ عورتوں کے حقوق وصول کرو، لیکن عورتوں پر جو حقوق ہیں ان کی ادائیگی کے لئے کہ ان کو تاکید کی جائے اور سمجھایا جائے: کیا ایسی کوئی انجمن قائم ہوئی؟ آج تک دنیا میں کبھی کوئی یونین اس لئے قائم نہیں کی گئی کہ ہم پر جو ذمہ داریاں ہیں ان کو ادا کیا جائے۔ حق مانگنے کیلئے تو انجمن قائم ہوتی ہے، لیکن حق دینے کے لئے نہیں۔ حالانکہ شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ تم پر جو حقوق ہیں وہ ادا کرو، اس کا اگر اہتمام کیا جائے گا تو پھر کبھی کوئی نزاع و جھگڑا پیدا نہیں ہوگا۔

مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں

اس لئے جہاں شوہروں کے حقوق بتلائے گئے ہیں وہاں عام طور پر عورتوں کو خطاب کیا گیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا ہے ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ مرد عورتوں کے اوپر نگران ہیں، ان کا انتظام سنبھالنے والے، ان کی دیکھ ریکھ رکھنے والے اور حالت درست کرنے والے ہیں ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرما رکھی ہے ﴿وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ اور اس لئے بھی کہ مردوں نے اپنے مال عورتوں کے اوپر مہر اور نفقہ کے طور پر خرچ کئے ہیں۔

﴿فَالصَّالِحَاتُ قَانِتَاتٌ حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ﴾ پس نیک عورتیں جو اللہ کی مطیع و فرمانبردار ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جن حقوق کی حفاظت کی تاکید فرمائی ہے اس کا اہتمام کرنے والی ہیں۔

مرد کو حاکم کیوں بنایا گیا؟

اس آیت کو لا کر مردوں کا عورتوں پر جو حق ہے وہ بتلایا گیا ہے۔ سب سے پہلا حق یہ ہے کہ مرد کو امیر کی اور عورت کو مامور کی حیثیت دی گئی ہے۔ آج کل تو یہ مسئلہ بھی موضوعِ بحث بنا ہوا ہے کہ مرد کو حاکم کیوں بنایا گیا؟ یہاں ﴿قَوَّامٌ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ﴿قَامَ یَقُوْمُ﴾ کا معنٰی ہے کسی کام کو ٹھیک طریقہ سے انجام دینا ﴿قَامَ عَلَی الْأَمْرِ﴾ اس وقت بولا جاتا ہے جب کہ اس کام کو ٹھیک اور درست طریقہ سے انجام دیا گیا ہو۔ گویا عورتوں کے معاملات کو درست کرنے والے اور انتظام کو ٹھیک طریقہ سے سنبھالنے والے مرد ہیں، ان کو منتظم مقرر کیا گیا ہے۔ انتظامی امور مردوں کے حوالہ کئے گئے ہیں، اس اعتبار سے ان کو امیر بنایا گیا ہے۔ یہاں ﴿قوَّامٌ﴾ کہا گیا ہے، مالک نہیں یعنی یہ نہیں کہا کہ مرد عورتوں کے مالک ہیں، اگر شوہر کو بیوی پر ملکیت دی ہے تو وہ فقط جنسی فائدہ اٹھانے کی ہے، اس سے آگے اس کی ذات کا اور اس کے مال کا مالک نہیں بنایا ہے، عورت کا ذاتی مال ہو تو شوہر کو اس میں تصرف کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ خیر! یہاں لفظ ''قوَّامٌ'' استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ امیر ہے۔

اور اس کی وجہ بھی بتلائی گئی ہے ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے، یعنی خِلقی اور فطری اعتبار سے مرد کو عورت کے اوپر فضیلت حاصل ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو قوتِ عمل مرد کو عطا فرمائی ہے وہ عورت کے اندر موجود نہیں ہے۔ اسی لئے بہت سے ایسے امور جن کے لئے زیادہ قوت کی ضرورت ہوا کرتی ہے وہ مرد کے حوالہ کئے گئے ہیں، اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دوسری مزید فضیلتیں بھی مرد کو عطا فرمائی ہیں۔ بلکہ میڈیکل

سائنس کی تحقیقات کے اعتبار سے بھی مرد کے دماغ کا وزن عورت کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ اور قویٰ کے اعتبار سے دوسری بہت ساری صلاحیتوں میں بھی فرق ہے۔ جسمانی اعتبار سے بھی خود میڈیکل سائنس نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں فوقیت حاصل ہے۔ خیر! اللہ تعالیٰ نے بعض اوصاف کے اندر مرد کو عورت کے اوپر فوقیت عطا فرمائی ہے، اور یہ ایک فطری، کھلی اور بدیہی چیز ہے، اس کے لئے زیادہ دلائل قائم کرنے کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کیا عورت اس سے دست بردار ہو جائے گی؟

آج ہمارے اس زمانہ میں عورتوں کی آزادی کا خوب شور مچایا جا رہا ہے اور حقوقِ نسواں کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے، حالانکہ اِس زمانہ میں بھی یوروپ اور امریکہ کا حال دیکھئے، جو لوگ اپنی انکھوں سے وہاں کا حال دیکھ کر آئے ہیں، ان سے پوچھئے۔ اور اس بات پر بھی غور کیجئے کہ اگر آپ نے عورت کو آزادی دے کر کسی دفتر میں پہنچا بھی دیا اور جس طرح مرد دفتر میں بیٹھ کر کام کرتا ہے، یہ بھی کرنے لگے گی، تو عورت کو فطری اور خِلقی طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، کیا دفتر میں پہنچنے کے بعد وہ ان سے دست بردار ہو جائے گی؟ مثلاً بچے جننے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر ہی رکھی ہے، مرد کے اندر نہیں رکھی، اگر مرد کو گھر میں بٹھا دیا اور عورت کو دفتر میں پہنچا دیا تو اب ایسا تو نہیں ہوگا کہ عورت میں سے بچے جننے والی صفت ختم ہو جائے گی، اس سے فطری عمل میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے، دفتر میں جانے کے بعد بھی اس کو تو بچے جننے ہی ہیں، اور ماں ہونے کی حیثیت سے بچے کو جو کچھ دینا ہے وہ تو وہی دے سکتی ہے؛ مرد نہیں دے سکتا۔ اسی لئے امریکہ میں بے شمار بچے

ایسے ہیں جو ماں باپ کی شفقت ومحبت سے محروم رہنے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر ان کا جو نشوونما اور ترقی ہونی چاہیے وہ نہیں ہوتی، اسی لئے وہاں پاگل پن اور نفسیاتی بیماریوں کے قصے ایشین ممالک کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہیں، حالانکہ ظاہری اعتبار سے راحت وآرام اور سکون کے اسباب جتنے اُن علاقوں میں مہیا ہیں، اتنے اِن علاقوں میں نہیں ہیں، اس کے باوجود نفسیاتی مریضوں کی تعداد وہاں زیادہ ہے۔

اور پھر یہاں تک لکھا ہے کہ عورت بیچاری صبح گھر سے نکلتی ہے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹریفک کا مقابلہ کر کے دفتر پہنچتی ہے، شام کو دفتر سے چھوٹ کر پھر ٹریفک میں اپنا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ضائع کر کے گھر پہنچتی ہے، اور گھر آنے کے بعد بچوں کا جو مسئلہ ہے وہ تو حل ہونے والا نہیں ہے، ان کی طرف تو اس کو جو توجہ دینی ہے وہ تو دینی ہی ہے۔ عورت کے باہر نکلنے اور مرد کے شانہ بہ شانہ چلنے سے اس کے فطری عمل میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے اور آزادی کا نعرہ لگا دینے کی وجہ سے عورتوں کو آزادی ملنے والی نہیں ہے۔

آزادئ نسواں؛ صرف لیبل

اور اس کے علاوہ دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ مرد جو قانون بناتا ہے اس میں اپنی بالادستی تو قائم ہی رکھتا ہے، چاہے زبان سے کچھ بھی کہتا رہے، پھر اگر یوروپ اور امریکہ ہو؛ امارت تو مرد کی ہی رہتی ہے اور سمجھدار لوگوں کا کہنا تو ہے کہ دراصل بات یہ ہے کہ مرد اپنی شہوت پوری کرنے کے لئے عورت کو نمائش گاہ میں لانا چاہتا تھا اور بغیر کسی وجہ کے لا نہیں سکتا تھا، اس لئے آزادئ نسواں کا صرف لیبل دے کر عورت کو باہر نکالا گیا ہے اور اس طرح مرد اپنی خواہشات پوری کر رہا ہے۔

خواتین پریشان ہیں

ایک بات یاد آئی گذشتہ ہفتہ ہی اخبار میں اچٹتی نظر پڑ گئی تو اس میں ایک رپورٹ پیش کی گئی تھی کہ دفتروں میں کام کرنے والی عورتوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جن کو اپنے اوپر کام کرنے والوں کی طرف سے پریشانیاں اور تکلیفیں پیش آتی رہتی ہیں، کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود کوئی سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

مرد کو عورت پر نگران مقرر کرنے کی ایک وجہ

خیر! مرد کو عورت پر نگران اور منتظم مقرر کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ تو وہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر مردوں کو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، وہ عورتوں کو نہیں دیں۔ اللہ تعالیٰ خالق اور پیدا کرنے والے ہیں ﴿أَلا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾ جو پیدا کرنے والا ہے کیا وہ ہر ایک کے حالات سے زیادہ واقف نہیں ہے؟ جیسے آپ کوئی چیز بنائیں تو اس میں کیا کمی ہے اور کیا کمال ہے؛ وہ آپ ہی جان سکتے ہیں۔ بنانے والا اس کے عیب و کمال کو جتنا جان سکتا ہے کوئی دوسرا اتنا نہیں جان سکتا اور جب اللہ تعالیٰ ہی نے فرمادیا ہے ﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ تو پھر کسی اور کو اعتراض کا کیا حق ہے۔

دوسری وجہ

اور دوسری وجہ یہ ہے ﴿وَبِمَا أَنْفَقُوا مِنْ أَمْوَالِهِمْ﴾ اور اپنا مال انہوں نے خرچ کیا یعنی نکاح میں لاتے وقت شوہر مہر دیتا ہے، اور بعد میں عورت کا نفقہ مرد پر واجب ہوتا ہے۔ شریعت نے تو عورت کو کمانے کے لئے کہا ہی نہیں ہے۔ مَیں پہلے بھی

بتلا چکا ہوں کہ ایک ہی شخصیت ایسی ہے جس کے پاس اپنا مال موجود ہوتے ہوئے بھی اس کا نفقہ دوسرے پر واجب ہے اور وہ بیوی ہے۔ بیوی کے پاس اپنے ذاتی کروڑ ہا کروڑ روپے موجود ہوں اور وہ نافرمان نہیں ہے اور شوہر کے گھر سے چلی نہیں گئی ہے، تو اس کا خرچہ شوہر کے اوپر واجب ہے اس کے علاوہ کوئی بھی ایسا نہیں ہے، چاہے وہ ماں ہو باپ ہو، اولاد ہو، ایک دو سال کا چھوٹا بچہ بھی اگر ایسا ہے کہ اس کی ملکیت میں مال موجود ہے تو اس کا نفقہ کسی دوسرے پر واجب نہیں ہے۔ ماں باپ کا نفقہ اولاد پر اس وقت واجب ہوتا ہے جب کہ ان کے پاس مال موجود نہ ہو اگر مال موجود ہے تو ان کا نفقہ اولاد پر نہیں ہے، بیٹے کے پاس اگر اتنے پیسے موجود ہیں جن میں اس کے کپڑے آسکتے ہیں تو باپ کے اوپر اس کے کپڑوں کے لئے خرچ کرنے کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہاں! صرف بیوی کی شخصیت ایسی ہے کہ شریعت نے اس کے خرچہ کی ذمہ داری شوہر پر رکھی ہے ﴿وَبِمَآ أَنۡفَقُوۡا مِنۡ أَمۡوَالِهِمۡ﴾ سے یہی بتلایا گیا ہے کہ شوہر ان پر اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔

کسی ایک کو امیر ضرور بنایا جاتا ہے

اب اسی چیز کو ایک غلط طریقہ سے پیش کیا گیا کہ مردوں کو حاکم بنا دیا گیا اور عورتوں کو غلام بنا دیا گیا، حالانکہ جو حقوق شریعت نے متعین کئے ہیں ان میں عورت کو صرف ایک ہی چیز کا پابند بنایا ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی، باقی دوسرے جتنے بھی کام کاج ہیں وہ شرعی حقوق کے طور پر لازم نہیں کئے ہیں۔

بہر حال! شریعت نے مرد کو عورت پر امیر اور منتظم بنایا ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دو یا تین آدمی سفر کر رہے ہوں تو ان کو چاہیے کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنا دیں

تاکہ سفر کے معاملات بخوبی انجام پاتے رہیں۔اسی طرح یہ زندگی بھی ایک سفر ہے، میاں بیوی دونوں مل کر اس سفر کو قطع کررہے ہیں اس لئے ضروری تھا کہ اس سفر کے لئے بھی کسی کو امیر مقرر کیا جاتا، لیکن یہ کام ان دونوں پر نہیں چھوڑا بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہی فیصلہ کر دیا اور شوہر کو زندگی کے اس سفر میں امیر بنا دیا، اور اس کی وجہ بھی بتلادی گئی کہ عمومی طور پر جو قوتِ عمل اور صلاحیتیں جنسی اعتبار سے مرد کے اندر موجود ہیں، وہ عورت کے اندر نہیں ہیں۔اگر انفرادی طور پر کہیں کوئی عورت کسی مرد سے بڑھی ہوئی ہو تو وہ اس اصول سے مستثنیٰ ہے۔دنیا کے کسی بھی اصول کو اٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں مستثنیات ہوتے ہی ہیں۔بہر حال! یہاں تو امیر بنانے کی بات چل رہی تھی، اور سارے اختیارات اسی نسبت سے شوہر کو حوالہ کئے گئے ہیں۔اب اس پر بھی اگر لوگوں کو اشکال ہے تو کیا کیا جائے۔اس لئے کہ دو میں سے ایک بات ہوسکتی ہے کہ تمام اختیارات یا تو شوہر کے حوالہ کئے جاتے یا عورت کے حوالہ کئے جاتے، اگر عورت کے حوالہ کئے جاتے؛ تو آج کوئی آدمی اگر اِس پر اشکال کرتا ہے؛ تو وہ اُس پر بھی اشکال کرسکتا تھا۔

امیر کی حیثیت اور مقام

بہر حال! شوہر کو امیر، نگران اور انتظام کو درست کرنے والے کی حیثیت دی گئی ہے، اور شریعت نے تو امیر کی حیثیت بھی بتلادی ﴿سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ﴾ (کنز العمال، ۱۷۵۱۸) جس کو امیر بنایا جائے وہ یہ نہ سمجھے کہ مجھے حکم چلانا ہے بلکہ اس کی طرف سے اس بات کا اہتمام ہو کہ اپنے رفقاء کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے، ان کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دینے کا اہتمام کرے؛ یہ ہے امارت کی حیثیت۔ تو یہاں پر بھی مرد کو امورِ خانہ داری کے واسطے منتظم مقرر کیا گیا ہے، اس کی ایک وجہ تو اس

میں صلاحیت تھی، اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ اس کو اس بات کا مکلّف کیا گیا کہ وہ عورت کو زیادہ سے زیادہ راحت و آرام پہنچانے کا اہتمام کرے۔

مرد کی امارت جنت سے چلی ہے

اسی لئے قرآنِ پاک میں ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جنت میں بسایا تو اس بات کی تاکید فرمائی کہ اس درخت کے قریب نہ جائیو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کو کھالو اور شیطان تم سے غلطی کروالے اور نتیجہ یہ ہو ﴿فَتَشْقٰی﴾ کہ تم مشقت اور تکلیف میں پڑ جاؤ۔ اس کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ وہاں حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں ہیں لیکن مشقت میں پڑنے کا خطاب فقط حضرت آدم کو کیا گیا کہ تم تکلیف میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ عام طور پر گھر کو چلانے کے معاملہ میں جو تکالیف آتی ہیں وہ مرد پر ہی عائد ہوتی ہیں، اور مرد کو ہی ان تکالیف کو اٹھانا پڑتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شروع ہی سے امارت مرد کے حوالہ کی گئی ہے

ایسی عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

۲۸۱. عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِذَادَعَاالرَّجُلُ اِمْرَأَتَهُ اِلیٰ فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَأْتِهٖ، فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَیْهَا، لَعَنَتْهَاالْمَلَائِکَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ.

وفی روایة لهما: اِذَابَاتَتِ الْمَرْأَةُ هَاجِرَةً فِرَاشَ زَوْجِهَا، لَعَنَتْهَاالْمَلَائِکَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ.

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے: نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب مرد نے اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف دعوت دی، وہ نہیں گئی۔ شوہر رات بھر اس سے ناراض رہا، اس عورت پر فرشتے لعنت (اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بددعا) کرتے ہیں یہاں تک کہ صبح ہو جائے۔ ایک روایت میں ہے: جو عورت اپنے شوہر کے بستر سے الگ رات گذارے گی، فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہیں گے۔

وفـي روايةٍ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ مَامِنْ رَجُلٍ یَدْعُوْ امْرَأَتَهٗ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَتَأْبٰی عَلَیْهِ اِلَّا کَانَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ سَاخِطًا عَلَیْهَا حَتّٰی یَرْضٰی عَنْهَا.

ایک اور روایت میں ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف دعوت دیتا ہے اور عورت انکار کرتی ہے، تو جو ذات آسمان میں ہے (اللہ تعالیٰ) اس پر ناراض ہو جاتا ہے یہاں تک کہ شوہر راضی ہو جائے۔

افادات:- ایک تو یہ ہے کہ بیوی صحبت کے قابل نہیں ہے، یا تو حالتِ حیض میں ہونے کی وجہ سے، یا ایسی بیمار ہے کہ وہ اس مشقت کو برداشت نہیں کر سکتی، کسی ماہر حکیم نے اس کو منع کر رکھا ہے؛ تو دوسری بات ہے۔ لیکن کوئی عذر نہ ہو اور انکار کرے اور اس کے منع کرنے پر شوہر اس سے ناراض ہو کر رات گذارے؛ تو ایسی عورت پر فرشتے لعنت کرتے ہیں

فرشتوں کی لعنت کی وجہ

گویا عورت کو نکاح کر کے لانے کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ مرد اپنی عصمت و عفت کی حفاظت کرے، اور جب عورت کو اس مقصد کے لئے بلایا جا رہا ہے اور عورت انکار کرے گی تو جس مقصد کے لئے نکاح کیا گیا تھا وہ مقصد حاصل نہیں ہو رہا ہے، اور جب عورت برضا و رغبت مرد کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش نہیں کرے گی تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مرد کی نگاہیں دوسری طرف جائیں گی اور مَیں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ جو آدمی گھر میں بھوکا رہتا ہے وہ باہر کھانا تلاش کرتا ہے۔ تو اگر عورت کو بلانے کے باوجود مرد کی ضرورت پوری نہیں ہوتی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مرد زنا میں مبتلا ہوگا، حالانکہ شریعت نے تو مرد کی عفت کے لئے اتنا زیادہ اہتمام کیا ہے کہ اگر

وہ ایک عورت سے اپنی ضرورت پوری نہ کر سکے تو دوسری بیوی کرنے کی بھی شریعت نے اجازت دی ہے لیکن زنا اور زنا کے مقدمات یعنی جو چیزیں زنا اور حرام کاری تک پہنچانے والی ہیں ان تمام کو شریعت نے صاف صاف طور پر حرام قرار دے دیا ہے۔ نگاہوں کو نیچی رکھنے کا حکم دیا، شرمگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا، البتہ نکاح کی اجازت دی اور اگر ایک سے ضرورت پوری نہیں ہوتی تو دو تین اور چار تک کی اجازت دی، اور یہ ایک فطری چیز ہے۔

آگے دوسری روایت کا حوالہ دیتے ہیں کہ جو عورت اپنے شوہر کے بستر سے الگ رہتے ہوئے رات گذارے گی، مطلب یہ ہے کہ اس کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش نہیں کرے گی تو فرشتے اس پر صبح تک لعنت کرتے رہتے ہیں۔

یہاں تک کہ شوہر راضی ہو جائے

ایک اور روایت میں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف اپنی ضرورت کے لئے دعوت دیتا ہے اور عورت انکار کرتی ہے، تو جو ذات آسمانوں میں ہے یعنی اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے یہاں تک کہ شوہر راضی ہو جائے، جب تک شوہر راضی نہیں ہوتا وہاں تک اللہ تعالیٰ بھی ناراض رہتے ہیں۔

شوہر کی اجازت ضروری ہے

۲۸۲. عن أبی هريرةؓ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَا يَحِلُّ لِامْرَأَةٍ أَنْ تَصُومَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ، وَلَا تَأْذَنَ فِيْ بَيْتِهِ إِلَّا بِإِذْنِهِ.

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے: حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں روزہ رکھے مگر اس کی اجازت سے۔ اور شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دے۔

افادات:- یعنی شوہر سفر میں نہیں ہے؛ تو اس کی اجازت کے بغیر روزہ نہ رکھے۔ اور اگر شوہر سفر میں ہے تو بات صاف ہے کہ وہ گھر پر ہے ہی نہیں کہ اس کی اجازت کا کوئی سوال پیدا ہو، اس لئے اگر وہ روزہ رکھتی ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ شوہر کے گھر پر موجود ہوتے ہوئے عورت اگر نفل روزہ رکھنا چاہتی ہے تو جب تک وہ شوہر سے پیشگی اجازت نہ لے لے، وہاں تک روزہ رکھنے سے بھی شریعت نے منع فرمایا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے کہ اگر اس کو دن میں ضرورت پیش آجائے اور اس کا روزہ ہے تو وہ اس کی ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں رہے گی، اس لئے منع کیا۔

اور شوہر کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر میں کسی کو آنے کی اجازت نہ دے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، عورت کا اپنا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً عورت کا سگا بھائی ہے لیکن شوہر نے کہہ رکھا ہے کہ تیرے بھائی کو میرے گھر میں مت گھسائیو، تو اس صورت میں عورت کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کو شوہر کے گھر میں آنے کی اجازت دے۔ ہاں! اگر وہ ملنے کے لئے آیا ہے تو عورت خود اس سے ملنے کے لئے گھر کے دروازے پر آسکتی ہے، وہ گھر سے باہر رہے اور یہ اندر سے اس سے بات چیت کرلے۔

ہر ایک اپنے ماتحت کا ذمہ دار ہے

۲۸۳۔ وعن ابن عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْأَمِيْرُ رَاعٍ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلَىٰ بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر شخص نگران و ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ چنانچہ بادشاہِ وقت اور حاکم اپنی رعیت کا نگران و ذمہ دار ہے، مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اور عورت اپنے شوہر کے

گھر اوراس کی اولاد کی نگران وذمہ دار ہے،لہٰذاتم میں سے ہرایک نگران اورذمہ دار ہے اور ہرایک سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

افادات:- یہاں اسی بات کو بتلانے کے لئے اس روایت کولائے ہیں کہ عورت کی اپنے گھر میں رہتے ہوئے دوذمہ داریاں ہیں،ایک تو گھر کی اور شوہر کے مال اور چیزوں کی حفاظت کرنا یعنی وہ گھر کا نظم ونسق اس طرح سنبھالے کہ شوہر کا مال ضائع نہ ہو۔اوردوسری ذمہ داری شوہر کی اولاد کی نگرانی اور پرورش کرنی ہے۔

لہٰذاتم میں سے ہرایک نگران اورذمہ دار ہے اور ہرایک سے اس کے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا،یعنی اگر وہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے تو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مؤاخذہ ہوگا۔

اپنے اعضاء کا بھی ذمہ دار ہے

بلکہ علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ کسی کے ماتحت کوئی نہیں ہے،اس نے شادی بھی نہیں کی ہے اور اکیلا ہی رہتا ہے؛تو وہ اپنے اعضاء کا ذمہ دار ہے یعنی اس کو اللہ تعالیٰ نے آنکھوں پر،زبان پر،کان پر،ہاتھ پر،پاؤں پر،شرمگاہ پر،اوردوسرے اعضاء پر اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ان اعضاء کو جس طرح چاہے استعمال کرے،تو گویا وہ ان کا نگران وذمہ دار ہے اس لئے ان کو اسی طریقہ پر استعمال کرنا ہے جس طرح استعمال کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے،اگر اس کے خلاف استعمال کرے گا تو کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

روٹی جلتی ہے تو جل جانے دے

۲۸۴.وَعَنْ أَبِیْ عَلِیٍّ طَلْقِ بْنِ عَلِیٍّ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ:اِذَادَعَاالرَّجُلُ زَوْجَتَهُ

حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب مرد اپنی بیوی کو اپنی ضرورت کے واسطے بلاوے،تو عورت کو چاہیے

لِحَاجَتِہٖ فَلْتَأْتِہٖ وَاِنْ کَانَتْ عَلَی التَّنُّوْرِ. کہ وہ فوراً جاوے، چاہے وہ چولہے پر بیٹھی ہو۔

افادات:- یعنی چولہے پر بیٹھی ہے اور توے پر روٹی ڈال دی ہے، اور اس حالت میں بھی اگر شوہر اس کو بلائے تو نبی کریم ﷺ کی تاکید یہ ہے کہ وہ چلی جاوے، روٹی جلتی ہے تو جل جانے دے، اس کی پرواہ نہ کرے۔ گویا اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ مرد کا دھیان ذرا دیر کے لئے بھی دوسری طرف جانے نہ پائے، ایک لمحہ کے لئے بھی وہ دوسری کوئی چیز نہ سوچے، اگر عورت کو بلایا اور اس نے انکار کیا تو اب اس کا دماغ دوسرے چکر میں پڑے گا، حالانکہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی مرد کے دل ودماغ میں اپنی بیوی کے سوا دوسری کوئی عورت آنی ہی نہیں چاہیے، اور اس کی شکل یہی تھی کہ عورت کو اس بات کی تاکید کی جاتی کہ مرد اپنی ضرورت کے لئے اس کو جب بھی بلائے، اس وقت وہ چاہے جس حالت میں بھی ہو؛ فوراً پہنچ جائے، اس صورت میں پھر مرد کا دھیان دوسری طرف نہیں جائے گا۔ اور اگر عورت ایسا نہیں کرتی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی توجہ دوسری طرف جائے گی اور وہ اپنے لئے دوسری شکلیں سوچے گا، اور یہی چیز آگے جا کر مرد اور عورت دونوں کی بربادی کا ذریعہ بنے گی بہت سی عورتیں اس معاملہ میں کوتاہی کرتی ہیں اور جب مرد آؤٹ لائن پر چلا جاتا ہے تو پھر روتی پھرتی ہیں، حالانکہ اس کو آؤٹ لائن پر جانے کے لئے اس طرح کی شکلیں اسی نے پیدا کی تھیں، اس لئے ان باتوں پر خاص دھیان دینے کی ضرورت ہے اور ایسی چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے

۲۸۵. عن أبی هريرةؓ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ لَوْ كُنتُ آمِراً أَحداً أَنْ يَّسْجُدَ لِأَحَدٍ لَأَمَرْتُ الْمَرْأَةَ أَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا.
(رواه الترمذی وقال: حديث حسن صحيح)

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر مَیں کسی کو حکم کرتا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرے تو مَیں عورت کو حکم کرتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

افادات:- ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی فرماتے ہیں کہ وہ ایران گئے تھے، یہ اس زمانہ کا قصہ ہے جبکہ ابھی ایران فتح نہیں ہوا تھا، وہاں انہوں نے دیکھا کہ حاکم کے سامنے لوگ سجدہ کرتے ہیں، انہوں نے آکر نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ وہ لوگ اپنے حاکم کو سجدہ کرتے ہیں، اس لئے یارسول اللہ! آپ تو زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں۔ اس وقت حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، اگر مَیں اللہ کے علاوہ کسی اور کو سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ گویا ان کا اتنا زیادہ حق ہے۔

جنت کا پروانہ

۲۸۶. وعن أُمِّ سَلَمَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: أَيُّمَا امْرَأَةٍ مَاتَتْ، وَزَوْجُهَا عَنْهَا رَاضٍ، دَخَلَتِ الْجَنَّةَ.
(رواه الترمذی وقال: حديث حسن)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو عورت اس حالت میں مرے کہ اس کا شوہر اس سے خوش ہے تو وہ جنت میں جائے گی۔

افادات:- اس روایت میں عورتوں کے لئے کتنی بڑی بشارت ہے کہ شوہر کا خوش ہونا ہی اس کے لئے جنت کا پروانہ ہے۔

حورِعین کا خطاب

۲۸۷ .وعن معاذِبنِ جبَلٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبیِّ ﷺ قَالَ:لاتُؤذِی امْرَأَۃٌ زَوْجَھَافِی الدُّنیا اِلَّاقَالَتْ زَوْجَتُہُ مِنَ الْحُوْرِالْعِینِ لاتُؤذِیْہِ قَاتَلکِ اللّٰہُ ! فَاِنَّمَاھُوَعِنْدَکَ دَخِیْلٌ، یُوْشَکُ اَنْ یُّفَارِقَکِ اِلَیْنَا.

(رواہ الترمذی وقال:حدیث حسن)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جب دنیامیں کوئی عورت اپنے شوہرکوتکلیف پہنچاتی ہے؛تواس مردکی وہ بیوی جو جنت کے اندرحوروں میں سے حورِعین (بڑی آنکھوں والی خوبصورت عورت)اس کو وہاں ملنے والی ہے وہ حوراس کی بیوی کوخطاب کرتے ہوئے کہتی ہے: اللہ تعالیٰ تجھے مارے،اس کوتکلیف مت پہنچا،اس لئے کہ وہ تو تیرے پاس مہمان ہے،عنقریب تجھے چھوڑ کروہ ہمارے پاس آنے والا ہے۔

افادات:- چونکہ عورتوں کوسوکن کی بات بہت تیزلگا کرتی ہےاوران کی باتوں سے دل جلاکرتا ہے،تو یہ حور بھی جواس کی ہونے والی بیوی ہےاس کا جملہ نبی کریم ﷺ نے اس لئے نقل فرمایا کہ تیرے اس کرنے پروہاں یہ کہاجاتا ہے،اس لئے تیری غیرت کا تقاضہ یہ تھا کہ تو اس کی نوبت ہی نہ آنے دے کہ اس کویہ کہنے کاموقع ملے، بلکہ اس کوراحت پہنچانے کااہتمام کر۔

اورمردکوبھی ایک طرح کی تسلی ہے کہ اگرعورت کی طرف سے ایذائیں پہنچتی ہیں توصبروتحمل سے کام لو،عنقریب جب دنیاسے جاؤ گے تووہاں تم کوایسی عورت ملنے والی ہے کہ جوتمہیں دنیامیں پہنچنے والی تکلیف پربھی اپنے لئے تکلیف محسوس کرتی ہے،توجب تم وہاں پہنچوگےتوتمہیں وہ کتنی راحت پہنچائے گی۔

مردوں کے لئے سب سے زیادہ سخت فتنہ

۲۸۸ .وعن اُسَامَۃَبْنِ زَیْدٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبیِّ ﷺ قَالَ:مَاتَرَکْتُ بَعْدِیْ فِتْنَۃً ھِیَ اَضَرُّ

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ میں نے اپنے بعدمردوں کیلئے کوئی

عَلیٰ الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ . (متفق علیه) زیادہ سخت فتنہ عورتوں کے مقابلہ میں نہیں چھوڑا۔

افادات:- یعنی ہر اعتبار سے، اپنی کشش ونمائش کے اعتبار سے بھی مردوں کیلئے سب سے بڑے فتنہ کی چیز عورتیں ہیں۔اور ویسے بھی جب عورتیں بیوی ہونے کی حیثیت سے ایسے امور میں-جن میں ان کو دخل نہیں دینا چاہیے- دخل دیتی ہیں اور مرد اگر ان کی مان کر چلتا ہے، تو اس کے نتیجہ میں معاشرت کی لائن سے بہت سی خرابیاں پیش آتی ہیں، اس لئے مردوں کو اس باب میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اور اس سلسلہ میں شریعت نے جو ہدایتیں دی ہیں ان کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ عورت کا حق ضائع کر دیا جائے، اور یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو اتنا سر پر بٹھا دے کہ اس کی بات مانتے ہوئے دوسروں کے حقوق کو ضائع کرتا رہے، بلکہ آدمی کو درمیانی اور معتدل راہ اختیار کرنی چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

آپس کے حقوق کی ادائیگی کا ہمیں اہتمام نصیب فرمائے۔

اور آپس کی حق تلفیوں سے ہماری حفاظت فرمائے۔

اَلنَّفَقَةُ عَلیٰ الْعَیَالِ

اہل وعیال پرخرچ کرنا

مجلس (۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

فأعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم.

وَعَلیٰ الْمَوْلُوْدِلَہٗ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ. (البقرۃ:۲۳۳)

وقال تعالی:—لِیُنْفِقْ ذُوْسَعَۃٍ مِّنْ سَعَتِہٖ وَمَنْ قُدِرَعَلَیْہِ رِزْقُہٗ فَلْیُنْفِقْ مِمَّااٰتَاہُ اللّٰہُ لَایُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْساًاِلَّامَااٰتٰھَا .(الطلاق:۷)وقال تعالی:—وَمَاأَنْفَقْتُمْ مِنْ شَیْیءٍ فَھُوَیُخْلِفُہٗ. (سبآء:۳۹)

اہل وعیال کی کفالت

پچھلے باب میں بیوی کے اوپر شوہر کے کیا حقوق ہیں ان کو بیان کیا تھااوراس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی اپنے گھر والوں اوراہل وعیال پر جوخرچ کرتا ہے، ان کا نفقہ برداشت کرتا ہے؛تواس پر اس کو کیا ملتا ہے،اسی سلسلہ میں کچھ آیات وروایات پیش کرتے ہیں

پہلی آیت لائے ہیں﴿وَعَلیٰ الْمَوْلُوْدِلَہٗ رِزْقُھُنَّ وَکِسْوَتُھُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ باپ کےاوپر بچوں کی ماؤں کا کھانا پینااور کپڑادستور کے مطابق لازم ہےیعنی یوں کہئے کہ بیوی اپنے شوہر کے پاس اپنے آپ کو فارغ کر کےاسی کے کام کے واسطے گھری رہتی ہےتواب شوہر پراس کی تمام ذمہ داری اپنی حیثیت کے مطابق لازم ہے۔اوردنیا کابھی دستور ہے کہ جوآدمی کسی کے کام کے لئے اپنے آپ کو فارغ کئے ہوئے ہواوراسی کے

کام کے لئے مصروف ومشغول ہوتو اس کا خرچہ اسی کے ذمہ ہوا کرتا ہے، اگر ہم اور آپ اپنے کسی کام کے واسطے کسی کو بمبئی لے جائیں یا اپنے گھر بلائیں اور کھانے کا وقت آوے تو ایسا نہیں ہوتا کہ اس سے کہہ دیں کہ جاؤ اپنے گھر جا کر کھالو، یا اپنے پیسوں سے کھالو، بلکہ جب اپنے کام کے لئے لے گئے تو کھلانے پلانے کی ذمہ داری بھی ہم پر ہی ہے۔

بیوی کے جیتے مرتے ساری ذمہ داری شوہر پر ہے

عورتوں کو مردوں کی ضرورت پورا کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے حلال کر کے ان کے نکاح میں دیا اور عورتیں مردوں کی اسی ضرورت کے پیشِ نظر اپنے آپ کو مردوں کے پاس اپنے تمام گھر والوں کو قربان کر کے آ گئی تو اب اس کے نفقہ اور اس کے خرچہ کی ساری ذمہ داری شوہروں کے اوپر ہے۔ اس سلسلہ میں پہلے بھی مَیں مسئلہ بتلا چکا ہوں کہ شریعت میں جو دوسروں کا نفقہ کسی کے اوپر واجب ہوتا ہے اس میں اصول تو یہ ہے کہ جس کے پاس اپنا مال موجود ہو، اس کا نفقہ اور خرچہ کسی دوسرے کے اوپر واجب نہیں ہوتا، یہاں تک کہ باپ کے پاس اپنا مال موجود ہے تو اس صورت میں باپ کا نفقہ وخرچہ اولاد کے اوپر نہیں ہے، وہ اپنے مال میں سے اپنا خرچ برداشت کرے گا۔ اولاد کے پاس اپنا مال موجود ہے، چاہے وہ نابالغ ہی کیوں نہ ہوں، ان کا نفقہ اور خرچہ ان کے مال میں واجب ہوتا ہے، باپ کے ذمہ نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی جس کے پاس اپنا مال موجود ہو، اس کا نفقہ اور خرچہ اسی کے مال میں سے نکالا جائے گا، البتہ ایک شخصیت ایسی ہے اور وہ ہے بیوی؛ کہ اس کا نفقہ شوہر کے اوپر ہے، چاہے بیوی کا اپنا مال کتنا ہی کیوں نہ ہو۔ بیوی کے پاس کروڑہا روپیہ موجود ہے، اس کے باوجود اس کا نفقہ شوہر کے اوپر ہے، چاہے شوہر صرف کھاتا پیتا ہے اور اس کے پاس ضرورت کے مطابق ہی رقم ہے، تب بھی

بیوی کا خرچہ شوہر کے اوپر ہوگا، بیوی کا نفقہ اس کے اپنے مال میں نہیں ہے۔

یہاں تک کہ جب آدمی کا انتقال ہو جائے تو مسئلہ یہ ہے کہ اپنے انتقال کے وقت آدمی نے جو کچھ مال و جائیداد وغیرہ چھوڑی ہے اس میں جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان میں سب سے پہلے اس کے ترکہ میں سے اس کی تجہیز و تکفین و تدفین کے مصارف نکالے جائیں گے، کسی سے مانگا نہیں جائے گا۔ ہاں! اگر اس نے کچھ بھی مال نہیں چھوڑا ہے تو پھر دوسرے لوگ اس کا انتظام کریں گے، چاہے مرنے والا بڑا ہو یا چھوٹا بچہ ہو، مرد ہو یا کوئی عورت ہو، لیکن اگر وہ عورت کسی کی بیوی ہے اور شوہر موجود ہے تو اس نے چاہے کروڑ ہا روپیہ اپنی ملکیت میں چھوڑا ہو؛ تب بھی اس کا کفن دفن شوہر کے ذمہ ہے، چونکہ زندگی میں اس کے کپڑے کا خرچہ شوہر کے اوپر واجب تھا، موت کے بعد کا لباس یعنی کفن کی ذمہ داری بھی شوہر کے اوپر ہی ہے، ہاں! اگر شوہر کے پاس کچھ بھی مال نہیں ہے تو پھر عورت کے مال میں سے کفن دفن کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

تو ایک تو اس کے کھلانے پلانے کی ذمہ داری، دوسرا اس کی رہائش کا انتظام اور تیسرا اس کے لباس کا انتظام اور جو ضروری چیزیں ہیں مثلاً بالوں کے واسطے ضروری تیل، یا غسل کے واسطے پانی اور صابن وغیرہ کا انتظام؛ یہ سارا خرچہ شوہر کے اوپر ہے، باقی عیش و عشرت کے لئے زائد چیزوں کی ذمہ داری شوہر کے اوپر نہیں ہے۔

خرچہ دینے میں کس کی حیثیت کا اعتبار ہوگا؟

﴿رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾ "دستور کے مطابق" یعنی مالی اعتبار سے عورت بھی اسی جیسے خاندان اور گھرانے سے تعلق رکھتی ہے جو پوزیشن اللہ تبارک وتعالیٰ نے شوہر کو عطا فرما رکھی ہے؛ تو اس کے مطابق اس کا خرچہ ہوگا، اگر وہ غریب ہیں تو عام

طور پر غریب لوگ جس قسم کے مکان میں رہتے ہیں، اور غریب لوگ جس قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں، اور غریب لوگ جس قسم کا کھانا استعمال کرتے ہیں؛ اسی قسم کا کھانا، مکان ورہائش کا انتظام، اور کپڑے شوہر کے اوپر واجب ہوں گے۔

اور اگر دونوں ایسے ہیں کہ ان کا تعلق مالدار طبقہ سے ہے تو اس صورت میں اونچے طبقہ والے آدمی جس قسم کے مکان میں رہتے ہیں، جس قسم کا لباس استعمال کرتے ہیں اور جس قسم کا کھانا پینا ان کا ہوتا ہے، اسی قسم کا خرچہ شوہر کے اوپر واجب ہوگا۔

اور اگر شوہر مالدار ہے اور بیوی غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، یا شوہر غریب ہے اور بیوی مالدار گھرانے سے تعلق رکھتی ہے تو اس صورت میں فقہاء کے یہاں کچھ تفصیل ہے، حنفیہ کے یہاں مفتٰی بہٖ قول یہ ہے کہ دونوں کی پوزیشن ملحوظ رکھتے ہوئے بیچ کا راستہ نکالا جائے گا۔

عورتوں کی کمائی کھانا

عورتوں کے لئے کمانے کو شریعت نے ضروری قرار نہیں دیا، اس کو تو گھر ہی میں رہنا ہے۔ ہاں! اگر اپنے گھر میں رہ کر کچھ کاروبار کرتی ہے، اور اس سے کچھ پیسہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کا اپنا ہے، شوہر کا اس پر کوئی حق نہیں ہے، اگر وہ اپنی مرضی سے شوہر کو دینا چاہے تو الگ بات ہے، اور شوہر کو بھی اس پر نگاہ نہیں رکھنی چاہیے۔ ایک مرد ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے جو مقام اور وقار اس کو عطا فرمایا ہے اس کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ بیوی کی کمائی کے اوپر شوہر کی نظر نہ ہو، بلکہ وہ سامنے چل کر دیتی ہو؛ تب بھی اپنے بلند حوصلہ کی وجہ سے یوں کہے کہ تم اپنا مال اپنے پاس رکھو، مَیں خود ہی کما کر لاتا ہوں اور تمہارے خرچ کا انتظام کرتا ہوں۔

جیب خرچ بھی دو

﴿لِيُنفِقْ ذُوْسَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهِ وَمَنْ قُدِرَعَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّاآتَاهُ اللّٰهُ﴾ حیثیت والا اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے۔ پہلے بتلایا تھا کہ ضروری اور واجب خرچہ کے علاوہ جیب خرچ کے لئے کچھ رقم بیوی کو دینی چاہیے، تاکہ ایسی ضرورتیں جن کو وہ کسی کے سامنے ظاہر نہ کرسکتی ہوان میں وہ اس رقم کو استعمال کرسکے، اور جس کی روزی نپی تلی اور تنگ ہے کہ اس کے پاس مالی وسعت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے جو دیا ہے وہ اس کے مطابق خرچ کرے۔ اسی آیت کی وجہ سے علماء کا ایک گروہ اس طرف گیا ہے کہ گھر کا خرچہ دینے میں شوہر کی مالی حیثیت کا اعتبار کیا جائے گا ﴿لَايُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا آتٰهَا﴾ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اتنا ہی پابند بناتے ہیں جتنا اس کو دیا گیا۔ اسی آیت میں آگے یہ ہے کہ بعض لوگ خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں اور یوں سوچتے ہیں کہ کم ہوجائے گا تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿سَيَجْعَلُ اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا﴾ عنقریب اللہ تعالیٰ تنگی کے بعد سہولت پیدا کردیتے ہیں۔

جو خرچ کروگے؛ اس کا بدلہ پاؤگے

﴿وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾ (بیوی بچوں پر خرچ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اللہ کے اس حکم کو پورا کرنے کے واسطے) تم جو کچھ بھی خرچ کروگے؛ اس کا بدلہ پاؤگے۔

ایک بات یاد رہے کہ ویسے بھی آدمی اپنی طبعی محبت کی وجہ سے اولاد اور بیوی پر خرچ کرتا ہی ہے، لیکن اگر وہ یہ نیت کرلے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی بیوی بچوں کا نفقہ برداشت کروں اور ان کی ضرورتوں کا انتظام کروں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسی حکم کو پورا کرنے کی نیت سے وہ محنت کرتا اور کماتا ہے، اور کمانے کے واسطے جو

مشقت پیش آتی ہے اس کو برداشت کرتا ہے اور پھر خرچ کرتا ہے تو اس صورت میں چونکہ اس کی نیت اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کی ہے، تو یہ سب اجر وثواب میں داخل ہے اور گویا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔

گھر والوں کے لئے تھکنا

احیاء العلوم میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے ﴿مَنْ سَعیٰ عَلیٰ عِیَالِہٖ مِنْ حِلِّہٖ فَھُوَ کَالْمُجَاھِدِفِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اخرجہ الطبرانی فی الاوسط۔ أحیاء علوم الدین۔۲/۸۹)﴾ جو آدمی حلال طریقہ سے اپنی اولاد کا خرچہ برداشت کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، تو وہ ایسا ہے جیسے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والا، یعنی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کو جہاد پر جو اجر وثواب ملتا ہے، یہ آدمی اپنے گھر والوں کی، اپنے بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے حلال طریقہ سے کمانے کے لئے جو کوشش کرے گا اور جو محنت کرے گا تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر بھی اس کو وہی اجر وثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے گویا اس کو یہ کام طبعی تقاضوں کی وجہ سے بوجھ سمجھ کر نہیں کرنا چاہیے۔

بعض لوگ محبت ہوتی ہے تو طبعی تقاضہ کی وجہ سے، اور اگر محبت نہیں ہوتی ہے تو بیگار سمجھ کر کرتے ہیں اور یوں سوچتے ہیں کہ یہ تو جھک مار کے کرنا ہی ہے، ایسی نیت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم پورا کرنے کی نیت سے کرے تو وہ بھی عبادت میں شمار ہوگا اور اس میں اس کو ثواب ملے گا۔

عورت کو حق ہے کہ وہ انکار کردے

ایک بات یاد رہے کہ آج کل لوگ اپنے اہل وعیال کا نفقہ پورا کرنے کے لئے

کوشش ضرور کرتے ہیں لیکن اس میں شریعت نے ایک بڑی شرط جو لگائی ہے وہ حلال کی ہے حلال کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی شوہر حرام کمائی کے ذریعہ سے عورت کا نفقہ ادا کرنا چاہتا ہے تو عورت کو یہ حق ہے کہ وہ انکار کردے کہ مَیں تمہاری اس کمائی کا پیسہ لینا نہیں چاہتی، مجھے تو حلال لاکر دو، اور اس سلسلہ میں عورت قاضی کے یہاں دعویٰ دائر کرسکتی ہے، اس لئے حلال کمائی کا اہتمام بہت ضروری ہے۔

ہمارے اور اسلاف کے درمیان بڑا فرق

ہمارے معاشرہ میں عام طور پر جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جو خرابیاں آچکی ہیں ان خرابیوں کے مختلف اسباب ہیں، ان اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنی کمائی کے ذرائع میں حلال طریقہ کا اہتمام کرنا چھوڑ دیا، اور حلال کی جو اہمیت ہمارے اسلاف کے یہاں تھی وہ ہمارے دلوں میں نہیں رہی۔ حرام سے بچنے کا جو اہتمام اور حرام کا جو ڈر ان کے دل و دماغ میں بیٹھا ہوا تھا اور حرام سے بچنے کے لئے وہ جتنا اہتمام کرتے تھے، اور حرام کیا بلکہ حرام کے شبہ سے بھی بچنے کا جو اہتمام کرتے تھے وہ ہمارے یہاں نہیں ہے، ''حکایاتِ صحابہ'' جو فضائل کی کتابوں میں پہلی کتاب ہے، آپ تعلیم میں سنتے رہتے ہیں، اس میں حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے زہد اور تقویٰ کا مستقل ایک باب قائم کیا ہے، اس باب میں کئی واقعات پیش کئے ہیں۔

وہ مشتبہ کھجور

خود نبی کریم ﷺ اس کا کتنا اہتمام فرماتے تھے، ایک مرتبہ جن زوجۂ مطہرہ کے یہاں آپ کی رات کی باری تھی، انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ کو نیند نہیں آرہی ہے،

کروٹیں بدل رہے ہیں، تو ان زوجۂ مطہرہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے آج آپ کو نیند نہیں آرہی ہے؟ حضو اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دراصل ایک کھجور گھر کے اندر پڑی ہوئی تھی، مَیں نے اُٹھا کر اس لئے کھالی کہ وہ ضائع نہ ہوجائے، لیکن اب مجھے یہ خیال آیا کہ اگر وہ صدقہ کی ہوئی تو؟ (مسند أحمد۔۶۸۲۰) اور چونکہ نبی کریم ﷺ کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے، محض اس خیال کی وجہ سے آپ کو رات بھر نیند نہیں آئی۔

اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدر کرنی چاہیے

دیکھو! جو لقمہ اور دانہ دستر خوان پر گر جاتا ہے اس کے بارے میں ہمیں یہی حکم دیا گیا ہے کہ اس دانہ کو اٹھا کر صاف کر کے کھالو، اگر پڑا رہنے دو گے تو وہ شیطان کے لئے ہو جائے گا، اس لئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اور دانے جس نے دئے؛ یہ دانہ بھی اسی نے دیا ہے۔ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی عمدہ مثال سے اس چیز کو سمجھاتے تھے کہ دیکھو! وزیر اعظم یا بادشاہ نے آپ کو کوئی چیز کھانے کے لئے دی، اور آپ اسی کے سامنے وہ چیز کھا رہے ہیں، اب اگر اس میں سے کوئی چیز گر گئی تو آپ فوراً اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالیں گے، اس لئے کہ آپ یہ سوچیں گے کہ اگر مَیں اس کو ایسے ہی چھوڑ دوں گا تو وہ کیا سمجھیں گے کہ میری دی ہوئی چیز کی اس کے یہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ جب ہم دنیا کے بڑے لوگوں کی دی ہوئی چیز کے ساتھ ان کا اکرام مدِ نظر رکھتے ہوئے اتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں تو پھر یہ جتنا بھی اور جو کچھ بھی دیا ہوا ہے وہ سب اللہ تبارک وتعالیٰ کا ہی دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہمیں ہر وقت دیکھتا ہے، ہم اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں، تو پھر ہمیں اس دانے کو اٹھا کر صاف کر کے کھالینا چاہیے، اس میں ہمیں کسی قسم کی عار اور شرم محسوس نہیں ہونی چاہیے اس معاملہ میں ہم بہت زیادہ کوتاہی کرتے ہیں۔

اکابر کا اہتمام

ہمارے اکابر کے یہاں اس کا بڑا اہتمام ہوا کرتا تھا، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے دستر خوان پر جب کھانا ہوتا تھا تو جب کھانا کھا کر سب فارغ ہو جاتے تھے اور کوئی دانہ یا روٹی کا کوئی ٹکڑا کسی کے سامنے گرا ہوا ہوتا تھا تو حضرت مولانا اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالیا کرتے تھے، حضرت کے اس اہتمام کی وجہ سے کسی کا لقمہ اگر گر جاتا تھا تو وہ اس کو گرا ہوا رہنے نہیں دیتا تھا۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی دیکھا، اس بات کا خاص اہتمام تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہونی چاہیے، یہاں تک کہ کسی پھل کے ذائقہ میں ذرا معمولی سی تبدیلی آ گئی ہوتی تو حضرت شیخ اس خیال سے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے یہ فرماتے تھے کہ کون ہے جو اس کو کھالے گا؟ اس لئے کہ بعض طبائع اس کو گوارا کر لیتی ہیں اور بعض طبائع کو گوارا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوئی آدمی گلاس میں پانی لے کر آدھا پیتا تو باقی آدھا گلاس پانی پھینک دینا حضرت شیخ کو بالکل گوارہ نہیں تھا، اگر دیکھ لیتے تو فرماتے کہ پانی تم نے پھینک دیا، ایسا کیوں کیا؟

ایک ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے

واقعہ ہے کہ پانی جیسی نعمت مفت میں اس طرح وافر مقدار میں ملی ہوئی ہے اس لئے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے۔ ابھی قریبی زمانہ میں کچھ کے اندر جو سمندری طوفان آیا تھا، اس کے بعد کے حالات ہم نے سنے کہ کسی اخبار کا کوئی نامہ نگار وہاں پہنچ گیا اور ایک بوتل پانی کی اس کے پاس تھی، تو پانی کی اس بوتل کو دیکھ کر بیسیوں آدمی اس کے چاروں

طرف جمع ہوگئے۔ جہاں پانی نہیں ہوتا وہاں ایک ایک قطرے کی قدر ہوتی ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں مفت میں اور وافر مقدار میں دیدیا ہے اس لئے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے، جن کے پاس نہیں ہے ان سے پوچھو کہ کتنی قیمتی چیز ہے۔ بہرحال! اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی جگہ پر بہت ہی قیمتی ہے، اس لئے ہمیں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

لوحِ دل پر نقش کرنے کی بات

اس سلسلہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا واقعہ حکایاتِ صحابہ ہی کے اندر لکھا ہوا ہے اس زمانہ میں لوگوں کے پاس بہت سے غلام ہوتے تھے، تو آقا ان سے کہہ دیا کرتے تھے کہ تم اپنے طور پر اپنا کاروبار کرو اور شام کو اتنی مقدار مجھے دے دینا، باقی جو بچے وہ تمہارا رہے گا، پھر پورے دن کی محنت کے بعد جو رقم آتی تھی وہ غلام مقررہ رقم ان کو پہنچا دیا کرتا تھا؛ اس کو خراج کہتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جس کو انہوں نے خراج پر اُٹھا رکھا تھا، ایک روز وہ کچھ کھانے کی چیز لے کر آیا، یہاں حضرت کا فاقہ تھا اور کھانے کی چیز لا کر حضرت کے سامنے رکھی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک لقمہ لے کر کھا لیا، حالانکہ ان کی عادت یہ تھی کہ روزانہ اس سے تفصیل پوچھتے تھے کہ یہ کہاں سے اور کس طرح لایا۔ اتفاق کی بات کہ اس روز فاقہ کی وجہ سے طبیعت میں بھوک کا تقاضہ تھا اور آج تک پوچھتے رہے اس لئے شاید ضرورت محسوس نہ کی ہو، یا طبیعت کے تقاضہ کی وجہ سے پوچھا نہیں اور ایک لقمہ اٹھا کر کھا لیا۔ لیکن آج تو غلام بھی کوئی نئی چیز لایا تھا اس لئے اسی نے پوچھا کہ حضرت! آپ تو روزانہ پوچھتے تھے کہ کہاں سے لایا، آج آپ نے نہیں پوچھا؟ فرمایا

کہ بھائی! اب بتادے کہاں سے لایا؟ اس نے کہا کہ بات دراصل یہ ہے کہ مسلمان ہو نے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں مَیں ایک قبیلہ میں گیا تھا، وہاں مَیں نے کہانت کی تھی (کہانت کا مطلب غیب کی خبر بتانا، جس کو جوتش کہتے ہیں) حالانکہ اس زمانہ میں کہانت کرنے والے جو کہانت کیا کرتے تھے مجھے وہ بھی صحیح معلوم نہیں تھی، ایسے ہی اٹکل سے مَیں نے ایک بات کہہ دی تھی، اور اس کا مَیں ماہر بھی نہیں تھا، اس وقت انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس کے معاوضہ میں ہم تمہیں کچھ دیدیں گے، اتفاق کی بات کہ آج میرا وہاں سے گذر رہوا تو ان کے یہاں کوئی تقریب تھی، اس لئے کھانا پکا تھا، انہوں اسی کے معاوضہ میں مجھے یہ کھانا دیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تو تو مجھے ہلاک ہی کردیتا۔ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گلے میں اُنگلی ڈال رہے ہیں تا کہ وہ لقمہ نکلے لیکن ایک لقمہ اور وہ بھی دو ایک وقت کے فاقہ کے بعد پیٹ میں گیا تھا، وہ اس طرح اُنگلی ڈالنے سے کہاں نکل سکتا تھا۔ انہوں نے بہت کوشش کی لیکن وہ نہیں نکلا، اب وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں۔ لوگوں نے بتایا کہ ایسا کیجئے کہ پانی منگوا کر خوب پئیں اور پھر قے کریں، ہوسکتا ہے کہ پانی کے ساتھ نکل جائے۔ لہٰذا بڑا پیالہ پانی منگوایا اور پانی پیتے رہے اور اُنگلی ڈال کر قے کرتے رہے؛ یہاں تک کہ بڑی مشقت اور تکلیف سے وہ لقمہ نکلا۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ نے خواہ مخواہ ہی اتنی زحمت برداشت کی، ایک لقمہ کے واسطہ اتنی تکلیف کاہے کو اٹھائی؟ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ جان ہی دیدیں گے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی وہ ہم لوگوں کے لئے اپنے لوحِ دل پر نقش کرنے کے قابل ہے کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آدمی کے جسم کا جو حصہ حرام مال سے بنا ہو، وہ جہنم کی آگ کا زیادہ حقدار ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سننے کے بعد یہ کیسے ممکن تھا کہ اس لقمہ کو مَیں اپنے

پیٹ میں رہنے دیتا، اگر وہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی مَیں اس کو نکال کر کے رہتا یعنی اس کو نکالنے میں میری جان چلی جاتی تو مَیں جان دیدیتا۔ (شعب الایمان۔۵۷۶۰)

نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہم اور آپ بھی سنتے ہیں ﴿لا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ (تفسیر حقی،۱۴/ ۲۵۵)﴾ وہ گوشت جو حرام مال سے تیار ہوا ہو؛ جنت میں نہیں جائے گا ﴿كُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ فَالنَّارُ أَوْلىٰ بِهِ (الکشف والبیان۔۴/ ۶۶)﴾ اور ہر وہ گوشت جو حرام مال سے بنا ہو، جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے ﴿كُلُّ جَسَدٍ غُذِيَ بِالْحَرَامِ فَالنَّارُ أَوْلىٰ بِهَا﴾ ہر وہ جسم جو حرام سے تیار ہوا ہو؛ جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ غور کیجئے کہ حرام کے معاملہ میں کتنی زیادہ سخت وعیدیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی ہیں۔

حرام لقمہ کا نقصان

حرام لقمہ جس کو ہم معمولی سمجھتے ہیں اس نے ہماری تمام عبادتوں کی تاثیر ختم کر دی ہے، ہمارا حال ایسا ہی ہو گیا ہے کہ ایک آدمی ہزاروں لاکھوں کی دوائی کھاتا ہے لیکن ایک بدپرہیزی ایسی کرتا ہے کہ لاکھوں روپیہ کی ساری دوا بے کار ہو جاتی ہے، تو اب سوچو کہ اس دوا سے کیا فائدہ ہوا۔ ہم اتنی ساری عبادتیں کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، اور بہت کچھ کرتے ہیں؛ لیکن اگر حرام غذا اندر چلی گئی تو ہماری ساری عبادتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

اس کی کوئی نماز قبول نہیں

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کسی آدمی نے کوئی کپڑا دس درہم (دس روپے) میں خریدا، جس میں

ایک روپیہ حرام کا ہے، تو جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر ہے اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔ اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی دونوں اُنگلیاں کانوں میں ڈال کر فرمایا کہ اگر مَیں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے نہ سنا ہو؛ تو میرے کان بہرے ہو جائیں۔ (مسند احمد۔۵۷۳۲)

ایک سوال

ایک صاحب پوچھنے لگے کہ اس میں حرام تھوڑا ہے، اور حلال زیادہ ہے؛ تو یہ معاملہ درست ہو جانا چاہیے۔ ان سے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ تو کہنے لگے کہ وہ ایک مسئلہ آتا ہے نا۔ کیا مسئلہ آتا ہے؟ پہلے مَیں آپ کو وہ مسئلہ پوری تفصیل سے بتا دوں تا کہ پوری بات صاف ہو جائے۔

ایک آدمی کی پوری کمائی حلال کی ہے، اگر وہ ہماری دعوت کرے یا ہمیں کوئی ہدیہ دے تو ہمارے لئے وہ دعوت کھانا حلال و جائز ہے اور ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ اور اگر ایک آدمی کی پوری کمائی حرام کی ہے اور وہ ہماری دعوت کرتا ہے یا ہمیں کوئی ہدیہ دیتا ہے؛ تو ہمارے لئے نہ تو وہ دعوت کھانا حلال و جائز ہے اور نہ وہ ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ یہ دونوں مسئلے تو اپنی جگہ پر بالکل صاف صاف ہیں۔

ایک آدمی ایسا ہے جس کی کمائی میں حلال بھی ہے اور حرام بھی ہے، مثلاً اس کی تجارت بھی ہے جس سے حلال روزی کماتا ہے لیکن کبھی کبھی سٹہ بھی کھیل لیتا ہے اور اس سے بھی کچھ آمدنی ہو جاتی ہے؛ اس کی دعوت کھانا جائز ہے کہ نہیں؟

اس کے متعلق بھی مسئلہ صاف لکھا ہے کہ وہ جس مال سے دعوت کر رہا ہے، اگر یقینی طور پر ہمیں معلوم ہو جائے کہ وہ مال حرام ہے، چاہے اس کی سٹہ والی آمدنی فقط دس

پرسنٹ (۱۰٪) ہی ہو، اور حلال آمدنی نوے پرسنٹ (۹۰٪) ہو؛ لیکن یہ ہم جانتے ہیں کہ اس نے ہماری دعوت سٹے والی آمدنی سے کی ہے، تو ہمارے لئے کھانا حلال اور جائز نہیں ہے، بالکل حرام ہے۔

اور اگر ہمیں یقین کے ساتھ معلوم ہے کہ ہماری دعوت اس نے جس مال سے کی ہے وہ حلال ہے، جیسے آپ نے اس کو منع کر دیا کہ مَیں تیری دعوت نہیں کھاتا، اس لئے کہ تیری آمدنی حرام ہے۔ تو اس نے کہا کہ مولوی صاحب! جس پیسہ سے مَیں آپ کی دعوت کر رہا ہوں وہ حلال کمائی کا ہے، مَیں نے تجارت کی تھی اس سے کمایا تھا اور اسی سے آپ کی دعوت کرتا ہوں اور آپ کو بھی اس بات کا یقین ہے، یا آپ کے سامنے اس نے کسی حلال کمائی والے سے قرض لیا اور ان پیسوں سے کوئی چیز خرید کر آپ کو ہدیہ میں دی، اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس نے جو دعوت کی یا جو ہدیہ دیا وہ حلال ہی میں سے دیا ہے؛ تو لینا جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اگر یقینی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ حرام میں سے ہے؛ تو لینا اور کھانا جائز نہیں ہے۔ اور اگر یقینی طور پر معلوم ہو جائے کہ حلال میں سے ہے؛ تو لینا اور کھانا جائز ہے، چاہے اس کی حلال آمدنی تھوڑی ہو اور حرام زیادہ ہو۔ یا حلال زیادہ ہو اور حرام کم ہو۔

تب ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں

لیکن اگر وہ ہماری دعوت کر رہا ہے یا ہمیں ہدیہ دے رہا ہے، اور اس کی آمدنی کچھ حلال کی ہے اور کچھ حرام کی ہے، اور ہمیں معلوم نہیں کہ ہماری دعوت جس مال سے کر رہا ہے وہ حلال ہے یا حرام۔ یا اس سے پوچھا تو اس کو بھی یاد نہیں ہے کہ یہ کس مال میں سے ہے؛ تو اس وقت علماء نے بتایا ہے کہ اگر اس کی آمدنی کا زیادہ حصہ حلال کا ہے

تو آپ کے لئے کھانا جائز ہے اور ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ اور اس کی آمدنی کا بڑا حصہ پچاس سے زیادہ پرسنٹیج (٪) اگر حرام کا ہے، تو آپ کے لئے نہ وہ کھانا حلال ہے اور نہ ہدیہ قبول کرنا جائز ہے۔ کیونکہ ہمیں یقینی طور پر معلوم نہیں ہے۔

جواب

لیکن بھائی! قاعدہ کی بات یہ ہے کہ جب آپ کما رہے ہیں تو آپ کو تو یقینی طور پر معلوم ہے کہ آپ کے پاس جو کمائی آرہی ہے، وہ حرام ہے، چاہے وہ ایک پرسینٹ (٪) ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے آپ جو معاملہ کر رہے ہیں اس میں جب ایک پرسینٹ (٪) بھی حرام آگیا بلکہ آدھا پرسینٹ (٪) بھی حرام آگیا تو وہ معاملہ پورا ہی حرام ہو گیا، اب آپ کے لئے وہ حلال نہیں رہا۔ تھوڑے سے حرام کی ملاوٹ سے پورا معاملہ حرام اور ممنوع ہو جاتا ہے۔

دیکھو! منطق کا ایک قاعدہ ہے کہ نتیجہ ہمیشہ ارذل کے تابع ہوتا ہے، یعنی دو چیزیں جمع ہو جائیں، ایک گھٹیا ہو اور دوسری بڑھیا ہو؛ تو نتیجہ گھٹیا کے تابع ہوگا، جیسے آپ دو دوست سفر کر رہے ہیں، آپ نے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا اور آپ کے دوست نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا لیکن دونوں سفر ساتھ کرنا چاہتے ہیں، تو سیکنڈ کلاس والا آپ کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتا، لیکن آپ سیکنڈ کلاس والے کے ساتھ بیٹھ سکتے ہیں۔ اسی طرح مثلاً دودھ سے بھرے ہوئے ایک پیالہ میں ایک قطرہ پیشاب کا گر گیا، تو پورا پیالہ خراب اور ناپاک ہو جائے گا۔

ایک اور مثال دوں کہ چار پانچ آدمیوں کی پوری پارٹی تفریح کے لئے پیدل نکلی، ان میں سے ایک کی رفتار گھنٹہ کی دس کلومیٹر کی ہے، دوسرے کی رفتار ایک گھنٹہ کی پانچ کلومیٹر کی ہے، تیسرے کی رفتار دو کلومیٹر کی ہے، اور سب دوست ساتھ ہی رہنا چاہتے

ہیں، تو سب کو دو کلو میٹر والے کی رفتار سے چلنا پڑے گا۔ ان ساری مثالوں سے ایک بات سمجھانا چاہتا ہوں کہ نتیجہ گھٹیا کے تابع ہوتا ہے، اور یہی قاعدہ ہے۔

اور جو لوگ مسئلہ جانتے ہیں ان سے مسئلہ پوچھو، آپ خود ہی قیاس کر کے حلال وحرام کے فیصلے کرنے لگیں؛ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ کیا حلال ہے اور کیا حرام ہے یہ ہمارے ائمہ اور ہمارے اکابر واسلاف طے کر چکے ہیں، اب ہمیں تو کتابوں میں سے دیکھ کر صرف عمل کرنا ہے، شریعت نے ہمارے ہاتھ میں فیصلہ نہیں دیا ہے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس حدیث میں سیدھا حکم موجود ہے، کسی کپڑے میں نو روپے حلال کے تھے، اور ایک روپیہ حرام کا تھا؛ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب تک وہ کپڑا اس کے جسم کے اوپر رہے گا، اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوگی۔

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مشتبہ سے احتیاط

یہی تو بات تھی جس کی وجہ سے ہمارے اسلاف اس چیز کو بھی چھوڑ دیا کرتے تھے جس میں حرام کا شبہ ہو۔ شبہ کا مطلب ہے ڈاؤٹ (Doubt)۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ کوفہ میں لوٹ کے مال کی کچھ بکریاں آئی ہیں، اور لٹیروں نے ان کو کوفہ میں بیچی ہیں گویا کہ کوفہ کی جو بکریاں تھی ان میں لوٹ کی بھی دو چار بکریاں شامل ہوگئی ہیں۔ اب وہ کونسی ہے یہ پتہ نہیں ہے۔ تو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تحقیق فرمائی کہ بکری کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ بتایا گیا کہ زیادہ سے زیادہ سات سال۔ تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سات سال تک بکری کا گوشت اس ڈاؤٹ اور خیال کی وجہ سے نہیں کھایا کہ ہوسکتا ہے کہ یہ گوشت اس بکری کا ہو جو لوٹ کے مال میں آئی تھی، حالانکہ کوفہ میں ہزاروں سینکڑوں بکریاں ہوں گی اور ان میں دو چار ہی مل گئی تھیں۔

اس سے ایک قدم آگے دیکھو۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک روز دیکھا کہ ایک فوجی کھانا کھا رہا ہے، کھانے میں گوشت تھا، اس نے بچا ہوا گوشت دریا میں ڈال دیا۔ ظاہر ہے کہ وہ گوشت مچھلیاں ہی کھائیں گی۔ اور ہم سب جانتے ہیں کہ فوجیوں کا معاملہ بے احتیاطی والا ہوتا ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ مچھلی کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ عمر بتائی گئی تو اتنے سالوں تک مچھلی نہیں کھائی، کہ کہیں وہ مچھلی نہ ہو جس نے اس فوجی کا پھینکا ہوا گوشت کھایا ہو۔ کیا نعوذ باللہ وہ لوگ دیوانے اور بیوقوف تھے؟ بالکل نہیں۔ پھر آخر اتنا زیادہ اہتمام کیوں کرتے تھے؟

حرام آلود غذا زہر سے زیادہ خطرناک ہے

آج اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ ہمارے کھانے میں تھوڑا سا زہر مل گیا ہے، اگرچہ وہ اتنا ہے کہ جس سے ہم مر نہیں جائیں گے، صرف بیمار ہو جائیں گے؛ تب بھی ہم اس کھانے کو ہاتھ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، اور وہ کھانا اپنے بیوی بچوں کو کھلانے کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوں گے، کیونکہ اس سے جسم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ لیکن جس کھانے کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ اس میں حرام کی ملاوٹ ہے، یا مشتبہ ہے، اس کو ہم خود بھی کھائیں اور اپنی اولاد کو بھی کھلاویں؛ تو اس سے روح کو کتنا نقصان ہوگا؟ یہ سوچنے کی بات ہے، حالانکہ روح کی زندگی ہی اصل زندگی ہے۔

حلال اور حرام کا طبعی اثر

نیک اور برے اعمال کی توفیق بھی حلال وحرام ہی پر موقوف ہے۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو اسی چیز کا حکم دیا جس کا حکم رسولوں کو دیا

﴿یَا أَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحاً﴾ اے رسولو! حلال کھاؤ اور نیک اعمال کرو، گویا حلال غذا کا طبعی اثر، آٹو میٹک نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو نیک عمل کی توفیق ہوگی۔

اس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟

اور باری تعالیٰ نے فرمایا﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ہم نے تم کو جو دیا ہے اس میں سے حلال کھاؤ۔ پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد میں، طلبِ علم میں، تبلیغ میں، یا کسی اور نیک کام میں حج وعمرہ میں جاتا ہے، اور سفر کی وجہ سے اس کے کپڑے میلے کچیلے، بال پراگندہ ہوجاتے ہیں، پھر وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر﴿یَا رَبِّ، یَا رَبِّ﴾ دعا کرتا ہے، اب اللہ کے راستہ میں ہے اور اتنی مشقتیں اٹھا رہا ہے پراگندہ حال اور پراگندہ بال ہے اور پھر وہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے، تو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ دعا ضرور قبول ہوجاتی، لیکن حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا جسم حرام غذا سے پل کر تیار ہوا﴿فَأَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهُ﴾ اس کی دعا کیسے قبول ہوگی۔ (مسلم شریف۔۲۳۹۳)

نیک عمل کی توفیق نہ ملنے کا ایک بڑا سبب

حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی حلال کھاتا ہے تو اس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں؛ وہ آدمی چاہے یا نہ چاہے۔ اور اگر کوئی آدمی حرام کھاتا ہے تو اس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں؛ وہ آدمی چاہے یا نہ چاہے۔ (احیاء العلوم۔۲/۱۰۳)

بہت سی مرتبہ ہم لوگ دینی مجلسوں میں بیٹھتے ہیں، اللہ والوں کے یہاں جاتے

ہیں اور نیک کام کرنا بھی چاہتے ہیں، روتے ہیں اور اس کے لئے کوشش بھی کرتے ہیں، لیکن ہم سے وہ نیک اعمال نہیں ہو پاتے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہم سے نیک اعمال نہ ہونے کے اسباب میں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ غذا میں حرام اجزاء کی ملاوٹ ہوتی ہے۔

دیوبند کا گھسیارا

اور حلال روزی کا ایک فطری اثر ہے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ فرماتے ہیں کہ دیوبند میں عبداللہ شاہ نامی ایک صالح آدمی تھے، ان کا ذریعۂ معاش یہ تھا کہ وہ جنگل میں جا کر گھاس کاٹ کر لا کر بیچا کرتے تھے، اور اسی سے بال بچوں پر خرچ کرتے تھے اور ان کی عادت یہ بھی تھی کہ گھاس کا جو گٹھر لاتے تھے، اس کو چھ آنے میں بیچ دیتے تھے، نہ کم نہ زیادہ۔ اور ان کا حساب یہ تھا کہ دو آنے اپنے لئے، دو آنے اپنے بال بچوں کے لئے اور دو آنے بچا کر رکھتے تھے۔ ان کی اس نیک نیتی کی وجہ سے لوگوں کو بھی یہ اہتمام رہتا تھا کہ اگر اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدنا ہوتا تو ان کے پاس سے ہی خریدتے تھے۔ لوگ پہلے ہی سے ان کے منتظر رہتے تھے کہ جب یہ بازار میں آویں تو دوڑ کر ان کے گٹھر پر ہاتھ رکھ دیں جس نے پہلے ہاتھ رکھ دیا اسی کو وہ بیچ دیا کرتے تھے۔ اور دو آنے بچا بچا کر جب کچھ رقم جمع ہو جاتی تو دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کی دعوت کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کی دعوت کھانے کے بعد دل میں اتنی نورانیت پیدا ہوتی تھی کہ چھ مہینہ تک اس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ نیک کام کرنے کو دل چاہا کرتا تھا اور گناہ سے نفرت رہتی تھی۔

ایک مشتبہ لقمہ کا ایک ولی پر اثر

اور حضرت مولانا یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ کسی نے ان کی

دعوت کی، ایک لقمہ اٹھایا اور ابھی حلق سے نیچے اترا تھا کہ دل کو محسوس ہوا کہ یہ مشتبہ لقمہ ہے، ڈاؤٹ اور شک والا ہے، بس! فوراً ہاتھ روک لیا، اس کے بعد نہیں کھایا۔ لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ جو ایک لقمہ چلا گیا تھا اس کا اثر دو مہینے تک یہ ہوا کہ دل میں خیال اور وسوسے آتے رہتے تھے کہ یہ گناہ کرلوں اور وہ گناہ کرلوں۔

بہرحال! اہل وعیال کے جو نفقات ہم پر واجب ہیں اس کے لئے ہمیں کوشش کرنی ہے، اور اس کے لئے کی جانے والی کوشش پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی ثواب ملتا ہے جو جہاد کرنے والے کو میدانِ جہاد میں ملتا ہے، لیکن یہ اہتمام بہت ہی ضروری ہے کہ اس کوشش میں حلال کا اہتمام کیا جائے، اور حرام سے بچنے کا اہتمام ضروری اور لازم ہے، اس کی طرف سے بہت زیادہ غفلت پیدا ہو رہی ہے۔

فطری اصول

اور دیکھو بھائی! یہ تو نیچرل یعنی فطری اصول ہیں جو بدل نہیں سکتے، جیسے ہم اور آپ زہر کھالیں، تو چاہے زہر جان بوجھ کر کھایا ہو یا بھول کر کھایا ہو، جب زہر اندر جائے گا تو وہ اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ آپ کہیں کہ مَیں نے بھول سے کھالیا تھا، مجھے معلوم نہیں تھا کہ زہر ہے، تو اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے۔ آپ کو معلوم ہو یا نہ ہو، آپ نے جان بوجھ کر کھایا ہو یا بھول سے کھایا ہو، زہر تو زہر ہے، وہ اپنا اثر دکھلاتا ہی ہے، یہ اس کا فطری اثر ہے۔

اسی طرح حرام اور حلال مال کا بھی فطری اثر ہے، ہم چاہے بھول سے کھاویں چاہے جان بوجھ کر کھاویں، اثرات تو ضرور ظاہر ہوں گے۔ اللہ والوں پر بھی اس کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں، ان پر یہ ہوتا ہے کہ کبھی اللہ کی طرف سے بیمار ہو جاتے ہیں

جس سے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے۔

اللہ والوں پر بھی اثر ہوتا ہے

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ کسی نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کی، حضرت شیخ کو بھی دعوت دی تھی۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ کے پیر تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت قبول کر لی اور حضرت شیخ کو معلوم تھا کہ اس کی کمائی مشتبہ ہے اس لئے حضرت شیخ نے دعوت قبول نہیں کی۔ اب اس نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ آپ نے میری دعوت قبول کی اور اس نے (حضرت شیخ) قبول نہیں کی۔ خیر! حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شریک بھی ہوئے لیکن وہاں سے آنے کے بعد انگلی ڈال کر قے کر کے سارا کھانا نکال دیا، اور اس کی وجہ سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کئی روز تک بیمار رہے۔ اللہ والوں پر یہی اثر ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس طرح کفارہ کرا دیتے ہیں۔

تقویٰ کا نبھانا

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ کوئی ایسا آدمی ان کی دعوت کرتا تو چونکہ حضرت کی طبیعت میں دلجوئی بہت تھی، حضرت کسی کا دل توڑا نہیں کرتے تھے، اس لئے قبول فرما لیا کرتے تھے۔ یہ بھی تقویٰ کا تقاضہ ہے، اور اس تقویٰ کا نبھانا بھی ایک سمجھ داری کی بات ہے۔ بعض لوگوں کو تو تقویٰ کا ہیضہ ہو جاتا ہے، جب کوئی آدمی دعوت کرتا ہے کہ جس کی کمائی میں کوئی شبہ نہیں ہے اس کو بھی پوچھتے ہیں کہ کس

طرح کمایا اور کہاں سے لایا۔ بھائی! جو آدمی کھلم کھلا ایسا ہو وہاں تو الگ بات ہے، لیکن جس کی کمائی کے متعلق لوگ ایسی کوئی بات نہیں کرتے تو پھر ہمیں اس میں زیادہ کھود کرید میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بھی ایک مسئلہ ہے۔

تقویٰ کا ہیضہ

ایک صاحب گنگوہ میں مہمان گئے اور مسجد میں ٹھہرے، اب جو کھانا لے کر جاتا تو وہ پوچھتے کہ اس کی کمائی کیسی ہے؟ کوئی کسان ہے تو اس سے پوچھتے کہ اچھا تو نے غلہ اپنے یہاں کھلایا، کسی پڑوسی کی کھیت میں سے تو نہیں گذارا؟ ایسا تو نہیں ہوا، ویسا تو نہیں ہوا۔ جا! مَیں تیرا کھانا نہیں کھاتا، اس طرح وہ کسی کا کھانا بھی نہیں کھا رہے ہیں۔ اور آپ کی مسجد میں کوئی ساتھی آئے اور آپ کھانا لے جائیں اور وہ نہ کھائے، بھوکا رہے، تو آپ اس کو اپنے لئے عیب سمجھیں گے کہ ایک مسافر آدمی ہماری مسجد میں آیا اور وہ بھوکا سویا، اس سے سب کو تکلیف ہوتی ہے، اور ہر شخص یہ سوچتا ہے کہ کسی طرح اس کو کھلاویں۔ اب جو بھی آدمی جائے تو اندر سے کچھ نہ کچھ مکھی نکال کر اس کو وہ صاحب رد کر دیں۔ لوگ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے کہ حضرت! ایسا ایسا معاملہ ہے، ان کا کیا جائے؟ تو حضرت نے فرمایا کہ ان سے کہو کہ لوگوں کو کاہے کو پریشان کرتے پھرتے ہو، یہاں گولر کا ایک درخت ہے، اس میں سے گولر لے کر کھا لیا کریں؛ اس میں کوئی شک وشبہ والا معاملہ نہیں ہے۔

بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ تقویٰ کو نبھانا اور اس کے تقاضہ کو پورا کرنا بھی ایک سمجھداری کی بات ہوتی ہے۔ ایسے واقعات سن کر بعض لوگوں کو جب تقاضہ ہوتا ہے تو وہ ایسا غلو کرتے ہیں کہ ساری دنیا پریشان ہو جاتی ہے، خود تو پریشان ہوتے ہی ہیں

اور گھر والے، رشتہ دار، پڑوسی اور سب لوگ پریشان ہوجاتے ہیں۔

خیر! حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جب کوئی دعوت کرتا تھا اور حضرت کو اگر معلوم ہوجاتا کہ اس کی کمائی مشتبہ ہے تو حضرت دست آور گولی لے لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ بھائی! مجھے تو دست آرہے ہیں؛ لہٰذا مَیں معذور ہوں۔ دیکھو! اللہ والوں کی یہ شان ہوتی ہے کہ ایک مسلمان کا دل بھی نہ ٹوٹے اور تقویٰ کا تقاضہ بھی پورا ہوجائے۔

ماتحتوں کی نافرمانی کا ایک سبب

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ شریعت نے بیوی بچوں کا جو نفقہ واجب کیا ہے اس کی ادائیگی میں ہم اور آپ کوشش کرتے ہیں، لیکن بھائی! اگر ہم ایسی غذا لاکر کھلاویں گے تو اس کے نتیجہ میں گھروں میں اللہ کی بھی اور آپ کی بھی نافرمانیاں ہی ہوں گی۔ اولاد نافرمان ہوگی، بیوی نافرمان ہوگی۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ بیوی نماز نہیں پڑھتی، مَیں تو بہت سمجھاتا ہوں، لیکن ٹی وی دیکھتی رہتی ہے، کسی طرح مانتی ہی نہیں، اولاد بھی نہیں مانتی۔ یہ جو نافرمانیاں ہوتی ہیں ان کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر کسی کے یہاں ایسا ہورہا ہو تو آپ اس کے متعلق ایسا سوچنے لگیں۔ یہ بھی ہماری ایک بڑی مصیبت ہوگئی ہے، یہ نظریہ بھی بہت ہی غلط ہے، حالانکہ اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ آپ اپنے لئے تو ضرور یہ سوچیں کہ کہیں کوئی ایسی بات تو نہیں ہورہی ہے، لیکن دوسرے کے متعلق کبھی ایسا مت سوچیں۔ ہمارا معاملہ اُلٹ گیا ہے، دوسروں کے لئے سوچتے ہیں، لیکن اپنے لئے کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچتے ہمارے بزرگوں میں معاملہ برعکس تھا کہ ایسی بات اپنے گھر میں ہورہی ہے تو وہ سوچتے تھے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مَیں مشتبہ غذا لاکر ان کو کھلا رہا ہوں۔ اس لئے

اگر کسی دوسرے کے یہاں ایسا ہو رہا ہو تو وہاں یہ چیز فٹ کرنے کی کوشش مت کرنا۔ خیر! عرض کرنے کا حاصل یہ ہے کہ حلال کا اہتمام کیا جائے، یہ بہت ضروری ہے۔

پانچ لاکھ روپے صدقہ کر دیے

ہمارے اسلاف کے واقعات ہم پڑھیں۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تجارت میں ایک پارٹنر تھا، اور امام صاحب کی عادت یہ تھی کہ تجارت کرتے تھے لیکن خود سودا نہیں کرتے تھے، دوسروں کو مال دیدیتے تھے اور نفع میں اس کو شریک کر لیتے تھے۔ حفص بن عبدالرحمٰن آپ کے شریک تھے، آپ نے ان کے پاس کپڑوں کے کئی تھان بھجوائے کہ اس کو فروخت کر دینا اور جو نفع ہوگا اس میں شرکت ہوگی۔ ایک کپڑے میں عیب تھا، آپ نے کہلوایا کہ جو خریدار آوے اس کو یہ عیب بتا دینا، پھر بیچنا۔ ان کے یہاں ہول سیل میں سودا ہوتا تھا۔ خیر! ایک آدمی بیس ہزار درہم میں پورا مال خرید کر لے گیا۔ آج کل کے حساب سے باسٹھ کلو چاندی جو تقریباً پانچ لاکھ روپے کی ہوتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے پوچھا کہ وہ عیب بتا دیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ مَیں وہ عیب بتانا تو بھول ہی گیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا بلکہ حقیقتاً وہ بھول گئے تھے۔ پوچھا کہ کس کے ہاتھ بیچا ہے؟ انہوں نے کہا کہ وہ بھی معلوم نہیں، اگر معلوم ہوتا تب بھی معاملہ صاف کرا لیتے۔ تو امام صاحب نے پورے بیس ہزار درہم (نفع بھی اور پونجی بھی) صدقہ کر دیے اور آئندہ کے لئے ان کے ساتھ پارٹنر شپ (PartnerShip) بھی ختم کر دی لہٰذا شریعت نے جو نفقہ کا حکم دیا ہے، اس کو حاصل کرنے کے معاملہ میں حلال کا اہتمام بہت ہی ضروری ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اہل وعیال کے اوپر خرچ کرنے کے سلسلہ میں بیان چل رہا ہے۔

جو کچھ بھی خرچ کروگے؛ اس کا بدلہ پاؤگے

﴿وَمَاأَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَيُخْلِفُهُ﴾ تم جو کچھ بھی خرچ کروگے اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی عطا فرمائے گا۔ اہل وعیال کے اوپر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کا بھی یہی حکم ہے۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ آدمی اگر مسجد بنانے میں، مدرسہ بنانے میں، اللہ کے راستہ میں، کسی غریب کو کھانا کھلانے میں، یا کسی اور کام میں خرچ کرے؛ تب ہی اس کو ثواب ملتا ہے، لیکن اگر وہ اپنے گھر والوں کے اوپر کچھ خرچ کرتا ہے تو اس میں ثواب نہیں ملے گا۔ اس آیت کو ذکر کرکے بتلا دیا گیا کہ جس کام میں بھی جو کچھ بھی آپ خرچ کریں گے، بشرطیکہ وہ کام ایسا ہو جہاں خرچ کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا اور آخرت میں ضرور عطا فرمائیں گے۔

کون سا خرچ افضل ہے؟

٢٨٩۔عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: دِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ، وَدِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ فِيْ رَقَبَةٍ، وَدِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰى مِسْكِيْنٍ، وَدِيْنَارٌ أَنْفَقْتَهُ عَلٰى أَهْلِكَ أَعْظَمُهَا أَجْراً الَّذِيْ أَنْفَقْتَهُ عَلٰى أَهْلِكَ. (رواہ مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک دینار وہ ہے جو تم اللہ کے راستہ میں خرچ کرو، ایک دینار وہ ہے جو کسی غلام کے آزاد کرنے میں خرچ کرو، ایک دینار وہ ہے جو آپ کسی غریب پر صدقہ کریں اور ایک دینار وہ ہے جو آپ اپنے گھر والوں پر خرچ کریں، ان چاروں میں سب سے زیادہ ثواب کے اعتبار سے بڑھا ہوا وہ ہے جو آپ نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا۔

افادات: -اللہ تعالیٰ کا راستہ عام ہے، چاہے جہاد میں خرچ کرو، طلبِ علم میں خرچ کرو، تبلیغ میں خرچ کرو، حج میں خرچ کرو، عمرہ میں خرچ کرو؛ یہ سب اس میں داخل ہے۔اسی طرح پہلے زمانہ میں غلام ہوا کرتے تھے، غلام کو آزاد کرنے پر بھی بہت ثواب اور اجر کا وعدہ کیا گیا ہے اور اس کی بڑی ترغیب دی گئی ہے۔کسی غلام کو آزاد کرنا گویا اس کو ایک نئی زندگی عطا کرنا ہے۔

یہاں چار قسم کے خرچوں کا تذکرہ کیا گیا (۱) ایک روپیہ وہ ہے جو آپ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں (۲) ایک روپیہ وہ ہے جو کسی غلام کو آزاد کرانے میں خرچ کرتے ہیں (۳) ایک روپیہ وہ ہے جو کسی غریب پر صدقہ کرنے میں خرچ کرتے ہیں (۴) اور ایک روپیہ وہ ہے جو اپنے گھر والوں کا جو نان نفقہ واجب ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔

حضور ﷺ چاروں کا تذکرہ کرنے کے بعد آگے فیصلہ کے طور پر فرماتے ہیں کہ ان چاروں میں سب سے زیادہ ثواب کے اعتبار سے بڑھا ہوا وہ روپیہ ہے جو آپ نے اپنے گھر والوں پر خرچ کیا یعنی اس میں آپ کو سب سے زیادہ ثواب ملے گا۔اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جانے والا، غلام کو آزاد کرانے میں خرچ کیا جانے والا، کسی غریب پر صدقہ کے طور پر خرچ کیا جانے والا اور اپنے گھر والوں پر خرچ کیا جانے والا؛ ان میں سب سے زیادہ ثواب اس روپیہ میں اور اس رقم میں ملتا ہے جو آپ نے اپنے گھر والوں پر خرچ کی ہے۔

اور اس کی وجہ علماء بتاتے ہیں کہ گھر والوں کا نفقہ آپ پر فرض ہے، اور جو بھی کسی مسکین اور غریب کو صدقہ کے طور پر دیں گے یا کسی غلام کو آزاد کرانے میں آپ خرچ کریں گے، یا اللہ کے راستہ میں خرچ کریں گے؛ یہ سب نفل ہے، اور سب ہی جانتے ہیں کہ فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ

گھر والوں پر خرچ کیا جانے والا روپیہ زیادہ اجر رکھتا ہے۔

نیت درست کرلیں

اور یہ بہت اہم چیز ہے، جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے سماج میں کون ہے جو اپنے گھر والوں، اپنے بال بچوں، اپنی بیوی وغیرہ کے نفقہ کے لئے کمانے کے واسطے محنت و مشقت نہ اٹھاتا ہو، سب ہی محنت و مشقت اٹھاتے ہیں اور ان کے لئے زحمت اُٹھا کر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں، لیکن یہ سب بوجھ، مفت کی بیگاری اور مجبوری سمجھتے ہیں، حالانکہ ایسا نہ سمجھا جائے بلکہ آدمی یوں سمجھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا نفقہ میرے اوپر فرض اور واجب کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر لازم کئے گئے فرض اور واجب کو ادا کرنے کے لئے مَیں محنت کر رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کر رہا ہوں؛ تو ان شاء اللہ جو کچھ بھی آپ محنت کریں گے وہ سب ثواب اور اجر میں شمار ہوگا۔

نیت بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے

پچھلی مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ایک روایت نقل کی ہے کہ جو اپنے گھر والوں کو حلال روزی لا کر دینے کے واسطے محنت کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کر رہا ہے۔ اس لئے نیت کے بدل جانے سے عمل کا حکم بدل جاتا ہے۔ دراصل کسی چیز کا عبادت بننا اور کسی چیز پر ثواب کا حاصل ہونا اور نہ ہونا؛ اس کا مدار ہی نیت پر ہے۔ مثال کے طور پر فرض کر لیجئے کہ اگلے روز ذرا پیٹ خراب ہو گیا تھا، کہیں زیادہ کھانا کھا لیا تھا، تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ایک دو روز

کھانا چھوڑ دو، اس لئے چھوڑ دیا اور کچھ نہیں کھایا اور اس طرح صبح سے شام تک بھوکا رہا، لیکن روزہ کی نیت نہیں تھی بلکہ نیت صرف یہ تھی کہ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی، یہ آدمی بھی صبح سے شام تک کھانا نہیں کھا رہا ہے۔ اور ایک وہ آدمی جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے روزہ کی نیت سے صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہے، تو اس کو روزہ کا ثواب ملے گا، اور پہلے والا بھی بھوکا پیاسا رہا لیکن اس کو روزہ کا ثواب نہیں ملے گا۔

فرق نیت سے ہوتا ہے

عبادت اور عادت میں فرق نیت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہم لوگ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو نیت کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھتے ہیں، اور ایک آدمی بس کے انتظار میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہے، یہ بھی اسی طرح کھڑا ہے جیسے ایک نمازی آدمی نماز میں باقاعدہ کھڑا رہتا ہے۔ یا جیسے ایک استاذ نے طالب علم کو سزا کے طور پر کھڑا کر دیا، یا رکوع کی طرح جھکا کر کھڑا کر دیا، تو وہ بھی بظاہر رکوع میں ہے؛ لیکن وہ عبادت نہیں کہلائے گی۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ عادت اور عبادت میں فرق نیت کی وجہ سے ہوتا ہے، آدمی اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کا ارادہ کر لے تو اسے عبادت کہیں گے، اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا یہی عبادت واطاعت ہے۔ روزہ وغیرہ کی جو شکل وصورت بتلائی گئی ہے وہ بھی درحقیقت عبادت نہیں ہے بلکہ اس کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کر رہے ہیں، یہ نیت ہو تب ہی عبادت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہی عبادت ہے

اسی لئے اگر ہم ایسے وقت میں نماز پڑھیں جس میں نماز پڑھنے کی شریعت نے

اجازت نہیں دی، مثلاً سورج طلوع ہورہا ہے، اس وقت باقاعدہ کوئی آدمی وضو کر کے نماز کی نیت سے نماز پڑھے، جیسا نماز میں تلاوت، قیام، رکوع، سجدہ کرتے ہیں وہ سب کچھ کرے، تو اس پر ثواب نہیں ملے گا بلکہ وہ گنہگار ہوگا، اس لئے کہ اس وقت نماز سے منع کیا گیا ہے، سورج کے طلوع ہوتے وقت نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے، تو اس پر ثواب تو کیا ملتا، اُلٹا گنہگار ہوگا۔

تو دیکھو! یہاں صورت نماز کی ہے، لیکن اس پر کوئی ثواب نہیں ملا۔ معلوم ہوا کہ اس میں عبادت کی شان اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کی وجہ سے آتی ہے، کیونکہ یہ ایسے وقت میں نماز پڑھ رہا ہے جب اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، اس لئے ایک ہی صورت ہونے کے باوجود وہ نماز نہیں کہلائے گی، اور اس پر کوئی ثواب نہیں ملے گا، بلکہ اُلٹا گنہگار ہوگا۔

اسی طرح روزہ کا معاملہ بھی ہے، سال بھر کے اندر کچھ دن ایسے بھی ہیں کہ جن میں روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے، جیسے عید الفطر، عید الاضحیٰ یعنی بقرعید کا دن، اور اس کے بعد تین دن، گیارہ، بارہ، تیرہ ذی الحجہ؛ جن کو ایامِ تشریق کہتے ہیں، اس طرح کل پانچ دن ایسے ہیں جن میں شریعت نے روزہ رکھنے سے منع کیا ہے، اب کوئی آدمی باقاعدہ نیت کر کے روزہ رکھے، تو ایسے روزوں پر ثواب تو کیا ملتا، اُلٹا وہ گنہگار ہوگا۔

معلوم ہوا کہ روزہ کی یہ صورت عبادت نہیں ہے بلکہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ بعض اوقات میں نماز پڑھنے سے منع کر دیا گیا، اور بعض ایام کے اندر روزہ رکھنے سے منع کر دیا گیا، وہ دراصل یہی بتلانے کے لئے ہے کہ نماز اور روزہ کی جو شکل وصورت شریعت نے بتائی ہے، وہ بذاتِ خود کوئی عبادت نہیں ہے، بلکہ اصل عبادت تو اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانا ہے، جس موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا گیا ہو اس کو اللہ ہی کا حکم بجالانے کے ارادے اور نیت سے انجام دیں؛ تو وہ عبادت ہے۔

یہ بھی عبادت ہے

بال بچوں کا خرچہ ونفقہ، ان کی ضرورتیں پوری کرنا آپ پر ضروری قرار دیا گیا ہے، ان کے لئے آپ اگر حلال طریقہ سے کمائیں گے اور شریعت کی حدود میں رہ کر آپ جو کچھ بھی کریں گے یعنی اس کمانے میں دوسرے کسی گناہ کا ارتکاب نہ ہو، جیسے نماز کا وقت آرہا ہے، تو نماز پڑھ رہے ہیں، رمضان ہے تو روزے رکھ رہے ہیں۔ ایسا نہیں کہ نوکری ایسی کرلی کہ نماز چھوٹ رہی ہے۔ تجارت ایسی کررہے ہیں کہ نماز کا وقت آرہا ہے تو نماز نہیں پڑھ رہے ہیں؛ پھر تو یہ گڑبڑ والا معاملہ ہو جائے گا۔ شریعت کے حدود میں رہ کر ساری چیزوں کی رعایت کرتے ہوئے آپ کما رہے ہیں؛ تو یہ کمانا بھی عبادت ہے۔

فرض کا ثواب نفل سے زیادہ ہے

بہر حال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہاں نبی کریم ﷺ نے اسی غلط فہمی کو دور کیا ہے کہ چار قسم کے خرچ بتائے (۱) ایک روپیہ وہ جو اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جائے (۲) ایک روپیہ وہ جو کسی غلام کے آزاد کرنے میں خرچ کیا جائے (۳) ایک روپیہ وہ جو کسی غریب پر صدقہ کیا جائے (۴) اور ایک روپیہ وہ جو آپ اپنے بال بچوں پر ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے خرچ کریں۔ نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ چوتھے نمبر والے میں سب سے زیادہ ثواب ہے، اس لئے کہ وہ خرچ آپ پر فرض ہے اور فرض کا ثواب نفل کے مقابلہ میں زیادہ ہوا کرتا ہے۔

حدود کی رعایت ضروری ہے

۲۹۰. وعن أبی عبد اللہ ویقال لہ أبی حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ جو نبی کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام

عبدالرحمن ثَوْبَانَ بْنِ بُجْدُدٍمَوْلی رسولِ اللہ ﷺ قال رسولُ اللہ ﷺ: أَفْضَلُ دِیْنَارٍیُنْفِقُهُ الرَّجُلُ دِیْنَارٌیُنْفِقُ عَلیٰ عِیَالِهٖ، وَدِیْنَارٌیُنْفِقُهُ عَلیٰ دَابَّتِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ وَدِیْنَارٌیُنْفِقُهُ عَلیٰ أَصْحَابِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ.
(رواہ مسلم)

ہیں،فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے اشادفرمایا: سب سے بہتر دینار جس کوآدمی خرچ کرتا ہے،وہ ہے جس کوآدمی اپنے بال بچوں پرخرچ کرے۔ اور(پھر)وہ دینار جواللہ کے راستہ میں اپنی سواری پرخرچ کرے،اور(پھر)وہ دینار جواپنے رفقاء پراللہ کے راستہ میں خرچ کرے۔

افادات:- بال بچوں پرخرچ کرنے میں سب سے زیادہ ثواب ہے لیکن وہ بھی حدود میں رہ کرہوتب ہی۔کوئی آدمی یہ سمجھے کہ بال بچوں کوسنیما دکھانے کے لئے پیسے خرچ کریں؛تو یہ صحیح نہیں ہوگا،اس لئے کہ فضول خرچی کی شریعت اجازت نہیں دیتی، ہرچیز میں شریعت نے حدود بتلائے ہیں ان کی رعایت ضروری ہے۔

﴿وَدِیْنَارٌیُنْفِقُهُ عَلیٰ دَابَّتِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ﴾اوراللہ کے راستہ میں اپنی سواری پرجو پیسہ خرچ کرتا ہے جیسے جہاد کے لئے،حج کے لئے،تبلیغ کے لئے،طلبِ علم کے لئے نکلا اوراس میں جوسواری-گھوڑا،اونٹ،اپنی گاڑی،موٹروغیرہ-استعمال کررہاہے،اوراس پرجوپیسہ خرچ کررہاہے؛اس پربھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ثواب ہے۔

﴿وَدِیْنَارٌیُنْفِقُهُ عَلیٰ أَصْحَابِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ﴾اوراپنے رفقاء کے اوپراللہ کے راستہ میں جوخرچ کرتا ہے۔جولوگ اللہ کے راستہ میں اس کے ساتھ شریک ہیں،سفرِحج میں شریک ہیں،سفرِطلبِ علم میں،سفرِجہاد میں،سفرِتبلیغ میں،ان پرجوکچھ خرچ کرتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں افضل ہے۔گویا یہ وہ جگہیں ہیں جن پرخرچ کرنے سے زیادہ ثواب ملتا ہے،لیکن اول نمبرپراسی کوذکرکیا کہ جوروپیہ اپنے بال بچوں پرخرچ کرے؛وہ سب سے افضل ہے۔

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا

۲۹۱. وعن أم سلمة رضی اللہ عنہا قَالَتْ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ! هَلْ لِيْ أَجْرٌفِيْ بَنِيْ أَبِيْ سَلِمَةَ أَنْ أُنْفِقَ عَلَيْهِمْ وَلَسْتُ بِتَارِكَتِهِمْ هٰكَذَاوَهٰكَذَا،اِنَّمَاهُمْ بَنِيَّ؟فَقَالَ: نَعَمْ! لَكِ أَجْرُ مَاأَنْفَقْتِ عَلَيْهِمْ. (متفق علیه)

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا اے اللہ کے رسول! مجھ سے ابوسلمہ کی جو اولاد ہے ان پر اگر مَیں خرچ کروں تو اس میں مجھے ثواب ملے گا؟ اور مَیں ان کو ایسے ہی بے یارو مددگار نہیں چھوڑوں گی، وہ میری ہی اولاد ہے۔ آپ نے فرمایا: جی ہاں! تم ان پر جو بھی خرچ کروگی اس میں تم کو ثواب ملے گا۔

افادات: -ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پہلے حضرت اُبوسلمہ رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں اورانہیں کے ساتھ ہجرت کر کے حبشہ گئی تھیں، پھر وہاں سے مدینہ منورہ آئیں، یہاں آنے کے بعد حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا تو بیوہ ہوگئیں، عدت پوری ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ان کے ساتھ نکاح کیا، حضور اکرم ﷺ سے ان کو کوئی اولاد نہیں ہوئی، لیکن پہلے شوہر ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے ان کی کئی اولادتھیں، زینب بنت ابی سلمہ، عمر بن ابی سلمہ وغیرہ، اوران کے سب بچے چونکہ چھوٹے تھے اور یہ ان سب کو لیکر ہی آئی تھیں اس لئے یہ سب حضورا کرم ﷺ ہی کی پرورش اور تربیت میں تھے۔

بچوں کو اپنے ساتھ کھانے بٹھانا چاہیے

عمر بن اُبی سلمہ کا قصہ بھی بخاری شریف کتاب الأطعمہ میں ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا، حضور ﷺ کھانے کے لئے مجھے اپنے ساتھ بٹھاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کھاتے وقت بچوں کو بھی اپنے ساتھ بٹھانا چاہیے، بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے وہ خود اکیلے کھا لیتے ہیں، بچوں کو ساتھ میں نہیں

بٹھاتے۔ بھائی! جب تک آپ بچوں کو ساتھ لے کر نہیں بیٹھیں گے، وہاں تک بچے کھانے پینے کے آداب سے کیسے واقف ہوں گے؟ وہ تو پھر اپنے طور پر جو کچھ کرتے رہیں گے ان کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ اس لئے کھانے پینے کے درمیان بھی بچوں کو اپنے ساتھ شریک رکھنا چاہیے اور اپنے ساتھ بٹھانا چاہیے۔ حضورِ اکرم ﷺ بھی عمر بن ابی سلمہ کو اپنے ساتھ بٹھایا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک پلیٹ میں کھانا کھا رہا تھا اور میرا ہاتھ پوری پلیٹ میں گھوم رہا تھا، جیسا کہ بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ یہاں ہاتھ مارا، اِدھر مارا اُدھر مارا۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے مجھے تین نصیحتیں فرمائیں کہ بیٹا! جب کھانا کھاؤ تو پہلے بسم اللہ پڑھو، دوسرا اپنے سامنے سے کھاؤ، اور تیسرا یہ کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ (بخاری شریف۔۵۳۷۶)

حضور ﷺ کی نصیحت اور حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ﴿فَمَا زَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِيْ بَعْدُ﴾ حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خصوصیت تھی کہ چاہے بڑا ہو یا چھوٹا، بچہ ہو یا جوان اور بوڑھا، عورت ہو یا مرد ہو؛ جب ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے کسی چیز کے متعلق تنبیہ فرما دی، یا ہدایت فرما دی؛ تو بس! پھر تو وہ بات ان کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتی تھی، پھر کبھی اس کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ چھوٹے بچے تھے لیکن وہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میرے کھانے کا طریقہ یہی ہو گیا یعنی حضورِ اکرم ﷺ نے کھانے کے لئے جو تاکید فرمائی تھی، اسی کے مطابق وہ کھاتے تھے، اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا تھا۔

بہر حال! حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد ان کے اگلے شوہر سے تھیں، ان میں یہ عمر بن ابو سلمہ بھی تھے اور نبی کریم ﷺ کے پروردہ تھے، ان کے متعلق ایک مرتبہ نبی کریم

ﷺ سے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا ﴿هَلْ لِیْ أَجْرٌ فِیْ بَنِیْ أَبِیْ سَلِمَةَ أَنْ أُنْفِقَ عَلَیْهِمْ﴾ اے اللہ کے رسول! مجھ سے ابوسلمہ کی اولاد جو ہے ان پر اگر مَیں خرچ کروں تو اس خرچ کرنے میں مجھے ثواب ملے گا؟ ﴿وَلَسْتُ بِتَارِکَتِهِمْ هٰکَذَا وَهٰکَذَا، اِنَّمَا هُمْ بَنِیَّ﴾ اور ظاہر ہے مَیں ان کو ایسے ہی بے یارومددگار نہیں چھوڑوں گی کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں بلکہ وہ میری ہی اولاد ہے۔ مطلب یہ کہ میری اولاد ہے اور مَیں ان کی ضرورت کو پورا کرنے کا اہتمام کروں گی، اب ان کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کھانے میں کپڑے میں اور دوسرے کاموں کے اندر مَیں جو کچھ بھی خرچ کروں گی؛ تو کیا اس پر مجھے ثواب ملے گا؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا ﴿نَعَمْ! لَکِ أَجْرُ مَا أَنْفَقْتِ عَلَیْهِمْ﴾ جی ہاں! تم ان پر جو بھی خرچ کروگی اس میں تم کو ثواب ملے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی اپنے بال بچوں پر جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے: یہ بھی ثواب سے خالی نہیں ہے۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ کسی غریب کو کھانا کھلا دیا یہی نیکی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے، اپنے بال بچوں کو جو کچھ کھلا رہے ہیں یہ بھی نیکی ہے، اور اس پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب ملتا ہے، اور جیسا کہ اوپر گذر چکا کہ اس میں سب سے زیادہ ثواب ہے، اس لئے آدمی اس کو بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد اور متعین کیا ہوا فریضہ، ذمہ داری اور ایک واجب سمجھ کر انجام دے اور اس پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے مناقب

۲۹۲. وعن سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ فی حدیثه الطویل الذی قدّمناهُ فی أوّل الکتاب فی باب النیة، أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث جو شروع کتاب میں نیت کے باب میں گذر چکی ہے اس میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم جو

قَالَ لَهُ: وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّاأُجِرْتَ بِهَا، حَتّٰی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِیْ امْرَأَتِکَ. (متفق علیہ)

کچھ بھی خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہو گے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو اجر وثواب ملے گا، یہاں تک کہ تم جو (لقمہ) اپنی بیوی کے منہ میں رکھو گے (اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ثواب ملے گا۔)

افادات:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ان دس حضراتِ صحابہ میں سے ہیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہی موقعہ پر ایک ہی مجلس میں جنت کی بشارت سنائی تھی، جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے۔ اور عشرۂ مبشرہ دوسرے صحابہ کے مقابلہ میں افضل سمجھے جاتے ہیں۔ یہ مستجاب الدعوات تھے، ان کی دعا ہمیشہ قبول ہوتی تھی۔ ان کی ایک طویل روایت کا ایک حصہ یہاں پیش فرمایا ہے، پوری روایت شروع کتاب میں نیت کے بیان میں گذر چکی ہے۔

دراصل فتحِ مکہ کے موقعہ پر یہ بیمار ہو گئے تھے اور ان کو زندہ رہنے کی امید نہیں رہی تھی تو انہوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ شاید میں اسی بیماری میں انتقال کر جاؤں گا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو زندہ رکھے گا اور آپ کے ذریعہ ایک قوم کو فائدہ پہنچائے گا اور ایک قوم کو نقصان پہنچائے گا۔ چنانچہ اہلِ فارس سے مقابلہ کے نتیجہ میں ان کی قوت ختم ہوئی اور مسلمانوں کو پورے طور پر ان پر تسلط اور غلبہ نصیب ہوا، اس جنگ میں مسلمانوں کی طرف سے سپہ سالار یہی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تھے۔ اسی بیماری کے وقت ایک جملہ انہوں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول! میرے وارثوں میں صرف ایک لڑکی ہے اور کوئی نہیں ہے، تو کیا میں اپنا پورا مال صدقہ کر دوں؟ یا پورے مال کو اللہ کے راستہ میں دینے کی وصیت کر دوں؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ نہیں۔ پھر

انہوں نے کہا کہ دو تہائی؟ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ آدھا؟ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ آدھا بھی نہیں۔ پھر انہوں نے کہا کہ ایک تہائی؟ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ ہاں! ایک تہائی کی اجازت ہے، لیکن ساتھ میں یہ بھی فرمایا کہ تم اپنے پیچھے اپنے وارثوں کو پیسے والا مالدار چھوڑ کر جاؤ یہ اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ غریب رہیں اور لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں، یعنی یہ پیسے تم ان کے ہاتھ میں دو گے تو ان کو وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے خرچ کریں گے اور کسی کے محتاج نہیں رہیں گے۔

مال جیسا آرہا ہے؛ ویسا جارہا ہے

ایک بات یاد رہے، بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جو اپنی سیدھی اولاد ہوتی ہے وہی وارث ہے، مثلاً اگر کسی کی بیٹی ہے اور ساتھ میں بھائی بہن وغیرہ ہیں تو چونکہ بھائی بھی وارث ہے اور بہن بھی وارث ہے۔ اب وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال ان کے پاس خواہ مخواہ مفت میں جارہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بھائی! کسی کے پاس مفت میں نہیں جارہا ہے بلکہ جس اللہ نے تم کو یہ دولت و نعمت عطا فرمائی ہے، اسی کا فیصلہ ہے کہ تمہارے مرنے کے بعد فلاں فلاں وارث ہیں، اس لئے یہ سب مفت میں نہیں جارہا ہے بلکہ انہیں کا حصہ ہے، اگر یہی دیکھا جائے تو آپ کے پاس بھی تو مفت میں ہی آیا ہے۔ لہٰذا جیسا آرہا ہے؛ ویسا ہی جارہا ہے۔

بہر حال! بعض لوگ یوں سمجھ کر کہ یہ تو ہمارے نہیں ہیں، یہ کوشش کرتے ہیں کہ مرنے سے پہلے ایسی شکلیں اختیار کی جائیں کہ مال کم سے کم ہو جائے اور ان کے ہاتھ میں کم سے کم جائے، حالانکہ جانتے ہیں کہ وہ بھائی بہن غریب و محتاج ہیں، اور ان کے ساتھ تو ویسے بھی اپنی زندگی میں حسنِ سلوک کرنا چاہیے تھا، اب مرنے کے وقت جو کچھ

تم چھوڑ کر جا رہے ہو، اس میں اللہ تعالیٰ نے ان کا حصہ لگا دیا، تو اب اس میں بھی کم کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟

جنت سے ایک بالشت دور جہنمی

اسی لئے آدمی کبھی ایسی وصیت کر جاتا ہے اور بڑا گنہگار بن جاتا ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ آدمی زندگی بھر نیکی کے کام کرتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے، لیکن مرتے وقت کوئی ایسی وصیت کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ جہنمی بن جاتا ہے (مشکوٰۃ شریف۔ص ۲۶۵) اس لئے کہ وہ کسی کا حق مار تا ہے، شریعت سے ناواقفیت کی وجہ سے ایسی سب باتیں پیش آتی ہیں۔

ایک لقمہ پر بھی ثواب ہے

بہر حال! حضور ﷺ نے آگے ایک جملہ یہ ارشاد فرمایا ﴿وَاِنَّکَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللهِ اِلَّا اُجِرْتَ بِهَا﴾ تم جو کچھ بھی خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو اجر و ثواب ملے گا، چاہے وہ کسی پر بھی خرچ کر رہے ہو، آگے ایسی بات حضور ﷺ بتا رہے ہیں جو جلدی سے آدمی کی طبیعت قبول نہیں کرتی ہے کہ اس پر بھی ثواب مل سکتا ہے ﴿حَتّٰی مَاتَجْعَلُ فِیْ فِیْ امْرَأَتِکَ﴾ یہاں تک کہ تم جو لقمہ اپنی بیوی کے منہ میں رکھو گے اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ثواب ملے گا۔ جب ایک لقمہ اس کے منہ میں رکھے جانے پر ثواب مل رہا ہے تو جو کچھ بیوی بچوں پر خرچ کیا جائے گا اس میں تو ضرور ثواب ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس پر بیوی کے جو حقوق واجب کئے ہیں، وہ ان کو ادا کر رہا ہے۔ اس کو خوش رکھنا، اس کے دل

کو راضی رکھنا، اس کی دلجوئی کرنا، اس پر خرچ کرنا؛ یہ سب بھی اللہ کے دئے ہوئے حکم ہیں تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو ثواب بھی ملے گا۔

صحبت پر ثواب

پہلے بھی بتا چکا ہوں، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت اس نیت سے کرے کہ مَیں اس کا حق ادا کر رہا ہوں تو اس پر بھی ثواب ملے گا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم (اللہ تعالیٰ ان کو بہترین بدلہ دے) نے فوراً سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کر کے اپنی شہوت پوری کر رہا ہے؛ کیا اس پر بھی ثواب ملے گا؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ اپنی شہوت کسی ناجائز اور حرام جگہ میں پوری کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں؟ تو اپنے آپ کو گناہ سے بچانے کے لئے اگر اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کر رہا ہے اور اس کا (بیوی کا) حق ادا کرنے کے لئے کر رہا ہے تو کیا اس پر ثواب نہیں ملے گا؟ آدمی گناہ سے بچنے کے لئے جب کوشش کرے گا تو ضرور ثواب ملے گا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا پہلو صحابہ کرام کے سامنے اجاگر کیا جس کی وجہ سے اس کا نیکی ہونا اور اس پر ثواب کا ملنا کھلم کھلا واضح ہو گیا۔

بیوی کے منھ میں لقمہ دینے پر ثواب کیوں؟

اصل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے شریعت کا جو نظام دنیا میں قائم کیا ہے اس کو جاری کرنے اور اس کو تقویت پہنچانے کے لئے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور شیطان اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس نظام کو توڑنے اور اس کو کمزور کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو آدمی کا اپنی بیوی کے منھ میں لقمہ دینا یہ میاں بیوی کے تعلقات مضبوط کر

نے اوران کے درمیان محبت کے بڑھنے کا سبب ہے،اور جب محبت بڑھے گی تو آپسی حقوق زیادہ سے زیادہ اداہوں گے،شوہر بھی بیوی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے گا اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح کو جاری کر کے دنیا میں جوشرعی نظام قائم کیا ہے وہ بھی سیدھی پٹری پر چلے گا۔ یوں نہ سمجھئے کہ یہ لقمہ ایسا ہی بیکار ہے، بلکہ یہ تو خدائی نظام میں تقویت پہنچانے والا ہے۔شیطان کا معاملہ اُلٹا ہے کہ شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی بھی طرح سے میاں بیوی کے تعلقات میں دراڑ پڑے،اور یہ گاڑی پٹری سے ہٹ جاوے۔اسی لئے شیطان کی نگاہ میں اپنے ساتھیوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ شطونگڑا ہے جومیاں بیوی کے تعلقات کوخراب کرانے والا ہو۔

تونے سب سے عمدہ کام کیا

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شیطان شام کے وقت سمندر پراپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنے تمام چیلے چانٹوں اورشطونگڑوں (چھوٹے شیطانوں) سے حساب وکتاب لیتاہے، جیسے شام کوآقا اپنے ماتحتوں سے رپورٹ مانگتا ہے کہ آج تم نے کیا کام کیا؟ تو نے کیا کیا؟ تونے کیا کیا؟ ہرایک اپنااپنا کارنامہ بیان کرتا ہے۔ایک کہتا ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھنے جارہاتھا،مَیں نے اس کے دل میں دوسرے کام کاایسا خیال ڈال دیا کہ وہ کام ہی میں لگارہا اورنماز ضائع کردی۔شیطان کہتا ہے کہ ٹھیک ہے۔اس طرح دوسرااور تیسرا؛اوردوسرے تمام سےان کے کارنامے سننے کے بعدآخرمیں کونہ میں سے ایک چیلا کھڑاہوتاہےاور کہتاہے کہ مَیں نے میاں بیوی کے درمیان ایسا جھگڑا کرایا کہ الگ ہی نہیں ہوا یہاں تک کہ شوہر نے بیوی کوطلاق دیدی۔شیطان اس کوخوب گلے لگاتاہےاور کہتاہے کہ تونے سب سے عمدہ کام کیااوراس کوخوب شاباشی دیتاہے۔(مسلم شریف۔۴۸۱۳)

یہ صرف طلاق ہی نہیں ہے

اس لئے کہ میاں بیوی کے تعلقات کا ٹوٹنا کوئی معمولی چیز نہیں ہے، اور اس کے نتیجہ میں صرف دو آدمیوں میں ہی جھگڑا نہیں ہوتا بلکہ دو خاندان ٹوٹتے ہیں۔ اب یہ خاندان اُس کا دشمن، اور وہ خاندان اِس کا دشمن بن جاتا ہے، یہ اُس کی برائی کرتا ہے اور وہ اِس کی برائی کرتا ہے۔ اب یہ نکاح تو ٹوٹ ہی گیا ہے، اور حلال طریقہ سے اپنی شہوت پوری کرنے کا جو ایک راستہ تھا وہ تو بند ہو گیا، اب آگے چل کر بعد میں دوسرے نکاح کے لئے معلوم نہیں کہ کب نوبت آتی ہے وہاں تک ضرورتیں اور طبعی تقاضے تو لگے ہوئے ہی ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ شیطان پھر زنا کاری و بدکاری میں بھی مبتلا کر دے، اور معلوم نہیں اس کے نتیجہ میں کہ کیا کیا ہوگا۔ اس لئے یہ صرف ایک طلاق ہی نہیں ہے بلکہ بہت کچھ ہے، اسی وجہ سے شیطان اس پر بہت خوش ہوتا ہے۔

ایسا بیگانہ پن بھی کیا؟

بہر حال! انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام ایسے ایسے طریقے بتلاتے ہیں جس سے دونوں کے تعلقات مزید خوشگوار ہوں اور ان دونوں میں محبت اور زیادہ بڑھے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ عورت مرد کے بچے ہوئے پانی سے وضو اور غسل نہ کرے، اور مرد عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کرے (ابوداود۔۸۱) بعض روایت میں یہ ہے۔ اور بعض روایتوں میں یہ ہے کہ مرد عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کرے (ابوداؤد۔۸۲) لیکن عورت مرد کے بچے ہوئے پانی سے غسل اور وضو کرے یا نہ کرے اس کی کوئی تصریح نہیں ہے۔ تو وہاں فقہاء نے اپنا اپنا نظریہ پیش فرمایا ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت علامہ عثمانی

رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صاحبِ شریعت نے جو حکم دیا وہ یہ ہے کہ میاں بیوی جب دونوں کے اندر تعلقات بالکل ایسے ہیں گویا دونوں ایک دوسرے کا جز و سمجھے جاتے ہیں کہ دونوں کے تعلقات ایسے ہیں کہ یہ اُس کا ایک حصہ ہے اور وہ اِس کا ایک حصہ ہے، اِس کے رشتہ دار اُس کے رشتہ دار ہیں اور اُس کے رشتہ دار اِس کے رشتہ دار ہیں، اسی لئے حرمت کے رشتے بھی قائم ہو جاتے ہیں، کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ بیوی کے جو اصول وفروع ہیں وہ مرد کے لئے اصول وفرع کے حکم میں ہو جاتے ہیں یعنی اس کے ماں باپ، دادادادی، نانانانی وغیرہ۔ اسی طرح مرد کے اصول وفروع بھی عورت کے لئے ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔ تو ان دونوں میں اتنا یگانگت کا رشتہ قائم ہو گیا، اب اس کے بعد ایسا بیگانہ پن کیوں ہو کہ وہ الگ غسل کر رہا ہے اور یہ الگ غسل کر رہی ہے؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ دونوں ایک ساتھ غسل کرو، یہ معاملہ ان کے تعلقات کو مزید استوار کرنے والا ہے۔

خیر! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ بیوی کے منہ میں لقمہ دئے جانے پر حضور ﷺ نے ثواب کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کو کوئی آدمی شہوت پر محمول نہ کرے، بلکہ یہ ایک تو فطری چیز ہے اور تعلقات کا تقاضہ ہے، اور تعلقات جتنے استوار ہوں گے اتنی ہی حقوق کی ادائیگی زیادہ ہوگی اور جتنا اس میں بگاڑ ہوگا اُتنا مرد کا دھیان دوسری طرف جائے گا، اور عورت کا دھیان دوسری طرف جائیگا، اور دونوں (میاں بیوی) گناہ میں مبتلا رہیں گے اور جتنے دونوں کے تعلقات ٹھیک ہوں گے؛ اتنا ہی دونوں گناہ سے بچیں گے۔

نیت درست کر لی جائے

۲۹۳۔ عن أبی مسعود البدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلیٰ اَهْلِهِ

حضرت ابومسعود انصاری بدری رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ سے نقل کرتے ہیں: جب آدمی اپنے گھر والوں پر

نَفَقَةً يَحْتَسِبُهَا،فَهِيَ لَهُ صَدَقَةٌ. (متفق عليه)

خرچ کرتا ہے،اور اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا ہے،تو وہ اس کے لئے صدقہ ہے۔

افادات:-﴿يَحْتَسِبُهَا﴾اس خرچ کرنے میں وہ اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتا ہے یعنی گویا اللہ کا حکم سمجھ کر اور یہ گمان کرتے ہوئے کہ مَیں جو خرچ کر رہا ہوں اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو ثواب اور اجر ملے گا،تو وہ اس کے لئے صدقہ کا حکم رکھتا ہے یعنی جس طرح صدقہ پر ثواب ملتا ہے اس پر بھی اس کو ثواب ملے گا۔مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بیوی بچوں پر خرچ تو سبھی کرتے ہیں لیکن اگر نیت ذرا درست کر لی جائے؛ تو یہی عبادت بن جائے گا اور اس پر ثواب ہی ثواب ہے۔

بیکار لوگ

۲۹۴.عن عبدالله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: كَفىٰ بِالْمَرْءِ اِثْمًا أَن يُّضَيِّعَ مَنْ يَّقُوْتُ. (أبو داود)

وراوه مسلم فى صحيحه معناه قال: كَفىٰ بِالْمَرْءِ اِثْمًا أَن يَّحْبِسَ عَمَّنْ يَّمْلِكُ قُوْتَهُ.

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے گناہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ جس کے خرچہ کی ذمہ داری اس پر ہے اس کو ضائع کردے۔مسلم شریف کی روایت میں ہے: آدمی کے گناہ کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے خرچہ کو روکے رکھے

افادات:-یعنی بیوی بچوں کا نفقہ اس پر ہے لیکن وہ محنت کر کے کما کر لا کر ان کو دیتا نہیں ہے،جس کے نتیجہ میں وہ تکلیفیں اٹھا رہے ہیں اور برباد ہو رہے ہیں؛تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کے گنہگار ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے یعنی یہ آدمی بڑا گنہگار ہے۔

بعض لوگ بیوی بچوں کے نفقہ کی ادائیگی کے لئے جو محنت کرنی چاہیے اور جو مشقت اُٹھانی چاہیے اور ان کی ضرورتیں پوری کرنے کا جو اہتمام ہونا چاہیے؛ وہ نہیں

کرتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی پریشان رہتے ہیں۔ بیوی کی ضرورت ہے، وہ بھوکی مررہی ہے، اس کے پاس پہننے کے لئے کپڑے نہیں ہیں، وہ دوسروں کے پاس سے قرض مانگ رہی ہے، وہ خود محنت اور مزدوری کررہی ہے، دوسروں کے یہاں برتن دھوکر اور جھاڑو لگا کر اپنی ضرورتوں کو پورا کررہی ہے، حالانکہ اس کی ضرورتیں تو آپ کو پوری کرنی چاہیے، آپ اس کی ضرورتیں پوری نہیں کررہے ہیں جس کے نتیجہ میں وہ ضائع ہورہی ہے، یہ بہت بڑا نقصان ہورہا ہے، ایسا آدمی بہت سخت گنہگار ہے۔

روپیہ خرچ کرنے سے گھٹنے والا نہیں ہے

۲۹۵. عن أبی هریرةؓ أن النبیّ ﷺ قَالَ مَا مِن یَّوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ اِلَّا مَلَکَانِ یَنْزِلَانِ، فَیَقُوْلُ أَحَدُهُمَا: أَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقاً خَلَفاً، وَیَقُوْلُ الْاٰخَرُ: أَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُمْسِکاً تَلَفاً.

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ارشاد فرمایا: ہر دن جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے آسمان سے دعا کرتے ہوئے اترتے ہیں، ان میں سے ایک یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا بدل عطا فرما یعنی جس نے خرچ کیا اور خرچ کے نتیجہ میں اس کا جو پیسہ گیا اس کے بدلہ میں اس کو دنیا اور آخرت میں دوسرا دیدے اور دوسرا فرشتہ یہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! روکنے والے کے مال کو برباد کر۔

افادات:۔ چونکہ عام طور پر آدمی اپنے بیوی بچوں پر یا جن کا خرچہ ونفقہ اس کے اوپر واجب ہے اس کی ادائیگی میں جو کوتاہی کرتا ہے اس کی ایک وجہ اس کا بخل بھی ہے، اس کی طبیعت میں جو بخل ہے اس کی وجہ سے وہ باوجود پیسہ ہونے کے ان کا حق ادا نہیں کرتا ہے، اور ان کا نفقہ نہیں دیتا ہے، نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرما کر بتلا دیا کہ بھائی! تم یوں سمجھتے ہو کہ ان پر خرچ کریں گے تو پیسہ گھٹ جائے گا اور کم ہو جائے گا، اتنا بیلنس کم ہو جائے گا، اتنے روپے جیب سے نکل جائیں گے؟ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں، ایک فرشتہ تو یوں دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! جو خرچ کرنے والا ہے اس کو بدلہ عطا فرما یعنی اس نے جو خرچ کیا ہے اس کی جگہ پر دوسرے اتنے ہی مل جائیں۔ آپ جو سمجھتے تھے کہ پیسہ کم ہوگیا اور گھٹ گیا، وہ گھٹنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی نے فرشتوں کو دعا کے واسطے مقرر کیا ہے۔ ایک تو دعا فرشتے کی ہو اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے کر رہا ہو، تو وہ دعا تو ضرور قبول ہوگی۔ معلوم ہوا کہ آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ خرچ کریں گے تو کم ہوجائے گا، ایسا نہیں ہے۔ جہاں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں آپ خوب خرچ کرو، ذرا بھی کم نہیں ہوگا، بدلہ ضرور ملے گا، اس کی جگہ پر دوسرا آجائے گا۔

روپیہ بچانے والا خوش فہمی میں ہے حالانکہ......

اور جو یوں سمجھتا ہے کہ خرچ کریں گے تو کم ہوجائے گا اور خرچ نہیں کریں گے تو جمع رہے گا تو اس کا حال بھی آگے آگیا ہے کہ دوسرا فرشتہ دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! جو بخل کرنے والا ہے، جہاں خرچ کرنے کے لئے کہا گیا ہے وہاں خرچ نہیں کرتا ہے، اس کے مال کو برباد کر۔ اب وہ یوں سمجھتا ہے کہ بیوی کے کپڑے لانے ضروری تھے، لیکن نہیں لایا اور اس طرح مَیں نے اتنے پیسے بچالئے۔ ایک ٹائم کھانا نہیں دیا، بال بچوں کو بھوکا رکھا، تو مَیں نے دوسو روپے کی بچت کرلی، اس طرح کر کے وہ خوش فہمی میں ہے، اور یہاں فرشتہ اس کے لئے بددعا کر رہا ہے کہ یہ جو کچھ بچت ہوئی ہے وہ برباد ہوجائے۔

اس لئے جو آدمی نبی کریم ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، آپ ﷺ کے ارشادات کو حق و یقین سمجھتا ہے، اِس حدیث کو سننے کے بعد وہ کاہے کو اپنے بیوی بچوں کے خرچ میں بخل کرے گا، اور کیوں خرچ نہیں کرے گا، بلکہ ضرور کرے گا۔ اس لئے کہ اس کو یقین ہے کہ اگر خرچ

نہیں کروں گا تو سب برباد ہو جائے گا اور اگر خرچ کروں گا تو ان کی ضرورتیں بھی پوری ہوں گی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم بھی پورا ہوگا اور اس کی جگہ پر دوسرا مال تو آ ہی جائے گا۔

کھڑکی کھولیے

جیسے آپ کا برتن بھرا ہوا ہے، تو اس بھرے ہوئے میں سے کچھ نکالو گے تب ہی تو دوسرا اس میں آئے گا، اگر برتن میں آنے کی جگہ ہوگی تب ہی تو آ سکتا ہے۔ جیسے اِدھر سے ہَوا اسی وقت داخل ہوگی جب کہ اُدھر کی کھڑکی کھول دو گے، اور ہوا کے نکلنے کا راستہ پیدا کرو گے، اِدھر سے نکلے گی تو اُدھر سے آئے گی، اِدھر کی کھڑکی بند کر رکھی ہے تو جب ہوا کو آپ جانے نہیں دیں گے تو دوسری ہوا کیسے آئے گی۔ اس لئے قاعدہ یہی ہے کہ خرچ کرو گے تو دوسرا آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے یہی قاعدہ بتلایا ہے۔

اوپر والا ہاتھ اور نیچے والا ہاتھ

۲۹۶. وعنه عن النبی ﷺ قال: اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلیٰ، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ، وَ خَیْرُ الصَّدَقَةِ مَا کَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنیً، وَمَنْ یَّسْتَعْفِفْ یُعِفَّهُ اللهُ، وَمَنْ یَّسْتَغْنِ یُغْنِهِ اللهُ.

(رواہ البخاری)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے اچھا ہے۔ اور جب آپ خرچ کرنے لگیں تو جن کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے وہاں سے شروعات کرو اور بہترین صدقہ وہ ہے جو غنیٰ کے ساتھ ہو۔ اور جو آدمی اپنے آپ کو عفیف بنائے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو سوال سے محفوظ رکھیں گے۔ اور جو اپنے آپ کو مستغنی رکھے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو مستغنی بنا دے گا۔

افادات:- ”اوپر والا ہاتھ اور نیچے والا ہاتھ“ کے کئی مطلب بیان کئے گئے ہیں۔ اوپر والا یعنی خرچ کرنے والا، اور نیچے والا یعنی روکنے والا اور بخل کرنے والا۔ اور ایک

مطلب یہ ہے کہ اوپر والا یعنی دینے والا اور نیچے والا یعنی مانگ کر لینے والا، اگر بغیر مانگے کچھ مل جائے اور لے، وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ اور ایک مطلب یہ ہے کہ اوپر والا یعنی سوال سے اپنے آپ کو بچانے والا۔ اور نیچے والا یعنی سوال کرنے والا۔ یہ تینوں مطلب بتلائے گئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی کسی سے سوال نہ کرے اور خرچ کرنے (دینے) کا اہتمام کرے، اور بخل سے کام نہ لے بلکہ خرچ کرتا رہے۔

ایسی سخاوت مطلوب نہیں ہے

﴿وَابۡدَأۡ بِمَنۡ تَعُوۡلُ﴾ دوسری بات نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمائی کہ جب آپ خرچ کرنے لگیں تو جن کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، جن کا خرچہ آپ پر واجب ہے، وہاں سے شروعات کرو۔ آپ جب خرچ کرنے بیٹھیں گے اور خرچ کرنا شروع کریں گے، تو ابتداء اپنے گھر سے ہونا چاہیے، پہلے گھر والوں پر اس کے بعد دوسروں پر خرچ کرو، اس لئے کہ ان کا نفقہ اور ذمہ داری آپ پر واجب ہے، ورنہ گجراتی میں کہاوت ہے:-

(Dth ltt Atufht Dtkxe attxu , WvttDgttgt ltu ytxtu)

یعنی گھر میں بھوکے ہیں اور دوسروں پر سخاوت ہو رہی ہے، ایسی سخاوت شریعت میں مطلوب اور پسندیدہ نہیں ہے۔ ایسی بھی کیا سخاوت؛ کہ اس سخاوت سے اپنے گھر والے ہی محروم رہیں، اس کو کوئی سخی کہے گا؟ کسی بھی آدمی میں اگر کوئی خوبی ہے تو اس کی اس خوبی کا نمبر اول پر فائدہ گھر کے لوگوں کو پہنچنا چاہیے، تب تو بات ہے، ورنہ پھر وہ خوبی ہی کیا ہوئی؟

بہرحال! حضور ﷺ فرماتے ہیں ﴿وَابۡدَأۡ بِمَنۡ تَعُوۡلُ﴾ جس کے خرچہ کی ذمہ داری آپ پر ہے، خرچ کرنے میں انہی سے شروعات کرو۔

بہترین صدقہ

﴿وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ مَاكَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنىً﴾ بہترین صدقہ وہ ہے جو غنٰی کے ساتھ ہو۔ ''غنٰی کے ساتھ ہو'' کا کیا مطلب ہے؟ بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ کسی محتاج اور ضرورت مند کو اگر دو تو اتنا دو کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے اور اپنی اس ضرورت کی طرف سے وہ مستغنی ہو جائے۔ مثلاً ایک آدمی بھوکا ہے، آپ اس کو کھانا دے رہے ہیں، تو ایسا نہ کرو کہ روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا، بلکہ کم سے کم اتنا تو دو کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ ایک آدمی ننگا ہے اس کو آپ کپڑا دے رہے ہیں، تو کم سے کم اتنا کپڑا تو دیجئے کہ اس کا ستر ڈھک جائے، اگر کپڑے کا تھان نہ دو؛ تو کم سے کم ایک جوڑا تو دے دیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس ضرورت کے لئے آپ صدقہ کر رہے ہیں تو اتنا دیجئے کہ اس کی اس ضرورت کے سلسلہ میں وہ آدمی کسی اور کا محتاج نہ رہے۔

اور بعض حضرات یوں کہتے ہیں آپ جب صدقہ کریں تو اس طرح کیجئے کہ آپ کے پاس اتنا رہ جائے کہ پھر بعد میں آپ خود محتاج نہ ہو جائیں یعنی سخاوت کا ایسا جوش نہ ہو کہ اپنے پاس جو کچھ تھا وہ سب دے ڈالا، جب اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضرورت پیش آئی تو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں کہ مجھے دو۔ کسی نے پوچھا کہ بھائی! تیرے پاس تو تھا اس کا کیا کیا؟ تو کہتا ہے کہ مَیں نے سخاوت کر ڈالی۔ بھائی! ایسی سخاوت بھی کیا کہ اب تجھے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے۔ اس لئے اپنی ضرورت اور اپنے گھر والے جن کی ذمہ داری ہے ان کی ضرورت کے مطابق رکھ کر پھر خرچ کرے اور صدقہ کرے؛ ایسا صدقہ بہترین صدقہ ہے۔ ہاں! اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ جس کے اوپر کسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، خود تنہا ہے اور بھوکا رہنے اور ضرورتوں کو برداشت کر

نے کی طاقت رکھتا ہے اور اس نے سب خرچ کر ڈالا اور پھر کسی کے سامنے ہاتھ بھی نہیں پھیلاتا تو وہ الگ بات ہے۔ لیکن اگر دوسروں کی ضروریات اس کے ذمہ لگی ہوئی ہے اور وہ صبر نہیں کر سکتے تو پھر بعد میں خواہ مخواہ ان کو صبر کی تلقین کرتے رہنا یہ بات ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اپنے پاس اتنا رہنے دے کہ اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضرورت پوری ہو، اسی کو ﴿عَنْ ظَهْرِ غِنىً﴾ کہا گیا ہے۔

بچنے پر بچایا جائے گا

﴿وَمَنْ يَّسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللّٰهُ﴾ اور جو آدمی اپنے آپ کو عفیف بنائے گا: تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرمائیں گے، اور سوال سے محفوظ رکھیں گے۔ عفت کا معنیٰ پاکیزگی، یعنی جو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچائے گا اور سوال نہیں کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نیکی کا کام کرنے کے لئے خود اس آدمی کو بھی اس کام کا ارادہ اور ہمت کرنی پڑتی ہے، ایک مرتبہ اس نے ارادہ اور ہمت سے کام لیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دستگیری ہو جائے گی، جیسے کوئی بچہ جب چلنا سیکھتا ہے تو کھڑا ہوتا ہے اور پھر ایک قدم اٹھاتا ہے تو باپ خود آگے بڑھ کر اس کو پکڑ لیتا ہے اور چلا لیتا ہے، لیکن اگر وہ بچہ قدم ہی نہیں اٹھائے تو پھر کوئی اس کو نہیں چلائے گا۔ اسی طرح یہاں پر بھی اصل تو اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی ہے، لیکن آدمی کی آزمائش ہے کہ وہ ارادہ کرے اور ہمت سے اس کام کو شروع کر دے۔ تو جو آدمی عفیف بننا چاہے اور سوال سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو محفوظ رکھے گا۔

﴿وَمَنْ يَّسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللّٰهُ﴾ اور جو اپنے آپ کو مستغنی رکھے گا، کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے گا، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو مستغنی بنا دے گا۔

اَلْاِنْفَاقُ مِمَّا یُحِبُّ وَمِنَ الْجَیِّدِ

محبوب اور عمدہ چیز کو
اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَآتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّآاِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً. أمابعد:—

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

لَنْ تَنَالُوْاالْبِرَّحَتّٰی تُنْفِقُوْامِمَّاتُحِبُّوْنَ.

یَااَیُّھَاالَّذِیْنَ آمَنُوْااَنْفِقُوْامِنْ طَیِّبَاتِ مَاکَسَبْتُمْ وَمِمَّااَخْرَجْنَالَکُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَلَاتَیَمَّمُوْاالْخَبِیْثَ مِنْہُ تُنْفِقُوْنَ.

محبوب اور عمدہ چیز اللہ کے راستہ میں دو

اس باب میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جو چیز خرچ کی جائے وہ ایسی ہونی چاہیے جو خرچ کرنے والے کو اپنی تمام چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہو، اور وہ چیز عمدہ بھی ہو۔ دو چیزیں بتائی ہیں محبوب بھی ہو اور عمدہ بھی ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے دو آیتیں اور ایک روایت پیش کی ہے۔

پہلی آیت ہے ﴿لَنْ تَنَالُوْاالْبِرَّحَتّٰی تُنْفِقُوْامِمَّاتُحِبُّوْنَ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم کامل نیکی نہیں پاسکتے یہاں تک کہ تم خرچ کرو اس مال میں سے جس کو تم پسند کرتے ہو یعنی جس مال سے تم کو سب سے زیادہ محبت ہو، اس کو جب تک خرچ نہیں کروگے، تب تک کامل نیکی تمہیں حاصل نہیں ہوگی۔

سلام پھیرنے کا انتظار نہ کیا

حضراتِ صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ وہ اپنی محبوب

چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کیا کرتے تھے۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اوراس کے پاک رسول ﷺ کے ارشادات پرعمل کرنا انہیں حضرات کا کام تھا، یہی وہ لوگ تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی کریم ﷺ کی صحبت اورآپ کی خدمت کے لئے چنا تھا اور وہ اس کا حق رکھتے تھے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ تو روایت میں آرہا ہے، ان کے علاوہ اور بھی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات کتابوں میں لکھے ہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور میرے علم میں آئی تو مَیں نے سوچا کہ میرے پاس جو مال ہے اس میں مجھے سب سے زیادہ محبوب کیا ہے؟ چنانچہ میری ایک باندی مرجانہ نامی تھی جو مجھے بڑی محبوب تھی مَیں نے اس کو اللہ کے واسطے آزاد کردیا۔ جب اللہ کے لئے آزاد کردیا تو مقصد تو حاصل ہوگیا، اب آزاد کرنے کے بعد اگر مَیں اس کے ساتھ نکاح کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا، شرعاً اس کی اجازت تھی اوراس میں کوئی بھی رکاوٹ نہیں تھی، لیکن اس صورت میں یہ ہوتا کہ ایک چیز جس کو مَیں نے اللہ کے واسطے اپنی ملکیت سے نکال دی ہے، صورتاً اس کو دوبارہ اپنے پاس لانا پایا جاتا، اور یہ نوبت نہ آوے اس لئے مَیں نے اس باندی کا نکاح اپنے غلام نافع کے ساتھ کرادیا۔ (روح المعانی۔۳/۲۲۳)

انہی سے ایک اور واقعہ منقول ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے اندر تلاوت کرتے ہوئے اسی آیت پر گذرے، تو اسی وقت نماز ہی کی حالت میں اپنی ایک محبوب باندی کو اشارہ سے آزاد کردیا

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عمل

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ جلولہ کی باندیوں میں سے کوئی اچھی باندی خرید کر میرے لئے بھیجو، چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے ایک بہت ہی حسین اور قیمتی باندی خرید کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے بھیجی۔ جب وہ آپ کے پاس پہنچی تو آپ نے اس کو اپنے قریب بلایا اور یہ آیت پڑھی ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اور اس کو آزاد کر دیا۔ (الدر المنثور)

محمد بن منکدر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اپنا ایک گھوڑا لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول میرے مال میں مجھے یہ گھوڑا سب سے زیادہ پسند ہے اور چونکہ باری تعالیٰ یہ فرماتے ہیں ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اس لئے مَیں یہ گھوڑا اللہ کے لئے صدقہ کرتا ہوں آپ اس کو قبول فرمالیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ لے لیا اس کے بعد آپ نے وہ گھوڑا ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو دیدیا، یہ دیکھ کر ان کے چہرے پر کچھ تغیر سا آیا، شاید ان کے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ بھی عجیب معاملہ ہوا کہ باپ کے پاس سے نکل کر بیٹے کے پاس گیا، گھر کا گھر میں ہی رہا، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے چہرے کے یہ آثار دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا صدقہ قبول کرلیا، اب مجھے اختیار ہے، مَیں چاہوں تو تمہارے بیٹے کو دوں یا کسی اور کو دوں، تمہیں اس کی وجہ سے گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (روح المعانی،۳/۲۲۳)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ کثرت سے شکر خرید کر صدقہ کرتے تھے اور لوگوں کو کھلاتے تھے، ایک مرتبہ ان کے غلام نے کہا کہ آپ شکر کے بجائے کھانا خرید کر دیا کریں تو زیادہ فائدہ ہوگا، انہوں نے فرمایا کہ تیری بات تو صحیح ہے، لیکن قرآن میں باری تعالیٰ یہ فرماتے ہیں ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ اور مجھے شکر بہت پسند

ہے اس لئے مَیں شکر خرید کر صدقہ کرتا ہوں، تا کہ مجھے کامل نیکی ملے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ کے ارشاد پر عمل کا کیسا جذبہ ان حضرات کے اندر موجود تھا۔ (روح المعانی۔۳/۲۲۳)

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

قبیلۂ بنوسُلیم کا ایک آدمی کہتا ہے کہ مَیں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی خدمت میں مقام ''ربذہ'' میں حاضر ہوا۔ ''ربذہ'' ایک دیہاتی علاقہ تھا، حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مشورہ سے وہیں منتقل ہو گئے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس سلسلہ میں ہدایت بھی فرمائی تھی۔ تو وہ آدمی کہتا ہے کہ جس زمانہ میں وہ وہاں رہتے تھے مَیں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ ایک آدمی جو اونٹوں کو سنبھال رہا ہے وہ معمر ہو چکا ہے اور ذرا کمزور بھی ہے، اور میرا جی چاہتا تھا کہ مَیں حضرت کی خدمت میں رہوں، اس لئے مَیں نے درخواست کی کہ حضرت! آپ مجھے اپنی خدمت میں رہنے کی اجازت دیجئے، آپ کے اونٹوں کو جو آدمی سنبھال رہا ہے، مَیں اس کی مدد بھی کروں گا اور آپ سے استفادہ بھی کروں گا، اس پر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بھائی! میرا دوست تو وہی ہے جو میری بات مانے، اگر تم میری اطاعت کرنے کے لئے تیار ہو، تب تو مَیں تم کو میرے پاس رہنے کی اجازت دیتا ہوں، ورنہ چلے جاؤ۔ اس نے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میری خواہش یہ ہے کہ جب مَیں کسی کو دینے کے لئے کوئی چیز مانگوں تو میرے مال میں جو سب سے بہتر ہو وہ لاکر مجھے دے۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ مَیں نے یہ شرط قبول کر لی اور اس ہدایت پر برابر عمل کرتا رہا ایک مرتبہ ان کو معلوم ہوا کہ فلاں چشمہ کے پاس جو لوگ آباد ہیں وہ کھانے پینے کی تکلیف میں مبتلا ہیں، تو حضرت نے مجھ سے کہا کہ میرے اونٹوں میں سے ایک اونٹ

لے آؤ۔ مَیں گیا اور دیکھا کہ ان اونٹوں میں ایک نر اونٹ سب سے عمدہ ہے اور وہ بڑا سدھایا ہوا اور بہت قیمتی بھی ہے، اور دوسرا نر اونٹ ان کے مال میں تھا بھی نہیں، اس لئے مَیں نے یوں سوچا کہ اگر یہ دیدیا جائے گا تو جفتی وغیرہ کے لئے نر اونٹ کی جو ضرورت رہتی ہے وہ بھی نہیں ہوگی، اس لئے مَیں نے اس کو چھوڑ دیا اور دوسرے نمبر پر ایک اونٹنی جو بہت بڑھیا تھی لیکن اس سے کم درجہ کی تھی وہ لا کر خدمت میں پیش کی۔ ان کی نظر جب اس اونٹ پر پڑی تو مجھ سے فرمانے لگے کہ تو نے میرے ساتھ خیانت کی ہے، مَیں فوراً گیا اور اس اونٹنی کو رکھ کر اس بڑھیا اونٹ کو لے کر آیا تو انہوں نے اعلان کیا کہ کون دو آدمی ایسے ہیں جو میرے کہنے کے مطابق نیکی کے کام میں شریک ہوں؟ دو آدمی آگے بڑھے، ان سے کہا کہ جلدی سے اس اونٹ کو ذبح کرو، اور پانی کے اس چشمہ کے پاس جتنے گھرانے رہتے ہیں، اس کے اتنے حصے کرو اور میرے گھر کا بھی اتنا ہی برابر کا ایک حصہ لگا لینا اور ان میں جا کر تقسیم کردو۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق اس کو ذبح کیا اور تقسیم کیا پھر انہوں نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اگر میری بات بھول گئے تھے تب تو تم معذور ہو، اور اگر جان بوجھ کر ایسا کیا تو کیوں؟ مَیں نے کہا کہ مَیں بھولا نہیں تھا بلکہ آپ کی بات تو یاد تھی لیکن آپ کی ضرورت کے پیشِ نظر مَیں نے ایسا کیا تھا۔ تو فرمایا کہ واقعی میری ضرورت کے لئے تم نے ایسا کیا تھا؟ مَیں نے کہا کہ ہاں۔ تو فرمانے لگے کہ میری حقیقی ضرورت تو یہ ہے کہ جب مَیں اکیلا قبر کے گھڑے میں ڈال دیا جاؤں گا اس وقت کی میری محتاجی سے بڑھ کر اور کوئی محتاجی نہیں ہوگی، اگر تم میری ضرورت کا خیال کرتے تو وہی اونٹ لاتے جس کی مَیں نے پہلے سے ہدایت کر رکھی تھی۔ (الدر المنثور)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی زریں نصیحت

پھر کہنے لگے کہ دیکھو! تمہارے مال میں تین پارٹنر اور شریک ہیں۔ایک شریک تو مقدر ہے۔تقدیر آدمی کے مال میں سے اپنا حصہ نکال ہی لیتی ہے۔بہت سی مرتبہ ہم پیسے رکھ کر سوچتے ہیں کہ فلاں کام میں آئیں گے،لیکن ہوا یہ کہ وہ کوئی چور لے گیا۔یا مثلاً کوئی چیز کچھ سوچ کر رکھی تھی لیکن سیلاب آیا اور وہ چیز بہہ گئی۔مطلب یہ ہے کہ تقدیر کی وجہ سے وہ چیزیں آدمی کے ہاتھ سے نکل جاتی ہیں۔تو ایک شریک تو مقدر ہے کہ بہت سی مرتبہ کوئی چیز اپنی کسی ضرورت کی سمجھ کر تم رکھتے ہو،اور تقدیر آ کر کسی بھی بہانے سے اس چیز کو تمہارے ہاتھ سے لے جاتی ہے،مثلاً چوری ہو گیا،سیلاب میں بہہ گیا،آگ لگنے کی وجہ سے جل گیا،یا اور کوئی بھی شکل ہو جاتی ہے۔

دوسرا شریک تمہارا وارث ہے جو اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب یہ مرے،قبر میں جاوے اور وہ مال میرے ہاتھ میں آوے۔اور تیسرے شریک تم خود ہو۔یہ کل تین شریک ہوئے لہٰذا تم ان تینوں میں سب سے کم حصہ لینے والے مت بنیو، بلکہ جب بھی دل میں آوے،فوراً اس کو خرچ کر کے اپنے لئے آخرت میں جمع کرا دیجیو،اگر رہنے دو گے تو وہ تمہارے ہاتھ میں رہنے والا نہیں ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک پرندے کا گوشت پیش کیا گیا،آپ کو پسند نہیں تھا اس لئے آپ نے اس کو تناول نہیں فرمایا اور کسی دوسرے کو منع بھی نہیں فرمایا۔مَیں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ گوشت میں فقیروں کو دیدوں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتی اس کو دینے کی بات کیوں کرتی ہو؟ (تفسیر ابن کثیر۔۱/۳۲۱) بہر حال! حضراتِ صحابہ کے

یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تم حقیقی طور پر کامل نیکی نہیں پا سکتے جب تک کہ تم تمہاری محبوب چیز کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرو۔

آ گے کیا بھیجا اور پیچھے کیا چھوڑا؟

اور حقیقت یہی ہے کہ جو خرچ کریں گے وہ ہمارے لئے جمع ہوگا، اگر یہاں رکھا رہے گا تو وہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ حدیثِ پاک میں ہے کہ جب آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو فرشتے پوچھتے ہیں ﴿مَا قَدَّمَ؟﴾ اس نے آگے کیا بھیجا؟ اور لوگ پوچھتے ہیں ﴿مَا أَخَّرَ؟﴾ کیا چھوڑ کر جا رہا ہے؟ (شعب الایمان۔۱۰۴۷۵)

دوسرے کے مال کی نگرانی

نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے پوچھا کہ کوئی ایسا ہے جس کو دوسرے کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ جواب میں صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ایسا تو کون ہوگا جس کو دوسروں کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو، ہر ایک کو اپنا ہی مال محبوب ہوتا ہے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اپنا مال تو وہی ہے جو تم نے کھایا پیا، یا پھر اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے جمع کرا دیا، باقی جو کچھ چھوڑ کر جاؤ گے؛ وہ سب دوسروں یعنی وارثوں کا ہے۔

ایک حماقت

اس حقیقت کو آدمی سمجھتا نہیں ہے۔ جو مال خود کمایا، خود اس کا مالک ہے، خود اس میں تصرف کر سکتا ہے؛ تب بھی خرچ نہیں کرتا ہے اور سوچتا یہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد میرے بچے میرے لئے دیں گے۔ ارے اللہ کے بندے! تو نے خود کمایا، تو اس کا

مالک تھااور اپنی مرضی سے اس میں جو چاہتا وہ تصرف کرسکتا تھا؛ لیکن تو نے خود تو خرچ کیا نہیں اور اب یہ امید رکھتا ہے کہ تیرے مرنے کے بعد تیری اولاد اس مال میں سے تیرے لئے خرچ کرے گی؟ یہ محال بات ہے۔کون اولاد ایسا کرتی ہے؟ کوئی نہیں کرتی۔

اصل بے وقوف تو یہ خود تھا

کسی کے باپ کا انتقال ہوجائے، اور وہ کروڑوں کی جائیداد چھوڑ کر جائے، تو اگر اس کی اولاد مل سمجھ کر خرچ کرنے کا فیصلہ کرے گی تو بہت سے بہت تو ایک دو فیصد اس کے لئے خرچ کرے گی، اور وہ بھی ایسا سمجھیں گے کہ باپ پر بڑا احسان کیا ہے، حالانکہ سارا مال وہی کما کر چھوڑ کر گیا تھا۔اور مَیں تو یہ کہتا ہوں کہ اس میں اولاد کا کوئی قصور بھی نہیں ہے، اصل بے وقوف تو یہ خود تھا کہ اپنی چیز تھی، خود خرچ کرسکتا تھا، لیکن جب خود اس نے اپنے لئے خرچ نہیں کی؛ تو اب اولاد اس کے لئے کیا خرچ کرے گی؟

اللہ تعالیٰ طَیِّب چیز ہی کو قبول فرماتے ہیں

بہرحال! باب کا عنوان قائم کیا تھا اس میں ایک بات تو یہ بتلائی تھی کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز محبوب ہونی چاہیے۔اور دوسری بات یہ بتلائی تھی ﴿وَمِنَ الْجَیِّدَ﴾ وہ چیز عمدہ بھی ہونی چاہیے، اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی دوسری آیت پیش کی ہے ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾ اے ایمان والو! تم نے جو کمایا اور حاصل کیا ہے اس میں جو چیز عمدہ ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرو۔لفظ ’’طَیِّـــب‘‘ قرآن وحدیث کی اصطلاح میں دونوں مفہوم میں بولا جاتا ہے، حلال کے لئے بھی لفظ ’’طَیِّـــب‘‘ استعمال کیا جاتا ہے، اور جو چیز عمدہ ہو اس کے لئے بھی اس کا

اطلاق ہوتا ہے، اور یہاں دونوں ہی مراد ہیں۔ظاہری طور پر بھی وہ چیز عمدہ ہونی چاہیے اور معنوی اعتبار سے وہ چیز حلال بھی ہونی چاہیے۔ایک چیز دیکھنے میں تو بہت اچھی ہے لیکن وہ حرام طریقہ سے حاصل کی گئی ہے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کی جاسکتی، حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ﴿اِنَّ اللہَ طَیِّبٌ، لایَقْبَلُ اِلَّا الطَّیِّبَ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور وہ پاک اور طیب چیز ہی کو قبول فرماتے ہیں۔اگر حرام چیز اللہ کے راستہ میں دی جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔اور اس آیت کا شانِ نزول بھی یہی بتلاتا ہے کہ یہاں طیب سے مراد عمدہ چیز ہے بعض لوگ گھٹیا قسم کی چیز صدقہ کے طور پر دیا کرتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَمِمَّا أَخْرَجْنَالَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ﴾ اور تمہاری زمین میں سے نکال کر ہم نے جو دیا اس میں سے بھی جو عمدہ ہو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرو ﴿وَلاتَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ اور دیکھو! ردی اور گھٹیا مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ارادہ مت کرنا۔ صاحبِ کتاب نے تو اتنی ہی آیت پیش کی ہے لیکن اسی آیت میں آگے جملہ ہے ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآأَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ تمہارا اپنا حال یہ ہے کہ ایسی گھٹیا چیز اگر کوئی آدمی تم کو دینا چاہے تو تم اس کو قبول نہیں کروگے، اِلَّا یہ کہ چشم پوشی اور درگذر سے کام لو۔

ہمارا مزاج

ہمارا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ جب اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی بات آتی ہے تو گھٹیا چیز ہی دیا کرتے ہیں جیسے نیا کپڑا آیا تو کہتے ہیں کہ پرانا جوڑا کسی مسکین کو اللہ واسطے دیدو۔ کھانا کھا چکے اور کچھ بچ گیا تو کہتے ہیں کہ اللہ کے واسطے کسی فقیر کو دیدو۔ یہاں تک کہ زندگی کا بھی گھٹیا حصہ ہی ہم دیتے ہیں، جوانی میں جب اللہ تعالیٰ نے

ساری صلاحیتیں دے رکھی تھیں اور قویٰ اعلیٰ درجے کے ملے ہوئے تھے تو اس زمانہ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت اور اس کی یاد میں استعمال نہیں کیا، اس وقت تو بس عیش و عشرت اور دنیا سے فائدہ اٹھانے میں لگے رہے اور جب بوڑھاپا آیا اور کسی کام کے نہ رہے، نہ منھ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت، گھر میں سے بھی بہوؤں نے نکال دیا کہ بڈھا خالی جھک جھک کرتا رہتا ہے، جا! مسجد میں جا کر بیٹھ؛ تو مسجد کا ایک کونہ پکڑ کر کہتا ہے کہ اب اللہ اللہ کرو، یعنی زندگی کا یہ وہ زمانہ ہے کہ جس میں کسی کام کا نہیں رہا تو اب اللہ کی یاد کے لئے فارغ ہو گیا۔ خیر! اگر کسی کو اللہ تعالیٰ یہ بھی توفیق دیدیں تو بڑی سعادت کی بات ہے، باقی یہ بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ پسندیدہ زمانہ تو جوانی ہی کا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ ایسی چیز کو بھی قبول کر لیتے ہیں، باری تعالیٰ خود ہماری حالت بیان فرماتے ہیں ﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ﴾ اگر تمہارے لئے کوئی ایسی چیز پیش کرتا تو تم اپنے لئے اس کو قبول نہ کرتے۔ سوچو کہ اللہ تعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے۔ یہ تو اس صورت میں ہے کہ کسی کے پاس عمدہ چیز ہو اور وہ ردی چیز پیش کرے، لیکن اگر کسی کے پاس بڑھیا چیز ہے ہی نہیں، جو بھی ہے وہ کم درجہ ہی کی ہے اور وہ اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرے گا، تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ اس کو ثواب مرحمت فرمائے گا۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا باغ

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں وہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے سوتیلے والد ہیں، ان کے والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ حضرت ام سُلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح انہی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا۔

۲۹۷. عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ أَبُوْطَلْحَةَ رضی اللہ عنہ أَكْثَرَ الْأَنْصَارِ بِالْمَدِيْنَةِ مَالًا مِّنْ نَخْلٍ، وَكَانَ أَحَبُّ أَمْوَالِهِ إِلَيْهِ بِيْرَحَآءَ، وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ، وَكَانَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَدْخُلُهَا وَيَشْرَبُ مِنْ مَّآءٍ فِيْهَا طَيِّبٍ. قَالَ أَنَسٌ: فَلَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ قَامَ أَبُوْطَلْحَةَ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! إِنَّ اللهَ تَعَالٰى أَنْزَلَ عَلَيْكَ ﴿لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ وَإِنَّ أَحَبَّ مَالِيْ إِلَيَّ بِيْرَحَآءُ، وَإِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالٰى أَرْجُوْا بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللهِ تَعَالٰى، فَضَعْهَا يَارَسُوْلَ اللهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللهُ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: بَخٍ! ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ، ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ. وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ. وَإِنِّيْ أَرٰى أَنْ تَجْعَلَهَا فِي الْأَقْرَبِيْنَ. فَقَالَ أَبُوْطَلْحَةَ: أَفْعَلُ يَارَسُوْلَ اللهِ. فَقَسَّمَهَا أَبُوْطَلْحَةَ فِيْ أَقَارِبِهِ، وَبَنِيْ عَمِّهِ. (متفق عليه)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سب سے زیادہ کھجور کے باغات کے مالک حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے، اوران کو اپنے کھجوروں کے باغات میں سب سے زیادہ محبوب باغ ''بیرحاء'' تھا، اور وہ بالکل مسجدِ نبوی کے سامنے تھا، اورخود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف بھی لے جاتے تھے اوراس میں میٹھا پانی نوش فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم کامل نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی محبوب چیز کوخرچ نہ کرو، تو حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اُٹھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے اورعرض کیا: اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، اور میرے اموال میں مجھے سب سے زیادہ محبوب ''بیرحاء'' ہے۔ لہٰذا یہ باغ میری طرف سے اللہ کے راستہ میں صدقہ ہے، میں اس پر اللہ تعالیٰ سے نیکی اورثواب کی اُمید رکھتا ہوں، اس لئے اس کو آپ جہاں چاہیں صَرف کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واہ واہ! یہ تو بڑا عمدہ اور نفع بخش مال ہے، یہ تو بڑا عمدہ اور نفع بخش مال ہے، اورتم نے جو بات کہی وہ مَیں نے سن لی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داروں میں جو غریب ومحتاج ہیں، آپ ان کو دیدیجئے۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کوسن کرعرض کیا کہ اے اللہ کے

رسول! مَیں اسی طرح کروں گا۔اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس باغ کو اپنے چچازاد بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔

افادات:۔ ''بیرحاء'' نامی باغ بالکل مسجدِ نبوی کے سامنے تھا، اب تو مسجدِ نبوی کا جو نیا اضافہ ہوا ہے اس میں باغ والی جگہ بھی مسجد کے اندر آ چکی ہے، مسجدِ نبوی کے سامنے کی طرف جو دروازے نکلتے ہیں وہاں یہ باغ تھا، پہلے وہاں ظاہری علامت زیادہ واضح تھی، لیکن جب لوگ اس طرف جانے لگے تو چونکہ حکومت کو ایسی چیزوں سے چڑ ہے، اس لئے اس علامت کو بھی چھپا دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہ باغ مسجدِ نبوی سے ذرا سی دوری پر بالکل سامنے کی طرف تھا۔

اپنا مال بڑوں سے خرچ کروائے

بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے یہ بھی عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ باغ چونکہ ایک بڑی چیز ہے، میرا تو جی یہ چاہتا تھا کہ کسی کو یہ پتہ بھی نہ چلے کہ یہ باغ مَیں نے اللہ کے راستہ میں صدقہ کیا ہے، لیکن یہ چیز چھپنے والی نہیں ہے اس لئے مَیں آپ کے سامنے ظاہر کر رہا ہوں۔ یہ درخواست کر کے انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! اب اس باغ کو آپ جہاں چاہیں صَرف کریں اور استعمال فرمائیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کوئی عمدہ چیز خرچ کرنا چاہتا ہو تو اپنے بڑوں کے ذریعہ سے خرچ کروائے، وہ چیز ان کے حوالہ کرے کہ آپ اس کو جہاں مناسب سمجھیں دیں۔ دیکھو! یہاں حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔تو جو بڑے ایسے ہوں کہ ان کے فیصلوں اور معاملات پر زیادہ اطمینان ہو، تو ایسی چیزوں میں یا تو ان سے مشورہ لے کر خرچ کرے، یا ان کے ہی حوالہ کر دیا جائے، تا کہ وہ جہاں چاہیں صَرف کریں۔

یہاں ''رَابِحٌ'' آیا ہے۔ ''رَابِحٌ'' ''رِبْحٌ'' سے مشتق ہے جس کا معنٰی ہے نفع بخش ہونا یہ بڑا نفع بخش مال ہے، یعنی دنیا کے اعتبار سے بڑا قیمتی مال ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ثواب دلوانے والا ہے۔ اور بعض روایتوں میں ''رَائِحٌ'' آیا ہے۔ ''رَاحَ یَرُوْحُ'' کا معنٰی ختم ہونے والا یعنی اگر تم اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہ بھی کرتے تب بھی یہ آپ کی ملکیت سے کسی نہ کسی وقت نکلنے والا تھا، یا تو زندگی ہی میں نکل جائے، یا جب مریں گے تو اس کو چھوڑ کر جائیں گے۔

زہے عز وشرف

حضور ﷺ نے فرمایا: واہ واہ! یہ تو بڑا عمدہ نفع بخش مال ہے، یہ تو بڑا نفع بخش مال ہے۔ اور تم نے جو بات کہی وہ مَیں نے سن لی۔ پھر حضور ﷺ نے بجائے اس کے کہ خود لے کر اس کو صَرف فرماتے، ان کو یہ مشورہ دیدیا کہ مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داروں میں جو غریب محتاج ہیں، آپ ان کو دیدیجئے، اس لئے کہ ویسے بھی یہ صدقہ ہے، اور صدقہ رشتہ داروں میں جو محتاج ہوں ان کو دینا دوسروں کے مقابلہ میں افضل ہے کہ اس میں صدقہ کا بھی ثواب ملے گا اور صلہ رحمی کا بھی ثواب ملے گا۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کے اس ارشاد کو سن کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اسی طرح کروں گا یعنی آپ نے جو ہدایت دی ہے اس کے مطابق اپنے رشتہ داروں میں خرچ کروں گا۔ چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ نے اس باغ کو اپنے چچازاد بھائیوں (حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ) کے درمیان تقسیم کر دیا۔ یہ دونوں حقیقی چچا کی اولاد میں سے نہیں تھے بلکہ خاندانی رشتہ کے چچازاد بھائی ہوتے تھے۔

وُجُوبُ أَمْرِهِ أَهْلَهُ وَأَوْلَادَهُ الْمُمَيِّزِيْنَ

تعلیم وتربیتِ اولاد

مجلس (۱)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً أمابعد.

فأعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

وَأْمُرْ أَھْلَکَ بِالصَّلوٰۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا. (سورۂ طٰہٰ: ۱۳۲)

یَاأَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْاقُوْاأَنْفُسَکُمْ وَأَھْلِیْکُمْ نَاراً. (سورۂ تحریم: ٦)

ترجمۃ الباب

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے جس کا حاصل ہے آدمی کا (ایک تو اتنی چھوٹی اولاد جس کو ابھی کچھ سوجھ بوجھ نہیں آئی ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے) اپنے گھر والوں کو اور اپنی اس اولاد کو جو سنِ تمیز کو پہنچ چکی ہے اور ان تمام لوگوں کو جو اس کی ماتحتی میں ہیں؛ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دینا اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی سے روکنا، اور شریعت میں جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان کے ارتکاب سے روکنا اور ان کے کرنے پر ان کو تنبیہ کرنا اور سزا دینا۔ تادیب کا مطلب ہے ٹوکنا۔

اس عنوان کے تحت تین چیزیں لائے۔ ایک تو یہ ہے کہ آدمی کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر والوں کو اور اپنی اولاد کو اور وہ تمام لوگ جو اس کی ماتحتی میں ہیں ایسے تمام لوگوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دے۔ چنانچہ اس کے متعلق لکھا ہے کہ گھر میں جو نوکر چاکر ایسے ہیں جن کے اوپر اس کی نگرانی ہے، یا اگر وہ کسی فیکٹری کا مالک

ہے تو اس کی ماتحتی میں کام کرنے والے لوگ ہیں۔ استاذ کی ماتحتی میں شاگرد ہیں۔ مرشد کی ماتحتی میں مرید ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس کی ماتحتی میں رہتے ہیں اور جن پر اس کا حکم چلتا ہے؛ ایسے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دے یعنی ان کو آمادہ کرے، ان سے کہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کریں، اللہ کے احکام کو بجالائیں۔ اور ایسے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی اور اللہ کے احکام کی مخالفت کرنے سے اور گناہوں سے روکے۔ اور اگر کوئی گناہ کرلے تو اس پر اس کو ٹوکے۔

یہ تین چیزیں ہیں (۱) ایک تو گھر کے تمام لوگ اور ان میں بھی خاص طور پر بیوی اور وہ اولاد جو سن تمیز کو پہنچ چکی ہے، جس میں کچھ سوجھ بوجھ آگئی ہے، جو آپ کی باتوں کو سمجھ لیتے ہیں اگر آپ اس سے کہیں کہ بیٹا! ایسا مت کرو، تو وہ سمجھتا ہے کہ مجھے منع کیا جارہا ہے۔ یا آپ اس سے کہیں کہ ایسا کرو تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے یہ کام کرنے کے لئے کہا جارہا ہے۔ ایسے تمام لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم دینا ہمارا فریضہ ہے۔ لیکن جو اولاد ابھی سنِ تمیز کو نہیں پہنچی ہے، جیسے ایک دو سال کا بچہ جس میں ابھی کوئی شعور نہیں آیا ہے، اس کے متعلق یہ حکم نہیں ہے (۲) دوسرے وہ تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کریں، اس کا حکم دینا (۳) اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی گناہ انہوں نے کرلیا تو اس سے روک کر اس پر ٹوکے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کل تین چیزیں آدمی کے لئے ضروری ہیں۔

گویا آدمی کے اوپر اپنے ماتحتوں کی تعلیم وتربیت لازم ہے کہ ان کو دین پر چلنے والا بنائے؛ اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی ذمہ داری کو بیان کیا ہے۔

نفقۂ جسمانی اور نفقۂ رُوحانی

پچھلے باب میں گھر والوں کا نفقہ بیان کیا تھا یعنی ان کے رہائش کا انتظام، کھانے

پینے کا انتظام اور کپڑوں کا انتظام؛ یہ جسمانی نفقہ ہے۔حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ نے ''اصلاحِ انقلاب'' نامی کتاب کے اندر لکھا ہے کہ آدمی کے اوپر جس طرح اپنے گھر والوں کا نفقۂ جسمانی واجب ہے، اسی طرح نفقۂ رُوحانی بھی واجب ہے۔ایک تو ہے مادی نفقہ یعنی اس کی جسمانی زندگی جس کے اوپر موقوف ہے، اگر بیوی بچے کھائیں گے پئیں گے نہیں؛ تو ہوسکتا ہے کہ موت واقع ہوجائے، پہننے کی بھی ضرورت ہے۔تو جسمانی اور مادی ضرورتوں کا پورا کرنا جس طرح ضروری ہے؛ اسی طریقہ سے روحانی نفقہ یعنی اس کی روحانی ضرورتوں کا پورا کرنا بھی اس کے اوپر ضروری ہے۔اور روحانی ضرورتیں کیا ہیں؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کے اوامر اور نواہی (اوامر کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے، اور نواہی کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے) سے بھی وہ اپنی اولاد کو اپنے ماتحتوں کو واقف کرے اور ان پر عمل کرنے کی ٹریننگ دے، ان کی تربیت کرے یعنی ان پر محنت کرکے ان کو ایسا بنادے۔تربیت کا مطلب یہی ہے۔

تعلیم وتربیت

دو چیزیں ہیں تعلیم اور تربیت۔تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ ان کو واقف کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے کن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کن چیزوں سے منع کیا ہے، مثلاً نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے، پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کرنے کا حکم دیا ہے، اچھے اخلاق اختیار کرنے کا حکم دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔اور فلاں فلاں چیزوں سے منع کیا ہے مثلاً چوری سے منع کیا ہے، جھوٹ سے منع کیا ہے، حسد سے منع کیا ہے، چغلی سے منع کیا ہے؛ زنا اور اسبابِ زنا کو حرام قرار دیا ہے، ان سب باتوں سے واقف کرنا اور باقاعدہ

ان کو بتلانا جب تک کہ ان کو بتلایا نہیں جائے گا اور واقف نہیں کیا جائے گا؛ وہاں تک ان کو کیسے پتہ چلے گا۔ تو یہ تعلیم ہوئی۔

تعلیم کے بعد تربیت کا مرحلہ آتا ہے یعنی اتنا کہہ دینا اور بتا دینا کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں سے منع کیا ہے؛ کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ آپ اس پر محنت کیجئے، جتنے بھی نیکی کے کام ہیں وہ تمام کام آپ نے اس کو بتا دئے، اس کے بعد آپ اس پر محنت کیجئے اور اس کو ایسی ٹریننگ دیجئے کہ وہ ان کاموں کا کرنے والا بن جاوے، اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے اس کو واقف کیا تو اب ساتھ ساتھ اس کی نگرانی کیجئے اور ایسی تربیت کیجئے کہ وہ ان کاموں کو نہ کرے؛ اس کا نام تربیت ہے۔

تعلیم وتربیت کی ایک بہترین مثال

ہم لوگ تعلیم وتربیت کا لفظ بولتے رہتے ہیں لیکن اس کی حقیقت نہیں سمجھتے۔ بھائی! آپ کسی ٹریننگ سینٹر میں جائیں گے مثلاً آپ کسی درزی کے پاس ٹیلرنگ کا کام سیکھنے کیلئے جائیں گے تو سکھانے والا پہلے تو آپ کو زبان سے بتائے گا کہ آپ کو کپڑا سینا ہے تو یوں کرنا ہے، یوں کرنا ہے، ایسا کرنا ہے؛ یہ تو تعلیم ہوئی۔ اس کے بعد پھر وہ اس بات پر محنت کرے گا کہ آپ سوئی میں دھاگہ کس طرح پروئیں، کپڑے کی کٹنگ کس طرح کریں، وہ اپنے سامنے آپ سے کٹنگ کروائے گا، سلوائے گا، طریقے بتلائے گا؛ اس کا نام ٹریننگ وتربیت ہے۔ ہر چیز میں دونوں باتیں ضروری ہوتی ہیں، اول نمبر پر تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد تربیت کا نمبر آتا ہے۔

دین کے معاملہ میں بھی یہی دونوں چیزیں ضروری ہیں، تعلیم بھی ضروری ہے،

ماں باپ کی اور گھر کے بڑے کی ذمہ داری ہے کہ گھر میں اس کے ماتحت جو لوگ رہتے ہیں، بیوی بچے اور اس کے گھر کے دوسرے افراد؛ ان سب کو اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف کرے، یہ بتائے کہ اللہ تعالیٰ نے کون سی چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور کون سی چیزوں سے منع کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ وہ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں یا نہیں، ان کو ٹریننگ دے اور عادی بنائے۔

دعوتِ غور وفکر

اب ہمیں یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ہم یہ دونوں کام کرتے ہیں یا نہیں؟ تعلیم یعنی ان کو واقف کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کن کن چیزوں کو کرنے کا حکم دیا ہے یا کن کن چیزوں سے منع کیا ہے۔ اور جو لوگ اس کا تھوڑا بہت اہتمام کر لیتے ہیں، وہی لوگ نمبر دو والا تربیت کا جو مرحلہ آتا ہے، اس کا اہتمام کرتے ہیں؟ جب بچے کو ہم نے یہ بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے پانچ وقت کی نماز فرض کی ہے اور اس کی تفصیل بھی بتا دی؛ تو پھر یہ بات بھی ضروری ہے کہ ہم دیکھیں کہ وہ نماز پڑھتا ہے یا نہیں۔ شریعت نے اس کی جو عمر بتائی ہے جب وہ اس عمر کو پہنچ جاوے تو اس کو اپنے ساتھ مسجد لے جاویں اور اس سے نماز پڑھوائیں، اس کو نماز کی عادت ڈالیں؛ یہ تربیت ہے۔

جیسے وہ فرض ہے؛ یہ بھی فرض ہے

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کر کے یہی چیز بتائی ہے کہ بھائی دیکھو! آپ نے اس کو مادی اور جسمانی نفقہ دینے کے لئے بڑی محنت کی، صبح سے شام تک دوکان اور فیکٹری میں، اپنی ملازمت اور سروس پر، اپنی کھیتی باڑی میں آپ محنت اسی لئے کرتے

ہیں تا کہ کچھ پیسے کما لیں اور ان کے ذریعہ سے اپنی بیوی بچوں اور اپنے ماتحت لوگوں کو کھلا پلا سکیں ان کے کپڑوں کا انتظام کر سکیں، ان کی رہائش کا انتظام کر سکیں؛ یہ آپ نے ان کے مادی نفقہ اور جسمانی ضرورتوں کا انتظام کیا، اب ان کی روحانی اور دینی ضرورت کا بھی انتظام کرنا آپ کا فریضہ ہے، ان کو اللہ کے احکام سے واقف کرنا، اللہ نے جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اس سے واقف کرنا اور جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے واقف کرنا اور پھر اس کی عادت ڈالنا، اس پر محنت کرنا؛ یہ بھی ضروری ہے۔ پچھلا باب تو مادی نفقہ کا تھا اور یہ باب روحانی نفقہ کا قائم کیا ہے۔ جیسے وہ (مادی) فرض ہے؛ ایسے ہی یہ (روحانی) بھی فرض ہے۔

کیا ہمارا دل ایسا ہی کڑھتا ہے؟

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہم جتنا اہتمام ان کے مادی نفقہ کا کرتے ہیں؛ کیا ویسا ہی اہتمام ان کے روحانی نفقہ کا بھی کرتے ہیں؟ اگر ہمارے گھر میں ایک وقت فاقہ ہو جاوے، بیوی بچوں کو کھانا نہ ملے؛ تو ہمارے دل پر جو گذرتی ہے وہ ہم اور آپ سمجھ سکتے ہیں، ہم سوچتے ہیں کہ آہ! مَیں اس قابل بھی نہیں ہوا کہ اپنے بیوی بچوں کو کھانا کھلا سکوں تو اگر ہمارے بچوں کو اللہ کے احکام سے واقفیت نہ ہو، قرآن پڑھنا نہیں آتا، نماز نہیں آتی، کلمہ نہیں آتا، روزہ کیا ہے وضو کس طرح کیا جاتا ہے؟ یہ سب نہیں آتا؛ تو کیا اس پر بھی ہمارا دل اتنا ہی جلتا ہے جو ایک وقت کا کھانا نہ ملنے پر جلا تھا؟ اور ہمارے دل میں جو کوفت اور کڑھن ہوئی تھی اور کونے میں بیٹھ کر رونا آیا تھا کہ آج مَیں اس قابل بھی نہیں کہ اپنے بال بچوں کو برابر کھلا سکوں، اس پر تو اتنا افسوس ہوا تھا، حالانکہ اگر ایک وقت کا کھانا نہیں ملا تو کوئی بڑا نقصان ہونے والا نہیں، لیکن اگر بچے کو نماز نہیں آتی، کلمہ نہیں آتا، وضو نہیں

آتا اوراللہ کے احکام سے واقفیت نہیں ہے؛ تو کیا اس کو بھی سوچ کر ہمارے دل میں کڑھن ہوتی ہے؟ کیا اس پر بھی کبھی رونا آتا ہے؟ کہ مَیں اس قابل بھی نہیں ہوں کہ مَیں اپنی اولاد کواللہ کے دین سے اوراللہ کے احکام سے واقف کرسکوں؟ اوران کوایسا بناؤں کہ وہ اللہ کے احکام پرعمل کرنے والے بن جائیں۔دراصل ہمیں یہ سوچنا چاہیے۔

اس کے کھانے اور کپڑوں کواوراس کے مکان کواوراس کے بستر کو،اس کی ظاہری ضرورتوں کوہم اہمیت دیتے ہیں اور ہماری نگاہوں میں یہ سب جتنا مہتم بالشان ہے؛ کیا اس کی تعلیم وتربیت اوراس کا دیندار ہونا اوراللہ کا فرماں بردار بننا، اللہ کی نافرمانی سے بچنا؛اس کی بھی ہماری نگاہوں میں اتنی حیثیت ہے؟ ہم نے اپنے بچے کے متعلق سنا کہ اس نے آج نمازنہیں پڑھی، یااس نے آج جھوٹ بول دیاتواس بات کوسن کرکیا ہمیں اتنی ہی تکلیف ہوتی ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے، حالانکہ اگرغورکیا جائے اورسوچا جائے توحقیقت یہ ہے کہ اگرایک وقت دووقت کیا؛ چاروقت بھی کھانا نہ ملے؛تواس کا وہ نقصان نہیں ہوگا جو جھوٹ بولنے سے اور نماز نہ پڑھنے سے اور جوکسی کے ساتھ براسلوک کرنے سے ہوگا، اس لئے کہ اس میں اس کے دین اور دنیا دونوں کا نقصان ہے، اس لئے اس کی بڑی اہمیت ہے۔

ہمارے زمانہ کاالمیہ

آج ہمارے اس زمانہ میں سب سے زیادہ غفلت اگرکسی چیز کی طرف سے برتی جارہی ہےتو وہ یہی ہے کہ ہم اپنی اولاد کی ظاہری ضرورتوں مثلاً کپڑوں کے واسطے، ان کے کھانے کے واسطے، ان کے بستر کے واسطے، ان کے کمرے اور رہائش کے واسطے جتنا اہتمام کرتے ہیں؛ ان کی تعلیم وتربیت کے واسطے ایساانتظام نہیں کرتے۔آج اگرہمارا

بیٹا ناراض ہوکر ضد کرے کہ مجھے جوتے چاہئیں اور وہ جوتے بازار میں ڈیڑھ ہزار کے ملتے ہوں تو ہم آج ہی لاکر دیدیں گے، آپ بچے کے جوتے کے لئے ڈیڑھ ہزار خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اور آج کل تو ان جوتوں کا مطالبہ سال میں ایک مرتبہ نہیں، بلکہ کئی مرتبہ آتا ہے۔ پرانے زمانہ میں یہ بات ہوتی تھی کہ ابا سال میں ایک مرتبہ جوتا لادیا کرتے تھے، اور آج کل تو بچہ ہر مہینہ نیا جوتا مانگتا ہے۔ پرانے لوگ جانتے ہیں کہ ہمیں تو سال میں بلکہ کبھی تو دو دو سال میں ایک مرتبہ نیا جوتا ملتا تھا اور اب تو بچے ہر مہینے میں پرانا جوتا پھینک کر دوسرا منگواتے ہیں، اور ماں باپ بھی جیسا وہ کہے ویسا جوتا خوشی خوشی لاکر دیتے ہیں، بس! ایک مرتبہ اس کا اشارہ ہو جائے!!! تو جوتے کے لئے ڈیڑھ ہزار خرچ کرنے کے لئے ہم شوق سے تیار ہیں۔

اور اسی بچے کو اللہ کا مطیع اور فرمانبردار بنانے کے لئے، دیندار بنانے کے لئے جو محنت کی جارہی ہے اس کے اندر اگر مصارف پیش آتے ہیں تو ہم تعاون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اسی بچے کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنے والے مدرسہ والے آپ کے پاس آئیں، یا اگر نہیں بھی آئیں تب بھی ہمیں تو خود سوچنا چاہیے تھا کہ جو کام ہمارا تھا یعنی بچے کو دین سے واقف کرانا؛ وہی ذمہ داری اللہ کے ان بندوں نے اٹھائی ہے اور وہ اس ذمہ داری کو پورا کر رہے ہیں، اور اس کی ادائیگی میں کچھ خرچہ بھی ہوتا ہے، کچھ مصارف بھی آتے ہیں، ان مصارف کے واسطے وہ آپ کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں، اب چاہیے تو یہ تھا کہ ان کو آپ کے پاس آنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی، آپ ان کے آئے بغیر ان کی خدمت میں پہنچتے اور کہتے کہ آپ کا بڑا احسان ہے، ہم تو زندگی بھر آپ کی غلامی کریں تب بھی آپ کا احسان ادا نہیں کر سکتے کہ ایک بہت بڑی ذمہ داری جو ہمارے

اوپر تھی وہ آپ نے اٹھالی۔ ہمارے اس زمانہ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے، اس کے کھانے کا پینے کا انتظام جتنی لگن اور اہمیت اور جتنی فکر کے ساتھ ہم کرتے ہیں؛ کیا اس کو دیندار بنانے کا اہتمام بھی اتنی ہی فکر، لگن اور اسی اہمیت کے ساتھ ہم کرتے ہیں؟ جواب ہے کہ نہیں کرتے، ہم لوگوں کے لئے یہ سوچنے کی چیز ہے۔

ہم سے بڑا بے غیرت کون ہوگا

مثلاً کوئی آدمی اگر ہمارے گھر والوں کا، بیوی بچوں کے کھانے پینے کا انتظام اپنے سر پر لے لے، ہمارے کہے بغیر وہ ہمارے بیوی بچوں کے کھانے کا انتظام کرتا ہے، اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ ہمارے بیوی بچوں کے کھانے کا انتظام کرنے میں اس کو خرچہ بھی ہوتا اور اس کے لئے وہ لوگوں سے پیسے بھی مانگتا ہے اور ہمارے پاس پیسے ہیں، ہم جاننے کے باوجود اس کو پیسے نہ دیں؛ تو ہم سے بڑا بے غیرت کون ہوگا، اس لئے کہ یہ تو ہماری ذمہ داری تھی لیکن اس کا احسان ہے کہ اس نے اپنے سر لے لی ہے۔

اسی طرح بچوں کی تعلیم وتربیت، ان کو دیندار بنانا، دین سے واقف کرنا؛ یہ ماں باپ ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے، اب یہ ذمہ داری اگر دوسرے لوگ اٹھا رہے ہیں اور ہماری طرف سے یہ فرض ادا کر رہے ہیں؛ تو ہمیں تو ان کا احسان مند ہونا چاہیے تھا، اور اس کام میں ہم سے جتنا زیادہ سے زیادہ بڑھ چڑھ کر مدد اور تعاون ہو سکتا ہو؛ وہ کرنے میں ہمیں ذرا بھی کوتاہی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

ہماری فکریں کیا ہیں؟

ہاں! اس کی دوکان ہو جائے، اس کا مکان ہو جائے، فیکٹری ہو جائے، اس کے

لئے اچھا سا کاروبار لگا کر جائیں، ہمارے مرنے سے پہلے بیٹے کو فیکٹری پر بیٹھا ہوا دیکھ کر ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اگر اچھی طرح سے فیکٹری چلاتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ اب مجھے اطمینان سے موت آئے گی، اس کے بغیر اطمینان سے موت نہیں آتی۔ ہمیں یہ فکر رہتی ہے کہ میرے مرنے سے پہلے پہلے وہ کاروبار پر لگ جانا چاہیے، ساری چیزوں میں ماہر ہوجانا چاہیے، موت کے وقت بھی اگر ہمیں فکر ہوتی ہے تو یہی ہوتی ہے کہ بچو! میرے بعد تم کیا کروگے؟ تمہارے کاروبار کا کیا ہوگا؟ اور حضرات انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام کا کیا حال تھا؟

میرے بعد تم کس کی عبادت کروگے؟

اللہ تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے واسطے نبیوں کا سلسلہ جاری کیا، قرآنِ پاک میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ موجود ہے ﴿أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْحَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ، اِذْقَالَ لِبَنِيْهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ﴾ حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسحاق ہیں اور ان کے بیٹے حضرت یعقوب ہیں، حضرت یعقوب کے بارہ بیٹے تھے، حضرت یوسف اور باقی گیارہ۔ ہم لوگ اگر بستر مرگ پر ہوں تو ہمیں تو یہ فکر ہوگی کہ میرے بچے کیا کھائیں گے، ان کے کاروبار کا مسئلہ کیسا ہوگا، ان کے رہنے کے لئے مَیں پورا گھر تو دے کر نہیں گیا، صرف ایک گھر ہے اور بچے چار ہیں؛ اب ان کا کیا ہوگا؟ لیکن یہاں نبیوں کو موت کے وقت اگر فکر ہے تو کیا ہے؟ حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کو جمع کر کے پوچھ رہے ہیں۔ باری تعالیٰ اس قصہ کو بیان کررہے ہیں، چونکہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت آئی اس وقت ہم اور آپ تو تھے نہیں، اگر اللہ تعالیٰ نہ بتاتے تو ہمیں کیسے پتہ چلتا، ذرا غور کیجئے کہ قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ نے کیسا عجیب وغریب انداز اختیار کیا ﴿أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ﴾ اے لوگو! جب حضرت یعقوب کی موت آئی

اس وقت کیا تم موجود تھے؟ ظاہر ہے ہم تو موجود نہیں تھے، باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ تم موجود نہیں تھے، اس لئے تم کو معلوم نہیں کہ اس وقت کیا ہوا تھا، لیکن مَیں تم کو بتا تا ہوں کہ کیا ہوا تھا﴿اِذْقَالَ لِبَنِیْهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ﴾ جب ان کی موت کا وقت آیا تو حضرت یعقوب نے اپنے بچوں کو جمع کیا، اوراس کے بعد کیا کہا؟ میرے بعد کیسے رہو گے؟ مل جل کر رہو گے لڑو گے تو نہیں؟ کاروبار اچھی طرح سے کرو گے؟ اپنی ماں کو تو نہیں ستاؤ گے؟ ایسا نہیں کہا۔ بلکہ یہ کہا﴿مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ؟﴾ اے میرے بیٹو! بتاؤ کہ میرے مرنے کے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ ان کو اگر فکر ہے تو بچوں کی دینداری کی فکر ہے۔

ہمیں کیا فکر رکھنی چاہیے؟

بیٹے بھی نبی کے تھے، اس لئے انہوں نے اطمینان دلا دیا کہ ابا جان! دنیا سے بے فکر ٹھنڈے دل کے ساتھ جایئے ﴿نَعْبُدُ اِلٰهَکَ وَاِلٰهَ اٰبَآءِکَ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ﴾ ہم آپ کے معبود یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں گے، زندگی بھر جس کی عبادت آپ کرتے رہے اور آپ کے باپ دادا یعنی حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق جس کی عبادت کرتے رہے۔ وہ کون ہے؟ ﴿اِلٰهًاوَّاحِدًا﴾ وہی ایک اللہ۔ اسی کی ہم بھی عبادت کریں گے ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ﴾ اور اس کے پورے فرمانبردار بن کر رہیں گے، ذرا بھی نافرمانی نہیں کریں گے۔ جب بیٹوں نے ابا جان کو اطمینان دلا دیا تب حضرت یعقوب کو اطمینان ہوا اور موت آئی۔ دیکھو! قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ نے موت کا یہ قصہ بھی ہم لوگوں کی عبرت کے واسطے ذکر کیا ہے کہ جب ہماری موت کا وقت آئے تو کیا ہم بھی اسی فکر کے ساتھ دنیا سے جاتے ہیں کہ میرے بچے میرے بعد دین کے معاملہ میں کیا کریں گے؟ یا کسی دوسری فکر کے ساتھ جاتے

ہیں؟ ہمیں کیا فکر رکھنی چاہیے جبکہ اللہ کے نبیوں کا یہ حال تھا۔

آج ہمیں یہ منظر بکثرت دیکھنے ملتا ہے

حضرت یعقوب علیہ السلام دنیا سے یہ فکر لے کر جا رہے ہیں کہ بچوں کو بلا کر پوچھتے ہیں کہ بتاؤ! کیا کرو گے؟ زندگی میں اور موت کے بستر پر بھی کیا ہماری فکریں یہی ہیں؟ نہیں! بلکہ زندگی میں بھی اگر ہماری فکریں ہیں تو یہ ہیں کہ اس کی ایک دوکان ہو جائے، ذرا کھاتا پیتا ہو جائے، کاروبار اچھا چلے، فیکٹری اچھی چلے، کارخانہ اچھا چلے اور اس پر پورا کنٹرول کر لے؛ تب ہمیں ذرا ٹھنڈک ہو، پھر اطمینان سے موت آئے گی، باقی دینداری کیسی بھی ہو۔ آج ہمیں یہ منظر بکثرت دیکھنے ملتا ہے کہ آدمی خود بڑا دیندار ہوتا ہے، پانچوں وقت کی نمازوں کا پابند، روزوں کا پابند، تہجد کا پابند، تلاوت کا پابند؛ لیکن اولاد کو دیکھتے ہیں تو بالکل اُلٹی سمت میں چل رہی ہے، یہ مشرق (ایسٹ) میں جا رہا ہے تو اولاد مغرب (ویسٹ) میں جا رہی ہے، یہ نمازوں کا پابند ہے تو اولاد کا معاملہ بالکل اُلٹا ہے، یہ منظر ہمیں بکثرت دیکھنے ملتا ہے۔

دین پر کوئی زد تو نہیں پڑ رہی ہے

دیکھو! یونیورسٹی میں پڑھانا برا نہیں ہے، آپ یہ مت سمجھنا کہ مَیں اس کو برا کہہ رہا ہوں بلکہ اپنی اولاد کو اس میں پڑھا کر دیندار بنائیے۔ اکبر الہ آبادی کا شعر ہے:-

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں پھولو ❁ جائز ہے غباروں میں اُڑو، چرخ پہ جھولو
بس ایک بات بندۂ مومن کی رہے یاد ❁ اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

آپ اپنے بچوں کو کہیں بھی پڑھائیے، ہم منع نہیں کرتے، ہم یہ نہیں کہتے کہ نرسری میں

مت بھیجو، کالج و یونیورسٹی میں مت بھیجو، ضرور بھیجئے لیکن یہ دیکھنا کہ وہاں جا کر اس کے دین پر کوئی زد تو نہیں پڑ رہی ہے، ہمیں اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے کہ اسکو دیندار بنانے کی کوشش کریں

تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک صاحب آئے، دیندار اور نمازی آدمی تھے، انہوں نے اپنے بچے کو یونیورسٹی میں پڑھایا اور جب اس کو بڑا اچھا سا منصب اور عہدہ بھی مل گیا تو وہ یوں کہنے لگے کہ ماشاء اللہ بچہ پڑھ لکھ کر اچھے عہدے پر لگ گیا ہے، اور اس نے اپنا کیریئر بھی بنالیا ہے، ہمارے سماج اور کمیونٹی کے اندر اُس کا نام ہے، بس اتنی بات ہے کہ وہ تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے۔

حضرت فرماتے ہیں کہ لو بھائی! تھوڑا سا بے دین ہو گیا، وہ اس کی دنیاوی تعلیم و ترقی پر تو بہت خوش ہیں اور اس کو فخریہ بیان کر رہے ہیں لیکن اس کی بے دینی پر ان کو کوئی فکر ہی نہیں ہے، اور اس کو اس انداز سے پیش کر رہے ہیں کہ بس! تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے۔

......تب ہی اثر ہو گا

حالانکہ باری تعالیٰ نے اس آیت ﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ میں فرمایا ہے کہ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر قائم رہیے، بعض لوگ بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بیٹا! مَیں تو نماز نہیں پڑھتا، لیکن تو تو پڑھ۔ خیر! یہ بھی اچھی بات ہے، اور کہنا بھی چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا یہ طرز کتنا مفید اور مؤثر ہے؟ ایسا کہنے سے کیا اس پر کوئی اثر پڑے گا؟ اسی کو بتلا رہے ہیں کہ اپنی اور گھر والوں

کی فکر ہونی چاہیے،اسی طریقہ سے اپنے گھر والوں کونماز کاحکم دیجئے اورخود بھی نماز کی پابندی کیجئے،گویا پہلے حکم دیا پھرنماز کی پابندی کی تاکید کی،اس لئے کہ اگرآپ پابندی نہیں کرتے ہیں اورگھر والوں کونماز کے لئے کہہ رہے ہیں؛تو آپ کا یہ کہنا فضول ہے، اس کا کوئی اثر ہونے والانہیں ہے،اس لئے کہ جب آپ نمازنہیں پڑھتے اور بیٹے سے کہتے ہیں تو بیٹایوں سمجھے گا کہ نماز اگرکوئی ایسی اچھی ہی چیز ہوتی تو ابا کیوں نہ پڑھتے؟ ابا تو پڑھتے نہیں اور مجھے کہہ رہے ہیں۔ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ آپ خود نہ کھائیں اور بیٹے سے کہیں کہ کھاؤ،ہم بھی کھاتے ہیں،اس کوبھی کھانے کے لئے کہتے ہیں تو ہم بھی نماز پڑھیں اس کوبھی نماز پڑھنے کے لئے کہیں گے؛تب ہی اثر ہوگا۔

اولاد کی تربیت کے سلسلہ میں یہ چند باتیں ہیں،بقیہ باتیں ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں ہوں گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماتحتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام ضروری ہے

گزشتہ مجلس میں بتلایا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے گھر والوں کو اور اولاد میں جو سنِ تمیز کو پہنچ چکی ہے اور ان تمام لوگوں کو جو آدمی کی ماتحتی میں رہتے ہیں، چاہے آقا کے ماتحت اس کے غلام یا ملازم ہیں، یا وہ استاذ کے ماتحت شاگرد ہیں، یا شیخ کے ماتحت اس کے مرید ہیں، یا وہ خاندان کا بڑا ہے اور دوسرے اس کے ماتحت ہیں؛ ان تمام کو اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے آمادہ کرے، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی سے ان کو روکے۔ اور اگر کسی نے کسی ایسے کام کا ارتکاب کرلیا، کوئی ایسی حرکت کر لی جو اللہ تعالیٰ کی منع فرمودہ ہے، تو اس پر اس کو ٹوکے اور آئندہ کے لئے منع کردے۔ اس باب سے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنے ماتحتوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرے۔

تعلیم کس کو کہتے ہیں اور تربیت کس کو کہتے ہیں یہ بتلا چکا ہوں اور اسی کے متعلق قرآنِ پاک کی جو آیتیں ہیں ان کی تشریح بھی پہلے آچکی ہے۔ اس سلسلہ میں جو روایتیں ہیں ان کو آج پیش کرتے ہیں۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے مناقب

۲۹۸. عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: أَخَذَ الحسن بن علی رضی اللہ عنہ تَمْرَةً مِنْ تَمْرِ الصَّدَقَةِ، فَجَعَلَهَا فِیْ فِيْهِ. فَقَالَ رسولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم: كَخْ كَخْ؛ اِرْمِ بِهَا، أَمَا عَلِمْتَ أَنَّا لَا نَأْكُلُ الصَّدَقَةَ؟

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ جب چھوٹے بچے تھے اس وقت ایک مرتبہ صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور اُٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دیکھا تو

وفی روایۃٍ: اِنَّالا تَحِلُّ لَنَاالصَّدَقَۃُ.
وقولہ: کَخْ کَخْ، یُقَالُ بِاِسْکَانِ الْخَآءِ.
وَیُقَالُ بِکَسْرِھَامَعَ التَّنْوِیْنِ وَھِیَ کَلِمَۃُ
زَجْرٍ لِلصَّبِیِّ عَنِ الْمُسْتَقْذَرَاتِ. وَکَانَ
الْحَسَنُ رضی اللہ عنہ صَبِیًّا.

فرمایا کہ تھوتھو، اس کو نکال کر پھنکو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم صدقہ کا مال نہیں کھاتے۔ دوسری روایت میں ہے کہ ہمارے لئے صدقہ کا مال کھانا جائز نہیں ہے۔

افادات: ۔حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بڑے صاحبزادے تھے، نبی کریم ﷺ کو ان کے ساتھ بہت زیادہ محبت اور بہت زیادہ پیار تھا۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ منبر پر خطبہ دے رہے تھے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھوٹے تھے اور ابھی چلنا سیکھا ہی تھا، وہ کمرے سے باہر نکل کر آپ ﷺ کی طرف بڑھنے لگے، اور چھوٹا بچہ جس نے تازہ تازہ چلنا سیکھا ہو، اس کے گرجانے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔ ان کو آتا ہوا دیکھ کر نبی کریم ﷺ نے اپنا خطبہ موقوف کیا، منبر سے اُتر کر ان کو اُٹھایا، اپنے کندھے پر بٹھایا، پھر منبر پر تشریف لے گئے اور خطبہ شروع کردیا (سنن نسائی، ۳/ ۱۰۸۔ سیر اعلام النبلاء، ۳/ ۲۶۵)

بخاری شریف میں روایت ہے حضرت ابوہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ بازار سے گزر رہے تھے، مَیں بھی آپ کے ساتھ تھا، جب گھر پر واپس پہنچے تو آپ ﷺ کو گھر میں آتا ہوا دیکھ کر حضرت حسن ﷺ جو چھوٹے بچے تھے وہ ہاتھ چوڑے کر کے آگے بڑھنے لگے (جیسے بچوں کی عادت ہوتی ہے) تو حضور اکرم ﷺ بھی ہاتھ چوڑے کر کے آگے بڑھے اور ان کو لے کر اپنے سینے سے چمٹے لیا اور دعا فرمانے لگے کہ

اے اللہ! مَیں اِن سے محبت کرتا ہوں، جو اِن سے محبت کرے تو بھی اُن سے محبت کر۔ (بخاری شریف، ۵۸۸۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے مَیں برابر اُن سے محبت رکھتا ہوں۔

بچوں کے ساتھ محبت کا مطلب

بہر حال! حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت زیادہ محبت تھی، لیکن محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچہ کوئی غلط حرکت کر رہا ہے تو اس کو ٹوکا اور روکا نہ جائے، ہمارے یہاں تربیت کے معاملہ میں سب سے پہلی جو کوتاہی ہوتی ہے وہ یہی ہوتی ہے کہ ان چھوٹے بچوں کو کوئی نامناسب حرکت کرتا ہوا دیکھ کر ہم منع نہیں کرتے۔ اور منع کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ان کی پٹائی کی جائے اور طمانچہ مارا جائے، یا ڈنڈے اور لکڑی سے مارا جائے، بلکہ روکنے کے محبت بھرے طریقے بھی ہیں، ان طریقوں سے ان کو روکنا چاہیے، اور کسی غلط چیز کا غلط ہونا اچھے طریقہ سے ان کے ذہن میں بٹھانا چاہیے۔ بچپن سے اگر کسی چیز کی عادت ڈالی جائے تو پھر وہ چیز برابر سیکھ لیتا ہے اور بڑے ہونے کے بعد وہ چیز اس کے دل و دماغ کے اندر محفوظ ہو جاتی ہے، اس لئے کہ بچپن کی سکھائی ہوئی چیز کے بارے میں علماء لکھتے ہیں کہ وہ ایسی ہو جاتی ہے ﴿کَالنَّقْشِ فِی الْحَجَرِ﴾ جیسے پتھر کے اوپر آپ نے کچھ لکھ دیا ہو یعنی جیسے پتھر کا لکھا ہوا مٹایا نہیں جا سکتا، وہ اس کے اوپر باقی رہتا ہے، ایسے ہی بچپن کے اندر جو چیز ذہن نشین کر دی جاتی ہے، اس کے دل و دماغ میں اتار دی جاتی ہے؛ وہ پوری زندگی برابر محفوظ رہتی ہے۔ اسی لئے بچہ چاہے چھوٹا ہو، لیکن جب وہ آپ کی بات سمجھنے لگے تو آپ اس کو اس کی غلط حرکت سے روک دیجئے۔ چنانچہ اس روایت میں ہے کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا۔

خاندانِ بنو ہاشم کے لئے صدقات جائز نہیں

قصہ یہ ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے یہاں صدقات کا جو بھی مال آتا تھا اس کو ایک جگہ رکھا جاتا تھا اور جو لوگ صدقات کے حقدار ہوتے تھے ان کو بوقتِ ضرورت موقع بموقع دیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے مکان میں جہاں پر یہ صدقات کی کھجوریں پڑی ہوئی تھیں وہاں سے ایک کھجور لے کر منہ میں ڈال لی۔ چونکہ وہ بچے تھے اس لئے ان کو پتہ نہیں تھا کہ یہ کھجور کیسی ہے اور ہمیں کھانی نہیں چاہیے، کیونکہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے اہلِ خاندان بنو ہاشم کے لئے صدقات کھانا جائز نہیں ہے۔

حضرت سلمان کی جانچ

خود حضورِ اکرم ﷺ کا معمول یہی تھا کہ آپ ﷺ صدقات کا مال نہیں کھاتے تھے، ہاں! ہدیہ قبول فرماتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں وہ پہلے یہود کے غلام تھے، انھوں نے نبی کریم ﷺ کی جو علامتیں کتبِ سابقہ میں پڑھی تھیں، ان میں سے ایک علامت یہ بھی تھی کہ نبی آخر الزماں ﷺ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، ہاں ہدیہ کھاتے ہیں۔ آپ ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ان علامتوں کو جانچنا شروع کیا جو انہوں نے اگلی کتابوں میں پڑھی تھیں، اس میں ایک علامت یہ بھی تھی کہ وہ صدقہ نہیں کھاتے ہیں، اور ہدیہ قبول کرتے ہیں اور اس کو کھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلے دن خدمت میں کچھ کھجوریں پیش کیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ صدقہ ہے۔ حضور ﷺ نے اصحابِ صفہ میں جو غریب تھے ان کو دیدیا اور کہا کہ لو بھائی! کھالو اور فرمایا کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے ہیں۔ پھر دوسرے روز خود کچھ کھجوریں لے کر حاضرِ خدمت ہوئے

اور نبی کریم ﷺ کے سامنے پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ ہدیہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے قبول فرمالیا، خود بھی نوش فرمایا اور جو لوگ موجود تھے ان سے بھی کہا کہ شریک ہوجاؤ۔ (المستدرک، ۲۱۴۱۴) یہ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپ ﷺ صدقہ تناول نہیں فرماتے تھے، نیز آپ ﷺ کے لئے اور آپ کے اہلِ خاندان کے لئے صدقہ حلال نہیں ہے۔

موقع سے جو تعلیم دی جائے وہ بڑی مؤثر ہوتی ہے

تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ چھوٹے بچے تھے بعض روایتوں میں ہے کہ ڈھائی، تین سال کی عمر تھی، انہوں نے صدقہ کی جو کھجور پڑی ہوئی تھی وہ اٹھا کر منہ میں رکھی، جب وہ منھ میں رکھ رہے تھے اس وقت حضور ﷺ کی نظر ان پر نہیں تھی، حضور کی بے خبری میں انھوں نے وہ کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ دی تھی، حضور ﷺ نے دیکھا کہ منہ ہلا رہے ہیں جیسے بچہ کوئی چاکلیٹ وغیرہ منھ میں رکھ کر کھاتا ہے۔ بلکہ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ان کے منہ میں سے کھجور ملا ہوا تھوک اور لعاب گرنے لگا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ منھ میں کیا ہے؟ جب دیکھا کہ کھجور ہے تو آپ ﷺ نے منھ میں انگلی مبارک ڈال کر کھجور نکال دی اور ساتھ ہی ساتھ زبانِ مبارک سے بھی فرمایا ﴿كَخٍ كَخٍ؛ اِرْمِ بِهَا﴾ "كَخٍ كَخٍ" یہ عربی زبان میں کوئی گندی چیز منہ میں ڈال دی ہو اس کو نکلوانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے ہم اردو میں بولتے ہیں تھو تھو۔ بچے کو تھو کہتے ہیں یعنی مطلب یہ ہے کہ منہ سے نکال دو۔ تھو تھو بول کر اس کو نکالنے کے لئے کہا جارہا ہے۔ اسی کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ﴿هِيَ كَلِمَةُ زَجْرٍ لِلصَّبِيِّ عَنِ الْمُسْتَقْذَرَاتِ﴾ گندی اور ناپسندیدہ چیز بچے کے ہاتھ یا منہ میں سے نکلوانے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: تھو تھو! اس کو نکال دو، تمہیں معلوم نہیں کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے؟ یعنی ہم اہلِ خاندانِ نبوت

صدقہ نہیں کھاتے، یہ فرما کر ان کے منہ میں سے وہ کھجور نکلوا دی۔

تو دیکھئے! یہاں حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی عمر زیادہ نہیں تھی، ڈھائی، تین سال کے تھے لیکن جیسے ہمارے یہاں سوچا جاتا ہے کہ نادان اور ناسمجھ بچہ ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں سوچا، اس سے تو کس کو انکار ہے کہ بچہ بھی ہے، نادان بھی ہے اور ناسمجھی میں کر لیا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب آپ اس کو تنبیہ بھی نہ کریں، یہی تو تعلیم و تنبیہ کرنے کا موقع ہے۔ اور موقع سے جس چیز کی طرف متوجہ کیا جائے وہ بڑی مؤثر ہوتی ہے اور یاد بھی رہتی ہے۔

جیسے آپ نے وعظ کی مجلس میں کوئی مسئلہ سن لیا تو اگر آپ کو شوق اور رغبت ہے تو آپ اس کو بھی یاد رکھیں گے، لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ ایسے موقع پر سنی ہوئی چیز بعد میں یاد نہیں رہتی۔ لیکن آپ نماز پڑھ رہے تھے اور نماز میں جو کام نہیں کرنا چاہیے وہ کر لیا اور کسی جاننے والے نے آپ کو بتایا کہ آپ نے اس طرح جو سجدہ کیا؛ وہ نہیں کرنا چاہیے تو آپ کو وہ چیز زندگی بھر برابر یاد رہے گی کہ ایک مرتبہ مَیں نے اس طرح سجدہ کیا تھا تو فلاں مولوی صاحب یا مفتی صاحب نے ٹوکا تھا کہ اس طرح سجدہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہی تھا

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بھی یہی تھا کہ آپ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو عمومی انداز میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام بتلاتے تھے، اور صحابہ کی تربیت کرتے تھے، لیکن جب موقع ہوتا تھا تو کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم چوکتے نہیں تھے۔

حدیثِ شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاحبزادے حضرت ابراہیم تھے، جن کا بچپن میں ڈیڑھ پونے دو سال کی عمر میں دودھ پینے کے زمانہ میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ جس روز ان کا انتقال ہوا اسی روز سورج گرہن ہو گیا، اور

زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا نظریہ اور عقیدہ یہ تھا کہ سورج گرہن کسی بڑے آدمی کی موت کی وجہ سے یا کسی بڑے آدمی کی پیدائش کی وجہ سے ہوتا ہے، جب سورج گرہن ہوا تو نبی کریم ﷺ نے نماز پڑھائی (سورج گرہن کے وقت نماز پڑھنی چاہیے) اور نماز پڑھانے کے بعد آپ ﷺ نے خطبہ دیا اور اس خطبہ میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو بڑی نشانیاں ہیں اور ان کو کسی کی موت کی وجہ سے، یا کسی کی پیدائش کی وجہ سے گرہن نہیں لگتا بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے (بخاری شریف۔۱۰۶۰)

گویا آپ ﷺ نے موقع سے یہ چیز بتلائی۔ اس لئے کہ عام طور پر لوگوں کا مزاج ہوتا ہے کہ جو غلط نظریہ ہوتا ہے وہ ایسے موقع پر ہی دہرایا جاتا ہے۔ جب سورج گرہن ہوگا تو غلط نظریہ والے اپنے غلط نظریہ کو پیش کریں گے کہ یقیناً کوئی مر گیا ہوگا، یا کوئی پیدا ہوا ہوگا۔ اور مسلمان کی اسلامی شان اور ایمانی حمیت اور غیرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس موقع پر اسلام کی تعلیمات کو پیش کرے؛ تو وہ یاد رہے گی۔ اور ایسے موقع پر لوگوں کو انتظار بھی رہتا ہے۔

محبت تعلیم و تربیت سے آڑے نہیں آئی

بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں ایک مزاج بنا ہوا ہے کہ بچے کو کوئی غلط حرکت کرتا ہوا دیکھ کر بھی محبت کی شدت اور لاڈ پیار کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے اور اگر کوئی کہہ رہا ہو تو اس کو بھی روک دیتے ہیں کہ مت کہو، ابھی تو نادان اور چھوٹا بچہ ہے۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ دیکھو! حضرت حسن رضی اللہ عنہ بڑی عمر کے نہیں تھے، ڈھائی تین سال کی عمر تھی، اس وقت کا یہ قصہ ہے اور جیسا کہ شروع میں بتلا چکا ہوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی اس کے باوجود یہ محبت تعلیم و تربیت میں آڑے نہیں آئی، بلکہ آپ نے بڑے اچھے انداز میں سمجھایا اور بچوں کو اسی طرح سمجھایا جائے کہ

بیٹا! یوں مت کرو، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ان کو کہہ کر وہ کھجور نکلوادی اور ساتھ ہی ساتھ ایک بات یہ بھی فرمادی کہ تمہیں معلوم نہیں کہ ہم صدقہ نہیں کھاتے، حالانکہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ عمر کی جس منزل میں تھے، وہ جانتے نہیں تھے کہ صدقہ کس کو کہتے ہیں، اس کے باوجود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ فرمایا تاکہ وہ بھی سنیں اور دوسرے بھی سنیں۔

بچے کی ذہن سازی کا طریقہ

تو بچہ اگر کوئی غلط حرکت کرتا ہو مثلاً بائیں ہاتھ سے کھاتا ہو اور ہم دیکھ رہے ہوں تو پھر ہم کو چاہیے کہ اس کو کہیں کہ بیٹا! اس طرح نہیں کھایا جاتا ہے بلکہ دائیں ہاتھ سے کھاتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے کھانا یہ مسلمان کا طریقہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا ادب ہے۔ اور بائیں ہاتھ سے کھانا غیر مسلموں کا طریقہ ہے۔ یہ چیز بچے کو بتلادی جائے اگر بائیں ہاتھ سے پانی پیتا ہے تو اس کو محبت اور شفقت سے منع کردو، اس کو ڈانٹنے اور پھٹکارنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کو محبت کے ساتھ بتاؤ اور سمجھاؤ اور کہو کہ بائیں ہاتھ سے غیر مسلم پیتے ہیں، ہم مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے پیتے ہیں۔ اس طرح بتانے سے بچپن ہی سے ان کے ذہن میں یہ چیز بیٹھے گی کہ اسلامی طریقہ دائیں ہاتھ سے پینا ہے۔ صرف اتنا ہی نہ کہے کہ دائیں ہاتھ سے پینا ہے بلکہ اس کو اس طرح کہنا چاہیے کہ دائیں ہاتھ سے پینا یہ اسلامی طریقہ ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بتلایا ہوا ادب ہے، یہ بھی اسلامی تعلیم ہے، اور بائیں ہاتھ سے کھانا اور پینا غیروں کا طریقہ ہے۔ تو بچپن سے اس کے ذہن میں ایک بات بیٹھے گی، اگر بائیں سے روک کر دائیں میں دیدیں گے تو عادت تو پڑے گی، لیکن ذہن میں یہ نہیں بیٹھے گا کہ یہ اسلامی طریقہ ہے۔

اس لئے ہمیں بھی چاہیے کہ اگر بچے کو کوئی چیز دے رہے ہیں اور وہ بچہ اس چیز کو لینے کے لئے بایاں ہاتھ بڑھاتا ہے تو مت دو، بلکہ اس کو محبت سے کہو کہ بیٹا! دائیں ہاتھ سے لو؛ یہ اسلامی طریقہ ہے۔ مسلمانوں کا طریقہ یہ ہے کہ مسلمان دائیں ہاتھ سے لیتا ہے اور غیر مسلم بائیں ہاتھ سے لیتے ہیں، کوئی چیز لینی ہو یا دینی ہو تو وہ دائیں ہاتھ سے لینی اور دینی چاہیے، یہ اس کو بتلایا جائے، اس طرح کرنے سے جہاں اس کو تعلیم ملے گی؛ وہیں اس کی تربیت بھی ہوگی اور یہ چیز ذہن کے اندر بیٹھے گی۔ اگر اس طرح دو تین مرتبہ بھی اس کو کہیں گے تو وہ چیز ہمیشہ کے لئے موت تک اس کے ذہن میں بیٹھ جائے گی کہ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے کھائے اور دائیں ہاتھ سے پیئے، دائیں ہاتھ سے کوئی چیز لے اور دے۔

غفلت سے باز آیا جفا کی

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ محبت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کو کسی غلط چیز کے معاملہ میں ٹوکا نہ جائے، ہاں یہ ہے کہ پٹائی نہ کی جائے اس لئے کہ ویسے بھی پٹائی کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کہیں گے تو سختی کے ساتھ کہیں گے، اور نہیں کہیں گے تو بالکل ہی نہیں کہیں گے:-

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ❁ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

ایسا معاملہ ہے، اگر نہیں کہیں گے تو بالکل نہیں کہیں گے، اور کہیں گے تو ڈھیلا اور پتھر مار کر کہیں گے۔ بھائی! نبی کریم ﷺ نے محبت بھرا جو طریقہ بتلایا وہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ ﷺ نے کیسے اچھے انداز سے فرمایا وہ دوسری روایت میں بھی آگے آرہا ہے۔

بچوں کو اپنے ساتھ کھانے بٹھائیے

۲۹۹ .عن أبی حفص عُمَرَبنِ أبی سَلَمَةَ عبدالله بن أبی الأَسَدِرَبِیبِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ قَالَ: کُنتُ غُلاماًفِیْ حِجْرِرَسُوْلِ اللهِﷺ، وَکَانَتْ یَدِیْ تَطِیْشُ فِی الصَّحْفَةِ،فَقَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ :یَاغُلامُ!سَمِّ اللهَ تعالیٰ، وَکُلْ بِیَمِیْنِکَ،وَکُلْ مِمَّایَلِیْکَ. فَمَازَالَتْ تِلْکَ طِعْمَتِیْ بَعْدُ(متفق علیه) تَطِیْشُ: تَدُوْرُفِیْ نَوَاحِی الصَّحْفَةِ.

حضرت عمر بن اُبی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور نبی کریم ﷺ کی پرورش میں تھا اور حضور ﷺ جب کھانے کے لئے بیٹھتے تو مَیں بھی ساتھ میں بیٹھتا تھا،اور میرا ہاتھ پلیٹ کے اندر سب طرف گھومنے لگتا تھا،تو نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے بچے!بسم اللہ پڑھو،اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔حضرت عمر بن اُبوسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد سے کھانے کا میرا طریقہ ہمیشہ کے لئے یہی ہوگیا۔

افادات:-حضرت عمر بن اُبی سلمہ رضی اللہ عنہ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اگلے شوہر کے صاحبزادے تھے۔حضرت اُم سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا نکاح جب نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوا تو ان کے بیٹے عمر اور ان کی بیٹی زینب وغیرہ؛ چھوٹے چھوٹے تھے وہ بھی ان کے ساتھ تھے،اور یہ بچے نبی کریم ﷺ کی پرورش میں آئے۔حضرت عمر بن اُبی سلمہ فرماتے ہیں کہ مَیں چھوٹا بچہ تھا اور نبی کریم ﷺ کی پرورش میں تھا اور حضور ﷺ جب کھانے کے لئے بیٹھتے تو مَیں بھی ساتھ میں بیٹھتا تھا۔

دیکھو!اس حدیثِ مبارکہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ کھانے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے معاشرے اور سماج میں بعض لوگوں کا مزاج یہ بھی ہوتا ہے کہ باپ کھانے کے لئے بیٹھتا ہے تو چھوٹی اولاد کو ساتھ میں کھانا کھانے کے لئے نہیں بٹھاتا بلکہ یوں کہتا ہے کہ اس کو کھلا دینا، یہ خواہ مخواہ شور کرتا ہے،ہمیں کھانے

نہیں دیتا ہے اور پریشان کرتا ہے۔ ارے بھائی! آپ کو تو اس کی تربیت کرنی ہے، آپ جب کھانے کے لئے بیٹھیں تو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر بیٹھئے، چاہے وہ شور کرتے ہوں، کھانے نہ دیتے ہوں؛ تب بھی ان کو اپنے ساتھ بٹھائیے، اس لئے کہ اگر آپ ان کو اپنے سامنے بٹھا کر نہیں کھلائیں گے تو کھانے کا جو اسلامی طریقہ اور انداز ہے اور کھانے کے جو آداب ہیں وہ ان کو کون بتلائے گا؟ اگر آپ نے کہہ دیا کہ اس کو اکیلے کھانا دیدینا، وقت پر اس کو کھلا دینا، میرے ساتھ اس کو مت بٹھانا؛ تو آپ کو پوری زندگی پتہ ہی نہیں چلے گا کہ بیٹے نے کھانے کا اسلامی طریقہ سیکھا یا نہیں پھر ہم اپنی ذمہ داری کیسے پوری کریں گے؟ اپنے ساتھ بٹھائیں گے تب ہی پتہ چلے گا کہ وہ بسم اللہ پڑھتا ہے یا نہیں، دائیں ہاتھ سے کھاتا ہے یا نہیں کھاتا، وہ لقمہ کس طرح اُٹھاتا ہے اور کہاں سے اُٹھاتا ہے، نیچے اگر گراتا ہے تو اس موقع پر کیا تلقین و تعلیم دینی چاہیے؛ وہ ہم اس کو بتائیں گے۔ اس لئے اگر ہم اپنے ساتھ ان کو بٹھا کر کھلائیں گے تو دو چار روز کے واسطے تکلیف تو ہوگی لیکن آئندہ وہ سدھر جائے گا اور اس کی تربیت ہو جائے گی اب اگر وہ بچہ کسی دوسرے کے گھر گیا اور وہاں کھانے کے لئے بیٹھے گا اور اس کا طریقہ لوگ دیکھیں گے، تو لوگ خوش ہو جائیں گے اور وہ کہیں گے کہ اس کے ماں باپ نے اس کی بہت اچھی تربیت کی ہے اور اگر ہم اس کو اپنے ساتھ نہیں بٹھائیں گے تو وہ نہیں سیکھے گا، اور اب اگر وہ کسی دوسرے کے گھر پہنچ گیا اور جب آپ خود اپنا بچہ، اپنا بیٹا اور اپنا لاڈلا ہونے کے باوجود اس کی ان حرکتوں سے عاجز تھے اور آپ کو اس کی حرکتیں ناگوار تھیں، تو جب دوسرے کے دستر خوان پر وہ ایسی حرکت کرے گا تو وہ لوگ بچے کے متعلق تو کچھ کہیں یا نہ کہیں، لیکن آپ کے متعلق رائے ضرور قائم کریں گے کہ بھائی! اس کے ماں باپ نے اس کو کھانے پینے کا

طریقہ نہیں بتلایا۔اس لئے یہ بہت اہم چیز ہے۔

تین آداب

دیکھو! حضرت عمر بن اُبوسلمہ نبی کریم ﷺ کے بیٹے نہیں تھے، ہاں! حضور کے پروردہ تھے، آپ کی اہلیہ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے اور یتیم تھے، آپ ﷺ کی پرورش میں تھے، ان پر آپ کتنی نگرانی کر رہے ہیں اور ان کی کیسی تربیت کر رہے ہیں، آپ ﷺ تو یتیم کی تربیت اتنی کر رہے ہیں اور ہم اپنے بیٹے کی ایسی تربیت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں حضرت عمر بن اُبوسلمہ فرماتے ہیں کہ میرا ہاتھ پلیٹ کے اندر سب طرف گھومنے لگا (عام طور پر بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ یہاں سے ایک لقمہ مارا، پھر اُدھر سے اُٹھایا) مجھے اس طرح کرتا ہوا دیکھ کر حضور ﷺ نے تین نصیحتیں فرمائیں، کھانے کے تین آداب بتلائے (۱) اے بچے! کھانے کے شروع میں اللہ تعالیٰ کا نام لو، بسم اللہ پڑھو (۲) دائیں ہاتھ سے کھاؤ (۳) اپنے سامنے سے کھاؤ، چاروں طرف ہاتھ مت مارو۔ حضورِ اکرم ﷺ نے یہ تین آداب ان کو بتلائے

حضراتِ صحابہ کی ایک خصوصیت

اس وقت حضرت عمر بن اُبوسلمہ بچے تھے، ہمارا تو بڑوں کا حال یہ ہے کہ ہم کو جب تنبیہ کی جاتی ہے تو ہم بھول بھال جاتے ہیں، لیکن حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اُجمعین کی یہ خصوصیت تھی کہ چھوٹا ہو یا بڑا، مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام؛ حضور ﷺ کی طرف سے اگر ایک مرتبہ تنبیہ کر دی گئی تو زندگی بھر کے لئے وہ یاد رکھ لیتے تھے، بعد میں پھر کبھی چوک نہیں ہوتی تھی۔ اب تو بڑوں کا حال یہ ہے کہ بار بار ٹوکا جاتا ہے تب بھی اپنی اس

حالت اور بگاڑ کو درست کرنے کا نام نہیں لیتے، لیکن حضرت عمر بن أبو سلمہ فرماتے ہیں ﴿فَمَازَالَتْ تِلْكَ طِعْمَتِي بَعْدُ﴾ ﴿طِعْمَةٌ﴾ یہ ﴿فِعْلَةٌ﴾ کے وزن پر ہے۔ عربی زبان میں کسی چیز کی خاص ہیئت اور طریقہ بتلانے کے لئے آتا ہے۔ تو حضرت عمر بن أبو سلمہ کہتے ہیں کہ اس کے بعد کھانے کا میرا طریقہ ہمیشہ کے لئے یہی ہو گیا کہ کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتا، دائیں ہاتھ سے کھاتا، اور اپنے سامنے سے کھاتا۔

دیکھو! اس وقت حضرت عمر بن أبو سلمہ چھوٹے بچے تھے، لیکن ایک مرتبہ حضور ﷺ نے تنبیہ فرمادی، بس! اس کی گرہ باندھ لی اور پھر ہمیشہ کے لئے اسی پر عمل کرنے لگے۔ بچے اپنے سے بڑوں کو دیکھتے ہیں اور ان سے سیکھتے بھی ہیں اور جو بتایا جاتا ہے اس کو اخذ بھی کرتے ہیں، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بچپن ہی سے ان کو عادت ڈالنی چاہیے، اس معاملہ میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ یہاں حضور ﷺ نے یہ نہیں سوچا کہ یہ ابھی چھوٹے ہیں، جب بڑے ہوں گے تو بتا دیا جائے گا اور وہ اس وقت سمجھ جائیں گے۔

ہر شخص ذمہ دار ہے

۳۰۰. وعن ابن عمر رضي الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ. اَلامَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ. (متفق عليه)

حضرت عبداللہ بن عمر رضي الله عنه فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تم میں سے ہر ایک نگران ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کے ماتحت کے متعلق کل قیامت میں پوچھا جائے گا، پورے ملک کا حاکمِ اعلیٰ پورے ملک کا ذمہ دار ہے، اور اس سے قیامت کے روز پورے ملک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اس سے گھر والوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور عورت: شوہر کے گھر کی چیزوں کی ذمہ دار ہے،

اس سے وہ سب چیزوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔اور خادم یعنی نوکر اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے،اس سے کل قیامت میں اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنے ماتحت کی جو ذمہ داری اس کے حوالہ کی گئی ہے اس کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

افادات:- ﴿رَاعٍ﴾ یعنی دیکھ ریکھ رکھنے والا۔تم میں سے ہر ایک دیکھ ریکھ رکھنے والا ذمہ دار اور جواب دار ہے اور تم میں سے ہر ایک سے جس کی جو ذمہ داری اور جواب داری ہے،اور جو اس کے ماتحت ہیں ان کے متعلق کل قیامت میں پوچھا جائے گا کہ تم نے ان کو تعلیم اور تربیت دی یا نہیں۔ بچے کے متعلق یہ نہیں پوچھیں گے کہ اس کے لئے آپ دوکان چھوڑ کر آئے یا نہیں؟ مکان چھوڑ کر آئے کہ نہیں؟ بینک بیلنس اس کو دے کر آئے یا نہیں؟ کار خرید کر اس کو دے کر آئے یا نہیں؟ یہ نہیں پوچھا جائے گا؛ بلکہ یہ پوچھا جائے گا کہ آپ نے اس کو دین سکھایا تھا یا نہیں؟تعلیم دی تھی یا نہیں؟ تربیت کی تھی یا نہیں؟

اور آپ دوکان ومکان کچھ بھی چھوڑ کر نہ جاویں،کل کو کوئی بچہ آپ کے خلاف یہ دعویٰ دائر نہیں کرسکتا کہ باری تعالیٰ! میرے ابا میرے لئے دوکان چھوڑ کر نہیں گئے تھے، بینک بیلنس چھوڑ کر نہیں گئے تھے، مجھے کار بھی دے کر نہیں گئے تھے۔ بالفرض اگر ایسا دعویٰ وہاں کرے گا تو بھی اس کی شنوائی ہونے والی نہیں ہے۔لیکن ہاں! یہ کہے گا کہ باری تعالیٰ! میرے ابا نے مجھے آپ کے احکام سے واقف نہیں کیا،کون سے کام کرنے تھے اور کن چیزوں سے بچنا تھا،نماز کا طریقہ اور دین کی ساری چیزیں مجھے نہیں سکھائیں۔اگر دین نہیں سکھایا ہے تو کل قیامت میں وہ دامن پکڑے گا،چاہے آپ اس کے لئے کروڑوں روپے چھوڑ کر اِس دنیا سے گئے ہوں۔ یہ یاد رہے کہ قیامت میں اس ذمہ داری کے متعلق سوال ہوگا۔

﴿الامَامُ رَاعٍ﴾ پورے ملک کا حاکمِ اعلیٰ پورے ملک کا ذمہ دار ہے، اوراس سے قیامت کے روز پورے ملک کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

﴿وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِیْ أَهْلِهٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ﴾ مرد: اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، گھر میں جتنے افراد بیوی بچے وغیرہ اس کی ماتحتی میں ہیں، وہ ان سب کا ذمہ دار ہے اور کل کو قیامت میں ان سب کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

﴿وَالْمَرْأَةُ رَاعِیَةٌ فِیْ بَیْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَعِیَّتِهَا﴾ عورت: شوہر کے گھر کی چیزوں کی ذمہ دار ہے، اور جو بچے اس کی پرورش میں ہیں ان کی ذمہ دار ہے، اور کل کو قیامت میں ان سب کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔

﴿وَالْخَادِمُ رَاعٍ فِیْ مَالِ سَیِّدِهٖ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ﴾ اور خادم یعنی نوکر اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے۔ آپ نے اپنے گھر میں یا اپنی فیکٹری میں یا اپنی دوکان میں جس کو نوکر رکھا ہے اور دوکان کا مال، یا جو چیزیں اور جو کام اس کے حوالہ کئے ہیں، ان سب کے متعلق وہ بھی ذمہ دار ہے، اگر اس میں ذرا بھی کمی ہوگئی، یا خیانت سے کام لیا تو کل قیامت میں اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

﴿فَکُلُّکُمْ رَاعٍ وَمَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ﴾ آخر میں پھر دوبارہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنے ماتحت کی جو ذمہ داری اس کے حوالہ کی گئی ہے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

تربیت نہ کرنے پر سزا ہوگی

خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ہر ایک کے اوپر ہے، اور اس کا اس کو اہتمام کرنا چاہیے تاکہ کل قیامت کے روز جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سوال کیا

جائے تو آدمی اس سے بری الذمہ ہو جائے۔ اور اگر اس نے تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کیا تو کل قیامت کے روز پکڑ دھکڑ ہو جائے گی اور وہاں اس سلسلہ میں مواخذہ ہو گا اور اس ذمہ داری کے ادا نہ کرنے پر سزا بھی ہوگی۔

جیسے ہم کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ تمہاری ذمہ داری ہے، مَیں تم سے پوچھوں گا۔ تو یہ ''پوچھوں گا'' کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اگر اس کی ادائیگی میں تم نے کوتاہی کی تو سزا بھی دی جائے گی۔ سزا کا لفظ لاتے نہیں ہیں، لیکن ''پوچھوں گا'' کا مطلب ساری دنیا جانتی ہے۔

آقا اور سیٹھ اگر اپنے نوکر کو یوں کہے کہ دیکھو! مَیں پوچھوں گا، حساب اور جواب لوں گا تو ''جواب لوں گا'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو تمہیں سزا ملے گی۔ اسی طرح یہاں پر بھی صرف یہ آیا ہے کہ پوچھا جائے گا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ادائیگی میں اگر کوتاہی ہوگی تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے ماتحتوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں جو ذمہ داری اللہ نے ہم پر ڈالی ہے اس کو سو فیصد ادا کرنے والے بن جائیں اور اس امانت کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور پورے طور پر پیش کر سکیں۔

تعلیم و تربیت کی عمر

۳۰۱. عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله ﷺ: مُرُوْا أَوْلَادَکُمْ بِالصَّلٰوۃِ وَھُمْ أَبْنَآءُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ أَبْنَآءُ عَشْرٍ، وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ.

(حدیث حسن، رواہ ابوداود باسنادٍ حسنٍ)

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو، حال یہ کہ وہ سات سال کے ہوں اور دس سال کا ہونے پر اگر نماز نہیں پڑھیں تو پھر ان کی پٹائی کرو۔ اور ان کے بستر الگ کر دو۔

افادات:- بچہ چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی؛ جب سات سال کی عمر کو پہنچ جائے تو ماں باپ کو چاہیے کہ اس کو نماز کے لئے کہیں کہ بیٹا! نماز پڑھو، کہتے رہیں اور تلقین کرتے رہیں، وہ اگر نہیں پڑھتا، کبھی چھوڑ دیتا ہے اور کبھی گُلّی مار دیتا ہے تو اس پر اس کو مارنے اور سزا دینے کی ضرورت نہیں ہے یعنی اس کو کہنا شروع کریں اور اس کو سمجھائیں۔

اور یہ بات یاد رہے کہ سات سال سے پہلے نہ کہیں۔ اسی سے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ بچہ جب سات سال کا ہوتا ہے تب ہی اس کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، اس سے پہلے تعلیم وتربیت کا بوجھ اس پر نہیں ڈالنا چاہیے۔ بعض ماں باپ اس سے پہلے ہی تعلیم کے لئے بٹھا دیتے ہیں اور تعلیم کا بوجھ ڈال دیتے ہیں، ہاں! اگر کھیل کھیل میں اس کو دو چار باتیں بتا دی جائیں؛ تو بات دوسری ہے۔ لیکن سات سال سے پہلے باقاعدہ اس کو تعلیم کے لئے بٹھانا؛ تو اکثر علماء فرماتے ہیں کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اس حدیثِ شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم وتربیت کا سلسلہ سات سال کی عمر میں شروع ہوتا ہے۔

پھر اس سے چھٹی ملنے والی نہیں

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ مَیں چھوٹا تھا تو والد صاحب نے مجھے پڑھنے میں نہیں لگایا تھا، ہمارے گھر کی عورتیں دادی وغیرہ میرے والد صاحب کو تنبیہ کرتی تھیں اور کہا کرتی تھیں کہ یہ اتنا بڑا ہو گیا، اس کو کچھ کہتے ہی نہیں ہو؟ تو والد صاحب یوں فرمایا کرتے تھے کہ جب اوکھلی میں سر دے گا تو پھر قبر کے علاوہ نکلنے والا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ تعلیم میں لگا دیں گے تو پھر اس سے چھٹی ملنے والی نہیں ہے، ابھی کھیلنے کا وقت ہے؛ کھیل لینے دو۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ سات

سال کا بچہ ہو تو تعلیم و تربیت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔

پٹائی کے لئے بھی حدود متعین ہیں

﴿وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ أَبْنَآءُ عَشْرٍ﴾ اور دس سال کا ہونے پر اگر نماز نہیں پڑھے تو پھر اس کی پٹائی کرو۔ معلوم ہوا کہ دس سال سے پہلے نماز نہ پڑھنے پر پٹائی کی بھی اجازت نہیں ہے، اسلئے کہ سات سال کا ہونے پر نماز کے لئے کہنے کا حکم دیا، لیکن اگر اس وقت کسی وجہ سے نماز نہیں پڑھی، تو آپ اپنے ساتھ لے جایئے اور پڑھایئے، لیکن آپ کسی جگہ گئے تھے اور تاکید کر گئے تھے کہ بیٹا! نماز پڑھ لینا، مَیں فلاں جگہ جا رہا ہوں، بعد میں آ کر پوچھوں گا، آنے کے بعد پوچھا تو معلوم ہوا کہ نماز نہیں پڑھی ہے تو اس سے کہو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی ہے تو اچھا چلو! اب دو رکعت قضا کر لو، یوں کہہ سکتے ہیں لیکن پٹائی نہ کی جائے۔

اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دس سال کا ہو جانے پر اگر نماز نہیں پڑھتا تو اس صورت میں اس کی پٹائی کرو۔ تو دیکھو! حضور ﷺ خود پٹائی کا حکم دیتے ہیں، البتہ پٹائی کے لئے شریعت نے حدود متعین اور مقرر کئے ہیں کہ اگر کسی بات پر بچے کی پٹائی کی جائے تو ایسی کی جائے جس سے اس کے جسم پر کوئی نشان نہ پڑے۔ مارنے کے متعلق ایک ہدایت تو یہ ہے کہ چہرے پر نہ مارا جائے، دوسری بات یہ ہے کہ اگر ہاتھ یا لکڑی سے مارا ہے تو ایسی سخت مار نہ ہو کہ اس کے جسم پر نشان پڑ جائیں اور تین سے زیادہ مارنے سے منع کیا ہے۔
بہر حال! مارنے کے لئے یہ حدود مقرر و متعین ہیں، اس سے زیادہ کی ماں باپ اور استاذ کسی کو بھی اجازت نہیں ہے۔ کتابوں میں منع لکھا ہے۔ اگر یہاں مدرسہ کے مولوی صاحبان

ہوں گے تو ناراض ہو جائیں گے کہ دیکھو مفتی صاحب کیسا مسئلہ بیان کر رہے ہیں۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اس کی پٹائی کرو، اس سے معلوم ہوا کہ بچے کو نماز کی خصوصی تاکید کرنی چاہیے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں قابلِ توجہ ہیں، اور بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

اب ان کے بستر بھی الگ کر دو

اور حدیثِ شریف میں ایک حکم یہ بھی ہے ﴿وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ اور ان کے بستر الگ کر دو۔ بستر الگ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اور لڑکی جب چھوٹے دو تین سال کے ہوتے ہیں؛ تو ساتھ ہی سوتے ہیں، لیکن جب وہ دس سال کے ہو جائیں، چاہے لڑکا اور لڑکی سگے بھائی بہن کیوں نہ ہوں، اب ان کو ایک بستر پر نہ سلایا جائے۔ ماں باپ کو چاہیے کہ ان کا بستر الگ کر دیں، کیونکہ جب دس سال کی عمر ہو گئی تو اس میں پھر خواہشات آنے لگتی ہیں اور بے خبری اور نادانستگی میں بھی کبھی کوئی غلطی ہو سکتی ہے، اس لئے لڑکے اور لڑکی کا بستر الگ کرنا چاہیے۔

بچوں کو نماز سکھاؤ

۳۰۲. وعن أبي ثُرَيَّةَ سَبُرَةَ بْنِ مَعْبَدِ الْجُهَنِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: عَلِّمُوا الصَّبِيَّ الصَّلٰوةَ لِسَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُ عَلَيْهَا ابْنَ عَشْرِ سِنِيْنَ. (حديث حسن، رواه ابو داود والترمذی وقال حديث حسن.) ولفظ أبي داود: مُرُوا الصَّبِيَّ بِالصَّلٰوةِ اِذَا بَلَغَ سَبْعَ سِنِيْنَ.

حضرت ابو ثریہ سبرہ بن معبد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سات سال کی عمر میں بچے کو نماز سکھاؤ اور دس سال کی عمر میں بچے کو نماز کے لئے مارو۔ دوسری روایت کے الفاظ ہیں کہ بچہ کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کا ہو جائے۔

افادات:- پہلی روایت میں یوں تھا کہ نماز کا حکم دو، اور یہاں یہ آیا کہ نماز سکھاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کو نماز سکھانی بھی چاہیے، یہ ذمہ داری ماں باپ کی ہے کہ وہ اپنے بچوں اور بچیوں کو نماز سکھائیں اگرچہ آپ نے اپنی اولاد کو مکتب میں بھیجا ہے، اور مکتب میں اس کے استاذ اس کو سکھائیں گے وہ تو اپنا کام کر ہی رہے ہیں، لیکن ہمارا بھی فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ ہم اس کی طرف توجہ کریں کہ بچے کو نماز کا طریقہ برابر یاد ہے یا نہیں۔

میرے والد کا طرزِ تربیت

مجھے یاد ہے کہ مَیں جب چھوٹا تھا، اس وقت ہمارے یہاں گھر میں دوسرے بھائیوں کے بچے بھی تھے، تو میرے والد صاحبؒ (اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھرے۔ آمین) کھانے سے دس پندرہ منٹ پہلے ایسے ہی بغیر کھانے کے خالی دسترخوان لگوادیتے تھے، اور بچوں کو دسترخوان پر بٹھا کر سب کی نماز سنتے، اور جب نماز پوری ہوجاتی تھی تو پھر کھانا لایا جاتا تھا اور پھر کھانے کے آداب سنتے تھے۔ یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

حاجی یوسف صاحب کا عجیب وغریب معمول

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب دامت برکاتہم (رحمۃ اللہ) جو ترکیسر میں مدرس ہیں انہوں نے ایک مرتبہ سنایا کہ وہ ری یونین تشریف لے گئے تھے، اور آپ نے بھی نام سنا ہوگا کہ ری یونین میں حاجی یوسف صاحب راوت ہیں، بہت بڑے رئیس آدمی ہیں، اور وہاں ان کو گورنمنٹ کی طرف سے بھی بہت کچھ القاب ملے ہوئے ہیں اور ترکیسر کا مدرسہ جس خاندان کے ماتحت چلتا ہے اس کے بڑے یہی ہیں، اور بڑے سخی آدمی ہیں اور ری یونین میں ہماری

کمیونٹی یعنی ہندوستانی مسلمانوں میں سب سے بڑے مالداراور رئیس شمار ہوتے ہیں،ان کے یہاں کا معمول یہ ہے کہ اتوار یا جمعہ کوان کے لڑکے اورلڑکیاں اوران کی اولا داورلڑکوں کی بیویاں اورلڑکیوں کے شوہر،اوران کے چھوٹے بڑے سب بچے؛ گویاپورے خاندان کووہ جمع کرتے ہیں،پھر پورے خاندان کوساتھ بٹھا کر کہتے ہیں کہ میری نماز سنو،ہر ہفتہ پوری نماز اور تمام آداب وغیرہ سناتے ہیں اور پورے خاندان کے تمام چھوٹوں اور بڑوں کی نماز خود سنتے ہیں۔اتنے بڑے رئیس آدمی جن کی لاکھوں اور کروڑوں سخاوتیں ہیں،ان کا یہ عجیب وغریب معمول ہے۔آدمی اگر کچھ کرنا چاہےتو کوئی مشکل و پریشانی نہیں ہے۔

یہ بہانے بازیاں فضول ہیں

بعض لوگ کہتے ہیں کہ میرے پاس وقت نہیں ہے،حالانکہ کھانے کے لئے بیٹھیں گےتو باتوں باتوں میں گھنٹہ آدھ گھنٹہ دستر خوان پرنکل جاتا ہے،اگراسی وقت کو اس کام کیلئے بھی استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ کاروبار میں مشغولی کی وجہ سے ہمیں فرصت ہی کہاں ملتی ہے،کھانے کا بھی وقت برابرنہیں ملتا؛ تو کیا کریں؟نہیں بھائی!ایسانہیں ہے۔''تو ہی اگرنہ چاہےتو باتیں ہزار ہیں'' جیسا معاملہ ہے، اگرہم چاہیں تو سب ہوسکتا ہے۔اتوار کو بچوں کولے کراُبھراٹ (ساحل سمندر پرایک جگہ کانام ہے) چلے جاتے ہیں،اورلوگوں کا بیان ہے کہ سورت والے وہاں بہت آتے ہیں اوراب تو بہت زیادہ لوگ جاتے ہیں اس لئے کہ وہاں واٹر پارک شروع ہوا ہے۔عورتوں اور بچوں کو وہاں لے جاتے ہیں اور بے حیائی کی حد ہوجاتی ہے،جب بچوں کو گھمانے لے جانے کے لئے ہمارے پاس وقت ہےاوراس کوہم اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں؛ توان

کی نماز سننے کا کیا ہمارے پاس وقت نہیں ہے؟ اس لئے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حَقُّ الْجَارِ وَالْوَصِيَّةُ بِهٖ

پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید

۱۵/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ ﷽ ۳/اپریل ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد

أعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم.

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ (النسآء:۳۶)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا ہے کہ پڑوسی کے کیا حقوق ہیں اور پڑوسی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے کیا تاکیدیں اور ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں کہ ان کے ساتھ کس طرح معاملہ وسلوک کرنا چاہیے۔

انسانی فطرت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطری طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ اکیلا زندگی نہیں گذار سکتا بلکہ زندگی گذارنے کے لئے فطری اور طبعی طور پر انسان کا نیچر اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مل کر رہے۔ ''انسان'' لفظِ اُنس سے بنا ہے اور اُنس کا مطلب ہے مانوس ہونا، انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطری طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ تنہا زندگی نہیں گذار سکتا بلکہ زندگی گذارنے کے لئے اس کو اپنے ہی ہم جنسوں کی ضرورت پڑتی ہے، یہ تو وحشی جانوروں کا مزاج اور طبیعت ہے کہ وہ الگ الگ رہتے ہیں۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

بلکہ لوگوں کے ساتھ مل جل کران کے درمیان رہنے کی حدیثِ پاک میں فضیلت آئی ہے، مشکوٰۃ شریف میں روایت ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ مؤمن جو لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اوران کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور ایذاؤں کو برداشت کرتا ہے وہ اس مؤمن سے بہتر ہے جو تنہا رہتا ہے اور لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور ایذاؤں کو برداشت نہیں کرتا۔ جب لوگوں کے ساتھ مل کر رہیں گے توان کی طرف سے تکلیفیں تو پہنچنے ہی والی ہیں، اوران کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں اور ایذاؤں کو برداشت کرنا یہ اعلیٰ درجہ ہے، اسی لئے شریعت نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی یعنی لوگوں سے الگ تھلگ رہنا جیسا کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے بنی اسرائیل کا ایک خاص مزاج تھا کہ وہ لوگ تنہائی اختیار کرلیا کرتے تھے، اسلام نے اس طریقہ کو پسند نہیں کیا بلکہ معاشرہ اور سماج میں رہ کر زندگی گذارنے کو تنہا رہنے کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے۔

معاشرت

تو مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ہی ایسی بنائی ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہے، مثلاً گھر میں ہے تو ماں باپ کے ساتھ، بیوی بچوں کے ساتھ، بھائی بہنوں کے ساتھ، گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ ہوگا، پھر پڑوسی اور محلّہ اوربستی والے ہیں اپنے کاروبار کے لئے دوکان پر جائے گا تو وہاں گاہکوں کے ساتھ واسطہ پڑے گا اور کارخانہ جائے گا تو بازار میں جو ہم پیشہ لوگ ہیں ان کے ساتھ واسطہ

پڑے گا، ٹرین یا بس یا اور کسی ذریعہ سے سفر کرتا ہے تو اور بھی بہت سارے لوگ ساتھ ہوتے ہیں جن سے اس کو واسطہ پڑتا ہے، تو اس طرح مختلف اوقات میں زندگی کے مختلف مرحلوں اور مواقع پر مختلف لوگوں کے ساتھ جو واسطہ پڑتا ہے اس وقت ان کے ساتھ وہ کس طرح سے پیش آتا ہے، اسی کو شریعت میں معاشرت سے تعبیر کیا جاتا ہے، معاشرت یہی ہے کہ ہم جس جگہ بھی ہوں وہاں اپنے آس پاس کے لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، شریعت میں اس کی باقاعدہ تفصیل بتلائی گئی ہے کہ کس کے ساتھ کیسے معاملہ کرنا چاہیے، اور یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو آیت پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اختصار کے ساتھ اس کی طرف متوجہ کیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشادات کے ذریعہ سے اس کی تفصیل بتائی۔

دین کے کل پانچ شعبے ہیں

آج کل ہم لوگوں نے دین کے اندر سے معاشرت کو نکال کر باہر پھینک دیا ہے، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ عبادات کا اہتمام کر لینا ہی دین ہے، حالانکہ دین کے کل پانچ شعبے ہیں ایک تو اعتقادیات کا شعبہ ہے یعنی آدمی کا عقیدہ درست ہو۔ عبادات کا شعبہ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ کا تعلق اور اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرتے ہوئے اس کا قرب ونزدیکی اور خوشنودی حاصل کرنا، اس کی محبت اپنے دل میں پیدا کرنے کے لئے اور اس کو راضی کرنے کے لئے کام کرنا۔ اس کے علاوہ معاملات، معاشرت اور اخلاق؛ یہ تین شعبے ہیں۔ تو معاشرت بھی دین کا بڑا اہم شعبہ ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرت والے شعبہ سے تعلق رکھنے والی بہت ساری باتیں ارشاد فرمائی ہیں اور ان کی تعلیم دی ہے، بلکہ یوں سمجھئے کہ عبادات کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہونے کی وجہ سے آپ کے دین

کے متعلق لوگ کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے، یعنی آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ مسجد میں ادا کی جاتی ہے، آپ روزہ رکھ رہے ہیں تو آپ کا دل جانتا ہے، زکوٰۃ ادا کریں گے تو کسی مسکین کو مال پہنچا دیں گے، لیکن لوگوں کے ساتھ آپ کا سلوک کیسا ہے، وہ لوگوں کے ساتھ میل جول سے پتہ چلے گا اور اسی کو دیکھ کر دوسرے لوگوں پر اسلامی اخلاق کا اثر پڑتا ہے اور اسلامی تعلیمات اجاگر ہوتی ہیں۔

اسلام کا اہم شعبہ

آج کل ہمارے اندر سے معاشرت کے آداب اور معاملات کی درستگی نکل گئی؛ اسی لئے اسلام کا جو اثر غیروں پر ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے اسلاف تجارت کی غرض ہی سے نکلے تھے لیکن ان کے معاملات اور معاشرت ہی سے غیر قومیں متأثر ہوئیں، چین میں اسلام تاجروں کے ذریعہ سے پہنچا، وہاں مسلمان تجارت کے لئے گئے تھے لیکن انہوں نے تجارت اسلامی اصول کے مطابق کی تو اس کو دیکھ کر وہاں کے لوگ اسلام لے آئے۔

بہر حال! معاشرت؛ اسلام کا بڑا اہم شعبہ ہے اور اس کا اہتمام کرنا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے، اس میں کوتاہی کے نتیجہ میں بندوں کے حقوق آدمی پر باقی رہ جاتے ہیں اور یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، بندوں کے حقوق اگر باقی رہ جائیں گے تو جب تک بندے معاف نہیں کریں گے، وہاں تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی معافی نہیں ملے گی ۔تو یہاں اسی معاشرت سے تعلق رکھنے والا ایک جزو ''پڑوسی کے حقوق'' کو بتایا جاتا ہے کہ پڑوسی کے حقوق کیا ہیں؟ اور پڑوسی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ کی طرف سے دی گئی تاکیدیں کیا کیا ہیں؛ انہیں کو بیان کریں گے۔

آیت کا ترجمہ وتفسیر

سب سے پہلے تو قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا﴾ آگے جو ہدایتیں دی جارہی ہیں اس کی ابتدا ہی اس بات سے کی کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کو ایک مانو۔ یہاں عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کی توحید کا حکم ہے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ گویا آگے جو ہدایتیں دی جارہی ہیں وہ شرک سے براءت اور توحید کا تقاضہ ہیں۔ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے حقوق ادا کرے گا؛ وہی دوسرے انسانوں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی اہتمام کرے گا، اور جو سب سے بڑا محسن ہے اور جس نے زندگی عطا فرمائی اور ساری نعمتوں سے نوازا، اس کے حقوق کی ادائیگی میں جو آدمی کوتاہی کرے گا، اس کی توحید کا اقرار نہیں کرے گا، دوسروں کو اس کے ساتھ شریک کرے گا؛ تو بھلا وہ دوسرے انسانوں اور جانوروں کے حقوق کیا ادا کرے گا؟ اس لئے توحید کی تعلیم سے ابتدا کی۔

پھر آگے فرمایا: ﴿وَبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا﴾ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے بعد ظاہری اعتبار سے انسان پر اگر کسی کا سب سے بڑا احسان ہے تو وہ اس کے ماں باپ کا ہے کہ دنیا میں اس کے وجود میں آنے کا ظاہری ذریعہ یہی بنے ہیں، اور پھر اس کے بڑے اور جوان ہونے تک ماں باپ ہی نے اس کی تعلیم وتربیت اور پرورش کیلئے بڑی محنتیں اور مشقتیں برداشت کیں، اس لئے ان دونوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کرو۔

﴿وَبِذِی الۡقُرۡبٰى﴾ اور رشتہ داروں کے ساتھ احسان کا سلوک کرو۔

﴿وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ﴾ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی بھلائی کرو۔

قریب اور دور کے پڑوسی

﴿وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبیٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ اور جو نزدیک کا پڑوسی ہے اور جو دور کا پڑوسی ہے؛ ان دونوں کے ساتھ بھی احسان کا سلوک کرو۔ یہاں اس آیت کو اسی ٹکڑے کی وجہ سے لائے ہیں، اگرچہ اس آیت میں اور بھی بہت ساری ہدایتیں دی ہیں لیکن آگے اس پر مستقل عنوانات آنے والے ہیں، یہاں پڑوسی والا عنوان قائم کیا ہے اس سے تعلق رکھنے والے یہ جملے ہیں۔

﴿وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبیٰ﴾ ''قریب کے پڑوسی'' سے کیا مراد ہے؟ تو اس کی تعیین اور تشریح کے سلسلہ میں حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے دو قول منقول ہیں۔ بعضوں نے کہا کہ ''قریب کا پڑوسی'' یعنی جس کا مکان ہمارے مکان سے قریب ہو، اور ﴿وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ ''دور کا پڑوسی'' یعنی جس کا مکان دور ہو۔ اور بعضوں نے کہا کہ ''قریب کا پڑوسی'' کا مطلب یہ ہے کہ جو پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار بھی ہے، اور ''دور کا پڑوسی'' کا مطلب یہ ہے کہ صرف پڑوسی ہے، رشتہ دار نہیں ہے۔

تین قسم کے پڑوسی

چنانچہ حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ پڑوسی تین قسم کے ہیں، ایک تو وہ جو صرف پڑوسی ہے، یعنی اس کا صرف پڑوس کا حق ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مثلاً کوئی غیر مسلم پڑوس میں رہتا ہے، تو اس کا صرف پڑوسی ہونے کے ناطہ سے حق ہے۔ دوسرا مسلمان پڑوسی ہے، یہاں دو حق ہیں ایک تو اس کے پڑوسی ہونے کا حق ہے اور دوسرا اس کے مسلمان ہونے کا حق ہے، اسلامی بھائی چارگی کا تقاضہ بھی کچھ اور ہے اور

تیسرا پڑوسی وہ ہے جو مسلمان بھی ہے اور رشتہ دار بھی، اس صورت میں تین باتیں آگئیں ایک تو پڑوس کا حق ہے، دوسرے اسلام کا حق ہے، تیسرے رشتہ داری کا حق ہے، اس کے تین حق عائد ہوتے ہیں۔ (شعب الایمان۔۹۵۶۰)

قرآن کی باریک بینی

﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ دیکھو! اسلام نے پاس میں بیٹھنے والے ہم نشین کی کتنی زیادہ رعایت کی ہے کہ جو آپ کے پاس بیٹھتا ہے اس کے ساتھ بھی احسان کا سلوک کرو۔ اب ذرا غور کیجئے کہ ہمارا ہم نشین کون ہے؟ مثلاً آپ ٹرین یا بس یا ہوائی جہاز میں سفر کر رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی دوسرے بھی بیٹھے ہوئے ہیں یا مثلاً آپ اسکول و مدرسہ میں جاتے ہیں تو آپ کے ساتھ جو بیٹھتے ہیں، یا آپ تجارت کے لئے بازار اور مارکیٹ میں جاتے ہیں تو تھوڑی دیر کے لئے آپ کے ساتھ جو بیٹھ رہے ہیں؛ یہ سب ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾ میں آگئے، آپ کے ہم نشین یعنی ساتھ میں بیٹھنے والے کے ساتھ بھی بھلائی اور احسان کا سلوک کرنے کا اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں حکم دیا ہے، ہم تو ان چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہی نہیں ہیں، حالانکہ قرآن نے کتنی جزرسی سے کام لیا ہے یعنی کتنی باریک باریک باتوں کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ماں باپ سے شروع کر کے رشتہ دار، یتیم، مسکین، پڑوسی اور اس کی بھی دونوں قسمیں، اور اس کے بعد آگے تھوڑی دیر کے لئے جس کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی نوبت آگئی؛ اس کا بھی حق قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے بتلایا ہے، اور ہمیں ان سب کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

﴿وَابْنِ السَّبِيْلِ﴾ اور مسافر کے ساتھ بھی احسان کا سلوک کرو۔ مسافر کے ساتھ رہنا تو نہیں ہے لیکن کوئی آدمی آپ کی بستی میں آیا اور ضرورت مند ہے، تو سفر کی وجہ سے

اس کا بھی حق ہے، اس لئے کہ اجنبی ماحول ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ وہ کسی دقت و پریشانی میں مبتلا ہو تو ہمیں تاکید کی گئی کہ اس کے ساتھ خصوصی معاملہ کیجئے تاکہ اس کی پریشانی دور ہو۔

﴿وَمَامَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ اور جن کے تمہارے ہاتھ مالک ہیں یعنی غلام، باندیاں اور جانور؛ یہ سب اس میں شامل ہو گئے۔ اُس زمانہ میں آقا لوگ غلام اور باندی کے مالک ہوا کرتے تھے، اور اسی طرح سے جانوروں کے بھی مالک ہوتے ہیں؛ ان کے ساتھ بھی بھلائی اور احسان کرنے کا قرآنِ پاک میں حکم دیا گیا ہے، جن جن کے حقوق آدمی کے اوپر آسکتے ہیں تقریباً سب کو اس آیت میں جمع کر دیا گیا ہے۔

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس باب سے تعلق رکھنے والی روایتوں کو پیش کرتے ہیں:-

پڑوسی کو وارث بنا ڈالیں گے

٣٠٣. وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ وَ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہما قالا: قال رسول اللہ ﷺ: مَازَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِىْ بِالْجَارِ، حَتّٰى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ.

حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما دونوں سے یہ روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی برابر تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ مجھے یہ خیال ہونے لگا کہ عنقریب وہ اس کو وارث بنا ڈالیں گے۔

افادات:- یعنی بار بار آتے رہے اور بتلاتے رہے اور ان کی طرف سے اتنی زیادہ تاکید ہوتی رہی کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں کل کو یہ حکم آجائے گا کہ پڑوسی بھی تمہارے مال میں وارث ہے، اگرچہ یہ حکم ہوا نہیں ہے لیکن اس سے پڑوسی کے حقوق کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آج کل ہم نے اپنے معاشرہ میں سب سے زیادہ

کوتاہی اسی معاملہ میں کر رکھی ہے، پڑوسیوں کے حقوق کو تو ہم کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں، اس کی طرف تو کوئی توجہ ہی نہیں دیتے۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے اور فرشتوں کے سردار ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ بھی کہنے کے لئے آئیں گے وہ اپنی طرف سے تو نہیں کہیں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا پیغام ہی لے کر آئیں گے، تو وہ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر آرہے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کو بار بار تاکید کی جا رہی ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پڑوسی کا حق کتنا زیادہ ہے۔

شوربہ میں پانی زیادہ ڈالو

۳۰۴. عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: یَا أَبَا ذَرٍّ! إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَكْثِرْ مَاءَ هَا، وَتَعَاهَدْ جِيْرَانَكَ (رواه مسلم)

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! جب تم شوربے والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈالو، اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو۔

وفی روایة لہ عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال: إِنَّ خَلِيْلِيْ ﷺ أَوْصَانِيْ: إِذَا طَبَخْتَ مَرَقاً فَأَكْثِرْ مَاءَهُ، ثُمَّ انْظُرْ أَهْلَ بَيْتٍ مِنْ جِيْرَانِكَ، فَأَصِبْهُمْ مِنْهَا بِمَعْرُوْفٍ.

دوسری روایت میں ہے: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے خلیل ﷺ نے مجھ کو تاکید فرمائی کہ جب تم شوربے والا سالن پکاؤ تو اس میں پانی زیادہ کر دو اور پھر اپنے پڑوس کے گھروں کو دیکھو، اور ان کو پہنچاؤ

افادات: -شوربے والے سالن کو عربی میں "مَرَقَةٌ" کہتے ہیں۔ اس میں پانی ذرا زیادہ ڈال دو، اور اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو یعنی شوربہ زیادہ کر دو گے تو ظاہر ہے کہ سالن زیادہ ہو جائے گا اور آپ پڑوسیوں تک پہنچا سکیں گے، اگر کم ہوگا تو آپ یہ

سوچیں گے کہ یہ ہمارے لئے کافی نہیں ہوگا، اگر تھوڑا پانی اس میں ڈال دیا تو اس سے مزہ میں کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے اپنی ضرورت کے لئے بھی کافی ہوجائے گا اور پڑوسیوں تک بھی پہنچ جائے گا۔

ہنڈیا کی بھاپ بھی چغلی کھاتی ہے

پڑوسیوں کے جو حقوق ہیں ان میں سے ایک حق یہ بھی ہے کہ گھر میں جو کھانا یا کوئی چیز بنائی جائے تو اس کو پڑوسیوں تک پہنچاؤ، اس کی حدیثِ پاک میں تاکید آئی ہے، اور اس کی وجہ حضور اکرم ﷺ نے یہ بتائی ہے کہ اپنی ہنڈیا کی بھاپ سے پڑوسی کو تکلیف مت پہنچانا۔ یعنی جب کھانا پکنے کے قریب آتا ہے تو اس سے خوشبو پھیلتی ہے، اور وہ پکانے والے کے مکان تک محدود نہیں رہتی بلکہ ذرا آگے بڑھ کر پڑوسی کی ناک میں بھی جاتی ہے، اور چغلی کھاتی ہے کہ وہاں مچھلی، گوشت یا کباب پک رہا ہے، پڑوس میں جاکر یہ بات خوشبو نے بتائی، اور مَیں کہا کرتا ہوں کہ آج کل کوکر نے آکر تو سیٹی بھی بجانی شروع کردی۔ حضور ﷺ نے صرف بھاپ کا فرمایا تھا اور اب تو سیٹی اتنی زور سے بجتی ہے کہ پورے محلّہ میں سنائی دیتی ہے، اس لئے اب تو وہاں تک کا خیال کرنا چاہیے۔

بہرحال! جب آپ کے یہاں کچھ پکے گا، اور وہاں آواز اور خوشبو پہنچے گی اور خاص کر اگر وہ اس حیثیت کے نہیں ہیں کہ وہ بھی ایسی چیز بنائیں اور ان کے بھی بچے ہیں تو ان کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوگی، اس لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اپنی ہنڈیا کی بھاپ سے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ مطلب یہ ہے جو پکایا ہے اس میں سے کچھ ان کے یہاں بھی بھیج دیں گے تو اب ان کو تکلیف نہیں ہوگی۔ اور اگر کچھ نہیں بھیجا اور آپ نے ہی کھا کر صاف کر ڈالا تو ان کو تکلیف ہوگی۔ اسی لئے حضور ﷺ نے یہ بھی تاکید فرمائی

ہے کہ اگر کوئی چیز خرید کر لاؤ تو چھپا کر لاؤ، اگر کھلی ہوئی لاؤ گے تو پڑوسی کے بچے بھی دیکھ لیں گے، اب آپ کو چاہیے کہ ان کو بھی دیں، اس لئے کہ جب بچوں نے دیکھا تو ان کے دل میں بھی حرص وطمع پیدا ہوگی، اور وہ اس کی ضد کریں گے، اور جب یہ چیز ان کو نہیں ملے گی تو ان کو تو تکلیف ہوگی ہی، ساتھ میں ان کے ماں باپ کو بھی تکلیف ہوگی، اس لئے کہ وہ جب اپنے بچوں کے مطالبہ کو پورا نہیں کرسکیں گے تو ان کو یہ حسرت ہوگی کہ ہمارے پاس اتنی وسعت وطاقت نہیں ہے کہ ہم اپنے بچوں کی اس خواہش کو پورا کرسکیں اور یہ چیز ان کے لئے تکلیف کا باعث ہوگی اور اس تکلیف کا ذریعہ ہم بنیں گے، اس لئے شریعت نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ پڑوسی کو بھی دو۔

میاں صاحب کا عجیب طرزِ عمل

اور ہمارے اکابر تو اس کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ اللہ اکبر! ہم تو اس سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کرسکتے، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں، راندیر تشریف لائے ہوئے تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا تو یہیں مدفون ہوئے، راندیر ہی کے قبرستان میں آپ کی قبر ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ میں سے تھے اور آج کل ہمارے مدارس میں جو سنن ابوداود پڑھائی جاتی ہے، اکثر اس کی سند انہی کے واسطہ سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچتی ہے۔ ان کا پورا ہی خاندان بزرگی کے اندر دیوبند میں مشہور تھا، ان کے بھی بڑے عجیب وغریب حالات تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے بھی استاذ تھے اور ان کے ساتھ بڑی محبت اور بے تکلفی تھی اور کچھ تجارتی معاملہ بھی تھا۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے صاحبزادہ نے ان کے متعلق یہ واقعہ لکھا ہے کہ ایک

مرتبہ عصر کے بعد مَیں والد صاحب (مفتی محمد شفیع صاحبؒ) کے ساتھ ان کے یہاں ملاقات کے لئے گیا، جب ہم بیٹھے تو حضرت نے پوچھا کہ مفتی جی! آم چوسو گے؟ والد صاحب نے کہا کہ حضرت! آم اور وہ بھی آپ کے دستِ مبارک سے ملیں، تو پھر کیسے انکار کیا جاسکتا ہے۔ خیر! حضرت ایک ٹوکرے میں رکھ کر چوسنے والے آم لے آئے، اور دوسرا خالی ٹوکرا بھی ساتھ میں لائے تاکہ اس میں چھلکے اور گٹھلیاں ڈالی جائیں، جب ہم کھا کر فارغ ہوئے تو جس ٹوکرے کے اندر چھلکے اور گٹھلیاں تھیں وہ ٹوکرا والد صاحب نے باہر پھینکنے کے لئے اٹھایا، تو حضرت میاں صاحب فرمانے لگے کہ مفتی جی! چھلکے پھینکنے بھی آتے ہیں؟ والد صاحب نے کہا کہ حضرت! چھلکے پھینکنا بھی کون سا ایسا فن ہے جس کو سیکھنے کی ضرورت ہو؟ تو فرمایا کہ نہیں! یہ بھی سیکھنے کی چیز ہے، لاؤ! مَیں بتاؤں۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت نے گٹھلیاں الگ کردیں اور چھلکے الگ کردئے، اس کے بعد باہر گئے اور محلّہ کے دو تین کونوں پر تھوڑے تھوڑے چھلکے الگ الگ جگہ پر ڈالے، اور ایک جگہ پر گٹھلیاں ڈالیں۔ پھر گھر واپس آکر کہا کہ دیکھو! ہمارا یہ محلّہ غریبوں کا ہے، جب وہ لوگ ایک جگہ پر اتنی سب گٹھلیاں اور چھلکے پڑے ہوئے دیکھیں گے تو ان کو یہ خیال ہوگا کہ کسی نے اتنے سب آم کھائے ہیں اور ان کے پاس غریب ہونے کی وجہ سے اتنی مالی استطاعت نہیں ہے کہ خرید کر کھا سکیں، تو اتنی گٹھلیوں اور چھلکوں کو دیکھ کر ان کو اپنی حالتِ نایافت پر غم اور افسوس ہوگا کہ ہائے! ہمارے پاس پیسے نہ ہوئے کہ ہم بھی خریدتے، اور ان کی اس تکلیف کا ذریعہ مَیں بنوں گا۔ مفتی صاحب کے صاحبزادے لکھتے ہیں کہ حالانکہ حضرت میاں صاحب کے یہاں جتنے آم آتے تھے اس میں حضرت کا یہ معمول تھا کہ آدھے سے زیادہ تو پڑوسیوں کے بچوں کو بلا بلا کر کھلاتے رہتے تھے،

اور دوسرے مہمانوں کو کھلاتے تھے، خود تو ایک دو آم ہی کھانے کی نوبت آتی تھی، اس کے باوجود حضرت یہ فرما رہے ہیں۔

اور پھر یوں فرمایا کہ یہ چھلکے الگ الگ جگہوں پر اس لئے ڈالے کہ ہمارے محلّہ والوں کی بکریاں انہیں جگہوں پر جمع ہوتی ہیں تو وہ چھلکے ان کے کام آ جائیں گے، اور جہاں گٹھلیاں ڈالی ہیں وہاں محلّہ کے غریب بچے کھیلتے ہیں، وہ اس کو توڑ کر اندر سے جو گودا نکلتا ہے اس کو سینک کر کھالیا کرتے ہیں۔ تو دیکھئے! حضرتؒ نے اس کا اتنا زیادہ اہتمام کیا۔

ہمارے اکابر دوسروں کا کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے

دوسرا ایک واقعہ خود حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت کا مکان کچا تھا، اس کی چھت بھی کھپریل کی تھی، اور دیواریں مٹی کی تھیں اور آپ جانتے ہیں کہ بارش کا زمانہ آنے سے پہلے کھپریل کی چھت کو بھی ٹھیک ٹھاک کرنا پڑتا ہے اور مٹی کی دیواروں پر بھی کوئی آڑ رکھنی پڑتی ہے تاکہ بارش کا پانی سیدھا مٹی پر نہ لگے، ورنہ دیوار کو نقصان پہنچتا ہے۔ تو حضرت میاں صاحب کو ہر سال وہ سب ٹھیک ٹھاک کرنا پڑتا تھا، اور اس کی وجہ سے گھر کا سامان وغیرہ باہر نکالنا پڑتا تھا اور ہر سال بڑا خرچہ بھی ہوتا تھا۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نے کہا کہ حضرت! ہر سال آپ یہ زحمت اٹھاتے ہیں اور اتنا سب خرچہ بھی برداشت کرتے ہیں، اگر دس پندرہ سال کا خرچہ شمار کیا جائے تو آپ پکا مکان بنا سکتے ہیں۔ اس پر میاں صاحب نے فرمایا کہ ہاں بھائی! ہمارے بوڑھے دماغ میں تو یہ بات کبھی آئی ہی نہیں جو آپ کے دماغ کے اندر آئی۔ اور اس کے بعد یوں فرمایا کہ دیکھو! ہمارا پورا محلّہ غریبوں کا ہے اور سب کے مکانات کچے

ہیں، اگر مَیں اپنا مکان پکا بنالوں گا تو میرا پکا مکان دیکھ کر ان لوگوں کو یہ خیال ہوگا کہ ہائے! ہم تو اپنے مکان کو پکا نہیں بنا سکتے، اور اس کی وجہ سے ان کو تکلیف ہوگی۔ تو کیا یہ اچھا لگے گا کہ اپنا مکان پکا بنا کر بیٹھ جاؤں اور ان کے لئے تکلیف کا باعث بنوں۔ چنانچہ حضرت مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ جب سارے محلے والوں کے مکانات پکے بن گئے؛ اس کے بعد حضرت نے اپنا مکان پکا بنایا، وہاں تک تکلیف برداشت کرتے رہے، حالانکہ حضرت کی استطاعت تھی اور بنا سکتے تھے لیکن پڑوسیوں کا اتنا زیادہ اہتمام کیا، یہ بڑی اہم چیز ہے۔

خیر! یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ اگر آپ شوربے والا سالن پکاتے ہو تو پانی تھوڑا زیادہ ڈال دو، اور پڑوسی تک بھی پہنچانے کا اہتمام کرو۔

اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں

۳۰۵. عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: وَاللهِ لایُؤْمِنُ، وَاللهِ لایُؤْمِنُ وَاللهِ لایُؤْمِنُ. قِیلَ: مَنْ یَارَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: اَلَّذِیْ لایَأْمَنُ جارُهٗ بَوَائِقَهٗ. (متفق علیه)

وفی روایة لمسلم: لایَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لایَأْمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ. (اَلْبَوَائِقُ): اَلْغَوَائِلُ وَالشُّرُوْرُ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ مؤمن نہیں۔ پوچھا گیا کہ یارسول اللہ! کون؟ حضور ﷺ نے فرمایا: وہ آدمی جس کا پڑوسی اس کی ایذارسانیوں اور اس کے شر سے مامون اور محفوظ نہ ہو۔

دوسری روایت میں فرمایا کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کے پڑوسی اس کے شرور سے مطمئن نہ ہوں۔

افادات: — مطلب یہ ہے کہ جس کے پڑوسی کو اس کی طرف سے خطرہ ہے یعنی

وہ تو تکلیف نہیں پہنچاتا اور ابھی تک اس نے کچھ کیا بھی نہیں ہے، لیکن اس کا مزاج ایسا اکھڑ قسم کا ہے کہ پڑوسی کو ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ معلوم نہیں! یہ کب کیا کر ڈالے، جیسے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ کرتے تو نہیں ہیں لیکن ان کے حالات اور عادات کی وجہ سے ان کا پڑوسی ڈرا سہا ہوا رہتا ہے، اس کی طرف سے اطمینان نہیں ہوتا؛ ایسے آدمی کے متعلق حضور ﷺ نے تین مرتبہ قسم کھائی ﴿وَاللهِ لایُؤْمِنُ، وَاللهِ لایُؤْمِنُ، وَاللهِ لایُؤْمِنُ﴾ اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں۔

ایمان کے جانچنے کا اصل معیار

آج ہم اپنا جائزہ لیں اور اپنے متعلق سوچیں کہ ہم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ کیا معاملہ رکھتے ہیں، ان کو ہماری طرف سے تکلیف اور ایذا پہنچتی ہے، اس کے باوجود ہماری بزرگی پر، ہمارے نمازی ہونے پر، ہمارے حاجی ہونے پر، ہمارے مولوی اور مفتی ہونے پر اور ہمارے مبلغ اور داعی ہونے پر کوئی آنچ نہیں آتی، ہمارے ایمان کے لالے پڑ رہے ہیں لیکن ہماری بزرگی قائم ہے، ہم سمجھتے ہیں کہ ہم عالم ہیں، مبلغ ہیں، دیندار ہیں؛ اِن حالات کے باوجود ہماری دینداری برابر قائم رہتی ہے اور حضور ﷺ تو فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی مؤمن ہی نہیں۔ اس لئے ایمان کے جانچنے کا اصل معیار یہ ہے۔

ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ یارسول اللہ! مجھے کیسے معلوم ہو کہ مَیں اچھا ہوں یا برا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تیرے پڑوسی یہ کہتے ہیں کہ تو اچھا ہے تو سمجھ لے کہ تو اچھا ہے۔ اور اگر تیرے پڑوسی تجھے برا کہتے ہیں تو تُو برا ہے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر ۴۲۲۳)

حضور ﷺ نے اچھائی اور برائی کا معیار ہمیں بتلا دیا۔ بہر حال! یہ بہت اہم چیز ہے، اس

کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے، آج کل ہمارے معاشرہ میں اس کی طرف سے بڑی کوتاہی برتی جاتی ہے، بھائی! اگر پڑوسی کی طرف سے تکلیف کی کوئی بات پہنچے تو اس کو برداشت کرو اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کا معاملہ کرو۔

ایک نرالی تعلیم

۳۰۶. وعنه ﷺ قال قال رسول الله ﷺ: يَانِسَآءَ الْمُسْلِمَاتِ! لَاتَحْقِرَنَّ جَارَةٌ لِجَارَتِهَا وَلَوْ فِرْسِنَ شَاةٍ. (متفق علیه)

حضرت ابو ہریرہ ﷺ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے مسلمان عورتو! کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے کسی چیز کے بھیجنے کو حقیر نہ سمجھے چاہے وہ بکری کی کُھری ہی کیوں نہ ہو۔

افادات: - چونکہ لینے دینے کا معاملہ خاص کر پڑوسیوں کے ساتھ عورتیں ہی کیا کرتی ہیں، اور عورتوں کا مزاج یہ ہے کہ کوئی اچھی چیز ہو تب ہی بھیجی جائے؛ ورنہ نہیں۔

کبھی کوئی مہمان بغیر اطلاع کے آتا ہے، ہمارے یہاں تو ایسا واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے کہ اچانک کوئی مہمان آ گیا اور مَیں نے کہا کہ گھر کھانے چلو، اور گھر پر پہلے سے کہا نہیں تھا، اب گھر والے کہتے ہیں کہ آپ نے پہلے سے کہلوایا نہیں۔ مَیں کہتا ہوں کہ اس میں شرم کیا کرنی، جو کھانا ہم کھا رہے ہیں؛ وہی اس کو کھلائیں گے، اور اگر وہ آئندہ وقت تک رہیں گے تو ایک وقت ان کا اکرام بھی کرلیں گے، ابھی اس وقت یہی موجود ہے تو یہی کھلا دیں گے۔

تو عورتوں کا ایک مزاج ہے کہ اچھا پکے گا تو بھیجیں گی ورنہ یہ سوچ کر نہیں بھیجیں گی کہ ایسا کیا بھیجنا۔ اور زیادہ مقدار میں ہو تب ہی بھیجیں گی، تھوڑا سا ہو تو نہیں۔ حالانکہ یہ سوچ صحیح نہیں ہے۔ پڑوسی کے ساتھ آپ جو حسنِ سلوک کریں اس میں یہ نہ دیکھئے کہ مثلاً بریانی پکے گی تب ہی بھیجیں گے۔ نہیں بھائی! کڑی کھچڑی بھی بھیجو۔ اور زیادہ مقدار میں

ہوتب ہی بھیجیں گے ایسا مت سوچئے، بلکہ قلیل مقدار میں ہوتب بھی بھیجو۔اسی کو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بکری کی کُھری ہی کیوں نہ ہو۔

شرّاح لکھتے ہیں کہ یہ تاکید دونوں کو ہوسکتی ہے یعنی بھیجنے والی کو بھی اور جس کو بھیجا جا رہا ہے اس کو بھی۔بھیجنے والی کو یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ مت سوچو کہ یہ کیا بھیجنا، آپ کے پاس جو موجود ہے وہ آپ بھیج دو۔اور جس کو بھیجا جا رہا ہے اس کو بھی تاکید کی جارہی ہے کہ کیا بھیجا ہے؛ یہ مت دیکھو، بلکہ یہ دیکھو کہ کیوں بھیجا ہے۔اس لئے کہ عورتوں کا یہ بھی مزاج ہے کہ پڑوسی کے یہاں سے اگر کچھ آیا تو دیکھتی ہیں اور پھر تبصرہ اس طرح کرتی ہیں کہ اس کو اتنا ذرا سا بھیجتے ہوئے شرم بھی نہیں آئی۔حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ تمہارے پڑوسی نے جو چیز بھی بھیجی ہو، چاہے معمولی چیز اور بکری کی کُھری ہی کیوں نہ ہو، اس کو حقیر اور معمولی نہ سمجھو۔یہ نہیں دیکھنا ہے کہ کیا بھیجا، بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ کیوں بھیجا، اس کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔اس کے دل میں آپ کا اکرام اور محبت ہے، اس لئے بھیجا ہے، اگر ایسی بات نہ ہوتی تو نہ بھیجتی اس لئے عام طور پر چیز نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اس کے پیچھے جو جذبہ ہوتا ہے وہ دیکھا جاتا ہے۔

پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا تقاضہ

۳۰۷. وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَايَمْنَعْ جَارٌ جَارَهُ أَنْ يَّغْرِزَ خَشَبَةً فِيْ جِدَارِهٖ. ثُمَّ يَقُوْلُ أَبُوْهُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ: مَالِيْ أَرَاكُمْ عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ! وَاللّٰهِ لَأَرْمِيَنَّ بِهَا بَيْنَ أَكْتَافِكُمْ. (متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو لکڑی اپنی دیوار میں لگانے سے نہ روکے۔پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرمانے لگے: کیا بات ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے رخ پھیر رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تمہارے درمیان میں میں اس کو ڈال کر رہوں گا۔

افادات: -’’لکڑی اپنی دیوار میں لگانے سے نہ روکے‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنا مکان بنالیا، پڑوسی کا پلاٹ ابھی تک خالی ہے، اب وہ بنارہا ہے، اور آپ نے چونکہ پہلے سے مکان بنالیا ہے، اس لئے آپ کی دیوار کھڑی ہے، اب ایک شکل تو یہ ہے کہ پڑوسی اپنی چھت کی لکڑیاں رکھنے کے واسطے اپنی دیوار الگ سے بنائے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ آپ سے اجازت طلب کرے کہ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی دیوار میں اپنی لکڑیاں ڈال لوں تاکہ مجھے مستقل دیوار بنانی نہ پڑے۔ تو نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کا تقاضہ یہ ہے کہ اگر وہ آپ سے اجازت مانگ رہا ہے تو آپ اس کو منع مت کرو اگرچہ یہ حکم وجوبی نہیں ہے، بلکہ استحبابی ہے، لیکن آپ ﷺ کا انداز دیکھئے کہ فرمایا ﴿لَا يَمْنَعُ﴾ منع نہ کرے، گویا حکم دیا جارہا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے جس وقت یہ روایت مجمع کے سامنے بیان کی تو دیکھا کہ لوگوں نے سر جھکالیا، گویا سب مراقبہ میں چلے گئے، جس سے حضرت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ یہ سمجھے کہ نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد شاید ان لوگوں کو ناگوار گذرا ہے۔ جیسے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی طبیعت پر کوئی بات گراں گذرتی ہے اور اس پر لوگ کہتے ہیں کہ ہاں! یہ حدیث ضرور ہے اور ہم مانتے بھی ہیں لیکن مولوی صاحب نے اس وقت مجمع کے سامنے کیوں نقل کی۔ تو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ سب لوگوں نے سر جھکالیا، گویا حضور کے اس ارشاد کو جس شوق وولولہ اور جس طلب کے ساتھ لینا چاہیے، اور اس کی طرف جو توجہ ہونی چاہیے؛ وہ نہیں ہے تو ان کو طیش اور غصہ آگیا اور فرمانے لگے کہ کیا بات ہے کہ مَیں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ حضور ﷺ کے اس ارشاد سے رخ پھیر رہے ہو؟ اور جیسا دھیان دینا چاہیے وہ نہیں دے رہے ہو؟ اللہ کی قسم! تم چاہو یا نہ چاہو، تمہارے درمیان

میں مَیں اس کو ڈال کر رہوں گا یعنی مَیں تو بتاؤں گا چاہے تم کو پسند ہو یا نہ ہو۔

پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچانا ایمان کا تقاضہ ہے

۳۰۸. وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَايُؤْذِ جَارَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْلِيَسْكُتْ.

(متفق عليه)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔

افادات:۔ ’’اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے‘‘ یعنی کوئی ایسا انداز اور کوئی ایسی روش کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جس کی وجہ سے پڑوسی کو تکلیف ہو۔ مختلف طریقوں سے تکلیف پہنچائی جاسکتی ہے، ان میں سے کسی بھی طریقہ سے تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔

پہلے بھی یہ روایت آچکی ہے۔ حضور ﷺ نے پڑوسی کو تکلیف پہنچانے سے منع فرمایا ہے، اس مناسبت سے یہاں پیش کی ہے۔

جب رہبر ہی رہزن بن جائے

بلکہ برائی کا معاملہ اگر پڑوسی کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ دوسروں کے ساتھ کئے جانے والے معاملہ کے مقابلہ میں بہت زیادہ زیادہ خطرناک ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ تم زنا کو کیا سمجھتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اے اللہ کے رسول! حرام کام ہے اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک رسول ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اگر اپنے پڑوسی کی عورت کے ساتھ زنا کرے تو یہ دوسری دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے، یہی حال چوری کا بھی ہے (الادب المفرد، ۱۰۳) چونکہ ایک پڑوسی اپنے پڑوسی سے پڑوسی ہونے کے ناطہ سے یہ توقع اور امید رکھتا ہے کہ آڑے وقت وہ اِس کے کام آئے گا، اوراس کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ کوئی آدمی اس کی عزت وآبرو پر ہاتھ ڈال رہا ہوگا تو وہ اِس کی حفاظت کرے گا۔ تو پڑوسی ہونے کی حیثیت سے چاہیے تو یہ تھا کہ دوسروں کی طرف سے اگر کوئی ایسی شکل ہوتی تو وہ حفاظت کرتا، اوراس کیلئے پشت پناہی کا ذریعہ بنتا، اس کے بجائے خود وہی ایسا کررہا ہے، تو یہ کتنی خطرناک بات ہوگئی، اسی لئے بڑے گناہوں میں اس کو شمار کیا گیا ہے۔

پڑوسی کوراحت پہنچانے کی کوشش کرو

۳۰۹۔ عن أبی شُرَیحِ الْخُزَاعِیِّ رضی اللہ عنہ أنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُحْسِنْ اِلیٰ جَارِہٖ. وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہُ. وَمَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیَقُلْ خَیْراً أَوْلِیَسْکُتْ.

حضرت ابوشریح خزاعی فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جوآدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہووہ اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔

افادات: — یہ روایت اوپر جیسی ہی ہے بس جملہ کا ذرا سا فرق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں تو یہ تھا کہ تم میں سے جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ اور یہاں اسی بات کو دوسرے الفاظ سے تعبیر کیا کہ تم میں سے جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے

پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرے یعنی اتنا ہی نہیں کہ تکلیف نہ پہنچائے بلکہ اس سے ایک قدم آگے کی تعلیم دی گئی کہ اس کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آئے اور اس کو راحت پہنچانے کی کوشش کرے۔

کون سے پڑوسی کا حق زیادہ ہے؟

۳۱۰. وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا قَالَتْ قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ لِيْ جَارَيْنِ فَاِلٰى اَيِّهِمَا أُهْدِيْ؟ قَالَ: اِلٰى أَقْرَبِهِمَا مِنْكِ بَاباً.

(رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا اے اللہ کے رسول! میرے دو پڑوسی ہیں مَیں ان میں سے کس کے پاس ہدیہ بھیجوں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جس کے مکان کا دروازہ تمہارے دروازہ کے قریب ہو۔

افادات:- ''ان میں سے کس کے پاس ہدیہ بھیجوں؟'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز اتنی مقدار میں ہے کہ دونوں کے پاس بھیجی نہیں جاسکتی، کسی ایک ہی کے یہاں بھیجی جاسکتی ہے، تب ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ اگر اللہ تعالیٰ نے وسعت دی ہو تو پھر وہاں یہ نہیں دیکھا جائے گا، بلکہ وہاں تو سب کو ہی پہنچانے کی کوشش کی جائے گی، اور یہاں ایسا تھا کہ دونوں کو نہیں دی جاسکتی تھی، اس لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ دونوں میں سے کس کو دوں؟ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کے مکان کا دروازہ تمہارے دروازہ کے قریب ہو؛ اس کو دو۔ اور اس کی وجہ بھی علماء نے لکھی ہے کہ دروازہ کے قریب ہونے کی وجہ سے وہ آپ کے حالات سے دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ باخبر ہوگا، آپ کے یہاں کیا آتا ہے اور کیا جاتا ہے وہ سب اس کی نظروں سے گذرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اگر خدانخواستہ آپ کے یہاں کبھی کوئی چور، ڈاکو یا دشمن آگیا اور آپ کو مدد کی ضرورت پڑی تو دوسروں کے مقابلہ میں وہی سب سے پہلے پہنچے گا، اس لئے اس کا حق بھی زیادہ ہے۔

بہترین پڑوسی

۱۱۳۱. وَعَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: خَیْرُ الْاَصْحَابِ عِنْدَاللّٰہِ تَعَالٰی خَیْرُھُمْ لِصَاحِبِہٖ. وَخَیْرُ الْجِیْرَانِ عِنْدَاللّٰہِ تَعَالٰی خَیْرُھُمْ لِجَارِہٖ.

(رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بہترین ساتھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور بہترین پڑوسی اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو اپنے پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرنے والا ہو۔

افادات:- گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہماری خیر وخوبی اور بھلائی واچھائی اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھائی کے اوپر موقوف ہے۔

......تو پڑوسی کے لئے کیسے پسند کروں؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے یہاں چوہے بہت بڑھ گئے اور اس کی وجہ سے وہ پریشان تھے، ایک مرتبہ انہوں نے اپنی مجلس میں شکایت کی کہ چوہے بہت ہوگئے ہیں اور اس کی وجہ سے بہت پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت! ایک بلی پال لو، تو چوہوں کا علاج خود بخود ہو جائے گا۔ خیر! یہ بات ہوگئی، چند روز گذرنے کے بعد پھر انہوں نے وہی بات کہی۔ کسی نے کہا کہ حضرت! آپ کو تو مشورہ دیا گیا تھا کہ بلی پال لیجئے، چوہوں کا علاج ہو جائے گا، آپ بلی کیوں نہیں پال لیتے؟ انہوں نے کہا کہ بھائی! بلی پالنے کی ہمت اس لئے نہیں ہوتی کہ اگر مَیں بلی لے آیا تو اس کو دیکھ کر چوہے پڑوسی کے گھر میں بھاگ جائیں گے، اور جب مَیں ان چوہوں کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا؛ تو پڑوسی کے لئے کیسے پسند کروں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہی مزاج ہمارا بن جائے تو کسی کا کسی کے ساتھ کوئی جھگڑا

ہی نہیں رہے گا اور ہماری معاشرت اور سماج جنت کا نمونہ بن جائے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے

دعاء

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَتَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلَااِلٰہَ غَیْرُکَ.

لَااِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ الْاَحَدُالصَّمَدُالَّذِیْ لَمْ یَلِدْوَلَمْ یُوْلَدْوَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًااَحَد.

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍوَّعَلیٰ اٰلِ سَیِّدِنَاوَمَوْلٰنَامُحَمَّدٍ کَمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی بِعَدَدِمَاتُحِبُ وَتَرْضٰی.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ اے اللہ! پڑوسیوں کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے جو ہدایتیں عطا فرمائی ہیں، ان پر سو فیصد عمل کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! پڑوسیوں کے حقوق کی ادائیگی میں ہم سے اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کو معاف فرما کر آئندہ ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا، اپنی مرضیات پر ہمیں زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اس مجلس میں جتنے بھی بیمار ہیں اور جن کے متعلقین بیمار ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ اے اللہ! جنہوں نے اپنے جن جن مقاصد کے لئے اور جن مصیبتوں کے دور ہونے کے لئے اور جن بیماریوں سے شفا کے لئے ہم سے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں

یا جن کے ہم پر حقوق ہیں؛ اے اللہ! ان تمام کی جائز مرادوں کو پورا فرما، پریشانیوں کو دور فرما، حاجتوں کو پورا فرما۔ اے اللہ! ان کی بیماریوں کو صحت وشفا سے بدل دے۔ نبی کریم ﷺ نے جتنی خیر وبھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو عطا فرما اور حضور ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی ان سے ہماری حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَتُبْ عَلَیْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ.

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ أَجْمَعِیْنَ.

بِرَحْمَتِکَ یَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ.

بِرُّ الْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُ الْأَرْحَامِ

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک
اور
رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

﴿مجلس ۱﴾

۲۲/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۰/اپریل ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰه فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَه وَنَشْهَدُاَن لَّااِلٰه اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰه تَعَالىٰ عَلَيْهِ وَعَلىٰ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً. أمابعد: فأعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ وَاعْبُدُوااللّٰه وَلَاتُشْرِكُوْابِهٖ شَيْئاً وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَاناً (النسآء ٣٦)

رشتہ داریاں دو طرح کی ہوتی ہیں

باب کا عنوان قائم کیا ہے "بِرُّالْوَالِدَيْنِ وَصِلَةُالْأَرْحَامِ" ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اور صلہ رحمی یعنی رشتہ داروں کے ساتھ رشتہ داری کو نبھانا اور ان کے حقوق کو ادا کرنا، یہاں ان دونوں باتوں کو بتلانا ہے۔

"رَحِم" عربی زبان میں بچہ دانی کو کہتے ہیں، عورت کے پیٹ میں جہاں بچہ رہتا ہے، اسے عربی میں رحم کہتے ہیں۔ جو رشتہ داریاں بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتے ہی ساتھ میں لے کر دنیا میں آتا ہے، ان ساری رشتہ داریوں کے لیے لفظ رحم بولا جاتا ہے، مثلاً جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہوتے ہی وہ کسی (ماں باپ) کا بیٹا ہوتا ہے، بھائی بہن دادا دادی، نانا نانی، چچا ماموں، خالہ پھوپھی؛ یہ ساری رشتہ داریاں وہ ہیں جو بچہ دنیا میں لے کر ہی آتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہوتی کہ یہاں آنے کے بعد کوئی رابطہ قائم ہوا ہو اور کانٹیکٹ ہوا ہو، جس کے نتیجہ میں رشتہ بنا ہو، اس لیے کہ کچھ رشتہ داریاں دنیا میں آنے کے بعد قائم ہوتی ہیں، مثلاً کسی عورت کے ساتھ نکاح ہوا تو وہ اس کی بیوی

بنی اور یہ اس کا شوہر بنا، اُس کے ماں باپ اِس کے ساس سسر بنے اور اِس کے ماں باپ اُس کے حق میں ساس سسر ہوئے، اوراس کے نتیجہ میں دوسرے بھی بہت سارے رشتے پیدا ہوئے۔ یہ رشتے بعد میں ایک تعلق قائم کرنے کے نتیجہ میں وجود میں آئے ہیں، اس کو سسرالی رشتہ کہا جاتا ہے، قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿وَهُوَالَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَراً فَجَعَلَهٗ نَسَباًوَّصِهْراً﴾ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے پانی سے یعنی ماں باپ کے نطفہ سے انسان کو پیدا کیا پھر اس کو نسبی رشتوں والا اور سسرالی رشتوں والا بنایا۔ یہی دو طرح کی رشتہ داریاں ہوتی ہیں، ایک تو پیدا ہوتے ہی لے کر آتا ہے جیسا کہ اوپر بتلایا وہ تمام نسبی رشتہ داریاں کہلاتی ہیں، اور بعد میں جا کر نکاح کے ذریعہ جو رشتے قائم ہوتے ہیں وہ سسرالی رشتہ داریاں کہلاتی ہیں۔

صلہ رحمی کسے کہتے ہیں؟

تو عربی زبان میں لفظ رحم ان رشتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو پیدا ہوتے ہی بچہ نسبی طور پر اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے، اوران رشتہ داریوں، ان قرابتوں اوران سگائیوں کا خیال رکھنا اوران میں سے ہر ایک کے حقوق ان کے درجے کے مطابق ادا کرنا؛ اسی کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''صلہ رحمی'' ہے۔ جیسا جیسا جس کا درجہ اسی کے مطابق اس کا حق ہوا کرتا ہے۔ ماں باپ کا حق جتنا ہے، بھائی بہنوں کا اتنا حق نہیں ہوسکتا یہ بات ہر آدمی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن یہ سب رشتے وہی ہیں جو پیدا ہوتے ہی بچہ لے کر آیا ہے۔ یہ جتنی بھی نسبی رشتہ داریاں ہیں ان کو رحم کہا جاتا ہے اوران رشتہ داریوں کا خیال رکھنا، ان کے حقوق ادا کرنا، ان کو نبھانا، ان کو باقی رکھنا، ان کو اور زیادہ مضبوط بنانا، اوران رشتہ داریوں کی وجہ سے جو تعلقات قائم ہوئے ہیں ان کا لحاظ

کرنا؛ ان ساری چیزوں کو ’’صلہ رحمی‘‘ کہتے ہیں۔

صلہ رحمی کی مختلف شکلیں

اب صلہ رحمی مختلف طریقوں سے ہوتی ہے، مثلاً ماں باپ محتاج ہیں تو ان کا خرچ برداشت کرنا، ان کی خدمت کرنا وغیرہ۔ یعنی صلہ رحمی کے بھی درجات ہیں، صلہ رحمی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ پیسے ہی دیں، کھانا ہی کھلائیں، شریعت نے خود اس کے درجات متعین کئے ہیں، کس کس کا نفقہ اور خرچہ کس پر واجب ہے اور کب واجب ہے، یہ سارے مستقل مسائل ہیں، اس میں آپ کو خود سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، آپ کے لیے تو آسان راستہ ہے کہ آپ کسی بھی مفتی سے یا کسی بھی دارالافتاء سے رابطہ قائم کر کے پوچھ سکتے ہیں کہ میرا فلاں رشتہ دار ہے، اس کا یہ معاملہ ہے، تو اب مجھ پر اس کا کتنا حق ہے؟ ان شاء اللہ اس کی ساری تفصیل آپ کو وہاں سے معلوم ہو جائے گی۔ بعض رشتہ دار ایسے ہوتے ہیں جو آپ کی مدد کے محتاج نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی دولت سے نواز رکھا ہے، ان کے پاس بھی اپنی ضرورت کے بقدر چیزیں موجود ہیں، اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ان کو کھانا کھلائیں، لیکن ان سے ملاقات کریں، ان کی خیریت پوچھیں، ان سے سلام کلام کریں؛ یہ بھی صلہ رحمی کا ایک درجہ ہے۔

باب کے عنوان کا خلاصہ

بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں دو باتیں بتانا چاہتے ہیں ایک تو ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور دوسرا صلہ رحمی۔ مَیں جب بھی لفظ ’’صلہ رحمی‘‘ بولوں گا اس کا مطلب وہی ہوگا جو ابھی مَیں نے تفصیل سے بتلایا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی نسبی طور پر جو رشتہ داریاں

اپنی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے، ان کا لحاظ کرنا اسی کا دوسرا نام ''صلہ رحمی'' ہے۔ اوران کا لحاظ نہ کرنا، ان کے حقوق کو ادا نہ کرنا؛ اسی کا دوسرا نام ''قطع رحمی'' ہے۔ اگر آپ ان دونوں کا ترجمہ کریں گے تو صلہ رحمی یعنی رشتہ داری کو ملانا اور جوڑنا۔ اور قطع رحمی یعنی رشتہ داری کو توڑنا۔ تو آدمی ان کے حقوق کو جب ادا نہیں کرے گا، تو رشتہ داری کہاں قائم رہے گی، اسی کو قطع رحمی سے تعبیر کیا گیا۔ تو صلہ رحمی کا مطلب ہے رشتہ داری کے حقوق ادا کرنا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا۔ اور قطع رحمی کا مطلب ہے ان تقاضوں کو پورا نہ کرنا۔

اب ان رشتہ داریوں میں پہلی اور بنیادی رشتہ داری ماں باپ کی ہے، اس لیے انہوں نے ''بِـرُّ الْوَالِدَیْنِ'' کا لفظ الگ استعمال کیا، اس لیے کہ ماں باپ ہی ہیں جن کے ذریعہ سب کے ساتھ تعلق قائم ہوا ہے۔ ماں اور باپ رشتہ داری کے اندر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، باقی سب رشتوں کے لیے یہی دونوں واسطہ بنتے ہیں۔ دادا یعنی باپ کا باپ، دادی یعنی باپ کی ماں۔ نانا یعنی ماں کا باپ، نانی یعنی ماں کی ماں۔ بھائی یعنی باپ کا بیٹا۔ بہن یعنی باپ کی بیٹی۔ بھتیجا یعنی باپ کے بیٹے کا بیٹا۔ بھتیجی یعنی باپ کے بیٹے کی بیٹی۔ بھانجا یعنی باپ کی بیٹی کا بیٹا۔ بھانجی یعنی باپ کے بیٹی کی بیٹی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی رشتہ میں بیچ میں ماں یا باپ کا واسطہ ضرور آئے گا۔ یہ سب تو براہِ راست رشتہ داریاں ہوئیں۔ پھر ان سے جو پیدا ہوئے وہ دوسرا سلسلہ ہو جائے گا، ان میں واسطہ اس کے نیچے والے بنیں گے۔ تو رشتہ داریوں میں بنیادی حیثیت ماں اور باپ کی ہے اس لیے انہوں نے والدین کو الگ سے ذکر کیا کہ ماں باپ اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کو ادا کرنا۔

اب علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں اپنی عادت کے مطابق کچھ آیتیں

اوراحادیث پیش کرتے ہیں۔پہلی آیت تو وہی ہے جو پچھلے باب میں پڑوسیوں کے حقوق کے سلسلہ میں آچکی ہے ﴿وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا﴾ چوں کہ اس آیت میں والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور رشتہ داروں کا خیال رکھنے کی تاکید ہے، اس لیے پہلے اسی آیت کو پیش کیا ہے، اس کی تفصیلی وضاحت مَیں گذشتہ مجلس میں کر چکا ہوں۔

خصوصی تاکید کا ایک نرالا انداز

دوسری آیت پیش کی ہے ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ﴾ یہ اس آیت کا ایک ٹکڑا ہے جو خطبۂ نکاح میں پڑھی جاتی ہے، جس میں صلہ رحمی کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ڈرو تم اس اللہ تعالیٰ سے جس کے واسطہ سے تم آپس میں ایک دوسرے سے اپنی ضرورتوں کو مانگتے ہو۔شروع آیت میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو پیدا کرنے والے اور پالنے والے ہیں اوراس کے بعد بھی تم زندگی کے مختلف مرحلوں پر اپنے کام نکالنے کے واسطے اس کا نام استعمال کرتے ہو جیسے ہم کسی سے کہتے ہیں کہ بھائی! اللہ کے واسطے میرا یہ کام کر دینا۔ یہاں اللہ کا نام استعمال کیا گیا ہے اسی طرح موقع بموقع انسانوں سے اپنے کام نکالنے کے لیے اللہ ہی کا نام بیچ میں لاتے ہو اوراسی کا واسطہ دے کر سامنے والے کو دبانے کی کوشش کرتے ہو اوراس سے اپنا حق وصول کرنے کی کوشش کرتے ہو۔تو جس کا نام لے کر تم دوسروں سے اپنا حق مانگ رہے ہو؛ اب تم خود ہی اگراس سے نہ ڈرو اور دوسروں کا حق ادا نہ کرو تو یہ کیسی بات ہوئی؟ اسلیے یہاں خاص طور پر تاکید کی گئی ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ﴾ تم اس اللہ سے ڈرو اوراس کے احکام کو پورا کرو جس کے واسطہ سے تم آپس میں ایک

دوسرے سے سوال کرتے ہو۔

جیسے کوئی آدمی اپنا کام تمہارا نام لے کر کسی دوسرے سے نکلوائے اور آپ کو پتہ چلے مثلاً آپ کے کسی دوست نے بتایا کہ فلاں صاحب آپ کا نام لے کر میرے پاس آئے تھے، تو آپ کی وجہ سے مَیں نے اس کا کام کر دیا۔ اب آپ اس آدمی سے جس نے آپ کا نام لے کر اپنا کام کروایا تھا کوئی بات کہیں اور وہ نہ مانے؛ تو آپ کیا کہیں گے؟ واہ بھائی واہ! میرا نام کیش کر کے تو تو نے اپنا کام کروالیا اور اب مَیں جو کہتا ہوں وہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ صاف طور پر تاکید فرماتے ہیں کہ اے لوگو! اس اللہ سے ڈرو، اس کے احکام پر عمل کرو؛ جس کا نام لے کر اور جس کا واسطہ دے کر تم آپس میں ایک دوسرے سے مطالبہ کرتے ہو اور اپنی ضرورتیں پوری کرواتے ہو۔ جب اپنے کام کا وقت تھا تو اس کے نام کا واسطہ دے کر کام نکلوایا؛ اور اب جب اس کے احکام کو پورا کرنے کا وقت آیا تو پیچھے ہٹتے ہو؛ یہ کوئی بات ہوئی؟ یہ بھی خصوصی تاکید کا ایک انداز ہے۔

پھر آگے فرمایا﴿وَالْأَرْحَامَ﴾ اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرنے سے ڈرو، تمہارے ہاتھوں رشتہ داریوں کے حقوق برباد نہیں ہونے چاہئیں۔

ڈبل پیمانے کیسے؟

بعض حضرات نے اس آیت کا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم آپس میں سوال کرتے ہو اور رشتہ داریوں سے بھی ڈرو جن کا واسطہ دیتے ہو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رشتوں کا واسطہ دیا جاتا ہے جیسے کہتے ہیں ارے! آپ تو میرے چچا ہیں، آپ تو فلاں عزیز کے دوست ہیں، اس کا خیال کیوں نہیں

کرتے؟ تو جس طرح اللہ کے نام کو بیچ میں لاتے ہیں، اسی طرح کبھی کبھی رشتہ داری کو بھی بیچ میں لاتے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اپنا کام نکالنے کے لیے تو رشتہ داری کا واسطہ دیا اور جب خود اس کا حق ادا کرنے کا وقت آیا تو یہ پیچھے ہٹ کیسی؟ اسی رشتہ داری کا ناتہ اور دُہائی دے کر دوسروں سے تو اپنا حق نکال لیا، اور اب اسی رشتہ داری کو بھول گئے کہ ان کے حقوق ادا نہیں کرتے، اس کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے؛ یہ کیسی بات ہوئی؟ یہ ڈبل پیمانے کیسے ہیں؟۔

تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کو رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرنے کی خاص تاکید کرنے کے لیے پیش فرما رہے ہیں کہ رشتہ داریوں اور سگائیوں کے حقوق کو برباد کرنے سے اور ضائع کرنے سے بچو اور ڈرو، تمہارے ہاتھوں رشتہ داری کا حق کا ضائع نہیں ہونا چاہیے، اس کے تقاضوں کو پورا کرو۔

عقل مندوں کے کچھ اوصاف

ایک اور آیت پیش کی ہے ﴿وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَاأَمَرَاللّٰهُ بِهٖ أَن يُّوْصَلَ﴾ "أولوا الألباب" یعنی سمجھ دار اور عقل مند کون ہیں؟ ہم نے دنیوی لائن سے عقل مندوں کے کچھ اوصاف متعین کر دئے ہیں اور انہی باتوں کو معیار بنا کر ہم کہتے ہیں کہ فلاں بڑا عقل مند ہے۔ اور قرآنِ کریم نے بھی عقلمند کا لفظ استعمال کر کے اس کے کچھ اوصاف مقرر کیے ہیں اور یہاں ان کو ذکر کیا ہے۔

ان میں سے ایک وصف یہ ہے کہ عقل مند وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو پورا کرتے ہیں اور وعدے کو توڑتے نہیں۔ آج کل تو جو آدمی بار بار وعدے کر کے لوگوں کو جتنا زیادہ چکر میں ڈالے؛ اس کو لوگ عقلمند اور بڑا ہوشیار کہتے

ہیں لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو عہد و پیمان کو پورا کرے، وہ عقل مند ہے۔

عقل مندوں کا دوسرا وصف یہ ہے کہ وہ لوگ جوڑتے ہیں اس چیز کو جس کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔اور کس چیز کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے؟ رشتہ داریوں کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔تو یہ لوگ بھی ان کے حقوق کو ادا کرکے اور ان کے تقاضوں کو پورا کرکے رشتہ داریوں کو قائم رکھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ رشتہ داریوں کے تقاضوں کو پورا کرنا اور ان کے حقوق کو ادا کرنا؛ قرآن کی اصطلاح میں آدمی کے عقل مند ہونے کی علامت ہے۔

ماں باپ کے ساتھ اچھے سلوک کا تاکیدی حکم

آگے ایک اور آیت سورۂ عنکبوت کی پیش فرمائی ہے: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا﴾ ہم نے انسان کو تاکیدی حکم دیا ہے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔پچھلی مجلس میں بھی بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کی بڑی تاکید فرمائی ہے اور بہت ساری آیتوں میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم دیا، اس کے ساتھ فوراً ہی ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم بھی جوڑ دیا ہے۔ اور اس کی وجہ بھی بتلائی تھی کہ انسان کے وجود میں آنے کا حقیقی ذریعہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے لیکن مجازی طور پر اگر دیکھا جائے تو ظاہری سبب تو ماں باپ ہی بنتے ہیں، اس لیے ان کے حق کو ادا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

ایمان افروز واقعہ

اور اس آیت کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے کہ ایک صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔جب وہ اسلام لائے، اس وقت تک ان کی

والدہ مسلمان نہیں ہوئی تھی، اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کے بڑے فرمانبردار اور اطاعت شعار تھے۔ ان کی والدہ کو جب معلوم ہوا کہ میرا بیٹا مسلمان ہو گیا ہے تو کہنے لگی کہ میں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گی جب تک تو اسلام کو چھوڑ نہ دے اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور بھوک ہڑتال کر دی۔ اب یہ سمجھا بھی رہے ہیں کہ کھانا کھالو لیکن وہ کہہ رہی ہے کہ تو نے نیا مذہب کیوں قبول کیا؟ جب تک تو اس کو نہیں چھوڑے گا وہاں تک میں نہیں کھاؤں گی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ماں مانتی نہیں ہے تو کہا کہ دیکھو اماں! تمہاری ہر بات پر میں جان دینے کے لیے تیار ہوں، لیکن اگر تم اپنی جان اس لیے قربان کر رہی ہو کہ میں ایمان کو چھوڑ دوں؛ تو یہ کبھی ہونے والا نہیں ہے، اگر تمہیں کھانا ہے تو کھاؤ؛ ورنہ جیسا تمہیں کرنا ہو کرو۔ جب انہوں نے یہ بات کہی تو اسی پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہم نے انسان کو تاکید کی کہ اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حکم دیا کہ اگر وہ شرک کا حکم دیں تو پھر ان کی اطاعت نہ کی جائے۔ (تفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۰۵۔۴/ ۱۵۷، بحوالہ مسند ابوداود طیالسی و مسلم۔ اصحاب سنن سوائے ابن ماجہ)

دیکھئے! اسلام نے تو کسی کی بھی اطاعت وفرمانبرداری اس شرط کے ساتھ مشروط کر دی ہے، اور ہر جگہ یہ قید لگا دی ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو، وہاں ہی ان کی بات مانی جائے گی۔

مسلمان ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا حکم دیکھتا ہے

میں پہلے بھی کسی موقعہ پر بتلا چکا ہوں کہ مسلمان جو کچھ بھی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہی کرتا ہے، مسلمان ماں باپ کی خدمت اس لیے کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی خدمت کرنے کا حکم دیا ہے۔ مسلمان بیوی بچوں کا خیال اس لیے رکھے گا کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کا خیال رکھنے کا اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، مسلمان بھائی بہنوں کے، دادا دادی، نانا نانی، رشتہ دار، پڑوسی، دوست احباب وغیرہ جن کے بھی حقوق ادا کرتا ہے وہ اس لیے کہ ان سب کے حقوق اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں۔ گویا اس نے تو اسلام قبول کر کے اور ایمان لا کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ ہی کے حوالہ کر دیا ہے، اور اسی کے ساتھ تعلق قائم کر لیا ہے، اب وہاں سے جو حکم ہوتا ہے اسی کے مطابق وہ کام کرتا ہے، اس کا اصل تعلق تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے، اس لیے ہر کام میں وہ پہلے یہی دیکھے گا کہ وہاں سے کیا حکم ہے؟ وہاں سے جو حکم ہوگا اسی کے مطابق وہ معاملہ کرے گا۔

ایک بہترین مثال

اس بات کو سمجھنے کے لیے مَیں ایک مثال دیتا ہوں۔ جیسے آپ کے گھر میں ٹیلیفون لگا ہوا ہے تو اس کا اصل تعلق تو ایکسچینج سے ہے، اس سے دنیا میں جہاں جہاں بھی آپ ٹیلیفون کریں گے تو پہلے اس کا رابطہ ایکسچینج سے ہوگا، بلکہ آپ کے جس پڑوسی کی دیوار بالکل آپ کی دیوار سے لگی ہوئی ہے، اس کے نمبر پر بھی آپ اپنے گھر کے نمبر سے فون لگائیں گے، تو اگرچہ اس کے گھر کا راستہ آپ کے گھر سے چند منٹ کے فاصلہ پر ہے، اور ایکسچینج کا راستہ آدھا گھنٹہ کے فاصلہ پر ہے، لیکن آپ کے نمبر سے فون سیدھے اس کے نمبر پر نہیں جائے گا بلکہ آپ کا فون پہلے ایکسچینج میں جائے گا اور وہاں سے اس کے نمبر پر جائے گا۔

اسی طرح ہمارا پہلا رابطہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، پھر ماں باپ، بیوی بچے، بھائی بہن، استاذ شیخ وغیرہ کے ساتھ ہے، اور ان کے جو بھی حقوق بتلائے ہیں اور

جن کے ساتھ بھلائی اور احسان کا معاملہ کرنے کو کہا ہے، یا جن کی بات ماننے کے لیے ہمیں پابند بنایا گیا ہے؛ ان تمام احکام کو پورا کرنے کے لیے رابطہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی بن رہی ہے۔ ہمیں یہی خیال آتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوجائے، ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے کٹنا نہیں چاہیے۔ جیسے ٹیلیفون ایکسچینج سے اگر ہمارا رابطہ کٹ گیا تو پھر پڑوس والے گھر سے بھی رابطہ نہیں ہوسکے گا۔ اس لیے کہ اس کے ساتھ تعلق ایکسچینج کے واسطہ سے ہے۔ تو اصل تو یہ ہے کہ ماں باپ وغیرہ کوئی بھی ہو؛ ان کی بات ماننے کے لیے مدار اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہورہی ہو

حدیثِ پاک میں ہے "لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ" (الدرالمنثور ۲/۱۷۷، بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ) جہاں خالق کی نافرمانی ہورہی ہو وہاں کسی بھی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ جس مخلوق کی فرمانبرداری کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے اسی کی ہم فرمانبرداری کررہے ہیں، اب وہی مخلوق اگر خالق کی نافرمانی کروانا چاہتی ہے؛ تو بھلا اس کی بات کیسے مانی جاسکتی ہے؟ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ جیسے کسی نے آپ سے کہا کہ فلاں کی بات مان کر چلنا اور پھر وہی آپ سے یوں کہے کہ اس کے ساتھ تعلق مت رکھیو، تو آپ کیا کہیں گے کہ ارے بھائی! تیری بات تو میں اس لیے مانتا ہوں کہ اُسی نے کہا ہے، اور اب تو مجھے اُسی سے تعلق رکھنے سے منع کررہا ہے؟ یہ کیسی بات ہوئی۔ بات سمجھانے کے لیے میں نے ایک مثال دی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمان اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے سب کچھ کرتا ہے، اسی لیے حضور ﷺ نے ایک اصول بتلا دیا کہ کسی بھی مخلوق کی - چاہے وہ ماں ہو یا باپ ہو یا اور کوئی بڑے سے بڑا ہو - بات ایسی چیز میں نہیں مانی

جائے گی جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو۔

ارے دوسرے تو دوسرے ہیں، خود حضور ﷺ سے اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ آپ کی بات بھی وہاں نہیں مانی جائے گی جہاں شریعت کی خلاف ورزی ہو رہی ہو، حالانکہ حضور ﷺ سے بھلا ایسا ہونا کیا ممکن تھا؟ ہرگز نہیں۔ قرآنِ کریم میں سورۂ ممتحنہ میں مؤمن عورتوں کی بیعت کا تذکرہ ہے ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْــٴًـا وَّ لَا یَسْرِقْنَ وَ لَا یَزْنِیْنَ وَ لَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَ لَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ اَیْدِیْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ اے نبی! مؤمن عورتیں جب آپ کے پاس ان کاموں پر بیعت ہونے کے واسطے آویں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گی اور چوری نہیں کریں گی اور زنا نہیں کریں گی اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی اور بہتان تراشی نہیں کریں گی اور نیکی کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ یہاں ﴿فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ کی قید لگائی ہے یعنی حضور ﷺ کی بات ماننے کا مسئلہ ہے حالانکہ ہر آدمی مانتا ہے کہ اللہ کا رسول کبھی کسی ایسی بات کا تو حکم دے ہی نہیں سکتا جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو، پھر بھی یہاں ﴿فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ کی قید لگائی۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ دراصل لوگوں کو متنبہ کرنا مقصود ہے کہ کسی کی بھی اطاعت اگر کی جائے گی تو نیکی کے کاموں میں اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں ہی کی جائے گی (تفسیر مظہری ۹/۲۶۷) جب نبیِ کریم ﷺ کو کہا جارہا ہے ﴿وَ لَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ﴾ تو پھر ہما شما کا کیا حال ہوگا۔ قرآنِ کریم کی اس آیت نے تو بہت واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "لا طَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةٍ، اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِیْ مَعْرُوْفٍ" کسی کی بھی بات

اسی وقت مانی جائے گی جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہ آتی ہو۔ ماں باپ اگر کسی ایسی چیز کا حکم دیں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو ان کے اس حکم پر عمل کرنا واجب تو کہاں ہوتا؛ جائز ہی نہیں ہے۔

والدین کے بوڑھاپے کا پورا لحاظ رکھو

ایک اور آیت پیش کی ہے ﴿وَقَضٰی رَبُّكَ أَن لَّا تَعۡبُدُوۡا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالۡوَالِدَيۡنِ إِحۡسَاناً﴾ اور تیرے رب نے اس بات کا حکم دیا کہ صرف اُسی کی عبادت کی جائے اور والدین کے ساتھ اچھائی کا سلوک کرنے کا حکم دیا ﴿إِمَّا يَبۡلُغَنَّ عِنۡدَكَ الۡكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوۡ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنۡهَرۡهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوۡلًا كَرِيۡماً﴾ اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو ''ہوں'' بھی مت کہو۔ جب عمر زیادہ ہوجاتی ہے تو آدمی کی عقل پر ذرا اثر پڑ جاتا ہے، عقل میں فتور آجاتا ہے اور وہ باتیں بھول جایا کرتا ہے۔ مثلاً ابا جان سو سال کے بوڑھے ہوگئے تو بعض دفعہ ایسی باتیں کرتے ہیں جس کا نقشہ خود قرآنِ کریم نے کھینچا ہے ﴿لِكَيۡلَا يَعۡلَمَ بَعۡدَ عِلۡمٍ شَيۡئاً﴾ اخیری عمر میں آدمی کو بہت ساری چیزیں یاد نہیں رہتیں۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کھانا کھایا اور تھوڑی دیر بعد کوئی ملنے والا آیا تو کہنے لگے کہ آج تو گھر والوں نے کھانا نہیں کھلایا۔ اب گھر والے کہتے ہیں کہ ہم نے ان کو کھلایا اور یہ دوسروں کے سامنے ہماری شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ان کو نہیں کھلایا۔

خیر! باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کو ''ہوں'' تک مت کہو، یعنی آپ کی طرف سے ''ہوں'' کا لفظ بھی ان کے لیے شدید تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور ان کو جھڑکو مت اور ان سے اچھی اور نرم بات کرو، چاہے وہ کچھ بھی کریں لیکن آپ کی طرف سے جواب

میں کوئی ایسی نامناسب بات ہونی نہیں چاہیے، آپ تو ان کی عمر کے تقاضہ کا پورالحاظ رکھیے۔

ایک سوال، دو ردِّ عمل

کسی کتاب میں ایک قصہ پڑھا تھا وہ سنا دوں: کہ ایک مرتبہ ایک بڑے میاں اپنے گھر کے صحن میں بیٹھے ہوئے تھے، صاحبزادے بھی پاس میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک کوّا بول رہا تھا تو بیٹے سے پوچھا کہ بیٹا! جو پرندہ بول رہا ہے یہ کیا ہے؟ بیٹے نے کہا کہ ابا جان! یہ کوا ہے، تھوڑی دیر بعد پھر پوچھا کہ بیٹا! جو بول رہا ہے، یہ کیا ہے؟ تو کہا کہ ابا! یہ کوا بول رہا ہے، تیسری مرتبہ پوچھا تو بیٹے کے آواز میں تیزی آئی کہ ابا جان! کوّا بول رہا ہے۔ پھر چوتھی مرتبہ پوچھا تو بیٹے نے ذرا چلاّ کر کہا کہ کہہ تو دیا کہ کوا بول رہا ہے۔ پھر پانچویں مرتبہ پوچھا تو بیٹا غصہ سے کہنے لگا کہ کتنی مرتبہ جواب دیا کہ کوا ہے، کوا ہے، کوا ہے اور کتنی بار پوچھیں گے۔

خیر! اب ابا جان گھر میں گئے اور اپنی ایک ڈائری لے کر آئے، اور کسی تاریخ کا صفحہ نکالا اور کہا کہ بیٹا! پڑھو، اِس میں کیا لکھا ہے؟ تو اس میں لکھا تھا کہ آج مَیں صحن کے اندر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ساتھ تین چار سال کی عمر کا میرا بچہ بھی بیٹھا ہوا تھا اور قریب ہی ایک درخت پر ایک کوّا بیٹھا ہوا بول رہا تھا تو اس بچے نے پوچھا کہ ابا جان! یہ کیا ہے؟ مَیں نے کہا کہ بیٹا! یہ کوّا ہے۔ پھر دوسری مرتبہ اس نے پوچھا تو میں نے کہا کہ بیٹا! یہ کوّا ہے۔ یہاں تک کہ پچیس مرتبہ اس نے پوچھا اور پچیس مرتبہ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ یہ کوا ہے۔ اور آگے یہ جملہ لکھا ہوا تھا کہ ''اس کے بار بار کے اس سوال پر مجھے بڑا پیار آیا''۔ پھر کہا کہ بیٹا! ایسا ہی سوال تو نے بھی کیا تھا اور پانچ مرتبہ نہیں بلکہ پچیس مرتبہ کیا تھا اور مجھے تو تیرے اس سوال پر پیار آیا تھا، اور تجھے میرے پانچ مرتبہ پوچھنے پر غصہ آ گیا؟۔

ان کو ''اُف'' تک نہ کہو

بہر حال! یہاں قرآنِ پاک نے خاص طور پر تاکید کر دی کہ اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک یا دونوں تمہاری موجودگی میں بوڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کے بوڑھاپے کی وجہ سے ان سے کوئی ایسی بات پیش آجائے جو آپ کی طبیعت کے خلاف ہو اور آپ کو ناگوار گزرے، تو ان کو ''اُف'' تک نہ کہو، اور ان کو جھڑکو مت، اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرو۔ ادب کا تقاضہ آپ کے ہاتھ سے چھوٹنا نہیں چاہیے، اور ان کے سامنے اپنی عاجزی کا بازو شفقت سے جھکائے رکھو یعنی زبردستی سے نہیں بلکہ شفقت و مہربانی کے ساتھ آپ ان کے سامنے جھکے جا رہے ہوں۔

﴿وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ اور اس سارے سلوک کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہو کہ اے اللہ! تو ان دونوں پر یعنی میرے ماں باپ پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا۔ گویا یہ سکھلایا گیا کہ اس سب کے بعد بھی تم ان کا حق تو ادا نہیں کر سکتے، اس لیے تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگو اور دعا کرو کہ اے اللہ! جیسے بچپن میں بڑی شفقت و محبت اور رحم کے ساتھ ان دونوں نے میری پرورش کی ایسے ہی تو بھی ان کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما۔

ماں باپ کی محبت ہی بے غرض ہوتی ہے

اور واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے اندر جتنے بھی تعلقات اور جتنی بھی محبتیں ہیں، عام طور پر وہ سب غرض پر مبنی ہوتی ہیں، صرف ماں باپ کی محبت ہی ایسی ہے جو کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہوتی۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کب تک زندہ رہے گا، بلکہ اگر ڈاکٹروں نے یہ کہہ بھی دیا ہو کہ آپ کا بچہ زیادہ زندہ رہنے والا نہیں ہے، تو وہاں تو

اب یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ بڑا ہو کر بوڑھاپے کی لاٹھی بنے گا، پھر بھی جب تک وہ زندہ رہے گا، وہاں تک ماں باپ حقِ خدمت ادا کرنے میں اور اس کے ساتھ محبت وشفقت کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے حالانکہ اس سے کوئی غرض حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

بتلانا یہ ہے کہ ماں باپ کی محبت ہی ایسی محبت ہے کہ جو کسی غرض پر مبنی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں محبت ڈال دی ہے، اور اسی کی بنیاد پر وہ سارا سلوک کرتے ہیں۔ اب ہم ان کے ساتھ جو کچھ بھی کریں گے وہ سب اسی کا بدلہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا بدلہ جیسا چکانا چاہیے وہ ہم کبھی بھی چکا نہیں سکتے، اس لیے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ اس سب کے باوجود یعنی آپ اُف بھی نہیں کریں گے، جھڑکیں گے بھی نہیں، اور ان کے ساتھ ادب سے بات چیت کریں گے، اور ان کے سامنے جھکے جھکے رہیں گے، پھر بھی ان کے حقوق کے جو تقاضے ہیں وہ پورے ادا نہیں کر سکتے، تو اب تمہارے لیے یہی ایک بات رہ جاتی ہے کہ ان کے لیے دعاءِ رحمت کرتے رہئے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ کسی کے متعلق یوں سمجھیں کہ اس کے احسان کا بدلہ مَیں ادا نہیں کر سکتا تو اب آپ ہاتھ پھیلا کر دعا کریں گے کہ اے اللہ! مَیں تو اس کے احسان کا بدلہ ادا نہیں کر سکتا؛ تو ہی اپنے پاس سے ادا کر دے۔ اسی طرح یہاں بھی آپ کو سکھلایا گیا کہ اس سب کے باوجود آپ ان کا حق ادا نہیں کر سکتے تو تمہارے لیے یہی ایک شکل رہ جاتی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے برابر یہ دعا کرتے رہو کہ اے اللہ! جیسے انہوں نے مجھے بچپن کے اندر شفقت ومحبت سے پالا تھا تو بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما۔

ماں نے تکلیفوں پر تکلیفیں جھیلیں

﴿وَوَصَّيۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَيۡهِ، حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ وَهۡنًا عَلٰى وَهۡنٍ وَّفِصٰلُهٗ فِىۡ

عَـامَیْـنِ أَنِ اشْـکُـرْلِیْ وَلِوَالِدَیْکَ﴾ ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کی تاکید کردی، اس کی ماں نے تکلیفوں پر تکلیفیں جھیل کر اس کو اُٹھایا اور پھر اس کو دو سال تک دودھ پلایا۔ اس لیے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا بھی شکر ادا کرو۔ اس آیت میں ماں کی اُس خاص مشقت وتکلیف کا تذکرہ کیا گیا جو اُس نے زمانۂ حمل میں برداشت کی اور پھر دودھ پلایا اور دودھ چھڑانے کی تکلیف بھی اٹھائی۔ حالانکہ دودھ تو بچے کا چھڑایا جارہا ہے لیکن تکلیف ماں اٹھارہی ہے، اس کا بھی تذکرہ قرآنِ کریم میں کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ پسندیدہ عمل

٣١٢: عـن أبی عبـدالـرحمن عبداللّٰہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قَـالَ: سَأَلْتُ النَّبِیَّ ﷺ أَیُّ الْـعَـمَـلِ أَحَبُّ اِلیٰ اللّٰہِ تَعَالیٰ؟ قَالَ: اَلصَّلوٰۃُ عَلیٰ وَقْتِھَا۔ قُلْتُ: ثُمَّ أَیٌّ؟ قَالَ: بِرُّالْوَالِدَیْنِ، قُلْتُ: ثُمَّ أَیٌّ؟ قَالَ: اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ سے دریافت کیا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنا۔ میں نے پوچھا: پھر؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔ میں نے پوچھا: پھر؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

افادات: بہت ساری احادیث میں اسی قسم کا سوال مختلف حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اِس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضراتِ صحابہ کے اندر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی اور اللہ تعالیٰ کی نزدیکی حاصل کرنے کا جذبہ کتنا زیادہ تھا، گویا ان کے دلوں میں ایک طلب اور تڑپ تھی کہ مجھے یہ بات معلوم ہوجائے کہ وہ کونسا عمل ہے جو اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے اور اس

کے کرنے سے مجھے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا؛ تاکہ مَیں وہ کام کروں، اسی لیے وہ حضرات بار بار اس طرح کا سوال کیا کرتے تھے۔

ہم اور آپ سوال تو کیا کرتے بلکہ بغیر سوال کے ہی کسی کتاب میں پڑھ کر اگر یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں عمل اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند ہے کہ اس کو کرنے سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے گا؛ تو اس پر عمل کا ہم کتنا اہتمام کرتے ہیں؛ ہم خود ہی اپنے گریبان میں جھانک کر اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یہ تو حضراتِ صحابۂ کرام ہی کا ذوق و مزاج تھا، گویا ان کی طبیعتوں میں یہ بات رچی بسی ہوئی تھی، ان کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ وہ تعلق و محبت اور وہ عشق تھا کہ ہر لمحہ اور ہر گھڑی وہ حضرات اس کی طلب و جستجو میں رہتے تھے کہ ہمیں وہ عمل معلوم ہو جائے جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اسی لیے آپ روایتوں میں بار بار پڑھیں گے کہ بہت سارے صحابہ نے یہی سوال حضور ﷺ سے پوچھا۔

ہمارے اور صحابہ کرام کے مزاج کا فرق

یہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، صحابہ میں ان کا بڑا اونچا مقام ہے، وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ پوچھا۔ ویسے حضورِ اکرم ﷺ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے پوچھے بغیر جو اعمال بتلاتے تھے، ان پر تو وہ حضرات عمل کرتے ہی تھے، اس میں وہ حضرات کوئی کوتاہی نہیں کرتے تھے، مزید برآں وہ اپنی طرف سے یہ سوال کر رہے ہیں۔ ہم ہوتے تو سوچتے کہ جو بتایا گیا ہے وہی کیا کم ہے کہ مزید سوال کریں۔ ہمارا مزاج ایسا ہے، اور اُن حضرات کا مزاج یہ تھا کہ جو احکام دئے جاتے تھے ان کو تو بجا ہی لاتے تھے لیکن ساتھ ہی اپنی طرف سے اور بھی سوال پوچھتے تھے۔ یہ دراصل ذوق کی بات ہے۔ تو ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضراتِ صحابہ کرام کا جذبہ

شوق اور ان کا مزاج کیا تھا۔

سوال ایک؛ جواب مختلف کیوں؟ ایک عمدہ مثال

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے سوال کیا، اس کا جواب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیا جو آگے آ رہا ہے، اور یہی سوال دوسرے صحابی نے کیا تو ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرا جواب دیا اور کسی تیسرے صحابی نے یہی سوال کیا تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے الگ ہی جواب دیا۔ تو سوال ایک ہی ہے لیکن جواب مختلف ہیں؛ یہ آخر کیا بات ہے؟ سوال ایک ہونے کے باوجود جواب میں فرق کیوں ہے؟

اس بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں لوگوں کی تربیت اور ان کا علاج کرنے کے واسطے تشریف لائے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو روحانی طبیب ہیں۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی نور اللہ مرقدہٗ بڑے واعظ اور مقرر گزرے ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے تھے، بڑے بزرگ اور عالم تھے، ان کے بیان کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ فرماتے تھے کہ آج کل وعظ کا یہ طریقہ ہے کہ ایک بڑے مجمع کے سامنے وعظ کرنے والا آ کر نصیحت کرتا ہے؛ درحقیقت یہ اصولی علاج نہیں ہے۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ حکیم اجمل خان صاحب کسی بڑے مجمع کے اندر آئیں اور تقریر کریں کہ ٹی بی کی بیماری ان اسباب کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس کا علاج اس طرح کیا جانا چاہیے اور اس میں فلاں چیزوں سے پرہیز کرو، اور اس میں فلاں چیزیں مفید ہیں اور فلاں چیزیں مضر ہیں، یہ ساری تفصیل ایک گھنٹہ تقریر کر کے ایک بڑے مجمع میں بتلا دیں۔ تو اب آپ ہی بتلائیے کہ اتنے بڑے مجمع میں سے یہ تقریر کس کے حق میں مفید ہوگی؟ صرف ٹی بی کے مریضوں کے لیے ہی مفید ہوگی، بقیہ کے لیے وہ کسی کام کی نہیں ہے۔

علاج کا اصل طریقہ تو یہ ہے کہ حکیم صاحب اپنے مطب میں اپنی مسند پر بیٹھیں اور بیماروں سے کہہ دیا جائے کہ باہر بیٹھو اور ایک ایک کرکے آکر ملاقات کرو، اور حکیم صاحب کے سامنے اپنی اپنی بیماری بتاؤ، وہ آپ کی بیماری کی تفصیل سن کر اس کے علاج کے طور پر دوا اور پرہیز بتائیں گے، جب ایک رخصت ہوگا تو دوسرا آئے گا، پھر تیسرا آئے گا۔ مطب کا اصل طریقہ یہی ہے۔

اسی طرح یہ بھی روحانی مطب ہے، اور روحانی طبیب کے علاج کا اصل طریقہ بھی یہی ہے کہ کسی صاحبِ دل یا کسی عالم یا کسی ماہر کے پاس جا کر ہر شخص اپنے اپنے مسائل پیش کرے اور اس کے سلسلہ میں ہدایتیں حاصل کرے۔ باقی یہ ایک عام انداز ہے۔ خیر! یہ بھی کوئی فضول اور بالکل بے کار نہیں ہے، اگر اس میں عمومی جذبہ پیدا کرنے والی بات ہے تو بہت اچھا ہے۔

نبی کریم ﷺ طبیبِ روحانی تھے

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ طبیبِ روحانی تھے اور آپ کی خدمت میں لوگ اپنے اپنے مسائل پیش کرتے تھے، اور علاج کا مطالبہ کرتے تھے، جس میں جو کمی ہوتی تھی اس کی طرف نبی کریم ﷺ نشان دہی فرما کر اس کا علاج تجویز فرماتے تھے، اور اس کے مطابق ان کو ہدایت دی جاتی تھی۔ تو چاہے سوال ایک ہی ہے، لیکن سوال کرنے والے مختلف ہیں، اس لیے جواب بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جیسا جیسا جس کا مسئلہ ہوگا ویسا ویسا اس کا جواب ہوگا۔ آپ کسی ڈاکٹر کے پاس جا کر پوچھئے کہ ڈاکٹر صاحب! میرے لیے کونسی غذا مفید ہے؟ تو ڈاکٹر صاحب پہلے تو آپ کا مزاج معلوم کریں گے کہ گرم ہے یا سرد ہے، اس کے بعد آپ کو کوئی چیز بتلائیں گے۔ اور یہی سوال مَیں جا کر

کروں گا تو میری ساری تفصیل جاننے کے بعد مجھے کوئی دوسری چیز بتائیں گے۔ تیسرے آدمی کو اسی سوال کے جواب میں کچھ اور بتائیں گے۔ اب تینوں نے ایک ہی سوال کیا؛ لیکن مجھے کچھ بتایا اور آپ کو کچھ اور بتایا اور فلاں کو کچھ اور بتایا۔ تو اب کوئی کہے کہ مختلف جواب کیوں ہیں؟ بھائی! سوال کرنے والے مختلف ہیں اور ان کا مزاج مختلف ہے اور ان کی ضرورتیں بھی مختلف ہیں؛ تو جواب بھی مختلف ہیں۔ اسی طرح مختلف حضراتِ صحابہ نے ایک ہی سوال کیا کہ کونسا عمل سب سے زیادہ افضل ہے؟ کسی کو جواب دیا کہ ماں باپ کی خدمت کرنا، کسی دوسرے کو جواب دیا کہ جہاد کرنا، کسی کو جواب دیا کہ غصہ نہ کرنا، کسی کو بتلایا گیا کہ خیر خواہی کرنا۔ جس کے لیے جو مناسب سمجھا گیا اس کو وہ بتایا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ وقت کا تقاضہ کیا ہے اس کے مطابق حکم بتایا گیا۔

وقت کے تقاضہ کو پورا کرنے کا نام دین ہے

بزرگوں نے کہا کہ دین اپنا شوق پورا کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ وقت کے تقاضہ کو پورا کرنے کا نام دین ہے، اللہ اور رسول کی اطاعت اسی میں ہوگی، وقت کا تقاضہ کیا ہے اس کو سمجھو اور اس موقعہ پر اللہ اور رسول کی کیا ہدایت ہے اس کو پورا کرو۔

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک آدمی جنگل میں اپنی بیوی کے ساتھ تنہا اور اکیلا رہتا ہے، آبادی وہاں سے دور ہے، جب نماز کا وقت آیا تو یہ آدمی کہتا ہے کہ مَیں تو نماز پڑھنے کے لیے مسجد جاؤں گا، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی تاکید آئی ہے۔ بیوی کہتی ہے کہ ہمارا مکان جنگل میں ہے، آبادی دور دور تک نہیں ہے اور آپ عشاء کی نماز پڑھنے کے لیے جانا چاہتے ہیں، حالانکہ یہاں بڑا خطرہ ہے، اگر آپ چلے گئے تو میری کیا گت بنے گی۔ اس وقت اگر وہ

یوں کہے کہ تیرا جو ہونے والا ہو وہ ہو، مَیں تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے جاؤں گا جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس گنا زیادہ ہے، وہ مَیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ تو حضرت فرماتے ہیں کہ دیکھو! اگرچہ نماز کا وقت آگیا ہے اور جماعت کی بھی بڑی اہمیت ہے، لیکن اس وقت یہ کہا جائے گا کہ اس کا نام شوق پورا کرنا ہے، اللہ و رسول کے حکم پر عمل کرنا نہیں ہے، حالانکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ وقت کا تقاضہ کیا ہے، اس کے مطابق عمل کرو۔

اپنے معاملہ میں فیصلہ کا بہترین طریقہ

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے دو پہلو ہوتے ہیں اور کسی ایک پہلو کو ترجیح نہیں دے سکتا یا اپنے طبعی رجحان کی وجہ سے دل کسی ایک پہلو کی طرف مائل ہے تو پھر اپنے معاملہ میں بجائے اس کے کہ خود فیصلہ کرے، کسی سمجھ دار شریعت کے تقاضوں سے واقف آدمی کے سامنے پیش کرے اور اس سے مشورہ لے، تاکہ اس میں اپنے نفس کے کسی کید اور دھوکہ کو دخل نہ ہو، اور اس کی طرف سے جو مشورہ دیا جائے اس پر عمل کرے؛ یہی بہترین طریقہ ہے۔ بہت سی مرتبہ آدمی یوں سمجھتا ہے اور اس کا دل یہی کہتا ہے کہ اس وقت کا تقاضہ یہی ہے، تو اب اس کو چاہیے کہ جو شخص دین کے تمام تقاضوں اور مسائل سے واقف ہو اس کے سامنے اپنی بات پیش کرے اور اس کے بتانے کے مطابق اپنا معاملہ درست کرے۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ایک ہی طرح کے سوال کے جواب میں مختلف باتیں فرمائی گئی ہیں، اس کی وجہ کیا ہے وہ مَیں نے بتلا دی۔

اس روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول!

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کونسا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا "اَلصَّلوٰۃُ عَلیٰ وَقْتِہَا" نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنا۔ بعض لوگ نماز تو پڑھتے ہیں لیکن مؤخر اور لیٹ کر دیتے ہیں یا قضا کر دیتے ہیں؛ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کے مستحب وقت میں اس کو ادا کرنا یہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب عمل ہے۔

پھر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! اس کے بعد کونسا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ "قَالَ: بِرُّ الْوَالِدَیْنِ" آپ ﷺ نے فرمایا کہ ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔ پھر مَیں نے پوچھا اس کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

دیکھو! اللہ کے راستہ میں جہاد کے مقابلہ میں ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کو آگے کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں اور روایتیں بھی پیش فرمائیں گے، جو ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں پڑھی جائیں گی۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۲۹/ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۷/اپریل ۱۹۹۹ء

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کی تاکید کے سلسلہ میں قائم کیا ہے، قرآنِ پاک کی آیات اور ایک حدیث گذشتہ مجلس میں بیان ہو چکی ہے، آج مزید روایتیں پیش فرما رہے ہیں۔

باپ کا حق ادا کرنے کی ایک صورت

۳۱۳۔عن أبی هریرة رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: لا یَجزِیُ وَلَدٌ وَالِداً الَّا أَنْ یَّجِدَهُ مَمْلُوکاً، فَیَشْتَرِیَهُ، فَیُعْتِقَهُ.(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بیٹا اپنے باپ کو پورا پورا بدلہ نہیں دے سکتا مگر یہ کہ اس کو غلام پائے تو اس کو خرید کر آزاد کر دے۔

افادات:- یعنی اولاد اگر اپنے باپ کا حق ادا کرنا چاہے تو اس کے حق کی ادائیگی کے لیے چاہے وہ کتنی ہی کوشش کرے اور کتنی ہی خدمت بجالاوے اور ان کی کتنی ہی اطاعت و فرمانبرداری کر لے، دنیا بھر کی راحتیں ان کو پہنچائے؛ تب بھی وہ پوری زندگی میں ان کا حق ادا نہیں کر سکتا، البتہ ان کا حق ادا کرنے کی ایک صورت نبیٔ کریم ﷺ نے بتلائی جو اُس زمانہ میں پائی جاتی تھی جب کہ غلامی کا سلسلہ تھا اور وہ صورت یہ ہے کہ کسی کا باپ کسی کی غلامی اور ملکیت میں ہے اور بیٹا اپنے باپ کو اس کے مالک سے خرید کر کے آزاد کر دے۔ ویسے بیٹے کا باپ کو خرید لینا ہی باپ کی آزادی کے لیے کافی ہے، اس لیے کہ علماء نے مسئلہ لکھا ہے کہ بیٹا باپ کو خریدے تو اس کے خریدتے ہی خود بخود باپ آزاد ہو جاتا ہے۔

تو بیٹا باپ کو خرید کر آزاد کر دے تب تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے باپ کا حق

پورا پورا ادا کر دیا، اس لیے کہ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ باپ کو غلامی سے نجات دلا کر گویا اس نے باپ کو نئی زندگی عطا کی، جیسے باپ اس کے دنیا میں آنے کے لیے ذریعہ بنا تھا اور دنیوی زندگی کے لیے واسطہ بنا تھا؛ تو باپ کو خرید کر غلامی سے آزاد کر کے یہ بھی باپ کے لیے نئی زندگی حاصل ہونے کا ذریعہ بنا، اس اعتبار سے گویا باپ کا جو احسان اس کے اوپر تھا اس کا کچھ بدلہ ادا کیا، اس لیے نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ایک شکل تو ایسی ہے کہ جس میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ بیٹے نے باپ کا پورا پورا بدلہ ادا کر دیا، باقی وہ کتنی ہی خدمت کر لے، اس کے ساتھ احسان و بھلائی کا معاملہ کرے، اس کو کتنی ہی راحت پہنچائے اور اس کے حکم کی بجا آوری کرے؛ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی اس کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یوں کہے کہ میں نے باپ کا پورا پورا حق ادا کیا۔ آج ہمارے زمانہ میں تو غلامی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اس لیے اس شکل پر تو عمل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جو اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو

٣١٤۔وعنه رضی اللہ عنہ أيضاً أَنَّ رسول الله ﷺ قال: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ، وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْ لِيَصْمُتْ. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے، اور جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ یا تو بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے۔

افادات: یہ روایت پہلے بھی ایک دو مرتبہ آ چکی ہے، اس میں صلہ رحمی والا حکم موجود ہے اس مناسبت سے اس باب میں اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔ عام طور پر

احادیث میں اختصار کے ساتھ یہ جملہ آتا ہے ”مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ“ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو۔ اس میں سب ہی ایمانیات آجاتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا اور آخرت کے دن پر ایمان لانا اس کے درمیان میں فرشتوں پر ایمان لانا، اللہ کی کتابوں پر ایمان لانا، رسولوں پر ایمان لانا؛ یہ سب موجود ہے، گویا پہلا اور آخر ذکر کر کے درمیان کی تمام چیزوں کی طرف اشارہ کر دیا جاتا ہے جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔

نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، مطلب یہ ہے کہ جو آدمی مؤمن ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔ پہلے اس کی تفصیل بتا چکا ہوں۔

اور جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو یعنی جو آدمی مؤمن ہے اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔ یہاں اس روایت کو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ باب کے عنوان میں صلہ رحمی کا بھی تذکرہ ہے۔

صلہ رحمی کی مختصر تفصیل

صلہ رحمی یعنی کسی کے ساتھ قرابت، رشتہ داری اور نسبی تعلق ہے تو اس نسبت سے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان حقوق کو ادا کرنا۔ اب یہ حقوق کیا ہیں؟ تو پہلے بھی مَیں نے بتلایا تھا کہ جس قسم کی رشتہ داری ہے اور جس کی جو حیثیت ہے اسی کے مطابق حقوق کی ادائیگی اس پر عائد ہوتی ہے، مثلاً ماں باپ، اولاد، بھائی بہن، دادا دادی، نانا نانی، خالہ، چچا، پھوپھی وغیرہ جتنی بھی خاندانی نسبی رشتہ داریاں ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی میں بعض چیزیں تو وہ ہیں جن کو بعض حالات میں شریعت نے اس پر

واجب اور ضروری قرار دیا ہے مثلاً ماں باپ کے پاس اپنا مال نہیں ہے جس سے وہ اپنا گزر بسر کرسکیں اور بیٹے کے پاس مال موجود ہے، یا بیٹا کمانے کی طاقت رکھتا ہے؛ تو اس صورت میں اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ ماں باپ کا نفقہ ادا کرے۔ ہاں! اگر ماں باپ کے پاس اپنا مال موجود ہے تو میں بتلا چکا ہوں کہ جب کسی کے پاس اپنا مال موجود ہو تو اس کے کھانے پینے کا، اس کے پہننے اوڑھنے کا اور اس کے رہنے سہنے کا خرچہ کسی دوسرے پر نہیں آتا، وہ اسی کے مال میں واجب ہوتا ہے سوائے بیوی کے، کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہے کہ اس کے پاس اپنا کتنا ہی مال موجود کیوں نہ ہو، وہ کروڑ پتی اور ارب پتی ہو تب بھی اس کا خرچہ اس کے شوہر پر ہی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی رشتہ دار ہو، ماں باپ، اولاد اور وہ بھی چاہے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو اور دوسرے تمام رشتہ دار کوئی بھی ہو، اگر ان کے پاس اپنا مال موجود ہے جس سے ان کے کھانے پینے کی ضرورت، پہننے اوڑھنے کی ضرورت، ان کے رہنے سہنے کی ضرورت پوری ہوسکتی ہے، تو اس صورت میں کسی دوسرے پر ان کا کوئی بھی نفقہ واجب نہیں ہے۔ اب واجب نہ ہونے باوجود ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اگر اولاد ان کے ساتھ ہدیہ وغیرہ کا سلسلہ جاری رکھے تو اچھا ہے، لیکن شریعت واجب قرار نہیں دیتی۔ لیکن اگر ان کے پاس اپنا مال موجود نہیں ہے، اور اس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہے تو پھر اس میں بڑی تفصیلات ہیں۔ بعض صورتوں میں ان کا نفقہ واجب ہوتا ہے، اور اگر کئی اولاد ہیں تو ہر ایک کے اوپر کچھ نہ کچھ حصہ ان کے حق کے مطابق عائد ہوتا ہے، جو ان کو ادا کرنا پڑے گا۔ بعض رشتہ داریاں دور کی ہیں مثلاً آپ کی خالہ ہیں اور ان کا بیٹا بھی موجود ہے اور اس کی حیثیت بھی ہے تو اس پر ہی ان کا خرچہ واجب ہوتا ہے لیکن اگر وہ اس کو ادا

نہیں کرتا تو اس صورت میں آپ کو ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا چاہیے۔

صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ

اور صلہ رحمی کا کم سے کم درجہ یہ ہے آدمی ان کے ساتھ ملاقات کرتا رہے اور ان کے ساتھ سلام وکلام کا سلسلہ جاری رکھے، اور خیر خیریت معلوم کرے؛ یہ صلہ رحمی کا ادنیٰ درجہ ہے، اگر کوئی آدمی یہ بھی نہیں کرتا تو یوں سمجھا جائے گا کہ اس نے قطع رحمی کی یعنی رشتہ داری کا حق ادا نہیں کیا، اور اس صورت میں قطع رحمی اور رشتہ داری کا حق ادا نہ کرنے پر جو وعیدیں قرآن واحادیث میں آئی ہیں وہ تمام اس کے اوپر عائد ہو جائیں گی اس لیے یہ تو ضروری ہے کہ اپنے جتنے بھی رشتہ دار ہوں، جن کے ساتھ نسبی تعلق ہے، چاہے وہ قریب کے ہوں یا دور کے ہوں، ان کے ساتھ کبھی کوئی معاملہ ایسا تو ہونا ہی نہیں چاہیے کہ ان کے ساتھ گفتگو کا سلسلہ بند کر دیں بول چال نہ ہو اور سلام کلام نہ ہو، اگر یہ نہیں ہوگا تو اس صورت میں یہ ساری وعیدیں اس کے اوپر آجائیں گی اور اس کے نتیجہ میں وہ مصیبتوں میں پھنسے گا۔

روزی کی تنگی کا سب سے بڑا سبب

آگے ایک روایت آنے والی ہے کہ آدمی جب صلہ رحمی کرتا ہے، رشتہ داری کے حقوق ادا کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی روزی میں برکت عطا فرماتے ہیں اس کی زندگی میں برکت عطا فرماتے ہیں اور اگر قطع رحمی کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کی روزی میں بے برکتی ہوتی ہے، روزی کا سلسلہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ آج کل لوگوں کو عام طور پر شکایتیں ہیں کہ کاروبار نہیں چلتا، بہت تکلیف ہے اور برکت نہیں ہے، حالانکہ کاروبار میں برکت نہ ہونے اور روزی کی تنگی کا سب سے بڑا سبب قطع رحمی ہے،

اب اگر اس لائن سے وہ آدمی سوچے تو اس کو خود اپنی پریشانی کا جواب مل جاتا ہے کہ کسی رشتہ دار کے ساتھ کچھ نہ کچھ معاملہ خراب چل رہا ہوتا ہے۔ بعض لوگ تو ماں باپ ہی کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں بنیاد کی شروعات ہی میں معاملہ گڑبڑ ہے، اور اگر ماں باپ کے حق کی ادائیگی کا کچھ اہتمام کیا تو دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی میں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں اور بعضوں کے ساتھ ایسی لڑائی ہوتی ہے کہ ان کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، سلام و کلام کے لیے راضی نہیں، اور پھر چاہتے یہ ہیں کہ ہماری روزی میں برکت ہو؛ یہ کیسے ہوسکتا ہے، معمولی معمولی باتوں میں آپس میں جھگڑے ہوتے ہیں، بات چیت بند ہو جاتی ہے، سلام وکلام کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے، اور جب مصیبتیں آتی ہیں تو پھر روتے پھرتے ہیں، اور مصیبت تو یہ ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا، اور یہ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ یہ تکلیف کاہے کی وجہ سے آئی۔ اور اگر اللہ کا کوئی بندہ متوجہ کرے تو اِدھر دھیان ہی نہیں دیتے، یوں سمجھتے ہیں کہ یہ تو ایسی ہی بات ہے، حالانکہ حقیقت میں مصیبت اسی کی وجہ سے آتی ہے۔

کمزوروں کی وجہ سے روزی دی جاتی ہے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ صاحبزادے کما کر ماں باپ کو دے رہے ہیں، اب شادی ہوئی تو بیوی کان بھر رہی ہے، اور یوں کہتی ہے کہ دیکھو! آپ اتنی تکلیف اٹھا کر کما کر ماں باپ کو دیتے ہیں اور تمہارا فلاں بھائی تو بیٹھا بیٹھا کھا رہا ہے، ماں باپ اس کو کچھ نہیں کہتے۔ اور جب ایک بات بار بار کہی جاتی ہے تو اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ یہ بھی سوچنے لگتا ہے کہ یہ بات تو ٹھیک کہتی ہے، اس کی بات پھینک دینے جیسی نہیں ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں وہ ماں باپ سے بات کرتا ہے، حالانکہ

جب آپ نے اپنی حیثیت کے مطابق خدمت کے طور پر ماں باپ کو پیش کردیا تو اب ان کو اختیار ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اس کو استعمال کریں، لیکن جب آپ اس سلسلہ میں ماں باپ سے گفتگو کریں گے تو اسی کے نتیجہ میں کبھی تو ماں باپ کے ساتھ بھی تعلقات کشیدہ ہوجاتے ہیں، اور بھائیوں کے ساتھ بھی ٹوٹ جاتے ہیں، اور پھر یہ صاحبزادے کہتے ہیں کہ میں ہی الگ ہوجاتا ہوں۔ پھر علاحدگی اختیار کرلینے کے کچھ زمانہ کے بعد کاروبار ٹھنڈا ہونے لگتا ہے تو اب سوچتے ہیں کہ کاروبار ٹھنڈا کیوں ہوگیا؟ ارے بھائی! تمہارے کاروبار میں جو کچھ آرہا تھا وہ تو ان کمزوروں کی وجہ سے ہی آرہا تھا حدیث پاک میں آتا ہے "اِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَآئِکُمْ" (سنن ترمذی،۱۷۰۲) تم کو تمہارے کمزوروں کی وجہ سے روزی دی جاتی ہے، یعنی جو کمزور خود کمانے کی طاقت نہیں رکھتے، تم کما کر ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوشش کررہے ہو، تو ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ تمہیں بھی روزی دیتے ہیں۔

پہلا شیطانی حربہ

اب دیکھو کہ نبی کریم ﷺ نے کیا تعلیمات دی ہیں؟ اور یہ یوں سمجھتا ہے کہ میں اِن کو کھلا رہا ہوں اور حضورِ اکرم ﷺ یہ بتلا رہے ہیں کہ یہ تجھے کھلا رہے ہیں۔ اب ہمارا ایمان تو نبیِ کریم ﷺ پر ہے، ہم اپنی آنکھوں سے یہ دیکھ رہے ہیں اور بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ ہم محنت کرتے ہیں اور ہم کما کر لاتے ہیں اور ہم اِن کو کھلا رہے ہیں، لیکن حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ نہیں! تم کو جو کچھ مل رہا ہے وہ تو اُس کی وجہ سے مل رہا ہے تو صریح ایمان والی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کچھ بھی نظر آتا ہو لیکن اللہ کے پاک رسول ﷺ جب یہ کہتے ہیں کہ تمہیں اُن کی وجہ سے روزی ملتی ہے تو ہمیں اس کو مان لینا چاہیے اور

ہمیں اسی کا یقین رکھنا چاہیے کہ ہماری آنکھیں کچھ بھی دیکھتی ہوں، ہماری آنکھ غلط دیکھ سکتی ہے لیکن اللہ کے پاک رسول ﷺ کبھی غلط کہہ نہیں سکتے۔ اگرچہ بظاہر ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہم کما کر ان کو کھلا رہے ہیں لیکن جب نبی کریم ﷺ نے فرمادیا کہ ان کی وجہ سے تمہیں روزی مل رہی ہے تو اب ہمارا ایمان یہی ہونا چاہیے، اور جب یہ ایمان ہوگا تو کیا ہم ان کے ساتھ تعلقات ختم کریں گے؟ ہرگز نہیں۔ جب ہم یہ سمجھیں گے کہ ہمیں جو کچھ مل رہا ہے وہ اُس کی وجہ سے مل رہا ہے تو ہم کبھی بھی اُس کے ساتھ تعلقات نہیں توڑیں گے، بلکہ اگر وہ توڑنا بھی چاہے گا تو ہم اُس کے سامنے ہاتھ جوڑیں گے کہ اللہ کے واسطے ایسا مت کرو، میری غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردو، مَیں تو آپ کو ساتھ ہی رکھوں گا، آپ کہیں نہیں جائیں گے۔ لیکن جب آپ یوں سمجھیں گے کہ مَیں محنت کرتا ہوں اور مَیں کما کر کھلاتا ہوں تو پھر آپ الگ ہونے کی بات کریں گے۔ جب کوئی آدمی آپ کو ایسا مشورہ دے رہا ہو، تو درحقیقت یہ پہلا شیطانی اور نفسانی حربہ ہے، آپ اس کو سمجھائیے کہ بھائی! مَیں اس کو نہیں کھلا رہا ہوں وہ مجھے کھلا رہے ہیں۔ اگر بیوی بھی یہ کہتی ہو تو اس سے کہنا چاہیے کہ پگلی! یہ بات نہیں ہے، تو جو سمجھ رہی ہے وہ بالکل غلط ہے، نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد ہے، اس لیے یہ لوگ مجھے کھلا رہے ہیں، یہ نہ سمجھنا کہ مَیں ان کو کھلا رہا ہوں۔ جب تک میرا معاملہ ان کے ساتھ درست ہے وہاں تک میری روزی میں برکت ہے اور مجھے روزی ملتی رہے گی، اور جس دن مَیں ان سے تعلقات کٹ کردوں گا اسی دن سے میرا معاملہ گڑبڑ میں پڑ جائے گا۔

دوسرا شیطانی حربہ

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ قطع رحمی کی وجہ سے روزی کا

وبال آتا ہے اور پھر آدمی سمجھتا نہیں ہے اور روتا پھرتا ہے، وظیفے پڑھتا ہے اور پھر یوں سوچتا ہے کہ کسی نے کچھ کرادیا ہے، یہ دوسرا شیطانی حربہ ہوتا ہے۔ جیسے کسی بیماری کی صحیح تشخیص ہی نہ ہو تو اس کا علاج کیا ہوگا۔ اسی طرح شیطان اب دوسرے راستہ پر لے جا رہا ہے، بیماری کی جو بنیاد اور سبب ہے اُدھر سے دھیان ہٹا کر دوسری طرف لے جا رہا ہے، اب وہ اور زیادہ چکر پر چڑھ جاتا ہے، عاملوں کے پاس جائے گا، کہیں تعویذ گنڈے کرائے گا، کوئی کہے گا کہ کالا جادو ہے اور کوئی کچھ کہے گا، لیکن جو کالا جادو اپنے اندر ہے اس کو دور کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتا، یہاں پر بھی الزام دوسروں کے اوپر دیتا ہے، اپنی غلطیوں کی طرف آدمی کا ذہن جلدی سے نہیں جاتا۔ اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو ایسے موقع پر اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ مَیں کوئی ایسا کام تو نہیں کر رہا ہوں جس پر حدیثِ پاک میں تنگی کی وعید سنائی گئی ہے، اگر ایسا کوئی کام ہے تو اس سے فوراً باز آجانا چاہیے، اس کا اصل علاج یہی ہے، دوسرا کوئی علاج نہیں ہے۔ بہر حال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ صلہ رحمی کا ادنیٰ اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ سلام کلام کا سلسلہ جاری رکھے، اگر وہ سلام کلام کا سلسلہ ختم کر دے گا تو یوں کہا جائے گا کہ اس نے رشتہ داری کا حق ادا نہیں کیا۔

اور نبیٔ کریم ﷺ نے تیسری بات ارشاد فرمائی کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے، اس کی تفصیل بتا چکا ہوں۔

رشتہ داری کی اپیل

٣١٥۔وعنه قال رضی اللہ عنہ قال رسول اللّٰه ﷺ: اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی خَلَقَ الْخَلْقَ حَتّٰی اِذَا فَرَغَ مِنْهُمْ قَامَتِ الرَّحِمُ، فَقَالَتْ: هٰذَا مُقَامُ الْعَائِذِبِكَ مِنَ

الْقَطِيعَةِ. قَالَ: نَعَمْ! أَمَا تَرْضَيْنَ أَنْ أَصِلَ مَنْ وَصَلَكِ، وَأَقْطَعَ مَنْ قَطَعَكِ؟ قَالَتْ: بَلَىٰ. قَالَ: فَذَالِكَ لَكِ. ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: اقْرَؤُوا إِنْ شِئْتُمْ ﴿فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ﴾ (متفق عليه)

وفي رواية للبخاري: فَقَالَ اللّٰهُ تعالىٰ: مَنْ وَصَلَكِ وَصَلْتُهُ، وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُهُ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب تمام مخلوق کو پیدا فرما چکے، تو قرابت کھڑی ہوئی۔ اور کہا کہ باری تعالیٰ! قطع رحمی کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے مَیں آپ کی پناہ حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ تو باری تعالیٰ نے بھی اس سے فرمایا کہ بالکل! تمہیں گارنٹی دی جاتی ہے۔ اچھا! کیا اس بات پر تو خوش ہے کہ جو تجھے جوڑے گا، مَیں اس سے جوڑوں گا، اور جو تجھے کاٹے گا، مَیں اس کو کاٹوں گا؟ اس کے جواب میں اس نے کہا کہ جی ہاں! مَیں اس پر تیار ہوں، تو باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ! تمہیں اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو، جس کا خلاصہ ہے کہ کیا تمہیں یہ توقع ہے کہ تم کو اگر قبضہ حاصل ہو جائے تو زمین کے اندر فساد پھیلاؤ گے اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرو گے یعنی قطع رحمی کرو گے؟ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی اور حق بات کے سننے سے ان کو بہرا بنا دیا اور حق کی طرف نظر کرنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رشتہ داری سے فرمایا کہ جو تجھے جوڑے گا میں اسے اپنے سے جوڑوں گا اور جو تجھے کاٹے گا تو میں اسے اپنے سے کاٹوں گا۔

افادات: وہ نسبی رشتہ داری جو بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے، اس کو عربی میں "رَحِمْ" کہتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرابت و رشتہ داری جسمانی اور جاندار چیز تو

ہے نہیں کہ اُٹھے اور بات کرے؟ اس سلسلہ میں شرّاح نے لکھا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف سے اس کے ان جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے اور اس کی اس درخواست کو پیش کرنے کے لیے کسی فرشتے کو کھڑا کر دیا ہو اور اس فرشتہ نے یہ بات اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کی ہو۔

یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ اگرچہ رشتہ داری حسی چیز نہیں ہے بلکہ ایک معنوی چیز ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات پر قدرت رکھتے ہیں کہ وہ اس کو کوئی جسم اور شکل عطا کریں اور وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بات پیش کرے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قرابت اور رشتہ داری کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے اور اس کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید کے لیے نبی کریم ﷺ نے تعبیر کا ایک مخصوص انداز اختیار فرمایا ہو، تاکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کتنی اہمیت ہے وہ لوگوں کو معلوم ہو جائے۔

خیر! تو قرابت اور رشتہ داری اُٹھی اور کہا کہ باری تعالیٰ! قطع رحمی کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے میں آپ کی پناہ حاصل کرنا چاہتی ہوں گویا قرابت اور رشتہ داری نے اپنی درخواست اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ کہہ کر پیش کی کہ میرے حقوق کو اگر ضائع کیا گیا تو اس کے لیے کیا گارنٹی ہے؟ رشتہ داری نے باری تعالیٰ سے یہ عرض کیا کہ باری تعالیٰ! آپ نے مجھے پیدا کیا اور میرے کچھ حقوق آپ نے مقرر کئے کہ ان کو ادا کیا جائے، اور ان کو ضائع و برباد نہ کیا جائے، تو اب میرے ان حقوق کو برباد ہونے سے بچانے کے سلسلہ میں مجھے آپ کی بارگاہ سے کوئی گارنٹی ملنی چاہیے اور ایسا

کچھ اطمینان مجھے ملنا چاہیے؛ تا کہ اس گارنٹی کی وجہ سے کوئی آدمی اگر میرے حقوق کو ضائع کرنے کا ارادہ کرے تو وہ ڈر جائے اور ضائع نہ کرے۔

کیا گارنٹی ہے کہ لوگ میرے حقوق ادا کریں گے یا نہیں کریں گے۔ اور اگر نہیں کریں گے تو ان کو کیا سزا ملے گی، اور اگر ادا کریں گے تو اس پر کیا انعام ملے گا؟ ابھی سے یہ طے ہو جائے تو میرا خیال رکھا جائے گا، اور اگر طے نہیں کیا جائے گا تو لوگ میرا خیال بھی نہیں رکھیں گے۔

رشتہ داری کو زبردست گارنٹی ملی ہے

تو باری تعالیٰ نے بھی اس سے فرمایا ''نَعَمْ'' بالکل! تمہیں گارنٹی دی جاتی ہے اچھا! کیا تو اس بات پر خوش ہے کہ جو تجھے جوڑے گا اور جو تیرے حقوق ادا کرے گا، مَیں اس سے جوڑوں گا، اور جو تجھے کاٹے گا اور تیرے حقوق ضائع کو برباد کرے گا، مَیں اس کو کاٹوں گا یعنی اس کو برباد کروں گا؟ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قرابت اور رشتہ داری کو کتنی زبردست گارنٹی دی گئی کہ باری تعالیٰ قرابت سے پوچھ رہے ہیں کہ اب تو تجھے اطمینان ہے؟ اس کے جواب میں قرابت نے کہا کہ جی ہاں! مَیں اس پر تیار ہوں، اگر اتنی گارنٹی مجھے مل جائے تو مَیں خوش ہوں۔ تو باری تعالیٰ نے فرمایا کہ جاؤ! تمہیں اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ جس کو جوڑے، تو پھر ساری دنیا بھی اس سے منہ موڑے تو اس کو کوئی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ جسے کاٹے پھر تو ساری دنیا بھی اسے خوش کردینا چاہے تو وہ خوش نہیں ہوسکتا۔ دنیا کا معمولی حاکم یا آپ کے شہر کا ڈی ایس پی، یا کلکٹر جب کسی کے متعلق اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے تو اس آدمی کو رات بھر نیند نہیں آتی،

زندگی کا چین وسکون خراب ہوجاتا ہے، تو جب اللہ تعالیٰ یوں کہہ دیں کہ میں اس کو کاٹوں گا تو اب وہ آدمی رشتہ داری کے حقوق ضائع کر کے کیا سکون واطمینان کی نیند لے سکتا ہے؟ کیا اس کو زندگی میں چین وسکون حاصل ہوسکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ کبھی بھی چین نہیں مل سکتا۔ اگر وہ چین وسکون حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ رشتہ داری کے حقوق کو ادا کرے۔

تو اب رشتہ داری اتنی بڑی زبردست گارنٹی لے کر دنیا میں آئی ہے، اور ہم پیدا ہوتے ہی اس رشتہ داری کو اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں، اب اگر ہمیں اپنا کام بنانا ہے تو پھر اس رشتہ داری کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے، اور اگر اس کو ضائع وبرباد کریں گے تو پھر یہ وعید ومصیبت ہم پر عائد ہوجائے گی۔

دولت اور کرسی کا نشہ

اس کے بعد نبی کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کی ایک آیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو، جس کا خلاصہ ہے کہ کیا تمہیں یہ توقع ہے کہ تم کو اگر حکومت مل جائے اور قبضہ حاصل ہوجائے تو زمین کے اندر فساد پھیلاؤ گے اور رشتہ داریوں کے حقوق کو ضائع کرو گے اور قطع رحمی کرو گے؟ یعنی عام طور پر ہوتا ایسا ہی ہے کہ آدمی کے ہاتھ میں جب کچھ پاور آتا ہے، چاہے وہ مسلس پاور ہو یا منی پاور ہو یعنی پیسوں کا پاور ہو یا طاقت وقوت کا پاور ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے ''ہم چوں من دیگرے نیست'' ہم سے بڑا کوئی نہیں ہے، پھر رشتہ داریوں کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں ان کو ضائع کرتا ہے، لوگوں کے ساتھ ظلم وزیادتیاں کرتا ہے۔ عام طور پر دولت آتی ہے یا کرسی ملتی ہے تو اسی کے نشہ میں آدمی یہ حقوق ضائع کرتا

ہے۔آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے قوت کے بل بوتے پر زمین میں فساد پھیلایا اور رشتہ داریوں کے حقوق ضائع کئے، ان پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی۔لعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دوری۔اور حق بات کے سننے سے ان کو بہرا بنا دیا اور حق کی طرف نظر کرنے سے ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا۔اس نشہ میں یہ ہوتا ہے کہ لوگ سمجھاتے بھی ہیں اور ساری دنیا ان کو اصل حقیقت دکھانے کی کوشش کرتی ہے کہ تم یہ سب غلط کر رہے ہو، لیکن ان کو نظر ہی نہیں آتا، ان کی سمجھ میں آتا ہی نہیں، کان بہرے اور آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔

حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون؟

٣١٦: وعنه رضی اللہ عنہ قال: جآءَ رَجُلٌ اِلیٰ رسولِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: یارسولَ اللّٰہِ! مَنْ أَحَقُّ النَّاسِ بِحُسْنِ صَحَابَتِیْ؟قَالَ: أُمُّكَ۔قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ۔قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: أُمُّكَ۔ قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟قَالَ: أَبُوْكَ۔ (متفق علیه)

وفی روایة: یارسول اللّٰہ! مَنْ أَحَقُّ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ؟قال: أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أُمُّكَ، ثُمَّ أَبَاكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ أَدْنَاكَ۔

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور اس نے سوال کیا، اے اللہ کے رسول، میرے حسنِ سلوک کا لوگوں میں سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیری ماں۔اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیری ماں۔اس نے پوچھا پھر کون؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تیری ماں۔اس نے پوچھا پھر کون؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تیرا باپ۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ اے اللہ کے رسول! میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہاری ماں، پھر تمہارا باپ، پھر رشتہ داری کے اعتبار سے جو جتنا قریب ہو۔

افادات: گویا حسنِ سلوک کے معاملہ میں باپ کے مقابلہ میں ماں کو تین گنا حق دیا گیا یعنی تین حصے ماں کے ہوئے اور ایک حصہ باپ کا ہوا۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں ایک ہے خدمت اور حسنِ سلوک۔ دوسرا ہے تعظیم اور حکم کی بجا آوری۔ تو تعظیم اور حکم کی بجا آوری میں ماں پر باپ مقدم ہے، اگر دونوں کے احکام میں ٹکراؤ ہو جائے اور کسی کا حکم شریعت کے خلاف نہ ہو تو باپ کا حکم مانا جائے گا۔ اور خدمت اور راحت پہنچانے کے معاملہ میں اور ہدیہ دینے کے معاملہ میں باپ پر ماں کو ترجیح ہوگی۔ اس لیے کہ ماں نے اس کے لیے تین مشقتیں اٹھائی ہیں، جب پیٹ میں تھا، جب پیدا ہوا، اور دودھ پلانے کے زمانہ میں۔ اور بعد میں جب پرورش کا زمانہ آیا تو ماں کے ساتھ باپ بھی شریک ہے، پہلے تین مرحلوں میں باپ میدان میں تھا ہی نہیں، صرف ماں ہی ماں تھی، لیکن جب بڑا ہوا اور تعلیم و تربیت کا زمانہ آیا تو اب دونوں شریک ہیں۔ تو گویا ماں نے تین گنا محنت کی ہے، اس لیے حسنِ سلوک اور خدمت و محبت کے معاملہ میں ماں کو ترجیح دی ہے، لیکن تعظیم اور حکم کو بجالانے کے معاملہ میں باپ کو ترجیح دی ہے، باپ کا حکم مقدم رکھا جائے گا۔

وہ آدمی ہلاک و برباد ہو

٣١٧: وعنه رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، ثُمَّ رَغِمَ أَنْفُ، مَنْ أَدْرَكَ أَبَوَيْهِ عِنْدَالْكِبَرِ، أَحَدَهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا، فَلَمْ يَدْخُلِ الْجَنَّةَ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اس کی ناک غبار آلود ہو، وہ آدمی ہلاک و برباد ہو، وہ آدمی ہلاک و برباد ہو؛ جس نے اپنے ماں باپ میں سے دونوں کو یا کسی ایک کو بوڑھاپے میں پایا، اس کے باوجود ان کی خدمت کر کے وہ جنت میں داخل نہ ہو سکا۔

افادات: اس لیے کہ بوڑھاپے کی حالت میں ماں باپ کو پایا، اگر وہ ان کی

خدمت کرتا تو وہ ضرور اس کو جنت میں داخل کراتے، لیکن اس نے ان کا حق ادا نہیں کیا اور جنت میں داخل نہیں ہو پایا تو اب اس کے لیے ہلاکت کے علاوہ اور کیا باقی رہا۔ اس لیے ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں خاص طور پر بوڑھاپے میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

ماں باپ کی تقسیم کا دردناک منظر

آج کل تو ایسا زمانہ آیا ہے کہ کیا کہا جائے، اللہ کی پناہ۔ ایک مولانا صاحب سنانے لگے کہ اب تو ماں باپ کو بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے؟ تو بتایا کہ بیٹوں میں جب جائیداد تقسیم ہوتی ہے تو بیٹے کہتے ہیں کہ باپ کو تو رکھ اور ماں کو مَیں رکھتا ہوں۔ پھر کیا ہوا؟ باپ کی وجہ سے جائیداد میں سے دو چار بیگہ زمین الگ کی گئی تھی، اور ماں کی وجہ سے کچھ الگ کی گئی تھی۔ اب ایسا ہوا کہ ماں کا انتقال ہو گیا، اور باپ رہ گیا، تو پھر اس میں بھی جھگڑے ہوتے ہیں۔ اب وہ بیٹا جس کے ساتھ باپ رہتا ہے وہ یوں کہتا ہے کہ والدہ کا تو انتقال ہو گیا اب تُو آرام سے بیٹھ گیا، اور میرے اکیلے پر باپ کی زحمت ہے، اس لیے اب تو بھی ان کی خدمت میں کچھ حصہ لے، ورنہ پھر زمین میں سے میرا حصہ لا۔ اللہ اکبر! یہ مزاج عام ہوتا جا رہا ہے، یعنی ماں باپ کی خدمت بھی جائیداد کی بنیاد پر کی جا رہی ہے، حالانکہ جائیداد اصل چیز تھوڑی ہے۔ پھر یہ کیا بات ہوئی کہ ایک بھائی کے یہاں ماں رہے گی اور دوسرے کے یہاں باپ رہے گا۔ حالانکہ پوری زندگی تو ان دونوں نے ایک ساتھ رہ کر زندگی گزاری، کیا یہ اولاد کی سعادتمندی کی بات ہے کہ ان کی اخیری زندگی میں ان دونوں کو الگ رکھا جائے؟ اس بات کو کون برداشت کرے گا؟ آپ تو اپنی بیوی سے الگ رہنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور ماں باپ

کے ساتھ یہ معاملہ کیا جارہا ہے؟

اچھا! یہ تو ماں باپ کی تقسیم ہوئی تھی۔اوراب تو باپ اکیلا رہ گیا تو انہوں نے یہ کیا کہ وہ کھانا ایک کے یہاں کھائیں گے، دوسرے کے یہاں غسل کرنے کے لیے جائیں گے اور سونا رہنا تیسرے کے یہاں ہوگا۔مَیں نے کہا کہ واہ بھئی واہ! یہ کیسی بات ہوئی کہ بوڑھاپے کے اندر باپ فقیروں کی طرح گداگری کرتا پھرے گا۔ یہ سب ہمارے سماج میں ہورہا ہے، اگر آپ معلوم کریں گے تو آپ کے معاشرہ میں بھی ایسے نمونے ضرور مل جائیں گے۔استغفراللہ۔

ایک افسوس ناک واقعہ

اوراب تو دھیرے دھیرے یہ مزاج بنتا جارہا ہے کہ اگر ماں باپ بوڑھے ہوگئے ہیں تو ان کو بڈھا گھر (nursing home)(نرسنگ ہوم) میں بھیج دو، یورپ اورامریکہ میں یہ طریقہ چل رہا ہے، ماں باپ بوڑھے ہوگئے تو بیٹا بڈھا گھر (nursing home)(نرسنگ ہوم) والوں سے رابطہ قائم کرکے کہتا ہے کہ مَیں اپنے ماں باپ کو آپ کے یہاں چھوڑ دیتا ہوں اوراس کی ماہانہ فیس ادا کردیتا ہوں۔یورپ والوں کو ماں باپ کی خدمت کرنے کی فرصت نہیں ہے، حالانکہ یہی جنت کمانے کا وقت تھا۔اب نتیجہ کیا ہوتا ہے؟

مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے لکھا ہے کہ کراچی میں ایک صاحب کے متعلق سنا کہ بیٹا باپ کو بڈھا گھر (نرسنگ ہوم) میں چھوڑ آیا تھا، باپ کا وہاں انتقال ہوگیا تو نرسنگ ہوم والوں نے اس کو اطلاع دی کہ آپ کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا ہے تو اس نے کہا کہ پلیز آپ ذرا ان کے کفن دفن کا انتظام کردیجیۓ، اس کا

جو بل ہو گا وہ مَیں ادا کر دوں گا، اور جنازہ کا جو وقت ہو وہ مجھے بتا دو، مَیں پہنچ جاؤں گا۔ خیر! انہوں نے جنازہ کا وقت اس کو بتایا لیکن اسی وقت صاحبزادے صاحب کی کوئی اہم میٹنگ تھی اس لیے انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اس وقت تو میری بہت اہم میٹنگ ہے، اس لیے مَیں حاضر ہونے سے قاصر ہوں، مہربانی کر کے آپ ان کو دفن کر دیں اور جو بل ہو؛ وہ مجھے بھیج دینا، مَیں ادا کر دوں گا۔ یہ ساری چیزیں جو ہمارے معاشرہ میں آرہی ہیں، وہ سب درحقیقت اسلامی تعلیمات کے سراسر خلاف ہیں۔

ایسے موقعہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے

اسلام نے جس قسم کا مکمل معاشرہ قائم کرنا چاہا اور صلہ رحمی کی تاکید کر کے آپس کے حقوق بتلائے اور ان کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا، اس کے نتیجہ میں جو محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو معاشرہ قائم ہوتا ہے؛ اس کو یورپ والے کیا جانیں۔ اور اب ہم بھی یورپ کی تقلید میں وہی حرکتیں کرنے لگے ہیں جن کا اسلامی تعلیمات اور انسانی شرافت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آدمی کو یہی سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی خدمت کا موقع دیا ہے، اور ان کی خدمت کر کے مَیں جنت کما سکتا ہوں، تو ایسے موقعہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اگر دوسرے بھائی یہ کہتے ہوں کہ ہم ماں باپ کو رکھنے کے لیے تیار ہیں تو آپ آگے بڑھ کر کہئے کہ نہیں نہیں! کچھ بھی ہو جائے، مَیں ہی ماں باپ کو رکھوں گا ہر ایک اس معاملہ میں سبقت سے کام لے، اور ہر ایک ان کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچانے کی کوشش کرے، کوئی ایک بات بھی ہماری طرف سے ایسی پیش نہیں آنی چاہیے جو اُن کی طبیعت پر گرانی کا باعث ہو۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمائے۔

۷/محرم الحرام ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۴/اپریل ۱۹۹۹ء

ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کا بیان چل رہا ہے، اس سلسلہ میں علامہ نوویؒ نے بہت ساری روایتیں پیش کیں، آج ایک اور روایت پیش کی ہے۔

کثیر الوقوع شکایت خدمتِ نبوی میں

۳۱۸: وعنه أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! اِنَّ لِیْ قَرَابَةً أَصِلُهُمْ وَيَقْطَعُوْنِیْ، وَ أُحْسِنُ اِلَيْهِمْ وَيُسِيْئُوْنَ اِلَیَّ، وَأَحْلُمُ عَنْهُمْ وَيَجْهَلُوْنَ عَلَیَّ، فَقَالَ: لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ، وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللّٰهِ ظَهِيْرٌ عَلَيْهِمْ مَادُمْتَ عَلٰى ذٰلِكَ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے رشتہ دار ہیں، مَیں تو ان کے حقوق کو ادا کرتا ہوں، لیکن رشتہ داری کی حیثیت سے میرے جو حقوق ان پر ہیں وہ ان کو ادا نہیں کرتے۔ اور مَیں ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا ہوں، محبت سے پیش آتا ہوں، اور وہ لوگ میرے ساتھ برائی سے پیش آتے ہیں۔ اور اگر ان کی طرف سے کوئی ناگوار بات پیش آ جائے تو مَیں تحمل و بردباری اور برداشت سے کام لیتا ہوں اور وہ میرے ساتھ جہالت سے پیش آتے ہیں۔ تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر واقعہ یہی ہے جیسا کہ تو نے کہا تو گویا تم اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعہ سے ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو۔ اور جب تک تم اپنے اس رویہ پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ برابر مددگار رہے گا۔

افادات: آج کل عام طور پر یہ ساری شکایتیں ہوتی ہیں، ایسے لوگ جو شریعت پر عمل کرنا چاہتے ہیں، یا مثلاً اس سے پہلے آپ نے جو روایتیں سنیں، یا آئندہ سنیں گے اس کے بعد آپ کے دل میں آیا کہ ہمیں رشتہ داری کے حقوق ادا کرنے چاہئیں اور آپ نے اس پر عمل شروع بھی کر دیا کہ آپ ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آ رہے ہیں، ان کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کر رہے ہیں، اگر ان کی طرف سے کوئی نادانی

ہو جائے تو آپ برداشت سے کام لے رہے ہیں، لیکن ان کی طرف سے جواب کے طور پر آپ کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا جو آپ ان کے ساتھ کر رہے ہیں؛ ایسے موقع پر آپ کو کیا کرنا چاہیے؟

اپنا فیصلہ کسی غیر جانبدار سمجھدار آدمی سے کرایا جائے

نبی کریم ﷺ سے یہی شکایت کی گئی کہ میرا ایسا ایسا معاملہ ہے۔ تو حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ''تیرا معاملہ واقعتاً ایسا ہی ہے جیسا کہ تو کہہ رہا ہے'' آپ ﷺ نے یہ جملہ اس لیے فرمایا کہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے طور پر یوں سمجھتا ہے کہ مَیں حق ادا کر رہا ہوں، حالانکہ دیانتداری کی بات تو یہ ہے کہ اپنے بارے میں آدمی کو خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو کسی غیر جانبدار اور سمجھدار آدمی کے سامنے پیش کرے کہ ایسا ایسا ہو رہا ہے، وہ یوں کر رہے ہیں اور مَیں یہ کر رہا ہوں، اور مَیں یوں سمجھتا ہوں کہ مَیں ان کے حقوق ادا کرتا ہوں اور وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے۔ مَیں ان کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آ رہا ہوں اور وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، مَیں اچھائی سے کام لیتا ہوں اور وہ برائی سے پیش آتے ہیں؛ اب آپ ہی بتائیے کہ دونوں طرف سے جو معاملہ ہو رہا ہے اس میں کون صحیح کر رہا ہے اور کون غلطی پر ہے۔ پوری تفصیل کسی ایسے آدمی کے سامنے رکھی جائے جو قرآن وحدیث اور اسلامی احکام سے واقف ہو اور سمجھدار ہو، اور اسی سے فیصلہ طلب کیا جائے۔

اس لیے کہ عام طور پر معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ جو دعویٰ آپ کر رہے ہیں، فریقِ مخالف بھی وہی دعویٰ کرتا ہے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ مَیں ان کا حق ادا کرتا ہوں وہ میرا حق ادا نہیں کرتے۔ اگر اُن سے پوچھا جائے کہ آپ کے متعلق یہ شکایت ہے تو وہ جواب

میں یہی کہیں گے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ مَیں ان کا حق ادا کرتا ہوں وہ میرا حق ادا نہیں کرتے۔ جو بات آپ اُن کے خلاف کہہ رہے ہیں، ہو بہو وہی دعویٰ وہ بھی آپ کے خلاف کر رہے ہیں۔ اب اگر دونوں اپنا اپنا دعویٰ لیے بیٹھے رہیں تو اس جھگڑے کا فیصلہ کبھی بھی آنے والا نہیں ہے، اس لیے جو آدمی سمجھدار اور شریعت کے احکام سے واقف ہو، اس کے سامنے بات پیش کیجئے، اگر آپ کی کوئی کمزوری ہے اور آپ کی طرف سے کوئی کمی اور فالٹ ہے تو اس کی طرف سے اس بات کی نشاندہی کی جائے گی کہ اس بارے میں آپ فالٹ میں ہیں، آپ کو اس کی اصلاح کرنی چاہیے، اور اُن کی طرف سے جو ہو رہا ہے اس سلسلہ میں بھی آپ کو ہدایت دی جائیگی۔

اکابر کا طرزِ عمل

ہمارے اکابر کو دیکھا کہ اپنا ذاتی کوئی بھی معاملہ ہوتا تو باوجود اس کے کہ ان کے پاس وافر علم ہے، بہت بڑے آدمی ہیں لیکن دوسروں سے رجوع فرماتے۔ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کی مجلس میں بارہا دیکھا کہ جب کوئی مسئلہ پیش آتا تھا اور حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لاتے تو فرماتے کہ مفتی جی! ایسا معاملہ ہے، اب آپ بتلاؤ کیا کیا جائے؟ ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ پیش فرماتے تھے، حالانکہ خود سب کچھ سمجھتے تھے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کا نفس کبھی خیانت کر جاتا ہے اور ہمارے اکابر تو اپنے نفس پر اعتماد کرتے ہی نہیں تھے کہ معلوم نہیں کب وہ خیانت کر لے، اور ہم لوگ ہیں کہ اپنے نفس پر بالکل مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں کہ ہم برابر ٹھیک ٹھاک چل رہے ہیں، ہماری طرف سے کہیں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی۔ حالانکہ اپنے معاملہ میں آدمی کے نفس کو اپنی کمزوری نظر نہیں آتی

اور وہ اپنے متعلق یہی سوچتا، سمجھتا اور فیصلہ کرتا ہے کہ مَیں جو کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک کر رہا ہوں، اور سامنے والی پارٹی اور دوسرے فریق کی طرف سے میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ اس لیے خود کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

ان کے منہ میں گرم راکھ

یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے کوئی تفصیل تو پوچھی ہی نہیں تھی بلکہ ارشاد فرمایا کہ اگر تم جو کہہ رہے واقعتاً ایسا ہی ہے تو گویا تم اپنے اس طرزِ عمل کے ذریعہ سے ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو۔ ویسے بھی کوئی سفوف آدمی پھانکتا ہے تو وہ جلدی سے گلے سے نہیں اترتا، اور راکھ تو کھانے کی چیز ہے ہی نہیں اور وہ بھی گرم ہو تو کتنی تکلیف دہ ہوگی۔ آپ ﷺ کے جواب کا حاصل یہ ہے کہ تم حق ادا کرتے ہو اور وہ ادا نہیں کرتا، تم اس کے ساتھ اچھائی سے پیش آتے ہو اور وہ تمہارے ساتھ برائی سے پیش آتا ہے، تو تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تم اپنی اس روش کے ذریعہ سے یوں سمجھو کہ اس کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہے ہو، اور جب تک تم اپنے اس رویہ پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ برابر مددگار رہے گا۔

ایک مددگار فرشتہ کا ساتھ

حدیثِ پاک میں ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ایک آدمی بُرا بھلا کہہ رہا تھا، حضرت اس کو جواب نہیں دے رہے تھے بلکہ خاموش تھے، حضور ﷺ بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برابر دیکھ رہے تھے، اور دیر تک ایسا ہوتا رہا، جب اس نے بہت زیادتی کی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دینا شروع کیا، اب حضورِ اکرم ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا بات ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم خاموش تھے، اُس وقت تک ایک فرشتہ تمہاری طرف سے اس کی باتوں کا جواب دے رہا تھا، لیکن جب تم نے جواب دینا شروع کیا تو وہ فرشتہ ہٹ گیا۔ (ابوداود شریف، ۴۸۹۶)

اور یہ بات سمجھ میں بھی آنے والی ہے، مَیں آپ کو ایک مثال دوں کہ آپ کے دو بیٹے لڑ رہے ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کر رہا ہے، تو تھوڑی دیر تک آپ یہ تماشہ دیکھیں گے کہ ایک کی طرف سے دوسرے پر کیا زیادتی ہو رہی ہے، اور جب آپ نے دیکھا کہ اس کی زیادتی ختم نہیں ہو رہی ہے اور دوسرا اس کو کوئی جواب بھی نہیں دے رہا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لیں گے، اور جو زیادتی کر رہا ہے اس کو آپ خود سزا دیں گے۔ اور اگر آپ نے دیکھا کہ ایک نے کچھ کیا اور دوسرے نے بھی اس کا جواب دیدیا تو اب معاملہ نمٹ گیا، اب آپ کسی کی طرف سے کوئی کاروائی نہیں کریں گے۔ قدرت کی طرف سے بھی بندوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ خیر! تو یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تک تم اپنے اس رویہ پر قائم رہو گے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ برابر مددگار رہے گا۔ آج کل یہ شکایت بہت عام ہوگئی ہے جیسا کہ آگے ایک دوسری روایت آرہی ہے۔

مؤمن کی سوچ بڑا بدلہ ہونی چاہیے

اور مَیں اس باب کے شروع میں بتلا چکا ہوں کہ مؤمن کا جو بھی عمل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہوتا ہے، ہم اس کے ساتھ جو بھلائی کر رہے ہیں اور اس کے حقوق کو ادا کر رہے ہیں وہ اس لیے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے، ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے کر رہے ہیں، اب اگر وہ اس

کے جواب میں ہمارے ساتھ بھلائی سے پیش نہیں آتا اور ہمارے حقوق ادا نہیں کرتا تو ہمیں دل گرفتہ ہونے اور پریشان وغمگین ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے تو جو کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لیے کیا تھا، اور جس کا حکم پورا کرنے کے لیے ہم نے کیا ہے وہ ان شاء اللہ ہم کو دنیا اور آخرت میں ضرور بدلہ دے گا۔ بھائی! جس کے لیے کام کیا ہے وہاں سے تنخواہ لو، جیسے کسی آدمی کو بادشاہِ وقت نے کہا کہ فلاں کا یہ کام کردو، اور اس نے وہ کام کردیا، تو جس کا کام کیا ہے وہ آدمی اگر معاوضہ میں کچھ دینا چاہے گا تو یہ قبول کرے گا؟ نہیں کرے گا، بالکل منع کردے گا اور کہے گا کہ بادشاہ سلامت نے کام کرنے کا کہا ہے، اس لیے کیا ہے، مجھے تو وہاں سے بدلہ ملنے والا ہے۔ اور اگر اس نے یہاں سے قبول کرلیا تو وہاں سے جو بڑا بدلہ ملنے والا تھا وہ نہیں ملے گا۔

بہر حال! مؤمن جو بھی کرتا ہے وہ اللہ واسطے کرتا ہے، اس لیے جو آدمی یہ کہتا ہے کہ مَیں اس کے حقوق ادا کرتا ہوں اور وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتا، مَیں ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آتا ہوں وہ میرے ساتھ برائی سے پیش آتے ہیں، اس کو یہ سوچنا چاہیے کہ مَیں ان کے جو حقوق ادا کررہا ہوں یا ان کی باتوں پر تحمّل و برداشت سے کام لے رہا ہوں وہ اس لیے کررہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا ہے، اور مَیں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کررہا ہوں، اور جس کا حکم پورا کررہا ہوں وہ مجھے ضرور بدلہ دے گا، یہ ہمارے ساتھ جو چاہے کرے، اسے ہمیں نہیں دیکھنا ہے۔ دراصل ہماری سوچ یہی ہونی چاہیے۔ اگر ہم یہ سوچ لیں تو پھر سامنے والے کے کسی بھی سلوک کی وجہ سے کبھی ہمیں ناگواری نہیں ہوگی، ہمارے دل کو اطمینان ہوگا کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کیا ہے۔ اگر آدمی کی یہ سوچ بن جائے تو کبھی اس کے معاملات میں تبدیلی نہیں آئے گی اور وہ

اپنے طرزِعمل پر باقی رہے گا۔ ہاں! دل پر ذرا اثر تو ہوتا ہے لیکن وہ اس سے صرفِ نظر کرتا ہے اوراس وقت نبی کریم ﷺ کے یہ ارشادات پیشِ نظر ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری مدد ہورہی ہے۔ اس لیے یہ بڑی اہم اور ضروری چیز ہے۔

جوآدمی روزی میں برکت کا طالب ہو

٣١٩: عن أنس رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: مَنْ أَحَبَّ أَن يُّبْسَطَ لَهُ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَأَ لَهُ فِيْ أَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جوآدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کی روزی میں کشادگی ہو، اس کو برکت والی روزی ملے، اوراس کی عمر کے اندر زیادتی ہوتو وہ صلہ رحمی کرے یعنی رشتہ داروں کے حقوق کوادا کرے۔

افادات: گویا رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں یہ بدلہ ملتا ہے کہ اس کی روزی کشادہ ہوتی ہے اوراس کی عمر میں برکت ہوتی ہے حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رشتہ داری ایسی چیز ہے کہ وہ جس طرح دنیا میں اس کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنی، اسی طرح جب ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا جائے گا تو دنیا میں زیادہ رہنے کا بھی ذریعہ بنے گی۔

ایک سوال اوراس کا جواب

اب یہاں بعض لوگوں کوسوال ہوتا ہے کہ عمر کی زیادتی اورروزی کی کشادگی کیسے ہوسکتی ہے؟ حالانکہ سب چیز تقدیر میں لکھی جاچکی ہے؟ تواس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ تقدیر کے مختلف طبقات ہیں، درجہ بدرجہ مختلف مراحل ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ لکھا ہے کہ اگر آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تواس کی روزی میں

کشادگی ہوگی اور اس کی عمر میں زیادتی ہوگی، یہ ایک مرحلہ ہوا، پھر دوسرے مرحلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صلہ رحمی کرے گا یا نہیں، اگر اس مرحلہ میں یہ بھی طے ہوگیا ہے کہ صلہ رحمی کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کی روزی میں کشادگی ہونے ہی والی ہے اور عمر بڑھنے والی ہے۔اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ روزی میں کشادگی کا ذریعہ صلہ رحمی والا عمل بنا۔

بہر حال! یہ چیز دنیوی اعتبار سے بھی مفید ہے اور آخرت میں بھی اس کا بدلہ ملنے والا ہے۔اور اس کے برعکس بھی ہے۔اسی لیے لکھا ہے کہ دنیا میں کسی نیکی کا بدلہ اتنا جلدی نہیں ملتا جتنا صلہ رحمی کا ملتا ہے۔فوراً روزی میں برکت ہوتی ہے اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے،اور کسی برائی کی سزا اتنی جلدی نہیں ملتی جتنی قطع رحمی کی ملتی ہے کہ اس کی وجہ سے فوری اثر روزی پر پڑتا ہے، روزی میں تنگی آتی ہے اور عمر کی برکت ختم ہوجاتی ہے۔

حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک

٣٢٠۔وعنه رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ أَبُوطَلْحَةَ رضی اللہ عنہ أَكْثَرَالْأَنصارِ بِالْمَدِيْنَةِ مَالاً مِّنْ نَخْلٍ، وَكَانَ أَحَبُّ أَمْوَالِهِ اِلَيْهِ بَيْرَحَاء،وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَالْمَسْجِدِ،وَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَدْخُلُهَاوَيَشْرَبُ مِن مَّآءٍ فِيْهَاطَيِّبٍ۔قَالَ أنسٌ:فَلَمَّانَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ﴿لَنْ تَنالُوْا الْبِرَّحَتّٰى تُنفِقُوْا مِمَّاتُحِبُّوْنَ﴾قَامَ أَبُوطَلْحَةَ اِلىٰ رَسولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: يَارَسولَ اللّٰهِ!اِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ أَنْزَلَ عَلَيْكَ﴿لَنْ تَنَالُوْاالْبِرَّ حَتّٰى تُنفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾وَاِنَّ أَحَبَّ مَالِىْ اِلَیَّ بَيْرَحَآءُ، وَاِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالىٰ أَرْجُوْا بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَاللّٰهِ تَعَالىٰ،فَضَعْهَا يَارَسولَ اللّٰهِ حَيْثُ أَرَاكَ اللّٰه. فَقَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: بَخٍّ!ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ،ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ۔ وَقَدْسَمِعْتُ مَاقُلْتَ۔ وَاِنِّىْ أَرىٰ أَنْ تَجْعَلَهَا فِى الْأَقْرَبِيْنَ، فَقَالَ أَبُوطَلْحَةَ:أَفْعَلُ يَارَسُولَ اللّٰهِ، فَقَسَّمَهَا

أَبُوطَلْحَةَ فِيْ أَقَارِبِهِ، وَبَنِيْ عَمِّهِ۔ (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انصار میں سب سے زیادہ کھجور کے باغات کے مالک حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ تھے، اوران کوان میں سب سے زیادہ محبوب باغ ''بیرحاء'' تھا، اوروہ باغ بالکل مسجدِ نبوی کے سامنے تھا، اورخود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھار وہاں تشریف بھی لے جاتے تھے اوراس میں جو میٹھا پانی تھا اس کونوش بھی فرماتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں جب یہ آیت نازل ہوئی کہ تم کامل نیکی نہیں پاسکتے جب تک کہ اپنی محبوب چیز کوخرچ نہ کرو، توحضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اُٹھے اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بڑھے اورعرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آپ پر یہ آیت نازل فرمائی، اورمیری جائیداد، اموال اورملکیتوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب مال ''بیرحاء'' نامی باغ ہے۔ لہٰذا یہ باغ میری طرف سے اللہ کے راستہ میں صدقہ ہے، مَیں اس باغ کے خرچ کرنے پر اللہ تعالیٰ سے نیکی اورثواب کی توقع اوراُمید رکھتا ہوں، اس لیے اے اللہ کے رسول! اس باغ کوآپ جہاں چاہیں صَرف کریں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واہ واہ! یہ توبڑا عمدہ اورنفع بخش مال ہے، یہ توبڑا نفع بخش مال ہے، اورتم نے جوبات کہی وہ مَیں نے سن لی۔ پھرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بجائے اس کے کہ خود لے کراس کوصَرف فرماتے، ان کو یہ مشورہ دیدیا کہ مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تمہارے رشتہ داروں میں جوغریب ومحتاج ہیں، آپ ان کودیدیجئے۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اسی طرح کروں گا۔ اس کے بعد حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اس باغ کواپنے چچازاد بھائیوں کے درمیان تقسیم کردیا۔

افادات: ''بیرحآء'' نامی باغ مسجدِ نبوی کے بالکل سامنے تھا، اب تووہ جگہ بھی مسجدِ نبوی کے نئے اضافہ شدہ حصہ میں آچکی ہے، بابِ مجیدی کی طرف ایک پتھر پر بیرحاء لکھا ہوا بھی ہے۔

مَیں پہلے بھی بتلاچکا ہوں کہ آدمی جب خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تواپنے مال میں جوگھٹیا چیز ہوتی ہے اسی کواختیار کرتا ہے، مثلاً ''کپڑے'' توجواستعمال شدہ ہیں وہ دو۔ ''کھانا'' جوبچ گیا ہے وہ دو۔ چیزوں میں بھی جواپنے کام کی نہیں رہی ہے وہ دو۔

عمر میں بھی جب آخری منزل آتی ہے، اور کاروبار کے لائق نہیں رہتا، تو کہتا ہے کہ اب مسجد میں بیٹھو۔ خیر! یہ ساری چیزوں کی توفیق بھی اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مل جائے تو بڑی چیز ہے، لیکن یہ بات ہے کہ اگر آدمی اپنی چیزوں میں سے بڑھیا اور عمدہ چیزیں اگر اللہ کے لیے دینے لگے؛ تو اس کا بدلہ بھی بڑا ملے گا۔

بہر حال! جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تو اِن چیزوں پر بڑھ چڑھ کر عمل کرنے والے تھے ہی، اس لیے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا کہ تم نیکی کامل طور پر حاصل نہیں کر سکتے یہاں تک کہ جو مال تمہیں محبوب اور پسند ہے اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرو، اور میری جائیدادوں میں جو مجھے سب سے زیادہ پسندیدہ جائیداد ہے وہ بیرحاء نامی باغ ہے، اس کو مَیں اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہوں اور مَیں اس کی نیکی کی اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھتا ہوں اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ اس کی نیکی اللہ تعالیٰ کے یہاں میرے لیے ذخیرہ ہوگی، لہٰذا یا رسول اللہ! یہ باغ آپ جہاں مناسب سمجھیں وہاں خرچ کردیں، آپ کو پورا اختیار دیتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ واہ واہ! یہ تو بہت بڑھیا اور عمدہ مال ہے اور تم نے جو کہا وہ مَیں نے سن لیا اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ دیا کہ مَیں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ تم اس باغ کو اپنے رشتہ داروں میں جو غریب ہیں ان کے درمیان تقسیم کردو۔ اس پر حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ ضرور مَیں اسی پر عمل کرتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے چچازاد بھائیوں میں وہ باغ تقسیم کردیا۔

تو رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک بھی ہوا اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا ثواب بھی ملا۔

ماں باپ کی خدمت جہاد بھی اور ہجرت بھی

٣٢١: وعن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قال: أَقْبَلَ رَجُلٌ اِلیٰ نَبِیِّ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: أُبَایِعُکَ عَلیٰ الْھِجْرَۃِ وَالْجِھَادِ، أَبْتَغِی الْأَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ۔ قَالَ: فَھَلْ لَّکَ مِنْ وَالِدَیْکَ أَحَدٌ حَیٌّ؟ قَالَ: نَعَمْ بَلْ کِلَاھُمَا۔ قَالَ: فَتَبْتَغِی الْأَجْرَ مِنَ اللّٰہِ تَعَالیٰ؟ قَالَ: نَعَمْ۔ قَالَ: فَارْجِعْ اِلیٰ وَالِدَیْکَ، فَأَحْسِنْ صُحْبَتَھُمَا۔

(متفق علیہ) وھٰذا لفظ مسلم۔

وفی روایۃ لھما: جَآءَ رَجُلٌ، فَاسْتَأْذَنَہُ فِی الْجِھَادِ، فَقَالَ: أَحَیٌّ وَالِدَاکَ؟ قَالَ: نَعَمْ۔ قَالَ: فَفِیْھِمَا فَجَاھِدْ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں آپ کے ہاتھ پر جہاد کی اور ہجرت کی بیعت کرتا ہوں، اور اس بیعت سے میرا مقصود اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟ اس نے کہا جی ہاں! دونوں زندہ ہیں۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: واقعتاً تو اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اس نے کہا جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں باپ کے پاس جاؤ اور ان کی اچھی خدمت کرو۔

دوسری روایت میں ہے: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان میں جہاد کرو۔

افادات: اس زمانہ میں جو لوگ ایمان لاتے تھے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہجرت اور جہاد کی بیعت کرتے تھے۔ اور مَیں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ حقیقی نیکی اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر چلنا ہے، اپنی مرضی پر نہیں۔

اہم سے روک کر غیر اہم میں ڈالنا شیطانی حربہ ہے

اور شیطان کی عادت یہ ہے کہ وہ انسان کو نیک کام کی طرف آنے ہی نہیں دیتا اس کی پہلی کوشش تو یہی ہوتی ہے آدمی نیکی کا ارادہ ہی نہ کرے، اور اگر اس نے ارادہ کرلیا تو پھر جو کام موقع کے اعتبار سے اہم اور ضروری ہوتا ہے اس کو چھڑوا کر غیر اہم کام کی اہمیت اس کے دل میں ڈال دیتا ہے تاکہ اگر ثواب پاوے تب بھی زیادہ نہ پاسکے، اسی لیے آدمی جو کام کررہا ہو اس میں اپنا ذاتی فیصلہ کرنے کے بجائے اس معاملہ میں جو جانکار ہوں ان سے مشورہ لینا چاہیے کہ اس وقت میرے لیے کیا مناسب ہے۔

عام طور ہوتا یہ ہے کہ والدین موجود ہوتے ہیں اور وہ اس کی خدمت کے محتاج ہوتے ہیں، ان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے باوجود ان کی خدمت کے بجائے وہ دوسرے کاموں میں لگا رہتا ہے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگرچہ شریعت کے ضروری احکام کا علم حاصل کرنا ہر آدمی پر فرضِ عین ہے، لیکن اگر اس کے ماں باپ اس کی خدمت کے محتاج ہیں اور اس کے وہاں سے ہٹ جانے کی صورت میں ان کو ضرر ہوگا تو وہ وہاں سے نکل نہیں سکتا، اس کے لیے وہیں ان کے پاس رہنا ضروری ہے۔ اور اگر وہ خدمت کے محتاج نہیں ہیں اور اجازت نہ دیں تو فرضِ عین کے لیے نکل سکتا ہے، لیکن فرضِ کفایہ کے لیے ان کی اجازت کے بغیر باہر جانا جائز نہیں ہے۔

بہرحال! شیطان یہ کرتا ہے کہ جو اہم چیز ہے اس سے اس کا دھیان ہٹا دیتا ہے اور غیر اہم کام میں اس کو مشغول کردیتا ہے۔ اس کے بعد ماں باپ کی خدمت کا موقع جب ہاتھ سے نکل جاتا ہے تو پھر جس کام میں لگا ہوا تھا اس کے بارے میں بھی وسوسے ڈالنا شروع کردیتا ہے اور پھر اُدھر سے بھی دھیان ہٹا دیتا ہے۔ عام طور پر یہ

چیزیں آدمی کو پیش آتی ہیں، ایک قسم کا انتشار پیدا کرنا ہی شیطان کا کام ہے، ہر چیز میں اس کی ایسی کوشش لگی رہتی ہے، اس لیے آدمی کو پہلے سے اس سلسلہ میں اہلِ علم سے مشورہ کر کے آگے اقدام کرنا چاہیے، تاکہ اس کی نوبت نہ آئے۔

دوسری روایت میں ہے کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور جہاد میں جانے کی اجازت چاہی، حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان میں جہاد کرو یعنی ان کی خدمت کر کے جہاد کا ثواب حاصل کرو۔

صلہ رحمی کرنے والا کون ہے؟

۳۲۲۔وعنه رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِيءِ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلَ الَّذِیْ اِذَاقُطِعَتْ رَحِمُهٗ وَصَلَهَا. (رواه البخاری)

ترجمہ: انہی سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی برابر کا بدلہ دے وہ صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے جس کا حق ادا نہ کیا جائے لیکن وہ حق ادا کرتا رہے۔

افادات: عام طور پر رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں ہم لوگوں کا مزاج یہ بنا ہوا ہے کہ اگر وہ ہمارے ساتھ اچھائی کر رہا ہے تو ہم بھی اس کے ساتھ اچھائی کریں گے، اور اگر وہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا اور ہمارے حقوق ادا نہیں کرتا تو ہم بھی اس کے حقوق کی ادائیگی کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کوئی سمجھاتا ہے تو کہتے ہیں کہ جب وہ ہمارے حق ادا نہیں کرتا تو ہم کیوں ادا کریں۔ حالانکہ ہم پر اس کے جو حقوق شریعت نے واجب کئے ہیں اس میں ایسی کوئی قید نہیں لگائی ہے کہ اگر وہ تمہارا حق ادا کرے تب ہی تم پر اس کا حق واجب ہوتا ہے۔ بلکہ ہم کو الگ سے یہ حکم دیا

گیا ہے کہ تم پر تمہارے رشتہ داروں کے یہ حقوق ہیں، اب ہم کو تو اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہے، اگر ہم ان حقوق کو ادا نہیں کریں گے تو اس کے متعلق وہاں پوچھ ہوگی، وہاں ہم یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ باری تعالیٰ! انہوں نے تو ہمارے حقوق ادا نہیں کئے تھے اس لیے ہم نے بھی ادا نہیں کئے۔ یہ جواب وہاں کارآمد بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے اگر وہ ہمارے ساتھ اچھائی کا سلوک کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھائی کا سلوک کریں؛ اس کا نام صلہ رحمی نہیں ہے، یہ تو برابری کا معاملہ ہوا۔

بھائی! کوئی پرایا اور اجنبی آدمی جس کے ساتھ ہماری کوئی قرابت اور رشتہ داری نہیں ہے وہ بھی جب ہمارے ساتھ بھلائی کرے گا تو اگر آدمی کی طبیعت کے اندر شرافت ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ بھلائی کرے گا، اس میں رشتہ داری کی کیا خصوصیت ہوئی۔ بلکہ کوئی کافر بھی ہمارے ساتھ بھلائی کرے گا تو ہم اس کے ساتھ بھی بھلائی کریں گے، تو بھلائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کرنا اس میں رشتہ داری کا معاملہ کہاں آتا ہے؟ یہ تو ایک الگ مسئلہ ہو گیا۔ صلہ رحمی کا مطلب تو یہ ہوا کہ اس کی تمہارے ساتھ رشتہ داری ہے؛ فقط اسی کو سامنے رکھ کر آپ اس کے ساتھ بھلائی کیجئے، چاہے وہ آپ کے ساتھ بھلائی کرے یا نہ کرے، اسی کو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں "لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِي" جو آدمی بھلائی کے بدلہ میں بھلائی کرے وہ صلہ رحمی کرنے والا نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں صلہ رحمی کرنے والا تو وہ ہے کہ سامنے والا حق ادا نہیں کرتا تب بھی یہ اس کا حق ادا کرے۔

ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے

کوئی آپ کے ساتھ برائی کرتا ہے اور بدلہ میں آپ بھی اُس کے ساتھ برائی کریں؛

تو اُس میں اور آپ میں فرق کیا ہوا؟ آپ کو تو چاہیے کہ وہ برائی کرے تب بھی آپ اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آئیں۔ عربی کا محاورہ ہے "کُلُّ اِنَاءٍ یَتَرَشَّحُ بِمَا فِیْہِ" ہر برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ ہم تو اپنے اندر بھلائی ہی بھلائی بھرے رکھیں، پھل دار درخت پر اگر کوئی آدمی پتھر مارے تو جواب میں وہ پھل ہی دے گا، پتھر نہیں۔

ہارون رشید اور ایک غلام

ہارون الرشید بہت بڑا بادشاہ تھا، اس کی حکومت کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ ایک مرتبہ ایک بادل جا رہا تھا اس کو دیکھ کر ہارون الرشید نے یوں کہا کہ اے بادل! تو کہیں بھی جا کر برس؛ تیرے پانی سے جو کھیتی پیدا ہوگی اس کا خراج میرے خزانے میں ہی آنے والا ہے۔ اتنی بڑی سلطنت تھی۔ خیر! یحییٰ بن اکثم ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بڑے تابعی گذرے ہیں، ایک مرتبہ انہوں نے ہارون الرشید کے یہاں رات گذاری، رات کے وقت بادشاہ سلامت کو پیاس لگی تو انہوں نے اپنے غلام کو آواز دی کہ ذرا پانی پلاؤ۔ غلام نیند میں سے اُٹھا اور کہنے لگا کہ دن میں بھی چین نہیں اور رات کو بھی چین سے سونے نہیں دیتے، ایسا کہہ کر پھر سو گیا۔ بادشاہ سلامت نے خود ہی اٹھ کر جا کر پانی لیا اور پیا۔ یحییٰ بن اکثم کہتے ہیں کہ مَیں نے کہا کہ امیر المؤمنین! آپ اس کو کوئی تنبیہ نہیں کرتے؟ غلام ہو کر اس طرح نامناسب جواب دیتا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اگر مَیں اس کو تنبیہ کروں گا تو مَیں اپنے اخلاق خراب کروں گا، اور مَیں اپنے اخلاق بگاڑ کر اس کے اخلاق سدھارنا نہیں چاہتا۔

پھر ایک وقت آئے گا

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ رشتہ دار اگر ہمارے ساتھ بھلائی کریں تب ہی ہم اپنے

رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کریں؛اس کا نام صلہ رحمی نہیں ہے۔حضور ﷺفرماتے ہیں کہ یہ تو برابر کا بدلہ ہوا،اور یہ رشتہ دار کی خصوصیت نہیں ہے،اجنبی آدمی بھی بھلائی کرے گا تو ہم اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کریں گے۔صلہ رحمی تو یہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ برائی کریں تب بھی ہم ان کے ساتھ بھلائی کریں،اس لیے یہی معاملہ ہونا چاہیے،ہمیں اپنی طرف سے وہی معاملہ کرنا چاہیے جس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے۔جیسے ایک کہاوت ہے کہ کتا کاٹے تو ہم جواب میں کاٹتے نہیں ہیں۔مطلب یہ ہے کہ کوئی برائی کا معاملہ کرے تو ہم جواب میں برائی کا معاملہ نہ کریں، بلکہ ہم تو اچھائی کا معاملہ ہی کریں،خاص کر رشتہ داروں کے معاملہ میں تو یہ بہت ہی ضروری ہے۔اگر اسی طرح سب سوچتے رہیں گے تو پھر آخر رشتہ داروں کے حقوق کیسے ادا ہوں گے؟ آپ تو ان کے ساتھ اس طرح پیش آتے رہیے کہ اگر کسی روز وہ آپ کے ساتھ تعلقات ٹھیک کرلیں تو آپ کو پشیمانی،ندامت اور پچھتاوے کی نوبت نہ آوے،اس کو زندگی بھر پچھتاوا رہے کہ وہ میرے ساتھ اب تک برابر اچھا سلوک کر رہا ہے،مَیں ہی نالائق ہوں،اس کا ضمیر اس کو ملامت کرے گا،آپ کا ضمیر مطمئن رہے گا،آپ کے دل میں کبھی تکلیف نہیں ہوگی۔اور ہم اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ صرف اللہ تعالیٰ کا حکم پورا کرنے کے لیے کریں، جب اس نیت سے کریں گے تو ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ جو ہمارے ساتھ بدسلوکی سے پیش آرہا ہے وہ بھی سدھر جائے گا اور اس کے حالات بھی درست ہوجائیں گے۔

رشتہ داری کی دعا

۲۲۳ : وعن عائشة رضی اللّٰہ عنها قالت: قال رسول اللّٰہ ﷺ: اَلرَّحِمُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ تَقُوْلُ: مَنْ وَصَلَنِیْ وَصَلَهُ اللّٰهُ،وَمَنْ قَطَعَنِیْ قَطَعَهُ اللّٰهُ. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ رشتہ داری عرش کے پاس لٹکی ہوئی یہ دعا کرتی رہتی ہے کہ جو مجھے جوڑے گا اللہ اسے جوڑیں گے اور جو مجھے توڑے گا اللہ اسے توڑیں گے۔

افضلیت موقع محل کے اعتبار سے ہوتی ہے

٢٢٤: عن أم المؤمنين ميمونة بنت الحارث رضى للّٰه عنها أَنَّهَا أَعۡتَقَتۡ وَلِيۡدَةً، وَلَمۡ تَسۡتَأۡذِنِ النَّبِيَّ ﷺ۔فَلَمَّا كَانَ يَوۡمُهَا الَّذِىۡ يَدُوۡرُ عَلَيۡهَا فِيۡهِ، قَالَتۡ: أَشَعَرۡتَ يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ! أَنِّىۡ أَعۡتَقۡتُ وَلِيۡدَتِىۡ؟ قَالَ: أَوَفَعَلۡتِ؟ قَالَتۡ: نَعَمۡ۔ قَالَ: أَمَا إِنَّكِ لَوۡ أَعۡطَيۡتِهَا أَخۡوَالَكِ كَانَ أَعۡظَمَ لِأَجۡرِكِ. (متفق عليه)

ترجمہ: اُم المؤمنین میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ انہوں نے ایک باندی آزاد کی، اوراس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے مشورہ نہیں کیا۔ جب ان کی باری کا دن آیا اور نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی فلاں باندی آزاد کردی۔ حضور ﷺ نے پوچھا: اچھا! ایسا کرچکی ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! آزاد کرچکی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی وہ باندی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تم کو زیادہ ثواب ملتا۔

افادات: نبی کریم ﷺ کی نو (۹) ازواجِ مطہرات تھیں اور ہر ایک کی ایک ایک دن کی باری تھی، اس طرح نویں دن ایک کی باری آتی تھی، جب ان کی باری کا دن آیا اور نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے گئے تو انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی فلاں باندی آزاد کردی۔ غلام و باندی کو آزاد کرنے کی بڑی فضیلت ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی ایک غلام یا باندی کو آزاد کردے تو اللہ تعالیٰ اس آزاد ہونے والے غلام کے ہر ہر عضو کے بدلہ میں آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو جہنم سے رہائی عطا فرمائیں گے۔ خیر! انہوں نے اطلاع

دی کہ آپ کو معلوم ہے کہ مَیں نے اپنی فلاں باندی آزاد کردی؟ حضور ﷺ نے پوچھا: اچھا! ایسا کرچکی ہو؟ انہوں نے کہا کہ جی ہاں! آزاد کرچکی ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم اپنی وہ باندی اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو تم کو زیادہ ثواب ملتا۔

حالانکہ آزاد کرنا بہت بڑی فضیلت والا کام ہے لیکن دراصل ان کے ماموں کو باندی اور نوکرانی کی ضرورت تھی، اس لیے حضور ﷺ نے ان کو یہ مشورہ دیا کہ اس کو باندی باقی رکھتے ہوئے ماموؤں کو ہدیہ دے دیتیں تو تم کو ثواب زیادہ ملتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بظاہر کسی کام کو ہم زیادہ بڑا سمجھتے ہیں لیکن اس کے مقابلہ میں دوسرا کام دوسری حیثیت سے ثواب میں بڑھ جاتا ہے۔ چوں کہ یہاں باندی ان کو ہدیہ کرنی تھی اور ساتھ ہی ان کی ضرورت پوری کرنی تھی اور پھر ساتھ ہی رشتہ داری کے حق کو بھی ادا کرنا تھا؛ یہ ساری باتیں پائی گئیں اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس میں ثواب زیادہ تھا۔ ویسے تو باندی کو آزاد کرنا کسی کو ہدیہ کرنے کے مقابلہ میں فضیلت کی چیز ہے، لیکن یہاں دوسری حیثیت سے ثواب بڑھ جاتا۔

غیر مسلم رشتہ دار اور حسنِ سلوک

۳۲۵: عن أسماءَ بنتِ أَبِیْ بَکْرٍ الصِّدِّیْقِ رضی اللہ عنہا قَالَتْ: قَدِمَتْ عَلَیَّ أُمِّیْ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ فِیْ عَھْدِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ، فَاسْتَفْتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہ ﷺ قُلْتُ: قَدِمَتْ عَلَیَّ أُمِّیْ وَھِیَ رَاغِبَۃٌ، أَفَأَصِلُ أُمِّیْ؟ قَالَ: نَعَمْ، صِلِیْ أُمَّكِ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت اسماء فرماتی ہیں کہ میری والدہ جو مشرکہ تھیں صلح والے زمانہ میں مجھ سے ملنے مدینہ آئیں تو مَیں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ میری ماں میرے یہاں کچھ ضرورت لیکر آئی ہیں، کیا مَیں ان کی ضرورت پوری کردوں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ان کی ضرورت کو پورا کرو، اور ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔

افادات: حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، ان کی والدہ کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسلام نہ لانے کی وجہ سے طلاق دے کر الگ کر دیا تھا، اور پھر وہ دوسرے کے نکاح میں تھیں، جب ٦ ھ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ والوں کے ساتھ صلح ہوئی تو مکہ والوں کا مدینہ منورہ آنا جانا شروع ہو گیا، اور حضرت اسماء کی والدہ جو مشرکہ تھیں، وہ بھی اپنی بیٹی کے پاس اسی زمانہ میں مکہ سے مدینہ منورہ ملنے کے واسطے آئیں تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! میری ماں میرے یہاں کچھ درخواست اور ضرورت لے کر آئی ہیں، تو کیا مَیں ان کی وہ ضرورت پوری کر دوں اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کروں؟ چوں کہ وہ غیر مسلمہ تھیں اس لیے پوچھنا پڑا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جی ہاں! ان کی ضرورت کو پورا کرو، اور ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو۔

مطلب یہ ہوا کہ رشتہ دار اگر غیر مسلم ہو تب بھی ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا چاہیے۔ ماں باپ اگر غیر مسلم ہوں تو ان کے ساتھ تو حسنِ سلوک کا حکم قرآنِ پاک کی اس آیت کے ذیل میں گذر چکا جو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے موقع پر نازل ہوئی تھی، اور وہاں تفصیل بتلا دی تھی۔

۱۴/محرم الحرام ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱/مئی ۱۹۹۹ء

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کی تاکید کے سلسلہ میں بیان چل رہا ہے اسی سلسلہ میں ایک اور روایت پیش کر رہے ہیں۔

٣٢٦: عَنْ زَيْنَبَ الثَّقَفِيَّةِ امْرَأَةِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللّٰه عنه وعنها قالتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: تَصَدَّقْنَ يَامَعْشَرَ النِّسَآءِ وَلَوْمِنْ حُلِيِّكُنَّ۔ قَالَتْ: فَرَجَعْتُ اِلٰى عبدِاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ فَقُلْتُ لَهُ: اِنَّكَ بِرَجُلٍ خَفِيْفُ ذَاتِ الْيَدِ، وَاِنَّ رَسولَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ أَمَرَنَا بِالصَّدَقَةِ، فَأْتِهِ، فَاسْأَلْهُ، فَاِنْ كَانَ ذٰلِكَ يُجْزِىءُ عَنِّىْ، وَاِلَّا صَرَفْتُهَا اِلٰى غَيْرِكُمْ۔ فَقَالَ عبدُاللّٰهِ: بَلِ ائْتِيْهِ أَنْتِ۔ فَانْطَلَقْتُ، فَاِذَا امْرَأَةٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ بِبَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، حَاجَتِىْ حَاجَتُهَا، وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ قَدْ أُلْقِيَتْ عَلَيْهِ الْمَهَابَةُ، فَخَرَجَ عَلَيْنَا بِلَالٌ، فَقُلْنَا لَهُ: ائْتِ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، فَأَخْبِرْهُ أَنَّ امْرَأَتَيْنِ بِالْبَابِ تَسْأَلَانِكَ، أَتُجْزِىءُ الصَّدَقَةُ عَنْهُمَا عَلٰى أَزْوَاجِهِمَا وَعَلٰى أَيْتَامٍ فِىْ حُجُوْرِهِمَا؟ وَلَا تُخْبِرْهُ مَنْ نَحْنُ۔ فَدَخَلَ بِلَالٌ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَسَأَلَهُ، فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللّٰهِ ا: مَنْ هُمَا؟ قَالَ: اِمْرَأَةٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ وَزَيْنَبُ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَىُّ الزَّيَانِبِ هِىَ؟ قَالَ: اِمْرَأَةُ عَبْدِاللّٰهِ۔ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَهُمَا أَجْرَانِ، أَجْرُ الْقَرَابَةِ، وَأَجْرُ الصَّدَقَةِ۔ (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت زینب ثقفیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے عورتوں کی جماعت! صدقہ کرو چاہے اپنے زیورات ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ جب میں مجلسِ وعظ سے واپس اپنے شوہر کے گھر لوٹی، تو میں نے اپنے شوہر سے کہا کہ (آج نبی کریم ﷺ نے ہم کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی، اور اس ترغیب کی وجہ سے میں

اللہ کے راستہ میں کچھ خرچ کرنا چاہتی ہوں، اب چوں کہ) آپ کے پاس ہی کچھ نہیں ہے اس لیے آپ نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر پوچھیں کہ میں جو کچھ اللہ کے راستہ میں نکالنا چاہتی ہوں؛ کیا وہ آپ کو دے سکتی ہوں؟ ورنہ پھر کسی دوسرے پر خرچ کروں گی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو نہیں جاتا، تم ہی جاؤ اور پوچھو۔ حضرت زینب فرماتی ہیں کہ میں پوچھنے کے لیے حضور ﷺ کے درِ اقدس پر گئی تو دیکھا کہ ایک اور انصاری عورت بھی اسی مقصد سے حضور کے دروازہ پر آئی ہوئی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو قدرتی طور پر ایک ہیبت عطا فرمائی تھی کہ جس کی وجہ سے کوئی آدمی جلدی سے آپ سے کوئی سوال نہیں کر پاتا تھا، اس لیے اس سلسلہ میں پوچھنے کے واسطہ ہم جھجک رہی تھیں اور آپ کے دروازہ پر ہی کھڑی تھیں کہ اچانک حضرت بلال رضی اللہ عنہ گھر سے نکلے، تو ان دونوں نے حضرت بلال سے کہا کہ آپ حضورِ اقدس ﷺ کے پاس تشریف لے جائیے اور بتلائیے کہ دروازہ پر دو عورتیں کھڑی ہیں اور آپ سے یہ سوال پوچھ رہی ہیں کہ صدقہ اگر ہم اپنے شوہروں پر کریں اور ہماری گود میں جو یتیم بچے پرورش پا رہے ہیں ان پر اگر خرچ کریں؛ تو کافی ہے یا نہیں؟ اور نبی کریم ﷺ کو یہ مت بتلائیو کہ ہم کون ہیں۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نبی کریم ﷺ کے پاس گئے اور ان کا مسئلہ پوچھا تو نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ پوچھنے والیاں کون ہیں؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتلا دیا کہ ایک انصاری عورت ہے اور ایک زینب ہیں، تو حضور اکرم ﷺ نے پوچھا کہ کون سی زینب ہے؟ کہا کہ حضرت ابن مسعود کی اہلیہ۔ پھر نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ ان کو بتلا دو کہ ان کو دوہرا اور ڈبل ثواب ملے گا، ایک تو صلہ رحمی کا اور ساتھ ہی ساتھ صدقہ کا ثواب بھی ملے گا۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق

افادات: (۱) نبی کریم ﷺ کے گھریلو امور حضرت بلال رضی اللہ عنہ انجام دیا کرتے تھے، خاص کر جو مال آتا جاتا تھا اس کا حساب و کتاب حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے پاس ہی رہا کرتا تھا، جو مہمان آتے تھے ان کی ذمہ داری بھی انہی کے سر تھی، اور وہی انتظام کرتے تھے، کبھی پیسے نہ ہوتے تو وہی کہیں سے قرض لے آتے تھے، بعد میں جب نبی کریم ﷺ کے پاس مال آتا تھا تو ادا کر دیا کرتے تھے۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے واسطہ جو مال خرچ کیا جائے اس کو صدقہ کہتے ہیں، اب اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری قرار دیا گیا ہے؛ تو وہ صدقاتِ واجبہ میں شمار ہوگا۔ اور اگر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضروری قرار نہیں دیا گیا ہے، لیکن آدمی اپنے طور پر اللہ کے لیے مال نکال رہا ہے؛ تو وہ صدقاتِ نافلہ میں شمار ہوگا۔ صدقہ کا مطلب ہی ہوتا ہے وہ مال جو اللہ کے واسطہ نکالا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کسی کو دیا جائے یعنی اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہو۔ اس کے علاوہ ایک ہدیہ ہوتا ہے، اس میں جس کو دیا جاتا ہے اس کو خوش کرنا مقصود ہوا کرتا ہے، اس میں بھی ثواب ملتا ہے، لیکن ایک الگ حیثیت سے ملا کرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ ہدیہ میں آپس میں محبت بھی پیدا ہوتی ہے۔ بہر حال! عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہدیہ ایک الگ چیز ہے اور صدقہ الگ چیز ہے۔

اور صدقہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک واجب اور دوسرا نفل۔ واجب تو انہی لوگوں کو دیا جا سکتا ہے جو محتاج ہوں، جن کو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف نفل صدقہ کے لیے کوئی قید نہیں ہے وہ کسی کو بھی آپ دے سکتے ہیں، مسلمان ہو یا غیر مسلم، امیر ہو یا غریب، البتہ اگر امیر کو دیں گے تو صدقہ نہیں بلکہ ہدیہ کہلائے گا، چاہے آپ دل میں صدقہ کی نیت کریں تب بھی وہ ہدیہ ہی کہلائے گا۔ کتابوں میں یہی لکھا ہوا ہے۔

(۳) حدیث سے معلوم ہوا کہ نفلی صدقہ اپنی اولاد اور شوہر کو بھی دے سکتے ہیں۔

زکوٰۃ اصل زیور ہی میں ہے

تو نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو تاکید فرمائی کہ اے عورتوں کی جماعت! اللہ کے واسطہ مال کو خرچ کرو، چاہے اپنے زیورات ہی میں سے کیوں نہ ہو۔ یعنی کوئی مال نہیں

ہے تو زیور ہی کو اللہ کے واسطہ خرچ کرو۔ چوں کہ عورتیں زیور کے معاملہ بہت زیادہ بخل سے کام لیتی ہیں، یہاں تک کہ زیور کی جو زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اس کی ادائیگی کے لیے بھی اگر پیسے نہ ہوں تو زکوٰۃ ادا نہیں کریں گی، اور اس میں تاخیر کریں گی۔ حالانکہ زکوٰۃ جو فرض ہوتی ہے وہ اصل اسی مال میں فرض ہوتی ہے جس پر زکوٰۃ عائد کی گئی ہے مثلاً زیور ہے تو مان لیجئے کہ اگر کسی کے پاس دس تولہ زیور ہے تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ کے طور پر واجب ہوگا، تو وہ اس زیور ہی میں واجب ہوتا ہے، اب ہم جو پیسے دیتے ہیں تو وہ اس کے بدلہ میں ہوجاتا ہے، اور اس سے بھی زکوٰۃ ادا تو ہوجاتی ہے، ورنہ اصل زکوٰۃ جو واجب ہوئی وہ تو اسی زیور کا چالیسواں حصہ واجب ہوا ہے، اسی کو نکالنا چاہیے، لیکن اگر کوئی آدمی اس زیور کا چالیسواں حصہ نکالنے کے بجائے اس چالیسویں حصہ کی قیمت ادا کردے؛ تب بھی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔ عام طور پر عورتیں یوں سمجھتی ہیں کہ ہمارے پاس زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زکوٰۃ معاف ہوجاتی ہے، بلکہ ایسی صورت میں جس زیور میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس زیور ہی کا چالیسواں حصہ نکالا جائے اور اسی کو زکوٰۃ کے طور پر دیدیا جائے، اس میں تاخیر نہ کی جائے۔

بنیادی تعلیمات میں سے صلہ رحمی بھی ہے

۳۲۷: وعن أبی سفیانَ صَخْرِبْنِ حَرْبٍ ﷛ فِیْ حَدِیْثِہِ الطَّوِیْلِ فِیْ قِصَّۃِ ھِرَقْلَ، أَنَّ ھِرَقْلَ قَالَ لِأَبِیْ سُفْیَانَ: فَمَاذَا یَأْمُرُکُمْ بِہٖ؟ یَعْنِی النَّبِیَّ ﷺ، قَالَ قُلْتُ یَقُوْلُ: اُعْبُدُوااللّٰہ وَحْدَہٗ، وَلَاتُشْرِکُوْابِہٖ شَیْئاً، وَاتْرُکُوْامَایَقُوْلُ آبَاءُ کُمْ وَیَأْمُرُنَا بِالصَّلٰوۃِوَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ وَالصِّلَۃِ.

ترجمہ: حضرت ابوسفیان ﷛ سے ایک لمبی روایت منقول ہے جس میں ہرقل والا پورا واقعہ

موجود ہے، اس میں ہرقل نے ابوسفیان سے سوال کیا کہ یہ نبی جو تمہارے درمیان آئے ہیں وہ تم کو کس چیز کا حکم دیتے ہیں؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ وہ ہمیں جن چیزوں کا حکم دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کسی اور کی پوجا مت کرو، اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور تمہارے آباء واجداد اور پرانے لوگ جو شرکیہ باتیں کہا کرتے تھے ان سب کو چھوڑ دو۔ اور یہ نبی ہم کو نماز کا، سچائی کا، پاکدامنی کا، اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتے ہیں۔

افادات: یہ روایت پہلے بھی کئی موقعوں پر آ چکی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جب دنیا کے مختلف حکمرانوں کے نام دعوتِ اسلام کے خطوط لکھے، تو قیصرِ روم جس کا نام ہرقل تھا اس کو بھی نبی کریم ﷺ نے نامۂ مبارکہ روانہ کیا، حضرت دحیہ کلبیؓ وہ خط لے کر گئے تھے، اور بُصریٰ جو شام کے علاقہ میں ایک جگہ ہے وہاں کا حاکم اس ہرقل کے ماتحت تھا اس کے حوالہ کیا اور اس نے وہ خط ہرقل تک پہنچایا۔ ہرقل نے بیت المقدس کی زیارت کی منت مانی تھی اور اس منت کو پورا کرنے کے لیے اس زمانہ میں ہرقل شام ہی آیا ہوا تھا، اس کو وہ خط وہیں پہنچایا گیا اور اس کو بتلایا گیا کہ یہ خط عرب سے ایک شخص نے آپ کے نام بھیجا ہے اور وہ شخص اپنے آپ کو اللہ کا بھیجا ہوا نبی کہتے ہیں۔ تو ہرقل نے نبی کریم ﷺ کا وہ نامۂ مبارک کھول کر پڑھنے سے پہلے مناسب سمجھا کہ آپ ﷺ کے متعلق تحقیق کر لی جائے کہ جنہوں نے یہ خط میرے پاس بھیجا ہے وہ کون ہیں؟ وہ خود بھی کتبِ سابقہ کا بڑا عالم تھا، اس زمانہ میں نصاریٰ میں دو بڑے عالم تھے ایک تو یہ خود ہرقل اور دوسرا ضَغَاطِرُ نامی آدمی تھا جو اُن کا مذہبی پیشوا (لاٹ پادری) تھا۔ اس لیے اس نے پوچھا کہ جہاں سے یہ خط آیا ہے اس علاقہ کے کچھ لوگ یہاں ہیں؟ اس زمانہ میں

نبی کریم ﷺ کی قریش کے ساتھ صلح ہوچکی تھی اور قریش کا ایک تجارتی قافلہ شام پہنچا ہوا تھا اور اس قافلہ کے سردار ابوسفیان تھے جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے، بلکہ اس وقت قریشِ مکہ کے سرغنہ یہی تھے۔ چنانچہ بتلایا گیا کہ ایک تجارتی قافلہ آیا ہوا ہے، تو ہرقل نے دربار قائم کیا اور ان قافلہ والوں کو بلایا اور اپنے سامنے ان سب کو بٹھایا اور پوچھا کہ تمہارے قافلہ میں ان خط بھیجنے والی شخصیت کا نسبی اور خاندانی اعتبار سے سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار کون ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ مَیں ہوں۔ چنانچہ ان کو سب سے آگے بٹھایا اور باقی سب کو ان کے پیچھے بٹھایا اور ان سے کہا کہ مَیں ان سے کچھ سوالات کرتا ہوں، اگر یہ درست جواب دیں تب تو ٹھیک ہے، اور اگر کوئی غلط جواب دیں تو تم لوگ بتلا دینا اور پھر اس نے کچھ سوالات کئے، ان میں ایک سوال یہ بھی کیا تھا ''فَمَاذَا یَأْمُرُکُمْ بِهِ؟'' یہ نبی جو تم میں آئے ہیں، تم کو کس چیز کا حکم دیتے ہیں اور کون سے کام کرنے کی تاکید کرتے ہیں؟ ابوسفیان کہتے ہیں کہ مَیں نے اس کو جواب دیا کہ وہ ہمیں جن چیزوں کا حکم دیتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ صرف ایک اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے علاوہ کسی اور کی پوجا مت کرو اور اس کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور تمہارے آباء واجداد اور پرانے لوگ جو شرکیہ باتیں کہا کرتے تھے ان سب کو چھوڑ دو۔ اور یہ نبی ہم کو نماز کا، سچائی کا، پاک دامنی کا، اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتے ہیں۔

بس! یہاں اس روایت کو اسی لیے پیش کیا ہے کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ کی بنیادی تعلیمات جن کو تمام اہلِ عرب جانتے تھے، اور وہ لوگ جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے ان کو بھی جب پوچھا گیا تو ابوسفیان نے نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کی اہم اور بنیادی چیزیں

ہرقل کے سامنے پیش کیں، ان میں رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا بھی تذکرہ کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات میں یہ چیز بڑی اہمیت رکھتی تھی اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس کو وہ لوگ بھی سمجھتے تھے جو ابھی تک اسلام نہیں لائے تھے۔ اس لیے اس چیز کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

مصر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

٣٢٨: وعنْ أَبی ذرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّكُم سَتَفْتَحُونَ أَرْضاً يُذْكَرُ فِيهَا الْقِيرَاطُ.

وفی رواية: سَتَفْتَحُونَ مِصْرَوَهِیَ أَرْضٌ يُسَمّٰی فِيهَاالْقِيرَاطُ، فَاسْتَوْصُوا بِأَهْلِهَا خَيراً، فَاِنَّ لَهُمْ ذِمَّةًوَرَحِماً.

وفی رواية: فَاِذَا افْتَتَحْتُمُوهَا، فَأَحْسِنُوااِلیٰ أَهْلِهَا، فَاِنَّ لَهُمْ ذِمَّةً وَرَحِماً. أوقال: ذِمَّةً وَصِهْراً. (رواه مسلم)

قَالَ العلماءُ: الرَّحِمُ الَّتِیْ لَهُمْ كَوْنُ هَاجَرَاُمِّ اِسْمَاعِيلَ علیہ السلام مِنْهُمْ. ((وَالصِّهْرُ)): كَوْنُ مَارِيَةَ أُمِّ اِبرَاهِيمَ بْنِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِنْهُمْ۔

ترجمہ: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم ایک سرزمین اور ملک فتح کرو گے جہاں قیراط کا سکہ چلتا ہے۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم اس ملک کو فتح کرو تو وہاں کے رہنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اس لیے کہ وہاں کے رہنے والے ذمی بن کر تمہارے ماتحت رہیں گے، اور ان کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے۔ علماء نے فرمایا کہ قریش کی یہ رشتہ داری حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ کی وجہ سے تھی کہ وہ اصلاً مصر کی رہنے والی تھیں۔ اور سسرالی رشتہ داری اس طرح تھی کہ نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ ماریہ قبطیہ کا تعلق مصر سے تھا۔

افادات: دس قیراط کا ایک درہم ہوا کرتا ہے اس روایت میں جس ملک کی

طرف اشارہ کیا ہے وہ ملکِ مصر ہے، جس وقت نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا اس وقت مصر فتح نہیں ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں وہ فتح ہوا اور اس کو فتح کرنے والے لشکر کے سپہ سالار حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ تھے۔ نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی سے پیشین گوئی فرمادی تھی کہ جس ملک میں قیراط کا سکہ چلتا ہے، اس ملک کو تم لوگ فتح کروگے، اور ساتھ ہی آپ نے یہ ہدایت وتاکید بھی فرمائی تھی کہ اس ملک کے رہنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔ اور اس کی وجہ یہ بتلائی تھی کہ جب تم اس ملک کو فتح کروگے تو وہاں کے رہنے والے ذمی بن کر تمہارے ماتحت رہیں گے۔

اسلام میں ذمی کے حقوق کی رعایت

جو لوگ اسلام قبول کرلیں ان کے لیے تو وہی احکام ہیں جو مسلمانوں کے لیے ہیں اور ان کو جان ومال وغیرہ کی وہ ساری سہولتیں اور فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں جو مسلمانوں کو دیے جاتے ہیں، لیکن ذمی کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ملک میں جو غیر مسلم آباد ہیں، وہ لوگ جب اسلامی حکومت کو تسلیم کرلیں اور وہیں رہائش منظور کرلیں تو ان کو کچھ خراج اور ٹیکس ادا کرنا ہوتا ہے، اور اس خراج کی ادائیگی کے بدلہ میں ان کو بھی جان اور مال کی حفاظت کی وہی گارنٹی دی جاتی ہے جو ایک مسلمان کے لیے ہوا کرتی ہے، بلکہ ان کے لیے مزید سہولت یہ ہے کہ اگر کبھی دشمن کی طرف سے کوئی حملہ ہو، یا دشمن سے مقابلہ کی نوبت آئے تو ہر مسلمان کا فرض ہوتا ہے کہ اگر حاکم کی طرف سے کہا جائے یا جہاد کا عام اعلان ہو تو وہ مقابلہ کے لیے باہر نکلے، لیکن غیر مسلم رعایا پر یہ ذمہ داری عائد نہیں ہوتی، اور مذہبی پوری پوری آزادی بھی ان کو حاصل ہوتی ہے یعنی اسلامی حکومت میں رہتے ہوئے اپنے مذہب پر پوری آزادی سے عمل کرسکتے ہیں۔

مصر والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی وجہ

بہرحال! ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی ایک وجہ تو یہ بتلائی کہ جب وہ اسلامی حکومت میں داخل ہوں گے تو عقدِ ذمہ (یعنی ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوگا اس) کی وجہ سے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا۔ اور حضور ﷺ نے دوسری وجہ یہ بھی بیان فرمائی کہ ان کے ساتھ رشتہ داری بھی ہے۔ وہ رشتہ داری کون سی ہے؟ یہ عرب والے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، قریش ان ہی سے نسبی تعلق رکھتے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ مصر کی تھیں، اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے ساتھ تمہاری رشتہ داری بھی ہے۔ یہاں بتلانا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کتنی دور کی رشتہ داری کا لحاظ فرمایا، اس لیے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی کئی پیڑھیوں اور نسلوں کے بعد نبی کریم ﷺ کا زمانہ آتا ہے، لیکن اس رشتہ داری کے لحاظ کی نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی اور اسی کی بنیاد پر اس ملک کے رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی ہدایت فرمائی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رشتہ داری کے کتنے حقوق ہیں۔ اور جتنی قریبی رشتہ داری ہوگی اتنے زیادہ حقوق عائد ہوں گے اور اس کا اتنا ہی لحاظ بھی کیا جائے گا۔

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کے ساتھ سسرالی رشتہ بھی ہے یعنی نبی کریم ﷺ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا تھیں جن سے نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے تھے وہ بھی مصر ہی کی رہنے والی تھیں، تو اس سسرالی رشتہ کا بھی لحاظ کیا گیا۔

اپنے رشتہ داروں کو ڈرایئے

٣٢٩: وعن أبي هريرة رضي الله عنه قَالَ لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ ﴿وَأَنْذِرْ

عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ دَعَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قُرَيْشاً، فَاجْتَمَعُوا، فَعَمَّ وَخَصَّ۔ وَقَالَ: يَابَنِي عَبْدِشَمْسٍ يَا بَنِي كَعْبِ بْنِ لُؤَيٍّ! أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِي مُرَّةَ بْنِ كَعْبٍ! أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِي عَبْدِمَنَافٍ! أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِي هَاشِمٍ! أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَابَنِي عَبْدِالْمُطَّلِبِ! أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَافَاطِمَةُ! أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ، فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً، غَيْرَ أَنَّ لَكُمْ رَحِماً، سَأَبُلُّهَا بِبِلَالِهَا۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآنِ پاک کی یہ آیت ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ نازل ہوئی، کہ آپ اپنے قریبی خاندان والوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرائیے، تو نبی کریم ﷺ نے تمام قبیلۂ قریش کو بلایا جب سب جمع ہوگئے تو آپ ﷺ نے عمومی اور خصوصی انداز میں خطاب فرمایا، کہ اے بنوعبد شمس اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ اے بنوکعب بن لوی! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ اے بنومرہ بن کعب! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ اے بنوعبد مناف! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ اے بنوہاشم! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ اے بنوعبدالمطلب! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ اے فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ۔ میں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں، البتہ تمہاری میرے ساتھ رشتہ داری ہے، اس کو میں تر کرتا رہوں گا۔

افادات: بنوعبد مناف نبی کریم ﷺ کے والد صاحب کے پردادا اور ہاشم کے والد ہوتے ہیں۔ اور آپ ﷺ اوپر سے شروع فرما کر نیچے تک آئے، یہاں تک کہ اپنی صاحبزادی کو بھی خصوصی خطاب فرمایا۔ اور نبی کریم ﷺ نے اپنے والد صاحب کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا کہ حضرت عبداللہ کی اولاد میں صرف آپ ﷺ تھے۔ لیکن دادا کی اولاد میں دوسرے چچا اور ان کی اولاد تھیں، اس لیے ان کا نام لیا اور اس کے بعد اپنی صاحبزادی کا نام لیا۔ یہاں نبی کریم ﷺ نے تمام خاندان والوں کو الگ الگ خطاب فرمایا۔ بتلانا یہی

چاہتے ہیں کہ دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے اپنے اہلِ خاندان کو اللہ کے عذاب سے ڈرانے کا حکم دیا تھا، اس حکم کو پورا کرنے کے لیے آپ ﷺ نے تمام کو الگ الگ خطاب فرمایا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اوپر جوں جوں آدمی کے نسب کا سلسلہ بڑھتا ہے، توں توں ان کے حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں، پھر قریب والے کا حق ادا کرنے کے بعد اس کے بعد والے کا، اور پھر اس کے بعد والے کا حق آتا ہے، اس لیے ان تمام کا خیال رکھا جائے۔

پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو! اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے بچاؤ، یعنی اگر تم اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرو گے اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچاؤ گے تب ہی جہنم کی آگ سے بچ سکو گے، مَیں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں یعنی اس معاملہ میں میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ویسے نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی، لیکن اگر کوئی آدمی ایمان نہیں لائے گا تو اس کے حق میں شفاعت کا اختیار نہیں دیا گیا ہے۔

پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! البتہ تمہاری میرے ساتھ رشتہ داری ہے، مطلب یہ ہے کہ تم ایمان لے آؤ، اور اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے چھڑالو، اگر ایمان نہیں لاؤ گے تو پھر مَیں تمہارے کسی کام نہیں آؤں گا، اس کے باوجود چوں کہ تمہارے ساتھ میری رشتہ داری رہے گی، اس کے حقوق کی ادائیگی کا مَیں خیال کروں گا، اور اس کو تر کرتا رہوں گا یعنی تراوٹ اور نمی پہنچاتا رہوں گا، مطلب یہ ہے کہ تمہاری رشتہ داری کی حیثیت سے جو حقوق میرے اوپر عائد ہوتے ہیں ان کو تو یقیناً دنیا کے اندر مَیں ادا کروں گا، لیکن اگر ایمان قبول نہیں کیا اور اپنے آپ کو جہنم کے عذاب سے نہیں بچایا تو پھر مجھے آخرت میں تمہارے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں ہوگا۔

رشتہ داری کے حق کی ادائیگی میں کفر مانع نہیں

٣٣٠۔وعن أبی عبداللّٰہ عمروبن العاص ﷛ قال: سمعتُ رسولَ اللّٰہِ ﷺ جِھَاراً غَیرَسِرٍّ یَقُولُ:اِنَّ آلَ بَنِیْ فُلانٍ لَیسُوْابِأَوْلِیَآئِیْ، اِنَّماوَلِیِّیَ اللّٰہُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ، وَلٰکِنْ لَّھُمْ رَحِماً أَبُلُّھَا بِبِلالِھَا۔

ترجمہ: حضرت عمرو بن عاص ﷛ فرماتے ہیں کہ کھل کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا یعنی یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ آل بنوفلان میرے دوست اور ساتھی نہیں ہیں، میرے ساتھی تو اللہ تعالیٰ اور نیک ایمان والے ہیں،لیکن ان کے ساتھ میری رشتہ داری ہے،مَیں اس کو نمی پہنچاتا رہوں گا۔

افادات:''آل بنوفلان'' کہہ کر آپ ﷺ نے اپنے ساتھ جن کی رشتہ داریاں تھیں ان میں سے کسی کا تذکرہ کیا۔بعض شرّاح فرماتے ہیں کہ آپ نے ابوطالب کا تذکرہ کیا تھا۔پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ فلاں خاندان والے اگرچہ ایمان نہیں لائے لیکن ان کے ساتھ میری رشتہ داری ہے،اوران کے حقوق کوادا کرنے کامَیں اہتمام کروں گا اوراس رشتہ کا خیال رکھوں گا،اس کو نمی پہنچاتا رہوں گا۔اس سے معلوم ہوا کہ رشتہ داری کی وجہ سے آدمی پر جوحق آتا ہے اس کی ادائیگی میں کفر بھی مانع نہیں ہے۔

جنت اور جہنم والے اعمال

٣٣١:وعن أبی أیوب خالدبن زیدالأنصاری أَنَّ رَجُلاً قَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! أَخْبِرْنِیْ بِعَمَلٍ یُدْخِلُنِی الْجَنَّۃَ وَیُبَاعِدُنِیْ مِنَ النَّارِ۔فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: تَعْبُدُ اللّٰہَ وَلا تُشْرِكُ بِہٖ شَیْئاً،وَتُقِیْمُ الصَّلٰوۃَ وَتُؤْتِی الزَّکٰوۃَ، وَتَصِلُ الرَّحِمَ.(متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت خالد بن زید انصاری ﷛ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلادیجئے جو مجھے جنت میں داخل کرادے اور جہنم سے دور کردے،اس کے جواب میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو،اس کے

ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور صلہ رحمی کرو۔

اس صدقہ پر دوہرا اجر و ثواب ہے

۳۳۲: وعن سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ عن النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِذَا أَفْطَرَ أَحَدُکُمْ فَلْیُفْطِرْ عَلیٰ تَمْرٍ فَاِنَّهٗ بَرَکَةٌ، فَاِنْ لَّمْ یَجِدْ تَمْراً فَالْمَآءُ، فَاِنَّهٗ طَهُوْرٌ، وَقَالَ: اَلصَّدَقَةُ عَلیٰ الْمِسْکِیْنِ صَدَقَةٌ، وَعَلیٰ ذِی الرَّحِمِ ثِنْتَانِ: صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ. (رواه الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ: حضرت سلمان بن عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آدمی روزہ افطار کرے تو کھجور سے افطار کرے، اس لیے کہ اس میں برکت ہے۔ اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی سے افطار کرے، اس لیے کہ وہ پاک کرنے والا ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی غریب پر صدقہ کرنے میں تو صرف صدقہ کا ثواب ہے اور کسی رشتہ دار پر صدقہ کرنے میں (صدقہ اور صلہ رحمی کا) دوہرا ثواب ہے۔

افادات: بتلانا یہ چاہتے ہیں اگر آدمی صدقہ کرنا چاہتا ہو تو پہلے اس کو دیکھ لینا چاہیے کہ اگر اس کے رشتہ داروں میں کوئی ایسا ہے جو اس صدقہ کا اہل ہے تو پہلے اسی پر صدقہ کرے۔ پہلے بھی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت گذر چکی ہے کہ انہوں نے عرض کیا کہ مَیں نے ایک باندی آزاد کی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آزاد کرنے کے بجائے تم اپنے ماموؤں کو دے دیتیں، تو تم کو زیادہ ثواب ملتا، حالانکہ آزاد کرنے کا بڑا اجر و ثواب ہے لیکن چوں کہ وہاں ان کے ماموؤں کو ضرورت تھی اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بیٹے سے اس کی بیوی کو طلاق دینے کا کہہ سکتا ہے؟

۳۳۳: وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قَالَ: کَانَتْ تَحْتِیْ امْرَأَةٌ وَکُنْتُ أُحِبُّهَا

وَكَانَ عُمَرُ يَكْرَهُهَا، فَقَالَ لِيْ: طَلِّقْهَا،فَأَبَيْتُ،فَأَتَىٰ عُمَرُ رضی اللہ عنہ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم، فَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ،فَقَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم: طَلِّقْهَا .(رواه أبوداود والترمذی وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے نکاح میں ایک عورت تھی، مَیں اس سے بہت زیادہ محبت کرتا تھالیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ پسندنہیں فرماتے تھے کہ وہ عورت میرے نکاح میں رہے،اس لیے انہوں نے مجھے حکم دیا کہ مَیں اس کوطلاق دیدوں،لیکن مَیں نے انکارکیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اورآپ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا،تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:اس کوطلاق دیدو۔

افادات: ظاہر ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے آدمی طلاق کاحکم دے رہے ہیں تو بلاوجہ تونہیں کہتے ہوں گے۔شرّاح نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا اپنی بیوی کے ساتھ زیادہ تعلق ہونے کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ محسوس کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے ان کوکوئی دینی ضرر پہنچے۔اسی حدیث کی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ نے توعلی الاطلاق لکھاہے کہ اگر والدین کسی بیٹے سے اس کی بیوی کوطلاق دینے کے لیے کہیں تواس کوطلاق دے دینی چاہیے یعنی اگر دین کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہواور والدین طلاق دینے کا کہیں تو طلاق دیدے۔لیکن دوسرے حضرات لکھتے ہیں کہ اگر والدین کا یہ مطالبہ بے جاہےاورناانصافی سے وہ ایسا حکم دیتے ہیں،تواس حکم کوماننا ضروری نہیں ہے۔

زیادتیاں دونوں طرف سے ہوتی ہیں

اس سلسلہ میں حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کاایک رسالہ ''تعدیلِ حقوقِ والدین'' کے نام سے بہشتی زیور کے ضمیمہ کے طور پرنویں حصہ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ چوں کہ ہمارے معاشرہ میں زیادتیاں دونوں طرف سے ہوتی ہیں،کہیں توصاحبزادے کو بیوی

کے ساتھ اتنی محبت ہوتی ہے کہ ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا، اور کہیں ماں باپ کے ساتھ اتنا زیادہ تعلق ہوتا ہے کہ بیوی کی حق تلفی ہوتی ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ نے اس رسالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ دونوں کو اعتدال کا خیال رکھنا چاہیے اور خاص کر والدین اگر پڑھے لکھے اور شریعت کے احکام سے واقف ہوں تو ان کو تو اعتدال کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

بہر حال! یہاں تو طلاق کا مطالبہ کرنے والے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے اور ظاہر ہے کہ وہ تو شریعت کے احکام سے واقف تھے اور جن کی رائے کے موافق وحی نازل ہوا کرتی تھی۔ پندرہ مواقع ایسے ہیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے موافق وحی نازل ہوئی ہے، اس لیے وہ کوئی ایسی نامناسب بات نہیں کہیں گے۔ لہٰذا والدین اگر شرعی احکام سے واقف ہیں اور وہ حکم دے رہے ہیں تو پھر یقیناً اس پر عمل کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ احکامِ شرع سے واقف نہیں ہیں اور وہ ایسا حکم دے رہے ہیں تو پھر اس صورت میں اہلِ علم سے مشورہ کر لیا جائے۔

جنت کا سب سے عمدہ دروازہ

٣٣٤: وعن أبی الدرداء رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلًا أَتَاهُ فَقَالَ: اِنَّ لِیُ امْرَأَةً وَاِنَّ أُمِّیَ تَأْمُرُنِیُ بِطَلَاقِهَا، فَقَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم يَقُوْلُ: اَلْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَاِنْ شِئْتَ، فَأَضِعْ ذٰلِكَ الْبَابَ، أَوِ احْفَظْهُ. (رواه الترمذی وقال: حديثٌ حسنٌ صحيحٌ)

ترجمہ: ایک آدمی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بیوی ہے اور میری والدہ حکم دیتی ہے کہ تم اس کو طلاق دیدو؛ تو مَیں کیا کروں؟ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ والد جنت کا سب اونچا اور عمدہ دروازہ ہے، اب اگر تو چاہے تو اس کو باقی رکھ، اور اگر تو چاہے تو اس کو ضائع کر دے۔

افادات: والد یعنی جس سے پیدا ہوا ہے، ماں اور باپ دونوں کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اور ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کے حکم پر عمل کرتے ہوئے تو اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔

خالہ بھی ماں کے درجہ میں ہے

۳۲۵: وعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْخَالَةُ بِمَنْزِلَةِ الْأُمِّ. (رواہ الترمذی)

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خالہ ماں کے درجہ میں ہے۔

افادات: یعنی جس طرح ماں کی خدمت کرنی چاہیے اسی طرح خالہ کی بھی خدمت کرنی چاہیے، اور ماں کی عدمِ موجودگی میں خالہ کو ہی حضانت یعنی پرورش کا حق حاصل ہوتا ہے۔ یہ ارشاد نبی کریم ﷺ نے ایک خاص موقع پر فرمایا تھا۔

شانِ ورود

نبی کریم ﷺ عمرۃ القضاء کے لیے ۷ھ میں تشریف لے گئے تھے۔ جب آپ وہاں سے واپس لوٹ رہے تھے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو حضور ﷺ کے چچا ہیں ان کی صاحبزادی جو تقریباً چار سال کی تھی، دوڑتی ہوئی چچا چچا کہتی ہوئی آپ ﷺ کے پیچھے ہولی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُس کو اُٹھا کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ کر دیا کہ اس کو سنبھالو۔ پھر جب مدینہ منورہ پہنچے تو اس بچی کی پرورش کے سلسلہ میں تین آدمیوں میں اختلاف ہوا، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، دوسرے ان کے بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ اور تیسرے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ۔ ان تینوں میں سے ہر ایک اس بات کا دعویدار تھا کہ اس بچی

کی پرورش کا حق ہمیں ملنا چاہیے اور ہم ہی اسے اپنے پاس رکھیں گے، اور ہم ہی اس کی پرورش کریں گے۔ یہ تینوں اپنا معاملہ لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، نبی کریم ﷺ نے فیصلہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ فرماتے ہوئے کر دیا کہ ان کے نکاح میں حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ہیں جو اس بچی کی خالہ ہیں اور خالہ ماں کے درجہ میں ہے۔ حضور ﷺ نے یہ جملہ اسی موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔

(بخاری شریف، کتاب المغازی، باب عمرۃ القضاء۔ رقم ۴۲۵۱۔ ۲/۶۱۰۔ السیرۃ النبویۃ الصحیحۃ، ۲/۴۶۵)

بہر حال! یہاں تو اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ خالہ کے ساتھ بھی آدمی کو وہی معاملہ کرنا چاہیے جو اپنی والدہ کے ساتھ کرتا ہے، خاص طور پر والدہ کی عدمِ موجودگی میں تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کرنے سے وہی سارا ثواب ملے گا جو والدہ کے ساتھ کرنے کی صورت میں ملتا تھا۔

صلہ رحمی کا حکم شروع ہی سے دیا جاتا تھا

۳۲۶۔ وعن عمرو بن عبسة رضی اللہ عنہ فی حدیثه الطویل قال فیه: دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ ﷺ بِمَکَّةَ یَعْنِی فِی أَوَّلِ النُّبُوَّةِ، فَقُلْتُ لَهُ: مَا أَنْتَ؟ قَالَ: نَبِیٌّ۔ فَقُلْتُ: وَمَا نَبِیٌّ؟ قَالَ: أَرْسَلَنِیَ اللّٰهُ تَعَالیٰ، فَقُلْتُ: بِأَیِّ شَیْءٍ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ: أَرْسَلَنِی بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ، وَکَسْرِ الْأَوْثَانِ، وَأَنْ یُّوَحَّدَ اللّٰهُ لَا یُشْرَكُ بِهِ شَیْءٌ.

ترجمہ: حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ سے ایک طویل روایت میں منقول ہے کہ نبوت کے ابتدائی زمانہ میں میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں مکہ میں حاضر ہوا، میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نبی ہوں۔ میں نے پوچھا کہ نبی کس کو کہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بندوں کی طرف (اپنا پیغام پہنچانے کے واسطے) بھیجا ہے، (اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے واسطے بھیجے اس کو نبی کہتے ہیں۔) پھر میں نے پوچھا

کہ اللہ تعالیٰ نے کیا حکم دے کر بھیجا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے صلہ رحمی اور بتوں کو توڑنے کا حکم اور یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانا جائے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

افادات: یہ اُس وقت کا قصہ ہے جب نماز فرض نہیں ہوئی تھی، روزہ اور دوسری چیزیں تو بعد میں ہی فرض ہوئی ہیں، اُس وقت تو صرف توحید کا حکم دیا جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو ایک مانو اور نبی کریم ﷺ کو اللہ کا رسول مانو، اُس موقع پر بھی جن چیزوں کا حکم دیا جاتا تھا ان میں سے یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔ اس سے صلہ رحمی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یہ اسلام کی کتنی بنیادی اور اہم تعلیمات میں سے ہے جس کا شروع ہی سے حکم دیا گیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ پوری امت کو اس کی اہمیت سمجھ کر اس کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنے کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔ آمین

تَحرِیمُ عُقُوقِ الوَالِدَینِ وَقَطِیعَةِالرَّحِمِ

والدین کی نافرمانی

اور

رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے کی حرمت

﴿مجلس ۱﴾

۲۸/محرم الحرام ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۵/مئی ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أمابعد:

أعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم:

فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوْافِی الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوْاأَرْحَامَکُمْ، أُولٰئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فَأَصَمَّھُمْ وَأَعْمٰی أَبْصَارَھُمْ(محمد)

وَالَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَھْدَ اللّٰہِ مِنْ بَعْدِ مِیْثَاقِہٖ وَیَقْطَعُوْنَ مَاأَمَرَاللّٰہُ بِہٖ أَنْ یُّوْصَلَ وَیُفْسِدُوْنَ فِیْ الْأَرْضِ أُولٰئِكَ لَھُمُ اللَّعْنَۃُ وَلَھُمْ سُوْۤءُ الدَّارِ.(الرعد)

وَقَضٰی رَبُّكَ أَن لَّاتَعْبُدُوْااِلَّااِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَاناً،اِمَّایَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْکِبَرَ أَحَدُھُمَا أَوْکِلَاھُمَافَلَا تَقُل لَّھُمَاأُفٍّ وَّلَا تَنْھَرْھُمَاوَقُل لَّھُمَاقَوْلاً کَرِیْماً۔ وَاخْفِضْ لَھُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَۃِ۔وَقُل رَّبِّ ارْحَمْھُمَا کَمَارَبَّیَانِیْ صَغِیْراً.(الاسراء)

ماقبل سے ربط

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پچھلا باب ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری اور صلہ رحمی کے سلسلہ میں قائم کیا تھا اور یہ باب قائم کررہے ہیں: ماں باپ کی نافرمانی، ان کو ایذاء وتکلیف پہنچانا اور رشتہ داری کے حقوق کو ادا نہ کرنا جس کو قطع رحمی کہتے ہیں؛ یہ حرام ہے۔اس لیے کہ جب ان کے حقوق ادا نہیں کئے جائیں گے تو تعلقات، رشتہ داری اور قرابت باقی نہیں رہے گی، بلکہ ٹوٹ جائے گی۔تو قطع رحمی کا مطلب ہوا رشتہ داری کو

توڑنا۔ اور وہ حقوق کو ادا نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس باب میں اس کا حرام ہونا بیان کریں گے۔ پچھلے باب میں ماں باپ کی فرمانبرداری اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا ضروری ہونا بتلایا تھا اور اس باب میں ماں باپ کی نافرمانی کا اور رشتہ داری کے حقوق کو ادا نہ کرنے کا حرام ہونا بتلا رہے ہیں۔

اس باب کے شروع میں جو آیتیں پیش کی ہیں تقریباً سب وہی ہیں جو پچھلے باب میں آئی تھیں اور وہاں اس کی تفصیل بتلا چکا ہوں اس لیے ان کو چھوڑ کر آگے جو روایتیں پیش فرماتے ہیں ان کو شروع کرتا ہوں۔

ہر گناہ بڑا ہے

٣٣٦: وعَنْ أَبِیْ بَکْرَةَ نُفَیْعِ بْنِ الْحَارِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: أَلا أُنَبِّئُکُمْ بِأَکْبَرِ الْکَبَائِرِ؟ –ثَلاثاً– قُلْنَا: بَلیٰ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ! قَالَ: اَلْاِشْرَاكُ بِاللّٰہِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ، وَکَانَ مُتَّکِئًا فَجَلَسَ، فَقَالَ: أَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ۔ فَمَازَالَ یُکَرِّرُهَا حَتّٰی قُلْنَا: لَیْتَهُ سَکَتَ.

ترجمہ: حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہوں میں سب سے بڑے گناہ مَیں تم کو نہ بتلاؤں؟ تین مرتبہ یہ سوال کیا، تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتلائیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ اس وقت آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ (آگے کہی جانے والی بات کی اہمیت بتلانے کے لیے) سیدھے بیٹھ گئے، اور فرمایا: جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی دینا۔ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار ارشاد فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش! حضور خاموش ہو جائیں۔

افادات: جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے ان کا ارتکاب کرنے کا

نام معصیت ہے، اور اسی کو ہم اردو زبان میں گناہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ ویسے گناہ کے سلسلہ میں علماء نے ایک بحث یہ کی ہے کہ کیا گناہوں میں تقسیم ہے، بڑے گناہ اور چھوٹے گناہ؟ تو بعض حضرات تو اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جس کو ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں وہ تمام بڑے گناہ ہی ہیں یعنی چھوٹے اور بڑے کی کوئی تقسیم نہیں ہے، اور وہ حضرات اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ دراصل یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم جس ذات کی نافرمانی کر رہے ہیں وہ ذات کتنی عظمت و کبریائی اور بڑائی والی ہے، کوئی شخصیت بہت بڑے مقام و عہدے اور بڑے منصب پر فائز ہو، تو چاہے اس نے چھوٹی سی بات ہی کہی ہو لیکن کوئی آدمی اگر اس کی بات کو نہ مانے اور اس کی خلاف ورزی کرے، تو اس کا یہ جرم و قصور بڑا گناہ شمار ہوتا ہے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا اور اس کے حکم کو توڑنا، چاہے وہ کیسا ہی حکم ہو، گناہ ہے۔ اس میں کوئی تقسیم نہیں ہے، اس کا ہر جرم اپنی جگہ پر بہت بڑی کوتاہی قرار دیا جائے گا۔

صغیرہ وکبیرہ اور ان کا حکم

لیکن قرآنِ پاک میں جو احکامات، اور حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ کے جو ارشادات ہیں ان کو سامنے رکھ کر محققین علماء نے گناہوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، بڑے گناہ جن کو کبیرہ کہتے ہیں اور چھوٹے گناہ جن کو صغیرہ کہتے ہیں۔ لہٰذا وہ گناہ جن پر قرآنِ پاک میں یا احادیثِ مبارکہ میں کوئی وعید آئی ہے اور جس پر سخت سزا سنائی گئی ہے ایسے تمام گناہوں کو انہوں نے کبیرہ بتلایا اور جن گناہوں پر سخت وعید نہیں سنائی گئی ہے یعنی ان کی ممانعت تو ہے لیکن ان پر سخت وعید نہیں آئی ہے؛ ایسے گناہوں کو صغیرہ کہا گیا ہے۔ اور پھر دونوں کا حکم بھی بتلایا ہے کہ صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ تو وہ ہیں کہ ان سے

اگر آدمی نے مستقل توبہ نہیں کی تب بھی آدمی جو نیک کام کرتا ہے ان کی وجہ سے چھوٹے گناہ آپ ہی آپ معاف ہو جاتے ہیں، مثلاً آدمی نماز کے واسطے وضو کرتا ہے تو حدیث میں آتا ہے کہ وضو کرنے کی وجہ سے اس کے وہ گناہ جو آنکھوں نے کئے، اور جو کان سے ہوئے، جو منھ سے سرزد ہوئے، ہاتھ پاؤں سے سرزد ہوئے؛ وہ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اس حدیث میں وضو کی وجہ سے جن گناہوں کے معاف ہونے کو بتلایا گیا ہے اس سے مراد چھوٹے گناہ ہیں۔ اسی طرح آدمی نماز کے لیے اپنے گھر سے چلتا ہے تو حدیثِ پاک میں آتا ہے اس کے ہر قدم پر اس کا ایک گناہ معاف ہوتا ہے، ایک نیکی لکھی جاتی ہے، ایک درجہ بلند ہوتا ہے۔ یہاں بھی جو گناہ معاف ہوا؛ وہ چھوٹا ہوا۔

ایک مثال

یوں سمجھئے کہ آپ کا کوئی ملازم کوئی چھوٹا موٹا معمولی قصور کر لے تو اس کی وجہ سے آپ کو ناگواری تو ہوتی ہے لیکن وہی ملازم جب آپ کی فرمانبرداری میں بہت مستعدی دکھائے اور کوئی ایسا کام کر لے جو آپ کو خوش کر دے، تو اس معمولی قصور کی وجہ سے آپ کو جو ناگواری ہوئی تھی وہ دور ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس نے کوئی بڑا قصور کیا ہے تو صرف آپ کے کام میں مستعدی دکھلانے سے اور آپ کی خدمت کرنے سے اس بڑے قصور کو معاف نہیں کریں گے، بلکہ وہ تو آپ کی نگاہوں میں باقی رہے گا، ہاں! جب اس بڑے قصور سے صاف صاف لفظوں میں باقاعدہ معافی مانگے گا تب ہی آپ اس کو معاف کریں گے۔ ایسے ہی چھوٹے گناہ نیکیوں اور مختلف عبادات کو انجام دینے کی وجہ سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن بڑے گناہ جب تک باقاعدہ ان سے توبہ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے ان گناہوں کی معافی نہ مانگے؛ وہاں تک وہ معاف نہیں ہوں گے۔

ہر مسلمان کو یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے

اور بڑے گناہ کون کون سے ہیں اس کے بارے میں علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں، علامہ ابن حجر ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "اَلزَّوَاجِرُ عَنِ اقْتِرَافِ الْکَبَائِرِ" ہے۔ اس میں انہوں نے تمام بڑے بڑے گناہ گنوائے ہیں اور اس سلسلہ میں قرآن وحدیث میں جو وعیدیں آئی ہیں وہ بھی شمار کرائی ہیں۔ اردو میں اس موضوع پر ابھی تازہ ہی ایک رسالہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلندشہری دامت برکاتہم کا آیا ہے، جو مدینہ منورہ میں مقیم ہیں، اس میں انہوں بڑے گناہ کون سے ہیں وہ جمع فرمائے ہیں۔ بہرحال! ایک مسلمان کو مسلمان ہونے کے ناطہ یہ بھی معلوم کر لینا چاہیے کہ کون کون سے گناہ بڑے ہیں اور کون کون سے گناہ چھوٹے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ چھوٹے گناہ کرے، لیکن جب بڑے گناہ معلوم ہو جائیں گے تو ان سے بچنے کا خصوصی اہتمام کرے گا۔ ویسے تو ہر مسلمان کو اپنے آپ کو ہر گناہ سے بچانا ہے، چھوٹا ہو یا بڑا ہو، لیکن بڑے گناہ تو ایسے ہیں کہ اگر وہ ہو جاویں تو فوراً اس سے توبہ کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی مانگنے کا اہتمام کرنا چاہیے، اس لیے کہ توبہ کے بغیر وہ معاف نہیں ہوتے۔

سب سے بڑے دو گناہ

بات یہاں سے چلی تھی کہ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت آئی تھی، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بڑے گناہوں میں بھی جو سب سے بڑے گناہ ہیں؛ وہ میں تم کو نہ بتلاؤں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہ سوال کیا، تو حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ کیوں نہیں یارسول اللہ! ضرور بتلائیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک

تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، چاہے اللہ کی ذات میں، یا اس کی صفات میں، یا اس کی عبادت میں؛ یا کسی بھی چیز میں اگر اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہرائے گا تو یہ ایسا بڑا گناہ ہے کہ جب تک اس سے توبہ نہ کرے اور ایمان قبول نہ کرے؛ وہاں تک معاف نہیں ہوتا۔

دیکھو! پچھلے باب میں ایک روایت گذری کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تھا کہ اعمال میں سب سے پسندیدہ عمل کون سا ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اپنے وقت پر نماز کو ادا کرنا اور والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کرنا۔ اور اس روایت میں گناہوں میں سب سے بڑے گناہ کون سے ہیں وہ بتلائے ہیں، اس میں ایک تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا ہے۔ اور شرک ایک ایسا گناہ ہے کہ آدمی جب تک توبہ نہ کرے اور شرک کو چھوڑ کر توحید اختیار نہ کرے اور ایمان نہ لاوے وہاں تک وہ گناہ معاف نہیں ہوتا ﴿اِنَّ اللّٰه لَا یَغْفِرُ أَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذَالِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ﴾ شرک کرنے والا کبھی بھی جنت میں نہیں جائے گا، بلکہ ہمیشہ جہنم میں ہی رہے گا۔ اور شرک کرنے کی وجہ سے ایمان ختم ہو جاتا ہے، اس پر تمام کا اتفاق ہے لیکن اس کے علاوہ باقی جتنے بھی بڑے گناہ ہیں ان کی وجہ سے ایمان ختم نہیں ہوتا اگر اس نے توبہ کر لی تو وہ معاف ہو جائیں گے اور اگر توبہ نہیں کی تو اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو معاف کر دے اور بغیر سزا دیے ہی جنت میں بھیج دے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ان گناہوں کی سزا دے، اور اس سزا کو بھگتنے کے بعد جنت میں بھیجے، چوں کہ ایمان ہے تو جنت میں جائے گا لیکن شرک کے ساتھ ایمان باقی نہیں رہتا۔

تو بڑے گناہوں میں ایک گناہ شرک ہے اور دوسرا بڑا گناہ بتلایا ہے "وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ" ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ دیکھو! وہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو پہلے نمبر پر رکھا

تھا اور ماں باپ کی اطاعت وفرمانبرداری کو دوسرے نمبر پر رکھا تھا۔اور یہاں گناہوں میں شرک کو نمبر اول پر رکھا اور دوسرے نمبر پر ماں باپ کی نافرمانی کو رکھا یعنی کوئی ایسا کام کرنا جس کی وجہ سے ماں باپ کو تکلیف ہو۔

ہاں! اگر ماں باپ کسی ایسی چیز کا حکم کریں جس سے شریعت نے منع کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی، یعنی گناہ کے کام کا اگر وہ حکم کریں تو اس کو پورا کرنے کا وہ پابند نہیں ہے، جیسا کہ پہلے بھی بتلایا جا چکا ہے کہ اس صورت میں ان کی بات مانی نہیں جائے گی، بلکہ اگر ان کی بات مانے گا تو گنہگار ہوگا، اس لیے ماں باپ کو بھی چاہیے کہ وہ ایسی چیز کا اپنی اولاد کو حکم نہ دیں، اور اگر انہوں نے ناواقفیت کی وجہ سے ایسا حکم دیا تو اولاد کو چاہیے کہ اس پر عمل نہ کرے۔

ایک اور سب سے بڑا گناہ

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس وقت نبی کریم ﷺ نے پہلی دو باتیں ارشاد فرمائیں اس وقت آپ تکیہ سے سہارا لگا کر اور ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے، پھر آپ آگے کہی جانے والی بات کی اہمیت بتلانے کے لیے سیدھے بیٹھ گئے، اور فرمایا "أَلَا وَقَوْلُ الزُّوْرِ وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ" اور بڑے گناہوں میں جو سب سے بڑے گناہ ہیں ان میں جھوٹی بات اور جھوٹی گواہی دینا بھی ہے۔آپ ﷺ نے اس گناہ سے خاص طور پر تنبیہ کرنے کے لیے اس کو ایسے انداز سے بتلایا کہ آپ سہارا لگا کر بیٹھے تھے اس کو چھوڑ کر آپ سیدھے بیٹھ گئے۔راوی کہتے ہیں کہ یہ بات آپ ﷺ بار بار ارشاد فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم اپنے دل میں یہ تمنا کرنے لگے کہ کاش! حضور خاموش ہو جائیں، یعنی نبی کریم ﷺ کے ساتھ صحابہ کو جو محبت اور تعلق تھا اس کے پیشِ نظر ان کے دل میں یہ

خیال آنے لگا کہ ہمیں اس بات کی اہمیت کو بتلانے کے واسطے آپ ﷺ اتنی تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں، ہم تو اس کی اہمیت سمجھ گئے ہیں، اب آپ خاموش ہو جائیں تو اچھا ہے۔ بتلانا یہ ہے کہ تیسرے گناہ کی اہمیت کو بتلانے کے لیے ایک تو آپ ﷺ ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور دوسرے یہ کہ بار بار اس جملہ کو آپ ﷺ دہراتے رہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گناہ کتنا خطرناک ہے۔ بہر حال! اس روایت کو اس باب میں لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ والدین کی نافرمانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔

چار بڑے گناہ

۳۳۷: وعن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عن النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: أَلاِشْرَاكُ بِاللّٰهِ وَعُقُوقُ الْوَالِدَیْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ بڑے گناہوں میں سے ایک یہ ہے اللہ تعالیٰ کیساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، دوسرا بڑا گناہ ماں باپ کی نافرمانی کرنا، تیسرا بڑا گناہ کسی کو ناحق قتل کرنا، اور چوتھا بڑا گناہ جھوٹی قسم کھانا۔

افادات: علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ خود یمینِ غموس کی وضاحت فرماتے ہیں کہ گذشتہ زمانہ سے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا اس کا نام یمینِ غموس ہے۔ اور اس کو غموس اس لیے کہتے ہیں وہ آدمی کو گناہ کے اندر ڈبا دیتی ہے، کسی بات پر جھوٹی قسم کھانے والا گناہ میں ڈوب جاتا ہے۔

قسم کھانے کے متعلق تفصیل

جھوٹی قسم کا تعلق گذشتہ زمانہ ہی سے ہوتا ہے، اگر کوئی آدمی آئندہ کے متعلق قسم کھائے تو اس میں تو یہ ہوتا ہے کہ وہ قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ مَیں فلاں کام کروں گا، یا فلاں

کام نہیں کروں گا، لہٰذا اس میں تو جھوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں! آئندہ جا کر کرنے کے کام کی قسم کھائی تھی اور موت تک نہیں کرے گا تو قسم ٹوٹے گی اور حانث ہوگا۔ اور اگر نہ کرنے قسم کھائی تھی اور وہ کام کرلیا تو قسم ٹوٹے گی، لیکن گذشتہ کسی کام کے متعلق اس سے کوئی بات پوچھی گئی مثلاً اس سے پوچھا گیا کہ فلاں کے پیسے تم نے لیے ہیں؟ اب اس نے لیے ہیں اس کے باوجود قسم کھا کر یہ کہتا ہے کہ اللہ کی قسم! مَیں نے نہیں لیے؛ تو جان بوجھ کر گذشتہ زمانہ سے متعلق جھوٹی قسم کھائی؛ اسی کا نام یمینِ غموس ہے۔

یمینِ لغو

ایک تو یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ کے کام متعلق قسم کھائے اور اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہوئے کھائے، مثلاً کسی نے پوچھا کہ آپ نے یہ بات کہی؟ اور اس بات کو ایک زمانہ گذر چکا ہے اور آپ نے وہ بات کہی تھی لیکن آپ کو یاد نہیں رہا کہ مَیں نے کہی تھی، اور آپ نے اپنے آپ کو سچا سمجھ کر یہ کہا کہ اللہ کی قسم! مَیں نے نہیں کہی۔ تو جس وقت آپ یہ قسم کھا رہے ہیں اس وقت آپ خود کو سچا سمجھ رہے ہیں یعنی آپ کو یہی یاد ہے کہ مَیں نے یہ بات نہیں کہی ہے، اور قسم کھالی، پھر بعد میں خیال آیا کہ مَیں نے تو یہ بات کہی تھی؛ تو ایسی قسم کو عربی زبان میں یمینِ لغو کہتے ہیں، اس پر کوئی کفارہ واجب نہیں ہوتا اور یہ کبیرہ گناہ بھی نہیں ہے، بس! ذرا سی کوتاہی ہوئی، اس لیے استغفار کر لینا چاہیے۔
لیکن دوسری بات یہ ہے کہ گذشتہ زمانہ کے کسی کام سے متعلق جان بوجھ کر اپنے آپ کو غلط سمجھتے ہوئے قسم کھائے، یعنی اس کو یاد ہے کہ مَیں نے یہ بات کہی ہے لیکن قسم کھا کر کہتا ہے کہ مَیں نے نہیں کہی؛ تو یہ قسم یمینِ غموس کہلائے گی، اور یہ کبیرہ گناہ ہے، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آدمی سے بہت زیادہ ناراض ہوتے ہیں۔

اس روایت میں کل چار چیزیں کبیرہ گناہ میں شمار کرائی ہیں، ان میں والدین کی نافرمانی بھی ہے، اس لیے اس روایت کو اس باب میں لائے ہیں۔

والدین کو گالی دینا بڑا گناہ ہے

۳۳۸۔وعنه أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مِنَ الْكَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَيْهِ، قَالُوْا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! وَهَلْ يَشْتُمُ الرَّجُلُ وَالِدَيْهِ؟ قَالَ: نَعَمْ؛ يَسُبُّ أَبَاالرَّجُلِ فَيَسُبُّ أَبَاهُ، وَيَسُبُّ أُمَّهُ فَيَسُبُّ أُمَّهُ۔(متفق علیه)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔ حضراتِ صحابہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا آدمی اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دے، اس کے جواب میں اُس نے اِس کے باپ کو گالی دی۔ یہی حال ماں کا بھی ہے کہ اِس نے اُس کی ماں کا نام لے کر گالی دی تو جواب میں اُس نے اِس کی ماں کا نام لے کر گالی دی۔

افادات: وہ زمانہ تو حضراتِ صحابہ کا تھا ان میں سے کسی کے تصور میں بھی یہ نہیں آسکتا تھا کہ کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو گالی بھی دے سکتا ہے آج ہمارے زمانہ میں یہ بات کوئی تعجب خیز نہیں ہے، آج کل تو ماں باپ کو منھ درمنھ گالی دینے والے بیسیوں موجود ہیں، لیکن اُس زمانہ میں اس چیز کا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے ماں باپ کو گالی دے، اس لیے حضراتِ صحابہ نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کوئی آدمی اپنے والدین کو گالی دے؟ تو حضور ﷺ نے اُس زمانہ کے اعتبار سے اس کی جو شکل ہوسکتی تھی وہ بتلائی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ایک آدمی دوسرے کے باپ کو گالی دے، اس کے جواب میں اُس نے اِس کے باپ کو گالی دی، اس طرح گویا اپنے باپ پر گالی پڑنے کا ذریعہ یہی بنا، یہ اگر اُس

کے باپ کو گالی نہ دیتا تو جواب میں وہ بھی اِس کے باپ کو گالی نہ دیتا۔ تو اپنے باپ پر گالی پڑنے کا سبب یہی بنا، اس لیے یوں سمجھا جائے گا کہ گویا اس نے ہی اپنے باپ کو گالی دی۔ یہی حال ماں کا بھی ہے کہ اِس نے اُس کی ماں کا نام لے کر گالی دی تو جواب میں اُس نے اِس کی ماں کا نام لے کر گالی دی۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ ہے اس کا اپنے ماں باپ کو گالی دینا۔ یعنی براہِ راست (direct) گالی دینا تو ان حضرات کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے، اور یہ (in direct) گالی دینا ہے۔ باقی حضور ﷺ یہ بھی جواب دے سکتے تھے کہ اگرچہ یہ چیز ابھی آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی لیکن ایک زمانہ آئے گا کہ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اپنے ماں باپ کو (direct) گالی دیں گے، لیکن اس وقت کے ماحول کی وجہ سے یہ جواب بھی ان کے لیے بڑا قابلِ تعجب ہوتا، لیکن اس شکل سے تو بات بالکل صاف ہوگئی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی گناہ کا ذریعہ بنے تو وہ خود بھی گنہگار بنتا ہے۔

معاشرہ میں رائج ایک کبیرہ گناہ

بہر حال! اس روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آدمی کو چاہیے کہ کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی نہ دے، ورنہ وہ جب جواب میں گالی دے گا تو گویا یہ اپنے ماں باپ کے لیے گالی پڑنے کا ذریعہ بنا اور یہ اس کے لیے کبیرہ گناہ ہے۔ یہ سوچنے کی چیز ہے کہ جیسے (direct) ماں باپ کو گالی دیتا تو وہ کبیرہ گناہ تھا، اسی طرح اگر ماں باپ پر گالی پڑنے کا ذریعہ بنا تو یہ بھی اس کے حق میں کبیرہ گناہ ہو جائے گا، اور جب تک کہ اس سے توبہ نہ کرے وہاں تک یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔ آج کل لوگ اس چیز میں بہت زیادہ مبتلا ہیں، اور اگر کوئی کہے کہ تو نے ایسا کہا تو اس نے تیرے ماں باپ کو گالی دی، تو یہ کہتا

ہے کہ میں نے تھوڑے ہی دی، اس نے دی تو وہ گنہگار ہے، لیکن اس کے گالی دینے کا ذریعہ تو تو بنا، اس لیے تو بھی گنہگار رہوا، اس کو اس کے فعل کا گناہ ہوگا لیکن یوں سمجھا جائے گا کہ اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا قصور اسی نے کیا، اور یہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اور اس کے کبیرہ گناہ ہونے کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں جاتا، ہاں! اس کو برا تو سمجھتے ہیں لیکن کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے۔ لہٰذا اس سے خاص بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا

٣٣٩: وعن أبی محمد جُبَيْرِ بْنِ مُطْعِمٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَاطِعٌ.

ترجمہ: حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کوئی قطع رحمی کرنے والا اور رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔

افادات: یہاں دیکھو کہ مطلقاً منع کر دیا گیا کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا، اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سزا بھگتنے کے بعد بھی جنت میں نہیں جائے گا؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جب اس نے اس گناہ کی سزا بھگت لی تو اب وہ قطع رحمی کرنے والا نہیں رہا، جب اس کا گناہ صاف ہو گیا تو اب گویا وہ اس لائق بن گیا کہ جنت میں جا سکتا ہے، لیکن جب تک کہ قطع رحمی کرنے والا جرم اور گناہ اس کے سر پر باقی ہے وہاں تک تو وہ جنت میں نہیں جا سکتا، اب یا تو توبہ کر کے اس گناہ کو دھلوا لے، یا اللہ تعالیٰ سزا دے کر اور جہنم کی بھٹی میں ڈال کر اس کا گناہ صاف کر دیں تو پھر وہ اس لائق ہو جائے گا کہ جنت میں جائے۔

ماں کے بارے میں خصوصی تاکید

٣٤٠: وعن أبی عيسٰى الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: إِنَّ

اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْأُمَّھَاتِ، وَمَنْعاً وَّھَاتِ، وَوَأْدَ الْبَنَاتِ، وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ، وَکَثْرَۃَ السُّؤَالِ، وَاِضَاعَۃَ الْمَالِ. (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ماؤوں کی نافرمانی کو تم پر حرام کیا ہے۔ اور لوگوں کے حقوق کو ادا نہ کرنے سے، اور بلا حق کے مطالبہ کرنے سے اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے سے بھی منع کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے قیل وقال، اور کثرت سے سوال کرنے اور مال ضائع کرنے کو تمہارے لیے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

افادات: یہ حدیثِ قدسی ہے۔ ''ماؤوں کی نافرمانی کو حرام کیا ہے'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپ کی نافرمانی حرام نہیں ہے، بلکہ دراصل بات یہ ہے کہ عام طور پر اولاد باپ کے مقابلہ میں ماں کی نافرمانی پر جرأت جلدی کرتی ہے، باپ سے تو ڈنڈے کی پٹائی کا ڈر رہتا ہے، اس لیے اولاد اس کی نافرمانی پر اتنی جرأت نہیں کرتی، جتنی وہ ماں کی نافرمانی کی جرأت کر ڈالتی ہے، اس لیے ماں کی نافرمانی کو خاص طور پر بیان کیا گیا کہ ماؤوں کی نافرمانی کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ماں کے معاملہ میں ذرہ برابر بھی کوتاہی سے کام نہ لیا جائے، اور چوں کہ ماں عورت ذات ہے جو کمزور صنف ہے، اور اس میں شفقت بھی زیادہ ہوتی ہے، اس وجہ سے بہت سی مرتبہ آدمی اس کی بات کو جلدی سے عمل میں نہیں لاتا اور اس طرح وہ اس کی نافرمانی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

اولاد کو کسی کام کے لیے کس طرح کہیں؟

اسی لیے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ ماں باپ اگر کوئی کام اولاد سے کروانا چاہیں تو صاف صاف یوں نہ کہیں کہ بیٹا! فلاں کام کرو، اس لیے کہ اگر وہ ناجائز کام نہیں ہے، تو وہ کام کرنا بیٹے کے لیے واجب اور ضروری ہو جاتا ہے، اور اگر نہیں کرے گا

تو ماں باپ کا نافرمان بنے گا اور کبیرہ گناہ کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ اس لیے علماء نے لکھا ہے کہ ماں باپ کو اس طرح کہنا چاہیے کہ بیٹا! فلاں کام کرو تو مناسب ہے، یعنی صاف لفظوں میں حکم دے کر نہ کہیں کہ یوں کرو، اس لیے کہ صاف لفظوں میں کہا اور بیٹے نے نہیں کیا تو وہ کبیرہ گناہ کرنے والا بنا۔ اور جب ماں باپ جانتے ہیں کہ بیٹے کا مزاج اس قسم کا ہے تو ان کو چاہیے کہ بیٹے کو کبیرہ گناہ سے بچانے کے لیے صاف صاف لفظوں میں کہنے کے بجائے اس طرح کہیں کہ بیٹا! یوں کرو تو اچھا ہے، اگر ایسا کرو گے تو جی خوش ہو جائے گا۔ اب اگر اس نے نہیں کیا تو ماں باپ کی نافرمانی کرنے کی وجہ سے جو کبیرہ گناہ ہوتا تھا وہ تو نہیں ہوگا۔ اس لیے ماں باپ کو بھی دیکھنا چاہیے کہ اگر وہ کام ایسا ہے جو ضروری نہیں ہے تو حکم دینے والا انداز اختیار نہ کریں، بلکہ ترغیب والا انداز اختیار کرنا چاہیے۔

یہ چیزیں بھی حرام ہیں

اور دوسری چیز جس کو اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے وہ لوگوں کے حقوق کو ادا نہ کرنا اور روک لینا ہے، یعنی کسی کا کوئی حق جانی یا مالی تم پر ہے اور وہ تم کو ادا کرنا چاہیے لیکن اس کو ادا نہیں کرتے؛ تو یہ بھی حرام ہے۔

اور اپنا کوئی حق دوسرے پر نہیں ہے اس کے باوجود اس کا مطالبہ کرنا؛ یہ بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔

”وَوَأْدَ الْبَنَاتِ“ اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا بھی حرام قرار دیا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان پہلے ایک باب میں گذر چکا ہے۔

فضول بحث میں پڑنا بھی ناجائز ہے

”وَکَرِہَ لَکُمْ قِیْلَ وَقَالَ“ اور اللہ تعالیٰ نے قیل اور قال کو تمہارے لیے ناپسندیدہ اور ناجائز قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چند آدمیوں کا کسی جگہ بیٹھ کر فضول بحثیں کرنا کہ فلاں نے یوں کہا، آج کل ایسی باتیں چل رہی ہیں، جس کو ہم گجراتی میں (**પાર કી પંચાત**) کہتے ہیں، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس میں اپنا وقت فضول ضائع کرنا ہے۔ زندگی اللہ تعالیٰ نے اس لیے نہیں دی ہے کہ آدمی اپنے وقت کو بے کار چیزوں میں ضائع کرے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے ”مِنْ حُسْنِ اِسْلامِ الْمَرْءِ تَرْکُہُ مَالا یَعْنِیْہِ“ (مجمع الزوائد للہیثمی ۱۸/۸ بحوالہ احمد وطبرانی۔ مسند احمد، ۲۰۱/۱) آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور بے کار چیزوں کو چھوڑ دے۔ لایعنی کا مطلب ہے ایسی چیز جس میں نہ دین کا کوئی فائدہ ہو اور نہ دنیا کا؛ ایسی چیزوں کو چھوڑ دے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ فضول بحثیں کرتے رہتے ہیں۔ اور اس میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی کا نام لے کر بات کہی جاتی ہے اس کو تو قال سے تعبیر کیا، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والے کا نام نہیں لیا جاتا بلکہ یوں ہی کہا جاتا ہے کہ ایسی باتیں ہو رہی ہیں، اور خود اس کو بھی اس بات کے صحیح ہونے کا یقین نہیں ہوتا اس کو قیل سے تعبیر کیا ہے۔

اور حدیثِ پاک میں آتا ہے ”کَفٰی بِالْمَرْءِ کَذِباً أَن یُّحَدِّثَ بِکُلِّ مَا سَمِعَ“ (مقدمۂ مسلم۔ رقم ۵) آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ جو سنے وہ لوگوں کے سامنے بیان کر دے۔ بس جو کچھ کان میں پڑ گیا وہ دوسروں کے سامنے اُگل دیا کہ ایسا سنا ہے، اب اگر اس سے پوچھو کہ کس نے کہا؟ تو کہتا ہے کہ سنا ہے۔ اس کا مطلب

یہ ہوا کہ وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ اگر نام لوں گا تو لوگ کہیں گے کہ کہتا تو دیوانہ ہے ہی، سنتا بھی دیوانہ؟ یعنی ایسے آدمی کی بات پر بھروسہ کر لیا۔ اور اپنا مقام گر نہ جاوے اس لیے وہ اس کا نام تو لے گا ہی نہیں، بس یہ کہے گا کہ سنا ہے، حالانکہ خود بھی اس بات کو جھوٹ سمجھ رہا ہے۔ تو جس چیز کو آدمی خود جھوٹا سمجھ رہا ہے وہ کیوں دوسروں کے سامنے بیان کرے اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جتنی چیزیں سنے اس کا دوسروں کے سامنے بیان کر دینا خود اس آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے کافی ہے۔

بہت زیادہ سوال کرنا حرام ہے

"وَكَثْرَةَ السُّؤَالِ" اور کثرت سے سوال کرنے کو بھی اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے بہت زیادہ سوال کرنے کا مطلب کیا ہے؟ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ لوگوں کے حالات کے متعلق بہت زیادہ کھود کرید کرنا جیسے کہ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے اندرونی حالات معلوم کرنے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ فلاں نے کیا کیا اور ابھی کیا کر رہا ہے، حالانکہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ اپنے کام میں لگے رہیں، لوگوں کے حالات کی ٹوہ میں لگا رہنا اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو ناجائز کہا ہے۔

یا کثرۃ السوال کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز جو ابھی تک پیش نہیں آئی ہے لیکن فرضی سوال قائم کر کے پوچھنا۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی معاملہ آپ کو پیش آیا اور آپ کسی عالم یا مفتی سے دریافت کریں کہ ایسا معاملہ مجھے پیش آیا ہے اس لیے اس سلسلہ میں پوچھنا چاہتا ہوں؛ تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن بعضوں کی ایسی عادت ہوتی ہے کہ کوئی بات پیش نہیں آئی، صرف ذہن میں ایک چیز گھڑ کر پوچھتا ہے، بعض مرتبہ تو اس

کا مقصد سامنے والے کا امتحان لینا ہوتا ہے۔ ارے بھائی! مفتی صاحب اور مولوی صاحب کا امتحان لینے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ ان کے اساتذہ نے ان کا امتحان لے لیا ہے، اور وہ کس درجہ کے ہیں وہ درجہ بھی ان کو دیدیا ہے، اب آپ کو تو یہ کام نہیں سونپا گیا ہے کہ ان کا امتحان لیں۔ اس لیے یہ بھی غلط طریقہ ہے۔ فرضی سوالات کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب تک ہمارے درمیان موجود تھے اس وقت اگر کوئی ایسا سوال کرتا تو اس کی ممانعت تھی، اس لیے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بہت برا ہے وہ آدمی جو کسی ایسی چیز کا سوال کرے جو پیش نہیں آئی اور اس کے سوال کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ چیز حرام قرار دیدی۔ لیکن یہ اس وقت تھا جب نبی کریم ﷺ دنیا میں تشریف فرما تھے، اب تو آپ دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں اور جتنی چیزیں حلال ہونی تھیں وہ حلال ہوچکیں اور جو حرام ہونی تھی وہ حرام ہوچکیں، اب اس میں کوئی فرق آنے والا نہیں ہے۔

مال کو ضائع کرنا ناجائز ہے

"وَاِضَاعَةَ الْمَالِ" اور مال کو ضائع کرنا یعنی جہاں پر مال خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہاں خرچ کرنا، یا جتنا خرچ کرنے کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ خرچ کرنا؛ یہ دونوں ناجائز ہے۔ مال کو بے جا استعمال کرنا اور بلاضرورت خرچ کرنا، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ہاں! نیکی کے کاموں میں آدمی زیادہ سے زیادہ خرچ کرے تو وہاں اسراف نہیں ہوگا، اس لیے کہ نیکی کے کام میں تو خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ

آج ایک جگہ نکاح میں جانا ہوا، وہاں بات ہوئی تو مَیں نے ایک قصہ عرض کیا تھا، موقع کی مناسبت سے یہاں بھی وہ قصہ عرض کردوں: ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی کوئی ضرورت پیش کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ کوئی آدمی اپنی حاجت لے کر آتا تو آپ کبھی منع نہیں فرماتے تھے، اس کی حاجت پوری فرمادیتے تھے، لیکن اگر اس وقت اس کی حاجت پوری کرنے کے لیے کوئی چیز آپ کے پاس موجود نہیں ہوتی تو دو شکلیں ہوتی تھیں یا تو آپ وعدہ فرمالیتے تھے کہ دوسرے وقت آنا، یا اپنے صحابہ میں سے جو صاحبِ حیثیت ہوتے تھے ان کے پاس بھیج دیتے تھے کہ فلاں کے پاس جاکر میرا نام لے لینا، اور وہ اس کی حاجت پوری فرمادیتے تھے۔

تو ایک آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی حاجت پیش کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیا۔ یہ بڑے مالدار صحابی تھے اور خلفاء راشدین میں تیسرے نمبر پر ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد بھی ہوتے ہیں، ان کا لقب ذوالنورین ہے، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو صاحبزادیاں یکے بعد دیگرے ان کے نکاح میں تھیں، پہلے حضرت ام کلثوم کا نکاح ان کے ساتھ ہوا تھا، ان کے انتقال کے بعد حضرت رقیہ کا نکاح ہوا، جب حضرت رقیہ کا انتقال ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میری اور بیٹی ہوتی تو مَیں ان کے نکاح میں دیتا۔

خیر! یہ آدمی ان کے پاس گئے، رات کا وقت تھا جب ان کے دروازہ پر پہنچے تو اس سے پہلے کہ ان کا دروازہ کھٹکھٹائیں، ان کے کان میں آواز پڑی کہ حضرت عثمان اپنی اہلیہ کو جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی ہیں زور سے کچھ کہہ رہے ہیں، تو یہ ٹھہر گئے۔

جب ان کے کان میں آواز آئی تو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ نے چراغ کی لَو ذرا تیز کردی تھی جس کی وجہ سے تیل زیادہ جلتا ہے، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ان کو ڈانٹ رہے تھے کہ چراغ کی بتّی ضرورت سے زیادہ اونچی کیوں رکھی؟ اس سے معلوم ہوا کہ روشنی بھی اتنی ہی استعمال کرنی چاہیے جتنی ضرورت ہو، بلاضرورت زیادہ استعمال کرنا اضاعتِ مال میں شامل ہے۔ خیر! حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ کو اس پر تنبیہ کررہے تھے کہ چراغ کی بتّی زیادہ اونچی کیوں رکھی؟ جب اس آدمی کے کان میں یہ آواز پہنچی تو سوچنے لگا کہ آدمی اپنی بیوی کے لیے تو سب کچھ قربان کرتا ہے، اور یہ تو اپنی بیوی کو اور وہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کو صرف اتنی سی بات پر ڈانٹ رہے ہیں، بھلا وہ مجھے کیا دیں گے۔ اس آدمی نے اپنے طور پر یہ سوچ لیا اور حضور کے بھیجے ہوئے ہونے کے باوجود بھی اپنی بات حضرت عثمانؓ سے نہیں کہی اور واپس ہوگیا۔ دوسرے دن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ تمہاری ضرورت پوری ہوئی یا نہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیا منع کیا؟ تو اس نے کہا کہ مَیں نے اپنی ضرورت ان کے سامنے رکھی ہی نہیں۔ فرمایا کہ کیوں نہیں رکھی؟ تو اس نے پوری بات بتلائی کہ ایسا ایسا ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا مت سوچو، بلکہ جاؤ اور ان سے کہو۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ تاکید فرمائی تو یہ گیا اور جب اپنی حاجت پیش کی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے امید سے بھی زیادہ دیا۔ بعد میں اس نے کہا کہ مَیں رات کو بھی آپ کے پاس آیا تھا لیکن مَیں نے سنا کہ آپ اپنی اہلیہ کو چراغ کی بتّی تیز رکھنے پر ڈانٹ رہے تھے، تو مَیں نے ایسا ایسا سوچا اور واپس چلا گیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم نے سمجھا ہی نہیں، ہم تو اللہ اور اس کے رسول کی منشاء کے مطابق مال خرچ کرتے

ہیں، جہاں وہ کہیں وہاں سب کچھ لٹانے کے لیے تیار ہیں اور جہاں وہ منع کر دیں تو وہاں ایک پائی بھی خرچ کرنے کے لیے ہم تیار نہیں۔

حضراتِ صحابہ اور ہمارے نظریہ میں فرق

حضراتِ صحابہ کا یہی مزاج تھا کہ جہاں اللہ اور رسول نے خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی وہاں خرچ کرنا، یا جتنی اجازت دی اس سے زیادہ خرچ کرنا اضاعتِ مال سمجھتے تھے اور جہاں خرچ کرنے کے لیے کہا ہے وہاں کتنا ہی خرچ کر ڈالو وہ اضاعتِ مال نہیں سمجھتے تھے اور ہمارے یہاں معاملہ اُلٹا ہو گیا ہے، اگر کسی نے شادی میں دو لاکھ خرچ کر ڈالے تو اس کو کوئی اضاعتِ مال نہیں کہتا، لیکن اگر کسی مدرسہ یا مسجد یا کسی نیکی کے کام میں پچاس ہزار دیدیئے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ تو لٹانے کے لیے بیٹھا ہے۔ ہمارا مزاج ایسا بن گیا ہے۔ حالانکہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے کہ سات دانے بوئے گئے اور ہر دانہ کے سات خوشے اور ہر خوشے کے اندر سو دانے ہوں گے گویا ایک کے سات سو دانے ملیں گے اور پھر وہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ہے کہ ایک کا سات سو گنا اور اس سے بھی زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ دینا چاہے گا دے گا، اب وہاں خرچ کرنے کو ہم فضول سمجھیں۔ اور جہاں خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے، وعید اور دھمکی دی گئی ہے؛ وہاں ہم خرچ کر ڈالتے ہیں۔

بہر حال! یہ وہ چیزیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ناجائز قرار دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی ان چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَالْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ

والدین، رشتہ دار اور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید

٦ ؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ٢٢ ؍مئی ١٩٩٩ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِیْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن یُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔أمابعد !

ماقبل سے ربط

ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا بیان چل رہا تھا، اس کے بعد والے باب میں ماں باپ کی نافرمانی اور رشتہ داروں کے حقوق کو نہ ادا کرنے پر کیا وعید ہے اس کو بیان کیا تھا۔ آج ماں باپ اور رشتہ داروں کے حقوق کے تتمہ اور تکملہ کے طور پر ہی ایک اور چیز بتلا رہے ہیں کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ماں باپ کی زندگی میں ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، جب ان کا انتقال ہوجاتا ہے تب اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میری طرف سے ماں باپ یا رشتہ داروں کے حقوق کے معاملہ میں کوتاہی ہوئی ہے، اور اس کا جی چاہتا ہے کہ جو کوتاہی اور ان کی نافرمانیاں ہوئیں اور ان کے حق جیسے ادا ہونے چاہئیں مجھ سے ادا نہیں ہو پائے؛ اس کی تلافی کی کیا شکل ہوگی۔ یا اگر اس کی طرف سے ایسی کوئی نوبت نہیں بھی آئی تب بھی ان کے ساتھ مزید اطاعت وسلوک کا ایک حصہ یہ بھی ہے جس کو اس باب میں بیان کرتے ہیں۔

باب کا عنوان ہے: "فَضْلُ بِرِّ أَصْدِقَآءِ الْأَبِ وَ الْأُمِّ وَالْأَقَارِبِ وَالزَّوْجَةِ وَسَائِرِ مَنْ یَّنْدُبُ اِکْرَامُهٗ" ماں باپ، رشتہ دار، بیوی اور جن جن لوگوں کا اکرام اس کے لیے ضروری ہے جیسے اساتذہ یا شیوخ یا خاندان کے بڑے؛ ان کے دوستوں اور

پہچان والوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا معاملہ کرنا۔

سب سے بڑی نیکی یہ ہے

۳۴۱: عنِ ابنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: اِنَّ أَبَرَّالْبِرِّأَن یَّصِلَ الرَّجُلُ وُدَّ أَبِیْہِ۔

ترجمہ: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے محبت والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

افادات: یعنی باپ کے ملنے والے، ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے، ان کے دوست واحباب کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا، ان کا اکرام کرنا، ان کی خدمت کرنا اور ان کو ہدیہ وغیرہ دینا، موقع بموقع ان کو دعوت دے کر اپنے گھر بلانا، مطلب یہ ہے کہ ان کو خوش رکھنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے وہ اختیار کرنا بھی بہت بڑی نیکی ہے، اور باپ کے حقوق کی ادائیگی کا ایک طریقہ یہ بھی ہے۔ عربی کے ایک شاعر کا شعر ہے:

أَمُرُّ عَلَی الدِّیَارِ دِیَارِ لَیْلٰی ❁ أُقَبِّلُ ذَاالْجِدَارَوَذَاالْجِدَارَا

وَمَا حُبُّ الدِّیَارِ شَغَفْنَ قَلْبِیْ ❁ وَلٰکِنْ حُبُّ مَنْ سَکَنَ الدِّیَارَا

مجنوں قیس جو لیلیٰ کا عاشق سمجھا جاتا ہے اس کی زبانی یہ شعر کہا گیا ہے کہ میں لیلیٰ کے شہر کے اس علاقہ سے جب گذرتا ہوں تو کبھی اِس دیوار کو بوسہ دیتا ہوں اور کبھی اُس دیوار کو بوسہ دیتا ہوں، اور ان دیواروں کے ساتھ میری محبت نہیں ہے، لیکن جو ذات اس آبادی میں آباد ہے یعنی لیلیٰ اس میں رہتی ہے اس لیے مَیں ان دیواروں کو بھی بوسہ دیتا ہوں۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کو جب کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو اس کے تعلق والوں کے ساتھ بھی وہ محبت کا برتاؤ کرتا ہے۔

دوست کا دوست

اور ہمارے معاشرہ میں ایک جملہ بولا بھی جاتا ہے کہ دوست کا دوست بھی دوست ہی ہوا کرتا ہے۔اسی طرح ماں باپ کے دوست واحباب اوران کے پاس اٹھنے بیٹھنے والوں کے ساتھ ان کی زندگی میں بھی اوران کی وفات کے بعد بھی آدمی کو بھلائی کا سلوک کرنا چاہیے یہی ان کے حقوق کی ادائیگی ہے،اگران کی زندگی میں ایسا معاملہ کروگے اوران کومعلوم ہوگا کہ ہمارے دوستوں کے ساتھ بھی ہمارا بیٹا محبت کا معاملہ کرتا ہے توان کا جی خوش ہوگا کہ اس کوان کے ساتھ براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ہمارے ملنے والے ہونے کی وجہ سے وہ ان کے ساتھ یہ معاملہ کررہا ہے۔اورمَیں پہلے بھی بتلاچکا ہوں کہ اگرآپ کی نسبت سے کسی آدمی نے کسی کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیااورآپ کو پتہ چلا کہ میری وجہ سے اس نے بھلائی کا سلوک کیا ہےتو آپ کے دل میں اس کی کتنی وقعت بڑھ جائے گی،اوریہی چیزمحبت کو بڑھانے والی اورحقوق کی ادائیگی میں معاون ومددگارثابت ہوتی ہے،اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس کی بھی تاکید فرمائی ہے۔

اسی سے ترقی ہوتی ہے

بزرگوں کا حال تو یہ تھا کہ وہ اساتذہ اوران کی اولاداوران کے خاندان والوں اسی طریقہ سے باپ کے دوست وغیرہ سب کا نہایت ہی اکرام محض اس وجہ سے کیا کرتے تھے کہ ان کواپنے بڑوں کے ساتھ تعلق تھا۔ایک بہت بڑے محدث تھے،ایک مرتبہ وہ حدیثِ پاک کا درس دے رہے تھے،دورانِ درس وہ کھڑے ہوگئے،پھر بیٹھ گئے،تھوڑی دیر کے بعد پھر کھڑے ہوگئے،پھر بیٹھ گئے،دوچارمرتبہ ایسا ہی کیا۔توکسی نے بعدمیں ان سے پوچھا کہ آج درس کے دوران آپ نے عجیب وغریب معاملہ کیا کہ

کھڑے ہوئے، پھر بیٹھے اور اس طرح دو چار مرتبہ کیا، کیا بات تھی؟ تو انہوں نے بتلایا کہ مَیں جہاں بیٹھ کر درس دے رہا تھا وہاں سامنے کچھ بچے کھیل رہے تھے، ان میں میرے استاذ کا بھی ایک بچہ تھا، جب وہ سامنے آتا تھا تو اپنے استاذ کی تعظیم کے خیال سے مَیں کھڑا ہو جاتا تھا۔ اور یہی چیز ہے جو آدمی کو آگے بڑھانے والی ہے اور اسی سے آدمی کی ترقی ہوتی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے سب سے بڑی نیکی یہ بتلائی کہ آدمی اپنے باپ کے محبت والوں کے ساتھ بھلائی اور احسان کا سلوک کرے؛ یہ بھی ماں باپ کا حق ہے۔

اور یہ صرف ماں باپ ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے رشتہ دار، یہاں تک کہ بیوی کے جو محبت والے ہیں ان کے ساتھ بھی محبت کا معاملہ کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے محبت والوں کے ساتھ محبت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم ان کے محبت والوں کے ساتھ بھی محبت کا معاملہ کریں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ

چنانچہ اسی سلسلہ میں ایک اور روایت پیش کرتے ہیں جس میں اوپر والی روایت کے ناقل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل بتلاتے ہیں کہ اس بات پر ان کا کتنا زیادہ عمل تھا۔

۳۴۲: عَنْ عبدِاللّٰهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عبدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ رضي الله عنه أَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْأَعْرَابِ لَقِيَهُ بِطَرِيْقِ مَكَّةَ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ عبدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ، وَحَمَلَهُ عَلىٰ حِمَارٍ كَانَ يَرْكَبُهُ، وَأَعْطَاهُ عِمَامَةً كَانَتْ عَلىٰ رَأْسِهِ، قَالَ ابْنُ دِيْنَارٍ: فَقُلْنَالَهُ أَصْلَحَكَ اللّٰهُ! اِنَّهُمُ الْأَعْرَابُ وَهُمْ يَرْضَوْنَ بِالْيَسِيْرِ، فَقَالَ عبدُاللّٰهِ بْنُ عُمَرَ رضي الله عنه: اِنَّ أَبَا هٰذَا كَانَ وُدًّا لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضي الله عنه، وَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ صِلَةُ الرَّجُلِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيْهِ.

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن دینارؒ راوی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ کے راستہ میں ملا، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو سلام کیا اور خود جس گدھے پر سوار تھے اس سے اتر گئے اور اس دیہاتی کو اس گدھے پر سوار کرایا اور ان کے سر پر جو عمامہ تھا وہ اتار کر اس کو دیا۔ حضرت عبداللہ بن دینارؒ (جو حضرت عبداللہ بن عمر کے شاگرد ہیں وہ بھی سفر میں ساتھ تھے، انہوں) نے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کا حال درست رکھے، آپ کے ساتھ صلاح وفلاح کا معاملہ فرمائے، یہ تو دیہات کے رہنے والے ہیں، ان کے ساتھ تو آپ احسان کا تھوڑا سا سلوک بھی کریں تو وہ خوش ہو جائیں گے، اگر کچھ تھوڑا سا بھی دیدیا ہوتا تو کافی تھا، لیکن آپ نے تو گدھا اور عمامہ اتنی بڑی بڑی چیزیں دیدیں؟ اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا باپ میرے والد صاحب کا دوست تھا، اس لیے میں نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ بھلائی اور محبت کا معاملہ کرے۔

افادات: دوسری روایت میں زیادہ وضاحت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ مکہ مکرمہ تشریف لے جا رہے تھے، سواری کے لیے تو اصل ان کے پاس اونٹ تھا لیکن ساتھ میں ایک گدھا بھی اسی لیے رکھا تھا کہ اونٹ پر سواری کرتے ہوئے طبیعت اکتا جائے تو گدھے پر سوار ہو کر طبیعت کو ذرا فرحت دے لیں، راستہ میں ایک دیہاتی ملا تو اس کو وہ گدھا بھی دیدیا اور اپنے سر پر جو عمامہ باندھے ہوئے تھے وہ بھی دیدیا۔ ہم نے پوچھا کہ آپ نے اس کو یہ دونوں چیزیں کیوں دیدیں؟ اگر تھوڑی سی کوئی چیز دیدیتے تب بھی یہ تو خوش ہو جاتا اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا باپ میرے والد صاحب کا دوست تھا، اس لیے میں نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا، اور میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ بھلائی اور محبت کا معاملہ کرے، اور یہاں تو اس آدمی کی

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ دوستی نہیں تھی بلکہ اس آدمی کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دوست تھے، تو گویا وہ اپنے والد کے دوست کا بیٹا تھا اس مناسبت سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا۔

آگے کی روایت کے الفاظ میں کچھ فرق ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو ایک دیہاتی ملا تو انہوں نے اس سے از خود پوچھا کہ تو تو فلاں کا بیٹا ہے نا؟ اس نے کہا کہ جی ہاں۔ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنا گدھا بھی دیا اور کہا کہ اس پر سوار ہو جاؤ، اور اپنا عمامہ بھی عنایت فرمایا اور کہا کہ اس کو اپنے سر پر باندھ لو۔

انہوں نے از خود اس کو پوچھا کہ تم فلاں کے بیٹے ہو؟ اور آج کل ہمارے یہاں تو ایسا ہوتا ہے کہ کوئی پہچان والا ملتا ہے اور اس کو خیال نہیں رہتا تو آدمی کہتا ہے کہ گزر جائے تو اچھا ہے، تاکہ اس کے ساتھ ملاقات کرنے اور کوئی سلوک کرنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ ہم تو صرفِ نظر اور چشم پوشی کرتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں کرنا چاہیے دیکھو! حضرت ابن عمر نے سامنے چل کر اس سے پوچھا اور اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا۔

والدین کے انتقال کے بعد ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے طریقے

٣٤٣: عَنْ أَبِی أُسَیْدٍ مَالِكِ بْنِ رَبِیْعَةَ السَّاعِدِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: بَیْنَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِذْجَآءَهُ رَجُلٌ مِّنْ بَنِیْ سَلَمَةَ فَقَالَ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! هَلْ بَقِیَ مِنْ بِرِّ أَبَوَیَّ شَیْءٌ أَبَرُّهُمَا بِهِ مِنْ بَعْدِمَوْتِهِمَا؟ فَقَالَ: نَعَمْ۔ اَلصَّلَاةُ عَلَیْهِمَا وَالْاِسْتِغْفَارُ لَهُمَا، وَاِنْفَاذُ عَهْدِهِمَا مِنْ بَعْدِهِمَا، وَصِلَةُ الرَّحِمِ الَّتِیْ لَاتُوْصَلُ اِلَّا بِهِمَا، وَاِکْرَامُ صَدِیْقِهِمَا. (رواہ ابوداود)

ترجمہ: حضرت ابو اسید ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس

میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بنوسلمہ - جو انصار ہی کا ایک قبیلہ تھا - کے ایک آدمی نے آ کر نبیٔ کریم ﷺ سے دریافت کیا کہ میرے ماں باپ وفات پا چکے ہیں، اب بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں کوئی چیز باقی رہ گئی ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جی ہاں! ایک تو ان کے لیے دعاءِ خیر اور دعاءِ مغفرت کرتے رہنا، اور ان کے دنیا سے جانے کے بعد ان کے عہد و پیمان اور وعدوں کو پورا کرنا۔ ان کے واسطہ سے جن کے ساتھ رشتہ داری لگتی ہے ان سارے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھنا، اور ان کے دوستوں کا اکرام کرنا۔

مرنے کے بعد بھی ثواب

افادات: ''کوئی چیز باقی رہ گئی ہے'' یعنی کوئی ایسا طریقہ ہے کہ ان کے دنیا سے جا چکنے کے بعد بھی مَیں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرسکوں؟ دیکھو! ماں باپ کے لیے دعا کا اہتمام بھی بہت ضروری ہے، آدمی جب تک زندہ ہے وہاں تک نیکی کے کام کرتا ہے، لیکن جب مر گیا تو اب اعمال کرنے کی صلاحیت ختم ہوگئی، زندگی میں وہ جو بھی نیک کام کرتا تھا اس کی وجہ سے اس کے نامۂ اعمال میں ثواب لکھا جاتا تھا وہ سلسلہ اب بند ہوگیا۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے ''اِذَامَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلَهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ'' (مسلم شریف، رقم ۱۶۳۱۔ ابوداود، رقم ۲۸۸۰) جب کسی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، البتہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اس کے مرجانے کے بعد بھی اس کے نامۂ اعمال میں ان کا ثواب لکھا جاتا ہے۔

''صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ'' ایک تو صدقۂ جاریہ یعنی نیکی کا کوئی ایسا کام کر گیا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، مثلاً کوئی کنواں کھدوادیا جس سے لوگ پانی حاصل کر کے پی رہے ہیں، یا کوئی مسافر خانہ بنوادیا، کوئی مدرسہ تعمیر کردیا یا مسجد تعمیر کردی، یا کوئی بھی ایسا کام کردیا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی بنائی ہوئی

اس چیز سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے اس کو ثواب ملتا رہے گا، اسی کو ہم اپنی زبان میں صدقۂ جاریہ کہتے ہیں۔

”أَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ“ دوسری چیز ہے: علم کی کوئی بات کسی کو سکھا دی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے جیسے آپ نے کسی کو نماز سکھا دی، اب آپ دنیا میں نہیں ہوں گے لیکن وہ آپ کی سکھائی ہوئی نماز پڑھ رہا ہے، یا پوری نماز نہیں، صرف سورۂ فاتحہ ہی سکھلائی اب جب تک وہ نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھتا رہے گا اس میں آپ کا حصہ لگا رہے گا اور آپ کو ثواب ملے گا، اور پھر اگر وہ کسی اور کو سکھائے گا اور وہ کسی اور کو سکھائے گا، اس طرح ہوسکتا ہے کہ یہ سلسلہ سالہا سال بلکہ صدیوں تک جاری رہے۔

حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم أجمعین کا جو مقام امت میں سب سے اونچا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دین پہنچانے کا ذریعہ یہی حضرات بنے، اب قیامت تک دین پر جتنا بھی عمل ہوتا رہے گا، سب میں ان کا حصہ رہے گا، ان کے ثواب کا کون مقابلہ کرسکتا ہے؟۔

اولاد کو ماں باپ کے لیے دعا کا اہتمام کرنا چاہیے

اور تیسری چیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ”أَوْوَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْلَهُ“ کوئی نیک بیٹا جو اس کے لیے دعاءِ خیر کرتا رہے۔ دیکھو! صرف یہ نہیں کہا کہ نیک بیٹا ہو، ویسے اگر بیٹا نیک ہے اور اس کو نیک بنانے پر ماں باپ نے محنت کی ہے، تو چاہے وہ ان کے لیے دعا نہ کرے، تب بھی اس کے نیک کام میں ماں باپ کا حصہ ہے، لیکن جب وہ نیک ہوگا تو یقیناً وہ ان کے لیے دعا بھی کرے گا ہی، گویا اس کی نیکی کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ماں باپ

کو نہ بھولے۔ لیکن اس میں ”یَدْعُوْلَہٗ“ کے الفاظ موجود ہیں کہ وہ ان کے لیے دعا کرے، گویا اس میں اس صالح اولاد کو بھی اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ تمہاری نیکی وصلاح اس بات پر موقوف ہے کہ والدین کے لیے دعاءِ خیر کرتے رہو۔ قرآنِ کریم میں بھی باری تعالیٰ نے دعا کا تذکرہ فرمایا ہے ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا﴾ اے اللہ! تو میرے ماں باپ کے ساتھ رحم کا معاملہ کر جیسا کہ بچپن میں جب کہ مَیں مہربانی اور شفقت کا محتاج تھا اس وقت انہوں نے میری پرورش کی، اب تو بھی ان کے ساتھ رحمت کا معاملہ فرما۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی ان کے لیے یہ دعا کی جارہی ہے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے ان پوچھنے والے صحابی کو یہ بتلایا کہ اگر تمہارے ماں باپ دنیا سے جاچکے ہیں تو ان کے ساتھ بھلائی کرنے کی شکل ابھی باقی ہے، یوں نہ سمجھنا کہ وہ تو گذر چکے اب مَیں کیا کروں، ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیسے کروں، ابھی بھی ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کا راستہ کھلا ہوا ہے، اور اس میں ایک بات یہ بتلائی کہ ان کے لیے دعا کرو، اس لیے ایصالِ ثواب کے ساتھ ساتھ دعا کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کا طرزِ عمل

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ کو دیکھا کہ اپنے اساتذہ اور مشائخ کے لیے اور اسی طرح کسی کے ساتھ اگر ذرا سا بھی تعلق ہوتا تو اس کے لیے بھی ایصالِ ثواب اور صدقات کا کثرت سے اہتمام فرمایا کرتے تھے، اور حضرت قربانی کے بے شمار جانور رکھتے تھے، جس میں براہِ راست اپنے اساتذہ اور مشائخ کے لیے تو حصہ رکھتے ہی تھے، لیکن جس کے ساتھ ذرا سا تعلق ہوتا، اس کے لیے بھی ایک حصہ رکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔ لہٰذا ہمیں بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ قربانی کے

موقع پر ان کی طرف سے قربانی کریں، کبھی ان کی طرف سے نفلی حج کرلیا، طواف کا اہتمام کرلیا، قرآنِ پاک کی تلاوت کر کے ان کو ایصالِ ثواب کر دیا، نیکی کے کام میں ان کی طرف سے خرچ کرلیا، کسی غریب کو کھلایا تو اس میں بھی ان کی نیت کر لی غرض یہ کہ نیکی کے مختلف کام ہیں ان کاموں میں ان کا بھی حصہ ہونا چاہیے۔

ایصالِ ثواب سے زیادہ دعا کا اثر ہوتا ہے

دیکھو! دو چیزیں ہیں، ایک ایصالِ ثواب اور دوسری دعا۔ عام طور پر دیکھا گیا کہ بعض لوگ ایصالِ ثواب کا اہتمام بہت کرتے ہیں لیکن دعا کا نہیں کرتے، حالانکہ دعا کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعا کا اثر زیادہ ہوتا ہے، اور اس کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! آپ کا کوئی دوست یا رشتہ دار ہے جس کو حکومت کا قصور وار ہونے کی وجہ سے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا، آپ اس کے لیے جیل میں دو وقت کھانا بنا کر بھیجتے ہیں تاکہ اس کو کھانے کی تکلیف نہ ہو، بس! آپ اتنا کر کے بیٹھ گئے۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ آپ اس کو چھڑوانے کے لیے کوشش کر رہے ہیں، اور جہاں جہاں تعلقات ہیں وہاں جا کر بڑوں کے ذریعہ سفارش کروا رہے ہیں کہ کسی طرح وہ چھوٹ جائے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ دعاءِ مغفرت کرنا ایسا ہے جیسا کہ اس کو چھڑانے کی محنت کرنا۔ اور ایصالِ ثواب ایسا ہے کہ ٹفن بنا کر اس کے لیے کھانا بھیجنا۔ اب آپ ہی بتاؤ کہ کس کی قدر زیادہ ہے۔

دعا آسان کام ہے

تو دعا کا اہتمام خاص ہونا چاہیے جس کی طرف سے عام طور پر لوگ غفلت

برتتے ہیں، حالانکہ دعا کرنا زیادہ آسان کام ہے، اور دعا کے لیے کوئی مخصوص حالت بھی ضروری نہیں ہے کہ نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر ہی دعا کی جائے، بلکہ چلتے پھرتے جہاں بھی ان کا خیال آ گیا ان کے لیے دعاءِ مغفرت کردی، درجات کی بلندی کی دعا کردی؛ یہ کافی ہے۔ دعا کے لیے تو کوئی وقت ہے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے دعا کے لیے کوئی شرط بھی نہیں لگائی ہے، باوضو ہونا بھی آداب میں سے ہے لیکن شرط اور ضروری نہیں ہے، ہر حال میں جب چاہیں آپ دعا کر سکتے ہیں۔

مغفرت کی دعا کا قاعدہ

تو مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ نبی کریم ﷺ نے ماں باپ کے دنیا سے تشریف لے جانے اور انتقال کر جانے کے بعد ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک طریقہ یہ بتلایا کہ ان کے لیے رحمت اور مغفرت کی دعا کی جائے۔ بعض لوگ یوں سوچتے ہیں کہ مغفرت کی دعا کتنی مرتبہ کرتے رہیں گے جب کہ ایک مرتبہ مغفرت تو ہو چکی ہے؟ آپ نے فضائلِ رمضان میں سنا ہوگا، حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ مغفرت کی دعا کا قاعدہ یہ ہے کہ آپ نے جس کے لیے مغفرت کی دعا کی ہے اگر اس کے گناہ معاف ہو چکے ہیں تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ کی یہ دعا ضائع اور برباد جانے والی نہیں ہے، آپ کی یہ دعا اس کے لیے درجات کی بلندی کا سبب بنے گی۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی دوسری شکل

دوسری شکل یہ بھی بتلائی کہ ان کے دنیا سے جانے کے بعد ان کے عہد و پیمان اور وعدوں کو پورا کرنا، انہوں نے کسی کے ساتھ بھلائی کا کوئی وعدہ کیا تھا اور اس وعدہ کو پورا کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی اور وہ آ کر کہتا ہے کہ آپ کے والد نے مجھ سے یہ وعدہ

کیا تھا تو آپ کو چاہیے کہ ماں باپ نے جن جن سے وعدہ کر رکھا تھا ان کو بے رخی سے ایسا نہ کہہ دیں کہ انہوں نے وعدہ کیا تھا، وہ تو دنیا سے گئے، مَیں نے تو وعدہ نہیں کیا تھا، بلکہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان سے کہہ دو کہ ٹھیک ہے ان شاء اللہ مَیں اس وعدہ کو پورا کرنے کا اہتمام کروں گا، یہ بھی ان کے ساتھ بہت بڑی نیکی ہے۔

بڑوں کے یہاں یہ دستور رہا ہے کہ اپنے کسی عزیز کے انتقال کے بعد جہاں وہ یہ اعلان کرتے ہیں کہ کسی کا کوئی قرضہ یا مطالبہ ہو تو مجھ سے مانگ لینا، کوئی حق ہو تو مجھ سے وصول کر لینا؛ وہیں یہ بھی اعلان کرتے تھے کہ انہوں نے کسی سے کوئی وعدہ کیا ہو تو مَیں اس کو پورا کروں گا۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ کا جانشین بنایا گیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے جو اعلان کیا وہ یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ نے اگر کسی سے کوئی وعدہ کیا ہو تو وہ میرے پاس آوے، مَیں اس وعدہ کو پورا کروں گا۔ (بخاری شریف، کتاب الشہادات۔ رقم، ٢٥٣٧)

اسی طرح ماں باپ نے بھی کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے مثلاً کسی کا بچہ اسکول یا مدرسہ میں پڑھتا ہے اور اس کے ابا سے تمہارے والد نے کہا تھا کہ اس کی تعلیم کا پورا خرچہ مَیں برداشت کرتا رہوں گا، اب اس کی تعلیم کے چند سال ہی ہوئے تھے اور ابا کا انتقال ہو گیا، اب وہ آدمی آکر کہتا ہے کہ آپ کے والد صاحب نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا، اب اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت دی ہے، اور آپ کے پاس دینے کی صلاحیت ہے تو کوشش کر کے اس وعدہ کو پورا کیجیے، ان شاء اللہ ان کی روح کو اس کا بہت ہی زیادہ فائدہ پہنچے گا اور ان کی درجات کی بلندی کا بڑا ذریعہ بنے گا۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی تیسری شکل

اور تیسری شکل یہ بھی ہے کہ ان کے واسطہ سے جن کے ساتھ رشتہ داری لگتی ہے ان سارے رشتہ داروں کا بھی خیال رکھنا، گویا یہ بھی ان کے ساتھ نیکی کا تعلق ہے۔ جیسے بھائی بہن۔ جیسا کہ مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ان کے ساتھ رشتہ باپ کی اولاد ہونے کی وجہ سے ہی جڑتا ہے، اسی طرح چچا، ماموں، خالائیں، پھوپھیاں وغیرہ رشتہ داریاں وہ ہیں جن کے لیے ماں باپ واسطہ بنے ہیں، تو ان سب کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا بھی ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا ایک حصہ ہے۔

والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کی چوتھی شکل

اور چوتھی شکل یہ ہے کہ ان کے دوستوں کا اکرام کرنا۔ دیکھو! صرف رشتہ داروں کا نہیں فرمایا، اس لیے کہ ان کے ساتھ تو رشتہ داری ہے، اس لیے ان کا تو خیال کرنا ہی ہے، لیکن والدین کے جو دوست تھے، ان سے محبت و تعلق رکھنے والے تھے ان کے ساتھ بھی حسبِ مرتبہ سلوک کرنا چاہیے، یعنی جس کے ساتھ زیادہ دوستی تھی تو اس کے ساتھ زیادہ سلوک کرنا چاہیے، کسی کے ساتھ کبھی کبھار اٹھنا بیٹھنا ہوتا تھا تو ان کے ساتھ اس کے مناسب معاملہ کرنا چاہیے؛ یہ بھی ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک ہے، اور اس کا اہتمام کرنا چاہیے، اس کے نتیجہ میں آدمی ماں باپ کا فرمانبردار لکھا جاتا ہے۔ کسی نے اگر ماں باپ کی زندگی میں ان کے ساتھ فرمانبرداری کا معاملہ نہیں کیا، گمراہی میں مبتلا تھا اور ماں باپ کے حق ادا نہیں کرسکا، جب ان کا انتقال ہوگیا اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توفیق دی اور ہدایت نصیب ہوئی، اب پچھتا رہا ہے کہ مَیں کیا کروں؛ تو اس کے لیے ماں باپ کے حقوق ادا کرنے کے یہ سارے طریقے ہیں، اگر ان سب کا اہتمام کرے

گا تو اللہ تعالیٰ اس کو ماں باپ کا فرمانبردار لکھ دیں گے۔

حضرت عائشہ کو حضرت خدیجہ پر غیرت

٣٤٤: وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: مَاغِرْتُ عَلٰی أَحَدٍ مِّن نِّسَآءِ النَّبِیِّ ﷺ مَاغِرْتُ عَلٰی خَدِیْجَةَ رضی اللہ عنہا، وَمَارَأَیْتُهَاقَطُّ، وَلٰکِنْ کَانَ یُکْثِرُ ذِکْرَهَا، وَرُبَّمَا ذَبَحَ الشَّاةَ، ثُمَّ یُقَطِّعُهَا أَعْضَآءً، ثُمَّ یَبْعَثُهَافِیْ صَدَائِقِ خَدِیْجَةَ، فَرُبَّمَاقُلْتُ لَهُ: کَأَنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْ الدُّنْیَا اِلَّا خَدِیْجَةُ! فَیَقُوْلُ: اِنَّهَا کَانَتْ وَکَانَتْ وَکَانَ لِیْ مِنْهَاوَلَدٌ.

وفی روایة: وَاِنْ کَانَ لَیَذْبَحُ الشَّاءَ، فَیُهْدِیْ فِیْ خَلا ئِلِهَامِنْهَا مَایَسَعُهُنَّ.

وفی روایة: کَانَ اِذَاذَبَحَ الشَّاةَ یَقُوْلُ: أَرْسِلُوْابِهَااِلٰی أَصْدِقَآءِ خَدِیْجَةَ.

وفی روایة قَالَتْ: اِسْتَأْذَنَتْ هَالَةُ بِنْتِ خُوَیْلِدٍأُخْتُ خَدِیْجَةَ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَعَرَفَ اسْتِئْذَانَ خَدِیْجَةَ، فَارْتَاحَ لِذٰلِكَ فَقَالَ: أَللّٰهُمَّ هَالَةُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ۔

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات میں کسی پر مجھے اتنی غیرت نہیں آئی جتنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آئی، حالانکہ مَیں نے ان کو دیکھا بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے، اور کبھی آپ ﷺ بکری ذبح فرماتے تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کے یہاں وہ گوشت بھیجتے تھے۔ تو مَیں کبھی یہ کہتی تھی کہ خدیجہ کے علاوہ دنیا میں کوئی عورت ہی نہیں ہے؟ حضور ﷺ فرماتے کہ وہ ایسی تھی، ایسی تھی، (یعنی ان کی خوبیوں کا تذکرہ فرماتے تھے) اور میری ساری اولاد انہیں سے ہے۔ ایک مرتبہ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے یہاں تشریف لائیں اور انہوں نے اجازت طلب کی۔ آپ کو حضرت خدیجہ کا استیذان یاد آ گیا، آپ ﷺ کی طبیعت میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فرمایا کہ خدیجہ کی بہن ہالہ معلوم ہوتی ہے۔

افادات: کسی کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ان میں آپس میں رقابت کا

معاملہ چلتا ہے، اگر شوہر نے کسی ایک کی ذرا سی تعریف کردی تو دوسری کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اتنی تعریف کیوں کردی۔ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی بیویوں میں کسی پر مجھے اتنی غیرت نہیں آئی جتنی حضرت خدیجہ پر غیرت آئی، حالانکہ مَیں نے ان کو دیکھا بھی نہیں، اس لیے کہ حضرت خدیجہ کی وفات کے دو سال بعد نبی کریم ﷺ کا نکاح حضرت عائشہ سے ہوا اور پھر رخصتی تو مدینہ منورہ آکر ہوئی تھی۔ اب یہ غیرت کیوں آئی؟ اس کی وجہ وہ خود فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کثرت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے کہ خدیجہ ایسی تھی، خدیجہ ایسی تھی، خدیجہ ایسی تھی۔ پھر فرماتی ہیں کہ کبھی آپ ﷺ بکری ذبح فرماتے تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے حضرت خدیجہ کی سہیلیوں کو تلاش کر کر کے ان کے یہاں وہ گوشت بھیجتے تھے۔

ہمارے معاشرہ کی ایک خرابی اور اس کا علاج

ہمارے معاشرہ میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ اگر آدمی کبھی ماں باپ کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرتا ہے تو بیوی بیچ میں آڑے آتی ہے، وہ یوں کہتی ہے کہ فلاں کو اتنا دینے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر بیوی کے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنا چاہتا ہے تو ماں باپ اس کے آڑے آتے ہیں کہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ شریعت نے دونوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے، جس کا جیسا مقام و مرتبہ ہو اس کے مناسب، اور جس کی جیسی رشتہ داری ہو اس کی اسی حیثیت کے مطابق بھلائی کا معاملہ کرنا چاہیے۔

ہاں! اگر اپنے ماں باپ کا حق ادا نہیں کرتا اور بیوی کے ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرتا رہتا ہے تو یہ اس کے لیے عیب کی چیز ہے، لیکن یہ جو کام کر رہا ہے وہ

برا کام تو نہیں کر رہا ہے، اس لیے اس کو سمجھایا جائے گا کہ بیوی کے ماں باپ تو ایک نسبت کی وجہ سے آئے ہیں، براہِ راست تیرے ماں باپ کا حق تجھ پر زیادہ ہے۔ تو اُس سے بھی اس کو روکنا نہیں ہے بلکہ اِس پر بھی آمادہ کرنا ہے کہ جب تو اس سے کم درجہ کی چیز کا خیال رکھ رہا ہے تو اوپر کے درجہ کی چیز کا خیال تو تجھے بطریقۂ اولیٰ رکھنا چاہیے۔ ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ وہ مت کر اور یہ کر۔

ہمارے معاشرہ کی اس خرابی کو دور کرنے کی آسان صورت یہی ہے کہ اگر وہ بیوی کے رشتہ داروں کے حقوق میں کوتاہی کرتا ہو تو ماں باپ خود کہیں کہ تم وہاں کیوں نہیں جاتے؟ اور ان کا حق کیوں ادا نہیں کرتے؟ یا اگر وہ ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے تو بیوی اور بیوی کے رشتہ داروں کو چاہیے کہ وہ کہیں کہ بھئی! تم ہمارے ساتھ تو اچھا معاملہ کرتے ہو اور اپنے ماں باپ، بھائیوں بہنوں اور پھوپھیوں کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں نہیں کرتے؟ ان کے ساتھ تو زیادہ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر ایسا طریقہ اپنایا جائے تو آپ ہی آپ معاملہ سدھر جائے گا۔

کسی کی بدعملی تمہیں انصاف کے تقاضوں سے نہ ہٹاوے

اس کے برخلاف ہمارے یہاں تو کوشش یہ ہوتی ہے کہ یہ ہمارا اکیلے کا بن کر رہ جائے، جب ایسی کوشش کریں گے تو وہ آپ کا بھی نہیں بنے گا، اس لیے کہ جو اپنے ماں باپ کا نہیں بنا؛ وہ آپ کا کاہے کو بنے گا؟ سیدھی بات ہے۔ اس لیے یہ طریقہ غلط ہے اور شریعت اس چیز کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۚ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ کسی قوم کی خرابی اور بدعملی تمہیں انصاف کے تقاضوں سے نہ ہٹاوے یعنی مثلاً بیوی اور اس کے گھر والوں نے بدسلوکی کی ہے تو

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ اپنے بیٹے سے یوں کہیں کہ ان کے ساتھ تعلق مت رکھو، یا ماں باپ نے بیوی کے ساتھ کوئی برا معاملہ کیا ہے تو بیوی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ شوہر سے کہے کہ ماں باپ کے ساتھ بھلائی مت کرو؛ یہ انصاف کے تقاضہ سے ہٹنے والی بات ہے۔ انصاف کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر ایک کے حق کو ادا کیا جائے، اگر آپ کے ساتھ کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ انتقامی کارروائی شروع کر دیں، انتقامی کارروائی شروع کرنا یہ بڑا خطرناک کام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سب کی حفاظت کرے کہ ایسی ہی بدلہ کی کارروائی اگر اللہ تعالیٰ ہم سے کرنے لگیں تو ہمارے لیے تو جینا دوبھر ہو جائے۔

بندہ طاقتِ انتقام نہ دارد

حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب سرہندی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور جانشین اپنے مکتوبات میں اپنے متعلق لکھتے ہیں کہ ”بندہ طاقتِ انتقام نہ دارد“ بندہ انتقام لینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ گویا یہ تو آدمی کو سوچنا ہی نہیں چاہیے، اگر کسی نے کوئی غلط حرکت کی تو اس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا، انتقامی کارروائی کرنا تو گویا قانون اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ اور یہ یاد رہے کہ دنیا کی کوئی بھی حکومت یا مینجمنٹ اس بات کو برداشت نہیں کرے گا کہ اس کے ماتحتوں میں سے کوئی آدمی قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے۔ ہم بھی اگر انتقامی اور بدلہ کی کارروائی پر اتر آتے ہیں تو درحقیقت ہم بھی اللہ تعالیٰ کے قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں بخشے نہیں جائیں گے۔ اور پھر کسی نے اگر غلطی کی تو اپنا مزاج معاف کرنے کا بنایا جائے، یہ سوچنا چاہیے کہ اگر اس کو ہم معاف

کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف کرے گا، ہم نے بھی تو اللہ تعالیٰ کی بڑی نافرمانیاں کی ہیں۔ خیر! بات دور نکل گئی۔

بیوی کی سہیلیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا

یہاں بات یہ چل رہی تھی کہ نبی کریم ﷺ اگر بکری ذبح فرماتے تھے، تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی سہیلیوں میں تقسیم فرماتے تھے، حالانکہ ان کے انتقال کو کئی سال ہو چکے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ حضرت خدیجہ کا تذکرہ فرماتے تو مَیں کبھی یہ کہتی تھی کہ خدیجہ کے علاوہ دنیا میں کوئی عورت ہی نہیں ہے؟ حضور ﷺ جواب میں فرماتے کہ وہ ایسی تھی، ایسی تھی، یعنی ان کی خوبیوں کا تذکرہ فرماتے تھے، اور کبھی حضور ﷺ خاص یہ چیز فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری اولاد انہیں سے ہے سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے، کہ وہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے تھے، باقی حضرت خدیجہ کے علاوہ کسی ازواجِ مطہرات سے آپ کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت ہالہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ کے یہاں تشریف لائیں اور انہوں نے گھر میں آنے کے لیے باہر سے اجازت طلب کی، ان کی آواز حضرت خدیجہ کی آواز سے ملتی جلتی تھی، اس آواز کو سن کر نبی کریم ﷺ کی طبیعت میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور فرمایا کہ خدیجہ کی بہن ہالہ معلوم ہوتی ہے۔ گویا ان کی آواز اور لہجہ نے حضرت خدیجہ کے لہجہ کی یاد دلا دی تو یہ بھی حضورِ اکرم ﷺ کے لیے خوشی کا باعث بن گئی۔

نسبت اور تعلق کی وجہ سے چھوٹوں کا اکرام کرنا

٣٤٥: عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَرَجْتُ مَعَ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ الْبَجَلِيِّ رضی اللہ عنہ فِيْ سَفَرٍ، فَكَانَ يَخْدُمُنِيْ فَقُلْتُ لَهُ: لا تَفْعَلْ، فَقَالَ: اِنِّيْ قَدْ رَأَيْتُ الْأَنْصَارَ تَصْنَعُ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم شَيْئًا آلَيْتُ عَلىٰ نَفْسِيْ أَنْ لَّاأَصْحَبَ أَحَداً مِّنْهُمْ اِلَّا خَدَمْتُهُ. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک سفر میں تھا، اور وہ میری خدمت کرتے تھے۔ مَیں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت! آپ ایسا نہ کریں، حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مَیں نے حضراتِ انصار کو دیکھا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ مدد اور بڑا اکرام کیا کرتے تھے جب سے مَیں نے ان کو ایسا کرتے دیکھا اس وقت سے قسم کھا رکھی ہے کہ ان انصار کے خاندان کا کوئی بھی آدمی ہوگا، مَیں اس کی خدمت کیا کروں گا۔

افادات: حضرت جریر رضی اللہ عنہ بڑے صحابہ میں سے ہیں، عمر میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بڑے تھے۔ اور وہ سفر میں حضرت انس کے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی خدمت کرتے تھے، اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضرت! آپ تو بڑے ہیں، آپ میرا کام کرتے ہیں تو مجھے بھی شرم آتی ہے، مَیں آپ کا کام کیا کروں گا۔ تو حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ مَیں نے مدینہ منورہ کے رہنے والے حضراتِ انصار کو دیکھا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت زیادہ مدد اور بڑا اکرام کیا کرتے تھے۔ جب سے مَیں نے ان کو ایسا کرتے دیکھا اس وقت سے قسم کھا رکھی ہے کہ ان انصار کے خاندان کا کوئی بھی آدمی ہوگا، مَیں اس کی خدمت کیا کروں گا۔ چوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ انصاری تھے اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کو جو نسبت اور تعلق تھا اس کا حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے کتنا زیادہ خیال کیا کہ بڑے ہونے اور منع کرنے کے باوجود حضرت انس کی - جو چھوٹے تھے-

خدمت کرتے تھے۔ ہمارے اکابر کی یہی تعلیم ہے۔اور نبی کریم ﷺ کی ہدایت اور آپ کے ارشادات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔

آج کل یہ ساری چیزیں ہم نے چھوڑ رکھی ہیں اسی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا پورا معاشرہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکا ہے، گھروں اور خاندانوں میں اور قبیلوں میں کوئی تعلقات باقی نہیں ہیں۔آپس میں لڑائی جھگڑے اور ایک دوسرے کے ساتھ بدگمانیاں جڑ پکڑ چکی ہیں۔اگر ان ساری تعلیمات پر عمل کا اہتمام کیا جائے تو کبھی بھی آپس کے جھگڑے اور نزاعات پیدا نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان ہدایات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

اِکْرَامُ أَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَبَيَانِ فَضْلِهٖ

اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت

۱۳ رصفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۲۹ رمئی ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّدًاعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔أمابعد:

أعوذباللّٰہمن الشيطان الرجيم، بسم اللّٰہالرحمن الرحيم اِنَّمَايُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً.

اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے "اِكْرَامُ أَهْلِ بَيْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَبَيَانُ فَضْلِهٖ" نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت، آپ کے خاندان والوں کا اکرام اور اس کی فضیلت کا بیان۔ بیت کا معنٰی گھر، اہلِ بیت یعنی گھر والے۔ اہلِ بیت کا مصداق کون ہیں؟ اس سلسلہ میں اہلِ سنت والجماعت اس بات پر متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات اور آپ کی اولاد اور آپ کے خاندان بنو ہاشم والے؛ سب اہلِ بیت میں داخل ہیں۔

یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی دو آیتیں پیش فرمائی ہیں، پہلی آیت سورۂ احزاب کی ہے، اس سے پہلے اور بعد کی آیتوں میں نبی کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو خطاب کر کے بہت ساری چیزیں بطورِ ہدایت بتلائی گئی ہیں اور بہت سارے احکام دیے گئے ہیں، انہیں کے درمیان یہ آیت بھی ہے ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُاللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْراً﴾ اے نبی کے گھر والو! اللہ

تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ تم سے گناہ اور نافرمانی کی گندگیوں کو دور کردے اور تم کو اس قسم کی چیزوں سے- چاہے وہ اعتقادی ہوں یا عملی، قولی ہوں یا اخلاقی، ہر قسم کی گندگیوں سے- مکمل طور پر پاک کردے، اس لیے تمہیں یہ احکام دیئے جارہے ہیں۔

اہلِ بیت سے کون مراد ہے؟

اس آیت میں اہلِ بیت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس کا مصداق کون ہے؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور مجاہد و عکرمہ وغیرہ حضرات سے اس کی تفسیر نقل کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ تو فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اہلِ بیت سے مراد تو ازواجِ مطہرات ہی ہیں، اور اس کی دلیل میں وہ یہ بات ارشاد فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پہلے والی اور اس کے بعد والی آیتوں میں صراحتاً عربی کا صیغہ جمع مؤنث حاضر استعمال کیا گیا ہے، اس لیے درمیان میں بھی یہی مراد ہے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے علاوہ دوسرے لوگ اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں، اس لیے کہ اس کی تفسیر کرنے والے خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس کے صاحبزادے ہیں، اور وہ خود بھی اہلِ بیت میں سے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

ویسے حدیث سے دیگر حضرات کا بھی اہلِ بیت میں سے ہونا ثابت ہے۔ چنانچہ مسلم شریف کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بالوں کی بنی ہوئی کالی چادر زیب تن فرما کر باہر تشریف لائے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں تو آپ نے اس چادر میں ان کو بھی سمولیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو بھی سمولیا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ آئے تو ان کو بھی لے لیا، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے ان کو بھی لے لیا، اور پھر فرمایا کہ اے اللہ! یہ میرے اہلِ بیت ہیں (مسلم شریف، ٦٤١٤) اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ حضرات بھی

اہلِ بیت میں سے ہیں۔ یہاں تو یہ بات چل رہی تھی کہ اس آیت میں اہلِ بیت کا جو لفظ استعمال کیا گیا اس سے کون مراد ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی رائے تو یہ ہے کہ اس آیت میں تو صرف ازواجِ مطہرات ہی مراد ہیں۔

البتہ دوسری جماعت اس بات کی طرف بھی گئی ہے کہ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اور اولاد اور آپ کے خاندان والے سب ہی مراد ہیں، اور اس کی دلیل میں وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے پہلی آیتوں میں جہاں ازواجِ مطہرات کو خطاب ہے وہاں جمع مؤنث حاضر کا صیغہ "کُنَّ" استعمال کیا گیا ہے، اور اس کے بعد کی آیتوں بھی وہی صیغہ "کُنَّ" استعمال کیا گیا، لیکن اس آیت میں جمع مذکر حاضر کا صیغہ "کُمْ" استعمال کیا گیا ہے، اس کی مصلحت ہی یہ ہے۔ گویا یہ بتلانا ہے کہ صرف ازواجِ مطہرات ہی نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے اہلِ خاندان بھی اس میں داخل ہیں، اسی مصلحت کے پیشِ نظر اس آیت میں صیغہ بدلا گیا ہے۔

اگرچہ بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ چوں کہ اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ازواجِ مطہرات کے ساتھ شامل کرنا مقصود تھا، اس لیے آپ کے مذکر ہونے کی وجہ سے آپ کو غلبہ دیتے ہوئے جمع مذکر حاضر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔

بہر حال! یہ ایک علمی بحث ہے جو پیش کر دی گئی، باقی اتنی بات ضرور ہے کہ اہلِ سنت الجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اہلِ بیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات اور آپ کے اہلِ خاندان، آپ کی صاحبزادیاں اور ان کی اولاد؛ سب ہی داخل ہیں۔

ہر سید علوی ہے، لیکن ہر علوی کا سید ہونا ضروری نہیں

ویسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نسل

چلی ہے، اس معنیٰ کر اگر دیکھا جائے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی کی اولاد اس وقت دنیا کے اندر ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پیدا ہوئیں، ویسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اور بیویاں بھی تھیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اور بھی کئی نکاح کئے اور ان بیویوں سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد ہوئی، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے ہوئی؛ ان کو سادات کہا جاتا ہے، اور ہمارے یہاں اصطلاح میں لفظِ سید عام طور پر صرف اُنہیں کے لیے بولا جاتا ہے، وہ علوی بھی ہیں اور سید بھی ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیویوں سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ علوی تو کہلائے گی لیکن ان کا سید ہونا ضروری نہیں ہے، اس لیے ہر سید علوی تو ہے لیکن ہر علوی کا سید ہونا ضروری نہیں۔

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خاندان بنو ہاشم بھی اہلِ بیت کا مصداق ہیں۔ اب ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اولاد بھی شامل ہے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نسل نہیں چلی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر گذرا۔ ان کے ایک بھائی حضرت جعفر اور حضرت عقیل کی اولاد بھی اہلِ بیت میں داخل ہے۔

دلوں کے تقویٰ کی بات

﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ یہ آیت پہلے بھی گذر چکی ہے، اس کا ترجمہ بتلایا گیا تھا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں اور جن چیزوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا نام لگا ہوا ہے، ان چیزوں کی جو آدمی تعظیم کرتا ہے اور ان کا ادب و احترام کرتا ہے؛ یہ دلوں کے تقویٰ کی بات ہے، ان چیزوں میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی اور آخری پیغمبر ہیں، تو شعائر اللہ میں سب

سے اونچا مقام آپ ہی کا ہے، اس نسبت سے آپ ﷺ کی جو آل واولاد ہے وہ بھی شعائر اللہ کا مصداق بن سکتی ہے، اس معنیٰ کر اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔ بہرحال! یہ باب قائم کر کے اہلِ بیت کا اکرام اور ان کی فضیلت کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔

نبی کریم ﷺ کی محبت ایمان کا جزو ہے

نبی کریم ﷺ کی محبت ایمان کا جزو ہے، آپ ﷺ کی محبت کے بغیر کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا بلکہ آپ ﷺ کی محبت آدمی کو اپنی، اپنے ماں باپ، اپنی اولاد اور تمام لوگوں کی محبت پر غالب رہنی چاہیے، جب تک کہ یہ محبت غالب نہیں ہوگی تب تک اس کا ایمان کامل نہیں ہوگا۔ ویسے نفسِ ایمان کے لیے محبتِ رسول تو ضروری ہے، البتہ باقی تمام محبتوں کے مقابلہ میں نبی کریم ﷺ کی محبت کا غالب ہونا؛ یہ ایمان کے کمال کے واسطے ضروری ہے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے "لایُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی أَکُوْنَ أَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِیْنَ" (سنن دارمی۔٢٧٤١) تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا یہاں تک کہ مَیں (نبی کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس) اس کی نگاہوں میں اس کے ماں باپ اور اس کی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اور جتنے بھی اہلِ ایمان ہیں ان کو الحمدللہ فی الجملہ یہ کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی محبت سب سے زیادہ ہونے کی دلیل

بعض مرتبہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ یہ کیفیت مجھے حاصل نہیں ہے، حالانکہ یہ کیفیت فی الجملہ ہر اہلِ ایمان کو حاصل ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ہیں اور ہمارے اکابر میں تقویٰ کے اعتبار سے ان کا بڑا اونچا مقام

ہے، وہ ایک جگہ تشریف لے گئے وہاں کے نواب صاحب نے اس حدیث پر یہ سوال کیا کہ حضرت! نبی کریم ﷺ کی محبت اپنی، اپنے ماں باپ اور اپنی اولاد کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے، لیکن بہت سے لوگ اس معیار پر پورے نہیں اترتے۔ حضرت مفتی صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس حدیث پر بیان شروع کیا اور حضورِ اکرم ﷺ کے فضائل ومناقب بیان کرنے شروع کئے، اور بیان کرتے ہوئے درمیان میں کہا کہ اچھا! اس بات کو چھوڑو، اور نواب صاحب آپ کے بڑوں کا کچھ تذکرہ ہو جائے۔ فوراً نواب صاحب کہنے لگے کہ حضرت! نعوذ باللہ من ذالک۔ اللہ کی پناہ! نبی کریم ﷺ کا تذکرہ ہو رہا تھا اور درمیان میں آپ میرے خاندان کے بڑوں کی بات کہاں لائے؟ حضرت مفتی صاحب نے کہا کہ اب آپ ہی بتائیے کہ آپ کو یہ بات گوارہ نہیں ہوئی کہ نبی کریم ﷺ کا تذکرہ چل رہا تھا، اس کو درمیان میں چھوڑ کر آپ کے ماں باپ یا آپ کے خاندان کے بڑوں کا تذکرہ کیا جائے؛ تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ نبی کریم ﷺ کی محبت آپ کے دل میں ان تمام لوگوں سے زیادہ ہے۔

یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ بہت سے لوگوں کو اشکال رہتا ہے۔ کسی کی بیوی یا بیٹا نعوذ باللہ نبی کریم ﷺ کی شانِ اقدس میں ذرا سی ادنیٰ گستاخی کا کوئی لفظ بول دے تو کیا وہ آدمی اس کو برداشت کرے گا؟ بالکل نہیں کرے گا۔ کیسا ہی گیا گذرا آدمی کیوں نہ ہو لیکن وہ اس بات پر کوئی نہ کوئی ایکشن ضرور لے گا، یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ ہر مسلمان کے دل میں نبی کریم ﷺ کی محبت موجود ہے۔

محبوب سے متعلق چیزوں کی محبت

خیر! نبی کریم ﷺ کی محبت جب تک سب کی محبت پر غالب نہ ہو وہاں تک آدمی

مؤمن نہیں ہوسکتا۔ اور مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جس کے ساتھ بھی آدمی کو محبت ہوتی ہے تو اپنے محبوب کا تعلق جن جن چیزوں کے ساتھ ہوتا ہے، ان تمام چیزوں کے ساتھ بھی آدمی کے دل میں محبت و تعظیم و عقیدت ہوتی ہے۔ اگر آج اس مجلس میں کوئی آدمی ایک کرتہ لے کر آئے اور یوں کہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا کرتہ مبارک ہے، تو آپ اور مَیں اس کرتہ کے ساتھ کیا معاملہ کریں گے؟ یا اگر حلف کے ساتھ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ نبی کریم ﷺ کا بال مبارک ہے تو اس کے ساتھ تعظیم کا جو معاملہ مَیں اور آپ کریں گے وہ ظاہر ہے، مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ کوئی تعلق رہا ہے ان چیزوں کی محبت و تعظیم اور ان کے ساتھ اکرام کا سلوک ہم اپنے ایمان کا ایک حصہ اور جزو سمجھتے ہیں۔ اسی طریقہ سے جو لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاندانی رشتہ و تعلق رکھتے ہیں اور حضورِ اکرم ﷺ کی اولاد میں سے ہیں ان کے ساتھ کس طرح کی تعظیم و اکرام کا سلوک کرنا چاہیے؛ یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، چنانچہ اسی سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ایک دو روایتیں پیش کرتے ہیں۔

مقامِ غدیرِ خُم کا خطبہ

٣٤٦: عن يزيدبن حَيَّانَ قَالَ: اِنْطَلَقْتُ أَنَاوَحُصَيْنُ بْنُ سَبْرَةَ وَعَمْرُو بْنُ مُسْلِمٍ اِلىٰ زَيْدِبْنِ أَرْقَمَ رضی اللہ عنہ، فَلَمَّا جَلَسْنَااِلَيْهِ، قَالَ لَهُ حُصَيْنٌ: لَقَدْلَقِيْتَ يَازَيْدُ خَيْراً كَثِيْراً، رَأَيْتَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ، وَسَمِعْتَ حَدِيْثَهُ، وَغَزَوْتَ مَعَهُ، وَصَلَّيْتَ خَلْفَهُ، لَقَدْلَقِيْتَ يَازَيْدُ خَيْراً كَثِيْراً۔ حَدِّثْنَايَازَيْدُمَاسَمِعْتَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ۔ قَالَ: يَاابْنَ أَخِيْ! وَاللّٰهِ لَقَدْ كَبِرَتْ سِنِّيْ، وَقَدُمَ عَهْدِيْ، وَنَسِيْتُ بَعْضَ الَّذِيْ كُنْتُ أَعِيْ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَمَاحَدَّثْتُكُمْ؛ فَاقْبَلُوْا وَمَالَا؛ فَلَا تُكَلِّفُوْنِيْهِ۔ ثُمَّ

قَالَ: قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا فِيْنَا خَطِيْبًا بِمَآءٍ يُدْعٰى خُمًّا بَيْنَ مَكَّةَ وَالْمَدِيْنَةِ، فَحَمِدَ اللّٰهَ وَأَثْنٰى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ، وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ: أَلَا أَيُّهَا النَّاسُ، فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ؛ يُوْشِكُ أَنْ يَأْتِيَ رَسُوْلُ رَبِّيْ فَأُجِيْبُ، وَأَنَا تَارِكٌ فِيْكُمْ ثَقَلَيْنِ۔ أَوَّلُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ؛ فِيْهِ الْهُدٰى وَالنُّوْرُ، فَخُذُوْا بِكِتَابِ اللّٰهِ، وَاسْتَمْسِكُوْا بِهٖ۔ فَحَثَّ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ، وَرَغَّبَ فِيْهِ۔ ثُمَّ قَالَ: وَأَهْلُ بَيْتِيْ، أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ أُذَكِّرُكُمُ اللّٰهَ فِيْ أَهْلِ بَيْتِيْ۔ فَقَالَ لَهٗ حُصَيْنٌ: وَمَنْ أَهْلُ بَيْتِهٖ يَا زَيْدُ؟ أَلَيْسَ نِسَآؤُهٗ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهٖ؟ قَالَ: نِسَآؤُهٗ مِنْ أَهْلِ بَيْتِهٖ، وَلٰكِنْ أَهْلُ بَيْتِهٖ مَنْ حُرِمَ الصَّدَقَةَ بَعْدَهٗ۔ قَالَ: وَمَنْ هُمْ؟ قَالَ: هُمْ آلُ عَلِيٍّ، وَآلُ عَقِيْلٍ، وَآلُ جَعْفَرَ، وَآلُ عَبَّاسٍ۔ قَالَ: كُلُّ هٰؤُلَآءِ حُرِمَ الصَّدَقَةَ؟ قَالَ: نَعَمْ. (رواہ مسلم)

وَفِيْ رِوَايَةٍ: أَلَا وَإِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمْ ثَقَلَيْنِ، أَحَدُهُمَا كِتَابُ اللّٰهِ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ، مَنِ اتَّبَعَهٗ كَانَ عَلَى الْهُدٰى وَمَنْ تَرَكَهٗ كَانَ عَلٰى ضَلَالَةٍ.

ترجمہ: یزید بن حیان کہتے ہیں کہ مَیں اور حصین بن سبرہ اور عمرو بن مسلم (یہ تینوں تابعین میں سے ہیں) حضرت زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو حصین بن سبرہ نے ان سے کہا: اے زید! آپ نے تو بہت بڑی سعادت اور بھلائی پائی ہے، نبی کریم ﷺ کا دیدار کیا، آپ کے ارشادات کو سنا، نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوات میں شرکت کا موقع ملا، نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھنے کی سعادت وخوش بختی حاصل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے بہت ساری بھلائیوں سے نوازا، گویا آپ تو بڑے صاحبِ قسمت ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری فضیلتیں آپ کو عطا فرمائیں، اس لیے اے زید! آپ نے نبی کریم ﷺ سے جو چیزیں سنی ہیں ان میں سے کوئی بات سنائیے۔ (اس وقت حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بوڑھے ہوچکے تھے اس لیے) فرمانے لگے کہ اے بھتیجے! اللہ کی قسم میری عمر بہت زیادہ ہوگئی ہے، اور نبی کریم ﷺ کی صحبت کا زمانہ بھی بہت طویل ہوگیا ہے اور نبی کریم ﷺ کے جو ارشادات مجھے یاد تھے ان میں سے بہت کچھ مَیں بھول چکا ہوں، اس لیے حضورِ اکرم ﷺ کی زبانِ

مبارک سے سنے ہوئے ارشادات میں سے جو مجھے یاد ہیں وہ مَیں تمہارے سامنے پیش کروں گا، ان کو سنکر قبول کرلو، اور جو پیش نہ کرسکوں ان کو پیش کرنے کا مجھے پابند نہ بناؤ۔ اس کے بعد انہوں نے فرمایا: ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ پانی کے ایک چشمہ کے پاس جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان میں واقع ہے، جس کا نام ''خُم'' ہے، ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کی اور لوگوں کو وعظ ونصیحت فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا: اے لوگو سنو! مَیں ایک انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے لیے دنیا میں ہمیشہ رہنا مقدر نہیں فرمایا، ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے والا میرے پاس آجائے اور مَیں اللہ تعالیٰ کی اس طلب پر لبیک کہوں۔ اس لیے مَیں تمہارے درمیان دو وزنی اور مضبوط چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں، پہلی تو قرآنِ پاک ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ورہنمائی موجود ہے اور اس میں نور اور روشنی بھی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر جمے رہو، اس طرح نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو قرآنِ پاک پر عمل کرنے کی ترغیب دی اور اُبھارا۔ اس کے بعد فرمایا کہ دوسری چیز جو تمہارے درمیان چھوڑ کر جارہا ہوں وہ میرے خاندان والے اور اہلِ بیت ہیں، مَیں تم کو میرے گھر والوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں، ان کے ساتھ اکرام اور محبت کا معاملہ کرنا۔ مَیں تم کو اہل بیت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔ اس پر حضرت حصین بن سبرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے زید! نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواجِ مطہرات اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! آپ کی پاکیزہ بیویاں اہلِ بیت میں سے ہیں، اور جن لوگوں پر زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا گیا ہے یعنی بنوہاشم؛ وہ سب حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں سے ہیں۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ وہ کون کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت علی، حضرت عقیل، حضرت جعفر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی اولاد؛ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کیلیے زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا گیا ہے، اور وہی نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت ہیں۔

افادات: یہ واقعہ حجۃ الوداع سے واپسی کا ہے، نبی کریم ﷺ نے ۱۰ھ میں حج فرمایا تھا اور وہاں سے واپسی کے بعد تقریباً اسّی (۸۰) سے نوے (۹۰) دن کے درمیان نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی ہے۔ تو واپسی میں مقامِ ''خم'' میں پانی کا ایک چشمہ تھا اور وہاں پانی جمع ہوگیا تھا اس لیے اس کو تالاب اور ''غدیرِ خم'' بھی کہتے ہیں،

مقامِ جُحفہ جوشام والوں کی میقات ہے اسی کے قریب یہ علاقہ واقع ہے، وہاں نبی کریم ﷺ نے ایک خطبہ دیا۔

خطبۂ غدیرخم کا پس منظر

سیر اور تاریخ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بھی ایک وجہ ہوئی تھی۔ حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کی روایت بخاری شریف میں بھی موجود ہے، ان کو کسی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بدگمانی ہوگئی تھی، اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے دل میں ان کے متعلق کچھ کدورت اور معمولی سا میل تھا۔ ہوا یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے مالِ غنیمت کا خُمس وصول کرنے کے لیے یمن بھیجا تھا، اور جس لشکر کے پاس سے یہ مالِ غنیمت کا خُمس وصول کرنا تھا اس کے سپہ سالار حضرت خالد رضی اللہ عنہ تھے، اسی لشکر میں حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جو خُمس وصول کیا اس مال میں جو باندیاں تھیں ان میں سے ایک باندی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے استعمال کے لیے رکھ لی ویسے مالِ غنیمت کا جو خُمس ہوتا ہے اس میں اہلِ بیت کا بھی حصہ ہے ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُم مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی﴾ (الأنفال-٤١) اس خُمس کا پانچواں حصہ نبی کریم ﷺ کے خاندان والوں کا بھی ہے، اسی نسبت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس باندی کو اپنے حصہ میں لیا تھا، لیکن چوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دوسروں کے سامنے اس کی وضاحت نہیں کی تھی اس لیے کچھ حضرات کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق بدگمانی ہوئی۔ اور حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ سے بھی کہا کہ وہ باندی انہوں نے رکھ لی تو حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! تم حضورِ اکرم ﷺ سے اس کا تذکرہ کرنا۔ خیر! وہیں سے پھر وہ لوگ حجۃ الوداع میں پہنچے تھے اور وہاں سے واپسی میں مدینہ منورہ جاتے ہوئے حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ

فرماتے ہیں کہ مَیں نے موقع دیکھ کر نبی کریم ﷺ سے حضرت علی کی شکایت کی، اس پر نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے بریدہ! کیا تمہارے دل میں ان کے لیے میل وکدورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! انہوں نے ایسا کیا ہے اس لیے میل ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے کہا کہ ان کے متعلق اپنے دل میں میل مت رکھو، اس لیے کہ ان کا (حضرت علی کا) حق مالِ غنیمت کے خُمس میں اس سے زیادہ ہے جو انہوں نے لیا ہے۔ انہوں نے یہ جو باندی لی ہے وہ تو اپنے حق سے بہت کم ہے، اس سے زیادہ لیتے تب بھی ان کے لیے تو اجازت تھی۔ ان کے اس فعل پر تم اپنے دل میں کدورت کیوں رکھتے ہو؟ اس کو دور کرو۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، مَیں نے دور کردی۔ جب بات صاف ہوگئی تو وہاں اب دیر کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ (بخاری شریف، ۴۳۵۰)

مَیں جس کا دوست، علی بھی اس کے دوست

اس لیے کہ ایسی باتیں تو معاشرہ کے اندر پیش آتی ہی رہتی ہیں، اور آئندہ اپنے اہلِ خاندان اور اپنے اہلِ بیت کے ساتھ لوگوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے، اور آنے والی اُمت کو بھی آگاہ کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے اسی مقام ''غدیرِ خُم'' پر ایک خطبہ دیا، اور اسی تقریر میں نبی کریم ﷺ نے یہ باتیں بھی ارشاد فرمائیں، اور وہ جملہ بھی فرمایا جو روایتوں میں آتا ہے ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ، فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ'' (ترمذی۔۳۷۱۳) حضور ﷺ نے فرمایا کہ مَیں جس کا دوست؛ علی بھی اس کے دوست ہیں۔ یعنی جو آدمی مجھ سے دوستی کا دعویٰ کرتا ہے اس کو چاہیے کہ حضرت علی کو بھی اپنا دوست بنائے۔

شیعوں کی تردید

اس جملہ کی وجہ سے اہلِ سنت اور شیعہ کے درمیان میں ایک مسئلہ پیدا ہوگیا۔

شیعہ لوگ نعوذ باللہ یوں کہا کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کے اولین حقدار حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے آکر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق مارا۔ اور وہ لوگ ان حضراتِ خلفاءِ ثلاثہ کو برا بھلا بھی کہتے ہیں۔ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ فضیلت اور خلافت کی ترتیب وہی ہے۔

شیعہ اسی روایت سے دلیل پکڑتے ہیں کہ دیکھو! ''غدیرِ خُم'' میں نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا اس میں آپ نے ارشاد فرمایا تھا ''مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ، فَعَلِیٌّ مَوْلَاهُ'' مَیں جس کا دوست؛ علی بھی اس کے دوست ہیں۔ حالانکہ اسی روایت میں ہے کہ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مبارک باد دی کہ تمہارے متعلق حضورِ اکرم ﷺ نے بہت اونچی بات ارشاد فرمائی۔ لیکن اہلِ سنت و الجماعت کا موقف یہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ مَیں جس کا دوست، علی بھی اس کے دوست ہیں، اور پھر آپ نے اپنے اہلِ بیت کی فضیلت اور اپنے اہلِ خاندان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی؛ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلافت کے اولین حق دار حضرت علی ہیں؟ اس سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضور یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ جو مجھ سے محبت کا دعویٰ رکھتا ہو، اس کو چاہیے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی محبت کرے، چوں کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ والا واقعہ پیش آیا تھا، اسی مناسبت سے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان کے متعلق دل میں کسی طرح کا میل نہیں رہنا چاہیے، چاہے کچھ بھی بات پیش آجائے، اس لیے اس روایت سے شیعوں کا یہ دلیل پکڑنا درست نہیں ہے۔ بلکہ اس خطبہ میں تو تمام صحابہ موجود تھے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی آخری بیماری میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ کی طبیعتِ

مبارک کچھ ٹھیک ہو رہی ہے، لیکن اس سے بے فکر مت ہو جانا، آپ کا وقتِ موعود اب قریب آ چکا ہے، اس لیے چلو! چل کر پوچھ لیں کہ آپ کے بعد حکومت کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں رہے گی، اس لیے کہ ہوتا یہ ہے کہ جو حاکم ہوتا ہے اس کے بعد اس کی اولاد ہی آتی ہے، اس لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ کہا کہ چل کر پوچھ لیں، اگر وہ بنو ہاشم ہی میں ہے تب تو چل جائے گا، اور اگر وہ دوسروں کے پاس ہے تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کریں گے کہ ان کو ذرا ہدایت دیدیجئے کہ وہ ہم بنو ہاشم کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مَیں تو نہیں آؤں گا، اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع کر دیا کہ بنو ہاشم میں نہیں ہے تو پھر کبھی کوئی نہیں دے گا۔ (بخاری شریف، ۴۱۸۲)

اس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اگر اس خطبہ کا یہی مقصد ہوتا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے کہ پوچھنے جانے کی کیا ضرورت ہے، آپ کو تو معلوم ہی ہے، آپ خود بھی اس وقت موجود تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا "مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ، فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ" اس سے ہمارا حق بنتا ہے۔ جب یہ حضرات خود اس جملہ سے اپنا حق نہیں سمجھے تو پھر دوسرے لوگ اس سے ان کا حق کیسے ثابت کرتے ہیں؟ اور بھی باتیں ہیں۔ ضمناً یہ بات آ گئی تو مَیں نے مناسب سمجھا کہ کچھ باتیں پیش کر دوں۔

اہلِ بیت کے بارے میں تاکید

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ حجۃ الوداع سے واپسی میں مقام ''غدیرِ خُم'' میں دیا، اسی خطبہ کے کچھ اجزاء کو حضرت زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ نقل کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور لوگوں کو وعظ و نصیحت فرمائی اور اس میں یہ بھی فرمایا کہ اے لوگو سنو! مَیں ایک انسان ہوں اور اللہ تعالیٰ نے کسی

انسان کے لیے دنیا میں ہمیشہ رہنا مقدر نہیں فرمایا، ہر ایک کو یہاں سے جانا ہے، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلانے والا میرے پاس آجائے اور مَیں اللہ تعالیٰ کی اس طلب پر لبیک کہوں، گویا آپ ﷺ نے پہلے ہی اس بات سے باخبر کردیا کہ میرا دنیا سے رخصت ہونے کا زمانہ قریب آگیا ہے، چنانچہ حجۃ الوداع سے واپسی ہی میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ کو بتلادیا تھا کہ اب آپ کی وفات کا وقت قریب آچکا ہے۔

اور فرمایا کہ مَیں تمہارے درمیان دو وزنی اور مضبوط چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں پہلی تو قرآنِ پاک ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور اس میں نور اور روشنی بھی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اور اس پر جمے رہو، مطلب یہ ہے کہ اس میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان پر پورے طور پر عمل کرو، اس طرح نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو قرآنِ پاک پر عمل کرنے کی ترغیب دی اور اُبھارا اس کے بعد فرمایا کہ دوسری چیز جو تمہارے درمیان چھوڑ کر جارہا ہوں وہ میرے خاندان والے اور اہلِ بیت ہیں، مَیں تم کو میرے گھر والوں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں یعنی ان کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، ان کے حقوق کو ادا کرنے میں کوتاہی مت کرنا، ان کے ساتھ اکرام اور محبت کا معاملہ کرنا، مَیں تم کو اہل بیت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں۔

اہلِ بیت کا مصداق

اس پر حضرت حصین بن سبرہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ اے زید! نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت کون ہیں؟ کیا آپ کی ازواجِ مطہرات اہلِ بیت میں سے نہیں ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ہاں! آپ کی پاکیزہ بیویاں اہلِ بیت میں سے ہیں، اور جن لوگوں پر زکوٰۃ

لینا حرام قرار دیا گیا ہے یعنی بنو ہاشم؛ وہ سب حضور ﷺ کے اہلِ بیت میں سے ہیں پھر انہوں نے پوچھا کہ وہ کون کون ہیں؟ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضرت علی، حضرت عقیل، حضرت جعفر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہم کی اولاد؛ یہ سب وہ لوگ ہیں جن کے لیے زکوٰۃ لینا حرام قرار دیا گیا ہے اور وہی نبی کریم ﷺ کے اہلِ بیت ہیں۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں اپنے اہلِ بیت کے ساتھ حسنِ سلوک اور محبت کا معاملہ کرنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔

اگر نبی کریم ﷺ کی روحانی توجہات چاہئیں

۳٤۸: وَعَن بُنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ عَنُ أبی بَكُرِن الصِّدِّيقِ رضی اللہ عنہ مَوُقُوفاً عَلَيُهِ أَنَّهُ قَالَ: أُرُقُبُوا مُحَمَّداً ﷺ فِیُ أَهُلِ بَيُتِهِ. (رواه البخاری)

معنیٰ أُرُقُبُوا: رَاعُوُهُ وَاحُتَرِمُوُهُ وَأَكُرِمُوُهُ.

ترجمہ: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے اہلِ خاندان اور آپ کے اہلِ بیت کے سلسلہ میں حضورِ اکرم ﷺ کا خیال رکھیو۔

افادات: یہ روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ یعنی حضور ﷺ کو سامنے رکھتے ہوئے آپ کے خاندان والوں کے ساتھ محبت واکرام کا، خدمت اور بھلائی کا سلوک کرتے رہیو، ان کے حقوق کو ادا کرتے رہیو۔

اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے جو اہلِ بیت، خاندانِ بنو ہاشم اور سادات ہیں ان کے ساتھ نہایت ہی اکرام واحترام کا معاملہ کرنا چاہیے اور جیسا کہ مَیں پہلے بتلا چکا ہوں کہ سادات کا لفظ تو نبی کریم ﷺ کی اولاد جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے واسطہ سے چلی ہے اسی کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن اہلِ بیت کا مفہوم زیادہ عام ہے،

اس میں ان کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دوسری بیویوں سے جو اولاد ہیں، اسی طرح حضرت عقیل رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں ان کی اولاد یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ہیں ان کی اولاد بھی داخل ہے، اور یہ سب اہلِ بیت کہلاتے ہیں، ان تمام کے حقوق ادا کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے، ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، ان کے ساتھ آدمی جتنا بھلائی اور احسان کا سلوک کرسکتا ہو، اس میں اپنی طرف سے کمی نہ کرے، بلکہ ان کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے جتنا بھی محبت واکرام کا معاملہ کیا جائے گا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحانی توجہات اتنی ہی زیادہ اس کو حاصل ہوں گی۔ آج بھی جو لوگ اس قسم کا معاملہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ بھلائی اور برکت کی شکل میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خواب میں بشارت کی صورت میں محسوس کرتے ہیں۔

چنانچہ حضرت مولانا مفتی مرغوب احمد صاحب لاجپوری رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ''سفینۃ الخیرات'' ہے، اصل تو اردو میں تصنیف فرمائی تھی، گجراتی میں بھی ترجمہ ہوکر شائع ہوچکی ہے، اس کتاب میں انہوں نے اس قسم کے کئی واقعات ذکر کئے ہیں۔ ویسے علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی اس سلسلہ میں کئی کتابیں ہیں، اور اب تو اس موضوع پر اور بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں اس قسم کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں۔

آج ہم تمہاری عزت افزائی کرتے ہیں

اسی کتاب میں ایک واقعہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ تصوف کے ہمارے تمام سلسلوں میں آتے ہیں، بزرگوں میں

ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کو ''سید الطائفہ'' کہا جاتا ہے، یعنی صوفیوں کی جماعت کے سردار ہیں، تصوف کے ہر سلسلہ میں چاہے وہ چشتیہ ہو، قادریہ ہو، سہروردیہ ہو، یا نقشبندیہ ہو؛ تمام سلسلوں میں ان کا نام آتا ہے۔ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ پہلے شاہی پہلوان اور کشتی باز تھے، اور آپ جانتے ہیں کہ شاہی پہلوان کے لیے تنخواہ تو ہوتی ہی ہے اور ساتھ ہی ساری سہولتیں اور ہر طرح کی فیسلیٹی بھی مہیا ہوتی ہیں۔ ایک مرتبہ ایک اجنبی مسافر عام جسمانی بناوٹ کا آیا، دبلا پتلا آدمی تھا، اس نے آکر چیلنج کیا کہ مَیں شاہی پہلوان کو چت کرسکتا ہوں۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم نے جنید کو دیکھا بھی ہے؟ وہ تو بڑے ہٹے کٹے، اور بڑے مضبوط وتنومند اور بڑے ڈیل ڈول والے آدمی ہیں تم تو ان کی ایک انگلی سے ہی چت ہو جاؤ گے، ان کو چت کرنے کا دعویٰ کہاں کرتے ہو، اس نے کہا کہ مَیں چیلنج کرتا ہوں۔ یہ بات خوب پھیلی اور بادشاہ تک بھی پہنچی، جب اس نے شاہی پہلوان کو چیلنج کیا تو اس کو کیسے برداشت کیا جاسکتا تھا، لوگوں نے اس کو بہت ہی سمجھایا کہ یہ حماقت کہاں کرتے ہو؟ لیکن اس نے کہا کہ نہیں! مجھے تو مقابلہ کرنا ہی ہے، چنانچہ مقابلہ طے ہوا، اور تاریخ اور وقت طے ہو گیا، اطراف بستی اور دار السلطنت کے تمام لوگ، اور جن جن لوگوں کو پتہ چلا؛ سب ہی وقت پر پہنچ گئے اور بہت بڑا مجمع جمع ہو گیا، حضرت جنید جو پہلوان تھے وہ بھی مقابلہ کے لیے آئے، اور ادھر سے یہ آدمی بھی آئے، جب دونوں اکھاڑے کے میدان میں آمنے سامنے پہنچے تو مقابلہ شروع ہونے سے پہلے حضرت جنید کے کان میں اس آدمی نے یوں کہا کہ مَیں آلِ رسول ہوں اور قسمت کا مارا ہوا پریشان حال ہوں، اور مَیں نے یہ سب اس لیے کیا ہے کہ اس مقابلہ کے بہانے سے میری عزت بڑھے اور مجھے کچھ انعام ملے، اب سارے معاملہ کو سنبھالنا تمہارے ہاتھ

میں ہے۔بس! اس گفتگو کے بعد مقابلہ شروع ہوا تو حضرت جنید چت پڑ گئے، لوگوں میں شور مچ گیا کہ ایسے شاہی پہلوان جس کو آج تک کوئی چت نہ کرسکا، آج کیسے چت ہوگئے؟ اور ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی بات خلافِ توقع پیش آتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ پھر سے مقابلہ ہو، جیسے بچے جب کھیلتے ہیں اور پہلی بال پر جب اسٹامپ اُڑ جائے تو کہتے ہیں کہ ٹرائل بال تھی، ایسی بات ماننے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔اسی طرح یہاں بھی کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس لیے کہا کہ پھر سے مقابلہ ہو۔ چنانچہ پھر سے مقابلہ ہوا تو دوبارہ وہ چت ہوگئے، تیسری مرتبہ مقابلہ ہوا تو تیسری مرتبہ بھی چت ہوگئے، اب تو کوئی گنجائش ہی نہیں تھی، حالانکہ شاہی پہلوان کا اس طرح چت ہوجانا بڑی ذلت کی بات تھی۔ خیر! اس آدمی کی جیت کا اعلان ہوگیا اور اس کو بڑا انعام دیا گیا اور شاہی جوڑا دیا گیا اور بڑی عزت ہوئی۔ بعد میں بادشاہ نے حضرت جنید سے پوچھا کہ کیا بات تھی، آپ پر ایسی کیا افتاد پڑی تھی کہ تین تین مقابلے اور راؤنڈ ہوئے اور تینوں ہی میں آپ ہار گئے اور چت ہوگئے؟ اس پر انہوں نے جو حقیقت تھی وہ بتلائی کہ اس نے مجھے یہ کہا تھا اور میری غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ اس کے سامنے مَیں مقابلہ جیت جاؤں۔ بادشاہ کو بھی بڑا تعجب ہوا کہ ایسی بے نفسی کا معاملہ کیا کہ اتنے بڑے مجمع کے سامنے چت ہوکر نبی کریم ﷺ کی آل کے احترام کے لیے اپنی ذلت کو گوارہ کرلیا۔اور یہ بہت بڑی بات تھی۔

خیر! اسی رات کو حضرت جنید نے خواب میں نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے فرمایا کہ اے جنید! آجاؤ، جس طرح تم نے میری آل کا اکرام کیا ہے، اور ان کی عزت افزائی کی ہے؛ آج ہم تمہاری عزت افزائی کرتے ہیں۔اور پھر نبی کریم ﷺ نے اپنے سینے سے ملالیا۔اس کے بعد جب صبح کو اٹھے تو پھر ان کا رجحان اس پہلوانی سے ہٹ کر

اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف ہوا، اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے، اور وہ اونچا مقام حاصل کیا کہ آج تمام سلسلوں میں بڑے قرار دیئے جاتے ہیں۔ تو دیکھئے! ان کو یہ مقام آخر کیسے حاصل ہوا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک اچھے جذبہ سے کیا ہوا کوئی معمولی سا کام آدمی کی زندگی کے دھارے کو بدل دیتا ہے۔

سادات کا خیال رکھنے کا انعام

ایک اور واقعہ لکھا ہے: ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ حج کے ارادے سے مَیں نے پانچ سو درہم جمع کئے تھے، ویسے فرض حج تو ادا کر چکا تھا، نفلی حج کے لیے جانا چاہتا تھا اور ہمارے علاقہ کے لوگ اسی دن روانہ ہونے والے تھے، وہ پانچ سو درہم لے کر مَیں بازار میں کچھ ضروری سامان خریدنے کے لیے نکلا، راستہ میں ایک عورت ملی، اس نے کہا کہ مَیں سادات میں سے ہوں، میری بچیاں گھر پر بھوکی ہیں اور مَیں ضرورت مند ہوں، آپ میری ضرورت پوری کر دیجئے۔ انہوں نے اسی وقت پانچ سو درہم کی وہ تھیلی اس کے حوالہ کر دی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں بھی ایسا اطمینان و سکون عطا فرمایا کہ حج کا وہ جذبہ بھی دور ہو گیا اور مجھے اسی پر سکون مل گیا اور وہ قافلہ روانہ ہو گیا۔ پھر جب میرے شہر کے وہ لوگ حج سے واپس آئے تو مَیں ان کے استقبال کے لیے گیا، اس زمانہ میں دستور تھا کہ لوگ حاجیوں کو دعا دیتے تھے: ”بَارَكَ اللّٰهُ فِيْ حَجِّكُمْ، وَتَقَبَّلَ اللّٰهُ سَعْيَكُمْ“ اللہ تعالیٰ تمہارے حج میں برکت دے، تمہاری کوشش کو قبول فرمائے۔ تو مَیں ان کو یہ دعا دیتا تھا تو وہ بھی جواب میں مجھے یہی دعا دیتے تھے، مَیں جتنے بھی حاجیوں سے ملتا سب مجھے یہی دعا دیتے تھے، آخر مَیں نے ایک سے کہا کہ کیا بات ہے؟ آخر تم مجھے یہ دعا کیوں دیتے ہو؟ تو وہ کہنے لگا کہ تم تو وہاں حج کے اندر

ہمارے ساتھ ساتھ تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ سارا ماجرا میری سمجھ میں نہیں آیا۔ رات کو نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا، حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم نے میری اولاد کے ساتھ جو معاملہ کیا، اللہ تعالیٰ نے اس کی وجہ سے ایک فرشتہ تمہاری شکل کا پیدا کر دیا ہے جو قیامت تک ہر سال تمہاری طرف سے حج کرتا رہے گا۔

شریف زادی سیدانی کا دردانگیز واقعہ

ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ ایک سید زادے تھے، وہ بلخ میں رہتے تھے، ان کا انتقال ہو گیا اور میراث میں کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ ان کی بیوی بھی سیدانی تھی، اور ان کی چھوٹی چھوٹی بچیاں بھی تھیں۔ اس شہر میں مالی غربت کی وجہ سے کوئی رسوائی نہ ہو، اس خیال سے وہ اس شہر کو چھوڑ کر سمرقند چلی گئیں کہ شاید وہاں اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکالے۔ جب وہاں پہنچی تو نیا شہر تھا، سردی کا موسم تھا اور اس کے ساتھ بچیاں بھی تھیں، بڑی مفلوک الحال تھی، سردی سے بچاؤ کے لیے لباس بھی پورا نہیں تھا، کھانے پینے کی بھی محتاج اور بھوکی تھی۔ وہ عورت اپنی بچیوں کو ایک مسجد میں بٹھا کر تنہا نکلی۔ دیکھا کہ ایک آدمی رئیسانہ ٹھاٹھ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے اور آس پاس لوگ بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ کسی نے بتایا کہ یہ اس شہر کا حاکم ہے۔ اس کے سامنے پیش ہو کر کہا کہ مَیں شریف زادی سیدانی ہوں، مسافر ہوں، میرے ساتھ بچیاں بھی ہیں جو بھوکی ہیں، سردی سے بچاؤ کے لیے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے، آپ میری مدد کیجیے۔ اس حاکم نے جواب میں یوں کہا کہ کیا کوئی گواہ ہے کہ تم سیدانی ہو؟ یا کوئی شہادت ہے؟ اس نے کہا کہ یہ نیا شہر ہے، اور مَیں پردیسی ہوں، یہاں مجھے کوئی پہچانتا ہی نہیں ہے، تو مَیں کوئی گواہ لا کر کیسے پیش کروں گی؟ اس حاکم نے کہا کہ اس کے بغیر کوئی مدد

نہیں مل سکتی۔ وہ وہاں سے نکلی، راستہ میں ایک مجوسی، اگنی پوجک، آتش پرست ملا، جس کو ہم پارسی کہتے ہیں، وہ اس شہر کا کوتوال تھا، پولیس کا ہیڈ (ڈی آئی جی) سمجھ لو۔ اس عورت نے اپنی بات اس کے سامنے رکھی کہ مَیں حاکم کے پاس گئی تھی، اس نے تو مجھے یہ جواب دیا، اور میرا ایسا ایسا حال ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اس کوتوال کے ساتھ خیر منظور تھی، اس نے اسی وقت اپنے نوکر کے ذریعہ اپنی بیوی کے پاس یہ کہلوایا کہ ابھی اسی وقت فوراً یہاں آؤ اور ان سیدانی کے ساتھ ان کی بچیوں کے پاس جاؤ، اور وہاں سے ان بچیوں کو لے کر آؤ اور اپنے مکان میں الگ کمرہ میں ان کو عزت کے ساتھ رکھو، اور ان کا پورا اکرام کرو۔ چنانچہ اس کے حکم کے مطابق اس کی بیوی اس عورت کے ساتھ گئی، بچیوں کو لے کر آئی، ان کو کھلایا پلایا اور پھر ان کے لیے نئے کپڑے سلوائے، اور ان کے لیے رہنے کا بہترین انتظام کیا۔

اِدھر یہ ہوا کہ رات کو وہ حاکم جب سویا تو خواب میں دیکھا کہ میدانِ حشر قائم ہے اور نبی کریم ﷺ کے لِواءُالحمد کے نیچے تمام مسلمان جمع ہو رہے ہیں، یہ حاکم بھی اس جھنڈے کے نیچے جانا چاہتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ نے اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ اس نے یہ کہا کہ یارسول اللہ! مَیں تو آپ کا امتی ہوں اور مسلمان ہوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تیرے مسلمان ہونے کی کیا شہادت ہے؟ کوئی گواہ ہے؟ شہادت لیکر آؤ، یا کسی کو بلاؤ جو یہ گواہی دے کہ تم مسلمان ہو۔ یہ کہتا ہے کہ مَیں میدانِ حشر میں مارا مارا پھر رہا ہوں کہ کوئی یہ گواہی دینے والا مل جائے، لیکن کوئی گواہ نہیں ملا، تو پریشان اور عاجز ہو کر واپس آیا اور کہا کہ یارسول اللہ! مجھے کوئی گواہ نہیں مل رہا ہے جو میرے اسلام و ایمان کے متعلق گواہی دے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تو شہر کا حاکم تھا، اور سب شہر والے

تجھے پہچانتے تھے،اس کے باوجود تجھے ایمان کے متعلق گواہی دینے والا کوئی گواہ نہیں ملتا؛تو اس بے چاری پردیسی عورت کے پاس تو اس بات کی گواہی مانگ رہا تھا کہ وہ میری اولاد میں سے ہے؟ پردیس میں اس کے لیے کون گواہی دے گا؟اور اُسی خواب میں یہ بھی دیکھا کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی شاندار محل کی طرف اشارہ کیا کہ یہ محل اُس کوتوال کا ہے جس نے اس عورت کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا ہے۔

بس! یہ جواب آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے سنا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔اب وہ پریشان ہوگیا اور سر پیٹنے لگا اور اپنے رخسار پر طمانچے مارنے لگا۔پھر اس نے اپنے لوگوں کو کہا کہ جلدی سے جاؤ اور اس عورت کو ڈھونڈو،اور یہ خود بھی اس عورت کو تلاش کرنے کے لیے نکل پڑا کہ وہ عورت کہاں ہے،بے چینی میں اِدھر اُدھر چکر کاٹ رہا تھا، کسی نے بتلایا کہ وہ تو فلاں کوتوال کے گھر پر ہے۔وہ حاکم اس کوتوال کے گھر پر گیا اور کہا کہ ان سیدانی کو اس کی بچیوں کے ساتھ میرے حوالہ کردو،مَیں تجھے ایک ہزار اشرفیاں دیتا ہوں اس کوتوال نے کہا کہ تو ایک ہزار کی بات کرتا ہے؟اگر ایک لاکھ بھی دے تو مَیں ان کو تیرے حوالہ نہیں کروں گا۔جو خواب تو نے دیکھا ہے؛وہی خواب مَیں نے بھی دیکھا ہے۔اور حضورِ اکرم ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ تو نے میری اولاد کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کیا ہے اس لیے یہ محل تیرے واسطے ہے۔اور تجھے میرے اوپر اتنی ہی تو فضیلت حاصل تھی کہ تو مسلمان ہے،لیکن یہ شریف زادی سیدانی جب سے میرے گھر میں آئی ہے میرا پورا خاندان اس کے ہاتھ پر اسلام لا چکا ہے،اس لیے اب تجھے میرے اوپر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے،مَیں ان کو تیرے حوالہ نہیں کروں گا۔

اور درحقیقت یہ ایک طبعی اور فطری چیز ہے۔ آپ ذرا سوچئے کہ ہماری اولاد کے ساتھ اگر ہماری وجہ سے کوئی آدمی اکرام اور محبت وعزت کا معاملہ کرتا ہے، تو اس کی کتنی قدر ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تو اسی طرح نبی کریم ﷺ کی نگاہوں میں اس آدمی کی قدر کتنی ہوگی جو آپ ﷺ کی آل واولاد کے ساتھ اکرام ومحبت کا معاملہ کرتا ہے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت کا تقاضہ ہے کہ آپ کی آل واولاد جتنی بھی ہے اور جہاں بھی ہے ان کے ساتھ محبت واکرام کا اور بھلائی کا معاملہ کیا جائے، اس میں ذرہ برابر بھی کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سادات کے اکرام کے لیے نسبت ہی کافی ہے

اب ایک اشکال کی چیز ہے کہ بعض سادات کو دیکھا جاتا ہے کہ بدعملی میں مبتلا ہوتے ہیں، نماز کے پابند نہیں ہوتے، کسی اور برائی میں مبتلا ہوتے ہیں؛ تو کیا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر آپ کو معلوم ہے اور یقین ہے کہ یہ سادات خاندان (بنوہاشم) سے تعلق رکھتے ہیں، نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کا خاندانی رشتہ ہے؛ تو آپ کے لیے تو ان کے ساتھ محبت واکرام اور عزت کا معاملہ کرنے کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے، اب رہی یہ بات کہ اس کی بدعملی کا کیا؟ تو وہ خود اس کا ذمہ دار ہے، اس کی اس بدعملی کی وجہ سے آپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس کے ساتھ اکرام ومحبت کا سلوک نہ کریں۔

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال سے سمجھایا کرتے تھے کہ بھائی دیکھو! ہیرا اگر پاخانہ میں گر جائے تو پاخانہ میں گرنے کے بعد بھی وہ ہیرا ہونے سے نکل نہیں جاتا، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ وہ پاخانہ میں پڑا ہوا ہے، اور اس پر پاخانہ لگا ہوا ہے، لیکن جہاں اس ہیرے کو وہاں سے نکال کر دھو ڈالو گے تو پھر اس ہیرے کی

قیمت میں کوئی کمی نہیں آئیگی۔

یا یوں سمجھئے کہ کسی بچہ کو پاخانہ ہوگیا اور اس میں وہ ایسا لت پت ہوگیا کہ اس نے ہاتھ میں لے کر اپنے منہ پر بھی پھیرلیا، جیسا کہ بعض بچوں کی عادت ہوتی ہے تو کیا اس کی وجہ سے اس بچہ سے نفرت کی جائے گی؟ بالکل نہیں۔ ہاں! اب وہ بچہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کو پانی سے غسل دے کر پاک صاف کرنے کی ہم کوشش کریں، اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرتے ہوئے اس کو اس حالت سے نکالنے کی محنت کریں، لیکن اس حالت کی وجہ سے اس سے نفرت نہیں کی جائے گی۔ جیسے بچہ ایسی حالت میں بھی ہوتا ہے تو ماں اس سے نفرت نہیں کرتی، اسی طریقہ سے ہمیں بھی اس سے نفرت نہیں کرنی ہے۔ ہاں! اس کی بدعملی سے اس کو نکالنے کی پوری کوشش کریں گے۔

اگر سید بدعمل ہو

بعض لوگ پھر ان کے ساتھ محبت کے اندر غلو کرتے ہیں اور اس محبت کی وجہ سے ان کی اس بدعملی کو بھی سراہتے ہیں۔ یہ بات بھی غلط ہے۔ ان کی بدعملی میں ان کی اطاعت نہیں کرنی ہے۔ اطاعت وفرمانبرداری تو ہمیں صرف اللہ اور اس کے پاک رسول ﷺ ہی کی کرنی ہے، اگر وہ ایسا کام کرنے کے لیے کہہ رہا ہے کہ جو اللہ ورسول کے حکم کے خلاف ہے تو ہمیں اس کی اس بات کو نہیں ماننا ہے، لیکن اس کا اکرام ومحبت، اور اس کے ساتھ احسان وبھلائی کا سلوک کرنا ہے جو ایک الگ چیز ہے۔

اب سادات خاندان سے تعلق رکھنے کی وجہ سے بعض سادات عملی کوتاہیاں کرتے ہیں، اس سلسلہ میں بھی کتابوں میں تفصیل موجود ہے۔ لکھا ہے کہ بھائی دیکھئے! جب نبی کریم ﷺ کے اوپر قرآنِ پاک کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ

الْأَقْـرَبِيْنَ﴾ اور بخاری و مسلم کی روایتوں میں ہے کہ اس کے ساتھ یہ بھی تھا ﴿وَأَخِصَ مِـنْهُـمَ الْـمُـخْـلَـصِيْـنَ﴾ آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اور ان میں بھی خاص اپنے خاندان والوں کو ڈرائیے۔ اس وقت آپ ﷺ نے جہاں اور خاندانوں کو دعوت دی، وہیں بنو ہاشم کو خاص دعوت دی اور ان میں بھی اپنے خاص لوگوں کو الگ سے نام لے کر دعوت دی، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''يَافَاطِمَةُ بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ! أَنْقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ، فَإِنِّيْ لاأَمْلِكُ لَكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئاً'' اے رسول اللہ کی بیٹی فاطمہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائیو میں اللہ کی پکڑ سے تم کو کچھ بھی بچا نہیں سکتا، تم کو خود ہی عمل کرنا پڑے گا ''يَاصَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ!'' اپنی پھوپھی حضرت صفیہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے رسول اللہ کی پھوپھی صفیہ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ تو حضور ﷺ نے اپنے خاندان کے الگ الگ لوگوں کا نام لے کر خطاب فرمایا کہ بدعملی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو معاملہ کیا جائے گا، اس کا میں ذمہ دار نہیں ہوں۔

نورٌ علیٰ نور

اور اگر نیک اعمال کے ساتھ سیادت کا شرف حاصل ہے تو پھر نورٌ علیٰ نور ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ تو ایسا ہی ہے کہ دو آدمیوں نے کوئی ڈگری حاصل کی، ان میں سے ایک تو وہ ہے جس کے خاندان کا حکومت کے ساتھ پرانا تعلق ہے اور اس کا خاندان پہلے سے حکومت کا وفادار چلا آرہا ہے، اس خاندان کے کسی لڑکے کے پاس جو ڈگری ہے، وہی ڈگری کسی دوسرے لڑکے کے پاس بھی ہے، لیکن جب نوکری دینے کی بات آئے گی تو ترجیح اسی کو دی جائے گی جس کا خاندان حکومت کا وفادار

چلا آرہا ہے۔ اور اگر اس منصب وملازمت کے لیے جس ڈگری کی ضرورت ہے اس ڈگری کا سرٹیفکٹ ہی اس نے حاصل نہیں کیا ہے؛ تو پھر کون کیا کرسکتا ہے؟ اس لیے اگر دونوں چیزیں ہوں گی تو فضیلت، درجات کی بلندی اور کامیابی جلدی مل جائیگی۔

تبرکات کب کام آسکتے ہیں؟

اس موقع پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے بات کو سمجھایا ہے کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں عبداللہ بن اُبی جو منافقوں کا سردار تھا، اس کا غزوۂ تبوک سے واپسی میں انتقال ہوا۔ اس کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بڑے مخلص مؤمن تھے، جب اُس کا انتقال ہوا تو انہوں نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ یارسول اللہ! میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے، آپ اپنا کرتہ عنایت فرمائیے، تاکہ اس کرتہ میں مَیں اس کو کفن دوں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے اس کے کفن کے لیے اپنا مبارک کرتہ عنایت فرمایا، اور حضور ﷺ نے اس کی جنازہ کی نماز پڑھی بلکہ اس کے منھ میں اپنا لعابِ دہن بھی رکھا اور اس کو قبر میں اتارا۔ (بخاری شریف، ۱۳۵۰) یہ سب کچھ ہوا، اس کے باوجود اس کی نجات نہیں ہوئی۔

ویسے آپ نے اپنا کرتہ کیوں عنایت فرمایا اس بارے میں کتابوں میں دو باتیں لکھی ہوئی ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے بیٹے جو درخواست لے کر آئے تھے، وہ مخلص مؤمن تھے، ان کی دل جوئی کے لیے آپ نے کرتہ عنایت فرمایا۔ اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غزوۂ بدر کے موقع پر جب قریش کے سردار قید پکڑے گئے تھے، اس میں حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے؛ وہ بھی قید پکڑے گئے تھے، جب ان کو قید پکڑ کر لایا گیا تو ان کے جسم پر کرتہ نہیں تھا، حضور ﷺ نے صحابہ سے

فرمایا کہ ان کو کرتہ پہناؤ۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بڑے قدآور آدمی تھے، جب ان کے لیے کرتہ ڈھونڈا گیا تو سوائے عبداللہ بن ابی کے کرتہ کے کوئی اور کرتہ ان کے ناپ کا ملا نہیں اس کا کرتہ ان کو فٹ آتا تھا، اس لیے اس نے ان کو کرتہ دیا تھا۔ روایتوں میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ اس کے اس احسان کا بدلہ بھی اس کے دنیا سے جاتے جاتے چکا دیا جائے، اس لیے آپ نے اپنا کرتہ دیا تھا۔ (مسند الصحابۃ فی الکتب الستۃ۔ ۱۳۳/۲۳)

خیر! اس کے بعد اس کے بیٹے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یارسول اللہ! آپ میرے ابا کی جنازہ کی نماز پڑھائیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے، اور آپ نماز شروع کرنا ہی چاہتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جا کر حضور کا کرتہ پکڑ لیا اور کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ہیں؟ اس نے تو یہ یہ حرکتیں کی ہیں، اس لیے کہ اس نے تو زندگی بھر اسلام و مسلمانوں کو نقصان ہی پہنچایا تھا، فلاں موقع پر اس نے یوں کیا، فلاں موقع پر یوں کیا، فلاں موقع پر یوں کیا اور آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے ہیں؟ اور قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے فرمایا ﴿اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ﴾ اے نبی! اگر آپ ان کے لیے ستر مرتبہ بھی دعاءِ مغفرت کریں گے تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا ہے تو پھر آپ کیوں اس کے لیے دعا کرتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! میرا کرتہ چھوڑو، اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ ستر سے زیادہ مرتبہ دعاءِ مغفرت کرنے سے اس کی معافی ہو جائے گی تو مَیں اس کے لیے ستر سے زیادہ مرتبہ بھی دعاءِ مغفرت کروں گا۔ پھر آپ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی، اور اس کو قبر میں بھی رکھا اور اپنا لعابِ دہن اس کے منہ میں رکھا۔ اور ابھی قبر بند کر کے وہاں سے ہٹے

نہیں تھے کہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ﴿وَلا تُصَلِّ عَلیٰ أَحَدٍ مِّنهُم مَاتَ أَبَداً وَّلاتَقُم عَلیٰ قَبرِہٖ﴾ اے نبی! آئندہ اگر ان منافقوں میں سے کسی کا انتقال ہوجائے تو کسی کی نماز جنازہ مت پڑھیو۔(بخاری شریف،۱۳٦٦) ایسی پابندی لگ گئی۔لیکن آپ ﷺ نے اس سے پہلے پڑھی تھی۔

تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہمارے استاذ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو حکمتیں بیان کی گئی ہیں وہ سب اپنی جگہ پر ہیں،لیکن یہاں تو نبی کریم ﷺ آنے والی اُمت کو یہ تعلیم دینا چاہتے تھے کہ جو آدمی دنیا سے اس حال میں جارہا ہے کہ اس کے کفن میں اللہ کے آخری پیغمبر اور سارے پیغمبروں کے سردار کا کرتہ ہے،اس کے منھ میں حضور ﷺ کا لعابِ دہن ہے،اوراس کے جنازہ کی نماز اللہ کے پاک رسول نے پڑھی ہے؛لیکن اس کے پاس ایمان نہیں ہے تو یہ سارے تبرکات اس کے لیے بے کار ہیں۔تبرکات اسی وقت کام آسکتے ہیں جب کہ ساتھ میں اعمال بھی ہوں،صرف تبرکات سے کام نہیں چلتا ہے،تبرکات معین ضرور ہیں لیکن ایمان جو شرطِ اول ہے،اگر وہی نہ ہو تو پھر تبرکات کچھ کام نہیں دیں گے۔گویا حضور ﷺ نے یہ سب اس لیے کیا تھا کہ آنے والی امت کو یہ سبق مل جائے کہ صرف تبرکات سے کچھ نہیں ہوگا جب تک کہ ساتھ میں ایمان وعملِ صالح نہ ہو،اس لیے اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نبی کریم ﷺ کی محبت ہمارے دلوں میں پیدا فرمائے،اوراس محبت کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی اوراس محبت کی نسبت سے جو اعمال انجام دینے چاہئیں ان اعمال کو انجام دینے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

تَوۡقِیۡرُ الۡعُلَمَآءِ وَالۡکِبَارِ وَأَهۡلِ الۡفَضۡلِ

علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا

مجلس ۱

۲۰ رصفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۵ رجون ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِاَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ أمابعد:

أعوذباللّٰه من الشيطان الرجيم۔ بسم اللّٰه الرحمن الرحيم قُلْ هَلْ يَسْتَوِىْ الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُوْلُوا الْأَلْبَابِ۔ (الزمر-۹)

باب کا عنوان

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا "تَوْقِيْرُ الْعُلَمَآءِ وَالْكِبَارِ وَأَهْلِ الْفَضْلِ" علماء، عمر رسیدہ اور فضل وکمال والوں کا احترام و تعظیم کرنا، اور دوسروں کے مقابلہ میں ان کو ترجیح دینا اور ان کی مجلس و بیٹھک کو اونچا کرنا اور ان کے مقام و مرتبہ کو ظاہر کرنا۔ یعنی ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے جس سے ان کے مقام و مرتبہ کی بلندی ظاہر ہو۔ اس باب میں انہوں نے تین چیزیں شامل کی ہیں۔ پہلی چیز ہے علماء کی تعظیم وتکریم کرنا، دوسری چیز ہے جو بڑی عمر والے لوگ ہیں ان کی تعظیم وتکریم کرنا، اور تیسری چیز ہے، جن میں کوئی فضل وکمال ہو ان کی تعظیم وتکریم کرنا۔ پہلی چیز کے تحت علمی کمال کا تذکرہ آ گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ اور بھی ایسے اوصاف ہیں جن کو حاصل کرنے کی شریعت میں تاکید کی گئی ہے۔ جیسے کسی آدمی میں سخاوت ہے، شجاعت و بہادری ہے، اعمالِ صالحہ کا اہتمام ہے، لوگوں کی خدمت اور لوگوں کو راحت پہنچانے کا مزاج وجذبہ ہے، اس طرح کے اوصاف وخوبیاں جس میں ہوں ان خوبیوں وکمال کی وجہ سے اس

کے ساتھ احترام وتعظیم کا معاملہ کرنا چاہیے۔

معاشرہ میں خوبیاں اس طرح پھیلتی ہیں

گویا شریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی کے اندر جو خوبی موجود ہے اس کو مدِنظر رکھتے ہوئے آپ اس کے ساتھ اکرام وتعظیم وتوقیر کا معاملہ کیجئے، اور جن میں یہ خوبی نہیں ہے ان کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دو، ان کی اس خوبی کی وجہ سے ان کے ساتھ خصوصی اور امتیازی سلوک کرو، اس لیے کہ اگر آپ ان کے ساتھ ان کی خوبیوں کی وجہ سے اکرام وتعظیم کا معاملہ کریں گے تو یہی چیز دوسروں کے لیے بھی ترغیب کا سبب بنے گی، جیسے اگر آپ اہلِ علم کی تعظیم ان کے علم کی وجہ سے کریں گے تو یہی چیز دوسروں کے لیے بھی علم حاصل کرنے کی ترغیب کا ذریعہ بنے گی۔ جو لوگ سخاوت اور شجاعت والے ہیں اچھے اوصاف وخوبیوں کے مالک ہیں ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے ان کے ساتھ اکرام واحترام کا معاملہ کیا جائے گا تو دوسرے لوگوں کو ترغیب ہوگی کہ یہ خوبیاں ایسی ہیں جن کو حاصل کیا جانا چاہیے، ورنہ اگر یہ سلسلہ امت کے اندر نہیں رہے گا تو پھر لوگ ان کمالات کو کوئی اہمیت نہیں دیں گے، اور خوبیوں کو خوبیاں نہیں سمجھیں گے اور ان کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

معیار بدل گیا

آج کل پیمانے، معیار اور قدریں بدل گئیں ہیں، وہ بچے جن کا زمانہ کمال اور خوبیوں کے حاصل کرنے کا ہوتا ہے، اس وقت اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلم میں کام کرنے والے ایکٹروں کے ساتھ لوگ ایسا اچھا معاملہ کرتے ہیں کہ ان کے پیچھے لٹو بنے ہوئے پھرتے ہیں اور ان کا نام بہت عزت کے ساتھ لیتے ہیں؛ تو آپ ہی اندازہ لگائیے کہ

اس بچے کا ذہن کیا بنے گا؟ مَیں اور آپ اس کو چاہے کتنا ہی برا سمجھتے ہوں لیکن ایک بچہ اپنے اس بچپن کے زمانہ میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا ہوا دیکھ رہا ہے تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ ایسی چیز ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ ان کے ساتھ عزت کا معاملہ کر رہے ہیں، لوگ ان کا نام عزت سے لیتے ہیں، ان کو سر پر بٹھاتے ہیں، ان کے پیچھے پیچھے لٹو بنے ہوئے پھرتے ہیں، ان کے نام سے اپنے بچوں کے نام رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کمال والی کوئی شخصیت ہے، اس لیے ہمیں بھی یہ کمال حاصل کرنا چاہیے۔

ایک کرکٹر اچھا بیٹسمین (Batsman) ہے، اس کا نام چھوٹے بڑے، عورتیں مرد، بوڑھے نوجوان، پڑھے لکھے اور ان پڑھ؛ سب کے منھ پر ہے، اور جب سب ہی اس کے ساتھ عزت والا معاملہ کریں گے، اپنی مجلسوں میں اسی کے نام کا تذکرہ بہت خوبیوں کے ساتھ کریں گے، تو آپ ہی بتلائیے کہ وہ بچہ جو اس مجلس میں بیٹھا ہوا یہ سب دیکھے گا اور سنے گا تو وہ کیا سمجھے گا؟ وہ تو یہی سمجھے گا کہ یہ ایسی چیز ہے جو حاصل کرنی چاہیے تاکہ مَیں بھی بڑا ہونے کے بعد جب ایسا بنوں گا تو میرے ساتھ بھی سب لوگ اسی طرح کا معاملہ کریں گے، لوگوں کی مجلسوں میں میرے بھی چرچے ہوں گے، میرے نام سے لوگ اپنے بچوں کا نام رکھیں گے۔

اکرام کس کا کیا جائے؟

اس لیے شریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ اکرام کس کا کیا جائے؟ عزت و احترام کا معاملہ کس کے ساتھ کیا جانا چاہیے؟ اپنی مجلسوں میں کن لوگوں کا تذکرہ ہونا چاہیے؟ کس کا نام لینے میں اور کس کے ساتھ سلوک کرنے میں آگے بڑھنا چاہیے؟ جن اوصاف کو حاصل کرنے کی شریعت نے ترغیب دی ہے اور سراہا ہے، قرآن وحدیث

میں ان کے فضائل بیان کئے گئے ہیں، اور اسلام نے جن خوبیوں کی تعلیم دی ہے وہ خوبیاں جس آدمی میں جس درجہ میں پائی جاتی ہوں، اس آدمی کے ساتھ اسی درجہ میں اکرام ومحبت کا اور تعظیم وحسنِ سلوک کا معاملہ کرنا چاہیے، جیسے ایک آدمی میں علم بھی ہے، اخلاق بھی ہیں، عمل بھی ہے، سخاوت وشجاعت بھی ہے، اور بھی بہت ساری خوبیاں ہیں تو ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ اسی درجہ عزت واحترام اور اکرام کا اور مجلسوں میں اس کو بڑا بنانے کا معاملہ کیا جائے گا۔

ایک آدمی ایسا ہے جو لوگوں کی خدمت کرتا ہے اور بے سہارا لوگوں کو سہارا دیتا ہے اور بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے، بیماروں کی خدمت کرتا ہے، مظلوموں کی مدد کرتا ہے، لوگوں کو مصیبت کے وقت کام آتا ہے، تو یہ سب وہ خوبیاں ہیں جن کی اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ یہ کام کرنے چاہئیں۔ تو اب انہیں اوصاف کی بنیاد پر پورے معاشرہ کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ اس آدمی کا اکرام کرے، اور اس کے ساتھ احترام کا امتیازی سلوک کرے، جب یہ ہوتا ہوا دیکھا جائے گا تو یہی چیز معاشرہ میں بچوں کی تربیت کا ذریعہ بنے گی۔

بچوں کا مزاج کیسے بنتا ہے؟

آج کل ہمارے بچوں کا مزاج کیوں نہیں بنتا؟ ہم ان بچوں کے سامنے کتنی تقریریں کریں کہ نماز کی پابندی کرو، اچھے اخلاق سیکھو، اپنے اندر تواضع پیدا کرو، لیکن جب وہ بچے دیکھتے ہیں کہ جو نمازوں کا اہتمام کرنے والا ہے، جو علم سیکھے ہوئے ہے اور جس میں تواضع اور اخلاق ہیں، اس کے ساتھ تو بڑائی کا کوئی معاملہ کیا ہی نہیں جاتا، تو اب اس بچے کے سامنے ہم روزانہ ایک گھنٹہ تقریر کریں، تب بھی اس کے دل میں ان

خوبیوں کی کوئی اہمیت نہیں بیٹھے گی، وہ بچہ تو معاشرہ وسماج کو دیکھتا ہے کہ جو اوصاف وخوبیاں مجھے بتلائی جارہی ہیں، اور جن کو سیکھنے کے لیے مجھے آمادہ کیا جارہا ہے، اور جس کے لیے مجھ پر اتنی محنت کی جارہی ہے؛ ان خوبیوں اور اوصاف کا ہمارے معاشرہ میں ویلیو اور قیمت ہی کیا ہے؟ ان خوبیوں والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جاتا ہے؟

آج کل ہمارے بچے جو دوسری لائنوں پر پڑ رہے ہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ ہم چاہے مجلسوں اور مدرسوں میں بیٹھ کر اور دیندار لوگ اپنے گھروں میں اپنے بچوں کو تعلیم دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود بچے اِدھر کیوں نہیں آتے؟ اس لیے نہیں آتے کہ وہ معاشرہ اور سماج میں دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی تو کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔

ایک عمدہ مثال

آپ تاجر لوگ ہیں، آپ تجارت کے لیے اسی چیز کا انتخاب کریں گے جس کی ڈیمانڈ ہو، اور جس چیز کی ڈیمانڈ زیادہ ہوگی اسی کو آپ اپنا سبجیکٹ (Subject) بنائیں گے کہ آج کل اس کا چلن ہے۔ جیسے آپ ڈائنگ مل والے ہیں تو جس ڈیزائن کا زیادہ چلن ہوگا اسی کو بنانے کی آپ زیادہ کوشش کریں گے۔ معاشرہ کا بھی یہی حال ہے، ہم لوگ آج اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے باوجود جو نا کام ہو رہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اپنے معاشرہ میں ان اوصاف کو وہ مقام نہیں دیا جس کی شریعت نے ہمیں تعلیم دی تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ جن لوگوں میں یہ خوبیاں ہوا کرتی تھیں، ان کو لوگوں کے درمیان ایک مقام حاصل ہوا کرتا تھا، لوگوں کے دلوں میں ان کے واسطے عزت واحترام کے جذبات ہوا کرتے تھے، جب وہ لوگوں کی مجلسوں میں پہنچ جاتے تھے تو لوگ ان کو اونچا بٹھاتے تھے، ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے، ان کے ساتھ ادب

واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔آج اس قسم کے لوگ ہمارے سماج اور کمیونٹی میں موجود ہوتے ہیں اور ہم ان کو جانتے ہیں اس کے باوجود ان کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا، تو پھر دوسرے لوگ ان اوصاف کو کیوں حاصل کریں گے؟ اور جو نئی نسل آرہی ہے وہ ان خوبیوں کی اہمیت کو کیا سمجھے گی؟ نئی نسل تو یہی سمجھے گی کہ ہاں! ایک کرکٹر کا اتنا مان پان ہے تو میں بھی کرکٹر ہی بنوں گا۔آپ کسی بھی بچے کو پوچھ لیجئے کہ تو کیا بننا چاہتا ہے؟ تو وہ اپنی آنکھوں سے جو ہوتا ہوا دیکھتا ہوگا، اسی کے متعلق کہے گا کہ میں یہ بننا چاہتا ہوں۔ اصل بات یہی ہے۔

اچھائیوں میں تنزلی کی وجہ

تو اسلام نے جو یہ تعلیم دی ہے کہ علماء اور عمر رسیدہ جنہوں نے اپنی عمریں اسلام کے اندر پوری کیں جیسا کہ آگے آرہا ہے، یا جس میں کوئی ایسا کمال اور خوبی ہے جس کو سیکھنے اور حاصل کرنے کی اسلام نے تعلیم دی ہے، اس خوبی کی وجہ سے آپ اس کا اکرام کیجئے، جب اسلام اس خوبی کو حاصل کرنے کی تلقین و تعلیم دے رہا ہے تو ساتھ میں یہ بھی تاکید کررہا ہے کہ جس میں یہ خوبی پائی جارہی ہے اس کے ساتھ آپ ادب اور تعظیم و تکریم کا معاملہ کیجئے، اس لیے کہ اگر یہ دونوں باتیں ہوں گی تب ہی اس خوبی کو بڑھاوا ملے گا، ورنہ یہ خوبی پنپنے والی نہیں ہے، کوئی بھی اس کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا آج کل اچھائیوں میں جو کمی آرہی ہے وہ ہمارے طرزِ عمل کی وجہ سے ہی آرہی ہے۔ جب ایک بچہ یہ دیکھتا ہے کہ کسی کے پاس اچھی موٹر کار ہے یا دولت اور بینک بیلنس ہے تو چاہے اس نے وہ دولت حرام طریقہ سے کمائی ہو، تب بھی معاشرہ میں اس کا ایک مقام ہے، اس چیز کو دیکھ کر بچے کا ذہن یہی بنے گا کہ جس طرح بھی ہو؛ یہ دولت حاصل کرو،

اب اگر دو چار کو گرا کر بھی دولت ملتی ہوگی تو وہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، پھر حلال وحرام کی تمیز بھی وہ نہیں دیکھے گا۔ حالانکہ ایک زمانہ وہ تھا کہ کوئی کیسا ہی دولت مند ہو، اگر اس نے غلط طریقہ سے وہ دولت کمائی ہوتی تو معاشرہ میں اس کا کوئی مقام نہیں ہوتا تھا، اس کے یہاں کھانا کھانے کے لیے بھی لوگ تیار نہیں ہوتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کو بوڑھے لوگ جانتے ہیں، لیکن آج کل وہ معاملہ نہیں رہا، ہمارے یہاں معیار بدلتے جا رہے ہیں۔ اسی لیے علامہ نوویؒ الگ سے مستقل ایک باب قائم کر کے ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کر رہے ہیں کہ قرآنِ پاک اور حدیث شریف میں ایسے لوگوں کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے وہ بھی ہمیں بتلایا گیا ہے، اور ہمیں قرآن وحدیث کی اسی تعلیم کے مطابق ایسے لوگوں کے ساتھ برتنا چاہیے، اور ان کے ساتھ اعزاز وتکریم کا معاملہ کرنا چاہیے، جب تک معاشرہ میں یہ بات نہیں پائی جائے گی وہاں تک کوئی بھی آدمی ان خوبیوں کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرے گا اور جب یہ سب صورتیں ہوں گی تو ان شاء اللہ ایسی خوبیاں معاشرہ کے اندر پیدا ہوں گی اور ان کو حاصل کرنے کے لیے کوششیں کی جائیں گی۔

کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟

اس سلسلہ میں پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر-٩) اے نبی! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو علم والے ہیں وہ اور جو علم والے نہیں ہیں؛ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ دونوں کا مرتبہ و مقام برابر نہیں ہو سکتا، جو مرتبہ ومقام اللہ تعالیٰ کے یہاں اہلِ علم کو حاصل ہے، جو لوگ اس کمال سے خالی ہیں ان کو وہ مقام حاصل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ کسی خاص چیز کے

حاصل کرنے پر جو انعام ملا کرتا ہے وہ چیز اگر ہوگی تب ہی انعام ملے گا، اور اگر وہ چیز نہیں ہوئی تو نہیں ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی علم کے حاصل کرنے پر جو فضیلتیں قرآنِ پاک اور احادیث میں بتلائی گئی ہیں، اگر آپ علم حاصل کریں گے تو وہ فضیلتیں حاصل ہوں گی، ورنہ نہیں ﴿إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ﴾ جو عقلمند اور سوجھ بوجھ والے ہیں وہی نصیحت حاصل کیا کرتے ہیں۔

منصبِ امامت کی تفصیل

۳۴۸: عن أَبِی مسعودٍ عُقْبَةَ بْنِ عَمْرٍو الْبَدْرِیِّ الأنصارِیِّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: يَؤُمُّ الْقَوْمَ أَقْرَؤُهُمْ لِكِتَابِ اللّٰهِ، فَإِنْ كَانُوا فِي الْقِرَاءَةِ سَوَآءً، فَأَعْلَمُهُمْ بِالسُّنَّةِ، فَإِنْ كَانُوا فِي السُّنَّةِ سَوَآءً، فَأَقْدَمُهُمْ هِجْرَةً، فَإِنْ كَانُوا فِي الْهِجْرَةِ سَوَآءً فَأَقْدَمُهُمْ سِنًّا، وَلَا يَؤُمَّنَّ الرَّجُلُ الرَّجُلَ فِي سُلْطَانِهٖ، وَلَا يَقْعُدُ فِي بَيْتِهٖ عَلٰى تَكْرِمَتِهٖ إِلَّا بِإِذْنِهٖ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو البدری الانصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کی امامت وہ آدمی کرائے جو اللہ کی کتاب کو پڑھنا سب سے زیادہ اچھا جانتا ہو۔ اگر وہ قرآن کے علم کے اندر برابر اور یکساں ہیں تو ان میں جو آدمی سنت کا زیادہ علم رکھتا ہو وہ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ اگر وہ اس میں بھی برابر ہوں تو جو ہجرت میں مقدم ہو اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اور اگر وہ ہجرت میں بھی یکساں ہوں تو پھر جو ان میں عمر میں بڑا ہو۔ اور اگر کوئی آدمی ایسی جگہ پہنچے جہاں کسی دوسرے کی امارت اور اختیارات چلتے ہوں تو وہ وہاں امامت نہ کرائے۔ اور اگر کسی کے گھر میں جائے تو صاحبِ خانہ کی جگہ پر نہ بیٹھے الا یہ کہ وہ اجازت دیدے۔

افادات: امامت دینی مناصب میں بہت اونچا منصب سمجھا جاتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں اور آپ کے بعد خلفاءِ راشدین نے یہ سلسلہ

جاری رکھا، یعنی حضور ﷺ کے زمانہ میں حضور کے علاوہ کوئی آدمی امامت نہیں کراتا تھا، آپ کے بعد خلفاءِ راشدین؛ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہم جو امت میں اسی ترتیب سے سب سے افضل ہیں، وہی حضرات اپنے زمانہ میں حکومت کا کاروبار بھی سنبھالتے تھے اور یہی حضرات نمازوں میں امامت بھی کراتے تھے۔

لفظ امامت عربی میں دونوں کے لیے بولا جاتا ہے، نماز کے اندر جو آدمی امامت کراتا ہے اس کے لیے بھی، اور اسلامی حکومت کا جو بادشاہ ہوا کرتا ہے، اس کے لیے بھی لفظ امام استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے فقہاء نے امامت کی دو قسمیں لکھی ہیں، امامتِ کبریٰ اور امامتِ صغریٰ۔ امامتِ کبریٰ یعنی پورے ملک کی سربراہی۔ اس لیے جو سربراہِ اعلیٰ ہوتا ہے وہ بھی امام کہلاتا ہے۔ اور جو نماز پڑھانے والا ہوتا ہے اس کو بھی امام کہتے ہیں۔

پھر بعد کے زمانوں میں ایسے لوگ حکومت کی کرسی پر آنے لگے کہ جو علم سے کورے ہوتے تھے، اور ان میں مسجد میں نماز کی امامت کی صلاحیت نہیں ہوتی تھی، تو مجبوراً یہ دونوں منصب ڈِوائڈ (Divide) اور تقسیم ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی تو امامت نہیں کراسکتا تھا تو ایسے لوگوں کو آگے بڑھانا پڑا جو علم والے ہوتے تھے۔ اس لیے بغیر علم کے آدمی کرسی پر تو بیٹھ سکتا ہے لیکن مصلے پر تو بغیر علم کے آ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہ تقسیم ہوئی اور یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے، ورنہ اسلام میں اصل تو یہی ہے کہ جو سربراہِ اعلیٰ ہو، وہ علم کے اعتبار سے بھی سب سے فائق ہو اور منصب کے اعتبار سے بھی بڑھا ہوا ہونا چاہیے۔

امامت کا سب سے زیادہ حقدار کون؟

خیر! تو حضور ﷺ فرماتے ہیں جو آدمی قوم میں سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہو، وہ امامت کرائے۔ اور اگر دو آدمی قرآن کے علم کے اندر برابر اور یکساں ہیں تو ان میں جو

آدمی سنت کا زیادہ علم رکھتا ہو وہ امامت کا زیادہ حق دار ہے۔ ویسے ائمہ میں امام ابوحنیفہ امام شافعی اور امام مالکؒ اور امام احمد کا بھی ایک قول یہی ہے، یہ سب حضرات اس طرف گئے ہیں کہ جو آدمی مسائل کا زیادہ جاننے والا ہو، بشرطیکہ قرآنِ پاک بھی صحت کے ساتھ پڑھنا جانتا ہو، تو پھر وہ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔

چوں کہ فقہاء نے کتابوں میں لکھا ہے کہ نماز میں کئی ارکان ہیں۔ تو علم اور مسائل کی ضرورت تو پوری نماز میں پڑتی ہے۔ اور حسنِ قراءت یعنی قرآنِ پاک کے اچھا پڑھنے کی ضرورت صرف ایک رکن میں پڑتی ہے، اس لیے جس چیز کی ضرورت نماز کے تمام ارکان میں پڑتی ہو، وہ چیز جس کے پاس ہو، وہ امامت کا زیادہ حقدار ہے۔ اس کے مقابلہ میں جس کے اندر ایک ہی چیز زیادہ پائی جاتی ہو یعنی حسنِ قراءت؛ اس کا نمبر بعد میں ہے۔ اس لیے فقہاء نے بھی ترتیب یہی لکھی ہے کہ جو آدمی مسائل کا زیادہ جاننے والا ہے اور ساتھ میں قراءت کی صحت بھی ہو تو وہ سب سے زیادہ حقدار ہے۔

اس کے بعد اگر دو امام ایسے ہیں کہ مسائل نماز جاننے میں دونوں کی سطح برابر ہے تو پھر ان دونوں میں جو اچھا پڑھنے والا اور ماہر ہو؛ اس کو ترجیح دی جائے گی۔

پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد جو سنت کے اعتبار سے زیادہ ہو، یعنی فقہاء نے جو ترتیب بتلائی ہے اس میں قراءت کے بعد یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہجرت بھی ایک چیز تھی تو ہجرت کے اندر جو پرانا ہو اس کو ترجیح دی جائے گی۔ اس لیے کہ جو لوگ مکہ مکرمہ میں اسلام لاتے تھے ان کے لیے یہ فرض تھا کہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائیں، جب تک وہ ہجرت نہ کرلیں وہاں تک ان کا ایمان مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا، بعد میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو پھر یہ حکم باقی نہیں رہا۔ تو ان میں بھی

جو پہلے ہجرت کر کے مدینہ آیا ہو وہ اس وصف میں پرانا ہوا۔ اور اگر ہجرت کے اعتبار سے بھی دونوں برابر ہیں تو پھر جو عمر کے اعتبار سے بڑا ہو۔ کیوں کہ اس نے اپنی عمر کا زیادہ حصہ اسلام کے اندر گذارا ہے، اس لیے اس کو ترجیح دی جائے گی۔

مہمان ازخود امامت نہ کرائے

اور اگر کوئی آدمی ایسی جگہ پہنچے کہ جہاں کسی دوسرے کی امارت اور اختیارات چلتے ہوں تو وہ وہاں اس کی امامت نہ کرائے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کسی کے یہاں مہمان ہو کر گئے، اور اس کے گھر میں نماز پڑھنے کی نوبت آئی، تو صاحبِ خانہ اگر امامت کرانے کی اہلیت رکھتا ہے تو مہمان کو چاہیے کہ امامت نہ کرائے، بلکہ صاحبِ خانہ ہی امامت کرائے، اس لیے کہ وہ اپنے دائرۂ حکومت میں ہے، جہاں وہ رہتا ہے وہ وہاں کا سربراہ ہے، اور وہاں کے رہنے والے سب اس کے ماتحت ہیں، اب اس کی موجودگی میں اگر دوسرا آدمی امامت کرائے گا تو اس کے منصب پر زد پڑے گی۔

دیکھو! اسلام نے لوگوں کے جذبات کی کتنی رعایت کی ہے کہ دوسرے کی جگہ پر جا کر آپ اپنا حکم مت چلاؤ، وہاں تو اسی کا حکم چلے گا، اس لیے وہاں تو وہی امامت کرائے گا۔ ہاں! اگر وہ مہمان کے اکرام کے طور پر درخواست کرے، اور کہے کہ آپ نماز پڑھائیے اور اس کی درخواست قبول کرتے ہوئے مہمان نماز پڑھائے تو پھر بات دوسری ہے، لیکن اصل تو یہی ہے کہ مہمان کو ازخود آگے نہیں بڑھنا چاہیے، ورنہ یہ چیز اس آدمی کے دائرۂ اختیار پر زد ڈالنے، اور اس کو مجروح کرنے والی ہے، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی۔

کسی کی خاص بیٹھک پر مت بیٹھو

اور اگر کسی کے گھر میں جائے تو صاحبِ خانہ کی جگہ پر نہ بیٹھے۔ کبھی ایسا ہوتا

ہے کہ صاحبِ خانہ اپنے گھر میں اپنی بیٹھک کے لیے کوئی مخصوص جگہ بناتا ہے جیسے آپ جانتے ہیں کہ دفتر اور آفس میں سیٹھ کے لیے کرسی متعین ہوتی ہے، اور بھی بہت ساری کرسیاں ہوتی ہیں لیکن سیٹھ کی اپنی ایک الگ کرسی ہوتی ہے، تو اگر آپ کسی کی آفس اور دفتر میں جائیں تو سیٹھ کی کرسی پر ہرگز نہ بیٹھیں، ہاں اگر وہ اجازت دے یا وہ خود بٹھائے تو بیٹھئے۔ ہمارے اکابر تو اس بات کا بھی اہتمام کرتے تھے کہ اس کے بٹھانے کے باوجود بھی کوشش یہی کرتے تھے کہ وہاں نہ بیٹھیں، اس لیے کہ یہ اس کی مخصوص جگہ ہے، آپ اگر اس پر بیٹھیں گے تو اس کے دل پر اثر پڑے گا۔ اسی طرح مکان میں بھی اگر اس نے اپنے بیٹھنے کے لیے کوئی مخصوص جگہ بنائی ہے تو اس پر نہ بیٹھئے دوسری جگہوں پر بیٹھئے۔

یہاں تو اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قرآنِ پاک اور سنت کا علم اور ہجرت کی وجہ سے امامت جیسے منصب کے لیے ترجیح دی۔ جیسا کہ اس باب کے عنوان میں ایک بات بتلائی تھی "وتقديمهم على غيره" جن میں جو جو کمالات ہیں، ان کی وجہ سے ان کو دوسروں کے مقابلہ میں فوقیت اور ٹوپ پوزیشن دی جائے گی اور آگے رکھا جائے گا، جس میں جتنے زیادہ کمالات ہیں اسی حساب سے اس کو آگے بڑھایا جائے گا، اور اسی مناسبت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔

صفوں کی درستگی کا ایک بڑا دنیوی فائدہ

۳۴۹: وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِي الصَّلَاةِ وَيَقُوْلُ: اِسْتَوُوْا وَلَا تَخْتَلِفُوْا، فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ. لِيَلِنِيْ مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ.

ترجمہ: حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ کی ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نماز کے لیے ہمارے کندھوں

کو چھوتے، اور فرماتے تھے صفیں درست کرو آگے پیچھے مت کھڑے رہو، ورنہ تمہارے دلوں میں کجی آجائے گی۔تم میں جو لوگ بالغ اور سمجھ دار ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں اور پھر اسی مناسبت سے اور لوگ رہیں۔

افادات: نماز سے پہلے نبی کریم ﷺ صفوں کو درست کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔شروع میں جب لوگ اس بات کے عادی نہیں بنے تھے تو نبی کریم ﷺ باقاعدہ پوری صف میں جا کر لوگوں کے کندھوں کو ملا ملا کر درست کرتے تھے، اور جب لوگ اس کے عادی بن گئے، اور آپ کے بار بار اس طرح کرنے کی وجہ سے لوگ جب سیکھ گئے اور آپ نے یہ محسوس کیا کہ اب لوگوں کے پاس جا جا کر کندھوں کو ملانے کی ضرورت نہیں ہے، تو آپ زبانی تاکید فرما دیا کرتے تھے "اِسْتَوُوْا" سیدھے کھڑے رہو، صفیں درست کرو۔اس لیے امام کو بھی چاہیے کہ صفوں کی درستگی کا اہتمام کرے۔ہاں! اگر لوگ خود اپنے طور پر درستگی کا اہتمام کرتے ہیں تو پھر امام کے لیے ضروری نہیں ہے، پھر بھی زبان سے کہہ دینا کہ صفیں درست کرو، یہ مستحب قرار دیا گیا ہے۔اور اگر مقتدی صفیں درست نہ رکھتے ہوں تو امام کے لیے صفیں درست کروانا ضروری ہے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر صفیں درست نہیں ہوں گی اور آگے پیچھے کھڑے رہو گے تو اس کا اثر دلوں پر پڑے گا اور تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا، گویا صفوں کی درستگی دلوں کو درست کرتی ہے، اگر لوگ اس کا اہتمام کریں صفیں سیدھی کر کے کھڑے رہیں تو اس کا قدرتی اثر یہ پڑے گا کہ دلوں کے اندر بھی محبت، اتفاق واتحاد پیدا ہوگا اور اگر آگے پیچھے کھڑے رہیں گے تو اس کا اثر دلوں پر پڑے گا۔اور دلوں میں اختلاف پیدا ہوگا۔

امام کے قریب کون کھڑا رہے؟

پھر حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم میں جو لوگ بالغ اور سمجھ دار ہیں وہ مجھ سے قریب

رہیں اور پھر اسی مناسبت سے اور لوگ رہیں یعنی نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز کی پہلی صف میں وہ لوگ حضور سے قریب رہیں جو زیادہ سمجھ دار اور پڑھے لکھے ہوں، اس کا آپ ﷺ نے بڑا اہتمام کیا۔ اور ترتیب یہی ہونی چاہیے کہ جو زیادہ پڑھے ہوئے لوگ ہوں وہ امام کے قریب ہوں۔ اور اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کبھی امام کو ضرورت پیش آجاتی ہے مثلاً امام کا وضو ٹوٹ گیا تو مسئلہ یہ ہے کہ امام اشارہ سے کسی کو اپنا نائب بنا کر وضو کے لیے چلا جائے اور وہ آدمی نماز کو جاری رکھے گا۔ اب اگر پیچھے ایسے لوگ ہیں جو مسائل سے واقف ہیں تو امام اپنی اس ذمہ داری کو پوری کر سکے گا۔ کبھی قراءت میں غلطی ہوتی ہے تو لقمہ دینے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہم لوگ تو صرف رمضان میں امام کے پیچھے سامع بنا کر حافظ کو کھڑا کرتے ہیں، باقی دنوں میں وہ کہیں بھی کھڑا ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔ حدیثِ پاک کی تعلیم یہ ہے کہ جو جانکار لوگ ہیں ان کو پہلے موقع دیا جائے۔ بلکہ نبی کریم ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے۔

بزرگوں کی مجلس کے آداب

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نماز کے لیے تشریف لائے تو ایک نوجوان آگے کھڑا تھا، انہوں نے اس کو وہاں سے ہٹا دیا اور خود کھڑے ہو گئے، نماز کے بعد اس سے کہا کہ برا نہ مانیو، نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ اسی موقع پر یہ بھی لکھا ہے کہ بزرگوں اور اہلِ علم کی مجالس میں بھی جو بڑے اور سمجھ دار اہلِ علم ہوں، جو ان کی باتوں کو سمجھنے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں، ان کو آگے بیٹھنے کا موقع دیا جائے، اور اسی کے ساتھ ان کو بھی آگے بیٹھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اب یہ ہے کہ جب مجلس لگنے جا رہی ہے اس وقت تو وہ پیچھے رہیں اور جب مجلس لگ چکی اس

کے بعد آگے آنے لگیں تو یہ بھی برا ہے۔اسی لیے آگے ایک روایت میں آنے والا ہے "وَاِیَّاکُمْ وَهَیْشَاتِ الْاَسْوَاقِ" تم بازاروں کے شور وشغب سے بچو،اس کی ایک وجہ یہ بھی بتلاتے ہیں کہ جو آدمی اپنے آپ کو بازاروں میں گھومنے پھرنے کے اندر مشغول رکھے گا تو اس کو آگے رہنے کا موقع نہیں ملے گا۔

تو دیکھئے! یہاں علامہ نوویؒ اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے تاکید فرمائی کہ جو بالغ، عقل مند اور سمجھ دار لوگ ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں اور نبی کریم ﷺ نے ان کے مقام ومرتبہ کی وجہ سے خاص تاکید یہ فرمائی کہ نماز میں بھی وہ میرے قریب رہیں، دیگر مجالس کا بھی یہی حکم ہے۔اب ظاہر ہے کہ ان اوصاف کی وجہ سے جب ان کو مجالس میں آگے جگہ ملے گی، تو پھر چھوٹے بھی ان اوصاف کو حاصل کرنے کا اہتمام کریں گے۔

سمجھ دار مجھ سے قریب رہیں

٣٥٠:وعن عبدِاللّٰهِ بْنِ مسعودٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: لِيَلِنِیْ مِنْكُمْ أُولُوا الْأَحْلَامِ وَالنُّهٰى ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ۔ثلاثاً۔وَاِیَّاکُمْ وَهَیْشَاتِ الْاَسْوَاقِ.(رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں جو بالغ، عقل منداور سمجھ دار ہیں وہ مجھ سے قریب رہیں، پھر جن کی سوجھ بوجھ ان سے ذرا کم ہے، وہ ان کے قریب رہیں، اسی طرح ترتیب رہے گی۔اور اپنے آپ کو بازاروں کے شور وشغب سے بچاؤ۔

افادات: گویا اس میں بھی ترتیب اور کیٹیگری ہے، جو اعلیٰ درجہ کے ہیں وہ آگے رہیں، پھر اس سے کم، پھر اس سے کم اور اسی اعتبار سے آگے سلسلہ رہے گا۔

زمین کا سب سے پسندیدہ ٹکڑا

اور اپنے آپ کو بازاروں کے شور و شغب سے بچاؤ یعنی آدمی کو بازاروں میں زیادہ وقت گذارنا نہیں چاہیے، ہاں! یہ ایک ضرورت کی چیز ہے۔ ایک کاروباری آدمی ہے جب تک کاروبار کا معاملہ ہے وہاں تک بازار میں رہے، جب کاروبار کا سلسلہ ختم ہو تو وہاں سے ہٹ جائے۔ یا جو کاروباری نہیں ہے، اور کسی چیز کے خریدنے کی ضرورت پیش آئی تو جہاں تک یہ ضرورت ہے وہاں تک بازار جائے، لیکن خریدنے سے فارغ ہونے کے بعد پھر اپنا وقت بازار میں لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں ویسے بھی تاکید آئی ہے، نبی کریم ﷺ سے ایک مرتبہ ایک آدمی نے آکر سوال کیا "أَيُّ الْبِقَاعِ أَحَبُّ" اے اللہ کے رسول! زمین کے خطوں میں سب سے زیادہ محبوب اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ ٹکڑا کون سا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں، حضرت جبرئیل آویں تو مَیں پوچھ کر بتاؤں۔ چنانچہ حضرت جبرئیل آئے تو ان سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں، مَیں باری تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں۔ چنانچہ وہ گئے اور آکر کہا کہ آج تو مَیں اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب ہوا کہ کبھی اتنا قریب نہیں ہوا تھا اور مَیں نے یہی سوال کیا تو باری تعالیٰ کی طرف سے جواب ملا "أَحَبُّ الْبِقَاعِ اِلیٰ اللّٰهِ مَسَاجِدُهَا وَأَبْغَضُ الْبِقَاعِ اِلیٰ اللّٰهِ أَسْوَاقُهَا" زمین میں سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ حصے اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں مسجدیں ہیں، اور زمین میں سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ حصے بازار ہیں۔ (کشف الخفاء ١٢٠)

اب ہمیں اپنے متعلق فیصلہ کرنا ہے کہ ہمارا جی کہاں زیادہ لگتا ہے، مسجدوں میں یا بازار کے اندر؟؟

فارغ وقت گذارنے کی جگہ

بہر حال! بازار کوئی ایسی جگہ نہیں ہے کہ جہاں جانا جائز ہی نہیں ہے، اس لیے کہ وہ ایک ضرورت کی چیز ہے، جس طرح بیت الخلاء ہوتے ہیں، کوئی آپ کو یہ نہیں کہے گا کہ بیت الخلاء جانا جائز نہیں ہے، ایک فطری تقاضہ کے لیے وہاں جانا ہی پڑتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ کوئی آدمی بیت الخلاء کو اپنی بیٹھک کے طور پر پسند کرتا ہو کہ چلو! فارغ وقت ہے تو وہاں جا کر بیٹھتے ہیں۔ تو جس طرح فارغ وقت کو وہاں گذارنا کوئی پسند نہیں کرتا، اسی طریقہ سے یہ سوچ بھی بدلنے کی ضرورت ہے کہ فارغ وقت ہے اس لیے چلو! بازار میں جا کر بیٹھتے ہیں، دوکان پر جا کر ٹائم پاس کرتے ہیں۔ یہ جگہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے، یہ ایک ضرورت کی چیز ہے، کاروبار کی نسبت سے جانا ہے تو جائیے، کوئی چیز خریدنے کے لیے جانا ہو تو جائیے، لیکن اگر نہ کاروباری ضرورت ہے، نہ کوئی چیز خریدنے کی ضرورت ہے، نہ کوئی اور کام ہے؛ تو پھر وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر بھی اگر کہیں جا کر بیٹھنا ہے تو مسجد سب سے زیادہ اچھی جگہ ہے۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بازاروں کے شور وشغب سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اور خاص طور پر یہ تاکید اسی لیے فرمائی گئی کہ جو آدمی بازاروں کے اندر مشغول رہے گا اس کو کبھی پہلی صف میں آنے کی توفیق نہیں ہوگی، پہلی صف میں آنے کی عادت تو اسی وقت پڑے گی جب بازاروں سے دل کم لگا ہوا ہو۔ حضور ﷺ کی پہلی بات پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب کہ بازاروں کے ساتھ تعلق ونسبت ضرورت کے درجہ میں کم سے کم رکھی جائے۔

غزوۂ خیبر کا پس منظر

۳۵۱۔وَعَنْ أَبِی یَحْیٰی وَقِیلَ أَبِی مُحَمَّدٍ سَهْلِ بْنِ أَبِیْ حَثْمَةَ الْأَنْصَارِی رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنْطَلَقَ عَبْدُاللّٰهِ بْنُ سَهْلٍ وَمُحَیِّصَةُ بْنُ مَسْعُوْدٍ اِلیٰ خَیْبَرَ وَهِیَ یَوْمَئِذٍ صُلْحٌ، فَتَفَرَّقَا،فَأَتیٰ مُحَیِّصَةُ اِلیٰ عبدِاللّٰهِ بْنِ سَهْلٍ وَهُوَ یَتَشَحَّطُ فِیْ دَمِهٖ قَتِیْلاً فَدَفَنَهُ،ثُمَّ قَدِمَ الْمَدِیْنَةَ، فَانْطَلَقَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ بْنُ سَهْلٍ وَمُحَیِّصَةُ وَحُوَیِّصَةُ اِبْنَامَسْعُوْدٍ اِلیٰ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم، فَذَهَبَ عَبْدُالرَّحْمٰنِ یَتَکَلَّمُ، فَقَالَ: کَبِّرْ کَبِّرْ،وَهُوَأَحْدَثُ الْقَوْمِ،فَسَکَتَ،فَتَکَلَّمَا فقَالَ: أَتَحْلِفُوْنَ وَتَسْتَحِقُّوْنَ قَاتِلَکُمْ؟وَذَکَرَتَمَامَ الْحَدِیْثَ۔(متفق علیه)

ترجمہ: حضرت سہل بن ابوحثمہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ بن مسعود (یہ دونوں صحابی ہیں ان دونوں کے باپ آپس میں چچازاد بھائی تھے، گویا یہ دونوں دو چچازاد بھائیوں کے بیٹے ہیں۔) ایک مرتبہ خیبر گئے۔ یہ صلح حدیبیہ کا زمانہ تھا۔ پھر دونوں الگ ہوئے۔ حضرت محیصہ جب عبداللہ کے پاس پہنچے تو وہ اپنے خون میں لت پت ہو رہے تھے (کسی نے خون کر دیا تھا) ان کو دفن کیا، اور مدینہ آئے۔ عبدالرحمٰن، حویصہ اور محیصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے، عبدالرحمٰن بولنے لگے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بڑے کو بولنے دو۔ یہ چھوٹے تھے اس لیے چپ ہوگئے۔ تب ان دونوں نے بات کی، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت کیا: کیا تم قسم کھاتے ہو اور قاتل سے حق کا مطالبہ کرتے ہو؟ اور پوری حدیث ذکر کی۔

افادات: خیبر؛ یہ مدینہ منورہ سے بارہ فرسخ کی دوری پر واقع ایک جگہ ہے جو یہودیوں کی آبادی تھی اور وہاں کھجوروں کے باغات بہت زیادہ تھے۔ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی اور وہاں سے واپس لوٹ رہے تھے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ فتح نازل کی گئی جس میں خیبر کی فتح کی بشارت سنائی گئی اور پھر صلح حدیبیہ کے دو تین مہینہ بعد ہی ۷ھ میں ماہِ محرم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے حضراتِ صحابہ کرام کی ایک فوج لے

کر وہاں گئے اور اللہ تعالیٰ نے خیبر فتح کرایا اور سارا خیبر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا، بہت سے یہودی مارے گئے اور پھر انہوں نے خیبر حوالہ کر دیا۔ یہودیوں کی شرارتیں بھی بہت زیادہ تھیں اس لیے نبی کریم ﷺ نے فیصلہ یہ فرمایا کہ تمام یہودی خیبر چھوڑ کر چلے جائیں، لیکن ان لوگوں نے درخواست دی کہ یہ تو آپ نے فتح کر ہی لیا ہے اور یہاں کی زمینیں اور باغات آپ لوگوں کی ملکیت میں آگئے ہیں، اب اگر آپ ہمیں یہاں سے نکال دیں گے تو یہاں کے باغات اور زمینوں کی کھیتی باڑی آپ لوگوں ہی کو سنبھالنا پڑے گی، اس لیے ہماری طرف سے درخواست یہ ہے کہ ہم لوگوں کو یہیں رہنے کا موقع دیا جائے، ہم یہ باغات اور زمینوں کو سنبھالیں گے، اس میں کھیتی باڑی کریں گے اور جو پیداوار ہوگی اس میں سے آدھا حصہ ہم کو دیجیو اور آدھا آپ لینا، اس طرح ان زمینوں کی دیکھ بھال اور ذمہ داریوں سے آپ لوگ سبکدوش اور آزاد رہیں گے اور آمدنی کا حصہ بھی ملتا رہے گا۔ جب نبی کریم ﷺ کے سامنے یہ بات پیش کی گئی تو آپ نے بھی اس کو منظور فرمالیا، اس لیے کہ وقت کا تقاضہ بھی یہی تھا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ایک فیصلہ یہ بھی فرمادیا کہ جب تک ہم چاہیں گے وہاں تک تم کو رہنے دیں گے، پھر جب ہم یہ فیصلہ کریں کہ اس جگہ کو چھوڑ دو تو چلے جانا پڑے گا۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں ان لوگوں کو وہاں سے نکالا تو وہ لوگ شام کے علاقہ میں آکر آباد ہوئے۔

خیر! جب یہ صلح ہوئی تو یہاں کی زمینیں اور باغات نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے درمیان میں مالکانہ حیثیت سے تقسیم فرمادیئے، اور جس کا جیسا جیسا حصہ تھا ہر ایک کے حصہ میں وہاں کی اتنی زمینیں آئیں، اور تمام مسلمانوں نے اپنی زمینیں کھیتی باڑی کرنے اور سنبھالنے کے واسطہ یہودیوں کے حوالہ کی تھیں۔ جب کھجوروں کی یا دوسری

کھیتی کی پیداوار ہوتی تھی تو آدھا حصہ ان کو دیتے تھے، اور آدھا مسلمان لیتے تھے، اسی کو بٹائی پر دینا کہتے ہیں اور اسی کو عربی زبان میں ''مُزَارَعَة'' کہتے ہیں اور خیبر کی نسبت سے اس کا نام ''مُخَابَرَة'' بنا ہے اس لیے اس کو ''مُخَابَرَة'' بھی کہتے ہیں۔

خیر! تو جن حضرات کے باغات اور زمینیں وہاں تھیں وہ حضرات کبھی کبھار ان باغات کو دیکھنے اور خبر گیری کے لیے جایا کرتے تھے۔ زمین والے اپنی زمین کسی کو حوالہ کرتے ہیں تو وہ سال کے درمیان کبھی کبھار وہاں جا کر دیکھتے ہیں کہ زمین کا کیا حال ہے، خاص کر کے جب پیداوار کا زمانہ قریب آیا ہو تو وہاں جا کر اندازہ لگاتے ہیں کہ اس سال پیداوار کیسی ہے۔ حضراتِ صحابہ بھی اسی غرض سے خیبر جایا کرتے تھے۔

ایک واقعہ

خیر! تو یہ دونوں چچازاد بھائی حضرت عبداللہ بن سہل اور حضرت محیصہ بن مسعودؓ بھی ایک مرتبہ اپنے باغات کی خبر لینے کے واسطے خیبر گئے، جب وہاں پہنچے تو ان میں سے ایک کی زمین اِدھر تھی اور دوسرے کی زمین اُدھر تھی، دونوں کا راستہ جہاں سے الگ ہوتا تھا وہاں دونوں نے ایک دوسرے سے کہا کہ تم اُدھر سے جاؤ، مَیں اِدھر سے جاتا ہوں، آگے جا کر ملتے ہیں، دونوں اپنی زمین کی طرف گئے، بعد میں حضرت محیصہ جب وعدے کے مطابق اس جگہ پر آئے تو حضرت عبداللہ کو وہاں نہیں پایا، وہ ان کے باغ پر پہنچے تو دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن سہل رضی اللہ عنہ کو کسی نے قتل کر دیا تھا اور خون میں لت پت پڑے تھے اور بہت خون بہہ رہا تھا اور انتقال ہو چکا تھا۔ وہاں کوئی اور آدمی بھی نہیں تھا اور کس نے قتل کیا ہے وہ حضرت محیصہ کو معلوم بھی نہیں تھا۔ حضرت عبداللہ تو اکیلے گئے تھے، اتنی بات تو ضرور تھی کہ وہاں آبادی یہودیوں ہی کی تھی، ان میں سے ہی کسی نے قتل کیا ہوگا،

لیکن قاتل کون تھا یہ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ انہوں نے قتل کرتے ہوئے تو دیکھا نہیں تھا۔ بھائی کی لاش لے کر مدینہ منورہ پہنچے، اس کے بعد حضرت محیصہ اپنے بھائی حضرت حویصہ، اور مقتول حضرت عبداللہ کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن سہل؛ یہ تینوں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں شکایت لے کر پہنچے اور بتلایا کہ ہم وہاں گئے تھے اور ایسا ایسا واقعہ ہوا۔

ایک فقہی مسئلہ

اب یہاں ایک لمبا چوڑا فقہی مسئلہ آتا ہے کہ اگر کسی آدمی کا قتل ہو جائے اور قاتل معلوم نہ ہو۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ قتل کرنے والے کو لوگوں نے دیکھا ہے اور وہ گواہی دیں تو اس کا جرم اور قصور ثابت ہو جائے گا، لیکن اگر کسی کی قتل کی ہوئی نعش کسی محلّہ میں ملی لیکن اس کا قاتل معلوم نہیں ہے، تو مسئلہ یہ ہے کہ اس سارے محلّہ والوں کو بلایا جائے گا، اور مقتول کا ولی اس محلّہ والوں میں سے پچاس آدمیوں کا انتخاب کرے گا، اور ان میں سے ہر ایک کو یہ قسم کھلائی جائے گی کہ اللہ کی قسم! نہ تو میں نے اس کو قتل کیا اور نہ میں اس کے قتل کرنے والے کو جانتا ہوں۔ یہ اس لیے کیا جائے گا کہ اگر ان میں سے کوئی قاتل ہے تو وہ قسم کھانے سے انکار کرے گا، اور اگر وہ کسی کو جانتا ہوگا تو اس کو بتانا پڑے گا، یہ طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا کہ اس طرح قاتل کا پتہ لگ جائے، لیکن اگر اس کے باوجود بھی پتہ نہیں لگا، یعنی وہ پچاس آدمی سب کے سب یہ قسم کھا رہے ہیں کہ نہ تو میں نے اس کو قتل کیا اور نہ میں اس کے قتل کرنے والے کو جانتا ہوں، تو پھر اس پورے محلّہ والوں پر مقتول کی دیت یعنی خون کی جو قیمت مقرر کی گئی ہے وہ عائد کر دی جائے گی۔

کسی کے سامنے بات پیش کرنے کا ادب

خیر! تو یہ تینوں بھائی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان تینوں میں

سب سے بڑے حویصہ تھے، اس کے بعد محیصہ اور سب سے چھوٹے عبدالرحمٰن بن سہل تھے اور یہی مقتول کے سگے بھائی تھے اس لیے انہوں نے ہی واقعہ بتانا شروع کیا، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا "کَبِّرْ کَبِّرْ" بڑے کو بولنے دو، بڑے کو بولنے دو۔ یعنی جب تم تینوں مل کر میرے پاس بات پیش کرنے کے لیے آئے ہو تو اب تم میں سے جو بڑا ہوگا وہی بات پیش کرے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی بڑے کے سامنے بات پیش کرنا بھی ایک فضیلت کی چیز ہے تو اس میں بھی ترجیح اسی کو دی جائے گی جو عمر کے اعتبار سے بڑا ہوگا، چنانچہ حضرت حویصہ ہی نے نبی کریم ﷺ کے سامنے سارا واقعہ بیان کیا۔

اب مسئلہ کی اور تفصیلات ہیں، اس میں ہم نہیں جاتے۔ یہاں تو علامہ نوویؒ اس روایت کو صرف اسی بنیاد پر لائے ہیں کہ اس واقعہ میں حضورِ اکرم ﷺ نے بولنے والے اگرچہ مقتول کے سگے بھائی تھے لیکن چوں کہ وہ چھوٹے تھے اس لیے ان کو بولنے کی اجازت نہیں دی، اور فرمایا کہ جو بڑا ہے وہی بات پیش کرے۔ ہاں! اگر بڑا ہی چھوٹے کو یوں کہے کہ تو بات پیش کر، تو پھر بات دوسری ہے، لیکن بڑے کے کہے بغیر چھوٹے کو اپنی طرف سے بات شروع کرنی نہیں چاہیے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بات پیش کرنے کی صلاحیت اور طریقہ بڑے کے مقابلہ میں چھوٹے میں زیادہ ہوتا ہے تو اس وقت اس کی ضرورت پیش آتی ہے کہ چھوٹا بات پیش کرے، اس صورت میں بڑا چھوٹے سے کہے کہ تم بات کرو، تو وہ پیش کرے، لیکن بڑے کے کہے بغیر چھوٹے کو سلسلۂ کلام اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔

تدفین میں بھی اہلِ قرآن کو فضیلت حاصل ہے

۳۵۲: وعن جابرٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَجْمَعُ بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ مِنْ قَتْلٰى

أُحُدٍ يَعْنِي فِي الْقَبْرِ، ثُمَّ يَقُولُ: أَيُّهُمَا أَكْثَرُ أَخْذاً لِلْقُرْآنِ؟ فَإِذَا أُشِيرَ لَهُ إِلَىٰ أَحَدِهِمَا، قَدَّمَهُ فِي اللَّحْدِ. (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُحد کے شہداء میں سے دو دو آدمیوں کو قبر کے اندر جمع کرتے تھے، پھر پوچھتے تھے کہ ان دونوں میں سے کسے قرآن پاک زیادہ یاد ہے؟ جب دونوں میں کسی ایک کے بارے میں بتلایا جاتا تو اسی کو قبر میں آگے رکھتے۔

افادات: غزوۂ احد دوسری بڑی جنگ ہے جو اسلام میں پیش آئی، غزوۂ بدر میں تو مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی لیکن غزوۂ احد میں مسلمانوں کے ستر سے زیادہ آدمی شہید ہوئے، اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے، جب جنگ ختم ہوگئی اور شہیدوں کو دفن کرنے کی ضرورت پیش آئی، اور قبریں کھودنا شروع کیں تو حضرات صحابہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس وقت جب کہ ہم زخمی، تھکے ہوئے اور بیمار بھی ہیں، ہمارے لیے ہر ایک کے لیے الگ الگ قبر کھودنا مشکل ہے۔ اس لیے دو دو، تین تین، چار چار آدمیوں کے برابر بڑی قبریں کھودی گئیں، اور ایک ایک قبر کے اندر دو دو تین تین چار چار آدمیوں کو دفن کیا گیا، ایک کو دفن کرنے کے بعد بیچ میں کچھ گھاس وغیرہ آڑ کر دیتے تھے، پھر دوسرے کو اور پھر اسی طرح تیسرے کو دفن کرتے تھے اور قبر بند کر دی جاتی تھی۔

ایک قبر میں ایک سے زیادہ آدمیوں کو دفن کرنا بھی جائز ہے، اور اس موقع پر یہی کیا گیا تھا۔ جب قبر میں رکھنے کا وقت آتا تھا تو دونوں کو ایک ساتھ ایک پر ایک کو تو رکھ نہیں سکتے اس لیے قبلہ کی طرف ایک کو رکھا جاتا اور اس کے پیچھے پھر دوسرے کو رکھا جاتا۔ اور یہی صحیح طریقہ ہے۔ تو جب قبر میں رکھنے کا وقت آتا تھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرات صحابہ سے پوچھتے کہ ان دونوں میں قرآن کریم کا زیادہ پڑھا ہوا کون ہے؟ کس کے پاس قرآن کا علم زیادہ ہے؟ جب کہا جاتا کہ یہ ہے، تو پہلے اس کو قبر میں رکھواتے تھے،

اور قبلہ کی طرف اس کو لٹاتے تھے، پھر دوسرے کا نمبر آتا تھا۔

یہاں تو علامہ نوویؒ اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ دیکھو! ایک قبر میں دفن کرتے وقت بھی قبلہ والی جہت جو افضل جہت ہے اس کا حق دار اس کو آدمی کو قرار دیا گیا جو دوسرے کے مقابلہ میں قرآن زیادہ پڑھا ہوا ہو، اور دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ علم رکھتا ہو، حضور ﷺ نے بھی اس کا بات لحاظ کیا۔

۲۷؍صفر المظفر ۱۴۲۰ھ ۱۲؍جون ۱۹۹۹ء

یہ باب چل رہا ہے جس میں علماء اور سن رسیدہ اور فضل وکمال والے لوگوں کی تعظیم وتوقیر کا بیان ہے، اور ان کو دوسرے ایسوں کے مقابلہ میں جن میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے آگے رکھنا، ان کے لیے اچھی اور اونچی بیٹھک تجویز کرنا، ان کے مرتبہ کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جس سے دیکھنے والوں کو ان کے مرتبہ کا خیال آئے۔ اسی سلسلہ کی روایتیں پیش فرما رہے ہیں ایک اور روایت پیش کی ہے۔

جو عمر میں بڑا ہو اس کا لحاظ کیجئے

۳۵۳: عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنهما أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: أَرَانِيْ فِي الْمَنَامِ أَتَسَوَّكُ بِسِوَاكٍ، فَجَآءَنِيْ رَجُلَانِ، أَحَدُهُمَا أَكْبَرُ مِنَ الْاٰخَرِ، فَنَاوَلْتُ السِّوَاكَ الْأَصْغَرَ، فَقِيْلَ لِيْ كَبِّرْ، فَدَفَعْتُهُ اِلَى الْأَكْبَرِ مِنْهُمَا. (رواہ مسلم مسنداً والبخاری تعلیقاً)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مَیں نے اپنے آپ کو خواب میں مسواک کرتے ہوئے دیکھا۔ اسی خواب کے دوران یہ بھی دیکھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے، ان میں ایک دوسرے سے عمر میں بڑا تھا، مَیں اپنی مسواک چھوٹے والے کو دینے لگا تو خواب ہی میں مجھ کو کہا گیا ”کَبِّــــرْ“ بڑے کو دیجئے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے وہ مسواک بڑے کو دی۔

افادات: اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ کو خواب میں بھی اس بات کی تلقین کی جارہی ہے کہ جو عمر میں بڑا ہے اس کا لحاظ کیجئے۔ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ مثلاً دو آدمی ایسے ہیں جو اپنے کمالات وخوبیوں میں برابر ہیں، علم وفضل کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں لیکن ان میں سے ایک عمر کے اعتبار سے

دوسرے سے بڑا ہے، تو اس صورت میں بڑے کا لحاظ کیا جائے گا۔ اور اگر فضل وکمال دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں، اور کوئی امتیازی وصف اور خوبی بھی کسی میں نہیں پائی جاتی، تب بھی جو عمر کے اعتبار سے بڑا ہے اس کا لحاظ کیا جائے گا۔

اس روایت میں کوئی تفصیل نہیں ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں آدمی جو خواب میں نظر آئے تھے علم وفضل اور کمال کے اعتبار سے یکساں ہوں اور پھر نبی کریم ﷺ نے ان میں جو عمر میں چھوٹا تھا اس کو مسواک دینا چاہا، تو آپ ﷺ کو خواب ہی میں تلقین کی گئی کہ آپ بڑے کو دیجئے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے

٣٥٤: عَنْ أَبِیْ مُوسٰی رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: اِنَّ مِنْ اِجلالِ اللّٰهِ تَعَالیٰ اِکْرَامَ ذِی الشَّیْبَةِ الْمُسْلِمِ، وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَیْرَالْغَالِیْ فِیْهِ، وَالْجَافِیْ عَنْهُ۔ وَاِکْرَامَ ذِی السُّلْطَانِ الْمُقْسِطِ. (حدیث حسن، رواہ ابوداود)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں سے یہ بھی ہے کہ جو مسلمان سفید بال والا ہو اس کا اکرام کیا جائے۔ اور جو حاملِ قرآن یعنی حافظ یا عالمِ قرآن ہے، اور وہ اس میں غلو کرنے والا نہیں ہے اور نہ وہ اس کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے، تو اس کا بھی اکرام کیا جائے۔ اور ایسا بادشاہ جو انصاف کرنے والا ہے اس کا بھی اکرام کیا جائے۔

افادات: اس روایت میں تین طرح کے آدمیوں کا تذکرہ ہے، اس میں پہلا تو وہ ہے جس کی عمر اسلام کی حالت میں بوڑھاپے تک گذری اور اس کے بال مسلمان ہونے کی حالت میں سفید ہوئے تو وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس کا اکرام وادب کیا جائے۔

دوسرا وہ جو قرآنِ پاک کا حامل ہے یعنی حافظ یا عالم ہے اور قرآن کے معاملہ

میں غلو اور حد سے آگے بڑھ کر کوئی کام نہیں لے رہا ہے۔

خاص دینی مزاج؛ اعتدال

بعض مرتبہ بعض لوگ اپنے کسی عمل کے اندر غالی ہوتے ہیں اور وہ جس چیز کو لے کر چل رہے ہیں اسی کو دوسری تمام چیزوں سے اہم سمجھتے ہیں، حالانکہ دین کی تعلیم میں اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے کہ جو باتیں شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہیں ان کے اندر بھی آدمی اعتدال اور میانہ روی سے کام لے، غلو نہ کرے اور حد سے آگے نہ بڑھے، قرآنِ پاک میں حکم دیا گیا ہے ﴿لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ﴾ دین کے معاملہ میں غلو سے کام نہ لیا جائے۔ غلو کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کے لیے جو حد مقرر کی گئی ہے اس کی اس مقررہ حد میں رہ کر آدمی نہ چلے۔

مَیں اس کی ایک مثال دے کر آپ کو یہ بات سمجھاتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا جو ادب بجالانا چاہیے، ان میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اگر تنہائی میں ہو تب بھی اپنا ستر نہ کھولے۔ لوگوں کے سامنے اپنے ستر کو چھپانا تو ضروری اور واجب ہے، اگر کوئی آدمی لوگوں کے سامنے اپنا ستر کھولے گا تو وہ حرام کام کا ارتکاب کرنے والا قرار دیا جائے گا اور گنہ گار ہوگا، لیکن اگر کوئی آدمی کسی بند کمرہ میں تنہا ہے وہاں اس کو انسانوں میں سے کوئی دیکھنے والا موجود نہیں ہے، اب وہاں تو کسی غیر کے سامنے ستر کھولنا لازم نہیں آتا، لیکن ایسے مواقع میں آدمی کو چاہیے کہ بلاضرورت ستر نہ کھولے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کوئی ضرورت ہوتی ہے جیسے کسی کو غسل کی ضرورت ہے، استنجاء اور پیشاب پاخانہ کی ضرورت ہے، یا اپنی بیوی سے اپنی حاجت پوری کرنے کی ضرورت ہے، ان مواقع پر تو ستر کھولنے کی شریعت نے اجازت دی ہے، اور جب تک آدمی ستر نہیں کھولے گا وہاں

تک وہ اپنی ان ضرورتوں کو پورا نہیں کرسکتا، لیکن اس میں بھی شریعت نے یہ تعلیم دی ہے کہ ضرورت کی مقدار ہی ستر کھولا جائے۔

چنانچہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب قضاءِ حاجت کے لیے جاتے تھے، تو جب بیٹھنے کے لیے زمین سے بالکل قریب ہوتے تھے تب ستر کھولتے تھے۔ (ابوداود، ۱۴) اس لیے اگر کوئی آدمی باہر سے ستر کھول کر جاتا ہے، یا چند قدم دور ہے اور ستر کھول دیتا ہے تو اس کی ضرورت نہیں ہے، ستر کھولنا تو اس لیے ہے کہ پیشاب پاخانہ کا تقاضہ پورا کرنا ہے، اس لیے اس جگہ پر پہنچ کر بھی بیٹھنے کے لیے جتنا زمین سے قریب ہوتا جائے اسی وقت بقدرِ ضرورت ستر کھولے۔ یہی اس کا ادب ہے۔

بہرحال! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ تنہائی میں جہاں کوئی دیکھنے والا موجود نہ ہو، تو اگرچہ وہاں ستر چھپانا فرض تو نہیں رہا، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادب یہ ہے کہ آدمی تنہائی میں بھی اپنے ستر کو چھپانے کا اہتمام کرے اس لیے کہ ہر مسلمان کا یہ تصور ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے، ہم اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں، ہمارا ہر حرکت وسکون اس کے علم میں ہے، تو اس کا ادب یہ ہے کہ تنہائی میں بھی ہم بلا ضرورت اپنا ستر نہ کھولیں۔ شریعت کا یہ ایک حکم ہے جو اللہ تعالیٰ کے آداب میں سے ہے، اگرچہ تنہائی کی حالت میں یہ فرض اور واجب نہیں ہے۔ اور لوگوں کے سامنے تو یہ فرض اور واجب ہے۔

اب حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے بھی یہ چیز تھی، ان میں سے بعض حضرات کے دل ودماغ پر یہ تصور کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے اتنا غالب آیا کہ جب وہ حضرات قضاءِ حاجت اور پیشاب پاخانہ کے لیے بیٹھتے تھے اس موقع پر بھی انہوں نے سوچا کہ اس وقت بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہیں، اور اپنا ستر کھول رہے

ہیں، تو حیا وشرم کی زیادتی کی وجہ سے ان میں سے بعض حضرات یہ کرتے تھے کہ قضاءِ حاجت کے لیے بیٹھتے وقت وہ اپنے سینے کو موڑ دیتے تھے اور دوہرا کر دیتے تھے، جیسے کوئی اوپر سے دیکھ رہا ہو تو ہم اپنے آپ کو کیسے جھکا دیتے ہیں اس طرح جھک جاتے تھے، اور اپنے آپ کو مشقت میں ڈالتے تھے۔ اس پر ان حضرات کی تنبیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں یہ آیت نازل کی گئی ﴿أَلَا اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ﴾ جب وہ پیشاب پاخانہ کے وقت قضاءِ حاجت کے لیے جاتے ہیں اور اس وقت ستر کھولنے کی نوبت آتی ہے تو وہ لوگ اپنے سینوں کو موڑ لیتے ہیں، اور ایسا اس لیے کرتے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ سے چھپ سکیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿أَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ، يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ جس وقت وہ کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور اس وقت جس چیز کو وہ چھپاتے ہیں یا ظاہر کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ تو وہ سب بھی جانتا ہے (روح المعانی، ۲۱۰/۱۱) اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ سب جانتے ہی ہیں تو پھر ستر بھی کیا چھپانا۔

غلو سے بچانے کا اہتمام

دیکھو! شریعت نے حدود کی دونوں طرف سے رعایت کی ہے کہ ویسے تو یہ ایک طرح کی بے ادبی ہے، اس بے ادبی سے بچانے کے لیے یہ حکم دیا کہ تنہائی میں ہو تب بھی آپ اللہ تعالیٰ کے ادب کو بجالاتے ہوئے ستر کو چھپانے کا اہتمام کریں، لیکن اسی شریعت نے ہمیں یہ اجازت دی کہ قضاءِ حاجت کے وقت بقدرِ ضرورت ستر کھول سکتے ہیں، اب اگر کوئی آدمی اس وقت ستر کھول کر بیٹھا ہے تو وہ ضرورت کی وجہ سے ہے، اگر اس وقت بھی وہ یہ تصور دل میں لائے جیسا کہ مَیں نے ابھی بعض صحابہ کے متعلق

بتلایا، اور اس طرح سینے کو موڑ کر وہ اپنے آپ کو بلاوجہ مشقت میں ڈالے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے ادب کی بجا آوری میں ایک طرح کا غلو ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو پسند نہیں کیا، اس لیے ان کو تنبیہ کی کہ ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اگر آپ یہ سوچتے ہیں ہم کپڑے نکالتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہوتے ہیں، تو پھر جب کپڑے پہنے ہوئے ہوتے ہو، اس وقت بھی تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں کے سامنے ہی ہوتے ہو؛ اس وقت کیا کرو گے؟

خلاصۂ کلام

بہر حال! یہ چیز ایک ایسی جماعت کی طرف سے پیش آرہی تھی جس کو اللہ تعالیٰ آنے والی پوری امت کے واسطے نمونہ بنانا چاہتے تھے، اور جو شریعتِ مطہرہ نبی کریم ﷺ لے کر دنیا میں تشریف لائے اس شریعت کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے یہی حضرات واسطہ بننے والے تھے، اس لیے اگر ان حضرات کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی، تو ہوسکتا تھا کہ آنے والی امت کو مشقت لاحق ہوتی، وہ حضرات تو اپنے اس جذبہ کی وجہ سے اس چیز کی رعایت کر پاتے، لیکن آنے والی امت اس کا لحاظ نہ کر پاتی اور بلاوجہ مشقت میں پڑ جاتی، اس لیے ان کو تنبیہ کی گئی اور اسی سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ دین کا کوئی بھی کام ہو، اس کی انجام دہی میں آدمی کو ان حدود کی پوری رعایت کرنی چاہیے جو شریعت نے مقرر کی ہیں، اگر وہ حد سے آگے بڑھے گا تو اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔

اعتدال کی ایک اور مثال

میں ایک اور مثال دیتا ہوں کہ قیام اللیل یعنی رات کو تہجد کے لیے اللہ تعالیٰ

کے سامنے کھڑا رہنا، یہ ایک پسندیدہ چیز ہے، اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی نزدیکی کا ذریعہ ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، اور اس کے بڑے فضائل ہیں، قرآنِ پاک میں بھی اس کی تاکید آئی ہے، اگرچہ اس کو فرض نہیں کیا گیا ہے، لیکن حدیثِ پاک میں آتا ہے جو آدمی اللہ تعالیٰ کا خصوصی قرب حاصل کرنا چاہے، اس کو چاہیے کہ اس نماز کا اہتمام کرے۔ اب ایک آدمی پوری رات جاگتا ہے، اور اپنے بدن کو راحت پہنچانے کا نام ہی نہیں لیتا؛ تو یہ غلط طریقہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، ان کے والد عمرو بن عاص نے ان کا نکاح کرایا۔ نکاح کی کچھ مدت کے بعد انہوں نے اپنی بہو سے پوچھا کہ صاحبزادے کا کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ماشاء اللہ بہت نیک ہیں، دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر تہجد میں مشغول رہتے ہیں۔ اس طرح اس نے چند جملوں میں اپنی بات کہہ دی کہ میرے حقوق ادا کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ کچھ مدت کے بعد پھر انہوں نے پوچھا تو پھر یہی جواب ملا، اب انہوں نے جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مَیں نے اپنے بیٹے عبداللہ کا نکاح ایک شریف گھرانے کی عورت سے کرا دیا، لیکن وہ تو عبادت میں ایسے مشغول ہیں کہ بیوی کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ہی نہیں کرتے، رات بھر تہجد میں مشغول رہتے ہیں اور دن بھر روزہ رکھتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ ٹھیک ہے، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکیہ پیش کیا تو آپ نے اس کو ایک طرف رکھا اور پھر ان سے سارے حال احوال پوچھے، اس کے بعد حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ دیکھو! پوری رات عبادت میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے، کچھ حصہ آرام بھی کرو "اِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ

حَقًّا،وَاِنَّ لِعَیْنَیْكَ عَلَیْكَ حَقًّا،وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَیْكَ حَقًّا، وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَیْكَ حَقًّا" تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے،تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے،تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے،تمہاری ملاقات کے لیے جو مہمان آتے ہیں ان کا بھی تم پر حق ہے،اوران تمام کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرنا چاہیے،عبادت کا یہ ذوق وشوق ٹھیک ہے،لیکن اس میں اتنا غلو کرنا کہ دوسروں کے حقوق پر زد پڑے، پسندیدہ چیز نہیں ہے۔اس کی اور بھی بہت ساری مثالیں ملیں گی۔تو مَیں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ کسی بھی چیز میں غلو پسندیدہ نہیں ہے، دین کا اونچے سے اونچا کام ہو اور وہ فرض کا درجہ رکھتا ہو لیکن اس میں بھی اگر آدمی مقررہ حدود سے آگے بڑھے،تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔کسی بھی چیز میں غلو پسندیدہ نہیں ہے، دین کے مختلف شعبے ہیں،کوئی آدمی دین کے کسی بھی شعبے سے منسلک ہو تو اس کو اس شعبے کے حدود میں رہ کر ہی کام کرنا چاہیے،اس میں حد سے آگے بڑھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

اس روایت میں حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "وَحَامِلِ الْقُرْآنِ غَیْرَالْغَالِی فِیْهِ" وہ حافظِ قرآن اور عالم جو اس میں غلو کی حد تک نہ پہنچے؛ تو اس کا اکرام کیا جائے۔ اور غلو کرنے والے کے متعلق حضور ﷺ نے کوئی بات نہیں فرمائی۔

"وَالْجَافِیْ عَنْهُ" اور جو اس کے حقوق کو چھوڑنے والا ہے اس کو بھی مستثنیٰ کر دیا۔ گویا حدود سے آگے بڑھنے والے کو بھی اندر سے نکال دیا اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے والے کو بھی چھوڑ دیا۔جو درمیانی راہ چلنے والا ہے اس کے اکرام کا حکم دیا ہے۔

اور اس روایت میں تیسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ جو بادشاہ انصاف کرنے والا ہو اس کا بھی اکرام کیا جائے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عظمت کے حقوق میں سے ہے۔

وہ ہم میں سے نہیں

٣٥٥: عَن عَمرِوبنِ شُعَيبٍ عَن أَبِيهِ عَن جَدِّهِ قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: لَيسَ مِنَّا مَن لَّم يَرحَم صَغِيرَنَاوَيَعرِف شَرفَ كَبِيرِنَا۔ (حديث صحيح،رواه ابوداود والترمذى، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ: نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو آدمی ہمارے چھوٹوں پر شفقت و مہربانی کا معاملہ نہ کرے، اور ہمارے بڑوں کی بزرگی اور ان کے شرف و کمال کا لحاظ نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

افادات: گویا اسلامی تعلیمات کا تقاضہ یہ ہے کہ چھوٹوں کے ساتھ شفقت و مہربانی اور محبت کا معاملہ کیجئے، اور بڑوں کے ساتھ ادب، عظمت، اور احترام کا معاملہ کیا جائے۔ دونوں چیزوں کا خیال کیا جائے۔

لوگوں کے مقام و مرتبہ کے مناسب معاملہ کیا جائے

٣٥٦: عن أَبِى ميمونَ بنِ أبى شَبِيبٍ رحمه الله اَنَّ عَائِشَةَ رضى الله عنها مَرَّ بِهَا سَائِلٌ، فَأَعْطَتهُ كِسرَةً، وَمَرَّبِهَارَجُلٌ عَلَيهِ ثِيَابٌ وَهَيئَةٌ، فَأَقعَدَتهُ، فَأَكَلَ، فَقِيلَ لَهاَ فِى ذٰلك؟ فقالتُ: قالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: أَنزِلُوا النَّاسَ مَنازِلَهُم۔ (رواه ابوداود)

وذكر مسلم فى أول صحيحه تعليقاً فقال: ذُكِرَ عَن عَائِشَةَ رضى الله عنها قَالَتُ: أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَن نُنزِلَ النَّاسَ مَنَازِلَهُم۔

ترجمہ: میمون بن ابی شبیب کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے ایک مانگنے والا گذرا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کو دے دیا۔ اس کے بعد ایک دوسر آدمی وہاں سے گذرا، جس کی ظاہری ہیئت ذرا اچھی تھی، اور وہ بھی ضرورت مند تھا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کو بٹھا کر کھلایا، اور پھر رخصت کیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس بارے میں

پوچھا گیا تو فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے مقام ومرتبہ کے مناسب معاملہ کیجئے۔

دوسری روایت میں ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو اس بات کا حکم دیا کہ ہم لوگوں کو ان کے مقام ومرتبہ پر رکھیں۔

افادات: پہلے والا ظاہری ہیئت سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مانگنے والا ہے، اس لیے اس کے ہاتھ میں دے دیا جائے، یہی اس کے حق کو ادا کرنا ہے۔ اور دوسرا آدمی بھی محتاج اور ضرورت مند تو تھا لیکن مانگنے والا معلوم نہیں ہوتا تھا، اس لیے اس کو بٹھا کر کھلایا۔

بہر حال! لوگوں میں سے ہر ایک سے اس کے مقام ومرتبہ کے مناسب معاملہ کیا جائے، یہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہے۔ جس کیٹیگری کا آدمی ہے ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ لیکن یہاں وہ کیٹیگری مراد ہے جو شریعت کی مقرر کی ہوئی ہے یعنی شریعت نے اس کو جو مقام اور درجہ عطا فرمایا ہے اس مقام ومرتبہ کے مناسب اس کے ساتھ معاملہ کیا جانا چاہیے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن

٣٥٧: وعن ابن عباسٍ رضی اللّٰہ عنھما قال: قَدِمَ عُيَيْنَةُ بْنُ حِصْنٍ، فَنَزَلَ عَلٰى ابْنِ أَخِيهِ الْحُرِّ بْنِ قَيْسٍ، وَكَانَ مِنَ النَّفَرِ الَّذِيْنَ يُدْنِيهِمْ عُمَرُ رضی اللہ عنہ، وَكَانَ الْقُرَّآءُ أَصْحَابَ مَجْلِسِ عُمَرَ وَمُشَاوَرَتِهِ، كُهُولًا كَانُوا أَوْ شُبَّانًا۔ فَقَالَ عُيَيْنَةُ لِابْنِ أَخِيهِ: يَاابْنَ أَخِيْ! لَكَ وَجْهٌ عِنْدَ هٰذَا الْأَمِيرِ، فَاسْتَئْذِنْ لِيْ عَلَيْهِ، فَاسْتَأْذَنَ لَهُ، فَأَذِنَ لَهُ عُمَرُ رضی اللہ عنہ۔ فَلَمَّا دَخَلَ قَالَ هِيْ يَاابْنَ الْخَطَّابِ! فَوَاللّٰهِ مَا تُعْطِينَا الْجَزْلَ وَلَا تَحْكُمُ فِيْنَا بِالْعَدْلِ۔ فَغَضِبَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ، حَتّٰى هَمَّ أَنْ يُوْقِعَ بِهِ،

فَقَالَ لَهُ الْحُرُّ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ قَالَ لِنَبِيِّهِ ﷺ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ وَإِنَّ هٰذَا مِنَ الْجَاهِلِينَ وَاللّٰهِ مَا جَاوَزَهَا عُمَرُ حِينَ تَلَاهَا عَلَيْهِ، وَكَانَ وَقَّافًا عِنْدَ كِتَابِ اللّٰهِ تَعَالَىٰ. (رواہ البخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عیینہ بن حصن فزاری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس کے پاس ٹھہرے، حر بن قیس ان لوگوں میں سے تھے جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس بٹھاتے تھے (اور اس کی وجہ یہ تھی وہ قرآنِ پاک کے پڑھنے والے اور اس کے معانی سے واقف تھے گویا وہ عالم تھے اس وجہ سے ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے پاس بٹھاتے تھے) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی (adviser body) مجلسِ شوریٰ میں سب علماء ہوتے تھے، چاہے وہ جوان ہوں یا ادھیڑ۔ عیینہ نے اپنے بھتیجے سے کہا کہ اے بھتیجے! امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا خاص مقام ہے، اس لیے ان کی خصوصی مجلس میں میرے لیے بھی حاضری کی اجازت لے لو چنانچہ انہوں نے ان کے لیے اجازت لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اجازت دی، چنانچہ وہ اس مجلس میں حاضر ہوئے۔ جب وہ مجلس میں پہنچے تو (کسی بات پر) کہنے لگے کہ اے ابن الخطاب! آپ ہم کو بہت زیادہ عطیات تو دیتے نہیں، اور ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ بھی نہیں کرتے (یہ سن کر) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور ان کا ہاتھ کوڑے پر گیا تا کہ ان کو ان کی اس غلط حرکت کی سزا دی جائے۔ ان کے بھتیجے حر بن قیس نے (دیکھا تو فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے) کہا کہ اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے حکم دیا ہے کہ جو قصور وار ہوں آپ ان سے درگذر کیجیے، اور بھلی بات کا حکم دیجیے، اور جو نادان اور جاہل لوگ ہوں ان سے چشم پوشی کیجیے۔ اور یہ بھی جاہلین ہی میں سے ہیں۔ (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے انہوں نے آیت پڑھی اور یہ بات عرض کی) تو فوراً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور ان کو سزا دینے کا جو ارادہ کیا تھا اس سے باز آ گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآنِ پاک کے سامنے بہت زیادہ ٹھہرنے والے تھے۔

عالم بڑا ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو

ہمارے یہاں ایک مزاج یہ ہے کہ کوئی آدمی کتنا ہی صاحبِ علم ہو، اگر اس کی

عمر کچھ کم ہے تو اس کے علم کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا، حالانکہ فتاویٰ عالمگیری میں لکھا ہے "اَلْعَالِمُ کَبِیْرٌ، وَاِنْ کَانَ صَغِیْراً، وَالْجَاھِلُ صَغِیْرٌ وَاِنْ کَانَ کَبِیْراً" عالم بڑا ہے، چاہے وہ عمر کے اعتبار سے چھوٹا ہو، اور غیر عالم چھوٹا ہے، چاہے وہ عمر کے اعتبار سے زیادہ ہو۔ عمر کا لحاظ تو اس وقت کیا جائے گا جبکہ ایک ہی کمال میں دو آدمی برابر ہوں لیکن اگر کمالات میں کوئی آدمی دوسرے سے بڑھا ہوا ہے تو وہاں آگے بڑھانے کے معاملہ میں عمر نہیں دیکھی جائے گی۔ ہاں! اس کی عمر کی وجہ سے اس کا اکرام ضرور کیا جائے گا، لیکن ان دونوں میں کس کو آگے بڑھایا جائے؟ تو اس میں اس کمال کا لحاظ ضرور کریں گے۔ بہرحال! حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن لوگوں سے مشورہ لیتے تھے اور اپنے پاس بٹھاتے تھے وہ سب اہلِ علم ہوتے تھے، چاہے وہ جوان ہو یا بوڑھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قرآن پر عمل کا اہتمام

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے تمام خلفاءِ راشدین کے یہاں جو لوگ اپنی حاجتیں لے کر جاتے تھے، ان کے لیے تو وہاں کوئی رکاوٹ تھی ہی نہیں، لیکن ان کی مشورہ کی جو خصوصی مجلس ہوتی تھی اس میں ہر ایک کو حاضری کی اجازت نہیں ہوتی تھی، لیکن حر بن قیس تو اصحابِ مشورہ میں سے تھے، اسی مجلس سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کے چچا نے جو مہمان آئے تھے اپنے لیے اجازت کو کہا کہ میں بھی اس خصوصی مجلس میں تمہارے ساتھ آنا چاہتا ہوں، میرے لیے بھی اجازت لے لو۔ چنانچہ انہوں نے ان کے لیے اجازت لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی رعایت میں ان کو اجازت دی، چنانچہ وہ اس مجلس میں حاضر ہوئے۔ اب ان کے مزاج میں ذرا اکھڑ پن تھا۔ یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی باتوں اور مشورہ میں مشغول تھے، اور کسی بات پر وہ کہنے لگے کہ اے ابن الخطاب!

آپ ہم کو بہت زیادہ عطیات تو دیتے نہیں، اور ہمارے درمیان انصاف سے فیصلہ بھی نہیں کرتے۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل وانصاف تو پوری دنیا میں مشہور ہے، لیکن انہوں نے اپنے مزاج کے اکھڑ پن کی وجہ سے ایسی بات کہی۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آگیا اور ان کا ہاتھ سیدھا کوڑے پر گیا، تاکہ ان کو ان کی اس غلط حرکت کی سزا دی جائے۔ ان کے بھتیجے نے دیکھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چچا پر امیر المؤمنین کا کوڑا پڑ جائے، ورنہ چچا کا تو برا حال ہو جائے گا۔ تو حضرت حر بن قیس نے فوراً حضرت عمرؓ سے کہا کہ اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے حکم دیا ہے کہ جو قصور وار ہوں، آپ ان سے درگزر کیجئے۔ اور بھلی بات کا حکم دیجئے۔ اور جو نادان اور جاہل قسم کے لوگ ہیں ان سے اعراض یعنی چشم پوشی کیجئے "وَاِنَّ ھٰذَا مِنَ الْجَاھِلِیْنَ" اور یہ بھی جاہلین ہی میں سے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے انہوں نے آیت پڑھی تو فوراً حضرت عمر کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، اور ان کو سزا دینے کا جو ارادہ کیا تھا اس سے باز آگئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ قرآنِ پاک کے سامنے بہت زیادہ ٹھہرنے والے تھے۔

قصہ کا سبق

ہمارا معاملہ تو ایسا ہے کہ ایسے موقع پر اگر کوئی آدمی ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد یا قرآنِ پاک کی کوئی آیت یا شریعت کا کوئی حکم سنائے تو بھی ہم نے جو طے کیا ہے اس سے پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے اور تاویلیں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن حضراتِ صحابہ کرام کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ یہاں بھی دیکھئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ اس نے ایسا کیوں کہا۔ بس! جیسے ہی آیت سنی، فوراً اس پر عمل کر لیا۔

یہاں تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس روایت کو اس لیے لائے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا اہلِ مشورہ اور اپنی (advisery body) علماء کو بنایا تھا، گویا یہ ان حضرات کا اکرام تھا۔

بڑوں کی مجلس میں ان کا لحاظ کرنا چاہیے

۳۵۸: وعن أبی سعید سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ قال: لَقَدْ كُنْتُ عَلٰی عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ غُلَاماً، فَكُنْتُ أَحْفَظُ عَنْهُ، فَمَا يَمْنَعُنِی مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا أَنَّ هٰهُنَا رِجَالًا هُمْ أَسَنُّ مِنِّی. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت سمرة بن جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں چھوٹا تھا اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو یاد کرلیا کرتا تھا، لیکن آپ کی مجلس میں بولتا نہیں تھا اس لیے کہ آپ ﷺ کی مجلس میں مجھ سے بڑی عمر والے لوگ موجود ہوتے تھے۔

افادات: بڑوں کی موجودگی میں چھوٹوں کا بولنا خلاف ادب سمجھا جاتا ہے، بس! اسی کو ثابت کرنے کے لیے یہ روایت پیش کی ہے کہ بڑوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

بوڑھوں کا اکرام، اور دنیوی انعام

۳۵۹: وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مَا أَكْرَمَ شَابٌّ شَيْخاً لِسِنِّهِ اِلَّا قَيَّضَ اللّٰهُ لَهُ مَنْ يُكْرِمُهُ عِنْدَ سِنِّهِ. (رواہ الترمذی وقال حدیث غریب)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی جوان جب کسی بوڑھے کا اکرام اس کی سن رسیدگی اور عمر کی وجہ سے کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس جوان کے لیے ایک ایسا آدمی پیدا کر دیتے اور مقرر کر دیتے ہیں جو اس کے بوڑھاپے کے زمانہ میں اس کا اکرام کرے گا۔

افادات: دیکھو! اس روایت میں دو بشارتیں ہوئیں، ایک تو یہ کہ یہ جوان بھی بوڑھاپے کا زمانہ پائے گا یعنی اس کی عمر لمبی ہوگی، اور دوسری خاص بات یہ کہ اس زمانہ

میں اللہ تعالیٰ ایسے لوگ پیدا کریں گے جو اس کا اکرام کریں گے۔ جوانوں کے لیے کتنی بڑی بات ہے!

ہے یہ گنبد کی صدا؛ جیسی کہے ویسی سنے

آج کل ہمارا سماج اور معاشرہ جس رخ پر جارہا ہے اور اس وقت جو تعلیم دی جارہی ہے، اور جو پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے، میڈیا کے ذریعہ سے جو عادت ڈلوائی جارہی ہے، اس میں ایک بات یہ بھی ہے کہ بڑوں کے اکرام کی طرف سے جوانوں کو ہٹایا جائے کہ ان کا کیا ہے؟ اور انہوں نے تمہارے ساتھ کیا احسان کیا ہے؟ ان کا تم پر کیا حق ہے؟ ایسی مختلف چیزیں پھیلائی جاتی ہیں۔ بھائی! یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ اسی نے ہمیں پیدا کیا اور اسی کی ساری نعمتیں ہم استعمال کرتے ہیں، اور اسی کا حکم ہم مانتے ہیں اور جب اسی نے ہمیں یہ حکم دیا کہ جو سن رسیدہ اور بڑی عمر کا بوڑھا ہو، اس کا اکرام کیا جائے؛ بس! اسی نسبت سے ہمیں بڑوں کا اکرام کرنا چاہیے، تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اس کے لیے ایسے اسباب مہیا فرمائے گا۔ ورنہ دنیا کا حال تو ایسا ہی ہے کہ اگر آدمی نے کسی کی بے عزتی اور بے ادبی کا معاملہ کیا تو پھر اس کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ کیا جائے گا۔ ہے یہ گنبد کی صدا؛ جیسی کہے ویسی سنے۔ "کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ" جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

(بخاری شریف۔ باب ماجاء فی فاتحۃ الکتاب۔ ۵۷۰/۱۰)

اگر عالم کوتاہی کرے تو؟

چوں کہ اس باب میں علماء کی توقیر کے سلسلہ میں خاص عنوان قائم کیا گیا تھا، تو آج کل عام طور پر بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں بعض اہلِ علم جن کی طرف سے عمل کے معاملہ میں کچھ کوتاہی ہوتی ہے، اس کی وجہ سے بدظنی پیدا ہوتی ہے۔ تو یہ تعلیم دی

جارہی ہے کہ ان کی کوتاہی اپنی جگہ پر ہے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے اور اگر وہ عمل کے معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا مواخذہ ہوگا، لیکن اس کی وجہ سے اس کے ساتھ اکرام کا معاملہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے، وہ حکم ہم پر سے ہٹ نہیں جاتا، جیسے کہ اگلے باب میں سادات کا حکم آیا تھا تو وہاں بھی میں نے بتلایا تھا۔

اسی طرح کوئی عالم اگر عمل کے معاملہ میں بے توجہی اور کوتاہی سے کام لیتا ہے تو اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک طبیب اور ڈاکٹر جو اپنے فن کا ماہر ہے لیکن بد پرہیز ہے، اور جو چیزیں صحت کے لیے مضر ہیں وہ خود ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ اگر وہ ان چیزوں کو استعمال کرے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی صحت اور تندرستی متأثر ہوگی اور وہ خود بیمار ہوگا، لیکن اس کے باوجود کوئی دوسرا بیمار اس سے علاج ومشورہ کے لیے جائے گا تو وہ اس کو توصحیح علاج بتائے گا اور مشورہ دے گا، اس نے اپنے فن کی جو معلومات تھیں ان معلومات کو چھوڑ کر اور بد پرہیزی کر کے اگر چہ خود اپنا نقصان کیا ہے، لیکن اگر آپ مشورہ لینے کے لیے جائیں گے تو وہ آپ کو توصحیح مشورہ ہی دے گا۔

ایک قانون داں (Lawyer) وکیل اور ایڈوکیٹ ہے، وہ ملک کے قانون کو جانتا ہے، لیکن وہ خود قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، تو اس خلاف ورزی کرنے پر اگر وہ پکڑا گیا تو جو سزا اس کو ملنے والی ہے وہ اس کو ملے گی، اللہ تعالیٰ کے یہاں تو ساری چیزیں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن اگر آپ قانون کے معاملہ میں اس کے پاس مشورہ لینے جائیں گے تو وہ اپنے علم کی بنیاد پر اور قانون کو جاننے کی وجہ سے آپ کو صحیح راستہ ہی بتائے گا، اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگر کسی عالم کی طرف سے اس کے علم کے

باوجود عملی طور پر کوئی کوتاہی ہوتی ہے تو اس کی وجہ سے اس کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں ہماری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

اگر عذاب دینا چاہتے

یہ علم خود اپنی جگہ پر ایک کمال ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمایا ہے۔ امام محمدؒ جو امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں، ان کے انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا گیا؟ تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کرسی پر بٹھایا اور موتیوں کا تاج میرے سر پر رکھا اور مجھ سے کہا کہ اے محمد! اگر ہم تم کو عذاب دینا چاہتے تو تمہارے سینے میں اپنا علم نہ رکھتے۔

تو معلوم ہوا کہ یہ علم بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور کیا ضروری ہے کہ وہ عالم اپنی اس بدعملی کے اوپر باقی رہے، ہوسکتا ہے کہ کل کو اسی علم کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور وہ تائب ہو کر اور اپنی بدعملی چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرلے، اور ہم اس کے حقوق کی ادائیگی کے معاملہ میں کوتاہی کرتے ہوئے، یا اس کا اکرام نہ کر کے اپنا ہی نقصان کرلیں۔

اہلِ علم کے متعلق ایک نہایت اہم مضمون

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ہے ''الاعتدال فی مراتب الرجال''۔ حضرت شیخؒ کے یہاں رمضان المبارک میں پڑھ کر سنائی جاتی تھی اور ہمارے یہاں بھی اس کو سناتے ہیں، اس کتاب میں حضرت شیخؒ نے علماء سے متعلق کچھ چیزیں لکھی ہیں، مناسب معلوم ہوا کہ وہ میں پڑھ کر سناؤں تو وہ آپ کے بھی سامنے آجائے، اسی لیے یہ کتاب میں ساتھ لایا تھا اور اسی کو سناتا ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ وہ شخص میری امت میں سے نہیں ہے جو ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے، ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے، اور ہمارے عالم کی قدر نہ کرے۔ (ترغیب)

اس ارشاد نبوی کے بعد علماء کو علی العموم گالیاں دینے والے اور برا بھلا کہنے والے اپنے آپ کو امتِ محمدیہ میں شمار کرتے ہیں لیکن صاحبِ امت ان کو اپنی امت میں شمار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔

حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تین شخص ایسے ہیں جن کو منافق کے سوا کوئی آدمی ہلکا (اور ذلیل) نہیں سمجھ سکتا، ایک شخص وہ جو اسلام کی حالت میں بوڑھا ہو گیا، دوسرے اہلِ علم، اور تیسرے منصف بادشاہ۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "أُغْدُ عَالِماً أَوْ مُتَعَلِّماً أَوْ مُسْتَمِعاً أَوْ مُحِبّاً وَلَا تَكُنِ الْخَامِسَ فَتَهْلَكَ" (مقاصد حسنہ) کہ تو یا عالم بن یا طالب علم، یا علم کا سننے والا، یا (علم اور علماء) سے محبت رکھنے والا، پانچویں قسم میں داخل نہ ہونا، ورنہ ہلاک ہو جائے گا

حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پانچویں قسم سے مراد علماء کی دشمنی ہے اور ان سے بغض رکھنا ہے۔ ایک حدیث میں حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ تو عالم بن، یا طالب علم، اور اگر دونوں نہ بن سکے، تو علماء سے محبت رکھنا، ان سے بغض نہ رکھنا۔

ایک حدیث میں وارد ہے کہ قرآن شریف کے حاملین یعنی حافظ اور علماء قیامت کے دن جنت والوں کے چودھری (سردار) ہوں گے۔

دوسری حدیث میں وارد ہے کہ حاملینِ قرآن اللہ کے ولی ہیں، جو شخص ان سے دشمنی کرتا ہے، وہ اللہ سے دشمنی کرتا ہے۔ اور جو ان سے دوستی کرتا ہے، وہ اللہ سے دوستی کرتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنی امت پر تین چیزوں سے زیادہ

کسی چیز کا خوف نہیں کرتا، منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ وہ علم والے شخص کو دیکھیں اور اس کو ضائع کر دیں، پرواہ نہ کریں۔ (ترغیب)

امام نوویؒ ''شرحِ مہذب'' میں لکھتے ہیں کہ بخاری شریف میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے کہ جو شخص میرے کسی ولی کو ستائے، میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے۔

اور خطیب بغدادی نے حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ اگر فقہاء (علماء) اللہ کے ولی نہیں ہیں تو پھر اللہ کا کوئی ولی ہے ہی نہیں۔

حِبرُ الامۃ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی فقیہ (عالم) کو اذیت پہنچائے، اس نے رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائی، اور جو شخص رسول اللہ ﷺ کو اذیت پہنچائے، اس نے اللہ جل جلالہٗ کو اذیت پہنچائی۔

حافظ ابوالقاسم بن عساکر فرماتے ہیں: میرے بھائی ایک بات سن لے، حق تعالیٰ شانہ مجھے اور تجھے اپنی رضا کے اسباب کی توفیق عطا فرمائے، اور ہم کو ان لوگوں میں داخل فرمائے جو اس سے ڈرنے والے ہوں اور جیسا کہ چاہیے ویسا تقویٰ کرنے والے ہوں، (یہ بات سن لے) کہ علماء کے گوشت (یعنی ان کی غیبت) نہایت زہریلے ہیں، ان کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی پردہ دری میں اللہ کی عادت سب کو معلوم ہے (کہ جو لوگ علماء کی اہانت کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی پردہ دری فرماتے ہیں) جو شخص ان کو عیب لگانے میں لب کشائی کرتا ہے، اس کے مرنے سے پہلے حق تعالیٰ شانہٗ اس کے دل کو مردہ بنا دیتے ہیں۔

مولانا عبدالحی صاحب لکھنویؒ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں: اگر گالیاں دینے

والے کا مقصود علم اور علماء کی تحقیر علم کی وجہ سے ہے تو فقہاء اس کے کفر کا فتویٰ دیتے ہیں، ورنہ اگر کسی اور وجہ سے ہے (یعنی اگر اس کی ذات سے تکلیف پہنچی اور اس کی وجہ سے برا بھلا کہا تو کافر تو نہیں ہے) تب بھی اس آدمی کے فاسق وفاجر ہونے میں اور اللہ کے غصہ اور دنیا اور آخرت کے عذاب کے مستحق ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

اس کے بعد فقہاء کے کلام سے، نیز قرآنِ پاک اور احادیث سے اس مضمون کی تائید نقل فرمائی ہے۔

ہم لوگوں سے یہ عہد لیے گئے

علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ جو اکابر صوفیاء میں ہیں، انہوں نے ایک کتاب ''عُہودِ محمدیہ'' لکھی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ فلاں فلاں باتوں پر حضور ﷺ نے عہد لیے ہیں، اس میں لکھتے ہیں: ہم لوگوں سے نبی اکرم ﷺ کی طرف سے ایک عام عہد اس بات کا لیا گیا ہے کہ ہم علماء کا اکرام کریں، اعزاز کریں اور ان کی تعظیم کریں۔ اور ہم میں یہ قدرت نہیں ہے کہ ان کے (احسانات کا) بدلہ ادا کرسکیں، چاہے ہم وہ سب دے دیں جو ہماری مِلک میں ہے، اور ساتھ ہی پوری زندگی ان کی خدمت کرتے رہیں۔ اس معاہدہ میں بہت سے طلباء اور بہت سے مریدین کوتاہی کرنے لگے ہیں، حتیٰ کہ ہم کو ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا جو اپنے استاذ کے حقوقِ واجبہ ادا کرتا ہو، یہ دین کے بارے میں ایک بڑی بیماری ہے، جس سے علم کی اہانت (بے قدری) کا پتہ چلتا ہے، اور اس ذات (یعنی نبی کریم ﷺ) کے حکم کے ساتھ لاپرواہی کا پتہ چلتا ہے، جس نے اس کا حکم فرمایا ہے۔

اسی کتاب میں ایک دوسری جگہ لکھا ہے کہ ہم لوگوں سے نبی اکرم ﷺ کی طرف

سے یہ عام عہد لیا گیا ہے کہ ہم علماء کی، صلحاء کی اور اکابر کی تعظیم کیا کریں، چاہے وہ خود اپنے علم پر عمل نہ کیا کریں۔ اور ہم لوگ ان کے حقوقِ واجبہ کو پورا کرتے رہیں، اور ان کے ذاتی معاملہ کو اللہ کے سپرد کردیں۔ جو شخص ان کے حقوقِ واجبہ، اکرام و تعظیم میں کوتاہی کرتا ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کرتا ہے، اس لیے کہ علماء رسول اللہ ﷺ کے جانشین ہیں اور ان کی شریعت کے حامل اور اس کے خادم۔ پس جو شخص ان کی اہانت کرتا ہے تو یہ سلسلہ حضور اقدس ﷺ تک پہنچتا ہے اور یہ کفر ہے۔ اور تم غور کرلو کہ بادشاہ اگر کسی کو ایلچی بنا کر کسی کے پاس بھیجے اور وہ اس کی اہانت (بے ادبی) کرے تو بادشاہ ایلچی کی بات کس غور سے سنے گا، اور اپنی اس نعمت کو جو اس اہانت (بے ادبی) کرنے والے پر تھی، ہٹالے گا، اور اس کو اپنے دربار سے ہٹادے گا، بخلاف اس شخص کے جو ایلچی کی تعظیم وتوقیر کرتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے تو بادشاہ بھی اس کو اپنا مقرب بنالیتا ہے۔

اس مضمون میں یہ بات کہ ’’چاہے وہ اپنے علم پر عمل کرنے والے نہ ہوں‘‘ ایسی ہی ہے جیسا کہ اس خط کے شروع میں حضرت معاذؓ کے کلام میں مفصل گذر چکی اس کے اعادہ (لوٹانے) کی ضرورت نہیں۔

چار قسم کے عذاب

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت اپنے علماء سے بغض رکھنے لگے گی، اور بازاروں کی عمارتوں کو بلند اور غالب کرنے لگے گی اور مال ودولت کے ہونے پر نکاح کرنے لگے گی (یعنی نکاح میں بجائے دینداری اور تقویٰ کے مالدار کو دیکھا جائے گا) تو حق تعالیٰ شانہ چار قسم کے عذاب ان

پر مسلط فرمائیں گے (۱) قحط سالی ہوجائے گی (۲) بادشاہ کی طرف سے مظالم ہونے لگیں گے (۳) حکام خیانت کرنے لگیں گے (۴) اور دشمنوں کے پے در پے حملے ہوں گے۔ (حاکم)

امت کے بے وقوف

آج کل ان عذابوں میں سے کون سا نہیں ہے جو امت پر مسلط نہیں، لیکن وہ اپنی خوشی سے ان کے اسباب کو اختیار کریں تو پھر شکایت کیا؟ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک گھر میں ایک کتیا تھی، جس کے بچے ہونے کا وقت قریب تھا، ان لوگوں کے یہاں کوئی آدمی مہمان ہوا تو کتیا نے خیال کیا کہ آج رات کو مہمان پر شور نہ کروں گی، لیکن بچہ پیٹ ہی میں سے شور کرنے لگا، حق تعالیٰ شانہٗ نے وحی سے ارشاد فرمایا کہ یہی مثال اس امت کی ہے جو تمہارے بعد آنے والی ہے کہ اس کے بے وقوف اس امت کے عالموں پر غالب ہوجائیں گے۔ (مجمع الزوائد)

کفر کا اندیشہ

فقہ اور فتاویٰ کی کتابوں میں کثرت سے یہ مضمون نقل کیا گیا ہے کہ علم سے اور علماء سے بغض ونفرت سخت اندیشہ ناک ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں نصاب الاحتساب سے نقل کیا ہے کہ جو شخص کسی عالم سے بلا کسی ظاہری سبب کے بغض رکھے، اس کے کفر کا اندیشہ ہے۔ ظاہری سبب سے مراد یہ ہے کہ اگر کوئی شرعی وجہ اور دلیل اس بات کی ہو تو مضائقہ نہیں ہے، لیکن بلا کسی شرعی وجہ سے ایسا کرنا سخت اندیشہ ناک ہے۔ ایسی صورت میں کہ جب اندیشہ ناک صورت پیدا ہوجانے کا خطرہ ہے، کیا ضروری نہیں کہ ہر شخص اس چیز میں خصوصی احتیاط برتے؟

کسی عالم کے قول کو رد کرنے کا حق ضرور حاصل ہے، اس کی تردید کی جاسکتی ہے مگر جب ہی، جب اس کے مقابل تردید کا شرعی سامان موجود ہو، اس کے قول کے خلاف نصوص شرعیہ موجود ہوں، اور رد کرنے والا نصوص سے استدلال کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ میرا مقصود ہرگز نہیں کہ عالم جو بھی کہہ دے وہ صحیح ہے، اور اس کے کسی قول پر رد اور انکار نہ کیا جائے، نبی کریم ﷺ کے سوا کوئی آدمی بھی ایسا نہیں ہے جس کے قول پر رد نہ کیا جاسکے، اس کے اقوال اور افعال میں غلطی کا احتمال نہ ہو، بیشک ہے اور ضرور ہے، لیکن رد کرنے کے واسطے اور غلطی پکڑنے کے واسطے شریعتِ مطہرہ میں حدود قائم ہیں، اس کے درجات ہیں، اس کے قواعد اور آداب ہیں، تاوقتیکہ اس سے واقفیت نہ ہو؛ رد کرنے کا حق بھی کسی کو نہیں ہے۔

قابلِ غور چند باتیں

میں یہ بھی نہیں کہتا کہ علماء بے عیب ہیں یا ان میں کوتاہیاں نہیں ہیں، یقیناً ہیں اور بمقتضائے زمانہ ہونا بھی چاہئیں، مگر ان کی کوتاہیوں کو پکڑنے کے ساتھ ساتھ چند امور قابل غور اور قابل لحاظ ہیں۔ اہل علم ہی ان چیزوں پر زیادہ اچھی طرح روشنی ڈال سکتے تھے، مگر چوں کہ یہاں معاملہ خود ان کی ذات کا آجاتا ہے اس لیے اس مسئلہ میں ان کو زیادہ واضح گفتگو کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اور اپنے وقار کا مسئلہ آجانے کی وجہ سے وہ اس میں وضاحت اور زور سے رد کرنے میں تساہل کرتے ہیں۔

(میں بھی اس کتاب کو سنانے کے واسطے لایا اس کی بھی وجہ یہی ہے، چوں کہ آج کل کوتاہی بہت ہو رہی ہے، میں اگر تفصیل سے بیان کرتا تو کہتے کہ مولوی صاحب اپنی عزت کروانے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں، اس لیے حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی

تصنیف لاکر اسی میں سے کتابوں کے حوالہ سے سنا رہا ہوں، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ بھائی! علماء کے حقوق کی تاکید اپنے منھ سے بیان کرنے میں ہمیں خود بھی بڑی حیاء آتی ہے، اسی لیے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ علماء اس موضوع کو چھیڑتے نہیں ہیں، حضرت شیخ بھی لکھ رہے ہیں، پھر بھی حضرت کو اس چیز کا احساس ہوا تو خود ہی یہ چیز فرما رہے ہیں کہ)

میں اجمالی طور پر ان امور کی طرف متوجہ کرتا ہوں۔ اول تو اس وجہ سے کہ میرا اور تمہارا خصوصی تعلق اس بدگمانی سے بالاتر ہے کہ میں اپنا اعزاز تم سے کرانا چاہتا ہوں۔ (چوں کہ یہ کتاب دراصل ایک خط ہے جو حضرت نے اپنے ایک شاگرد کو لکھا ہے۔ اس شاگرد نے کچھ سوالات کیئے تھے، حضرت نے ان کے جواب دیئے ہیں۔ انہیں کو کہہ رہے ہیں کہ ہمارا تعلق تو ایسا ہے، اس لیے تم یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی عزت کروانا چاہتا ہوں۔)

دوسرے اس وجہ سے بھی کہ میرا کچھ زیادہ شمار بھی علماء کی جماعت میں نہیں ہے ایک کتب فروش ہوں، کتابیں بیچتا ہوں اور ایام گزاری کرتا ہوں (حضرت شیخ اپنے آپ کو یہ لکھ رہے ہیں)

تیسرے یہ خط بھی میرا ایک نجی خط ہے۔

چوتھے اس وجہ سے کہ میرے ساتھ تمہارا، بلکہ میرے تمام دوستوں کا جو معاملہ ہے، وہ میری حیثیت سے زیادہ ہے، اس لیے غور سے سنو، یہاں چند باتیں قابل لحاظ ہیں اور عام طور پر ان میں خلط ملط کیا جاتا ہے، یا عمداً ان سے اعراض یا تسامح کیا جاتا ہے، اور کہیں ناواقفیت بھی اس کا سبب ہے۔ بہر حال! یہ امور قابل غور ہیں:-

(۱) کیا ہر وہ شخص جو اہلِ علم کے لباس میں ہو، کسی عربی مدرسہ میں طلباء کے رجسٹر میں نام لکھا چکا ہو، تقریر دلچسپ کرتا ہو، تحریر اچھی لکھتا ہو؛ وہ عالم ہے، اور علماء کی

جماعت کا فرد ہے؟ اس لیے ہر شخص کی بات کو لے کر اور سن کر علماء کی طرف منسوب کر دینا ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا کھرا کھوٹا، اصلی جعلی، واقعی مصنوعی، دنیا کی ہر چیز میں نہیں ہے؟ دیکھو! دنیا کی قیمتی سے قیمتی چیز سونا چاندی اور جواہرات ہیں اور ضروری سے ضروری اور ہر شخص کا محتاج الیہ پیشہ حکیم اور ڈاکٹر کا پیشہ ہے، تو پھر کیا دونوں قسمیں ایسی نہیں ہیں جن میں کھرے سے کھوٹا زیادہ، اور اصلی سے نقلی زیادہ نہ ملتا ہو؟ یا واقعی سے مصنوعی بڑھے ہوئے نہ ہوں، تو پھر کیا حکیموں اور ڈاکٹروں کو اس وجہ سے گالیاں دی جاتی ہیں کہ ان کے لباس میں مصنوعی اور خطرۂ جان طبیب زیادہ ہیں، یا ہر سونے چاندی اور جواہرات کو اس وجہ سے پھینک دیا جاتا ہے کہ وہ نقلی اور مصنوعی زیادہ ملتے ہیں؟؟ نہیں نہیں! بلکہ ان چیزوں میں یہاں تک افراط کی جاتی ہے کہ جہاں مشہور اور واقف طبیب میسر نہیں ہوتا، وہاں جان بوجھ کر ایسے ہی طبیبوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ اس لیے کہ ضرورت سخت ہے۔ طبیب حاذق کے پاس فوراً پہنچنا مشکل ہے۔ (یعنی بیماری میں اچھا ڈاکٹر نہ ملے تو چالو ڈاکٹر سے بھی کام چلا لیتے ہیں، یوں سمجھ کر کہ اگر اس وقت اس سے رجوع نہیں کریں گے تو مر جائیں گے تو چوں کہ اپنی تندرستی ضروری سمجھی نا، اس لیے اس کی طرف رجوع کر لیا۔ اور دین کے معاملہ میں!!! کہ دین کو بچانا ہے، اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہے، لیکن اس کی ضرورت اتنی سمجھی نہیں جاتی، اس لیے کوتاہی کرتے ہیں۔) مصنوعی سونا دیدہ و دانستہ (جان بوجھ کر) خریدا جاتا ہے، کیوں کہ ضرورت کو پورا کرنا ہے، اور اصلی سونا اس وقت ملنا دشوار ہے، یا گراں (مہنگا) ہے کہ تحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن علماء سب ہی گردن زنی (گردن مارنے کے قابل) ہیں، اس لیے کہ ان کے لباس میں جھوٹے بہت ہیں۔

تم نے غور کیا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ اس لیے کہ وہ (سونا چاندی اور ڈاکٹر کا علاج) ضرورت کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، اور یہ بے ضرورت ہیں۔ اُن کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے اور یہ بے کار آمد ہے، اُن میں اچھے سے اچھے طبیب کی تلاش ہے، لیکن اس وقت تک کہ اچھا طبیب ملے جو بھی موجود ہو، وہ نہایت مغتنم ہے، اور اس کی رائے پر عمل نہایت اہم اور ضروری ہے، اور یہاں حقیقی (علماء) ملتے نہیں ہیں، اور جو ملتے ہیں وہ ہمارے نزدیک کامل نہیں ہیں، اس لیے لغو اور بے کار ہیں۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے اور دینی ضرورت کو ضرورت سمجھا جائے، دین کا اہتمام اور اس کی فکر قلوب میں کم از کم اتنی ہو جتنی ایک عزیز کے بیمار ہونے کی، یا بیٹی کے نکاح کرنے کی؛ تو عالمِ کامل کی تلاش میں طبیب ِ حاذق کی تلاش سے زیادہ سرگرداں ہوں۔ اگر دین کا فکر ہو تو حقیقی ضرورت یہی ہے۔ عزیز کی بیماری کا منتہاء موت ہے، جس کے بغیر چارہ نہیں، حاذق سے حاذق اور ماہر سے ماہر طبیب یہاں بے بس ہیں، وہ اپنا ہی کچھ نہیں بنا سکتا، تو دوسرے کا کیا کر سکتے ہیں۔

بیٹی کی شادی میں زیور نہ ہی میسر آسکا تو کیا بگڑ گیا؟ اتنا ہی ہوا کہ برادری کے لوگ، عزیز و اقارب طعن و تشنیع کریں گے، وہ ابھی کب چھوڑ دیں گے، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اب چار سنائیں گے، اُس وقت آٹھ سنا دیں گے۔ لیکن علماء کی ضرورت دین کے لیے ہے، جس کے بغیر زندگی بے کار ہے، دنیا میں آنا بے کار ہے، آدمی صرف دین ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے، حق سبحانہ وتقدس کا ارشاد ہے کہ میں نے آدمی اور جن صرف اپنی عبادت ہی کے لیے پیدا کئے ہیں۔ جب یہی اصل غرض آدمی کی پیدائش سے ہے، تو اس کے لیے جس چیز کی غرض ہوگی وہ سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہوگی۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ علماء کی مثال زمین میں ایسی ہے جیسا کہ آسمان

پرستارے جن کے ذریعہ سے جنگل کے اندھیروں میں اور سمندر کے سفر میں راستہ پہچانا جاتا ہے، اگر ستارے بے نور ہوجائیں تو اقرب ہے یہ بات کہ رہبرانِ قوم راستے سے بھٹک جائیں۔ (ترغیب)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ نبوت کے درجہ سے بہت قریب جماعت ایک علماء کی ہے، دوسرے مجاہدین کی۔ اس لیے کہ علماء اس چیز کا راستہ بتاتے ہیں جو اللہ کے رسول لے کر آئے ہیں اور مجاہدین اپنی تلواروں سے اس طرف متوجہ کرتے ہیں۔ (احیاء)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ خیر کی بات سکھانے والے کے لیے اللہ جل شانہٗ رحمت بھیجتے ہیں، فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں، اور ہر وہ چیز جو آسمان وزمین میں ہے حتی کہ چیونٹی اپنے سوراخ میں اور مچھلیاں سمندر میں اس کے لیے دعاءِ خیر کرتی رہتی ہیں۔ (ترمذی) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ جب کوئی عالم مرجاتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پیدا ہوجاتا ہے جس کو اس کا کوئی نائب ہی بھر سکتا ہے۔ (احیاء)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ ایک ہزار عابد جو شب بیدار ہوں اور دن بھر روزہ رکھتے ہوں ان کی وفات ایک ایسے عالم کی وفات سے زیادہ سہل (آسان) ہے جو حلال وحرام سے واقف ہو۔ (احیاء)

(۲) دوسری یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دنیا کے ہر کام میں فن والوں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، مکان بنانا ہے تو مستری کے بغیر چارہ نہیں، قفل (تالا) درست کرانا ہے تو لوہار کے بغیر گذر نہیں۔ مقدمہ کرنا ہے، آپ لاکھ سمجھ دار ہوں ہوشیار ہوں لیکن وکیل کے بغیر مفر نہیں۔ آپ لاکھ قابل ہوں لیکن تعمیر مستری ہی کرے گا، مگر علم دین ایسا ارزاں (سستا) ہے کہ ہر شخص جو ذرا بھی بولنا یا لکھنا جانتا ہے، وہ واقف اسرار شریعت

ہے، محقق ملت ہے، اوراس کی محققانہ تحقیق کے خلاف قرآن شریف اوراحادیثِ نبویہ بھی قابل قبول نہیں، پھرعلماء بیچاروں کا توذکرہی کیا ہے۔اورچوں کہ اس کے مقابل اگرکوئی آوازاٹھتی ہےتووہ علماء کی جانب سے ہوتی ہے،اس لیے جتنا بھی یہ روشن دماغ علماء کے خلاف زہراُگلیں،اورعلماء کے خلاف جھوٹ یاسچ الزام لگاکرعوام کوان سے بدکائیں؛وہ قرینِ قیاس ہے کہ ان کی غلط باتوں کی اوردین میں تحریف کی پردہ دری علماء ہی سے ہوتی ہے،وہ مخالف بھی بنیں گے،وہ دشمن بھی بنیں گے،اورجوکچھ کرسکتے ہیں وہ سب ہی کچھ کرگذریں گے۔مگرکیاہوسکتا ہے۔ایسےلوگوں کے بارے میں حضور ﷺ کاارشادہے کہ مجھے اپنے بعدسب سے زیادہ خوف تم پرہے ہراُس منافق کا،جوزبان کا ماہرہو۔(ترغیب) کہ یہ لوگ اپنی شستہ تحریروتقریرسےلوگوں کواپنا گرویدہ بناکرگمراہ کرتے ہیں اوردین کے ہرجزوکااستہزاء ومذاق کرتے ہیں۔حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں دین کے اجزاء کے متعلق بھی ہرفن کے خواص کوممتازفرمادیا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جابیہ میں خطبہ(وعظ)فرمایاجس میں یہ اعلان فرمایا کہ جوشخص کلام اللہ شریف کے متعلق کوئی بات معلوم کرنا چاہےوہ اُبی بن کعب کے پاس جائے۔اورجس شخص کوفرائض کاکوئی مسئلہ پوچھناہووہ زیدبن ثابت کے پاس جائے۔اورجس شخص کو فقہ کاکوئی مسئلہ معلوم کرناہووہ معاذبن جبل کے پاس جائے۔البتہ جس شخص کو(بیت المال سے) کچھ مال طلب کرناہووہ میرے پاس آئے کہ مجھے اللہ نے والی اورمال کی تقسیم کرنے والابنایاہے۔(مجمع الزوائد)

اورپھرحضرات تابعین رحمہم اللہ کےزمانہ میں توہرشعبہ کی مستقل جماعتیں قائم ہوگئیں تھیں،محدثین کی جماعت علیٰحدہ،فقہاء کی علیٰحدہ،مفسرین کامستقل گروہ،واعظین

مستقل، صوفیہ مستقل؛ لیکن ہمارے زمانہ میں ہر شخص اس قدر جامع الاوصاف اور کامل مکمل بننا چاہتا ہے کہ وہ معمولی سی عربی عبارت لکھنے لگے، بلکہ صرف اردو کی عبارت دلچسپ لکھنے لگے، یا تقریر برجستہ کرنے لگے، تو پھر وہ تصوف میں مستقل اہل الرائے ہے، فقہ میں مستقل مجتہد ہے، قرآن پاک کی تفسیر میں جو نئی سے نئی بات دل چاہے گھڑے۔ نہ اس کا پابند کہ سلف کا یہ قول ہے یا نہیں، نہ اس کی پرواہ کہ نبی کریم ﷺ کے ارشادات اس کی نفی تو نہیں کرتے۔ وہ دین میں مذہب میں جو چاہے کہے، جو منہ میں آئے بکے، کیا مجال ہے کہ کوئی شخص اس پر نکیر کر سکے، یا اس کی گمراہی کو واضح کر سکے۔ جو یہ کہے کہ یہ بات اسلاف کے خلاف ہے، وہ لکیر کا فقیر ہے، تنگ نظر ہے، پست خیال ہے، تحقیقاتِ عجیبہ سے عاری ہے۔ لیکن جو یہ کہے کہ آج تک جتنے اکابر نے، اسلاف نے جو کچھ کہا وہ سب غلط ہے اور دین کے بارے میں نئی نئی باتیں نکالے، وہ دین کا محقق ہے۔ نبی کریم ﷺ کا تو ارشاد ہے کہ جو شخص قرآن پاک کی تفسیر میں اپنی رائے سے کچھ کہے اگر وہ صحیح بھی ہو، تب بھی اس نے خطا کی۔ (مجمع الزوائد) مگر یہ لوگ قرآن پاک کی ہر آیت میں سلف کے اقوال کو چھوڑ کر نئی بات پیدا کرتے ہیں۔

اور صریح ظلم یہ ہے کہ علماء کو ہر شخص مشورہ دیتا ہے کہ وہ تفریق نہ کریں، تفسیق نہ کریں، تکفیر نہ کریں، لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ یہ روشن دماغ دین کی حدود سے نہ نکلیں۔ یہ نبوت کا انکار کر دیں، یہ قرآن وحدیث کا انکار کر دیں، یہ نماز روزہ کو لغو بتا دیں، یہ حضور کی شان میں گستاخیاں کریں، صحابہ کرام کو گالیاں دیں، ائمہ مجتہدین کو گمراہ بتا دیں، فقہ اور حدیث کو نا قابل عمل بتا دیں، دین کے ہر ہر جزو سے انکار کر دیں، دین کی ہر بات کا استہزاء اور مذاق اُڑائیں، لیکن یہ پھر بھی مسلمان رہتے ہیں، پکے دین دار رہتے ہیں۔

اور جو اُن کے خلاف آواز اُٹھائے وہ دین کا دشمن ہے، مسلمانوں کا بدخواہ ہے، وہ کافر بنانے والا ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو علماء کافر نہیں بناتے ہیں، اس لیے کہ جو شخص ضروریاتِ دین میں سے کسی ایک چیز کا بھی انکار کردے، وہ اپنی رضا اور رغبت اور اپنی روشن خیالی یا اپنے جہل سے کافر تو خود ہی بن چکا ہے، خواہ اس کو کوئی کافر بتائے یا نہ بتائے۔ اور اگر وہ اب تک کافر نہیں بنا تو کسی کے کافر بتانے سے کافر نہیں بنتا۔ اور اگر بن چکا ہے تو کسی کے کافر نہ بتانے سے مسلمان نہیں رہ سکتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو کافر بتانے والے کا تو احسان ہے کہ وہ اس پر تنبیہ کررہا ہے، متنبہ کررہا ہے کہ جو چیز تم نے اختیار کی ہے وہ اسلام سے نکال دینے والی چیز ہے، اور کفر میں داخل کردینے والی چیز ہے۔ اگر دین کی فکر ہے تو اس تنبیہ پر متنبہ ہونا چاہیے۔ کہنے والے کے قول پر اعتماد نہیں تو خود تحقیق کرلینا چاہیے کہ کہنے والے کا قول صحیح ہے یا غلط ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ غلط ہوگا اور مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ بعض اوقات غلط بھی ہوتا ہے، لیکن یہ بھی صحیح نہیں کہ ہمیشہ ہی غلط ہوتا ہے۔ اس لیے یہ نظریہ کہ مغربی تعلیم کے زیر اثر، یا دین سے ناواقفیت کے سبب کہنے والا جو چاہے کہہ گذرے، اس کو ہرگز کافر نہ کہا جائے، دنیا کے ساتھ خیرخواہی نہیں۔ یہ ناواقفوں کو اور ان لوگوں کو جو ناواقفیت سے اس آفت میں مبتلا ہوجانے والے ہیں، کافر بنانا ہے۔ اس لیے حقیقت میں کافر بنانے والے وہ لوگ ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ کفر کی باتوں پر تنبیہ نہ کی جائے، ان کو واضح اور ظاہر نہ کیا جائے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ کفر آج کل ایسا سستا ہوگیا ہے کہ ہر شخص کافر ہے، اور اس خیال سے کفریات سے متأثر نہ ہونا یہ خود دین سے، نبی اکرم ﷺ کے پاک ارشادات سے، فقہائے امت کے اقوال سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ (الاعتدال فی مراتب الرجال۔ص۔١٦٤تا١٧٥)

زِيَارَةُ أَهْلِ الْخَيْرِ وَمُجَالَسَتُهُمْ وَصُحْبَتُهُمْ وَمُحَبَّتُهُمْ

نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانا اور ان سے محبت رکھنا

مجلس ۱

۴؍ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ۱۹؍جون ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّآاِلٰہَ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماًکَثِیْراًکَثِیْراً۔أَمَّابَعْدُ: وَإِذْقَالَ مُوسٰی لِفَتَاہُ لَاأَبْرَحُ حَتّٰی أَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ أَوْأَمْضِیَ حُقُباً.

عنوان کی وضاحت

باب قائم کیا ہے کہ جولوگ صالح ،اہلِ خیراور نیک ہوں، ان کی ملاقات کیلیے جانا چاہیے ،اوران کے پاس اٹھنا بیٹھنا چاہیے۔اس لیے کہ ان کے پاس اٹھنے بیٹھنے کی صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان پر جوخصوصی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے پاس بیٹھنے والوں کوبھی اپنے اندرشامل کرلیا کرتی ہیں۔اس لیے ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا یہ بھی ان برکتوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ "وَصُحْبَتُھُمْ" اوران کی مصاحبت اوران کا ساتھ اختیار کرنا۔ "وَمُحَبَّتُھُمْ" اوران کے ساتھ محبت اورتعلق رکھنا "وَطَلَبُ زِیَارَتِھِمْ وَالدُّعَاءُ مِنْھُمْ" اورجس طرح خودان کی زیارت کے لیے جائے، اسی طرح ان سے یہ درخواست کرنا کہ آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں۔اوران سے دعا کی درخواست کرنا۔ "وَزِیَارَۃُالْمَوَاضِعِ الْفَاضِلَۃِ" اورایسے مقامات کی زیارت کیلیے جانا جن کی کوئی خصوصی فضیلت قرآنِ پاک یا احادیثِ مبارکہ میں آئی ہے۔علامہ نوویؒ نے اس باب کا عنوان یہی قائم کیا ہے۔گویاان تمام چیزوں کی اہمیت کواس باب میں بیان کرنا اور ثابت کرنا چاہتے ہیں۔چنانچہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے توسورۂ کہف کی ان آیتوں

کو ذکر کیا ہے جن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔

قرآن میں سب سے زیادہ ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِىَ حُقُبًا﴾ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے یوں کہا کہ میں اپنا یہ سفر برابر جاری رکھوں گا یہاں تک کہ دو دریا جہاں ملتے ہیں وہاں پہنچ جاؤں یا اس مقصد کے لیے سالہا سال ایک طویل زمانہ تک اپنا یہ سفر جاری رکھوں۔

یہ واقعہ جو قرآن پاک کی ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے وہ احادیث کے اندر موجود ہے، اس کا بہت کچھ حصہ تو ان آیات کے اندر ہے اور اس کا ابتدائی حصہ احادیث میں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنی قوم میں لوگوں کی اصلاح اور نصیحت کے لیے ایک بیان کیا اور ایسی تقریر فرمائی کہ جس سے سننے والے بہت متاثر ہوئے، جب وہ اپنے اس بیان سے فارغ ہوئے تو مجمع میں سے ایک آدمی نے ان سے سوال کیا کہ روئے زمین پر آپ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی اور موجود ہے؟

واقعہ بھی یہی تھا کہ شریعت کا جتنا علم اللہ تعالیٰ نے اس زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا اتنا کسی اور کو نہیں دیا تھا۔ چوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے جلیل القدر پیغمبروں میں سے ہیں۔ پیغمبروں میں بھی بعض پیغمبر اور رسول وہ ہیں جن کو ایک خصوصی مقام حاصل ہے، جیسے حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم؛ یہ پانچ پیغمبروں کے نام جلیل القدر انبیاء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر پیغمبروں میں سے تھے، اور اللہ تعالیٰ کا خصوصی قرب حاصل تھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی کا سلسلہ جاری تھا، بلکہ اگر غور کریں تو

قرآنِ پاک میں جس کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ مختلف مقامات پر مختلف انداز سے آیا ہے، کسی اور نبی کا تذکرہ اتنی کثرت سے قرآن میں موجود نہیں۔

......اس ذات کی محبوبیت کا کیا عالم ہوگا؟

علامہ عثمانیؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا اور میرے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ قرآنِ پاک میں مختلف مواقع پر اور وہ بھی ایک خاص انداز سے جس سے ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے خصوصی تعلق اور ان کی عجیب محبت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک خاص برگزیدگی اور پسندیدگی کا پتہ چلتا ہے ان کی پیدائش، بچپن، دودھ پینے کا زمانہ، بڑا ہونا، جوانی کے ایام کو کس شہر میں گذارنا، پھر وہاں سے ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جانا اور وہاں نکاح ہونا، پھر نبوت سے نوازا جانا، پھر اپنی قوم کے ساتھ کا پورا معاملہ؛ مطلب یہ ہے کہ ان کی پوری زندگی کی تفصیلات موجود ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور نبی کی زندگی کی اتنی زیادہ تفصیل قرآنِ پاک میں موجود نہیں ہے۔ علامہ عثمانیؒ فرماتے تھے کہ اس کی وجہ سے مجھے یہ خیال پیدا ہوتا تھا کہ نبی کریم ﷺ کا مقام تو تمام نبیوں میں سب سے بڑھ کر ہے، آپ تو سید الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں، پھر بھی حضرت موسیٰ کا تذکرہ جس انداز سے کیا گیا ہے ویسا تو آپ ﷺ کا بھی تذکرہ قرآنِ پاک میں موجود نہیں، حالانکہ قرآنِ پاک تو نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ یہ چیز بار بار میرے دل میں کھٹکتی تھی۔ پھر فرماتے ہیں کہ جب اس آیت پر غور کیا ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ جس میں نبی کریم ﷺ کو خطاب کر کے باری تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ اے نبی! لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو، تو تم میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس

آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی پیروی اور اتباع پر ہر اس آدمی کو- جو آپ ﷺ کی پیروی کرے -محبوبیت کا مقام عطا فرمایا ہے۔تو جس ذات کی پیروی کرنے پر پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محبوبیت کا مقام دیا جاتا ہو؛تو خود اس ذات کی محبوبیت اور قرب کا کیا عالم ہوگا!

حضرت موسیٰ کا جواب، اللہ کا عتاب

خیر!تو اس آدمی نے سوال کیا تھا کہ اس وقت روئے زمین پر آپ سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی اور موجود ہے؟اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جلیل القدر پیغمبر تھے،آپ کے پاس وحی آیا کرتی تھی،اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی معلومات کے مطابق اس آدمی کو یہ جواب دیا کہ نہیں۔گویا شریعت کے احکام کو سب سے زیادہ جاننے والا میں ہی ہوں اور آپ کا جواب بالکل درست تھا۔لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا معاملہ اپنے مقرب اور خصوصی بندوں کے ساتھ بڑا عجیب وغریب ہوا کرتا ہے۔یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جب یہ سوال کیا گیا تو چاہیے تو یہ تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں یوں کہتے کہ دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کے بندے تو بہت سارے ہیں،کون کس درجے پر ہے اور کس کو کتنا علم دیا گیا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔گویا اس سوال کے جواب کو حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے علم کے حوالے کرتے،لیکن اس کے بجائے انھوں نے جب یہ جواب دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔اور بطورِ عتاب کے ان سے یہ کہا گیا کہ ہمارے ایک بندے ہیں جو وہ باتیں جانتے ہیں جو تم نہیں جانتے۔تم جو یہ کہتے ہو کہ روئے زمین پر سب سے زیادہ جاننے والا میں ہوں تو ان کے پاس ایک ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔

ویسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو احکامِ شریعت اور اسرارِ شریعت کا جو علم دیا گیا تھا اتنا کسی اور کے پاس نہیں تھا لیکن ایک اور طرح کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیا تھا، اسی کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ السلام کو باخبر کیا گیا کہ ہمارے ایک بندے ایسے ہیں جن کے پاس ایسا علم اور جانکاری ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ سنا تو انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ باری تعالیٰ! آپ کے وہ بندے کہاں رہتے ہیں؟ مَیں چاہتا ہوں کہ ان کی ملاقات کروں اور ان کی صحبت اختیار کروں اور ان سے وہ علم حاصل کروں جو میرے پاس نہیں ہے۔

علامہ نوویؒ ان آیات کو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام خود اتنے اونچے مقام پر تھے کہ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر ہیں، آپ کے پاس وحی آتی ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام اور اسرارِ شریعت کا جو علم آپ کو دیا گیا ہے وہ کسی اور کو اتنا نہیں دیا گیا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو باخبر کیا جا رہا ہے کہ ہمارا ایک ایسا بندہ بھی ہے ﴿وَاٰتَیۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا﴾ اس کے پاس ہمارا دیا ہوا ایسا علم ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس بلند و بالا مقام کے باوجود اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ مَیں ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں اور ان کی صحبت میں رہ کر اس علم کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اجازت دی۔ پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ آپ کے اس بندے سے کہاں ملاقات ہوگی؟ تو ایک جگہ کی نشاندہی کی گئی کہ مجمع البحرین یعنی جہاں دو دریا ملتے ہیں وہاں وہ آپ کو ملیں گے۔

اب یہ دو دریا کون سے ہیں؟ اس سلسلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے، بعض

کہتے ہیں کہ بحر فارس اور بحر روم جہاں ملتے ہیں۔ آج کل تو نہر سوئیز کی وجہ سے وہ ملے ہوئے ہی ہیں لیکن اُس زمانہ میں بالکل تو نہیں ملتے تھے، بلکہ ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ قریب جس مقام پر تھے، اس کے اعتبار سے کہا گیا ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ دریائے دجلہ جہاں بحر فارس میں آکر گرتا ہے وہاں ملاقات ہوئی۔ لیکن حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ خلیج عقبہ بندرگاہِ ایلہ جہاں پر واقع ہے، وہ علاقہ مراد لیا گیا ہے۔

خیر! ایک جگہ بتلادی گئی، پھر مجمع البحرین جو بتلایا گیا تھا وہ بھی ایک بڑا رقبہ و علاقہ تھا، اس میں خاص طور پر کون سی جگہ پر ان سے ملاقات ہوگی، اس کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پھر علامت دریافت کی کہ کوئی ایسی نشانی مجھے بتلادی جائے جس کی وجہ سے مَیں یہ معلوم کرلوں کہ مجمع البحرین میں فلاں جگہ پر ان سے ملاقات ہوگی۔ جیسے کسی کو کہا جائے کہ سورت میں ملاقات ہوگی تو وہ پوچھے گا کہ سورت میں کون سی جگہ ہوگی؟

عزم پختہ ہو

خیر! اللہ تعالیٰ کی طرف سے علامت کے طور پر یہ حکم دیا گیا کہ آپ ایک مچھلی تل کر اپنے ساتھ رکھ لیجئے، جس جگہ وہ مچھلی زندہ ہوکر پانی کے اندر چلی جائے، وہیں ہمارے اس بندے سے آپ کی ملاقات ہوگی۔ چنانچہ بات طے ہوگئی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے مقام سے حضرت خضر کی ملاقات کے لیے روانہ ہوئے۔ جس وقت روانہ ہو رہے تھے اسی موقعہ کا اس آیت کے اندر تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور روانہ ہوتے وقت انہوں نے اپنے جس پیغمبرانہ عزم و ارادہ کا اظہار کیا وہ دیکھئے۔ اور پیغمبروں کا حال یہی ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں اور جس کام کا بیڑا اُٹھاتے ہیں تو اس کام میں ان کا عزم

ایسا ہی پختہ ہوتا ہے۔

اس وقت ان کے ساتھ خدمت کے لیے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام تھے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جانشین بنے، اس وقت ان کو پیغمبری نہیں ملی تھی، اور حضرت موسیٰ کی خدمت میں تھے۔ ان کو بھی اپنے ساتھ لیا اور ان سے حضرت موسیٰ نے کہا کہ میں اپنے اس سفر پر برابر چلتا رہوں گا، اپنے اس سفر کے ارادے سے باز نہیں آؤں گا یہاں تک دو دریا جہاں ملتے ہیں وہاں پہنچ جاؤں ﴿أَوْ أَمْضِيَ حُقُباً﴾ یا سالہا سال چلتا رہوں۔ "حُقُب" یہ "حُقُبَةٌ" کی جمع ہے، تیس سال کو کہا جاتا ہے۔ اور "حُقُبَةٌ" جمع ہے، اور عربی میں جمع کا صیغہ کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک سو بیس سال ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چاہے ایک طویل زمانہ تک بھی کیوں سفر کرنا نہ پڑے، تب بھی میں وہاں جا کر رہوں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب کسی کارِ خیر کا ارادہ کرے اور بیڑا اُٹھائے تو اُس کو اسی طرح پختہ عزم و ارادہ سے کام لینا چاہیے کہ اس کام کو میں انجام دے کر ہی رہوں گا۔

اپنی ذات پر اعتماد نہ ہو

خیر! آگے علامہ نووی نے آیتیں چھوڑ دی ہیں جن میں یہ ہے کہ حضرت موسیٰ روانہ ہوئے اور چلتے چلتے مجمع البحرین والے علاقہ تک پہنچے، اسی علاقہ میں ایک چٹان تھی، اس کے پاس ایک مرتبہ دوپہر کے وقت دونوں (حضرت موسیٰ اور حضرت یوشع) آرام کے لیے لیٹے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع سے کہا تھا کہ دیکھو! اس مچھلی کا خیال رکھنا، تو حضرت یوشع نے جواب میں عرض کیا تھا کہ کوئی بڑا کام آپ نے نہیں سونپا ہے۔

دیکھو! کسی بھی کام کو چاہے وہ معمولی سا ہی کیوں نہ ہو، اس کام کی انجام دہی میں جب آدمی اپنی ذات پر اعتماد کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت اور اس کے ارادے کی طرف نظر نہیں ہوتی، تو اس صورت میں چھوٹے سے چھوٹا کام بھی آدمی انجام نہیں دے سکتا، اللہ تعالیٰ دنیا کو دکھلاتے ہیں۔ ہاں اگر وہ ان شاء اللہ کہہ دے تو وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر ان کی زبان سے یہ نکلا کہ کوئی بڑا کام آپ نے نہیں سونپا ہے، آپ بے فکر رہیے، یہ کام ہو جائے گا۔ دونوں لیٹے تو ان کو نیند نہیں آئی، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام سو گئے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ اسی چٹان کے پاس آبِ حیات کا چشمہ تھا، اس کے کچھ چھینٹے اس مچھلی کو لگے اور اس میں جان آ گئی اور وہ مچھلی زنبیل میں سے اچھل کر دریا میں کود گئی۔ اور جب دریا میں گری اور آگے بڑھی تو باقاعدہ سرنگ بناتی چلی گئی۔ (بخاری شریف، ۴۴۵۰) یعنی کاغذ وغیرہ کے بیچ میں سے جب کوئی سخت چیز گذرے تو سوراخ بن جاتا ہے، لیکن پانی میں سوراخ نہیں بنتا، بلکہ پانی کا حال تو یہ ہوتا ہے جب کوئی چیز پانی میں ڈالیں، تو جب وہ آگے بڑھے گی تو پانی کا پچھلا حصہ آپس میں ملتا چلا جائے گا، لیکن یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ یہ دکھلایا کہ جب وہ مچھلی پانی کے اندر داخل ہو رہی تھی تو ساتھ ہی ساتھ پانی میں سوراخ اور سرنگ سی بنتی چلی گئی۔ حضرت یوشع اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو آرام فرما رہے تھے، اس لیے انہوں نے سوچا کہ حضرت آرام فرما رہے ہیں، اس لیے بیدار کرنا مناسب نہیں۔ جب بیدار ہوں گے تو ان کو بتا دوں گا۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو یہ بتانا ہی بھول گئے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ اس کام کو معمولی سمجھا تھا، حالانکہ جب تک

میری توفیق شامل حال نہ ہو وہاں تک آدمی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام نہیں دے سکتا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی گوشمالی

بہرحال! حضرت موسیٰ علیہ السلام اٹھے اور کہا کہ چلو اور آگے بڑھ گئے۔ جب چٹان کے پاس سوئے تھے وہ دوپہر کا وقت تھا، وہاں سے شام تک چلتے رہے، رات کو بھی چلے پھر دوسرے دن جب صبح ہوئی، اور کچھ وقت گذرا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے خادم سے کہا ﴿اٰتِنَا غَدَآءَ نَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِ نَا ھٰذَا نَصَبًا﴾ بھائی! ہمارا کھانا لاؤ، اب تو ہم تھکے اور بھوک کا بھی کچھ احساس ہوا۔ دیکھو! وہاں سے یہاں تک چلتے ہوئے آئے تو تھکن نہیں ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب تک تو بھوک اور تھکن کا احساس نہیں تھا، لیکن جب مقصد سے آگے نکلے اور اتنا آگے بڑھ چکے تب احساس ہوا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتلا دیا کہ تم سب سے زیادہ جاننے کا دعویٰ کر رہے تھے، اور ساتھ میں مچھلی اس لیے لائے تھے کہ جہاں وہ زندہ ہو کر پانی میں گرے گی تو جگہ معلوم ہو جائے گی، لیکن وہ کب زندہ ہوئی اس کا پتہ ہی نہیں چلا، اور جس جگہ کی تلاش میں نکلے تھے اس سے آگے نکل گئے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ سب بطورِ سبق بتلایا گیا تھا۔

خیر! جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کھانا لاؤ، تو حضرت یوشع نے جواب دیا کہ ارے! بات بتلانا تو بھول ہی گیا، شیطان نے بھلا دیا اور شیطان کی عادت ہی یہ ہے کہ وہ کام کی بات بھلا دیا کرتا ہے۔ پوچھا: کیا ہوا؟ تو کہا کہ ہم جہاں لیٹے تھے وہیں وہ مچھلی زندہ ہو کر زنبیل سے نکل کر پانی میں داخل ہو گئی تھی اور عجیب وغریب طریقہ سے اس نے اپنا راستہ پانی میں بنا لیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ بھائی! وہیں تو ہمیں

جانا تھا۔ چلو! واپس لوٹتے ہیں۔ اب جس راستہ پر وہ چلے تھے وہ باقاعدہ بنا ہوا راستہ، پگڈنڈی اور سڑک نہیں تھی، اس لیے اپنے پاؤں کے نشانات ہی کو دیکھتے دیکھتے واپس لوٹے۔ گویا آدھا دن اور پوری رات جو چلے تھے اتنا پھر دوبارہ اُلٹا چلنا پڑا، اور مزید مشقت اُٹھانی پڑی۔

حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات

اور جب اسی جگہ پر پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی چادر تانے ہوئے لیٹا ہے۔ چادر کا ایک سرا سر کے نیچے دبا ہوا ہے اور دوسرا سرا پاؤں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس طرح سونا جائز ہے۔ بعض لوگ اس کو ناجائز کہتے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ وہ اس طرح سوئے ہوئے تھے۔

بہر حال! حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو سلام کیا، جب حضرت خضر علیہ السلام نے سنا تو سوچا کہ یہاں سلام کیسا؟ اس لیے کہ وہ علاقہ اہلِ ایمان کا نہیں تھا۔ تو حضرت خضر نے پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ مَیں بنی اسرائیل والا موسیٰ ہوں۔ پوچھا: یہاں کیوں آئے ہو؟ کہا: آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں ﴿هَلْ أَتَّبِعُكَ عَلٰىٓ أَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا﴾ دیکھو! حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کی صحبت میں رہنے کے لیے ہی گئے تھے، اس لیے پوچھا کہ کیا مَیں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت اور علم کی جو باتیں آپ کو سکھائی گئی ہیں، وہ آپ مجھے سکھلائیں۔ مَیں آپ کی رفاقت اور آپ کی صحبت اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

بس! یہاں تو انہوں نے اس آیت کو اتنی ہی پیش کر کے ختم کر دی ہے۔ آگے قصہ طویل ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اتنا سن کر آپ حضرات کو بھی شوق پیدا ہوا ہو، اس لیے اس

قصہ کو مکمل کر دیتا ہوں۔

تکوین

حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ آپ میرے ساتھ رہ نہیں سکیں گے اور صبر نہیں کر سکیں گے۔ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص علم آپ کو عطا فرمایا ہے۔ یعنی شریعت کا اور احکام خداوندی کا علم آپ کو دیا ہے کہ بندوں کو کیا کرنا چاہیے، کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں بندوں کی ہدایت کے واسطے اور زندگی گذارنے کا طریقہ بتلانے کے لیے جو احکام نازل فرماتے ہیں اسی کو شریعت کہتے ہیں۔ اس کا علم جتنا آپ کے پاس ہے وہ میرے پاس نہیں "وَاِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنَ اللّٰہِ، لاتَعْلَمُہ" اور ایک علم اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے، اور وہ اسرارِ کائنات کا علم ہے جو تمہیں معلوم نہیں۔

دیکھو! دو چیزیں ہیں ایک تو ہے تکوین اور ایک ہے تشریع۔ تکوین کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ پوری کائنات؛ زمین و آسمان، چاند و سورج وغیرہ جو کچھ پیدا کیا اور اس میں مختلف مخلوقات کو پیدا کیا، اسی میں انسان کو بھی بسایا اور اس کی ضرورتیں بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں۔ کائنات کا یہ پورا نظام اللہ تعالیٰ نے قائم کیا ہے۔ اور کائنات کے اس نظام کو چلانے کے واسطے اللہ تعالی نے کچھ اصول بھی مقرر کئے ہیں جن کے مطابق یہ نظام چل رہا ہے، اور اس کو چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ کا اسٹاف اور عملہ بھی ہے اور وہ فرشتے ہیں۔ تو اس پوری کائنات کے نظام کو اللہ تعالیٰ چلاتے ہیں اور اس سلسلہ میں فرشتوں کو احکام بھی دیتے رہتے ہیں جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ لیلۃ القدر یا بعض مخصوص راتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو فیصلے بتلائے جاتے ہیں۔

اس کی بہت ساری تفصیلات ہیں۔

شیاطین اور تکوینیات

پہلے زمانہ میں جب کہ جن وشیاطین کے لیے راستہ بند نہیں کیا گیا تھا تو وہ آسمانوں پر جا کر جو چیزیں سنتے تھے وہ یہی ہدایات ہوتی تھیں۔ جیسے بادشاہِ وقت کی طرف سے اپنے ماتحتوں کو ہدایات دی جاتی ہیں، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو کائنات کے نظام کے سلسلہ میں ہدایات دی جاتی تھیں، اسی کو سننے کے لیے شیاطین آسمانوں پر جایا کرتے تھے اور سنتے تھے، تو بعض باتیں ان کے کانوں میں پڑ جاتی تھیں۔ جب نبی کریم ﷺ کی بعثت ہوئی تو یہ سلسلہ بالکل بند کر دیا گیا اور ان کو ستارے مارنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے جب یہ جاتے تھے تو ان کو ستارے مار کر اور میزائل داغ کر وہاں سے بھگایا جاتا تھا، لیکن ایک آدھ بات ان کے کان میں پڑ جاتی تھی۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو یہ حکم دیا گیا کہ فلاں جگہ فلاں تاریخ کو سیلاب لانا ہے، یا زلزلہ لانا ہے۔ اب یہ بات ان کے کان میں پڑ گئی تو اس سے پہلے کہ وہ میزائل نما ستارہ اس کو لگے، وہ اپنے نیچے والے شیطان کو بتا دیتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ نیچے والے کو بتانے سے پہلے ہی وہ ستارہ اس کو آ کر لگتا تھا، گویا ان کی ساری کوشش بے کار جاتی تھی۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ جلدی سے نیچے والے کو بتا دیتا تھا اس کے بعد وہ ستارہ اس کو لگتا تھا۔ یہ تو بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے۔ (بخاری شریف، ۵۴۲۹)

خیر! کبھی وہ نیچے والے کو بتا دیتا تھا، پھر وہ اس کے نیچے والے کو، اور وہ اپنے نیچے والے کو بتاتا، اس طرح آتے آتے اخیر والا اپنے دوست کاہن اور جوتشی کو وہ بات بتاتا تھا۔ اب یہ ایک ایسی بات ہے جو کائنات کے نظام کے متعلق اوپر ہی سے آئی ہوئی

ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُس زمانہ کی مصلحتوں کی وجہ سے اتنی پابندی بھی نہیں تھی اس لیے وہ اوپر سے یہ بات گویا چرالایا کرتے تھے۔ اور وہ واقعہ تو ہونا ہی تھا، اس لیے کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تھا۔ جب وہ بات کاہن کے پاس پہنچتی تو وہ کاہن لوگوں کو کہتا کہ فلاں دن دنیا میں یہ واقعہ پیش آنے والا ہے۔ اب وہ بات تو سچ ہوتی تھی اور ایسا ہی واقعہ ہوتا تھا۔ تو پھر وہ کاہن ایک سچی بات کے سہارے سے اپنی سو جھوٹی باتیں لوگوں میں چلاتا تھا۔ اس لیے کہ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ فلاں دن فلاں تاریخ کے متعلق اس نے یہ پیشین گوئی دی تھی اور وہ بات ٹھیک اسی طرح وجود میں آئی تھی، تو سوچتے ہیں کہ اس کی بات میں کچھ وجود معلوم ہوتا ہے۔ اور پھر اس کی دوسری باتیں بھی لوگ سچ مان لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کا یہی ارشاد حدیث میں نقل کیا گیا ہے۔

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کائنات کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مقرر کیا ہے اور فرشتے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق اس کائنات کو چلاتے ہیں؛ اسی کو اصطلاح میں تکوین کہتے ہیں۔ اور اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو جو ہدایتیں دی جاتی ہیں؛ اسی کو تکوینیات کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ کا ایک کارخانہ ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے مطابق فرشتوں کے ذریعہ سے چل رہا ہے دنیا کی کوئی چیز بھی اللہ تعالیٰ حکم کے بغیر نہیں چلتی۔

تشریع

اور دوسری چیز تشریع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دراصل اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو انسانوں کی ضرورت پوری کرنے کے واسطے پیدا کیا ہے، اور انسانوں کو اپنی عبادت واطاعت اور فرمانبرداری کے واسطے پیدا کیا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ انسانوں کو

ان چیزوں سے واقف کرانا چاہتے ہیں کہ کون سے کام کروگے تو اس سے میں خوش ہوؤں گا اور کون سے کام کروگے تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ان ساری تفصیلات کو تشریع کہا جاتا ہے۔اور اس بارے میں بندوں کو اختیار دیا کہ وہ چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔ایسا نہیں ہے کہ کرنے کا کوئی کام اگر کوئی نہیں کرے گا تو اس کی وجہ سے وہ آدمی گونگا، اندھا یا بہرا ہو جائے گا، یا اس کو بخار آجائے گا۔ایسا نہیں ہوتا۔اور اسی میں تو بندوں کا امتحان ہے۔

خیر! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ شریعت کے احکام کو بتلانے کے لیے باقاعدہ اپنے بندوں کو بھیجا، جن کو نبی اور رسول کہا جاتا ہے۔اور ان تک وہ احکام پہنچانے کے لیے وحی کا سلسلہ جاری کیا۔وحی شریعت کے احکام کو بتانے کے لیے نازل ہوتی تھی۔

تو یہ دو چیزیں۔تکوین اور تشریع۔الگ الگ ہوئیں۔اب تکوین تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے جو چل رہا ہے، اس سے انسانوں کو کوئی واسطہ نہیں ہے، انسانوں کی ضرورتیں مختلف طریقہ سے پوری ہو رہی ہیں۔اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا کہ اس اس طریقے سے زندگی گذارو۔انہی طریقوں کا نام تشریعی احکام ہیں۔

حضرت خضر علیہ السلام کو تکوینیات کا علم دیا گیا تھا

اب تکوینی نظام کے سلسلہ میں کتابوں میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نظام میں زیادہ تر فرشتوں کو لگا رکھا ہے، لیکن انسانوں میں سے بھی اپنے بعض مخصوص بندوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تکوینی نظام سے متعلق ہدایتیں دی جاتی ہیں۔حضرت خضر علیہ السلام انہیں بندوں میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے تکوینیات یعنی کائنات کے بھیدوں سے واقف کیا تھا اور ان کے متعلق ان پر وحی آتی تھی۔ویسے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے

انسانوں پر جو وحی نازل ہوتی ہے وہ تشریعی احکام کے متعلق نازل ہوا کرتی ہے، لیکن حضرت خضر علیہ السلام کے اوپر جو وحی آتی تھی اس میں کائنات کے متعلق احکام نازل کئے جاتے تھے۔ یہ خاص علم تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو دیا تھا۔

کامیابی تکوینیات کے علم پر موقوف نہیں

لیکن ایک بات یاد رہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں کہ جو علم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیا گیا تھا وہ تو ایسا تھا کہ اس پر جب کوئی آدمی عمل پیرا ہو تو اس کی دنیا بھی بن جاوے اور آخرت بھی بن جاوے۔ گویا کامیابی اور ناکامی کا مدار اسی پر ہے۔ جبکہ حضرت خضر علیہ السلام کو کائنات کے رازوں اور بھیدوں کا جو علم دیا گیا تھا، وہ ایسا نہیں تھا جس پر کامیابی اور ناکامی کا مدار ہو۔ جیسے آج ہم یہاں بیٹھے ہیں، ایک آدمی کو ہم نے دیکھا جو بہت شریف سا ہے، لیکن اچانک پولیس آئی، اس کی پٹائی کی اور اس کو پکڑ کر لے گئی۔ ہم اس آدمی کے حالات سے واقف ہیں کہ بڑا شریف ہے، اور کبھی کوئی جرم اس نے نہیں کیا، کبھی کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی، اس لیے یہ معاملہ ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے، ہمارا دل اس کو قبول ہی نہیں کرتا۔ اور قدرت کی طرف سے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کروایا جارہا ہے، اس کا راز ہم نہیں سمجھ سکتے۔ ہمارے علم میں ہی نہیں آسکتا، یہ کائنات کے رازوں میں سے ایک چیز ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔ لیکن مان لو کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی ذریعہ سے ہم کو بتا دیا جائے کہ اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے ہوا ہے۔ تو جب نہیں جانتے تھے تو کیا نقصان ہوا؟ اور اب جان لیا تو ہمارا دنیا یا آخرت کا کیا فائدہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ تو کائنات کا ایک نظام ہے جو چل رہا ہے۔ اگر اس نظام کے اندرونی بھیدوں سے ہمیں واقفیت نہیں

ہے تو ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے۔ اور اگر واقف ہو جائیں گے تو ہمارا دنیا اور آخرت کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہمارا جو کچھ بھی فائدہ اور نقصان ہے اس کا تعلق تو شریعت کے احکام سے ہے۔ شریعت کے احکام کو جانیں اور اس پر عمل کریں تو فائدہ ہے۔ اگر نہیں جانیں گے اور چھوڑ دیں گے تو اس میں نقصان ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شریعت کا علم دیا گیا تھا جس پر انسانوں کی کامیابی اور ناکامی کا مدار تھا۔ اور حضرت خضر علیہ السلام کو کائنات کے اسرار کا علم دیا گیا تھا جس پر کسی کامیابی اور ناکامی کی بنیاد نہیں تھی۔ ہاں! اگر جان لیں تو بعض چیزوں میں ہمیں جو اشکال رہتا ہے، وہ دور ہو جائے۔ جیسے اسی واقعہ میں آرہا ہے۔

آپ سے ضبط نہ ہو سکے گا

تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا "وَاِنِّیْ عَلٰی عِلْمٍ مِّنَ اللّٰہِ، لَا تَعْلَمُہٗ" اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک علم دیا ہے جو میں پورا نہیں جانتا۔ اور اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک علم دیا جو آپ پورا نہیں جانتے۔ حضراتِ انبیاء کو بھی کائنات کے رازوں سے واقف کیا جاتا ہے لیکن اتنی تفصیل سے نہیں جیسا کہ اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ تو حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: ﴿اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِیَ صَبْرًا﴾ آپ میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکو گے۔ اس لیے کہ جو چیز پیش آرہی ہے اس کے اندر کے بھید سے تم واقف نہیں ہو گے، تو آپ سے ضبط نہیں ہو سکے گا۔ اس کا ظاہری حال ایسا ہوگا جس سے آپ بے چین ہو جائیں گے، اور آپ غیر اختیاری طور پر اعتراض کر بیٹھیں گے۔ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ خیال تو تھا ہی نہیں کہ آگے کیسے خطرناک معاملات پیش آنے والے ہیں، اس لیے انہوں نے کہہ دیا ﴿سَتَجِدُنِیْ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا

وَّلاأَعْصِي لَكَ أَمْراً﴾ آپ مجھے صابر پائیں گے اور کسی بات میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ وعدہ کرلیا۔

سفر شروع ہوا

اب ان تینوں کا قافلہ دریا کے کنارے کنارے آگے چلا، اتنے میں دیکھا کہ ایک کشتی ہے تو ان حضرات نے ان کشتی والوں سے گفتگو کی کہ ہمیں سوار کرلو۔ بخاری شریف میں ہے کہ کشتی والوں نے حضرت خضر کو پہچان لیا کہ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں اس لیے انہوں نے ان سب کو مفت میں سوار کرلیا۔ یہاں پر میں مولویوں سے کہا کرتا ہوں کہ مفت کی سواری تو ہمارے لیے پرانے زمانہ سے چلی آرہی ہے۔ خیر! انہوں نے کہا کہ آپ سے کرایہ نہیں لیں گے اور مفت سوار کرالیا۔

کشتی میں سوار ہونے کے بعد دیکھا کہ ایک چڑیا کشتی کے کنارے بیٹھی ہے اور اس نے اپنی چونچ ڈبوئی، تو حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اس چڑیا نے اپنی چونچ ڈبو کر دریا میں سے جتنا پانی لیا ہے، اس کی جو حیثیت پورے دریا کے مقابلہ میں ہے، اتنی حیثیت بھی میرے تمہارے اور سارے عالم کے تمام انسانوں کے علم کی اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس کی چونچ میں جو پانی آیا ہے وہ بھی محدود اور دریا کا پانی بھی محدود ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم غیر محدود ہے۔

تختہ توڑ دیا

اس کے بعد تھوڑا آگے چلے تھے کہ اچانک حضرت خضر علیہ السلام نے اس کشتی کا ایک تختہ توڑ دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ تختہ توڑ دیا تو ان کو اپنا وہ وعدہ، شرط اور جو ایگریمنٹ (Agreement) ہوا تھا وہ یاد نہیں رہا۔ داخلہ کی جو شرط ہوئی تھی؛ یاد

نہیں رہی۔

یہاں مَیں ہمارے طلبہ سے کہا کرتا ہوں کہ مدرسہ میں داخلہ کی جو شرطیں لگائی جاتی ہیں کہ یوں کرنا پڑے گا اور توں کرنا پڑے گا، یہ قرآن سے ثابت ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام علم حاصل کرنے ہی تو گئے تھے اور حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساتھ رکھنے کی جو منظوری دی تھی اس میں یہ شرط لگائی تھی کہ اس طرح رہنا پڑے گا کہ کوئی اعتراض نہ ہو۔

خیر! ان کو وہ شرط یاد ہی نہیں رہی اور ایک دم بے خیالی میں بول پڑے کہ یہ کیا کیا؟ یہ تو آپ سب لوگوں کو ڈبا دینے کا کام کر رہے ہیں۔ اور پھر یہ کہ ان لوگوں نے ہمیں مفت سوار کر کے ہمارے ساتھ احسان کیا، اس کا بدلہ دینے کے بجائے آپ تو اُلٹی بات کر رہے ہیں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ میں نے نہیں کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر و تحمل نہیں کر سکیں گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یاد آ گیا کہ اوہو! مَیں نے شرط منظور کی تھی، فوراً کہا: ﴿لَا تُؤَاخِذْنِیْ بِمَا نَسِیْتُ وَلَا تُرْهِقْنِیْ مِنْ اَمْرِیْ عُسْرًا﴾ مَیں بھول گیا تھا (اور واقعتاً حضرت موسیٰ علیہ السلام بھول ہی گئے تھے کہ یہ شرط ہوئی ہے اور غیر اختیاری طور پر یہ چیز زبان سے نکلی تھی) اس پر میری پکڑ مت کرو، پہلی بھول پر کوئی بھی پکڑ نہیں کرتا اور میرے معاملہ میں تنگی نہ ڈالو۔ یعنی اگر آپ میری اس بھول کی وجہ سے اپنی صحبت سے الگ کر دیں گے تو یہ میرے لیے تنگی والی بات ہو جائے گی۔ خیر! حضرت خضر علیہ السلام نے کہا کہ ٹھیک ہے۔

یہ کیا کیا؟

آگے بڑھے اور کشتی سے اترے۔ ایک بستی کی طرف جا رہے تھے، بستی کے

باہر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے ایک حسین اور خوبصورت چھوٹے بچہ کو (جو دیکھنے میں بھی بڑا ذہین معلوم ہوتا تھا) پکڑ کر اس کی گردن کاٹ کر مار ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دیکھا تو بول پڑے ﴿لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا﴾ یہ کیا کیا؟ یہ تو بہت خطرناک کام کیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے پھر وہی بات کہی کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کرسکیں گے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا ﴿إِن سَأَلْتُكَ عَن شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصَاحِبْنِي﴾ اگر اس کے بعد کوئی سوال کروں تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھنا۔

دیکھو! اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں بھول گیا، اس لیے کہ دوسری مرتبہ جو اعتراض کیا تھا اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنا وعدہ یاد تھا لیکن یہ کام ہی ان کی نگاہوں میں ایسا خطرناک تھا کہ وعدہ یاد ہوتے ہوئے بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی شخصیت خاموشی اختیار نہ کرسکی۔ فوراً بول پڑے۔ اور اسی لیے معذرت کرتے ہوئے یہ نہیں کہا کہ میں بھول گیا، بلکہ مزید ایک مہلت مانگی کہ اگر اب سوال کروں تو مجھے الگ کر دینا۔

جدائی کا وقت آ گیا

خیر! آگے بڑھے، اور ایک بستی میں پہنچے۔ بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر ہیں اور بھوکے بھی ہیں، ہماری میزبانی کرو۔ ان لوگوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی بستی میں سے گذر رہے تھے کہ ایک بڑی لمبی چوڑی دیوار کو دیکھا جو جھکی ہوئی تھی اور گرنے کے قریب تھی، کوئی بھی آدمی اس کے پاس سے گذرتا تو ڈر کے مارے دور دور سے گذرتا تھا کہ کہیں گر نہ جائے۔ حضرت خضر نے چن کر اس کو سیدھا کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

کہا کہ اس بستی والوں نے تو ہماری میزبانی بھی نہیں کی، ان کی ذمہ داری تھی کہ ہماری میزبانی کرتے کہ ہم بھوکے اور مسافر تھے، لیکن انہوں نے وہ تو کیا نہیں، اور آپ نے ان کے ساتھ احسان کیا؟ اگر آپ چاہتے تو ان سے اجرت کا مطالبہ کرتے، اور جو اجرت ملتی اس سے ہمارا کام بھی بن جاتا کہ کھانے کو مل جاتا، یا کم سے کم اجرت میں کھانا ہی لے لیتے؟ تو حضرت خضر نے کہا ﴿هَـذَا فِـرَاقُ بَيْـنِـىْ وَبَيْنِكَ﴾ بس! یہ تیسری مرتبہ اعتراض کیا، اب ہماری اور تمہاری جدائی کا وقت ہے۔ اور اب مَیں آپ کو بتلا دیتا ہوں کہ ان تین باتوں کی وجہ کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کاش! حضرت موسیٰ اور تھوڑا صبر کرتے تو ہمیں کائنات کے اور زیادہ راز معلوم ہوتے۔

عین احسان شناسی

خیر! پہلی بات کے متعلق بتلایا کہ دیکھو! وہ کشتی غریب بھائیوں کی تھی۔ روایتوں میں آتا ہے کہ وہ کل دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ اپاہج تھے، کمانے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے، اور دوسرے پانچ بھائی اس کشتی میں کام کرتے تھے، مسافروں کو اِدھر سے اُدھر لے جاتے تھے اور سامان ڈھوتے تھے، اور جو کچھ کماتے تھے اسی میں سے ان کا گذران چلتا تھا۔ حضرت خضر نے کہا یہ ان بے چاروں کی کشتی تھی اور اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں تھا۔ اور آگے جہاں یہ جا رہے تھے اس علاقہ کا حاکم بڑا ظالم تھا، جو کشتی بھی اچھی حالت میں ہوتی اس کو وہ چھین لیا کرتا تھا، اور ان غریبوں کی کشتی بھی بہت اچھی اور ٹوپ (Top) کنڈیشن میں تھی، اور اس کی عادت کے مطابق اگر وہ اس کشتی کو دیکھتا تو ضرور چھین لیتا۔ مَیں نے یہ تختہ اس لیے اُکھاڑ دیا تھا کہ وہ اگر دیکھے گا تو کہے گا کہ یہ کشتی اچھی نہیں ہے۔ اس طرح ان کی کشتی بچ جائے گی،

اس طرح ان بے چاروں کا ذریعۂ معاش باقی رکھنے کی مَیں نے کوشش کی تھی دیکھنے میں تو آپ کو یہ معلوم ہوا کہ ہم نے ان کے ساتھ احسان فراموشی کا معاملہ کیا، لیکن حقیقت میں یہ احسان شناسی والی بات تھی۔ اندر کا بھید معلوم نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو اشکال ہوا۔ ہم اور آپ بھی جب یہ حقیقت سنتے ہیں تو ہمارا بھی سارا اشکال دور ہو جاتا ہے۔

دوسرا راز

خیر! پھر دوسرے واقعہ کے متعلق کہا کہ اس بچہ کے والدین مؤمنین میں سے صالح اور اللہ کے نیک بندے تھے، اور یہ بچہ آگے جا کر ان کی نافرمانی کرتا، کفر اختیار کرتا اور اپنے ماں باپ کو تکلیف پہنچاتا۔ اور ہوسکتا تھا کہ اس بچہ کی محبت میں والدین بھی کفر کی طرف مائل ہو جاتے، تو اللہ تعالیٰ کو یہی منظور ہوا کہ اس بچہ کے بدلہ ان کو اور کوئی اولاد دے، اس لیے وحی کے ذریعہ مجھے حکم دیا گیا کہ اس کو ختم کردو۔ الہام کے ذریعہ نہیں بلکہ باقاعدہ وحی کے ذریعہ اس کو ختم کرنے کا حکم ملا اس لیے اس کو قتل کر دیا گیا روایتوں میں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک صالح لڑکی دی اور اس کے بطن سے ایک نبی پیدا ہوئے۔

نیکی کی برکت، پشتہا پشت تک

اور تیسرے نمبر کے متعلق بتلایا کہ دیوار دراصل دو یتیم بچوں کی تھی، اور اس دیوار کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا اور یہ دونوں ابھی چھوٹے تھے، اگر یہ دیوار گر جاتی تو خزانہ کھل جاتا، اور لوگ اس کو لوٹ لے جاتے۔ اور یہ دونوں بچے ابھی اس قابل نہیں ہیں کہ اس خزانہ کو سنبھال سکیں۔ اور ان کا باپ نیک آدمی تھا۔

اس جگہ پر مفسرین نے لکھا ہے کہ ماں باپ کی نیکی اولاد تو کیا، بلکہ اولاد کی

اولاد اور اس اولاد کی اولاد، اس طرح پشتہا پشت تک کو کام آتی ہے۔ بلکہ اہلِ خاندان اور اہل محلّہ اور اہلِ قریہ کو کام آتی ہے۔ اللہ والوں کی موت پر سب کو صدمہ کیوں ہوتا ہے؟ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ان کے وجود سے ہمیں بھی فائدہ پہنچ رہا ہے۔

حضرت شبلیؒ جو بڑے بزرگوں میں سے ہیں انہوں نے کہا کہ دیکھو! میرے مرنے کے بعد تم کو میری قدر ہوگی اور تمہیں پتہ چلے گا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ بغداد میں رہتے تھے، جب انتقال ہوا، اس کے دوسرے ہی روز دشمن قبیلے والوں نے بغداد پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ بغداد والے کہتے تھے کہ ہم کو تو دوہرا غم ہوا، ایک شبلی کی وفات کا اور دوسرا دشمن کے حملہ کا۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو نیکی اختیار کرنی چاہیے۔

اولاد کے لیے کیا فکر کریں؟

آج کل لوگ یہ سوچتے ہیں کہ میرے بعد میری اولاد کا کیا ہوگا؟ اپنی اولاد کے مستقبل کے لیے بہت ساری تدبیریں سوچی جاتی ہیں کہ میں کس طرح مال جمع کروں اور کتنا بینک بیلنس بڑھاؤں، کتنی جائیدادیں ان کے لیے مہیا کروں، مکانات تیار کروں، زمینیں خریدلوں اور ان کے لیے دکان وفیکٹری بنالوں۔ یہ ساری چیزیں سوچی جاتی ہیں۔ حالانکہ پتہ ہی نہیں کہ یہ سب بنانے والے کی زندگی تک بھی باقی رہتی ہیں یا نہیں۔ اور اگر باقی رہیں تو آئندہ اس سے ان کو فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ کسی کی بڑی سے بڑی فیکٹری ہو، لیکن کاروبار ہی نہ چلے، تو آپ سب بخوبی جانتے ہیں کہ فیکٹری ہونے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی فیکٹری دردِ سر بن جاتی ہے۔ گویا ہاتھی پال رکھا ہے جو زیادہ مصیبت بن جاتا ہے۔ تو آدمی یہ ساری چیزیں سوچتا ہے لیکن یہ نہیں سوچتا کہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور نیکی کی راہ اختیار کروں اور اللہ کے

نیک بندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں۔ آدمی اگر نیک بنے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اس کی اولاد اور اس کی پشتہا پشت کی حفاظت کرے گا۔

بعض لوگوں نے یہاں ایک ضعیف روایت بیان کی ہے ﴿وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا﴾ ان کا باپ یعنی ان کی ساتویں پشت پر جو آتا تھا وہ نیک وصالح تھا، اس کی نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان بچوں کے خزانے کی حفاظت فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۂ کہف)

اسی لیے آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اختیار کرے اور یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ضائع نہیں کرے گا۔ نہ ان کو ضائع کرے گا اور نہ ان کے پسماندگان اور متعلقین کو ضائع کرے گا۔ بس یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے حکم کو ضائع نہ کیجئے۔

یہ ہمارا موضوع نہیں ہے

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت خضر نے کہا کہ ان کے باپ کی نیکی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں تھا کہ ان کا خزانہ ضائع ہو جائے، جب وہ بڑے ہو جائیں گے تو خود اس خزانے کو نکال لیں گے۔ اس طرح حضرت خضر نے تینوں کام کی علتیں بتلا دیں کہ یہ کائنات کے راز ہیں۔

تکوینیات کا حال یہی ہوتا ہے کہ ایک چیز دیکھنے میں ہمیں بظاہر بہت اُلٹی معلوم ہوتی ہے اور ہمارے دل میں اعتراض ہوتا ہے۔ لیکن دیکھو! کوئی آدمی اگر ہمارے کسی معمولی سے فعل پر ذرا سا اعتراض کر دے تو ہمارا دماغ خراب ہو جاتا ہے، مزاج بگڑ جاتا ہے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی دنیا میں وجود میں آرہا ہے اس پر آدمی کو کبھی دھیان دینا ہی نہیں چاہیے۔ یہ ہمارا کام ہے ہی نہیں۔ ہمیں تو صرف یہی کہنا چاہیے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، وہ علیم وقدیر ہے

اور حکیم وخبیر ہے، سب کچھ اس کی حکمت کے مطابق ہی ہورہا ہے۔ اس لیے آدمی کو کبھی اس طرف دھیان دینا ہی نہیں چاہیے۔ ورنہ یہ معاملہ کبھی آدمی کے ایمان کے ختم ہونے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ایک خان صاحب کا واقعہ

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک خان صاحب اپنے وطن سے بھاگ کر چلے آئے اور راجپوتانہ کے علاقہ میں کسی زمین دار کے یہاں ملازم ہوگئے۔ وہ خانصاحب تھے، ان کی وجہ سے زمین دار کو بھی اچھی خاصی مدد ہوگئی، وہی اس کی ساری جائیداد کی حفاظت کرتے تھے۔ اتفاق کی بات کہ اس علاقہ میں قتل کا ایک واقعہ پیش آیا اور خانصاحب کے سر الزام آیا تو ان کو گرفتار کرلیا گیا۔ کیس چلا اور خانصاحب کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ یہ انگریز کے زمانہ کا قصہ ہے۔ اس زمانہ میں لندن میں پرائیویٹ کونسل ہوتی تھی، وہاں تک کیس لڑا جاتا تھا۔ جب ان کو پھانسی کی سزا ہوئی تو ان کے مالک اور آقا نے کہا کہ آپ بے فکر رہو، میں آپ کا کیس اوپر تک لڑوں گا۔ ان خانصاحب نے کہا کہ حضور! آپ کا احسان ہے لیکن میری درخواست ہے کہ آپ کو کیس لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آقا نے کہا کہ تم بے قصور ہو اور تمہیں سزا ہوئی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ کی بات بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قتل کے معاملہ میں مجھے جو گرفتار کیا گیا ہے، وہ مَیں نے نہیں کیا ہے۔ لیکن مَیں اپنے علاقہ میں ایک بے قصور کو قتل کر کے وہاں سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کی سزا کا یہ انتظام کیا گیا ہے۔ مجھے اسی دنیا میں اس کی سزا بھگت لینے دو، تاکہ آخرت کے وبال سے بچ جاؤں۔ اس لیے میری آپ سے

درخواست یہی ہے کہ میرا کیس آگے لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

تبصرے نہ کریں

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کائنات میں بے شمار واقعات ایسے پیش آتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنے حالات تو دیکھتے نہیں، اپنے اعمال کی درستگی کا اہتمام نہیں کرتے، اور قدرت کے جو واقعات پیش آتے ہیں اس پر تبصرے کرتے رہتے ہیں، اور ان تبصروں میں نعوذ باللہ کبھی ایسے جملے زبان سے نکال دیتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتراض لازم آتا ہے۔ اس لیے ایسی چیزوں سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

وہ مالک ہے جو چاہے کرے

حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا یہ واقعہ قرآنِ پاک میں ذکر کر کے آنے والی دنیا کو خاص طور پر یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ دیکھو! کائنات میں جو واقعات پیش آتے ہیں کہ ان کی ظاہری شکل وصورت کبھی ایسی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کو جب اندر کا حال معلوم نہیں تھا تو اعتراض پیدا ہوا۔ لیکن انہوں نے اعتراض اللہ تعالیٰ پر نہیں کیا تھا، بلکہ حضرت خضر پر کیا تھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا۔ اگرچہ حضرت خضر علیہ السلام نے جو کچھ کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کیا تھا۔ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن میں بظاہر اعتراض کی چیز نظر آتی ہے، لیکن جب اس کی حقیقت معلوم ہو جاتی ہے، جیسے آج جب ہم نے بھی سنا اور اندر کا حال معلوم ہوا تو سارا معاملہ برابر معلوم ہوا۔ اسی لیے دنیا میں جب بھی کوئی چھوٹا یا بڑا معاملہ پیش آوے اور اس میں ظاہری اعتبار سے چاہے کیسا ہی معلوم ہوتا

ہو، لیکن ایک مؤمن کی ایمانی شان کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف کبھی کوئی اعتراض کا تصور بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ چیز آدمی کے لیے بڑی خطرناک ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان تو یہ ہے ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے متعلق اس سے پوچھا نہیں جائے گا۔ ہاں! لوگوں سے پوچھا جائے گا۔ اور وہ تو مالک ہے جو چاہے کرے۔

بلکہ علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ چلو مان لو کہ کوئی قصور نہیں ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے پٹوا دیا تو آخر اللہ تعالیٰ تو اس کے خالق اور مالک ہیں، اس کے ساتھ جو چاہیں معاملہ کریں۔ جیسے ہماری ایک گھڑی ہے جس کو ہم نے پھینک دی، اب کوئی آکر ہم سے پوچھے کہ اتنی قیمتی گھڑی تھی، اس کو آپ نے پھینک دی، آپ نے ایسا کیوں کیا؟ تو ہمارا اور آپ کا ایک ہی جواب ہوتا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں، تجھے کہنے کا کیا حق ہے؟ حالانکہ ہماری مالکی کی کیا حیثیت ہے، حقیقی مالک تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور اس کے خالق تو ہم ہیں ہی نہیں۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ کو اسی مناسبت سے لائے ہیں۔ آج وقت بھی بہت ہو چکا ہے، یہیں بات کو ختم کرتے ہیں۔

۱۱/ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ۲۶/جون ۱۹۹۹ء

گذشتہ مجلس میں ایک عنوان قائم کیا تھا جس میں علامہ نوویؒ نے فرمایا تھا کہ جو نیک لوگ ہیں ان کی ملاقات، ان کی ہم نشینی، ان کے پاس بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا اور ان سے محبت کا تعلق رکھنا، اور ان سے درخواست کرنا کہ وہ آپ کے یہاں آئیں یا ان سے دعا کی درخواست کرنا۔ اس سلسلہ میں سورۂ کہف کی ایک آیت ذکر کی تھی اس کا بیان گذشتہ مجلس میں تفصیل سے ہو چکا ہے۔ آج یہاں سورۂ کہف ہی کی ایک دوسری آیت کو عنوان کی مناسبت سے پیش کر رہے ہیں۔

......تب سوچیں گے

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ﴾ مکہ مکرمہ کے رئیس اور سردار قسم کے لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ ہم آپ کی باتیں سننے کے لیے آپ کی مجلس میں آنا تو چاہتے ہیں، لیکن کیسے آویں کہ آپ کی مجلس میں معمولی قسم کے لوگ جن کو ہمارے معاشرہ اور سماج میں کوئی مقام حاصل نہیں وہ آکر بیٹھتے ہیں، ایسے لوگوں کی موجودگی میں آپ کے پاس آکر بیٹھنا ہمیں اپنے مقام سے کم تر معلوم ہوتا ہے، اس میں ہم اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی باتوں کو سنیں اور آپ جس دعوت کو پیش کر رہے ہیں اس کی طرف توجہ کریں تو اس کی شکل یہ ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ جو آپ کی مجلس میں آتے ہیں ان کو آپ اپنی مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہ دیں۔ یا پھر آپ ہمارے لیے الگ مجلس قائم کریں کہ اس مجلس میں ہم ہی ہم ہوں، یہ معمولی قسم کے لوگ اس میں نہ ہوں، تو اس صورت میں ہم آپ کی باتیں سنیں گے اور آپ کی دعوت کی طرف توجہ کریں گے، اور

اس کو قبول کرنے کے معاملہ میں غور کریں گے اور سوچیں گے۔

ایسا نہیں ہوگا

نبی کریم ﷺ کو اس بات کا خیال رہتا تھا کہ مَیں اپنی دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچاؤں۔ اور ایسے بڑے لوگ جن کے متعلق یہ توقع اور امید ہو کہ اگر وہ ایمان لے آئیں، اور ہماری دعوت پر لبیک کہیں تو ان کی وجہ سے ہماری دعوت کو زیادہ فروغ ہوگا اور دوسرے لوگ بھی ان کے مقام ومرتبہ کو دیکھتے ہوئے ہماری دعوت کی طرف مائل ہوں گے۔ نبی کریم ﷺ کو لگن تھی کہ میری بات تمام لوگوں تک پہنچ جائے اور لوگ اس کی طرف توجہ کریں۔ خود باری تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی یہ شان بیان فرمائی ہے ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلىٰ آثَارِهِمْ إِن لَّمْ يُؤْمِنُوا بِهٰذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً﴾ شاید آپ اپنے آپ کو ہلاک کر دیں اس بات پر افسوس میں کہ وہ آپ کی بات پر ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ تو اس کی وجہ سے ہوسکتا تھا کہ نبی کریم ﷺ ان کی اس بات کی طرف مائل ہو جاتے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت نازل فرمائی کہ اے نبی! آپ اپنے آپ کو روکے رکھیے، اپنے آپ کو مقید کر لیجئے ان لوگوں کے ساتھ جو صبح اور شام اللہ تعالیٰ کو پکارتے رہتے ہیں، اس کو یاد کرتے رہتے ہیں اور اس کی عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ آپ ایسے لوگوں کے ساتھ اپنے آپ کو لگائے رکھیے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرما کر ان لوگوں کی طرف سے جو فرمائش کی گئی تھی اس کا جواب دے دیا کہ تم لوگ نبی کریم ﷺ کی باتیں سننا چاہتے ہو تو تم جس طرح چاہتے ہو اس طرح نہیں، بلکہ مجلس میں جو لوگ آتے ہیں، جن کا مقصود

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا جوئی ہوا کرتا ہے، ایسے لوگوں کو اس مجلس سے نکالا اور ہٹایا نہیں جائے گا، ان کی موجودگی میں انہیں کے دوش بدوش بیٹھ کر حضور ﷺ کی باتیں سننا منظور ہے تب تو ٹھیک ہے، باقی تم لوگ جو یہ چاہتے ہو کہ تمہارے لیے الگ مجلس قائم کی جائے؛ تو ایسا نہیں ہوگا۔

حضور ﷺ کو صحبتِ صالحین کا حکم

خیر! یہ تو اس آیت کا شانِ نزول ہوا۔ یہاں علامہ نوویؒ نے باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ایک خاص بات بیان کی تھی کہ جو لوگ نیک اور صالح ہوں ان کی ملاقات کے لیے جانا، ان کے پاس بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنا۔ تو اس آیت کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھئے! نبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات تو کسی کی صحبت کی محتاج نہیں تھی، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کو خاص طور پر تاکید فرمائی کہ اے نبی! آپ اپنے آپ کو مقید کر دیجئے، پابند بنائیے اور اپنے آپ کو بٹھائیے ان لوگوں کے پاس جو اللہ تعالیٰ کو صبح وشام خالص اسی کو راضی کرنے کے لیے پکارتے ہیں۔

گویا علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت سے یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم ﷺ کو تاکید کی گئی کہ آپ کو بھی اس بات کا اہتمام ہونا چاہیے، تو اس سے اس بات کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ جو صلحاء اور نیک لوگ ہیں ان کی ملاقات اور ان کی ہم نشینی، ان کے پاس بیٹھنا، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنا؛ یہ کتنا ضروری اور اہم ہے۔

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلہ میں احادیث پیش کرتے ہیں:-

اُمِ اُیمن نے شیخین کو رُلا دیا

٣٦٠۔وَعنْ أَنَسٍ ﷛ قَالَ: قَالَ أَبُوبَكْرٍ ﷛ لِعُمَرَ صبعْدَ وَفَاةِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ: اِنْطَلِقْ بِنَا اِلىٰ أُمِّ أَيمَنَ رضى اللّٰه عنها نَزُوْرُهَا كَمَا كَانَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا، فَلَمَّا انْتَهَيَا اِلَيْهَا، بَكَتْ، فَقَالَا لَهَا: مَا يُبْكِيْكِ؟ أَمَا تَعْلَمِيْنَ أَنَّ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِرَسولِ اللّٰهِ ﷺ؟ فَقَالَتْ: اِنِّي لَاأَبْكِي اِنِّيْ لَاأَعْلَمُ أَنَّ مَا عِنْدَاللّٰهِ تَعَالىٰ خَيرٌ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، وَلٰكِنْ أَبْكِيْ أَنَّ الْوَحْيَ قَدِانْقَطَعَ مِنَ السَّمَآءِ، فَهَيَّجَتْهُمَا عَلىٰ الْبُكَآءِ، فَجَعَلَا يَبْكِيَانِ مَعَهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت انس ﷛ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ایک دن حضرت ابوبکر صدیق ﷛ نے حضرت عمر فاروق ﷛ سے کہا کہ چلیے! ہم لوگ حضرت ام ایمن ؓ کی زیارت کے لیے جائیں جیسے نبی کریم ﷺ ان کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ جب یہ دونوں ان کے پاس پہنچے تو وہ رونے لگیں۔ انہوں نے کہا: کیوں روتی ہو؟ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے پاس جو ملا ہے وہ یہاں سے بہتر ہے؟ انہوں نے کہا: میں اس لیے نہیں روتی۔ مجھے یہ بات معلوم ہے۔ لیکن مَیں اس لیے روتی ہوں کہ آسمان سے وحی اترنے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ سو ان کو بھی رونے پر ابھارا اور وہ دونوں بھی ان کے ساتھ رونے لگے۔

افادات: حضرت ام ایمن ؓ نبی کریم ﷺ کے والدِ محترم حضرت عبداللہ کی باندی تھیں، اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کے لیے میراث میں جو چیزیں چھوڑی تھیں ان میں سے یہ بھی تھیں۔ گویا یہ اس طرح آپ کی ملک میں آئی تھیں پھر آپ ﷺ نے ان کو آزاد کیا تھا، نبی کریم ﷺ کو انہوں نے بچپن میں کھلایا تھا، آپ ﷺ کو دودھ تو حضرت حلیمہ سعدیہ ؓ نے پلایا تھا لیکن حضرت ام ایمن ؓ نے آپ ﷺ کو کھلایا تھا۔ کھلائی ہوتی ہیں۔ یہ بچپن میں نبی کریم ﷺ کو سنبھالتی اور خیال رکھتی تھیں، نبی کریم ﷺ ان کا بڑا احترام

کرتے تھے، اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتے تھے جو ایک ماں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

حضرت اُمِ اَیمن کا ناز

چنانچہ روایتوں میں آتا ہے کہ یہ بھی کبھی نبی کریم ﷺ کے سامنے اسی طرح اڑ جاتی تھیں جیسے ایک ماں اپنے بیٹے کے ساتھ کرتی ہے۔ انصار کی عادت یہ تھی کہ جب نبی کریم ﷺ کے پاس خمس کا مال زیادہ نہیں آتا تھا اور فتوحات کی کثرت نہیں ہوئی تھی، اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں مہمانوں کی آمدورفت اور لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا، اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے مال کی ضرورت ہوتی تھی تو جو حضرات انصار باغات والے تھے، وہ اپنے باغات میں سے کچھ درخت نبی کریم ﷺ کے لیے مخصوص کردیا کرتے تھے، اور آکر عرض کردیتے کہ یارسول اللہ! یہ پانچ درخت آپ کے لیے ہیں یعنی اس میں جو کھجوریں اتریں گی، وہ آپ اپنے استعمال میں لائیں۔ نبی کریم ﷺ اس کو قبول فرما لیا کرتے تھے، لیکن غزوۂ بنونضیر اور غزوۂ بنوقریظہ کے بعد ان کے جو باغات مالِ غنیمت کے طور پر ملے، ان میں سے نبی کریم ﷺ کو بھی بہت کچھ ملا، تو اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے وہ درخت جو حضراتِ انصار کی طرف سے عاریۃً استعمال کرنے کے لیے آپ کو دئے گئے تھے، وہ سب واپس کردئے۔ اسی طرح حضراتِ انصار مہاجرین کو بھی درخت دیا کرتے تھے، تو مہاجرین نے بھی ان کو واپس کردئے۔

بنونضیر کا جو مالِ غنیمت حاصل ہوا تھا اس میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو خصوصی اختیارات دیئے تھے اور آپ ﷺ نے بنونضیر کی طرف سے ملنے والی جائیدادیں اور باغات زیادہ تر مہاجرین کے درمیان تقسیم کردیئے تھے، انصار میں سے دو چار جو زیادہ حاجت مند تھے ان کو بھی دیا گیا تھا، لیکن زیادہ تر مہاجرین کو دیا گیا تھا۔ اس موقع پر

مہاجرین نے بھی - انصار کی طرف سے جو تعاون ہوتا تھا - شکریہ کے ساتھ ان سے معذرت کر دی کہ اب ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس وقت اعلان فرمایا تھا کہ جن کے جو درخت ہیں وہ آ کر ہم سے واپس لے لیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر والوں نے بھی کچھ درخت نبی کریم ﷺ کے استعمال کے لیے حضور کی خدمت میں عاریۃً پیش کئے تھے۔ جب حضور کی طرف سے یہ اعلان ہوا تو اس کی واپسی کے لیے گھر والوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو بھیجا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے گھر والوں نے جو درخت نبی کریم ﷺ کو استعمال کے لیے دیئے تھے، حضور نے وہ درخت حضرت ام ایمنؓ کو استعمال کے لیے عنایت فرمائے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں پہنچا تو نبی کریم ﷺ نے حضرت ام ایمن کو بلایا اور کہا کہ ان کے درخت واپس کر دو۔ انہوں نے کہا کہ میں واپس نہیں کرتی۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ حضرت ام ایمن میرے گلے میں کپڑا ڈال کر کھینچنے لگیں اور فرمانے لگیں کہ میں نہیں دینے والی ہوں، میں نہیں دینے والی ہوں۔ نبی کریم ﷺ ان کو جواباً کہنے لگے کہ آپ دے دیجئے، ہم آپ کو اس کے بدلہ میں ڈبل دیں گے، تین گنا دیں گے، چار گنا دیں گے۔ اس طرح حضور ﷺ ان کو بہلا پھسلا کر راضی فرماتے رہے، یہاں تک کہ حضور اکرم ﷺ نے ان سے کہا کہ آپ کے پاس جو درخت ہیں اس سے دس گنا ہم آپ کو دیں گے، لیکن یہ آپ ان کو واپس کر دیجئے۔ جب نبی کریم ﷺ نے دس گنا دینے کا وعدہ فرمایا تب انہوں نے وہ درخت واپس کئے۔ (بخاری شریف۔ ۴۱۲۰)

بہرحال! عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ان کا معاملہ

ناز کا تھا جیسے ماں اپنے بیٹے کے ساتھ ایسے مواقع پر کیا کرتی ہے، اور حضور اکرم ﷺ ان کا بڑا احترام وادب فرمایا کرتے تھے، اور ان کا بڑا خیال ولحاظ فرماتے تھے۔ بعد میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت ام ایمن کا نکاح حضرت زید بن حارثہؓ سے کرادیا تھا اور انہی سے حضرت اسامہ پیدا ہوئے تھے۔

بڑوں کا معمول ملحوظ رہے

اور جیسا کہ اس روایت میں آیا کہ خود نبی کریم ﷺ ان کی زیارت کے لیے تشریف لے جایا کرتے تھے۔ علامہ نوویؒ اس روایت سے یہی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ اپنے اس مقامِ رفیع کے باوجود ان کے یہاں تشریف لے جارہے ہیں اور حضور ﷺ کی اتباع ہی میں آپ کی وفات کے بعد حضراتِ شیخین ان کے پاس جارہے ہیں۔ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمارہے ہیں کہ چلیں ہم ان کے پاس جائیں جیسے نبی کریم ﷺ ان کے یہاں تشریف لے جایا کرتے تھے، ہمیں بھی ان کی خدمت میں حاضری دینی چاہیے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے بڑوں کا معمول چھوٹوں کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ جیسے آپ کے خاندان کے بڑے کسی بزرگ کے پاس اس کی صلاح ونیکی کی وجہ سے حاضری دیا کرتے تھے، کسی صاحبِ فضل وکمال کے پاس ان کے فضل وکمال کی وجہ سے حاضری دیتے تھے تو چھوٹوں کو بھی اس کا اہتمام رہے۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

پتے کی بات

خیر! جب یہ دونوں حضرات ان کی خدمت میں پہنچے تو ان کی آمد پر نبی کریم ﷺ کی یاد تازہ ہونا لازمی تھی، تو وہ رونے لگیں، جب ان کو روتے دیکھا تو ان حضرات نے

تسلی کے طور پر ان سے کہا کہ کیوں روتی ہیں؟ تمہیں یہ معلوم نہیں کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ ملا ہے وہ دنیا کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔ یعنی دنیا میں نبی کریم ﷺ جس حال میں تھے وہاں آپ کو یہاں سے زیادہ راحت ہے، اور اگر کسی کو اپنے محبوب کے متعلق یہ معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں کے مقابلہ میں وہاں زیادہ راحت میں ہے تو وہ یہ معلوم کر کے خوش ہوتا ہے کہ ہمیں تو انہی کی راحت مطلوب ہے، تو اب ہمیں وہاں کے حال کا تصور کر کے بجائے رونے کے خوش ہونا چاہیے۔ ان حضرات نے تسلی کے طور پر یہ کہا کہ اب روتی کیوں ہو؟ اس پر انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں اس لیے نہیں روتی کہ مَیں یہ بات نہیں جانتی کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس دنیا کے مقابلہ میں بہت بڑھ کر ملا ہے، یہ بات تو میں بھی بخوبی جانتی ہوں۔ لیکن میں تو اس لیے روتی ہوں کہ وحی کا سلسلہ جو نبی کریم ﷺ کے وجودِ مسعود کی وجہ سے دنیا میں تھا، آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کی وجہ سے منقطع ہو گیا۔ جب تک نبی کریم ﷺ دنیا میں تھے وہاں تک حضرت جبرئیل وحی لے کر آتے رہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں سے وحی کا آنا اور اللہ کے کلام کا اللہ کے نبی پر نازل ہونا؛ دنیا والوں کے لیے اور جس زمانہ میں یہ وحی نازل ہو رہی ہے خصوصاً اس زمانہ والوں کے لیے واقعتاً بڑا برکات و خیرات کا ذریعہ اور سبب تھا۔ تو ظاہر ہے کہ جب نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، تو اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اور وحی کی آمد کی وجہ سے جو برکتیں اور رحمتیں دنیا والوں پر نازل ہوتی تھیں؛ وہ نہیں رہیں۔ میں تو اس بات پر رو رہی ہوں۔ جب انہوں نے یہ بات فرمائی تو اس بات کو سن کر تو پھر ان حضرات کا دل بھی بھر آیا اور وہ بھی رونے لگے کہ ان کی بات تو پتے کی ہے۔ اور جو بات اُن کو رُلا رہی تھی، اب تو یہ حضرات بھی اپنے آپ پر قابو نہیں

رکھ سکے، اور وہ بھی بے اختیار رونے لگے۔

اللہ کی نسبت پر ملاقات کا انعام

۲٦۱: وعن أبی هريرةَ رضی الله عنه عنِ النبی صلی الله علیه وسلم: أَنَّ رَجُلاً زَارَأَخَالَهُ فِیْ قَرْيَةٍ أُخْرٰی، فَأَرْصَدَاللّٰهُ تَعَالیٰ عَلیٰ مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا۔ فَلَمَّاأَتیٰ عَلَيْهِ قَالَ: أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قَالَ: أُرِيْدُ أَخًا لِیْ فِیْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ۔ قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا عَلَيْهِ؟ قَالَ: لَا، غَيْرَ أَنِّی أَحْبَبْتُهُ فِی اللّٰهِ تَعَالیٰ۔ قَالَ: فَاِنِّی رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكَ بِأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَاأَحْبَبْتَهُ فِيْهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ ایک آدمی دوسرے گاؤں میں خالص اللہ کی نسبت پر اپنے بھائی کی ملاقات کے لیے جانے لگا۔ جس راستہ سے وہ گذر رہا تھا اس راستہ پر اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو فرشتے نے اس سے سوال کیا: بھائی! کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا کہ اس بستی میں میرا ایک دینی بھائی ہے، میں اس کی ملاقات کے لیے جا رہا ہوں۔ فرشتہ نے پوچھا کہ تمہارا اس کے ساتھ کوئی بھلائی کا معاملہ رہا ہے کہ اس کے باقی رکھنے اور اس کو فروغ دینے کے لیے تم جا رہے ہو؟ اس نے کہا: نہیں! بلکہ صرف اللہ کے واسطہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں۔ فرشتہ نے کہا کہ میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص یہ بشارت اور خوش خبری سنانے کے واسطے بھیجا گیا ہوں کہ جس طرح تو نے اللہ کی خاطر اس سے محبت کی، اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت رکھتا ہے۔

افادات: (۱) اگرچہ اس فرشتہ کو بھی معلوم تھا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو تو بتلا کر بھیجا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس فرشتہ کو جو بشارت سنانے کے واسطے بھیجا تھا اس بشارت کی بنیاد قائم کرنے کے لیے یہ سوال ضروری تھا۔

(۲) یہاں سوال کیا ہے "أَيْنَ تُرِيْدُ؟" کہاں جا رہے ہو؟ اور وہ جواب دے رہا ہے کہ کس لیے جا رہا ہوں۔ ویسے اس فرشتہ کا مقصد "أَيْنَ تُرِيْدُ؟" سے یہی تھا کہ اگر

وہ یہ جواب دیتا کہ اس بستی میں جارہا ہوں تو وہ فرشتہ آگے یہی پوچھتا کہ اس بستی میں کیوں جارہا ہے۔اس لیے یہ بھی سوال کا اصل مقصد سمجھ گیا،اوراس کے نتیجہ میں دوسرا جوسوال وجود میں آنے والا ہے،اس کا جواب پہلے ہی دیدیا۔

(٣) ظاہر ہے کہ جوصلحاء اور نیک لوگ ہوتے ہیں ان کے ساتھ کوئی مؤمن جب بھی کوئی معاملہ کرتا ہے،ان کی ملاقات کے لیے جائے گا،ان کی مجلس میں بیٹھنے کے لیے جائے گا،یاان کی صحبت اختیار کرنے کے لیے جائے گا،یاان سے محبت کا تعلق رکھے گا،جو ہمارے باب کا عنوان ہے؛تو وہ سب اللہ ہی کی نسبت پر ہوتا ہے۔

اس لیے اس روایت کو علامہ نوویؒ نے یہاں پر ذکر کیا ہے کہ دیکھو!اللہ تعالیٰ کی نسبت پر جب کوئی تعلق قائم کیا جاتا ہے تو اللہ کے یہاں وہ کتنا اونچا درجہ رکھتا ہے۔

(٤)فرشتہ نے کہا کہ میں تیری طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص یہ بشارت سنانے کے واسطے بھیجا گیا ہوں کہ جس طرح تو نے اللہ کی خاطر اس سے محبت کی اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت رکھتا ہے۔

اسی لیے یہ بھی تعلیم ہے کہ اگر کوئی مسلمان بھائی ہم سے یوں کہے کہ میں تجھ سے اللہ کے واسطے محبت رکھتا ہوں تو ہم جواب میں بطورِ دعا یہ کہیں کہ جس ذات کے لیے تو مجھ سے محبت رکھتا ہے،وہ ذات بھی تجھ سے محبت رکھے (مسند احمد،١٢٥٩٠) یہ آداب میں سے ہے۔

(٥) یہاں پر فرشتہ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایلچی بن کر اس سے یہ کہا کہ جس اللہ کی خاطر تو نے اس سے محبت کی ہے،اللہ تعالیٰ بھی تجھ سے محبت رکھتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ نیک لوگوں کے ساتھ کو معاملہ کیا جاتا ہے،وہ محض اللہ کی محبت کی وجہ

سے ہوا کرتا ہے، مثلاً ان کی زیارت کے لیے جانا، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے پاس بیٹھنا، ان کے ساتھ محبت رکھنا؛ تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے بدلہ میں اپنی طرف سے یہ انعام عطا فرماتے ہیں کہ اس بندہ سے محبت کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت کسی کو حاصل ہو جائے تو پھر اس کا بیڑا پار ہے۔

آج ہماری مجلس میں حضرت مولانا احمد لاٹ صاحب دامت برکاتہم تشریف فرما ہیں، میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ حضرت مولانا ہی کچھ ارشاد فرمائیں، لیکن وہی بزرگوں والا اصول حضرت نے یہاں بھی اپنایا کہ یہ تو آپ کا معمول ہے، اس لیے آپ کو تو یہ پورا کرنا ہی چاہیے۔ اس لیے میری بات ابتداءً تو نہیں مانی، لیکن اب میں دوبارہ حضرت سے درخواست کرتا ہوں کہ دو چار باتیں ارشاد فرمادیں اور دعا بھی فرمادیں۔

۱۸ / ربیع الاول ۱۴۲۰ھ ۳ / جولائی ۱۹۹۹ء

بیان چل رہا تھا کہ نیک لوگوں کی زیارت اور ان کی ہم نشینی، اور ان کی صحبت اختیار کرنا اور ان کے ساتھ محبت رکھنا اور ان سے اپنے یہاں آنے کی اور ان سے دعا کی درخواست کرنا، اور بابرکت جگہوں کی زیارت کے لیے جانا۔ اسی سلسلہ میں اور روایتیں پیش کرتے ہیں۔

جنت میں ٹھکانہ بنانے کا آسان نسخہ

٣٦٢: وعنه قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ عَادَمَرِيضاً أَوْزَارَأَخاً لَهُ فِي اللّٰهِ، نَادَاهُ مُنَادٍ: بِأَنْ طِبْتَ، وَطَابَ مَمْشَاكَ، وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلًا۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت اور خبر گیری کے لیے جاتا ہے، یا اپنے اس بھائی کی ملاقات کے لیے جاتا ہے جس کے ساتھ بھائی چارگی کا تعلق اللہ کی نسبت پر قائم کیا ہے، تو ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے کہ تو بڑا پاکیزہ اور عمدہ ہے، اور تیرا یہ چلنا بھی بڑا اچھا ہے، اور تو نے جنت میں اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

افادات: علامہ نووی رحمہ اللہ یہاں اس روایت کو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ جس کے ساتھ کسی نے اللہ کی نسبت پر اخوت اور بھائی چارگی کا تعلق قائم کیا ہے، تو جب وہ آدمی اس کی ملاقات کے لیے جاتا ہے، تو اس کی کتنی بڑی فضیلت ہے۔

جنت میں اپنا ٹھکانہ بنالینا کتنا آسان ہے، کسی دینی بھائی یا جس سے اللہ کی نسبت سے محبت ہو، اس کی ملاقات کے لیے جانے میں کوئی زیادہ وقت خرچ نہیں ہوتا، پانچ دس منٹ میں بھی یہ کام نمٹ سکتا ہے۔ یا کسی بیمار کی تیمارداری کے لیے آدمی جاوے، تو ویسے بھی اس کے آداب میں سے یہ ہے کہ وہاں زیادہ نہ رُکے، بلکہ کھڑے کھڑے اس کی خبر پوچھ کر واپس آجاوے۔ تو اس پر اتنی بڑی فضیلت سنائی گئی کہ اس

نے جنت میں اپنے لیے ٹھکانہ بنالیا۔

ان اعمال کو معمولی مت سمجھو

ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال ہیں جن میں ریا کا بھی کوئی شبہ نہیں ہے، بڑے اعمال میں تو دکھلاوے کا بھی شبہ ہوسکتا ہے، جیسے کوئی آدمی تہجد پڑھے، تو ہوسکتا ہے کہ اس میں نفس کو دخل ہو کہ لوگ مجھے دیکھیں اور میری تعریف کریں، لیکن کوئی آدمی کسی بیمار کی خبر گیری کے لیے جب جاتا ہے، یا کسی نیک آدمی کی ملاقات کے لیے جاتا ہے تو وہاں کبھی دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ میں کوئی بڑا عمل کر رہا ہوں، اور لوگ مجھے دیکھیں اور اس پر میری شہرت اور نیک نامی ہو، بلکہ یہ عمل خالص اللہ کے لیے ہوتے ہیں۔ تو یہ عمل چھوٹا سا ہے، اور اس میں ریا کا بھی کوئی شائبہ نہیں ہے، اور اتنی بڑی فضیلت ہے۔ تو ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال جن پر اتنی بڑی بڑی فضیلتیں آئی ہیں، آدمی اگر انہیں کا اہتمام کرلے، اور اس قسم کے اعمال کو انجام دینے کی عادت بنالے، تو کب کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائے، اور نجات کا ذریعہ بن جائے؛ یہ کون کہہ سکتا ہے۔ اس لیے ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال کو بھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے، جبکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی بڑی بشارت دی جارہی ہے۔

نیک و بد ہم نشین کی مثال

٣٦٣: عَنْ أَبِی مُوسٰی الأَشْعَرِی رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اِنَّمَا مَثَلُ الْجَلِیْسِ الصَّالِحِ وَجَلِیْسِ السُّوْءِ، کَحَامِلِ الْمِسْکِ، وَنَافِخِ الْکِیْرِ۔ فَحَامِلُ الْمِسْکِ؛ اِمَّا أَنْ یُحْذِیَکَ، وَاِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ، وَاِمَّا أَنْ تجدَ مِنْهُ رِیْحًا طَیِّبَةً۔ وَنَافِخُ الْکِیْرِ؛ اِمَّا أَنْ یُّحرِقَ ثِیَابَکَ، وَاِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِیْحًا مُنْتِنَةً. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ نیک ہم نشین اور ساتھی کی مثال اور برے ہم نشین اور ساتھی کی مثال مشک رکھنے والے اور بھٹی جھونکنے والے جیسی ہے۔ پس مشک رکھنے والا؛ یا تو تم کو خوشبو لگا دے گا، یا تم اس سے عطر خریدو گے، یا اس کے پاس سے اچھی خوشبو تو سونگھ ہی لو گے۔ اور بھٹی جھونکنے والا؛ یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا، یا اس کے پاس سے بدبو تو سونگھ ہی لو گے۔

مثالیں اور انبیاءؑ کی تعلیمات

افادات: بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ جلدی سے سمجھ میں نہیں آتی، ان کو سمجھنا آسان ہو جائے اس کے لیے آدمی ظاہری اور حسی طور پر جو نمونے اور منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، اسی میں سے کسی چیز کو پیش کر کے بات سمجھائی جاتی ہے۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص طور پر یہ ملکہ اور وصف اور یہ خصوصی شان عطا کی جاتی ہے کہ وہ معنوی چیزوں کو یعنی جو بات عقل سے تعلق رکھتی ہے اس کو سمجھانے کے لیے حسی اور ظاہری مثالیں پیش کرتے ہیں تا کہ اس کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ اسی لیے حدیث کی کتابوں میں محدثین باقاعدہ الگ سے ایک عنوان "کتاب الامثال" قائم کرتے ہیں، اور اس کے تحت صرف ایسی روایتیں لاتے ہیں جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالیں دے کر کیا کیا چیزیں سمجھائی ہیں۔ یہ بھی حضراتِ انبیاء کرامؑ کی تعلیمات کا ایک خاص حصہ ہیں۔ اور قرآنِ پاک میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے بہت سی چیزوں کو مثال دے کر سمجھایا ہے۔ یہاں پر بھی اچھے آدمی کی صحبت اور برے آدمی کی صحبت کو سمجھانے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مثال دی ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مشک رکھنے اور بیچنے والا اور دوسرا بھٹی جھونکنے والا جس کو لوہار کہتے ہیں۔ تو ان دو شخصوں کو مثال اور نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

نیک ہم نشین کی مثال

چنانچہ فرمایا کہ اچھی صحبت والے کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشک بیچنے والا ہوتا ہے کہ اگر آپ مشک بیچنے والے عطر فروش کے پاس جا کر بیٹھ جائیں تو اگر آپ کا اس کے ساتھ تعلق زیادہ ہے، پرانی جان پہچان اور دوستی ہے تو وہ آپ کو تھوڑا سا عطر دیدے گا۔ اگر پوری شیشی نہیں دے گا تو کم سے کم عطر کا پھایہ ہی دیدے گا۔ تو اس کی طرف سے یہ فائدہ آپ کو پہنچے گا۔ یا اگر وہ نہیں دے گا تو آپ کا جی چاہے گا کہ آپ وہ خرید لیں۔ جیسے آدمی کوئی اچھی چیز دیکھتا اور اس کو پسند بھی آجاتی ہے اور جیب میں پیسے بھی ہیں اور خریدنے کی استطاعت بھی ہے تو وہ اس کو خرید لیتا ہے۔ اور اگر نہ اس نے دیا اور نہ آپ نے خریدا، تب بھی خوشبو تو کہیں گئی ہی نہیں۔ اس کے پاس جا کر بیٹھنے سے آپ کو جو خوشبو محسوس ہوگی، اس کی وجہ سے آپ کا دماغ تروتازہ ہو جائے گا، طبیعت میں فرحت کی سی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے خوشبو آدمی کی عقل کو بڑھاتی ہے۔ امام شافعیؒ کا مقولہ ہے کہ جو آدمی اچھی خوشبو استعمال کرتا ہے، اس کی عقل بڑھتی ہے۔

بہرحال! حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آپ کم سے کم خوشبو ہی محسوس کریں گے یعنی اس کی صحبت کسی حال میں بھی فائدے سے تو خالی نہیں ہے۔ نیک آدمی کی صحبت میں آپ بیٹھیں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو وہ آپ کو کوئی بھلی بات کہہ دے گا، اور اگر کچھ نہ کہے تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں اس میں آپ کا بھی حصہ لگ جائے گا۔

برے ہم نشین کی مثال

”کِیر“ کیا ہے؟ آپ نے لوہار کی بھٹی دیکھی ہوگی، اس میں پیچھے کی طرف

چمڑے کا ایک ٹکڑا لگا ہوا ہوتا ہے، جب اس کو دباتے ہیں تو اس کی وجہ سے ہوا پیدا ہوتی ہے، اور آگے بھٹی میں کوئلے ہوتے ہیں، وہ ہوا ان پر پڑتی ہے جس کی وجہ سے اس کی آگ تیز ہوتی رہتی ہے، اور جس وقت وہ ہوا آگے بڑھتی ہے تو چنگاریاں اُڑتی ہیں اور دھواں بھی اُٹھتا ہے۔ اگر کہیں کسی لوہار کی بھٹی کا منظر آپ نے دیکھا ہو، تو وہ اسی طرح کا ہوتا ہے۔

تو بری صحبت کی مثال بھٹی جھونکنے والے لوہار جیسی ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ جس وقت بھٹی کو جلانے کے لیے وہ چمڑے کا ٹکڑا دبا رہا ہوگا تو جو چنگاریاں اُڑیں گی اس میں سے ایک آدھ چنگاری اگر آپ کے کپڑوں میں لگ گئی تو کپڑے جلا دے گی، یا اگر ایسا نہیں ہوا تو کم سے کم اس کا دھواں تو کہیں گیا ہی نہیں، وہ تو آپ کی ناک میں پہنچ کر ہی رہے گا۔ ایسے ہی برے آدمی کی صحبت میں جب بیٹھیں گے تو اس کی ہم نشینی سے آپ کو نقصان ضرور پہنچے گا۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی کو اچھی صحبت اختیار کرنی چاہیے۔

صحبت کا کردار......ابو مسلم خولانیؒ کا قصہ

اس زمانہ میں عام طور پر آدمی کے بنانے اور بگاڑنے میں صحبت ہی کو بڑا دخل ہے، اسی لیے اپنے لیے بھی اور اپنے گھر والوں کے لیے بھی، اپنے بال بچوں کے لیے بھی، چھوٹوں بڑوں ہر ایک کے لیے اس بات کا اہتمام کیا جائے کہ وہ اچھی صحبت اختیار کریں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنے آپ کو یا اپنے بال بچوں اور گھر والوں کو بری صحبت سے بچانے کا اہتمام نہیں کرتا، تو چاہے آپ اس کو کتنی ہی تعلیم دے ڈالیں، کبھی بھی اس کی حالت درست ہونے والی نہیں ہے، وہ اپنی اسی برائی پر باقی رہے گا۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ ذرا سی دیر میں آدمی پر اثر ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو مسلم

خولانیؒ تابعین میں بہت بڑے بزرگ گذرے ہیں، مستجاب الدعوات تھے۔ان کا معمول یہ تھا کہ اپنے گھر میں جب تشریف لایا کرتے تھے تو گھر میں داخل ہونے سے پہلے باہر ہی سے اللہ اکبر کہتے تھے۔ان کی بیوی بھی جواب میں اللہ اکبر کہتی تھی۔ایک روز ایسا ہوا کہ رات کے وقت آئے اور اللہ اکبر کہا لیکن اندر سے جواب نہیں آیا تو فوراً کہا کہ میری بیوی کا دماغ کسی نے خراب کیا ہے۔اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔جب یہ اندر پہنچے تو ان کے پہنچتے ہی بیوی نے شکایت شروع کر دی کہ آپ میرے لیے زیور تو بنواتے نہیں، اچھے کپڑے تو بنواتے نہیں۔وہ سمجھ گئے کہ اس عورت کے آنے کی وجہ سے یہ ہوا ہے۔انہوں نے ہاتھ اُٹھائے اور دعا کی کہ اے اللہ! میری بیوی کا دماغ جس نے خراب کیا ہے اس کی بینائی چھین لے۔وہ عورت جو وہاں بیٹھی ہوئی تھی وہ کہنے لگی کہ تمہارا چراغ بجھ گیا۔اس سے کہا گیا کہ چراغ تو جل رہا ہے لیکن تیری آنکھوں کی روشنی ختم ہوگئی ہے۔اب وہ رونے لگی اور ان سے دعا کی درخواست کرنے لگی۔انہوں نے کہا کہ یہ وعدہ کر کہ آئندہ کبھی میرے گھر میں قدم نہیں رکھے گی، تب ہی دعا کروں گا۔اس نے وعدہ کیا، تو انہوں نے دعا کی کہ اے اللہ! اس کی بینائی واپس کر دے۔اللہ تعالیٰ نے وہ دعا بھی قبول فرمالی۔اور اس کو گھر سے رخصت کیا۔

عجیب شیخِ کامل کی صحبت کا اثر

حضرت تھانویؒ کے مواعظ میں ہے کہ ایک ڈپٹی کلکٹر صاحب تھے، ان کو جو تنخواہ ملتی تھی، وہ اس تنخواہ کا بڑا حصہ اپنے رشتہ داروں اور غریب غرباء پر خرچ کرتے تھے، گھر میں بڑی سادگی تھی۔بیوی کے پاس کوئی زیور بھی نہیں تھا، بالکل سادہ کپڑوں میں رہتی تھی اور گھر کا کام کاج بھی خود ہی کرتی تھی۔سالہا سال سے اسی طرح ٹھیک

ٹھاک معاملہ چل رہا تھا۔ایک مرتبہ ان کے دور کے کسی رشتہ دار کے یہاں شادی تھی، وہاں سے دعوت آئی تو وہ وہاں پہنچی۔ان کے گھر کا حال جب اس نے دیکھا کہ وہاں تو ایسا ساز وسامان ہے اور نوکر چاکر ہیں، خادمائیں بھی ہیں اوران کی بیوی کو دیکھا کہ زیورات بھی خوب پہنے ہوئے ہیں۔حالانکہ سرکاری گریڈ اور ملازمت کے اعتبار سے وہ کم درجہ میں کام کرتے تھے۔اور اِن کا گریڈ اُن سے بہت اونچا تھا۔بس! وہاں سے آتے ہی وہ شوہر کے سر چڑھ گئی کہ آپ نے تو آج تک مجھے کچھ دیا ہی نہیں، اور وہاں دیکھو کہ گریڈ اور ملازمت کے اعتبار سے وہ آپ سے بہت کم درجے کے ہیں، اس کے باوجود زیورات بھی ہیں اور کپڑے بھی اچھے اچھے ہیں، نوکرانیاں اور خادمائیں بھی ہیں، گھر میں ساز وسامان بھی اچھے سے اچھا ہے۔پھر تو وہ ایسی ان پر مسلط ہوئی کہ بے چارے زندگی بھر روتے رہے کہ میں اب تک جو نیکیاں کرتا رہا وہ سب ختم ہوگئیں۔ اب تو سارے پیسے اس کے پیچھے ہی خرچ ہو جاتے ہیں۔حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ عجیب شیخِ کامل کی صحبت تھی کہ ایک ہی نظر میں ساری زندگی کا دھارا بدل دیا۔

تو حقیقت یہ ہے کہ بری صحبت بہت ہی خطرناک چیز ہے۔آج کل ہم لوگوں کو اپنے اور اپنے گھر والوں، بال بچوں کے متعلق اس کا خاص اہتمام کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے ان چیزوں کی طرف توجہ کیجیے۔بہت سے لوگ سوچتے ہیں اور کوششیں کرتے ہیں پھر بھی اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو صحبتیں میسر آتی ہیں اور جو ماحول ملتا ہے، وہ سدھرنے نہیں دیتا۔ بلکہ سدھرے ہوئے کو بگاڑ دیتا ہے۔

کیا دیکھ کر لڑکی پسند کی جائے؟

٣٦٤: وعن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسولُ اللّٰهِ ﷺ: تُنكَحُ الْمَرْأَةُ

لِأَرْبَعٍ؛ لِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِحَسَبِهَا وَلِدِيْنِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورت کے ساتھ چار باتوں میں سے کسی ایک کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، یا چاروں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

(۱) لِمَالِهَا: بہت سے لوگ عورت کو پسند کرنے میں اس کے مال کو سامنے رکھتے ہیں کہ یہ مال دار ہے، اگر ہم اس کے ساتھ نکاح کریں گے تو اس کے مال سے ہمیں فائدہ پہنچے گا، اس کی مالداری والی خوبی کو دیکھ کر اس کو ترجیح دیتے ہیں۔

(۲) لِجَمَالِهَا: اور کبھی اس کی خوبصورتی کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

(۳) لِحَسَبِهَا: خاندانی شرافت کی وجہ سے۔ اونچے گھرانے کی لڑکی ہے، ہم اگر اس کے ساتھ شادی کریں گے تو ہماری کیٹیگری اور ہمارا مقام بھی بڑھ جائے گا، یہ سمجھ کر اس کے ساتھ نکاح کرتے ہیں، چاہے پھر زندگی بھر اس کی غلامی کرنی پڑے

(۴) لِدِيْنِهَا: اور کبھی اس کی دینداری، نیکی اور صلاح کی وجہ سے اس سے نکاح کیا جاتا ہے۔ تو یہ چار خوبی ہوئیں۔

عام طور پر ان چار میں سے کسی ایک خوبی کو دیکھ کر آدمی اپنے نکاح کے لیے عورت کو پسند کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ ان چاروں کو بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ تم تو دیندار عورت کو اپنے نکاح کے لیے اختیار کر کے کامیابی حاصل کرو۔ گویا ان چار اوصاف میں سے کون سا وصف مدنظر رکھنا چاہیے، یہ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو بتا دیا اس لیے کہ ہمیں ایک دو دن اس کے ساتھ نہیں گزارنے ہیں، بلکہ نکاح تو پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ اب مال کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ وہ کب تک باقی رہے گا

مال کے متعلق عربی میں کہاوت ہے ''اَلْمَالُ غَادٍوَرَاحٍ'' صبح کو آتا ہے، شام کو جاتا ہے شام کو آتا ہے اور صبح کو جاتا ہے۔ بہت سے مال وثروت والے دیکھے ہوں گے کہ جو صبح کو مالدار ہیں اور کوئی قدرتی آفت ایسی آگئی کہ شام کو سارا مال ختم ہوگیا۔ اس لیے یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے اس کو ترجیح دی جائے۔

اسی طریقہ سے اگر خاندان کی وجہ سے بھی کوئی آدمی نکاح کرتا ہے تو جو زندگی دونوں میاں بیوی ہونے کی حیثیت گزاریں گے اس پر اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ اگر یہ بات ہے کہ خاندانی عورت ہے تو شریف ہوگی، تو پھر تو وہی دین داری والا مسئلہ آگیا، درحقیقت صرف اونچے خاندان والا ہونے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اور رہی خوبصورتی؛ تو اس کا حال تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ اگر بیماری آگئی، یا آٹھ روز تک بخار نے ڈیرا ڈال دیا اور تھوڑے دست بھی آگئے تو ساری خوبصورتی ختم ہوجائیگی۔ اور بوڑھاپا تو آنے ہی والا ہے جو جوانی کی ساری خوبصورتی کو ختم کردے گا

اصل چیز دین داری ہے کہ جس میں حقوق کی ادائیگی کا اہتمام ہو، باقی اگر کوئی عورت دین دار بھی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اِن اوصاف میں سے کوئی وصف بھی ہے تو نورٌ علیٰ نور۔ لیکن جب مقابلہ ہو کہ ایک طرف کوئی عورت ایسی مل رہی ہے جو صرف خوبصورت ہے، لیکن دین دار نہیں ہے، اور دوسری ایسی ہے کہ جو دین دار ہے لیکن اتنی زیادہ خوبصورت نہیں ہے۔ تو پھر ہم کو نبی کریم ﷺ کی تعلیم یہ بتلاتی ہے کہ اگر ترجیح دینے کا وقت آئے تو آپ دین دار کو خوبصورت کے مقابلہ میں ترجیح دیجئے۔ باقی اگر کوئی عورت خوبصورت بھی ہے اور دین دار بھی ہے، اور دوسری صرف دین دار ہے تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ جس میں دو وصف ہیں اس کو اگر آپ ترجیح دیں، تو اس میں کوئی

حرج کی بات نہیں ہے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ جس کے ساتھ آپ کو پوری زندگی گزارنی ہے، جس کی رفاقت اور صحبت آپ زندگی بھر کے لیے اختیار کرنے جارہے ہیں، وہاں پر آپ کو چاہیے کہ نیکی کو دیکھیں، نیک لوگوں کی صحبت میں یہ چیز بھی آجاتی۔

آپ کیوں زیادہ نہیں آتے؟

٣٦٥: وعن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لجبريل: مايمنعك أن يزورنا أكثر مماتزورنا؟ فنزلت: ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا﴾ (رواه البخاری)

ترجمہ مع تشریح: حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ میرے پاس جتنا آتے ہیں، اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ (دراصل ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے آنے میں دیر ہوئی۔ مختلف روایتیں ہیں، آٹھ روز، پندرہ دن تک نہیں آئے، اور چالیس روز کی بھی روایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک طویل زمانہ تک حضرت جبرئیل علیہ السلام نہیں آئے اور نبی کریم ﷺ ان کی آمد کا انتظار فرماتے تھے۔ جب آئے تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں تو آپ کی زیارت و دیدار اور ملاقات کا مشتاق و منتظر تھا، آپ نے دیر کیوں کردی؟) تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا کہ میں بھی آپ کی زیارت و ملاقات کا مشتاق تو تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی اجازت اور حکم کے بغیر نہیں آسکتا۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل سے یہی کہا ہے کہ آپ ان کو جواب میں یہ کہو ﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا﴾ کہ ہم آپ کے پاس نہیں آسکتے مگر اللہ تعالیٰ کے

حکم سے۔ وہی ہمارے آگے اور پیچھے اور جو سامنے ہے اس سب کا مالک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ آپ کی زیارت کا شوق تو مجھے بھی ہے جیسا آپ کو ہے، لیکن میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر نہیں آسکتا۔ ابھی تک حکم نہیں ملا تھا تو نہیں آیا، اب آج حکم ملا تو حاضر ہوا ہوں۔

بہرحال! یہاں تو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! نبی کریم ﷺ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی زیارت کے مشتاق تھے۔ گویا آپ ﷺ کو ایک مدت تک طلب رہی کہ کب جبرئیل آویں اور ملاقات ہو۔ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کا صلحاء میں سے ہونا ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ تو جب حضور اکرم ﷺ بھی اس چیز کو چاہتے ہیں کہ صالح لوگوں کی صحبت میسر آئے، حالانکہ آپ ﷺ تو کامل بھی تھے اور مکمِّل بھی تھے، اس کے باوجود آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی صحبت کے خواہش منداور متمنی ہیں۔ تو اب تو ہر ایک آدمی کو صلحاء اور نیک لوگوں کی صحبت کا متمنی اور مشتاق ہونا چاہیے، اور ان کی زیارت کا اہتمام کرنا چاہیے۔

دوستی صرف ایمان والوں سے کرو

۳٦٦: عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال: لَاتُصَاحِبْ اِلاَّ مُؤْمِناً وَلَا يَأْكُلْ طَعَامَكَ اِلاَّ تَقِيٌّ. (رواہ ابوداود والترمذی باسناد لابأس بہ)

ترجمہ: حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ (مصاحبت، رفاقت اور) دوستی اختیار مت کرو مگر اس کی جو مؤمن (یعنی کامل الایمان) ہو۔ اور تمہارا کھانا (یعنی محبت والا) نہ کھاویں مگر نیک لوگ۔

افادات: حاجت والا کھانا تو ہر ایک کو کھلایا جاسکتا ہے، لیکن دوستی کی بنیاد پر آپ جو دعوت کریں وہ نیکوں کی ہی کرنی چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ جب آدمی نیکوں سے ہی دوستی کا اہتمام کرے گا تو دوستی کے نام پر دعوت بھی انہیں کی کرے گا۔ اور اگر

بروں سے دوستی کرے گا تو دوستی کے نام پر انہی کی دعوت کرنے کی نوبت آئے گی۔ باقی حاجت اور ضرورت کی وجہ سے جو کھانا کھلایا جاتا ہے، اس میں مؤمن کی بھی قید نہیں ہے، بلکہ کافر بھی اگر ضرورت مند ہے تو اس کو بھی کھلایا جائے گا۔ اسی طریقہ سے مؤمن میں بھی اگر ضرورت مند فاسق ہے، اور ضرورت مند ہونے کی بنیاد پر کھانا کھلا رہے ہیں تو وہاں یہ نہیں دیکھیں گے کہ وہ کیسا آدمی ہے، نماز پڑھتا ہے یا نہیں۔ وغیرہ۔

اس جگہ علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ تمہارا اطعامِ محبت، دوستی کی بنیاد پر کھلایا جانے والا کھانا نیکوں کے علاوہ اور کوئی نہ کھائے۔

انسان اپنے دوست کے طریقہ پر ہوتا ہے

۳٦۷: عَنْ أَبِی هریرةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَلرَّجُلُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ أَحَدُکُمْ مَنْ یُّخَالِلُ۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقہ، اس کے دین اور روش پر ہوتا ہے۔ (یعنی آدمی کی چال ڈھال بھی وہی ہوتی ہے جو اس کے دوست کی ہوتی ہے۔) اس لیے آدمی دیکھ لے کہ کس کے ساتھ دوستی کرتا ہے۔

افادات: بھائی! کسی کو آپ پہچاننا چاہیں کہ اس کا مزاج کیسا ہے؟ تو یہ دیکھ لیجئے کہ وہ کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے، اس کی طبیعت کا میلان ورجحان کن لوگوں کی طرف ہے، وہ کدھر جھکتا ہے؛ اسی سے اس کی طبیعت اور مزاج کا اندازہ ہو جائے گا۔ قرآنِ پاک میں بھی ہے ﴿وَلَا تَرْکَنُوْا اِلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّکُمُ النَّارُ﴾ جو گنہگار لوگ ہیں ان کی طرف نہ جھکو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کو بھی جہنم کی آگ پکڑ لے۔ جب ان پر عذاب آئے گا تو وہ تم کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیں گے۔ بہر حال! آدمی اپنے دوست ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے ہر آدمی کو چاہیے کہ نیک لوگوں ہی کی

دوستی اختیار کرے، برے لوگوں کے ساتھ دوستی نہ کرے۔

حشر بھی محبت والوں کے ساتھ ہوگا

٣٦٨: عَنْ أَبِی مُوسیٰ الأَشعرِیّ ﷛ أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ. وفی روایة: قیل لِلنبِیِّ ﷺ: اَلرَّجُلُ یُحِبُّ الْقَوْمَ وَلَمَّا یَلْحَقْ بِهِمْ؟ قَالَ: اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ۔

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری ﷛ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی کو نیک لوگوں کے ساتھ محبت و تعلق ہے لیکن ابھی تک وہ نیکی کے اس معیار پر نہیں پہنچا کہ ان کو پالے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی ان لوگوں کے ساتھ رہے گا جن کے ساتھ محبت رکھتا ہے۔

افادات: ''وَلَمَّا یَلْحَقْ بِهِمْ'' عربی زبان میں لفظ ''لَمَّا'' اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کہ کوئی چیز ابھی تک واقع نہ ہوئی ہو، لیکن اس کے واقع ہونے کی امید ہو۔ جیسے کوئی پوچھے: ''أَجَاءَ زَیْدٌ؟'' زید آیا؟ تو اگر یہ کہیں ''لَمَّا یَأْتِ'' ابھی تک تو نہیں آیا۔ یعنی آنے کی امید ہے۔

اسی طرح ایک آدمی نیک، صلحاء اور اللہ والوں کے ساتھ محبت رکھتا ہے، لیکن ابھی تک اس کا عمل اس درجہ کا نہیں ہوا کہ ان تک پہنچ جائے، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس کی اس محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو بھی ان کے ساتھ رکھیں گے۔ اس لیے آدمی کو محبت کا تعلق بھی نیکوں کے ساتھ ہی رکھنا چاہیے۔ بروں کے ساتھ نہیں۔

محبت ہے لیکن عمل اس درجہ کا نہیں

٣٦٩: عَن أَنَسٍ ﷛ أَنَّ أَعـرَابِیًّـا قالَ لِرَسُولِ اللهِ ﷺ: مَتَى السَّاعَةُ؟

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَـا أَعْدَدْتَ لَهَا؟ قَالَ: حُبُّ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ، قَالَ: أَنْتَ مَعَ مَنْ أَحْبَبْتَ. (متفق عليه)

وفـي رواية: مَـا أَعْدَدْتُ لَهَا مِنْ كَثِيْرِ صَوْمٍ، وَلَا صَلَاةٍ، وَلَا صَدَقَةٍ؛ لٰكِنَّنِيْ أُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ.

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دیہات کا ایک رہنے والا حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا، اور اس نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! قیامت کب آئے گی؟ حضور ﷺ نے پوچھا کہ تو نے اس کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے اس کے لیے کوئی زیادہ روزے یا نمازیں اور صدقہ وخیرات تو نہیں کر رکھے ہیں، لیکن ہاں! میں اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تو انہیں لوگوں کے ساتھ رہے گا۔

افادات: یعنی تو جنت میں ان کے ساتھ جائے گا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ مقام جو جنت میں حضور اکرم ﷺ کو ملے گا وہی اس کو بھی ملے گا۔ اس مقام کو تو کون پا سکتا ہے، لیکن اس کے لیے اس جگہ جانے کا فیصلہ ہو جائے گا۔

سب کا کام بن گیا

اب ایک بات یہ ہے کہ محبت کی علامت بھی پائی جانی چاہیے۔ اسی لیے امام بخاریؒ نے یہ روایت اپنی کتاب الجامع الصحیح بخاری شریف میں جہاں بیان فرمائی ہے اس باب کا عنوان قائم کیا ہے ﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ تم میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ خالی زبانی دعویٰ کافی نہیں ہے۔ ایک تو زبانی دعویٰ ہوتا ہے اور ایک اس کی حقیقت ہوتی ہے۔ کوئی آدمی جب کوئی دعویٰ کرتا ہے تو پھر اس کی علامتیں بھی دیکھی جاتی ہیں۔ تو اس کی علامت یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی پیروی اختیار کرے۔ تو اس

دیہاتی سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تو جس سے محبت کرتا ہے اسی کے ساتھ رہے گا۔

اس لیے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب حضور اکرم ﷺ کا یہ جواب سنا کہ ''تو جس سے محبت کرتا ہے اس کے ساتھ رہے گا''تو یہ سن کر صحابہ کو اتنی خوشی ہوئی کہ کسی اور چیز سے اتنی خوشی نہیں ہوئی تھی (بخاری شریف۔۳۶۸۸) اس لیے کہ تمام صحابہ کو حضور اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت تھی۔ گویا یہ جواب سن کر سب خوش ہو گئے کہ اب تو ہم سب کا کام بن گیا۔

کوشش کرتا رہے

۳۷۰:وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: جَاءَ رَجُلٌ اِلٰی رَسولِ اللّٰہِ ﷺ، فقال: یارسولَ اللّٰہ! کَیُفَ تَقُوُلُ فِیُ رَجُلٍ أَحَبَّ قَوُمًاوَلَمُ یَلُحَقُ بِھِمُ؟فقال رسولُ اللّٰہِ ﷺ: اَلُمَرُءُ مَعَ مَنُ أَحَبَّ۔

ترجمہ:ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اس آدمی کے سلسلہ میں کیا ارشاد فرماتے ہیں جو کچھ لوگوں سے محبت رکھتا ہے لیکن وہ ابھی تک اپنے عمل کی وجہ سے اس مقام تک پہنچ نہیں سکا (نیکی اور بزرگی کے جس درجہ کے وہ لوگ ہیں، یہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچا) تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ آدمی انہیں کے ساتھ رہے گا جن سے محبت رکھتا ہے

افادات: جب اللہ والوں اور نیک وصلحاء کے ساتھ تعلق اور محبت ہوتی ہے تو کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ ہمارا عمل تو اس درجہ کا نہیں ہے، پتہ نہیں کچھ فائدہ ہوگا یا نہیں۔تو آدمی کو چاہیے کہ کوشش کرتا رہے، اس کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد اس کی تسلی کے لیے کافی ہے۔

اوصاف فطری ہوتے ہیں

۳۷۱:وَعَنُ أَبِیُ هُریرةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ:اَلنَّاسُ مَعَادِنُ کَمَعَادِنِ

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ: خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا، وَالْأَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ، فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا ائْتَلَفَ، وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اخْتَلَفَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگ ایسی کانوں کی طرح ہیں جیسے سونے اور چاندی کی کانیں ہوتی ہیں۔ جو لوگ زمانہ جاہلیت میں (یعنی اسلام کے آنے سے پہلے) شریف، اچھے اور اونچے سمجھے جاتے تھے (گویا خاندانی شرافت ان کے لیے مسلّم تھی تو) اسلام میں بھی وہ ایسے ہی سمجھے جائیں گے۔ (البتہ ایک) شرط یہ ہے کہ وہ دین کی سمجھ حاصل کرلیں (تو گویا یہ چیز ان کی اور زیادہ پختہ ہو جائے گی۔) اور اللہ تعالیٰ نے روحیں مختلف جماعتوں میں پیدا کی ہیں، پہلے روز جن روحوں میں آپس میں تعلق اور دوستی ہوئی، دنیا میں بھی ان میں تعلق ہوگا، اور جن روحوں میں وہاں تعلق پیدا نہیں ہوا، یہاں بھی ان میں تعلق پیدا نہیں ہوگا۔

افادات: کان کو گجراتی میں (ખાણ) اور انگریزی میں (Maeiled) کہا جاتا ہے۔ یعنی جیسے سونے چاندی کی کانیں ہوتی ہیں ایسے ہی لوگوں کا حال ہے۔ سونے چاندی کی کان کا مطلب یہ ہے کہ قدرتی طور پر زمین کے جس خطہ میں سونا نکلتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے زمین کے اس حصہ میں یہ صلاحیت اسی دن سے رکھ دی ہے جس دن زمین کو پیدا کیا تھا۔ تو جس طرح مختلف چیزوں کی کانیں ہوتی ہیں اسی طریقہ سے لوگوں کا حال بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں میں مختلف صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تو انسانوں کے اندر جتنے بھی اوصاف اور خوبیاں ہوتی ہیں وہ بھی گویا ایک فطری چیز ہے۔

جسموں کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے روحیں پیدا فرمائیں، جسم تو دنیا میں آنے کے وقت وجود میں آئے گا۔ دنیا تو معلوم نہیں کب سے چل رہی ہے اور کب تک چلے گی، اور ہر ایک کے لیے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آنے کا ایک وقت مقرر کیا ہے اس وقت وہ آئے گا اور جانے کا جو وقت مقرر کیا ہے اس وقت ہ جائے گا، لیکن جس وقت کائنات کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اس وقت سے روحیں پیدا کی ہیں۔

باہم مناسبت وعدم مناسبت پہلے دن سے ہے

تو اس پہلے روز جن روحوں میں آپس میں تعلق اور دوستی ہوئی، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت اور اُنس پیدا ہوا، دنیا میں بھی ان کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا۔ اور جن روحوں میں وہاں عالَمِ ارواح میں تعلق پیدا نہیں ہوا، یہاں دنیا میں بھی ان میں تعلق پیدا نہیں ہوگا۔ بعض مرتبہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک آدمی آتا ہے، پہلی مرتبہ ملاقات ہوتی ہے اور ایسا تعلق ہو جاتا ہے جیسے برسہا برس سے ہو۔ دراصل وہ اسی تعلق کا اثر ہوتا ہے جو عالَمِ ارواح میں روحوں میں قائم ہوا تھا۔ اور بعضا ایسے ہوتے ہیں کہ زندگی بھر ایک ساتھ رہتے ہیں، مثلاً سالہا سال سے ایک ہی آفس میں کام کر رہے ہیں لیکن آپس میں بات کرنے کی بھی نوبت نہیں آتی، دونوں میں سے کسی کو دوسرے کی پڑی ہی نہیں ہوتی۔ وہ بھی دراصل اسی کا اثر ہے کہ طبیعتوں میں مناسبت نہیں ہے۔

حضرت اویس قرنیؒ کے مناقب

٣٧٢: وعن أُسَيرِ بن عَمرٍو -ويُقَالُ ابنُ جابر وَهُوَ بِضَمِّ الْهَمْزَةِ وَفَتْحِ السِّيْنِ الْمُهْمَلَةِ- قَالَ: كَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ إِذَا أَتىٰ عَلَيْهِ أَمْدَادُ أَهلِ الْيَمَنِ سَأَلَهُمْ: أَفِيكُمْ أُوَيسُ بنُ عَامِرٍ؟ حَتىٰ أَتىٰ عَلىٰ أُوَيسٍ، فَقَالَ لَهٗ: أَنْتَ أُوَيسُ بنُ عَامِرٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: مِنْ مُرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرْنٍ؟ قَالَ: نَعَمْ قَالَ: فَكَانَ بِكَ بَرَصٌ فَبَرِأْتَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعَ دِرْهَمٍ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: لَكَ وَالِدَةٌ؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: "يَأْتِي عَلَيْكُمْ أُوَيسُ بنُ عَامِرٍ مَعَ أَمْدَادِ أَهْلِ الْيَمَنِ مِنْ مُرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرْنٍ، كَانَ بِهٖ بَرَصٌ فَبَرِأَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعَ دِرْهَمٍ، لَهٗ وَالِدَةٌ، هُوَ بِهَا بَرٌّ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ، فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَسْتَغْفِرَ

لَكَ فَافْعَلْ" فَاسْتَغْفِرْ لِيْ، فَاسْتَغْفَرَ لَهٗ. فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ: أَيْنَ تُرِيْدُ؟ قَالَ: اَلْكُوْفَةَ، قَالَ: أَلَا أَكْتُبُ لَكَ إِلٰى عَامِلِهَا؟ قَالَ: أَكُوْنُ فِيْ غَبْرَاءِ النَّاسِ أَحَبُّ إِلَيَّ. فَلَمَّا كَانَ مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ حَجَّ رَجُلٌ مِنْ أَشْرَافِهِمْ فَوَافٰى عُمَرَ، فَسَأَلَهٗ عَنْ أُوَيْسٍ، فَقَالَ: تَرَكْتُهٗ رَثَّ الْبَيْتِ قَلِيْلَ الْمَتَاعِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "يَأْتِيْ عَلَيْهِمْ أُوَيْسُ بْنُ عَامِرٍ مَعَ أَمْدَادِ مِنْ أَهْلِ الْيَمَنِ، مِنْ مُرَادٍ ثُمَّ مِنْ قَرَنٍ، كَانَ بِهٖ بَرَصٌ فَبَرَأَ مِنْهُ إِلَّا مَوْضِعَ دِرْهَمٍ، لَهٗ وَالِدَةٌ، هُوَ بِهَا بَرٌّ لَوْ أَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهٗ، فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ يَّسْتَغْفِرَ لَكَ فَافْعَلْ"، فَأَتٰى أُوَيْساً، فَقَالَ: اِسْتَغْفِرْ لِيْ، قَالَ: أَنْتَ أَحْدَثُ عَهْداً بِسَفَرٍ صَالِحٍ فَاسْتَغْفِرْ لِيْ، قَالَ: لَقِيْتَ عُمَرَ؟ قَالَ: نَعَمْ، فَاسْتَغْفَرَ لَهٗ، فَفَطِنَ لَهُ النَّاسُ فَانْطَلَقَ عَلٰى وَجْهِهٖ. (رواه مسلم)

وفي رواية لمسلم أيضا: عَنْ أَسِيْرِ بْنِ جَابِرٍ أَنَّ أَهْلَ الْكُوْفَةِ وَفَدُوْا عَلٰى عُمَرَ وَفِيْهِمْ رَجُلٌ مِّمَّنْ كَانَ يَسْخَرُ بِأُوَيْسٍ، فَقَالَ عُمَرُ: هَلْ هَاهُنَا أَحَدٌ مِّنَ الْقَرْنِيِّيْنَ؟ فَجَاءَ ذٰلِكَ الرَّجُلُ، فَقَالَ عُمَرُ إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَدْ قَالَ: "إِنَّ رَجُلاً يَأْتِيْكُمْ مِنَ الْيَمَنِ يُقَالُ لَهٗ أُوَيْسٌ، لَايَدَعُ بِالْيَمَنِ غَيْرَ أُمٍّ لَهٗ، قَدْ كَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَدَعَا اللّٰهُ تَعَالٰى فَأَذْهَبَهُ إِلَّا مَوْضِعَ الدِّيْنَارِ أَوِ الدِّرْهَمِ، فَمَنْ لَقِيَهٗ مِنْكُمْ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ".

وفي رواية له عَنْ عُمَرَ رضي الله عنه قَالَ: إِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: "إِنَّ خَيْرَ التَّابِعِيْنَ رَجُلٌ يُقَالُ لَهٗ أُوَيْسٌ، وَلَهٗ وَالِدَةٌ، وَكَانَ بِهٖ بَيَاضٌ فَمُرُوْهُ فَلْيَسْتَغْفِرْ لَكُمْ".

ترجمہ مع تشریح: حضرت اُسیر بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جب یمن کے لوگ کمک کے لیے آتے تھے (اس زمانہ میں اسلامی لشکر جو

مختلف علاقوں میں بھیجے جاتے تھے، ان لشکروں کو مدد پہنچانے کے لیے اسلامی سلطنت کے مختلف علاقوں سے لوگ امیر المؤمنین کی خدمت میں مدینہ منورہ آتے تھے، اور عرض کرتے تھے کہ آپ جہاں چاہیں ہمیں اسلامی لشکر کی مدد کے واسطے بھیجئے۔ تو جس جس مورچہ اور محاذِ جنگ پر ضرورت ہوتی تھی وہاں ان کو بھیجا جاتا تھا۔ تو اس قسم کے لوگ اسلامی لشکر کو مدد پہنچانے کے لیے جب یمن سے آتے تھے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے پوچھتے تھے کہ کیا تمہارے درمیان حضرت اویس بن عامر ہیں؟ یہاں تک کہ جب یمن والوں کا وہ قافلہ مدینہ منورہ پہنچا جس میں حضرت اویس تھے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہی سے پوچھا کہ کیا تم اویس ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر پوچھا کہ تمہارا تعلق یمن کے قبیلۂ مراد سے ہے؟ اور قبیلۂ مراد کی شاخ قرن سے ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر پوچھا: کیا تمہارے جسم میں سفید داغ تھے اور تم نے اس کے اچھا ہونے کی دعا کی تھی جس کی وجہ سے جسم کے سارے داغ اچھے ہوگئے، صرف ایک درہم کے برابر داغ تمہارے جسم پر باقی رہ گیا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ پھر پوچھا: تمہاری والدہ بھی ہیں؟ کہا: جی ہاں! ہیں۔ پھر کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے پاس یمن سے آنے والے قافلوں میں اویس بن عامر آئیں گے، جن کا تعلق قبیلۂ مراد کی شاخ قرن سے ہے اور ان کو برص تھا اور وہ سوائے ایک روپیہ جتنی جگہ کے اچھا ہوگیا، اور ان کی ماں بھی ہے جن کی یہ بڑی خدمت کرتے ہیں۔

(بلکہ آپ اندازہ لگائیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے، اسلام لا چکے تھے اور دل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کی تمنا تھی، لیکن والدہ کو خدمت کی ضرورت تھی اس وجہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر نہیں ہوسکے، اور صحابیت

کا شرف حاصل نہ کر پائے۔ آج اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ نبی کریم ﷺ فلاں جگہ تشریف فرما ہیں تو کون ہے جو وہاں جانے کی کوشش نہیں کرے گا؟ ان کے دل میں بھی تمنا تھی لیکن والدہ کی خدمت کی وجہ سے وہ اپنا وطن اور گھر نہیں چھوڑ سکتے تھے، اس لیے نہیں جا پائے، تو حضور اکرم ﷺ نے ان کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پوری تفصیل بتلا دی۔)

(اور اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا مقام یہ ہے کہ) اگر اللہ کا نام لے کر کسی بات پر قسم کھا لیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دے گا (پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ کہا کہ) اگر تم ان سے دعاءِ مغفرت کرواسکو تو کروالینا (یعنی تمہاری ملاقات ہو اور موقع ملے تو ان سے اپنے لیے دعاءِ مغفرت ضرور کرانا۔ (جب وہ آئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوری تفصیل دریافت فرمالی اور تحقیق ہوگئی کہ یہی حضرت اویس قرنی ہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا اور کہا کہ) میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجئے۔

(دیکھو! نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید کی، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقام اس امت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد آتا ہے۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہی ہے، اس کے باوجود حضور اکرم ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تاکید فرماتے ہیں کہ جب وہ آئیں تو ان سے اپنے لیے دعاءِ مغفرت ضرور کرانا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اونچے درجہ والا ہو اس کو بھی دوسرے سے- جو چاہے اپنے سے کم درجہ والا ہو، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو اس سے- اپنے لیے دعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ کوئی بھی یہ نہ سمجھے کہ میں اونچے مقام والا ہوں، مجھے دوسرے سے دعا کی درخواست کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

(بہر حال! حضرت عمر نے ان سے دعا کی درخواست کی) تو حضرت اویس قرنی (سمجھتے تھے کہ یہ چھوڑیں گے نہیں، اس لیے) نے ان کے لیے دعاءِ مغفرت کی۔

چٹھی نہیں لکھوائی

(اس کے بعد) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کہاں کا ارادہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوفہ جانے کا ارادہ ہے۔ (یمن سے آئے تھے اور کوفہ جو عراق میں واقع ہے وہاں جانے کا ارادہ تھا، وہ بتلایا) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تمہارے لیے کوفہ کے گورنر کے نام چٹھی لکھ دوں؟ (دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود سامنے سے ان سے پوچھ رہے ہیں، حالانکہ وہ ایسے آدمی نہیں تھے کہ اصولی طور پر ایسی بات پوچھیں لیکن چوں کہ اویس قرنی کا خاص مقام تھا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ چٹھی لکھ دوں تاکہ وہ تمہاری ضرورتوں کا خیال رکھے) تو انہوں نے فرمایا کہ میں عام لوگوں میں رہوں یہ مجھے زیادہ پسند ہے، اس لیے کوئی چٹھی نہ لکھیے، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ (اگر آپ چٹھی لکھ دیں گے تو گورنر صاحب میرے لیے خاص اہتمام کریں گے، تو گویا میں بھی (VIP) ہو جاؤں گا، اور میں (VIP) بننا نہیں چاہتا، میں تو وہاں جا کر عام لوگوں میں زندگی گزاروں، یہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ چنانچہ چٹھی نہیں لکھوائی۔ اب یہ تو کوفہ چلے گئے اور وہاں رہنے لگے۔ کوفہ والوں کو معلوم نہیں تھا کہ ان کا مقام کیا ہے۔)

خیر! دوسرے سال حج کے موقع پر کوفہ کے رہنے والوں میں سے ایک بڑا آدمی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا، اور اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے حضرت اویس کے متعلق پوچھا کہ اویس کا کیا حال ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں نے ان کو دیکھا کہ معمولی مکان میں بہت قلیل سامان کے ساتھ رہتے ہیں۔

تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس آدمی سے کہا کہ (اویس کس مقام کے آدمی ہیں؛ یہ تمہیں معلوم ہے؟) میں نے نبی کریم رضی اللہ عنہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارے پاس یمن سے آنے والے قافلوں میں اویس بن عامر آئیں گے، جن کا تعلق قبیلۂ مراد کی شاخ قرن سے ہے اور ان کو برص تھا اور ان کا وہ برص سوائے ایک روپیہ جتنی جگہ کے اچھا ہو گیا، اور ان کی ماں بھی ہے جن کی یہ بڑی خدمت کرتے ہیں۔ اللہ کے یہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر وہ اللہ کا نام لے کر کسی بات پر قسم کھالیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری کر دے۔ اور مجھے حضور رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ تم ان سے اپنے لیے دعاءِ مغفرت کرا سکو تو کرا لینا۔

شہرت کی زندگی پسند نہ کی

(یہ ساری بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ کے اس آدمی کو بتائی) چنانچہ یہ آدمی جب حج سے واپس گیا تو حضرت اویس کی خدمت میں اہتمام سے حاضر ہوا اور کہا کہ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجئے (حضرت اویس بھی سوچنے لگے کہ آج تک تو یہ آدمی کبھی آیا نہیں، اور آج آیا؛ کیا بات ہے) حضرت اویس نے اس سے کہا کہ ابھی تو تم بڑی اونچی جگہ سے حج کر کے آرہے ہو، تم میرے لیے دعاءِ مغفرت کرو (اس لیے کہ حدیث میں بھی آیا ہے کہ جو حج کر کے آوے، اس سے آپ اپنے لیے دعاءِ مغفرت کی درخواست کیجئے (مشکوٰۃ، ص ۲۲۳) اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! حاجی کی بھی مغفرت کر دے اور حاجی جس کے لیے دعاءِ مغفرت کرے، اس کی بھی مغفرت کر دے (شعب الایمان۔۴۱۱۲) تو حضرت اویس نے اس آدمی سے کہا کہ آپ بہت اچھی جگہ سے لوٹ کر آرہے ہیں اس لیے آپ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجئے، لیکن اس نے کہا کہ نہیں! آپ پہلے میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجئے) تو حضرت اویس نے کہا کہ کیا وہاں حضرت

عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تھی؟ اس نے کہا: جی ہاں (تو وہ سمجھ گئے کہ اب تو یہ میرا پیچھا چھوڑے گا نہیں، اس لیے) حضرت اویس نے اس کے لیے دعاءِ مغفرت فرمائی (پھر تو اس آدمی نے باقاعدہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ اپنی بستی میں ایک ایسی شخصیت موجود ہے۔ اب تک تو وہ گمنام رہتے تھے، کسی کو ان کا پتہ نہیں تھا، لیکن اب تو سب لوگوں کو پتہ چل گیا) چنانچہ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگوں کو پتہ چل گیا ہے تو وہاں سے رخصت ہو کر دوسری جگہ چلے گئے (انہوں نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ اس طرح شہرت کے ساتھ زندگی گزاریں)

مسلم کے حوالہ سے ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، ان میں ایک آدمی وہ بھی تھا جس کو معلوم نہیں تھا کہ حضرت اویس کا کیا مقام ہے۔ وہ ان کی ظاہری حالت اور مفلوک الحالی دیکھ کر ان کا مذاق اور ٹھٹھا اڑایا کرتا تھا۔ جب وہ قافلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا تو ان سے ان کا حال پوچھا، تو اس آدمی نے ان کا حال بتایا، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا مقام بتلایا۔ تو پھر اس نے اپنی حالت سے توبہ کی کہ اب تک ان کا مقام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے مَیں تو ان کا مذاق اُڑایا کرتا تھا۔

روایت کا سبق

بہرحال! یہاں پر تو یہ بتانا ہے کہ دیکھو! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے دعاءِ مغفرت کی تاکید فرمائی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دوسروں کو کہا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو اللہ کے نیک بندے ہوں ان سے ملاقات کرنی چاہیے اور ان سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے اور جس مقام پر وہ آباد ہوں وہاں کے لوگوں کو بھی ان سے

واقف کرانا چاہیے، اور تاکید بھی کرنی چاہیے تاکہ وہ بھی ان سے فائدہ اُٹھائیں۔

چنانچہ اہل اللہ کے یہاں اس بات کا بھی اہتمام تھا۔ بعض اکابر کے واقعات میں ہے کہ ان کے مریدین اور معتقدین میں سے بعض لوگ جو اونچے مقام کے ہوتے تھے اور لوگ ان کے حال سے واقف نہیں ہوتے تھے تو لوگوں کو ان سے واقف کرنے کے لیے کوئی بات وہ ظاہر کر دیا کرتے تھے۔

بادشاہوں کا حال یہ تھا

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ کا جب انتقال ہوا تو انہوں نے وصیت کی کہ میرے جنازہ کی نماز وہ آدمی پڑھائے جس نے کبھی کسی غیر محرم کی طرف نظر نہ کی ہو، اور جس کی عصر کی چار سنتیں کبھی فوت نہ ہوئی ہوں۔ جنازہ لاکر رکھا گیا، اور یہ اعلان کیا گیا کہ حضرت شیخ کی یہ وصیت ہے۔ بڑا مجمع موجود تھا، کوئی آگے نہیں بڑھا۔ کئی مرتبہ جب اعلان ہوا اور کوئی آگے نہیں بڑھا تو سلطان شمس الدین التمشؒ (ان کا مزار قطب مینار کے علاقہ میں ہے، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کا کیؒ کا مزار مہرولی میں ہے) آگے بڑھے اور کہا کہ حضرت شیخ نے میرا راز لوگوں کے درمیان کھول دیا۔ میں نے زندگی بھر کبھی کسی غیر محرم کی طرف نظر نہیں کی، اور میری عصر کی چار سنتیں کبھی فوت نہیں ہوئی۔ اس زمانہ کے بادشاہوں کا یہ حال تھا۔

ہم کو بھی دعا میں نہ بھولیو

۳۷۳: عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضي الله عنه قَالَ: اِسْتَأْذَنْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْعُمْرَةِ، فَأَذِنَ لِيْ، وَقَالَ: لَا تَنْسَنَا يَاأُخَيَّ مِنْ دُعَائِكَ۔

وفی روایة: اَشْرِكْنَا يَاأُخَيَّ فِيْ دُعَائِكَ۔

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی، تو نبی کریم ﷺ نے اجازت دی اور فرمایا کہ اے ہمارے پیارے بھائی! ہم کو بھی دعا میں نہ بھولیو۔

افادات: (۱) یہ بھی آداب میں سے ہے کہ آدمی اگر اپنے بڑوں کے ساتھ رہے تو جب کسی کام کے لیے باہر جانا ہو تو ان کی اجازت لے۔ یعنی ان کے سامنے اظہار کرے، اگر وہ اجازت دیں تو جائے۔

(۲) حضور اکرم ﷺ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے درخواست کر رہے ہیں، چوں کہ وہ بیت اللہ کی زیارت کو جا رہے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ بیت اللہ کی زیارت کے لیے جا رہے ہوں، یا ایسے مقام پر جا رہے ہوں جہاں دعا قبول ہوتی ہے تو ان کی خدمت میں دعا کے لیے درخواست کرنی چاہیے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر وہ اس کی درخواست منظور کرلے تو اس کو بھی چاہیے وہاں اس کے واسطے دعا کرے۔

بابرکت جگہوں کی زیارت کرنا

اور چوں کہ اس باب کے عنوان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ بابرکت جگہوں کی زیارت کے لیے جانا، اسی مناسبت سے یہ آخری روایت لا رہے ہیں۔

٣٧٤: وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: كان النبی ﷺ يزور قباء راكباً وماشياً، فيصلي فيه ركعتين۔

وفی رواية: كان النبی ﷺ يأتی مسجد قباء كل سبت راكباً وماشياً وكان ابن عمر يفعله۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ قباء کی زیارت کے لیے کبھی سواری پر اور کبھی پیدل تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اور وہاں جا کر دو رکعت ادا فرماتے تھے۔ اور

دوسری روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ ہر سنیچر کو مسجد قباء سوار ہو کر اور کبھی پیدل تشریف لے جاتے تھے۔ اور حضرت ابن عمر کا معمول بھی یہ تھا۔

افادات: قباء مسجد نبوی سے کافی دوری پر واقع ہے، اس زمانہ میں تو وہ مدینہ سے الگ ایک آبادی اور بستی تھی، آج کل تو مدینہ منورہ کا ہی ایک حصہ ہو گیا ہے، لیکن بہرحال وہ دوری پر واقع ہے، پھر بھی نبی کریم ﷺ وہاں کبھی سواری پر جاتے تھے اور کبھی پیدل تشریف لے جاتے تھے۔ اس لیے دونوں طریقے اختیار کرنے چاہئیں۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا کہ ہر پیر اور جمعرات کو وہاں جاتے تھے (مسند البزار ۱؍۳۰۳) اور یہ فضیلت بھی ہے کہ جو آدمی مسجد قباء جا کر دو رکعت نماز پڑھے، تو اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مقبول عمرہ کا ثواب ملتا ہے۔ (المعجم الکبیر۔۵۵۶۱)

توجہ نہ دی جائے

اس روایت سے یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ایسی برکت اور فضیلت والی جگہیں جن کی فضیلت حدیث پاک میں آئی ہے، ان کی زیارت کے لیے بھی آدمی کو جانا چاہیے۔ چوں کہ ہمارے یہاں سے جو لوگ حج و عمرہ کے لیے جاتے ہیں ان کو بھی ایسی جگہوں کی زیارت کا اہتمام کرنا چاہیے۔ ویسے وہاں ''زیارۃ زیارۃ'' کے نام سے موٹر گاڑی والے آواز تو دیتے ہی ہیں۔ لیکن بعض لوگ ان کی زیارت کرنے جانے والوں کو روکتے ہیں۔ تو میں بتا دوں کہ ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے۔ ایسے مقامات جن کی فضیلت حدیث پاک میں آئی ہے ان کی زیارت کے لیے بھی آدمی کو جانا چاہیے۔ اس روایت کو اسی لیے لائے ہیں کہ یہ بھی نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ اور جن چیزوں کا ثبوت ہے ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔

مدینہ منورہ میں روزانہ دو عمرے

بمبئی کے ہمارے ایک حاجی داود صاحب ہیں وہ مدینہ منورہ میں ہم سے کہنے لگے کہ مکہ مکرمہ میں رہتے ہوئے تو ایک عمرہ کرنے میں دیر بھی لگتی ہے اور محنت بھی زیادہ ہوتی ہے لیکن میں تو مدینہ میں رہتے ہوئے روزانہ آسانی سے دو عمروں کا ثواب لیتا ہوں۔ وہ اس طرح سے کہ یہاں فجر کی نماز کے بعد اشراق تک تو ذکر میں بیٹھا رہتا ہوں اور اشراق پڑھ لیتا ہوں۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جو آدمی فجر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھا رہے اور اللہ کی یاد میں مشغول رہے، اور اشراق پڑھ کر اٹھے تو اس کو ایک عمرہ کا ثواب ملتا ہے۔ اور پھر یہاں سے نکل کر قباء جاتا ہوں اور وہاں دو رکعت نماز پڑھ لیتا ہوں۔ اس طرح روزانہ دو عمروں کا ثواب آسانی سے حاصل کر لیتا ہوں۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ نے یہ سب فضیلتیں اور ثواب کی بہت آسان آسان شکلیں مہیا کر دی ہیں، اور اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں جو ان چیزوں کو حاصل کرنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ آج ہم نے اپنی عقلوں اور اپنی سوجھ بوجھ کو دنیا میں ایسا لگا رکھا ہے کہ جہاں دو پیسے زیادہ ملتے ہوں وہاں تو ضرور جائیں گے، لیکن ایسے بڑے بڑے ثواب کے معاملہ میں ہم استغناء اور بے پرواہی اختیار کرتے ہیں۔ ہم میں اور ہمارے اسلاف میں یہی فرق ہے کہ وہ ان چیزوں کے حریص تھے، اور دنیا کی طرف سے بے رغبت تھے۔ اور ہم دنیا کے حریص ہیں اور ان چیزوں کی طرف سے بے رغبت ہیں اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلائے اور توفیق عطا فرمائے۔

دعا

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالىٰ جَدُّكَ وَلَاالِهَ غَيْرُكَ.

اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اے اللہ! جیسا کہ تیرے حبیب پاک ﷺ نے تاکید فرمائی، تیرے نیک بندوں کی زیارت اور ہم نشینی اور صحبت اور ان کے ساتھ محبت کا تعلق رکھنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اور اے اللہ! ان کی اس محبت کو ہمارے لیے دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنا۔ اے اللہ! اسی کو ہمارے لیے آخرت میں نجات کا ذریعہ بنا۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما، اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما، حاجتمندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ اے اللہ! تیرے جن بندوں نے ہم حاضرین مجلس سے دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں، سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل سے پوری فرما۔ اے اللہ! حضور اکرم ﷺ نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہم کو اور پوری امت محمدیہ کو عطا فرما۔ اور نبی کریم ﷺ نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، اے اللہ! ان سے ہماری اور پوری امت محمدیہ کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

فَضْلُ الْحُبِّ فِی اللهِ وَالْحَثِّ عَلَیْهِ

اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اور اس کی تاکید

﴿مجلس ١﴾

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ أمابعد:

أعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہُ أَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (الفتح، آیت ٢٩)

وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُوا الدَّارَ وَالْإِیْمَانَ مِن قَبْلِھِمْ یُحِبُّونَ مَنْ ھَاجَرَ إِلَیْھِمْ۔ (الحشر، آیت ٩)

یہاں باب کا عنوان قائم کیا ہے "فضلُ الحبِّ فی اللّٰہِ والحثِّ علیہ واعلام الرجل من یحبہ انہ یحبہ وماذا یقول لہ اذا اعلم" **اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت، اور آدمی کا اس آدمی کو باخبر کرنا جس سے وہ اللہ کے واسطے محبت رکھتا ہے۔ اور وہ اس کو جواب میں کیا کہے؟ اس کو اس باب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی ترغیب بیان کریں گے کہ یہ عمل کرنا چاہیے کہ دو مؤمن آپس میں اللہ کی نسبت پر ایک دوسرے سے محبت کا تعلق رکھیں۔ اور اگر آپ کو کسی سے اللہ کے واسطے محبت ہے تو آپ کو چاہیے کہ اس کو بتلا دیں کہ میں اللہ کی نسبت پر تم سے محبت کرتا ہوں اور جب کوئی آ کر کہے کہ مَیں تم سے اللہ کے واسطے محبت رکھتا ہوں تو جس سے یہ کہا گیا ہے وہ اس کو جواب میں کیا کہے؟ یہ ساری باتیں احادیث کے ذریعہ سے اس باب میں پیش کریں گے۔ پہلے تو علامہ نوویؒ نے دو آیتیں پیش کی ہیں۔**

صلحِ حدیبیہ

پہلی آیت ہے ﴿ مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہُ أَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ﴾ یہ سورۂ فتح کی آخری آیت ہے۔ دراصل سورۂ فتح صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئی تھی۔ نبی کریم ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ اپنے صحابہ کے ساتھ مدینہ منورہ سے چلے، احرام باندھا، اور مکہ مکرمہ آکر بیت اللہ کا طواف کیا، صفا ومروہ کے درمیان سعی کی، اور پھر حلق یا قصر کروا کر احرام کھول دیا۔ نبی کریم ﷺ نے اپنا یہ خواب حضرات صحابۂ کرام کے سامنے بیان کیا، چوں کہ حضرات مہاجرین کو مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آئے ہوئے ایک طویل مدت ہوئی تھی، اور مکہ کی یاد تو ان کو ستاتی ہی رہتی تھی۔ جب نبی کریم ﷺ نے اپنے اس خواب کا ان کے سامنے تذکرہ کیا، تو فوراً سب تیار ہو گئے کہ ہم عمرہ کرنے کے لیے جائیں گے۔ اور پھر یہ نبی کریم ﷺ کا خواب تھا اور نبی کا خواب چوں کہ وحی کا حکم رکھتا ہے، اس لیے ان کو یقین تھا کہ ان شاء اللہ اب یہ چیز ہمیں نصیب ہوگی، اس لیے سب نے ارادہ کرلیا اور نبی کریم ﷺ نے بھی ارادہ فرمالیا۔ ٦ھ ذوالقعدہ کے مہینہ میں نبی کریم ﷺ حضراتِ صحابہ کو لے کر مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے، مقامِ ذوالحلیفہ سے آپ احرام باندھ کر چلے۔ ادھر مکہ والوں کو پتہ چل گیا کہ حضور اکرم ﷺ حضراتِ صحابہ کو لے کر عمرہ کے ارادہ سے ہی چلے ہیں، ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ عمرہ ہی کے لیے آرہے ہیں، لڑائی کا ارادہ نہیں ہے، لیکن انہوں نے سوچا کہ یہ لوگ اس طرح اطمینان کے ساتھ آئیں اور عمرہ کرکے چلے جائیں، اس میں ہماری ناک کٹ جائے گی، اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ یہ لوگ تم پر غالب آ گئے، اسی لیے مکہ والوں نے یہ طے کیا کہ ہم ان کو کسی بھی حال میں بیت اللہ کی زیارت اور عمرہ کرنے نہیں دیں گے۔ اب قریش نے مکہ مکرمہ کے اطراف میں جو قبائل آباد تھے ان کو جمع کرکے یہ بات دوسرے طریقہ سے پیش کیا کہ یہ لوگ حرم کی حرمت کو ختم کرنے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ

پر حملہ کرنے کے واسطے مدینہ منورہ سے چلے ہیں، اس لیے آپ ہمارا ساتھ دیجیے، ہم سب مل کر ان کا مقابلہ کریں گے۔اور چوں کہ حرم کی حرمت کا تو سب ہی لحاظ کرتے تھے اس لیے انہوں نے بھی کہا کہ یہ تو نہیں ہوسکتا ہے۔،اس طرح انہوں نے آپس میں معاہدہ کیا کہ ہم ان کو کسی بھی حال میں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے نہیں دیں گے۔

اِدھر نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اورآپ نے مکہ مکرمہ کے حالات سے باخبر ہونے کے واسطے پہلے سے اپنے آدمی بھی آگے بھیج دیئے۔مکہ والوں نے جب مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہ ہونے دینے کا فیصلہ کیا تو حضرت خالد بن ولید- جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے- کی سرکردگی میں گھوڑے سواروں کا پورا دستہ اس بات کے لیے مقرر کیا گیا کہ راستہ ہی میں جا کر ان کو روکا جائے۔وہ اِدھر سے روانہ ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے جن کو بھیجا تھا انہوں نے آکر آپ کو اطلاع دی کہ وہاں تو یہ صورتِ حال ہے،تو نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے۔حضور اکرم ﷺ نے خود اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ کیا ہم ایسا نہ کریں کہ مکہ مکرمہ کے اطراف کے جو لوگ مکہ والوں کا ساتھ دینے کے واسطے وہاں پہنچے ہوئے ہیں ان کے علاقے تو لڑنے والے مردوں سے خالی ہو چکے ہوں گے،اس لیے ہم ان کے علاقوں میں جا کر ان کے گھروں پر حملہ کریں تو وہ لوگ مکہ والوں کا ساتھ چھوڑ کر یہاں آنے پر مجبور ہو جائیں گے،اس طرح ہم مکہ والوں کے لشکر کی طاقت کو توڑ دیں گے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ اور ہم تو اپنا یہ ارادہ ظاہر کر کے مدینہ منورہ سے چلے ہیں کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے واسطہ چلے ہیں،اس لیے ہم اپنے اسی ارادہ سے آگے بڑھیں،ابھی اپنے ارادے

میں کوئی تبدیلی نہ کریں، راستہ میں کوئی ہمیں روکے گا اور مقابلہ کی نوبت آئے گی تو دیکھ لیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ اس طرح آپ روانہ ہوئے۔ جب آپ مقامِ حدیبیہ میں پہنچے (''حدیبیہ'' جدہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے، جس کو آج کل ''شمسیہ'' کہا جاتا ہے، اس کا کچھ حصہ حدودِ حرم میں ہے اور کچھ حصہ حدودِ حرم سے باہر ہے) تو وہاں نبی کریم ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی، آپ ﷺ نے وہیں پڑاؤ ڈالا۔ لوگ کہنے لگے ''خَلَأَتِ الْقَصْوَآءُ، خَلَأَتِ الْقَصْوَآءُ'' حضور کی اونٹنی بیٹھ گئی، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ بیٹھنا اس کا شیوہ نہیں ہے ''حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيلِ'' بلکہ جس ذات نے ہاتھی والوں کے لشکر کو حرم میں پہنچنے سے روکا تھا، اسی نے اس کو بھی آگے بڑھنے سے روکا ہے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ قریش اگر حرم کی حرمت کو باقی رکھنے کے لیے آج مجھ سے کوئی معاہدہ کرنا چاہیں گے تو میں ان کی ساری شرطیں منظور کر کے ان کے ساتھ معاہدہ کروں گا۔ پہلے آپ نے آدمی بھیجا، اس کے بعد حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا کہ اے عمر! آپ جائیے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ کو تو معلوم ہے کہ مکہ والوں کو میرے ساتھ کیسی عداوت ہے اور میرے خاندان کے زیادہ لوگ بھی وہاں نہیں ہیں جو میری حمایت کریں۔ آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجیں، ان کے خاندان کے بہت سارے لوگ وہاں ہیں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ ان کو جا کر کہیں کہ ہم لڑنے کے واسطہ نہیں آئے ہیں، بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں، ہمارا راستہ چھوڑ دو، ہم زیارت کر کے واپس لوٹ جائیں گے۔ اور وہاں جو لوگ اسلام لا چکے ہیں لیکن کمزوری کی وجہ سے ہجرت نہیں کر پائے ہیں ان کو بھی بتلا دو کہ ان شاء اللہ عنقریب اللہ تعالیٰ تمہارے لیے کشادگی

کی صورتیں پیدا فرمائیں گے۔ یہ دونوں پیغام الگ الگ کہلوائے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب یہاں سے چلے تو مکہ مکرمہ میں یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ عثمان آرہے ہیں تو ان کے خاندان کے لوگ بڑی تعداد میں ان کے استقبال کے لیے آئے اور ان کو اپنے ساتھ لے گئے کہ آپ جس کام کے لیے آئے ہیں وہ اطمینان سے کیجئے، آپ کا بال بھی کوئی بیکا نہیں کرسکتا۔ چنانچہ مکہ مکرمہ پہنچ کر انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سردارانِ مکہ کو پہنچا دیا۔ جب یہ کام ہوگیا تو ان کے خاندان کے لوگوں نے کہا کہ آپ تو یہاں آہی گئے ہیں، آپ بیت اللہ کا طواف کرکے عمرہ کرلیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ کے رسول کو تو وہاں روکا جائے اور اکیلا عثمان یہاں طواف کرلے؟ یہ ناممکن بات ہے۔ ان کے اس جواب پر ان کے خاندان والوں کو بھی ناراضگی ہوئی کہ ہم نے ان کی اتنی ساری حمایت کی اور یہ تو انہیں کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے ان کو روک لیا اور واپس جانے نہیں دیا۔ جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو یہاں مسلمانوں کے لشکر میں یہ مشہور ہوگیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کردئے گئے۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کیکر کے درخت کے نیچے حضراتِ صحابہ سے بیعت لی کہ ہم عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے، اسی بیعت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان حضراتِ صحابہ کو اللہ کی خوشنودی اور رضامندی کا پروانہ دیا گیا ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ (الفتح: ۱۸) اللہ تعالیٰ راضی ہوگیا ان ایمان والوں سے جو آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اسی بیعت کو "بیعتِ رضوان" کہا جاتا ہے، یعنی وہ بیعت جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضامندی و خوشنودی کا پروانہ دیا گیا۔ اب یہ بات بھی وہاں پہنچ گئی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے آدمی بھیجے اور

وہاں سے بھی کچھ لوگ آئے اور پھر اخیر میں ان کی طرف سے صلح کی گفتگو کرنے کے لیے سہیل بن عمرو آئے، اور دس سال کے لیے صلح ہوئی کہ ہم آپس میں لڑائی نہیں کریں گے۔ اس صلح میں بہت ساری شرطیں تھیں ان میں سے پہلی شرط یہ تھی کہ اس سال ہم آپ کو عمرہ اور بیت اللہ کی زیارت کرنے نہیں دیں گے، ابھی تو واپس جانا پڑے گا، آئندہ سال اسی مہینہ میں آیئے، تین روز یہاں قیام کیجئے گا، اور اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے سوائے ایک ایک تلوار کے اور وہ بھی میان میں ہونی چاہیے۔ دوسری شرط یہ بھی تھی کہ اگر یہاں سے کوئی آدمی آپ کے یہاں آجائے گا تو اس کو واپس کرنا پڑے گا، اور آپ کا کوئی آدمی یہاں آئے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے اور دوسرے قبائل کو اختیار ہے کہ اس صلح میں جو جس کا ساتھ دینا چاہے دے۔ خیر! اس طرح کی اور بھی شرطیں تھیں اور یہ شرطیں ایسی تھیں جن کو قبول کرنے کے لیے آدمی کی طبیعت آمادہ نہ ہو۔ نبی کریم ﷺ نے جب یہ معاملہ حضراتِ صحابہ کے سامنے پیش کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ عرض کرنے لگے کہ اے اللہ کے رسول! ہم اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے اگر شہید ہوگئے تو کیا جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ ضرور جاؤ گے تو کہنے لگے کہ پھر ہم اتنا دب کر کیوں صلح کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں، اور اللہ کے حکم کے خلاف کوئی کام نہیں کرتا۔ بہرحال! ان شرائط کو قبول کرنا اور واپس لوٹنا مسلمانوں پر بڑا شاق گذرا، سب ایک ہی بات پر تیار تھے کہ ہم لڑلیں گے، لیکن ایسی صلح کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔ لیکن نبی کریم ﷺ کی ہدایت کے سامنے اپنی طبیعت کے خلاف اور جوشِ غضب کے باوجود سب نے آپ ﷺ کی بات مان لی۔ یہ حضراتِ صحابہ کی بڑی آزمائش تھی لیکن وہ حضرات اس آزمائش میں پوری کامیابی سے

پار نکلے، کسی ایک نے بھی حضور ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔

جب صلح نامہ لکھوایا جارہا تھا اس میں یہ جملہ لکھا تھا کہ یہ وہ صلح نامہ ہے جو محمد رسول اللہ نے قریشِ مکہ سے کیا ہے۔ حضور ﷺ نے اس صلح نامہ کے الفاظ میں اپنے نامِ مبارک کے ساتھ لفظِ ''رسول اللہ'' لکھوایا تھا۔ تو قریش کی طرف سے جو سہیل بن عمرو آئے تھے انہوں نے کہا کہ لفظِ رسول اللہ کاٹ دو، اس کے بجائے محمد بن عبداللہ لکھو۔ اس لیے کہ اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہیں تھا۔ لکھنے کا کام حضرت علی رضی اللہ عنہ کررہے تھے، حضور ﷺ نے ان سے کہا کہ اے علی! لفظِ رسول اللہ مٹا دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: ''واللهِ لَاأَمْحُوكَ أَبداً'' اللہ کی قسم! مَیں کبھی بھی نہیں مٹا سکتا۔ حضور ﷺ نے وہ تحریر اپنے ہاتھ میں لی اور پوچھا کہ مجھے بتاؤ کہ یہ لفظ کہاں لکھا ہے؟ اور پھر اپنے ہاتھ سے وہ لفظ مٹا کر اس کی جگہ پر محمد بن عبداللہ لکھوایا۔ (سیرۃ المصطفیٰ ۲/۳۵۴ تا ۳۶۲ اختصاراً)

اس موقع پر ان لوگوں نے جو لفظ رسول اللہ مٹوایا تو اللہ تعالیٰ نے سورۂ فتح صلحِ حدیبیہ سے واپسی پر راستہ ہی میں نازل فرمائی اس میں خاص طور پر ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ﴾ (الفتح، آیت ۲۹) فرمایا گویا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے نام کے ساتھ ''رسول اللہ'' لکھ دیا تاکہ قیامت تک آپ ﷺ کے نام کے ساتھ یہ پڑھا جاتا رہے۔ مشرکین بھلے ہی لفظِ رسول اللہ کو مٹواتے رہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں تو آپ رسول ہی ہیں۔

ویسے قرآنِ پاک میں عام طور پر جہاں آپ ﷺ کا تذکرہ آتا ہے وہاں آپ کو لقب اور صفت کے ساتھ خطاب کیا جاتا ہے جیسے ﴿يٰأَيُّهَا النَّبِيُّ۔ يٰأَيُّهَا الرَّسُوْلُ۔ يٰأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ۔ يٰأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ آپ ﷺ کا نام صرف چار جگہوں پر خاص خاص مصلحتوں کے پیش نظر لیا گیا ہے۔ ایک تو سورۂ آل عمران میں آیا ہے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُوْلٌ﴾

(آل عمران ، آیت ۱٤٤) دوسری جگہ سورۂ احزاب میں ہے ﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ﴾ (الاحزاب، آیت ٤٠) تیسرا سورۂ محمد میں ہے ﴿وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَى مُحَمَّدٍ﴾ (محمد، آیت ۲) اور چوتھا سورۂ فتح میں ہے ﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ﴾ (الفتح۔ آیت ۲۹) اور ہر جگہ کوئی نہ کوئی مصلحت تھی، یہاں یہی مصلحت تھی جو میں نے بیان کی، اس لیے آپ کے نام کے ساتھ لفظ رسول اللہ بھی لایا گیا ہے۔

حضرات صحابہ کی خوبیاں

اور حضراتِ صحابہ جنہوں نے اس آزمائش کے موقع کے پر بھی نبی کریم ﷺ کی اطاعت وفرمانبرداری کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا، حالانکہ پورا صلح نامہ ان کے جذبات کے خلاف تھا، پھر بھی انہوں نے نبی کریم ﷺ کی پوری اطاعت وفرمانبرداری کی، اور چوں کہ آپ ﷺ کے بعد اور کوئی نبی آنے والے نہیں ہیں، اور آپ ﷺ اپنے پیچھے جہاں قرآنِ پاک کو چھوڑ کر جا رہے ہیں، وہیں حضراتِ صحابہ کی تربیت کی ہوئی پوری ایک جماعت کو امت کے لیے نمونہ بنا کر چھوڑ کر جا رہے تھے، اس لیے اس موقع پر باری تعالیٰ نے ان کی خوبیاں بھی بیان فرمائیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ کے ساتھ جو ایمان والے ہیں (ان کی سب سے پہلی خوبی جو بیان کی ہے وہ دراصل اس باب سے تعلق رکھتی ہے۔ کہ ان کے ساتھ جو رفقاء ہیں) وہ کافروں کے اوپر سخت ہیں اور آپس میں بڑے مہربان اور محبت رکھنے والے ہیں۔

اور کفار پر سختی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ سختی کرتے تھے، بلکہ جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ سختی کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں ان کی رشتہ داری اور دوستی درمیان میں حائل نہیں ہوتی، اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق بڑی سے بڑی سختی

کرنے کے لیے تیار ہیں، بلکہ ان کی گردن کاٹنے کے لیے بھی تیار ہیں لیکن جہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا، وہاں اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ اسی چیز کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کو بھی چاہیے کہ اللہ کی نسبت پر آپس میں محبت اور مہربانی کا معاملہ کریں جیسا حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا امتیازی وصف تھا۔ حضرات صحابہ کے آپس میں اللہ کی نسبت پر محبت کے جو تعلقات تھے، اس کو بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جہاں حضرات صحابہ کی خوبیاں بیان کیں وہاں سب سے پہلی خوبی یہ بیان کی۔

انصار کی مہاجرین سے للہ محبت

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالإِيْمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ (الحشر۔ آیت ۹) یہ سورۂ حشر کی آیت کا ایک ٹکڑا ہے۔ ''مالِ فیٔ'' یعنی وہ مال جو دشمنوں کے پاس سے بغیر جنگ کے حاصل ہوتا ہے اس کے حق دار کون لوگ ہیں، ان کو اس سورت میں بیان فرمایا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں ہے ﴿لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ﴾ (الحشر، آیت ۸) وہ مہاجرین فقراء جو اپنے شہروں اور مالوں سے نکالے گئے۔ اور دوسرے حق دار کا اس آیت ﴿وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ﴾ میں تذکرہ ہے، جس میں انصار کا ذکر ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے ٹھکانہ بنایا مدینہ منورہ کو جو دارالاسلام ہے۔ یہاں دار سے مراد دارالہجرت یا دارالاسلام ہے۔ اس لیے کہ اسلام کا سب سے پہلا مرکز مدینہ منورہ ہی ہے، اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بغیر جنگ کے اسلام کا مرکز بنایا اور پھر وہیں سے

دوسرے تمام علاقے فتح ہوئے۔ تو جنہوں نے ٹھکانہ بنایا مدینہ منورہ کو جو دارالاسلام ہے۔

﴿وَالإِيمَانَ﴾ اور جنہوں نے ایمان کو بھی ٹھکانہ بنایا، گویا ایمان لائے ﴿مِن قَبۡلِهِمۡ﴾ مہاجرین کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آنے سے پہلے۔ گویا انصار مدینہ منورہ میں پہلے ہی سے آباد ہیں اور ان کے آباء و اجداد یہاں آکر اسی لیے آباد ہوئے تھے کہ انہوں نے اگلی کتابوں میں یہ پڑھا تھا کہ نبی آخر الزمان ہجرت کر کے اسی جگہ آنے والے ہیں، اسی لیے وہ یہاں آکر بسے تھے کہ ان کو یا ان کی اولاد کو اللہ تعالیٰ ایمان لانے کی سعادت دے۔ تو ان کی ایک خوبی تو یہ تھی کہ انہوں نے مدینہ منورہ کو اپنا ٹھکانہ بنایا، اسلام کو اپنے دل کے اندر جمایا۔

اور تیسری خوبی یہ بتلائی ہے ﴿يُحِبُّونَ مَنۡ هَاجَرَ إِلَيۡهِمۡ﴾ جو لوگ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے ان کے پاس پہنچے، ان کے ساتھ وہ محبت کرتے ہیں۔ ورنہ دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی جگہ سے آکر کسی اور آبادی میں رہتا ہے تو اس کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جاتا جو اپنے آدمیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اجنبی کو اجنبی ہی کہا جاتا ہے، اور وہ پرایا ہی سمجھا جاتا ہے، چاہے اس کی دو تین نسلیں گذر جائیں۔ لیکن حضراتِ انصار نے حضراتِ مہاجرین کے ساتھ محبت کا وہ سلوک کیا کہ ان کو اپنے گھروں میں جگہ دی، ان کا سارا خرچہ برداشت کیا، مال میں ان کو اپنے ساتھ شریک کیا۔ نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر انہوں نے درخواستیں پیش کیں۔ ایک ایک مہاجری کو اپنے پاس رکھنے کے لیے انصار آپس میں جھگڑتے تھے۔ ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ اس کو میرے یہاں ٹھہرایا جائے۔ اور اس کے لیے نبی کریم ﷺ نے باقاعدہ قرعہ اندازی فرمائی، اور اس میں جس کا نام نکلا اس کے یہاں اس کو ٹھہرایا گیا۔ گویا ان کا یہ ایسا وصف ہے کہ اس زمانہ سے

لے کر آج تک کوئی بھی اس کا نمونہ پیش نہیں کرسکا﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾ ان کی یہ محبت جو حضرات مہاجرین کے ساتھ تھی وہ اللہ کی نسبت پر تھی، اس لیے اس آیت کو یہاں پر لائے ہیں۔

ایمانی حلاوت کے تین اعمال

۳۷۵: عَنْ أَنس رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ، أَن يَكُونَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَن يُّحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَن يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ، كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُّقْذَفَ فِي النَّارِ. (متفق عليه)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کے اندر تین باتیں ہوں گی، وہ ایمان کی حلاوت کو محسوس کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اس کے نزدیک ان دونوں کے ماسوا سے زیادہ محبوب ہوجائیں۔ اور آدمی کسی دوسرے شخص سے محض اللہ کے لیے محبت کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جب اس کو کفر سے نجات دی تو پھر اس میں لوٹنے کو ایسا ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔

افادات: ’’ایمان کی حلاوت‘‘ سے کیا مراد ہے؟ تو عام طور پر اس حدیث کی شرح کرنے والے علماء فرماتے ہیں کہ اس سے حلاوتِ معنوی مراد ہے۔ اس لیے کہ ایمان کھانے پینے کی محسوس چیز نہیں ہے جس کی مٹھاس اور شیرینی کو کوئی آدمی حسی طور پر محسوس کرے۔ بلکہ یہ ایک معنوی وصف ہے۔ گویا جس کے دل کے اندر ایمان سرایت کرجائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی بجاآوری میں لذت محسوس کرے گا۔ استلذاذ بالطاعات یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادتیں کرکے اس کو مزہ آئے گا۔ اور دین پر عمل کرنا بڑا مشقت کا کام ہے لیکن جس آدمی کے دل میں ایمان گھر کرجاتا ہے اور یہ تینوں باتیں

پائی جاتی ہیں اس کے لیے ایمان کے نتیجہ میں جواحکام دئے گئے ہیں ان پر عمل کرنا مشکل اور دشوار نہیں رہتا، بلکہ اس میں اس کو مزہ آتا ہے۔

بھائی! سردی کے موسم میں آخری رات میں جلدی اُٹھ کر نماز پڑھنا، گرمی کے زمانہ میں سخت گرمی میں روزے رکھنا، یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن جن کے دل میں ایمان گھر کیا ہوا ہوتا ہے ان کو اس میں مزہ آتا ہے، ان تکلیفوں کو برداشت کرنے میں وہ لوگ لطف محسوس کرتے ہیں؛ اسی کو ایمان کی حلاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا ایک قسم کی مٹھاس محسوس کر رہے ہیں۔

اور ابن ابی الجمرہ جنہوں نے بخاری شریف کی منتخب احادیث کی تشریح کی ہے اور ان کی وہ کتاب "بَهْجَةُ النُّفُوس" کے نام سے دو جلدوں میں چھپ چکی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ یہاں مٹھاس سے حسی مٹھاس مراد ہے یعنی جیسے ہم کوئی میٹھی چیز کھاتے اور اس کی شیرینی محسوس کرتے ہیں اسی طرح جن کے دل میں یہ تینوں باتیں پائی جاتی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ان کو حسی طور پر بھی ایمان کی مٹھاس کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ جو آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے وہی اس کو محسوس کرسکتا ہے، اس لیے جو وہاں تک نہیں پہنچا ہے اس کو چاہیے کہ جو محسوس کر رہے ہیں ان کی باتوں کو مان لے اور ان کی تصدیق کرے:۔

لذتِ ایں بادہ نہ یابی بخدا تا نہ چشی

یہ جام ایسا ہے کہ اس کا لطف اور اس کی لذت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو اس کو چکھتا ہے اس لیے جن کو محسوس ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں تو اس کو مان لینا چاہیے۔

بہرحال! نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں جن میں تین باتیں ہوں وہ اپنے اندر

ایمان کی مٹھاس محسوس کرے گا۔پہلی بات ہے اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول اس کے نزدیک ان دونوں کے ماسواسب سے زیادہ محبوب ہوجائیں۔اصل الاصول تو اللہ تعالیٰ کی محبت ہے،اورمخلوق میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ قریب اوراس کی صفات اور شئون کا مظہرنبی کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات ہے،اس لیے اللہ کی محبت کے نتیجہ میں حضور ﷺ کے ساتھ بھی اسی طرح کی محبت ہوگی۔پھرجو جتنا اللہ تعالیٰ سے قریب ہوگا، اللہ کے صالحین اورمقرب بندوں کی محبت بھی دلوں میں اسی مقدار میں ہوگی۔ورنہ اصل محبت تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔

اورآدمی کسی دوسرے شخص سے محض اللہ کے لیے محبت کرے۔اس روایت کو یہاں تو اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ اللہ کے واسطےکسی سے محبت کرنا وہ چیز ہے جس پر اللہ تعالیٰ ایمان کی حلاوت نصیب کرتے ہیں۔

ترمذی شریف کی ایک روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے فرمایا”مَنْ أَعْطٰی لِلّٰہِ ومَنَعَ لِلّٰہِ وَأَحَبَّ لِلّٰہِ وَأَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِاسْتَکْمَلَ اِیْمَانَہٗ“ جس نے کچھ دیا تو اللہ کے واسطے دیا،اورنہیں دیا تو اللہ کے واسطے۔کسی سے محبت کی تو اللہ کی وجہ سے کی،اورکسی سے عداوت اوردشمنی رکھی تو اللہ کے واسطے رکھی؛تو اس نے اپنے ایمان کومکمل کرلیا۔اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو کامل الایمان ہوتاہے اس کے سارے تعلقات اورہرکام اپنے نفس کے لیےنہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتے ہیں۔اسی لیے علماء نے لکھاہے کہ وہ ماں باپ کے،بیوی بچوں کے،اعزاء واقرباء اوردوسرے لوگوں کے حقوق ادا کرتا ہےتو اس لیےنہیں کہ وہ ماں باپ ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کی ادائیگی کاحکم دیاہے،گویااپنےنفس کے تقاضہ کی وجہ سےنہیں کرتا بلکہ اللہ تعالیٰ کےحکم کی وجہ سے کرتا

ہے۔اس کے نزدیک ساری دنیا سے تعلقات کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ سے جب محبت ہوگی تو وہ آدمی ایمان کی مٹھاس کو محسوس کرے گا۔

اور اللہ تعالیٰ نے جب اس کو کفر سے نجات دی تو پھر کفر میں دوباہ لوٹنے کو ایسا ہی ناپسند کرے جیسا کہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔ چوں کہ اس زمانہ میں لوگ کفر سے ہی اسلام میں داخل ہوتے تھے، تو گویا جب اللہ تعالیٰ نے اس کو کفر سے نجات دے کر اسلام لانے کی سعادت عطا فرمائی، تو دوبارہ کفر میں لوٹنے کو وہ اتنا ہی برا سمجھتا ہے جیسا آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔یعنی دوبارہ کفر کی طرف لوٹنے کو کبھی تیار نہیں ہوتا۔

جس میں یہ تین باتیں ہوں گی نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ آدمی ایمان کی حلاوت کو محسوس کرے گا۔اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طاعات کی بجا آوری اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو پورا کرنا بہت آسان ہوگا بلکہ اس میں اس کو لطف اور مزہ آئے گا۔

باب کا عنوان تھا کہ اللہ کے واسطے آپس میں جو تعلق اور محبت قائم کی جاتی ہے اس کی کیا فضیلت ہے؟ اسی سلسلہ میں یہ روایت لائے ہیں۔

عرش کے سائے میں سات آدمی

٣٧٦: عَنْ أَبی هریرةَ رضی اللہ عنہ عنِ النَّبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِی ظِلِّهِ یَوْمَ لَاظِلَّ اِلَّا ظِلُّهُ؛ اِمَامٌ عَادِلٌ۔ وَشَابٌّ نَشَأَفِی عِبَادَةِاللّٰهِ عزوجل۔ وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ۔ وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰهِ، اِجْتَمَعَا عَلَیْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْهِ۔ وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ حُسْنٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ اِنِّی أَخَافُ اللّٰهَ۔ وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا، حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَاتُنْفِقُ یَمِیْنُهُ۔ وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ. (متفق علیه)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سات آدمی وہ ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے سائے میں اس دن جگہ دیں گے جب اللہ کے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ ایک وہ حکمران جو عدل وانصاف سے کام لے۔ دوسرا وہ نوجوان جس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی ہو۔ تیسرا وہ آدمی جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا ہوا ہو۔ اور ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی، اسی کی خاطر آپس میں ملے اور اسی کی خاطر جدا ہوئے۔ اور وہ آدمی جس کو کسی حسن وجمال والی عورت نے برائی وبدکاری کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ اور وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ کسی غریب کو دیا اور ایسا چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔ اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور آنسو آ گئے۔

سایہ سے کیا مراد ہے؟

افادات: قیامت کا دن بڑا سخت اور تکلیف دہ دن ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ سورج دو یا تین میل کی دوری پر ہوگا اور گرمی کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گناہوں کے مطابق پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، کوئی ٹخنوں تک، کوئی گھٹنوں تک، کوئی کمر تک، کوئی گلے تک، کوئی کان تک اور کوئی اپنے پسینہ میں تیر رہا ہوگا۔ اس دن کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ ایک خاص ٹھنڈک میں گویا اپنی چھاؤں میں جگہ دیں گے۔ اب یہاں اللہ کے سائے سے کیا مراد ہے؟ ایک قول یہ ہے کہ ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی توجہ اور عنایت کا ایسا معاملہ کیا جائے گا جس کی وجہ سے اس دن کی تپش اور حرارت سے وہ محفوظ رہیں گے، گویا ایرکنڈیشن میں ہوں گے۔ بعض لوگوں نے دوسری روایتوں کے پیشِ نظر اللہ کے عرش کا سایہ مراد لیا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں جگہ دی جائے گی۔

امام عادل عام ہے

ایک وہ حکمران جو عدل وانصاف سے کام لے۔ پہلے بھی بتلا چکا ہوں کی امام کا اطلاق حکمرانِ اعلیٰ کے لیے بھی ہوتا ہے، امامت کبریٰ بول کر یہی مراد لیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ اور حضراتِ خلفاءِ راشدین رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد بھی ایک طویل زمانہ تک یہ سلسلہ رہا کہ جو حکمرانِ اعلیٰ ہوتا تھا وہی نماز کی بھی امامت کرتا تھا، لیکن بعد میں دھیرے دھیرے یہ دونوں چیزیں الگ ہوگئیں۔

خیر! حکمرانِ اعلیٰ جو سب کا حاکم ہو اس کو امام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسا حکمران جو اپنے ماتحت رعیت کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لے، تو وہ قیامت

کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ پائے گا۔اور حکمران چوں کہ صاحبِ اختیار ہوتا ہے، سیاہ وسفید کا مالک ہوتا ہے، وہ جو کچھ کرنا چاہے اس کے لیے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی ،ایسا حکمران جب انصاف سے کام لیتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ کا ڈر اس کے دل میں موجود ہے،اسی ڈر اور اللہ کے ساتھ کے تعلق کی وجہ سے وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرتا ہے،اور یہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے،اوراسی کی وجہ سے روزِ قیامت جبکہ گرمی اپنی شدت پر ہوگی اس کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ عطا فرمائیں گے۔

اور جہاں امام کا اطلاق حکمرانِ اعلیٰ کے لیے کیا گیا ہے، وہیں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے حضراتِ شراح نے لکھا ہے کہ ہر آدمی کو اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ اختیارات دے رکھے ہیں۔ایک آدمی اپنے پورے خاندان کا ذمہ دار ہے،تو اس کے خاندان کے سارے افراد اس کی ماتحتی میں ہیں۔اسی طرح ایک آدمی اپنے گھر کا ذمہ دار ہے تو اس کے گھر میں جتنے افراد رہتے ہیں وہ اس کی ماتحتی میں ہیں۔اور شوہر ہے تو اس کی بیوی اور اس کی اولاد اس کی ماتحتی میں ہیں۔اور بیوی ہے تو شوہر کی بہت ساری چیزیں اسی کے دائرۂ اختیار اور حفاظت میں ہوا کرتی ہیں۔ بلکہ اگر کوئی آدمی ایسا ہے کہ اس کا کوئی نہیں ہے تو اس کو اپنے اعضاء اور اپنی ذات پر اختیار حاصل ہے،تو اپنے اعضاء کو استعمال کرنے کے معاملہ میں وہ عدل وانصاف سے کام لے یعنی اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں جو احکامات دئے ہیں اور شریعت کی طرف سے جو ہدایتیں دی گئی ہیں ان کے مطابق وہ اپنے اعضاء وجوارح کو استعمال کرے،اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور معصیت میں استعمال نہ کرے،تو یہ بھی امام عادل کے عموم میں داخل وشامل سمجھا

جائے گا۔ ورنہ جیسا کہ میں نے پہلے بتلایا کہ اصل میں تو امام کا اطلاق حکمرانِ اعلیٰ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اور ایسے حکمران ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے زمانۂ حکمرانی میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پوری پوری رعایت کی۔

نکیل خود پکڑ کر لائے

سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں بخاری شریف میں ایک واقعہ موجود ہے کہ حضرت اسلم رضی اللہ عنہ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے آزاد کردہ غلام ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں امیر المؤمنین کے ساتھ جا رہا تھا، راستہ میں ایک عورت ملی اور اس نے کہا کہ مَیں خُفَاف بن اِیْمَاء غفاری کی بیٹی ہوں، میرے ابا غزوۂ حدیبیہ میں شریک ہوئے تھے اور آج میرے بچے بھوک کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں ٹھہر گئے اور کہا کہ بہت ہی قریبی نسبت کا تم نے حوالہ دیا ہے۔ اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المال کے مخزن پر تشریف لے گئے اور ایک مضبوط قسم کا اونٹ نکال کر اس پر دو بوریوں میں غلہ بھر کر لادا، اور بیچ میں کپڑے اور نقدی رکھ کر اس اونٹ کی نکیل خود پکڑ کر لائے اور اس عورت کے حوالہ کر دیا، اور کہا کہ یہ ختم نہ ہونے پائے گا کہ اس سے پہلے دوسرا آجایا کرے گا۔ کسی آدمی نے یہ سارا معاملہ دیکھ کر کہا کہ اے امیر المؤمنین! آپ نے اس کو بہت زیادہ دے دیا، اس کے جواب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمھیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے باپ اور بھائیوں نے ایک قلعہ کی فتح میں حصہ لیا اور اس سے جو مالِ غنیمت حاصل ہوا، آج بہت سارے لوگ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ گویا اس سب کے مقابلہ میں اس کو جو کچھ دیا گیا ہے وہ تو بہت کم ہے۔ بہر حال! اس طرح کے واقعات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سوانح میں موجود ہیں۔ (بخاری شریف۔ باب غزوۃ حدیبیہ۔ ٣٩٢٨)

خود کھانا پکایا

ایک مرتبہ رات کو تفتیش کے لیے نکلے، دیکھا کہ ایک عورت ہنڈیا کو چولہے کے اوپر رکھے ہوئے ہے، اور وہیں اس کے بچے رو رہے ہیں۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ پکانے کے واسطے کچھ ہے نہیں، صرف بچوں کو بہلانے کے واسطے چولہے پر ہنڈیا میں پانی رکھا ہے تاکہ بچے بہل کر سو جائیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ سن کر رو پڑے، فوراً واپس گئے اور کھانے کا سامان لائے اور خود چولہا جلا کر کھانا پکایا۔ حضرت اسلم کہتے ہیں کہ چولہے کی لکڑیاں جلانے کے واسطے پھونک مارتے تھے جس کی وجہ سے آپ کی پوری ڈاڑھی بھی دھویں سے بھر گئی۔ جب کھانا پک گیا تو اپنے سامنے ان بچوں کو کھلایا اور فرمایا کہ جس طرح میں نے ان کو روتا ہوا دیکھا تھا، اب ہنستا ہوا دیکھ کر جانا چاہتا ہوں۔

کتنے بچے ضائع کر دیے

ایک اور موقعہ پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ساتھ حالات کی تفتیش کے لیے نکلے ہوئے تھے، دیکھا کہ ایک بچہ رو رہا ہے، اس کی ماں سے کہا: یہ کیوں رو رہا ہے؟ اس کو راضی کرو اور اس کا رونا بند کراؤ۔ یہ کہہ کر آگے تشریف لے گئے، پھر جب دوبارہ وہاں سے گذرے تو دیکھا کہ وہی بچہ رو رہا ہے تو اس عورت کو تنبیہ کی۔ وہ عورت نہیں جانتی تھی کہ یہ امیر المؤمنین ہیں۔ تیسری مرتبہ پھر تنبیہ کی تو اس عورت نے کہا کہ دراصل مَیں تو اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں، اس لیے رو رہا ہے۔ اس بچہ کو دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس بچہ کی عمر اتنی تو نہیں معلوم ہوتی کہ اس کا دودھ چھڑایا جائے، ابھی سے اس کا دودھ کیوں چھڑوا رہی ہو؟ تو اس نے کہا کہ امیر المؤمنین بچوں کا وظیفہ اسی وقت مقرر کرتے ہیں جب ان کا دودھ چھڑا دیا جاتا ہے۔ اس لیے میں

اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور آپ کی ہچکیاں بندھ گئی، اور اتنا روئے کہ اس روز صبح کی پوری نماز میں بھی روتے رہے، اور نماز کے بعد کہا "كَمْ ضَيَّعْنَا أَطْفَالَ الْمُسْلِمِيْنَ" ہم نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو ضائع کر دیا، اس کے بعد اعلان فرمادیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ جاری کر دیا جائے۔

آج کل بچوں کے وظیفے جو یوروپین ممالک میں جاری کئے جاتے ہیں، یہ بھی دراصل حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں عوام کی فلاح و بہبودی کے لیے جو جاری کئے تھے اسی کی نقل ہے۔

بہر حال! بات امام عادل کی چل رہی تھی۔ تو آدمی کے ماتحت جو بھی ہوں وہ ان کا حکمران ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کسی فیکٹری کا مالک ہے، اور اس کے ماتحت بہت سارے مزدور کام کرتے ہیں، تو ان کے تمام معاملات میں بھی اس کو عدل وانصاف سے کام لینا چاہیے۔ ایسی تمام صورتیں جو ان کے استحصال کی ہوں، بلا معاوضہ ان سے فائدہ اُٹھا کر ان کے حقوق کو ضائع ہوتے ہوں؛ اس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔

بہر حال! ہر وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے کچھ نہ کچھ اختیار دیا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے دائرۂ اختیار میں جو لوگ بھی آتے ہیں، ان کے ساتھ عدل و انصاف سے کام لے۔

خواہشات کو رام کر کے

دوسرا وہ نوجوان جس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت کے اندر ہوئی ہو۔ نوجوانی میں جو جذبات ہوتے ہیں وہ اس بات کے متقاضی ہوتے ہیں کہ آدمی اپنی

شہوتیں پوری کرے اور رنگ رلیاں منائے، لیکن ایسی جوانی کے زمانہ میں بھی اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کے احکامات مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے جذبات کو دبا کر اپنی خواہشات کو رام کر کے، اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری واطاعت کا اہتمام کیا، گویا کہ اس کی نشو ونما ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں ہوئی؛ تو ایسا نوجوان بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ پائے گا۔

جس کا دل مسجد میں اٹکا ہو

اور تیسرا وہ آدمی جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا ہوا ہے۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ وہ آدمی جب مسجد سے باہر نکلتا ہے تو دوبارہ جب تک مسجد میں واپس نہیں آجاتا، وہاں تک اس کا دل مسجد ہی میں لگا رہتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نمازوں کی ادائیگی کے ساتھ اس کا ایسا تعلق ہے کہ ایک نماز ادا کرنے کے بعد جب وہ گھر یا دوکان پر واپس لوٹتا ہے تو دوسری نماز کا وقت آنے تک اس کا دل اسی طرف اٹکا ہوا رہتا ہے۔ جیسے ظہر کی نماز پڑھ کر اگر اپنے کسی کام یا ضرورت کے لیے گھر پر گیا، یا تجارت میں لگا ہے، تب بھی دل تو مسجد کے اندر ہی اٹکا ہوا ہے کہ کب عصر کا وقت ہو، اذان سنوں اور دوبارہ مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے جاؤں۔ گویا ہر وقت اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نماز کی ادائیگی کا خیال اور اہتمام ہے، اور اس کی وجہ سے دل اسی فکر میں مشغول ہے؛ ایسا آدمی بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سائے میں جگہ پائے گا۔

فرشتوں کی آمین کا کیا؟

نماز کی جماعت کے لیے جو قدم اُٹھائے جاتے ہیں اس کے بارے میں حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی تنہا نماز پڑھے اس کے مقابلہ میں جماعت کے ساتھ

نماز پڑھنے پر پچیس (۲۵) گنا ثواب زیادہ ملتا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، اور اس میں یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ جو قدم بھی مسجد کی طرف اُٹھاتا ہے اس پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔

اور بعض روایتوں میں ستائیس (۲۷) گنا ثواب کا تذکرہ آیا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا کہ جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی ہو، مسجد کے ساتھ ان کا ایسا تعلق ہوتا تھا کہ وہ کسی لمحہ بھی جماعت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

حضرت امام محمد بن سلمہؒ جو امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے شاگردوں میں سے ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ روزانہ دو سو رکعات نفل نماز پڑھا کرتے تھے، اور جماعت کی نماز کا بڑا اہتمام تھا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی وجہ سے جماعت چھوٹ گئی تو چوں کہ حدیثِ پاک میں جماعت کی نماز کا ثواب ستائیس (۲۷) گنا بتلایا گیا ہے۔ اور وہ تو فقیہ تھے اور جانتے تھے کہ ایک مرتبہ پڑھ لینے سے فریضہ ادا ہو جاتا ہے، اس کے باوجود اس حدیث کی وجہ سے انہوں نے اس نماز کو تنہا ستائیس (۲۷) مرتبہ ادا کیا، تاکہ جماعت کی نماز کی ستائیس گنا والی فضیلت حاصل کی جاسکے۔ اللہ تعالیٰ کا معاملہ بھی اپنے خاص بندوں کے ساتھ انہیں کے مناسب ہوا کرتا ہے۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے "یَا ابْنَ سَلِمَةَ! كَيْفَ بِتَأْمِيْنِ الْمَلَائِكَةِ؟" اے ابن سلمہ! فرشتوں کی آمین کا کیا کرو گے؟ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اور اس میں امام کے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھنے کے بعد آمین کہتا ہے تو اس وقت فرشتے آمین کہتے ہیں "فَمَنْ وَافَقَ تَأْمِيْنُهُ

تَأْمِيْنَ الْمَلاَئِكَةِ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ" جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوجاتی ہے یعنی وہ بھی اسی وقت آمین کہے جس وقت فرشتے آمین کہہ رہے ہوں تو اس کے اگلے سارے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ اس طرح گویا ان کو تنبیہ کردی گئی کہ آپ نے اس نماز کو ستائیس مرتبہ ادا تو کرلیا لیکن جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں امام کے ساتھ آمین کہنے پر جو فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ کہاں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ بہرحال! آدمی کا دل مسجد کی طرف لگا رہنا چاہیے کہ کب نماز کا وقت ہو اور مَیں پہنچوں۔

سنن ونوافل کا مقصد

آج کل تو مصیبت یہ ہوگئی کہ مسجد میں آنے بعد بھی لوگ باہر ہی کھڑے رہتے ہیں، وضو کرکے جماعت خانہ سے باہر ہی کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے ہیں اور گھڑی دیکھتے رہتے ہیں کہ ابھی تو پانچ سات منٹ باقی ہیں، سنتیں پڑھنے کی یا تلاوت و تسبیح میں مشغول ہونے کی توفیق نہیں ہوتی۔ حالانکہ نماز سے پہلے سنتیں اسی لیے رکھی گئی ہیں کہ آدمی ان کو پڑھ کر اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کرکے فرض ادا کرنے کے قابل بنائے۔ گویا فرض کی ادائیگی اس شان کے ساتھ ہونی چاہیے کہ اس کا دل پورے طور پر اللہ تعالیٰ شانہٗ کی طرف متوجہ ہو چکا ہو، اور رجوع وانابت کی ایسی کیفیت حاصل ہوچکی ہو کہ دوسرے سارے خیالات اس کے دل سے نکل چکے ہوں۔ اسی کیفیت کو بنانے کے لیے اس سے پہلے سنتیں رکھی گئی ہیں، لیکن اب اس کا بھی اہتمام ختم ہوتا جارہا ہے، اور وقت ہونے کے باوجود لوگ اس کی ادائیگی کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہ بڑی کوتاہی کی بات ہے۔

اللہ کے لیے باہم محبت

اور ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے محبت کی، اسی کی خاطر آپس میں ملے اور اسی کی خاطر جدا ہوئے۔ بعض تعلقات تو وہ ہوتے ہیں جو ہم آپس میں اپنی اغراض، تجارت وکاروبار اور دنیوی کام کاج کے لیے قائم کرتے ہیں، ان تعلقات کے پیشِ نظر بھی آپس میں ملاقاتیں ہوتی ہیں، اس کے لیے بھی لوگ آپس میں ملتے اور جدا ہوتے ہیں۔ لیکن ایک تعلق وہ ہوتا ہے جو اللہ کی نسبت پر، دین سیکھنے اور سکھانے اور دین کی باتوں کو عام کرنے کے واسطے قائم کیا جاتا ہے۔ اس نسبت سے آپس کے جو تعلقات ہوتے ہیں کہ اسی نسبت پر آپس میں ملے اور کام پورا ہونے پر اسی نسبت پر جدا بھی ہوئے۔ یہی وہ تعلق ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ اور اس روایت کو علامہ نوویؒ یہاں اسی بات کو بتلانے کے واسطے لائے ہیں کہ دیکھئے! یہ محبت وہ تھی جو اللہ کے واسطے تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو قیامت کے روز اپنے عرش کے سائے میں جگہ دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپس میں دین کی نسبت پر تعلقات قائم کر کے ان کو ترقی دینے اور بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور اکثر تعلقات اگر اسی نسبت پر قائم کر لیے جائیں تو ان شاء اللہ یہ فضیلت آسانی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس کی بڑی قدر و قیمت ہے

اور وہ آدمی جس کو حسن و جمال والی کسی عورت نے برائی و بدکاری کی دعوت دی تو اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ جوانی میں ویسے بھی آدمی پر شہوات کا غلبہ ہوتا ہے، نفس وشیطان کی طرف سے تقاضے ہوتے ہیں، اب ایسی حالت میں اگر کوئی

عورت اس قسم کی پیشکش کرے تو عام طور پر آدمی اس میں ملوث ہو جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کو ایسی حسن و جمال والی عورت (اور دوسری روایت میں "ذات منصب" کے الفاظ آئے ہیں) جو شریف گھرانے کی بھی ہو۔ یعنی آبرو باختہ اور پیشہ ور عورتیں تو اپنی طرف دعوتیں دیتی ہی رہتی ہیں اور شریف آدمی اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتا، لیکن جو عورت شریف گھرانے کی ہے اور حسین و جمیل بھی ہے، اگر ایسی عورت دعوت دے، اس کے باوجود کوئی آدمی یہ کہہ کر اپنے آپ کو اس سے الگ رکھے تو اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہے۔ یہ ایسا عمل ہے جس پر اللہ تبارک و تعالیٰ بہت راضی اور خوش ہوتے ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی نوازشات ہوتی ہیں۔

امتِ محمدیہ کے یوسف

امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں حضرت سلیمان بن یسارؒ کا واقعہ لکھا ہے۔ یہ تابعین میں سے ہیں، بڑے حسین و جمیل تھے، فقہاءِ سبعہ مدینہ میں ان کا شمار ہوتا ہے، ایک مرتبہ وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ حج یا عمرہ کے لیے جا رہے تھے، مقامِ ابوا میں انہوں قیام کیا اور خیمہ لگایا، ان کا ساتھی بازار میں کچھ لینے کے واسطے گیا۔ جہاں انہوں نے خیمہ لگایا تھا وہاں ایک چھوٹی سے پہاڑی تھی اور اس پر تنبو میں ایک بدو اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا، وہ عورت بھی بڑی حسین و جمیل تھی۔ جب اس عورت نے ان کو دیکھا تو ان پر فریفتہ و عاشق ہوگئی، اور وہ اس انتظار میں رہی کہ تنہائی کا موقعہ ملے تو مَیں ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کا ساتھی کسی کام سے باہر گیا ہوا ہے تو وہ فوراً پہاڑی سے اتر کر ان کے خیمہ میں پہنچ گئی اور اپنے چہرے پر سے نقاب ہٹا دیا۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ وہ اتنی حسین و جمیل تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ چاند کا ٹکڑا ہو۔

حضرت سلیمان بن یسارؒ تو اس کو دیکھ کر گھبرا گئے، وہ سمجھے کہ کوئی چیز مانگنے کے واسطے آئی ہے، اس لیے دینے کے واسطے کھانے کی کوئی چیز تلاش کرنے لگے۔ اس نے کہا کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے بلکہ میں تو آپ سے وہ چیز چاہتی ہوں جو ایک عورت مرد سے چاہا کرتی ہے۔ یہ سن کر انہوں نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ کر اتنی زور زور سے رونا شروع کیا کہ وہ عورت بھی گھبرا گئی، اور یہ سوچ کر کہ کہیں رسوائی نہ ہو جائے جلدی سے وہاں سے چلی گئی یہ روتے رہے جس کی وجہ سے آنکھیں اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کا ساتھی جب واپس آیا تو ان کی یہ کیفیت دیکھ کر پوچھنے لگا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے معاملہ کو چھپانے کے لیے کہا کہ گھر والے یاد آ گئے ہیں۔ اس نے کہا: نہیں! گھر والوں کی یاد میں آدمی ایسا نہیں روتا، سچ سچ بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے ساری تفصیل بتائی تو وہ بھی رونے لگا۔ انہوں نے کہا: تو کیوں روتا ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ میں یہاں نہیں تھا، ورنہ میں تو پھنس ہی جاتا، اور اپنے آپ کو اس طرح بچا نہ پاتا جیسا تم نے اپنے آپ کو بچایا۔

خیر! آگے چلے اور مکہ مکرمہ پہنچے۔ طواف سے فارغ ہونے کے بعد اپنی چادر میں لپٹ کر مقامِ ابراہیم اور حجر اسود کے بیچ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ غنودگی طاری ہوئی، خواب کی حالت میں ایک حسین اور خوبصورت نوجوان کو دیکھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا: آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: میں یوسف ہوں۔ پوچھا: یوسف صدیق ہو؟ کہا: ہاں۔ انہوں نے کہا کہ آپ کا زلیخا کے ساتھ کا قصہ بڑا عجیب ہے۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: وہ ابوا والی عورت کے ساتھ تمہارا قصہ اس سے زیادہ عجیب ہے۔

دیکھئے! اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا عمل کیسا قبول ہوا۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ

گناہ کے مواقع میں اپنے آپ کو بچالینا اور اپنی حفاظت کر لینا؛ یہ وہ عمل ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو بہت پسند ہے۔حضراتِ انبیاء کا عمل ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی نوازش ہوتی ہے۔ایسا آدمی بھی کل قیامت میں اللہ کے عرش کے سائے میں جگہ پائے گا۔

......تب تک صدقہ قابل قبول نہیں

اور وہ آدمی جس نے صدقہ کسی غریب کو دیا اور ایسا چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ہے۔یعنی صدقہ چھپا کر دینے میں ریا ونمود سے حفاظت ہوتی ہے،اور ساتھ ہی جس کو دیا جار ہا ہے اس کی عزت وحرمت کا بھی لحاظ رہتا ہے۔اگر اس طرح دیا جاتا ہے کہ لوگ دیکھیں تو اس سے جس کو دیا جار ہا ہے اس کی غیرت پر بڑا اثر پڑتا ہے،اس لیے اگر چھپا کر دیا جائے تو اس سے بھی اس کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ کوئی آدمی یہ سمجھ کر صدقہ دے کہ جس غریب کو صدقہ دے رہا ہوں،وہ اس مال کا جتنا محتاج ہے،مَیں اس صدقہ کے ثواب کا اس سے زیادہ محتاج ہوں،اور اس کا احسان میرے اوپر اس سے زیادہ ہے جتنا میرا اس پر ہے؛ تب تک اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدقہ قابلِ قبول نہیں سمجھا جاتا۔اس لیے یہ بھی ایک خاص چیز ہے،لہٰذا کوئی یوں نہ سمجھے کہ صدقہ دے کر میں احسان کر رہا ہوں بلکہ یہ سمجھے کہ وہ قبول کر کے میرے اوپر احسان کر رہا ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے ثواب مل رہا ہے۔

......اور آنسو آ گئے

اور وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں

اور آنسو آ گئے۔ ظاہر ہے کہ تنہائی میں تو کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے کہ وہاں ریا و نمود اور دکھلاوا مقصود ہو، بلکہ تنہائی میں جو آدمی اس طرح اللہ کو یاد کر کے روئے گا وہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور ڈر ہی کی وجہ سے روئے گا۔ تو یہ چیز بھی اللہ تعالیٰ کو بڑی پسند ہے۔ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان اعمال کا اہتمام کرنے کی سعادت وتوفیق عطا فرمائے

اللہ کے واسطے محبت اور تعلق رکھنے کی کیا فضیلت ہے،اوراس کی ترغیب بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

آج میں ان کو سایہ دوں گا

٣٧٧.عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللّٰهِ ﷺ:اِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلاَ لِیْ،اَلْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِیْ ظِلِّیْ يَوْمَ لاَظِلَّ اِلَّاظِلِّیْ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز یہ اعلان کریں گے کہ کہاں ہیں وہ لوگ جو میری عظمت و بڑائی کی خاطر آپس میں محبت رکھتے تھے؟ آج میں ان کو اپنے سائے میں جگہ دوں گا جبکہ میرے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے۔

افادات: اللہ تعالیٰ تو سب کو جانتے ہیں لیکن محشر میں جمع ہونے والے سارے مجمع کے اندران کے اس مقام کا لوگوں کو پتہ چل جائے اوردوسروں سے وہ ممتاز ہوجائیں اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے گا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی آدمی نیکی کا کوئی کام انجام دے،تو اگر حوصلہ افزائی کے واسطے اس کو دوسروں کے سامنے ممتاز کیا جائے،تاکہ دوسروں کو بھی پتہ چلے اوراس کام کی ترغیب ہو؛تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

جلال کا نکتہ

اور یہاں خاص طور پر لفظ ''جلال'' استعمال کیا ہے،لفظ ''جمال'' استعمال نہیں کیا یعنی اللہ تعالیٰ کی ہیبت اور خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے آپس میں محبت کا تعلق ہو،تاکہ ایسے صالح نوجوان جو بے ریش ہوں،ان کے صلاح کا نام لے کران کے ساتھ ظاہری

تعلق رکھ کر کسی کو یہ ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے کہ میں ان کے ساتھ اللہ واسطے محبت کرتا ہوں۔ گویا شہوانی طریقے پر کی جانے والی محبت نہ ہو، بلکہ اللہ کے واسطے ہی محبت کی جائے۔

جیسا کہ بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ فلاں تو اللہ کے جمال کا آئینہ ہے۔ حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ سے کسی نے سوال کیا کہ جو نوجوان ہوتے ہیں، ان کے حسین چہرے تو اللہ تعالیٰ کی صفتِ جمال کا آئینہ ہوتے ہیں؛ ان کو دیکھنے کی کیوں اجازت نہیں دی جاتی؟ حضرت تھانویؒ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ یہ آتشیں آئینے ہیں اگر دیکھیں گے تو آنکھوں کو جلا کر رکھ دیں گے۔ چنانچہ جو لوگ عشق مجازی میں مبتلا ہوتے ہیں، ہمیشہ ان کا دل بے چین رہتا ہے، ان کو کبھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ جبکہ اللہ کے عشق میں مبتلا ہونے والوں کو ایک طرح کا سکون وطمانینت حاصل ہوتی ہے۔

خیر! تو ان لوگوں کو خطاب فرما کر اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ آج میں ان کو اپنے سائے میں جگہ دوں گا جبکہ میرے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہے۔ گویا ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی عنایت اور توجہ کا معاملہ کیا جائے گا، اور اس دن کی گرمی اور تکالیف سے ان کو محفوظ رکھا جائے گا۔

باہم محبت پیدا کرنے کا نسخہ

۳۷۸. وعنه قال قال رسول اللهﷺ: وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَاتَدْخُلُوا الْجَنَّةَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا، وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا۔ أَوَلَا أَدُلُّكُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْهُ تَحَابَبْتُمْ؟ أَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَكُمْ۔ (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! تم لوگ جنت میں داخل نہیں

ہو سکتے یہاں تک کہ ایمان لاؤ (ظاہر ہے کہ ایمان کے بغیر تو آدمی جنت میں جا ہی نہیں سکتا، ایمان تو داخلۂ جنت کے لیے شرط ہے) اور تم کامل طور پر مؤمن نہیں بن سکتے یہاں تک کہ آپس میں اللہ کے واسطے ایک دوسرے سے محبت کرو (گویا آپس میں اللہ واسطے محبت کرنا ہی آدمی کے کمالِ ایمان اور حقیقی معنٰی میں مؤمن ہونے کی دلیل ہے۔ آگے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ) میں تم کو ایسا عمل اور نسخہ نہ بتلاؤں کہ جب تم اس کو انجام دو گے تو اس کے نتیجہ میں آپس میں محبت پیدا ہوگی؟ آپس میں سلام کو رواج دو اور پھیلاؤ۔

افادات: سلام کی بڑی تاکید آئی ہے۔ وہ اعمال جو آدمی کو جنت میں لے جانے والے ہیں نبی کریم ﷺ نے بہت تاکید کے ساتھ ان میں خاص طور پر افشاءِ سلام یعنی سلام کے عام کرنے کو بیان کیا ہے۔

حضرت مولانا ابرار الحق صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ وہ اعمال جن کے انجام دینے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرے نیک اعمال کی توفیق ہوا کرتی ہے ان میں ایک سلام بھی ہے۔ اس لیے بھائیو! سلام کی عادت ڈالو۔

آج کل ہمارے معاشرہ میں سے سلام ختم ہوتا جارہا ہے، اگر کوئی سلام کرتا بھی ہے تو کوئی جان پہچان والا مل گیا اسی کو کرتا ہے۔ قیامت کی علامتوں میں سے یہ بتلایا گیا ہے کہ جان پہچان والے ہی کو سلام کیا جائے گا۔ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو، جب یہ سمجھ رہے ہو کہ وہ مسلمان ہے تو اس کو سلام کیا جائے۔

بہر حال! حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سلام کے نتیجہ میں آپس میں محبت پیدا ہوگی اور اسی محبت کی وجہ سے تمہارے ایمان کے اندر قوت آئے گی۔ اب جو عمل ایمان کو تقویت پہنچانے والا اور درجۂ کمال تک پہنچانے والا ہو، جب حضور پاک ﷺ وہ نسخہ

ہمیں بتلادیں تو پھراس پر عمل کیوں نہ کیا جائے؟ ہر مومن کی یہ خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ مجھے ایمان کا کمال حاصل ہو۔

اللہ کی محبوبیت حاصل کرنے کا آسان عمل

۳۷۹. وعنه رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: أَنَّ رَجُلاً زَارَأَخَـالَهُ فِيْ قَرْيَةٍأُخْرٰى، فَـأَرْصَـدَ اللّٰهُ تَـعَالىٰ عَلىٰ مَدْرَجَتِهِ مَلَكًا۔وذكر الحديث الىٰ قوله: أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَاأَحْبَبْتَهُ فِيْهِ۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کی روایت ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتے ہیں کہ کسی آدمی کا دوسری بستی میں ایک دینی بھائی تھا جس سے اس کو اللہ کے واسطے محبت تھی وہ اس کی ملاقات کے لیے گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے راستہ میں ایک فرشتے کو بھیجا جو اس کے انتظار میں رہا۔ جب وہ اس دینی بھائی کی ملاقات کے لیے اس بستی کے قریب پہنچا تو وہ فرشتہ اس سے ملا اور پوچھا: کہاں کا ارادہ ہے؟ اس نے کہا: اس بستی میں میرا ایک دینی بھائی ہے جس کے ساتھ مجھے اللہ واسطے محبت اور تعلق ہے، اسی سے ملاقات کے لیے میں یہاں آیا ہوں۔ تو اس نے پوچھا: کیا تم نے اس پر کوئی احسان کیا تھا جس کا بدلہ حاصل کرنے کی غرض سے تم یہاں آئے ہو؟ یا تمہارا کوئی مطالبہ اور اُگھرانی (ઉઘરાણી) باقی ہے جس کی وصولی کے لیے آئے ہو؟ اس نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس! مجھے تو اس سے اللہ واسطے محبت ہے اور اسی محبت کی خاطر اس سے ملاقات کرنے آیا ہوں، اس کے علاوہ کوئی اور غرض اور مطالبہ وغیرہ نہیں ہے۔ اس پر اس فرشتے نے کہا کہ میں تیرے پاس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ جیسے تو نے اس کے ساتھ اللہ واسطے محبت کی؛ اللہ تعالیٰ بھی تیرے ساتھ محبت فرماتے ہیں۔

افادات: کتنا آسان عمل ہے جس میں کوئی دشواری نہیں ہے۔ بعض اعمال تو

ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، جیسے رات میں تہجد کے لیے اٹھنا، عبادات کی انجام دہی کے لیے محنت کرنا، روزے رکھنا جس میں کھانا پینا چھوڑنا پڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہاں تو بس آدمی سچے دل سے اللہ کے واسطے محبت کا تعلق قائم کرلے تو اس سے کتنی بڑی فضیلت حاصل ہوگی۔

انصار کی فضیلت

٣٨٠: عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال فی الانصار: لایحبھم الامؤمن ولایبغضھم الامنافق۔من أحبّھم أحبّہ اللّٰہ،ومن أبغضھم أبغضہ اللّٰہ.

ترجمہ: حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی فضیلت کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ ان سے مؤمن ہی محبت کرے گا، اور منافق ہی ان کے ساتھ بغض رکھے گا۔ جو انصار کے ساتھ محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس سے محبت رکھیں گے۔ اور جو انصار کے ساتھ بغض وعداوت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ بغض اور عداوت رکھیں گے۔

افادات: چوں کہ منافقین کو حضراتِ مہاجرین کا مدینہ منورہ آنا ناگوار تھا، اور اسی لیے وہ لوگ انصار سے بغض رکھتے تھے کہ انہوں نے ہی ان کو یہاں بلایا اور ان کو پناہ دی اور ان کا تعاون کرتے ہوئے ان کو اپنے گھروں میں جگہ دی۔ گویا انصار کے ساتھ محبت یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونے کی دلیل ہے۔

بیان چل رہا تھا: اللہ کی خاطر آپس میں محبت اور تعلق رکھنا، اور احادیث میں اللہ کے لیے محبت رکھنے کی جو ترغیب آئی ہے اس کو بتلانا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ روایت پیش فرماتے ہیں۔

انبیاء وشہداء رشک کریں گے

٣٨١: عن معاذ رضی اللہ عنہ قال: سمعت رسول اللہ ﷺ یقول: قال اللہ عزوجل: المتحابون فی جلالی، لھم منابر من نور یغبطھم النبیون والشھدآء.

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا (جس حدیث میں نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل فرمائیں وہ حدیث قدسی کہلاتی ہے) کہ میری عظمت اور جلال کی نسبت سے آپس میں محبت کرتے ہیں (یعنی اللہ کی بڑائی کے پیش نظر ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا تعلق رکھتے ہیں) ان کے لیے قیامت کے روز نور کے منبر قائم کئے جائیں گے جس پر وہ لوگ براجمان ہوں گے۔ ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر انبیاء کرام اور شہداء بھی ان پر رشک کریں گے۔

افادات: گویا وہ بھی تمنا کریں گے کہ یہ چیز ہمیں حاصل ہو جاتی۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ انبیاء کرام اور شہداء کو ان سے نیچا مقام ملا ہوگا۔ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً ایک آدمی کے پاس عمدہ سے عمدہ سو گھوڑے ہیں لیکن اس نے کسی کے پاس کوئی بہت ہی عمدہ گھوڑا دیکھا تو اس کے جی میں یہ خیال آیا کہ ایسا عمدہ گھوڑا میرے پاس بھی ہوتا تو اچھا تھا۔ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی پاس کوئی مخصوص چیز دیکھ کر آدمی کے دل میں یہ خواہش اور تڑپ پیدا ہوتی ہے کہ کاش! ایسی چیز مجھے بھی میسر آجاتی۔ تو یہاں بھی حضرات انبیاء کرام اور شہداء کے رشک کرنے سے کوئی اشکال

نہیں ہونا چاہیے۔

بہرحال! یہاں تو اللہ تعالیٰ کی خاطر جو لوگ آپس میں محبت کا تعلق رکھتے ہیں ان کو قیامت کے روز جو خصوصی انعام سے نوازا جائے گا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتلایا گیا کہ وہ ایک ایسا انعام ہوگا کہ اس چیز کے حصول کی انبیاء اور شہداء بھی تمنا کریں گے۔ اس سے اللہ واسطے کی جانے والی محبت کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاص کر کے اہل اللہ کے ساتھ ہماری جو محبت ہوتی ہے کہ ہمیں ان سے کوئی غرض نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ اللہ کے خاص بندے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر ایک دوسرے کے ساتھ آپس میں محبت اور تعلق رکھنا ہمارے اختیار کی چیز ہے۔ اگر ہم ان فضیلتوں کو حاصل کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔

بشارت سن لو

٣٨٢: وعن أبی ادریس الخولانی رحمہ اللہ دخلت مسجد دمشق، فاذا فتیً برّاق الثنایا واذا الناس معه، فاذا اختلفوا فی شیء، أسندوه الیه، وصدروا عن رأیه، فسألت عنه فقیل: هٰذا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔ فلما کان من الغد، هجرت، فوجدته قد سبقنی بالتهجیر، ووجدته یصلی، فانتظرته حتّٰی قضی صلاته، ثم جئته من قبل وجهه، فسلمت علیه۔ ثم قلت: واللّٰه انی لأحبك للّٰه۔ فقال: آللّٰه؟ فقلت: أللّٰه۔ فقال: آللّٰه؟ فقلت: أللّٰه، فأخذنی بحبوة ردائی، فجبذنی الیه، فقال: أبشر، فانی سمعت رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم یقول: قال اللّٰه تعالیٰ وجبت محبتی للمتحابین فیَّ، والمتجالسین فیَّ، والمتزاورین فیَّ، والمتباذلین فیَّ۔

(حدیث صحیح رواه مالك فی المؤطا باسناده الصحیح)

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابوادریس خولانیؒ (جو اکابر تابعین میں سے مستجاب الدعوات تھے اور صاحبِ کرامات بھی تھے، وہ) فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ دمشق کی مسجد میں داخل ہوا (دمشق اس زمانہ میں شام کا دارالسلطنت تھا) وہاں پر ایک نوجوان کو دیکھا جس کے دانت بڑے چمک دار تھے اور لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ اگر کسی مسئلہ میں لوگوں میں آپس میں اختلاف ہوتا تو اس کو حل کرنے اور اس الجھن کو دور کرنے کے لیے انہیں سے رجوع کرتے تھے، اور وہ جو فیصلہ کرتے تھے لوگ اسی کو تسلیم بھی کر لیتے تھے۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ مجھے بتلایا گیا کہ یہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں۔ جب دوسرا دن آیا تو میں جلدی سے مسجد میں پہنچ گیا تاکہ مجھے ان سے کچھ گفتگو کرنے کا موقع ملے، تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں آچکے ہیں اور نماز میں مشغول ہیں۔ مَیں ان کے انتظار میں رہا یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہوئے، تو میں نے ان کو سلام کیا اور عرض کیا کہ اللہ کی قسم! مَیں آپ سے اللہ واسطے محبت کرتا ہوں۔ انہوں نے کہا: اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتے ہو؟ میں نے کہا: ہاں! اللہ کی قسم کھا کر یہ بات کہتا ہوں۔ دوبارہ انہوں نے پوچھا: اللہ کی قسم کھا کر یہ کہتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ تو انہوں نے کمر کے پاس سے میری چادر پکڑی، اور مجھے اپنی طرف کھینچا، پھر فرمانے لگے کہ بشارت سن لو: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ میری خاطر آپس میں محبت اور تعلق رکھتے ہیں (اپنے کسی مفاد اور غرض کے لیے نہیں) اور اسی محبت کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات کرتے ہیں اور (یہ ملاقات سوکھی سوکھی نہ ہو، بلکہ) ایک دوسرے پر اللہ واسطے کچھ خرچ بھی کرتے ہیں (آپس میں کھلانے پلانے کا بھی سلسلہ ہوتا ہے) تو ایسے لوگوں کے لیے میری محبت واجب ہوگئی۔

افادات: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ صحابی ہیں اور انصار میں سے ہیں۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یمن کی طرف حاکم اور قاضی بنا کر بھیجا تھا۔ صحابۂ کرام میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا کہ لوگوں میں حلال اور حرام کے سب سے زیادہ جاننے والے معاذ بن جبل ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں طاعون پھیلا تھا، جو طاعونِ عمواس کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ اسی میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

مشغول شخص کے انتظار کا ادب

حضرت ابوادریس خولانیؒ فرماتے ہیں کہ جب دوسرا دن آیا تو میں جلدی سے مسجد میں پہنچ گیا تاکہ ان سے گفتگو کرنے کا مجھے موقع ملے، تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھ سے پہلے وہاں آچکے ہیں اور وہ نماز میں مشغول ہیں، تو میں ان کے انتظار میں رہا یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہوئے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انتظار میں تھے تو پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ پہلے بھی بتلایا تھا کہ دورانِ نماز یا وِرد اگر کسی کا انتظار کرنا ہو تو اس انداز سے انتظار نہ کیا جائے کہ اس کو پتہ چل جائے کہ فلاں آدمی میرے انتظار میں ہے۔ اس لیے کہ اگر ایسا ہوگا تو اس کی نماز یا وِرد میں جو یکسوئی ہے وہ باقی نہیں رہے گی۔ اس کا جی اس طرف متوجہ ہو جائے گا تو اس وِرد کا جو مقصود ہے وہ حاصل نہیں ہوگا۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کا انتظار مقصود ہو، اور وہ کسی عبادت نماز، ذکر، دعا، تلاوت وغیرہ میں مشغول ہے تو اس انداز سے اس کا انتظار کیا جائے کہ اس کو پتہ نہ چلے کہ فلاں شخص میرے انتظار میں ہے۔

ملاقات کا مناسب طریقہ

اور دوسری بات یہ فرمائی کہ جب وہ فارغ ہوئے تو ان کے چہرے کی طرف سے آیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی سے ملاقات کا مناسب طریقہ یہی ہے کہ سامنے کی طرف سے آیا جائے۔

اللہ کی محبت کے حق دار

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی خاطر آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں، جیسے دین کی

باتیں سیکھنے سکھانے اور سننے سنانے کے لیے، دین کی دوسری ایسی فکریں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ان امور کو انجام دینے کے لیے، لوگوں کی خدمت انجام دینے کے واسطے بیماروں کی مدد کا مشورہ کرنے کے لیے، جس میں اپنا مفاد اور غرض نہ ہو، ایسے امور کی تدبیریں اختیار کرنے کے لیے، اور ان پر غور وفکر کرنے کے لیے آپس میں مشورہ کے لیے بیٹھیں گے؛ وہ سب اسی ”اَلْمُتَجَالِسِیْنَ فِیَّ“ میں شامل ہوگا۔ جیسے ہم سب آپس میں مل کر اس وقت یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ہماری کوئی اور غرض نہیں ہے، نبی کریم ﷺ کے ارشادات سننے سنانے کے لیے جمع ہوئے ہیں؛ یہ بھی اسی میں داخل ہے۔ اللہ اور رسول کی باتیں سننے کے لیے کہیں بھی بیٹھ جاؤ، کتاب کی تعلیم ہو رہی ہے، قرآن پاک کے سیکھنے سکھانے کے لیے جمع ہونا، مسائل کا سیکھنا سکھانا، لوگوں میں دین پھیلانے کے لیے دعوت وتبلیغ کی نسبت سے بیٹھنا؛ یہ سب اس میں داخل ہے۔

دیکھو! محبت کا محل قلب ہے، اور جب اللہ واسطے محبت ہوگی تو اجتماعِ قلوب ہوگا اور پھر جب وہ لوگ آپس میں مل کر بیٹھیں گے تو اجتماعِ قوالب ہوگا۔

”وَالْمُتَزَاوِرِیْنَ فِیَّ“ اور اسی محبت کی خاطر آپس میں ایک دوسرے کی زیارت اور ملاقات کرتے ہیں۔ کسی کے یہاں آپ کا اسی نسبت سے جانا ہوا کہ اللہ کے کسی حکم کو پورا کرنا مقصد ہے، وہ بھی اس میں داخل ہے۔

”وَالْمُتَبَاذِلِیْنَ فِیَّ“ اور یہ ملاقات سوکھی سوکھی نہ ہو بلکہ ایک دوسرے پر اللہ واسطے کچھ خرچ بھی کرے، آپس میں کھلانے پلانے کا بھی سلسلہ ہو۔ تو جو ایک دوسرے پر آپس میں اللہ کی خاطر خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کے راستہ میں نکلے اور کہیں خرچ کی نوبت آ گئی تو ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہوئے اللہ ہی کی نسبت سے کہتے ہیں کہ میں خرچ کرتا ہوں، کوئی اور غرض مقصود نہیں ہے۔

اہل اللہ کی خدمت میں جب اللہ کے واسطے حاضری دی جاتی ہے تو وہاں یہ سب چیزیں پائی جاتی ہیں کہ ان سے محبت اللہ واسطے ہوتی ہے۔ان کی مجلس میں بیٹھنا اللہ کے واسطے ہوتا ہے۔ان کی زیارت کے لیے جانا اللہ واسطے ہوتا ہے۔اور جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، وہ بھی اللہ واسطے ہوتا ہے۔اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے سے محبت رکھنے والے،اور اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے،اور اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے کی ملاقات کرنے والے اور اللہ ہی کی خاطر ایک دوسرے پر خرچ کرنے والے؛ ایسے تمام لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری محبت واجب ہے۔گویا وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے حق دار ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے

یہ وہ نغمہ ہے جو......

یہی وہ مجالس ہوتی ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت کے جھونکے چلتے ہیں۔حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے"اِنَّ لِرَبِّکُمْ فِیْ أَیَّامِ الدَّھْرِ نَفَحَاتٌ،أَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَهَا، أَنْ تُصِیْبَکُمْ نَفْحَةٌ مِّنْهَافَلَا تَشْقَوْنَ بَعْدَهَاأَبَداً" زمانہ کے دن اور راتوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت کے خاص جھونکے چلتے ہیں، آپ لوگ ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔جیسے ہَوا چل رہی ہو اور اس کے سامنے اگر ہم آجائیں تو ہَوا ہم پر سے گذرے گی۔ اسی طرح اللہ کی رحمت کے جھونکوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، اگر ایک آدھ جھونکا آپ کو بھی لگ گیا تو پھر کبھی بھی بدبختی پاس نہیں آئے گی، ہمیشہ کی سعادت حاصل ہو جائے گی۔ اور گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ہمیشہ کے واسطے چن لیے جاؤ گے۔گویا اجتباء وجذبِ خداوندی ہوگی۔اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿اَللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ﴾ گویا یہ نعمت وہ ہے جو ہر ایک کو حاصل نہیں ہوتی اور ہر وقت نہیں ملتی: ؎

محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں	یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر چھیڑا نہیں جاتا

بہر حال! یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔ لیکن بزرگوں نے لکھا ہے کہ جو آدمی ذکر کا اہتمام کرے، اور گناہوں کو چھوڑ دے؛ تو ایسے لوگوں کے قلوب اللہ تعالیٰ کی ان رحمتوں کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں۔ ان قلوب میں اللہ کی رحمت کے جھونکوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

جب کسی سے اللہ واسطے محبت ہو

٣٨٣: عن أبی کریمة المقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: اِذَا أَحَبَّ الرَّجُلُ أَخَاهُ، فَلْيُخْبِرْهُ أَنَّهُ يُحِبُّهُ. (رواہ ابوداود والترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ: حضرت مقداد بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی سے اللہ کی خاطر محبت رکھے، تو اس کو چاہیے کہ جس کے ساتھ وہ اللہ کی نسبت سے محبت رکھتا ہے اس کو خبر کر دے کہ میں تم سے اللہ کی خاطر محبت رکھتا ہوں۔

افادات: اللہ کے لیے محبت کی جائے تو اس کے آداب میں سے یہ ہے کہ جس کے ساتھ آپ اللہ کی نسبت سے محبت اور تعلق رکھے ہوئے ہیں اس کو بھی باخبر کر دیں کہ میں آپ سے اللہ کی خاطر محبت کرتا ہوں۔ اور پہلے ایک روایت گذر چکی ہے جس میں یہ بھی تھا کہ جس کو بتلایا جائے وہ اس کو دعا کے طور پر یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت رکھے جس طرح تم اس کی خاطر مجھ سے محبت رکھتے ہو، اور اس کی وجہ سے یہ تعلق اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔

حدیث مسلسل بالمحبة

٣٨٤: وعن معاذ رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أخذ بیده وقال: یامعاذ! واللہ انی لأحبك ثم أوصیك یامعاذ! لاتدعن فی دبر کل صلوٰة تقول: أَللّٰهُمَّ أَعِنِّی

عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ۔

ترجمہ: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔ پھر فرمایا کہ میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ ہر نماز کے بعد یہ کہنا مت چھوڑیو، یعنی ہر نماز کے بعد پابندی سے یہ دعا کرتے رہنا "اَللّٰھُمَّ أَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِكَ وَشُکْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ" (جس میں یہ دعا مانگی گئی ہے کہ) اے اللہ! تو میری مدد کر اس معاملہ میں کہ میں تیری یاد کروں اور تیرا شکر ادا کروں، اور تیری عبادت بہتر طریقہ سے انجام دے سکوں۔

افادات: یہ روایت محدثین کے یہاں مسلسل بالمحبۃ کے نام سے مشہور ہے کہ ہر استاذ اپنے شاگرد سے یہ روایت بیان کرتے ہوئے مسلسل سند سے پہلے نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کرتا ہے، اور اخیر میں وہ بھی یوں کہتا ہے کہ میں بھی تم سے محبت کرتا ہوں، تم بھی ہر نماز کے بعد یہ پڑھا کرو۔ آپ لوگ بھی اس کا اہتمام کریں۔

میں نے بھی اپنے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ سے اور اسی طرح حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ سے یہ روایت اسی تسلسل کے ساتھ سنی ہے۔

معمولات پر پابندی کی دعا

اس دعا کی بڑی برکتیں ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے معمولات کی پابندی کے سلسلہ میں پریشان ہوتے ہیں کہ کچھ دنوں تک پابندی ہوتی ہے، پھر چھوٹ جاتے ہیں۔ بہت سے نیک اعمال شروع کرتے ہیں، کچھ دنوں تک معاملہ چلتا ہے، پھر ان سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اس دعا کا اہتمام کرنے کی برکت سے ان شاء اللہ معمولات کی پابندی بھی آسانی سے نصیب ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس دعا میں اللہ تعالیٰ کی مدد خاص ان تین کاموں کے لیے مانگی گئی ہے کہ اے اللہ! تو میری مدد کر اس بات پر کہ

میں تیری یاد اور ذکر کروں اور تیری نعمتوں پر تیرا شکر ادا کروں، اور تیری عبادت بہتر سے بہتر طریقہ سے انجام دوں۔ لہٰذا اس دعا کی عادت بنالو۔ فرض نماز کے سلام کے بعد فوراً پہلا کام یہ ہونا چاہیے۔ ان شاء اللہ اس دعا کی برکت سے آپ کے لیے اپنے معمولات پر پابندی بہت آسان ہوجائے گی۔

کیا تم نے ان کو بتا دیا؟

٣٨٥: عن أنس رضی اللہ عنہ أن رجلا كان عندالنبی ﷺ، فمرّ رجل به، فقال: يارسول الله! انی لأحب هٰذا، فقال له النبی ﷺ: أأعلمته؟ قال: لا، قال: أعلمه۔ فلحقه فقال: انی أحبك فی الله۔ فقال: أحبك الذی أحببتنی لهٗ. (رواه ابوداود باسناد صحيح)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک صحابی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، وہاں سے ایک صاحب گذرے۔ ان صحابی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مَیں اس آدمی سے محبت کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تم نے اس کو بتلا دیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس کو باخبر کردو۔ چنانچہ وہ صحابی اُٹھے اور جلدی سے جاکر ان سے ملے اور کہنے لگے: اللہ کی خاطر میں تم سے محبت رکھتا ہوں۔ تو ان صحابی نے کہا: جس ذات کی خاطر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو، وہ ذات بھی تم سے محبت رکھے۔

افادات: یہی آداب میں سے ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی خاطر آپس میں جو محبت اور تعلق قائم کیا جاتا ہے، جس میں اپنی کوئی غرض اور اپنا کوئی مفاد شامل حال نہ ہو، اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر ہے، اور اس کے نتیجہ میں آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے، اور قیامت کے روز اس کی وجہ سے بڑا مرتبہ حاصل ہوگا۔ یہ بڑی آسان چیز ہے، اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ کسی

کے ساتھ اللہ کی نسبت پر محبت کا تعلق قائم کر لینا بہت سہل سودا ہے۔ جتنے بھی دینی کام ہیں ان کو انجام دینے کے لیے آپس میں جو تعلق قائم کئے جائیں گے وہ سب اسی میں داخل ہیں۔ ان سب میں یہ فضیلت بڑی آسانی سے حاصل ہو جائے گی۔

علاماتُ حبِّ اللہِ تَعَالیٰ الْعَبْدَ وَالحَثِّ عَلی التَّخَلُّقِ بِهَا

اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں اور اس کو حاصل کرنے کی ترغیب

مجلس ۱

۱۷/ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ ۳۱/جولائی ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَن یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَن لَّااِلٰہ اِلَّااللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُاَنَّ سَیِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالیٰ عَلَیْہِ وَعَلیٰ اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ أمابعد:—

اللہ تعالیٰ کی اپنے بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں، اوراس کو حاصل کرنے کی ترغیب اوراس کے لیے کوشش کرنا۔ یعنی اللہ تعالیٰ بندے سے کب محبت کرتا ہے، اس کی نشانی بتلائی جاتی ہے، اوراللہ تعالیٰ کی محبت کو ہم کیسے حاصل کرسکتے ہیں کہ اللہ ہم سے محبت کرے، اوراس مقام کو ہم کیسے پاسکتے ہیں، اس کی ترغیب بھی دی ہے اوراس کو حاصل کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔

محبت کی نشانی

﴿قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌرَّحِیْمٌ﴾ اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ اگرتم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہوتو میری پیروی کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا اورتمہارے گناہوں کومعاف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ گناہوں کا معاف کرنے والا بڑا مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ محبت رکھتا ہے یہاں اس کی علامت یہ بتلائی گئی کہ آدمی نبی کریم ﷺ کی پیروی اوراتباع کرے۔ جوآدمی اپنی زندگی کے مختلف احوال اور شعبوں میں نبی کریم ﷺ کی زیادہ سے زیادہ پیروی اورآپ کے نقش قدم پرچلنے کا اہتمام کرے گا، یہ اس بات کی علامت سمجھی جائے گی کہ وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت یہی ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی پیروی اور اتباع کرے، حضور اکرم ﷺ کی سنتوں کو زیادہ سے زیادہ اپنی زندگی میں لانے کی کوشش کرے۔

مقام محبوبیت

اس لیے کہ دنیا میں کوئی آدمی کسی چیز کا دعویٰ کرتا ہے تو اس دعویٰ کی صداقت کے لیے اس سے کوئی علامت اور شہادت مانگی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ سے محبت ہے تو خود اللہ تعالیٰ نے ہی یہ فرمادیا کہ اے نبی! آپ ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو، اور جب اللہ کی محبت کی وجہ سے نبی کریم ﷺ کی پیروی کی، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس انعام سے نوازے جاؤ گے کہ اللہ تعالیٰ خود ہی تم سے محبت کرنے لگے گا یعنی اب تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ پہلے محبّ تھے، اب محبوب بن گئے۔ اور اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام بہت اونچا مقام ہے۔

میں پہلے بھی نقل کر چکا ہوں کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ بہت کثرت سے کیا ہے، کسی اور نبی کا تذکرہ قرآنِ پاک میں اس کثرت سے نہیں کیا گیا ہے، اور بعض جگہوں پر تو بڑی محبت اور خاص انداز سے کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک جگہ تو یہ کہا گیا ہے ﴿وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِي﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارے اوپر میں نے محبت ڈال دی، تاکہ تمہاری پرورش میری نگاہوں کے سامنے ہو۔ تو علامہ عثمانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب دیکھ کر مجھے خیال آتا تھا کہ نبی کریم ﷺ تو سید الانبیاء ہیں، لیکن آپ کا بھی تذکرہ قرآنِ پاک میں اس کثرت سے نہیں ہے، حالانکہ قرآن تو آپ

پر نازل ہوا؟ لیکن جب اس آیت پر غور کیا تو قلبی انشراح ہو گیا، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ جو آدمی نبی کریم ﷺ کی پیروی کرے گا، اللہ تعالیٰ خود اس سے محبت کرے گا۔ تو جن کی پیروی کرنے سے، اور جن کے نقشِ قدم پر چلنے سے؛ پیروی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام حاصل ہو جاتا ہو؛ تو خود اس ذات کو محبوبیت کا کتنا اونچا مقام حاصل ہو گا!!!

اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لائے گا

دوسری آیت پیش کی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کن لوگوں سے محبت کرتا ہے اس کی کچھ علامات بتلائی ہیں۔ ﴿یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَأْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ۔ أَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ أَعِزَّةٍ عَلَی الْکَافِرِیْنَ۔ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ﴾ اے ایمان والو! جو آدمی اپنے دین سے ہٹ جائے گا تو (اللہ تعالیٰ کو وہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، اللہ تعالیٰ کی ذات تو غنی ہے) وہ ان کی جگہ پر ایسی قوم کو لائے گا جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرے گا اور وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کریں گے۔ وہ لوگ ایمان والوں سے بڑی تواضع اور انکساری سے پیش آئیں گے، اور کافروں کے مقابلہ میں بڑی قوت کا معاملہ کریں گے۔ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے ہوں گے۔ اور اللہ کے معاملہ میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔ یہ (وہ مقام ہے جو) اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے جس کو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑا کشادہ عطا کرنے والا ہے اور بہت زیادہ جاننے والا ہے (کہ کون اس کا اہل ہے اور کون نہیں۔)

دو کاموں پر اعلانِ جنگ

٣٨٦: وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ قَالَ: مَنْ عَادىٰ لِي وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ. وَمَاتَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَايَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهٗ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهٗ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهٖ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهٖ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي أَعْطَيْتُهٗ، وَلَئِنْ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيْذَنَّهٗ. (رواه البخاري)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آدمی میرے کسی ولی کے ساتھ دشمنی رکھے گا، تو میں اس سے جنگ کا اعلان کرتا ہوں، لڑائی کی دھمکی اور چیلنج کرتا ہوں۔

افادات: دیکھو! قرآنِ پاک میں لڑائی کا ایک چیلنج دیا گیا ہے ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ سود کی حرمت کا حکم نازل ہونے سے پہلے جن لوگوں نے آپس میں سودی معاملہ کر رکھا تھا جیسے کسی کو سود پر قرض دے رکھا تھا تو باری تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا کہ اس سے پہلے سود کے جو معاملے تم کر چکے ہو، اس میں صرف اپنی اصل رقم ہی لیجیو۔ اوپر تم نے جو سود مقرر کیا ہے وہ مت لینا۔ سود کے معاملہ میں اتنا سخت رویہ اپنایا گیا۔ سابقہ جو معاملات ہو چکے تھے ان کے بارے میں بھی یہ تاکید کی گئی کہ بس! اصل ہی لینا، اوپر کا مت لینا۔ اور اگر ایسا نہیں کرو گے تو ایسے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ اور لڑائی کی خبر کر دو۔ اتنا خطرناک معاملہ ہے۔

آج اگر سورت کا کوئی معمولی پی ایس آئی، یا حکومت کا معمولی عہدے والا کوئی افسر کسی کو دھمکی دیدے کہ میں دیکھ لوں گا، تو اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی

ہے، اس کے کھانے کا مزہ کرکرا ہو جاتا ہے، زندگی کا لطف ختم ہو جاتا ہے، حالانکہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جس کو جنگ کی دھمکی دیں، اس کو کہاں سکون اور چین میسر آسکتا ہے۔ اس کے باوجود جو مسلمان اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے ہوئے سود کے معاملات کرے گا؛ وہ بھلا کیسے سکون پا سکے گا؟ اور پھر اس کے لیے ترقی کا راستہ کیسے کھل سکتا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنگ اور لڑائی کی دھمکی والا ایک حکم تو سود والا ہے جو قرآنِ پاک میں آیا ہے۔ اور دوسری دھمکی حدیثِ قدسی میں آئی ہے کہ جس نے میرے کسی دوست اور ولی سے، کسی اللہ والے سے دشمنی رکھی؛ تو- اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ- میری طرف سے اس کو لڑائی کا اعلان ہے۔

قبر سے تین پیغام

اسی لیے ہمارے شیخ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ ہمیشہ اپنی مجلس میں بڑی تاکید سے فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! ان اللہ والوں سے ڈرتے رہو۔

اور حضرت شیخ فرماتے تھے کہ میرے والد صاحب کا جب انتقال ہوا تو وہ اپنے سر پر بڑا قرضہ چھوڑ گئے تھے، جس کی ادائیگی مجھ پر آپڑی تھی، اور خاندان والوں کو بھی اس کی بڑی فکر تھی، لیکن مجھے اطمینان تھا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ایک صاحب تعزیت کے لیے آئے، بڑے آدمی تھے، اللہ والے تھے، اور ان کو کشفِ قبور ہوتا تھا، وہ والد صاحب کی قبر پر گئے اور مراقبہ کیا اور وہاں سے آنے کے بعد کہا کہ بھائی! تمہارے والد صاحب نے تین باتیں کہی ہیں اور میرے ذریعہ سے تم پر تین پیغام کہلوائے ہیں۔ ایک تو یہ کہا ہے کہ ان اللہ والوں سے ڈرتے رہیو، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔ اور دوسرا پیغام یہ دیا ہے کہ میرے قرضہ کے متعلق فکر مت کرنا وہ ادا ہو جائے گا۔ اور حضرت

شیخ فرماتے ہیں کہ شروع جوانی میں والد صاحب کے انتقال کے بعد مکان کے جس حصہ میں مَیں آرام کرتا تھا اس کے دروازے کی کنڈی نہیں لگاتا تھا، تو والد صاحب نے تیسرا پیغام یہ کہلوایا کہ دروازہ کی کنڈی لگالیا کرو۔ ویسے کنڈی لگانے کی حدیث میں بھی تاکید آئی ہے۔

اُلٹی کیسے سیدھی ہوسکتی ہے؟

حضرت شیخؒ نے آپ بیتی میں بھی لکھا ہے اور حضرت کی مجلس میں خود میں نے بھی کئی مرتبہ سنا ہے۔ فرماتے تھے کہ جب یہ جملہ میں نے سنا کہ ان اللہ والوں سے ڈرتے رہیو، ان کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے، تو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس لیے کہ مَیں یوں کہا کرتا تھا کہ اُلٹی تو اُلٹی ہی ہوتی ہے، کسی کی بھی ہو، اللہ والا ہے تو کیا ہوا؟ اُلٹی کیسے سیدھی ہوسکتی ہے؟ اس لیے حضرت فرماتے ہیں کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔

اس کے بعد جس زمانہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ - جو حضرت شیخ کے شیخ اور پیر ہیں - ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، تو جاتے وقت انہوں نے مدرسہ مظاہر علوم کی نظامت کے لیے حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ کو مقرر کیا، وہ حافظ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ سہارنپور میں دو چار لوگ حضرت حافظ صاحب کے مخالف تھے، ان سے بیر اور عداوت رکھتے تھے۔ حضرت سہارنپوریؒ جب مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے تو یہ لوگ یہاں سے حضرت پر حافظ صاحب کی جھوٹی جھوٹی شکایتوں کے خط لکھا کرتے تھے۔ جس زمانہ میں یہ غلط خط وہاں پہنچتے تھے تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوریؒ بھی وہاں مقیم تھے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت رائپوریؒ نے مجھ پر یہ لکھا کہ آپ حافظ صاحب سے کہئے کہ فلاں صاحب آپ

کے متعلق شکایتوں کے ایسے خط یہاں لکھ رہے ہیں، ان کو ذرا سنبھالیں۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت رائپوری کو جواب میں لکھا کہ آپ کو تو معلوم ہے کہ ان کو حافظ صاحب سے خواہ مخواہ کی دشمنی ہے، اور کوئی بات نہیں۔ اس لیے وہ لوگ جھوٹی شکایتوں کے خط لکھ رہے ہیں اور آپ بھی جانتے ہیں۔ حضرت رائپوری نے دوبارہ مجھے لکھا کہ نہیں! حافظ صاحب کو تاکید کرو کہ ان کی دل جوئی کرتے رہیں، تاکہ ان کی طرف سے اس طرح کے خطوط نہ پہنچیں۔ اس کے بعد حضرت رائپوریؒ جب واپس تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں لکھا، آپ کو بھی معلوم تھا۔ اس پر حضرت رائپوریؒ نے فرمایا کہ بھائی دیکھو! اگرچہ یہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ وہ جھوٹی شکایتیں لکھتے ہیں، لیکن جب بار بار ایسے خطوط حضرت کے پاس پہنچتے رہیں گے تو آپ بھی جانتے ہیں کہ جب کوئی جھوٹی بات بار بار کہی جاتی ہے تو وہ کچھ نہ کچھ اثر تو کرتی ہی ہے۔

فوراً بدگمانی

اور مَیں تو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ آج کل تو ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ ہم تو بہت کچے ہوگئے ہیں۔ ایک آدمی کے ساتھ سالہا سال سے ہمارا اُٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا ہے، اس کے مزاج سے ہم واقف ہیں اور ہمارے مزاج سے وہ واقف ہے۔ اس کے باوجود ایک غیر متعلق آدمی آکر ہمارے کان میں یوں کہہ دے کہ تمہارا دوست تمہارے متعلق ایسا ایسا کہہ رہا تھا، تو بس! ہمارا اس کے ساتھ کا پندرہ سال کا تجربہ ایک طرف رہ جائے گا اور اس غیر کی اس ایک بات پر ہم یقین واعتماد کرلیں گے۔ حالانکہ جس آدمی نے آکر یہ بات کہی ہے اسی پر ہم دوسری باتوں میں اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتے، پھر بھی اس بات کو سن کر تو ہمارا دماغ چکرا ہی جاتا ہے، اور ہم فوراً بدگمانی میں مبتلا ہوجاتے ہیں، اور اپنے

اس دوست اور ساتھی کے متعلق ہمارا پندرہ سال کا تجربہ دھرا کا دھرارہ جاتا ہے۔ ہمارا حال تو ایسا ہو گیا ہے۔

خیر! یہ تو بیچ میں ایک بات آ گئی تو صرف اسی غرض سے کہہ رہا ہوں کہ اس زمانہ میں اس طرح کے چکّر بہت بڑھ گئے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر بھائی بھائی میں، دوست دوست میں، اہلِ خاندان میں آپس میں اختلافات اور جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جب اس کی تحقیق کی جاتی ہے اور اس بات کی اندر سے کھود کرید کی جاتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں صاحب نے ایسا کہا تھا۔ اب جن صاحب نے اس کی بات پر اعتماد کیا ہے ان سے اگر سوال کیا جاتا ہے کہ بھائی! تم نے ان کی اتنی سی بات سن کر یہ کام کیا؟ کیا تمہارے نزدیک یہ آدمی معتبر ہے؟ تو وہی کہتا ہے کہ یہ معتبر آدمی تو نہیں ہے۔ جب معتبر نہیں ہے تو پھر کیوں اپنے زندگی بھر کے تجربہ کو اس کی وجہ سے قربان کر رہے ہو؟ آج کل ایسا ہو رہا ہے۔ اس لیے ایسی باتوں میں بہت سمجھ داری سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

تو ایک غلط بات بھی جب بار بار آدمی کے سامنے آتی ہے تو وہ دل پر اثر کرتی ہے۔ حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ حضرت رائپوریؒ نے فرمایا کہ حضرت کے پاس بھی جب بار بار یہ لوگ جھوٹی شکایتوں کے خط لکھتے رہیں گے، تو حضرت کے دل میں ان کے متعلق کدورت اور ناگواری پیدا ہو جائے گی کہ حافظ صاحب وہاں کیا کر رہے ہیں (جیسے اپنے کسی متعلق آدمی کے بارے میں جب بار بار شکایت پہنچے کہ وہ ایسی حرکتیں کرتا ہے تو اس کی وجہ سے بڑے کو تکلیف ہوتی ہے نا کہ یہ کیا غلط حرکتیں کرتا رہتا ہے) اور اللہ والوں کے دل میں کسی کے متعلق ناگواری کا پیدا ہونا اس کو فتنہ میں ڈالنے کا

ذریعہ بنتا ہے۔اس کے اوپر اس کی وجہ سے کچھ نہ کچھ ایسے حالات آہی جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے۔حضرت شیخ فرماتے ہیں کہ جب حضرت رائپوریؒ نے یہ بات کہی تو میری سمجھ میں وہ بات آئی کہ اللہ والوں کی اُلٹی بھی سیدھی ہوتی ہے۔

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کے اسلام کا قصہ

اسی سے ایک اور بڑا مسئلہ حل ہو جاتا ہے جو حدیث میں بھی آتا ہے لیکن بہت سے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔حضرت وحشی رضی اللہ عنہ جنہوں نے غزوۂ اُحد کے موقع پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔اُس وقت وہ کفار کی طرف سے آئے تھے اور ان کے آقا نے ان سے کہا تھا تم ان کو (حضرت حمزہ کو) قتل کرو گے تو مَیں تم کو آزاد کر دوں گا۔ چوں کہ ان کے آقا کے چچا کو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر کے موقع پر مارا تھا۔ تو حضرت وحشی اس وقت اسی لیے آئے تھے، اور انہوں نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تھا، اور پھر ان کو آزادی ملی۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام لوگوں کو عام معافی دیدی تھی، لیکن ان میں سے گیارہ مرد اور چار عورتیں؛ کل پندرہ اشخاص ایسے تھے جن کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا تھا کہ ان کا جرم ناقابل معافی ہے۔ان پندرہ میں سے ایک حضرت وحشی بھی تھے۔اس لیے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے واقعہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر پر بڑا اثر ہوا تھا، اور اس کے بعد ان کی نعش کے ساتھ بھی ان لوگوں نے جو معاملہ کیا تھا وہ بڑا بھیانک تھا، اس کی وجہ سے اور زیادہ تکلیف ہوئی تھی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے تو جلتے پر تیل چھڑکنے کا کام کیا تھا۔ خیر! جب ان کے متعلق یہ اعلان ہوا تو حضرت وحشی وہاں سے بھاگ کر طائف چلے

گئے، فتح مکہ کے بعد طائف کا بھی محاصرہ کیا گیا تھا لیکن وہ فتح نہیں ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو بتا دیا گیا تھا کہ وہ ابھی فتح ہونے والا نہیں ہے، اس لیے آپ نے وہاں سے محاصرہ اٹھالیا اور دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کو ہدایت دیدے اور مدینہ بھیج دے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے طائف والوں کو ہدایت دی۔ اور جس زمانہ میں مختلف قبائل کی طرف سے وفود حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں (٩ھ) پہنچ رہے تھے، طائف والوں نے بھی یہ کہلوانے کے لیے اپنا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں بھیجا کہ ہم سب اسلام قبول کرتے ہیں۔

طائف والوں کا وفد (deputation) جب مدینہ منورہ جا رہا تھا تو کسی نے حضرت وحشی سے کہا کہ ابھی موقع ہے، تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ جو آدمی وفد میں سفیر بن کر جاتا ہے اس کو گزند نہیں پہنچاتے اور اس کو کوئی تکلیف نہیں دی جاتی۔ اگرچہ آپ کے متعلق یہ اعلان ہو چکا ہے، لیکن اگر اس طرح جاؤ گے تو امید ہے کہ بچ جاؤ گے۔ چنانچہ اس وفد میں یہ بھی گئے۔ جب یہ مدینہ منورہ پہنچے اور نبی کریم ﷺ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے تو کسی نے حضور سے عرض کیا کہ یہ حضرت حمزہ کے قاتل وحشی ہیں۔ انہوں نے فوراً کلمہ پڑھا تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایک آدمی کا اسلام لانا مجھے ایک ہزار کافروں کے قتل کرنے کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہے۔ (فتح الباری۔ باب قتل حمزہ، ٤٢٧/٦٤)

انہوں جب کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر لیا تو حضور اکرم ﷺ نے ان سے کہا کہ اگر تم ایسا کر سکتے ہو کہ میرے سامنے نہ آؤ اور اپنا چہرہ مجھے نہ دکھاؤ؛ تو ایسا کرو۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی خواہش یہ دیکھی تو مدینہ

منورہ سے روانہ ہوگئے تاکہ آپ کے سامنے آنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ بھی دیکھنے کے قابل چیز ہے۔ محبوب کی خواہش کو اپنی خواہش پر ترجیح دینا اسی کو کہتے ہیں:۔

أُرِيدُ وِصَالَهُ وَيُرِيدُ هَجرِي	فَأَتْرُكُ مَا أُرِيدُ لِمَا يُرِيدُ

مَیں تو محبوب کے وصال کا طلبگار رہوں لیکن وہ میری جدائی چاہتا ہے۔ تو مَیں اپنی خواہش کو اس کی خواہش پر قربان کرتا ہوں۔ حضرت وحشی نے بھی نبی کریم ﷺ کی خواہش معلوم ہونے کے بعد مدینہ منورہ چھوڑ دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ (بخاری شریف۔ باب قتل حمزہ، ۴۰۷۲۔)

حضرت وحشی رضی اللہ عنہ کو کیوں منع فرمایا؟

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ تو رحمۃ للعالمین تھے اور ہیں، پھر آپ نے ان سے یہ کیوں فرمایا کہ تم اپنا چہرہ مجھے مت دکھاؤ اور میرے سامنے نہ آؤ؟

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے اس کا یہی جواب دیا ہے کہ یہاں آپ ﷺ کا ان کو اپنے سے دور رکھنا اپنے لیے نہیں، بلکہ اُن کے لیے تھا۔ حضرت وحشی کی بھلائی اور خیرخواہی اسی میں تھی کہ وہ حضور کی نظروں سے دور رہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو واقعہ پیش آیا تھا، اس سے حضور اکرم ﷺ کے قلبِ اطہر پر جو تکلیف ہوئی تھی، وہ بہت زیادہ تھی۔ چوں کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا مثلہ کیا گیا تھا جس کو دیکھ کر حضور اقدس ﷺ نے قسم کھائی تھی کہ مَیں اس کے بدلہ میں ستّر (۷۰) آدمیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کروں گا۔ اور جب تک بدلہ نہیں لوں گا تب تک چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ اسی پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ﴾ اگر تم بدلہ لینا چاہو تو پھر اتنا ہی بدلہ لو جتنا انہوں نے تمہارے ساتھ کیا ہے، اور اگر تم صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ اچھا ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ

نے اپنا وہ ارادہ بدل دیا اور اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔ (تفسیر ابن کثیر ۴/۵۹۲۔ سورۂ نحل)

خیر! حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت وحشی سے جو یہ فرمایا اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت وحشی جب بھی حضور کے سامنے آتے، تو وہ واقعہ تازہ ہو جاتا۔ جیسے کسی نے کسی کے بیٹے کو قتل کر دیا ہو تو چاہے والد نے قاتل کو معاف کر دیا ہو لیکن اس کو دیکھ کر بیٹے کے قتل کا منظر تو سامنے آ ہی جاتا ہے۔ اسی طرح ان کے سامنے آنے سے حضور ﷺ کو وہ واقعہ تازہ ہو جاتا اور آپ کے دل پر غیر اختیاری تکلیف ہوتی۔ اس لیے کہ تکلیف کا ہونا اختیاری چیز نہیں ہے۔ آپ کے اختیار میں معاف کر دینا تھا؛ وہ کر دیا۔ لیکن کسی کو دیکھ کر آدمی کے دل میں غیر اختیاری طور پر جو غم پیدا ہو جاتا ہے، اس میں اس آدمی کے اختیار کو دخل نہیں ہے۔ تو ایک واقعہ ہو چکا تھا اور حضرت وحشی کو دیکھ کر وہ چیز تازہ ہو جاتی، اور اس کی وجہ سے آپ ﷺ کے دل پر اثر ہوتا جس سے آپ ﷺ کے دل کو تکلیف پہنچ سکتی تھی، اور یہ چیز حضرت وحشی کو آئندہ چل کر فتنہ میں ڈال سکتی تھی، اس سے بچانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا کہ میرے سامنے مت آنا۔ گویا اس میں انہیں کی بھلائی تھی۔ نعوذ باللہ! یہ بات نہیں تھی کہ نبی کریم ﷺ ان سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ آپ کی شان تو حدیثِ پاک میں یہ آئی ہے کہ کبھی آپ نے اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا، تو یہاں بھلا کیسے لیتے۔

اللہ والوں سے عداوت نہ رکھو

بہرحال! مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ اپنی مجلس میں بار بار یہ ارشاد فرماتے تھے۔ اور خاص طور پر اہلِ علم سے کہتے تھے کہ دیکھو! اللہ والوں کے ساتھ دل میں عداوت نہ رکھو۔ کسی سے تم کو عقیدت نہیں ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تم نے ان سے عقیدت کیوں نہیں رکھی۔ اور تم ان سے بیعت کیوں نہیں ہوئے۔ لیکن ان کے متعلق اپنی دل میں بدگمانی اور عداوت نہ رکھو۔ اس لیے کہ اس پر "فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" والی بہت سخت وعید آئی ہے۔

اخبار لا اعتبار

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ آج کل لوگوں کی عادت ہے کہ بڑے اور مشہور علماء کے متعلق جب مخالفین اخباروں میں ایسی چیزیں دیدیتے ہیں تو وہ لوگ کہنے لگتے ہیں کہ فلاں صاحب نے ایسا کیا، اور فلاں صاحب نے ایسا کیا۔ ایک تو ویسے بھی اخباروں میں جو چیزیں آتی ہیں، اگر ہماری ذات کے متعلق آتا ہے تو ہم خود کہتے ہیں کہ اخبار والے جھوٹ لکھتے ہیں، اور اللہ کے کسی بندے کے متعلق ایسی کوئی بات اخبار میں آگئی، اور اس کو اللہ کا مقبول بندہ سمجھتے ہیں، پھر بھی ہم اخبار والے کی بات کو سچا مان لیتے ہیں۔ ہم نے بھی عجیب دو پیمانے اختیار کر رکھے ہیں۔

تب بھی بدگمانی نہ کریں

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ تو یہاں تک فرماتے تھے کہ تم نے اپنی آنکھوں سے اس کو کوئی غلط کام کرتے ہوئے دیکھا ہو، تب بھی کیا ضروری ہے کہ اپنے دل میں اس کے متعلق بدگمانی رکھو۔ تم نے اس کو غلط کام کرتے ہوئے تو دیکھا، لیکن معاملہ تو اس کا اور اللہ تعالیٰ کا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ رات کی تنہائیوں اور اندھیریوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر، آنسو بہا کر اس نے تو توبہ کر لی، اور آپ کو اس کی اس توبہ کا پتہ بھی نہیں چلا۔ اس نے تو اپنا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوبارہ ٹھیک کر لیا، اور تم زندگی بھر اس کے متعلق اپنے دل میں بدگمانی رکھ کر اور اس کی برائیاں کر کر کے اپنی عاقبت برباد کر رہے ہو۔ واقعہ یہی

ہے کہ ہم لوگ بہت سے اللہ والوں کے معاملہ میں اسی فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔اس لیے بھائیو دیکھو! یہ چیز بہت ضروری ہے۔آج کا یہ زمانہ فتنوں کا ہے،اور لوگوں میں ایسی باتیں بہت چلتی رہتی ہیں،اس لیے ذرا وضاحت کے ساتھ میں نے عرض کر دیا۔

معصوم کون ہے؟

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ معصوم کون ہے؟معصوم تو صرف انبیاء کرام ہی ہیں۔صحابہ کرام کے متعلق بھی ہم اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ یہ نہیں ہے کہ وہ معصوم تھے۔ہاں! ہم ان کو محفوظ ضرور سمجھتے ہیں۔تو پھر دوسروں کے متعلق کیا کہنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کسی اللہ والے کے متعلق دل میں ایسا جذبہ رکھنا جس کو عداوت سے تعبیر کیا جائے،اور پھر اس سے آگے بڑھنا کہ اس کی مخالفت کرنا،اس کی برائیاں کرنا،اس کے متعلق لوگوں میں غلط باتیں پھیلانا،اور اس کے درپئے آزار ہونا تو اور زیادہ خطرناک ہے۔

اور دیکھئے! اہلِ علم اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ "مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا" اصل میں تو یہاں یوں تھا"مَنْ عَادٰی وَلِیًّالِیْ" جس کا مطلب یہ تھا کہ جو میرے کسی دوست کے ساتھ عداوت رکھے۔"لِیْ" بعد میں ہونا چاہیے تھا،لیکن یہاں پہلے لائے۔گویا اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی اللہ والے کے ساتھ عداوت رکھنا یوں سمجھئے کہ اللہ کے ساتھ عداوت رکھنا ہے۔اس لیے یہ بڑی خطرناک چیز ہے،اس سے اپنے آپ کو بہت زیادہ بچانے کی ضرورت ہے۔اس زمانہ میں بہت سے لوگ ایسے ابتلاء میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔بھائی! ہم اور کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنے دلوں کو ایسی چیزوں سے پاک اور صاف رکھنے کا تو نہایت ہی اہتمام کریں۔

یہ حدیث تو ذرا لمبی ہے،ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں اس کی تشریح کریں گے۔

۲۴ ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ ۷ اگست ۱۹۹۹ء

یہ بیان چل رہا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کی کیا علامتیں اور نشانیاں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کرنے کے لیے ابھارنے والی باتیں ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ذکر کی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو آدمی میرے کسی ولی سے عداوت رکھتا ہے، ایسے آدمی کو میری طرف سے جنگ کا اعلان ہے۔ اس کی وضاحت گذشتہ مجلس میں ہو چکی ہے۔

قرب بالفرائض

آگے ارشاد ہے کہ بندہ میرا قرب کسی چیز سے اتنا زیادہ حاصل نہیں کرسکتا جتنا ان چیزوں سے کرسکتا ہے جو میں نے بندوں کے اوپر فرض کی ہیں۔ یعنی اللہ کا کوئی بندہ اللہ کا قرب حاصل کرنا چاہے تو اس کے دو راستے ہیں، ایک قرب بالفرائض، اور دوسرا قرب بالنوافل۔ قرب بالفرائض یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں پر جو چیزیں فرض کی ہیں جیسے پنج وقتہ نمازیں، رمضان المبارک کے روزے، زکوٰۃ، حج، اسی طریقہ سے جو چیزیں واجب ہیں وہ بھی عملی طور پر فرض کے ہی حکم میں ہیں جیسے قربانی اور صدقۃ الفطر۔ تو اس حدیثِ قدسی میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرا بندہ میری طرف سے اس پر فرض کی ہوئی چیزوں کو اور جن امور کو میں نے اس پر لازم اور ضروری قرار دیا ہے ان کو بجالا کر اور ان پر عمل کر کے میرا جتنا قرب اور نزدیکی حاصل کرسکتا ہے، کسی اور چیز سے اتنا قرب اور نزدیکی حاصل نہیں کرسکتا۔ گویا اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہونے میں نمبر اول پر فرائض ہیں۔

نفس وشیطان کا ایک دھوکہ

آج کل لوگوں کا جو مزاج بنتا جارہا ہے، اس حدیثِ پاک میں اس کی بھی اصلاح کی گئی ہے۔ ہر زمانہ میں شیطان اور نفس آدمی کو ایک الگ انداز سے دھوکہ دے کر گمراہی میں ڈالتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ نوافل کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں؛ فرائض کا اتنا زیادہ اہتمام نہیں کرتے۔ جتنی توجہ نوافل کی طرف کرتے ہیں، اتنی توجہ فرائض کی طرف نہیں کرتے۔ بعضوں کو دیکھا ہوگا، بقول حضرت حکیم الامت تھانویؒ: ''وظیفہ چیں بن جاتے ہیں'' یعنی یہ پڑھو اور وہ پڑھو۔ یہ اسم اعظم ہے اس کو ہزار اور لاکھ مرتبہ پڑھو۔ بس! اسی طرح صبح سے شام تک تسبیح لیے بیٹھے رہتے ہیں اور سب پڑھ رہے ہیں، لیکن فرض نماز نہیں پڑھ رہے ہیں، اس کی طرف سے غفلت ہے۔ فلاں صاحب نے یہ بتلایا کہ اس کے پڑھنے سے روزی میں برکت ہوگی اور اس کے عمل سے کاروبار میں ترقی ہوگی، اور اس کے پڑھنے سے لوگ ہماری طرف یوں مائل ہوں گے، اور یہ پڑھنے سے دشمنوں کے دل میں ہمارا رعب بیٹھے گا، وغیرہ وغیرہ۔ کہیں سے ذرا کچھ سن لیا کہ ہزار مرتبہ پڑھنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے، تو بس! تسبیح لے کر پڑھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ دراصل نفس وشیطان کا بڑا دھوکہ ہے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے، اس میں باری تعالیٰ یہ فرماتا ہے کہ کوئی بندہ میرا جتنا قرب فرائض کے ذریعہ سے حاصل کرسکتا ہے، نوافل یا کوئی اور عمل کے ذریعہ سے اتنا قرب حاصل نہیں کرسکتا۔

ایک مثال

اور اس کو ایک سیدھی سادی مثال سے سمجھو کہ آپ نے اپنے یہاں کسی کو ملازم رکھا اور اس کی ایک ڈیوٹی مقرر کی کہ مثلاً آفس میں تم کو یہ کام کرنا ہے، یہ حساب وکتاب

رکھنا ہے، اور یہاں جو مال آتا ہے اور جاتا ہے اس کی اینٹری کرنی ہے۔ یہ سارے کام اس کے ذمہ لگائے اور اسی کی تنخواہ آپ نے مقرر کی۔ اب وہ آدمی مقررہ کام جو آپ نے اس کے لیے ضروری ٹھہرائے ہیں وہ تو کرتا نہیں، حساب وکتاب تو رکھتا نہیں اور جہاں آپ آفس میں داخل ہوئے تو فوراً چائے پیش کرتا ہے، جب آپ اٹھنے لگے تو آپ کے جوتے سیدھے کر رہا ہے، آپ لیٹنے گئے تو آپ کے پاؤں دبانے لگتا ہے، لیکن جس کام کی آپ اس کو تنخواہ دے رہے ہیں، اس کے بارے میں آپ نے پوچھا کہ وہ حساب لاؤ، تو کہتا ہے کہ ذرا رہ گیا ہے، کل کرلوں گا۔ دوسرے روز پوچھا کہ اس حساب کا کیا ہوا؟ تو کہتا ہے کہ ہاں! کر رہا ہوں، آپ بے فکر رہیے۔ آپ کی دوسری ساری خدمتیں برابر کر رہا ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ حالانکہ آپ نے اس کو اس کے لیے رکھا بھی نہیں ہے، اپنی طرف سے وہ کام انجام دے رہا ہے۔ تو اب آپ ہی بتائیے کہ اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہوگی؟ آپ چند دنوں تک تو اس کا یہ حال برداشت کریں گے، اس کے بعد آپ اس کو رخصت کر دیں گے۔ حالانکہ وہ آپ کی ذات کی خدمت زیادہ کر رہا ہے، لیکن آپ کہیں گے کہ میں نے اس کو اس کام کے لیے نہیں رکھا ہے۔ تو درحقیقت اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو فرض قرار دیا ہے اس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کرسکتی۔

نماز باجماعت کی تاکید

اس زمانہ میں یہ ایک بڑی مصیبت ہے کہ کوئی آدمی اگر کسی چیز کی طرف مائل ہوا اور اس کے ذہن میں کوئی وظیفہ آیا تو اسی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ اللہ کا نام کوئی آدمی پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کا ثواب ضرور دیں گے۔ مَیں اس سے منع نہیں کر رہا ہوں

لیکن جو فرائض ہیں ان کو وہ آدمی ادا نہیں کرتا۔ یا نماز تو پڑھتا ہے لیکن گھر ہی میں پڑھ لیتا ہے، جماعت کے ساتھ نہیں پڑھتا؛ تو یہ بہت ہی غلط بات ہے۔ جماعت کی تو اتنی زیادہ تاکید آئی ہے کہ حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو لوگ رات کی نماز میں جماعت میں نہیں آتے، میرا جی تو چاہتا ہے کہ میں یہاں نماز کھڑی کرنے کا حکم دے کر جاؤں، اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اگر عورتوں اور بچوں کا خیال نہ ہوتا تو میں ایسا کرتا۔ بعض علماء کے نزدیک تو نماز کے لیے جماعت شرط ہے۔ ہمارے حنفیہ کے یہاں بھی جماعت سنتِ مؤکدہ ہے، کوئی آدمی اگر جماعت چھوڑنے کی عادت بنالے تو وہ فاسق ہے، اس کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ اور بھی بہت ساری احادیث میں اس کی بڑی تاکید آئی ہے۔

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایک آدمی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں نہیں آتا اور صبح صادق سے پہلے سے اٹھ جاتا ہے، اور اپنے گھر کے ایک کونہ میں مصلیٰ پر بڑی تسبیح لے کر بیٹھ جاتا ہے، مصلیٰ سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتا، اور فرض نماز وقت پر گھر ہی میں پڑھ لیتا ہے، جماعت کا اہتمام نہیں کرتا؛ تو اب آپ ہی بتائیے کہ اس کے لیے کیا فیصلہ ہے۔ اور جو آدمی نماز ہی نہیں پڑھتا اور سارے وظیفے پڑھتا رہتا ہے؛ اس کے متعلق کیا رائے ہے؟ تو درحقیقت اس قسم کے لوگ خاص دھوکہ میں ہیں، اور نفس وشیطان آدمی کو ان چیزوں میں ڈال کر اس کی جو اصل ذمہ داری ہے، اور اس کا جو فرضِ منصبی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر مختلف حیثیتوں سے جو چیزیں لازم اور ضروری قرار دی گئی ہیں، ان سے ہٹانا چاہتا ہے۔ اس لیے اس حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میرا بندہ میرا قرب کسی اور چیز سے اتنا زیادہ حاصل نہیں کرسکتا، جتنا فرائض کے ذریعہ سے حاصل کرسکتا ہے۔

دوسری مثال

اس کے بالمقابل آپ اپنا وہ ملازم دیکھئے کہ اس کے لیے آپ نے جو ڈیوٹی مقرر کی ہے، وہ برابر اس کو انجام دیتا ہے۔ وقت پر پابندی سے حاضر ہو جاتا ہے، اور اپنی ذمہ داری میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں کرتا۔ لیکن آپ کو سلام بھی نہیں کرتا، اور کبھی آپ کے جوتے اس نے سیدھے نہیں کئے، آپ کے ٹیبل پر ٹھنڈا پانی لا کر بھی کبھی نہیں رکھا، آپ بیمار ہوئے تو کبھی آپ کی خیریت پوچھنے بھی نہیں آیا، تب بھی جو واقعتاً تجارتی ذہن کا آدمی ہوگا وہ اس کی یہ ساری باتوں کو برداشت کر لے گا کہ وہ اپنی ڈیوٹی تو برابر پوری کر رہا ہے نا، بس! کافی ہے۔ اس کے متعلق آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی، آپ اس سے خوش ہیں، چاہے آپ اس کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار نہ کریں۔

تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرائض لازم کئے گئے ہیں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو فرض کیا ہے، اور پھر بندہ اس کی طرف سے غفلت برتے، تو یہ سوچنے کی چیز ہے کہ وہ کتنی بڑی غفلت قرار دی جائے گی۔ وہ ناقابل معافی جرم ہے۔ اور فرائض جان بوجھ کر چھوڑنے پر شریعت میں بہت سخت سزائیں ہیں۔ لیکن کوئی آدمی نفل نہیں پڑھے گا تو کوئی بھی سزا نہیں ہے۔ اس لیے یہ بڑی اہم بات ہے۔ ہم لوگ اس قسم کی حدیثوں کو پڑھتے ہیں اور ترجمہ سمجھ کر گزر جاتے ہیں، لیکن اس کے اندر جو سبق دیا گیا ہے، اور جس چیز کی طرف خاص طور سے متوجہ کیا گیا ہے، اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ اس میں ہماری اصل بیماریوں کو پکڑا ہے۔

بعض لوگ فرائض تو ادا کرتے ہیں لیکن نوافل کا جتنا اہتمام کرتے ہیں، اتنا اہتمام فرائض کا نہیں کرتے۔ ان کی جو توجہ نوافل کی طرف ہوتی ہے، اتنی توجہ فرائض کی

طرف نہیں ہوتی۔ پہلی قسم تو وہ تھی جو فرائض سرے سے ادا ہی نہیں کرتی تھی۔ اور دوسری قسم یہ ہے کہ جو فرائض ادا تو کرتی ہے لیکن جو خاص اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں کرتی۔ وہ بھی غلط ہے اور یہ بھی غلط ہے۔ جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست فرض قرار دیا ہو؛ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ چیز کتنی اہم ہوگی۔ اور جس کو فرض نہیں کیا ہے اس کا بھی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں کس چیز کی کتنی اہمیت ہے وہ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے گئے ہیں اسی سے پتہ چلتا ہے۔

قرب بالنوافل

اب فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کا مسئلہ آیا، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ نوافل کے ذریعہ سے میرے قریب ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ فرائض کی ادائیگی کے بعد محبت پیدا کرنے والی چیز نوافل ہے، کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنا مقام بنانا چاہتا ہے، تو خود اللہ تعالیٰ اس کے لیے نوافل کا راستہ بتارہے ہیں۔ جیسے ایک آدمی اپنی ڈیوٹی کے ساتھ ساتھ خدمتیں بھی کرتا ہے؛ تو آپ اُس کے ساتھ دل سے جو محبت کریں گے؛ وہ ظاہر ہے۔ اسی کے ساتھ ایک آدمی ایسا ہے جو اپنی تمام ذمہ داریوں کو پورا پورا انجام دیتا ہے، اس کی ڈیوٹی کے معاملہ میں آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن آپ کے ساتھ خدمت وغیرہ کا کوئی تعلق نہیں رکھتا تو سیدھی سی بات ہے کہ اِس سے اگرچہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہے، لیکن جو محبت اُس کے ساتھ ہوگی وہ اِس کے ساتھ نہیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ خود حفاظت کا انتظام کرتے ہیں

آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں جب کسی سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں

اور اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا قائم ہو جاتا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ اور میں اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کا پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

ان چیزوں کا کیا مطلب ہے؟ اس کی تشریح میں شراح اور علماء نے بہت ساری باتیں کہی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کسی بندے کو اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوبیت کا مقام ملتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بندے کی ہر حرکت وسکون، اس کا چلنا پھرنا، اس کا دیکھنا اور سننا؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ اسی چیز کو سنتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ اس کو اسی چیز کے سننے کی توفیق دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ اور جس کام سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے اس کو اس کام کی طرف جانے ہی نہیں دیتے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ ہی حفاظت کریں گے تو اس کے دل میں بھی ایسی چیزوں کے سننے کا خیال کہاں پیدا ہوگا۔ اس کو تصور ہی نہیں آئے گا۔ کوئی لاکھ اس کے پیچھے پڑے، اس کو اپنے ارادے سے ہٹا نہیں سکتا۔ دوسرے جملوں کا بھی یہی مطلب ہے کہ میں اس کی نگاہ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کو وہی چیزیں دکھلاتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہوتے ہیں، دوسری چیزوں کے دیکھنے کی اس کے دل میں خواہش ہی پیدا نہیں ہوتی۔ جیسے جس بچے سے باپ محبت کرتا ہو تو اس بچے کو باپ ایسی چیز کرنے ہی نہیں دیتا جو باپ کو پسند نہیں ہے۔ اس کو سمجھاتا رہتا ہے کہ دیکھو

بیٹا! ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس سے نقصان ہوگا۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، وہ تو دلوں کا مالک ہے، اس لیے وہ تو دلوں میں ایسی چیز کی رغبت اور میلان ڈالتا ہی نہیں جو خود کو ناپسند ہے۔

اس لیے کہ آدمی کوئی بھی کام اس وقت کرتا ہے جب پہلے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر آپ ہی کسی چیز کو دیکھنا نہ چاہیں تو پھر آپ کی آنکھ وہ چیز کیوں دیکھے گی؟ آنکھ تو وہی چیز دیکھتی ہے جس کا آدمی کے دل میں ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ پہلے دل حکم دے گا، پھر آنکھ ادھر متوجہ ہوگی۔ سننے کے لیے بھی یہی معاملہ ہے۔ پکڑنے کے لیے بھی یہی مسئلہ ہے۔ چلنے کے لیے بھی یہی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اس کی حفاظت کا انتظام کرتے ہیں، اور شیطان کو اس پر قابو اور تسلط دیتے ہی نہیں۔

قرآنِ پاک میں اسی کو کہا گیا ہے ﴿وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ﴾ شیطان نے جب اللہ تعالیٰ کے سامنے قسم کھا کر یہ کہا تھا کہ مَیں اولادِ آدم کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے گمراہ کروں گا، اور ان کا برابر شکار کرتا رہوں گا، اور ان میں سے اکثر وہ ہوں گے جو تیرے شکر گزار اور اطاعت شعار نہیں ہوں گے۔ تو نے ان کو جو نعمتیں جن مقاصد کے لیے دی ہیں؛ وہاں استعمال کرنے والے نہیں ہوں گے۔

شکر کس کو کہتے ہیں؟

آنکھ کا شکریہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھ جس کام کے لیے دی ہے، وہاں استعمال کی جائے۔ کان کا شکریہ ہے کہ کان جس کام کے لیے دیا ہے، وہاں استعمال کیا جائے۔ جس سے اللہ تعالیٰ راضی ہو وہی چیز سنی جائے، یہی کان کا شکر ہے۔ اور شیطان کے تسلط کے نتیجہ میں آدمی ان اعضاء کو ایسی جگہ استعمال کرنے لگتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ

نے استعمال کرنے سے منع کیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمادیا﴿اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ﴾ میرے جو مخصوص بندے ہیں ان پر میں تجھے قابو نہیں دوں گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بندہ فرائض کی ادائیگی کے بعد جب نوافل کا اہتمام کرتا ہے تو اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو وہی چیز دکھلاتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اور وہی چیز سنواتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ وہی چیز اس کے ہاتھوں پکڑواتے ہیں جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ اسی طرف اس کے قدم آگے بڑھتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ راضی ہوتا ہے۔ اس حدیث کے تمام مطالب کا خلاصہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا۔ تو اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ جب محبت کرے گا تو اس کی پوری طرح سے حفاظت کرے گا۔ دنیا کا بھی یہی دستور ہے کہ محبت کرنے والا جب کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کو کسی ایسی جگہ جانے ہی نہیں دیتا جہاں وہ نہیں چاہتا۔

سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں

"وَاِنْ سَأَلَنِیْ أَعْطَیْتُهٗ" جب اس کو یہ مقام حاصل ہوگیا تو اب ظاہر ہے کہ آگے کے سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اب اگر وہ مجھ سے سوال کرتا ہے اور مانگتا ہے تو میں اس کو دوں گا۔ اس کی کوئی درخواست رد نہیں کی جائے گی۔ جو دعا کرے گا وہ قبول ہوگی۔

"وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَأُعِیْذَنَّهٗ" اور اگر کسی شر سے اللہ کی حفاظت چاہے گا اور اللہ کی پناہ میں آنا چاہے گا، تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنی پناہ میں لے لیں گے۔ جب بھی کسی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آنا چاہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کریں گے۔

اس کے لیے تو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد ہوتی رہے گی۔

ایسی خیرات سے کیا حاصل؟

یہاں بات قرب کی چل رہی تھی اور اسی سے محبوبیت کا مقام ملتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ نمبر اول پر عبادات کے تمام شعبوں میں فرائض کا اہتمام کیا جائے۔ بہت سے لوگوں کو دیکھا ہوگا کہ خوب خیرات کرتے ہیں لیکن ان کو پوچھو کہ زکوٰۃ کا حساب کیا ہے؟ تو کہیں گے کہ نہیں کیا ہے۔ تو اب ایسی خیرات سے کیا حاصل ہوا؟ اس لیے فرائض اپنی جگہ پر فرائض ہیں، جب تک کہ وہ نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ کے یہاں نوافل قبول نہیں ہوتے۔ اس لیے فرائض کے اہتمام کے ساتھ جیسا کہ ابھی بتلا دیا کہ نوافل بھی کوئی بے کار چیز نہیں ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا وہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ ہر طرح سے اس کی مدد اور حفاظت کرتے ہیں۔

مقبولیت و مردودیت کا معیار

٣٨٧: وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ تَعَالىٰ الْعَبْدَ نَادىٰ جِبْرِيلَ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، فَيُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَاناً فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقُبُولَ فِي الْأَرْضِ. (متفق عليه)

وفي رواية لمسلم: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ إِذَا أَحَبَّ عَبْداً دَعَا جِبْرِيلَ، فَقَالَ: إِنِّي أُحِبُّ فُلَاناً فَأَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي

السَّمَاءِ، فَيَقُولُ: إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَأَحِبُّوهُ، فَيُحِبُّهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ يُوضَعُ لَهُ الْقُبُولُ فِي الْأَرْضِ. وَإِذَا أَبْغَضَ عَبْدًا دَعَا جِبْرِيلَ، فَيَقُولُ: إِنِّي أُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضْهُ، فَيُبْغِضُهُ جِبْرِيلُ، ثُمَّ يُنَادِي فِي أَهْلِ السَّمَاءِ: إِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ فُلَانًا فَأَبْغِضُوهُ، فَيُبْغِضُهُ أَهْلُ السَّمَاءِ، ثُمَّ تُوضَعُ لَهُ الْبَغْضَاءُ فِي الْأَرْضِ.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو پکارتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتے ہیں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ حضرت جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اس کے بعد حضرت جبرئیل آسمان والوں میں آواز لگاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندہ سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے زمین پر قبولیت ڈال دی جاتی ہے۔

یہی روایت ایک اور سند سے پیش کی ہے جس میں ایک اضافہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو ناپسند کرتے ہیں تو حضرت جبرئیل کو فرماتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے نفرت کرتا ہوں، تم بھی اس کو ناپسند کرو۔ چنانچہ حضرت جبرئیل اس کو ناپسند کرتے ہیں اور تمام آسمان والوں میں وہ اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں کو ناپسند کرتے ہیں، اے آسمان والو! تم سب بھی اس کو ناپسند کرو اور اس سے نفرت کرو۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان والے اس کے ساتھ نفرت اور بغض کا معاملہ کرتے ہیں۔ پھر اس کے لیے روئے زمین پر ناپسندیدگی رکھ دی جاتی ہے۔

افادات: اس حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے مقبولیت اور مردودیت کا صحیح معیار بتایا ہے۔ اس حدیث سے ہمارے اکابر اور شراح نے یہ استدلال کیا ہے کہ جو مقبولیت اوپر سے نیچے کی طرف یعنی خواص سے عوام کی طرف جاوے، وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ عنداللہ مقبول ہے۔ اور جو قبولیت ایسی نہ ہو، بلکہ صرف عوام ہی عوام تک محدود رہے، یا عوام میں بہت چرچا ہونے کی وجہ سے خواص بھی اس کو جاننے لگ

جائیں، لیکن اخص الخواص پھر بھی اس کی طرف متوجہ نہیں؛ تو یہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت نہیں ہے۔

عنداللہ مقبولیت کی اصل ترتیب تو یہی ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کریں، پھر حضرت جبرئیل، پھر وہ آسمان میں کہیں اور تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگیں اور پھر اس کی محبت زمین والوں میں ہو۔ اور پھر زمین میں بھی یہی ترتیب رہتی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کے اخص الخواص بندوں کے دلوں میں اس کی محبت پہلے آتی ہے۔ وہ اس سے محبت کا تعلق اور معاملہ کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ محبت کا معاملہ کرنے لگ جاتے ہیں کہ فلاں اہل اللہ کے یہاں یہ آدمی مقبول ہے۔ اور تمام اللہ والے اس سے محبت کا تعلق رکھتے ہیں۔ پھر یہ معاملہ آگے بڑھتا ہے۔ اور پھر عوام کے اندر مقبولیت آتی ہے۔ یہ عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے۔

مقبولیت یا فتنہ

کھیرالو والے باپو ([illegible]) کا کسی زمانہ میں بہت چرچا ہوا تھا، موجودین میں سے بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ ان کے دم کرنے کا عوام میں اتنا زبردست چرچا تھا کہ وہ بھروچ میں دم کریں گے اور ان کا دم سورت میں پہنچ جائے گا۔ کسی زمانہ میں ہر جگہ ان کا خوب چرچا تھا، لیکن اس زمانہ میں اللہ کے مقبول جو بندے تھے ان کو پتہ بھی نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور پھر تو لوگوں نے بھی دیکھ لیا کہ کچھ دنوں کے بعد اس کا کیا حشر ہوا۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح آیا اور گذر گیا۔ یہ کوئی مقبولیت نہیں ہے؛ بلکہ یہ تو ایک فتنہ ہوا کرتا ہے۔

اور اگر فساق وفجار کے وہاں کسی کا مقام ہے، اور اہلِ ایمان تو اس کو پسند ہی نہیں کرتے تو پھر اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسوں کے متعلق تو کوئی گمان ہونا ہی نہیں چاہیے کہ یہ بھی مقبولیت ہوسکتی ہے۔ ساری دنیا کے فساق وفجار اس کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور تعریفیں کرتے ہیں، اور ان کی طرف سے نکالے جانے والے اخباروں کے اندر اس کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں، تو یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہونے کی کوئی علامت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ظاہر فرمادیں گے

حدیثِ پاک کا مضمون ہے، حضور اقدس ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا کوئی عمل کرتا ہے، چاہے سات پردوں کے اندر ہو، مکان کے کونے میں اور اندھیریوں میں ہو؛ تب بھی جب وہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اس کو لوگوں میں ظاہر فرمادیں گے۔ اور جو آدمی اللہ کی نافرمانی کے کام کرتا ہے، چاہے سات پردوں میں چھپ کر کرتا ہو، تو وہ بھی لوگوں میں ظاہر ہوجاتا ہے۔

دلوں پر حکومت

دیکھو! ہر زمانہ میں جو اہل اللہ ہوتے ہیں ان کی محبت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ساری دنیا ان سے محبت کرتی ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ کیا آپ نے ان کو دیکھا ہے، تو بہت سے لوگ ایسے ملیں گے جو یہ کہیں گے کہ نہیں! آج تک ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ لیکن ان کے دلوں میں بھی ان کی محبت جوش مارتی ہے۔ ابھی ماضی قریب میں ہمارے حضرت قاری صدیق صاحب باندویؒ جب تشریف لاتے تھے۔ لوگ جب ان کی آمد کا سنتے تو کھنچے چلے جاتے تھے۔ ہر زمانہ میں اللہ والوں کی یہی مقبولیت رہی ہے۔ اور بعض اہل اللہ کا حال

تو ایسا ہے کہ ان کے انتقال کے بعد بھی صدیوں تک ان کی یاد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے وعظ میں ہے کہ ایک انگریز کہنے لگا کہ ایک آدمی صدیوں سے قبر میں سویا ہوا ہے، اور وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہا ہے۔ کون؟ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ۔ حالانکہ وہ قبر میں ہیں لیکن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے ہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ والوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں کس نے ڈالی؟ کیا کوئی ان کا خاص پروپیگنڈہ کرتا ہے؟ کسی اخبار میں آیا؟ کہیں ریڈیو اور ٹی وی پر ان کا نام آیا؟ بلکہ یہ لوگ تو ایسی تمام چیزوں سے اپنے آپ کو بہت دور رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے باوجود ان کا پورے عالم میں چرچا ہوتا ہے۔ حالانکہ اِس دور کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ان کا نام میڈیا میں ضرور آنا چاہیے، لیکن میڈیا میں ان کا کہیں تذکرہ نہیں ہوتا، اور لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے؟ یہ وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے، اسی کو ”ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْأَرْضِ“ کہا گیا ہے۔

یہی حال مبغوضیت کا بھی ہے۔ دنیا کے بہت سے بدمعاش اور اللہ کے بڑے بڑے نافرمانوں کو مَیں نے اور آپ نے کبھی دیکھا بھی نہیں ہے۔ فرعون اور ابوجہل کو کس نے دیکھا ہے، لیکن ابوجہل کے متعلق میرے اور آپ کے دل میں کیا محبت کا جذبہ ہے؟ اسی طرح ہر زمانہ کے اعلیٰ درجہ کے نافرمانوں کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ایک نفرت سی ہوتی ہے۔ آخر وہ کیا چیز ہوتی ہے؟ حالانکہ جس کے دل میں نفرت ہے اس سے پوچھا جائے کہ فلاں بندہ نے تیرا کچھ بگاڑا ہے؟ اس نے تیرا کوئی نقصان کیا

ہے؟ تو وہ کہے گا کہ نہیں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر کیوں اس کے متعلق نفرت ہے؟ کس نے دل میں نفرت ڈالی؟ دراصل یہی بات ہے کہ یہ سب قدرت کا نظام ہے۔

بہرحال! یہ دونوں چیزیں؛ مقبولیت اور مردودیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہیں۔ اور اس بات کو آپ لوگ یاد رکھ لیجئے کہ کون سی مقبولیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ خواص سے عوام کی طرف آوے۔ اگر صرف عوام ہی عوام میں رہے، خواص کی طرف نہ ہو، تو وہ عنداللہ مقبولیت کی علامت نہیں سمجھی جاتی۔

ایک صحابی کی ادا

٣٨٨: وَعَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ رَجُلًا عَلٰى سَرِيَّةٍ، فَكَانَ يَقْرَأُ لِأَصْحَابِهٖ فِيْ صَلَاتِهِمْ، فَيَخْتِمُ بِـ ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾، فَلَمَّا رَجَعُوْا ذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَالَ: "سَلُوْهُ لِأَيِّ شَيْءٍ يَصْنَعُ ذٰلِكَ"؟ فَسَأَلُوْهُ، فَقَالَ: لِأَنَّهَا صِفَةُ الرَّحْمٰنِ، فَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَقْرَأَ بِهَا، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "أَخْبِرُوْهُ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُحِبُّهٗ". (متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو لشکر کی ایک ٹکڑی کے اوپر امیر بنا کر بھیجا۔ (پہلے بھی میں بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم ﷺ جو لشکر روانہ فرماتے، اور آپ بنفسِ نفیس اس میں تشریف نہیں لے جاتے تھے، ایسے لشکر کو "سَرِيَّةٌ" کہتے ہیں۔ اور جو امیرِ لشکر ہوتا تھا وہی نماز کی جماعت کا امام بھی ہوتا تھا، اس کی تفصیل بھی پہلے بتلا چکا ہوں) تو وہ امیرِ لشکر جب ساتھیوں کو نماز پڑھاتا تھا تو ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد جو قراءت کرنی ہوتی وہ کرتا، اور اخیر میں "سورۂ قل ھو اللہ اُحد" پڑھتا۔ وہاں سے آنے کے بعد ساتھیوں نے نبی کریم ﷺ کے سامنے اس کا

تذکرہ کیا (کہ یارسول اللہ! ہمارے امام صاحب تو عجیب آدمی ہیں، ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد جو قراءت کرنی ہوتی وہ کرتے، اور اخیر میں ''سورۂ قل ھواللہ احد'' ضرور پڑھتے تھے۔ گویا تعجب کے طور پر رفقاء نے اس چیز کا تذکرہ کیا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ صرف یہی سورۃ پڑھتے تھے جیسے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، لیکن اِس روایت میں ''یَـخْتِمُ'' کا لفظ ہے۔) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے پوچھو کہ ایسا کیوں کرتا ہے؟ (آخر اس نے ایسی عادت کیوں بنائی ہے؟) لوگوں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس سورت میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے (﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ أَحَدٌ﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے ﴿اللّٰهُ الصَّمَدُ﴾ اللہ بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ﴾ نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔

شانِ نزول

روایتوں میں آتا ہے کہ کفارِ قریش نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ''أَنْسِبْ لَنَا رَبَّكَ'' چوں کہ ان کے یہاں تو نسب نامہ کی بڑی اہمیت تھی، اور وہ اپنے نسب اور خاندان پر فخر کرتے تھے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کو، بچہ بچہ کو، دیہاتی اور شہری کو اپنا نسب نامہ پورا یاد ہوتا تھا، بلکہ اپنا ہی نہیں، پورے خاندان کا نسب نامہ یاد ہوتا تھا۔ تو انہوں نے آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اپنے رب کا نسب بیان کرو، اس پر یہ سورۃ نازل ہوئی کہ اللہ تعالیٰ سے نہ کوئی پیدا ہوا ہے، اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو اس سورۃ میں بیان کیا گیا ہے۔

خیر! ان صحابی نے۔ جو اپنی ہر رکعت میں قراءت کے بعد یہ سورت پڑھا

کرتے تھے- جواب میں عرض کیا کہ)مَیں اس سورت کو پڑھنا اس لیے پسند کرتا ہوں (کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات کو بیان کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے یہ وجہ بتائی) تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو بتادو کہ اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرتا ہے۔

افادات: سیدھی بات ہے کہ جب کوئی اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس سے محبت کرے گا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہیں، جن کے ذریعہ سے آدمی اللہ کی محبت حاصل کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی محبت ومعرفت کے انوار سے ہمارے قلوب کو منور فرمادے۔

اَلتَحْذِیْرُ مِنْ اِیْذَآءِ الصَّالِحِیْنَ وَالضُّعْفَةِ وَالْمَسَاکِیْنَ

نیک اور کمزوروں کو تکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا

۱/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ ۱۴/ اگست ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداًعَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ أمابعد:

نیا عنوان قائم کیا ہے جس میں نیک لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے ڈرایا جا رہا ہے کہ نیک لوگوں کے ساتھ کوئی آدمی اگر ایذاء رسانی کا معاملہ کرے، کوئی ایسا سلوک یا رویہ اختیار کرے، جس سے ان کو تکلیف پہنچتی ہو؛ تو اس کے اوپر کیا وعید ہے۔ اور اس کی وجہ سے اس آدمی کو کیا نقصان بھگتنا پڑے گا۔ اس کو اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں۔

بڑا بہتان، کھلا گناہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلے تو قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے، اگرچہ وہ آیت اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، اس میں یہ حضرات بھی آجاتے ہیں جن کا باب کے عنوان میں تذکرہ آیا ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ایذا اور تکلیف پہنچاتے ہیں ﴿بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا﴾ بغیر اس کے کہ ان ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں نے کچھ ایسا کام کیا ہو جس کی وجہ سے وہ تکلیف کے حق دار بنتے ہوں۔ (مطلب یہ ہے کہ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ناحق تکلیف پہنچاتے ہیں) ﴿فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا﴾ تو ایسے لوگ اپنے اوپر بہتان کا اور کھلم کھلے گناہ کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ اگر تکلیف زبان کے ذریعہ سے غیبت کر کے یا اور کسی طریقہ سے پہنچائی ہے، تو

گویا وہ ایک طرح کا بہتان ہے جس کا گناہ اپنے سر ڈال رہے ہیں۔ قولی تکلیف کے لیے بہتان کا لفظ استعمال کیا۔ اور اگر اپنے کسی عمل اور فعل سے تکلیف پہنچا رہے ہیں تو بھی گویا کھلم کھلا گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

تو معلوم ہوا کہ کسی بھی اہلِ ایمان مرد یا عورت کو تکلیف پہنچانے پر، چاہے وہ قولی ہو یا فعلی ہو، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ایسا کرکے وہ اپنے سر پر بہت بڑا بہتان اور الزام لے رہے ہیں اور کھلم کھلا گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کھلم کھلا گناہ کا ارتکاب کیا تو اس کی سزا بھی ان کو بھگتنا ہے۔

گویا ان کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں بہتان اور اثمِ مبین سے تعبیر کیا ہے۔ اور قرآنِ پاک جس چیز کو اثمِ مبین کہے وہ کبیرہ گناہ میں داخل ہوگا۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ کسی بھی مسلمان مرد یا عورت کو تکلیف پہنچانا حرام ہے، چاہے کسی بھی طریقہ سے تکلیف پہنچائے، اپنی زبان سے پہنچائے یا اپنے ہاتھ سے پہنچائے، کوئی ایسا طرزِ عمل یا ایسی عملی شکل اختیار کرے جس کے نتیجہ میں کسی کو تکلیف پہنچ رہی ہے؛ تو وہ سب حرام اور گناہِ کبیرہ ہے۔

غلط پارکنگ

ہم لوگ بہت سی مرتبہ ایسا کام کرلیا کرتے ہیں جس کی وجہ سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے اور ہمیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جیسے ایک آدمی اسکوٹر پر سوار ہو کر جا رہا تھا، کوئی ملنے والا سامنے آیا تو وہیں راستہ میں اپنی سواری اس طرح کھڑی کردی، یا اپنی گاڑی راستہ ہی میں ٹھہرادی، اس کی وجہ سے پیچھے والوں کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔ یا اپنی سواری ایسی جگہ پارک کردی جس کی وجہ سے آنے

جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ آدمی جب عجلت میں ہوتا ہے تو عام طور پر یہ سمجھ کر کہ مَیں ابھی آتا ہوں، اپنی موٹرسائیکل یا کار کو غلط جگہ پارک کر کے چلا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی ایک دو کو نہیں، بلکہ کئی آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ وہ تو یہ سمجھ کر گیا تھا کہ دو چار منٹ میں آجاتا ہوں لیکن انہیں دو چار منٹ میں یہاں کیا ہو رہا ہے، اس کا اس کو اندازہ نہیں ہوتا۔ جب کبھی خود ہی اس طرح کی تکلیف سے دوچار ہوتا ہے تو پھر اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے۔

ٹیپ ریڈیو زور سے بجانا

اسی طرح اپنے گھر میں زور زور سے ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈ بجا رہا ہے، چاہے اس میں کسی کا وعظ ہی کیوں نہ ہو۔ یہ کیا بات ہوئی کہ آپ جو وعظ سننا چاہتے ہیں وہ دوسروں کو- جبکہ وہ اپنے کام مشغول ہیں- زبردستی سنائیں۔ جب زور زور سے آواز ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی کی نیند خراب ہوتی ہے۔ یا آپ کے لیے چاہے سونے کا وقت نہ ہو لیکن کوئی بیمار ایسا ہے کہ جس کو رات بھر نیند نہیں آئی تھی، اور اِس وقت اس کی آنکھ لگ ہی رہی تھی کہ آپ کی ریڈیو کی آواز سن کر اس کو جو آرام پہنچنے والا تھا اس سے وہ محروم ہو گیا۔ لوگوں کو تکلیف پہنچانے کی اور بھی بہت ساری شکلیں ہیں۔

نماز سے تکلیف نہ دے

علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ ایک آدمی نماز کی نیت مسجد کی آخری صف میں باندھ رہا ہے، اور پوری مسجد خالی ہے تو اس کو چاہیے تھا کہ آگے کی صفوں میں کہیں کھڑا ہو کر نیت باندھتا۔ جب آخری صف میں نیت باندھے گا اور کوئی نکلنا چاہے گا تو اس کو پوری مسجد گھوم کر جانا پڑے گا۔ یہ بھی ایذاء مسلم میں آجاتا ہے۔ ہر موقع پر آدمی کو اس

بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ مَیں جو شکل اختیار کر رہا ہوں اس کی وجہ سے کسی کو دانستہ یا نادانستہ کوئی تکلیف تو نہیں پہنچ رہی ہے۔

عام استعمال کی چیزوں کو اس طرح استعمال کر کے رکھ دینا کہ آئندہ وہ کسی دوسرے کے لیے قابلِ استعمال نہ رہیں؛ یہ بھی اسی میں داخل ہے۔ بہرحال! آدمی اگر سمجھ داری سے کام لے، تو ایسی بہت سی باتوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے جو اس کی بے خبری میں لوگوں کی ایذاء اور تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔

یہاں تو علامہ نوویؒ نے یہ آیت پیش کی ہے، اس میں چوں کہ عام اہلِ ایمان -چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں ہوں ان- کو ایذاء پہنچانے پر اللہ تعالیٰ نے یہ وعید سنائی ہے، اس میں صالحین تو بطریقۂ اولیٰ آجائیں گے۔ جب عام اہلِ ایمان کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے تو جو نیک لوگ اور اللہ کے مقبول اور مقرب یا کمزور اور مسکین بندے ہیں ان کو اگر کوئی آدمی تکلیف پہنچائے گا تو اس میں تو اور زیادہ گناہ ہوگا۔

جس کا کوئی نہیں

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿فَأَمَّا الْيَتِيمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ کسی یتیم کے اوپر مسلط مت ہو جاؤ، اور اس کو مغلوب مت کرو۔ یعنی یتیم کے ساتھ زبردستی ایسا معاملہ مت کرنا جس کی وجہ سے وہ دباؤ میں آجائے۔ یتیم بھی کمزوروں میں آجاتا ہے۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسا کمزور جس کے متعلق یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ہمارے اس معاملہ پر ہمارے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے سکے گا، اس کی طرف سے ردِّ عمل کے طور پر کوئی کارروائی نہیں ہوگی، تو قوی آدمی اس کے ساتھ غلط معاملہ کرنے کی جرأت کر لیتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں اس کا اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔

بھلے ہی دنیا میں وہ کمزور ہے اور اس وجہ سے وہ آپ کے اس غلط رویہ پر فوری طور پر کوئی ایکشن اور بدلہ نہیں لے سکتا۔ لیکن آپ یہ سمجھ کر کہ وہ میرا کچھ نہیں کرسکتا، اس کے ساتھ ناحق زیادتی کریں؛ شریعت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے۔

بلکہ بعض روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا آدمی جس کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہو، ایسے آدمی کے ساتھ جب کوئی زیادتی کا معاملہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی غیرت جوش میں آجاتی ہے، اور پھر وہ آدمی ایسا پکڑ لیا جاتا ہے کہ دوسروں کے لیے عبرت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس لیے کبھی کسی کی کمزوری کو دیکھ کر اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کرنا؛ یہ آدمی کے لیے بڑا مہلک اور خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اس لیے کہا کہ یتیم کو مغلوب مت کرو، بلا وجہ اس کو دباؤ میں مت لاؤ۔

سائل کو مت جھڑکو

﴿وَأَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ اور مانگنے والے کو مت جھڑکو۔ کوئی آدمی آپ کے پاس سوالی بن کر آیا، تو اگر اس کے سوال کو پورا کرنے کے لیے آپ کے پاس کچھ موجود ہے تو آپ اپنی حیثیت کے مطابق اس کو دے دیجئے۔ لیکن آپ اس کو کچھ دیتے تو ہیں نہیں اور بلا وجہ جھڑکتے ہیں، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ شریعت نے ہر ایک کے لیے کچھ حقوق مقرر کئے ہیں کوئی آدمی جب آپ کے دروازہ پر سائل بن کر آیا ہے تو شریعت نے اس کا بھی حق رکھا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے "لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَإِنْ جَاءَ عَلَىٰ فَرَسٍ" (ابوداود شریف۔۱٦٦۷) مانگنے والے کا بھی ایک حق ہے، چاہے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ہی آیا ہو اگر کوئی آدمی موٹر سائیکل پر مانگنے کے لیے آیا تو آپ اس سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تیرے پاس موٹر سائیکل

ہے، اور تو مانگتا ہے؟ اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ بے چارہ موٹر سائیکل پر جارہا تھا، اور کسی نے لوٹ لیا۔ اب اس کی جیب میں کچھ نہیں بچا اس لیے اس کو مانگنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ ہمیں اس چکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے پاس موٹر سائیکل ہے اور مانگتا ہے۔ ہم اس کے سوال پر اپنی حیثیت کے مطابق اگر اس کی کچھ مدد کر سکتے ہیں تو کریں۔ اور اگر ہمارے پاس اتنی طاقت اور استطاعت نہیں ہے، تو کم از کم اس کو جھڑکنے کی یا اس کے خلاف کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے اُلجھا نہ جائے، بلکہ اس کو کوئی مناسب اور بھلی بات کہہ دیجئے؛ یہ بھی نیکی کا کام ہے۔ اور جب مانگنے والا آپ کو یہ دعا دے رہا ہے کہ اللہ تمہارا بھلا کرے تو آپ بھی اس کو یہی دعا دید یجئے، لیکن اس کو کسی حال میں بھی جھڑکا نہ جائے؛ یہ بدسلوکی ہے۔ وہ تو آپ سے اچھی توقع لے کر آیا تھا، اب آپ اس کی وہ توقع تو پوری نہیں کر رہے ہیں، اور زبان سے اس کو بھلی دعا دے سکتے تھے، یا اچھی بات کہہ سکتے تھے؛ وہ بھی نہیں کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ اس میں تو آپ کا کوئی خرچ بھی نہیں ہو رہا ہے، اوپر سے اس کو جھڑک رہے ہیں گویا یہ تو بالکل گھٹیا درجہ کی اور نچلی سطح کی بات ہوئی۔ کوئی معمولی آدمی بھی اس گوارہ نہیں کرسکتا کہ جب آپ کچھ مال نہیں دے رہے ہیں تو زبان سے اچھی بات کہہ دینے میں تو آپ کا کچھ خرچ نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی تو آپ اس کو ڈانٹنے کے لیے زبان ہلا ہی رہے ہیں؛ تو بھلی بات کے لیے یا دعا دینے کے لیے ہلانے میں کیا حرج تھا؟ شریعت کی یہی تعلیم ہے کہ ہم اپنے اخلاق کو کیوں خراب کریں؟ ہاں! اگر وہ بار بار بلاوجہ آپ سے اُلجھ رہا ہے، تو اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے حسنِ تدبیر سے کم سے کم جو طریقہ ہوسکتا ہو، وہ اختیار کر سکتے ہیں۔

آگے اس سلسلہ میں جو روایتیں لا رہے ہیں ان میں دو روایتوں کا تو حوالہ ہی دیدیا۔ ایک تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جو پچھلے باب میں گذری "مَنْ عَادیٰ لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ" باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو میرے کسی دوست اور ولی کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے، اس کو میں جنگ کی وارننگ دیتا ہوں۔ اس کی پوری تفصیل اوپر والے باب میں گذر چکی ہے۔

ایک اور روایت کا حوالہ دیا ہے جو کئی ابواب پہلے گذری ہے، اس کو تو ہم دوبارہ تازہ کر لیتے ہیں۔

اللہ کی تلواروں نے حق وصول نہیں کیا

عَنْ أَبِی هُبَيْرَةَ عَائِذِبْنِ عَمْرٍو الْمُزَنِيِّ وَهُوَمِنْ أَهْلِ بَيْعَةِ الرِّضْوَان رضی اللہ عنہ أَنَّ أَبَا سُفْيَانَ أَتٰى عَلٰى سَلْمَانَ وَصُهَيْبٍ وَبِلالٍ فِیْ نَفَرٍ، فَقَالُوْا: مَا أَخَذَتْ سُيُوْفُ اللّٰهِ مِنْ عَدُوِّ اللّٰهِ مَأْخَذَهَا۔ فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ رضی اللہ عنہ: أَتَقُوْلُوْنَ هٰذَا لِشَيْخِ قُرَيْشٍ وَسَيِّدِهِمْ؟ فَأَتَى النَّبِيَّا فَأَخْبَرَهُ، فَقَالَ: يَاأَبَابَكْرٍ! لَعَلَّكَ أَغْضَبْتَهُمْ؟ لَئِنْ كُنْتَ أَغْضَبْتَهُمْ لَقَدْ أَغْضَبْتَ رَبَّكَ۔ فَأَتَاهُمْ، فَقَالَ: يَاإِخْوَتَاهُ! آغْضَبْتُكُمْ؟ قَالُوْا: لَا، يَغْفِرُاللّٰهُ لَكَ يَا أَخِیْ۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابوہبیرۃ رضی اللہ عنہ جو اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ صلحِ حدیبیہ کے زمانہ میں ابوسفیان کا مدینہ منورہ آنا ہوا۔ حضرت سلمان فارسی، حضرت صہیب رومی، حضرت بلال حبشی اور دوسرے فقراء مسلمان ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے (اور یہ تینوں پردیسی تھے۔ حضرت سلمان فارس کے رہنے والے تھے۔ حضرت صہیب روم کے رہنے والے تھے اور حضرت بلال حبشہ کے رہنے والے تھے۔ ابوسفیان وہاں سے گزرے) تو ان کو دیکھ کر یہ حضرات کہنے لگے کہ اللہ کی تلواروں نے اللہ کے دشمنوں سے ابھی تک اپنا حق وصول نہیں کیا ہے (ان کی یہ بات

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اچھی نہیں لگی۔ابوسفیان اگرچہ اسلام نہیں لائے تھے لیکن قریش کے سردار اور بڑے آدمی تھے۔اور قریش عرب کا باعزت خاندان تھا) تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں سے کہا کہ تم قریش کے ایک بڑے آدمی اور سردار کو ایسی بات کہتے ہو؟ (حضرت ابوبکر نے ان کی بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ تم نے یہ اچھی بات نہیں کہی۔اگرچہ حضرت ابوبکر نے ان حضرات کو تنبیہ کرنے کے لیے کوئی سخت بات نہیں کہی تھی،صرف اتنا ہی کہا تھا کہ قریش کے سردار کے ساتھ تم اس طرح پیش آرہے ہو؟ اور اس کو ایسی بات کہہ رہے ہو؟) پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور خود ہی نے یہ اطلاع دی کہ یارسول اللہ! آج ایسا ایسا ہوا (ممکن ہے اس خیال سے آگاہ کیا ہو کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی اس رائے سے اتفاق کریں گے۔جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے نقل کی) تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"یَاأَبَابَکْرٍ !لَعَلَّکَ أَغْضَبْتَھُمْ؟ لَئِنْ کُنْتَ أَغْضَبْتَھُمْ لَقَدْ أَغْضَبْتَ رَبَّکَ"اے ابوبکر! شاید تم نے ان حضرات کو ناراض کردیا (یعنی ہوسکتا ہے کہ تمہارے اس جملہ کی وجہ سے ان حضرات کو ناگواری ہوئی ہو،تمہاری یہ بات ان کو پسند نہ آئی ہو) اگر تم نے ان کو ناراض کیا ہے (یعنی اگر تمہارے اس جملہ سے ان کو تکلیف پہنچی ہے اور ناگواری ہوئی ہے) تو تم نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کردیا۔چنانچہ انہوں نے کہا:"یَااِخْوَتَاہ! آغْضَبْتُکُمْ؟" اے بھائیو! کیا میں نے تم لوگوں کو ناراض کردیا؟ ان لوگوں نے کہا کہ نہیں! ہمیں کوئی ناراضگی نہیں ہوئی ہے۔"یَغْفِرُاللّٰہُ لَکَ یَاأَخِیْ" اے ہمارے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے (یعنی ہماری طرف سے تو معاف ہے ہی،لیکن اگر تم کو یہ احساس ہے تو ہم بھی تمہارے لیے دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے۔)

افادات: دیکھو! یہاں کہنے والا کوئی اور نہیں، بلکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جن کا ایک مقام تھا،اس مناسبت سے اگر انہوں نے ایسی بات اپنی ہی جماعت کے چھوٹے لوگوں کو اچھی نیت سے کہی،تو ان کو حق تھا۔لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ تم نے ایسا کہہ کر ان کو ناراض کیا ہو۔یعنی یہ امکان ہے کہ تمہاری اس بات سے ان کو ناگواری ہوئی ہو،اور واقعتاً اگر ناگواری ہوئی ہے تو تم نے ایسا کر کے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا۔

بس! یہاں تو یہ روایت اسی لیے لائے تھے کہ دیکھو! حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو خاص طور پر متنبہ کیا۔ اس لیے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات جن لوگوں سے کہی تھی وہ صالحین میں سے بھی تھے، اور ضعفاء و کمزوروں میں سے بھی شمار ہوتے تھے۔ یہ دونوں باتیں ان میں تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے مقام اور منصب، یا اپنی کسی دنیوی حیثیت کی وجہ سے کمزور ہو، تب بھی ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی بات کریں جو اس کے لیے ناگواری اور تکلیف کا باعث ہو جائے۔

جب حضور اکرم ﷺ نے یہ فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فوراً ان حضرات کے پاس معافی مانگنے کے لیے گئے۔ یہ بھی حضراتِ صحابہ ہی کی شان تھی۔ میں پہلے بھی بار بار یہ بات بتلا چکا ہوں اور بار بار اس لیے متنبہ کرتا ہوں کہ ہم لوگوں کو بھی اس سے سبق لینا چاہیے کہ حضور اکرم ﷺ حضراتِ صحابہ میں سے کسی کو کسی بات پر اگر متنبہ کرتے تھے تو فوراً وہ حضرات اس چیز کی تلافی کی کوشش کرتے تھے۔ فوراً ان کی طرف سے اس بات کا اہتمام کیا جاتا تھا کہ جو قصور ہم سے سرزد ہوا ہے اس کی تلافی ہو جائے۔ چنانچہ جب حضور اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو متنبہ کیا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری اس بات سے ان حضرات کو تکلیف پہنچی ہو، اور اگر ان کو تکلیف پہنچی ہے تو پھر تم نے اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا؛ تو فوراً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے پاس آئے۔

ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایسی بات کہی جائے اور حدیث بھی سنائی جائے اور قرآن کی آیت بھی سنائی جائے، تب بھی ہم تاویلیں کر کے اپنے دل کو مطمئن کرنے کی کوشش کر لیتے ہیں، اگرچہ دل مطمئن نہ ہو، لیکن اس کی جو تلافی کرنی چاہیے، اس کا اہتمام ہماری طرف سے نہیں کیا جاتا۔

جب صدیق رضی اللہ عنہ نے فاروق رضی اللہ عنہ سے معافی مانگی

یہاں تو ایک بڑے آدمی نے چھوٹوں کے ساتھ یہ معاملہ کیا تھا، اس پر حضور ﷺ یہ فرمارہے ہیں۔ لیکن اگر کسی بڑے کے ساتھ یہ بات کی گئی ہو تو پھر معاملہ اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ بخاری شریف میں قصہ موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی بات پر غصہ میں ڈال دیا، یعنی کسی بات پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو غصہ آ گیا اور ناراضگی ہو گئی، تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ معافی مانگنے لگے کہ میری بھول ہو گئی مجھے معاف کر دو۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اتنی زیادہ ناراضگی تھی کہ وہ وہاں سے ہٹ گئے۔ اب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کے پیچھے پیچھے جارہے ہیں اور کہہ رہے کہ معاف کر دو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ناراضگی کی حالت میں آگے آگے چلے جارہے ہیں، یہاں تک کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا گھر آیا تو وہ گھر میں داخل ہو رہے تھے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پھر ان سے کہا کہ معاف کر دو، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور گھر میں چلے گئے۔ جب انہوں نے گھر کا دروازہ ہی بند کر لیا تو اب کیا باقی رہ جاتا تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ وہاں سے واپس آ کر حضور اکرم ﷺ کی مجلس میں بیٹھ گئے، لیکن انہوں نے حضور سے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی احساس ہوا کہ مَیں نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اگر انہوں نے مجھے ناراض کیا تھا تو وہ معافی بھی تو مانگ رہے تھے، اس لیے مجھے معاف کر دینا چاہیے تھا۔

اب وہ مجرم ہے

یہاں ایک بات یاد رہے کہ اگر کسی نے کسی کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا اور اس کو اپنے اس غلط رویہ پر احساس ہوا اور وہ معافی مانگ رہا ہے، تو اب سامنے والے کی

ذمہ داری ہے کہ وہ معاف کردے۔ اگر وہ معاف نہیں کرتا ہے تو اب وہ مجرم بن جاتا ہے۔ کسی سے معافی مانگی جائے اور وہ معاف نہ کرے؛ تو اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے آج کل ہمارے معاشرے اور سماج میں ایک بیماری یہ بھی ہوگئی ہے کہ اگر کسی کو احساس ہوا اور وہ جا کر معافی مانگتا ہے، تو یہ کہتا ہے کہ جاؤ! مَیں معاف نہیں کروں گا، وہ بار بار اس کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا ہے، تب بھی یہ انکار کرتا ہے۔ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔ شریعت اس کی تعلیم نہیں دیتی۔

بھائی! اللہ تعالیٰ کے یہاں تو اس معافی کی اتنی زیادہ قدر دانی ہے کہ اللہ کا کوئی بندہ یوں کہہ دے کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے اس نے جتنا بڑا جرم کیا تھا، کسی دوسرے کو ناراض کر کے تو اتنا بڑا جرم نہیں ہوسکتا ہے؟ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک آدمی اپنا توشہ پانی لے کر سفر میں نکلا اور ایک جگہ پر آرام کے لیے لیٹا، اس کے اونٹ پر سارا سامان موجود تھا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ اونٹ سارے سامان کے ساتھ غائب ہے اب وہ اس جنگل بیابان میں اکیلا ہے، نہ وہاں پانی ہے اور نہ کھانے کے لیے کچھ ہے۔ اس نے اپنے اونٹ کو خوب تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ آخر تھک ہار کر یہ سوچ کر کہ اب تو موت ہی آنے والی ہے، دوبارہ اسی جگہ پر آ کر لیٹ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اس کا وہ اونٹ موجود ہے۔ اس کو دیکھ کر اس کو جو خوشی ہوگی وہ ظاہر ہے گویا اس کو نئی زندگی ملی۔ تو اب وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے جب بولنے لگا تو مارے خوشی کے زبان بھی قابو میں نہیں رہی، اور یوں کہنے لگا کہ اے اللہ! تو میرا بندہ اور مَیں تیرا رب۔ (مشکوٰۃ-۲۰۳)

یہ مثال دے کر حضور ﷺ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس کی خوشی دیکھو کہ کتنا زیادہ خوش ہوا

ہوگا۔ جبکہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے تو نئی زندگی ملی، کہ اس کی زبان بھی قابو میں نہیں رہی۔

توجب کوئی بندہ گناہ کرنے کے بعد اللہ کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے اس توبہ واستغفار پر اس سے زیادہ خوشی ہوتی ہے جتنی اس آدمی کو اپنی سواری کا گمشدہ جانور ملنے پر ہوئی تھی جس پر اس کا کھانا پینا اور سامان تھا اور وہ بے قابو ہوگیا تھا کہ زبان بھی اُلٹ سُلٹ بولنے لگی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ تو معافی مانگنے والے سے اتنا زیادہ خوش ہوتے ہیں۔ حالانکہ اگر کچھ کیا جاتا تو وہاں سے کیا جاتا کہ وہ خالق ہے، مالک ہے۔ اس کی نعمتیں ہم ہر آن اور ہر لمحہ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس کی نافرمانی کی گئی اور وہاں معافی مانگی گئی اور وہ معاف نہ کرتا اور سزا دیتا؛ تو انصاف کی بات تھی۔ لیکن وہاں سے تو خوشی کا اظہار ہو رہا ہے۔ اور یہاں ہمارے ساتھ کبھی کسی نے کوئی معاملہ کر دیا اور جب وہ ہم سے معافی مانگنے آیا تو ہم معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کیا ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے گناہ بھی معاف کیے جائیں۔

کیا تمہیں معافی پسند نہیں؟

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ یاد کرو جو پہلے کئی مرتبہ بتایا جا چکا ہے کہ جب حضرت عائشہؓ کے ساتھ تہمت کا معاملہ پیش آیا تھا، اور بعد میں قرآنِ پاک میں تہمت سے ان کے پاک ہونے کی آیتیں نازل ہوئیں تو اس واقعہ میں مخلص مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے حصہ لیا تھا ان میں ایک حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، غریب تھے اور مہاجری بھی تھے، ان کا سارا خرچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی برداشت کرتے تھے۔ وہ بھی منافقین کی چرب زبانی کی وجہ سے اس سازش میں پھنس گئے تھے۔ جب حضرت عائشہؓ کی

براءت آئی تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قسم کھالی کہ اب میں ان کا خرچہ نہیں دوں گا وہاں انہوں نے تو معافی بھی نہیں مانگی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ان کی سفارش کی ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ أَنْ يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ تم میں سے جو فضیلت اور کشادگی والے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مال و دولت دے رکھی ہے، وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ اپنے رشتہ داروں، غریبوں اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہیں کریں گے ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ (روح المعانی۔ ۱۸/ ۱۲۵)

آدمی اپنے معاملہ میں چاہتا ہے کہ اگر اس سے غلطی اور کوتاہی ہوئی اور اس کو اس کا احساس ہے اور معافی بھی مانگتا ہے، تو اسے معاف کیا جائے۔ تو جب ہم اپنے معاملہ میں یہ چاہتے ہیں تو یہی چیز ہم اپنے دوسرے بھائی کے حق میں کیوں نہ چاہیں؟ اگر اس نے ہمارے ساتھ غلطی کا معاملہ کیا، اور وہ معافی بھی مانگ رہا ہے؛ تو اب ہمیں چاہیے کہ اس کو معاف کردیں۔

میرے دوست کے معاملہ میں میرا خیال نہ کرو گے؟

بہرحال! بات یہ چل رہی تھی کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تو آکر چپکے سے حضور کی مجلس میں بیٹھ گئے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو احساس ہوا کہ وہ میرے پاس معافی مانگ رہے تھے، لیکن مَیں نے معاف نہیں کیا اور گھر کا دروازہ بند کرلیا؛ یہ میں نے اچھا نہیں کیا، تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آئے اور خود ہی پورا قصہ حضور کی خدمت میں بیان کررہے ہیں کہ یارسول اللہ! ایسا ہوا کہ انہوں نے میرے ساتھ یہ

معاملہ کیا اور مجھے ناراضگی ہوئی، پھر وہ مجھ سے معافی مانگ رہے تھے، لیکن میں نے معاف نہیں کیا، یہاں تک کہ میرا گھر آ گیا تو میں نے اندر جا کر دروازہ بند کرلیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کر حضور اقدس ﷺ کو بہت غصہ آیا، اور آپ کا چہرۂ انور سرخ ہو گیا اور فرمانے لگے "هَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوالِيْ صَاحِبِيْ، هَلْ أَنْتُمْ تَارِكُوالِيْ صَاحِبِيْ" کیا میرے دوست کو معاف کرنے کے لیے تم تیار نہیں ہوئے؟ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور اکرم ﷺ کے اس غصہ کو دیکھ کر عرض کرنے لگے یا رسول اللہ! غلطی میری تھی یعنی میں نے ہی ابتدا کی تھی، ان کی کوئی غلطی نہیں تھی، پھر بھی حضور اکرم ﷺ برابر یہی جملہ ارشاد فرماتے رہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس کے بعد تو کوئی بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا نام ہی نہیں لیتا تھا، سب بہت زیادہ ڈرتے تھے کہ کہیں ان کو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو حضور اکرم ﷺ ناراض ہو جائیں گے۔ (بخاری شریف۔٣٦٦١)

صالحین اور نیک لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے جو روکا جاتا ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ اللہ کے دوست ہیں، اگر ان کو تکلیف پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، اور ہمارا تو بیڑا ہی غرق ہو جائے گا۔

کہیں اللہ تعالیٰ تم سے مطالبہ نہ کرلے

٣٨٩: وعن جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مَنْ صَلّٰى صَلَاةَ الصُّبْحِ فَهُوَفِيْ ذِمَّةِاللّٰهِ، فَلَايَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ، فَاِنَّهُ مَنْ يَّطْلُبُهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ يُدْرِكْهُ، ثُمَّ يَكُبُّهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ۔

ترجمہ مع تشریح: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو آدمی فجر کی نماز اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ پڑھ لے، وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آ جاتا ہے۔ (یہ بھی بہت بڑی چیز ہے جس نے فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھی، وہ اللہ کی حفاظت اور نگرانی میں آ گیا، جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے امان

دے دیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس کو حفاظت مل گئی ہے؛) تو اب دیکھنا کل قیامت میں اللہ تعالیٰ اپنی اس حفاظت کی وجہ سے تم سے کوئی مطالبہ نہ کرے (یعنی وہ آدمی جو فجر کی نماز اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ پڑھ چکا ہے، چوں کہ وہ اللہ کی حفاظت میں ہے، اب اگر تم اس آدمی کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرو گے اور کوئی تکلیف پہنچاؤ گے، تو گویا تم ایسے آدمی کے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہو جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے امان مل چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے پوچھے گا کہ ہم نے جس آدمی کو امان دے رکھی تھی تم نے اس کو تکلیف پہنچائی؟ کیوں؟ کیا بات ہے؟ اور اللہ تعالیٰ جب کسی سے مطالبہ کرلے، تو آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس کا آگے انجام کیا ہونے والا ہے۔ اس لیے کہ) اگر اللہ تعالیٰ کسی سے اپنی ذمہ داری اور امان کے بارے میں کوئی مطالبہ اور پوچھ تاچھ کرے گا تو ایسے آدمی کو اللہ تعالیٰ پکڑے گا، اور پھر اس کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالے گا۔

اس لیے بھائیو! جو نماز پڑھنے والے ہیں ان سے بھی ڈرتے رہنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ وہ بھی صالحین میں آ گئے۔

اِجْرَآءُ أَحْكَامِ النَّاسِ عَلىٰ الظَّاهِرِ وَسَرَائِرُهُمْ عَلىٰ اللهِ

ظاہر کے مطابق معاملہ کرو
دل کا حال اللہ کے حوالے کرو

۸/جمادی الاولیٰ ۱۴۲۰ھ ۲۱/اگست ۱۹۹۹ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُبِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَاوَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَامَن يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَن يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَن لَّآاِلٰهَ اِلَّااللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُاَنَّ سَيِّدَنَاوَمَوْلَانَامُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ أمابعد:—

فَإِن تَابُوْاوَأَقَامُوْاالصَّلَاةَ وَآتَوُاالزَّكَاةَ فَخَلُّوْاسَبِيْلَهُمْ (التوبة۔آیت ٥)

شک شبہ کرنے کی اجازت نہیں

اسلام میں ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے ساتھ مسلمان کی حیثیت سے، یا مشرک کے ساتھ مشرک کی حیثیت سے جو معاملہ رکھنے کا حکم دیا ہے؛ وہ ظاہر کے مطابق ہوگا۔یعنی جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان بتلا رہا ہے اور وہ اپنی زبان سے کلمۂ اسلام کا اظہار کرتا ہے اور وہ یوں کہتا ہے کہ میں مؤمن ہوں،اور ایک مسلمان کے مسلمان ہونے کے لیے جو علامتیں اسلام نے بتلائی ہیں مثلاً نماز پڑھنا، زکوٰۃ کا ادا کرنا وغیرہ، وہ سب علامتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں تو پھر ہم اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے۔ چوں کہ اس نے اپنے آپ کو مسلمان بتلایا اور مسلمانوں والی علامتیں بھی اس میں پائی جاتی ہیں، تو اب ہم اس کے معاملہ میں شک وشبہ نہیں کریں گے کہ معلوم نہیں اس کے دل میں کیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ ہم کو دھوکہ دیتا ہو؟ ہمارے سامنے اسلام و ایمان کا اظہار کرتا ہو؛ اور دل میں دوسری بات ہو؟ دکھلاوے کے واسطہ نماز پڑھتا ہو؟ اس طرح کا کوئی شک وشبہ کرنے کی ہمیں اجازت نہیں دی گئی۔ بلکہ ہم کو شریعت نے اس بات کا مکلّف کیا کہ جب اس نے اپنی زبان سے کلمۂ اسلام کا اظہار کیا

اور اپنے آپ کو مؤمن بتلایا، اور کسی مؤمن کے ایمان کے لیے جو علامت شریعت کی طرف سے مقرر کی گئی ہے وہ بھی اس میں پائی جاتی ہے، تو اب آپ کا فریضہ یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ مؤمنوں کا سا معاملہ کریں۔ پھر اگر حقیقت میں اس کے دل میں کوئی دوسری بات ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دیجئے۔ اگر اس کے دل میں کوئی دوسری چیز ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت میں جب حساب و کتاب لیں گے تو اس سے نمٹ لیں گے۔ ہمیں اس فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ معلوم نہیں اس کے دل کے اندر کیا ہے۔ اسلام کا یہ ایک خاص حکم ہے جس کو علامہ نووی ؒ اس عنوان کے تحت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جو لوگ اپنے آپ کو جیسا ظاہر کر رہے ہیں، اسی کے مطابق احکام جاری کئے جائیں گے اور اندرونِ دل کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے گا۔

تو ان کا راستہ چھوڑ دو

چنانچہ اس سلسلہ میں آیت پیش کی ﴿فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ﴾ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مشرکین اہلِ حرب (یعنی جن مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کا جنگ کا سلسلہ چل رہا ہے ان) کے متعلق حکم دیا ہے کہ ان کو گھیرو، پکڑو اور قتل کرو۔ ان کو چھوڑو مت۔ لیکن پھر فرمایا کہ اگر وہ توبہ کریں اور اپنے شرک سے باز آجائیں اور ایمان قبول کرلیں، اور نماز قائم کرنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں، گویا کلمۂ اسلام کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی ظاہری علامتیں بھی ان میں پائی جاویں، تو اب ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یعنی اب ان کو گھیرنے، گرفتار کرنے، قتل کرنے اور ان کے خلاف مشرک ہونے کی حیثیت سے جو کارروائی کرنے کا حکم تھا، اس کو جاری رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اب آپ ان کے ساتھ مسلمانوں کا سا

معاملہ کیجئے، اور ایک مسلمان کی جان مال، عزت و آبرو جس طرح محفوظ سمجھی جاتی ہے اس کے ساتھ بھی اسی جیسا معاملہ ہونا چاہیے۔

مجھے قتال کا حکم دیا گیا ہے

۳۹۰۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوا أَن لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ۔ فَاِنْ فَعَلُوْا ذَالِكَ، عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَآئَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ۔ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ۔

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) حکم دیا گیا کہ لوگوں کے ساتھ قتال کروں (مشرکین کے ساتھ جنگ کروں) یہاں تک کہ وہ اس بات کی شہادت دینے لگیں کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ دیں۔ جب وہ ایسا کرنے لگیں (یعنی زبان سے کلمۂ اسلام پڑھ لینے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے) تو یہ حضرات مجھ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کرلیں گے (یعنی وہ قتال اور جنگ جو ان کے ساتھ کی جاری تھی، جس کی وجہ سے ان کی جان مال محفوظ نہیں تھی، انہوں نے ان کاموں کی وجہ سے اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کرلیا) البتہ اسلام کا مطالبہ ان پر باقی رہا۔ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

مگر اسلام کے حق سے

افادات: "اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ" البتہ اسلام کا مطالبہ ان پر باقی رہا۔ یعنی اس کے بعد اگر کوئی کام ایسا کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں اسلامی حکم یہ ہے کہ ان کی جان پر ہاتھ ڈالا جائے، یا ان کے مال کو لیا جائے، تو پھر اس میں اس کو حفاظت نہیں ملے گی۔ مثلاً اس نے مؤمن ہو جانے کے بعد کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دیا، تو اب ظاہر

ہے کہ اسلام نے اس موقع پر قاتل کے لیے یہی سزا مقرر کی ہے کہ مقتول کے بدلہ میں بطورِ قصاص کے اس کو قتل کیا جائے۔ اب کوئی آدمی یوں کہے کہ بھائی! یہ کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے، زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔ اور قرآن وحدیث میں تو یہ آیا ہے کہ ایک آدمی کلمۂ شہادت پڑھ لے، نماز پڑھے، زکوٰۃ دے، تو اس کی جان اور اس کا مال محفوظ ہو جاتا ہے۔ تو اب اس پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے، اس کی جان تو محفوظ ہے؟ تو "بِحَقِّ الْاِسْلَامِ" کہہ کر اس قسم کے احکام کو مستثنیٰ کر دیا۔

یا مثلاً ایک آدمی نے زنا کا ارتکاب کیا اور وہ "مُحْصَنْ" یعنی شادی شدہ، عاقل بالغ اور آزاد ہے۔ اور اس کی عاقلہ بالغہ آزاد عورت کے ساتھ شادی ہو چکی ہے، اس کے بعد بھی اس نے زنا کا ارتکاب کیا، تو ایسے آدمی کے لیے اسلامی حکومت کو شریعت یہ حکم دیتی ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے۔ یعنی پتھر مار کر اس کی جان ختم کی جائے تو دیکھو! یہاں شریعتِ اسلام نے ہی اس کی جان لینے کا حکم دیا ہے۔

"إلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ" کا مطلب یہی ہے کہ جہاں اسلام ہی اس کی جان لینے کا مطالبہ کرتا ہے، تو وہاں چاہے وہ کلمہ پڑھ چکا ہو، نمازوں کا اہتمام کرتا ہو، زکوٰۃ بھی دیتا ہو؛ سب کچھ کر رہا ہو، لیکن جب اس نے کوئی ایسی حرکت کر لی، جس پر اسلام نے ہی سزا کے طور پر یہ حکم مقرر کیا ہے کہ اس کی جان لی جائے، یا اس کا مال لیا جائے، تو پھر وہاں یہ تینوں کام اس کے لیے رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ وہاں کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کلمہ پڑھتا ہے، نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ دیتا ہے، اس کی جان اور مال تو محفوظ ہے پھر کیوں اس پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے؟ یہاں اسلام ہی کے حکم سے اس پر ہاتھ ڈالا جا رہا ہے جس اسلام نے کلمہ اسلام کا اظہار کرنے پر اور نماز وزکوٰۃ کا اہتمام کرنے پر اس کے

جان و مال کی حفاظت کی گارنٹی دی تھی؛ وہی اسلام اب یہ حکم دے رہا ہے کہ اس کی اس حرکت پر اس کی جان لی جائے۔ تو اب معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں

”وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ“ یہاں اس روایت کو اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھو! نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا کہ جب یہ لوگ کلمۂ شہادت کا اقرار کرلیں، نماز پڑھنے لگیں اور زکوٰۃ دینے لگیں، تو اس کے نتیجہ میں ان کے جان و مال محفوظ ہو جائیں گے۔ اب کسی کو یہ شک وشبہ کرنے کی اجازت نہیں ہے کہ ہوسکتا ہے انہوں نے ظاہر میں دکھلاوے کے واسطے ایسا کیا ہو، اور حقیقی طور پر وہ ایمان نہ لائے ہوں۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں ”وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللّٰهِ“ ان کا حساب اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے۔ اب ہم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے دل کے اندر کی چیز کے متعلق کسی قسم کے شک وشبہ کا اظہار کریں، یا اپنے دل میں اس کے متعلق کوئی تردد رکھیں کہ معلوم نہیں وہ دھوکہ دینے یا دکھلاوے کے واسطہ ایسا کر رہا ہو۔ شریعت نے جب ہم کو یہ بتلا دیا کہ جو آدمی ان اعمال کو انجام دے، اس کے ساتھ تمہیں یہ معاملہ کرنا ہے۔ جب وہ ان اعمال کو انجام دے رہا ہے تو ہمیں اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا ہے۔ اب اس کے دل میں کیا ہے، اس کے متعلق ہمیں کھود کرید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

مجھے یہ حکم نہیں دیا گیا ہے

بخاری شریف میں روایت ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے یمن بھیجا تھا، وہاں سے انہوں نے مالِ غنیمت کے خمس کے طور پر کچھ سونا نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ جب وہ سونا مدینہ منورہ پہنچا تو چار حضرات جو مؤلفۃ القلوب تھے۔ یعنی ایسے

لوگ جن کی دل جوئی کرنا مقصود تھا- ان میں وہ سونا نبی کریم ﷺ نے تقسیم کر دیا، اس پر ایک آدمی نے کہا کہ ہم اس سے زیادہ حقدار تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی تو آپ نے فرمایا "أَلَا تَـأْمَنُونِيْ وَأَنَا أَمِينُ مَنْ فِي السَّمَآءِ" تم لوگ مجھ پر اعتماد اور بھروسہ نہیں کرتے حالانکہ آسمان والا یعنی اللہ تعالیٰ مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کرتا ہے؟ رات اور دن اس کے پاس سے مجھ پر وحی آتی ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ مجھ پر بھروسہ اور اعتماد کر رہا ہے اور مجھے امین قرار دے رہا ہے تو تمہیں میرے اوپر بھروسہ کیوں نہیں؟ جیسے کوئی بڑی شخصیت کسی کے ساتھ اعتماد کا معاملہ کرتی ہو اور کوئی چھوٹا ایسا کہے، تو کہتے ہیں کہ فلاں پر تجھے بھروسہ نہیں؟

اس موقع پر ایک آدمی کھڑا ہوا جس کا حلیہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کی آنکھیں اندر کو گھسی ہوئی تھیں، رخسار اُبھرے ہوئے تھے، پیشانی باہر کو نکلی ہوئی تھی، سر منڈا ہوا تھا ڈاڑھی گھنی تھی اور پائنچے اونچے تھے۔ اس نے نبی کریم ﷺ سے کہا "اِتَّـقِ اللّٰہَ" اللہ سے ڈریو، اس پر نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اگر مَیں اللہ سے نہیں ڈروں گا تو اور کون ڈرے گا؟ اس وقت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اُٹھے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اجازت دیجئے کہ مَیں اس کی گردن اُڑا دوں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: نہیں! "لَعَلَّهٗ أَن يَّكُونَ يُصَلِّيْ" شاید یہ نماز پڑھتا ہو۔ اس کے جواب میں حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: "كَمْ مِّنْ مُّصَلٍّ يَـقُوْلُ بِلِسَانِهٖ مَالَيْسَ فِيْ قَلْبِهٖ" بہت سے نماز پڑھنے والے ایسے ہوتے ہیں جن کے دل میں وہ بات نہیں ہوتی جو ان کی زبان پر ہوا کرتی ہے۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ظاہری اور نمائشی طور پر نماز پڑھتا ہو اور کلمہ کا اظہار کرتا ہو، لیکن اس کے دل میں یہ بات نہ ہو؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: "اِنِّیْ لَمْ أُوْمَرْ أَنْ أُنَقِّبَ عَنْ قُلُوْبِ النَّاسِ" مجھے یہ

حکم نہیں دیا گیا ہے کہ مَیں لوگوں کے دلوں کی باتوں کو کھود کرید کروں۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ظاہر کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری شریف:۴۳۵۱)

مقصد یہ ہے کہ اسلامی شریعت کا یہ ایک اصول ہے، خاص کر جبکہ اسلامی مملکت ہو، اور وہاں اسلامی احکام ظاہری طور پر لوگوں پر جاری کئے جاتے ہوں، تو اس کی خاص ضرورت پیش آتی ہے کہ جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہا ہے، اس کے متعلق کوئی شک وشبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے۔

ایک غلط طریقہ

آج کل ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی اسلام قبول کرنے کے لیے آیا، اور ہمارے سامنے کلمہ بھی پڑھا اور نماز پڑھنا بھی شروع کر دیا اور اسلامی احکام پر عمل بھی کرنے لگا، اس کے باوجود بعض لوگ اس شک وشبہ کا اظہار کرتے ہیں کہ معلوم نہیں کہ یہ کون آدمی ہوگا۔ کوئی جاسوس تو نہیں ہے۔ یہ غلط طریقہ ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ جب اس نے ساری چیزیں کرلیں تو آپ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیجئے، اب اگر اس کے دل میں کوئی دوسری بات ہے تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اس سے حساب لے لیں گے۔ جنت تو حقیقی اسلام پر ہی ملنے والی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ اس کے دل میں کیا ہے۔ ہمیں اس چکر میں پڑنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو جس چیز کا کہا گیا ہے اسی کی پابندی کرنی ہے۔

اب اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے

۳۹۱: عن أبی عبداللہ طارق بن أشیم رضی اللہ عنہ قال: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہ ﷺ یَقُوْلُ: مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَكَفَرَ بِمَا يُعْبَدُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ؛ حَرُمَ مَالُهٗ وَدَمُهٗ

وَحِسَابُهُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى.

ترجمہ مع تشریح: حضرت طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی لاالہ الااللّٰہ کہے (یعنی اسلام کا کلمہ پڑھے۔ یہاں شراح نے لکھا ہے کہ لاالہ الااللّٰہ کے ساتھ محمد رسول اللّٰہ بھی ہے، اس لیے کہ صرف لاالہ الااللّٰہ سے آدمی مؤمن نہیں ہوجاتا جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرے۔ یہ تو کلمہ اسلام کا ایک عنوان ہے۔) اوراللہ تعالیٰ کے علاوہ جن چیزوں کی پوجا کی جاتی ہے ان کا انکار کردے (اس سے اپنے آپ کو بری ظاہر کردے۔ یہ ایک ضروری چیز ہے کہ کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو جب اس کو کلمہ اسلام پڑھایا جائے گا وہاں پہلے ہی اس سے پوچھ لیا جائے گا کہ اب تک کس چیز کا عقیدہ رکھتے تھے۔ اس عقیدے سے بھی توبہ کرائی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ جن بتوں کی وہ پوجا کرتا تھا اس سے توبہ کرکے اپنی براءت کا اظہار کردے، اوراللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا قائل ہوجائے) تو اس کا مال اور خون حرام ہوجاتا ہے (یعنی اب ہم اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے) اوراس کا حساب اللہ کے حوالہ کیا جائے گا (یعنی اب ہمیں اس کے معاملہ میں شک وشبہ اور تردد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

عین لڑائی میں کلمہ پڑھ لیا تو؟

۳۹۲: وَعَنْ أَبِيْ مَعْبَدِ الْمِقْدَادِ بِنِ الْأَسْوَدِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم: أَرَأَيْتَ إِنْ لَقِيْتُ رَجُلاً مِنَ الْكُفَّارِ، فَاقْتَتَلْتُ، فَضَرَبَ إِحْدٰى يَدَيَّ بِالسَّيْفِ فَقَطَعَهَا، ثُمَّ لَاذَ مِنِّيْ بِشَجَرَةٍ فَقَالَ: أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ، أَأَقْتُلُهُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ بَعْدَ أَنْ قَالَهَا؟ فَقَالَ: لَاتَقْتُلْهُ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَطَعَ إِحْدٰى يَدَيَّ ثُمَّ قَالَ ذٰلِكَ بَعْدَ مَا قَطَعَهَا، فَقَالَ: لَاتَقْتُلْهُ، فَإِنْ قَتَلْتَهُ فَإِنَّهُ بِمَنْزِلَتِكَ قَبْلَ أَنْ تَقْتُلَهُ، وَإِنَّكَ بِمَنْزِلَتِهِ قَبْلَ أَنْ يَقُوْلَ كَلِمَتَهُ الَّتِيْ قَالَ. (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح: حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اگر میدانِ جنگ میں کسی کافر سے میری مڈبھیڑ ہوجائے (اور ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑیں) اسی دوران وہ تلوار کے ذریعہ سے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالے، اس

کے بعد (جب وہ دیکھے کہ اب میں اس پر حملہ آور ہونا چاہتا ہوں تو) اپنے بچاؤ کے لیے وہ ایک درخت کی آڑ میں چلا جائے، اور وہاں پہنچ کر فوراً کہے "أَسْلَمْتُ لِلّٰهِ" میں اسلام لے آیا۔ تو اے اللہ کے رسول! اب کیا مَیں اس کو قتل کر سکتا ہوں؟ (چوں کہ اس زمانہ میں جہاد کا سلسلہ جاری تھا اور یہ صورتیں پیش آتی رہتی تھیں۔ دیکھئے! یہاں ظاہری حالات یہ بتلا رہی ہے کہ اس نے اپنی جان بچانے کے لیے ایسا کیا ہے، اسی لیے انہوں نے سوال کے واسطے نبی کریم ﷺ کے سامنے خاص یہ صورت پیش کی۔) حضور ﷺ نے فرمایا "لَا تَقْتُلْهُ" آپ اس کو قتل نہ کیجئے۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ ڈالا اس کے بعد وہ یہ بات کہہ رہا ہے؟ (تو اس کی وجہ سے سمجھ میں تو یہی آ رہا ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے ایسا کہہ رہا ہے) تو نبی کریم ﷺ نے پھر کہا "لَا تَقْتُلْهُ" تب بھی اس کو قتل نہ کرو۔

افادات: یعنی جب وہ کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کر چکا جس کی وجہ سے اس کی جان اور مال محفوظ ہو گئے، اس کے باوجود بھی اگر تم نے اس کو قتل کر دیا تو اس کو قتل کرنے سے پہلے جو حالت اور پوزیشن تمہاری تھی، اب وہ پوزیشن اس کی ہو گئی۔ اور جو پوزیشن کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی تھی وہ پوزیشن تمہاری ہو گئی۔ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ مسلمان تھے اور کسی جرم کے مرتکب بھی نہیں ہوئے تھے، وہ معصوم الدم تھے۔ انہوں نے کسی مسلمان کی جان نہیں لی تھی کہ جس کی وجہ سے ان کی جان لینا درست ہو۔ اور اس نے جب کہہ دیا کہ میں مسلمان ہوا تو اب اس کی پوزیشن بھی وہی ہو گئی کہ اس کی بھی جان و مال محفوظ ہو گئے۔ اس کے بعد بھی اگر اس کو قتل کر دیا تو جو پوزیشن کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی تھی وہ پوزیشن تمہاری ہو گئی۔ یعنی نعوذ باللہ وہ کافر نہیں ہو گئے، بلکہ اس کے کلمہ پڑھنے سے پہلے اس کی جان محفوظ نہیں تھی، اور کلمہ پڑھ لینے کی وجہ سے اس کی بھی جان محفوظ ہو گئی تھی، اور جب اس کے قتل کا ارتکاب کیا تو اس کی وجہ سے قصاص کے طور پر اب تمہاری جان لینا جائز ہو گیا۔ اس لیے اب تمہاری جان محفوظ نہیں رہی۔ یہ مثال دے کر بطورِ تشبیہ جان کے محفوظ ہونے اور نہ ہونے کو سمجھایا گیا ہے۔

دراصل بتلانا یہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے ایسی صورت موجود تھی جس میں ایک قرینہ اور علامت بھی ہے کہ اس نے ان کا ہاتھ کاٹا، اور جب یہ اُس پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھ رہے ہیں، تو ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی جان بچانے کے لیے ایسی بات کر رہا ہو، تب بھی نبی کریم ﷺ نے اس بات کا پابند بنایا کہ جب ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہو، اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کرنا چاہیے۔ وہ کس حالت میں اپنے اسلام کا اظہار کر رہا ہے، اس کا کوئی فرق نہیں کیا گیا۔

آگے اسی طرح کا ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں۔

لاڈلے، لاڈلے زادے

٣٩٣: وَعَنْ أُسَامَةَ بن زيدٍ رضي الله عنه قَالَ: بَعَثَنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ إِلَى الْحُرَقَةِ مِنْ جُهَيْنَةَ، فَصَبَّحْنَا الْقَوْمَ عَلَىٰ مِيَاهِهِم، وَلَحِقْتُ أَنَا وَرَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ رَجُلاً مِنْهُم، فَلَمَّا غَشِينَاهُ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فَكَفَّ عَنْهُ الْأَنْصَارِيُّ وَطَعَنْتُهُ بِرُمْحِيْ حَتَّىٰ قَتَلْتُهُ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِينَةَ بَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ، فَقَالَ لِي: يَا أُسَامَةُ! أَقَتَلْتَهُ بَعْدَ مَاقَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّمَا كَانَ مُتَعَوِّذاً، فَقَالَ: أَقَتَلْتَهُ بَعْدَ مَا قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ؟ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا عَلَيَّ حَتَّىٰ تَمَنَّيْتُ أَنِّي لَمْ أَكُنْ أَسْلَمْتُ قَبْلَ ذٰلِكَ الْيَوْمَ. (متفق عليه)

وَفِي رِوَايَةٍ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: أَقَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَقَتَلْتَهُ؟ قُلْتُ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنَّمَا قَالَهَا خَوفاً مِنَ السِّلَاحِ، قَالَ: أَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهِ حَتَّىٰ تَعْلَمَ أَقَالَهَا أَمْ لَا؟ فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتَّىٰ تَمَنَّيْتُ أَنِّي أَسْلَمْتُ يَوْمَئِذٍ.

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے یہ روایت منقول ہے۔ یہ حضرت اسامہ بن

زید رضی اللہ عنہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ہیں۔حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنّٰی رہ چکے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے محبوب اور لاڈلے تھے،انہیں کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ہیں،اسی لیے ان کو "حِب ابنُ الحِب" کہا جاتا تھا۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب اور محبوب کے بیٹے۔

ترجمہ مع تشریح: حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک شاخ حرقہ تھی۔وہ لوگ بنوحرقہ اور حرقات کہلاتے تھے۔ان کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے لشکر لے کر بھیجا (تو کفار کے جس علاقہ پر حملہ کرنے کے لیے ہم گئے تھے، وہ سارا مشرکین کا علاقہ تھا) صبح کے وقت ان کے چشمہ اور قیام گاہ پر ہم نے ان کو جالیا (یعنی ہم نے حملہ کردیا) میں اور ایک انصاری ہم دونوں اس قبیلہ کے ایک آدمی پر حملہ کے لیے پہنچ گئے۔جب ہم بالکل اس کے اوپر پہنچے تو وہ بول پڑا الا الٰہ الا اللہ۔

دوسری روایت میں ہے کہ سب قبیلہ والے بھاگ گئے اور ایک آدمی رہ گیا اور ہم اس کے پاس اس کے قتل کے ارادہ سے پہنچ گئے۔جب اس نے ہم کو بالکل اپنے پر چڑھا ہوا آیا دیکھا تو اس نے کلمہ پڑھ لیا۔تو وہ انصاری تو رک گئے،لیکن میں نے اپنا نیزہ اس کی طرف بڑھایا اور اس کو قتل کردیا۔ (یہ واقعہ تو وہاں ہوگیا) پھر جب ہم مدینہ منورہ واپس آئے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ساری تفصیلات معلوم ہوئیں (سارے حالات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آئے تو) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر فرمایا کہ اے اسامہ! اس آدمی نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا تھا،اس کے باوجود تم نے اس کو قتل کردیا؟ میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ تو جان بچا رہا تھا (یعنی اس نے لا الٰہ الا اللہ دل سے تھوڑا ہی کہا تھا؟ بلکہ جب اس نے دیکھا کہ ہم تلوار لے کر اس کے سر پر پہنچ گئے ہیں تو اپنی جان بچانے کے لیے اس نے یہ جملہ کہہ دیا۔حضرت اسامہ فرماتے ہیں کہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر دوبارہ فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی تم نے اس کو قتل کردیا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہ فرماتے رہے، یہاں تک کہ میں دل میں یہ سوچنے لگا کہ کاش! آج ہی مَیں مسلمان ہوا ہوتا۔

افادات: مطلب یہ ہے کہ اگر آج اسلام لایا ہوتا تو چوں کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے "اَلْاِسْلَامُ یَھْدِمُ مَا کَانَ قَبْلَہٗ" کوئی آدمی اسلام قبول کرے تو اسلام لانے

سے پہلے جتنے بھی بڑے بڑے گناہ کئے تھے، چاہے بیسیوں آدمیوں کو قتل کیوں نہ کیا ہو؛ وہ سب معاف ہو جاتے ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ میرا آج اسلام لانا میرے اس گناہ کے معاف ہونے کا ذریعہ بن جاتا۔ یہ جملہ بول کر ان کا مقصد اپنے آپ کو اس گناہ سے پاک صاف رکھنا تھا اور کوئی چیز نہیں تھی۔

کیا تم نے اس کا دل چیرا تھا؟

ایک روایت میں یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اے اسامہ! اس نے لا الٰہ الا اللہ کہا، پھر بھی تم نے اس کو قتل کر دیا؟ مَیں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! تلوار کے ڈر سے اس نے کہا تھا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا کہ اس نے یہ کلمہ تلوار کے ڈر سے کہا ہے؟ یعنی اس نے یہ کلمہ سچے دل سے پڑھا، یا تلوار کے ڈر سے پڑھا؛ یہ تو دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے۔ تم نے تو صرف ظاہری حالت کو دیکھا۔ ہوسکتا ہے کہ عین اس حالت میں بھی ایک آدمی سچے دل سے یہ کلمہ پڑھ لے۔ یہ کوئی بعید اور ناممکن بات تو ہے نہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق دل سے ہو، اس معاملہ میں کبھی ہمیں اس بات کی جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے دل کی نیت کے متعلق کوئی فیصلہ کریں۔ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جو معاملہ بھی دل سے تعلق رکھنے والا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا چاہیے، ہم اس کے متعلق کوئی دو ٹوک بات نہیں کہہ سکتے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو ان کے اس فعل پر بار بار ٹوکا۔

صحابہ کی شان

حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ کسی چیز پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ان کو تنبیہ کی جاتی، یا تاکید کے طور پر کوئی بات کہی جاتی، تو زندگی میں ایک بار جو بات کہہ دی گئی وہ ان کے دل پر پتھر کی لکیر کی طرح نقش ہو جاتی تھی۔ پھر کبھی اس کے خلاف ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک صحابی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمادیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی سے کوئی سوال مت کرنا۔ اس کے بعد اگر وہ گھوڑے پر سوار ہوتے اور ہاتھ میں سے کوڑا نیچے گر جاتا، تو کبھی کسی مانگتے نہیں تھے کہ میرا کوڑا دو۔ بلکہ خود اترتے، کوڑا اٹھاتے اور پھر سوار ہوتے۔

ہر صحابی کی یہی شان تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کی جانے والی ہدایت ایسی نہیں ہے کہ اس کی طرف سے آدمی غفلت برتے اور بے پرواہی سے کام لے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جب ایک مرتبہ تنبیہ کر دی گئی تو ایک مؤمن کی شانِ ایمانی کا تقاضہ یہی ہے کہ زندگی بھر کے واسطے وہ بات اس کے قلب پر نقش ہو جانی چاہیے۔

کسی کا ساتھ نہ دیا

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جب ایک مرتبہ یہ معاملہ پیش آ گیا، اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اجتہادی نظریات کے اختلاف کے پیشِ نظر آپس میں جنگ کی نوبت آئی، تو مسلمانوں ہی کے دو لشکر آپس میں ٹکرائے۔ اس زمانہ میں حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تین گروہ ہو گئے تھے۔ ان میں سے اکثر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف ہو گئے تھے۔ بعض

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف تھے۔اور بعض غیر جانبدار (Neutral) تھے، یعنی کسی کی طرف نہیں تھے۔ وہ اس سے اپنے آپ کو الگ ہی رکھتے تھے۔ اس وقت جو لوگ اس سے الگ تھلگ رہے تھے، انہیں میں سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حالانکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا تعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانہ کے ساتھ بالکل گھر جیسا تھا۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک ران پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور دوسری ران پر حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، تو بھی ان سے محبت رکھیو۔ (بخاری شریف، ۳۵۲۸۔ سنن النسائی الکبری، ۸۱۸۴)

بہر حال! میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھرانہ کے ایک فرد کی طرح تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس معاملہ میں انہوں نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔

مجھے جرأت نہیں ہوتی

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ امیر المؤمنین تھے اور اہلِ حق کے نمائندے تھے، اس لیے ہر ایک کا فریضہ بنتا تھا کہ ان کا تعاون کر کے ان کا ساتھ دیتا۔ اور جنہوں نے اس معاملہ میں غیر جانبدار رہ کر یا کسی اور طریقہ سے کمی کوتاہی سے کام لیا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں ان کے ساتھ بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ بخاری شریف ہی میں ایک واقعہ موجود ہے کہ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں کسی ضرورت سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی بھیجا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ وہ پوچھیں گے کہ انہوں نے ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیا تھا؟ تو جواب میں ان کو میری طرف سے یہ کہنا کہ اگر میں آپ کو شیر

کے منہ میں دیکھتا تو اس بات کو پسند کرتا کہ آپ کے ساتھ ساتھ میں بھی ہوتا، لیکن آپس کی یہ جنگ ایک ایسی چیز ہے جس میں مجھے جرأت نہیں ہوتی (بخاری شریف، ۷۱۱۰) چوں کہ یہ ایک ایسی بات تھی جس پر نبی کریم ﷺ ان کو ایک مرتبہ تنبیہ کر چکے تھے، اس لیے آئندہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے انہوں نے اس معاملہ میں اپنے آپ کو الگ رکھا تھا۔

تب تم کیا جواب دو گے؟

۳۹٤: عَنْ جُنْدُبِ بنِ عَبدِاللّٰهِ أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَ بعثاً مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ إِلىٰ قَوْمٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ، وَأَنَّهُمْ اِلتقَوا، فكَانَ رَجُلٌ مِّنَ المُشْرِكِينَ إِذَا شَاءَ أَن يَّقْصُدَ إِلىٰ رَجُلٍ مِّنَ المُسلِمِيْنَ قَصدَ لَهٗ فقتَلَهٗ، وَأَنَّ رَجُلاً مِّنَ الْمُسلِمينَ قَصدَ فقتلَهٗ، وَكُنَّا نَتحدَّثُ أَنَّهٗ أُسَامَةُ بنُ زَيدٍ، فَلَمَّا رَفَعَ السَّيفَ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، فقتَلَهٗ، فَجاءَ البَشِيرُ إِلىٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فسَأَلَهٗ وَأَخبَرَهٗ، حتىٰ أَخبَرَهٗ خبَرَ الرَّجُلِ كَيفَ صَنَعَ، فَدَعَاهُ، فَسَأَلَهٗ، فَقَالَ: وَلِمَ قَتَلتَهٗ؟ فقَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! أَوجَعَ فِي المُسلِمِينَ وَقَتَل فُلَاناً وَفُلَاناً، وَسَمّٰى لَهٗ نفراً، وَإِنِّي حَمَلتُ عَلَيهِ، فَلَمَّا رَأَى السَّيفَ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: أَقَتَلتَهٗ؟ قَالَ: نعَم، قَالَ: فَكَيفَ تَصنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جاءَت يوم القِيَامَةِ؟ قَالَ: يَارَسُولَ اللّٰهِ! اِستغفِرلِي، قَالَ: وَكَيفَ تصنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَت يَومَ القِيَامَةِ؟ فَجعَلَ لَايَزِيدُ عَلىٰ أَن يَّقُولَ: كَيفَ تَصنَعُ بِلَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ إِذَا جَاءَت يَومَ القِيَامَةِ؟ (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مشرکین کی ایک قوم کی طرف ایک لشکر بھیجا۔ جب دونوں کی آپس میں جنگ ہوئی تو مشرکین میں ایک بڑا بہادر آدمی تھا، جس مسلمان کا وہ رخ کرتا، اس پر حملہ آور ہو کر اس کو قتل کر دیتا تھا۔ چنانچہ ایک مسلمان آدمی اس کی

بے خبری کا منتظر رہا، تاکہ وہ اس پر حملہ کرے۔ (حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان جو اس مشرک کی بے خبری کا منتظر تھا وہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ تھے۔) جب انہوں نے موقع پالیا اور دیکھا کہ وہ غافل ہے تو اس کو مارنے کے لیے اس انداز سے تلوار اُٹھائی کہ اس کو جوابی حملہ کرنے کا موقع ہی نہ ملا (غفلت کا مطلب یہی تھا کہ وہ جوابی کارروائی نہ کر پائے اور اس سے پہلے ہی اس کا معاملہ ختم ہو جائے۔ خیر! جب انہوں نے تلوار اُٹھائی اور اس نے بھی دیکھا کہ اب میرے پاس دفاع کا کوئی موقع نہیں ہے) تو فوراً اس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھا لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے اس کو قتل کر دیا۔ (گویا وہ اس کا کلمہ سننے کے باوجود بھی رکے نہیں) اس جنگ میں جب مسلمانوں کو کامیابی ہوئی تو اس کی خبر دینے والا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے تمام حالات پوچھے، اس آدمی نے سارے حالات بتائے اور اس میں اس بہادر کا واقعہ بھی سنایا کہ اس نے کئی مسلمانوں کو قتل کیا اور جب اس پر حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے حملہ کیا تو اس نے کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھا، لیکن حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں وہ قتل ہوا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو بلایا اور پوچھا کہ تم نے اس کو قتل کیوں کیا؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! اس نے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا، کئی آدمیوں کے نام لے کر کہا کہ فلاں اور فلاں کو اس نے قتل کیا، اور پھر جب مَیں اس پر حملہ آور ہوا اور اس نے میری تلوار کو اپنے سر پر دیکھا کہ وہ اپنا کام کرنے جا رہی ہے تو اس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کو قتل کر دیا؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: جی ہاں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے اسامہ! قیامت کے روز جب اس آدمی کا یہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ تمہارے خلاف دعویٰ دائر کرے گا؛ تو تم کیا جواب دو گے؟ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے جب یہ سنا تو کہا کہ آپ میرے لیے دعاءِ مغفرت کیجیے۔ اس کے جواب میں پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ قیامت کے روز جب وہ آئے گا تو اس کے لا الٰہ الا اللہ کا کیا جواب دو گے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بار بار یہی جملہ فرماتے رہے۔

افادات: اس موقع پر شراح نے یہ بھی نقل کیا ہے کہ بعض محدثین نے نقل کیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کے لیے دعاءِ مغفرت کی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی توبہ بھی نازل ہوئی۔

اب فیصلہ ظاہر پر ہوگا

۳۹۵: عَنْ عَبدِاللّٰهِ بنِ عُتبَةَ بنَ مَسعُودٍ قَالَ: سَمِعتُ عُمَرَ بنَ الخَطَّابِ يَقُولُ: إِنَّ نَاساً كَانُوا يُؤخَذُونَ بِالوَحيِ فِي عَهدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، وَإِنَّ الوَحيَ قَدِ انقَطَعَ، وَإِنَّمَا نَأخُذُكُمُ الآنَ بِمَا ظَهَرَ لَنَا مِنْ أَعمَالِكُمْ، فَمَنْ أَظهَرَ لَنَا خَيراً أَمَّنَّاهُ وَقَرَّبنَاهُ، وَلَيسَ لَنَا مِنْ سَرِيرَتِهٖ شَيْءٌ، اَللّٰهُ يُحَاسِبُهُ فِي سَرِيرَتِهٖ، وَمَنْ أَظهَرَ لَنَا سُوءاً لَمْ نَأمَنْهُ وَلَمْ نُصَدِّقْهُ، وَإِنْ قَالَ إِنَّ سَرِيرَتَهٗ حَسَنَةٌ. (رواه البخاري)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں لوگوں کو وحی کی وجہ سے پکڑا جاتا تھا۔ اب وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا اس لیے تمہارے جو ظاہری اعمال ہیں، اسی کے مطابق ہم تمہارے ساتھ معاملہ کریں گے۔

افادات: یعنی بعض منافقین جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، اور نبی کریم ﷺ بھی ان کے ساتھ مؤمنوں ہی کا سا معاملہ کرتے تھے؛ لیکن جب ان کے متعلق خاص طور پر بذریعۂ وحی حضور اکرم ﷺ کو بتلایا جاتا، تو ان کے ساتھ مشرکوں کا سا معاملہ کیا جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو مؤمن ظاہر کررہا ہے لیکن وحی نے آکر اس کے خلاف کوئی چیز بتلائی تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحی آئی ہے اس کی وجہ سے اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) اب وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا اس لیے تمہارے جو ظاہری اعمال ہیں، اسی کے مطابق ہم تمہارے ساتھ معاملہ کریں گے۔ چنانچہ جو آدمی ہمارے سامنے اپنے آپ کو بھلا ظاہر کرے گا یعنی کلمۂ اسلام پڑھے گا، نماز ادا کرے گا، زکوۃ ادا کرے گا اور ہمیں

اس میں مسلمانوں کی سی علامتیں نظر آئیں گی، تو ہم اس کو جان و مال کی گارنٹی دیں گے، اپنے قریب کریں گے، مسلمانوں کا سا معاملہ کریں گے اور اپنی جماعت میں اس کو داخل کریں گے، اس کے اندر کے حال سے ہمیں کوئی لینا دینا نہیں ہے، اندر کے معاملہ کا حساب قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس سے لیں گے۔ یہاں دنیا میں تو وہ اپنے آپ کو جیسا ظاہر کر رہا ہے؛ ہم اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔ اور جو آدمی ہمارے سامنے اپنے آپ کو برا ظاہر کرے گا یعنی کافروں کا سا معاملہ کرے گا تو ہم نہ تو اس کو جان و مال کی امان دیں گے، اور نہ اس کو مسلمان قرار دیں گے، چاہے اس کے اندر کچھ بھی ہو۔ اس کے اندر کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارے لیے تو شریعت کی طرف سے یہی تاکید کی گئی ہے کہ جو آدمی ہمارے سامنے اپنے آپ کو جس طرح ظاہر کرتا ہے، اس کے مطابق ہم اس کے ساتھ معاملہ کریں، اور اس کے دل میں کیا ہے اس کے متعلق کوئی تردد اور شک وشبہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کیا جائے۔

بَابُ الْخَوْفِ ﴿مجلس ۱﴾

اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان

﴿مجلس ۱﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:۔

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔۔۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

وَإِیَّایَ فَارْھَبُوْنِ (البقرۃ:۴۰)

وقال تعالیٰ: إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِیْدٌ (البروج:۱۲)

وقال تعالیٰ: وَکَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرٰی وَھِیَ ظَالِمَۃٌ إِنَّ أَخْذَہٗ أَلِیْمٌ شَدِیْدٌ۔ إِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَۃً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَۃِ ذٰلِكَ یَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّہُ النَّاسُ وَذٰلِكَ یَوْمٌ مَّشْھُوْدٌ۔ وَمَا نُؤَخِّرُہٗ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ۔ یَوْمَ یَأْتِ لَا تَکَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِہٖ فَمِنْھُمْ شَقِیٌّ وَسَعِیْدٌ۔ فَأَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَھُمْ فِیْھَا زَفِیْرٌ وَشَھِیْقٌ۔ (ھود:۱۰۲ تا ۱۰۶)

وقال تعالیٰ: وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰہُ نَفْسَہٗ (آل عمران:۲۸)

وقال تعالیٰ: یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِیْہِ۔ وَأُمِّہٖ وَأَبِیْہِ۔ وَصَاحِبَتِہٖ وَبَنِیْہِ۔ لِکُلِّ امْرِءٍ مِّنْھُمْ یَوْمَئِذٍ شَأْنٌ یُّغْنِیْہِ۔ (عبس:۳۴ تا ۳۶)

وقال تعالیٰ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ۔ يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّا أَرْضَعَتْ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكَارَى وَمَا هُمْ بِسُكَارَى وَلَكِنَّ عَذَابَ اللَّهِ شَدِيدٌ۔ (الحج:۱،۲)

وقال تعالیٰ: وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ۔ (الرحمن:۴۶)

وقال تعالیٰ: وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ۔ قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ۔ إِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوهُ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ (الطور:۲۵ تا ۲۸)

باری تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے

یہ باب خوف کا قائم کیا ہے کہ آدمی کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے اللہ تبارک وتعالیٰ بے نیاز ہے، وہ بندوں کی عبادت، تسبیحات اورذکر و اذکار کا محتاج نہیں، بندے جو کچھ بھی کرتے ہیں درحقیقت اس کے ذریعہ سے اپنا ہی فائدہ حاصل کرتے ہیں، بندوں کی عبادتوں ،ذکراذکار، تسبیحات اور اللہ تعالیٰ کوراضی کرنے کے دوسرے طریقوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ کی عظمت اور کبریائی اوراس کی بڑائی و شان میں ذرہ برابر اضافہ نہیں ہوتا۔ مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں :-

مَن نہ گردم پاک از تسبیح شاں
پاک ہم ایشاں شوند و دُرفشاں

بندے جو سبحان اللہ، سبحان اللہ کہتے ہیں، میری تسبیح پڑھتے ہیں، مجھے یاد کرتے ہیں، میری عبادت کرتے ہیں، تو ان کے سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے میں پاک نہیں ہوتا۔ سبحان اللہ کا ترجمہ ہے: اللہ کی ذات بڑی پاک ہے۔ ہم اگر کہیں کہ اللہ کی ذات بڑی پاک ہے تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات میں پاکی نہیں آتی، اللہ تعالیٰ تو پاک ہی ہے۔ پھر آگے فرماتے ہیں کہ سبحان اللہ کہنے کی وجہ سے بندے خود پاک ہوتے ہیں اور بندوں کے اندر خوبی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی ہم سبحان اللہ کہیں گے تو ہماری گندی زبان پاک ہو جائے گی۔ نعوذ باللہ! ہمارے سبحان اللہ کی وجہ سے اللہ کی ذات میں کوئی پاکی نہیں آئے گی۔ یہ تو اس کا احسان وکرم ہے کہ اس نے اپنا نام لینے کی اجازت دی، ورنہ ہماری یہ زبان جن چیزوں میں ہر وقت ملوث رہتی ہے، اور جن گندگیوں کے ہم مرتکب رہتے ہیں، اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی بھی اجازت نہ دی جاتی، یہ تو اسی کا کرم ہے کہ اجازت ہی نہیں، بلکہ حکم دیا۔ فارسی کا ایک شعر ہے:-

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

میں ہزار مرتبہ اپنا منہ گلاب ومشک سے دھوؤں، اس کے بعد بھی ہماری زبان اس قابل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا نام لے سکے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا بے ادبی ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا کہ اس نے اپنا نام لینے کی اجازت ہی نہیں، بلکہ حکم دیا، اور اس طرح ہماری پاکی کا سامان پیدا کیا۔ بندے جب اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے

خود بندے کی ذات پاک ہوتی ہے اور اس کے گناہ جھڑتے ہیں ، اور اللہ تعالیٰ کا قرب و نزدیکی حاصل ہوتی ہے۔

عبادت کے وقت ڈر کی کیفیت ہو

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی عبادتوں کا محتاج نہیں ہے،وہ تو بے نیاز ہے۔اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا آدمی کو ہر وقت استحضار رہنا چاہیے،اور جب بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری بجالائے تو ڈرتے رہنا چاہیے،یعنی گناہ کرتے ہوئے تو آدمی کو ڈرنا ہی ہے، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت کرتے وقت بھی ڈرتے رہنا چاہیے۔قرآنِ پاک میں ہے:﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾حضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا) سے پوچھا گیا کہ اس آیت کے اندر جو بتلایا گیا ہے کہ وہ لوگ جو بھی عمل کرتے ہیں اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں،تو اس آیت میں کیا یہ مراد ہے کہ کوئی آدمی کسی گناہ کا ارتکاب کرے اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے ؟ اس لئے کہ اس آیت میں صرف اتنا ہی ہے کہ وہ جو کچھ بھی عمل کرتے ہیں اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔ تو حضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا) نے کہا کہ نہیں ! بلکہ عبادت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے کہ معلوم نہیں میری یہ عبادت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ (ترمذی شریف،۳۱۷۵)

ہماری عبادتوں کی حقیقت

ایک آدمی حضرت تھانوی(رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں حاضر ہوا،اور اس نے اس طرح سے پنکھا جھلنا شروع کیا کہ حضرت کو لگ رہا تھا۔ حضرت نے تھوڑی دیر تو تحمل سے کام لیا، پھر فرمایا: بھائی! تم تو اپنے خیال میں یوں سمجھتے ہو کہ میری خدمت کررہے ہو اور مجھے راحت پہنچا رہے ہو؛ لیکن درحقیقت مجھے تکلیف ہورہی ہے۔ تو ہماری عبادتیں بھی ایسی ہیں کہ ہم جو عبادتیں انجام دیتے ہیں ان کا حق تو ہم سے ادا ہوتا ہی نہیں ، اوران عبادتوں کے ذریعہ ہم یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے خوش ہوجائیں گے ،حالاں کہ ہمیں تو اس سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں ہماری عبادت سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کوئی گستاخی نہ ہوجائے۔

بارگاہِ قدس کا ادب سکھادیا

حضرت شاہ غلام علی صاحب دہلوی(رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مرزامظہر جانِ جاناں (رحمۃ اللہ علیہ)کے مرید تھے، اپنے وقت کے بہت بڑے شیخ تھے، ان کی خدمت میں دور دور سے لوگ حاضر ہوتے تھے،عراق،شام،سرحد،بخارا و سمرقند کے علاقہ کے لوگ بھی رمضان المبارک اور دوسرے دنوں میں حضرت کی خدمت میں سلوک طے کرنے کے لئے حاضری دیا کرتے تھے،سلسلۂ نقشبندیہ کے بڑے بزرگ گزرے ہیں،اوران کا حلقہ بڑا وسیع تھا میں جو سنانا

چاہتاہوں وہ یہ ہے کہ وہ جس زمانہ میں حضرت مرزامظہر جانِ جاناں (رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں رہتے تھے، ایک مرتبہ حضرت کے گھر میں سے ان سے کہا :بھائی غلام علی! ایک سوئی لاکردو۔وہ سوئی لے آئے، پیرانی صاحبہ نے کہا:غلام علی!تمہیں سوئی بھی خریدنا نہیں آتا؟ایسی موٹی سوئی لے کر آگئے؟انہوں نے جب یہ سناتو رونے لگے اور کہا:انہوں نے تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کاادب سکھادیا،جب ہم ایک انسان کی پسندیدگی کے معیار پر پورے نہیں اتر سکتے،یعنی ایک عورت نے ہم سے مطالبہ کیاکہ ہمارے لئے سوئی خرید کر لاؤاور جب ہم نے لاکر پیش کی تو جس قسم کی سوئی چاہتی تھی وہ ہم خرید کر نہیں لا سکے؛ تواللہ تعالیٰ کی بارگاہ کے لائق جوعبادت ہے وہ ہم کہاں پیش کرسکتے ہیں۔بہت دیر تک اسی چیز کو سوچ کرروتے رہے۔

اس بارگاہ کا حق کہاں اداہوسکتاہے

ان کاایک واقعہ یہ بھی ہے کہ وہ حضرت مرزاصاحب(رحمۃ اللہ علیہ) کو پنکھا جھلاکرتے تھے، ایک مرتبہ ذراآہستہ جھل رہے تھے ، توحضرت مرزا صاحب نے فرمایا:میاں غلام علی! کچھ کھایابھی ہے یا نہیں ؟ اس طرح آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہے ہوکہ مجھے توہوا بھی نہیں آرہی ہے۔توذرازورسے جھلنے لگے،توحضرت نے کہا: تم توجھے اُڑاہی دوگے۔جب یہ دونوں باتیں ہوئیں توڈرتے ڈرتے عرض کیاکہ حضرت! نہ یوں بنے،نہ توں بنے۔تو حضرت نے کہا:لاؤ! میرا پنکھامجھے دیدو، مجھے نہیں جھلوانا۔تووہ رونے لگے اور معافی مانگی۔توحقیقت یہ

ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ کے جو حقوق ہیں، اوراس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا جو حق ہے وہ توہم سے کہاں ادا ہوسکتا ہے؟اس لیے آدمی کو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہناچاہیے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کی خشیت

نبیٔ کریم (ﷺ) سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقرب اور کون ہوگا؟ بخاری شریف میں روایت ہے، حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ جب ہوا ذرا تیز چلنے لگتی تو نبیٔ کریم (ﷺ) مسجد کی طرف لپکتے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور گڑگڑاتے تھے جب بادل آتے ہوئے دیکھ لیتے توآپ کے چہرۂ انورپر پریشانی کے آثارظاہر ہوجاتے۔ ایک مرتبہ آپ سے عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسول! لوگ بادل کودیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں کہ اب بارش آئے گی،اور ہم آپ کو دیکھتے ہیں کہ آپ جب کسی بادل کو آتا ہوا دیکھتے ہیں تو آپ کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمایاں ہوجاتے ہیں ؟ تو حضوراکرم (ﷺ) نے فرمایا: بھائی! کیا گارنٹی (Guarantee) کہ وہ بادل پانی ہی لے کر آرہاہے۔ بادل وہ بھی تھاجو قومِ عاد کے اوپر آیاتھااورجب انہوں نے بادل کو آتےہوئے دیکھاتویوں کہاتھا:﴿هٰذَا عَارِضٌ مُّمۡطِرُنَا﴾یہ بادل آرہاہے،ہم پر بارش برسائے گا۔عادایک قوم گزری ہے ان کے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جب ان کے لئے عذاب طے فرمادیا، تو آٹھ دن تک اتنی سخت گرمی پڑی کہ سارے تالاب،دریاندی نالے وغیرہ میں جوکچھ بھی پانی کے

ذخیرے تھے؛سب خشک ہوگئے ،لوگ گرمی کی وجہ سے سخت پریشانی میں مبتلا تھے،اس کے بعد ایک بادل کو آتا ہوا دیکھا تو سب اس بادل کے نیچے آگئے کہ اب بارش برسے گی توہم کو سکون حاصل ہوگا جب وہ سب اس بادل کے نیچے آگئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر آگ برسائی اور سب ختم ہوگئے اس لئے آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ کیا گارنٹی ہے کہ جو بادل آرہا ہے وہ بارش ہی برسائے گا۔(بخاری شریف،۴۸۲۹)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے، آدمی جتنا اللہ تعالیٰ سے قریب ہوتا ہے اتنا ہی اس سے ڈرتا رہتا ہے۔تو یہاں خوف کا باب قائم کیا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔اسی سلسلہ میں کچھ آیتیں اور حدیثیں پیش کرتے ہیں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ﴾ مجھ ہی سے ڈرتے رہو،یعنی اصل ڈر تو اللہ تعالیٰ ہی کا ہے،کسی اور سے آدمی خوف نہ کرے۔

اور پھر یہ بھی فرمایا﴿إِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ﴾ اللہ تبارک وتعالیٰ کی پکڑ اور اس کی گرفت بہت سخت ہے۔آدمی کو اس بات کا تصور کرتے رہنا چاہیے۔میں پہلے ہی بتلا چکا ہوں کہ کس بات پر گرفت ہوجائے اس کی گارنٹی نہیں دی جاسکتی،کبھی چھوٹی سی بات پر بھی گرفت ہوجاتی ہے۔اس لئے آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے۔

ان میں بڑی عبرت ہے

اورسورۂ ھود کی کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔اگلی قوموں کے قصے بیان کئے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانیوں پر پکڑا گیااور ان کی گرفت ہوئی، وہ سب بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشادہے﴿وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾ تیرے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے ،جب وہ کسی بستی کی پکڑ کرتا ہے جب کہ وہ بستی والے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوں۔بیشک اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی دردناک اور سخت ہوا کرتی ہے﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ﴾ یہ جتنے بھی قصے بیان کئے گئے،ان میں بڑی عبرت ہے اس آدمی کے لیے جو آخرت کے عذاب سے ڈرے﴿ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ﴾ اور آخرت کا جودن ہے اس میں تمام لوگوں کوجمع کیاجائے گااور جسے سب کے سب کھلی آنکھوں دیکھیں گے۔اوریہ مت سمجھئے کہ وہ آنے والا نہیں ہے ﴿وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ مَّعْدُودٍ﴾ ہم نے اس کو ایک مقررہ وقت تک کے لیے ٹلا رکھا ہے۔ہم نے جو وقت طے کیاہے اس وقت وہ دن آئے گا۔جس دن وہ آجائے گا،اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی۔مومن ہویاکافر۔ بات کرنے کی بھی جرأت نہیں کرے گا۔ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کی اجازت ہوگی تو بات کرے گا﴿فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيدٌ﴾اور قیامت کے دن میدانِ حشر میں دونوں قسم کے لوگ ہوں گے،نیک بخت بھی ہوں گے اور بدبخت بھی ہوں گے، اور اس میں جوبدبخت ہوں گےوہ جہنم میں ڈالے جائیں گے، وہ چیخ و پکار کرتے رہیں گے۔

ان آیتوں کو لاکر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کی تاکید فرمارہے ہیں۔

قیامت کا منظر

آگے ایک اورآیت ہے﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ﴾قیامت کے دن آدمی اپنے بھائی،ماں ، باپ،بیوی اوربیٹوں سے بھاگے گا۔یعنی اپنے رشتہ داروں کو دیکھ کر اس ڈرسے بھاگے گاکہ معلوم نہیں وہ مجھ سے کیامطالبہ کربیٹھیں۔عام طورپر آدمی کا دنیامیں جن لوگوں سے واسطہ پڑتاہے،انہیں کے کچھ حقوق باقی رہ جاتے ہیں اور انہیں کی طرف سے مطالبہ کا ڈررہتاہےتواس دن انہیں رشتہ داروں کودیکھ کرآدمی بھاگے گا۔باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن ہر ایک اپنی حالت میں اس طرح گرفتارہوگا کہ دوسروں کی طرف سے بے پرواہ ہوجائے گا۔یعنی اس کو دوسرے کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں ہوگا، بس اپناہی فکر لاحق ہوگا۔

قیامت کا زلزلہ

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمْ إِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيمٌ﴾اے لوگو!اپنے رب سے ڈرو،بے شک قیامت کا زلزلہ بڑا خطرناک ہے، جس دن تم اس کو دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اپنے دودھ پیتے بچے کوبھول جائے گی اورآپ اس دن لوگوں کو ایسامحسوس کریں گے گویاوہ نشے میں ہیں،حالاں کہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا

سخت ہے۔اس دن کی ہیبت وخوف لوگوں پر اتنا سخت طاری ہوگا کہ وہ اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھیں گے۔

ایک رات میں جوان بوڑھا ہوگیا

کتبِ تفسیر میں لکھا ہے کہ ایک آدمی رات کو سویا تو اس کے بال سیاہ تھے، صبح میں اُٹھ کر دیکھا تو سب بال سفید تھے۔اس سے پوچھا کہ بھائی! کیا بات ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں نے رات کو خواب میں قیامت کا منظر دیکھا،اس کی مجھ پر ایسی ہیبت طاری ہوئی اور میری طبیعت پر ایسا اثر پڑا کہ سارے سیاہ بال سفید ہوگئے (تفسیر قرطبی،سورۂ مزمل) خواب میں یہ منظر دیکھ کر جب ایسا حال ہوسکتا ہے، تو بیداری میں کیا حال ہوگا؟

انسانی پیدائش کی ترتیب

حدیث ۳۹۶

عَنْ بْنِ مَسْعُوْدٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَهُوَ الصادق المصدوق: إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِى بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِينَ يوماً نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ الْمَلَكُ، فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ، وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ: بِكَتْبِ رِزْقِهِ وَأَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَشَقِيٌّ أَوْ سَعِيدٌ. فَوَالَّذِى لا إِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وبينها إِلاَّ ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ،

فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا ، وَإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتَّى مَا يَكُونُ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلاَّ ذِرَاعٌ، فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْخُلُهَا .(مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم سے ارشاد فرمایا، حال یہ ہے کہ آپ سچے بھی ہیں اور آپ کی تصدیق بھی کی گئی ہے (یعنی لوگ آپ پر ایمان بھی لائے اور آپ کی بات کو سچا بھی مانا) کہ انسان کو اس کی پیدائش کے لئے نطفہ کی شکل میں اس کی ماں کے رحم میں چالیس دن تک جمع کیا جاتا ہے (جب مرد کا نطفہ عورت کے رحم کے اندر جوش اور شدت کے ساتھ پہنچتا ہے تو اس کے ذرات پورے رحم میں پھیل جاتے ہیں ، پھر اللہ تعالیٰ کو اس نطفہ سے اگر بچہ پیدا کرنا منظور ہوتا ہے تو وہ اجزاء جو پورے رحم مادر میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں وہ سب دھیرے دھیرے ایک جگہ اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ نطفہ کے سارے منتشر اجزاء جو بچہ دانی میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں وہ سب ایک جگہ چالیس دن میں جمع ہوتے ہیں)اس کے بعد وہ نطفہ جمے ہوئے خون کی شکل اختیار کرتا ہے (اوراس کی یہ حالت چالیس روز تک رہتی ہے)اس کے بعد پھر وہ گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کرتا ہے (اور یہ کیفیت بھی چالیس دن تک رہتی ہے) اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں جان ڈالتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بچہ کی چار چیزیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے، پہلی چیز تو اس کی روزی، دوسری اس کی عمر، تیسری اس کے اعمال، اور چوتھی وہ نیک بخت ہے یا بدبخت۔

نئی فائل تیار کروائی

یہ چار چیزیں جو فرشتہ لکھتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے متعلق ابھی یہ فیصلہ ہوا۔ بلکہ فیصلہ تو پہلے سے ہو چکا تھا۔ حضرت مولانا بدر عالم صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ یوں سمجھو کہ جب اللہ تعالیٰ کو اس کی پیدائش منظور ہوئی تو لوحِ محفوظ میں اس کے بارے میں جو کچھ لکھا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے فرشتہ بھیج کر اس کے لئے ایک نئی فائل الگ تیار کروائی۔ چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ فرشتہ پوچھتا ہے کہ باری تعالیٰ! اس کے لئے کیا لکھا جائے؟ باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو! لوحِ محفوظ میں اس کے لئے کیا لکھا گیا ہے؟ اس کے مطابق لکھ دو۔ تو یوں سمجھو کہ ایک سو بیس دن کے بعد اس کی الگ فائل شروع ہو گئی۔ اس کو ایک مثال سے میں سمجھاتا ہوں کہ جیسے حاملہ ہونے کی حالت میں ہسپتال کے اندر ماں کا جب داخلہ ہوتا ہے تو جب تک اس کو بچہ پیدا نہیں ہوا، وہاں تک صرف ماں کی فائل ہوتی ہے، لیکن جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو بچہ کی ایک الگ فائل بنائی جاتی ہے، پھر وہ ماں کی فائل میں شمار نہیں ہوتا۔ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ہے کہ جب اس کو دنیا میں بھیجنا منظور ہوا تو فرشتہ بھیج کر اس کے لئے الگ معاملہ شروع کیا گیا۔

نوشتۂ تقدیر غالب آکر رہتا ہے

(اب دیکھئے کون نیک بخت ہے اور کون بدبخت ہے وہ تو اللہ کی طرف سے طے ہوچکا ہے)تو حضوراکرم (ﷺ) فرماتے ہیں: قسم ہے اس ذات کی جس کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں، بعض مرتبہ کوئی آدمی جنتیوں جیسے اعمال کررہا ہوتا ہے یعنی لوگ اس کو دیکھ رہے ہیں کہ اچھے اعمال کررہا ہے، یہاں تک کہ اچھے اعمال کرتے کرتے زندگی کا جب آخری مرحلہ آیااور اب موت میں اور اس میں زیادہ فاصلہ نہیں رہا،اور قریب ہے کہ اپنے اس عمل کے ذریعہ سے جنت میں پہنچ جائے،ایک ہاتھ کافاصلہ رہ گیا(یہ قلیل فاصلہ کی طرف اشارہ ہے،لیکن اللہ تعالیٰ نے روزِازل اس کے لیے جہنمی ہونے کا فیصلہ کیا تھا) تواب وہ فیصلہ غالب آتاہے اوراخیر میں موت سے پہلے وہ جہنمیوں جیسے اعمال کرتا ہے (جس کانتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسی حالت میں موت آتی ہے)اور جہنم میں جاتاہے۔اور کوئی آدمی جہنمیوں جیسے عمل کرتارہا، یہاں تک کہ اس کےاور جہنم کے درمیان میں ایک ہاتھ کے برابریعنی تھوڑاسا فاصلہ رہ گیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے جنتی ہونے کافیصلہ کیا تھا تووہ فیصلہ غالب آتاہے ،اوروہ جنتیوں کے سے عمل کرنے لگتاہے(اور اسی پر موت آتی ہے) اور جنت میں داخل ہوجاتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی کو بھی اپنے عمل پر اعتماد کرکے مطمئن نہیں رہنا چاہیے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ معلوم نہیں انجام کیا ہو؟ملا علی

قاری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے اہل اللہ کو اسی چیز نے فکر اور تشویش میں ڈال رکھا ہے کہ معلوم نہیں انجام کیا ہو؟ اس لئے کہ فیصلہ اسی پر ہوتا ہے۔

جہنم کا ایک منظر

حدیث ۳۹۷

وعنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلى الله عليه وسلم): يُؤْتَى بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لَهَا سَبْعُوْنَ أَلْفَ زِمَامٍ مَعَ كُلِّ زِمَامٍ سَبْعُوْنَ أَلْفَ مَلَكٍ يَجُرُّوْنَهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) ہی سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کو قیامت کے روز (میدانِ حشر میں) لایا جائے گا، اس کی ستر ہزار (۷۰۰۰۰) لگام ہوں گی، اور ہر لگام کو ستر ہزار (۷۰۰۰۰) فرشتے کھینچ رہے ہوں گے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جہنم اتنی بڑی ہوگی کہ اس کو قریب کرنے کے لئے اتنا زیادہ اہتمام کیا جائے گا۔ اس روایت کو لانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ یہ سن کر آدمی کے اندر خوف کی کیفیت پیدا ہو جو اس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ سے روکے۔

سب سے کم عذاب

حدیث ۳۹۸

وعن النعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ إِنَّ أَهْوَنَ أَهْلِ النَّارِ عَذَاباً يَوْمَ الْقِيَامَةِ لَرَجُلٌ يُوْضَعُ فِيْ أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ جَمْرَتَانِ يَغْلِيْ مِنْهُمَا دِمَاغُهُ. مَا يَرَىٰ أَنَّ أَحَداً أَشَدُّ مِنْهُ عَذَاباً. وَأَنَّهُ لَأَهْوَنُهُمْ عَذَاباً۔ (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز جہنمیوں میں عذاب کے اعتبار سے سب سے ہلکا وہ آدمی ہو گا جس کے دونوں پاؤں کے تلویوں کے نیچے دو انگارے رکھے جائیں گے۔ ان دو انگاروں کا اثر یہ ہو گا کہ اس کا دماغ کھول رہا ہو گا جیسے ہانڈی کو آگ کے اوپر رکھتے ہیں تو اس کا پانی کھولتا ہے۔ اور وہ یوں سمجھ رہا ہو گا کہ مجھ سے زیادہ سخت عذاب والا اور کوئی نہیں ہے، حالانکہ سب سے ہلکا عذاب اس کو ہو رہا ہو گا۔

افادات:- ”أَخْمَصِ قَدَمَيْهِ“ پاؤں کا وہ حصہ جو پاؤں زمین پر رکھتے وقت زمین پر نہیں لگتا۔ گویا دونوں پاؤں کے ان حصوں میں ایک ایک انگارا رکھا جائے گا، اور جہنم کے اندر سب سے ہلکے اور کم عذاب والا آدمی یہ ہو گا۔ بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جہنم کا عذاب بہت ڈرنے کی چیز ہے۔ بعض لوگوں کو جب جہنم کے عذاب سے متعلق وعید کی کچھ آیتیں اور احادیث سنائی جاتی ہیں تو وہ بڑی جرأت سے اپنی زبان سے ایسی ویسی باتیں نکال دیتے ہیں کہ ”نعوذ باللہ“ جہنم میں چلے جائیں گے۔ یا بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ تیری طرف سے سزائیں بھگت لوں گا۔ یہ بڑے خطرناک جملے ہیں۔ اور سب سے ہلکا عذاب یہ ہے لیکن وہ سمجھ رہا ہو گا کہ مجھ سے زیادہ سخت عذاب والا اور کوئی نہیں ہے۔

گلے تک آگ

حدیث ۳۹۹

وَعَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ نَبِيَّ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: مِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ النَّارُ إِلَى كَعْبَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى حُجْزَتِهِ، وَمِنْهُمْ مَنْ تَأْخُذُهُ إِلَى تَرْقُوَتِهِ۔ (رواه مسلم)

(الْحُجْزَةُ) مَعْقِدُ الْإِزَارِ تَحْتَ السُّرَّةِ وَ (التَّرْقُوَةُ) بِفَتْحِ التَّاءِ وَ ضَمِّ الْقَافِ : هِيَ الْعَظْمُ الَّذِي عِنْدَ ثُغْرَةِ النَّحْرِ وَلِلْإِنْسَانِ تَرْقُوَتَانِ فِي جَانِبَيِ النَّحْرِ ۔

ترجمہ:- حضرت سمرہ بن جندب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جہنمیوں کو جب جہنم میں ڈالا جائے گا تو ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق آگ پکڑے گی (یعنی جس نے جیسے جیسے گناہ کئے ہوں گے اس کے مناسب اس کو عذاب ہوگا) بعض وہ ہوں گے جن کو ٹخنوں تک آگ لگے گی۔ بعض وہ ہوں گے جن کو گھٹنوں تک آگ پکڑے گی۔ بعض وہ ہوں گے جو کمر تک آگ میں ڈوبے ہوں گے۔ اور بعض گلے تک آگ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

کانوں تک پسینے میں

حدیث ۴۰۰

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہ): أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ حَتَّى يَغِيبَ أَحَدُهُمْ فِي رَشْحِهِ إِلَى أَنْصَافِ أُذُنَيْهِ ۔ (متفق عليه)

وَ(الرَّشْحُ): الْعَرَقُ۔

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے میدانِ حشر میں پیش ہوں گے (اوراس وقت سورج قریب ہوگا، اس کی وجہ سے ہرایک پسینے میں ڈوبا ہوا ہوگا) یہاں تک کہ بعض وہ ہوں گے جو کانوں تک پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

افادات:- یعنی ان کے پسینے اتنے ہوں گے کہ وہ کان تک ڈوبے ہوئے ہوں گے۔اور یہ تو میدانِ حشر کا حال ہے، جہنم کا نہیں۔ جہنم کا حال تو اوپر بتلایا تھا۔

... تو ہنسو کم، اور روؤ زیادہ

حدیث ۴۰۱

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) خُطْبَةً مَا سَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ فَقَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ، لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً. فَغَطّٰى أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وُجُوْهَهُمْ وَلَهُمْ خَنِيْنٌ (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ ہمیں ایک خطبہ دیا، ویسا خطبہ میں نے کبھی نہیں سنا۔اس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے لوگو! آخرت اور جنت و جہنم کے جو حالات میں جانتا ہوں ، اگرتم لوگ جاننے لگو، تو ہنسو کم، اور روؤ زیادہ۔جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان سے یہ ساری باتیں لوگوں نے سنیں تو حضراتِ صحابہ نے مارے غم کے اپنے چہرے ڈھانپ لئے اور خوب رونے لگے۔(یعنی ان کے منہ سے رونے کی آوازیں نکلنے لگیں ۔)

سورج ایک میل دور ہو گا

حدیث ۴۰۲

وعن المقداد (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعتُ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُولُ: تُدْنَى الشَّمْسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الْخَلْقِ حَتَّى تَكُوْنَ مِنْهُمْ كَمِقْدَارِ مِيْلٍ.

قَالَ سُلَيْمُ بْنُ عَامِرٍ الرَّاوِيْ عَنِ الْمِقْدَادِ: فَوَاللهِ مَا أَدْرِى مَا يَعْنِى بِالْمِيْلِ، أَمَسَافَةَ الْأَرْضِ أَمِ الْمِيْلَ الَّذِيْ تُكْتَحَلُ بِهِ الْعَيْنُ؟

قَالَ: فَيَكُوْنَ النَّاسُ عَلَى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ فِي الْعَرَقِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى كَعْبَيْهِ، وَ مِنْهُمْ مَنْ يُكُوْنُ إِلَى رُكْبَتَيْهِ، وَ مِنْهُمْ مَنْ يَكُوْنُ إِلَى حِقْوَيْهِ، وَ مِنْهُمْ مَنْ يُلْجِمُهُ الْعَرَقُ إِلْجَاماً۔ قَالَ: وَ أَشَارَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) بِيَدِهِ إِلَى فِيْهِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت مقداد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز سورج کو مخلوق کے قریب کیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ان سے ایک میل کی مقدار دور ہو گا۔ حضرت مقداد صحابی سے یہ روایت نقل کرنے والے تابعی حضرت سلیم بن عامر (رحمۃ اللہ علیہ) کہتے ہیں کہ میں یہ نہیں بتلاسکتا کہ میل سے کیا مراد ہے؟ (زمین کی مسافت ناپنے کے لئے بھی میل بولا جاتا ہے جو آٹھ فرلانگ کا ہوتا ہے۔ اور آنکھ میں سرمہ ڈالنے کے لیے جو سلائی استعمال ہوتی ہے اس کو عربی زبان میں میل کہتے ہیں) تو حضرت سُلَیم تابعی فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو فرمایا کہ ایک میل دور ہو گا، تو میں نہیں بتلا سکتا کہ میل سے کیا مراد ہے؟ زمین ناپنے کا میل یا سرمہ دانی کی سلائی مراد ہے۔

اہلِ ہیئت کے یہاں ایک حساب ہے جس کو نوروالے میل کہا جاتا ہے۔تو نور والے میل کے حساب سے سورج زمین سے نو کروڑ تینتیس لاکھ (۹,۳۳,۰۰,۰۰۰) میل دور ہوتا ہے۔تو سوچنے کی چیز یہ ہے کہ جب اتنا دورہونے کی صورت میں گرمی کے زمانہ میں اس کی گرمی کی شدت کا یہ حال ہوتا ہے کہ ہم سے برداشت نہیں ہوتی، تو جب وہ ایک میل دوری پر ہوجائے گا تو پھر اس کی گرمی کا کیا عالَم ہو گا؟

حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ سورج کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے تمام لوگ اپنے اپنے اعمال کے مطابق پسینہ میں غرق ہوں گے۔بعض لوگ ٹخنوں تک پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ بعض گھٹنوں تک پسینہ میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔بعض ہنسلی تک ڈوبے ہوئے ہوں گے۔اور بعض لوگوں کوپسینے کی لگام پہنادی جائے گی یعنی منہ تک ڈوبے ہوئے ہوں گے۔ حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے منھ تک اشارہ کرکے بتلایا۔

اتنازیادہ پسینہ نکلے گا کہ...

حدیث ۴۰۳

وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ : يَعْرُقُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يَذْهَبَ عَرَقُهُمْ فِي الْأَرْضِ سَبْعِيْنَ ذِرَاعًا وَيُلْجِمُهُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ آذَانَهُمْ ۔ (متفق عليه)

وَمَعْنَى يَذْهَبُ فِي الْأَرْضِ: يَنْزِلُ وَيَغُوصُ ۔

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز لوگ اتنے پسینہ میں غرق اور شرابور ہوں گے کہ ان کا پسینہ بہہ کر زمین کے اندر ستر ہاتھ نیچے تک چلا جائے گا۔

افادات :- پہلی بات تو یہ کہ پسینہ ان کے جسم سے اتنا نکلے گا کہ زمین کے اندر نیچے ستر ہاتھ تک چلا جائے گا۔ اب غور کیجیے کہ جو ندی ہوتی ہے جہاں بارہ مہینے پانی رہتا ہے اس کو بھی کھود کر دیکھئے کہ کتنا نیچے پانی گیا ہے۔ تو جب ان کے پسینہ کا اثر ستر ہاتھ تک نیچے جائے گا تو سوچو کہ کتنا پسینہ نکلے گا۔ اور پھر اس کے بعد جو پسینہ اوپر آئے گا وہ کسی کو ٹخنوں تک، تو کسی کو گھٹنوں تک، کسی کو کمر تک اور اخیر میں کانوں تک پہنچے گا۔

جہنم کی گہرائی

حدیث ۴۰۴

وعَنْهُ قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذْ سَمِعَ وَجْبَةً. فَقَالَ: هَلْ تَدْرُوْنَ مَا هٰذَا؟ قُلْنَا: اَللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ قَالَ: هٰذَا حَجَرٌ رُمِيَ بِهِ فِيْ النَّارِ مُنْذُ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا. فَهُوَ يَهْوِيْ فِيْ النَّارِ الْأٰنَ حَتّٰى انْتَهٰى إِلٰى قَعْرِهَا فَسَمِعْتُمْ وَجْبَتَهَا.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں ہم لوگ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپ نے کسی چیز کے گرنے کی آواز سنی، تو حضراتِ صحابہ سے پوچھا: معلوم ہے یہ

کاہے کی آواز آئی؟ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا : اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ایک پتھر تھا جو جہنم کے اندر ستر سال پہلے ڈالا گیا تھا، وہ گرتے گرتے آج اس کی تہہ میں پہنچا، اور تم نے اس کے گرنے کی آواز سنی (اس سے اندازہ لگا یا جاسکتا ہے کہ جہنم کتنی گہری ہوگی!)

براہِ راست گفتگو ہوگی

حدیث ۴۰۵

وَعَنْ عَدِيِّ بْنِ حَاتِمٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلاَّ سَيُكَلِّمُهُ رَبُّهُ لَيْسَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهُ تَرْجُمَانٌ، فَيَنْظُرُ أَيْمَنَ مِنْهُ فَلاَ يَرَى إِلاَّ مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ أَشْأَمَ مِنْهُ فَلاَ يَرَى إِلَّا مَا قَدَّمَ، وَيَنْظُرُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلاَ يَرَى إِلاَّ النَّارَ تِلْقَاءَ وَجْهِهِ، فَاتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ۔ (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت عدی بن حاتم (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک سے اللہ تبارک وتعالیٰ گفتگو فرمائیں گے اس طرح کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی ترجمان (ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے والا) نہیں ہوگا (گویا اللہ تعالیٰ کے سامنے بالکل اس طرح پیشی ہے کہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے اس کی بات چیت ہورہی ہے اور اللہ تعالیٰ سیدھا اس سے سوال کررہے ہیں، اس وقت وہ ڈرے گا کہ کیسے میں اپنا بچاؤ کروں) دائیں طرف دیکھے گا تو جو اعمال اس نے کئے ہیں وہ ہوں گے، بائیں طرف دیکھے گا تو وہاں بھی اپنے ہی اعمال دیکھے گا، اور سامنے دیکھے گا تو جہنم ہوگی (اس لئے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ) اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی کوشش کرو، چاہے کھجور کے ایک ٹکڑے سے ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ کھجور کا ایک آدھا حصہ اللہ کے راستہ میں صدقہ کرکے بھی آدمی اپنے آپ کو جہنم سے بچا سکتا ہے، جتنے بھی نیک اعمال ہیں وہ سب جہنم سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔

تم لذتیں اُٹھانا چھوڑ دو...

حدیث ۴۰۷

وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِنِّي أَرَى مَا لاَ تَرَوْنَ، أَطَّتِ السَّمَاءُ وحُقَّ لَهَا أَنْ تَئِطَّ، مَا فِيهَا مَوْضِعُ أَرْبَعِ أَصَابِعَ إِلاَّ وَمَلَكٌ وَاضِعٌ جَبْهَتَهُ سَاجِداً لِلّٰهِ تَعَالَى۔ وَاللهِ لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا أَعْلَمُ، لَضَحِكْتُمْ قَلِيلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً، وَمَا تَلَذَّذْتُمْ بِالنِّسَاءِ عَلَى الْفُرُشِ، وَلَخَرَجْتُمْ إِلَى الصُّعُدَاتِ تَجْأَرُوْنَ إِلَى اللهِ تَعَالَى۔ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وَقَالَ: حديث حسن)

و(أطّت) بِفَتْحِ الْهَمْزَةِ وتشديد الطاءِ و(تئط) بِفَتْحِ التَّاء وبعدها همزة مكسورة والأَطِيْطُ: صوت الرَّحْلِ وَالْقَتَبِ وشِبْهِهِمَا، ومعناه: أنَّ كَثْرَةَ مَنْ فِي السَّمَاءِ مِنَ الْمَلاَئِكَةِ الْعَابِدِيْنَ قَدْ أَثْقَلَتْهَا حَتَّى أَطَّت. و(الصُّعُدَات) بِضَم الصاد والعين: الطُّرُقَات: ومعنى: (تَجْأَرُوْنَ) تَسْتَغِيْثُوْنَ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میں وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ آسمان چرچرا رہا ہے یعنی بوجھ کی شدت کی وجہ سے اس میں سے آواز نکل رہی ہے (اونٹ کا جو کجاوا ہوتا ہے، اس کے اوپر لکڑی کا فریم رکھا جاتا ہے اور اس کے اوپر بوجھ لادا جاتا ہے، جب اس پر بوجھ لادتے ہیں تو لکڑی کے فریم کے اندر سے چرچرانے کی آواز نکلتی ہے۔ کرسی

پر کوئی بھاری بھرکم آدمی بیٹھ جائے تو اس کرسی میں سے ایک قسم کی آواز نکلتی ہے: اس آواز کو چرچرانا کہتے ہیں) اور اس کو حق ہے کہ وہ چرچرائے (کیوں چرچراتا ہے؟) آسمان میں چار انگلی کے برابر بھی جگہ نہیں مگر وہاں ایک فرشتہ ہے جو اپنی پیشانی کو اللہ کے حضور سجدے میں رکھے ہوئے ہے۔ (گویا اتنے زیادہ فرشتے آسمان پر ہیں کہ ان کے بوجھ کی وجہ سے آسمان چرچراتا ہے۔) حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم! آخرت میں پیش آنے والے ان حالات کو اگر تم جان لو جو میں جانتا ہوں، تو تم ہنسو کم، اور روؤ زیادہ۔ بلکہ ان حالات کا اگر تمہیں علم ہو جائے تو تم اپنے بستروں پر اپنی عورتوں سے لذت حاصل نہیں کروگے۔ (یعنی طبیعت پر ایسا خوف اور ایسی خشیت غالب ہو جائے کہ آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرنا بھی بھول جائے) اور اس خوف کی وجہ سے تم چِلّاتے ہوئے جنگلوں کی طرف نکل جاؤ۔

افادات:- یہ غفلت بھی اس معنیٰ کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے کہ جس کی وجہ سے آدمی دنیا میں زندگی گزار رہا ہے۔ لیکن اتنی بھی غفلت نہ ہو جائے کہ آدمی آخرت کی طرف سے بے خبر ہی ہو جائے۔

قیامت کے سوالات

حدیث ۴۰۷

وَعَنْ أَبِي بَرْزَةَ بِرَآء ثُمَّ زای۔ نَضْلَةَ بْنِ عبید الأسلمی (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): لَا تَزُوْلُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ عُمُرِهِ فِيْمَ أَفْنَاهُ؛ وَعَنْ عِلْمِهِ فِيْمَ فَعَلَ فِيْهِ؛ وَعَنْ مَالِهِ مِنْ أَيْنَ اِكْتَسَبَهُ؛ وَفِيْمَ أَنْفَقَهُ؛ وَعَنْ جِسْمِهِ فِيْمَ أَبْلَاهُ؛ (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ، وقَالَ: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت ابوبرزہ اسلمی(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز بندے کے قدم اللہ تعالیٰ کے حضور سے ہٹ نہیں پائیں گے یہاں تک کہ اس کو چند سوالات کئے جائیں۔پہلا سوال تو یہ پوچھا جائے گا کہ عمر کہاں ختم کی؟ (آدمی یہ سوچ لے کہ میں جو کچھ کررہاہوں ، اپنی عمر کو جن چیزوں میں بسر کررہا ہوں ،اللہ تعالیٰ کے حضور یہ سوال ہونے والا ہے اور اس کا جواب دینا ہے۔)اور (یہ بھی سوال ہوگا کہ) اللہ تعالیٰ کے جو احکام تمہیں معلوم تھے ان پر کتنا عمل کیا؟ اورمال (کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ) کہاں سے کمایااور کہاں خرچ کیا؟ (آج ہم لوگ مال کی طلب میں تو لگے ہوئے ہیں لیکن کبھی سوچتے نہیں کہ اس کا بھی جواب دینا ہے،کہاں سے آرہا ہے وہ بھی جواب دینا ہے ،اور کہاں خرچ کررہے ہیں وہ بھی جواب دینا ہے۔اس لئے آدمی کمانے میں بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کو مد نظر رکھے اور جس طریقہ سے کمانے کا شریعت نے حکم دیاہے اس کے مطابق کمائے، اگرغلط طریقہ سے حاصل کیا تووہ مصیبت ہے۔اور جائزطریقہ سے کمانے کے بعد غلط طریقہ سے خرچ کیا تو وہ بھی مصیبت ہے۔اس لئے کہاں سے کمایااس کا بھی جواب دینا ہے اور کس طرح خرچ کیا اس کا بھی جواب دینا ہے۔)جسم(کے متعلق پوچھاجائے گاکہ)اس کو کہاں پرانا کیا۔”

پرانا کیا“ کا مطلب یہ ہے کہ اس کااستعمال کہاں کیا۔جسم میں آنکھیں بھی ہیں، زبان،کان،ہاتھ،پاؤں بھی ہے شرم گاہ بھی ہے؛جسم کے مختلف اعضاء جو کچھ بھی کر رہے ہیں ان سب کا اللہ تبارک وتعالیٰ کو جواب دینا ہے، اور وہاں ایسا نہیں ہے کہ کچھ دے دلا کر کام نپٹا لیا جائے،بلکہ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرشتے مقرر ہیں وہ سب کچھ لکھ رہے ہیں۔قیامت کے روز لوگ جب اپنے اعمال نامہ کودیکھیں گے توکہیں گے ﴿مَالِ

﴿هٰذَا الۡكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصَاهَا﴾اس کتاب کو کیا ہو گیا ،یعنی فرشتہ کے لکھے ہوئے اس اعمال نامہ کا کیا حال ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی بات ایسی نہیں جو اس نے چھوڑی ہو، سب کچھ اندر موجود ہے﴿مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ﴾ آدمی جو بولتا ہے اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگران مقرر ہے، آدمی جو بولتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔اس لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور جواب کے لیے پیش ہونا ہے اور اپنے کئے کا جواب دینا ہے،اگر یہ سوچے گا تو پھر اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا اور پھونک پھونک کر قدم رکھے گا﴿وَاَمَّا مَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفۡسَ عَنِ الۡهَوٰى﴾ جو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کے تصور سے ڈرا اور اپنے آپ کو خواہشات اور نفس کے تقاضوں سے روکا؛ تو پھر جنت اس کا ٹھکانا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خوف کا بیان چل رہاہے ، یہ روایت گزشتہ مجلس میں بھی آچکی ہے اسی کے ضمن میں کچھ باتیں آج بھی پیش کی جاتی ہیں۔

حدیث ۴۰۷

وَعَنْ أَبِي بَرْزَةَ بِرَاء ثُمَّ زَاى نَضْلَةَ بْنِ عبيد الأسلمي (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): لَا تَزُوْلُ قَدَمَا عَبْدٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْأَلَ عَنْ عُمُرِهِ فِيْمَ أَفْنَاهُ؟ وَعَنْ عِلْمِهِ فِيْمَ فَعَلَ فِيْهِ؟ وَعَنْ مَالِهِ مِنْ أَيْنَ اِكْتَسَبَهُ؟ وَفِيْمَ أَنْفَقَهُ؟ وَعَنْ جِسْمِهِ فِيْمَ أَبْلَاهُ؟

ترجمہ مع تشریح:-حضرت ابو برزہ اَسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایاکہ بندے کے قدم اللہ تعالیٰ کے سامنے سے میدان حشر میں نہیں ہٹیں گے،یہاں تک کہ اس سے اس کی عمر کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ اس نے اس کو کہاں ختم کیا۔

زندگی ایک سرمایہ ہے

افادات :-زندگی جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے،دراصل یہی وہ سرمایہ اور دولت ہے جس کو لے کر انسان دنیا کے اندر آتا ہے۔بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جسم اوراعضاء کی شکل میں جو نعمتیں اس کو عطا کی جاتی ہیں ان سے دنیا میں رہ کرفائدہ اُٹھانے کے لئے ایک وقتِ مقررہ دیا گیا ہے جس کو ہم زندگی اور عمر سے

تعبیر کرتے ہیں، یہی ایک سرمایہ ہے جس کو لے کر انسان دنیا کے اندر آتا ہے۔ اور حضراتِ علماء نے لکھا ہے کہ یہ ایک ایسا سرمایہ ہے جو سیال ہے یعنی آدمی اگر اس کو اپنے کام میں لاوے اور اس کو ایسے اعمال میں استعمال کرے جو اس کے لئے کارآمد ہوں، تب بھی عمر ختم ہورہی ہے، اور اگر اس میں کوئی کام نہ کرے، بلکہ ویسے ہی بیٹھا رہے تب بھی اس کی عمر ختم ہو جائے گی، زندگی کے ایام گزرہی رہے ہیں ، آدمی کی سعادت کی بات ہے کہ وہ زندگی کے ان ایام کو ایسے کاموں میں خرچ کرے جو اس کے لئے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے سرخروئی کا باعث ہوں، اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی جس مقصد کے لئے دی ہے اسی مقصد میں اس کو استعمال کرے۔

جامد سرمایہ

اس کو اس طرح سمجھ لیں کہ دنیا کے اندر دو قسم کے سرمایے اور دولتیں ہیں۔ ایک دولت تو وہ ہے جو آدمی کے اختیار میں ہے، آدمی جب چاہے اس دولت کو استعمال کرے اور جب چاہے اس کو محفوظ رکھے، جیسے زیور ہے کہ جب اس کی مرضی ہوگی اس کو اپنے کام میں لاسکتا ہے، یا مثلاً آپ کے پاس پچاس ہزار روپے ہیں، یا سونا چاندی ہے، تو یہ ایک ایسا سرمایہ اور دولت ہے جس کو آپ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں استعمال کر سکتے ہیں؛ اس کو "جامد سرمایہ" کہتے ہیں۔ اگر آپ ابھی خرچ کرنا نہ چاہیں تو تجوری میں بند کر دیں ، یا کسی کے پاس امانت کے طور پر رکھ دیں، پھر سال دو سال کے بعد آپ اس کو

استعمال کرلیں ، کوئی بات نہیں، آپ جب چاہیں اپنی مرضی کے مطابق اس کو استعمال کریں ،وہ پچاس ہزارروپے یا سوناچاندی کی شکل میں جودولت ہے وہ محفوظ ہے،اگر ابھی ضرورت نہیں ہے تو محفوظ رکھیں۔یہ جامد سرمایہ کہلاتا ہے۔

سیال سرمایہ

اوردوسرا''سرمایہ سیال'' ہوتاہے یعنی ایساسرمایہ کہ اسی وقت آدمی اس سے فائدہ اُٹھالے تب تووہ اُس کے لئے کار آمدہے،اور اگراس وقت فائدہ نہیں اُٹھایا تو وہ سرمایہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا،مثلاً آپ کے پاس ایک زمین تھی،اس پر آپ نے دوکان یامکان تعمیرکیا تاکہ اس کو کرایہ پر دے کراس سے آمدنی حاصل کریں ، اوراس کے لئے آپ نے پیسے خرچ کئے۔تو وہ زمین جس پر مکان بنا ہواہے وہ تو ایک جامد سرمایہ ہے یعنی ایسا سرمایہ ہے کہ جوآپ کے قبضے میں ہے ، آپ کے پاس محفوظ ہے،اور کوئی اس کوآپ کے پاس سے چرا نہیں سکتا، لیکن، ایک مقصد (یعنی کرایہ پر دینے) کے لئے آپ نے اس جگہ ایک عمارت بنائی ہے کہ کرایہ داراس سے فائدہ اُٹھاکراس کے بدلہ میں آپ کو معاوضہ کے طورپرکرایہ ادا کرے۔تومکان رہائش کے لئے ہے، اور دوکان تجارت کے لئے ہے۔اب آپ کرایہ پردیں گے توکرایہ داراس مکان میں رہائش اختیارکرکے جو فائدہ اُٹھاسکتاہے یہ بھی ایک طرح کاسرمایہ اور دولت ہے،آپ اس دولت کو کرایہ دار کے ہاتھوں فروخت کررہے ہیں۔لیکن آپ نے مکان تیار ہونے کے بعد جب اس قابل

ہوگیا کہ اس میں رہائش اختیار کی جائے،اور جن لوگوں کو ضرورت ہے وہ مطالبہ بھی کررہے ہیں کہ آپ کا مکان تیار ہوگیا ہے، ہمیں کرایہ پر دیدیجئے،لیکن آپ کہہ دیں کہ نہیں! ابھی نہیں دینا ہے ،اور تالا بند کرکے رکھیں ،تواگرچہ مکان ایسا سرمایہ ہے کہ اپنی جگہ پر محفوظ ہے لیکن جس روز سے بنایا تھا اس روز سے لے کر دو سال پورے ہونے تک آپ نے اس کو تالے میں بند رکھا،اگر آپ خود اس میں رہائش اختیار کرتے یا اس کو کرایہ پر دیدیتے،تو اس سے جو فائدہ اُٹھایا جاسکتا تھا،اس فائدہ کو آپ کرایہ دار کے ہاتھوں فروخت نہیں کر رہے ہیں ، توجوں جوں وقت نکل رہا ہے اس کا وہ فائدہ ضائع ہورہا ہے۔تو معلوم ہوا کہ اُس مکان میں رہائش اختیار کرکے جو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے یہ بھی ایک طرح کا سرمایہ ہے، آپ کے پاس وہ دولت ایسی ہے جو سیال ہے، آپ ہاتھ در ہاتھ اسی وقت اس سے فائدہ اُٹھائیں تو آپ اس سے کوئی قیمت حاصل کرسکتے ہیں، آپ خود فائدہ اُٹھائیں یا کسی کرایہ دار کو کرایہ پر دے کراس سے رقم حاصل کریں ،یہ بھی ایک طرح کی دولت ہے۔مکان تو آپ کی پروپرٹی ہے جو ایک الگ دولت ہے،لیکن اس سے فائدہ اُٹھانا ایک الگ سرمایہ ہے۔

جیسے آپ اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بعض بڑے بڑے سرمائے ضائع ہورہے ہیں۔فلاں جگہ گیس ہے،لیکن وہ ہوامیں تحلیل ہورہی ہے، اور حکومت اس کو ضائع کر رہی ہے۔یہ ایسا سیال سرمایہ ہے کہ اس کو حاصل کرکے اِسی وقت فائدہ اُٹھایا

جاسکتا ہے۔ندیوں میں پانی بہہ رہا ہے اس سے بجلی حاصل کی جاسکتی ہے،اگر وہاں کوئی پلانٹ لگاکر اس سے بجلی حاصل نہیں کی گئی تو لوگ کہتے ہیں کہ جو قدرتی سرمایہ اللہ تعالیٰ نے ملک کو دے رکھا ہے اس سے حکومت فائدہ نہیں اُٹھاتی ، اسے ضائع کررہی ہے۔

عمر مثل برف

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں عمر کے جو ایام دے رکھے ہیں اورزندگی عطا کی ہے؛یہ بھی ایک سیال سرمایہ ہے۔مثلاً اس وقت ۸-۳۰ بجے ہیں ،اب ایسا تو ہے نہیں کہ آپ ۸-۳۰ سے ۹-۰۰ بجے تک کا آدھا گھنٹہ تجوری میں بند کرکے رکھ دیں کہ ابھی ہم اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے ،لیکن کل ہمیں اس وقت کی ضرورت پڑے گی تو ہم اِس آدھ گھنٹہ سے فائدہ اُٹھالیں گے۔ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ زندگی کا جو وقت گزر رہا ہے، یہ سیال سرمایہ ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے اور اس کو کارآمد بنانے کی ایک ہی شکل ہے کہ اس کو جامد شکل دیدی جائے، یعنی ابھی ہم اس کو کسی کام میں لگالیں اوراس سے فائدہ اُٹھاکر محفوظ کرلیں۔

اسی لئے بزرگوں نے عمر کو برف کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔برف کے بیوپاری کے پاس اس کی پونجی برف کی شکل میں ہوتی ہے،یہی اس کا رأس المال ہے جو لمحہ بہ لمحہ پگھل رہا ہے۔ویسے آپ برف کو تو فریج میں رکھ کر یا اور طریقوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں لیکن فرض کرلیجئے کہ کسی کے پاس فریج بھی نہیں ہے اوروہ برف بیچ رہا ہے،تو اس کے لئے

ضروری ہے کہ جلدی سے جلدی اس کو بیچ کر پیسوں کی شکل میں تبدیل کرلے، تب ہی اس کا سرمایہ محفوظ ہوگا۔ اس میں جتنی دیر ہوتی جائے گی، اتنی ہی برف پگھلتی چلی جائے گی۔ اسی طرح زندگی کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ جو نعمت عطا فرمائی ہے یہ بھی ایک سیال سرمایہ ہے۔ خواجہ عزیز الحسن مجذوب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں :ــــ

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بہ دم

یعنی دھیرے دھیرے یہ عمر برف کی طرح گھٹتی جارہی ہے، اب عمر کے ان ایام کو ہم اگر کسی چیز سے بدل کر اپنے لئے کارآمد بنالیں، تو یہ کام کی چیز ہے۔

وقت کی قیمت

میں نے پہلے بھی کسی وقت مثال دی تھی کہ دیکھو! جو وقت گذر رہا ہے اس سے ہم کیا قیمت وصول کرسکتے ہیں؟ اس سے دنیوی اعتبار سے بھی قیمت حاصل کرسکتے ہیں اور اُخروی اعتبار سے بھی قیمت حاصل کرسکتے ہیں۔ دنیوی اعتبار سے مثلاً آپ نے اپنا وقت کسی کے ہاتھ ملازمت کے طور پر بیچ دیا کہ میں آپ کے یہاں آٹھ گھنٹے نوکری کروں گا، اس کے ساتھ وقت طے ہوا، اب اس ملازمت پر آپ کو جو تنخواہ ملے گی، گویا آپ نے اپنی زندگی کے اس وقت سے پیسوں کی شکل میں فائدہ اُٹھا کر ان پیسوں کو محفوظ کرلیا۔

اور دوسری شکل اُخروی اعتبار سے ہے کہ آپ زندگی کے ان ایام کو ان کاموں میں خرچ کریں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں، اس کو راضی کرنے میں، نیکی کے کاموں میں۔ پھر اس میں بھی مختلف درجات ہیں، کسی کام میں ثواب کم ملتا ہے اور کسی میں زیادہ ملتا ہے۔ فرض کر لیجئے آپ کونے میں بیٹھ کر تسبیح پڑھتے ہیں تو اس تسبیح پر آپ کو اجر و ثواب ملے گا۔ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں تو ایک حرف کے اوپر آپ کو دس نیکیاں ملیں گی۔ اگر آدھ گھنٹے تک یہ کام کریں گے تو اس تیس منٹ میں آپ بے شمار نیکیاں حاصل کر سکتے ہیں۔

سلیمانی سلطنت سے بہتر

ایک سبحان اللہ کتنا قیمتی ہے؟ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے فضائل ذکر میں واقعہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) ایک مرتبہ اپنے تخت پر ہوا میں اُڑتے ہوئے تشریف لے جا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو حضرت سلیمان (علیہ السلام) کے لئے مسخر کر دیا تھا، آپ جہاں چاہتے تھے ہوا آپ کو لے جاتی تھی۔ گھوڑوں کے اوپر ایک مہینہ میں جو مسافت طے کی جا سکتی تھی، ہوا وہ مسافت آپ کو صبح یا شام کے تھوڑے سے وقت میں طے کرا دیا کرتی تھی، اللہ تبارک و تعالیٰ نے بطورِ معجزہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) کو یہ چیز عطا فرمائی تھی۔ تو ایک مرتبہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) ہوا پر اپنے پورے دربار کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک بندۂ مؤمن نے ان کو دیکھا۔ آدمی کا مزاج ایسا ہے کہ جب ایسی چیز کسی کے پاس دیکھتا ہے تو اس کے دل میں

خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی عمدہ نعمت عطا فرمائی ہے! اس مؤمن کے دل میں بھی ایسا ہی خیال آیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضرت سلیمان (علیہ السلام) پر اس چیز کو منکشف کیا، آپ نے ہوا کو حکم دیا کہ مجھے نیچے اُتار دو، پھر اس سے کہا کہ ایک بندۂ مؤمن کا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنا؛ سلیمان بن داؤد کی پوری سلطنت سے بہتر ہے۔ (تفسیر قرطبی، ۱۵/۱۳۴)

ایک منٹ کی قیمت

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) معراج پر تشریف لے گئے تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے ملاقات ہوئی، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فرمایا کہ اپنی امت کو میرا سلام کہو (علی ابراہیم وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام) اور ان سے یوں کہو کہ جنت تو چٹیل میدان ہے، اس کے درخت سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر ہیں۔ آدمی جتنی تسبیح پڑھے گا، اتنے ہی درخت جنت میں لگ جائیں گے۔ گویا ہمیں یہ بتایا گیا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنے پر جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ (ترمذی شریف، ۳۴۶۲)

ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سورج گرہن کی نماز پڑھا رہے تھے، دورانِ نماز حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھے، پھر پیچھے ہٹے۔ نماز کے بعد صحابہ نے پوچھا کہ آج آپ نے نماز کے دوران ایسی چیزیں کیں جو ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: نماز کے دوران اللہ تعالیٰ نے میرے سامنے جنت و جہنم کو منکشف کیا، میں جو آگے بڑھا تھا وہ اس لئے کہ میں نے یہ چاہا کہ انگور کا ایک خوشہ توڑ لوں، اگر میں توڑ لیتا تو تم لوگ قیامت تک اس کو کھاتے رہتے

اور کبھی بھی وہ ختم نہ ہوتا(بخاری شریف، ۷۴۸)اس لئے کہ جنت کی نعمت کی خاصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے،اس کو فنا نہیں ہے۔تو اس کو دنیا کھاتی رہتی،وہ خوشہ جوں کا توں اپنی جگہ پر باقی رہتا۔جب جنت کے ایک خوشہ کا یہ حال ہے کہ سب لوگ قیامت تک کھاتے رہیں تب بھی ختم نہ ہو؛تو پھر ایک پورے درخت کا کیا حال ہوگا، اور یہ ایک درخت ایک مرتبہ سبحان اللہ پڑھنے سے حاصل ہوتا ہے۔اب آپ اپنی گھڑی اُٹھا کر دیکھو کہ ایک منٹ میں کتنی مرتبہ سبحان اللہ پڑھ سکتے ہو؟آسانی سے پچاس،ساٹھ مرتبہ تو ہو ہی جائے گا۔گویا ایک منٹ میں ساٹھ مرتبہ سبحان اللہ کہیں گے تو جنت کے ساٹھ درخت مل جائیں گے،تو زندگی کے ان اوقات سے آدمی کتنی بڑی دولت حاصل کر سکتا ہے!۔

ہماری اصل پونجی

دراصل اس سرمایہ کو ہم ضائع کر رہے ہیں یعنی اگر آدمی کچھ نہ کرے،ایک گناہ بھی نہ کرے،صرف بیٹھا رہے،تب بھی وہ وقت ضائع اور برباد تو ہوا کہ اس نے اس وقت کو کسی بھی کام میں نہیں لگایا۔کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زندگی بڑی قیمتی ہے اور یہی ہماری اصل پونجی اور سرمایہ ہے جس کو لے کر ہمیں دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اسی لئے نبیٔ کریم(ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی دو نعمتیں ایسی ہیں جن سے فائدہ اُٹھانے کے معاملہ میں لوگ بڑے نقصان اور گھاٹے میں ہیں۔ایک تندرستی اور دوسری فرصت(بخاری شریف،۶۴۱۲)یعنی

ان دونعمتوں سے جس قسم کا فائدہ اُٹھانا چاہیے، اتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا، اس کو ضائع کیا جاتا ہے، لوگ اس سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں کھوٹ میں رہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہ) اور وقت کی قدر

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہ) کہیں تشریف لے جا رہے تھے، ایک قبر پر نظر پڑی تو اپنی سواری سے اُترے، دو رکعت نماز ادا فرمائی۔ لوگ سمجھے کہ شاید صاحبِ قبر کے ساتھ کوئی تعلق اور رشتہ ہو گا، اس وجہ سے آپ نے نماز پڑھی ہو گی۔ انہوں نے کہا کہ نہیں! میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ جب آدمی قبر میں پہنچ جائے گا تو یہ تمنا کرے گا کہ کاش! مجھے دو رکعت نماز پڑھنے کا وقت مل جاتا، لیکن اس کو موقع نہیں ملے گا۔ اس لئے جب میں نے اس قبر کو دیکھا تو مجھے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد یاد آگیا تو میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی مجھے موقع دیا ہے، تو اس سے فائدہ اُٹھالوں (کتاب الزھد لابن مبارک)

اس لئے آدمی کو سوچنا چاہیے کہ زندگی کے لمحات بہت قیمتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا سوال ہو گا، ہمیں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور زندگی کے متعلق جواب دینا ہے۔ اگر ہمارے کسی بڑے نے ہمیں کوئی دولت اور سرمایہ دیا ہو اور استعمال کی اجازت دی ہو، لیکن یہ بھی کہہ دیا ہو کہ اس کا حساب لوں گا، تو جب بھی ہم اُس کو

استعمال کریں گے اور جہاں کہیں خرچ کریں گے، ہر وقت ہمارے ذہن میں یہ چیز مستحضر رہے گی کہ مجھے جواب دینا ہے، اگر میں نے غلط جگہ خرچ کر دیا تو کیا جواب دوں گا۔

دوسرا سوال

دوسرا سوال یہ ہوگا کہ جو مسائل اور دین کے احکام تمہارے علم میں آئے ان پر تم نے کیا عمل کیا۔ یہ ہر ایک آدمی کے لئے ہے، جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے جس قدر بھی علم عطا فرمایا ہے، اس علم کے مطابق اس نے کتنا عمل کیا، قیامت کے روز اس کے متعلق پوچھا جائے گا، اس میں اگر کوتاہی ہوئی تو سزا ہوگی۔

ایسی چالاکی ہلاکت ہے

مال کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ آج کل لوگ مال کے معاملہ میں کوئی احتیاط نہیں برتتے۔ آدمی سوچتا ہے کہ میں کسی بھی طرح مال حاصل کرلوں۔ کوئی آدمی لوگوں کو دھوکہ دے کر، جھوٹ بول کر، غلط طریقوں سے اگر مال حاصل کرلیتا ہے تو سماج میں لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا ہوشیار اور چالاک آدمی ہے، حالاں کہ یہ چالاکی اللہ تعالیٰ کے یہاں ہلاکت کا ذریعہ ہے۔ آدمی کو پہلے نمبر پر یہ سوچنا ہے کہ جو مال بھی میں حاصل کروں وہ غلط طریقہ سے نہ ہو، اللہ تبارک و تعالیٰ کو ناراض کرکے نہ

ہو، اور شریعت نے جن طریقوں سے مال حاصل کرنے کی اجازت دی ہے انہیں کے مطابق حاصل کیا جائے۔

مسائل معلوم کریں

اگر آپ تجارت کرتے ہیں تو اس علم کو سیکھ لیجئے کہ میں اس طریقہ سے کام کرتا ہوں، یہ درست ہے یا نہیں؟ جو بھی کاروبار آپ کا ہو اس کا علم سیکھ لو۔ آج کل ہر آدمی دنیوی سرکاری قوانین کے متعلق بڑا چوکنا رہتا ہے کہ کوئی بات ایسی ویسی نہ ہو جائے، موقعہ بہ موقعہ وکلاء اور قانون کے ماہرین سے مدد لی جاتی ہے اور جس لائن کا مسئلہ ہو اس فن کے ماہر کے پاس برابر حاضری بھی دی جاتی ہے۔ غرض یہ کہ آپ نے اپنے لئے ہر ایک کی خدمات لے رکھی ہیں، اور وہ آپ کا اس سلسلہ میں پرسنل گائڈنس ہے، انکم ٹیکس وکیل سے آپ مشورہ لیں یا نہ لیں، سال کی فیس جو اس کو دینا ہے، وہ تو دینا ہی ہے۔ اسی طرح سیل ٹیکس وکیل اور پولیوشن آفیسر وغیرہ وغیرہ۔ بس! مسائل بتانے والا بیچارہ مولوی ہی مفت میں بیٹھا ہے جو آپ سے کوئی فیس نہیں لیتا، لیکن پھر بھی اس سے پوچھنے اور مسائل معلوم کر کے اس پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ دنیا کی حکومت کے ڈر سے اور اس کے قانون کی گرفت سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں اور پیسے بھی خرچ کرتے ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کل کو اگر گرفت ہو گئی تو کون بچانے آئے گا۔ اس لیے یہ بہت اہم بات ہے کہ مال کہاں سے کمایا۔

اگر یہ لقمہ میری جان کے ساتھ نکلتا

مشکوۃ شریف میں روایت ہے، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: لوگوں پر ایک زمانہ آنے والا ہے کہ آدمی اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا کہ مال کہاں سے آرہا ہے، حلال طریقہ سے یا حرام طریقہ سے (مشکوٰۃ، ۲۴۱) حالاں کہ حرام بڑا خطرناک ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: ہر وہ گوشت جو حرام مال سے پل کر تیار ہوا (یعنی حرام غذا استعمال کی اور اس سے جسم کا گوشت بنا) تو جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے، یعنی وہ گوشت جہنم میں جائے گا (ترمذی، ۶۱۴) یہ حدیث تو ہم بھی سنتے ہیں۔ اور یہی حدیث حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے بھی سنی تھی آپ نے حکایاتِ صحابہ میں یہ قصہ پڑھا اور سنا ہوگا۔ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا ایک غلام تھا جس کو خراج پر اُٹھا رکھا تھا یعنی اس کو اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اپنے طور پر کمائے اور کچھ حصہ اس میں سے آپ کو بھی دیدیا کرے۔ چنانچہ وہ اپنی کمائی کا ایک حصہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ کھانا لایا، حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو کئی وقت کا فاقہ تھا، وہ کھانا جب آپ کے سامنے لاکر رکھا تو آپ نے ایک لقمہ اُٹھا کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور وہ حلق سے نیچے اتر گیا اس غلام نے عرض کیا: حضرت! آپ تو ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں سے لایا ہے، آج نہیں پوچھا، کیا آپ بھول گئے؟ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ اب بتادے کہ کہاں سے لایا ہے۔ اس نے کہا کہ اسلام لانے سے پہلے میں نے کچھ لوگوں کی کہانت کی تھی۔ ”کہانت“ یعنی غیب کی خبریں دینا،

جو تشی یہی کرتے ہیں ،اُس زمانہ میں اس کا بڑارواج تھا۔تواس نے کہا کہ میں نے کہانت کی تھی اوروہ بھی مجھے برابر آتی نہیں تھی،اوراس وقت ان کے پاس اس کا معاوضہ دینے کے لئے کچھ نہیں تھا،توانھوں نے کہاتھاکہ پھرکسی موقع پرہم دیں گے۔آج میرا وہاں سے گزر ہوا،توکوئی تقریب چل رہی تھی اور کھاناپکاتھا،تو اس کہانت کے بدلہ میں انہوں نے مجھے یہ کھانادیا۔چونکہ یہ کہانت کامعاوضہ تھاجوظاہرہے کہ حرام کمائی تھی اس لئے حضرت ابوبکرصدیق(رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ توتومجھے ہلاک ہی کر ڈالتا۔پھرحلق میں انگلیاں ڈالیں اور جو ایک لقمہ حلق میں گیاتھااس کوانگلی ڈال ڈال کرنکالنے کی کوشش کی۔لیکن ایک دو وقت کے فاقہ کے بعدایک لقمہ اندرگیاتھا،وہ اس طرح انگلی ڈالنے سے کہاں نکلنے والا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ پانی پی لیجئے اورپھرقے کیجئے،ہوسکتاہے کہ پانی کے ساتھ نکل آئے۔ چنانچہ ایک بڑے پیالہ میں پانی منگوایا،اورخوب پانی پیااورپھرانگلی ڈال کرقے کی، اس کے نتیجے میں بڑی مشکل سے وہ لقمہ -جو اندر چلا گیا تھا- باہرآیا۔کسی نے کہا: حضرت!ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لئے اپنے آپ کو ہلاک کردیں گے۔حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ اگر یہ لقمہ میری جان کے ساتھ نکلتاتب بھی نکال کررہتا۔اس لئے کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سناہے کہ جوگوشت حرام غذا سے تیار ہو،جہنم اس کی زیادہ حقدار ہے۔تومجھے یہ ڈر ہواکہ اس لقمہ سےمیرے جسم کاکوئی حصہ تیار نہ ہوجائے، اور ایسا نہ ہوکہ میں جہنم میں چلا جاؤں۔

ہم لوگ بھی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کو سنتے ہیں لیکن ہم اس سے کیا اثر لیتے ہیں؟ اس پر ہمارا کتنا عمل ہے؟ اور ہم اپنی زندگی کے مختلف مواقع پر جہاں ایسی نوبت آتی ہے، اس سے کتنا فائدہ اُٹھاتے ہیں؟ حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے سنا تھا تو وہ اس کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

خرچ کرنے میں کُل مختار نہیں

اور صرف کمائی کا ہی سوال نہیں ہوگا کہ حلال طریقہ سے کمایا یا نہیں؟ بلکہ آپ نے جہاں خرچ کیا وہ جگہ غلط ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں اس کا بھی سوال ہوگا۔ آدمی سمجھتا ہے کہ میں نے کمایا تو یہ میری کمائی ہے، اب میں جس طرح چاہوں خرچ کروں۔ ایسا نہیں ہے، ہم خرچ کرنے میں بھی اپنی مرضی پر چھوڑے نہیں گئے ہیں، ہم اس میں کُل مختار نہیں ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کی جگہیں بھی بتلائی ہیں اپنی ذات پر بھی اپنی ضرورت سے زائد خرچ کرنا فضول خرچی کہلاتا ہے اور اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا قصہ

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی کو حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے پاس کسی غرض کے لئے بھیجا، جب وہ ان کے مکان کے دروازے کے قریب پہنچے تو حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی آواز آئی، جب اور قریب ہوئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) اپنی اہلیہ کو ڈانٹ رہے

تھے۔اور اہلیہ بھی کون تھیں؟نبیٔ کریم (ﷺ) کی صاحبزادی۔اوراُن کو صرف اس بات پر ڈانٹ رہے ہیں کہ چراغ کی بتی اتنی اونچی کیوں رکھی ہے، تیل زیادہ جلتاہے۔جب اس آدمی نے یہ سنا توسوچاکہ چراغ کی بتی ذرا اونچی رکھنے پر اپنی بیوی کو ڈانٹ رہے ہیں تو بھلامجھے کیا دیں گے،یہ سوچ کر وہ واپس ہوگیا کہ آدمی اپنی بیوی کے معاملہ میں بڑا سخی رہتاہے، خاص کرجب کہ اس کے ساتھ محبت ہوتووہ جوچاہے خرچ کرائے،اور یہاں تو گھر کی ضرورت کے اندرچراغ جلایاتھا،اس میں بتی ذراتیز ہوگئی تواس پراتنا خفا ہورہے ہیں۔ دوسرے دن وہ صحابی جب حضور(ﷺ)کے خدمت میں پہنچےتوحضورنے پوچھاکہ:بھائی کیاہوا؟انہوں نے کہاکہ: میں نے ان سے نہیں کہا۔پوچھا:کیوں؟توانہوں نے کہاکہ وہاں ایساایساسناتومیں واپس آگیا۔حضورِاکرم(ﷺ)نے دوبارہ بھیجا۔جب جاکر اپنی حاجت رکھی تو حضرت عثمان(رضی اللہ عنہ) نے ان کو خوب دیا۔انہوں نےاپنے دل کی بات کہی کہ میں تو رات بھی آیاتھالیکن آپ اپنی اہلیہ کو ڈانٹ رہے تھے اس لئے میں یہ سوچ کرواپس چلاگیا، تو حضرت عثمان(رضی اللہ عنہ) نے جواب میں فرمایاکہ ہم تونبیٔ کریم(ﷺ)کی منشاکودیکھتے ہیں، آپ(ﷺ)جہاں خرچ کرنے کے لئے کہیں گے وہاں ہزاروں لاکھوں خرچ کردیں گے،اورجہاں خرچ کرنے سے منع کریں گے وہاں ایک پائی بھی خرچ کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔

ایک مؤمن کا مزاج بھی یہی ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کے لئے فرمایا اور ترغیب دی، وہاں خوب خرچ کرے۔ یا جتنی اجازت دی ہے اتنا ہی خرچ کرے، اس سے زیادہ نہیں۔ اور جہاں خرچ کرنے سے منع کیا ہے وہاں تو خرچ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی جگہ خرچ کرنا تو بڑی نافرمانی کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اللہ تعالیٰ کی ہی نافرمانیوں میں استعمال ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا تو اسی پیسے سے اللہ کی نافرمانی کے لئے قوت حاصل کرے، یہ تو بڑی بے مروتی اور بڑی نالائقی کی بات سمجھی جائے گی۔

اور جسم کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ اس کو کہاں استعمال کیا۔ جسم میں سارے اعضاء آگئے: آنکھ، زبان، کان، ہاتھ، پاؤں اور جسم میں جو کچھ بھی ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جس طرح استعمال کرنے کا حکم دیا ہے اگر اس کے خلاف استعمال کیا تو پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔

زمین کی خبریں کیا ہیں؟

حدیث ۴۰۸

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَرَأَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا (الزلزلة:۴) ثُمَّ قَالَ: أَتَدْرُوْنَ مَا أَخْبَارُهَا؟ قَالُوْا: أَللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. قَالَ: فَإِنَّ أَخْبَارَهَا أَنْ تَشْهَدَ عَلَى كُلِّ عَبْدٍ أَوْ أَمَةٍ بِمَا عَمِلَ عَلَى ظَهْرِهَا، تَقُوْلُ: عَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا فِيْ يَوْمِ كَذَا وَكَذَا فَهٰذِهِ أَخْبَارُهَا. (رواہ الترمذی، وقال حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سورۂ زلزال کی یہ آیت تلاوت فرمائی ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا﴾ جس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی، اپنے اندر رکھے ہوئے سماچار (સમાચાર) دے گی۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: تمہیں معلوم ہے کہ زمین کی خبریں کیا ہیں ؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اس کی خبریں یہ ہیں کہ اس کی پیٹھ پر جو کچھ بھی کیا گیا اس کی ہر مرد اور عورت کے متعلق قیامت کے روز گواہی دے گی کہ فلاں دن فلاں وقت یہ عمل کیا تھا۔

افادات:- اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز کئی قسم کے گواہ لائیں گے، ایک تو خود اعمال نامہ ہوگا۔ دوسرے وہ فرشتے جو آدمی کے ساتھ مقرر ہیں اور وہ سب لکھتے رہتے ہیں۔ تیسرے انسان کے اعضاء گواہی دیں گے۔ اور چوتھے زمین گواہی دے گی جہاں اس نے اعمال کئے تھے۔

مَیں کیسے راحت پاسکتا ہوں ؟

حدیث ۴۰۹

وعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدرِی (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): كَيْفَ أَنْعَمُ! وَصَاحِبُ الْقَرْنِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ وَاسْتَمَعَ الْإِذْنَ مَتیٰ يُؤْمَرُ بِالنَّفْخِ فَيَنْفُخُ فَكَأَنَّ ذٰلِكَ ثَقُلَ عَلٰی أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ لَهُمْ: قُوْلُوْا: حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (رَوَاهُ التِّرْمِذِیُّ، وَقَالَ حَدِيْثٌ حَسَنٌ)

(اَلْقَرْنُ) هُوَ الصُّوْرُ الَّذِیْ قَالَ اللهُ تَعَالیٰ: (وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ) كَذَا فَسَّرَهُ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا میں کیسے خوش ہو سکتا اور راحت و آرام پا سکتا ہوں جبکہ صور پھونکنے والا فرشتہ صور (جو سینگ کی شکل کا ہے) اپنے منہ میں لئے ہوئے اور کان اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کئے ہوئے منتظر ہے کہ کب اس کو پھونکنے کا حکم دیا جاتا ہے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اس چیز کو سن کر ڈر گئے۔ اس پر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کہو "حَسْبُنَا اللہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ" اللہ تعالیٰ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے (مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہوئے یہ کلمہ بھی پڑھتے رہو، اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھو، تو اللہ تعالیٰ خیر کا معاملہ کرے گا)

افادات:- حضرت اسرافیل (علیہ السلام) جن کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے صور پھونکنے کی ڈیوٹی حوالہ کی گئی ہے، وہ روزِ اول سے اپنے منہ میں صور لئے ہوئے کھڑے ہیں اور ہر لمحہ اس انتظار میں ہیں کہ کب اللہ تعالیٰ کا حکم ہو اور میں صور پھونکوں اور قیامت قائم ہو۔ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جب یہ کیفیت ہے تو آدمی کیسے آرام پا سکتا ہے۔ بھائی! کوئی آدمی اپنے گھر میں کھانا لے کر بیٹھا ہو، اور اس کو اندیشہ ہو کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے زلزلہ آیا تھا اور معلوم نہیں کہ زمین دوبارہ کب حرکت میں آجائے گی؛ تو وہ اطمینان سے کھانا کھا سکتا ہے؟ جب کسی خطرہ کے واقع ہونے کے امکانات ہوں جیسے مکان کی چھت بالکل کمزور گرنے کے قریب ہے، تو اس میں رہنے والا کیا اپنے آپ کو راحت میں محسوس کر سکتا ہے؟ نہیں! بلکہ وہ تو ہر وقت پریشان رہے گا۔ تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں

کہ میں کیسے راحت میں اپنے آپ کو رکھ سکتاہوں جبکہ اسرافیل صور لئے ہوئے کھڑے ہیں اس انتظار میں کہ کب حکم ہو اور میں پھونک ماروں۔

وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا

حدیث ۴۱۰

وعن أبي هريرة(رضي الله عنه)قَالَ : قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلى الله عليه وسلم):مَنْ خَافَ أَدْلَجَ, وَمَنْ أَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ,أَلا أَنَّ سِلْعَةَ اللهِ غَالِيَةٌ,أَلا أَنَّ سِلْعَةَ اللهِ الْجَنَّةُ۔

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ)فرماتےہیں کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا:جو آدمی ڈرتا ہے،وہ اندھیرے میں نکل جاتاہے۔اور جو اندھیرے میں نکل جائے گا وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔اوردیکھو! اللہ کاسامان بڑا قیمتی ہے،اور اللہ تعالیٰ کا سامان جنت ہے۔

افادات:-اُس زمانہ میں عام طورپر ایسا ہوتاتھا کہ جب کسی قبیلےوالوں کو پتہ چل جاتا کہ صبح میں ہمارے قبیلہ پر دشمن کی طرف سے یلغار ہونے والی ہے، تووہ لوگ اندھیرے ہی میں حفاظت کے طورپراپنی جگہ چھوڑکرنکل جاتے تھے۔یہاں اندھیرے میں نکل جانے سے مرادیہ ہے کہ جوآخرت کاخوف رکھتا ہے،وہ رات کو اُٹھ کر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وعبادت میں مشغول ہوگا ،اور جو اس میں مشغول ہوگا وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔

پھر حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا سرمایہ بڑا قیمتی ہے یعنی جنت۔ گویا اللہ تعالیٰ نے جنت کو ہمارے سامنے بکاؤ مال بنا کر رکھا ہے کہ جنت کو خریدو۔ اور جنت کی قیمت اللہ تعالیٰ نے ہماری جان اور مال کو رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے ان کی جان اور مال کو جنت کے بدلہ میں خرید لیا ہے، گویا جنت سودے کی چیز ہے۔ جو سامان آدمی فروخت کرنے کے لئے نکالتا ہے؛ اس کو "سِلْعَةٌ" کہتے ہیں۔ حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا سامان بڑا قیمتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کا سامان جنت ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے مشقت و محنت اُٹھانی چاہیے۔

معاملہ اتنا سخت ہوگا...

حدیث ۴۱۱

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) يَقُوْلُ: يُحْشَرُ النَّاسُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حُفَاةً عُرَاةً غُرْلاً. قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! الرِّجَالُ وَالنِّسَاءُ جَمِيْعًا يَنْظُرُ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ؟ قَالَ: يَا عَائِشَةُ! الْأَمْرُ أَشَدُّ مِنْ أَنْ يُهِمَّهُمْ ذٰلِكَ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَلْأَمْرُ أَهَمُّ من أَنْ يَنْظُرَ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْض. (متفق عَلَيْهِ)

(غُرْلاً) بِضَمِّ الْغَيْنِ الْمُعْجَمَةِ أَيْ: غَيْرَ مَخْتُوْنِيْنَ.

ترجمہ:-حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ لوگ قیامت کے دن اس حال میں اُٹھائے جائیں گے کہ وہ ننگے پیر، ننگے بدن، بغیر ختنہ کئے ہوئے ہوں گے۔میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! مرد اور عورتیں سب اس حال میں ہوں گے تو وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے نہیں ؟(یعنی شرم نہیں آئے گی؟) تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اے عائشہ! اس وقت معاملہ اتنا سخت اور اہم ہو گا کہ وہ ایسی باتیں سوچ ہی نہیں سکیں گے کہ ایک دوسرے کی طرف نظر اٹھائیں۔

بَابُ الرَّجَآءِ مجلس ۱

اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان

مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَ نَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:-

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ. (الزمر:٥٣)

وقَالَ تعالى: وَهَلْ نُجَازِيْٓ إِلَّا الْكَفُوْرَ. (سبأ:١٧)

وقَالَ تعالى: إِنَّا قَدْ أُوْحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى. (طه:٤٨)

وقَالَ تعالى: وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ. (الاعراف:١٥٦)

امید اور خوف

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نیا عنوان قائم کیا ہے "باب الرجآء" امید کا بیان۔ دو چیزیں ہیں؛ ایک امید، اور دوسری خوف اور ڈر۔ آدمی کا ایمان مکمل ہونے کے لئے دونوں کی ضرورت

ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید بھی ہونی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے بھی رہنا چاہیے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے "اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ" ایمان امید اور خوف کے درمیان میں ہے۔ صرف امید ہی امید ہو، خوف اور ڈر نہ ہو؛ تب بھی آدمی مؤمن نہیں رہتا۔ اور خوف ہی خوف ہو، امید نہ ہو؛ تب بھی آدمی کا ایمان باقی نہیں رہتا ﴿اِنَّهٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف ۸۷) اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔ مؤمن کے ایمان کے لئے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔

دنیوی دستور بھی ہے

ویسے دنیا میں بھی دستور یہی ہے کہ آدمی کو کسی کام کے لئے ابھارنے والی یا کسی برائی سے روکنے والی دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں امید و خوف۔ کسی بھی چیز کے مطالبہ پر- چاہے وہ کسی کام کو کرنے کا ہو، یا کسی چیز سے بچنے کا ہو- فطری اور نفسیاتی طور پر آدمی کو ابھارنے کے لئے دو ہی چیزیں مؤثر ثابت ہوتی ہیں، ایک جلبِ منفعت، اور دوسری دفعِ مضرت۔ اس کو کوئی فائدہ حاصل ہونے کی توقع اور امید ہو، یا کسی نقصان کا ڈر ہو؛ تب ہی وہ حرکت میں آئے گا۔

شریعت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے گئے ہیں، انسان کو جن کا پابند و مکلف بنایا گیا ہے، ان میں بھی دو طرح کے احکام ہیں، کچھ چیزیں کرنے کی ہیں اور کچھ چیزیں بچنے کی ہیں، کچھ مامورات ہیں اور کچھ منہیات ہیں۔ جو کرنے کی چیزیں ہیں ان کے کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے امیدیں دلائی گئیں ہیں؛ اسی کو وعدہ کہتے ہیں۔ اور بچنے کی

چیزوں سے اگر کوئی آدمی نہیں بچتا تو اس کو ڈرایا گیا ہے؛ اسی کو وعید کہتے ہیں۔ اور ایمان کے کمال کے لئے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی امید و خوف

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا مقولہ ہے کہ اگر یہ اعلان ہو جائے کہ سوائے ایک آدمی کے سب کی مغفرت کر دی گئی؛ تو مجھے اپنے متعلق یہ ڈر ہو گا کہ شاید وہ ایک مَیں ہوں جس کی مغفرت نہیں کی گئی، گویا ان کو اتنا ڈر اور خوف ہے۔ اور اگر یہ اعلان ہو جائے کہ سوائے ایک آدمی کے سب کے لئے جہنم کا فیصلہ کیا گیا ہے، تو مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ ایک مَیں ہی ہوں۔ گویا امید بھی اتنی زیادہ ہے۔ (احیاء العلوم ۴/۱۷۳)

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی نصیحت

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے اپنے صاحبزادہ سے فرمایا کہ ڈر تو ایسا رکھو کہ ساری دنیا کے لوگوں کے برابر نیکی لے کر جاؤ، تب بھی یہ ڈر ہو کہ شاید وہ قبول نہ ہو۔ اور امید ایسی رکھو کہ سب کے برابر گناہ لے کر جاؤ، تب بھی یہ گمان ہو کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا ارشاد

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا مقولہ ہے کہ کوئی گناہ کا کام چھوٹا سمجھ کر کرو مت، اور کوئی نیکی کا کام چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت۔ ہو سکتا ہے کہ وہ نیکی کا کام جو آپ نے چھوٹا اور معمولی سمجھ رکھا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں وہی کام آپ کی مغفرت کا سبب اور ذریعہ بن جائے۔ اور جس گناہ کے کام کو معمولی سمجھ کر کیا ہے، ہو سکتا ہے وہی پکڑ کا ذریعہ بن جائے

دودھ والی رات یاد ہے؟

ایک بزرگ کا انتقال ہوا، کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ انہوں نے کہا کہ مجھے باری تعالیٰ کے حضور پیش کیا گیا اور یہ سوال کیا گیا کہ ہمارے پاس کیا لے کر آئے ہو؟ مَیں نے اپنے اعمال پر نظر دوڑائی اور سوچا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ ایسا کون سا عمل ہے جس کو باری تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کروں، ہر عمل کے متعلق مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ کوئی بھی عمل ایسا نہیں ہے جو باری تعالیٰ کے حضور پیش کرنے کے قابل ہو۔ پھر مَیں نے یہ سوچا کہ توحید البتہ ایک ایسا عمل ہے جو پیش کیا جا سکتا ہے۔ (توحید کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو بھی ایک مانا جائے، اور اس کی تمام صفات میں بھی اسی کو یکتا سمجھے۔ نفع و نقصان کا مالک بھی اللہ تعالیٰ ہی کو مانے کہ اس کے علاوہ کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور بہت ساری چیزیں اس میں آ جاتی ہیں۔) تو ان

بزرگ نے جواب دیا کہ توحید لے کر آیا ہوں۔ وہاں سے کہا گیا کہ وہ دودھ والی رات یاد ہے؟ ہوا یہ تھا کہ انہوں نے ایک رات دودھ پیا، اور پیٹ میں کچھ درد ہوا تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ دودھ پینے کی وجہ سے پیٹ میں درد ہوا ہے، حالانکہ وہ درد تو اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہوا تھا، لیکن ظاہری سبب کے طور پر آدمی ایسا بول دیتا ہے۔ اسی طرح ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا تھا، اس پر پکڑ ہوگئی۔ بظاہر یہ جملہ توحید کے خلاف ہے کہ پیٹ کے درد کی نسبت دودھ پینے کی طرف کی گئی، حالانکہ پیٹ کا درد دینے والی ذات بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ اب تو وہ بزرگ ڈر گئے کہ پکڑ ہوگئی، اب معلوم نہیں چھٹکارا کیسے ہوگا۔

پھر وہاں سے کہا گیا کہ جاؤ! بلی کے ایک بچہ کی وجہ سے ہم نے تم کو بخش دیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ٹھنڈی کی ایک رات کے اندر وہ اپنے گھر سے باہر نکلے، دیکھا کہ بلی کا ایک بچہ ٹھنڈی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا ہے، ان کو اس پر ترس آگیا، وہ اس کو اپنے گھر میں لے آئے اور انگیٹھی کے پاس بٹھایا، جب اس کو گرمی پہنچی تو اس کو ٹھنڈی کی وجہ سے جو تکلیف تھی وہ دور ہوگئی، پھر جب اس کے حواس بحال ہوئے تو وہ خود ہی چلا گیا۔ ان کا وہ عمل باری تعالیٰ کو پسند آگیا تو وہاں سے کہا گیا کہ اس عمل کی وجہ سے ہم نے تم کو بخش دیا۔ دیکھو! ان کے سارے عمل دھرے کے دھرے رہ گئے اور ایک چھوٹا سا عمل کارآمد بن گیا۔

کتے پر ترس کھانا کام آگیا

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک زانیہ فاحشہ عورت تھی ایک مرتبہ سفر میں کہیں جارہی تھی، دورانِ سفر جنگل میں پیاس کا احساس ہوا، دیکھا کہ بغیر منڈیر کا ایک کچا کنواں ہے، اور جو کنواں کچا ہوتا ہے اس میں نیچے پانی تک پہنچنے کے لئے دیوار میں پالے بنے ہوئے ہوتے ہیں، کوئی اندر اترنا چاہے تو ان کے ذریعہ سے اُتر سکتا ہے۔ وہاں کوئی ڈول اور رسی تو تھی نہیں، اس لئے اس نے اندر اتر کر پانی پی لیا، پھر جب وہ باہر نکلی تو دیکھا کہ ایک پیاسا کتا وہاں کھڑا ہے اور پیاس کی شدت کی وجہ سے گیلی مٹی چاٹ رہا ہے۔ اس عورت نے سوچا کہ پیاس کی جس شدت کو مَیں بھگت چکی ہوں، اور اس کی وجہ سے جو تکلیف مجھے پیش آئی تھی، یہ کتا بھی اسی مشقت سے گذر رہا ہے، اس کو کتے پر ترس آیا اور وہ دوبارہ نیچے اتری، اس کے پاس چمڑے کا موزہ تھا، اس میں پانی لیا اور چونکہ دونوں ہاتھ اوپر چڑھنے کے واسطے استعمال کرنے تھے، اس لئے اس موزہ کو اپنے منہ میں دانتوں سے دبایا اور اوپر آکر کتے کو پانی پلایا۔ اسی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کردی گئی (بخاری شریف، ۳۴۶۷) دیکھنے میں وہ عمل چھوٹا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو قبول کرلیا۔

گناہ کی حقیقت

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کسی گناہ کو چھوٹا سمجھتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ گناہ کوئی بھی ہو، وہ چھوٹا نہیں ہے۔ کیونکہ گناہ کی حقیقت ہی یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ نافرمانی کس ذات کی ہے؟ جو شخصیت اور ذات جتنی اونچی اور جتنی عظمت والی اور جتنی صاحبِ وقعت ہوتی ہے؛ اس کی مخالفت، حکم عدولی اور اس کی نافرمانی اسی مناسبت سے اتنی ہی زیادہ سخت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی معمولی آدمی ہے، اگر اس کی کوئی بات نہ مانی جائے تو کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی اور اگر بادشاہِ وقت کسی معمولی چیز کا بھی حکم دے، اگر اس کے اس حکم میں اس کی نافرمانی کی جائے تو یہ بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی بھی گناہ چاہے کبیرہ ہو یا صغیرہ؛ اس کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

کبیرہ اور صغیرہ کی بحث

ویسے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ گناہوں میں کبیرہ اور صغیرہ کی تقسیم بھی ہے یا نہیں؟ علماء کے یہاں اس مسئلہ میں باقاعدہ بہت کچھ گفتگو ہوئی ہے، اور اس موضوع پر مستقل بحث کی گئی ہے۔ بعض حضرات تو اس طرف گئے ہیں کہ تمام گناہ کبیرہ ہی کبیرہ ہیں، کوئی گناہ صغیرہ نہیں۔ اور اس کی وجہ وہ حضرات یہ بیان فرماتے ہیں کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی

نافرمانی کی ہے،اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی عظمت، اس کی کبریائی اس کی بڑائی جیسی ہے،اس کے مقابلہ میں کوئی آدمی چھوٹی سی بھی نافرمانی کرے گا تووہ معمولی نہیں سمجھی جائے گی،بلکہ اس کو بڑا ہی کہا جائے گا۔اسی بنیاد پر اہلِ علم میں سے بہت سے حضرات یہ فرماتے ہیں کہ کوئی بھی گناہ صغیرہ نہیں ہے ،تمام گناہ کبیرہ ہی ہیں

لیکن علماء کی ایک بڑی جماعت قرآن وحدیث کے نصوص کو سامنے رکھ کر اس طرف گئی ہے کہ گناہوں میں تقسیم ہے،بعض کو صغیرہ کہا جائے گا اور بعض کو کبیرہ کہا جائے گا، قرآن وحدیث کے مطالعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔قرآنِ پاک میں ہے﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ (النسآء.۳۱)﴾ اوراحادیث میں بھی مختلف حدیثوں میں یہ بات آتی ہے،ان کو سامنے رکھ کر ایسے حضرات نے جن کی بات تمام اہلِ علم کے یہاں قابلِ قبول ہے یہی فرمایا ہے کہ گناہوں میں صغیرہ اور کبیرہ کی تقسیم ہے ،یہ اور بات ہے کہ صغیرہ گناہ پر بھی آدمی اصرار کرے یعنی اس کو کرتا رہے تو وہ کبیرہ بن جاتا ہے۔

بلی پر ظلم نے پکڑوادیا

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حدیثِ پاک میں یہ قصہ آتا ہے کہ ایک عورت نے ایک بلی پال رکھی تھی،اوراس کو جو خوراک دینی چاہیے وہ دیتی نہیں تھی،اوراس کو باندھ کر رکھا ہوا تھا اگر اس کو کھلی چھوڑ دیتی تو کم سے کم وہ خود ہی اِدھر اُدھر جاکر اپنی غذا فراہم کر لیتی اور اپنا گذارا کر لیتی،لیکن وہ بھی نہیں کیا اور باندھے رکھا،اس لئے وہ خود بھی کچھ نہیں کر سکتی

تھی، اور یہ خود اس کو غذا نہیں دیتی تھی اسی میں وہ ہلاک ہوگئی۔ نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس عورت کو جہنم میں ڈالا (بخاری شریف، ۲۳۶۵) حالاں کہ دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی سی چیز ہے۔ تو میں نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا مقولہ نقل کیا تھا کہ کسی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت، اور کسی گناہ کو معمولی سمجھ کر کرو مت۔

نیکی کی مجھے بھی ضرورت ہے

خود نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرت اور صحابہ ٔ کرام (رضی اللہ عنہم) کے حالات کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیکیوں کے حریص تھے، جیسے ہم لوگ پیسوں کے حریص ہیں جس طرح بھی کوئی نیکی ہاتھ آسکتی ہو، اس موقع کو چھوڑنے کے لئے وہ حضرات تیار نہیں ہوتے تھے۔ حدیث ِ پاک میں خود نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصہ ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب سفر میں ہوتے۔ اور آپ حضرات بھی جانتے ہیں کہ دورانِ سفر کھانا وغیرہ پکانے کی نوبت آتی ہے، تو رفقاء آپس میں کام کو تقسیم کر لیتے ہیں۔ تو نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اپنے ذمہ کوئی کام لے لیتے تھے، صحابہ ٔ کرام عرض کرتے کہ اے اللہ کے رسول! ہم کرلیں گے، تو نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جواب میں ارشاد فرماتے کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو۔ کبھی کسی دوسرے کا کوئی کام اپنے ذمہ لینے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ بے چارہ کمزور ہے اور کام کر نہیں سکے گا اس لئے سوچتے ہیں کہ چلو ہم اس کا کام کر دیں۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)

فرماتے کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو۔اور کبھی آدمی یہ سوچتا ہے کہ اس کا کام کر کے نیکی حاصل کرلوں، تو حضور (ﷺ) نے فرمایا کہ نیکی کی مجھے بھی ضرورت ہے۔

معمولی گناہ سے بھی بچو

اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ کسی نیکی کے کام کے لئے ترغیب دی جائے تو نعوذ باللہ بعض لوگ تو بڑی بے باکی اور جرأت کے ساتھ بول دیتے ہیں کہ ہمارے پاس بہت ساری نیکیاں ہیں یعنی ایسے جملے اپنی زبان سے نکالتے ہیں جس سے اس نیکی کی طرف سے ایک طرح کی بے رغبتی محسوس ہوتی ہے۔یہ بڑا خطرناک پہلو ہے۔

بات چل رہی تھی کہ نیکی اور گناہ کے سلسلہ میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا یہ ارشاد ہے کہ کسی بھی نیکی کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت، اور کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کرو مت، بخاری شریف میں روایت ہے، نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ﴿إِيَّاكُمْ وَمُحَقَّرَاتُ الذُّنُوبِ (شعب الایمان،۶۸۸۱)﴾ چھوٹے چھوٹے گناہ ، جن کو تم معمولی سمجھتے ہو؛ ان سے بھی بچو، یعنی معمولی سمجھ کر ان کو مت کرو۔اور میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایمان کی بنیاد ان دونوں چیزوں۔ امید اور خوف پر قائم ہے۔

امید کسے کہتے ہیں ؟

یہاں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) امید کو بیان کرنے جارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنی چاہیے، اورامید کے سلسلہ میں قرآنِ پاک کی آیتیں اور احادیث پیش کریں گے۔ لیکن امید کے سلسلہ میں آیات اوراحادیث کو سننے سے پہلے ایک بات سمجھ لینی چاہیے کہ امید کس کو کہتے ہیں۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں نے توامید کا مطلب یہ سمجھ رکھاہے کہ بے باکی سے گناہ کرتے رہو، اور اگر کوئی سمجھائے کہ بھائی! یہ بڑا سخت گناہ ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑاغفوررحیم ہے۔ بس! ایک جواب یادکررکھاہے اوروہی جملہ ہماری زبانوں پر چڑھا رہتاہے۔ اس لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ یقین بھی ہو کہ سارے گناہ معاف کردیئے جائیں گے تب بھی یہ طریقہ بالکل درست نہیں ہے۔

ایک مثال

یہ تو ایساہی ہواکہ ایک آدمی چھری لے کراپنے ہاتھ کوکاٹ رہاہے، جب آپ نے اس کو دیکھا توکہاکہ بھائی! یہ کیاکررہے ہو؟ تووہ کہتاہے کہ میرے پاس بہت اعلیٰ قسم کا مرہم ہے، کیساہی خطرناک زخم کیوں نہ ہو، وہ لگاتے ہی ٹھیک ہو جاتا ہے، اس لئے میں چھری لے کرہاتھ کاٹنے بیٹھاہوں۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ ایسے آدمی کے متعلق آپ کیا فیصلہ کریں گے؟ اس سے کہاجائے گاکہ تمہاری بات ٹھیک ہے کہ اس مرہم سے ایک دوسیکنڈ

میں زخم ٹھیک ہوجاتا ہے، لیکن یہ مرہم تمہارے پاس ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم چھری لیکر ہاتھ اور جسم کاٹنے کے لئے بیٹھ جاؤ، بلکہ مرہم کا مطلب تو یہ ہے کہ خدانخواستہ اگر کبھی کسی حادثہ کا شکار ہوجائیں تو ایمرجنسی میں آپ کا یہ مرہم کام دے سکتا ہے۔باقی اس کا مطلب کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ اگر ایسا مرہم پاس ہے تو چھری لے کر اپنے جسم کو کاٹنے بیٹھ جائیں اور پھر اس مرہم کو زخم پر لگاتے رہیں۔یہ عقلمند اور دانشمند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ایسی حرکت تو ممکن ہے کہ بچے کرلیں، باقی کوئی بڑا آدمی تو ایسا نہیں کرسکتا۔ بہرحال! اگر یہ گارنٹی اور یقین مل بھی جائے کہ ہمارے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے تب بھی آدمی گناہوں کے اوپر جرأت نہ کرے۔

مؤمن کے ایمان کا تقاضہ

آپ نے فضائلِ نماز کی تعلیم میں پڑھا اور سنا ہوگا کہ نماز کی وجہ سے آدمی کے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔وہاں علماء نے لکھا ہے کہ احادیث میں جہاں بھی ایسے اعمال سے گناہوں کا معاف ہونا آیا ہے اس سے صغیرہ گناہ مراد ہیں، کبیرہ نہیں۔کبیرہ کے متعلق تمام علماء یہی لکھتے ہیں کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے۔ویسے احادیث میں مطلق آیا ہے کہ گناہ معاف ہوجائیں گے، جیسے "مَنۡ قَامَ لَیۡلَةَ الۡقَدۡرِ إِیۡمَاناً وَّ إِحۡتِسَاباً غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنۡ ذَنۡبِهٖ (بخاری شریف، ۱۸۰۲)" اسی طرح اور بھی اعمال کے متعلق احادیث موجود ہیں، وہاں مطلق گناہ کی معافی کا کہا گیا ہے، لیکن علماء نے اس کو صغیرہ کے ساتھ مقید کیا ہے۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے والدِ محترم حضرت مولانا یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ سے ایک بات لکھی ہے کہ یہاں صغیرہ کی قید اس وجہ سے بھی لگائی جاتی ہے کہ ایک مؤمن کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی طرف سے کوئی کبیرہ گناہ تو پیش آ ہی نہیں سکتا، البتہ اس سے صغائر کا صدور ہو سکتا ہے، اس لئے ان اعمال سے وہ معاف بھی ہو جاتے ہیں اور اگر کبھی کسی وجہ سے اس سے کوئی کبیرہ گناہ ہو گیا تو اس کو اس وقت تک چین ہی نہیں آئے گا جب تک کہ توبہ کر کے اور رو دھو کر اس گناہ کو معاف نہ کرا لے۔ گویا اس کے نامۂ اعمال میں کبائر تو ہوں گے ہی نہیں، ہاں! صغائر ہوں گے تو وہ ان عبادتوں سے معاف ہو جایا کریں گے۔

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر ہمیں گناہوں کی معافی کی گارنٹی بھی مل جائے، تب بھی اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی جان بوجھ کر گناہ کرے۔

امید رکھنا کسے کہتے ہیں؟

دوسری بات یہ ہے کہ امید رکھنا کس کو کہتے ہیں؟ اور ہم نے جو یہ انداز اختیار کر رکھا ہے کہ گناہ کرتے رہو اور یہ کہتے رہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے، اللہ تعالیٰ رحم کرنے والے اور معاف کرنے والے ہیں۔ تو جو آدمی ایسی بات کرتا ہے اسی سے یہ سوال کیا جائے کہ بھائی! اگر کسی کافر اور مشرک سے آپ کی ملاقات ہو، اور آپ اس کو ایمان کی دعوت دیں کہ ایمان لے آؤ، ورنہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں جلنا پڑے گا اس کے جواب میں وہ

مشرک اگر آپ سے یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے؛ تو کیا اس کے اس جواب کو آپ تسلیم کرلیں گے؟ بالکل نہیں! بلکہ آپ اس سے یوں کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم تو ضرور ہے، لیکن اس کی مغفرت اور رحمت جن لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اس کے لئے بھی خود اللہ تعالیٰ ہی نے کچھ اصول بتلائے ہیں اور اس میں سب سے پہلی بات یہ کہہ دی گئی ہے ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَالِكَ لِمَن يَشَآءُ (النسآء:۳۱)﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، اس کو تو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا، البتہ اس کے علاوہ دوسرے گناہوں کو جس کو چاہے گا اللہ تعالیٰ معاف کردے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت ومغفرت کے اصول

پہلی آیت جو یہاں پیش کی ہے اس کے شانِ نزول میں جو باتیں کہی جاتیں ہیں اس کے ذیل میں بھی یہ آیت آتی ہے ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر:۵۳)﴾ اے نبی! آپ کہہ دیجئے: اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کرکے اپنی جانوں پر ظلم و زیادتی کی ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کردے گا، بیشک وہی معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ اس آیت کے سلسلہ میں بھی مفسرین نے لکھا ہے کہ قرآنِ پاک میں سورۂ فرقان میں باری تعالیٰ کی طرف سے یہ آیتیں نازل ہوئیں ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللهِ إِلٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ

النَّفۡسَ الَّتِیۡ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالۡحَقِّ وَ لَا یَزۡنُوۡنَ وَمَنۡ یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ یَلۡقَ اَثَاماً (الفرقان:۶۸)﴾ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے، اور کسی کو ناحق قتل نہیں کرتے، اور زنا کا بھی ارتکاب نہیں کرتے، ان کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ آیتیں جب مشرکین کے پاس پہنچیں، خاص کر حضرت وحشی (رضی اللہ عنہ) کے پاس جنہوں نے اپنے زمانۂ کفر و شرک میں حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو قتل کیا تھا، بعد میں تو وہ ایمان لے آئے تھے، تو انہوں نے کہا کہ ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر و شرک کیا ہے، اور بہت سارے لوگوں کو قتل بھی کیا ہے، اور دوسرے بہت سارے گناہ کئے ہیں ؛ اب ہمارے لئے تو معافی کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی، اس پر آیت نازل ہوئی ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ (النسآء:۳۱)﴾ جب یہ آیت لکھ کر مکہ والوں کے پاس بھیجی گئی تو انہوں نے کہا کہ اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے مغفرت کو اپنی مشیت پر موقوف رکھا ہے، گویا اس میں ان کو دعوت دی گئی ہے کہ تم ایمان لے آؤ انہوں نے کہا کہ ایمان لانے کے بعد بھی تو اللہ تعالیٰ نے دوسرے گناہوں کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ جس کو چاہیں گے معاف کریں گے اور اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے متعلق نہیں چاہا تو ہمارا کیا ہوگا؟ اس پر آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا کہ اے میرے وہ بندو! جنہوں نے کفر و شرک اور دوسرے گناہوں کا ارتکاب کرکے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا، اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کردے گا، بیشک وہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے، اس کے بعد وہ ایمان لے آئے۔ (تفسیر قرطبی، سورۂ زمر)

خیر! میں یہ عرض کررہاتھا کہ کسی کافرومشرک کو آپ ایمان کی دعوت دیں اور وہ جواب میں یوں کہے کہ اللہ تعالیٰ غفورالرحیم ہے ،توآپ اس سے صاف طور پر یہ کہیں گے کہ بھائی! یہ مغفرت اوررحمت تمہیں ملنے والی نہیں ہے،بلکہ اس کا بھی ایک اصول ہے،اس سے اتناتومعلوم ہواکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور معافی کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں، کافر کے لئے توپہلاہی قانون یہ ہے کہ جب تک وہ کفر چھوڑکراسلام وایمان قبول نہ کرلے،وہاں تک تووہ اس کاحقدارہی نہیں بنتا۔اسی طرح اہلِ ایمان کے حق میں بھی کچھ قاعدے بتائے گئے ہیں۔

کس کے اعمال تولے جائیں گے؟

جیسے قیامت میں اہلِ ایمان کے نامۂ اعمال کوتولاجائے گا۔ دیکھو!کافروں کے اعمال نہیں تولے جائیں گے،ان کے لئے توکفرکی وجہ سے سیدھاہی جہنم کافیصلہ سنا دیا جائے گا۔ اس لئے یہ بھی ایک بحث ہے کہ کس کے اعمال تولے جائیں گے؟اکثر علماء یہی لکھتے ہیں کہ اہلِ ایمان ہی کے اعمال تولے جائیں گے، اس لئے کہ وہ اپنے ایمان کی وجہ سے جنت کے مستحق بن چکے ہیں ،لیکن گناہ نے ان کا معاملہ ذرا کھٹائی میں ڈال دیاہے،تواب وہاں ان کے اعمال تول کر یہ دیکھاجائے گاکہ اس میں نیکیاں کتنی ہیں اورگناہ کتنے ہیں۔ اگر گناہوں کاپلڑاغالب ہے توسزاکے لئے جہنم میں بھیجا جائے گااورسزابھگتنے کے بعدمؤمن ہونے کی وجہ سے جنت کافیصلہ ہوگا،اوراگرنیکیاں غالب ہیں تواس صورت میں شروع ہی

سے اس کو جنت میں بھیجا جائے گا۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا اصول اور قانون بتایا ہے، اس لئے جو لوگ گناہ کر کے یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفور الرحیم ہے، ان کا یہ کہنا درست نہیں ہے۔

کسی کو عمل جنت میں داخل نہیں کرائے گا

اچھا! یہ تو گنہگاروں کی بات ہوئی۔ لیکن جو لوگ دیندار ہیں اور نیکی کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کے معاملہ میں غلو سے کام لیتے ہیں اور وہ اس طرح کہ جو اعمال ہمیں کرنے کے لئے کہا گیا ہے جیسے نماز، روزہ وغیرہ کا اہتمام کرنا، یا گناہوں سے بچنا؛ ان اعمال کے بعد بھی اصل تو یہ ہے کہ آدمی کے لئے جنت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ایک روز ارشاد فرمایا: "لَنْ يُّدْخِلَ أَحَدَكُمْ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ" تم میں سے کسی کو اس کا عمل جنت میں داخل نہیں کرائے گا۔ حضراتِ صحابہ نے عرض کیا: "وَأَنْتَ يَارَسُوْلَ اللهِ؟" اے اللہ کے رسول! آپ بھی؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: "وَأَنَا، إِلاَّ أَنْ يَّتَغَمَّدَنِيَ اللهُ بِرَحْمَتِهِ" میں بھی؛ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیں (بخاری شریف، ۵۶۷۳) جب حضور (ﷺ) اپنے لئے یہ فرماویں تو پھر دوسروں کے لئے تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ان لوگوں کے لئے ہے جو اعمال کا اہتمام کرتے ہیں، اور جو لوگ اعمال کا اہتمام ہی نہیں کرتے اور گناہوں میں مست رہتے ہیں، ان کا تو جواب صاف ہو گیا۔

توفیق بھی اسی وقت ملتی ہے

اورجولوگ اعمال کااہتمام کرنے والے ہیں ان کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنے خیالات درست کرلیں،اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نےان اعمال کے اوپر جنت اوراس کی نعمتوں کے جووعدے کئے ہیں وہ تمام صرف اللہ کے فضل سے ہی ملنے والے ہیں ،اس لئے کہ جنت کے متعلق بھی بخاری شریف اور تمام کتبِ احادیث میں موجودہے کہ ایک ادنیٰ جنتی کودنیاسے دس گنا بدلہ ملے گا،اوریہ بھی اس جنتی کو جو گرتا پڑتاجنت میں پہنچاہو گا،جیساکہ اس کا تفصیلی قصہ حدیث میں موجودہےایک ادنیٰ اور معمولی جنتی کودنیاسے دس گنابدلہ ملے گا(بخاری شریف، ٦٥٦١)اور حقیقت تو یہ ہے کہ سارے اعمال محض علامت ہیں ،ورنہ آدمی کوجنت میں لے جانے والی اورجنت کی نعمتیں دلوانے والی چیزاللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے،اوروہی اصل ہے، اس کے اندر مؤثرِ حقیقی اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہی ہے،اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملِ حال ہوگی تب ہی یہ رتبہ ملے گا۔اور سیدھی بات تو یہ ہے کہ اعمال کی توفیق بھی اسی وقت ملتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی رحمت شاملِ حال ہو، ورنہ جماعت کاکام کرنے والے بھی بہت سے احباب یہاں موجودہیں جولوگوں کے پاس جاتے ہیں اورلوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی!مسجد میں آؤ، تو اس کو مسجد میں آناایسامعلوم ہوتاہے جیساکہ سولی پر چڑھایاجارہا ہو،اتنی منت و سماجت کرنے کے بعد بھی وہ کیسے کیسے بہانے کرکے نکل جاتاہے۔کیاان لوگوں نے مسجد میں اس کے لئے کوئی

سولی کا تختہ تیار رکھا ہے جو وہ یہاں آنے سے ڈرتا ہے؟ یہاں آکر اس کو کیا کرنا ہے، صرف تھوڑی دیر کے لئے نماز ادا کرنی ہے، یا دین کی بات سن کر اللہ کو یاد کرنا ہے۔ سبحان اللہ کا جملہ آدمی اپنی زبان پر جو لاتا ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے لاتا ہے۔

كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ

حدیث ِپاک میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے:﴿كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ (بخاری شریف ،۷۵۵۲)﴾ اللہ تعالیٰ نے جس کو جس کے لئے پیدا کیا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق بھی ملتی ہے، اور وہی کام اس کے لئے آسان بھی کیا جاتا ہے۔ دنیا میں دونوں طرح کے لوگ ہیں، برے بھی ہیں اور اچھے بھی ہیں ، برے لوگ برے کام کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں، لوٹ چلاتے ہیں، اور گناہ کے بڑے بڑے خطرناک کام کرتے ہیں، اور وہ ان کاموں کو آسانی کے ساتھ انجام دے لیتے ہیں ، اس لئے کہ ان کے لئے وہی کام طے ہوا ہے، لہٰذا ان کو وہ کام انجام دینے میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آتی۔ وہی آدمی جو بڑی بے باکی کے ساتھ دس آدمیوں کو آسانی سے قتل کرسکتا تھا، اسی سے آپ لا الٰہ الا اللہ پڑھنے کو کہئے، یا اس سے کہئے کہ ہمارے ساتھ چار رکعات نماز پڑھنے کے لئے آؤ، تو اس کے لئے وہ بڑا مشکل ہو جائے گا۔ حالاں کہ ہم اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہیں لیکن وہ اس کو مشکل سمجھ رہا ہے، اس سے یہ ہو ہی نہیں رہا ہے۔

اور جو لوگ نیکی کے کام کرنے والے ہیں اور جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے اطاعت و فرمانبرداری لکھ دی ہے، نماز ادا کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، گناہوں سے بچتے ہیں، ان کو آپ معمولی سا گناہ کرنے کے لئے کہئے تو وہ تیار نہیں ہوں گے۔ قتل کرنا تو در کنار، صرف کسی کو ایک تھپڑ مارنے کو کہیے۔ اور وہ بھی چھوڑو، ان سے کہیے کہ فلاں کو صرف ایک گالی ہی دیدو، تو ہم تم کو سو روپے دیں گے۔ تو وہ کہے گا کہ ہزار بھی دو تب بھی مَیں گالی نہیں بولوں گا۔ حالانکہ دیکھنے کے اعتبار سے زبان پر گالی کا لانا صرف ایک جملہ ہے اور کوئی مشکل کام بھی نہیں ہے، لیکن جیسے پہلی قسم کے آدمی کو سبحان اللہ کہنا مشکل معلوم ہوتا تھا، یہ جملہ اس کو بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی کی بات ہے، اس لئے جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی اور اپنا نام لینے کی، نمازوں کا اہتمام کرنے کی اور دوسرے نیکی کے کام کرنے کی توفیق دی ہے، اور ساتھ ہی گناہوں سے بچنے کی توفیق دی ہے؛ تو ان کو چاہیے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے رہیں مَیں آپ سب سے یہی کہتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرما رکھی ہے، اب اس نعمت میں آپ زیادتی چاہتے ہیں تو بہت آسانی سے کر سکتے ہیں کہ اس کا شکر ادا کیا جاتا رہے: ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾ باری تعالیٰ کا قرآنِ پاک میں وعدہ ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو ہم تمہاری نعمتوں میں اضافہ کریں گے۔

اس پہلو پر بھی غور کیجیے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ جو لوگ نیکی کے کام کرتے ہیں وہ بھی اس معاملہ میں ذرا غلو سے کام لیتے ہیں۔ دیکھو! ہم میں سے بہت سے لوگ وہ ہوں گے جو نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، نیکی کے کام کرتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنے متعلق یہ فیصلہ کئے بیٹھے ہیں کہ گویا جنت میں ہماری بکنگ ہو چکی ہے، اور ریزرویشن ہو گیا ہے، دوسرا پہلو تو ہم کبھی بھولے سے بھی نہیں سوچتے، حالاں کہ حضراتِ صحابہؓ کرام (رضی اللہ عنہم) وہ لوگ ہیں جن کو دنیا میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے جنت کی بشارتیں سنائی گئیں، اس کے باوجود وہ حضرات ڈر رہے ہیں۔ نعوذ باللہ ایسا تو نہیں تھا کہ جنت کی جو بشارت ان کو زبانِ رسول سے دی گئی تھی اس پر ان کو اعتماد نہیں تھا؟ ایسا بالکل نہیں تھا، بلکہ پورا پورا یقین تھا لیکن اس کے باوجود عذاب کا ڈر اتنا غالب آجاتا تھا کہ وہ سہم جاتے تھے۔

الہامی مثال

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ کسی جگہ اونچائی کے اوپر دو فٹ چوڑا راستہ بنا ہوا ہو اور آپ سے کہا جائے کہ اس پر چلو، تو سیدھی بات ہے کہ راستہ دو فٹ چوڑا ہے، اور عام طور پر آدمی کو چلنے کے لئے دو فٹ سے زیادہ چوڑی جگہ نہیں چاہیے، لیکن جب وہ یہاں چلتا ہے تو کبھی اس کو ایسا خطرہ یا خیال آتا ہے کہ مَیں گر جاؤں گا؟ اور اونچائی پر دو فٹ چوڑے

راستہ پر چلنے کے لئے کہا جائے گا تو بعض تو پہلے سے ہی منع کر دیں گے، بعض ڈرتے ڈرتے چلیں گے کہ کہیں گر نہ جائیں، حالانکہ وہ اوپر جتنی جگہ پر چل رہا ہے اتنی ہی جگہ پر نیچے بھی چلتا ہے، لیکن نیچے جس طرح آسانی سے چلتا ہے اُس طرح اوپر نہیں چل سکتا۔ آخر ایسا کیوں؟ اس لئے کہ وہاں خوف غالب آجاتا ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جوب

اسی طرح ان حضرات کو بشارتیں سنائی گئی تھیں، پھر بھی وہ بہت زیادہ ڈرتے تھے۔ اس سے نعوذباللہ یہ خیال پیدا نہ ہو کہ ان کے ایمان ویقین میں کمی تھی، ان کے جیسا ایمان تو کون پیش کر سکتا ہے، وہ تو پوری امت کے لئے نمونہ ہیں، لیکن دراصل اس بشارت کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا خوف اتنا زیادہ غالب آجاتا تھا کہ یہ چیز نگاہوں کے سامنے رہتی ہی نہیں تھی۔ جیسے کسی دشمن نے حملہ کر دیا، اب اپنے پاس بھی کوئی ہتھیار موجود ہے لیکن دشمن کا خوف اتنا غالب آیا کہ وہ اپنا ہتھیار تو بھول ہی گیا۔ بعد میں کہتا ہے کہ ارے یار! مَیں تو اپنا ہتھیار بھول ہی گیا تھا، اگر ذرا سا بتلاتا تو وہ بھاگ جاتا۔ جیسے فارسی کا مقولہ ہے: ''مُشتے کہ بعد از جنگ یاد می آید، بر پُشتِ خود باید زد'' وہ مُکّا جو لڑائی کے بعد یاد آئے، وہ اپنی ہی پیٹھ پر مارنا چاہیے۔ جب آدمی کا کسی سے جھگڑا ہوتا ہے تو بعد میں وہ سوچتا ہے کہ مَیں یوں مارتا اور یوں کرتا اور توں کرتا۔ آدمی کی ذہنی سوچ ہوتی ہے، یہ سب ایسی ہی بے تکی باتیں

ہیں،جب کام کاوقت تھااس وقت توساری چوکڑیاں تم بھول بھال گئے تھے،اب ان خیالات کاکیا فائدہ ہے۔

ہمارامزاج

خیر!جن حضرات کویقین تھااورجن کوبشارتیں سنائی گئی تھیں ان پراللہ تعالیٰ کا کتناخوف غالب تھا۔اورہم لوگ جواعمال کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں ہم جس قسم کی امیدیں لئے بیٹھے ہیں،اوراپنےاوپرمکمل اعتماد کئےہوئےہیں ،گویاہم یوں سمجھتے ہیں کہ حضرت جبرئیل وحی لے کرآکرہمیں کہہ چکے ہیں کہ جنت میں تمہاری فلاں سیٹ نمبر ہے،اور فلاں بنگلہ نمبرہے۔ہم تواپنے متعلق ایساہی سمجھتے ہیں اوردوسروں پر تبصرے کرتے رہتےہیں ۔آج کل ہمارامزاج یہی بناہواہے،حالانکہ جنت میں جانے کا اصل مدار اعمال نہیں ہیں، خودنبیٔ کریم (ﷺ)اپنے متعلق یہی فرمارہے ہیں۔

اعمال کاویلیوئیشن (valuation)

اورپھر جن اعمال پرجنت کے بدلہ کاوعدہ کیاگیاہے توپہلےذرایہ بھی دیکھوکہ وہ بدلہ ہمیں حق کے طورپرنہیں مل رہاہے۔ایسانہیں ہے کہ ان اعمال کی وجہ سے ہمارا استحقاق ہوگیاہے۔اس لئے کہ اگرایساہی ہوتاتوہمیں ذرا غورکرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارےاعمال کی حیثیت اوراس کی قیمت کیاہے؟ہمیں اپنے اعمال کاویلیوئیشن (valuation) کرلینا

چاہیے،اوراس کے مقابلہ میں ہمیں جو کچھ معاوضہ مل رہاہے جس کا جنت میں وعدہ کیا گیا ہے؛وہ کیاہے؟لہٰذا آیئے ہم اپنے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ دیکھو!ہم پورے چوبیس گھنٹے اللہ کی عبادت میں نہیں لگاتے بلکہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ وقت کی فرض نمازیں جماعت کے ساتھ اداکرتے ہیں ،جماعت سے پانچ سات منٹ پہلے مسجد میں آتے ہیں، اور اگراس سے پہلے آگئے تب بھی اندر آنے کی زحمت نہیں کرتے،یوں کہتے ہیں کہ ابھی تو جماعت میں بہت وقت باقی ہے، ذرا باہر ہی کھڑے رہو۔نفس اورشیطان کیساہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ اندر آنےہی نہیں دیتا،جن کومسجد میں آنے کی توفیق ملی ہوئی ہے وہ بھی مسجد کے احاطہ میں آنے کے بعد جماعت خانہ میں داخل نہیں ہوتے،اس لئے کہ اندر جانے کے بعد باتیں کرنے کا وقت نہیں ملے گا۔ارے بھائی!اللہ تعالیٰ نے آنے کی توفیق دی ہے تو بیٹھ کرکچھ پڑھ لو، اگر دس پندرہ منٹ پہلے آگئے توکیاحرج تھاکہ وضو کرکے اندر آجاتے اور سنتیں پڑھ کر جو پانچ سات منٹ بچ گئے ان میں کچھ تسبیح اورقرآنِ پاک وغیرہ پڑھ لیتے تواس میں ہمارا کیاچلاجاتا؟لیکن ہم ایسانہیں کرتےاورباہرجوتے اتارنے کی جگہ پرہی کھڑے رہتے ہیں،جب پانچ منٹ باقی ہوں گےتواندرآکرجلدی جلدی وضو کریں گے،اور جب جماعت کھڑی ہوگی تب ہی مسجدمیں داخل ہوکرنمازمیں شامل ہوں گے۔یہ ایک الگ موضوع ہے جویہاں شروع ہوگیا۔ضمناً بات آگئی تواس پر تنبیہ کردی۔

زندگی بھر کی محنت کی قیمت

خیر! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہم اللہ کی عبادت میں جو اوقات لگاتے ہیں ہمیں اس کا حساب کرنے کی ضرورت ہے کہ پانچوں وقت کی نماز میں ہمارا کل کتنا وقت لگتا ہے؟ پانچ وقت کی نمازیں کل ملا کر زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سے دو گھنٹے لگتے ہیں، اور ذرا خشوع و خضوع سے پڑھیں تو ڈھائی گھنٹے ہوں گے، اس سے زیادہ نہیں لگتے۔ اب ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہمارے اس ڈھائی گھنٹے کی قیمت ہمیں دنیا میں کیا مل رہی ہے؟ اس لیے کہ ہم صرف یہ نماز تو نہیں پڑھ رہے ہیں، اس کے علاوہ اوقات میں ہم اپنے کاروبار میں لگتے ہیں، تجارت والا تجارت میں لگتا ہے، سروس اور ملازمت والا اس میں لگتا ہے، تو اب یہ آدمی جو ملازمت اور سروس کر رہا ہے اس کو ڈھائی گھنٹے کی تنخواہ کتنی ملتی ہے؟ سب کو معلوم ہے کہ آٹھ سے دس گھنٹے ملازمت اور سروس کے ہوتے ہیں اور اس کی ماہانہ تنخواہ جو مقرر ہوتی ہے وہ مان لیجئے کہ تیس ہزار ہے۔ چلو مان لو کہ تیس ہزار نہیں بلکہ تین لاکھ ہے، حالانکہ ایسے تو بہت کم لوگ ہوں گے کہ جن کو ماہانہ تین لاکھ تنخواہ ملتی ہو لیکن ہم زیادہ سے زیادہ ویلیو کے حساب سے تسلیم کرتے ہیں کہ ٹھیک ہے کوئی کسی ڈائنگ ہاؤس میں بہترین ماسٹر ہے تو اس کو تین لاکھ تنخواہ ملتی ہے۔ تو اب اس کو مہینہ کے جو تین لاکھ ملے تو ایک دن کے دس ہزار ہوئے، اور دن بھر کے وہ دس گھنٹے لگاتا ہے تو ایک گھنٹہ کے ایک ہزار ہوئے۔ اب ہم روزانہ ڈھائی گھنٹے اللہ کے کام میں اور عبادت میں لگاتے ہیں تو ہمارے ڈھائی ہزار اس

کام میں لگے۔اب ہم زندگی میں پندرہ سولہ سال کے بعد نمازیں پڑھنا شروع کرتے ہیں اور پچاس ساٹھ سال میں سے شروع کے پندرہ سال نکال کر روزانہ کے ڈھائی ہزار کے اعتبار سے حساب لگالو تو چار سے پانچ کروڑ روپے ہوں گے،اب مَیں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ ان پانچ کروڑ سے پوری دنیا نہیں بلکہ سورت شہر کا سب سے اعلیٰ اور پوش ایریا جو کہلاتا ہے وہاں کتنے اسکویر فٹ زمین خرید سکتے ہیں؟اوراس میں کیسا بنگلہ بناسکتے ہیں؟آج اس زمانہ میں سورت شہر کے سب سے پوش ایریا(Posh Area) میں بڑا بنگلہ تو ملنے سے رہا۔یہ ہماری زندگی بھر کی محنت کی قیمت ہوئی۔

زندگی بھر کے نقشوں کا نقشہ

اب آپ پوری دنیا کا نقشہ اُٹھا کر دیکھو کہ اس پوری دنیا کے نقشہ میں ہندوستان کہاں ہے،اور پورا ہندوستان پوری دنیا کا کتنا حصہ بنتا ہے؟اور پھر اس ہندوستان میں گجرات کی کیا حیثیت دکھتی ہے؟اور دنیا کے نقشہ میں شاید گجرات کا نام تو ملے گا لیکن سورت کا نام اس میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔اس کے لئے آپ کو دنیا کا نقشہ چھوڑ کر ہندوستان کا نقشہ نکالنا پڑے گا،دنیا کے نقشہ میں سورت کا وہ نقطہ تھا ہی نہیں،ہاں!ہندوستان کے اس نقشہ میں سورت کا حصہ ایک نقطہ اور پوئنٹ کے برابر ملے گا،اور پانچ کروڑ میں جو جگہ آپ نے خریدی ہے،اس کی حیثیت اس ایک نقطہ اور پوئنٹ میں کیا ہوگی؛اس کا آپ اندازہ

لگالیجئے۔یہ توسب سے بڑی ویلیو نکال کرہم حساب کررہے ہیں ، کم تنخواہ والے اس حساب سے اپنااپنااندازہ نکال لیں۔

اورپھریہ توہم صرف نمازکاحساب لگارہے ہیں ،دوسرے اعمال کاکیاحال ہے وہ تو ابھی ہم نے دیکھاہی نہیں۔اورادنیٰ جنتی کودنیاکادس گنا ملنےوالاہے،توپھر اوپرکے بڑے درجہ والوں کاتوکہنا ہی کیا۔حالاں کہ ہم نے اس مثال میں دنیاکے اونچی سے اونچی تنخواہ والے کاحساب لگایاتھا۔

یہاں اوروہاں کاتقابل

اورپھریہ توصرف مقداراورکوئنٹیٹی (Quantity)کی بات ہوئی ہے،حالانکہ کسی بھی چیزمیں صرف مقدار ہی نہیں دیکھی جاتی،کوالٹی(Quality) بھی دیکھی جاتی ہے،اس لئے وہاں کے ادنیٰ اوریہاں کے اعلیٰ کاموازنہ کروکہ یہاں کے اعلیٰ بنگلہ کا مٹیریل(Material) کیا ہوسکتاہے اوروہاں کے ادنیٰ بنگلہ کی کوالٹی کیسی ہوگی۔ یہاں کی چیزیں کیسی ہیں اور وہاں کی چیزوں کی کوالیٹی کیسی ہے۔جنت کی صرف ایک حورکے متعلق حدیثِ پاک میں آتاہے کہ اس کاصرف دوپٹہ دنیاومافیہاسے بہتر ہے،اور اگر وہ حورسمندرمیں صرف تھوک دے توسمندروں کاساراکھارا پانی میٹھا ہوجائے۔حالانکہ سمندرکتنے بڑے ہیں ؟زمین کے مقابلہ میں سمندروں کاحصہ دوتہائی زیادہ ہے اور ابھی توہم نےصرف یہاں کے بنگلہ

اورزمین کا تذکرہ کیا ہے، اس کے علاوہ یہاں تو دوسری چیزیں مثلاً ڈیکوریشن(Decoration) رنگ روغن اور فرنیچروغیرہ کے پیسے الگ ہوں گے،اور وہاں تو سب کچھ تیار ملے گا۔

اپنے اعمال پر کبھی بھروسہ نہ کرو

تواب کیاکسی کو یہ کہنے کاحق ہے کہ جنت اوراس کی ساری چیزیں ہمیں اعمال کے بدلہ میں ملیں گی۔بالکل نہیں۔یہ تودراصل اللہ تعالیٰ دیناچاہتے تھے اس لئے بہانہ کے طورپر ہم سے یوں کہاگیاکہ یہ اعمال کرلوتوتم کویہ مل جائے گا۔اس کومیں ایک مثال سے سمجھاتا ہوں کہ یہ توایساہی ہے جیسے ایک غریب فقیرآدمی مسجدکے دروازہ پرآپ کے پاس آیا، آپ اس کوکچھ رقم دیناچاہتے ہیں،اس کوآزمانے کے لئے آپ نےاس سے کہاکہ اگرتم یہاں سے چوک بازارتک پیدل جاؤ تومیں تم کوایک ہزارروپے دوں گا ظاہرہے کہ کوئی بھی یہی کہے گاکہ چوک بازار تک جانے کی جوشرط لگائی گئی ہےوہ اس کی قیمت نہیں ہے، بلکہ صرف آزمائش ہے، ورنہ تویہ آدمی اس کوایک ہزارروپے دینا چاہتاہے،صرف بہانہ کے طورپریہ بات کہی گئی ہے۔اب وہ وہاں تک توکیاجاتابلکہ آپ کی اس سوسائٹی کے باہر چندقدم جاکرواپس آیااور کہنے لگاکہ لاؤ!وہ ایک ہزارروپےدو۔تو اس سے کیاکہاجائے گا؟ اسی طرح اعمال کابھی حال ہے،ہمیں اپنےاعمال کی حیثیت اور قیمت دیکھ لینی چاہیے کہ اس کی قیمت اورحیثیت کیاہے۔آدمی اپنے اعمال پر کبھی بھروسہ نہ کرے۔

با حضورِ دل نہ کردم طاعتے

اور پھر ہم جو نمازیں پڑھتے ہیں وہ کیسی ہیں وہ ہم ہی جانتے ہیں جیسا کہ میں نے مسجد میں آنے کا ہمارا طریقہ اور ڈھنگ بتلادیا، اسی طرح اللہ اکبر سے جو نماز شروع کریں گے وہاں سے لے کر السلام علیکم ورحمۃ اللہ تک کا ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟ دل پر ہاتھ رکھ کر بتلائیں کہ اس دوران دل کا کتنا دھیان نماز میں حاضر رہتا ہے اور کتنا غائب رہتا ہے۔ جس طرح آجکل ہر چیز آٹو میٹک (Automatic) ہوگئی ہے، اسی طرح ہماری نماز بھی آٹو میٹک (Automatic) ہو چکی ہے، اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے تو اس کے بعد سب کام برابر ہوتے ہیں، کوئی چیز چھوٹتی نہیں ہے، لیکن سلام پھیرنے کے بعد اس سے پوچھیں کہ کون سی سورت پڑھی تھی، تو کہتا ہے کہ یاد نہیں ہے، حالاں کہ اس نے سورت پڑھی ہے، لیکن خود اسے ہی یاد نہیں، پہلے وہ سوچے گا، دماغ پر زور لگانا پڑے گا کہ کون سی سورت پڑھی تھی۔ یہ ہماری نماز کا حال ہے۔

شیخ فریدالدین عطار (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک کتاب "پند نامہ" ہمارے یہاں مدارس میں پڑھائی جاتی ہے، اس میں انہوں نے بڑی اچھی بات ارشاد فرمائی ہے:-

بے گنہ نہ گذشت بر من ساعتے　　　با حضورِ دل نہ کردم طاعتے

اے اللہ! کوئی گھڑی میرے اوپر بغیر گناہ کے نہیں گذری، اور کوئی عبادت میں نے دل کی حاضری کے ساتھ نہیں کی۔ اگر ہم سے قیامت میں پوچھ لیا جائے کہ ایک سجدہ ایسا لاؤ جو حضورِ دل کے ساتھ کیا ہو؛ تو کیا زندگی بھر کی نمازوں میں سے ہم وہ پیش کرنے کے قابل ہیں ؟ بالکل نہیں۔ ہمارے اعمال کی حیثیت یہی ہے۔

اس دربار کے قابل ہیں یا نہیں ؟

اور آپ دیکھیں گے کہ یہ اعمال کس ذات کے لیے کئے جاتے ہیں؟ عبادتیں تو اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کی جاتی ہیں ، ہمارا عقیدہ ہے کہ جو کام عبادات کے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور ذات کے لئے نہیں کرسکتے، اگر کسی اور کے لئے کئے جائیں گے تو وہ شرک کہلائے گا، لیکن آپ احادیث کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ اکثر عبادتوں کے بعد استغفار کے کلمات رکھے گئے ہیں ، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد حضور اکرم (ﷺ) زور سے تین مرتبہ استغفر اللہ پڑھتے تھے (سنن دارمی، ۱۳۴۸) اور نماز کے بعد کے جو اذکار بتائے جاتے ہیں ان میں استغفار بھی آتا ہے ۔ اسی طرح روزہ افطار کرنے کی دعا میں ہے: يَاوَاسِعَ الْفَضْلِ اِغْفِرْلِیْ (المعجم الاوسط ۷۷۳۸) وہاں بھی معافی مانگی جارہی ہے۔ غور کرنے کی چیز ہے کہ صبح سے شام تک بھوکے رہے، اور اب معافی مانگی جارہی ہے؟ درحقیقت اس سے یہی بتلایا جارہا ہے کہ جو عبادت تم پیش کررہے ہو، وہ اُس دربار کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ اسی لئے قرآنِ پاک میں اللہ کے نیک بندوں کا حال بتلایا گیا: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ

مَاآتَوْا وَقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جو اس طرح اعمال کرتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے سہمے رہتے ہیں۔اس پر کسی نے پوچھا کہ کیا گناہ کرتے ہوئے ڈرتے ہیں ؟ تو فرمایا کہ نہیں! بلکہ نیکی کے کام کرکے ڈرے رہتے ہیں کہ معلوم نہیں؛وہ اس دربار کے قابل ہیں بھی یا نہیں،اور قبول بھی ہوتے ہیں یا نہیں۔(ترمذی شریف،۳۱۷۵)

میں یہ عرض کررہا تھا کہ امید کے معاملہ میں جو دیندار لوگ ہیں وہ بھی غفلت سے کام لیتے ہیں،اس لئے صرف امید کا سبق پڑھ لینے سے کوئی کام نہیں بنتا۔اور دراصل مَیں امید کی حقیقت بتلانا چاہتا تھا۔آج وقت بھی زیادہ ہوچکا ہے،بقیہ باتیں ان شاء اللہ آئندہ مجلس میں ہوں گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امید کا بیان چل رہا تھا، گذشتہ مجلس میں امید کی حقیقت بتلائی تھی، اور یہ بھی بتلایا تھا کہ ہم جو اعمال انجام دیتے ہیں اور انکے بل بوتے پر بڑی بڑی امیدیں باندھتے ہیں۔ حالاں کہ درحقیقت ہمارے اعمال کی قیمت ہی کیا ہے؟ اور ہمیں جو بھی وعدے کئے گئے وہ تمام اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے پورے ہوں گے جن میں ہمارے اعمال کا کوئی عمل دخل نہیں۔

فقیر اللہ تعالیٰ کا نائب ہے

اور دیکھو! عبادت تو خالص اللہ تعالیٰ کا حق ہے جو اس کے علاوہ کسی اور کے لیے انجام نہیں دی جاسکتی، اسی طرح صدقہ بھی دراصل عبادت ہی کی ایک قسم ہے۔ جو مال اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جاتا ہے؛ وہ صدقہ کہلاتا ہے، اور وہ بھی عبادت ہے، اس لئے وہ بھی اللہ کے علاوہ کسی اور کی نیت سے آپ خرچ نہیں کرسکتے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے اور اصولِ فقہ کی کتابوں میں فقہاء لکھتے ہیں کہ آدمی جب زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو وہ مال جب فقیر کے ہاتھ میں جاتا ہے تو گویا آپ نے اللہ کے ہاتھ میں دیا۔ فقیر دراصل اللہ تعالیٰ کا نائب بن کرلیتا ہے۔ (المعجم الکبیر، ۸۵۷۱) اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں یہ کہہ دیا گیا کہ جو مال آپ کو ہمارے واسطے نکالنا ہے وہ فقیر کو دیدینا۔ اس کو دیا گویا ہم کو دیا۔

یہاں ایک بات قابلِ غور ہے کہ بہت سی مرتبہ ہم صدقات اور زکوٰۃ کے نام سے مال دیتے ہیں، اس وقت ہمارے دل میں اس فقیر کے متعلق۔ جو یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کیا ہوا نائب بن کر ہمارے پاس آیا ہے۔ کیا جذبات ہوتے ہیں ؟ بھائی آپ کے اوپر کسی کا قرضہ ہو اور اس کی وصولیابی کے لئے وہ آدمی کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر آپ کے پاس بھیجے، تو کیا آپ اس کے ساتھ تحقیر یا بے عزتی کا معاملہ کر سکتے ہیں؟ ایسا کرتے ہوئے آپ ڈریں گے کہ یہ تو اس کا نمائندہ ہے، گویا کہ وہی بذاتِ خود میرے پاس آیا ہے، اگر کچھ بھی غلط معاملہ کروں گا تو یہ وہاں اس کی اطلاع کر دے گا۔ اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کو اطلاع کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے ، سب کچھ اس کے علم میں ہے، اس کے باوجود ہم اس فقیر کے متعلق دل میں کیا جذبات رکھتے ہیں ؟

اِس کا احترام کیوں نہیں ؟

حضرت مولانا محمد عمر صاحب پالن پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک جملہ یاد آ گیا جو وہ اپنے بیان میں فرمایا کرتے تھے کہ تم مسجد کا اکرام اور تعظیم کرتے ہو، حالاں کہ وہ پتھر کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے، اس کا اکرام اور ادب واحترام اس لئے کرتے ہو کہ یہ عبادت کی ایک جگہ ہے جہاں نماز ادا کی جاتی ہے، ورنہ پتھر کی ایک عمارت ہے، کوئی جاندار چیز بھی نہیں ہے۔ تو وہ جگہ چوں کہ عبادت کو ادا کرنے کے لئے مقرر کی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک اہم فریضہ وہاں ادا کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا ادب اور احترام کیا جاتا ہے؛ تو آخر اس فقیر کا ادب اور احترام

تمہارے دلوں میں کیوں نہیں ہوتا؟ جبکہ زکوٰۃ جو اللہ تعالیٰ کا ایک نہایت اہم فریضہ ہے وہ اسی کے ہاتھوں ادا ہورہا ہے۔ اور وہ کوئی پتھر کی عمارت نہیں ہے، بلکہ جاندار مخلوق ہے، اور وہ بھی انسان ہے۔ ویسے بھی ایک انسان کا انسان ہونے کے ناتے اکرام کرنا چاہیے تھا، چہ جائیکہ وہ تو ایک اہم فریضہ ادا کرنے کی جگہ بھی ہے؛ پھر تو اس کا کتنا زیادہ احترام ہونا چاہیے!

ہمارے دئے ہوئے میں سے خرچ کرو

اور قرآنِ پاک میں جہاں خرچ کا تذکرہ آتا ہے وہاں ایک خاص انداز اختیار کیا گیا ہے: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ گویا یہ بتلایا گیا کہ تم جو کچھ خرچ کروگے وہ ہمارے دئے ہوئے ہی میں سے خرچ کروگے۔ جیسا کہ باپ کا بچہ سے مانگنا یہ اس کے محتاج ہونے کی علامت نہیں ہے، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ جو دے گا اس سے باپ کی ضرورت پوری ہوجائے گی، بلکہ باپ تو صرف یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ میرے کہنے پر وہ کیا کرتا ہے۔ اسی طرح یہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا جو حکم دیا ہے اس سے نعوذ باللہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس کے خزانہ میں کوئی کمی تھی۔ یا ایسا بھی نہیں ہے کہ خرچ کرکے اس نے اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان کیا ہے۔ بلکہ دراصل ہمیں مال دے کر آزمایا جارہا ہے کہ یہ میرا دیا ہوا میرے کہنے پر کتنا خرچ کرتا ہے، اور اسی سے تعلق کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

خرچ کرنے کے دو طریقے

قرآن پاک میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتَابَ اللهِ وَ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَّرْجُونَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ(فاطر:۲۹)﴾ ہم نے جو دیا اس میں سے چھپ کر اور کھلم کھلا خرچ کرتے ہیں۔اس آیت میں یہ بھی بتلایا ہے کہ خرچ کرنے کے دو طریقے ہیں،ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ سات آدمی جن کو قیامت کے دن عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی، ان میں سے ایک وہ بھی ہے جس نے اتنا اخفاء اور چھپا کر اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا اہتمام کیا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا اس کا بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا(بخاری شریف،۶۶۰) اور دوسرا طریقہ کھل کر خرچ کرنا ہے۔علماء نے اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ کون سا صدقہ کھل کر کیا جائے اور کون سا چھپ کر کیا جائے۔تو زکوٰۃ کے معاملہ میں لکھا ہے کہ اگر وہ اس طرح دی جائے کہ لوگوں کو پتہ چلے تب بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس میں لوگوں کو بھی ترغیب ہوگی،اور اس پر کسی کو بدگمانی کا بھی موقع نہیں ملے گا کہ فلاں زکوٰۃ نہیں نکالتا۔اور نفلی صدقات میں چھپا کر دینا چاہیے، الاَّ یہ کہ کوئی ایسا موقع ہو جہاں لوگوں کو ترغیب دینے کی ضرورت ہو تو پھر وہاں کھل کر بھی دے سکتے ہیں۔ یہ دونوں طریقے ہیں۔

امید کا صحیح طریقہ

اس آیت میں تین چیزیں بتلائی ہیں کتاب اللہ کو پڑھتے ہیں ، نماز قائم کرتے ہیں، اور اللہ کے دئے ہوئے میں سے خرچ کرتے ہیں۔باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں کوئی گھاٹا نہیں ہے یعنی جنت کی امید رکھتے ہیں۔اس آیت میں کہا﴿یَرْجُوْنَ﴾ امید رکھتے ہیں یعنی ان کاموں کو انجام دینے کے بعد بھی کوئی گارنٹی نہیں دی گئی،بلکہ اس کے بعد بھی امید رکھتے ہیں۔ حضرت حکیم الامت (نور اللہ مرقدہٗ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کس طرح امید رکھنی چاہیے اس کا صحیح طریقہ یہی ہے جو قرآنِ پاک میں بتلایا گیا ہے۔

امید کا مفہوم ،ایک مثال

دنیا میں بھی امید کا یہی طریقہ ہے۔ایک آدمی اگر یہ چاہتا ہے کہ حکومت کے اندر کلکٹری کا منصب حاصل کرے،اور بچپن سے اس نے یہ امید رکھی ہے تو وہ کیا کرے گا؟ وہ شروع ہی سے اس انداز سے آگے بڑھے گا،کلکٹر بننے کے لئے تعلیم کی جتنی مقدار ضروری ہے،ان تمام مراحل کو(step by step)پوری توجہ سے طے کرے گا۔ پہلے پرائمری، پھر سیکنڈری، پھر ہائی سکول، پھر کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم اور جتنی ڈگریوں کی ضرورت ہے وہ پوری کرے گا،اور اس میں بھی اعلیٰ طریقہ سے پوری کرنے کا اہتمام

کرے گا۔ کلکٹر تو کئی سالوں کے بعد بنے گا، لیکن اس نسبت پر بچپن سے خوب اچھی طرح محنت چل رہی ہے۔اور پھر مان لو کہ اس کو ڈگری مل گئی تو ڈگری کا مل جانا یہ تو صرف اس بات کی علامت ہے کہ اس میں کلکٹر بننے کی صلاحیت ہے،اس ڈگری کے ملتے ہی وہ کلکٹر نہیں بن جاتا،بلکہ ابھی اور بھی مراحل سے گذرنا باقی ہے۔پہلے وہ درخواست دے گا،اس کے بعد بھی فوراً کلکٹر نہیں بنا دیتے، بلکہ پہلے کوئی دوسرا عہدہ ملتا ہے، مثلاً پہلے تحصیلدار بنایا، پھر نائب معاملتدار،اس کے بعد معاملتدار بنا،اور پھر کئی سالوں بعد کلکٹر بنا۔اس طرح پورا سلسلہ چلتا ہے۔اس درمیان کوئی اس سے پوچھے کہ کیا آپ کلکٹر بن گئے؟تو کہتا ہے کہ ہاں! کام چل رہا ہے،ابھی معاملتدار میں ہوں،دھیرے دھیرے پوسٹ بڑھے گی تو کلکٹر تک پہنچ جاؤں گا۔حالانکہ معاملتدار کی پوسٹ پر بھی کتنی مدتوں کی محنت کے بعد آیا ہے، لیکن یہی کہتا ہے کہ امید ہے۔

ایک بزرگ اور ایک ڈپٹی کمشنر

ایک صاحب ایک بزرگ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اللہ کی نزدیکی حاصل کرنے کا کوئی آسان طریقہ بتلا دیجئے۔ان بزرگ نے ان کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ ان کو باتوں میں لگا دیا کہ بھائی! آپ کون ہیں ،اور کیا کرتے ہیں ؟ وہ کہنے لگے کہ میں ڈپٹی کمشنر تھا۔تو پوچھا کہ آپ ڈپٹی کمشنر کیسے بنے؟اب اس کو پتہ نہیں تھا کہ وہ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں،وہ سمجھا کہ ایسے ہی میرے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔

اورویسے بھی انسان کی ایک خاص نفسیات ہے کہ اس سے اس کے بارے میں سوال کیا جائے کہ مثلاً آپ کو اللہ تعالیٰ نے اتنی دولت سے نوازا تو آپ نے اس کے لئے کیا کام کئے ؟بس! پھر دیکھو کہ اس کا دفتر کھلے گا،اوروہ اپنی صلاحیتوں کو بیان کرے گا کہ میں نے کیسی کیسی محنتیں کیں۔ایک صاحب سے ہماری ملاقات ہوتی رہتی ہے،ان کی کپڑے کی دوکان ہے جب کبھی کپڑا خریدنے کی ضرورت سے وہاں جانا ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ پوچھے بغیر ہی مجھ سے یہ کہنے لگتے ہیں کہ مولوی صاحب! پہلے تو میں ماچس بیچتا تھا اور پھر یہ کیا اوروہ کیا۔ اوراگر کسی سے پوچھو تو پھر تووہ ایسا شروع ہوتا ہے کہ بس آپ سنتے ہی رہ جائیں گے۔ یہ انسان کی نفسیات ہے۔کوئی کسی عہدہ پر ہواور آپ اس سے پوچھیں کہ آپ اس عہدہ پر کیسے پہنچے ؟تووہ بڑے لطف اور مزے لے لے کر ساری تفصیل بیان کرے گا،پھر تو آپ کو معذرت کرنی پڑے گی کہ وقت تنگ ہو رہا ہے، آئندہ پھر کبھی سنیں گے۔

خیر!ان صاحب نے بھی بزرگ کو سنانا شروع کیا کہ میں نے بڑی محنت سے پڑھائی کی اور پھر ڈگری حاصل کی اور پھر درخواست دی اوراس کے لئے بھی بڑی تکلیف اُٹھانی پڑی،اورایک مدت تک بڑی محنت اور لگن سے کام کرنے کے بعد ڈپٹی کمشنر بنا اوراب ریٹائرڈ ہوا ہوں۔بزرگ نے پوچھا: آپ کی عمر کتنی ہوئی؟کہا: ساٹھ سال ہوئی۔اب ان بزرگ نے کہا کہ جناب!آپ ڈپٹی کمشنری سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں ،توشاید آپ کی نگاہوں میں اللہ کا قرب ڈپٹی کمشنری سے تو

اونچی ہی چیز ہوگی؛ تب ہی تو یہاں آئے ہیں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! یہ تو بہت بڑی چیز ہے۔ تو ان بزرگ نے کہا کہ آپ ڈپٹی کمشنری کی پوسٹ پر تو پچاس پچپن سال کی عمر تک محنت کرنے کے بعد پہنچے تھے، اور یہاں آکر ہم سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کا کوئی ایسا آسان راستہ بتادو کہ دو چار دن میں وہ حاصل ہوجائے۔

مفت میں لینا چاہتا ہے

آدمی کا یہی مزاج ہے کہ دنیا کے معاملہ میں بڑا ہوشیار بنتا ہے اور دن رات خوب محنت کرتا ہے اور سردی، گرمی، بارش دھوپ کچھ نہیں دیکھتا۔ لیکن دین کے معاملہ میں ویسی محنت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہ چیز مفت میں لینا چاہتا ہے، دین کے معاملہ میں ڈھونڈتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے کوئی سستا سودا مل جائے۔ کوئی ایسا بزرگ مل جائے جو دم کردے اور میرا سینہ کھل جائے۔

ایک مولوی صاحب کہتے تھے کہ یہ کیا ہے کہ کسی بزرگ کی خدمت میں جائیں اور ان سے بیعت ہوں اور اصلاح کا تعلق قائم کریں؛ تب کچھ کام بنے۔ مَیں یہ سب چیزوں کو نہیں مانتا۔ ہم کو تو ایسا بزرگ چاہیے کہ ایک نگاہ کرے اور سینہ کھل جائے۔ مَیں نے ان سے کہا کہ پھر تو ڈھونڈتے ہی رہو۔ ہمارا یہ مزاج ہوگیا ہے کہ آدمی دین کے معاملہ میں مفت کا چاہتا ہے، ویسے دنیا کے معاملہ میں بھی مفت کا ڈھونڈتا تو رہتا ہے لیکن کوشش بھی برابر جاری رہتی ہے، لیکن دین کے معاملہ میں کوشش بھی نہیں کرتا۔

اسی کا نام امید ہے

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ دنیوی معاملہ میں امید کے ساتھ پوری محنت بھی کی جاتی ہے۔ جیسے ایک کسان اگر یہ چاہتا ہو کہ اس کے کھیت کے اندر ایک بیگہ میں زیادہ سے زیادہ کوئنٹل گیہوں میں حاصل کروں ،تو وہ اس کے لئے عمدہ قسم کا بیج لائے گا کھاد ڈالے گا،پانی برابر پلائے گا،خوب محنت کرے گا،اور اب اس سے پوچھو کہ کیا حال ہے ؟ تو اس کا جواب یہ ہو گا کہ اب اچھی فصل کی امید ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ دنیوی معاملات میں امید کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس چیز کے لئے قاعدہ سے جتنی محنت کی جانی چاہیے،اتنی کوشش کرنے کے بعد اس چیز کی توقع رکھنا؛اسی کا نام امید ہے

کنوارے کو اولاد کا تعویذ چاہیے!

جیسے ایک آدمی بچے کی امید رکھتا ہے تو اس کو شادی کرنی پڑے گی،اور صحبت کے بعد توقع رکھے۔ ایک صاحب حضرت شاہ عبد العزیز صاحب دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس تعویذ لینے کے واسطے آئے اور کہا کہ حضرت! اولاد کا تعویذ چاہیے۔ حضرت نے پوچھا کہ آپ نے شادی کی ہے؟ تو اس نے کہا کہ نہیں !ابھی شادی تو نہیں کی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ وہ شادی کئے بغیر اولاد کا تعویذ لینے آیا تھا،اس کے متعلق آپ کیا رائے قائم کریں گے؟ کہنے کا حاصل

یہ ہے کہ اسباب اختیار کئے جاتے ہیں اور پھر امید رکھی جاتی ہے۔ دنیوی معاملات میں ہم اسی کو امید کہتے ہیں۔

ایک طالبِ علم کو شاہزادی سے نکاح کرنے کے حوصلے تھے، اور وہ ہمیشہ اسی خیال میں مست رہتا۔ کسی نے پوچھا کہ بھائی کیا ہوا؟ تو کہنے لگا کہ بس! آدھا معاملہ تو طے ہو گیا ہے، آدھا باقی ہے ہماری طرف سے تو منظوری ہے، اُدھر کی بات نہیں جانتا۔

اپنے بس میں جتنا ہو؛ کرلو پھر...

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی دنیوی اعتبار سے محنت کرتا ہے پھر امید رکھتا ہے، اور امید کا اصل مفہوم یہی ہے۔ تو کیا امید کا جو معنیٰ، مفہوم و مطلب ہم دنیوی معاملات میں سمجھتے ہیں؛ دین کے معاملہ میں وہ بدل جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جو مطلب وہاں لیا جائے گا، وہی مطلب یہاں بھی لیا جائے گا۔ دنیا کے کسی بھی کام میں امید اس وقت رکھی جاتی ہے جب اس کے سارے اسباب اختیار کر لئے جائیں، اپنے ہاتھ میں جتنا تھا وہ کر لیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے توقع اور امید رکھو۔ ایسے ہی دین کے معاملہ میں اپنے ہاتھ میں جتنا ہو وہ کرلو، پھر اللہ تعالیٰ سے امید رکھو؛ اس کا نام امید ہے۔

یہ امید نہیں ؛ ہوس ہے

اسباب کو اختیار کئے بغیر کوئی آدمی امید رکھے تو اس کو امید نہیں ، بلکہ ہوس کہتے ہیں۔ اسی کو حدیثِ پاک میں فرمایا گیا: ﴿اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللهِ (مسند احمد،١٧١٢٣)﴾ سمجھدار اور ہوشیار آدمی وہ ہے جو اپنے نفس کو زیر کرے، قابو اور (control) میں لاوے، اور موت کے بعد آنے والی زندگی کے لئے عمل کرے۔ اور عاجز و درماندہ، بے کار ہے وہ آدمی؛ جو اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے چلتا رہے، جیسا نفس کہے ویسا ہی کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے امیدیں بھی باندھے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ یہ سمجھ داری کی بات نہیں ہے، بلکہ بے وقوفی کی بات ہے، یہ حماقت ہے، دنیوی معاملہ میں ہم بھی اس کو حماقت کہتے ہیں۔ جیسے ایک کسان نے اپنی زمین کو جوتا اور اس میں ہل چلایا، بیج ڈالا، پانی پلایا، کھاد ڈالا اور اس کی پوری حفاظت کی، پھر جب کٹائی اور فصل لینے کا وقت آیا تو وہ امید لگائے بیٹھا ہے کہ میرا گھر غلہ سے بھر جائے گا؛ تو اس کا یہ امید رکھنا درست ہے، اور دوسرا کسان ایسا ہے کہ نہ اس نے زمین میں ہل چلایا، نہ بیج ڈلا، نہ کھاد ڈالی، نہ پانی پلایا اور نہ کچھ کیا، لیکن جب فصل کاٹنے کا وقت آیا تو جیسے سب لوگ امید باندھے بیٹھے ہیں؛ یہ بھی امید لگائے بیٹھا ہے، تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس کو بے وقوف ہی کہیں گے، اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا۔

اسی طرح سے دینی معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے امید کا طریقہ بتلادیا ہے ﴿إِنَّ الَّذِينَ يَتْلُونَ كِتَابَ اللَّهِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً يَرْجُونَ تِجَارَةً لَّن تَبُورَ (فاطر:۲۹)﴾ قرآنِ پاک میں ﴿يَرْجُونَ﴾ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے یعنی امید اسی کا نام ہے کہ آپ سارے اسباب کو اختیار کرلیجئے اور پھر امید لگایئے، تب تو بات برابر ہے، اور یہی امید کا صحیح طریقہ بھی ہے۔ اس کے بغیر کوئی آدمی امید لگا رہا ہے، تو اس کا نام امید نہیں ہے بلکہ یہ تو حماقت ہے، اور اسی کا نام ہوس ہے۔

مؤمن کی شان

تو بنیادی چیز میں یہی بیان کرنا چاہتا تھا کہ امید کی حقیقت کیا ہے۔ اور مَیں بار بار یہ کہتا رہتا ہوں کہ دیکھو! ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں کرنے کو کہا ہے، مؤمن ان کو کرتا رہے۔ اور جن چیزوں سے بچنے کے لئے کہا ہے ان سے بچتا رہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے امیدیں قائم کرے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے کرنے کو کہا ہے وہ کر سکتا ہے پھر بھی نہ کرے۔ یا جن چیزوں سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے ان کو جان بوجھ کر اختیار کرے۔ یہ مؤمن کی شان سے بعید ہے۔ مؤمن تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہی رہے گا، اور گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہی رہے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کے دوران کبھی اپنی بیماری کی وجہ سے، یا کمزوری کی وجہ سے اتفاقیہ طور پر کوئی کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا لیکن چھوٹ گیا، تو وہ معافی مانگنے سے معاف ہو جائے گا۔ جیسے آپ کا کوئی نوکر

ایسا ہے جس کو آپ جو کچھ کہتے ہیں وہی کرتا ہے، پھر کسی روز کہی ہوئی کوئی بات اس نے نہیں کی، تو آپ اس پر اس کی گرفت نہیں کریں گے (Let go) کر دیں گے کہ ہمیشہ وہ ہر کام برابر کرتا ہے، آج بیمار ہو گیا ہو گا، خود ہی اس کا عذر نکال لیں گے۔

اسی طرح جن چیزوں سے بچنے کے لئے کہا گیا ہے ان سے بچتا ہے، کبھی اپنے ارادہ سے وہ کام اس نے کئے نہیں ہیں، لیکن غیر اختیاری طور پر اس سے کوئی کام ہو گیا اور اس سے اس نے معافی بھی مانگ لی تو اللہ تعالیٰ اس کو معاف کر دے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں سے منع کیا ہے، آدمی جانتا ہے کہ وہ حرام کام ہیں اور انکا کرنا گناہ ہے اور پھر بھی کرے۔ یہ تو ایمان کے تقاضہ کے سراسر خلاف ہے۔ مؤمن سے تو ایسا ہونا ہی نہیں چاہیے۔ یہ سیدھی سادی بات ہے۔

باب کا مقصد

خیر! علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس کا مقصد یہی ہے کہ اس باب میں وہ ایسی حدیثیں بیان کرنا چاہتے ہیں جن سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید اور رجا پیدا ہو۔ اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سارے اعمال برابر انجام دیتا ہے اور گناہوں سے بچتا بھی ہے، لیکن کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو بعض انسانوں پر اس گناہ ہو جانے کے نتیجہ میں اتنی زیادہ ندامت غالب ہو جاتی ہے کہ وہ یوں سوچنے لگتے ہیں کہ ہم نے یہ کیا کر ڈالا؟ اب ہمارا کیا ہو گا؟ اب تو ہم بالکل ہلاک ہی ہو جائیں گے۔ ایسی مایوسی چھانے لگتی

ہے۔اس باب میں جو حدیثیں آرہی ہیں وہ دراصل اسی قسم کی مایوسی کو ختم کرنے کے لئے ہیں۔ لیکن سیدھی بات ہے کہ جو آدمی کچھ بھی نہیں کرتا،اس کے لئے یہ باتیں نہیں ہیں۔ اس باب کو قائم کرنے کی بنیاد یہی ہے کہ گویا ہمیں یہ تلقین کی جارہی ہے کہ کوئی آدمی باوجود اہتمام کے یہ سوچنے نہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک نافرمانی ہلاکت کا سبب ہوسکتی ہے۔اس سے کہا گیا کہ بالکل مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت بڑی وسیع ہے﴿إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَن كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ (طٰہٰ:۴۸)﴾ اللہ تعالیٰ کا عذاب تو انہیں لوگوں کو ہوگا جنہوں نے رسولوں کی نافرمانی کی اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے رخ پھیرا۔

باری تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے:﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (أعراف:۱۵۶)﴾ میری رحمت ہر چیز کو شامل ہے۔اس جگہ پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ حکم دنیا ہی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دنیا میں مؤمن اور کافر سب کے لئے عام ہے، لیکن آخرت میں تو معاملہ ایمان کی وجہ سے ہوگا۔

جنت میں ضرور جائے گا

حدیث ۴۱۲

عن عبادۃ بن الصامت (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ شَهِدَ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيْكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَ رَسُوْلُهُ ، وَأَنَّ عِيْسٰى عَبْدُ اللّٰهِ وَ رَسُوْلُهُ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِنْهُ، وَأَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ، وَالنَّارَ حَقٌّ أَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ عَلٰى مَا كَانَ مِنَ الْعَمَلِ ۔ (متفق علیه)

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: مَنْ شَهِدَ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ النَّارَ۔

ترجمہ:-حضرت عبادہ بن صامت (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اس بات کی گواہی دے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اور اس بات کی گواہی دے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اور یہ گواہی بھی دے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ کا کلمہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم پر ڈالا ہے (اس لیے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی پیدائش کسی مرد کے نطفہ سے نہیں ہوئی بلکہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کلمۂ کن سے ہوئی ہے۔) اور یہ گواہی دے کہ جنت اور جہنم حق ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے، چاہے جیسے بھی اعمال ہوں گے۔

افادات:-اتنی بات تو طے ہے کہ جب وہ ایمان لے آیا تو اب اس کے کیسے ہی اعمال کیوں نہ ہوں، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے۔ اگر کوئی آدمی دنیا سے ایمان کے ساتھ گیا اور شرک کا کوئی ایسا کام اس نے نہیں کیا جس سے ایمان ختم ہو جائے، تو وہ ایک نہ ایک دن جنت میں ضرور جائے گا۔ یا فوراً جائے گا جس کو دخولِ اولین کہتے ہیں، یا پھر یہاں سے گناہوں کی آلودگی لے کر گیا تھا تو پاک وصاف کرنے کے لئے بھٹّی میں ڈالا جائے گا اور پاک وصاف کرواکر جنت میں بھیجا جائے گا۔ باقی جنت میں ضرور جائے گا۔

طلب سے زیادہ عنایت

حدیث ۴۱۳

وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): يَقُوْلُ اللهُ مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا أَوْ أَزِيْدُ، وَمَنْ جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا أَوْ أَغْفِرُ وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّي شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا، وَمَنْ أَتَانِي يَمْشِيْ أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً، وَمَنْ لَقِيَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطِيْئَةً لَا يُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَقِيْتُهُ بِمِثْلِهَا مَغْفِرَةً۔ (رواہ مسلم)

معنی الحدیث: (مَنْ تَقَرَّبَ) إِلَيَّ بِطَاعَتِيْ (تَقَرَّبْتُ) إِلَيْهِ بِرَحْمَتِيْ۔ وَإِنْ زَادَ زِدْتُ۔ (فَإِنْ أَتَانِيْ يَمْشِيْ) وَأَسْرَعَ فِيْ طَاعَتِيْ (أَتَيْتُهُ هَرْوَلَةً) أَيْ: صَبَبْتُ عَلَيْهِ الرَّحْمَةَ وَسَبَقْتُهُ بِهَا، وَلَمْ أُحْوِجْهُ إِلَى الْمَشْيِ الْكَثِيْرِ فِي الْوُصُوْلِ إِلَى الْمَقْصُوْدِ۔ (وَقُرَابُ الْأَرْضِ) بِضَمِّ الْقَافِ، وَيُقَالُ بِكَسْرِهَا وَالضَّمُّ أَصَحُّ وَأَشْهَرُ وَمَعْنَاهُ: مَا يُقَارِبُ مِلْأَهَا۔ وَاللهُ أَعْلَمُ۔

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ جو آدمی ایک نیکی لے کر آئے گا اس کو دس گنا یا اس سے بھی زیادہ بدلہ دیا جائے گا (گویا نیکی کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کے یہاں کم سے کم دس گنا ملتا ہے، اور زیادہ جتنا اللہ تعالیٰ چاہیں گے دیں گے۔) اور جو آدمی کوئی گناہ کا کام کرے، تو اس کے گناہ کا بدلہ اتنا ہی ہے جتنا اس کا گناہ ہے، یا میں اس کو معاف کردوں گا۔ (اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے وہ چاہے تو معاف کردے) اور جو آدمی مجھ سے ایک بالشت قریب ہوگا، میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوؤں گا (یعنی جو آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کرکے اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ذریعہ سے اس سے ایک ہاتھ قریب ہوں گے، یعنی وہ جتنا بڑھا اللہ تعالیٰ اس سے دوگنا اس کی طرف

متوجہ ہوئے، گویا اس کی طرف سے جتنی طلب ہوتی ہے،وہاں سے اس سے زیادہ عنایت ہوتی ہے جیسے بچہ جب آدھا قدم آگے بڑھاتا ہے تو ماں باپ آگے بڑھ کر اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں بس وہاں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بندہ میرے پاس آنا چاہتا ہے) اور جو آدمی ایک ہاتھ میری طرف بڑھاتو میں اس کی طرف ایک باع یعنی چار ہاتھ متوجہ ہوتا ہوں (آدمی جب دونوں ہاتھ پھیلائے گا تو وہ چار ہاتھ ہو جائیں گے؛اس کو باع کہتے ہیں۔بعضوں نے دو ہاتھ کہا ہے، لیکن صحیح یہی ہے کہ چار ہاتھ مراد ہیں۔)اور جو میری طرف چل کر بڑھے گا تو میں اس کی طرف دوڑ کر بڑھوں گا (مطلب یہ ہے کہ بندے کی طرف سے جو کوشش ہوتی ہے،اللہ تعالیٰ کی طرف سے کئی گنا زیادہ اس کو قبولیت ملتی ہے آج کل کی زبان میں اس کو (Response) کہتے ہیں)اور جو میرے پاس قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ زمین بھر کر گناہ ہوں، لیکن (ایک بات ہے کہ)کسی کو میرے ساتھ شریک نہیں ٹھہراتا تھا؛تو مَیں اتنی ہی مغفرت لے کر اس سے ملتا ہوں۔

افادات:-علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) نے اس حدیث کا مطلب بیان کیا ہے کہ جو میرے قریب ہوا یعنی جس نے میری اطاعت و فرمانبرداری اختیار کی،وہ میرے قریب ہوتا ہے۔یہ بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا ہوا۔اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے قریب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت بندے کی طرف بھیجتے ہیں "وَاِنْ زَادَ زِدتُّ" اگر وہ زیادتی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی زیادتی ہوتی ہے۔ ”اور وہ چل کر آیا“ یعنی میری اطاعت و فرمانبرداری بہت جلدی کی،اس میں تاخیر نہیں کی۔دیکھو!وہاں مقدار بتلائی گئی تھی اور یہاں وقت بتلایا جارہا ہے یعنی بندہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے میں

جتنا وقت لگتا ہے، اس سے زیادہ جلدی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو نوازا جاتا ہے، وہاں سے بدلہ ملنے میں دیر نہیں لگتی۔

واجب کرنے والے دو کام

حدیث ۴۱۴

عَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! مَا الْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ: مَنْ مَاتَ لاَ يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ۔ وَمَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آیا اور عرض کیا: یارسول اللہ! وہ دو کام کونسے ہیں جو واجب کرنے والے ہیں؟ (یعنی جن کا نتیجہ بالکل طے شدہ ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جو آدمی ایسی حالت میں مرا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہے؛ تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اور جو آدمی اس حالت میں مرا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہراتا تھا؛ تو وہ جہنم میں داخل ہوگا (یہ دونوں واجب کرنے والی چیزیں ہیں۔)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

موضوع چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید رکھنی چاہیے، اسی سلسلہ میں آج روایت لائے ہیں۔

نہایت ہی امید افزا روایت

حدیث ۴۱۵

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَّبِي (صلی اللہ علیہ وسلم) وَمُعَاذ رَدِيفُهُ عَلَى الرَّحلِ قَالَ: يَا مُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ۔ قَالَ: يَامُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللهِ وَ سَعْدَيْكَ۔ قَالَ: يَامُعَاذُ! قَالَ: لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللهِ وَسَعْدَيْكَ۔ (ثلاثا) قَالَ: مَامِنْ عَبْدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ صِدْقاً مِنْ قَلْبِهِ إِلَّا حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ قَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَفَلَا أُخْبِرُ بِهَا النَّاسَ فَيَسْتَبْشِرُوْا؟ قَالَ: إِذًا يَتَّكِلُوْا. فَأَخْبَرَ بِهَا مُعَاذٌ عِنْدَ مَوْتِهِ تَأَثُّماً. (متفق علیه)

وَقَوْلُهُ: (تَأَثُّماً) أَيْ خَوْفاً مِنَ الْإِثْمِ فِيْ كَتْمِ هٰذَا الْعِلْمِ۔

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سواری پر تشریف لے جارہے تھے اور حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) آپ کے پیچھے اس سواری پر سوار تھے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اے معاذ! انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں، ارشاد فرمائیے۔ پھر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے معاذ! انہوں نے پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حاضر ہوں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر فرمایا: اے معاذ! انہوں نے پھر عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! حاضر ہوں (دراصل نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور آئندہ جو بات کہی جانے والی ہے اس کی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لیے تین مرتبہ خطاب فرمایا تھا، ورنہ حضرت معاذ تو اسی اونٹ کے اوپر آپ کے پیچھے ہی سوار تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) "یا معاذ" نہ بھی فرماتے اور اپنی بات ارشاد فرمادیتے تو حضرت معاذ سن لیتے، لیکن ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پہلے ان کا نام لے کر آپ نے خطاب فرمایا، پھر جب انہوں نے جواب میں اپنی توجہ کا اظہار فرمادیا تو دوبارہ پھر پکارا، پھر سہ بارہ پکارا جب یہ بات ہوچکی) تو پھر ارشاد فرمایا: اللہ کا جو بندہ اس بات کی سچے دل سے گواہی دے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے بندے اور رسول ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ اس بندے کو جہنم کے اوپر حرام کردیتے ہیں۔

(ظاہر ہے کہ اس روایت میں ایمان والوں کے واسطے کتنی بڑی امید ہے کہ جو ایمان لے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور معبود ہونے کا اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبدیت ورسالت کا اقرار کرتے ہیں، دل سے بھی سچا سمجھتے ہیں اور زبان سے بھی اس کا اقرار کرتے ہیں، صرف اتنی بات پر یہ بشارت سنائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسکو جہنم پر حرام کردیتے ہیں۔)

جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بات ارشاد فرمائی تو حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! (اتنی بڑی بشارت جو آپ نے اہلِ ایمان کے لئے سنائی ہے) مَیں لوگوں کو اس کی اطلاع نہ کردوں؛ تاکہ وہ بھی اس بشارت کو سن کر خوش ہوجائیں؟ (اس لیے کہ جو بھی اہلِ ایمان اس چیز کو سنے گا تو ظاہر ہے کہ اس کو اس پر قلبی مسرت ہوگی اور وہ خوش

ہو گا) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں فرمایا: "إِذًا يَتَّكِلُوا" لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔ پھر حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) نے موت کے وقت گناہ کے ڈر سے یہ روایت بتلادی۔

روایت کرنے سے کیوں منع فرمایا؟

افادات:۔بعض طبیعتیں ایسی ہیں کہ اتنا سننے کے بعد انکے عمل کا جذبہ کمزور ہو جائے گا اور اعمال کر کے جو اونچے مراتب حاصل کر سکتی ہیں ان سے محروم رہ جائیں گی۔ایک تو ہے اس کا جہنم پر حرام ہونا اور جنت میں پہنچ جانا، اور ساتھ ہی جنت میں پہنچنے کے بعد وہاں کے مراتب کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہے، آدمی جیسے جیسے اعمال کرے گا اور اس میں جتنی محنت کوشش و مجاہدہ کرے گا، اس کو اللہ تعالیٰ جنت میں اتنا ہی اونچا مقام عطا فرمائیں گے تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ آپ لوگوں کو یہ بات سنادیں گے تو ہو سکتا ہے کہ بعض طبیعتیں اس کو سننے کے بعد اعمال کے معاملہ سست پڑ جائیں ،اور اعمال کر کے جو مراتب حاصل کر سکتی ہیں، ان کے معاملہ میں کوتاہی سے کام لینے لگیں۔اور اس بشارت پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں کہ چلو! ہم کلمہ تو پڑھتے ہی ہیں ، ہم کو اتنی گارنٹی تو مل ہی گئی ہے، اس لئے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ابھی لوگوں کو کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس روایت کا پتہ کیسے چلا؟

راوی کہتے ہیں کہ جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتلانے سے منع فرمادیا تھا تو اس روایت کا پتہ کیسے چلا؟ تو حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کی وفات کا وقت آیا تو چونکہ حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے ایک ذمہ داری یہ بھی سونپی گئی تھی "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" جو سننے والے موجود ہیں وہ ان لوگوں تک [جو ابھی موجود نہیں ہیں] میری بات پہنچادیں۔ یہ ایک ذمہ داری ان کے حوالہ کی گئی تھی اس لئے جب حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کی موت کا وقت آیا تو یہ سوچ کر کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے دی گئی یہ بشارت کہیں میرے ساتھ قبر میں نہ چلی جائے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد امت تک پہنچنے سے رہ جائے، اس لئے بالکل آخری وقت میں گناہ سے بچنے کے لئے انہوں نے یہ بات لوگوں کو بتلائی۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) خود اس کی تشریح فرماتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ایک علم جو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عطا فرمار کھا تھا وہ چھپارہ جائے، اور اس کی وجہ سے سر پر ایک گناہ آجائے، اس لئے مرتے وقت یہ بات لوگوں کو بتلا کر گئے۔

عشق است وہزار بدگمانی

ویسے یہ بشارت نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک اور موقع پر بھی ارشاد فرمائی تھی۔ مسلم شریف میں (مسلم شریف، ۱۶۵) روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کے درمیان تشریف فرما تھے، اچانک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے درمیان سے اٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے، صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) یہ سمجھے کہ آپ اپنی کسی ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، تھوڑی دیر انتظار کیا لیکن جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف نہیں لائے تو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی۔ اس لئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمن بھی بہت تھے جو آپ کو مختلف طریقوں سے ایذاء پہنچانے کے درپے رہتے تھے، اور پھر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جو محبت تھی اس کی وجہ سے ان کے دلوں میں یہ خیال آیا کہ کہیں کچھ ہو تو نہیں گیا۔ جیسے ایک بچہ ماں کے بازو میں لیٹا ہوا ہے، اور اس کی سانس کی آواز نہیں آتی تو ماں ایک دم سے بیٹھ کر دیکھنے لگ جاتی ہے کہ اس کو کچھ ہوا تو نہیں۔

کسی کا کوئی عزیز قریب جس سے اس کو محبت ہے، اگر وہ بیمار ہو اور سانس کا پتہ نہ چلتا ہو، تو وہ اس کے چہرہ کے قریب کان لے جاتا ہے، اس کو ہاتھ لگا کر دیکھتا ہے، اس کی نبض دیکھتا ہے، یہ محبت کا لازمی تقاضہ ہے۔ ”عشق است وہزار بدگمانی“ جیسا معاملہ ہوتا ہے۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) رات کو عبادت میں مصروف ہوئے، جب سجدہ میں تشریف لے گئے تو دیر تک سجدہ میں رہے، وہ فرماتی ہیں کہ

مجھے اندیشہ لاحق ہوا، مَیں نے اُٹھ کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قدمِ مبارک پر ہاتھ رکھ کر دیکھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ روح پرواز کرگئی ہو۔ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے، جو لوگ اس کیفیت سے گذر چکے ہیں وہ اس چیز کو بہت آسانی کے ساتھ محسوس کرسکتے ہیں۔ بہر حال! حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو یہ فکر لاحق ہوا کہ آپ کہاں تشریف لے گئے، سب آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے۔

جنت کی خوشخبری سنادو

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک باغ کے متعلق مجھے خیال ہوا تو میں نے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈا، لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ کے پانی کے باہر نکلنے کی جو نالی تھی اس میں سے ہو کر میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس باغ میں تشریف فرما ہیں، مَیں نے جاکر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان سے اچانک اٹھ کر چلے آئے اور دیر ہوگئی تو سب پریشان ہوگئے، اور سب ہی آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے ہوئے ہیں، مَیں بھی اسی لئے نکلا تھا اور اس باغ میں آنے کا کوئی راستہ نہیں ملا تو پانی نکلنے کی نالی سے میں اندر گُھسا ہوں اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ معلوم ہوا کہ حضراتِ صحابہ پر یہ کیفیت گذری، تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کو اپنے نعلین مبارک دے کر یہ فرمایا کہ جاؤ اور جو بھی تمہیں راستہ میں ملے، جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور مَیں اللہ کا بندہ اور

رسول ہوں ؛اس کو جنت کی خوشخبری سنادو۔گویا اس طریقہ سے صحابہ کرام کی طبیعتوں پر آپ کے ساتھ محبت کی وجہ سے جو فکر لاحق ہوا تھا اورانہوں نے کلفت کی جو کیفیت محسوس کی تھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی تلافی فرمانا چاہتے تھے۔چوں کہ اہلِ ایمان کو ایمان کی وجہ ہی سے آپ سے محبت تھی، اسی ایمان پر یہ خوشخبری سنائی جارہی ہے۔

کہیں لوگ بھروسہ کرکے نہ بیٹھ جائیں

خیر!حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نعلین مبارک لے کر خوشی خوشی باہر نکلے اوراتفاق کی بات یہ ہوئی کہ سب سے پہلے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے ملاقات ہوگئی،اب حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) تو بڑے جوش وخروش کے ساتھ جارہے تھے،حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ اے ابوہریرہ!کیا بات ہے؟ تمہارے ہاتھ میں یہ جوتیاں کیسی؟کہاں جارہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جوتیاں مبارک ہیں اورمجھے حضور نے فرمایا ہے کہ جو بھی اہلِ ایمان تمہیں راستہ میں ملے اس کو جنت کی خوشخبری سنادو،اس لئے مَیں جارہا ہوں۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ان کے سینے پر ایسی زور سے ہاتھ مارا کہ حضرت ابوہریرہ گر گئے اور کہا کہ واپس جاؤ۔اس طرح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ان کو واپس کیا۔اب حضرت ابوہریرہ آگے آگے اور حضرت عمر پیچھے پیچھے، دونوں اسی باغ میں پہنچے۔حضرت ابوہریرہ تو بالکل رونے کے قریب ہوگئے تھے،انہوں نے جاکر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسول!آپ نے مجھے یہ ذمہ داری سونپی تھی،مَیں اسی کی ادائیگی کے لئے جارہا تھا اور حضرت عمر سے ملاقات ہوگئی،انہوں نے مجھے

منع کر دیا اور کہا کہ واپس چلو۔اتنی دیر میں حضرت عمر بھی وہاں پہنچ گئے اور نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ان کو بھیجا تھا؟ کہا: ہاں۔ پوچھا کہ وہ آپ کی جوتیاں مبارک تھیں ؟ کہا: ہاں ۔ عرض کیا کہ کیا اس لئے بھیجا تھا کہ لوگوں کو خوشخبریاں سنائیں ؟ کہا: جی ہاں۔ تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ایسا نہ کیجئے، کہیں لوگ اس پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں ۔ تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ٹھیک ہے، کسی کو اطلاع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا ایک پہلو یہ بھی تھا اور دوسرا پہلو وہ بھی تھا جو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ملحوظ رکھتے ہوئے صحابہ کی دلجوئی کے لئے بشارت سنانے کے لئے بھیجا تھا، لیکن جب دوسرا پہلو آپ کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے روک دیا کہ ٹھیک ہے، کسی کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ بات لوگوں کو بتلائی نہ جائے، بلکہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے عرض کرنے کا حاصل یہ تھا کہ یہ پہلو بھی ہونے کی وجہ سے مناسب یہ ہے کہ ابھی لوگوں کو اس بات کی اطلاع نہ دی جائے، اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے یہ عرض کیا تھا کہ اے اللہ کے رسول! لوگوں کو ابھی عمل کرنے دیجئے ، ورنہ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے

بات ایک ؛ اثر مختلف

ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کا اثر مختلف طبیعتوں پر مختلف ہوتا ہے، ایک ہی بات مختلف آدمیوں کے سامنے کہی جائے تو سننے والوں کے مزاج کے اعتبار سے اس بات کا

اثر ضروری نہیں کہ ایک پر جیسا ہوا، دوسرے پر بھی وہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ دوسرے پر کوئی دوسرا اثر ہو۔ آخر جن حضرات کو دنیا میں جنت کی بشارت سنائی گئی تھی جن کو عشرۂ مبشرہ کہا جاتا ہے، اسی طرح صحابہ میں ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے حضرات ہیں جن کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے دنیا ہی میں جنت کی بشارت سنائی گئی تھی، لیکن جیسا کہ آپ حضرات نے پڑھا اور سنا ہو گا کہ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ کاش! مَیں کوئی تنکا ہوتا۔ کاش! مَیں کوئی گھاس ہوتا جس کو کوئی جانور کھا جاتا۔ حالاں کہ یہ وہ لوگ تھے جن کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے جنت کی بشارت مل چکی تھی۔ اور ایک حال ہمارا ہے کہ اگر ایک مہینہ تک پابندی کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دی تو ہم ایسا سمجھنے لگتے ہیں کہ اب حضرت جبرئیل وحی لے کر آنے ہی والے ہیں ۔ دراصل مَیں مزاجوں کا فرق بتلانا چاہتا ہوں ۔

طبیعتوں کا فرق ... ایک مثال

شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا ہے :-

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

بارش کی خوبی میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہو سکتا، کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ بارش میں عیب ہے، بارش کا پانی تو ماشاء اللہ ہوتا ہے، اس میں تو کوئی کلام ہو ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہی

بارش کا پانی باغ میں جب پہنچتا ہے تو اس میں پھول کھلتے ہیں ، اور یہی بارش کا پانی جب کھاری زمین میں پڑتا ہے؛ تو وہاں کانٹے اُگتے ہیں۔

دوسری مثال

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک لوگوں کی ہدایت کے واسطے نازل کیا ہے ،اس کے باوجود قرآنِ پاک ہی میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ اللہ تعالیٰ اسی قرآن کے ذریعہ سے بہت سوں کو گمراہ بھی کرتا ہے، اور بہت سوں کو ہدایت بھی عطا فرماتا ہے۔دراصل یہ طبیعتوں کا فرق بتایا گیا ہے،اس میں نعوذباللہ قرآنِ پاک کی کوئی خرابی نہیں ہے۔جیسے بارش کے پانی میں کسی کو کوئی اشکال نہیں ہے بلکہ وہ پانی جہاں گرا ہے ،اس جگہ کی خرابی کی وجہ سے اس میں خرابی پیدا ہوئی۔

تیسری مثال

ایک عمدہ غذا اور بہترین خمیرہ کسی تندرست آدمی کو کھلایئے جس کا معدہ غذا کو ہضم کرتا ہے تو یہ غذا اس کے پیٹ میں جاکر صالح خون اور قوت پیدا کرے گی اور یہی غذا کسی ایسے آدمی کو کھلایئے جس کو ہیضہ اور کولیرا ہو گیا ہو،تو وہ آدمی مرجائے گا۔یہ سمجھنے کی بات ہے۔اسی کو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ ایک ایسی بات ہے جو امت تک پہنچانی ضروری ہے،لیکن سب کا حال ایک سا نہیں ہوتا۔

اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا

حضرت معاذ(رضی اللہ عنہ)نے جب خبر دینے کی اجازت مانگی تو حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)نے جواب میں صرف اتنا ہی اشاد فرمایا: "اِذاً یَتَّکِلُوا" لوگ بھروسہ کرکے بیٹھ جائیں گے، یہ نہیں فرمایا کہ کسی کو خبر مت کریو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم لوگوں کو اس بات کی خبر دینا چاہو تو اس پہلو کو بھی سامنے رکھنا۔ چنانچہ اسی پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) نے پوری زندگی تو کسی کو اس بات کی خبر نہیں دی، لیکن مرتے وقت اطلاع دی کہ بھائی دیکھو! میرے پاس نبیِ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کے ارشادات کے قبیل سے جو کچھ تھا وہ سب تو مَیں پہنچا چکا ہوں ، لیکن یہ ایک بات ہے جو میں ابھی تک نہیں پہنچا پایا ہوں۔ اب ظاہر ہے کہ ایک آدمی اتنی ساری چیزوں کا خیال رکھتے ہوئے اور اتنے اہتمام سے مرتے وقت آخر میں یہ چیز بتا کر گیا ہو، تو پھر دوسرا جو خطرہ والا پہلو تھا وہ باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے انہوں نے اس بات کی خبر دیدی، اور اپنا ذمہ بھی پورا کردیا۔

اس روایت میں ایمان والوں کے واسطے بہت بڑی بشارت ہے کہ جو آدمی سچے دل سے ایمان لاتا ہے ، اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام کردیتے ہیں۔

اہم اور قابلِ فہم بحث

یہاں ایک بات یاد رہے کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ جو کلمہ پڑھے گا وہ جنت میں جائے گا،اور جو فلاں گناہ کرے گا وہ جہنم میں جائے گا۔شرک کی وجہ سے کبھی جنت میں نہیں جاسکتا۔غرض کہ مختلف باتوں پر مختلف چیزیں سنائی گئیں ہیں۔حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ اس میں دراصل ہر عمل کی ایک خاصیت بتلائی ہے،جیسے ڈاکٹری اور طب کی جو کتابیں ہوتی ہیں ان میں ایک تو کتابیں وہ ہوتی ہیں جن میں مفردات کو بتایا جاتا۔یعنی ایک جڑی بوٹی کے بارے میں بتایا گیاہے کہ اس کی خاصیت یہ ہے،اگراس کو کھاؤگے تو یہ ہوگا۔دوسری جڑی بوٹی کی خاصیت یہ بتائی ہے کہ اس کو کھاؤگے تو یہ ہوگا۔ ہرایک کی الگ الگ خاصیت بتائی گئی ہے۔مفردات میں یہی ہوا کرتا ہے۔

اسی طرح یہاں اعمال کے متعلق آیا کہ مثلاًکسی کے دل میں ذرہ برابر بھی کبر ہووہ جنت میں نہیں جائے گا۔اوردوسری طرف یہ بھی آیاہے کہ جس نے لاالٰہ الااللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔اب سوال پیدا ہوا کہ یہ کیا بات ہے؟بظاہران دونوں باتوں میں تعارض سا معلوم ہوتا ہے۔تودراصل ہر عمل کا الگ الگ خاصہ بتلایا گیاہے۔فقط ایمان کی خاصیت یہ بتلائی کہ وہ جنت میں لے جائے گا۔اوراِدھر کبر کی خاصیت اور نقصان یہ بتلایا کہ وہ جہنم میں لے جائے گا۔توجن احادیث میں اس طرح مختلف اعمال پر مختلف چیزیں بتلائی گئی ہیں

وہ دراصل ہر ہر عمل کا الگ الگ خاصہ بتلایا گیا ہے، لیکن اب اگر اس طرح کی کئی چیزیں جمع ہو جائیں تو کیا ہو گا؟

اس کو اسی مثال سے سمجھئے کہ جیسے کوئی طبیب یہ بتلائے کہ کیلا کھاؤ گے تو سردی ہو جائے گی، اور الائچی کھاؤ گے تو گرمی ہو جائے گی۔ تو الائچی اور کیلے کی خاصیت الگ الگ بتلائی، لیکن کسی نے الائچی بھی کھائی اور کیلا بھی کھایا؛ تو اب کیا ہو گا؟ وہ اس طبیب نے نہیں بتلایا تھا۔ اس لئے اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ دونوں چیزیں اندر جا کر کیا اثر دکھلاتی ہیں اور اس کی طبیعت ان دونوں کا کیا اثر لیتی ہے، اور اندر دونوں کے جمع ہونے کے بعد کیا نتیجہ پیدا ہوتا ہے، اور کون کس پر غالب آتا ہے، یہ ایک الگ چیز ہے جو بعد میں جا کر پتہ چلے گی۔

اسی طریقہ سے یہاں پر بھی ہے کہ نیک اعمال کی خاصیتیں بتلائی ہیں کہ فلاں نیک عمل کی وجہ سے یہ ہو گا، اور فلاں عمل کی وجہ سے یہ ملے گا۔ اور اسی طرح برے اعمال اور گناہوں کا نقصان بتلایا کہ یہ کرو گے تو یہ ہو گا اور یہ کرو گے تو یہ ہو گا۔ ہر عمل کو الگ الگ کر کے بتلایا۔ اب اگر دونوں جمع ہو جائیں تو کیا ہو گا؟ تو وہ تو وہاں جا کر ہی پتہ چلے گا لیکن یہ بات ضرور ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والا جنت میں ضرور جائے گا۔ یہ بڑی اہم اور قابلِ فہم بحث ہے، اس لئے اس کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔

خیر! باب کا عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنی چاہیے تو جو بھی اہلِ ایمان ہیں ان کے لئے اس روایت سے بہت بڑی امید قائم ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ سے ان کی حفاظت فرمائیں گے۔

ان دو چیزوں کو لے کر جائے

حدیث ۴۱۶

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَوْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا (شَكَّ الرَّاوِي، وَلَا يَضُرُّ الشَّكُّ فِي عَيْنِ الصَّحَابِيِّ، لِأَنَّهُمْ كُلُّهُمْ عُدُولٌ) قَالَ: لَمَّا كَانَ غَزْوَةُ تَبُوكَ، أَصَابَ النَّاسَ مَجَاعَةٌ، فَقَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ! لَوْ أَذِنْتَ لَنَا فَنَحَرْنَا نَوَاضِحَنَا فَأَكَلْنَا وَادَّهَنَّا؟ فَقَالَ: رَسُولُ اللهِ (ﷺ): افْعَلُوا۔ فَجَاءَ عُمَرُ (رضی اللہ عنہ) فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنْ فَعَلْتَ قَلَّ الظَّهْرُ، وَلَكِنِ ادْعُهُمْ بِفَضْلِ أَزْوَادِهِمْ، ثُمَّ ادْعُ اللهَ لَهُمْ عَلَيْهَا بِالْبَرَكَةِ، لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَجْعَلَ فِي ذَلِكَ الْبَرَكَةَ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ): نَعَمْ۔ فَدَعَا بِنِطَعٍ فَبَسَطَهُ، ثُمَّ دَعَا بِفَضْلِ أَزْوَادِهِمْ، فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيءُ بِكَفِّ ذُرَةٍ وَيَجِيءُ بِكَفِّ تَمْرٍ وَيَجِيءُ الْآخَرُ بِكِسْرَةٍ حَتَّى اجْتَمَعَ عَلَى النِّطَعِ مِنْ ذَلِكَ شَيْءٌ يَسِيرٌ، فَدَعَا رَسُولُ اللهِ (ﷺ) بِالْبَرَكَةِ۔ ثُمَّ قَالَ: خُذُوا فِي أَوْعِيَتِكُمْ فَأَخَذُوا فِي أَوْعِيَتِهِمْ حَتَّى مَا تَرَكُوا فِي الْعَسْكَرِ وِعَاءً إِلَّا مَلَأُوهُ وَأَكَلُوا حَتَّى شَبِعُوا وَفَضَلَ فُضْلَةٌ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ): أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَأَنِّي رَسُولُ اللهِ، لَا يَلْقَى اللهَ بِهِمَا عَبْدٌ غَيْرَ شَاكٍّ فَيُحْجَبَ عَنِ الْجَنَّةِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ یا حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ جب غزوۂ تبوک ہوا تو لوگوں کو بڑی بھوک کا سامنا ہوا (یعنی اس غزوہ میں سامانِ سفر زیادہ نہیں تھا، اس کی وجہ سے دورانِ سفر فاقے بھی بہت ہوئے) تو حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا کہ اے اللہ کے

رسول! اگر آپ اجازت دیں تو ہم اپنے اونٹوں کو ذبح کریں اور اس کا گوشت کھانے میں استعمال کرلیں (''نَوَاضِحُ''، ''نَاضِحَۃ'' کی جمع ہے، پانی کھینچنے کے لئے جو اونٹ ہوا کرتا ہے، اس کے لیے بولا جاتا ہے، لیکن یہاں مطلق اونٹ مراد ہے) اور اس کی چربی سے جو تیل نکلے اس کو جسموں پر لگائیں (گرمی کی وجہ جسم کی کھال جو سخت ہوجاتی وہ بھی نرم رہے گی) نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا کہ ٹھیک ہے ایسا کرلو۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ویسے بھی سواریوں کی کمی ہے (ایک اونٹ پر باری باری کئی کئی آدمی سوار ہوتے ہیں) اگر آپ اونٹوں کو ذبح کرنے کی اجازت دیدیں گے تو (ابھی سفر جاری ہے) سواریاں اور بھی کم ہوجائیں گی، اس لئے آپ ایسا کیجئے کہ لوگوں کو حکم دیجئے کہ ہر ایک کے توشہ دان میں جو کچھ بچا کھچا ہو، وہ حاضر کریں اور جب سب آجائے تو آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے، اللہ تعالیٰ آپ کی دعا کی برکت سے سب کی ضرورتیں پوری کردے گا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ہاں! یہ بات ٹھیک ہے۔ چناں چہ ایک چمڑا لایا گیا (جو عام طور پر اُس زمانہ میں دسترخوان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا) اس کو بچھا کر اعلان کردیا گیا کہ جس کے توشہ دان میں جو کچھ بچا ہو، سب لاؤ اور یہاں جمع کرداو۔ چنانچہ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ لے آیا، کوئی آدمی صرف ایک مٹھی مکئی لے کر آیا، اور کوئی ایک مٹھی کھجور لے کر آیا، کسی کے پاس روٹی کا ایک ٹکڑا تھا تو وہ لے کر آیا۔ جس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب لاکر اس چمڑے پر ڈال دیا، یہاں تک کہ پورے لشکر کے پاس سے ملاکر اس چمڑے کے ٹکڑے پر بہت قلیل مقدار جمع ہوگئی (حالاں کہ ایک قول کے مطابق چالیس ہزار کا لشکر تھا، اور ایک قول کے مطابق ستر ہزار کا لشکر تھا) خیر! نبیٔ کریم (ﷺ) نے برکت کی دعا فرمائی اور فرمایا کہ اپنے اپنے برتن بھرلو۔ چناں چہ سب نے اپنے برتنوں کو بھرنا شروع کیا تو پورے لشکر میں کوئی برتن ایسا نہیں بچا جو بھرنہ گیا ہو (چالیس ہزار کے لشکر کے پاس جتنے برتن تھے وہ سب بھر گئے) اور اس میں سے سب نے کھایا، یہاں تک کہ سب نے پیٹ بھر کر کھایا پھر بھی

اس میں بچ گیا (یہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی دعا کی برکت تھی) پھر نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا: "أَشْهَدُ أَنَّ لَاإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهَ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ" مَیں اس بات کی گواہی دیتاہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اورمَیں اللہ کا رسول ہوں۔(ایساکوئی بھی معجزہ جب نبیٔ کریم (ﷺ) کے دستِ مبارک پرظاہر ہوتاتھایاآپ کی بیان فرمائی ہوئی کوئی پیشین گوئی رونما ہوتی تھی تو آپ (ﷺ) یہ جملہ ارشادفرماتے تھے کہ مَیں اس بات کی گواہی دیتاہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اورمَیں اللہ کا رسول ہوں۔گویاآپ کے رسول ہونے کی ایک علامت اورنشانی لوگوں کے سامنے ظاہر ہوئی جس کودیکھ کرلوگ اس کوتسلیم کررہے ہیں اورویسے بھی وہ تواہلِ ایمان تھے گویاان کو مزید ثبوت فراہم ہوا۔)

(پھر حضورنے فرمایا)جو اللہ کا بندہ ان دونوں چیزوں کو (یعنی توحید و رسالت؛ اللہ تعالیٰ کی الوہیت،اورنبیٔ کریم (ﷺ) کے اللہ کارسول ہونے کا اقرار)لے کر اللہ تعالیٰ کے پاس جائے گا کہ اس کے دل میں توحیدورسالت کے بارے میں ذرہ برابرتردّد اور شک وشبہ نہیں ہوگا(جس کو یقین کہتے ہیں)توپھراس کے اورجنت کے درمیان کوئی حجاب اورپردہ نہیں ہوگا۔

افادات:-کوئی آدمی اگر یہ دوچیزیں-توحیداوررسالت کااقرار-لے کر اللہ کے دربارمیں پہنچ گیاتوپھروہ جنت سے روکانہیں جائے گا،اس کوجنت میں داخلے کا پروانہ مل جائے گا۔گویایہ بھی بہت بڑی بشارت ہے،اس لئے اس روایت کو امید والے باب میں ذکرکیا گیا ہے۔

غزوۂ تبوک

غزوۂ تبوک ۹ھ میں ہوا تھا۔"تبوک" جزیرۃ العرب میں مدینہ منورہ سے شام جاتے ہوئے ایک علاقہ ہے اور وہیں سے قیصرِ روم کی مملکت کے حدود شروع ہوتے تھے،شام کے نبطی سوداگر زیتون کا تیل فروخت کرنے مدینہ منورہ آیا کرتے تھے،ان کے ذریعہ سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ خبر ملی کہ قیصرِ روم نے ایک بہت بڑا لشکر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا ہے،جس کا مقدمۃ الجیش مقامِ بلقاء تک پہنچ گیا ہے اور ہرقل نے تمام فوج کو سال بھر کی تنخواہیں بھی تقسیم کردی ہیں۔ اور پھر اس علاقہ میں غسان، بنو قین وغیرہ جو قبائل آباد ہیں ،وہ بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں،اور وہ سب مل کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں ،جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا کہ وہ ہم پر لشکر لے کر آویں ،اس سے پہلے ہم ہی جا کر ان سے مقابلہ کریں گے۔لہٰذا نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام کو تیاری کا حکم دیا۔چوں کہ یہاں مقابلہ دنیا کی ایک بہت بڑی حکومت اور سلطنت سے تھا جو اس زمانہ کی سپر پاور سمجھی جاتی تھی۔اُس زمانہ میں دو ہی حکومتیں سپر پاور تھی، ایک تو یہی روم کی حکومت تھی جس کا بادشاہ قیصر کہلاتا تھا اور دوسری فارس کی حکومت تھی جس کا بادشاہ کسریٰ کہلاتا تھا۔تو یہاں روم والوں کی طرف سے لشکر آرہا تھا،اور اِدھر مدینہ منورہ میں جو مسلمان آباد تھے ان کا حال جو تھا وہ سب کے علم میں ہے، اس لیے اس موقع پر نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی۔ اس

لیے کہ جنگ کی تیاری کے لئے سواریوں اور ہتھیاروں وغیرہ بہت کچھ چیزوں کی ضرورت پیش آتی ہے،اوراس زمانہ میں الگ سے توکوئی نظام تھا نہیں، جیسے آج کل تمام ممالک کے بجٹ کے اندراس کے لیے ایک الگ سے حصہ رکھا جاتا ہے۔اور ہر مسلمان کے اوپر فوجی تعلیم ضروری ہے، وقت آنے پرجب یہ کہا جائے کہ جہاد کے لئے نکلنا ہے توہر ایک کے لئے نکلنا ضروری ہو جاتا ہے،اسلامی تعلیم یہی ہے۔ خیر! حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)نے اعلان فرمادیا کہ تیاری کرو۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ویسے تو حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کسی دشمن کے مقابلہ کے لئے لشکر تیار کراتے تھے توبتلاتے نہیں تھے کہ کہاں جانا ہے (بخاری شریف،۴۴۱۸) جنگ کی مصلحت کا تقاضہ یہی ہوتا ہے، کسی مہم کو سر کرنے کے لئے جب کوئی ٹکڑی بھیجی جاتی ہے توپہلے سے بتایا نہیں جاتا۔ اس کے سردار کو بھی عین وقت پر بتاتے ہیں اوروہ سردار بھی اپنے ساتھیوں کو تو بتاتا ہی نہیں ،بلکہ ساتھ لے کرجاتا ہے کہ ایک جگہ جانا ہے اوریہی رازداری کا تقاضہ ہوا کرتا ہے۔لیکن اس موقع پر چوں کہ دور کا سفر تھااور مقابلہ بھی ایک طاقتور دشمن سے تھا،اس لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)نے صاف صاف بتلادیا تھا کہ تبوک جانا ہے ، اور فلاں دشمن سے مقابلہ ہے تاکہ جیسی پُرزور تیاری کرنا چاہیں وہ کرلیں ،اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی اپیل کی تھی۔چناں چہ یہ وہی موقع تھا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے جس کو جو حیثیت دی

تھی وہ اس کے مطابق لے کر حاضر ہوا۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اللہ کے راستہ میں دینے کے لئے اپنے گھر کا سب کچھ لے کر حاضر ہوئے اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے پاس جو کچھ تھا اس کا آدھا لے کر آئے۔

کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اس وقت جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی تو مجھے معلوم تھا کہ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کا ہاتھ اس وقت کشادہ نہیں ہے، اور میری حالت اس وقت ذرا اچھی تھی، تو میں نے سوچا کہ اگر کسی موقع پر حضرت ابو بکر سے میں آگے بڑھ سکتا ہوں تو یہی موقع ہے، اس لئے میرے پاس جو کچھ تھا اس کا آدھا لے کر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اُدھر حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے پاس جو کچھ بھی تھا وہ سارا لے کر حاضر ہوئے۔ مربی کی شان دیکھئے کہ ویسے کبھی یہ پوچھا نہیں جاتا تھا کہ کیا لے کر آئے اور کیا چھوڑ کر آئے، لیکن اس روز نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ گھر پر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ آدھا چھوڑ کر آیا ہوں۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا: گھر پر کیا چھوڑ کر آئے ہو؟ انہوں نے کہا کہ جو کچھ تھا وہ سب لے کر آیا ہوں۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ مَیں دل میں سوچنے لگا کہ مَیں کبھی ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ آپ سیرت کا مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے

گا کہ کبھی آپ (ﷺ) نے ایسا سوال نہیں فرمایا، صرف یہی ایک موقع ہے جب آپ (ﷺ) نے یہ پوچھا۔ اس میں بھی گویا ان لوگوں کی تربیت مقصود ہے۔

صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کی قربانی

خیر! اس موقع پر حضورِ اکرم (ﷺ) نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی، اور لوگوں نے بھی اسوقت خوب خرچ کیا، سب سے پہلے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے پورا مال پیش کیا جو تقریباً چار ہزار درہم تھے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) آدھا مال لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ اور جو بڑے مالدار صحابہ تھے جیسے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ)؛ انہوں نے نوسو (۹۰۰) اونٹ اور سو (۱۰۰) گھوڑے سازوسامان کے ساتھ اور نقد روپئے الگ؛ اتنا سب نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں پیش کیا۔ اور حضرت عبد الرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) دو سو اوقیہ چاندی لے کر حاضر ہوئے۔ حضرت عباس (رضی اللہ عنہ)، حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہ)، حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ)، حضرت محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عاصم بن عدی (رضی اللہ عنہم) اور دوسرے حضراتِ صحابہ میں سے ہر ایک نے اپنی حیثیت کے مطابق بہت کچھ دیا، یہاں تک کہ بعض حضرات کے پاس کچھ نہیں تھا تو انہوں نے مزدوری کی اور شام کو ایک یا دو صاع کھجوریں جو مزدوری میں ملیں، وہی لا کر نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں پیش کر دیں۔ بہر حال! لشکر روانہ ہوا۔ (الرحیق المختوم) اور پھر اس سے پچھلے سال قحط سالی ہوگئی تھی اور اس وقت کھجوروں کے پکنے کا زمانہ تھا، شدید گرمی تھی، اور مدینہ والے چونکہ کھیتی باڑی والے لوگ تھے اور باغ والوں

کی عادت ہوتی کہ وہ اپنا سب سامان لے کر باغات میں چلے جاتے ہیں ، جیسے ہمارے یہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ جن کے آم کے باغات ہوتے ہیں،جب آم کے پکنے کا زمانہ آتا ہے تو وہ پورے خاندان کے ساتھ باغ کے اندر چلے جاتے ہیں،وہیں چھوٹا سا مکان بنا ہوا ہوتا ہے ،جب تک پوری فصل وصول نہ کرلیں تب تک وہیں قیام رہتا ہے۔ مدینہ والوں کے یہاں بھی یہی دستور تھا اور باغات کے اندر ٹھنڈک بھی اچھی ہوتی ہے۔ اُدھر کھجوروں کے کاٹنے کا عین وقت آیا تھا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے نکلنے کا مطالبہ ہوا۔ حضراتِ صحابہ تو ہر وقت تیار ہی رہتے تھے،وہ سب روانہ ہوئے۔ البتہ کچھ حضرات کی طرف سے تھوڑی سی کوتاہی ہوئی تو ان کو تنبیہ ہوئی۔ جب مقامِ تبوک پر پہنچے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہاں قیام فرمایا تو کوئی لشکر نہیں آیا، روایتوں میں ہے کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب ڈال دیا کہ ان کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں پندرہ روز اور ایک قول کے مطابق پچیس روز قیام پذیر رہے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی، تو پھر وہاں سے واپس تشریف لائے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ طیبہ کا یہ آخری غزوہ تھا،اس کے بعد کوئی غزوہ پیش نہیں آیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ کی ذات سے آدمی کو امید رکھنی چاہیے ،یہ مضمون پچھلی کئی مجلسوں سے چل رہا ہے،اس سلسلہ میں احادیث بیان کررہے ہیں۔

سچے دل سے کلمہ طیبہ پڑھنے پر وعدہ

حدیث ۴۱۸

وعَنْ عِتْبَان بن مالك (رضی اللہ عنہ) وَهُوَمِمَّنْ شَهِدَ بَدْراً ،قَالَ: كُنْتُ أُصَلِّي لِقَوْمِي بَنِي سَالِمٍ، وَكَانَ يَحُولُ بَيْنِي وَبَيْنَهُمْ وَادٍ إِذَا جَاءَتِ الْأَمْطَارُ، فَيَشُقُّ عَلَيَّ اجْتِيَازُهُ قِبَلَ مَسْجِدِهِمْ، فَجِئْتُ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقُلْتُ لَهُ:إِنِّي أَنْكَرْتُ بَصَرِي وإِنَّ الْوَادِيَ الَّذِي بَيْنِي وَبَيْنَ قَوْمِي يَسِيلُ إِذَا جَاءَتِ الأَمْطَارُ فَيَشُقُّ عَلَيَّ اجْتِيَازُهُ فَوَدِدْتُ أَنَّكَ تَأْتِي فتُصَلِّي فِي بَيْتِي مَكَاناً أَتَّخِذُهُ مصَلَّى . فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): سَأَفْعَلُ . فغَدَا رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَأَبُو بَكْرٍ (رضی اللہ عنہ) بَعْدَ مَا اشْتَدَّ النَّهَارُ-وَاسْتَأْذَنَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَأَذِنتُ لَهُ، فَلَمْ يَجْلِسْ حَتَّى قَالَ:أَيْنَ تُحِبُّ أَنْ أُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ؟ فَأَشَرْتُ لَهُ إِلى الْمَكَانِ الَّذِي أُحِبُّ أَنْ يُصَلِّيَ فِيهِ-فَقَامَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَكَبَّرَ وَصَفَفْنَاوَرَاءَهُ فَصَلَّى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ وَسَلَّمْنَاحِيْنَ سَلَّمَ- فَحَبَسْتُهُ عَلى خَزِيْرَةٍ تُصْنَعُ لَهُ-فَسَمِعَ أَهْلُ الدَّارِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فِي بَيْتِي. فَثَابَ رِجَالٌ مِنْهُمْ حَتَّى كَثُرَ الرِّجَالُ فِي الْبَيْتِ. فَقَالَ رَجُلٌ:مَافَعَلَ مَالِكٌ لا أَرَاهُ! فَقَالَ رَجُلٌ :ذٰلِكَ مُنَافِقٌ،لاَ يُحِبُّ اللهَ وَرَسُولَهُ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم):لاَتَقُلْ ذٰلِكَ،أَلاَ تَرَاهُ قَالَ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ يَبْتَغِي بِذٰلِكَ وَجْهَ اللهِ تَعَالى. فَقَالَ:أَللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ -أَمَّا نَحْنُ فَوَاللهِ مَا نَرَى وُدَّهُ وَلاَ حَدِيْثَهُ إِلاَّ إِلَى الْمُنَافِقِيْنَ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم):فَإِنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لاَإِلٰهَ إِلاَّ اللهُ يَبْتَغِي بِذٰلِكَ وَجْهَ اللهِ-(متفق عليه)

وَ(عِتْبَانَ) بِكَسْرِ الْعَيْنِ الْمُهْمَلَةِ واسكان التاء المثناةِ وبعدها باء موحدة۔ وَ(الْخَزِيْرَةُ) بالخاء المعجمةِ والزاء: هِيَ دَقِيْقٌ يُطْبَخُ بِشَحْمٍ۔ وَقَوْلُهُ: (ثَابَ رِجَالٌ) بِالثَّاءِ الْمُثَلَّثَةِ: أَيْ جَاؤُوْا واجْتَمَعُوْا۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عتبان بن مالک انصاری (رضی اللہ عنہ) (صحابی ہیں اور یہ ان حضرات میں سے ہیں جو غزوۂ بدر میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ شریک ہوئے ہیں) فرماتے ہیں کہ میں اپنے قبیلہ بنو سالم والوں کو نماز پڑھایا کرتا تھا (گویا وہ اپنے قبیلے والوں کے امام تھے) میرے قبیلے کی جو مسجد تھی اس کے اور میرے گھر کے درمیان ایک وادی اور ایسی نشیبی جگہ پڑتی تھی کہ جہاں بارش کے زمانہ میں پانی بھر جاتا تھا، جس کی وجہ سے بارش کے زمانہ میں اس وادی کو پار کرکے مسجد تک پہنچنا میرے لئے مشکل ہوا کرتا تھا۔ (جب تک بینائی ٹھیک رہی وہاں تک تو وہ اس مشکل کے باوجود بھی آتا رہا۔ لیکن جب بینائی میں کمزوری آگئی تو) میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری نگاہیں کچھ کمزور ہوگئیں ہیں، اور یہ وادی جو میرے گھر اور محلہ کی مسجد کے درمیان میں پڑتی ہے وہ بارش کے زمانہ میں بھر جاتی ہے اور میرے لئے اس کا پار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (گویا میں مسجد تک جا نہیں سکتا) اس لئے میری دلی تمنا ہے کہ اللہ کے رسول! آپ میرے گھر تشریف لایئے، اور میرے گھر میں کسی جگہ پر نماز ادا فرمالیجئے، تاکہ میں اپنے گھر کی اس جگہ کو اپنے لئے نماز کی جگہ کے طور پر مقرر کرلوں (جس کو گھر کی مسجد کہا جاتا ہے) چناں چہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ ان شاء اللہ آؤں گا (آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے وعدہ فرمالیا) حضرت عتبان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ دوسرے روز چاشت کے وقت نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) میرے یہاں تشریف لائے اور گھر میں داخل ہونے کی اجازت طلب کی، میں نے اجازت دی۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اندر تشریف لائے تو آتے ہی بیٹھنے سے پہلے آپ نے مجھ سے فرمایا کہ تم کون سی جگہ کو مسجد بنانا چاہتے ہو؟ میں نے ایک جگہ کی

طرف اشارہ کردیا، آپ اس جگہ تشریف لے گئے اور نماز کی نیت باندھ لی، تو ہم نے بھی آپ کے پیچھے صف بنا کر نیت باندھ لی (ویسے کوئی آدمی اس طرح نفل پڑھ رہا ہو تو اس کے پیچھے نیت باندھنے کی اجازت ہے، لیکن دو آدمی سے زیادہ نہیں ہونے چاہئیں) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو رکعات نماز ادا فرمائی (جب آپ ان کے مکان پر تشریف لائے تھے تو ظاہر ہے کہ گھر والے آسانی سے تو چھوڑتے نہیں) چناں چہ ہم نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تواضع کے لیے خزیرہ پیش کیا۔ اور جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تشریف آوری کی محلہ والوں کو اطلاع ہوئی تو بہت سارے لوگ میرے گھر میں جمع ہوگئے، ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ کیا بات ہے کہ مالک بن دخیشن نظر نہیں آتے؟ (یہ ایک صحابی ہیں جو اسی محلہ میں رہتے تھے، اور اتفاق کی بات کہ وہ اس وقت محلے میں نہیں ہوں گے، ورنہ ظاہر ہے کہ ان کو اطلاع ملتی تو وہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملاقات کے لیے ضرور آتے، لیکن جب وہ نظر نہیں آئے تو ایک آدمی نے موقع پا کر یہ تذکرہ چھیڑا کہ محلہ کے سب لوگ آئے، لیکن مالک نظر نہیں آتے، کیا بات ہے؟ جب اس نے یہ سوال قائم کیا) تو دوسرے نے کہا کہ وہ تو منافق آدمی ہے، اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا۔ جب دوسرے نے یہ کہا تو اس پر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ایسا مت بولو کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے خالص دل سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی حاصل کرنے کے لیے لا الٰہ الا اللہ کہا ہے؟ (گویا حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے متعلق پکے مؤمن ہونے کی گواہی دے دی۔ اس پر وہ صحابی خاموش ہوگئے) اور کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، لیکن میں نے تو یہ بات اس لیے کہی تھی کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ملنا جلنا منافقین سے زیادہ ہوتا ہے۔ پھر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اس آدمی پر حرام کردیا ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے۔

افادات:-یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھئے! سچے دل سے صرف کلمہ طیبہ پڑھنے پر اور دل سے اس کو مان لینے پر یہ وعدہ ہے۔منافقین بھی زبان سے کلمہ پڑھتے تھے لیکن دل میں دوسری بات ہوتی تھی۔اب ظاہر ہے کہ مؤمنین کے لئے یہ کتنی بڑی امید کی چیز ہے۔

گھر کی مسجد بھی ہونی چاہیے

اس روایت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے گھر کی کسی جگہ کو نماز کے لیے مخصوص کرلے، تاکہ گھر والوں میں سے جس کسی کو نماز پڑھنی ہو تو اسی جگہ پر نماز ادا کریں، اور اس جگہ کو پاک صاف رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔اس لیے کہ اگر کوئی جگہ مقرر نہیں ہوگی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کی پاکی اور صفائی کا جتنا اہتمام ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پائے گا۔بچوں والا گھر ہوتا ہے تو ہر جگہ بچے گھومتے پھرتے رہتے ہیں کہیں پیشاب پاخانہ کر دیتے ہیں اور ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو پاکی ناپاکی سے واقف نہیں ہوتے، تو اگر گھر کے اندر نماز کے لیے کوئی جگہ مقرر نہیں کریں گے تو ظاہر ہے کہ کوئی اہتمام اور فکر نہیں ہوگی۔اس کے بجائے اگر ایک جگہ مقرر کرلی جائے گی تو گھر والے تمام افراد بھی اس جگہ کی پاکی کا خاص اہتمام کریں گے، اور اس جگہ کو ناپاکی سے بچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔اس لیے تاکید آئی ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے گھر کی کسی مناسب جگہ کو نماز کے لیے مقرر کرلے۔ اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں اور کتابوں میں گھر کی مسجد کہا جاتا

ہے۔اور مرد تو محلے کی مسجد میں جہاں وہ نماز پڑھتے ہیں وہاں اعتکاف کرتے ہیں،لیکن عورتوں کے لیے اعتکاف کا مسئلہ آتا ہے کہ عورتیں کہاں اعتکاف کریں گی؟ تو آپ نے پڑھا ہوگا کہ عورتیں اپنے گھر کی مسجد میں اعتکاف کریں یعنی گھر کی اس جگہ میں اعتکاف کریں جس کو نماز کے لئے مقرر کیا ہے۔اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ہمارے گھر میں تو کوئی ایسی جگہ متعین نہیں ہے تو ہم کیا کریں؟تو علماء فرماتے ہیں کہ آج تک نہیں تھی تو اب مقرر کرلیجئے، اور آئندہ اسی جگہ پر نماز پڑھا کیجئے اور وہیں اعتکاف کرلیا کیجئے، اور اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے۔

خزیرہ کیا چیز ہے؟علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ)نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ آٹے کو چربی ڈال کر پکایا جاتا ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی ڈال دیتے ہیں،جب وہ خوب پک جاتا ہے اور پانی خشک ہوجاتا ہے؛اسی کو خزیرہ کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بندوں سے ماں سے زیادہ محبت ہے

حدیث ۴۱۸

عن عمر بن الخطاب(رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَدِمَ رَسُولُ اللّٰہِ(صلی اللہ علیہ وسلم) بِسَبْيٍ. فَإِذَا امْرَأَةٌ مِنَ السَّبْيِ تَسْعَى. إِذْ وَجَدَتْ صَبِيًّا فِي السَّبْيِ أَخَذَتْهُ فَأَلْزَقَتْهُ بِبَطْنِهَا، فَأَرْضَعَتْهُ. فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ(صلی اللہ علیہ وسلم): أَتُرَوْنَ هٰذِهِ الْمَرْأَةَ طَارِحَةً وَلَدَهَا فِي النَّارِ؟ قُلْنَا: لَا وَاللّٰہِ. فَقَالَ: لَلّٰہُ أَرْحَمُ بِعِبَادِهِ مِنْ هٰذِهِ بِوَلَدِهَا. (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس کچھ قیدی لائے گئے ،ان قیدیوں میں عورتیں اور بچے بھی تھے،ان میں ایک عورت تھی (جس کا دودھ پیتا بچہ ہو گا۔اوردودھ پلانے والی جوعورت ہوتی ہے اس کی چھاتی میں جب دودھ بھرجاتا ہے،تواس کو بے چینی ہوتی ہے،جب تک بچے کو دودھ نہ پلائے وہاں تک اس کوچین نہیں پڑتا۔تواس عورت کی چھاتی جب دودھ سے بھرگئی اوراس کا بچہ اس کے پاس نہیں تھااس لئے)وہ بے چینی سے اِدھر اُدھر دوڑ رہی تھی اورجو بھی بچہ اس کو مل جاتااس کو اُٹھالیتی اوراپنے سینے سے چپکالیتی اوراس کو دودھ پلادیتی۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب یہ منظر دیکھا تو حضراتِ صحابہ سے پوچھاکہ بتلاؤ! اگراس عورت کو اس کابچہ مل جائے توکیایہ دیدہ ودانستہ اپنے بچے کوآگ میں کبھی ڈال سکتی ہے؟(جو اپنے بچے کے لئے اتنی بےچین ہے اورجس کی یہ کیفیت ہے کہ کسی پل اس کواطمینان وسکون نہیں،توکیاوہ اپنے بچے کوآگ میں ڈال سکتی ہے؟حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں)ہم نے جواب دیاکہ اللہ کی قسم!کبھی نہیں ڈال سکتی۔ اس پر حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایاکہ اس عورت کواپنے بچے کے ساتھ جتنی محبت،شفقت اورمہربانی ہے؛ اللہ تعالیٰ کواپنے بندوں کے ساتھ اس سے زیادہ محبت وشفقت اورمہربانی ہے۔

افادات:۔تواب ظاہرہے کہ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو جہنم میں نہیں ڈالے گا،لیکن جو آدمی باوجودروکے جانے کے خودہی جہنم میں جاوے؛تواس کاکوئی علاج نہیں۔

رحمت غضب پر غالب ہے

حدیث ۴۱۹

وعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): لَمَّا خَلَقَ اللهُ الْخَلْقَ كَتَبَ فِيْ كِتَابٍ، فَهُوَ عِنْدَهُ فَوْقَ الْعَرْشِ: إِنَّ رَحْمَتِيْ تَغْلِبُ غَضَبِيْ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: غَلَبَتْ غَضَبِيْ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ: سَبَقَتْ غَضَبِيْ۔ (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جب مخلوق کو پیدا کیا تو ایک صحیفے میں ایک جملہ لکھ دیا اور وہ عرش کے اوپر اس کے پاس محفوظ ہے کہ ’’میری رحمت میرے غضب کے اوپر غالب ہے‘‘۔

بعض روایتوں میں ہے: میری رحمت میرے غضب سے آگے نکل جاتی ہے۔

افادات:- دنیا کے اندر ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بے انتہاء نافرمانیاں ہوتی ہیں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ ہر ایک کو روزی پہنچا رہے ہیں، ہر ایک کی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، جو لوگ اللہ تعالیٰ کے بڑے نافرمان ہیں ان کو بھی روزی دی جاتی ہے۔ آپ ہی بتلائیں کہ یہ سارے اختیارات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ قدرت میں رکھے ہیں اگر وہ اختیارات ہمیں دیئے جاتے تو کیا ہم اپنے کسی مخالف کو ایک دانہ بھی دیتے؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے جس کے نتیجہ میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے

سارے بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کا انتظام کیا ہے، گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے۔ بہت ہی کم اس کے غضب کا ظہور ہوتا ہے، ورنہ جہاں دیکھو گے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کے مظاہر ہی نظر آئیں گے۔

رحمت کے ایک حصہ کا کمال

حدیث ۴۲۰

وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) يَقُوْلُ: جَعَلَ اللهُ الرَّحْمَةَ مِئَةَ جُزْءٍ، فَأَمْسَكَ عِنْدَهُ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ، وَأَنْزَلَ فِي الْأَرْضِ جُزْءًا وَاحِدًا، فَمِنْ ذَالِكَ الْجُزْءِ يَتَرَاحَمُ الْخَلَائِقُ، حَتّٰى تَرْفَعُ الدَّابَّةُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ أَنْ تُصِيْبَهُ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى مِئَةَ رَحْمَةٍ أَنْزَلَ مِنْهَا رَحْمَةً وَاحِدَةً بَيْنَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ وَالْبَهَائِمِ وَالْهَوَامِّ۔ فَبِهَا يَتَعَاطَفُوْنَ، وَبِهَا يَتَرَاحَمُوْنَ، وَبِهَا تَعْطِفُ الْوَحْشُ عَلٰى وَلَدِهَا، وَأَخَّرَ اللهُ تَعَالٰى تِسْعًا وَتِسْعِيْنَ رَحْمَةً يَرْحَمُ بِهَا عِبَادَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ (متفق علیہ)

رواه مسلم أيضًا من رِوَايَة سلمان الفارسی (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ): إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى مِئَةَ رَحْمَةٍ، فَمِنْهَا رَحْمَةٌ يَتَرَاحَمُ بِهَا الْخَلْقُ بَيْنَهُمْ، وَتِسْعٌ وَتِسْعُوْنَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ: إِنَّ اللهَ تَعَالٰى خَلَقَ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِئَةَ رَحْمَةٍ، كُلُّ رَحْمَةٍ طِبَاقَ مَا بَيْنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ، فَجَعَلَ مِنْهَا فِي الْأَرْضِ رَحْمَةً۔ فَبِهَا تَعْطِفُ الْوَالِدَةُ عَلٰى وَلَدِهَا وَالْوَحْشُ وَالطَّيْرُ بَعْضُهَا عَلٰى بَعْضٍ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ أَكْمَلَهَا بِهٰذِهِ الرَّحْمَةِ۔

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کئے، ان میں سے ننانوے حصے اپنے پاس رہنے دیئے، اور ایک حصہ یعنی سوواں حصہ زمین پر اتارا۔ دنیا کی ساری مخلوقات؛ چاہے وہ جنات ہوں یا انسان، چوپائے ہوں یا درندے، ان سب میں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت، مہربانی اور شفقت کا جو سلوک (آپ دیکھ رہے ہیں وہ) اسی رحمت کے سوویں حصہ کا اثر ہے، شیر اور شیرنی بھی اپنے بچوں کے ساتھ اور بھیڑیا اپنے بچے کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وہ سوواں حصہ جنات، انسانوں چوپایوں اور زمین کے کیڑوں مکوڑوں میں اور تمام جانوروں میں تقسیم کر دیا، اور اسی ایک حصہ کا یہ اثر ہے کہ یہ ساری مخلوق آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت و مہربانی اور شفقت کا معاملہ کر رہی ہے۔ اور اسی ایک حصہ کا یہ نتیجہ ہے کہ درندہ بھی اپنی اولاد کے ساتھ محبت کرتا ہے۔ اور گھوڑا اپنا پاؤں اونچا رکھتا ہے تاکہ اس کا بچہ دب نہ جائے (خاص کر گھوڑی میں آپ یہ بات دیکھیں گے کہ اس کے پاس جب اس کا بچہ بیٹھا ہوا ہوتا ہے تو گھوڑی اپنا آگے والا پاؤں اونچا ہی رکھتی ہے اور وہ بچہ جب کھیل رہا ہوتا ہے تب ہی وہ اپنا وہ پیر رکھتی ہے، ورنہ وہ اسی ڈر سے اپنے پاؤں کو اُٹھائے رکھتی ہے کہ کہیں بچہ میرے پاؤں کے نیچے دب نہ جائے۔ تو آخر ایک جانور کے اندر اپنے بچہ کے ساتھ محبت کی یہ بات کہاں سے آئی؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ رحمت کا وہ سوواں حصہ جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اتارا ہے؛ یہ سب اسی کا اثر ہے) پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کے بقیہ ننانوے حصے اپنے پاس رہنے دیئے ہیں ان ننانوے حصوں کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اپنے بندوں کے ساتھ رحمت و مہربانی کا معاملہ کریں گے۔

افادات:-جب رحمت کے ایک پرسینٹ (۱ر فیصد) کی وجہ سے ان نافرمانیوں کے باوجود ساری دنیا قائم ہے، توجب آخرت میں بقیہ ننانوے حصوں کا اثر ظاہر ہوگا؛ تو پھر کیا کچھ نہ ہوگا؟ یہ بات سن کر ظاہر ہے کہ آدمی کو کتنی امید پیدا ہوسکتی ہے، اوراس کی وجہ سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کی امید دل میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس روایت کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے امید والے باب میں ذکر کیا ہے۔

میرے بندے کو معلوم ہے

حدیث ۴۲۱

وعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ (ﷺ) فِيمَا يَحْكِي عَنْ رَبِّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى قَالَ: أَذْنَبَ عَبْدٌ ذَنْباً فَقَالَ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي فَقَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَذْنَبَ عَبْدِي ذَنْباً، فَعَلِمَ أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ. ثُمَّ عَادَ فَأَذْنَبَ فَقَالَ: أَيْ رَبِّ اغْفِرْ لِي ذَنْبِي فَقَالَ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: أَذْنَبَ عَبْدِي ذَنْباً، فَعَلِمَ أَنَّ لِي رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِالذَّنْبِ، قَدْ غَفَرْتُ لِعَبْدِي فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ. (متفق عَلَيْهِ)

وقوله تعالیٰ: (فَلْيَفْعَلْ مَا شَاءَ) مَا دَامَ يَفْعَلُ هٰكَذَا يُذْنِبُ وَيَتُوبُ أَغْفِرُ لَهُ فَإِنَّ التَّوْبَةَ تَهْدِمُ مَا قَبْلَهَا.

ترجمہ:- یہ حدیث ِ قدسی ہے۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم (ﷺ) سے نقل کرتے ہیں اور حضور (ﷺ) اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے، پھر وہ اپنے گناہ کی معافی مانگتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یہ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے اس بندے نے ایک گناہ کیا اور اس کو معلوم ہے کہ میرا ایک رب

و مالک ہے جو میرے گناہ کو معاف کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے (گویا بندہ یہ جانتا ہے تب ہی تو مجھ سے عرض کررہاہے کہ یااللہ! میرے گناہ کو معاف کردے۔ نبیٔ کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ وہ گناہ معاف کردیتاہے۔ پھروہ آدمی دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب کرتا ہے، اور پھر عرض کرتا ہے کہ یااللہ! میرے گناہ کو معاف کردے، تواللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندہ نے گناہ کیا، اوراس کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب و مالک ہے جو اس کے گناہ کو معاف کرتاہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتاہے۔ پھربندہ تیسری مرتبہ گناہ کرتاہے اور کہتاہے کہ اے اللہ! میرے گناہ کو معاف کردے۔ تواللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! میرے بندے نے گناہ کیا اوروہ جانتا ہے اس کا ایک رب ہے جو گناہ کو معاف بھی کرتا ہے اور گناہ پر پکڑ بھی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندہ کو معاف کردیااب وہ جو چاہیے کرے۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ جب وہ بندہ معافی مانگتاہے تومیں معاف کر دیتا ہوں، گویا بندوں کے لئے ہر وقت توبہ کادروازہ کھلا ہواہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کاحاصل یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑاگنہگار ہو اوراس سے باربارگناہ کاصدورہوا ہو، تب بھی اس کو یہ نہیں سوچناچاہیے کہ میراگناہ معاف ہوگا یانہیں ،بلکہ وہ جب بھی اللہ کی بارگاہ کے اندراپنے گناہ کی معافی کے لئے درخواست پیش کرے گا،وہاں سے ذرہ برابرتاخیرنہیں ہوگی اورگناہ کی معافی آہی جائے گی۔

آدمی نڈر نہ بن جائے

باقی جیسا کہ پہلے بھی بتلاچکاہوں کہ آدمی کو دیدہ ودانستہ گناہ کاارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ایک تو آدمی بے حیائی کے ساتھ جرأت کرکے اللہ کاڈر رکھے بغیر گناہ کرے۔ایسے حالات میں عام طورپر یہ ہوتاہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اس کو یہ کہنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اے اللہ!میرے گناہ کومعاف کردے۔ ہاں!پھر بھی اگر اس کی زبان سے ایساجملہ نکلے گا تو اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، لیکن عام طورپر ایساجملہ اس کی زبان سے نکلتاہی نہیں ہے۔اورجس نے بے حیائی اورنڈربن کرگناہ نہ کیا ہو،بلکہ نادانستہ ہوگیاہو؛اسے ہی ڈرتے ڈرتے یہ کہنے کی توفیق ہوتی ہے،یہاں پر یہ بتلاناہے کہ کسی آدمی سے نادانستہ ایساکام ہوا، یاجرأت کے ساتھ ہوالیکن بعد میں ندامت ہوئی اور وہ توبہ کرے گا؛توپھر کیساہی بڑا گناہ کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اس کو معاف کردیتا ہے۔

آدمی جب بھی توبہ کرے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ باربارٹوٹتی رہی تب بھی آدمی کواس کی وجہ سے پشیماں ہونے کی ،یا یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں تو باربار توبہ کرتا ہوں اور ٹوٹ جاتی ہے؛اب کیاکروں ؟اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کوئی انتہانہیں ہے، بس اتنا ہے کہ آدمی جب بھی توبہ کرے اس وقت توبہ کی حقیقت کوسامنے رکھے۔ ہرتوبہ میں تین چیزیں

ضروری ہیں،اور بعض میں چوتھاایک حصہ بھی لگ جاتا ہے۔لیکن عام طورپر توبہ میں تین چیزیں ہوتی ہیں۔ایک تو یہ کہ دل میں ندامت اور پچھتاواہو۔ندامت کہتے ہی ہیں دل کے اندرتکلیف اوررنج ہوناکہ ہائے!میں نے یہ کیا کرڈالا؟توایک تودل کے اندر ندامت کا احساس ہو ،جیسے کوئی آدمی اپنے محبوب کو-جس کے ساتھ اس کو دلی تعلق ہے- ناراض کرلے،کوئی ایساکام کرلے جس سے وہ ناراض ہوجائے،تواس کے دل کو اس وقت تک چین ہی نہیں آتا جب تک کہ اس کو راضی نہ کرلے،اس کے لئے یہ تصورہی سوہانِ روح ہوتا ہے کہ میرا محبوب مجھ سے ناراض ہوگیا۔توپہلی بات یہ ہے کہ دل میں ندامت ہو۔

دوسرا یہ ہے کہ اس گناہ کوچھوڑدے۔اورتیسرا یہ ہے کہ پختہ ارادہ کرے کہ آئندہ اس کام کو نہیں کروں گا۔جس وقت توبہ کررہا ہے اس وقت یہی ارادہ پختہ ہو۔اس وقت دل میں یہ نہ ہوکہ میں کروں گا،پھر چاہےاس توبہ کرنے کے دومنٹ بعد وہ کام ہوجائے۔اس نے توپکاارادہ کیاتھا کہ میں نہیں کروں گا لیکن ہوگیا،توپہلے جوتوبہ کی تھی وہ اپنی جگہ پر صحیح تھی،اللہ نےاس پر گناہ معاف کردیا۔بعدمیں دوبارہ جو گناہ ہوا اس کی وجہ سے پہلے والی توبہ پرکوئی زد نہیں پڑتی ہے،وہ اپنی جگہ درست ہے،اگراس وقت یہ ارادہ تھاتواللہ نے گناہوں کو معاف کردیاہے۔

توبہ کا مسئلہ بہت آسان ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلفاء میں ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) تھے، وہ نوجوانوں کو جمع کرکے فرماتے تھے کہ بھائی دیکھو! توبہ کا مسئلہ بہت آسان ہے کہ بس! رات کو سوتے وقت پکا ارادہ کرلو اور توبہ کرلو؛ سب گناہ معاف ہوجائیں گے۔ مولانا تقی صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سے عرض کیا: حضرت! توبہ کے اندر تو تین چیزیں ہیں، ایک تو ندامت، دوسرا اس گناہ کو چھوڑنا اور تیسرا پختہ ارادہ کرنا۔ اور آپ جو کہہ رہے ہیں کہ روزانہ رات کو سوتے وقت توبہ کرلو، تو ٹھیک ہے کہ ندامت بھی ہوسکتی ہے، ساتھ میں وہ گناہ بھی چھوڑ رہا ہے، لیکن تیسری شرط کہ "پختہ ارادہ کرلے" تو اگر دل میں ذرا بھی تردد ہے تو یہ شرط نہیں پائی جاتی؟ تو حضرت نے فرمایا: پختہ ارادہ کا تعلق تو دل سے ہے، اور پختہ ارادہ کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ آدمی یہ طے کرلے کہ آئندہ میں اس کام کو نہیں کروں گا۔ عرض کیا گیا کہ کبھی دل میں ہوتا ہے کہ کہیں میری توبہ ٹوٹ نہ جائے، اور میرا نفس غالب نہ آجائے، اور شیطان مجھ سے یہ کام کروالے گا تو؟ تو حضرت نے فرمایا: یہ جو اندیشہ اور خطرہ لگا ہوا ہے اور آپ ڈر رہے ہیں کہ کہیں ایسا ہوگیا تو کیا ہوگا؟ ایسا خطرہ پختہ ارادہ کے منافی نہیں ہے۔ ہم نے تو اپنے طور پر پختہ ارادہ کرلیا کہ آئندہ یہ کام نہیں کرنا ہے، اب ساتھ میں جو ڈر لگا ہوا ہے کہ کہیں ہمارا نفس غالب آکر یا شیطان بہکاوے میں ڈال کر ہم سے یہ کام نہ

کروالے؛ تو یہ گمان ہمارے اس پختہ ارادے کے خلاف نہیں ہے۔ اور اگر یہ ڈر ہے تو اس کا بھی ایک آسان علاج ہے کہ اس وقت ارادہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا بھی کرلے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تو پختہ ارادہ کرلیا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، لیکن میں کمزور ہوں اور میرا ارادہ بھی کمزور ہے، ہوسکتا ہے کہ میرا نفس مجھ پر غالب آجائے، یا شیطان بہکاوے میں ڈال دے، اس لئے اے اللہ! تو ہی مدد کرنے والا ہے، تو میری مدد کر اور نفس وشیطان کے مقابلہ میں مجھے ثابت قدم رکھ۔ اس کے بعد بھی اگر گناہ ہوگیا تو اپنی پہلے والی توبہ تو پکی تھی، اب پھر سے دوبارہ ویسی ہی توبہ کرلے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، آدمی جب چاہے توبہ کرلے۔

باقی یہ سوچنا کہ جب توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو گناہ کرلو۔ تو جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ کسی کے پاس کتنا ہی بڑھیا مرہم کیوں نہ ہو، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ چھری لے کر اپنی انگلیاں کاٹنے کے لئے بیٹھ جاوے ۔ اگر کوئی کہے کہ بھائی! یہ کیا کر رہا ہے؟ تو وہ کہے کہ میرے پاس بہت عمدہ مرہم ہے ، اس کو لگاتے ہی فوراً خون بند ہوجاتا ہے اور زخم بالکل ٹھیک ہوجاتا ہے اس لیے انگلی کاٹ رہا ہوں؛ تو یہ بے وقوفانہ حرکت ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ باوجود حفاظت کی تمام تدابیر اختیار کرنے کے جسم کا کوئی حصہ کٹ گیا؛ تب وہ مرہم استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

بہر حال! اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ بندہ جو چاہے کرے یعنی جب تک یہ توبہ کرتا رہے گا اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے گناہ کو معاف کرتا رہوں گا، چاہے اس نے کیسے ہی گناہ کیوں نہ کئے ہوں۔ باقی یہ ہے کہ توبہ ہوتی رہنی چاہیے۔

اگر تم لوگ گناہ نہ کرو تو...

حدیث ۴۲۲---۴۲۳

وعنه قال قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (ﷺ): وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْلَمْ تُذْنِبُوْا لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ، وَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى، فَيَغْفِرُ لَهُمْ۔

وعن أبي ايوب خالد بن زيد (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ (ﷺ) يَقُوْلُ: لَوْلَا أَنَّكُمْ تُذْنِبُوْنَ لَخَلَقَ اللّٰهُ خَلْقاً يُذْنِبُوْنَ، فَيَسْتَغْفِرُوْنَ، فَيَغْفِرُ لَهُمْ۔

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم لوگ گناہ نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ تم کو ہٹا کر ایسی قوم کو لائے گا جو گناہ کرے گی اور اپنے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے گی اور استغفار کرے گی اور اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کرے گا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

افادات:- اس حدیث کا مطلب سمجھنے میں غلط فہمی نہ ہو، دراصل اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے گناہ اور نیکی کرنے کی صلاحیت رکھی ہے، اگر اللہ کو یہ منظور ہوتا کہ اس سے گناہ ہی نہ ہو، تو گناہ کرنے کی صلاحیت رکھی ہی نہ جاتی، اور پھر تو انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی، ایسی مخلوق فرشتوں کی شکل میں پہلے سے پیدا شدہ موجود تھی کہ جن کے اندر گناہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ فرشتے اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا بھی چاہیں تب بھی نہیں کرسکتے، ان میں نافرمانی کا مادہ ہی نہیں ہے، اور انسان میں اللہ تعالیٰ نے دونوں چیزیں رکھی ہیں۔ اس کے بعد انسان کو حکم دیا کہ گناہ مت کرنا، اگر گناہ کروگے تو مَیں ناراض ہو جاؤں گا۔ تو گناہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور فقط صلاحیت ہی نہیں بلکہ گناہ کا تقاضا موجود ہے، نفس یہ کہہ رہا ہے کہ ایسا کرو، صلاحیت اور تقاضہ دونوں باتیں ہیں اس کے باوجود انسان یہ سوچ کر کہ میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا، اس نے مجھے منع کیا ہے کہ یہ کام مت کرنا، اب چاہے نفس تقاضہ کرتا ہے اور مجھ میں ایسا کرنے کی طاقت بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کے لئے وہ انسان اپنے آپ کو اس معصیت و نافرمانی اور گناہ کے کام سے روکے، تو آپ اندازہ لگایئے کہ اللہ تعالیٰ کتنا خوش ہوں گے۔

یہ کمال نہیں

دیکھو! دو باتیں الگ الگ ہیں، ایک تو یہ کہ کسی کام کی صلاحیت ہو اور نہ کرے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی کام کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ جیسے ایک آدمی اندھا ہے، اب اگر وہ کسی نامحرم اور اجنبی عورت کی طرف نظر نہیں کرتا، سینما نہیں دیکھتا، ٹی وی نہیں دیکھتا اور لوگوں سے کہتا ہے کہ مَیں نے کبھی ٹی وی نہیں دیکھا، کبھی کسی اجنبی عورت کی طرف نگاہ نہیں اُٹھائی؛ تو کیا کہیں گے کہ اللہ کے بندے! تو تو اگر چاہے تب بھی نظر نہیں اُٹھا سکتا، تیرے اندر صلاحیت ہی کہاں ہے؟ اس لیے یہ کوئی کمال کی بات نہیں۔

اور ایک آدمی بینا ہے، اس میں اجنبی عورت کو دیکھنے کی صلاحیت موجود ہے، اور طبیعت میں تقاضہ بھی موجود ہے، نفس کہہ رہا ہے اس کے باوجود وہ آدمی یہ سوچ کر نگاہ نہیں اٹھاتا کہ اللہ تعالیٰ نگاہوں کی خیانت کو جانتا ہے، وہ مجھے پوچھے گا تو میں کیا جواب دوں گا۔ تو اب اندازہ لگایئے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کتنا خوش ہوں گے۔ اور یہی تقویٰ کا نور ہے۔

تو شانِ غفاری کا ظہور کیسے ہوتا؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب اللہ کو بندے سے گناہ کروانے ہی نہیں تھے تو پھر انسان میں گناہ کی صلاحیت ہی کیوں رکھی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں صلاحیت بھی رکھی اور تقاضہ بھی رکھا اور پھر اللہ نے حکم دیا کہ مت کرو۔ اب جب نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ

اس کے دل میں تقویٰ کا نور ڈالیں گے۔ اور پھر بھی اگر کسی سے گناہ ہو گیا تو اس کے لئے راستہ بند نہیں کیا، بلکہ کہا کہ دل سے معافی مانگو تو ہم خوش ہوں گے اور معاف کر دیں گے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت معاف کرنے کی بھی ہے۔ اگر گناہ کرنے والے نہ ہوتے اور گناہ کرکے اللہ سے معافی نہ مانگتے تو پھر اللہ کی اس صفت اور شانِ غفاری کا ظہور کیسے ہوتا؟ اس لئے جب انسان گناہ کرے گا اور پھر توبہ واستغفار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے ظہور کا ذریعہ بنے گا۔

سالہا سال کی عبادت وہ کام نہیں کرتی

بلکہ بعض کتابوں میں یہاں تک لکھا ہے کہ عبادت کرنے کے بعد طبیعت کے اندر جو غرور پیدا ہوتا ہے، اس کے مقابلہ میں کسی جرم کرنے کے بعد طبیعت میں جو انکساری پیدا ہوتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ ظاہر ہے کہ غرور کی وجہ سے عبادت کا معاملہ تو ختم ہو گیا اور عبادت کا تو ستیا ناس ہی ہو گیا لیکن گناہ کرنے کے بعد جو انکساری اور ندامت پیدا ہوئی، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سالہا سال کی عبادت وہ کام نہیں کرتی جو کام گناہ کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ندامت کر جاتی ہے اور اس کی وجہ سے اس کا کام بن جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے: ؎

زاہد غرور داشت، سلامت نہ برد راہ

رِند از راہ نیاز بدار السلام رفت

زاہد کو تو اپنی عبادت کے اوپر غرور تھا اس لئے وہ پھنس گیا، اور گنہگار کو اپنے گناہ کے اوپر نیاز؛ تو وہ اپنی اسی ندامت سے جنت کے اندر پہنچ گیا۔

میں یہ عرض کررہا تھا کہ گناہ کے نتیجے میں بندہ اللہ کے سامنے معافی مانگتا ہے اور اس طرح اللہ کی صفتِ غفاریت اور صفتِ رحمت کا ظہور ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں ۔ اسی کو بتلایا گیا کہ انسان کو اسی لئے پیدا کیا گیا کہ وہ گناہ کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگیں گے اور اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرے گا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی صفتِ مغفرت کا ظہور ہوگا۔

اس لیے اس حدیث کا مطلب سمجھنے میں کسی کو غلط فہمی نہ ہو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیدہ ودانستہ کسی گناہ کا ارتکاب کیا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں یہ مادے تو رکھے ہیں لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ آدمی گناہوں کا ارتکاب نہ کرے، اور اگر ہو جائے تو پھر اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۱/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ ۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات سے امید رکھنے کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں پچھلی دو تین مجلسوں میں چند حدیثیں آئی تھیں۔ آگے ایک راویت لاتے ہیں۔

کلمہ پر جنت کی خوشخبری

حدیث ۴۲۴

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كُنَّا قُعُوداً مَعَ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَعَنَا أَبُوبَكْرٍ وَعُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا فِي نَفَرٍ، فَقَامَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا، فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا فَخَشِينَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُونَنَا فَفَزِعْنَا فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ فَخَرَجْتُ أَبْتَغِي رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)، حَتَّى أَتَيْتُ حَائِطاً لِلأَنْصَارِ وَذَكَرَ الْحَدِيثَ بِطُولِهِ إِلَى قَوْلِهِ: فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِذْهَبْ فَمَنْ لَقِيتَ وَرَآءَ هٰذَا الْحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لَآ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ، فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) بھی کچھ صحابہ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان سے اٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے ہم یہ سمجھے کہ آپ اپنی کسی ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں، جب سب نے تھوڑی دیر انتظار کیا لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) واپس تشریف نہیں لائے تو سب کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اس لیے سب

آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں سب سے پہلے میں ہی آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلا۔ یہاں تک کہ ایک انصاری صحابی کے باغ کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ آپ شاید اندر ہوں گے تو میں نے اندر جانے کا راستہ ڈھونڈا لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ کے پانی کے باہر نکلنے کی جو نالی تھی اس میں سے ہو کر میں اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس باغ میں تشریف فرما ہیں، مَیں نے جا کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان سے اچانک اٹھ کر چلے آئے اور دیر ہو گئی تو سب پریشان ہو گئے، اور سب ہی آپ کی تلاش اور جستجو میں نکلے ہوئے ہیں، میں بھی اسی لئے نکلا تھا اور اس باغ میں آنے کا کوئی راستہ نہیں ملا تو مَیں پانی نکلنے کی نالی میں سے اندر گھسا ہوں اور آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ معلوم ہوا کہ حضراتِ صحابہ پر یہ کیفیت گذری تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کو اپنے نعلین مبارک دے کر فرمایا کہ جاؤ اور جو بھی تمہیں راستہ میں ملے، جو اس بات کی گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور مَیں اللہ کا بندہ اور رسول ہوں؛ اور اس بات پر وہ دل سے پورا یقین رکھتا ہو اس کو جنت کی خوشخبری سنا دو۔ [اس روایت کی تشریح پہلے گذر چکی ہے۔]

ہم آپ کو راضی کر دیں گے

حدیث ۴۲۵

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص (رضي الله عنهما): أَنَّ النَّبِيَّ (صلى الله عليه وسلم) تَلَا قَوْلَ اللهِ فِيْ إِبْرَاهِيْمَ (عليه السلام): ﴿رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَإِنَّهُ مِنِّيْ﴾ [ابراهيم:٣٦] الآية وقول عيسى (عليه السلام): ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [المائدة:١١٨] فَرَفَعَ يَدَيْهِ وَقَالَ: اَللّٰهُمَّ أُمَّتِيْ

أُمَّتِيْ. وبَكَى. فَقَالَ اللهُ تَعَالى: يَاجِبْرِيْلُ! اِذْهَبْ إِلى مُحَمَّدٍ، وَرَبُّكَ أَعْلَمُ. فَسَلْهُ مَايُبْكِيْهِ؟ فَأَتَاهُ جِبْرِيْلُ، فَأَخْبَرَهُ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) بِمَاقَالَ وَهُوَ أَعْلَمُ. فَقَالَ اللهُ تَعَالى: يَاجِبْرِيْلُ! اِذْهَبْ إِلى مُحَمَّدٍ فقُلْ: إِنَّاسَنُرْضِيْكَ فِيْ أُمَّتِكَ وَلَانَسُوْءُكَ. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے باری تعالیٰ کا وہ ارشاد تلاوت کیا جس میں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا ہے کہ اے میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سارے لوگوں کو گمراہ کیا (یعنی بہت سے لوگ ان بتوں کی تاثیر کے قائل ہو کر اور یہ سمجھ کر کہ یہ بھی کچھ نفع نقصان پہنچانے کے مالک ہیں گمراہی میں مبتلا ہیں، گو یا ان کی گمراہی کا ذریعہ یہ بت بنے۔ اسی کو تعبیر کیا گیا کہ ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دعا فرما رہے ہیں کہ) اے باری تعالیٰ! پس جو میری پیروی کرے گا وہ تو مجھ سے ہے (یعنی جو میرے اوپر ایمان لائے گا اور میں تیرے جن احکام کو ان تک پہنچارہا ہوں ان احکام پر عمل کرنے کے معاملہ میں میری پیروی کرے گا تو اس کا تعلق مجھ سے ہے) اور جو میری نافرمانی کرے گا؛ تو تو بخشنے والا اور مہربان ہے (گویا ان نافرمانوں کے متعلق بھی حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کررہے ہیں کہ آپ تو مغفرت کرنے والے، رحمت کرنے والے، معاف کرنے والے اور مہربانی کرنے والے ہیں، اگر آپ چاہیں تو ان کی بھی بخشش کرسکتے ہیں)

اور پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ایک دعا جو قرآنِ پاک میں ہے، نبیٔ کریم (ﷺ) نے وہ آیت بھی پڑھی: اے اللہ! تو اگر ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں (تو ان کا مالک ہے اور مالک کو اختیار ہوتا ہے کہ اپنی چیز میں جو چاہے کرے اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، یا دم مارنے کی کوئی گنجائش نہیں) اور اگر تو ان کو معاف کردے تو بے شک تو قوت والا اور حکمت والا ہے (معاف

کرنے پرقدرت رکھتاہے،اور حکمت والا بھی ہے کہ کس کو کس طرح معاف کیا جائے وہ بخوبی جانتا ہے۔توحضرت ابراہیم(علیہ السلام)کی جو اپنی امت کے نافرمانوں اور فرمانبرداروں کے سلسلہ کی دعا،اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی دعاجو نافرمانوں کے سلسلہ میں ہے؛ان دونوں دعاؤں کی نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تلاوت فرمائی) اس کے بعدنبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے دونوں ہاتھ دعاکے لئے اٹھائے اور باری تعالیٰ کے حضورمیں عرض کیا کہ اے اللہ!میری امت،میری امت (اے اللہ! تو میری امت کو معا ف کر دے، ان کو بخش دے۔گویا ان دو نوں جلیل القدر انبیاء نے اپنی امت کے گنہگاروں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحمت کی جودعا فر مائی،اس کا تذکرہ کرنے کے بعد نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کے واسطے دعاکررہے ہیں :اے اللہ! تومیری امت کومعاف کردے) تو اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل (علیہ السلام)سے کہا کہ اے جبرئیل! محمد(صلی اللہ علیہ وسلم)کے پاس جاؤ(ویسے تو اللہ تعالیٰ خوب جانتاتھاکہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کیادعا کررہے تھے اور کیوں رورہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)کے اس رونے پرجوانعام دینے والے ہیں اس کو ظاہر کرنے کے لیے پوچھاجارہا ہے۔جیسے کوئی بچہ کسی چیز کے لئے جب روتا ہے تو باپ جانتاہے کہ وہ کیوں رورہاہے،پھر بھی پوچھتاہے کہ بیٹا!کیوں روتاہے؟ فلاں چیز چاہیے، چلودے دی،تاکہ اس کارونابندہوجائے۔ایسے ہی یہاں اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے اس کے باو جودحضرت جبرئیل (علیہ السلام)کو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خد مت میں بھیجااور کہاکہ جاکر ان سے پو چھوکہ کو ن سی چیز ان کو رُلارہی ہے؟میرے حبیب! آپ کیو ں رو تے ہیں ؟)

چناں چہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر حضرت جبرئیل (علیہ السلام)نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے،تو نبیؐ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتلایا کہ میری امت کی معافی اور مغفرت کا سوال کرتا ہوں۔حالاں کہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے تھے، آپ کی اس دعا سے واقف تھے۔پھر حضرت جبرئیل(علیہ السلام) نے جاکر باری تعالیٰ کو خبر دی کہ آپ کے حبیب یہ مانگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جو اب میں فرمایا کہ اے جبرئیل!

محمد(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاؤ، اور ان سے کہو کہ ہم آپ کی امت کے سلسلہ میں آپ کو راضی کردیں گے، اور آپ کو امت کے سلسلہ میں ذرا بھی ناراض نہیں کریں گے۔

میں راضی ہونے والا نہیں

افادات:۔حضرت امام شافعی(رحمۃ اللہ علیہ)اور حضرت عمر بن عبدالعزیز(رحمۃ اللہ علیہ)فرماتے ہیں کہ یہ بہت زیادہ امید دلانے والی روایت ہے۔اور حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جب تک میری امت کا ایک آدمی بھی جہنم میں رہے گا، میں راضی ہونے والا نہیں ہوں،میں تو سب کو جہنم سے نجات دلاکر ہی راضی ہوؤں گا۔

دیکھو!حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)کو امت کا کتنا درد ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ سے اپنی امت کی مغفرت کے لئے رو رو کر دعا مانگ رہے ہیں۔اس لئے اب ہمیں بھی آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) کا حق سمجھنا چاہیے۔ جب ہمارے لئے آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)رو رہے ہیں تو کیا اب ہماری ذمہ داری نہیں بنتی کہ ہم نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کریں اور آپ کے طریقوں کو اپنی زندگی میں اپنائیں۔اور کوئی بھی ایسا کام نہ کریں جو نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کو ناراض کرنے والا ہو، اور آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) کی ناراضگی کا باعث ہو۔ روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ ہر ہفتہ قبر مبارک کے اندر حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)کے سامنے امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں،جب کوئی امتی اچھے عمل کرتا ہے اور آپ کو بتلایا جاتا ہے کہ آپ کے امتی نے یہ اعمال کئے ہیں، تو آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)خوش ہوتے ہیں ۔اور جب بتلایا جاتا ہے کہ برے اعمال کئے ہیں، تو اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو تکلیف ہوتی ہے۔(مسند البزار،۱۹۲۵)

بڑی بے مروتی کی بات

اس لیے ہر امتی کے اوپر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ حق ہے کہ جب آپ ہمارے لئے روتے ہیں اور ہماری مغفرت اور رحمت کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور میں درخواست کرتے ہیں، تو ہمیں بھی چاہیے کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع و پیروی اور آپ کی سنتوں کو اپنی زندگی میں اپنانے کا پوراپورا اہتمام کریں۔ ہر حال میں ہماری طرف سے یہی کوشش ہو، اس کے بعد بھی خدانخواستہ نادانستہ طور پر بے خبری میں کہیں غفلت ہوگئی تو اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے، لیکن دانستہ طور پر نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقوں کو چھوڑنا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دشمنوں اور غیروں کے طریقوں کو اختیار کرنا کتنی بڑی بے غیرتی اور بے مروتی کی بات ہوگی۔ یہ محبت کا تقاضہ نہیں ہے۔

اللہ کا اور بندوں کا کیا حق ہے؟

حدیث ۴۲۶

وعن معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كُنْتُ ردف النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) عَلٰى حِمَارٍ، فَقَالَ يَامُعَاذُ! هَلْ تَدْرِيْ مَا حَقُّ اللهِ عَلٰى عِبَادِهٖ؟ وَمَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ؟ قُلْتُ: أَللهُ وَ رَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ. قَالَ: فَإِنَّ حَقَّ اللهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوْهُ، وَلَا يُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئاً وحَقَّ الْعِبَادِ عَلَى اللهِ أَنْ لَا يُعَذِّبَ مَنْ لَا يُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ. أَفَلَا أُبَشِّرُ النَّاسَ؟ قَالَ: لَا تُبَشِّرْهُمْ فَيَتَّكِلُوْا۔ (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح:-حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک گدھے پر سوار ہو کر تشریف لے جا رہے تھے، اور میں اسی گدھے پر آپ کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا، اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے معاذ! کیا تمہیں معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کے بندوں پر کیا حق ہے؟ اور بندوں کا اللہ تعالیٰ پر کیا حق ہے؟ حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں (آپ ہی بتلائیے) تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا بندوں کے اوپر یہ حق ہے کہ بندے اللہ ہی کی عبادت کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ اور بندوں کا حق اللہ تعالیٰ پر یہ ہے کہ وہ اس آدمی کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا ہے۔ حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اور لوگوں کو اس بات کی بشارت نہ سنادوں؟ (یہ تو بہت آسان چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنا بڑا وعدہ ہے۔ اس لئے یہ چیز لوگوں کے لئے بڑی خوشخبری اور مسرت افزا ہے۔ تو میں لوگوں کو اس چیز کی اطلاع کر دوں ؛ تاکہ یہ سن کر سب ہی خوش ہو جائیں؟) تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: ابھی نہ بتانا، ورنہ لوگ بھروسہ کر کے بیٹھ جائیں گے۔

افادات:-ایک بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی کے اوپر کوئی چیز واجب نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اسکا وعدہ فرمالیا ہے، اس لئے گویا اللہ تعالیٰ یہ چیز اپنے بندوں کو ضرور عطا فرمائیں گے، اسی معنٰی کو حدیثِ پاک میں یوں تعبیر کیا گیا کہ

اللہ تعالیٰ کے اوپر بندوں کا حق یہ ہے کہ اس آدمی کو عذاب نہیں دے گا جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اور میں پہلے عرض کرچکاہوں کہ جنت کے اندر بڑے بڑے درجات ہیں جو آدمی کو مختلف اعمال پر دیئے جائیں گے۔اگر بشارت سنادی جائے توانسان کا مزاج ہے کہ صرف اس چیز کولے کراس بات پر کفایت کرلے گا کہ اتنی چیز جہنم سے حفاظت کے لیے کافی ہے۔اس لئے مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ اس وقت لوگوں کو اس بات کی اطلاع نہ دی جائے۔ اور جیساکہ پہلے بھی میں بتلاچکاہوں کہ مختلف طبیعتیں اور مختلف مزاج ہوتے ہیں ایک ہی بات پر ہرایک کا تاثرالگ ہوتا ہے،ایک ہی بات دوآدمیوں کو کہی جاتی ہے لیکن ایک آدمی کچھ اوراثر لیتا ہے،اوردوسراآدمی دوسرااثرلیتاہے۔اوریہ بھی سوال نہیں ہوسکتا کہ حضرت معاذ(رضی اللہ عنہ)کو نبیِٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیوں بتلایا؟اس لئے کہ انکے متعلق یہ اندیشہ نہیں تھا۔ ہمارے جیسے سست و کاہل اور کم عملوں کے متعلق ہوسکتاہے کہ اس بات کو سننے کے بعد اطمینان کی سانس لے کر بیٹھ جاتے۔اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایاکہ ’’ ان کو عمل کرنے دو، جنت کے اندر بڑے درجات ہیں ‘‘۔

وہ ثابت قدم رہیں گے

حدیث ۴۲۷

وعن البرآء بن عازب(رضی اللہ عنہ) عن النَّبِيِّ(صلی اللہ علیہ وسلم):اَلْمُسْلِمُ إِذَاسُئِلَ فِيْ الْقَبْرِيَشْهَدُ أَنْ لاَإِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًارَسُوْلُ اللهِ،فَذَالِكَ قَوْلُهُ تَعَالیٰ:يُثَبِّتُ اللهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْابِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِيْ الْحَيَاةِالدُّنْيَاوَفِيْ اَلْآخِرَةِ۔(ابراھیم:۲۷)

ترجمہ:-حضرت براء بن عازب(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان کو جب قبر کے اندر سوال کیا جائے گا(کہ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے؟ اوراس شخصیت یعنی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق کیا کہتے ہو؟)اس وقت وہ گواہی دے گا اور کلمہ پڑھے گا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)اللہ کے رسول ہیں۔(گویا مومن قبر میں جواب دے گا)اور قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کے ارشادکا یہی مطلب ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو دنیا اور آخرت میں جمائے گا،مضبوط و ثابت قدم رکھے گا

افادات: جو لوگ دنیا کی زندگی میں کلمہ کے اوپر جمے رہے، اور ان کا عقیدہ پختگی کے ساتھ رہا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبو د نہیں اور اپنے اسی عقیدہ کے مطابق زندگی گذاری کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا،اسی کی عبادت کرتے رہے۔اور جس کا یہ عقیدہ رہا کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور انہی تعلیمات کو اپنی زندگی کی اندر مشعلِ راہ بنایااور انہی کے مطابق زندگی گذاری، توجیسے زندگی میں اس پر جمارہا، قبر میں

اللہ تعالیٰ اس کی مدد کریں گے ۔ایمان والوں کے لئے یہ چیز بڑی امید کی ہے۔جو لوگ دنیا میں ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں اور قبر کی ہولناکیوں سے ڈرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ان کے شاملِ حال رہے گی۔یہ بڑے اطمینان وتسکین کی چیز ہے۔

نیکیوں کا بدلہ دنیا اور آخرت میں

حدیث ۴۲۸

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) عن رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: إِنَّ الْكَافِرَ إِذَا عَمِلَ حَسَنَةً أُطْعِمَ بِهَا طُعْمَةً مِنَ الدُّنْيَا۔ أَمَّا الْمُؤْمِنُ فَإِنَّ اللهَ تَعَالَى يَدَّخِرُ لَهُ حَسَنَاتِهِ فِي الْآخِرَةِ وَيُعْقِبُهُ رِزْقاً فِي الدُّنْيَا عَلَى طَاعَتِهِ.

وَفِي رِوَايَةٍ: إِنَّ اللهَ لَا يَظْلِمُ مُؤْمِنًا حَسَنَةً يُعْطِي بِهَا فِي الدُّنْيَا وَ يَجْزِي بِهَا فِي الْآخِرَةِ وَأَمَّا الْكَافِرُ فَيُطْعَمُ بِحَسَنَاتِ مَا عَمِلَ لِلّٰهِ تَعَالَى فِي الدُّنْيَا حَتَّى إِذَا أَفْضَى إِلَى الْآخِرَةِ لَمْ يَكُنْ لَهُ حَسَنَةٌ يُجْزَى بِهَا۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دنیا کے اندر جب کوئی کافر کوئی نیکی کا کام کرتا ہے، اس کو اس کی نیکی کا بدلہ دیا جاتا ہے۔ رہا مومن؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی نیکیوں کو آخرت کے لئے محفوظ رکھتے ہیں، اور دنیا میں بھی اس کی طاعت ونیکی پر کچھ دیتے ہیں لیکن بڑا بدلہ آخرت کے اندر عطا فرمائیں گے ۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ذرا بھی کمی نہیں کرتے، مومن کی نیکی کا بدلہ دنیا میں بھی دیا جاتا ہے اور اس کا پورا بدلہ آخرت کے اندر ملے گا۔اور رہا کافر تو اس کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں ہی دیدیا جاتا ہے ، یہاں تک کہ جب آخرت کے اندر جاتا ہے تو اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رہتی۔

نظامِ خداوندی

افادات:- اللہ تبارک و تعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے کہ کافر کی عبادت کا تو اسلام نہ ہونے کی وجہ سے سوال ہی نہیں ہوتا، اگر وہ کوئی نیکی کا کام کرتا بھی ہے تو ایمان نہ ہونے کی وجہ سے وہ کام قابلِ قبول نہیں ہوتے، اس لئے کہ عبادت کے لئے نیت شرط ہے۔ کوئی غیر مسلم نماز پڑھے تو وہ نماز نہیں کہلائے گی۔ روزہ رکھے تو وہ روزہ نہیں کہلائے گا۔ لیکن دوسرے نیکی کے کام جو لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں، جیسے کسی کو کھانا کھلا دیا، کسی کو کپڑا پہنا دیا، کسی کی مدد کر دی، کسی پریشان حال کی پریشانی دور کی؛ تو یہ سب کام مسلمان کرے تب بھی نیکی اور کافر کرے تب بھی نیکی ہیں، اس میں نیت کا سوال نہیں آتا۔ تو نیکی کا ایسا کوئی بھی کام جب کافر دنیا کے اندر کرتا ہے تو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کا بدلہ دنیا ہی میں عطا فرما دیتے ہیں، گویا اس کی نیکی کا معاوضہ باقی نہیں رکھا جاتا، دنیا ہی میں سب دیدیا جاتا ہے۔ اور ایمان والوں کی جتنی بھی نیکیاں ہیں ان کو اس کا بدلہ دنیا میں نہیں دیا جاتا، دنیا میں ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں جو ان کی نیکیوں کا پورا پورا بدلہ بن سکے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ایمان کے نتیجہ میں کی گئی نیکیوں کے بدلہ کو آخرت کے اندر رکھا ہے۔ البتہ دنیا میں بھی تھوڑا بہت اس کو اس کی ان نیکیوں کا بدلہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقی بدلہ تو آخرت ہی میں دیا جائے گا۔

اسی لئے دوسری روایتوں میں اس بات کی صراحت ہے کہ عام طور پر اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر مؤمن کو اس کے گناہوں کی سزا مختلف شکلوں میں دے کر اس کی برائیوں کو ختم کردیتے ہیں اور اس گناہ سے پاک صاف کردیتے ہیں (شعب الایمان،۹۸۱۹) جیسے ''بیماریوں کی شکل میں''مصیبت کی شکل میں''روزی کی تنگی کی شکل میں' اور لوگوں کی ایذارسانی کی شکل میں' یہاں تک کہ بہت سے ایمان والے وہ ہوتے ہیں کہ ان کی کوئی برائی باقی ہی نہیں رہتی جس کا بدلہ نہ لیا گیا ہو، اور جس کی سزا اس کو نہ دیدی ہو، اور آخرت کے اندر اس کی نیکیوں کی وجہ سے اس کو جنت میں بھیجا جائے گا۔ اور کافر کا معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس لئے حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا مزاج اور طبیعت یہ تھی کہ جب دنیا کی کوئی دولت یا اور کوئی نعمت ان کے پاس آتی تھی تو وہ ڈر جاتے تھے کہ یہ چیز کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ تو نہیں۔

نعمتیں ملنے پر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی سوچ

حضرت خباب بن اَرت (رضی اللہ عنہ) کی روایت بخاری شریف کے اندر ہے (بخاری شریف ۴۰۴۷) وہ بیمار تھے جب لوگ ان کی خبر پرسی کے لئے گئے تو وہ فرمانے لگے کہ ہم لوگ اللہ کے نبی پر ایمان لائے اور ایمان کے راستہ میں ہم نے مشقتیں اور تکلیفیں اُٹھائیں اور ہم میں سے بہت سے وہ ہیں جنھوں نے اپنی ان تکلیفوں کا ذرہ برابر بھی بدلہ دنیا میں نہیں پایا بلکہ ان کی ساری نیکیاں آخرت کے لئے جمع ہیں ، انہیں میں سے حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہ) اور

حضرت مصعب بن عمیر وغیرہ ہیں۔ حضرت مصعب (رضی اللہ عنہ) غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے تو ان کو کفن پہنانے کے لئے صرف ایک ہی چادر تھی اور اس وقت ان کا حال بھی یہ تھا اگر ان کے چہرہ اور سر کو ڈھانپا جاتا تو پاؤں کھل جاتے اور پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر کھل جاتا تھا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ سر اور چہرہ کو ڈھانپ دو اور پاؤں کے اوپر گھاس ڈال دو وہ حضرات تو دنیا سے اسی طرح چلے گئے اور ہم اپنے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پا رہے ہیں۔ مال کے آنے پر وہ لوگ ڈرتے تھے۔

قابلِ اصلاح تعبیر

آج کے زمانہ میں ہم یوں سمجھتے ہیں کہ جتنا زیادہ مال و دولت آئے وہی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اس کے نہ ملنے پر ہم بہت زیادہ ناراض ہو جاتے ہیں، اور ملنے پر یوں سمجھتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی عنایت ہو رہی ہے۔ بعض لوگ تو اس کو یوں تعبیر کیا کرتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیکھا، گویا اب تک تو دیکھا نہیں تھا۔ جب تک دو پیسے نہیں ملے، وہاں تک اللہ تعالیٰ نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ یہ عجیب تعبیر ہے۔ جب کوئی ایسا بولتا ہے تو میرے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے کہ بولنے والا کچھ خیال کیوں نہیں کرتا۔

اللہ کے مقبول بندوں کا حال

کسی جگہ ایک بزرگ رہتے تھے، ایک مرتبہ بارش آئی تو وہ کہنے لگے کہ کیا ہی موقع سے بارش آئی ہے۔ اللہ والوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً تنبیہ ہوتی ہے۔ غیب سے آواز آئی کہ کیا ہم کبھی بے موقع بھی برساتے ہیں؟ یہ اللہ کے مقبول بندوں کا حال ہوتا ہے، اور ہم تو معلوم نہیں ایسی کیا کیا بکواس کر جاتے ہیں جس پر ہمیں تردّد بھی نہیں ہوتا۔

وجود ہی گناہ

بعض مرتبہ لوگ بولتے ہیں کہ میں نے ایسا کون سا گناہ کیا کہ یہ مصیبت آئی، بعض اللہ والے فرماتے ہیں: ''وُجُوْدُكَ ذَنْبٌ لَا یُقَاسُ بِهٖ ذَنْبٌ'' تمہارا وجود ہی گناہ ہے، کسی دوسرے گناہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارا کوئی لمحہ غفلت سے خالی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی یہ جو نعمتیں ہمیں مل رہی ہیں وہ ساری بلا استحقاق مل رہی ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کو سامنے رکھتے ہوئے زبان سے ایسا جملہ نکالنے سے ڈرنے اور بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اس لئے ہم پر تو اللہ تعالیٰ کا کرم ہی کرم ہے، جتنی نعمتیں ہمیں دے رکھی ہیں، وہ اس کا احسان ہے، ہم اس کے احسان اور اس کی ان نعمتوں کا بدلہ کہاں ادا کر سکتے ہیں، جب اس کا حق ہی ادا نہیں کر سکتے تو پھر آگے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔

پانچ نمازوں کی مثال

حدیث ۴۲۹

وعن جابر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ كَمَثَلِ نَهْرٍ جَارٍ غَمْرٍ عَلَى بَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ مِنْهُ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ.

(الغمر) الْكَثِيْر۔

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ پانچ نمازوں کی مثال ایسی ہے جیسے تم میں سے کسی کے دروازہ پر بہت زیادہ پانی والی نہر بہہ رہی ہو اور وہ ہر دن اس میں پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو۔

افادات:- جو آدمی پانچ وقتہ نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اس کے لئے اس حدیث میں بڑی امید ہے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے مکان کے سامنے نہر ہو اور وہ بھی زیادہ پانی والی ہو جس کا پانی صاف شفاف ہو، اور وہ اس میں پانچ وقت نہائے تو کیا اس کے بدن پر میل کچیل رہے گا؟ نہیں رہے گا۔ اسی طریقہ سے جو آدمی پانچ وقت کی نماز ادا کرتا ہے وہ ان نمازوں کے ذریعہ سے گناہوں سے ایسا ہی پاک صاف ہو جاتا ہے جیسا کہ نہر میں پانچ وقت نہانے والا جسمانی میل کچیل سے پاک صاف ہو جاتا ہے۔ اس حدیث میں بہت بڑی امید ہے۔

حضرت شیخ کے والدماجد (رحمۃ اللہ علیہ) کا ارشاد

اگرچہ علماء نے یہ لکھا ہے اور آگے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) بھی فرماتے ہیں کہ یہاں جن گناہوں کا تذکرہ ہے کہ نمازوں سے معاف ہوجاتے ہیں وہ سب صغیرہ گناہ ہیں۔اور کبیرہ گناہ توجب تک آدمی توبہ نہ کرے وہاں تک معاف نہیں ہوتے۔اور اس سلسلہ میں حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے فضائلِ نماز میں اپنے والدِ محترم مولانا محمد یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ سے جوبات ذکر فرمائی ہے اس کو میں پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کرچکا ہوں۔ قرآن و حدیث کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو گناہ عبادتوں اور دوسری نیکیوں کی وجہ سے معاف ہوتے ہیں؛وہ صغیرہ گناہ ہیں ، کبیرہ گناہ نہیں۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) کے والد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ مسلمان کے اعمال نامہ میں کبیرہ گناہ تو ہوتا ہی نہیں ہے، ہاں کبھی اس سے نادانستہ طور پر صغیرہ گناہ ہوجاتا ہے، تو وہ ان عبادتوں کی وجہ سے معاف ہوجاتا ہے۔اوراگر کبھی کبیرہ گناہ ہوگیا توجب تک وہ توبہ کرکے اللہ تعالیٰ سے معاف نہ کروالے وہاں تک اس کو چین وسکون نہیں ہوتا۔جیسے اگرکسی کو کسی کے ساتھ محبت ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی کوئی بڑی نافرمانی تووہ کرتا ہی نہیں۔ہاں!بے خبری میں کوئی چھوٹی موٹی غلطی اس سے ہو جاتی ہے تووہ اس کی خدمت کے صلہ میں معاف کردی جاتی ہے۔

جنازہ میں چالیس مؤمنوں کی شرکت کی فضیلت

حدیث ۴۳۰

وعن ابن عباس(رضی اللہ عنہ)قَالَ:سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ:مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوْتُ ، فَيَقُوْمُ عَلٰى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُوْنَ رَجُلاً لَا يُشْرِكُوْنَ بِاللّٰهِ شَيْئاً إِلَّا شَفَّعَهُمُ اللّٰهُ فِيْهِ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو مسلمان انتقال کرجاتا ہے اوراس کے جنازہ کے اوپر ایسے چالیس آدمی نماز پڑھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے ہیں (یعنی مؤمن) تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو اس مرنے والے کے حق میں قبول کرلیتے ہیں۔

افادات:- اس لئے کہ جنازہ کی نماز جو پڑھی جاتی ہے وہ درحقیقت نماز پڑھنے والے مرنے والے کے لئے دعاءِ مغفرت کرتے ہیں۔اور دعاء کے آداب میں سے یہ ہے کہ اس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرو، پھر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجو، اس لئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجنا آدمی کی اس دعاء کو قبولیت کے قریب کردیتا ہے اور جنازہ کی نماز میں پہلی تکبیر کے بعد ثناء پڑھی جاتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہوئی۔ دوسری تکبیر کے بعد درود پڑھا جاتا ہے۔ اور تیسری تکبیر کے بعد دعاء مغفرت پڑھی جاتی ہے: "أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيْرِنَا وَ كَبِيْرِنَا وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا" جس میں آدمی یہ مانگتا ہے کہ اے اللہ! جو ہمارے زندے ہیں ان کی بھی مغفرت فرما، اورجو مرچکے ہیں ان کی بھی مغفرت فرما،

اور جو موجود ہیں اور جو موجود نہیں ہیں ان کی بھی مغفرت فرما چھوٹوں اور بڑوں کی بھی مغفرت فرما، مردوں اور عورتوں کی بھی مغفرت فرما گویا جو لوگ نمازِ جنازہ پڑھ رہے ہیں وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش اور درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ! اسے معاف کردے۔ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کا انتقال ہو جاتا ہے اور چالیس مسلمان اس کی جنازہ کی نماز پڑھتے ہیں گویا چالیس مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس مردے کے لئے سفارش کی کہ اے اللہ! اس کو معاف کردے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ ان چالیس مسلمانوں کی سفارش کو اللہ تعالیٰ قبول کرلیتے ہیں، جب چالیس مسلمان اللہ کی بارگاہ میں یوں کہہ رہے ہیں کہ باری تعالیٰ! اس کو معاف کردیجئے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جاؤ! میں نے اس کو معاف کردیا۔

یہ بھی بہت بڑی امید دلانے والی روایت ہے کہ جس کے جنازہ میں چالیس یا اس سے زیادہ مسلمان شریک ہوتے ہیں تو اس کی مغفرت کی امید بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس روایت کو اس باب میں نقل کیا ہے۔ ان ساری روایتوں میں یہی مضمون مشترک ہے کہ ان کے پڑھنے سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے بڑی امیدیں وابستہ ہو جاتی ہیں، اس لئے ان تمام روایتوں کو اس باب میں نقل کر رہے ہیں۔

جنت میں امتِ محمدیہ کا حصہ

حدیث ۴۳۱

وعن ابن مسعود(رضی اللہ عنہ) قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) فِيْ قُبَّةٍ نَحْوًامِنْ أَرْبَعِيْنَ . فَقَالَ: أَتَرْضَوْنَ أَنْ تَكُوْنُوْارُبُعَ أَهْلِ الْجَنَّةِ ؟قُلْنَا:نَعَمْ.قَالَ:أَتَرْضَوْنَ أَنْ تَكُوْنُوْاثُلُثَ أَهْلِ الْجَنَّةِ؟قُلْنَا:نَعَمْ.قَالَ:وَالَّذِيْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ ، إِنِّيْ لَأَرْجُوْا أَنْ تَكُوْنُوْا نِصْفَ أَهْلِ الْجَنَّةِ.وَذٰلِكَ أَنَّ الْجَنَّةَلَايَدْخُلُهَاإِلَّانَفْسٌ مُسْلِمَةٌ،وَمَاأَنْتُمْ فِيْ أَهْلِ الشِّرْكِ إِلَّا كَالشَّعَرَةِ الْبَيْضَاءِ فِيْ جِلْدِ الثَّوْرِ الْأَسْوَدِ، أَوْكَالشَّعَرَةِ السَّوْدَآءِ فِيْ جِلْدِالثَّوْرِالْأَحْمَرِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم چالیس کے قریب صحابہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر تھے،اس وقت حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم کو مخاطب کرکے فرمایاکہ کیاتم اس بات پرخوش اورراضی ہوکہ جنتیوں میں چوتھائی حصہ تمہارا (یعنی امتِ محمدیہ کا)ہو؟(جب سے دنیاپیداہوئی ہے وہاں سے لے کر قیامت تک جتنے لوگ آئیں گے، ان میں سے جنت میں جتنے جائیں گے،ان جنت میں جانے والوں میں چوتھائی حصہ تمہاراہو،کیاتم اس پر خوش ہو؟ حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں)ہم نے جواب میں عرض کیا:جی ہاں۔پھر حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی ہو کہ جتنے لوگ جنت میں جائیں گے ان میں سے ایک تہائی تمہارا(یعنی امتِ محمدیہ کا)ہو؟ ہم نے عرض کیا:جی ہاں۔ پھر حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد((صلی اللہ علیہ وسلم))کی جان ہے میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید رکھتاہوں کہ تم لوگ جنتیوں میں

آدھے ہوگے،اور یہ اس لیے کہ جنت میں امتِ مسلمہ ہی داخل ہوگی۔اور تم لوگ شرک والوں کے اندر ایسے ہی ہو جیسے سیاہ بیل کے جسم پر سفید بال ہوتا ہے، یا سفید بیل کے جسم پر سیاہ بال ہوتا ہے۔

افادات:-یعنی جتنے لوگ جنت میں جائیں گے ان میں آدھی تعداد تو امت محمدیہ کی ہوگی اور باقی امتیں جو حضرت آدم (علیہ السلام) سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) تک گذری ہیں، وہ تمام مل کر آدھی تعداد ہوگی۔

ایک اور روایت میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو ثلث فرمایا ہے۔جن لوگوں کا جنت میں جانا طے ہے ان کی ۱۲۰/ صفیں ہوں گی، اس میں ۸۰/ صفیں امتِ محمدیہ کی اور چالیس صفیں باقی امتوں کی ہوں گی۔(مسند احمد، ۴۳۲۸) دیکھو! جنت میں جانے والوں میں امتِ محمدیہ کا کتنا بڑا حصہ آیا۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت کے اندر اہلِ ایمان ہی جائیں گے، کافر تو جانے والے نہیں، تو جتنے اہلِ ایمان حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر قیامت تک ہوں گے، ان میں دو تہائی تعداد امتِ محمدیہ کی ہوگی، اور ایک تہائی باقی امتوں کی ہوگی۔

کالے بالوں میں ایک سفید بال

اب کسی کو خیال آسکتا ہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ دنیا کی اتنی بڑی آبادی میں ایک بڑی تعداد تو غیروں کی ہے، اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ تم لوگ شرک والوں کے اندر ایسے ہی ہو جیسے سیاہ بیل کے جسم پر سفید بال ہوتا ہے۔یا سفید بیل کے جسم پر سیاہ بال

ہوتا ہے۔ جسم کے تمام سفید بالوں کے مقابلہ میں کالے بال کی کیا اہمیت و حیثیت ہے؟ یا تمام کالے بالوں میں ایک سفید بال کی کیا حیثیت ہے؟ تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ دنیا کے اندر جو مشرک اور غیر مسلم ہیں ان کے مقابلہ میں تعداد کے اعتبار سے ایمان والوں کی تعداد بہت کم ہے۔ بلکہ یاجوج ماجوج کو ملایا جائے تو جیسا کہ ایک روایت میں آتا ہے: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم کو خطاب کریں گے: اے آدم! تو حضرت آدم (علیہ السلام) حاضر ہو کر عرض کریں گے کہ باری تعالیٰ! حاضر ہوں۔ تو کہا جائے گا کہ ان میں سے جن کو جہنم بھیجنا ہے ان کو الگ کرو۔ وہ کہیں گے کہ کتنے؟ کہا جائے گا کہ ہزار میں نو سو ننانوے۔ حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے جب یہ روایت سنی تو وہ سب ڈر گئے اور سب کے چہرے خوف سے پیلے پڑ گئے کہ ایک ہزار میں نو سو ننانوے تو جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا، اب پتہ نہیں کہ ان ہزار میں سے ایک قسمت والا کون ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب صحابہ کا یہ حال دیکھا تو پھر فرمایا کہ کیا تم اس بات پر خوش ہو کہ جنت میں جانے والوں میں چوتھائی تعداد تمہاری ہو؟ پھر فرمایا کہ تہائی تعداد تمہاری ہو؟ پھر فرمایا کہ آدھی تعداد تمہاری ہو؟ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے والی گنتی ان کافروں کے ذریعہ سے پوری کی جائے گی، اور ایمان والوں کی تعداد کافروں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے سفید بیل کے جسم میں ایک کالا بال ہو۔

جہنم میں مومن کا فدیہ

حدیث ۴۳۲

وعن أبي موسیٰ الأشعری (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ دَفَعَ اللهُ إِلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا، فَيَقُوْلُ هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ۔

وَفِيْ روایۃ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: يَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ نَاسٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ بِذُنُوْبٍ أَمْثَالَ الْجِبَالِ يَغْفِرُهَا اللهُ لَهُمْ۔ (رواہ مسلم)

وقوله: (دَفَعَ إِلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ يَهُوْدِيًّا أَوْ نَصْرَانِيًّا فَيَقُوْلُ: هٰذَا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ) مَعْنَاهُ مَا جَاءَ فِيْ حَدِيْثِ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) (لِكُلِّ أَحَدٍ مَنْزِلٌ فِي الْجَنَّةِ، وَمَنْزِلٌ فِي النَّارِ. فَالْمُؤْمِنُ إِذَا دَخَلَ الْجَنَّةَ خَلَفَهُ الْكَافِرُ فِي النَّارِ، لِأَنَّهُ مُسْتَحِقٌّ لِذٰلِكَ بِكُفْرِهِ) ومَعْنَى (فِكَاكُكَ) أَنَّكَ كُنْتَ مُعَرَّضًا لِدُخُوْلِ النَّارِ، وَهٰذَا فِكَاكُكَ، لِأَنَّ اللهَ تَعَالٰى قَدَّرَ لَنَا عَدَدًا يَمْلَؤُهَا، فَإِذَا دَخَلَهَا الْكُفَّارُ بِذُنُوْبِهِمْ وَكُفْرِهِمْ، صَارُوْا فِيْ مَعْنَى الْفِكَاكِ لِلْمُسْلِمِيْنَ۔ وَاللهُ أَعْلَمُ۔

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا جب قیامت کادن ہوگا تو اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایک یہودی یا ایک نصرانی دے کر یوں فرمائیں گے کہ جہنم میں یہ تیرا فدیہ ہے (یعنی تیری جگہ پر جہنم کے اندر یہ جائے گا) ایک اورروایت میں ہے کہ قیامت کے روز بعض مسلمان پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر آئیں گے تب بھی باری تعالیٰ ایمان کی وجہ سے معاف کر دیں گے۔

افادات:-اس کو آپ اس طرح سمجھئے کہ آسمان سے بجلی گری اور کسی ایک کو ختم کردیا توسب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم سب کی طرف سے کفارہ ہوگیا، ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میرا بدلہ ہوگیا، چونکہ اس کوکسی ایک کوتوشکار کرناہی تھا، یہ ایک اس کا شکار بن گیا، اورباقی سب بچ گئے،تواس کو ان الفاظ سے تعبیر کیاجاتاہے۔

یا جیسے فیکٹری والوں کا جائزہ لینے اور سروے کرنے کے لیے انکم ٹیکس والے نکلے، اور سورت کی تین سو فیکٹریوں میں سے دس پر چھاپہ مار کران کے خلاف چالان کردیا تودوسری تمام فیکٹری والے اطمینان کاسانس لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چلو یہ دس ہماری طرف سے کفارہ بن گئے۔ان انکم ٹیکس والوں کوتودس کو ہی پکڑ نا تھااوروہ دس انہوں نے پکڑ لئے۔تو یہ ایک طرح کی تعبیر ہے۔

میں یہ مثال اس لئے دے رہا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنم کے لیے ایک تعداد مقرر کی ہے کہ اتنے آدمیوں کو جہنم میں بھیجناہے،اب جہنم کی یہ تعداد ان یہودو نصاریٰ سے جو حضور(ﷺ) کی بعثت کے بعد بھی اسی مذہب پر قائم رہے، اور غیر مسلموں سے پوری کی جائے گی۔ حضور(ﷺ) کی بعثت کے بعد کسی یہودی کی یہو دیت اور نصرانی کی نصرانیت قابلِ قبول نہیں ہے جب تک کہ نبیٔ کریم(ﷺ) پر ایمان نہ لے آئے۔ہاں! آپ(ﷺ) کی بعثت سے پہلے جو یہودو نصاریٰ صحیح طریقہ پر تھے؛وہ نجات پائیں گے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لیے ایک تعداد مقرر کی ہے،وہ تعداد توجہنم میں بھیجنی ہی ہے

اوروہ ان یہودونصاریٰ سے پوری کی جائے گی تواب اہلِ ایمان کو اطمینان ہو گیا کہ جہنم کے اندر ہماری طرف سے کفارہ ہوجائے گا۔اسی کوان الفاظ سے تعبیر کیا گیا: "هٰذا فِكَاكُكَ مِنَ النَّارِ" جہنم کے اندر تمہاری طرف سے یہ بدلہ اور فدیہ و کفارہ ہو گیا۔

ہرایک کے لیے دودو جگہیں

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کی تشریح میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انسان پیدا کئے ہیں ہر ایک کے لئے جنت میں ایک مقام ہے، اور جہنم میں ایک مقام ہے۔گویاہرایک کے لیےدودو جگہیں مقرر کی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کون جنت والے عمل کر کے جنت میں جائے گا،اور کون جہنم والے عمل کرکے جہنم میں جائے گا،لیکن اس کے باوجود قدرت کا ایک نظام اور قانون ہے،اسی کے تحت ہر ایک کے لئے ایک ٹھکانہ جنت میں اور ایک ٹھکانہ جہنم میں طے ہے۔اب جو ایمان لائیں گے اورنیک اعمال کریں گے وہ نجات پاکرجنت میں جائیں گے۔اورجوایمان سے محروم رہیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔اب جو جنت میں گئےان کے لئے جہنم میں جوٹھکانہ مقرر تھاوہ خالی رہے گا۔اور جو جہنم میں گئے ان کے لیے جنت میں جوٹھکانہ طے کیا گیاتھاوہ خالی رہے گا۔تواب یہ ہو گا کہ جوجنت میں گئےان کواپنامقام جوان کے لئے جنت میں طے تھا وہ تو ملا ہی،لیکن جو جہنم میں گئےان کے جنت میں جو فلیٹ خالی رہ گئےتھے وہ اِن کے درمیان تقسیم کردیئےجائیں گےاوراُدھر جو جہنم میں گئے،ان کوان کامقام تو ملا، اور جنت

والوں کے حصہ کی جو کوٹھریاں جہنم میں خالی رہ گئیں، وہ اِن جہنمیوں میں تقسیم کی جائیں گی۔اسی کو قرآنِ کریم میں ”تَغَابُنُ“ سے تعبیر کیا گیاہے۔”تَغَابُنُ“ کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کا سودا اور معاملہ جہنمیوں کے ساتھ ہوا، اور وہ سودا ایسا ہوا جس میں جنت والے نفع میں رہے اور جہنم والے گھاٹے میں رہے۔ جہنم والوں کو جنت والوں کے حصہ کے جو درکات تھے وہ ملے۔اور جنت والوں کو جہنم والوں کے جو درجات تھے وہ ملے۔اس طرح اللہ تعالیٰ جنت والوں کے درجات بلند فرمائیں گے۔

درجات اور درکات

جنت کے اندر جو مقامات ہوتے ہیں ان کو ”درجات“ کہا جاتا ہے۔اور جہنم میں جو مقامات ہوتے ہیں ان کو ”درکات“ کہا جاتا ہے۔تو جنتیوں کے حصہ کے درکات یعنی کال کوٹھریاں؛ جہنمیوں کو دیدی جائیں گی اور جہنم والوں کے جو درجات جنت میں ہیں وہ جنتیوں کو دے دیئے جائیں گے۔یعنی ان کے نام کے جو فلیٹ تھے وہ ان کو دئے جائیں گے، تو جہنم والوں کے حق میں یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہوا۔علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ اسی کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مؤمن کو یوں کہے گا کہ یہ تمہارا بدلہ ہے یعنی تمہیں اس جگہ پر جانا تھا، لیکن اس کال کوٹھری میں اس کو فٹ کردیا جائے گا، اسی کو ”فِكَاكُ“ سے تعبیر کیا گیاہے۔بات سمجھ میں آگئی؟ اس روایت میں بھی اہلِ ایمان کے واسطے بڑی امید کی چیز ہے ، اس لئے اس روایت کو یہاں بیان کیا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۸/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۰ھ ۹/ اکتوبر ۱۹۹۹ء

اللہ تعالیٰ کی ذات سے اُمید رکھنی چاہیے، اس عنوان پر علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کچھ روایتیں پیش کی ہیں جو پچھلی پانچ مجلسوں سے چل رہی ہیں، اس سلسلہ کی روایتیں آج بھی پیش کی جارہی ہیں۔

جا! آج بھی تجھے معاف کر دیا

حدیث ۴۳۳

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُولُ: يُدْنَى الْمُؤْمِنُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ رَبِّهِ حَتَّى يَضَعَ كَنَفَهُ عَلَيْهِ، فَيُقَرِّرُهُ بِذُنُوبِهِ، فَيَقُولُ: أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ أَتَعْرِفُ ذَنْبَ كَذَا؟ فَيَقُولُ: رَبِّ أَعْرِفُ. قَالَ: فَإِنِّي قَدْ سَتَرْتُهَا عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا، وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ، فَيُعْطَى صَحِيفَةَ حَسَنَاتِهِ.

(كَنَفَهُ): سَتْرُهُ وَرَحْمَتُهُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز بندے کو اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ اتنا قریب کیا جائے گا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت کی چادر اس پر ڈالیں گے (یعنی اس کے اوپر پردہ ڈالیں گے تاکہ دوسرے لوگ دیکھ نہ سکیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کیا معاملہ کر رہے ہیں۔) پھر اللہ تعالیٰ اس بندے سے اس کے گناہوں کا اقرار

کرائیں گے، جیسے باری تعالیٰ اس سے پوچھیں گے تو فلاں گناہ جانتا ہے؟ تجھے یاد ہے تو نے فلاں روز فلاں جگہ پر یہ گناہ کیا تھا ؟(اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوسرے گناہ بھی اس کو یاد دلائے جائیں گے وہ جواب میں انکار تو نہیں کر سکے گا اس لئے)وہ عرض کرے گا کہ اے باری تعالیٰ! مجھے معلوم ہے۔(گویا وہ اقرار و تسلیم کرلے گا کہ میں نے ان گناہوں کا ارتکاب کیا ہے۔)تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہم نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی تھی، جا! آج بھی تجھے معاف کردیا پھر اس کی نیکیوں کا دفتر اسے دے دیا جائے گا۔

باری تعالیٰ بھی ہنس دیں گے

افادات:-دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ چھوٹے چھوٹے گناہ اس کے سامنے پیش کریں گے اور اس سے ان کا اقرار لیا جائے گا،اب وہ ڈرے گا کہ ان کے علاوہ میرے بڑے بڑے گناہ بھی ہیں،دیکھو!ان سب کا کیا ہوتا ہے۔ جب وہ ان چھوٹے چھوٹے گناہوں کا اقرار کرلے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہم نے دنیا میں تیری پردہ پوشی کی تھی، جا! آج بھی تجھے معاف کردیا،اور ہر گناہ کے بدلہ میں تجھے نیکی دی۔ اُس پر وہ عرض کرے گا کہ باری تعالیٰ! میرے کچھ اور گناہ بھی ہیں جو یہاں نظر نہیں آرہے ہیں۔اس کے اس جواب پر اللہ تعالیٰ بھی ہنس دیں گے(مسلم شریف،۴۸۷)یعنی ابھی تو یہ حال تھا کہ وہ اپنے گناہوں سے ڈر رہا تھا کہ ابھی اگر بڑے گناہوں کا تذکرہ

آئے گا تو میرا کیا حال ہو گا، اور جب دیکھا کہ یہاں تو بہت کچھ مل رہا ہے تو اب خود ہی یاد دلا رہا ہے کہ ان گناہوں کا تو یہاں کچھ ذکر ہی نہیں ہو رہا ہے۔

نبیٔ کریم (ﷺ) کی برکت

لیکن یہاں بخاری و مسلم کی روایت دوسرے انداز سے ہے جس میں یہ ہے کہ جب وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرے گا تو باری تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ میں نے تیرے ان گناہوں پر دنیا کے اندر پردہ پوشی کی تھی، اور لوگوں کو تیرے ان گناہوں سے واقف نہیں ہونے دیا تھا، آج بھی کسی کو واقف نہیں ہونے دیا جائے گا۔ ہر آدمی اپنے حالات اور اپنی کوتاہیوں سے بخوبی واقف ہے، ان گناہوں کی اطلاع اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو نہیں ہے، اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا اس امت پر بہت بڑا احسان و انعام ہے۔ اگلی امتوں پر بڑی پابندیاں تھیں ، قرآنِ پاک میں نبیٔ کریم (ﷺ) کی شان یہ بتلائی گئی ہے کہ آپ (ﷺ) کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے وہ ساری سختیاں اس اُمت پر سے اُٹھالیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کے اندر یہ ہوتا تھا کہ کوئی آدمی رات میں کوئی گناہ کرتا تو صبح اس کے دروازہ پر لکھا ہوتا کہ آج اس نے یہ کام کیا ہے، لیکن اس امت کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ چھپا رہے ہیں ، بے شمار گناہ ایسے ہوتے ہیں جو دنیا میں کسی کو بھی پتہ نہیں چلتے، یہاں تک کہ اس کی بیوی، اس کا بیٹا، اس کا بھائی، اس کا باپ، اور گھر میں ساتھ رہنے والے افراد، بلکہ اس کا ایسا دوست جو چوبیس گھنٹے ساتھ رہتا ہے، لیکن آدمی ان سے بھی چھپاتا ہے اور جانتا

ہے کہ میرے اس گناہ کا اس کو علم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے ان سارے گناہوں پر پردہ پوشی فرما رکھی ہے۔ تو باری تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ دنیا میں مَیں نے تیرے ان گناہوں کی پردہ پوشی کی اور ان کو چھپایا، لوگوں کے سامنے ان کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب دنیا میں ایمان کی وجہ سے یہ معاملہ کیا گیا تو آخرت میں تو اس ایمان پر مزید انعام دیا جاتا ہے، اس لئے آج یہاں معاف کر دیتے ہیں۔

ایمان والے مطمئن ہیں

اور دوسری بات یہ ہے کہ آدمی کو دنیا میں اپنے کرتوت چھپانے کے بعد بھی ہر وقت یہ ڈر تو لگا ہی رہتا ہے کہ وہ کہیں کھل گئے تو میرا کیا ہوگا۔ لیکن یہاں اللہ تعالیٰ اس کو اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ سارے گناہ جو دنیا میں چھپائے گئے تھے، آج بھی چھپا کر معاف کئے جائیں گے اور معافی بھی لوگوں سے چھپا کر ہی عطا ہوگی۔ دنیا والوں کا حال تو یہ ہے کہ کسی کو معاف کر دیں کہ تو نے ایسا کیا تھا، لیکن جا! ہم نے تجھے چھوڑ دیا، تب بھی لوگوں کے سامنے کم سے کم اس کا اظہار تو کیا جاتا ہے کہ اس نے یہ حرکت کی تھی لیکن اس کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو معافی دی جائے گی تو وہاں لوگوں کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، چپکے چپکے ہی معاملہ نمٹ جائے گا۔ اور نیکیوں کا جو اعمال نامہ تھا وہ اس کے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ

گناہ تو معاف کردیئے گئے تھے اور نیکیاں ہی نیکیاں رہی ہیں تو اس کا نتیجہ یہی نکلنے والا ہے کہ وہ خوشی خوشی اپنی نیکیوں کا صحیفہ اور کامیابی کا پروانہ لے کر جنت میں جائے گا۔

بخاری شریف میں حضرت ابن عمر(رضی اللہ عنہ)ہی کی روایت ہے جس میں یہ بھی اضافہ ہے کہ اہلِ ایمان کے ساتھ تو یہ معاملہ کیاجائے گا کہ اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کا اقرار کرا کر معاف کردیں گے اوراس معافی کا دوسروں کو پتہ بھی نہیں چلے گا، چپکے چپکے ہی سب معاملہ نمٹا دیاجائے گا۔باقی جو ایمان والے نہیں ہیں ان کو تو لوگوں کے سامنے کہا جائے گا کہ تم نے ہمارے بھیجے ہوئے رسولوں کو جھٹلایا تھا اوران پر تم ایمان نہیں لائے (بخاری شریف، ۲۴۴۱) گویا حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر قیامت تک جتنے پیدا ہوئے پوری انسانیت میدانِ حشر میں جمع ہوگی، تمام لوگوں کے سامنے اُن کو رسوا کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ یہ بات ایک مؤمن کے لئے بڑی اُمید کی ہے۔

نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں

حدیث ۴۳۴

وعن ابن مسعود(رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَجُلاً أَصَابَ مِنَ امْرَأَةٍ قُبلَةً، فَأَتَى النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَأَخْبَرَهُ فَأَنْزَلَ اللهُ تَعالى: وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّأٰتِ [ھود:۱۱۴] فَقَالَ الرجل: أَلِي هٰذَا يَارَسُوْلَ اللهِ؟ قَالَ: لِجَمِيعِ أُمَّتِي كُلِّهِمْ

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے ایک عورت کو بوسہ دے دیا، پھر فوراً نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع دی (کہ مجھ سے ایسا ہوگیاہے)اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی جس میں ہے کہ نماز قائم کیجئے دن کے دونوں حصوں میں (یعنی صبح وشام۔فجر اور عصر کی نماز مراد ہے)اور رات کی کچھ گھڑیوں میں (مغرب اور عشاء کی نماز مراد ہے)نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں۔اس آدمی نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول!یہ میرے لئے خاص ہے ؟تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا کہ نہیں ! بلکہ میری پوری اُمت کے لئے ہے۔

افادات:-روایتوں میں ہے(سنن ترمذی۔ ۳۱۱۵)ایک عورت ان کے یہاں کھجور خریدنے کے لئے آئی تھی،انہوں نے کہا کہ اندر اچھی کھجوریں رکھی ہوئی ہیں ، جب وہ اندر پہنچی تواس عورت کا بوسہ لے لیا۔بس ان سے یہ حرکت ہوگئی۔حضراتِ صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) کامعاملہ توایساتھا کہ عام طورپرتووہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتے تھے لیکن خدانخواستہ کوئی بات ہوگئی تو پھر ان کے دل کو چین وسکون نہیں ہوتاتھا جب تک کہ وہ گناہ کی سیاہی کو دھوکرصاف نہ کرلیں اوراس کے بوجھ کو اپنے اوپر سے اُتارنہ لیں۔اس لیے وہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اوراطلاع دی کہ یارسول اللہ!مجھ سے ایسا گناہ ہوگیاہے، مجھے پاک کیجئے،یعنی مجھے سزا دیجئے تاکہ میرا گناہ دور ہوجائے اور میرے سر سے بوجھ اتر جائے،مَیں پاک صاف ہوجاؤں ،اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی:﴿وَأَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَزُلَفًا مِّنَ اللَّیْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّئَاتِ (ھود:۱۱۴)﴾

بس! تمہارا گناہ معاف ہوگیا

حدیث ۴۳۵

وعن أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! أَصَبْتُ حَدّاً، فَأَقِمْهُ عَلَيَّ وَحَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فَصَلَّى مَعَ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)، فَلَمَّا قَضَى الصَّلَاةَ. قَالَ: يَارَسُولَ اللهِ! إِنِّي أَصَبْتُ حَدّاً فَأَقِمْ فِيَّ كِتَابَ اللهِ. قَالَ: هَلْ حَضَرْتَ مَعَنَا الصَّلَاةَ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: قَدْ غُفِرَ لَكَ (متفق علیه)

وقوله: (أَصَبْتُ حَدّاً) مَعْنَاهُ: مَعْصِيَةً تُوجِبُ التَّعْزِيرَ. وَلَيْسَ الْمُرَادُ الْحَدَّ الشَّرْعِيَّ الْحَقِيقِيَّ، كَحَدِّ الزِّنَا وَالْخَمْرِ وَغَيْرِهِمَا، فَإِنَّ هٰذِهِ الْحُدُودَ لَا تَسْقُطُ بِالصَّلَاةِ، وَلَا يَجُوزُ لِلْإِمَامِ تَرْكُهَا۔

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ ایک آدمی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسا جرم کیا ہے جس کی وجہ سے مجھ پر حد واجب ہوگئی۔ اتنے میں نماز کا وقت آگیا، تو اس نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نماز ادا کی، جب نماز پوری ہوچکی تو اس نے پھر وہی بات کہی کہ اللہ کے رسول! مجھے سزا دیجئے اور اللہ کا جو حکم ہے وہ میرے اوپر جاری کرکے مجھے پاک کیجئے۔ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ہمارے ساتھ نماز میں تو تم شریک تھے نا؟ اس نے کہا: جی ہاں تو آپ نے فرمایا کہ بس! تمہارا گناہ معاف ہوگیا۔

کیا اسلامی سزائیں وحشیت ہے؟

افادات:- "حد" مخصوص قسم کی سزا ہوا کرتی ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے مخصوص گناہوں کے اوپر ضروری قرار دی گئی ہے، مثلاً کوئی آدمی شراب پئے تو اسّی (۸۰) کوڑے اس کو لگائے جاتے ہیں۔ یا کوئی آدمی اگر زنا کا ارتکاب کرے اور وہ غیر شادی شدہ ہے تو سو (۱۰۰) کوڑے، اور شادی شدہ ہے تو اس کو سنگسار کر دیا جاتا ہے، اگر کوئی آدمی چوری کرے تو دایاں ہاتھ پہنچوں کے اوپر سے کاٹ دیا جاتا ہے۔ یہ بعض مخصوص گناہوں کے اوپر مخصوص سزائیں ہیں؛ اس کو" حد" کہتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہے۔ جب کوئی آدمی اس قسم کے گناہ کا ارتکاب کرے اور حاکم کے سامنے یہ چیز ثابت بھی ہو جائے تو پھر حاکم کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کو معاف کرے، بلکہ اس کو سزا دینا ضروری ہے۔

آج کل کی دنیا میں تو نعوذباللہ اسلام کی ان سزاؤں کو بڑے خطرناک لفظوں میں وحشیانہ عمل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایسی تعبیر سے ہر مسلمان کو اللہ بچائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں اور جو سزائیں مقرر کی ہیں، ان کے متعلق ایسے جملے استعمال کئے جاتے ہیں، حالاں کہ اسلام کی نگاہوں میں انسان کی جان ومال، عزت و آبرو اور عقل و خرد اور نسب کی حفاظت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کوئی آدمی جب شراب پیتا ہے تو آدمی کی عقل و خرد پر اثر انداز ہوتی ہے، اس لئے شریعت نے اس کے لئے سزا مقرر کی ہے۔ صرف چار

پانچ ہی گناہ ایسے ہیں جن کے بارے میں مخصوص قسم کی سزائیں بطورِ حد مقرر کی گئی ہیں؛ ان میں ایک شراب نوشی بھی ہے حدیثِ پاک میں شراب کو ’’اُم الخبائث‘‘ تمام گناہوں کی ماں قرار دیا گیا ہے۔ شراب نوشی کی وجہ سے آدمی کی عقل سلامت نہیں رہے گی تو وہ کچھ بھی کر گزرے گا۔ بہت سے لوگ نشہ کی حالت میں زنا کرتے ہیں، قتل کرتے ہیں اور دوسرے گناہوں کا ارتکاب بھی کرتے ہیں، کوئی بھی اقدام کر گزرنا ان سے بعید نہیں ہے؛ اس سے حفاظت کے لئے ایک سزا مقرر کی گئی ہے کہ شراب نوشی پر اسّی (۸۰) کوڑے لگائے جائیں۔

یا کوئی آدمی اگر چوری کرے تو وہ دوسرے کے مال کی حفاظت کو ختم کرتا ہے، اور شریعت کی طرف سے دوسرے کے مال کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی ہے، اور جو شخص اس گارنٹی کو ختم کرتا ہے، اس کے لئے سزا مقرر کی گئی ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی اگر زنا کا ارتکاب کرتا ہے، تو وہ دوسرے کی عزت و آبرو پر ڈاکہ تو ڈال ہی رہا ہے، ساتھ ہی ساتھ زنا کی وجہ سے نسب مخلوط ہو جائے گا۔ کسی کی بیوی کے ساتھ زنا کیا تو اب جو بچہ پیدا ہوگا تو پتہ نہیں چل سکتا کہ وہ شوہر کا ہے، یا زانی کا؟ اور اسلام کی نگاہ میں نسب کی حفاظت بھی بنیادی چیزوں میں سے ہے، اس لئے یہ سزا رکھی ہے کہ زنا کے اوپر کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اور اگر شادی شدہ ایسی حرکت کرے تو چوں کہ زنا سے بچنے کے اسباب مہیا ہو چکے ہیں پھر بھی زنا میں مبتلا ہو رہا ہے، اس لئے اس کی سزا

سنگساری رکھی گئی۔اور کوئی آدمی اگر کسی کی جان پر ڈاکہ ڈالے اوراس کی جان کو ختم کردے تو اس کے بدلہ میں قتل کیا جاتا ہے۔تو یہ سب سزائیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی ہوئی ہیں۔

جہاں اسلامی احکام جاری کئے جاتے ہیں اوراسلامی قوانین کا عمل دخل ہے، وہاں کتنی چوریاں ہوتی ہیں ؟کتنے قتل ہوتے ہیں ؟کتنی شراب نوشی ہوتی ہے؟اس کے اعدادوشمار جمع کرلئے جائیں ۔اس کے مقابلہ میں جولوگ اسلامی سزاؤں کوغلط قرار دیتے ہیں ان کے یہاں ان جرائم کا کتناارتکاب ہوتاہے،وہاں گناہوں کا کتنابازار گرم ہورہا ہے؛وہ دیکھ لو، اور آج کل کی دنیاان سزاؤں کوغلط عنوان دے کراپنے آپ کوان میں سے کون سے گناہوں سے بچاپارہی ہے؟حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہ) کی تربیت اس انداز سے کی گئی تھی کہ وہاں اگر کسی سے نادانستہ طور پر کوئی جرم ہوجاتا توپکڑنے کیلئے پولیس نہیں بھیجنی پڑتی تھی،بلکہ مجرم خود کہہ رہا ہے کہ مجھ سے یہ گناہ ہوگیا ہے ،مجھے پاک کر دیجئے۔اس روایت میں بھی اس امت کے لئے بڑی اُمید کی بات آئی ہے کہ جو لوگ نیکیوں کے کام کرتے رہتے ہیں، اگر ان سے کچھ گناہ صادر بھی ہوجاتے ہیں تواللہ تعالیٰ کی رحمت سے اُمید ہے کہ ان نیکیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف کردیں گے ۔

ہم خُرما وہم ثواب

حدیث ۴۳۶

وعنه قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(ﷺ):إِنَّ اللهَ لَيَرْضَى عَنِ الْعَبْدِأَنْ يَأْكُلَ الْأَكْلَةَ،فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا، أَوْ يَشْرَبَ الشَّرْبَةَ،فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا. (رواه مسلم)

(اَلْأَكْلَةَ):بِفَتْحِ الْهَمْزَةِوَهِيَ الْمَرَّةُالْوَاحِدَةُمِنَ الْأَكْلِ كَالْغَدْوَةِ وَالْعَشْوَةِ.

ترجمہ:-حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم(ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے اس بات پرراضی ہوتاہے کہ وہ کھانا کھائیں تواللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کریں ،یا کوئی چیز پیئیں تواس پر اللہ کی حمدوثنا بیان کریں۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ کھاکرجب آدمی دُعا پڑھتاہے:﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مُسْلِمِيْنَ.﴾اللہ تعالیٰ کا بڑااحسان اوراس کی تعریف ہے کہ اس نے ہم کو کھلایا پلایا اورہمیں مسلمان بنایا؛تو اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش اور راضی ہو جاتا ہے،گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرکے کھانے پینے کا حق ادا کیا۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے

حدیث ۴۳۷

وعن أبي موسیٰ (رضی اللہ عنہ) عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالیٰ يَبْسُطُ يَدَهُ بِاللَّيْلِ لِيَتُوبَ مُسِيئُ النَّهَارِ، وَيَبْسُطُ يَدَهُ بِالنَّهَارِ لِيَتُوبَ مُسِيئُ اللَّيْلِ، حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا۔ (رَوَاهُ مُسْلِمٌ)

ترجمہ:-حضرت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات کو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ دن کا گنہگار توبہ کرلے۔اوردن کو اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے تاکہ رات کا گنہگار توبہ کرلے، یہاں تک کہ سورج مغرب کی جانب سے طلوع ہو۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے دن میں گناہ کئے تورات کو توبہ کرلے؛اللہ تعالیٰ معاف کردیتے ہیں۔رات میں گناہ کئے تودن میں توبہ کرلے؛اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔البتہ آخری زمانہ میں جب قیامت قریب ہوگی اور سورج مغرب کی طرف سے طلوع ہوگا،اس کے بعد توبہ قبول نہیں ہوگی۔

یہ بھی بڑی امید کی چیز ہے۔آدمی کتناہی گنہ گارکیوں نہ ہو،اسلام میں اس کے لئے مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے،بس!توبہ کرلے۔اورتوبہ کے لئے بھی کوئی قیدوشرط نہیں ہے۔وہ جہاں ہے وہیں اپنی جگہ پراُسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجائے اور اپنے گناہ پرپچھتائے اوراللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اوریہ عہدکرے کہ آئندہ نہیں کروں گا؛ بس! توبہ ہوگئی۔

صلوۃ الوضوء کی فضیلت

حدیث ۴۳۸

وعَنْ أَبِي نَجِيح عمرِ و بْنِ عَبَسَةَ السُّلَمِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ : كُنْتُ وَ أَنَا فِي الْجَاهِلِيَّةِ أَظُنُّ أَنَّ النَّاسَ عَلَى ضَلَالَةٍ،وَأَنَّهُمْ لَيْسُوا عَلَى شَيْءٍ،وَهُمْ يَعْبُدُونَ الْأَوْثَانَ فَسَمِعْتُ بِرَجُلٍ بِمَكَّةَ يُخْبِرُ أَخْبَارًا،فَقَعَدْتُ عَلَى رَاحِلَتِي،فَقَدِمْتُ عَلَيْهِ،فَإِذَا رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) مُسْتَخْفِياً،جُرَآءُ عَلَيْهِ قَوْمُهُ،فَتَلَطَّفْتُ حَتَّى دَخَلْتُ عَلَيْهِ بِمَكَّةَ،فَقُلْتُ لَهُ: مَا أَنْتَ؟ قَالَ:أَنَانَبِيٌّ۔قُلْتُ:وَمَا نَبِيٌّ؟قَالَ:أَرْسَلَنِي اللهُ۔قُلْتُ:وَبِأَيِّ شَيْءٍ أَرْسَلَكَ؟ قَالَ:أَرْسَلَنِي بِصِلَةِ الْأَرْحَامِ، وَ كَسْرِ الْأَوْثَانِ،وَأَنْ يُوَحَّدَاللهُ لَا يُشْرَكُ بِهِ شَيْءٌ.قُلْتُ: فَمَنْ مَعَكَ عَلَى هٰذَا؟ قَالَ: حُرٌّ وَ عَبْدٌ۔ ومَعَهُ يَوْمَئِذٍ أَبُوبَكْرٍ وَبِلَالٌ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قُلْتُ: إِنِّي مُتَّبِعُكَ قَالَ:إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ ذَالِكَ يَوْمَكَ هٰذَا،أَلَا تَرَى حَالِي وحَالَ النَّاسِ؟ وَلٰكِن ارْجِعْ إِلَى أَهْلِكَ،فَإِذَاسَمِعْتَ بِي قَدْ ظَهَرْتُ فَأْتِنِي قَالَ: فَذَهَبْتُ إِلَى أَهْلِي وَقَدِمَ رَسُولُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) الْمَدِينَةَ حَتَّى قَدِمَ نَفَرٌ مِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ فَقُلْتُ: مَا فَعَلَ هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِي قَدِمَ الْمَدِينَةَ؟ فَقَالُوا: النَّاسُ إِلَيْهِ سِرَاعٌ،وَقَدْ أَرَادَ قَوْمُهُ قَتْلَهُ،فَلَمْ يَسْتَطِيعُوا ذَالِكَ. فَقَدِمْتُ الْمَدِينَةَ، فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ،فَقُلْتُ:يَارَسُولَ اللهِ! أَتَعْرِفُنِي؟قَالَ:نَعَمْ،أَنْتَ الَّذِي لَقِيتَنِي بِمَكَّةَ.قَالَ:فَقُلْتُ:يَارَسُولَ اللهِ!أَخْبِرْنِي عَمَّا عَلَّمَكَ اللهُ وَأَجْهَلُهُ.أَخْبِرْنِي عَنِ الصَّلَاةِ؟ قَالَ:صَلِّ صَلَاةَالصُّبْحِ ثُمَّ اقْصُرْعَنِ الصَّلَاةِ حَتَّى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ قِيدَ رُمْحٍ، فَإِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ وَحِينَئِذٍيَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ.ثُمَّ صَلِّ ،فَإِنَّ الصَّلَاةَ مَشْهُودَةٌ مَحْضُورَةٌ حَتَّى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ ، ثُمَّ اقْصُرْعَنِ الصَّلَاةِ،فَإِنَّهُ حِينَئِذٍ تُسْجَرُ جَهَنَّمُ .فَإِذَا أَقْبَلَ الْفَيْءُ فَصَلِّ،فَإِنَّ الصَّلَاةَمَشْهُودَةٌمَحْضُورَةٌحَتَّى تُصَلِّيَ الْعَصْرَ،ثُمَّ اقْصُرْعَنِ الصَّلَاةِحَتَّى تَغْرُبَ الشَّمْسُ، فَإِنَّهَا تَغْرُبُ بَيْنَ قَرْنَيْ شَيْطَانٍ،وحِينَئِذٍيَسْجُدُ لَهَا الْكُفَّارُ . قَالَ:فَقُلْتُ:يَانَبِيَّ اللهِ!فَالْوُضُوءَ حَدِّثْنِي عِنْهُ؟فَقَالَ:مَامِنْكُمْ رَجُلٌ يُقَرِّبُ وَضُوئَهُ

فَيَتَمَضْمَضُ وَيَسْتَنْشِقُ فَيَسْتَنْثِرُ، إِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا وَجْهِهِ، وَفِيهِ، وَخَيَاشِيمِهِ ثُمَّ إِذَا غَسَلَ وَجْهَهُ كَمَا أَمَرَهُ اللهُ، إِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا وَجْهِهِ مِنْ أَطْرَافِ لِحْيَتِهِ مَعَ الْمَاءِ۔ ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ إِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا يَدَيْهِ مِنْ أَنَامِلِهِ مَعَ الْمَاءِ۔ ثُمَّ يَمْسَحُ رَأْسَهُ مِنْ أَطْرَافِ شَعْرِهِ مَعَ الْمَاءِ ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ إِلَّا خَرَّتْ خَطَايَا رِجْلَيْهِ مِنْ أَنَامِلِهِ مَعَ الْمَاءِ۔ فَإِنْ هُوَ قَامَ فَصَلَّى، فَحَمِدَ اللهَ تَعَالَى، وَأَثْنَى عَلَيْهِ وَمَجَّدَهُ بِالَّذِي هُوَ لَهُ أَهْلٌ، وَفَرَّغَ قَلْبَهُ لِلّٰهِ تَعَالَى إِلَّا انْصَرَفَ مِنْ خَطِيئَتِهِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ.

فَحَدَّثَ عَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ بِهٰذَا الْحَدِيثِ أَبَا أُمَامَةَ صَاحِبَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) فَقَالَ لَهُ أَبُو أُمَامَةَ: يَا عَمْرُو بْنُ عَبَسَةَ! أُنْظُرْ مَا تَقُولُ! فِي مَقَامٍ وَاحِدٍ يُعْطَى هٰذَا الرَّجُلُ؟ فَقَالَ عَمْرٌو: يَا أَبَا أُمَامَةَ ! لَقَدْ كَبِرَتْ سِنِّي، وَرَقَّ عَظْمِي، وَاقْتَرَبَ أَجَلِي، وَمَا بِي حَاجَةٌ أَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللهِ تَعَالَى وَ لَا عَلَى رَسُولِ اللهِ (ﷺ) لَوْ لَمْ أَسْمَعْهُ مِنْ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) إِلَّا مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا حَتَّى عَدَّ سَبْعَ مَرَّاتٍ، مَا حَدَّثْتُ أَبَدًا بِهِ، وَلٰكِنِّي سَمِعْتُهُ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمرو بن عبسہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جب کہ نبئ کریم (ﷺ) کی بعثت نہیں ہوئی تھی اور آپ (ﷺ) کی دعوت کا سلسلہ جاری نہیں ہوا تھا اس وقت بھی میں یہ سمجھتا تھا کہ لوگ گمراہی پر ہیں، بتوں کی پوجا کرتے ہیں، اور کسی دین کے پابند نہیں ہیں (مطلب یہ ہے کہ اس وقت بھی مَیں بت پرستی کو برا سمجھتا تھا) پھر مجھے پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ میں ایک آدمی ظاہر ہوئے ہیں اور وہ کچھ غیب کی خبریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ باتیں لوگوں کو بتلا رہے ہیں، تو مَیں اپنے اونٹ پر سوار ہوا اور نبئ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا، جس وقت مَیں پہنچا تو نبئ کریم (ﷺ) مکہ والوں کی ایذاء رسانیوں کی وجہ سے چھپے ہوئے تھے، آپ کی قوم آپ کو بڑی تکلیفیں پہنچارہی تھی (ایسے وقت میں حضور کی خدمت میں کیسے حاضر ہوتا جبکہ کوئی بتاتا بھی نہیں تھا کہ حضور کہاں ہیں جیسے حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ) کا قصہ ہے کہ وہ پہنچے تھے، پھر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے بتلایا کہ

میرے پیچھے پیچھے اس طرح آنا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ تم میرے پیچھے آرہے ہو)اسی طرح مَیں نے بھی مکہ پہنچ کر تدبیر کی اور کسی طرح حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پہنچ گیا وہاں پہنچ کر مَیں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)سے یہ سوال کیا :آپ کون ہیں اور کیاہیں ؟آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)نے جواب میں فرمایا میں نبی ہوں ۔ میں نے پوچھا: نبی کیا ہوتاہے (اس لئے کہ آج تک نبی کالفظ سنانہیں تھا)تو آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا:اللہ تعالیٰ نے مجھے اپناپیغام لے کر بھیجاہے(اور جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپناپیغام بندوں تک پہنچائیں اس کونبی کہتے ہیں) میں نے پوچھا:کیا پیغام اور کیا تعلیمات دے کرآپ کو بھیجا ہے؟توحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایاکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جن احکام کولے کربھیجاہے ان میں ایک توصلہ رحمی ہے (یعنی رشتہ داری کے حقوق کو اداکرنا۔صلہ رحمی اسلام کی بالکل ابتدائی تعلیمات میں سے ہے، جبکہ ابھی نمازروزہ اور دیگر عبادتیں فرض نہیں ہوئی تھیں۔گویاصلہ رحمی کاخوبی کی چیز ہونا ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکارنہیں کیا جاسکتا ہے) اوربتوں کے توڑنے کاحکم لے کربھیجا ہے۔اوریہ حکم دیاہے کہ اللہ کو ایک مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔میں نے پوچھا:آپ جوپیغام اور حکم لے کر آئے ہیں ، اس میں آپ کاساتھ کون دے رہا ہے؟حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایاکہ ایک غلام اور ایک آزاد۔اس دن نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کے اوپر ایمان لانے والوں میں حضرت ابو بکر(رضی اللہ عنہ) تھے جو آزادتھے،اور غلاموں میں حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) تھے۔

عمروبن عبسہ(رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول! میں بھی آپ کی پیروی کروں گا،اورمیں بھی آپ پر ایمان لاتاہوں۔توجواب میں حضور نے فرمایاکہ آج اس حالت میں تم وہ نہیں کرسکوگے(دیکھو!نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ایمان لانے سے منع نہیں فرمایا، ان کے ایمان کوتوآپ (صلی اللہ علیہ وسلم)نے قبول کرلیالیکن مکہ میں رہ کر اپنے ایمان کے اظہاراور اعلان سے آپ نے منع فرمایاکہ بھائی تم سے یہ نہیں ہوسکے گا، تم اگراپنے ایمان کا اعلان کردوگے توپھروہ لوگ تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور تمہیں بہت

تکلیفیں پہنچائیں گے۔ہم تو یہاں کے رہنے والے ہیں اور یہ تکلیفیں پہنچانے والے بھی ہمارے اپنے ہیں ، پھر بھی یہ ہم کو نہیں چھوڑتے ،تو تمہاراحال کیا ہو گا جبکہ تم تو اجنبی ہو، تمہارے ساتھ تو اور زیادتی ہوگی جو تم برداشت نہیں کرسکوگے)تم دیکھ نہیں رہے ہو کہ میرااور وہ لوگ جو میرے اوپرایمان لائے ہیں ان کا کیاحال ہورہاہے۔اس لئے میں تم کومشورہ دیتاہوں کہ اپنے گھراپنے قبیلہ اور وطن میں واپس ہوجاؤ،جب تم کو پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے لوگوں پر غلبہ دیاتب میرے پاس آنا(دیکھو!حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)کواپنے غلبہ اور ظہورکاکتناقوی یقین تھا کہ ایک وقت آئے گااور تمہیں پتہ چلے گااوریہ اطلاع ملے گی کہ مجھے اللہ نے سب لوگوں پر کامیابی عطا فرمائی ہے،اس وقت میرے پاس چلے آنا۔)

حضرت عمروبن عبسہ(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ میں اپنے وطن واپس لوٹ گیا، اس کے بعدتو حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)مدینہ منورہ تشریف لے گئے،میں اپنے وطن اوراپنے قبیلہ ہی میں رہا اورمیں لوگوں سے باقاعدہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)کی خبریں معلوم کرتا رہااور لوگوں سے آپ کا حال پوچھتا رہا،یہاں تک کہ میرے قبیلہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ پہنچے اورجب واپس آئے تو میں نے پوچھا: بھائی !یہ صاحب جو ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے تھے ان کا کیا حال ہے؟ اوران کی کیا خبرہے؟ ان آنےوالوں نےمجھے بتلایا کہ لوگ اب ان کی دعوت کوبہت تیزی سے قبول کر رہے ہیں،اور مکہ والوں نے ان کو قتل کرناچاہالیکن نہیں کرسکے۔جب مجھے یہ معلوم ہوا تومیں مدینہ منورہ آیا اور حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)کی خدمت میں حاضرہوااورمیں نے

پہلا سوال کیا: اللہ کے رسول! آپ مجھے پہنچانتے ہیں؟ حضور (ﷺ) نے فرمایا: جی ہاں! تم وہی ہو جو مجھے مکہ مکرمہ میں ملے تھے۔

نماز کے اوقات کی تعلیم

پھر میں نے حضور (ﷺ) سے عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت سارے احکام بتلائے ہیں، وہ سب آپ مجھے بتلایئے اور مجھے نماز کا طریقہ بھی سکھلایئے۔ چنانچہ نبی کریم (ﷺ) نے بتلایا کہ فجر کی نماز ادا کرو اور پھر نماز پڑھنے سے رک جاؤ، یہاں تک کہ سورج طلوع ہونے کے بعد ایک نیزہ کے برابر اونچا ہو جائے، اس لئے کہ جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے، اور اس وقت کافر لوگ سورج کو سجدہ کرتے ہیں۔

شیطان کا عجیب تماشہ

(شیطان نے بھی عجیب تماشہ بنا رکھا ہے، سورج کی پوجا کرنے والوں کے اوقات مقرر ہیں، جس وقت سورج طلوع وغروب ہوتا ہے تو اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور اس کی پوجا کرتے ہیں، تو شیطان کی عادت یہ ہے کہ جس وقت سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان سورج کے بالکل سامنے آکر اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ سورج اس کے پیچھے ایسا لگتا ہے کہ اس کے دو سینگ کے درمیان ہو، اسی کو تعبیر کیا گیا ہے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں

کے بیچ میں طلوع ہوتا ہے، اور شیطان دیکھنے والوں کو یہ تأثر دیتا ہے کہ یہ لوگ میری پوجا کررہے ہیں،اس لئے حضور(ﷺ)فرماتے ہیں کہ جس وقت سورج طلوع ہونے لگے اس وقت عبادت مت کرو، اس لئے کہ یہ کافروں کی عبادت کا وقت ہے)

پھر اس کے بعد جب ایک نیزہ بلند ہوجائے تونماز پڑھ لو،اس وقت اگرتم نماز پڑھو گے توفرشتے تمہاری نماز کے اندر حاضر ہوں گےاور اس کاثواب بھی لکھاجائے گایہاں تک کہ نیزہ کا سایہ کم سے کم جتنا ہوسکتا ہے اتنا ہوجائے،اس وقت پھر نماز پڑھنا بند کردو۔ (مطلب یہ ہے کہ سورج جب بالکل سر کے اوپر آجائے گاتوہرچیز کاسایہ بالکل کم ہوجائے گا،اس لئے کہ سورج جب اونچاہوناشروع ہوتا ہے، تو ہر چیز کا سایہ گھٹنا شروع ہوتاہے یہاں تک کہ ذراسارہ جاتاہے۔بعض علاقے توایسے ہیں جہاں سورج بالکل سر کے اوپرتونہیں آتا، لیکن آسمان کے بیچ میں آجاتا ہے، اورذراجھکاؤہوتاہے، کیوں کہ ہمارے علاقوں میں دوپہرکے وقت سردیوں میں سایہ ذرا لمبا ہوتا ہے،اور گرمیوں میں کم ہوتا ہے، پھر جب سورج دوسری طرف ڈھلنا شروع ہوگا تو سایہ پھر دوبارہ بڑھنا شروع ہوگا۔صبح سے استوائے شمس تک توسایہ مغرب کی طرف تھا اب مشرق کی جانب ہو جائے گا؛اسی کو ''فے ''کہتے ہیں۔تو حضور(ﷺ)فرماتے ہیں کہ) جب سورج بالکل بیچ میں آجائے تونماز پڑھنابند کردو، اس لئے کہ اس وقت جہنم کو بھڑکایاجاتاہے۔اس کے بعدجب سایہ مشرق کی طرف جانے لگے تونماز شروع کرو(یعنی سورج ڈھل جائے تو نماز پڑھو)

اس لئے کہ اس وقت نماز پڑھوگے تو فرشتے بھی آئیں گے اوراعمال نامہ میں نیکیاں بھی لکھی جائیں گی، یہاں تک کہ عصر کا وقت آجائے تو عصر کی نماز پڑھ لو۔جب عصر کی نماز پڑھ لی تواب نماز پڑھنا بند کردو یہاں تک کہ سورج ڈوب جائے،اس لیے کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان ڈوبتا ہے اوراس وقت کافر لوگ اس کو سجدہ کرتے ہیں (اس طرح نبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو نماز کے اوقات بتائے)

وضو کا طریقہ

حضرت عمرو بن عبسہ (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں نے پوچھا: آپ مجھے وضو کے متعلق بتایئے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی اپنے وضو کا پانی اپنے قریب کرتا ہے، اور کلّی کرتا ہے،ناک میں پانی ڈالتا اور نکالتا ہے،تو اس کے مَنخُرُوں اور منہ سے گناہ دُھل جاتے ہیں ،پھر جب چہرہ دھوتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو چہرہ کے گناہ ڈاڑھی کی طرف سے دُھل جاتے ہیں۔ پھر جب ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتا ہے تو دونوں ہاتھوں کے گناہ پوروں سے دُھل کر پانی کے ساتھ نیچے زمین پر گرتے ہیں ،اور جب سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ بالوں کی طرف سے پانی کے ساتھ گرتے ہیں۔ اور پھر جب دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کے گناہ پوروں سے انگلیوں کے پانی سے نیچے گرتے ہیں۔ جب پوروں سے پانی ٹپکتا ہے تو گناہ بھی ٹپک جاتے ہیں۔ اوراس کے بعد جب کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے اوراللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہے(جیسے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ

الْعَالَمِیْنَ﴾ کہتا ہے)اور جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کی تعریف کرتا ہے ، اور اپنے دل کو خالص اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتا ہے ،تو وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔

مَیں کیوں جھوٹ باندھوں

(راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمرو بن عبسہ (رضی اللہ عنہ)نے یہ روایت بیان کی تو ایک صحابی حضرت ابو اُمامہ(رضی اللہ عنہ) بھی وہاں موجود تھے۔اب چوں کہ اس میں وضو کرنے کے بعد دو رکعت پڑھنے پر یہ فضیلت بتلائی گی ہے کہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسا کہ ماں نے آج اس کو جنا ہو تو)حضرت ابو امامہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا :اے عمرو بن عبسہ!ذرا سوچ کر بولو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ ایک ہی مرتبہ میں سارے گناہوں کو ختم کر دیا جائے گا۔اس کے جواب میں عمرو بن عبسہ(رضی اللہ عنہ)نے کہا: اے ابو امامہ! میری عمر بڑی ہوگئی ہے،میری ہڈیاں کمزور پڑگئی ہیں اور میری موت کا وقت قریب ہے، مجھے کوئی ضرورت نہیں پڑی کہ اللہ اوراس کے رسول کے خلاف کوئی جھوٹ باندھوں(اس میں میرا کوئی مفادوابستہ نہیں ہے۔ جب آدمی موت کے قریب ہوتا ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے تو اللہ کے نام پر میں ایسی جھوٹی بات کروں اور حضور کے حوالہ سے ایسی جھوٹی بات کہوں اس کی مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔)اگر میں نے یہ بات حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) سے ایک مرتبہ ،دو مرتبہ، تین مرتبہ، یہاں تک کہ سات مرتبہ نہ سنی

ہوتی تو کبھی بھی میں یہ بات بیان نہ کرتا۔ گویا حضور اکرم (ﷺ) کا یہ ارشاد جو میں نے بیان کیا ہے وہ میں نے ایک مرتبہ نہیں، سات مرتبہ؛ بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ سنا ہے (یہ بڑی امید والی روایت ہے، اسی لئے یہاں پیش کی ہے)

جب رحم کرنا چاہتے ہیں

حدیث ۴۳۹

وعن أبي موسیٰ الأشعری (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ (ﷺ) قَالَ: إِذَا أَرَادَ اللهُ تَعَالیٰ رَحْمَةَ أُمَّةٍ، قَبَضَ نَبِيَّهَا قَبْلَهَا، فَجَعَلَهُ لَهَا فَرَطًا وَسَلَفاً بَيْنَ يَدَيْهَا وَإِذَا أَرَادَ هَلَكَةَ أُمَّةٍ عَذَّبَهَا، وَنَبِيُّهَا حَيٌّ، فَأَهْلَكَهَا وَهُوَ حَيٌّ يَنْظُرُ، فَأَقَرَّ عَيْنَهُ بِهلَاكِهَا حِيْنَ كَذَّبُوْهُ وَعَصَوْا أَمْرَهُ (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔ حضرت اَبوموسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امت کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں تو اس امت کے نبی کو اس سے پہلے وفات دے دیتے ہیں (اُمت باقی رہتی ہے) اوراس نبی کو ان کے لیے پیش روبنا کر اُٹھالیتے ہیں اوراللہ تعالیٰ جب کسی امت یا قوم کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس اُمت کو نبی کی موجودگی اور زندگی میں ہی عذاب دیتے ہیں، وہ نبی زندہ ہوتے ہیں اور امت کی ہلاکت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اوراس طرح نبی کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں کہ انھوں نے مجھے جھٹلایا، اور میری نافرمانی کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو سزادی۔

پیش رو کا مطلب

افادات:-اُس زمانہ میں جب کوئی قافلہ یا لشکر سفر کرنے والا ہوتا تھا تو اس قافلہ یا لشکر کے کچھ لوگوں کو پہلے بھیج دیا جاتا تھا۔ مثلاً لشکر تو یہاں سے شام کو روانہ ہونے والا ہے، اور دس کلومیٹر دور جا کر پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ ہے تو جو جگہ قیام کے لئے طے ہوتی تھی وہاں پہلے سے چند آدمیوں کو بھیج دیا جاتا تھا، وہاں پہنچ کر یہ لوگ آنے والے قافلہ اور لشکر کے لئے پانی کا انتظام کرتے تھے، تاکہ جب قافلہ وہاں پہنچے تو تکلیف نہ ہو، پہنچتے ہی سب چیزیں تیار ملیں۔ تو پہلے جاکر انتظام کرنے والے کو عربی زبان میں ''فَرَطٌ'' کہتے ہیں، اردو میں اس کا ترجمہ ''پیش رو'' کرتے ہیں پہلے سے آگے جاکر انتظام کرنے والی جماعت۔ گویا اللہ تعالیٰ کسی قوم کی موجودگی میں اس قوم کے نبی کو وفات دیتے ہیں تو اس نبی کی ذات کو اس قوم کے لئے پیش رو بنا دیتے ہیں، وہ نبی اللہ تعالیٰ کے یہاں جاکر اس امت کے لئے سب تیار کرتا ہے۔ اسی لئے حضور (ﷺ) نے جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو یہی فرمایا تھا کہ میں تمہارے لئے پیش رو ہوں، میرا تم سے حوضِ کوثر پر ملاقات کا وعدہ ہے۔

جب ہلاک کرنا چاہتے ہیں

اوراللہ تعالیٰ جب کسی امت یاقوم کو ہلاک کرناچاہتےہیں تو اس اُمت کونبی کی موجودگی میں کو عذاب دیتے ہیں اوریہ اس امت کے لئے برائی کی چیزہے۔اس امت کواللہ تعالیٰ ایسی حالت میں ہلاک کرتاہے کہ وہ نبی موجود ہوتےہیں اورامت کی ہلاکت کودیکھ رہےہوتےہیں،گویالوگوں نےنبی کوجھٹلایا یاتکلیفیں پہنچائی تو اللہ تعالیٰ اس نبی کے دیکھتےہوئےاُن لوگوں کوہلاک کرتے ہیں ،تاکہ نبی کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں کہ انھوں نےمجھے جھٹلایااور میری نافرمانی کی،تواللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی ۔

ظاہرہےکہ ہم امتِ محمدیہ کےلئےاس روایت میں بہت ہی امیدافزا بات ہے کہ اُمت ِمحمدیہ کے موجودہوتے ہوئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کو دنیا سےاُٹھالیا۔آپ کادنیاسےتشریف لے جانا پوری امت کےلئےاس معنٰی کررحمت ہےکہ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)ہمارےلئےپہلےسےجاکرپیش روبنے ہوئے ہیں ،اوروہاں جاکر ہمارے لئے سب تیاری کروارہے ہیں۔

فَضۡلُ الرَّجَآءِ

اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

قال اللّٰہُ تعالیٰ أخبارًا عن العبد الصالح (وَأُفَوِّضُ أَمْرِیْ إِلَی اللّٰہِ إِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ فَوَقَاہُ اللّٰہُ سَیِّئَاتِ مَا مَکَرُوْا) (غافر: ۴۴،۴۵)

تو اللہ تعالیٰ نے ان کو محفوظ رکھا

پہلے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اُمید اور خوف کے متعلق روایتیں پیش کی تھیں۔اس سے پہلے باب میں صرف اُمید کا تذکرہ تھا،اب اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی اللہ تبارک وتعالیٰ سے اُمید رکھتا ہے تو اس کے لئے کیا فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے پر کن کن انعامات سے نوازا جاتا ہے،اس پر کیا نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔

سورۂ غافر میں اللہ تعالیٰ ایک بندے کا تذکرہ کرتے ہیں جس نے لوگوں کو ایمان کی دعوت دی تھی اور اُن کی طرف سے اس بندۂ صالح کو گزند اور تکلیف پہنچانے کی دھمکی دی گئی تھی، اس موقع پر اس بندے نے جواب میں ایک بات کہی جس کا یہاں تذکرہ

ہے۔اس نے جواب میں کہا:میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں،اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حالات سے بخوبی واقف ہے۔یعنی بندہ کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور بندہ اللہ تعالیٰ سے جس طرح کی اُمید قائم کرکے اپنے امور، معاملات اور اپنی ضرورتوں کو اس کے حوالے کرتا ہے،تو اللہ تعالیٰ اس سے بخوبی واقف ہے۔جب انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھتے ہوئے،اپنے مخالفین کی شرارتوں اور ان کی طرف سے جو تکلیفیں جو ایذائیں پہنچ سکتی تھیں ،ان کی طرف سے جو سازش ان کے ساتھ کی جاسکتی تھی،اس کے جواب میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کردیا تو باری تعالیٰ نے ان کے مخالفین کی سازشوں سے ان کو محفوظ رکھا۔

جب دشمن سازشیں کرے

اس آیت کے ذریعہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہر آدمی کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جہاں دشمنوں اور مخالفین کی طرف سے اس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ کیا جاسکتا ہے، اور وہ بلاوجہ اس کو گزند اور تکلیف پہنچا سکتے ہیں ۔خاص طور سے وہ اللہ کے بندے جو اللہ کے لئے کام کرتے ہیں ،اور اللہ کی دعوت اور پیغام کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں ،دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں ،اور اس نسبت سے ان کے ساتھ مخالفت کا معاملہ کیا جاتا ہے،اور مخالفین ان کو گزند اور تکلیف پہنچانے کی تدبیریں کرتے ہیں ایسے مواقع پر جو آدمی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے اور اللہ سے اُمید و اعتماد رکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ میں

اپنے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں،وہ میری طرف سے فیصلہ کرے گا،تو ایسے مواقع پر اللہ تعالیٰ دشمن کی طرف سے کی جانے والی سازشوں سے اپنے اس بندے کو محفوظ رکھتے ہیں۔فارسی کا مقولہ ہے کہ:-

دشمن اگر قوی است، محافظ قوی تر است

دشمن اگر مضبوط ہے تو حفاظت کرنے والی ذات اس سے زیادہ مضبوط ہے۔ آدمی کو ایسے مواقع پر دشمن کے پاس جو کچھ طاقت اور اسباب و وسائل ہیں،ان اسباب ووسائل اور طاقت کو دیکھ کر گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے،بلکہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید واعتماد رکھتے ہوئے اللہ کے حوالے کردے،تو پھر بڑے سے بڑا دشمن بھی اس کو کوئی گزند وتکلیف نہیں پہنچا سکتا۔اللہ تعالیٰ حفاظت کرنے والے ہیں۔

جیسی امید ویسا معاملہ

حدیث ۴۴۰

وعن أبي هريرة(رضی اللہ عنہ)عن رَسُوْل اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) أَنَّهُ قَالَ:قَالَ اللهُ: أَنَاعِنْدَ ظَنِّ عَبْدِىْ بِىْ، وَأَنَامَعَهُ حَيْثُ يَذْكُرُنِيْ.وَاللهِ!للهُ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ مِنْ أَحَدِكُمْ يَجِدُ ضَالَّتَهُ بِالْفَلَاةِ وَمَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ شِبْرًا،تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ ذِرَاعاً.وَمَنْ تَقَرَّبَ إِلَيَّ ذِرَاعاً، تَقَرَّبْتُ إِلَيْهِ بَاعًا وإِذَا أَقْبَلَ إِلَيَّ يَمْشِىْ أَقْبَلْتُ إِلَيْهِ أُهَرْوِلُ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نقل کیا کہ میرا بندہ میرے ساتھ جو گمان رکھتا ہے، اس کے مطابق میں اس کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب بھی وہ مجھے یاد کرے۔ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنے گمشدہ جانور کو جنگل و صحرا اور رَن کے اندر پالے۔ جو آدمی میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے، میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اور جب کوئی بندہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف چار ہاتھ بڑھتا ہوں۔ اور جو میری طرف چل کر آتا ہے، میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔

افادات:- پہلا جملہ اس باب کے عنوان کے ساتھ تعلق رکھتا ہے۔ چوں کہ باب کا عنوان قائم کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنے کی کیا فضیلت ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ بندے کو اپنی زندگی میں جو بھی امور اور معاملات پیش آتے ہیں ان میں وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جس طرح کی اُمیدیں رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے معاملات کو اللہ کے حوالے کر دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کے کام بغیر تدبیروں کے بنادیتے ہیں۔ عام طور پر دوسرے لوگ ویسے امور میں جو کاوشیں اور مشقتیں اٹھاتے ہیں، ایسی مشقت اور تکلیف اُٹھائے بغیر ہی اللہ تعالیٰ اس کے کام بنادیتے ہیں۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ روزی کے معاملہ میں بھی اور دوسرے معاملات کے اندر بھی آدمی اللہ تعالیٰ سے جیسی اُمید رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں۔ باقی یہ ہے کہ اللہ کی ذات پر اعتماد اور اُمید کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ دل کا حال خوب جانتے ہیں۔ ایک آدمی کے دل میں تردد ہے، اور زبان سے اعتماد و توکل کا اظہار کرے تو پھر اس کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جائے گا۔ سیدھی بات ہے۔

زبانی جمع خرچ نہیں چلے گا

آدمی کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو بھی معاملہ ہوتا ہے اس میں صرف زبانی جمع خرچ کام نہیں دیتا۔ بندے تو دھوکہ کھا سکتے ہیں، کسی بندے کے سامنے آپ اپنی وفاداری اور دلی محبت کا اظہار کریں اور آپ جو کہہ رہے ہیں، آپ کے دل میں وہ ساری باتیں نہیں ہیں، تو چونکہ آپ کے دل کے حال سے وہ واقف نہیں ہے، اس لیے وہ تو آپ کی باتوں کو سن کر متاثر ہوگا اور آپ کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے گا۔ اور ایسا بندوں کے ساتھ ہو سکتا ہے اس لئے کہ بندے دل کے حال سے واقف نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ جب معاملہ ہوگا تو وہ تو دل کے بھید سے بخوبی واقف ہے، جیسا آدمی کے دل میں ہوگا ویسا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ کیا جائے گا، وہاں زبانی جمع خرچ کے طور پر آدمی لاکھ کہے کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا ہے، مجھے تو اللہ کی ذات پر پورا اعتماد ہے، مجھے تو اس سے پوری اُمید ہے، یہ سب کچھ بولتا رہے، لیکن دل میں اگر دوسری بات

ہے،توظاہرہے اللہ تعالیٰ تو دل کی حالت سے بخوبی واقف ہے جیسا دل میں ہے ویسا ہی اس کے ساتھ معاملہ ہوگا۔آپ یوں سمجھیں کہ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مجھے روزی دیں گے،اگر محنت کروں گاتو ملے گی؛تواب محنت کروگے تو ملے گی لیکن اگرآپ یوں کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتا ہوں کہ بغیر محنت کے مجھے کھلائے گا،تواگرواقعتاًدل میں ایسا ہی ہے تواللہ تعالیٰ ویسا ہی کریں گے، کوئی دوسری بات نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ گمان کے مطابق ہی معاملہ کریں گے۔

جیسے دودھ پیتابچہ

جیسے میں مثال دیاکرتاہوں کہ گھرمیں بچے ہوتے ہیں ،ان میں بڑی اولاد بھی ہوتی ہےاورایک دم چھوٹاساآٹھ ،دس ،پندرہ دن کابچہ بھی ہوتاہے جو ابھی چلنا پھرنابھی نہیں سیکھا ہے۔اس کے متعلق سب لوگ جانتے ہیں کہ اس کاسارا معاملہ ماں باپ ہی کے حوالے ہے،نہ اس کا کوئی اختیارہے کہ میں اپنے کھانے پینے کا، سونے کا، اپنی حفاظت کا اور اپنے دوسرے امور کاانتظام کروں ،ماں باپ ہی اس کی ان چیزوں کوسمجھتے ہیں ، وہی اس کی ساری چیزوں کی خیر خبررکھتے ہیں ،وقت آنے پروہی اس کے لئے سارا انتظام کرتے ہیں۔جب دودھ پلانے کا وقت آئے گا تو وہ نہیں کہے گا کہ مجھے دودھ پلاؤ بلکہ خود ماں ہی اس کودودھ پلائے گی۔یہ بچہ اپناکوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اپنا سارا معاملہ ماں باپ کے حوالہ کردیتاہے۔نہلانا،سنوارنا،کپڑے پہنانا وغیرہ سب کام ماں باپ ہی کریں گے۔

پھر جوں جوں بڑا ہوتا جائے گا اور اپنے معاملات کو اپنے ہاتھ میں لیتا جائے گا، توں توں ماں باپ کے سلوک میں کمی آتی جائے گی۔اور بڑے ہونے کے بعد وہ ماں باپ سے جو جو امید رکھتاہے وہ اس کو پورا کرتے ہیں ،باقی سب کام اسی کے حوالے کردیتے ہیں۔یہ ایک مثال ہے۔اسی طریقہ سے بندہ کامعاملہ اپنے تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے۔

ہم بہت سے امور میں اپنے متعلق یوں سمجھتےہیں کہ بھائی!ہم یہ کام انجام دیتے ہیں۔ اور میں توکہاکرتا ہوں کہ بیوی بچوں کے متعلق آدمی فکر کرتا ہے کہ میرے بچوں کو کون کھلائے گا،اس لئے مَیں کماؤں اور محنت کروں ،تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ ٹھیک ہے ؛کرلو۔تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اپنے بچوں کو محنت کرکے کما کر کھلاتاہوں؛ توکرلو،اللہ تعالیٰ اسی کے مطابق آپ کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔یہ سیدھی سادی بات ہے۔حدیث ِپاک میں اللہ تعالیٰ نے جووعدہ فرمایا ہے وہ بالکل سو فیصدبلکہ ایک سوایک فیصداپنی جگہ پر صحیح ہے،لیکن دل کامعاملہ اللہ تعالیٰ بخوبی جانتا ہے اوراسی کے مطابق معاملہ کرتاہے۔اب یہ ہے کہ آزمانےکے لئے تھوڑی بہت آزمائش بھی بھیجتےہیں کہ دیکھیں!وہ اپنی اُمید پر کتناباقی رہتاہے۔

زندگی اسی دھوکہ میں گزرتی ہے

بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ سے دُعا کرائیں گے تو یوں ہو جائے گا، فلاں مزار پر جائیں گے اور چڑھاوا چڑھائیں گے تو ہمارا فلاں کام ہو جائے گا؛ تو اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں، آدمی جیسا سوچتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔

بلکہ اکابر تو یہاں تک لکھتے ہیں کہ بت پرستی کرنے والے اپنے بتوں سے جیسی توقع رکھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام ان سے بنتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرتے ہیں، اور اسی دھوکہ میں وہ زندگی بھر رہتے ہیں۔ یہ ایک خاص چیز ہے۔ اس کو اگر آدمی سوچ لے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لے، تو اس کے بہت سارے معاملات آسان ہو سکتے ہیں، اور کوئی دشواری نہیں ہو گی۔

جب بھی وہ مجھے یاد کرے

"وَأَنَامَعَهُ حَيْثُ يَذْكُرُنِي" اور میں بندے کے ساتھ ہوتا ہوں، جب بھی وہ مجھے یاد کرے۔ بندہ اللہ تعالیٰ کو جس جگہ یاد کرے گا وہاں اللہ تعالیٰ اس کے پاس ہے۔ کسی کونے میں یاد کرے گا تو، کہیں ہوائی جہاز میں بیٹھ کر یاد کرے گا تو، سمندر کے اندر آبدوز

(Submarine)میں بیٹھ کرپانی کے نیچے یاد کرے گاتو؛غرضیکہ جہاں بھی یاد کرے گا،اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی انتہانہیں

اللہ کی قسم!اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے بھی بہت زیادہ خوش ہوتا ہے جو اپنے گمشدہ جانور کو جنگل و صحرا اوررَن کے اندرپالے۔یہ بات پہلے بھی تفصیل سے آچکی ہے۔ایک آدمی سفر میں ہے،سواری کے اوپراس کاتوشہ،پانی ہے، وہ صحرا میں ایک جگہ کچھ آرام کرنے کے لئے اُترااوراس نے اپنے اونٹ کو وہیں درخت کے ساتھ باندھ دیااورسو گیا۔جب آنکھ کھلی تودیکھاکہ سواری کاجانوروہاں نہیں ہے۔کھانے پینے کاسامان بھی اسی کے اوپر تھا،اس کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔اب اس لق و دق صحرامیں آگے سفر جاری رکھنے کے لئے بھی اس کے پاس کوئی ذریعہ موجود نہیں۔اس نے اپنے جانورکوخوب تلاش کیا،اس کے باوجود کامیابی نہیں ملی،اب اس کو یقین ہوگیا کہ میں زندہ رہنے والا نہیں ہوں۔اس لئے کہ سواری کے لئے جانور بھی نہیں کہ منزل پر پہنچوں، اور کھانے پینے کا سامان بھی نہیں کہ کھاپی کرزندہ رہ سکوں۔لہٰذا دوبارہ اپنی جگہ پرآکریہ سوچ کرلیٹ گیاکہ اب تو مجھے موت ہی آکر اس مصیبت سے نجات دے گی۔اسی میں اس کی آنکھ لگ گئی،پھرجب سوکراُٹھاتودیکھاکہ سواری کا جانوروہیں موجودہے تووہ بہت خوش ہوا۔

حدیثِ پاک میں اس کی خوشی سے بے قابو ہونے کو ان الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ خوشی میں آکر شکرانہ کے طور پر اللہ تعالیٰ سے یوں کہتا ہے کہ اے اللہ !تو میرا بندہ اور مَیں تیرا خدا۔یعنی کہنا تو یہ چاہیے تھا کہ تو میرا خدا و آقا،اور میں تیرا بندہ۔لیکن خوشی میں بے قابو ہوکر اس کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے۔اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی، وہ تو سمجھ چکا تھا کہ میری موت آنے والی ہے ،اور یہ تو نئی زندگی ہوئی۔

اللہ تعالیٰ کو بندوں سے کتنا تعلق ہے!

توحضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں وہ انسان اپنے اس گمشدہ جانور کے ملنے پر کتنا خوش ہوتاہے!توجب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتاہے،اپنے گناہوں پر پچھتاتا ہے، اور یہ عہدوپیمان اورپختہ ارادہ کرتاہے کہ اب دوبارہ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ تو گویا یہ بندہ جو اللہ سے بچھڑ چکاتھا،دور ہوچکاتھا، توبہ کرکے دوبارہ اللہ کے قریب ہوا اور اللہ کابنا؛تو اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے اس بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتے ہیں جیسے وہ آدمی اپنی گمشدہ سواری کا جانور ملنے پر خوش ہوا تھا۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندے کے ساتھ کتنا زیادہ تعلق ہے۔

ہماری اولاد نافرمانی کرنے کے بعدجب دوبارہ معافی مانگنے آتی ہے، توہم اس کو اتنی جلدی معاف نہیں کرتے،اس کو کچھ نہ کچھ لتاڑتے ہیں،تھوڑی بہت معمولی سزا، یاکچھ بے رُخی کااظہارکرتے ہیں۔لیکن وہاں تویہ سوال ہی نہیں ، جیسے ہی بندے نے توبہ کی،باری

تعالیٰ کی طرف سے فوراً عنایتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں کے ساتھ عجیب معاملہ ہے، یہ تو ہماری کوتاہی کی بات ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی مہربانیاں، اتنا لطف و کرم ہونے کے باوجود اپنے آپ کو اللہ سے دور رکھے ہوئے ہیں، یہی ہمارے لئے محرومی کی بات ہے، ورنہ وہاں تو کوئی رکاوٹ ہے ہی نہیں، اس کا دروازہ ہر وقت کھلا ہوا ہے۔ اور پھر آپ اس دروازے پر جائیں گے تو وہاں کوئی ناراضی کا اظہار نہیں کیا جائے گا۔ آپ کو آپ کی سابقہ گناہوں پر لتاڑا نہیں جائے گا، شرم نہیں دلائی جائے گی، بلکہ وہاں تو خوشی کا اظہار کیا جائے گا۔

ایسے دروازے پر ہم کیوں نہ جائیں؟

اور پھر کوئی آدمی اللہ کی طرف بڑھنے اور تعلق قائم کرنے کے لئے کوشش کرتا ہے، اس کو اتنے عمدہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو آدمی میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے، میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں۔ گویا بندے کی طرف سے اگر ذرا سی حرکت ہوگئی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کھینچ لیا جاتا ہے۔

اور کوئی بندہ میری طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف چار ہاتھ بڑھتا ہوں۔ دونوں ہاتھوں کو دائیں بائیں پھیلا دو تو وہ ”باع“ کہلاتا ہے، جو چار ہاتھ کا ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ کے دو بالشت ہوتے ہیں۔ آپ اپنی کہنی سے ہاتھ کی بڑی انگلی تک ناپ لیجئے، دو بالشت

ہوں گے۔اس طرح ایک باع کے آٹھ بالشت ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جوں جوں اس کی طرف سے حرکت میں تیزی آتی ہے،توں توں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی زیادہ بڑھ کر نوازا جاتا ہے۔

دیکھو!پہلے ایک بالشت کے جواب میں ایک ہاتھ یعنی ڈبل تھا۔اور یہاں ایک ہاتھ کے جواب میں ایک باع یعنی چار ہاتھ کا تذکرہ ہے۔گویا پہلے کے بعد آپ آگے بڑھے تو وہاں اور زیادہ خوشی ہوئی۔اور جو میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ مجھ سے قریب ہونے کے لئے جو طریقہ اختیار کرتا ہے، میں اس کے طریقہ کی کئی گنا زیادہ پذیرائی کرتا ہوں۔

گویا بتلایا جارہا ہے کہ آپ جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں گے، اور آگے بڑھیں گے ،اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سے کئی گنا زیادہ آپ کی پذیرائی ہوگی اور آپ کو قبول کیا جائے گا۔اس لیے بھائی!اب ایسے دروازے پر ہم کیوں نہ جائیں ؟ دنیا کے دروازے تو ایسے ہیں کہ کوئی بھی ہو، ایک مرتبہ، دو مرتبہ، تین مرتبہ جائیں گے تو ہمیں وہاں سے دھتکار دیا جائے گا کہ کیا بار بار ہمارے پاس آتا ہے؟کچھ کام ہے یا نہیں ؟ آپ کا کسی سے کیسا ہی تعلق و محبت والا معاملہ کیوں نہ ہو،آپ اس کے یہاں ایک مرتبہ، دو مرتبہ گئے،تو وہاں سے پھر معاملہ بے رُخی ،نفرت اور تحقیر کا ہوتا ہے، اور یہاں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی پذیرائی ہوتی ہے۔

یہ حدیثِ قدسی ہے۔ اگراسی ایک حدیث کو ہم باربار سوچتے رہیں تو اسی میں ہماری زندگی کی ساری مشکلات کا حل موجود ہے۔ ایک تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان رکھنے کے سلسلہ میں، اور پھر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے معاملہ میں مکمل رہنمائی موجود ہے۔

کسی کو موت نہ آئے مگر ...

حدیث ۴۴۱

وعن جابر بن عَبۡدِ اللهِ (رضی اللہ عنہ): أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوۡلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَبۡلَ مَوۡتِهٖ بِثَلَاثَةِ أَيَّامٍ، يَقُوۡلُ: لَا يَمُوۡتَنَّ أَحَدُكُمۡ إِلَّا وَهُوَ يُحۡسِنُ الظَّنَّ بِاللهِ۔

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات سے تین دن پہلے آپ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے میں نے سنا کہ تم میں سے کسی کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھتا ہو۔

افادات:- حدیثِ پاک میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: "مَنۡ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهٗ (بخاری شریف، ۶۱۴۲)" جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو محبوب رکھتے ہیں۔ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ ارشاد فرمایا تو حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو موت کو ناپسند کرتے ہیں۔ یعنی اگر چہ موت اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے واسطہ ہے کہ موت کے بعد ہی اللہ تعالیٰ

سے ملاقات کا مرحلہ آتا ہے، لیکن قدرتی طور پر آدمی کے دل میں موت سے ایک طرح کی دوری اور وحشت کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ تو یہ تو بڑا مشکل ہو جائے گا کہ ہر آدمی موت کو ناپسند کرتا ہے۔ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے، جب مؤمن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں آخرت کی طرف رُجحان کو بڑھا دیتے ہیں۔ اس لئے بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ موت کے قریب ان پر ایسے حالات ڈال دیئے جاتے ہیں کہ وہ لوگوں کی طرف سے مایوس ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب قدرت کا ایک نظام ہے یہاں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ کسی کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اچھا گمان رکھتا ہو۔ اور حدیث کی خبر ہے، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ مؤمن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی معاملہ کیا جاتا ہے کہ جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے اچھا گمان پیدا ہو ہی جاتا ہے۔

شیطانی حربہ کا توڑ

حدیث ۴۴۲

وعن أنسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ: قَالَ اللهُ تَعَالىٰ: يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلىٰ مَا كَانَ مِنْكَ وَلَا أُبَالِيْ. يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ، ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ، غَفَرْتُ

لَكَ وَلاَ أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا. ثُمَّ لَقِيْتَنِي لاَ تُشْرِكُ بِي شَيْئًا. لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً.

ترجمہ:- حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کوارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا اے انسان! جب تک تو مجھے پکارتا رہے گا، مجھ سے امید رکھے گا؛تو میں تجھے معاف کردوں گا، چاہے کتنے ہی گناہ کیوں نہ کئے ہوں اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے اے انسان!اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں اور پھر تو مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگے، تو میں تیرے گناہ کو معاف کردوں گااور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔اے انسان! اگر تو زمین بھر کر گناہ کرے اورپھر میرے یہاں اس حالت میں آئے کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو، تو مَیں زمین بھر مغفرت لے کر تیرے پاس آؤں گا۔

افادات:- یعنی بندہ یوں سوچتاہے کہ میرے اتنے بڑے بڑے گناہ ہیں،میں نے اتنی ساری نافرمانیاں کی ہیں ؛بھلا میری کیسے مغفرت ہوسکتی ہے؟یہ دراصل شیطانی حربہ ہے۔ شیطان بندے کو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے اوراللہ تعالیٰ کی ذات سے بدگمان کرنے کے لئےایسی بات دل میں ڈالتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے گناہ میں نے کئے ہیں،اب میری کیسے مغفرت ہوسکتی ہے ؟

دریائے رحمت کا کیا عالم ہوگا !

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت حکیم الامت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے اجل خلفاء میں سے گزرے ہیں۔ کراچی میں رہتے تھے۔انہوں نے بڑی عجیب و غریب مثال دی ہے۔جیسے کراچی ساحل سمندر پر واقع ہے اسی طرح بمبئی بھی ساحل سمندر پر ہے،اس لئے ہم بمبئی کی مثال لیتے ہیں۔ بمبئی اتنابڑا شہر ہے کہ جس میں لاکھوں آدمی آباد ہیں،ان لاکھوں آدمیوں کا پیشاب پاخانہ اور ساری نجاستیں گٹر کے ذریعہ سمندر کے اندر پہنچتی ہیں؛تولاکھوں انسانوں کی ساری نجاستوں کی وجہ سے کیاوہ سمندر ناپاک ہوگیا؟ نہیں،بلکہ سمندر کی ایک موج آئے گی توان لاکھوں انسانوں کی ساری نجاستوں کو ختم کر دے گی۔ دنیا کا ایک سمندر تو دوسرے سمندروں کا معمولی سا حصہ ہوتا ہے،اس سمندر کی ایک معمولی سی موج لاکھوں انسانوں کے پیشاب پاخانہ کی نجاست کو ختم کرنے کے لئے کافی ہے،اورلاکھوں انسانوں کا پیشاب پاخانہ سمندر کی ایک موج پر بھی غالب نہیں آسکتا، تو پھر باری تعالیٰ کے دریائے رحمت کا کیا عالم ہوگا!

مایوسی دور کرنے کا طریقہ

آدمی کو یہ سوچنا ہی نہیں چاہیے کہ میرے اتنے بڑے بڑے گناہ ہیں ، میرا کیا ہوگا،یہ مایوسی والی بات ہوتی ہے، شیطان اس طرح انسان کے دل میں مایوسی پیدا کرکے اس کو

اللہ تعالیٰ سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقعہ پر نبیٔ کریم (ﷺ) کے ان ارشادات کو آدمی پڑھے اور سوچے تو اس سے دل کی مایوسی دور ہوتی ہے۔ اور اللہ والے جو نبیٔ کریم (ﷺ) کی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں ان سے ملیں، تو ان کی زبان سے ایسی چیزیں سننے کو ملیں گی۔ یہ مایوسی جو پیدا ہوتی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے ان ارشادات سے اور اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ اگر واقفیت ہوتی ہے تو پھر ایسی نوبت نہیں آتی۔

گویا یہ بڑی امید والی بات ہے۔ اصل تو یہاں باب کا جو عنوان تھا اس سے تعلق رکھنے والی بات شروع کا وہ جملہ ہے: "إِنَّكَ مَادَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي" آدمی جتنا اللہ تعالیٰ کو پکارتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ سے جیسی امید رکھے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مغفرت کی جائے گی اور گناہ معاف ہوں گے۔

اَلْجَمْعُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ

خوف اور امید کو جمع کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

اعلم أَنَّ الْمُخْتَارَ لِلْعَبْدِ فِیْ حَالِ صِحَّتِہٖ أَنْ یَکُوْنَ خَائِفًا رَاجِیًا، وَیَکُوْنَ خَوْفُہٗ وَرَجَاؤُہٗ سَوَاءً. وَفِیْ حَالِ الْمَرَضِ یُمَحِّضُ الرَّجَاءَ. وَقَوَاعِدُ الشَّرْعِ مِنْ نُصُوْصِ الْکِتَابِ وَالسُّنَّۃِ وَغَیْرِ ذٰلِکَ مُتَظَاهِرَۃٌ عَلٰی ذٰلِکَ.

قَالَ اللہ تعالیٰ: (فَلَا یَأْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ) [الاعراف: ۹۹]

وقَالَ تَعَالٰی: (إِنَّہٗ لَا یَیْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ) [یوسف: ۸۷]

وقَالَ تعالیٰ: (یَوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْہٌ) [آل عمران: ۱۰۶]

وقَالَ تعالیٰ: (إِنَّ رَبَّکَ لَسَرِیْعُ الْعِقَابِ وَإِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ الرَّحِیْمُ) [الاعراف: ۱۶۶]

وقَالَ تعالیٰ: (إِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ) [الانفطار: ۱۳، ۱۴]

وقَالَ تعالیٰ: فَأَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُہٗ فَھُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَاضِیَۃٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُہٗ فَأُمُّہٗ ھَاوِیَۃٌ) [القارعۃ ۶۔۹]

والآيات فِيْ هٰذَا الْمَعْنٰى كَثِيْرَةٌ. فَيَجْتَمِعُ الْخَوْفُ وَالرَّجَاءُ فِيْ آيَتَيْنِ مُقْتَرِنَتَيْنِ أَوْ آيات أَوْ آيَة.

دو بازو

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں کہ خوف اور رجاء ؛یہ دونوں حالتیں اور کیفیتیں بیک وقت بندے کے دل میں ہونی چاہئیں ،حضراتِ صوفیہ فرماتے ہیں کہ یہ دو بازو ہیں جن کے ذریعہ سے بندہ دین میں پرواز اور ترقی کرتا ہے۔آدمی اپنے گناہوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا بھی رہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی رہے۔اور یہ دونوں کیفیتیں ہونی چاہئیں ،اسی بات کو بتلانے کے لیے انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

تین زمانے؛ تین حالتیں

ایک چیز رجاء اور امید ہے،اور دوسری چیز خوف ہے۔آدمی کو جو پسندیدہ اور ناپسندیدہ، محبوب اور مکروہ احوال پیش آتے ہیں ،وہ زمانہ کے اعتبار سے اپنے وجود کی وجہ سے تین حالتوں پر منقسم ہیں۔(۱) یا تو وہ فی الحال موجود ہیں (۲) یا زمانۂ ماضی میں وہ حالت اور کیفیت رہی تھی (۳) یا وہ حالت اور کیفیت ایسی ہے جس کا زمانۂ مستقبل کے اندر پیش آنے کا انتظار اور توقع ہے۔اب اگر وہ کیفیت زمانۂ ماضی میں رہی تھی،اور آدمی کا دل اُس گزری ہوئی حالت اور کیفیت کا تصور کر رہا ہے؛تو اسی کو تذکرا ور یاد سے تعبیر کرتے ہیں۔پچھلے زمانے کی

یادیں ہیں، چاہے وہ اچھی ہوں یا بری، وہ حالات جو گزر چکے ہیں، انکے متعلق جب خیال آتا ہے، اور دل ان میں مشغول ہوتا ہے ؛اسی کو تذکر اور گزشتہ کی یادوں سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور اگر وہ حالت اور کیفیت ایسی ہے جو اِسی وقت پائی جارہی ہے؛ تو اسی کو وجدان، ادراک وشعور سے تعبیر کرتے ہیں۔ جن حالات سے بندہ گزر رہا ہے اس کا دل اس کو محسوس کر رہا ہے، اور اِسی وقت یہ حالت پائی جارہی ہے؛ اس لیے اس کو وجدان اور ادراک کہتے ہیں

اور اگر وہ حالت ایسی ہے جس کی مستقبل میں پیش آنے کی توقع اور امید ہے، مستقبل میں پائے جانے کا انتظار ہے، تو اب اگر وہ حالت ناپسندیدہ ہے جس کے انتظار کی وجہ سے دل تکلیف کی کیفیت محسوس کر رہا ہے؛ تو اسی کو خوف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اگر وہ حالت اور کیفیت -جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہے- ایسی ہے جس کے تصور سے، اور جس کو سوچ کر دل مسرت اور راحت کی کیفیت محسوس کر رہا ہے؛ تو اسی کو رجاء اور امید سے تعبیر کرتے ہیں۔ گویا زمانۂ مستقبل میں پیش آنے والی مرغوب و پسندیدہ حالت کے خیال وتصور سے دل میں ایک طرح کی راحت اور لذت کی کیفیت محسوس ہوتی ہے؛ اسی کو رجاء سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

امید اور دھوکہ ۔ فرق اور مثالیں

البتہ حالات اسباب کے تابع ہوتے ہیں اور اسباب کے نتیجہ میں ہی وجود میں آتے ہیں، تو اس حالت کے وجود میں آنے کے لیے اسباب کے درجے میں جو چیزیں مطلوب ہیں، اگر آدمی نے ان اسباب کو انجام دیا ہے، اور پھر مستقبل میں پسندیدہ اور مرغوب حالت کا اس کو انتظار اور توقع ہے؛ تو یہ حقیقی رجاء ہوئی۔ اور اگر اس کو پسندیدہ حالت کے پائے جانے کا انتظار تو ہے لیکن اس کے وجود میں لانے کے لیے قدرت کی طرف سے خارجی اعتبار سے جو اسباب مقرر کئے گئے ہیں، ان اسباب کو انجام نہیں دیا ہے، اور پھر مستقبل میں پسندیدہ اور مرغوب حالت کا اس کو انتظار اور توقع ہے؛ تو اس کو بجائے رجا و امید کے غرور اور دھوکے سے تعبیر کرتے ہیں۔

جیسے آدمی کے پاس زمین ہے، اس میں اس نے ہل چلایا، بیج ڈالا، پانی پلایا، اور کھیتی کو نقصان سے بچانے والی چیزوں سے حفاظت کا انتظام کیا، اور ایک انسان کو زمین سے فائدہ اٹھانے کے لیے جو جو اسباب وجود میں لانے چاہئیں وہ سب کر ڈالے، پھر قدرت پر چھوڑا، اس کے بعد وہ آدمی اس بات کی تمنا اور خیال کرے کہ مجھے اس زمین سے پیداوار حاصل ہوگی؛ تو اس کو رجاء اور امید کہیں گے اور اگر اس نے نہ ہل چلایا، نہ بیج ڈالا، نہ پانی پلایا اور نہ کچھ کیا۔ اور جب موسم وسیزن آرہا ہے اور لوگ اپنے کھیتوں اور زمینوں سے پیداوار کی امید لگائے بیٹھے ہیں، تو یہ بھی امید لگاتا ہے تو اس کو دھوکے سے تعبیر کریں گے۔

امتحان کا زمانہ ہے، ایک طالب علم نے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مطالعہ، سبق کی حاضری، اس کے بعد کی محنت؛ اول سے اخیر تک سارے اسباب پوری توجہ سے انجام دیئے، اور پھر امتحان دیا، اور اب یہ امید رکھتا ہے کہ میں کامیابی حاصل کروں گا؛ تو اس کو رجاء کہیں گے۔ لیکن کسی طالب علم نے کیا کچھ نہیں ہے اور کامیابی کی امید لگاتا ہے؛ تو اس کو غرور اور دھوکہ کہیں گے۔

اور اگر اس چیز کے پائے جانے کے اسباب نہ معلوم ہیں اور نہ معدوم ہیں، تو اس کو تمنا سے تعبیر کرتے ہیں۔

بہر حال! خوف اور رجاء اسی وقت کہا جائے گا جبکہ دونوں پہلو اس انداز پر ہوں کہ دونوں کے پائے جانے کی توقع و امید ہو۔ اور جو چیز آئندہ پیش آنے والی ہے وہ یقینی ہے؛ تو اس کو رجاء اور خوف سے تعبیر نہیں کریں گے۔ جیسے صبح میں سورج طلوع ہونے والا ہے، تو اب یہ نہیں کہیں گے کہ مجھے صبح سورج کے طلوع ہونے کی امید ہے۔ شام کو سورج غروب ہونے والا ہے تو یوں نہیں کہیں گے کہ مجھے شام کو سورج کے غروب ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہاں! بارش ایسی چیز ہے کہ ہوسکتا ہے کہ برسے اور ہوسکتا ہے کہ نہ برسے، تو اس کے متعلق حالات کو دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ بارش کے ہونے کی امید ہے، یا نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ جہاں دونوں پہلو پائے جاتے ہیں، وہاں خوف و رجاء کہا جاسکتا ہے۔

تو رجاء کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی پسندیدہ اور مرغوب حالات یا امر کے مستقبل میں پائے جانے کا انتظار اور توقع ہو، اس کے لیے اسباب کو انجام دینے کا نام رجاء ہے۔ اب اگر کوئی آدمی ایمان بھی لایا، اعمالِ صالحہ کا اہتمام بھی کر رہا ہے، گناہوں سے بھی بچ رہا ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے معاف کریں گے اور جنت عطا کریں گے؛ تو اس کو رجاء کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر یہ سب نہیں کر رہا ہے، تو پھر اس کو غرور اور دھوکے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور خوف کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اپنے گناہوں اور نافرمانیوں کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس پر پکڑیں گے۔

خوف اور امید یکساں ضروری

تو یہ دونوں کیفیتیں ضروری ہیں: اَلْإِيمَانُ بَيْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ ان دونوں کے بیچ بیچ کی کیفیت کا نام ایمان ہے۔ اس لیے اگر کوئی آدمی صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت پر نگاہ کرتے ہوئے بالکل نڈر ہو جائے تو وہ مؤمن نہیں، یا اس پر خوف اتنا غالب آگیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا تو یہ بھی ایمان نہیں۔ ایمان ان دونوں کے بیچ کی کیفیت ہے۔ دونوں چیزیں ہونا ضروری ہے، اور یہ دونوں کیفیتیں یکساں پائی جانی چاہئیں۔

اور بعض حضرات نے اس میں تفصیل بیان کی ہے کہ آدمی کا جیسا مزاج ہو، اس کے مطابق حکم لگائیں گے۔ جیسے روٹی بھی ہے اور پانی بھی ہے، اب ان دونوں میں سے کیا چیز ضروری ہے؟ تو اگر کسی آدمی پر بھوک غالب ہے، پیاس نہیں لگی ہے تو اس کے لیے کہیں

گے کہ روٹی کی ضرورت ہے، پانی کی نہیں۔ اور دوسرا آدمی ہے جس کو بھوک نہیں لگی ہے لیکن پیاس غالب ہے، تو کہیں گے کہ اس کے لیے پانی کی ضرورت ہے۔ اور اگر کسی آدمی کے لیے دونوں باتیں یکساں ہیں کہ بھوک بھی لگی ہے اور پیاس بھی لگی ہے، تو کہیں گے کہ اس کو دونوں کی ضرورت ہے۔ بہر حال! سامنے والے کا جیسا جیسا حال ہوگا اس کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

یہاں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: آدمی کی تندرستی کے زمانہ میں دونوں باتیں پائی جانی چاہئیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار بھی ہو، اور اپنے گناہوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے عذاب و پکڑ سے ڈرتا بھی ہو، گویا خوف اور امید کی کیفیت برابر برابر ہو۔ البتہ زندگی کے جو آخری ایام ہوتے ہیں، بیماری اور مرض الموت میں امید کو غالب کرنا چاہیے۔ ویسے اگر اس وقت بھی دونوں کیفیتیں پائی جاتی ہوں تو اس کے لیے کارآمد ہے، جیسا کہ روایتوں میں ہے کہ ایک آدمی بیمار تھا، مرض الوفات میں تھا نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا کہ کیا حال ہے؟ اس نے جواب دیا: اپنے گناہوں کی وجہ سے ڈر رہا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کا امیدوار ہوں۔ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اس حالت میں آدمی اللہ تعالیٰ سے جس چیز کی امید رکھتا ہے اللہ تعالیٰ وہ چیز عطا فرمادیتے ہیں، اور جس سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی اس چیز سے حفاظت فرماتے ہیں۔ (سنن ترمذی، ۹۸۳۔ ابن ماجہ، کتاب الزہد، ۴۲۶۱)

"وَقَوَاعِدُ الشَّرْعِ مِنْ نُصُوصِ الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ وَغَيْرِ ذٰلِكَ مُتَظَاهِرَةٌ عَلٰى ذٰلِكَ" شریعت کے قواعد اور قرآن وحدیث کے نصوص اس سلسلہ میں بہت زیادہ ہیں، چناں چہ قرآنِ پاک میں عام طور پر دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، یا کہیں دونوں طرح کی آیتیں یکے بعد دیگرے لاتے ہیں، اور کہیں ایک ہی آیت میں دونوں کو ذکر کرتے ہیں۔

چناں چہ باری تعالیٰ کا ارشاد لائے: ﴿فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے جو بے خوف ہو جائیں وہ وہی لوگ ہیں جو گھاٹے اور خسارے والے ہیں۔ یہ ایمان کے منافی حالت ہے۔

اور دوسری آیت لائے: ﴿إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ﴾ اللہ کی رحمت سے وہی لوگ مایوس ہوتے ہیں جو کافر ہیں۔

دیکھو! پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف ہونے والوں کا تذکرہ تھا اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہونے والوں کا تذکرہ ہے۔ گویا دونوں چیزیں ہونی چاہئیں۔

﴿يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ﴾ یہاں ایک ہی آیت میں دونوں حالتیں بیان کی گئی ہیں، جو کامیاب ہیں ان کے چہرے اللہ تعالیٰ کے یہاں سفید اور روشن ہوں گے۔ اور جو ناکام ہیں ان کے چہرے اللہ تعالیٰ کے یہاں سیاہ ہوں گے۔ ان دونوں حالتوں کا استحضار رہنا چاہیے۔

﴿إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ اس ایک ہی آیت میں اللہ تعالیٰ کی دونوں صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ تیرا رب بہت تیزی کے ساتھ سزا دینے والا ہے، اور وہ گناہوں کو معاف کرنے والا، مہربان بھی ہے۔

﴿فَأَمَّا مَن ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ وَأَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُمُّهُ هَاوِيَةٌ﴾ جس کے اعمال کے ترازو نیکیوں کی وجہ سے وزنی ہو جائیں گے، وہ پسندیدہ زندگی میں جنت میں رہیں گے، اور جس کے نیکیوں کے ترازو ہلکے رہیں گے، اس کا ٹھکانہ ہاویہ ہے۔ ہاویہ سے جہنم مراد ہے۔

اب اس سلسلہ میں تین روایتیں پیش کرتے ہیں۔

امید وخوف؛ معتدل تعلیم

حدیث ۴۴۳

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ): أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ الْمُؤْمِنُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الْعُقُوبَةِ؛ مَا طَمِعَ بِجَنَّتِهِ أَحَدٌ. وَلَوْ يَعْلَمُ الْكَافِرُ مَا عِنْدَ اللهِ مِنَ الرَّحْمَةِ مَا قَنَطَ مِنْ جَنَّتِهِ أَحَدٌ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے یہاں سزا کیسی سخت ہے؛ اگر ایمان والے کو اس کا پتہ چل جائے تو اس کی جنت کی کسی کو امید نہ رہے (یعنی جنت سے سب مایوس ہو جائیں) اور اللہ تعالیٰ کے یہاں رحمت کتنی زیادہ ہے؛ اس کا اگر کافر کو پتہ چل

جائے تو وہ بھی جنت سے مایوس نہ رہے(یعنی اس کو بھی جنت کی امید ہو جائے کہ میں بھی جنت میں چلا جاؤں گا۔)

افادات:-حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا مقولہ مشہور ہے: اگر یہ اعلان ہو جائے کہ سب لوگ جہنم میں جائیں گے سوائے ایک کے؛ تو مجھے اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ ایک میں ہی ہوؤں گا۔ اور یہ اعلان ہو جائے کہ سب لوگ جنت میں جائیں گے سوائے ایک کے؛ تو مجھے ڈر ہے وہ محروم میں ہی نہ ہوؤں۔ اعتدال کا تقاضہ یہی ہے۔ ویسے خوف کے مقابلہ میں امید والی روایتیں زیادہ آئی ہیں۔

اُمتِ محمدیہ کی سزا

روایتوں میں ہے، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میری امت کی عذاب وسزا زلزلے اور فتنے ہیں (المعجم الکبیر للطبرانی، ۱۵۹۶) دنیا کے اندر یہ جو خطرناک حالات پیش آتے ہیں زلزلے آتے ہیں، آدمی پریشانیوں، مصیبتوں اور فتنوں سے گزرتا ہے، وہی اس کے لیے اعمالِ بد کی سزا ہو جاتی ہے، پھر آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کو سزا نہیں دیں گے۔

بڑوں کی باتیں

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جس کے گناہ کو چھپایا تو اللہ تعالیٰ کے کرم ورحمت سے بعید ہے کہ آخرت میں اس کے گناہ کو نہ چھپائے۔ اور جس کو دنیا میں گناہ

پر سزادی ہے تو اللہ تعالیٰ کے عدل سے بعید ہے کہ اس کو دوبارہ سزا دے (سنن ترمذی، ۲۶۲۶) حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا حساب وکتاب میرے ماں باپ کے بجائے اللہ تعالیٰ لے؛ اس لیے کہ وہ میرے ماں باپ سے زیادہ میرے اوپر رحم کرنے والا ہے (احیاء العلوم ۴/۱۵۹) ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب بندے گناہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے بھی چھپا لیتے ہیں، تاکہ فرشتوں کی نگاہ میں نہ آوے، ورنہ کل قیامت میں وہ گواہی دیں گے۔ اگر وہ دیکھ لیں تو ان کو گواہی دینی ہی ہے، اس لیے ان سے بھی اللہ تعالیٰ چھپاتے ہیں۔

سفید جسم میں ایک کالا بال

بخاری شریف میں روایت ہے: قیامت کے دن اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمائیں گے کہ اپنی اولاد میں سے جہنم کا توشہ اور اس کی رسد نکالو۔ وہ پوچھیں گے کہ کتنی؟ تو ایک روایت میں ہے کہ سو میں سے ننانوے، اور دوسری روایت میں ہے کہ ہزار میں سے نوسوننانوے۔ یہ سن کر حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) لرز گئے، اور ان کے اوپر مایوسی کی کیفیت طاری ہوگئی، سب کے سر جھک گئے، کوئی سر اُٹھانے کے لیے تیار نہیں، اور سب رونے لگے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جب ہزار میں سے نوسوننانوے جہنم میں جائیں گے تو پھر کون بچے گا؟ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ دنیا میں کفار کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کی تعداد ایسی ہے جیسے سفید بیل کے جسم

میں ایک کالا بال، یا کالے بیل کے جسم میں ایک سفید بال (بخاری شریف۔ ۶۵۲۹/۶۵۳۰) چناں چہ ہم دیکھیں گے کہ ہر زمانہ میں اہلِ ایمان کے مقابلہ میں اہلِ کفر کی تعداد زیادہ رہی ہے۔

اہلِ ایمان کا فدیہ

اسی لیے بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ قیامت کے روز اہلِ ایمان میں سے ہر ایک کو کوئی یہودی، کوئی نصرانی، کوئی مشرک حوالے کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کو پکڑو، اور اپنے فدیہ کے طور پر جہنم میں ڈالو کہ اے اللہ! میں اپنی جگہ پر اس کو جہنم میں دیتا ہوں۔ (احیاء العلوم۔ ۱۵۵/۴)

اُمید آفزا روایتیں

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم زمین بھر کر گناہ لے کر آؤ، میں تمہارے ساتھ زمین بھر کر مغفرت لے کر پیش آؤں گا۔ (احیاء العلوم۔ ۱۵۶/۴)

روایتوں میں آتا ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے، اور پھر اپنے گناہ سے مغفرت طلب کرتا ہے تو باری تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ دیکھو! یہ میرا بندہ جانتا ہے کہ میرا کوئی رب ہے جو میرے گناہ کو معاف کرتا ہے اور میری گرفت کرسکتا ہے؛ تم گواہ رہو کہ میں نے اس کے گناہ کو معاف کر دیا۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اگر شرک سے پاک ہو کر آؤ گے، تو کچھ بھی کر کے آؤ، میں تمہیں جنت میں ہی بھیجوں گا، جہنم میں نہیں بھیجوں گا۔

پھر میں آپ کو رسوا نہیں کروں گا

ایک روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) سے باری تعالیٰ نے فرمایا کہ کل قیامت کو مَیں آپ کی اُمت کا حساب آپ کے حوالے کروں گا، تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: اے اللہ! آپ مجھ سے زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہیں، آپ ہی حساب لیں، مَیں نہیں لوں گا۔ تو اس پر باری تعالیٰ نے فرمایا کہ پھر مَیں آپ کو رسوا نہیں کروں گا۔ قرآنِ پاک میں بھی ہے: ﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ﴾ اس آیت کی تفسیر میں ابن ابی الدنیا نے یہ روایت بیان کی ہے (تفسیر البحر المحیط، سورۂ تحریم)

سب سے زیادہ اُمید والی آیت

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ کے بارے میں امام باقر ابو جعفر (رحمۃ اللہ) فرماتے ہیں کہ تم لوگ یوں سمجھتے ہو کہ قرآنِ کریم میں سب سے زیادہ اُمید والی آیت ﴿إِنَّ اللهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ ہے، لیکن ہم اہلِ بیت کے نزدیک سب سے زیادہ اُمید والی آیت ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ﴾ ہے، اس لیے کہ جب تک پوری اُمت کو بخشا نہ جائے گا، وہاں تک اللہ کے نبی (ﷺ) راضی نہیں ہوں گے۔ (تفسیر روح المعانی، سورۃ الضحیٰ)

اسی لیے کہا گیا ہے کہ رحمت والی آیتیں اور روایتیں سزا والی آیتوں اور روایتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہیں ، اس طرح کی روایتیں اور آثار ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے قوی امید رکھنی چاہیے۔

اگر انسان سن لے

حدیث ۴۴۴

وعن أبي سعيد ن الخدريّ(رضی اللہ عنہ)أنَّ رَسُوْلَ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: إِذَا وُضِعَتِ الْجَنَازَةُ واحْتَمَلَهَا النَّاسُ أَوِالرِّجَالُ عَلَى أَعْنَاقِهِمْ،فَإِنْ كَانَتْ صَالِحَةً، قَالَتْ: قَدِّمُوْنِيْ قَدِّمُوْنِيْ وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَصَالِحَةٍ قَالَتْ:يَاوَيْلَهَا!أَيْنَ تَذْهَبُوْنَ بِهَا؟يَسْمَعُ صَوْتَهَا كُلُّ شَيْءٍ إِلاَّ الْإِنْسَانُ.وَلَوْ سَمِعَهُ صَعِقَ.(رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت ابو سعید خدری(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: جب جنازہ رکھا جاتا ہے (یعنی میت کو چارپائی پر رکھ کر قبرستان لے جانے کے لیے باہر لایا جاتا ہے)اور لوگ اس کو اپنی گردنوں اور کندھوں پر اُٹھاتے ہیں تو اگر مرنے والا نیک ہوتا ہے تو وہ ان لوگوں سے کہتا ہے " قَدِّمُوْنِيْ قَدِّمُوْنِيْ"مجھے جلدی سے لے چلو،مجھے جلدی سے لے چلو۔ اور اگر مرنے والا نیک نہیں ہوتا تو وہ کہتا ہے: ہائے افسوس!تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟ جب مردہ یہ بات بولتا ہے تو اس کی اس بات کو انسان کے علاوہ سب سنتے ہیں ،اگر انسان سن لے تو وہ بے ہوش ہو جائے۔

اس روایت میں رجاء اور خوف دونوں کو بتلانا چاہتے ہیں۔

جوتے کے تسمے سے زیادہ قریب

حدیث ۴۴۵

وعن أبي مسعود(رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم): اَلْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلیٰ أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، والنَّارُ مِثْلُ ذٰلِكَ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت آدمی کے جوتے کے تسمے زیادہ اس سے قریب ہے، اسی طریقہ سے جہنم بھی۔

افادات:- آدمی جو چپل پہنتا ہے تو اس کی پٹّی جسم سے بالکل لگی ہوئی ہوتی ہے، تو جنت اس سے بھی زیادہ قریب ہے، اس لیے کہ جنت آدمی کے اعمال کی وجہ سے ہے، اور اعمال تو اس کے اندر ہی موجود ہیں۔ اگر اچھے اعمال ہیں تو وہ جنت کا حقدار ہے اور برے اعمال ہیں تو جہنمی ہے۔ اس روایت میں بھی جنت اور جہنم دونوں کو ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے، اس لیے اس روایت کو بھی اس باب میں پیش کیا ہے۔

فضل البکآء من خشیۃ اللہ تعالیٰ وشوقاً الیہ

اللہ تعالیٰ کی خشیت

اور

اس کی محبت میں رونے کی فضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۴؍شوال المکرم ۱۴۲۰ھ ۲۲ جنوری ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

یہ اہل اللہ کی عادت رہی ہے

نیا عنوان قائم کیا ہے: اللہ تبارک و تعالیٰ کی خشیت وخوف اور اس کی محبت میں رونا۔ پہلے ابواب میں اللہ تعالیٰ کے خوف کا تذکرہ کیا تھا، اب اس کا ایک لازمی نتیجہ کہ جس دل میں اللہ تعالیٰ کی خوف وخشیت ہوتی ہے، اس سے کیا اثر مرتب ہوتا ہے، اور اس کی فضیلت بھی بتلانا چاہتے ہیں۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی خشیت اور خوف جس کے دل میں ہوگا وہ یقیناً اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت سے روئے گا، اس صفتِ خشیت کا ظہور رونے کی شکل میں ہوگا اور یہ بھی مطلوب ہے۔ اللہ کے خوف سے رونا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت اور اس کی رضا اور خوشنودی کا باعث ہے۔ جتنے بھی اللہ

کے مقبول بندے گزرے ہیں، حضرات انبیاء کرام(علیہم السلام)، حضراتِ صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم)، اور ان کے بعد جتنے بھی اولیاء اللہ گزرے ہیں ان کی ایک خاص صفت اور عادت یہ بھی رہی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتے رہتے تھے۔ بعض حضرات وہ تھے جن کا رونا لوگوں کے سامنے ظاہر ہوتا تھا۔ اور بعض ایسے تھے جو اس کو بھی چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔

اس کے بعد وہ نہیں ہنسے

امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نقل کیا ہے، اور مسند احمد میں یہ روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت جبرئیل (علیہ السلام) سے پوچھا: کیا بات ہے کہ میں نے میکائیل (علیہ السلام) کو کبھی بھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ جب سے اللہ تعالیٰ نے جہنم کو پیدا کیا ہے، تب سے وہ کبھی نہیں ہنسے۔

اور یہ بھی نقل کیا گیا ہے کہ فرشتوں کی ایک بڑی جماعت ایسی ہے جو کبھی نہیں ہنسی، صرف روتی ہی رہتی ہے، اس ڈر سے کہ اللہ تعالیٰ ناراض ہو کر ہمیں جہنم میں نہ ڈال دے۔ (احیاء العلوم۔ ۴/۱۹۱)

حضراتِ انبیاء کی کیفیتِ خشیت

مولانا مفتی عاشق الٰہی صاحب دامت برکاتہم نے اپنی تفسیر میں تذکرہ کیا ہے اور امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی اس کو ذکر کیا ہے، حضرت ابوالدرداء (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام)

جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو اُن کے سینے میں سے ہانڈی میں سے جیسی آواز آتی ہے ایسی آواز آتی تھی اور وہ آواز ایک میل دور سے سنائی دیتی تھی (احیاء العلوم، ۱۹۱/۴) خود نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال ایسا تھا کہ آپ کے سینے میں سے اللہ تعالیٰ کے خوف اور خشیت کی وجہ سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے ہانڈی کو چولہے پر رکھنے اس کے پکنے اور اس میں جوش آنے سے نکلتی ہے (شمائل ترمذی، صفحہ ۲۱) حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا مقام دیا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات سے متعلق جو چیزیں وہ جانتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی شانِ بے نیازی کا ان کو ایسا استحضار رہتا تھا کہ وہ ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے۔ اگرچہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان بھی دلایا جاتا ہے، لیکن (پہلے بھی میں ایک مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ) اس ڈر کے سامنے وہ اطمینان اس وقت غائب ہو جاتا ہے اور اس کی طرف سے توجہ ہٹ جاتی ہے، اور وہ ڈر ایسا مسلط ہوتا ہے کہ ان پر یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

جو عالم اللہ کے خوف سے روتا نہ ہو...

نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: "وَاللهِ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللهِ وَأَخْشَاكُمْ لَهُ" اللہ کی قسم! میں تم لوگوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا سب سے زیادہ جاننے والا ہوں (المسند الجامع) تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ خوف وخشیت بھی میرے اندر ہو۔ اسی لئے قرآن کریم میں کہا ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ اللہ تعالیٰ کی خشیت اگر مخلوق کے کسی

طبقہ میں سب سے زیادہ ہے تو وہ علماء کے اندر ہے یعنی وہ حضرات جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے پورے طورپر واقف ہیں، ظاہر ہے کہ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف اوراس کی خشیت زیادہ ہوگی۔

حضرت سعید (رحمۃ اللہ علیہ) کا مقولہ صاحب ِروح المعانی نے نقل کیا ہے کہ جو عالم اللہ تعالیٰ کے خوف سے روتا نہ ہو، اس کا علم اس کے حق میں نافع نہیں۔ اور صاحب ِروح فرماتے ہیں کہ علماء کی شان یہ ہے کہ اللہ کے خوف سے روتے رہیں۔ حقیقی معنی میں علم اس کے دل میں آیاہوا اسی وقت سمجھا جائے گا جب کہ وہ اللہ کے خوف سے روتا رہتاہو۔

صدیقِ اکبر کا خوفِ خدا

حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے متعلق روایتوں میں موجود ہے، اورآپ نے فضائل کی کتابوں میں سنا بھی ہوگا کہ وہ پرندے کو دیکھ کر خطاب کرتے تھے: "لَيْتَنِي مِثْلُكَ يَاطَائِرُ، وَلَمْ أَكُنْ بَشَراً"، (احیاء العلوم، ۴/ ۱۹۳) اے پرندے !کاش کہ میں تیری طرح ایک پرندہ ہوتا انسان نہ ہوتا۔ اس لئے کہ اس کا کوئی حساب کتاب نہیں ۔کل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو کوئی جواب نہیں دینا، ان جانوروں کو اللہ تعالیٰ نے مکلّف نہیں بنایاہے، کل کو ان کا حساب کتاب نہیں ہے، اور ہمیں تو اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ گویا قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے ڈر سے حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) یہ جملہ کہا کرتے تھے، حالاں کہ یہ وہ شخصیت ہے جو انبیاء کرام کے گروہ کے بعد مخلوق میں سب سے زیادہ افضل ہے،

جن کو نبیٔ کریم (ﷺ) نے جنت کی بشارت سنائی ، بلکہ یہ ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) نے جنت کے دروازوں کا تذکرہ کیا کہ آٹھ دروازے ہیں اور فلاں دروازے سے فلاں طبقہ کو داخلہ ملے گا۔ کسی نے پوچھا کہ کوئی ایسا بھی ہے جس کو ہر دروازے سے پکارا جائے؟ تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا: ہاں! ابو بکر ایسے ہیں (ترمذی شریف ، ۲۲۳۸) ان کو زبانِ نبوت سے یہ بشارت ملی ہوئی ہے، اور آپ (ﷺ) کی صداقت کو صدیق سے بڑھ کر ماننے والا اور کون ہو سکتا ہے! لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے خوف سے ان کا یہ حال تھا کہ پرندے کو خطاب کرکے وہ کہا کرتے تھے: کاش! میں تیری طرح ایک پرندہ ہوتا ، انسان نہ ہوتا۔

فاروقِ اعظم کا حال

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے متعلق لکھا ہے کہ قرآنِ پاک کی آیت سن کر کبھی بے ہوش ہو جاتے اور ایسے بیمار ہو جاتے تھے کہ کئی روز تک ان کی عیادت کرنی پڑتی تھی۔

اور کبھی کبھی تنکے کو اُٹھا کر یوں کہتے تھے: کاش کہ میں تنکا ہوتا۔

کبھی فرماتے: "لَيْتَنِيْ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا" کاش کہ میں بھولا بسرا ہوتا۔

کبھی فرماتے: "لَيْتَنِيْ لَمْ أَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوراً" کاش! میں ایسی چیز ہوتا جو پیدا نہیں ہوتی جس کا کوئی تذکرہ نہ ہوتا۔

کبھی یوں فرماتے: "لَيْتَنِيْ لَمْ تَلِدْنِيْ أُمِّيْ" کاش! میری ماں نے مجھے جنا ہی نہ ہوتا۔ رونے کی وجہ سے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے رخسار کے اوپر نالیوں کے دو نشان پڑ گئے تھے، یہ ان کی خشیت کا عالم تھا۔ (احیاء العلوم، ۴/ ۱۹۳)

دیگر صحابہ کی کیفیت

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے متعلق نقل کیا جاتا ہے، وہ فرماتے تھے: کاش مرنے کے بعد میں دوبارہ پیدا کیا نہ جاتا۔ اس لئے کہ پیدا ہونے کے بعد جواب دینا ہے، یہ کہہ کر روتے رہتے تھے۔ حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ) اور حضرت طلحہ (رضی اللہ عنہ) کے متعلق نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے: کاش میں درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا، جلا دیا جاتا اور انسانوں کے کام آجاتا (احیاء العلوم، ۴/ ۱۹۳) یہ وہ حضرات ہیں جن کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دنیا کے اندر جنت کی بشارتیں سنائی اس کے باوجود جو خشیت ان کے قلب میں اللہ تعالیٰ کی تھی اس کے نتیجے میں یہ چیزیں ظاہر ہوتی تھیں۔

خشیت کیسے حاصل ہو؟

یہاں امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اسی چیز کو بتلانا چاہتے ہیں اور یہ وہ چیز ہے جو حاصل کرنے کی ہے۔ دیکھو! قرآنِ پاک کے اندر خشیت کا تذکرہ تو ہے، اور خشیت کا معنٰی بھی ہم لغت کے اعتبار سے سمجھتے ہیں، لیکن خشیت کیا چیز ہے؟ اور کیسے حاصل کی جائے گی؟ اور جتنی بھی قلبی

صفات کا تذکرہ آتا ہے، جیسے تواضع، شکر، صبر اوراخلاص وغیرہ ان کے معنیٰ لغت کے اعتبار سے ہم جانتے ہیں اوران کے اوپر تفصیلی بیان بھی کرسکتے ہیں، لیکن ان صفات کا حصول ان کتابوں سے نہیں ہوگا، بلکہ ضروری ہے کہ ان صفات کے جو حاملین ہیں ان کی صحبت اختیار کی جائے،اس کے نتیجے میں ہی یہ ساری چیزیں حاصل ہوں گی۔ نبیٔ کریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کی صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ صفات حاصل کیں،اور ان سے سلسلہ بہ سلسلہ یہ صفات آگے والوں نے حاصل کیں۔یہی وہ چیزیں ہیں جن کے حاصل کرنے کے لئے صحبتوں کو اختیار کیاجاتا ہے،جب آدمی اہلِ خشیت کی صحبت میں بیٹھے گا؛ تب یہ چیز حاصل ہوگی۔

کثرت سے رونے والے دو بزرگ

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب (نوراللہ مرقدہٗ) کو مجلس کے اندر دیکھا کہ کبھی ایسی کوئی بات کا تذکرہ آتاتواچانک ایک کیفیت طاری ہوجاتی تھی، جھٹکے میں پورابدن بھاری ہوجاتا، بڑی قوت کے ساتھ اپنی اس کیفیت کو دبانے کی کوشش فرماتے تھے۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ’’اکابر کا رمضان‘‘ میں لکھاہے اور حضرت کی زبان سے میں نے بھی بارہاسنا کہ ویسے تو تمام اللہ والوں کی اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے کی عادت ہوتی ہے، لیکن میرے والد حضرت مولانا یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) کو جتنی کثرت سے راتوں کو روتے ہوئے دیکھا، ویسا کسی کو نہیں دیکھا۔وہ ایسے روتے تھے جیسے کسی بچے کی

استاذ پٹائی کر رہا ہو اور وہ روتا ہے۔ ایسے بلبلا کر روتے تھے کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا تھا اور دیر تک اسی طرح روتے رہتے تھے۔

اور حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق سنا کہ روتے ہوئے فارسی کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے:۔

چہ بودے کہ دوزخ زمَن پُر شُدے   مگر دیگراں را رہائی شُدے

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ! جن لوگوں کو تو جہنم میں بھیجنا چاہتا ہے ان کی جگہ پر اگر تو مجھے عذاب دے کر اُن کو بچالے؛ تو یہ میری سعادت کی بات ہے۔ بہر حال! یہ چیز بھی مطلوب ہے، اس کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ اہم چیز ہے

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے آیت پیش کی ہے: ﴿وَيَخِرُّوْنَ لِلْأَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا﴾ اس آیت سے پہلے اہلِ کتاب میں جو مخلصین اہلِ علم تھے جو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت پر ایمان لے آئے اور آپ کی تصدیق کی ان کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سنتے ہیں تو وہ روتے ہوئے ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر جاتے ہیں اور اس سے ان کے خشوع، اللہ سے ڈرنے اور گڑگڑانے میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے روتے رہتے ہیں۔

اور دوسرے موقع پر اللہ تعالیٰ نے کفارِ مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ﴿أَفَمِنْ هَذَا الْحَدِيثِ تَعْجَبُونَ.وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ﴾ قرآنِ پاک کی آیت کو سن کر تم انکار کے طور پر تعجب کرتے ہو، اور تم ہنستے ہو، روتے نہیں ؟

اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو سن کر رونا؛ یہ اللہ والوں کی شان ہے۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق لکھا ہے کہ رات کو بے چینی سے کروٹ لیتے رہتے تھے اور روتے رہتے تھے، اہلیہ نے پوچھا: کیا بات ہے ؟ کہا: میں یہ چاہتا ہوں کہ اور دو آنکھیں اللہ کے خوف سے رونے والی ہو جائیں۔

تو یہ بہت ضروری اور اہم چیز ہے، اس پر امام (رحمۃ اللہ علیہ) نے چند روایتیں پیش کی ہیں۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے

حدیث ۴۴۶

وعن ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ لِي النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم): اقْرَأْ عَلَيَّ الْقُرْآنَ . قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! أَقْرَأُ عَلَيْكَ ، وَعَلَيْكَ أُنْزِلَ؟ قَالَ: إِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْ غَيْرِي. فَقَرَأْتُ عَلَيْهِ سُورَةَ النِّسَاءِ، حَتَّى جِئْتُ إِلَى هٰذِهِ الآيَة: فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا [النساء:۴۱] قَالَ: حَسْبُكَ الآنَ. فَالْتَفَتُّ، فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے ارشاد فرمایا: مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں آپ کو پڑھ کر سناؤں حالاں کہ آپ پر قرآن نازل کیا گیا ہے؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ مَیں دوسرے سے سننا چاہتا ہوں۔ تو مَیں نے آپ کے سامنے سورۂ نساء پڑھنا شروع کی، یہاں تک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ (جس کا ترجمہ ہے کہ) اس وقت کیا حال ہوگا جب کہ ہم ہر امت کے لئے ایک گواہ بلائیں گے اور اے نبی! ہم آپ کو ان تمام پر گواہ کے طور پر لائیں گے۔ تو نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: بس کرو۔ حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ آپ کے یہ فرمانے پر میں خاموش ہوگیا۔ اس کے بعد میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا، تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

افادات:- نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآنِ پاک سننے کی فرمائش کر کے گویا یہ بتلانا چاہتے تھے کہ کبھی آدمی کو دوسرے کی زبان سے بھی سننا چاہیے۔ علماء نے لکھا ہے کہ خود پڑھنے کے مقابلہ میں دوسرے سے سننے میں آدمی کو غور وفکر اور تدبر کا موقعہ زیادہ ملتا ہے اس لئے کہ خود پڑھنے میں الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کرنے ہیں، ذہن کو اس کی طرف متوجہ کرنے کی بھی ضرورت ہے، اور دوسرے سے سننے کی صورت میں جو تدبر اور غور وفکر ہوگا خود پڑھنے میں اس درجہ کا نہیں ہوگا۔ گویا نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اُمت میں یہ طریقہ بھی جاری کرنا چاہتے تھے، اس لئے آپ نے ان سے سننے کی فرمائش کی۔

"حَسْبُكَ الْآنَ" اس سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ کوئی آدمی کسی سے کلامِ پاک سن رہا ہو، اور سنتے سنتے جب طبیعت سیر ہو جائے تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ بس ٹھہر جاؤ، حالاں کہ قرآنِ پاک پڑھا جا رہا ہے، تو بس کہہ کر روکنا کیا معنی رکھتا ہے؟ امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ مسئلہ ثابت کرنے کے لئے مستقل عنوان قائم کیا ہے اور اسی روایت کے ذریعہ اس مسئلے کو ثابت کیا ہے۔

"فَالْتَفَتُّ، فَإِذَا عَيْنَاهُ تَذْرِفَانِ" حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ آپ کے یہ فرمانے پر میں خاموش ہو گیا، اس کے بعد میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا، اس لیے کہ جب تک پڑھ رہے تھے، تب تک تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نگاہ نہیں تھی، نگاہیں نیچی کر کے پڑھ رہے ہوں گے، پھر دیکھا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اور آگے پڑھنے سے روک دینے کی شاید یہ بھی وجہ ہو کہ آگے پڑھنے کی صورت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رونے کی کیفیت میں اضافہ ہو جاتا اور اس کا ظہور ہو جاتا۔ اور یہ چیز مطلوب ہے کہ اس طرح کی کوئی کیفیت کسی کے اوپر طاری ہو تو اس کو چھپانے کی کوشش کرے، اسی لئے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو پڑھنے سے منع فرمایا۔ اس روایت سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رونا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) رات بھر نماز میں ایک ہی آیت پڑھتے رہے: ﴿إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾

(تفسیر ابن کثیر ۲/۱۲۱)

ہنسو کم اور روؤ زیادہ...

حدیث ۴۴۷

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) خُطْبَةً مَاسَمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ. فَقَالَ: لَوْتَعْلَمُوْنَ مَاأَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً قَالَ: فَغَطّٰى أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وُجُوْهَهُمْ ، وَلَهُمْ خَنِيْنٌ. (متفق علیه) وسَبَقَ بَيَانُهُ فِيْ بَابِ الْخَوْفِ۔

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ ایسا وعظ فرمایا کہ ایساوعظ میں نے کبھی نہیں سنا۔ اسی میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بات ارشاد فرمائی: اگر تم آخرت و قیامت کے احوال کے متعلق وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں (یعنی وہ تفصیل جو مجھے معلوم ہے، تمہیں معلوم ہوجائے) تو تم لوگ ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد سن کر اپنے چہروں کو چادروں سے ڈھانپ لیا اور اُن کے منھ کے اندر سے ناک کی آواز کے ساتھ رونے کی آواز آنے لگی۔

افادات:- ناک کی آواز کے ساتھ اُوں اُوں کرکے جو آدمی روتا ہے اس کو عربی میں "خَنِيْنٌ" کہتے ہیں۔ اس روایت کے ذریعہ سے حضراتِ صحابہ کرام کا رونا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ حضرات بھی اس صفت سے متصف تھے۔

یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس جائے

حدیث ۴۴۸

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): لَا يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللهِ حَتَّى يَعُودَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ، وَلَا يَجْتَمِعُ غُبَارٌ فِي سَبِيْلِ اللهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ۔

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا، وہ جہنم میں نہیں جائے گا یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس جائے۔ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہوئے جو غبار آدمی کی ناک میں جاتا اور جسم پر لگتا ہے؛ وہ اور جہنم کی آگ ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتے۔

افادات:- جانور کے تھنوں میں سے دودھ نکالا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اُسے واپس تھن میں نہیں ڈالا جاسکتا، گویا یہ ایک ناممکن اور محال چیز ہے، تو جیسے دودھ تھن میں واپس نہیں جاسکتا، اسی طریقہ سے جو آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے وہ بھی جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔ بلکہ ایک روایت صاحبِ روح المعانی نے نقل کی ہے کہ جس قوم کے اندر ایک آدمی بھی ایسا ہو جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والا ہو، تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو عذاب نہیں دیں گے۔

اُمت کی پریشانیوں کی ایک وجہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ آج اُمت کی پریشانیوں کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے رونے والے کم ہوگئے۔ آج ہم اپنی مصیبتوں کی وجہ سے روتے ہیں، کوئی مصیبت آگئی، کوئی بیماری آگئی، کوئی انتقال کر گیا، کوئی آفت آگئی، کسی اور تکلیف میں مبتلا ہوگئے، مثلاً مال چوری ہوگیا، کاروبار میں گھاٹا ہوگیا تو خوب روئیں گے، لیکن ہمیں اس بات کی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئیں؛ حالاں کہ رونے کی اصل چیز تو یہ ہے۔ دنیا کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ آج نہیں تو کل؛ ہمارے ہاتھ سے چھوٹنے والی ہیں، کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے، تو پھر ایسی چیز کے ہاتھ سے چلے جانے پر رونا کیا معنٰی رکھتا ہے؟ اصل چیز تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے۔ ان روایتوں کو اسی لئے لائے ہیں کہ آدمی کو اس بات کی عادت ڈالنی چاہیے۔

کام سیکھنے کا طریقہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں رونا نہیں آتا۔ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: "اِنْ لَّمْ تَبْكُوْا فَتَبَاكَوْا" اگر رونا نہ آئے تو رونے جیسی شکل بناؤ۔ اگر بہ تکلّف روئیں گے تو دھیرے دھیرے رونے کی عادت پڑ جائے گی۔ یہ بھی سیکھنے کی چیز ہے۔ جس چیز سے اللہ تعالیٰ راضی اور خوش ہو، اور جس کے متعلق ایسے وعدے ہوں کہ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا، وہ جہنم میں

نہیں جائے گا،تواس چیز کو حاصل کرنے اور ایسی صفت سیکھنے کے لئے چند دن بناوٹی بھی رونا پڑے،تواس میں حرج کی کیابات ہے۔شروع میں کوئی بھی کام سیکھنے کے لئے تو بہ تکلف ہی کیاجاتاہے، کوئی اچھی صفت یا عادت ہو، چند دن تک تواس کو سیکھنے کے لئے بہ تکلف یعنی زبردستی کرنا ہی پڑے گا،جب زبردستی کریں گے توکرتے کرتے عادت ہو جائے گی اوروہ چیز بھی خود بہ خود حاصل ہوجائے گی۔

رونے پر ہی ملتا ہے

اوررونے پر اللہ تعالیٰ کے طرف سے بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) اپنی مجلس میں ایک قصہ سنایاکرتے تھے۔ایک بزرگ کاانتقال ہونے لگا،وہ اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئےلوگوں سے قرض لیاکرتے تھے۔جب قرض خواہوں کومعلوم ہوا کہ فلاں صاحب مرنے والے ہیں تووہ سب جمع ہوگئے کہ ہمارے پیسے لاؤ۔اب یہ اللہ تعالیٰ سے دعاکررہے ہیں کہ اے اللہ جب تک زندگی تھی تب تک تومیرایہ بدن رہن تھا(قرض خواہ کے پاس کوئی چیز گروی رکھی ہوتی ہے تو اس کو اطمینان ہوتا ہے کہ ہمارے پاس اس کی چیزہے،اس کی وجہ سے وہ مطالبہ میں شدت اختیار نہیں کرتا۔ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب تک میں موجود تھا وہاں تک توان کو ایک طرح کا اطمینان تھا) اے اللہ!اب میں تومررہاہوں ،اوریہ لوگ آئے بیٹھے ہیں ،اب توکچھ انتظام کردے۔وہ اس طرح دعاہی کررہے تھے کہ اسی درمیان باہرسے آواز آئی کہ کوئی بچہ مٹھائی بیچ رہا

ہے۔بزرگ نے کہا کہ اس کو بلاؤ۔وہ آیا تو اس سے پوچھا کہ یہ پورا تھال کتنے میں دیا؟ اس نے کہا کہ اتنے میں۔تو اس سے وہ خرید لیا اور کہا کہ جتنے یہاں بیٹھے ہیں،سب کو تقسیم کر دو۔ چنانچہ سب کو مٹھائی دی گئی۔اب بچے نے کہا کہ پیسے لاؤ۔تو انہوں نے کہا کہ تو بھی لائن میں بیٹھ جا۔اب وہ تو بچہ تھا،جب اس کو پیسے نہیں ملے تو اس نے رونا شروع کر دیا۔تھوڑی دیر بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا کہ فلاں آدمی نے یہ تھیلی بھیجی ہے اور اس میں رقم ہے۔جب شمار کیا گیا تو اس میں سے اتنی ہی رقم نکلی جتنا ان کا قرضہ تھا۔کسی نے پوچھا: حضرت!آپ نے اس بچہ کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے میں نے دعا کی تو وہاں سے جواب ملا کہ کوئی رونے والا چاہیے،جب میں نے دیکھا کہ یہ جتنے بیٹھے ہیں ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جس کو رونا آئے،اور باہر سے اس بچے کی آواز آئی تو میں نے سوچا کہ ہاں یہ رونے والا ہے،تو میں نے کہا کہ اس کو بلاؤ اور مٹھائی خرید لی،اور اس سے کہا کہ تو بھی بیٹھ جا۔یہ سن کر جب اس نے رونا شروع کیا تو میری شرط پوری ہو گئی۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) اس واقعہ کو سنا کر فرماتے تھے کہ پیارو!رونا تو بہت اچھی چیز ہے،اللہ تعالیٰ مجھے بھی نصیب فرمائے۔رو کر تو بہت سارے مطالبے منوا لئے جاتے ہیں۔جو چیز قوت سے نہیں منوائی جاتی،وہ رو کر حاصل کی جاتی ہے۔اور اللہ تعالیٰ کو منانے کے لیے سب سے آسان طریقہ رونا ہے۔اس لئے حاصل کرنے کی چیز یہ ہے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ رونا نہ آئے تو رونے جیسی شکل بنائے۔آدمی کو رونے کی عادت ڈالنی چاہیے،اور اپنے

آپ کو اس کا عادی بنانا چاہیے۔ حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ اے اللہ کے رسول! دنیا اور آخرت میں نجات دینے والی کون سی چیز ہے؟ تو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین باتیں ارشاد فرمائیں۔ اپنی زبان کو کنٹرول میں رکھو۔ بلاضرورت گھر سے نہ نکلو۔ اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔ (ترمذی شریف، ۲/۶۶)

یہ چیز ختم ہوگئی

رونا بہت پسندیدہ چیز ہے۔ جتنے بھی حضرات انبیاء کرام اور اہل اللہ گزرے ہیں، ان سب کے حالات کا جب آپ مطالعہ کریں گے تو اس میں یہ چیز (اللہ کے خوف سے رونا) قدرِ مشترک ملے گی۔ اور یہ بہت ضروری چیز ہے، اسی لئے یہ باب قائم کیا ہے کہ اس صفت کو حاصل کرو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں تو یہ چیز معدوم اور ختم ہی ہوگئی ہے، اس لئے آدمی اس چیز کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے۔

سات خوش نصیب

حدیث ۴۴۹

وعنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ إِلَّاظِلُّهٗ: إِمَامٌ عَادِلٌ. وَشَابٌّ نَشَأَفِيْ عِبَادَةِاللّٰهِ تَعَالٰى. وَرَجُلٌ قَلْبُهٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ. وَرَجُلَانِ تَحَابَّا فِي اللّٰهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وتَفَرَّقَا عَلَيْهِ.

وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَجَمَالٍ فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللهَ. وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لَا تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ. وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز عرش کے سائے میں جگہ دیں گے جس روز اس کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا (۱) انصاف کرنے والا حاکم (۲) وہ نوجوان جو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں نشوو نماپائے۔ (گویاجوانی کے زمانہ میں کسی گناہ کاارتکاب نہ کرے) (۳) وہ آدمی جس کا دل مسجد کے اندر اٹکا ہو (دوسری روایت میں ہے کہ نماز پڑھ کر واپس آتا ہے تو یہ سوچتا رہتا ہے کہ کب دوسری نماز کا وقت ہو اور میں نمازاداکروں) (۴) وہ دوآدمی جن میں آپس میں اللہ کی نسبت پر محبت ہو (اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں۔ اللہ کے احکام کو پورا کرنے کی نسبت پر جولوگ آپس میں ملتے ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں) اسی پر ان کاملنا ہواوراسی پر جداہوں (۵) وہ آدمی جس کوکسی منصب والی، خوبصورت عورت (یعنی دنیاوی اعتبار سے بھی گری پڑی نہیں، بلکہ اچھے گھر سے تعلق رکھنے والی، خوبصورت عورت) نے اپنی خواہش پوری کرنے کے لئے بلایااور اس نے جواب میں کہا: مَیں اللہ سے ڈرتا ہوں (۶) وہ آدمی جس نے اللہ کے واسطے صدقہ ایسے چھپاکرکیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہوئی کہ دائیں ہاتھ نے کیادیا (۷) ساتویں وہ آدمی جس نے تنہائی میں اللہ کویاد کیا اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے (یعنی تنہائی میں اللہ کویاد کرکے رویا)

اس روایت سے بھی رونے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔اس لئے اس کو یہاں پیش کیاہے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کے رونے کی کیفیت

حدیث ۴۵۰

عن عَبْدِ اللهِ بن الشِّخِّيرِ (رضی اللہ عنہ) قَالَ أَتَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) وَهُوَ يُصَلِّي وَلِجَوْفِهِ أَزِيْزٌ كَأَزِيْزِ الْمِرْجَلِ مِنَ الْبُكَاءِ.

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن شخّیر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ میں ایک مرتبہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نماز میں مشغول تھے اور آپ کے سینۂ مبارک سے رونے کی وجہ سے ایسی آواز آرہی تھی جیسے ہنڈیا کے اندر سے پانی کے کھولنے کی وجہ سے آتی ہے۔

افادات:۔"مِرجَل" تانبے کی ہنڈیا ہوتی ہے جس کے اندر کھانا پکایا جاتا ہے۔تو تانبے کی ہنڈیا کے اندر پانی ڈال کر اس کو آگ پر رکھا جائے اور آگ کی تپش سے اندر پانی کھولے تو اس سے جیسی آواز پیدا ہوتی ہے، ایسی آواز آپ (ﷺ) کے سینۂ مبارک سے آتی تھی۔

حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) رونے لگے

حدیث ۴۵۱

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) لأبِي بْنِ كَعْبٍ (رضی اللہ عنہ): إِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا قَالَ: وَسَمَّانِي؟ قَالَ: نَعَمْ فَبَكَى أُبَيٌّ. (متفق عليه) وفي رواية: فَجَعَلَ أُبَيٌّ يَبْكِي۔

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں تمہیں سورۂ "لَمۡ یَکُنِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا" پڑھ کرسناؤں۔ حضرت اُبی (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا: اللہ کے رسول! کیا میرا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ مجھے یہ سورت سنائیں؟ تونبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں۔ یہ سن کر حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) روئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت اُبی (رضی اللہ عنہ) روتے رہے۔

افادات:- حضرت اُبی (رضی اللہ عنہ) انصاری صحابی اور قراءِ صحابہ میں سے تھے، بلکہ ان کے متعلق حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: "أَقۡرَؤُهُمۡ أُبَیٌّ" صحابہ میں علمِ قراءت کے سب سے زیادہ جاننے والے اُبی ہیں۔ حضرت اُبی (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا کہ اللہ کے رسول! کیا میرا نام لے کر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مجھے آپ یہ سورت سنائیں؟ اس لئے کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو اختیار دیا گیا ہو کہ آپ اپنے صحابہ میں سے کسی ایک کو یہ سورت سنایئے، اور آپ نے اپنے طور پر ان کو تجویز کیا ہو۔ چناں چہ بخاری شریف کی روایت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اختیار دیا ہے، یا میرا نام لیا ہے؟ حالاں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اختیار دیا جاتا اور آپ ان کو پسند کرتے تو یہ بھی ایک فضیلت کی چیز تھی، لیکن اگر اللہ تعالیٰ کے طرف سے نام لیا جائے تو بہت ہی زیادہ فضیلت کی بات ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں! تمہارا نام لیا ہے، یہ سن کر حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) روئے۔ (بخاری شریف، حدیث نمبر: ۶۱، ۴۹۶۰)

ان کا یہ رونا یا تو محبت کی وجہ سے تھا جیسا کہ عنوان میں "شوقاً الی اللہ" کہا ہے، اس کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مارے شوق کے روتے رہے:

ع : ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یا وہ یہ سوچ کر روئے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر میں کہاں ادا کر سکتا ہوں، اس سے اپنے آپ کو عاجز پا کر روئے۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں

حدیث ۴۵۲

وعنه قال:قَالَ اَبُو بَكرٍ لِعُمَرَ (رضی اللہ عنہ) بَعدَ وَفَاةِ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) : اِنطَلِق بِنَا إِلَى أُمِّ أَيمَنَ (رضی اللہ عنہا) نَزُورُهَا كَمَا كَانَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَزُورُهَا. فَلَمَّا انتَهَيَا إِلَيهَا بَكَت. فقَالَا لَهَا: مَا يُبكِيكِ؟ أَمَا تعلَمِينَ أَنَّ مَا عِندَ اللهِ تَعَالَى خَيرٌ لِرَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) ! قَالَت مَا أَبكِي أَن لَا أَكُونَ أَعلَمُ اَنَّ مَا عِندَ اللهِ خَيرٌ لِرَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)، وَلٰكِنِّي أَبكِي أَنَّ الوَحيَ قَد انقَطَعَ مِنَ السَّمَاءِ؛ فَهَيَّجَتهُمَا عَلَى البُكَاءِ، فَجَعَلا يَبكِيَانِ مَعَهَا (رواه مسلم، وقد سبق فی بابِ زِيارَةِ أهلِ الخَيرِ)

ترجمہ :- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ایک روز کہا کہ چلو! ہم حضرت اُمِ ایمن (رضی اللہ عنہا) کے پاس ان کی زیارت اور ملاقات کے لئے جائیں جیسے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جایا کرتے تھے۔ جب یہ حضرات

حضرت اُمِّ ایمن (رضی اللہ عنہا) کے پاس پہنچے، تو ان دونوں کو دیکھ کر حضرت اُمِّ ایمن (رضی اللہ عنہا) رونے لگیں انہوں نے (بطورِ تسلی ان سے) کہا: کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے جو کچھ نعمتیں اور مراتب ہیں؛ وہ یہاں سے بہتر ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے کہ میں یہ بات نہیں جانتی کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں جو کچھ بھی ہے وہ دنیا کے مقابلے میں اچھا ہے، لیکن مَیں تو اس لئے رو رہی ہوں کہ آسمان سے وحی کا سلسلہ اب منقطع ہوگیا۔ ان کی اس بات نے ان دونوں کو بھی رونے پر اُبھارا، چناں چہ وہ دونوں حضرات بھی رونے لگے۔

افادات:- نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی حضرت اُمِّ ایمن (رضی اللہ عنہا) کی زیارت کے لئے تشریف لے جاتے تھے، چوں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بچپن میں انھوں نے کھلایا ہے۔ (''کھلانا'' کھانا کھلانے کے معنٰی میں نہیں ہے، بلکہ بہلانے کے لئے لے جانا مراد ہے دودھ پلانے والی ''دائی'' کہلاتی ہے، اور بچوں کو سنبھالنے والی ''کھلائی'' کہلاتی ہے) تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بچپن میں انھوں نے کھلایا تھا (یعنی کھیل لگایا تھا) اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا بڑا احترام فرماتے تھے اور ان کو بڑی محبت سے رکھتے تھے۔ چناں چہ ان کی طرف سے کوئی بات ہوتی تھی تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) برداشت فرماتے تھے۔

حضرت اُمّ ِ اَیمن (رضی اللہ عنہا) کا ناز

غزوۂ بنو قریظہ کے بعد جو باغات غنیمت میں آئے تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو حضراتِ مہاجرین کے درمیان تقسیم کیا۔ اس سے پہلے یہ ہوتا تھا کہ انصار اپنے باغات میں سے کچھ درخت نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لئے الگ کر لیتے تھے کہ فلاں باغ کے اتنے درخت حضور کے لئے خاص ہیں، اور حضور کی خدمت میں جا کر عرض کرتے تھے: اے اللہ کے رسول! ہمارے باغ میں سے اتنے درخت آپ کے لئے ہیں یعنی ان میں جتنی بھی کھجوریں پیدا ہوں گی وہ آپ کی خدمت میں ہدیہ ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کو اپنی ضرورتوں میں استعمال فرماتے تھے، جو حاجت مند صحابہ ہوتے تھے ان کو دیتے تھے، مہمان آتے تھے ان کی خدمت فرماتے تھے۔ تو کچھ درخت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے اہلِ خاندان کی طرف سے دیئے گئے تھے، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ حضرت اُمِّ اَیمن (رضی اللہ عنہا) کو دے رکھے تھے۔ جب بنو قریظہ والا غزوہ ہوا اور باغات آئے تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ سارے باغات مہاجرین میں تقسیم فرما دیئے، اور انصار کے جتنے بھی درخت تھے وہ سب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو واپس فرما دیئے۔

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے خاندان کی طرف سے جو درخت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو استعمال کے واسطے دیئے گئے تھے وہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ام اَیمن (رضی اللہ عنہا) کو دے رکھے تھے۔ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں اپنے خاندان کی طرف سے لینے کے لئے حاضر ہوا تھا، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ یہ درخت ان کو واپس کر دو۔ تو وہ کہنے لگیں کہ میں تو نہیں

دوں گی۔ اور میرے گلے میں دُوپٹہ ڈال کر کھینچنے لگیں اور کہنے لگیں کہ میں نہیں دوں گی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ تم دے دو، مَیں تم کو اس سے دوگنا دوں گا۔ تو کہنے لگیں کہ پھر بھی مَیں نہیں دوں گی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا کہ تین گنادوں گا، چار گنادوں گا، یہاں تک کہ جب دس گُنادینے کا کہا؛ تب وہ راضی ہوئیں۔ (بخاری شریف۔۴۱۲۰)

اپنے بڑوں کی نقل

خلاصہ یہ کہ حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا بڑا اکرام فرمایا کرتے تھے اور ان کی ملاقات و زیارت کے لئے جاتے تھے۔ اور جن کی زیارت کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) خود جاتے ہوں، تو بھلا حضرت ابوبکر اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کیوں نہ جائیں؟ اس سے پتہ چلا کہ جو کام اپنے بڑے کیا کرتے ہوں، ان کے بعد بھی وہ سلسلہ آدمی کو جاری رکھنا چاہیے۔ جیسے آپ کے والدِ بزرگوار اللہ کے نیک بندے تھے، تو وہ جن لوگوں کی ملاقات کو جایا کرتے تھے، آپ کو بھی وہ سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ان کی ملاقات کے لئے جاتے رہنا چاہیے۔

فوائدِ حدیث

(۱) جب یہ حضرات حضرت اُمِّ ایمن (رضی اللہ عنہا) کے پاس پہنچے تو ان کو دیکھ کر حضرت اُمِّ ایمن رونے لگیں، اس لئے بھی کہ یہ حضرات ہمیشہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ رہتے تھے جیسے کسی کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، اور ان کا قریبی کوئی دوست آجائے تو ان کو دیکھ کر آدمی کی

یاد تازہ ہوجاتی ہے اور اس کی وجہ سے وہ روتا ہے۔اسی طرح ان حضرات کو دیکھ کر بھی ظاہر ہے کہ حضور(ﷺ) کی یاد آنا لازمی بات تھی۔

(۲)''لیکن مَیں تو اس لئے روتی ہوں کہ آسمان سے وحی کا سلسلہ اب منقطع ہوگیا ہے''یعنی آپ(ﷺ) آخری نبی تھے، اور نبی کے پاس نبوت کی نسبت پر جو وحی آتی تھی اب وہ وحی دنیا میں آنے والی نہیں ہے، گویا دنیا وحی کی برکات سے محروم ہوگئ۔

حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے رونے کی کیفیت

حدیث ۴۵۳

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: لَمَّا اشْتَدَّ بِرَسُوْلِ اللّٰهِ (ﷺ) وَجَعُهُ قِيلَ لَهُ فِيْ الصَّلَاةِ. فَقَالَ: مُرُوا أَبَا بَكْرٍ فَلْيُصَلِّ بِالنَّاسِ. فقَالَتْ عَائِشَةُ (رضی اللہ عنہا): إِنَّ أَبَا بَكْرٍ رَجُلٌ رَقِيقٌ، إِذَا قَرَأَ الْقُرآنَ غَلَبَهُ الْبُكَاءُ. فَقَالَ: مُرُوهُ فَلْيُصَلِّ.

وفی روایۃ عن عائشۃ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: قُلْتُ: إِنَّ أَبَا بَكْرٍ إِذَا قَامَ مَقَامَكَ لَمْ يُسْمِعِ النَّاسَ مِنَ الْبُكَاءِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی آخری بیماری جس میں حضور کی وفات ہوئی، جب نماز کا وقت آیا تو آپ (ﷺ) پر بے ہوشی طاری ہوئی، پھر جب آپ ہوش میں آئے تو پوچھا کہ کیا لوگوں نے نماز پڑھ لی؟ بتایا گیا کہ نہیں؛ اے اللہ کے رسول! آپ کا انتظار ہے۔ آپ (ﷺ) نے وضو کے لئے پانی منگوایا، پھر بے ہوشی طاری ہوگئی، دوبارہ جب ہوش میں آئے تو پھر پوچھا تو بتایا گیا کہ لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو حضور (ﷺ) نے کہا: ابو بکر سے کہو کہ وہ نماز پڑھائیں۔ جب نبیٔ کریم (ﷺ) نے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کو نماز پڑھانے کے لئے تجویز فرمایا تو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا)

نے عرض کیا کہ ابوبکر نرم دل آدمی ہیں، جب قرآنِ پاک پڑھتے ہیں تو ان پر رونا غالب آجاتا ہے (یعنی وہ روتے رہتے ہیں) تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا: ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے کہا: اے اللہ کے رسول! ابوبکر جب آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو ان پر بکاء کی ایسی کیفیت طاری ہوجائے گی کہ لوگوں کو آواز نہیں پہنچے گی۔

افادات :-حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی یہی تو بات تھی کہ ہجرت سے پہلے وہ اپنے گھر میں رات کو تہجد کے اندر قرآن پڑھتے تھے اور روتے تھے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے جمع ہوجاتے تھے اور یہی چیز مشرکین پر بڑی شاق گذرتی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ تو بڑا مشکل ہوجائے گا کہ ہماری عورتیں اور بچے ان کا قرآن سن سن کر ہمارے قابو میں نہیں رہیں گے۔اس لئے انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو تکلیف پہنچانا شروع کیا،اور اس کے نتیجے میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے ہجرت کرنے کا ارادہ فرمایا۔ابن دغنہ نے جب یہ سنا تو حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ آپ جیسا آدمی یہاں سے نہیں جا سکتا، آپ میں فلاں فلاں خوبیاں ہیں، میں آپ کو امان دیتا ہوں،اور اس نے مشرکینِ مکہ سے کہا کہ میں نے ان کو امان دی ہے،اب ان کو کوئی چھیڑے گا نہیں۔ان لوگوں نے ابن دغنہ سے کہا کہ آپ جب ہم کو یہ کہہ رہے ہیں تو ان سے بھی ایک بات کہیے کہ یہ نماز میں زور زور سے قرآن پڑھتے ہیں اور روتے ہیں جس کو سن کر ہماری عورتیں

اور بچے جمع ہو جاتے ہیں، اس کی وجہ سے کہیں وہ فتنے میں مبتلا نہ ہو جائیں، اس لئے ان سے کہیے کہ یہ ایسا نہ کریں۔ (بخاری شریف۔۲۱۷۵)

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی یہ عادت تھی کہ قرآن مجید جب پڑھتے تھے تو رونا آہی جاتا تھا۔ تو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ جب نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوں گے اور قرآنِ پاک کی تلاوت کریں گے، تو نرم دل ہونے کی وجہ سے رونے کا غلبہ ہو گا اور گویا نماز پوری نہیں کرا سکیں گے۔ اس لئے اللہ کے رسول! آپ کسی اور سے فرمائیں کہ وہ نماز پڑھائے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: انہی سے کہو۔ دو تین مرتبہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے کہا تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ ابو بکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

یہاں اس روایت کو لانے کا مقصد حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کی اس صفتِ بکاء کو بیان کرنا ہے کہ وہ قرآنِ پاک کی تلاوت کے وقت رویا کرتے تھے، اور یہ رونا کبھی اللہ تعالیٰ کے خوف سے اور کبھی اللہ تعالیٰ کے شوق میں ہوتا تھا۔

دولت نیکیوں کا بدلہ تو نہیں ؟

حدیث ۴۵۴

عن إبراهيم بن عبد الرحمٰن بن عوف: أَنَّ عبد الرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) أُتِيَ بِطَعَامٍ وَكَانَ صَائِمًا فَقَالَ: قُتِلَ مُصْعَبُ بن عُمَيْرٍ (رضی اللہ عنہ) وَهُوَ خَيْرٌ مِنِّي، فَلَمْ يُوجَدْ لَهُ مَا يُكَفَّنُ فِيهِ إِلَّا بُرْدَةٌ، إِنْ غُطِّيَ بِهَا رَأْسُهُ بَدَتْ رِجْلَاهُ وَإِنْ غُطِّيَ بِهَا رِجْلَاهُ بَدَا رَأْسُهُ. ثُمَّ بُسِطَ لَنَا مِنَ الدُّنْيَا مَا بُسِطَ - أَوْ قَالَ: أُعْطِينَا مِنَ الدُّنْيَا مَا أُعْطِينَا - قَدْ خَشِينَا أَنْ تَكُونَ حَسَنَاتُنَا عُجِّلَتْ لَنَا، ثُمَّ جَعَلَ يَبْكِي حَتّٰى تَرَكَ الطَّعَامَ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) کے صاحبزادے ابراہیم راوی ہیں کہ حضرت عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے پاس کھانا لایا گیا اور وہ روزہ سے تھے (کھانا ذرا عمدہ قسم کا تھا اس کو دیکھ کر ان کو پہلے کا زمانہ یاد آگیا) تو فرمانے لگے کہ حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہ) شہید کئے گئے، وہ مجھ سے افضل تھے، جب وہ شہید ہوئے تو کفن دینے کے لئے اتنا کپڑا میسر نہیں آیا جس سے پورا کفن دیا جاسکے سوائے ایک چادر کے، اور وہ بھی اتنی مختصر تھی کہ اگر ان کا چہرہ چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں چھپائے جاتے تو چہرہ کھل جاتا تھا پھر دنیا کی دولت ہمارے پاس آئی تو ہمیں تو یہ ڈر ہے کہ کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ دنیا ہی میں نہ دیا گیا ہو۔ یہ فرما کر وہ روتے رہے، یہاں تک کہ کھانا نہیں کھایا۔

افادات:- (۱) بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ روزہ دار کے لئے جب افطار کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ کھانے کا زیادہ محتاج ہوتا ہے، طبیعت میں بھی کھانے کا تقاضہ ہوتا ہے اس کے باوجود خوف و خشیت کی ایسی کیفیت ان پر غالب آئی کہ انھوں نے کھانا نہیں کھایا۔

(۲) حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہ) مہاجرین اولین میں سے ہیں، غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کا جھنڈا ان ہی کے ہاتھ میں تھا اور وہ شہید کئے گئے اور چوں کہ ان کا چہرہ نبیؑ

کریم (ﷺ) کے چہرہ سے بہت مشابہت رکھتا تھا تو جس آدمی نے ان کو شہید کیا تھا اس نے یہ مشہور کردیا کہ میں نے محمد (ﷺ) کو قتل کردیا اور اسی وجہ سے حضور (ﷺ) کی شہادت کی افواہ پھیل گئی۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور تمام امت کا عقیدہ ہے کہ عشرہ مبشرہ باقی تمام صحابہ سے افضل ہیں اس کے باوجود وہ یہ فرمارہے ہیں "حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہ) مجھ سے افضل ہیں" وہ یاتوبطورِ تواضع کے فرمارہے ہیں، یا جس وقت یہ ارشاد فرمایا اس وقت تک حضور (ﷺ) نے ان کو یہ بشارت نہیں سنائی تھی۔

(۳) "اگر ان کا چہرہ چھپایا جاتا تو پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں چھپایا جاتا تو چہرہ کھل جاتا تھا" اس کا مطلب یہ ہے کہ فقر کا یہ عالم تھا، ایسی حالت میں وہ دنیا سے رُخصت ہوئے، اس کے بعد دنیا کی وہ دولت وثروت ملی جوکہ ملی۔ اس لئے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ پھیلا اوردوسرے ممالک فتح ہوئے تو دولت و ثروت کی ریل پیل ہوئی۔ اوریہ حضرت عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) توپہلے ہی سے مالدار صحابہ میں شمار کئے جاتے تھے۔

جلدی سے بدلہ دیئے جانے کامطلب یہی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم نے نیکیوں کے جو کام کئے ہیں، یہ ان کا اجر وثواب ہو، اور ان کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا ہو، اور کل کو آخرت میں ہم سے یوں کہا جاوے کہ تم کو تو بدلہ دنیا میں ہی دیا گیا تھا، یہاں کیا مانگنے

آئے ہو۔اس ڈر سے ان حضرات کے پاس جب دولت و ثروت آتی تھی تو ڈرتے تھے اور کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ کیا ارادہ کیا ہے۔ان کو یہ خطرہ رہتا تھا۔اورآج ہمارا حال یہ ہے کہ کسی کے پاس دولت ہو تو یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پکڑا ہے۔تو کیانعوذباللہ اس سے پہلے کوئی اور بات تھی؟ اللہ تعالیٰ کا فضل و عنایت نہیں تھی؟ ان حضرات کے یہاں تو یہ چیز خطرے کی سمجھی جاتی تھی۔

یہ فرماکروہ روتے رہے،یہاں تک کہ کھانا نہیں کھایا۔حالاں کہ روزے سے تھے، افطار کے وقت کھانالایاگیاتھا،اورروزے کا تقاضا یہ تھاکہ کھاتے لیکن ان پر خشیت و بکا کی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ کھاناچھوڑ دیا۔

دو قطرے اوردو نشان

حدیث ۴۵۵

وَعَن اَبِي اُمَامَةَ صُدَيِّ بن عجلان الباهِلِي(رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِي(صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لَيۡسَ شَيۡئٌ أَحَبَّ اِلَى اللهِ تَعَالٰى مِنۡ قَطۡرَتَيۡنِ وَأَثۡرَتَيۡنَ : قَطۡرَةُ دُمُوۡعٍ مِنۡ خَشۡيَةِ اللهِ، وقَطۡرَةُ دَمٍ تُهۡرَاقُ فِيۡ سَبِيۡلِ اللهِ. وَأَمَّا الأَثۡرَانِ:فَأَثَرٌ فِيۡ سَبِيۡلِ اللهِ تَعَالٰى، أَثَرٌ فِيۡ فَرِيۡضَةٍ مِنۡ فَرَائِضِ اللهِ تَعَالٰى. (رَوَاهُ التِّرمِذِيُّ وقَالَ حديثٌ حسنٌ)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ(رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو دو قطروں اوردونشانوں سے زیادہ محبوب اورکوئی چیز نہیں۔ایک تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے جو آنسو نکلے اس کا قطرہ۔اوراللہ کے راستہ میں جہاد میں دشمن سے لڑتے ہوئے جو خون بہے اس کا قطرہ۔اورجو دو

نشان اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں ان میں سے ایک وہ نشان ہے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے دشمن کی تلوار یا نیزے سے لگا اور جسم پر نشان رہ گیا۔اور دوسرا اللہ تعالیٰ کے کسی فریضے کی ادائیگی میں جو نشان لگا۔

افادات:-دوسری روایت میں ہے کہ کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا اور اس کا آنسو نکلا، چاہے وہ مکھی کے سر کے برابر ہو، اور چہرے کے اوپر اتر آیا؛ تو اللہ تعالیٰ بدن کے اس حصے کو جہنم کے اندر نہیں ڈالے گا۔

''قطرۃ دموع'' اور ''قطرۃ دم'' شرّاح فرماتے ہیں کہ ''دموع'' جمع لائے اور ''دم'' واحد لائے۔ گویا خون کے ایک قطرہ پر بھی یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

''اللہ تعالیٰ کے کسی فریضے کی ادائیگی میں جو نشان لگا'' مثلاً نماز پڑھتے پڑھتے پیشانی کے اوپر جو نشان پڑ جاتا ہے یا وضو کا جو نشان چہرے پر رہتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ کے کسی بھی فریضے کی ادائیگی میں کوئی نشان پڑ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ یہاں اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ جو قطرہ اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے وہ آنسو کا قطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نکلا ہو۔ اس لئے آدمی کو یہ کیفیت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، اس کی عادت ڈالنی چاہیے اور اہتمام کرنا چاہیے۔

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے دلوں کی کیفیت

حدیث ۴۵۶

عن العرباض بن سارية (رضی اللہ عنہ) قال: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَوْعِظَةً بَلِيْغَةً، وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ.

ترجمہ:- حضرت عرباض بن ساریہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ ہم کو بہت مؤثر وعظ فرمایا جس کے نتیجے میں لوگوں کے دل دہل گئے اور آنکھیں بہہ پڑیں۔

افادات :- یہاں اس روایت کو اس لئے لائے ہیں کہ دیکھو! حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وعظ سن کر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے دلوں کی کیفیت اللہ کے خوف و خشیت سے ایسی ہوجاتی تھی کہ ان کے دل دہل جاتے تھے اور آنسو بہہ پڑتے تھے۔ یہی کیفیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس کا طریقہ پہلے بتلایا گیا کہ شروع میں بہ تکلّف رونے کی صورت بنائی جائے، پھر دھیرے دھیرے یہ کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔

(یہ روایت تفصیل سے باب المحافظة علی السنة، حدیث نمبر ۱۵۷، [حدیث کے اصلاحی مضامین] جلد ۳، صفحہ از ۲۰۸ تا ۲۱۰ پر گزر چکی ہے۔ ادارہ)

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

فَضْلُ الزُّهْدِ فِي الدُّنْيَا وَالْحَثُّ عَلَى التَّقَلُّلِ مِنْهَا وَفَضْلُ الْفَقْرِ مجلس ۱

دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت اور سازو سامان میں کمی رکھنے کی ترغیب اور فقر کی فضیلت

مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۱/ شوال المکرم ۱۴۲۰ھ ۲۹/ جنوری ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

أعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ. كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ. (یونس ۲۴)

نیا عنوان قائم کیا ہے۔ دنیا کے معاملہ میں زہد اختیار کرنے کی فضیلت، اور دنیا کے سازو سامان میں کمی رکھنے کی ترغیب، اور فقر کی فضیلت۔

حقیقی سکون وراحت کاراستہ

اس سے پہلے خوف ورجا کا بیان تھا۔ جس طرح خوف اور رجا؛ یہ دونوں باطنی اخلاق میں سے ہیں، اسی طریقہ سے زہد بھی دل سے تعلق رکھنے والی ایک صفت اور باطنی خُلق ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اگر اپنے باطنی اخلاق درست کرلے تو اس صورت میں اس کے لیے جہاں آخرت کی کامیابی ہے، وہاں اُسکو دنیاوی اعتبار سے بھی راحت وسکون حاصل ہوگا۔ دنیا کا چین اور سکون بھی اُس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک اخلاقِ باطنہ درست نہ کرلے۔ کوئی آدمی ظاہری اعتبار سے دنیوی اسباب و وسائل کتنے ہی جمع کیوں نہ کرلے، کئی فیکٹریاں قائم کرلے، بنگلے کھڑے کرلے، کئی گاڑیاں لاکر صحن میں کھڑی کردے کتنا ہی بینک بیلنس جمع کرلے ، اور دنیا کی زیب و زینت اور عیش و آرام کا سازوسامان کتنا ہی جمع کیوں نہ کرلے؛ لیکن دل کا سکون وچین اور حقیقی راحت اسی وقت حاصل ہوگی جب اپنے اخلاقِ باطنہ اور اندرون کی خوبیوں کو حاصل کرے، جب تک یہ بات نہیں ہوگی، وہاں تک صرف ظاہری اسباب و وسائل اختیار کرنے سے دل کا سکون حاصل نہیں ہوسکتا۔ چناں چہ انہیں اخلاقِ باطنہ میں سے ایک خُلق کو آج بیان کرنا چاہتے ہیں ، اور وہ ”زہد“ ہے۔

زُہد کیا ہے؟

ہم عابد اور زاہد بولا کرتے ہیں ۔یہ زہد کیا چیز ہے؟ دنیا سے بے رغبتی ،اور دل کا دنیا کی محبت سے خالی ہونا؛ زہد کہلاتا ہے۔زاہد یعنی جس کے دل میں دنیا کی رغبت نہ ہو۔جس کے دل میں دنیا کی محبت نہیں ،جس کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہے، ایسے آدمی کو ''زاہد'' کہتے ہیں۔اوراس خوبی کو'' زُہد'' کہتے ہیں اور اس کی قرآن و حدیث میں بڑی ترغیب آئی ہے،اور آدمی کے لئے دینی اعتبار سے بنیادی وصف یہی ہے۔اس لیے کہ سب سے بڑی خرابی اور سب سے براوصف جو آدمی کے اندر ہے وہ دنیا کی محبت ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے نبیٔ کریم (ﷺ)نے ارشاد فرمایا:''حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ ''(کشف الخفاء ،۱۰۹۹)دنیا کی محبت ہر برائی اورگناہ کی جڑ ہے۔دنیا میں جتنے بھی جرائم، برائیاں اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی نافرمانیاں وجود میں آرہی ہیں ، اُن سب کے پیچھے اگر آپ غور کریں تو دنیا کی محبت ہی کارفرمانظر آئے گی۔یہی دراصل ساری خرابیوں کی بنیاد ہے۔

ہر برائی کی جڑ

مثلاً ایک آدمی اگر چوری کرتا ہے تو اسی لیے کہ اُس کے دل میں مال کی محبت ہے۔یاایک آدمی زناکرتاہے،شراب پیتاہے،تویہ بھی دراصل دنیوی لذتیں ہیں جو اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے ہیں،اوریہ تمام لذتیں وقتی اور ختم ہونےوالی ہیں جس کے

حاصل کرنے کے لئے آدمی زنااور شراب کے ذریعہ سے مددحاصل کرتا ہے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلاہوتا ہے۔جتنے بھی جرائم اور گناہ ہیں اگر آپ اُن کی بنیاددیکھیں گے؛تودنیاکی محبت ہی ہوگی۔اسی لئے قرآن میں دنیاکی حقیقت کو مختلف انداز سے واضح کیاگیاہے کہ دنیا کی کیا حقیقت ہے؟ باربار بتایاگیاکہ جو تم اُس کے پیچھے پڑے ہو، رات دن ایک کر رہے ہو،اپنی ساری صلاحیت و قابلیت اور قوت جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے عطا فرمائی ہےاس کو اللہ تعالیٰ کو خوش کرنےاور آخرت کے واسطے استعمال کرنا چاہیے تھا،لیکن تم اس کو دنیا کے پیچھے ضائع اور برباد کررہے ہو۔

رُخ صحیح کرلیں

اس دنیاکی حقیقت کیاہے؟اوروہ کتنے دن کی ہے؟اسکو مختلف مثالوں سے قرآنِ پاک کے اندر بیان کیاگیا ہے، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے دل ایسا بنایاہے کہ اُس میں ایک وقت میں حقیقی اعتبار سے کئی محبتیں جمع نہیں ہو سکتیں ،بلکہ صرف ایک ہی محبت رہ سکتی ہے۔تعلقات تومختلف اشخاص سے ہوسکتے ہیں ، لیکن حقیقی محبت اگر دیکھی جائےتو ایک ہی سےہوسکتی ہے۔اور جس دل میں دنیاکی محبت ہو،اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آسکتی ،اور جب تک اللہ تعالیٰ کی محبت آدمی کے دل میں پیدا نہ ہوجائے، وہاں تک اس کی زندگی کا رُخ صحیح نہیں ہوسکتا۔اور اصل تو رخ کا صحیح کرنا ہی ہے۔مثلاً آپ گاڑی چلاتے ہیں ،تواگراُس کا رُخ غلط ہے تو اُس صورت میں آپ جتنی تیزسے تیز

چلاتے جائیں گے اتنے ہی منزل سے دور ہوتے جائیں گے، کبھی بھی منزل تک پہنچنے والے نہیں۔ اور اگر ایک مرتبہ رُخ صحیح کرلیا، اس کے بعد آپ آہستہ بھی چلائیں گے تب بھی آج نہیں تو کل؛ منزل پر ضرور پہنچیں گے۔ تو حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آجائے تو یوں سمجھئے کہ زندگی کا رُخ صحیح ہوگیا۔ اور جب رخ صحیح ہوجائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے واسطے، اُس کے احکام کو بجالانے کے واسطے جو بھی محنت ہوگی، آدمی آسانی سے اُس کو برداشت کرے گا۔ نہ نماز اس کے لئے بھاری رہے گی، نہ نماز کے لئے اُٹھنا اُس کے لئے مشکل رہے گا۔ نہ کسی قسم کی مالی قربانی دینا اُس کے لئے مشکل رہے گا۔

حُبِّ دنیا کے کرشمے

جو لوگ دوسروں کے حقوق مارتے ہیں جیسے باپ کا انتقال ہوگیا تو بھائی اپنی بہنوں کا حق نہیں دیتا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے بہنوں کا بھی حق رکھا ہے۔ وراثت میں اُن کی ملکیت ہے، لیکن بھائی نہیں دیتا؛ آخر کیوں ؟ اسی مال کی محبت کی وجہ سے نہیں دیتا۔

ایک آدمی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، وہ مال کی محبت کی وجہ سے۔ لوگوں کے ساتھ دھوکہ دہی کرتا ہے، وہ بھی مال کی محبت کی وجہ سے۔ جب تک کہ دنیا اور مال کی محبت دل کے اندر موجود ہے، وہاں تک شریعت کے احکام پر عمل کرنا اس کے لئے مشکل ہے اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری میں قدم قدم پر دنیا کی محبت اس کے لئے رکاوٹ بنتی ہے۔ شریعت

کے احکام کو بجالانے میں مشکلیں کیوں پیش آتی ہیں؟اس لئے کہ دنیا کی محبت ہے۔اگر دل میں دنیا کی محبت نہ ہوتی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت ہوتی تو اس کے لئے سب کچھ قربان کرنا آسان تھا۔

حقیقی محبت اگر کسی سے کرتا

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کا دل ایسابنایا ہے کہ اُس میں ایک وقت میں حقیقی اعتبار سے ایک ہی محبت آسکتی ہے۔حدیثِ پاک میں آتاہےحضرت ابو بکر صدیق(رضی اللہ عنہ) کے فضائل میں حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:"لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذاً خَلِيْلاً لَا تَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ خَلِيْلاً"، اگر میں دل سے کسی کو اپنا دوست بناتا اور حقیقی محبت اگر کسی سے کرتا: توابو بکر سے کرتا (بخاری شریف،۳۴۵۷)لیکن حقیقی محبت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی سے نہیں کی جاسکتی۔ حالاں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو تعلق حضرت ابو بکر صدیق(رضی اللہ عنہ) کے ساتھ تھا وہ ساری دنیا جانتی ہے،سب کومعلوم ہے کہ کتنا زیادہ تعلق تھا۔صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) میں سب سےزیادہ تعلق نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کاحضرت ابو بکرصدیق(رضی اللہ عنہ) کے ساتھ تھا، اُس کے باوجود حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے قلبی محبت کی حقیقت کو ظاہر کیاکہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے قلبی محبت نہیں ہوسکتی ہے۔ اگراللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اورسے حقیقی محبت ہوسکتی توحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ مَیں ابو بکر سے کرتا۔

اور حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو نسبت اور تعلق تھا اس کو حضرت مجدد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک مثال سے بہت آسانی سے سمجھایا ہے کہ اگر ایک آئینہ ہو، اور اس آئینہ کے سامنے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہوں، تو اس آئینہ میں جو نظر آرہا ہے گویا وہ ابو بکر ہیں اور باہر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں ۔"من توشدم تو من شدی" جیسا معاملہ تھا۔اور تمام خوبیوں میں ایسی ہی یکسانیت تھی اور اس کے نمونے احادیث میں ملتے ہیں۔

صدیقِ اکبر (رضی اللہ عنہ) کو نسبتِ اتحاد

غزوۂ حدیبیہ کے موقعہ پر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کفارِ مکہ کے ساتھ صلح کی تھی۔ دراصل آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) عمرہ اور بیت اللہ کی زیارت کے ارادہ سے احرام باندھ کر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ تشریف لائے تھے، مشرکین نے روکا کہ ہم نہیں جانے دیں گے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مختلف لوگوں کے ذریعہ سے پیغام پہنچایا ،اور سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ہم لڑنے کے لیے نہیں آئے ہیں ، ہم تو بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں ، زیارت کرکے واپس چلے جائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں جانے دیں گے، آخر میں صلح کی نوبت آئی۔ ان تک بات پہنچانے کے لئے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو بھیجا جب وہ وہاں گئے تو مکہ والوں نے اُن کو روک لیا۔ اور یہاں یہ بات مشہور ہوئی کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) شہید کر دیئے گئے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے بیعت لی کہ ہم عثمان کے خون کا بدلہ لیں گے۔ اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) لڑنے کے لیے بالکل تیار تھے ، اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

ہاتھوں پر بیعت کرچکے تھے کہ ہم جان دیدیں گے لیکن میدان سے قدم نہیں ہٹائیں گے، لیکن پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبیٔ کریم (ﷺ) کو بتلایا گیا کہ صلح کرلیں۔ اس لیے صلح کی گفتگو شروع ہوئی۔ اس میں انہوں نے ایسی شرطیں رکھیں کہ کوئی مان ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسی شرطیں تھیں جن کو ماننے میں بظاہر اپنی بات کو چھوڑنا پڑتا تھا، اور آدمی ایک طرح کی بے عزتی محسوس کرتا تھا۔ منجملہ شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ ابھی واپس جانا ہوگا، حالانکہ آپ (ﷺ) مکہ کے قریب پہنچ چکے تھے چند کلومیٹر ہی دور تھے، اور وہ کہنے لگے کہ ہم عمرہ کرنے نہیں دیں گے، اور بیت اللہ کی زیارت بھی کرنے نہیں دیں گے، ابھی تو واپس جانا پڑے گا۔ دوسرا یہ کہ دس سال کے لیے ہمارے درمیان صلح رہے گی، اس درمیان ہمارے یہاں سے کوئی آدمی مسلمان ہوکر آپ کے وہاں آئے گا تو آپ کو واپس کرنا ہوگا۔ اور اگر آپ کا کوئی آدمی یہاں آئے گا تو ہم واپس نہیں کریں گے۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ان کی سب شرطیں مان لیں۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو دیکھا جائے تو سب ایک دم سے خاموش تھے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت سہل بن حُنَیف (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اگر نبیٔ کریم (ﷺ) کے کسی حکم کو رد کیا جاسکتا، تو ہم اس کو رد کردیتے۔ یعنی دل میں ایسے جذبات تھے، لیکن صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) جان دے سکتے تھے لیکن حضورِ اکرم (ﷺ) کا حکم رد نہیں کرسکتے تھے۔ وہ حضرات اس کا تصور ہی نہیں کرسکتے تھے کہ حضور (ﷺ) کا حکم اور آپ کی بات ٹالی جاسکتی ہے۔

اس موقع پر تمام صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) ایک دم سے خاموش تھے۔جب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے بھی رہا نہیں گیا تو انہوں نے نبئ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیوں نہیں ۔پھر پوچھا: کیا آپ اللہ کے سچے رسول نہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیوں نہیں۔پھر پوچھا: اگر ہماری ان کے ساتھ لڑائی ہو جائے اور ہمارے آدمی مارے جائیں ،تو کیا جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جائیں گے۔پھر پوچھا: اُن کے آدمی جہنم میں نہیں جائیں گے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جائیں گے۔تو کہنے لگے : پھر کیوں ہم اتنا دب کر صلح کریں ؟ پھر کہا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ سے وعدہ نہیں فرمایا ہے؟ اور آپ نے خواب بھی دیکھا تھا کہ ہم بیت اللہ کی زیارت کر رہے ہیں۔تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ٹھیک ہے، لیکن اُس میں وقت کی قید نہیں تھی کہ اسی سال کریں گے۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا، تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ میں اللہ کا رسول ہوں ، میں جو بھی کرتا ہوں ، اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتا ہوں۔اب وہ خاموش تو ہو گئے لیکن پھر بھی دل میں کھٹک ابھی باقی تھی۔

جس وقت حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ ساری بات ہو رہی تھی اس وقت حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) وہاں موجود نہیں تھے،وہ لشکر کے کسی دوسرے حصے میں تھے تقریباً ڈیڑھ ہزار کا لشکر تھا۔حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گفتگو کرنے کے بعد حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے پاس پہنچے اور ان سے بھی یہی سارے سوالات کیے۔کیا ہم حق پر اور وہ

باطل پر نہیں ہیں؟ اور حضرت ابو بکر(رضی اللہ عنہ) نے ہو بہو وہی سارے جوابات دیئے، جو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیئے تھے۔

دوسرا واقعہ

ایک موقعہ پر حضرت ابو بکر صدیق(رضی اللہ عنہ) مشرکینِ مکہ کی ایذاء رسانیوں سے تنگ آکر مکہ مکرمہ چھوڑنے کی تیاری کر رہے تھے ،جب اپنا سامان لیکر نکلے تو ابن دغنہ جو مکہ کے بڑے لوگوں میں تھا اُس نے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو؟ حضرت ابو بکر(رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ ان مکہ والوں نے مجھے تنگ کر رکھا ہے، میرے لئے اب یہاں زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا ہے، اس لیے مَیں یہاں سے جارہا ہوں۔ اُس نے کہا کہ آپ جیسا شخص یہاں سے چلا جائے، یہ نہیں ہوسکتا۔ اس وقت اس نے جو جملے کہے وہ یہ تھے:"إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ، وَتَقْرِي الضَّيْفَ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ"(صحیح البخاری، الطبعۃ الھندیۃ/ حدیث نمبر ۲۲۹۷، ۳۹۰۵) آپ صلہ رحمی کرنے والے ہیں، جو نہیں کماسکتا اُس کو کماکر دینے والے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے والے ہیں، اور مصیبت کے موقعہ پر لوگوں کی مدد کرنے والے ہیں ۔اس شخص نے یہ سارے اوصاف حضرت ابو بکر(رضی اللہ عنہ) کے گنوائے۔ اور ہو بہو یہی سارے اوصاف نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے تھے۔جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر پہلی وحی آئی اور آپ غار حِرا سے واپس مکان پر تشریف لائے، چوں کہ پہلی وحی تھی، اس سے پہلے کبھی فرشتے سے ملاقات کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لئے آپ سہم گئے تھے کہ

پتہ نہیں اب کیا ہوگا، اور آپ کو اپنی جان کے متعلق خطرہ لاحق ہوا، تو حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہا) سے سارے حالات بیان کرنے کے بعد عرض کیا: "اِنِّیْ خَشِیْتُ عَلٰی نَفْسِیْ" مجھے اپنی جان کا خطرہ معلوم ہوتا ہے۔ تو حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نے کہا: "كَلَّا! وَاللّٰهِ لَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا" اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ آپ کو رسوا نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، مہمانوں کی میز بانی کرتے ہیں، جو کمانے کے قابل نہیں اُس کو کما کر دیتے ہیں، مصائب کے موقعہ پر لوگوں کی مدد کرتے ہیں (صحیح البخاری، الطبعۃ الھندیۃ/ حدیث نمبر ۳، اور ۴۹۵۳، اور ۶۹۸۲)

حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) نے جو اوصاف حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس موقعہ پر بیان کئے تھے، ہُو بہُو یہی اوصاف ابن دَغِنَہ نے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے بیان کئے تھے۔ اور پھر کہا تھا کہ میں تمہاری ذمہ داری لیتا ہوں، تم مکہ چھوڑ کر مت جاؤ۔

ایک وقت میں ایک ہی محبت

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو ایسا یکسانیت کا تعلق تھا، اس کے باوجود نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اگر اللہ کے علاوہ کسی اور کو حقیقی معنیٰ میں دوست بنایا جاتا، اور اُس کی محبت دل میں رکھی جاتی تو میں ابو بکر کی محبت دل میں رکھتا، لیکن ان کی بھی محبت دل میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی محبت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی دل میں آنی ہی نہیں چاہیے۔ مؤمن کے دل میں حقیقی محبت اللہ تعالیٰ ہی کی ہوگی۔ باقی جتنے بھی تعلقات ہیں وہ سب اس کے حکم کی

وجہ سے ہیں۔اسی لیے جہاں کہیں بھی کوئی ایسی بات آئے جو اللہ کی محبت میں آڑ بننے والی ہو، تو اُس تعلق کو ختم کرنا چاہیے۔اسی لئے شریعت نے قاعدہ بتایا ہے کہ جس کام میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو، اس میں کسی کی بات مانی نہیں جائے گی ، چاہے سامنے کوئی بھی ہو، ماں ہو، باپ ہو، بیوی ہو، بیٹا ہو ،یا اور کوئی ہو۔اللہ تعالیٰ کی نافرمانی والی چیزوں میں کسی کی بات نہیں مانی جائے گی۔

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں

تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کی محبت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔جس دل میں دنیا کی محبت ہوگی اُس دل میں اللہ کی محبت نہیں آسکتی۔یہ سیدھی سادی بات ہے۔ مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں :-

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں این خیال ست و محال ست و جنوں

تم اللہ تعالیٰ کے بھی طلبگار ہو اور کمینی دنیا کے بھی طلبگار ہو، اُس کے بھی خواہش مند ہو؟ یہ دونوں باتیں جمع نہیں ہوسکتیں ،یہ خواب وخیال اور محال چیز ہے؛ بلکہ یہ تو پاگل پن ہے۔یا یہ ہوگا یا وہ ہوگا۔جس دل میں دنیا کی محبت ہوگی اس میں اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں آئے گی، اور جس دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت آئے گی اس میں دنیا کی محبت ہو ہی نہیں سکتی

ضرورت اور محبت

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولوی صاحب !آپ تو اتنی ساری باتیں کرتے ہیں، لیکن ہمیں رہنا تو دنیا ہی میں ہے۔ بھوکے ہوں گے تو کھانا کھائیں گے، پیاس لگے گی تو پانی پینا ہی پڑے گا، رہنے کے لئے مکان کی ضرورت ہوتی ہی ہے، پہننے کے لئے کپڑے کی ضرورت ہے، اگر دنیا کو ساتھ میں نہیں رکھیں گے تو یہ سب ضرورتیں آخر کہاں سے پوری کریں گے؟

تو بھائی دیکھو !یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ آپ اپنی ضرورتیں پوری نہ کیجئے۔ بھوک لگے تو آپ کھانا کھایئے، بلکہ کھانا نہیں کھاؤ گے، اور ویسے ہی مر جاؤ گے تو گنہگار ہو گے، اگر بھوک لگی اور آدمی کے پاس کھانا ہے اور نہیں کھاتا یہاں تک کہ بھوک کی وجہ سے مر گیا تو گنہگار مرا، یہ تو ایک طرح کی خود کشی ہو گی، اُس نے حرام کام کیا، شریعت نے اس کا حکم نہیں دیا۔ شریعت تو یہ حکم دیتی ہے کہ اپنی جان بچاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض ہم پر عائد کئے ہیں، اُن کی ادائیگی کے قابل رہو، اتنا کھاؤ کہ طاقت حاصل ہو۔ تو کھانے کا حکم دیا، پینے کا حکم دیا، لباس کو ضروری قرار دیا۔ بلکہ نماز میں خاص مقدار لباس کی ایسی ہے جس کو پہننا ضروری ہوتا ہے، اس کے بغیر نماز ہی درست نہیں ہوتی۔ تو لباس کا حکم دیا، بلکہ قرآن کریم میں لباس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کے طور پر بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو زینت اور حفاظت کا سبب بنایا۔

تو اللہ تعالیٰ نے دنیامیں ساری چیزیں ہماری ضرورت کے لئے بنائی ہیں ، اس لئے ان کاحاصل کرنا، کمانااور اس کے ذریعہ سے اپنی ضرورتیں پوری کرنا منع نہیں ہے۔اصل تو یہ کہا جارہاہے کہ اُس کی محبت دل میں نہ رکھو۔ضرورت پوری کرنا الگ چیز ہے، اور دل میں اُس کی محبت رکھنا الگ چیز ہے۔

دنیااوردل؛پانی اور کشتی

کوئی کہے کہ دن میں چوبیس گھنٹے اس سے پالاپڑتا ہے،اس کے بغیر تو زندہ ہی نہیں رہ سکتے،تواُس کی محبت دل میں کیسے نہیں ہوگی؟تومولاناروم (رحمۃ اللہ علیہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے،انہوں نے بہت اچھی مثال دی ہے کہ دیکھو!کشتی پانی کے بغیرچل ہی نہیں سکتی، کشتی کا چلنا پانی پرموقوف ہے ،اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے نیچے پانی ہونا چاہیے، اگرپانی نہیں ہوگا توکشتی چل نہیں سکتی۔لیکن پانی باہر باہرہی ہونا چاہیے،اگرسوراخ ہوگیااورپانی اندر آگیاتوکشتی ہلاک ہوجائے گی۔اسی طریقہ سے دنیا کے بغیرہم زندہ نہیں رہیں گے، لیکن دنیا باہر باہرہونی چاہیے، دل کے اندر نہیں چاہیے، اگر دل کے اندرہم اس کوجگہ دیں گے ،تو یہی دنیاہم کو ہلاک وبرباد کرکے رکھ دے گی۔جب آدمی اُس کی محبت دل میں نہیں رکھے گا،بلکہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت رہے گی تو دنیاکوحاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کوکبھی نہیں توڑے گا،بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی کمائے گا،

اوراس کے حکم کے مطابق ہی خرچ کرے گا، دنیاکی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ایک چھوٹے سے حکم کو بھی توڑنے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

آج کل ہم جوحیلے بہانے ڈھونڈتے رہتے ہیں ناکہ مولوی صاحب! اس کا کوئی راستہ بناچاہیے،یہ پریشانی اوردشواری ہے،اُس کے بغیرچلتاہی نہیں ،بیمہ توکرانا ہی پڑے گا۔ تو میں سوال کرتاہوں کہ کیابیمہ کرانے سے دکان بچ جائے گی؟اگرجلنے والی ہے تووہ جل کرہی رہے گی۔درحقیقت دل میں ایسے سوالات جوپیدا ہوتے ہیں ، اس کی وجہ دنیا کی محبت ہی ہے ،اگراللہ تعالیٰ کی محبت ہوتی تو آدمی کے لیے ساری چیزیں آسان ہو جاتیں، اللہ تعالیٰ تھوڑی دیر کے لیے آزماتے ہیں۔

محمودوایاز

حضرت محمود غزنوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایازنامی ایک غلام تھا، اُس سے اُن کو بڑی محبت تھی، اورلوگ کہتے تھے کہ ایک ادنیٰ غلام ہے اور اس کے ساتھ محمود غزنوی اتنی محبت کا معاملہ کرتے ہیں۔ایک مرتبہ ان کے پاس کہیں سے ایک بڑاقیمتی موتی آیا، دربار سجا ہوا تھا،انہوں نے وزیراعظم صاحب سے کہاکہ یہ موتی توڑدو۔وہ نہیں سمجھا کہ بادشاہ امتحان لے رہے ہیں،اس لیےوزیراعظم نے کہاکہ حضرت! یہ کیسے توڑدوں ،اتنا قیمتی موتی ہے، اس نے نہیں توڑا۔دوسرے سے کہا، تیسرے سے کہا لیکن کسی نے نہیں توڑا ، آخر میں انہوں نے ایازسے کہاکہ اس کو توڑدو۔اس نے ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کی اور

زور سے نیچے دے مارا اور توڑ ڈالا۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے کہ کتنا قیمتی موتی تھا، تم نے توڑ دیا؟ تو اُس نے کہا کہ ہاں! مجھ سے غلطی ہوگئی، لیکن اگر میں اس کو نہ توڑتا تو بادشاہ سلامت کا حکم ٹوٹتا، اور ان کا حکم اس موتی سے بھی زیادہ قیمتی ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ بھلے ہی یہ موتی بڑا قیمتی کیوں نہ ہو، اور ساری دنیا اسے قیمتی سمجھتی ہو، لیکن اس سے زیادہ قیمتی تو بادشاہ کا حکم ہے جسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے مجھے اسے توڑنا پڑا۔ اُس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا کہ محمود کو اس کے ساتھ جو محبت ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی محبت دل میں ہو، دنیا کی محبت سے دل خالی ہو۔ آج ہمارے لئے قدم قدم پر جورکاوٹیں کھڑی ہیں اُس کی بنیاد یہی ہے۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے لیے یہی ساری چیزیں آسان تھیں۔

یہ دل میں اُتارنے کی چیز نہیں

اور دیکھو! دنیا ضروری تو ہے لیکن اس کی محبت دل میں نہیں ہونی چاہیے، بعض لوگوں نے اس کی ایک اور مثال دی ہے۔ جیسے کسی نے شاندار قسم کا کوئی بنگلہ بنایا، اُس میں بیڈ روم بنایا، ڈرائنگ روم اور سٹنگ روم بنایا، لیکن بیت الخلاء نہیں بنایا۔ اس نے یوں سوچا کہ بدبودار چیز کو ایسے اعلیٰ بنگلے میں کیا بنانا۔ تو ظاہر ہے کہ جو بھی آئے گا وہ کہے گا کہ چاہے سب کچھ ہے، لیکن بیت الخلاء نہیں ہے، تو یہ بنگلہ ادھورا ہے۔ کسی بنگلے کے مکمل ہونے کے لئے بیت الخلاء ضروری ہے۔ وہ نہیں ہوگا تو یہ بنگلہ ناقص ہے ایک مکمل گھر کے لئے

بیت الخلاء لازمی اور ضروری چیز ہے؛ لیکن کیا کوئی آدمی اپنے دل میں بیت الخلاء کی محبت لیے پھرتا ہے کہ میں کب اپنے کام کاج سے فارغ ہوؤں اور وہاں جاکر آرام سے بیٹھوں؟ نہیں! بلکہ وہ ایک ضرورت کی چیز ہے، جس کے بغیر مکان مکمل نہیں ہوسکتا، اُس کے باوجود اُس کی محبت ذرہ برابر بھی دل میں نہیں ہوتی اور کبھی اُس کا خیال بھی نہیں آتا۔ اسی طرح دنیا کا حال بھی ہے کہ دنیا ایک ضروری چیز ہے، لیکن ایسی ہی ہے جیسا کہ بیت الخلاء ضروری ہوتا ہے کہ اُس کے بغیر آدمی زندگی نہیں گذار سکتا اور مکان بھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دنیا کی یہ ساری چیزیں زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہیں ، لیکن دل میں اُتارنے کی چیز نہیں ہے، اس کی محبت ہی ساری رکاوٹ کی بنیاد ہے۔

چوٹ کر گیا

حضرت فرید الدین عطار (رحمۃ اللہ علیہ) بڑے بزرگ گذرے ہیں ، ان کی فارسی زبان میں ”پندنامہ“ ایک کتاب ہے جو ہمارے مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ پہلے وہ تاجر اور دنیادار آدمی تھے، دوافروش تھے، یونانی دوا کی بہت بڑی دوکان تھی اور خوشبوئیں بھی رکھتے تھے، اسی لئے عطار کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ دوکان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک درویش صفت آدمی آیا اور ایک شیشی اُٹھائی اس کو دیکھا، دوسری شیشی اُٹھائی اس کو دیکھا، تیسری شیشی اُٹھائی اس میں کچھ دیکھا، یہ ڈبیہ اٹھائی، وہ ڈبہ اُٹھایا۔ انہوں نے کہا: کیا بات ہے ، کیا کچھ خریدنا ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ انہوں نے کہا: جب کچھ خریدنا نہیں چاہتے تو یہ سب اُٹھا

اُٹھاکر کیا دیکھ رہے ہو؟ اُس نے کہا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم نے اتنی ساری شیشیاں جمع کر رکھی ہیں، تمہاری روح کیسے نکلے گی؟ وہ تو ایک شیشی میں سے نکلے گی، دوسری شیشی میں پھنسے گی، دوسری سے تیسری میں جائے گی۔انہوں نے کہا: جیسے تیری نکلے گی ویسے میری نکلے گی۔اس نے کہاکہ دیکھو میری تو اس طرح نکلے گی۔اورایک کونے میں جاکرلیٹا،لا الٰہ الا اللہ کہا اور مر گیا۔

اللہ تعالیٰ کبھی اپنے کسی بندہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو ایسے غیبی لطیفے ظاہر کردیتاہے۔ان کے لیے بھی اللہ کے قرب اوراس کی رضامندی کے حصول کاوقت آگیا تھا۔بس!یہ واقعہ اُن کے دل پرچوٹ کر گیااور تجارت چھوڑکراللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوگئے اور مقبولین میں شامل ہوئے۔

دل پر چوٹ لگ گئی

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جی انہی چیزوں میں اٹکے ہوئے رہتے ہیں تو موت کے وقت یہی چیزیں سامنے آجاتی ہیں۔ حضرت ابراہیم بن ادہم (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں،پہلے وہ حاکم تھے،ان کی بڑی سلطنت تھی،اللہ تعالیٰ کوجب اُن کو اپنی طرف متوجہ کرنامنظور ہواتو ایک مرتبہ ایسا ہواکہ وہ اپنے محل میں اپنی اہلیہ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے،اتنے میں سناکہ محل کی چھت کے اوپرسے کسی کے چلنے کی آواز آرہی ہے۔سوچنے لگے کہ ابھی اس وقت محل کی چھت کے اوپر کون ہوگا؟کوئی چور آگیا ہوگا۔سنتریوں سے

کہا کہ دیکھو کون ہے۔اس کو پکڑ کر دربار میں پیش کیا گیا۔پوچھا: کون ہو، اور اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ اُس نے کہا: میرا اونٹ گم ہو گیا ہے، میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔انہوں نے کہا: پاگل آدمی ہو، کہیں اونٹ شاہی محل کی چھت پر تلاش کیا کرتے ہیں ؟ اگر تلاش ہی کرنا ہے تو جنگل اور صحراء کے اندر جاؤ، وہاں تمہارا اونٹ ملے گا،شاہی محل کی چھت کے اوپر اونٹ تلاش کرنا تو پاگل پن اور بڑی حماقت کی بات ہے اُس نے کہا: جس طرح شاہی محل کی چھت پر اونٹ کا تلاش کرنا حماقت ہے ،اسی طرح محل میں بیٹھ کر اللہ کو ڈھونڈنا بھی بڑی حماقت ہے۔بس! یہ سن کر دل پر چوٹ لگ گئی، سب سلطنت چھوڑ دی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

زُہد کی اہمیت

تو یہی زہد کی حقیقت ہے اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے،بلکہ ساری خوبیوں اور باطنی اوصاف کی جڑ یہی ہے۔اسی لئے آپ نے فضائلِ صدقات کے دوسرے حصہ میں پڑھا اور سنا ہو گا کہ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے زہد کی فضیلت کے لیے بڑے اہتمام سے مستقل ایک فصل قائم کی ہے اور اس میں زاہدوں کے قصے بتائے ہیں۔آپ قرآن اور حدیث میں اور بزرگوں کے کلام میں بھی جگہ جگہ دیکھیں گے تو یہی ملے گا کہ یہ دنیا فانی اور ختم ہونے والی چیز ہے،اور بہت تاکید کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا ہے۔ جتنی بھی برائیاں ہیں جیسے

حسد، کینہ، بغض، لڑائی جھگڑے ؛یہ ساری برائیاں اسی دنیا کی محبت کی وجہ سے آتی ہیں، اسی کی خاطر سب کچھ ہوتا ہے،اس لئے اس کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔

یہاں باب قائم کیا ہے ”زہد فی الدنیا“ اوربہت ساری آیات پیش کی ہیں۔ دنیاسے بے رغبتی کی فضیلت،اور دنیا کو کم سے کم اختیار کرنے کی ترغیب۔یعنی آدمی کو اپنی ضرورتیں توپوری کرنی ہی ہیں، لیکن کوشش یہ کرے کہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے میں جتناکم سے کم ہوسکتا ہے اسی پر اکتفاء کرے،دنیاکوزیادہ حاصل نہ کرے۔اگر زیادہ حاصل کرے گاتواس کا نتیجہ یہ ہوگاکہ آدمی کی حاجتیں اورخواہشات بڑھتی جائیں گی ، پھر اس کی محبت بھی بڑھتی جائے اورقیمت بھی ادا کرنی پڑے گی۔

چارملکوں کے گورنرکامکان

حضرت ابو عبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) عشرہ مبشرہ میں سے ہیں،اور رومیوں کے ساتھ جو آخری معرکہ ہوا،جس میں اسلام کوغلبہ ہوا،اس کے سپہ سالارہی تھے۔حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نےان کودمشق اورشام کاگورنر بنایا تھا۔ایک مرتبہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ)شام تشریف لے گئے، اُس زمانہ میں شام آج کے شام جتنا نہیں تھا،بلکہ فلسطین، شام ،جورڈن اور لبنان؛یہ کل چارملک مل کراس زمانہ کا شام کہلاتا تھا۔اس کے گورنرحضرت ابوعبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) تھے۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی عادت یہ تھی کہ کسی کوجب کسی علاقے کا حاکم بناتے تھے، تواس کاجائزہ بھی لیتے رہتے تھے،اس کے حالات کی اطلاع لیتے تھے کہ حاکم بننے کی وجہ

سے اس میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی، کہیں دنیا کی محبت میں مشغول تو نہیں ہوگیا تو ایک مرتبہ خود شام تشریف لے گئے، حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) ان کے استقبال کے لیے آئے، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ میں ذرا آپ کا مکان دیکھنا چاہتا ہوں۔انہوں نے کہا: کیوں دیکھو گے، آنسو بہانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: نہیں! مجھے دیکھنا ہے۔کہا: چلیئے۔جب دمشق کی پوری آبادی سے گذر کر باہر نکلے تو دیکھا کہ کھجور کی ٹہنیوں سے بناہوا ایک جھونپڑا ہے۔جب اندر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک مصلیٰ بچھاہوا تھا۔یہ دیکھ کر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا: تمہارے پاس صرف یہ مصلیٰ ہی ہے، کوئی بستر بھی نہیں؟ اور کھانے کے لئے کوئی برتن بھی نہیں؟ انہوں نے کہا: یہ مصلیٰ جائے نماز کا بھی کام دیتاہے، اور یہی میرا بستر بھی ہے، اسی پر سوتا ہوں۔اور جھونپڑے کی چھت میں سے لکڑی کا ایک پیالہ نکالا اور کہا یہ میرا پیالہ ہے، اسی سے پیتا ہوں ، اسی میں کھاتاہوں، اس کے علاوہ اور کوئی سامان نہیں ہے۔یہ دیکھ کر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) رونے لگے اور کہا: سب نے اپنی حالت میں تبدیلی کرلی، لیکن اللہ تعالیٰ تم کو جزائے خیر دے کہ تم اسی حالت پر ہو جس پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چھوڑا تھا۔(سیر اعلام النبلاء)

فقر کا مطلب

اس باب میں فقر کی فضیلت بھی بیان کی ہے۔فقر کا مطلب کیاہے ؟فقر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے دل میں دنیا کی رغبت نہ رکھے۔بزرگوں نے لکھاہے کہ ایک آدمی کے

پاس ظاہری اعتبار سے مال و دولت نہیں ہے لیکن دل دنیا کی محبت سے بھرا ہوا ہے تو اس سے زیادہ محروم کون کہا جاسکتا ہے کہ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ دنیوی اعتبار سے بھی مال ودولت نہیں ہے اور دل میں دنیا کی محبت بھری ہوئی ہے، تو آخرت سے بھی محروم رہا۔ اوردوسرا آدمی ایسا ہے جس کے پاس بہت دولت ہے، لیکن اس کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہے، دنیاکی رغبت اس کے دل میں نہیں ہے، توکوئی حرج کی بات نہیں، یہ مال و دولت اس کے لئے مضر نہیں۔

دنیوی زندگی کی مثال

باری تعالیٰ کاارشاد پیش کیاہے: ﴿إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتَّىٰ إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُونَ عَلَيْهَا أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنَاهَا حَصِيدًا كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ ۚ كَذَٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾ دنیوی زندگی کی مثال بارش کے اس پانی کی ہے جو ہم نے آسمان سے اتارا، اس کے ساتھ زمین کا سبزہ باہر نکل آیا (بارش کا پانی جب برستا ہے توزمین پر سبزہ نکل آتا ہے، اوریہی جانوروں اور انسانوں کے کھانے کی مختلف چیزیں ہیں) یہاں تک کہ جب زمین نے اپنی رونق حاصل کرلی اور وہ مزین ہوگئ (یعنی اس سبزہ کی وجہ سے بڑی خوبصورت نظر آنے لگی) اور جن لوگوں نے یہ کھیتی باڑی بوئی تھی وہ یوں سمجھنے لگے کہ اب تو یہ بالکل تیار ہے اور ہم اس کو اپنے قابو میں لے چکے (باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) اسی درمیان ہمارا

حکم آپہنچا (کوئی آسمانی آفت) دن میں یارات میں (آگئی، یا گرم ہوا چلی، یابرف پڑی)توہم نے اس کو چوراچورا کرکے بالکل ایسا کردیا کہ گویا کل یہاں کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ہم اسی طرح نشانیوں کو واضح کرکے پیش کرتے ہیں تاکہ لوگ سوچیں اور غوروفکر کریں۔

آدمی دنیا میں محنت اور کوشش کرتاہے،بنگلے کھڑے کئے، کاریں اور فیکٹریاں بنائیں، سب لوگ سمجھتے ہیں کہ ایک بہت بڑاسامراج قائم کیا ہے،لیکن ادھر آنکھ بند ہوئی کہ سارا معاملہ ختم ہوجاتاہے۔کہاں گیا؟ ایک دم سے سب کچھ غائب ہوجاتاہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ توزندہ رہتا ہے اور یہ سب ختم ہوجاتا ہے۔

کہنے کاحاصل یہ ہے کہ دنیاباقی رہنے والی چیز نہیں ہے،پھرکیوں آدمی اپنی صلاحیت اورقوت اس کے اندربرباد کرے۔آدمی کوچاہیے کہ ضرورت جتناحاصل کرنے کے بعد اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو آخرت کے لئے استعمال کرے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۸/شوال المکرم ۱۴۲۰ھ ۵/فروری ۲۰۰۰ء

دنیا سے بے رغبتی کا عنوان چل رہا تھا کہ آدمی اپنے دل میں دنیا کی محبت نہ رکھے، اس لیے کہ ساری خرابیوں کی جڑ یہی ہے۔اس سلسلہ میں انہوں نے بہت ساری آیتیں پیش کی ہیں۔ایک آیت گذشتہ مجلس میں ہوچکی تھی۔

باقیات صالحات

آج دوسری آیت پیش کی ہے جس میں دنیوی زندگی کتنی قلیل ہے،اس کو بتلاتے ہیں ﴿وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللّٰهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا. الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا. (کھف: ۴۵۔۴۶)﴾ اے نبی!آپ اُن کے سامنے دنیوی زندگی کی مثال پیش کیجئے :اُس پانی کی طرح جس کو ہم نے آسمان سے اُتارا(یعنی بارش)پھراس کے ساتھ زمین کا سبزہ نکل آیا (بارش جب برستی ہے تو کھیتی اوردوسری سر سبز چیزیں بارش کی وجہ سے اُگ آتی ہیں اوروہ آدمی کو بہت اچھی اور بھلی بھی لگتی ہے،بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کتنے دنوں کے واسطے،چند دنوں کے بعد)پھروہی سبزہ(جو نکلا تھا)سوکھ جاتا اور چورا چورا ہوجاتا ہے، اور ہوائیں اس کو اُڑا کرلے جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ ہرچیز پر قادر ہے

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ یہ مال واولاد دنیوی زندگی کی زیب و زینت ہے، اور باقی رہنے والے نیک اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کے اعتبار سے بھی بہت بہتر ہیں اور امید رکھنے کے اعتبار سے بھی یہی بہتر ہیں۔آئندہ ذخیرہ رکھنے کے اعتبار سے بھی زیادہ بہتر ہیں ، آئندہ اس سے امید رکھی جاسکتی ہے۔دنیا کا مال و اسباب آدمی کتنا ہی جمع کر لے لیکن بہر حال ایک دن وہ چھوٹنے والا ہے۔

یہ مثال دے کر بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ سب دنیوی زندگی کی ظاہری چمک دمک اور زیب وزینت ہے،اُس کی وجہ سے آدمی کو اس کی طرف مائل ہوکر آخرت کو نقصان پہنچانے کی ضرورت نہیں۔یہ جو کچھ بھی نظر آرہاہے ،سب چندروزہ ہے۔یا دنیا میں موت سے پہلے ہی ہاتھوں سے نکل جائے گا ،یا اگر یہاں باقی رہا تو مرنے کے بعد خودہی اس کو چھوڑکر جانا ہے۔ہمیشہ باقی رہنے والی چیز نہیں ہے۔باقی رہنے والے تونیک اعمال ہیں جو آدمی کرتا ہے۔

حدیث پاک میں ”باقیات الصالحات “کی تشریح میں یہ بھی آیا ہے کہ اللہ کے ذکر کے طورپڑھی جانے والی تسبیحات -سبحان اللہ ،الحمداللہ،اللہ اکبر لاالٰہ الا اللہ ولاحول ولا قوۃ الاباللہ-کاثواب ہمیشہ باقی رہنے والا ہے(موطامالک ۷۱۵)اور دوسرے جتنے بھی نیک اعمال ہیں وہ سب باقیات الصالحات ہیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بڑا اجر ملے گا۔اس لیے جس سے آدمی امید اور آس لگائے وہ یہی چیزیں ہیں۔باری تعالیٰ بھی فرماتے ہیں کہ اُمید

لگانے کی چیزیں تو یہی ہیں ۔پیسہ تو ختم ہوجائے گالیکن نیک اعمال جو ہم کریں گے، وہی آخرت میں کام آئیں گے ،انھی سے کام بنے گا۔

لہوولعب

ایک اورآیت میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿اعْلَمُوا أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَزِينَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ ثُمَّ يَهِيجُ فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُونُ حُطَامًا وَفِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ. (الحدید:۲۰)﴾

جان لو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشہ ہے۔

چھوٹے چھوٹے بچے جو کھیل کھیلتے ہیں،جن کا کوئی مقصداورکوئی فائدہ نہیں ہوتا؛ایسی چیز کو”لَعِبٌ“سے تعبیر کیاجاتاہے۔اور آدمی غم وفکرسے اپنے آپ کو نجات دلانے، طبیعت میں چستی پیداکرنے اورطبیعت کو بہلانے کے لیےجوکوئی مشغلہ اختیار کرے: اس کو ”لَهْوٌ“سے تعبیر کیاجاتاہے۔اس میں ذرا مقصد توہوتا ہے ، لیکن یہ بھی وقت گزاری کی ہی ایک چیزہے۔تو دُنیوی زندگی کو لعب و لہو سے تعبیر کیا ہے۔

بچہ جب ایک دم چھوٹاہوتاہے،اس وقت جوکچھ کھیل کیاکرتاہے؛اس کو ”لعب“ سے تعبیر کیاجاتاہے،اور کچھ بڑا ہوکر اپنے آپ کو بہلانے کے لئے جو کچھ کھیلا کرتا ہے؛ اس کو” لہو“ سے تعبیر کیا جاتاہے۔

﴿وَزِیْنَةٌ وَتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ﴾ اور (دنیوی زندگی) زینت اور آپس میں ایک دوسرے سے فخر کرنا ہے۔ آدمی جب جوان ہوتا ہے تو عام طور پر اس کی طبیعت میں یہ ہوتا ہے کہ میں اچھا لباس پہنوں، اچھی سواری، اچھی کار، اچھا اسکوٹر استعمال کروں، اور میرا عمدہ مکان ہو۔ اور پھر ان چیزوں میں آپس میں فخر کرتا ہے کہ میرا لباس تمہارے لباس سے، میری کار تمہاری کار سے، میری سواری تمہاری سواری سے اچھی ہے، میرا مکان تمہارے مکان سے عمدہ ہے۔

زندگی میں تین مرحلے

آدمی کی زندگی میں تین مرحلے آتے ہیں۔ بچپن، جوانی اور بوڑھاپا۔ بچپن میں عام طور پر کھیل کود میں آدمی کا وقت گزرتا ہے، جس کو ''لعب ولہو'' سے تعبیر کیا گیا۔ اور جوان ہونے کے بعد '' زینت و تفاخر'' میں مشغول ہوتا ہے یعنی ایسی چیزوں میں جو آدمی کی زینت کا باعث ہوتی ہیں، اور اسی پر آپس میں فخر کرتا ہے۔ اور جب عمر بڑی ہو جاتی ہے، بڑھاپا آتا ہے تو پھر ''تکاثر فی الاموال والاولاد'' یعنی مال واولاد کی زیادتی میں آپس میں ایک دوسرے پر فخر کیا جاتا ہے، اب یہ چیز دیکھی جاتی ہے کہ میرے پاس اتنا مال ہے، میری اتنی اولاد ہے۔ گویا دنیوی زندگی کے یہ تین دور ہیں جن کے اندر عام طور پر آدمی کی جو مرغوبات ہوتی ہیں ان کو اس آیت میں بیان کر دیا ہے۔

آگے باری تعالیٰ فرماتے ہیں: دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہے جیسے بارش برسی اس سے جو کچھ بھی سبزہ وغیرہ ہوا، اس کو دیکھ کر کسان بہت خوش ہوتے ہیں، پھر اس میں کچھ نکھار اور رونق پیدا ہوتی ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد وہی رونق پیلی پڑ جاتی ہے، اور کچھ دنوں کے بعد چورا چورا ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ گویا کھیتی کا پورا پروسجر (procedure) ہے کہ دو تین چار مہینے میں معاملہ نمٹ جاتا ہے، کھیتی آدمی کو بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ چند روزہ ہے۔

بہر حال! اللہ تعالیٰ یہ بتلاتے ہیں کہ دنیوی زندگی کا بھی یہی حال ہے، آدمی کتنا ہی مال و دولت جمع کر لے، کتنی ہی چیزیں اپنے لیے حاصل کر لے اور بسا لے، چند دنوں کا معاملہ ہے۔ اس میں اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے تو پھر آخرت میں بڑا سخت عذاب ہے، اور اگر یہاں اطاعت اور فرمانبرداری کرر کھی تھی تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت بخشش اور خوشنودی عطا کی جائے گی۔ دنیا میں دو حال سے خالی نہیں، یا تو اللہ کو ناراض کرنے والے کام کئے ہیں تو سخت عذاب سے واسطہ پڑے گا، اور اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوگی، اور پھر کوئی کوتاہی ہوئی ہوگی تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے۔

رقیم، متاع اور تبارک

اور دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔ "متاع" اس چیز کو کہتے ہیں جس سے آدمی اپنی وقتی ضرورت پوری کر لیا کرے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) ایک واقعہ بیان

کرتے تھے۔صاحب بن عباد جو لغت کے امام ہیں اور مؤرخ بھی ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھے قرآنِ پاک کے تین لفظوں کی تحقیق مطلوب تھی،ایک تو لفظ "رَقِيْمٌ" جو سورۂ کہف میں ہے۔دوسرا لفظ "تَبَارَكَ"،جو سورۂ فرقان اور سورۂ ملک میں ہے اور تیسرا لفظ "مَتَاعٌ"۔ اوران کی عادت تھی کہ وہ دیہاتوں اوراعراب کے علاقوں میں پہنچ جاتے جہاں خالص عربی زبان بولی جاتی تھی اوران کی زبان سنتے تھے۔وہ کہتے ہیں کہ مَیں ایک جگہ پہنچا تو دیکھا کہ گھروالے نہیں ہیں اورایک بچہ بیٹھاہواہے اتنے میں ایک کتا آیااوروہ کپڑا جو چولہے پر ہنڈیاوغیرہ پکڑنے کے لیے استعمال کیاجاتا ہے،اس کو اپنے منھ میں اٹھا کر چلاگیااور قریب ہی پہاڑ کی چوٹی تھی اس پر جاکرپاؤں پھیلاکراچھی طرح سے براجمان ہوکر بیٹھ گیا۔جب گھر والے آئے تو اس بچے نے سارا منظرجو دیکھا تھاوہ اس طرح بیان کیا: "جَآءَ الرَّقِيْمُ وَأَخَذَالْمَتَاعَ وَتَبَارَكَ الْجَبَلَ"،رقیم یعنی کتا آیا اورمتاع یعنی وہی کپڑا(صافی،جو قیمتی نہیں ہواکرتالیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا) اُٹھایااور پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ کرپاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا(تفسیر حقی۔۷/۳۲۲) بتلانا یہ ہے کہ اس کپڑے کی کوئی قیمت نہیں ، لیکن کوئی کچن اورباورچی خانہ اس سے خالی بھی نہیں،اس لئے کہ اس کے بغیر کام بھی نہیں چلتا ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ ضرورت کی چیز ہے، لیکن اس کی کوئی حیثیت اورقیمت نہیں ہے،اس لئے اس میں آدمی کو دل نہیں لگانا چاہیے۔اگر اس

کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام توڑے،اور اللہ تعالیٰ سے اپنا جیسارشتہ قائم کرنا چاہیے وہ نہ کرے ؛تویہ تواورزیادہ خطرناک بات ہے۔

استعمال کا سامان

آگے ایک اور آیت پیش کی﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ.ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ . (آل عمران :۱۴)﴾لوگوں کے لیے چیزوں کی محبت مزین کردی گئی(یعنی اللہ تعالیٰ نے قدرتی اور فطری طور پر انسان کے دل کے اندر ان چیزوں کو مرغوب بنایا ہے۔ یعنی)عورتیں ، لڑکے،سونے اورچاندی کے سجائے ہوڈھیر،نشان لگے ہوئے گھوڑے،جانور اورکھیتی(یہ ساری چیزیں ایسی ہیں کہ قدرتی طور پر انسان کے دل میں ان کی محبت ہوتی ہے) جیسا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ)نے باری تعالیٰ سے عرض کیا: اے اللہ !انسان کے دل میں ان چیزوں کی تونے محبت ڈالی ہے، لیکن ہم اُس کو تیری رضا کے ساتھ حاصل کریں ، اور تیری رضا کے مطابق استعمال کریں ، اس کی ہمیں توفیق عطا فرما۔(بخاری شریف،۶۴۴۰)

توان چیزوں کی محبت فطری ہے،لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی کے استعمال کا سامان ،ضرورت اوربرتنے کی چیزہے ، اس سے زیادہ اورکچھ نہیں اوراچھا ٹھکانہ

تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ہے۔اس لئے آدمی کو چاہیے کہ اپنے لیے اچھا ٹھکانہ حاصل کرنے کی کوشش کرے، اور دنیوی زندگی کے دھوکہ میں نہ آئے۔

دنیا کی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے

اور ایک آیت پیش کی ہے:﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللَّهِ الْغَرُورُ.(فاطر:۵)﴾اے لوگو!اللہ کا وعدہ(کہ دنیا ختم ہوگی قیامت آنے والی ہے،اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہےاور اعمال کا جواب دینا ہے، یہ سب) ایک حقیقت ہے (یہ نہ سمجھنا کہ یہ سب ایسا ہی ہے ، بلکہ یہ سب ہونے والا ہے) اس لئے دنیا کی زندگی تم کو دھوکہ میں نہ ڈالے۔یعنی دنیا کی زندگی میں پڑکر یہ مت بھول جانا کہ دوبارہ پیدا ہونا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اپنے اعمال کا حساب کتاب ہوگا۔اور اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں تم کو شیطان دھوکہ میں نہ ڈال دے۔شیطان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ آدمی دنیا میں ایسا رچ بس جائے اور اس کے اندر ایسا مرکھپ جائے کہ آخرت کو فراموش ہی کردے۔اس لیے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو!شیطان کے دھوکے میں نہ آنا،اس کی کوشش تو یہی ہوگی کہ وہ تمہیں ایسی چیزوں میں مشغول کردے جو تمہارے لئے نقصان کا باعث ہو۔

اور مفسرین نے لکھا ہے کہ شیطان کا دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے کاموں میں ڈال کر یہ اُمید دلاتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو بہت معاف

کرنے والے ہیں۔جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہیں وہ یہی سمجھ کر کہ اللہ تعالیٰ غفوررحیم ہے۔لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی(باب المراقبہ ،جلد نمبر ۲ ،حدیث نمبر ۶۶ کے ذیل میں)بتلا چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی کاایک قاعدہ ہے، اس لیے شیطان کے اس دھوکہ میں آکر گناہوں اور نافرمانیوں میں نہ لگے،اور دنیا کی محبت کے پیش نظر آخرت سے غافل نہ ہوجائے۔

تم کو غفلت میں ڈال دیا

ایک اور آیت پیش کی ہے﴿أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ۔حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ۔كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ﴾مال و دولت کی زیادتی نے تم کو غفلت میں ڈال دیا (جب آدمی کے پاس مال و دولت آتا ہے، تواس کو زیادہ حاصل کرنے کی فکر میں اللہ تعالیٰ اورآخرت کی طرف سے غافل ہوجاتا ہے،اوریہ سلسلہ اس کی زندگی میں جاری رہتا ہے) یہاں تک کہ تم قبروں کی زیارت کرلوگے (یعنی موت تک آدمی اس میں لگارہتاہے کہ میں مال اور بڑھالوں،اس میں کسی نہ کسی طرح اضافہ کر لوں،اوراس میں وہ ایسا مشغول ہوجاتاہے کہ موت آجاتی ہے)ایسا نہ ہو،اور ہر گز ایسا نہیں ہونا چاہیے، تم کو معلوم ہوگااور پھر یقین کے ساتھ معلوم ہوگا۔(یعنی گویا وہاں جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہلاوا نہیں ہے، بلکہ حقیقت ہے کہ آخرت کا معاملہ پیش آنے والا ہے۔

آخرت کا گھر ہی ہمیشہ کی زندگی ہے

ایک اور آیت ہے﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔(العنکبوت:٦٤)﴾دنیا کی یہ زندگی ایک تماشہ اور کھیل ہے (کہ تھوڑی دیر کے لئے آدمی تماشہ دیکھتا ہے اور دل بہل جاتا ہے اور پھر تماشہ ختم ہوجاتا ہے، سب کچھ خواب و خیال کی طرح ایک چیز ہوجاتی ہے) اور آخرت کا گھر ہی ہمیشہ کی زندگی ہے، کاش کہ لوگ جانتے (لیکن عام طور پر لوگ اس سے غافل ہیں)

بہرحال! قرآنِ پاک میں بے شمار آیتیں ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے مختلف طریقوں سے انسانوں کو یہ بتلایاہے کہ دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، اورآخرت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس لئے آدمی کوچاہیے کہ آخرت کی تیاری کرے۔ دنیا بقدر ضرورت حاصل کرے اور اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی ایسا کام نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والاہو۔

آگے اس سلسلے میں روایتیں لاتے ہیں، ان سب کاحاصل یہ ہے کہ آدمی کو اپنے دل میں دنیا کی محبت نہیں رکھنی چاہیے۔

حضور کو اندیشہ

حدیث ۴۵۷

عن عمرو بن عوف الانصاری(رضی اللہ عنہ) :أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ(صلی اللہ علیہ وسلم)بَعَثَ أَبَا عُبَيْدَةَ بنَ الجَرَّاحِ إِلَى الْبَحْرَيْنِ يَأْتِي بِجِزْيَتِهَا. فَقَدِمَ بِمَالٍ مِنَ الْبَحْرَيْنِ، فَسَمِعَتِ الأنصَارُ بِقُدُومِ أَبِي عُبَيْدَةَ. فَوَافَوْا صَلَاةَ الْفَجْرِ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ(صلی اللہ علیہ وسلم). فَلَمَّا صَلَّى رَسُولُ اللّٰهِ(صلی اللہ علیہ وسلم)انْصَرَفَ، فَتَعَرَّضُوا لَهُ، فَتَبَسَّمَ رَسُولُ اللّٰهِ(صلی اللہ علیہ وسلم)حِينَ رَآهُمْ، ثُمَّ قَالَ: أَظُنُّكُمْ سَمِعْتُمْ أَنَّ أَبَا عُبَيْدَةَ قَدِمَ بِشَيْءٍ مِنَ الْبَحْرَيْنِ؟ فَقَالُوا: أَجَلْ، يَا رَسُولَ اللّٰهِ. فَقَالَ: أَبْشِرُوا وَأَمِّلُوا مَا يَسُرُّكُمْ فَوَاللّٰهِ مَا الْفَقْرَ أَخْشَى عَلَيْكُمْ، وَلٰكِنِّي أَخْشَى أَنْ تُبْسَطَ الدُّنْيَا عَلَيْكُمْ كَمَا بُسِطَتْ عَلَى مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَتَنَافَسُوهَا كَمَا تَنَافَسُوهَا، فَتُهْلِكَكُمْ كَمَا أَهْلَكَتْهُمْ. (متفق علیه)

ترجمہ:-حضرت عمرو بن عوف انصاری(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح(رضی اللہ عنہ) کو بحرین بھیجا تا کہ لوگوں کے اوپر جو جزیہ مقرر کیا گیا تھا وہ وصول کر کے لاویں۔ چناں چہ بحرین سے وہ جزیہ کے طور پر مال کی ایک بڑی مقدار لے کر آئے (کہتے ہیں کہ ایک لاکھ درہم لے کر آئے تھے اور اتنی بڑی رقم نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی، یہ پہلا موقع تھا کہ مال کی اتنی بڑی مقدار جزیہ کے طور پر آئی تھی۔ رات کے وقت وہ آئے تھے اور راتوں رات یہ بات مدینہ منورہ میں پھیل گئی کہ ابو عبیدہ بحرین سے جزیہ کی بڑی مقدار وصول کر کے لائے ہیں ، اور ظاہر ہے کہ یہ ساری رقم مسلمانوں میں تقسیم ہونے والی تھی، جب رات ہی مدینہ میں یہ بات پھیل گئی اور)انصار نے بھی سنا تو فجر کی نماز میں سب مسجد نبوی میں نبیؐ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آگئے۔ جب نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فجر کی نماز سے فارغ ہو کر واپس ہو رہے تھے تو

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اپنے آپ کو حضور کے سامنے پیش کرنے لگے، جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو دیکھا تو آپ مسکرائے، اورارشاد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگوں نے یہ بات سن لی کہ ابو عبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے ہیں۔ انہوں نے جواب میں کہا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! ایسا ہی ہے۔ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشادفرمایا: خوشخبری سن لو اور اپنے آپ کو اُمید دلاؤ اُس چیز کی جو خوش کرنے والی ہے، لیکن (ایک بات یادرکھو) اللہ کی قسم! مجھے تمہارے متعلق فقر کا اتنا اندیشہ نہیں ہے جتنا ڈر اوراندیشہ اس بات کا ہے کہ تمہارے اوپر دنیا پھیلادی جائے، جیسے تم سے پہلی اُمتوں کو دی گئی تھی، پھر تم اُس کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں اسی طرح ایک دوسرے کے مقابلہ پر اورایک دوسرے کی ریس میں آجاوٗ جیسے کہ وہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ پر آتے تھے۔ پھر یہ دنیا تم کو اُسی طرح ہلاک کردے جس طرح اُن کو ہلاک کیا تھا۔

افادات:- بحرین والوں کے ساتھ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صلح ہوئی تھی اور ان پر جزیہ مقرر کیا تھا، اسی کو وصول کرنے کے لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح (رضی اللہ عنہ) کو جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں بھیجا۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ مدینہ منورہ کے مختلف محلے تھے، اور عام طور پر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) فجر کے بعد اطمینان سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آتے تھے، اوروہ حضرات ظہر و عصر کی نماز میں آپ کے ساتھ شریک ہوتے تھے، عصر کی نماز کے بعد پھر اپنے اپنے محلوں میں چلے جاتے تھے اور مغرب، عشاء اور فجر وہیں ہوتی تھی۔ البتہ جو حضرات مسجد نبوی کے آس پاس آباد تھے وہ تمام نمازیں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ مسجد نبوی میں ادا کرتے

تھے۔لیکن اس روزوہ لوگ بھی-جواپنے محلوں میں فجر کی نماز پڑھنے کے عادی تھے-مسجد نبوی میں پہنچ گئے کہ فجر کے بعد مال تقسیم ہوگا،جب نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فجر کی نماز سے فارغ ہوکرواپس ہورہے تھے توصحابہُ کرام نے یہ سوچ کراپنے آپ کو حضور کے سامنے پیش کیا کہ ہمیں دیکھیں گے تو یاد آجائے گا۔جب نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو دیکھاتوآپ مسکرائے کہ روزانہ توفجر کی نماز اپنے اپنے محلوں میں پڑھتے ہیں ،اور آج یہاں آئے۔اصل بات آپ سمجھ گئے۔آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)نے مسکراکر ارشاد فرمایاکہ میرا خیال یہ ہے کہ تم لوگوں کو پتہ چل گیاہے کہ ابو عبیدہ بحرین سے مال لے کر آئے ہیں؟انہوں نے کہا:جی ہاں اے اللہ کے رسول!ایساہی ہے۔انہوں نے کوئی بات چھپائی نہیں۔ ہم لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے، اگرہماری بات پکڑی جائے توکہنے لگتے ہیں کہ نہیں حضرت!ایسا نہیں ہے، میں تو ویسے ہی آگیا تھا،یہاں آکر مجھے پتہ چلا۔لیکن انہوں نے سچی سچی بات بتلادی کہ ہاں اے اللہ کے رسول! ہمیں رات کو معلوم ہوا کہ ابو عبیدہ مال لے کر آئے ہیں ، اسی لئے آج فجر کی نماز میں ہم یہاں آگئے۔

فقر سے اتنانقصان نہیں پہنچتا

حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشادفرمایا:خوشخبری سن لو اور اپنے آپ کو اُمید دلاوٗ اُس چیز کی جوخوش کرنے والی ہے۔مطلب یہ ہے کہ تم جو اُمید لے کر آئے ہووہ پوری ہونے والی ہے،مَیں مال تقسیم کروں گا اور سب کو ملے گا اور تم جس مقصد کے لئے آئے ہو وہ

حاصل ہوجائے گا، لیکن ایک بات یاد رکھو، اللہ کی قسم! تمہارے متعلق مجھے فقر کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ یعنی اگر تم کو فقر و فاقہ آجائے، اُس کی وجہ سے مجھے اتنا ڈر نہیں، جتناڈر اور اندیشہ اس بات کا ہے کہ تمہارے اوپر دنیا پھیلا دی جائے، اور دُنیاکی مال و دولت تم کواس کثرت سے دی جائے جیسے تم سے پہلی اُمتوں کو دی گئی تھی، پھر تم اس کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں اسی طرح ایک دوسرے کے مقابلہ اور ریس میں آجاؤ جیسے کہ وہ لوگ کرتے تھے۔ اورجب دنیاحاصل کرنے کے لیے مقابلہ ہوگاتو آپس میں دشمنیاں پیداہوں گی اور قتل وقتال ہوگا، رشتہ داروں کے حقوق ضائع ہوں گے، اور دیگر گناہوں میں ابتلاء ہوگا۔ پھریہ دنیا تم کو اُسی طرح ہلاک کردے گی جس طرح اُن لوگوں کو ہلاک کیاتھا۔ گویانبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتلادیا کہ فقروفاقہ کی وجہ سے تمہارے دین پر مجھے اتنا خطرہ نہیں جتنا مال و دولت کی وجہ سے ہے۔ فقر و فاقہ میں تمہارا دین اتنا برباد نہیں ہوگا جتنا مال و دولت کی وجہ سے ہوگا، مال و دولت اوردنیاکی کشادگی حاصل کرنے کے لیے جب آپس میں حقوق ضائع ہوتے ہیں، اس سے دین کوجو نقصان پہنچتا ہے، اتنافقر سے نہیں پہنچتا۔

دنیا کی زیب وزینت کا ڈر

حدیث ۴۵۸

عن أبي سعيد بن الخدری (رضی اللہ عنہ) قَالَ: جَلَس رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) على الْمِنْبَرِ، وَجَلَسْنَا حَوْلَهُ، فقَالَ: إِنَّ مِمَّا أَخَافُ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِيْ مَا يُفْتَحُ عَلَيْكُمْ مِنْ زَهْرَةِ الدُّنْيَا وَزِيْنَتِهَا ۔ (متفق عليه)

ترجمہ:-حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) منبر پر کچھ ارشاد فرمانے کے لئے تشریف فرما ہوئے اور ہم آپ کے آس پاس بیٹھ گئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی اس تقریر میں یہ ارشاد فرمایا: مجھے اپنے بعد تم پر جس چیز کا ڈر ہے وہ یہ ہے کہ تم پر دُنیا کی زیب و زینت کھولی جائے گی۔

افادات:-میرے بعد ملک فتح ہوں گے اور دنیا کی دولت اور زیب و زینت تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھولی جائے گی اور اس کے نتیجے میں دنیا کو حاصل کرنے کے لئے آپس میں مقابلے ہوں گے اور بندوں کے حقوق ضائع ہوں گے اور دین کو نقصان پہنچے گا اس کا مجھے ڈر ہے۔ گویا پہلے سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متنبہ کردیا۔

دنیا شیریں اور سرسبز ہے

حدیث ۴۵۹

وعنه أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) قَالَ إِنَّ الدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَإِنَّ اللهَ تَعَالٰى مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا. فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ. فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَاتَّقُوا النِّسَآءَ.

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: دنیا شیرین، سرسبز وشاداب ہے۔ اوراللہ تعالیٰ تم کواس دنیاکی حکومت میں دوسروں کاجانشین بنائے گااور پھر تمہیں آزمائے گاکہ تم کیا کرتے ہو۔ دُنیا کے فتنے سے بچو اور عورتوں کے فتنے سے بھی بچو۔

افادات:- (۱)" شیرین، سر سبز وشاداب"کامطلب یہ ہے کہ دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہوتی ہے اور استعمال کرنے میں بھی اچھی لگتی ہے، دنیامیں یہ دونوں باتیں ہیں۔

(۲)"اللہ تعالیٰ تم کو دنیا کی حکومت میں دوسروں کا جانشین بنائے گا" یعنی آج تو دنیاکی حکومتیں دوسرے لوگوں کے پاس ہیں، لیکن ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس دنیامیں مسلمانوں کواقتداراور حکومت عطافرمائے گا۔ چناں چہ بعدمیں تمام ممالک فتح ہوئے، مسلمانوں کے ہاتھوں میں حکومت آئی اور پوری دنیا پر قبضہ نصیب ہوا۔

(۳)''آزمائے گا کہ تم کیا کرتے ہو'' یعنی دنیا جو دی جائے گی وہ تمہارے لیے آزمائش ہوگی کہ اس دنیا کے ملنے کے بعد تم اللہ تعالیٰ کے احکام پر کتنا عمل کرتے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی کتنی خلاف ورزی کرتے ہو۔

بربادی لانے والی دو چیزیں

یہی دو چیزیں ''مال اور عورتیں'' ہیں جن کے نتیجے میں کہ عام طور پر آدمی برباد ہوتا ہے،اس لیے دنیا کے معاملہ میں بھی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہدایتیں عطا فرمائی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو باقی رکھتے ہوئے،اس کی مرضی کے مطابق شریعت کے بتلائے ہوئے جائز طریقہ سے حاصل کی جائے،اور صحیح طریقہ سے حاصل ہونے کے بعد خرچ کرنے کے لیے بھی شریعت کا بتلایا ہوا طریقہ اختیار کیا جائے۔ گویا کمانا بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کے ساتھ ہونا چاہیے اور خرچ بھی اس کی رضا کے مطابق ہی ہونا چاہیے۔

اس طرح عورتوں کے معاملہ میں شریعت نے ہدایتیں فرمائی ہیں کہ ان سے احتیاط کیا جائے، غیر محرم سے اپنے آپ کو روکا جائے، حجاب پردہ کے احکام کی ساری تفصیل شریعت میں اسی لئے بتلائی گئی ہے۔ان ساری چیزوں کا اگر آدمی اہتمام کرے گا تب ہی عورتوں کے فتنے سے اپنے آپ کو بچا سکے گا، اور اگر ایسا نہیں کرے گا تو پھر خطرہ ہے کہ عورت کے فتنے میں مبتلا ہو جائے گا۔

حقیقی زندگی تو آخرت کی ہے

حدیث ۴۶۰

وعن أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: أَللّٰهُمَّ لَاعَيْشَ إِلَّاعَيْشَ الْاٰخِرَةِ

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔

افادات:- اس لئے آدمی کو آخرت ہی کے لیے اپنی صلاحیتیں استعمال کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جو قوتیں دی ہیں وہ آخرت کی زندگی سنوارنے اور بنانے کے لئے استعمال کرے۔ اگر آدمی اپنی صلاحیت دنیا کے لیے استعمال کرے گا تو گویا یہ اپنی صلاحیتوں کو برباد کرنا ہوا۔

میت کے ساتھ تین چیزیں

حدیث ۴۶۱

وعنه عَنْ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: يَتْبَعُ الْمَيِّتَ ثَلَاثَةٌ؛ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَعَمَلُهُ. فَيَرْجِعُ اثْنَانِ وَ يَبْقٰى وَاحِدٌ، يَرْجِعُ أَهْلُهُ وَمَالُهُ وَيَبْقٰى عَمَلُهُ.

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) ہی سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: آدمی کا جب انتقال ہوتا ہے تو اس کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں؛ ایک تو اس کے گھر والے، دوسرے اس کا مال، اور تیسرے اس کے اعمال۔ (جب آدمی کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے تو) دو تو واپس لوٹ جاتے ہیں اور ایک اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اس کے اعزہ و اقرباء اور مال تو واپس آجاتا ہے لیکن اعمال اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔

افادات:- آدمی جب مرتا ہے اور اُس کا جنازہ اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے، تو رشتہ دار، اولاد اور دوسرے اعزہ واقرباء ساتھ جاتے ہیں، اور مال بھی جاتا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ آدمی جو مال چھوڑ کر مرتا تھا وہ بھی قبر تک ساتھ لے جایا جاتا تھا، پھر واپس لایا جاتا تھا، اگرچہ اب وہ دستور نہیں رہا لیکن کچھ نہ کچھ چیزیں ساتھ جاتی ہی ہیں، مثلاً جنازہ۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا کہ جس چارپائی پر آدمی کو قبرستان لے جایا جاتا تھا وہ خود اسی کی ہوتی تھی، آج کل چارپائی کے بجائے جنازے ہوتے ہیں اور وہ مسجد سے لائے جاتے ہیں، لیکن پھر بھی نیچے بچھانے کے لئے چادر گھر کی ہی ہوتی ہے۔ اب تو وہ بھی مسجد کی ہونے لگی ہے۔ خیر کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کچھ نہ کچھ مال آدمی کے ساتھ جاتا ہے۔ اور اعمال اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں جب آدمی کو قبر میں اُتار دیا جاتا ہے، تو اس کے اعزہ و اقرباء اور مال تو واپس آجاتا ہے لیکن اعمال اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں، اس لئے جو چیز ساتھ رہنے والی ہو اسی کو درست

کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اگر مال اور اولاد کے لئے ہی آپ نے ساری محنتیں کیں اور اپنی صلاحیتوں کو اسی میں ضائع کر کے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوئے تو پھر اس کو بھگتنا پڑے گا۔

جنت و جہنم کا غوطہ

حدیث ۴۶۲

وعَنْهُ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ): يُؤْتىٰ بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً، ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابْنَ آدَمَ، هَلْ رَأَيْتَ خَيْراً قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيْمٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ: لاَ وَ اللهِ يَا رَبِّ. وَيُؤْتىٰ بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْساً فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ، فَيُقَالُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ، هَلْ رَأَيْتَ بُؤْساً قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟ فَيَقُوْلُ: لاَ وَاللهِ، مَا مَرَّ بِي بُؤْسٌ قَطُّ، وَلاَ رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) ہی سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز جہنمیوں میں سے ایسے آدمی کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ آرام اور عیش و عشرت میں تھا اور جہنم میں ایک غوطہ لگایا جائے گا اور پھر اس سے سوال ہوگا: اے انسان! کبھی تو نے کوئی راحت دیکھی؟ کبھی کوئی نعمت یا عیش و عشرت کی کوئی چیز تیرے اوپر سے گذری؟ تو وہ قسم کھا کر کہے گا: میں نے کبھی کوئی راحت دیکھی ہی نہیں۔ اور جنتیوں میں سے ایسے آدمی کو لایا جائے گا جو دنیا میں سب سے زیادہ تکلیف مشقت اور دُکھ میں تھا۔ اس کو بھی جنت کے اندر ایک غوطہ لگا کر پوچھا

جائے گا کہ کیا کبھی تونے کوئی دکھ دیکھا ہے؟ کبھی کوئی تکلیف تیرے اوپر آئی ہے؟ تو وہ قسم کھا کر کہے گا کہ نہیں اللہ کی قسم! کبھی کوئی دکھ اور کوئی تکلیف میں نے دیکھی ہی نہیں۔

افادات:- غوطہ لگانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ ایک سانس کے برابر ذراسی دیر ہوتی ہے، اس غوطہ کے درمیان آدمی دوسرا سانس نہیں لے سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ذراسی دیر کے لئے رکھا جائے گا۔ پہلے آدمی نے دنیا کی پوری زندگی بڑے عیش و آرام میں گزاری تھی، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کی تھیں اور جہنمی بنا تھا تو جہنم میں ایک غوطہ کھانے کے بعد اس کا حال یہ ہوگا کہ دنیا کی زندگی کے سارے عیش و آرام اور راحتیں بھول کر کہے گا کہ میں نے کبھی راحت دیکھی ہی نہیں کہ راحت کس چڑیا کا نام ہے۔ اور دوسرے آدمی نے کبھی کوئی عیش و آرام اور راحت نہیں دیکھی، اس کی پوری زندگی دکھ اور تکلیف میں گزری تھی لیکن وہ اتنی سی دیر میں سب دُکھ بھول جائے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ بھائی! دنیا کی زندگی کی راحت و آرام اور اس کے عیش و عشرت کے لئے آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کرے اور عذاب مول لے؛ یہ بڑی خطرناک چیز ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

دنیا اور آخرت کا موازنہ

حدیث ۴۶۳

وعَنِ الْمُسْتَوْرِدُ بن شَدَّاد(رضی اللہ عنہ)قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَاالدُّنْيَا فِيْ الْآخَرَةِ إِلاَّ مِثْلُ مَا يَجْعَلُ أَحَدُكُمْ إِصْبَعَهُ فِيْ الْيَمِّ، فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ۔!

ترجمہ:-حضرت مستوردبن شداد(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: دنیا کی حیثیت آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے ایک انگلی دریا میں ڈالیں اور باہر نکالیں پھر دیکھیں کہ اس انگلی پر کتنا پانی آیا۔

افادات:-اس انگلی پر جو پانی آرہا ہے ، اس کی حیثیت دریا کے مقابلہ میں کیا ہے؟ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)فرماتے ہیں کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی حیثیت اتنی ہی ہے، بلکہ یہ بھی صرف سمجھانے کے لئے ہے،ورنہ دنیاتو ختم ہونے والی،اورآخرت باقی رہنے والی ہے،آخرت کی نعمتیں ہر اعتبار سے باقی رہنے والی ہیں ،اورکوالیٹی(Quality)اور کونیٹی(Quantity) دونوں اعتبار سےوہ دنیا سے بہتر ہی ہے۔ایک اور روایت میں ہے کہ دنیا کی حیثیت آخرت کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے تم اپنا کوڑا زمین پرڈالو، تو وہ کتنی جگہ روکے گا؟اتنی بھی قیمت آخرت کے مقابلہ میں دنیاکی نہیں ہے؛تواب اس دنیا کی خاطر آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کیوں کرے؟

ساری حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ اپنے دل میں دنیا کی محبت کوجگہ نہ دے کہ اسی کے نتیجہ میں اس کو حاصل کرنے کے لئے آدمی اللہ تعالیٰ کی

نافرمانیوں پر اُتر آتا ہے۔دنیا کی محبت ہی جب دل سے نکل جائے گی پھر اس کی نوبت نہیں آئے گی۔

دنیا کی حقیقت یہ ہے

حدیث ۴۶۴

وعن جابر(رضی اللہ عنہ)أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم)مَرَّبِالسُّوقِ وَالنَّاسُ كَنَفَتَيْهِ،فَمَرَّ بِجَدْيٍ أَسَكَّ مَيِّتٍ، فَتَنَاوَلَهُ فَأَخَذَ بِأُذُنِهِ،ثُمَّ قَالَ:أَيُّكُمْ يُحِبُّ أَنْ يَكُوْنَ هٰذَا لَهُ بِدِرْهَمٍ؟ فَقَالُوا:مَا نُحِبُّ أَنَّهُ لَنَا بِشَيْءٍ،وَمَا نَصْنَعُ بِهِ؟ثُمَّ قَالَ:أَتُحِبُّوْنَ أَنَّهُ لَكُمْ؟ قَالُوا وَاللهِ لَوْ كَانَ حَيًّا كَانَ عَيْبًا، إِنَّهُ أَسَكُّ، فَكَيْفَ وَهُوَ مَيِّتٌ! فَقَالَ:فَوَاللهِ لَلدُّنْيَا أَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُمْ.

قوله:(كَنَفَتَيْهِ)أَيْ:عَنْ جانبيه۔و(الأَسَكُّ)الصَّغِيْرُ الأُذُنِ

ترجمہ:-حضرت جابر(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)ایک مرتبہ بازار سے گزرے، لوگ آپ کی دونوں طرف چل رہے تھے۔آپ کا گزر بکری کے مرے ہوئے ایک ایسے بچے کے پاس سے ہوا جو چھوٹے چھوٹے کان والا تھا(اور چھوٹے کان والی بکری ویسے ہی ان کے یہاں کم قیمت سمجھی جاتی تھی) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس مرے ہوئے بچے کا کان پکڑ کر اٹھایا اور فرمایا کہ کون اس بات کو پسند کرتا ہے کہ یہ بچہ اس کو ایک درہم میں مل جائے۔صحابہ نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول! معمولی چیز دے کر بھی لینا کوئی پسند نہیں کرے گا،اس لئے کہ اس کو لے کر کیا کریں گے؟تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ تم کو مل جائے؟ صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے

رسول! اگر یہ زندہ ہوتا تب بھی اس کے کان چھوٹے ہونے کی وجہ سے معمولی قیمت میں بھی ہم اس کو لینا پسند نہ کرتے، اب جبکہ وہ مرچکا ہے ، کوئی حیثیت اور قیمت ہی نہیں رہی۔ تو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا (دیکھو! بکری کا یہ بچہ تمہاری نگاہوں میں کیسا بے قیمت ہے کہ تم لینے کے لئے بالکل تیار نہیں ہو، تو) اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں دنیا اس سے بھی زیادہ بے قیمت ہے۔

افادات:- نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مختلف مثال اور نمونے پیش کرکے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) اور اپنی اُمت کے دلوں میں دنیا کی بے رغبتی بٹھانا چاہتے ہیں اور دنیا کی محبت سے دلوں کو خالی کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! دنیا ایسی حقیر چیز ہے، اس کو دل میں جگہ دے کر کیا کروگے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۵/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۱۲/فروری ۲۰۰۰ء

زہد کے سلسلہ میں بیان چل رہا تھا کہ آدمی اپنے دل کو دنیا کی محبت سے خالی رکھے، اور اپنی ضرورت کو پورا کرنے میں بھی دنیا میں کم سے کم لگے۔ اس سلسلے میں گذشتہ مجلس میں چند روایتیں پیش کی تھیں، آج بھی کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کچھ زیادہ ہی روایتیں پیش کی ہیں جس کی وجہ یہی ہے کہ سب سے بڑی بیماری جو ہمارے اندر پائی جاتی ہے وہ دنیا کی محبت ہے۔ جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ ساری خرابیوں اور برائیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔ اگر وہ دل سے نکل جائے اور دل کے اندر دنیا کی رغبت باقی نہ رہے تو پھر آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا بہت آسان ہوجاتا ہے۔

مال کے فتنہ سے بچنے کا علاج

حدیث ۴۶۵

وعن أبي ذر (رضي الله عنه) قَالَ: كُنْتُ أَمْشِي مَعَ النَّبِيِّ (صلى الله عليه وسلم) فِي حَرَّةٍ بِالْمَدِينَةِ، فَاسْتَقْبَلَنَا أُحُدٌ فَقَالَ: يَا أَبَا ذَرٍّ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ. فَقَالَ: مَا يَسُرُّنِي أَنَّ عِنْدِي مِثْلَ أُحُدٍ هٰذَا ذَهَبًا تَمْضِي عَلَيَّ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ وَعِنْدِي مِنْهُ دِينَارٌ، إِلَّا شَيْءٌ أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ، إِلَّا أَنْ أَقُوْلَ بِهِ فِي عِبَادِ اللهِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا وَهٰكَذَا، عَنْ يَمِيْنِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ وَمِنْ خَلْفِهِ. ثُمَّ سَارَ، فَقَالَ: إِنَّ الْأَكْثَرِيْنَ هُمُ الْأَقَلُّوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا مَنْ قَالَ بِالْمَالِ

هَكَذَا و هَكَذَا وهَكَذَا، عَنْ يَمِيْنِهِ وعَنْ شِمَالِهِ وَمِنْ خَلْفِهِ. وقَلِيْلٌ مَا هُمْ. ثُمَّ قَالَ لِيْ: مَكَانَكَ لاَ تَبْرَحْ حَتّٰى آتِيكَ، ثُمَّ انْطَلَقَ فِيْ سَوَادِ اللَّيْلِ حَتّٰى تَوَارَى، فَسَمِعْتُ صَوْتاً قَدْ إِرْتَفَعَ. فَتَخَوَّفْتُ أَنْ يَكُوْنَ أَحَدٌ عَرَضَ لِلنَّبِيِّ (ﷺ)، فأَرَدْتُ أَنْ آتِيهِ فَذَكَرْتُ قَوْلَهُ "لاتَبْرَحْ حَتّٰى آتِيكَ" فَلَمْ ابرَحْ حَتّٰى أَتَانِيْ. فَقُلْتُ: لَقَدْ سَمِعْتُ صَوْتاً تَخَوَّفْتُ مِنْهُ، فَذَكَرْتُ له، فَقَالَ: وَهَلْ سَمِعْتَهُ؟ قُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: ذَاكَ جِبْرِيْلُ أَتَانِيْ، فَقَالَ: مَنْ مَاتَ مِنْ أُمَّتِكَ لاَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ. قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰى وإِنْ سَرَقَ؟ قَالَ: وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ. (متفق عليه، وهٰذا لفظ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ رات کے وقت مدینہ منورہ کی پتھریلی جگہ میں چل رہا تھا (اس زمانہ میں مدینہ کے دونوں طرف میدان تھا جہاں چھوٹے چھوٹے پتھر بچھے ہوئے تھے، اور درمیان میں مدینہ منورہ آباد تھا۔ اور ایسا میدان جس میں چھوٹے چھوٹے پتھر ہوں، عربی زبان میں اس کو "حَرَّة" کہتے ہیں۔ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ انہی میدانوں میں سے ایک میدان میں مَیں نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ چل رہا تھا) چلتے چلتے ہمیں سامنے اُحد پہاڑ نظر آیا (جب آدمی مدینہ منورہ کی آبادی سے باہر نکلتا ہے تو احد پہاڑ بالکل سامنے ہی نظر آتا ہے) تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! سنو۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں، فرمایئے، کیا ارشاد ہے۔ تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: یہ بات میرے لئے باعثِ مسرت نہیں ہے کہ میرے پاس اُحد پہاڑ کے برابر سونا ہو اور تین دن میرے اوپر ایسے گزر جائیں کہ میرے پاس اس میں سے ایک دینار بھی باقی رہ گیا ہو، سوائے اتنی مقدار کے جس کو میں قرضہ کی ادائیگی کے لیے رہنے دوں، مگر یہ کہ میں اس سونے کو اللہ کے بندوں میں اس طرح (دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کے) تقسیم کر دوں۔ اس کے بعد حضور (ﷺ) نے فرمایا: جو لوگ زیادہ مال

والے ہیں وہ قیامت کے دن کم اجر و ثواب والے ہوں گے، البتہ وہ آدمی جو اپنے مال کو اس طرح اور اس طرح خرچ کرتا رہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے ہاتھ سے دائیں بائیں اور پیچھے اشارہ کیا (کہ اس طرح ہاتھ بھر بھر کر خرچ کرے تو وہ البتہ قیامت کے روز بھی زیادہ ثواب والے لوگوں میں ہوگا۔) پھر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ یعنی جن کے پاس مال زیادہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ اس طرح کثرت سے خرچ بھی کریں ایسے لوگ کم ہیں۔ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اس کے بعد نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: یہیں ٹھہرو، یہاں سے مت ہٹنا جب تک کہ میں واپس نہ آجاؤں۔ یہ فرماکر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) رات کے اندھیرے میں آگے بڑھ گئے، یہاں تک کہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نگاہوں سے اوجھل ہوجانے کے بعد مجھے ایک آواز سنائی دی، اور وہ ذرا بھیانک قسم کی آواز تھی، تو مجھے ڈر لاحق ہوا کہ شاید نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کوئی تکلیف پہنچانے کے لیے وہاں پہنچ گیا ہو، یا کوئی ایسی ویسی بات پیش آئی ہو اسی کے نتیجہ میں یہ آواز آرہی ہے، اس لئے میرے دل میں خیال آیا کہ جہاں سے آواز آرہی ہے میں بھی ادھر چلا جاؤں، لیکن مجھے یاد آیا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تاکید فرماگئے تھے کہ میں جب تک نہ آؤں یہیں رہنا، اس لئے میں اپنی جگہ سے نہیں ہٹا، یہاں تک کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) واپس تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے دل میں آیا تھا کہ میں اُدھر پہنچوں لیکن پھر آپ نے جاتے وقت تاکید فرمائی تھی کہ میں اپنی جگہ سے نہ ہٹوں، اس لئے میں نہیں آیا۔ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم نے وہ آواز سنی تھی؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! سنی تھی۔ اس پر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: یہ حضرت جبرئیل کے آنے کی آواز تھی، اور انہوں نے آکر یہ خوش خبری سنائی کہ آپ کی اُمت میں سے کوئی آدمی دنیا سے اس حالت میں رُخصت ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں

ٹھہراتا ہے، تو وہ جنت میں جائے گا۔ اس پر میں نے کہا: اگرچہ زنا کیا ہو، اور چوری کی ہو؛ تب بھی وہ جنت میں جائے گا؟ تو انہوں نے کہا: اگرچہ زنا کیا ہو اور چوری کی ہو۔

افادات:- اس حدیثِ پاک میں ایک تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے مال کے سلسلہ میں اپنا مزاج بتلادیا اور دوسرے لوگوں کو متوجہ کیا کہ اگر کسی کے پاس مال ہو تو اس کے فتنے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آدمی اس مال کو اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کرے جیسا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا کہ ہاتھ بھر بھر کے اتنا خرچ کرے کہ وہ جلدی سے خرچ ہوجائے۔ ضرورت کے بقدر اپنے پاس رہنے دے، باقی سب اللہ کے راستہ میں خرچ کردے۔ مال کی وجہ سے آنے والی خرابیوں سے بچنے کا یہی علاج ہے۔ جس کے پاس مال زیادہ ہو اس کے حق میں آخرت کے اعتبار سے پورے طور پر مفید اسی وقت ہوسکتا ہے جب کہ اس کو کثرت سے اللہ کے راستہ میں خرچ کرے۔

مال ودولت کے بارے حضور (ﷺ) کا نظریہ

حدیث ۴۶۶

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) عن رَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) قَالَ: لَوْ كَانَ لِي مِثْلُ أُحُدٍ ذَهَبًا لَسَرَّنِي أَنْ لَا تَمُرَّ عَلَيَّ ثَلَاثُ لَيَالٍ وَعِنْدِي مِنْهُ شَيْءٌ إِلَّا شَيْءٌ أَرْصُدُهُ لِدَيْنٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا:اگر اُحد پہاڑ کے برابربھی میرے پاس سوناہو،تومجھے یہ بات پسندنہیں کہ تین راتیں اس پر گزرنے پائیں، سوائے وہ جس کو میں اپنے قرضہ کی ادائیگی کے لیے رہنے دوں۔

افادات:-اس روایت میں بھی حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے اپنی اسی تمناکو پیش فرمایاہے جو اوپر گزری۔اور قرض کی ادائیگی بہت اہم ہے،اس کے لئے اپنے پاس اتنی مقدار رہنے دوں گا جس سے قرض خواہ کا قرض ادا ہوجائے۔

عمدہ اصول

حدیث ۴۶۷

وعنه قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم):اُنْظُرُوْاإِلىٰ مَنْ هُوَأَسْفَلُ مِنْكُمْ وَلَاتَنْظُرُوا إِلىٰ مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ؛ فَهُوَأَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللهِ عَلَيْكُمْ.

وفی روایة البخاری:-إِذَا نَظَرَأَحَدُ كُمْ إِلىٰ مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ،فَلْيَنْظُرْإِلىٰ مَنْ هُوَ أَسْفَلُ مِنْهُ.

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: جو آدمی (دنیوی اعتبار سے،مال ودولت یاکسی بھی اعتبارسے)تم سے کم درجہ کاہو اس کو دیکھو اور جو تم سے اونچے درجہ کا ہو (مال کے اعتبارسے یادنیوی کسی اوراعتبارسے)اس کی طرف نہ دیکھو(اگرآپ ایساکروگے تو)

اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں تم پر ہیں ان کو تم حقیر نہیں سمجھوگے، اور ان کی ناقدری نہیں کروگے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ کوئی آدمی آپ کو ایسا نظر آیا جو مال کے اعتبار سے یا جسمانی خوبصورتی کے اعتبار سے تم سے اچھا ہے، تو جو تم سے کم درجہ کا ہے اس کی طرف بھی نگاہ کرلو (تاکہ اس کی وجہ سے اللہ کی جو نعمت تمہیں ملی ہے اس کی ناقدری نہ ہو۔)

افادات:-اس روایت میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے ایک بہت ہی عمدہ اصول بتلایا ہے، اس لئے کہ انسان کے مزاج میں فطری طور پر مال کی جو محبت ہے وہ تو ساتھ ہی لگی ہوئی ہے، اس محبت کی وجہ سے عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آدمی کو کتنا ہی کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملا ہوا ہو، تب بھی اس کو اس پر صبر نہیں آتا ہے۔وہ اپنے سے زیادہ والے کو جب دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ میرے پاس تو یہ چیز نہیں ہے۔کسی آدمی کے پاس چاہے دس فیکٹریاں ہوں، لیکن جب پندرہ فیکٹری والے کو دیکھے گا تو کہے گا کہ دیکھو! یہ کتنا بڑا آدمی ہے، اور پھر وہی حسرت پیدا ہوتی ہے، حالانکہ اس کی ضرورت سے بہت زیادہ خود اس کے پاس موجود ہے۔یا اگر کسی دوسرے کے پاس مرسڈیز (Mercedes) گاڑی دیکھی، اب چاہے خود اس کے پاس (BMW) ہو، تب بھی وہ کہے گا کہ میرے پاس (Mercedes) تو نہیں ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کا مزاج ہی ایسا بنا ہوا ہے۔

پریشانی سے راحت ملی

حضرت عبداللہ بن مبارک (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے محدث گزرے ہیں، بڑے فقیہ بھی تھے اور تاجر بھی تھے، اللہ تعالیٰ نے دولت بھی بہت زیادہ عطا فرمائی تھی۔ ایک سال حج کے لئے تشریف لے جاتے اور ایک سال جہاد میں تشریف لے جاتے۔ انہوں نے دُعا فرمائی تھی کہ اے اللہ! میری زندگی تو مالداروں جیسی ہو لیکن میری موت مسکینوں جیسی ہو اور چوں کہ خود بھی مالدار تھے، اس لیے فرماتے ہیں کہ پہلے میں مالداروں میں بیٹھا کرتا تھا تو ہمیشہ غمگین اور پریشان رہتا تھا۔ کسی کو دیکھا کہ اس کا کپڑا میرے کپڑے سے اچھا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی، کسی کی سواری میری سواری سے اچھی دیکھی تو مجھے تکلیف ہوتی، کسی کا مکان میرے مکان سے اچھا دیکھا تو تکلیف ہوتی۔ ظاہر ہے کہ خود کا مکان چاہے کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، ایک آدھ چیز تو دوسرے کے مکان میں ضرور اچھی ہوتی ہے۔ یہ ایک قدرتی چیز ہے۔ فرماتے ہیں کہ جب ان کے پاس بیٹھتا تھا تو یہ ساری چیزیں دیکھ دیکھ کر ہمیشہ غمگین اور پریشان رہتا تھا کہ یہ چیز میرے پاس کیوں نہیں ہے۔ پھر میں نے ان کے پاس بیٹھنا چھوڑ دیا اور جو لوگ مجھ سے کم تر تھے ان کے اندر بیٹھنا شروع کیا تو مجھے بڑی راحت ملی، جب کسی کو دیکھتا تو سوچتا کہ اللہ تعالیٰ کا بڑا شکر ہے کہ میرا لباس اس کے لباس سے اچھا ہے، میری سواری اس کی سواری سے اچھی ہے، میرا مکان اس کے مکان سے اچھا ہے۔ اس کے بعد مَیں بڑی راحت وآرام میں آگیا۔

ذہنی وفکری تشویش کا علاج

اور ایک بات بتاؤں کہ در حقیقت آدمی جو بھی تکلیف اُٹھاتا ہے ،زیادہ تر اس تکلیف کا تعلق ذہن اور فکر سے ہوتا ہے، حقیقت سے نہیں ہوتا ہے،اس روایت میں نبئ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی کا علاج بتلایا ہے کہ آپ کسی ایسے آدمی کو دیکھ لو جو مال و دولت کے اعتبار سے یا ظاہری خوبصورتی کے اعتبار سے آپ سے اچھا ہو تو اس وقت ذرا آپ اپنے سے نیچے والے لوگوں کو بھی دیکھ لیجئے۔ اگر آپ نے دیکھا کہ کسی کے پاس ۲۵ ر لاکھ والا بنگلہ ہے؛ تو بھائی! آپ کو آس پاس جھونپڑ پٹیاں بھی کہیں نظر آجائیں گی،ان کو بھی دیکھ لیجئے۔اور اگر آپ کے پاس جھونپڑا ہے تو پھر فٹ پاتھ پر بغیر کسی جھونپڑے کے سونے والے بھی ہیں ان کو دیکھ لیجئے۔اور گٹر لائن کے اندر بھی سونے والے آپ کو نظر آئیں گے۔ اگر جھونپڑ ا بھی ہے تو آپ یوں سوچئے کہ ایک جھونپڑا بھی تو ملا ہوا ہے، اس کے پاس تو اتنا بھی نہیں ہے۔اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسٹیشن کی کسی بینچ اور کرسی پر رات گذار دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اگر سوچے تو ایسے نمونے ضرور نظر آئیں گے،جس کے نتیجے میں اللہ کی نعمت کی قدر پیدا ہوگی۔

میرے پاؤں تو سلامت ہیں

شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ مَیں ایک مرتبہ ایسی حالت میں گھر سے نکلا کہ پیر میں جوتا نہیں تھا، مجھے بڑا افسوس تھا کہ آج کھلے پیر جارہا ہوں اور اس کی وجہ سے طبیعت پر ایک خاص اثر تھا، اور غمگینی چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں ایک آدمی کو دیکھا کہ اس کے پاؤں ہی نہیں ہیں؛ تو مَیں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ میرے پاؤں تو سلامت ہیں، بھلے ہی جوتا نہیں تو کیا ہوا۔ تو حقیقت یہی ہے کہ آدمی ان چیزوں کو بھی بار بار دیکھے جس کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے۔

اب تو مجھے حق الیقین حاصل ہوگیا

باقی یہ ہے کہ آدمی کی خواہشات کی کوئی انتہاء نہیں ہے۔ ایک قصہ لطیفہ کے طور پر سناتا ہوں، اور ہمارے مولوی لوگوں کو تو سناتا رہتا ہوں کہ میں ایک مرتبہ سفر سے واپس آرہا تھا، ٹرین چھوٹ گئی تو ٹرک میں بیٹھا، ایک اور مولوی صاحب بھی اسی میں ساتھ بیٹھے۔ بہت سیدھے سادے آدمی ہیں۔ کہنے لگے کہ ہم جو کتابوں میں پڑھتے ہیں کہ مقدر میں جو روزی ہوتی ہے اتنی ہی ملتی ہے، اس سے زیادہ نہیں ملتی، اس پر یقین تو تھا لیکن اس کے باوجود دل میں یہ خیال رہتا تھا کہ ایک آدمی ہندوستان میں رہ کر پانچ سو روپے کماتا ہے، اور وہی آدمی سعودی چلا جائے تو وہاں اس کو پانچ سو ریال ملیں گے؛ تو یہ کیسے برابر ہوسکتا

ہے۔وہ کہتے ہیں کہ دل میں ایسا خیال آتا تھا،لیکن اب تو مجھے حق الیقین حاصل ہو گیا کہ جو مقدر میں ہے وہی ملتا ہے۔میں نے کہا کہ حق الیقین کیسے ہو گیا؟تو کہنے لگے کہ دراصل میں ایک جگہ پڑھاتا تھا اور وہاں مجھے بارہ سو (۱۲۰۰)روپے تنخواہ ملتی تھی۔میرے دل میں آیا کہ اتنے پیسے کافی نہیں ہیں،اورزیادہ ملنے چاہئیں۔لوگ سعودیہ محنت مزدوری کرنے کے لیے جاتے ہیں تو میں بھی جاؤں۔لہٰذا میں نے اپنا مکان بیچا ، کچھ قرضہ بھی کیا اور آزاد ویزا حاصل کر کے وہاں گیا،اور دو سال وہاں رہا، اس درمیان یہاں پیسے بھی بھیجے اور جو قرض تھا وہ بھی ادا کیا،اور دوسال کے بعدجب واپس آیااور میں نے حساب کیاتوجانے کا خرچہ جو پچاس ہزار،یا ساٹھ ہزار ہوا تھاوہ نکالنے کے بعد باقی جوپیسے بچے،ان کودوسال پر تقسیم کیاتومہینہ کے بارہ سو (۱۲۰۰) روپے ہی نکلے،تو میں نے سوچا کہ اپنے نصیب میں تو وہ بارہ سو (۱۲۰۰) روپے ہی ہیں ۔

یقین کے تین درجے

دیکھو!ایک علم الیقین ہوتا ہے،اورایک عین الیقین ہوتا ہے،اورایک حق الیقین ہوتا ہے۔آدمی کو کسی چیز کا یقین علم کے درجہ میں ہوتا ہے جیسے آپ کو کسی نے بتلایا کہ آگ جلاتی ہے۔بتلانے والا آپ کا بھروسہ مند آدمی ہے،آپ کواس کی ہر بات پر یقین ہے،اس نے کہہ دیا،آگ جلاتی ہے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ بالکل صحیح کہتا ہے،اس کو علم الیقین کہتے ہیں ۔یہ یقین کا پہلا درجہ ہے۔

اس کے بعد دوسرا درجہ عین الیقین کا ہے۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ پہلے تو صرف سنا تھا لیکن اب آنکھ سے دیکھ بھی لیا کہ کہیں آگ لگی اور کوئی آدمی اس میں جل گیا، جب آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا تو آپ کا یقین اور بڑھ گیا؛ اس کو عین الیقین کہتے ہیں۔

اور تیسرا درجہ حق الیقین کا ہے۔ اتفاق کی بات کہ آپ خود ہی کسی وجہ سے اس مرحلہ سے دوچار ہوگئے، مثلاً کسی گرم چیز کو آپ نے پکڑ لیا اور آپ کا ہاتھ جل گیا۔ خود پر بیتی اور اس سے جو یقین حاصل ہوا؛ اس کو حق الیقین کہتے ہیں۔

چشم کشا حقیقت

بہت سے دوکان والے بینک سے قرض لے کر فیکٹری کھولتے ہیں، اب فیکٹری چل رہی ہے، پندرہ بیس آدمی کام کر رہے ہیں، پیسے آرہے ہیں اور وہ بینک میں قسط چکا رہے ہیں اور اس کا سالانہ سود بھی ادا کر رہے ہیں، ملازمین کی تنخواہ دی جارہی ہے، سرکاری آفیسرز آتے ہیں تو ان کو رشوت دی جارہی ہے، کوئی چیز پاس کرانے کے لیے پیسے نکالے، اور فلاں بل پاس کرانے کے لیے دوسرے پیسے نکالے وغیرہ وغیرہ۔ بظاہر تو کاروبار تو بہت اچھا چل رہا ہے، بہت سارے پکے رجسٹر بھی بنے ہوئے ہیں۔ پیسے آ بھی بہت رہے ہیں اور جا بھی بہت رہے ہیں؛ لیکن اگر وہ آدمی یوں سوچے کہ اس سب میں سے میرے حصہ کا کتنا ہے؟ تو میں یوں سمجھتا ہوں کہ پہلے جو دوکان کرتا تھا اور اُس میں سے اس کو پانچ ہزار

ملتے تھے،اب فیکٹری کرنے کے بعد بھی پانچ ہزار سے زیادہ اس کی ملکیت میں نہیں آرہے ہوں گے۔دوسرے جو پیسے اِدھر اُدھر نکل رہے ہیں اگرچہ سب اسی کے ماتحت ہو رہا ہے، لیکن اس کے پاس جو اپنے خاص استعمال میں رہ جاتے ہیں وہ اتنے ہی ہوتے ہیں۔یہ بات اور رہی کہ یوں کہا جائے گا کہ یہ صاحب فیکٹری کے مالک اور سیٹھ ہیں ، اور اتنے سارے نوکران یہاں کام کرتے ہیں ،لیکن جو آیا اور گیا،وہ تو دوسروں کا تھا۔دیکھا تو یہ جائے گا کہ خود اس کا اپنا کتنا ہے!

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) کا تجویز کردہ علاج

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ صوفی اقبال صاحب نے ذکر کیا ہے۔ان کا ایک رسالہ ”فیضِ شیخ“ ہے۔صوفی اقبال صاحب دامت برکاتہم مدینہ منورہ میں حضرت شیخ کے خلیفہ ہیں،کئی سالوں سے وہیں مقیم ہیں،آج کل بہت بیمار بھی چل رہے ہیں،دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو صحت عطا فرمائے۔(اب انتقال ہو چکا ہے؛رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً)حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سارے افادات انہوں نے شائع کئے ہیں۔وہ فرماتے ہیں کہ مجھے جوانی میں تجارت کا بہت شوق تھا۔حضرت کے سامنے اس کا تذکرہ کیا تو حضرت نے مجھ سے فرمایا:دیکھو صوفی جی!میں تو یوں سمجھتا ہوں کہ سہارنپور میں جتنی بھی دوکانیں ہیں وہ میری ہیں اور میں ان کا مالک میں ہوں اور جو لوگ ان دوکانوں پر بیٹھے ہوئے ہیں وہ سب میرے کارندے ہیں،سارا حساب کتاب وہ رکھتے ہیں اور وہ جو کچھ کرتے

ہیں اس کا اپنا معاوضہ ان کو دیا جاتا ہے، اور میری قسمت کا جو ہے وہ مجھ تک یہاں پہنچ جاتا ہے۔ حقیقت میں ان کے ذہن میں دنیا کمانے کا جو کیڑا تھا اس کو دور کرنے کے لیے حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ ایک علاج بتلایا۔

میں نے بھی ابھی آپ کے سامنے یہی عرض کیا کہ آپ واقعتاً بھی مالک بن جائیں، تو اصل تو دیکھنا یہ ہے کہ آپ کے ہاتھ میں کیا آیا! یہ سب کچھ تو ہوا کہ بینک سے لون لی، کسی سے قرض لیا، فیکٹری خریدی، زمین بھی لی، لیکن اخیر میں آپ کے پاس کیا آیا! آدمی کے پاس اتنا ہی آتا ہے جو اس کی قسمت کا ہوتا ہے، اس سے زیادہ نہیں آتا۔

قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکے ؟

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ میں نے تقدیر پر ایک رسالہ لکھا، اس میں بہت سارے قصے لکھے جو لوگوں سے سنے تھے۔ بعض لوگ اپنے ایسے ایسے حالات سناتے ہیں کہ عبرت ہوتی ہے، خاص کر جو تعویذ لینے آیا ہو، وہ سب کچھ سچ سچ بتاتا ہے بالکل جھوٹ نہیں بولتا، اس لئے کہ اس کو تعویذ چاہیے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس رسالہ میں مَیں نے لکھا تھا کہ جس کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے مرغی کھانا لکھا ہے، تو یا تو سیٹھ بن کر کھائے گا یا باورچی بن کر کھائے گا۔ باورچی جب سیٹھ کے یہاں مرغی پکائے گا تو وہ بھی وہی کھائے گا۔ اور جس کی قسمت میں کار میں گھومنا لکھا ہے تو وہ سیٹھ بن کر پھرے، یا ڈرائیور بن کر پھرے۔ اونچی سے اونچی کار ہو، جس کار میں سیٹھ صاحب بیٹھیں گے اسی میں

ڈرائیور بھی بیٹھتا ہے۔اور حضرت نے لکھا ہے کہ جس کے لیے جیل جانا لکھا ہے تو چاہے مجرم بن کر جائے، یا شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی بن کر جائے۔اس زمانہ میں جنگ آزادی کے سلسلہ میں حضرت مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) بار بار جیل جاتے رہتے تھے۔

کروڑپتی کی قسمت میں دال کا پانی

ایک انگریز کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ایک سگریٹ پیتا تھا اتنی دیر میں اس کے خزانہ میں ہزاروں روپے جمع ہوتے تھے، لیکن وہ پیٹ کا بیمار تھا، ڈاکٹروں اور حکیموں نے کہہ دیا تھا کہ غذا کے طور پر دال کا پانی پینا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ بھی کھائے تو مر جائے گا۔اب اگر وہ لاکھوں اور کروڑوں کمائے ،تب بھی اس کی قسمت میں دال کا پانی ہے، اس سے زیادہ نہیں ۔

ٹینشن کیوں ؟

میں یہ سارے نمونے اس لئے پیش کرتا ہوں کہ آدمی اتنی ساری محنتیں کرتا ہے، مشقتیں اُٹھاتا ہے، اتنا سب بوجھ سر پر لے کر پھرتا ہے؛ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی یہ سب سوچے۔آج کل جس کو دیکھو وہ یہی کہتا ہے کہ میں ٹینشن میں ہوں۔دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک امریکہ ہے، لیکن سب سے زیادہ ٹینشن وہاں کے رہنے والوں میں ہے، جنگل

میں رہنے والوں کو کوئی ٹینشن نہیں ،اس لیے کہ انہوں نے اپنی ضرورت کو جتنا کم پھیلایا ہے اتنا ہی زیادہ آرام میں ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حقیقت میں سارے جھگڑے ہم خود اپنے لئے طے کرتے ہیں، حالاں کہ حضوراکرم(ﷺ)کا ارشاد ہے کہ آدمی کو موت نہیں آسکتی یہاں تک کہ اپنی روزی پوری کرلے۔جس کی قسمت میں روزی کے جتنے دانے لکھے ہیں جب تک ا ن کو پورانہیں کرے گا؛وہاں تک موت آنے والی نہیں ہے۔حضوراکرم(ﷺ)فرماتے ہیں کہ روزی کے طلب کرنے کے معاملہ میں کاروبارکوزیادہ مت پھیلاؤ(Short cut) اِختیار کرو،زیادہ لمباکاروبار ہونا نہیں چاہیے،بس اتنا ہوجس سے آپ کی ضرورت پوری ہوجائے،بقیہ اوقات کو اللہ تعالیٰ کی یاد اورآخرت کی تیاری میں استعمال کرنا چاہیے۔

دنیا کی محبت والوں کا مزاج

حدیث ۴۶۸

وعنه عن النبی(ﷺ)قَالَ:تَعِسَ عَبْدُالدِّیْنَارِ والدِّرْھَمِ وَالْقَطِیْفَةِ وَالْخَمِیْصَةِ ؛ إِنْ أُعْطِیَ رَضِیَ،وإِنْ لَمْ یُعْطَ لَمْ یَرْضَ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: برا ہے جو دینار و درہم کا، اور چادر و کملی کا غلام بنا ہوا ہے، اگر اس کو یہ چیزیں مل جاتی ہیں تو خوش رہتا ہے اور اگر نہیں ملتی تو ناراض رہتا ہے۔

افادات:- اس روایت میں نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کا مزاج بتلایا ہے کہ پیسہ آیا تو اللہ کا شکر ادا کریں گے کہ اللہ میاں کی نظر کرم ہے۔ گویا اس کی نظر کرم کو ایک ہی چیز (صرف پیسہ) میں محدود کردی۔ اگر کسی پاس دو پیسے آگئے تو اس کو تعبیر ہی اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ میاں نے ہاتھ پکڑلیا۔ نعوذ باللہ گویا کہنا چاہتے ہیں کہ اب تک بے یار و مدد گار تھا۔ تو حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ان کو پیسہ ملے، دینار و درہم ملے؛ مطلب یہ ہے کہ کچھ ملے تو اللہ تعالیٰ سے خوش ہوتے ہیں اور نہ ملے تو ناراض ہوجاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی شکایت کرتے ہیں کہ میرا تو یہ حال ہے، میری تو یہ مصیبت ہے، حالاں کہ ایک بندہ کا مزاج ایسا نہیں ہونا چاہیے، دراصل یہ سب باتیں دنیا کی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لباس

حدیث ۴۶۹

وعنه قَالَ:لَقَدْ رَأَيْتُ سَبْعِيْنَ مِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ، مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَاءٌ : إِمَّا إِزَارٌ، وَإِمَّا كِسَاءٌ، قَدْرَبَطُوافِيْ أَعْنَاقِهِمْ،فَمِنْهامَايَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ،وَمِنْهَا مَايَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ،فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهِ كَرَاهِيَةَ أَنْ تُرَى عَوْرَتُهُ۔

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) ہی کی ایک روایت ہے کہ اہلِ صفہ میں سے ستر آدمیوں کو میں نے ایسی حالت میں دیکھاکہ ان میں سے کسی کے پاس ”رِداء“ یعنی اوپر کا حصہ ڈھانپنے والی چادرتو تھی ہی نہیں۔بہت سے بہت ان کے پاس نیچے کا حصہ ڈھانپنے والی چادر تھی۔اور بہت سے تووہ تھے جن کے پاس ایک کملی ہوتی تھی اسی کو اس طرح لپیٹ کراوپر سے کانٹے لگا کر باندھ دیتے تھے کہ ستر چھپ جاتاتھا۔ اور بہت سے وہ تھے جن کی چادرتوصرف گھٹنوں تک آتی تھی۔ اور بعض وہ تھے جن کی چادرٹخنوں تک آتی تھی،اس کے آگے والے حصے کو اپنے ہاتھوں میں پکڑے رہتے تھے تاکہ کہیں ستر نہ کھل جائے۔

افادات:- صفہ مسجدِ نبوی کے اندرایک چبوترہ ہے ،مسجد نبوی کے اندر باب جبرئیل سے جب داخل ہوتے ہیں تودائیں طرف ہے۔نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں بعض صحابہ وہ تھے جنھوں نے علم حاصل کرنے اور نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات کو سننے کے لئے اپنے آپ کو فارغ کردیا تھا، ان کی نہ تو بیوی تھی،نہ بال بچے تھے؛وہ تنہا رہتے تھے۔آج کل کے حساب سے طلبۂ علم تھے۔ان کی قیام گاہ وہی چبوترہ ہوتا تھا، وہیں رہنا،وہیں سونا؛انہیں کو عربی زبان میں ”أَهْلُ الصُّفَّة“ کہتے ہیں ،اردوزبان میں ”چبوترہ والے “ ترجمہ ہوگا۔تووہ لوگ وہاں رہتے تھے، اس پر رہنے والوں اور علم حاصل کرنے میں مشغول رہنے والوں

کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی،جیسے ہمارے یہاں مدرسوں میں بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے،تو یہ حضور(ﷺ) کا مدرسہ تھا جہاں تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔

اوراس زمانہ میں عام طورپرسلاہوالباس پہننے کے بجائے دوچادریں استعمال کرنے کا رواج تھا۔بدن کے نچلے حصہ کو ڈھانپنے کے لئے جوچادرہوتی تھی اس کوعربی میں ”اِزَارٌ“ کہتے ہیں ۔اور بدن کے اوپر والے حصہ کو ڈھانپنے کے لئے اچھی نقشی دار چادر ہوا کرتی تھی ،اسی کو”رِدَآءٌ“ کہتے ہیں۔

گویاصحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) کےلباس کا یہ حال تھاکہ لباس کے طورپرایک ہی چادر ہوتی تھی، دوسری چادر بھی نہیں ہوتی تھی۔بعض کے پاس فقط لنگی ہوتی تھی،اوپرکاحصہ ننگا رہتا تھا، اسی چادرکو اپنی گردن میں باندھ دیتے تھے۔کسی کی آدھی پنڈلی تک پہنچتی تھی، کسی کی ٹخنوں تک پہنچتی تھی۔ان حضرات کایہ حال تھا،لیکن اس پران کو کوئی افسوس وغم نہیں ہوتاتھاکہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے، اس کی تو فکر ہی نہیں ، ان کے پیش نظر تو صرف آخرت تھی۔

قیدخانہ اورجنت

حدیث ۴۷۰

وعنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللہِ(ﷺ):اَلدُّنْیَاسِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) ہی کی روایت ہے کہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے، اور کافر کے لیے جنت ہے۔

افادات:- دیکھو! قید خانہ میں کیسی زندگی گزرتی ہے کہ آدمی کو اُس میں رہنے کی تمنا نہیں ہوتی، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس بات کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے کہ اپنی ضرورتیں کم سے کم میں پوری کرے ؛ تاکہ دنیا میں جی لگنے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

بعض حضرات اشکال بھی کرتے ہیں کہ بعض مومنین کو دیکھتے ہیں کہ بہت اچھی مالی حالت میں اور راحت وآرام میں ہوتے ہیں، اور بعض کافروں کو دیکھتے ہیں کہ جسم کے اوپر لباس بھی نہیں ہوتا۔ تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ حدیث میں ایک عام اندازہ بتلایا گیا ہے کہ عموماً مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ مومن کو آخرت میں جنت کے اندر جو ملنے والا ہے اس کے مقابلہ میں یہاں اس کو ساری دنیا کی راحتیں ملی ہوں ؛ تب بھی وہاں کے مقابلہ میں یہ سب قید خانہ ہی ہے۔ اور کافر کو وہاں جو سزائیں ہونے والی ہیں ، کفر پر جو عذاب ہونے والا ہے، اس کے مقابلہ میں چاہے یہاں بھوکے مرتا ہو؛ تب بھی یہ دنیا جنت ہے۔

نادر مثال

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ دیکھو! ایک پرندہ پنجرہ کے اندر ہے، اور اس جیسے دوسرے پرندے باہر باغ کے اندر ہیں اور وہ پنجرہ اسی باغ کے اندر رکھا ہوا ہے۔ تو اس کے حق میں یہ قید ہے کہ ہمجولیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ باغ میں گھوم پھر رہے ہیں اور وہ اندر بند ہے، چاہے اس پنجرہ کے اندر اس کو کتنی ہی اچھی غذا کھانا پانی وغیرہ کیوں نہ دیا جاتا ہو، پھر بھی وہ پنجرہ اس کے حق میں قید خانہ کہلائے گا، وہ دیکھ رہا ہے کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اس کو یہ ملنے والا ہے۔

اس کے برخلاف ایک پرندہ وہ ہے جو پنجرہ میں ہے، اس کو پانی بھی نہیں مل رہا ہے، اور دانہ بھی نہیں مل رہا ہے، لیکن باہر شکاری چھری لے کر کھڑا ہے کہ باہر نکلے تو اس کو ذبح کرے ، تو اب چاہے اس کو یہاں دانہ بھی نہ ملتا ہو، پانی بھی نہ ملتا ہو؛ تب بھی وہ یہ سوچتا ہے کہ کوئی مجھے اندر سے نہ نکالے تو اچھا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو کہا گیا کہ مومن کے حق میں یہ قید خانہ ہے اور کافر کے حق میں جنت ہے اس میں کوئی اشکال نہیں ہے، آخرت کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو یہ بات سو فیصد درست ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۲/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۱۹/فروری ۲۰۰۰ء

یہ باب زہد فی الدنیا کا چل رہا تھا کہ آدمی اپنے دل میں دنیا کی محبت نہ رکھے بلکہ اس سے بے رغبتی ہو، اس سلسلہ میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کئی آیتیں بھی پیش کی تھیں اور بہت ساری روایتیں بھی پیش کرنے کا اہتمام کیا ہے، وہی سلسلہ چل رہا ہے۔

دنیا میں اس طرح رہو

حدیث ۴۷۱

وعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) قَالَ أَخَذَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) بِمَنْكِبِيَّ ۔ فَقَالَ : كُنْ فِي الدُّنْيا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ، أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ۔

وَكَانَ ابنُ عمرَ يَقُوْلُ: إِذَا أَمْسَيْتَ فَلاَ تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلاَ تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ وَخُذْ مِنْ صِحَّتِكَ لِمَرَضِكَ، وَمِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ۔

قَالُوا فِيْ شَرْحِ هٰذَا الْحَدِيْثِ مَعْنَاهُ: لاَتَرْكَنْ إِلَى الدُّنْيَا وَلاَ تَتَّخِذْهَا وَطَناً، وَلاَتُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِطُوْلِ الْبَقَاءِ فِيْهَا، وَلاَبِالْإِعْتِنَاءِ بِهَا، وَلاَتَتَعَلَّقْ مِنْهَا إِلاَّ بِمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ الْغَرِيْبُ فِيْ غَيْرِ وَطَنِهِ، وَلاَتَشْتَغِلْ فِيْهَا بِمَا لاَيَشْتَغِلُ بِهِ الْغَرِيْبُ الَّذِيْ يُرِيْدُ الذَّهَابَ إِلَى أَهْلِهِ۔

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ نبیؐ کریم(ﷺ)نے میرے دونوں مونڈھوں کو پکڑ کر ارشاد فرمایا: دنیا میں اس طرح رہو جیسے پردیسی، یا راستہ چلنے والا رہتا ہے

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ جب شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اور اپنی تندرستی میں اپنی بیماری کے لئے، اور اپنی زندگی میں اپنی موت کے لئے توشہ حاصل کرلو۔

افادات:-کوئی آدمی سفر کرکے دوسری جگہ جاتاہے اور وہاں اس کو چند روز قیام کرنا مقصود ہوتا ہے تو عیش و آرام اور راحت کا زیادہ سامان جمع نہیں کرتا، جو تکلیف آتی ہے اس کو برداشت کرتاہے اور یہ سوچتاہے کہ مجھے یہاں کتنے روز رہنا ہے، دوچار روز کے بعد تو میرا یہاں سے واپسی کا نظام بناہوا ہے، اور یہ میرا وطن نہیں ہے، لہٰذا اپنے لئے کوئی مکان بنانے کی فکر نہیں کرتا، نہ کوئی ایسی تدبیر کرتاہے جو اس بات پر دلالت کرنے والی ہو کہ وہ یہاں مستقل قیام کرنے والاہے۔ جیسے پردیسی آدمی پردیس میں رہتاہے تو وہاں جی نہیں لگاتا، اور نہ وہ وہاں اپنے لئے عیش و آرام کے سامان مہیا کرنے کی فکر کرتا ہے، بلکہ پردیس میں جس مقصد کے لئے آناہوا ہے وہ اپنے اسی مقصد کو حاصل کرنے کی طرف زیادہ تر توجہ لگایاکرتا ہے۔

جیسے آپ بمبئی کسی کام کی غرض سے گئے ہوں تو وہاں آپ اپنے لئے راحت و آرام کی فکر نہیں کریں گے، بلکہ جس مقصد کو لے کر گئے ہیں، آپ کی پوری کوشش یہی ہوتی

ہے کہ میں اپنے اس مقصد کو پورے طور پر حاصل کرلوں۔ تو اسی طرح دنیا میں انسان کی آمد آخرت کی تیاری کے لئے ہوئی ہے، دنیا ہمارا مستقل گھر نہیں ہے، ہماری حیثیت یہاں ایک پر دیسی کی ہے۔

جیسے راہ گیر

بلکہ مزید ترقی کرتے ہوئے ایک قدم اور آگے کی بات نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمائی کہ: راستہ چلتا ہوا مسافر ہوتا ہے۔ یعنی پردیس میں جب کوئی آدمی جاتا ہے تو وہاں تو چند روز رہتا بھی ہے، لہذا وہ تھوڑا بہت اہتمام تو کرتا ہے۔ لیکن ایک آدمی کا سفر جاری ہے، راستہ چل رہا ہے، تو اب اگر راستہ چلتے چلتے کبھی تھکن بھی محسوس ہوئی، تو تھوڑی دیر کے لئے کسی درخت کے نیچے کھڑا ہو جائے گا، یا چند منٹ کے لئے کہیں بیٹھ جائے گا، اور پھر آگے سفر پر بڑھ جائے گا۔ وہ اتنا بھی اہتمام نہیں کرتا جیسا کہ ایک پردیسی پردیس میں چند روز قیام کے دوران کرتا ہے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس ارشاد کے ذریعہ سے ہم کو متوجہ کیا کہ یہاں اپنے لئے راحت و آرام کے کوئی زیادہ اسباب اور سامان مہیا کرنے کے بجائے آخرت کی تیاری میں لگنا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرمایا کرتے تھے کہ جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ اور یہ بات بھی اپنی جگہ سو فیصد صحیح ہے کہ کوئی گارنٹی نہیں کہ ہم صبح تک زندہ رہیں گے یا نہیں! تو پھر کیوں ہم اپنے لئے کل

صبح تک کا پروگرام بھی بنائیں ،ایسی تیاری کیوں نہ کرلیں کہ ابھی بلاوا آجائے تو ہم اس کے لئے تیار ہوں۔

اعمال کیے بغیر ثواب

اورفرماتے ہیں کہ:اپنی تندرستی میں اپنی بیماری کے لئے، اوراپنی زندگی میں اپنی موت کے لئےتوشہ حاصل کرلو۔یعنی آدمی کے ساتھ تندرستی اور بیماری لگی ہوئی ہے تو اب اس بات کااہتمام کرلےکہ تندرستی کے زمانہ میں اعمال کا ایسا اہتمام کرے کہ اگر بیماری کی وجہ سے ان اعمال اور معمولات میں کمی بھی آگئی تو تندرستی کے زمانہ میں اس نے جوکام انجام دئے تھے اس سے اس کا کام چلتا رہے۔اس لیے کہ ایک حدیث میں ہےکہ آدمی تندرستی کے زمانہ میں جن اعمال کا اہتمام کرتا ہے، اگر بیماری کی وجہ سے وہ ان اعمال کو انجام نہیں دے سکتا تواللہ تعالیٰ بغیرکئے ہی ان اعمال کا ثواب دیا کرتے ہیں (الادب المفرد،۵۰۰)جیسے آدمی جب کماتا ہے تو اس میں بھی اس بات کا خیال رکھتا ہے کہ بیماری آجائے توکام چل جائے،اس لئے اتنا کماتا ہے کہ بیماری کے زمانہ میں بھی اگراس کو کام کرنے یا کاروبار کا موقعہ نہ ملے تو یہ کمائی اس کے لئے کافی ہو۔اوراپنی زندگی میں موت کے لئے تیاری کرلے اورچوں کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے اس لیے آدمی کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

دنیا کا قیام

علماء فرماتے ہیں کہ ہمارا یہاں قیام اتنا ہی ہے جتنا وقت اذان کہنے کے بعد اقامت کا ہوا کرتا ہے، بلکہ اذان و اقامت کے بعد نماز شروع کرنے کے درمیان ہوا کرتا ہے۔ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو ایک کان میں اذان اور دوسرے کان میں اقامت کہی جاتی ہے، گویا جنازے کی نماز کی تیاری ہو چکی ہے، اب بس نماز و اقامت کے درمیان جتنا فاصلہ ہوتا ہے اتنے ہی فاصلہ کے بقدر ہمارا دنیا کے اندر قیام ہے، اس لئے آدمی کو یہاں اپنے واسطے راحت و آرام کے زیادہ اسباب یا سازو سامان کو مہیا کرنے کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس حدیث کی شرح میں علماء کا کلام نقل کیا ہے کہ دنیا کی طرف مائل نہ ہو، اس کی طرف دل نہ لگاؤ، اس کو اپنا وطن نہ بناؤ۔

اور یہ جو فرمایا تھا کہ جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو، اور شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، گویا آدمی کو اپنے دل میں یہ چیز سوچنی ہی نہیں چاہیے کہ یہاں زندہ رہنا اور دیر تک قیام کرنا ہے۔ آدمی ایسے پروگرام نہ بنائے کہ ایک مہینہ کے بعد یوں کریں گے، اور اتنے دنوں کے بعد یوں کریں گے، اس طرح پروگرام بنا کر گویا اپنے آپ کو زندگی کی اُمید دلا رہا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ آدمی کو چاہیے کہ ہر وقت تیار رہے یعنی دنیا میں باقی رہنے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ ہو، دنیا کے ساتھ تمہارا رشتہ اور تعلق اتنا ہی ہو جتنا ایک پردیسی کا پردیس کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

محبوب بننے کا نسخہ

حدیث ۴۷۲

وعن ابی العباس سهل بن سعد الساعدی (رضی اللہ عنہ) قَالَ: جَآءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِی (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ! دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ أَحَبَّنِيَ اللّٰهُ وَأَحَبَّنِي النَّاسُ. فَقَالَ: ازْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبَّكَ اللّٰهُ، وَازْهَدْ فِيمَا عِنْدَ النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ (حديث حسن، رواه ابن ماجه وغيره بأَسَانِيدَ حَسَنَةٍ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد ساعدی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے آکر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں کہ جب میں اس کو کرلوں تو اللہ تعالیٰ بھی مجھ سے محبت رکھے اور لوگ بھی مجھ سے محبت کریں؟ (گویا میں اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بھی محبوب بن جاؤں اور لوگوں کی نگاہوں میں بھی محبوب بن جاؤں) تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: دنیا سے بے رغبتی اختیار کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے۔ اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس سے بے رغبتی برتو، تو لوگ بھی تم سے محبت کریں گے۔

افادات:- دنیا کی محبت اگر آپ دل میں سے نکال لو، اور دنیا سے بے رغبتی برتو؛ تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے، اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے رغبتی برتو؛ تو لوگ تم سے محبت کریں گے۔ کسی کے ساتھ آدمی کا کیسا ہی تعلق کیوں نہ ہو، لیکن جہاں کوئی مطالبہ اس کے سامنے کیا گیا تو سالہا سال کے تعلق کے اوپر پانی پھر جاتا ہے اس لیے لوگوں کے پاس جو مال ودولت ہے، آدمی اگر اپنے آپ کو اس کی طرف سے بے رغبت

بنالے گا، تووہ یوں سمجھیں گے کہ اس کو میرے مال کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں ہے، اور پھر وہ کوئی خطرہ بھی محسوس نہیں کریں گے اور آپکے ساتھ محبت اور تعلق بھی رکھیں گے۔

اس روایت میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بننے کا آسان نسخہ بتلایاہے کہ آدمی دنیا کی محبت دل میں نہ رکھے۔اور لوگوں کے نزدیک محبوب بننے کا بھی بڑا آسان نسخہ بتلایا کہ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے، اس کی طمع و لالچ تمہارے دل میں نہیں ہونی چاہیے۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی فقیری

حدیث ۴۷۳

وعن النعمان بن بشير (رضی اللہ عنہ) قَالَ: ذَكَرَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (رضی اللہ عنہ) مَا أَصَابَ النَّاسُ مِنَ الدُّنْيَا، فَقَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَظَلُّ الْيَوْمَ يَلْتَوِيْ مَا يَجِدُ مِنَ الدَّقَلِ مَا يَمْلَأُ بِهِ بَطْنَهُ۔ (رواه مسلم)

(الدَّقَلُ) بِفَتْحِ الدَّالِ الْمُهْمَلَةِ وَالْقَافِ: رَدِيْءُ التَّمْرِ۔

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے لوگوں کے پاس دنیا کے مال و دولت کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا کہ دن بھر آپ اپنے پیٹ کو فاقہ سے لپیٹے رہتے تھے، اور آپ کو گھٹیا قسم کی کھجور بھی اتنی میسر نہیں ہوتی تھی کہ اس کے ذریعہ سے آپ اپنا شکم مبارک (پیٹ) بھر سکیں۔

گھٹیا قسم کی کھجور جو سوکھ جاتی ہے اس کو ”دقل“ کہتے ہیں۔

افادات:- چوں کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت میں بڑے بڑے ممالک فتح ہوئے جس کی وجہ سے مالِ غنیمت سے مسلمانوں کے پاس خوب دولت آئی اور مال کی ریل پیل ہوئی۔ اس کا ذکر کرکے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) یہ فرمانے لگے کہ آج لوگوں کے پاس مال ودولت کی یہ حالت ہے۔

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر کا حال

حدیث ۴۷۴

وَعَنْ عائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: تُوُفِّيَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)، وَمَا فِي بَيْتِي مِنْ شَيْءٍ يَأْكُلُ ذُو كَبِدٍ إِلاَّ شَطْرُ شَعِيرٍ فِي رَفٍّ لِي، فَأَكَلْتُ مِنْهُ حَتّٰى طَالَ عَلَيَّ، فَكِلْتُهُ فَفَنِيَ۔ (متفق عليه)

قَوْلُهَا: (شَطْرُ شَعِيرٍ) أَيْ: شَيْءٌ مِنْ شَعِيرٍ، كَذَا فَسَّرَهُ التِّرْمِذِيُّ۔

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انتقال ایسی حالت میں ہوا کہ میرے مکان میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کو کوئی جاندار کھاسکے، سوائے تھوڑے سے جَو کے، جو ایک الگنی میں رکھے ہوئے تھے، میں اس میں سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد بھی برابر کھاتی رہی، یہاں تک کہ جب اس پر طویل زمانہ گزرا تو میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اب کتنے رہ گئے ہیں اس کو ناپا۔ بس! پھر (اس میں سے برکت ختم ہوگئی اور) وہ جو ختم ہوگئے۔

افادات:- یہاں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس کھانے پینے کی کوئی فراوانی نہیں تھی، اور جیسا کہ پہلے آچکا کہ اگر آپ (ﷺ) چاہتے تو یہ چیز بھی آپ کو حاصل ہوجاتی لیکن آپ نے اپنے لئے اسی چیز کو پسند کیا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کا ترکہ

حدیث ۴۷۵

وعن عمروبن الحارث أُخِي جُوَيْرِيَّةَ بِنْتِ الحَارِثِ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ: مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) عِنْدَ مَوْتِه دِيْنَاراً وَلاَ دِرْهَماً، وَلاَ عَبْداً وَلاَ أَمَةً، وَلاَ شَيْئاً إِلاَّ بَغْلَتَهُ الْبَيْضَاءَ الَّتِيْ كَانَ يَرْكَبُهَا، وَسِلاَحَهُ وَأَرْضاً جَعَلَهَا لِابْنِ السَّبِيْلِ صَدَقَةً۔

ترجمہ:- حضرت عمروبن حارث (رضی اللہ عنہ) جو اُم المؤمنین حضرت جویریہ (رضی اللہ عنہا) کے بھائی ہیں، فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنی موت کے وقت نہ تو کوئی سونے کا سکہ چھوڑا، نہ چاندی کا، نہ کوئی غلام، نہ باندی، نہ کوئی اور چیز، سوائے آپ کا سفید خچر جس پر آپ سواری فرماتے تھے، اور آپ کے ہتھیار، اور ایک زمین جس کی آمدنی آپ نے مسافروں کے لئے وقف فرمائی تھی۔

افادات:- اور اس میں سے بچی ہوئی آمدنی کو مسلمانوں کی ضرورتوں پر خرچ کرتے تھے۔ اور جو زمین آپ نے چھوڑی تھی اس کو بھی آپ نے اپنے بعد مسافروں کے لیے وقف کردی تھی۔ اس لیے آدمی یہ نہ سوچے کہ میں دنیا سے ایسی حالت میں جا رہا ہوں

کہ اپنے بال بچوں کے لئے میں نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔عام طور پر آدمی یہ بھی سوچ کر زیادہ دنیا حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔حالاں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے پیچھے کوئی مال و دولت نہیں چھوڑی،اگر یہ مطلوب اور پسندیدہ چیز ہوتی تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ایسا ضرور کرتے۔

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے احوال

حدیث ۴۷۶

وعن خَبابِ بن ٱلأَرَتِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: هَاجَرْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) نَلْتَمِسُ وَجْهَ اللهِ تَعَالیٰ، فَوَقَعَ أَجْرُنَا عَلَى اللهِ، فَمِنَّا مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَأْكُلْ مِنْ أَجْرِهِ شَيْئاً، مِنْهُمْ: مُصْعَبُ بْنُ عُمَيْرٍ (رضی اللہ عنہ) قُتِلَ يَوْمَ أُحُدَ، وَتَرَكَ نَمِرَةً، فَكُنَّا إِذَا غَطَّيْنَا بِهَا رَأْسَه، بَدَتْ رِجْلَاهُ، وَإِذَا غَطِّيْنَا بِهَا رِجْلَيْهِ بَدَا رَأْسُهُ، فَأَمَرَنَا رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) أَنْ نُغَطِّي رَأْسَهُ، وَنَجْعَلُ عَلَى رِجْلَيْهِ شَيْئاً مِنَ الإِذْخِرِ، وَمِنَّا مَنْ أَيْنَعَتْ لَهُ ثَمَرَتُهُ، فَهُوَ يَهْدِبُهَا

(النَّمِرَةُ): كِساءٌ مُلَوَّنٌ مِنْ صُوْف۔ وَقَوْلُه: (أَيْنَعَتْ) أَيْ: نَضِجَتْ و أُدْرِكَتْ۔ وقولُهُ: (يَهْدِبُهَا) هُوَ بِفَتْحِ الْيَاءِ وَضَمِّ الدَّالِ وَكَسْرِهَا لُغَتَانِ: أَيْ: يَقْطُفُهَا وَيَجْتَنِيهَا، وَهَذِهِ اسْتِعَارَةٌ لِمَا فَتَحَ اللهُ تَعَالىٰ عَلَيْهِمْ مِنَ الدُّنْيَا وَتَمَكَّنُوا فِيهَا۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت خباب بن الارت (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہجرت کی (مکہ مکرمہ چھوڑ کر مدینہ منورہ آئے) اور اپنے اس عملِ ہجرت سے خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی طلب کررہے تھے، اس لیے ہمارے اس عمل کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں یقینی ہے۔پس ہم میں سے بعض تو ایسی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے کہ انہوں نے اپنے اس نیک عمل کا اجر و

بدلہ دنیا میں نہیں لیا، انہی میں سے حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہ) ہیں کہ جنگِ اُحد میں شہید ہوئے اور انہوں نے رنگین قسم کی ایک چادر چھوڑی تھی، اور وہ بھی اتنی چھوٹی تھی کہ جب اس میں ان کو کفن دیا گیا تو اگر ان کے سر کو چھپایا جاتا تھا تو پاؤں کھل جاتے تھے، اور پاؤں چھپایا جاتا تو سر کھل جاتا تھا۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ سر کو چھپا لو اور پاؤں کو ڈھانپنے کے لئے گھاس ڈال دیا گیا۔ اور ہم میں سے بعض وہ ہیں جن کے پھل پک گئے تو وہ ان کو استعمال کر رہے ہیں (یعنی دنیا میں انہوں نے ایسا زمانہ پایا کہ ان کے نیک عمل کا بدلہ دنیا میں بھی کچھ ان کو مل گیا، چنانچہ جن حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے فتوحات کا زمانہ پایا اور ان کے پاس مال غنیمت میں بہت ساری دولت آئی، لیکن حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہ) دولت کے آنے کو اپنے لیے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔)

دنیا کی قدر وقیمت

حدیث ۴۷۷

وعن سھلِ بن الساعدی (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): لَوْكَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَاللهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَاسَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ.

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد ساعدی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اگر دنیا کی قدر وقیمت اللہ تعالیٰ کے یہاں مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔

افادات:- اس لیے اگر کسی کو دنیا کا مال اور عیش و آرام کی چیزیں میسر نہیں ہیں تو اس کی وجہ سے دل گرفتہ اور رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ اپنی خصوصی توجہ آخرت کی طرف کرے۔

دنیا ملعون ہے

حدیث ۴۷۸

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ: أَلَا إِنَّ الدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ مَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا إِلَّا ذِكْرَ اللهِ تَعَالَى، وَمَا وَالَاهُ وعَالِماً وَمُتَعَلِّماً (رواه الترمذي وقال: حديث حسنٌ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ دنیا ملعون ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ہے) اور جو کچھ بھی دنیا میں ساز و سامان ہے وہ سب بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، البتہ اللہ کا ذکر اور وہ تمام چیزیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر سے قریب کرنے والی ہیں، اور علم سکھانے والا اور علم سیکھنے والا (اس سے مستثنیٰ ہیں۔)

افادات:-اس روایت کو لاکر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جس کے ذریعہ سے آدمی اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے؛ اس کو دنیا کا حصہ قرار نہیں دیا جائے گا اسی لیے بزرگوں کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ہر وہ چیز جو تم کو تمہارے رب سے غافل کردے وہ تمہاری دنیا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی دنیا کی بقدر ضرورت چیزیں اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑے بغیر

حاصل کرتا ہے، اوران سے اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں مدد حاصل کرتا ہے تواُس کو دنیا میں شمار نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ تووہ چیز ہے جو اللہ کے ذکراور اس کی یاد سے قریب کرنے والی ہے۔ اللہ کی یاد اور ہر وہ چیز جو اللہ کی یاد سے قریب کرنے والی ہو؛ وہ دنیا کا حصہ قرار نہیں دیا گیا۔

اب اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے مطابق دولت کمائی یعنی کمانے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہیں کیا جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کاموجب ہو، اور پھر اُس کو خرچ کرنے کاجب وقت آیا تو وہاں بھی کوئی ایسا اندازاختیار نہیں کیاجو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ہو، بلکہ انہی چیزوں میں خرچ کیا جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے، اس صورت میں چاہے وہ کتنی ہی بڑی مقدار کیوں نہ ہو، اس کودنیا میں شمار نہیں کیا جائے گا، اور ایک آدمی تھوڑی سی چیز حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے احکام توڑتا ہے، یااس کواستعمال اس طرح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے، تو وہ بھی دنیا میں داخل ہے اوروہ اس وعید کا حق دار بنے گا۔

بتلانایہ چاہتے ہیں کہ وہ تمام چیزیں اورکام جو آدمی کواللہ تعالیٰ کی یاد سے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق سے دور کردیں، وہ تمام دنیا کہلائیں گے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

جائیداد مت بناؤ

حدیث ۴۷۹

وَعَن عَبدِاللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ)قَالَ قَالَ رَسُولُ اللہ(صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) : لَا تَتَّخِذُوا الضَّيْعَةَ فَتَرْغَبُوا فِي الدُّنْيَا۔ (رَوَاهُ الترمذی،وَقَالَ:حدیث حسنٌ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم(صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) نے ارشاد فرمایا: جائیداد مت بناؤ؛ورنہ (دل میں)دنیا کی محبت پیدا ہوگی۔

افادات:-"ضَيْعَة"یعنی غیر منقول جائیداد۔ایسی چیز جواپنی جگہ پر رہنے والی ہے، مثلاً مکان بنایا،دوکان بنائی، فیکٹری لگائی،پلاٹ خریدا؛یہ سب"ضَيْعَة" کہلاتی ہے۔تو نبیٔ کریم (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ) نے فرمایا کہ یہ چیزیں مت بساؤ،اس لئے کہ اس کے نتیجے میں آدمی کا دل دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے۔

چوں کہ یہ باب زہد کے بارے میں قائم کیا گیا تھا کہ دنیا کی محبت دل میں نہ ہو، اس لیے ایسی تمام چیزیں جو دنیا کی محبت پیدا کرنے والی ہیں ان کو اختیار کرنے سے بھی نبیٔ کریم (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ)نے منع فرمایاہے۔اگر آدمی ایسی چیزیں اپنی ضرورت کے مطابق اختیار کرتا ہے توضرورت کی حد تک ہی اختیار کرے ،لیکن اس میں ایسا کوئی اندازاختیار نہ کرے جس

کے نتیجے میں اُس کا دل دنیا میں مشغول ہو۔بس !ضرورت کی حدتک اس کو برتے، لیکن دل اُس میں نہ لگائے، بلکہ دل تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی لگائے۔

موت اس سے جلد دیکھتا ہوں

حدیث ۴۸۰

عَنْ عَبْدِاللہِ بْنِ عَمروبن العاص (رضی اللہ عنہ) قَالَ : مَرَّ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللہِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَنَحْنُ نُعَالِجُ خُصًّا لَنَا فَقَالَ: مَا هٰذَا ؟ فَقُلْنَا: قَدْ وَهٰى فَنَحْنُ نُصْلِحُهُ فَقَالَ: مَا أَرَى الْأَمْرَ إِلَّا أَعْجَلَ مِنْ ذٰلِكَ (رواہ ابوداؤد والترمذی بأسناد البخاری ومسلم)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم اپنے جھونپڑے کی مرمت کر رہے تھے، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا وہاں سے گزر ہوا تو پوچھا: کیا کررہے ہو؟ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ جھونپڑا کمزور ہو گیا ہے اور ٹوٹ چکا ہے، ہم اس کی مرمت کررہے ہیں۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: میں موت کا معاملہ اس سے جلد دیکھتا ہوں۔

افادات :-آدمی مکان کی مرمت اسی لئے کرتا ہے کہ مرمت کرنے کے بعد اس میں رہائش اختیار کرے گا، تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ موت کب آتی ہے اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ جھونپڑا درست کررہے ہیں اسی درمیان موت آجائے، یا جھونپڑا درست کرنے کے بعد اس جھونپڑے سے فائدہ اُٹھانے سے پہلے ہی موت آجائے۔ تو جو چیز جلد آنے والی ہے اس کی تیاری کی طرف دھیان پہلے دینا چاہیے۔

ذہن کی گردش

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جب مکان، دوکان یا فیکٹری بناتا ہے، یا ایسی چیزیں جو جائیداد کے قبیل سے ہوتی ہیں، ان کو بساتا ہے تو اس دوران آدمی کا ذہن اُدھر ہی چلتا ہے، اور اس تعمیر کے دوران طبیعت دھیرے دھیرے آخرت سے ہٹ کر دنیا کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ مثلاً فیکٹری بناتا ہے تو پورا ایک پروگرام اس کے ذہن میں چلتا ہے کہ ابھی تو فیکٹری بن رہی ہے، پھر اس کی مشینری لاؤں گا، پھر اس کے اندر پاور آئے گا، پھر اس کے اندر کام کاج شروع ہوگا، اس کا پروڈکشن ہوگا، پھر میں اس کی مارکیٹنگ کروں گا تو اتنا نفع ہوگا، پھر اس میں اتنی ترقی ہوگی وغیرہ۔ تو کتنے لمبے زمانہ کا پروگرام اور کتنا لمبا چوڑا پروسیجر (Procedure) سامنے ہے اور اسی کو وہ برابر سوچ رہا ہے۔ فیکٹری بنانے کا پلان اور اس کی ساری چیزیں ہمیشہ اس کے ذہن میں گردش کرتی رہتی ہیں، ایسا تو ہے نہیں کہ کسی وقت آئی اور نکل گئی، بلکہ اس کا ذہن اُدھر ہی چلتا ہے اور یہی سوچتا رہتا ہے، اور سوچتے سوچتے اس کا جی ادھر ہی لگ جاتا ہے، اور جو اصل مقصود تھا اور جدھر توجہ کرنی چاہیے تھی، اُدھر توجہ باقی نہیں رہتی۔ یہی حال مکان کی تعمیر کا ہوتا ہے، اور یہی حال دوکان کے کاروبار کا ہوتا ہے۔

مقصد سے توجہ نہ ہٹے

اس روایت میں بات تو جھونپڑے کی ہے، اور نیا جھونپڑا بھی نہیں بنارہے تھے، یا ایسا بھی نہیں تھا کہ جو بنا ہوا تھا اس کو گرا کر نیا بنارہے تھے، بلکہ ٹوٹے ہوئے جھونپڑے کی مرمت کی جارہی تھی۔ وہ کوئی فلیٹ تعمیر نہیں کررہے تھے، کوئی بنگلہ نہیں بنا رہے تھے۔ حدیث کے الفاظ موجود ہیں "خُصًّا لَنَا" اے اللہ کے رسول! ہمارا جھونپڑا ٹوٹ گیا ہے، اس کی مرمت کررہے ہیں۔ لیکن یہ مرمت ایسی چیز ہے کہ ہوسکتا تھا اس کے دوران آدمی یہ سوچنے لگ جائے کہ ذرا اچھی مرمت کریں تاکہ ایک سال تو چلے۔ تو گویا ایک سال تک کے لئے وہ اپنے ذہن سے اپنا ویزا تو بڑھوا ہی رہا ہے، اور اپنی سمجھ سے گویا وہ یوں سوچ رہا ہے کہ مجھے اب ایک سال تو دنیا میں رہنا ہی ہے، اس لیے نبیٔ کریم ﷺ اُن کو متوجہ فرمارہے ہیں کہ معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی کا ہے، یعنی تم تو یہ سمجھ کر جھونپڑے کی مرمت کرتے ہو کہ ذرا ٹھیک کرلیں تاکہ سال دو سال چل جائے گا۔ تو یہ سال دو سال کا تم کیوں سوچ رہے ہو؟ یہ مرمت کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ تم نے اپنے لئے بہت کچھ آگے سوچ لیا ہے۔ چھ مہینے سوچا، یا سال دو سال سوچا۔ جھونپڑا تو ایک سال تک کا معاملہ ہے کہ ابھی یہ بارش کا زمانہ نکل جاوے اور آئندہ بارش تک چلے، اور فیکٹری تو بہت کچھ سوچواتی ہے۔ تو نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں: "مَا أَرَى الْأَمْرَ إِلَّا أَعْجَلَ مِنْ ذَالِكَ"

یہ فرما کر دراصل نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی تربیت فرما رہے ہیں کہ دیکھو! یہ ٹھیک بات ہے کہ جھونپڑا ٹوٹ گیا ہے اور مرمت کی ضرورت ہے، اس لئے مرمت کر رہے ہو، لیکن مرمت کرتے وقت آدمی کو یہ چیز ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رکھنی چاہئے کہ پتہ نہیں مرمت کئے ہوئے اس جھونپڑے سے کتنا فائدہ اُٹھانے کی نوبت آتی ہے، ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے، اس کے حضور پیش ہونا ہے ، اپنی زندگی کے تمام اعمال کا جواب دینا ہے۔ اور جھونپڑا درست کرنے کے بعد پتہ نہیں اس میں رہنے کی نوبت آئے گی یا نہیں۔ اس کو ٹھیک کرنے کے دوران ایسا نہ ہو کہ اس کے ساتھ تمہارا تعلق اتنا زیادہ ہو جائے کہ تمہارا جی اسی میں لگ جائے اور تم موت کی طرف سے غافل ہو جاؤ۔ غور کیجیے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی کیسی تربیت فرماتے ہیں جہاں کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا کہ اس کی وجہ سے اس کا دل دنیا کی طرف مائل ہو رہا ہے تو اس موقعہ پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا جملہ اپنی زبان مبارک سے ارشاد فرمادیا کہ اس سے دل ہٹے اور اپنے مقصود کی طرف متوجہ ہو۔

نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا

کھانے پینے تک کی چیزوں میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس بات کا اہتمام فرماتے تھے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے، حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے وقت گھر سے باہر تشریف لائے کہ عموماً اس وقت باہر نہیں نکلتے تھے اور نہ کسی سے ملاقات

فرماتے تھے ،اتنے میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) بھی وہاں آئے،تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے ؟کیوں آئے ؟انہوں نے جواب میں عرض کیا کہ اس لیے آیا ہوں تا کہ اللہ کے رسول سے ملاقات ہوجائے اور آپ کے چہرۂ انور کا دیدار کرلوں اور آپ کو سلام کرلوں۔اتنے میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا کہ وہ بھی گھر سے باہر نکلے ہیں۔ پوچھا:کیا بات ہے؟انہوں نے کہا:اے اللہ کے رسول !بھوک کے تقاضہ سے بے چین ہوگیا اور کھانے کے لئے کچھ تھا نہیں،تو باہر نکلا ہوں۔تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:مَیں بھی بھوک محسوس کررہا ہوں۔یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی بھوک کے تقاضہ کی وجہ سے بے چین ہو کر باہر نکلے تھے۔پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ فلاں انصاری صحابی (ابوالہیثم بن التیہان) کا کھجور کا باغ ہے، چلیں!آج ان کے یہاں جائیں۔ان صحابی کی خواہش بھی تھی کہ حضور ان کے باغ میں تشریف لائیں۔تینوں وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ صحابی تو نہیں ہیں ،مگر ان کی بیوی موجود ہے۔پوچھا:تمہارے شوہر کہاں گئے؟کہا:وہ درختوں کو پانی پلارہے ہیں ،ان کو اطلاع کرائی تو وہ آئے اور حضور کو دیکھ کر آپ سے لپٹ گئے اور کہا:اے اللہ کے رسول!میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میری قسمت کہ آپ میرے یہاں تشریف لائے۔بہت خوش ہوئے اور جلدی جلدی کھجوروں کے خوشے توڑ کر لائے،اوردودھ بھی لائے اور کہا:میں بکری ذبح کرتا ہوں ۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: دیکھو !دودھ دینے والی بکری ذبح مت کرنا،اس لیے کہ اس کے دودھ کا فائدہ ختم ہوجائے گا،جو بکری دودھ نہ دیتی ہو،وہ ذبح کرنا۔انہوں نے کہا:ٹھیک ہے۔جانور ذبح کیا،گوشت پکایا اور حضور کے سامنے پیش کیا۔آپ

(ﷺ) نے تناول فرمایا، حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے بھی تناول فرمایا۔ پھر حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہی یعنی درخت کا سایہ، تازہ کھجور اور ٹھنڈا پانی، یہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں ہیں جن کے متعلق قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ﴾ کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں انہی نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔(سنن ترمذی۔ باب ماجاء فی معیشۃ اصحاب النبی (ﷺ)۔ حدیث نمبر:۲۳۶۹)

دراصل آدمی کو شدید بھوک کے تقاضے کے بعد جب کوئی چیز ملتی ہے، تو اس پر ایسا متوجہ ہوتا ہے کہ دوسری چیزوں سے غافل ہوجاتا ہے، تو نبیٔ کریم (ﷺ) یاد دلا رہے ہیں کہ دیکھو! کھانے میں مشغول ہوکر اُدھر سے دھیان نہیں ہٹنا چاہیے۔

جب ہم احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہر ایسے موقعہ پر جہاں نبیٔ کریم (ﷺ) یہ محسوس کرتے کہ دنیا کے اس کام میں لگ کر آدمی آخرت سے غافل ہوجائے گا تو آپ (ﷺ) آخرت کی طرف متوجہ کردیتے۔ ویسے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا حال بھی یہی تھا کہ نہ ان کے دلوں میں دنیا کی محبت تھی، وہ خود ہی دنیا سے بڑے بے رغبت تھے، اور جو کچھ آتا تھا ہمیشہ خرچ کرنے والے تھے، اگرچہ ان کے پاس کچھ ہوتا ہی نہیں تھا، لیکن جو تھوڑا بہت میسر آجاتا تھا، اُس پر بھی نبیٔ کریم (ﷺ) ان کی ایسی تربیت فرماتے تھے۔

عین حکمت کا تقاضہ

حضرت تھانوی(رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: لوگ تمنائیں کرتے ہیں کہ ہم بھی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں موجود ہوتے۔ حالانکہ حضراتِ صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) نے جو مجاہدے کئے اور جو مشقتیں اُٹھائی ہیں ،اور جس طرح کی قربانیاں دی ہیں، ان کا اگر ہم مطالعہ کریں تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے جس کو جس زمانہ میں پیدا کیا ہے وہ اس کی عین حکمت کا تقاضہ ہے۔ اگر ہم اُس زمانہ میں ہوتے تو معلوم نہیں کہ خدانخواستہ کس لسٹ میں نام آتا۔ اس لئے آدمی کو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور قناعت کی صفت پیدا کرنی چاہیے۔

دور کی نہ سوچے

خیر! میں یہ عرض کررہا تھا کہ جھونپڑا بناتے وقت کم سے کم آدمی کا یہ تصور ہوتا ہے کہ اس کو ایسا ٹھیک کرلوں کہ چھ مہینے چل جائے، ایک سال چل جائے۔ تو چھ مہینے اور ایک سال کا تصور جو دماغ میں آیا اس کو حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نکالنا چاہتے ہیں کہ ”میں تو معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی کا دیکھتا ہوں“ معلوم نہیں موت کب آجائے، اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ (۱) کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے رہنے کے لیے اطمینان کی رہائش دی ہے یعنی امن سے ہے، کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے (۲) اور

بدن و جسم میں عافیت ہے، یعنی کوئی مہلک بیماری نہیں ہے(۳)اور اس کے پاس کھانے کے لیے ایک دن کی روزی موجود ہے؛تو یوں سمجھو کہ اس کو ساری دنیا ملی ہوئی ہے۔ تو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی بہت آگے کی نہ سوچے۔

ایک بوڑھا تاجر اور اس کے عزائم!

آدمی جب مستقبل کی پلاننگ کرنے لگتا ہے تو ایک دو سال کی نہیں ،بلکہ سالہا سال اور صدیوں تک کی پلاننگ کر ڈالتا ہے، گویا صدیوں دنیا میں رہنا ہے،اور پھر اپنی ہی نہیں ، بلکہ اپنی آنے والی دو تین نسلوں کی فکر کر ڈالتا ہے کہ بس!اب تو مزے میں رہو۔ شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک قصہ بیان کیا ہے کہ میں ایک مرتبہ ایک تاجر کے یہاں مہمان ہوا،جب اس سے ملاقات ہوئی تو وہ کہنے لگا کہ میری تجارت فلاں ملک میں بھی ہے،اور فلاں ملک میں بھی ہے۔بہت کچھ بتانے کے بعد پھر کہنے لگا کہ بس میری ساری تمنائیں پوری ہو چکی ہیں،اب ارادہ یہ ہے کہ تجارت کی غرض سے ایک آخری سفر کرلوں۔یہاں ایران سے گندھک لے کر چین جاؤں گا،اور وہاں جا کر اس کو فروخت کروں گا، اس لئے کہ وہاں اس کی ڈیمانڈ بہت ہے،اس سے وہاں بہت منافعہ ملے گا۔پھر وہاں سے چینی برتن لے کر روم جاؤں گا،وہاں اس کو فروخت کروں گا،وہاں اس کی بڑی ڈیمانڈ ہے۔اور روم سے کپڑا لے کر ہندوستان جاؤں گا،وہاں اس کو فروخت کروں گا اس سے وہاں بہت نفع آئے گا۔ پھر ہندوستان سے فولاد خریدوں گا، وہ لے کر حلب جاؤں گا۔وہاں کا شیشہ بڑا عمدہ ہوتا ہے،اس

لئے وہاں سے شیشہ خریدوں گا، وہ لے کر یمن جاؤں گا، اس کو وہاں بیچوں گا۔ اور یمن سے یمنی چادر لاکر یہاں ایران میں بیچوں گا۔ بس! پھر ایک دوکان کھول کر اطمینان سے بیٹھ جاؤں گا۔

شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی اس وقت ہی زندگی کے آخری مرحلے میں ہے اور اتنا لمبا سفر کرنے کے بعد بھی یہ نہیں سوچتا کہ مسجد میں بیٹھوں گا، بلکہ ایک دوکان کھول کر اطمینان سے بیٹھ جاؤں گا۔ بس! میری اتنی ہی تمنا باقی ہے۔ پھر اس نے شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) سے کہا کہ تم بھی کچھ سناؤ تو شیخ نے فرمایا:

آں شنیدستی کہ در صحرائے غور ۔۔۔ بار سالارے بیفتاد از ستور
گفت چشم تنگ دنیادار را ۔۔۔ یا قناعت پر کند یا خاک گور

ترجمہ:- تم نے سنا ہے غور کے صحرا میں ایک بڑے سپہ سالار اور بڑے مالدار تاجر کا سامان ایک اونٹ پر تھا، وہ اونٹ مارے بھوک کے اِدھر گرا اور اس کا سامان اُدھر گرا، پھر اس نے ایک بات کہی کہ دنیادار کی ان تنگ نگاہوں کو یا تو قناعت بھر سکتی ہے یا پھر قبر کی مٹی۔ ورنہ آدمی کی حرص ایسی عجیب و غریب چیز ہے کہ بس وہ اپنے طور پر مال جمع کرتا ہی رہتا ہے اور اس کی حرص ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

ایک مالدار کا عبرت ناک واقعہ

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک یہودی مالدار کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بڑا مالدار آدمی تھا، اس کے پاس سونے چاندی کے ڈھیر تھے، اس نے اپنے خزانے کی چابی پر ایک نگران مقرر کر رکھا تھا جو اس کی حفاظت کرتا تھا، ایک مرتبہ اس نے سوچا کہ اس نگران دربان کا امتحان لینا چاہیے کہ وہ کہیں میرے خزانے میں خیانت تو نہیں کرتا۔ وہ رئیس خود ہی خزانے پر پہنچ گیا اور جس مکان کے اندر یہ خزانہ محفوظ تھا، اس کی چابی اس کے پاس بھی رہتی تھی، اپنی چابی سے دروازہ کھول کر اندر گیا اور دیکھا کہ سب ٹھیک ہے یا نہیں۔ اسی درمیان وہ دربان آیا تو اس نے دیکھا کہ دروازہ کھلا ہوا ہے، تو اس نے دروازہ بند کر دیا، اور تالا لگا دیا۔ اس کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اندر مالک موجود ہے۔ جب مالک صاحب دروازے کی طرف آئے تو دیکھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے، تو خوب شور مچایا اور آوازیں لگائیں، لیکن کسی نے سنی ہی نہیں۔ جب بھوک لگی تو نہ چاندی اور سونے سے بھوک مٹا سکتا تھا، نہ پیاس بجھا سکتا تھا۔ وہیں چاندی اور سونے کے ڈھیر تھے، اسی میں وہ مر گیا۔ بعد میں جب دروازہ کھولا گیا تو پتہ چلا کہ وہ مرا ہوا ہے۔

توکل پر بصیرت افروز مضمون

اب کوئی آدمی یوں کہے کہ مولوی صاحب! کسی کو اگر ایک دن کا کھانا ملے تو کیا دوسرے دن کھانا نہیں چاہیے؟ تو بھائی دیکھئے! قرآنِ کریم میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا﴾ زمین کے اندر جتنے بھی جاندار ہیں ان کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ تو جس اللہ نے آج روزی دی ہے وہی اللہ کل بھی دے گا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ کرنا چاہیے، تو وہ تم کو پرندوں کی طرح روزی دے گا کہ وہ صبح اپنے گھونسلے سے خالی پیٹ نکلتے ہیں، اور شام کو جب واپس آتے ہیں تو پیٹ بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا انہوں نے کہیں دوکان لگائی ہے؟ کوئی فیکٹری لگائی ہے کوئی تجارت اور کاروبار شروع کیا ہے؟ نہیں! بلکہ صبح جس وقت وہ اپنے گھونسلوں سے نکل رہے ہوتے ہیں اس وقت ان کا کوئی متعین پروگرام بھی نہیں ہوتا ہے، لیکن شام کو اللہ تعالیٰ ان کو پیٹ بھر کر واپس کرتے ہیں۔

اس پر حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) اور دوسرے اکابرین نے لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے۔ بلکہ پرندے صبح کے وقت اپنے گھروں اور گھونسلوں سے نکلے، گھونسلوں میں بیٹھے نہیں رہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جب نکلے تو صرف آج ہی کی فکر لے کر نکلے تھے، کل کی فکر لے کر نہیں نکلے تھے۔ اور یہ انسان جو

پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے وہ اس لئے کہ آج ہم یہاں بیٹھے بیٹھے دس سال آگے کی فکر کرتے ہیں ،تواب ٹینشن نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟اگر آج ایک دن کی فکر کرلیں ،توکوئی ٹینشن نہیں ہے اورمسئلہ بہت ہی آسان ہے۔بلکہ بہت سے لوگوں کے پاس توسالوں کا موجودہوتا ہے، اور ان کی پوری دو نسلوں کا موجودہوتا ہے،مگر پھر بھی وہ زیادہ ہی کی فکر میں پڑے ہوئے ہیں ،حقیقت میں دنیا کی حرص ختم نہیں ہوسکتی۔

یہ بھی دیکھا؛وہ بھی دیکھ

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی(دامت برکاتہم) فرماتے ہیں کہ میں لاس اینجلس گیا،تو وہاں ہمارے ایک دوست مجھے ایک بازار میں لے گئے،اور کہنے لگے کہ یہ دنیا کا سب سے مہنگابازارہے۔یہاں جتنی قیمت سے چیزیں ملتی ہیں دنیامیں اورکہیں نہیں ملتی۔ یہاں موزوں کی ایک جوڑدو ہزار ڈالرمیں ملتی ہے۔اور ایک ٹائی تین ہزار ڈالر میں ملتی ہے۔ایک سوٹ دس ہزار،بیس ہزار، تیس ہزار،اور ایک لاکھ ڈالر تک ملتاہے۔اور ایک دوکان تو انہوں نے مجھے ایسی بتلائی کہ اس کے دو حصے ہیں ،ایک نچلا اور دوسرااوپر والا۔ نچلے حصے میں تو آپ خریداری کے لیے جاسکتے ہیں لیکن اوپر والے حصے میں آپ نہیں جاسکتے۔اگر اوپر والے حصے میں آپ کو جانا ہو ، تو پہلے سے (Appointment) لینا پڑتا ہے۔اورمالک خودآکر آپ کولے جائے گا،اوروہ آپ کودیکھ کر مشورہ دے گاکہ یہ سوٹ آپ پرمناسب ہے یادوسراکوئی سوٹ بہتررہے گا۔اورصرف اس مشورے کے بھی وہ

دس پندرہ ہزار ڈالر فیس لیتا ہے۔اور بتایا کہ چارلس جو برطانیہ کا شہزادہ تھا،اس نے (Appointment) لیا تو اس کو چھ مہینے بعد کا وقت دیا۔دنیا کی دولت کا یہ حال ہے۔

پھر مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ اس بازار سے نکل کر ہم اسی لاس اینجلس میں ایک کلومیٹر آگے بڑھے تو وہاں دیکھا کہ ٹرافک سگنل پر کچھ لوگ بھیک مانگ رہے تھے ہمارے ساتھی سے بھیک مانگی تو اس نے کہا کہ میرے پاس چلّڑ نہیں ہے، تو بھکاری نے یوں کہا کہ:مجھے ایک ڈالر نہیں چاہیے،مجھے تو صرف دس پینس دے دو،میرا پیٹ بھوک کی وجہ سے خالی ہے۔

ٹینشن :ناشکری کی سزا

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ دیکھو!جب دولت کی فراوانی ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی انتہاء نہیں ہوتی،اور آدمی کی حرص بڑھتی ہی رہتی ہے۔آدمی خود ہی اپنی ضرورتیں بڑھاتا رہتا ہے۔اسی لیے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وہ تعلیم سامنے ہونی چاہیے کہ دنیا کے معاملہ میں آپ اپنے سے نیچے والے کو دیکھئے،اوپر والے کو نہ دیکھئے،تب ہی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا ہوسکے گا۔اصل تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتا رہے۔

آج ہمارا مزاج دنیا کی حرص کی وجہ سے،قناعت نہ ہونے اور دنیا کی محبت دل میں ہونے کی وجہ سے ایسا بن گیا ہے کہ سب کچھ ہے، بہترین مکان ہے، فرنیچر ہے، کاروبار

چل رہاہے، پھر بھی پوچھوکہ کیا حال ہے؟ توکہتے ہیں کہ بس چل رہاہے، گزر رہی ہے، (Time pass) ہورہاہے۔بھائی! اتنی ساری نعمتیں موجودہیں پھر بھی ایسا کیوں کہتے ہو؟ توکہتے ہیں کہ بس! آج کل مندی چل رہی ہے۔اس ایک مندی کی وجہ سے ایسا ٹینشن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں لاکھوں نعمتوں کے باوجود ناشکری ہے حالاں کہ ٹینشن اسی ناشکری کا نتیجہ ہوتاہے۔آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرادا کرنے والامزاج بنالے تو سارے مسئلے آسان ہوجائیں۔ہرایک کی الگ ذہنیت ہوتی ہے۔شریعت ہم کویہ تعلیم دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کاشکراداکرو،اگر شکراداکروگے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنی نعمتوں میں اضافہ کروں گا۔

شکرگزاری کا نرالاانداز

ہمارے بزرگوں میں ایک بزرگ گزرے ہیں ،حضرت مولاناسیداصغرحسین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جوحضرت میاں صاحب کے نام سے مشہورہیں۔ان کامزار راندیرکے قبرستان میں ہے۔اصل دیوبندکے رہنے والے ہیں۔ہمارے اکابرین میں سےہیں اورابوداؤدشریف پڑھایاکرتے تھے،ہماری سندمیں ان کانام آتاہے۔ایک مرتبہ وہ بیمار تھے ، سخت بخار تھا۔کسی نے پوچھا:حضرت!کیاحال ہے؟توکہنے لگے کہ الحمدللہ! میری آنکھیں سلامت ہیں ، ناک سلامت ہے،کان سلامت ہے،ہاتھ سلامت ہے، پاؤں سلامت ہے ، اللہ تعالیٰ نے گھرمیں عافیت کے ساتھ رکھاہے۔بہت کچھ گنوایا، پھر کہا: بس! تھوڑا سا بخار ہے۔یہ بھی

بیان کرنے کا ایک انداز ہے۔ حالاں کہ اس وقت وہ شدید بخار میں مبتلا تھے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کو شمار کرانے کے بعد اس کو ایسے انداز سے بیان کیا کہ بس ذرا بخار ہے، باقی تو سب الحمدللہ ٹھیک ہے۔ یہ بھی ایک انداز ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس اگر گلاس ہو، اور آدھا دودھ سے بھرا ہوا ہو، تو جو شکر گزار آدمی ہو گا، وہ یوں کہے گا کہ آدھا گلاس دودھ میرے پاس ہے، اور جو ناشکرا ہو گا وہ کہے گا کہ آدھا گلاس خالی ہے، شکر گزار بھرے ہوئے کو دیکھے گا اور ناشکرا خالی حصہ کو دیکھے گا۔ تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں، آدمی اُنہی کو دیکھے۔ جتنا ان کو دیکھے گا اور شکرادا کرے گا، اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں میں اضافہ ہو گا۔

ایک ہی سوال مالدار اور غریب سے

باقی دنیوی اعتبار سے حالات کا ہونا کوئی عجیب بات نہیں، اس لیے کہ دنیا ہے ہی ایسی جگہ جہاں آدمی سو فیصد اپنے آپ کو مطمئن نہیں پاسکتا۔ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ اس دنیا کا جو سب سے مالدار ترین انسان ہے، اس سے آپ جا کر پوچھ لیجیے کہ بھائی! تمہاری ساری تمنائیں پوری ہو گئیں؟ اور کسی غریب سے بھی یہی سوال پوچھ لیجیے؛ تو میں سمجھتا ہوں کہ غریب تو یوں کہے گا کہ ایک دو باقی ہیں، لیکن مالدار کہے گا کہ بہت ساری تمنائیں ابھی باقی ہیں، اس لیے آدمی ان باتوں کی طرف ذرا دھیان دے اسی کو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

فرمایا: "مَا أَرَى الْأَمْرَ إِلَّا أَعْجَلَ مِنْ ذَالِكَ" آدمی ہر وقت یہی سوچتا رہے۔ لمبے لمبے پلان ہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی طرف لے جاتے ہیں۔

اُمتِ محمدیہ کا فتنہ

حدیث ۴۸۱

وعن کعب بن عیاض (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ: إِنَّ لِكُلِّ أُمَّةٍ فِتْنَةً وَفِتْنَةُ أُمَّتِي الْمَالُ. (رواه الترمذی، وقَالَ: حديثٌ حسنٌ صحيحٌ)

ترجمہ:- حضرت کعب بن عیاض (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ہر امت کے لیے ایک فتنہ ہے، اور میری امت کا فتنہ مال ہے۔

افادات:- ایسے حالات اور ایسی چیزیں جن کے ذریعہ سے کسی کو آزمایا جائے؛ اس کو عربی زبان میں "فتنہ" کہتے ہیں، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کون کتنا اللہ تعالیٰ کے حکم پر چلنے والا ہے، اور کون کتنا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والا ہے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر اُمت کے لئے کوئی ایسی چیز رکھی ہے جس کے ذریعہ سے اس کو آزماتے ہیں اور اللہ تعالیٰ میری اُمت کو مال کے ذریعہ سے آزمائیں گے۔ مال ہی کے معاملہ میں پتہ چلے گا کہ کتنا شریعت پر چلتا ہے اور کتنا ہٹا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام پر کتنا عمل کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو کتنا توڑتا ہے۔ اس لئے مال کو کمانے اور خرچ کے معاملہ

میں آدمی کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب نہ کرے۔ قیامت کے روز سب سے پہلے جن چیزوں کے متعلق سوال ہوگا اس میں مال کے متعلق بھی پوچھا جائے گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو کمانے میں تو اہتمام کرتے ہیں کہ کسی ناجائز چیز کا ارتکاب نہ ہو، لیکن خرچ کرنے کے معاملہ میں اہتمام نہیں کرتے۔ حالانکہ شریعت نے ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کو فضول خرچی بتلایا ہے۔ فضول خرچی کا مطلب کیا ہے؟ ضرورت جتنے میں پوری ہوتی ہو اس سے زیادہ خرچ کرنا؛ اس کو فضول خرچی کہتے ہیں۔

مکان کے مختلف درجات

آپ کہیں گے کہ مولوی صاحب! آپ تو جھونپڑے کی بات کر رہے ہیں، ہم جھونپڑے میں کیسے رہیں گے؟ تو حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا کہ بھائی! ہم یہ نہیں کہتے کہ وہ اونچا مقام جو حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو حاصل تھا، تم بھی حاصل کرو، وہ مقام تو حاصل کرنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے، لیکن شریعت کی حدود کی تو ہمیں پوری پوری رعایت کرنی چاہیے۔ اور حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے مکان کے مختلف درجات بتلائے ہیں، اس اصول کو آپ ہر چیز میں جاری کر سکتے ہیں۔

رہائش

فرمایا کہ:ایک مکان تو آدمی کی رہائش یعنی رہنے کی ضرورت کا ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس ایسا کوئی انتظام ہو جس میں وہ اپنے آپ کو گرمی، سردی، بارش وغیرہ سے بچاسکے، اگر آپ نے چار ڈنڈے لگا کر اس کے اوپر پلاسٹک ڈال دیا، تو ضرورت پوری ہو جائے گی، اور گرمی سردی بارش سے بھی بچاؤ ہو جائے گا؛ یہ رہائش کہلاتی ہے۔

آسائش

رہائش کے بعد دوسرا درجہ آسائش اور راحت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تیز دھوپ آئے گی تو ایسے مکان میں گرمی لگے گی، بارش میں پانی ٹپکے گا، اس لیے اور کچھ راحت حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس مکان کو پختہ بنا لیا، ایسا پختہ مکان جس میں آپ گرمی کی تیزی سے اپنے آپ کو بچالیں اور کچھ راحت سے رہیں ؛ تو یہ آسائش کا درجہ ہے اور یہ بھی جائز ہے۔ اصل ضرورت تو پہلے والے سے پوری ہو رہی تھی لیکن اس کے بعد جو آسائش اور راحت کا درجہ تھا، اس کی بھی اجازت ہے۔

آرائش

پھر تیسرا درجہ آرائش کا آتا ہے کہ اپنے جی کو ذرا ٹھیک لگے، مثلاً آپ نے بھلے ہی پکا مکان بنایا، لیکن پلاسٹر نہیں کیا، رنگ وروغن کا درجہ تو بعد کا ہے، تب بھی اس میں آپ آرام سے رہ سکتے ہیں ، لیکن جی کو ذرا اچھا لگے اس لیے پلاسٹر بھی کرایا، رنگ و روغن بھی لگایا؛ تو یہ آرائش ہے۔ اپنے جی کو خوش کرنے اور اپنی طبیعت میں سکون پانے کے لیے ذرا ٹھیک ٹھاک کرنا ؛ یہ بھی جائز ہے۔

نمائش

لیکن چوتھا درجہ نمائش اور دکھلاوے کا ہے۔ لوگ کہیں کہ یہ بلڈنگ فلاں کی ہے اور اس حویلی کے مالک فلاں سیٹھ صاحب ہیں ،اور یہ فلیٹ فلاں صاحب کا ہے، اور ساری دنیا دیکھنے کے لیے آتی ہے، لوگوں میں چرچا ہے کہ ان کے یہاں کا ڈیکوریشن تو جاکر دیکھو، ان کی رہائش تو جاکر دیکھو کہ کیسی بنائی ہے۔ اور پھر آدمی یہ سوچے کہ میرے یہاں ہر چیز موجود ہو، اگر میں ایسا نہیں بناؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ میں جس (Area) میں رہتا ہوں، میرا مکان اس (Area) کے مناسبِ حال بھی نہیں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ تھرڈ کلاس (Third Class) آدمی یہاں کہاں آگیا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ لوگوں میں ایسا چرچا نہ ہو، لوگ مجھے (Third Class) اور گھٹیا نہ سمجھیں، میں جس پوش ایریا (Posh Area) میں رہتا ہوں اس

میں میرا مکان ایسا ہونا چاہیے، حالاں کہ اس مکان میں بظاہر کوئی کمی نہیں ہے، پھر بھی اس کا سب سامان نکلوایا اور پھر نیا بنایا؛ یہ نمائش کہلاتی ہے جو حرام ہے،اس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔

اور یہ بات بھی یاد رہے کہ نمائش کی کوئی انتہاء نہیں ہے، اس سلسلہ میں آدمی کی حرص بڑھتی رہتی ہے اور جیسا کہ بتایا کہ ایک ٹائی تین ہزار ڈالر کی بھی آسکتی ہے،اور ایک سوٹ ایک لاکھ ڈالر کا بھی آئے گا،تب بھی کمی پوری ہونے والی نہیں ہے۔اس لیے آدمی اپنی اصلی ضرورت پر نظر رکھے، شریعت بھی یہی چاہتی ہے اور نبیٔ کریم (ﷺ) کا ارشاد بھی یہی ہے۔

اس کے علاوہ کوئی حق نہیں

حدیث ۴۸۲

وَعَن اَبِي عَمرو،وَيُقالُ أَبوعبدِالله،وَيُقالُ أَبوليلى عُثمَان بن عفان (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) قَالَ:لَيسَ لِابْنِ آدم حَقٌّ فِيْ سِوَى هٰذِهِ الْخِصَالِ :بَيْتٌ يَسْكُنُهُ وَثَوْبٌ يُوَارِيْ عَوْرَتَهُ وَجِلْفُ الْخُبْزِ وَالْمَاءِ(رواہ الترمذی وقَالَ:حديثٌ صحيحٌ)

وقَالَ الترمذی: سَمِعتُ أَبَا دَاوُد سُلَيْمَانَ بنِ سَالِمِ الْبَلْخِيَّ يَقُوْلُ : سَمِعْتُ النَّضرَ بْنَ شُمَيْلِ يَقُوْلُ : الْجِلْفُ:الْخُبْزُ لَيْسَ مَعَهُ إِدَامٌ، وقَالَ غَيْرُهُ: هُوَ غَلِيْظُ الْخُبْزِ. وقَالَ الْهَرَوِيُّ: الْمُرَادُ بِهِ هُنَاوِعَاءُ الْخُبْزِ،كَالْجَوَالِقِ والْخُرْجِ. والله أعلم.

ترجمہ:-حضرت عثمان بن عفان(رضی اللہ عنہ)سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا کہ انسان کوچندباتوں کے سواکوئی حق نہیں ،ایک توایسامکان جس میں رہائش اختیارکرے کہ اس میں گرمی،سردی،بارش،دھوپ سے اپنابچاؤکرلے۔اوراتنا کپڑاجس سے اپنا بدن ڈھانپ لے اور اپنا سرچھپا لے۔اور روٹی کاموٹا ٹکڑا ،اورپانی۔

افادات:-رہنے کا ایسا گھرجس میں رہائش کی ضرورت پوری ہوجائے، اس میں بنگلہ نہیں گناجاتا۔بس!اس کے علاوہ آدمی کاکوئی حق نہیں۔نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اگرآدمی کی اتنی ضرورت پوری ہوجائےتو آدمی کو دوسری کسی چیزکی حرص اور لالچ میں رہنا نہیں چاہیے،آدمی کو چاہیے کہ حرص اورلالچ سے اپنے آپ کو بچائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۹/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۲۶/ فروری ۲۰۰۰ء

انسان کا حقیقی مال

حدیث ۴۸۳

وعن عبد اللہ بن الشِّخِّيرِ بِكَسْرِ الشِّيْنِ وَالْخَاءِ الْمُعْجَمَتَيْنِ۔ أَنَّهُ قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَهُوَ يَقْرَأُ (أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ) قَالَ: يَقُوْلُ ابْنُ آدَمَ: مَالِيْ، مَالِيْ، وَهَلْ لَكَ يَا ابْنَ آدَمَ مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ، أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن شخّیر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ سورۂ "أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" کی تلاوت فرمارہے تھے۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: انسان کہتاہے: میرا مال، میرا مال؛ لیکن اے انسان! تیرے لیے تیرے مال میں سے اس کے علاوہ اور کیا ہے جو تونے کھایا اور ختم کیا، یا پہنا اور اس کو پرانا کیا، یا اللہ کے راستہ میں صدقہ کیااور ذخیرہ کرلیا۔

افادات:- شروع باب میں سورۂ "أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ" کی تشریح آچکی ہے اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ نے اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ مال و دولت اور دنیا کے ساز و سامان کی کثرت نے تم کو غفلت میں ڈال دیاہے۔ اس لیے آدمی جو کماتا اور جمع کرتا ہے تو یوں سمجھتا ہے کہ میرا مال ہے، اور مال کی نسبت اپنی طرف کرتا ہے۔ اور ظاہری اعتبار سے وہ مال اس

کی ملکیت میں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مال کے ملکیت میں ہونے کی وجہ سے اس کو کیا فائدہ پہنچ رہاہے؟ حقیقی فائدہ تو اسی وقت پہنچاہوا سمجھا جائے گا جب وہ اس کو اپنی دنیا یا آخرت کی کسی ضرورت میں استعمال بھی کرے۔اسی کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ اے انسان! تیرے لئے تیرے مال میں سے اس کے علاوہ اور کیا ہے جو تونے کھایااور ختم کیا، یا پہنا اور اس کو پرانا کیا، یا اللہ کے راستہ میں خرچ کیا اور ذخیرہ کرلیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی اگر اپنی بنیادی ضرورتوں میں اس مال کو استعمال کرتا ہے تب تو ٹھیک ہے کہ وہ مال اس کے لئے کار آمد ہوا۔ مثلاً کھانے پینے میں یالباس میں استعمال کیا، یااللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کیا،تووہ اس کے لئے بطور ذخیرہ کے اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع ہوا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں آخرت میں اس کااجر و ثواب ملے گا۔ باقی یہ کہ نہ تو اس نے اپنی ضرورتوں میں استعمال کیا ،نہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا تو زندگی بھر وہ مال اس کی ملکیت میں رہا لیکن سوائے اس کے کہ وہ اس مال کی نسبت اپنی طرف کرتا رہا اور خوش ہوتا رہاکہ یہ سب میرا مال ہے،اور کوئی فائدہ اور نفع اس کو نہیں پہنچا۔

دوسروں کے مال کا محافظ

اسی لئے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کون ایساہے کہ اس کودوسرے کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ہر ایک کو اپنا ہی مال محبوب ہوتا ہے، دوسرے کے مال سے کیا محبت رکھنی؟

اگر کسی کے پاس مال دولت ہے تو اس کے ساتھ تعلق و محبت ہوتی ہے، کسی اور کے پاس چاہے کروڑوں اور اربوں کی دولت بھی ہو، تو اس سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ اس سے محبت ہوتی ہے۔ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ بھائی! اپنا تو وہی ہے جو کھا لیا اور ختم کر دیا، یا پہن لیا اور پرانا کر دیا، یا پھر اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کر دیا؛ باقی جو کچھ بھی ہے وہ سب دوسروں کا ہے۔ آدمی زندگی بھر یہ سمجھتا ہے کہ میں اس سب مال کا مالک ہوں، اور اسی کی طرف نسبت بھی کی جاتی ہے، اسی کے خزانے میں جمع رہتا ہے، اور اس کے کھاتہ اور اکاؤنٹ میں محفوظ رہتا ہے، لیکن سوائے اس کے کہ وہ اس کی حفاظت کرتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کرتا، جب موت آتی ہے تو وہی سب مال اس کے وارثوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، پھر وہ لوگ اس کو اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ حقیقی طور پر آدمی غور کرے تو اپنا مال تو وہی ہے جو دنیوی اعتبار سے یا اخروی اعتبار سے اپنے کام میں آیا، اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ذخیرہ بنایا ہے تو وہی اپنا ہے

اصل ضرورت بہت ہی کم ہے

یہ ارشاد فرما کر گویا اس بات کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اگر آدمی اپنی حقیقی ضرورت پر غور کرے تو اس کی اصلی ضرورت کتنی ہوتی ہے؟ مثلاً ایک آدمی نے بہت بڑا بنگلہ بنایا جس کے اندر سو کمرے بنائے، اور ہر ایک میں بیڈ ہے، اور بہتر سے بہتر بستر بھی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایک وقت میں وہ ایک ہی کمرہ استعمال کرے گا اور ایک ہی بستر پر سوئے

گا۔سو کمرے ایک ہی وقت میں استعمال میں آنہیں سکتے،ضرورت تو ایک ہی سے پوری ہوتی ہے۔

اسی طریقہ سے اگرچہ کئی جوڑے لباس کے اس نے اپنے لئے بنوا لئے،لیکن ایک وقت میں تو وہ ایک ہی جوڑااستعمال کرے گا،بلکہ اگر ایک سے زیادہ استعمال کرے تو لوگ کہیں گے کہ شاید اس کے دماغ میں خلل ہے اور عقل میں فتور ہے کہ ایک سے زیادہ جوڑے ایک ساتھ پہن لیے۔تو ظاہر ہے وہ تو اچھا بھی نہیں سمجھا جاتا اور اس کو اس کے فتورِ دماغی پر محمول کیاجاتا ہے۔تو چاہے جتنے بھی کپڑے ملکیت میں ہوں لیکن ایک وقت میں اس کی ضرورت میں تو ایک ہی آئے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اگر حقیقی طور پر غور کرے تو اس کی ضرورت تو بہت کم میں پوری ہوسکتی ہے۔بس!صرف حرص ہی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کچھ جمع کررہا ہے۔ اس کی طرف نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متوجہ کیا کہ بھائی !آدمی اگراس پر غور کرے تووہ دنیاکی خاطر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہیں کرے گا،اوردنیاکوایک ضرورت کی چیز سمجھ کر ضرورت کے مطابق حاصل کرے گا، اور اسی کے مطابق خرچ کرے گا۔ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے کی فکرہی نہیں کرے گا۔

ضرورت کی توضیح

پہلے بھی مَیں مثال سے سمجھا چکا ہوں کہ ہر مکان کے اندر بیت الخلاء ایک ضرورت کی چیز سمجھی جاتی ہے، بہت بڑا اور عمدہ سے عمدہ بنگلہ ہو، لیکن اس میں اگر بیت الخلاء نہیں ہے، تو یہ مکان کے اندر ایک طرح کا نقص ہے، لیکن ضرورت کی چیز ہونے کے باوجود کوئی آدمی اس میں مستقل رہائش اختیار نہیں کرتا، جب بھی قضائے حاجت کی ضرورت پیش آتی ہے اور پیشاب پاخانہ کا تقاضہ ہوتا ہے، تو جتنی دیر کا تقاضہ ہو، اتنی دیر کے لیے اس کو استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح سے مال ودولت بھی ایک ضرورت کی چیز ہے، ضرورت کے بقدر اس کو حاصل کیا جائے، اور ضرورت کے بقدر اس کو استعمال کیا جائے۔ اگر تجارت اور کاروبار کی وجہ سے برکت کے طور پر اللہ تعالیٰ نے مال زیادہ دیا ہے تب بھی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ بس! استعمال تو اپنی ضرورت کے مطابق ہی کرنا ہے، اس سے زیادہ اگر استعمال کرے گا تو یہ فضول خرچی میں داخل ہے جو گناہ ہے۔ اور اگر نافرمانی میں استعمال کرے گا تو اس کا گناہ ہونا تو ظاہر ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے، سب کو اللہ تعالیٰ کا فضل ہی سمجھنا چاہیے، اس میں اس کی کسی صلاحیت کو، اور اس کے کسی کمال کو دخل نہیں ہے، جو کچھ بھی ملا ہے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملا ہے۔

مال ودولت بری چیز نہیں

ویسے قرآنِ پاک میں دنیا کو اللہ تعالیٰ کا فضل قرار دیا گیاہے اگر وہ صحیح طریقے سے استعمال ہو:﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾ اسی طرح ارشاد ہے: ﴿وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِن فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ﴾ قرآنِ پاک میں اور بھی مختلف جگہوں پر مال کو اللہ تعالیٰ کا فضل بتایا گیاہے۔اور لفظِ خیر سے بھی تعبیر کیا گیا ہے:﴿إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ﴾تواگر آدمی مال کو اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی اوراس کی اطاعت کے ساتھ حاصل کرے،اور اس کی خوشنودی ورضا کے مطابق ہی اس کو استعمال کرے ؛تو پھر یہ ساری فضیلتیں ہیں۔

اس لیے یہ نہ سمجھاجائے کہ مال ودولت اپنی ذات کے اعتبار سے بری چیز ہے بلکہ آدمی کا اس کے سلسلے میں جو نظریہ ہوتا ہے اسی کے مطابق حکم لگایا جاتا ہے۔آدمی اگر اس کو اپنا مقصود بنالے کہ اسی کے لیے سب کچھ کرتا ہے اور آخرت مد نظر ہی نہیں رکھتا تو یہ بری چیز ہے۔اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ دنیا کو ایک منزل اور گزرگاہ کے طور پر بقدر ضرورت صحیح طریقہ سے حاصل کرتا اوراستعمال کرتاہے تو پھر یہ بری چیز نہیں ہے۔

اب اگرکسی کو کاروبار کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے برکت دی اور مال زیادہ مقدار میں ملاتو یہ سمجھناچاہیے کہ جو کچھ بھی ملتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے دینے سے ہی ملتا ہے،اس میں

آدمی کی کوئی صلاحیت کارآمد نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دیتا ہے۔ اسی لئے اس کو فضل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فساد کا ارادہ نہ کرو

قارون کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَابْتَغِ فِيْ مَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ دیا ہے اس کے ذریعہ سے آخرت کو حاصل کرو۔ اس کے پاس دولت بہت کثرت سے تھی، آج بھی مثال کے طور پر قارون کا خزانہ بولا جاتا ہے، اور اس زمانہ میں دولت خزانوں میں رکھی جاتی تھی اور اس کے اوپر بڑے بڑے تالے لگائے جاتے تھے اور اس کے خزانوں کی کنجیاں اُٹھانے کے لیے ایک پوری جماعت ہوتی تھی باری تعالیٰ کی طرف سے اس کو کہا گیا کہ اس دولت سے آخرت حاصل کرنے کی کوشش ہونی چاہیے: ﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ اور اپنی ضرورت کے لیے بھی استعمال کرو۔ شریعت یہ بھی نہیں کہتی کہ آپ کو مال ملا تو اس کو پھینک دو، بلکہ دنیا میں سے جو حصہ ملا ہے اس سے اپنی ضرورت پوری کیجئے ﴿وَأَحْسِنْ كَمَآ أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ﴾ اور اپنی ضرورتوں کے بعد جو مال بچ جائے تو جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان و فضل کرتے ہوئے تمہیں عطا فرمایا، تم بھی لوگوں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو اور خرچ کرو۔ ویسے بھی آخرت کے اعتبار سے یہ چیز مفید ہے ﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِأَنْفُسِكُمْ مِنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ جو کچھ بھی تم خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھیج دو گے، وہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں جمع ہو جائے گا اور وہاں تم کو ملے گا ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ تمہارے

پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ باقی رہے گا اس لیے اگر باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کی صورت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں جمع کرادو ﴿وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ﴾ اور دیکھو! اس مال کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو، اگر مال اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے کاموں میں استعمال کیا جارہا ہے تو یہ ایک طرح کا فساد ہے، اس لئے کہا گیا کہ فساد کا ارادہ نہ کرو۔

تو یہاں پر نبیٔ کریم (ﷺ) نے بھی اسی طرف متوجہ کیا ہے کہ آدمی اگر یہ سوچے کہ دنیا میں میرا حصہ تو صرف اتنا ہی ہے، تو پھر دنیا کے لیے اپنی زندگی کو برباد نہیں کرے گا، بلکہ بقدرِ ضرورت حاصل کر کے آخرت کی تیاری میں لگے گا۔ تو ''زہد'' کا مطلب ہوا کہ دنیا کی محبت کا دل میں نہ ہونا، اور بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرنا، دنیا میں بقدرِ ضرورت لگنا اور اس کے علاوہ اپنے اوقات و صلاحیت اور اللہ تعالیٰ نے جو بھی نعمتیں دی ہیں ان سب کو آخرت حاصل کرنے اور آخرت کمانے کے لئے استعمال کرنا۔

حُبِّ نبوی کے لیے فقر لازمی

حدیث ۴۸۴

وعن عبداللہ بن مغفّل (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِی (ﷺ): يَا رَسُولَ اللهِ! وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ. فَقَالَ: أُنْظُرْ مَاذَا تَقُولُ؟ قَالَ: وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ. ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. فَقَالَ: إِنْ كُنْتَ تُحِبُّنِي فَأَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافاً، فَإِنَّ الْفَقْرَ أَسْرَعُ إِلَى مَنْ يُحِبُّنِي مِنَ السَّيْلِ إِلَى مُنْتَهَاهُ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

(التِّجْفَافُ)بِكَسْرِ التَّاءِ الْمُثنَاةِ فَوْقُ وَإِسْكَانِ الْجِيمِ وَبِالْفَاءِ الْمُكَرَّرَةِ: وَهُوَ شَيْءٌ يُلْبَسُهُ الْفَرَسُ، لِيُتَّقَى بِهِ الْأَذَى، وَقَدْ يَلْبَسُهُ الْإِنْسَانُ۔

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مغفل (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ سے محبت رکھتا ہوں ۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے جواب میں فرمایا: ذرادیکھو! کیا کہہ رہے ہو؟(یعنی جو بول رہے ہوذرا سوچ کر بولو؟) اس نے کہا: اللہ کی قسم!میں آپ سے محبت رکھتا ہوں ۔ تین مرتبہ اس نے یہ بات دہرائی۔تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اگر تو مجھ سے محبت رکھتا ہے، توپھر فقیری لازمی طورپر لگی ہوئی،اس کے لیے تیار ہوجا،اس لئے کہ جو آدمی مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کی طرف فقیری ایسی تیزی کے ساتھ آتی ہے جیسے سیلاب کا پانی نشیب کی طرف آتاہے۔

خوش ہونے کی چیز

افادات:- ویسے ہی سیلاب کے اندر تیزی ہوتی ہے ،اور نشیب والے حصہ میں اور زیادہ تیزی سے بہتا ہے۔تو نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو! جوآدمی مجھ سے محبت رکھتا ہے اس کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے،گویاآدمی جتناآخرت کی طرف راغب ہوگا اور نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے طریقوں کو جتنازیادہ اختیارکرے گا،تو اِس قسم کی اتنی ہی آزمائشیں اس کو پیش آئیں گی، لیکن اس کی وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے،بلکہ یہ تو خوش ہونے کی چیز ہے کہ میں صحیح راہ پر چل رہا ہوں۔

حالات؛ صحیح منزل کی علامت

حضرت مولانا قاری صدیق صاحب(رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک مرتبہ تقریر میں فرمایا تھااور حضرت مفتی محمد شفیع صاحب(رحمۃ اللہ علیہ) کے ملفوظات میں بھی ہے کہ آدمی ایک منزل کی طرف چلتا ہے، جیسے آدمی سورت سے ممبئی جانے کے لئے ٹرین میں سوار ہوا،جب ٹرین چلے گی اورکوئی اسٹیشن آئے گاتو آدمی پوچھے گا کہ بھائی! کون سا اسٹیشن آیا؟ سچین آیا،مرولی آیا تواب اس کو اطمینان ہو گا کہ ممبئی جانے والے راستہ پر ہی یہ سارے اسٹیشن آتے ہیں، تو اب اس کوسکون و اطمینان ہو گا کہ میں اپنی منزل کی طرف برابر آگے بڑھ رہا ہوں۔ اور اگرراستہ میں جواسٹیشن آنے چاہئیں وہ نظر نہیں آرہے ہیں ،دوسرے اسٹیشن نظر آرہے ہیں،مثلاً آپ نے دیکھا کہ کیم اورکوسمبا آیا۔تواب آپ پریشان ہوں گے کہ ممبئی جاتے ہوئے یہ اسٹیشن تونہیں آتے!اب آپ سوچیں گے کہ میں منزل کی طرف آگے نہیں بڑھ رہا ہوں ، بلکہ یہ تومیں اپنی منزل سے دور ہورہا ہوں۔تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو راہ بتائی ہے،اگر آدمی اس پرچلے اورپھر جوحالات ان حضرات کو پیش آئے تھے وہی سب حالات اس کوبھی پیش آرہے ہیں تواس کو سمجھنا چاہیے کہ میں صحیح راستہ پر چل رہا ہوں۔

آزمائش ناراضگی کی علامت نہیں

حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے سب سے زیادہ آزمائش انبیاء کرام کی ہوتی ہے، پھر جو آدمی جتنا ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرے گا اور جتنا زیادہ ان کے قریب ہونے کی کوشش کرے گا، اتنا ہی اس کی بھی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن آج کل تو مزاج ایسا بن گیا ہے کہ دین کی راہ میں اگر اس قسم کے حالات پیش آتے ہیں، تو اس کی وجہ سے دل گرفتہ ہوجاتے ہیں، مثلاً کسی کے اوپر کاروباری حالات آئے تو آکر کہتا ہے کہ مولوی صاحب! میں تو پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور رمضان کے روزے بھی برابر رکھتا ہوں، زکوۃ بھی دیتا ہوں؛ پھر بھی میرے ساتھ ایسا کیوں ہورہا ہے؟ گویا وہ یہ بتلانا چاہتا ہے کہ (نعوذ باللہ) وہ تو اللہ تعالیٰ پر احسان کررہا ہے، پھر اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیوں ہورہا ہے! حالانکہ اس کو تو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ جو کچھ ہورہا ہے وہ سب گویا ایک نوع کی آزمائش ہے۔ آدمی جتنا دیندار بننا چاہتا ہے اور دین کے اندر پختگی حاصل کرنا چاہتا ہے، اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف طریقوں سے آزمائش ہوتی ہے۔ آزمائش کی وجہ سے آدمی یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہیں۔ دنیا میں کاروباری اعتبار سے، فقر کی وجہ سے، یا بیماری وغیرہ کے جتنے بھی حالات آتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی علامت نہیں ہیں۔ آدمی کو تو صرف یہ سوچنا چاہیے اور اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام کو صحیح طور پر ادا کررہا ہوں یا نہیں۔ مَیں کسی گناہ کا ارتکاب تو

نہیں کر رہا ہوں۔ کسی معصیت میں تو مبتلا نہیں ہوں۔ آدمی اپنا جائزہ لینے کے بعد اگر اس نتیجے پر پہنچا کہ مَیں کسی معصیت اور گناہ میں یا کسی نافرمانی میں مبتلا نہیں ہوں، تو بس! یہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور بڑے شکر کی چیز ہے۔

ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ بالکل اپاہج تھا، اس پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اور وہ اس حال میں بھی الحمد للہ پڑھ رہا تھا۔ کسی نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: کیا بات ہے کہ اس حالت میں بھی تو الحمد للہ کہہ رہا ہے؟ اس نے کہا: اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ میں اس مصیبت میں گرفتار ہوں، کسی معصیت اور نافرمانی میں مبتلا نہیں ہوں۔

قابلِ اصلاح نظریہ

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی پر کیسے ہی حالات آویں، اس کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ ایسے وقت آدمی یہ سوچ لے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے معصیت اور گناہ میں نہیں ڈالا، میں گناہ سے بچا ہوا ہوں، اگرچہ مصیبت آئی۔ اور مصیبت تو انبیاء پر بھی آئی ہے، کوئی اس سے بچا ہوا نہیں ہے۔ اس لیے آج کل جو ایک مزاج بنتا جا رہا ہے کہ ذرا سی کوئی بات پیش آتی ہے تو آدمی فوراً پریشان ہو جاتا ہے، اور جہاں دو پیسے آئے تو تعبیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ پکڑا۔ گویا نعوذ باللہ اب تک چھوڑ رکھا تھا۔ ہمارا یہ جملہ اور نظریہ بالکل درست نہیں ہے۔

اسلاف کا طرزِ عمل

بلکہ ہمارے اسلاف کے یہاں تو یہ حال تھا کہ ان کے پاس مال آتا تھا تو وہ ڈرتے تھے اور روتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف (رضی اللہ عنہ) والی روایت اسی باب میں پہلے گزر چکی ہے کہ جب ان کے پاس کھانا لایا گیا تو وہ رونے لگے ،اور حضرت مصعب بن عمیر (رضی اللہ عنہ) کا حال یاد کیا، حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہ) کی حالت کا تذکرہ کیا کہ وہ دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ انہوں نے دنیا سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ گویا اس پر ان کو خوشی بھی تھی کہ ان کو اپنی نیکیوں کا پورا بدلہ آخرت میں ملے گا،اور ہم ہیں کہ اپنے پھلوں کو یہیں توڑ رہے ہیں۔ دنیا کے آنے پر ان کو ایک طرح کی فکر رہتی تھی کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہمارے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں مل گیا۔ اس لئے کہ کافر جو نیکی کے کام کرتا ہے اس کو ان کاموں کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے، اس پر اچھے حالات آتے ہیں ، اور آخرت کے واسطے اس کی کوئی نیکی باقی نہیں رکھی جاتی۔ لیکن اسلاف ایسے حالات سے خوش نہیں ہوتے تھے بلکہ ڈرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اس کا بدلہ نہ ہو۔

حُبِ مال وجاہ کی خطرناکی

حدیث ۴۸۵

وعن كعب بن مالك(رضي الله عنه)قَالَ قالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلى الله عليه وسلم):مَاذِئْبَانِ جَائِعَانِ اُرْسِلاَ فِيْ غَنَمٍ بِاَفْسَدَلَهَامِنْ حِرْصِ الْمَرْءِ إِلَى الْمَالِ وَالشَّرَفِ لِدِيْنِهٖ.

ترجمہ:-حضرت کعب بن مالک(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دو بھوکے بھیڑیوں کواگر بکریوں کے ریوڑمیں چھوڑدیاجائے تووہ بکریوں کواتنا خراب نہیں کریں گے، جتنامال وجاہ کی لالچ ومحبت آدمی کے دین کوخراب کرتی ہے۔

افادات:-حب ِجاہ یعنی منصب وعہدہ اورکرسی کی محبت اورلالچ۔اس روایت میں نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ایک مثال سے اس چیزکوسمجھایاہے کہ اگردوخونخواراور بھوکے بھیڑیوں کو بکریوں کے ریوڑمیں چھوڑدیاجائے۔اوربعض روایتوں میں ہے کہ بکریوں کے ایسے ریوڑ میں چھوڑدیاجائے جس کے اوپرکوئی چرواہابھی موجود نہ ہو،تو وہ دونوں ان بکریوں کو جتنا نقصان پہنچاسکتے ہیں،مال وجاہ کی محبت اورلالچ کی وجہ سے آدمی کے دین کواس سے بھی زیادہ نقصان پہنچتاہے۔اس لئے آدمی کوچاہیے کہ اپنے دل میں مال اورمنصب کی محبت نہ رکھے۔

اور دیکھو! محبت رکھنا الگ چیز ہے، اور ضرورت کے لئے اس کو حاصل کرنا الگ چیز ہے۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ضرورت کے پیشِ نظر آدمی اس کو برتتا ہے، لیکن اس کی محبت دل میں نہیں ہوتی، تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

دنیا ایک راہ گزر ہے

حدیث ۴۸۶

وعن عبد اللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) قَالَ نَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) عَلٰى حَصِيْرٍ، فَقَامَ وَقَدْ أَثَّرَ فِيْ جَنْبِهٖ، قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! لَوِ اتَّخَذْنَا لَكَ وِطَآءً. فَقَالَ: مَالِيْ وَلِلدُّنْيَا؟ مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلَّا كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا. (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک چٹائی کے اوپر لیٹے ہوئے تھے، جب آپ اُٹھے تو آپ کے جسمِ اطہر کے اوپر چٹائی کے نشان تھے۔ اس پر ہم نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے لیے کوئی نرم بستر تیار کرلیں۔ حضورِ اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مجھے دنیا سے کیا لینا دینا؟ دنیا میں میرا حال اس سوار کی طرح ہے جو چلتے چلتے تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو اور اپنی سواری کو راحت پہنچانے کے لیے کسی درخت کا سایہ حاصل کرلیتا ہے اور پھر اس سایہ کو چھوڑ دیتا اور چل دیتا ہے۔

افادات:- جیسے ہم اور آپ بھی جب سفر کرتے ہیں اور کبھی موٹر گرم ہوگئی تو کہیں راستہ میں کسی درخت کے نیچے تھوڑی دیر کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تو اب کیا ہمیں یاد

رہتا ہے کہ کون سے درخت کے نیچے کھڑے ہوئے تھے؟ اس درخت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے، بس! وقتی طور پر تھوڑی دیر کے واسطے اس سے فائدہ اُٹھالیا، اسی طریقہ سے نبیٔ کریم (ﷺ) بتلانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں جو ہم آئے ہیں یہ ہماری آخری منزل نہیں ہے، بلکہ یہ تو راستہ کی ایک چیز ہے، جیسے راستہ چلتے ہوئے آدمی کسی چیز سے تھوڑی دیر کے لئے فائدہ اُٹھالیا کرتا ہے، کہ نہ اس کے ساتھ دل لگاتا ہے اور نہ اس جگہ کو یاد رکھتا ہے، بس وقتی طور پر جتنی دیر کے لئے فائدہ اُٹھایا ہے اتنی دیر کے لیے اس کے ساتھ تعلق رہتا ہے، جب چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، تو وہ چیز اس کو یاد نہیں رہتی ہے۔ اسی طریقہ سے دنیا کے ساتھ ہمارا معاملہ ہونا چاہیے۔

خلاصۂ کلام

دنیا کے اندر کاروبار کرنے اور کھانے کمانے سے منع نہیں کیا گیا ہے، اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا کہ دنیا کو آخری منزل نہ سمجھا جائے، اسی کو اپنا مقصود نہ بنالیا جائے اور اسی کے لیے اپنی صلاحیتوں کو ضائع نہ کرے۔ یہ ضرورت کی ایک چیز ہے، اس لئے بقدرِ ضرورت اس کو حاصل کیجئے، پھر آپ کی پوری توجہ اور دھیان، آپ کی پوری سوچ اور ساری محنت آخرت کے لیے اور اللہ تعالیٰ کو راضی رکھنے کے لیے ہونی چاہیے۔

پانچ سو سال پہلے جنت میں داخلہ

حدیث ۴۸۷

عن أبي هريرة(رضی اللہ عنہ)قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم):يَدْخُلُ الفُقَرَآءُ الْجَنَّةَ قَبْلَ الأَغْنِيَاءِ بِخَمْسِ مِائَةِ عَامٍ.

(رواہ الترمذی وقال:حدیث صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا فقراء جنت کے اندر اغنیاء (مالداروں) سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے۔

افادات: -مطلب یہ ہے کہ جو اغنیاء اپنے اعمال کی وجہ سے جنت کے حقدار ہیں وہ جنت کے اندر جائیں گے، لیکن چونکہ ان کے پاس مال اور دنیا کی دولت تھی اس لیے اس کا حساب تو دینا ہی پڑے گا۔اس حساب وکتاب کے اندر مشغولی کی وجہ سے جنت میں پہنچنے میں ان کو پانچ سو سال کی تاخیر ہوجائے گی،جب کہ فقراء ان سے پانچ سو سال پہلے جنت میں چلے جائیں گے۔حالانکہ دنیا کی زندگی اتنی نہیں تھی۔دنیا کے اندران لوگوں نے جودولت وثروت حاصل کی وہ توچالیس پچاس سال تھی، لیکن اس کووہاں پانچ سو سال تک بھگتنا پڑا کہ جنت کے اندرداخلہ میں دنیا کی اس دولت کی وجہ سے تاخیر ہوگئی۔دنیامیں جو تھوڑی راحت اور کچھ عیش پا بھی لیا تو وہ دنیا کا عیش تھا، اس کے مقابلہ میں جنت کے پانچ سوسال کی راحت سے وہ محروم رہا۔یہ بھی ایک سوچنے کی چیز ہے۔

مال کی کمی؛ جنت میں لے جانے والی

حدیث ۴۸۸

عن ابن عباس وعمران بن الحُصَيْن (رضی اللہ عنہ) عن النَّبِی (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: اطَّلَعْتُ فِي الْجَنَّةِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا الْفُقَرَآءَ، وَاطَّلَعْتُ فِي النَّارِ فَرَأَيْتُ أَكْثَرَ أَهْلِهَا النِّسَآءَ. (متفقٌ عليه من رواية ابن عباس۔ ورواه البخاری أيضاً من رواية عمران بن الحُصَيْن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت میں جھانکا تو جنت میں جانے والے اکثر فقراء ہیں ۔اور جہنم میں جھانکا تو جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہے۔

افادات:- چونکہ ان کے پاس مال کم تھا، اور عام طور پر آدمی مال حاصل کرنے کے لیے ایسی چیزوں کا اور ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہوتی ہیں۔ اسی لیے شروع باب میں آیا تھا، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "مَا الْفَقْرَ أَخْشٰى عَلَيْكُمْ وَلٰكِنْ أَخْشٰى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا" مجھے تمہارے متعلق فقر کا اندیشہ نہیں ہے۔ اگر فقر کسی کے پاس ہے تو اس کی وجہ سے اس کو دینی اعتبار سے اتنا نقصان نہیں پہنچ سکتا، جتنا مال کی کثرت کی وجہ سے پہنچ سکتا ہے۔

اِس زمانہ کے ایک سوال کا جواب

اور جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی۔ ویسے دوسری روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) عورتوں کے پاس تشریف لے گئے اور ان کو آپ نے نصیحت فرمائی جس میں یہی بات ارشاد فرمائی۔ تو عورتوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں ؟

اور دیکھو! ایسا نہیں ہے کہ عورتیں ؛عورتیں ہیں اس لئے ان کو جہنم میں بھیجا جائے گا، بلکہ ان کی چند لغزشوں کی وجہ سے ان کو زیادہ مقدار میں جہنم میں بھیجا جائے گا۔ اور یہ بات میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جب عورتوں کی بات آتی ہے تو آج کل بعض لوگ جو مرد و عورت کی مساوات کے دعویدار ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ عورت نے کون سا جرم کیا ہے جو اس کو جہنم میں زیادہ مقدار میں بھیجا جائے گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورت ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ جرم اور گناہ ان کو جہنم میں لیجانے والے ہیں، اس کی صراحت دوسری روایت میں موجود ہے۔ خود عورتوں نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں ہوگا کہ جہنم میں اکثریت عورتوں کی ہوگی؟

عورتوں کی دو بری عادتیں

نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: "تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ" تم لعن طعن زیادہ کرتی ہو۔ عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ لعنت وملامت اور طعن و تشنیع اور بددعائیں دینا ان میں

بہت زیادہ ہوتا ہے۔ زبان کی بے احتیاطیاں جتنی عورتوں کی طرف سے ہوتی ہیں اتنی مردوں کی طرف سے نہیں ہوتیں، دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لیے ایسی بات بولے گی کہ سامنے والے کے تن بدن میں آگ لگ جائے۔ اس لیے حضور (ﷺ) نے عورتوں کو متوجہ فرمایا کہ اس چیز سے اگر اپنے آپ کو بچاؤ گی تو جہنم سے بچنا آسان ہوگا.

اور دوسری چیز ہے: "وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيْرَ" شوہر، جیون ساتھی، شریکِ حیات جس کو عربی زبان میں "عَشِيْرٌ" کہا جاتا ہے یعنی جس کے ساتھ زندگی گزار رہی ہو، ان کی ناشکری کرتی ہو۔ ناشکری کے لئے عربی زبان اور قرآن و حدیث میں لفظِ کفر استعمال کیا گیا ہے۔ کافر کو کافر اسی لئے کہتے ہیں کہ جس اللہ نے اس کو پیدا کیا اور اتنی ساری نعمتیں دیں اور بہت ساری چیزوں سے نوازا؛ اس کو چھوڑ کر دوسرے کی عبادت کرتا ہے؛ تو اس سے بڑا ناشکرا اور کون ہوگا؟ تو ناشکری کے لیے بھی عربی زبان میں لفظِ کفر استعمال کیا جاتا ہے۔ تو عورتوں میں ایک خرابی اور کمزوری یہ بھی ہے کہ شوہر بیچارہ اس کے ساتھ کتنا ہی احسان و بھلائی کا معاملہ کرے، اور اس کو کتنی ہی سہولت وراحت پہنچانے کی کوشش کرے، لیکن پھر بھی اگر کبھی کوئی بات پیش آتی ہے، تو حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ترمذی شریف کی تقریر میں فرمایا کہ وہ کہتی ہے کہ تیرے گھر میں آکر میں نے دیکھا ہی کیا ہے؛ ایک چیتھڑا اور ایک ٹھیکرا۔ وہ کپڑے کو چیتھڑے سے تعبیر کرے گی، اور برتن کو ٹھیکرے سے تعبیر کرے گی۔

دنیا کے خوش بخت روکے جائیں گے

حدیث ۴۸۹

وعن أسامة بن زيد (رضی اللہ عنہ) عن النبي (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: قُمْتُ عَلَى بَابِ الْجَنَّةِ فَكَانَ عَامَّةُ مَنْ دَخَلَهَا الْمَسَاكِيْنُ، وَأَصْحَابُ الْجَدِّ مَحْبُوْسُوْنَ، غَيْرَ أَنَّ أَصْحَابَ النَّارِ قَدْ أُمِرَ بِهِمْ إِلَى النَّارِ۔ (متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میں جنت کے دروازہ پر کھڑا رہا تو دیکھا کہ عام طور پر اس میں جانے والے مسکین ہیں، اور اربابِ ثروت (جو دنیا کے اندر خوش بخت سمجھے جاتے ہیں، مال و دولت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا خوش قسمت بنایا ہے، ایسے خوش بخت) لوگ روکے گئے ہیں۔ البتہ جن لوگوں کے لیے جہنم کا فیصلہ ان کے گناہوں کی وجہ سے ہو چکا تھا، ان کو جہنم میں ڈال دیا گیا۔

افادات:- اگر چہ وہ اپنے عمل کی وجہ سے جنت کے حقدار ہیں لیکن چوں کہ مال زیادہ تھا تو اس کا حساب تو دینا ہی ہے۔ اور غریبوں کے پاس مال و دولت نہیں تھی تو حساب و کتاب کے اندر مشغولی کے نتیجے میں جو تاخیر ہو سکتی تھی اس سے وہ بچ گئے، اور جلدی جنت میں پہنچ گئے۔ لیکن جو مالدار اور خوش بخت اپنی نیکیوں کی وجہ سے جنت کے حقدار تھے، ان کو جہنم میں نہیں بھیجا جائے گا اور وہ اولِ وہلہ میں جنت میں بھی نہیں جا پائیں گے، مال و دولت کا حساب و کتاب دینے میں ان کو کچھ دیر لگے گی۔ گویا حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ دیکھو! مال و دولت اگر کسی کو مل بھی جائے اور اس کو صحیح طریقہ سے

استعمال بھی کرے۔ اگر جنت میں جانے کا فیصلہ ہو بھی گیا ہو؛ تب بھی حساب تو کہیں گیا ہی نہیں، مال کا حساب تو دینا ہی پڑے گا۔

شاعر کی سچی بات

حدیث ۴۹۰

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: أَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَهَا شَاعِرٌ كَلِمَةُ لَبِيدٍ: أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللهَ بَاطِلٌ (متفقٌ علیه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سب سے سچی اور صحیح بات جو کسی شاعر نے کہی ہو وہ لبید شاعر کا یہ شعر ہے: "أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللهَ بَاطِلٌ" اللہ کے علاوہ ہر چیز بے کار ہے۔

افادات:- لبید بن أعصم عرب کا ایک شاعر گزرا ہے، اس نے یہ شعر کہا ہے۔ چوں کہ عام طور پر شاعروں کے کلام میں مبالغہ آرائی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ سب سے عمدہ اور ایک دم صحیح بات جو کسی شاعر نے کہی ہو وہ یہ ہے: "اللہ کے علاوہ ہر چیز بے کار ہے اور ختم ہونے والی ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات باقی رہنے والی ہے"۔

بہر حال! آدمی آخرت ہی کے لیے محنتیں کرے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت کے لیے اپنی صلاحیت کو استعمال کرے۔ باقی اگر دنیا کے لیے محنتیں کرے گا تو دنیا ختم ہونے والی ہے۔

پورے باب کا نچوڑ

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس باب میں اپنی عادت کے خلاف بہت ساری روایتیں ذکر کی ہیں۔ پچھلے ابواب میں اتنی کثرت سے روایتیں نہیں لائے تھے، لیکن یہ باب زہد کے بارے میں قائم کیا کہ آدمی کے دل میں دنیا کی محبت نہ ہو، دنیا سے بے رغبتی ہو۔ اس باب کے تحت بہت ساری روایتیں پیش فرمائیں، تاکہ اس کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے۔ اور جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ ساری بیماریوں اور خرابیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے، دنیا کی محبت ہی کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، آخرت کو بھول جاتا ہے، آخرت کے اعمال کی طرف سے غفلت اور کوتاہی برتتا ہے اور گناہ میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس لیے آدمی جتنا اپنے دل کو دنیا کی محبت سے خالی رکھے گا اتنا ہی زیادہ کامیاب ہوگا۔

زہد کا خلاصہ اتنا ہی ہے کہ مال کی محبت دل میں نہیں ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ مال مت کماؤ، بلکہ آدمی کے پاس چاہے کتنا ہی مال ہو، لیکن دل میں دنیا اور مال کی محبت نہیں ہے؛ تو وہ "زاہد" ہے۔ اور ایک آدمی کے پاس مال کچھ بھی نہیں ہے، لیکن اس کا دل مال کی محبت سے بھرا ہوا ہے؛ تو اس کو "زاہد" نہیں کہیں گے۔

میں نے پہلے بھی قصہ سنایا تھا، ملا علی قاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو منیٰ کے بازار میں دیکھا جو ہزاروں کا کاروبار اور لین دین کررہا تھا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا دل اللہ کی یاد سے غافل نہیں تھا۔ یعنی ہاتھ کاروبار میں مشغول تھے لیکن دل اللہ کی طرف متوجہ تھا۔ وہی بزرگ فرماتے ہیں کہ دوسرے آدمی کو دیکھا کہ کعبہ کا غلاف پکڑے ہوئے رورہا تھا اور آنسو بہا رہا تھا، لیکن ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

تو اصل چیز یہی ہے کہ آدمی دل سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق رکھے اور آخرت کی طرف متوجہ ہو۔ باقی کاروبار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق مال کماتا ہے، تو اس سے منع نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن اتنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق کمائے اور اس کی رضا کے مطابق ہی استعمال کرے؛ تب تو بات بنے گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے۔

دعا

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ اے اللہ! دنیا اور مال کی محبت سے ہمارے قلوب کو پاک اور صاف فرما۔ اپنی معرفت ومحبت کے انوار سے ہمارے قلوب کو منور و معمور فرما۔ اپنی یاد سے ہمارے دلوں کو آباد فرما۔ اے اللہ! آخرت کے لیے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی اور آخرت ہی کو پیش نظر رکھنے کی

ہمیں توفیق عطافرما۔ہم سے راضی ہوجا۔اپنی مرضیات پرزیادہ سے زیادہ چلا کرنامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔نبیؑ کریم(ﷺ)کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہرشعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق وسعادت عطا فرما۔اے اللہ! امتِ مسلمہ کے حال پررحم فرما،امت کی اجتماعی وانفرادی پریشانیوں کو دور فرما۔اور اے اللہ!ہمیں نبیؑ کریم(ﷺ)کے طریقے پر صحیح طورسے گامزن ہونے کی توفیق عطافرما۔

فَضُلُ الْجُوْعِ وَخُشُوْنَةِ الْعَيْشِ

بھوک وفاقہ برداشت کرنے

اور

سادہ زندگی بسر کرنے کی فضیلت

﴿مجلس ۱﴾

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۶/ذی قعدۃ الحرام ۱۴۲۰ھ ۴/مارچ ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَ نَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

أَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا اِلاَّ مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولٰئِكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ شَیْئًا

عنوان کا خلاصہ

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے پہلے باب قائم کیا تھا کہ دنیا کی محبت سے آدمی کو دور رہنا چاہیے، اس لیے کہ ساری برائیوں کی جڑ یہی ہے۔ اب دنیا کی محبت کن چیزوں سے بڑھتی ہے اور کون سا طریقہ اختیار کرنے سے دنیا کی رغبت کم ہوتی ہے، اس کی کچھ تدبیروں کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔ بھوکا رہنے اور مشقت والی سادہ زندگی گزارنے کی

فضیلت۔ اور کھانے پینے ولباس میں کم سے کم پر اکتفاء کرنے کی فضیلت۔اور نفس کی خواہشات اور شہوتوں کو چھوڑنے کی فضیلت۔

عام طور پر آدمی جب نفس کی خواہشات کو پورا کرنا چاہتا ہے،اور کھانے پینے اور پہننے کے معاملہ میں عیش و عشرت اور مرفہ الحالی (خوش حالی) کو مدنظر رکھتا ہے تو اسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنی ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے اسے کچھ تدبیریں بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔اس لئے کہ ظاہر ہے کہ یہ ساری چیزیں اسی وقت پوری ہوسکتی ہیں جب کہ آدمی کچھ مال حاصل کرے، اور اگر مال اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضامندی اور اس کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق حاصل نہیں ہوپاتا تو پھر اللہ کی ناراضگی والے طریقے اختیار کرتا ہے،اور پھر یہی چیز ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔اس لیے یہ باب قائم کرکے ایسی آیتیں اور احادیث پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی کو اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل میں کم سے کم پر اکتفاء کرنا چاہیے۔

اس لیے کہ پہلے بھی بتلایا تھا کہ دنیا کی مثال راستہ کی ایک منزل کی طرح ہے اور ہمارا سفر آخرت کی طرف ہے،اس لیے ہماری منزل آخرت ہے،اور دنیا ایک راہ گزر ہے،تو جیسے ایک مسافر اپنی راہ گزر میں اپنی ضرورتوں کے معاملہ میں کم سے کم پر اکتفاء کرتا ہے، اور اگر ان کے پورا کرنے کے سلسلے میں کچھ مشقت اور تکلیف ہوتی ہے تو وہ اس کو خوشی سے برداشت کرتا ہے،اسی طریقہ سے دنیوی زندگی میں آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ

یہ دنیا میرا اصلی ٹھکانہ نہیں ہے، اصلی ٹھکانہ تو آخرت ہے،لہٰذا دنیا میں تو آدمی کے پاس اتنا ہی سامان ہونا چاہیے جو اس کو آخرت تک پہنچادے۔

حضرت ابو عبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) کے مناقب

حضرت ابو عبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) بڑے جلیل القدر صحابہ میں سے ہیں ، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جن حضرات کو ایک ہی مجلس میں جنتی ہونے کی بشارت سنائی، ان میں یہ بھی ہیں، سقیفۂ بنو ساعدہ میں نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) جب مشورہ کے لیے جمع ہوئے کہ آپ کے بعد اب کس کو اختیارات دئے جائیں اور کس کو حضور کا جانشین مقرر کیا جائے،اس موقعہ پر حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ)نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں انہوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ میں تمہارے سامنے دو آدمیوں کو پیش کرتا ہوں ، ان میں سے کسی ایک کو چن لو:ایک تو حضرت عمر بن خطاب(رضی اللہ عنہ) اور دوسرے حضرت ابو عبیدہ بن جراح(رضی اللہ عنہ)(سیر اعلام النبلاء) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ان کو"أَمِينُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ" اس امت کے امانت دار کالقب دیا ہے،گویا وہ صفتِ امانت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔دراصل ایک وفد نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آیا اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ آپ ہمارے یہاں کسی آدمی کو بھیج دیجئے تاکہ ہم جزیہ کی رقم ان کے حوالہ کردیں ،تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ میں ایک ایسے آدمی کو بھیجوں گا جو اس امت کے امین ہیں۔اس وقت بڑے بڑے

لوگوں نے یہ تمنا کی کہ معلوم نہیں یہ قرعۂ فال کس کے نام نکلتا ہے، پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابو عبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) کو وہاں بھیج دیا۔(سیر اعلام النبلاء)

اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: تم میں سے ہر شخص ایسا ہے کہ میں اس کی کسی نہ کسی بات پر گرفت کرسکتا ہوں سوائے ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) کے (سیر اعلام النبلاء) یہ حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ) کے فضائل ہیں۔

انہوں نے اسلام کی خاطر بڑی قربانیاں دیں۔ انہوں نے حبشہ کی ہجرت بھی کی، اس کے بعد مدینہ منورہ کی بھی ہجرت کی۔ غزوۂ بدر کے موقعہ پر ان کے والد لشکر کفار کی طرف سے لڑنے کے لیے میدان میں آئے تھے، ان کے والد ان کی تلاش میں رہے کہ میں اپنے بیٹے کو ختم کردوں۔ اور کئی مرتبہ ان کے والد ان کے سامنے آئے لیکن یہ طرح دے گئے۔ دراصل یہ اپنے ہاتھ سے اپنے والد کو قتل کرنا نہیں چاہتے تھے، اگرچہ ان کے کفر سے ناراض تھے لیکن پھر ایک مرتبہ ان کے والد سامنے آئے تو آخر ایمان کفر پر غالب آیا، اور انہوں نے اپنے والد کو اسی غزوۂ بدر کے موقعہ پر قتل کردیا، اس سے بڑی قربانی اور کیا ہوسکتی ہے۔ بہر حال ان کا بڑا اونچا مقام ہے۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر میری دنیا سے روانگی کا وقت آیا اور ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ) موجود ہوں گے تو میں اپنی جگہ پر ان کو مقرر کروں گا، اور اللہ کے یہاں اگر

سوال ہوا تو میں عرض کروں گا کہ باری تعالیٰ! ایک ایسے آدمی کو مقرر کر کے آیا ہوں جس کو آپ کے حبیب(صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کا امین قرار دیا ہے۔(سیر اعلام النبلاء)

رومیوں کے ساتھ مسلمانوں کی جو لڑائیاں ہوئیں ان میں آخری اور فیصلہ کن جو جنگ ہوئی ہے وہ جنگِ یر موک کہلاتی ہے،اس جنگ میں سپہ سالار یہی تھے،انہی کے ہاتھوں رومیوں کو شکست ہوئی اور رومیوں کا تمام تسلط شام اور عرب کے علاقوں سے ختم ہوا۔ صحابہ میں ان کا بڑا اونچا مقام سمجھا جاتا ہے۔

فاتحِ روم کی زندگی کا حال

میں جو قصہ سنانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نے ان کو شام کا گورنر مقرر کیا تھا اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی عادت تھی کہ وہ جن لوگوں کو مختلف علاقوں کے اوپر حاکم اور گورنر مقرر کرتے تھے، ان کے حالات کی جستجو بھی کرتے رہتے تھے کہ وہ کس حالت میں ہیں ،حکومت کی کرسی پر آکر کہیں عیش و عشرت میں تو نہیں پڑ گئے،کہیں اپنی حالت میں تبدیلی تو نہیں کرلی۔حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) کی عادت تھی کہ چھپ کر بھی ان کی خبر گیری کرتے تھے،اور دوسرے لوگوں کے ذریعہ سے بھی احوال کی تحقیق کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کو کسی جگہ کا امیر مقرر کیا،پھر ان کو کسی ضرورت سے مدینہ منورہ بلایا،جب وہ مدینہ منورہ کے قریب پہنچے تو مدینہ میں داخل ہوں اس سے

پہلے ہی حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)یہ سوچ کرایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئے کہ تحقیق کریں کہ کہیں کوئی مال ودولت توساتھ لے کر نہیں آئے ہیں، گویاراستہ ہی میں ان کی تلاشی لی۔ یہ حضرت عمرکا معاملہ تھا۔

جب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) شام کے سفر پر گئے تو ایک موقعہ پرانہوں نے حضرت ابوعبیدہ(رضی اللہ عنہ) سے کہا :مجھے اپنے گھر لے جاؤ۔حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) سمجھ گئے کہ یہ میرے گھر آکرمعلوم کرناچاہتے ہیں کہ میرے گھرمیں کیاسازوسامان ہے۔انہوں نے کہا: امیرالمؤمنین!آپ میرے گھر آئیں گے توسوائے آنسو بہانے کے اورکچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا:کوئی بات نہیں ،مجھے لے جاؤ۔تشریف لے گئے، جب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) ان کے مکان میں داخل ہوئے تو دیکھاکہ صرف تین چیزیں ہیں ،ایک چمڑا ہے، لکڑی کاایک پیالہ ہے ،اور ایک مشکیزہ ہے۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: آپ کا سامان کہاں ہے؟ انہوں نے کہا:بس یہی سامان ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں۔ ایک آدمی کو قبرتک پہنچانے کے لیے اتناہی سامان کافی ہے۔مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اورکیا کرنا ہے؟دنیا تو ایک راہ گزر ہے ،ایک دن ہرآدمی کو مرنا ہے، اور اس کے بعد اصل زندگی آخرت کی ہے۔توحضرت عمر (رضی اللہ عنہ)نے پوچھا:آپ کا کھانا کیاہے؟تو ایک دیوارکی شگاف میں سے روٹی کے چند ٹکڑے نکالے اور کہا: یہ میرا کھاناہے۔(سیر اعلام النبلاء) یہ وہ شخص ہے جنہوں نے روم کو فتح کیا تھااور روم کی سلطنت اس سے لرزتی تھی۔

تمام صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) کا نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد یہی حال تھا۔اور یہ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) کی تربیت تھی کہ ان حضرات کی نگاہوں میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ دنیا کی اس زمانے کی جو (Super Power)طاقتیں سمجھی جاتی تھیں وہ دو تھیں۔ایک سلطنت کسریٰ شاہ ایران کی، اوردوسری قیصرشاہ روم کی۔جب ان دونوں کو مسلمانوں نے فتح کرلیا تو خوب دولت آئی، اس کے باوجودعام طور پر ان کے حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

مدائن کے گورنر کا حال

حضرت سلمان فارسی(رضی اللہ عنہ) مدائن کے گورنر تھے،اس کے باوجودان کالباس ایک معمولی آدمی کی طرح کاہوتا تھا۔ایک مرتبہ بازار سے گزررہے تھے، باہر ملک سے کوئی تاجر آیا ہوا تھااوراس کے پاس سامان تھا۔وہ ان کو دیکھ کریوں سمجھا کہ کوئی مزدور ہے تو ان سے کہا کہ میرا سامان اُٹھالو،انہوں نے اُٹھالیا، سامان اُٹھاکر جارہے تھے،ساتھ میں وہ تاجر بھی چل رہا تھا۔جب بازار سے گزرنے لگے تو لوگوں نے اس تاجر سے کہا کہ یہ تو یہاں کے گورنر ہیں۔وہ بھی تعجب میں پڑگیااوراب ڈرنے لگااور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھ سے گستاخی ہوگئی۔انہوں نے کہاکہ ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں نے نیکی کی نیت کرکے تمہارا سامان اُٹھایا ہے،میں نے جس نیت سے عمل خیرشروع کیا ہے اس کو پورا کرکے رہوں گا۔پھراس کو جہاں سامان پہنچانا تھا، وہاں تک پہنچایا۔(سیر اعلام النبلاء)

اصل چیز یہی ہے کہ آدمی دنیا میں اپنی ضرورتیں کم سے کم رکھے، جتنی ضرورتیں بڑھائے گا اتنی ہی محنت کرنی پڑے گی، اور ہر وقت وہ یہی سوچے گا کہ زیادہ پیسہ کماؤں گا تب ہی تو یہ ساری ضرورتیں پوری ہوں گی۔ آدمی جتنا اپنے آپ کو شہوتوں میں لگائے گا اتنا ہی دنیا کمانے کے لیے محنت زیادہ کرنی پڑے گی اور دنیا کی محبت بڑھے گی، اسی لیے قرآن وحدیث میں عام طور پر اسی بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اپنے نفس کی خواہشات کو روکے۔

دنیا کے لیے قربانیاں؛ آخرت کے لیے کیوں نہیں؟

اور ویسے اگر ہم دیکھیں تو دنیا حاصل کرنے کے لیے بھی آدمی اپنی بہت ساری خواہشات کو قربان کرتا ہے۔ جو لوگ ملازمت کرتے ہیں وہ صبح جلدی گھر سے نکلتے ہیں، اگر بمبئی جا رہا ہے تو فلائنگ (Flying) پکڑنے کے لئے، اور احمد آباد کی طرف جا رہا ہے تو کوین (Queen) پکڑنے کے لیے جلدی سے اُٹھتا ہے۔ تو آخر وہ اپنی نیند کی قربانی دے ہی رہا ہے۔ کاروبار میں اپنی فیکٹری سنبھالنے کے لیے کتنی مشقتیں ہوتی ہیں، صبح گھر سے جاتا ہے تو دو پہر کا کھانا نہیں کھاتا، ناشتہ کر کے جاتا ہے اور شام کو آکر کھانا کھاتا ہے۔ اور پھر کیسے کیسے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے اور کیسے کیسے حالات پیش آتے ہیں، ان کو خوش کرنے کے لیے کیا کیا تدبیریں اختیار کرتا ہے۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا، لیکن یہ سب اس لیے کر رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کمائی حاصل کرے۔ تو دنیوی اعتبار سے جس چیز کو وہ اپنی ترقی

سمجھ رہا ہے اس کے حاصل کرنے کے لیے یہ ساری قربانیاں دیتا ہے،تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخرت کی نعمتیں جو اس دنیا سے کئی گنا بڑی اور دائمی ہیں ، ان کے لیے آخر یہ سب کیوں نہیں ہوتا؟ دنیا کے لیے ہم صبح جلدی اُٹھ سکتے ہیں ،نیند قربان کر سکتے ہیں ،دنیا کے لیے ہم دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو جھکا سکتے ہیں،دنیا کی خاطر دوسروں کو خوش کرنے کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں ، دنیا کے لیے ہم دوپہر کا کھانا چھوڑ سکتے ہیں، دوپہر کی نیند چھوڑ سکتے ہیں،اور بہت ساری خواہشات قربان کر سکتے ہیں،اگر کسی رشتہ دار کے یہاں شادی آئی اور اتوار کا دن نہیں ہے تو آپ نہیں جاتے،کہتے ہیں کہ میری دوکان کی گاہکی کا وقت ہے۔کہنے کا حاصل یہ ہے کہ بہت ساری چیزیں ہم چھوڑتے ہیں ،اور ایسا نہیں ہے کہ ہم محنت نہیں کرتے اور مشقت نہیں اٹھاتے،لیکن یہ سب دنیا کے لیے کرتے ہیں ۔تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دنیا کے لیے ہم یہ سب کچھ کر سکتے ہیں تو آخرت کے لیے آخر ہم سے یہ سب کیوں نہیں ہوتا؟حالاں کہ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ دنیا کی حقیقت ہی کیا ہے۔

عقلمندی کا طریقہ

ہم میں اور ہمارے اسلاف و اکابر میں یہی فرق ہے کہ وہ یہی ساری چیزیں آخرت کے لیے کرتے تھے،ہم بھی وہی سب کرتے ہیں لیکن دنیا کے لیے کرتے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم کس چیز کے لیے قربانی دیتے ہیں؟ایک ایسی چیز کے لیے جو دنیا میں بھی ہمارے

لیے زیادہ کام نہیں آتی، اور جس کو یہیں چھوڑ کر ایک دن جانا ہے۔ اور انہوں نے یہ ساری قربانیاں ایک ایسی چیز کے لیے دیں جو ہمیشہ ہمیش ان کے ساتھ آنے والی ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی بھی دلانے والی ہے۔ عقلمندی اور دانشمندی کا طریقہ کون سا ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث میں خاص طو پر ترغیب دی گئی کہ آدمی اپنے کھانے پینے اور لباس کی ضرورتیں کم سے کم رکھے، اور اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑ نے کا اہتمام کرے اور خشونتِ عیش یعنی کھردری زندگی گزارنے کی کوشش کرے، ایسی زندگی جس میں آدمی بہت سادگی کے ساتھ رہتا ہو۔ اس باب میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) ایسی ہی زندگی کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ناخَلَف اولاد کی دو بُری خصلتیں

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا۔ سورۂ مریم کی آیت ہے: ﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ﴾ اس آیت سے پہلے بہت سارے انبیاء کا تذکرہ ہے اور ان کے حالات بتائے ہیں کہ وہ نمازوں کو قائم کرتے تھے، اس کے اوقات اور اس کی ساری چیزوں - فرائض، واجبات، سنن- اور اس کے سارے تقاضوں کا نہایت اہتمام کرتے تھے، اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے بعد ایسے ناخَلَف لوگ آئے (''خَلۡفٌ'' ایسی اولاد اور ایسے جانشین جو اپنے بڑوں کے اوصاف اور خوبیوں کے حامل نہ ہوں۔ ان کے بڑے جو اچھے کام کرتے تھے ان اچھے کاموں کو وہ انجام نہ دیتے ہوں اور ان کے بڑوں میں جو خوبیاں تھیں، وہ

ان سے متصف نہ ہوں ؛ایسے لوگوں کو عربی میں ’’خَلْفٌ‘‘ کہتے ہیں ، جس کا اردو ترجمہ ہم ’’ناخَلَف اور ناہنجار اولاد‘‘ کرتے ہیں) ﴿أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ جنہوں نے نمازوں کو ضائع کیا ﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ اور جنہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی ﴿فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا﴾ یہ لوگ برا بدلہ پائیں گے ﴿إِلَّا مَنْ تَابَ﴾ (البتہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کی زندگی میں موقعہ اور مہلت ہے) مگر وہ لوگ جنہوں نے توبہ کی ، ایمان لائے ،اور اچھے اعمال کئے۔ اگر بعد میں یہ صفات اختیار کرلیں ،تو پھر وہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے،ان کے اچھے اعمال کا بدلہ دینے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔

اس آیت میں خاص طور پر دو چیزیں بیان کی ہیں ﴿أَضَاعُوا الصَّلٰوةَ﴾ ﴿وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ﴾ نماز کو ضائع کیا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی۔ معلوم ہوا خواہشات کی پیروی کرنا نہایت بُری چیز ہے جس کو چھوڑنا چاہیے۔

حقیقی دولت یہ نہیں ،وہ ہے...

دوسرا ارشاد نقل کیا:﴿فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِيْ زِيْنَتِهٖ﴾ قارون کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت دولت دے رکھی تھی،صرف اس کے خزانوں کی کنجیاں اُٹھانے کے لئے طاقتور آدمیوں کی ایک پوری جماعت ہوتی تھی، ایک مرتبہ وہ اپنے ٹھاٹ باٹھ والے زیب وزینت کے لباس میں باہر نکلا﴿قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا﴾ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی دنیوی اعتبار سے خوشحال ہو،اور وہ اپنی خوشحالی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھے

لباس یا اچھی گاڑی اور سواری لے کر نکلے، تو اس کو دیکھ کر بہت سے لوگوں کی رال ٹپکنے لگتی ہے، چناں چہ قارون بھی جب اس لباس میں نکلا تو وہ لوگ جو دنیوی زندگی کے خواہش مند تھے وہ کہنے لگے: ﴿یٰلَیۡتَ لَنَا مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ قَارُوۡنُ﴾ کاش ہمیں بھی ایسی دولت ملتی جو قارون کو دی گئی ہے ﴿اِنَّهٗ لَذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ﴾ وہ تو بڑا نصیب والا ہے۔ گویا اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر وہ بھی رال ٹپکانے لگے اور اس جیسی حالت کی اپنے لیے تمنا کرنے لگے ﴿وَقَالَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ﴾ لیکن وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت عطا فرمائی تھی اور علم سے نوازا تھا، وہ دنیا کے خواہش مندوں کی بات سن کر کہنے لگے ﴿وَیۡلَکُمۡ﴾ تمہارا ناس ہو ﴿ثَوَابُ اللّٰهِ خَیۡرٌ لِّمَنۡ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت کے اندر جو بدلہ ملنے والا ہے وہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو ایمان لائیں اور عمل صالح کریں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی دولت نہیں ہے، حقیقی دولت تو وہ ہے جو آخرت میں ملنے والی ہے، لیکن وہ ایمان اور اعمالِ صالحہ پر ملنے والی ہے۔ اس لیے آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ہر نعمت کے متعلق سوال کیا جائے گا

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ثُمَّ لَتُسۡـَٔلُنَّ یَوۡمَئِذٍ عَنِ النَّعِیۡمِ﴾ پھر قیامت کے روز نعمتوں کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا۔ ویسے آدمی تمنا تو کرتا ہے کہ مجھے یہ ملے اور وہ ملے، دولت ملے، لیکن آدمی کو سوچنا چاہیے کہ دنیوی اعتبار سے جو کچھ بھی دیا جاتا ہے وہ سب اگرچہ اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ تمنا کرنے کے بعد اگر مل گیا تو کیا

اس کا حق اور اس کا شکر بھی ادا کرسکوگے ؟ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان تمام نعمتوں کے متعلق سوال ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں۔ ہر نعمت - چاہے تندرستی ہو، فرصت ہو، دولت ہو اور کھانا پینا لباس ہو، اس کے- متعلق پوچھا جائے گا کہ اس نعمت کا کیا حق ادا کیا۔

ایک قصہ

امامِ حاکم شہید (رحمۃ اللہ علیہ) نے مستدرک میں حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے ایک لمبی روایت نقل فرمائی ہے جو صحیح سند کے ساتھ مروی ہے، اور اس کو امام منذری (رحمۃ اللہ علیہ) نے الترغیب والترہیب میں نقل کیاہے۔ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لاکر فرمایا ابھی میرے دوست حضرت جبرئیل (علیہ السلام) تشریف لائے تھے اور یہ فرمایا کہ پچھلی امتوں میں سے اللہ کا ایک بندہ اپنے گھربار عزیز واقارب مال ودولت سب کچھ چھوڑ کر سمندر کے بیچ میں پہاڑ نما ایک ٹیلہ تھا اس میں جاکر عبادت کرنا شروع کردی، وہ سمندر اتنا وسیع تھا کہ اس ٹیلہ کی ہر جانب چار چار فرسخ دوری تک سمندر تھا، وہاں پر کوئی کھانے کی چیز نہیں تھی، اور سمندر کا پانی بھی بالکل نمکین تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس میں ایک انار کا درخت اُگا دیا، اور انگلی کے برابر میٹھے پانی کا ایک چشمہ جاری کردیا، یہ عابد دن رات چوبیس گھنٹہ اپنی عبادت میں گزار دیتا اور چوبیس گھنٹے میں انار کا ایک پھل کھالیتا اور میٹھے پانی کے چشمہ سے ایک گلاس پانی نوش فرمالیتا، اسی حالت میں پانچ سو سال

گزر گئے، پانچ سو سال کے بعد جب اس عابد کی موت کا وقت آیا تو اس نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ دعا مانگی کہ سجدے کی حالت میں اس کی روح پرواز کر جائے، اور اس کی نعش کو مٹی وغیرہ ہر چیز پر حرام کر دے، اور قیامت تک سجدے کی حالت میں صحیح وسالم رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول فرمائی، سجدے کی حالت میں اس کی موت ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے وہاں ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ قیامت تک وہاں کسی انسان کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ قیامت کے دن اس عابد کو اللہ کے دربار میں حاضر کیا جائے گا، تو اللہ پاک فرشتوں سے فرمائے گا کہ میرے بندے کو میرے فضل سے جنت میں داخل کر دو، تو وہ عابد کہے گا: "رَبِّ بَلْ بِعَمَلِیْ" کہ اے میرے رب! بلکہ میرے عمل کے بدلے میں جنت میں داخل کر دیجیے، کیوں کہ میں نے پانچ سو سال تک ایسی عبادت کی ہے جس میں کسی قسم کی ریاکاری کا شائبہ بھی نہیں تھا، تو اللہ پاک پھر فرمائے گا کہ میری رحمت سے داخل کر دو، تو یہ بندہ کہے گا کہ میرے عمل کے بدلے میں داخل کیجیے، تو اس پر اللہ پاک فرمائے گا کہ اس کے عمل اور میری دی ہوئی نعمتوں کا موازنہ کرو، تو موازنہ کر کے دیکھا جائے گا کہ اللہ نے جو اس کو بینائی عطا فرمائی ہے، صرف بینائی کی نعمت اس کی پانچ سو سال کی عبادت کا احاطہ کرلے گی، اس کے بعد پورے جسم میں کان کی نعمت، زبان کی نعمت، ہاتھ کی نعمت، ناک کی نعمت، پیر کی نعمت، دل ودماغ کی نعمت، ان سب کا بدل باقی رہ جائے گا، پھر ان کے علاوہ جو پانچ سو سال تک اللہ نے میٹھا پانی پلایا ہے اور انار کا پھل کھلایا ہے، ان تمام کا بدل باقی رہ جائے گا، تو اللہ پاک فرمائے گا کہ اس کی پانچ سو سال کی عبادت تو صرف نعمتِ بصر کے

بدلے میں ختم ہوگئی، ہماری باقی نعمتوں کا بدل کہاں ہے؟ لہٰذا اس کو جہنم میں داخل کردو، تو فرشتے اسے گھسیٹ کر جہنم کی طرف لے جانے لگیں گے، تو وہ چلّانے لگے گا، اے میرے رب! محض اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل فرمادیجئے، تو اللہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ تجھے تو اپنی پانچ سو سال کی عبادت پر بڑا ناز تھا، اب تیری عبادت کہاں چلی گئی؟ اور خطرناک سمندر کے بیچ میں میں نے تجھے انار کے پھل کھلائے اور پانچ سو سال تک مسلسل میٹھا پانی پلایا، میری ان نعمتوں کے بدلے میں تم کیا لائے ہو؟ تو وہ کہے گا کہ اے اللہ! آپ اپنی رحمت سے مجھے جنت میں داخل فرمایئے، آپ کی رحمت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا ہے، پھر آخر میں جب حجت تمام ہوجائے گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میری رحمت و میرے فضل کے ذریعے اس کو جنت میں داخل کردو۔

تو وہ عابد اپنے دل دل میں کہے گا کہ میں نے پانچ سو سال تک ایسی عبادت کی ہے جس میں ریاکاری کا شائبہ تک نہیں، اور اب اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے جنت میں داخل کررہا ہے اور میری پانچ سو سال کی عبادت کا ذکر تک نہیں کیا، اللہ تعالیٰ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں سے کہے گا کہ اس کو جنت کے بجائے جہنم کی طرف لے جاؤ، اور جہنم سے اتنی دوری پر کھڑا کردو کہ اس کے اور جہنم کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہو، جب اتنی دوری پر کھڑا کردیا جائے گا تو جہنم کی طرف سے گرم لُو چلے گی، جس سے اس عابد کا حلق خشک ہوجائے گا اور پیاس کے عالم میں سخت پریشانی میں

مبتلا ہو جائے گا، اسی اثناء میں ایک دستِ غیب نمودار ہو گا جس میں ایک گلاس پانی ہو گا، یہ عابد اس کو دیکھ کر چلّا چلّا کر کہے گا کہ یہ پانی مجھے دے دیا جائے، تو ایک آواز آئے گی: پانی مل سکتا ہے مگر اس کی قیمت ہے، مفت میں نہیں ملے گا یہ عابد کہے گا کہ اس کی قیمت کیا ہے؟ تو آواز آئے گی کہ اس کی قیمت پانچ سو سال کی ایسی عبادت ہے جس میں کسی قسم کی ریاکاری کا شائبہ تک نہ ہو، تو یہ کہے گا کہ میرے پاس ایسی عبادت موجود ہے، لہٰذا میں پانچ سو سال کی عبادت دے دیتا ہوں مجھے یہ پانی پلا دیا جائے، چناں چہ پانچ سو سال کی عبادت کے بدلے میں یہ پانی خرید کر پی لے گا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اس کو پھر اب میرے پاس لاؤ، چناں چہ اللہ کے دربار میں حاضر کیا جائے گا تو اللہ پاک فرمائے گا کہ تجھے تو اپنی پانچ سو سال کی عبادت پر بڑا ناز تھا؟ اور اس کی قیمت ایک گلاس پانی تم نے خود تجویز کی ہے، اور ہم نے جو پانچ سو سال تک تم کو انار کا پھل کھلایا ہے، اور میٹھا پانی پلایا ہے، تم اس کے عوض میں کیا لائے ہو؟ تو وہ عابد اللہ کے دربار میں سربسجود ہو کر فریاد کرے گا کہ اے اللہ! اب بات سمجھ میں آگئی کہ تیری رحمت اور فضل کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا، چناں چہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و فضل سے اس کو جنت میں داخل فرما دے گا۔

(انوارِ ہدایت۔ صفحہ ۲۷۱، ۲۷۲)

تو حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بھی ہم حساب نہیں دے سکتے۔ اس کے بالمقابل اگر ہم کسی کو مہینہ کے دو چار ہزار روپے دے کر ملازمت پر رکھتے ہیں تو اس کے آٹھ گھنٹے ایسے خریدتے ہیں کہ پوری مزدوری کراتے ہیں۔ اگر وہ ذرا بھی کمی کرے تو

اس کو ڈانٹتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری نعمتیں دے رکھی ہیں ، اس کے بعد ہم کیا کرتے ہیں ؟یعنی کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتا ہے تو ان نعمتوں کا بدلہ کہاں ادا ہو سکتا ہے؟ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ تمنائیں کرتا ہے، لیکن یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میں جن چیزوں کی تمنائیں کرتا ہوں ، اگر مل بھی گئیں ، تو کیا میں ان کا حق ادا کرسکوں گا؟ اس لئے باری تعالیٰ نے فرمایا : قیامت کے روز اللہ کی نعمتوں کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا۔ اس لئے پہلے تو ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا حق بھی ہم سے ادا ہو رہا ہے یا نہیں ؟

دنیا کی وسعت اگر مطلوب ہوتی...

حدیث ۴۹۱

وعن عائشة رَضِيَ الله عنها قَالَتْ: مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ (ﷺ) مِنْ خُبْزِ شَعِيْرٍ يَوْمَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ حَتّٰى قُبِضَ.

(متفقٌ عليهِ)

وفِي رِوَايَة: مَا شَبِعَ آلُ مُحَمَّدٍ (ﷺ) مُنْذُ قَدِمَ الْمَدِيْنَةَ مِنْ طَعَامِ الْبُرِّ ثَلَاثَ لَيَالٍ تِبَاعاً حَتّٰى قُبِضَ.

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبئ کریم (ﷺ) کے گھرانے والوں نے کبھی جَو کی روٹی بھی مسلسل دو دن پیٹ بھر کر نہیں کھائی، یہاں تک کہ نبئ کریم (ﷺ) کی وفات ہوئی۔

افادات:- جو اس زمانہ میں سب سے گھٹیا اور کمتر چیز سمجھی جاتی تھی، وہ بھی نبیؐ کریم (ﷺ) کے گھر والوں کو مسلسل دو روز پیٹ بھر کر میسر نہیں ہوئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب سے نبیؐ کریم (ﷺ) مدینہ منورہ تشریف لائے، آپ کے گھر والے کبھی گیہوں کی روٹی سے تین رات مسلسل شکم سیر نہیں ہوئے یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کھانے پینے اور دنیا کی چیزوں کی وسعت اگر کوئی مطلوب چیز ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہوتی، تو اس کے زیادہ حق دار نبیؐ کریم (ﷺ) اور آپ کے گھر والے تھے، آپ (ﷺ) نے اپنے اور اپنے گھر والوں کے لیے جو حالت پسند کی اسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو رکھا، اگر آپ چاہتے تو دوسری حالت کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے فیصلہ کیا جاتا۔

اس روایت سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! آپ کے گھر والوں کا بھوکا رہنا یہی وہ حالت ہے جو اللہ کے رسول (ﷺ) کے نزدیک پسندیدہ ہے، اور جب اللہ کے رسول اس حالت کو پسند کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ بھی یہی حالت بنے گی، آج کل تو ہم اس طرح بھوکا رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

اُمت کے لیے بھی پسندیدہ یہی ہے

حدیث ۴۹۲

وَعَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنهَا أَنَّهَا كَانَتْ تَقُوْلُ: وَاللهِ يَا ابْنَ أُخْتِيْ! إِنْ كُنَّا نَنْظُرُ إِلَى الْهِلاَلِ، ثُمَّ الْهِلاَلِ ، ثلاثةُ أَهِلَّةٍ فِيْ شَهْرَيْنِ، وَمَا أُوْقِدَ فِيْ أَبْيَاتِ رَسُوْلِ اللهِ(ﷺ) نَارٌ. قُلْتُ: يَا خَالَةُ! فَمَا كَانَ يُعِيْشُكُمْ؟ قَالَتْ: أَلْأَسْوَدانِ ؛ التَّمْرُ وَالْمَآءُ ، إِلاَّ أَنَّهُ قَدْ كَانَ لِرَسُوْلِ اللهِ(ﷺ) جِيْرانٌ مِنَ الْأَنْصَارِ ، وَكَانَتْ لَهُمْ مَنَائِحُ وَكَانُوْا يُرْسِلُوْنَ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ(ﷺ) مِنْ أَلْبَانِهَا فَيَسْقِيْنَا. (متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت عروہ (رضی اللہ عنہ)(جو حضرت اسماء(رضی اللہ عنہا) کے بیٹے، حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) کے صاحب زادے اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے بھانجے ہیں،اپنی خالہ) ام المؤمنین حضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا) سے نقل کرتے ہیں کہ وہ کہا کرتی تھیں : اللہ کی قسم اے میرے بھانجے!ہم ایک چاند دیکھتے، پھر دوسرا چاند دیکھتے،اس طرح تین چاند دومہینے کے دوران ہوتے ہیں (مہینہ کے شروع میں چاند دیکھا پھر مہینہ آیا اس کا چاند دیکھا ،پھر اس کے بعد والے مہینے کا چاند دیکھا،اس طرح تین چاند دیکھے تو درمیان میں دومہینے گذرے)اورحال یہ ہوتا تھا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے گھروں میں آگ نہیں جلائی جاتی تھی، چولہا نہیں جلتا تھا(گویا پکانے کے لیے کوئی چیز ہوتی ہی نہیں تھی،اوریہ حضوراکرم(ﷺ) کی تمام ازواجِ مطہرات کے گھروں کا حال تھا)حضرت عروہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: خالہ جان! پھر کون سی چیز تمہیں زندہ رکھتی تھی؟(کیا کھاکر زندہ رہتے تھے؟)توحضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا) نے جواب میں فرمایا : ”الأسودان“ دوکالی چیزیں یعنی کھجور اور پانی(پانی بھی آپ کنویں میں دیکھیں تواوپر سے کالا ہی نظر آتاہے)البتہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے کچھ انصاری پڑوسی تھے جن کے دودھ دینے والے جانور تھے، وہ

کبھی حضور(ﷺ) کے لیے دودھ بھیج دیتے تھے، وہ حضور ہم کو پلادیتے تھے(روٹی یا گوشت اور سالن ایسی کوئی چیز مسلسل دو مہینے تک میسر نہیں آتی تھی۔)

افادات:- بتلانا چاہتے ہیں کہ زندگی گذارنے کی جو حالت اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک(ﷺ) کے لیے پسند فرمائی وہ یہی ہے۔اورجب یہ حالت حضور(ﷺ) کے لیے مطلوب اور محبوب رہی، تو اُمت کے لیے بھی یہی حالت محبوب ہوگی ،اور حقیقتاً یہی حالت اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ بھی ہے،لیکن ہم اپنی کمزوری کی وجہ سے اس حالت کو برداشت نہیں کرسکتے تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جو گنجائش دی ہے، اس سے اس کی حد میں رہ کر ہم فائدہ اُٹھاتے رہیں، لیکن پھراپنی اس حالت پر مغرور بھی نہ ہوں،بلکہ اپنی اس حالت کو پسند نہ کریں،پسند تو اسی حالت کو کرنا چاہیے۔

حضور کا زمانہ یاد آگیا

حدیث ۴۹۳

وعن أَبِي سَعِيد الْمَقْبُرِيِّ عن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ): أَنَّهُ مَرَّ بِقَوْمٍ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ شَاةٌ مَصْلِيَّةٌ ، فَدَعَوْهُ ، فَأَبَى أَنْ يَأْكُلَ، وقَالَ: خَرَجَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ) مِنَ الدُّنْيَا وَلَمْ يَشْبَعْ مِنْ خُبْزِ الشَّعِيرِ. (رواہ البخاری)

(الْمَصْلِيَّةُ) بفتح الميم: اي مشْوِيَّةٌ.

ترجمہ:- حضرت ابو سعید مقبری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا، جو کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے، اوران کے سامنے بھونی ہوئی بکری رکھی تھی، جب انہوں نے حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھا تو ان کو بھی دعوت دی کہ آیئے! تشریف لایئے، آپ بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہوجایئے۔ توحضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے کھانے میں شریک ہونے سے انکار کردیا، اوران کو حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حالت یاد آگئی توفرمایا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تودنیا سے ایسی حالت میں تشریف لے گئے کہ آپ نے جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی اور ہم بھونی ہوئی بکریاں کھائیں۔

افادات:- یہ ان کا ایک حال ہے کہ اس وقت وہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حالت یاد آئی تو انہوں نے کھانے میں شریک ہونا پسند نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بھونی ہوئی بکری کھانا ناجائز ہے، یہاں تو بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ دیکھو! نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کیا حال تھا کہ آپ دنیا سے ایسی حالت میں تشریف لے گئے کہ جَو کی روٹی بھی پیٹ بھر کر نہیں کھائی۔

حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی غذا

حدیث ۴۹۴

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: لَمْ يَأْكُلِ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) عَلَى خِوَانٍ حَتّٰى مَاتَ، وَمَا أَكَلَ خُبْزًا مُرَقَّقًا حَتّٰى مَاتَ (رواہ البخاری)

وفی رِوَايَةٍ لَهُ: وَلَا رَأَى شَاةً سَمِيطًا بِعَيْنِهِ قَطُّ.

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی خِوانُ پر کھانا نہیں کھایا، یہاں تک کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہوگئی۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی چپاتی (پتلی روٹی) بھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ کھال اتاری ہوئی بھونی ہوئی بکری آپ نے کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھی بھی نہیں۔

افادات:- "خِوَانٌ" اس زمانہ کے اندر ایک تھالی سی بنی ہوئی ہوتی تھی اور اس کے نیچے پائے لگے ہوتے تھے، اس کے اوپر کھانا سجاکر خوشحال لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ وہ تھال زمین سے ذرااونچا ہونے کی وجہ سے اس پر سے کھانا لینے کے لیے جھکنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اُس زمانہ میں اس کا رواج بھی نہیں تھا۔ آگے تذکرہ آرہا ہے، بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت انس (رضی اللہ) نے بھونی ہوئی بکری پکوائی اور لوگوں کو کھلائی پھر فرمایا کہ یہ چیز حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی نہیں کھائی، اب تو خوشحالی کا زمانہ آیا ہے اس لیے تم کھا رہے ہو۔

اورآپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی چپاتی (پتلی روٹی) بھی نہیں کھائی یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ کھال اتاری ہوئی بھونی ہوئی بکری آپ نے کبھی اپنی آنکھوں سے دیکھی بھی نہیں، کھانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ چیزیں کھانا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ روایت میں موجود ہے کہ

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نے دعوت میں یہ دونوں چیزیں لوگوں کو کھلائیں، لیکن یہ بھی فرمادیا کہ دیکھو! یہ چیزیں مطلوب نہیں ہیں، ان کی وجہ سے اترانے کی ضرورت نہیں ہے، مطلوب تو یہ ہے کہ آدمی سادہ زندگی گزارے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال یہ تھا کہ آپ جس وقت دنیا سے رخصت ہوئے وہاں تک یہ چیزیں کبھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہیں کھائیں۔

ہمارے لیے نمونہ

حدیث ۴۹۵

عن النعمان بن بشير (رضی اللہ عنہما) قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ نَبِيَّكُمْ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَمَا يَجِدُ مِنَ الدَّقَلِ مَا يَمْلَأُ بِهِ بَطْنَهُ (رواه مسلم)

(الدَّقَلُ): تَمْرٌ رَدِيءٌ.

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے تمہارے نبی حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا کہ آپ کو کبھی گھٹیا قسم کی کھجوریں بھی اتنی میسر نہیں ہوئیں جن سے آپ اپنا پیٹ بھر سکیں۔

افادات:- "الدَّقَلُ" یعنی وہ کھجوریں جو سوکھ گئی ہوں۔ ہمارے یہاں جو کھجوریں آتی ہیں ان میں کبھی کوئی پیشی سوکھی ہوئی نکل آتی ہے جو خراب قسم کی کھجور کہلاتی ہے۔ ایسی خراب اور گھٹیا قسم کی کھجور بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کبھی اتنی میسر نہیں ہوئی جس سے آپ اپنا پیٹ بھر سکیں؛ تو اعلیٰ قسم کی کھجوروں کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ حضور (ﷺ) نے اس طرح اپنی زندگی گزاری کہ کھانے پینے کے معاملہ میں آپ کا یہ حال تھا، گویا نبیٔ کریم (ﷺ) کی زندگی ایسی سادہ تھی۔اب ہمارے لیے تو نمونہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی مبارک ذات ہی ہے، ہم اگر اس کا ہوبہو پورا اقتداء نہ کرسکیں، تو کم سے کم کوشش تو یہی کرنی چاہیے ،یا کم ازکم ان حالات سے آگاہ اور باخبر تو ہونا چاہیے، اور اس حالت کو اپنے لیے پسند تو کرنا ہی چاہیے۔

بغیر چھنے آٹے کی روٹی

حدیث ۴۹۶

وعن سهل بن سعد (رضی اللہ عنہ) قَالَ: مَارَأَى رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) النَّقِيَّ مِنْ حِيْنِ ابْتَعَثَهُ اللهُ تَعَالى حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ تَعَالى فَقِيْلَ لَهُ: هَلْ كَانَ لَكُمْ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) مَنَاخِلُ؟ قَالَ مَا رَأَى رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) مُنْخُلاً مِنْ حِيْنَ ابْتَعَثَهُ اللهُ تَعَالى حَتّٰى قَبَضَهُ اللهُ تعالى فَقِيْلَ له: كَيْفَ كُنْتُمْ تَأْكُلُوْنَ الشَّعِيْرَ غَيْرَ مَنْخُوْلٍ؟ قَالَ: كُنَّا نَطْحَنُهُ فَيَطِيْرُ مَا طَارَ، وَمَا بَقِيَ ثَرَّيْنَاهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:۔حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے کبھی میدے کی روٹی نہیں دیکھی جب سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو مبعوث فرمایا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔اس پر حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا گیا کہ کیا نبیٔ کریم (ﷺ) کے زمانہ میں چھلنی (جس میں آٹا چھانا جاتا ہے) نہیں ہوتی تھی؟ انہوں نے کہا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے کبھی چھلنی نہیں دیکھی جب سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی بناکر بھیجا یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوئی۔ پھر ان سے پوچھا گیا کہ بغیر

چھنے ہوئے جَوکے آٹے کی روٹی تم لوگ کیسے کھاتے تھے؟ توانہوں نے کہاکہ چھلنی تو نہیں تھی لیکن ہم جب جَوکا آٹا چکی کے اندر پیستے تھے تواس کے بعد ہم اوپر سے پھونک ماردیتے تھے، جس سے بڑے بڑے چھلکے اُڑ جاتے تھے، اس کے بعد آٹے کو بھگاکر روٹی بنالیتے تھے۔

افادات:-ہم لوگ تو گیہوں کا آٹا بھی چھان کرروٹی بناتے ہیں ،اور آٹے کوچھان لینے کی وجہ سے میدہ زیادہ نرم ہوجاتا ہے۔اور جَو کو جب پیسا جاتا ہے تو اس میں بھوسہ ہوتا ہے،اور اس میں چھلکے زیادہ ہوتے ہیں ، اس کے آٹے کو بغیر چھانے ہوئے گوندھاہی نہیں جاسکتا، جیسے گیہوں کے جو چھلکے نکلتے ہیں توصرف ان چھلکوں کو گوندھانہیں جاسکتا،اس میں چکناپن ہی نہیں ہوتا کہ آٹے کی طرح گوندھا جاسکے۔جَوکے آٹے میں چھلکے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ اس کو بغیر چھانےاور بغیر چھلکے نکالے ہوئے گوندھاہی نہیں جاسکتا، اور آٹا جب تک گوندھا نہیں جائے گاوہاں تک روٹی نہیں بنے گی۔تو جب انہوں نے یہ کہا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی چھلنی دیکھی ہی نہیں ، تو پوچھنے والے نے پوچھا کہ جَوکی روٹی تم کھاتے تھے تو جَوکی روٹی بغیر چھلنی کے کیسے بنتی تھی؟ اس لئے کہ چھلکے نکالنے ضروری ہوتے ہیں۔تو انہوں نے جواب دیاکہ اس پرپھونک مار دیتے تھے ،جس سے موٹے موٹے چھلکے اُڑ جاتے تھے۔

اورجیساکہ شروع میں کہا تھاکہ بھوک کی فضیلت اورمجاہدے والی سخت زندگی گزارنے کی فضیلت بیان کرناچاہتے ہیں ،اسی لئے یہ ساری روایتیں پیش کی ہیں۔اور ظاہر

ہے نبیؐ کریم(ﷺ) نے اپنے لیے زندگی گزارنے کی جو حالت پسند فرمائی، اس سے بہتر حالت اور کونسی ہوگی؟ اس لیے ہم لوگوں کو بھی چاہیے کہ اگر اس پر عمل نہ کرسکیں تو کم سے کم بار باران چیزوں کو پڑھتے رہیں، اور دل و دماغ میں ان کو جمائے رکھیں، اس کی وجہ سے بھی بہت کچھ فرق پڑسکتا ہے۔ ایسانہیں ہوناچاہیے کہ ان چیزوں کو ایسابھلادیا جائے کہ خیال ہی نہ رہے کہ حضورِاکرم (ﷺ) کی زندگی کیسی تھی اور آپ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق وسعادت عطافرمائے

دعا

اے اللہ! نبیؐ کریم(ﷺ) کے طریقہؑ زندگی کواختیارکرنے کی ہمیں توفیق اورہمت عطافرما۔ اے اللہ! اسی طریقِ زندگی کی محبت ہمارے دلوں میں پیدافرمااوراسی کے لئے سعی ومحنت کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔ اے اللہ! ہماری تمام ضرورتوں کی کفالت فرما۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ باب قائم کیا جس میں بتلانا چاہتے ہیں کہ فاقہ اور بھوک برداشت کرنے اور سادہ زندگی گذارنے کی کیا فضیلت ہے۔ اور کھانے پینے، لباس اور دوسری انسانی ضرورتوں میں آدمی کم سے کم پر اکتفاء کرے، اوراپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑنے کا اہتمام کرے، تو اس کی کیا فضیلت ہے۔

چناں چہ اسی سلسلہ میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک اورواقعہ ذکر کیا ہے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) جو گروہ انبیاء کے بعد انسانوں میں سب سے افضل سمجھے جاتے ہیں ،وہ بھی شریک ہیں۔ اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات جو انسانیت کے افضل ترین افراد ہیں ان کی زندگی کیسی تھی اور وہ کھانے پینے اور ضروریات کی تکمیل کے معاملہ میں کتنا کم سے کم پر اکتفاء کرتے تھے اور کیسی مشقتیں اور مجاہدے، اور فقروفاقہ برداشت کرتے تھے۔ ہمارے لیے ان حضرات کی زندگی ایک نمونہ ہے، اور ہمیں بھی انہیں کا اتباع اور پیروی کرنا چاہیے۔

افضل ترین افراد کی زندگی

حدیث ۴۹۷

وَعَنْ اَبِي هُرَيرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ : خَرَجَ رَسولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) ذَاتَ يَوْمٍ أَوْ لَيْلَةٍ فَإِذَا هُوَ بِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا، فَقَالَ: مَا أَخْرَجَكُمَا مِنْ بُيُوتِكُمَا هٰذِهِ السَّاعَةَ ؟ قَالَا : الْجُوْعُ يَا رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ قَالَ : وَأَنَا، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأَخْرَجَنِي الَّذِيْ أَخْرَجَكُمَا، قوما. فَقَامَا مَعَهُ فَأَتَى رَجُلاً مِنَ الْأَنْصَارِ، فَإِذَا هُوَ لَيْسَ فِيْ بَيْتِهِ، فَلَمَّا رَأَتْهُ الْمَرْأَةُ قَالَتْ مَرْحَبًا وَأَهلًا، فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): أَيْنَ فُلانٌ؟ قَالَت؟: ذَهَبَ يَسْتَعْذِبُ لَنَا الْمَاءَ، إِذْ جَاءَ الْأَنْصَارِيُّ، فَنَظَرَ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَصَاحِبَيْهِ، ثُمَّ قَالَ : الْحَمْدُ لِلّٰهِ مَا أَحَدٌ الْيَوْمَ أَكْرَمَ أَضْيَافاً مِنِّي فَانْطَلَقَ فَجَاءَهُمْ بِعِذْقٍ فِيْهِ بُسْرٌ وَتَمْرٌ وَرُطَبٌ، فَقَالَ كُلُوْا، وَ أَخَذَ الْمُدْيَةَ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِيَّاكَ وَالْحَلُوْبَ فَذَبَحَ لَهُمْ، فَأَكَلُوْا مِنَ الشَّاةِ وَمِنْ ذٰلِكَ الْعِذْقِ وَشَرِبُوْا، فَلَمَّا أَنْ شَبِعُوْا وَرَوُوْا قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) لِأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا: والذی نفسی بیده لَتُسْئَلُنَّ عَنْ هٰذَا النَّعِيْمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، أَخْرَجَكُمْ مِنْ بُيُوْتِكُمُ الْجُوْعُ، ثُمَّ لَمْ تَرْجِعُوْا حَتّٰى أَصَابَكُمْ هٰذَا النَّعِيْمُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے مکان سے باہر تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) بھی باہر موجود ہیں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان دونوں حضرات سے پوچھا: اس وقت آپ دونوں کو گھروں سے باہر نکالنے کا باعث کیا چیز ہوئی؟ یعنی یہ وقت عام طور پر گھر سے نکلنے کا نہیں ہے، پھر تم اپنے گھروں سے باہر کیوں آئے؟ ان دونوں حضرات نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: "اَلْجُوْعُ یَارَسُوْلَ اللّٰہ" بھوک کی شدت نے اس وقت ہم لوگوں کو اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا۔ بھوک اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے،

اس اُمید پر باہر نکلے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ شاید کچھ انتظام فرمادے۔اُن کے اس جواب کو سن کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے،تم دونوں کو جس چیز نے اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا، اسی چیز نے مجھے بھی اپنے گھر سے نکالا ہے، یعنی مجھ پر بھی بھوک کا وہی شدید حملہ ہے اور اسی کے تقاضے نے مجھ کو باہر نکالا ہے۔اس کے بعدنبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ان دونوں حضرات سے فرمایا: چلو۔ چناں چہ یہ دونوں حضرات نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کے ساتھ چلے ، آپ ایک انصاری صحابی کے یہاں ان کے باغ میں تشریف لے گئے (علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) نے بتلایا ہے کہ ان انصاری صحابی کانام ”أَبُوالْهَيْثَمِ بْنِ التَّيِّهَان“ تھا)

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) جب وہاں پہنچے تووہ اپنے باغ کے مکان پر موجود نہیں تھے۔جب ان کی اہلیہ نے نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کواپنے یہاں آیا ہوا دیکھا تو عرض کیا :مَرْحَباًوَّ اَھْلًا“ خوش آمدید۔ گویا ان کا استقبال کیا کہ تشریف لایئے۔تو نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے پوچھا: تمہارے شوہر کہاں ہیں؟ان کی اہلیہ نے جواب دیا:وہ پینے کے لیے میٹھا پانی لینے باہر گئے ہوئے ہیں (چوں کہ عام طور پر وہاں میٹھاپانی میسر نہیں ہوتا تھاتوپینے کی ضرورت پوری کرنے کے لیےدوردراز علاقوں سے اس کاانتظام کیاجاتاتھا)کچھ ہی دیرمیں وہ صحابی پہنچ گئے،جب انہوں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)اور آپ کے دونوں رفقاء کو اپنے باغ میں دیکھا تو مارے خوشی کے کہنے لگے:الحمدللہ۔گویاآپ حضرات باربار کہاں آتے ہیں ،آپ کا میرے یہاں آنا میری سعادت کی بات ہے۔ آج مجھ سے بڑھ کر شریف مہمانوں والا کوئی نہیں ہوسکتا۔

آج میرے گھر جو شخصیت آئی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں آج کسی کے یہاں ایسے مہمان نہیں ہوں گے (اور ظاہر ہے کہ اُن کی بات اپنے جگہ پر سو فیصد درست تھی) چناں چہ ان حضرات کو آیا ہوا دیکھ کر میزبانی کے لیے فوراً گئے اور اپنے باغ میں سے کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لے آئے جس میں تازہ پکی ہوئی کھجوریں اور پک کر جو کھجوریں سوکھ جاتی ہیں، جن کو عام طور پر ہم استعمال کرتے ہیں، اور ادھ پکی کھجوریں تینوں قسم کی موجود تھیں، اور پورا خوشہ لاکر نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے درخواست کی کہ آپ نوش فرمایئے۔ پھر انھوں نے چھری لی تو نبیٔ کریم (ﷺ) سمجھ گئے کہ وہ بکری یا اُس کا بچہ ذبح کرنا چاہتے ہیں تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے تاکید فرمائی: دودھ دینے والے جانور سے بچیو (مطلب یہ ہے کہ جو بکری اس وقت دودھ دے رہی ہے اس کو ذبح مت کرنا، اس لئے کہ اس وقت مقصد صرف گوشت خوری ہے اور جو بکری دودھ نہیں دے رہی ہے اس کو ذبح کرنے سے بھی یہ مقصد حاصل ہوجائے گا۔ اب اگر دودھ دینے والی بکری ذبح کروگے تو گوشت کھانے کا مقصد تو حاصل ہوجائے گا لیکن دوسرے فائدہ سے محرومی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضرورتوں کی تکمیل میں بھی آدمی کو سوچ سمجھ کر فیصلہ اور مناسب انداز اختیار کرنا چاہیے۔ دیکھئے! اس وقت نبیٔ کریم (ﷺ) نے دودھ دیتی بکری ذبح کرنے سے منع فرمایا) چناں چہ انہوں نے ان حضرات کے لیے ایک بکری ذبح کی، گوشت پکایا، ان حضرات نے اس کو کھایا اور کھجور کا جو خوشہ توڑ کر لائے تھے اس میں سے بھی کھایا اور پھر پانی نوش کیا جب یہ حضرات کھاپی کر شکم سیر اور سیراب ہوگئے تو نبیٔ کریم

(ﷺ)نے حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ)کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: قسم ہے اس ذاتِ پاک کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے،قیامت کے روز ان نعمتوں کے متعلق تم سے سوال کیا جائے گا۔ (دیکھو! تم لوگوں کو بھوک نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا اور پھر تم اپنے گھروں کو واپس نہیں لوٹے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی۔ اس کا بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔ایسے موقع پر جب کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کررہا ہو، اس کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کو استعمال کررہا ہوں ، اللہ تعالیٰ کے یہاں ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا، یہی نبیٔ کریم(ﷺ) کی تعلیم ہے۔)

ہر نعمت کا یہی حق ہے

دیکھو!شدت بھوک کی حالت میں یہ حضرات نکلے تھے، اس کے بعد یہ چیزیں میسر آئی تھیں،پھر بھی حضوراکرم(ﷺ) ان کو متوجہ کررہے ہیں کہ یہ نعمتیں اگرچہ شدتِ بھوک میں میسر ہوئیں،پھر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں اور ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا کہ تم نے ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا۔اس لئے جو آدمی اللہ تعالیٰ کی جو بھی نعمتیں استعمال کر رہا ہے، ان کو استعمال کرتے ہوئے ہر لمحہ اور ہر گھڑی اس کو یہ بات اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جن نعمتوں کو استعمال کررہا ہوں، کل کو اللہ تعالیٰ کے یہاں ان نعمتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ ہماری ان نعمتوں کا

کیاحق اداکیا؟ہماری ان نعمتوں کواستعمال کرنے کے بعد تم نے ہماری کتنی اطاعت و فرمانبرداری کی،اور ہماری نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے کاکتنا اہتمام کیا۔ تمام نعمتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا اہتمام کرتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچانے کا بھی اہتمام کرے۔ گویایہی ہر نعمت کا حق ہے۔

مثلاً ہم دنیا میں کسی کی روٹی کھاتے ہوں تواگرچہ نہ اس نے ہمیں پیدا کیا، اور نہ دوسرے اعضاء دیئے،اوربہت ساری نعمتیں ہم اس کی استعمال بھی نہیں کرتے،وہ تو صرف ہمیں کھلاپلارہا ہے،اس کے باوجود ہم اس کا اتنا حق سمجھتے ہیں کہ ہمیں اس کی بات مان لینی چاہیے؛تو پھر اللہ تعالیٰ تو ان ساری نعمتوں کاپیدا کرنے اور دینے والا ہے اس کی اطاعت کااوراس کی معصیت اورنافرمانی سے بچنے کااہتمام ہمارے لیے کتنا ضروری ہے!اس کے حقوق کی ادائیگی کا تقاضہ یہی ہے۔

سابقین اوّلین کی زندگیوں کاحال

حدیث ۴۹۸

وَعَن خَالِدِبن عُمَيْرِالعَدَوِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ:خَطَبَنَاعُتْبَةُبْنُ غَزوَانَ،وَكَانَ أَمِيرًاعَلَى الْبَصرَةِ،فَحَمِدَ اللهَ وَأَثْنَى عَلَيهِ،ثُمَّ قَالَ : اَمَّا بَعدُ! فَإِنَّ الدُّنيَا قَدْ أَذَنَتْ بِصُرْمٍ،وَوَلَّتْ حَذَّاءَ ، وَلَمْ يَبْقَ مِنْهَاإِلَّاصُبَابَةٌ كَصُبَابَةِ الإِنَاءِ يَتَصَابُّهَا صَاحِبُهَا،وَإِنَّكُمْ مُنْتَقِلُونَ مِنهَاإِلَى دَارٍلَازَوَالَ لَهَا فَانْتَقِلُوا بِخَيْرِ مَا بِحَضْرَتِكُمْ فَإِنَّهُ قَدْ ذُكِرَ لَنَا أَنَّ الْحَجَرَ يُلْقَى مِنْ شَفِيرِ جَهَنَّمَ فَيَهْوِي فِيهَا سَبعِينَ عَاماً،لَايُدْرِكُ لَهَا قَعْرًا وَاللهِ لَتُمْلَأَنَّ

أَفَعَجِبْتُمْ ؟! وَلَقَدْ ذُكِرَ لَنَا أَنَّ مَا بَيْنَ مِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَصَارِعِ الْجَنَّةِ مَسِيرَةُ أَرْبَعِينَ عَاماً. وَلَيَأْتِيَنَّ عَلَيْهَا يَوْمٌ وَهُوَ كَظِيظٌ مِنَ الزِّحَامِ، وَلَقَدْ رَأَيْتُنِي سَابِعَ سَبْعَةٍ مَعَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ)، مَا لَنَا طَعَامٌ إِلاَّ وَرَقُ الشَّجَرِ، حَتّٰى قَرِحَتْ أَشْدَاقُنَا، فَالْتَقَطْتُ بُرْدَةً فَشَقَقْتُهَا بَيْنِي وَبَيْنَ سَعْدِ بْنِ مَالِكٍ، فَاتَّزَرْتُ بِنِصْفِهَا، وَاتَّزَرَ سَعْدٌ بِنِصْفِهَا، فَمَا أَصْبَحَ الْيَوْمَ مِنَّا أَحَدٌ إِلاَّ أَصْبَحَ أَمِيراً عَلٰى مِصْرٍ مِنَ الْأَمْصَارِ، وَإِنِّي أَعُوذُ بِاللهِ أَنْ أَكُونَ فِي نَفْسِي عَظِيماً وَعِنْدَ اللهِ صَغِيراً۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت خالد بن عمیر عدوی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضرت عتبہ بن غزوان (رضی اللہ عنہ) جو بصرہ کے امیر اور گورنر تھے انہوں نے ایک مرتبہ تقریر فرمائی جس میں پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی، اس کے بعد فرمایا: دنیا نے ختم ہونے کا اعلان کیا ہے، اور بہت تیزی سے واپسی کے لیے اس نے پیٹھ پھیری ہے (یعنی وہ ختم ہورہی ہے) اور اب دنیا کا اتنا ہی حصہ بچ گیا ہے جیسے کسی برتن میں کوئی کھانے پینے کی چیز رکھی ہو اور اس میں آخر میں کچھ بچا کھچا رہ جاتا ہے جس کو اس برتن کا مالک بڑی مشکل سے جمع کرتا ہے تاکہ اُس آخری حصہ سے بھی فائدہ اُٹھالیا جائے (دنیا جب سے بنی ہے اس وقت سے لے کر اس وقت ہمارے سامنے دنیا کا جو حصہ رہ گیا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی برتن میں کوئی پینے کی چیز ہو اور وہ پی جاچکی ہو اور آخر میں چند قطرے رہ جاتے ہیں جن کو برتن ٹیڑھا کرکے بڑی مشکل سے جمع کرکے آدمی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہے) اور تم اس دنیا سے ایک ایسے گھر کی طرف جانے والے ہو جو ختم ہونے والا نہیں ہے، اس لیے تمہارے سامنے جو چیزیں ہیں ان میں سے جو بہتر سے بہتر ہو اس کو حاصل کرکے جاؤ، اس لیے کہ ہمیں یہ بتلایا گیا (اور ظاہر ہے صحابہ کو بتلانے والے نبی کریم (ﷺ) ہی ہیں۔ گویا آپ (ﷺ) کی طرف سے یہ چیز ہمیں بتلائی گئی ہے) کہ جہنم کی گہرائی اتنی زیادہ ہے کہ اگر کوئی پتھر جہنم کے اندر ڈالا جائے تو جہنم کی تہہ تک

پہنچتے ہوئے ستر (۷۰) سال ہوں گے، بلکہ ستر (۷۰) سال تک وہ پتھر جہنم کے اندر جاتا رہے گا پھر بھی اس کی تہہ تک پہنچ نہیں سکے گا (اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہنم کتنی گہری ہے) اور اللہ کی قسم! جہنم اتنی گہری ہونے کے باوجود انسانوں سے (ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے) بھر دی جائے گی۔ یہ ارشاد فرمانے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کو میری بات سن کر تعجب ہو رہا ہے، تو کہنے لگے کہ تمہیں تعجب ہوتا ہے؟ حالاں کہ یہی حقیقت ہے۔ اور ہمیں یہ بھی بتلایا گیا کہ جنت کے دروازوں کے دو کواڑوں کے درمیان کا فاصلہ چالیس سال کی مسافت کے برابر ہے (اتنے بڑے بڑے دروازے ہوں گے کہ چالیس سال تک آدمی چلتا رہے تو اس مسافت کو پورا کر سکتا ہے، ایسی جنت جس کے دروازوں کا یہ حال ہے) اس پر بھی ایک دن ایسا آئے گا کہ وہ انسانوں کی بھیڑ سے بھری ہوئی ہوگی (جہنم بھی بھر دی جائے گی اور جنت بھی بھر دی جائے گی۔ اب جہنم کن لوگوں سے بھری جائے گی وہ بھی لوگ جانتے ہیں اور جنت میں کن کو بھیجا جائے گا وہ بھی سب کو معلوم ہے) پھر اپنے متعلق فرمایا کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے رفقاء میں مَیں ساتواں ہوں (یہ بہت قدیم الاسلام تھے، شروع میں اسلام لائے تھے) اور ہمارے لیے کھانے کے واسطے درختوں کے پتوں کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا، یہاں تک کہ درختوں کے پتے کھانے کی وجہ سے ہمارے منہ کے کنارے زخمی ہوگئے (کھانے کا تو یہ حال تھا۔ اور لباس کا کیا حال تھا اس کو بیان فرماتے ہیں کہ) مجھے ایک چادر کہیں سے ملی تو میں نے اس کے دو ٹکڑے کئے، آدھی کو میں نے اپنی لنگی بنالیا، اور آدھی کو حضرت سعد بن مالک - یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں انہوں - نے اپنی لنگی بنالیا (گویا اوپر کے بدن کا حصہ ڈھانکنے کے لئے کوئی چیز نہیں تھی) یہ تمام وہ حالات اور مجاہدے تھے جو ہم نے برداشت کیے۔ جنہوں نے یہ ساری مشقت برداشت کی تھی ان میں سے آج ایک بھی ایسا نہیں مگر یہ کہ وہ کسی نہ کسی شہر کا گورنر ہے۔ (یعنی اُس وقت وہ حال تھا لیکن آج

اللہ تعالیٰ نے یہ چیز بھی دی ہے۔جب انہوں نے گورنری والی بات کی تو شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ کہیں اپنی بڑائی بیان کرنے کے لیے وہ یہ کہہ رہے ہیں ،اس لیے فرمانے لگے کہ)میں اللہ تعالیٰ سے اس بات کی پناہ چاہتا ہوں کہ میں خود اپنی نگاہوں میں بڑا بنوں ،اوراللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں چھوٹاہوؤں۔

افادات:-حضرت عتبہ بن غزوان (رضی اللہ عنہ)ایک صحابی ہیں۔بصرہ جوحضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے دورِخلافت میں آباد ہوا،اس کا نقشہ تیار کرنے کی ذمہ داری حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے انھی کے حوالہ کی تھی،ان کامزار بھی بصرہ ہی میں ہے،ابھی قریبی زمانہ میں ہمارا وہاں جانا ہوا تھا تو بصرہ ہی میں جہاں حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) کامزارہے،انھی کے قریب ان کا بھی مزار ہے۔کچھ دنوں تک حضرت عمر (رضی اللہ عنہ)نے بصرہ کی امارت اورگورنری کی ذمہ داری بھی ان کے حوالے کی تھی۔

اس روایت کو لاکریہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کی گزر بسر کیسی تھی اور وہ کس طرح زندگی گزارتے تھے۔اس لیے کہ یہ حضرات جن کی فضیلت اورجن کی اسلام میں قدامت ان کے اونچے مقام کی دلیل ہے ،ایسے اونچے مرتبہ والے حضرات گزر بسر کے اعتبار سے، معیشت کے اعتبار سے اس حالت میں تھے۔

بڑائی سے خدا کی پناہ

"وَإِنِّي أَعُوذُ بِاللهِ أَنْ أَكُونَ فِي نَفْسِي عَظِيماً" آدمی اپنی آپ کو بڑا سمجھے یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اس کیفیت سے اور اپنے اندر اس قسم کا خیال پیدا ہونے سے میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں، صرف بیانِ واقعہ کے طور پر ایک چیز ذکر کی ہے، اور مَیں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں کہ اپنی نگاہوں میں بڑا ہوؤں اور اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں چھوٹا ہوؤں۔ یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں آتا ہے، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دُعا فرمائی: "اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِي فِي عَيْنِي صَغِيراً وَّفِي أَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيراً" اے اللہ! مجھے اپنی نگاہوں میں چھوٹا بنا، اور لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بنا۔ یہاں لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بننے کی جو دُعا کی گئی ہے، وہ بھی بڑائی کے واسطے نہیں، بلکہ چھوٹا ہونے اور کم حیثیت ہونے کی وجہ سے لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں سے حفاظت کے واسطے یہ دعا مانگی گئی ہے، اس لیے کہ عام طور پر ایسا ہوتا ہے۔

بہر حال! اس روایت میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ ان حضرات کی کیا حالت تھی، یہ وہ حضرات تھے جن کا مقام اسلام کے اندر سب سے اونچا سمجھا جاتا ہے، ان حضرات کے کھانے پینے کا یہ حال تھا، گویا ہمیں بھی انہیں کی اتباع کرتے ہوئے اپنے کھانے پینے اور دوسری ضروریات کی تکمیل میں سادگی اور کم سے کم پر اکتفاء کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے۔

ایسے موقعہ پر آدمی خوش ہو

حدیث ۴۹۹

وعن أبي موسى الأشعري (رضی اللہ عنہ) قَالَ أخرجت لَنَا عَائِشَةُ (رضی اللہ عنہا) كِسَاءً وَإِزَارًا غَلِيظًا قَالَتْ: قُبِضَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فِي هٰذَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے ہمارے سامنے ایک چادراورایک موٹی سی لنگی نکال کر بتائی، اور ارشاد فرمایاکہ نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات اسی لباس میں ہوئی ہے۔

افادات:- بوقتِ وفات نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جسمِ اطہرپر ایک موٹے کپڑے کی لنگی اور ایک چادر تھی۔اس سے معلوم ہواکہ نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) لباس میں کتنا زیادہ سادگی اور کم سے کم پر اکتفاء کرنے کا اہتمام فرماتے تھے! حالاں کہ آخر میں تو فتوحات کا سلسلہ ہوا تھا اور بہت کچھ مال آتا تھا، اس کے باوجود اپنے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سادگی ہی کو پسند کیا، اور اسی لباس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہوئی۔

ہم کوتو ہماری مرضی اور خواہش سے کم قسم کا کپڑا ملے،یا کھانے پینے میں اپنی خواہش سے کم چیز ملے تو اس پر ہم غمگین ہوجاتے ہیں کہ ہمیں ایسا کپڑا پہننا پڑا؟ ہمارا احساس یہ ہوتا ہے اوراس کو اپنے لیے بے عزتی سمجھتے ہیں ،اپنی توہین اور انسلٹ سمجھتے ہیں، حالاں

کہ بدرجۂ مجبوری ہی سہی اگر آدمی کو ایسی نوبت آئے تو یوں سوچے کہ نبیٔ کریم(ﷺ) کے نمونہ پر چلنے کا ہمیں موقع ملا۔ایسے موقعہ پر آدمی خوش ہو،نہ کہ ناراض ہو،لیکن ایسے موقعہ پر عام طور پر آدمی ناراض ہوتا ہے،اور ناراض ہی نہیں بلکہ نعوذباللہ بہت سے لوگ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے بڑے خطرناک جملے استعمال کرتے ہیں ، اوراللہ تعالیٰ کی وہ ساری نعمتیں جواب تک استعمال کرتے رہے اس کا خیال بھی نہیں آتا اگر ایک موقعہ ایسا آیا تو ان کی زبان سے ناشکری کی باتیں نکلتی ہیں۔

صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کے کھانے

حدیث ۵۰۰

وعن سعد بن أَبِي وَقَّاصٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: إِنِّي لَأَوَّلُ الْعَرَبِ رَمَى بِسَهْمٍ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَلَقَدْ كُنَّا نَغْزُو مَعَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) مَا لَنَا طَعَامٌ إِلاَّ وَرَقُ الْحُبْلَةِ، وَ هٰذَا السَّمُرُ، حَتّٰى إِنْ كَانَ أَحَدُنَا لَيَضَعُ كَمَا تَضَعُ الشَّاةُ مَا لَهُ خَلْطٌ. (متفق عليه)

ترجمہ:-حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہ)(جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں ، اور عشرۂ مبشرہ کا مقام تمام صحابہ میں سب سے اونچا ہے۔فارس کو فتح کرنے والے اور کسریٰ کی سلطنت کو ختم کرنے والے اسلامی لشکر کے سپہ سالار یہی تھے) فرماتے ہیں کہ میں عرب میں سب سے پہلا آدمی ہوں جس نے اللہ کے راستہ میں تیر چلایا۔اور ہم لوگ نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ غزوات کے اندر شریک ہوئے تھے اور ہمارے پاس کھانے کے لیے سوائے کیکر کے پتوں کے کچھ نہیں ہوتا تھا،یہاں تک کہ

درختوں کے پتے کھانے کی وجہ سے ہم میں کا ہر آدمی اس طرح پاخانہ کرتا تھا جیسے بکری کرتی ہے(بکری کا پاخانہ مینگنیوں کی شکل کا ہوتا ہے) جو نرم نہیں ہوتا۔

افادات:- ہجرت کے دوسرے سال حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام(رضی اللہ عنہم) کی ایک جماعت اپنے چچا زاد بھائی حضرت عبیدہ بن حارث یاابو عبیدہ بن حارث (رضی اللہ عنہ) کی سرکردگی میں بھیجی تھی اور اس کا مقابلہ قریش کے ایک قافلہ سے ہواجن کے تعاقب میں یہ حضرات گئے تھے،اس وقت معمولی سی جھڑپ ہوئی،اس جھڑپ میں سب سے پہلے تیر حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ)نے چلایاتھا۔گویا اسلام میں اللہ کے راستہ میں سب سے پہلا تیر چلانے والے یہی ہیں۔ان کے حق میں یہ ایک فضیلت وسعادت کی چیز ہے، اس لیے اُس کو ذکر کیا۔

اوراس روایت سے اس بات کاپتہ چلتاہے کہ ان حضرات کی زندگی کس طرح گزری تھی،اور کس طرح کی چیزیں ان کو کھانے کو میسر ہوتی تھی ، ان حضرات نے ان چیزوں کے میسر نہ آنے کوکبھی بھی اپنےلئے اللہ تعالیٰ کے یہاں کمی اور قلت کاسبب نہیں سمجھا۔ ہمیں اگر کھانے کو کم ملا تو یوں کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ ناراض ہے۔ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کسی اورسے اتنازیادہ خوش نہیں تھے جتناان حضرات سے خوش تھے ، پھر بھی ان کو کھانے پینے اور لباس کے لیے جو چیزیں ملی تھیں،وہ ہمیں ان روایتوں کے پڑھنے اورسننے سے معلوم ہوتاہے۔

اپنے گھر والوں کے لیے نبیٔ کریم (ﷺ) کی دعا

حدیث ۵۰۰

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ): أَللّٰهُمَّ اجْعَلْ رِزْقَ الٰ مُحَمَّدٍ قُوْتاً. (متفق عليه)

قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ وَالْغَرِيْبِ: مَعْنَى (قُوْتًا) أَيْ: مَا يَسُدُّ الرَّمَقَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے دعا فرمائی: اے اللہ! محمد (ﷺ) کے گھرانے کی روزی بقدر ضرورت ہو۔

افادات:- "قُوْتٌ" یعنی اتنا جس سے جان بچ جائے، گویا اپنے خاندان اور اپنی ذریت کے لیے نبیٔ کریم (ﷺ) نے یہی حال پسند کیا۔ اور ہم اپنی اولاد کے لیے کیا پسند کرتے ہیں اور ہم کیا دعائیں کرتے ہیں؟ ان کو خوب پیسے ملیں، خوب آرام سے رہیں، خوب مزے اُڑائیں۔ اور نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنی اولاد کے لیے کیا دعا مانگی؟ ان کو بقدر ضرورت، جان بچ جائے اتنی روزی ملے۔ گویا یہی وہ حالت ہے جس کو نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنے گھرانے کے لیے پسند فرمایا۔ اور ظاہر ہے کہ جو حالت نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنے گھرانے کے لیے پسند فرمائی ہو، تو چونکہ ہر مسلمان کو نبیٔ کریم (ﷺ) سے محبت اور تعلق ہوتا ہے، اس کا تقاضہ یہی ہے کہ اپنے لیے بھی اسی حالت کو پسند کرے۔

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی بھوک کا حال

حدیث ۵۰۲

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ وَاللّٰهِ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، إِنْ كُنْتُ لَأَعْتَمِدُ بِكَبِدِي عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْجُوعِ، وَإِنْ كُنْتُ لَأَشُدُّ الْحَجَرَ عَلَى بَطْنِي مِنَ الْجُوعِ، وَلَقَدْ قَعَدْتُ يَوْماً عَلَى طَرِيقِهِمُ الَّذِي يَخْرُجُونَ مِنْهُ، فَمَرَّ بِي النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَتَبَسَّمَ حِينَ رَآنِي، وَعَرَفَ مَا فِي وَجْهِي وَمَا فِي نَفْسِي، ثُمَّ قَالَ: أَبَاهِرٍّ! قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ. قَالَ: اِلْحَقْ وَمَضَى فَاتَّبَعْتُهُ، فَدَخَلَ فَاسْتَأْذَنَ، فَأَذِنَ لِي فَدَخَلْتُ، فَوَجَدَ لَبَناً فِي قَدَحٍ، فَقَالَ: مِنْ أَيْنَ هٰذَا اللَّبَنُ؟ قَالُوا: أَهْدَاهُ لَكَ فُلَانٌ أَوْ فُلَانَةٌ۔ قَالَ: أَبَاهِرٍّ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ. قَالَ: اِلْحَقْ إِلَى أَهْلِ الصُّفَّةِ فَادْعُهُمْ لِي۔ قَالَ: وَأَهْلُ الصُّفَّةِ أَضْيَافُ الْإِسْلَامِ، لَا يَأْوُونَ عَلَى أَهْلٍ وَلَا مَالٍ وَلَا عَلَى أَحَدٍ، وَكَانَ إِذَا أَتَتْهُ صَدَقَةٌ بَعَثَ بِهَا إِلَيْهِمْ، وَلَمْ يَتَنَاوَلْ مِنْهَا شَيْئاً، وَإِذَا أَتَتْهُ هَدِيَّةٌ أَرْسَلَ إِلَيْهِمْ، وَأَصَابَ مِنْهَا، وَأَشْرَكَهُمْ فِيهَا، فَسَاءَنِي ذٰلِكَ، فَقُلْتُ: وَمَا هٰذَا اللَّبَنُ فِي أَهْلِ الصُّفَّةِ! كُنْتُ أَحَقُّ أَنْ أُصِيبَ مِنْ هٰذَا اللَّبَنِ شَرْبَةً أَتَقَوَّى بِهَا، فَإِذَا جَاءُوا وَأَمَرَنِي فَكُنْتُ أَنَا أُعْطِيهِمْ؛ وَمَا عَسَى أَنْ يَبْلُغَنِي مِنْ هٰذَا اللَّبَنِ، وَلَمْ يَكُنْ مِنْ طَاعَةِ اللّٰهِ وَطَاعَةِ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) بُدٌّ فَأَتَيْتُهُمْ فَدَعَوْتُهُمْ، فَأَقْبَلُوا وَاسْتَأْذَنُوا، فَأَذِنَ لَهُمْ وَأَخَذُوا مَجَالِسَهُمْ مِنَ الْبَيْتِ قَالَ: يَا أَبَاهِرٍّ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ۔ قَالَ: خُذْ فَأَعْطِهِمْ۔ قَالَ: فَأَخَذْتُ الْقَدَحَ، فَجَعَلْتُ أُعْطِيهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتَّى يَرْوَى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ، فَأُعْطِيهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتَّى يَرْوَى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ، فَأُعْطِيهِ الرَّجُلَ فَيَشْرَبُ حَتَّى يَرْوَى، ثُمَّ يَرُدُّ عَلَيَّ الْقَدَحَ حَتَّى انْتَهَيْتُ إِلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَقَدْ رَوِيَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ، فَأَخَذَ الْقَدَحَ فَوَضَعَهُ عَلَى يَدِهِ، فَنَظَرَ إِلَيَّ فَتَبَسَّمَ، فَقَالَ: أَبَاهِرٍّ. قُلْتُ: لَبَّيْكَ يَارَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: بَقِيتُ أَنَا وَأَنْتَ۔ قُلْتُ: صَدَقْتَ يَارَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: اقْعُدْ فَاشْرَبْ،

فَقَعَدْتُ فَشَرِبْتُ، فَقَالَ : اشْرَبْ ، فَشَرِبْتُ ، فَمَازَالَ يَقُولُ: اشْرَبْ،حَتّٰى قُلْتُ لاَ،وَالَّذِیْ بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لاَأَجِدُلَهُ مَسْلَكاً!قَالَ:فَأَرِنِي،فَأَعْطَيْتُهُ الْقَدَحَ،فَحَمِدَاللهَ تَعَالٰى،وَسَمّٰى وَشَرِبَ الْفَضْلَةَ۔

ترجمہ مع تشریح:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اس اللہ کی قسم جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں !میں بھوک کی وجہ سے اپنا کلیجہ زمین سے لگادیا کرتا تھا اور کبھی بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ایک مرتبہ بھوک کی وجہ سے اس راستہ پر بیٹھ گیا جہاں سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے صحابہ گزرا کرتے تھے کہ شاید میری ظاہر حالت دیکھ کر کسی کوترس آئے اورمجھے کھانے کے لیے کچھ ملے(بعض روایتوں میں ہے کہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)سے پہلے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا گزرہواتو حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے ان سے کوئی آیت پوچھی کہ فلاں آیت کیا ہے؟ ان کا مقصد یہ تھاکہ میں پوچھوں گااور بات کروں گا تو شاید اس دوران میری حالت کا ان کوکچھ اندازہ ہوگا اور محسوس کریں گے کہ شاید یہ بھوکے ہیں، اورمجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے، لیکن میں نے جوآیت پوچھی تھی وہ بتاکر آگے چلے گئے) اس کے بعد پھر نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) آئے تومجھے وہاں بیٹھاہوادیکھ کراور میرے چہرے کو دیکھ کرہی سمجھ گئے اور مسکرانے لگے(کہ بھوک کی حالت ہے اور میرے دل میں کیا تقاضہ ہے وہ بھی سمجھ گئے) چناں چہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے کہا : 'یاأَبَاھِرٍ"(ابو ہریرہ کے نام کو مختصر کرکے بولاجاتاہے)میں نےکہا: اے اللہ کے رسول!میں حاضرہوں۔ توحضور(صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: آجاؤ۔یہ کہہ کر آپ توتیزی سے آگے بڑھ گئے اور میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیچھے لپکا، آپ گھرمیں داخل ہوگئے،میں نے اندر داخل ہونے کی اجازت چاہی ،تومجھے بھی داخل ہونے کی اجازت دے دی، میں بھی گھر میں داخل ہوا۔جب آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)گھر میں تشریف لے گئے تودیکھا کہ ایک پیالے میں دودھ ہے (بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جن زوجۂ مطہرہ کے یہاں آپ تشریف لے گئے تھے ،ان سے پوچھاکہ کوئی چیز ہے؟انہوں

نے کہا:ہاں! فلاں انصاری صحابی نے ہدیہ کے طور پر ایک پیالہ دودھ کا بھیجا ہے)تو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا:اے ابوہریرہ!میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!حاضر ہوں۔آپ نے فرمایا: جاؤ! صفہ والوں کو بلا کر لاؤ۔حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں :صفہ والے درحقیقت مسلمانوں کے مہمان تھے،ان کے پاس نہ اپنا کوئی گھر تھا، نہ کوئی کھانے پینے کا انتظام تھا(مسجد میں پڑے رہتے تھے، علم حاصل کرنے کا مشغلہ تھا اوران کے کھانے پینے کی ذمہ داری مسلمانوں کی تھی،جس کو جو میسر آتا تھااُن کی تواضع کر دیا کرتا تھا)اور حضوراکرم(ﷺ) کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ اگر آپ کے گھر کوئی چیز آتی اور بھیجنے والا کہلواتا کہ یہ صدقہ کی ہے تونبیٔ کریم (ﷺ) اس میں سے کچھ بھی تناول نہیں فرماتے تھے بلکہ وہ پورا کے پورا صفہ والوں کے لیے بھیج دیتے تھے۔اوراگر کوئی ہدیہ آتا تھا توحضور(ﷺ)ان صفہ والوں کواپنے گھر بلوالیتے تھے اوراس کھانے پینے کی چیز میں ان کو بھی شریک فرمالیتے تھے ،آپ (ﷺ) خود بھی نوش فرماتے تھے اور ان کو بھی کھلاتے تھے (اب یہ دودھ جو آیا ہوا تھااس کے متعلق گھر والوں نے بتلایا کہ ہدیہ میں آیا ہے،تو اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق حضور (ﷺ)نے کہا:اے ابوہریرہ! جاؤ؛ صفہ والوں کوبلالاؤ۔حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں :میں تودیکھ چکا تھا کہ کیاچیز ہے،اور کس لیے بلوایا جارہا ہے،صرف ایک پیالہ دودھ تھا،اس لئے جب مجھے ان کوبلانے کے لیے فرمایا تو) میں اپنے جی میں سوچنے لگاکہ صفہ والوں کی تعداد کے مدِ نظر اس دودھ کی کیا حیثیت ہے؟ (وہ توکئی آدمی ہیں اور دودھ کاتو صرف ایک ہی پیالہ ہے)میں ہی زیادہ حق دار تھاکہ اس دودھ کو پیوں اوراس کے ذریعہ سے قوت حاصل کروں (جب حضور(ﷺ)نے محسوس فرماہی لیاکہ میں بھوکاہوں توصفہ والوں کو بلوانے کی کیاضرورت تھی،مجھے ہی پلادیتے۔اوراس لیے بھی یہ سوچنے لگاکہ)جب میں ان کوبلاکرلاؤں گااوروہ آئیں گے تو(چوں کہ مجھے ہی یہ خدمت حوالہ کی گئی ہے تو) مجھ سے ہی فرمائیں گے کہ ان کوپلاؤ۔اورمجھے امید نہیں ہے کہ میرے حصے میں اس میں سے کچھ بھی آئے (اس لیے کہ

ظاہر ہے جس کو پلانے کی خدمت دی جائے، خود اس کا نمبر آخر میں ہوا کرتا ہے، اس لیے مجھے جی میں بہت بُرا معلوم ہوا) لیکن میں کیا کرتا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک (ﷺ) کی اطاعت کے بغیر چارۂ کار بھی تو نہیں تھا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں گیا اور ان کو بلا لیا، چناں چہ وہ لوگ آئے اور نبیٔ کریم (ﷺ) سے گھر میں داخلے کی اجازت طلب کی۔ تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے ان کو اجازت دے دی۔ جب وہ لوگ داخل ہو کر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا: اے ابو ہریرہ۔ میں نے کہا: لبیک یارسول اللہ! میں حاضر ہوں۔ آپ نے کہا: یہ پیالہ لو اور ان کو دو (انہوں نے جو سوچا تھا وہی ہوا۔ اب یہاں پر بھی آپ (ﷺ) کی بات پر عمل کئے بغیر چارۂ کار نہیں تھا) میں نے پیالہ لیا اور صفہ والوں میں سے ایک کے ہاتھ میں پیالہ تھما دیا، اس نے اس پیالہ میں سے پیا یہاں تک کہ بالکل شکم سیر اور سیراب ہو گیا، جب پیٹ بھر کر پی لیا، تو اس نے وہ پیالہ مجھے واپس کیا، میں نے دوسرے کو دیا، اس نے پیا، یہاں تک کہ وہ شکم سیر ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب سب پی چکے، اور حضور (ﷺ) سب سے آخر میں تشریف فرما تھے، وہاں تک میں پہنچ گیا (تمام صفہ والے پیٹ بھر کر فارغ ہو چکے تھے) تو میں نے آپ (ﷺ) کے دستِ مبارک میں وہ پیالہ دے دیا۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے میرے ہاتھ میں سے وہ پیالہ لیا اور اپنے ہاتھ پر رکھا اور مجھے دیکھ کر مسکرانے لگے (میرے دل کی بات حضور سمجھ گئے تھے) اور (مسکرا کر) فرمایا: اے ابو ہریرہ! میں نے کہا: لبیک یا رسول اللہ۔ فرمایا: اب تو میں اور تم دو ہی رہ گئے ہیں۔ میں نے کہا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! آپ نے سچ فرمایا۔ پھر آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ اور اب تم پیو۔ حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں بیٹھا اور میں نے پیا، جب میں پی چکا اور واپس کرنے لگا تو حضور (ﷺ) نے فرمایا اور پیو۔ حضور (ﷺ) باربار فرماتے رہے: اور پیو، اور پیو، اور پیو؛ یہاں تک کہ حضور (ﷺ) اتنا اصرار کرتے رہے کہ آخر میں مجبور ہو کر میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، اب تو اندر جانے کا راستہ ہی نہیں

ہے۔جب میں نے یہ کہا تو حضور(ﷺ)نے فرمایا :ذرا مجھے بھی یہ پیالہ دکھاؤ کہ اندر کتنا دودھ رہ گیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں :میں نے وہ پیالہ نبیؐ کریم (ﷺ) کودیا توحضور(ﷺ)نے اللہ تعالیٰ کی حمدوثناء بیان کی(کہ اس نے سب کی ضرورتیں پوری فرمائیں) اوربسم اللہ کہہ کربچا ہوادودھ خودنوش فرمایا۔

افادات:- بھوک کی وجہ سے کلیجہ میں درد کی کیفیت محسوس ہوتی ہے ،تو ایسے موقعہ پرآدمی کلیجہ دباتاہے۔تو سکون حاصل کرنے کے لیے کلیجہ جس طرف ہوتاہے بدن کے اس حصہ کوزمین کے ساتھ لگاکرپڑا رہتا تھا۔اور کبھی بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھ لیتاہے۔میں پہلے بھی بتلاچکاہوں کہ بھوک کی وجہ سے پیٹ اندر کی طرف جاتا ہے، کمرجھک جاتی ہے،اورکام کرنے اور چلنے میں مشقت لاحق ہوتی ہے، تو اس خلاء کو پُر کرنے کے لیےاوپرسےپتھر رکھ کرباندھاجاتاتھاتاکہ اس کی وجہ سے سہاراہو اور چلنے پھرنے میں آسانی رہے، قوت وطاقت رہے۔

روایت سے مستنبط کچھ آداب

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگرکسی کو بلایا گیا ہو، وہ بھی جب پہنچے، تو اندر آنے کے لیے اس کواجازت لینی چاہیے،صرف بلالیناہی کافی نہیں ہے۔اگرچہ اس میں تفصیل ہے،بعض حضرات فرماتے ہیں کہ بلانےوالا اگراپنے مکان میں ایسی جگہ بیٹھاہوا

ہے جہاں پردہ کی ضرورت ہے تو اجازت لینی چاہیے۔ اور اگر بلانے والا ایسی جگہ بیٹھا ہے جہاں پردہ نہیں ہے تو اس کا بلا لینا ہی کافی ہے، از سرِ نو اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس کے ہاتھ میں پہلے پیالہ ہوتا تھا وہ فارغ ہونے کے بعد دوسرے کو نہیں دیتا تھا بلکہ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے ہاتھ ہی میں دیتا تھا۔ اور ادب یہی ہے کہ جب کوئی آدمی کسی برتن میں ہمیں کھانے پینے کی کوئی چیز دے تو اس چیز کو کھا کر جب ہم اپنی ضرورت سے فارغ ہو جائیں اور اس میں کچھ بچا ہوا ہو تو وہ کسی دوسرے کو نہیں دینا چاہیے، بلکہ جس نے ہمیں دیا ہے اسی کو واپس کرنا چاہیے۔ الَّا یہ کہ اس نے ہدایت کی ہو کہ آپ فلاں کو دیدینا تو الگ بات ہے۔ ورنہ ہمارا فریضہ یہی ہے کہ ہم اسی کو واپس دیں۔

اور یہ اس وقت ہے جب کسی دوسرے کے گھر میں ہو۔ آپ اگر اپنے گھر میں ہوں اور اپنی چیز ہو اور آپ نے اپنے گھر والوں یا اپنے بیٹے سے منگوائی ہو، تو آپ مالک ہیں جس کو دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ کسی دوسرے کے گھر میں ہوں تو وہ ہماری ملکیت نہیں ہے۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو دیکھا کہ مجلس میں کبھی پینے کے لئے مولانا ابراہیم صاحب پانڈور مدظلہ یا اور کوئی، ٹھنڈا مشروب یا کوئی اور چیز لے کر آتا تو آپ فارغ ہو کر اسی کو واپس دیتے جو لے کر آیا ہوتا، لوگ بہت چاہتے تھے کہ ہمیں ملے، لیکن کسی دوسرے کو نہیں دیتے تھے۔

بہر حال! اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات کی زندگی کس طرح گذرتی تھی اوراس بات کی ترغیب دیناچاہتے ہیں کہ آدمی کو اپنی ضروریات پورا کرنے کے معاملہ میں ایساہی انداز اختیار کرنا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے باب چل رہا تھا بھوک برداشت کرنے کی فضیلت اور سادہ زندگی گذارنے، کھانے پینے میں کم سے کم پر اکتفاء کرنے کا، اور آدمی اگر اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑدے تو اس پر کیا مقام ملے گا۔اس سلسلہ میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی مبارک زندگیوں کے نمونے پیش کررہے ہیں۔

بھوک کی وجہ سے بے ہوشی

حدیث ۵۰۳

وعن محمد بن سيرين عن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُنِي وَإِنِّي لَأَخِرُّ فِيمَا بَيْنَ مِنْبَرِ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) إِلى حُجْرَةِ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) مَغْشِياً عَلَيَّ، فَيَجِيئُ الْجَائِي، فَيَضَعُ رِجْلَهُ عَلى عُنُقِي، وَيَرَى أَنِّي مَجْنُونٌ وَمَا بِي مِنْ جُنُونٍ، مَا بِي إِلَّا الْجُوعُ

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت نقل کرتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو دیکھا کہ میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر شریف اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے حجرہ کے درمیان- جس کو ریاض الجنۃ کہتے ہیں -زمین کے اوپر بیہوش ہوکر گر جاتا تھا۔ آنے والے آتے اور میری گردن پر یہ سمجھ کر پاؤں رکھتے کہ مجھے جنون طاری ہے، حالاں کہ وہ جنون نہیں ہوتا تھا، بلکہ بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہوکر میں گر جایا کرتا تھا۔

افادات:-(۱)اس زمانہ میں جنون کی ایک قسم ہوا کرتی تھی جس میں اگر آدمی بیہوش ہو جاتا تو اس کا علاج گردن کی ایک رگ دبانے سے کیا جاتا تھا، جس سے جنون میں افاقہ ہوتا تھا اور بیہوشی ختم ہو جاتی تھی۔

(۲)اور ظاہر ہے کہ خود نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ہی ان حضرات کو دینے کے لیے کچھ ہوتا تو آپ ضرور عنایت فرمادیتے اور ان کو فاقوں کی نوبت نہ آتی، لیکن جیسا کہ پہلے معلوم ہوا کہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھرانے کا حال بھی کیا تھا۔

بنیادی ضرورتوں کے لیے زرہ گروی رکھی

حدیث ۵۰۴

وعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ: تُوُفِّيَ رَسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) وَدِرْعُهُ مَرْهُوْنَةٌ عِنْدَ يَهُوْدِيٍّ فِيْ ثَلاثِيْنَ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ. (متفق عليه)

ترجمہ:-حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ایسی حالت میں ہوئی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک یہودی کے پاس سے تیس صاع جَو خریدے تھے اور اس کی قیمت کے بدلہ میں اعتماد اور بھروسہ کے طور پر اپنی زرہ گروی رکھی تھی (اور وہ زرہ چھڑائی نہیں گئی، اسی حالت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات ہوئی۔)

افادات:-ظاہر ہے کہ آدمی کے پاس جب اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے اتنی رقم نہ ہو، تب ہی گروی رکھنے کی نوبت پیش آتی ہے۔اس روایت کو پیش کرکے بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس اتنا مال بھی موجود نہیں تھا کہ اپنے گھر والوں کے نفقہ کو ادا کرنے اور ان کے کھانے پینے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے جس سے سامان لیا کرتے تھے، اس کی قیمت بھی نقد ادا کرسکیں، اسی لیے زرہ کو گروی رکھنے کی ضرورت پیش آئی۔

حضور (ﷺ) کے گھرانے کا دن ایسی حالت میں گزرتا...

حدیث ۵۰۵

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: رَهَنَ النَّبِيُّ (ﷺ) دِرْعَهُ بِشَعِيرٍ، وَمَشَيْتُ إِلَى النَّبِيِّ (ﷺ) بِخُبْزِ شَعِيرٍ وَإِهَالَةٍ سَنِخَةٍ، وَلَقَدْ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: (مَا أَصْبَحَ لِآلِ مُحَمَّدٍ صَاعٌ وَلَا أَمْسَى) وَإِنَّهُمْ لَتِسْعَةُ أَبْيَاتٍ۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ:-حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے جَو کے بدلے میں اپنی زرہ گروی رکھی تھی (حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت اوپر آئی اس میں بھی یہی تھا) اور ایک مرتبہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں جَو کی روٹی اور ایسی چربی لے کر حاضر ہوا جس کا مزہ طویل زمانہ تک پڑے رہنے کی وجہ سے بدل گیا تھا۔اور حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کی زبانِ مبارک سے سنا کہ محمد ((ﷺ)) کے گھرانے والوں کے پاس نہ صبح کے وقت کوئی چیز ایک صاع کے برابر ہوتی تھی اور نہ شام کے وقت ہوتی تھی۔(یعنی ایسی حالت میں دن گزرتا کہ اتنی مقدار بھی اپنی ضرورت پوری

کرنے کے لیے ان کے پاس نہیں ہوتی تھی)حالاں کہ نبیٔ کریم(ﷺ) کے نو(۹) گھرانے تھے۔ (نو[۹]ازواجِ مطہرات تھیں، کسی کے گھر میں ضرورت کے لئے کوئی چیز موجود نہیں ہوا کرتی تھی)

افادات:- ''اِهَالَةٌ'' اس چربی کو کہتے ہیں جس کو پگھلا کر ضرورت کے وقت استعمال کرنے کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔جب جانور کو ذبح کیا جاتا تھا، اس سے جو چربی نکلتی تھی اس کو وہ حضرات پگھلا کر رکھ لیا کرتے تھے۔اور''سَنِخَةٌ'' کھانے کی ایسی چیز کو کہتے ہیں کہ دیر تک پڑے رہنے کی وجہ سے جس کا ذائقہ بدل جائے۔ یہاں''اِهَالَةٌ سَنِخَةٌ'' کہا گیا یعنی ایسی پگھلائی ہوئی چربی جس کا مزہ بدلا ہوا ہو۔

اب ظاہر ہے کہ اگر اس سے اچھا کوئی کھانا پاس ہوتا یا خود حضور اکرم (ﷺ) کے پاس کوئی چیز میسر ہوتی تو یہ حضرات ایسی چیز لے کر کیوں حاضر ہوتے۔معلوم ہوا کہ نہ حضور اکرم (ﷺ) کے پاس کچھ تھا، اور نہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کے پاس کوئی عمدہ چیز ہوتی تھی۔

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی سادگی کا ایک اور نمونہ

حدیث ۵۰۶

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ : لَقَدْ رَأَيْتُ سَبْعِيْنَ مِنْ أَهْلِ الصُّفَّةِ ،مَا مِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَآءٌ ، إِمَّا إِزَارٌ وإِمَّا كِسَآءٌ، قَدْ رَبَطُوا فِيْ أَعْنَاقِهِمْ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ، وَمِنْهَا مَا يَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهٖ كَرَاهِيَةَ أَنْ تُرَى عَوْرَتُهُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے ستّر(۷۰)اہلِ صفہ ایسے دیکھے کہ ان میں سے(کسی کے بدن پر پوراجوڑانہیں ہوتا تھا۔اوراس زمانہ میں دو چادریں جوڑے کے طورپراستعمال کی جاتی تھیں،ایک لنگی کے طورپراوردوسری بدن کے اوپر کے حصہ کو ڈھانکنے کے لئے۔)کسی کے پاس صرف لنگی ہوتی تھی،یا صرف ایک بڑی چادر ہوتی تھی جس کواپنی گردن میں باندھ لیتے تھے۔کسی کی چادراتنی ہوتی تھی کہ آدھی پنڈلی تک پہنچتی تھی،کسی کی ٹخنوں تک آتی تھی۔اورچوں کہ ایک ہی چادرہوتی تھی تو کھلنے سے بچانے کے لیے وہ اس کواپنے ہاتھ سے پکڑے رہتے تھے۔(بدن چھپانے کے لیے پورا لباس بھی ان میں سے کسی کے پاس نہیں ہوتا تھا۔اس سے ان حضرات کی سادہ زندگی کا پتہ چلتاہے۔)

افادات:- پہلے بھی آچکاہے کہ اہلِ صفہ وہ حضراتِ صحابۂ کرام(رضی اللہ عنہم) تھے جنھوں نے اپنے آپکو علم دین سیکھنے کے لئے فارغ کررکھاتھا،نہ ان کاکوئی گھر اورمکان تھا،نہ گھر والے، بیوی بچے تھے۔مسجد نبوی میں ایک چبوترہ تھاوہیں وہ حضرات چوبیس گھنٹے پڑے رہتے تھے،اورنبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کے پاس کھانے کی کوئی چیز آتی توآپ ان کوعنایت فرمادیتےتھے، اسی سے ان کی ضرورت پوری ہوجاتی تھی،ورنہ بھوکے رہتے تھے۔

حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کابستر

حدیث ۵۰۷

وعن عائشة(رضی اللہ عنہا)قَالَتْ كَانَ فِرَاشُ رَسُوْلِ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم)مِنْ أَدَمٍ حَشْوُهُ لِيْفٌ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بستر چمڑے کا تھا اس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

افادات:- چھال یعنی کھجور کے درخت میں جالی دار ایک چیز لٹکی ہوئی ہوتی ہے جیسے ناریل کے درخت میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایسی چیز لٹکا کرتی ہے۔ درخت کے تنے پر جو چھال ہوتی ہے وہ مراد نہیں ہے، اس لئے کہ وہ اس کام کی نہیں ہوتی کہ اس کو بھرا جائے، بلکہ مراد وہ لٹکی ہوئی چیز ہے جو کچھ نرم بھی ہوتی ہے اور وہ حضرات اس کو تکیہ اور بستر میں بھرنے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے، جیسے آج کل روئی استعمال کی جاتی ہے۔

با ایں ہمہ ہیچ افسوس ندارد

حدیث ۵۰۸

وعن ابن عمر رضی اللہ عنهما قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذْ جَآءَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، ثُمَّ أَدْبَرَ الْأَنْصَارِيُّ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَا أَخَا الْأَنْصَارِ! كَيْفَ أَخِي سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ؟ فَقَالَ: صَالِحٌ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ يَعُوْدُهُ مِنْكُم؟ فَقَامَ وَ قُمْنَا مَعَهُ، وَنَحْنُ بِضْعَةَ عَشَرَ، مَا عَلَيْنَا نِعَالٌ، وَلَا خِفَافٌ، وَلَا قَلَانِسُ، وَلَا قُمُصٌ، نَمْشِي فِي تِلْكَ السِّبَاخِ، حَتّٰى جِئْنَاهُ، فَاسْتَأْخَرَ قَوْمُهُ مِنْ حَوْلِهِ حَتّٰى دَنَا رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَأَصْحَابُهُ الَّذِيْنَ مَعَهُ. (رَوَاهُ مُسْلِم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اتنے میں ایک انصاری صحابی آئے، اورانہوں نے نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سلام کیا، اس کے بعد جب وہ جانے لگے تو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے پوچھا: اے انصاری بھائی! ہمارے بھائی سعد بن عبادہ کا کیا حال ہے؟ (وہ بیمار چل رہے تھے) انہوں نے کہا: اب ٹھیک ہیں۔ تو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہلِ مجلس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تم میں سے کون ان کی عیادت کے لیے آتا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ آپ کے اس ارشاد پر اس مجلس میں جتنے بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، سب ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوگئے (ظاہر ہے کہ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ساتھ چلنے کی دعوت دیں تو صحابہ میں سے کون انکار کرسکتا تھا) ہم دس سے کچھ زیادہ لوگ تھے (تیرہ (۱۳) سے انیس (۱۹) تک کے عدد کے لیے لفظ "بضعۃ عشر" بولا جاتا ہے) اور ہمارا حال یہ تھا کہ نہ ہمارے پاس جوتے تھے، نہ موزے تھے، نہ ٹوپیاں تھیں، نہ کُرتے تھے (سب کا حال ایسا تھا) ہم ایسی نمکین زمین میں چل رہے تھے جس میں سبزہ نہیں تھا یہاں تک کہ جب ہم حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کے یہاں پہنچے تو اس وقت ان کے قبیلے کے لوگ ان کو گھیر کر بیٹھے ہوئے تھے، نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہمیں آتا ہوا دیکھ کر وہ لوگ کھڑے ہوگئے، تو نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے ساتھی ان کے قریب بیٹھ گئے۔

افادات:- اس روایت کو لاکر یہ بتلانا ہے کہ یہ حضرات اس حال میں زندگی گزار رہے ہیں کہ نہ ان کے پاس جوتا ہے، نہ موزہ ہے، نہ کُرتہ ہے اور نہ ٹوپی ہے، اور اس پر بھی ان کو کوئی غم یا افسوس نہیں ہے۔ اور ہم لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ہمارے پاس جوتا نہ ہو تو ہم بہت افسوس کرتے ہیں۔ لیکن اگر نماز کی جماعت فوت ہو جائے، نماز چھوٹ

جائے، شریعت کے حکم کے معاملہ میں ہم سے کوتاہی ہورہی ہے، تو کبھی ہمیں افسوس اور غم نہیں ہوتا ہے، اور کبھی ہمارا جی نہیں دُکھتا اور اس پر کبھی رونا نہیں آتا۔ اور اگر کبھی ایک وقت کھانا نہ ملا ہو، یا ہماری مرضی کے مطابق لباس نہ ہو، تو ہم شکوے شکایت کرتے اور رونے لگتے ہیں۔ ان حضرات کی زندگی کا اگر ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان سارے حالات کے باوجود نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پوری سیرت میں اور صحابہ ُکرام (رضی اللہ عنہم) کے حالات میں کہیں یہ نہیں ملے گا کہ کسی کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نکلا ہو کہ نعوذباللہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہے، اور ہمیں اپنی مرضی کے مطابق کوئی چیز نہ ملے تو یہ جملہ ہماری زبان پر آتا ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہے۔ گویا اس کو ناراضگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

ایسے لوگ آئیں گے

حدیث ۵۰۹

وعن عمران بن الحُصَيْنِ رضی اللہ عنهما عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) اَنَّهُ قَالَ: خَيْرُكُمْ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ. قَالَ عِمْرَانُ: فَمَا اَدْرِىْ قَالَ النَّبِيُ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَرَّتَيْنِ اَوْ ثَلَاثًا ثُمَّ يَكُوْنُ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ، وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ، وَيَنْذِرُوْنَ وَلَا يُوْفُوْنَ، وَيَظْهَرُ فِيْهِمُ السِّمَنُ.

ترجمہ: -حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ تم میں بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے، اس کے بعد وہ لوگ جو میرے بعد ہوں گے، پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے (حضرت عمران (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: مجھے یاد نہیں رہا کہ نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے "ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ" دو

مرتبہ ارشاد فرمایا، یا تین مرتبہ۔) پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو گواہی دینے کے لیے آگے بڑھیں گے، حالانکہ ان کو گواہی کے لیے بلایا نہیں جائے گا۔ اور جب ان کے پاس کوئی امانت رکھی جائے گی تو وہ خیانت کریں گے۔اور وہ لوگ نذریں اور منتیں مانیں گے لیکن اس کو پوری نہیں کریں گے۔اوران میں موٹاپا نمایاں ہو گا۔

افادات:- آج کل ہمارے سماج میں یہ مزاج بنا ہوا ہے کہ کوئی موقع آتا ہے تو نذر مان لی جاتی ہے، مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں کام ہو جائے گا تو میں یوں کروں گا، لیکن جب وہ کام ہو جاتا ہے تو یاد بھی نہیں رہتا کہ میں نے نذر مانی ہے جس پورا کرنا ضروری ہے۔

یہاں تو اس روایت کو اسی لئے لائے ہیں کہ وہ لوگ کھانے پینے کے ایسے عادی ہوں گے کہ ان کے جسم موٹے ہوں گے۔ گویا کھانے پینے کی اتنی کثرت جو آدمی کے جسم کو موٹا بنانے کا ذریعہ بنے، اس کو نبیٔ کریم (ﷺ) نے برائی کے طور پر شمار کروایا، اور نبیٔ کریم (ﷺ) کے بعد جو برا زمانہ آنے والا ہے اس کی علامت کے طور پر ذکر کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیز پسندیدہ نہیں ہے۔ آج کل اس کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اور لوگ یہ جملہ بولتے رہتے ہیں کہ خوب کھاؤ اور جان بناؤ۔ حالاں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس کو ناپسند فرمایا ہے۔ لہٰذا اگر آدمی کو سب کچھ میسر ہو تب بھی بقدرِ ضرورت پر اکتفاء کرنا چاہیے، آدمی کھانے پینے میں اتنا آگے نہ بڑھے کہ اس کے موٹاپے کا ذریعہ بنے۔

خرچ کرنے کی ترتیب

حدیث ۵۱۰

وَعَن أَبِي أُمَامَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): يَا ابنَ آدَمَ، إِنَّكَ أَن تَبذُلَ الفَضلَ خَيرٌ لَكَ، وَإِن تُمسِكهُ شَرٌّ لَكَ، وَلَا تُلَامُ عَلَى كَفَافٍ، وَابدَأ بِمَن تَعُولُ. (رَوَاهُ التِّرمِذِي، وَقَالَ: حديث حسنٌ صحيحٌ)

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے آدم کی اولاد! اگر تو اپنا زیادہ مال خرچ کر دے تو یہ تیرے لئے بہت اچھا ہے، اور اگر روکے رکھے تو برا ہے۔ اور بقدرِ ضرورت (دنیوی ضرورتوں میں) جو کچھ خرچ کرے اس میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) کوئی ملامت نہیں ہے۔ اور خرچ کرنے کے معاملہ میں جن کی تم پر ذمہ داری ہے ان سے شروعات کرو۔

افادات:- "فضل" یعنی اپنی دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنے کے بعد جو مال بچ جائے، اس کے متعلق نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اس کو جمع کرکے نہ رکھو، بلکہ اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کردو؛ یہی بہتر ہے۔ اگر اس کو رہنے دوگے تو یہ تمہارے لئے برا ہے، اس لیے کہ تمہاری ضرورتیں تو پوری ہو رہی ہیں، اب جو زائد بچ رہا ہے یہ تمہاری ضرورتوں میں استعمال نہیں ہو رہا ہے، اگر آپ اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ نہیں کروگے تو چھوڑ کر جاؤ گے، آپ کے تو کسی کام آنے والا نہیں ہے، لیکن اگر نیکی کے کاموں میں خرچ کردوگے تو وہ سب اللہ تعالیٰ کے یہاں جمع ہو جائے گا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ چھوڑ کر جانے کے مقابلہ میں خرچ کرنا ہی اچھا ہے۔

اور یہ بھی فرمایا: خرچ کرنے کے معاملہ میں جن کی تم پر ذمہ داری ہے ان سے شروعات کرو۔ مطلب یہ ہے کہ بال بچے، والدین، اور دوسرے ایسے رشتہ دار جن کا نفقہ اور خرچہ واجب ہے، یا جن پر خرچ کرنے کی فضیلت آئی ہے؛ آدمی کو ایسے لوگوں سے شروعات کرنی چاہیے، اور پھر دوسرے لوگوں کو دینا چاہیے۔ گویا خرچ کرنے کا بھی ایک خاص انداز بتایا گیا ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آپ خرچ کرنے کا سلسلہ شروع کریں تو دوسروں کو تو خوب دے رہے ہیں اور جن کی ذمہ داری آپ پر عائد ہوتی ہے، یا جن کا نفقہ آپ پر واجب ہے، ایسوں کو تو پوچھتے ہی نہیں۔

جس کو تین چیزیں ملیں

حدیث ۵۱۱

وعن عُبَيدِاللهِ بنِ مِحْصَنٍ الأَنْصَارِي الخطمِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ أَصْبَحَ مِنْكُمْ آمِناً فِي سِرْبِهِ، مُعَافًى فِي جَسَدِهِ، عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ، فَكَأَنَّمَا حِيزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيرِهَا. (رَوَاهُ الترمذی، وقَالَ: حدیث حسن)

(سِرْبُهُ) بكسر السين المهملة: أي نَفْسُهُ، وقِيلَ قَومُه

ترجمہ:- حضرت عبید اللہ بن مِحْصَن انصاری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو آدمی ایسی حالت میں صبح کرے کہ وہ اپنی قیام گاہ میں بالکل امن سے ہے (یعنی اس کو کوئی خوف اور خطرہ نہیں ہے، اس کی جان مال سب محفوظ ہے) اور اس کے جسم میں عافیت ہے (کسی

قسم کی بیماری میں مبتلا نہیں ہے)اور ایک دن کے کھانے پینے کا اس کے پاس انتظام ہے؛تو گویا اس کے لیے ساری دنیا اکٹھی کر کے دے دی گئی ہے۔

افادات:-یعنی دنیا کی ساری ضرورتیں اس کو حاصل ہیں ، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اگر وہ کسی پاس ہے بھی تو وہ سب زائد ہے۔

میری ضرورت کا مجھ تک پہنچ جاتا ہے

ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہ کا جملہ صوفی اقبال صاحب مہاجر مدنی (رحمۃ اللہ علیہ)نے ذکر کیا ہے کہ ایک مرتبہ مجھے تجارت کا شوق ہوا،حضرت کے سامنے تذکرہ کیا تو حضرت نے فرمایا: دیکھو!سہارنپور میں جتنے کارخانے اور دکانیں ہیں ،میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ سب میری ہیں،اوران پر جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور چلا رہے ہیں وہ سب میرے کارندے ہیں،حساب و کتاب کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے رکھی ہے،اور میری ضرورت کا مجھ تک پہنچ جاتا ہے،باقی سب اپنے کام کاج کی وجہ سے وہ لوگ لے لیتے ہیں۔

غور طلب حقیقت

حقیقت یہی ہے کہ کسی کے پاس اگر کروڑوں کی جائیداد بھی ہو،تو اس میں سے چوبیس گھنٹے کے ایک دن میں خود اس کے کام کا کیا ہے؟صرف وہی ہے جو اس دن اس کی ضرورت میں استعمال ہو رہا ہے،باقی جو کچھ بھی ہے وہ سب زائد ہے۔کہنے کو تو یوں کہا

جائے گا کہ وہ اس کا مالک ہے، لیکن خود اس کے استعمال میں نہیں آرہا ہے۔ جیسے ایک آدمی کے پاس بڑا بنگلہ ہے جس میں سو کمرے ہیں، ہر کمرے میں بیڈ(Bed) بستر بنا ہوا ہے، اور بہترین طریقے سے سجایا گیا ہے، تب بھی ایک وقت میں ایک ہی جگہ سوئے گا، باقی ننانوے تو خالی پڑے رہیں گے۔ اگر سو جوڑے کپڑے بنائے گا، تو ایک وقت میں تو ایک جوڑا ہی پہنے گا، باقی ننانوے جوڑے رکھے رہیں گے، بلکہ اگر ایک ساتھ دو جوڑے پہن لے گا تو سب کہیں گے کہ سیٹھ صاحب کے دماغ میں خلل آگیا ہے۔ کھانا پینا کتنا ہی زیادہ تیار کیا جائے، ایک وقت میں اپنی ضرورت جتنی ہے اور تندرستی بھی ساتھ دے رہی ہے، تو جتنا تقاضہ ہے اس سے زیادہ نہیں کھا سکتا بقیہ سب اس کے حق میں بے کار ہے۔ تو غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ آدمی جتنا بھی مال و دولت جمع کرتا ہے، اس میں سے خود اس کے استعمال میں کتنا آتا ہے، اس کی بنیادی ضرورتیں جتنے مال سے پوری ہوجاتی ہیں، اس کے علاوہ سب زائد ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں: اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے یہ تین چیزیں عطا فرما دیں تو یوں سمجھے کہ میری سب ضرورتیں پوری ہورہی ہیں اور ساری دنیا ملی ہوئی ہے۔

کامیاب ترین آدمی

حدیث ۵۱۲

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ : قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَكَانَ رِزْقُهُ كَفَافاً، وَقَنَّعَهُ اللهُ بِمَا أَتَاهُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اسلام لایا اور اس کی روزی بقدرِ ضرورت ہے، اور پھر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے اس پر قناعت اور صبر سے کام لیتا ہے؛ تو وہ کامیاب ترین آدمی ہے۔

افادات:- دراصل سب سے بڑی دولت قناعت ہے۔ اگر کسی کے پاس تھوڑا سا ہی مال ہے لیکن قناعت کی صفت حاصل ہے تو کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اور اگر بہت بڑی مقدار میں دولت موجود ہے، لیکن قناعت نہیں ہے تو ہمیشہ پریشان رہے گا۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے قناعت کی دولت مانگے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا بتلائی ہے: "أَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْمَا أَعْطَيْتَنِيْ وَاخْلُفْ عَلٰى كُلِّ غَائِبَةٍ لِيْ بِخَيْرٍ" طواف میں رکن یمانی سے لے کر حجراسود کے درمیان پڑھی جاتی ہے، جیسے ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ پڑھی جاتی ہے، ایسے ہی جب حجراسود قریب آتا ہے اس وقت یہ دعا بھی حدیث میں آئی ہے۔ اے اللہ! جو روزی تو نے مجھے دی ہے اس پر قناعت عطا فرما، اور جتنا دیا ہے اس میں برکت فرما۔

خوش خبری ہے اس کے لیے

حدیث ۵۱۳

وعن أبي محمد فُضَالَةَ بنِ عبيدٍ الأنصاری (رضی اللہ عنہ) أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ : طُوْبٰى لِمَنْ هُدِیَ لِلإِسْلَامِ، وَكَانَ عَيْشُهُ كَفَافًا وَقَنِعَ.

ترجمہ:- حضرت فضالہ بن عبید انصاری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ خوش خبری ہے اس آدمی کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اور اس کو بقدرِ ضرورت روزی عطا فرمائی، اور اس پر وہ قناعت کرتا ہے۔ (مطلب یہ ہے کہ جو آدمی بقدرِ ضرورت پر قناعت کرے وہ قابلِ مبارکباد ہے۔)

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے گھرانے کی راتیں

حدیث ۵۱۴

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَبِيْتُ اللَّيَالِيَ الْمُتَتَابِعَةَ طَاوِيًا، وَأَهْلُهُ لَا يَجِدُوْنَ عَشَآءً، وَكَانَ أَكْثَرُ خُبْزِهِمْ خُبْزَ الشَّعِيْرِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کئی راتیں مسلسل ایسی گزارتے تھے کہ آپ بھوکے ہوتے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے گھر والوں کو رات کا کھانا میسر نہیں آتا تھا،

اور جب کھانا میسر ہوتا تھا، تو وہ بھی عام طور پر جَو کی روٹی ہوتی تھی (دوسری کوئی چیز کبھی کبھار استعمال کرنے کی نوبت آتی تھی)

اہلِ صفہ کی بھوک پر حضور (ﷺ) کی تسلی

حدیث ۵۱۵

وعن فُضَالَةَ بْنِ عبيدٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) كَانَ إِذَا صَلَّى بِالنَّاسِ، يَخِرُّ رِجَالٌ مِنْ قَامَتِهِمْ فِي الصَّلَاةِ مِنَ الْخَصَاصَةِ وَهُمْ أَصْحَابُ الصُّفَّةِ. حَتّٰى يَقُوْلَ الْأَعْرَابُ: هٰؤُلَاءِ مَجَانِيْنَ. فَإِذَا صَلَّى رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) انْصَرَفَ إِلَيْهِمْ، فَقَالَ: لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا لَكُمْ عِنْدَ اللهِ تَعَالٰى لَأَحْبَبْتُمْ أَنْ تَزْدَادُوْا فَاقَةً وَحَاجَةً (رواه الترمذی)

اَلْخَصَاصَةُ: اَلْفَاقَةُ وَالْجُوْعُ الشَّدِيْدُ

ترجمہ:- حضرت فضالہ بن عبید (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) جب نماز پڑھاتے تھے تو بہت سے لوگ نماز کے درمیان بھوک کی وجہ سے بیہوش ہو کر گر جاتے تھے، اور وہ صفہ والے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ دیہات سے جو لوگ آتے تھے وہ ان حضرات کو دیکھ کر کہتے تھے کہ ان پر پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ (جیسے کسی کو مرگی کا مرض ہوتا ہے تو وہ بیہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ تو وہ لوگ بھی ان حضرات کو ایسا ہی سمجھتے تھے کہ ان کو بھی وہی بیماری ہے۔) پھر جب نبیٔ کریم (ﷺ) نماز سے فارغ ہو کر ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو آپ ان کو تسلی دیتے ہوئے فرماتے: تمہارے اس مجاہدے پر اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہارے لئے بطورِ اجر و ثواب کے جو کچھ رکھا ہوا ہے وہ اگر تم جان لو، تو تم دل سے اس بات کو پسند کرنے لگو کہ تمہارا یہ فاقہ اور ضرورت اور زیادہ بڑھ جائے۔

افادات:-یعنی اس وقت فاقہ کی یہ حالت ہے کہ تم بیہوش ہوکر گر رہے ہو لیکن اس پر اللہ تعالیٰ نے جو اجر و ثواب رکھا ہے وہ اگر معلوم ہو جائے تو تم یہ تمنا کرنے لگو کہ اس تکلیف میں اور اضافہ ہو جائے۔ دیکھئے! نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی اس حالت کو دیکھ کر رنج کا اظہار نہیں فرمایا، بلکہ بطورِ تسلی کے ارشاد فرمایا کہ یہ تو ایسی چیز ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہیں جو کچھ ملنے والا ہے اگر اس کا پتہ چل جائے تو اس میں اور زیادتی کی تمنا کرو۔

بھرا ہوا سب سے بُرا برتن

حدیث ۵۱۶

وعن أَبِي كَرِيمَةَ المقدام بن معديكرِبَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ: مَا مَلأَ آدَمِيٌّ وِعَاءً شَرًّا مِنْ بَطْنٍ، بِحَسْبِ ابْنِ آدَمَ أُكُلاَتٌ يُقِمْنَ صُلْبَهُ، فَإِنْ كَانَ لاَ مَحَالَةَ فَثُلُثٌ لِطَعَامِهِ، وَثُلُثٌ لِشَرَابِهِ، وَثُلُثٌ لِنَفَسِهِ۔ (رواہ الترمذی)

(أُكُلاَتٌ) أَيْ: لُقَمٌ

ترجمہ:-حضرت مقداد بن معدیکرب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ انسان نے اپنے پیٹ سے برا اور کوئی برتن نہیں بھرا (یعنی پیٹ ایک ایسا برتن ہے جس کو بھرنا برا ہے) اور انسان کے لیے چند لقمے کافی ہیں جو اس کی پیٹھ کو سیدھا کر دیں (یعنی اتنا کھانا جس سے آدمی ذرا اٹھا ہو کر چل سکے۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ) اگر زیادہ ہی کھانا ہے تو اتنا کھاؤ کہ اپنے پیٹ

کا ایک حصہ کھانے کے لیے، ایک حصہ پینے کے لیے، اور ایک حصہ سانس کے لیے(یعنی زیادہ سے زیادہ کھاناہے تو اتنا کھائے کہ ایک تہائی پیٹ بھرے۔)

سادگی ایمان کا حصہ ہے

حدیث ۵۱۷

وعن أبي أُمَامَةَ إِيَاسِ بن ثعلبةَ الأنصاري الحارثي(رضی اللہ عنہ) قَالَ: ذَكَرَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَوماً عِنْدَهُ الدُّنْيَا،فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم): أَلَا تَسْمَعُوْنَ؟ أَلَا تَسْمَعُوْنَ؟أَنَّ الْبَذَاذَةَ مِنَ الإِيْمَانِ ،أَنَّ البَذَاذَةَ مِنَ الإِيْمَانِ. يَعْنِيْ:التَّقَحُّلَ.

اَلْبَذَاذَةُ:بِالْباء الموحدة والذَّالَيْنِ الْمُعْجَمَتَيْنِ۔ وهِيَ رَثَاثَةُ الْهَيْئَةِ وَتَرْكُ فَاخِرِ اللِّبَاسِ ۔ وَأَمَّا التَّقَحُّلُ: فَبِالقافِ وَالْحَاءِ:قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ:الْمُتَقَحِّلُ هُوَالرَّجُلُ الْيَابِسُ الْجِلْدِمِنْ خُشُوْنَةِ الْعَيْشِ وَتَرْكِ التَّرَفُّهِ۔

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیُ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہ نے حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے دنیا(کی مال ودولت)کاتذکرہ کیا، تو نبیُ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کیا سنتے نہیں ؟ کیا سنتے نہیں ؟سادگی ایمان کا حصہ ہے،سادگی ایمان کا حصہ ہے۔

افادات:- "بِذَاذَۃٌ"سادہ لباس اورسادہ زندگی۔یعنی لباس میں آدمی فخرو مباہات اور بڑائی سے اپنے آپ کو بچائے،اوررہن سہن میں سادگی اختیار کرے۔اور آدمی اپنی حالت ایسی بنائے کہ سادہ زندگی کی وجہ سے اور کھانے پینے کے اندر عیش و عشرت کو چھوڑدینے

کی وجہ سے آدمی کی کھال خشک ہوجائے،یعنی سادہ کھانا استعمال کرے ،زیادہ روغنی کھانا جب استعمال کرے گا تو کھال نرم ہوگی۔

عنبر مچھلی کا قصہ

حدیث ۵۱۸

وعن أبي عبد الله جابر بن عبد الله (رضی اللہ عنہ) قَالَ: بَعَثَنَا رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم)، وأَمَّرَ عَلَيْنَا أَبَا عُبَيْدَةَ (رضی اللہ عنہ) نَتَلَقَّى عِيْرًا لِقُرَيْشٍ، وَزَوَّدَنَا جِرَابًا مِنْ تَمْرٍ لَمْ يَجِدْ لَنَا غَيْرَهُ، فَكَانَ أَبُو عُبَيْدَةَ يُعْطِيْنَا تَمْرَةً تَمْرَةً، فَقِيْلَ: كَيْفَ كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ بِهَا؟ قَالَ: نَمُصُّهَا كَمَا يَمُصُّ الصَّبِيُّ، ثُمَّ نَشْرَبُ عَلَيْهَا مِنَ الْمَآءِ، فَتَكْفِيْنَا يَوْمَنَا إِلَى اللَّيْلِ، وَكُنَّا نَضْرِبُ بِعِصِيِّنَا الْخَبَطَ ثُمَّ نَبُلُّهُ بِالْمَآءِ فَنَأْكُلُهُ، قَالَ: وَانْطَلَقْنَا عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ، فَرُفِعَ لَنَا عَلٰى سَاحِلِ الْبَحْرِ كَهَيْئَةِ الْكَثِيْبِ الضَّخْمِ، فَأَتَيْنَاهُ فَإِذَا هِيَ دَابَّةٌ تُدْعَى الْعَنْبَرَ، فَقَالَ أَبُو عُبَيْدَةَ: مَيْتَةٌ، ثُمَّ قَالَ لَا بَلْ نَحْنُ رُسُلُ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَفِيْ سَبِيْلِ اللهِ وَقَدِ اضْطُرِرْتُمْ فَكُلُوا، فَأَقَمْنَا عَلَيْهِ شَهْرًا، وَنَحْنُ ثَلَاثُمِئَةٍ حَتّٰى سَمِنَّا، وَلَقَدْ رَأَيْتُنَا نَغْتَرِفُ مِنْ وَقْبِ عَيْنِهِ بِالْقِلَالِ الدُّهْنَ وَ نَقْطَعُ مِنْهُ الْفِدَرَ كَالثَّوْرِ أَوْ كَقَدْرِ الثَّوْرِ، وَ لَقَدْ أَخَذَ مِنَّا أَبُو عُبَيْدَةَ ثَلَاثَةَ عَشَرَ رَجُلًا فَأَقْعَدَهُمْ فِيْ وَقْبِ عَيْنِهِ وَأَخَذَ ضِلَعًا مِنْ أَضْلَاعِهِ فَأَقَامَهَا ثُمَّ رَحَلَ أَعْظَمَ بَعِيْرٍ مَعَنَا فَمَرَّ مِنْ تَحْتِهَا وَتَزَوَّدْنَا مِنْ لَحْمِهِ وَشَائِقَ، فَلَمَّا قَدِمْنَا الْمَدِيْنَةَ أَتَيْنَا رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَذَكَرْنَا ذٰلِكَ لَهُ فَقَالَ: هُوَ رِزْقٌ أَخْرَجَهُ اللهُ لَكُمْ، فَهَلْ مَعَكُمْ مِنْ لَحْمِهِ شَيْءٌ فَتُطْعِمُوْنَا؟ فَأَرْسَلْنَا إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) مِنْهُ، فَأَكَلَهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح وافادات:- حضرت جابر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم صحابہ کا ایک لشکر بھیجا اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح (رضی اللہ عنہ) کو ہمارا امیر بنایا آپ نے ہمیں

قریش کے ایک قافلہ کی ٹوہ لگانے کے لئے بھیجا تھا اور توشہ کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں (پورے لشکر کو جو تقریباً ساڑھے تین سو (۳۵۰) آدمی تھے) چمڑے کی ایک تھیلی دی جس میں کھجوریں بھری ہوئی تھیں، اور کوئی چیز توشہ کے طور پر دینے کے لیے تھی ہی نہیں ۔ (حضرت جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ) حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) ہم میں سے ہر ایک کو روزانہ ایک ایک کھجور دیتے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ اس ایک کھجور کا کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے کہا: جس طرح بچہ کے منہ میں کھجور دی جائے تو وہ چوستا رہتا ہے، ایسے ہی ہم اس کھجور کے دانے کو چوستے رہتے تھے، اور اس پر پانی پی لیتے تھے چوبیس گھنٹے کے لیے ہمیں وہی کافی ہو جاتا تھا۔ اور ہم اپنی لکڑیوں کے ذریعہ سے درختوں کے پتے جھاڑ لیا کرتے تھے اور اسی کو پانی میں بھگا کر کھا لیتے تھے۔ (حضرت جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ) پھر ہم سمندر کے کنارے پہنچے تو وہاں ہمیں ایک چھوٹا سا ٹیلا نما نظر آیا، جب ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ وہ تو ایک بڑا جانور تھا جس کو عنبر کہا جاتا ہے (یہ وہیل مچھلی کی ایک قسم ہے) وہ کنارے پر پڑی ہوئی تھی۔ حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) نے پہلے تو کہا: یہ کوئی مردار جانور ہے، پھر فرمایا: نہیں! بلکہ یہ تو سمندری مچھلی ہے۔ اور ہم اللہ کے راستہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بھیجے ہوئے ہیں اور ویسے بھی اضطراری حالت میں ہیں جس میں مردار کھانا جائز ہے، اس لیے کھاؤ۔ چنانچہ ہم نے ایک مہینہ وہاں قیام کیا، اور ہم تین سو آدمی تھے، ہم اسی کو کھاتے رہے یہاں تک کہ اس کو کھانے کی وجہ سے ہم موٹے ہو گئے۔

(بخاری شریف کی روایت میں یہ ہے کہ فاقوں کی وجہ سے ہمارے جسموں میں جو کمزوری آ گئی تھی، اور ہمارے جسم جو دبلے ہو گئے تھے اس مچھلی کو کھانے کی وجہ سے وہ دبلا پن دور ہو گیا۔ موٹاپے کا مطلب یہی ہے۔)

پھر فرماتے ہیں کہ اس مچھلی کی آنکھ کا کھڈّا(گڑھا)اتنا بڑا تھا کہ ہم مٹکے بھر کر اس میں سے تیل نکالتے تھے،اوراسی سے گوشت پکاتے تھے۔اور حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ)نے ہم میں سے تیرہ آدمیوں کو چنااوران کواس آنکھ کے گڑھے میں بٹھایا۔جس کی آنکھ کا گڑھا اتنا بڑا ہو کہ تیرہ آدمی آرام سے اندر بیٹھ سکتے ہوں،وہ مچھلی کتنی بڑی ہوگی!اور فرماتے ہیں :اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی کولے کرکمان کی طرح کھڑاکیا، اور ہمارے پاس جوسب سے اونچااونٹ تھااس کواس کے نیچے سے گزارا۔

حضرت قیس بن سعدبن عبادہ (رضی اللہ عنہ)

اس روایت میں توصرف یہی ہے ،لیکن دوسری روایت میں ہے کہ اس اونٹ پر ہم میں سےجوسب سے اونچاآدمی تھااس کوسوار کرایا۔یہ حضرت قیس بن سعدبن عبادہ (رضی اللہ عنہ) تھے۔یہ بہت اونچے آدمی تھے،ان کے متعلق لکھاہے کہ جب سواری پر سوار ہوتے تھے تو ان کے پاؤں زمین پر لگتے تھے۔اوریہ بہت زیادہ بہادر بھی تھے،نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کے باڈی گارڈکے طورپر آگے آگے یہی رہتے تھے۔امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس پر مستقل باب قائم کیاہے۔

قیصرِ روم کو دنداں شکن جواب

حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں ایک مرتبہ قیصرِ روم نے دو آدمی بھیجے، ایک بہت اونچا تھا اور دوسرا بہت پہلوان تھا۔ گویا وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر اس کا جواب ہو تو دو۔ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے اونچے آدمی کا جواب دینے کے لئے انہی (حضرت قیس بن سعد بن عبادہ) کو بلایا۔ جب یہ آئے تو انہوں نے اوپر لمبا کرتہ پہنا ہوا تھا، نیچے سے اپنا پائجامہ نکالا اور اس سے کہا کہ اس کو پہنو، جب اس نے پہنا تو وہ گلے تک پہنچتا تھا۔

اور پہلوان و مضبوط آدمی کا جواب دینے کے لیے حضرت محمد بن حنفیہ (رضی اللہ عنہ) (جو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے صاحبزادے ہیں ان) کو بلایا اور پہلوان کے مقابلہ کے لیے بھیجا، انہوں نے اس پہلوان سے کہا: میں یہاں بیٹھتا ہوں تو مجھے میری جگہ سے ہلا دے۔ چناں چہ وہ بیٹھے تو اس نے بہت کوشش کی لیکن ذرہ برابر بھی ہلا نہیں سکا۔ پھر اس سے کہا: اچھا! اب تو بیٹھ۔ جب وہ بیٹھا تو انہوں نے ایک انگلی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اوپر اُٹھالیا۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سکّے کو ہاتھ میں لے کر مسلتے تھے تو اس کے اوپر جو چھاپ ہوتی ہے اس کو مٹا دیتے تھے۔

تو حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت قیس بن سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کو سب سے اونچے اونٹ پر سوار کرایا اور ان کے ہاتھ میں ایک نیزہ دیا اور اس کو اونچا رکھنے کو کہا اور اس پسلی کے نیچے سے -جو کمان کی طرح بنا کر کھڑی کی تھی- گزرنے کے لیے کہا، اس طرح اس کے نیچے

سے یہ گزرے تب بھی نیزہ اس پسلی کو نہیں لگا۔(اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ مچھلی کتنی بڑی ہوگی!)

(حضرت جابر بن عبداللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ) اس کے بعد بھی وہ گوشت اتنا بچا کہ ہم اپنے ساتھ باندھ کر واپس لے گئے۔جب ہم مدینہ منورہ پہنچے اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کا تذکرہ کیا تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روزی ہے جو خاص تمہارے لیے بھیجی تھی۔ پھر پوچھا: تمہارے پاس اس کا کچھ گوشت بچا ہوا ہے؟ بتایا گیا کہ ہے۔ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نے وہ گوشت نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لا کر پیش کیا تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس کو تناول فرمایا۔

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کرتہ کی آستین

حدیث ۵۱۹

وعن أسماء بنت يزيد (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: كَانَ كُمُّ قَمِيْصِ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) إِلَى الرُّصْغِ.(رواه ابو داود والترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت اسماء بنت یزید (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کرتے کی آستین ؛ کہنی اور ہتھیلی کے درمیان آدھے ہاتھ تک تھی۔

افادات:-اس سے یہ بتلاناچاہتے ہیں کہ اتناکپڑابھی نہیں تھاکہ آستین گٹوں تک پوری بنائی جاسکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس باب میں سادہ زندگی بسر کرنے، بھوک وفاقہ برداشت کرنے اور کھانے پینے اور لباس میں کم سے کم مقدار پر اکتفاء کرنے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔اور اس بات کی ترغیب دی گئی ہے کہ آدمی اپنی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کو چھوڑے۔اسی سلسلہ میں نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی کے نمونے پیش کئے کہ وہ حضرات کھانے پینے اور لباس میں کتنے کم پر اکتفاء کرتے تھے،اور کیسے فاقوں کو برداشت کرتے تھے۔

دورِ نبوت کا ایک اہم واقعہ

حدیث ۵۲۰

وعن جابر(رضی اللہ عنہ)قَالَ:إِنَّا كُنَّا يَوْمَ الْخَنْدَقِ نَحْفِرُ، فَعَرَضَتْ كُدْيَةٌ شَدِيْدَةٌ ، فَجَاؤُوْا إِلَى النَّبِيِّ(صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالُوا:هٰذِهِ كُدْيَةٌ عَرَضَتْ فِي الْخَنْدَقِ، فَقَالَ :(أَنَا نَازِلٌ) ثُمَّ قَامَ وَبَطْنُهُ مَعْصُوْبٌ بِحَجَرٍ،وَلَبِثْنَا ثَلاَثَةَ أَيَّامٍ لاَ نَذُوْقُ ذَوَاقاً فَأَخَذَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) الْمِعْوَلَ، فَضَرَبَ فَعَادَ كَثِيْباً أَهْيَلَ أَوْ أَهْيَمَ، فَقُلْتُ : يَا رَسُوْلَ اللهِ، ائْذَنْ لِيْ إِلَى الْبَيْتِ ، فَقُلْتُ لِامْرَأَتِيْ : رَأَيْتُ بِالنَّبِيِّ(صلی اللہ علیہ وسلم) شَيْئاًمَا فِيْ ذٰلِكَ صَبْرٌ فَعِنْدَكِ شَيْءٌ ؟ فَقَالَتْ:عِنْدِيْ شَعِيْرٌ وَعَنَاقٌ فَذَبَحْتُ الْعَنَاقَ وَطَحَنْتُ الشَّعِيْرَحَتّٰى جَعَلْنَا اللَّحْمَ فِي الْبُرْمَةِ ، ثُمَّ جِئْتُ النَّبِيَّ(صلی اللہ علیہ وسلم) وَالْعَجِيْنُ قَدِ انْكَسَرَ،وَالْبُرْمَةُ بَيْنَ الْأَثَافِيِّ قَدْ كَادَتْ تَنْضُجُ، فَقُلْتُ : طُعَيِّمٌ لِيْ فَقُمْ أَنْتَ يَا

رَسُوْلَ اللهِ وَرَجُلٌ أَوْ رَجُلَانِ، قَالَ (كَمْ هُوَ) ؟ فَذَكَرْتُ لَهُ، فَقَالَ: (كَثِيْرٌ طَيِّبٌ قُلْ لَهَا لَا تَنْزِعِ الْبُرْمَةَ، وَلَا الْخُبْزَ مِنَ التَّنُّوْرِ حَتّٰى آتِيَ) فَقَالَ: (قُوْمُوْا) فَقَامَ الْمُهَاجِرُوْنَ وَالْأَنْصَارُ، فَدَخَلْتُ عَلَيْهَا فَقُلْتُ: وَيْحَكِ قَدْ جَاءَ النَّبِيُّ (ﷺ) وَالْمُهَاجِرُوْنَ وَالْأَنْصَارُ وَمَنْ مَعَهُمْ! قَالَتْ: هَلْ سَأَلَكَ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: (اُدْخُلُوْا وَلَا تَضَاغَطُوْا) فَجَعَلَ يَكْسِرُ الْخُبْزَ، وَيَجْعَلُ عَلَيْهِ اللَّحْمَ، وَيُخَمِّرُ الْبُرْمَةَ، وَالتَّنُّوْرَ إِذَا أَخَذَ مِنْهُ، وَيُقَرِّبُ إِلَى أَصْحَابِهِ ثُمَّ يَنْزِعُ، فَلَمْ يَزَلْ يَكْسِرُ وَيَغْرِفُ حَتّٰى شَبِعُوْا وَبَقِيَ مِنْهُ، فَقَالَ: (كُلِيْ هٰذَا وَأَهْدِيْ، فَإِنَّ النَّاسَ أَصَابَتْهُمْ مَجَاعَةٌ)

وَفِيْ رِوَايَةٍ قَالَ جَابِرٌ: لَمَّا حُفِرَ الْخَنْدَقُ رَأَيْتُ بِالنَّبِيِّ (ﷺ) خَمَصاً، فَانْكَفَأْتُ إِلَى امْرَأَتِيْ، فَقُلْتُ: هَلْ عِنْدَكِ شَيْءٌ؟ فَإِنِّيْ رَأَيْتُ بِرَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) خَمَصاً شَدِيْداً فَأَخْرَجَتْ إِلَيَّ جِرَاباً فِيْهِ صَاعٌ مِنْ شَعِيْرٍ، وَلَنَا بُهَيْمَةٌ دَاجِنٌ فَذَبَحْتُهَا، وَطَحَنَتِ الشَّعِيْرَ، فَفَرَغَتْ إِلَى فَرَاغِيْ، وَقَطَّعْتُهَا فِيْ بُرْمَتِهَا، ثُمَّ وَلَّيْتُ إِلَى رَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) فَقَالَتْ: لَا تَفْضَحْنِيْ بِرَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) وَمَنْ مَعَهُ، فَجِئْتُهُ فَسَارَرْتُهُ، فَقُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللهِ! ذَبَحْنَا بُهَيْمَةً لَنَا وَ طَحَنْتُ صَاعاً مِنْ شَعِيْرٍ فَتَعَالَ أَنْتَ وَ نَفَرٌ مَعَكَ فَصَاحَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) فَقَالَ يَا أَهْلَ الْخَنْدَقِ: إِنَّ جَابِراً قَدْ صَنَعَ سُوْراً فَحَيَّهَلَا بِكُمْ) فَقَالَ النَّبِيُّ (ﷺ): لَا تُنْزِلُنَّ بُرْمَتَكُمْ وَلَا تَخْبِزُنَّ عَجِيْنَكُمْ حَتّٰى أَجِيْءَ، فَجِئْتُ، وَجَاءَ النَّبِيُّ (ﷺ) يَقْدُمُ النَّاسَ، حَتّٰى جِئْتُ امْرَأَتِيْ فَقَالَتْ: بِكَ وَبِكَ! فَقُلْتُ قَدْ فَعَلْتُ الَّذِيْ قُلْتِ. فَأَخْرَجَتْ عَجِيْناً، فَبَصَقَ فِيْهِ وَبَارَكَ، ثُمَّ عَمَدَ إِلَى بُرْمَتِنَا فَبَصَقَ وَبَارَكَ، ثُمَّ قَالَ: ادْعِيْ خَابِزَةً فَلْتَخْبِزْ مَعَكِ، وَاقْدَحِيْ مِنْ بُرْمَتِكُمْ، وَلَا تُنْزِلُوْهَا) وَهُمْ أَلْفٌ، فَأُقْسِمُ بِاللهِ لَأَكَلُوْا حَتّٰى تَرَكُوْهُ وَانْحَرَفُوْا، وَإِنَّ بُرْمَتَنَا لَتَغِطُّ كَمَا هِيَ، وَإِنَّ عَجِيْنَنَا لَيُخْبَزُ كَمَا هُوَ.

ترجمہ مع تشریح:-حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ خندق کے دن ہم لوگ کھدائی کا کام کر رہے تھے (سردی کا زمانہ تھا، حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) جس ٹولی اور جماعت میں تھے اور اس جماعت کو کھدائی کے لیے جو حصہ حوالہ کیا گیا تھا اس کی) کھدائی کے دوران ایک جگہ پر سخت چٹان نکل آئی

(بہت کوششیں کیں ،بہت کلہاڑیاں اوراوزار استعمال کیے،لیکن سارے ہتھیارجواب دے گئے اور کند ہوگئےلیکن وہ چٹان ٹوٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔جو حضرات یہ کام کررہے تھے انہوں نے آپس میں کہاکہ ہم چاہیں تو سخت چٹان کو چھوڑ کر دوسری طرف سے کھدائی کرسکتے ہیں ،لیکن اس میں یہ ہوگا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جوخط کھینچاہے اس سے ہٹناپڑے گااورہم حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت اور حکم کے بغیروہاں سے ہٹ نہیں سکتے،اس لئے)یہ حضرات نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضرہوئے اور عرض کیا:اے اللہ کے رسول!ایسی صورتِ حال ہے۔حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:میں آتاہوں (اورمیں خود اترکراس پتھر کو توڑوں گا۔یہ بات یاد رہے کہ اس کھدائی میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی بذاتِ خودشریک تھے اور جو مٹی نکلتی تھی وہ اٹھاکر باہر پھینکنے کاکام خود فرماتے تھے۔حضرت براء بن عازب (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ میں نے خود نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شکمِ مبارک پردیکھاکہ مٹی اُٹھاکرپھینکنے کی وجہ سےپوراپیٹ مٹی سے چھپ گیاتھا)آپ اپنی جگہ سے اُٹھے،اس وقت نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شکمِ مبارک پر پتھر بندھا ہواتھا(اوریہ کیوں تھا؟حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ)تین دن گزرچکے تھے لیکن کوئی چیز چکھنے کونہیں ملی تھی (دوسرے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے بھی پیٹ پرپتھرباندھے ہوئے تھے اور حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)کے پیٹ مبارک پر بھی بھوک اورفاقہ کی وجہ سےپتھربندھا ہواتھا آپ اندر اترے) پھاوڑا لیااوراس کے ذریعہ سے اس چٹان کومارا،آپ کے اس ضرب لگانےکیوجہ سے وہ چٹان بالکل ریت کی طرح ہوگئی۔

دوسری روایتوں سے معلوم ہوتاہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)نے تین ضربیں لگائیں ،پہلی ضرب سے ایک تہائی حصہ،اوردوسری ضرب سے دوسراایک تہائی،اورآخری ضرب سے آخری بچا ہوا حصہ ٹوٹا،اورہرضرب پرایک روشنی نمودارہوتی تھی۔حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ)نے وہ

روشنی دیکھی، تو پوچھا: اے اللہ کے رسول! کچھ روشنی نظر آئی تھی۔ آپ (ﷺ) نے پوچھا: اچھا! کیا تم نے بھی وہ روشنی دیکھی؟ کہا: جی ہاں۔ اس پر حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: پہلی ضرب پر جو روشنی نکلی اس میں مَیں نے شام کے قیصر کے سرخ محلات دیکھے، دوسری روشنی میں مدائن کے سفید محلات دیکھے اور پھر تیسری روشنی میں صنعاء کا علاقہ دیکھا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے بتایا گیا کہ یہ سب آپ کے لیے فتح ہوگا، یہ سنکر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے نعرۂ تکبیر بلند کیا۔

(اس وقت کچھ منافقین بھی وہاں موجود تھے۔ اب ایسے موقع پر جبکہ کھانے پینے کے لالے پڑ رہے تھے، دشمن سر پر چڑھائی کے لیے تیار تھا، اور کھدائی کا کام بھی خود ہی کرنا پڑ رہا تھا، ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ اگر ایسی بشارت سنائی جائے کہ اس زمانہ کی دو بڑی طاقتیں جو سپر پاور (Super Power) سمجھی جاتی تھیں وہ فتح ہوں گی تو یہ کیسے عقل میں آنے والی بات ہے؟ منافقین نے وہی کہا جو ایمان ویقین کی دولت سے محروم لوگ باتیں کیا کرتے ہیں۔

اور ایمان کی اتنی بڑی قیمت کیوں ہے؟ جنت کی قیمت ایمان ہی ہے؛ اس لئے کہ ایمان کا مطلب ہی یہ ہے کہ ایسے حالات جو اس بات کی صداقت کی تائید نہیں کر رہے ہیں لیکن اللہ کا نبی وحی کی بنیاد پر ایک بات کہہ رہا ہے جو حالات کے خلاف ہے، اس کے باوجود اس بات کو مان لینا اور یقین کر لینا کہ ایسا ہی ہے۔ بظاہر اس کے بالکل خلاف نظر آ رہا

ہو تب بھی اس کو یقین کے ساتھ بالکل سچا سمجھنا، یہی عین ایمان ہے ورنہ حالات موافق ہوں اور کوئی بات کہی جائے تو عقل بھی اس کی تائید کرتی ہے، اور آدمی ویسے بھی وہ بات مان لیتا ہے۔ تو منافقین نے جب یہ سنا تو وہ ٹھٹھا واستہزاء کرنے لگے کہ دیکھو! کھانے کا تو ٹھکانہ نہیں ہے اور ان کو قیصر وکسریٰ کے محل نظر آرہے ہیں کہ وہ فتح ہوں گے۔ اسی کو سورۂ احزاب میں ذکر کیا گیا ہے: ﴿وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا غُرُورًا﴾ جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ایسی بات کر رہے تھے کہ اللہ اور رسول نے ہم کو جو باتیں کہی ہیں وہ دھوکے کی بات ہے، وہ خالی سبز باغ دکھا رہے ہیں۔)

(خیر! وہ چٹان ٹوٹ گئی، اور کھدائی کا کام مکمل ہوا۔ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شکمِ مبارک پر پتھر بندھا ہوا جب میں نے دیکھا تو مجھ سے نہیں رہا گیا، میں نے اپنے دل ہی دل میں ایک بات سوچی کہ گھر جاکر معلوم کروں اور کھانے کی کوئی چیز ہو تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کروں۔ چوں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس میں جب حاضری دی جاتی تھی تو وہاں سے گھر جانے کے لیے اجازت لینا ضروری تھا، اور پھر یہاں تو جنگ کی تیاریوں کے لیے آئے ہوئے تھے، تو اجازت لینا اور زیادہ ضروری ہوگیا تھا) اس لیے میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے گھر جانے کی اجازت مرحمت فرمائیں، مجھے کام ہے (حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اجازت دے دی۔ وہ اپنے گھر آئے) اور اپنی بیوی سے کہا:

مَیں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وہ چیز دیکھی (یعنی بھوک وفاقہ کا وہ اثر دیکھا) کہ مجھ میں برداشت کی طاقت نہیں رہی، تیرے پاس کھانے کے لیے کچھ ہے (تاکہ ہم حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کرسکیں؟) اس پر ان کی بیوی نے جواب دیا: کچھ جَو پڑے ہوئے ہیں (وہ ایک صاع، یعنی ساڑھے تین سیر تھے) اور بکری کا ایک بچہ ہے (حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ) مَیں نے بکری کا وہ بچہ ذبح کیا اور بیوی نے وہ جَو پیس کر آٹا تیار کیا اور اس کو گوندھا اور میں نے گوشت کے ٹکڑے کرکے ہنڈیا میں ڈالے، اور پھر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں ایسی حالت میں حاضر ہوا کہ آٹے کا خمیر ٹوٹ چکا تھا (مطلب یہ ہے کہ آٹا اس قابل ہوگیا تھا کہ اس کی روٹی بنائی جاسکے) اور ہنڈیا میں گوشت پکنے کے قریب تھا۔ مَیں نے حضور کی خدمت میں آکر (چپکے سے) عرض کیا کہ تھوڑا سا کھانا گھر پر حاضر ہے، اے اللہ کے رسول! آپ اور آپ کے ساتھ ایک دو آدمی تشریف لایئے (وہ کھانا اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سب کے لیے کافی ہوتا، ورنہ ان حضرات کو تو سب کو دعوت دینے میں بھی کوئی تأمل نہیں تھا۔ اس لیے انھوں نے مصلحت کے پیشِ نظر یہ عرض کیا کہ آپ اپنے ساتھ ایک دو آدمیوں کو لے کر گھر تشریف لایئے، تھوڑا سا کھانا موجود ہے، نوش فرمایئے۔ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے پوچھا: جس کو آپ تھوڑا سا کھانا کہتے ہیں وہ کتنا ہے؟ مَیں نے بتلادیا، تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: یہ تو بہت زیادہ اور بہت عمدہ چیز ہے۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت جابر سے ایک بات تاکید کے طور پر ارشاد فرمائی کہ اپنی بیوی سے کہنا کہ ہنڈیا کو چولہے پر سے نہ اُتارے اور تنور میں سے روٹی نہ نکالے جب تک

کہ میں نہ آجاؤں۔یہ فرماکر حضورِاکرم (ﷺ) نے صحابہ کرام سے کہا: چلو (اعلان کرادیا کہ جابرکے یہاں کھانے کی دعوت ہے، سب چلو) وہاں پر جتنے حضراتِ صحابہ موجود تھے (ایک ہزار سے زیادہ لوگ تھے) وہ سب حضوراکرم (ﷺ) کے ساتھ اُٹھے (حضرت جابر تو آگے نکلے اور حضور (ﷺ) پیچھے تشریف لے جارہے ہیں ،یہ جلدی جلدی اپنے گھر پہنچے اور بیوی سے کہنے لگے کہ حضورِاکرم (ﷺ) تو مہاجرین وانصار جتنے بھی وہاں تھے سب کو لے کر آرہے ہیں۔ گویاان پر ایک پریشانی کی سی کیفیت تھی کہ اب کیا ہوگا۔ظاہر ہے کہ یہ کھانا ان سب کے لیے توکافی نہیں ہوسکتا ہے) اس پر ان کی اہلیہ نے ان سے پوچھا (اور یہ اس کی سمجھ داری کی بات ہے) تم سے حضور (ﷺ) نے حالات پوچھے تھے؟ کہا: ہاں (اور مَیں نے بتلادیا تھا اس کے باوجود بھی حضور (ﷺ) نے سب کو بلالیا۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ اس پر ان کی بیوی نے کہا کہ پھر توفکر کی بات نہیں) چناں چہ حضور (ﷺ) تشریف لائے (راوی نے یہاں ذرااختصار سے کام لیاہے،ورنہ دوسری روایتوں میں ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) تشریف لائے اورآپ نے کچھ پڑھنے کے بعد ہنڈیا اور آٹے کے اندر اپنالعابِ دہن ڈالا، اور ان کی اہلیہ سے فرمایاکہ تم ایک اور عورت روٹی پکانے والی بلالو۔پھر آپ نے ہنڈیا کا ڈھکن بھی بند کردیا اور حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے کہاکہ) سب سے کہو کہ ایک ساتھ نہ آئیں (مکان میں اتنی گنجائش بھی نہیں تھی،دس دس آدمی آتے جائیں۔ چناں چہ دس دس کو اندر بلایا جاتا تھا، اور تنور سے روٹیاں نکلتی تھی) تو نبیٔ کریم (ﷺ) خود اپنے دستِ مبارک سے توڑ توڑ کر برتن میں رکھ کر ہنڈیامیں سے اس کے اوپر شوربہ اور گوشت کی بوٹیاں ڈالتے

تھے،اس کے بعد ہنڈیا کو ڈھانپ دیتے تھے اور آٹے پر بھی کپڑا ڈلوا دیتے تھے۔اس طرح صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) باری باری آتے رہے اور کھاتے رہے، یہاں تک کہ سب شکم سیر ہو گئے (حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اس کے بعد بھی کھانا بچ گیا۔بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں ہنڈیا کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ شروع میں جتنا تھا اتنا ہی رہ گیا ہے، کچھ بھی کم نہیں ہوا ہے) پھر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی اہلیہ کو بھی تاکید کی کہ تم بھی کھاؤ اور دوسرے پڑوسیوں کو بھی ہدیہ کے طور پر بھیجو(اس لیے کہ آج کل فاقہ چل رہا ہے، اور دوسرے لوگوں کے پاس بھی کھانے کا انتظام نہیں ہے)

اسی روایت کو دوسری سند سے پیش کیا ہے اس میں کچھ الفاظ کا فرق ہے، جس میں کچھ دوسری چیزیں بیان کی گئی ہیں جو میں آپ کے سامنے ذکر کر چکا ہوں۔

غزوۂ خندق کا پس منظر

افادات:-خندق ایک غزوہ کا نام ہے۔نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں مشرکین اور دشمنانِ اسلام کے ساتھ مختلف لڑائیاں ہوئیں، جن لڑائیوں میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ نفسِ نفیس شریک ہوئے؛ ان کو غزوہ کہتے ہیں۔تو خندق بھی ایک ایسی ہی لڑائی ہے جو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں ۵ھ میں پیش آئی، اور اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ اس سے پہلے مدینہ منورہ کے اندر یہودیوں کا ایک قبیلہ بنو نضیر کے نام سے آباد تھا، اس کی شرارتوں کی

وجہ سے اس کے ساتھ جنگ کی نوبت آئی اور اس قبیلے کے رہنے والے لوگوں کو وہاں سے جلاوطن کیا گیا۔ان کے ساتھ جب جنگ ہوئی اور انہوں نے دیکھا کہ ہم مقابلہ نہیں کرسکتے تو نبیٔ کریم (ﷺ) کے فیصلے پر راضی ہوگئے کہ آپ ہمارے لیے جو سزا تجویز کریں گے ہم اس کے لیے تیار ہیں۔تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے ان سے کہا کہ تم اپنے ساتھ اونٹوں پر اٹھا کر جتنا بھی مال وسامان لے جاسکتے ہو؛ لے جاؤ اور مدینہ چھوڑ دو۔ تمہارے مکانات اور زمینوں پر مسلمان قابض ہوں گے۔چناں چہ اس پر عمل ہوا اور ان کو مدینہ منورہ سے جلاوطن کیا گیا، ان میں کے کچھ لوگ خیبر میں جاکر آباد ہوئے، کچھ لوگ اُردن کے علاقہ میں جاکر آباد ہوئے۔خیبر میں جاکر آباد ہونے والوں میں قبیلہ بنو نضیر کے کچھ سردار قسم کے لوگ بھی تھے،جس میں حیی بن اخطب وغیرہ افراد تھے۔حیی بن اخطب کو اپنی جلاوطنی پر بڑا طیش اور ناراضگی تھی اور وہ کسی نہ کسی طریقہ سے نبیٔ کریم(ﷺ)اور مسلمانوں سے انتقام لینا چاہتا تھا۔چناں چہ وہ یہودیوں کے چالیس آدمیوں کا ایک وفد لے کر مکہ مکرمہ گیا اور مشرکینِ مکہ سے گفتگو کی کہ آپ لوگ مدینہ پر چڑھائی کریں ،ہم آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے۔اور مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف بہت زیادہ بھڑکایا۔ویسے مکہ والے پہلے سے مسلمانوں کے دشمن تو تھے ہی، اور اس سے پہلے بھی وہ مدینہ منورہ پر چڑھائی کرچکے تھے،اور ان کے ساتھ غزوۂ بدر،غزوۂ اُحد وغیرہ کئی جنگیں ہوچکی تھیں،اب ان یہودیوں نے آکر دوبارہ ان کو آمادہ کیا۔ویسے تو انہوں نے مکہ والوں کے دل کی بات ہی کہی تھی لیکن مزید پختگی حاصل کرنے کے لیے مکہ والوں نے ان سے کہا کہ آپ لوگ

اہلِ کتاب ہیں (یہ لوگ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے اور تورات کو ماننے والے تھے) تو اب یہ بتاؤ کہ ہم جس مذہب کو مانتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں؛ وہ اچھا ہے، یا مسلمان جس مذہب کو مانتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں؛ وہ اچھا ہے؟ یہ لوگ ہمارے بتوں کی برائی کرتے ہیں اور ہم کو مشرک بتلاتے ہیں۔ اب یہودی اہلِ کتاب ہونے کے ناتے سے یہ بات تو اچھی طرح جانتے تھے کہ بتوں کی پوجا کرنا بہت ہی برا کام ہے، اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اگرچہ ایمان نہیں لائے تھے لیکن اپنی کتاب تورات میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق جو پیشین گوئیاں تھیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو علامتیں ان کی کتاب میں بتائی گئی تھیں، اس کی بنیاد پر ان کو اس بات کا یقین تھا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری پیغمبر ہیں، اور ان کا ضمیر ان باتوں کو سمجھتا تھا کہ مسلمان جس دین اور مذہب کو مانتے ہیں وہ درست ہے، اور مکہ والوں کا مذہب غلط ہے، اس کے باوجود اپنے ضمیر کے خلاف انہوں نے کہا کہ تمہارا مذہب صحیح ہے، تم حق پر ہو اور وہ باطل پر ہیں۔ پھر مکہ والوں نے اتنی سی بات پر ہی اطمینان کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کہا کہ چلو آؤ! ہم سب کعبہ کا غلاف پکڑ کر آپس میں معاہدہ کریں کہ جب تک مسلمانوں کو ختم نہیں کریں گے، وہاں تک ہم سب مل کر ان کا مقابلہ کریں گے۔ چناں چہ یہودیوں کے چالیس آدمیوں کا جو وفد آیا تھا وہ اور مکہ کے ذمہ دار اور سردار سب مل کر حرم میں گئے اور کعبہ شریف کا پردہ پکڑ کر آپس میں معاہدہ کیا کہ جب تک ہم نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلمانوں کو شکست نہیں دیں گے، ان کو ختم نہیں کریں اور ان کا قلع قمع نہیں

کریں گے ،وہاں تک ان کے ساتھ ہماری برابر لڑائی رہے گی،اوراس کے لیے ایک دوسرے کاپوراپوراساتھ دیں گے۔

یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ حلم ہے کہ اللہ کے دشمن ،اللہ کے گھر کاپردہ پکڑ کر، اللہ کے محبوب رسول کو ختم کرنے کا معاہدہ کررہے ہیں اوراللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے، اوروہ قادر ومختارہے،اس کے باوجودان کو ڈھیل دے رہاہے،اس لئے کہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ اس معاہدہ کا آگے چل کرکیاحال ہونے والاہے،اس وقت سب کوپتہ چلے گا۔

بہرحال!اس طرح بات پکی ہوئی ،اس کے بعد یہ لوگ مکہ مکرمہ کے آس پاس مشرکین کے جوقبائل -غِطفان، سُلَیم اوراسلم غیرہ- آباد تھے، ان کے پاس گئے اوران سے بھی ساتھ دینے کوکہا۔ویسے ان کوتومسلمانوں کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں تھی اس لیے ان کورشوت اورلالچ دی کہ اگرتم لوگ لڑائی میں ہماراساتھ دوگے توخیبرکے اندر جوکھجوریں پیدا ہوتی ہیں ،اس کی ایک سال کی پوری پیداوار ہم تمہیں دیں گے۔ان کو دشمنی سے کوئی لینادینانہیں تھالیکن ان کوکھجوروں کاجولالچ دیا گیا،اس بنیادپر انہوں نے بھی ساتھ دینے کی حامی بھرلی،یہ سب طے ہوگیا،اس کے بعد مکہ مکرمہ سے باقاعدہ ایک بڑا لشکر روانہ ہوا،اوراس میں غِطفان کے قبائل بھی شریک ہوئے،اُدھرسے یہودی بھی آئے، گویا ایک متحدہ محاذ(National Alliance)مسلمانوں کے مقابلہ کے واسطہ وجودمیں آیا۔جب یہ لوگ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تھے تودس ہزارکا مجمع تھا۔نبیٔ کریم (ﷺ) کے چچاحضرت

عباس (رضی اللہ عنہ) ایمان لے آئے تھے، لیکن مکہ مکرمہ ہی میں تھے، انہوں نے ابھی تک ہجرت نہیں کی تھی۔ ویسے انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہجرت کی اجازت طلب کی تھی لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے فرمایا تھا کہ ابھی وہیں رہو، اور تم سب سے آخر میں ہجرت کروگے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ پر نبوت کو ختم کیا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تم پر ہجرت کو ختم کرے گا۔ اس لیے وہ مکہ مکرمہ ہی میں رہتے تھے اور مکہ والے مسلمانوں کے خلاف جو تدبیریں اور سازشیں کرتے تھے ان سب کی خبر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیا کرتے تھے۔ جب یہ لشکر روانہ ہوا تو حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) نے ایک تیز رفتار سوار بھیج کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع دی کہ یہاں سے ان لوگوں کا دس ہزار کا لشکر روانہ ہو چکا ہے۔ خیبر کے یہودیوں نے یہ سب تدبیریں کی ہیں اور وہ بھی ساتھ دینے والے ہیں۔ جب یہ اطلاع مدینہ منورہ پہنچی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کو مشورہ کے لیے جمع کیا کہ دس ہزار کا لشکر ہے، ان کے مقابلہ کے لیے کیا تدبیر اختیار کی جائے۔ اس سے پہلے غزوۂ اُحد کے موقع پر مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اور اِس وقت کے مشورہ میں حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) بھی موجود تھے جو اصل فارس کے رہنے والے تھے۔ ان کے اسلام کا بھی بڑا لمبا چوڑا قصہ ہے جو آپ نے حکایاتِ صحابہ میں تفصیل سے پڑھا اور سنا ہوگا۔ وہ غلام بنا کر لائے گئے اور جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس مشورہ کی مجلس میں وہ بھی تھے۔ اب یہاں سوال یہ تھا کہ دشمن اتنی بڑی تعداد میں چڑھ کر آرہا ہے، اس کا مقابلہ کس طرح کیا جائے؟ تو حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) نے

مشورہ دیا کہ ہمارے یہاں فارس میں دستور یہ ہے کہ ایسے موقع پر شہر کے آس پاس اتنی بڑی خندق کھود دی جاتی ہے کہ دشمن اس کو آسانی سے پار نہ کرسکے، اور وہیں رہ کر اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ دشمن اندر اتر کر بھی اوپر آنے نہ پائے، گویا خندق کو دشمن کے لیے آڑ بنادی جاتی ہے۔ جب انہوں نے یہ مشورہ دیا تو سب نے ان کی رائے کو پسند کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ مکہ مکرمہ کی طرف سے آنے والے راستہ پر جہاں سے لوگ مدینہ منورہ میں داخل ہوتے ہیں، اس پورے حصہ پر ایک گہری خندق کھود دی جائے۔

چناں چہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہ نفسِ نفیس اس پورے حصہ کا خط کھینچا۔ اوپر کے علاقہ سے وادئ بطحان اور راطونہ تک خط کھینچا گیا تھا، جو تقریباً ساڑھے تین میل سے لمبی، اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ فٹ چوڑی اور اتنی گہری کہ تر زمین نظر آگئی جو تقریباً پندرہ فٹ ہوتی ہے؛ ایسی گہری خندق کھودنا طے ہوا۔ اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کی دس دس کی ٹولیاں اور جماعت بنائی، اور ہر ایک جماعت کو کچھ کچھ حصہ کھودنے کا کام سونپ دیا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ پہاڑی علاقہ ہے، وہاں کی کھدائی بھی کوئی آسان کام نہیں تھا اس کے باوجود اتنی لمبی چوڑی اور اتنی گہری خندق حضراتِ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے صرف چھ دن میں مکمل کردی۔ اور وہ فقر و فاقہ کا زمانہ تھا، جب خندق کھودی جارہی تھی اس زمانہ میں بھی مسلمانوں کے پاس کھانے پینے کی سہولتیں نہیں تھیں اس

لئے پیٹ پر پتھر باندھ کر یہ کام کر رہے تھے۔یہ واقعہ جو اوپر روایت میں ذکر ہوا ہے وہ اسی خندق کے کھودنے کے دوران پیش آیا ہے۔

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) اور ہم

بہر حال !اس روایت کو لانے کا مقصد یہی ہے کہ یہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اَجمعین کی زندگی تھی کہ تین تین دن گزر جاتے تھے اور فاقہ رہتا تھا، کھانے کو کچھ میسر نہیں ہوتا تھا،اس کے باوجود کوئی شکایت نہیں تھی،اور اپنی اس حالت پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ہمارے یہاں تو صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اگر ایک آدھ وقت خدانخواستہ کھانا نہ ملے تو معلوم نہیں کیسی کیسی باتیں ہم زبان پر لے آتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی شکایتیں ہونے لگتی ہیں ،کفریہ کلمات آدمی زبان سے نکالنے لگ جاتے ہیں۔درحقیقت یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضراتِ صحابہ کی زندگی سے ہمیں سبق لینا چاہیے کہ ان کے ساتھ یہ معاملہ کوئی ایک آدھ دن کے واسطے نہیں تھا، بلکہ ان کی پوری زندگیاں اسی طرح گزری ہیں ،حالاں کہ دنیوی نعمتوں کے بھی وہ ہم سے زیادہ حقدار تھے،لیکن انہوں نے اسی حالت کو اپنے لیے پسند کیا۔پہلے بھی آچکا کہ تین تین چاند اس حالت میں طلوع ہوتے تھے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا،لیکن کسی کے متعلق کسی جگہ آپ کو یہ بات نہیں ملے گی کہ شکایت کا کوئی کلمہ ان کی زبان سے نکلا ہو۔بلکہ اس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری بجالاتے تھے۔اور ہم تو یوں

سمجھتے ہیں کہ فقرو فاقہ نعوذباللہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کی وجہ سے آتا ہے، اور زیادہ پیسے ملیں اوراچھی حالت ہوتووہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی علامت ہے۔یہ سب علامتیں ہم نے اپنے طورپر مقرر کررکھی ہیں،جوبالکل درست نہیں،بلکہ احادیث سے تو یہ معلوم ہوتاہے کہ اللہ تعالیٰ دنیااسے بھی دیتے ہیں جس سے ناراض ہوں اوراس کو بھی دیتے ہیں جس سے راضی ہوں۔مؤمن کوبھی دیتے ہیں،کافرکوبھی دیتے ہیں۔بلکہ قرآنِ کریم میں سورۂ زخرف میں ہے جس سے تویہ معلوم ہوتاہے کہ کمزورقسم کے مؤمنوں کے ایمان سے بچل جانے کااندیشہ نہ ہوتاتو کافروں کو اللہ تعالیٰ اتنادیتے کہ ان کے گھروں کی چھتیں، سیڑھیاں،دروازے اوران کی مسہریاں اورپلنگ بھی سونے چاندی کے ہوتے،لیکن اگر ایسا ہوتا توبہت سے کمزور مسلمان یوں سمجھتے کہ چلو بھائی!پاٹلی(جماعت)بدل دو،وہیں اچھا ہے۔یعنی ہمارے ایمان کی حفاظت کالحاظ کرتے ہوئے ان کافروں کواتناکم دیاگیاہے، ورنہ اللہ تعالیٰ ان کو اورزیادہ دیتے۔

برکت کاایک قصہ

حدیث ۵۲۱

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ:قَالَ أَبُوطَلْحَةَ لِأُمِّ سُلَيْمٍ:قَدْسَمِعْتُ صَوْتَ رَسُوْلَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) ضَعِيْفاً أَعْرِفُ فِيْهِ الْجُوْعَ .فَهَلْ عِنْدَكِ مِنْ شَيْءٍ .فَقَالَتْ : نَعَمْ. فَأَخْرَجَتْ أَقْرَاصاً مِنْ شَعِيْرٍ .ثُمَّ أَخَذَتْ خِمَاراً لَهَا. فَلَفَّتِ الْخُبْزَ بِبَعْضِهِ . ثُمَّ دَسَّتْهُ تَحْتَ ثَوْبِيْ وَرَدَّتْنِيْ بِبَعْضِهِ ثُمَّ أَرْسَلَتْنِيْ إِلٰى رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) . فَذَهَبْتُ بِهٖ

فَوَجَدْتُ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) جَالِساً فِيْ الْمَسْجِدِ، وَمَعَهُ النَّاسُ. فَقُمْتُ عَلَيْهِمْ، فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ): أَرْسَلَكَ أَبُوْطَلْحَةَ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ فَقَالَ: أَلِطَعامٍ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ): قُوْمُوْا. فَانْطَلَقُوْا وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ حَتّٰى جِئْتُ أَبَاطَلْحَةَ فأَخْبَرْتُهُ. فقَالَ أَبُوْطَلْحَةَ: يَاأُمَّ سُلَيْمٍ! قَدْجَاءَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) بِالنَّاسِ وَلَيْسَ عِنْدَنَا مَا نُطْعِمُهُمْ؟ فَقَالَتْ: أللهُ وَرَسُوْلُهُ أَعْلَمُ. فَانْطَلَقَ أَبُو طَلْحَةَ حَتّٰى لَقِيَ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) فَأَقْبَلَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) مَعَهُ حَتّٰى دَخَلاَ. فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ): هَلُمِّيْ مَاعِنْدَكِ يَا أُمَّ سُلَيْمٍ. فَأَتَتْ بِذٰلِكَ الْخُبْزِ. فَأَمَرَ بِهِ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) فَفُتَّ، وَعَصَرَتْ أُمُّ سُلَيْمٍ عُكَّةً فَأَدَمَتْهُ، ثُمَّ قَالَ فِيْهِ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) مَا شَاءَ اللهُ أَنْ يَقُوْلَ، ثُمَّ قَالَ: (ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ) فَأَذِنَ لَهُمْ فَأَكَلُوْا حَتّٰى شَبِعُوْا ثُمَّ خَرَجُوْا، ثُمَّ قَالَ: (ائْذَنْ لِعَشَرَةٍ) فأَذِنَ لَهُمْ حَتّٰى أَكَلَ الْقَوْمُ كُلُّهُمْ وَشَبِعُوْا وَالْقَوْمُ سَبْعُوْنَ رَجُلاً أَوْثَمَانُوْنَ.

وفی روایۃ: فَمَا زَالَ يَدْخُلُ عَشَرَةٌ، وَيَخْرُجُ عَشَرَةٌ حَتّٰى لَمْ يَبْقَ مِنْهُمْ أَحَدٌ إِلاَّ دَخَلَ، فَأَكَلَ حَتّٰى شَبِعَ، ثُمَّ هَيَّأَهَا فَإِذَا هِيَ مِثْلُهَا حِيْنَ أَكَلُوْا مِنْهَا.

وفی روایۃ: فَأَكَلُوْا عَشَرَةً عَشَرَةً، حَتّٰى فَعَلَ ذٰلِكَ بِثَمَانِيْنَ رَجُلاً، ثُمَّ أَكَلَ النَّبِيُّ (ﷺ) بَعْدَ ذٰلِكَ وَأَهْلُ الْبَيْتِ، وَتَرَكُوْا سُؤْراً۔

وفی روایۃ: ثُمَّ أَفْضَلُوْا مَا بَلَغُوْا جِيْرَانَهُمْ۔

وفی روایۃ عن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: جِئْتُ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) يَوماً، فَوَجَدْتُهُ جَالِساً مَعَ أَصْحَابِهِ، وَقَدْ عَصَبَ بَطْنَهُ بِعِصَابَةٍ، فَقُلْتُ لِبَعْضِ أَصْحَابِهِ: لِمَ عَصَبَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) بَطْنَهُ؟ فَقَالُوا: مِنَ الْجُوعِ، فَذَهَبْتُ إِلٰى أَبِي طَلْحَةَ، وَهُوَزَوْجُ أُمِّ سُلَيْمٍ بِنْتِ مِلْحَانَ۔ فَقُلْتُ: يَاأَبَتَاهُ! قَدْرَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) عَصَبَ بَطْنَهُ بِعِصَابَةٍ، فَسَأَلْتُ بَعْضَ أَصْحَابِهِ، فَقَالُوا: مِنَ الْجُوْعِ۔ فَدَخَلَ أَبُو طَلْحَةَ عَلٰى أُمِّي، فَقَالَ: هَلْ مِنْ شَيْءٍ؟ قَالَتْ:

نَعَمْ، عِنْدِیْ کِسَرٌ مِنْ خُبْزٍ وَتَمَرَاتٌ، فَإِنْ جَاءَنَا رَسُوْلُ اللهِ (صلى الله عليه وسلم) وحْدَهُ أَشْبَعْنَاهُ، وَإِنْ جَآءَ آخَرُ مَعَهُ قَلَّ عَنْهُمْ...وَذَكَرَ تَمَامَ الْحَدِيْثِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) نے حضرت اُمِ سلیم (رضی اللہ عنہا) سے کہا (یہ حضرت ام سلیم (رضی اللہ عنہا)؛ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی والدہ ہیں، حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے باپ کا نام مالک تھا، ان کے انتقال کے بعد اُن کی والدہ حضرت اُمِ سلیم (رضی اللہ عنہا) نے حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ نکاح کیا تھا۔ حضرت ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے سوتیلے والد ہیں) کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آواز بہت کمزور پائی ہے، میرا خیال یہ ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فاقہ ہے، جس کا اثر آپ کی آواز میں محسوس ہوا، اس لیے کیا تمہارے پاس کوئی چیز ہے جسے ہم نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ اس کے بعد انہوں نے جَو کی چندروٹیاں گھر کے کونہ میں سے نکالیں اور اپنی اوڑھنی اپنے ہاتھوں میں لی اوراس اوڑھنی کے ایک کنارہ سے وہ روٹیاں لپیٹ کر میری بغل میں دبادیں، اور اوڑھنی کا بچا ہوا باقی حصہ میرے جسم پر ڈال دیا، تاکہ وہ چھپ جائے، اور مجھے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بھیجا کہ جاؤ! حضور کی خدمت میں پیش کرو (حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں) میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پہنچا تو دیکھا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مسجدِ نبوی میں تشریف فرما ہیں، آپ کے ساتھ اور حضرات بھی ہیں۔ میں وہاں جاکر کھڑا ہوگیا (نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سمجھ گئے کہ ان کو حضرت ابوطلحہ (رضی اللہ عنہ) نے بھیجا ہے، چوں کہ تھوڑی دیر پہلے ہی حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) وہاں سے اُٹھ کر گئے تھے۔ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: کیاابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) نے تم کو بھیجا ہے؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ اب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ سمجھے کہ کھانے کے واسطے بلانے کے لیے بھیجا ہے، تو پوچھا: کھانا کھانے کے واسطے بلانے کے لئے؟ تو کہا: جی ہاں۔ یہاں ان کے ہاتھوں

ام سلیم(رضی اللہ عنہا) نے روٹیاں بھیجی ہی تھیں۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے گھر آکر دیکھا کہ روٹیاں تھوڑی ہیں اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رفقاء کے ساتھ دعوت نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے انہوں نے مناسب سمجھا کہ آپ کی خدمت میں بھیج دیں تاکہ آپ اپنے طور پر اس کو تناول فرمائیں اور اپنی ضرورت پوری کرلیں، لیکن روٹیاں لے کر جب حضرت انس(رضی اللہ عنہ) پہنچے تو نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) مسجد ہی میں تشریف فرماتھے، گھر پر تشریف نہیں لے گئے تھے۔ دوسری روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس(رضی اللہ عنہ) کو اختیار دیا تھا کہ اگر مناسب معلوم ہو تو حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کو گھر پر بُلوالیں۔ لیکن جب یہاں آکر دیکھا کہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) تو مجمع میں موجود ہیں، تو اب یہ کشمکش میں پڑگئے کہ لوگوں کے درمیان یہ روٹیاں جو میرے ساتھ بھیجی گئی ہیں ، میں آپ کی خدمت میں پیش کروں یانہ کروں، اس لیے کہ یہ بہت کم مقدار تھی ،اور نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ لوگوں کے موجودگی میں اگر اس قسم کی کوئی چیز آپ کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر آتی تھی ،تو آپ تنہا تناول نہیں فرماتے تھے ،بلکہ لوگوں کو بھی شریک کرلیتے تھے۔ اس لیے جب انہوں نے یہ منظر دیکھا تووہ چکرا گئے اور کشمکش میں پڑگئے، اور وہیں کھڑے ہوگئے۔ ان کو کھڑا ہوا دیکھ کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ سمجھے کہ ابوطلحہ(رضی اللہ عنہ) نے بلانے کے لیے ان کو بھیجاہے،اس لیے پوچھا کہ تمہیں ابوطلحہ(رضی اللہ عنہ) نے بھیجا ہے؟ توانہوں نے کہا: جی ہاں۔ کھانا کھانے کے واسطے بلانے کے لئے؟ تو کہا: جی ہاں۔ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے پاس بیٹھے ہوئے حضرات سے کہا: چلو۔ جو خطرہ تھاوہی بات پیش آئی کہ سب کے لیے کافی ہوجائے اتنا تووہاں تھانہیں۔ چناں چہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تمام صحابہ بھی اُٹھے جو وہاں موجود تھے۔ حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں جلدی جلدی گھر پہنچ گیا اور جاکر حضرت ابوطلحہ(رضی اللہ عنہ) کو اطلاع دی کہ نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) تواپنے تمام رفقاء کے ساتھ تشریف لارہے ہیں۔ دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوطلحہ(رضی اللہ عنہ) بھی یہ سن کر ذرا گھبرائے کہ گھر میں توکوئی چیز

ہے نہیں ،اورنبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لارہے ہیں۔ اپنی اہلیہ حضرت اُم سلیم(رضی اللہ عنہا) سے جو حضرت انس(رضی اللہ عنہ) کی والدہ تھیں کہا: نبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ(رضی اللہ عنہم) کے ساتھ تشریف لارہے ہیں اور ہمارے پاس ان کو کھلانے کے لئے کوئی چیز نہیں ہے۔ یہ سن کر حضرت ام سلیم(رضی اللہ عنہا) نے کہا: اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتےہیں۔انہوں نے معلوم کرلیا تھا کہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کو بتلادیا گیا ہے،اس لیے بڑے اطمینان سے کہا: حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ یہ بھی ان کی سمجھ داری کی بات ہے۔ چناں چہ یہ سب بات توگھر میں ہوئی۔اس کے بعد ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) گھر سے باہر تشریف لائے۔کیوں کہ معلوم ہوچکا تھا کہ نبیؑ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لارہے ہیں،تو گھر میں بیٹھے نہیں رہے، بلکہ باہر آکرنبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کااستقبال کیا۔ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے ساتھ تشریف لائے یہاں تک کہ یہ دونوں حضرات مکان میں داخل ہوئے۔گھر میں داخل ہونے کے بعد نبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ام سلیم (رضی اللہ عنہا) سے کہا: تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ لاؤ،مجھے دو۔ حضرت انس(رضی اللہ عنہ) پہلے ہی روٹیاں لے کر پہنچ چکے تھےانہوں نے وہ روٹیاں نبیؑ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کیں،تو نبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ ان روٹیوں کو توڑو۔ پھر کہا: گھرمیں اور کوئی چیزہے؟ بتایا گیا: گھی کاصرف ایک پیالہ ہے اوروہ بھی ختم ہورہا ہے،اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:وہ بھی لاؤ۔

دوسری روایت میں ہے کہ نبیؑ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابوطلحہ(رضی اللہ عنہ) دونوں نے مل کر بڑی قوت سے اس کو دباکرنچوڑا،تو اندر سے گھی کے کچھ قطرے ٹپکے۔گویا یہی سالن ہوگیا۔پھر نبیؑ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ پڑھااور اس کے اندر دم فرمایااور حضرت انس(رضی اللہ عنہ) سے کہا: اُٹھو، اور دس آدمیوں کو بلاؤ۔ چناں چہ دس آدمی اندر گھر میں داخل ہوئے۔انھوں نے اسی روٹی کو جس کاچورا کیا گیا تھااور گھی کے چند قطرے اوپر سے ٹپکائے گئے تھے اس کو کھایا، یہاں

تک کہ شکم سیر ہوگئے۔وہ لوگ باہر گئے تو پھر کہا اور دس کو بلواؤ۔چناں چہ اور دس کو بلایا گیا۔انھوں نے بھی کھایا،وہ بھی شکم سیر ہوئے،اور باہر نکلے۔پھر کہا اور دس کو بلالو۔ ان کو اجازت ملی تووہ آئے،اس طرح سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔وہ تمام ستّر (۷۰) یا اَسّی(۸۰) آدمی تھے۔

اس روایت کے دوسرے الفاظ کو بھی ذکر کیاہے۔اس میں یہ بھی ہے حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبیٔ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضرہوا۔دیکھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیٹ پر پٹی بندھی ہے۔اب یہ تو بچے تھے ان کو کبھی خیال نہیں گذرا کہ ایسا کیوں کیاجاتا ہے۔انہوں نے لوگوں سے پوچھا: کیا بات ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے شکم مبارک کے اوپر پٹی باندھی ہے؟ لوگوں نے کہا: بھوک کی وجہ سے۔توحضرت انس(رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں:میں نے جاکراپنے سوتیلے والد حضرت ابو طلحہ(رضی اللہ عنہ) کواس کی اطلاع دی کہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پیٹ مبارک پرتو بھوک کی وجہ سے پٹی بندھی ہے، میں نے لوگوں سے پوچھاکہ ایسی پٹی کیوں بندھی ہےتولوگوں نے یہ بتلایا۔چناں چہ حضرت ابوطلحہ(رضی اللہ عنہ) تشریف لائے اور پھر یہی قصہ پیش آیاجو اوپر تفصیل سے گزرا۔

افادات:-خلاصہ یہ ہے کہ اصل زندگی تویہی ہے لیکن ہم اللہ تعالیٰ سے اس طرح کی آزمائش نہ مانگیں ،بلکہ دعایہی مانگیں کہ ہمیں اچھی حالت میں رکھے ، ہماری کمزوری کی وجہ سے ایسی نوبت نہ آئے، اوربغیر آزمائش ہی کے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کامعاملہ

فرمائے۔باقی ایسی زندگی کا پسندیدہ اور مطلوب ہونااوراس کی فضیلت اوراس کی وجہ سے مراتب کابلند ہونا؛اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے۔یہی اچھی چیز تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے اور حضرات انبیاء کے بعد افضل ترین جماعت-صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم)-کے لیے پسند کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق وسعادت عطافرمائے

دعا

اے اللہ! ہمارے گناہوں کو معاف فرما، خطاؤں سے درگزر فرما۔ اے اللہ! تیرے حبیبِ پاک (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) اور حضراتِ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگیوں اور ان کے طریقۂ زندگی سے سبق لینے کی اور اسی کو محبوب اور پسندیدہ بنانے کی تو ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اپنا فضل فرما۔ اے اللہ! ہماری کمزوریوں سے درگزر فرما۔ نبیٔ کریم (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنانے اور اختیار کرنے کی تو ہمیں توفیق عطا فرما۔

القناعة والعفاف والاقتصاد فی المعیشة

مجلس ۱

قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا اور معیشت میں میانہ روی

مجلس ۱

یکم ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۳/ جون ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡكَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِكۡ وَسَلِّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

ترجمۃ الباب کا خلاصہ

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نیا باب قائم کیا ہے جس کا عنوان ہے: قناعت اختیار کرنا اور سوال سے بچنا، زندگی گزارنے اور خرچ کرنے کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنا اور بلا ضرورت سوال کرنے کی برائی۔

پہلی بات "قناعت" ہے۔ قناعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کو جو کچھ ملے اس پر راضی اور خوش رہے، جس کو گجراتی میں (આત્મ સંતોષ) کہتے ہیں، گجراتی کی کہاوت ہے: "સંતોષી નર સદા સુખી" جو آدمی قناعت والا ہوتا ہے وہ ہمیشہ خوش اور عیش و آرام میں رہتا ہے۔

دوسری بات ”عَفاف“ ہے۔اس کا مطلب ہے اپنے آپ کو سوال سے بچانا، کسی کے سامنے سوال نہ کرنا۔ ویسے عفت روکنے کے معنٰی میں بھی آتا ہے کہ نفس کو ہر ایسی چیز سے روکنا جو اس کے لئے تکلیف کا ذریعہ ہو،اس کے لئے لفظ عَفاف استعمال ہوتا ہے۔اور عام طور پر یہ لفظ دو چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے: ایک توسوال سے بچنے کے لئے،اور دوسرا اپنی شرمگاہ کو زنا وغیرہ گناہ سے بچانے کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے،جس کو عفت و پاک دامنی کہتے ہیں۔ لیکن عربی زبان میں عفاف ایک الگ ہی مفہوم رکھتاہے۔اگرچہ یہاں یہی مراد لیاگیاہے کہ آدمی اپنے آپ کو لوگوں سے سوال کرنے سے بچائے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ زندگی گذارنے اور خرچ کرنے کے معاملہ میں آدمی میانہ روی اختیار کرے،نہ تو بہت زیادہ خرچ کرے اور نہ بخل سے کام لے،بلکہ درمیانی راہ اختیار کرے۔

نہ اسراف کی اجازت، اورنہ بخل کی

اسلام نے ہر معاملہ میں میانہ روی کو پسند کیا ہے اور نبی کریم (ﷺ) نے اس کی ترغیب دی ہے﴿وَالَّذِیۡنَ اِذَاۤ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَکَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا﴾ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندے اور عبادالرحمٰن کی جو علامتیں اور نشانیاں بتلائی گئی ہیں،ان میں ایک نشانی یہ بھی ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی بھی نہیں کرتے کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرتے ہوں، اور

اس میں کمی اور بخل سے بھی کام نہیں لیتے، بلکہ ضرورت کے بقدر خرچ کرتے ہیں، اور درمیانی راہ اختیار کرتے ہیں۔

"اسراف" کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے، جہاں خرچ نہیں کرنا چاہیے وہاں خرچ کرنا، اور دوسرے جہاں خرچ کرنا چاہیے وہاں بھی جتنا خرچ کرنا چاہیے اس سے زیادہ خرچ کرنا؛ ان دونوں کے لئے اسراف بولا جاتا ہے۔ بعضوں نے اسراف اور بسط میں فرق کیا ہے۔ قرآنِ پاک میں ایک اور جگہ بھی باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے) ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾ اپنا ہاتھ بندھا ہوا بھی مت رکھو، اور بالکل کھلا بھی نہ چھوڑو۔ خرچ کرنے کے معاملہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی ایسا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی خرچ ہی نہ کرے، مٹھی بند رکھے۔ اور یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک دم کھول دے، بلکہ میانہ روی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے ، ورنہ ایسا ہوگا کہ اگر زیادہ خرچ کروگے تو جیب خالی ہو جائے گا اور بالکل غمگین ہو کر سر جھکا کر بیٹھ جاؤ گے۔

پھر آدمی بے صبری سے کیوں کام لے؟

اسی سلسلہ میں قرآنِ پاک کی ایک آیت ذکر کی ہے ﴿وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ﴾ روئے زمین پر جتنے بھی جاندار ہیں، اللہ تعالیٰ کے اوپر ان کی روزی ہے ، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کی روزی کا ذمہ لے

رکھا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے روزی کا ذمہ لے رکھا ہے تو پھر آدمی کیوں بے صبری سے کام لے۔ بس! اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر روزی دے گا، ہماری روزی وقت پر ضرورت کے بقدر مل ہی جائے گی، وہ کہیں جانے والی نہیں ہے﴿وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا﴾ آدمی کا جو مستقل جائے قیام اور ٹھکانہ "permenant Address" ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تھوڑی دیر کے لئے آدمی کہیں جاتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ دنیا کا دستور تو یہ ہے اگر کسی کا کہیں وظیفہ مقرر ہو تو وہ اس کی مقررہ جگہ "permenant Address" پر پہنچتا ہے۔ اگر اس کو کہیں سفر درپیش ہو تو اس کو پہلے سے درخواست دینی پڑتی ہے، اور محکمہ میں اطلاع کرنی پڑتی ہے کہ اتنے دنوں کے واسطے میں فلاں جگہ جارہا ہوں، میرا وظیفہ مجھے وہاں پر بھیج دیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حضور میں کوئی درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں دہلی جانے والا ہوں، میری روزی وہاں بھیج دی جائے، بلکہ اللہ تعالیٰ سب جانتے ہیں، آپ مستقل طور پر جہاں قیام فرما ہیں وہ بھی، اور جہاں تھوڑی دیر کے لئے جانے والے ہیں اس سے بھی اللہ تعالیٰ خوب واقف ہے۔

سوال کرنے کا ایک قدرتی اثر

﴿لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا(البقرۃ:۲۷۳)﴾ صدقات کن لوگوں کو دینے چاہئیں؟ اس سلسلہ میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: یہ ان فقیروں کا حصہ ہے جو اللہ کے راستہ میں روک دیئے

گئے۔ گویا جو لوگ اللہ تعالیٰ ہی کے کاموں کے لئے اپنی ذات کو روکے ہوئے ہیں، ان کاموں کی مصروفیت کی وجہ سے، جہاد کی مصروفیت کی وجہ سے ،اور دوسرے دینی امور کی مصروفیت کی وجہ سے روزی حاصل کرنے کے لئے زمین میں سفر نہیں کر پاتے، اور جو آدمی ان کی حالت سے ناواقف ہے وہ بھی ان کی ظاہری حالت دیکھ کر ان کو مال دار سمجھتا ہے کہ وہ لوگوں سے سوال نہیں کرتے۔ اور چاہے اپنی زبان سے سوال نہیں کرتے اور جزع فزع اور بے صبری کے ذریعہ اپنی حالت کا لوگوں کے سامنے اظہار بھی نہیں کرتے لیکن ان کے چہرے کی علامتوں سے آپ ان کو پہچان لیں گے ﴿لَا یَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً﴾ یہ ایسے لوگ ہیں جو لوگوں سے اصرار کر کے مانگتے نہیں ہیں۔

اس آیت کا یہی جملہ ﴿لَا یَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافاً﴾ خاص طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خاص شان یہ بتلائی کہ باوجود ضرورت مند ہونے کے وہ سوال نہیں کرتے۔ آگے روایتیں آئیں گی کہ اپنی ضرورت ہو تب بھی آدمی کو اپنے آپ کو سوال سے بچانا چاہیے۔ بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ سوال ہی ہماری ضرورتوں کا حل ہے، حالاں کہ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ سوال کے نتیجہ میں آپ کی ضرورت ختم نہیں ہوگی، بلکہ اور بڑھ جائے گی۔ سوال کرنے کا یہ قدرتی اثر ہے۔

مقصدِ زندگی

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ. مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَّمَا أُرِيدُ أَن يُّطْعِمُونِ﴾ میں نے جنات اور انسانوں کو اپنی عبادت اور فرمانبر داری کے لئے پیدا کیا ہے ،اس لیے آپ تواللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اپنا کام کیجئے۔باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں ان سے روزی نہیں مانگتا۔میں یہ نہیں چاہتا کہ وہ مجھے کھلائیں؛بلکہ ان کو روزی تومیں دیتا ہوں۔ دنیاکا دستور تو یہ ہے کہ آقا لوگ غلاموں کو کام کاج میں لگا کر ان کی آمدنی سے اپنی روزی کے طور پرکچھ حاصل کرتے ہیں، باری تعالیٰ نے ایسا نہیں کیاکہ بندوں کو روزی کموانے کے لئے پیدا کیا ہو۔

حقیقی مالداری؛ دل کی صفت

حدیث ۵۲۲:-

عن أَبِي هُرَيْرَةَ(رضی اللہ عنہ)عَنِ النَّبِيِ((صلی اللہ علیہ وسلم))قَالَ:لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ،وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ۔ (متفق عليه)

(العَرَضُ)بفتح العين والرَّاء:هُوَ الْمَالُ۔

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مالداری مال وسامان کی کثرت اور زیادتی کا نام نہیں ہے، بلکہ حقیقی مالداری دل کی بے نیازی ہے۔

افادات:-غنٰی اور مالداری سامان کی زیادتی کا نام نہیں، بلکہ دل کی بے نیازی ہے، آدمی کے دل میں ایک قسم کاسکون واطمینان ہو، بے نیازی کی کیفیت ہو، اور لوگوں سے سوال نہ کرے۔باقی بہت سے لوگوں کے پاس بہت سا روپیہ ہوتا ہے، اس کے باوجود ان کے دل میں حرص و طمع بھری ہوئی ہوتی ہے ،اتنا سازو سامان اور روپیہ ہونے کے باوجود ان کو صبر اور قرار نہیں ہوتا۔

وہ آدمی کامیاب ہوگیا

حدیث ۵۲۳:-

وعن عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ، وَرُزِقَ كَفَافاً، وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشادفرمایا : کامیاب ہوگیا وہ آدمی جو اسلام لایا(اس لئے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے) اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بقدرِ ضرورت روزی دی گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو جو دیا پھر اس پر قناعت بھی عطا فرمائی۔

افادات:-یعنی اس کے دل میں کوئی حرص اور لالچ نہیں ہے،بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ملا ،اسی پروہ راضی اورخوش ہے،اور اسی سے وہ اپنی ضرورت پوری کررہا ہے، زیادہ کی طلب میں لگا ہوا نہیں ہے۔

بغیرسوال ملنے پربرکت کاوعدہ

حدیث ۵۲۴:-

عن حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سألتُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) فَأَعْطَانِي ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَأَعْطَانِي، ثُمَّ سَأَلْتُهُ فَأَعْطَانِي، ثُمَّ قَالَ: يَا حَكِيم ، إنَّ هَذَا المَالَ خَضِرٌ حُلوٌ فَمَنْ أخذَهُ بِسَخَاوَةِ نَفسٍ بُورِكَ لَهُ فِيهِ ، وَمَنْ أخذَهُ بإشرافِ نَفسٍ لَمْ يُبَارَكْ لَهُ فِيهِ ، وَكَانَ كَالَّذِى يَأْكُلُ وَلاَ يَشْبَعُ ، واليَدُ العُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اليَدِ السُّفْلَى. قَالَ حكيم : فقلتُ: يَارسول الله ! وَالَّذِى بَعَثَكَ بِالحَقِّ لاَ أَرْزَأُ أحداً بَعْدَكَ شَيْئاً حَتَّى أُفَارِقَ الدُّنْيَا ، فَكَانَ أَبُو بَكْرٍ (رضی اللہ عنہ) يَدْعُو حَكيماً لِيُعْطِيَه العَطَاء ، فَيَأبَى أنْ يَقبَلَ مِنْهُ شَيْئاً ، ثُمَّ إنَّ عُمَرَ (رضی اللہ عنہ) دَعَاهُ لِيُعطِيَه فَأَبَى أنْ يَقبَلَهُ . فقال : يَا مَعْشَرَ المُسْلِمِينَ ! أُشْهِدُكُمْ عَلَى حَكيمٍ أنّي أعْرِضُ عَلَيْهِ حَقَّهُ الَّذِى قَسَمَهُ اللهُ لَهُ فى هَذَا الفَيء فَيَأبَى أنْ يَأخُذَهُ. فَلَمْ يَرْزَأْ حَكيمٌ أحداً مِنَ النَّاسِ بَعْدَ النبى (صلی اللہ علیہ وسلم) حَتَّى تُوُفِّي. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

((يَرْزَأْ)) براءٍ ثُمَّ زايٍ ثُمَّ همزة؛ أيْ : لَمْ يَأخُذْ مِنْ أحَدٍ شَيْئاً ، وَأصْلُ الرُّزءِ النُّقْصَان، أيْ : لَمْ يَنقُص أحَداً شَيْئاً بالأخذِ مِنْهُ . وَ((إشْرَافُ النَّفسِ)) : تَطَلُّعُهَا وَطَمَعُهَا بالشَّيء . وَ((سَخَاوَةُ النَّفْسِ)) : هِيَ عَدَمُ الإشْرَاف إِلَى الشَيء ، وَالطَّمَع فِيهِ، وَالمُبَالاَةِ بِهِ وَالشَّرَهِ.

ترجمہ:- حضرت حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مال کا مطالبہ کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے عطا فرمایا۔ میں نے پھر مانگا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر عطا کیا میں نے پھر سوال کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر عطا فرمایا۔ اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے حکیم! یہ مال بڑا سرسبز و شیرین اور میٹھا ہے (دیکھنے میں بھی آدمی کو بہت اچھا لگتا ہے، اور برتنے اور خرچ کرنے میں بھی۔ یعنی اس کو جب استعمال کیا جاتا ہے تب بھی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے) جو آدمی اس کو سخاوتِ نفس (یعنی نفس کے استغناء) کے ساتھ حاصل کرے گا، اس کے لئے اس میں برکت دی جائے گی۔ اور جو آدمی اس کو اشرافِ نفس (یعنی نفس کی حرص و طمع) کے ساتھ لے گا تو اس کے لئے اس میں برکت نہیں ہے۔ اوراس کا حال ایسا ہوتا ہے کہ وہ کھانا کھاتا رہتا ہے اور پیٹ نہیں بھرتا۔ اور اوپر والا ہاتھ، نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ حضرت حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ (نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مال کے سلسلہ میں میری درخواست پوری کرنے کے بعد جب مجھے یہ نصیحت فرمائی تو اس نصیحت کو سن کر) میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے، مَیں آج کے بعد کسی کے مال میں کمی نہیں کروں گا (کسی سے مال کا مطالبہ کرکے اس کو زحمت میں نہیں ڈالوں گا) یہاں تک کہ دنیا سے جدا ہو جاؤں (یعنی مجھے موت آجائے) پھر حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) اپنے دورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) کو بلوا بھیجتے، تاکہ ان کو ان کا حصہ دیں لیکن وہ اس میں سے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیتے تھے۔ پھر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) کو مقررہ وظیفہ لینے کے لئے بلایا، لیکن انہوں نے انکار کیا، تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے وہاں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: اے مسلمانوں کی جماعت! میں تم کو اس بات پر گواہ بناتا ہوں کہ میں نے حکیم بن حزام کو ان کا بیت المال میں مقررہ حصہ پیش کیا، لیکن انہوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ حضرت حکیم بن

حزام (رضی اللہ عنہ) نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کسی کو بھی تکلیف نہیں دی، کسی سے بھی مال کا مطالبہ نہیں کیا اور کوئی چیز نہیں لی، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوا

افادات:- سخاوت کا مطلب ہے کہ دل میں لالچ اور حرص نہ ہو۔ اور ''اشراف'' عربی زبان میں کہتے ہیں کہ اونچائی پر سے کسی چیز کو دیکھنا اور جھانکنا۔ گویا نفس کسی چیز کے متعلق اپنے اندر طلب رکھتا ہو، اسی کو نفس کی تاک جھانک کہتے ہیں، مثلاً کوئی آدمی یوں سوچے کہ مجھے فلاں آدمی یہ چیز دیدے، مجھے ہدیہ دے، مجھے فلاں کی طرف سے یہ چیز مل جائے۔ آدمی کے دل میں ایسی طلب ہو، چاہے اس کو سامنے والا کچھ نہ دے۔ ایک تو ہوتا ہے زبان سے مانگنا اور سوال کرنا، اور ایک ہے دل سے کسی کی چیز کے متعلق لالچ اور خواہش رکھنا کہ فلاں آدمی مجھے فلاں چیز دے؛ اس کو ''اشراف'' کہتے ہیں۔ جس طرح زبان سے سوال کرنا حرام ہے، اسی طرح اشراف بھی حرام ہے۔ دونوں ہی ممنوع ہیں۔

اسی لئے اشرافِ نفس کے ساتھ کوئی چیز ملی ہو مثلاً دل میں ایسی لالچ پیدا ہوگئی کہ فلاں آدمی مجھے ہدیہ دے، اس کے بعد واقعۃً اس نے ہدیہ دیا تو اس میں برکت نہیں ہوگی، اور اس کا لینا پسندیدہ نہیں ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جو آدمی دل کی لالچ اور طلب کے ساتھ کوئی چیز لیتا ہے، تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اور اس کا حال ایسے جانور یا آدمی جیسا ہوتا ہے جس کو جوع البقر کی بیماری ہوگئی ہو کہ وہ کھانا کھاتا رہتا ہے اور اس کا پیٹ نہیں

بھرتا، ایسا ہی یہ بھی ہوتا ہے کہ کتنا ہی مال اس کے پاس آئے، لیکن اس کی طمع اور طلب میں کمی نہیں آئے گی۔

"اوپر والا ہاتھ" یعنی دینے والا ہاتھ، یا نہ مانگنے والا اور سوال نہ کرنے والا ہاتھ؛ "نیچے والے ہاتھ" یعنی سوال کرنے والے ہاتھ، یا نہ دینے والے ہاتھ؛ یا لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

مال کے سلسلہ میں نبی کریم (ﷺ) کے نصیحت فرمانے پر حضرت حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) نے نبیٔ کریم (ﷺ) سے وعدہ کرلیا کہ آئندہ موت تک میں کبھی کسی سے سوال نہیں کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کی یہ خصوصیت تھی کہ جب کسی بات پر نبیٔ کریم (ﷺ) کی طرف سے ان کو ٹوکا جائے، نصیحت و تنبیہ کی جائے، تو بس! پھر مضبوطی سے اس کو ایسا پلے باندھ لیتے تھے کہ دوبارہ اس سلسلہ میں ان کو اصلاح کی ضرورت ہی نہیں رہتی تھی۔ وہ ہمارے جیسے نہیں تھے کہ بار بار ٹوکا جائے، تنبیہ کی جاتی رہے؛ تب بھی دو دن کے بعد، دو مہینے یا دو سال کے بعد بھول جاتے ہیں۔ حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو ایک مرتبہ کسی بات پر نبیٔ کریم (ﷺ) نے تنبیہ فرمادی، تو زندگی بھر کے لئے کافی ہوجاتی تھی۔

عہد نبھانے کا سبق آموز نمونہ

دیکھو! ان کے اس سوال پر نبیٔ کریم (ﷺ) نے بطورِ نصیحت کے یہ چیزیں ارشاد فرمائی تھیں جس میں بتلادیا کہ سوال نہ کرنے کی یہ فضیلت ہے، اور بغیر سوال کے جو چیز ملتی ہے اس میں

برکت ہے۔سوال دو طریقوں سے ہوتا ہے،ایک تو زبان سے اوردوسرا دل سے: دونوں کے اندر برکت نہ ہونے کو بتلایا ہے۔

توانہوں نے نبیُ کریم(ﷺ)کے سامنے ہی عہد کرلیاکہ آئندہ کسی سے سوال نہیں کروں گا اورکسی کو زحمت نہیں دوں گا۔اس کے بعد حضرت ابوبکرصدیق(رضی اللہ عنہ) اپنےدورِ خلافت میں حضرت حکیم بن حزام کوبلوا بھیجتے کہ مالِ غنیمت آیاہواہے،اس میں تمہاراجو حصہ ہے،یابیت المال میں جو وظائف مقرر کئےجاتےتھے،اس میں تمہارا جو وظیفہ مقرر ہے،وہ آکرلے جاؤ یعنی ان کو باقاعدہ بلواتےتھے،لیکن وہ انکار کردیتےتھےاورکوئی چیز قبول نہیں کرتے تھے۔ جب حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)کادورِخلافت آیاتوانہوں نے بھی حضرت حکیم بن حزام(رضی اللہ عنہ)کو مقررہ وظیفہ لینے کے لئےبلایالیکن انہوں نےانکارکیا۔چوں کہ حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)کو آخرت کابڑافکررہتاتھا کہ ابھی نہیں لیتے، اگرکل کو قیامت میں میرے خلاف اللہ تعالیٰ کے حضورمیں دعویٰ کردیاکہ عمر نےمیرا حق نہیں دیا تومیرے پاس اس کاکیاجواب ہوگا اس لئے حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نےوہاں موجودمسلمانوں کوگواہ بناکریہ کہاکہ تم گواہ رہوکہ میں نے ان کاحصہ ان کوپیش کیالیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔پھرحضرت عثمان(رضی اللہ عنہ) کا زمانہ آیا، اس کے بعد حضرت علی(رضی اللہ عنہ) کادور آیا۔ اس لئے کہ حضرت حکیم بن حزام(رضی اللہ عنہ) کاانتقال حضرت معاویہ(رضی اللہ عنہ)کے دورِخلافت میں ہوا۔ان کی زندگی کے ساٹھ(٦٠) سال کفرکی حالت میں،اورساٹھ(٦٠) سال اسلام کے اندر گزرے: کسی بھی دورمیں انہوں نے کچھ بھی نہیں لیا۔

میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ وہ وعدہ جو انہوں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کیا تھا اس کو طویل زمانہ تک نبھایا۔ یہ ان حضرات کی عزیمت اور پختگی کی بات ہے۔ حضرت حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کسی کو بھی تکلیف نہیں دی، کسی سے بھی مال کا مطالبہ نہیں کیا اور کوئی چیز نہیں لی یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوا۔

چیتھڑوں والا غزوہ

حدیث ۵۲۵:-

وعن أبي بردة عن أبي موسیٰ الأشعری (رضی اللہ عنہ) قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فِيْ غَزَاةٍ وَنَحْنُ سِتَّةُ نَفَرٍ، بَيْنَنَا بَعِيْرٌ نَعْتَقِبُهُ، فَنَقِبَتْ أَقْدَامُنَا وَنَقِبَتْ قَدَمِيْ، وَسَقَطَتْ أَظْفَارِيْ، فَكُنَّا نَلُفُّ عَلَى أَرْجُلِنَا الْخِرَقَ، فَسُمِّيَتْ غَزْوَةَ ذَاتِ الرِّقَاعِ لِمَا كُنَّا نَعْصِبُ عَلَى أَرْجُلِنَا مِنَ الْخِرَقِ. قَالَ أَبُوْ بُرْدَةَ: فَحَدَّثَ أَبُوْ مُوْسَى بِهٰذَا الْحَدِيْثَ، ثُمَّ كَرِهَ ذٰلِكَ، وَقَالَ: كَأَنَّهُ كَرِهَ أَنْ يَكُوْنَ شَيْئًا مِنْ عَمَلِهِ أَفْشَاهُ. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت ابوبُردہ (رضی اللہ عنہ) حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) کے صاحبزادے فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نے ایک روز فرمایا کہ ہم لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک غزوہ کے لئے نکلے۔ ہم چھ آدمیوں کی ایک جماعت بنائی گئی تھی اور ہمارے درمیان سواری کے واسطے ایک ہی اونٹ تھا، ہم باری باری اس پر سوار ہوتے تھے (جب چھ آدمی باری باری سوار ہوں گے تو ایک مرتبہ جو آدمی سوار ہو چکا اس کی باری اتنی دیر بعد آئے گی کہ درمیان میں پانچ آدمی سوار ہوں گے۔ اور پیر میں جوتے بھی نہیں

تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدل چلنے کی وجہ سے) ہمارے پاؤں میں شگاف پڑ گئے، میرے پاؤں میں بھی شگاف پڑ گئے اور میرے ناخن تک گر گئے (ان شگافوں کی وجہ سے جو تکلیف ہوتی تھی اس سے بچنے اور چلنے میں آسانی ہو اس کے لئے) ہم اپنے پاؤں کے اوپر کپڑے کے چیتھڑے لپیٹتے تھے، اسی لئے اس غزوہ کا نام "غزوۂ ذات الرقاع" "چیتھڑوں والا غزوہ" ہے ("رِقاع" عربی زبان میں چیتھڑوں کو کہتے ہیں) حضرت ابو بردہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) یہ واقعہ بیان کرنے کو تو کر گئے (ہو سکتا ہے کسی خاص جذبہ اور کیفیت میں بیان کر دیا ہو) لیکن پھر ان کی طبیعت میں ناگواری پیدا ہوئی اور خیال ہوا کہ مجھے یہ بیان نہیں کرنا چاہیے تھا (کہ ہم نے دین کے لئے ایسی مشقتیں اُٹھائیں ہیں) راوی کہتے ہیں گویا کہ انہوں نے اپنے کسی عمل کے ظاہر کرنے کو پسند نہیں فرمایا۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے ایسی سخت تکلیفوں پر بھی صبر کیا لیکن کسی سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ "عفاف" یعنی اپنے آپ کو اتنی سخت حاجت کے باوجود سوال سے بچایا۔

دیکھو! ایک تو یہ ہے کہ عمل کرتے وقت آدمی کے دل میں ایسا خیال پیدا ہو، یہاں ایسی بات نہیں تھی، اس لئے کہ عمل تو ہو چکا تھا، اور عمل ہو چکنے کے بعد اس کو بیان کرنے سے اگر مقصود آدمی کی ریا و شہرت ہو؛ تو وہ بھی برا ہے۔ اور ظاہر ہے ان کا مقصود ریا اور شہرت نہیں تھی، لیکن وہ حضرات اپنے نفس کے کید اور نفس کی طرف سے پیش آنے والی برائیوں سے بے خوف نہیں رہتے تھے، بلکہ ڈرتے رہتے تھے۔

صفتِ استغناء پر سندِ نبوی

حدیث ۵۲۶:-

وعن عمرو بن تغلِبَ ۔ بِفَتْحِ الْمُثَنَّاةِ فَوْقَ و إِسكان الغين المعجمة و كسر اللام: أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) أَتَى بِمَالٍ أَوْ سَبْيٍ فَقَسَّمَهُ، فَأَعْطَى رِجَالاً، وَتَرَكَ رِجَالاً، فَبَلَغَهُ أَنَّ الَّذِيْنَ تَرَكَ عَتَبُوا، فَحَمِدَ اللهَ، ثُمَّ أَثْنَى عَلَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: أَمَّا بَعْدُ! فَوَاللهِ إِنِّي لَأُعْطِي الرَّجُلَ وَأَدَعُ الرَّجُلَ، وَالَّذِيْ أَدَعُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنَ الَّذِيْ أُعْطِي، وَلٰكِنِّي إِنَّمَا أُعْطِي أَقْوَاماً لِمَا أَرَى فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِنَ الْجَزَعِ وَالْهَلَعِ، وَأَكِلُ أَقْوَامًا إِلَى مَا جَعَلَ اللهُ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مِنَ الْغِنَى وَ الْخَيْرِ، مِنْهُمْ عَمْرُو بْنُ تَغْلِبَ۔ قَالَ عَمْرُوبْنُ تَغْلِبَ: فَوَ اللهِ مَا أُحِبُّ أَنَّ لِي بِكَلِمَةِ رَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) حُمْرَ النَّعَمِ۔

(رواه البخاری)

(الْهَلَعُ): هُوَ أَشَدُّ الْجَزَعِ، وقِيْلَ: الضَّجَرُ۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمرو بن تَغلِب (رضی اللہ عنہ) (ایک صحابی ہیں وہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں کچھ مال یا قیدی آئے۔ آپ (ﷺ) نے وہ مال لوگوں کے درمیان تقسیم کیا (لیکن وہ اتنا زیادہ نہیں تھا کہ سب کو دیا جاسکتا اس لیے) آپ (ﷺ) نے کچھ لوگوں کو دیا اور کچھ لوگوں کو نہیں دیا۔ پھر نبی کریم (ﷺ) کو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو نہیں دیا ان کو کچھ ناراضگی اور ناگواری ہوئی ہے (جب آپ (ﷺ) کو یہ اطلاع ملی تو حضور نے ایک تقریر فرمائی، اس میں) اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرنے کے بعد فرمایا: اللہ کی قسم! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میں ایک آدمی کو دیتا ہوں اور دوسرے کو نہیں دیتا (اس کی وجہ سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کو دیا جارہا ہے اس کے ساتھ محبت کا تعلق زیادہ ہے، اسی لئے تو اس

کو دیا اور جس کو چھوڑا گیا شاید اس کے ساتھ وہ تعلق اور محبت کا رشتہ نہیں ہے، اسی لئے اس کو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن یادرکھو! صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ) جس کو میں نے نہیں دیا، وہ میرے نزدیک -اس کے مقابلہ میں جس کو میں نے دیاہے- زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ اور جن لوگوں کو دیا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض لوگوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ ان کے دل میں بے صبری اور بے چینی کی کیفیت ہوتی ہے (اگر ان کو نہ ملے تو وہ چپ نہیں رہ سکتے، ان کی بے صبری ان کو مانگنے پر آمادہ کر دے گی ، اس لئے وہ مانگنے کے لئے آئیں اس سے پہلے ہی میں ان کو دے دیتا ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ جن سے تعلق زیادہ ہوتا ہے ان کو چھوڑ کیوں دیا؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ) بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں استغناء ،اور بے پرواہی کی صفت رکھی ہے (ان کو کسی طرح کی بے صبری اور بے چینی نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں ”عفت“ یعنی سوال سے اپنے آپ کو بچانے اور ”قناعت“ کا وصف رکھا ہے، اس کی وجہ سے میں اُن کو نہیں دیتا) انہی میں -اس روایت کے نقل کرنے والے- عمرو بن تَغلِب بھی ہیں (حضور اکرم (ﷺ) نے صراحت کے ساتھ ان کا نام لیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد) حضرت عمرو بن تَغلِب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! میں اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے اس ارشاد کے بدلہ میں مجھے سرخ اونٹ ملیں (نبیٔ کریم (ﷺ) کی طرف سے ایسی اونچی سند دی گئی ہے کہ ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی وہ نہیں مل سکتی ہے۔)

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرایوں کو دے کر اپنے والوں کو نہیں دیتے اس لیے کہ پرائے بخشیں گے نہیں، لہٰذا ان کو دیدو، اپنے لوگوں کو بعد میں دیکھ لیا جائے گا، ایسا ہی معاملہ یہاں بھی تھا۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا کہ جن لوگوں کو میں نہیں دیتا وہ دراصل ان کی خوبیوں

یعنی صفتِ ستغناء اور صفتِ قناعت کی وجہ سے نہیں دیتا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ تبارک و تعالیٰ کے اخلاق سے متصف تھے، اور اہلِ ایمان کو بھی تاکید کی گئی ہے: "تَخَلَّقُوا بِأَخلَاقِ اللهِ" اور اللہ تعالیٰ بھی جب کسی کو دیتے ہیں اور کسی کو نہیں دیتے؛ وہاں پر بھی یہی معاملہ ہوتا ہے کہ جن کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر ان کو نہ دیا جائے تو پتہ نہیں وہ کیا کرڈالیں، ہوسکتا ہے کہ نہ ملنے پر بے صبری میں ایمان سے ہاتھ دھوبیٹھیں، اس لیے ان کے ایمان کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ کچھ نہ کچھ دے دیا کرتے ہیں۔ اور بعض ایسے مضبوط ایمان والے ہوتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جانے والی آزمائش کو برداشت کرلیتے ہیں، یا ان کے دینی حالات ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نہیں دیا جاتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس طرح بھی سوچا کرے۔

۸/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۱۰/جون ۲۰۰۰ء

باب چل رہا ہے کہ آدمی قناعت اختیار کرے اور اپنے آپ کو سوال کرنے سے بچائے اوراپنی معیشت یعنی زندگی گذارنے میں میانہ روی اختیار کرے۔

جو آدمی سوال سے بچنا چاہتا ہے...

حدیث ۵۲۷:-

وعن حکیم بن حزام(رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ : اليَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ،وَخَيْرُ الصَّدَقَةِمَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفُّهُ اللهُ،وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللهُ. (متفق عليه)
هٰذَالَفْظُ الْبُخَارِيْ،وَلَفْظُ مُسْلِم اخصر۔

ترجمہ:- حضرت حکیم بن حزام(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:اوپر والاہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا ہاتھ)نیچے والے ہاتھ(یعنی مانگنے والے ہاتھ)کے مقابلہ میں بہترہے(اس سے مانگنے کی بُرائی معلوم ہوئی)اور اگر آپ کوئی چیز خرچ کرنا چاہتے ہیں تو جن کا نفقہ اور ذمہ داری آپ پر ہے ان سے شروع کیجئے۔اور بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی بے پرواہی اوردل کے اطمینان کے ساتھ دیاکرتاہے۔اورجو آدمی اپنے آپ کو سوال سے بچانا چاہتا ہے، عفت اختیار کرتا ہے ،اللہ تبارک و تعالیٰ بھی اس کو عفت عطا فرماتے ہیں۔اور جو آدمی مستغنی بنناچاہتا ہے ، اللہ تعالیٰ بھی اس کو دوسروں سے مستغنی بنادیتے ہیں۔

افادات:- ایک آدمی کا ارادہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے اللہ کے راستہ میں مال خرچ کروں، تو پہلے ان لوگوں پر خرچ کرے جن کی ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اور جن کا نفقہ برداشت کرتا ہے: مثلاً بیوی ، بچے ،ماں باپ اور دوسرے قریب و دور کے اعزاءو اقارب جن کی ذمہ داری درجہ بدرجہ اس کے اوپر آتی ہے،انہی سے شروعات اورابتدا ء کرنی چاہیے۔ جب ان کی ضرورتیں پوری ہو جائیں اس کے بعد دوسروں کے اوپر خرچ کرنا چاہیے۔ اس لئے کہ ویسے بھی جب ان کا نفقہ آدمی کے اوپر واجب ہے تو اس حیثیت سے ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی فکر کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔کسی بھی نیک کام میں خرچ کرنے کے معاملہ میں نبی کریم (ﷺ) نے ہمیں یہی اصول بتلایا ہے کہ ابتدا ءان لوگوں سے ہونی چاہیے جن کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔

کوئی آدمی باہر تو بہت کچھ خرچ کرتا ہے، اور جو لوگ اس سے قریبی تعلق رکھنے والے ہیں: مثلاً اس کے رشتہ دار، بھائی، بہنیں، اس کے بھتیجے، بھانجے؛ وغیرہ ؛ان کو نہیں دیتا، وہ بیچارے اپنی ضرورتوں کی وجہ سے دوسروں کے محتاج ہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہو گیا جیسا کہ گجراتی میں کہاوت ہے:(ઘર ના છોકરા ઘંટી ચાટે , ઉપાધ્યાય ને આંટો) ”یعنی گھر کے بچے چکی پر لگا آٹا چاٹ رہے ہیں، اور اجنبی پر آٹے کی سخاوت ہو رہی ہے“ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ابتداء انہی سے کرے۔

بے نیازی سے دینے کے دو مطلب

"عَنْ ظَهْرِ غِنًى" کا مطلب یہ ہے کہ صدقہ دینے کے بعد اپنی ضرورتوں کے پیشِ نظر دل میں خیال نہ آئے کہ میں نے خرچ نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا۔اس کی دو صورتیں ہیں: ایک تو یہ ہے کہ اُس کے پاس اتنا مال ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے بعد بھی اپنی ضرورتوں کی تکمیل کے واسطے مال بچ جاتا ہے جس سے اپنی اوراپنے ماتحتوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی؛ تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔گویا اس کو مستغنی کرنے والی چیز موجود ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مال خرچ کرنے بعد اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچتا ، جیب خالی ہوجاتی ہے ،لیکن اس کا دل اتنا قوی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر اتنا زیادہ اعتماد وبھروسہ ہے کہ اپنے پاس کچھ نہ رکھتے ہوئے بھی جب وہ خرچ کرے گا تو بعد میں بھولے سے بھی یہ خیال آنے والا نہیں ہے کہ میں نے خرچ نہ کیا ہوتا تو اچھا تھا ؛ تو اس صورت میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

تو جو صدقہ استغناء کے ساتھ دیا گیا ہو یعنی جو چیز اللہ کے راستہ میں خرچ کی گئی ہے، بعد میں اس کی طرف حرص باقی نہ رہے؛ وہ بہترین صدقہ ہے۔

"وَمَنۡ یَسۡتَغۡنِ یُغۡنِهِ اللهُ" جو آدمی مستغنی بننا چاہتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ اس کو دوسروں سے مستغنی بنادیتے ہیں۔جب احادیث میں سوال کرنے کی ممانعت آئی ہے تو اب اپنے آپ کو سوال سے بچانے کے لئے کون سی تدبیر اختیار کرے اور استغناء والی صفت کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟اسی کو بتایا گیا:"مَن یَّستَعفِفُ"یعنی جو اپنے آپ کو بہ تکلف سوال سے بچائے گا۔دوسری روایت میں "مَن یَّتَعَفَّفُ" بھی آیا ہے یعنی ہمت وارادہ کرکے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچائے گا۔یعنی ہو سکتا ہے کہ حالات کے پیشِ نظر ایسی نوبت آجائے کہ اس کا نفس یہ کہے کہ لوگوں سے مانگ لو،ایسے حالات میں بھی وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرتے ہوئے ہمت سے کام لے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے، گویا حالات اور نفس کے تقاضہ کے باوجود بہ تکلف سوال کرنے سے اپنے آپ کو روکتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو صفتِ عفت واستغناءعطا فرمادیتے ہیں۔

اوصافِ کمال حاصل کرنے کا طریقہ

دنیا میں کمال کے جتنے بھی اوصاف ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے آدمی کو محنت اور مجاہدہ سے کام لینا پڑتا ہے، ریاضت کرنی پڑتی ہے، کچھ مشقت اُٹھانی پڑتی ہے:تب ہی وہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔مثلاً ایک آدمی صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے،تو اس صفت کو پیدا کرنے کے لئے کچھ مشقت اُٹھانی پڑے گی،انسان کی طبیعت تو اس کو بے صبری پر آمادہ

کرے گی، نفس اُبھارے گا، حالات بھی ایسے ہوسکتے ہیں کہ وہ بے صبری کا اظہار کرے، لیکن اس کو چاہیے کہ ہمت سے کام لے کر، بہ تکلف اپنی ذات پر جبر کرکے، نفس پر دباؤ ڈال کر صبر سے کام لے؛ جب ایسا کرتا رہے گا تو دھیرے دھیرے یہ صفت اس کے اندر پیدا ہوجائے گی۔ اسی طرح عفت کی صفت کا حال بھی ہے اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بھی یہی ہے۔ اسی کو کہا گیا کہ جو آدمی لوگوں سے اپنے آپ کو مستغنی اور بے پرواہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو صفتِ غنٰی عطا فرما دیتے ہیں۔ یعنی حالات اور حوادث تو اس کو مجبور کرسکتے ہیں کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی محتاجی کا اظہار کرے، لیکن اگر وہ ہمت سے کام لے کر اور ذرا مجاہدہ و مشقت برداشت کرکے اپنے آپ کو اس سے بچائے گا، تو دھیرے دھیرے صفتِ غنٰی یعنی اس کے دل کے اندر بے نیازی کی صفت اللہ تعالیٰ پیدا فرمادیں گے۔ کسی بھی صفت کو حاصل کرنے کے لئے آدمی ارادہ کرلے کہ مجھے اپنے اندر اس صفت کو پیدا کرنا ہے، اس کے بعد ہمت سے کام لے۔ بس! یہ دو کام کرے گا تو پھر ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ وہ اس صفت کو پورے طور پر حاصل کرلے گا۔

دنیوی اعتبار سے بھی جو کمالات ہوا کرتے ہیں ان کو حاصل کرنے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، کوئی بھی آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے کمالات لے کر پیدا نہیں ہوتا، البتہ قدرتی صلاحیتیں اس کے اندر ہوتی ہیں، انہی صلاحیتوں کے اوپر محنت کرکے اگر ان کو

اُجاگر کرتا ہے، تو وہ ان صفات اور کمالات کو حاصل کرلیتا ہے ،چاہے وہ دنیوی ہوں یا اُخروی ہوں۔

یہاں پر بھی عفت اور غنٰی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا کہ شروع میں آدمی کو ارادہ وہمت سے کام لے کر اپنی ذات پر کچھ جبر کرنا پڑے گا،بوجھ ڈالنا پڑے گا، ہمت سے کام لینا پڑے گا؛ جب باربار ایسا کرتا رہے گا تو پھر ایک وقت آئے گا کہ یہ چیزاس کی طبیعت بن جائے گی۔

جیسے بھوک ہم برداشت تو نہیں کرسکتے ،لیکن اگر ہم دھیرے دھیرے عادت ڈالیں کہ ایک وقت کھانا نہیں کھایا،دوسرے وقت نہیں کھایا،تیسرے وقت نہیں کھایا؛ تو بھوک برداشت کرنے کی عادت پڑجائے گی،اور ایک وقت آئے گا کہ پھرچارپانچ وقت کے بعد بھی آدمی کوبھوک کی تکلیف نہیں ہوتی۔شروع میں بہت بے چینی ہوتی تھی لیکن جب عادت پڑگئی تو طبیعت پر کوئی بے چینی نہیں ہے۔ہر چیز کا یہی حال ہے۔

سوال کرنے والوں کے لیے خاص ہدایت

حدیث ۵۲۸:-

وعن أَبِي عَبْدِالرَّحْمٰنِ مُعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سُفْيَان(رضی اللہ عنہ)قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم): لاَتُلْحِفُوا فِي الْمَسْأَلَةِ، فَوَاللهِ لاَ يَسْأَلُنِي أَحَدٌ مِنْكُمْ شَيْئًا، فَتُخْرِجَ لَهُ مَسْأَلَتُهُ مِنِّي شَيْئاً ، وَأَنَالَهُ كَارِهٌ ، فَيُبَارَكَ لَهُ فِيمَا أَعْطَيْتُهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت معاویہ بن ابی سفیان(رضی اللہ عنہ)سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سوال کرنے میں اصرار سے کام نہ لو۔اللہ کی قسم!تم میں سے کوئی آدمی مجھ سے کسی چیز کا سوال کرے اور مجھ سے کوئی چیز نکلوالے ،حالاں کہ میں دینا نہیں چاہتا تھا،توپھر جو میں دیتا ہوں اس میں اس کوبرکت عطا نہیں ہوتی۔

افادات:-نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کے پاس لوگ اپنی اپنی حاجتیں لے کر آتے تھے ،جیسے: بڑوں کے پاس جاتے ہیں،یاجولوگ دوسروں کی حاجتیں پوراکرنے کا اہتمام کرتے ہیں ان کے پاس بھی لوگ پہنچتے ہیں؛ ایسے لوگوں کونبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ہدایت فرمائی کہ اپنی ان حاجتوں کو پورا کروانے کے لئے مانگنے میں اِصرار نہ کیاکرو ،کسی سے لپٹ کر نہ مانگو۔جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس کے سامنے وہ اپنی حاجت پیش کرتے ہیں،توگویا اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں، جب تک وہ ان کی حاجت کوپورا نہ کرے وہاں تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے،اس کو تنگ کرکے رکھ دیتے ہیں، بہت سی مرتبہ تووہ آدمی عاجزآکر اور مجبور ہوکر اس کی ضرورت کوپوراکرتاہے۔شریف آدمی کے ساتھ جب اصرار کا معاملہ کیا جاتا ہے تو باوجود جی نہ چاہنے کے بھی وہ دے دیتا ہے۔

بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی حاجت مند کی حاجت اور حالت کا جائزہ لے کر خود ہی برضا و رغبت اس کی مانگ کو پورا کرتا ہے ؛تب تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اور وہ سمجھ رہا ہے کہ یہ اپنی حاجت کی جتنی مقدار بتارہا ہے،اس کی اتنی زیادہ ضرورت نہیں ہے،اور وہ امداد کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، لیکن یہ اس کے پیچھے پڑ کر زبردستی اس کے پاس سے نکلواتا ہے؛ توپھر اس میں اس کو برکت عطا نہیں ہوتی۔ گویا جو مال جبراً نکلوایا جاتا ہے وہ مال بغیر کسی فائدہ کے ضائع ہو جاتا ہے،اوروہ آدمی دوبارہ لوگوں سے سوال کرنے لگتا ہے،اس طرح سوال کرکے درحقیقت وہ آدمی اپنے مسئلہ کو بجائے حل کرنے کے اور زیادہ اُلجھارہا ہے، ضرورت تواس بات کی تھی کہ وہ صبر سے کام لیتا اور عفت اختیار کرتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی راستہ کھول دیتے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی حاجت مند ہو ؛تب بھی اپنی حاجت کا سوال کرنے میں اصرار سے کام نہیں لینا چاہیے۔

سوال نہ کرنے پر نبی کریم (ﷺ) کی بیعت

حدیث ۵۲۹:-

وعن أبي عبد الرحمٰن عوف بن مالك الأشجعيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللهِ (ﷺ) تِسْعَةً أَوْ ثَمَانِيَةً أَوْ سَبْعَةً۔ فَقَالَ: أَلَا تُبَايِعُوْنَ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ). وَكُنَّا حَدِيْثِيْ عَهْدٍ بِبَيْعَةٍ۔ فَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ۔ ثُمَّ قَالَ: أَلَا تُبَايِعُوْنَ رَسُوْلَ اللهِ۔ فَبَسَطْنَا أَيْدِيَنَا ۔ وَقُلْنَا: قَدْ بَايَعْنَاكَ فَعَلَامَ نُبَايِعُكَ؟ قَالَ: عَلَى أَنْ

تَعْبُدُوْا اللهَ وَلَاتُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا، وَالصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ، وَتُطِيْعُوا اللهَ (وَأَسَرَّ كَلِمَةً خَفِيْفَةً) وَلَاتَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا. فَلَقَدْ رَأَيْتُ بَعْضَ أُولٰئِكَ النَّفَرِ يَسْقُطُ سَوْطُ أَحَدِهِمْ. فَمَا يَسْأَلُ أَحَدًا أَيُنَاوِلُهُ إِيَّاهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو عبدالرحمن عوف بن مالک اشجعی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازخود ارشاد فرمایا: تم لوگ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے؟ (عوف بن مالک (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ) ہم نے ابھی تازہ تازہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کی تھی (یعنی ہمیں بیعت ہوئے کچھ زیادہ وقت نہیں گذرا تھا اور پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرمارہے تھے کہ تم اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتے؟ تو) ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوچکے ہیں۔ پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تم لوگ اللہ کے رسول کے ہاتھ پر بیعت نہیں ہوتے؟ (جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری مرتبہ فرمایا) تو ہم نے بیعت ہونے کے لیے اپنے ہاتھ آگے بڑھادیئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوتے ہیں (ارشاد فرمایئے) آپ کس چیز پر ہم سے بیعت لیناچاہتے ہیں؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: میں تم کو بیعت کررہا ہوں اس بات پر کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کروگے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراؤگے، پانچوں نمازیں اپنے وقت پر ادا کروگے، اوراللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کروگے۔ اس کے بعد نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک بات بہت آہستہ ارشاد فرمائی: کسی سے کچھ نہیں مانگوگے۔ حضرت عوف (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جو حضرات نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت ہوئے تھے ان میں سے بعضوں کو دیکھا کہ وہ حضرات اس عہدوپیمان کا اتنا زیادہ لحاظ کرتے تھے، اس پر عمل کا اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ ان میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے پر سوار ہوتا، اس کا کوڑا نیچے گرجاتا تووہ کسی سے مانگتا نہیں تھا (کہ میرا کوڑا دے دو) بلکہ خود اُتر

کرلیتاتھا(اس لئے کہ یہ بھی کسی سے مانگنا اورسوال کرناہوا اور انہوں نے سوال نہ کرنے کانبی کریم (ﷺ) کے ہاتھ پر عہدو پیمان کیا تھا۔)

افادات:- بیعت: ایک طرح کا عہدوپیمان ہوتا ہے۔ آدمی اللہ تعالیٰ سے عہدو پیمان کرتا ہے اور جس کے ہاتھ پر بیعت ہورہا ہے اس کو اپنے اس عہدو پیمان پر گواہ بناتا ہے کہ میں یہ کام کروں گااور یہ کام نہیں کروں گا۔ سوال کی ممانعت کو بتلانے کے لئے اس روایت کو یہاں لائے ہیں۔

مانگنے کی عادت پر سزا

حدیث ۵۳۰:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنھما أن النبی (ﷺ) قال: لَاتَزَالُ الْمَسْأَلَةُ بِأَحَدِكُمْ حَتّٰى يَلْقَى اللهَ تَعَالىٰ وَلَيْسَ فِيْ وَجْهِهِ مُزْعَةُ لَحْمٍ. (متفق علیه)

((الْمُزْعَةُ)) بضم الميم وإسكان الزاي وبالعين المهملة: الْقِطْعَةُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما نبی کریم (ﷺ) کاارشاد نقل فرماتے ہیں کہ جس شخص کو مانگنے کی عادت ہوجاتی ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت نہ ہوگا۔

اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ

حدیث ۵۳۱:-

وعنه أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (ﷺ) قَالَ وَهُوَ عَلَى الْمِنْبَرِ، وَذَكَرَ الصَّدَقَةَ وَ التَّعَفُّفَ عَنِ الْمَسْأَلَةِ، اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى، وَالْيَدُ الْعُلْيَا هِيَ الْمُنْفِقَةُ، وَالسُّفْلٰى هِيَ السَّائِلَةُ. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) نے منبر پر تشریف فرما ہونے کی حالت میں اپنی تقریر میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا تذکرہ کیا، اور سوال سے بچنے کا بھی تذکرہ کیا (کہ کسی سے سوال مت کرو۔ اس میں یہ بھی فرمایا) اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر والا ہاتھ وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے والا ہاتھ ہے، اور نیچے والا ہاتھ وہ لوگوں سے سوال کرنے والا ہاتھ ہے۔

اس روایت میں اوپر والا اور نیچے والا ہاتھ کس کو کہتے ہیں وہ خود نبی کریم (ﷺ) نے بتلا دیا ہے۔

وہ کیا جمع کر رہا ہے؟

حدیث ۵۳۲:-

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) قال قال رَسُولُ اللهِ (صلى الله عليه وسلم): مَنْ سَأَلَ النَّاسَ تَكَثُّراً فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْراً، فَلْيَسْتَقِلَّ أَوْ لِيَسْتَكْثِرْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے مال میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں سے سوال کرتا ہے، تو گویا وہ اپنے لئے انگارے جمع کررہا ہے۔ اب اس کی مرضی کی بات ہے، چاہے کم مانگے، چاہے زیادہ مانگے۔

افادات:- بعض لوگوں کی سوال کرنے کی عادت ہوتی ہے، گویا انہوں نے سوال کرنے اورمانگنے ہی کو اپنا ذریعۂ معاش بنارکھا ہے، جیسے آج کل ایک طبقہ ہے جو اسی لئے لوگوں سے سوال کرتا ہے کہ مانگ کرمال اکٹھا کرے، حالاں کہ ضرورت پوری کرنے کے لئے ان کے پاس بہت کچھ موجود ہوتا ہے۔

نصاب کی تین قسمیں

دیکھو! کتابوں میں مسئلہ لکھاہے کہ نصاب تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک نصاب تو وہ ہے جس میں آدمی کے اوپر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ قربانی و صدقۂ فطر واجب ہوتا ہے؛ ایسا آدمی زکوٰۃ کامال اور واجب صدقات نہیں لے سکتا۔ اس کا نصاب یہ ہے کہ کسی آدمی کے پاس ۸۷/ گرام اور ۴۸۰/ ملی گرام سونا، یا ۶۱۲/ گرام اور ۳۵۰/ ملی گرام چاندی ہو، یا اسی کے بقدر پیسے ہوں، یا تجارت کا اتنا سامان ہو، اوراس پر کچھ قرض بھی نہ ہو؛ تو اس

صورت میں اس پر زکوٰۃ بھی فرض ہے ، صدقۃ الفطر بھی واجب ہے ،اور قربانی بھی واجب ہے۔ایسا آدمی کسی سے زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔یہ تو پہلے نمبر کا نصاب ہوا۔

دوسرا نصاب

دوسرے نمبر کا نصاب یہ ہے کہ جس میں آدمی کے اوپر قربانی اور صدقۃ الفطر واجب ہوتا ہے، اوروہ آدمی زکوٰۃ بھی نہیں لے سکتا ،لیکن اس کے اوپر زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی مثلاً کسی کے پاس سوناچاندی تو نہیں ہے،روپے بھی نہیں ہیں، تجارت کا سامان بھی نہیں ہے، لیکن گھرمیں اپنی ضرورت سے زیادہ کچھ سامان موجود ہے، جیسا کہ آج کل عام طور پرکچھ زائد چیزیں بطورِشو کے گھروں میں رکھنے کامزاج بناہواہے؛اسی کولایعنی کہتے ہیں۔

لایعنی کی ایک اور قسم

ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے: حدیثِ پاک میں آتاہے نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا :"مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُهٗ مَالَایَعْنِیْهِ" آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لا یعنی چھوڑدے۔عام طورپرشراحِ حدیث لایعنی کا مطلب بے کار کام اور بے کاربات بتاتے ہیں۔یعنی جس میں نہ دنیاوی اعتبار سے کوئی فائدہ ہو، نہ آخرت کے اعتبار سے کوئی فائدہ ہو،ایسی بات اورایسے کام کو لا یعنی کہتے ہیں ،لیکن آج کل لایعنی کی ایک اور

قسم ’’لایعنی اشیاء ‘‘نکلی ہے ، مثلاً گھر کے کونہ میں بہت بڑا پوٹ رکھاہوا ہے۔ پہلے زمانہ میں اس میں پانی بھر کر رکھاجاتا تھا، لیکن آج کل وہ صرف شو کے لئے رکھا جاتا ہے۔ اور بھی بے شمار چیزیں ایسی ہونے لگی ہیں جو کسی کام کی نہیں ہوا کرتیں، اور ہزاروں روپیہ اس پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر یہی روپیہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا گیا ہوتا ، کسی نیکی کے کام میں لگایا گیا ہوتا، صدقہ ٔ جاریہ میں استعمال کیا گیا ہوتا؛ تو کتنا اجر و ثواب ملتا۔ اس وقت ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں محض دکھلاوے کے لئے ہم نے اس طرح کی کچھ چیزیں اپنے ذہن سے گھڑ لی ہیں کہ ہمارے گھر میں شو کا سامان ہوگا تب ہی یوں سمجھا جائے گا کہ نشاط سوسائٹی (اُس جگہ کا نام جہاں حضرت کی مجلس ہوا کرتی ہے) میں مکان بناکر رہنے کے قابل ہے، ورنہ یہاں رہنے کے قابل نہیں۔ تو بھائیو! ہم نے ایسا جو مزاج بنایا ہے شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔ ہم اس کو حرام تو نہیں کہیں گے لیکن اس کو پسندیدہ بھی قرار نہیں دیا گیا ہے، یہ بے کار چیزیں ہیں، جن سے کوئی حاصل نہیں ہے۔

ضرورت کی چیز کیا ہے؟

میں یہ عرض کررہا تھا کہ کسی کے پاس ضرورت سے زائد چیز ہو۔ اور ضرورت کی چیز کیا ہے؟ دو چار پتیلیاں جو کھانا پکانے کے کام آتی ہیں اور چند پلیٹ اور پیالے جو کھانا کھانے کے کام آتے ہیں۔ یہ چیزیں بھی ہمارے حساب سے ہیں، ورنہ آپ کو یاد ہوگا، میں نے پہلے حضرت

ابو عبیدہ بن جراح(رضی اللہ عنہ) کا قصہ بیان کیا تھا کہ ان کے پاس مٹی کا صرف ایک پیالہ تھا، وہی کھانا کھانے کے لئے اور وہی پانی پینے کے لئے تھا۔ تو استعمال کی کچھ چیزیں، پہننے کے کچھ لباس، اور کچھ ضروری چیزیں بستر وغیرہ ہوں۔ یہ ضرورت کی چیزیں ہیں۔

چوتھا بستر شیطان کا

حدیث پاک میں تو یہاں تک آتا ہے کہ ایک آدمی کے پاس تین بستر ہونے چاہئیں، ایک اپنا، دوسرا بیوی کا، تیسرا مہمان کا۔ اگر چوتھا بستر ہے تو وہ شیطان کا ہوتا ہے (مشکوٰۃ المصابیح، کتاب اللباس) اس سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جو چیزیں بھی زائد ہیں وہ سب شیطان کے نام پر ہیں، شیطان اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے۔ ایسی زائد چیزوں کے لئے عام طور پر حدیث پاک میں شیطان ہی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ شیطان کے لئے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز اس کے حق میں اجر و ثواب کی نہیں ہے، بلکہ اس کا مال بے کار ضائع ہو رہا ہے۔ بہر حال! ضرورت سے زائد تمام چیزیں اس میں داخل ہیں۔

جس کے یہاں ٹی وی ہو: اس کو زکوٰۃ دینا

تو اگر ضرورت سے زائد چیزوں کی قیمت ۶۱۲/ گرام اور ۳۵۰/ ملی گرام چاندی کے برابر ہو جاتی ہے، تو اس کے اوپر قربانی واجب ہے، اور صدقۃ الفطر بھی واجب ہے، ایسا آدمی

زکوٰۃ نہیں لے سکتا۔ اب مثلاً کسی کے گھر میں ٹی وی (TV) ہے تو سب جانتے ہیں کہ ٹی وی (TV) ضروریاتِ زندگی میں سے نہیں ہے۔ اگر اس ٹی وی (TV) کی قیمت چاندی کے نصاب جتنی ہے؛ تو ایسے آدمی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتے، سیدھی سادی بات ہے۔ اگر ایسے آدمی کو زکوٰۃ دوگے تو ادا نہیں ہوگی۔ اس طرح کی اور بھی زائد چیزوں کا یہی حکم ہے۔

اس لئے زکوٰۃ دینے والے کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ پہلے دیکھ لے کہ جس کو زکوٰۃ دے رہا ہے وہ حقدار بھی ہے یا نہیں؟ البتہ اگر وہ مقروض ہے اور اس پر اتنا زیادہ قرضہ ہے کہ اس کو ادا کرنے بعد اس کے پاس جو سامان رہتا ہے اس کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی، مثلاً دس لاکھ کا مقروض ہے، تو اس کو زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔

جس پر صدقۂ فطر واجب؛ اس پر قربانی واجب

دیکھو! ہمارے معاشرہ میں لوگوں نے بہت سے مسئلے اپنے ذہن سے بنا رکھے ہیں۔ بہت سوں کے پاس اس نوع کا نصاب ہوتا ہے اور ان پر قربانی واجب ہوتی ہے، وہی لوگ رمضان کے مہینہ میں صدقۃ الفطر دیتے ہیں، لیکن قربانی کے زمانہ میں قربانی نہیں کرتے۔ ان سے پوچھو تو کہیں گے کہ صدقۃ الفطر واجب ہے، پھر اگر انہی سے کہیں کہ قربانی بھی واجب ہے، تو کہیں گے کہ قربانی واجب نہیں ہے۔ یہ اپنے طور پر ہی فتویٰ دے رہے ہیں، حالاں کہ کتابوں میں صدقۃ الفطر اور قربانی میں کوئی فرق نہیں کیا گیا ہے، جس پر صدقۃ الفطر واجب ہے،

اس پر قربانی بھی واجب ہے، اور جس پر صدقۃ الفطر واجب نہیں، اس پر قربانی بھی واجب نہیں، لیکن لوگوں نے دونوں کو الگ کہاں سے کیا، یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ خیر! یہ دوسرا نصاب ہے۔

تیسرا نصاب

تیسرا نصاب کتابوں میں لکھا ہے، اور دراصل مَیں اسی کو بتلانا چاہتا تھا کہ کسی کو آج اپنی اور اپنے ماتحتوں؛ بیوی، بچوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کھانے پینے کا سامان میسر ہے؛ تو یہ آدمی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا، کسی سے سوال نہیں کر سکتا، ایسے آدمی کے لئے سوال کرنا حرام ہے۔ اس کو حرمتِ سوال (سوال کے حرام ہونے) کا نصاب کہتے ہیں۔ علماء نے کتبِ فقہ میں باقاعدہ تیسری قسم کا یہ نصاب لکھا ہے۔

یہ پیسے نہیں، انگارے ہیں

اب اگر کوئی کہے کہ اس کے پاس آئندہ کل کے لئے کچھ نہیں ہے؛ تب بھی نہیں مانگ سکتا؟ تو اس سے کہیں گے کہ بھائی! جب کل آئے اور اس وقت اگر کچھ نہ ہو تو مانگے، لیکن آج سے کیوں مانگتا ہے؟ جیسے بھیک مانگنے والے کرتے ہیں۔ آج کل کے جو بھیک منگے ہیں وہ سب کیا بھوکے مر رہے ہیں؟ نہیں۔ بلکہ آپ تو اخباروں میں پڑھتے ہی ہوں گے کہ بھیک منگوں کی

موت آتی ہے تو وہ ہزاروں لاکھوں روپے اپنے پیچھے چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اس لیے ایسے جو لوگ سوال کرتے ہیں وہ صرف اپنے مال کو بڑھانے کے لیے سوال کرتے ہیں، ان کا سوال فقط مال کے اضافہ کے لئے ہوتا ہے۔

اور بعض مانگنے والے ایسے ہوتے ہیں جو ظاہری طور پر سڑکوں کے اوپر کھڑے رہ کر بھیک نہیں مانگتے، لیکن انھوں نے بھی اپنی عادت بنالی ہوتی ہے ،ان کی ضرورت کا ان کے پاس موجود ہوتا ہے ،پھر بھی لوگوں سے مانگتے رہتے ہیں؛ وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ اسی کو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی لوگوں سے سوال کرے تاکہ اس کے مال میں اضافہ ہو، ایسا آدمی گویا اپنے لئے انگارے جمع کررہا ہے، اب اس کی مرضی کی بات ہے ،چاہے کم مانگے، چاہے زیادہ مانگے۔ اس طرح سوال کرکے اور مانگ کر جتنے بھی پیسے آئیں گے ،درحقیقت وہ پیسے نہیں ہیں، بلکہ جہنم کے انگارے ہیں۔ اس لئے سوال سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے کہ سوال کرنا حرام ہے۔

سوال کرنا چہرہ پر خراش ہے

حدیث ۵۳۳:-

وَعَنْ سَمُرَةَ بن جندب(رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ(ﷺ): إِنَّ الْمَسْأَلَةَ كَدٌّ يَكُدُّ بِهَا الرَّجُلُ وَجْهَهُ إِلاَّ أَنْ يَسْأَلَ الرَّجُلُ سُلْطَانًا أَوْ فِيْ أَمْرٍ لاَ بُدَّ مِنْهُ. (رواه الترمذی، وقَالَ: حدیث حسن صحیح)

(اَلْکَدُّ: اَلْخَدْشُ وَنَحْوُہٗ)

ترجمہ:-حضرت سمرہ بن جندب(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: سوال کرنا آدمی کے چہرہ پر خراش ہے جس کے ذریعہ سے آدمی اپنے چہرے کو زخمی کرتا ہے، مگر یہ کہ آدمی کسی حاکم سے سوال کرے،یاکسی ایسی چیز کے لیے سوال کرتاہے کہ جس کے بغیر چارۂ کار نہیں۔

افادات:-ناخن جب چہرے پرمارے جاتے ہیں تو اس کی وجہ سے چہرے پر خراش اورزخم پڑجاتے ہیں ،ایسے آدمی کاچہرہ بھدّا اوربد صورت معلوم ہوتا ہے۔نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ لوگوں سے سوال کرنا ایسا ہی ہے جیسے اپنے چہرے کو زخمی کرنا۔اورایسا آدمی قیامت کے روز ایسی حالت میں اُٹھایا جائے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت نہیں ہوگا۔

کن صورتوں میں سوال کی اجازت ہے؟

اورچوں کہ حاکموں کے ساتھ لوگوں کی حاجتیں متعلق کردی گئی ہیں اس لئے حاکم کے سامنے اگرکوئی آدمی سوال کرتا ہے تو اس کے لئے یہ وعید نہیں ہے۔

یا کسی ایسی چیز کے لیے سوال کرتاہے کہ جس کے بغیر چارۂ کار نہیں،مثلاً کوئی آدمی مقروض ہوگیا، قرض کا دباؤ اتنا زیادہ بڑھ گیا کہ اس کی ادائیگی کی اس میں طاقت ہی نہیں

ہے، اور قرض خواہوں کی طرف سے شدید تقاضا ہے ، ایسی حالت میں اگر وہ اس کی ادائیگی کے لئے کسی سے مدد مانگے اور سوال کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

یا روز مرّہ کی ضرورتوں کے لئے تو پیسے موجود ہیں، لیکن کوئی ایمر جنسی صورت پیش آگئی جیسے: اچانک ایکسیڈنٹ ہو گیا اور بیٹے کی ٹانگ ٹوٹ گئی، اب باپ کے پاس اس کا علاج کرنے کے لئے پیسے نہیں ہیں، تو مجبوراً کسی کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے

فاقہ کہاں پیش کرنا چاہیے؟

حدیث ۵۳۴:-

وعن ابن مسعود(رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولِ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ فَأَنْزَلَهَا بِالنَّاسِ لَمْ تُسَدَّ فَاقَتُهُ۔ وَمَنْ أَنْزَلَهَا بِاللهِ فَيُوْشِكُ اللهُ لَهُ بِرِزْقٍ عَاجِلٍ أَوْ آجِلٍ. (رواه ابوداود والترمذی وقَالَ: حديث حسن) (يُوشِكُ) بکسر الشين: أيْ يُسْرِعُ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جس آدمی کو فاقہ پیش آیا (یعنی مال نہ ہونے کی وجہ سے اس کے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، اور اس کو ایک دو وقت بھوکا رہنا پڑا) پھر اس نے اپنے اس فاقہ کو لوگوں کے سامنے پیش کیا (یعنی لوگوں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا کہ میں تو بھوکے مر رہا ہوں، مجھے کچھ دو۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ) اس کا فاقہ بند ہونے والا نہیں ہے (مانگ کر وقتی طور پر تو ضرورت پوری ہو جائے گی، لیکن وہی ضرورت پھر

دوبارہ پیدا ہوگی اور وہ ضرورت مندہی رہے گا)اور جس نے اس فاقہ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا تو اللہ تعالیٰ جلدی ہی اس کے فاقہ کو دور کریں گے، یا تو فوری روزی کے ذریعہ، یا بعد میں اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی اسباب مہیا کردے گے(اور اس کی حاجت پوری ہوجائے گی۔)

نہ مانگنے پر جنت کی ضمانت

حدیث ۵۳۵:-

عن ثوبان(رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) : مَنْ تَكَفَّلَ لِي أَنْ لاَ يَسْأَلَ النَّاسَ شَيْئاً، وَأَتَكَفَّلُ لَهُ بِالْجَنَّةِ؟ فَقُلْتُ أَنَا۔ فَكَانَ لاَ يَسْأَلُ أَحداً شَيْئًا .(رواه أبوداود بإسناد صحيح)

ترجمہ:-حضرت ثوبان(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو مجھے اس بات کی گارنٹی دے کہ لوگوں سے سوال نہیں کرے گا ،تومیں اس کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں حضرت ثوبان(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں :میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!مَیں آپ کواس بات کی گارنٹی اورضمانت دیتا ہوں کہ میں کسی سے سوال نہیں کروں گا۔راوی کہتے ہیں کہ حضرت ثوبان(رضی اللہ عنہ)کسی سے کوئی چیز مانگتے نہیں تھے (یہاں تک کہ کوڑابھی زمین پر گرجاتا تو مانگتے نہیں تھے، بلکہ خود اتر کر لے لیا کرتے تھے۔)

سوال کرنا تین آدمیوں کے لیے جائز ہے

حدیث ۵۳۶:-

وعن أَبِي بِشْرٍ قبيصةَبنِ الْمُخَارِقِ(رضی اللہ عنہ)قَالَ: تَحَمَّلْتُ حَمَالَةً ، فَأَتَيْتُ رسولَ الله(صلی اللہ علیہ وسلم) أَسْأَلُهُ فِيهَا،فَقَالَ:أَقِمْ حَتَّى تَأْتِيَنَاالصَّدَقَةُ فَنَأْمُرَ لَكَ بِهَا. ثُمَّ قَالَ :يَاقَبِيصةُ!إنَّ المَسْأَلَةَ لاَ تَحِلُّ إِلاَّ لأَحدِ ثلاثةٍ:رَجُلٌ تحمَّلَ حَمَالَةً ،فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَها،ثُمَّ يُمْسِكُ،وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ جَائِحَةٌ اجْتَاحَتْ مَالَهُ فَحَلّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يُصِيبَ قواماً مِنْ عَيش-أَوْ قَالَ :سِدَاداً مِنْ عَيْشٍ -وَرَجُلٌ أَصَابَتْهُ فَاقَةٌ،حَتَّى يَقُولَ ثَلاَثَةٌ مِنْ ذَوِي الحِجَى مِنْ قَوْمِه:لَقَدْ أَصَابَتْ فُلاناً فَاقَةٌ . فَحَلَّتْ لَهُ الْمَسْأَلَةُ حَتَّى يصيب قواماًمن عيش-أَوْقَالَ:سداداًمن عيشٍ فماسِوَاهُنَّ مِنَ المسألَةِ يَاقَبِيصَةُ سُحْتٌ،يَأْكُلُهَا صَاحِبُهَاسُحْتاً .(رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت قبیصہ بن مُخارق(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بوجھ اپنے سر لیاتھا،اس سلسلہ میں کچھ مددحاصل کرنے کے لئے میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایاکہ انتظارکرو،ہمارے پاس کہیں سے کوئی مال آئے گاتوہم تمہیں دیں گے۔پھر حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: سوال کرنا (چندہ کرنا) جائز نہیں ہے، مگر تین آدمیوں کے لئے۔ایک تو وہ جس نے کوئی بوجھ اپنے سر لیاہو،اس کے لئے سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ جتنا بوجھ اپنے سر لیا ہے وہ پورا کرلے،پھرسوال سے رک جائے۔دوسرا وہ آدمی جس کواچانک کوئی مصیبت پیش آئی جس نے اس کا سارا مال ہلاک کردیا،ایسے آدمی کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کھڑا کر سکے۔اورتیسراوہ آدمی جس کو فاقہ لاحق ہو اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمیوں کے سامنے اس کے حالات ہوں جو اس کے متعلق گواہی دیں کہ واقعتاً اس کو فاقہ ہے،تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے،لیکن اتناہی جس سے اس کی ضرورت پوری ہوجائے۔یہ ارشادفرمانے کے بعد حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے قبیصہ!اس کے علاوہ جو سوال کرتا ہے وہ سب حرام ہے، اورایسا آدمی اپنے پیٹ میں حرام ڈال رہا ہے۔

افادات:- "حَمَالَۃ" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کبھی ایسی صورت پیش آتی ہے کہ دو گروہوں یادوآدمیوں کے درمیان کوئی جھگڑاہوا،ان کا جھگڑا ختم کرانے کے لئے کوئی آدمی صلح صفائی کی کوشش کرتا ہے،اس کوشش کے دوران ضرورت پیش آئی کہ وہ کوئی ذمہ داری اپنے سر لے،مثلاً ایک آدمی کے دوسرے کے اوپر دولاکھ نکلتے ہیں، وہ مانگنے گیا تو اس نے کہا کہ مَیں نہیں دوں گا،اوردونوں میں لڑائی ہوئی،اِس کے بھی رشتہ دار آئے، اُس کے بھی رشتہ دار آئے،اور لڑائی برابر چھڑ گئی،مقدمہ بازی ہوئی، کوئی بھی اپنا مقدمہ ہٹانے کے لئے تیار نہیں ہے۔دو چار آدمی دونوں پارٹیوں کے پاس گئے کہ بھائیو!آپ کا جھگڑا کس چیز کا ہے ؟بتایا گیا: ایسی بات ہے کہ یہ ہمارے پیسے نہیں دیتے۔دوسرے فریق سے پوچھا: تمہارے ذمہ ہیں یا نہیں ؟ انہوں نے اقرار کیا کہ :ہاں ! ہمارے ذمہ ہیں لیکن اس وقت دینے کے لیے ہمارے پاس نہیں ہیں اور ان لوگوں نے ہمارے ساتھ ایساایسا کیا ، اس لئے ہم نہیں دیں گے۔اب بیچ بچاؤ کرنے والایوں کہہ دے کہ: اچھا بھائی !ایسا کرو کہ تم کچھ چھوڑدو،میں پچاس ہزاراپنی طرف سے تم کودے دوں گا، لیکن یہ لڑائی ختم کرو۔کبھی ایسی نوبت آتی ہے کہ جھگڑوں کو ختم کرانے ،اور صلح صفائی کے واسطے آدمی کوئی ذمہ داری اپنے سر لے لیتا ہے؛اس قسم کی ذمہ داری کو حدیث میں "حَمَالَۃ"سے تعبیر کیا ہے۔یہ بھی نیکی کا کام ہے بشرطیکہ آدمی نباہ سکے۔اورجو آدمی نبھانے کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو ایسی چیزوں میں دخل نہیں دینا چاہیے۔نیکی کاہرکام استطاعت پر موقوف ہے جیسے: رات بھر جاگنے کی عادت اور طاقت نہیں،

پھر بھی رات بھر جاگو گے تو دوسرے دن بیمار ہو جاؤ گے، ایسے آدمی سے یہی کہیں گے کہ رات بھر جاگنا تمہارا کام نہیں ہے۔ اسی طرح کسی کا بوجھ اپنے سر لینا بھی ہر ایک کا کام نہیں۔ جو کر سکتا ہو اسی کے لئے نیکی ہے۔

اور جو لوگ اس قسم کا بوجھ اپنے سر لیتے ہیں وہ احباب کے حلقے میں بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ ایسا جھگڑا ہوا تھا، میں نے پچاس ہزار کی ذمہ داری لے لی ہے، اب اس میں کون میری مدد کرے گا؟ اپنے دوسرے ساتھیوں سے ایسا مطالبہ کیا جاتا ہے، اس قسم کے سوال کے لئے عام ہاتھ نہیں پھیلایا جاتا، بلکہ کچھ خصوصی لوگوں کے سامنے بات پیش کی جاتی ہے؛ تو ایسی اپیل کرنے کی بھی اجازت ہے۔

اسی طرح مدرسہ والے اور مہتمم صاحب بچوں کو مدرسہ میں داخلہ دیتے ہیں، اور بچوں کا بوجھ اپنے سر پر لے لیتے ہیں کہ ان کا کھانا پینا رہائش کا سارا انتظام ہم کریں گے، اور اسی بوجھ کو پورا کرنے کے لئے وہ چندہ کے لئے نکلتے ہیں؛ وہ بھی "تحمّلَ حَمَالَۃً" میں داخل ہے۔ یا رفاہِ عام کے کام کرنے والے ذمہ دار حضرات درخواست کرتے ہیں، مثلاً: کسی ہسپتال، یا کسی ادارے کے ذمہ دار لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے چندہ کی اپیل کرتے ہیں؛ وہ بھی "تحمّلَ حَمَالَۃً" میں داخل ہیں۔

دوسرا وہ آدمی جس کو اچانک کوئی ایسی مصیبت پیش آئی جس نے اس کا سارا مال ہلاک کردیا؛ ایسے آدمی کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے یہاں تک کہ اس کے ذریعہ سے اپنے آپ کو کھڑا کرسکے۔ مثلاً : قومی فساد ہوا، بڑا مالدار آدمی تھا ،تاجر تھا، لیکن فسادیوں نے سب کچھ لوٹ لیا،کاروبار کو آگ لگادی،اوروہ بیچارہ فٹ پاتھ پر آگیا، اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔

یا سیلاب آیا اوراس میں اس کا سب کچھ بہہ گیا۔یا آگ لگ گئی ،اس میں سب جل کر راکھ ہوگیا اور کچھ بھی نہیں بچا؛تو ایسا آدمی بھی اتناسوال کرسکتا ہے کہ جس سے وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے اور جس سے معیشت اور گزران ٹھیک ہوجائے۔

اور تیسرا وہ آدمی جس کو فاقہ لاحق ہو،اور اس کی قوم کے تین سمجھدار آدمیوں کے سامنے اس کے حالات ہوں اور وہ اس کے متعلق گواہی دیتے ہو ں کہ واقعتاً اس کو فاقے ہیں ؛تو اس کے لئے بھی سوال کرنا جائز ہے۔ لیکن اتنا ہی جس سے اس کی ضرورت پوری ہوجائے۔ ویسے فاقہ کا دعویٰ تو ہر آدمی کر سکتا ہے کہ میرے فاقے چل رہے ہیں ، جو بھکاری ہوتے ہیں وہ بھی اپنے فاقے ہی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

حقیقی مسکین کی پہچان

حدیث ۵۳۷:-

وعن أَبِی هريرة(رضی اللہ عنہ)أَنَّ رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ:لَيْسَ المسكينُ الَّذِی يَطُوفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ، وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، وَلٰكِنَّ المِسكينَ الَّذِی لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيهِ، وَلَا يُفْطَنُ لَهُ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ، وَلَا يَقُومُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مسکین وہ نہیں ہے جو لوگوں کے پاس سوال کے لئے چکر لگاتا رہے اور ایک دو لقمے یا ایک دو کھجوریں اس کو لوگوں کے دروازوں سے آگے بڑھادیں، بلکہ حقیقت میں ضرورت مند اور مسکین وہ آدمی ہے جس کے پاس اتنا نہیں ہے جس سے وہ اپنی ضرورت پوری کرسکے، اور (ساتھ ہی) اس نے اپنی حالت بھی ایسی نہیں بنائی ہے کہ کسی کو پتہ چلے کہ وہ اس کی ضرورت پوری کردے، اور کہیں کھڑے رہ کر لوگوں سے سوال بھی نہیں کرتا۔

افادات:- بھیک مانگنے والے کو آپ دو پیسے دیدیں تو وہ آگے چل دیتا ہے، روٹی کا ایک ٹکرا دے دو تو آپ کا پیچھا چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا، ایسا آدمی مسکین اور ضرورت مند نہیں ہے، وہ تو مانگ کر اپنی ضرورتیں پوری کرہی رہا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ حقیقی معنٰی میں مسکین (جس کے اوپر صدقہ کرنے کی قرآنِ پاک میں تاکید آئی ہے) کہلانے کا حقدار وہی آدمی ہے جس کی ظاہری حالت سے بالکل پتہ نہ چلے کہ وہ مستحق بھی ہے۔ اس لئے مال خرچ کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ جس شخص کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حقیقی معنوں میں مسکین کہا ہے اس کا پتہ چلا کر اس تک مال کو پہنچائیں۔

خرچ کرنے والوں کا فریضہ

اب اگر کوئی یہ کہے کہ جب وہ مانگتا نہیں ہے، اوراس نے ظاہری طور پر اپنی حالت بھی ایسی نہیں بنائی ہے جس سے اندازہ ہو؛ تو ایسے آدمی کا پتہ چلانا کیسے ممکن ہے؟ اگر وہ سوال کرے تب تو پتہ بھی چلے کہ وہ حق دار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اپنے وسائل اور ذرائع سے ایسے لوگوں کے حالات کی تحقیق کریں اور معلوم کریں، اور اپنے مال کو صحیح ٹھکانے پر پہنچانے کے لئے اُن تک صدقہ پہنچانے کی کوشش کریں، یہ مال خرچ کرنے والوں کا فرض اور ذمہ داری ہے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو زیادہ ثواب کے حقدار ہوں گے۔ اسلاف کے حالات جب ہم پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کا نہایت اہتمام کیا کرتے تھے۔

اِدھر بھی توجہ دیں

آج کل تو صدقہ کہاں کرنا چاہیے اور اس کا زیادہ حقدار اور صحیح مصرف کون ہے اس کو معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ رمضان المبارک میں بہت سے لوگ زکوٰۃ نکالتے ہیں تو ان کے دروازہ پر بھیک مانگنے والے جمع ہوجاتے ہیں، وہ خود بھی جانتے ہیں کہ ان کے پاس ان کی ضرورت سے زیادہ مال موجود ہے پھر بھی وہ لوگ انہیں کو زکوٰۃ کا مال دیدیتے ہیں، حالاں کہ اپنے ہی محلے ، بستی اور علاقے میں بہت سارے ضرورت مند لوگ

فاقوں میں مبتلا ہوتے ہیں، ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہورہی ہیں، وہ محتاج اور مقروض ہیں، لیکن ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ صدقہ کرنے والوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ اپنے وسائل استعمال کرکے حقیقی ضرورت مندوں کے بارے میں آگاہی حاصل کریں اور ان پر خرچ کرکے زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرنے کا اہتمام کریں۔

اللہ تعالیٰ سب کو توفیق واہتمام نصیب فرمائے

دعاء

اے اللہ! قناعت اور سوال سے بچنے کی صفت ہمیں نصیب فرما، اے اللہ! تیرے دئے ہوئے پر راضی رہنے کا وصف ہمیں عطا فرما۔ اے اللہ! بے صبری، جزع فزع اور طمع و حرص سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ دنیا اور مال وجاہ کی محبت سے ہمارے دلوں کو پاک اور صاف فرما۔ ہماری ضروریات کی خزانۂ غیب سے کفالت فرما۔ اے اللہ! نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جن اوصاف وکمالات کی تاکید فرمائی ہے اور ان کے حصول کی ترغیب دی ہے، وہ تمام اوصاف و کمالات محض اپنے فضل سے بلا استحقاق ہمیں نصیب فرما۔ اور وہ تمام برائیاں جن سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے، اے اللہ! محض اپنے فضل سے ان سے بچنے کا اہتمام نصیب فرما، اور محض اپنے فضل سے ان سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے ہماری حفاظت فرما۔ ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو دور فرما۔ حاجت مندوں کی حاجتیں پوری فرما۔ قید وبند میں محبوسین کو رہائی نصیب فرما، مقدمات میں ماخوذوں کو بری فرما۔ اے اللہ! جو جس مصیبت میں گرفتار ہے اس کو اس سے نجات

عطافرما۔ اے اللہ! پورے عالم میں جہاں کہیں بھی مسلمان آزمائش، پریشانیوں اور مصائب کا شکار ہیں؛ ان کو عافیت نصیب فرما۔ اے اللہ! اسبابِ لعنت وغضب سے اُن کی پوری پوری حفاظت فرماکر اسبابِ رحمت و مغفرت اختیار کرنے کی توفیق مرحمت فرما۔ حبیبِ پاک (ﷺ) نے جتنی بھی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی؛ وہ ہمیں اور پوری امت کو عطافرما، اور جن شروروبرائیوں سے پناہ چاہی، ان سے حفاظت فرما۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا انك انت التوّاب الرحيم

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰلہ واصحابہ أجمعین

برحمتك يا ارحم الراحمين

جواز الاخذ من غیر مسألة ولا تطلع الیه

بغیر سوال اور اشرافِ نفس کے کوئی چیز ملے؛ اس کو لینا

۱۵ / ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۷ / جون ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:-

باب کا عنوان

پہلے ایک عنوان قائم کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ملے اس پر آدمی قناعت اختیار کرے اور اپنے آپ کو بلا وجہ سوال سے بچانے کا اہتمام کرے۔ سوال کی جو مذمت اور برائی احادیث میں آئی ہے، وہ بیان ہو چکی۔ اب اسی مناسبت سے ایک اور باب قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی چیز بغیر سوال کے، یا بغیر کسی تدبیر کے آجائے۔ نہ تو اس نے کوئی مطالبہ کیا، نہ اس کی طرف کوئی لالچ رکھی، اس کے دل میں اس کا کوئی خیال بھی پیدا نہیں ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بھیج دی؛ تو پھر اس کو لینا چاہیے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں روایت لائے ہیں۔

بغیر اشراف وسوال کے کچھ ملے تو؟

حدیث ۵۳۸:-

عن سالم بن عبد الله بن عمر، عن أبيه عبد الله بن عمر، عن عمر (رضی اللہ عنہم) قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يُعْطِينِي العَطَاءَ، فَأَقُولُ: أعطِهِ مَنْ هُوَ أَفْقَرُ إِلَيْهِ مِنِّي. فَقَالَ: خُذْهُ، إِذَا جَاءَكَ مِنْ هَذَا المَالِ شَيْءٌ وَأَنْتَ غَيْرُ مُشْرِفٍ وَ لاَ سَائِلٍ، فَخُذْهُ فَتَمَوَّلْهُ۔ فَإِنْ شِئْتَ كُلْهُ، وَإِنْ شِئْتَ تَصَدَّقْ بِهِ، وَمَا لا، فَلاَ تُتبعهُ نَفْسَكَ. قَالَ سَالِمٌ: فَكَانَ عَبْدُ اللهِ لاَ يَسأَلُ أحداً شَيْئاً، وَلاَ يَرُدُّ شَيْئاً أُعْطِيَه.

ترجمہ:- حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں اور وہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی مجھے کوئی بخشش یا عطیہ عنایت فرماتے، تو مَیں عرض کرتا: اے اللہ کے رسول! آپ کی اس بخشش اور عطیہ کا جو آدمی مجھ سے زیادہ حاجت مند ہے آپ اس کو عنایت فرمائیے۔ اس پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد فرماتے: مَیں جو دے رہا ہوں وہ لے لو (پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک ہدایت فرمائی کہ دیکھو!) مال کے قبیل سے کوئی چیز اگر تمہارے پاس آئے، اور اس چیز کے متعلق تم نے اپنے دل میں کوئی تمنا بھی نہیں کی تھی، اور نہ ہی زبان سے سوال کیا تھا؛ تو اس کو لے لو اور مالک بن جاؤ، پھر چاہو تو صدقہ کر دو۔ اور اگر زبانی یا دلی طلب کے بغیر کوئی چیز نہ ملے تو پھر اپنے آپ کو اس کے پیچھے مت تھکاؤ۔ حضرت سالم فرماتے ہیں (چوں کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) بہت زیادہ متبعِ سنت تھے، اس لیے) ان کا معمول یہ تھا کہ کسی سے کوئی سوال نہیں کرتے

تھے اگر کوئی چیز کسی کی طرف سے بغیر سوال کے دی جاتی تو(اسی حدیث پر عمل کرنے کی غرض سے) اس کو رد بھی نہیں فرماتے تھے۔

افادات:-چوں کہ حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)نے نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)سے قناعت کی فضیلت سن رکھی تھی ،اور یہ بات بھی ان کے علم میں تھی کہ آدمی کومال کی حرص نہیں کرنی چاہیے، اس لئے حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)کے عطافرمانے پروہ یہ سمجھ کر کہ جوکچھ میرے پاس ہے وہ میری ضرورت کے لئے کافی ہے،آپ جو مجھے عطافرمارہے ہیں اس کے حقدار میرے مقابلہ میں دوسرے ہیں ؛لہٰذا وہ عرض کرتے کہ یہ چیز آپ دوسروں کو عنایت فرمایئے۔یہ عرض کرکے گویا وہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کی اس بخشش اورعطیہ کو قبول کرنے سے معذرت کرتے،تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشادفرمایاکہ جومَیں دے رہاہوں وہ لے لو۔

بعض مرتبہ توایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی کودیکھ کر اپنے دل میں سوچتا ہے کہ وہ مجھے فلاں چیز دیدے تو اچھا ہے۔یعنی زبان سے تواظہار نہیں کیا لیکن دل میں یہ جذبہ موجودہے کہ فلاں آدمی مجھے بخشش اور ہدیہ کے طور پرکچھ دے؛ اسی کو اشراف کہتے ہیں ۔ حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ آپ نے نہ تو زبان سے سوال کیا ،اور نہ دل میں ایساکوئی خیال گزرا ،اور وہ چیز تمہیں مل رہی ہے،تو اب تم اس چیز کو لے لو، اس کے مالک بن جاؤ۔ اس کے بعد اگر تمہیں ضرورت ہے تو اپنے استعمال میں لاؤ،اور اگر تمہیں ضرورت نہیں ہے تو کسی دوسرے کو دیدو، لیکن اس چیز کو واپس مت کرو۔لیکن اس کے لئے دو شرطیں لگائی ہیں،

ایک یہ کہ زبان سے سوال نہ کیاہو۔اور دوسرے یہ کہ دل میں بھی خواہش اور طلب پیدا نہ ہوئی ہو۔دلی اور زبانی طلب کے بغیراگر کوئی چیز میسر آجائے تو اس کو قبول کرلینا چاہیے۔

یہ اشراف نہیں ہے

اب دلی طلب کے سلسلہ میں ایک تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی دل میں یہ سوچتا ہے کہ فلاں آدمی مجھے ہدیہ کرے،اور اس کی طرف سے نہ ملنے پر دل میں رنج وملال بھی ہوتا ہے، اگر ایسی صورت ہے اور پھرکوئی آدمی کچھ دے رہاہے ؛تولیناجائز نہیں ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتاہے کہ ایک آدمی کی عادت ہی ہے کہ آپ اس کے یہاں جاتے ہیں،یا آپ کا جب اس سے ملنا ہوتا ہے، تو وہ ضرور کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش کرتا ہے، اس کی اُسی عادت کی وجہ سے آپ کے دل میں خیال آیا کہ یہ مجھے کوئی چیز دے گا، تواس کے قبول کرنے کے سلسلہ میں کیاحکم ہے؟ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مولانا خلیل احمدصاحب سہانپوری(رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ نقل فرماتے تھے کہ وہ پنجاب کے کسی شہر میں تشریف لے جایا کرتے تھے، وہاں کے نواب صاحب کے وزیر بھی عالم تھے،اوروہ حضرت تھانوی(رحمۃ اللہ علیہ)اورحضرت سہارنپوری(رحمۃ اللہ علیہ)کودعوت دیا کرتے تھےاوریہ حضرات تشریف لے جاتےتھے۔ ایک مرتبہ وہاں جاتےوقت حضرت سہارنپوری(رحمۃ اللہ علیہ) نے حضرت تھانوی

(رحمۃ اللہ علیہ) سے سوال کیا: اچھا! ایک بات بتلاؤ، ہم وزیر صاحب کے یہاں جاتے ہیں اور ان کا معمول ہے کہ جب ہم جاتے ہیں تو وہ کوئی نہ کوئی چیز ہدیہ میں پیش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے دل میں کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وہ کچھ دیں گے؛ تو یہ اشراف تو نہیں ہے؟ اس پر حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: اچھا! آپ یہ بتاؤ کہ اگر وہ نہ دیں تو دل میں کوئی رنج وملال پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا: نہیں! بس ایک خیال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عادت ہے تو وہ دیں گے، باقی اگر کچھ نہ دیں تو دل میں ذرّہ برابر بھی ناراضگی اور ملال نہیں ہوتا۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: پھر تو یہ اشراف میں داخل نہیں ہے۔

ایک اہم سبق

دیکھو! حضرت سہارنپوری (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے استاذ کے درجہ میں ہیں لیکن یہ حضرات اپنے نفس کے معاملہ میں اپنی ذات پر اعتماد نہیں کرتے تھے، جہاں اپنی ذات کا معاملہ ہوتا وہاں دوسروں سے پوچھا کرتے تھے، اس لئے کہ نفس اپنے لئے تو اچھی شکل ہی گھڑ لیا کرتا ہے، اپنے فعل کو تو اچھے محمل پر ہی محمول کیا کرتا ہے، اس لئے اپنے ذاتی معاملہ میں دوسروں سے پوچھا جائے۔

سلیقہ مند شاگرد کی ذکاوت ...واقعہ

اور اشراف ہی کے سلسلہ میں ایک واقعہ حضرت مولانامناظر احسن گیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) نے "اسلام کے نظامِ تعلیم و تربیت" میں نقل کیا ہے۔ایک بڑے عالم تھے جو درس دے رہے تھے،ان کے اوپر فاقہ کی حالت گزر رہی تھی،ان کے چہرہ اور آواز سے ظاہر ہورہا تھا کہ کئی وقت سے فاقہ ہے۔اگر کم مدت کا فاقہ ہوتو اس پر قابو بھی پایا جاسکتا ہے۔خیر! ان کے پاس پڑھنے والوں میں ایک رئیس بھی تھے، انہوں نے جب استاذ کی یہ کیفیت دیکھی تو کسی بہانہ سے اجازت لے کر گھر گئے ،اور تھوڑی دیر کے بعد ایک خوان لے کر آئے جس میں کھانے پینے کی مختلف اشیاء تھیں اوراستاذ کی خدمت میں پیش کیا۔اب کئی وقت کا فاقہ تھالیکن جب یہ لائے تواستاذ صاحب نے کہا: دیکھو!اس کا لینا میرے لیے جائز نہیں ہے اس لیے میں قبول نہیں کر سکتا ، کیوں کہ جب تم مجھ سے اجازت لے کر یہاں سے اُٹھے، اس وقت میرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ میرے واسطے کچھ لینے جارہے ہو۔چوں کہ میرے دل میں اس کی طرف رغبت پیدا ہوئی تھی اور آپ لے کر آئے ہیں؛تو یہ اشراف ہے۔اس لئے میرے لئے اس کا قبول کرنا جائز نہیں۔وہ شاگرد بھی سمجھدار تھے،جب استاذ نے منع کیاتو پوراخوان لے کر فوراً چلے گئے،استاذ کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے ، تھوڑی دیر کے بعد پھر لے کرحاضر ہوئے اور کہا : حضرت!اب تودل میں خیال نہیں رہا تھا؟استاذ نے کہا: ٹھیک ہے اب

نہیں رہا تھا تو عرض کیا: اب تو قبول فرما لیجئے۔ دیکھئے! ”محبت تجھ کو آدابِ محبت خود سکھا دے گی“ اسی کو کہتے ہیں۔

الحث علی الأکل من عمل یدہ والتعفف بہ عن السؤال والتعرض للأعطاء

کمانے کے لئے محنت کرنے اور سوال و سوالی جیسی صورت بنانے سے بچنے کی ترغیب

۱۵؍ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۷؍جون ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

روزی تلاش کرنے کی ترغیب

ایک اور عنوان قائم کیا ہے: اپنی روزی کے لیے اپنے ہاتھ سے محنت کرنے، دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے سے بچانے، اور سوالی کی سی حالت بنانے سے بچنے کی ترغیب۔

سوال کی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ کہ آدمی زبان سے کوئی چیز مانگے کہ مجھے دو۔ اور دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ زبان سے تو اظہار نہیں کرتا لیکن اپنی حالت ایسی ظاہر کرتا ہے جس سے دیکھنے والے کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اس کو کچھ دینا چاہیے، تو ان دونوں کی ممانعت ہے۔

ایک آیت لائے ہیں: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ جب نمازِ جمعہ پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ کی روزی تلاش کرو۔ چوں کہ اس آیت

میں باری تعالیٰ نے روزی تلاش کرنے کی ترغیب دی ہے، اور ظاہر ہے کہ ہر ایک کو یہ بات کہی جارہی ہے۔معلوم ہوا کہ آدمی کی اپنے ہاتھ کی محنت کی کمائی زیادہ پسندیدہ ہے۔

خود کام کرنا بہتر ہے

حدیث ۵۳۹:-

وعن أبي عبد الله الزبير بن العوّام (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): لأَنْ يَأْخُذَ أحَدُكُمْ أحبلَهُ ثُمَّ يَأْتِيَ الجَبَلَ، فَيَأْتِيَ بِحُزْمَةٍ مِنْ حَطَب عَلَى ظَهْرِهِ فَيَبِيعَهَا، فَيكُفَّ اللهُ بِهَا وَجْهَهُ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أنْ يَسْأَلَ النَّاسَ، أعْطَوْهُ أَوْ مَنَعُوهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت زبیر بن العوام (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنی رسیاں اُٹھائے (تاکہ لکڑیاں چن کر جمع کرے تو ان کو باندھنے کے کام آئے) اور پہاڑ پر جاکر لکڑیوں کا گٹھر اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آئے پھر بازار میں فروخت کرے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اس کے چہرے کو دوسروں کے سامنے سوال کی بے عزتی سے بچائے؛ یہ اس بات سے بہتر ہے کہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے، پھر وہ چاہے تو دے، چاہے تو منع کردے۔

حدیث ۵۴۰:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): لأَنْ يَحْتَطِبَ أحَدُكُمْ حُزْمَةً عَلَى ظَهْرِهِ، خَيْرٌ لَهُ مِنْ أنْ يَسْأَلَ أحداً، فَيُعْطِيَهُ أَوْ يَمْنَعَهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا گٹھر لے کر آئے وہ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے اس بات سے کہ کسی سے سوال کرے، پھر وہ چاہے تو دے، چاہے تو نہ دے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جنگل میں جاکر لکڑیاں چن کر لا کر بازار میں فروخت کرنا اور اس طرح دوسروں کے سامنے سوال کی بے عزتی سے بچنا زیادہ بہتر ہے جیسا کہ پہلے بھی روایت آچکی ہے کہ سوال کے نتیجہ میں قیامت کے روز چہرے پر خراش نمایاں ہوگی۔ اور یہ آدمی محنت مزدوری کرکے اپنی ضرورت پوری کررہا ہے تو گویا اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے اس کے چہرے کو بدنما ہونے سے بچارہا ہے۔ اس لیے کہ کوئی آدمی کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے تو اس بات کی کوئی گارنٹی تو ہے نہیں کہ اس کا سوال پورا ہی کیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ دے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ نہ دے۔ جب اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے رسوا کرکے بھی ضرورت پوری ہونے کی گارنٹی نہیں ہے تو اس کے مقابلہ میں محنت مزدوری سے جو بھی حاصل ہو وہ زیادہ اچھا ہے، اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے عزت تو رکھ لی۔

نبی اور بادشاہ بھی ہاتھ سے کماتے تھے

حدیث ۵۴۱:-

وعنه عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: كَانَ دَاوُدُ (علیہ السلام) لَا يَأْكُلُ إِلَّا مِنْ عَمَلِ يَدِهِ. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: حضرت داود علٰی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتے تھے۔

افادات:- حالاں کہ ان کے پاس بڑی بادشاہت تھی، ان کے ہاتھوں میں ملک کے خزانوں کی چابیاں تھیں، وہ مالک و مختار تھے، اس کے باوجود شاہی خزانہ سے نہیں کھاتے تھے، بلکہ اپنے ہاتھ سے مزدوری کرتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے لوہے کو موم کی طرح نرم بنادیا تھا، وہ اس سے زِرَہ یعنی لوہے کی شیروانی بناتے تھے اور اسی کو بیچ کر جو مزدوری آتی تھی اس سے اپنا گزران کرتے تھے، حالاں کہ اتنی بڑی حکومت کے مالک تھے، لیکن حکومت کی رقم کو اپنی ضرورتوں میں استعمال نہیں کرتے تھے۔

حضرت زکریا (علیہ السلام) کا پیشہ

حدیث ۵۴۲:-

وعنه (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: كَانَ زَكَرِيَّا (علیہ السلام) نَجَّاراً.

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: حضرت زکریا (علیہ السلام) بڑھئی تھے (جس کو ہم ستھار "सुथार" کہتے ہیں۔ اور اس کی جو اجرت آتی تھی اس سے اپنا گزر بسر کرتے تھے۔)

افادات:-ویسے بھی جو چیزیں انسانی ضرورت کی ہیں ان پیشوں کا علم اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء (علیہم السلام) کے ذریعہ سے ہی لوگوں تک پہنچایا ہے۔ جیسے کپڑے بننے اور سینے کا کام ، بڑھئی، ستھاری، لوہاری کا کام، زراعت اور طب وغیرہ ؛ چوں کہ یہ سب انسانی ضرورتوں کی چیزیں ہیں، اس لیے یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام (علیہم السلام) پر وحی کے ذریعہ سے القاء فرمائیں، پھر انہی کے واسطے سے لوگوں کو سکھلائی گئی ہیں۔

ہاتھ کی کمائی

حدیث ۵۴۳:-

وعن المقدام بنِ مَعْدِیکرِب (رضی اللہ عنہ) عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: مَا أَکَلَ أَحَدٌ طَعَاماً قَطُّ خَیْراً مِنْ أَنْ یَأْکُلَ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ، وَإِنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ دَاوُدَ (صلی اللہ علیہ وسلم) کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:-حضرت مقدام (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کسی نے کوئی کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر نہیں کھایا۔ اور بے شک اللہ کے نبی داود (علیہ السلام) اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھایا کرتے تھے۔

افادات:- اپنے ہاتھ سے جو محنت مزدوری کر کے حاصل کرے گا،اور اس سے کھانے کی چیز خرید کر کھائے گا، وہ اس کے حق میں سب سے بہتر ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو خود کمانے کے واسطے کوشش کرنی چاہیے ، چاہے وہ مزدوری کی شکل میں ہو ، زراعت اور کھیتی باڑی کی شکل میں ہو،یامحنت کی جو بھی مختلف شکلیں ہیں ان میں سے کوئی بھی جائز شکل اختیار کرے؛تو وہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے۔باقی آدمی اگر بیٹھا رہے اور دوسروں کے اوپر نگاہیں ڈالے رہے،تو یہ شکل شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے۔البتہ وہ حضرات جن کو توکل کا اونچا مقام حاصل ہے،وہ محنت مزدوری نہ کرنے کے باوجود کسی کے اوپر نگاہ ڈالے ہوئے نہیں ہوتے؛ ان کے لئے کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

الکرم والجود

اوالانفاق فی وجوہ الخیر

ثقۃ باللہ تعالیٰ مجلس ۱

سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے

نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا

مجلس ۱

۱۵/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۱۷/ جون ۲۰۰۰ء

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡكَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

ترجمۃ الباب کا خلاصہ

پچھلے باب میں کمانے کی فضیلت آئی تو ظاہر ہے جب آدمی محنت مزدوری کرے گا تو اس کے نتیجہ میں ہاتھ میں پیسہ آئے گا تو اس کو کہاں استعمال کرنا چاہیے؟ اسی کو اس باب میں بتلایا جارہا ہے۔نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے سخاوت سے کام لینا۔یعنی آدمی کے پاس مال ہوتا ہے تو نفس و شیطان اس کو ترغیب دیتے ہیں کہ مال کو خرچ مت کرو ،کچھ اپنے پاس بھی رہنے دو، آڑے وقت کام آئے گا۔اب سوال یہ ہے کہ آڑے وقت اگر ضرورت بھی پڑے گی تو کتنے کی پڑے گی؟ہزار، دو ہزار، پانچ ہزار کی پڑے گی، لیکن جو دس لاکھ پڑے ہیں اس کو آڑے وقت کے نام سے خرچ کرنے سے نفس روکتا ہے۔اسی لئے کہا گیا کہ آدمی کو ایسے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے خرچ

کرناچاہیے۔اللہ تعالیٰ نے جب ابھی دیا ہے تواس وقت بھی وہی دے گااور ضرورت پوری کرے گا۔نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے ہاتھ کو روکنا پسندیدہ نہیں ہے۔

﴿وَمَآأَنْفَقْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ(سورۃ سبا:۳۹)﴾جوکچھ بھی تم خرچ کرو گے ،اللہ تعالیٰ اس کا معاوضہ اوربدلہ دنیا اور آخرت میں عطا فرمائے گا۔

﴿وَمَاتُنفِقُواْمِنْ خَيْرٍ فَلأَنْفُسِكُمْ وَمَاتُنفِقُونَ إِلاَّ ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللهِ۔ وَمَاتُنفِقُواْمِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لاَتُظْلَمُونَ.(البقرۃ۲۷۲)﴾جو کچھ بھی مال تم خرچ کروگے وہ اپنے واسطے ہی کروگے،یعنی اس کا فائدہ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی تم کوہی پہنچنے والا ہے،وہ کہیں ضائع جانے والی چیز نہیں ہے۔اور مال میں سے جو کچھ تم اللہ کو راضی کرنے کے لئے خرچ کروگے ، اللہ تعالیٰ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دے گا، اور تمہارے خرچ کئے ہوئے کے اجر وثواب میں دنیا کے بدلہ میں ذرّہ برابر کمی نہیں کی جائے گی۔

حسد جائز نہیں ہے مگر...

حدیث ۵۴۴:-

وعن ابن مسعود(رضی اللہ عنہ)عن النبیِّ(صلی اللہ علیہ وسلم)قَالَ:لاحَسَدَ إِلاَّ فی اثْنَتَيْنِ؛ رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالاً ،فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فی الحَقّ.وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ حِكْمَةً ،فَهُوَ يَقْضِي بِهَا ويُعَلِّمُهَا .(متفقٌ عَلَيهِ)

ومعناه: يَنْبَغي أنْ لاَ يُغبَطَ أحَدٌ إلاَّ عَلَى إحْدَى هَاتَيْنِ الخَصلَتَيْنِ.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:حسد جائز نہیں ہے، مگر دو آدمیوں کے معاملہ میں۔ایک وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا،اس کے بعد اس کو حق میں (نیکی کے کاموں میں) اس مال کے ختم کرنے پر مسلط کردیا۔اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا،اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہےاور لوگوں کو بھی علم سکھلاتا ہے۔

افادات:-ویسے حسد کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا کی ہے ، صاحبِ نعمت کی اس نعمت کو دیکھ کر کوئی آدمی یوں سوچے کہ اللہ تعالیٰ یہ نعمت اس کے پاس سے چھین کر مجھے دیدے؛اس کو حسد کہتے ہیں اور یہ حرام ہے۔اور اگر یہ خیال ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت اس کو عطا فرمائی ہے،اس کے پاس بھی باقی رہے اور ایسی نعمت اللہ تعالیٰ مجھے بھی دے؛تو اس کو عربی میں ’’غبطہ ‘‘کہتے ہیں، اور اردو میں اسی کو’’رشک‘‘کہتے ہیں۔اس روایت میں فرمایا گیا کہ دوآدمیوں کے اوپر حسد کرسکتے ہیں۔اہلِ علم فرماتے ہیں کہ یہاں حسد بول کر رشک اور غبطہ مراد ہے کہ دو آدمی ایسے ہیں کہ اُن کی نعمت کو دیکھ کر تم اپنے دل میں یہ تمنا کرسکتے ہو کہ اللہ تعالیٰ ایسی نعمت اس کے ہاتھ سے چھینے بغیر ہمیں بھی عطا فرمائے۔

’’فِی الْحَقِّ‘‘ یعنی نیکی کے کاموں میں جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔یعنی بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے پاس مال ہوتا ہے تو وہ نیکی کے کاموں میں خوب خرچ کرتے ہیں اوراس کثرت سے خرچ کرتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے ان کو مال سے

عداوت اور دشمنی ہے،اس کو اپنے پاس رکھنا ہی نہیں چاہتے ؛ ایسے آدمی کو دیکھ کر کوئی رشک کرے اور دل میں یہ تمنا کرے کہ: کاش! اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی مال دیا ہوتا تو میں بھی مال کو نیکی کے کاموں میں اسی طرح خرچ کرتا جس طرح یہ آدمی خرچ کرتا ہے؛تواس کی اجازت ہے۔

اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، اس کے ذریعہ سے وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے ،اورلوگوں کو علم سکھلاتا ہے؛ یہ آدمی بھی اس قابل ہے کہ اس پر رشک کیا جائے۔ہم یوں سوچیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسا علم دیتا توہم بھی اسی طرح حق کے مطابق فیصلہ کرتے اور لوگوں کو یہ علم سکھاتے۔یہ دو آدمی ہیں جن پر رشک کیا جاسکتاہے اور اس کی ترغیب آئی ہے۔

مومن کا حقیقی مال تو یہی ہے؟

حدیث ۵۴۵:-

وعنه قَالَ:قَالَ رسولُ الله (ﷺ): أَيُّكم مَالُ وَارِثِهِ أحبُّ إِلَيهِ مِنْ مَالِهِ؟قالوا:يَارسول اللهِ!مَامِنَّا أحَدٌ إلاَّ مَالُهُ أحبُّ إِلَيهِ.قَالَ:فإنَّ مَالَهُ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهِ مَا أخَّرَ.(رواه البخاري)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے سوال کیا: تم میں سے کون ہے جس کو اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے ہر ایک کو اپنا ہی مال زیادہ محبوب ہے (وارث کا مال کس کو محبوب ہوگا؟) حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: (اگر اپنا ہی مال محبوب ہے تو) اپنا مال تو وہ ہے جو آگے بھیج دیاجائے، جو مال چھوڑ کر گئے ، وہ وارث کا مال ہے (تو اب دیکھ لو کہ تم کون سے مال سے محبت کرتے ہو)

افادات:-عام طور پر آدمی کا جو فطری تقاضہ اور طبیعت ومزاج ہے کہ ہر ایک کو اپنا ہی مال دوسرے کے مال کے مقابلہ میں زیادہ محبوب ہوتا ہے۔ دوسرے کا مال ہلاک بھی ہوجائے تو کچھ پرواہ نہیں ہوا کرتی۔

بہت سی مرتبہ آدمی زندگی بھر لاکھوں روپے جمع کرتاہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا مال ہے، لیکن جب موت آتی ہے تواس مال کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چلاجاتاہے ،نہ تو اس مال کواپنی ضروریات (کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں) استعمال کیا،نہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا؛بس! ایسے ہی چھوڑ کر چلاگیا۔اب پتہ چلا کہ وہ جس کو زندگی بھر اپنا مال سمجھتارہا،وہ اس کا نہیں تھابلکہ وارثوں کاتھا جن کے ہاتھ میں اب پہنچاہے۔تواس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اپنا تو وہی ہے جو خرچ کرکے آگے بھیج دو۔اس روایت میں اس بات کی ترغیب دی جارہی ہے کہ

آدمی کو چاہیے کہ جو کچھ اپنی ضرورت سے زائد ہو اس کو خرچ کرکے آگے بھیج دے، ورنہ تو دوسروں کے لیے پیچھے چھوڑ کر جانا ہو گا۔

اس سے بڑی حماقت کیا ہو گی؟

اور پھر جو بھی کام اپنے لیے کرلے گا وہ اس کے لیے آخرت میں کام آنے والا ہے، دوسروں پر بھروسہ کرنا اور دوسروں سے امید وتوقع رکھنا فضول ہے۔ پہلے بھی میں نے عرض کیا تھا کہ خود کمایا، اپنے پاس اپنی تحویل میں، اپنے کنٹرول میں اور اپنے اختیار میں رہا، پھر بھی اپنے لیے خرچ نہیں کیا، اور جب مرا تو دوسروں کے لیے چھوڑ کر گیا پھر یہ امید رکھتا ہے کہ اب دوسرے میرے لیے کچھ خرچ کریں گے ،اس سے زیادہ نادانی اور بے وقوفی اور کیا ہو گی! جب تمہارے ہاتھ میں تھا ، تم نے کمایا تھا، تم مالک تھے پھر بھی خود خرچ نہیں کیا کہ آخرت میں کام آئے ،اور اب یہ امید رکھتے ہو کہ میرے بعد میری اولاد اس مال میں سے میرے لیے کچھ خرچ کرے گی۔ جب خود خرچ نہیں کیا ،تو وہ کیا خرچ کرے گی؟ یہ امید تو فضول ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنے مال میں سے اپنے ہاتھوں سے خود ہی خرچ کرلے۔

ایک غلط سوچ، اور اس کی اصلاح

آدمی یوں سوچتا ہے کہ اگر میں اولاد کے لیے نہیں چھوڑوں گا تو میرے بعد میری اولاد کیا کرے گی؟ اللہ اکبر! ارے بھائی! تمہاری اولاد کو جس خدا نے پیدا کیا ہے وہی اس کا انتظام کرے گا۔ گویا ہم تو (نعوذ باللہ) خدا بنے بیٹھے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو پال رہے ہیں، ان کی ضرورتیں ہم پوری کر رہے ہیں۔ حالاں کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں تھا؛ اس وقت اس کی ضرورتیں کون پوری کر رہا تھا؟ ہر ایک کی ضرورت اللہ تعالیٰ ہی پوری کرتا ہے۔ آدمی یوں سوچتا ہے کہ بچوں کے لیے میں کچھ کر کے جاؤں۔ تو بھائیو! ان کے لیے اگر کچھ کرنا ہی ہے تو وہ کرو جس کی شریعت نے آپ کو تاکید کی ہے یعنی ان کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرو، ان کو علم سکھاؤ، اچھے اعمال کا پابند بناؤ، ان کی تعلیم و تربیت کی طرف توجہ دو۔ اصل کام تو یہ ہیں جو ہر آدمی کو اپنی اولاد کے لیے کرنے چاہئیں، اور شریعت میں انہی کی تاکید کی گئی ہے۔

اگر کسی روایت میں یہ آیا ہو تو ہمیں بتاؤ کہ اپنی اولاد کے لئے مکان چھوڑ کر جاؤ، زمین چھوڑ کر جاؤ، روپے پیسے چھوڑ کر جاؤ۔ ہاں! یہ حکم تو آیا ہے کہ جب تک وہ چھوٹے ہیں، حاجت مند ہیں، آپ کی تحویل میں ہیں تو ان کے کھانے پینے کا انتظام کرو، لیکن یہ بھی سوچو کہ وہ چھوٹے ہیں تب بھی اگر آپ کو موت آگئی تو آپ کے بعد ان کا کیا حال ہو گا؟ ان کی ضرورتیں پوری ہوں گی یا نہیں؟ ضرور پوری ہوں گی۔ آدمی ایک طرف یوں سمجھ رہا ہے کہ

جب بڑے ہوں گے اس کے بعد یہ مجھے کما کر کھلائیں گے، اور دوسری طرف یوں سوچتا ہے کہ میں ان کے لئے کچھ چھوڑ کر جاؤں۔ یعنی ہماری زندگی تضادات کا شکار ہے، آدمی دونوں طرف کی باتیں کرتا ہے، اولاد سے امید بھی رکھتا ہے، اور اولاد کے لئے کچھ چھوڑنا بھی چاہتا ہے۔

کھجور کے ایک ٹکڑے کی تاثیر

حدیث ۵۴۶:-

وعن عَدِيِّ بن حَاتِمٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن حاتم (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ، چاہے کھجور کے آدھے ٹکڑے کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- اگر آپ کھجور کا ایک ٹکڑا اللہ کے راستہ میں صدقہ کریں گے تو گویا اس کے ذریعہ سے آپ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچا رہے ہیں۔ جب کھجور کے ایک ٹکڑے میں یہ تاثیر ہے تو زیادہ خرچ کرنے میں کیا کچھ تاثیر نہیں ہوگی۔

آپ (ﷺ) نے کبھی ”نا“ نہیں کہا

حدیث ۵۴۷:-

عن جابرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: مَاسُئِلَ رسولَ اللہِ (ﷺ) شَيْئاً قَطُّ، فقالَ: لاَ. (متفقٌ عَلَيۡهِ)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ نبیؑ کریم (ﷺ) سے کوئی چیز مانگی گئی ہو اور آپ نے ”نا“ کہا ہو۔

افادات:- جب بھی کوئی چیز مانگی گئی تو آپ (ﷺ) نے فوراً دے دی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ آپ سے سوال کیا گیا ہو اور آپ نے انکار فرمایا ہو، بلکہ اگر آپ کے پاس نہیں ہوتا تو وعدہ فرمالیتے تھے، دوسرے وقت بلا لیتے تھے۔ بعض لوگوں کو یوں کہہ دیا کرتے تھے کہ کسی سے لے لو، میں تمہارا قرضہ ادا کردوں گا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کا چہرہ کِھل گیا

ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا۔ ایک آدمی آیا، اس نے اپنی حاجت پیش کی، نبی کریم (ﷺ) کے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، آپ (ﷺ) نے فرمایا: اچھا بھائی! تم کہیں سے اُدھار لے لو، بعد میں مَیں ادا کردوں گا۔ اس پر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جو چیز آپ کے پاس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا آپ کو مکلف نہیں بنایا ہے، پھر آپ بلاوجہ

بوجھ کیوں اپنے سر لے رہے ہیں ؟لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) کی اس بات سے حضورِ اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کو بہت زیادہ ناگواری ہوئی۔ ایک انصاری نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ خوب خرچ کیجئے اور عرش والے کی طرف سے ذرّہ برابر بھی کمی کی پرواہ نہ کیجئے،یعنی اللہ تعالیٰ محروم نہیں کرے گا۔یہ سن کر حضورِ اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کا چہرہ کِھل گیا اور فرمایا:مجھے اسی کا حکم ہے(مسند بزار:۲۷۳/ تہذیب الآثار للطبری:۱۱۸)

بہر حال! حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی مانگنے والے کو انکار نہیں فرمایا ، بلکہ جو چیز مانگی گئی وہ عطا فرمادی ، حتیٰ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضرورت کی ہوتی تھی وہ بھی دے دیا کرتے تھے

باوجود سخت ضرورت کے چادر دے دی

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک عورت نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں ایک چادر لے کر آئی جو لنگی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔اس نے آکر عرض کیا:اے اللہ کے رسول!میں نے اپنے ہاتھ سے سوت کات کر یہ چادر بنائی ہے، تاکہ آپ اس کو لنگی یا ازار کے طور پر استعمال کریں۔راوی کہتے ہیں:عین ایسے موقعہ پر آکر اس عورت نے وہ چادر پیش کی تھی کہ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) کو خود اس کی سخت ضرورت تھی،اس وقت آپ کے پاس لنگی نہیں تھی۔چناں چہ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو قبول فرمالیا ،پھر آپ مکان میں تشریف لے گئے،اس کو پہن کر تشریف لائے۔جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی مجلس میں بیٹھے تو ایک صحابی آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) کے قریب ہوئے اور اس

کو ہاتھ لگا کر کہنے لگے :اے اللہ کے رسول! یہ مجھے دے دیجئے۔ حضور(ﷺ)نے کہا: ٹھیک ہے۔آپ (ﷺ)دوبارہ گھر میں تشریف لے گئے اوروہ چادرتہ کرکے بھجوائی۔ جب آپ (ﷺ)گھر میں تشریف لے گئے تو دوسرے صحابہ(رضی اللہ عنہ) نے ان صحابی کوآڑے ہاتھوں لیاکہ تمہیں سمجھ نہیں پڑتی، تمہیں معلوم ہے کہ حضور (ﷺ) کے پاس اس وقت کوئی کپڑا نہیں ہے، آپ کو بڑی شدید ضرورت تھی ایسی حالت میں یہ چادر آپ کے پاس ہدیہ میں آئی، آپ نے اس کو زیب تن کیااورتم نے اس کو مانگ لی؟ انہوں نے کہا: میں نےاس لئےمانگی ہے کہ یہ میرا کفن بنے۔چناں چہ روایتوں میں ہے اس چادر کو ان صحابی نے محفوظ رکھا یہاں تک کہ انتقال کےبعدان کے کفن میں استعمال ہوئی(بخاری شریف.باب مَنِ اسْتَعَدَّ الْكَفَنَ فِي زَمَنِ النبی(ﷺ) فَلَمْ يُنْكَرْ عَلَيْهِ.حدیث رقم:۱۲۷۷) یہاں تو بتانا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیز تھی پھر بھی نبی کریم (ﷺ)نے عطا فرمادی۔

حضرت امام زین العابدین(رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق فرزدق شاعر کا ایک قصیدہ ہےجس کا ایک شعریہ ہے:-

مَاقَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ

لَوْ لَا التَّشَهُّدُ لَكَانَتْ لَاءُهٗ نَعَمْ

انہوں نے کلمۂ شہادت کے علاوہ کبھی اپنی زبان سے ’’لا‘‘کہا ہی نہیں۔اگر کلمۂ شہادت نہ ہوتا تو ان کی زبان پر’’ لا‘‘ آتا ہی نہیں۔

سخاوت کی برکت اور بخل کی نحوست

حدیث ۵۴۸:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): مَا مِنْ يَوْمٍ يُصبحُ العِبَادُ فِيهِ إِلاَّ مَلَكَانِ يَنْزلانِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقاً خَلَفاً، وَيَقُولُ الآخَرُ: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكاً تَلَفاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ہر دن جب بندے صبح کرتے ہیں تو دو فرشتے اُترتے ہیں (بعض روایتوں میں ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی دونوں طرف دو فرشتے ہوتے ہیں) ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! جو تیرے راستہ میں خرچ کرنے والا ہو اس کو اس مال کا جو اس نے خرچ کیا ہے بدلہ عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! جو خرچ کرنے کی جگہ میں خرچ نہیں کرتا، روکے رکھتا ہے، اس کے مال کو ہلاک کردے۔

افادات:- ظاہر ہے کہ فرشتوں کی دعا تو ضرور قبول ہوگی۔ بعض شرّاح نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں "مُمْسِكاً تَلَفاً" میں مطلق تلف فرمایا گیا ہے۔ گویا جو آدمی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتا ہے، اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہاں خرچ نہیں کرتا ہے، تو صرف مال ہی نہیں، بلکہ اس کی دوسری صلاحیتیں بھی ضائع ہوتی ہیں، اللہ کی راہ میں استعمال میں نہیں آتیں۔ بخل کی یہ نحوست ہے۔

پہلے خالی کرو، تو بھری جائے گی

حدیث ۵۴۹:-

وعنه أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَنْفِقْ يَاابْنَ آدَمَ يُنْفَقْ عَلَيْكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا (یہ حدیث قدسی ہے) اے انسان! خرچ کر؛ تجھ پر خرچ کیا جائے گا۔

افادات:- باری تعالیٰ فرماتے ہیں: تم خرچ کرو تو تم کو ملے گا۔ اگر خرچ نہیں کروگے تو نہیں ملے گا۔ ہر چیز کے اندر قدرت کا یہی قانون ہے جیسے: آپ یہاں کی کھڑکیاں بند کردیں، ہوا کے آنے جانے کا راستہ نہ رکھیں؛ تو تازہ ہوا نہیں آئے گی۔ اگر آپ کھڑکی کھول دیں گے، ہوا کے جانے کا راستہ نکال دیں گے؛ تو نئی ہوا آئے گی۔ اسی طرح آپ کی جیب بھری کی بھری ہے، تو دوسرا کہاں سے آئے گا، پہلے اس کو خالی کرو تو دوبارہ بھری جائے گی۔ جیب بھری کے بھری ہی رہنے دیتے ہیں، خالی تو کرتے نہیں، پھر دوسرے کے آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ برتن بھرا ہوا ہے تو نئی چیز اس میں کیسے آئے گی؟ نئی چیز لینا چاہتے ہو تو اس برتن کو پہلے خالی کرو، پھر اس میں نئی چیز آئے گی۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم خرچ کرو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خرچ کیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں میں خرچ

کرنے کی تاکید فرمائی اور ترغیب دی ہے، اس میں خرچ کرنے کے معاملہ میں آدمی کو بخل سے کام نہیں لینا چاہیے۔

۲۲/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۴/جون ۲۰۰۰ء

بیان چل رہا تھا کہ اللہ کے اعتماد پر نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا اور سخاوت و فراخ دلی سے کام لینا۔اسی سلسلہ میں آگے مزید روایتیں پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے اعمال میں بہترین عمل

حدیث ۵۵۰:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ العَاصِ(رضی اللہ عنہ)أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُوْلَ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم): أَيُّ الإسْلَامِ خَيْرٌ؟ قَالَ: تُطْعِمُ الطعامَ وَتَقْرَءُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَّمْ تَعْرِفْ.(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے سوال کیا: اسلام کے اعمال میں سب سے اچھا عمل کون سا ہے؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: کھانا کھلانا۔اور جس کو پہچانتے ہو اور جس کو نہیں پہچانتے؛ سب کو سلام کرنا۔

افادات:- سلام؛ مسلمان ہونے کے ناطے سے اسلامی ایک حق ہے، اس میں پہچان والا ہونا ضروری نہیں ہے،بس! جس کا مسلمان ہونا معلوم ہو جائے اس کو سلام کیا جائے؛ چاہے اس کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو،بلکہ صرف پہچان والے کو سلام کرنا تو آخری زمانہ کی نشانی بتلائی گئی ہے۔اور نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسلام کے سب سے اچھے عمل میں نمبر اول پر کھانا کھلانا بتلایا

ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نیکی کا ایسا کام ہے جو مال خرچ کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اس روایت میں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ آدمی اس کام میں اپنا مال خرچ کرے۔

یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے

حدیث ۵۵۱:-

وعنه قَالَ: قَالَ رسول الله (ﷺ): أَرْبَعُونَ خَصْلَةً: أَعْلاهَا مَنِيحةُ العَنْزِ، مَا مِنْ عَامِلٍ يَعْمَلُ بخَصْلَةٍ مِنْهَا؛ رَجَاءَ ثَوَابِهَا وَتَصْدِيقَ مَوْعُودِهَا، إلاَّ أدْخَلَهُ اللهُ تَعَالَى بِهَا الجَنَّةَ. (رواه البخاری . وقد سبق بيان هَذَا الحديث فی باب بَيَانِ كَثْرَةِ طُرُقِ الخَيْرِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: چالیس کام ایسے ہیں کہ کوئی بھی اللہ کا بندہ اگر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اور اس کام پر دنیا اور آخرت میں جو ثواب اور بدلہ ملنے والا ہے اس وعدہ کو سچا سمجھتے ہوئے کسی بھی ایک کام کو کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کریں گے۔ ان چالیس کاموں میں سے ایک کام دودھ دینے والی بکری کسی کو عاریت کے طور پر دینا ہے۔

افادات:- بہت سی جگہوں پر دیہاتوں میں آج بھی یہ رواج ہے کہ کسی آدمی کے پاس بہت سارے دودھ دینے والے جانور ہیں، مثلاً: کئی بکریاں دودھ دیتی ہیں، خود مالک کی دودھ کی ضرورت تو ایک دو سے پوری ہو جاتی ہے، تو ان میں سے ایک دو بکری اپنے کسی رشتہ

دار، یاکسی غریب کو دیدیتے ہیں کہ جب تک یہ جانوردودھ دیتا رہے، تم اس کو اپنے پاس رکھو، اوراس کے دودھ سے فائدہ اٹھاؤ ،جب یہ جانوردودھ دینا بندکردے تو واپس کردینا۔ دودھ دینے والی بکری، اونٹنی، گائے یا بھینس؛جب تک کہ وہ دودھ دے کسی کواستعمال کرنے کے لئے دینا، تاکہ وہ اس کے دودھ سے فائدہ اٹھائے -نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جن چالیس کاموں میں سے کسی بھی ایک کام کے کرنے پر اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرماتے ہیں ان میں- یہ کام بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ گویا خرچ کرنے کی ایک چیز یہ بھی ہے،اس لئے اس کو یہاں ذکر کیاہے۔

مال خرچ کرنے کی تعلیم اور ترتیب

حدیث ۵۵۲:-

وعن أَبِي أُمَامَةَ صُدَيِّ بْنِ عَجْلَانَ (رضی اللہ عنہ) قال قال رسولُ اللهِ (ﷺ) : يَاابْنَ آدمَ !إِنَّكَ أَنْ تَبْذُلَ الْفَضْلَ خَيْرٌ لَّك. وَاَنْ تُمْسِكَهُ شَرٌّ لَّك. وَلَا تُلَامُ عَلَى كَفَافٍ وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ. وَالْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلَى. (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابو امامہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا :اے انسان! تو اپنا زائد مال خرچ کردے، یہ تیرے لیے بہتر ہے۔اور اس کو اپنے پاس رہنے دے، یہ تیرے لیے برا ہے۔البتہ آئندہ جتنی مقدار کی ضرورت پڑنے والی ہے اس کو اگر تو اپنے پاس روکے رکھے، اس پر کوئی ملامت نہیں

(حرج کی بات بھی نہیں ہے)اور جب خرچ کرنا شروع کرے تو جن لوگوں کا خرچہ تیرے ذمہ ہے،ان سے خرچ کرنے میں شروعات کر۔اور اوپر والا ہاتھ (یعنی خرچ کرنے والا)نیچے والے(یعنی مانگنے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔

افادات:-زائد مال کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری ضرورتیں پوری ہو جانے کے بعد جو بچ جائے۔اس مال کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرنا بہتر ہے،اس لئے کہ اگر خرچ نہیں کروگے تو ایک وقت آئے گا جب تم دنیا سے جارہے ہوگے، توسب مال یہیں چھوڑ کر جاؤگے،اس وقت وہ تمہارے کسی کام آنے والا نہیں ہے۔تمہارے بعد جو لوگ آنے والے ہیں ان کے ہاتھ میں پہنچے گا۔اگر تم نے اس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کر دیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں ذخیرہ ہو جاتا،وہاں کے بینک میں جمع ہو جاتا اور تمہارے لیے کارآمد ہو تا۔

اور جب خرچ کرنا شروع کرو تو جن کے خرچ کی ذمہ داری تم برداشت کرتے ہو پہلے ان کو دو،شروعات اپنے گھر ہی سے کرنی چاہیے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ آپ نیکی کے طور پر خرچ کرنا شروع کریں تو دوسروں کو تو دیں اور جن کے خرچ کی ذمہ داری تمہارے سر ہے،وہ بیچارے محروم رہیں، دوسروں کو آپ کی سخاوت سے فائدہ ہو رہا ہے،اور یہ بیچارے بھوکے مر رہے ہیں۔

سخاوت سے اسلام محبوب بن جاتا

حدیث ۵۵۳:-

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ مَا سُئِلَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) عَلَى الإِسْلَامِ شَيْئاً إِلاَّ أَعْطَاهُ. وَلَقَدْ جَاءَهُ رَجُلٌ، فَأَعْطَاهُ غَنَمًا بَيْنَ جَبَلَيْنِ، فَرَجَعَ إِلَى قَوْمِهِ، فَقَالَ: يَا قَوْمِ! أَسْلِمُوا؛ فَإِنَّ مُحَمَّداً يُعْطِي عَطَآءَ مَن لا يَخْشَى الفَقْرَ، وَإِنْ كَانَ الرَّجُلُ لَيُسْلِمُ مَا يُرِيدُ إِلاَّ الدُّنْيَا، فَمَا يَلْبَثُ إِلاَّ يَسِيراً حَتَّى يَكُونَ الإِسْلَامُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا . (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:-حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی طرف سے اسلام قبول کرنے کے اوپر بطورشرط کے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کسی چیز کا سوال ہوتا تو آپ ضرور دیدیتے۔ایک مرتبہ ایک آدمی آیا،اس نے مسلمان ہونے پر شرط رکھی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو دو پہاڑوں کے درمیان(جو وادی ہوتی ہے، وہ پورا) میدان بکریوں سے بھرا ہوادے دیا۔جب اس نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سخاوت دیکھی تو اپنی قوم میں واپس گیا اور کہا: اے میری قوم !مسلمان ہوجاؤ ؛ وہ تو اتنا دیتے ہیں کہ ان کو فقرکاڈر ہی نہیں ہے(حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں) کبھی کوئی آدمی فقط دنیا کے واسطے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا سا زمانہ نہیں گزرتا تھاکہ اس کے دل و دماغ میں اوراس کی نگاہ میں مذہبِ اسلام ؛دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے ان سب سے زیادہ محبوب ہوجاتا تھا۔

افادات:-اگرکوئی آدمی آکریوں کہتا: اے اللہ کے رسول!مجھے یہ چیز دیجئے تو میں مسلمان ہوجاؤں گا،یااگرآپ مجھے اتنا مال دیں تو میں اسلام قبول کرتا ہوں ؛ توحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی

عادتِ شریفہ تھی کہ وہ جو بھی چیز اسلام قبول کرنے کے لیے شرط کے طور پر مانگتا، آپ (ﷺ) عنایت فرمادیتے تھے۔ اور عام طور پر آدمی جب خرچ کرتا ہے تو سوچتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہیں رہے گا تو میں کیا کروں گا، لیکن حضور (ﷺ) تو ایسا سوچتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ دوسری روایتوں میں ہے کہ اس کے ترغیب دینے پر اس کی پوری قوم مسلمان ہوگئی۔ آپ (ﷺ) کی سخاوت اس کے اوپر اتنا اثر کرگئی کہ وہ خود تو اسلام لایا ہی، اپنی پوری قوم کو بھی اسلام لانے پر آمادہ کیا۔

حضور (ﷺ) کے پاس کوئی مطالبہ لے کر آتا کہ مجھے فلاں چیز چاہیے، اگر آپ دیں تو میں اسلام لاتا ہوں، حالاں کہ کھلم کھلا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دنیا کی فلاں چیز کے واسطے ہی اسلام لا رہا ہے، لیکن پھر بھی حضور (ﷺ) دیدیتے اور اس کو اسلام کے لیے آمادہ کرتے۔ اولاً تو اسلام لانے کی شکل یہی ہوتی تھی کہ اپنی غرض کی خاطر وہ اسلام لاتا تھا، لیکن پھر تھوڑا سا زمانہ نہیں گزرتا تھا کہ اس کے دل و دماغ میں اور اس کی نگاہ میں مذہبِ اسلام؛ دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ان سب سے زیادہ محبوب ہوجاتا تھا۔ یعنی اس کے اسلام کی ابتداء تو یہ ہوتی تھی لیکن بعد میں پھر اس کی نگاہ میں دنیا کی کوئی حیثیت نہیں رہتی تھی اور وہ پکا سچا مسلمان ہوجاتا تھا۔

غیر حقدار کو دینے کی وجہ

حدیث ۵۵۴:-

وعن عمر (رضی اللہ عنہ) قَالَ : قَسَمَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَسْماً ، فَقُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ ! لَغَيْرُ هٰؤلاَءِ كَانُوا أَحَقَّ بِهِ مِنْهُمْ؟ فَقَالَ: إِنَّهُمْ خَيَّرُونِي أَنْ يَسْأَلُوْنِي بِالْفُحْشِ، أَوْ يُبَخِّلُونِي وَلَسْتُ بِبَاخِلٍ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ کچھ مال تقسیم فرمایا، میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں اس مال کے زیادہ حقدار تھے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: انہوں نے مجھے دو باتوں میں سے ایک کا اختیار دیا، یا تو وہ فحش گوئی کرکے مجھ سے مانگیں (اگر میں دے دوں تو ٹھیک ہے) ورنہ وہ مجھے بخیل کہیں، اور مَیں بخیل نہیں ہوں (اس لئے باوجود اس کے کہ دوسرے لوگ ان کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہوتے ہیں، میں ان کو دیتا ہوں، دوسروں کو نہیں دیتا)

حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سخاوت کا نمونہ

حدیث ۵۵۵:-

وعن جبير بن مطعم (رضی اللہ عنہ) قَالَ : بَيْنَمَا هُوَ يَسِيرُ مَعَ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَقْفَلَهُ مِنْ حُنَيْنٍ، فَعَلِقَهُ الأَعْرَابُ يَسْأَلُوْنَهُ، حَتَّى اضْطَرُّوْهُ إِلَى سَمُرَةٍ، فَخَطِفَت رِدَاءَهُ، فَوَقَفَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فقال: أَعْطُونِي رِدَائِي، فَلَوْ كَانَ لِي عَدَدُ هٰذِهِ العِضَاهِ نَعَماً، لَقَسَمْتُهُ بَيْنَكُمْ، ثُمَّ لاَ تَجِدُونِي بَخِيلاً وَلاَ كَذَّاباً وَلاَ جَبَاناً ـ (رواه البخاری)

((مَقْفَلَهُ)) أَيْ: حَالَ رُجُوعِه. وَ((السَّمُرَةُ)): شَجَرَةٌ. وَ((العِضَاهُ)): شَجَرٌ لَهُ شَوْكٌ.

ترجمہ:- حضرت جبیر بن مطعم (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب غزوۂ حنین سے واپس لوٹ رہے تھے، تو دیہات کے رہنے والے بہت سے لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے لپٹ گئے، آپ کو گھیر لیا اور سوال کرنے لگے (کہ ہم کو دیجئے) یہاں تک کہ (وہ آپ کے پیچھے ایسے پڑے کہ ان سے بچنے کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پیچھے ہٹتے جارہے تھے، اور مجبوراً) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیکر کے ایک درخت کے پاس پناہ لینی پڑی (تو کیکر کے درخت کی ٹہنیوں اور کانٹوں میں آپ کی چادر اُلجھ گئی اور آپ کے جسم سے اتر گئی، تو) وہ چادر بھی ان دیہاتیوں نے لے لی۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کھڑے ہوگئے اور فرمایا: میری چادر تو مجھے دیدو (اس پر تم نے کیوں قبضہ کرلیا؟) پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: دیکھو! اس پوری وادی کے اندر جتنے بھی کانٹے دار درخت ہیں ان کے برابر اگر میرے پاس مویشی اور جانور ہوتے تو میں تمہارے درمیان تقسیم کردیتا اور تم مجھے بخیل، جھوٹا یا بزدل نہ پاتے۔

افادات :- مطلب یہ ہے کہ اِس وقت جو نہیں دے رہا ہوں وہ اس لیے کہ میرے پاس ہے ہی نہیں، اگر میرے پاس ہوتا تو میں ذرّہ برابر بخل سے کام نہ لیتا۔

غزوۂ حنین

مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد یہ غزوہ پیش آیا تھا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پتہ چلا کہ قبیلۂ ہوازن اور قبیلۂ بنوثقیف اور آس پاس کے دوسرے قبائل کے لوگ جمع ہوئے ہیں اور ان کا ارادہ مکہ مکرمہ پر حملہ کرنے کا ہے، تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن ابی حدرد

اَسلمی (رضی اللہ عنہ) کو بھیجا کہ جاؤ معلوم کرکے آؤ کہ جو خبر ہمیں ملی ہے کہ یہ لوگ جمع ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں؛ واقعتاً یہ خبر صحیح ہے؟ چناں چہ وہ جاکر آئے اور اطلاع دی کہ جی ہاں! وہ سب جمع ہوئے ہیں اور مکہ مکرمہ پر چڑھائی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان صحابہ کو۔جن کو لے کر آپ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ فتح کرنے کے لئے تشریف لائے تھے۔حکم دیا کہ چلیں! اس سے پہلے کہ وہ ہم پر چڑھائی کریں، ہم ہی جاکر ان کی خبر لیں۔ چناں چہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضراتِ صحابہ کے ساتھ وہاں پہنچے۔وادیٔ حنین وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی، مکہ مکرمہ اور طائف کے درمیان عرفات سے تھوڑی ہی آگے واقع ہے۔وہ لوگ تیراندازی میں بڑے مشہور تھے۔جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے ساتھ ان کی وادی میں داخل ہوئے تو شروع میں معمولی سامقابلہ کر کے وہ لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ انہوں نے پہلے سے ہی یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے تیر اندازوں کو پہاڑوں کے اندر چھپادیا تھا، اور مقابلہ کے لیے کچھ لوگ ظاہری طور پر آئے، پھر انہوں نے بھی پسپائی اختیار کی۔ صحابہ میں کچھ جلدباز لوگ تھے، وہ یوں سمجھے کہ ہمارا پلڑا بھاری ہوگیا ہے، تووہ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہوگئے، اتنے میں جولوگ چھپے ہوئے تھے انہوں نے اچانک حملہ کرکے پیچھے سے تیر برسانے شروع کردیئے، اس سے بہت سارے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے پاؤں اُکھڑ گئے۔

اس ابتدائی شکست کی اصل وجہ تو یہ ہوئی تھی کہ جس وقت نبی کریم (ﷺ) حنین کی طرف جارہے تھے، اس وقت بارہ ہزار کا لشکر ساتھ تھا۔ایک آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہیں ہوں گے۔اس جملہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعداد کی زیادتی کامیابی کا سبب بن سکتی ہے،حالاں کہ ایک مؤمن کا ایمان تو یہ ہونا چاہیے کہ ساز و سامان یا تعداد کی زیادتی سے کامیابی نہیں ملتی؛ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مدد سے کامیابی ملتی ہے۔اسی کو قرآن کریم نے بتلایا﴿وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئاً﴾یاد کرو حنین والے دن کو: جب تمہاری تعداد کی کثرت نے تم کو عجب وغرور میں مبتلا کردیا تھا،اوروہ کسی کام نہیں آئی، پھر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی مدد اُتاری،نبی کریم(ﷺ)توجمے رہے تھے ، بالآخر مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا اور کامیابی ہوئی اوربہت سارا مالِ غنیمت حاصل ہوا۔مالِ غنیمت کے اندر۴/ہزاراوقیہ چاندی، ۲۴/ہزاراونٹ،۴۰/ہزار بکریاں ملی تھیں ،اور۶/ہزار قیدی بھی تھے۔اس موقعہ پر نبی کریم (ﷺ) نے مالِ غنیمت کا جو خمس یعنی پانچواں حصہ تھا اس میں سے بہت سے لوگوں کو دیا تھا۔

صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا

حدیث ۵۵۶:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قالَ: مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، ومَازَادَاللّٰهُ عَبْداً بِعَفْوٍ اِلاَّ عِزّاً، وَمَاتَوَاضَعَ أَحَدٌلِلّٰهِ اِلاَّرَفَعَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ.(رواہ مسلم.)

حدیث ۵۵۷:-

وَعَنْ اَبِي كَبْشَةَ عمرِو بْنِ سَعْدٍ الْاَنْمَارِيِّ (رضی اللہ عنہ) اَنَّهُ سَمِعَ رسولَ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ: ثَلَاثَةٌ اُقْسِمُ عَلَيْهِنَّ وَاُحَدِّثُكُمْ حَدِيْثًا فَاحْفَظُوْهُ: مَانَقَصَ مَالُ عَبْدٍمِنْ صَدَقَةٍ، وَلاَ ظُلِمَ عَبْدٌ مَظْلَمَةً صَبَرَ عَلَيْهَا إِلاَّ زَادَهُ اللّٰهُ عِزّاً، وَ لاَ فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسأَلَةٍ إِلاَّ فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقرٍ - أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا - وَأُحَدِّثُكُمْ حديثاً فَاحْفَظُوهُ. قَالَ: إِنَّمَاالدُّنْيَا لِاَرْبَعَةِ نَفَرٍ، عَبْدٍرَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَّعِلْمًافَهُوَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَيَصِلُ فِيهِ رَحِمَهُ وَيَعْلَمُ لِلّٰهِ فِيهِ حَقًّا، فَهٰذَا بِأَفضلِ المنازلِ. وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ عِلْمًاوَلَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا، فَهُوَصَادِقُ النِّيَّةِ، يَقُوْلُ: لَوْ اَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَ بِنِيَّتِهِ، فَاَجْرُهُمَا سَوَآءٌ. وَعَبْدٍ رَزَقَهُ اللّٰهُ مَالًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ علمًا، فَهُوَ يَخْبِطُ فِی مَالِهِ بغير علمٍ، لاَ يَتَّقِي فِيهِ رَبَّهُ، وَلاَ يَصِلُ فِيهِ رَحِمَهُ وَلاَ يعْلَمُ لِلّٰهِ فِيهِ حقًا، فَهٰذا بِاَخْبَثِ الْمَنَازِلِ. وَعَبْدٍ لَمْ يَرْزُقْهُ مَالًا وَلَا عِلْمًا، فهويقول: لو اَنَّ لِيْ مَالًا لَعَمِلْتُ فِيهِ بِعَمَلِ فُلَانٍ، فَهُوَبِنِيَّتِهٖ، فَوِزْرُهُمَا سَوآءٌ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ(رضی اللہ عنہ)کی روایت ہے کہ نبیؐ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: صدقہ مال کو کم نہیں کرتا۔اور اللہ تعالیٰ کسی بندہ کی معافی کے نتیجہ میں اس کی عزت ہی بڑھاتے ہیں، اور جو آدمی اللہ کے لیے تواضع اختیار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

دوسری روایت میں ہے، نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: تین چیزوں پر میں قسم کھاتا ہوں ،پھر میں ایک بات کہوں گا ؛اس کو یاد رکھنا۔

[۱] اللہ کی قسم! کسی بندے کا مال صدقہ سے کم نہیں ہوتا۔

[۲] جس بندے پر ظلم کیا جاتا ہے اور وہ اس پر صبر کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کی عزت کو بڑھاتے ہیں۔

[۳] جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے ،اللہ تعالیٰ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں۔

اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : ایک بات کہتا ہوں اس کو یاد رکھو : دنیا میں چار قسم کے آدمی ہیں:-

[۱] ایک وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا،وہ آدمی اپنے اس علم کی وجہ سے مال کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے(اس کو کماتا ہے تو بھی اللہ کے حکم کے مطابق،اور خرچ کرتا ہے تو بھی اللہ ہی کے حکم کے مطابق)اور اس مال کے ذریعہ سے صلہ

رحمی کرتا ہے، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتا ہے،اوراللہ تعالیٰ نے جتنے حقوق اس مال کے اندر لگائے ہیں ان کو جانتا اور ادا کرتا ہے؛ یہ آدمی سب سے اونچے درجہ کا ہے۔

[۲] دوسرا بندہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم تو دیا ہے؛ لیکن مال نہیں دیا۔اس کے دل میں نیت سچی ہے، اس لئے کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگر مجھے مال دیا ہوتا تو (جیسے اس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال اور علم دونوں دیا ہے،اور وہ اس مال کے حقوق ادا کرتا ہے)میں بھی اسی طرح مالی حقوق ادا کرتا، صلہ رحمی کرتا اورجہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کے لیے کہا ہے ،وہاں خرچ کرتا ؛اس کے ساتھ اس کی نیت کے مطابق ہی معاملہ کیا جائے گا۔چناں چہ وہ اور پہلے والا دونوں کو برابر ثواب ملے گا۔

[۳] تیسرا وہ بندہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال تو دیا ہے؛ لیکن علم سے محروم ہے۔وہ اپنے مال میں جہالت کی وجہ سے بہت گڑبڑ کرتا ہے۔نہ اس مال کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتاہے، نہ رشتہ داروں کے حقوق اداکرتاہے ،اورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائے ہوئے دیگر حقوق جانتا اور ادا کرتاہے؛ یہ سب سے بدتر آدمی ہے۔

[۴] اورچوتھا آدمی وہ جس کے پاس نہ مال ہے، اورنہ علم ہے۔وہ کہتا ہے کہ میرے پاس بھی اگر مال ہوتاتومیں بھی ایساہی کرتاجیسے وہ کرتاہے (یعنی مال کوبےجاخرچ کرتا)یہ اس کی نیت کی بات ہے،اس لیے اس کااور تیسرے والے کا گناہ برابرہے۔

افادات:-اس روایت میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قسم کھاکر یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہورہاہے کہ صدقہ دینے سے مال گھٹ رہا ہے؛ لیکن حقیقت میں اس کی وجہ سے مال میں کمی نہیں ہوتی؛ بلکہ زیادتی ہی ہو تی ہے۔

اور عام طور پر ایسا ہو تا ہے کہ کسی نے ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی کا معاملہ کیا، پٹائی کردی، بے عزتی اورانسلٹ کردی، تو ہمارا نفس چاہتا ہے کہ اس سے انتقام اور بدلہ لیں، لیکن نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ معاف کردو۔جب معاف کرنے کی بات آتی ہے اوردوسرے لوگ بھی تلقین کرتے ہیں کہ ہاں بھائی !معاف کردو،تووہ آدمی سوچتا ہے کہ یہ تومیری بے عزتی کی بات ہے، لوگ کہیں گے کہ بہت ڈھیلا آدمی ہے، بدلہ لینے کی طاقت نہیں رکھتا، اسی جذبہ کے نتیجہ میں آدمی معاف نہیں کرتا اورانتقام لیتا ہے۔شریعت کہتی ہے کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں معاف کردوں گا تومیری بے عزتی ہوگی، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) قسم کھاکر فرماتے ہیں کہ اگر معاف کردوگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری عزت اور بڑھا دے گا۔جیسا کہ صدقہ کرنے میں بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مال گھٹ رہا ہے ، ایساہی یہاں پر بھی ہے۔

''اور جو آدمی سوال کا دروازہ کھولتا ہے ،اللہ تعالیٰ اس پر فقر کا دروازہ کھولتے ہیں'' یعنی کوئی آدمی مانگنے کا سلسلہ شروع کرتاہے تو بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مانگے گاتو لوگ اس کو دیں گے، اوراس کے نتیجہ میں مال میں اضافہ ہوگا۔لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ یہ

آدمی سوال کا دروازہ کھول کر اپنے لیے فقر کا دروازہ کھول رہا ہے، اس سے مال بڑھتا نہیں؛ بلکہ گھٹتا ہے۔

اس روایت سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ آدمی کو اپنا ارادہ اور نیت ہمیشہ اچھی ہی رکھنی چاہیے، اس لیے کہ بعض آدمی محض اپنے ارادہ اور نیت کی وجہ سے مال اور علم نہ ہوتے ہوئے بھی گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اوپر گزرا۔

جو خرچ کیا وہ سب باقی ہے

حدیث ۵۵۸:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) أَنَّهُمْ ذَبَحُوا شَاةً. فَقَالَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم): مَا بَقِيَ مِنْهَا؟ قالت: مَا بَقِيَ مِنْهَا إِلاَّ كَتِفُهَا. قَالَ: بَقِيَ كُلُّهَا غَيْرُ كَتِفِهَا . (رواه الترمذی وقال: حديث صحيح)).

ومعناه: تَصَدَّقُوا بِهَا إِلاَّ كَتِفَهَا. فَقَالَ: بَقِيَتْ لَنَا فِی الآخِرَةِ إِلاَّ كَتِفَهَا.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں نے بکری ذبح کی، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: اس میں سے کتنا بچا؟ بتایا گیا کہ سب تقسیم ہوگئی، صرف اس کا بازو بچا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سب باقی ہے؛ ہاں! جو بازو بچا ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ تم نے جو تقسیم کر دیا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ ہو گیا ﴿مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہونے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں جو ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ گویا جتنا دے دیا وہ باقی ہے اور جو ابھی تمہارے پاس باقی ہے، وہ ختم ہو نے والا ہے۔

تم روک کر مت رکھو؛ورنہ...

حدیث ۵۵۹:-

وعن أسماء بنت أبي بكرٍ الصديق رضی اللہ عنہما قالت: قَالَ لِي رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): لَا تُوكِي فَيُوكَى عَلَيْكِ.

وفي رواية: أنفقي أَوِ انْفَحِي، أَوْ انْضَحِي، وَلَا تُحصي فَيُحْصِيَ اللهُ عَلَيْكِ، وَلَا تُوعي فَيُوعِيَ اللهُ عَلَيْكِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وَ((انْفَحِي)) بالحاء المهملة، وَهُوَ بمعنى ((أنفقي)) و كذلك ((انْضحي))

ترجمہ:-حضرت اسماء (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تم روک کر مت رکھو کہ تم پر روکا جائے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ تم بچا کر نہ رکھو، ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے بچا کر رکھیں گے۔

سخی اور بخیل : ایک مثال

حدیث ۵٦۰:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) أنَّه سمع رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقولُ: مَثَل البَخيل وَالمُنْفِقِ، كَمَثَلِ رَجُلَيْنِ عَلَيْهِمَا جُنَّتَانِ مِنْ حَديدٍ مِنْ ثُدِيِّهِمَا إِلَى تَرَاقِيهِمَا. فَأَمَّا المُنْفِقُ: فَلاَ يُنْفِقُ إِلاَّ سَبَغَتْ - أَوْ وَفَرَتْ - عَلَى جِلْدِهِ حَتَّى تُخْفِيَ بَنَانَهُ، وَتَعْفُو أثَرَهُ. وأمَّا البَخِيلُ: فَلاَ يُرِيدُ أنْ يُنْفِقَ شَيْئاً إِلاَّ لَزِقَتْ كُلُّ حَلْقَةٍ مَكَانَهَا فَهُوَ يُوسِّعُهَا فَلاَ تَتَّسِعُ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

وَ((الجُنَّةُ)): الدِّرْعُ؛ وَمَعنَاهُ أنَّ المُنْفِقَ كُلَّمَا أنْفَقَ سَبَغَتْ، وَطَالَتْ حَتَّى تَجُرَّ وَرَاءهُ، وَتُخْفِيَ رِجْلَيْهِ وَأثَرَ مَشْيِهِ وَخطُوَاتِهِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بخیل کی اور خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے دو آدمی ہیں جن پر لوہے کی دو زرہیں - جو لڑائی کے موقع پر پہنی جاتی ہیں - ان کے سینے سے ہنسلیوں تک ہوں، پس سخی کی حالت تو یہ ہے کہ اس نے جونہی خرچ کیا تو وہ زرہ بآسانی نیچے اتر گئی، یا اس کی کھال پر مکمل آگئی یہاں تک کہ اس نے اس کے پوروں کو بھی ڈھانپ لیا، اور وہ کرتہ نیچے زمین کے ساتھ گھسٹ رہا ہے۔ اور بخیل کا حال ایسا ہے کہ جب بھی وہ خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو ہر حلقہ اپنی جگہ چپک جاتا ہے، وہ اس کو کشادہ کرتا ہے، لیکن کشادہ نہیں ہوتی۔

افادات:- آدمی جب اپنا کرتہ پہنتا ہے تو جسم کو اس میں داخل کرنے کے لئے پہلے نچلا حصہ اپنے سر کے اوپر ڈالتا ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے نچلا حصہ اوپر آئے گا، پھر آستین داخل کرے

گا، اور دھیرے دھیرے وہ کرتہ نیچے اتر کر پورے جسم کو ڈھانپ لے گا۔اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کرتہ تنگ ہوتا ہے تو اوپر ہی اوپر پھنس جاتا ہے، نیچے اترتا ہی نہیں، آدمی اس کو اتارنے کی محنت کرتا ہے، اس کے ہاتھ بھی اس میں پھنسے ہوئے ہیں لیکن نیچے اترنے کا نام نہیں لیتا، اگر کرتہ کشادہ ہو تو آسانی کے ساتھ اتر جاتا ہے۔ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں: خرچ کرنے والے کی مثال ایسی ہی ہے ،جب وہ چاہتا ہے تو اس کا دل اور طبیعت ایسی بنی ہوئی ہے کہ جیسے ہی اس نے خرچ کرنے کا ارادہ کیا، فوراً وہ بڑی آسانی سے خرچ کرلیتا ہے ، خرچ کرنے کے معاملہ میں اس کے دل کی طرف سے ذرہ برابر بھی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ گویا اس کا حال ایسا ہے جیسے وہ کرتہ جو اس نے اوپر ڈالا تو بڑی آسانی سے نیچے تک اتر تا چلا گیا، یہاں تک کہ اس نے اس کے پاؤں بھی ڈھانپ لیے ،اور وہ کرتہ نیچے زمین کے ساتھ گھسٹ رہا ہے۔

اور بخیل کا حال ایسا ہے کہ وہ خرچ کرنا چاہتا ہے، لیکن اس کا مزاج اور طبیعت ساتھ نہیں دیتی، وہ ارادہ کرتا ہے تب بھی ہاتھ جیب کے اندر جاتے ہی نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے: کرتہ پہننے کے لیے اس کو اوپر سے ڈالا اور نیچے اتارنے کی بڑی کوشش کرتا ہے ؛ لیکن کرتہ اترتا ہی نہیں ہے۔

نبی کریم (ﷺ) نے بخل اور سخاوت کو ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں مزاج اور طبیعت کی ہیں۔ بعضوں کی طبیعت میں سخاوت ہوتی ہے، جب بھی وہ کسی کارِ خیر میں خرچ کرنا چاہتے ہیں تو بڑی آسانی سے اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور بعضوں کے مزاج میں

بخل ہوتا ہے، وہ اگر کارِ خیر میں خرچ کرنے کا ارادہ بھی کریں تب بھی اس کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔تو سخی آدمی کارِ خیر میں خرچ کرنے کے اپنے ارادہ میں کامیاب ہوجاتا ہے، اور بخیل آدمی کارِ خیر میں خرچ کرنے کے اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔

۲۹/ ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱/ جولائی ۲۰۰۰ء

سخاوت اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں یہ باب چل رہا تھا بہت ساری روایتیں ذکر کیں، آخری دو روایتیں باقی رہ گئی ہیں۔

تو بخل کیوں؟...

اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے سلسلہ میں درحقیقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی دل کی تنگیوں کو دور کرنے کا فیصلہ کرلیں اور اللہ تعالیٰ سے دعامانگیں کہ اے اللہ !تو ہمارے دل کی تنگی کو دور کردے۔وجہ کیاہے؟آدمی جو کچھ بھی خرچ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کادیاہوا ہوتاہے۔ہر آدمی کے پاس جوکچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے عطافرمارکھاہے،اس میں کسی آدمی کی محنت ومشقت کو کوئی دخل نہیں ہے۔اوریہ بات پہلے بھی بتلاچکا ہوں کہ اگر محنت ومشقت ،یا آدمی کی صلاحیتوں پر،یاسرٹیفکٹ اور پڑھائی پرروزی کی کمی اور زیادتی موقوف ہوتی؛تو جن کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں وہ روزی سے محروم رہتے۔ایک مزدورجسمانی طورپر جتنی محنت ومشقت اٹھاتاہے،دفترمیں بیٹھنے والاسیٹھ اتنی محنت و مشقت نہیں اٹھاتا،اس کے باوجوددونوں کی روزی میں بیّن فرق ہے۔روزی کے معاملہ میں تواس

بات کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دیتا ہے۔تو جو چیز اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی، آدمی اس کے خرچ کرنے میں آخر بخل اور تنگی سے کیوں کام لے؟

بغیر خرچ کئے سخاوت کا ثواب

آپ پہلے روایت پڑھ چکے ہیں، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مال و دولت کے استعمال کے اعتبار سے آدمیوں کی چار قسمیں ہیں۔ان میں ایک وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا اور علم بھی دیا ، اس علم کی وجہ سے وہ اس مال کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے، اور ناراضگی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے ،اللہ تعالیٰ اس کو سب سے اونچا مقام عطا فرماتے ہیں۔اوردوسرا آدمی وہ جس کے پاس مال نہیں ہے، لیکن اس کو علم دیا گیاہے،پہلے والے کو دیکھ کر یہ سوچتااور تمنا کرتاہے کہ اللہ تعالیٰ اگر مجھے بھی مال دیتا تو میں بھی مال کواسی طرح نیکی کے کاموں میں خرچ کرتا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشادفرمایا: اس کو بھی اتنا ہی اجروثواب ملے گا۔اب دیکھو کہ اس نے کیاخرچ کیا؟ پہلے آدمی نے توخرچ بھی کیااوردوسرے نے تو ایک پائی بھی خرچ نہیں کی، صرف دل میں ارادہ و نیت اور پختہ عزم ہے۔اب اس کاارادہ سچا ہے یا جھوٹا؛یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں،اوراجر دینے والے بھی اللہ تعالیٰ ہی ہیں،وہ خوب جانتے ہیں کہ کس کے دل میں کیاہے۔دنیا کے کسی آدمی کے سامنے توہم اپنی لچھے دار باتوں سے ہوسکتا ہے کہ دھوکہ دیدیں؛لیکن اللہ تعالیٰ کامعاملہ توایسانہیں ہے،وہ تو دلوں کے حال سے

بخوبی واقف ہے کہ کس کی نیت سچی ہے اور کس کی جھوٹی ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو نیکی کا ارادہ کرنے پر بھی بہت کچھ دیا جاتا ہے۔

دعا میں بھی سخاوت سے کام لو

دعا کا معاملہ ہی لے لو۔ ہم لوگوں کا مزاج ایسا ہے کہ ہم نے دل اتنا تنگ کرلیا ہے کہ دعا کے لئے جب بیٹھتے ہیں تو اپنے لئے، اپنے بچوں کے لئے، اپنے گھر والوں کے لئے تو مانگتے ہیں ،لیکن کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ ساری امت اور ساری انسانیت کے لئے مانگیں، حالاں کہ ہمیں اپنی جیب سے تو کچھ دینا نہیں ہے، صرف مانگنا ہے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست ہی کرنی ہے ،اللہ تعالیٰ کے حضور یہ کہنا ہے: اے باری تعالیٰ! سب کو نوازیئے۔ اور جس کو کہا جارہا ہے وہ تو ویسے بھی دینے والا ہے، اس کے خزانے بھرے ہوئے ہیں۔ جب وہ ہمارے مانگنے پر ہماری ضرورتیں پوری کرے گا، تو ہمارے اسی مانگنے پر ساری دنیا کی ضرورتیں بھی پوری کرے گا، بلکہ وہاں تو وعدہ یہ ہے کہ آدمی اگر تنہا اپنے لئے مانگے ،تو ہوسکتا ہے کہ اس پر نہ دیا جائے۔ لیکن اگر وہ کسی اور کے لئے مانگتا ہے، تو فرشتے اس کی دعا پر آمین کہتے ہیں اور کہتے ہیں: ”وَلَکَ مِثْلُہٗ“ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اتنا ہی دے۔ تو مانگنے میں بھی ہم اپنے دلوں کی تنگی کو ظاہر کرتے ہیں، حالاں کہ جب مانگنے ہی کے لئے بیٹھے ہیں تو پھر تنگی کیوں کی جائے، ساری دنیا کے لیے مانگو اور خوب مانگو۔ اسی طرح نیکی کے کاموں کا ارادہ کرنے کا بھی حال ہے۔

پچھتّر ہزار مکاتب

حضرت حاجی فاروق صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلفاء میں سے تھے، چند سال پہلے ہی انتقال ہوا، انہوں نے ایک بات فرمائی کہ ڈھاکہ میں حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے ایک خلیفہ حافظ جی حضور کے نام سے مشہور تھے، بڑے بزرگوں میں سے تھے۔ انہوں نے وہاں کی غریب آبادیوں اور دیہاتوں کے اندر مکاتب قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ایک مرتبہ مجھے بھی بلایا تو میں وہاں گیا، تو انہوں نے کہا: میں نے پچھتّر ہزار (۷۵۰۰۰) مکاتب قائم کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور وہ اس لائن سے کام بھی کر رہے تھے۔ جب ان کا انتقال ہوا تو تقریباً پندرہ سو (۱۵۰۰) مکاتب ہی قائم کر سکے تھے، لیکن دنیا سے گئے تو ثواب تو پچھتّر ہزار (۷۵۰۰۰) مکاتب کا لے کر گئے۔ اتنا آسان مسئلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں تنگی ہے۔

غور و فکر کی بات

جب آدمی دنیا میں آتا ہے تو سوچو کہ کیا لے کر آتا ہے؟ خالی ہاتھ آتا ہے۔ اور جب جائے گا تب بھی خالی ہاتھ جائے گا، اپنے ساتھ پیسے لے کر نہیں جائے گا۔ اب شیطان آدمی کو دھوکہ میں ڈالتا ہے ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَآءِ﴾ شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے یعنی

آدمی کو یہ فکر دلاتا ہے کہ تمہارا سارا مال ختم ہو جائے گا؛ تو تمہارے بچے کیا کھائیں گے؟ اگر تم خرچ کردو گے تو تمہارے پاس کیا رہے گا؟

دیکھو! دنیا میں جتنے بھی نیکی کے کام ہو رہے ہیں، مسجدیں بن رہی ہیں، مدرسے اور مکاتب قائم ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ غریبوں، بیواؤں، مسکینوں کی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، بیماروں کے لئے ہسپتال قائم کروا رہے ہیں۔ پوری دنیا میں ضرورتمندوں کی ضرورتوں کے اور نیکی کے جتنے بھی کام ہو رہے ہیں، سب اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی کے ہاتھ سے کروا ہی رہا ہے، کوئی کام رُکا ہوا نہیں ہے۔ اگر کہیں مسجد بن رہی ہے اور مَیں یا آپ پیسہ نہیں دیں گے، تو ایسا نہیں ہے کہ وہ مسجد نہیں بنے گی؛ مسجد تو کھڑی ہو کر رہے گی۔ اگر ہسپتال بن رہا ہے، اور میں یا آپ پیسہ خرچ نہیں کریں گے تو ایسا نہیں ہے کہ ہسپتال نہیں بنے گا؛ ہسپتال تو ضرور بنے گا۔ غریبوں کا علاج معالجہ ہو گا، یتیموں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری ہوں گی۔ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کی جتنی بھی جگہیں ہیں، وہاں ہمارے نہ دینے سے، یا ہمارے ہاتھ کھینچ لینے سے، یا ہمارے دل کی تنگی سے کوئی کام رکنے والے نہیں ہیں، بلکہ اس طرح کے سب کام ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ یہ سب کام کروا رہے ہیں تو اگر ہم اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگ لیں کہ: اے اللہ! تیرے یہ سب کام جن کے تو نے فیصلے کئے ہیں اور دنیا میں ہو رہے ہیں، مسجدیں تعمیر ہو رہی ہیں، مدارس قائم ہو رہے ہیں، مکاتب بنائے جا رہے ہیں، ہسپتالیں قائم ہو رہی ہیں، غریبوں اور بیواؤں کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں، بیماروں کے

علاج معالجے ہو رہے ہیں ، اور رفاہِ عام کے سینکڑوں کام دنیا میں ہورہے ہیں اوراے اللہ!تواپنے خزانوں سے دیتا ہے،اپنی مخلوق ہی میں سے کسی نہ کسی کو تو واسطہ بنارہا ہے،تواے اللہ! تیرا احسان اور فضل ہوگا اگر تو مجھے بھی ان کاموں کے لیے واسطہ بنالے۔اگر ہم یہ دعا کرلیں تو اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کیا کمی ہے ؟

دل کووسیع کرنے کی ضرورت ہے

اصل تویہ ہے کہ ہماراہی دل تنگ ہے،اپنے دل کووسیع کرنے کی ضرورت ہے۔جولوگ نیکی کے کاموں میں خرچ کررہے ہیں ،ہسپتال قائم کروارہے ہیں ،غریبوں کے علاج ومعالجہ پرہزاروں لاکھوں خرچ کرنے والے دنیامیں موجودہیں۔حاجی ابراہیم صاحب یہاں موجودہیں،ان سے پوچھ لو!ایسے ایسے لوگ آتےہیں اورکہہ جاتےہیں کہ ہماری طرف سے پچاس لاکھ ، اور ایک کروڑلیجئے۔تو کیاجنھوں نے یہ پیسے دئے ہیں وہ غریب و محتاج ہوگئے؟کیا ان کی اولاد نعوذباللہ لوگوں کے سامنے بھیک مانگ رہی ہیں؟نہیں۔بلکہ جتناانہوں نے دیا،اللہ تعالیٰ نے اس سے زیادہان کو دیا۔آپ پہلے پڑھ ہی چکے ہیں کہ فرشتے دعاکرتے ہیں:”اَللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا“

اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے مقررہیں جن کاوظیفہ ہی یہ ہے کہ روزانہ دعاکرتے رہیں:

اے اللہ!خرچ کرنے والے کواچھا بدلہ عطا فرما۔

یہ شانِ کریمی کے خلاف ہے

اور دیکھو! اللہ تعالیٰ تو ایسے کریم ہیں کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی کے خلاف ہے کہ بندہ تو نقد دے اور اللہ تعالیٰ صرف ادھار وعدہ کرتا رہے؛ ایسا نہیں ہو سکتا۔ آخرت میں تو اللہ تعالیٰ دے گا ہی؛ دنیا میں نقد بدلہ بھی دیتا ہے۔ جو خرچ کرتے ہیں ان سے جا کر پوچھ لو۔ اس لیے آدمی یوں نہ سمجھے کہ خرچ کرنے سے کمی آئے گی۔ یہ شیطانی دھوکہ ہے، شیطان آدمی کو ورغلاتا ہے۔ آدمی جتنا خرچ کرے گا وہ اس کے فائدہ کی چیز ہے، اور اس سے کمی آنے والی نہیں ہے؛ بلکہ اللہ تعالیٰ اور اضافہ ہی کریں گے۔ حضرت عثمان غنی (رضی اللہ عنہ) کے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے قصے تو آپ حضرات نے سنے ہی ہوں گے۔ وہ لوگ تو ایسے تھے کہ اپنی ذات پر ایک پائی بھی خرچ کرنا گوارا نہیں کرتے تھے، لیکن اللہ کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتے تھے۔ حضرت عثمان، حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما اور ان کے بعد دنیا میں جتنے بھی اسخیاء گزرے ہیں جنھوں نے اللہ کے راستہ میں بے شمار دولت خرچ کی ہے؛ کیا ان کی دولت گھٹ گئی؟ نہیں؛ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اتنا کچھ دیا کہ مرتے وقت جو چھوڑا اس کی تقسیم کرنے والوں کے لئے حساب کرنا مشکل ہو گیا۔ حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) کے متعلق حضرت عبد الرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب ان کی وراثت

تقسیم ہوئی تو سونا کلہاڑی سے توڑا گیا(جس کا تفصیلی قصہ جلد:۳/ ص:۱۰۳ تا ۱۱۰ پر قابلِ مطالعہ ہے۔مرتب۔)بہر حال! یہ چیزیں ایسی ہیں جن کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

حلال خرچ کرنے کی برکت

حدیث ۵۶۱:-

وعنه قال قالَ رسولُ اللهِ(ﷺ) : مَنْ تَصَدَّقَ بعَدلِ تَمْرَةٍ مِنْ كَسْبٍ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللهُ إِلَّا الطَّيب، فَإِنَّ اللهَ يَقْبَلُهَا بِيَمِينِهِ، ثُمَّ يُرَبِّيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ حَتَّى تَكُونَ مِثْلَ الْجَبَلِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اگر کسی نے اللہ کے راستہ میں ایک کھجور کے برابر حلال کمائی میں سے صدقہ کیا،اورچوں کہ اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ (بڑی خوشنودی کے ساتھ) اپنے دائیں ہاتھ سے لیتے ہیں،پھراس خرچ کئے ہوئے کو دینے والے ہی کے لیے بڑھاتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے کے بچے ،یا گائے کے بچھڑے کو پالتا اوراس کی پرورش کرتا ہے۔

افادات:- کھجور کاایک دانہ کیاحیثیت رکھتاہے؛لیکن یہاں ایک ہی دانہ کاتذکرہ ہے،اور قید ہے کہ حلا ل کمائی میں سے ہو۔اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حلال ہی کو قبول کرتا ہے، حرام کو قبول نہیں کرتا۔

آج ہمارے اس زمانہ میں ایک اور مصیبت آگئی ہے کہ بہت سے لوگ یوں سوچتے ہیں کہ غلط طریقہ سے دولت حاصل کرلو،بعدمیں اس کا کچھ حصہ نیکی کے کاموں میں خرچ کردیں گے۔اس طرح کرکے وہ سمجھتے ہیں کہ کمائی کی دھلائی ہوگئی اور کفارہ ہوگیا۔حالاں کہ ایسانہیں ہے۔

حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) کامقولہ

حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے محدث اورفقیہ گزرے ہیں،بڑے بزرگ بھی ہیں ،ان کا مقولہ ہے : جو آدمی حرام کمائی میں سے نیکی کے کاموں میں خرچ کرتاہے، وہ ایسا ہی ہے جیسے ناپاک کپڑے کو پیشاب سے دھوکرپاک کرنے کی کوشش کرے۔حالاں کہ ناپاک کپڑا پیشاب کے ذریعہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا ، اس کو پاک کرنے کے لیے پانی ہی کی ضرورت ہے۔اسی طرح حرام کمائی سے جو صدقہ دیا جائے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبو ل ہی نہیں ہوتا،کیوں کہ اللہ تعالیٰ توپاکیزہ ہی کو قبول کرتاہے۔اگرکوئی آدمی غلط چیزلاکرہمیں دے، اور بعدمیں معلوم ہو؛ تو ہمارا کیا حال ہوگا؟کیا ہم اس کو منظور رکھیں گے؟ نہیں۔جب ہماری اور آپ کی غیرت اس بات کو گوارہ نہیں کرتی؛ تو اللہ تعالیٰ کیسے قبو ل کریں گے؟

جب کھجور کا ایک دانہ پہاڑ بن جاتا ہے!

اگر ہم پاکیزہ اور حلال کمائی میں سے ایک کھجور کا دانہ بھی صدقہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ بڑی خوشنودی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ سے لیتے ہیں،یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل ہوجاتاہے۔ورنہ اس کے یہاں دائیں بائیں کا کوئی فرق نہیں۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تو دونوں ہاتھ دائیں ہی ہیں({ખમ ૨૬૫૭})

"(ثُمَّ يُرَبِّيهَا لِصَاحِبِهَا كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ)اللہ تعالیٰ اس کو قبول کرنے بعد خرچ کرنے والے کے لیے اس کو بڑھاتے ہیں جیسے تم میں سے کوئی آدمی اپنے گھوڑے کے بچے ،یا گائے کے بچھڑے کو پالتااوراس کی پرورش کرتا ہے" یہاں تشبیہ گھوڑے کے بچھڑے کے ساتھ اس لیے دی گئی ہے کہ اس کی نشو ونما بہت تیزی کے ساتھ ہوتی ہے،اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ صدقہ کی ہوئی کھجور کواتناجلدی بڑھاتا ہے کہ وہ پہاڑ کے برابر ہوجاتاہے۔کہاں کھجور کا صرف ایک دانہ اور کہاں پہاڑ!مطلب یہ ہے کہ ایک معمولی چیز بھی اگر آپ نے اللہ کی راہ میں خرچ کی ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کو بڑھاکر بہت زیادہ کردیا جاتا ہے، اوراس میں نہایت برکت ہوتی ہے۔

ایک تہائی خرچ کرنے کی برکت

حدیث ۵۶۲:-

وعنه عن النبیِّ (صلی اللہ علیہ وسلم): بَیْنَمَا رَجُلٌ یَمْشِی بِفَلاَةٍ مِنَ الأَرْضِ، فَسَمِعَ صَوْتاً فی سَحَابَةٍ: اسقِ حَدِیقَةَ فُلانٍ، فَتَنَحَّى ذَلِكَ السَّحَابُ فَأَفْرَغَ مَاءَهُ فی حَرَّةٍ، فإِذَا شَرْجَةٌ مِنْ تِلْكَ الشِّرَاجِ قَدِ اسْتَوْعَبت ذَلِكَ الماءَ كُلَّهُ، فَتَتَبَّعَ المَاءَ، فإِذَا رَجُلٌ قَائِمٌ فی حَدِیقَتِهِ یُحَوِّلُ الماءَ بِمِسحَاتِهِ، فَقَالَ لَهُ: یَا عَبْدَ اللهِ! ما اسمُكَ؟ قال: فُلانٌ للاسم الذی سَمِعَ فی السَّحابَةِ. فقال له: یا عبدَ الله! لِمَ تَسْأَلُنِی عَنِ اسْمِی؟ فَقَالَ: إِنِّی سَمِعْتُ صَوتاً فی السَّحابِ الَّذِی هَذَا مَاؤُهُ، یقولُ: اسْقِ حَدِیقَةَ فُلاَنٍ لاسمِكَ، فَمَا تَصْنَعُ فِیهَا؟ فَقَالَ: أَمَا إِذ قلتَ هَذَا، فَإِنِّی أَنْظُرُ إِلَى مَا یَخْرُجُ مِنْهَا، فَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثِهِ، وَآكُلُ أَنَا وَعِیَالِی ثُلُثاً، وَأَرُدُّ فِیهَا ثُلُثَهُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ: ایک آدمی ایک ویران صحراء میں سے گزر رہا تھا، اوپر سے ایک بادل گزرا، اس آدمی نے اس بادل میں سے آواز سنی، کوئی اس بادل کو کہہ رہا تھا: فلاں آدمی کے باغ اور کھیتی کو پانی پلا اور سیراب کر۔ یہ آواز اس آدمی نے بھی سنی، اس کے بعد اس نے دیکھا کہ اس بادل میں سے ایک ٹکڑا الگ ہوگیا اور آگے جاکر اس کا پورا پانی ایک پتھریلی زمین پر برسا۔ وہاں چھوٹی چھوٹی نالیاں اور ایک نہر بنی ہوئی تھی، وہ سارا پانی جمع ہوکر ان نالیوں کے اندر آگیا اور اس نہر میں آگے بڑھنے لگا۔ وہ آدمی اس پانی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تاکہ دیکھے کہ یہ پانی کہاں جاتا ہے۔ آگے جاکر دیکھا تو ایک آدمی اپنے باغ میں پھاوڑا لے کر اپنے باغ میں پانی داخل کررہا تھا اور پھاوڑے کے ذریعہ سے پانی کا رخ اپنے باغ کی طرف پھیر رہا تھا۔ اس آدمی نے اس باغ

اور باڑی والے سے پوچھا: او بھائی! تیرا نام کیا ہے؟ اس نے کہا: میرا نام یہ ہے۔ اس کا وہی نام تھا جو اس نے بادل کے اندر سے سنا تھا۔ اس باغ والے نے پوچھا: اے اللہ کے بندے! تو مجھ سے میرا نام کیوں پوچھ رہا ہے؟ تجھے کیا ضرورت پیش آئی؟ اس نے کہا: اس نالی کے ذریعہ سے جو پانی آرہا ہے اور تو نے پھاوڑے سے اس کا رخ پھیر کر اپنے باغ کے اندر داخل کیا ہے، یہ پانی جس بادل سے برسا، اس بادل میں سے تیرے نام کے ساتھ یہ آواز آئی تھی۔ (گویا کوئی کہنے والا اس بادل سے کہہ رہا تھا کہ فلاں کے کھیت کو پانی پلا اور تیرا ہی نام لیا تھا۔) اب تو بتا کہ آخر کون سی بات ہے جس کی وجہ سے تیرے لئے یہ سارے انتظامات ہو رہے ہیں؟ تیرے اندر وہ کون سی ایسی خوبی ہے؟ اس نے کہا: بھائی دیکھ! جب تو نے یہ بات مجھے بتلا ہی دی؛ تو اب میرے لئے بھی ضروری ہو گیا کہ میں کیا کرتا ہوں وہ تجھے بتلا دوں۔ اس کھیتی میں جو کچھ پیداوار ہوتی ہے، مَیں اس کے تین حصے کرتا ہوں۔ ایک تہائی حصہ تو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہوں۔ ایک تہائی مَیں اور میرے بال بچے کھاتے ہیں۔ ایک تہائی حصہ جمع رکھتا ہوں تاکہ آئندہ سال اس کو دوبارہ بونے کے کام میں لاؤں۔

دیکھو! پورا مال صدقہ نہیں کرتا تھا؛ بلکہ تیسرا حصہ خرچ کرتا تھا، اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے یہ سارے انتظامات ہو رہے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہیے کہ اپنی کمائی کے اندر سے کچھ حصہ مقرر کرلے جو اللہ کے راستہ میں خرچ کیا جاتا ہو۔

ہمارے اسلاف کا عمل

حضرت تھانوی(رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب(رحمۃ اللہ علیہ) کے ملفوظات میں لکھاہے کہ: حضرت کے پاس جو کچھ آتا تھا اس کے تین حصے کرلیتے تھے،اس میں سے ایک حصہ اللہ کے راستہ میں خرچ کیا کرتے تھے۔

خود حضرت مفتی محمد شفیع صاحب(رحمۃ اللہ علیہ) کے حالات میں ان کے صاحبزادے حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ والد صاحب کا یہی معمول تھا۔ آدمی کے پاس جو پیسے آتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں،ایک تو وہ جس میں آدمی کی محنت کو دخل ہوتا ہے،اوردوسرے وہ جو بغیر محنت کے آئیں ،مثلاً آپ ملازمت، تجارت، یامحنت مزدوری کرتے ہیں،اس کے نتیجہ میں کچھ پیسے آتے ہیں۔اوردوسرا یہ کہ کسی نے ہدیہ دیا،کوئی چیز بھیج دی۔تومحنت کے نتیجہ میں جو آتا،اسی وقت اس کا بیسواں حصہ الگ کرلیتے تھے،مثلاًدس روپے کا نوٹ ہے ،اس کا بیسواں حصہ یعنی پچاس پیسے نکال کرالگ کرلیتے تھے۔یہ نہیں سوچتے تھے کہ ابھی کھلے نہیں ہیں تو بعدمیں الگ کرلیں گے؛بلکہ اتنازیادہ اہتمام کرتے تھے کہ جس وقت وہ ہاتھ میں آتا تھا اور کھلے پاس ہوتے تواسی وقت الگ کردیتے۔اوراگرکھلے نہیں ہوتے تو بڑے اہتمام کے ساتھ اسی وقت آدمی کو بازار بھیج کر کھلے کرواتے ،اور اس میں سے بیسواں حصہ الگ کردیتے۔اور جومال بغیر محنت کے آتا تھا اس کا دسواں حصہ الگ کرتے تھے۔اور ایک

تھیلی الگ ہی رکھی تھی، جو رقم بھی الگ کرتے،اس تھیلی میں ڈالتے رہتے تھے ،پھر نیکی کے کاموں میں جہاں کہیں خرچ کرنے کی نوبت آتی؛ اس میں سے خرچ کرتے رہتے اس لیے ہر آدمی کو چاہیئے کہ ایسا کوئی انتظام کرلے، پھر اہتمام سے اس پر عمل کرے۔

نفس کا مکر اور اس کی پکڑ

اور نفس پر ذرا بھی اطمینان نہیں ہے۔بہت سی مرتبہ ہم سوچتے ہیں کہ بعد میں یہ کام کرلیں گے۔ لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جو آدمی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرے، اس میں دیر نہ کرے،معلوم نہیں کہ کب دل پلٹ جائے۔ اور اگر دل نہ پلٹے تب بھی شیطان اس میں کچھ نہ کچھ کمی تو کرواہی دیتا ہے، مثلاً :پہلے ہزار روپے خرچ کرنے کی نیت کی تھی،لیکن خرچ کرتے وقت شیطان ہزار کے بجائے پانچ سو،یا سو پچاس تو کم کروا ہی دے گا۔ بہت سی مرتبہ تو بالکل ہی ختم کروادیتا ہے۔دل میں یہ خیال اور وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ کام فرض تو ہے نہیں، نفل ہی ہے نا،ابھی نہیں بلکہ بعد میں خرچ کریں گے۔ مگر دیکھو ایک بات یاد رکھنا! آدمی اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے دل میں جو معاملہ کرتا ہے،اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے آدمی لوگوں کو تو دھوکہ دیتا ہی ہے ، اللہ تعالیٰ کے معاملہ میں بھی یہی چالاکی کرنے کی سوچتا ہے۔ مثلاً : دل میں نیت کرتا ہے کہ میرے اس سودے میں نفع ہو گیا تو میں اس کا دس فیصد (۱۰٪) فلاں نیکی کے کام میں خرچ کروں گا۔ اب

جتنا سوچا تھا اسی کے مطابق نفع ہو گیا، جب نفع ہاتھ میں آیا تو اب سوچتا ہے کہ نفع ایک لاکھ ہوا، تو دس فیصد تو دس ہزار ہو جاتے ہیں۔ پہلے جب دس فیصد بول رہا تھا، اس وقت نہیں سوچا تھا، اب سوچ رہا ہے کہ دس ہزار نکالنا تو مشکل ہے۔ لہٰذا دل ہی دل میں اِدھر اُدھر کی تاویل کرنا شروع کرتا ہے، اور کسی نہ کسی طرح دس ہزار میں کمی کر ہی ڈالتا ہے۔ بعض تو ایسے ہیں کہ کہہ دیتے ہیں کہ بعد میں دیں گے۔ بعض وہ ہوتے ہیں کہ دس ہزار کے پانچ ہزار کر ڈالتے ہیں۔ لیکن دیکھو بھائی! اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کون سی کمی ہے؟ اگر نہیں دینا ہے تو پانچ ہزار بھی کیوں خرچ کرتے ہو؟ یہ دے کر کیا اللہ تعالیٰ پر کوئی احسان کر رہے ہو؟ نعوذ باللہ! کیا اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی ہے، اس لیے پانچ ہزار بھی دے رہے ہو؟

نیت کا اثر... سبق آموز قصہ

ایک قصہ یاد آیا، حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی (رحمۃ اللہ علیہ) (جو ہمارے تمام بزرگوں کے شیخ ہیں اور ہمارے اکثر سلسلے وہیں ملتے ہیں، ان) کے شیخ تھے۔ جس زمانہ میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) تھانہ بھون میں خانقاہ کی مسجد میں آکر قیام پذیر ہوئے، اس وقت مسجد کو درست کرنے اور اس میں کمرہ وغیرہ بنانے کی ضرورت تھی۔ ایک آدمی حضرت میاں جی نور محمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس دعا کے لیے آیا، اس کی جائیداد پر کوئی دوسرا قابض ہو گیا تھا اور اس کا مقدمہ چل رہا تھا۔ اس نے

آکر حافظ نور محمد صاحب جھنجھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے دعا کی درخواست کی کہ: حضرت !دعا فرمادیجئے کہ جائیداد پر دوسرا آدمی قابض ہوگیا ہے، مقدمہ چل رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ سے چھڑادے، اور مجھے کامیابی دے۔ حافظ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: بھائی دیکھو !ہمارے حاجی صاحب کی مسجد میں کمرہ نہیں ہے، ان کو فلاں فلاں ضرورت ہے (جو جو ضرورت تھی وہ ساری بتائی) وہ کام تم کرادو، ہم تمہارے لیے دعا کی ذمہ داری لیتے ہیں ۔اس نے کہا: حضرت! ضرور کرادوں گا۔ حضرت نے دعا کردی اور وہ مقدمہ میں کامیاب ہوگیا، واپس آکر اطلاع بھی دی۔ اب اس کے دل میں چور آیا، اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ بہت سارا کام ہے، چلو! ایسا کرتا ہوں کہ آدھا بنادوں ۔ ابھی یہ سوچا ہی تھا کہ کورٹ سے آدھی جائیداد چھوڑنے کا آرڈر آگیا۔ اس نے آکر حافظ صاحب ؒ سے کہا: حضرت ! جائیداد تو آدھی ہی چھوٹی۔ حضرت نے فرمایا: کیا کریں! یہ تو تمہارے اختیار میں تھا۔ ہم نے تو دعا پوری کے لیے کی تھی ، تم نے اپنے ہی ہاتھ سے اس کو آدھا کروادیا۔ تم نے اپنی نیت بدل دی، تو وہاں سے فیصلہ بھی ایسا ہی ہوگیا۔

توحقیقت یہ ہے کہ آدمی سوچتا ہے کہ ابھی نہیں دیتے، بعد میں دیں گے تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ابھی دوسرا سودا بھی تو آنے والا ہے۔ اس لئے آدمی کو شیطان کے دھوکہ میں نہیں آنا چاہیے۔ شیطان آدمی کو فقر سے ڈراتا ہے، کہتا ہے کہ تم اتنا سب خرچ کروگے تو مال کم ہوجائے گا، ابھی فلاں ضرورت باقی ہے، پہلے وہ پوری کرلو بعد میں دوسرا مال بھی تو آنے والا

ہے، اس وقت نکال لیں گے۔اور شیطان تم کو برائی کا (یعنی اللہ کے راستہ میں خرچ نہ کرنے کا)حکم کرتا ہے۔اس لیے انسان کو شیطان کی باتوں پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اَلنَّهْیُ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ

بخل

اور

لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت

۲۹/ربیع الاول ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱/جولائی ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

بخل و شح کا معنیٰ

نیا باب قائم کیا ہے: ”اَلنَّھْیُ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ“ ”بخل“ سخاوت کی ضد ہے، یہ بھی نفس کی ایک بیماری ہے کہ آدمی کی طبیعت میں اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا مزاج نہ ہو۔ دوسری چیز ”شُحّ“ ہے جو بخل ہی کی ایک قسم ہے لیکن اور زیادہ خطرناک ہے کہ مزاج میں بخل بھی ہو اور ساتھ میں حرص اور لالچ بھی ہو، جیسے بعض لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے مزاج کے اندر خرچ کرنے کا مادہ تو نہیں ہوتا، لیکن ساتھ میں حرص بھی ہوتی ہے۔ تو ایسا بخل جو حرص کے ساتھ ملا ہوا ہو؛ اسی کو ”شح“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

جہنم کا راستہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَىٰ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَىٰ﴾ جس نے اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے بخل کیا اور آخرت کی طلب سے بے پرواہی برتی۔ خرچ کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں جو بدلہ ملنے والا ہے اس کو جھٹلایا، یعنی اس پر یقین نہیں کیا؛ تو ہم اس کے لیے جہنم کا راستہ آسان کردیں گے ﴿وَمَا يُغْنِي عَنْهُ مَالُهُ إِذَا تَرَدَّىٰ﴾ جب اس کی ہلاکت کا وقت آئے گا تو اس کا مال کچھ بھی کام نہ دے گا۔ آدمی اس امید پر مال جمع کرتا ہے کہ وقت پر کام آئے گا، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی پکڑ ہونے لگتی ہے تو پھر وہ کام نہیں دیتا۔

نعمتیں صحیح جگہ استعمال نہ کرنے کی نحوست

حدیث پاک میں آتا ہے نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد ہے: جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے کاموں میں خرچ کرنے کا وقت آتا ہے (اور اس کے سامنے مطالبہ بھی رکھا گیا) پھر باوجود خرچ کرنے کی استطاعت کے خرچ نہیں کرتا؛ تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور گناہ کے کاموں میں خرچ کرنے کی نوبت آتی ہے۔ بہت سے لوگوں کو ترغیب دی جاتی ہے، ان کے پاس پیسے بھی موجود ہوتے ہیں، خرچ بھی کرسکتے ہیں، لیکن نہیں کرتے: ایسے لوگوں کے پیسے پھر مقدمہ بازی اور ڈاکٹروں کے یہاں، وکیلوں کی فیس میں خرچ ہوتے ہیں۔ یا ان کی

اولاد ایسی ناہنجار نکلتی ہے کہ وہ اس مال کو جوّے سٹے اور گانے بجانے میں استعمال کر دیتی ہے۔ مال جب نیکی کے کام میں خرچ نہیں ہو گا تو گناہ کے کام میں خرچ کرنے کی نوبت آئے گی۔

اسی روایت میں نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد ہے، آپ نے فضائلِ حج میں سنا ہو گا کہ جب کسی آدمی پر حج فرض ہو جاتا ہے، پھر وہ کسی دنیاوی کام کی وجہ سے حج کے لئے نہیں جاتا، یہ سوچتا ہے کہ آئندہ سال جائیں گے، نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ: لوگ حج کر کے آجائیں گے اور اس کا دنیاوی کام ابھی تک نہیں ہوا ہو گا۔ جس کام کے لیے حج کو ٹالا تھا، وہ کام بھی نہیں ہوا اور حج بھی رہ گیا۔ اور جو آدمی اپنے پاؤں کو اپنے کسی مسلمان بھائی کی حاجت پوری کرنے کے لیے مشقت نہیں دیتا، تو پھر اس کے پاؤں گناہ کی طرف بڑھتے ہیں۔ اب ہمارے اختیار کی بات ہے کہ ہم اپنے لیے کون سی راہ چنتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ اور جو آدمی اپنے نفس کے بخل سے بچالیا گیا؛ وہی کامیاب ہے۔

ظلم و شح سے بچو

حدیث ۵۶۳:-

وعن جابر (رضی اللہ عنہ) ان رسولَ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: اِتَّقُوا الظُّلْمَ، فَإِنَّ الظُّلْمَ ظُلُمَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. وَاتَّقُوا الشُّحَّ، فَإِنَّ الشُّحَّ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ. حَمَلَهُمْ عَلَى أَنْ سَفَكُوا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوا مَحَارِمَهُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ظلم و زیادتی سے، اور کسی کا حق مارنے سے بچو؛ کیوں کہ ظلم قیامت کے دن اندھیروں کی شکل اختیار کرے گا۔ اور وہ بخل جو حرص ولالچ کے ساتھ ملا ہوا ہو، اس سے بھی بچو؛ اس لئے کہ اسی بخل نے جو لالچ کے ساتھ ہوتا ہے، تم سے اگلوں کو ہلاک کیا کہ انہوں نے اسی کے نتیجہ میں خون بہائے، آپس میں قتل وقتال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت آئی۔ اور اسی بخل و حرص کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کرلیا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ایسا بخل جو لالچ کے ساتھ ہو، یہ ایک ایسی برائی اور ایسا رذیلہ اور دل کی ایسی بری صفت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ جب آدمی بخل کی وجہ سے کسی کا حق ادا نہیں کرے گا، کسی کا مطالبہ پورا نہیں کرے گا، مثلاً: بھائی کا یا پارٹنر کا حق دبا کر بیٹھا ہے وہ نہیں دیتا، تو نتیجہ یہ ہوگا کہ لڑائی ہوگی، خون خرابہ ہوگا، آپس میں جھگڑے کی نوبت آئے گی۔ اس کے بالمقابل طبیعت اور مزاج میں انفاق اور سخاوت کا مادہ ہے، تو پھر ان ساری برائیوں کی نوبت نہیں آئے گی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں ان ساری چیزوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، (آمین)

بَابُ الْإِيْثَارِ وَ الْمُوَاسَاةِ

ایثار اور غم خواری

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَ نَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡكَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارِكۡ وَسَلَّمۡ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا کَثِیۡرًا۔ أما بعد:-

﴿وَیُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِھِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِھِمۡ خَصَاصَۃٌ﴾(الحشر:۹)

﴿وَیُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسۡکِیۡنًا وَّیَتِیۡمًا وَّأَسِیۡرًا﴾(الدھر:۸)

ایثاراور مواسات کا مطلب

باب کا عنوان قائم کیاہے:باب الإیثاروالمواسات ”ایثار“کامطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دے، مثلاً: کھاناموجود ہے،خود بھی بھوک لگ رہی ہے، طبیعت میں کھانے کاتقاضہ ہے ، اس کے باوجوددوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہوئے ان کو کھلادے؛اس کو ”ایثار“ کہتے ہیں۔گجراتی میں اسی کو ”تیاگ بھاؤنا “(ત્યાગ ભાવના;)کہتے ہیں کہ وہ چیزخود استعمال کرنے کے بجائے دوسروں کے لیے چھوڑدے،دوسروں کو اپنے مقابلہ میں ترجیح دے۔

”مواسات“یعنی غم خواری۔کسی مصیبت زدہ کی مصیبت میں آپ بھی شریک ہوجائیں ؛اِسی کو ”مواسات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے:﴿يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾وہ خود فاقہ سے اور ضرورت مند ہونے کے باوجود دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔اِس آیت کا شانِ نزول آگے جوروایت آرہی ہے اس میں بتلایاہے۔اس میں حضراتِ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین)اورخاص طور پر انصار کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ان حضرات کی شان یہ ہے کہ خود محتاج اور ضرورتمند ہوتےہیں اس کے باوجود اپنے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا دوسرا ارشاد نقل کیا:﴿وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا﴾ خود کھانے کی چاہت ہے، کھانے کی طرف میلان ہے ،طبیعت میں تقاضہ موجود ہے، اس کے باوجود مسکین ، یتیم کو اور قیدی کو کھلاتے ہیں، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے واسطے کرتے ہیں۔

بعضوں نے ”حُبِّہٖ“ میں ضمیر کو باری تعالیٰ کی طرف لوٹا کر کہا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی بنیاد پر ان لوگوں کو کھلاتے ہیں۔

ایثار کرنے پر اللہ تعالیٰ خوش ہوگئے

ایثار کا وصف حضرات صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) میں کیسا موجود تھا اس کو اس روایت میں بتلاتے ہیں۔

حدیث ۵۶۴:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: إِنِّي مَجْهُودٌ، فَأَرسَلَ إِلَى بَعْضِ نِسَائِهِ، فقالت: وَالَّذى بَعَثَكَ بِالحَقِّ مَاعِندِى إِلاَّمَاءٌ، ثُمَّ أرسَلَ إِلَى أُخرَى، فَقَالَتْ مِثلَ ذٰلِكَ، حَتَّى قُلْنَ كُلُّهُنَّ مِثلَ ذٰلِكَ: لاوَالَّذِى بَعَثَكَ بالحَقِّ مَاعِندِى إِلاَّمَاءٌ. فَقَالَ النبى (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ يُضيفُ هَذَا اللَّيلَةَ؟ فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الأَنصَارِ: أَنَا يَارسولَ الله. فَانْطَلَقَ بِهِ إِلَى رَحلِهِ، فقَالَ لامرَأَتِهِ: أكرِمِى ضَيفَ رسولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم).

وفى روايةٍ قَالَ لامرَأتِهِ: هَلْ عِندَكِ شَيءٌ؟ فقَالَتْ: لاَ! إِلاَّقُوتَ صِبيَانِي. قَالَ: فَعَلِّلِيهِم بِشَيءٍ، وَإِذَا أَرَادُوا العَشَاءَ فَنَوِّمِيهِم، وَإِذَادَخَلَ ضَيفُنَافَأَطفِئِى السِّرَاجَ، وَأَرِيهِ أَنَّا نَأكُلُ. فَقَعَدُوا وَ أَكَلَ الضَّيفُ، وَبَاتَاطَاوِيَينِ. فَلَمَّاأَصبَحَ غَدَاعَلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: لَقَدْعَجِبَ اللهُ مِن صَنِيعِكُمَابِضَيفِكُمَااللَّيلَةَ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں مصیبت زدہ ہوں، مجھے فاقہ اور مصیبت لاحق ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے (اس کی ضرورت کو اپنی طرف سے پورا کرنے کی خاطر) ایک آدمی کو اپنی ازواج میں سے ایک کے یہاں بھیجا (کہ اگر کچھ کھانے کی چیز ہو تو بھیج دو) انہوں نے جواب دیا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق لے کر بھیجا ہے، میرے پاس سوائے پانی کے اور کچھ بھی نہیں ہے (وہ آدمی یہ جواب

لے کر آیا) پھر نبی کریم (ﷺ) نے اپنی دوسری زوجہ مطہرہ کے یہاں آدمی بھیجا، انہوں نے بھی وہی جواب دیا، یہاں تک کہ تمام ازواجِ مطہرات نے یہی جواب دیا۔(اس سے پتہ چلتا ہے کہ خود نبی کریم (ﷺ) کا اور ازواجِ مطہرات کا گزر بسر کیسے ہوتا تھا) حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ اس آدمی کو آج کی رات مہمان بنا کر اپنے یہاں کون لے جاتا ہے ؟ ایک انصاری نے کہا: اللہ کے رسول! میں اس کی میزبانی کا فریضہ انجام دوں گا۔(روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) جو حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے سوتیلے والد ہوتے ہیں انہوں نے یہ پیشکش کی تھی) چناں چہ (وہ اس مصیبت زدہ صحابی کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گئے اور) اپنی بیوی سے کہا (کہ دیکھو! یہ نبی کریم (ﷺ) کے مہمان ہیں) ان کا اکرام کرو (مطلب یہ ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) کے مہمان کے ساتھ ان کی خدمت گزاری، ان کے اکرام اور عزت و احترام کا جو معاملہ کرنا چاہیے، وہ پورے طور پر ملحوظ رہے) دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے اپنی بیوی سے پوچھا: کیا تمہارے پاس کچھ ہے؟ (یعنی گھر میں کوئی چیز ہے جو کسی کے سامنے پیش کی جا سکے؟) اس نے بتایا کہ سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہیں ہے (یعنی صرف بچوں کے کھانے کے لیے کچھ رکھا ہے) تو انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: بچوں کو جب کسی چیز کی ضرورت ہو، اور جب شام کا کھانا مانگیں تو ان کو بہلا پھسلا کر سلا دینا، اور رات کے وقت جب مَیں مہمان کو لے کر آؤں (اور ہم کھانے کے لیے بیٹھیں) اس وقت چراغ بجھا دینا (ہم مہمان کو ایسا تاثر دیں گے کہ ہم بھی کھا رہے ہیں۔ چناں چہ جب مہمان آئے، سب کھانے کے لیے بیٹھے تو ان کی اہلیہ نے چراغ بجھا دیا) مہمان نے کھانا کھایا (اور یہ دونوں کھانے کا محض دکھلاوا کرتے رہے، جیسے ہاتھ میں لقمہ بنا کر منھ تک لے جاتے اور منھ ہلاتے رہتے) اس طرح خود بھوکے رہ کر رات گزاری۔ صبح کے وقت جب نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں وہ صحابی حاضر ہوئے تو حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: رات کو تم دونوں (میاں بیوی) نے اپنے مہمان کے ساتھ جو معاملہ

اورسلوک کیا (جس ایثارسے کام لیاکہ تم خودبھی بھوکے اور ضرورت مندتھے اس کے باوجود خودکھاناکھانے کے بجائے مہمان کے لیے وہ کھانا پیش کردیا، اوراپنے مقابلہ میں مہمان کو ترجیح دی) اس پر اللہ تعالیٰ بہت خوش اورراضی ہوئے

دوکا کھانا تین کوکافی ہے

حدیث ۵۶۵:-

وعنه قَالَ:قَالَ رسول اللهِ(ﷺ):طَعَامُ الاثْنَيْنِ كَافِي الثَّلَاثَةِ،وَطَعَامُ الثَّلَاثَةِ كَافِي الأَرْبَعَةِ (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روایة لمسلمٍ:عن جابر(رضی اللہ عنہ)عن النبی(ﷺ)قَالَ:طَعَامُ الوَاحِدِ يَكْفِي الاثْنَيْنِ،وَطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الأَرْبَعَةَ،وَطَعَامُ الأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَة.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ)کی روایت ہے کہ نبی کریم(ﷺ)نے ارشاد فرمایا: دوآدمیوں کا کھانا تین کے لیے کافی ہوجاتا ہے، اور تین کا چار کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

مسلم شریف میں حضرت جابر(رضی اللہ عنہ)کی روایت میں یہ ہے کہ ایک کاکھانادوکوکافی ہوجاتاہے اور دو کا چارکواورچارکاآٹھ کوکافی ہوجاتاہے۔

افادات:- اگرکھانا اتناہی ہوکہ دو آدمی شکم سیر ہو کر کھاسکیں،پھر اس کے اندر تیسرے کو بھی شریک کر لیاجائے، تواگرچہ تینوں کاپیٹ گلے تک نہیں بھرے گا؛ لیکن اس

کھانے میں سے تینوں اتنا کھالیں گے جس سے تینوں کی بھوک مٹ جائے گی اور ضرورت پوری ہو جائے گی۔

دراصل یہ ارشاد فرما کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) غم خواری کی تعلیم دے رہے ہیں کہ دو آدمی اگر کھانا لے کر بیٹھے ہوں اور ان کو خیال ہو کہ ہم یہ کھانا شکم سیر ہو کر کھائیں گے تو ان کو چاہیے کہ تیسرا آدمی جو بھوکا اور ضرورت مند ہے، اس کو بھی اپنے ساتھ شریک کرلیں۔ گویا دوسرے کے غم اور تکلیف کو بانٹ لو، اس کے غم میں شریک ہو جاؤ، تھوڑی سی تکلیف اپنے اوپر لے لو۔ کسی کے ساتھ اس کے غم و مصیبت میں شریک ہو جانا؛ اسی کو مواسات اور غم خواری سے تعبیر کرتے ہیں۔ جب دو آدمی اپنے کھانے میں تیسرے کو شریک کر لیں گے، یا تین آدمی چوتھے کو شریک کر لیں گے؛ تو یہ صفت اپنے اندر پیدا ہو جائے گی اور اسی کی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ترغیب دی ہے۔

ضرورت سے زائد کو خرچ کردو

حدیث ۵۶۶:-

وعن أبي سعيد الخدری (رضی اللہ عنہ) قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ فِي سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذْ جَاءَ رَجُلٌ عَلَى رَاحِلَةٍ لَهُ، فَجَعَلَ يَصْرِفُ بَصَرَهُ يَمِيناً وَشِمَالاً، فَقَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا ظَهْرَ لَهُ، وَمَنْ كَانَ

لَهُ فَضْلٌ مِنْ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لَا زَادَ لَهُ. فَذَكَرَ مِنْ أَصْنَافِ الْمَالِ مَا ذَكَرَ، حَتَّى رَأَيْنَا أَنَّهُ لَا حَقَّ لِأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک سفر میں جارہے تھے، ایک آدمی اپنی سواری پر سوار ہو کر آیا، اور اپنی نگاہیں دائیں بائیں دوڑانے لگا (جیسے ضرورت مند آدمی اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو میری ضرورت کو پورا کر سکے؟) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جس کسی کے پاس زائد سواری ہو، وہ سواری کسی ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ اور جس کے پاس اپنی ضرورت سے زائد توشہ (کھانے پینے کا سامان) ہو، وہ ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس کھانے پینے کا سامان موجود نہ ہو (حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس موقع پر مال کی اور بھی انواع واصناف کو بیان کیا (جیسے اگر کسی کے پاس زائد بستر ہو تو ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس بستر نہیں ہے۔ اگر کسی کے پاس زائد کپڑے ہیں تو ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ اس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مال کی مختلف قسمیں بیان فرما کر یہی تاکید فرمائی کہ زائد مال ایسے آدمی کو دیدے جو اس کا ضرورت مند ہو) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کو سن کر ہمیں یہ خیال ہونے لگا کہ آدمی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد کسی بھی چیز (سواری، کھانا، کپڑا، بستر وغیرہ) میں خود اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے۔

افادات:- اس لیے ہمیں چاہیے کہ اس کے ذریعہ سے دوسرے ضرورت مند لوگوں کی حاجتوں کو پورا کریں۔ ویسے قرآنِ پاک میں بھی باری تعالیٰ نے اس سلسلہ میں فرمایا ہے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ باری

تعالیٰ نے فرمایا: جو تمہاری ضرورت سے زائد ہو وہ سب خرچ کردو۔ ظاہر ہے کہ ضرورت پوری ہونے کے بعد جو زائد ہے اس کو پڑا رہنے دیں گے، تو اس سے آپ کی ضرورت تو پوری ہو نہیں رہی ہے، آپ کی ضرورت کا جو تھا وہ آپ کے پاس موجود ہے، یہ تو زائد ہے، آپ اس کو دوسرے کے حوالہ نہیں کریں گے، اور نیکی کے راستہ میں خرچ نہیں کریں گے، تو وہ کسی کام کا نہیں ہے، اسی لیے اس کی ترغیب دی گئی ہے۔

ایثار کا عملی سبق

حدیث ۵۶۷:-

وعن سهل بن سعدٍ(رضی اللہ عنہ) أنَّ أمرَأةً جاءت إلَی رسولِ الله(صلی اللہ علیہ وسلم) بِبُرْدَةٍ مَنْسُوجَةٍ، فقالَت: نَسَجْتُهَا بِيَدَيَّ لِأَكْسُوكَهَا، فأَخَذَهَا النَّبِيُّ(صلی اللہ علیہ وسلم) مُحتَاجاً إلَيهَا، فخرَجَ إلَينَا وإِنَّهَا إِزَارُهُ. فقَالَ فُلانٌ: اكْسُنِيهَا مَا أحسَنَهَا! فقَالَ: نَعَم. فجَلَسَ النَّبِيُّ(صلی اللہ علیہ وسلم) فِي المَجلِسِ، ثُمَّ رجَعَ فطَوَاهَا، ثُمَّ أرسَلَ بِهَا إِلَيهِ. فقَالَ لَهُ القَومُ: مَا أحسَنتَ! لَبِسَهَا النَّبِيُّ(صلی اللہ علیہ وسلم) مُحتَاجاً إِلَيهَا، ثُمَّ سَأَلتَهُ، وعَلِمتَ أنَّهُ لا يَرُدُّ سَائِلاً؟ فقَالَ: إنِّي وَاللهِ مَا سَأَلتُهُ لِأَلبِسَهَا، إنَّمَا سَأَلتُهُ لِتَكُونَ كَفَنِي. قَالَ سَهلٌ: فكَانَت كَفَنَهُ (رواہ البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سہل بن سعد ساعدی(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک عورت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس بُنی ہوئی ایک چادر لے کر حاضر ہوئی (جو اس نے خود تیار کی تھی۔ بعض روایتوں میں ہے کہ وہ ایسی چادر تھی جس کے کناروں کو ذرا لچھے دار بنایا گیا تھا) اس نے وہ چادر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں ہدیہ

کے طور پر پیش کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ چادر میں نے خود اپنے ہاتھ سے بُن کر تیار کی ہے؛ تاکہ آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے اس کی چادر بطورِ ہدیہ قبول فرمالی ایسی حالت میں کہ آپ کو خود اس کی ضرورت بھی تھی،پھر(دوسری مجلس میں جب) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے تو آپ اسی چادر کو لنگی کے طور پر زیب تن کیے ہوئے تھے (اس سے پتہ چلا کہ آپ کو ضرورت تھی۔ حضرت سہل(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)کے مجلس میں تشریف لانے کے بعد) ایک صحابی (بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت عبدالرحمن بن عوف(رضی اللہ عنہ) تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہ) تھے)نے کہا:اے اللہ کے رسول!یہ چادرتوبہت عمدہ ہے،آپ مجھے عنایت فرمادیجئے(بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے چھوکرعرض کیا: اے اللہ کے رسول!یہ توبہت عمدہ ہے، مجھے عنایت فرمادیجئے) حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے کہا :ٹھیک ہے(اسی وقت تودے نہیں سکتے تھے،اس لیے کہ آپ اس کو پہنے ہوئے تھے،اس لئے وعدہ فرمالیا) چناں چہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کو اس مجلس میں جتنی دیر بیٹھنا تھا اتنی دیرتشریف فرمارہے، پھر آپ اٹھ کر(مکان میں) تشریف لے گئے اوروہ چادر(جو لنگی کے طور پرآپ زیبِ تن کیے ہوئے تھے اس کو نکال کر) لپیٹ کران صحابی کے پاس بھجوا دی(جن سے آپ نے وعدہ کیا تھا۔بعض روایت میں ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)کی موجودگی میں تو درخواست کرنے والے صحابی سے کسی نے کچھ نہیں کہا؛ لیکن جب نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)اس مجلس سے اٹھ کراپنے مکان میں تشریف لے گئے)تو لوگوں نے کہا:تم نے(حضور(صلی اللہ علیہ وسلم)سے اس چادر کاجو مطالبہ کیا،یہ) ٹھیک نہیں کیا (تمہیں معلوم ہے کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کی خدمت میں جب یہ چادرپیش کی گئی تو)آپ کوخود ہی چادر کی ضرورت تھی(شاید اسی وجہ سے آپ نے اس کو فوراًزیبِ تن کیااوریہ جانتے ہوئے بھی تم نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)سے مانگ لی) پھر تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی چیزآپ (صلی اللہ علیہ وسلم)سے

مانگتا ہے تو نبی کریم (ﷺ) اس کی بات کو رَد نہیں فرماتے (اگر وہ چیز موجود ہوتی ہے تو فوراً عنایت فرمادیتے ہیں، اور اگر نہیں ہوتی ہے تو وعدہ فرمالیتے ہیں۔ گویا تم نے نبی کریم (ﷺ) سے اس چادر کی درخواست کر کے حضور کو زحمت ومشقت میں ڈالا۔ اگر آپ کی ضرورت سے زائد چیز ہوتی تو کوئی بات بھی نہ تھی، لیکن یہ تو آپ کی ضرورت کی چیز تم نے لے لی۔ جب دوسرے صحابہ نے ان کو اپنی درخواست اور مطالبہ پر تنبیہ کی) تو انہوں نے کہا (بھائیو دیکھو!) اللہ کی قسم! میں نے وہ چادر اپنے استعمال اور پہننے کے لیے نہیں مانگی ہے، بلکہ اس لیے مانگی تاکہ (آئندہ چل کر جب میری موت آئے تو یہ چادر) میرے کفن کے طور پر استعمال ہو۔ چناں چہ اس واقعہ کو نقل کرنے والے صحابی حضرت سہل (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں (اس چادر کو انہوں نے محفوظ رکھا اور جب ان کی وفات ہوئی تو) وہ چادر ان کے کفن کے طور پر استعمال ہوئی۔

افادات:- یہاں اس روایت کو پیش کر کے یہ تعلیم دینا مقصود ہے کہ دیکھو! خود نبی کریم (ﷺ) کو اس چادر کی ضرورت تھی، آپ کے پاس لنگی کے طور پر پہننے کے لئے اس وقت دوسری چادر نہیں تھی، اس کے باوجود آپ نے اپنے مقابلہ میں ان مطالبہ کرنے والے صحابی کو ترجیح دیتے ہوئے وہ چادر عنایت فرمادی۔ اس طرح آپ (ﷺ) نے امت کو ایثار کا عملی سبق دیا۔

ایثار کرنے والوں سے حضور (ﷺ) کا اظہارِ تعلق

حدیث ۵۶۸:-

وعن أَبِي موسیٰ(رضی اللہ عنہ)قال قال رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم):إِنَّ الأَشْعَرِيِّينَ إِذَا أَرْمَلُوا فِي الْغَزْوِ، أَوْ قَلَّ طَعَامُ عِيَالِهِمْ بِالْمَدِينَةِ، جَمَعُوا مَا كَانَ عِنْدَهُمْ فی ثَوْبٍ وَاحِدٍ، ثُمَّ اقْتَسَمُوهُ بَيْنَهُمْ فی إِنَاءٍ وَاحِدٍ بِالسَّوِيَّةِ، فَهُمْ مِنِّي وَأَنَا مِنْهُمْ.(متفقٌ عَلَيْهِ)

((أَرْمَلُوا)):فَرَغَ زَادُهُمْ أَوْ قَارَبَ الْفَرَاغَ.

ترجمہ:-حضرت ابوموسیٰ أشعری(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اشعرین (قبیلۂ بنو اشعر کے لوگ) جب سفر میں جاتے ہیں اور ان کا توشہ ختم ہونے کے قریب ہوتا ہے، یا مدینہ منورہ میں رہتے ہوئے(حالت ِ حضر میں)جب ان کے یہاں کھانا کم ہوجاتا ہے تو جس کے پاس جو ہوتا ہے اس کو ایک کپڑے یا برتن میں جمع کرلیتے ہیں، پھر آپس میں برابر تقسیم کرلیتے ہیں(ان کے اس وصف کوبیان فرمانے کے بعد حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نےان کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے فرمایاکہ)میں ان سے ہوں اور وہ مجھ سے ہیں۔

افادات:- أشعر؛یمن کاایک قبیلہ ہے۔حضرت ابو موسیٰ أشعری(رضی اللہ عنہ)،ان کے بھائی اور ان کے قبیلہ کےباون ترپن حضرات نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)کی خدمت میں حاضری کے لیےیمن سے روانہ ہوئے،انہوں نےسمندری راستہ اختیارکیا،کشتی میں سوارہوئے،بادبانی کشتی تھی،اتفاق کی بات کہ ہواکارخ بدل جانے کی وجہ سے مدینہ منورہ پہنچنے کے بجائے وہ حبشہ پہنچ گئے، وہاں پہلے سے کچھ مسلمان قیام پذیر تھے جو ہجرت کرکے وہاں پہنچے ہوئے تھے، ان سب کے امیر حضرت جعفر بن ابی طالب(رضی اللہ عنہ)تھے، وہ لوگ ان کے ساتھ ہوگئے۔ ۷ھ میں جب خیبر فتح ہوا

اس وقت حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) ان تمام مسلمانوں کو -جو ہجرت کرکے حبشہ پہنچے ہوئے تھے- اپنے ساتھ لے کرمدینہ منورہ حاضر ہوئے،اس وقت حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ منورہ میں موجود نہیں تھے، وہ سب خیبر حاضر ہوئے، وہاں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کی۔

اس روایت میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان اشعری قبیلہ والوں کی ایک خوبی ذکر کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی جماعت ایسی ہو کہ جس کے اندر کوئی ایسا وصف پایاجاتاہوجو ان کے لیے خوبی اور کمال کا ہو، اوراس کے ذریعہ دوسروں کو امر خیر کے واسطے ترغیب بھی دی جاسکتی ہو ،تو دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے کہ فلاں لوگ ایساکرتے ہیں۔

دیکھو ! کسی کے دکھ درد کو بانٹ لینامواسات اور غم خواری کاوصف ہے۔اور ظاہر ہے جب کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو، یاکسی کے پاس زیادہ ہو اور کسی کے پاس کم ہو،اورسب مل کر ساتھ دیں،توتمام کی ضرورتیں آسانی سے پوری ہوسکتی ہیں۔

التَّنَافُسُ فِی أُمُوْرِ الآخِرَةِ وَالإِسْتِکْثَارُ مِمَّا یُتَبَرَّکُ بِہِ

آخرت کے کاموں میں سبقت لیجانے

اور

برکت والی چیز کو زیادہ حاصل کرنے کا اہتمام کرنا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:-

باب کا عنوان

آخرت اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے مقابلہ کرنا، سبقت لے جانا۔ اور ایسی چیز جس سے برکت حاصل کی جاسکتی ہو اس کو زیادہ حاصل کرنے کی اگر کوئی آدمی کوشش کرے ؛تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی امور ایسے نہیں ہیں کہ ان میں لوگ ایک دوسرے سے سبقت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مثلاً: فلاں کے پاس اتنی دولت ہے تو میں اس سے زیادہ دولت سمیٹ لوں۔ فلاں نے اتنا بڑا بنگلہ بنایا تو میں اس سے بڑا بنگلہ بنا لوں۔ فلاں نے ایسے کپڑے پہنے ہیں تو میں اس سے بھی اچھے کپڑے پہن لوں۔ دنیا کی کسی بھی چیز میں مقابلہ آرائی کی اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور آگے بڑھنے کی ترغیب نہیں دی گئی ہے۔ ہاں ! نیکی کے کاموں میں البتہ ایک دوسرے سے

آگے بڑھنے کی ترغیب دی گئی ہے، آخرت کے کام ایسے ہیں کہ آپس میں سبقت کرنے والے ،مقابلہ اور ریس کرنے والے اس میں ریس کرسکتے ہیں﴿وَفِيْ ذَالِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ﴾

برکت حاصل کرنے کا اہتمام

حدیث ۵۶۹:-

وعن سَهْلِ بن سَعدٍ(رضی اللہ عنہ):أنَّ رسول اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) أُتِيَ بِشَرابٍ،فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلامٌ ، وَعَنْ يَسَارِهِ الأشْيَاخ ، فَقَالَ لِلغُلامِ:أتَأْذَنُ لِيْ أنْ أُعْطِيَ هؤُلاَءِ؟ فَقَالَ الغلامُ:لاَ وَاللهِ يَارسولَ الله! لاَ أُوْثِرُ بِنَصِيبِي مِنْكَ أحداً.فتَلَّهُ رسُوْلُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) فِيْ يَدِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((تَلَّهُ)) بالتاءِ المثناة فوق: أيْ وَضَعَهُ.وهذَا الغُلامُ هُوَ ابنُ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس مشروب لایا گیا، آپ نے اس میں سے نوش فرمایااور(جو بچا اس کو دینے کے لیے پاس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے) اپنی داہنی جانب دیکھاتو ایک نوعمر لڑکا بیٹھا ہوا تھا اور آپ کی بائیں طرف معمر لوگ، عمر رسیدہ شیوخ تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس نوعمرلڑکے سے کہا: کیا تم اجازت دیتے ہو کہ میں میرا بچا ہوا ان کو دوں؟اس پراس نوعمر لڑکے نے کہا:(یہ آپ کابچاہوا بڑا متبرک ہے،یہ میرا حصہ ہے)اللہ کی قسم !اس کے بارے میں مَیں کسی دوسرے کو ترجیح نہیں دوں گا۔توحضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

افادات:-چوں کہ دائیں طرف ہونے کی وجہ سے اصولی طور پر اسی کو دیناچاہیے، جیسا کہ بعض روایتوں میں یہ ادب بتلایا ہے۔دائیں طرف حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیٹھے ہوئے تھےاور بائیں طرف حضرت خالدبن ولید(رضی اللہ عنہ) تھےاور یہ حضرت عبداللہ بن عباس(رضی اللہ عنہ) کے مقابلہ میں معمر تھے۔اور یہ واقعہ حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجۂ مطہرہ حضرت میمونہ بنت حارث (رضی اللہ عنہا) کے یہاں پیش آیا۔حضرت میمونہ (رضی اللہ عنہا)ان دونوں حضرات-حضرت عبداللہ بن عباس اورحضرت خالدبن ولید رضی اللہ عنہما-کی خالہ ہوتی ہیں۔وہیں حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف فرما تھے،پینے کی کوئی چیز آئی،آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)نےنوش فرمایا اوربچےہوئے کے متعلق حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نےعبداللہ بن عباس(رضی اللہ عنہما) سے فرمایاکہ یہ بچا ہوا ہےاورچوں کہ تم میری دائیں طرف ہو؛ اس لیے اس کے زیادہ مستحق تم ہی ہواورحق بھی تمہارا ہے،لیکن اگر اجازت دو تومَیں ان کو دوں۔اس پر انہوں نے کہا: آپ کا بچا ہوا بڑامتبرک ہےاورمیرا حصہ ہے، اس کو میں کسی اور کو دینے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے گلاس ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"فَتَلَّهُ"،"تَلَّ"کامطلب یہ ہے کہ ناگواری کا اظہار کرتےہوئے قوت کے ساتھ کسی کے ہاتھ میں دینا،جس کوہم" تھما دینا"کہتے ہیں۔

حالاں کہ جب حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نےان سے پوچھاجس سے حضور کی منشاء معلوم ہوسکتی تھی کہ آپ کی بھی خواہش یہ تھی کہ ان کو دیا جائے، لیکن منشاء معلوم ہوجانے کے بعد

بھی وہ کہہ رہے ہیں کہ نہیں! میں خود ہی لینا چاہتا ہوں، اس لئے نبی کریم (ﷺ) نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

برکت سے کوئی مستغنی نہیں

حدیث ۵۷۰:-

وعن أَبِي هريرة(رضی اللہ عنہ)عن النبيِّ(ﷺ) قَالَ:بَيْنَا أَيُّوبُ (علیہ السلام) يَغْتَسِلُ عُرْيَاناً ، فَخَرَّ عَلَيْهِ جَرَادٌ مِنْ ذَهَبٍ ، فَجَعَلَ أَيُّوبُ يَحْثِي فِي ثَوْبِهِ،فَنَادَاهُ رَبُّه-عزوجل-:يَاأَيُّوبُ ! أَلَمْ أَكُنْ أَغْنَيْتُكَ عَمَّاتَرَى؟ قَالَ: بَلَى وَعِزَّتِكَ ! وَلَكِنْ لاَغِنَى بِي عَنْ بَرَكَتِكَ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(ﷺ)نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ حضرت ایوب (علیہ السلام) غسل خانے میں کپڑے نکال کر غسل فرمارہے تھے۔ایسی حالت میں ان کے اوپر سونے کی ٹڈیاں گریں، حضرت ایوب (علیہ السلام) ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑوں میں سمیٹنے لگے، باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو خطاب ہوا: اے ایوب!تم جو ٹڈیاں دیکھ رہے ہو، اس سے ہم نے تم کو مستغنی نہیں کررکھا ہے؟حضرت ایوب (علیہ السلام)نے جواب دیا:اے باری تعالیٰ !تیری عزت کی قسم! (آپ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آسمان سے آئی ہوئی یہ چیز بھی تو آپ کی نعمت اور برکت کی ہے؛اور) میں آپ کی برکت کی اس چیز سے کیسے مستغنی ہوسکتاہوں۔

افادات:- اگر غسل کرنے والا ایسی جگہ غسل کررہا ہے جو تنہائی کی ہے جیسے: غسل خانہ؛تو کپڑے اتار کر بھی غسل کرسکتے ہیں۔ہاں ! اگر لوگوں کے سامنے ہوتو پھر ستر ڈھانپا ہوا ہونا ضروری ہے۔

سونے کی ٹڈیاں جو گریں وہ یا تو باقاعدہ جاندار تھیں اور ان کا جسم اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے سونے کا بنادیا تھا۔یا یہ کہ وہ زندہ نہیں تھیں بلکہ ان کی شکل و صورت ٹڈیوں کی طرح بنی ہوئی تھی۔

جب حضرت ایوب (علیہ السلام) ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑوں میں سمیٹنے لگے،تو یہ عمل بظاہر لالچ معلوم ہوتا ہے،اس لئے باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو خطاب ہوا:اے ایوب!تم جو ٹڈیاں دیکھ رہے ہو، اس سے ہم نے آپ کو مستغنی نہیں کررکھا ہے؟یعنی ہم نے آپ کو پہلے سے بہت کچھ دے نہیں رکھا ہے ،اس کے ہوتے ہوئے ان ٹڈیوں کو اپنے کپڑے میں سمیٹنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہماری اتنی نعمتیں تمہارے پاس موجود ہیں، پھر کیوں اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟ حضرت ایوب (علیہ السلام) نے جواب دیا:باری تعالیٰ!آپ کی عزت کی قسم! آپ نے مجھے بہت کچھ دے رکھا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آسمان سے آئی ہوئی یہ چیز بھی تو آپ کی نعمت اور برکت کی ہے۔میں آپ کی برکت سے کیسے مستغنی ہوسکتا ہوں؟پہلے جو آپ نے دے

رکھا ہے اس کا بھی محتاج ہوں اور یہ نئی نعمت آئی اس کا بھی محتاج ہوں؛ اس لیے میں اپنے آپ کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔

فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ

شکر گزار مالدار کی فضیلت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:-

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى:- "اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ الخ:

شکر گزار مالدار

ایک نیا عنوان قائم کر رہے ہیں: وہ مالدار جو شکر گزار ہو اس کی کیا فضیلت ہے؟ آگے خود ہی اس کی وضاحت کرتے ہیں کہ شکر گزار مالدار کسے کہتے ہیں: "وَهُوَ مَنْ اَخَذَ الْمَالَ مِنْ وَجْهِهٖ" وہ آدمی جو شریعت کے بتائے طریقہ کے مطابق مال حاصل کرے" وَصَرَفَهٗ فِيْ وُجُوْهِهِ الْمَاْمُوْرِ بِهَا" اور جہاں اس کو خرچ کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے وہیں خرچ کرے؛ ایسے صاحبِ مال کو شکر گزار مالدار کہا جاتا ہے۔

شکر کی حقیقت

شکر کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے ،اگر وہ غیر اختیاری ہے،یعنی اس کے حاصل کرنے میں ہماری کسی کوشش و محنت کو دخل نہیں ہے؛بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر ہماری کسی کمائی، محنت اور کوشش کے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، جیسے زندگی ، جسم اور اس کے اندر لگے ہوئے سارے اعضاء ، اور بھی بہت ساری نعمتیں ہیں جو انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بغیر محنت وکوششِ حصول مل جاتی ہیں، ان کے اوپر شکر کا تقاضہ یہ ہے کہ ان نعمتوں کی نسبت سے اللہ تعالیٰ نے جو حقوق لازم کئے ہیں،جو ذمہ داریاں اس صاحبِ نعمت کے اوپر ڈالی ہیں، اوران نعمتوں کی نسبت سے جو احکام دیئے ہیں ان کو پورے طور پر ادا کرے؛یہی اس نعمت کا شکر ہے، ورنہ ان نعمتوں کو جہاں استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے،یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے وہاں استعمال کرنا؛اس نعمت کی ناشکری ہے۔یہ تو غیر اختیاری نعمتیں ہوئیں

اور جو اختیاری نعمتیں ہیں یعنی جن کو کوشش اور محنت کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے ان میں بھی اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال نہ ہو،اور اللہ تعالیٰ نہ دینا چاہیں؛تو آدمی لاکھ کوشش کرے وہ نعمت حاصل ہی نہیں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ان نعمتوں کے حصول میں اور ان نعمتوں کے انسان تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ اس کی محنت و کوشش کو بھی دخل ہوتا ہے ،تو اس سلسلہ میں شکر یہ ہے کہ ان کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے جو طریقہ بتلایا ہے

اسی کو عمل میں لا کر حاصل کرے، اور اس کے نتیجہ میں جو بھی مل جائے، اس کو وہیں استعمال کرے جہاں شریعت کے اجازت دی ہے، اوراس سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو حقوق لازم کئے ہیں ان کو ادا کرے۔ اس میں کچھ حقوقِ واجبہ ہیں، کچھ حقوق مستحبات کے قبیل سے ہیں، تو جو بھی حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا اہتمام کرے، اور ان نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرنے سے بچے؛ یہی اس کا شکر ہے۔

شکر کا پہلا درجہ

اب جو غیر اختیاری نعمتیں ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ نے زندگی عطا فرمائی، جسم عطا فرمایا اور جسم میں بے شمار اعضاء - آنکھیں، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں، دل و دماغ وغیرہ - عطا فرمائے؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں ہیں جن میں ہمارے کسی اختیار کو دخل ہی نہیں، یہ سب نعمتیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے بغیر محنت کے عطا فرما رکھی ہیں، تو ان کے حاصل کرنے کے لئے تو ظاہر ہے کہ کوئی غلط طریقہ اختیار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جب یہ حاصل ہو چکی ہیں تو اب ان کو کس طرح استعمال کرنا چاہیے، اور ان سے کس طرح فائدہ اٹھانا چاہیے؟

تو پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی ان تمام نعمتوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال ہونے سے بچائے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دی ہیں تو ان کو جہاں استعمال کرنے سے اللہ تعالیٰ نے

منع فرمایا ہے ،جیسے کہا گیا ہے کہ نامحرم کو مت دیکھو،بے ریش لڑکوں کومت دیکھو، ناجائز تصویروں کومت دیکھو؛توان جگہوں پر استعمال نہ کرنا۔

اسی طرح زبان ہے ؛اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ سے بولنے کی نعمت ہمیں عطا فرمائی ہے،تواب اس زبان سے جتنی بھی نافرمانی کے کام ہوسکتے ہیں ان تمام کاموں سے آدمی اپنے آپ کو لازماً بچائے۔

یہی حال کانوں کا ہے؛ کانوں کی نعمت کے ذریعہ سے سننے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے،تو ہم کانوں کو ایسی تمام چیزوں کے سننے سے روکیں جن سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے۔

نیکی یا گناہ کے مراحل پر بھی اجروزجر

حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم (ﷺ)نے ارشاد فرمایا: آنکھیں زنا کرتی ہیں اور ان کا زنا نامحرم کو دیکھنا ہے۔کان زنا کرتے ہیں اور ان کا زنا نامحرم کی بات سننا ہے۔زبان گناہ کرتی ہے اس کا زنا کسی نامحرم کے ساتھ بات کرنا ہے۔شرمگاہ تواس کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے(صحیح مسلم۔باب قُدِّرَ عَلَى ابْنِ آدَمَ حَظُّهُ مِنَ الزِّنَى وَغَيْرِهِ.)یہ صرف ایک مثال دی گئی ہے کہ زنا ایک حرام کام ہے، اور اس کوتو آدمی اصالۃً اپنی شرمگاہ کے ذریعہ انجام دیتا ہے جو اس کا آخری درجہ ہے جہاں پہنچ کر یہ کام وجود میں آتا ہے ،یہ توزنا کا آخری درجہ ہے، یہاں جا کر تو زنا کا فائنل اور آخری نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔لیکن نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنے ارشادات کے ذریعہ سے

ہماری رہنمائی فرمائی کہ آپ زنا کو صرف شرمگاہ تک محدود نہ سمجھئے،شرمگاہ تو اس کا آخری مرحلہ طے کراتی ہے، لیکن پہلے کے مراحل جو طے ہوتے ہیں اوران کے لیے جن اعضاء کو استعمال کیاجاتاہے ،ان کو بھی زنا ہی کہا جائے گا،اسی لیے آنکھ کا زنا، کان کا زنا ،زبان کازنا،ہاتھ کازنا؛یہ الفاظ استعمال کئے گئے اور ان کو بھی اعضاء کا زنا بتلایاہے۔

یہی طریقہ ہر چیز میں ہے ،جیسے آدمی نماز کے لیے مسجد میں چل کر آئے گا،تو اس کے واسطے پاؤں کو استعمال کرے گا۔تو چل کر آنا کیااللہ تعالیٰ کے یہاں ضائع جائے گا؟اور ثواب صرف مسجد میں آکر نماز ادا کرنے پر ملے گا؟حالاں کہ نماز تو مسجد میں آنے کے بعد ادا کی جاتی ہے،اور ظاہرہے کہ نمازی جب غیر نمازوالے ان کام کو انجام دے گا تب ہی تو نماز کو اداکرپائے گا۔ہم نے نماز کی ادائیگی کے لیے نماز سے پہلے جتنے بھی مراحل طے کئے ،مثلاً غسل کیا، وضوکیا ،کپڑے پہنے، گھر سے نکلے، چل کر مسجد میں آئے؛یہ سب کام نماز کو ادا کرنے کے لیے ہی کئے،اوریہاں آکر دیکھا کہ ابھی تو جماعت میں دیرہے پھر نماز کے انتظار میں بیٹھے،حالاں کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنا ہمارے لئے بہت دشوار ہوتا ہے،اسی لئے توشریعت نے انتظار کی فضیلت بتائی ہے کہ جب تک آدمی نماز کے انتظار میں رہتا ہے گویا نمازہی میں رہتا ہے۔حدیثِ پاک میں نماز کے انتظار کی اتنی بڑی فضیلت اسی لیے بتلائی کہ انتظارکوئی معمولی کام نہیں ہے،بڑی مشقت کا کام ہے،اورانتظار میں اپنی طبیعت کو لگانے کی وجہ سے جو مشقت ہوتی ہے اس کو برداشت کرنا بھی مجاہدہ کاکام ہے،تو اس مجاہدہ پر بھی اجر ملتاہے،حالاں کہ

ابھی باقاعدہ نماز میں لگا نہیں ہے؛ لیکن نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اس کو نماز کا ثواب ملے گا، اس لئے کہ یہ کام عبادت کے لیے انجام دیا گیا ہے۔

توشریعت ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ عبادت کے لیے شروع میں آپ نے جو مراحل طے کئے اور تمہیدی طور پر جوکچھ بھی کیا، اس پر یوں نہ سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی اجر نہیں ملے گا، آپ کا یہ عمل بےکار نہیں ہے، بلکہ اس پر بھی مستقل اجر ملتا ہے۔ نماز کا اجرو ثواب تو الگ ہے، اس سے پہلے آپ نے جو کچھ کیا اس کا مستقل ثواب اللہ تعالیٰ کے یہاں ملے گا۔ یہی قاعدہ ہر کام میں چلے گا۔ جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں، تو اس کے لئے سحری کھاتے ہیں، حالاں کہ کھانا ایک طبعی عمل ہے لیکن سحری پر بھی حدیثِ پاک میں فضیلت موجود ہے، اس کو بابرکت کھانا کہا گیا ہے، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی تاکید فرمائی ہے، اس کھانے پر باقاعدہ ثواب کا وعدہ فرمایا ہے، اس لئے کہ یہ کھانا عبادت کا ذریعہ بن رہا ہے۔

یہ طرزِ عمل؛ شرافت کا جنازہ

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں جو ہمیں اپنی کسی کوشش اور محنت کے بغیر ملیں، ان کے سلسلہ میں نمبر اول پر یہ ذمہ داری اور فریضہ ہم پر عائد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی ایک نعمت کو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کریں، ورنہ اس سے بڑی ناشکری اور کیا ہوگی؟ جیسے: آپ نے کسی کو کوئی چیز دی، وہ آدمی اس چیز کو آپ ہی کو ناراض کرنے

میں استعمال کرتا ہے، اس کے ذریعہ سے آپ کو ہی تکلیف پہنچا رہا ہے، تو آپ ہی بتلایئے کہ اس سے بڑا خطرناک کام اور کیا ہو سکتا ہے؟ مثلاً: آپ نے سفارش کر کے کسی کو کوئی عہدہ دلوایا، وہ آدمی اس سے غلط فائدہ اٹھاکر آپ کو ہی نقصان پہنچا رہا ہے؛ تو دنیا کیا کہے گی ؟ حالاں کہ ہماری نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا، بلکہ ہمیں تو بتلادیا گیا کہ ساری دنیا مل کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر تل جائے اور دنیا میں جو سب سے زیادہ نافرمان اور سرکش آدمی ہے، سب لوگ ایسے بن جائیں، تب بھی اللہ تعالیٰ کی شان میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے؛ لیکن ہماری شرافت اور مروت کا تو جنازہ نکل ہی گیا۔ ہمارا یہ طرزِ عمل شرافت کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لئے تو علماء لکھتے ہیں کہ نافرمانیاں اور گناہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہی نہیں ہیں، بلکہ شرافت اور مروت کے بھی خلاف ہیں۔ اس لئے تمام نعمتیں چاہے اختیاری ہوں یا غیر اختیاری؛ ان کے سلسلہ میں سب سے پہلا فریضہ ہم پر یہی عائد ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے زندگی کے دن، ہفتے، مہینے، ساعتیں اور گھڑیاں ہمیں عطا فرمائیں، تو اب زندگی کے ان اوقات کو ہم گناہوں میں استعمال نہ کریں۔ اگر ایک گھڑی کو بھی ہم اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کریں گے ؛ تو یہ ناشکری ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جوانی عطا فرمائی، تو جوانی کی صلاحیتوں کو کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے، اپنی شہوت پوری کرتا ہے، جوانی کی قوت کو ظلم اور زیادتی میں استعمال کرتا ہے؛ تو یہ جوانی کی نعمت کی ناشکری

ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مال دیا،تواس کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کرتا ہے۔ساری نعمتوں میں آدمی اول درجہ پر یہی سوچ کہ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو؛ چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اختیاری ہو یا غیر اختیاری؛ ہرگز ہرگز اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال نہیں کروں گا۔ورنہ یہ سب سے پہلی ناشکری ہوگی۔

شکر کا دوسرا درجہ

نمبر دوپر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کے سلسلہ میں جو ذمہ داری وجوبی حیثیت سے ضروری قرار دی ہے اس کو انجام دے۔مثلاً جسم عطا فرمایا،اسی کے ذریعہ سے نماز،روزہ وغیرہ تمام جسمانی عبادتیں ادا کی جاتی ہیں، جسم سے متعلق یہ سب اہم فریضے ہیں۔اسی طرح دیگر تمام نعمتوں سے متعلق جتنے بھی فرائض ہیں ان کو انجام دینا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا،یہ نعمت البتہ ایسی ہے کہ اس میں آدمی کے اختیار کو بھی کچھ دخل ہوتا ہے،اور بعض دفعہ غیر اختیاری بھی ملتا ہے،جیسے:باپ یا کسی رشتہ دار کا انتقال ہوا اور بیٹے یا وارث کو لاکھوں کروڑوں روپے مل گئے؛یہ بغیر محنت کے ملے ہیں۔ یا کسی نے ہدیہ دیا تو یہ بھی بغیر محنت کے ملا۔اور کبھی محنت کرکے کاروبار کے ذریعہ سے کماتا ہے۔تو مال سے متعلق جو فرائض ہیں ،ان کوادا کرنا ضروری ہے۔ مال کا فریضہ کیاہے؟ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر، قربانی وغیرہ۔یا صاحبِ مال ہونے کی حیثیت سے آپ پر اللہ تعالیٰ نے آپ کی

اولاد، بیوی،ماں باپ ،بھائی بہن وغیرہ کانفقہ واجب کیا، یا کبھی اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا وجوب کا درجہ حاصل کرلیتاہے؛ تو یہ سب مال سے تعلق رکھنے والے واجبات ہیں ،ان سارے فرائض کو ادا کرے۔پھر اس کے بعد اس نعمت سے تعلق رکھنے والے مستحبات کو بھی ادا کرنے کا اہتمام کرے ،یعنی اللہ تعالیٰ جس کام سے راضی ہوتاہے اس کا اہتما م کرے۔ چاہے کوئی بھی نعمت ہو،اس کی قدردانی کا حق یہی ہے کہ وہ نعمت جس کام کے لئے دی گئی ہے، اوراس سے لوگوں کو جتنا زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہو، اس کازیادہ سے زیادہ اہتمام کرناہی اس نعمت کا سب سے بڑا شکرہے

اوراگراس نعمت کوحاصل کرنے میں ہماری کسی محنت و کوشش کو دخل ہے،توپھر یہ بھی خیال رکھا جائے کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کے اندر کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والاہو۔جیسے مال ،مکان وجائیداد کو حاصل کرنے کے لیے کوئی آدمی لوگوں کی جیب کاٹتا ہو،مال لوٹتا ہو، چوری کرتا ہو، ظلم و زیادتی کرتا ہو لوگوں کے حقوق مارتا ہو؛ تویہ سب جائز نہیں۔اس کو حاصل کرنے کے لیے شریعت نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی کو اختیار کرےیعنی مزدوری کرے،کاروبار کرے۔پھر اس کو اختیار کرنے کے ساتھ کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے دوسرا کوئی فرض چھوٹ جائے، جیسے: دکان پر بیٹھا توکاروبار میں ایسا مشغول ہوگیا کہ فرض نمازیں چھوڑدیں ،ایسا کرنے کی وجہ سے کمائی کے حلال ہونے کے باوجود یہ دکانداری نماز چھوڑنے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کاذریعہ بنی،اگرچہ اس کمائی کوبہ

حیثیت کمائی کے حرام نہیں کہیں گے، لیکن سائڈ اِفیکٹ تو ہورہی ہے،اور ہم ہر کام میں سائڈ اِفیکٹ کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی اپنی کمائی کو اس سے بچانے کا اہتمام کیجیے،ورنہ اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی۔

خلاصۂ کلام

خلاصہ یہ ہوا کہ ان ساری چیزوں کو اگر ملحوظ رکھیں گے تو کہا جائے گا کہ اس نعمت کا حق ادا کیا۔اسی لئے علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) نے عنوان قائم کیا ہے:**فَضْلُ الْغَنِيِّ الشَّاكِرِ**"ایسا مالدار جو شکر گزار ہو اس کی فضیلت کا بیان۔اور شکر گزار آدمی کی خود ہی وضاحت کردی کہ جس طریقہ سے مال حاصل کرنا چاہیے،اسی طریقہ سے حاصل کرے ،یعنی مال حاصل کرنے کا جو جائز طریقہ ہے اسی کو اختیار کرے،اور جہاں اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہیں خرچ کرے۔یہاں "مامور بہا" کی قید لگا کر ایک اور بات بتائی جارہی ہے کہ جائز کام میں خرچ کرنے پر بھی فضیلت اسی وقت ملے گی جب کہ اسی جگہ خرچ کرے جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔جائز کام میں خرچ کرنے پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔یہ الگ چیز ہے کہ فقہاء کرام کے یہاں جائز اور مباح کو بھی "مامور بہا" بتلایا گیا ہے، اور "مامور بہا" واجب کو بھی کہتے ہیں۔

خرچ کرنے میں یہ بھی بہتر اور وہ بھی!

اب اس سلسلہ میں آیتیں پیش کرتے ہیں۔ایک آیت تو پہلے (بَاب النَّهِیْ عَنِ الْبُخْلِ وَالشُّحِّ میں) آچکی ہے۔دوسری آیت ہے:﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِیَ﴾ اللہ کے راستہ میں جو خرچ کرتے ہو اس کو تم ظاہر کرو،یعنی کھل کر خرچ کرو کہ لوگوں کو پتہ چلے؛تو یہ بہت اچھی بات ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

یہ مستقل مسئلہ ہے کہ خرچ کرنے میں اخفاء یعنی چھپانا اچھا ہے یا ظاہر کرنا؟ علماء نے لکھا ہے کہ جو فرائض کے قبیل سے ہو ،اس کو تو ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، تاکہ دوسروں کو بھی ان فرائض کی ادائیگی کی ترغیب ہو، جیسے فرض نماز؛کہ اس کو مسجد میں آکر ہی ادا کرنا چاہیے۔اسی طرح سے زکوٰۃ کو ادا کرنے میں بھی اظہار کرے تو کوئی حرج کی بات نہیں یعنی اس طرح زکوٰۃ دے کہ لوگوں کو پتہ چلے؛ تاکہ دوسروں کو بھی اس فریضہ کی ادائیگی کا اہتمام ہو۔ البتہ نوافل میں جیسا موقع ہو،اگر موقع کے مناسب اخفاء ہو تو اس کی فضیلت زیادہ ہوگی، اور اگر کوئی موقع ایسا ہے کہ لوگوں کو ترغیب کی ضرورت ہے تو اظہار میں بھی کوئی حرج نہیں۔

﴿وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ﴾ اگر اللہ کے راستہ میں خرچ کی جانے والی چیز کو چھپا کر فقراء کو دو،تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اور

اللہ تعالیٰ تمہاری سیئات کو درگزر کرے گا اور جو تم کرتے ہو اس سے اللہ تعالیٰ واقف اور باخبر ہے۔ اس آیت میں صدقات کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے، اور جیسا کہ بتایا کہ نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا بھی شکر کا ایک حصہ ہے۔

نیکی کا اعلیٰ درجہ

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ﴾ تم نیکی کا اعلیٰ درجہ اس وقت تک پا نہیں سکتے، جب تک کہ تم ان چیزوں کو خرچ کرو جو تمہارے نزدیک محبوب ہیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کے معاملہ میں ہمارے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے اس میں سے وہی نکالا جاتا ہے جو رڈی ہو چکا ہو۔ جیسے: کپڑے پہنتے پہنتے پرانے ہوگئے، اور نئے آئے تو سوچتے ہیں کہ پرانے کپڑے اللہ کے راستہ میں کسی غریب کو دیدو۔ کھانا کھاچکے اور بچ گیا، گھر میں کوئی کھانے والا باقی نہیں ہے، تو فقیر کو دے دو۔ زندگی گزر گئی، بڑھاپا آگیا، اب گھر والے بھی دھکا دے کر گھر سے باہر نکال رہے ہیں "نہ منہ میں دانت، نہ پیٹ میں آنت" والا معاملہ ہوگیا، تو اب مسجد میں جاکر تسبیح پڑھو۔ اگرچہ ایسے کاموں پر بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب ملتا ہے، لیکن نیکی کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی ایسی چیز خرچ کرے جو اس کے نزدیک بھی قیمتی اور محبوب ہو، جس کی وجہ سے دینے کو بھی جی آمادہ نہ ہوتا ہو، لیکن مجاہدہ کر کے اور اپنے نفس کے تقاضوں کو روک کر اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کردے۔ جیسے جوانی کے زمانہ کو

اللہ کی عبادت میں لگائے تو یہ اعلیٰ درجہ ہے اوراس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔جو چیز آپ کو مرغوب اور محبوب ہو اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ کیجئے ﴿وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ اور جو کچھ بھی تم خرچ کروگے اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔کیسے حالات میں خرچ کرتے ہو اوردل میں کیا ارادہ ہے؛ اس سے اللہ تعالیٰ واقف ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو احکام دیئے جاتے تھے ان پر عمل کرنے کا حضرات ِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔جب یہ آیت نازل ہوئی تو فوراً حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا،اورمیرا باغ ”بیر حآء“ مجھے سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ ہے ، وہ آپ کی خدمت میں پیش ہے ، اس کو آپ جہاں چاہیں خرچ کریں۔ان کا یہ باغ جو مسجد نبوی کے بالکل سامنے تھااور اس میں پانی بھی بڑا عمدہ تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شیریں پانی کو نوش فرمانے کے لئے اس باغ میں تشریف بھی لے جاتے تھے۔یہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کا حال تھا۔

دو قابلِ رشک شخصیتیں

حدیث ۵۷۱:-

وعن عبدِ اللہ بنِ مسعودٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالاً، فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ. وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ حِكْمَةً، فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ) وتقدم شرحہ قریباً

حدیث ۵۷۲:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبی (ﷺ) قَالَ: لَاَ حَسَدَ إِلاَّ فی اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الْقُرْآنَ، فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ. وَرَجُلٌ آتَاهُ مَالاً، فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں پر حسد کرسکتے ہیں۔ایک تو وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو اور پھر اس مال کو حق (نیکی) کے کاموں میں خرچ کرنے پر اس کو مسلط کیا ہو۔ اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، وہ اس علم کے ذریعہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور لوگوں کو بھی وہ علم سکھلاتا ہے۔

افادات:- (اس روایت کی تفصیل باب الکرم والجود میں قریب ہی گزرچکی ہے) حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت ملی ہو، اس نعمت کے متعلق دوسرا آدمی یہ سوچے کہ مجھے مل جائے اور اس سے یہ نعمت چھن جاوے۔

اس روایت میں حسد بول کر غبطہ مراد لیاہے، جس کو اردو میں رشک کہتے ہیں، یعنی سامنے والے کے پاس نعمت باقی رہتے ہوئے اپنے لیے اس نعمت کی تمنا کرنا۔گویا حضور اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ دوہی آدمی اس لائق ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نعمت ملی ہے اس کو دیکھ کر دوسرا آدمی تمنا کرسکتاہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ایسی نعمت عطافرمائے۔

پہلی شخصیت

ایک تو وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا ہو ، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو اس مال پر مسلط کیا ہو یعنی اس کو اتنی قوت اور ہمت دی ہو کہ اس مال کو اللہ تعالیٰ نے جہاں خرچ کرنے کا حکم فرمایا، وہاں برابر خرچ کرتا رہتا ہو۔ گویا اس کو اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کے لئے مسلط کیا ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے کہ وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور جہاں اللہ تعالیٰ نے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ رات دن اس کو نیکی کے کاموں میں برابر خرچ کرتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کے پاس مال ہو اور نیکی کے کاموں میں اس کو خرچ کرتا ہو، وہ اس قابل ہے کہ اس پر رشک کیا جائے۔ اسی کو ''غنی شاکر'' سے تعبیر کیا ہے۔

دوسری شخصیت

دوسرا آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا، جس کے ذریعہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اس علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ علم کی نعمت اگر اللہ تعالیٰ نے کسی کو عطا فرمائی ہو تو اس کا حق یہی ہے کہ وہ اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ اگر اس کے پاس علم ہے اور شریعت کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی

صلاحیت ہے ،تو اس کو چاہیے کہ وہ لوگوں کو علم سکھائے اور حق کے مطابق فیصلے کرے۔ بلکہ ایسی کوئی چیز اس کو معلوم ہے اور جس کا جاننا دوسرے کے لیے بھی ضروری ہے، تو اس کا بتانا اس پر فرض ہے، اگر چھپائے گا اور نہیں بتائے گا؛ تو اس پر بڑی سخت وعید ہے۔ کسی آدمی سے کوئی بات پوچھی گئی اور وہ اس کو جانتا ہے ، لیکن اس نے اس کو چھپایا تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز اس کو جہنم کی آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ (ابن ماجہ. بَابُ مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهُ)

ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا

اس حدیث کے تحت علماء نے لکھا ہے کہ اس میں صراحت ہے کہ اس سے ایسی چیز پوچھی گئی ہو جس کا جاننا ضروری تھا اور اس نے چھپایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لایعنی اور بے کار سوال کا جواب اگر نہ دے تو اس پر یہ وعید نہیں ہے۔ ہم دارالافتاء میں بیٹھتے ہیں تو لوگ بے کار اور لایعنی چیزیں بھی بہت پوچھتے ہیں۔ تو یہ بات بھی سمجھ لی جائے کہ ہر چیز کا جواب نہیں دیا جاتا، اس لئے کہ ایسی چیزوں کا بتانا ضروری نہیں ہے، بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ اس کا جواب دیا ہی نہ جائے۔ یہاں تو وہ علم مراد ہے کہ جو لوگوں کے لیے سیکھنا ضروری ہے، جیسے ایک آدمی کو نماز کا طریقہ معلوم نہیں ہے، نماز کے فرائض اور واجبات معلوم نہیں ہیں، وہ آپ کے پاس آیا اور درخواست کرتا ہے کہ مجھے نماز کا طریقہ بتا دیجئے، لیکن آپ منع کرتے ہیں اور نہیں سکھاتے؛ تو

یہ اس وعید میں داخل ہے۔ آپ کو زکوٰۃ کا مسئلہ معلوم ہے،ایک آدمی صاحبِ نصاب ہے، وہ آپ کے پاس مسئلہ معلوم کرنے کے لئے آیااورآپ سے پوچھا اور جاننے کے باوجود آپ نے نہیں بتایاتو اس وعید میں داخل ہوجائیں گے۔توہروہ چیز جس کا جاننا شرعی طور پر ضروری ہےاورآپ کووہ معلوم بھی ہے؛ تواس کابتانا ضروری ہے۔

دو باتیں

دیکھو! یہاں دوباتیں بتائی ہیں۔ایک یہ کہ مال تھا توجیسےمال میں سے خرچ کرنا واجب ہے، اصحابِ حقوق کے حقوق اداکرناضروری ہے۔اولاد کا ماں باپ کے اوپر حق ہے، اور ماں باپ کا اولاد پر حق ہے، اگران دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرےکاحق ادا نہیں کرے گا؛ تو گنہگار ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگراللہ تعالیٰ نےعلم دیاہے تو جو لوگ جاہل ہیں ان کا حق ادا کرو، اگر وہ آپ سے پوچھتے ہیں اور آپ جانتے ہوئے بھی ان کو نہیں بتاتے، تو آپ کے لیے یہی وعید ہے۔علم والی نعمت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی اس کا شکر یہی ہے کہ لوگوں کو سکھاؤ، خود توعمل کرنا ہی ہے، لیکن اوروں کو بھی سکھایا جائے۔

حفظِ قرآن کا حق

دوسری روایت میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے: ''رَجُلٌ اٰتَاہُ اللہُ الْقُرْآنَ فَھُوَ یَقُوْمُ بِہٖ اٰنَآءَ اللَّیْلِ وَاٰنَآءَ النَّھَارِ'' اوپر تو مطلق علم کے بارے میں بتلایا تھا، یہاں بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو قرآنِ کریم کی نعمت عطا فرمائی یعنی حفظِ قرآن کی دولت سے مالا مال کیا، وہ اس کو لے کر رات دن کے مختلف اوقات میں نماز میں کھڑا رہ کر پڑھتا رہتا ہے۔ گویا اس کا حق ادا کررہا ہے؛ تو یہ اس کا شکر ہے۔ اگر کسی کو قرآنِ کریم کی دولت دی گئی، اس کا شکر یہی ہے کہ رات اور دن میں اس کو نمازوں کے اندر پڑھے، اگر نہیں پڑھتا ہے اور سویا رہتا ہے تو اس پر حدیث میں بڑی سخت وعید آئی ہے۔

فقراءِ مہاجرین کی کڑھن

حدیث ۵۷۳:-

وعن أَبي هريرة(رضی اللہ عنہ): أَنَّ فُقَراءَ المُهَاجِرِينَ أَتَوْارسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالُوْا: ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالدَّرَجَاتِ العُلَى وَالنَّعِيمِ المُقِيمِ، فقَالَ: وَمَاذَاك؟ فقالوا: يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَيَتَصَدَّقُونَ وَلاَ نَتَصَدَّقُ وَ يَعْتِقُونَ وَ لاَنَعْتِقُ .فَقَالَ رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم): أَفَلاَأُعَلِّمُكُمْ شَيْئاً تُدْرِكُونَ بِهِ مَنْ سَبَقَكُمْ ، وَتَسْبِقُونَ بِهِ مَنْ بَعْدَكُمْ، وَلاَيَكُونُ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ إِلاَّ مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَاصَنَعْتُمْ؟ قَالُوْا: بَلَى يَارسولَ الله.قَالَ: تُسَبِّحُونَ وَتُكَبِّرُونَ وَتَحْمِدُونَ دُبُرَكُلِّ صَلاَةٍ ثَلاثاً وَثَلاثِينَ مَرَّةً .فَرَجَعَ فُقَرَآءُ المُهَاجِرِينَ إِلَى رسولِ

اللهِ(ﷺ)، فقالوا: سَمِعَ إِخْوَانُنَا أَهْلُ الْأَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا، فَفَعَلُوا مِثْلَهُ؟ فَقَالَ رسولُ اللهِ(ﷺ): ذَٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ. (متفقٌ عَلَيْهِ. وَهَذَا لفظ رواية مسلم)

((الدُّثُور)): الأَمْوَالُ الكَثِيرَةُ، وَاللهُ أعلم.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: غریب مہاجرین نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مال دار لوگ جنت کے اونچے درجات اور جنت کی ہمیشہ کی نعمتوں کو لے اڑے (سارے درجات انہوں نے حاصل کرلیے) آپ (ﷺ) نے سوال کیا: وہ کیسے؟ فقراءِ مہاجرین نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں؛ وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، ہم روزہ رکھتے ہیں؛ وہ بھی روزہ رکھتے ہیں، لیکن ان کے پاس مال ہے تو وہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں، اور ہم خرچ نہیں کرسکتے۔ وہ غلاموں کو خرید کر آزاد کرتے ہیں اور ہم آزاد نہیں کرسکتے۔ حضور اکرم(ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں تم کو ایسی چیز نہ سکھاؤں کہ اس کے ذریعہ تم ان لوگوں کو پالو جو تم سے آگے بڑھ گئے ہیں، اور جو لوگ بعد میں آئیں ان سے بھی آگے بڑھ جاؤ، اور تم سے افضل اور بہتر کوئی نہیں ہوسکتا مگر وہی جو اسی عمل کو کرے جس کو تم کرتے ہو۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتائیے۔ حضور(ﷺ) نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳/ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳/ مرتبہ الحمدللہ، اور ۳۳/ مرتبہ اللہ اکبر کہا کرو (مالدار حضرات نے سنا تو انہوں نے بھی وہ عمل شروع کردیا) وہی فقراء پھر رسول اللہ(ﷺ) کی خدمت میں آئے اور عرض کیا: ہم نے جو عمل شروع کیا، ہمارے مالدار بھائیوں نے سنا تو انہوں نے بھی شروع کردیا (وہ تو پھر برابر ہوگئے) حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: "ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ" یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔

افادات: دیکھو !ان کو یہ فکرلاحق تھی،اور ہم کو تو یہ فکر لاحق ہے کہ اس نے بنگلہ بنایا اورہم بنگلہ بنانے میں اس سے پیچھے رہ گئے۔اس نے دو بلڈنگ تعمیر کرلیں اور ہماری ایک ہی ہے۔اس نے دو فیکٹریاں بنالیں،ہماری نہیں ہے۔ان چیزوں میں تو ہم بہت چوکنے رہتے ہیں، لیکن آخرت کی نعمتوں کو حاصل کرنے میں کبھی ہمارا ذہن جاتا ہی نہیں کہ فلاں آگے بڑھ رہاہے، تو میں بھی آگے بڑھوں۔ہم میں ان چیزوں کا اہتمام نہیں رہا۔حضراتِ صحابہ کرام کے متعلق کسی بھی روایت میں یہ بات آئی ہو تومجھے بتاؤکہ فلاں صحابی یہ شکایت لے کر حضور(ﷺ)کی خدمت میں گئے ہوں کہ اے اللہ کے رسول! فلاں صاحب تجارت میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں،آپ دعا کیجئے کہ میری تجارت میں بھی کچھ برکت ہوجائے،بلکہ صرف دعا کی درخواست ہی لے کر آئے ہوں ایسا بھی کسی روایت میں آیا ہو تو بتاؤ۔

خیر! ان لوگوں نے اس نسخہ پر عمل شروع کردیا،پھرمالداروں کو بھی پتہ چل گیا کہ ایک نیا نسخہ حاصل ہوگیاہے۔وہ حضرات ہمارے زمانہ کی طرح نیکیوں سے بے رغبت نہیں تھے۔اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرمائے، آج تو کسی کونیکی کے کام کی اگررغبت دی جاتی ہے تو کہتاہے کہ جاؤ! دوسروں سے کہو،ہم نے توبہت نیکیاں کمالی ہیں۔ایسے جملے زبان سے نکالتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے۔

بَابُ ذِكْرِ الْمَوْتِ

وَقَصْرِ الْأَمَلِ

مجلس ۱

موت کے یاد کرنے اور

تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان

مجلس ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلاَّ مَتَاعُ الْغُرُورِ (آل عمران:۱۸۵)

وقال تعالیٰ: وَمَا تَدْرِی نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِی نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ.(لقمان:۳۴)

قال تعالیٰ: فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لاَ يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلاَ يَسْتَقْدِمُونَ (النحل:۶۱)

قال تعالیٰ: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلاَ أَوْلاَدُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هم الْخَاسِرُونَ وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلاَ أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللهُ نَفْساً إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ.(المنافقون:۹-۱۰-۱۱)

وقال تعالیٰ: حَتّٰى إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحاً فِيمَا تَرَكْتُ كَلاَّ إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِنْ وَرَائِهِمْ بَرْزَخٌ إِلَى يَوْمِ يُبْعَثُونَ فَإِذَا نُفِخَ فِي الصُّورِ فَلاَ أَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَلاَ يَتَسَاءلُونَ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِينُهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِينُهُ فَأُولئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ فِي جَهَنَّمَ خَالِدُونَ تَلْفَحُ وَجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُونَ أَلَمْ تَكُنْ آيَاتِي تُتْلَى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ إِلَى قوله تعالَى: كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الأَرْضِ عَدَدَ سِنِينَ قَالُوا لَبِثْنَا يَوماً أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْأَلِ العَادِّينَ قَالَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلاَّ قَلِيلاً لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُم تَعْلَمُونَ أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لاَ تُرْجَعُونَ (المؤمنون:۹۹ تا ۱۱۵)

وقال تعالیٰ: أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلاَ يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمِ الأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ فَاسِقُونَ (الحديد:١٦). والآيات فی الباب كثيرةٌ معلومة.

گناہوں میں مبتلا ہونے کی وجہ

نیا عنوان قائم کیا ہے :موت کو یاد کرنے، اور تمناؤں امیدوں کو مختصر کرنے کا بیان

یہ بہت اہم اور ضروری چیز ہے۔عام طور پر آدمی گناہوں میں مبتلا ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو توڑنے اور نافرمانیوں کی نوبت آتی ہے، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ موت کی طرف سے غفلت رہتی ہے۔اگر آدمی کو موت پیشِ نظر رہے، اور ہر وقت اس کا احساس

اوراس کی یاد رہے توگناہوں اور اللہ کے احکام کو توڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسی لئے قرآنِ پاک میں کئی جگہوں پر موت کو یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے اوراس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔احادیث میں بھی نبی کریم (ﷺ) نےاس کی طرف متوجہ کیا ہے۔فرمایا:"اَکۡثِرُوۡا ذِکۡرَ ہَاذِمِ اللَّذَّاتِ یعنی المَوۡتَ. (سنن ترمذی)" لذتوں کو کاٹنے اور ختم کرنے والی یعنی موت کو کثرت سے یاد کیا کرو۔

ناقابلِ انکار حقیقت

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔دنیا میں بے شمار چیزیں اور حقائق ایسے ہیں کہ ان کو تسلیم کرنے سے لوگوں نے انکار کیا،یا اس میں شک و شبہ کا اظہار کیا۔خود اللہ تعالیٰ کے وجود کا بہت سے لوگ انکار کرتے ہیں،اس کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔نبی کریم(ﷺ) کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتے۔ بہت سے لوگ قیامت کو نہیں مانتے۔لیکن صرف موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کرتا،چاہے مسلمان ہو، کافر ودہریہ ہو؛سب کو یہ حقیقت تسلیم ہے کہ موت آنے والی ہے۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ موت کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے،ہو سکتا ہے کہ ابھی آجائے، پانچ منٹ کے بعد آجائے، ایک گھنٹہ کے بعد آجائے، ایک دن کے بعد آجائے، ہفتہ کے بعد، مہینہ کے بعد ، سال بھر کے بعد آجائے۔مطلب یہ ہے کہ یہ بات طے ہے کہ آنے والی

ہے لیکن کب آئے گی اس کا وقت معلوم نہیں۔ جب اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تو پھر ہمیشہ تیار رہنا چاہیے اور اس کی تیاری بھی کرتے رہنا چاہیے، اس کی طرف سے اگر غفلت برتی جائے گی تو یہ آدمی کے لیے بہت زیادہ مضر اور نقصان دہ ہے۔ شیطان آدمی کو یہ سمجھاتا اور بہکاتا ہے کہ ابھی تو جوانی ہے، اللہ تعالیٰ نے قوت دی ہے، پیسہ اور سارے اسباب ہیں؛ جو کرنا ہے ابھی کرلو، بعد میں توبہ کرلیں گے؛ حالاں کہ اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی کہ بعد میں توبہ کا موقع بھی ملے گا یا نہیں عام طور پر جو نافرمانیاں ہوتی ہیں وہ اسی دھوکہ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آدمی یہ سوچ لے کہ موت کسی بھی وقت آسکتی ہے، اس کے لیے ہمیں تیار رہنا چاہیے، اور اس کی تیاری بھی کرتے رہنا چاہیے؛ تو پھر ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے باز رکھ سکے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کی کوشش کرے۔

مختصر سفر کی تیاری اور لمبے سفر سے غفلت!

دنیا کے اندر آدمی کا چھوٹا موٹا سفر ہوتا ہے، تو اس کے لئے کتنی تیاریاں کی جاتی ہیں، مثلاً دو روز کے لیے دہلی جانا ہے؛ لیکن اس کے لئے پہلے سے ٹکٹ بک کراتے ہیں، ریزرویشن کراتے ہیں، دہلی میں بھی فون کردیتے ہیں کہ فلاں ہوٹل میں جگہ بک کرا لو، وہاں جو دوست احباب ہیں ان کو اطلاع کی جاتی ہے کہ فلاں اسٹیشن پر اترنے والا ہوں، وہاں میرے استقبال کے لیے موجود رہیں۔ صرف دو دن کا معاملہ ہوتا ہے اس کے باوجود یہ ساری

تیاریاں کی جاتی ہیں۔اور آخرت کا اتنا لمبا سفر ہے،جہاں سے دوبارہ واپس بھی نہیں آنا ہے،اس کے باوجود اس کی تیاری کے معاملہ میں ہم غفلت برتتے ہیں۔

آپ سے بڑا بیوقوف کوئی نہیں

حضرت بہلول (رحمۃ اللہ علیہ) ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کا ہارون الرشید کے یہاں آنا جانا تھا۔بادشاہ بھی ان کے ساتھ دل لگی کیا کرتے تھے۔اپنے دربانوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ جب بھی آئیں؛ روکا نہ جائے۔وہ آتے تھے اور یہ دل لگی کیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ آئے تو ہارون الرشید نے ان کو ایک چھڑی دی اور کہا کہ: یہ میں آپ کو بطورِ امانت دیتا ہوں،جب آپ کو اپنے سے زیادہ بیوقوف شخص دنیا میں نظر آئے،اس کو دے دینا۔انہوں نے برا نہیں مانا، چھڑی لے لی اور اپنے پاس حفاظت سے رکھ لی۔ایک مدت کے بعد ایک مرتبہ ان کو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت بیمار ہیں، اور ان کی زندگی کی امید کم ہے؛تو وہ اس چھڑی کو لے کر حاضر ہوئے اور پوچھا:

امیر المومنین !کیا حال ہے، کیسی طبیعت ہے؟

کہا:بس اب جانے کا وقت آگیا ہے۔

پوچھا: کہاں کے سفر کا ارادہ ہے؟

کہا: آخرت کا سفر درپیش ہے۔

پوچھا: واپسی کب ہے؟

کہا: کیسی باتیں کرتے ہو؟ کیا وہاں جانے والا کبھی واپس آیا کرتا ہے؟

پوچھا: پھر آپ نے اس کے لیے کیا تیاریاں کی ہیں؟

کہا: افسوس اسی کا ہے کہ اس کے لیے جو تیاریاں کی جانی چاہیے تھیں؛ وہ نہیں ہوئیں۔

انہوں نے کہا: بادشاہ سلامت! آپ کا دنیا میں تو یہ حال تھا کہ اگر کہیں دو تین روز کے لیے جانا ہوتا تھا تو لشکر کی ایک ٹکڑی پہلے بھیج دیا کرتے تھے جو خیمے لگادیا کرتی تھی، کھانے پینے کا سامان اور عیش و عشرت کی چیزیں لے کر وہاں پہنچ جاتی تھی، آپ کے لیے وہاں خیمے لگادیئے جاتے تھے، اور ہر طرح کے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ دو تین دن کے سفر کے لیے تو آپ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے، اور اتنا لمبا سفر جہاں سے (آپ خود ہی کہہ رہے ہیں) واپس کوئی نہیں آیا کرتا، اس کے لئے آپ نے کوئی تیاری نہیں کی؟

پھر کہا: آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے جو آپ نے ایک وقت یہ کہہ کر میرے حوالہ کی تھی کہ کوئی مجھ سے زیادہ بیوقوف ملے اس کو دیدوں۔ آج میں سمجھا ہوں کہ آپ سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہے کہ آپ دنیا کے معمولی معمولی سفر کے لیے بڑی

زبردست تیاریاں کیا کرتے تھے، اور اتنے طویل سفر کے لیے آپ نے کوئی تیاری ہی نہیں کی! یہ کہہ کر وہ چھڑی ہارون الرشید کے حوالہ کی اور چل دیئے۔

سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

یہ کوئی ہنسنے ہنسانے کی بات نہیں ہے؛ بلکہ درحقیقت یہی معاملہ ہمارا اور آپ سب کا ہے، ہم سب اسی میں مبتلا ہیں۔ دنیا کی چندروزہ زندگی کے لیے اتنی تیاریاں کرتے ہیں، بہتر سے بہتر مکانات تعمیر کرتے ہیں اور ان کے اندر ہر طرح کے عیش و عشرت، راحت و آرام کے اسباب کی بھرپور کوششیں کرتے ہیں، اور آخرت کے متعلق ہم اپنی زبان سے یوں تو کہتے ہیں کہ ہمیں وہاں جانا اور ہمیشہ رہنا ہے، لیکن اس کے واسطے ہماری طرف سے کوئی تیاری نہیں ہے۔ گویا کہ اس حماقت اور بے وقوفی میں ہم میں سے ہر شخص مبتلا ہے۔ اسی لئے اس کی بڑی تاکید کی گئی ہے۔

حضراتِ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) اور اسلافِ عظام کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی زندگیوں میں یہ بات نظر آتی ہے کہ وہ ہر وقت موت کو پیشِ نظر رکھتے تھے، انہوں نے اپنے نفس کو کبھی اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ طویل امیدیں قائم کرے کہ جس کی وجہ سے موت سے غفلت ہو جائے۔ ہم جو بڑی بڑی امیدیں باندھتے ہیں اور اس کے لئے دس بیس سال کے لمبے لمبے پروگرام بناتے ہیں، حالاں کہ کہنے والے نے بڑی عمدہ بات کہی ہے :

ع سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں

ہمیں پتہ نہیں ہے کہ ایک منٹ کے بعد، پانچ منٹ کے بعد اور ایک گھنٹے کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ تو یہ لمبی تمنائیں ہی ہیں جنہوں نے ہمیں غفلت میں ڈال رکھا ہے۔

اسی لیے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ باب قائم کیا ہے کہ موت کو یاد کیا جائے اور امیدوں، تمناؤں کو کم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ذکر کی ہیں۔

حقیقی کامیابی

پہلی آیت لائے ہیں: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی بھی اپنے متعلق یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ ہم پر موت نہیں آنے والی ہے۔ جب موت آئے گی اور ہم وہاں پہنچیں گے ﴿وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ قیامت کے روز تم کو اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ وہاں کا معاملہ کیا ہے؟ ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ جو آدمی جہنم سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا؛ وہ کامیاب ہے، اور حقیقی کامیابی اسی کا نام ہے۔ ہم تو یوں سمجھتے ہیں کہ فیکٹری بنالی تو کامیاب ہوگئے، ایک سے دو کر دی تو کامیاب ہوگئے بلڈنگ بنالی تو کامیاب ہوگئے، تجارت خوب چل رہی ہے تو کامیاب ہوگئے، دنیا کے اعتبار سے جو آدمی جتنا زیادہ پیسہ کماتا ہے، لوگ اسی کو کامیاب سمجھتے ہیں۔ لیکن اس آیت میں کہا گیا کہ جو آدمی اپنے آپ کو جہنم سے بچا لے اور جنت کا حقدار ہو جائے وہ

کامیاب ہے﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ دنیوی زندگی تو دھوکہ کا سامان ہے،اس کے اندر پھنسنے کی اور اس سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔اس حیثیت سے آدمی سوچتا رہے کہ دنیوی زندگی دھوکہ کی چیز ہے،ہمیشہ رہنے والی چیز نہیں ہے، قبرستان کی زیارت کرتا رہے، پہلے لوگوں کے حالات پر غور کرتا رہے، بڑے بڑے بادشاہ اور بڑے بڑے فاتح دنیا میں آئے؛ لیکن وہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے ،کوئی بھی اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لے گیا۔

اس سے بڑی کوئی حماقت نہیں

آگے ایک اورآیت پیش کی ہے:﴿وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾کسی کو یہ معلوم نہیں ہے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ آدمی گناہ کرتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ کل توبہ کر لیں گے ،پھر توبہ کر لیں گے،لیکن بتلا دیا گیا کہ کل کیا ہونے والا ہے اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔کل کی توبہ کے خیال سے آج گناہ میں مبتلا ہونے سے بڑی کوئی حماقت نہیں ہوسکتی۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ توبہ کی وجہ سے گناہ معاف بھی ہو جائیں،تب بھی ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ اگر کسی کے پاس اچھے سے اچھا مرہم ہے جس کے متعلق مرہم کے ایجاد کرنے والوں نے گارنٹی دے رکھی ہو کہ کیسا ہی زخم کیوں نہ ہو، آپ لگائیں گے تو فوراً اچھا ہوجائے گا۔تو کیا کوئی آدمی اس وجہ سے کہ اس کے پاس ایسا مرہم ہے کہ اس کے

لگانے سے زخم فوراً اچھا ہو جاتا ہے، اپنی انگلیاں کاٹ لیتا ہے؟ کیا اپنے آپ کو زخمی کر لیتا ہے؟ جب ہم اپنے جسم کے معاملہ میں ان سارے معالجات اور تدبیریں ہونے کے باوجود اس کا خطرہ مول نہیں لیتے، تو آخرت کے معاملہ میں ایسا کیوں کیا جائے؟ آگے فرمایا: اور کسی کو معلوم نہیں ہے کہ کس جگہ اس کی موت آنے والی ہے، تو پھر آدمی کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

نہ جلدی، نہ دیر

آگے ایک اور ارشاد نقل کیا: ﴿فَإِذَا جَآءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ اس آیت سے پہلے یہی مضمون بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ گناہ کرتے ہیں اور نافرمانیوں میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ اگر ہر ایک نافرمانی پر گرفت کرنے لگے تو پھر کوئی جاندار دنیا کے اندر باقی نہیں رہ سکتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ اب وہ وقت کتنا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے، باقی مقررہ وقت سے پہلے اس کو موت نہیں آئے گی۔ لیکن جب وقتِ مقررہ آجائے گا تو موت ٹھیک اسی وقت آکر رہے گی، ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں ہو سکتا، نہ وقت مقررہ سے پہلے آسکتی ہے اور نہ وقت مقررہ سے مؤخر ہو سکتی ہے۔

وہی گھاٹے میں ہیں

آگے ایک اور ارشاد نقل کیا: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ اے ایمان والو! تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غفلت میں نہ ڈالیں۔ عام طور پر آدمی مال اور اولاد کی وجہ سے غفلت کا شکار ہوتا ہے، خاص یہی دو اسباب ہوتے ہیں تو ان دونوں کے باب میں چوکنا کر دیا گیا کہ ان کی وجہ سے اللہ کی یاد، اس کے احکام کی بجا آوری، اور اس کی اطاعت سے غفلت میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمایا: جو آدمی ایسا کرے گا یعنی مال و اولاد کی محبت میں آکر غفلت کا شکار ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جائے گا تو یہی لوگ خسارے اور گھاٹے والے ہیں، ان کو آخرت کا نقصان اٹھانا پڑے گا ﴿وَأَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کے پاس موت آجائے، پھر وہ یوں کہنے لگے: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے قریب کے وقت کے لیے مہلت کیوں نہ دی؟ یعنی موت جب آئے گی اور مال خرچ نہیں کیا تو وہ تمنا کرے گا کہ مجھے کچھ وقت مل جائے؛ تاکہ یہ مال جو میرے پاس ہے، میں وہ خرچ کر دوں اور نیکو کار بن جاؤں، نیک اعمال کرنے لگوں۔ آدمی کو جب تک کہ موت نہیں آجاتی وہاں تک غفلت میں رہتا ہے، اور جیسے ہی موت

بالکل سر پر آجاتی ہے تو ایسی تمنائیں کرتا ہے لیکن ان تمناؤں سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے ﴿وَلَن يُؤَخِّرَ اللهُ نَفساً إِذَا جَآءَ أَجَلُهَا وَاللهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعمَلُونَ﴾ اور جب کسی کا مقررہ وقت آجائے گا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو ذرّہ برابر بھی مہلت نہیں دیں گے، اس وقت تو اس کی جان قبض کر ہی لی جائے گی۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

وہی پرانی روش

دوسری آیتوں میں بتلایا گیا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کا دھوکہ ہے؛ بلکہ آخرت میں جانے کے بعد کفار یہ تمنا کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیجا جائے؛ تاکہ ہم ایمان لے آئیں اور اعمالِ صالحہ کرلیں۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اگر دوبارہ بھی جائیں گے تب بھی غفلت ہی کا شکار ہونے والے ہیں۔ اور دنیا ہے ہی ایسی کہ آدمی دھوکہ میں پڑ جاتا ہے، اور اس میں ایسا مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس پر غفلت طاری ہو جاتی ہے۔ ہر آدمی ایسی باتیں صرف وقت آنے پر ہی کرتا ہے۔ آپ دنیا میں دیکھ لیجئے کہ بہت سے لوگ جب کسی مہلک اور خطرناک بیماری کا شکار ہو جاتے ہیں جس میں بچنے کی امید نہیں رہتی، اس وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں کہ اے اللہ! اگر میں زندہ رہا تو کبھی نافرمانی نہیں کروں گا، اور اپنے اعمالِ بد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ طے کرتے ہیں کہ پھر کبھی اس گناہ کا ارتکاب نہیں کروں گا،

لیکن پھر جب اچھے ہو جاتے ہیں تو پہلے جیسے تھے ویسے ہی ہو جاتے ہیں، ان کی پرانی روش میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں پڑتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں۔

حساب کتاب کا منظر

﴿حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّیْۤ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ كَلَّا اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا﴾

یہاں تک کہ جب ان کے پاس موت کا وقت آئے گا تو یوں کہیں گے: باری تعالیٰ ! مجھے واپس بھیج دیجئے تاکہ میں نیک اعمال کروں اور پیچھے جو مال چھوڑ آیا ہوں اس میں سے صدقہ و خیرات کروں (باری تعالیٰ فرماتے ہیں) ہرگز نہیں! یہ ایک ایسی بات ہے جو وہ اپنی زبان سے نکال رہا ہے، جس پر عمل ہونے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ یہ تو صرف ایسی ہی باتیں ہیں، اگر دوبارہ بھیجا جائے تب بھی وہ اپنی حرکتوں پر ہی رہے گا ﴿وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ﴾ اور (موت کے بعد) ان کے دوبارہ زندہ کئے جانے تک ایک پردہ ہے یعنی دنیا سے جانے کے بعد برزخ کی زندگی آتی ہے، جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور لوگ دوبارہ پیدا کیے جائیں گے وہاں تک اس کو وہیں رہنا ہے ﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَاۤ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ﴾ پھر جب دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا تو سب لوگ زندہ کیے جائیں گے، اس وقت آپس میں کوئی رشتہ داریاں نہیں رہیں گی۔ دنیا میں تو رشتہ داریوں اور تعلقات کی وجہ سے ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ آڑے وقت میں ایک دوسرے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنے

کا جذبہ ہوتا تھا، لیکن جب آخرت میں پہنچیں گے تو کسی طرح کی کوئی رشتہ داری باقی نہیں رہے گی، ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا عمل ہوگا، اور نہ ایک دوسرے کے پاس کچھ مانگ سکیں گے ﴿فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ . وَ مَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَأُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوٓا أَنۡفُسَهُمۡ فِيۡ جَهَنَّمَ خَالِدُوۡنَ﴾ وہاں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر نیک اعمال کے ذریعہ اس کا ترازو بھاری ہو جائے گا تو وہ کامیاب ہے، اور اگر اعمال صالحہ سے اس کا ترازو ہلکا رہے گا تو پھر یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو نقصان اور گھاٹے میں ڈالا، اور وہ جہنم کے اندر ہمیشہ رہیں گے ﴿تَلۡفَحُ وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ وَهُمۡ فِيۡهَا كَالِحُوۡنَ﴾ جہنم کی آگ ان کے چہروں کو جھلسا دے گی اور وہ اس کے اندر بھی بالکل بد صورت ہو جائیں گے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جہنمی کے اوپر کا ہونٹ پیشانی تک چڑھ جائے گا، اور نیچے کا ہونٹ ناف تک لٹک جائے گا، (ترمذی.) اور زبان باہر نکل کر اتنی لمبی ہو جائے گی کہ جہنمی لوگ اس کو روندیں گے (ترمذی۔ بَابُ مَا جَاءَ فِي عِظَمِ أَهۡلِ النَّارِ)

یعنی جہنمی کا جہنم کے اندر یہ حال ہوگا کہ چہرا بگڑ جائے گا، شکل و صورت بگڑ جائے گی۔

﴿أَلَمۡ تَكُنۡ آيَاتِيۡ تُتۡلٰى عَلَيۡكُمۡ فَكُنۡتُمۡ بِهَا تُكَذِّبُوۡنَ﴾ وہاں ان کو جہنم کے داروغہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہماری نشانیاں اور پیغام تمہارے پاس نہیں آئے تھے کہ جب تمہارے سامنے پڑھے جاتے تھے، تو تم اس کو جھٹلاتے تھے؟ مطلب یہ ہے کہ نصیحت قبول کرنے کا جو وقت تھا اس سے تم نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ پھر پوچھا جائے گا: ﴿كَمۡ لَبِثۡتُمۡ فِي الۡأَرۡضِ عَدَدَ سِنِيۡنَ﴾ دنیا میں کتنے سال رہے؟ دنیا کی پچاس، ساٹھ، سو، ایک سو پچاس سال کی اتنی طویل زندگی جو ملی تھی اس

کے باوجود یہ حال ہوگا کہ وہ کہیں گے﴿لَبِثْنَا يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ ہم تو ایک دن رہے یعنی وہاں آخرت میں پہنچنے کے بعد دنیا کی یہ طویل زندگی بھی مختصر معلوم ہوگی۔ دنیا میں اگر اس بات کا کچھ احساس ہوتا تو کچھ کارآمد بھی ہوتا۔اور بعض لوگ تو کہیں گے کہ ہم پورا ایک دن بھی نہیں رہے، بلکہ ایک دن کا بھی کچھ حصہ دنیا میں رہے۔ان سے کہا جائے گا:﴿فَسْئَلِ الْعَادِّيْنَ﴾ فرشتے جو سب کچھ شمار کرنے کے لیے مقرر تھے انہی سے پوچھو﴿قَالَ إِنْ لَبِثْتُمْ إِلَّا قَلِيْلًا لَوْ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾اور کہا جائے گا کہ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی بہت تھوڑی ہے اور اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اگر تم جانتے ہو ﴿أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ﴾پھر کہا جائے گا کہ کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا؟یعنی وہاں تمہارے اعمال کے متعلق کوئی پوچھ نہیں ہوگی؛ بلکہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سب پوچھا جائے گا اور حساب کتاب ہوگا۔اور کیا تم نے یہ خیال کیا تھا کہ تم ہماری طرف لوٹ کر نہیں آؤ گے؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک خاص کام کے لیے پیدا کیا ہے، اور پھر لوٹ کر وہاں جانا ہے جہاں اس کے متعلق سوال ہوگا۔

کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا؟

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد کے واسطے،اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے جو حق اتارا

اس کے سامنے جھکیں یعنی ایمان والوں کے دل تو ایسے ہونے چاہئیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی آیتیں اور احکام ان کے سامنے پیش کئے جائیں تو ان کے دل جھک جائیں اور ان کو قبول کر لیں اور اللہ کی یاد کے لیے آمادہ ہو جائیں ﴿وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ﴾ اور وہ ایسے نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی۔ یعنی امتِ محمدیہ سے پہلے جن امتوں کو کتابیں دی گئیں (جیسے یہود اور نصاریٰ) ان کو ایسا نہیں بننا چاہیے ﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ﴾ زمانہ ان کے اوپر طویل ہو گیا یعنی نبیوں کی صحبت سے وہ دور ہو گئے، تو نتیجہ یہ ہوا ﴿فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ ان کے دل سخت ہو گئے ﴿وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ﴾ اور ان میں سے بہت سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں۔

اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔ آدمی اللہ تعالیٰ کی ان آیات کی کثرت سے تلاوت کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے پیغام کو مدِ نظر رکھے؛ تب ہی غفلت دور ہو سکتی ہے۔ یہاں تو نمونے کے طور پر چند آیتیں پیش کی گئیں جن میں خاص طور پر متوجہ کیا گیا کہ موت آنے والی ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونا ہے اور جواب دینا ہے، وہاں جاکر پتہ چلے گا کہ دنیوی زندگی کی آخرت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دنیا کی زندگی بہت قلیل ہے، اس تھوڑے سے وقت کو آدمی سنبھال لے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کا اہتمام کر لے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچالے، نفس اور شیطان کے دھوکے میں نہ آئے؛ تو اس کے لیے کامیابی ہے۔

بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہوں

حدیث ۵۷۴:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: أَخَذَ رَسُوْلُ اللهِ (ﷺ) بِمَنْكِبِي فقال: كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيْبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے میرا کندھا پکڑ کر فرمایا: دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ پردیسی (پردیس میں) یا راستہ چلتا ہوا آدمی رہتا ہے

افادات:- آپ کسی جگہ سفر کرکے جائیں تو وہاں کوئی مکان بناتے ہیں؟ نہیں بناتے۔ پردیس میں آدمی سوچتا ہے کہ مجھے یہاں کتنے دن رہنا ہے، دو دن کا مسئلہ ہے، جس طرح بھی وقت گزر جائے۔ میں جس کام کے لیے آیا ہوں اس کو پورا کرلوں، پھر جلدی سے لوٹ جاؤں گا۔ دنیا میں آدمی کو اسی طرح رہنا چاہیے، اس لیے کہ ہمارا اصل گھر تو آخرت میں ہے، دنیا میں جو آنا ہوا ہے وہ آخرت کی تیاری کے لیے ہی ہے، اسی لیے یہاں کے گھر کو آباد کرنے کی اور دنیا کے عیش و آرام کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔

﴿أَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ﴾ بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر فرمایا کہ یا جیسے راستہ چلتا ہوا آدمی ہوتا ہے۔ یعنی پردیسی کا تو کسی جگہ دو دن ٹھہرنا بھی ہوتا ہے، وہ تو گیسٹ ہاؤس یا ہوٹل میں قیام بھی کرتا ہے، لیکن جو آدمی راستہ کاٹ رہا ہے اور چل رہا ہے، وہ تو چل ہی رہا ہے، کہیں ٹھہرتا

نہیں ہے۔ اس کا حال تو اس سے بھی آگے ہوتا ہے کہ وہ تو اتنا بھی نہیں سوچتا، جتنا دو دن قیام کرنے والا آدمی سوچتا ہے۔ کوئی آدمی راستہ میں چل رہا ہو تو کتنا ہی اچھا منظر آئے، وہ اس منظر کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ میں تو مسافر ہوں، یہاں سے گزر رہا ہوں، ایسے مناظر تو آیا ہی کریں گے، اگر میں ان کی طرف توجہ کروں گا تو میرا سفر رہ جائے گا۔

وقت آنے سے پہلے تیاری کرلو

آگے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا مقولہ نقل کیا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے:

﴿إِذَا أَمْسَيْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الصَّبَاحَ، وَإِذَا أَصْبَحْتَ فَلَا تَنْتَظِرِ الْمَسَاءَ﴾ جب تم شام کرو تو صبح کا انتظار نہ کرو، اور جب صبح کرو تو شام کا انتظار نہ کرو۔ یعنی جب صبح ہو تو یہ نہ سوچو کہ شام ہونے والی ہے، بس آدمی اسی وقت تیاری کرلے، اور ہر وقت موت کے واسطے تیار اور ریڈی (Ready) رہے، یہ نہ سوچے کہ کل کرلیں گے۔ آج کا کام کل پر چھوڑا نہیں جاتا؛ بلکہ ہر وقت اپنے آپ کو موت کے واسطے تیار رکھے۔ صبح ہو تو شام کا انتظار نہیں، اور شام ہو تو صبح کا انتظار نہیں۔ اپنی تندرستی کے اندر ہی بیماری کے لئے تیاریاں کر لو، اور اپنی زندگی میں موت کی تیاری کر لو۔

دنیوی اعتبار سے آدمی تندرستی کے زمانہ میں سوچتا ہے کہ یہ تندرستی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے، کبھی بیماری بھی آسکتی ہے، تو تندرستی کے زمانہ میں وہ اتنا کچھ کمالیتا ہے کہ کبھی بیماری آئے تو تندرستی کے زمانہ کا کمایا ہوا کام دے۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے معاملہ میں

بھی آدمی کو سوچنا چاہیے کہ تندرستی کے زمانہ میں اعمال کا اتنا زیادہ اہتمام کرو کہ اگر کبھی درمیان میں بیماری آگئی، اور اس کی وجہ سے اس طرح کے اعمال انجام نہ دے سکو، تو تندرستی میں کیا ہوا عمل کار آمد ہو۔ جیسے آدمی تندرستی کے زمانہ کی کمائی سے بیماری میں فائدہ اٹھاتا ہے، اسی طریقے سے اعمال کے معاملہ میں بھی ہونا چاہئے۔ ویسے فرائض تو ادا کرنے ہی ہیں؛ لیکن نوافل کے لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی اپنی تندرستی کے زمانہ میں جن نوافل کا اہتمام کرتا ہے، بیماری کی وجہ سے اگر ان کو انجام نہ دے سکے، تب بھی اللہ تعالیٰ اس کا ثواب اس کو عطا فرمائیں گے۔

اور اپنی زندگی سے موت کے لئے توشہ حاصل کر لو۔ موت تو آنے ہی والی ہے، اس کے لئے اپنی زندگی ہی میں تیاری کر لینی چاہئے، آخرت کی تیاری کے معاملہ میں آدمی غفلت نہ برتے۔

وصیت لکھنے کا حکم اور طریقہ

حدیث ۵۷۵:-

وعنه : أَنَّ رسول اللهﷺ قَالَ :مَاحَقُّ امْرِءٍ مُسْلِمٍ، لَهُ شَيْءٌ يُوصِي فِيهِ ، يَبِيتُ لَيْلَتَيْنِ إِلاَّ وَوَصِيَّتُهُ مَكْتُوبَةٌ عِنْدَهُ.(متفقٌ عَلَيْهِ،هَذَا لفظ البخاری.)

وفی روايةٍ لمسلمٍ :يَبِيتُ ثَلاَثَ لَيَالٍ.

قَالَ ابن عمر: مَا مَرَّتْ عَلَيَّ لَيْلَةٌ مُنْذُ سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) قَالَ ذَلِكَ إِلَّا وَعِنْدِي وَصِيَّتِي.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ دو راتیں نہ گزارے مگر اس حال میں کہ کوئی ایسی چیز جو اس کے پاس قابلِ وصیت ہو جس کی وصیت اس کے پاس لکھی ہوئی ہو۔

افادات:- یعنی ایسی وصیت جو ضروری ہے وہ اپنے پاس لکھی ہوئی ہونی چاہئے، مثلاً ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ یا بندوں کا کوئی حق باقی ہے، تو اس سلسلہ میں وصیت کرنا لازم ہے، اگر آدمی بغیر وصیت کے مرے گا تو اس حق کے ضائع ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑ ہوگی۔ جیسے: ایک آدمی کی نمازیں فوت ہوئی ہیں، وہ ان کی قضا کر رہا ہے؛ تو قضا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کو وصیت بھی لکھ دینی چاہیے کہ میں اپنی نمازیں- جو مجھ پر اتنی باقی ہیں- روزانہ اتنی قضا کر رہا ہوں، اور فلاں تاریخ سے میں نے شروع کر رکھی ہیں، اگر اس کی قضا مکمل ہونے سے پہلے میری موت آجائے تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مال میں سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کیا جائے۔ یہی حال روزوں کا ہے۔ اگر وصیت لکھی ہوئی ہے تو وارثوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مال کے تہائی میں سے فدیہ ادا کریں۔ لیکن اگر وصیت نہیں کی ہے تو ان کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر وارث ادا کریں گے تو ان کا تبرع اور احسان ہے؛ لیکن ان کے اوپر ضروری نہیں ہے؛ چاہے وہ لاکھوں کی دولت چھوڑ کر گیا ہو۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق باقی ہوں تو ان کے حق میں وصیت کرنا بھی ضروری ہے، اور بندوں کے جو حقوق ہیں وہ بھی آدمی ہر وقت لکھے ہوئے تیار رکھے کہ فلاں کا میرے اوپر اتنا قرض باقی ہے، اگر اس کی ادائیگی سے پہلے میری موت آجائے تو میرے مال میں سے اس کو ادا کیا جائے۔ اسی طرح امانتوں کے متعلق بھی لکھ لینا ضروری ہے۔ ہر امانت پر باقاعدہ نام کے ساتھ لکھے کہ یہ فلاں کی امانت ہے۔ جتنے بھی حقوق یا امانتیں ہیں ان کے متعلق وصیت لکھی ہوئی ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ خود کو یاد ہے، لیکن اس پر لکھا ہوا نہیں ہے اور ایسی حالت میں موت آگئی، تو ظاہر ہے کہ ورثاء اس کی وضاحت نہ ہونے کی وجہ سے جس کی امانت ہے اس تک پہنچا نہیں سکیں گے، تو اس صورت میں ذمہ داری مرنے والے کی ہوگی۔ لیکن اگر وصیت کے طور پر لکھا ہوا ہے اور پھر ورثاء کی طرف سے کوتاہی ہوئی؛ تو وہ گنہ گار ہوں گے۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ یا بندوں کے حقوق میں سے جو چیز بھی قابلِ وصیت ہو، اس کو لکھ کر تیار رکھنا چاہیے۔ وصیت کا تیار رکھنا گویا اپنے آپ کو موت کے لیے تیار رکھنے کی علامت ہے، اس لئے کہ موت کب آئے گی کچھ کہا نہیں جا سکتا ہے۔

زندگی، موت اور امیدیں

حدیث ۵۷۶:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: خَطَّ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) خُطُوطاً، فَقَالَ: هَذَا الإِنْسَانُ وَهَذَا أَجَلُهُ، فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ جَاءَ الخَطُّ الأَقْرَبُ. (رواہ البخاری)

حدیث ۵۷۷:-

وعن ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) قَالَ: خَطَّ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) خَطّاً مُرَبَّعاً، وَخَطَّ خَطّاً في الوَسَطِ خَارِجاً مِنْهُ، وَخَطَّ خُطَطاً صِغَاراً إِلَى هَذَا الَّذِي فِي الْوَسَطِ مِنْ جَانِبِهِ الَّذِي في الوَسَطِ، فَقَالَ: هَذَا الإِنْسَانُ، وَهذا أجَلُهُ مُحِيطاً بِهِ- أَوْ قَدْ أَحَاطَ بِهِ- وَهذَا الَّذِي هُوَ خَارِجٌ أَمَلُهُ، وَهذِهِ الْخُطَطُ الصِّغَارُ الأَعْرَاضُ، فَإِنْ أَخْطَأَهُ هَذَا، نَهَشَهُ هَذَا، وَإِنْ أَخْطَأَهُ هَذَا، نَهَشَهُ هَذَا. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ خط (لکیریں) کھینچیں، پھر فرمایا: یہ انسان ہے، اور یہ اس کی موت ہے۔ ابھی وہ امیدوں کی بھول بھلیوں ہی میں ہوتا ہے کہ قریب والا خط اسے آدبوچتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعو (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مربع (چوکور) نشان بنایا، اس کے اندر سے ایک لمبا خط کھینچا جو پورے چوکھٹے کے اندر سے گزر کر پار ہو گیا۔ پھر اس بیچ والے لمبے خط کے دونوں طرف لکیریں کھینچیں اور فرمایا: چوکٹھا موت ہے جو آدمی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، آدمی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اندر کا جو لمبا خط ہے وہ انسان ہے۔ اور باہر جو خط نکالا گیا ہے وہ

اس کی امیدیں اور تمنائیں ہیں جو آدمی موت سے بھی آگے کی کیا کرتا ہے۔اور جو چھوٹی چھوٹی لکیریں کھینچی تھیں ان کے متعلق فرمایا: یہ اس کے اوپر آنے والے مصائب، آلام و آفات ہیں۔اب اگر ایک سے چھوٹتا ہے تو دوسری میں مبتلا ہوتا ہے۔دوسری سے چھوٹتا ہے تو تیسری کی گرفت میں آتا ہے۔(نقشہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو۔)

افادات:-مطلب یہ ہے کہ آدمی کی تمنائیں اپنی زندگی سے بھی آگے کی ہوا کرتی ہیں، انسان بہت آگے کی سوچتا ہے، اور چاروں طرف جو خط لگائے گئے ہیں وہ مصیبتیں ہیں جو ہر وقت اس پر آتی رہتی ہیں۔کونسی مصیبت اس کا قصہ ختم کردے نہیں کہا جاسکتا۔اور یہ سلسلہ برابر پوری زندگی چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ آخر میں موت آکر پکڑ لیتی ہے۔

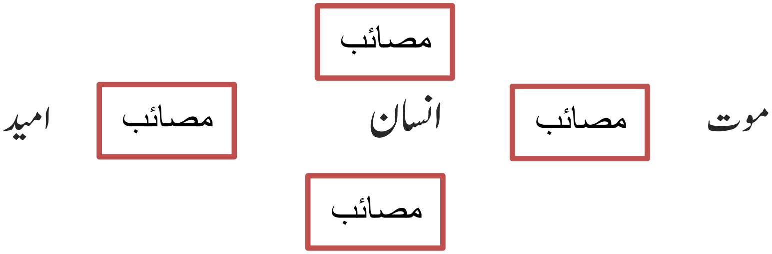

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیان چل رہا تھا کہ موت کو یاد رکھنا چاہیے اور امیدوں کو مختصر کرنا چاہیے۔اسی سلسلہ میں روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو

حدیث ۵۷۸:-

وعن أَبي هريرة (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: بَادِرُوا بِالأَعْمَالِ سَبْعاً، هَلْ تَنْتَظِرُونَ إِلاَّ فَقْراً مُنْسِياً، أَوْ غِنىً مُطْغِياً، أَوْ مَرَضاً مُفْسِداً، أَوْ هَرَماً مُفَنِّداً، أَوْ مَوْتاً مُجْهِزاً، أَوْ الدَّجَّالَ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ، أَوْ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ؟! (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سات چیزوں سے پہلے اعمال میں سبقت کرو(کہیں ایسا نہ ہو کہ جن سات چیزوں کا تذکرہ آرہاہے ان میں سے کچھ چیزیں پیش آجانے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا ہوجائے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اعمالِ خیر کے معاملہ میں کل کا انتظار نہ کرے)کیاتم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بھلادینے والا ہو؟ یا ایسی مالداری کاجو سرکشی میں مبتلا کردینے والی ہو؟یا ایسی بیماری کا جو تمہاری صحت کو خراب اور قویٰ کو ختم کرنے والی ہو؟یا ایسے بڑھاپے کاجو سٹھیا دینے والاہو؟یا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟یادجال کاانتظارہے کہ اَن دیکھی چیزوں میں سب

سے بدتر چیز ہے جس کا انتظار کیا جاتا ہے ؟یاپھر قیامت کا انتظار ہے؟ حالاں کہ قیامت تو بہت ڈرانے والی اور کڑوی حقیقت ہے۔

امروزوفردا

افادات:-عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کے دل میں کسی نیک عمل ،یا کسی بھلائی، یا کسی عملِ خیر کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہوتا ہے، تو ایسے موقع پر نفس اور شیطان اس نیک عمل سے روکنے کے لئے اس کو دھوکہ دیتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ کل کرلیں گے۔شیطان کا معاملہ ایسا ہے کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے مناسب فریب اختیار کرتا ہے۔کسی مؤمن کے متعلق یہ تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کسی نیکی کے کام کے متعلق وہ یہ کہے کہ یہ کام کرنا ہی نہیں ہے، اس لئے جب اس کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا تو اس کو روکنے کے لیے شیطان یہ تدبیر اختیار کرتا ہے کہ اس کو کل پر ٹالنے کی کوشش کرتا ہے کہ کل اس کام کو کریں گے۔یاکوئی آدمی جوانی کی عمر میں ہے تو وہ یہ سوچتا ہے کہ ابھی میری عمر ہی کیا ہے، جب ادھیڑ عمر آئے گی، تب اعمالِ خیر کا اہتمام کریں گے۔توشیطان اورنفس اعمالِ خیر اور نیکی کے کام سے روکنے کے لیے کل پر ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں ،اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تاکید فرماتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ میں سبقت کرو ،یعنی جب دل میں اس

کام کا داعیہ پیدا ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیدا شدہ اس داعیہ کی قدر کرتے ہوئے جلدی سے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کرو۔

نیکی کے داعیہ کی قدر کرو

بزرگوں نے لکھا ہے کہ نیک کام کا داعیہ جب کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مہمان ہے۔ جیسے کسی کے گھر مہمان آئے، تو اس کی قدر کی جاتی ہے، اکرام کیا جاتا ہے، اور مہمان کے مناسب عزت و احترام کا معاملہ کیا جاتا ہے اگر آنے والے مہمان کا احترام نہ کیا جائے اور قدر نہ ہو، اور وہ مہمان اگر شریف الطبع ہے تو دوسری مرتبہ آپ کے گھر میں قدم نہیں رکھے گا۔ اسی طریقہ سے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیک کام کا داعیہ آدمی کے دل میں ڈالا جاتا ہے، تو یہ واردِ روحانی ہوتا ہے، یہ داعیہ باری تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوا مہمان ہوتا ہے، اس کی قدر کرنی چاہیے، اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس داعیہ پر فوری طور پر عمل کا اہتمام کرلے۔ اگر اس وقت ٹال دیا، فوری طور پر اس پر عمل نہیں کیا، تو ہو سکتا ہے کہ دوبارہ دل میں داعیہ پیدا ہی نہ ہو۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ داعیہ تو دل میں پیدا ہو، لیکن اس وقت عمل کا موقع نہ ہو؛ اس لئے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تاکید فرماتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ انجام دینے کے معاملہ میں سبقت اور جلدی کرو۔

بھلادینے والا فقر

"هَلْ تَنْتَظِرُونَ اِلَّا فَقْرًا مُنْسِيًا" کیا تم انتظار کرتے ہو ایسے فقر کا جو بُھلادینے والا ہو؟ مطلب یہ ہے کہ آپ کوئی نیک کام کرنے کے معاملہ میں تاخیر کیوں کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ یہ کام کل انجام دیا جاسکے گا؟ ہو سکتا ہے کہ آج اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیک کام کرنے کے لیے اسباب عطا فرما رکھے ہیں، آج آپ کے پاس وسائل موجود ہیں، جتنا مال خرچ کرنے کی ضرورت ہے اللہ تعالیٰ نے اتنامال بھی دے رکھا ہے، اب اگر آپ نے اس کام کو انجام نہیں دیا، تو ہو سکتا ہے کہ وہ مال آپ کے ہاتھ سے نکل جائے، اور ایسا فقر آجائے جو بُھلادینے والا ہو، تو کیا تم اس بات کا انتظار کرتے ہو؟ یعنی آج جب اپنی خوشحالی کے وقت، عیش وآرام کی حالت میں نیکی کے کام کو انجام نہیں دے رہے ہو؛ تو کیا جب فقروفاقہ آجائے گا جس کے اندر آدمی مصیبت کی وجہ سے اپنی ضرورت کی چیز بھی بھول جایا کرتا ہے، اس وقت تم نیکی کا کام کروگے؟ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب فقر کی مصیبت آتی ہے تو بہت سے اپنے کام بھی آدمی بھول جایا کرتا ہے۔ خدانہ کرے ایساوقت آئے، اس سے پہلے پہلے نیکی کے کام انجام دے دو۔

سرکش بنانے والی مالداری

”أَوْ غِنًى مُطْغِيًا“ یا تمہیں انتظار ہے ایسی مالداری کا جو سرکشی میں مبتلا کردینے والی ہو؟ بعض مرتبہ آدمی سوچتا ہے کہ ذرا حالت ٹھیک ہوجائے، ابھی مال کم ہے، ذرا مال آجائے۔ یا مال ہے لیکن کچھ زیادہ ہو جائے، تو اس وقت ہر نیک کام کو انجام دیں گے۔ اس وقت ہم کو فراغت کا موقع بھی مل جائے گا۔ نبی کریم (ﷺ) متوجہ فرماتے ہیں کہ مال بڑھ جانے اور دولت کی زیادتی کی صورت میں تم بجائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور نیکی کے کام کرو، ہوسکتا ہے کہ مالداری تم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی پر آمادہ کردے۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مال کی جب فراوانی ہوتی ہے، دولت کی کثرت ہوتی ہے تو آدمی اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھتا ہے، اس کے احکام کو توڑتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ ایسی مالداری کا انتظار ہے جو تم کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی میں مبتلا کردینے والی ہو؟

مہلک بیماری

”أَوْ مَرَضًا مُفْسِدًا“ یا تمہیں ایسی بیماری کا انتظار ہے جو تمہاری صحت کو خراب کرنے والی اور تمہارے قویٰ کو ختم کرنے والی ہو؟ یعنی آدمی سوچتا ہے کہ کل اس نیکی کے کام کو انجام دیں گے، حالاں کہ آج بدن میں تندرستی ہے، قویٰ کام کر رہے ہیں، آدمی اپنی صلاحیتوں سے

فائدہ اٹھاسکتاہے،اور نیکی کے کاموں میں ان صلاحیتوں کو استعمال کرسکتاہے ،پھر بھی اگر آج اس کام کو انجام نہیں دیتااور سوچتاہے کہ کل کریں گے،آئندہ دیکھا جائے گا،تو نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ کل ہو سکتا ہے کہ تم پر ایسی بیماری حملہ کردے،کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ جو تمہاری صلاحیتوں کو فاسد اور خراب کردے، تمہاری صحت اور قویٰ ایسے بگاڑ کر رکھ دے کہ جن اعضاء سے تم نیکی کے کام کر سکتے تھے وہ صلاحیت ہی تمہارے اندر باقی نہ رہے۔تو کیا ایسی بیماری کا انتظار ہے؟ اس کے آنے سے پہلے پہلے صحت و تندرستی کو اور اپنی صلاحیت و سلامتی کو غنیمت سمجھ لواور نیکی کا کام کر لو۔

سٹھیادینے والابڑھاپا

”أَوْ هَرَماً مُفَنِّداً“ یابڑھاپے کا انتظار ہے؟ بعض مرتبہ آدمی سوچتا ہے کہ ابھی جوان ہوں، ابھی عمر ہی کیا ہے، ابھی تو دنیا کے اندر بہت رہنا ہے، اَدھیڑ عمر ہوگی، اس کے بعد بڑھاپا آئے گا، اس وقت نیکی کے اعمال کا اہتمام کریں گے۔حالاں کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بڑھاپے کے اندر ہی آدمی کو موت آئے ،دنیا کے اندر جوان بھی مرا کرتے ہیں، اس لیے بڑھاپے کی کوئی گارنٹی نہیں اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔پھر یہ ہے کہ بڑھاپا آگیاتو ہوسکتا ہے کہ بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے آپ کے اعضاء کام ہی نہ کر سکیں۔سٹھیا دینے والا بڑھاپا آجائے ،جس کے نتیجے میں عقل بھی ماؤف ہوجاتی ہے، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی

ختم ہو جاتی ہے، قویٰ بھی جواب دینے لگتے ہیں۔اس لیے نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ کیا ایسے بڑھاپے کا انتظار ہے؟ اس سے پہلے پہلے نیکی کا کام کر لو۔

اچانک کی موت

" أَوْ مَوْتاً مُجْهِزاً " یا اچانک آنے والی موت کا انتظار ہے؟ آدمی سوچتا ہے کہ پھر کر لیں گے۔ظاہر ہے کہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے بڑے سے بڑے ملحد اور دہریوں کو بھی انکار نہیں۔ہر ایک کو یہ بات تسلیم ہے کہ موت آنے والی ہے۔اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں تو مقرر ہے لیکن ہمیں معلوم نہیں کہ وہ کون سے وقت آجائے۔اس لئے نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ کیا اچانک کی موت کا انتظار ہے؟اس لئے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ جوانی کے بعد اَدھیڑ عمر آئے گی، پھر بڑھاپا اور پھر موت آئے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے بھی اچانک کی موت آکر گرفتار کرلے۔اگر چہ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ موت سے پہلے موت کی علامتیں اور نشانیاں آدمی کے اوپر ظاہر ہوتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی گویا اس کو نصیحت کی جاتی ہے۔

تم نوٹس کا نوٹس نہیں لیتے

میں نے پہلے بھی واقعہ سنایا تھاجو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھاہے کہ کسی کی ملاقات ملک الموت سے ہوگئی، انہوں نے کہا: دنیا کی حکومتوں کا دستور تو یہ ہے کہ کسی کو کوئی سزا دینی ہوتی ہے تو اس کو پہلے سے نوٹس دے کر آگاہ کیا جاتا ہے کہ آپ کو سزا دی جانی ہے؛اور تمہارا معاملہ تو ایسا ہے کہ اچانک ہیآجاتے ہواور روح قبض کر لیتے ہو۔ملک الموت نے جواب میں کہا: میری طرف سے تو اتنی زیادہ نوٹس دی جاتی ہے کہ اتنی کسی اور کی طرف سے نہیں دی جاتی ہوگی۔ بخار کا آنا، بیماریوں کا آنا، قویٰ کا کمزور ہونا، بال کاسفید ہونا، اولاد کی اولاد کا ہوجانا؛یہ سب میرے نوٹس ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے:﴿أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وجآءَكُمُ النَّذِيرُ﴾ کیاہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی کہ کوئی آدمی اپنی اصلاح کرنا چاہتا اور نصیحت حاصل کرنا چاہتاتونصیحت حاصل کرلیتا،اور تمہارے پاس ڈرانے والا آیا تھا۔ یہاں ڈرانے والے سے مراد بعض مفسرین نے کہاکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ بابرکات ہے۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے آکر آگاہ کردیاکہ موت آنے والی ہے اور آپ نے لوگوں کو ڈرایا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب وکتاب دینا ہے، اپنے گناہوں کی سزا بھگتنی ہے۔بعضوں نے کہا: اس سے مراد اولا دکی اولاد کاہونا ہے۔یعنی بیٹوں کے یہاں اولاد کاہوجانا گویا اس بات کی علامت ہے کہ اب آپ کی رخصتی کا وقت قریب آگیا ہے۔آپ کو دنیا سے

جانے کی تیاری کرلینی چاہئے۔ بالوں کا سفید ہوجانا، نگاہوں کا کمزور ہوجانا، شنوائی کی صفت کا متأثر ہوجانا؛ یہ ساری علامتیں ہیں۔ تو ملک الموت نے کہا: دیکھو! اتنے سارے نوٹس بھیجتا ہوں کہ کوئی بھی حکومت اتنے نوٹس نہیں بھیجتی ہوگی؛ لیکن کیا کریں کہ ہمارے اتنے سارے نوٹس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیتا۔({vH ٢٣٤٤})(التذکرۃ: جلد ا، ص: ۴۶)

دجّال

" أَوِ الدَّجَّالَ ، فَشَرُّ غَائِبٍ يُنْتَظَرُ" یا پھر دجال کا انتظار ہے؟ ظاہر ہے کہ آدمی ابھی نیک اعمال نہیں کرتا، یوں سوچ رہا ہے کہ آئندہ زمانہ میں کریں گے، لیکن آنے والا زمانہ کیسا ہوگا اس کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ سخت سے سخت حالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ معلوم نہیں آدمی کن مصائب کا شکار ہوجائے اور کیسے ماحول سے اس کو واسطہ پڑے۔ آج نیکی کا کام نہیں کرتا تو کیا دجال آئے گا تب نیکی کا کام کرے گا؟ آپ(ﷺ) فرماتے ہیں کہ اَن دیکھی چیزوں میں سب سے بدتر چیز جس کا انتظار کیا جاتا ہے وہ دجال ہے۔ یعنی دجال ایک ایسی حقیقت ہے جو ابھی تک وجود میں نہیں آئی، لیکن جو چیزیں ہم نے نہیں دیکھی ہیں، آئندہ زمانہ میں آنے والی ہیں، اور جس کا انتظار کیا جاتا ہے، ان میں سب سے بدتر چیز اگر کوئی ہوسکتی ہے تو وہ دجال ہے۔ تو کیا اس کا انتظار ہے کہ وہ آئے گا تو ہم نیک اعمال کریں گے؟ حالاں کہ جب ابھی نیک کام کی طرف قدم نہیں بڑھتے ، نیکی کی طرف طبیعت آمادہ

نہیں ہوتی، تو جب دجال دنیا میں آجائے گا اس وقت تو گمراہی کے دروازے زیادہ کھلے ہوئے ہوں گے؛ اس وقت نیکی کیا کر سکیں گے؟

قیامت

"أَوِ السَّاعَةَ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ" یا پھر قیامت کا انتظار ہے کہ جب قیامت قائم ہوجائے گی تب نیکی کے کام کریں گے؟ ظاہر ہے کہ قیامت بڑی سخت مصیبت لے کر آئے گی، اس کے بعد تو پھر نیکی کے موقع کا سوال ہی نہیں رہتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاص طور سے متوجہ کیا کہ آدمی کے دل میں نیکی کا کوئی داعیہ پیدا ہو، اور اعمالِ خیر کے لیے طبیعت آمادہ ہو، اس وقت تاخیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بات کا انتظار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس داعیہ کی قدر کرتے ہوئے فوری طور پر نیک عمل میں لگ جانا چاہیے۔

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

حدیث ۵۷۹:-

وعنه قال قال رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ يَعْنِي الموتَ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: لذتوں کو توڑنے والی چیز موت کو کثرت سے یاد کرو۔

افادات:-موت زندگی کی ہر لذت کو ختم کردینے والی ہے،اور جب موت آجائے گی تو آدمی دنیا کے اندر کیسے ہی عیش و آرام میں رہتا ہو، کیسی ہی لذت میں ہو؛ساری لذتیں ختم ہو جائیں گی۔ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) اس چیز کو کثرت سے یاد کرنے کی تاکید فرماتے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ چوبیس گھنٹوں میں اس کو کتنی مرتبہ یاد کرتے ہیں؟ رات کو سونے کے لیے جاتے ہیں اس وقت کیا کیا خیالات ہمارے دل و دماغ میں آتے ہیں؟ اپنے معاش کے متعلق بہت ساری چیزیں ہم سوچتے ہیں،اپنے کاروبار کے متعلق بہت ساری تدبیریں کرتے ہیں، اپنی تجارت و دکان کے متعلق اور اپنی دوسری چیزوں کے متعلق بہت کچھ غورو فکر کرتے ہیں،اور بہت ساری چیزوں کی طرف ہمارا دھیان جاتا ہے؛ لیکن کبھی ہمیں موت کا خیال نہیں آتا۔ آدمی اپنی آنکھوں سے اپنے رشتہ داروں کو مرتے ہوئے دیکھتا ہے، اپنے ہاتھ سے ان کو غسل دیتا ہے ، اپنے ہاتھ سے اپنے رشتہ داروں کو قبر میں اتارتا اور دفن کرتا ہے۔ کل جو زمین کے اوپر ہمارے سامنے چلتے پھرتے تھے آج وہ قبروں کے اندر ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہم دیکھتے ہیں اس کے باوجود ہم یہ نہیں سوچتے کہ یہ وقت ہم پر بھی آنے والا ہے۔ہماری سب سے بڑی بیماری ہی آخرت سے غفلت ہے۔ اگر آدمی موت کو اکثر یاد کرتا رہے، ہر وقت اس بات کا استحضار اور تصور ہو کہ موت آنے والی ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کے پاس جانا ہے،اپنے کیے کا جواب

دیناہے،توغفلت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی جو نافرمانیاں ہوتی ہیں،یا اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری میں جوکوتاہیاں ہوتی ہیں،ان کی نوبت ہی نہیں آسکتی،آخرت کادھیان اور فکرہی اصل چیزہے۔آدمی اگرموت کو یاد کرتا رہے توپھر ایسی غفلت طاری نہیں ہوسکتی جس کے نتیجہ میں نافرمانی ہو۔اسی لیے نبی کریم(ﷺ)نے موت کو کثرت سے یاد کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اب ہم اپنی حالت پر غور کریں کہ کیاہم پورے چوبیس گھنٹوں میں کبھی ایک دو مرتبہ بھی موت کویاد کرتے ہیں؟ اس کی بھی ہمیں توفیق نہیں ملتی۔اس لئے یہ خاص اور اہم چیز ہے جس کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔روایتوں میں آتا ہے کہ جو آدمی دن میں پچیس مرتبہ یہ دعا پڑھتا ہے:أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لِيْ فِي الْمَوْتِ وَفِيْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ" پھر اگر اس کو اسی دن میں موت آجائے تو شہداء کا درجہ ملے گا۔(مؤطا:باب مایکون من الموت شهادة. الحزب الاعظم، منزل الخامس ، یوم الاربعاء ، دعا رقم :۴۵) دیکھو!موت کو یاد کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت کے مقام کا وعدہ کیاگیاہے۔اس لیے ہمیں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کرنا چاہیے۔

موت کا مراقبہ

بزرگوں نے ایک مراقبہ کی بھی تلقین فرمائی ہے کہ آدمی سونے سے پہلے تھوڑی دیر آنکھیں بندکرکے یہ سوچے: میری موت کا وقت قریب ہے،روح نکل رہی ہے ، اب گھر والے میری آنکھیں بند کررہے ہیں،اب لوگوں میں اعلان ہورہا ہے کہ فلاں کا انتقال

ہوگیا، اب غسل کی تیاریاں کی جارہی ہیں، میرے کپڑے اتارے جارہے ہیں، اب تخت پر لٹایا گیا اور غسل دیا جارہا ہے، اس کے بعد کفن پہنایا جارہا ہے، اب جنازہ میں رکھا جارہا ہے، لوگ کندھوں پر اٹھارہے ہیں، نمازِ جنازہ پڑھی جارہی ہے۔ قبر میں اتارا جارہا ہے، اب مجھ پر مٹی ڈالی جارہی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ کم سے کم سوتے وقت اس پورے منظر کا استحضار کرے؛ اسی کو "مراقبۂ موت" کہا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں آخرت کی فکر لاحق ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچنے کی توفیق ہوگی۔

درود شریف کا فائدہ

حدیث ۵۸۰:-

وعن أُبَيِّ بنِ كعبٍ (رضی اللہ عنہ) كَانَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ قَامَ. فَقَالَ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! اذْكُرُوا اللهَ، جَاءتِ الرَّاجِفَةُ، تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ، جَاءَ المَوْتُ بِمَا فِيهِ، جَاءَ المَوْتُ بِمَا فِيهِ. قُلْتُ: يَا رسول الله! إِنِّي أُكْثِرُ الصَّلاَةَ عَلَيْكَ، فَكَمْ أَجْعَلُ لَكَ مِنْ صَلاَتِي؟ فَقَالَ: مَا شِئْتَ. قُلْتُ: الرُّبُع؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ: فَالنِّصفَ؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ: فَالثُّلُثَيْنِ؟ قَالَ: مَا شِئْتَ، فَإِنْ زِدْتَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ. قُلْتُ: أَجعَلُ لَكَ صَلاَتِي كُلَّهَا؟ قَالَ: إِذاً تُكْفى هَمَّكَ، وَيُغْفَرُ لَكَ ذَنْبكَ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:-حضرت اُبی بن کعب(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب رات کا ایک تہائی حصہ گزر جاتا تھا تو اٹھتے اور فرماتے: اے لوگو! اللہ کو یاد کرو (ہمیں بھی اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ رات کے اخیری حصہ میں اٹھ کر اللہ کو یاد کریں) لرزہ دینے والی آگئی، اس کے بعد میں آنے والی آجائے گی (جب پہلا صور پھونکا جائے گا اس کے چالیس سال کے بعد دوسرا صور پھونکا جائے گا) موت اپنے تمام لوازمات کے ساتھ آگئی (مطلب یہ ہے کہ موت کب آجائے، یہ کہا نہیں جاسکتا۔ حضرت اُبی بن کعب(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ پر کثرت سے درود بھیجتا رہتا ہوں، دعاؤں کا میرا جو وقت ہے اس میں سے مَیں آپ پر درود بھیجنے کے لیے کتنا وقت تجویز کروں؟ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جتنا تمہارا جی چاہے۔ میں نے کہا: چوتھائی حصہ آپ پر درود بھیجنے کے لیے الگ کرلوں؟ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ہاں! تمہیں اختیار ہے، اگر اور زیادہ کرلو؛ تو تمہارے لیے بہتر ہے۔ میں نے کہا: کیا آدھا تجویز کرلوں؟ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تمہیں اختیار ہے، اگر اس میں اور اضافہ کرو؛ تو تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: دو تہائی حصوں کو فارغ کرلوں؟ رسول اللہ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تمہیں اختیار ہے، اگر اس میں اور زیادہ کر لو؛ تو تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا میں اپنے پورے وقت کو آپ پر درود پڑھنے کے لیے فارغ کرلوں؟ حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تب تو تمہاری تمام ضرورتیں پوری کی جائیں گی، اور تمہارے تمام گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

افادات:-درود شریف کی کثرت کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہاری تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی اور تمہاری تمام ضرورتوں کی اللہ تعالیٰ کفایت کرے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے

بَابُ اسۡتِحۡبَابِ زِيَارَةِ الۡقبورِ لِلرِّجَالِ وَمَا يَقُوۡلُهُ الزائر

مردوں کے لیے قبرستان جانے کا مستحب ہونا وہاں کے مسنون اعمال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قبرستان جانا اور اس کے فائدے

نیا عنوان قائم کیا ہے: مَردوں کے لیے قبروں کی زیارت کا مستحب ہونا۔ جو آدمی قبروں کی زیارت کے لیے جائے تو وہ وہاں جاکر کیا کہے؟ کیوں کہ اس سے پہلے باب میں موت کی یاد کو ذکر کیا تھا، اور قبروں کی زیارت بھی موت کو یاد کرنے کا ایک ذریعہ ہے، اسی مناسبت سے یہ باب لائے ہیں۔

حدیث ۵۸۱:-

عن بُرَيْدَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عن زِيَارَةِ الْقُبُورِ، فَزُورُوهَا. (رواه مسلم)

وفی رواية: فَمَنْ أَرَادَ أَنْ يَزُورَ الْقُبُورَ فَلْيَزُرْ، فَإِنَّهَا تُذَكِّرُنَا الآخِرَةَ.

ترجمہ:- حضرت بریدہ اَسلمی (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میں نے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کیا تھا؛ لیکن اب تم قبروں کی زیارت کرو۔

دوسری روایت میں بھی ترغیب آئی ہے: جو آدمی قبروں کی زیارت کرنا چاہے تو کرے، اس لئے کہ وہ آخرت کی یاد دلاتی ہے۔

افادات:-زیارتِ قبور کی پہلے ممانعت کر دی گئی تھی لیکن پھر نبیٔ کریم (ﷺ) نے اجازت دے دی۔ اسی لیے بعض حضرات نے زیارتِ قبور کو مستحب کہا ہے۔ آدمی اگر قبروں کی زیارت کرتا رہے تو اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ موت یاد رہتی ہے اور اس کے نتیجہ میں آدمی کو تین فائدے حاصل ہوتے ہیں:-

[۱]توبہ کی توفیق ہوتی ہے۔

[۲]اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی عطا فرما رکھا ہے اس پر قناعت نصیب ہوتی ہے۔

[۳]عبادات میں اطمینان اور دلجمعی حاصل ہوتی ہے۔

اوراگر آدمی موت کو یاد نہیں کرتا تو اس کے نتیجہ میں اس کے برعکس اس کو نہ تو توبہ کی توفیق ہوتی ہے، اور نہ اس کو اللہ کے دیئے ہوئے پر قناعت ہوتی ہے،بلکہ حرص پیدا ہوجاتی ہے کہ جو ملتا ہے اس سے اور زیادہ ملے اور زیادہ ملے۔اس کی تمنائیں، امیدیں اورآرزوئیں بڑھتی رہتی ہیں، عبادات میں بھی اطمینان اور دلجمعی نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے قبروں کی زیارت کے مستحب ہونے کو بیان فرمارہے ہیں۔قبرستان جانا موت کو یاد دلانے کا ایک ذریعہ ہے۔

کیا عورتیں قبرستان جاسکتی ہیں؟

باب کا جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ’’لِلرِّجالِ‘‘یعنی ’’مردوں کے واسطے‘‘ کی قید لگائی۔ اس سے بتانا چاہتے ہیں کہ مَردوں کے واسطے قبروں کی زیارت مستحب ہے،اس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔لیکن ایک سوال ہے کہ کیا عورتوں کے لئے بھی قبروں کی زیارت جائز ہے یا نہیں ؟اس سلسلہ میں علماء کی ایک جماعت اس بات کی قائل ہے کہ مَردوں ہی کے لیے مستحب ہے، عورتوں کے لئے نہیں، اس سلسلہ میں نبی کریم (ﷺ) کا ایک ارشاد ہے جس سے انہوں نے استدلال کیا ہے:لَعَنَ اللّٰہُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْر (مسند ابویعلی:۵۹۰۸/السنن الکبریٰ للبیھقی:۷۴۵۵)قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

اور کچھ حضرات عورتوں کے لیے بھی قبروں کی زیارت کو مستحب تو نہیں کہتے ، البتہ چند شرطوں کے ساتھ جائز کہتے ہیں۔وہاں جاکر اپنے غم کو تازہ نہ کرے۔بدعات کا ارتکاب نہ کرے۔

قبر کی زیارت کرکے مقصد تو فقط موت کو یاد کرنا اور آخرت کا استحضار ہے، پھر بھی علماءِ احناف میں سے متأخرین نے علی الاطلاق عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت کو ممنوع لکھا ہے ،چاہے کوئی بھی عورت ہو، اور کسی بھی نیت سے جانا چاہتی ہو۔چاہے وہ اہل اللہ کی قبریں ہوں یا اپنے رشتہ دار کی قبریں ہوں۔

بعض حضرات نے عورتوں کے لیے حرام ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس لیے کہ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کی قبروں پر عورتیں جائیں گی تو وہاں پر رونا دھونا ہوگا اور غم کو تازہ کرنا ہوگا۔ اور بزرگوں اور نیک بندوں کی قبروں پر جائیں گی تو وہاں بدعات کا ارتکاب کریں گی، شریعت کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب کریں گی۔ اور مشاہدہ بھی ہے کہ عام طور پر وہاں یہی سب ہوتا ہے، اور حکم جو لگتا ہے وہ اسی بنیاد پر لگا کرتا ہے، اب اگر کوئی عورت ایسی چیزوں سے مستثنیٰ ہو، تو اس کی وجہ سے اس کو اجازت نہیں مل سکتی۔ بہرحال! متأخرین کا فتویٰ یہی ہے کہ عورتوں کے لئے قبروں کی زیارت درست نہیں ہے

قبرستان جانے کی دعا اور آداب

حدیث ۵۸۲:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) كلَّمَا كَانَ لَيْلَتُهَا مِنْ رسولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يَخْرُجُ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ إِلَى البَقِيعِ، فَيقولُ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ، وَأَتَاكُمْ مَا تُوعَدُونَ، غَداً مُؤَجَّلونَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَاحِقُونَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لأَهْلِ بَقِيعِ الغَرْقَدِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ جب بھی میری باری کی رات ہوتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) رات کے آخری حصہ میں بقیع (جو مدینہ منورہ کا قبرستان ہے) تشریف لے جاتے، اور ان الفاظ و کلمات سے ان کو سلام کرتے تھے: اے مسلمانوں کی آبادی والو! تم پر سلام ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس چیز کا وعدہ

کیا جاتا تھا وہ چیز تم تک پہنچ چکی، اور قیامت تک کے لئے مہلت ہے۔ اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ اے اللہ تو بقیعِ غرقد یعنی اس قبرستان والوں کی مغفرت فرما۔

قبرستان کس دن جائے؟ مقاصدِ زیارت

افادات:- قبرستان کی زیارت کے سلسلہ میں علماء نے لکھا ہے کہ جمعہ کا دن اور اس میں بھی صبح کا وقت سب سے اچھا ہے۔ اس لیے آدمی جمعہ کے دن صبح کے وقت قبرستان کی زیارت کے لیے جائے۔ ویسے جمعہ سے ایک دن پہلے یعنی جمعرات، ایک دن بعد یعنی سنیچر، اسی طرح پیر؛ اس طرح کل چار دنوں - جمعرات، جمعہ، سنیچر اور پیر - میں قبروں کی زیارت کے لیے قبرستان جانے کو مستحب لکھا ہے، اور اس میں سب سے اچھا جمعہ کا دن ہے اور وقت صبح کا ہو تو زیادہ مناسب ہے، ورنہ جو وقت میسر آجائے

زیارتِ قبور ایک تو موت کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے ہوتی ہے، اس لیے جن قبروں کی زیارت کی جا رہی ہیں ان کا پہچاننا بھی ضروری نہیں ہے، قبروں کا دیکھنا ہی آدمی کے لیے موت کی یاد کو تازہ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

دوسرے یہ کہ زیارت؛ قبرستان میں جو مدفون ہیں ان کے لیے دعا کرنے کے واسطے ہوتی ہے، اس کے لیے بھی پہچاننا ضروری نہیں ہے، قبرستان جا کر وہاں والوں کے لیے دعائے

مغفرت کرے، جیسے : نبی کریم(ﷺ)نے جنت البقیع میں جو لوگ مدفون تھے ان کے لیے دعا ئے مغفرت فرمائی۔

تیسرے یہ کہ زیارت ؛اپنے مرحوم رشتہ داروں،ماں باپ وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیےہوتی ہے،یہ ان کاہم پر حق ہے اور اس کی ادائیگی کے مختلف طریقے ہیں، ان کے دنیا سے رخصت ہونےکے بعد آدمی ان کے لیے دعائے مغفرت کرے، ایصالِ ثواب کرے۔ توقبرستان جاکر ان کی قبر کی زیارت کرنا بھی انہیں حقوق کی ادائیگی میں داخل ہے۔بلکہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر اپنے ماں باپ کی قبروں میں سے کسی ایک کی زیارت جمعہ کے دن کرتا ہے تو اس کے لیے حج کا ثواب لکھاجاتا ہے۔(نوادرالاصول فی احادیث الرسول ۱/۱۲۶/ فیض القدیر شرح جامع الصغیر ۶/۱۸۳)

اوراللہ والوں کی قبرکی بھی زیارت کی جاتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ ان کی برکتوں میں سے کچھ حصہ ہمیں بھی نصیب فرمائے۔ مگر وہاں زیارت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جب قبرستان میں قدم رکھے تودعا اور سلام کے الفاظ پڑھے ،جو آگے والی روایت میں بھی آنے والے ہیں، نبی کریم (ﷺ)نے اس کی باقاعدہ تعلیم دی ہے۔

زیارتِ قبور کی تعلیم

حدیث ۵۸۳:-

وعن بريدة(رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) يُعَلِّمُهُمْ إِذَا خَرَجُوا إِلَى المَقَابِرِ أَنْ يَقُولَ قَائِلُهُمْ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَهلَ الدِّيَارِ مِنَ المُؤْمِنِينَ وَالمُسلمِينَ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لَلاَحِقونَ، أَسْأَلُ اللهَ لَنَا وَلَكُمُ العَافِيَةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت بریدہ(رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کو باقاعدہ سکھلاتے تھے کہ کوئی آدمی جب قبرستان جائے تو یوں کہے: تم پر سلامتی ہو اے مؤمنین اور مسلمین کی آبادی والو! اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے آکر ملنے والے ہیں۔ مَیں اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہارے لیے عافیت کا سوال کرتا ہوں (اور اس کا بھی اضافہ کرے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے۔)

زیارت کی دعا میں ''ان شاء اللہ'' کیوں؟

افادات:- یہاں سوال ہوسکتا ہے کہ موت کا آنا تو یقینی ہے، پھر جو ''ان شاء اللہ'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے؛ وہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ موت یقینی ہے؛ لیکن موت ایمان ہی پر آئے، اس کی کیا گارنٹی ہے؟ اور یہاں سلام مسلمانوں اور ایمان والوں کو کیا جارہا ہے، اور ''ان شاء اللہ'' کا اضافہ اس لیے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو ہمیں بھی ایمان کے اوپر موت نصیب فرما کر تمہارے اندر شامل کرے گا۔

حسنِ خاتمہ اور سوءِ خاتمہ کے اسباب

ایمان کے اوپر موت نہ آنے کے جو اسباب ذکر کیے ہیں، ان میں ایک سبب یہ ہے کہ آدمی نماز چھوڑے۔ دوسرا:شراب کا عادی ہو۔ تیسرا: ماں باپ کا نافرمان ہو۔ اور چوتھا: ایمان والوں کو تکلیف وایذاء پہنچاتا ہو۔کتابوں میں خاص طور پر ان چار کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ ان کاموں کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے برے خاتمہ کا اندیشہ رہتا ہے۔

اوراگر کوئی آدمی مسواک کا اہتمام کرے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ امید ہے کہ اس کو ایمان کے اوپر موت نصیب ہوگی۔اس لئے ہمیں ہر اس چیز کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے متعلق کتابوں میں لکھاہو کہ اس کے نتیجہ میں ایمان کے اوپر موت نصیب ہوتی ہے اور خاتمہ اچھا ہوتا ہے۔اور ہر اس چیز سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اس کے نتیجہ میں خاتمہ برا ہو سکتا ہے۔

قبرستان میں داخلہ کے وقت سلام

بہر حال !قبرستان میں داخل ہوتے وقت سلام کرے۔پھر صاحبِ قبر کو بھی خصوصیت کے ساتھ "السلام علیکم" کہہ کر سلام کر سکتا ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے نبی کریم(ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کوئی مؤمن جب اپنے مؤمن بھائی کی قبر کے اوپر سے گزرتا ہے جس کو وہ

پہچانتا تھا،اور اس کو سلام کرتا ہے، تو صاحب قبر اس کو محبت سے دیکھتاہے،اور اس کے سلام کا جواب دیتا ہے۔تومعلوم ہوا کہ کسی صاحبِ قبر کو بھی خاص طورسے اگرسلام کیا جائےتوکوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی روح کولوٹاتے ہیں ، پھروہ سلام کاجواب دیتا ہےاورخوش ہوتاہے(مشکوۃالمصابیح مع شرحہ مرعاۃالمفاتیح ،وذکرہ ابن القیم فی کتاب الروح تحت المسئلۃ الاولیٰ وھي ھل تعرف الاموات زیارۃ الاحیاء وسلامھم أم لا؟)اس لیے ایک تو قبرستان میں داخل ہوتےوقت عمومی کلمات سے سلام کرے، پھر جس کی قبر پر جارہا ہے اس کوبھی خصوصیت سے کلماتِ سلام کہے۔ جیسے کسی مجمع میں داخل ہوتے ہیں تو "السلام علیکم" کہتے ہیں،پھر کسی خاص آدمی سے ملتے ہیں توالگ سے سلام کیا جاتا ہے۔

ایصالِ ثواب کاطریقہ

پھر قبرستان میں داخل ہوتے ہی عمومی انداز میں پورے قبرستان والوں کے لیے ایصالِ ثواب کااہتمام کرے۔اس سلسلہ میں علامہ شامی(رحمۃ اللہ علیہ)نے اپنی کتاب میں ذکرکیاہےکہ آدمی قبرستان میں داخل ہونے کے بعدسورۂ فاتحہ۔ سورۂ بقرہ کااول:الم سے مفلحون تک۔ آیۃالکرسی۔سورۂ بقرہ کاآخریعنی آمن الرسول سے لے کرسورت کے ختم تک۔سورۂ یٰس۔سورۂ تبارک۔سورۂ تکاثر۔سورۂ اخلاص بارہ یا گیارہ یاسات یاتین مرتبہ۔ (شامی،جلد۱/ص:۲۶۶) یہ

سب پڑھ کر اس کا ثواب قبرستان والوں کو پہنچادے؛ تو اس قبرستان میں جتنے بھی مردے ہیں ان کی تعداد کے برابر اللہ تعالیٰ اس پڑھنے والے کو بھی ثواب عطا فرمائیں گے۔اس لئے جیسا موقع ہو اس کے مطابق پڑھے۔ اگر وقت ہے تو سب کے لیے الگ الگ ایصالِ ثواب کا بھی اہتمام کیا جائے۔

ایصالِ ثواب کی ایک شکل تو یہ ہے کہ پڑھنے کے بعد یوں کہے: اے اللہ! میں نے جو کچھ پڑھا ہے، اس کا ثواب اس قبرستان کے تمام مردوں کو میری طرف سے پہنچادے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ پڑھنے سے پہلے دل میں نیت کرے کہ: میں ان کی طرف سے پڑھتا ہوں، تو پھر بعد میں کہنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔دل میں آپ نے نیت کی ہے پھر جو کچھ پڑھا ہے،اس کا ثواب پہنچ جائے گا۔یہ دونوں شکلیں ہیں۔

ثواب پورا پہنچتا ہے، یا تقسیم ہو کر؟

پھر علماء نے مستقل ایک بحث لکھی ہے کہ پڑھ کر جو ثواب بھیجا جاتا ہے،وہ پورا پورا ہر ایک کو ملتا ہے، یا تقسیم ہو کر ملتا ہے؟تو اصول، قاعدہ اور قیاس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ثواب تقسیم ہو کر ملے۔جب آپ پڑھ کر سب کو دے رہے ہیں تو تقسیم ہی کیا جائے گا،لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے اگر کوئی آدمی امید رکھے کہ وہ ہر ایک کو پورا پورا ثواب دے گا؛تو اس کی رحمت سے کوئی بعید بات نہیں ہے۔وہاں تو آدمی کے اخلاص کو دیکھا جاتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جتنوں کو پڑھ کر بخشا ہے،ان سب کو پورا پورا ملے گا، اور جتنا ان کو ملا ہے اتنا ہی اس کو ملے گا اور اس کو پڑھنے کا الگ سے ملے گا۔ (شامی، جلد ۱/ص: ۶۶۲)

مثلاً آپ نے دس مرتبہ "قُلْ ہُوَاللّٰہُ اَحَدٌ "پڑھ کر دس آدمیوں کو بخشا، تو ان دسوں کو دس دس مرتبہ "قُلْ ہُوَاللّٰہُ اَحَدٌ " کا ثواب ملے گا، اور ان کے برابر آپ کو سو"قُلْ ہُوَاللّٰہُ اَحَدٌ " کا ثواب ملے گا،اورآپ نے دس مرتبہ پڑھی ہے اس کا الگ یعنی ایک سودس"قُلْ ہُوَاللّٰہُ اَحَدٌ " کا ثواب ملے گا۔اللہ تعالیٰ کے فضل سے کوئی چیز بعید نہیں ہے، آدمی اگر امید رکھے تو اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں۔حدیث ِپاک میں آتا ہے:"اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ "بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھتا ہے، ویسا ہی معاملہ میں اس کے ساتھ کرتا ہوں۔اس لئے ہر ایک کو اس بات کی عادت بنا لینی چاہیے کہ جب مسلمانوں کے کسی قبرستان کے پاس سے گزر ہو رہا ہو،تو کم سے کم تین مرتبہ "قُلْ ہُوَاللّٰہُ اَحَدٌ " پڑھ کر اس کا ثواب پورے قبرستان والوں کو پہنچادے۔

زندوں کو بھی ایصالِ ثواب کیا جاسکتا ہے؟

اس موقع پر علماء نے اس پر بھی کلام کیا ہے کہ مُردوں کی طرح زندوں کو بھی ثواب پہنچایا جاسکتا ہے یا نہیں؟بعض حضرات کہتے ہیں کہ چوں کہ مُردے محتاج ہیں وہ خود کوئی نیک عمل نہیں کر سکتے ،اس لیے ان کو تو پہنچایا جاسکتا ہے،جب کہ جو لوگ زندہ ہیں وہ نیک عمل

کرنے پر قادر ہیں، ابھی ان کا اعمال نامہ بند نہیں ہوا ہے، اس لئے وہ خود اپنے لئے کریں۔ ان کو ثواب نہیں پہنچایا جاسکتا۔

لیکن دوسرے علماء فرماتے ہیں کہ جس طرح ثواب مُردوں کو پہنچتا ہے، اسی طرح زندوں کو بھی پہنچتا ہے (شامی، جلد۱/ص: ٦٦٦) اس لیے کہ ایصالِ ثواب کا حاصل اتنا ہی ہے کہ آپ نے جو نیک عمل کیا، اس پر آپ کو جو اجر و ثواب ملا، آپ اللہ تعالیٰ سے درخواست و دعا کررہے ہیں کہ: اے اللہ! یہ ثواب جو مجھے ملا ہے، فلاں کو دیدے۔ جو ثواب آپ نے کمایا ہے اور آپ کے کھاتے میں جمع ہوا ہے، اب آپ اس کو دوسرے کے کھاتے میں ٹرانسفر کررہے ہیں، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

قبر کے پاس کس طرح کھڑا رہے؟

پھر آپ کسی مخصوص قبر کی زیارت کے لیے جائیں تو اس کے دائیں بازو پاؤں کی طرف کھڑے رہیں، اس طرح کہ آپ کی پشت قبلہ کی طرف ہو، اس لیے کہ مُردے کو قبر میں اُسی کروٹ لٹایا جاتا ہے۔ اگر آپ سرہانے کی طرف کھڑے ہوں گے تو اس کو دیکھنے میں تکلیف ہوگی، جیسے کوئی پیچھے کھڑا ہو تو پیچھے مڑکر دیکھنا پڑتا ہے، اس میں دیکھنے والے کو زحمت ہوتی ہے، لیکن اگر سامنے کھڑے رہو تو اس کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ کتابوں میں یہی آداب لکھے ہیں۔ ہاں اگر وہاں ایسی جگہ نہیں ہے بلکہ قبریں اس طرح بنی ہوئی ہیں کہ پاؤں کی طرف جانے

کی صورت میں قبر پر پاؤں رکھنے پڑتے ہیں، یا راستہ سرہانے کی طرف ہی ہے، تو پھر اس صورت میں مجبوری ہونے کی وجہ سے اجازت ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے بلکہ آپ آرام سے پاؤں کی طرف سے جاسکتے ہیں تو پھر پاؤں ہی کی طرف اس طرح کھڑے رہیں کہ قبلہ کی طرف پیٹھ ہو اور مُردہ جو لیٹا ہوا ہے وہ لیٹے لیٹے آپ کو دیکھ رہا ہو۔ اور سلام بھی کیا جائے۔

دور کھڑا رہے یا قریب؟ تو لکھا ہے کہ اس کی زندگی میں جتنا دور اور قریب رہتے تھے، اسی طرح کا معاملہ کیا جائے۔ جیسے بڑا آدمی ہوتا ہے تو زندگی میں اس کی عظمت کی مناسبت سے ہم ایک دم قریب نہیں جاتے؛ بلکہ ادب کی وجہ سے تھوڑا سا دور ہٹ کر کھڑے رہتے ہیں، تو موت کے بعد بھی وہی مناسبت باقی رہے گی، اس لیے موت کے بعد بھی ہٹ کر کھڑے رہیں۔ اور اگر زندگی میں آپ بالکل قریب جاتے تھے تو قبر کے بھی بالکل قریب رہیں۔ اور ایصالِ ثواب کرنے کے بعد اس کے لئے دعائے مغفرت کا بھی اہتمام کیا جائے کہ ”دعائے مغفرت اہم ہے“۔

ثواب پہنچنے کے بارے میں مذاہبِ ائمہ

ایصالِ ثواب کے سلسلہ میں ایک چیز یاد رہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت معتزلہ کی ہے جو پہلے گزرے ہیں، وہ یوں کہتے ہیں کہ کسی بھی عمل کا ثواب نہیں پہنچتا، ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین بھی اسی مسلک کے قائل ہیں۔ اہلِ سنت و الجماعت کا مسلک اس سلسلہ میں یہ

ہے کہ نیک عمل کا جو ثواب پہنچایا جاتا ہے وہ دو طرح کے ہیں : ایک مالی عبادتیں ہیں ، اور دوسری جانی عبادتیں ہیں۔ تو مالی عبادتوں کا ثواب تو سب کے نزدیک پہنچ جاتا ہے۔ اور جانی عبادتیں یعنی نماز پڑھ کر یا قرآن و تسبیح پڑھ کر جو ثواب ملتا ہے، وہ شوافع اور مالکیہ کے یہاں نہیں پہنچتا، اگرچہ شوافع کے متاخرین علماء نے فرمایا ہے کہ اس کا ثواب بھی پہنچ جاتا ہے۔ احناف کے نزدیک دونوں قسم کی عبادتوں کا ثواب پہنچ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانی عبادتوں کے مقابلہ میں مالی عبادتوں کا اہتمام زیادہ کرنا چاہیے؛ تاکہ اہلِ سنت و الجماعت کے نزدیک بالاتفاق وہ ثواب پہنچے۔ (شامی، جلد ا/ص: ۲٦٦)

دعائے مغفرت یا ایصال ثواب؟

اور دعائے مغفرت کے مفید ہونے میں تو کسی کو کلام ہی نہیں ہے، اہلِ سنت والجماعت اور معتزلہ دونوں اس کو مانتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دعائے مغفرت مردہ کے حق میں مفید و کار آمد ہے، اس لیے اگر دعائے مغفرت کرلے تو ایک ایسی چیز ہو جائے گی جس کے میت کے حق میں مفید ہونے میں کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔ ویسے بھی علماء نے لکھا ہے کہ ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعائے مغفرت کا اہتمام زیادہ ہونا چاہئے۔ لیکن ہم لوگوں کا مزاج بر عکس بنا ہوا ہے۔ ہم لوگ دعائے مغفرت کے مقابلہ میں ایصالِ ثواب کا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ حدیث ِپاک میں آتا ہے ، نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: "اذامَاتَ الاِنْسانُ ،اِنْقَطَعَ عنهُ عَمَلُهُ اِلَّامِنْ

ثلاثۃٍ، صدقۃٍ جاریۃٍ، أَوْ علمٍ یُنْتَفَعُ بہٖ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْالَہٗ“ آدمی کا جب انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے؛ البتہ تین چیزیں باقی رہتی ہیں، یا تو اس نے کوئی ایسا نیکی کا کام کیا تھا جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں، جیسے کہیں کنواں کھدوادیا، کہیں مسجد بنوادی، مدرسہ تعمیر کرادیا، مسافرخانہ تعمیر کرادیا، کوئی کتاب وقف کردی، یا علم کا کوئی سلسلہ جاری کردیا، کسی کو نماز سکھادی، اس نے دوسرے کو سکھائی، اس نے تیسرے کو سکھائی۔ یا کسی کو قرآنِ مجید پڑھنا سکھایا، اب وہ دوسروں کو سکھارہا ہے؛ یہ سارے سلسلے ایسے ہیں کہ ان سے مرنے کے بعد بھی فائدہ ہوتا رہتا ہے، اس لیے ان کا ثواب بھی ملتا رہتا ہے۔

دعائے مغفرت زیادہ مفید ہے

یا اولاد نیک ہے جو ماں باپ کے لیے دعائے مغفرت کرتی رہے۔ یہ دعائے مغفرت بہت مفید چیز ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نوراللہ مرقدہٗ دعا کے مفید اور کارآمد ہونے کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ دیکھو! کسی کا کوئی عزیز یا رشتہ دار جیل میں ہو، اب ایک شکل تو یہ ہے کہ کوئی آدمی کوشش کر کے اس تک دو وقت کھانے کا ٹفن پہنچاتا ہے۔ اور دوسرا آدمی ٹفن تو نہیں پہنچاتا، مگر ذمہ داروں سے مل کر کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح یہ جیل سے باہر نکلے، اس کے لیے کیس تیار کراتا ہے، یا سفارش کراتا ہے کہ کسی طرح جلدی سے جیل سے باہر آجائے۔ تو اب آپ ہی بتاؤ کہ ٹفن پہنچانے والا زیادہ عمدہ کام

کررہاہے یاجیل سے نکالنے کے لیے کوشش کرنے والے کی کوشش بڑھ کر ہے؟یہ بات اور ہے کہ دونوں کی کوشش اپنی جگہ پر عمدہ ہے،اور دونوں کاکام محبت ہی کی وجہ سے ہے؛لیکن ظاہرہے کہ چھڑانے کی کوشش کرنے والا زیادہ اہم کام انجام دے رہاہے۔اسی طرح سے ایصالِ ثواب کے مقابلہ میں دعائے مغفرت کااہتمام زیادہ ہوناچاہیے۔ویسے دونوں کام اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔

اگر کوئی یوں کہے کہ جب اس کی مغفرت ہوگئی ہے ،یا وہ اللہ کے نیک بندے ہیں جو بخشے بخشائے ہیں؛اب ان کے لیے دعائے مغفرت کے کیامعنٰی؟تومعلوم ہونا چاہیے کہ دعائے مغفرت کی خاصیت ہے کہ کوئی آدمی کسی کے لیے دعائے مغفرت کرتا ہے، اگر اس کے گناہ معاف ہوچکے ہیں تو یہی دعائے مغفرت اس کے لیے ترقیٔ درجات کاسبب بنتی ہے۔معلوم ہواکہ دعاایک بہت ہی مفید اورکارآمد چیز ہے۔

توقبروں کی زیارت کے سلسلہ میں جوباتیں اہم ہیں،وہ سب تفصیل سے ذکر کردی گئیں۔

ایک مراقبہ

حدیث ۵۸۴:-

وعن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ : مرَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) بِقُبورٍبالمدِينَةِ ، فَأَقْبَلَ عَلَيْهِمْ بِوَجْهِهِ ، فَقَالَ : السَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا أَهْلَ القُبُورِ ، يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَكُمْ ، أَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بالأَثَرِ. (رواہ الترمذی،وقال:حدیث حسن)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں نبی کریم (ﷺ) کا گزر مدینہ منورہ میں چند قبروں کے پاس سے ہوا، آپ ان کی طرف اپنے چہرے سے متوجہ ہوئے (یعنی ان کے قریب گئے) اور آپ نے کہا: اے قبر والو! تم پر سلام ہو، اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے (دیکھو! آپ (ﷺ) نے دعائے مغفرت فرمائی) تم ہم سے پہلے دنیا سے رخصت ہوئے، ہم تمہارے بعد میں آرہے ہیں۔

افادات:-ظاہر ہے جانے والے چلے گئے، اب ہماری باری ہے۔ آدمی قبرستان میں جا کر یہ بھی سوچے، اور قبر والا جیسا آدمی تھا ویسا منظر سامنے لائے۔ بہت سی قبریں ایسے لوگوں کی ہوں گی جن کو آپ نے ان کی زندگی میں دیکھا تھا کہ کیسے حالات تھے، بعض کروڑپتی تھے، بڑے رعب و دبدبے والے تھے، بڑے ثروت و دولت والے، بڑے عہدے و منصب والے ایسے بھی ہوں گے جن سے آپ واقف تھے، ان کی قبر پر جب نظر پڑے تو آدمی کو سوچنا چاہیے کہ زندگی میں اس آدمی کا کیا حال تھا، اور آج قبر کے اندر پڑا ہوا ہے، کوئی پرسانِ حال نہیں۔ اس غور و فکر کے نتیجہ میں آدمی کا دل دنیا کی طرف سے سرد ہوتا ہے، اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے، دنیا کی محبت کم ہوتی ہے، اور قبروں کی زیارت کا جو مقصد ہے وہ حاصل ہوتا ہے۔

غفلت کا انتہائی درجہ، اس کا علاج

ورنہ آج کل ہم لوگوں کا مزاج تو ایسا بنا ہوا ہے اور غفلت اتنی زیادہ طاری ہے کہ قبرستان میں ایک طرف میت کو دفن کیا جارہا ہے اور دوسری طرف لوگ ٹولیاں بنا بنا

کر دنیا کی باتوں میں لگے ہوئے ہیں، اتنی دیر کے لیے بھی ہم سے خاموش رہا نہیں جاتا۔ بعض لوگ تو وہیں بیڑی سیگریٹ پینے لگتے ہیں۔ قبرستان سے ہمیں جو عبرت حاصل کرنی چاہیے وہ ختم ہوگئی۔ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے: اب تو قبرستان سے عبرت حاصل کرنے کی ہماری صلاحیت بھی باقی نہیں رہی۔ ہاں! اتنا ہے کہ ہسپتال جاتے ہیں تو تھوڑا بہت اثر ہو جاتا ہے؛ لیکن اب تو دھیرے دھیرے وہ بھی ختم ہوتا جارہا ہے، ہسپتال جاکر بھی اثر قبول کرنے والے پہلے کے مقابلہ میں کم لوگ رہ گئے ہیں۔ ہاں! کوئی اگر شدید مریض ہو جس کی کیفیت دیکھنے کے قابل نہ ہو؛ تو کچھ اثر ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ کے یہ سارے حالات ہوتے جارہے ہیں۔ ہمارا مزاج جو ایسا بنتا جارہا ہے وہ غفلت کا انتہائی درجہ ہے۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے غفلت کو دور کرنے کا ایک ذریعہ بتلایا ہے، اور اس کے ذریعہ عبرت حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس لیے اب ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر وہاں جانے کے بعد بھی ہمارے دلوں پر اثر نہیں ہوتا؛ تو پھر ہماری اس قساوت، دل کی سختی اور غفلت کو دور کرنے کا کیا علاج کیا جائے۔ اس لیے آدمی کو کثرت سے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ پہلے روزانہ وہاں جائے اور زیادہ وقت وہاں گزارے، یہاں تک کہ یہ کیفیت پیدا ہو جائے۔ جیسے: ایک آدمی کوئی میٹھی چیز کھا رہا ہے اور وہ اس کو کڑوی لگ رہی ہے، تو پھر اس آدمی کو سوچنا چاہیے کہ یہ میری بیماری ہے، مجھے اس کا علاج کرنا چاہیے۔

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام یہ ہے کہ آدمی قبروں کی زیارت کا اہتمام کرے۔ ہم لوگ اس سلسلہ میں بڑی غفلت برتتے ہیں، بہت گنے چنے ہوتے ہیں جو اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ کم سے کم جمعہ کے دن فجر کی نماز کے بعد کہیں اور جانے کے بجائے سیدھے قبرستان جائیں، پھر گھر میں قدم رکھیں۔ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ورنہ آج کل ایسا ہوگیا ہے کہ ایک صاحب کہنے لگے: اب تو مرنے والوں کو اتنا جلدی بھلادیا جاتا ہے کہ موت کے بعد تیسرے چوتھے دن تو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ ویسے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ دفن کرنے کے بعد دفن کرنے والے قبر سے واپس رخصت ہونے لگتے ہیں تو ایک فرشتہ مٹھی میں مٹی اٹھا کر ان کے چہروں پر ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ جاؤ! اپنے کام میں مشغول ہو جاؤ اور اس کو بھول جاؤ (شرح الصدور بشرح حال الموتی والقبور / باب دفن العبر في الأرض التي خلق منها) اس لیے میں کہا کرتا ہوں کہ اس فرشتہ کی بات کا اثر ہم بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔

خیر! یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک نظام ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے اتنے سارے واقعات پیش آتے ہیں ان کے بعد تو ہمارا جی کسی چیز میں لگنا ہی نہیں چاہیے۔ مرنے والوں کو دیکھ رہے ہیں اور دفن کر رہے ہیں، لیکن ہم پر انتہائی درجہ کی غفلت طاری ہو چکی

ہے۔حالاں کہ مزاج میں اعتدال ہوناچاہیے، اور ان باتوں کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

كَرَاهَةِ تَمَنِّي الْمَوْتِ بِسَبَبِ ضُرٍّ نَزَلَ بِهِ وَلَا بَأْسَ بِهِ لِخَوْفِ الْفِتْنَةِ فِي الدِّيْنِ

کسی مصیبت کے سبب موت کی تمنا کا ناپسندیدہ ہونا اور دینی فتنہ میں مبتلا ہونے کے ڈر سے موت کی دعا کرنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پچھلے ابواب میں چند باتیں گزریں، پہلے موت کو یاد کرنے کا تذکرہ تھا، اس کے بعد والے باب میں قبروں کی زیارت کا طریقہ بتلایا تھا، ان ابواب کی وجہ سے شاید کسی کو یہ خیال پیدا ہو کہ موت کی دعا بھی کی جاسکتی ہے، موت مانگی بھی جاسکتی ہے؛ تو موت مانگنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کے متعلق تفصیل ہے جو علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اس عنوان کے تحت بتارہے ہیں کہ کسی مصیبت کے نازل ہونے کی وجہ سے موت کی تمنا کرنا منع ہے، البتہ اگر دین میں فتنہ کا ڈر اور خطرہ ہو، تو موت کی تمنا کی جاسکتی ہے۔

مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیماری میں گرفتار ہوتا ہے، ایک مدت تک علاج و معالجہ کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، لیکن وہ بیماری ٹھیک نہیں ہوتی، وہ آدمی اس بیماری کی وجہ سے پریشان ہو کر عاجز آکر موت کی دعا و تمنا کرتا ہے۔ یا مالی و اقتصادی اعتبار سے مصیبت آئی، کھانے پینے کی تکلیف ہے، ادھر ادھر بہت کچھ ہاتھ پیر مارے، محنت بھی کی؛ لیکن کچھ ہاتھ نہیں آیا، طویل مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا، گھر والے بھی تقاضے بڑھاتے جارہے ہیں۔ یا اولاد پریشان کرتی ہے، یا بیوی نافرمان ہے جس کی وجہ سے ٹینشن رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

کسی دنیوی مصیبت کی وجہ سے ،چاہے وہ بیماری کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں ہو، آدمی یہ سوچتا ہے کہ موت بھی نہیں آتی؟ اگر موت آجائے تو اچھا ہے۔ لیکن ایسے حالات کی وجہ سے موت کی تمنا اور دعا کرنا جائز نہیں ہے۔

اگر موت مانگنی ہی ہے تو؟

اگر ایسے حالات آگئے کہ پریشانی کی وجہ سے طبیعت موت کی دعا کرنے کے لیے آمادہ ہی ہے، تو اس کا ایک طریقہ بتایا گیا کہ آدمی یوں دعا کرے: " اَللّٰھُمَّ اَحْیِنِیْ مَاکَانَتِ الْحَیَاۃُ خَیْرًا لِیْ ، وَتَوَفَّنِیْ اِذَاکَانَتِ الْوَفَاۃُ خَیْرًا لِیْ "اے اللہ! مجھے زندہ رکھ جب تک میرے لیے زندگی میں بھلائی اور خیر ہے، اور مجھے موت دے اگر میرے لیے موت میں خیر اور بھلائی ہو۔ اس لیے کہ آدمی کا یقینی اور قطعی طور پر اپنے لیے موت کا سوال کرنے کا مطلب تو یہ ہے کہ وہ اپنے لیے گویا یہی سمجھتا ہے اور اس نے اپنے لئے فیصلہ کر لیا ہے کہ موت ہی میرے حق میں بہتر ہے، حالاں کہ ظاہر ہے اس کو آئندہ کے حالات معلوم نہیں کہ مستقبل اپنے اندر کیا چھپائے ہوئے ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ آئندہ کیا صورتیں پیش آنے والی ہیں ۔اس لیے آدمی اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہ کرے؛ بلکہ جب حالات ایسے ہوں تو یہ دعا کرسکتا ہے جو ابھی بتلائی، لیکن صراحتاً موت کی دعا مانگنے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

دینی آزمائش کی وجہ سے موت مانگنا

البتہ اگر آزمائش اور حالات ایسے پیش آئے کہ دینی اعتبار سے نقصان کا اندیشہ اور خطرہ ہے کہ کہیں ایمان ہاتھ سے نہ چلا جائے،یا بدعملی میں مبتلاہوجانے کا اندیشہ یقین کے درجہ میں ہو، یا غالب گمان ہو-صرف وہم کی بنیاد پر نہیں- تو اپنے آپ کو دینی ضرر اور نقصان سے بچانے کے لیے اگر وہ موت کی دعا کرتا ہے تو اس کی اجازت دی گئی ہے؛ورنہ اجازت نہیں ہے۔

حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)نے جب اخیری حج کیاجس کے بعدان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا،اس حج میں حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)نے یہ دعاکی تھی : اے اللہ!سلطنت کے حدود بہت پھیل چکے ہیں اور میرے قویٰ کمزور ہورہے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ تیرے بندوں میں سے کسی بندے کا حق میرے ہاتھوں کہیں ضائع نہ ہوجائے۔ایساہواس سے پہلے تو مجھے موت عطافرما۔وہاں سے واپس لوٹ کرجب مدینہ منورہ پہنچے اورایک دو نمازیں ہی پڑھانے کی نوبت آئی تھی کہ ان کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔ (فتح الباری / اسد الغابہ / سیرۃ ابن الخطاب)

موت کی تمنا کرنے کی کوئی وجہ نہیں

حدیث ۵۸۵:-

عن أَبِی ھریرۃ(رضی اللہ عنہ): أَنَّ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لا یَتَمَنَّ أحدُکُمُ المَوْتَ، إمَّا مُحْسِناً فَلَعَلَّهُ یَزْدَادُ، وَإمَّا مُسِیئاً فَلَعَلَّهُ یَسْتَعْتِبُ. (متفقٌ عَلَیْهِ، وھذا لفظ البخاری)

وفی روایة لمسلم: عن أَبِی ھریرۃ(رضی اللہ عنہ) عن رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لاَیَتَمَنَّ أَحَدُکُمُ المَوْتَ، وَلاَ یَدْعُ بِهِ مِنْ قَبْلِ أنْ یَأْتِیَهُ؛ إنَّهُ إِذَا مَاتَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ وَإنَّهُ لاَیَزِیدُ المُؤْمِنَ عُمُرُهُ إلاَّ خَیْراً.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے(کیوں؟ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے آگے خود ہی اس کی توضیح فرمائی ہے۔اس لیے کہ موت کی تمنا کرنے والا دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ نیکوکار ہے، یا بدکار ہے۔اعمالِ صالحہ پر مداومت کرنے والا ہے، یا برائیوں اور گناہوں میں مبتلا رہتا ہے)اگر وہ نیکوکار ہے تو(موت کی تمنا کیوں کرتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ نے اسے نیک کام کرنے کی توفیق دے رکھی ہے،تو آئندہ کی زندگی میں مزید نیک کام اس کے ہاتھوں وجود میں آئیں گے)اس کی نیکیوں میں اضافہ ہو گا(اور یہی چیز آخرت کے اعتبار سے درجات کی ترقی کا ذریعہ بنے گی۔تو ایسے آدمی کے لئے تو زندگی میں فائدہ ہے ،پھر کیوں موت مانگتا ہے؟) اور اگر وہ بدکار ہے (اس لئے موت کی تمنا کرتا ہے تاکہ جلدی سے اس کو بدکاری سے نجات ملے)تو ہو سکتا ہے کہ آئندہ زندگی میں اس کو توبہ نصیب ہو جائے(نیکی کی توفیق مل جائے، اور وہ اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے۔اگر ابھی اسی حالت میں موت آجائے گی تو دنیا سے بغیر توبہ کے جائے گا، حالاں کہ اس کے لیے آئندہ امید اور توقع ہے کہ اعمالِ صالحہ اور توبہ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو راضی کر لے۔اس لئے ایسا آدمی بھی کیوں موت کی تمنا کرتا ہے؟)

حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) کی یہی روایت مسلم شریف میں دوسرے الفاظ سے آئی ہے جس میں نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی موت کی تمنا نہ کرے،اور موت آنے سے پہلے اس کی دعا بھی نہ کرے۔اس لیے کہ جب وہ مرجائے گا تو عمل کا سلسلہ ختم ہوجائے گا (اس لیے کیوں ایسی چیز کی تمنا کر رہا ہے کہ جس کے نتیجہ میں اعمال کا سلسلہ ختم ہوتا ہے) اور مؤمن کی عمر اس کے لیے خیر ہی لے کر آتی ہے(اگر نیکو کار ہے تو اس کے لیے خیر ہونا ظاہر ہے، اور اگر بدکار ہے تو جیسا کہ اوپر آگیا کہ امید ہے اس کو توبہ نصیب ہوجائے ؛ تو یہ زندگی اس کے لیے بھی خیر کا ذریعہ بنے گی)

موت کی قطعی دعا نہ کرے

حدیث ۵۸۶:-

وعن أنسٍ(رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم): لاَ يَتَمَنَّيَنَّ أَحَدُكُمُ المَوْتَ لِضُرٍّ أَصَابَهُ، فَإِنْ كَانَ لاَ بُدَّ فَاعِلاً، فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ أَحْيِنِي مَا كَانَتِ الحَيَاةُ خَيْراً لِي، وَتَوَفَّنِي إِذَا كَانَتِ الوَفَاةُ خَيراً لِي. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا : تم میں سے کوئی آدمی کسی تکلیف اور مصیبت کی وجہ سے- جو اس کو پہنچی ہے- موت کی تمنا نہ کرے۔اور اگر دعا کرنی ہی ہے تو (پھر قطعی طور پر دعا نہ کرے کہ اے اللہ! مجھے موت دے ہی دے، بلکہ) یہ دعا کرے:اے اللہ!اگر میرے

لیے میری زندگی میں خیر و بھلائی ہے ،تو مجھے زندہ رکھ۔اور اگر میرے لیے موت کے اندر بھلائی ہے ،تو مجھے موت نصیب کر۔

افادات:-دنیوی مصیبت چاہے جسمانی ہو،چاہے مالی ہو، چاہے کسی اور طریقہ کی ہو؛ بہرحال مصیبت، تکلیف اور بیماری کی وجہ سے آدمی موت کی تمنا نہ کرے ،اوراگر کسی وجہ سے ایسی دعاکرنی ہی ہو،اس کی طبیعت موت کی دعاکرنے کے لئے بےچین ہو ،تو پھر قطعی طور پر دعا نہ کرے، بلکہ یہ دعا کرے :اے اللہ! میرے لیے میری زندگی میں اگر خیر اور بھلائی ہے تو مجھے زندہ رکھ، اور اگر میرے لیے موت کے اندر بھلائی ہے تو مجھے موت عطا کر۔اس لئے کہ وہ نہیں جانتا ہے کہ اس کے لیے کس چیز میں خیر و بھلائی ہے،بلکہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔اس لئے آدمی کو مستقبل سے تعلق رکھنے والی تمام چیزوں میں قطعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کرناچاہیے،بلکہ جب بھی اللہ تعالیٰ سے کوئی دعا کرے تواسی انداز سے کرے۔

مانگی تھی تلے کو،ملی اوپر کو

پہلے بھی میں نے قصہ سنایاتھا، حضرت شیخ(رحمۃ اللہ علیہ)سنایاکرتے تھے کہ ایک آدمی سفر کررہاتھا،سواری کے لیے کوئی جانور نہیں تھااس لئے پیدل سفر کر رہا تھا۔جب چلتے چلتے تھک گیاتو دعا کرنے لگا : اے اللہ !سواری دیدے، گھوڑا دیدے، گھوڑی دیدے بار باریہی دعا کر تارہا۔جب دیکھاکہ نہ گھوڑا مل رہا اور نہ گھوڑی مل رہی ہے،توکہنے لگا: اے اللہ!گھوڑی کا بچہ

ہی دیدے۔ خیر! پھر وہ تھکا ہارا راحت و آرام حاصل کرنے اور کچھ ستانے کے لیے ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا کہ اتنے میں اس کے قریب سے ایک سپاہی ایک گھوڑی پر سوار جارہا تھا، اس کی گھوڑی حاملہ تھی۔ اتفاق کی بات کہ وہیں اس کی گھوڑی کو بچہ پیدا ہوا۔ نیا پیدا شدہ بچہ تھا، اس کو چلانا تو مناسب نہیں تھا، اس لیے اس سپاہی نے اس آدمی کو ایک ڈنڈا مار کر کہا: چل اُٹھ! اور اُس کے کندھے پر اس بچہ کو ڈالا اور کہا: اس کو لے کر میرے ساتھ آگے آگے چل۔ اب یہ کہنے لگا کہ: اے اللہ! مانگی تھی تلے کو، مل گئی اوپر کو۔

عورتوں کی عادت

اس لیے جب اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مانگی جائے تو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ ہماری بہت سی ایسی دعائیں قبول نہیں کرتے ورنہ بہت سی مرتبہ آدمی اپنے مال اور اولاد سے ناراض ہو کر بددعا کرتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ تھوڑی تکلیف پہنچی تو کہتی ہیں کہ: یہ بچہ مر بھی نہیں جاتا، تکلیف دیتا رہتا ہے، مر جائے تو اچھا۔ پھر جب وہ دعا قبول ہو جاتی ہے تو زندگی بھر روتی پھرتی ہے۔ یہ تو اچھا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی بہت سی دعاؤں کو قبول نہیں کرتے۔ قرآنِ پاک میں بھی موجود ہے ﴿وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُم بِالْخَيْرِ (یونس:۱۱)﴾ اس کی تفسیر بخاری شریف میں حضرت مجاہد (رحمۃ اللہ علیہ)

یہی فرماتے ہیں({ FR 2325 }) تومیں یہ عرض کررہا تھا کہ جس چیز کے متعلق یقینی معلوم نہ ہو،اس کے متعلق آدمی یقینی طورپر اللہ تعالیٰ سے کوئی دعانہ کرے۔

بددعاکاخاصہ

ایک بات ضمناًیادآگئی اس لئے بتلادیتاہوں۔حضرت شیخ(رحمۃ اللہ علیہ) نے آپ بیتی میں لکھاہے کہ بعض مرتبہ کسی کو کوئی نقصان و تکلیف پہنچتی ہے، اب یہ سمجھتا ہے کہ فلاں آدمی نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیاہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا، بلکہ کسی دوسرے نے کیاہے۔اب وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ فلاں نے میرے ساتھ ایسا کیا ہے، اس لئے اس کا نام لے کر اس کے لئے بددعا کرتا ہے کہ اے اللہ! اس کو موت آجائے، اس کا ایسا نقصان ہوجائے،وغیرہ وغیرہ۔اب یہ تو اس کے لیے بددعااس لیے کررہا ہے کہ یہی سمجھ رہا ہے کہ اسی آدمی نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے اور میرا نقصان کیا ہے،میرے گھر کو آگ اسی نے لگائی ہے،حالاں کہ اس نے اس کو ایسا کرتےہوئے دیکھانہیں ہے،کسی نے اس کے ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے، اوراس کے دل و دماغ میں ایسابھر دیا ہے۔

اوریاد رکھنابددعا کا ایک خاصہ ہے۔جو لوگ بددعائیں کرتے رہتے ہیں وہ بھی ذرا سنبھلیں، اس لئے کہ بددعا ایک طرح کی لعنت ہے۔اورلعنت یعنی اللہ کی رحمت سے دور کردینے کی دعا۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی جب کسی کے لیے بددعا کرتا ہے تویہ بددعا آسمان پر

جاتی ہے ، لیکن آسمان کے دروازے اس کے لئے بند کردیئے جاتے ہیں، پھر نیچے آتی ہے اور جس کے لیے بددعا کی گئی ہے اس کے پاس جاتی ہے، اب اگر وہ اس بددعا کا حقدار ہوتا ہے، یعنی جس کے لیے بددعا کی گئی ہے، واقعتاً اس کی حرکتیں ایسی ہیں کہ اس نے ظلم و زیادتی کا معاملہ بددعا کرنے والے کے ساتھ کیا ہے ؛ تب تو وہ اس کو لگ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ بلاوجہ اس کے لیے بددعا کی گئی ہے ؛تو پھر وہ اس کو نہیں لگتی، بلکہ بددعا کرنے والے پر ہی واپس لوٹ آتی ہے، اور اسی کو نقصان پہنچاتی ہے۔

حضرت فقیہ الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کی ایک مثال

ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اس کو ایک مثال سے سمجھاتے تھے کہ بددعا تو ایک گیند کی طرح ہے، اگر آپ نے گیند پھینکی تو جہاں پھینکی گئی ہے وہ جگہ نرم ہے اور اس گیند کو اپنے اندر سمونے کی اس میں صلاحیت ہے تو وہ گیند اندر چلی جائے گی، اور اگر وہ جگہ اس قابل نہیں ہے ،بلکہ سخت ہے، تو جس نے گیند پھینکی ہے اسی کے پاس واپس آجائے گی۔ بددعا کا بھی یہی حال ہے۔

احتیاط والی بات

اس لیے پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی کسی کے لیے بددعا کیوں کرے ؟اوراگر اپنے کسی نقصان کی وجہ سے ایسی نوبت آہی گئی ہے تو حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ کسی کا نام نہ لے؛بلکہ یوں کہے: اے اللہ! جس نے میرے ساتھ ایسامعاملہ کیا ہے، میرے گھر میں جس نے آگ لگائی ہے ،اس کے ساتھ توایسا کر۔اس لئے کہ ہو سکتا ہے جس کانام لیاہے اس نے نہ کیا ہو،کسی دوسرے نے کیا ہو۔جب آپ یہی کہیں گے کہ جس نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے، توپھروہ اپنی جگہ پر درست ہے۔اب اگرآپ جس کے متعلق سمجھ رہے ہیں، اسی نے کیاہے تو اس کولگے گی۔اور اگراس نے نہیں کیا ہے بلکہ کسی دوسرے نے کیاہے تو جس نے کیا ہے اس کو لگے گی۔اس لئے بددعا کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

اگر منع نہ ہوتاتومیں موت کی دعاکرتا

حدیث ۵۸۷:-

وعن قیس بنِ أَبِی حازمٍ ،قَالَ:دَخلْنَا عَلَی خَبّاب بن الأرتِّ (رضی اللہ عنہ) نَعُودُهُ وَقَدِ اکْتَوَی سَبْعَ کَیَّاتٍ،فَقَالَ: إنَّ أَصْحَابَنَا الَّذِینَ سَلَفُوا مَضَوْا،وَلَمْ تَنْقُصْهُمُ الدُّنْیَا،وَإنَّا أَصَبْنَا مَالاَ نَجِدُ لَهُ مَوْضِعاً إلاَّ التُّرَابَ وَلولا أَنَّ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نَهَانَا أنْ نَدْعُوَ بالمَوْتِ لَدَعَوْتُ بِهِ .ثُمَّ أتَیْنَاهُ مَرَّةً أُخْرَی وَهُوَ یَبْنِی حَائِطاً لَهُ،فَقَالَ:إنَّ المُسْلِمَ لَیُؤْجَرُ فِی کُلِّ شَیْءٍ یُنْفِقُهُ إلاَّ فِی شَیْءٍ یَجْعَلُهُ فی هَذَا التُّرَابِ (متفقٌ عَلَیْهِ)

ترجمہ:-حضرت قیس بن اَبی حازم(رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ حضرت خباب بن اَرت(رضی اللہ عنہ) بیمار تھے، ہم لوگ ان کے پاس عیادت وخبر گیری کے لیے حاضر ہوئے(حضرت خباب(رضی اللہ عنہ)ان حضراتِ صحابہ میں سے ہیں جو شروع میں اسلام لائے تھے، اور جن کو بڑی تکلیفیں پہنچائی گئیں تھیں)انہوں نے اس بیماری میں سات مرتبہ داغ لگوائے تھے (لکھا ہے کہ ان کو بواسیر کی تکلیف تھی، کسی طرح سے ٹھیک نہیں ہورہی تھی، کسی نے یہ علاج بتلایاتو انہوں نے داغ لگوائے۔جب ہم لوگ حاضرہوئے تو)انہوں نے فرمایا: ہمارے وہ ساتھی جو انتقال کرگئے،انہوں نے دنیاکو ایسی حالت میں چھوڑاکہ دنیا نے ان کی آخرت کے اجرو ثواب میں کوئی کمی نہیں کی۔اورہم دنیامیں زندہ رہے تو ہمارے ہاتھ میں اتنی دولت آئی کہ اس کو رکھنے کے لیے مٹی کے علاوہ اورکوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے،اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے موت کی دعا سے ہم کو منع نہ کیاہوتاتو میں موت کی دعاکرتا(اس سے معلوم ہوا کہ موت کی دعا کرنے سے منع کیا گیا ہے)قیس بن حازم(رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: پھردوبارہ ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت وہ اپنی ایک دیوار درست کرا رہے تھے(یعنی تعمیر کرارہے تھے،جب ہم نے یہ دیکھاتواس پر)انہوں نے کہا:مسلمانوں کو ان کے ہر اس کام میں جس میں وہ مال خرچ کرتے ہیں؛ثواب ملتا ہے، مگر جو مال مٹی میں ڈالیں(یعنی تعمیرپرخرچ کرے اس میں ثواب نہیں ملتا)

افادات:-جب آدمی کو دنیاکے اندرکوئی بھی نعمت اور راحت پہنچتی ہے تو اس میں اس کے اعمالِ خیر کا دخل ہوتاہے، اور جوتکلیف و مصیبت آتی ہے اس میں اس کے اعمالِ بد کا دخل ہوتا ہے﴿وَمَآ أَصَـٰبَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ﴾ان کے کہنے کامطلب یہ تھاکہ ہمارے وہ ساتھی جو ایمان لائے اور اس کے واسطے انہوں نے تکلیفیں اٹھائیں، ان تکلیفوں پربڑے

بڑے ثواب کے مستحق بنے، لیکن دنیا کی نعمتیں ان کو ہاتھ لگے اس سے پہلے ہی وہ دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اس لیے کہ بعد میں فتوحات کا سلسلہ جاری ہوا، بڑے بڑے ملک فتح ہوئے، اور مالِ غنیمت کے طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں بے شماردولت آئی۔ اگر وہ لوگ بھی یہ زمانہ پاتے تو ان کے پاس بھی یہ ساری چیزیں آتیں اور دنیا میں کچھ نعمتیں، مال و دولت اور ثروت ان کو بھی ملتیں، اور ان کو آخرت میں ان کے اعمال کا جو بدلہ ملنے والا ہے اس کے اندر کمی کا ذریعہ بنتیں، لیکن وہ تو ان سب میں سے کچھ بھی نہیں لے گئے: اس لئے ان کو آخرت میں پورا پورا بدلہ ملے گا۔ گویا دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ دنیا کی نعمتوں نے ان کے اجرو ثواب میں کوئی کمی نہیں ہونے دی، دنیا سے فائدہ اٹھائے بغیر دنیا سے رخصت ہوگئے۔ جتنے بھی اعمال کیے تھے ان کا پورا پورابدلہ وہیں ملے گا۔ اور ہم دنیامیں زندہ رہے تو ہمارے ہاتھ میں اتنی دولت آئی کہ اس کو رکھنے کے لیے مٹی کے علاوہ اور کوئی جگہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ انہوں نے کہاکہ ایک وقت وہ تھا کہ حضور اکرم (ﷺ) کے زمانہ میں صدقہ کرنے کے لیے درہم موجود نہیں تھا اورآج میرے گھر پر تیس چالیس ہزار درہم پڑے ہوئے رہتے ہیں۔

تعمیر میں خرچ ناپسندیدہ ہے

مسلمانوں کو ان کے ہر اس کام میں جس میں وہ مال خرچ کرتے ہیں -چاہے اولاد اور گھر والوں پر ہو یا دوست احباب پر-ثواب ملتا ہے، مگر جو مال مٹی میں ڈالیں یعنی تعمیر کے اندر خرچ کریں، اس پر ثواب نہیں ملے گا۔ تعمیر پر مال خرچ کرنے کی حدیثِ پاک میں ممانعت آئی ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے پسند نہیں فرمایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا گزر ہمارے پاس سے ہوا، اور ہمارا ایک جھونپڑا تھا جس کو ہم مٹی سے لیپ رہے تھے، تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تعمیر سے متعلق یہی ارشاد فرمایا جو اوپر گزرا۔ اس پر ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ جھونپڑا ہی تو ہے جس کو لیپ کر ذرا ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: موت تو اس سے بھی جلدی آنے والی ہے (ترمذی: باب ماجاء في قصر الأمل / ابوداود: باب مَا جَاءَ فِي الْبِنَاءِ) یعنی جھونپڑا لیپ کر ٹھیک ٹھاک کروگے تو اس ٹھیک کئے ہوئے جھونپڑے سے پورا فائدہ اُٹھانے کی نوبت بھی نہیں آئے گی، اس لیے کہ یہ جھونپڑا سال دو سال، چار سال تو ٹکے گا، اس سے پہلے تو موت آجائے گی۔ معلوم ہوا کہ تعمیر میں مال خرچ کرنے کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ مساجد کو مزین کرنے سے حدیثِ پاک میں ممانعت آئی ہے اور مساجد کو مزین کرنے کو قیامت کی نشانی بتلایا گیا ہے۔ حضرت علامہ انور

شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ حدیثِ پاک میں اس کی ممانعت کے باوجود آج تعمیر کا یہ حال ہے کہ عمارتیں آسمان کو چھو رہی ہیں؛تو اگر ذرا سی ترغیب آئی ہوتی تو ہمارا کیا حال ہوتا!!!!!

بَابُ الْوَرَعِ وَتَرْكِ الشُّبُهَاتِ

احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِكْ وَسَلَّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

أعوذ باللّٰہ من الشیطان رجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وَ تَحْسَبُوْنَہٗ ھَیِّنًا وَّ ھُوَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمٌ

ورع کا مطلب

امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نیا عنوان قائم کیا ہے: ورع کا بیان۔

ورع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی احتیاط اور بچاؤ سے کام لے۔ جس چیز سے شریعت نے منع کیا ہے اس سے بچنا تو ضروری ہے ہی، اگر کوئی آدمی اس کا ارتکاب کرے گا تو گنہگار ہو گا۔ لیکن شریعت کی منع کی ہوئی کچھ چیزوں سے بچنے کے لیے آدمی ایسی چیزوں کو بھی چھوڑ دے جن سے شریعت نے منع نہیں کیا ہے؛ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''ورع'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مثلاً: آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے بعض ایسے کاموں سے

بھی اپنے آپ کو بچائے جو فی نفسہٖ جائز ہیں، لیکن ان کے کرنے کی صورت میں یہ خطرہ ہے کہ یہی کام کسی ناجائز کام تک لے جانے کا ذریعہ بنیں گے؛ اسی کا نام ''ورع'' ہے۔

تورع کا مطلب یہ ہوا کہ آدمی ناجائز کام میں پھنس جانے اور مبتلا ہو جانے اور ناجائز چیز کا ارتکاب ہو جانے کے ڈر سے جائز کام کو بھی چھوڑ دے۔

شبہ والی چیز کو چھوڑنا

عنوان کا دوسرا جزو تھا ''تَرْكُ الشُّبُهَاتِ'' جس کام کے متعلق آدمی کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز- جس کو مشتبہ کہتے ہیں- ان چیزوں کو بھی چھوڑ دینا۔ کبھی کسی کام میں دونوں طرح کے پہلو ہوا کرتے ہیں، آدمی کسی ایک پہلو کو دیکھتا ہے تو اس کو وہ کام جائز معلوم ہوتا ہے، دوسرے پہلو سے اس کو دیکھتا ہے تو وہ کام ناجائز معلوم ہوتا ہے، گویا اس کام کے سلسلہ میں اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز؛ تو اس کو بھی چھوڑ دے۔

تم اس کو معمولی سمجھتے ہو

باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا: ﴿وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ﴾ تم اس کو معمولی سمجھتے ہو، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بہت بڑی چیز ہے۔ بعض مرتبہ کوئی معمولی اور چھوٹا سا کام

ہوتا ہے، جس کو آدمی ہلکا سمجھ کر کر ڈالتا ہے،لیکن وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا اور قابلِ مؤاخذہ ہوتا ہے ، اور اسی پر پکڑ دھکڑ ہوجاتی ہے۔

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے حکایاتِ صحابہ میں ایک قصہ ذکر کیا ہے۔ایک بزرگ تھے،انہوں نے خط لکھا۔اس زمانہ میں قلم سے لکھاجاتا تھا، اس کی روشنائی کو سکھانے اورخشک کرنے کے لیے مٹی استعمال کی جاتی تھی۔خط لکھنے کے بعداس خط پر مٹی ڈال دیتے تھے ،وہ مٹی روشنائی کوچوس لیاکرتی تھی،پھراس مٹی کو جھاڑ دیا کرتے تھے۔توخط لکھنے کے بعداس پر ڈالنے کے لیے مٹی نہیں تھی۔جس مکان میں رہتے تھے وہ کرایہ کا کچا مکان تھا۔انہوں نے سوچا کہ اس کی دیوار پر سے کچھ مٹی کھرچ کر اس پرڈال لوں اورروشنائی کو خشک کر لوں، پھر خیال آیا کہ یہ مکان کرایہ کا ہے، میں مالک تو ہوں نہیں۔ پھر سوچا کہ معمولی سی مٹی ہی تو ہے،اس لئے کھرچ کرڈال دی، رات کوخواب میں دیکھا،کوئی کہنے والا کہہ رہاہے: کل قیامت میں پتہ چلے گاکہ یہ مٹی معمولی ہے یانہیں!۔مطلب یہ ہے کہ بہت سی مرتبہ آدمی کسی کام کواپنے خیال سے چھوٹا سمجھتا ہے؛ لیکن یہی چھوٹاکام اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث بن کر اس کی قسمت کا فیصلہ کرڈالتا ہے، اس لیے ایسی کسی بھی چیزکو معمولی نہ سمجھا جائے۔

اور گناہوں کامسئلہ ایساہی ہے۔ گناہ کا مطلب ہے:اللہ تعالیٰ کی نافرمانی۔ علماء نے قرآنِ پاک کی آیتوں اور احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے گناہوں کی تقسیم صغیرہ اور کبیرہ کی ہے یعنی

چھوٹے گناہ اور بڑے گناہ۔اس کے باوجود بعض اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ کوئی گناہ چھوٹا نہیں، سب گناہ بڑے ہی ہیں، انہوں نے اس پہلو سے دیکھا کہ گناہ کے ذریعہ نافرمانی کس کی ہورہی ہے؟ اللہ تعالیٰ شانہ ٗ کی نافرمانی ہورہی ہے۔اور اللہ کی عظمت، اس کی کبریائی ،اس کی بڑائی اوراس کی شان کو سامنے رکھتے ہوئے اگر دیکھا جائے تو کوئی معمولی نافرمانی بھی معمولی نہیں ہے۔کوئی آدمی کسی بڑے آدمی کی شان میں کوئی معمولی چیز کرلیتا ہے، تو وہ بھی بہت بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔

یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟

حضرت تھانوی(رحمۃ اللہ علیہ)سے کسی نے بدنگاہی کے متعلق پوچھا کہ: حضرت! بدنگاہی اور نامحرم کو دیکھ لینا؛یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ؟حضرت نے جواب میں لکھا کہ :چنگاری چھوٹی ہو یا بڑی؛آگ لگانے کا کام تو دونوں ہی کرتی ہیں۔ہمارے ایمان کو برباد کرنے کے لیے ایک بدنگاہی بھی کافی ہے۔آدمی چھوٹی سی چنگاری اور جلتی ہوئی سگریٹ کو اپنے کپڑے کی پیٹی میں یہ سمجھ کرنہیں رکھتا کہ یہ چھوٹی سی تو ہے۔کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ پیٹی کو جلانے کے لیے ایک سگریٹ بھی کافی ہے۔اس لیے آدمی کو گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کہیں رفتار کو قابو میں لانا پڑتا ہے

اور گناہوں سے بچنے کے لیے بہت سے ایسے کام جو فی نفسہ گناہ نہیں ہیں، لیکن ان کے کرنے کے نتیجہ میں ہو سکتا ہے کہ آدمی کی طبیعت گناہوں تک پہنچ جائے، ان جائز کاموں کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ جیسے: بیمار آدمی کو بہت سی چیزوں سے بچایا جاتا ہے، ان میں بعض چیزیں تو وہ ہوتی ہیں جو واقعۃً اس کے لیے مضر ہوتی ہیں اور بعض چیزیں مضر تو نہیں ہوتیں لیکن اس کے باوجود گھر والے اس کے سامنے نہیں لاتے کہ اگر یہ کھائے گا تو ہو سکتا ہے کہ پھر معاملہ آگے بڑھے۔

ہم اپنے دنیوی معاملات میں ہر جگہ یہ سب باتیں سوچتے ہیں، جیسے کاروباری سلسلہ میں بھی سرکاری قانون کی رو سے بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو ممنوع ہیں، اور بہت سے کام ممنوع تو نہیں ہوتے لیکن پھر بھی آدمی سوچتا ہے کہ اگر یہ کرلیں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ پکڑ ہو جائے، اس لئے جو کام ممنوع نہیں ہیں ان سے بھی بچنے کا اہتمام کرتا ہے۔

یا جیسے آپ ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ تو ڈرائیونگ کے دوران بھی بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے، تو احتیاط کی خاطر وہاں اپنی رفتار کو قابو میں لے آتے ہیں۔ دین کی راہ پر چلنے والے آدمی کو بھی بہت سی مرتبہ اپنی رفتار کم کردینی پڑتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ایکسیڈنٹ ہو جائے۔ جب ہم اپنے دنیوی معاملات میں ہر جگہ اس چیز کا خیال کرتے ہیں کہ پکڑ دھکڑ نہ ہو جائے، اگرچہ وہ

چیز اپنی ذات کے اعتبار سے کرنے کی اجازت ہوتی ہے ،اس کے باوجود اپنے آپ کو اس سے بچاتے ہیں؛تو پھر دین کے معاملہ میں ایسا کیوں نہیں سوچتے؟

مشتبہ سے بچا تو دین وعزت محفوظ

اب علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) کچھ احادیث پیش کرتے ہیں۔ آگے جو روایت لائی جارہی ہے وہ دین کے معاملہ میں بڑی اہم روایت ہے۔امام ابوداود(رحمۃ اللہ علیہ)جو حدیث کے بہت بڑے امام ہیں ،اپنے زمانہ کے بہت بڑے صاحبِ تقوی و طہارت بزرگ تھے،وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی پانچ لاکھ حدیثیں جمع کیں، پھر ان میں سے انتخاب کر کے ایک کتاب تصنیف کی تو ان پانچ لاکھ میں سے چار ہزار آٹھ سو (۴۸۰۰) روایتیں اس کتاب میں ذکر کیں،اسی کتاب کا نام ’’سنن ابوداود‘‘ ہے۔پھر فرماتے ہیں کہ ان چار ہزار آٹھ سو روایتوں کا خلاصہ صرف چار حدیثیں ہیں جن میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے جو ابھی آرہی ہے۔

حدیث ۵۸۸:-

وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيرٍ رضی اللہ عنہما قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُوْلُ: اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَ اِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ، وَ بَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ، لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِى الْحَرَامِ، كَالرَّاعِى يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى، يُوْشِكُ اَنْ يَّرْتَعَ فِيْهِ، اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، اَلَا وَاِنَّ حِمَى

اللہِ مَحَارِمُہٗ . اَلَاوَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهٗ ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ.(متفقٌ عَلَيْهِ،ورویاہ مِنْ طرقٍ بِأَلْفَاظٍ متقاربةٍ.)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: حلال بھی واضح ہے، اور حرام بھی واضح ہے (یعنی شریعت نے بتلادیا ہے کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے) اور اس حلال وحرام کے بیچ بیچ میں بعض چیزیں مشتبہ ہیں جن کو بہت سے لوگ جانتے بھی نہیں (اور ان کے متعلق وہ آسانی سے فیصلہ بھی نہیں کرپاتے۔ اب جو آدمی اپنے دین کی حفاظت کرنا چاہتا ہو اور اپنے آپ کو دین کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچانا چاہتا ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ان مشتبہ چیزوں سے بچالے) اب اگر اس نے مشتبہ سے اپنے آپ کو بچالیا تو اپنے دین اور اپنی عزت و آبرودونوں کی حفاظت کر لی۔ اور جو شبہ والی چیز کے اندر پڑا تو وہ حرام کے اندر مبتلا ہوجائے گا (اور اس کو نبی کریم (ﷺ) ایک مثال دے کر سمجھاتے ہیں) جیسے ایک چرواہا کسی چراگاہ کے قریب اپنے جانوروں کو چرا رہا ہو، تو ہوسکتا ہے کہ وہ ادھر منہ ڈال دے اور اندر چلا جائے۔ اور جان لو کہ ہر بادشاہ و حکمران کی کچھ چراگاہیں (باڑے) مقرر ہیں۔ خبردار! اللہ تعالیٰ کی چراگاہیں اس کی حرام کردہ چیزیں ہیں۔ اور دیکھو! ہر آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتاہے، اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑتا ہے۔ اور سنو! وہ ٹکڑا دل ہے۔

افادات:- "إِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ" مشتبہ چیزوں سے اگر بچ جائے گا تو دین بھی محفوظ رہے گا، یہ تو صاف بات ہے۔ اس لیے کہ اگر اس سے نہیں بچا تو آگے جا کر یہی چیز حرام میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بنے گی، اور جب حرام میں مبتلا ہو گا تو دین کہاں محفوظ رہا؟ تو مشتبہ سے بچنے میں

گویا دین کی حفاظت ہوئی۔اور عزت کی حفاظت اس طرح ہوتی ہے کہ جب آدمی کوئی مشتبہ کام کرتا ہے تو لوگ طعنہ دیتے ہیں اور بطور تعجب کہتے ہیں کہ فلاں نے ایسا کام کیا؟ گویا اس کی عزت پر آنچ آئی اور یہی چیز اس کے لیے باعثِ عیب ہوئی۔خاص کر دین دار طبقہ ،جن کو دین سے کوئی تعلق ہوتا ہے، دینی معاملات میں کوئی مخصوص حیثیت حاصل ہوتی ہے،وہ جب کبھی کوئی ایسا کام کرلیتے ہیں جو فی نفسہٖ تو جائز ہوتا ہے؛ لیکن کچھ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، تو لوگ اسی کو موضوعِ بحث بنالیتے ہیں کہ دیکھو !فلاں صاحب نے ایسا کیا۔اب اگر کہا بھی جائے کہ وہ کام جائز تھا اس لیے کیا،اس میں کیا اشکال ہے؟تب بھی کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، لیکن ان کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔تو دیکھو! اگر یہ آدمی اپنے آپ کو اس کام سے بچاتا ؛تو اس کی عزت کی بھی حفاظت ہوتی۔

شاہی چراگاہ

پہلے زمانہ میں بادشاہ، حکمران اور نواب ہوتے تھے، ان کے یہاں زمین کا ایک بڑا حصہ شاہی چراگاہ کے طور پر مخصوص کر لیا جاتا تھا،وہاں کسی اور کو جانور چرانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔گویا ان کے جانوروں کے چرنے کے لیے ایک مخصوص باڑا ہوتا تھا اور اس کے متعلق اعلان کردیا جاتا تھا کہ یہ سرکاری چراگاہ ہے، اس کے اندر کوئی دوسرا اپنے جانور نہ چرائے۔اب اگر اس میں کوئی آدمی اپنے جانور چراتا تو وہ مجرم قرار دیا جاتا،اور اس

کو سزا کا حقدار سمجھا جاتا۔ نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ایک چرواہا اپنے جانوروں کو کسی مخصوص باڑے اور سرکاری چراگاہ کے قریب چرا رہا ہو، تو اگرچہ جانوروں کو اندر نہیں لے گیا، بلکہ اس باڑے کے باہر کا جو حصہ ممنوع نہیں ہے، اور جہاں چَرانے کی اجازت ہے؛ لیکن اس سرکاری باڑے کے بالکل قریب لگا ہوا حصہ ہے ، تو ہو سکتا ہے کہ کبھی اس کی غفلت کی جہ سے کوئی جانور سرکاری چراگاہ میں منھ ڈال دے ، یا اندر گھس جائے؛ تو اس پر پکڑ دھکڑ ہو جائے۔ بس! ہمارے نفس کا بھی یہی حال ہے، اگر ہم اپنے نفس کو دور دور سے نہیں بچائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ نفس اندر ہی مبتلا ہو جائے

اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں، سب حکمرانوں کے اوپر حکمران ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی قانون سے تعلق رکھنے والا کچھ حصہ ایسا ہے جس کے متعلق اعلان کر دیا گیا ہے کہ کوئی اس کام کو نہ کرے۔ اسی کو حرام کہتے ہیں اور نبی کریم (ﷺ) نے اس کو سرکاری باڑے اور چراگاہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے ، جس کے متعلق حاکم کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی نہ جائے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کاموں کا کوئی ارتکاب نہ کرے، یہ سرکاری چراگاہ ہے، کسی کو اس میں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ اب کوئی آدمی مشتبہ کام کرے گا تو مشتبہ چیز تو حرام کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے، اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس وہ مشتبہ کام کرتے کرتے اندر پہنچ جائے اور حرام کا ارتکاب کر لے۔

اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آگیا تو...

پھر نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ آدمی کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب وہ درست رہتا ہے تو سارا جسم درست رہتا ہے۔ جیسے جسمانی نظام کے اعتبار سے دل صحیح ہو تو سب اعضاء صحیح رہتے ہیں، اور دل پر ذرا سی آنچ آگئی تو معاملہ گڑبڑ ہو جاتا ہے، اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی اگر دل کا معاملہ گڑبڑ میں آگیا تو سارا دین گڑبڑ میں آجائے گا، اور دل ٹھیک رہا تو سارا دین ٹھیک رہے گا۔ جسم کے اندر جتنے اعضاء ہیں وہ سب دل کے تابع ہیں۔ آنکھ دیکھے گی نہیں جب تک کہ دل نہیں چاہے گا، جب دل حکم دے گا کہ یہ دیکھو، تو آنکھ دیکھے گی۔ دل حکم دے گا کہ سنو تو کان سنے گا۔ دل حکم دے گا کہ یہ بولو، تو زبان بولے گی۔ دل حکم دے گا فلاں چیز پکڑو، تو ہاتھ آگے بڑھیں گے۔ دل حکم دے گا کہ فلاں جگہ جاؤ، تو قدم اٹھیں گے۔ اگر دل نہیں چاہے گا تو پھر وہ کام نہیں ہوگا۔ جیسے کوئی کہے کہ یہ چیز کھاؤ، تو سامنے والا کہتا ہے کہ دل نہیں چاہتا، جب تک کہ آدمی کا دل نہیں چاہے گا وہاں تک وہ کوئی کام نہیں کرے گا۔ یہ پورا جسم ظاہری اعتبار سے بھی دل کے تابع ہے۔

نیت پر بنیاد کیوں؟

اسی لیے نیت کے اوپر بنیاد رکھی گئی ہے۔ نیت کیا ہے؟ دل کا چاہنا اور نہ چاہنا؛ اسی کا نام نیت ہے۔ اور یہ نیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ آپ کو اس کام پر آمادہ کرنے والا جذبہ کون ساتھا۔ وہ اگر ٹھیک ہے تو آپ کا کام بھی ٹھیک ہے، اور اگر وہ گڑبڑ ہے تو اس کام میں بھی گڑبڑ ہو گی۔

اس بات کا ڈر رہے گا

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اس روایت کو پیش کر کے خاص طور پر "ورع" ہی کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دیکھو! سرکاری چراگاہ کے اندر جانے کی ممانعت ہے، لیکن جو حصہ چراگاہ سے بالکل لگا ہوا ہے، وہ ممنوع حصہ نہیں ہے، لیکن اگر کوئی چرواہا اپنے جانوروں کو لے کر اس حصہ میں چرائے گا تو اس بات کا ڈر رہے گا کہ کوئی جانور ممنوع حصہ کے اندر چلا جائے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے، ان کے قریب قریب کی کئی چیزیں ایسی ہیں جو اپنی ذات کے اعتبار سے تو حلال اور درست ہیں؛ لیکن اس کے باوجود ان سے بچنے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی چیزیں آگے بڑھ کر گناہ میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بن جائیں۔

ایک نمونہ

احکام میں بھی بہت مرتبہ اس کی رعایت کی جاتی ہے۔ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آیااور پوچھا: اے اللہ کے رسول!روزہ کی حالت میں مَیں اپنی بیوی کوبوسہ دے سکتا ہوں ؟آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا۔دوسرا آدمی آیا اوریہی سوال کیا توحضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے اجازت دیدی۔دراصل پہلاسوال کرنے والانوجوان تھا، اور ظاہر ہے کہ نوجوان کو اگر بوسہ کی اجازت دی جاتی، تو معاملہ جماع تک پہنچ سکتا تھا، اور دوسرابوڑھا تھا اس میں وہ خطرہ نہیں تھا(ابوداود.باب کَرَاهِيَتِهِ لِلشَّابِّ.حدیث نمبر:۲۳۸۹) ویسے فقہاء نے تویہ قید کے ساتھ ہی بتادیا کہ جس کو اپنے اوپر یہ اندیشہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں معاملہ آگے پہنچ سکتاہے تواس کو اجازت نہیں ہے،ورنہ گنجائش ہے۔بوسہ فی نفسہٖ مفسدِصوم نہیں ہے،اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے۔

امام صاحب کاورع

ہمارے اسلاف کامعاملہ دین کے بارے میں یہی تھا۔وہ حضرات تو گناہوں سے بچنے کے معاملہ میں بہت زیادہ پختہ اور محتاط تھے،پھر بھی اپنے آپ کو معمولی معمولی چیزوں سے بچانے کااہتمام کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دوپہرکے وقت

جارہے تھے، گرمی کا زمانہ تھا۔ گرمی کے موسم میں آدمی کوشش کرتا ہے کہ سایہ کے اندر ذرا آرام سے چلے۔ تو وہاں دیواروں کا سایہ تھا اسی میں چلتے ہوئے جارہے تھے، چلتے چلتے اچانک سایہ میں سے باہر نکل آئے۔ کسی نے کہا: آپ باہر کیوں آگئے؟ امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: جس مکان کی دیوار کا یہ سایہ ہے، اس صاحبِ مکان کو میں نے کچھ قرض دے رکھا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی آدمی یوں سمجھے کہ میں نے جو قرض دیا ہے اس کی وجہ سے اس کی چیز سے فائدہ اٹھارہا ہوں۔ اور جس کو قرض دیا جائے، پھر اس قرض کے بدلہ میں اس سے کوئی فائدہ اٹھایا جائے؛ تو وہ سود ہوتا ہے۔

ایک اور واقعہ

امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) ہی کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کوفہ کے قریب ایک قافلہ لوٹا گیا، اور اس لوٹ کی کچھ بکریاں کوفہ کے مارکیٹ میں بکیں، کس نے بیچی اور کس نے خریدی، اس کا کچھ پتہ نہیں چلا، لیکن اتنا طے تھا کہ لوٹ کا مال مارکیٹ میں بکا ہے، اور اس میں بکریاں بھی تھیں۔ امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کسی سے پوچھا: بکری کی عمر کتنی ہوا کرتی ہے؟ بتایا گیا: چھ سال۔ تو امام صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے چھ سال تک بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ حالاں کہ آپ کسی بھی مفتی سے پوچھئے تو وہ یہی کہے گا کہ آپ کے لیے بکری کا گوشت کھانا ممنوع نہیں ہے؛ لیکن وہاں صرف اس بات کا ڈر تھا کہ مَیں بکری کا گوشت کھا لوں، تو کہیں وہی بکری نہ ہو

جولوٹی گئی تھی۔وہ حضرات اس معاملہ کے اندر اتنا زیادہ احتیاط کرتے تھے۔ہمارے اکابرین اور بزرگوں کے اور بھی بہت واقعات ہیں جو اس سلسلہ میں بہت زیادہ محتاط تھے۔

ناظمِ مطبخ کاورع

ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک قصہ سنایا تھاکہ مظاہر علوم میں ایک استاذ مولاناظہورالحق صاحب تھےجو ناظمِ مطبخ تھے۔اور مطبخ میں جو کھاناپکتاہے وہاں کا جو ذمہ دارہوتاہے اس کویہ دیکھناہوتاہے کہ نمک اورمزہ کے اعتبار سے کھانا برابرہے یانہیں، اوریہ کام چکھ کرہی ہوسکتاہے،لیکن وہ اتنی زیادہ احتیاط کرتے تھے کہ خود کبھی نہیں چکھتے تھے، بلکہ کسی طالب علم کوبلاکرچکھواتے تھے ،حالاں کہ اگر خود بھی چکھتےتو یہ اپنے فرضِ منصبی کی ادائیگی ہوتی اور شرعاًاس کی اجازت تھی؛ لیکن اپنے آپ کو اس سے بچاتے تھے۔

مہتمم صاحب کاورع

حضرت مولاناعنایت الٰہی صاحب(رحمۃ اللہ علیہ)مظاہر علوم کے مہتمم تھے، حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے آپ بیتی میں ان کے متعلق لکھاہے کہ جب جلسہ ہوتا تھا تو پورے جلسہ کا انتظام کرتے تھے،شام کوگھرسے ان کاجو کھاناآتاتھا،وہ ایک کونہ میں رکھ دیتے تھے اور رات کو سب کام

نمٹاکر، مہمانوں کو فارغ کرکے اپنا وہی کھاناجو بالکل ٹھنڈا ہوچکاہوتاتھا، ایک کونہ میں بیٹھ کر کے کھالیتے تھے۔اتنی زیادہ احتیاط فرماتے تھے۔

مُحشّی ٔبخاری کاورع

حضرت مولانااحمد علی صاحب سہارنپوری(رحمۃ اللہ علیہ)جن کاحاشیہ بخاری شریف کے اوپر ہے۔ان کے متعلق حضرت شیخ(رحمۃ اللہ علیہ)نے لکھاہے کہ ایک مرتبہ مظاہرکے چندہ کے سلسلہ میں کلکتہ تشریف لے گئے تھے۔کلکتہ ہی میں کسی جگہ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے(جیسے یہاں نشاط سوسائٹی سے کوئی آدمی کسی کی ملاقات کے لئے چوک بازار جائے تواس میں کرایہ خرچ ہوتاہے)لیکن انہوں نے اس جگہ جانے کے لیے مدرسہ سے کرایہ وصول نہیں کیا، اور لکھاکہ اگرچہ میں وہاں گیاتوسب سے زیادہ چندہ ہوا؛لیکن وہاں جانے میں میری نیت چندہ کرنے کی نہیں تھی؛بلکہ اپنے ذاتی کام کے لئے ایک شخص سے ملاقات کی نیت تھی، اگرچندہ کی نیت سے جاتاتو مجھے حق تھاکہ مدرسہ سے کرایہ وصول کروں۔حضرت(رحمۃ اللہ علیہ)فرماتے ہیں کہ انہوں نے رجسٹرکے اندریہ نوٹ لکھا تھا،میں نے خود وہ نوٹ لکھاہوا دیکھاہے۔

طالبِ علمی کے زمانہ میں احتیاط

حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی (رحمۃ اللہ علیہ) ہمارے اکابر میں گزرے ہیں۔ان کے حالات میں لکھا ہے کہ دہلی میں پڑھتے تھے، وہ طالبِ علمی کے زمانہ میں صرف روٹی کھاتے تھے، کبھی روٹی سالن کے ساتھ نہیں کھائی۔کسی نے کہا: آپ صرف روٹی کھاتے ہیں؟ تو کہا: دہلی میں جتنے بھی سالن بنتے ہیں، ان میں اچور ڈالا جاتا ہے (اچور یعنی کچے آم کو سکھا کر رکھ لیا جاتا ہے،اور سالن کے اندر کھٹائی پیدا کرنے کے لیے ڈالتے ہیں۔دلی والوں کے یہاں ہر سالن میں ڈالا جاتا ہے) اور ہمارے علاقہ کے اندر آموں کے باغات کی بیع صحیح نہیں ہوتی ؛ اس لیے یہ سالن نہیں کھاتا۔اتنا زیادہ احتیاط فرماتے تھے!

پھر ایک خط نہ لیتے...

حضرت مفتی مظفر حسین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) ہی کے بارے میں لکھا ہے کہ دہلی سے کاندھلہ جاتے تو بہلی والوں سے پہلے سے معاملہ کرلیا کرتے تھے اور اپنا پورا سامان بتلادیتے تھے کہ میں سوار ہوؤں گا اور یہ میرا سامان ہے،اور اتنا کرایہ ہوگا۔یہ سب طے ہوچکنے کے بعد اگر کوئی آدمی آتا اور کہتا کہ حضرت! آپ کاندھلہ تشریف لے جارہے ہیں،میرا ایک خط لے جایئے، تو حضرت فرماتے: دیکھو! میں اس سے معاملہ کرچکا ہوں اور اپنا سارا سامان بتلاچکا ہوں

جس میں یہ خط نہیں تھا، اب تم اس سے پوچھ لو،اگر وہ اجازت دے ،تو میں یہ خط لوں گا ،ورنہ نہیں۔ حالاں کہ ایک خط لینے میں کون سا وزن بڑھ جاتا؛ لیکن نہیں لیتے۔ یہ ان کے تقویٰ اور ورع کی بات تھی۔

پرہیز گاری برتنا ہر ایک کا کام نہیں

ایک مرتبہ بیل گاڑی میں بیٹھے ہوئے کاندھلہ جارہے تھے۔اور بزرگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر ایک سے اس کے مزاج کے مطابق بات کرتے ہیں۔ راستہ میں بیل گاڑی چلانے والے سے پوچھا:تم بیل کو کتنا چارہ دیتے ہواور تمہاری تنخواہ کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ دورانِ گفتگو اس نے کہا:یہ گاڑی تو ہماری نہیں ہے،یہ تو ہماری مالکہ کی ہے۔پوچھا: کون ہے؟ پتہ چلا کہ یہ بیل گاڑی کسی طوائف اوررنڈی کی ہے۔یہ سن کر حضرت کو ایک دم جھٹکا سا لگا، لیکن فوراًنہیں اترے بلکہ تھوڑی دیرچلنے دیا،پھرکہا: گاڑی ذرا ٹھہراؤ، مجھے استنجے کا تقاضہ ہے،اور فارغ ہوجانے کے بعداپنا ڈھیلا سکھانے کے لیے پیدل چلتے رہے،گاڑی چل رہی ہے اور حضرت بھی ساتھ چل رہے ہیں۔کچھ دیر بعد وہ کہنے لگا:حضرت! بیٹھ جایئے،توحضرت نے کہا:ذرا پاؤں کی رگیں پھول گئی ہیں، اس لئے پاؤں چھوٹے کررہاہوں اور چلتے رہے۔چلتے چلتے جب کافی دیر ہوگئی تووہ بھی سمجھ گیا کہ ایسامعلوم ہوتا ہے کہ ان کو پتہ چل گیاکہ یہ طوائف کی ہے، اس لئے نہیں بیٹھیں گے۔تواس نے کہا کہ: حضرت! اگر ایسا ہوکہ آپ بیٹھنے والے نہ ہوں تو

میں واپس چلا جاؤں۔ حضرت نے کہا کہ: یہ بات تو صحیح ہے کہ میں نہیں بیٹھوں گا؛ لیکن تم کو میرے ساتھ وہاں تک چلنا ہو گا، اس لیے کہ میرے ساتھ معاملہ کیا ہے اور میری وجہ سے دوسرے گاہکوں کو منع کیا ہو گا، تو اس کا نقصان ہو گا اور مجھے یہ گوارہ نہیں ہے۔ پھر خالی گاڑی وہاں تک لے گئے، اور پورا کرایہ ادا کیا۔

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس موقع پر حاشیہ لکھا ہے کہ تقویٰ اور پرہیزگاری برتنا بھی ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ خالی گاڑی اس لیے ساتھ لے گئے کہ بعض لوگوں کو کام کیے بغیر کرایہ لینا اچھا معلوم نہیں ہوتا، تو اس پر بھی بوجھ نہ پڑے کہ حضرت تو بیٹھے نہیں، اب میں اس کا کرایہ کیوں لوں؟

میں نے بات سمجھنے کے لیے یہ چند نمونے بتلائے کہ اگر مسئلہ کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کام جائز ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ لوگ احتیاط کرتے تھے۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ فتویٰ کے اعتبار سے جائز ہے اور تقویٰ کے اعتبار سے ناجائز ہے، اس کا مطلب یہی ہے کہ کسی گناہ میں پھنس جانے کے ڈر سے جائز کام کو بھی آدمی چھوڑ دے؛ اسی کا نام ورع ہے، اور اس کی حدیثِ پاک میں تاکید آئی ہے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کا ورع

حدیث ۵۸۹:-

وعن أنسٍ (رضی اللہ عنہ) أنَّ النبيَّ (ﷺ) وَجَدَ تَمْرَةً فِي الطَّرِيقِ، فَقَالَ: لَوْلَا أَنِّي أَخَافُ أَنْ تَكُونَ مِنَ الصَّدَقَةِ لأَكَلْتُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کو راستہ میں ایک کھجور کا دانہ ملا تو آپ نے فرمایا: اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ یہ دانہ صدقہ کا ہوگا، تو میں اس کو کھالیتا۔

افادات:-یعنی ایک طرف امت کو اس بات کی تعلیم بھی دیدی کہ کھانے کی ایک چیز پڑی ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، ضائع نہیں ہونی چاہیے، لیکن اپنے آپ کو اس کو کھانے سے اس لیے بچا رہے ہیں کہ ہوسکتا ہے کھجور کا یہ دانہ صدقہ کا ہو، اور حضورِ پاک (ﷺ) کے لیے صدقہ کھانا منع تھا، اس لیے آپ نے یہ ارشاد فرمایا۔ تو کھجور کا وہ دانہ صدقہ کا ہوگا صرف اس ڈر کی وجہ سے نبی کریم (ﷺ) نے اس کو استعمال نہیں فرمایا؛ یہی ورع ہے۔ حالاں کہ یقینی طور پر اور گارنٹی کے ساتھ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ صدقہ ہی کا ہے۔

جس چیز پر دل کھٹکے ...

حدیث ۵۹۰:-

وعن النَّواسِ بن سمعان(رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ:البِرُّ ؛ حُسْنُ الخُلُقِ . وَالإِثْمُ ؛ مَا حَاكَ فِي نَفْسِكَ ، وَ كَرِهْتَ أنْ يَطَّلِعَ عَلَيهِ النَّاسُ.(رواہ مسلم)

((حَاكَ)) بِالحاءِ المهملةِ والكافِ: أيْ تَرَدَّدَ فِيهِ

ترجمہ:- حضرت نواس بن سمعان(رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: نیکی یہ ہے کہ آدمی کے اخلاق اچھے ہوں۔ اور گناہ یہ ہے جو دل میں کھٹکے، اور اس سے لوگ واقف ہو جائیں اس کو تو ناپسند کرے۔

حدیث ۵۹۱:-

وعن وَابِصَةَ بن مَعبدٍ(رضی اللہ عنہ) قَالَ:أتَيْتُ رَسُول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ البِرِّ ؟ قُلْتُ : نَعَمْ. فَقَالَ:اسْتَفْتِ قَلْبَكَ. البرُّ: مَا اطْمَأنَّتْ إِلَيْهِ النَّفسُ، وَاطْمَأنَّ إِلَيْهِ القَلْبُ. وَالإثْمُ: مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ، وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ، وَإنْ أفْتَاكَ النَّاسُ وَأفْتُوكَ. (حديث حسن، رواه أحمد والدَّارمِيُّ في مُسْنَدَيْهِمَا .)

ترجمہ:- حضرت وابصہ بن معبد(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا (اس سے پہلے کہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کچھ پوچھوں) آپ نے خود ہی فرمایا: نیکی کیا ہے، اس کے متعلق پوچھنے کے لیے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں۔ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اپنے دل سے فتویٰ لے لو۔ جس

کام پر دل مطمئن ہو وہ نیکی ہے۔اور جس کام کے متعلق دل میں کھٹکا اور تردد ہو(کہ کروں یا نہ کروں ؛تو سمجھ جاؤ کہ) یہی گناہ ہے،چاہے فتویٰ دینے والے تمھیں فتویٰ دے دیں۔

وہی ”دل“ کہلانے کے لائق ہے

افادات:-جس چیز کے متعلق دل میں کھٹکا ہو؛ اس کام کو نہیں کرنا چاہیے ، احتیاط کا تقاضہ یہی ہے۔اسی لیے لکھا ہے کہ وہ آدمی جس کا دل گناہوں سے پاک ہو؛ وہی دل ”دل“ کہلانے کے لائق ہے۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کسی آدمی نے مسلسل گناہوں اور نافرمانیوں کا ارتکاب کر کے اپنا قلب ہی خراب کر لیا ہے، اوراب زنا کر کے بھی اس کو کھٹکا پیدا نہ ہو، اور وہ یوں کہے کہ مجھے تو کوئی کھٹکا پیدا نہیں ہوتا۔اس کی بات کا اعتبار نہیں کیا جاتا،بلکہ وہاں تو یوں کہا جائے گا کہ اس کی فطرت ہی مسخ ہوچکی ہے،اور مسخ شدہ فطرت معیار قرار نہیں دی جاسکتی۔مثلاً:کسی کی ٹانگ ہی ٹیڑھی ہو تو سیدھا جوتا اس کے اندر نہیں آسکتا۔

احتیاطاً بیوی کو الگ کر دیا

حدیث ۵۹۲:-

وعن أَبِي سِرْوَعَةَ عُقبَةَ بنِ الحارِثِ (رضی اللہ عنہ) أَنَّهُ تَزَوَّجَ ابنَةً لأبي إهَابِ بن عزيزٍ، فَأَتَتْهُ امْرَأَةٌ، فَقَالَتْ: إنّي قَدْ أرضَعتُ عُقبَةَ وَالَّتِي قَدْ تَزَوَّجَ بِهَا. فَقَالَ لَهَا عُقْبَةُ: مَا أَعْلَمُ أَنَّكِ أَرضَعْتِنِي وَلاَ أَخْبَرْتِنِي، فَرَكِبَ إِلَى رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) بِالمَدِينَةِ، فَسَأَلَهُ: فَقَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): كَيْفَ؟ وَقَدْ قِيلَ. فَفَارَقَهَا عُقْبَةُ وَنَكَحَتْ زَوْجاً غَيْرَهُ.
(رواه البخاري) ((إهَابٌ)) بكسر الهمزة وَ((عَزِيزٌ)) بفتح العين وبزاي مكررة

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو سروعہ عقبہ بن حارث (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے اَبواِہاب بن عزیز کی بیٹی (جویریہ) سے نکاح کیا۔ ایک سیاہ فام عورت آئی اور اس نے کہا: میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے، اور اس لڑکی کو بھی دودھ پلایا ہے جس کے ساتھ اس نے نکاح کیا ہے (گویا اس عورت کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ یہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہیں اس لیے ان کا نکاح آپس میں نہیں ہو سکتا) تو اس پر حضرت عقبہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا: مجھے معلوم نہیں ہے کہ تو نے مجھے دودھ پلایا ہو، اور اگر پلایا تھا تو میں جوان اور بڑا ہو گیا، آج تک تم نے مجھے اطلاع اور خبر کیوں نہیں دی؟ (گویا ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ تیری اس خبر میں مجھے شک ہے، اس لیے وہ قابلِ قبول نہیں ہے۔ لیکن بہر حال! یہ ایک اہم بات تھی، چوں کہ حضرت عقبہ (رضی اللہ عنہ) مکہ مکرمہ میں رہتے تھے اس لیے باقاعدہ یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے اسی پر ایک عنوان قائم کیا ہے: "بابُ الرِّحلَةِ فی المُسئَلَةِ النَّازِلَةِ" کوئی مسئلہ پیش آئے اس کو دریافت کرنے کے لیے مستقل سفر کرنا۔ ہمارے اکابر اور اسلاف کا

یہی حال تھا۔اتنا سا ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے اُس زمانہ میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جارہے ہیں۔آج کل تو ایکسپریس ہائی وے اور ’’A.C‘‘بسیں چلتی ہیں،پھر بھی ہم ایسا اہتمام نہیں کرتے)تو یہ مسئلہ پوچھنے کے لیے نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت کیا۔حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:’’کَیفَ؟وَقَدْ قِیْلَ‘‘ تم اس کو اپنے نکاح میں کیسے باقی رکھ سکتے ہو، جبکہ یہ بات کہی گئی؟(یعنی اگر چہ آج تک تمہیں اس کی اطلاع نہیں ہوئی اور نہ اس نے تم کو بتلایا،اور نہ تمہیں معلوم ہے؛ لیکن جب اس کی زبان سے یہ بات نکلی ہے، تو اب ظاہر ہے کہ ایک کھٹکے والی چیز ہوگئی ، اس لئے احتیاط کا تقاضہ یہی ہے کہ اس عورت کو نکاح میں باقی نہ رکھا جائے۔آپ نے جدائی کے لئے صاف طور پر نہیں کہا۔اور بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے جدائی کے لیے فرمایا)چناں چہ حضرت عقبہ(رضی اللہ عنہ)نے اس عورت سے جدائی اختیار کرلی اور اپنے نکاح سے نکال دیا اور اس عورت نے دوسرے شوہر کے ساتھ نکاح کرلیا۔

ایک مسئلہ

افادات:-ویسے فقہاء کے یہاں یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ اگر کوئی ایک عورت کسی کے متعلق دودھ پلانے کی اطلاع دے تو صرف اس کی اطلاع سے دودھ پلانے کا مسئلہ ثابت ہو گا یا نہیں؟ہم اس وقت اس سے بحث نہیں کرتے ، لیکن یہاں پر اکثر حضراتِ علماء یہی فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ)نے حضرت عقبہ بن حارث(رضی اللہ عنہ)کو اس سے بچنے کی جو تاکید فرمائی تھی وہ ورع کے طور پر تھی۔یعنی اس کا احتمال ہے کہ واقعی اس نے دودھ پلایا ہو۔اور جب اس

کی بات سچی ہو تو ان کے لئے اس سے نکاح کرنا حرام ہے۔تو صرف حرام کے ڈر سے بھی آدمی کو چاہیے کہ اپنے آپ کو بچائے۔

شک والی چیز چھوڑ کر...

حدیث ۵۹۳:-

وعن الحسن بن علی رضی اللہ عنھما قَالَ: حَفِظتُ من رسول الله (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ): دَعْ مَا يريبُكَ إِلَى ما لاَ يَرِيبُكَ.(رواه الترمذی،وقال:حديث حسن صحيح)

معناه: اتْرُكْ مَا تَشُكُّ فِيهِ،وَخُذْ مَا لاَ تَشُكُّ فِيهِ.

ترجمہ:-حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنھما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کی زبان سے سن کر یہ کلمہ اورجملہ یاد کرلیا ہے: ” دَعْ مَا يريبُكَ إِلَى ما لاَ يَرِيبُكَ“یعنی شک والی چیز کو چھوڑکربغیر شک کی چیز کواختیار کرو۔

افادات:-کسی معاملہ میں شک و تردد ہو،تو تردد والی چیز کو چھوڑ دو۔ آدمی کو بلاتردد والی چیز کو اختیار کرنی چاہیے؛ ورع کا خلاصہ یہی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا قصہ

حدیث ۵۹۴:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ لأبي بَكر الصديق (رضی اللہ عنہ) غُلامٌ يُخرِجُ لَهُ الخَرَاجَ، وَكَانَ أَبُو بَكرٍ يَأكُلُ مِن خَرَاجِهِ، فَجَاءَ يَوماً بِشَيءٍ، فَأكَلَ مِنهُ أَبُو بَكرٍ فَقَالَ لَهُ الغُلامُ: تَدرِي مَا هَذَا؟ فَقَالَ أَبُو بكر: وَمَا هُوَ؟ قَالَ: كُنتُ تَكَهَّنتُ لإنسَانٍ فى الجَاهِلِيَّةِ، وَمَا أُحسِنُ الكَهَانَةَ، إلاَّ أنِّي خَدَعتُهُ، فَلَقِيَنِي، فَأعطَانِي لِذَلِكَ هَذَا الَّذِي أكَلتَ مِنهُ، فَأدخَلَ أَبُو بَكرٍ يَدَهُ، فَقَاءَ كُلَّ شَيءٍ فِي بَطنِهِ. (رواه البخاری)

((الخَرَاجُ)): شَيءٌ يَجعَلُهُ السَّيِّدُ عَلَى عَبدِهِ يُؤَدِّيهِ كُلَّ يَومٍ، وبَاقِي كَسبِهِ يَكُونُ لِلعَبدِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا ایک غلام تھا جس کو انہوں نے خراج پر اٹھا رکھا تھا، اس کا خراج استعمال کرتے تھے۔ (غلام سے کہہ دیا تھا کہ تم کماتے رہو اور اس میں سے مجھے اتنا حصہ دے دینا۔ وہ جو لاتا تھا اس کو حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اپنے استعمال میں لاتے تھے) ایک دن وہ غلام کھانے کی کوئی چیز لے کر آیا تو حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے اس کو کھالیا (مسند احمد کی روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے ابھی ایک ہی لقمہ کھایا تھا کہ) اس غلام نے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ یہ کیا ہے؟ (دوسری روایتوں میں یہ بھی ہے کہ غلام نے کہا: آپ تو روزانہ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے لایا، اور آج آپ نے نہیں پوچھا؟ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کا فاقہ تھا اور طبیعت میں کھانے کا تقاضہ تھا اس لئے نہیں پوچھا اور ایک لقمہ منھ میں ڈال لیا) تو فرمایا: اچھا! اب بتادے کہ کہاں سے لایا ہے؟ اس نے کہا: اسلام لانے سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں مَیں نے ایک آدمی کے لیے کہانت کی تھی (کہانت یعنی غیب کی

خبریں دینا اور مستقبل کے متعلق بتلانا۔ اُس زمانہ میں عرب میں اس کا بڑا رواج تھا، کاہن اور جوتشی ہوا کرتے تھے جو لوگوں کو بتلایا کرتے تھے کہ تمہارا یوں ہوگا اور فلاں ہوگا۔ تو اس نے کہا کہ اس وقت میرے پاس ایک آدمی آیا تھا اور اسی کے متعلق میں نے کہانت کی ایک بات کہی تھی) حالاں کہ میں کہانت جانتا بھی نہیں تھا(میں نے اس کو دھوکہ دیا تھا "کریلا نیم چڑھا" والی بات تھی، یعنی ایک تو کہانت خود غلط کام تھا اور اس میں بھی جانتا نہیں تھا، دھوکہ دیا تھا) آج میری اس کی ملاقات ہوئی تو میں نے جو کہانت کی تھی اس کی اجرت اور معاوضہ کے طور پر اس نے مجھے یہ کھانا دیا تھا جو آپ نے کھایا (حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ) حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے اپنے منھ میں ہاتھ ڈالا اور جو کچھ پیٹ میں تھا وہ سب قے کر ڈالا۔

تو بھی نکال کر رہتا...

افادات:- مسندِ احمد کی روایت میں ہے کہ وہ ایک لقمہ تھا، قے کرنے کے واسطے انگلی ڈالی تو قے نہیں ہوئی، کسی نے کہا کہ ایک ہی لقمہ کھایا ہے، کیسے نکلے گا، ایسا کیجئے کہ آپ پانی پی کر قے کریں تو پانی کے ساتھ وہ لقمہ بھی نکل آئے گا۔ چناں چہ ایک بڑا پیالہ پانی کا بھر کر منگوایا، اس کو پیا اور پھر قے کی تو بڑی مشکل سے وہ لقمہ باہر آیا۔ اس پر کسی نے کہا کہ ایک ہی تو لقمہ تھا، آپ نے اس کے لیے اتنی زیادہ زحمت اور تکلیف کیوں اٹھائی؟ حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں فرمایا: اگر وہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی میں اس کو نکال کر رہتا، کیوں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ وہ گوشت جو حرام غذا سے تیار

ہوا ہو، جہنم کی آگ کا زیادہ حق دار ہے، اور میں نہیں چاہتا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ حرام غذا سے پل کر تیار ہو۔

خراج کا مطلب یہ ہے کہ اُس زمانہ میں لوگوں کے پاس کئی کئی غلام ہوتے تھے، اپنے کام اور خدمت کے واسطے تو ایک دو کافی ہو جاتے تھے، باقی کو آقا اجازت دے دیتا تھا کہ تم کو جو ہنر اور کام آتا ہے؛ وہ کرتے رہو، اور تمہاری کمائی میں سے اتنا ہم کو دے دیا کرنا، بقیہ سب تمہارا ہوگا۔ تو جو مقدار آقا اپنے لینے کے لیے مقرر کرتا تھا اس کو ''خراج'' سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

بیٹے کو دوسروں سے کم دیا

حدیث:۵۹۵-

وعن نافِعٍ أن عُمَرَ بن الخطّاب (رضی اللہ عنہ) كَانَ فَرَضَ لِلمُهَاجِرينَ الأَوَّلِينَ أَربَعَةَ الآفٍ وَفَرَضَ لابْنِهِ ثَلاثَةَ آلافٍ وَخَمْسَمِئَةٍ. فَقِيلَ لَهُ: هُوَ مِنَ المُهَاجِرِينَ فَلِمَ نَقَصْتَهُ؟ فَقَالَ: إِنَّمَا هَاجَرَ بِهِ أَبُوهُ. يقول: لَيْسَ هُوَ كَمَنْ هَاجَرَ بِنَفْسِهِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت نافع (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے دورِ خلافت میں بیت المال میں سے جو وظیفے مقرر کیے تھے، تو مہاجرینِ اولین کے لیے وظیفہ کے طور پر چار ہزار (۴۰۰۰) درہم سالانہ مقرر کیے تھے؛ لیکن اپنے صاحبزادہ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کے لیے- جو اپنے باپ کے ساتھ ہجرت کر کے آئے تھے اور وہ بھی مہاجرینِ اولین میں سے تھے ان کے لیے- بجائے چار ہزار (۴۰۰۰) کے

ساڑھے تین ہزار(۳۵۰۰) مقرر کیے۔کسی نے پوچھا : یہ بھی تو مہاجرینِ اولین میں سے ہیں، آپ کا بیٹا ہوا تو کیا ہوا؟ ان کے لیے بھی تو چار ہزار مقرر کیجئے۔اس پر حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:(اس وقت عبداللہ چھوٹے تھے، اور) ان کو ان کے باپ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

افادات:-گویا یوں سمجھئے کہ اصل ہجرت تو ان کے باپ نے کی تھی اور ان کے باپ ان کو اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ان کی ہجرت کے اندر حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نے عملی طور پر گویا کچھ نقص محسوس کیا،یعنی وہ مکمل طور پر اپنے ارادہ سے نہیں،بلکہ اپنے باپ کے تابع بن کر آئے تھے۔جو آدمی مستقل بالارادہ ہوتا ہے،اور اپنے ارادہ وفیصلہ سے جو کام کرتا ہے اس کا معاملہ اور جو اپنے باپ کے فیصلہ وارادہ سے کرتا ہے،ان دونوں میں کچھ نہ کچھ فرق توہوتا ہی ہے۔گویاحضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نے کہا : جو آدمی خود اپنے ارادہ و فیصلہ سے ہجرت کر کے آیا،یہ اگرچہ اسی زمانہ میں ہجرت کر کے آئے تھے؛لیکن پھر بھی دونوں میں کچھ تو فرق ہے۔دیکھو!حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)نے اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹاہونے کی وجہ سے جو معاملہ کیا وہ احتیاط ہی کی وجہ سے تھا۔

نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے

ایک مرتبہ حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)کے پاس تقسیم کرنے کے لیے چادریں آئیں۔ آپ نے ہر ایک کو ایک ایک چادر دی۔بعد میں کسی وقت حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) خطبہ دینے کے لئے منبر پر

کھڑے ہوئے تو ان کے جسم پراسی طرح کی دو چادریں تھیں۔ حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نے کہا: إِسْمَعُوا وَأَطِيْعُوا" سنو اور کہنا مانو، تو ایک آدمی کھڑا ہوا اور کہا: "لَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ يَا عُمَرُ" ہم نہیں سنیں گے اور نہیں مانیں گے۔ پوچھا: کیوں بھائی؟ اس نے کہا: وہ جو چادریں آئی تھیں ان میں سے آپ نے سب کو ایک ایک تقسیم کی، اور آپ کے جسم پر ہم دیکھ رہے ہیں کہ دو چادریں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے انصاف سے کام نہیں لیا، تو پھر کیسے آپ کی بات سنی اور مانی جائے۔ اسی مجلس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے، حضرت عمر(رضی اللہ عنہ) نے ان سے کہا: اٹھو اور ان کو جواب دو۔ وہ کھڑے ہوئے اور کہا: میرے حصہ میں جو چادر آئی تھی وہ میں نے اپنے ابّا کو دی ہے، پھر اس آدمی نے کہا: اب ہم آپ کی بات سنیں گے اور مانیں گے۔

(سیرت ابن الخطاب: ۱۶۷)

کوئی متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا...

حدیث ۵۹۶:-

وعن عَطِيَّةَ بن عُروة السَّعْدِيِّ الصحابِيِّ(رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم): لاَ يَبْلُغُ الْعَبدُ أَنْ يَكُونَ من الْمُتَّقِينَ حَتَّى يَدَعَ مَا لاَ بَأْسَ بِهِ، حَذَرًا مِمَّا بِهِ بَأْسٌ.(رواه الترمذی)

ترجمہ:-حضرت عطیہ بن عروہ سعدی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کوئی بندہ متقیوں کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتا یہاں تک کہ وہ ایسی چیز کو جس کے اندر کوئی خطرہ اور حرج نہیں ہے محض اس ڈر سے چھوڑدے کہ اس کے کرنے کی وجہ سے حرج والی کسی چیز میں مبتلا ہونا لازم آئے گا۔

لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنادیتے ہیں

افادات:-حضرت میاں جی نور محمد صاحب جھنجھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی (رحمۃ اللہ علیہ) کے شیخ ہیں۔ایک مرتبہ ان کے سامنے کوئی آدمی اچھی آواز سے کچھ اشعار پڑھ رہا تھاتو انہوں نے اس کو منع کردیا۔لوگوں نے پوچھاکہ حضرت! کیوں نہیں سنتے؟ حضرت نے فرمایا: لوگ کبھی کبھی مجھے امام بنادیتے ہیں، اور بلامزامیر یعنی گانے بجانے کے آلات کے بغیر صرف اچھی آواز والے اشعار کو بھی بعض علماء نے منع کیا ہے۔حضرت مستقل امام نہیں تھے، بلکہ کبھی کبھی لوگ ان کے پیچھے نماز پڑھ لیتے تھے، اس لیے انہوں نے اس کو سننا گوارہ نہیں کیا۔لوگوں کی نمازوں کو بچانے کا اتنازیادہ اہتمام کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں بھی عمل کی توفیق عطا فرمائے

اِسْتِحْبَابِ
الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ
اَوِالْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّيْنِ
وَوُقُوْعٍ فِي حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَّنَحْوِهَا

خلوت گزینی کا مستحب ہونا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زندگی گزارنے کے دو طریقے

زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں، دونوں متضاد اور الگ الگ ہیں، ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان، رشتہ داروں، پڑوسیوں، دوستوں میں، معاشرہ اور سماج میں رہ کر سب کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے۔ اور دوسرا طریقہ عُزلت کا ہے یعنی آدمی گوشہ نشینی اختیار کرے، سماج اور سوسائٹی سے الگ تھلگ ایسی جگہ جہاں کسی سے کوئی واسطہ نہ پڑتا ہو، لین دین کی اور کوئی معاملہ کرنے کی نوبت نہ آئے، جس کو گوشہ نشینی کی زندگی کہا جاتا ہے اس طرح زندگی گزارے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں

اسلام نے رہبانیت کی اجازت نہیں دی ہے۔ رہبانیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی لوگوں سے کٹ کر پہاڑوں کی کھوہ میں جا کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے مشقت اٹھا کر تن تنہا رہے؛ جس کو ”برہم چریہ“ کہا جاتا ہے۔ اسلام آنے سے پہلے بنو اسرائیل کے اندر بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جس کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے: وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَاءَ رِضْوَانِ اللَّهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ

رِعَايَتِهَا(الحدید) یہ رہبانیت؛ جسے انہوں نے ایجاد کیا ہے،(باری تعالیٰ فرماتے ہیں)ہم نے ان کے اوپر یہ طریقہ لازم نہیں کیا تھا، بلکہ یہ چیز انہوں نے اپنے طور پر یہ سمجھتے ہوئے ایجاد کی کہ یہ طریقہ اختیار کرکے ہم اللہ تعالیٰ کو راضی اور خوش کرلیں گے۔پھر اس کا جو اہتمام ہونا چاہیے اور اس کی جو رعایت کی جانی چاہیے،اس کے حقوق وحدود کو جس طرح بجالانا چاہیے اس کو بجا نہیں لاسکے۔اس لیے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم نہیں کی گئی تھی،بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اختیار کی تھی، اس کا یہی نتیجہ ہونا تھا۔

بہر حال!اسلام رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا۔اسی لئے اللہ تعالیٰ نے تمام حضراتِ انبیاء کرام(علیہم السلام) کو سماج ہی میں بھیجا ، جہاں لوگوں کا اجتماعی گروہ زندگی گزار رہا ہوتا ہے، انہی میں آکر وہ کام کرتے ہیں،اور انسان فطری طورپر بھی ایسا ہی بنایا گیا ہے کہ وہ لوگوں میں رہ کر زندگی گزارے،اورپیدائشی طور پر بھی وہ اپنے ساتھ کچھ تعلقات اور رشتہ داریاں لے کر دنیا میں آتا ہے،اس لیے اصل تو یہ ہے کہ آدمی سماج اور سوسائٹی میں رہ کر زندگی گزارے، چناں چہ حدیثِ پاک میں نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے کہ وہ آدمی جو لوگوں کے اندر مل جل کر رہتا ہے، اور ان کی طرف سے پہنچائی جانے والی ایذاؤں اور تکلیفوں پر صبر سے کام لیتا ہے ،وہ اس سے بہتر ہے جو الگ تھلگ رہتا ہے اور ان کی ایذاء رسانیوں پر صبر نہیں کرتا۔(ترمذی:۲۵۰۷،باب [مخالطۃ المسلم للناس] / سنن ابن ماجہ:۴۰۳۲،کتاب الفتن)

فتنہ کی حالت

اور جہاں لوگ مل کر زندگی گزارتے ہیں وہاں دو طرح کے حالات ہوتے ہیں، ایک تو فتنہ کی حالت ہوتی ہے کہ مثلاً فتنہ اتنا عام ہو گیا کہ آدمی کو اپنے آپ کو گناہوں اور ان کی طرف لے جانے والے اسباب ووسائل سے بچانا مشکل ہو گیا، تو ایسے فتنہ وآزمائش کے زمانہ میں عزلت ، گوشہ نشینی اور تنہائی اختیار کرنے کو ترجیح دی گئی ہے، اور اسی کو پسند کیا گیا ہے۔ خاص طور پر اگر لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے میں آدمی کو اپنے دین کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو کہ ان کی طرف سے جو حالات پیش آئیں گے ان پر صبر نہیں کر سکے گا اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوگی ، اور ہو سکتا ہے کہ ان پر زیادتی ہو جائے، ان کے حقوق تلف ہوں ،غیبت اور بہتان تراشی میں ابتلاء کی نوبت آئے، اپنا حال ومزاج دیکھ کر اور لوگوں کے حالات دیکھ کر اس کو یہ غالب گمان ہے، اور اپنے دین کے اندر فتنہ ، نقصان اور حرام یا شبہات میں پڑنے کا اندیشہ اور گمانِ غالب ہے؛ تو گوشہ نشینی پسندیدہ، مستحب اور مطلوب ہے، اس پر سب علماء کا اتفاق ہے۔ اس صورت میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے آدمی پر ضروری ہے کہ اختلاط اور لوگوں کے ساتھ میل جول اختیار نہ کرے۔

گوشہ نشینی مستحب ہونے کی تین شکلیں

اور اگر عام حالات ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اختلاط، سماج اور سوسائٹی میں رہنے کی صورت میں دین کے متعلق کسی نقصان ، یا حرام میں پڑنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے؛ تو کون سی صورت بہتر ہے؟ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا یا گوشہ نشینی وتنہائی اختیار کرنا؟ تو اس سلسلہ میں علماء کی دورائیں ہیں۔ چناں چہ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اس باب میں اسی کو بیان فرماتے ہیں:

۱:-"اِسْتِحْبَابُ الْعُزْلَةِ عِنْدَ فَسَادِ النَّاسِ وَالزَّمَانِ" اگر زمانہ والوں میں بگاڑ آگیا ہو تو تنہائی اور گوشہ نشینی مستحب ہے۔

۲:-"اَوِالْخَوْفِ مِنْ فِتْنَةٍ فِي الدِّيْنِ" یا اپنے دین میں کسی نقصان یا کسی فتنہ میں پڑجانے کا اندیشہ ہو، تو اس صورت میں بھی تنہائی مستحب ہے۔

۳:-"وَوُقُوْعٍ فِی حَرَامٍ وَشُبُهَاتٍ وَّنَحْوِهَا" یا سماج اور معاشرہ میں زندگی گزارنے کی صورت میں ڈر ہے کہ ہم حرام کاموں میں مبتلا ہوجائیں گے، کسی بھی طرح کا حرام ہو، صرف زنا کاری اور شراب نوشی ہی نہیں؛ بلکہ لوگوں کے حقوق ضائع ہونے ، لوگوں پر بہتان تراشی، غیبت بازی ان کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا ہونے کا احتمال اور ظن غالب ہو؛ تو اس صورت میں بھی گوشہ نشینی اور تنہائی مستحب ہے۔

اللہ کی طرف دوڑ لگاؤ

اس سلسلہ میں انہوں نے ایک تو عام آیت سے استدلال کیا ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَفِرُّوا إِلَى اللَّهِ إِنِّي لَكُم مِّنْهُ نَذِيرٌ مُّبِينٌ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف دوڑ لگاؤ، یعنی سب سے ہٹ کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اور نبی کریم (ﷺ) سے فرمایا گیا: آپ کہیے کہ میں تم لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے کھلم کھلا ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔

اسی سلسلہ میں کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔ اور آگے جو باب لائیں گے اس میں عام حالات میں کیا چیز پسندیدہ ہے، اس کو بتلائیں گے۔

حضرت سعد (رضی اللہ عنہ) کی گوشہ نشینی

حدیث ۵۹۷:-

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ (ﷺ): ان اللهَ يُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِيَّ الْغَنِيَّ الْخَفِيَّ . (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت سعد بن أبي وقاص (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: بیشک اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے، اور اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پاک صاف ہو، غناءِ قلبی کی دولت سے مالا مال ہو، اور لوگوں سے مخفی اور گمنام رہتا ہو۔

افادات:- یہاں حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہ) کی روایت کے صرف وہی الفاظ پیش کئے ہیں جو انہوں نے نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے حوالہ سے ذکر کئے ہیں، لیکن صاحب الترغیب والترہیب نے مسلم شریف ہی کے حوالہ سے اس میں اضافہ فرمایا ہے کہ حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درمیان جب اختلاف چل رہا تھا اور ان میں آپس میں جنگ جاری تھی، اس زمانہ میں حضرت سعد بن اَبی وقاص(رضی اللہ عنہ) اپنے اونٹوں اور بکریوں کو لے کر جنگل میں چلے گئے، اور وہاں یکسوئی اور گوشہ نشینی کے ساتھ زندگی گزارنا شروع کیا (حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہ) عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں) اسی زمانہ میں ان کے بیٹے عمر بن سعد(رضی اللہ عنہ) ان کے پاس ان کو سمجھانے کے لیے گئے، وہ اپنی سواری پر سوار آرہے تھے، حضرت سعد بن ابی وقاص(رضی اللہ عنہ) نے جب ان کو دور سے آتا ہوا دیکھا تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی: "اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ ھٰذَا الرَّاكِبِ" اے اللہ! اس سوار کی برائی سے میں پناہ چاہتا ہوں۔ جب وہ ان کے قریب آئے تو کہنے لگے: ابا جان! لوگ تو وہاں قتل ہو رہے ہیں اور آپ اپنے اونٹوں کو لے کر یہاں آگئے، لوگوں کی خبر کیوں نہیں لیتے؟ ان کے حال پر آپ توجہ کیوں نہیں کرتے؟ حضرت سعد بن اَبی وقاص (رضی اللہ عنہ) نے ان کے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا: چپ بھی رہو، میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے: "ان اللہ یُحِبُّ الْعَبْدَ التَّقِیَّ الْغَنِیَّ الْخَفِیَّ" **بیشک** اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے محبت رکھتا ہے، اپنے اس بندے کو پسند کرتا ہے جو پاک صاف ہو، غناءِ قلبی کی دولت سے مالا مال ہو،

اور لوگوں سے مخفی اور گمنام رہتا ہو۔ پھر فرمایا : اب جاؤ۔ یہ کہہ کر ان کو رخصت کردیا، اور خود ساتھ نہیں گئے۔ (الترغیب والترہیب: ۴۱۳۷/ مسلم: ۷۶۲۱)

حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) نے مدینہ منورہ سے باہر ہی اپنا ایک مکان بنا لیا تھا، وہیں رہتے تھے، جب ان کا انتقال ہوا تو وہیں سے ان کا جنازہ لایا گیا، اور بقیع میں دفن کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فتنہ کے زمانہ میں یکسوئی حاصل کر کے اپنی دین کی حفاظت ضروری اور واجب ہو جاتی ہے۔ اس روایت کو لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں

اصحابِ کہف کا قصہ

اصحابِ کہف کا قصہ جو بنی اسرائیل کے زمانہ میں پیش آیا تھا اس کو قرآنِ کریم نے بیان کیا ہے اس میں اسی چیز کو بتلایا گیا ہے۔ ایک بادشاہ تھا جس کا نام دقیانوس تھا، بت پرست اور بڑا سخت گیر تھا، لوگوں کو بت پرستی کے لئے آمادہ کیا کرتا تھا، لوگ اس کی سختی کی وجہ سے یا پھر لالچ میں آکر بت پرستی اختیار کرلیتے تھے۔ ان حالات میں چند نوجوان جن کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی وہ اپنے ایمان پر ہی قائم رہے، بادشاہ نے ان کو بلایا، انہوں نے برسرِ دربار بادشاہ کو ایمان کی دعوت دی اور اس کی بت پرستی پر اس کو ٹوکا۔ وہ ظالم تو تھا ہی، اسی وقت وہ انتقام لے سکتا تھا؛ لیکن اس نے ان کو مہلت دی کہ چند دن غور کرلو۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمیں تو اپنے ایمان پر قائم رہنا ہے۔ اس نے

مہلت دی ہے تو ظاہر ہے کہ بعد میں بھی بت پرستی کے واسطے ہمیں مجبور کرے گا، اگر ہم اپنے ایمان کی حفاظت چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم اس بستی کو چھوڑ دیں۔ چناں چہ وہ وہاں سے نکل کر ایک کھوہ میں چلے گئے، وہیں چھپ گئے اور وہیں پناہ حاصل کرلی اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحۡمَةً وَهَيِّئۡ لَنَا مِنۡ أَمۡرِنَا رَشَدًا﴾ اے اللہ! اپنی طرف سے ہمارے لیے رحمت کا فیصلہ فرما اور ہمارا معاملہ آسان کردے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند طاری کردی، پھر کئی سالوں کے بعد جب اُٹھے اور باہر نکلے تو حکومت بدل چکی تھی، اور بادشاہ ایمان والا تھا۔

سب سے بہتر کون؟

حدیث ۵۹۸:-

وعن اَبِیْ سَعِیْدِنِالْخُدْرِیِّ (رضی اللہ عنہ) قال قالَ رَجُلٌ :اَیُّ النَّاسِ اَفْضلُ یَا رسولَ الله؟ قَالَ: مُؤْمِنٌ مُجَاهِدٌ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فی سَبِیلِ اللهِ. قَالَ: ثُمَّ مَنْ؟ قَالَ: ثُمَّ رَجُلٌ مُعْتَزِلٌ فِیْ شِعْبٍ مِنَ الشِّعَابِ یَعْبُدُ رَبَّهُ.

وفی روایة: یَتَّقِی اللهَ، وَیَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ. (متفقٌ عَلَیْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے: ایک آدمی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون سا آدمی سب سے اچھا اور بہتر ہے؟ حضور پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: وہ مسلمان جو اپنے مال اور جان سے اللہ کے راستہ میں جہاد کرتا ہو۔ اس نے پوچھا: پھر کون؟

حضوراکرم(ﷺ)نے فرمایا: وہ آدمی جو کسی گھاٹی کے اندر یکسوئی اختیار کرکے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو جائے۔

اور ایک روایت میں ہے: اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہتا ہو، گناہوں سے بچتا ہو ،اور لوگوں کو اپنے شر سے بچاتا ہو۔(یعنی لوگوں میں رہنے کی صورت میں یہ ڈر ہے کہ میرے شر سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی، اس لئے یکسوئی اورتنہائی اختیار کرتا ہو۔)

وہ زمانہ قریب ہے

حدیث ۵۹۹:-

وعنه قال قال رسول الله (ﷺ): يُوشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمٌ يَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری(رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم(ﷺ)نے ارشاد فرمایا: وہ زمانہ قریب ہے کہ مسلمان کا بہترین مال کچھ بکریاں ہوں گی جن کو لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اورجہاں بارش گراکرتی ہے ایسے علاقوں میں چلا جائے،اوروہ آدمی اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے ایسا کرے گا۔

ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں

حدیث ۶۰۰:-

وعن أَبي هريرة(رضی اللہ عنہ) عن النبی(صلی اللہ علیہ وسلم)قَالَ :مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيّاً إِلاَّ رَعَى الْغَنَمَ.فَقَالَ أَصْحَابُهُ: وأنْتَ؟ قَالَ:نَعَمْ، كُنْتُ أرْعَاهَاعَلَى قَرَارِيطَ لأَهْلِ مَكَّةَ.

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس نے بکریاں چرائی ہیں ۔ صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بھی؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:ہاں!میں بھی مکہ والوں کی بکریاں چند سکوں کے بدلہ چرایا کرتا تھا۔

بہترین زندگی

حدیث ۶۰۱:-

وعنه عن رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم)أَنَّه قَالَ:مِنْ خَيْرِ مَعَاشِ النَّاسِ لهم رَجُلٌ مُمْسِكٌ عِنَانَ فَرَسِهِ فی سَبيلِ الله، يَطيرُ عَلَى مَتْنِهِ كُلَّمَاسَمِعَ هَيْعَةً أَوْ فَزعَةً، طَارَ عَلَيْهِ يَبْتَغِي القَتْلَ، أَوْ المَوْتَ مَظَانَّه، أَوْ رَجُلٌ فِي غُنَيمَةٍ فی رَأْسِ شَعَفَةٍ مِنْ هذِهِ الشَّعَفِ، أَوْ بَطنِ وَادٍ مِنْ هذِهِ الأَوْدِيَةِ، يُقِيمُ الصَّلاَةَ، وَيُؤتِي الزَّكَاةَ، وَيَعْبُدُ رَبَّهُ حَتَّى يأْتِيَهُ اليَقِينُ،لَيْسَ مِنَ النَّاسِ إِلاَّ فِي خَيْرٍ. (رواه مسلم)

(يَطِيرُ) : أَيْ يُسْرِعُ. وَ(مَتْنُهُ) : ظَهْرُهُ. وَ(الهَيْعَةُ) : الصوتُ للحربِ. وَ(الفَزعَةُ): نحوه. وَ(مَظَانُّ الشَيْءِ): المواضعُ الَّتي يُظَنُّ وجودُهُ فِيهَا. وَ(الغُنَيْمَةُ) بضم الغين : تصغير الغنم . وَ(الشَّعَفَةُ) بفتح الشين والعين: هي أعلى الجَبَل.

ترجمہ:۔حضرت ابو ہریرہ(رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:لوگوں میں بہترین زندگی والا وہ آدمی ہے جو اللہ کے راستہ میں اپنے گھوڑے کی لگام پکڑےہوئے اس کی پیٹھ پر سوار اُڑا چلا جاتا ہو۔جہاں کہیں دشمن کے ہتھیار یا گھبراہٹ کی آواز سنتاہےاور دشمن کی طرف سے خطرے کی کوئی بات دیکھتا ہے ؛تودوڑاہوا وہاں پہنچ جاتا ہے، اوراپنی جان قربان کرنے کی کوشش کرتاہے،گویامقابلہ کی حالت میں موت کو تلاش کرتا ہے۔یاوہ آدمی جو اپنی چند بکریاں لے کر پہاڑ کی چوٹیوں میں سے کسی چوٹی پر یا کسی وادی میں جاکر رہتا ہے، نماز قائم کرتا ہے، زکوۃ ادا کرتا ہے،اوراپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتاہے ، یہاں تک کہ اس کی موت آجائے۔اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھتا اور بھلائی پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔(خلاصہ یہ ہوا کہ فتنہ کے زمانہ میں اگر اپنے دین کے متعلق خطرہ ہو تو یکسوئی کو ترجیح دی گئی ہے۔)

بَابُ فَضْلِ الِاخْتِلَاطِ بِالنَّاسِ

لوگوں سے اختلاط کی شرائط

اب وہ زمانہ آیا کہ نہیں؟تواس سلسلہ میں علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) نے دوسرا باب قائم کیاہے جس میں انہوں نے کوئی روایت پیش نہیں کی ہے،بلکہ علماء کاجونظریہ ہے صرف اسی کو پیش کیا ہے۔فتنہ کے بارے میں توانہوں نے اوپرباب قائم کرکے بتلادیاکہ فتنہ کے زمانہ میں جب کہ آدمی کوسماج میں رہ کر اپنے دین کے خراب ہونے کااندیشہ ہو توعزلت نشینی مستحب ہے، اور اگردین کے فساد کایقین ہو تو عزلت نشینی واجب ہے، لیکن عزلت نشینی کے لئے بھی باقاعدہ شرائط ہیں،ان تمام شرائط کااہتمام کرتے ہوئے عزلت نشینی اختیار کرے۔

اور عام حالات میں کیا مناسب ہے؟ لوگوں کے ساتھ خلط ملط کر کے رہنا، یاعزلت نشینی؟چناں چہ باب قائم کیا ہے:**بَابُ فَضْلِ الِاخْتِلَاطِ بِالنّاسِ،وَحُضُوْرِ جُمُعِهِمْ وَجَمَاعَاتِهِمْ ،وَمَشَاهِدِالْخَيْرِ ، وَمَجَالِسِ الذِّكْرِمَعَهُمْ ، وَعِيَادَةِ مَرِيْضِهِمْ وَحُضُوْرِجَنَائِزِهِمْ، وَمُوَاسَاةِ مُحْتَاجِهِمْ،وَإِرْشَادِ جَاهِلِهِمْ،وغيرِذالكَ مِنْ مَّصَالِحِهِمْ لِمَنْ قَدَرَعَلَى الْأَمرِبِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهْىِ عَنِ الْمُنْكَرِ،وقَمَعَ نَفْسَهُ عَنِ الْإِيْذَاءِ وَصَبَرَعلَى الْأَذىٰ.**"لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی فضیلت،جمعہ وجماعتوں کی حاضری، نیکی کے موقعوں پر حاضری ، ذکر کی مجلسوں کی حاضری، مریضوں کی خبرپرسی، جنازوں کی حاضری، محتاجوں کی خیرخواہی،نادانوں کی رہنمائی، اس کے علاوہ دوسری مصلحتیں ہیں۔یعنی سماج اور سوسائٹی میں رہ کرآدمی کو یہ سارے فائدے حاصل ہوتے ہیں،لیکن یہ اس کے لئے ہےجو امر المعروف اور نہی عن المنکرکی قدرت رکھتا ہو،بھلی بات کا حکم کرنے اور بری بات سے منع کرنے پر قادرہو ،لوگوں کوتکلیف پہنچانے سے اپنے

آپ کو بچا سکتا ہو ،یعنی اپنے آپ پر اتنا کنٹرول ہو کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور لوگوں کی طرف سے جو تکلیف پہنچے، اس پر صبر سے کام لیتا ہو؛ تو اس صورت میں لوگوں کے ساتھ مل کر رہنا پسندیدہ ہے۔

پھر علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں :"اِعْلَمْ اَنَّ الِاخْتِلَاطَ بِالنَّاسِ عَلَى الْوَجْهِ الَّذِیْ ذَكَرْتُهٗ هُوَالْمُخْتَار"ان تمام شرائط کے ساتھ سماج اور سوسائٹی میں رہے جو اوپر بتلائے گئے(کہ وہ سارے فوائد ہوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام ہو ،اور اپنے آپ کو لوگوں کی ایذاء رسانیوں سے بچاتا ہو،اور لوگوں کی ایذاء رسانیوں پر صبر کرتا ہو)تب ہی پسندیدہ ہے۔نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی ایسی ہی گزری ہے،اور تمام انبیاء (علیہم السلام)،خلفاء راشدین کا بھی یہی طریقہ رہا ہے، ان کے بعد صحابہ، تابعین، علماءِ مسلمین اور خیارِ امت کا بھی یہی طریقہ رہا ہے، اور یہی اکثر تابعین اور ان کے بعد والوں کا مذہب ہے،امام شافعی، امام احمد اور اکثر فقہاء یہی فرماتے ہیں۔باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى﴾نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرو۔یہ عام حالات میں ہے۔

کیا وہ زمانہ آگیا؟

علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) ساتویں صدی کے ہیں، ان کے سو سال بعد علامہ کرمانی (رحمۃ اللہ علیہ) شارحِ بخاری آئے جو آٹھویں صدی کے بڑے عالم ہیں، وہ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ان ساری باتوں کو

نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ہمارے زمانہ میں خلط ملط کرکے رہنے کے مقابلہ میں گوشہ نشینی افضل ہے۔ ان کے ستر سال بعد شارحِ بخاری علامہ عینی (رحمۃ اللہ علیہ) آئے، وہ بھی فرماتے ہیں کہ میں علامہ کرمانی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تائید کرتا ہوں، ہمارے زمانہ میں خرابیاں اور بڑھ گئی ہیں۔ حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ ان تمام حضرات کے اقوال کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ: یہ سب باتیں تو نویں صدی تک کی تھیں، اب تو چودھویں صدی پوری اور پندرہویں صدی شروع ہوگئی، اب حالات میں جتنا بڑا انقلاب آگیا ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اس کے باوجود کوئی صاحبِ علم، صاحبِ تقویٰ، دیندار آدمی لوگوں میں یہ شرائط مذکورہ بالا رہے، تو آج بھی اس کے لیے لوگوں میں مل جل کر رہنا مفید ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو جیسا کہ علامہ عینی (رحمۃ اللہ علیہ) اور علامہ کرمانی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ آج کل کی مجالس عام طور پر گناہوں سے خالی رہیں ہی نہیں، اس لیے دینی مجالس کو چھوڑ کر دوسری تمام مجالس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے، اِلّا یہ کہ وہاں جانے سے کسی کو دینی نفع پہنچنے کی امید ہو، تو اس صورت میں اس کی اجازت ہے۔

ماتحتوں کو نہ بخشے

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے اس موضوع پر تفصیل سے کلام فرماتے ہوئے ایک خاص نصیحت فرمائی ہے کہ ایک بات یاد رہے، جہاں آپ کسی منکر سے روکنے کی طاقت رکھتے ہوں

تواسے روکنے میں کبھی دریغ نہ کرنا، پیچھے نہ ہٹنا، کمزوری نہ دکھلانا، خاص کر اپنے ماتحتوں (بیوی، اولاد، نوکر) کے معاملہ میں آدمی کو چاہیے کہ ذرّہ برابر بھی کمزوری نہ دکھلائے،اور منکرات و برائیوں سے ان کو روکنے کا اہتمام کرے۔ اس لیے کہ نبی کریم (ﷺ) کاارشادہے:مَنْ رَأٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ . فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَذَالِكَ أَضْعَفُ الْاِيْمَانِ (او کما قال علیہ والسلام) تم میں سے جو آدمی کسی برائی کودیکھے توچاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو روکے ، اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان سےروکے، اگر اس کی بھی طاقت نہیں تودل سے اس کوبرا سمجھے۔پھرفرمایا: یہ ایمان کاکم سے کم درجہ ہے۔اور بعض روایتوں میں ہے: "وَلَيْسَ وَرَآءَ ذَالِكَ مِنَ الْاِيْمَانِ حِبَّةُ خَرْدَلٍ" اس کے بعد ایمان کا درجہ ہے ہی نہیں۔کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنے دل سے برا سمجھے۔

احقاقِ حق یاتذلیل؟

اس کے بعد حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ)نے دوسری بات ارشادفرمائی کہ جہاں برائیوں سے روکنے میں فتنہ کا قوی اندیشہ ہو،وہاں فتنہ جگانے کی کوشش نہ کی جائے۔دونوں کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔بہت سی مرتبہ آدمی اعلانِ حق اوراحقاقِ حق کے نام سے کسی کو لوگوں کےسامنے رسواکرنے،یانیچا دکھلانے کے لیے کہتاہے کہ:تم یوں کررہے ہو۔اوردوسری طرف جو اپنے ماتحت ؛اپنابیٹا،اپنی بیوی وغیرہ برائیوں میں مبتلا ہیں، لیکن محض محبت و تعلق کی وجہ

سے ان کو روک ٹوک نہیں کررہاہے۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ جو آپ کے ماتحت ہیں ان کو روکو، ان کے معاملہ میں کوئی رکاوٹ ہی نہیں ہے۔ان کی طرف سے تجارت میں اگرکوئی مالی نقصان ہوتاہے، آپ کی فیکٹری، دکان میں وہ کوئی گڑبڑکردیتے ہیں توکیاآپ اس کو برداشت کرتے ہیں؟ ہرگزنہیں، بلکہ گالی دیں گے، برا بھلا کہیں گے، پٹائی کریں گے، آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتاہےتوسب کچھ کرتے ہیں، اوراسی بیٹے،اسی ماں اور بیوی کودیکھ رہے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی کررہے ہیں، نماز نہیں پڑھتے، گناہوں میں مبتلا ہیں؛ لیکن وہاں کچھ نہیں کہتے۔یہ ان کے ساتھ بدخواہی اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔اس لیے کہ آدمی جہاں برائی سے روکنے پر قدرت رکھتا ہو،اس کے باوجود نہ روکے،تواللہ تعالیٰ کاعام عذاب آئے گا، پھر اس سے نہ وہ بچ سکیں گے اور نہ یہ اپنے آپ کو بچا سکے گا۔یہ اہم بات ہے، جس کویاد رکھناچاہیے۔

عذابِ الٰہی کودعوت نہ دیں

خلاصہ یہ ہواکہ دونوں حالتوں میں آدمی امتیازکرے، اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں کہ جہاں آدمی کو قدرت حاصل ہوتی ہے، وہاں ہاتھ سے روکنے کا اہتمام کرے، اورجہاں قدرت نہیں ہے ، وہاں زبان سے ایسے انداز سے سمجھادے جس سے کوئی فتنہ نہ ہو۔اوراگر اس صورت میں بھی خطرہ ہو، توپھرکم سے کم دل سے برا سمجھنے پر اکتفاء کرے،اور اپنے کام میں مشغول

رہے۔اس صورت میں پھر چاہے کسی کی طرف سے کتنے ہی طعنے دیئے جاتے رہیں ان کوبرداشت کرتا رہے، کوئی جواب دینے کی ضرورت نہیں ہے۔حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس موقع پر خاص طور پر تاکید فرمائی ہے کہ اگر ہمت ہوتوان کے لیے دعائِ خیر بھی کرے ۔اس بات کویادرکھو،یہ بہت اہم چیز ہے۔

آدمی یہ نہ سمجھے کہ معاشرہ میں رہتے ہوئے میں برائیوں سے صَرفِ نظر کر لوں، اس کی شریعت کسی حال میں اجازت نہیں دیتی۔ہاں! یہ بات ٹھیک ہے کہ کسی اجنبی کو کہنے کی صورت میں اگراندیشہ ہوتو آدمی نہ کہے، لیکن اپنے ہی لوگ گناہوں،بدعملیوں اور برائیوں میں مبتلا ہیں اور ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوتی؛یہ بڑی خطرناک چیز ہے اوریہ چیز اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دینے والی ہے۔

یہ آیت شبہ میں نہ ڈالے

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ آدمی یہ نہ سوچے کہ میں عمل کررہاہوں،یہ میرے لیے کافی ہے، چاہے بیوی بچے برائی کے اندر مبتلا ہوں۔جیسے بعض حضرات اس سلسلہ میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ﴾اے ایمان والو! تم اپنی اصلاح کی طرف توجہ کرو،کوئی آدمی گمراہ ہے تو وہ تم کو نقصان نہیں پہنچا سکتا ہے۔حضرت ابوبکر صدیق(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ یہ آیت تم کوشبہ میں نہ ڈالے، اس سے مراد

یہ نہیں ہے۔جہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہوجاتا ہے وہ اس میں داخل نہیں ہے،ہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بعد بھی وہ اگر اپنی اصلاح نہیں کرتا تو آپ بری الذمہ ہوجاتے ہیں۔اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی سے آدمی اپنے آپ کو روک لے۔اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اگر حالات ایسے آگئے تو آدمی اپنے متعلق غورو فکر کر کے اس بات کا فیصلہ کرسکتا ہے،جیسے حدیثِ پاک میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: إِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا، وَهَوًى مُتَّبَعًا، وَدُنْيَا مُؤْثَرَةً، وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِي رَأْيٍ بِرَأْيِهِ، فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ، وَدَعِ الْعَوَامَّ (سنن ترمذی. بَابٌ: ومن سورة المائدة. حدیث رقم: ۳۰۵۸) جب تم دیکھو کہ بخل و حرص کی پیروی کی جارہی ہے،خواہشاتِ نفس کے پیچھے لوگ دوڑ رہے ہیں،دنیا کو ترجیح دی جاری ہے، ہر ذی رائے اپنی رائے پر مست ہے کہ مَیں جو کہہ رہا ہوں وہی صحیح ہے؛تو ایسے موقع پر تم اپنے آپ کو سنبھال لو اور عوام کی طرف توجہ نہ دو۔باقی یہ ہے کہ کسی بھی طریقہ سے، نرمی کے ساتھ، محبت کے ساتھ اگر آپ اپنی بات عوام تک پہنچاسکتے ہیں تو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح توفیق عطا فرمائے۔

التَّواضُعِ وَخَفْضُ الْجَنَاحِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ

تواضع اختیار کرنا

مجلس ۱

۱۰/ جمادیٰ الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۹/ ستمبر ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ

وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:-

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

ساری خوبیوں کی جڑ

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نیا باب قائم کیا ہے: تواضع اختیار کرنا اور ایمان والوں کے سامنے اپنے پہلو کو جھکانا۔

تواضع کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہی ساری نیکیوں اور خوبیوں کی جڑ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا، اس لیے کہ تواضع کے مقابلہ میں تکبر ہے جو ساری خرابیوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ شیطان جو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے مردود ہوا اس کی اصل وجہ یہی تھی کہ اس نے تکبر کیا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کو جب اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا تو شیطان بھی ان کی جماعت میں تھا، اس لئے یہ بھی اس حکم میں داخل تھا،

لیکن اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟﴿خَلَقْتَنِىْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ﴾ مجھے آپ نے آگ سے پیدا کیا ہے اور ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے، آگ اوپر اُٹھنے والی چیز ہے، مٹی پستی میں رہنے والی چیز ہے، اس لیے مٹی کے مقابلہ میں آگ کو فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا شیطان نے انکار کیا، اور اپنی عقل چلائی۔ حالاں کہ اصل تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا تھا تو عقل کے گھوڑے دوڑانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، علامہ اقبال کا ایک شعر ہے:

روزِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو، وہ دل نہ کر قبول

آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے احکام اور شریعت کو عقل کی ترازو میں تولنا شروع کردے گا تو پھر بات ہی ختم ہوجائے گی، پھر تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اوراس کے حکم کی بجاآوری نہیں ہوگی؛ بلکہ اپنی عقل پر چلنا ہوگا۔ اگر یہ سوچتا کہ اللہ تعالیٰ میرا بھی خالق ہے اور اس کا بھی خالق ہے، وہ میری حقیقت سے بھی واقف ہے اور اس کی حقیقت سے بھی واقف ہے، اس کے باوجود جب اس نے حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ کرو تو اس کو ماننا چاہیے، لیکن وہ اپنی عقلی دلیل لایا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حجت بازی کرنے لگا۔

حضرت آدم کا امتیازی وصف

میں پہلے بھی بتلاچکا ہوں کہ حضرت آدم (علیہ السلام) کو فرشتوں کے مقابلہ میں بھی اور شیطان کے مقابلہ میں بھی جو فضیلت حاصل ہوئی، اس کی اصل بنیاد ان کی شانِ عبدیت، شانِ بندگی اور عجز و تواضع ہے، جو شان ایک بندے کی ہونی چاہیے وہی شان ان میں پائی گئی، یہی ایک چیز تھی جس نے ان کو سب کے مقابلہ میں فوقیت دلوائی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اونچے مرتبہ پر پہنچایا۔

حضرت علامہ انورشاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ فرشتوں کے سامنے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا: ﴿اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً﴾ زمین کے اندر میں اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں، تو سیدھی سادی بات تو یہ ہے کہ آگے کچھ بولنے کی کچھ گنجائش ہی نہیں تھی، اس کے باوجود فرشتوں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا: ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ﴾ باری تعالیٰ! آپ زمین کے اندر ایک ایسی شخصیت کو بھیج رہے ہیں جو زمین میں فتنہ اور فساد مچائے گی اور خون خرابہ کرے گی؟ ﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ﴾ ہم آپ کی تعریف اور پاکی بیان کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کی عبادت کرنے اور پاکیزگی بیان کرنے کے لیے کافی ہیں؛ پھر ان کی کیا ضرورت ہے؟ باری تعالیٰ نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کردیا: ﴿إِنِّيْ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں جو چیزیں جانتا ہوں تم وہ نہیں جانتے، فرشتوں نے فوراً عرض کیا: ﴿سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ

لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ آپ کی ذات پاک ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں سوائے اس کے جو آپ نے ہمیں سکھایا، آپ بہت زیادہ جاننے والے حکمت والے ہیں۔ بہر حال! انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا، لیکن ان کی طرف سے پہلے ایک بات تو پیش ہوئی۔ اس کے بعد جب سجدہ کے لیے کہا گیا تو فرشتے تو فوراً سجدہ ریز ہو گئے لیکن شیطان نے حکم نہیں مانا اور سجدہ کرنے سے انکار کر دیا، باری تعالیٰ کے سامنے حجت بھی کرنے لگا کہ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا، میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟ حالاں کہ یہاں صرف اللہ تعالیٰ کے عشق اور محبت کی ضرورت تھی۔

ایک "ع" کی کمی

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ شیطان میں تین عین تھے۔ بہت بڑا عابد تھا، بہت بڑا عارف تھا اور بہت بڑا عالم بھی تھا۔ اس کے علم کا کیا کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فرشتوں کا استاذ بنا دیا تھا، تبھی تو معلم الملکوت کہلایا۔ عبادت کا یہ عالم کہ آسمان پر کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں اس نے سجدہ نہ کیا ہو۔ اور عارف یعنی اللہ تعالیٰ کی شان کو پہچاننے والا بھی تھا، اسی لیے حضرت آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہ کرنے پر جب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی بارگاہ سے مردود کیا تو اس نے ایک درخواست پیش کر دی کہ قیامت کے بعد دوبارہ زندہ کیے جانے تک مجھے مہلت دی جائے۔ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی بارگاہ سے ہانکا تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض تھا،

ایسی ناراضگی کی حالت میں اللہ تعالیٰ کے حضور یہ درخواست پیش کرنا اس کی معرفت ہی کی علامت ہے کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی چیز سے متأثر نہیں ہوتی۔ ہمارا تمہارا حال تو یہ ہے کہ اگر ہم کسی سے ناراض ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ابھی مجھ سے بات نہ کرنا، تمہاری کوئی درخواست منظور نہیں ہوگی چوں کہ اس وقت ایک خاص کیفیت ہے۔ لیکن شیطان جانتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کسی کیفیت سے متأثر ہونے والے نہیں ہیں، وہ تو حاکم ہے، اگر درخواست قابلِ قبول ہے، تو قبول ہو جائے گی، چاہے اس وقت اللہ تعالیٰ مجھ پر غصہ ہیں۔ چناں چہ اسی حالت میں اس نے درخواست پیش کی اور اللہ تعالیٰ نے وہ منظور کرلی کہ جا! تجھے مہلت دی جاتی ہے جب تک کہ پہلا صور پھونکا جائے گا۔ اس نے ہوشیاری سے کام لیا تھا اور کہا تھا کہ دوبارہ جب پیدا کیے جائیں وہاں تک مہلت دی جائے، اس کا مقصد یہ تھا کہ پہلے صور پر سب ختم ہو جائیں گے اور دوسرے صور پر سب دوبارہ پیدا ہوں گے، تو دوبارہ پیدا ہونے تک جب مہلت مانگوں گا تو مجھ پر موت طاری نہیں ہوگی۔ وہ ہوشیاری کرنے گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں کسی کی ہوشیاری کہاں چل سکتی ہے؟ لہٰذا باری تعالیٰ نے کہا: تجھے مہلت تو دی جاتی ہے لیکن ایک مقررہ وقت یعنی پہلے صور کے پھونکے جانے تک ہی دی جاتی ہے۔

بہرحال! یہ تین عین اس میں تھیں، لیکن وہ عاشق نہیں تھا، اگر عاشق ہوتا تو باری تعالیٰ کی طرف سے جب حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو فوراً کر دیتا۔ یہ نہ دیکھتا کہ میں کیا ہوں

اوروہ کیاہے، اس لیے کہ عاشق کاتویہ حال ہوتا ہے کہ اس کے محبوب و معشوق کی طرف سے جو حکم دیا جائے اس پر جان چھڑکنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

محبت جب پیوست ہو جاتی ہے

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کاتعلق محبت والاہوناچاہیے ﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ﴾ ایمان والے اللہ تعالیٰ سے خوب ڈٹ کر محبت کرنے والے ہیں، بلکہ ایمان نام ہی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کاہے،ایمان کی حقیقت یہی ہے۔اور محبت کا حال یہ ہے کہ جب وہ ایک مرتبہ دل میں پیوست ہو جاتی ہے توپھر نکلنے کانام نہیں لیتی، اسی لیے تو جب حضورپاک(ﷺ)نے قیصرِ روم ہرقل کے نام خط لکھا تھا، جس میں اس کو اسلام کی دعوت دی تھی۔اس مبارک نامہ کو کھولنے اوراس کا مضمون پڑھنے سے پہلے ہی ہرقل نے حضورِپاک (ﷺ)سے متعلق حالات معلوم کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ یہ کس شخصیت کا خط ہے، بھیجنے والے کون ہیں۔ چناں چہ وہ اس زمانہ میں بیت المقدس کی زیارت کے لیے آیا ہواتھا۔مکہ مکرمہ سے بھی قریش کاایک قافلہ وہاں پہنچا ہوا تھا جس کی سرداری ابو سفیان کررہے تھے جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے،بلکہ حضور(ﷺ) کے مدِمقابل کافروں کے سردار تھے ، انھی لوگوں کو تحقیق حال کے لیے بلایا گیا ،اس نے ان سے بہت سارے سوالات کیے،ان میں ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ جو اس دین کے اندرداخل ہوجاتا ہے؛توپھرکیا اس سے ہٹتاہے؟ انہوں نے

کہا: نہیں! ایسا تو نہیں ہوتا۔ تو ہرقل نے اس کی وجہ یہی بتائی تھی کہ ایمان کا حال ایسا ہی ہے کہ جب وہ دلوں کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے تو پھر نکلنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ اصل تو ایمان نام ہی اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے۔

اُمُّ الامراض

میں یہ عرض کررہا تھا کہ اگر شیطان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی تو یہ بات ہی پیدا نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے شیطان کو ہلاک کرنے کا سبب تکبر اور بڑائی ہے۔ تکبر ہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی کے نتیجہ میں غصہ آتا ہے، اسی کے نتیجہ میں حسد پیدا ہوتا ہے، اسی کے نتیجہ میں بغض اور کینہ پیدا ہوتا ہے، اور اسی کے نتیجہ میں اور بھی بہت ساری خرابیاں جنم لیتی ہیں، اسی لئے اہلِ تصوف کے یہاں اس کا نام ہی ''اُمُّ الامراض'' یعنی ساری بیماریوں کی ماں اور جڑ ہے۔ تو تکبر ساری خرابیوں کی جڑ ہے، اس کے بالمقابل تواضع ہے۔ اس بات سے تواضع کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس آدمی کے اندر تواضع ہوگی وہ تکبر سے پاک صاف ہوگا، تو بہت ساری برائیوں کی جڑ خود بخود ہی کٹ گئی، لہٰذا تواضع بہت ضروری چیز ہے، اسی لیے اس کا حکم و ترغیب دی گئی اور قرآن و حدیث میں اس کی اہمیت بتلائی گئی ہے، خود حضور پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے عمل سے اس کو کرکے بتلایا ہے۔

تواضع کی حقیقت

تواضع کی حقیقت کیا ہے؟تواضع کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے،صرف کمتر کہناکافی نہیں ، بلکہ کمتر سمجھناضروری ہے۔آدمی دل سے اپنے آپ کو سب سے کم درجہ سمجھے۔اگر کوئی آدمی زبان سے اپنے آپ کوحقیر، فقیر ،پر تقصیراور بندۂ ناچیز کہتا ہے اوردل سے اپنے آپ کوبڑا سمجھتاہےتوچاہے ایسے الفاظ کہتا رہے؛ اس کا نام تواضع نہیں ہے۔بلکہ دل سے اپنے آپ کوسب سے کمتراور سب سے نکما سمجھتاہو، اوریہ سوچتاہوکہ اللہ تعالیٰ اگرکوئی کام مجھ سے کروا رہا ہے تو یہ محض اس کا فضل وکرم اور اس کی عنایت ہے،باقی ذاتی اعتبار سے اس میں میرا کوئی کمال اورمیری اپنی کوئی قابلیت نہیں ہے،میری ذاتی صلاحیت کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔یہی اصل ہے کہ آدمی اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے؛اسی کا نام تواضع ہے۔

نمائشی تواضع

اپنے آپ کوکمتر کہنے اوربولنے کا نام تواضع نہیں ہے،بلکہ یہ توتواضع کی نمائش ہے۔بعض مرتبہ آدمی تواضع کی نمائش کرتاہے کہ کسی نے کچھ کہاتوکہنے لگتاہے کہ میں تو بڑانالائق ہوں ،میں کچھ بھی نہیں ہوں ،تاکہ سامنے والے کہیں کہ نہیں نہیں حضرت ! آپ

تو بہت بڑے مقام والے ہیں۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ لوگوں کی زبان سے اپنی بڑائی کہلوانے کا ایک انداز یہ بھی ہے۔

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس تھے، ان کے متعلق حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ جب کوئی ان کی تعریف کرتا تھا، تو وہ بالکل چپ اور خاموش رہتے تھے، تردید بھی نہیں کرتے تھے۔ اس سے کوئی آدمی یہ نہ سمجھے کہ شاید ان میں تکبر تھا اس لیے اپنی تعریف سنتے رہتے تھے، حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی، بلکہ وہ خاموش اس لئے رہتے تھے کہ تردید کے اندر بھی کبھی تکبر کا پہلو آجاتا ہے۔

حقیقی تواضع کی ایک علامت

حقیقی تواضع کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ: میں ناچیز، گنہگار، بندۂ حقیر پر تقصیر ہوں، اور سامنے والا جواب میں اگر یہ کہہ دے کہ: ہاں! آپ بالکل ایسے ہی ہیں؛ پھر دیکھئے! اس کا چہرہ متاثر ہوتا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا چہرہ اس سے متاثر ہوتا ہے اور اس کی طبیعت پر اس جواب کا اثر ہوتا ہے، تو سمجھ جاؤ کہ حقیقی تواضع نہیں ہے۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو اس صورت میں سمجھا جائے گا کہ حقیقی تواضع سے آراستہ ہے۔

حضورِ پاک (ﷺ) کی تواضع

حضورِ پاک (ﷺ) کی حیاتِ طیبہ کا اگر ہم مطالعہ کریں تو ہر جگہ تواضع نظر آئے گی۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضورِ پاک (ﷺ) کی طبیعت میں اتنی زیادہ تواضع تھی کہ مدینہ منورہ کی کوئی بچی بھی کسی کام کے لیے آپ کا ہاتھ پکڑ کر لے جاتی تو آپ چلے جاتے تھے۔ جس آدمی کے مزاج میں تکبر ہو، وہ بھلا ایسا کر سکتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اگر کوئی آدمی حضورِ پاک (ﷺ) سے مصافحہ کرتا تھا تو جب تک وہ اپنا ہاتھ نہ ہٹاتا، حضورِ اکرم (ﷺ) اپنا ہاتھ نہیں ہٹاتے تھے، اور کوئی آپ کی طرف متوجہ ہو کر بات چیت کرتا تو جب تک وہ اپنی بات پوری کر کے اپنا چہرہ نہیں پھیرتا تھا تب تک حضورِ اکرم (ﷺ) بھی اپنا چہرۂ مبارک نہیں پھیرتے تھے۔

مجبوری کی وجہ سے مسند بنوائی گئی

مجلس میں بھی پہلے یہ ہوتا تھا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) سب کے ساتھ ملے جلے بیٹھتے تھے، آپ کے لیے کوئی ممتاز نشست نہیں بنائی گئی تھی، اس لئے کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کون ہیں اور صحابہ کون ہیں، اس کی وجہ سے نئے آنے والوں کو تکلیف ہوتی تھی، کوئی نیا آدمی آتا جو آپ کو پہچانتا نہ ہو، تو اس کو دوسروں سے پوچھنا پڑتا کہ حضورِ پاک

(ﷺ) کون ہیں۔ پھر اگر مجمع زیادہ ہوتا تو دور والے آپ کو دیکھ بھی نہیں پاتے تھے۔ان ساری دشواریوں کے پیش نظر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے حضورِ اکرم (ﷺ) سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے لیے کوئی اونچی بیٹھک بنوائیں، اس لیے کہ نئے آنے والے آپ کو پہچانتے نہیں ،ان کو لوگوں سے پوچھنا پڑتا ہے، اگر آپ کے لیے ممتاز بیٹھک بنائیں گے تو پوچھنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ دوسرا یہ ہے کہ جو لوگ دور ہوتے ہیں ان کو آپ دور سے نظر نہیں آتے تو ان کے لیے بھی دشواری کا سبب ہے، اگر آپ اونچائی پر ہوں گے تو ان کو بھی آپ کی زیارت کا موقع ملے گا، ان ساری ضرورتوں کی وجہ سے نبی کریم (ﷺ) نے اونچی بیٹھک بنانے کی اجازت دی پھر حضورِاکرم (ﷺ) اس پر تشریف فرما ہوتے تھے۔

آپ جب چلتے تھے تو اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ آپ کے پیچھے پیچھے چلیں ۔ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ کے آگے راستہ کرنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا کہ راستہ دیا جائے، جیسا کہ بڑوں کے لیے کیا جاتا ہے، آپ کے لئے ایسا نہیں ہوا کرتا تھا، حضورِ اکرم (ﷺ) اس کو پسند ہی نہیں کرتے تھے۔ عرض کرنے کا منشاء یہ ہے کہ تواضع کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی دل سے اپنے آپ کو کمتر سمجھے۔

نعمتوں کو عطیۂ خداوندی سمجھے

اب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دے رکھی ہیں؛ ان کا کیا؟ مثلاً ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے علم سے نوازا ہے، تو یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ آدمی یہ سمجھے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، کسی کے پاس دولت ہے تو وہ یہ سمجھے کہ میرے پاس دولت نہیں ہے؛ یہاں تواضع کیسے اختیار کی جائے؟ تو کتابوں میں لکھا ہے کہ جو نعمت اس کے پاس ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ ، دَین و بخشش سمجھے کہ یہ علم ،عہدہ، منصب ، مال ودولت ، حسن و جمال،یا جو کچھ بھی ہے؛اس میں میری ذاتی قابلیت وصلاحیت کو دخل نہیں ہے ، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمایا ہے۔ ہماری جسمانی نعمتیں تو عطیۂ خداوندی ہی ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو کیا وہ یہ سب نعمتیں مانگنے جاتا ہے؟اس کے اندر تو کسی چیز کی قابلیت نہیں ہوتی، اس کو سب کچھ دینے والی ذات اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔اس لئے آدمی یہ سوچ کہ مجھے جو کچھ بھی ملا ہے وہ سب محض اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرما رکھا ہے، اس سے شکر کا جذبہ بھی پیدا ہوگا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کو باری تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ اگر آپ کہیں تو اُحد پہاڑ کو سونے کا بنادیا جائے اور آپ کے لیے دولت کی ریل پیل ہو جائے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے عرض کیا: باری تعالیٰ! مجھے یہ منظور نہیں ہے؛ بلکہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز کھانا کھاؤں،ایک روز

بھوکا رہوں؛ تاکہ جس روز کھانا کھاؤں اس روز آپ کا شکر ادا کروں اور جس روز بھوکا رہوں اس روز صبر سے کام لوں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی حال میں اپنے لیے کوئی امتیازی حیثیت پسند نہیں فرماتے تھے اور جو اکابرینِ امت گزرے ہیں، ان کا حال بھی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اقتداء میں یہی تھا۔

خلیفۂ وقت کا سترہ پیوندی کرتہ

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) ایک مرتبہ خطبہ دے رہے تھے، آپ کے جسم پر جو کرتہ تھا اس پر سترہ پیوند لگے ہوئے تھے، جس میں ایک چمڑے کا تھا۔ اپنے زمانہ کا علی الاطلاق حکمران اور ایسا خلیفۂ وقت جن کی سلطنت کی حدود بڑی وسیع تھیں، فتوحات کا سلسلہ جاری تھا، اس کے باوجود ان کے لباس کا یہ عالم تھا۔ اور آپ کو جہاں نیند آتی تھی وہیں لیٹ جاتے اور سو جاتے تھے۔ کھانے کے معاملہ میں بھی سادگی کا یہی حال تھا۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کا بعد میں بھی یہی سلسلہ رہا۔ تو تواضع کی حقیقت یہی ہے کہ آدمی دل سے یہ سمجھے کہ میں سب سے کمتر ہوں، کسی قابل نہیں ہوں، اور جو کچھ اپنے پاس ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت اور دَین سمجھے۔

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تواضع

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ میں ہر مسلمان سے فی الحال اور ہر کافر سے فی المآل اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہوں۔ مسلمان سے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی نعمت عطا فرما رکھی ہے۔ اور کافر سے احتمال کے درجہ میں کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمائے اور اونچا مرتبہ عطا فرما دے۔ پس یہ کیفیت ہونی چاہیے کہ آدمی اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھے۔

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کی مجلس کی کیفیت

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے ملفوظات میں ہے کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک مرتبہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری (رحمۃ اللہ علیہ) (دونوں حضرات حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں سے تھے) سے کہا کہ جب لوگ حضرت کی مجلس میں بیٹھتے ہیں اس وقت پوری مجلس میں دل میں یہی خیال رہتا ہے کہ میں ہی سب سے نکما اور کمتر ہوں ۔حضرت مفتی محمد حسن صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: یہی کیفیت میری بھی رہتی ہے۔ پھر ان دونوں نے کہا کہ اچھا! حضرت کے سامنے اس کو عرض کیا جائے، کہیں اس میں ہمارے نفس کا کوئی کید تو نہیں ہے؟ دونوں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا حال عرض کیا، تو حضرت

تھانوی(رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: جس وقت مجلس منعقد ہوتی ہے، اس وقت میرا حال یہ ہوتا ہے کہ جتنے مجلس میں بیٹھے ہوتے ہیں، میں اپنے آپ کو ان میں سب سے زیادہ نکما اور کمتر سمجھتا ہوں ۔

متکبر کی نقد سزا

عرب میں ایک کہاوت ہے: ”متکبر کا حال ایسا ہے جیسے وہ کسی پہاڑ پر کھڑا ہو۔“ پہاڑ پر کھڑا رہنے والا آدمی نیچے والوں کو بہت چھوٹا دیکھتا ہے، لیکن دوسروں کا معاملہ بھی اس کے ساتھ یہی ہوتا ہے یعنی نیچے والے بھی جب اس کو دیکھتے ہیں تو اِن کو وہ چھوٹا ہی نظر آتا ہے، چناں چہ تکبر کرنے والا بھی دوسروں کو بہت کمتر سمجھتا ہے، خود اس کو بھی دوسرے لوگ حقیر ہی سمجھتے ہیں۔ یہ قدرتی اثر ہوتا ہے۔ تکبر کرنے والے کی یہ قدرتی نقد سزا ہے۔ جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے تو دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔ چوں کہ اس نے اوپر سے دیکھ کر دوسروں کو چھوٹا سمجھا، تو نیچے والے بھی تو اس کو دیکھ رہے ہیں تو وہ بھی نیچے سے چھوٹا ہی لگ رہا ہے۔

نقشوں کو تم نہ جانچو

اور تکبر میں تحقیر کا معاملہ بھی ہوتا ہے اور تحقیر کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں۔ مسلم شریف کی روایت ہے: ”بِحَسْبِ امْرِءٍ مِّنَ الشَّرِّ أَنْ يَّحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمِ“ کسی مسلمان کی برائی کے لیے

اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔لہٰذا کسی کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس کے دل میں ایمان کی جو دولت ہے وہ بہت بڑی دولت ہے،اسی وجہ سے شریعت نے ہر ایمان والے کے احترام کا حکم دیا ہے۔ پھر یہ کہ کس کی ایمانی کیفیت کیسی ہے یہ کون جان سکتا ہے؟ کسی کے متعلق یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتاوہ کہ کس درجہ کا ہے؟آج جتنے بھی لوگ بڑے منصب اور عہدوں پر فائز ہیں، ان کے نام اوران کے منصب سے جو آدمی واقف نہ ہو، اس کے سامنے ان کو کھڑا کر دیا جائے؛ تو کیا چہرہ دیکھ کر وہ کہہ دے گا کہ یہ صدر جمہوریہ ہیں،اور یہ وزیر اعظم ہیں؟ نہیں کہہ سکے گا۔کسی کے بھی چہرہ سے اس کے اندر کی حقیقت کا پتہ نہیں چلا کرتا۔اسی طرح ظاہری حالت کی وجہ سے کسی کے متعلق فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔

حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) کی تواضع

میں یہ بتارہاتھاکہ تواضع کی صفت بہت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ مسجد کے باہر صحن میں حدیث کادرس دے رہے تھے، اسی دوران بارش کے چھینٹے گرنے لگے،توطلبا فوراًاپنی کتابیں لے کر مسجد کی طرف دوڑے۔حضرت نے دیکھا کہ سب کے جوتے باہر پڑے ہوئے ہیں تو حضرت سب کے جوتے اٹھا کر ایک جگہ رکھنے لگے،تاکہ بارش سے بھیگ کر خراب نہ ہوجائیں۔ طلبانے جب یہ دیکھا تو بہت شرمندہ

ہوئے۔ حضرت نے یہ نہیں سوچا کہ میں اتنا بڑا آدمی ہوں۔ جو بڑے حضرات ہوتے ہیں ان کی شان یہی ہوتی ہے۔

دارالعلوم کے صدر مدرس کی تواضع

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے استاذ تھے، اونچے پائے کے بزرگ اور بڑے عالم تھے ، ان کے متعلق لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی دیہاتی نے آپ کی دعوت کی، اس کا گھر دور تھا، جب دعوت کا وقت آیا تو اس نے سواری بھی نہیں بھیجی۔ حضرت نے سوچا کہ اس کے یہاں دعوت ہے، چلو! چلتے ہیں۔ پیدل پہنچ گئے، اس نے کھانا کھلایا، آم کا موسم تھا، آم بھی کھلائے، اور واپسی میں آم کی ایک پیٹی بھی ساتھ دے دی۔ ایک تو سواری کا انتظام نہیں کیا، اور جب روانہ ہو رہے تھے تو آم بھی دے دیئے۔ حضرت نے انکار نہیں کیا، بلکہ قبول کر لئے۔ اب پیٹی لے کر چل رہے ہیں اور طبیعت بہت نازک تھی ، اتنا وزن اُٹھانے کی عادت بھی نہیں تھی، اس لیے ایک ہاتھ میں تھوڑی دیر اٹھاتے، پھر دوسرے ہاتھ میں اٹھاتے، اسی طرح ہاتھ بدلتے رہے۔ جب دیوبند قریب آیا تو دونوں ہاتھ بالکل شل سے ہو چکے تھے تو اس پیٹی کو سر پر رکھ دیا۔ جب دونوں ہاتھ خالی ہوئے، راحت ملی تو کہنے لگے کہ یہ تجویز پہلے سے کیوں نہیں سوجھی ؟ خیر! پھر شہر میں داخل ہوئے، بازار سے گزر رہے تھے تو دکاندار نیچے اتر اتر کر سلام کرنے لگے، لیکن حضرت اس پیٹی

کو سر پر اٹھائے ہوئے بے فکر چلے جارہے تھے،اور سب کے سلام کا جواب بھی دے رہے تھے،دل میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ میں پیٹی اٹھائے ہوئے ہوں۔ تو آدمی کو اپنے اندر تواضع پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

دَم نکلنے کے بعد ذائقہ آتا ہے

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) کی بڑی عجیب و غریب بات نقل کی ہے۔ حضرت فرماتے تھے: جب پلاؤ پکایا جاتا ہے تو چاول شروع میں بہت اچھلتا اور جوش مارتا ہے،اور جب تک کچا ہوتا ہے اس میں سے آواز آتی رہتی ہے،لیکن جب پکنے کے قریب آتا ہے اور تھوڑی دیر باقی ہوتی ہے تو اس کا دم نکالا جاتا ہے،اس وقت وہ بالکل خاموش پڑا رہتا ہے،اور جہاں اس کا دم نکال دیا گیا تو اس میں سے خوشبو بھی پھوٹتی ہے اور اس کا ذائقہ بھی عمدہ ہو جاتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ: آدمی میں بھی خوشبو اور ذائقہ اسی وقت آئے گا جب کہ اس کا دم نکال دیا جائے،جب تک اس میں دم رہے گا وہاں تک اچھلتا کودتا رہے گا،اور یہ اس کے کچا رہنے کی علامت ہے۔

اللہ تعالیٰ کو تواضع ہی پسند ہے

باری تعالیٰ نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دیا: ﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ جو آپ پر ایمان لائے ہیں، ان کے لیے آپ اپنا بازو جھکائیے، آپ ان کے سامنے تواضع اور انکساری سے پیش آیئے۔ اللہ تعالیٰ کو فنائیت، عبدیت اور تواضع ہی پسند ہے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى﴾ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ﴿وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ﴾ اور تم کو مختلف خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ﴿لِتَعَارَفُوْا﴾ محض پہچان کے لیے۔ اس کی بنیاد پر اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور اس پر تکبر کرنا صحیح نہیں ہے ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اپنے آپ کو گناہوں سے زیادہ بچانے والا ہو۔

ذرا بند قبا دیکھ ...

باری تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ اے لوگو! اپنی پاکی بیان مت کرو۔ یعنی اپنی خوبیاں ذکر مت کرو کہ میں ایسا پاک ہوں اور ایسی خوبیوں والا ہوں، تم میں کون پاکیزہ ہے یہ تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے۔

قرآن میں ایک اور جگہ سورۂ نور میں فرمایا ہے:﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَنْ يَّشَآءُ﴾ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی اپنے آپ کو گناہوں سے بچا نہ پاتا۔ اگر کوئی آدمی گناہوں سے بچ رہا ہے، نیکی کے کام کررہا ہے، تواس فخر و غرور میں نہ رہے کہ یہ میرا کمال ہے۔ نہیں بھائی! ایسا بالکل نہیں ہے، بلکہ یہ تواللہ تعالیٰ کی توفیق ہے ، اگراس کی توفیق ایک لمحہ کے لیے بھی ہٹ جائے تو آدمی کسی بڑے سے بڑے گناہ میں مبتلا ہوسکتاہے۔ قرآنِ پاک میں اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایاہے کہ جو گناہوں سے بچ رہاہے وہ اس کو اپنا کمال نہ سمجھے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اوراس کی رحمت ہے، اگراس کی رحمت نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی گناہوں سے بچ نہ سکتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ جس کوچاہتاہے اسے بچاتاہے۔ اس لئے اپنی پاکیزگی بیان مت کرو:-

ے

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بند قبا دیکھ

آدمی کو اپنے معاملہ میں پاکیزہ بننے کی ضرورت نہیں ہے، یہ تو لوگ ہی فیصلہ کریں گے، یا اللہ تعالیٰ کے یہاں فیصلہ ہوگا۔ اس آیت میں ﴿فَلَا تُزَكُّوْا﴾ کہہ کر کبر سے منع کیا گیا اور تواضع اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔

کوئی کسی پر فخر نہ کرے

حدیث ۶۰۲:-

عَنْ عِیاضِ بْنِ حِمارٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِنَّ اللهَ اَوْحٰى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا، حَتّٰى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ، وَلَا يَبْغِي أَحَدٌ عَلٰى أَحَدٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر وحی بھیجی کہ تم تواضع اختیار کرو (یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھو) یہاں تک کہ تم میں سے کوئی کسی کے اوپر فخر و غرور نہ کرے اور اپنی بڑائی نہ جتلائے۔ اور کوئی کسی پر ظلم اور سرکشی نہ کرے۔

افادات:- تکبر ہوگا تو انسانوں پر ظلم سے بھی باز نہیں آئے گا۔ جہاں بھی ظلم ہوتا ہے تکبر کے نتیجہ ہی میں ہوتا ہے۔ جہاں تواضع ہوگی وہاں ظلم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ وہاں تو جانوروں تک کے ساتھ انصاف اور رحم و کرم کا معاملہ کیا جائے گا حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو خطبہ دیا تھا اس میں فرمایا تھا: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ! كُلُّكُمْ بَنُو اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ﴾ تم سب آدم کی اولاد ہو، اور حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے مٹی سے پیدا کیا ہے، اس لیے کسی عربی کو عجمی پر، کسی سفید کو کالے پر فخر کرنے اور بڑائی جتلانے کی ضرورت نہیں ہے ﴿إِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقَاكُمْ﴾ تم میں سب سے باعزت اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرنے والا اور گناہوں سے بچنے والا ہو۔

اس لئے ہمیں تو یہی دیکھنا ہے کہ وہاں کیا فیصلہ ہوتا ہے، یہاں دنیا میں کسی نے اگر واہ واہ کر دی، یا تعریف کر دی، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تواضع اختیار کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ (آمین)

۱۷؍جمادیٰ الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۶؍ستمبر ۲۰۰۰ء

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ تواضع کا بیان چل رہا ہے اور اس کی شریعت میں بڑی تاکید ہے ،اس سلسلہ میں بہت کچھ وضاحت گذشتہ مجلس میں آچکی ہے۔آج کچھ روایتیں پیش فرماتے ہیں۔

صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا

حدیث ۶۰۳:-

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ (صلى الله عليه وسلم) قَالَ: مَانَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْداً بِعَفْوٍ إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔اور معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندہ کی عزت ہی بڑھاتے ہیں۔اور کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا اور اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے ،تو اللہ تعالیٰ اس کے درجہ کو بلند ہی کرتے ہیں۔

افادات:-بعض روایتوں میں حضورِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پہلے کلمات کو قسم کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے یعنی حضورِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قسم کھا کر یہ بات ارشاد فرمائی کہ صدقہ مال میں کمی نہیں کرتا۔چوں کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ کرنے کی وجہ سے مال کم ہو رہا

ہے، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکید فرماتے ہوئے قسم کے ساتھ یہ بات ارشاد فرمائی کہ دیکھنے میں اگرچہ صدقہ کرنے کی وجہ سے آپ کو ایسا نظر آتا ہے کہ مال آپ کے ہاتھ سے نکل رہا ہے اور اس میں کمی ہو رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صدقہ کے نتیجہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ مال میں اضافہ ہی فرماتے ہیں۔

معافی عزت بڑھاتی ہے

"وَمَا زَادَ اللّٰہُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا" اور بندے کے معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کی عزت وآبرو میں اضافہ ہی کرتے ہیں۔ یعنی کسی آدمی نے آپ کی شان میں گستاخی کر دی، کوئی ناروا معاملہ اور نامناسب سلوک کر دیا، آپ کو گالی دی، لیکن جب آپ اس کو معاف کر رہے ہیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے اور ہمارا نفس دھوکہ بھی دیتا ہے کہ تم اس کو معاف کر کے اپنی کمزوری دکھلاتے ہو؟ اس میں تو اپنی بے عزتی ہے اور عام طور پر اسی کی وجہ سے آدمی کو طیش آجاتا ہے، اس کی طبیعت میں غصہ آجاتا ہے، اور انتقام کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اس کی طرف سے آپ کے ساتھ کی گئی اس گستاخی اور نامناسب سلوک کو اگر آپ معاف کر دیں گے، تو یوں نہ سمجھئے کہ اس کی وجہ سے آپ کی عزت پر کوئی حرف آگیا اور آپ کی عزت میں کمی ہو گئی، آپ کا ویلیو گھٹ گیا اور بے عزتی ہو گئی۔ ہرگز ایسا نہیں ہو گا، بلکہ معاف کرنے کی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کی عزت

بڑھائیں گے۔بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاف کرکے آدمی اپنی کمزوری دکھارہا ہے اور عزت گھٹ رہی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کے نتیجہ میں اس کی عزت کو اور زیادہ بڑھائیں گے، اس میں اور اضافہ کریں گے۔

الیوم یوم المرحمۃ

حضورِ اکرم (ﷺ) کے ساتھ زندگی بھر جن لوگوں نے ایذارسانی کا معاملہ کیا، آپ کی عزت کے درپئے رہے، آپ کو طرح طرح سے تکلیفیں پہنچائیں، آپ کو جھٹلایا، آپ کو وطن سے بے وطن کیا، یہاں تک کہ مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد بھی آپ کے پیچھے پڑے رہے، لشکر لے کر حملے کرنے کے لئے آتے رہے۔ایسا معاملہ کرنے والوں کو آخر حضورِ اکرم (ﷺ) نے فتحِ مکہ کے موقعہ پر معاف کردیا۔جب آپ کعبۃ اللہ سے باہر آئے اور دروازے پر کھڑے ہوکر دیکھا کہ مکہ والے تمام کے تمام مسجدِ حرام میں جمع ہیں، تو آپ نے پوچھا: تم لوگ میرے متعلق کیا خیال کرتے ہو کہ مَیں تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا؟ ان لوگوں نے جواب دیا: "أَخٌ كَرِيمٌ وَابْنُ أَخٍ كَرِيمٍ" آپ شریف بھائی ہیں، شریف بھائی کے بیٹے ہیں، ہم آپ سے بھلائی ہی کی توقع رکھتے ہیں چناں چہ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: "لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، إِذْهَبُوا، أَنْتُمُ الطُّلَقَآءُ" اکثر یہ ہوتا ہے کہ آدمی معاف کرنے بعد بھی دو ایک جملے تو کہہ ہی دیتا ہے کہ چلو! معاف کردیا، پھر ایک آدھ بات سنا دیتا ہے، لیکن حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ تم پر کوئی ملامت

نہیں ہے، جاؤ! تم سب آزاد ہو، آپ (ﷺ) نے ان لوگوں کے ساتھ جو معاملہ کیا تو اس کی وجہ سے کیا آپ (ﷺ) کی عزت میں کمی آگئی؟ نہیں! بلکہ اللہ تعالیٰ نے عزت اور بڑھادی، آپ کا مرتبہ اور زیادہ بلند ہوا۔

کوئی آدمی اگر یہ سمجھتا ہو کہ اس کے ساتھ نازیبا، ناروا اور نامناسب سلوک کرنے والے، یا گالی دینے والے، یا ایذائیں اور تکلیفیں پہنچانے والے کو معاف کرنے کی وجہ سے ہماری عزت گھٹتی ہے؛ تو اس کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، اللہ تعالیٰ اس کے نتیجہ میں اس کی عزت کو بڑھاتے ہی ہیں، کرکے تو دیکھو۔ حضورِ اکرم (ﷺ) جب قسم کھا کر ایک بات فرمارہے ہیں تو آدمی تجربہ کرلے، تجربہ کرنے سے آپ ہی آپ اس بات کا اندازہ ہوجائے گا۔

تواضع کی زبردست خاصیت

"وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلاَّ رَفَعَهُ اللّٰهُ" کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے، اپنے آپ کو کمتر سمجھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے درجہ کو بلند ہی کرتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کبریائی وبڑائی اور اس کی عظمت جس کے دل میں سما جائے، اس کی بات ہی کچھ اور ہوجاتی ہے؟ پھر بھلا وہ اپنے آپ کو کہاں اونچا اور بڑا سمجھ سکتا ہے؟ جس کو اللہ تعالیٰ کی عظمت کا استحضار ہر وقت ہو، جس کی نگاہوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بڑائی وکبریائی ہو، وہ کبھی اپنی ذات کی طرف نظر کر ہی نہیں سکتا۔

جب عظمت الٰہی جاگزیں ہوتی ہے

حضرت مولاناشاہ وصی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کاارشادہے:﴿إِنَّ الْمُلُوكَ إِذَادَخَلُواقَرْيَةًأَفْسَدُوهَاوَجَعَلُوا أَعِزَّةَ أَهْلِهَا أَذِلَّةً﴾ دنیاکے بادشاہوں کادستوریہ ہے کہ جب کسی آبادی یاملک میں فاتحانہ طور پر داخل ہوتےہیں تواس کوزیرکرکے اس کے عزت والے لوگوں اور سرداروں کو قید کرکے رسوا و ذلیل کرتے ہیں؛تاکہ وہ دوبارہ مقابلہ میں سراُٹھانے کے قابل نہ رہیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت اوراس کی عظمت جب کسی دل میں آجاتی ہے توپھر نفس کا غرور، اس کا کبر، اس کا حسد اور جتنے بھی بڑے بڑےروگ نفس کے اندر ہیں،سب زیر ہوجاتے ہیں،اللہ تعالیٰ ان کوختم کردیتاہے۔تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ کے لئے تواضع اختیارکرتاہے تواللہ تعالیٰ اس کو سربلندی عطافرماتے ہیں۔یہ تواضع کی زبردست خاصیت ہے۔

کتے اورسور سے بھی گیاگزرا

حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشادفرمایا:جو آدمی اللہ تعالیٰ کے واسطے تواضع اختیار کرتا ہے تواللہ تعالیٰ اس کوسربلندی عطافرماتے ہیں"فَهُوَفِي نَفْسِهِ صَغِيْرٌوَفِي أَعْيُنِ النَّاسِ عَظِيمٌ"وہ اپنی نگاہوں میں چھوٹاہوتا ہے لیکن لوگوں کی نگاہوں میں بڑاہوتاہے۔اوریہ بھی ارشادفرمایاکہ جوآدمی تکبر

کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرکے رہتا ہے "فَهُوَ فِي أَعْيُنِ النَّاسِ صَغِيرٌ، وَفِي نَفْسِهِ كَبِيرٌ" وہ آدمی اپنی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے، وہ اپنے آپ کو اونچا سمجھتا ہے کہ مجھ جیسا کوئی نہیں "ہم چوں من دیگرے نیست" بعض لوگوں نے اس میں ترمیم کرتے ہوئے یہ کہا ہے "ہم چوں من ڈنگرے نیست" میرے جیسا کوئی جانور نہیں ہے۔ جب وہ یوں سمجھتا ہے کہ میرا اہم مرتبہ کوئی نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کرتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہوں میں بڑا ہوتا ہے، لیکن لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتا ہے آگے حضور (ﷺ) فرماتے ہیں: "حَتَّى لَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِمْ مِنْ كَلْبٍ أَوْ خِنْزِيرٍ" یہاں تک کہ لوگوں کی نگاہوں میں وہ کتے اور سور سے بھی زیادہ ذلیل ہو جاتا ہے (شعب الایمان:۷۷۹۰) وہ آدمی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے، لیکن اس کو معلوم نہیں کہ لوگوں کا میرے متعلق کیا خیال ہے۔

پچھلی مجلس میں عربی کی ایک کہاوت سنائی تھی کہ جو آدمی تکبر کرنے والا ہوتا ہے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ پہاڑ پر کھڑا ہونے والا آدمی ہوتا ہے، اس کو نیچے والے چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، وہ اپنے تکبر کی وجہ سے دوسروں کو حقیر وذلیل سمجھتا ہے، لیکن نیچے والے بھی اس کو چھوٹا ہی دیکھتے ہیں، یعنی نیچے والوں کو بھی وہ بڑا نظر نہیں آتا۔

تواضع کا اعلیٰ نمونہ

حدیث ۶۰۴:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ): أَنَّهُ مَرَّ عَلَى صبيانٍ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ، وقال: كَانَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) يفعله. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- ایک مرتبہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کا کچھ بچوں کے پاس سے گزر ہوا تو انہوں نے خود ہی بچوں کو سلام کیا، اس کے بعد فرمایا: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی ایسا ہی کرتے تھے۔

افادات:- یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جب بچوں کے پاس سے گزرتے تھے تو آپ ازخود بچوں کو سلام کرتے تھے۔ اس سے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تواضع کا پتہ چلتا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مقام تو بہت بلند تھا، اس کے باوجود آپ جب بچوں کے پاس سے گذرتے تھے تو سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ ویسے بھی بعض روایتوں میں ہے: "اَلْبَادِئُ بِالسَّلامِ بَرِئٌ مِنَ الْكِبْرِ (فیض القدیر شرح جامع الصغیر)" جو آدمی سلام میں ابتدا کرتا ہے وہ عام طور پر تکبر سے بری ہوتا ہے۔ اور جس کے دل میں کبر ہوتا ہے وہ عام طور پر سلام میں ابتدا نہیں کرتا، وہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ مجھے سلام کریں، میں کسی کو سلام کیوں کروں؟ لیکن حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عمل یہ تھا کہ آپ بچوں تک کو اپنی طرف سے سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ اس میں بچوں کی تعلیم و تربیت بھی مقصود ہے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تواضع کا بھی پتہ چلتا ہے۔

ایک اور نمونہ

حدیث ۶۰۵:-

وعنه قَالَ : إن كَانَتِ الأَمَةُ مِنْ إمَاءِ المَدِينَةِ لَتَأْخُذُ بِيَدِ النَّبِيِّ (ﷺ) فَتَنْطَلِقُ بِهِ حَيْثُ شَاءتْ . (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مدینہ کی باندیوں میں سے کوئی باندی (اور بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ مدینہ کی بچیوں میں سے کوئی بچی) حضورِ اکرم (ﷺ) کا ہاتھ پکڑ لیتی تھی اور جہاں چاہتی لے جاتی تھی۔

افادات:- یعنی آپ اس کے کہنے پر بھی انکار نہیں فرماتے تھے اور وہ آپ کو جہاں لے جانا چاہتی وہاں آپ تشریف لے جاتے تھے۔ اس سے آپ (ﷺ) کی غایتِ تواضع معلوم ہوتی ہے۔

گھر کے نبوی اعمال

حدیث ۶۰۶:-

وعن الأَسْوَدِ بن يَزِيدَ، قَالَ : سُئِلَتْ عائشةُ (رضی اللہ عنہا) مَا كَانَ النَّبِيُّ (ﷺ) يَصْنَعُ فِي بَيْتِهِ ؟ قالت : كَانَ يَكُونُ فی مِهْنَةِ أَهْلِهِ - يعني : خِدمَة أهلِه - فإذا حَضَرَتِ الصَّلاَةُ، خَرَجَ إِلَى الصَّلاَةِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت اَسود بن یزید (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے پوچھا گیا: حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب گھر میں تشریف لاتے تھے تو کیا کرتے تھے؟(یعنی گھر میں رہنے کے درمیان آپ کیا کام کرتے تھے ؟)حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا : گھر والوں کے کام کاج میں رہتے تھے،لیکن جب نماز کا وقت آتا تھا تو فوراً نماز کے لئے نکل جاتے تھے۔

افادات:-یعنی ان کا تعاون کرتے تھے ،گھر کے کام کاج میں مدد فرماتے تھے۔ چناں چہ بعض روایتوں میں ہے کہ اگر مشک پھٹی ہوئی ہوتی تھی تو اس کو سی لیتے تھے، جھاڑو دیتے تھے، بکری کا دودھ اپنے دستِ مبارک سے دوہتے تھے، اپنے کپڑے میں جوں تلاش کرتے تھے۔ ویسے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جوں نہیں ہوتی تھی شرّاح نے لکھا ہے کہ ایسا ہوتا ہے کہ جب آدمی دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھتا ہے تو کسی کی جوں چڑھ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) گھر میں جاکر ان چھوٹے چھوٹے کاموں کا اہتمام فرماتے تھے۔گھر والوں کے کام کاج میں اس طرح تعاون اور مدد کرنا، ان کا ہاتھ بٹانا؛ یہ غایتِ تواضع کی علامت ہے۔ متکبر بھلا ایسا کر سکتا ہے؟ وہ تو لیجئے دیجئے ہی میں لگا رہتا ہے۔ ایسا آدمی جب گھر بھی جاتا ہے تو گھر والے اس کی وجہ سے پریشان ہو جاتے ہیں کہ یہ مصیبت کب یہاں سے نکلے۔ اسی لئے لکھا ہے کہ آدمی کو گھر میں بالکل ہلکا پھلکا رہنا چاہیے، بوجھل بن کر نہیں رہنا چاہیے۔ یعنی گھر والوں کے ساتھ آدمی کا معاملہ ایسا رہے کہ گھر والے اس کے وجود کو گھر میں برکت سمجھیں اور یہ سوچیں کہ جتنا زیادہ گھر میں رہے اتنا ہی اچھا ہے، اس کو بوجھ نہ سمجھیں کہ ذرا کسی بچے نے بھی کچھ کہہ

دیا تو اس کو طمانچہ ماردیا۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ذرادیر کے لیے بھی اگر گھر میں گئے تو ایک ہنگامہ کھڑا کردیتے ہیں۔ حالاں کہ حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معاملہ اس نوع کا تھا کہ جب گھروالوں کے درمیان میں ہوتے توگھر کے کام کاج میں ان کا ساتھ دیتے۔

جس وقت،جو فرض

آگے ایک بات فرمائی کہ جب نماز کاوقت آتا تھاتوفوراًنماز کے لئے نکل جاتے تھے۔ دراصل جس کاجیساحق ہواس کواداکرتے رہناچاہیے،جب اللہ تعالیٰ کے حق کاوقت آگیا تواس کی ادائیگی میں بھی کوتاہی اورغفلت نہیں ہونی چاہیے، جیساکہ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم)کاعمل بتلایاکہ نماز کا وقت آنے پر فوراً نماز کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ گھر میں جاکرگھروالوں کے کام میں ان کاہاتھ تو بٹاتے ہیں، لیکن اس میں اتناغلوکرجاتے ہیں کہ نماز کا وقت آتاہے تواس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں،اُدھر کام میں ذراہاتھ بٹانا شروع کیاتو یہاں تک ہاتھ بٹارہے ہیں کہ اِدھر جماعت بھی چھوٹ رہی ہے۔تویہ طریقہ بھی بالکل غلط اورناپسندیدہ ہے۔

پردیسی کے ساتھ متواضعانہ سلوک

حدیث ۶۰۷:-

وعن أَبِي رِفَاعَةَ تَمِيم بن أُسَيْدٍ(رضی اللہ عنہ) قَالَ: انْتَهَيْتُ إِلَى رَسولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) وَهُوَ يخطب، فقلت: يَا رسول الله! رَجُلٌ غَرِيبٌ جَاءَ يَسْأَلُ عن دِينِهِ لا يَدْرِي مَا دِينُهُ؟ فَأَقْبَلَ عَلَيَّ رسولُ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) وتَرَكَ خُطْبَتَهُ حَتَّى انْتَهَى إِلَيَّ، فَأُتِيَ بِكُرْسِيٍّ، فَقَعَدَ عَلَيْهِ، وَجَعَلَ يُعَلِّمُنِي مِمَّا عَلَّمَهُ اللهُ، ثُمَّ أَتَى خُطْبَتَهُ فَأَتَمَّ آخِرَهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابورفاعہ تمیم بن اسید(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا کہ آپ تقریر فرمارہے تھے۔میں نے پہنچتے ہی عرض کیا:اے اللہ کے رسول! ایک پردیسی آدمی اپنے دین کے متعلق آپ سے کچھ پوچھنے کے لیے آیاہے، اس کو یہ معلوم نہیں کہ اس کادین کیاہے؟(کس چیز کاعقیدہ رکھنا چاہیے؟ کس چیز کو عمل میں لانا چاہیے؟ دین کے متعلق اس کومعلومات چاہئیں)وہ صحابی کہتے ہیں کہ میری بات سن کر نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) اپنا خطبہ اور تقریر چھوڑ کر میری طرف متوجہ ہوئے یہاں تک کہ منبر سے اتر کرمیرے پاس آئے، پھر کرسی لائی گئی توآپ اس پر بیٹھےاور اللہ تعالیٰ نے جواحکام بتلائے ہیں وہ مجھے سکھانے لگے۔جب مجھے بتلاچکے توپھر واپس منبرپرتشریف لے گئے اوراپنا خطبہ پوراکیا۔

افادات:-ایک پردیسی آدمی کی بات پر تقریر کودرمیان میں چھوڑدینا غایت درجہ تواضع کی بات ہے۔بعض کام ایسے ہوتے ہیں جس میں آدمی منتظر رہتا ہے کہ یہ کام پوراکرلوں پھر

آپ کی طرف توجہ کرتاہوں۔اگرچہ کوئی آدمی اپنے کسی کام میں مشغولی کی وجہ اس کو پوراکرنے کے بعدتوجہ کرے تویہ چیزتواضع کے منافی نہیں ہے۔

انگلیاں چاٹنا؛تواضع کی علامت

حدیث۶۰۸:-

وعن أنس(رضی اللہ عنہ)أن رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) كَانَ إِذَا أَكَلَ طَعَاماً ،لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلاَثَ. قَالَ: وقال: إِذَا سَقَطَتْ لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيُمِطْ عنها الأَذى،وليَأْكُلْها وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطان.وأمرَ أن تُسْلَتَ القَصْعَةُ،قَالَ: فإنَّكُمْ لاَ تَدْرُونَ فِي أيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کھاناکھاکر فارغ ہوجاتے تھے تواپنی تینوں انگلیوں کوچاٹ لیاکرتے تھے۔اورآپ نے ارشاد فرمایا:کسی کا لقمہ اگر گرجائے تو اس پرجو میل مٹی لگی ہواس کودورکرے،پھراس لقمے کوکھالے،اس کو شیطان کے لیے چھوڑنہ دے۔اور حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے یہ بھی حکم دیاکہ پیالے کو صاف کرکے چاٹ لیاجائے، اس لیے کہ تم کویہ پتہ نہیں ہے کہ تمہارے کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے۔

افادات:-عام طورپر حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ تین انگلیوں-انگوٹھا، انگشت ِشہادت اوردرمیانی انگلی-سے کھاتے تھے۔ان تین انگلیوں ہی سے لقمہ لیتے اورکھاناتناول فرماتے تھے اورجب کھانےسے فارغ ہوجاتےتو ان تینوں انگلیوں کو چاٹ

لیتے تھے۔پہلے درمیانی پھر انگشت ِشہادت پھر انگوٹھا۔اور انگلیوں کو چاٹنا غایت ِتواضع کی بات ہے، متکبر لوگ بھلا ایسا کہاں کرسکتے ہیں؟

شیطان کو آرام نہ پہنچاؤ

"وَلَا یَدَعْھَا لِلشَّیْطَانِ"اس لقمے کو شیطان کے لیے نہ چھوڑدے۔اگر آپ چھوڑدیں گے تو گویا وہ شیطان کی غذا بنے گی،اور شیطان یہی چاہتا ہے، حالاں کہ شیطان کو تو بھوکا ہی رکھنا چاہیے،اس کو کسی طرح کا آرام نہیں پہنچانا چاہیے۔

شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی جب گھر میں داخل ہو تو اللہ کا نام لے کر داخل ہو، اگر آدمی اللہ کا نام لئے بغیر اور گھر میں داخل ہوتے وقت کی جو دعائیں ہیں وہ پڑھے بغیر داخل ہوتا ہے تو شیطان خوش ہوتا ہے کہ چلو! آج اس گھر میں ہمیں رات کو قیام کا موقع مل گیا۔اسی طرح کھانا شروع کرتے ہوئے بھی بسم اللہ نہیں پڑھتا تو وہ خوش ہوجاتا ہے کہ چلو! ہم کو کھانے میں شرکت مل گئی۔اسی لیے شریعت نے ان چیزوں میں اللہ کا نام سکھایا ہے ،اور شیطان ان میں سے اپنا حصہ نکلوانے کے لیے مختلف تدبیریں اپناتا ہے ،وہ ایسی کوششیں کرتا ہے کہ کسی بھی طرح کچھ نہ کچھ آپ سے چھین لے۔کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کئی لوگ ساتھ میں کھانے کے لئے بیٹھے ہیں تو وہ کسی ایسے آدمی کو لے آتا ہے جس نے بسم اللہ نہ پڑھی ہو۔

شیطان لُچّا ہے

ایک مرتبہ حضورِاکرم(ﷺ) کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک باندی دوڑی ہوئی آئی اور برتن میں ہاتھ ڈالناہی چاہتی تھی کہ آپ نے اس کاہاتھ پکڑلیا۔اسی دوران ایک اوردیہاتی آیااور جلدی سے بسم اللہ پڑھے بغیرہی ہاتھ ڈالنا چاہتاتھا، آپ نے دوسرے ہاتھ سے اس کاہاتھ بھی پکڑلیا،پھرارشادفرمایا: دیکھو! شیطان کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہیں (صحیح مسلم:۵۳۷۸/مسنداحمد)شیطان یہ چاہتاتھا کہ بسم اللہ پڑھوائے بغیران کو کھانا کھلوائے تاکہ اس کے ضمن میں خود اس کو بھی کھانا مل جائے، لیکن میں نے اس کے ہاتھوں کو پکڑلیا۔معلوم ہواکہ اس کی ایک کوشش یہ بھی ہوتی ہے۔

اس طرح کھاتے کھاتے ایسابھی ہوتاہے کہ کوئی لقمہ گرجاتاہے ،توہوسکتاہے کہ شیطان ہی نے آپ کے ہاتھ سے کسی طریقہ سے گروادیاہو۔جو لُچّے لوگ ہوتے ہیں نا وہ ایساہی کیاکرتے ہیں کہ آپ کوئی چیز کھارہے ہوں تو ہاتھ ماردیتے ہیں تاکہ گرجائے اوروہ اٹھاکرکھالیں۔ توشیطان بھی لُچّاہے، اس کی عادت بھی یہی ہے کہ آپ کے ہاتھ سے لقمہ کسی طرح نیچے گرادے،اگرآپ اس کویوں ہی چھوڑدیں گے تووہ کھالے گااوراس کامقصدحاصل ہوجائے گا،اس لیے حضورِاکرم(ﷺ) فرماتے ہیں کہ آپ اس کواٹھاکرصاف کرکے کھالیجئے،تاکہ شیطان کوشرکت کاموقع نہ ملے۔

ایک جزو بھی ضائع نہ جائے

"فَإِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ الْبَرَكَةُ" حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کرکے چاٹ لیا جائے، اس لیے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے۔ یعنی پیالے میں جتنا کھانا ہے وہ اگر آپ پورا کرچکے ہیں لیکن اس کے کناروں کے اوپر کھانے کے تھوڑے اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو چھوڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ ان کو صاف کرلو۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ پیالے میں ایک کلو کھانا رکھا ہوا ہے وہ سب کھا ہی جاؤ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کو ضرورت کم ہے، اور کھانے کی مقدار زیادہ ہے ،تووہ دوسرے موقع پر کھالی جائے گی،لیکن کھانے کے جو ذرّات اور دانے اس پیالے اور برتن کے اِدھر اُدھر کونے میں لگے ہوئے ہیں، اگر آپ صاف نہیں کریں گے تووہ ضائع ہوکر شیطان کا حصہ بنیں گے،اس لئے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ پیالے کو انگلی سے صاف کرلو اور چاٹ لو، پتہ نہیں کہ کھانے کی برکت کون سے حصہ میں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسی کو چاٹ لینے کے نتیجہ میں آدمی کو سیری نصیب ہوجاتی ہے،اور برکت کا مطلب یہی ہے کہ آدمی کی ضرورت اس سے پوری ہوجائے،ورنہ کھانے کے بعد بھی تقاضا باقی رہ جاتا ہے۔

قدرِ نعمت

ہمارے اکابر تو اس بات کا یہاں تک اہتمام کرتے تھے کہ جو ذرّات منھ میں رہ جاتے وہ بھی ضائع نہ چلے جائیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق سنا کہ کھانا کھاچکنے کے بعد کلی کرنے سے پہلے ایک گھونٹ پانی منھ میں گھماکر حلق سے نیچے اتار لیتے تھے، تاکہ کھانے کے وہ ذرّات باہر نہ گرجائیں۔

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس کہیں سے کوئی ہدیہ آیا،اس ٹوکری پر کچھ ذرّات لگے ہوئے تھے تو آپ نے بڑی محنت سے ان کو تلاش کرکے نوش فرمایا تاکہ وہ ضائع نہ جائیں۔ درحقیقت یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، آدمی جب اس بات کو مدِّنظر رکھے گا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے تو پھر اس کو قدر ہوگی اور اس کو ضائع ہونے سے بچانے کا اہتمام ہوگا۔

حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی (رحمۃ اللہ علیہ) اس کی بڑی اچھی مثال دے کر سمجھاتے تھے: کسی بڑے آدمی نے آپ کو کوئی چھوٹی سی چیز- کھانے کے دوچار لقمے ، ایک دو پیڑے، یا تھوڑی سی مٹھائی- دی ،اس کے سامنے آپ وہ چیز کھارہے ہیں اور وہ دیکھ بھی رہا ہے، تو اب اس کا کوئی ذرہ بھی نیچے گرے گا تو آپ یہ سوچ کر جلدی سے اس کو اٹھالیں گے کہ وہ دیکھ رہا ہے، اگر نہیں اٹھاؤں گا تو وہ کیا کہے گا کہ میری دی ہوئی چیز کی اس کے نزدیک کوئی قدر نہیں

ہے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تو ہر چیز کو دیکھ ہی رہا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمت کی قدردانی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی دی چیز کا ایک ذرّہ بھی ضائع نہ کیا جائے۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں دیکھا کہ اس بات کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہونے دیتے تھے، اگر کسی نے پانی پیا اور آدھا گلاس بچ گیا، تو اس کو پھینکنے کی اجازت نہیں تھی۔ فرماتے تھے کہ بھائی! اس کو رہنے دو، کوئی دوسرا پی لے گا۔

...تب قدر ہوتی ہے

دراصل ہمارے پاس پانی وافر مقدار میں موجود ہے اس لیے ہمیں قدر نہیں ہے۔ آپ نے سنا ہوگا کہ جہاں پانی نہیں ملتا یا کبھی کوئی ایسا موقع آجاتا ہے کہ پانی کی قلت ہو جاتی ہے؛ تب اس کی قدر ہوتی ہے۔ کَنڈلا (گجرات کے ساحل سمندر پر ایک جگہ کا نام ہے) میں جو سمندری طوفان آیا تھا، اس کے بعد وہاں پانی کی قلت ہوگئی تھی ،وہاں جانے والوں نے بتایا کہ جو لوگ مدد کی اشیاء لے کر گئے تھے ان کے پاس خود کے پینے کے لئے پانی کی بوتلیں تھیں۔ وہاں کے لوگ ان کے پاس جمع ہو جاتے اور عاجزی کرتے کہ ہم اتنی مدت سے پیاسے ہیں، ہمیں ایک گھونٹ پانی دے دو۔ ایک گھونٹ پانی کی قدر ایسے مواقع پر معلوم ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کیسی قیمتی نعمت ہے۔ اس لئے اس کی قدردانی کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ضائع نہ ہونے پائے۔

اس روایت میں پیالے کو چاٹنے کا حکم ہے، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) انگلیوں کو چاٹ لیتے تھے، یہ سب تواضع ہی کی چیزیں ہیں۔ جس آدمی کے مزاج میں تکبر ہو گا، وہ بھلا ایسے کام کیسے کرے گا!

وہ ادا بہت پسند آئی

حدیث ۲۰۹:-

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: ((مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيّاً إِلَّا رَعَى الغَنَمَ)) قَالَ أَصْحَابُهُ: وَأَنْتَ؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ، كُنْتُ أَرْعَاهَا عَلَى قَرَارِيطَ لِأَهْلِ مَكَّةَ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کوئی نبی نہیں بھیجا مگر اس نے بکریاں چرائی۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ جی ہاں! مَیں چند قیراط (سکوں) کے بدلہ میں مکہ والوں کی بکریاں چَرایا کرتا تھا۔

افادات:- ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھی بکریاں چَرانا ثابت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے حضراتِ انبیاء کی تربیت ہوتی ہے۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ بکری ویسے تو بڑا مسکین جانور ہے لیکن جب ضد پر آجاتی ہے اور اپنے اگلے پاؤں چوڑے کرکے کھڑی ہو جاتی ہے، تو اس کو ڈنڈا مارو؛ تب بھی نہیں ہٹتی، اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے گی لیکن ہٹے گی نہیں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! تمہیں یاد ہے تم ایک مرتبہ بکریاں چَرا رہے تھے، ایک بکری بھاگی تو تم اس کے پیچھے دوڑے، وہ برابر دوڑتی جا رہی تھی اور تم اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے، یہاں تک کہ جب وہ بھی تھک گئی اور تم بھی تھک گئے، تو وہ تمہارے ہاتھ آ گئی۔ تم اس کو گود میں لے کر کہنے لگے: ارے پیاری! تو نے اتنا بھاگ کر اپنے آپ کو بھی تھکایا اور مجھے بھی تھکا دیا۔ تمہاری یہ ادا مجھے بہت پسند آئی۔ پھر اسی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ کلام فرمایا۔

بتلانا یہ چاہتا ہوں کہ بکریوں کے چرانے میں حضراتِ انبیاء کی ایک طرح سے تربیت کی جاتی تھی۔

حضراتِ انبیاء کی تربیت

ایک موقع پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک غزوہ میں تشریف لے جا رہے تھے، راستہ میں ایک جگہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) پیلو کے پھل توڑنے لگے تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: کالا دیکھ کر توڑنا۔ پیلو کا پھل جب کچا ہوتا ہے تو سبز ہوتا ہے، پھر اس میں پیلا پن آتا ہے، پھر سرخی آتی ہے اور پھر کالا ہوتا ہے، اور جو کالا ہوتا وہی میٹھا ہوتا ہے۔ تو صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے بکریاں چَرائی ہیں؟ یعنی یہ نکتہ تو اسی آدمی کو معلوم ہو سکتا ہے جو بکریاں چَرانے کے لیے جنگل میں گیا ہو۔ گھر پر رہے ہوئے آدمی کو یہ بات معلوم

نہیں ہوسکتی۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں! میں نے بکریاں چَرائی ہیں، اور ہر نبی نے بکریاں چَرائی ہیں۔

ایک بات یادرہے

تو بکریاں چَرانا تواضع کی بات ہے اور تواضع پیدا کرنے والی بھی ہے، لیکن ایک بات یادرہے کہ جس کو بکریاں پالنے کا شوق ہو وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اس کا یہ عمل دوسروں کے لیے ایذاء کا باعث نہ ہو۔ بعض لوگ شوق میں بکریاں پالتے ہیں، پھر ان کی نگرانی نہیں کرتے تو پڑوسیوں کو اس کی وجہ سے تکلیف ہوجاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ورنہ اس کی وجہ سے جھگڑے بھی ہوتے ہیں۔

تو بھی قبول کرلوں گا

حدیث ۶۱۰:-

وعنه، عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لَوْ دُعِيتُ إِلَى كُراعٍ أَوْ ذِرَاعٍ لأَجَبْتُ، ولو أُهْدِيَ إِلَيَّ ذراعٌ أَوْ كُراعٌ لَقَبِلْتُ.

(رواه البخاري)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) ہی سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:اگر کوئی پائے یادست کا گوشت کھانے کے لئے مجھے بلائے،تو میں اس کی دعوت کو قبول کروں گا۔یایہی چیزیں ہدیہ میں دے،تومَیں اس کو بھی قبول کرلوں گا۔

افادات:- بکری کا جو اگلا پیر ہوتا ہے اس کو ''ذراع'' کہتے ہیں۔آپ لوگ کہیں گے کہ پائے توبہت اچھی چیز ہے،سورت والے ناشتہ میں بارہ ہانڈی اور پائے بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں۔اُس زمانہ میں پائے ایسے نہیں پکائے جاتے تھے ،بلکہ وہ لوگ اس کو آگ پر بھون لیتے تھے، اورآپ سمجھ سکتے ہیں کہ بعض مرتبہ دیر تک کوکر میں پکانے بعد بھی وہ کچے رہ جاتے ہیں اور کھائے نہیں جاسکتے، توآگ پر بھوننے پر کیسے بنتے ہوں گے۔پھرپایوں میں کھانے کا حصہ بھی بہت کم ہوتا ہے۔تو حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی اگرمجھے اس کے لیے بھی دعوت دے گاتو میں قبول کروں گا اور اس کے گھرپرحاضری دوں گا۔یاہدیہ میں بھی دے گاتومیں اس کو قبول کرلوں گا۔یہ بھی نہایت تواضع کی بات ہے۔

اس سے معلوم ہواکہ اگر کوئی معمولی یاکم قیمت چیز- جس کی قدروقیمت زیادہ نہ سمجھی جاتی ہو- بھی کسی آدمی کودی جائے، اوروہ اس کو قبول کرلے تو یہ تواضع کی دلیل ہے۔ورنہ جوآدمی متکبر ہوتاہے وہ ایسی چیزکوکہاں قبول کرے گا؟وہ توطرح طرح کی باتیں بنائے گاکہ یہ کیاچیز دینے آئے ہو؟کیا میری بے عزتی کررہے ہو؟

کوئی چیز جب سر اُٹھاتی ہے

حدیث ۶۱۱:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَتْ نَاقَةُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) العضباءُ لَا تُسْبَقُ أَوْ لَا تَكَادُ تُسْبَقُ، فَجَاءَ أَعْرَابِيٌّ عَلَى قَعودٍ لَهُ، فَسَبَقَهَا، فَشَقَّ ذَلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ حَتَّى عَرَفَهُ، فَقَالَ: حَقٌّ عَلَى اللهِ أَنْ لَا يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا وَضَعَهُ. (رواه البخاري)

ترجمہ:-حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی اونٹنی عضباء ہمیشہ آگے ہی رہتی تھی، کوئی دوسرا اونٹ اس سے آگے نہیں جاسکتا تھا۔ایک مرتبہ ایک دیہاتی اپنے نوعمر اونٹ پر آیا، اور اس سے آگے نکل گیا، یہ چیز صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) پر بڑی شاق گذری (برداشت نہیں ہوئی) حضورِ اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے ان جذبات واحساسات کو ان کے چہروں سے محسوس کیا تو ایک اصول ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ پر ضروری ہے کہ دنیا کی کوئی چیز جب سر اُٹھاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو نیچا کر کے رہتے ہیں۔

افادات:-"عضباء" آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) کی اونٹنی کا نام ہے۔"عضباء" دراصل ایسی اونٹنی کو کہتے ہیں جس کا کان کٹا ہوا ہو۔اس اونٹنی کا کان کٹا ہوا تھا یا نہیں؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ اس کا نام نہیں تھا بلکہ اس کا صرف لقب تھا۔

قدرت کا ایک دستور اور قانون ہے کہ جو سر اٹھائے گا، اس کو نیچا ہونا ہے۔اس لئے کوئی آدمی اپنے آپ کو بہت بڑا بنانے کی کوشش نہ کرے، ورنہ ہوتا یہی ہے کہ اس کے لیے

قدرت کی طرف سے نیچا ہونے کی شکلیں پیدا کی جاتی ہیں۔اور جیسا کہ میں نے پہلے مشکوٰۃ شریف کے حوالہ سے ایک روایت ذکر کی تھی کہ جو آدمی تکبر کرتا ہے ،اللہ تعالیٰ اس کو ذلیل کر کے رہتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ آدمی تواضع اختیار کرنے کا اہتمام کرے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق وسعادت نصیب فرمائے

تحریم الکبر والاعجاب

کبر وخود پسندی حرام ہے

۲۴/ جمادی الاخریٰ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۲۳/ ستمبر ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا. أما بعد:-

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ

تکبر اور خود پسندی

نیا عنوان قائم کیا ہے: تکبر اور خود پسندی کا حرام ہونا۔

تکبر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے دوسروں کو حقیر سمجھے۔ اور خود پسندی یہ ہے کہ اپنی خوبیوں پر دوسرے کسی کی تحقیر کے بغیر دل ہی دل میں اِترانا۔یعنی اپنی ذات کے متعلق اچھا گمان ہو،اس میں دوسرے کی تحقیر نہیں ہوتی؛ یہ عجب اور خود پسندی ہے۔

جو بڑا بننا نہیں چاہتے

قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے:﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو عطا کریں گے جو زمین کے اندر نہ تو بڑا بننا چاہتے ہیں، اور نہ فساد پھیلانا چاہتے ہیں۔ اور اچھا انجام متقیوں کے واسطے ہے۔ گویا جب آدمی بڑا بننا چاہتا ہے تو اسی کے نتیجہ میں بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور زمین میں فساد ہوتا ہے۔ اور جو لوگ زمین میں تواضع کے ساتھ رہتے ہیں، بڑائی نہیں چاہتے وہ فساد بھی نہیں پھیلاتے۔ تو اللہ تعالیٰ آخرت میں ایسے ہی لوگوں کو وہاں کا گھر اور نعمتیں عطا فرمائیں گے۔

زمین میں اکڑ کر مت چلو

ایک اور آیت کا حصہ پیش کیا ہے:﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا﴾ زمین میں اکڑ کر مت چلو۔ "مَرَحٌ" یعنی اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہوئے اکڑ کر چلنا۔

سورۂ لقمان کی آیت پیش کی ہے:﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ اپنے رخسار کو تکبر کی وجہ سے لوگوں سے مت پھیرو (متکبر اپنی بڑائی جتلانے کے واسطے لوگوں سے اپنا رخ پھیر لیتا ہے، منھ موڑ لیتا اور اعراض کرتا ہے) اور زمین میں اترا کر نہ چلو، بیشک اللہ تعالیٰ تکبر کرنے والے اترانے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو دشمن رکھتا ہے،اور جس کو اللہ تعالیٰ اپنا دشمن بنائیں پھر اس کے لئے دنیا میں کہاں ٹھکانہ رہے گا،اور کون اس کو اونچا لا سکے گا؟

اترانے کا عبرتناک انجام

قارون کے متعلق قرآن کریم میں ہے:﴿إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِن قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ ۖ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ لَا تَفْرَحْ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ﴾ قارون حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قوم سے (تعلق رکھتا) تھا،اپنی قوم کے مقابلہ میں وہ سرکشی اور غرور پر اتر آیا۔ہم نے اس کو ایسے خزانے عطا فرمائے تھے جن کی کنجیاں بھی بڑے طاقتور لوگوں کی ایک پوری جماعت اٹھایا کرتی تھی۔لوگوں نے اس سے کہا: تو مت اِترا،اِترانے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے، (لیکن وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آیا اور ایک روز اسی اتراہٹ کے اندر عمدہ لباس پہنے ہوئے،اپنے بالوں کو سنوارے ہوئے اکڑتے ہوئے چل رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی دولت، خزانوں،مکان واپارٹمنٹ کے ساتھ زمین کے اندر دھنسا دیا اور قیامت تک دھنستا چلا جائے گا)

گویا جو آدمی عجب ،خود پسندی اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار اور لعنت برستی ہے ،اور ایسا انسان اللہ تعالیٰ کے عذاب کا حق دار بنتا ہے۔

ذرّہ برابر تکبر کی سزا

حدیث ٦١٢:-

وعن عبد الله بن مسعود(رضی اللہ عنہ) عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لاَ يَدْخُلُ الجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ !. فَقَالَ رَجُلٌ : إنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَناً ، ونَعْلُهُ حَسَنَةً ؟ قَالَ : إنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الجَمَالَ ، الكِبْرُ : بَطَرُ الحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ.(رواه مسلم)

(بَطَرُ الحَقِّ): دَفْعُهُ وَرَدُّهُ عَلَى قَائِلِهِ . وَ(غَمْطُ النَّاسِ): احْتِقَارُهُمْ .

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کے دل میں ذرّہ برابر تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ایک شخص نے عرض کیا: آدمی تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں،اس کے جوتے اعلیٰ ہوں (لباس کے معاملہ میں عمدگی کو پسند کرتا ہے؛ تو کیا یہ تکبر کی بات ہے؟) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:اللہ تعالیٰ جمیل وخوبصورت ہے ،اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ تکبر تو حق کا انکار کرنا، قبول نہ کرنا ،اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

افادات:- تکبر کو شیطانی گناہ بتلایا گیا ہے، اور ایسے گناہوں پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ یعنی ذرّہ برابر دل میں تکبر ہوگا تو اس کے ہوتے ہوئے وہ آدمی جنت میں نہیں جاسکتا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ زرد رنگ کی چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں ہوتی ہیں، ان کو عربی میں "ذرّۃٌ" کہتے ہیں۔ کبھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھڑکی یا دروازہ کے سوراخ سے دھوپ کسی

اندھیرے گھر میں آتی ہے تو اس دھوپ کے اندر کچھ اُڑتا ہوا نظر آتا ہے جو عام حالت میں نظر نہیں آتا؛ اسی کو "ذرّہ" کہتے ہیں۔

بعض لوگوں نے ایک روٹی کا وزن کیا اور پھر اس کو کسی جگہ رکھ دیا تو زرد رنگ کی بہت ساری چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں اس پر آگئیں، اس کے بعد ان تمام چونٹیوں سمیت اس کا وزن کیا، تو وزن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مطلب یہ ہے کہ تکبر کا اتنا کم حصہ کہ جس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، اتنا بھی کسی کے دل میں ہے تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ بہت سخت وعید ہے۔

ٹھیک ٹھاک اور ٹیپ ٹاپ

" إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ "، اللہ تعالیٰ جمیل وخوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ "جمال" کا ترجمہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) نے ٹھیک ٹھاک فرمایا ہے، اور اس کی تشریح یہ فرمائی ہے کہ آدمی کا اپنی حالت کو درست رکھنا۔ ایسی صورت نہ ہو کہ اس کی ظاہری حالت کو دیکھ کر کسی کو نفرت یا دل میں کدورت پیدا ہو۔ بعضوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ ایک پائنچہ اونچا اور دوسرا نیچا ہے، ایک آستین چوڑی، دوسری تنگ ہے، ٹوپی بھی پھٹی ہوئی ہے، کپڑے میلے کچیلے اور بال بھی بکھرے ہوئے ہیں؛ ایسی ہیئت کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ آدمی کا لباس چاہے معمولی ہو، لیکن صاف ستھرا ہو اور اس کی ہیئت ٹھیک ٹھاک ہو۔

حضرت شاہ صاحب(رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: ایک تو ہے ٹھیک ٹھاک، اور ایک ہے ٹیپ ٹاپ۔ ٹیپ ٹاپ یعنی تجمل اور زینت؛ اس کو مردوں کے لئے پسندیدہ قرار نہیں دیا ہے، ہاں! عورتوں کے لیے پسندیدہ ہے جبکہ اپنے شوہر کے لیے کرتی ہوں۔ مرد اپنے آپ کو ایسی چیزوں میں لگائے اس کو پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ ٹھیک ٹھاک تو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، لیکن ٹیپ ٹاپ پسند نہیں ہے۔ گویا ٹھیک ٹھاک ایک درمیانی حالت ہے، اور ٹیپ ٹاپ میں آدمی آگے بڑھتا اور غلو کر جاتا ہے، اس لئے اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ تو آدمی اپنا حال درمیانی رکھے، یہ اچھی چیز ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اس کو پسند کرتے ہیں اور ہونا بھی چاہیے؛ یہ تکبر نہیں ہے۔

یہ تکبر نہیں

تو پھر تکبر کیا ہے؟ حضورِ پاک(صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود ہی اس کی تشریح فرمائی ہے۔ اچھا لباس پہننا، اچھا جوتا اور اچھی ٹوپی استعمال کرنا؛ اس کا نام تکبر نہیں ہے ، بلکہ "اَلْكِبْرُ: بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ" حق کا انکار کرنا، حق قبول نہ کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا؛ یہ تکبر ہے۔ اگر اعلیٰ درجہ کے کپڑے پہن کر مزاج میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ کوئی آدمی صحیح اور درست بات کہتا ہے، حق بات پیش کرتا ہے؛ تب بھی وہ انکار کر دیتا ہے کہ اس نے مجھے کیوں کہا؟ دیکھتا نہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں؟ تو یہ تکبر ہوا۔ باقی آدمی اپنا لباس عمدہ سے عمدہ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ سچائی کو

کبھی رد نہیں کرتا، جو حق بات اس کے سامنے پیش کی جاتی ہے اس کو فوراً قبول کرلیتا ہے؛ تو پھر اس کو تکبر نہیں کہیں گے۔

یہ کبر ہے

اور کوئی آدمی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے لیکن حق بات پیش کی جاتی ہے تو وہ قبول کرنے لیے تیار نہیں ہوتا، انکار کر دیتا ہے؛ تو یہ تکبر کی بات ہے۔ بعض فقراء اس مزاج کے ہوتے ہیں، صاحبِ ثروت ہی متکبر ہو یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ یہ تو دل کی ایک کیفیت ہے۔ چناں چہ وہ فقیر جو متکبر ہو، اس کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ رکھتے ہیں، اس لئے کہ اگر کچھ پاس ہے اور تکبر کرتا ہے تو کوئی بات بھی ہے کہ اس کی وجہ سے تکبر پیدا ہوا، لیکن کوئی آدمی فاقہ مست ہے اور تکبر کرتا ہے؛ تو یہ تو بہت ہی زیادہ بری چیز ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ: وہ اپنی دمڑی میں مست اور ہم اپنی چمڑی میں مست۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ چمڑی کونسی مستی کی چیز ہے۔

خبثِ باطن

جس کے اندر کسی گناہ کا سبب ہو اور وہ گناہ کا ارتکاب کرے تو کوئی بات بھی ہے۔ جیسے احادیث میں تین آدمیوں کا ذکر کیا گیا ہے،ایک بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ، اور تیسرا تکبر کرنے والا فقیر؛ان تینوں کو اللہ تعالیٰ بہت زیادہ مبغوض و ناپسندیدہ رکھتے ہیں۔

بوڑھا زانی: بڑھاپے میں ویسے بھی آدمی کے قویٰ جواب دینے لگتے ہیں، بیوی موجود ہو تب بھی آدمی کو اس کی طرف رغبت اور میلان کم ہوجاتا ہے، اور یہ بوڑھا ہوکر زنا میں مبتلا ہوا۔ یہ تو عمر کی وہ منزل تھی کہ اس زمانہ میں حلال طریقے سے بھی یہ چیز ملتی ہے تو آدمی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے، چہ جائیکہ حرام میں مبتلا ہوا۔ گویا یہ اس کے باطنی خبث پر دلالت کرنے والی چیز ہے،اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو بھی بہت زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ رکھتے ہیں

جھوٹا بادشاہ: آدمی عام طور پر جھوٹ اس لئے بولتا ہے کہ وہ کوئی مفاد حاصل کرنا چاہتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ سچائی کے ساتھ مَیں وہ فائدہ حاصل نہیں کرسکوں گا، لیکن بادشاہ کے پاس تو ساری سلطنت ہے،اس کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس کا جھوٹ بولنا تو باطن میں خباثت کا پتہ دیتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو مبغوض رکھتے ہیں۔

فقیر متکبر: فقر کے ساتھ تکبر کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اس کے پاس کچھ ہوتا، ثروت ودولت ہوتی، کوئی منصب وعہدہ ہوتا اور اس کے ساتھ تکبر ہوتا، تو کوئی بات بھی

تھی، لیکن فقر کے ساتھ تکبر کرتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ باطنی خبث کی وجہ سے یہ حرکت کررہا ہے۔

کوئی برا نہیں۔

تو تکبر کی ایک علامت حق کا انکار کرنا۔اور دوسری علامت کسی کو حقیر سمجھنا۔تحقیر بھی بہت خطرناک چیز ہے،شریعت اس کی کسی حال میں اجازت نہیں دیتی۔ مسلم شریف کی روایت ہے، نبیؐ کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: "بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ" کسی آدمی کی برائی کے لیے یہی کافی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے،اللہ تعالیٰ نے ایک مؤمن کے دل میں ایمان کی جو کیفیت اور دولت پیدا فرمائی ہے اس کی وجہ سے اس کا اکرام کرنے کی اوراس کی تحقیرسے بچنے کی شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے ، اس کے پاس بہت بڑی دولت ہے،بلکہ لکھاہے کہ دوسری مخلوقات کو بھی حقیر نہیں سمجھناچاہیے۔

عطاء اور بقاء کا مراقبہ

اورسوال یہ ہے کہ آدمی کس بنیاد پر کسی دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے؟اس لیے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے اس میں اس کے کمال کوکوئی دخل نہیں ہے،بلکہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جب بھی آدمی کو یہ خیال پیداہو کہ میرے پاس دولت ہے،علم ہے تقویٰ و بزرگی

ہے، عملِ صالح ہے،کوئی منصب وعہدہ ہے،غرض ہر وہ چیز جس کی وجہ سے دل میں تکبر پیدا ہوسکتاہے،تواس کے متعلق آدمی یوں سوچے کہ یہ سب مجھے میرے استحقاق کی وجہ سے نہیں ملاہے،بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطاہے،اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ چیزعطافرمائی ہے۔ اورپھریہ بھی سوچے کہ اس کابقابھی اللہ تعالیٰ کے فضل پرہی موقوف ہے، مثلاً:دولت ، علم، بزرگی اورتقویٰ ؛یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ اگراللہ تعالیٰ کا فضل شاملِ حال ہوگاتب ہی باقی رہیں گی، ورنہ آن کی آن میں اللہ تعالیٰ اس کوختم بھی کرسکتاہے۔اگردماغ پرذراسااثر آگیا تو ساری عقل غائب ، اورساراعلم ختم ہوجاتاہے کیسا ہی آدمی ہو ، وہ لوگوں کے لیے کھلونابن جاتاہے،ساری چیزیں اور سارے کمالات دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔اس لئے یہ بات غورکرتے رہنی چاہیے کہ جوکچھ بھی ہے، محض اللہ تعالیٰ کی عطا اوراس کی بخشش ہے ،اوراس میں میرے کسی بھی استحقاق کو دخل نہیں ہے،پھراس کاباقی رہنابھی اللہ تعالیٰ کی مشیت ہی پر موقوف ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میں جس کوکمزور سمجھ رہاہوں ،کیاضروری ہے وہ ہمیشہ ایساہی رہے۔ابھی اس کے پاس یہ چیز نہیں ہے،ہوسکتاہے کہ یہ چیز آج جومیرے پاس ہے، کل کو اللہ تعالیٰ مجھ سے زیادہ اچھے اندازمیں اس کودیدے۔مثلاً :ہم اپنے آپ کو اس لیے بڑاسمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس دولت ہے،اس کے پاس نہیں ہے،لیکن ہوسکتاہے کہ کل اس کے پاس ہم سے ڈبل دولت آجائے۔دنیامیں ایسے واقعات ہوتےہی رہتے ہیں کہ کل جس کے پاس

کچھ نہیں تھا،ایک مدت کے بعد اس کے پاس دولت کی ریل پیل ہوجاتی ہے۔تواپنی جس نعمت کی وجہ سے مَیں اپنے آپ کوبڑا اور سامنے والے کو حقیر سمجھ رہاہوں؛کیا ضروری ہے کہ میرے پاس وہ نعمت باقی رہے اورکیا ضروری ہے کہ اس کے پاس آئندہ نہ آئے ؟ہوسکتاہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو مجھ سے زیادہ مقدارمیں دیدے۔ آدمی اگریہ ساری باتیں سوچتارہے گاتوکبھی کسی کی تحقیردل میں پیدا نہیں ہوگی۔

اتنی نہ بڑھا۔

اور تحقیرہی کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے آدمی محروم ہوجاتاہے۔جب یہ کیفیت کسی کے دل میں پیداہوجاتی ہے تواللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تیرے پاس جوکچھ بھی ہے وہ میری عطاہے،تیرے کمال کواس میں کیا دخل ہے؟اگر کسی کے پاس علم یا دولت،بزرگی،تقویٰ وپرہیزگاری ہے،اوروہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتاہے ؛تواس کے بارےمیں خودباری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَداً وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ﴾اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اوراس کی رحمت شاملِ حال نہ ہوتی توتم میں سے کوئی بھی گناہ سے بچ نہیں سکتا تھا۔

﴿مَا زَكَىٰ مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَداً﴾اہلِ علم جانتے ہیں کہ جب نکرہ نفی کے تحت آتاہے توعموم کافائدہ دیتاہے۔اور باری تعالیٰ پوری تاکید کے ساتھ فرمارہے ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی گناہ سے بچ ہی نہیں سکتاتھا۔لیکن اللہ تعالیٰ جس کوچاہتاہے اس کوگناہوں سے بچنے کی

توفیق عطا فرماتاہے۔اس لئے اگرہمیں توفیق ملی ہے تو یہ محض اللہ تعالیٰ کاکرم ہے: ﴿فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ اپنے آپ کوپاک صاف ظاہر مت کرو، اپنی پاکی پر مت اتراؤ،اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کون گناہ سے بچنے والاہے۔علامہ اقبال نے کہاہے:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت		دامن کو ذرا دیکھ ، ذرا بند قبا دیکھ

یعنی آدمی کوخوداپنے حالات پر نظر کرتے رہنا چاہیے،خودآدمی اپنے حالات سے دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ واقف ہوتاہے،اس لیے کسی کی تحقیرتوہونی ہی نہیں چاہیے۔

کبر سے ارتداد تک

پہلے بھی میں نے قصہ سنایاتھا، موقعہ کی مناسبت سے پھرسناتاہوں۔اس واقعہ کوابن سعدنے اپنی کتاب طبقات میں حضرت عروہ بن زبیر(رضی اللہ عنہ) کے حوالہ سے ذکرکیاہے۔حجۃ الوداع کےموقع پرنبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)میدانِ عرفات سے روانگی کے لیے تیارتھے ،آفتاب غروب ہوچکاتھا،لیکن ایسامعلوم ہوتاتھاکہ آپ کسی کاانتظار کررہے ہیں۔حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس یمن کے کچھ سردارقسم کے لوگ بھی موجودتھے،وہ آپس میں گفتگوکرنے لگے کہ ایسالگ رہاہے کہ حضورکسی کے انتظارمیں کھڑے ہیں کہ وہ آجائیں توچلیں،لیکن پتہ نہیں کہ کس کاانتظارہے؟ اتنے میں ایک نوجوان سانولے رنگ کا ،دبلا پتلا، ہونٹ موٹے،چپٹاچہرہ آیا۔یہ حضرت اسامہ بن زید(رضی اللہ عنہ) تھےجو حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے بڑے لاڈلے تھے۔چہرے مہرے سے خوبصورت

نہیں تھے، ان کے والد حضرت زید (رضی اللہ عنہ) گورے چٹے تھے، لیکن ان کی والدہ سیاہ فام تھیں، حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہ) پر اُن کا ہی اثر آیا تھا۔ خیر! ان سردار قسم کے لوگوں نے جب اِن کو دیکھا تو آپس میں کہنے لگے کہ: ان کی وجہ سے ہمیں اتنی دیر یہاں انتظار کروایا گیا؟ گویا ایک قسم کی تحقیر ان کے دل میں پیدا ہوئی۔ حضرت عروہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) -جو اس واقعہ کے راوی ہیں- فرماتے ہیں: فَلِذٰلِكَ كَفَرَ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ أَجلِ ذَا، اسی وجہ سے یمن والے کفر وارتداد میں مبتلا ہوئے۔

صاحبِ طبقات محمد بن سعد کہتے ہیں: میں نے اپنے استاذ یزید بن ہارون -جو بڑے محدث ہیں- سے پوچھا کہ حضرت عروہ (رضی اللہ عنہ) کے اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ انہوں نے فرمایا: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد ارتداد کا فتنہ پھیلا، بہت سے لوگ اسلام چھوڑ کر کافر ہوگئے ان میں یمن کے اسی علاقہ کے لوگ مبتلا ہوئے، اور اس کی وجہ ان کا یہی تحقیر کا جملہ تھا۔

(حیاۃ الصحابۃ. جلد:۲۔ ص:۵۳۴. الاستخفاف بالمسلم واحتقارہ)

دوسرا واقعہ

شیخ ابو عبداللہ اندلسی (رحمۃ اللہ علیہ) کا عبرت ناک واقعہ ہے۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے آپ بیتی میں بڑی تفصیل سے پورا قصہ ذکر کیا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے مستقل رسالہ لکھا ہے، کسی زمانہ میں مَیں نے اس کا گجراتی کیا تھا اور گجراتی میں وہ شائع بھی ہو چکا ہے۔

ایک بڑے محدث تھے ، قراءاتِ سبعہ کے ساتھ قرآنِ پاک کے حافظ ، عربی کے بڑے ماہر، اوراپنے وقت کے بہت بڑے بزرگ تھے، ان کی خانقاہیں تھیں، سیکڑوں ان کے مرید تھے۔ایک مرتبہ اپنے مریدوں کے ساتھ ایک جگہ سے گزر رہے تھے جو عیسائیوں کی بستی تھی ،وہاں سے گذرنے کے دوران ان کے کلیساؤں اور عبادت گاہوں سے ناقوس کی آوازآرہی تھی اور وہاں سور بھی چررہے تھے۔ان کے دل میں ان لوگوں کی تحقیر آئی کہ یہ عجیب قوم ہے، کس چیز کی عبادت کرتے ہیں اور کس دین پر عمل کرتے ہیں؟وہ فرماتے ہیں کہ اسی وقت میں نے ایک آواز سنی کہ تمہیں جوکچھ ملا ہے ،وہ توہماری عطا ہے، اس میں تمہارے کونسے عمل اور صلاحیت کو دخل ہے؟اسی بستی سے گزررہے تھے تو دیکھا کہ اس بستی کے سردار کی نوجوان لڑکی اپنی سہیلیوں کے ساتھ پانی بھرنے کے لیے کنویں پر جارہی تھی،جب اس پر نظرپڑی توان کادل اس پر آگیا، شیخ وہیں کھڑے ہوگئے اور ہٹنے کانام ہی نہیں لے رہے ہیں۔مریدین منتظرہیں کہ شیخ چلیں تو ہم بھی چلیں۔کچھ دیربعد شیخ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: اب تومیں یہیں کا ہوگیاہوں۔پھر انہوں نے باقاعدہ پیغامِ نکاح بھیجاتوسردار نے کہا: میں اپنی بیٹی ایسے نہیں دے سکتا،بلکہ میری چندشرطیں ہیں: آپ ایک مدت تک یہیں رہیے، ہمارے دین کواختیار کیجیے،اور اتنے زمانہ تک میرے سور چرائیے؛تب میں اس کا نکاح آپ سے کروں گا۔شیخ نے اپنے مریدوں سے اپنارشتہ توڑکرکہا: تم لوگ جاؤ، میں تمہارے ساتھ آنے والانہیں ہوں،وہیں رہ گئے اور ایک لمبی مدت تک اسی حالت میں رہے۔

شیخ کے سب معتقدین پر اس واقعہ کا بڑا اثر تھا کہ اتنا بڑا محدث، اتنا بڑا عالم اور اتنا بڑا شیخِ وقت کس ابتلاء میں پھنس گیا! سب مریدین بیچارے رو رو کر دعا کرتے تھے کہ: اے اللہ! ہمارے شیخ کو اس ابتلاء و آزمائش سے نکال دے۔ کچھ مدت کے بعد مریدین شیخ کی خیریت دریافت کرنے کے لئے واپس آئے، تو دیکھا کہ سر پر نصاریٰ کی ٹوپی ہے، کمر پر زنار باندھا ہوا ہے، اور اسی عصا پر ٹیک لگائے کھڑے ہیں جس کا سہارا لے کر اپنے مریدین کی تربیت کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے کھڑے رہتے تھے، اور سوروں کو چرا رہے ہیں۔ حضرت شبلیؒ اور حضرت جنیدؒ بھی اس قافلہ میں تھے، حضرت شبلی نے شیخ سے کچھ سوالات کیے کہ آپ کو تو پورا قرآنِ پاک قراءاتِ سبعہ کے ساتھ یاد تھا؛ اب بھی اس کی کوئی آیت یاد ہے؟ شیخ نے کہا: دو آیت کے سوا کچھ یاد نہیں، ایک تو یہ ہے: ﴿وَمَن يُّهِنِ اللهُ فَمَالَهُ مِن مُّكْرِمٍ إِنَّ اللهَ يَفْعَلُ مَايَشَاءُ﴾ جس کو اللہ تعالیٰ ذلیل کرتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اور دوسری یہ ہے: ﴿وَمَن يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالإِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ جس نے ایمان کے بدلے میں کفر اختیار کیا تحقیق وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہوگیا۔ پھر پوچھا: آپ کو تو ہزاروں حدیثیں یاد تھیں، اب بھی کوئی یاد ہے؟ کہا: صرف ایک حدیث یاد ہے: «مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهُ فَاقْتُلُوْهُ» جو آدمی اپنا دین بدل دے اس کو قتل کردو۔

خیر! بعد میں پھر اللہ تعالیٰ نے توفیق دی، توبہ کرکے دوبارہ ایمان میں آئے، اور پھر وہی سارا علم اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عطا فرمایا۔ یہ سب ہوچکنے کے بعد میں انہوں نے اپنے اس ابتلاء و

آزمائش کی جووجہ بتلائی وہ یہی تھی کہ میرے دل میں اس بستی والوں کے متعلق حقارت کاجذبہ آیاتھا،اسی کی وجہ سے اس آزمائش میں اللہ تعالیٰ طرف سے ڈالاگیا۔(نوٹ :-یہ قصہ مفصل آپ بیتی نمبر۵ میں ملاحظہ فرمائیں۔مرتب۔)

دینی کام کرنے والوں سے

بہت سی مرتبہ دین کے کام میں لگے ہوئے لوگ اس قسم کی آزمائش میں مبتلا ہوجاتے ہیں،اس کے پیچھے بھی عام طورپریہی چیزکارفرماہوتی ہے،اس لئے اللہ تعالیٰ نےاگرکسی کودینی کام کی توفیق عطا فرمائی ہے ، علمی ، تصنیفی ، تبلیغی ،یاکسی بھی لائن سے؛توکبھی کسی بندۂ خداکی تحقیردل میں نہیں آنی چاہیے۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ)فرماتے ہیں کہ میں ہر مسلمان کوحالاًاورکافرکومآلاًاپنے سے بہترو افضل سمجھتاہوں۔مسلمان کواس لیے کہ ایمان جیسی نعمت اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی ہے،اور ہوسکتاہےاس کی کوئی خوبی اور وصف ایساہوجواللہ تعالیٰ کے یہاں اس کومیرے مقابلہ میں زیادہ مقام دلانے کا باعث ہو؛اس لیےمیں اس کو اپنے سے افضل سمجھتاہوں۔اورہرکافرکو احتمالاًافضل سمجھتا ہوں،ہوسکتاہےکہ کل کووہ اسلام لے آئے، اور مدارتوخاتمہ پرہے۔کسی کو معلوم نہیں کہ کس کاخاتمہ کس حال پر ہوتا ہے،کسی کافرکے متعلق بھی ہم گارنٹی سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کفرپر ہی مرے گا، کل کواللہ تعالیٰ نے ہدایت دیدی،اوردنیاسے ایمان کے ساتھ چلا گیاتووہ توکامیاب ہوگیا،اورکسی مؤمن کے متعلق گارنٹی

نہیں دی جاسکتی کہ ایمان کے ساتھ ہی دنیا سے جائے،نعوذباللہ کہیں محرومی کی نوبت آئی اور ایمان سے محروم ہوکرگیا تووہ ناکام ہوا۔اس لئے آدمی کے دل میں کسی کی بھی تحقیر نہیں آنی چاہیے، اس سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے،اس کے نتیجہ میں آدمی بہت ساری آزمائشوں میں مبتلا ہوتاہے،اسی کو ’’غَمْطُ النَّاس‘‘ کہا گیاہے۔

پھر کبھی ہاتھ نہ اٹھاسکا

حدیث ۶۱۳:-

وعن سلمةبن الأكوع(رضی اللہ عنہ) أنّ رَجُلاً أكَلَ عِنْدَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) بشمالِهِ. فَقَالَ : كُلْ بيَمِينِكَ . قَالَ : لاَ أسْتَطِيعُ ! قَالَ: لاَ اسْتَطَعْتَ. مَا مَنَعَهُ إلاَّ الكِبْرُ. قَالَ: فما رفعها إِلَى فِيهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:-حضرت سلمہ بن اَکوع(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: ایک آدمی نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کے پاس بیٹھ کربائیں ہاتھ سے کھانا کھارہاتھا۔حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھاؤ(توحق بات کوقبول نہ کرتے ہوئے) اس نے کہا:میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھاسکتا(حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔وہ دائیں ہاتھ سے کھاسکتاتھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا،اوربات نہیں مانی)توحضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: ٹھیک ہے!اب نہیں کھاسکو گے(حضرت سلمہ(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں)اس کے بعد کبھی وہ اپنادایاں ہاتھ اٹھاہی نہیں سکا(ہمیشہ کے لئے اس کادایاں ہاتھ بیکار ہوگیا۔)

افادات:-بہت سی مرتبہ کسی آدمی کو بھلائی کے کام کے لئے یا کسی برائی سے بچنے کے لئے کہا جاتا ہے، تو اس بات کو رد کر دیتا ہے، حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ جو بات مجھے کہی جارہی ہے وہ بالکل درست ہے، لیکن کبر کی وجہ سے اس کو قبول نہیں کرتا، تو پھر اس کو اسی طرح کی تکلیفیں بھگتنی پڑتی ہیں۔اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے۔

پھر جنت کے قابل بنے گا

حدیث ۶۱۴:-

وعن حارثة بن وهبٍ(رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم) يقول: ألا أُخْبِرُكُمْ بأَهْلِ النَّار: كلُّ عُتُلٍ جَوّاظٍ مُسْتَكْبِرٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت حارثہ بن وہب(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا: میں تمہیں جہنمیوں کے متعلق نہ بتاؤں (کہ کون لوگ جہنم میں جائیں گے؟) ہر بد مزاج ،منھ پھٹ، غرور کرنے اور اترانے والا۔

افادات:-اگر مؤمن ہے تب بھی تکبر کے ہوتے ہوئے جنت میں نہیں جاسکتا۔ جہنم کی بھٹی میں ڈال کر تکبر سے پاک صاف کریں گے، پھر جنت میں جانے کے قابل بنے گا۔

جنت ودوزخ کا مناظرہ

حدیث ۶۱۵:-

وعن أبي سعيدنالخدری(رضی اللہ عنہ) عن النبی(صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ:احتَجّتِ الجَنَّةُ وَالنَّارُ ، فَقَالَت النَّارُ : فيَّ الجَبَّارُونَ والمُتَكَبِّرُونَ.وقالتِ الجَنَّةُ: فيَّ ضُعفاءُ الناسِ ومساكينُهم،فقضى اللهُ بَينهُما: إنكِ الجنّةُ رَحمَتِي،أرْحَمُ بِكِ مَنْ أشَاءُ،وَإنَّكِ النَّارُ عَذَابِي أُعَذِّبُ بِكِ مَنْ أشَاءُ،وَلِكِلَيْكُمَا عَلَيَّ مِلْؤُهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:-حضرت ابو سعید خدری(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت اوردوزخ میں آپس میں دلیل بازی ہوئی(یعنی دونوں میں سے ہر ایک نے اپنی فوقیت جتانے کے لیے دلیلیں پیش کیں، دونوں میں مناظرہ ہوا) جہنم کہنے لگی: میرے اندر توبڑے بڑے سرکش اور تکبر کرنے والے ہیں (دنیامیں جوبڑے سمجھے جاتے تھے ،جیسے: فرعون، ہامان، قارون و شداد)اور جنت کہنے لگی : میرے اندر توکمزور مسکین قسم کے لوگ ہیں۔اللہ تعالیٰ نے دونوں کے درمیان فیصلہ کیا(کہ لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے)جنت سے کہا:تو میری رحمت کا مظہر ہے،مَیں جس کے ساتھ رحم کا معاملہ کرنا چاہتاہوں، اس کو تیرے اندر بھیج دیتا ہوں۔اور جہنم سے کہا:تومیری سزا دینے کاذریعہ ہے، تیرے ذریعہ مَیں جس کوچاہتاہوں سزا دیتاہوں۔اورتم میں سے ہر ایک کے لیے میرے پاس بھرا واہے(یعنی تمہاری ضرورت اور مانگ پوری کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔جنت کو بھی میں اس کے مناسب لوگوں سے بھروں گا۔اور جہنم کو بھی میں اس کے مناسب لوگوں سے بھروں گا)

جو چھوٹوں کو بڑا بنادے

افادات:-بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ جہنم کے مقابلہ میں جنت نے کیا دلیل پیش کی؟ وہ تو یوں کہہ رہی ہے کہ میرے اندر کمزور اور مسکین لوگ ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں: وہ یہ بتلانا چاہتی ہے کہ جو دنیا میں کمزور اور ناقابلِ توجہ سمجھے جاتے تھے، میرے اندر آنے کے بعد آج وہ بادشاہ بن گئے اور بڑے شمار ہونے لگے۔ تو جو چھوٹوں کو بڑا بنادے، اس کے کمال کا کیا کہنا۔ دراصل جنت کی بات میں بھی اس کے اندر جانے والے لوگوں کی صفات کا اثر ظاہر ہو گیا، اصل میں جنت یہی کہنا چاہتی ہے، لیکن اس چیز کو وہ تواضع والے انداز میں بیان کر رہی ہے۔ چوں کہ جنت متواضعین کی جگہ تھی، اس لئے اس کلام کے پیش کرنے میں بھی تواضع کا اثر آ گیا۔ اور جہنم متکبرین کی جگہ ہے اس لئے اس کو اس نے اسی انداز میں پیش کیا۔

جنت اور جہنم کا بھراوا

جنتی اور جہنمی جب اپنی اپنی جگہ پہنچ جائیں گے تو باری تعالیٰ جہنم سے پوچھیں گے: "**هَلِ امۡتَلَأۡتِ**؟" کیا تو بھر گئی؟ تو وہ کہے گی: "هَلۡ مِنۡ مَّزِيۡدٍ" اور کچھ ہے؟ اس کے اس مطالبے کو ختم کرنے کے لئے باری تعالیٰ (اپنی شایانِ شان) اپنا قدم اس میں رکھ دیں گے جس کی وجہ سے جہنم کی طغیانی ختم ہو جائے گی، اس کو بھرنے کے لئے کوئی الگ مخلوق پیدا نہیں کی جائے

گی۔اور جنت کے اندر جنتیوں کو بھیجنے کے بعد بھی بہت سی جگہ خالی رہ جائے گی ،حالاں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کو دنیا کا دس گنا عطا کیا جائے گا اور اعلیٰ کا تو معلوم نہیں کیا حال ہوگا۔غرض سب کو سب کچھ دے چکنے کے بعد بھی جنت میں بہت سی جگہ خالی رہ جائے گی تو اس کو بھرنے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے،اس کے ذریعہ سے جنت کے خالی حصوں کو بھریں گے تاکہ وہ آباد ہوجائے۔

نظرِ رحمت سے محروم

حدیث ۶۱۶:-

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) أنَّ رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قَالَ: لَا يَنْظُرُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَراً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے جو اپنی لنگی اور پائجامہ (یعنی وہ کپڑا جو نیچے پہنا جاتا ہے) تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے تک لٹکائے۔

افادات:- کوئی بھی لباس جو تکبر کی وجہ ٹخنے ڈھانپ دیتا ہو، وہ اس میں داخل ہے، چاہے وہ پائجامہ ہو، پتلون ہو، لنگی ہو یا عربی کرتہ؛ سب اس میں داخل ہیں۔ دیکھو! کتنی

سخت وعید ہے کہ تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظرِ رحمت نہیں فرمائیں گے۔

تین مبغوض ترین

حدیث ۶۱۷:-

وعنه، قَالَ: قَالَ رسول الله (ﷺ): ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ. (رواه مسلم) ((الْعَائِلُ)): الْفَقِيرُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے بات کرے گا، نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھے گا (بلکہ) ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: بوڑھا زانی، جھوٹا بادشاہ، اور تکبر کرنے والا فقیر۔ (تشریح پہلے آچکی ہے)

متکبر کو شدید دھمکی

حدیث ۶۱۸:-

وعنه قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): قَالَ الله -عز وجل-: الْعِزُّ إِزَارِي وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، فَمَنْ يُنَازِعُنِي فِي وَاحِدٍ منهما فَقَدْ عَذَّبْتُهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: عزت میری ازار اور کبریائی میری چادر ہے، جو ان کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا، میں اس کو عذاب دوں گا۔

افادات:- بعض روایتوں میں "قَصَمْتُہُ" کا لفظ ہے، مَیں اس کی گردن توڑ دوں گا۔ آدمی اپنے جسم کا نچلا حصہ جس لباس سے ڈھانکتا ہے اس کو عربی میں "ازار" کہتے ہیں، چاہے وہ پائجامہ ہو یا لنگی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آدمی بڑائی اختیار کرنا چاہے گا، مَیں اس کو سزا دوں گا اور دنیا ہی میں اس کو رسوا کر دوں گا۔

خود پسندی کی نقد سزا

حدیث ۶۱۹:-

وعنه: أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي فِي حُلَّةٍ تُعْجِبُهُ نَفْسُهُ، مُرَجِّلٌ رَأْسَهُ، يَخْتَالُ فِي مِشْيَتِهِ، إِذْ خَسَفَ اللهُ بِهِ، فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِي الأَرْضِ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

((مُرَجِّلٌ رَأْسَهُ)): أَيْ مُمَشِّطُهُ. ((يَتَجَلْجَلُ)) بالجيمين: أَيْ يَغُوصُ وَيَنْزِلُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایک مرتبہ ایک آدمی ایک جوڑا پہنے جا رہا تھا، خود پسندی میں مبتلا تھا، بالوں میں کنگھی کیے ہوئے تھا، چال میں اکڑ پیدا ہو گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اسے زمین میں دھنسا دیا، اب وہ قیامت تک زمین میں اترتا رہے گا۔

متکبر لکھ دیا جاتا ہے

حدیث ۶۲۰:-

وعن سَلَمَةَ بنِ الأَكْوَعِ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): لاَيَزَالُ الرَّجُلُ يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ حَتَّى يُكْتَبَ فِي الجَبَّارِينَ، فَيُصِيبَهُ مَا أَصَابَهُمْ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن) ((يَذْهَبُ بِنَفْسِهِ)) أيْ : يَرْتَفِعُ وَيَتَكَبَّرُ.

ترجمہ:-حضرت سلمہ بن اَکوع (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: آدمی برابر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جو بڑے بڑے متکبرین گزرے ہیں ان میں اس کو بھی لکھ دیا جاتا ہے، اوران کو اللہ تعالیٰ کا جو عذاب پہنچا تھا، وہی عذاب اس کو بھی پہنچتا ہے۔

افادات:-حالاں کہ اس کے اندر اور کوئی برائی نہیں ہے، صرف اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہے، بس اس کی وجہ سے ان کے ساتھ شمار کیا گیا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں تکبر اور خود پسندی سے محفوظ رکھے

اور تمام رذائل سے ہمیں پاک وصاف فرمادے

بابُ حُسنِ الخُلُقِ

اچھے اخلاق

یکم رجب المرجب ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۳۰ر ستمبر ۲۰۰۰ء

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:-

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ.

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ

صرف یہ اخلاق نہیں

نیا عنوان قائم کیا ہے: اچھے اخلاق کا بیان۔

اخلاق سے کیا مراد ہے؟ عام طور پر ہمارے یہاں اس لفظ کو جب استعمال کرتے ہیں تو مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ آدمی لوگوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ کوئی آدمی بوقتِ ملاقات اگر خندہ پیشانی سے ہنس مکھ طریقہ سے، یا نرمی سے پیش آتا ہے، تو کہتے ہیں کہ اس کے اخلاق بہت اونچے اور اچھے ہیں، لیکن شریعت کی اصطلاح میں صرف اتنی بات کو اخلاق نہیں کہتے، اگرچہ شریعت کی نگاہ میں یہ بھی ایک پسندیدہ طریقہ ہے، جو آدمی بااخلاق ہوگا اس میں

یہ بات بھی پائی جائے گی، لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اخلاق کا لفظ جب قرآن اور حدیث میں بولا جاتا ہے، تو اس کا ایک مخصوص مفہوم و معنٰی مراد لیا جاتا ہے۔

دیکھو! اخلاق کی درستگی کی طرف شریعت نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا ہے، اگر اخلاق درست ہوں گے؛ تب ہی عبادات، معاملات اور معاشرت بھی ٹھیک ہوں گے۔ اگر اخلاق بگڑے ہوئے ہیں تو عبادات، معاملات اور معاشرت بھی ٹھیک نہیں ہو سکتے، بلکہ یہ آدمی کے لیے وبال بن جاتے ہیں۔ اس لئے اخلاق کی درستگی کی طرف خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا گیا ہے۔

جسم کی قدر روح سے ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، ایک اس کا جسم ہے، اور ایک روح ہے۔ ویسے بھی صرف جسم کا نام انسان نہیں ہے جب تک کہ اس میں روح موجود نہ ہو۔ بغیر روح کے خالی جسم کو کوئی بھی انسان سے تعبیر نہیں کرتا۔ اگر جسم کے اندر سے روح نکال لی جائے تو کوئی جسم اپنی اصلی حالت پر باقی نہیں رہتا، حالاں کہ اس کا پورا جسم ویسا ہی موجود ہے جیسا روح نکلنے سے پہلے تھا۔ کان، ناک، زبان، ہونٹ، ہاتھ، پاؤں، جسم کے دوسرے سارے اعضاء اپنی حالت پر موجود ہیں، اس کے باوجود کوئی اس کو انسان سے تعبیر نہیں کرتا، بلکہ اب اس کو ''لاش'' کہا جاتا ہے، جو در اصل لاشئ ہے، یعنی کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس کو ''لاش'' سے اس لئے

تعبیر کیا جاتا ہے کہ جب تک اس میں روح تھی لوگ اس کے ساتھ محبت و اکرام کا معاملہ کرتے تھے، اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے تھے، اگر وہ کوئی بڑا آدمی تھا تو اس کی اطاعت کو اپنے لئے عزت سمجھتے تھے، اس کی چشم و ابرو کے منتظر رہتے تھے، لیکن جب اس کے جسم میں سے روح نکل جاتی ہے، تو اب اس کی اطاعت ضروری نہیں سمجھی جاتی ہے، وہ ساری چیزیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جب تک وہ زندہ تھا اس میں مالک بننے کی صلاحیت تھی، چیزیں اس کی ملکیت میں آسکتی تھیں، لیکن اب موت کی وجہ سے مالک بننے کی صلاحیت بھی ختم ہو گئی۔ جب تک وہ زندہ تھا، اپنی بیوی کا شوہر تھا، لیکن جب انتقال ہو گیا تو نکاح کا رشتہ بھی ختم ہو گیا، اگرچہ دوسرے رشتے ختم نہیں ہوتے، لیکن زندگی میں اس کے ساتھ جو تعلق رہتا ہے، موت کے بعد وہ باقی نہیں رہتا، کتنی ہی محبت و تعلق ہو، اس کی عزت و احترام دل میں ہو، لیکن روح نکل چکنے کے بعد اس کے جسم کو اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو گھر میں بھی رکھیں، بلکہ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پہلی فرصت میں اس کو نہلا کر، کفن پہنا کر دفن کا انتظام کیا جائے۔ اولاد چاہے کتنی ہی محبت کرنے والی ہو، لیکن جب باپ کے جسم سے روح نکل جائے، پھر ان سے کوئی کہے کہ اس جسم کو گھر ہی میں رہنے دو، تو اولاد اس کو گھر میں رکھنے کے لیے تیار نہیں ہو گی۔ معلوم ہوا کہ جسم کی جو بھی قدر و قیمت ہے وہ روح کی وجہ سے ہے۔

روح سے متعلق بھی احکام

روح بھی انسان کاایک جزوہے،اس کے متعلق بھی کچھ خاص خاص ہدایتیں شریعت نے دی ہیں،جسم کے اوپر جیسے مختلف حالات طاری ہوتے ہیں ، مثلاً جسم تندرست ہوتا ہے، بیمار بھی ہوتاہے، توانا و طاقتور ہوتاہے ،کمزورونحیف بھی ہوتا ہے خوبصورت اوربدصورت ہوتا ہے۔اسی طریقہ سے روح صحت منداور بیمار ہوسکتی ہے، طاقتور اور نحیف ہوسکتی ہے، خوبصورت اوربدصورت ہوسکتی ہے۔مطلب یہ ہے کہ جو حالات جسم پر طاری ہوتے ہیں،وہی حالات روح پر بھی طاری ہوسکتےہیں۔اورروح کے متعلق بھی شریعت نے ہمیں خاص طور پر ہدایتیں دی ہیں، اوریہی آدمی کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔

جسمانی اعمال میں فرائض

ظاہری اعمال کاتعلق آدمی کے اعضاء سے ہے۔مثلاً:نمازمیں قیام،رکوع سجدہ، قعدہ، قراءت وغیرہ ارکان ہیں ،یا تسبیحات، ثناء،تشہداوردرودپڑھتے ہیں ؛یہ سب وہ چیزیں ہیں جن کوآدمی اپنے اعضاء کے ذریعہ انجام دیتاہے،اوریہ جسمانی عبادت ہے۔

روزہ بھی جسمانی عمل ہے،جو شریعت نے ہم پر فرض کیاہے۔زکوۃمالی عبادت ہے،اس میں بھی آدمی کے بدن کاکچھ حصہ لگتا ہے کہ اپنے ہاتھ سے اس کو ادا کرتاہے۔حج میں پہنچنے

کے لیے مال کو کام میں لایا جاتا ہے، وہاں پہنچنے کے بعد جو مناسک وافعال ادا کئے جاتے ہیں وہ بھی تمام جسم ہی کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں تو جسمانی اعمال میں بہت سارے اعمال فرض وواجب کا درجہ رکھتے ہیں، اور شریعت کی طرف سے ان کو فرائض کی حیثیت دی گئی ہے جن کو بجالانا ضروری ہے۔

اسی طرح جسمانی اعمال میں بعض ایسے ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، مثلاً: شراب پینا، چوری کرنا، زنا کرنا، اور بھی بہت سارے کام ہیں جن کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اگر کوئی آدمی وہ کام کرے گا تو گنہگار ہوگا۔

روحانی اعمال میں فرائض ومحرمات

اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی کچھ اعمال ایسے ہیں جن کو انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے، اور وہ فرض کا درجہ رکھتے ہیں۔ تواضع فرض کا درجہ رکھتی ہے۔ شکر فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ صبر فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اسی طریقہ سے اور بھی باطنی صفات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتی ہیں، جیسے: زہد، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے اوپر توکل واعتماد رکھنا اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے رجاء اور امید قائم رکھنا، اللہ تعالیٰ کا خوف اور ڈر؛ یہ سب وہ روحانی صفات ہیں جو فرائض کا درجہ رکھتی ہیں، اور ان کا حاصل کرنا آدمی کے لیے ضروری ہے۔

اسی طریقہ سے روحانی کچھ صفات ایسی ہیں جو ذمیمہ اور بری کہلاتی ہیں، ان سے بچنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح زنا، چوری، شراب نوشی اور دیگر برے افعال سے بچنا ضروری ہے، جیسے یہ حرام کام ہیں، اسی طرح حسد حرام ہے، تکبر حرام ہے، کینہ و بغض رکھنا حرام ہے، دنیا کی محبت رکھنا حرام ہے، مال اور جاہ کی محبت حرام ہے، اسی طرح بقیہ صفاتِ ذمیمہ جتنے بھی ہیں ان تمام کو شریعت میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ سب "اخلاق" کہلاتے ہیں جن کا تعلق روح اور دل سے ہے، ظاہری جسم سے یہ کام انجام نہیں دیئے جاسکتے، بلکہ یہ سب اندرونی چیزیں ہیں۔ یعنی آدمی تواضع جسم سے انجام نہیں دے سکتا۔ تواضع کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی صرف سر کو جھکا دے، یا اپنے سینے کو کسی کے سامنے موڑ دے، یا ہم جس کو خاطر تواضع سے تعبیر کرتے ہیں کہ کوئی مہمان آیا ہو، تو اس کی خدمت کر لی جائے؛ یہ تواضع نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ پہلے بتلا دیا تھا کہ آدمی اپنے آپ کو کم درجہ اور کمتر سمجھے؛ اس کا نام تواضع ہے، اور اس کا تعلق دل سے ہے، ظاہری اعضاء سے نہیں ہے۔

اسی طریقہ سے شکر ہے، تو دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر بجالانا ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے صبر، زہد و توکل ہے، امید رکھنا، اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا؛ یہ ساری چیزیں آدمی کے ظاہری جسم سے تعلق نہیں رکھتی ہیں، بلکہ ان سب کا تعلق دل سے ہے۔ اسی طرح اخلاص بھی دل اور روح سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، اعضاء سے تعلق رکھنے والی چیز نہیں ہے، بلکہ اگر دیکھا جائے تو آدمی کے جتنے بھی ظاہری اعمال ہیں، ان کے اندر بھی اخلاص کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہاں

تک کہ نماز، روزہ وغیرہ بڑی بڑی عبادتوں میں بھی اگر اخلاص نہیں ہے تو اس صورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں وہ سب قبول تو کیا ہوتیں، ان پر ثواب تو کیا ملتا؛ اُلٹا ان کی وجہ سے سزا ہوگی اور جہنم میں بھیجا جائے گا۔

لینے کے دینے

حدیث ِپاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز سب سے پہلے تین آدمیوں کو بلایا جائے گا، ایک شہید، دوسرا قاری اور تیسرا وہ آدمی ہوگا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا تھا۔ اور ہر ایک سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمہیں یہ نعمتیں دی تھیں، ان میں تم نے کیا کیا؟ ہر ایک اپنا عمل بتلائیں گے۔ مالدار کہے گا: نیکی کا کوئی کام اور اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں مَیں نے خرچ نہ کیا ہو۔ اس سے کہا جائے گا: ٹھیک ہے، لیکن تمہاری نیت یہ تھی کہ لوگ سخی کہیں، دل کے اندر شہرت کی نیت تھی، تم چاہتے تھے کہ تمہاری شہرت اور نیک نامی ہو۔

شہید سے کہا جائے گا: ہم نے تمہیں جسمانی صحت وقوت دی تھی، شجاعت و بہادری دی تھی، اس کو تم نے کہاں استعمال کیا؟ وہ کہے گا: باری تعالیٰ! تیرے راستہ میں تیرے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑتا رہا، یہاں تک کہ جان تک قربان کر دی۔ اس سے بھی یہی کہا جائے گا: یہ سب تو نے اس لیے کیا تھا کہ لوگ تیری تعریف کریں کہ بڑا بہادر تھا۔

قاری اور عالم سے پوچھا جائے گا: ہم نے علم جیسی نعمت دی تھی، اس میں کیا عمل کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے علم پھیلایا، پڑھا اور پڑھایا۔ اس سے بھی کہا جائے گا کہ یہ سب اس لئے کیا تھا، تا کہ لوگ بڑا عالم کہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اخلاص نہیں تھا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ سب سے پہلے انہیں کو جہنم کے اندر بھیجا جائے گا۔

تو دیکھو! اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوئے، بلکہ ان کے اوپر سزا کا فیصلہ ہوا۔

حاصلِ کلام

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ تمام باطنی اعمال روح و قلب سے تعلق رکھتے ہیں، جن کو "اخلاق" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور یہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں، جب تک یہ درست نہ ہوں گے، وہاں تک ظاہری اعمال کے اندر بھی جان نہیں آئے گی۔ ظاہری اعمال کی قبولیت اور ان کا درست ہونا، ان کے اندر اثر کا پیدا ہونا؛ یہ ساری چیزیں باطنی اخلاق پر موقوف ہیں، اگر وہ اچھے ہوں گے تو ظاہری اعمال بھی اچھے ہوں گے، اور اگر وہ بگڑ گئے تو ظاہری اعمال بھی بگڑ جائیں گے۔ اس باب میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اسی کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

خُلقِ عظیم

ایک آیت پیش کی ہے:﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ﴾ حضورِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) کو باری تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: آپ کو عظیم اخلاق پر پیدا کیا گیا ہے ،یعنی کسی انسان میں اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق جتنے بھی ہوسکتے ہیں،ان میں سب سے زیادہ اعلیٰ اخلاق سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نوازاہے ،اورآپ کی ذات کو دنیا والوں کے لیے نمونہ بنایاہے۔

غصہ پینا،معاف کرنا

﴿وَالْكَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ﴾غصہ کوپینے والے اور لوگوں سے درگزرکرنے والے ہیں۔عفوودرگزریعنی کسی کومعاف کردینے کاجذبہ ہونا اورغصہ کو پی جانا؛یہ دل کے اندر ہوتا ہے۔غصہ دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے ،لیکن اس کے ظاہری آثار ہوتے ہیں کہ آدمی کو جب غصہ آئے گاتواس کا چہرہ سرخ ہوجائے گا، رگیں پھول جائیں گی،بکواس کرناشروع کردے گا،کبھی ہاتھ بھی اٹھا دے گا ،آگ بگولہ ہوجائے گا؛یہ سب اس کے آثاراور نشانیاں ہیں۔اصل چیزتودل کے اندرہے یعنی غصہ۔اورغصہ کوبڑی بری چیزقراردیاگیاہے۔جیسا کہ پہلے گزرگیاکہ ایک آدمی نے آکرنبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)سے درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔آپ نے فرمایا: ”لَاتَغْضَبْ“غصہ مت کرنا۔دوبارہ پوچھاتو بھی یہی تاکیدفرمائی۔تیسری مرتبہ پوچھاتو پھر یہی تاکیدفرمائی۔(بخاری شریف:۶۱۱۶،باب الْحَذَرِ مِنَ الْغَضَبِ)

ازالہ نہیں، امالہ

غصہ ان چیزوں میں سے ہے جن کا تعلق انسان کے باطن سے ہے،اور کوئی آدمی اگر غصہ کو ختم کرنا چاہے تو وہ ختم بھی نہیں ہو سکتا۔ جن اوصاف کو اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر فطرتاً پیدا کیے ہیں ان کے بارے میں شریعت کا مقصود یہ ہے کہ ان کا امالہ کر دیا جائے یعنی ان کو صحیح رخ پر موڑ دیا جائے،ان کا ازالہ مقصود نہیں ہوتا۔ اگر آدمی کی طبیعت میں غصہ نہیں ہوگا تو کافروں کے ساتھ مقابلہ کیسے ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاد کا حکم دیا ہے، وہاں بات کیسے بنے گی؟ برائی کے کاموں سے روکنے کے لیے بھی غصہ کی ضرورت رہتی ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ صفت آدمی کے اندر ہونی چاہیے،البتہ اس کا رخ صحیح کر دیا جائے، اپنی ذات کے لیے اس کو استعمال کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آپ کے ساتھ کوئی آدمی بدسلوکی کرتا تھا تو حضور (ﷺ) کبھی بدلہ اور انتقام نہیں لیتے تھے، لیکن جہاں اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جا رہا ہوتا تو حضورِ اکرم (ﷺ) کو ایسا غصہ آتا تھا کہ کوئی بھی سامنے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ معلوم ہوا کہ غصہ کا بھی صحیح مصرف ہے۔

اسی طرح آدمی کے اندر خرچ کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے،اب وہ آدمی اگر اس جذبہ کو فضول خرچی میں استعمال کرے گا،تو گنہگار ہوگا۔ اس لیے خرچ کرنے والی اس صفت کو اگر وہ آدمی نیکی کے کاموں میں استعمال کر لے تو کارآمد ہے۔

یا خرچ نہ کرنا جس کو بخل کہا جاتا ہے وہ بھی طبیعت کے اندر کا ایک جذبہ ہے جو انسان کو خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ اگر انسان اسی جذبہ کو اس طرح استعمال کرے کہ گناہ کے کاموں میں خرچ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے رکھے، تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ ہاں! نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے سے روکے گا؛ تو یہ بری چیز ہے۔

اسی طرح آدمی کے دل میں ایک چیز شہوت رکھی گئی ہے۔ اگر شہوت ہی نہ ہو تو بیوی کا حق کیسے ادا کرے گا؟ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جو آدمی کے اندر ہونا چاہیے، لیکن اگر اس کو غلط جگہ استعمال کرتا ہے تو گناہ میں مبتلا ہو گا، اس لئے اس کے رخ کو صحیح طرف پھیر دیا جائے؛ اسی کو امالہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو اچھی چیزیں ہیں ان کو اچھے مصارف میں استعمال کرے۔ اور جو بری چیزیں ہیں ان کا رخ بھی اچھے مصارف کی طرف موڑ دے، اور آدمی صحیح طریقہ سے ان کو استعمال کرنا سیکھ جائے۔ امالہ کا مطلب ہی یہ ہے : رخ کو صحیح کر دینا، اور اس صلاحیت کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا، غلط جگہ استعمال کرنے سے بچالینا۔ کسی بھی صفت کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ مقصود ہے۔

نفس پر قابو پانے کا واقعہ

حضرت علی(رضی اللہ عنہ) کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی کوئی بات کہی، تو حضرت علی(رضی اللہ عنہ) کو غصہ آگیا، اس کو پچھاڑ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے۔اب وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا تو اس نے لیٹے ہی لیٹے حضرت علی(رضی اللہ عنہ) کے چہرہ پر تھوک دیا،تو وہ فوراً اس کے سینے سے اتر گئے۔کسی نے کہا:اس نے جب آپ پر تھوک دیا تو یہ تو اس سے انتقام لینے کا اور زیادہ موقع تھا، آپ نے اس کو چھوڑ کیوں دیا؟حضرت علی(رضی اللہ عنہ) نے فرمایا:پہلے جب اس کو مَیں نے پچھاڑا تھا وہ اس لیے کہ اس نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخی کی بات کہی تھی، لیکن جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو میرا نفس طیش میں آگیا،اب اگر مَیں اس کے ساتھ کچھ کرتا تو گویا مَیں اپنی ذات کے لیے انتقام لیتا،اور شریعت اس بات کی تعلیم نہیں دیتی،شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ تمہاری ذات کا معاملہ ہو تو درگزر کردو۔

اچھے اخلاق کی تکمیل

حدیث ۶۲۱:-

وعن أنس(رضی اللہ عنہ) قال: كَانَ رسولُ الله(صلی اللہ علیہ وسلم) أَحْسَنَ النَّاسِ خُلُقاً

ترجمہ:- حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) اخلاق کے اعتبار سے لوگوں میں سب سے بہتر تھے۔

افادات:- بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو دنیا کو اخلاق سکھانے ہی کے لیے بھیجے گئے تھے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: "بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ" مَیں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں۔ اچھے اخلاق کا جو اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ ہو سکتا ہے وہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کے سامنے پیش کیا۔

حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوصاف واخلاق

حدیث ۶۲۲:-

وعنه، قَالَ: مَا مَسِسْتُ دِيبَاجاً وَلاَ حَرِيراً أَلْيَنَ مِنْ كَفِّ رسولِ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم)، وَلاَ شَمَمْتُ رَائِحَةً قَطُّ أَطْيَبَ مِنْ رَائِحَةِ رسولِ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم). وَلَقَدْ خدمتُ رسولَ اللهِ(صلی اللہ علیہ وسلم) عَشْرَ سنين، فما قَالَ لی قَطُّ: أُفٍّ، وَلاَ قَالَ لِشَيءٍ فَعَلْتُهُ: لِمَ فَعَلْتَه؟ وَلاَ لشَيءٍ لَمْ أفعله: أَلاَ فَعَلْتَ كَذا؟ (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت انس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے کسی طرح کا ریشم، نہ موٹا، نہ مطلق ریشم؛ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہتھیلی سے زیادہ نرم نہیں چھویا۔ اور حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوشبو سے زیادہ اچھی خوشبو میں نے کبھی نہیں سونگھی۔ اور مَیں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دس سال تک خدمت کی، کبھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے اُف نہیں فرمایا۔ اور نہ کرنے جیسا کوئی کام کیا ہو تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں کیا۔ اور جو کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا اور نہیں کیا، تو اس پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں نہیں کیا۔

افادات:- آپ(ﷺ) کی ہتھیلی ریشم سے بھی زیادہ نرم و گداز تھی۔ ویسے آپ کا جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا، اس کے باوجود اس میں نرمی تھی، چھونے والے کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ریشم سے زیادہ نرم ہے۔

مجسم خوشبو

قدرتی طور پر آپ(ﷺ) کے جسمِ مبارک میں سے خوشبو مہکتی تھی۔ حضورِ اکرم (ﷺ) خوشبو کا استعمال بھی کثرت سے فرماتے تھے، لیکن قدرتی طور پر بھی اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) کے پسینے کے اندر خوشبو رکھی تھی۔ حضرت انس(رضی اللہ عنہ) کی والدہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ دوپہر کے وقت حضور(ﷺ) میرے یہاں ایک چمڑے پر لیٹے ہوئے تھے، آپ کا پسینہ نکلا، مَیں اس کو ایک بوتل میں جمع کرنے لگی، حضورِ اکرم (ﷺ) کی آنکھ مبارک کھلی تو مجھ سے پوچھا: یہ کیا کر رہی ہو؟ مَیں نے عرض کیا: آپ کا پسینہ جمع کر رہی ہوں، اس سے زیادہ اچھی خوشبو اور کوئی نہیں ہے، اور اس کو ہم اپنی خوشبوؤں میں ملاتے ہیں۔ آدمی کے پاس کم درجہ کی خوشبو ہو، پھر اعلیٰ درجہ کی کوئی خوشبو مل جائے تو وہ اس کو اپنی خوشبو کے اندر ملا لیتا ہے، اور اس طرح اپنی کم درجہ کی خوشبو کو بھی اعلیٰ درجہ کی بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ حضورِ اقدس (ﷺ) کے جسمِ اطہر میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے قدرتی طور پر خوشبو پیدا فرمائی تھی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آپ (ﷺ) جب کسی گلی سے گزر جاتے، تو بعد میں وہاں سے گزرنے والا اس

خوشبو سے جان لیتا تھا کہ حضور پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) یہاں سے گزرے ہیں۔ کسی بچے کے سر پر اگر آپ ہاتھ پھیر دیتے، تو دن بھر اس کے سر سے خوشبو آتی تھی۔ کسی سے مصافحہ کر لیتے تھے تو اس کے ہاتھوں سے خوشبو آتی رہتی تھی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جسمِ اطہر میں اللہ تعالیٰ نے ایسی عمدہ خوشبو رکھی تھی۔

خادمِ خاص کا تجربہ

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) سے -جو حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے سوتیلے والد ہوتے ہیں- کہا کہ کوئی چھوٹا بچہ ہو تو اس کو ہمارے حوالہ کر دو کہ ہمارے گھر کے کام کاج میں مدد کرے اور خدمت کر دیا کرے۔ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: میری عمر دس سال تھی، حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) مجھے اپنے پیچھے اونٹ پر سوار کر کے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں لائے اور آپ کے حوالہ کیا کہ یہ ہمارا بچہ ہے، آپ اس کو اپنی خدمت کے لئے قبول فرمالیں، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قبول فرمالیا۔

بچوں کی عادت تو سب جانتے ہی ہیں کہ ان کا جو کام ہوتا ہے وہ از خود تو کرتے نہیں ہیں ،بڑوں کو دیکھ بھال اور نگرانی کر کے کام کروانا پڑتا ہے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے،خود حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میری والدہ،نانی اور خالہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہاں خدمت کے لئے جانے کی مجھ سے پابندی کرواتی تھیں اور یاد دلا کر مجھے بھیجتی تھیں، جیسے گھر

والے بچوں کو مدرسہ اور اسکول بھیجتے ہیں۔ گویا ان کی والدہ، نانی، خالہ وغیرہ تاکید کے ساتھ ان کو نبی کریم (ﷺ) کے یہاں بھیجتی تھیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دس سال کی عمر میں آپ (ﷺ) کی خدمت میں لگے اور حضورِ اکرم (ﷺ) کی وفات تک (یعنی دس سال) حضورِ اکرم (ﷺ) کی خدمت کی۔ جب حضورِ اکرم (ﷺ) کی وفات ہوئی اس وقت حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی عمر بیس سال تھی، اور ظاہر ہے کہ دس سال کا بچہ خدمت کرنے میں کوتاہی تو ضرور کرے گا۔ جب بڑی عمر والے کوتاہی کرتے ہیں تو پھر چھوٹوں سے کیوں نہیں ہوگی۔ لیکن حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: ان دس سالوں میں نبی کریم (ﷺ) نے کبھی مجھے اُف نہیں فرمایا۔ نہ کرنے کا کام کیا ہو؛ تو آپ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ "یہ کام کیوں کیا"۔ اور جو کام کرنے کے لئے کہا گیا تھا اور نہیں کیا؛ تو اس پر آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ "ایسا کیوں نہیں کیا"۔

علماء فرماتے ہیں کہ اس میں دراصل حضورِ اکرم (ﷺ) ہی کے اخلاق کو بتلانا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) جس عمر میں آپ کی خدمت کر رہے تھے، اس میں یہ بات قرینِ قیاس، بلکہ ضروری ہے کہ ان سے کوتاہی ہوئی ہی ہوگی۔ بلکہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) خود فرماتے ہیں کہ کبھی حضورِ اکرم (ﷺ) مجھے کسی کام کے لیے بھیجتے تھے، تو مَیں راستہ میں کھیل یا کوئی چیز دیکھنے کے لیے کھڑا ہو جاتا اور دیکھنے میں مشغول ہو جاتا، حضورِ اکرم (ﷺ) پیچھے سے آکر میرا کان پکڑ کر فرماتے کہ تم کو تو وہاں بھیجا تھا، یہاں کیوں کھڑے ہو؟ حضرت انس (رضی اللہ عنہ)

فرماتے ہیں: کبھی بچپن کی وجہ سے میں یوں کہہ دیتا: میں وہاں نہیں جاؤں گا، حالاں کہ دل میں ہوتا کہ جاؤں گا، تب بھی حضور (ﷺ) کچھ نہیں فرماتے تھے۔ یہ حضورِ اکرم (ﷺ) کے اخلاق تھے، حالاں کہ عام طور پر اپنے خادم کے ساتھ مخدوم کا جو معاملہ ہوتا ہے وہ سب جانتے ہیں۔

اخلاق کی بلندی

حدیث ۶۲۳:-

وعن الصعب بن جثّامة (رضی اللہ عنہ) قال: أهديت رسول الله (ﷺ) حِمَاراً وَحشِيّاً، فَرَدَّهُ عَلَيَّ، فَلَمَّا رأی مَا فی وجهی قَالَ: إنَّا لَمْ نَرُدَّهُ عَلَيكَ إلاّ لأنّا حُرُمٌ.

ترجمہ:- حضرت صعب بن جثامہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں نے ایک جنگلی گدھا (زندہ شکار کرکے) نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں بطورِ ہدیہ پیش کیا تو آپ نے قبول نہیں فرمایا (حضورِ اکرم (ﷺ) کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے میرے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہوئے) جب میرے چہرے پر آپ (ﷺ) نے اس کا اثر دیکھا تو فرمایا: ہم حالتِ احرام میں ہیں، اس لئے ہم نے اس کو واپس کیا ہے (اور کوئی وجہ نہیں ہے)

افادات:- پالتو گدھا کھانا تو حرام ہے، لیکن جنگلی گدھا کھانا حلال ہے، اور چوں کہ جو آدمی حالتِ احرام میں ہوتا ہے وہ نہ تو شکار کر سکتا ہے اور نہ شکار کو اپنے پاس رکھ سکتا ہے۔ اور کسی بڑے آدمی کے پاس بڑی محبت کے ساتھ کوئی ہدیہ لے کر جائیں اور وہاں قبول نہ ہو، تو دل

پر اثر ہوتا ہے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ان کے ہدیہ کو قبول نہ کرنے کی وجہ سے ان کی طبیعت پر کچھ ناگواری محسوس کی تو بطورِ معذرت کے یہ بات ارشاد فرمائی کہ ہم حالتِ احرام میں ہیں۔ یہ آپ (ﷺ) کے اخلاق کے بلندی کی بات ہے۔ جو آدمی بااخلاق ہوتا ہے اس کو سامنے والے کی ذرا سی بات کا بھی فوری طور پر احساس ہوتا ہے، اور اگر اپنی طرف سے اس کو کوئی ایسی بات پیش آئی ہو تو پھر وہ اپنے اخلاق کے ذریعہ سے اس کو دور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

نیکی اور گناہ کیا ہے؟

حدیث ۶۲۴:-

وعن النَّوَّاس بنِ سمعان (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سألتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) عن البِرِّ وَالإِثم، فَقَالَ: البِرُّ: حُسنُ الخُلقِ. والإِثمُ: مَا حاكَ فِی صدرِك، و كَرِهتَ أن يَّطَّلِعَ عَلَيهِ النَّاسُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت نواس بن سمعان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) سے پوچھا: نیکی کیا ہے اور گناہ کیا ہے؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: نیکی اچھے اخلاق ہیں۔ اور گناہ جو تمہارے دل میں کھٹکے، اور تم یہ ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو۔

افادات:- جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اچھے اخلاق کا تعلق آدمی کے دل سے ہے، جب کسی کے دل میں اچھی صفات ہوں گی تو اس کے اعمال میں بھی ان کا ظہور ہوگا۔

گویا اچھے اخلاق ہی نیکی کی جڑ ہیں، اسی لئے اخلاقِ فاضلہ اعمالِ صالحہ سے بھی مقدم ہیں، جب تک اخلاق صحیح نہیں ہوں گے تب تک اعمال میں صلاح اور درستگی نہیں آسکتی۔ اگر ان کے بغیر ظاہری طور پر اچھے اعمال کرتا بھی ہے، اور دیکھنے والوں کو اچھے بھی معلوم ہوتے ہیں؛ تب بھی اخلاق کے نادرست ہونے کی وجہ سے وہ سارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل نہیں کرتے۔

اور دوسری بات حضورِ اکرم (ﷺ) نے یہ ارشاد فرمائی کہ جو تمہارے دل کے اندر کھٹکے، اور جس کام کے متعلق تم یہ ناپسند کرو کہ لوگوں کو اس کی خبر ہو؛ وہ گناہ ہے۔ گویا تمہارے دل کے اندر کسی کام کے چھپانے کا خیال پیدا ہونا، اور دل کی کھٹک اس کے گناہ ہونے کی علامت ہے۔

بہترین لوگ

حدیث ۶۲۵:-

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ: لَمْ یکن رسولُ اللہ (ﷺ) فَاحِشاً وَلاَ مُتَفَحِّشاً، وکان یَقُولُ: إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلاَقاً.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: نبی کریم (ﷺ) نہ تو فحش گو تھے، اور نہ بہ تکلف فحش گوئی کرنے والے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ تم میں سب سے بہتر لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں۔

افادات:- "فَاحِش" یعنی طبعی وفطری طور پر آدمی کا مزاج ہی فحش باتیں بولنے کا ہو۔ اور "مُتَفَحِّش" یعنی فطری طور پر تو اس کے مزاج اور طبیعت میں فحش گوئی نہیں ہے، لیکن کبھی دوستوں کو خوش کرنے کے لیے ایسی کوئی بات زبان سے نکال دیتا ہے حضورِ اکرم (ﷺ) نہ تو طبعی طور پر فحش گو تھے اور نہ کبھی بہ تکلف فحش گوئی کرتے تھے۔

اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں

حدیث ۶۲۶:-

وعن أَبِي الدرداءِ (رضی اللہ عنہ) أن النبی (ﷺ) قَالَ: مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فی مِيزَانِ العبدِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ، وَإِنَّ اللهَ يُبْغِضُ الْفَاحِشَ الْبَذِيَّ. ((الْبَذِيُّ)): هُوَ الَّذِي يتكلَّمُ بِالْفُحْشِ وردیء الكلامِ.

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز آدمی کے ترازو میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ فحش گوئی کرنے والے بدزبان آدمی کو پسند نہیں کرتا۔

افادات:-جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اعمال میں بھی وزن اور قبولیت اخلاق ہی سے آتی ہے ،اوراخلاق میں سے ایک صفت اخلاص بھی ہے کہ کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں اخلاص کے بغیر قبول نہیں ہوتا۔تواچھے اخلاق آدمی کے ترازو میں سب سے زیادہ وزنی چیز ثابت ہوں گے۔

دو جنتی عمل

حدیث ۶۲۷:-

وعن أَبي هريرة(رضی اللہ عنہ) قَالَ: سُئِلَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) عَنْ أَكثرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ الْجَنَّةَ؛ قَالَ: تَقْوَى اللهِ وَحُسنُ الخُلُقِ. وَسُئِلَ عَنْ أَكْثَرِ مَا يُدْخِلُ النَّاسَ النَّارَ؛ فَقَالَ: الفَمُ وَالفَرْجُ.

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ)سے منقول ہے کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)سے پوچھا گیا:وہ کونسی چیز ہے جو سب سے زیادہ لوگوں کوجنت میں لے جائے گی؟نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: گناہوں سے بچنااوراچھے اخلاق۔اورآپ(صلی اللہ علیہ وسلم)سے پوچھاگیا: لوگوں کوسب سے زیادہ جہنم میں لے جانے والی چیز کونسی ہے؟ حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: منھ اورشرمگاہ۔

افادات:- تقویٰ یعنی اللہ تعالیٰ کا ڈر-جس کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائے-اور اچھے اخلاق؛یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو کثرت سے آدمی کو جنت میں لے جائے گی۔

منھ میں زبان کی بے احتیاطیاں بھی آجاتی ہیں، کھانے پینے کے معاملہ میں جو بے احتیاطیاں ہوتی ہیں، وہ بھی اس میں آجاتی ہیں۔دوسری چیز شرمگاہ؛ان دو اعضاء کی بے احتیاطی کی وجہ سے عموماً آدمی جہنم میں جاتا ہے۔اسی لیے بخاری شریف کی روایت ہے،نبی کریم(ﷺ)ارشاد فرماتے ہیں:"مَن يَّضمَن لِي مَا بَيْنَ لَحيَيهِ وَمَا بَيْنَ رِجلَيهِ أَضمَن لَهُ الْجَنَّةَ" جو آدمی مجھے اپنے اس عضو کی جو اس کے دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور جو دونوں ٹانگوں کے درمیان میں ہے(یعنی شرمگاہ) کی گارنٹی دے(کہ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی کوئی نافرمانی نہیں کرے گا)تو میں ایسے آدمی کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں (بخاری شریف،باب حفظ اللسان:٦٤٧٤) حدیث ِپاک میں آتا ہے کہ لوگوں کو کثرت سے جہنم میں لے جانے کا ذریعہ زبان ہی کی کاٹی ہوئی کھیتیاں بنیں گی (ترمذی)منھ سے مراد زبان بھی ہو سکتی ہے، اور دوسری بے احتیاطیاں بھی اس میں آجاتی ہیں۔

کامل ایمان والے

حدیث ۶۲۸:-

وعنه قال قَالَ رسول الله (ﷺ): أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَاناً أَحْسَنُهُمْ خُلُقاً، وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایمان والوں میں مکمل ایمان والے لوگ وہ ہیں جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہوں، اور تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے ہیں۔

افادات:- آدمی کے اخلاق کا سب سے بڑا ظہور بیویوں کے معاملہ میں ہوتا ہے، اس لیے کہ ان سے چوبیس گھنٹے واسطہ پڑتا ہے، اور جس سے زیادہ واسطہ پڑتا ہو، اسی کے سامنے آدمی کی خوبیاں اور برائیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ جن سے واسطہ کم پڑتا ہے، ان کے سامنے یہ چیزیں اتنی زیادہ نہیں آتیں، اسی لیے جو لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے زیادہ اچھے ہیں وہ لوگوں میں بھی سب سے زیادہ اچھے ہیں۔ اگر آدمی کے اخلاق کی ساری دنیا میں دھوم مچی ہوئی ہو، لیکن اس کے گھر والوں کو شکایت ہو؛ تو ایسے اخلاق کس کام کے؟ جیسے: کسی آدمی کی سخاوت کی دنیا میں دھوم مچی ہو اور اس کے گھر والے بھوکے مرتے ہوں، تو لوگ کیا کہیں گے کہ ساری دنیا اس کے دستر خوان پر کھاتی ہے تو کیا ہوا، خود اس کے گھر والے تو محروم ہیں۔ اسی طرح اگر تمہارے اخلاق سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، آپ کی تعریف کر رہے ہیں، لیکن تمہارے گھر

والوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچتا؛ تو پھر بات کیسے بنے گی۔ اسی لئے فرمایا کہ تم میں اخلاق کے اعتبار سے سب سے اچھے وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ اچھائی سے پیش آتے ہیں۔ اور بیوی کی طرف سے ناگوار باتیں کثرت سے پیش آتی رہتی ہیں، اس لئے جو آدمی اخلاق کے اعتبار سے زیادہ کامل ہوگا، وہی اس محاذ پر فاتح بن سکے گا۔

اچھے اخلاق والوں کا مقام

حدیث ۶۲۹:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: سَمِعْتُ رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقول: إنَّ المُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ القَائِمِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ایمان والا اپنے اچھے اخلاق کے ذریعہ؛ ہمیشہ روزہ رکھنے والے اور رات بھر قیام کرنے والے کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔

افادات:- آدمی مسلسل روزے رکھ کر اور رات بھر قیام کرکے اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر و ثواب حاصل کرتا ہے، وہی اجر و ثواب، وہی مقام و مرتبہ اچھے اخلاق سے بھی حاصل کرسکتا ہے۔

تین آدمی ، تین گارنٹی

حدیث ۶۳۰:-

وعن أبي أُمَامَةَ الباهِلِيِّ(رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : أنَا زَعِيمٌ ببَيتٍ في ربَضِ الجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ المِرَاءَ، وَإنْ كَانَ مُحِقّاً . وَبِبَيْتٍ في وَسَطِ الجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الكَذِبَ،وَإنْ كَانَ مَازِحاً . وَبِبَيْتٍ في أعلَى الجَنَّةِ لِمَنْ حَسُنَ خُلُقُهُ.(حديث صحيح،رواه أبُو داود بإسناد صحيح) ((الزَّعِيمُ)) : الضَّامِنُ.

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ باہلی(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایا: جو آدمی حق پر ہوتے ہوئے جھگڑا چھوڑدے؛مَیں اس کو جنت کے کنارے پرایک مکان دلانے کی گارنٹی دیتاہوں۔ اورجو شخص جھوٹ کو چھوڑدے، چاہے مذاق ہی میں کیوں نہ ہو؛مَیں اس کوجنت کے بیچ میں مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔اور جس کے اخلاق اچھے ہوں ؛مَیں اس کے لئے جنت کے اونچے درجہ پر مکان دلانے کی گارنٹی دیتا ہوں۔

افادات:- جہاں بھی کوئی معاملہ ہوتاہے،اس میں ایک آدمی حق پر ہوتا ہے۔دوسرا ناحق اس سے جھگڑتاہے۔حق پرہونے کا تقاضہ تویہ ہے کہ وہ مقدمہ بازی کرکے بھی اپناحق وصول کرے،اس کے باوجود وہ جھگڑاچھوڑدے،اپناحق جانے دے؛ایسے آدمی کے لئے حضوراکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)جنت کے کنارے پر مکان دلانے کی ذمہ داری لیتے ہیں۔

حضور(ﷺ) کی نگاہوں میں محبوب اور قریب جگہ پانے والے

حدیث ۶۳۱:-

وعن جابر(رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ : إِنَّ مِنْ أَحَبِّكُمْ إِلَيَّ ، وَأَقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِساً يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، أَحَاسِنَكُم أَخْلَاقاً . وَإِنَّ أَبْغَضَكُمْ إِلَيَّ وَأَبْعَدَكُمْ مِنِّي يَوْمَ الْقِيَامَةِ ، الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ وَالْمُتَفَيْهِقُونَ قالوا: يَارسول الله ! قَدْ عَلِمْنَا الثَّرْثَارُونَ وَالْمُتَشَدِّقُونَ ، فَمَا الْمُتَفَيْهِقُونَ ؟ قَالَ : الْمُتَكَبِّرُونَ (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت جابر(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا : میرے نزدیک تم میں سب سے زیادہ محبوب، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔ اور میری نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ دور وہ ہیں جو بہ تکلّف بہت زیادہ بولنے والے، لوگوں پر اپنی باتوں کے زور سے چڑھ بیٹھنے والے اور زیادتی کرنے والے ہیں۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ”ثَرْثَارُوْن“ اور ”مُتَشَدِّقُوْن“ کو توہم جانتے ہیں؛ لیکن ”مُتَفَیْهِقُوْن“ کون لوگ ہیں؟ حضور اکرم(ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تکبر کرنے والے۔

افادات:- حضورِ اکرم(ﷺ) کی نگاہوں میں محبوب اور قیامت کے روز حضور(ﷺ) سے سب سے زیادہ قریب جس کو جگہ ملے گی ؛وہ اچھے اخلاق والے ہیں اور تکبر کرنے والا اپنی باتوں میں بڑے بڑے الفاظ استعمال کر کے لوگوں پر اپنی دھونس جمانا اور رعب بٹھانا چاہتا ہے، ایسے

لوگ حضوراکرم(ﷺ) کی نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہیں ، اور قیامت کے روز حضوراکرم(ﷺ) سے سب سے زیادہ دور ہوں گے۔

عبداللہ بن مبارک(رحمۃ اللہ علیہ) سے حسنِ خلق کی تفسیریہ نقل کی گئی ہے: "طلاقة الوجه، وبذل المعروف، وكف الأذىٰ" مسکراتاہواچہرہ ،اچھی چیز خرچ کرنااور کسی کوتکلیف نہ دینا۔

باب الحلم والاناءۃ والرفق

حلم ، وقار،نرمی

مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حلم ، وقار، نرمی

باب کاعنوان قائم کیاہے:"حلم "یعنی بردباری و تحمل ۔اور"اِناء ۃ"یعنی سنجیدگی ووقار۔اور"رِفُق"یعنی نرمی۔

"حلم "کامطلب یہ ہے کہ خلافِ مزاج کوئی بات پیش آئے توبجائے غصہ ہونے کے اس کوبرداشت کرجانا،سامنے والے کے ساتھ غصہ والا معاملہ کرنے کےبجائے برداشت کرکے بھلائی والامعاملہ کرنا۔خلافِ مزاج چیزبرداشت کرنےکو عربی میں"حلم"اوراردومیں"بردباری" کہتے ہیں۔

"اِناء ۃ"کامطلب ہے: کسی بھی کام کواطمینان کے ساتھ انجام دینا، جلدبازی سے کام نہ لینا،جس کوگجراتی میں(ધીરજ) کہتے ہیں۔

اور"رفق" کا معنیٰ" نرمی" ہے۔

یہ تین اوصاف ہیں۔عام طورپرآدمی جب غصہ میں آتاہے توان تینوں کے خلاف باتیں وجودپذیرہوتی ہیں، اس لئے اصل تویہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کوغصہ سے بچائے۔اس سلسلے میں آگے روایتیں بھی آئیں گی،پہلے اللہ تبارک وتعالیٰ کے کچھ ارشادات ذکرکئے ہیں۔

سب سے عمدہ گھونٹ

﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔ جب آدمی کو غصہ آئے تو اس کے تقاضہ کو پورا کرنے کے بجائے اس کو دبائے اور غصہ پی جائے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ سب سے عمدہ گھونٹ جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے، وہ غصہ کو پینا ہے۔ تو غصہ کو پینا، دبانا اور لوگوں سے درگزر کرنا؛ یہ بہت عمدہ اوصاف ہیں۔ اس لئے کہ غصہ آدمی کو انتقام اور بدلہ لینے پر آمادہ کرتا ہے، اور معاف کر دینا بلکہ معاف کر دینے کے بعد مزید اس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا؛ یہ بہت ہی اونچی صفت ہے۔

جا! تجھے آزاد کیا

حضرت امام زین العابدین علی بن حسین بن علی (رحمۃ اللہ علیہ) ایک مرتبہ دسترخوان پر تشریف فرما تھے، غلام کھانے کی کوئی گرم گرم چیز لے کر آیا، اس کے ہاتھ سے وہ برتن چھوٹا اور وہ ان کے ایک بچے کے اوپر گرا، وہ جل گیا، انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے غلام کی طرف دیکھا، تو غلام نے فوراً پڑھا: ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ یہ سن کر انہوں نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس نے

آگے پڑھا:﴿وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾انہوں نے کہا: میں نے تجھے معاف کردیا۔اس نے آگے پڑھا:﴿وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ انہوں نے فرمایا جا! مَیں نے تجھے آزاد کردیا۔

یہ حضرات کیسے اونچے اوصاف کے حامل تھے! قرآن وحدیث کی تعلیمات کی اصل چیز جو ہم لوگوں کے سمجھنے اور اختیار کرنے کی ہے؛ وہ یہی ہے۔حضراتِ صحابہ تابعین اور اسلاف کرام(رحمۃ اللہ علیہ) کے سامنے ایسے مواقع پر جب کوئی نصیحت ،یا قرآن وحدیث کے حوالہ سے کوئی بات پیش کی جاتی تو وہ اپنے نفس کے تقاضوں کو اسی وقت چھوڑدیتے تھے اور فوراً اس پر عمل کرتے تھے،اپنی طبیعت ومزاج کے خلاف فوراً ان چیزوں کے اوپر عمل کے لیے آمادہ ہوجاتے تھے۔ایسے بے شمار واقعات حضراتِ صحابہ کرام(رضی اللہ عنہ) کی زندگی میں ملیں گے کہ کسی بات پر ناراض ہوکر-چاہے وہ ناراضگی حق بجانب ہی ہو- انہوں نے کوئی اقدام کیا،لیکن جب اس پر متنبہ کیا گیا تو وہ فوراً باز آگئے۔

کوئی بااعتدال،کوئی بدحال

حضرت ابوبکر صدیق(رضی اللہ عنہ) کا واقعہ پہلے بھی گزرا کہ حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) جو آپ (رضی اللہ عنہ)کی صاحبزادی اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لاڈلی زوجۂ مطہرہ تھیں،ان پر جب منافقین نے تہمت لگائی، اس پروپیگنڈے میں کچھ مخلص مؤمنین بھی پھنس کر غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے تھے، انہیں میں حضرت مسطح بن اثاثہ(رضی اللہ عنہ) بھی تھے، جن کی والدہ حضرت ابوبکر صدیق(رضی اللہ عنہ) کی خالہ

زاد بہن تھیں۔ حضرت مسطح (رضی اللہ عنہ) غریب تھے، رشتہ دار تھے، مہاجری تھے، نیز غزوئہ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے، اور حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ان کا سارا خرچہ برداشت کرتے تھے۔

ان حضرات کی انصاف پسندی اور مزاج کا اعتدال دیکھئے! جب حضرت عائشہ صدیقہ (رضی اللہ عنہا) پر تہمت والا معاملہ پیش آیا تو جن حضرات کا اس میں ابتلاء وآزمائش ہوئی تھی ان کے ساتھ انہوں نے کیا معاملہ کیا اور کب کیا؟ حصہ لینے والی بات تو پہلے ہو چکی تھی لیکن محض ان کے حصہ لینے پر حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے کوئی اقدام نہیں کیا اور کوئی ایکشن نہیں لیا، جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں حضرت صدیقہ (رضی اللہ عنہ) کی براءت اور ان کا اس تہمت سے پاک ہونا نازل ہوا، اور بات صاف ہوگئی کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے متعلق جو باتیں چلائی گئی تھیں وہ تہمت اور پروپیگنڈہ تھا، اب ان لوگوں کا مجرم ہونا بالکل واضح ہوگیا، تو حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے ان پر ایکشن لیا۔

اس لیے کہ کوئی آدمی اگر کسی کے متعلق کوئی بات کہتا ہے تو اس میں دونوں پہلو ہو سکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ جھوٹا ہو۔ اگر سچا ہو تو غلطی کی اصلاح ہونی چاہیے، لیکن جھوٹا ہونا ثابت ہو جانے کے بعد تو کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ اور ہم لوگوں کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ سچا ہو تب بھی ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ پہلے ہی کر لیتے ہیں یعنی اس نے جو بات کہی ہے وہ سچی ہے تب بھی ہم اس کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اپنی اصلاح نہیں کرتے، بلکہ اسی کے خلاف ایکشن لیتے ہیں۔ یہاں غور کیجئے کہ محض اس معاملہ کے پیش آنے پر حضرت ابوبکر

صدیق نے کچھ نہیں کیا، بلکہ ان پر خرچ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا، جب قرآنِ پاک میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی براءت کی آیتیں نازل ہوئیں اور بات صاف ہوچکی کہ جو لوگ اس میں حصہ لینے والے تھے، سب بہتان تراش تھے، ان کی طرف سے یہ غلط حرکت ہوئی ہے، تب حضرت ابو بکر صدیق نے قسم کھائی کہ میں ان پر خرچ نہیں کروں گا۔

اس موقع پر علماء نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے ان پر خرچ نہ کرنے کی جو قسم کھائی اس میں بظاہر دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) ان کی صاحبزادی تھیں، اور دوسری یہ کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجۂ مطہرہ تھیں، اور ان کے نہ خرچ کرنے کی قسم کھانے کی دراصل علت یہی تھی کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زوجۂ مطہرہ کے ساتھ انہوں نے ایسا معاملہ کیا تھا۔ خیر! ان کا خرچہ بند کر دیا اور قسم کھالی کہ آئندہ ان پر خرچ نہیں کروں گا، اس پر قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ تم میں جو فضیلت اور وسعت والے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ نے جن کو باطنی کمالات سے نوازا رکھا ہے اور مالی وسعت بھی دے رکھی ہے) وہ اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں، غریبوں، اور اللہ کے راستہ میں ہجرت کرنے والوں پر خرچ نہیں کریں گے۔ حضرت مسطح (رضی اللہ عنہ) میں یہ تینوں باتیں تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے رشتہ دار بھی تھے کہ خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے، غریب اور محتاج بھی تھے، اللہ کے راستہ میں ہجرت کر کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے تینوں اوصاف کو ذکر

کیا گیا۔ گویا ان میں سے کوئی ایک بات بھی ہوتی تو کافی تھی، چہ جائیکہ یہ تینوں چیزیں ہیں ایسے لوگوں پر خرچ نہ کرنے کی قسم نہ کھائیں۔

دیکھو! قرآنِ پاک میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے لیے باری تعالیٰ کی طرف سے "أُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَة" کا لقب استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ان کے مقام کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

بلکہ آگے فرمایا: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا﴾ معاف کریں اور در گزر کریں ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟

سفارش بھی، تنبیہ بھی

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی کیسا پیارا انداز اختیار فرمایا! حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کو تنبیہ بھی کی جارہی ہے اور حضرت مسطح (رضی اللہ عنہ) کی سفارش بھی کی جارہی ہے۔ حضراتِ صحابہ کا مقام بھی دیکھئے کہ ان کی طرف سے کوئی فروگذاشت ہورہی ہے تو اللہ تعالیٰ بڑے پیارے انداز سے اصلاح فرمارہے ہیں۔ اِدھر ان سے بھی قصور ہوا تھا، وہ اپنے قصور پر نادم بھی تھے، ان پر حد بھی جاری ہوئی تھی اور معافی بھی ہوگئی تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے سفارش کردی۔ جب کسی سے نادانی میں جرم ہوگیا، وہ معافی مانگ رہا ہے اور اس کو اس کے جرم کی سزا جو شریعت کی مقرر کی ہوئی ہے وہ بھی دی جاچکی ہے، تو معاملہ ختم ہوگیا، اب اور کیا رہ جاتا ہے۔ ہم

لوگوں کا معاملہ تو ایسا ہے کہ گویا زندگی بھر کے لیے ایسا کھونٹا لگادیا کہ اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حالاں کہ اسلام کی تعلیم دیکھئے کہ وہ دونوں طرف کیا سکھاتا ہے۔ ان سے قصور ہوا اور قصور بھی معمولی نہیں تھا، بلکہ بہت بڑا قصور تھا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اس تہمت والے واقعہ کی وجہ سے ایک طویل زمانہ تک بڑا اثر رہا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی تھی، سارے مسلمان اس کی وجہ سے پریشانی میں مبتلا رہے، لیکن پھر بھی ان سے تو نادانستگی میں ہوا تھا جس کی سزا بھی مل گئی، اس پر نادم بھی ہوئے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً وحی اتری۔

اب معاملہ صاف کرلیجئے

گویا اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے اہلِ ایمان کی تربیت فرمارہے ہیں کہ ان کے اندر کیسے اوصاف ہونے چاہئیں؟ ایسی کوئی بات ہوجائے تو اہلِ ایمان کا مزاج کیا ہونا چاہیے؟ اس لئے کہ معاشرہ، سماج اور سوسائٹی میں کسی سے قصور اور کوتاہی ہوجاتی ہے اس کے بعد اگر وہ اپنے قصور و کوتاہی پر نادم بھی ہے اور شریعت کی طرف سے مقررہ سزا بھی دی جاچکی ہے، تو اب آئندہ کے لئے معاملہ صاف کرلیجئے۔ یہاں اللہ تعالیٰ خود سفارش فرمارہے ہیں: ﴿وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو بلاکر ان کے سامنے تلاوت فرمائی۔ آپ تلاوت فرماکر فارغ ہوئے تو حضرت ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: "بَلَىٰ أُحِبُّ أَن يَّغْفِرَ اللَّهُ لِي" کیوں نہیں!

مَیں پسند کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کو معاف کردے۔اسی وقت جو وظیفہ اور خرچہ بند کردیا تھا، وہ جاری کردیااور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی بند نہیں کروں گا اور اب تک جو باقی تھا وہ بھی دیدیا۔

ہمارا مزاج ؟خدا کی پناہ!

حضراتِ صحابہ کا مزاج قرآنی تعلیمات اور نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کے ارشادات کے معاملہ میں یہی تھا۔بخاری شریف میں حضرت عمر(رضی اللہ عنہ)کے متعلق یہ جملہ ہے:"کَانَ وَقَّافاً عِنْدَ کِتَابِ اللہ"اللہ تعالیٰ کی کتاب یعنی قرآن کی کوئی بات سامنے آجائے تو فوراً رُک جانے والے تھے۔قرآن کے مقابلہ میں اپنے نفس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔اور ہم لوگوں نے اپنا مزاج اتنا زیادہ بگاڑرکھا ہے کہ خدا کی پناہ!کوئی آدمی ہمارے سامنے قرآنِ کریم کی ایک آیت تو کیا،بیسیوں آیتیں پیش کردے،نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیکڑوں حدیثیں پڑھ دے ،اور ہمارا دل کہہ رہا ہو کہ یہ سب صحیح کہہ رہا ہے؛ پھر بھی ہم تاویلیں کریں گے کہ اس میں تو یوں ہے اور فلاں ہے۔کہیں آپس میں صلح کے لئے کوئی بات کہنے کے بعد کہا جائے کہ اتنی ساری حدیثیں سنائی گئیں،اب تو معاف کردیجئے،تب بھی کہتے ہیں :آپ کی سب باتیں ٹھیک ہیں ،لیکن اس کو تو دیکھو! کیسا نالائق ہے،یہ تو معاف کرنے کے لائق نہیں ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ لوگ ایسے بھی

ہیں جن کو معاف نہیں کیا جانا چاہیے، اگر ایسا ہوتا تو حدیث میں بتلا دیا جاتا، حالاں کہ ایسا کہیں نہیں آیا ہے۔ درحقیقت ہم لوگوں کا مزاج بگڑ گیا ہے۔

اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو اللہ اور اس کے پاک رسول(ﷺ) کے حوالہ کردیں، ان کے سامنے سرنڈر ہو جائیں ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ ''سِلْم'' یعنی اپنے آپ کو حوالہ کردینا، ہمارا کوئی ارادہ و خواہش نہیں، ہمارا کوئی تقاضہ نہیں، ہمارا جی مانے یا نہ مانے، ہمارے مزاج کے موافق ہو یا مخالف، ہم کو بظاہر اس سے کچھ فائدہ ہو یا نقصان؛ اُدھر سے جو فیصلہ ہو جائے اور جو کہا جائے، بس! ہم تو اسی میں راضی ہیں۔ دراصل اسلام یہی چاہتا ہے کہ ہر چیز میں اپنے آپ کو پورے طور پر خدا و رسول کے حوالے کر دیجئے۔ جیسا کٹھ پتلی کا حال ہوتا ہے، اور جیسے کسی کے پاس ایک مشین ہوتی ہے، جس طرح وہ چاہتا ہے اس کو چلاتا ہے، اسی طرح ہمیں بھی کرنا ہے؛ تب ہی بات ہے۔ شریعت ہمارا مزاج اسی طرح کا بنانا چاہتی ہے۔

اور کوڑا رکھ دیا

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے ﴿خُذِ الْعَفْوَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ بناؤ۔ جو لوگ تمہارے ساتھ زیادتی کرنے والے ہیں ان کو معاف کرنے کا آپ کا مزاج ہونا چاہیے۔ ﴿وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ اور بھلی بات کا حکم دیجئے ﴿وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ اور جو آپ کے ساتھ جہالت کا سلوک، نامناسب برتاؤ کرنے والے ہیں، آپ ان سے صرفِ نظر اور چشم پوشی کیجئے، یعنی انتقام نہ لیجئے۔

بخاری شریف میں بروایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما منقول ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے لئے جو مجلسِ شوریٰ بنائی تھی (جن سے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) اہم امور اور معاملات میں مشورہ لیتے تھے) وہ تمام کے تمام قراء، اہلِ علم اور قرآن کے علماء تھے۔ حر بن قیس ؒ بھی انہی لوگوں میں سے تھے۔ ان کے چچا عیینہ بن حصن فزاری (رضی اللہ عنہ) صحابی تھے، لیکن دیہات کے رہنے والے تھے، ان کے مزاج میں اکھڑپن تھا۔ ایک مرتبہ وہ مدینہ منورہ آئے اور اپنے بھتیجے حر بن قیس ؒ کے یہاں قیام کیا۔ ان کو معلوم تھا کہ میرے بھتیجے کا امیر المؤمنین کے یہاں خاص مقام ہے۔ انہوں نے اپنے بھتیجے حر بن قیس ؒ سے کہا: امیر المؤمنین کے یہاں تمہارا خاص مقام اور عزت ہے، میرے لئے بھی ان کے یہاں خصوصی اوقات میں حاضری کی اجازت لے لیجئے، ویسے تو وہاں ایسا کچھ نہیں تھا، جو آدمی جب ملنا چاہتا مل سکتا تھا، لیکن کچھ خصوصی اوقات ہوتے تھے جن میں ہر ایک کو آنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا، صرف اہلِ مشورہ وہی وہاں موجود ہوتے تھے، اس لئے انہوں نے خاص اوقات میں اپنے لئے حاضری کی اجازت طلب کرنے کی درخواست کی۔ اور چچا باپ کے درجہ میں ہوتا ہے، اس لئے چچا کی اس خواہش کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے حر بن قیس ؒ نے امیر المؤمنین سے اجازت طلب کی کہ میرے چچا میرے گھر پر مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ میں جب یہاں آؤں تو وہ بھی ساتھ آئیں۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اجازت دیدی (حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے یہاں تو کوئی بھی غلط بات کرتا تو فوراً اس کو سزا دی جاتی تھی، اس میں دیر نہیں لگتی تھی۔ خیر!) جب وہ آئے تو مجلس میں بیٹھتے ہی عیینہ بن حصن

فزاری (رضی اللہ عنہ) نے ایک بے تکی بات کر دی۔ کہا: "هِيَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ! فَوَاللهِ، مَا تُعْطِينَا الْجَزْلَ، وَلَا تَحْكُمُ بَيْنَنَا بِالْعَدْلِ" اے ابن الخطاب! آپ انصاف سے فیصلہ نہیں کرتے، اور برابر ہم کو بخشش اور عطیے بھی نہیں دیتے۔ (حالاں کہ ظاہر ہے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے یہاں تو سارا نظام مرتب تھا، ہر ایک کے وظائف مقرر تھے جو سب کو ملتے تھے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) ہی کے زمانہ میں حکومت کے سارے نظامات باقاعدہ مرتب کئے گئے تھے۔ علامہ شبلی نعمانی (رحمۃ اللہ علیہ) نے الفاروق میں اس کی پوری تفصیل ذکر کی ہے۔ اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا عدل و انصاف تو ایک مسلّمہ حقیقت ہے) حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا ہاتھ فوراً کوڑے پر گیا۔ حر بن قیس نے دیکھا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) چچا کی خبر لے ڈالیں گے اور سارا مزہ کِرکِرا ہو جائے گا۔ انہوں نے موقعہ کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فوراً یہ آیت پڑھی: امیر المؤمنین! باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اپنے پاک رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرمایا ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ بنایئے، بھلی بات کا حکم کیجئے اور نادانوں سے چشم پوشی، اعراض و صرفِ نظر کیجئے "وَإِنَّ هٰذَا مِنَ الْجَاهِلِيْنَ" اور یہ بھی ایسے ہی ہیں، حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا مزاج فوراً اعتدال پر آ گیا، اسی وقت کوڑے سے ہاتھ ہٹا لیا۔ اسی موقعہ پر بخاری شریف میں یہ جملہ ہے: "وَكَانَ وَقَّافاً عِنْدَ كِتَابِ اللهِ تَعَالَى" اللہ تعالیٰ کی کتاب کے سامنے اپنے آپ کو روکنے والے تھے یعنی جہاں کوئی اس کی بات پیش ہوئی فوراً اس سے رک گئے

(بخاری شریف: ۴۶۴۲، باب [خذ العفو وأمر بالعرف وأعرض عن الجاهلين])

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شریعت ہم سے یہی مزاج چاہتی ہے، جیسے کبھی رشتہ داروں سے ناچاقی اور خلافِ مزاج بات پیش آجاتی ہے، لیکن شریعت ہمیں کہتی ہے کہ ان کے ساتھ اچھا معاملہ کرو، تو بس ہمیں کرنا ہے، وہاں پھر تاویلات بھول جایئے، جب ہر چیز کی تفصیل شریعت میں موجود ہے، تو پھر ہم اس میں تاویلیں کرتے رہیں اور اس میں غلطی نکالتے رہیں کہ یوں ہے اور فلاں ہے؛ یہ تمام باتیں ہمارے نفس کی دھوکہ بازی ہے۔ شیطان آدمی کو اللہ ورسول کے ارشادات، ہدایات اور حکموں پر عمل کرنے سے روکتا ہے۔

اگر یہ طریقہ اپنائیں...

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ﴾ نیکی اور برائی، اچھا اور برا سلوک دونوں برابر نہیں ہوسکتے ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ (سامنے والے کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آجائے تو آپ اس کا) جواب ایسے طریقہ سے دیجئے جو اچھا ہو۔ حضرت جبرئیل (علیہ السلام) جب اس آیت کو لے کر نازل ہوئے تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: اچھا سلوک کیا ہے؟ انہوں نے کہا: "صِلْ مَنْ قَطَعَكَ" جو رشتہ دار آپ سے قطع رحمی کرے، رشتہ داری کے حقوق ادا نہ کرے، آپ اس کے حقوق ادا کیجئے۔ "وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ" اور جو آپ پر زیادتی کرے آپ اس کو معاف کیجئے۔ "وَأَحْسِنْ اِلٰى مَنْ أَسَآءَ اِلَيْكَ" اور جو آپ کے ساتھ برائی کرے، آپ اس کے ساتھ اچھا سلوک کیجئے۔ بھلے طریقہ سے

جواب دینے کا مطلب یہی ہے۔جب یہ طریقہ آپ اپنائیں گے تو وہ آپ کا پکا دوست بن جائے گا یعنی ہمیشہ کا ٹینشن ختم ہو جائے گا۔

لیک بعد از خرابیٔ بسیار

دراصل ٹینشن تو ہم لوگ خود بڑھاتے رہتے ہیں، کسی نے ہمارے ساتھ برا سلوک کیا، اس کے جواب میں ہم بھی ویسا ہی سلوک کرتے ہیں،تو اب کیا ہو گا؟ ظاہر ہے کہ جب یہ سلسلہ آگے بڑھے گا تو ٹینشن بھی بڑھتا ہی جائے گا۔آخر کسی وقت تو اس کو ختم کرنا ہے،یا اس کو ہمیشہ چلاتے ہی رہنا ہے؟ تھوڑے زمانہ کے بعد پھر کہتے ہیں کہ چلو!اب صلح کر لیں:ے

آں چہ کند دانا کند ناداں
لیک بعد از خرابیٔ بسیار

عقلمند آدمی جو کام کرتا ہے ،نادان آدمی بھی وہ کام کرتا ہے ،لیکن بہت نقصان ہو جانے کے بعد۔ عقلمند وہی کام پہلی فرصت میں کر لیتا ہے۔اتنے سارے کیس لڑے،اتنے سارے پیسے خرچ کیے،اتنی ساری لڑائیاں کیں، کاروبار کا نقصان کیا، ساری دنیا میں جگ ہنسائی اور بدنامی ہوئی،اس کے بعد صلح کی سوجھی۔یہی کام پہلے روز کر لیتے تو کتنا اچھا ہوتا!اتنے نقصانات جو اٹھائے،اتنے سارے پیسے خرچ کیے،اگر اس کا پاؤ حصہ بھی اس کو دے دیا ہوتا،تو وہ آپ کا غلام بن جاتا۔

وہ سکتہ میں آگیا

ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس آیا، آپ کو برا بھلا کہا اور خوب گالیاں دیں، آپ سر جھکا کر سنتے رہے، جب وہ سب کہہ چکا تو حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہ) نے عکرمہ سے کہا: اے عکرمہ! ان سے پوچھ لیجیے کہ ان کی کوئی حاجت ہے جو ہم پوری کر سکتے ہیں؟ یہ سن کر وہ آدمی بالکل خاموش ہو گیا اور سکتہ میں آگیا۔ اس کے بجائے کچھ اور سلوک کیا جاتا تو کیا یہ ممکن تھا؟

ہمت کا کام

اس لئے شریعت کا بتلایا ہوا طریقہ ہی آسان ہے ﴿ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ اسی آیت میں آگے فرمایا ہے کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ دنیا میں یہ ہو گا کہ جو تمہارا دشمن ہے وہ پکا دوست بن جائے گا۔ اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لوگ دوست بنانے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ آپ اگر اتنا ہی کر لیں، اور تھوڑا تحمل سے کام لیں، تھوڑی بردباری اپنائیں، تو بہت آسانی کے ساتھ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آدمی کی آزمائش کا موقع یہی ہوتا ہے، اس وقت آدمی اپنے نفس کے اوپر کنٹرول کرے ضبط رکھے اور غصہ پیئے۔

آگے فرمایاہے:﴿وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾اس کی توفیق نہیں ہوتی مگرانہی لوگوں کو جو صبرکرنے والے ہیں﴿وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْحَظٍّ عَظِيْمٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ جس کو اس کی توفیق دے وہ بڑے نصیبے والاہے۔اس کی توفیق ہی سے یہ چیز ہوسکتی ہے؛ورنہ اتنا آسان کام نہیں ہے،لیکن آدمی اگرکوشش کرے تودھیرے دھیرے یہ چیزاس کو حاصل ہوجاتی ہے۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَوَغَفَرَاِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾جو آدمی صبر سے کام لے اور معاف کردے؛ تویہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

دوپسندیدہ خوبیاں

حدیث ۶۳۲:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ اللہ(صلی اللہ علیہ وسلم) لأَشَجِّ عَبْدِ القَيْسِ إنَّ فيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ : الْحِلْمُ وَالأَنَاةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما راوی ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے أَشَجّ عبدالقیس سے فرمایا: تمہارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں (اگر ہمیں معلوم ہوجائے کہ وزیراعظم یاصدرِ مملکت اس خوبی کو بہت پسند کرتے ہیں، تو ہم اپنے اندر اس خوبی کوپیداکرنے کی کوشش کرتے ہیں،تو اللہ تعالیٰ جس خوبی کوپسند کرتے ہیں ہمیں اپنے اندروہ پیداکرنے کی کوشش کرنی چاہیئے)ایک تو بردباری اور دوسری اطمینان وسکون کے ساتھ کسی کام کوانجام دینا۔

افادات:-عبدالقیس عرب کاایک قبیلہ ہےجو بحرین کے علاقہ میں آباد تھا،ان کاایک وفدنبی کریم(ﷺ)کی خدمت میں حاضرہوا۔اورجیساکہ عام طورپرہوتا یہ ہے کہ کسی بڑی شخصیت کے پاس جب لوگ جاتے ہیں تو دل میں بڑے جذبات اور بڑی تمنائیں ہوتی ہیں کہ جب جاکر ملیں گے توپہلی فرصت میں ان سے نیاز حاصل کریں گے،یہاں بھی یہی ہواکہ جب قافلہ والے سفرکرکے مدینہ منورہ پہنچے تو نبی کریم (ﷺ)مسجدِ نبوی میں تشریف فرماتھے، آپ کودیکھتے ہی قافلے والے اونٹوں سے اترے اوران کوباندھےبغیر ہی بھاگے، اور ملاقات کے واسطےسیدھے حضور(ﷺ) کے پاس پہنچ گئے، ان میں ایک آدمی منذر نامی تھےجن کالقب اَشَجّ تھا۔انہوں نے سب کے اونٹوں کوباندھا اورچوں کہ سفرسے آئے ہوئے تھے اس لئے کپڑے بھی میلے ہوچکے تھے، تو اپنا سامان کھولا اوراس میں سے دھلے ہوئے کپڑے نکالے اور بدلے،پھرنبی کریم(ﷺ) کی خدمت میں حاضرہوئے۔یہ سارا منظر حضوراکرم(ﷺ) دیکھ رہے تھے۔دوسرے لوگ توپہلے سے خدمت میں پہنچ چکے تھے اور گویاانہوں نے اپنے زعم میں ان سے سبقت حاصل کرلی تھی،لیکن جب یہ اس طرح تیاری کرکے حضوراکرم(ﷺ)کی خدمت میں حاضرہوئے توحضوربہت خوش ہوئے اوران سے فرمایا: تمہارے اندر دو خوبیاں ایسی ہیں جن کواللہ تعالیٰ پسندکرتے ہیں؛ ایک توبردباری اور دوسری اطمینان و سکون کے ساتھ کسی کام کوانجام دینا۔عام طور پرایسے موقع پر طبیعت عجلت اورجلدی بازی کوچاہتی ہے،لیکن

انہوں نے عجلت نہیں کی تو اس پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی تعریف فرمائی اور ان کی اس عادت کو پسند فرمایا۔

غصہ مت کرو

توحلم اور بردباری بہت عمدہ صفت ہے ،اس لئے کہ سب کام غصہ میں خراب ہو جاتے ہیں۔غصہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس میں انتقام کے لئے آدمی کا خون کھولنے لگتا ہے،اور اس کا اثر پورے جسم پر نمایاں ہوتا ہے، یہاں تک کہ ظاہری اعضا پر بھی اثر پڑتا ہے،جیسے چہرہ سرخ ہو جاتا ہے،رگیں پھول جاتی ہیں، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں اور زبان پر اثر یہ ہوتا ہے کہ اول فول بکنے لگتا ہے، گالیاں دیتا ہے، تہمت لگاتا ہے ، اور پتہ نہیں کیا کیا کرتا ہے۔ہاتھ اور اعضاء پر اثر یہ پڑتا ہے کہ سامنے والے پر حملہ آور ہوتا ہے اور پٹائی یا قتل کرنے یا اس کے کپڑے پھاڑ دینے یا اس کو نوچنے کے درپے ہو جاتا ہے۔اور اگر وہ ہاتھ میں نہیں آتا تو جو چیز ہاتھ میں آ گئی اسی کو اٹھا کر پھینک دیتا ہے، اور توڑ ڈالتا ہے۔گویا آدمی کی عقل ہی جاتی رہتی ہے،اور عقل اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی چیز دے رکھی ہے ،وہ جب جاتی ہے تو یہ سب کارنامے انجام دیتا ہے۔ اسی آدمی کو بعد میں جب بتایا جائے کہ آپ نے یہ سب کیا ہے، تو وہ خود پچھتاتا ہے۔ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی آدمی غصہ ہوا ہو،اور بعد میں پچھتایا نہ ہو،ہر غصہ ہونے والے کو بعد میں پچھتانا

پڑتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ سب سے خطرناک چیز غصہ ہے، اس پر کنٹرول کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔ حضور اکرم (ﷺ) نے بھی اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے کہ غصہ مت کرو۔

قصور گاہک کا، سزا بیوی کو!

اور غصہ کی وجہ سے بعض ایسے نقصانات پہنچ جاتے ہیں کہ زندگی بھر آدمی پچھتاتا رہتا ہے۔ جیسے بہت سے لوگ طلاق دیتے ہیں۔ جھگڑا کسی کے ساتھ ہوا ہے اور اس کو بیوی پر اتارتے ہیں۔ طلاق دینے کے بعد آکر کہتے ہیں کہ مفتی صاحب! میرا طلاق دینے کا ارادہ نہیں تھا، بس! غصہ میں دے دی۔ جب میرے پاس ایسے طلاق والے آتے ہیں تو مجھے ان کے اوپر بہت تعجب ہوتا ہے۔ اس لئے کہ جب ان سے پوچھتے ہیں کہ ہوا کیا تھا؟ تو کہتے ہیں کہ بیوی کے بھائی کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، بیوی کے ابا کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی، بلکہ بعض مرتبہ تو جس سے لڑائی ہوئی وہ بیوی کا رشتہ دار بھی نہیں ہوتا۔ یا کسی گاہک پر غصہ آگیا تھا، اسی غصہ میں میاں صاحب گھر پہنچے اور بیوی کو طلاق دے ڈالی۔ عجیب و غریب معاملہ ہے! تو میں عرض کر رہا تھا کہ غصہ آدمی کی عقل ختم کر دیتا ہے۔

جب وہ غصہ میں ہوتا ہے

شیطان سے کسی نے پوچھا کہ تم کو انسان کے اوپر سب سے زیادہ قابو کون سے وقت ملتا ہے؟ اس نے کہا: جب وہ غصہ میں ہوتا ہے اس وقت مجھے اس پر پورا کنٹرول ہو جاتا ہے، اس وقت اس کی پوری لگام میرے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور میں جو چاہتا ہوں؛ کرواتا ہوں۔ اس لئے شیطان چاہتا ہی ہے، اس کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ آدمی غصہ میں آجائے۔

مناظرہ میں کامیابی کا گُر

ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے: مناظرہ اور علمی بحثوں میں کامیاب ہونے کا سب سے بڑا گُر یہی ہے کہ آپ کوئی ایسا کام کر دیجئے کہ جس سے سامنے والے کو غصہ آجائے۔ بس! ایک مرتبہ وہ غصہ میں آگیا تو اس کا سارا علم، سارے دلائل، اور اس کا سارا حافظہ غائب ہو جائے گا، پھر آپ جس طرح چاہیں اس پر قابو حاصل کر لیجئے۔ مناظرہ میں کامیابی کا یہ بہت ہی آسان نسخہ ہے۔

خوبیاں وہبی یا کسبی؟

پھر حضرت منذر اشجّ عبد القیس (رضی اللہ عنہ) نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ دو چیزیں میں نے حاصل کی ہیں، یا اللہ تعالیٰ نے مجھے ان خصلتوں پر پیدا کیا ہے؟ (یعنی یہ خوبیاں قدرتی ہیں یا میں نے محنت، ریاضت اور مجاہدہ کر کے حاصل کی ہیں؟ کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو آدمی محنت، ریاضت اور مجاہدہ کر کے حاصل کرتا ہے اور کچھ خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ فطری طور پر آدمی کے اندر ودیعت فرماتے ہیں) تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم کو اسی پر پیدا کیا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسی دو خصلتوں پر پیدا کیا، جن کو وہ پسند کرتا ہے

دونوں راہیں بتلا دیں

یہ بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدمی کے قلب میں ہر طرح کی صفات کی جڑیں اور بیج رکھے ہیں۔ آدمی جیسے ماحول میں پرورش پاتا ہے اور جو راہ خود اپنے لیے اختیار کرتا ہے، اسی کے مطابق ترقی کرتا ہے ﴿وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ﴾ اللہ تعالیٰ نے دونوں راہیں بتلا دی ہیں۔ کس چیز میں کیا فائدہ ہے اور کس چیز میں کیا نقصان ہے؛ وہ بھی بتلا دیا ہے۔ تو حلم کا مادہ آدمی میں ہوتا ہی ہے، لیکن آدمی ریاضت اور مجاہدہ کر کے اس کو ترقی دیتا ہے۔ ایسے ہی جتنی بھی خوبیاں ہیں ان

کے بیج اللہ تعالیٰ نے تمام انسانی دلوں میں ڈال رکھے ہیں،بری صفات کے بیج بھی ہوتے ہیں ،اب آپ کس کو پانی دیتے ہیں اس پر ساری بنیاد ہے۔اچھے اوصاف کے مناسب پانی اہل اللہ، اہلِ تقویٰ اوراچھے اخلاق والوں کی صحبت اوران سے استفادہ ہے ۔ اوربرے اوصاف کے مناسب پانی بری صحبت ہے۔اگربری صحبت میں رہ کران کو پانی پلائیں گے ؛تو وہی بڑھیں گے اور پھران کا نتیجہ ظاہر ہو گا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گزشتہ مجلس میں عنوان شروع ہواتھا:بردباری اورانا ءۃ؛اطمینان و سکون سے کام کوانجام دینا،اورنرمی؛ان تین چیزوں کی تفصیل بھی بتلادی تھی۔اسی سلسلہ میں روایات چل رہی ہے۔

نرمی کاجادو

حدیث ۶۳۳:-

وعن عائشة(رضی اللہ عنہا)قالت قَالَ رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم):إِنَّ اللهَ رفيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ فِي الأَمْرِ كُلِّه. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا)راوی ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے ارشاد فرمایاکہ: اللہ تعالیٰ نرم ہیں، اور ہر چیز میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔

افادات:- نرمی کی عادت ہرکام میں خوبی پیداکردیتی ہے، اور سختی کی وجہ سے اس کام کی خوبی گھٹتی، اور کبھی تو بالکل ختم ہی ہوجاتی ہے۔آپ کبھی کسی کوتنبیہ کرنا چاہیں، تو تنبیہ کی بات بھی اگر نرمی کے ساتھ کریں گے تو اس کی وجہ سے سامنے والے پر جو اثرہوگا، سختی کے ساتھ کہنے میں وہ اثرنہیں ہوگا۔اس لئے نرمی بھی ایسی چیزہے جس کی شریعت میں تاکید آئی ہے اوراس کوساری خوبیوں کی جڑ قراردیاگیا ہے۔

اگر طویل المیعاد فائدہ حاصل کرنا ہے !

حدیث ۶۳۴:-

وعنها: أَنَّ النبيَّ (ﷺ) قَالَ : إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفقَ، وَيُعطى عَلَى الرِّفق، مَا لاَ يُعطِي عَلَى العُنْفِ، وَمَا لاَ يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نرم ہیں، نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ اور نرمی پر وہ چیز دیتے ہیں جو سختی پر نہیں دیا کرتے، اور کسی بات پر وہ نعمت نہیں عطا فرماتے جو نرمی پر عطا فرماتے ہیں۔

افادات:- کسی بھی کام کو آپ انجام دینا چاہیں تو اس کے لئے دو ہی طریقے ہوسکتے ہیں، یا تو سختی والا پہلو اپنا کر اس کام کو انجام دیں، یا نرمی اختیار کرکے انجام دیں۔ مثلاً کسی آدمی کو کسی برائی سے روکنا ہے، یا کسی بھلے کام کی تاکید کرنی ہے تو آپ سختی والا رویہ اختیار کریں یا نرم طریقہ اختیار کریں۔ نبی کریم (ﷺ) ہمیں یہ ہدایت فرمارہے ہیں کہ بھائی! نرمی کو اللہ تبارک و تعالیٰ پسند فرماتے ہیں، اس لئے مؤمن کو نرمی والا طریقہ ہی اختیار کرنا چاہیے۔

پھر آگے یہ بھی بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ نرمی پر وہ عطا فرماتے ہیں جو سختی پر نہیں دیا کرتے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ نرمی کے نتیجہ میں جو اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں، سختی کے نتیجہ میں وہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ سختی کی وجہ سے کوئی فائدہ ہو بھی گیا

تووہ وقتی اورہنگامی ہوتاہے، طویل زمانہ کے اعتبار سےوہ مفیداور کارآمد ثابت نہیں ہوتا ہے۔ بہت کم ایساہوتاہے کہ اس سےکوئی طویل المیعادفائدہ حاصل ہواہو۔اس لیے حضوراکرم(ﷺ)یہ ہدایت فرماتے ہیں کہ مؤمن کو چاہیے کہ وہ نرمی والا طریقہ اختیارکرے۔

اس زمانہ میں عام طورپرتعلیم وتربیت کے ذمہ دارحضرات، عصری تعلیم گاہوں کے سربراہان نفسیاتی اوردوسرےاندازسے لوگوں کی اصلاح کے، اوربرائی سے روکنے کے جوطریقے اختیارکرتےہیں،ان میں بھی اسی بات کی کوشش کی جاتی ہے کہ نرمی والاپہلواختیار کیا جائے۔ ہمیں توحضوراکرم(ﷺ)کی یہ تعلیم ہے کہ نرمی اختیار کرو۔اورخود حضوراکرم(ﷺ) کا عمل کیا تھا وہ آگے آنے والاہے۔

اس کام میں رونق آجاتی ہے

حدیث ۶۳۵:-

وعنهاأَنَّ النبيَّ (ﷺ) قَالَ: إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ.(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا)سے منقول ہے کہ نبی کریم(ﷺ)نے ارشاد فرمایا: نرمی جس چیز میں بھی ہوگی،اس کوزینت اورخوبی عطا کرے گی۔اورجس چیز میں سے نکال دی جائے گی،اس کوعیب دار بنادے گی۔

افادات:- آپ جس کام میں بھی نرمی اپنائیں گے اس میں خوبی نمایاں ہوگی، نرمی اس کام کو مزید مزین کرے گی، اس کی زینت اور خوبصورتی کو بڑھائے گی۔ جس کام میں نرمی والاپہلواختیارکیا جائے گا،اس میں رونق آجائے گی ،زینت اور خوبی پیدا ہو جائے گی۔اور اس میں سے اگرنرمی نکال دی جاتی ہے تو وہ کام عیب دار ہو جاتا ہے،اس میں ویسی خوبی، رونق اور زینت باقی نہیں رہتی جو نرمی سے حاصل ہوسکتی تھی۔

تم آسانی کرنے والا بناکر بھیجے گئے ہو

حدیث ٦٣٦:-

وعن أَبِي هريرة(رضی اللہ عنہ) قَالَ : بَالَ أعْرَابِيٌّ في المسجدِ، فَقَامَ النَّاسُ إِلَيْهِ لِيَقَعُوا فِيهِ، فَقَالَ النبيُّ(صلی اللہ علیہ وسلم):دَعُوهُ وَأَرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ سَجلاً مِنْ مَاءٍ، أَوْ (قال)ذَنُوباً مِنْ مَاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِينَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِينَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ دیہات کا رہنے والا ایک نیا آدمی(آیا،مسلمان ہوا، اور) مسجدِ نبوی ہی میں پیشاب کرناشروع کردیا۔لوگ اس کی طرف دوڑے تاکہ اس کو تنبیہ کریں(یعنی اس کو روکیں)حضوراکرم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے صحابہ کرام(رضی اللہ عنہم) سے فرمایا: اس کو چھوڑدو ، پیشاب کرلینے دو،اورپانی سے بھراہواایک ڈول لاکر اس پر بہادو۔تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بناکر بھیجے گئے ہو،دشواری اور مشکلی پیدا کرنے والے بناکر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اَلْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ

افادات:-دوسری روایت میں ہے کہ پہلے تواس نے نمازپڑھی اوراس میں ایک دعاکی:أَللّٰھُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّداًوَلَاتَرْحَمْ مَعَنَاأَحَداً.اے اللہ !مجھ پراور محمد(ﷺ) پر رحم کیجئے اور کسی دوسرے پر رحم نہ کیجئے۔ نمازکے بعد حضوراکرم(ﷺ)نے فرمایا:"لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعاً" اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی کشادہ اوروسیع ہے، تم نے صرف اپنے اور میرے لئے رحمت کی دعامانگ کر اس کوتنگ کردیا۔یہ کہنے کی کیاضرورت تھی کہ ہمارےساتھ کسی اور پر رحم نہ کیجئے۔تو ایک کام تواس نے یہ کیا (صحیح البخاری ،باب رَحمَۃِ النَّاسِ وَالْبَھَائِمِ : ٦٠١٠)

پھراس نے حضور(ﷺ)سے سوال کیا:"مَتیٰ السَّاعَۃُ؟" قیامت کب آئے گی؟ حضوراکرم (ﷺ) نے اس سے پوچھا :"مَاأَعْدَدْتَّ لَھَا؟"تونے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے جو قیامت کا سوال کرتاہے ؟جیسے کوئی آدمی پوچھے کہ امتحان کب ہے؟ تو آپ اس سے کہیں گےکہ تم نے کیا تیاری کی ہے کہ امتحان کا سوال کررہے ہو؟ اسی طرح قیامت کب آئے گی جوتم پوچھ رہے ہو؛توتم نے کیاتیاری کی ہے؟اس نے کہا:"مَاأَعْدَدْتُّ لَھَا کَثِیْرَصَلوٰۃٍوَصَوْمٍ وَصَدَقَۃٍ" اے اللہ کے رسول!میں نے اس کے لئے کوئی زیادہ نماز،روزوں کا اہتمام تونہیں کیاہے ،بس!فرائض پر اکتفا کرتاہوں، لیکن میں اللہ اوراس کےرسول سے محبت رکھتاہوں۔ حضوراکرم(ﷺ)نےارشادفرمایا: "اَلْمَرْءُمَعَ مَنْ أَحَبَّ" آدمی اسی کے ساتھ رہے گا جس سے وہ محبت رکھتا ہے (صحیح البخاری، باب

عَلَامَةِ حُبِّ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ) حضرت انس(رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے کہ حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ جواب سن کر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) اتنے خوش ہوئے کہ اس سے پہلے کسی چیز سے اتنے خوش نہیں ہوئے تھے۔(سنن الترمذی:۲۳۸۵) اس لئے کہ ان کو تو حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) سے بہت زیادہ محبت تھی اور یہ جواب تو گویا ان کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔

پھر اس دیہاتی نے تیسرا کام یہ کیا کہ جب اس کو پیشاب کا تقاضا ہوا تو مسجدِ نبوی ہی میں پیشاب کرنا شروع کر دیا۔اس کے نزدیک باہر اور اندر کا کوئی فرق تو تھا نہیں۔اس دیہاتی کے متعلق شرّاح ایک جملہ لکھتے ہیں: "اَلْقَائِلُ وَالسَّائِلُ وَالْبَائِلُ"وہ قائل یعنی دعا کرنے والا تھا۔سائل یعنی سوال کرنے والا تھا۔اور بائل یعنی پیشاب کرنے والا تھا۔

ویسے بھی اُس زمانہ میں مسجدوں میں فرش فروش یا پتھر اور ٹائلس وغیرہ لگے ہوئے نہیں ہوتے تھے، کچی ریت بچھی ہوئی ہوتی تھی اس لیے جو پیشاب گر رہی تھی وہ زمین میں جذب ہو رہی تھی۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ زمین پر پیشاب گری ہو اور سوکھ جائے تو اس سے بھی زمین پاک ہو جاتی ہے، لیکن چوں کہ مسجد کا معاملہ تھا، ہو سکتا ہے کہ سوکھنے میں دیر لگے اور دوسری نماز کا وقت قریب ہو، اگر اس سے پہلے سوکھی نہیں تو وہ جگہ ناپاک رہے گی، یا سوکھ تو گئی لیکن بدبو کا اثر رہ سکتا ہے اس لئے بھی فوری طور پر نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ اس پر پانی کا ایک ڈول بہا دو۔یہ تو اس کی پیشاب سے مسجد کے فرش پر جو اثر ہوا تھا اس کو دور کرنے کی تدبیر بتائی۔

روایت کا سبق

پھر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو ایک نصیحت فرمائی: تم لوگ آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری اور مشکل کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ اسی سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مبعوث فرمایا، پھر آپ اپنی اُمّت کو یہ ذمہ داری سونپ رہے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے شریعت کے جتنے احکام نازل فرمائے ہیں ان کو آگے پہنچانے کے لئے تم بھیجے گئے ہو۔

یہاں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو حلم وبردباری کا سبق دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حرکت کرتا ہوا دیکھ کر آدمی کو فوری طور پر غصہ آتا ہے، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو روک دیا کہ شاید غصہ کی حالت میں کوئی کچھ کر ڈالے۔ اور ایک تدبیر بھی بتلادی جو خطرے سے خالی تھی کہ اس کو پیشاب کر لینے دیا جائے، اس کے بعد اس پر پانی بہادیا جائے، اس میں کچھ نقصان نہیں تھا۔ اور اس کو روکنے میں دو میں سے ایک نقصان لازمی تھا۔ اگر وہ فوری طور پر رک جائے تو اس کو جسمانی نقصان ہو گا، اور اگر نہیں روکے گا اور اُٹھ کر بھاگے گا تو مزید فرش ناپاک ہو گا۔ گویا حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو بتلا دیا کہ اگر تم اس پر غصہ کرو گے اور اس کو روکو گے تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے، بلکہ نقصان ہی ہو گا۔ زمین پر پیشاب کا کچھ حصہ گر ہی

چکاہے، وہ تو ختم ہونے والا نہیں، اس کی پاکی کے لئے تو تدبیر کرنی ہی ہے ،اب اس کو وہیں پورا پیشاب کرلینے دو، بعد میں اس حصہ کو دھودیا جائے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ غصہ کی حالت میں کوئی اقدام اور تدبیر پورے طور پر نافع نہیں ہوتی، اس میں کچھ نہ کچھ قصور، کمی وکوتاہی رہ ہی جاتی ہے ،جس کی طرف اس وقت غصہ کی وجہ سے آدمی کا دھیان نہیں جاتا ،بعد میں اس کو بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کے بجائے فلاں تدبیر کی ہوتی تو اچھا تھا، اس میں یہ نقصان نہ ہوتا۔ اور آئندہ کے لئے یہ بھی بتلادیا گیا کہ تمہارے مزاج میں آسانی ہونی چاہیے، سختی نہیں ہونی چاہیے۔ گویا امت کے لئے یہی ایک چیز اصولی ہے کہ آدمی آسانی والے طریقہ کو اپنائے۔

آسانی کو ترجیح دیجیے

حدیث ۶۳۷:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: يَسِّرُوا وَلاَ تُعَسِّرُوا، وَبَشِّرُوا وَلاَ تُنَفِّرُوا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کے لئے آسانی کرو، دشواری نہ کرو۔ لوگوں کو بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

افادات:-یہ خطاب مختلف طریقوں سے آچکاہے کہ دین میں جوآسان پہلو ہو، اس کوشریعت نےترجیح دی ہے۔اس کامطلب یہ بھی نہیں کہ جہاں صراحتاً حرمت ہووہاں بھی کوئی آدمی اس روایت کو پیش کرکے آسانی کا مطالبہ کرے،جیسے: کوئی کہنے لگے: مولوی صاحب! اب ایسازمانہ آگیاہے کہ سودسے بچنا مشکل ہوگیا ہے،اس لئے آپ اجازت دے دو۔ ارےبھائی! مولوی صاحب سودکی اجازت کہاں سے دیں گے جبکہ قرآن وحدیث میں صاف صاف اس کی حرمت آئی ہے؟بلکہ آسانی کامطلب یہ ہے کہ ہروہ کام جس میں شرعی اعتبار سے دونوں پہلوہوسکتے ہیں، ان میں جوآسان پہلوہو،وہ اختیارکرناچاہیے،دشواری والا پہلو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔یاحکمران طبقہ کو حضور (ﷺ) خطاب کررہے ہیں کہ اپنے عوام اور پبلک سے جومعاملہ پڑے،اوراس میں ان کے لئے دونوں پہلوہوں، توآسانی والا پہلو اختیارکرو۔چناں چہ بعض حضرات جیسے حضرت معاذ اورحضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما کو حضورِاکرم (ﷺ)نے یمن کی طرف حاکم بناکربھیجا،تو ان کوخاص تاکیدفرمائی تھی:"یَسِّرَا وَلَاتُعَسِّرَا" اس سے یہ بھی معلوم ہوتاہے کہ حکمران طبقہ کوبھی خطاب کیاگیاہے کہ تمہاری طرف سے عوام کی معاشرت سے متعلق جو احکام جاری کئے جائیں،جو آرڈیننس جاری ہوں،ان میں نرمی کاپہلو اختیار کرنا ، سختی والانہیں۔

متنفر مت کرو

''بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا''، لوگوں کو بشارت سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔ ''لَا تُنَفِّرُوا'' کا مقابل ''اَنِّسُوْا'' ہونا چاہئے تھا، یعنی لوگوں کو مانوس کرو۔ مانوس کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ساتھ ملاؤ، جیسے بچہ جب بدکتا ہے تو اس کو مانوس کیا جاتا ہے۔ تو لوگوں کو بدکاؤ مت، اور نفرت نہ دلاؤ۔ یعنی آپ ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کیجئے جس کی وجہ سے لوگ آپ سے دور بھاگنے لگیں۔ آپ اگر دین کا کام کر رہے ہیں تو کوئی ایسا طریقہ نہ اپنایئے جس کی وجہ سے لوگ بجائے اس کے کہ آپ سے قریب ہوں، وہ طریقہ ان کو دور کرنے کا ذریعہ بنے، اور آپ کی ذات سے جو فیض وفائدہ پہنچ سکتا ہے وہ نہ پہنچے۔

جامع ترین نبوی اصول

زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق یہ وہ بنیادی اصول ہیں جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی امت کو دیئے۔ یعنی آسانی والا معاملہ ہونا چاہیے، سختی نہیں ہونی چاہیے۔ دھمکیاں دے کر کام لینے کے بجائے بشارت اور خوش خبری سنا کر کام لینا، لوگوں کو بِدکا کر کام لینے کے بجائے مانوس کر کے کام لینا چاہیے۔ چاہے بیوی کے ساتھ معاملہ ہو، چاہے اولاد کے ساتھ معاملہ ہو، اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملہ ہو، ملازمین کے ساتھ معاملہ ہو، یا کسی دوسرے کے ساتھ معاملہ ہو؛

ہر شعبے میں آپ یہ اصول اپنا سکتے ہیں۔ یہ حضورِاکرم(ﷺ) کی جامع تعلیمات میں سے ہے۔ آپ کے اشادات تو جوامع الکلم کے قبیل سے ہوا کرتے تھے، یعنی ایسی ہدایت جو زندگی کے ہر شعبے میں آدمی کے لئے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے۔ گویا یہ وہ ہدایت اور زندگی کا ایک بہت بڑا بنیادی اصول ہے جس سے آپ ہر جگہ فائدہ اٹھاسکتے ہیں۔

بعض لوگ فرماتے ہیں کہ حضورِاکرم(ﷺ) نے اپنی امت کوزندگی کے ہر شعبے میں اختیار کرنے کے واسطے ایسا اونچااصول بتلادیا ہے کہ کوئی آدمی اگراس ایک اصول کو اپنالے،تووہ اپنی زندگی کے ہر میدان اور ہر شعبے میں کامیاب ہی کامیاب ہے۔بس آپ بھی کرکے دیکھ لیجئے!

جونرمی سے محروم کردیاگیا...

حدیث۶۳۸:-

وعن جریرِ بنِ عبدِاللهِ(رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللهِ(ﷺ) یقولُ: مَنْ یُحْرَمِ الرِفْقَ، یُحْرَمِ الْخَيْرَ كُلَّهُ. (رواه مسلم.)

ترجمہ:-حضرت جریربن عبداللہ بجلی(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی نرمی سے محروم کردیاگیا،وہ ہر بھلائی سے محروم کردیا گیا۔

افادات :- حضورِاکرم(ﷺ)نے نرمی کی اہمیت کو بتلانے کے لئے کتنی بلیغ تعبیر اختیار فرمائی۔گویایہ ایک ایسی صفت ہے کہ اگرکسی آدمی کواللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ صفت و خوبی نہیں ملی ہے اوراس کے مزاج میں یہ بات نہیں ہے، تو سمجھوکہ وہ بہت ساری خیر سے محروم رہ جاتا ہے۔

چناں چہ ایساہی ہوتا ہے؛ جس کے مزاج میں درشتی، سختی اوراکھڑ پن ہوتاہے تو غیرتوغیر؛ اپنے بھی اس سے دوربھاگتے ہیں۔تمام ہی یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس کا سامنا نہ ہوتو اچھاہے۔وہ اگرگھرمیں آجائے توگھر والے بھی ہر وقت دل سے دعامیں مشغول ہوجاتے ہیں کہ یہ بَلاجتنی جلدی ٹلے،اتناہی اچھاہے۔سب لوگ اسی انتظارمیں رہتے ہیں کہ کب یہ گھرسے جائے۔بلکہ اگر وہ گھر میں آئے تودوسرے لوگ موقع نکال کر اِدھر اُدھر ہوجاتے ہیں کہ جناب تنہاہی تشریف رکھیں۔معلوم ہواکہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

نبی کریم(ﷺ) کی مختصرترین نصیحت

حدیث ۶۳۹:-

عن أَبی هريرة(رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَجلاً قَالَ للنبيِّ (ﷺ) : أَوْصِنی. قَالَ: لاَتَغْضَب. فَرَدَّدَ مِرَاراً، قَالَ: لاَ تَغْضَبْ (رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)سے ایک آدمی نے درخواست کی: اے اللہ کے رسول!مجھے نصیحت کیجئے(دوسری روایت میں ہے کہ اس نے کہا: ”أَوْصِنِيْ ، وَأَوْجِزْ “نصیحت کیجئے اور مختصرنصیحت کیجئے)تونبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: غصہ مت کرنا۔اس نے بارباریہی درخواست کی توآپ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہی فرمایا: غصہ مت کرنا۔

افادات:-گویا اس نے کم وقت میں نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)سے کسی کارآمد بات کی نصیحت کرنے کی درخواست کی، اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔اس سے معلوم ہواکہ کوئی آدمی اگراس طرح کی درخواست کرے ؛تو خلاف ِادب نہیں ہے۔اگر کوئی آپ سے ایساکہےتو یہ مت سوچئے کہ عجیب آدمی ہے ،نصیحت بھی چاہ رہا ہے، اور اوپر سے یہ بھی کہہ رہا ہے کہ مختصر کیجئے۔ایساہو تا ہے کہ کبھی کسی آدمی کے پاس وقت کم ہوتا ہے ،وہ آپ کے پاس فیض حاصل کرنے کے لئے آیا،ملاقات کرکے اس کو گاڑی پکڑنی ہے،یاکسی ضروری کام سے کہیں جانا ہے،اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ آپ سے کچھ فائدہ پہنچ جائے،اس لئے کہتاہے کہ کوئی مختصر سی نصیحت کردیجئے۔اگرآپ لمبی چوڑی تقریر شروع کریں گے تو وہ سوچتارہے گاکہ میں نے یہ بلااپنے سرکہاں لے لی؟اوریہی چیز کبھی لوگوں کو متنفرکرنے کاباعث بنتی ہے۔

ایک زرّیں نصیحت

حضرت مولاناابرارالحق صاحب(رحمۃ اللہ علیہ) تو یہاں تک فرماتے تھے کہ آپ نے اعلان کیا کہ نمازکے بعدپانچ منٹ کے لئے بیٹھ جائیں،دین کی بات ہوگی۔تو پانچ منٹ ہی وعظ کہئے؛چھٹا منٹ نہیں ہونا چاہیے۔آپ نےجووقت دیاہے کہ پندرہ منٹ بات ہوگی، توپندرہ منٹ میں آپ بات نمٹا دیجیے۔اس لئے کہ اگر آج آپ نے اس پر عمل نہیں کیا تودوسرے موقع پراگرآپ دو منٹ کا بھی اعلان کریں گے ،تب بھی کوئی نہیں بیٹھے گاکہ فلاں صاحب نےپانچ منٹ کا کہا تھا اورپندرہ منٹ لگائے تھے،اوریہ طریقہ لوگوں کو دین کی بات سننے سے روکتاہے ۔سیدھی سادی بات ہے۔

اوردوسری بات یہ ہے کہ ویسے بھی یہ ایک وعدہ ہے،اوروعدہ کاپورا کرنا ضروری ہے۔ اورپھروہ وعدہ جو مسجدمیں،اللہ کے گھرمیں، منبر کے پاس،اتنے سارے آدمیوں کےسامنے کیا گیاہو؛اوروہ پورانہ کیاجائے،توکتنی بری بات ہے! حالاں کہ جو ایسےویسے لوگ ہوتےہیں ان کو بھی منبرکے پاس لاکرسچی بات بلوانے کی کوشش کی جاتی ہے،اورآپ تو دیندارآدمی ہوکر منبرکے پاس کیاہواوعدہ پورانہ کریں؛توپھرکیسے بات بنے گی؟

یہ بھی حکمت ہے

بمبئی جامع مسجد میں حضرت مولانا شوکت علی صاحب دامت برکاتہم ہیں۔ میں جب بھی بمبئی جاتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ اتنا بڑا شہر ہے اور اتنا مشغولی والا مجمع ہوتا ہے کہ ہر آدمی اپنے ایک ایک منٹ کو وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ اپنا سب کاروبار چھوڑ کر جمعہ پڑھنے آتا ہے، اس کے باوجود جمعہ کی نماز کے بعد اس روز کا جو خطبہ ہوتا ہے، حضرت مولانا اس کی مختصر سی تشریح فرماتے ہیں۔ اور سب کو معلوم ہے کہ مولانا کا معمول یہ ہے کہ پانچ سات منٹ میں معاملہ نمٹا دیتے ہیں، تو کوئی بھی وہ بیان سنے بغیر نہیں جاتا، بلکہ جو لوگ اوپر نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نیچے آکر بیٹھتے ہیں اور مولانا کی بات سن کر جاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو کون بیٹھتا؟ اس لئے صحیح بات تو یہی ہے کہ یہ بھی حکمت کا ایک طریقہ ہے۔ اگر ہماری مساجد میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ جمعہ کی نماز کے بعد بیان ہوگا تو کتنے لوگ بیٹھیں گے؟ میں آپ کو یقین سے بتا دوں کہ ایک بھی نہیں بیٹھے گا۔

تقریرِ رسول حجت ہے

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی نے یہ کہا کہ نصیحت کیجئے اور مختصر نصیحت کیجئے، تو اس کی یہ بات خلافِ ادب نہیں ہے۔ دیکھو! نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس پر کوئی تنبیہ نہیں فرمائی کہ تو عجیب

آدمی ہے، ایک تو نصیحت کا مطالبہ کرتا ہے، اور ساتھ میں یہ بھی کہتا ہے کہ مختصر ہو۔ اگر اس کا یہ مطالبہ اور یہ درخواست غلط ہوتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ضرور نکیر فرماتے کہ ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تو امت کی اصلاح کے لئے ہی بھیجے گئے تھے، اس لئے کسی غلط بات کو آپ باقی نہیں رکھ سکتے تھے۔ اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کسی بات پر خاموشی اختیار کرنا اور تردید نہ کرنا، اس بارے میں تمام علماء بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ یہ اس چیز کے جائز اور درست ہونے کی علامت ہے۔ اہلِ علم موجود ہیں وہ جانتے ہیں کہ تقریرِ رسول حجت ہے۔

خیر! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس کی بات مانتے ہوئے صرف ایک لفظ میں بہت مختصر نصیحت فرمائی: "غصہ مت کرنا"۔ جس نے مختصر نصیحت کی درخواست کی تھی وہ بھی حیرت میں پڑ گیا کہ اتنی مختصر نصیحت ارشاد فرمائی، حالاں کہ میرے پاس تو ابھی وقت ہے، اس لئے اس نے پھر وہی درخواست کی، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پھر یہی فرمایا: غصہ مت کرنا۔

دیکھو! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیسی عجیب نصیحت فرمائی۔ اس لئے کہ غصہ نہیں کریں گے تو اس کے لئے بردباری اور حلم لازم ہی ہے۔ جب کوئی بات غصہ پیدا کرنے والی سامنے آئے تو آپ کو غصہ نہیں کرنا ہے۔ تو پھر کیا کرنا ہے؟ بردباری اختیار کرنی ہے اور برداشت کرنا ہے۔ باب قائم کیا تھا کہ بردباری سے کام لو، وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

گناہ کے دو محرکات

یہ درحقیقت بہت مختصر سی نصیحت ہے لیکن آدمی کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب لانے والی ہے۔اس لئے کہ علماء فرماتے ہیں کہ انسان کی طبیعت کے اندر گناہ کے محرکات دو ہیں :ایک غصہ اوردوسرا شہوت۔عام طور پر آدمی جب گناہ کرتا ہے تویا تو شہوت اور خواہشِ نفس کی وجہ سے کرتا ہے،جیسے کسی چیز کی کھانے کی خواہش ہوئی اور وہ مل رہی ہے،لیکن پیسے نہیں ہیں توآدمی چوری کرتا ہے۔یاکوئی غلط خواہش پیدا ہوئی، اس کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔توزنا ،چوری اوراس قسم کے جتنے بھی گناہ ہیں جن کو نفسانی گناہوں سے تعبیر کیا گیاہے ،آدمی وہ سب گناہ خواہش کے نتیجہ ہی میں کرتا ہے۔

شہوت وغصہ میں ایک فرق

توخواہش وشہوت کی وجہ سے جوگناہ ہوتے ہیں ان میں عام طور پر اللہ تعالیٰ کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔لیکن غصہ کے نتیجہ میں عام طور پر بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں اس لیے کہ غصہ کے نتیجہ میں یہ ہوگا کہ جس پر غصہ آیاہے ،وہ دو حال سے خالی نہیں۔یاتو وہ آپ کا ماتحت ہےاورآپ سے کمزور ہے۔اگر آپ کا ماتحت اورآپ سے کمزور ہےتوغصہ میں آپ اس

کی پٹائی کریں گے، اس کا چہرہ نوچیں گے، گالیاں دیں گے، برا بھلا کہیں گے، اور پتہ نہیں کیا کیا کریں گے، ایسے موقع پر آدمی اپنے ماتحتوں کے ساتھ جو کچھ کرتا ہے، وہ سب آپ کریں گے۔

ویسے آدمی کے مزاج میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے غصہ رکھا ہے، اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے بری چیز بھی نہیں ہے، بلکہ غصہ ایک خاص مقصد کے لئے رکھا گیا ہے کہ کسی آدمی کی جان پر حملہ ہو، اس کی عزت وآبرو پر حملہ ہو، اس کے مال پر حملہ ہو، اس کے دین پر حملہ ہو؛ تو اس کا دفاع کر سکے۔ اگر آدمی کی طبیعت میں غصہ نہیں ہوگا تو وہ کبھی دفاع نہیں کر سکے گا۔ آدمی کے اندر جو "ڈفینس" (Defence) کا جذبہ ابھرتا ہے، وہ اسی غصہ کے نتیجے میں ابھرتا ہے۔ آپ ستون کو کتنا ہی ماریئے، کچھ نہیں کرے گا، وہ آپ سے کوئی بدلہ نہیں لے گا، اس لئے کہ ستون کے اندر غصہ ہے ہی نہیں۔ معلوم ہوا کہ غصہ بھی ضروری ہے، انسان کی طبیعت میں غصہ تو ہونا ہی چاہیے، اور اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر رکھا ہے، لیکن اس غصہ کو جہاں استعمال کرنا چاہیے، وہیں استعمال کیا جائے دوسری جگہ پر نہیں۔ جیسا کہ میں نے پچھلی مجلس میں بھی کہا تھا کہ غصہ کے نتیجہ میں آدمی کی عقل مغلوب اور ختم ہو جاتی ہے، جب آدمی کو غصہ آتا ہے تو وہ عقل سے کام نہیں لیتا۔ اور عقل سے کام نہ لینے کی میں نے کچھ مثالیں بھی دی تھیں۔

غصہ پر قابو پانے کی ایک تدبیر

اور ایک بات یاد رہے کہ شریعت نے غصہ تو اپنے اوپر آنے والے نقصان کو دور کرنے کے لئے رکھا ہے، اگر کسی کی حرکت سے آپ کو کوئی نقصان ہوا ہے تو اس نقصان کو دور کرنے کے لئے جتنی مقدار غصہ کی ضروری ہے، وہ کیجئے۔ مثلاً: آپ کی بنیادی ضرورت کی کوئی چیز تھی، اس میں اس نے نقصان پہنچادیا، آپ کا کھانا چھین لیا، آپ کا مال چھین لیا، تو آپ اس سے واپس لیجئے۔ شریعت نے بدلہ اور انتقام کی جوابی کاروائی کی اتنی اجازت دی ہے جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے ﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ اگر تمہیں بدلہ ہی لینا ہے، تو جتنی زیادتی تمہارے ساتھ کی گئی ہے اتنا ہی بدلہ لو، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دی گئی ہے، ورنہ ظلم اور زیادتی ہوگی۔

تو اگر ہمارا کسی ایسی چیز کا نقصان ہو جس کی وجہ سے ہماری جان، ہمارے مال یا ہماری بنیادی ضرورتوں پر زد پڑتی ہے؛ تو غصہ کے ذریعہ سے اپنا دفاع کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن اگر کسی بنیادی ضرورت پر زد نہیں پڑتی، بلکہ کسی نے کچھ ایسا کیا جس کی وجہ سے آپ کے جاہ پر اثر پڑا۔ مثلاً: اس نے گالی دی، تو اس سے آپ کا کیا نقصان ہوا؟ آپ جس منصب پر ہیں، کیا آپ اس منصب سے نیچے آگئے؟ یا آپ کا عہدہ چھن گیا؟ نہیں۔ آپ اگر وزیر اعظم ہیں اور کوئی آدمی سو گالیاں دے، تب بھی آپ کی وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر کوئی خطرہ نہیں آئے گا، وہ

جوں کی توں باقی رہے گی۔ یا اس نے گالی دی تو آپ کا مال گھٹ گیا؟ آپ کی فیکٹری بند ہو گئی؟ آپ کی تجارت کے اندر جو منافعہ ہوتا تھا، وہ گھٹ گیا؟ اس کے گالی دینے سے آخر نقصان کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں ہوا۔ تو اگر کسی نے گالی دی، تو یوں سوچ لیجئے کہ اس کی وجہ سے جب میرا کچھ بھی نقصان نہیں ہوا تو پھر جانے دو، اس نے گالی دی تو دی، اس سے کیوں الجھنا۔ ویسے شریعت نے اجازت دی ہے کہ اگر کوئی برا لفظ کہے تو آپ برا لفظ کہہ سکتے ہیں، لیکن حدیثِ پاک میں نبی کریم (ﷺ) کے اوصاف اور اخلاق بیان کئے گئے ہیں کہ دنیا کی کسی چیز کی وجہ سے آپ (ﷺ) کو غصہ نہیں آتا تھا۔ جیسے آپ کے بچے کے ہاتھ سے گلاس گر گیا اور ٹوٹ گیا، تو وہ ٹوٹنے والا تھا، ٹوٹ گیا، اب آپ اس پر غصہ کیوں کرتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ کیا آپ کے غصہ کے بعد وہ گلاس ٹھیک ہو جائے گا؟ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا، اب اس کی تلافی ہونی والی نہیں ہے۔ اس لئے آدمی اگر یہ سوچ لے تو بہت سی چیزوں میں اپنے آپ کو غصہ سے بچا سکتا ہے۔

غصہ کے شاخسانے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ گناہ کے محرکات دو ہیں، ایک شہوت اور دوسرا غصہ۔ اور ان کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے بتلایا تھا کہ غصہ کے نتیجہ میں سامنے والا اگر ماتحت ہے تو آپ اس پر زیادتی کریں گے، گالی دیں گے۔ زبان

سے زیادتی ہوگی، ہاتھ سے زیادتی ہوگی،اور ہوسکتاہے کہ اس کا وظیفہ بند کردیں،یاپیسے دیتے تھے ،وہ نہیں دیں گے ، اس کو کپڑے دیئے تھے،وہ واپس لے لیں گے ،یہ سب آپ کریں گے؛ تواس طرح آپ نے بندوں کوتکلیف پہنچائی۔

اوراگروہ آپ سے اونچاآدمی ہے،قوت والاہے کہ وہاں آپ دم نہیں مارسکتے تو ’’خشم درویش بہ جان درویش‘‘ والامعاملہ ہوگا،وہاں توآپ کچھ کرنہیں سکتے اور طبیعت میں غصہ ہے، نتیجہ یہ ہوگاکہ غائبانہ اس کی غیبت کریں گے، اپنا غصہ اتارنے اوردل کو ٹھنڈاکرنے کے لئے اس پرالزامات لگائیں گے۔ اس کے متعلق جھوٹی باتیں لوگوں کے اندرپھیلائیں گے کہ وہ ایساہے اورویساہے۔اس بیان بازی میں اگرواقعہ بیان کریں؛ توغیبت ہے۔اوراگروہ عیوب اس میں نہیں ہیں توبہتان ہے؛اور دونوں کبیرہ گناہ ہیں۔اس کے بعد بھی اگر آپ کا غصہ ٹھنڈانہیں ہواتوآپ اس کی وجہ سے اپنی طبیعت میں گھٹن محسوس کریں گے؛ اسی کو کینہ اوربغض کہتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب اس کوتکلیف پہنچے گی توآپ خوش ہوں گے،لوگوں سے کہیں گے کہ اس کے ساتھ ایساہواتو برابرہی ہے،یہ اسی کا حقدار تھا۔

اس نے توآپ کو ایک گالی دی تھی،لیکن ساری دنیاآکراس کومار رہی ہے تو آپ خوش ہورہے ہیں، حالاں کہ وہ بھی مسلمان ہے اورآپ بھی مسلمان ہیں،اور مسلمان بھائی ہونے کی حیثیت سے آپ کواس کا بچاؤ کرنا چاہیے، اوراس کی امداد کرنی چاہیے، لیکن آپ نہیں کررہے ہیں۔توغورکروکہ اس غصہ نے ہم کو کتنی نچلی سطح پرلاکرڈال دیاکہ اسلامی اخوت

وبھائی چارگی کی نسبت سے نبی کریم (ﷺ) نے جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں، ان کا بھی ہمیں خیال نہیں رہا "اَلْمُسْلِمُ أَخُ الْمُسْلِمِ، لَايَظْلِمُهُ وَلَايَخْذُلُهُ وَلَايَحْقِرُهُ" مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر زیادتی نہیں کرتا، اور اگر کوئی دوسرا زیادتی کرے، تو اس کو بے یارومددگار نہیں چھوڑتا، اور اس کو حقیر نہیں سمجھتا۔ لیکن یہاں یہ سب ہو رہا ہے۔

پھر مزید یہ ہوگا کہ جب اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نعمت پہنچے گی؛ مثلاً: اس کے لئے ترقی کے اسباب پیدا ہوں گے تو اس غصہ کی وجہ سے آپ کو وہ بھی اچھے نہیں لگیں گے، آپ یہ تمنا کریں گے کہ اس کو یہ عہدہ کہاں مل گیا؟ جلدی سے چھن جانا چاہیے؛ اسی کا نام حسد ہے۔ تو دیکھو! ایک غصہ نے کہاں سے کہاں پہنچادیا؟ اور پھر اس حسد اور بغض کے نتیجہ میں آدمی کیا کیا کرتا ہے تو صرف ایک غصہ نے کتنے بڑے بڑے گناہوں میں مبتلا کروادیا!

اور شہوت وخواہشِ نفس کی وجہ سے ہونے والے اکثر گناہ تو وہ تھے جن کا تعلق حقوق اللہ سے تھا کہ حرام لقمہ کھالیا، کوئی حرام کام کرلیا، زنا کرلیا، لیکن غصہ کی وجہ سے عام طور پر جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اس کے نتیجہ میں بندوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔

بہت بڑا انقلاب آسکتا ہے

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے آپ بیتی میں کبر کے بیان میں بڑے اہتمام سے اس چیز کو بیان کیا ہے کہ شیطانی گناہ آدمی کے لئے بڑے خطرناک ہیں، لیکن اگر کسی روز اپنی پچھلی زندگی

کے متعلق رونے دھونے اورتوبہ کی توفیق ہوئی اورآدمی نے سوچا کہ ہائے!میں نے کیا کیا کرڈالا، اور پھر رات کی تنہائیوں اور اندھیریوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ اٹھاکر دعا مانگی اور دوآنسو بہادیے؛ تو سارا معاملہ نمٹ گیا۔ لیکن اگر کسی کی پٹائی کی تھی، گالیاں دی تھی، چہرہ نوچا تھا، کپڑے پھاڑے تھے، اس کی کسی چیز کو نقصان پہنچایا تھا، اس کی غیبت کی تھی اوراس پر تہمت لگائی تھی، اورپتہ نہیں کیا کیا کیا تھا: اب اگر احساس ہوا تو چاہے ہمیں دس رمضانوں تک دس شب قدر بھی مل جائے، اور کوئی اللہ کا بندہ بالیقین بتادے کہ آج شب قدر ہے، اور آپ رات بھر جاگتے رہیں اور دعائیں کرتے رہیں اور توبہ کرتے رہیں؛تب بھی وہ گناہ معاف ہونے والے نہیں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ جس کا حق ہے اسی سے معاف کرالو۔اسی لیے حضورِپاک(ﷺ) نے اس آدمی کی باربار کی درخواست پر نصیحت فرمائی:غصہ مت کرنا۔اگر اس ایک چیز ہی کو آدمی اپنالے؛تواس کی زندگی میں بہت بڑاانقلاب آسکتاہے۔

ہر کام اچھائی کے ساتھ انجام دیناچاہیے

حدیث ۶۴۰:-

وعن أَبِي يعلى شَدَّاد بن أوسٍ(رضی اللہ عنہ) عن رسول الله (ﷺ) قَالَ : إِنَّ اللهَ كَتَبَ الإِحْسَانَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ ،فَإِذَا قَتَلْتُم فَأَحْسِنُوا القِتْلَة ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَأَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ ، وَلْيُحِدَّ أَحَدُكُمْ شَفْرَتَه ، وَلْيُرِحْ ذَبِيحَتَهُ (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابویعلی شداد بن اوس(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا :اللہ تعالیٰ نے اچھا سلوک ہر چیز پر لازم کر دیا ہے ،جب تم کسی کو قصاص میں قتل کرو یا جانور کو ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو،اور اپنی چھری کو تیز کر کے اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ۔

افادات:-دیکھو!شریعت میں جن گناہوں کی وجہ سے قتل کی سزا مقرر ہوئی ہے، جیسے قصاص کے طور پر کسی کو قتل کیا جائے ؛تو وہاں پر بھی تاکید کی گئی ہے کہ اس کے ساتھ جان لینے کا جو معاملہ کیا جائے اس میں دیر نہیں کرنا چاہیے۔ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو تکلیف پہنچا پہنچا کر جان لی جائے،بلکہ ایک دفعہ میں معاملہ ختم کر دینا چاہیے، اس نے کسی کو قتل کیا تھا اس کے بدلہ میں اس کو قتل کیا جارہا ہے،تو اس نے چاہے کسی بھی طریقہ سے قتل کیا ہو، گھٹا گھٹا کر جان لی ہو، لیکن اس کو تو آپ ایک جھٹکے ہی میں ختم کر دو۔

اسی طرح اگر جانور ذبح کر رہے ہیں تو اچھی طرح ذبح کرو۔اسی لئے یہ تعلیم ہے کہ چھری کو اچھی طرح تیز کر لو۔دیکھو!اپنی ضرورت کی وجہ سے آدمی جانور ذبح کرتا ہے لیکن اس میں بھی اچھا سلوک اور بھلائی والا طریقہ اپنانے کا حکم دیا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اپنی چھری کو تیز کر کے اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچاؤ، یعنی اس طرح ذبح کیجیے کہ وہ جلدی سے ذبح ہو جائے۔گویا اس میں بھی اچھا طریقہ یہی تھا اس لئے حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی تاکید فرمائی۔تو ہر کام کو اچھائی کے ساتھ انجام دینا چاہیے۔

بندہ بن کر رہے

حدیث ۶۴۱:-

وعن عائشة(رضی اللہ عنہا) قالت : مَا خُيِّرَ رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم) بَيْنَ أَمْرَيْنِ قَطُّ إِلاَّ أَخَذَ أَيْسَرَهُمَا ، مَا لَمْ يَكُنْ إِثْماً ، فَإِنْ كَانَ إِثْماً ، كَانَ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنْهُ . وَمَا انْتَقَمَ رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم) لِنَفْسِهِ فى شَيْءٍ قَطُّ ، إِلاَّ أن تُنْتَهَكَ حُرْمَةُ الله ، فَيَنْتَقِمَ للهِ تَعَالَى.

ترجمہ:- حضرت عائشہ(رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب کبھی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو آسان وسہولت والی ہوتی تھی اسی کو اختیار فرماتے تھے، جب تک کہ اس میں نافرمانی نہ ہو۔ اگر کسی کام میں گناہ کا پہلو ہوتا تو اس سے آپ لوگوں میں سب سے زیادہ دور رہتے تھے۔ اور آپ نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ ہاں! البتہ اگر اللہ پاک کا کوئی حکم توڑا جاتا تو آپ بدلہ لیتے تھے(اس میں آپ معاف نہیں کرتے تھے۔)

افادات:- آسانی والی بات کو اختیار کرنے میں اپنی عبدیت کا اظہار ہے، اسی لئے حدیثِ پاک میں آیا ہے حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جس طرح یہ چاہتے ہیں کہ عزیمت والی چیز کو اختیار کیا جائے، وہیں اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں کہ رخصت پر عمل کیا جائے۔

(شعب الایمان:۳۶۰۶)

شریعت کے احکام میں دو پہلو ہوتے ہیں: عزیمت اور پختگی والا اعلیٰ پہلو، اور دوسرا سہولت والا پہلو۔ جیسے آپ رمضان کے مہینہ میں سفر میں ہیں، تو آپ کو روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے، پھر بھی آپ رکھیں تو یہ عزیمت ہے۔ حضور اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان سہولتوں والے احکام کو اسی طرح اختیار کیا جائے جیسے عزیمت والے احکام کو اختیار کیا جاتا ہے۔ شریعت کی دی گئی سہولت کو اختیار نہ کرنے میں گویا اپنی بہادری دکھلانا ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ بندہ تو بندہ بن کر رہے یہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق لکھا ہے کہ جب بیمار ہوتے تو بہت چِلّاتے تھے۔ کوئی کہتا: حضرت! اتنا کیوں چِلّاتے ہیں؟ تو فرماتے: بھائی! اللہ تعالیٰ نے بیماری دی ہی اس لئے ہے کہ اس کو ہمارا چِلّانا پسند ہے؛ لہٰذا چِلّاؤ۔ ہم اپنی بہادری نہیں دکھلاتے کہ میں بہت برداشت کر سکتا ہوں۔ یہ حضرت کے مزاج کی بات ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے پہلو کو غلط بتلانا چاہتا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پہلو عبدیت والا ہے۔ اسی لئے فرمایا گیا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ دو کاموں میں سے جو آسان ہوتا تھا اسی کو اختیار فرماتے تھے، البتہ وہ گناہ نہیں ہونا چاہیے۔

ہمارا مزاج برعکس ہو گیا

اور نبی کریم (ﷺ) نے اپنی ذات کے لئے کبھی انتقام اور بدلہ نہیں لیا۔ہاں! اگر اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم توڑا جارہا ہو تو آپ بدلہ لیتے تھے، اس میں آپ معاف نہیں کرتے تھے۔ایک مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے۔آج ہمارا مزاج اس کے برعکس ہو گیا ہے، شریعت کے احکام توڑے جارہے ہیں، جیسے بیٹا نماز نہیں پڑھتا، گناہوں کے کام کرتا رہتا ہے، باپ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، لیکن کبھی اس کو غصہ نہیں آتا، اور اس کو روکنے کی کوشش نہیں کرتا، لیکن اگر یہی بیٹا دوکان پر حاضری نہ دے تجارت میں نقصان کردے، کوئی ایسا فیصلہ کرلے جس سے فیکٹری پر آنچ آجائے، تو فوراً غصہ بھڑک اُٹھتا ہے۔بیوی نماز نہیں پڑھتی، بے پردہ رہتی ہے، دوسرے گناہوں میں مبتلا ہے، لیکن کبھی نرمی سے بھی نہیں روکتے، لیکن اگر کھانے میں نمک مرچ زیادہ ہو جائے، پلیٹ توڑ دے، یا کچھ اور نقصان پہنچادے؛ تو میاں صاحب بڑے غصہ میں آجاتے ہیں۔جہاں معاف کرنا تھا وہاں غصہ کرتے ہیں اور جہاں معاف نہیں کرنا تھا وہاں معاف کررہے ہیں۔ہر جگہ ہمارا یہی حال ہو چکا ہے۔

جب مذہب پر حملہ ہو

اس وقت ہمارے اس ملک میں اسلام کے تعلق سے غیروں کی طرف سے جو اسکیمیں بنائی جارہی ہیں، جیسے کہ اسکولوں میں ایسا نظام لایا جارہا ہے کہ بچے اسلام سے محروم ہو جائیں۔یا

وندے ماترم کہو۔یاسرسوتی دیوی کی وندناکرو، جو قانون یوپی میں لازماًلایا گیاتھا،اسی طرح کی اورچیزیں جو ان کی طرف سےلائی جاتی ہیں توایسے موقعوں پر اجتماعی طورپراپنے دین کی حفاظت کے لئے ،اللہ کے خاطر اس کا دفاع کرنا سب پر فرض اورلازم ہوجاتاہے،لیکن وہاں کوئی نہیں بولتا۔اور جب قومی فسادات ہوتےہیں تو چوں کہ اس میں اپنی جان پر آتی ہے، اپناکاروبارلٹتاہے، توجواب دینے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔حالاں کہ دفاع یہاں پربھی کرناہے۔ میں یہ بتلاناچاہتا ہوں کہ جس وقت ابتداء دینی امورسے ہوتی ہے،اس وقت ہم خاموش رہتے ہیں،اور پھر جب یہی معاملہ آگے بڑھتے بڑھتے ہماری جانوں،ہمارے کاروبار اورہماری متعلقہ چیزوں تک آتا ہے توہم شورمچاتے ہیں۔اگر یہی شورہم نے پہلے دن مچایا ہوتا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی نوبت آنے ہی نہ دی جاتی۔

اس لیے ہرجگہ اس کااہتمام ضروری ہے کہ دین کا جہاں معاملہ ہو وہاں آدمی خاموش نہ رہے، وہاں غصےکااظہارہوناچاہیے،اوراپنی ذات کے لئےدرگزر،عفوو صفح سےکام لیناچاہیے،یہی سیرچشمی اوراعلیٰ ظرفی کہلاتی ہے کہ اپنامعاملہ ہوتو آدمی معاف کردے۔لیکن اگردین کامعاملہ ہوتووہاں معاف کرنا سیر چشمی نہیں کہلاتی۔

جنتیوں کی چند صفات

حدیث ۶۴۲:-

وعن ابن مسعود(رضی اللہ عنہ)قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) :أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَنْ يَحْرُمُ عَلَى النَّارِ؛أَوْ بِمَنْ تَحْرُمُ عَلَيْهِ النَّارِ؛تَحْرُمُ عَلَى كُلِّ قَرِيبٍ،هَيِّنٍ،لَيِّنٍ،سَهْلٍ.(رواه الترمذي،وقال:حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشادفرمایا: میں وہ آدمی نہ بتلاؤں جو جہنم پر حرام ہے یا جہنم اس پر حرام ہے؟ پوچھا گیا: کون؟ حضورِاکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشادفرمایا : جہنم ہراس آدمی پر حرام ہے جولوگوں سے قریب ہو، طبیعت کا نرم ہو،اور سہولت پیدا کرنے والا ہو۔

افادات:- حدیث ِپاک میں آتاہے کہ قیامت کے روزاللہ تعالیٰ ایک آدمی کوبلائیں گے اورتمام اوّلین وآخرین کے سامنے فرشتوں سے پوچھیں گے کہ اس کے اعمال نامہ میں کیاہے؟اللہ تعالیٰ توسب جانتے ہیں پھر بھی پوچھیں گے۔فرشتے کہیں گے کہ کوئی زیادہ نمازروزےتوہیں نہیں،البتہ اس کے ساتھ جب کوئی زیادتی کرتاتھاتویہ معاف کردیتاتھا۔اوراس کے جومالی مطالبےلوگوں پرہوتےتھے،جیسے کسی کوبطورِقرض پیسے دے رکھے ہیں، اس سے وصولی کرنی ہے اور سامنے والا کہتاکہ بھائی! ابھی میرے پاس گنجائش نہیں ہے ،تووہ اپنے آدمیوں سے کہتا تھاکہ اس کے ساتھ نرمی کرو۔باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ جب یہ بندہ اور مخلوق ہوکرایساکرتاتھا تو میں تو اورزیادہ اس بات کاحقدارہوں اورسب کے سامنے اس

کااعزازکیاجائے گا اور اس کے لئے جنت کا فیصلہ ہوگا۔ (بخاری :باب مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ.حدیث :۳۴۵۱/مسلم:باب فَضْلِ إِنْظَارِ الْمُعْسِرِ.)

توحقیقت یہ ہے کہ بردباری،غصہ کوروکنااورنرمی کامعاملہ کرنا؛یہ شریعت کی بنیادی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم ہے۔اگر آدمی اپنی زندگی میں اس ایک اصول کو اپنالےاورحضوراکرم(ﷺ)کی اس ایک ہدایت کواختیارکرلے تو ہراعتبارسے کامیابی حاصل کرسکتاہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

باب العفو
والاعراض عن الجاھلین

نادانوں کو معاف کرنا

اور

چشم پوشی سے کام لینا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

چشم پوشی سے کام لینا

پچھلے دو تین عنوانات جو گزرے ان میں صبر اور بردباری کا بیان تھا۔ اب ایک ذیلی اور ضمنی عنوان قائم کیا ہے کہ جو لوگ آپ کے ساتھ بدسلوکی کرنے والے ہیں، اور جو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہیے، ویسا رویہ اور سلوک اختیار کرنے کے بجائے، ناروا اور غلط سلوک کرتے ہیں، ایسوں سے صَرفِ نظر کرنا، چشم پوشی سے کام لینا، ان کو معاف کر دینا اور درگزر کرنا۔

صبر اور تحمل کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کو برداشت کر لیا، اب آگے کا درجہ یہ ہے کہ آپ اس کے اس غلط رویہ کا انتقام لے سکتے ہیں، آپ میں اس کی طاقت بھی ہے اور کوئی ایسی صورت بھی ہے جہاں شریعت نے آپ کو اس سے اتنا بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، جتنی زیادتی اس نے آپ کے ساتھ کی ہے، اس کے باوجود آپ چھوڑ دیں اور اس کو معاف کر دیں؛ تو یہ اعلیٰ درجہ ہے۔ اس صفت کو اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے، اسی سے متعلق کچھ چیزیں یہاں پر پیش کرتے ہیں۔

آیتیں تو تقریباً وہی ہیں جو پچھلے ابواب میں گذر چکیں، پہلی آیت ہے: ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ﴾ درگزر کو اپنا شیوہ اور عادت بنائیے، اور بھلی بات کا لوگوں کو حکم دیجیے، اور جو لوگ آپ کے ساتھ جہالت کا سلوک کریں ان سے چشم پوشی اور اعراض کیجیے۔

سورۂ نور کی یہ آیت بھی پہلے گزر چکی ہے: ﴿وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا أَلَا تُحِبُّوْنَ أَنْ يَغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ درگزر سے کام لیں اور معاف کردیں۔ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟

حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا واقعہ پہلے بھی گزرا کہ انہوں نے اپنی خالہ زاد بہن کے بیٹے حضرت مسطح بن اثاثہ (رضی اللہ عنہ) کا نفقہ اور خرچہ بند کردیا تھا، جنہوں نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) پر بہتان والے قصہ میں نادانستہ حصہ لیا تھا، اور آئندہ نہ دینے کی قسم کھالی تھی، جس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ قصہ پہلے کئی مرتبہ تفصیل سے بتلاچکا ہوں۔

﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ یہ آیت بھی پہلے گزری ہے کہ جو لوگوں سے درگزر کرنے اور معاف کرنے والے ہیں اللہ تعالیٰ ایسے نیکوکار لوگوں کو پسند کرتا ہے اور ان سے محبت رکھتا ہے۔

﴿وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾ جو آدمی صبر سے کام لے اور معاف کردے، تو یہ بڑے حوصلے اور ہمت کی بات ہے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کا عفو

حدیث ۶۴۳:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) أنها قالت للنبي (ﷺ): هَلْ أَتَى عَلَيْكَ يَوْمٌ كَانَ أَشَدَّ مِنْ يَوْمِ أُحُدٍ؟ قَالَ: لَقَدْ لَقِيتُ مِنْ قَوْمِكِ، وَكَانَ أَشَدُّ مَا لَقِيتُ مِنْهُمْ يَوْمَ الْعَقَبَةِ، إِذْ عَرَضْتُ نَفْسِي عَلَى ابْنِ عَبْدِ يَالِيلَ بْنِ عَبْدِ كُلَالٍ، فَلَمْ يُجِبْنِي إِلَى مَا أَرَدْتُ، فَانْطَلَقْتُ وَأَنَا مَهْمُومٌ عَلَى وَجْهِي، فَلَمْ أَسْتَفِقْ إِلاَّ وَأَنَا بِقَرْنِ الثَّعَالِبِ، فَرَفَعْتُ رَأْسِي، وَإِذَا أَنَا بِسَحَابَةٍ قَدْ أَظَلَّتْنِي، فَنَظَرْتُ فَإِذَا فِيهَا جبريلُ (علیہ السلام) فَنَادَانِي، فَقَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالَى قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ، وَمَا رَدُّوا عَلَيْكَ، وَقَدْ بَعَثَ إِلَيْكَ مَلَكَ الْجِبَالِ لِتَأْمُرَهُ بِمَا شِئْتَ فِيهِمْ. فَنَادَانِي مَلَكُ الْجِبَالِ، فَسَلَّمَ عَلَيَّ، ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ إِنَّ اللهَ قَدْ سَمِعَ قَوْلَ قَوْمِكَ لَكَ، وَأَنَا مَلَكُ الْجِبَالِ، وَقَدْ بَعَثَنِي رَبِّي إِلَيْكَ لِتَأْمُرَنِي بِأَمْرِكَ، فَمَا شِئْتَ، إِنْ شِئْتَ أَطْبَقْتُ عَلَيْهِمُ الأَخْشَبَيْنِ. فَقَالَ النَّبِيُّ (ﷺ) بَلْ أَرْجُو أَنْ يُخْرِجَ اللهُ مِنْ أَصْلَابِهِمْ مَنْ يَعْبُدُ اللهَ وَحْدَهُ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((الأَخْشَبَانِ)): الجَبَلانِ المُحيطانِ بمكَّة. وَالأخشبُ: هُوَ الجبل الغليظ

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں ایک مرتبہ میں نے نبی کریم (ﷺ) سے عرض کیا: آپ پر اُحد کے دن سے بھی زیادہ سخت کوئی دن گزرا ہے؟ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تمہاری قوم کی طرف سے مجھے بہت سی تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں، اور سب زیادہ سخت ایذاء جو مجھے ان سے پہنچی وہ عقبہ والا دن تھا۔ جس وقت میں نے ابن عبد یالیل بنِ عبد کُلال کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا، اور اس کو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کی دعوت دی، تو اس نے وہ دعوت قبول نہیں کی۔ میں وہاں سے ایسی حالت میں واپس چلا کہ

میں بڑا غمگین تھا، اس غم کی حالت سے میں نے ابھی کچھ سکون و قرار بھی نہیں پایا تھا کہ میں مقامِ قرنِ ثعالِب میں پہنچا، جب میں نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو دیکھا کہ ایک بادل سا آیا جس نے مجھ پر سایہ کرلیا، میں نے دیکھا کہ حضرت جبرئیل (علیہ السلام) ہیں۔ انہوں نے مجھے پکار کر کہا: آپ نے قوم کی جو بات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کی وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے سنی اور انہوں نے جو جواب دیا وہ بھی سنا، اب آپ کے پاس پہاڑوں کے فرشتہ کو بھیجا ہے تاکہ آپ ان کے سلسلہ میں اس فرشتہ کو جو چاہیں حکم کریں، وہ حکم بجالائے گا۔ چناں چہ پہاڑوں کے فرشتے نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سلام کیا اور عرض کیا: اے محمد ((صلی اللہ علیہ وسلم))! آپ کی قوم نے آپ کو جو جواب دیا وہ اللہ تعالیٰ نے سنا۔ میں پہاڑوں کا فرشتہ ہوں، مجھے آپ کے پاس بھیجا گیا ہے تاکہ آپ ان کے سلسلہ میں جو چاہیں؛ حکم کریں، مَیں ایسا ہی کروں گا۔ فرمایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ چاہیں تو آس پاس کے ان دونوں پہاڑوں کو میں ایک کردوں (اور یہاں والے درمیان میں پِس جائیں۔) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں فرمایا: نہیں! بلکہ میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی نسلوں سے ایسے لوگ پیدا کریں گے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک کرنے والے نہیں ہوں گے۔

افادات:- غزوۂ اُحد؛ مسلمانوں اور کفارِ قریش کے درمیان ۳ھ میں ایک جنگ ہوئی تھی۔ مشرکینِ مکہ لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کرنے آئے تھے اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مسلمانوں کو لے کر ان کے مقابلہ کے لئے مدینہ سے باہر- جہاں اُحد پہاڑ واقع ہے- تشریف لے گئے تھے، اور وہاں دونوں لشکروں کے درمیان مقابلہ ہوا، شروع میں تو مسلمانوں کا پلڑا ابھاری رہا لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کچھ لوگوں کو ایک مخصوص جگہ پر مقرر کیا تھا اور ان کا مورچہ بنایا تھا کہ اس جگہ

کونہ چھوڑنا، چاہے ہم کامیاب ہوں یا ناکام۔ لیکن جب انہوں نے مسلمانوں کی کامیابی دیکھی، تو اپنی وہ جگہ -جہاں ان کو حفاظت کے لیے مقرر کیا تھا- چھوڑدی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ میں آخر میں مسلمانوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ ستر (۷۰) سے زیادہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہ) شہید ہوئے۔ خود نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی بہت زیادہ چوٹ آئی، آپ کا چہرۂ مبارک زخمی ہو گیا، آپ کے دندانِ مبارک کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا، آپ کو اور بھی زخم آئے، یہ بڑا سخت دن تھا؛ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے اسی کے متعلق پوچھا۔ اس سوال کے جواب میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ ارشاد فرمایا جو اوپر گزرا۔

دیکھئے! نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ دعوتِ ایمان پیش کرنے کے جواب میں قوم کی طرف سے جو نازیبا سلوک کیا گیا تھا؛ اس سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طبیعتِ مبارکہ پر بڑا اثر ہوا تھا، غم وحزن اور تکلیف کی کیفیت آپ پر چھاگئی تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے پاس فرشتہ بھیجا گیا، اگر آپ چاہتے تو قوم کی طرف سے کیے گئے اس نازیبا سلوک کا بدلہ لے سکتے تھے۔ فرشتے نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے یہ بات پیش کی تھی کہ اگر آپ چاہیں تو ان لوگوں کو دو پہاڑوں کے درمیان پیس کر رکھ دوں لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معافی اور درگزر سے کام لیا، اور یہ امید ظاہر کی کہ اگر یہ ایمان نہیں لائے تو ان کی نسلوں سے اللہ تبارک وتعالیٰ ایسے لوگ پیدا کریں گے جو ایمان لائیں گے، اور خالص اللہ ہی کی عبادت کریں گے۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ عمل پیش کرکے ہمیں یہ سبق دینا چاہتے ہیں کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اتنا زیادہ ایذاء رسانی اور بداخلاقی کا سلوک کیا گیا، اس کے باوجود نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عفوودرگزر اور چشم پوشی سے کام لیا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ بھیجا گیا تھا۔ اگر آپ چاہتے تو وہاں سے بھی منظوری مل چکی تھی، لیکن حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے معاف کردیا۔ یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں اختیار کرنا چاہیے۔

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی کو نہیں مارا

حدیث ۶۴۴:-

وعنها (رضی اللہ عنہا) قالت: مَا ضَرَبَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) شَيْئاً قَطُّ بِيَدِهِ، وَلاَ امْرَأَةً وَلاَ خَادِماً، إِلاَّ أنْ يُجَاهِدَ فِي سَبيلِ اللهِ، وَمَا نِيلَ مِنْهُ شَيْءٌ قَطُّ فَيَنْتَقِمَ مِنْ صَاحِبِهِ، إِلاَّ أنْ يُنْتَهَكَ شَيْءٌ مِنْ مَحَارِمِ اللهِ تَعَالَى، فَيَنْتَقِمُ للهِ تَعَالَى (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت ہے کہ نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا، نہ کسی عورت کو، نہ خادم، نوکر اور غلام کو؛ البتہ اللہ کے راستہ میں اگر آپ جہاد میں شریک ہوتے؛ اس وقت دشمنوں کے مقابلہ میں کوئی بات ہوتی۔ اور نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی گئی، آپ کو کسی نے تکلیف پہنچائی، تو آپ نے اس سے کبھی انتقام نہیں لیا، البتہ اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں میں سے کسی

چیز کا اگر کوئی آدمی ارتکاب کرتا، اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو توڑتا؛ تو اس پر نبی ٔکریم (ﷺ) ناراض ہو کر اس سے انتقام لیتے تھے۔

افادات:- حدود تو اللہ تعالیٰ کا حق ہے، مثلاً کسی نے زنا کا ارتکاب کیا اور حضورِ اکرم (ﷺ) کے سامنے وہ معاملہ پیش ہوا، اور زنا ثابت ہو گیا؛ تو حضور معاف نہیں کرتے تھے، کیوں کہ شریعت کا حکم یہ ہے کہ جب حاکمِ وقت کے سامنے مجرم کا کوئی ایسا جرم آجائے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے، تو حاکم اس کو معاف نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اس کو معاف کرنے کا حاکم کو اختیار نہیں ہے

یہی مساوات ہے

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت فاطمہ مخزومیہ تھی، بنو مخزوم قریش کا بڑا اونچا قبیلہ سمجھا جاتا تھا، ابو جہل بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر اس نے چوری کی، تو قبیلہ والے سہم گئے کہ چوری کا ثبوت ہو گیا ہے؛ اب ہاتھ کاٹا جائے گا اور پورے قبیلے کی بدنامی ہو گی۔ اس لیے لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) سے بات کی جائے کہ درگزر سے کام لیجیے؛ لیکن حضورِ اکرم (ﷺ) سے جا کر کون کہے؟ لوگوں نے کہا: حضرت اسامہ بن زید کو تیار کرو، کیوں کہ حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) حضورِ اکرم (ﷺ) کے منہ بولے بیٹے تھے، اور حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہ) انہی کے بیٹے تھے۔ یہ بھی حضورِ اکرم (ﷺ) کے بڑے

لاڈلے تھے، اس لیے لوگوں نے کہا کہ اگر وہ حضورِ اکرم (ﷺ) سے جا کر کہیں گے تو ہو سکتا ہے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کچھ چھوڑ چھاڑ دیں۔ چناں چہ سب بڑے لوگوں نے ان سے کہا اور یہ ان سب کے کہنے پر نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس پہنچے اور عرض کیا، تو حضور (ﷺ) سخت ناراض ہوئے، اور حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہ) سے فرمایا: "أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰهِ؟" اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کے معاملہ میں تم سفارش لے کر آئے ہو؟ اگلی قومیں اسی پر تو ہلاک ہوئی ہیں کہ ان میں سے جب کوئی نچلے درجہ کا آدمی کوئی قصور کرتا تو جو سزا مقرر ہوتی وہ اس کو دی جاتی، اور اونچے خاندان کا آدمی اگر وہی قصور کرتا تو اس کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس پر بڑی ناراضگی کا اظہار فرمایا، پھر فرمایا: میری بیٹی فاطمہ (اعاذھا اللہ منہا) بھی اگر ایسے جرم کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔ (بخاری شریف: باب كَرَاهِيَةِ الشَّفَاعَةِ فِي الْحَدِّ، إِذَا رُفِعَ إِلَى السُّلْطَانِ. رقم: ۲۶۴۸، ۳۴۷۵، ۳۷۳۲، ۳۷۳۳، ۴۳۰۴، ۶۷۸۸، ۶۸۰۰)

دیکھئے! اسلام میں تو مساوات ہے۔ اور مساوات کا مطلب یہی ہے کہ قانون کے نافذ کرنے معاملہ میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے۔ قانون کی خلاف ورزی کسی بڑے آدمی نے کی ہو، یا چھوٹے آدمی نے کی ہو؛ اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہے، اس کے جاری کرنے کے معاملہ میں کسی کی کوئی رورعایت نہ برتی جائے؛ یہی مساوات ہے۔

قیامت تک کے لیے یہی اصول ہے

میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اگر شریعت کا کوئی حکم توڑا جاتا اور اس پر شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر ہوتی، اس سزا کو جاری کرنے کے معاملہ میں نبیٔ کریم (ﷺ) کوئی رورعایت نہیں فرماتے تھے، اور نہ رعایت کی جاسکتی تھی، قیامت تک کے لیے تمام حُکّام کو یہی حکم ہے کہ ایسے معاملہ میں کوئی رورعایت نہ کریں۔ ہاں! اگر اپنا ذاتی معاملہ ہوتا، آپ کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ کوئی آدمی اگر ناروا معاملہ کرتا تو حضورِ اکرم (ﷺ) اس سے کوئی انتقام اور بدلہ نہیں لیتے تھے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے کہ اگر ہماری ذات کے ساتھ کسی نے کوئی ناروا سلوک کیا ہے توہم درگزر سے کام لیں۔

لیکن آج ہمارا معاشرہ بدل چکا ہے، دین کے معاملہ میں جہاں شریعت نے چھوڑنے کی اجازت نہیں دی وہاں چھوٹ چھاٹ دیدیتے ہیں، کیوں کہ اس میں ہمارا تو کچھ نہیں بگڑتا، چاہے شریعت ٹوٹتی رہے اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ اور جہاں اپنی ذات کا معاملہ آتا ہے، وہاں ہم چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ اصل تو یہ ہے کہ اپنی ذات کے معاملہ میں آدمی درگزر سے کام لے اور معاف کردے۔ اور جہاں شریعت کا کوئی حکم ٹوٹ رہا ہو، وہاں ذرا بھی رورعایت سے کام نہ لے، اس لیے کہ اصل چیز حکمِ الٰہی ہے۔

ایک دیہاتی کا طرز اور آپ (ﷺ) کا عمل

حدیث ۶۴۵:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ كُنْتُ أمشى مَعَ رسول الله (ﷺ) وَعَلَيْهِ بُرْدٌ نَجْرَانِيٌّ غَلِيظُ الحَاشِيَةِ. فأَدْرَكَهُ أَعْرَابِيٌّ فَجَبَذَهُ بِرِدَائِهِ جَبْذَةً شَدِيدَةً. فَنَظَرْتُ إِلَى صَفْحَةِ عَاتِقِ النَّبِيِّ (ﷺ) وَقَدْ أَثَّرَتْ بِهَا حَاشِيَةُ الرِّدَاءِ مِنْ شِدَّةِ جَبْذَتِهِ. ثُمَّ قَالَ: يَا مُحَمَّدُ! مُرْ لِي مِنْ مَالِ اللهِ الَّذِي عِنْدَكَ. فَالتَفَتَ إِلَيْهِ. فَضَحِكَ ثُمَّ أَمَرَ لَهُ بِعَطَاءٍ.

ترجمہ:- حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم (ﷺ) کے ساتھ جارہا تھا، حضورِ اکرم (ﷺ) کے جسمِ مبارک پر نجران کی بنی ہوئی موٹے کنارے والی ایک چادر تھی، ایک دیہاتی آیا اور آپ کو اس چادر سے پکڑ کر زور سے اس طرح کھینچا کہ میں نے حضورِ اکرم (ﷺ) کی گردن مبارک پر دیکھا کہ چادر کو زور سے کھینچنے کی وجہ سے نشان پڑ گیا (دراصل وہ دیہاتی کچھ بات کرنا چاہتا تھا تو اس نے اس طریقہ سے معاملہ کیا) پھر کہنے لگا: اللہ تعالیٰ کا جو مال آپ کی تحویل اور تصرف میں ہے اس میں سے میرے لیے کچھ دینے کا حکم دیجیے (حالاں کہ یہ بات ویسے بھی عرض کر سکتا تھا لیکن اس نے رسول اللہ (ﷺ) کے ساتھ ایسا معاملہ کیا) حضورِ اکرم (ﷺ) اس کو دیکھ کر مسکرائے اور اس کو دینے کا حکم فرمایا۔

افادات:- اس روایت کو لاکر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ آدمی صبر و تحمل اور بردباری سے کام لے، برداشت کرے، معاف بھی کرے اور مزید احسان بھی کرے؛ گویا یہ چاروں کام کرے۔ پہلا درجہ صبر کا ہے، پھر تحمل کا درجہ ہے، اس کے بعد معافی کا درجہ ہے، اور معافی کے بعد

احسان کا درجہ ہے۔ نبی کریم (ﷺ) کا بتلایا ہوا اصل طریقہ یہی ہے۔ یہاں دیکھئے! آپ (ﷺ) نے اس کے اس معاملہ پر ذرّہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں فرمایا۔ نہ صرف یہ؛ بلکہ مسکرا کر اس کے ساتھ پیش آئے اور اس نے جو درخواست کی تھی وہ بھی پوری فرمائی۔

بردباری کا عجیب امتحان

حضرت امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ دو آدمیوں کے درمیان بحث ہوئی، ایک کہنے لگا: حضرت امام سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) -جو بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے- زیادہ بردبار اور حلیم ہیں۔ دوسرے نے کہا: حضرت امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) سب سے زیادہ بردبار اور حلیم ہیں۔ جو حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) کو زیادہ بردبار کہتا تھا اس نے کہا کہ میں امتحان لیتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کتنے بردبار ہیں۔

چوں کہ امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق یہ مشہور ہے کہ چالیس سال تک عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔ اس کا بھی قصہ یہ ہوا کہ (آپ کی عادت تو رات کے آخری حصہ ہی میں اٹھنے کی تھی) ایک مرتبہ تشریف لے جا رہے تھے تو ایک بڑھیا نے آپ کی طرف اشارہ کر کے کسی سے کہا: یہ نوجوان عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کرتا ہے، امام صاحبؒ نے جب یہ سنا تو اپنے جی میں کہنے لگے: لوگ میرے متعلق ایسا گمان رکھتے ہیں اور مَیں تو ایسا ہوں نہیں۔

چناں چہ اسی دن سے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھنا شروع کر دی، اور پھر چالیس سال تک آپ کا یہ معمول رہا۔

اسی معمول کی وجہ سے آپ رات بھر سوتے نہیں تھے۔ اور چوں کہ تجارت بھی تھی، علمی مشغلہ بھی تھا تو فجر کی نماز کے بعد سے ظہر تک مسائل بتلانے میں اور دوسرے کاموں میں لگے رہتے تھے اور ظہر کے بعد کھانا کھا کر عصر تک قیلولہ کرتے تھے۔ بس لے دے کر قیلولہ کا اتنا وقت ہی آپ کے آرام کا تھا۔

خیر! ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ امام صاحب ظہر کے بعد لیٹنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ اس آدمی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب نیچے اترے اور کہا: فرمایئے؛ کیا کام ہے؟ اس نے کہا: میں ایک مسئلہ دریافت کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حالاں کہ سب کو معلوم تھا کہ آپ مسائل بتلانے کے لیے صبح کے وقت بیٹھتے ہیں، اس وقت وہ آیا نہیں، اور آرام کے وقت پہنچا۔ خیر! فرمایا: کہو کیا مسئلہ ہے؟ تو اس نے کہا کہ میں بھول گیا کہ کیا پوچھنا چاہتا تھا۔ امام صاحب نے اس سے کہا: اچھا جب یاد آجائے تو پوچھ لینا، آپ نے دروازہ بند کر لیا، اوپر جا کر ابھی لیٹنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ امام صاحب اتر کر آئے تو وہی آدمی سامنے تھا۔ اس نے کہا: آپ اوپر تشریف لے گئے تو مجھے وہ مسئلہ یاد آگیا، لیکن آپ اتر کر ابھی آدھی سیڑھی پر ہی پہنچے ہوں گے کہ پھر میں بھول گیا، تو امام صاحب نے کہا: بہت اچھا! جب یاد آجائے تو پوچھ لینا اور اس کو رخصت کیا، دروازہ بند کیا اور اوپر گئے اور لیٹے بھی نہیں تھے کہ تیسری مرتبہ پھر

دروازہ کھٹکھٹایا۔ آپ پھر اترے تو وہی آدمی تھا، کہنے لگا: مجھے مسئلہ یاد آگیا ہے، آپ نے ذرّہ برابر بھی ناگواری کا اظہار نہیں کیا اور فرمایا: اچھا بھائی! پوچھو کیا مسئلہ ہے؟ تو اس نے سوال کیا کہ انسانی پاخانہ کا مزہ کیسا ہوتا ہے؟ میٹھا یا کڑوا؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: جب وہ تازہ ہوتا ہے تو اس کا مزہ میٹھا ہوتا ہے، اور سوکھنے کے بعد کڑوا ہو جاتا ہے۔ اس پر اس نے پوچھا: کیا آپ نے چکھا ہے؟ امام صاحبؒ نے کوئی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کہا: ہر چیز کا مزہ معلوم کرنا چکھنے ہی پر موقوف نہیں ہے، بہت سی چیزیں آدمی عقل سے بھی معلوم کر سکتا ہے، دیکھو! جب وہ تازہ ہوتا ہے تو اس پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور سوکھنے بعد مکھیاں نہیں بیٹھتیں، یہ اس بات کی علامت ہے کہ تازہ ہونے کی حالت میں اس کا مزہ میٹھا ہوگا۔ خیر! جب امام صاحبؒ اس کو یہ جواب دے چکے تو اس نے کہا: حضرت! مجھے معاف کر دیجیے گا، دراصل میری اپنے ایک دوست کے ساتھ بحث ہوگئی تھی، میں آپ کے صبر و تحمل، عفو و درگزر کو آزمانا چاہتا تھا، میں اس سے ہار گیا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اتنا اونچا حوصلہ کون لا سکتا ہے! اسی لیے بزرگوں کے حالات اور قصے پڑھتے رہنا چاہئیں تاکہ ہماری بدمزاجی تھوڑی بہت ٹھیک ہوتی رہے، اگر ان کے حالات پڑھتے رہیں گے تو چاہے مکمل طور پر نہ سہی، کچھ نہ کچھ اعتدال تو آ ہی جائے گا۔

تکلیف دینے پر دعا دینے کا ایک نمونہ

حدیث ۶۴۶:-

وعن ابن مسعود(رضی اللہ عنہ) قَالَ كأني أنظر إِلَى رسول الله(صلی اللہ علیہ وسلم) يَحْكِي نَبِيّاً مِنَ الأنبياءِ، صَلَوَاتُ اللهِ وَسَلامُه عَلَيْهِمْ، ضَرَبَهُ قَوْمُهُ فَأَدْمَوْهُ، وَهُوَ يَمْسَحُ الدَّمَ عَنْ وَجْهِهِ، ويقول: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِقَوْمِي، فَإِنَّهُمْ لاَ يَعْلَمُونَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں گویا میں نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنی نظروں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ ایک نبی کا حال بیان کررہے ہیں جن کی قوم نے ان کو اتنا مارا پیٹا کہ ان کے جسم سے خون بہنے لگا، اور وہ اپنے چہرہ سے خون صاف کررہے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کررہے ہیں: اے اللہ! میری قوم کو معاف کردے، اس لیے کہ وہ مجھے نہیں جانتے (کہ میں تیرا رسول ہوں، اگر وہ مجھے جانتے تو میرے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرتے۔)

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے آدمی کوئی قصہ جو بہت مدت پہلے پیش آیا ہو اس کو ایسے انداز سے بیان کرتا ہے کہ گویا میری نگاہوں کے سامنے ابھی بھی وہ منظر بالکل تازہ ہے۔ یہاں حضرت ابن مسعود(رضی اللہ عنہ) نے اسی انداز سے یہ حدیث بیان فرمائی۔

اس روایت میں بھی معاف کرنے اور درگزر کرنے کا حال بیان کیا گیا ہے۔

حقیقی پہلوان

حدیث ۶۴۷:-

وعن أَبي هريرة (رضی اللہ عنہ) أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِی يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: پہلوان وہ نہیں ہے جو لوگوں کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔

افادات:- غصہ آئے تو اس کو برداشت کرنا اور غصہ کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا؛ یہی اصل بہادری ہے۔

(نوٹ:- یہ روایت حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد اول ، صبر کے بیان صفحہ ۳۳۲ پر گزر چکی ہے، وہاں غصہ کے موضوع پر تفصیلی کلام موجود ہے۔ مرتب۔)

باب إحتمال الأذیٰ

تکلیف برداشت کرنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اوپر والے ہی مضمون سے متعلق ایک عنوان قائم کیا ہے: کوئی آدمی آپ کو تکلیف پہنچائے تو آپ اس تکلیف کو برداشت کرلیجیے۔ یہاں پر بھی امام نوویؒ دو آیتیں اور ایک روایت لائے ہیں، آیتوں کا ترجمہ اور تشریح تفصیل سے پہلے گزر چکی ہے۔

گرم راکھ ڈال رہا ہے

حدیث ۶۴۸:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رسول الله! إِنَّ لِي قَرَابَةً أَصِلُهم وَيَقْطَعُونِي، وَأُحسِنُ إِلَيْهِمْ وَيُسِيئُونَ إِلَيَّ، وَأَحْلُمُ عَنهم وَيَجْهَلُونَ عَلَيَّ. فَقَالَ: لَئِنْ كُنتَ كَمَا قُلْتَ، فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ، وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللهِ تَعَالَى ظَهِيرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذَلِكَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، مَیں ان کے حقوق ادا کرتا ہوں؛ وہ میرے حقوق ادا نہیں کرتے۔ مَیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہوں، بھلائی واحسان کا معاملہ کرتا ہوں؛ وہ میرے ساتھ برائی کا سلوک کرتے ہیں۔ وہ میرے اوپر زیادتی کرتے ہیں اور مَیں برداشت کرتا ہوں (گویا وہ میرے ساتھ جہالت اور نادانی والا سلوک کرتے ہیں اور مَیں برداشت کرتا ہوں) اس پر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: تو جو بات کہہ

رہاہے اگر واقعتاً ایسا ہی ہے؛تو گویاتوگرم راکھ ان کے منھ میں ڈال رہاہے۔اوراللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے ساتھ ان کے خلاف برابرایک مددگاررہے گا،جب تک تواسی حالت میں ہے۔

افادات:-ویسے بھی راکھ کامنھ میں جانا آدمی کے لئے بڑی تکلیف دہ بات ہوتی ہے،اور ساتھ ہی چولہے کی گرم راکھ اگرمنھ میں ڈالی جائے توکیا حال ہوگا۔

کہنے کاحاصل یہ ہے کہ اس طرح معاملہ کرکے توان کو شکست دے رہاہے۔اورجب تک توان کے ساتھ ایساسلوک کرتارہے گا،اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ تیری مدد کے لئے تیرے ساتھ رہے گا۔

فرشتہ گیا،شیطان آیا

ایک روایت میں آتاہے کہ ایک آدمی حضرت ابوبکرصدیق(رضی اللہ عنہ)کو براًبھلاکہہ رہا تھا، حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ) بالکل خاموش تھے۔نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)دونوں کو دیکھ کر مسکرارہے تھے۔پھرجب یہ سلسلہ جاری رہااور دیرہوگئی تو حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ) اس کو جواب دینے لگے،نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نےرخ پھرلیا۔حضرت ابوبکر(رضی اللہ عنہ)نے عرض کیا :اے اللہ کے رسول!کیابات ہے آپ نے چہرہ پھیرلیا؟آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جب تک تم خاموش تھے،اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ بھیجاتھاجو تمہاری طرف سے اس کی باتوں کا جواب دے رہاتھا۔لیکن جب تم نے جواب دینا

شروع کیاتووہ فرشتہ وہاں سے ہٹ گیا اور شیطان آگیا،اس لئے میں نے منھ پھرلیا۔بہرحال! اللہ تعالیٰ کی مدد آدمی کے ساتھ ہوتی ہے۔ (سنن ابوداود ، باب فِي الاِنْتِصَارِ۔حدیث رقم:۴۸۹۸)

بہادری یابزدلی

آج کل توہمارے سماج اور معاشرہ میں اس چیزکوبزدلی کی علامت سمجھاجاتا ہے،گویا بدلہ لینا ہی بہادری ہے۔لیکن جیساکہ نبی ٔکریم(ﷺ)کاارشاد گزرا کہ اصل بہادری غصہ کو پی جانا،صبرکرنااورمعاف کردیناہے۔غصہ کے وقت اپنے آپ پر کنٹرول رکھنے کا نام بہادری ہے۔دنیاوالوں کی اصطلاح چاہےکچھ بھی ہولیکن شریعت اور نبی ٔکریم(ﷺ)کی بتلائی ہوئی اصطلاح میں بہادری اسی کانام ہے کہ آدمی غصہ کو پی جائے،دنیاوالے چاہے اس کو بزدلی سے تعبیرکرتے رہیں۔آج کل توکوئی آدمی اگر ایساکرتا ہے تولوگ کہتے ہیں کہ اس میں کچھ جان ہے یا نہیں ؟ارے بھائی! اس میں جان ہے تب ہی تو برداشت کررہاہےاوردر حقیقت یہی قوت کی بات ہے، ذرا برداشت کرکے تودیکھو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق وسعادت عطا فرمائے

الغضب إذا انتهكت حرمات الشرع والانتصار لدين الله تعالى

شعائر دین کی بے حرمتی کے وقت غصہ کرنا اور اللہ کے دین کے لئے بدلہ لینا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

قال اللّٰہُ تعالیٰ:-وَمَنْ یُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰہِ فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ.

قال اللّٰہُ تعالیٰ:-اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ أَقْدَامَکُمْ.

غصہ کب کرسکتے ہیں؟

اب تک تو غصہ کی قباحت کو بیان کیا تھا کہ آدمی اپنے غصہ کے اوپر کنٹرول کرے اور اس کو پینے اور دبانے کی کوشش کرے۔لیکن اس باب کو لاکر ایک موقع ایسا بھی بتلاتے ہیں جہاں شریعت کی طرف سے غصہ کو استعمال میں لانے کا حکم دیا گیا ہے شریعت کی طرف سے جو حدود مقرر ہیں اگر کوئی آدمی ان سے تجاوز کرنے لگے ، شریعت کی رعایت نہ کرے ،ان حدود کو توڑنے لگے۔یا شریعت نے جن کاموں کی تعمیل کا حکم دیا ہے کوئی آدمی ان کی تعمیل نہ کرے ؛تو ایسے مواقع پر آدمی کو اپنے غصہ کا اظہار کرنا چاہیے۔

"والانتصار لدین اللہ تعالیٰ" اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے انتقام لینا۔یعنی دین کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہو تو آدمی کو چاہیے کہ اپنے غصہ اور ناراضگی کو استعمال کرتے ہوئے جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ زیادتی کا معاملہ کررہا ہے اس سے بدلہ اور انتقام لے۔اپنی ذات کے لئے انتقام اور بدلہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے ،لیکن اس مقصد کے لیے بدلہ لینے کا حکم ہے۔

شعائراللہ کی عظمت رضاءِ الٰہی کا ذریعہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ﴾ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کی تعظیم وتکریم کا حکم دیا ہے ،جو آدمی ان کا احترام کرے ،ان کی عظمت اور ادب کو ملحوظ رکھے،تو یہ بات اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی اچھی ہے،درجات کی بلندی اور اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔

"حُرُمات"میں دین کی ساری چیزیں آجاتی ہیں۔بعض چیزیں تو وہ ہیں جو دین کا شعار اور علامت بتلائی گئی ہیں، جیسے بیت اللہ،کتاب اللہ،نبی اللہ؛ ان کے ساتھ اگر کوئی آدمی زیادتی کا معاملہ کرے،اور ان کے ادب واحترام کے خلاف کوئی حرکت کرے، ایسے موقع پر کوئی دوسرا آدمی ان کے ادب واحترام کو برقرار رکھنے کے لیے اپنے غصہ کو استعمال کرے؛ تو شریعت اس کی اجازت دیتی ہے۔

دوسری آیت پیش کی ہے:﴿إِنْ تَنْصُرُوا اللهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ﴾ اگر تم اللہ کی مدد کروگے(یعنی اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اٹھوگے) تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو جمائے گا۔

لوگوں کو دین سے متنفر نہ کرے

حدیث ۶۴۹:-

وعن أبي مسعود عقبة بن عمرو البدرى(رضی اللہ عنہ) قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبيِّ(صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: إِنِّي لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ أَجْلِ فلانٍ مِمَّا يُطِيلُ بِنَا! فَمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ(صلی اللہ علیہ وسلم) غَضِبَ فِى مَوْعِظَةٍ قَطُّ أَشَدَّ مِمَّا غَضِبَ يَوْمَئِذٍ؛ فَقَالَ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ. فَأَيُّكُمْ أَمَّ النَّاسَ فَلْيُوجِزْ؛ فَإِنَّ مِنْ وَرَائِهِ الكَبِيرَ وَالصَّغِيرَ وَذَا الحَاجَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو بدری انصاری(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی کہ فلاں آدمی کی وجہ سے میں فجر کی نماز میں غیر حاضر رہتا ہوں، اس لیے کہ وہ بہت لمبی قراءت کرتا ہے(یہ بات سن کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو نصیحت فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں کہ)کسی نصیحت و وعظ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اتنا زیادہ غضبناک اور غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا جتنا اس روز دیکھا۔ آپ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے لوگو! تم میں سے بعض لوگ وہ ہیں جو لوگوں کے دلوں میں دین کی طرف سے نفرت پیدا کرنے کا کام کرتے ہیں، اس لئے تم میں سے کوئی آدمی جب امامت کرے تو مختصر نماز

پڑھائے، اور ایسا اس لیے کرے کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے والے بوڑھے بھی ہوتے ہیں، بچے بھی ہوتے ہیں اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔

نماز کی مسنون قراءت

افادات:-ایک بات ذہن نشین رہے کہ ایسی لمبی قراءت ممنوع ہے جو شریعت کی مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہو۔کون سی نماز میں کتنی مقدار قراءت کرنی چاہیے کتنی آیتیں ہونی چاہئیں،کون سی سورتیں پڑھنی چاہئیں؛یہ سب احادیث سے ثابت ہے ،اور فقہاء نے ان کو واضح کرکے کتابوں میں لکھ دیا ہے ۔قرآن کی سورتوں کا ایک حصہ ہے جس کا نام ”مفصلات“ ہے۔”سورۂ حجرات“ سے لے کر” سورۂ ناس“ تک جتنی سورتیں ہیں ان تمام کو”مفصلات“ سے تعبیر کرتے ہیں۔اوران میں جتنی سورتیں لمبی ہیں ان کو”طوالِ مفصل“کہتے ہیں،اوروہ ”سورۂ حجرات“سے ”سورۂ بروج“تک ہیں ۔اورجو سورتیں درمیانی درجہ کی ہیں ان کو ”اوساطِ مفصل“ کہاجاتا ہے،وہ” سورۂ بروج“ سے ”سورۂ لم یکن الذین کفروا“تک ہیں۔ اورجو سورتیں چھوٹی ہیں ان کو ”قصارِ مفصل “ کہا جاتاہے،وہ ”سورۂ لم یکن الذین کفروا“ سے”سورۂ والناس“تک ہیں۔اور کون سی نماز میں کون سی سورۃ پڑھی جائے؟توفقہاء نے اس کی تفصیل یہ بتائی ہے کہ فجر اور ظہر میں”طوالِ مفصل“ میں سے پڑھنا سنت ہے۔عصر و عشاء میں”اوساطِ مفصل“ میں سے پڑھی جائے۔اور مغرب میں ”قصارِ مفصل“ میں سے پڑھی جائے۔

اب کوئی آدمی طبیعت کی سستی وکاہلی اوردین کے ساتھ بے رغبتی کی وجہ سے مسنون قراء ت کوبھی اپنے لیے لمبا سمجھتاہو تویہ اس کی کوتاہی سمجھی جائے گی۔خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے حدود بتلائے ہیں۔

احادیث کاغلط استعمال نہ کریں

بعض لوگ ایسی روایتیں سن کران کوغلط جگہ چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔اگرکوئی امام حدود کی رعایت کرتے ہوئے قراء ت کرتاہے تواس کے پاس جاکریہ حدیث سنائیں گے کہ دیکھو!حدیث میں یہ آیاہے ،اورمطلب اپنی طرف سے نکالیں گے۔اس لئے میں نے وضاحت کردی۔

" إِنَّ مِنكُمۡ مُنَفِّرِينَ "شریعت نے دین کے تمام امورکے لئے حدود مقرر کئے ہیں اورہرکام کے متعلق پوری تفصیل بتائی ہے۔کونسی نمازکونسے وقت میں کس طریقہ سے پڑھی جائے اس کی تفصیل بتلادی ہے۔کون سا کام کس درجہ کاہے اورکون سے کام کی فضیلت کتنی ہے۔اور موقع ومحل کے اعتبار سے کس کام کی فضیلت بڑھ جاتی ہے۔کسی کام کی فضیلت آج کم ہے لیکن دوسرے موقع پراسی کام کی فضیلت زیادہ ہوجائے گی۔جو آدمی پوری شریعت سے واقف ہوتاہے ،قرآن وحدیث کی ساری تعلیمات اس کے سامنے ہوتی ہیں،قرآن وحدیث سے جوچیزیں معلوم ہوتی ہیں،جن کو فقہاء نے کتابوں میں وضاحت کے ساتھ لکھ دیاہے، وہ

ساری باتیں اس کے پیشِ نظر ہیں، وہ سارے حدود کو اچھے طریقہ سے سمجھتا ہے کہ کس موقع پر کس چیز کی رعایت ہونی چاہیے۔

جب مستحب چیز بدعت بنتی ہے

اب کچھ لوگ شریعت کی مقرر کردہ حدود کی رعایت نہیں کرتے، جس چیز کو شریعت نے جو مقام دیا ہے، اس چیز کو اس سے آگے بڑھا، یا گھٹا دیتے ہیں۔ بعض لوگ اعتقادی طور پر ایسا کرتے ہیں، تو کچھ لوگ عملی طور پر ایسا کرتے ہیں۔ ایک چیز اپنی جگہ پر صحیح اور پسندیدہ ہوتی ہے لیکن لوگ اس کو اس کے درجہ سے بڑھا دیتے ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ ایک چیز مستحب ہے، لیکن لوگ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے لگے کہ اس کو واجب کا درجہ دیدیا، اس کو اتنی اہمیت دیدی گئی کہ اگر کوئی آدمی وہ کام نہیں کرتا تو طعن و تشنیع کی جاتی ہے، اس پر اعتراضات و تنقید کی جاتی ہے، تو اس صورت میں مستحب ہونے کے باوجود اس کام سے روک دیا جائے گا، اب اس کو بدعت و حرام قرار دیا جائے گا؛ جب تک کہ اس کے متعلق ذہنیت ٹھیک نہ ہو جائے۔ گویا اعتقادی طور پر بھی شریعت نے ہر چیز کا مقام بتادیا۔ لہٰذا عقیدہ کے اعتبار سے بھی اس کو اسی درجہ پر رکھیے، نہ بڑھایئے اور نہ گھٹایئے۔ جس چیز کا جو گریڈ (Grade) ہے، اس کو اس سے اوپر یا نیچے کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

عملی بے اعتدالی بھی صحیح نہیں

اور عمل کے لئے بھی شریعت نے حدوداور درجات بتائے ہیں، کوئی آدمی عملی طور پر آگے پیچھے کرنے لگے، تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مثلاً شریعت نے کہا کہ روزہ صبحِ صادق سے شروع ہو کر غروبِ آفتاب تک رہتا ہے۔ اس لئے حکم یہ ہے کہ جب غروبِ آفتاب کا یقین ہو جائے، اور کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے، تو آپ روزہ افطار کرنے میں تاخیر نہ کیجئے، ورنہ گنہ گار ہوں گے۔ کیونکہ اب تاخیر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کئے ہوئے وقت سے زائد بھوکا رہنے کو آپ اچھا سمجھ رہے ہیں، حالاں کہ شریعت نے تو عبادت اتنے ہی وقت کے لئے رکھی ہے ، آپ اس میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔

اُدھر سحری کے لئے حکم یہ ہے کہ اس میں جتنی تاخیر کرو اتنا ہی اچھا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ دو روزے ایک ساتھ رکھوں تو اس کی اجازت نہیں۔ مثلاً آج صبح روزہ رکھا، شام کو روزہ نہیں کھولا، رات میں بھی نہیں کھایا، نہ سحری کی؛ اور دوسرے دن کا روزہ بھی ساتھ میں ملا لیا، اس طرح دو دن کے روزے لگاتار رکھ لئے ، بیچ میں کھانا پانی کچھ نہیں کیا؛ جس کو شریعت کی اصطلاح میں صومِ وصال کہتے ہیں۔

حضورِ اکرم (ﷺ) اس طرح روزے رکھتے تھے ،جب صحابہ کرام (رضی اللہ عنہ) نے آپ (ﷺ) کو ایسا کرتے دیکھا تو انہوں نے بھی اس طرح روزے رکھنا شروع کر دیا۔ حضور (ﷺ) کو پتہ چلا تو

فرمایا کہ دیکھو! مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی قوت دی جاتی ہے جس سے میں اس کو برداشت کرسکتاہوں، تم اس طرح روزے مت رکھو۔ آپ نے ان کو حرام ہونے کی وجہ سے نہیں روکا تھا، بلکہ ان کی حالت پر شفقت کرتے ہوئے منع کیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ رمضان کے آخر میں یہ صورت پیش آئی تھی۔ دو دن ہوئے تھے اور چاند نظر آگیا۔ حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: اگر آج انیتس کا چاند نہ ہوتا تو میں ایک روزہ ملا لیتا، پھر دیکھتا کہ کتنے لوگ میرا ساتھ دیتے ہیں۔ (بخاری: باب التَّنْكِيلِ لِمَنْ أَكْثَرَ الْوِصَالَ)

قانون کو ہاتھ میں نہ لیں

تو شریعت نے ہر جگہ ، ہر چیز میں اور ہر کام میں اتنی وضاحت کر دی ہے کہ ہر کام کا ایک مقام و درجہ متعین کر دیا، اور عمل کی شکلیں بتلادیں۔ بدعت کو حرام اسی لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس شکل کو آدمی اپنی طرف سے متعین کرتا ہے۔ حالاں کہ وہ کام نیکی کے مشابہ ہے، لیکن شریعت نے وہ طریقہ نہیں بتلایا ہے۔ گویا بدعتی شریعت اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لے رہا ہے، اسی لئے اس کی اجازت نہیں ہے ، اور اس کو حرام اور بڑا سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کہے کہ یہ کرنا ہے تو وہ عبادت ہے۔ اور جہاں منع کرے کہ نہیں کرنا ہے تو وہ گناہ ہے۔ نماز جیسی نماز کے معاملہ میں دیکھئے، شریعت نے کہا کہ سورج جب طلوع ہورہا

ہواس وقت مت پڑھو، اگر پڑھوگے توگنہ گار ہوگے۔روزہ ہی کو لیجئے اگر کوئی عید کے روزرکھے توحرام کاارتکاب کیا۔اسی کو شریعت کے حدود کہا جاتا ہے

اجتماعی کاموں کاایک سنہرااصول

اس نصیحت میں حضورِاکرم (ﷺ) نے گویایہی بتلایاکہ شریعت نے جوطریقہ بتلایاآپ جوش میں آکراس سے آگے بڑھنے جائیں گے تونتیجہ یہ ہوگاکہ وہ کام آپ تو جوش میں کرلیں گے، لیکن ہر آدمی آپ کے جوش کاساتھ دے یہ ضروری نہیں ہے، نتیجہ یہ ہوگاکہ دوسرے لوگ آپ سے کٹ جائیں گے،اسی کو تعبیرکیا"إِنَّ مِنكُمْ مُنَفِّرِينَ"۔تم میں سے بعض لوگ ایساطریقہ اختیارکرتے ہیں کہ لوگ دین سے کٹ جاتے ہیں،ان کے دلوں میں دین کے اس کام کی طرف سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے ، اس لئے تم میں سے کوئی آدمی جب امامت کرے، تو مختصر نماز پڑھائے(اور مختصر کی تفصیل میں بتلاچکا ہوں) ایسااس لیے کرے کہ اس کے پیچھے نمازپڑھنے والے بوڑھے بھی ہیں، بچے بھی ہیں اورضرورت مند بھی ہیں۔اب اگرکوئی یوں کہے کہ سب مقتدیوں نے مل کر اجازت دی ہے کہ آپ لمبی نماز پڑھایئے تو؟جواب یہ ہے کہ تب بھی منع کریں گے،اس لیے کہ آپ کے نماز شروع کرنے کے بعدکوئی ضرورت مند آگیاتواس کوتویہ بات معلوم نہیں ہے، اس لیے وہ پریشان ہوگا۔

اسی لئے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ نماز کا جو وقت مقرر کیا گیا ہے مثلاً: اس مسجد کے بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ عشاء کی نماز ۰۰-۹ بجے شروع ہوگی۔ اگر آپ کو اس وقت سے آگے پیچھے کرنا ہے، تو بورڈ پر یہ وقت مت لکھئے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک آدمی ایسا ہے جس کو ۳۰-۹ بجے کی بس میں سوار ہونا ہے، اس نے بورڈ پر دیکھا کہ یہاں ۰۰-۹ بجے کی نماز ہے، دس منٹ میں جماعت ہو جائے گی، اس لئے میں جماعت سے نماز پڑھ کر آرام سے بس پکڑ لوں گا، یہ سوچ کر وہ مسجد میں آیا، لیکن مسجد میں کوئی پروگرام ہو رہا تھا، اس لیے نماز بجائے ۰۰-۹ کے ۱۵-۹ بجے شروع ہوئی، اب اس کی تو ساری گنتی فیل ہوگئی، اس کا جی نماز میں کیسے لگے گا؟ اس لیے جتنے بھی اجتماعی کام ہوتے ہیں، ان میں ان ساری چیزوں کی رعایت کی جانی چاہئے؛ کیوں کہ اس میں ہر قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز کے دوران اگر کسی بچے کے رونے کی آواز سنتے تھے، تو نماز کو مختصر کر دیتے تھے کہ اس کی ماں کا جی بچے میں اٹکا ہوا رہے گا (بخاری شریف : باب من أخف الصلاة عند بكاء الصبي) اُس زمانہ میں عورتیں بھی جماعت میں شریک ہوتی تھیں

بہر حال! یہاں شریعت کی مقرر کردہ حدود سے جو تجاوز ہو رہا تھا، ان حدود کو برقرار رکھنے کے لئے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ناراض ہوئے۔ اگرچہ لمبی نماز دیکھنے کے اعتبار سے کام کی اچھی شکل معلوم ہو رہی تھی، لیکن حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ٹوک رہے ہیں کہ یہی چیز آگے جا کر لوگوں کو دین سے

دور کرنے کا سبب بنے گی،اس لئے اسی وقت تنبیہ فرمائی کہ دین کے مقرر کئے ہوئے حدود کو توڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) کا غصہ

حدیث ۶۵۰:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: قَدِمَ رسولُ الله (ﷺ) مِنْ سَفر، وَقَدْ سَتَرْتُ سَهْوَةً لِي بِقِرَامٍ فِيهِ تَمَاثِيلُ، فَلَمَّا رَآهُ رسول الله (ﷺ) هتكَهُ وَتَلَوَّنَ وَجهُهُ، وقال: يَاعَائِشَةُ! أَشَدُّ النَّاسِ عَذَاباً عِنْدَ اللهِ يَوْمَ القِيَامَةِ الَّذِينَ يُضَاهُونَ بِخَلْقِ اللهِ.

((السَّهْوَةُ)): كَالصُّفَّةِ تَكُونُ بَيْنَ يدى البيت. وَ((القِرام)) بكسر القاف سِتر رقيق، وَ((هَتَكَه)): أَفْسَدَ الصُّورَةَ الَّتِي فِيهِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ایک سفر سے واپس تشریف لائے، مَیں نے ایک باریک پردے کے ذریعہ -جس پر کچھ تصویریں بنی ہوئی تھیں- ایک طاقچہ کو ڈھانپ رکھا تھا (ان کو تصویر کی حرمت کا علم نہیں تھا) حضور اکرم (ﷺ) نے اس پردے کو دیکھا تو آپ کا چہرۂ انور بدل گیا، آپ نے وہ پردہ پھاڑ دیا اور فرمایا: اے عائشہ! قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب والے وہ لوگ ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کی پیدا کرنے کی صفت کی مماثلت ومشابہت اختیار کرتے ہیں۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے تو ایسی صورت بنائی کہ اس میں جان بھی ڈال دی، لیکن یہ صرف صورت بناتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ خلق کی مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہیں، برابری کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ پوری پوری برابری نہیں کرسکتے۔ اسی لئے قیامت میں ان سے کہا جائے گا کہ تم نے جو تصویر بنائی تھی، اس میں جان ڈالو۔ اللہ تعالیٰ تو ایسی تصویر بناتے ہیں کہ اس میں جان بھی ڈالتے ہیں، اب تم بھی جان ڈالو، اور وہ جان ڈال نہیں سکیں گے (آخر جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے)

باب کا جو عنوان قائم کیا تھا اس میں یہ بھی تھا: ”والانتصار لدین اللہ تعالیٰ“ اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے انتقام اور بدلہ لینا۔ تو دیکھو! ایک غلط چیز ہوئی، اس کو روکنے کے لئے نبی کریم (ﷺ) نے عملی اقدام بھی کیا اور آئندہ کے واسطے غصے کے ساتھ تنبیہ بھی کردی۔

حدود اللہ میں رواداری نہیں

حدیث ۶۵۱:-

وعنها أن قريشاً أَهَمَّهُمْ شَأْنُ الْمَرْأَةِ المخزومية الَّتِي سَرَقَتْ ، فقالوا مَنْ يُكَلِّمُ فِيهَا رسول الله (ﷺ)؟ فقالوا: مَنْ يَجْتَرِءُ عَلَيْهِ إِلاَّ أُسَامَةُ بنُ زَيْدٍ حِبُّ رسول الله (ﷺ)؟ فَكَلَّمَهُ أُسَامَةُ. فَقَالَ رسول الله (ﷺ): أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ الله تَعَالَى؟ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ. ثُمَّ قَالَ: إِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ

فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ أَقَامُوا عَلَيْهِ الحَدَّ، وَايْمُ اللهِ! لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ قریش کو قبیلۂ مخزوم کی عورت کے معاملہ نے بہت فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کی تھی۔ لوگوں نے آپس میں کہا کہ اس بارے میں اللہ کے رسول سے کون بات کرے؟ لوگوں نے طے کیا کہ اسامہ بن زید- جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے محبوب ہیں -ہی بات کرسکتے ہیں۔ خیر! حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہ) نے اس بارے میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بات کی، تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ناراضگی سے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کو معاف کرانے کے معاملہ میں تم میرے پاس سفارش لے کر آئے ہو؟ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا: تم سے پہلی امتیں اس لئے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کا کوئی شریف (یعنی بڑے گھرانے کا) آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے (چشم پوشی سے کام لیتے تھے اور درگزر کردیتے تھے) اور کوئی کمزور (چھوٹے گھرانے کا) آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے (پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا) اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (رضی اللہ عنہا) (اَعاذھا اللہ منھا) نے چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹتا۔

افادات:- یہ واقعہ ۸ھ فتح مکہ کے موقعہ پر پیش آیا تھا۔ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت جس کا نام فاطمہ مخزومیہ (رضی اللہ عنہا) تھا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی چیزیں عاریۃً لے کر مکر جاتی تھیں، اور کبھی کبھار کوئی چیز چُرا بھی لیا کرتی تھیں۔ اب چوری میں پکڑی گئیں، اور وہ ثابت ہوگئی (اور چوری والے جرم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کی گئی ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹا جائے) سب کو یقین ہوگیا کہ ان کا ہاتھ کاٹا جائے گا (اس لئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مقرر کی

ہوئی سزا -حد- ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا مقرر کی جاتی ہے ،اس کو عربی زبان میں ”حَدٌّ“ کہتے ہیں۔)تو سب کو فکر لاحق ہوا کہ یہ عورت قریش کے بڑے خاندان مخزوم کی ہے، اور یہ خاندان بڑا باعزت سمجھا جاتا تھا، اگر اس کا ہاتھ کٹے گا تو پورے خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔ لوگ آپس میں مشورہ کے لئے بیٹھے اور یہ بات زیرِ بحث آئی کہ حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جاکر کوئی آدمی سفارش کرے کہ اس عورت کو سزا نہ دی جائے ، چھوڑ دیا جائے اور اس کا ہاتھ کٹنے سے بچ جائے، لیکن حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاکر کہے کون؟ سب لوگ اس بات پر متفق ہوئے کہ یہ جرأت حضرت اسامہ بن زید(رضی اللہ عنہ) ہی کر سکتے ہیں جو نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے لاڈلے ہیں۔ ان کا لقب ہی حِبُّ رسول اللہ تھا۔ ان کے والد حضرت زید بن حارثہ(رضی اللہ عنہ) تھے جو غلاموں میں سب سے پہلے اسلام لانے والے ہیں، اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اپنا منھ بولا بیٹا بنایا تھا، اور لوگ ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارتے تھے۔ زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ کوئی آدمی کسی کو منھ بولا بیٹا بنالے تو اسی کی طرف اس کی نسبت کرتے اور اسی کا بیٹا کہتے تھے ،لیکن بعد میں قرآنِ پاک میں اس پر ممانعت آگئی پھر زید بن حارثہ کہا جانے لگا۔

تو نے خرید کر مجھے انمول کر دیا

بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ یہ ایک مرتبہ کسی قافلے میں جارہے تھے ،اس قافلہ پر کسی قبیلے نے شب خون مارا (اس زمانہ میں عموماً لوگ قافلہ کی شکل میں چلتے تھے اس میں عورتیں

اور بچے بھی ہوتے تھے۔حملہ کی صورت میں عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر غلام باندی بنالیتے ،پھر ان کو بیچ دیتے تھے)یہ پکڑے گئے اوران کو مکہ مکرمہ لاکر بیچا گیا اور حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی ملکیت میں آئے۔انہوں حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں ہدیہ کے طور پر پیش کیا۔جب ان کے والد کو معلوم ہوا کہ قافلہ لوٹا گیا،میرا بیٹا پکڑا گیا اوراب پتہ نہیں وہ کہاں ہے،وہ بیٹے کی محبت میں بڑے پریشان تھے،ہر آنے جانے والے سے پوچھتے تھے کہ میرے بیٹے کو کہیں دیکھو تو بتانا۔

یہ مکہ مکرمہ ہی میں تھے اور بیت اللہ کی زیارت کے لئے ان کے علاقہ کے کچھ لوگ آئے،کسی نے ان کو دیکھ لیا،ان کے والد کو جاکر اطلاع دی کہ تمہارے بیٹے کو ہم نے وہاں دیکھا ہے۔ان کے والد اور چچا دونوں مکہ مکرمہ اپنے بیٹے کو لینے کے واسطے آئے، تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ہے۔یہ دونوں خدمت میں آئے اور درخواست کی کہ آپ کی سخاوت بڑی مشہور ہے ،آپ جو قیمت چاہیں؛ہم ادا کرنے کے لئے تیار ہیں،آپ ہمارے بیٹے کو ہمارے حوالہ کیجئے۔تو حضور اکرم(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اسی سے پوچھ لو ،اگر وہ آنے کو تیار ہو تو ویسے ہی لے جاؤ ،اوراگر وہ انکار کرے تو میں زبردستی نہیں کروں گا۔خیر!ان کو بلایا اور پوچھا کہ ان دونوں کو جانتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہاں!یہ میرے ابا، اور یہ چچا ہیں۔حضور(صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: یہ تمہیں لینے کے لئے آئے ہیں، میری طرف سے اختیار ہے، اگر ان کے ساتھ جانا چاہو تو جاؤ، اور میرے پاس رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو۔انہوں نے کہا:اے اللہ کے رسول !میں تو آپ کے پاس ہی رہوں گا۔ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ان کے والد اور چچا کو بڑا تعجب ہوا،ان سے کہا:

غلامی کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو؟ دونوں نے بہت اصرار کیا، منایا اور سمجھایا، لیکن وہ جانے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ تو حضور اکرم (ﷺ) نے یہ اعلان فرمایا: تم گواہ رہو کہ میں ان کو اپنا بیٹا بناتا ہوں۔ اس طرح یہ حضور (ﷺ) کے محبوب بنے۔ انہی کے بیٹے حضرت اسامہ بن زید ہیں، یہ بھی حضور کے بڑے لاڈلے تھے اور انہی کا لقب حِبُّ رسولِ اللہ تھا۔

روایتوں میں آتا ہے حضور اکرم (ﷺ) اپنی ایک ران پر حضرت حسن (رضی اللہ عنہ) کو بٹھاتے تھے، دوسری ران پر حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہ) کو بٹھاتے تھے اور دعا فرماتے تھے کہ: اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں، تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان سے محبت کرے، اس سے بھی محبت فرما۔ (سیر اعلام النبلاء)

خیر! لوگوں نے کہا کہ حضور (ﷺ) سے سفارش تو یہی کر سکتے ہیں، ایسے موقعوں پر ایسے ہی لوگوں کو ڈھونڈا جاتا ہے۔ لوگوں نے ان سے کہا اور بڑے لوگوں کے کہنے کی وجہ سے وہ بھی آمادہ ہوگئے، حضور (ﷺ) کی خدمت میں پہنچے۔ اب وہ نہیں سمجھتے تھے کہ یہ کتنی اہم چیز ہے، نہ ان کو یہ معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی سزا کے معاملہ میں سفارش چل نہیں سکتی، اس لئے انہوں نے گفتگو کی، ان کی بات سن کر حضور (ﷺ) نے فرمایا: "أَتَشْفَعُ فِيْ حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللهِ تَعَالىٰ؟" اے اسامہ! تم اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کو معاف کرانے کے معاملہ میں میرے پاس سفارش لے کر آئے ہو؟ پھر آپ (ﷺ) نے ایک تقریر فرمائی کہ تم سے پہلی امتیں اسی لئے ہلاک اور برباد ہوئیں کہ ان میں کا کوئی شریف یعنی بڑے

گھرانے کا آدمی چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے چشم پوشی سے کام لیتے تھے، درگزر کردیتے تھے۔ اور کوئی کمزور اور چھوٹے گھرانے کا آدمی چوری کرتا تو اس پر سزا جاری کرتے۔ پھر حضور (ﷺ) نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر فاطمہ بنت محمد (رضی اللہ عنہا) (أعاذها الله منها) چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹتا۔

یہاں پر حضور اکرم (ﷺ) نے جو غصہ کا اظہار فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کی ایک حد کو قائم رکھنے کے لئے فرمایا۔ اور ایسی چیزوں میں نہ کوئی سفارش قبول کی جاتی ہے، اور نہ رواداری برتی جاتی ہے۔

قبلہ کی طرف تھوکنے پر حضور (ﷺ) کی ناراضگی

حدیث ۶۵۲:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ): أنَّ النبيَّ (ﷺ) رأى نُخَامَةً في القبلَةِ. فَشَقَّ ذَلِكَ عَلَيهِ حتَّى رُؤِيَ في وَجْهِهِ، فَقَامَ فَحَكَّهُ بِيَدِهِ. فَقَالَ: إن أحدَكُمْ إذَا قَامَ فِي صَلاَتِهِ فَإنَّهُ يُنَاجِي رَبَّهُ، وَإنَّ رَبَّهُ بَيْنَهُ وبيْنَ القِبلَةِ. فَلاَ يَبْزُقَنَّ أحدُكُمْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ، وَلَكِنْ عَنْ يَسَارِهِ، أَوْ تَحتَ قَدَمِهِ. ثُمَّ أَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهِ فَبَصَقَ فِيهِ، ثُمَّ رَدَّ بَعضَهُ عَلَى بَعْضٍ، فَقَالَ: أَوْ يَفْعَلُ هكذا. (متفقٌ عَلَيهِ)

وَالأمرُ بالبُصَاقِ عَنْ يَسَارِهِ أَوْ تحتَ قَدَمِهِ هُوَ فِيما إذَا كَانَ في غَيْرِ المسجِدِ. فَأَمَّا في المسجِدِ فَلاَ يَبصُقِ إلاَّ في ثَوْبِهِ.

ترجمہ مع تشریح:-حضرت انس(رضی اللہ عنہ)فرماتے ہیں کہ نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)نے قبلہ کی دیوار کے اندر بلغم کا اثر دیکھا،یہ چیز نبی کریم(صلی اللہ علیہ وسلم)کو بڑی شاق اور گراں گزری، یہاں تک کہ اس کا اثر آپ کے چہرۂ انور میں محسوس کیا جانے لگا۔پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اُٹھے اور اپنے دستِ مبارک سے کھرچ کر اس کو صاف کیا اور فرمایا: آدمی جب نماز کے لئے کھڑا ہوتا ہے تو اس حالت میں وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے،اور اس حالت میں اللہ تعالیٰ گویا اس کے بالکل سامنے ہوتا ہے(قِبْلَۃ، فِعْلَۃ کے وزن پر ہے۔عربی زبان میں چہرے کے سامنے کی حالت کو قبلہ کہتے ہیں۔آدمی کا چہرہ کسی مخصوص جہت کی طرف ہونا)اس لئے نماز کی حالت میں سامنے کی طرف نہ تھوکے(جیسے کوئی بڑا آدمی سامنے ہو اس کی طرف تھوکنا کتنی بڑی گستاخی کی بات سمجھی جاتی ہے)اور اگر اس حالت میں تھوکنے کی ضرورت پیش آ ہی جائے تو بائیں طرف یا اپنے پاؤں کے نیچے تھوکے،پھر آپ نے اپنی چادر کا کنارہ پکڑ کر اس میں تھوکا ، مَلا اور فرمایا: یا ایسا کرے۔

علامہ نووی(رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ بائیں طرف یا پاؤں کے نیچے تھوکنے کی جو بات کہی گئی ہے وہ مسجد کے باہر کسی میدان اور صحن وغیرہ کا حکم ہے،لیکن اگر مسجد میں ہو اور تھوکنے کی ضرورت پیش آجائے تو پھر ایک ہی شکل رہ جاتی ہے کہ اپنے کپڑے میں تھوک لے۔

افادات:-اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز کی حالت میں تھوکنے کی ضرورت پیش آئے تو اس کے لیے شریعت نے ایک حد مقرر کی ہے اور اس کا طریقہ بھی بتلایا ہے۔جس آدمی نے اس کے خلاف کیا اور قبلہ کی طرف تھوکا تو اس پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی سخت ناراضگی

کااظہار فرمایا۔معلوم ہوا کہ جہاں شریعت کی خلاف ورزی ہوتی ہو، وہاں آدمی کو اپنی ناراضگی ظاہر کرنی چاہیے ،تاکہ آئندہ ایسی نوبت نہ آئے۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی نماز پڑھارہاتھا،دورانِ نماز اس نے قبلہ کی جانب تھوکا۔بعد میں نبیٔ کریم (ﷺ)نے لوگوں سے کہا: آئندہ یہ آدمی تمہیں نماز نہ پڑھائے۔چناں چہ دوسرے وقت وہ آگے بڑھناچاہتاتھاتولوگوں نے روک دیاکہ ہم تمہاری اقتداء نہیں کریں گے۔پوچھا:کیوں ؟سب نے کہاکہ نبیٔ کریم(ﷺ) منع فرمایا ہے۔تووہ آدمی نبیٔ کریم(ﷺ) کی خدمت ِاقدس میں حاضرہوااورپوچھا۔آپ (ﷺ) نے فرمایا: ہاں!میں نے منع کیاہے۔راوی کہتے ہیں کہ آپ(ﷺ) نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ تم نے نماز کی حالت میں قبلہ کی طرف تھوک کر اللہ اوراس کے رسول کواذیت وتکلیف پہنچائی ہے(ابوداود شریف،باب فی کراھیۃالبزاق فی المسجد، حدیث نمبر:۴۸۱)اس لیے تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں امامت کی اجازت دی جائے۔

معلوم ہوا کہ شریعت کے خلاف کوئی بات ہوئی ہوتواس موقع پر آدمی کواپنی ناراضگی اور ناگواری کااظہار کرناچاہیے تاکہ آئندہ یہ سلسلہ جاری نہ رہے اورشریعت کے حدود پامال نہ ہوں

بَابُ أَمْرِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ بِالرِّفْقِ بِرِعَايَاهُمْ وَنَصِيْحَتِهِمْ، وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ

وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ، وَالتَّشْدِيْدِ عَلَيْهِمْ وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ

اصحابِ اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں، ان کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کریں، ان کو دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی مصالح سے پہلو تہی نہ کریں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أما بعد:-

اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے:

اللہ تعالیٰ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمام لوگوں کے حقوق کو واضح کر کے امت کے سامنے پیش کر دیا ہے، اور اسلام کی تعلیمات کی بنیاد ہی اس بات پر ہے کہ ان تمام حقوق کو ادا کیا جائے، گویا اسلام نام ہی حقوق کی ادائیگی کا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر کیا حق ہے وہ بھی بتلا دیا، اور خود بندوں کے آپس کے حقوق بتلائے کہ ماں باپ کا اولاد کے اوپر کیا حق ہے، اولاد کا ماں باپ کے اوپر کیا حق ہے۔ بیوی کا شوہر کے اوپر اور شوہر کا بیوی کے اوپر کیا حق ہے۔ بھائی کا بھائی پر، بہن کا بہن پر، بھائی بہنوں کے آپس میں ایک دوسرے پر کیا حقوق ہیں، ایک پڑوسی کا دوسرے پڑوسی کے اوپر کیا حق ہے، آقا کا اپنے غلام کے اوپر کیا حق ہے، اور غلام کا آقا پر کیا حق ہے؛ یہ سب حقوق تفصیلی طور پر اسلام نے بتلائے ہیں۔

حکمرانوں کا پورا سلسلہ:

چناں چہ اسی سلسلہ میں ایک چیز آج پیش کی جارہی ہے کہ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو ان میں ایک حکمران طبقہ ہوتا ہے اوران میں بھی درجات ہوتے ہیں۔ایک توحاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے جس کو بادشاہ اورسلطان کہاجاتا ہے، پھراس کی ماتحت درجات ہوتے ہیں، جیسے ہمارے ملک میں پوراایک نظام ہے کہ صدر یاوزیرِاعظم ہوتے ہیں ،پھران کے ماتحت گورنروں اور وزرائے اعلیٰ کا سلسلہ ہے،پھروزرائے اعلیٰ کے ماتحت ضلعوں کے کلکٹر وغیرہ ہیں ،پھر تحصیل کے پیمانوں پرحاکم ہیں ،پھر دیہات اوربستیوں کے پیمانوں پر حاکم ہیں۔اورہر سطح پرکچھ نہ کچھ ذمہ داریاں ہوتی ہیں ،یہ ساری ذمہ داریاں جن کے حوالہ کی جاتی ہیں ان کو ایک قسم کی حکمرانی حاصل ہوتی ہے، چاہے چھوٹے پیمانے پر ہو،یابڑے پیمانے پرہو۔اگروہ حاکمِ اعلیٰ ہے جس کے ہاتھ میں حکومت دی گئی ہے،توپوراملک اور تمام رعیت اس کے ماتحت ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کی،رعایااورپبلک کی کیاذمہ داریاں ہیں ؟ان کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہیے؟اورپھرپبلک ورعایا کے اوپراس حکمران کے کیاحقوق ہیں ؟

حکومت نہ ہونے کی صورت میں بھی ہرایک پرکچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں جن کی وجہ سے کچھ لوگ اس کے ماتحت ہوتے ہیں ،جیسے :گھریا خاندان کابڑاذمہ دار ہوتا ہے تواس کی ماتحتی میں کچھ لوگ ہیں۔گھرکے ذمہ دارکے ماتحتی میں اس کے بیوی بچےاوردوسرے لوگ

جو گھر کے اندر سکونت اور رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں جن کا یہ بڑا سمجھا جاتا ہے؛ اس پر ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں۔

جہاں خاندان مشترکہ طور پر زندگی گزارتے ہیں، تو خاندان کا جو سربراہ اور بڑا ہوتا ہے، وہ سب کا ذمہ دار ہوتا ہے، اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے حقوق ہوتے ہیں، علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دونوں باب بالترتیب لائیں گے، اس کی تفصیل بیان کریں گے اور اس سلسلہ میں نبی کریم (ﷺ) نے جو ذمہ داریاں بتلائی ہیں ان سے متعلق روایتیں پیش کریں گے۔

جیتے جی جنت کا نمونہ بنانے کا نسخہ:

اس سلسلہ میں ایک چیز ذہن نشین رہے کہ جہاں کہیں معاملہ دو پارٹیوں یا دو فریق کا ہوتا ہے، تو ہر فریق کے اوپر دوسرے فریق کی نسبت سے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ایسی بے شمار مثالیں ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ہے، اور ہر ہر گھر کے اندر یہ تعلق ہوتا ہے، بلکہ ایک ہی گھر کے اندر کئی میاں بیوی رہتے ہیں؛ تو شوہروں کا ایک گروہ اور جماعت ہے، ان کے مقابلہ میں بیویوں کی ایک جماعت اور پارٹی ہے۔ اسی طریقہ سے سیٹھ اور نوکر کا تعلق ہے، تو سیٹھوں کی پوری ایک جماعت اور طبقہ ہے اور ان کے ماتحت کام کرنے والوں کا پورا ایک گروہ ہے۔ تو جو مالک، آقا اور سیٹھ ہیں ؛ ان کو کیا حقوق حاصل ہیں؟ اور ان کی اپنے ماتحتوں اور نوکروں کی نسبت سے کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اسی طرح نوکروں کا جو گروہ ہے ان کے اوپر اپنے آقا کی نسبت سے کیا کیا ذمہ

داریاں عائد ہوتی ہیں ؟اس سلسلہ میں حکومتوں کے بھی قانون ہوتے ہیں۔ اور شریعتِ اسلامیہ میں اللہ تعالیٰ نے بھی یہ سارے حقوق واضح کردیئے ہیں اور اس سلسلہ میں ایسا انداز اختیار کیا ہے کہ اگر دونوں فریق اپنی اپنی ذمہ داریوں کو پوری دیانت اور امانت داری کے ساتھ ذرّہ برابر بھی کمی کیے بغیر ادا کریں ؛پھر تو یہ دنیا جیتے جی جنت کا نمونہ ہی بن جائے، اور اگر ایک فریق تو ان حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے جو اس کے اوپر دوسرے فریق کے واجب ہوئے ہیں، لیکن دوسرا فریق اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے،تب بھی کوئی جھگڑا اور نزاع کی نوبت پیش نہیں آئے گی۔

اسلام اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ تمہارے اوپر دوسروں کے جو حقوق ہیں اس کو ادا کرو، اور اپنے حقوق کا مطالبہ مت کرو۔چناں چہ آپ قرآن وحدیث کے اندازِ تخاطب کو دیکھیں گے تو اس میں خاص طور پر جس کا حق ہے اس کو خطاب نہیں کیا ہے،بلکہ جس پر حق ہے اس کو خطاب کیا ہے۔ جیسے:بیوی کا حق ہے تو بیوی کو یہ نہیں کہا کہ شوہر کے اوپر تیرا حق ہے،بلکہ شوہر کو یوں کہا گیا کہ تمہارے اوپر بیوی کا یہ حق ہے۔یا بیوی کے اوپر شوہر کا حق ہے تو شوہر کو خطاب کرکے یوں نہیں کہا گیا کہ اے شوہروں کی جماعت!تمہاری بیویوں پر تمہارے یہ حقوق ہیں،بلکہ عورتوں کو براہِ راست خطاب کیا گیا ہے کہ تمہارے اوپر شوہروں کے یہ یہ حقوق ہیں، تم ان کو ادا کرو۔ایسے ہی یہاں پر بھی ہے۔

عنوان کا خلاصہ:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلا باب قائم کیا، جس کا عنوان ہے: ذمہ داروں کو اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کرنے کا حکم۔ جیسا کہ میں نے بتلایا کہ حکمرانی کے بھی مراتب اور درجات ہیں، ایک تو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے، پھر اس کے ماتحت ہوتے ہیں، پھر اس کے ماتحت؛ اسی طرح ایک بہت لمبا چوڑا سلسلہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ حکم صرف بادشاہِ وقت کے لیے خاص نہیں ہے، بلکہ جو گھر کا ذمہ دار، بڑا اور رئیس ہوتا ہے اس کو بھی یہ سارے احکام لاگو پڑتے ہیں۔ "وَنَصِيْحَتِهِمْ وَالشَّفْقَةِ عَلَيْهِمْ" ان کی خیر خواہی اور پوری پوری بھلائی چاہنے، اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کرنے کا حکم۔ "وَالنَّهْيِ عَنْ غَشِّهِمْ" اور ان کی بدخواہی سے منع کرنے کا حکم۔ بحیثیت حاکم کے تمہاری طرف سے کوئی ایک حرکت بھی ایسی نہیں ہونی چاہیے جس سے تمہارے ماتحتوں کے متعلق بدخواہی معلوم ہوتی ہو۔ "وَالتَّشْدِيْدِ عَلَيْهِمْ" جہاں حکمران کو حکم دیا گیا کہ نرمی کرو، وہیں ان کے ساتھ سختی کرنے سے منع کیا گیا۔ یعنی دونوں باتیں ہونی چاہئیں، صرف نرمی کا حکم نہیں دیا گیا، بلکہ سختی سے بھی منع کیا گیا، جیسے: خیر خواہی کا حکم دیا اور ساتھ ہی بدخواہی سے منع کیا۔

بے توجہی اور غفلت سے منع کیا گیا:

"وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ" ان کی جو جو مصلحتیں ہوں ان کی طرف سے بے خبری، بے توجہی اور ان کے معاملہ میں غفلت برتنے سے بھی منع کیا گیا۔ اور ان کی بھلائی کی جتنی بھی شکلیں ہوسکتی ہیں وہ سوچی جائیں۔ مثلاً: ایک آدمی پورے گھر کا سربراہ اور رئیس ہے، اب گھر میں کیا ہورہاہے اس کو اس بات کی کوئی پڑی ہی نہیں ہے، گھر والے کہاں سے کھارہے ہیں، کیا کررہے ہیں، ان کی ضرورتیں کیسے پوری ہورہی ہیں، اس کو اس بات کی کوئی فکر نہیں ہوتی، وہ اپنے میں مست ہے، اور ان کی طرف سے بالکل غفلت برت رہاہے۔

یا اگر اچھا کھلا پلا تو رہاہے لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت برت رہاہے کہ ان کے اعمال کیا شکل اختیار کررہے ہیں۔ یا اس کو اس بات کی کوئی پرواہ ہی نہیں ہے کہ میرا بیٹا کس کی صحبت میں پھر رہاہے، میری بیوی کہاں جارہی ہے، میری بیٹیاں کیا کررہی ہیں۔ یا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہاہے کہ گھر والے غلط لیٹریچر کا مطالعہ کررہے ہیں جس سے ان کی ذہنیت خراب ہوتی ہے، لیکن ان کی طرف سے بے توجہی اور غفلت برتتا ہے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اوپر سے لے کر نیچے تک ہر ایک کے لیے یہ حکم یکساں ہے۔

مصلحت اور حاجت کا فرق:

"وَعَنْ حَوَائِجِهِمْ" ان کی ضرورتوں سے غفلت برتنے سے منع کیا گیا ہے۔ مصالح اور حوائج دو چیزیں الگ الگ ہیں، مصالح کا مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس سے اس کی زندگی میں خوبی اور نکھار آتا ہے، زندگی بنتی اور سنورتی ہے، اور اس میں تعلیم و تربیت، اخلاق، اعمال، اٹھنا بیٹھنا، بول چال؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں۔ اور حوائج کا مطلب ہے ضرورتیں ؛ جس میں کھانا، پینا، کپڑا مکان؛ یہ ساری چیزیں آتی ہیں ۔ اب ایک آدمی اگر اپنے ماتحتوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، اور ان کے کپڑوں کا بہترین انتظام کرتا ہے، اس پر برابر پیسے خرچ کرتا ہے، ذرّہ برابر اس کی طرف سے غفلت نہیں برتتا، لیکن ان کی تعلیم و تربیت کی طرف سے غفلت کا معاملہ کرتا ہے، ان کی عادتوں کی طرف سے غفلت و بے پرواہی برتتا ہے تو پھر یہ گڑبڑ والی بات ہو جائے گی۔ اس لیے کہ وہ ان کی حاجتیں پوری کر رہا ہے ، لیکن ان کی مصلحتوں اور بھلائیوں کی طرف توجہ نہیں کر رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں بحیثیت ایک ذمہ دار کے ہر طرف سے چوکنّا رہنا ہے اور ہر ہر چیز کا خیال کرنا ہے۔ گھر کے لیڈر اور ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے صرف کھلانا پلانا ہی کافی نہیں ہے۔

آج کل ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہم گھر کے ذمہ دار ہیں تو گھر کے لوگوں کے رہنے سہنے، کھانے پینے، کپڑوں وغیرہ دوسری ضرورتوں کا انتظام کر دیں گے؛ تو گویا ہم نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی۔ حالاں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "وَإِهْمَالِ مَصَالِحِهِمْ وَالْغَفْلَةِ عَنْهُمْ وَعَنْ

حَوَائِجِهِمْ“ ان کی ذات سے بھی غفلت نہ برتے اور ان ضرورتوں سے بھی غفلت نہ برتے، ان کی ہر چیز کا خیال رکھے؛ یہ سب ذمہ داریاں ہیں۔

ایک مثال:

بھائی! آپ گاڑی میں پٹرول تو دیتے ہیں، لیکن اس کے شیشے کی صفائی نہیں کرتے، سروس نہیں کراتے؛ تو کیا کام چل جائے گا؟ نہیں چلے گا! بلکہ ہر ہر چیز کرنی پڑے گی، تب ہی آپ کی گاڑی چلے گی۔ اسی طریقہ سے کھلانے پلانے، رہنے سہنے کا انتظام تو کرتے ہیں؛ لیکن ان کے اخلاق، اعمال، اقوال کے سدھار اور تعلیم و تربیت کی طرف دھیان نہیں دیتے، ان کی عادتیں کیسی ہیں، کہاں اٹھتے بیٹھتے ہیں، گھر میں کیا کرتے ہیں، اس طرف سے غفلت برتتے ہیں اور کوئی توجہ نہیں کرتے؛ تو کام نہیں چلے گا۔ اور جتنے بھی ذمہ دار ہیں ہر ایک کے لیے یہی حکم ہے، بادشاہِ وقت اور حاکمِ اعلیٰ جو پوری سلطنت کا ذمہ دار ہے، اس کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنی رعیت کی ان ساری چیزوں کا خیال رکھے۔

موت کی گھڑی میں رعایا کی اصلاح کی فکر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پتہ چلے گا کہ وہ صرف اتنا ہی نہیں سوچتے تھے کہ نظامِ سلطنت برابر چلے، بلکہ رعیت کی ہر ہر چیز کا پورا خیال رکھتے تھے، لوگوں کا کیا حال ہے،

ان کے اخلاق کیسے ہیں ،ان کے اعمال کیسے ہیں ، وہ کس قسم کا لباس پہنتے ہیں ؛وہ ان سب چیزوں کا خیال رکھتے تھے۔اس بات کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا،ابولؤلؤ نے خنجر مارا جس سے آپ زخمی ہوئے اور آپ کے جاں بر ہونے کی امید نہیں تھی، سب کا گمان تھا کہ اسی بیماری میں انتقال ہوجائے گا اور اسی بیماری میں آپ کی وفات بھی ہوئی۔ اسی بیماری کے دوران ایک نوجوان آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے آیا،جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو آپ کی نظر اس کی لنگی یا پائجامہ پر پڑی جو ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا تھا، آپ نے اس کو بلایا اور کہا:اے بھائی! "إِرْفَعْ ثَوْبَكَ" اپنا پائجامہ اونچا رکھو "فإِنَّهُ أَنْقَى لِثَوْبِكَ" یہ تمہارے کپڑے کی صفائی کا ذریعہ ہے "وَأَتْقَى لِرَبِّكَ" اوراپنے رب کے یہاں تقویٰ کا ذریعہ بھی ہے (صحیح بخاری، باب قصة البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفانؓ،حدیث نمبر:۳۴۹۷)غور کرو کہ عین موت کی گھڑی میں وہ اس ذمہ داری سے بے خبر اور بے پرواہ نہیں تھے۔

ایک مرتبہ جب آپ شام کے علاقہ میں تشریف لے گئے،تو وہاں اسلامی لشکر کے مختلف حصوں کے سپہ سالار ملے،ان کے حالات کو دیکھا توان کے لباس پر ان کو ٹوکا۔

جامع آیت:

پہلی آیت لائے ہیں :﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبَى﴾ اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔یہ ایک ایسی جامع آیت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

قرآنِ پاک کی ساری تعلیمات پیش کرنے کے لئے یہ ایک آیت ہی کافی ہے۔اسی لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے جمعہ اور عیدین کے دوسرے خطبہ میں اس کو شریک کرلیا، خطیب اپنے خطبہ کو اسی آیت پر ختم کرتا ہے۔یہ ایسی جامع آیت ہے کہ قرآنِ کریم کی تمام تعلیمات کی پوری عکاسی کرتی ہے۔ بعض حضرات تو اسی آیت کی وجہ سے ایمان لائے ہیں۔

آیت کا اثر پوری قوم پر:

حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار تھے، ان کو معلوم ہوا کہ نبیٔ کریم ((صلی اللہ علیہ وسلم)) کا ظہور ہوا ہے اور آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے،لوگوں کو اسلام وایمان کی دعوت دیتے ہیں ، تو انہوں نے اپنی قوم سے کہا :میں جاکر ان کے حالات کی تحقیق کرکے آتا ہوں۔ قوم نے کہا : آپ ہمارے قبیلے کے سردار ہیں، آپ خود نہ جایئے،بلکہ ان کے حالات کی تحقیق کے لیے دوآدمیوں کو بھیج دیجیے۔ چناں چہ دوآدمی گئے جنہوں جاکر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا:"مَنْ أَنْتَ وَمَا أَنْتَ؟" آپ کون ہیں اور کیا ہیں؟ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:"أَنَا مُحَمَّدُ بْنِ عَبْدِاللهِ" مَیں محمد بن عبداللہ ہوں "وَأَنَا عَبْدُاللهِ وَرَسُوْلُهُ" اور میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں ۔ان کے سوال "کون ہو؟" کے جواب میں اپنا نام بتادیا،پورانسب بھی تفصیل سے نہیں بتایا۔اور "کیا ہو؟" کے جواب میں بتادیا کہ اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں پھر تعلیم کے طورپر آپ نے قرآنِ پاک کی یہی آیت پڑھ

کرسنائی۔ انہوں نے عرض کیا: اس کو لوٹایئے یہاں تک کہ ان کو یہ آیت یاد ہوگئی۔ آپ نے ایسا نہیں بتلایا کہ میں بڑے خاندان کا ایک فرد ہوں، بلکہ ان لوگوں نے اپنے طور پر نبی کریم (ﷺ) کے نسب شریف سے متعلق لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ آپ تو بڑے اونچے خاندان قبیلۂ مضر سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب وہ دونوں واپس آئے اور رپورٹ پیش کی کہ ہم نے ان سے پوچھا تو انہوں نے تو مختصر سا جواب دیا، اپنے خاندان کی تفصیل بھی ذکر نہیں کی، لیکن جب ہم نے لوگوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے اونچے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان پر جو وحی آتی ہے اس میں سے یہ آیت پڑھ کر سنائی ہے، جب حضرت اکثم بن صیفی رضی اللہ عنہ نے یہ آیت سنی تو کہا: وہ تو بڑے اچھے اخلاق کا حکم دیتے ہیں اور برے اخلاق سے روکتے ہیں اور فوراً اسلام قبول کرلیا، پھر اپنی قوم سے کہا: جلدی سے تم لوگ بھی اسلام میں داخل ہوجاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ ساری دنیا اسلام میں داخل ہوجائے، اس کے بعد تم ضمنی طور پر داخل ہوؤ، پھر تمہاری کوئی حیثیت نہ رہے، ابھی اسلام لانے میں سبقت کرنے کا موقع ہے۔ اس طرح یہ خود بھی مسلمان ہوئے اور پورے قبیلے کو بھی مسلمان بنالیا۔ (تفسیر ابن کثیر، سورۂ نحل)

...میرا ایمان پختہ ہوگیا:

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شروع میں جب میں ایمان لایا تو میرے دل میں ایمان مضبوط نہیں تھا، بس ایمان لے آیا تھا لیکن اس بارے میں ابھی "ڈانواں ڈول"

اور مذبذب تھا۔ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر وحی کے نزول کے آثار ظاہر ہوئے، جب وحی نازل ہوچکی، تھوڑی دیر بعد حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہی آیت پیش کی،جب مَیں نے یہ آیت سنی تو اس کے مضمون کے نتیجہ میں میرا ایمان پختہ ہوگیا۔(تفسیر قرطبی،سورۂ نحل)

عدل:

خلاصہ یہ ہے کہ یہ عجیب وغریب آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ "عدل" کا حکم دیتا ہے۔عدل یعنی انصاف وبرابری۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ہر ذی حق کا حق ادا کرنا"عدل" ہے۔اورعدل سے اعتدال مراد لیا گیاہے یعنی اللہ تعالیٰ اعتدال ومیانہ روی کا حکم کرتاہے کہ اپنے عقائد،اعمال ، اخلاق،معاشرت اور معاملات کودرست کرواور ہر چیز میں اعتدال مطلوب ہے۔

احسان:

"وَالْاِحْسَانِ"اور اللہ تعالیٰ بھلائی کا حکم دیتاہے۔مفسرین لکھتے ہیں کہ عدل تو واجب ہے کہ ہر ذی حق کا حق پوراپورا اداکیاجائے،اور پھر حق سے زائد بھی کچھ دیا جائے؛اسی کو احسان اور بھلائی سے تعبیر کیاگیاہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں : احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو خوبی کے ساتھ اچھی طرح انجام دینا، جیسے:اہلِ عرب بولتے ہیں :"طَبَخْتُ۔فَأَحْسَنْتُ الطَّبْخَةَ"میں نے پکایا

اور بڑا اچھا پکایا۔ کوئی عمل اچھے اور عمدہ اندازو طریقہ سے پختگی کے ساتھ کیا گیا ہو، تو اس کو احسان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے تمام اعمال، اخلاق، عبادات، معاملات، معاشرت؛ ہر ہر چیز میں آدمی خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرے۔

اِیۡتَآءِ ذِی الۡقُرۡبٰی:

"وَاِیۡتَآءِ ذِی الۡقُرۡبٰی" اور اللہ تعالیٰ رشتہ داروں کو دینے کا حکم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احسان کے عام حکم میں رشتہ دار بھی آ گئے تھے، اور واجب حق تو ہر ایک کا ادا کرنا ہی ہے، لیکن جہاں احسان یعنی واجب سے زیادہ دینے کی بات آتی ہے تو اس میں پھر درجات ہوتے ہیں، خاص کر رشتہ داروں کے ساتھ آدمی زیادہ بھلائی کا معاملہ کرے، رشتہ داری کی وجہ سے ان کا حق زیادہ ہے۔

فحش، منکر، سرکشی:

"وَیَنۡهٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ وَالۡبَغۡیِ" اور اللہ تعالیٰ بے حیائی اور ظاہری و باطنی ہر طرح کی برائی سے منع کرتا ہے "وَالۡمُنۡكَرِ" اور نامعقول حرکتوں اور باتوں سے بھی منع کرتا ہے "وَالۡبَغۡیِ" اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے "یَعِظُكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ" اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے، شاید تم نصیحت حاصل کرو۔

ہر ایک ذمہ دار ہے:

حدیث ۶۵۳:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یقول : كُلُّكُمْ رَاعٍ ، وَكُلُّكُمْ مَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ : الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ، وَالمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْؤُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا ، وَالخَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ ، وَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے (یہاں تک کہ جس کے ماتحت کوئی نہ ہو، وہ بھی اپنی ذات کا ذمہ دار ہے۔ اپنی جان اور جسم پر اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے جسم کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چلائے) اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا (جیسی جیسی ذمہ داری اس کو سونپی گئی ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کے یہاں پوچھ ہوگی اور مطالبہ ہوگا کہ تم نے اپنی اس ذمہ داری کو کتنا پورا کیا۔ جیسے: کوئی) اگر پورے ملک کا سربراہِ اعلیٰ اور حکمران ہے تو پورے ملک کا پوچھا جائے گا (اور اگر کسی علاقہ کا نگران ہے تو اس علاقہ کے متعلق، اور کسی بستی کا نگران ہے تو بستی کے متعلق، اور کسی محلہ کا نگران ہے تو محلہ کے متعلق، اور کسی خاندان کا نگران ہے تو خاندان کے متعلق، اور مکان کا نگران ہے تو مکان کے متعلق سوال کیا جائے گا) اور مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، ان کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔ نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے، اس سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے، اور ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلق سوال کیا جائے گا۔

افادات:۔ "الإِمَامُ رَاعٍ" امام سے مراد حاکمِ اعلیٰ، بادشاہِ وقت ہے، اس کو اپنی ماتحت پوری رعیت، پبلک اور پورے ملک کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا۔

"والرجلُ رَاعٍ" مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، وہ اپنے گھر کا سربراہ ہوتا ہے، اس کے ماتحت بیوی بچے ہوتے ہیں ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا کہ تم نے اپنی ذمہ داری کو ادا کیا یا نہیں۔ اگر اس میں کوتاہی کی ہے تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے پکڑ ہوگی۔

"والمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوجِهَا" عورت اپنے گھر اور مکان کی ذمہ دار ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ اولاد کی نگرانی کے سلسلہ میں اور شوہر کے مکان میں جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب کی ذمہ دار ہے۔ شوہر تو کاروبار اور کمانے اور دوسری ضرورتوں کے واسطے باہر رہتا ہے، اب گھر میں شوہر کا جو کچھ بھی ہے ان ساری چیزوں کی رکھوالی اور نگرانی کی ذمہ داری بیوی کی ہے۔ اولاد کی نگرانی بھی بیوی کے اوپر ہے۔ اور گھر کے سارے نظام کی ذمہ داری بھی عورت کے اوپر ہے۔ شوہر کی غیر حاضری میں عورت اپنی ذات کی عفت و پاک دامنی کی بھی حفاظت کرے، ساتھ ہی ساتھ بال بچوں کی نگرانی بھی کرے، اگر اس نے اس میں کوتاہی برتی، اور خیانت سے کام لیا، جیسے: بعض عورتیں اپنی ذات کے معاملہ میں بھی بے خبر اور اپنی اولاد کے معاملہ میں بھی غافل رہتی ہیں، حالاں کہ ان کو ہر چیز کو نبھانا اور سنبھالنا ہے، ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق پوچھا جائے

گا۔اس لیے کہ شوہر صبح جب گھر سے نکلتا ہے تو اپنے گھر میں جو کچھ ہے وہ سب بیوی کے حوالہ کر کے جاتا ہے، اگر اس میں کوئی کوتاہی یا خیانت ہوئی تو بیوی سے اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہو گا۔

"والخادمُ راعٍ فِی مالِ سیِّدِہٖ" نوکر اور غلام اپنے آقا اور سیٹھ کے مال میں ذمہ دار ہے جو اس کے حوالہ کیا گیا ہو۔کوئی آدمی اگر کسی جگہ ملازم ہے، تو سیٹھ نے جو کام اس کے حوالہ کیا ہے، مثلاً: کوئی مشین حوالہ کی جاتی ہے، تو یہ اس کے آقا کا مال ہے، اس کو صحیح طریقہ سے چلانا، اس کو نقصان سے بچانے کی کوشش کرنا، اس کو چلانے میں پوری امانت و دیانت سے کام لینا؛ یہ نوکر کا کام ہے۔یا سیٹھ نے دوکان حوالہ کی، تجارت کے مال کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی اور اسی کی تنخواہ دی جاتی ہے، تو اس کے متعلق قیامت کے روز پوچھا جائے گا۔

"کُلُّکُمْ راعٍ ومسئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ" تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔مطلب یہ ہے کہ جس کے سر جتنی ذمہ داری حوالہ کی گئی ہے، اس کے متعلق اس سے پوچھا جائے گا۔جیسی جیسی جس کی حیثیت اور جیسا جیسا جس کا مقام ہو گا اتنی ہی ذمہ داری اس کی زیادہ اور بڑی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق اس سے سوال ہو گا۔

آج کل تو یہ ہو گیا ہے کہ کوئی اونچا عہدہ یا منصب مل جائے تو ہم خوش ہوتے ہیں، حالاں کہ یہ تو ڈرنے کی چیز ہے۔جس کا منصب جتنا اونچا ہو گا، اتنے ہی زیادہ لوگ اس کے ماتحت آئیں

گے اور ان سب کی ذمہ داری اس کے اوپر عائد ہوگی، اس میں سے کسی ایک کے حق کی ادائیگی میں بھی کوتاہی ہوئی تو قیامت کے روز اس کا جواب دینا پڑے گا۔

ماتحتوں کے بدخواہ کی سزا:

حدیث ۶۵۴:-

وعن أبي يعلى مَعْقِل بن يَسارٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله** (ﷺ) **يقول: مَا مِنْ عَبْدٍ يَسْتَرْعِيهِ اللهُ رَعِيَّةً، يَمُوتُ يَوْمَ يَمُوتُ وَهُوَ غَاشٌّ لِرَعِيَّتِهِ، إِلَّا حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ الجَنَّةَ.** (متفقٌ عليه)

وفي رواية: ((فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهِ لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الجَنَّةِ))

وفي رواية لمسلم: ((مَا مِنْ أميرٍ يلي أمور المُسْلِمِينَ، ثُمَّ لا يَجْهَدُ لَهُمْ وَيَنْصَحُ لَهُمْ إِلَّا لَمْ يَدْخُلْ مَعَهُمُ الْجَنَّةَ))

ترجمہ:- حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا: جس بندہ کو اللہ تعالیٰ اپنی رعیت کا نگران مقرر کرے (جیسا کہ اوپر بتلایا کہ جس کے ماتحت جتنے بھی لوگ ہوتے ہیں، اگر کوئی ایک گھر کا سربراہ ہے، کوئی پورے خاندان کا سربراہ ہے، کوئی پوری بستی کا سربراہ ہے، کوئی پورے علاقہ کا سربراہ ہے) اور جس روز وہ مر رہا ہے تو اس کی موت ایسی حالت میں آ رہی ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کی بدخواہی کیے ہوئے ہے، یا ان کی بھلائی چاہنے کے بجائے ان کی برائی چاہ رہا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر جنت کو حرام کر دے گا۔

افادات:- اسلام نے رعایا کے اوپر حکمرانوں کے بڑے حقوق بتائے ہیں، جیسا کہ آئندہ باب آنے والا ہے جس میں آئے گا کہ ان کی پوری فرمانبرداری کرو، اور جب کہ رعیت تو پوری فرماں برداری کررہی ہے، لیکن حکمران رعیت کی خیر خواہی کرنے کے بجائے بدخواہی کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ یہ چیز ان کے لیے مضر ہے، اس کے باوجود اپنے کسی مفاد کے پیشِ نظر ان کے لیے وہی چیز اختیار کرتا ہے؛ تو ایسے آدمی پر اللہ تعالیٰ جنت کو حرام کردیں گے۔

دوسری روایت میں ہے: "فَلَمْ يَحُطْهَا بِنُصْحِهِ" پوری پوری خیر خواہی نہیں کی، یعنی جو بھلائی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں چاہی، اس میں کمی کی۔ مثلاً: کھانا تو کھلایا، کپڑے تو پہنائے، لیکن اچھے آداب نہیں سکھلائے، اچھے اخلاق سے آراستہ نہیں کیا، دینی تعلیم نہیں دی، اس کو دنیا حاصل ہو جائے اس کی ڈگریاں تو دلوادیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہو، ایسی چیز ان کو نہیں سکھلائی، نماز نہیں سکھلائی، تو ظاہر ہے کہ خیر خواہی میں کمی رہ گئی؛ ایسا آدمی جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

جن کے رتبے ہیں سوا...:

ایک روایت میں ہے کہ جو حکمران مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے، پھر وہ ان کے لیے پوری پوری خیر خواہی نہیں کرتا بلکہ اس میں کمی رکھتا ہے، تو وہ اپنے گناہوں کی وجہ سے اوّلِ وہلہ میں جنت میں نہیں جاسکے گا، بلکہ خیانت اور کوتاہی کی سزا بھگتنے کے بعد جائے گا۔ ہاں! اگر اپنی مقدور بھر طاقت کے مطابق پوری خیر خواہی کرڈالی، جتنا اس کے بس میں تھا اس

میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، تو اس کا ذمہ بری ہو جائے گا، اس لیے منصب وعہدہ اور اونچا مقام کوئی آسان چیز نہیں ہے:

جن کے رتبے ہیں سوا، ان کی مشکل بھی سوا ہوتی ہے

جس کا جتنا اونچا مقام ہوتا ہے اس کی ذمہ داری بھی اسی مناسبت سے بڑی ہوا کرتی ہے اگر اس میں اس نے کوتاہی سے کام لیا تو دنیا میں بھی لوگ تھو تھو کریں گے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی جواب دینا ہے۔

جیسا برتاؤ؛ ویسی دعا:

حدیث ۶۵۵:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ** (ﷺ) **يقول فی بیتی هَذَا: اللّٰهُمَّ مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَشَقَّ عَلَيْهِمْ، فَاشْقُقْ عَلَيْهِ. وَمَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئاً، فَرَفَقَ بِهِمْ، فَارْفُقْ بِهِ.** (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو میرے اس مکان اور حجرہ میں فرماتے ہوئے سنا: اے اللہ! جو آدمی میری امت کی کسی کام کا ذمہ دار ہوا (یعنی کوئی حکمرانی اور ذمہ داری اس کے سر آئی) اور اس نے (بجائے راحت اور نرمی کرنے کے) ان کے اوپر بلاوجہ سختی کی اور ان کو مشقت میں ڈالا؛ تو اے اللہ! تو بھی اس کو مشقت میں ڈال۔ اور جو میری امت کے کسی کام کا ذمہ دار ہوا اور

اس کو حکمرانی کا منصب ملا پھر اس نے ان کے ساتھ نرمی برتی؛تو اے اللہ! تو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

افادات:- نرمی کا مطلب یہ ہے کہ جہاں شریعت نے نرمی کا حکم دیاہے وہاں نرمی اختیار کی جائے۔ورنہ جہاں شریعت کے قانون کونافذ کرنے کے معاملہ میں سختی اختیار کرنی پڑے ؛تووہاں توسختی سے کام لیناہی ضروری ہے۔یہاں سختی کامطلب یہ ہے کہ بلاوجہ لوگوں کومشقت میں ڈالنا، جیساکہ بعضوں کوعادت ہوتی ہے کہ اس کو مارا اس کوپھٹکارا،اس کوکچھ کردیا؛ ایسانہیں کرنا چاہیے۔ایک تو قانون کونافذ کرناہوتاہے ، وہاں توشریعت کا قانون نافذکیاجائے گا؛اوراس کانام سختی نہیں ہے۔

خرد کانام جنوں رکھ دیا...:

آج لوگوں نے سختی اورنرمی کی تعریف اوراصطلاحات بھی بدل ڈالی ہیں، اور سختی و نرمی کے لیےپیانے بھی بدل دیئے ہیں۔اگر کوئی باپ اپنی اولادکی صحیح تربیت کے معاملہ میں ذراسختی کرتا ہے، جیسے: صبح جلدی اٹھتا ہے، بچہ کواپنے ساتھ نمازپڑھنے کے لیے مسجد لے جاتاہے،تولوگ کہتے ہیں کہ یہ بڑاسخت ہے،بچہ تو ابھی بیچارہ دس بارہ سال کاہے،اس کوسونے نہیں دیتا، صبح جلدی اٹھاکر ظلم کرتاہے۔حالاں کہ سات سال کی عمر میں تو شریعت نے بھی نماز کے لیے کہنے کاحکم دیاہے، اوریہ بچہ توبارہ سال کا ہوا ، اس کو بھی باپ تاکید کرے تولوگ ایسا کہتے ہیں کہ

باپ بڑا سخت ہے،حالاں کہ اس کا نام سختی نہیں ہے،بلکہ باپ اگراس کو نہیں کہے گا تو گنہگار ہو گا۔اسی طریقہ سے بیٹا اگر ٹی وی دیکھ رہاہے اورباپ روک رہا ہے ،تولوگ کہتے ہیں کہ باپ بڑا سخت ہے،اگرنہ روکے تو اس کانام نرمی ہے،حالاں کہ یہ نرمی نہیں ہے،بلکہ بدخواہی ہے۔

حاکموں سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرو:

حدیث ٦٥٦:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) :كَانَتْ بَنُو إسرَائِيلَ تَسُوسُهُم الأَنْبِيَاء، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ، وَإِنَّهُ لاَ نَبِيَّ بَعْدِي، وَ سَيكُونُ بَعْدِي خُلفَاءُ فَيَكثُرُونَ. قالوا : يَا رسول الله، فَمَا تَأْمُرُنَا ؛ قَالَ : أَوْفُوا بِبَيْعَةِ الأَوَّلِ فَالأَوَّلِ، ثُمَّ أَعْطُوهُمْ حَقَّهُمْ، وَاسْأَلُوا اللهَ الَّذِي لَكُمْ، فَإِنَّ اللهَ سَائِلُهُمْ عَمَّا اسْتَرْعَاهُمْ

(متفقٌ عليه).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل کی سرداری ان کے انبیاء کرتے تھے(یعنی ان کے ہاتھ میں حکومت ہوتی تھی) جب ایک نبی کا انتقال ہوتا تھاتو اس کی جگہ پر دوسرا نبی اس کا جانشین بنتا تھا،لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اس لیے میرے بعد خلفاء ہوں گے اوروہ زیادہ ہوں گے(اس لیے کہ جب تک دنیا قائم ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا)صحابہ نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!آپ ان کے سلسلہ میں ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ (یعنی بعد میں جو لوگ آئیں گے اورجن کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوگی،ان کے ساتھ ہم کیا معاملہ کریں ؟)

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ نے فرمایا: پہلے جس کے ہاتھ پر بیعت لی گئی اس کے عہدو پیمان کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو، اور تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو، اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

افادات:۔بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی کے ہاتھ پر حکمرانی کی بیعت لی گئی اور اس کو حاکم مقرر کیا گیا، پھر دوسرا آدمی اس کے اوپر زبردستی بزورِ قوت چڑھ بیٹھتا ہے اور اس کے پاس سے حکومت چھین کر لوگوں سے بیعت لینا شروع کر دیتا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر پہلے بیعت کی گئی تھی اور اس کے ساتھ تم نے جو عہدو پیمان کیا تھا؛ اس کو پورا کرو، اس لیے کہ اسلام دوسروں کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ پہلے حکمران کو ہٹا کر اس کی جگہ پر آجائیں، اس لیے تم نے پہلے کے ہاتھ پر بیعت کے وقت جو عہدو پیمان کیا تھا اور وفاداری کا وعدہ کیا تھا؛ اس کو پورا کرو اور اس کا حق ادا کرو۔

جہاں کہیں فتنے رونما ہوتے ہیں :

اور اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی کرتے ہیں، تو اس کو لینے کے لیے تلوار مت نکالو اور لڑنے کے لیے میدان میں مت آجاؤ، اس لیے کہ سارے فتنوں کی جڑ یہی ہے، بلکہ تمہارا جو حق ان کے اوپر ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

کتاب الفتن میں بھی محدثین ان روایتوں کو خاص طور پر لاتے ہیں، اس لیے کہ جب بھی کہیں فتنے ہوتے ہیں اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ذمہ دار کی طرف سے بلاوجہ سختی ہوئی جس کی وجہ سے رعیت میں اشتعال پیدا ہوا۔ یا ذمہ دار نے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کی، تو رعیت کی طرف سے مطالبہ ہوا۔ یا رعیت نے ذمہ دار کے حقوق کی ادائیگی اور اطاعت و فرمانبرداری میں کوتاہی کی جس کے نتیجہ میں اس نے سخت نوٹس لیا اور ٹکراؤ پیدا ہوا۔ جہاں کہیں بھی فتنے رونما ہوتے ہیں، چاہے وہ گھر کا فتنہ ہو، میاں بیوی کا مسئلہ ہو، فیکٹری کا فتنہ ہو، سیٹھ نوکر کا مسئلہ ہو، یا علاقہ کا ہو، حکمران اور پبلک کا مسئلہ ہو، جہاں کہیں کوئی بھی جھگڑا ہوتا ہے اگر آپ اس کی بنیاد دیکھیں گے تو یہی ہوگی کہ یا تو اس کے اوپر جو ذمہ داری ہے وہ ادا نہیں کرتا ہے، یا دوسرا مطالبہ کرتا ہے، حالاں کہ شریعت یہ کہتی ہے کہ اگر وہ تمہارے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے تو تم اس سے مت مانگو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ اس لئے کہ اگر وہ کچھ کمی کوتاہی کر رہے ہیں، اور حق نہیں دیتے تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا۔

آج کل کی سب سے بڑی گڑبڑ:

آج کل تو معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ ہم لوگوں کے سارے حساب وکتاب دنیا ہی میں کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی رشتہ دار نے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا، تو ہم اس سے یہیں نمٹ لینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں کے لئے باقی چھوڑنا ہی نہیں چاہتے، یوں سمجھتے ہیں گویا میدانِ حشر میں کچھ

ہونے والا ہی نہیں ہے، یہاں ہم ہی سب نمٹادیں۔ کسی نے گالی دی تو صبر سے کام نہیں لیتے اور کہتے ہیں کہ اب میں تجھے بتاتا ہوں۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے کہ ہم اپنے کام میں لگے رہیں۔ اگر ہم یوں سوچیں کہ اس نے یہ کیا، فلاں نے وہ کیا، اس سے بدلہ لینا ہے، فلاں سے انتقام لینا ہے، فلاں نے ایسا کیا تو اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جائے؛ اگر ہم یہی سب کرتے رہیں تو پھر اپنی ذمہ داریاں کہاں ادا کریں گے۔ آج کل ہر جگہ جو گڑبڑیاں ہو رہی ہیں اس کی وجہ یہی ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہو گیا ہے، سب ہی یہ سوچتے ہیں کہ جو ذمہ دارِ اعلیٰ ہے وہ ایسا کرے، استاذ کو یوں کرنا چاہیے، اس نے ایسا کیوں کیا، فلاں نے ایسا کیوں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ سب کی پڑی ہوئی ہے، اگر نہیں پڑی ہے تو اپنی نہیں پڑی ہے۔ اپنے اوپر جو ذمہ داریاں ہیں اس کی ادائیگی کا اہتمام نہیں ہے، پھر اگر کسی نے ذرا سا کوئی معاملہ کیا تو فوراً ٹکراؤ کی شکلیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں:

بیوی کا حق اگر شوہر نے ادا نہیں کیا تو بیوی کو چاہیے کہ وہ اس کا حق ادا کرتی رہے، اور اپنے حق کے متعلق اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی رہے کہ: اے اللہ! میرے شوہر کو توفیق دے کہ وہ میرا حق ادا کرے۔ اگر وہ کوتاہی کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہونے والا ہے، وہاں دیر تو ہے، اندھیر نہیں۔ اس کے عدل وانصاف کا تقاضہ یہی ہے کہ ہر ایک سے پوچھا جائے اور اس کا ظہور قیامت کے روز اس طرح ہوگا کہ اگر سینگ والی بکری نے بغیر سینگ والی بکری کو مارا ہے،

تو اللہ تعالیٰ سینگ والی کا سینگ چھین کر بغیر سینگ والی بکری کو سینگ دیں گے اور کہیں گے کہ اس کو مارلو،حالاں کہ بکری جانور ہے اور جانوروں کے لیے شریعت نہیں آئی ہے ،شریعت کے احکام تو ہم انسانوں کے لیے ہیں ،لیکن پھر بھی وہاں عدل وانصاف اس طرح ہو گا۔ اسی لیے ہمیں خاص طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے۔

آج کل عام طور پر جو فتنے ہو رہے ہیں اس کی بڑی وجہ یہی ہے،لہٰذا اس بات کا اہتمام ہو کہ ہم پر جو حقوق عائد ہوتے ہیں ان کو ادا کریں ، اور ہمارے حقوق کی ادائیگی میں سامنے والے کی طرف سے اگر کوتاہی ہو رہی ہے تو اگر عافیت کے ساتھ بغیر لڑائی جھگڑے کے مل جاتے ہیں؛ تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔

بدترین ذمہ دار کی نشانی:

حدیث ۶۵۷:-

وعن عائِذِ بن عمرو رضی اللہ عنہ أَنَّهُ دَخَلَ عَلَى عُبَيْدِ اللهِ بن زيادٍ، فَقَالَ لَهُ: أَيْ بُنَيَّ! إِنِّي سَمِعْتُ رسولَ الله صلی اللہ علیہ يقول: إِنَّ شَرَّ الرِّعَاءِ الحُطَمَةُ. فإِيَّاكَ أَن تَكُونَ مِنْهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت عائذ بن عمرو رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ عبیداللہ بن زیاد کے یہاں تشریف لے گئے اور (عبیداللہ بن زیاد؛ خلافتِ بنوامیہ کے زمانہ میں کوفہ کا گورنر تھا)اس سے کہا: اے میرے بیٹے!

میں نے نبیِ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بدترین ذمہ داروہ ہے جو سخت دل اور سخت مزاج ہو، اس لئے تو ایسا بدترین حکمران مت بنیو۔

ایسے حاکم کی طرف اللہ تعالیٰ توجہ نہیں فرمائیں گے:

حدیث ۶۵۸:-

وعن أبي مريم الأزدِيِّ رضی اللہ عنہ **أنّه قَالَ لِمعاوية** رضی اللہ عنہ **: سَمِعْتُ رسول الله** (ﷺ) **يقول: مَنْ وَلاَّهُ اللهُ شَيْئاً مِنْ أُمُورِ الْمُسْلِمِينَ، فَاحْتَجَبَ دُونَ حَاجَتِهِمْ وَخَلَّتِهِمْ وَفَقْرِهِمْ، احْتَجَبَ اللهُ دُونَ حَاجَتِهِ وَخَلَّتِهِ وَفَقْرِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فجعل معاوية رجلاً عَلَى حوائجِ النَّاسِ.** (رواه أبو داود والترمذي.)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو مریم أزدی رضی اللہ عنہ نے حضرت معا ویہ رضی اللہ عنہ سے کہا- چوں کہ وہ امیر المؤمنین تھے- کہ میں نے نبیِ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار بنایا (یعنی کسی بھی طرح کی حکمرانی عطا فرمائی) پھر اس نے رکاوٹ اختیار کی اور لوگوں کی حاجت سے اپنے آپ کو چھپائے رکھا، ان کی حاجتیں پوری کرنے کے لیے باہر نہیں آیا، اور نہ کسی کو اپنے تک آنے دیا (یعنی باہر پہرے دار بٹھا رکھے، لوگ تو چاہتے ہیں کہ اپنی حاجتیں لے کر اس کے پاس جائیں لیکن وہاں اجازت ہی نہیں ملتی، اور وہ ان کی ضرورتوں اور ان کے فقر کی طرف توجہ نہیں کرتا) تو قیامت کے روز اللہ تبارک وتعالیٰ اس کی حاجت کے درمیان رکاوٹ بنیں گے اور اس کی طرف توجہ نہیں فرمائیں گے (جیسا گناہ کیا تھا قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ کی

طرف سے ویسی ہی سزا دی جائے گی)چناں چہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب یہ حدیث سنی تو اس بات کا اہتمام کیا کہ لوگوں کی حاجتوں کے لیے باقاعدہ ایک آدمی مقرر کیا(جو لوگوں کی حاجتوں کی تحقیق کرتا رہے اوران تک پہنچائے۔یعنی لوگوں کو خود بھی آنے کی ضرورت نہیں ،ان کا آدمی خود ہی جا کر تحقیق کرے اورآ کر بتلائے، تاکہ وہ ان کی ضرورتیں پوری کر سکیں)

الوالی العادل

انصاف سے پیش آنے والا حکمران

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَأَقۡسِطُوۡا إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُقۡسِطِیۡنَ

باب کا عنوان:

پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ جو لوگ حکمران اور صاحبِ اختیار ہیں، جن کے پاس پاور س ہیں، وہ اپنی رعایا کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کریں ،اس کی تفصیل آچکی تھی۔ آج باب قائم کیا ہے:"اَلۡوَالِی الۡعَادِلُ"وہ حکمران جو اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا ہو،اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کیسا اجر وثواب ملے گا، اور اس کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا مقام ہے۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ہر وہ معاملہ جس کا تعلق دو گروہ اور دو جماعتوں سے ہوتا ہے توشریعت کی طرف سے دونوں میں سے ہر ایک جماعت کو اس کے مناسب ہدایتیں دی جاتی ہیں،اگر دونوں جماعتیں شریعت کی طرف سے دی گئی ہدایتوں پر عمل کا اہتمام کرتی ہیں ؛تب تو پھر چین ہی چین اور اطمینان ہی اطمینان رہتا ہے۔اور اگر کوئی ایک جماعت بھی شریعت کی طرف سے بتلائی گئی ان ہدایتوں پر عمل کرتی ہے،تب بھی کوئی فتنہ اور فساد نہیں ہوتا۔ہاں !اگر دونوں ہی اللہ تعالیٰ کے احکام توڑنے پر تل جائیں اور دونوں میں سے کوئی بھی کسی کا حق ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو؛ تو پھر لڑائی ہوتی ہے۔

یہاں ایسے حکمران کا بیان کیا جارہاہے جو عدل وانصاف سے پیش آتا ہو۔پہلی آیت پیش کی ہے:﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ﴾ اللہ تعالیٰ انصاف اور بھلائی کرنے کا حکم دیتاہے کہ ہر ایک کا حق پورا پورا ادا کیا جائے۔اس آیت کی تفصیل گزشتہ مجلس میں عرض کرچکاہوں۔

دشمنوں کے معاملہ میں بھی انصاف :

﴿وَأَقْسِطُوْا إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ انصاف کرو؛بیشک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتاہے۔بلکہ قرآنِ کریم میں تو یہاں تک تاکید کی گئی ہے: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى أَنْ لَّا تَعْدِلُوْا، إِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾ کسی جماعت کی شناعت اور برائی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو چھوڑدو۔یعنی اگر کوئی آدمی آپ کے ساتھ ناانصافی سے پیش آتا ہے تب بھی شریعت آپ کو یہ حکم دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ انصاف کا معاملہ کریں ؛یہی چیز تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔دشمنوں کے معاملہ میں بھی شریعت نے انصاف کے تقاضوں کو پکڑے رہنے کا حکم دیاہے۔

سایہ دار سات گروہ...پہلا گروہ:

حدیث ٦٥٩ :-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللهُ فی ظِلِّهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلاَّ ظِلُّهُ: إِمَامٌ عادِلٌ. وَشَابٌ نَشَأَ فی عِبادة الله تَعَالَى. وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فی المَسَاجِدِ. وَرَجُلانِ تَحَابَّا فی اللهِ، اجتَمَعَا عَلَيْهِ، وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ. وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذاتُ مَنْصِبٍ وجَمالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أَخافُ اللهَ. وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ. وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِياً فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے روز میدانِ حشر میں اپنے سائے میں جگہ دیں گے جبکہ اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا:-

۱: انصاف کرنے والا حاکم۔

۲: وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی۔

۳: وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔

۴: ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ اللہ کی نسبت پر ہی آپس میں ملے، اور اسی نسبت پر جدا ہوئے۔

۵: وہ آدمی جسے اونچے منصب وخاندان والی خوبصورت عورت زناکاری و بدکاری کے لیے دعوت دے، لیکن وہ جواب میں کہے: میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

۶ : وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپا کر کیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ اس کے دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔

۷ : وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

افادات:-سات آدمیوں سے مراد مخصوص شخصیتیں نہیں ہیں ،بلکہ پوری جنس مراد ہے، جیسے: "إِمَامٌ عَادِلٌ" انصاف کرنے والے حاکم کا تذکرہ ہے، تو یہ کسی ایک شخصیت کا نام نہیں ہے،بلکہ جب سے شریعتِ مطہرہ جاری ہوئی ہے تب سے قیامت تک جو بھی آدمی عدل وانصاف کے ساتھ حکمرانی کرے گا،وہ سب اس میں آجائیں گے۔

اس باب میں یہ روایت اسی مناسبت سے لائے ہیں کہ وہ حکمران جس کے ہاتھ میں اختیارات ہیں ،اورپہلے بتلاچکاہوں کہ اختیارات کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں ، ایک توحاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتاہے جوسب سے اوپرہوتاہے اور اس کی ماتحتی میں مختلف علاقوں اورصوبوں کے حاکم ہوتے ہیں ،پھران صوبوں کے جو حصے ہیں ، مثلاً: ضلع اورضلعوں میں تحصیلیں، یہاں تک کہ گھرکاجوسربراہ ہوتاہے وہ بھی اس گھرکاحاکم کہلاتا ہے،وہ بھی شریعت کی طرف سے اس بات کاپابندہے کہ اپنے ماتحتوں کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لے،ناانصافی کا برتاؤنہ کرے۔توپہلا گروہ ہوا "إِمَامٌ عَادِلٌ" انصاف کرنے والا حکمران۔

دوسرا گروہ:

”وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ اللهِ تَعَالَى“وہ نوجوان جس نے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں پرورش پائی،یعنی اس کی جوانی اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں گزری ہو۔کیوں کہ عام طور پر جوانی میں نفس کے تقاضے اور خواہشات عروج و شباب پر ہوتی ہیں،وہی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جاتی ہیں ،اس لیے جو نوجوان ایسے حالات میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اوراس کی عبادت میں اپنے اوقات کو گزارتا ہو،تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر وقیمت ہے۔

تیسرا گروہ:

”وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فی الْمَسَاجِدِ“وہ آدمی جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔مطلب یہ ہے کہ ایک نماز کی ادائیگی سے فارغ ہو کر گھر، کاروبار، دوکان یا فیکٹری پر آیا اوراپنے کام میں تو لگا، لیکن اس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہے کہ دوسری نماز کا وقت آنے والا ہے،مَیں بروقت کیسے مسجد پہنچوں اوراس نماز کو شریعت کے بتلائے ہوئے صحیح طریقہ سے ادا کروں۔تو اگرچہ وہ اپنے کاروبار کو بھی انجام دیتا ہے، اپنی دوسری ذمہ داریاں بھی پوری کرتا ہے لیکن اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ مسجد میں لگا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہے۔

چوتھا گروہ:

"وَرَجُلانِ تَحَابَّا فی اللهِ اجتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ"، ایسے دو آدمی جنہوں نے آپس میں اللہ کے واسطے اور اللہ کی نسبت پر محبت کی ہو۔ آپس میں ملے تو اللہ ہی کی نسبت پر، اور جدا ہوئے تب بھی اسی نسبت پر۔ اس لیے کہ کچھ ملاقاتیں اور تعلقات وہ ہوتے ہیں جو آدمی اپنی ذاتی اغراض کے پیشِ نظر قائم کرتا ہے۔ اور کچھ تعلقات وہ ہوتے ہیں جو اللہ کی نسبت پر ہوتے ہیں، اس میں کوئی اپنی ذاتی غرض شامل نہیں ہوتی، وہ ملاقات دین کی اور اللہ کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اپنی ذاتی غرض کے لیے تو سب ہی تعلق و محبت کرتے ہیں، لیکن اللہ کی خاطر ایک دوسرے سے محبت اور تعلق رکھنا، اسی بنیاد پر ملنا اور اسی بنیاد پر جدا بھی ہونا؛ ایسے دو آمیوں کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی قدر و قیمت ہے، اور قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ ایسوں کو اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

پانچواں گروہ:

"وَرَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذاتُ مَنْصِبٍ وجمالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أخافُ اللهَ"، وہ آدمی جس نے اپنی خواہشات پر ایسا کنٹرول کیا ہے کہ ایسی عورت جو اونچے منصب و خاندان والی ہے اور خوبصورت بھی ہے، اس نے بدکاری کے لیے دعوت دی، تنہائی میں اپنی طرف آمادہ کیا، ایسے موقع پر آدمی عام طور پر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن وہ آدمی جواب میں کہتا ہے کہ مَیں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں،

اس کے لیے اس حرکت سے باز رہنے کا ذریعہ صرف اللہ تعالیٰ کا خوف بنا؛ تو قیامت کے روز ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے۔

چھٹا گروہ:

"وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَةٍ فَأَخْفَاهَا حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ" وہ آدمی جس نے کوئی صدقہ ایسا چھپا کر کیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا خرچ کیا۔ اس لیے کہ صدقہ اگر کھل کر کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ اس میں مقصود نام آوری اور شہرت ہو، اس لیے ایسے چھپا کر دیا کہ گویا اس کے دائیں ہاتھ نے خرچ کیا لیکن اس کے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہیں چلا۔ آدمی کا اس طرح عمل کو انجام دینا انتہائی خلوص کی طرف اشارہ کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول اور پسندیدہ ہوتا ہے کہ ایسے آدمی کو بھی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنا سایہ عطا کریں گے۔

ورنہ تو عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ لوگ کھل کر دینے ہی پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ بعد میں بھی ساری دنیا میں اعلانات کرتے پھرتے ہیں کہ مَیں نے اس کو اتنا دیا اور فلاں کو اتنا دیا۔ اور اگر خدانخواستہ اس کے چشم وابرو کا خیال رکھنے میں ذراسی کوتاہی ہوئی تو پھر اس کی خیر نہیں ہوتی۔ اس لیے کہا گیا کہ یہ جو کچھ کررہا ہے خالص اللہ کے واسطے اور اللہ تعالیٰ سے اپنا اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کررہا ہے؛ اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بڑی قدر ہے۔

ساتواں گروہ:

”وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللہَ خَالِیاً فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ“وہ آدمی جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔تنہائی میں اللہ کو یاد کرکے رونا،یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ غایتِ تعلق اورانتہائی محبت اوراس کے خوف وخشیت کی علامت ہے،ایسے آدمی کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔

تو یہ سات قسم کے آدمی ہیں،جن میں نمبراول پر حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس حکمران اور صاحبِ اختیار کو شمار کرایا جو انصاف سے کام لے۔اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو جہاں کہیں بھی کچھ اختیارات دیئے ہوں اوران اختیارات کی نوعیت جیسی بھی ہو،وسیع پیمانے پر ہو،یا محدود طریقہ پر ہو،اپنے گھر میں ہو،اپنے خاندان میں ہو،اپنی برادری میں بڑا عہدہ اوربڑے اختیارات ملے ہوں،پوری جماعت اور برادری کی سربراہی ملی ہو،یا پورے علاقہ کا حاکم ہو،اوروہ اپنے اختیارات کے حدوداور دائرے میں عدل و انصاف سے کام لیتا ہو،توان شاء اللہ اس وعدے کا حقدار ہوگا اوریہ بشارت اس کو حاصل ہوگی۔اسی طرح اپنے گھر میں اپنے ماتحتوں پر،بیوی بچوں پر اور دوسرے اہلِ خانہ پرجہاں اس کو اختیارات حاصل ہیں،اگروہ انصاف سے کام لے گا تو اس کے حق میں بھی یہ بشارت پوری ہوگی۔

نور کے منبروں پر ہوں گے:

حدیث ٦٦٠:-

وعن عبدِاللهِ بن عَمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : إنَّ المُقْسِطِينَ عِنْدَ اللهِ عَلَى مَنَابِرَ مِنْ نُورٍ، الَّذِينَ يَعْدِلُونَ فِى حُكْمِهِمْ و أَهْلِيْهِم وَمَاوَلُوا۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: انصاف کرنے والے اللہ تعالیٰ کے یہاں نور کے منبروں پر ہوں گے، جو اپنے فیصلوں اوراپنے گھروالوں کے معاملہ میں اورجن لوگوں کے اوپران کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کواستعمال کرنے کے معاملہ میں عدل وانصاف سے کام لیتے ہیں۔

افادات:- قیامت کے روزاللہ تبارک وتعالیٰ ان کونور کی کرسیوں اورنور کے منبروں پر بٹھائیں گے،یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان کااعزازواکرام ہوگا۔انصاف کرنے والے کون ہیں؟جواپنے فیصلوں اوراپنے گھروالوں کے معاملہ میں اور جن لوگوں کے اوپراس کوحاکم بنایاگیاہے اوراختیارات دیئے گئے ہیں ان اختیارات کواستعمال کرنے کے معاملہ میں عدل و انصاف سے کام لیتے ہیں ،یعنی بلاوجہ کسی کی جانبداری سے، ظلم وزیادتی اور کسی کوترجیح دینے سے کام نہیں لیتے،بلکہ انصاف کے تقاضوں کوپورا کرتے ہیں،اورماتحتوں کے حقوق کوپورا پورا ادا

کرتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نور کے منبروں پر بٹھائیں گے۔ اور جو ان تقاضوں کو پورا نہیں کریں گے ،ان کے لیے یہ بشارت نہیں ہے۔

بہترین اور بدترین حکمرانوں کی علامت:

حدیث ۶۶۱:-

عن عوف بن مالك رضی اللہ عنہ قال سمعتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) يقول: خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ، وَتُصَلُّونَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّونَ عَلَيْكُمْ . وشِرَارُ أَئِمَّتِكُم الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ ، وَتَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ !، قَالَ: قُلْنَا: يَارسول اللهِ! أَفَلاَ نُنَابِذُهُم؟ قَالَ: لاَ، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاَةَ. لاَ، مَا أَقَامُوا فِيكُمُ الصَّلاَةَ. (رواه مسلم)

قَوْله: ((تصلّون عَلَيْهِمْ)): تدعون لَهُمْ.

ترجمہ:- حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تمہارے حکمرانوں میں بہترین لوگ وہ ہیں جن سے تم محبت کرو، اور جو تم سے محبت کریں، ان کے لیے تم دعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے دعائیں کریں۔ اور تمہارے حکمرانوں میں بدترین حکمران وہ ہیں کہ تم ان سے دل میں عداوت رکھو، اور وہ تم سے عداوت رکھیں تم ان پر لعنت بھیجو، اور وہ تم پر لعنت بھیجیں ،وہ تم کو برا کہیں اور تم ان کو برا کہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا کیا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں ؟ آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: نہیں! جب تک کہ وہ

تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں۔ نہیں! جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں (وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔)

افادات:- دیکھو! آج دنیا کا حال کیا ہے؟ آج کل ہر گھر میں یہی مصیبت ہے۔اس لیے اپنے گھر والوں میں بھی کون بہترین آدمی ہے اور کون نہیں؛ اس کا اِس سے اچھا کوئی معیار نہیں ہے۔ آدمی اپنے متعلق یہ سمجھنا چاہتا ہو کہ میرا تعلق اپنے ماتحتوں کے ساتھ کیسا ہے؟ تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس کا بہترین معیار بتلایا کہ وہ آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ ان سے محبت کرتے ہو۔ وہ آپ کے لیے دعا کرتے ہیں اور آپ ان کے لیے دعا کرتے ہو۔ وہ آپ کے لیے بے چین ہو جاتے ہیں اور آپ ان کے لیے بے چین ہو جاتے ہو؛ یہ "خِيَارُ أَئِمَّتِكُمْ" بہترین حکمران کی علامت ہے۔ اس لیے اگر آپ کو بھی معلوم کرنا ہے کہ اپنے ماتحتوں کے درمیان میں آپ کا معاملہ کیسا ہے؟ آپ کو جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان کے استعمال میں آپ صحیح ہیں یا غلط؟ تو دیکھ لو کہ آپ کے ماتحت آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان کے ساتھ محبت کرتے ہو؟ آپ ان کو دل سے چاہتے ہو اور وہ بھی آپ کو دل سے چاہتے ہیں؟ آپ ان کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہو اور وہ بھی آپ کے لیے دل سے دعائیں کرتے ہیں؟ اگر آپ کو ذرا سی گزند پہنچے تو وہ بے چین ہو جاتے ہیں اور رونے لگتے ہیں آپ کے لیے دعائیں کرنے لگتے ہیں، اور اگر ان کو کچھ ہو جائے تو آپ بے چین ہو جاتے ہو، ان کے لیے آپ دعائیں کرنے لگ جاتے ہو، وہ آپ سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں اور آپ بھی ان سے محبت رکھتے ہو؟ اگر ایسا ہے تب تو سمجھ جاؤ کہ معاملہ

برابر ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے، تو سیدھی بات ہے کہ معاملہ الٹا ہے۔ ویسے تو ہر آدمی اپنے طور پر یہی دعویٰ کرتا ہے کہ میرا معاملہ برابر ہے، اپنے آپ کو کون غلط کہتا ہے، لیکن حضور اکرم (ﷺ) نے اس کی یہ علامت بتلادی۔

نظام سلطنت کے بقاء کی اہمیت:

جب حضورِ اکرم (ﷺ) نے بدترین حکمرانوں کی یہ علامت بتلائی کہ تم ان سے بغض رکھو، وہ تم سے بغض رکھیں، تم ان سے دشمناوٹ رکھو، وہ تم سے دشمناوٹ رکھیں، تم ان کو برا بھلا کہو اور لعنت ملامت کرو، اور وہ تم کو برا بھلا کہیں، تم پر لعنت ملامت کریں، تم ان کے لیے بددعائیں کرو اور وہ تمہارے لیے بدعائیں کریں، تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ایسے حکمرانوں کی اطاعت کا پھندا ہم اپنی گردنوں سے اتار نہ دیں؟ یعنی جو حکمران ایسے ہوں تو ان کی بات ماننے کی کیا ضرورت ہے، ان کو گولی مارو؛ ہم ان سے بغاوت نہ کرلیں؟ تو آپ (ﷺ) نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔

دیکھو! شریعت نظام کو باقی رکھنے کا کتنا اہتمام کرتی ہے! ان کی علامت تو بتلائی گئی، لیکن اس کے باوجود آگے کہہ رہے ہیں کہ ان کی اطاعت کی جو ذمہ داری تم پر عائد ہوتی ہے، اس سے آپ اپنے آپ کو نکال نہیں سکتے، جب تک کہ وہ تمہارے درمیان نماز کو قائم کرتے رہیں وہاں تک ان کو پھینک مت دیجیو۔ یعنی یہ حکمران جب تک تھوڑا بہت بھی دین کو قائم کررہے

ہیں، نمازیں قائم کررہے ہیں ،ظاہری طور پر دین پر ہیں ،تو پھر ان سے ان کی اطاعت کا جو عہدوپیمان آپ نے کیا ہے اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ ہاں! اگر وہ کفر میں مبتلا ہو جائیں ،بلکہ بعض روایتوں میں یہاں تک ہے: "إِلَّا أَنْ تَرَوْا كُفْراً بَوَاحاً عِنْدَكُمْ مِنَ اللهِ فِيهِ بُرْهَانٌ" (بخاری. باب قول النبي (صلى الله عليه وسلم) سترون بعدي أمورا تنكرونها. حديث رقم: ۷۰۵٦) جب کھلم کھلا کفر کرنے لگیں ،اور بالکل اسلام سے ہٹ جائیں تو پھر تمہارے اوپر ان کی اطاعت کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ شریعت نے حکمرانوں کی زیادتیوں کے باوجود ان کی اطاعت سے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔

یہی معاملہ گھر کے ذمہ دار کا ہے کہ اگر گھر کے بڑے کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو شریعت یہ ضرور کہے گی کہ وہ غلطی پر ہے،اور اس کی علامتیں بھی بتلا دیں ، لیکن اس کے باوجود آپ کو یہ اجازت نہیں دی جائے گی کہ آپ ان کی اطاعت سے نکل جائیں ، آپ کو تو ہر حال میں ان کی اطاعت کرتے رہنا ہے۔

تین جنتی:

حدیث ٦٦٢:-

وعن عِياضِ بن حِمارٍ رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رسولَ الله (صلى الله عليه وسلم) يقول: أَهْلُ الْجَنَّةِ ثَلَاثَةٌ: ذُوسُلْطانٍ مُقْسِطٌ مُوَفَّقٌ، وَرَجُلٌ رَحِيمٌ رَقِيقُ الْقَلْبِ لِكُلِّ ذِی قُرْبَى ومُسْلِمٍ، وعَفِيفٌ مُتَعَفِّفٌ ذو عِيالٍ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جنت والے تین ہیں؛ ایک تو وہ حکمران جس کے پاس پاور ہے پھر بھی وہ انصاف کرنے والا ہے، اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھلائی کی توفیق دی گئی ہے۔ دوسرا وہ آدمی جو ہر رشتہ دار اور مسلمان کے لیے مہربان اور نرم دل ہے۔ اور تیسرا وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔

افادات:- بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی اس کو ڈانٹتے ہیں کہ ارے یار! تم اتنے میٹھے کیوں بنتے ہو، سب لوگ تم کو ہڑپ کرجائیں گے (خود سے تو کچھ بھلائی ہوتی نہیں، اور دوسرے کچھ کرتے ہیں تو ان کو بھی روکنے کی کوششیں کی جاتی ہیں) تب بھی وہ کہتا ہے کہ جس کو جو کرنا ہے اس کو وہ کرنے دو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا بڑا اجر ہے۔

اور وہ بال بچے والا جو اپنے آپ کو سوال کے تقاضوں سے بچاتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ چوں کہ وہ بال بچے والا ہے اس لئے یہ احتمال تھا کہ وہ اپنی ضرورتوں کی زیادتی کی وجہ سے کسی کے سامنے اپنی ضرورتیں پیش کرے، لیکن وہ کسی سے سوال نہیں کرتا، جو ضرورت ہوتی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے مانگتا ہے؛ تو ایسا آدمی بھی جنتی ہے۔

وُجُوبُ طَاعَةِ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ فِيْ غَيْرِ مَعْصِيَةٍ وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ

حاکموں کی اطاعت کے احکام مجلس ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حاکم کے حکم دینے کی وجہ سے جائز کام واجب ہو جاتا ہے:

اس باب میں یہ بتلاتے ہیں کہ رعایا پر اپنے حکمرانوں کی اطاعت کن چیزوں میں ضروری ہے؟

حکمرانوں کی طرف سے دیا جانے والا کام گناہ کا نہ ہو، بلکہ جائز کام ہو تو حاکم کی حکمرانی کی وجہ سے وہ جائز کام واجب کا درجہ اختیار کرلیتا ہے۔ ماں باپ کا بھی مسئلہ یہی ہے، اس لیے ماں باپ اگر اولاد کو ایسے کام کا حکم دیں جو جائز ہے، تو ماں باپ کے حکم دینے کے بعد وہ کام واجب ہو جاتا ہے۔

ماں باپ کے لیے اہم نصیحت:

اسی لیے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ماں باپ کو چاہیے کہ اپنے الفاظ کو استعمال کرنے میں احتیاط سے کام لیں، اگر اولاد سے کوئی کام کروانا چاہتے ہیں تو یوں نہ کہیں کہ ایسا کرو۔ اس لیے کہ اگر اولاد وہ کام نہیں کرے گی تو ماں باپ کی حکم عدولی کرنے کی وجہ سے گنہگار ہوگی اور یہ حرکت نافرمانی قرار دی جائے گی۔ اور ماں باپ کی نافرمانی پر جو وعیدیں ہیں اس کی حقدار بن جائے گی اور مصیبتوں میں پڑے گی اور کوئی ماں باپ اپنی اولاد کے لئے

ایسا نہیں چاہتے۔لہٰذا ماں باپ کو یوں کہنا چاہیے کہ: بیٹا!ایسا ہو جائے تو اچھا ہے۔اگر اس طرح ہو جائے تو ٹھیک ہے۔اور اولاد کو بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ ماں باپ کی یہ خواہش ہے،اگرچہ وہ صاف لفظوں میں حکم نہیں دے رہے ہیں ، لیکن ان کی منشاء یہی ہے، اور ان کا جی یہی چاہتا ہے تو اس کے مطابق عمل کرے۔

بہرحال!جس کو بھی آپ پر حکمران اور سربراہ بنایا گیا ہے، اس کی طرف سے کسی ایسے کام کا حکم دیا جائے جو گناہ نہیں ہے،بلکہ جائز ہے؛ تو اس حکمران کے حکم کے نتیجہ میں وہ کام ضروری اور واجب ہو جاتا ہے۔

سربراہ کی بات ماننے کے حدود:

ایک بات یاد رکھیے کہ سربراہی کی نوعیتیں مختلف ہیں۔کچھ سربراہی محدود ہوتی ہے،اور کسی کو عام سربراہی حاصل ہوتی ہے۔جیسے :حاکم اعلیٰ اور پورے ملک کے بادشاہ کو عمومی سربراہی حاصل ہے۔بعضوں کو مختلف شعبوں میں سربراہی حاصل ہوتی ہے، مثلاً: آپ نے کسی کے یہاں ملازمت اختیار کی اور اس کو اپنا بڑا مان لیا، تو وہ مالک اور سیٹھ اگر اس شعبہ سے متعلق کسی جائز کام کا حکم کرتا ہے تو آپ کے لیے اس کا حکم ماننا ضروری ہے۔لیکن اگر وہی سیٹھ آپ کو اس شعبہ سے ہٹ کر کسی دوسرے کام کے متعلق کہتا ہے،مثلاً: آپ کا سیٹھ آپ کو یوں کہے کہ تو تیری بیوی کو طلاق دیدے؛تو وہاں سیٹھ صاحب کا حکم نہیں مانا جائے گا۔سیٹھ صاحب کا حکم

دوکان، فیکٹری، اورآفس سے متعلق جو بھی جائز کام ہیں، وہیں تک ماناجائے گا۔ اگر ناجائز کام یا شریعت کے خلاف کسی بات کے لیے کوئی بھی کہے؛ تو اس پر عمل کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

نافرمانی میں فرمانبرداری نہیں:

"وَتَحْرِيْمُ طَاعَتِهِمْ فِي الْمَعْصِيَةِ" گناہ اور نافرمانی کے کاموں کا حکم اگر بادشاہِ وقت بھی دے، اور باقاعدہ فرمان جاری کردے؛ تب بھی اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔ اس لئے کہ جتنے بھی حکمران ہم پر بڑے بنائے گئے ہیں، ہم ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہی کرتے ہیں۔ میں پہلے بھی کسی موقع پر بتلاچکاہوں کہ مؤمن کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، ایک آدمی جب یہ کہتاہے کہ میں ایمان لایاتو اس نے اپنا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑدیا، اب اُدھر سے جو کہاجائے گا وہی کیاجائے گا۔ اولاد ماں باپ کی فرمانبرداراس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ماں باپ کی فرمانبرداری کا حکم دیاہے۔ آدمی اپنے بڑوں کی عزت اوران کا احترام اس لیے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیاہے کہ اپنے بڑوں کی عزت و احترام کرو، جو آدمی ایسانہیں کرتاوہ برا سمجھاجاتاہے۔

اس طرح بیوی کا حق اداکرتاہے، اس کی فرمائشیں حق سمجھ کر اس لیے پوری کرتا ہے کہ شریعت نے اس کے حقوق کے ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ بیوی شوہر کی بات اس لیے مانتی ہے کہ جس پروہ ایمان رکھتی ہے اس نے حکم دیاہے کہ شوہر کی اطاعت کرو، اولاد پرماں باپ

شفقت کا معاملہ کرتے ہیں اوران کی ضرورتوں کا خیال اس لیے رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیاہے۔جب اصل بات یہ ہے تواب وہی شوہر،وہی ماں باپ، وہی بیوی، وہی اولاد؛ کوئی ایسی حرکت کرنے کے لیے کہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہو،اللہ تعالیٰ کوناراض کرنے والی ہو؛توہم کہیں گے کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے کہنے سے تمہاری بات مانتے تھے،اب اگرتم ہم کو اللہ تعالیٰ ہی سے توڑنا چاہتے ہو،تو یہ کسی حال میں قابلِ برداشت نہیں ہوگا۔معلوم ہوا کہ مؤمن کا اصل رشتہ اور تعلق اللہ تعالیٰ سے ہی ہوتا ہے۔

مؤمن کے اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مثال:

میں نے مثال بھی دی تھی کہ آپ کے گھر میں جو فون ہوتا ہے اس کا کنکشن ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ ہوتاہے۔اسی ٹیلیفون ایکسچینج کے ساتھ دوسرے بہت سارے فون بھی جڑے ہوئے ہوتے ہیں،یہاں تک کہ آپ کے پڑوس میں مکان ہے جس کی دیواریں بالکل آپ کے گھر سے لگی ہوئی ہیں،اگر آپ اس کے فون پر بھی کال (Call) کریں گے تو وہ سیدھی اس کے فون پر نہیں جائے گی،بلکہ پہلے ٹیلیفون ایکسچینج جائے گی اور وہاں سے اُدھر آئے گی۔وہ جواب دے گا تو وہ بھی ڈائرکٹ (Direct) آپ کے فون پر نہیں آئے گی بلکہ اِنڈائرکٹ (In Direct) آئے گی۔اگر آپ کا تعلق ٹیلیفون ایکسچینج سے ختم ہوجائے گا تو پڑوسی سے بھی ختم ہوجائے گا،حالاں کہ وہ بالکل پڑوس میں ہے، لیکن ایکسچینج کے واسطے سے بات ہورہی ہے۔ایسے ہی جن جن

لوگوں کے ساتھ مؤمن کا تعلق ہے وہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہے، درمیان میں اللہ تعالیٰ کا حکم ہی واسطہ ہے۔ اس لیے چاہے باپ ہو، یا شوہر ہو، یا کوئی اور بڑا ہو؛ اگر وہ کسی ایسے کام کے کرنے کا حکم دیتے ہیں جو ناجائز ہے ، شریعت نے جس کام کی اجازت نہیں دی ہے، تو ان کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اور نہ کرنے پر کوئی گناہ بھی نہیں ہو گا، بلکہ آدمی کے لیے لازم اور ضروری ہے کہ ایسا کام نہ کرے، اگر ایسا کام کرے گا تو گنہگار ہو گا۔

پریشان ہونے کی ضرورت نہیں :

بعض مرتبہ لوگ آکر کہتے ہیں کہ ابّا ایسی بات کا حکم دیتے ہیں جو گناہ ہے، اور جب میں نہیں مانتا تو ابّا کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ میری بات مانو۔ پھر بھی میں نہیں مانتا تو ابّا ناراض ہو کر مجھے بد دعا دیتے ہیں ؛ اب مَیں کیا کروں ؟ مَیں ان سے کہتا ہوں کہ : بھائی! ابّا کی بد دعا کو عمل میں کون لائے گا؟ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی عمل میں لائیں گے۔ اگر ابّا کے ہاتھ میں کچھ ہوتا تو وہ کچھ کر کے نہ بتلاتا؟ صرف بد دعا کر کے چپ چاپ کیوں بیٹھا رہتا؟ معلوم ہوا کہ بد دعا کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی سے کہہ رہا ہے کہ: اے اللہ! یہ میری بات نہیں مانتا ہے، اس لیے اس کا ایسا کر ڈالیو۔ اور اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں کہ وہ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہا ہے، اس نے میرے ایک بندہ کو میرے ہی حکم کی خلاف ورزی کرنے کا حکم دیا تھا، اور اس نے وہ

بات نہیں مانی تھی، اس پر وہ بددعا کررہاہے؛تو اب اس کی بددعا تھوڑے ہی قبول کی جائے گی؟ لہٰذا ایسے موقع پر ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ...:

حدیث ۶۶۳:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہ عن النبی (ﷺ) قَالَ:عَلَى المَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ و الطَّاعَةُ فِيمَا أحَبَّ و كَرِهَ،إلاَّ أنْ يُؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ،فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلاَ سَمْعَ وَلاَ طَاعَةَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کسی بھی حکمران کی طرف سے جب حکم دیاجائے، تومسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کو سنے ماننے اوراس پر عمل کرے، چاہے جو چیز کرنے کے لیے کہی گئی ہے وہ اس کی طبیعت کو پسند ہو، یا ناپسند ہو(بس صرف یہ دیکھا جائے گا کہ گناہ کے کام کا حکم تونہیں ہے، اگر کسی جائز چیز کا حکم ہے ،توچاہے آپ کی طبیعت کو پسند ہویانہ ہو، طبیعت اس کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو؛ اس کو ماننا ضروری ہے۔ہاں !)اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو(آپ ادب کے ساتھ بتلادو کہ آپ کی)یہ بات سننے اور عمل کے قابل نہیں ہے۔

حدیث ۶۶۴:-

وعنہ قَالَ: كُنَّا إِذَا بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ (ﷺ)عَلَى السَّمعِ و الطَّاعَةِ،يَقُولُ لَنَا:فِيمَا اسْتَطَعْتُمْ (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم (ﷺ) کے ہاتھ پر (کسی بھی حاکم کی بات) سننے اور اس کو ماننے کے بارے میں عہد کرتے تھے تو آپ یہ قید لگا دیا کرتے تھے کہ جتنی طاقت و قدرت میں ہو گی (اتنی ضرور سنیں گے اور مانیں گے)

..جاہلیت کی موت مرے گا:

حدیث ۶۶۵:-

وعنه قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلاَ حُجَّةَ لَهُ، وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ، مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً. (رواه مسلم)

وفي رواية لَهُ: وَمَنْ مَاتَ وَهُوَ مُفَارِقٌ لِلْجَمَاعَةِ، فَإِنَّهُ يَمُوتُ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً.

((المِيتَةُ)) بكسر الميم.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے اپنے امیر اور حاکم کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اپنے اس جرم کے اوپر معذرت کے واسطے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہو گی (یعنی اس کے پاس کوئی عذر اور دلیل ایسی نہیں ہو گی جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو اپنے حاکم کی نافرمانی کی سزا سے بچا سکے۔ جب اسلامی حکومت ہوتی ہے تو حکومت کا جو حکمرانِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوتا ہے، لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں، ہاتھ میں ہاتھ دے کر وعدہ اور عہد و

پیمان کرتے ہیں کہ ہم آپ کی اطاعت کریں گے، آپ کا حکم مانیں گے۔تو حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ) جو آدمی ایسی حالت میں مرا کہ اس نے کسی ایسے مسلمان حاکم (جس کو باقاعدہ حکومت کا سربراہ مقرر کیا گیا ہے اس) کے ہاتھ پر اطاعت کی بیعت نہیں کی؛ تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

افادات:-زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا اور جس وقت نبیٔ کریم (ﷺ) جزیرۃ العرب میں مبعوث ہوئے اس وقت بھی کوئی بادشاہت نہیں تھی، ہر ہر قبیلے کا اپنا اپنا الگ الگ نظام ہوتا تھا، اور ہر ہر قبیلے میں مختلف سردار ہوتے تھے، کوئی اِس کی مان رہاہے، کوئی اُس کی مان رہاہے، کسی ایک کی اطاعت وفرمانبرداری پر کسی کا اتفاق نہیں تھا، لیکن اسلام نے آکر پورا ایک نظام قائم کیا اور ایک آدمی کی اطاعت کے لیے سب کو آمادہ کیا، اسی لیے آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جو آدمی بغیر بیعت کے انتقال کرے گا تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

ہر حکمران کی بات سنو اور مانو؛ چاہے ...:

حدیث ٦٦٦:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : اسْمَعُوا وأَطِيعُوا، وَإِنِ استُعْمِلَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ حَبَشِيٌّ، كَأَنَّ رأْسَهُ زَبِيبَةٌ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم اپنے حکمرانوں کی بات سنواوراس پر عمل کرو، چاہے تم پر کسی حبشی غلام کو حاکم بنایاجائے اوروہ بھی ایسا حبشی غلام ہوکہ جس کا سر اتناچھوٹاہو جیسے کشمش (کالی دراک)ہوتی ہے۔

افادات:- بعض حبشی ایسے ہوتے ہیں جن کے سر چھوٹے ہوتے ہیں۔ تو ویسے بھی عرب اور تمام اقوام میں حبشی سب سے کمتر سمجھے جاتے ہیں، اوراس میں بھی جو غلام ہوتووہ اور زیادہ کمتر سمجھا جاتا ہے،اورپھر وہ غلام بھی چھوٹے سر والا ہو، تواس کی توکوئی وقعت ہی نہیں ہوتی۔ لیکن اگرحاکمِ اعلیٰ کی طرف سے کسی ایسے غلام کو بھی کسی جگہ کا حاکم بنادیا جائے جو پہلے غلام تھا؛ تو اس کی اطاعت ضروری ہے۔

ویسے یہ مسئلہ اپنی جگہ پر الگ ہے کہ جوخود غلام ہواس کوکسی طرح کی حکمرانی سونپی جاسکتی ہے یانہیں ؟اس کوکسی ماتحت جگہ کا حاکم بنایاجاسکتاہے یا نہیں؟ یہاں مطلب یہ ہے کہ پہلے وہ غلام تھا،اب غلامی سے آزاد ہوچکاہے، لیکن سیاہ فام ہے اور ظاہری شکل وصورت اور جسم کے اعتبارسے ایسا نہیں کہ جس کو دیکھ کر کسی کے دل میں اس کی وقعت پیداہوتی ہو ،ایسے آدمی کوبھی اگرتمہارے اوپر نگران اورحاکم مقرر کردیا گیا ہو تو حضورِاکرم (ﷺ) نے فرمایاکہ اس کی بات بھی کوسنو اورمانو۔

ہر حال میں مانو:

حدیث ۶۶۷:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ): عَلَيْكَ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فی عُسْرِكَ وَيُسْرِكَ، وَمَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ، وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تمہارے لیے ضروری ہے کہ اپنے حکمران کی بات سنو اور اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو، فقیری کی حالت میں ہو یا مالداری کی حالت میں ہو (ایسا نہیں کہ جیب خالی ہے تو حکم مانتے رہے، لیکن جب دو پیسے آگئے تو ماننے کے لیے تیار نہیں) اور تمہاری طبیعت اس حکم کو ماننے کے لیے آمادہ ہو یا نہ ہو (تمہارا موڈ ہو یا نہ ہو) اور تمہارے مقابلہ میں جب دوسروں کو ترجیح دی جائے (تب بھی ماننا ضروری ہے)

افادات:- "مَنْشَطِكَ وَمَكْرَهِكَ" کا مطلب یہ ہے کہ ہر حال میں ماننا ہے۔ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ موڈ میں آئے تو اپنے ابّا کی بات پر عمل کر لیا، ورنہ نہیں کیا، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ ان کی بات کو تو ہر حال میں ماننا ہی ہے، بس شرط ایک ہی ہے جو اوپر گزر چکی کہ گناہ کے کام کا حکم نہ دیا جا رہا ہو۔

...تو پھر تم میں اور اجنبی میں فرق ہی کیا؟:

"وَأَثَرَةٍ عَلَيْكَ"، ایک تو یہ کہ ابّا آپ کو خوب پیسے دے رہے ہیں ، کھلا پلا رہے ہیں ، اس وقت آپ ابّا کی بات مان رہے ہیں، اسی طرح حاکم کی طرف سے خوب نوازشات کا معاملہ چل رہا ہے، دادودہش ہو رہی ہے، اس وقت تو مانتے ہیں، حالاں کہ ایسے وقت تو سب ہی مانتے ہیں، لیکن جب آپ کے مقابلہ میں دوسروں کو ترجیح دی جا رہی ہے، مثلاً: چار بھائی ہیں ، تین بھائیوں کے ساتھ ابّا بہت اچھا معاملہ کر رہے ہیں ، آپ کو تو ایک پائی بھی نہیں دیتے، ان کو اچھے اچھے کپڑے لا کر دے رہے ہیں، لیکن آپ کو کبھی اچھا سوٹ لا کر نہیں دیا، ان کی ساری فرمائش پوری ہوتی جا رہی ہیں ، اور آپ کی ایک فرمائش بھی پوری نہیں کی؛ پھر بھی ابّا یہ حکم دیں کہ تمھیں ایسا کرنا ہے، تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ ان کی بات مانو اور ویسا ہی کرو۔ یوں مت کہنا کہ ان تینوں بھائیوں کی باتیں تو مانی جائیں اور ان کی فرمائشیں پوری کی جائیں ، میرا تو آج تک کبھی کچھ کیا ہی نہیں ؛ اب میں آپ کی بات کیسے مانوں ؟ ارے بھائی! اس بنیاد پر بات مانی جائے گی تو پھر تمہارے اور اجنبی میں فرق ہی کیا رہا؟ تم پر جو اطاعت ضروری قرار دی گئی وہ تو ہر حال میں ضروری ہے، بس شرط ایک ہی ہے کہ گناہ کے کام کے لیے نہ کہا جائے۔

کسی حاکم یا بڑے کی طرف سے کسی کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ کیا جا رہا ہے جس کی وجہ سے وہ اطاعت کرتا ہے ، تو وہ تو اطاعت کرے گا ہی، لیکن آپ کے ساتھ کوئی خصوصی معاملہ

نہیں کیابلکہ آپ کے مقابلہ میں دوسروں کوترجیح دی جارہی ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کی جماعت کا چیرمین دوسرے کوترجیح دے رہا،اورآپ کی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا،تب بھی چیرمین چوں کہ چیرمین(Chair Man)ہے، اس لیے آپ بات مان رہے ہیں؛تب تو برابر ہے۔ورنہ آپ کواگرلڈّوکھلارہاہے اور آپ اس کی بات مان رہے ہیں؛توکیافرق پڑتاہے۔

کہنے کاحاصل یہی ہے کہ اپنے حکمران اورسربراہ کی اطاعت ہرحال میں کرنی ہے،چاہے وہ آپ کے ساتھ اچھاسلوک رکھتاہو،یانہ رکھتاہو۔آپ کے مقابلہ میں دوسروں کوترجیح دیتاہوتب بھی آپ کواس کاحکم مانناہے، بس ایک شرط ہے کہ وہ کوئی گناہ کے کام کاحکم نہ دیتا ہو۔ اور اسی شعبہ سے متعلق حکم کوماننالازم ہے جس شعبہ میں آپ اس کے ماتحت ہیں جیساکہ میں نے اوپر مثال دے کر بتلایاتھا۔

یکم ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۷/ جنوری ۲۰۰۱ء

بنیادی اصول:

باب کا عنوان قائم کیا ہے کہ: حکمران اگر ایسا حکم دے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوتی ہو، تو ان کے حکم کو ماننا واجب اور ضروری ہے۔ اور اگر وہ کوئی ایسا حکم دے جس کے بجالانے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی ہوتی ہے، تو پھر اس کو پورا کرنا اور اس پر عمل کرنا حرام ہے۔ اسی مناسبت سے روایتیں لا رہے ہیں۔

پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ مسلمان کا اصل تعلق تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کے ساتھ ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے تو اسی کے حکم سے دوسرے لوگوں کی اطاعت کرتا ہے، اگر ماں باپ کا حکم مانتا ہے تو اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ بیوی اگر شوہر کا حکم مانتی ہے تو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے شوہر کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اسی طرح کوئی ماتحت اپنے سربراہ کا کوئی حکم مانتا ہے تو وہ اسی لیے کہ شریعت نے اس کی اتباع اور فرمانبرداری کا حکم دیا ہے، مؤمن کا اصل تعلق اور رشتہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ ہی ہے، اس کے بعد وہ ان سارے لوگوں کے احکام کو اللہ تعالیٰ ہی کے حکم کی وجہ سے مانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے احکام کو اپنے اپنے دائرے اور حدود

میں واجب الاطاعت قرار دیا ہے۔ اس میں بنیادی اصول بتلادیا گیا تھا کہ جب کسی کا کوئی حکم ایسا ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہو تو پھر ان کے کسی حکم پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ان کے حکم پر عمل کرتے تھے، بلکہ ان کے حکم کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھتے تھے، لیکن جب وہی ایسی بات کا حکم دے رہے ہیں جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آتی ہے؛ تو پھر ان کے حکم کو ہم رد کر دیں گے۔

اُمتِ محمدیہ کی فتنوں سے سلامتی:

حدیث ٦٦٨ :-

وعن عبدِاللهِ بن عمر رضی اللہ عنہ وَقَالَ: كنا مَعَ رسول الله (ﷺ) فی سَفَرٍ فَنَزَلْنَا مَنْزِلاً، فَمِنَّا مَنْ يُصْلِحُ خِبَاءَهُ، وَمِنَّا مَنْ يَنْتَضِلُ، وَمِنَّا مَنْ هُوَ فی جَشَرِهِ، إِذْ نَادَى مُنَادِي رسولِ الله (ﷺ) : الصَّلاةُ جَامِعَةٌ. فَاجْتَمَعْنَا إِلَى رسولِ الله (ﷺ) فَقَالَ: إِنَّهُ لَمْ يَكُنْ نَبِيٌّ قَبْلِي إِلاَّ كَانَ حَقّاً عَلَيْهِ أَنْ يَدُلَّ أُمَّتَهُ عَلَى خَيْرِ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ، وَيُنْذِرَهُم شَرَّ مَا يَعْلَمُهُ لَهُمْ . وَإِنَّ أُمَّتَكُمْ هٰذِهِ جُعِلَ عَافِيَتُهَا فی أَوَّلِهَا ، وَسَيُصِيبُ آخِرَهَا بَلاَءٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا ، وَتَجِيءُ فِتْنَةٌ يُرَقِّقُ بَعْضُهَا بَعْضاً ، وَتَجِيءُ الفتنَةُ فَيقُولُ المُؤْمِنُ : هذه مُهلكتی، ثُمَّ تنكشف، وتجیء الفتنةُ فيقولُ المؤمنُ: هٰذِهِ هٰذِهِ. فَمَنْ أَحَبَّ أَنْ يُزَحزَحَ عَنِ النَّارِ، ويُدْخَلَ الجَنَّةَ، فَلْتَأْتِهِ منيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ باللهِ واليَوْمِ الآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِی يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ. وَمَنْ بَايَعَ إِمَاماً فَأَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهِ، وَثَمَرَةَ قَلْبِهِ، فَلْيُطِعْهُ إِنِ استَطَاعَ، فَإِنْ جَاءَ آخَرُ يُنَازِعُهُ فَاضْرِبُوا عُنُقَ الآخَرِ.

ترجمہ مع مختصر تشریح:۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم (ﷺ) کے ساتھ ایک سفر میں تھے ،دورانِ سفر آرام کی ضرورت پیش آئی تو ہم نے ایک جگہ پر قیام کیا۔ اس دوران کوئی آدمی اپنے خیمے کو درست کررہا تھا، کوئی آدمی نیزے بازی کی مشق کر رہا تھا، اور کوئی آدمی اپنے مویشیوں میں مشغول تھا (اس لئے کہ جب کسی جگہ پر ٹھہرتے ہیں تو ہر ایک اپنی اپنی ضرورتیں پوری کرلیتا ہے) اتنے میں نبی کریم (ﷺ) کے منادی نے آواز دی: اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ (حضورِ اکرم (ﷺ) صحابہ کو کسی خاص بات بتلانے کے لئے یا کسی خاص پیغام کو ان تک پہنچانے کے لئے اگر فوری طور پر جمع کرنا چاہتے تو اس کے لئے ان الفاظ میں اعلان کراتے تھے۔مقصد ہوتا تھا کہ فوراً آجاؤ) چناں چہ ہم لوگ نبی کریم (ﷺ) کے پاس جمع ہوگئے اس وقت نبی کریم (ﷺ) نے یہ ارشاد فرمایا: مجھ سے پہلے جو بھی نبی آئے ان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ضروری قرار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی امت کو ہر ایسی چیز کی طرف رہنمائی کریں جسے اُس امت کے لئے بھلائی کا ذریعہ سمجھتے ہوں۔اور ان کو اس برائی سے ڈرائیں جو ان کے حق میں وہ بری سمجھتے ہوں۔پھر ارشاد فرمایا: ہماری اس امت -یعنی امتِ محمدیہ - کی فتنوں سے سلامتی اللہ تعالیٰ نے اس کے شروع میں رکھی ہے،البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو تم اُوپرا اور اَجنبی سمجھتے ہو۔اس امت کے آخری زمانہ میں ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنے کو کم کرکے دکھلائے گا اور صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق و باطل میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا،ایسے موقع پر ایک مؤمن یوں کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کر ڈالے گا (مطلب یہ ہے کہ ہر بعد میں آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ سے بڑا ہوگا۔ایک فتنہ جب آئے گا تو اس کو

دیکھ کر آدمی یوں سمجھے گا کہ یہ فتنہ بہت بڑا ہے اور اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کر دے گا۔ پھر جب وہ فتنہ ختم ہو جائے گا اور وہ حالات دور ہو جائیں گے) اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس یہی وہ فتنہ ہے جو مجھے ہلاک کر دے گا اور میرے ایمان کو ختم کر دے گا۔ اس لیے جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کو جہنم سے دور کیا جائے اور جنت میں داخل کیا جائے؛ اس کو چاہیے کہ اس کی موت ایسی حالت میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اور لوگوں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرے جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ اور جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اعلیٰ، بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر اطاعت و فرمانبرداری کی بیعت کی اور بیعت کے وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کیا، تو اب اپنی طاقت کے مطابق اس حکمران کی پوری پوری اطاعت کرے۔ اس کے بعد اگر کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج و تخت کا دعویدار کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑا دو۔

افادات:۔ اس روایت سے مندرجۂ ذیل امور معلوم ہوئے :-

۱: ہر نبی کا یہ فریضہ تھا کہ جو کام اور طریقہ اپنی امت کے لئے باعثِ خیر جانتا ہو، اپنی امت کو اس طریقہ اور اس کام کی طرف رہنمائی کرے اور دعوت دے، اور جو کام اور طریقہ اپنی امت کے لئے غلط، برا، مضر اور نقصان دہ سمجھتا ہو، اس سے اپنی امت کو ڈارئے اور اس کام سے بچائے۔ حضرات علمائے کرام بھی چونکہ انبیاء کے جانشین ہیں ، اس لئے ان کا بھی یہی

فریضہ ہے کہ لوگوں کو وہ چیز بتلائیں جو دین اور شریعت کی تعلیمات کے اعتبار سے بھلائی اور خیر کا ذریعہ ہیں۔ اور جو چیزیں لوگوں کے حق میں مضر اور نقصان دہ ہوں، ان سے روکنا بھی اہلِ علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ کام علماء کے لیے ضروری اور واجب ہے، خاموشی اختیار کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی

۲: اس امت کا ابتدائی دور وہ ہے جس میں یہ امت فتنوں سے محفوظ رہے گی، ظاہر ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) تشریف فرماتھے، آپ کے بعد حضراتِ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا، تو اس وقت یہ اُمت دینی فتنوں سے محفوظ تھی۔ البتہ اس امت کے بعد میں آنے والے حصے اور طبقے کو کچھ آزمائشیں اور کچھ ایسی چیزیں پیش آئیں گی جن کو اُوپرا اور اَجنبی سمجھا جائے گا۔

ہر وہ کام جس کے کرنے کی شریعت نے اجازت نہ دی ہو، اس کو غلط اور ممنوع قرار دیا ہو؛ ان کو ''منکَر'' کہتے ہیں۔ اور جس کام کا شریعت کی طرف سے حکم دیا گیا ہو؛ اس کو ''معروف'' کہا جاتا ہے۔ لغوی اور ڈکشنری کے اعتبار سے معروف کا ترجمہ 'جانی پہچانی چیز' ہوتا ہے۔ جس کا مزاج دینی ہوگا اور ماحول بھی دینی ہوگا، ایسے معاشرہ میں نیک کام جانے پہچانے ہوں گے۔ اور غلط وگناہ کے کام انجانے ہوں گے، جن کو کوئی جانتا اور پہچانتا نہ ہوگا، گویا ایسے کام اجنبی اور اُوپرے سمجھے جاتے ہیں، اس لیے ان کو ''منکَر'' سے تعبیر کیا جاتا ہے (معروف اور منکَر پر تفصیلی کلام جلد/۳ میں ملاحظہ فرمائیں۔ مرتب۔)

فتنہ کسے کہتے ہیں ؟:

۳: ”فتنہ“ عربی زبان کا لفظ ہے ”فَتَنَ یَفْتِنُ“ کا اصل ترجمہ ہوتا ہے: سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کو پہچاننے اور اس کے میل کچیل کو دور کرنے کے لئے آگ کے اندر ڈالنا۔ اور شریعت کی اصطلاح میں ”فتنہ“ ان حالات اور آزمائش کو کہا جاتا ہے جس سے آدمی کے ایمان اور نفاق، اخلاص اور عدمِ اخلاص کو پہچانا جاتا ہے ایسے حالات کہ جس میں حق اور باطل ایسے گھل مل جائیں، دونوں میں ایسی آمیزش ہو جائے، دونوں ایسے قریب ہو جائیں کہ آسانی کے ساتھ یہ پہچاننا مشکل ہو جائے کہ حق کیا ہے اور باطل کیا ہے، سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے، ایسے حالات کو سمجھنا ہر آدمی کا کام نہ رہے؛ ایسے واقعات کو ”فتنہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی طریقہ سے اگر گناہوں کی کثرت ہونے لگے، فسق وفجور عام ہو جائے، تو اس کو بھی بعض روایتوں میں ”فتنہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اسی طرح مسلمانوں کی دو جماعتوں میں آپس میں ٹکراؤ ہو جائے اور جنگ چھڑ جائے اور ان دونوں میں سے ہر ایک اپنے اپنے موقف اور نظریہ پر ایسا قائم ہو کہ اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہی نہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ایسے بھڑے ہوئے ہوں کہ ملنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں، ہر ایک اپنے حق پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، ایسے مشکل حالات پیدا ہو جائیں، اور ایسی شکل

بن گئی ہو کہ عام آدمی کے لیے تمیز کرنا دشوار ہو جائے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے؛ اس کو بھی روایتوں میں ”فتنہ“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بہر حال! لفظ ”فتنہ“ کا مفہوم عام ہے ،سب کے اندر قدرِ مشترک بات اتنی ہے کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ جس میں آدمی کے لئے آسانی سے حق اور باطل،سچ و جھوٹ کے اندر تمیز کرنا مشکل ہو جائے۔بس! جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمانی بصیرت عطا فرمائی ہو اور جس پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہو،وہی ان حالات کے اندر کوئی صحیح فیصلہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے،ورنہ ہر ایک کے لیے یہ کام آسان نہیں ہوا کرتا؛ایسے حالات کو ”فتنہ“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسے فتنے آئیں گے کہ ایک فتنہ دوسرے فتنہ کو کم کرکے بتلائے گا،یعنی ہر بعد میں آنے والا فتنہ اس سے پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑھا ہوا ہو گا۔ایک حالت آتی ہے تو آدمی اس کو دیکھ کر سہم جاتا ہے اور ڈر جاتا ہے کہ یہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے،ایسا تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں ،لیکن جب اس کے ختم ہونے کے بعد دوسرا معاملہ پیش آتا ہے تو بعد والا معاملہ اس سے بھی زیادہ بھیانک اور خطرناک ہوتا ہے،اس وقت وہی آدمی یوں کہتا ہے کہ پہلے والے حالات تو اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں تھے۔

”فتنہ“ کی تشریح بہ زبانِ نبی:

اور فتنہ کی تشریح فرماتے ہوئے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خود فرماتے ہیں کہ صورتِ حال یہ ہوگی کہ ایک فتنہ آئے گا اور ایسے حالات پیدا ہوجائیں گے کہ جس میں آدمی کے لیے حق وباطل میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا، ایسے موقع پر ایک مؤمن کہے گا کہ یہ فتنہ تو مجھے ہلاک ہی کرڈالے گا، یعنی اس فتنہ کی کیفیت کو دیکھ کر مؤمن اپنے ایمان کے متعلق خطرہ محسوس کرے گا اور یوں کہے گا یہ مجھے ہلاک کردے گا، پھر وہ فتنہ ختم ہوجائے گا، حالات دور ہوجائیں گے، اس کے بعد دوسرا فتنہ آئے گا تو اس وقت مؤمن کہے گا کہ بس! یہی فتنہ ایسا ہے جو مجھے ہلاک کردے گا اور میرے ایمان کو ختم کردے گا گویا پہلے کے مقابلہ میں دوسرے کو اتنا زیادہ سخت پائے گا کہ یہ کہنے پر مجبور ہوجائے گا کہ یہی میرے ایمان کی بربادی کا ذریعہ بنے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتِ حال ہوگی کہ ہر آنے والا فتنہ پہلے والے فتنہ کے مقابلہ میں بڑا ہوگا، ہر آنے والی کیفیت پہلی والی کیفیت کو مات کردے گی۔ آج کل یہی شکلیں پیدا ہورہی ہیں۔

امیر کی اطاعت ضروری ہے:

۴: جس کسی نے حاکمِ وقت امام یعنی حاکمِ اعلیٰ بادشاہِ وقت کے ہاتھ پر اطاعت وفرمانبرداری کی بیعت کی، اور اپنے دل سے اقرار بھی کیا، گویا وہ اس بات کا عہدوپیمان لیتا ہے کہ میں اس کو

اپنا امیر تسلیم کرتا ہوں اور اس کی اطاعت کروں گا، چاہے اس کا حکم میرے مزاج کے موافق ہو، یا میرے مزاج کے خلاف ہو۔ آدمی جب بیعت کرتا ہے تو اس وقت اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے دل سے عہد و پیمان اور اقرار بھی کرتا ہے، تو اب اس حکمران کی پوری پوری اطاعت اپنی طاقت کے مطابق کرے، اس کے بعد کوئی دوسرا آدمی حکومت اور تاج و تخت کا دعویدار اگر کھڑا ہو جائے تو جو بعد میں کھڑا ہوا ہے اس کی گردن اڑا دو۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم پہلے والے سے عہد و پیمان کر چکے ہو، تو اب دوسرے کا ساتھ دینا کسی حال میں بھی جائز نہیں۔ پہلے والے کے ساتھ اطاعت کا عہد و پیمان کیا تھا تو اب اس کی اطاعت ضروری ہے اور دوسرا جو دعویدار کھڑا ہوا ہے اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ اس کو تو ختم کیا جائے گا۔ بہر حال! باب کا عنوان جو قائم کیا تھا کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے وہ اس روایت سے ثابت ہوتا ہے۔

اُن کا بوجھ اُن پر؛ تمہارا تم پر:

حدیث ٦٦٩:-

وعن أَبي هُنَيْدَةَ وَائِلِ بن حُجرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَأَلَ سَلَمَةُ بن يَزِيدَ الجُعفِيُّ رسولَ الله (ﷺ) فَقَالَ: يَا نَبِيَّ الله، أَرَأَيتَ إنْ قامَتْ عَلَيْنَا أُمَرَاءُ يَسألُونَا حقَّهُم، وَيَمْنَعُونَا حقَّنَا، فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَأَعْرَضَ عنه، ثُمَّ سَأَلَهُ، فَقَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، فإنَّمَا عَلَيهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حمِّلتُمْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت سلمہ بن یزید جعفی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا: اے اللہ کے نبی! ہمیں بتلائیے کہ اگر ہمارے اوپر ایسے حکمران مسلط ہوں جو ہم سے اپنا حق مانگتے ہوں اور ہمارا حق ادا نہ کرتے ہوں؛ ایسوں کے متعلق آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟ ہم ان کے ساتھ کیا معاملہ کریں ؟ یہ سن کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بے رخی برتی۔ انہوں نے پھر یہی سوال پوچھا تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اپنے حکمرانوں کے حکم کو سنو اور ان کی اطاعت کرو، اس لیے کہ اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، اور تمہاری ذمہ داری تم پر ہے۔

افادات:- اسلام نے حاکم کا حق محکومین وماتحتوں پر مقرر کیا ہے، ان کا حق رعایا کے ذمہ یہ ہے کہ جائز کاموں کے اندر ان کی اطاعت واجب اور فرض قرار دی گئی ہے، اس کے علاوہ بھی حقوق ہیں کہ ان کی خیر خواہی ضروری ہے۔ اسی طریقہ سے محکوم یعنی رعیت کے بھی حقوق ہیں جیسا کہ پہلے بھی آچکا ہے کہ رعایا کی خیر خواہی کرنا حاکم کے لیے ضروری ہے، اور دوسرے حقوق بھی ہیں جن کی تفصیل پچھلے باب میں آگئی تھی۔

ان صحابی نے سوال کیا کہ ایسے حکمران اگر ہمارے اوپر آگئے جو اپنا حق تو ہم سے وصول کرتے ہیں یعنی اپنی بات تو ہم سے منواتے ہیں ، اپنی اطاعت تو کرواتے ہیں گویا ان کی طرف سے اس بات کا مطالبہ ہوتا ہے کہ ہماری فرمانبرداری کرو، لیکن ہمارے جو حقوق ان کے اوپر لازم ہوتے ہیں وہ ادا نہیں کرتے، ہماری ضرورتوں اور تقاضوں کو وہ پورا نہیں کرتے، ہمارے ساتھ جو خیر خواہی کا

معاملہ کرنا چاہیے وہ نہیں کرتے؛ ایسے وقت ہم کیا کریں؟ ان کا یہ سوال سن کر نبی کریم (ﷺ) نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عام طور پر جب اس طرح کے سوالات حضورِ اکرم (ﷺ) سے کیے جاتے تھے تو آپ (ﷺ) ابتداءً اس کا جواب نہیں دیا کرتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر سوال کا فوری جواب نہیں دیا جاتا، بلکہ بعض سوالات ایسے ہوتے کہ ان کے جواب میں ٹال مٹول سے کام لیا جاتا ہے، اور بہت سے سوال تو ایسے ہوتے بھی نہیں کہ ان کا فوری جواب دیا جائے۔ ہاں! جب دیکھے کہ آدمی کے سوال کا جواب دیئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے؛ تو بات دوسری ہے۔

شریعت کا اصول:

دیکھو! شریعت کا یہ ایک اصول ہے جو میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ شریعت کی طرف سے ہر جگہ حقوق مقرر کر دئے گئے ہیں۔ حکمرانوں کے اوپر ان کے ماتحتوں اور رعایا کے حقوق مقرر کیے گئے، اور رعایا کے اوپر حکمرانوں کے حقوق مقرر کیے گئے۔ اب ہر ایک کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان حقوق کو ادا کرے۔ یا جیسے شوہر کے اوپر بیوی کا حق مقرر کیا گیا اور بیوی کے اوپر شوہر کا حق مقرر کیا گیا۔ اب شوہر کے لیے ضروری ہے کہ بیوی کا حق ادا کرے اور بیوی کے لیے ضروری ہے کہ شوہر کا حق ادا کرے۔ لیکن عام طور پر دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ جن دو فریق کے آپس میں ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں (جیسے میاں بیوی، یا حاکم

اور محکوم، آقا اور غلام) اس میں جو قوت والا فریق ہوتا ہے وہ ایسا انداز اور ایسی روش اختیار کرتا ہے کہ اپنا حق جو سامنے والے پر ہے وہ تو اپنی قوت کے زور سے وصول کرتا ہے، لیکن سامنے والے کا جو حق اپنے اوپر ہے اس کو ادا کرنے کی فکر نہیں کرتا؛ تو اب ایسے مواقع پر کیا کیا جائے؟

آپ حدیث کے پورے ذخیرے کو اٹھاکر دیکھ لیجیے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے تمام مواقع پر یہ نہیں فرمایا کہ وہ تمہارا حق ادا نہیں کرتا تو تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ کہیں بھی ایک حدیث آپ کو ایسی نہیں ملے گی، اس لیے کہ نظامِ عالَم کو باقی رکھنے کا طریقہ یہ ہے ہی نہیں۔ اور میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ اگر دونوں فریق ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرتے ہیں تب تو نورٌ علی نورٍ؛ پورا معاشرہ جنت کا نمونہ بن جائے گا۔ اور اگر جن دو فریق کے ایک دوسرے کے اوپر حقوق مقرر کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک فریق سامنے والے کے حقوق کو ادا نہیں کرتا، لیکن دوسرا فریق اس کے حقوق کو ادا کرتا ہے؛ تب بھی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئے گی، معاملہ سنبھلا ہوا رہے گا۔ لیکن اگر سامنے والا فریق بھی حق ادا نہیں کرتا تو پھر ٹکراؤ کی نوبت آئے گی۔ جیسے: شوہر اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن بیوی کا حق ادا نہیں کرتا، تو وہاں ہم بیوی کو کبھی یہ مشورہ نہیں دیں گے کہ تو بھی شوہر کا حق ادا مت کر۔ اسی طرح حاکم کے پاس قوت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنا حق وصول کرتا ہے، لیکن اس کے اوپر اپنے ماتحتوں کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں وہ ان کو ادا نہیں کرتا۔ اب اگر ماتحت آکر یہ سوال کریں کہ آپ ہی بتائیے کہ ہم کیا کریں؟ تو آپ کبھی بھی یہ مشورہ نہ دیں کہ تم بھی اس کا حق ادا مت کرو۔ اس

روایت میں حضورِ اکرم (ﷺ) بھی ایسا مشورہ نہیں دے رہے ہیں بلکہ آپ (ﷺ) نے فرمایا: "إِسْمَعُوْا وَأَطِيعُوْا" اس کا تم پر یہ حق ہے کہ وہ تم کو جو حکم دے اس کو مانو، بس! جب وہ حکم دیتا ہے تو مان لو، اس طرح تمہاری ذمہ داری تو تم پوری کرلو۔

" فإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا، وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ " ہماری ذمہ داری یہی ہے کہ جو شریعت کی طرف سے ہم پر لازم کی گئی، اور ان کی ذمہ داری وہ ہے جو شریعت کی طرف سے ان پر لازم کی گئی تھی۔ اب اگر وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو اس کا بوجھ ان پر رہے گا، ہمیں اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتے تو ہم ان کا حق کیوں ادا کریں؟ شریعت ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ آپ حق ادا کرتے رہے یا نہیں ؛ اس کا فیصلہ تو اللہ تبارک تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ قیامت کے روز کیا ہی جائے گا جہاں کبھی اس کے خلاف ہونے والا نہیں ہے۔

یہاں یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران کی اطاعت ضروری ہے۔ اور ویسے بھی جب وہ قوت کے زور سے اپنا حق وصول کررہا ہے، تو اگر ہم یہ مشورہ دیں کہ تم اس کا حق ادا مت کرو؛ تو یہی چیز فتنہ بڑھانے کا ذریعہ بنے گی۔

اصل علاج یہ نہیں:

اورایک بات یہ بھی غور طلب ہے کہ وہ اپنا حق اسی لئے تو وصول کررہا ہے کہ اس کا حق ہے،اور کسی آدمی کا اپنے حق کو وصول کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں ہے،سیدھی سی بات ہے۔اس کو حق پہنچتاہے کہ اپنا حق وصول کرے اس لیے کررہا ہے۔ہاں !سامنے والے کاجو حق ادانہیں کررہا ہے،یہ بات غلط ہے، اس کی طرف سے یہ کوتاہی ہورہی ہے۔اب اگر ہم سامنے والے کو یہ مشورہ دیں کہ تم بھی حق ادامت کرو،تو آپ ہی سوچئے کہ ہم سامنے والے کو بھلائی کامشورہ دے رہے ہیں ، یاغلط مشورہ دے رہے ہیں ؟جو غلطی یہ کررہاتھااس کا علاج ڈھونڈنے کے لیے سامنے والافریق ہمارے پاس آیا،تو علاج میں ہم بھی وہی بات بتلارہے ہیں کہ تو بھی اس کاحق مت اداکرنا؛تو یہ علاج کہاں ہوا،بلکہ معاملہ کواورزیادہ بگاڑناہوا۔شریعت کبھی یہ مشورہ نہیں دیتی۔

اگر ہم یہ کہیں گے کہ تم اس کاحق ادا مت کرو توظاہرہے کہ وہ تو پہلے ہی قوت سے اپناحق وصول کررہا تھااوراب اگریہ حق ادا نہیں کرے گا تو ٹکراؤکی شکلیں پیدا ہوگی جب یہ اس پراپنازورچلاناچاہیے گاتواس کے اس زورسےبچنےکے لیے سامنے والا فریق جو کمزورہے وہ دوسروں کی حمایت حاصل کرے گا،اورجب دوسروں کی حمایتیں آئیں گی توجھگڑے اور فتنے زیادہ پیدا ہوں گے، اس لئے شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی،یہ بات بڑے خطرے کی ہے،

عام طور پر فتنے اسی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں ، ایسے تمام حالات میں شریعت کی بڑی تاکید رہتی ہے کہ تم سامنے والے کا حق ادا کرتے رہو، اگرچہ وہ تمہارے حق میں کوتاہی کرے۔

شفابخش علاج :

آج کل تو ایسا مزاج بن گیا ہے کہ لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کیا ہم بزدل ہیں کہ وہ ہمارا حق ادا نہیں کرتا تب بھی ہم اس کا حق ادا کریں؟ لوگوں نے اس کا نام بزدلی رکھ دیا ہے، حالاں کہ یہ بزدلی نہیں ہے۔ آپ یہ طے کرلیجئے کہ میں اس کا جو حق ادا کر رہا ہوں وہ بزدلی کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے ادا کر رہا ہوں ۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ہر کام میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیشِ نظر رکھیں۔

اور یہ بھی بڑی عجیب بات ہے کہ بہت سے دینی کام جو ہم کرتے ہیں وہ حکمِ خداوندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ معاشرے اور سماج کا ایک طریقہ اور دھارا بنا ہوا ہے اس لیے کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہماری دینداری کا بہت بڑا حصہ ایسا ہی ہے۔ بعض لوگ اگر شراب نہیں پیتے تو وہ اس لیے نہیں کہ حرام ہے، بلکہ سوچتے ہیں کہ اگر میں پیوں گا تو لوگ کیا کہیں گے۔ میں سنیما دیکھنے جاؤں گا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہاں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو نہیں سوچتا۔ تو درحقیقت بہت سے گناہوں سے لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں ،بلکہ سماج کے ڈر سے بچتے ہیں، اور بہت سے کام اللہ تعالیٰ کی خاطر نہیں ، بلکہ سماج کے ڈر سے کرتے ہے۔ حالاں

کہ شریعت کی تعلیم تو یہ ہے کہ چھوٹے سے چھوٹا کام کروتب بھی اور بڑے سے بڑا کام کرو تب بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی کرو۔اور اگر کوئی کام نہ کرو،تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے واسطے مت کرو۔جیسا کہ حدیث ِ پاک میں آتا ہے:"مَنْ أَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ" جس نے دیا تو اللہ کے واسطے دیا، اور نہیں دیا تب بھی اللہ کے واسطے نہیں دیا"فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ"تو اس کا ایمان کامل ہو گیا۔

خلاصۂ علاج:

خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے مواقع پر آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کو مدِّنظر رکھے، اور یہی سوچے کہ میرا اس کے حق کو ادا کرنا بزدلی کی وجہ سے نہیں ہے،بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے؛تو پھر دیکھئے کہ بھائیوں بھائیوں میں اور رشتہ داروں میں کیسی محبتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ ہمارے سماج میں جتنے بھی بگاڑ ہیں یہ آپسی حقوق کے ادا نہ کرنے کے نتیجہ ہی میں ہیں ،اگر اس تعلیم پر عمل کر لیا گیا تو ان شاءاللہ سارے بگاڑ ختم ہو جائیں گے۔جب بھی ایسا کوئی معاملہ ہو اور لوگ کہیں کہ کیا تو بزدل ہے؟وہاں اسی سوچ کی ضرورت ہے"فَإِنَّمَا عَلَيْهِمْ مَا حُمِّلُوا ،وَعَلَيْكُمْ مَا حُمِّلْتُمْ" وہ جو کرتا ہے اس کی ذمہ داری اس پر ہے،کل کو قیامت میں اس کا جواب اس کو دینا ہے۔ہاں !میری ذمہ داری مجھ پر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کا جو حق میرے اوپر لازم کیا ہے ،میں اس کو ادا کروں گا، چاہے وہ میرا حق ادا نہ کرتا ہو۔

یہ سودے بازی نہیں ہے:

”معاملات میں سودے بازی ہوتی ہے، حقوق میں سودے بازی نہیں ہوتی“ دونوں باتیں الگ الگ ہیں جس کو ذرا برابر سمجھ لیجئے۔ جیسے: میں نے آپ سے ایک مکان خریدا، اگر میں پیسے نہ دوں تو آپ مجھے مکان نہ دیجئے۔ آپ مکان نہ دیں، تو میں پیسے نہ دوں؛ یہ تو برابر کا معاملہ ہے، یہ تو سودا ہوا جو آپس کے معاملات میں ہوتا ہے۔ لیکن شریعت نے جو حقوق مقرر کئے ہوئے ہیں، یہ کسی طرح کی سودے بازی نہیں ہے، باپ کے اوپر بیٹے کا حق، یا بیٹے کے اوپر باپ کا حق؛ یہ کوئی سودے بازی نہیں ہے کہ بیٹا باپ کا حق ادا کرے تب ہی باپ بیٹے کا حق ادا کرے گا۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، اور دونوں کے لیے لازم ہے کہ اپنا اپنا کام کریں۔ دونوں میں کوئی ایک نہیں کرتا تو دوسرے کو چاہیے کہ یہ نہ دیکھے کہ وہ کیوں نہیں کرتا، بلکہ وہ خود حق ادا کرنے کا اہتمام کرے۔ یہ سب حقوق ہیں اور حقوق اللہ تعالیٰ نے متعین کئے ہیں۔ اسی ایک اصول کو مدّ ِنظر رکھنے کی ضرورت ہے، اگر ہم اس چیز کو پیشِ نظر رکھیں گے، تو ان شاء اللہ کبھی کوئی گڑبڑ کی نوبت نہیں آئے گی۔

ایسے زمانہ میں کیا کرے؟:

حدیث ۶۷۰:-

عن عبد الله بن مسعود رضی اللہ عنہ قال قال رسول الله (ﷺ): إِنَّهَا سَتَكُونُ بَعْدِي أَثَرَةٌ وَأُمُورٌ تُنْكِرُونَهَا! قالوا: يَا رسول الله! كَيْفَ تَأْمُرُ مَنْ أَدْرَكَ مِنَّا ذَلِكَ؟ قَالَ: تُؤَدُّونَ الحَقَّ الَّذِي عَلَيْكُمْ، وَتَسْأَلُونَ اللهَ الَّذِي لَكُمْ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میرے بعد ترجیحی معاملہ کیا جائے گا، اور ایسی چیزیں ہوں گی جن کو تم اجنبی سمجھو گے یعنی پسند نہیں کروگے۔ اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے تو وہ کیا کرے؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگو اور اسی سے دعا کرو۔

افادات:- حُکَّام جن کے ہاتھ میں اختیارات اور پاورس (Powers) ہوتے ہیں، ان اختیارات کے نتیجہ میں جب وہ کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو انصاف کے ساتھ اور حقدار کا حق سمجھ کر کرتے ہیں، لیکن بعض لوگوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح نہیں ہے، اس کو یہ منصب اور عہدہ نہیں دینا چاہیے تھا، وہ آدمی اس لائق نہیں تھا، اس نے اس کی فیور (Favour) کی ہے۔ ”أَثَرَةٌ“ کے معنٰی فیور کرنا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے کبھی کوئی معاملہ کیا تو بعض لوگوں نے اس کو بھی فیور پر

محمول کیا تھا جس پر آپ (ﷺ) نے فرمایا تھا: ہم تو ایسا نہیں کرتے، لیکن آئندہ ایسا ہوگا کہ تم ایسے ترجیحی اور فیور والے معاملات دیکھو گے۔

توحکمرانوں کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہوتا ہے، جن کے ہاتھ میں اختیارات ہوتے ہیں، وہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے، بلکہ ان کی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری کے مطابق کام کرتا ہے، پھر بھی اپنے اور پرائے سب ان پر اشکالات کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ غلط کیا ہے، اس کو یہ چیز نہیں کرنی چاہیے تھی، فلاں منصب فلاں کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! جو آدمی ایسا زمانہ پالے اور اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ ترجیحی سلوک کئے جارہے ہیں، نامناسب باتیں ہورہی ہیں؛ تو وہ کیا کرے؟ تلوار نکال کر مقابلہ کے لئے میدان میں آجائے؟ حضورِ اکرم (ﷺ) فرمایا: اپنا حق وصول کرنے کے لیے آستینیں مت چڑھاؤ، تلوار لے کر میدان میں مت اتر آؤ؛ یہی چیز فتنہ ہے، اور فتنہ چھوٹے انداز میں ہو یا بڑے انداز میں؛ بہت بری چیز ہے۔ اس لیے ان حاکموں کا تم پر جو حق ہے وہ تم ادا کرو، اور تمہارا ان پر جو حق ہے وہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو اور دعا کرتے رہو۔

عام طور پر آپ دیکھیں گے کہ جہاں کہیں بھی اس طرح کے فتنے، جنگیں اور لڑائیاں ہوتی ہیں، وہ انہی بنیادوں کے اوپر ہوا کرتی ہیں کہ فلاں ہمارا حق کیوں نہیں

دے رہا ہے، ہم تو اپنا حق وصول کر کے رہیں گے، اسی میں دو پارٹیاں ہو جاتی ہیں اور مقابلہ کی نوبت آجاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ اور نیک توفیق عطا فرمائے

۸/ذی قعدہ ۱۴۲۱ھ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۳/فروری ۲۰۰۱ء

بیان چل رہا تھا کہ جو حکمران ہیں، چاہے وہ حاکمِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہوں، یا حاکمِ اعلیٰ کی طرف سے مقرر کردہ ماتحت حاکم ہوں، پھر وہ ایسی بات کا حکم دیتے ہوں جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم نہیں آتی ہو، تو اس صورت میں ان کی اطاعت اور فرماں برداری واجب اور ضروری ہے؛ البتہ گناہ کے کاموں کا وہ حکم دیں تو اس صورت میں اس کو مانا نہیں جائے گا اوران پر عمل نہیں ہوگا۔

جس نے امیر کی اطاعت کی......:

حدیث ۶۷۱:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ أطَاعَنِي فَقَدْ أطَاعَ اللهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللهَ، وَمَنْ يُطِعِ الأَمِيرَ فَقَدْ أطَاعَنِي، وَمَنْ يَعصِ الأميرَ فَقَدْ عَصَانِي. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی۔ اور جس نے میری نافرمانی کی گویا اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر آدمی جس گناہ کا مرتکب شمار ہوتا ہے اور اس پر جو سزا مل سکتی ہے ، نبی کریم (ﷺ) کی نافرمانی پر بھی وہی حکم ثابت ہو گا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم (ﷺ) کو بھیجا ہی اس لئے ہے کہ آپ جن چیزوں کا حکم دیں ان پر تمام لوگ عمل کریں، اور جن چیزوں سے حضورِ اکرم (ﷺ) منع فرمائیں ان سے لوگ باز رہیں﴿مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ قرآنِ کریم میں ہے کہ: رسول جس چیز کا حکم دیں اس کو لے لو، اس پر عمل کرو، اور جس چیز سے وہ منع کریں اس سے باز آجاؤ۔ تو جس طرح اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا اور اس کی اطاعت و فرمانبرداری ضروری ہے، اسی طرح رسولِ پاک کا حکم ماننا اور آپ کی اطاعت وفرمانبرداری بھی ضروری ہے۔ اور نبی کریم (ﷺ) کی طرف سے جو حکام اور ماتحت امراء مختلف امور کو انجام دینے کے لئے مقرر کئے جاتے تھے ان کے متعلق حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ میری طرف سے جو امراء مقرر کئے جائیں، جو ان کی اطاعت کرے گا گویا اس نے میری اطاعت کی۔

عام طور پر یہی ہوتا ہے جو حاکمِ اعلیٰ ہوتا ہے یا جو بڑی شخصیت ہوتی ہے، اس کا حکم اور اس کی بات تو لوگ خوشی خوشی مان لیا کرتے ہیں ، اور اس پر عمل کرنے میں اور اس کی اطاعت وفرمانبرداری میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے، لیکن گڑبڑ نیچے آکر ہوتی ہے کہ جب ان کی طرف سے کچھ باتیں پیش کی جاتی ہیں تو لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ حالاں کہ یہ بات بدیہی ہے کہ حاکمِ اعلیٰ تو پورے حدودِ سلطنت میں پہنچ نہیں سکتا، اس کو نظام چلانے کے لئے

اوراپنے ماتحت مختلف شعبوں اور مختلف کاموں کو انجام دینے کے لئے آدمی مقرر کرنے ہی پڑیں گے۔اور ظاہر ہے کہ جو شعبہ جس کے حوالہ کیا جائے گا اس شعبہ سے متعلق اختیارات بھی اس کودیئے جائیں گے،تو اس نے جن لوگوں پر اعتماد کیا ہے اور جن کی صلاحیتوں کو قابل سمجھتےہوئے ان کو متعین کیا ہے،ان حضرات کے متعلق حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جس نےان مقرر کردہ لوگوں کی اطاعت کی گویااس نے میری اطاعت کی، اور جس نے ان کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

گورنمنٹ کا اصول بھی یہی ہوتاہے۔گورنمنٹ کے عملہ اوراسٹاف کی طرف سے گورنمنٹ کے قوانین اور اصول کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے جو حکم جاری کیا جائے گا، اس حکم کو ماننااوراس پر عمل کرنا اسی طرح ضروری ہوتاہے جیسا اوپر والے حاکم کی طرف سے جاری کئے ہوئے حکم کوماننا۔اگر اس کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو اسی طرح سزا کا حقدار ہوتا ہے جس طرح حاکمِ اَعلیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں سزا کا حقدار ہوتاہے،اس کے بغیر کسی بھی سلطنت کا نظام،اورکوئی بھی نظمِ مملکت چل ہی نہیں سکتا، اسی لئے حضورِ اکرم (ﷺ) نے خاص طور پر اس طرف متوجہ کیا ہے۔

ایک اہم اصول:

ہمارے سماج اور معاشرہ میں مختلف طریقوں سے جو نظام چلائے جاتے ہیں ، چاہے انجمنوں کی شکلوں میں ہوں ،چاہے جماعتوں کی شکلوں میں ہوں ،یا مسجد و مدرسہ کا نظام ہو، ہرایک جگہ نظام چلانے کے لئے ایک تو سربراہ مقرر کیا جاتا ہے اور پھر وہ سربراہ اپنے ماتحت کاموں کو انجام دینے کے لئے مختلف لوگوں کو مقرر کرتا ہے،توعام طورپردوسروں کی طرف سے رکاوٹیں نیچے والوں کے معاملہ میں ہی پیش آتی ہیں ،وہ یوں سمجھتے ہیں کہ مَیں اس کی کیوں مانوں؟میں تواس سے اونچاہوں۔توان کویہ سوچنا چاہیے کہ دراصل وہ اِس کی نہیں مان رہے ہیں ،بلکہ اِس کو جس نے مقرر کیا ہے اُس کی مان رہے ہیں ،اگریہی بات سمجھ لیں گے تو پھر کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی، اور کبھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔جتنے بھی جھگڑے اور اختلافات شروع ہوتے ہیں اوراس قسم کے نظاموں کو چلانے میں جو دشواریاں پیش آتی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے۔

جاہلیت کی موت:

حدیث ۶۷۲:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أن رسول اللہ (ﷺ) قال: مَنْ كَرِهَ مِنْ أَمِيرِهِ شَيْئاً فَلْيَصْبِرْ، فَإِنَّهُ مَنْ خَرَجَ مِنَ السُّلْطَانِ شِبْراً مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے بادشاہ اور امیر کی طرف سے کسی چیز کو ناپسند سمجھے (یعنی امیر نے کوئی حکم دیا، یا کوئی معاملہ اور سلوک اس کے ساتھ ایسا کیا جو اس کو ناگوار ہے ، اس کی طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی) تو اس کو چاہیے کہ صبر کرے(نہ کوئی مقابلہ کرے اور نہ اس کے خلاف کرے)اس لیے کہ جو آدمی حاکم کی فرمانبرداری سے ایک بالشت بھی باہر نکلا، وہ جاہلیت کی موت مرا۔

افادات:- اس لئے کہ مقابلہ کرنے،اس کی خلاف ورزی کرنے اور اس کی نافرمانی کرنے میں بڑی خرابیاں ہیں،ایسے ایسے نقصانات ہیں جس کی کوئی تلافی ہو ہی نہیں سکتی،لہٰذا جب یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے تو صبر سے کام لے۔

اورچوں کہ زمانۂ جاہلیت میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں تھا،ہر قبیلہ اپنا ایک الگ نظام، اوراپنی الگ حکومت چلاتا تھا، اسلام نے آکروہ سارے نظام ختم کرکے ایک امیر کے ماتحت سب لوگوں کو لاکراس ایک امیر کی اطاعت کوضروری قرار دیا،اور ایک اجتماعی نظام انسانوں کو عطافرمایا،پھر اس نظام کو چلانے کے لئے حکام کی تعیین کی گئی اور ان کے ذریعہ سے پورے نظام کو چلایا گیا۔یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو اسلام نے آکربتلائیں ،ورنہ زمانۂ جاہلیت میں

عربوں میں ایسا کوئی نظام نہیں تھا، اس لئے حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں :جو اس کی خلاف ورزی کرے گا گویا اس نے جاہلیت والا طریقہ اپنانا چاہا،اسی لئے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

جس نے حاکم کی توہین کی:

حدیث ۶۷۲:-

وعن أبی بکرة رضی اللہ عنہ قال:سمعتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) یقول:مَنْ أهانَ السُّلطَانَ؛أَهَانَهُ اللہ. (رواہ الترمذی وقال:حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا : جس نے حاکم اور بادشاہ کی بے عزتی اور توہین کی، اس کے ساتھ اس کی شان کے خلاف معاملہ کیا؛ اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے آدمی کو بے عزت کرے گا۔

افادات:- اس لئے کہ جو حاکمِ اَعلیٰ ہوتا ہے اس کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جانا پورے نظم ونسق کو برباد کرنے کا ذریعہ بنتا ہے،ہر ایک کو جرأت نہیں ہوتی لیکن کسی ایک آدمی نے جرأت کرلی توگویا اس نے دوسروں کو بھی جرأت پر آمادہ کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نظام کا سارا ڈھانچہ ختم ہوجائے گا،اس ایک کی اہانت پورے نظام کی بربادی کی شکل میں ظاہر ہوگی،اور ظاہر ہے کہ اس کے نقصانات کتنے ہوسکتے ہیں؟ اسی لئے حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: جس نے حاکم کی توہین کی، اللہ تعالیٰ اس کی توہین اور بے عزتی کرے گا۔ وہ آدمی یہ نہ سمجھے کہ ایسا

کرکے میرا کچھ بگڑنے والا نہیں ہے، قدرت کی طرف سے تکوینی طور پر اس کے ساتھ اسی کے مناسب سزا کا معاملہ کیا جائے گا۔

اَلنَّهْىُ عَنْ سُؤَالِ الْإِمَارَةِ

وَاِخْتِيَارُ تَرْكِ الْوِلَايَاتِ إِذَا لَمْ يَتَعَيَّنْ عَلَيْهِ

عہدہ طلب کرنے کی ممانعت

اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلامی اصول:

اگر کوئی آدمی اپنی طرف سے کوئی عہدہ مانگے اور طلب کرے ؛تواسلام اس کی اجازت نہیں دیتا،لیکن اگرکسی آدمی کے اندر صلاحیت ہے اور وہ باکمال شخصیت ہے اس میں ایسے اوصاف ہیں کہ ذمہ داری کے کاموں کوانجام دے سکتا ہے، توخود حاکمِ اعلیٰ کو چاہیے کہ وہ اس کوذمہ داری حوالہ کرے۔ویسے بھی اسلام نے تو ایک اصول بتادیاہے: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ حکم دیتے ہیں کہ تم امانتیں ان کے حق داروں تک پہنچاؤ۔ حکومتوں کے یہ عہدےاور مناصب بھی ایک طرح کی امانت ہیں ، اسی لئے نبی ٔکریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ: کسی آدمی نے کسی کو کوئی عہدہ و منصب دیا، اور اس قوم میں اس سے اچھا آدمی موجودہےجواس ذمہ داری کو اس سے بھی اچھی طرح ادا کر سکتا ہے؛تو اس نے اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول (ﷺ)کے ساتھ خیانت کی۔ یعنی جس کوعہدہ دیاہے،اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی میں اس سے اچھی صلاحیتیں موجودہیں ، اورحاکم بھی اس کوجانتا ہے اوراس کو دینے میں کوئی دوسری رکاوٹ اورمانع بھی نہیں ہے،اس کے باوجود اُس کو نہ دے کردوسرے کو وہ منصب وعہدہ دیا؛ تواسلام کی تعلیم کے مطابق اس نے خیانت کی۔حاکمِ اعلیٰ کی ذمہ داری ہے کہ مناصب وعہدوں کی تقسیم کے وقت جب کسی آدمی کو تجویز کیا جائے تو ان کمالات،

صلاحیتوں اوراوصاف کی بنیاد پر تجویز کیا جائے جو اس کام کو انجام دینے کے لیے ہونے چاہئیں۔ جس میں جتنی زیادہ صلاحیت ہو اسی کو دینا چاہیے، اگر اس کو نہ دے کر اس سے کم صلاحیت والے کودیا گیاتواس نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول(ﷺ) کے ساتھ خیانت کی۔جب اسلام کی تعلیم یہ ہے تو پھر کسی کو کوئی عہدہ مانگنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاکمِ اعلیٰ کو حکم دیا گیا ہے کہ جو باصلاحیت ہواس کو پیشکش کرے۔باقی خود ہی مانگنا کہ مجھے یہ عہدہ و منصب دیا جائے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا۔

باصلاحیت آدمی کے لیے دوراستے ہیں:

پھر یہ ہے کہ کسی کو اس کی صلاحیت اور کمالات کی وجہ سے کوئی عہدہ دیا جارہا ہو، جیسے: صدر بنایا جارہاہو، سکریٹری بنایا جارہاہو؛ تواس کو قبول کرناچاہیے یا نہیں ؟

بعض مرتبہ شکل ایسی ہوتی ہے کہ پورے سماج ومعاشرہ اورپوری کمیونٹی(community) میں کوئی ایساہے ہی نہیں جواس عہدہ کو سنبھال سکے، صرف یہی اکیلا ہے۔کسی دوسرے میں ایسے اوصاف نہیں جو اس ذمہ داری کوامانت داری کے ساتھ کماحقہ' پوراکر سکے، سب لوگ کہتے ہیں کہ یہ کام تویہی کرسکتاہے، کوئی دوسرا نہیں کرسکتا؛ تو پھر اس کو انکار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ایسی صورت میں تو اس کی یہ ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ اس ذمہ داری کو قبول کرلے،اگرانکار کردے گاتو گنہگار ہو گا۔

لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس ذمہ داری کو انجام دینے کی صلاحیت رکھنے والا یہ اکیلا نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سارے لوگ اسی کے برابری اور لیول کے موجود ہیں جو اس ذمہ داری کو قبول کرسکتے ہیں ،اور پھر اس سے کہا جارہا ہے کہ آپ قبول کیجئے ،تو اس صورت کے اندر اپنے آپ کو اس ذمہ داری سے بچانے کے واسطے یہ سوچتے ہوئے انکار کرتا ہے کہ ذمہ داری کا کام ہے، پتہ نہیں کہ مجھ سے پورے طور پر یہ ذمہ داری ادا ہوگی یا نہیں ،اس امانت کو پورے طور پر انجام دے سکوں گا یا نہیں ،اس لیے کہتا ہے کہ یہ عہدہ مجھے نہیں چاہیے، میں اس ذمہ داری کو قبول کرنا اور یہ بوجھ اٹھانا نہیں چاہتا، یہ کام مجھ سے نہیں ہوگا، یا میں اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہوں؛ تو شرعاً اس کی اجازت ہے۔

اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں :

لیکن اسلام نے سامنے سے کسی عہدہ اور منصب کو مانگنے کی تو بالکل اجازت دی ہی نہیں۔ آج کل تو معاملہ بالکل بدل ہی گیا ہے۔ الیکشن میں خود ہی امید واری کرتے ہیں کہ مجھے ذمہ دار بناؤ، حالاں کہ اسلام اس نظریہ کا قائل ہی نہیں اور اس نظریہ کو بالکل پسند ہی نہیں کرتا۔ اسلام تو کہتا ہے کہ آپ لوگوں سے نہ کہو، لیکن اگر ذمہ دار، اہل الرای، اربابِ حل وعقد آپ کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر آپ سے کہیں کہ آپ کو ہی یہ کام کرنا ہے اور آپ منع کریں؛ تو یہ اصل بات ہے۔ ایسا نہیں کہ ساری دنیا منع کرتی ہے کہ ان کو نہیں دینا ہے، لیکن

آپ کہتے ہیں کہ:"میں ہی صدر بنوں گا، میں ہی سکریٹری بنوں گا، اور میں بھی دیکھتا ہوں کہ کون میرے مقابلہ پر آتا ہے؟" اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے، یہ تو بڑی گڑبڑ والی چیز ہے۔

آخرت کا گھر کس کے لیے؟:

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (القصص:۸۳)﴾ اس آیت سے پہلے آخرت کی کچھ چیزیں بیان کی گئی تھیں، اس کے بعد باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ آخرت کا وہ گھر ہم انہی لوگوں کو دیں گے، انہی کے لیے ریزروڈ (Reserved) رکھتے ہیں جو زمین میں بڑا بننا نہیں چاہتے، اور نہ زمین میں فساد پھیلانا چاہتے ہیں، اور انجام تو نیکوکاروں کے واسطے ہی ہے۔ یعنی جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلتے ہیں اور نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے آپ کو بڑائی طلب کرنے سے بھی بچاتے ہیں؛ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ آخرت میں کامیاب کرتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نزدیک جو بندے آخرت کے حقدار ہیں ان کا مخصوص وصف ﴿لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ﴾ ہے کہ وہ عہدہ نہیں چاہتے، ان کا مزاج ایسا ہے کہ ان کو کوئی عہدہ دیا جائے تب بھی وہ منع کرتے ہیں، ہاں! لوگوں کے اصرار کے نتیجہ میں قبول کرلیں؛ تو یہ بات اور رہی، لیکن وہ اپنی طرف سے اس کے خواہش مند نہیں ہوتے، بلکہ ان کی خواہش تو یہ ہوتی ہے کہ یہ عہدہ مجھے نہ سونپا جائے۔

اگر مدد چاہتے ہو تو عہدہ مت مانگو:

حدیث ۶۷۴:-

وعن أبي سعيد عبد الرحمن بن سمرة رضی اللہ عنہ قال قال لی رسول الله (ﷺ) : يَا عَبْدَ الرَّحمان بن سَمُرَةَ! لاَ تَسْأَلِ الإِمَارَةَ، فَإِنّكَ إن أُعْطِيتَهَا عَنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ أُعِنْتَ عَلَيْهَا، وَإِنْ أُعْطِيتَهَا عَنْ مَسْأَلَةٍ وُكِلْتَ إِلَيْهَا، وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَى يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا، فَأْتِ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ وَ كَفِّرْ عَنْ يَمِينكَ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت عبدالرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے عبدالرحمن !عہدہ مت مانگو، امارت مت طلب کرو، سرداری کا سوال مت کرو(کہ مجھے پریسیڈنٹ بناؤ، مجھے سکریٹری بناؤ) اس لئے کہ (اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک اصول ہے کہ) جو عہدہ اور منصب بغیر مانگے ہوئے ملتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مدد ہوگی، اور اگر آپ کے طلب کرنے اور مانگنے سے ملا ہے ،تو(اللہ تعالیٰ کی مدد نہیں ہوگی، بلکہ)تمہارے حوالہ کردیا جائے گا۔اور جب تم نے کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام ایسا ہے جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دو اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دیدو۔

افادات:- آدمی نے کوئی عہدہ مانگا نہیں تھا ،کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا ، بلکہ ذمہ داروں نے اس کی صلاحیتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے بغیر طلب کے اس پر ڈالا ہے؛تو اس صورت میں اس عہدہ کی جو ذمہ داریاں ہیں ان کو انجام دینے میں اوراس ڈیوٹی کو پورا کرنے میں اللہ تعالیٰ اس

کی مدد کرے گا۔اوراگر کوئی عہدہ سامنے سے مانگتاہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ میں اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہوں،باری تعالیٰ کہتے ہیں کہ: اچھا!اب اس کام کوتم ہی انجام دو۔

چھوٹے سے چھوٹے کام میں بھی آدمی کوچاہیے کہ اپنی ذات کے اوپر اعتماد نہ کرے،ہر کام میں اعتماد اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہیے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی وہ کام کرواسکتاہے،اور کسی کا سامنے چل کرعہدہ مانگنا؛ اللہ تعالیٰ کی ذات کے بجائے اپنی ذات پر اعتماد کی دلیل ہے۔

عمدہ مثال:

جیسے:ایک باپ کئی فیکٹریوں کا مالک ہے ،اس کے ماتحت کئی طرح کے کام ہیں،اس کے بیٹوں میں سے ایک بیٹا کہتا ہے کہ: اباجان! مجھے فلاں پوسٹ دیدو،میں اس عہدہ پر کام کروں گا، اپنی طرف سے اس نے ابا سے یہ فرمائش کی کہ مجھے اس عہدہ پر کام کرناہے۔تواس کی طرف سے یہ فرمائش کرنااس بات کی دلیل ہے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں اس عہدہ کا حقداراور اہل ہوں ، اور میں اس کام کو برابر انجام دوں گا۔ویسے باپ کی خواہش تو یہ تھی کہ وہ دوسرے کودیتا ،لیکن یہ سامنے سے مانگ رہا ہے۔

ایک شکل یہ تھی کہ اس نے مانگا نہیں ،بلکہ باپ نے کہا کہ تم یہ کام کرو،اور وہ منع کرتا ہے کہ اباجان! مجھے نہیں چاہیے، اس کے منع کرنے کے باوجود جب باپ وہ کام سونپے گا، تو پھر اس پر برابر نظر بھی رکھے گا، ذرّہ بھی اِدھر اُدھر ہو گا تو فوراً باپ اس کو ڈائریکشن دے گا کہ بیٹا! ایسا نہیں، بلکہ ایسا کرو۔ ہمہ تن اس کی طرف متوجہ رہے گا کہ کہیں چوک نہ ہو جائے۔ لیکن جس نے خود ہی مانگا ہے، اور کہیں گڑبڑ کا موقع آئے گا تو باپ سوچے گا کہ چلو! دیکھتے ہیں وہ کیا کرتا ہے؟ بہت اکڑتا تھا کہ میں کر کے دوں گا تو اب دیکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے؟ قدرت کی طرف سے بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔

بہتر کام کو انجام دینے کے لیے قسم توڑنا:

اس روایت میں دوسری چیز یہ بتلائی گئی کہ کسی بات پر قسم کھائی ہو، اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی کام تمہیں اچھا معلوم ہوا، جیسے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی معاملہ پر آدمی قسم کھالیتا ہے کہ فلاں جگہ نہیں جاؤں گا ، لیکن وہاں جانے میں ہی خیر معلوم ہوتی ہے۔ یا کسی نے قسم کھالی کہ میں فلاں سے بات نہیں کروں گا، لیکن جب مسئلہ پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایسی قسم کھانا جائز نہیں ہے ،اس لیے اس قسم کو توڑو اور اس سے بات کرلو۔ جب بات کروگے تو قسم ٹوٹے گی، تو اس کا کفارہ دیدو۔ تو کسی کام کی قسم کھائی اور دوسرا کام سامنے آیا جو اس سے بہتر ہے تو ایسی قسم کو چھوڑ کر دوسرے اچھے کام کو انجام دینا چاہیے، اور قسم ٹوٹنے کا کفارہ دے دینا چاہیے۔

پہلے بھی کئی بار یہ قصہ بتاچکاہوں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت مسطح بن آثاثہ رضی اللہ عنہ کے متعلق قسم کھائی تھی کہ ان کو خرچہ نہیں دوں گا، پھر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی جس میں کہا گیا کہ: معاف کردو، اللہ تعالیٰ معافی کو پسند کرتا ہے، کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؛ توحضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خرچہ دیناشروع کردیا۔ کسی پر خرچ نہ کرنے کے مقابلہ میں اس پر خرچ کرنا اچھا کام ہے، چناں چہ اس کو اختیار کرنے پر قسم کا کفارہ دیدیا۔

کسی دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر مت بننا:

حدیث ۶۷۵:-

وعن أَبِي ذرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): يَاأَبَاذَرٍّ!إِنِّي أَرَاكَ ضَعِيفاً، وَإِنِّي أُحِبُّ لَكَ مَا أُحِبُّ لِنَفْسِي. لاَ تَأَمَّرَنَّ عَلَى اثْنَيْنِ، وَلاَ تَوَلَّيَنَّ مَالَ يَتِيمٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اے ابوذر! میں تمہیں کمزور پاتا ہوں (یعنی تمہارا حال دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تم میں ضعف وکمزوری ہے) اس لئے میں تمہارے لئے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں؛ لہٰذا دو آدمیوں پر بھی امیر مت بننا، اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا۔

افادات:- امیر اور سربراہ بننا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، چاہے کسی بھی شعبہ میں ہو،اس کی وجہ سے بہت بوجھ سر پر آجاتا ہے۔اس لیے حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: تم کمزور ہو، لہٰذا دو آدمیوں کے اوپر بھی امیر اور سربراہ مت بننا۔اور کسی یتیم کے مال کا والی مت بننا، اس لئے کہ یتیم کے مال کی ذمہ داریاں بھی بہت بڑی ہیں ،ذرّہ برابر بھی اس میں اِدھر اُدھر ہوگیا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا سخت جواب دینا پڑے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ لوگوں میں بھی اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔بعض وہ ہوتے ہیں کہ جن کو اس طرح کی ذمہ داری اگر سونپی جائے اوروہ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کے پیشِ نظریہ سمجھتا ہو کہ میں اپنی کمزوری کی وجہ سے اس ذمہ داری کو پورے طور پر کماحقہٗ ادا نہیں کرسکوں گا،تو پھر اس کو چاہیے کہ ایسی ذمہ داری قبول نہ کرے۔

امارت سببِ ندامت:

حدیث ٦٧٦ :-

وعنه،قَالَ: قُلْتُ: يَارسول الله ! ألا تَسْتَعْمِلُنِی؟ فَضَرَبَ بِيَدِهِ عَلَى مَنْكِبِي، ثُمَّ قَالَ: يَا أَبَاذَرٍّ ! إنَّكَ ضَعِيفٌ، وإنّها أمانةٌ،وَإنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ،إلَّامَنْ أخَذَهَا بِحَقِّهَا،وَأدَّى الَّذِی عَلَيْهِ فِيهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نے خود ہی حضورِاکرم (ﷺ) سے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! آپ مجھے کسی جگہ کا عامل (حکمران) نہیں بناتے؟ (فلاں کو آپ نے

فلاں جگہ بھیجا، فلاں کو فلاں جگہ؛ مجھے بھی کسی جگہ کا امیر بنادو، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری اس درخواست پر) نبی کریم (ﷺ) نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابوذر! تم کمزور ہو، اور کسی جگہ کا تم کو امیر بنادیا جانا (ایک طرح کا منصب و عہدہ ہے، جو) ایک طرح کی امانت ہے (یہ دنیا میں تو بہت اچھا لگتا ہے کہ بڑائی ملتی ہے، عہدہ و منصب ملتا ہے) لیکن (اگر اس کا حق ادا نہیں کیا گیا تو) قیامت کے روز یہی چیز رسوائی اور ندامت کا سبب ہوگی۔ ہاں ! جو اس کا حق ادا کرے اور اس ذمہ داری کو قبول کرنے پر جو جو کام سر پر آتے ہیں ، ان کو پورے طور پر انجام دے ؛ تب تو ٹھیک ہے۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اپنی طرف سے تو سوال کرنا ہی نہیں چاہیے؛ لیکن اگر سامنے سے کوئی ذمہ داری دی جارہی ہو تو اس کو چاہیے کہ برابر دیکھ لے کہ یہ ذمہ داری جو میرے حوالہ کی جارہی ہے اس کو میں پورے طور پر انجام دے سکتا ہوں یا نہیں ؟ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے جن وسائل اور اسباب ، جن کمالات وخوبیوں، جس صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے وہ مجھ میں ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو پھر اس کو قبول نہ کرے، اس لئے کہ اس صورت میں اس کا حق ادا نہ ہوسکے گا، اور حق ادا نہ ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کہ امانت میں خیانت ہوگی اور قیامت کے روز رسوائی ہوگی۔

حدیث ٦٧٧:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **أن رسول الله** (ﷺ) **قال: إِنَّكُمْ سَتَحْرِصُونَ عَلَى الإِمَارَةِ، وَسَتَكُونُ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ.** (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم لوگ امارت (حکمرانی، کرسی ومنصب) کی حرص ولالچ رکھوگے، آرزو رکھوگے اور تمنا کروگے؛ لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور پچھتاوے کا ذریعہ بنے گی۔

افادات:- فلاں عہدہ مجھے مل جائے، میں صدر بن جاؤں، میں سیکریٹری بن جاؤں، لیکن یہی چیز قیامت کے روز ندامت اور خسارہ کا ذریعہ بنے گی۔اس روایت میں بھی وہی بات ارشاد فرمائی گئی جو اوپر گزرچکی ہے کہ مانگنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی، اور مدد نہ ہونے کی صورت میں اس کے حقوق کی ادائیگی میں جو حق تلفی ہوگی اور کمی رہ جائے گی، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت کے روز سزا بھگتنی پڑے گی۔اسی لئے حضور (ﷺ) نے فرمایا: تم حرص تو رکھتے ہو، لیکن یہی چیز قیامت میں ندامت کا ذریعہ بنے گی۔

حَثُّ السُّلْطَانِ وَالْقَاضِيْ وَغَيْرِهِمَا مِنْ وُلَاةِ الْأُمُوْرِ عَلٰى إِتِّخَاذِ وَزِيْرٍ صَالِحٍ وَتَحْذِيْرِهِمْ مِنْ قُرَنَاءِ السُّوْءِ

بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لئے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب

اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صالح آدمی کو مشیر بناؤ:

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ حکمران جن کے ہاتھ میں کرسی کی وجہ سے کچھ پاورس اور اختیارات ہیں ،چاہے حاکمِ اعلیٰ ہو، کسی جگہ کا گورنر یا کلکٹر ہو، قاضی ہو، یا جتنے بھی سربراہانِ مملکت ہیں ؛ان کو چاہیے کہ کسی صالح آدمی کو اپنا مشیر مقرر کرلیں۔اس لیے کہ جتنے بھی ذمہ دار اور حکمران ہوتے ہیں ان کے پاورس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے آس پاس بہت سارے لوگ جمع ہوجاتے ہیں جو ان کو مشورہ دینے کا کام کرتے ہیں۔اس لیے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ کسی صالح اور نیک آدمی کو -جو اس کام کی صلاحیت بھی رکھتا ہو- اپنے لیے مشیر مقرر کرلیں۔اور بُرے رفقاء اور ساتھیوں سے اپنے آپ کو بچائیں اور ایسوں کی بات ماننے سے بچیں ؛ورنہ یہی لوگ ان کے لیے ہلاکت کا اور جہنم میں ڈھکیلے جانے کا ذریعہ بن جائیں گے۔

دنیا کی دوستیاں قیامت کی دشمنیاں :

اس سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے جو اپنے عام مفہوم کے لحاظ سے یہاں بھی صادق آتی ہے: ﴿اَلۡأَخِلَّآءُ يَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُهُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الۡمُتَّقِينَ﴾(سورۂ زخرف:۶۷) دنیا کے اندر آپس میں جو دوستیاں کی جاتی ہیں ، خاص کر وہ دوستیاں

جو اپنی اغراض کی بنیاد پر ہوتی ہیں ،ایسی سب دوستیاں قیامت کے روز دشمنیوں میں تبدیل ہوجائیں گی،اورجب وہاں اس کا نتیجہ ظاہر ہوگا تو یہ سب ایک دوسرے کے خلاف بارگاہِ الٰہی میں مقدمہ دائر کریں گے کہ اس نے میرا یوں کیا اورتوں کیا﴿ إِلَّا الْمُتَّقِينَ﴾البتہ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں ،اورجن کا تعلق آپس میں اپنی اغراض کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی نسبت پر ہے،ایسی دوستی دنیا میں بھی کارآمد ہےاورآخرت میں بھی کام آئے گی کہ یہ دوستی دشمنی سے نہیں بدلے گی، بلکہ باقی رہے گی،اوراس سے ان شاء اللہ فائدہ بھی پہنچے گا۔

قاعدۂ کلیہ:

حدیث ٦٧٨:-

وعن أَبی سعيدٍ وأبی هريرة رضی اللہ عنهما أَنَّ رسولَ الله (ﷺ) قَالَ:مَا بَعَثَ اللهُ مِنْ نَبِيٍّ ، وَلاَ اسْتَخْلَفَ مِنْ خَليفَةٍ إلاَّ كَانَتْ لَهُ بِطَانَتَانِ:بِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بالْمَعْرُوفِ وتَحُضُّهُ عَلَيْهِ ، وَبِطَانَةٌ تَأْمُرُهُ بالشَّرِّ وَتَحُضُّهُ عَلَيْهِ ، وَالمَعْصُومُ مَنْ عَصَمَ اللهُ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا،یاجس کو خلیفہ بنایاہے،ان کے کچھ خصوصی مشورہ دینے والے ہوتے ہیں، جن میں کچھ لوگ اچھے بھی ہوتے ہیں جو اس کو اچھامشورہ دیتے ہیں اور بھلائی کے لیے آمادہ کرتے

ہیں، اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو برا مشورہ دیتے ہیں اور برائی کے لئے آمادہ کرنے والے اور برائی کی ترغیب دینے والے ہوتے ہیں؛ لیکن معصوم تو وہی رہتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ بچالے۔

افادات:- "بِطَانَةٌ" ایسا آدمی جو بالکل اندر گھسا ہوا ہو، جس کا اس کے اوپر پورا پورا اثر ہوتا ہے، اور وہ مشورہ کے طور پر اپنی ہی بات منواتا ہے۔ اس روایت کے الفاظ پر غور کیجئے "مَابَعَثَ اللہُ مِنْ نَبِيٍّ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کے پاس بھی دونوں طرح کے لوگ ہوں گے۔

اس روایت میں نبی کریم (ﷺ) نے ایک اصول اور قاعدۂ کلیہ بتلادیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہی دستور ہے کہ اگر کسی کو کسی جگہ کی حکمرانی یا کسی جگہ کی کوئی ذمہ داری سونپی جاتی ہے- اور یہ حکم عام ہے، چاہے وہ سربراہِ اعلیٰ اور بادشاہِ وقت ہو، یا کسی صوبہ کی سربراہی ہو، یا اپنی قوم، اپنے خاندان، اپنے قبیلہ کی سرداری، ذمہ داری اور امارت ہو- تو اس امیر کے پاس اثر انداز جو حلقہ ہوتا ہے، اس میں دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں، اچھائی کا مشورہ دینے والے ، بھلائی کی ترغیب دینے والے بھی ہوتے ہیں اور برائی کے لیے ابھارنے والے بھی ہوتے ہیں۔ جتنے بھی صاحبِ اختیار لوگ ہوں گے، جیسے: کسی کو کسی جماعت و برادری کا پریسیڈنٹ بنادیا گیا، کسی کو مدرسہ کا مہتمم بنادیا گیا، کسی کو مسجد کا متولی بنادیا گیا، ان سب کے لیے یہی قانون ہے۔ پھر اگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے خیر مقدر فرمائی ہے تو وہ اچھے مشورے دینے والوں ہی کی سنے گا، اس کی سمجھ میں انہی کی بات بیٹھے گی اور وہی کرے گا، دوسروں کی بات پر دھیان بھی نہیں دے گا، لہٰذا اچھا مشورہ دینے والوں کی وجہ سے اگر اچھا فیصلہ کرے گا وہ کام اچھے طریقہ سے انجام پذیر ہوگا۔ اور اگر

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق شاملِ حال نہیں ہے تو پھر غلط مشورے دینے والوں کی بات ہی اس کی کھوپڑی اور دماغ میں بیٹھے گی، اچھی راہ دکھانے والوں کی بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی اور ان کی نہیں مانے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق چھین رکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی ایسا ہے ہی نہیں جس کے پاس اچھی بات پہنچتی ہی نہ ہو۔

مصاحبین سے بدگمانیاں مت کرو:

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے آس پاس کے حلقہ کے بارے میں دور رہ کر بدگمانی میں مبتلا ہونے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمارے سماج ومعاشرہ میں صاحبِ اختیار کے پاس بیٹھنے والوں کے متعلق بھی بہت زیادہ بدگمانیاں کی جاتی ہیں ، اگر صاحبِ اختیار نے کوئی غلط فیصلہ اور اقدام کیا، تو کہیں نہ کہیں سے وہ بات اس کے کان میں پڑی ہوگی، لیکن ہم لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ متعین ہی کردیتے ہیں کہ فلاں نے ہی ایسا کہا ہوگا، اس لیے اس نے ایسا کیا۔ ارے بھائی! کیا تم سننے گئے تھے کہ اس نے ہی یہ کہا ہے! ایسی بدگمانی بالکل غلط ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ دوسرا آدمی تو صرف بتلانے والا ہوتا ہے ، کرنے والا تو خود ہی ہے، اور جب اس کی توفیق ہی چھین لی گئی ہے تو دوسرا کیا کرے گا۔ پھر بعض مرتبہ تو صرف بدگمانی کی بنیاد پر لوگ اس کے درپئے آزار ہوجاتے ہیں، حالاں کہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی، بعد میں جب حالات کا پتہ چلتاہے اور حقیقت سامنے آتی ہے، تو پھر بدگمانی کرنے والے پچھتاتے ہیں اور

کہتے ہیں کہ ہاں بھائی! دراصل اس نے تو بہت اچھے مشورے دئے تھے، لیکن اُسی نے نہیں مانے، ہم نے خواہ مخواہ ہی بدگمانیاں کیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کے متعلق بدگمانیوں میں مبتلا نہ ہوا جائے، بلکہ اگر حکمران وذمہ دار کی طرف سے غلط چیزیں ہورہی ہیں تو اس کی خیر خواہی یہی ہے کہ اس کے لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھلائی کی توفیق دے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے گا تو وہ بھلی باتیں مانے گا اور اس کے مطابق فیصلے کرے گا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قدرت کا یہ ایک نظام ہے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی کو اچھے مشورے دینے والے موجود ہی نہ ہوں، اس کے اردگرد ایسے لوگ ضرور ہوں گے۔ یہ اور بات رہی کہ توفیق نہ ہونے کی صورت میں وہ ان کی بات نہیں مانے گا اور جب توفیق ملے گی تو انہی کی مانے گا اور وہی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ صاحبِ اختیار کے ساتھ جب بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں:

حدیث ۶۷۹:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم): إِذَا أَرَادَ اللهُ بِالأَمِيرِ خَيْراً، جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ صدقٍ، إِنْ نَسِيَ ذَكَّرَهُ، وَإِنْ ذَكَرَ أَعَانَهُ، وَإِذَا أَرَادَ بِهِ غَيْرَ ذَلِكَ جَعَلَ لَهُ وَزِيرَ سُوءٍ، إِنْ نَسِيَ لَمْ يُذَكِّرْهُ، وَإِنْ ذَكَرَ لَمْ يُعِنْهُ. (رواه أبو داود بإسنادٍ جيدٍ على شرط مسلم)

ترجمہ:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی امیر (حکمران اور سربراہ وذمہ دار، صاحبِ اختیار) کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو ایک مخلص اور خیر خواہ مشورہ دینے والا عطا فرماتے ہیں، اگر وہ بھلی بات کو بھولتا ہے تو یہ یاد دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتی ہے تو یہ مدد کرتا ہے، اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کسی امیر کے ساتھ دوسرا کوئی (یعنی برائی کا) ارادہ فرماتے ہیں تو اس کے لیے برا مشورہ دینے والا ساتھی مقرر کردیتے ہیں، وہ اگر اچھی بات بھولتا بھی ہے تو یہ اس کو یاد نہیں دلاتا ہے، اور اگر اس کو یاد ہوتا ہے تو اس کو انجام دینے میں ساتھ نہیں دیتا (مدد نہیں کرتا، سپورٹ نہیں کرتا)۔

افادات:۔قدرت کے اُسی نظام ودستور کے **متعلق** ۔جو اوپر بیان کیا گیا تھا۔ اس روایت میں بالکل صاف صاف ارشاد فرمادیا ہے۔

النهي عن تولية الامارة والقضاء وغيرهما من الولايات لمن سألها

امارت وقضاء وغیرہ عہدے: ان کا مطالبہ کرنے والوں، یا لالچ رکھنے والوں کو دینے کی ممانعت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس سلسلہ کا یہ آخری باب ہے۔جو آدمی امارت، عہدۂ قضاء ،یا کسی بھی طرح کا عہدہ و منصب مانگے،اس کو وہ عہدہ و منصب دینے سے شریعت میں منع کیا گیا ہے۔اس سلسلہ میں پہلے بتایا جاچکا ہے کہ اسلام کا اصول تو یہی ہے کہ کوئی سامنے سے چل کر مانگے تو مت دو،بلکہ زبان سے نہیں بولا لیکن اس کی حرص و طلب اور لالچ دل میں ہے، اور اپنے دل کی بات اشاروں میں ظاہر کر رہا ہے ،تاکہ سامنے والا سمجھ جائے کہ وہ فلاں عہدہ و منصب مانگ رہا ہے؛ ایسے آدمی کو بھی وہ عہدہ و منصب دینے سے منع کیا گیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ جس کے دل میں عہدہ کی خواہش پیدا ہوئی اس کو اگر دوگے تو خیر نہیں ہے۔پہلے بھی یہ بات آچکی کہ تمہارے مانگنے پر اگر دی گئی تو اس کی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد نہیں ہوگی، اور اگر بغیر مانگے ملا تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی۔

جو کوئی عہدہ مانگے یا اس کی لالچ رکھے اس کو عہدہ نہیں دیتے:

حدیث ٦٨٠:-

عن أَبِي موسَى الأشعرى رضی اللہ عنہ قَالَ:دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) : أَنَا وَرَجُلانِ مِنْ بَنِي عَمِّي،فَقَالَ أَحَدُهُمَا : يَا رسول الله ، أَمِّرْنَا عَلَى بَعْضِ مَا ولاَّكَ الله عزوجل ۔ وقال الآخَرُ مِثْلَ ذَلِكَ . فَقَالَ : إِنَّا وَاللهِ لاَ نُوَلِّي هَذَا العَمَلَ أَحَداً سَأَلَهُ، أَوْ أَحَداً حَرَصَ عَلَيْهِ.

ترجمہ:–حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبیِ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ میرے دو چچازاد بھائی بھی تھے، ان دونوں میں سے ایک نے نبیِ کریم (ﷺ) سے درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! فلاں ذمہ داری کا کام اور عہدہ جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے اختیار میں دیا ہے؛ وہ میرے حوالے کیجئے۔ دوسرے نے بھی ایسی ہی بات کہی۔ اس پر نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کوئی عہدہ ہم سے مانگے، یا دل میں کسی عہدہ کی لالچ رکھے؛ ہم اس کو وہ عہدہ نہیں دیتے۔

افادات:–دوسری روایت میں ہے کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سے کہا : ابو موسیٰ! جاؤ! ہم تم کو مقرر کرتے ہیں، حالاں کہ ان کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں تھا اور وہ اس مقصد کے لیے حاضر بھی نہیں ہوئے تھے، لیکن ان کو یمن کے ایک حصہ کا گورنر بنا کر بھیج دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی خود عہدہ طلب کرے اسے نہیں دیا جائے۔

آج کل تو جمہوریت کا اصول ہی یہ ہے کہ الیکشن کے لیے آپ اپنا نام پیش کرو، جس میں پہلا کام ہی اپنی طرف سے مطالبہ پیش کرنے کا آتا ہے، حالاں کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ جو عہدہ و منصب مانگنے سے ملا کرتا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد ہٹ جایا کرتی ہے، اور جو ذمہ داری بغیر مانگے ملا کرتی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے، اس لیے ہمیں اسلام کی ان ساری تعلیمات کو مدِّ نظر رکھنی چاہئیں

کتاب الادب

باب الحیاء وفضله

والحث علی التخلق به

شرم کا بیان اور اس کی فضیلت

اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیاء اور شرم کسے کہتے ہیں؟:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب کے اخیر میں خود ہی حیاء کی وضاحت فرمائی ہے ویسے حیاء کی تشریح لغوی اعتبار سے یہ کی گئی ہے: "تَغَيُّرٌ وَ إِنْكِسَارٌ يَعْتَرِي الْإِنْسَانُ مِنْ خَوْفِ مَا يُعَابُ بِهٖ وَيُلَامُ عَلَيْهِ" ایسا کام جس کے کرنے کی وجہ سے آدمی پر کوئی داغ اور عیب آتا ہو، یا جس کے کرنے پر لوگ اس پر ملامت کرتے ہوں (کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟) ایسے ڈر سے آدمی کی طبیعت میں ایک طرح کی جو شکستگی پیدا ہوتی ہے اور پھر ایسے کام سے بچنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

جیسے: ایک آدمی کے دل میں سینما دیکھنے کا خیال آیا لیکن وہ سوچتا ہے کہ اگر میں دیکھنے گیا تو لوگ کیا کہیں گے۔ جو بھی کام ایسا ہو جس کے کرنے پر لوگوں کی طرف سے اس پر نکتہ چینی اور ملامت ہوتی ہو، اس پر عیب لگتا ہو، اس خیال سے اس کام کے کرنے کا جذبہ اور حوصلہ ٹوٹے، طبیعت میں شکستگی پیدا ہو؛ اسی کا نام حیاء ہے۔

بعضوں نے اس کو انقباضی کیفیت کہا ہے: "إِنْقِبَاضُ الْإِنْسَانِ عَنْ إِرْتِكَابِ مَا يُكْرَهُ" ناپسندیدہ چیز جس کے کرنے سے آدمی کی طبیعت میں جو جھجک پیدا ہوتی ہے، جس کو گجراتی زبان میں

(સંકોચ) کہتے ہیں، یعنی کسی برے کام کے کرنے سے طبیعت منقبض ہوتی ہے (સંકોચ) محسوس کرتی ہے؛ اسی کا نام حیاء ہے۔یہ تو لغت اور ڈکشنری کے لحاظ سے حیاء کا معنٰی ہوا۔

شریعت کے اعتبار سے بتایاہے کہ یہ ایک وصف اور خُلق ہے۔اللہ تعالٰی نے فطری طور پر جو وصف انسان کے دل میں پیدا کیے ہیں؛ان کو خُلق سے تعبیر کیا جاتاہے۔توجووصف آدمی کو برے کام کے چھوڑنے پر آمادہ کرتاہے، اور کسی بھی حق والے کے حق کی ادائیگی میں (حق کوئی بھی ہو، اللہ کا حق، بندوں کا حق)کوتاہی کرنے سے آدمی کو روکتا ہو؛اس وصف کو شریعت کی اصطلاح میں "حیاء اور شرم" کہتے ہیں۔

شرم توایمان کا حصہ ہے:

حدیث ۶۸۱:-

عن ابن عمرَ رضی اللہ عنھما أنَّ رسولَ اللہِ (ﷺ) مَرَّعَلَی رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ وَھُوَ یَعِظُ أَخَاہُ فِی الحَیَاءِ، فَقَالَ رسولُ اللہِ (ﷺ) : دَعْہُ، فَإِنَّ الْحَیَاءَ مِنَ الإِیمَانِ۔(متفقٌ عَلَیہِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کا گزر ایک انصاری کے پاس سے ہوا جو اپنے بھائی کو شرم کے سلسلہ میں نصیحت کر رہا تھا۔نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا : بھائی! چھوڑو بھی؛(ایسی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے) شرم والی خوبی بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

افادات:- دوسری روایت میں موجود ہے کہ وہ کہہ رہا تھا کہ تو کتنی زیادہ شرم رکھتا ہے جس کی وجہ سے تجھے نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ جیسے: بعض آدمیوں کے مزاج میں اتنی حیاء ہوتی ہے کہ وہ اپنا حق جو دوسرے کے اوپر ہوتا ہے اس کے وصول کرنے میں بھی جھجھک محسوس کرتے ہیں، حیاء کی صفت ان کو سختی کرنے سے روکتی ہے اور سامنے والا اس کا حق نہیں دیتا تو یہ شرماتا اور سوچتا ہے کہ اس سے سختی کے ساتھ کیسے بات کروں۔ اس انصاری کا بھائی بھی ایسا ہی تھا، تو وہ اپنے بھائی کو نصیحت کر رہا تھا کہ اگر تو ایسا ہی کرتا رہے گا تو لوگ تجھے جینے نہیں دیں گے، ایسی شرم اچھی نہیں ہے، اتنا نرم بھی مت رہ، تھوڑا بہت پھُوں پھاں (رعب) کرنی چاہیے۔ نبی کریم (ﷺ) نے اس نصیحت کرنے والے سے کہا: دَعْهُ ! فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الإِيْمَانِ۔ بھائی! ایسی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو ایسا ہی رہنے دو؛ یہ شرم تو ایمان کا ایک حصہ ہے۔ گویا یہ بڑی قیمتی چیز ہے۔ یہ جو کر رہا ہے وہ کوئی برا کام نہیں ہے کہ اس پر آپ اس کو ڈانٹ رہے اور روک رہے ہیں! بلکہ یہ تو ایمان کا تقاضہ ہے، اور یہ وصف جتنا زیادہ ہوگا اتنا ہی اچھا ہے، اس میں کوئی برائی نہیں ہے، اس میں خیر ہی خیر اور بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اگرچہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اس سے کچھ نقصان ہو رہا ہے لیکن حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

حدیث ۶۸۲:-

وعن عمران بن حصینٍ رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ اللہ (ﷺ): اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روایة لمسلمٍ: الحیاءُ خَيْرٌ كُلُّهُ. أَوْ قَالَ: اَلْحَيَاءُ كُلُّهُ خَيْرٌ.

ترجمہ :- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے (اسی واقعہ میں یہ بھی آیاہے کہ وہ بھائی جو نصیحت کررہاتھااس سے) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: حیاء اور شرم توپوری کی پوری بھلائی اور خیر ہی خیر ہے، اس میں کوئی بری چیز ہے ہی نہیں (اس لئے اس بارے میں کوئی نصیحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔)

ایمان کی ایک شاخ:

حدیث ٦٨٣:-

وعن أَبِی هریرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: الإِيمَانُ بِضْعٌ وَسَبْعُونَ أَوْ بِضْعٌ وَسِتُّونَ شُعْبَةً: فَأَفْضَلُهَا قَوْلُ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَالحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الإِيمَانِ. (متفقٌ عليه)

((البِضْعُ)) بكسر الباءِ ويجوز فتحها: وَهُوَ مِنَ الثَّلَاثَةِ إِلَى الْعَشَرَةِ.

وَ((الشُّعْبَةُ)): القِطْعَةُ وَالْخَصْلَةُ. وَ((الإِمَاطَةُ)): الإِزَالَةُ. وَ((الأَذَى)): مَا يُؤْذِي كَحَجَرٍ وشوك وَطِينٍ ورماد وَقَذَرٍ وَنَحْوِ ذَلِكَ.

ترجمہ :- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایمان کی ستّر (۷۰) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، اورایک روایت میں ہے کہ ایمان کی ساٹھ (٦٠) سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جس میں سب سے اعلیٰ درجہ ”لاالٰہ الااللہ“ ہے، اورسب سے کم درجہ تکلیف دینے والی چیز (پتھریاکانٹا، وغیرہ) کو راستہ سے ہٹاناہے، اور حیاء بھی ایمان کی ایک بڑی شاخ ہے۔

افادات:- حیاء اور شرم کی اہمیت کے پیشِ نظراس کو الگ سے بیان کیا۔ایمان کے نتیجہ میں آدمی کو جتنے بھی اچھائی کے کام کرنے ہیں،یا جن برائی کے کاموں سے اپنے آپ کو بچانا ہے، ان تمام اچھائی کے کاموں پر آمادہ کرنے والی اور تمام برائی کے کاموں سے آدمی کو روکنے والی چیز حیاء ہی ہے۔

حقیقی حیاء اور شرم:

ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ نبیؐ کریم (ﷺ) نے حضرات صحابہ سے ارشاد فرمایا:اسْتَحْيُوا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ.قَالَ:قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ !إِنَّا لَنَسْتَحْيِي وَالْحَمْدُ لِلهِ. قَالَ: لَيْسَ ذَاكَ ، وَلَكِنَّ الِاسْتِحْيَاءَ مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ أَنْ تَحْفَظَ الرَّأْسَ وَمَا وَعَى، وَتَحْفَظَ الْبَطْنَ وَمَا حَوَى، وَتَتَذَكَّرَ الْمَوْتَ وَالْبِلَى، وَمَنْ أَرَادَ الآخِرَةَ تَرَكَ زِينَةَ الدُّنْيَا .فَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ فَقَدِ اسْتَحْيَا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ (ترمذی شریف:۲۶۴۶) اللہ تعالیٰ سے ایسی شرم رکھو جیسی شرم رکھنی چاہیے۔صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!ہم تو الحمدللہ شرم رکھتے ہیں۔ حضورِاکرم (ﷺ) نے فرمایا:ایسی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے حقیقی شرم یہ ہے کہ آدمی اپنے سر کی اور جن چیزوں کو سر لئے ہوئے ہے؛ان سب کی حفاظت کرے۔یعنی آنکھیں ،زبان، کان،خیالات،عقائد، تصورات؛یہ ساری چیزیں سر سے تعلق رکھتی ہیں۔ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو جو شریعت کے تقاضہ اور حکم کے خلاف ہو۔ اور پیٹ کی اور جن چیزوں کو پیٹ اپنے اندر لئے ہوئے ہے؛ان سب کی حفاظت کرے۔یعنی

حرام لقمہ سے پیٹ کو بچائے اور غلط طریقہ سے کسی کا مال ہڑپ کرنے سے اپنے آپ کو بچائے۔ اور آدمی موت کو اور موت کے بعد گَل سڑ جانے کو یاد رکھے۔ اور جو آدمی آخرت چاہتا ہے وہ دنیا کی زینت کو چھوڑ دے یعنی آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دے؛ اسی کا نام اللہ تعالیٰ سے حقیقی حیاء ہے

گویا آدمی اپنے پورے جسم کی اس طرح حفاظت کرے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہونے کی نوبت نہ آئے، اور سارے حقوق ادا ہوں ، دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے، گناہوں سے اپنے آپ کو بچائے؛ اسی کو استحضار کی کیفیت کہا جاتا ہے کہ ہر وقت آدمی یہ سوچے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے۔ اسی لئے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حدیثِ جبرئیل میں جس چیز کو احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، ترمذی شریف کی اس روایت میں بھی وہی مقصود ہے۔ جب آدمی میں استحضار والی یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی؛ تو پھر ان شاء اللہ وہ کبھی گناہ نہیں کرے گا۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے، حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: الْحَيَاءُ وَ الإِيمَانُ قُرِنَا جَمِيعًا ، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الآخَرُ (المستدرك على الصحيحين : ٨٥) حیاء اور ایمان دونوں جوڑی ہیں، ایک جاتا ہے تو دوسرا بھی جاتا ہے۔

بے حیائی کی منظّم سازش:

اسی لئے اسلام کے دشمنوں نے خاص کر یہودیوں نے آج سے دوصدی پہلے اٹھارہویں صدی میں پورے عالَم پر اپنا تسلط جمانے کے لئے کچھ فیصلے کئے تھے جو یہودیوں کا پروٹوکول (Protocol) کہلاتا ہے کہ آئندہ ہمیں اپنا نظام کس طرح کا چلانا ہے، ان فیصلوں میں انہوں نے ایک بات یہ طے کی تھی کہ بے حیائی کو ایسی عام کردو کہ آدمی کے مزاج میں سے حیاء اور شرم کا مادّہ ہی ختم ہوجائے۔ آج کل ٹی وی اور انٹرنیٹ پر جتنے بھی پروگرام آتے ہیں اور میڈیا کے مختلف میگزین کے ذریعہ جن کی تشہیر کی جاتی ہے، جو مستقل ایک فن بن چکا ہے، ان ساری چیزوں کی جڑ اور بنیاد شرم وحیاء کے مادّے کو ختم کرنا ہے۔ اسی لئے حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى، إِذَا لَمْ تَسْتَحِي فَافْعَلْ مَاشِئْتَ (صحیح البخاری: ۶۱۲۰) تمہارے اندر سے جب شرم کا مادّہ ختم ہوجائے تو پھر جو چاہو کرو۔ یہ حیاء ہی ہے جو آدمی کو گناہوں سے روکتی ہے، ایک مرتبہ کسی نے حیاء والی دیوار کو ڈھادیا؛ تو پھر وہ کسی بھی طرح کی حرکت کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا۔

عام طور پر عورت کے مزاج میں حیاء اور شرم ہوا کرتی ہے، لیکن بعض عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ جب ان کے اندر سے صفتِ حیاء ختم ہوجاتی ہے، تو پھر کوئی بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا، سب ان سے ڈرتے ہیں۔ کوئی عورت جب بے حیاء ہوکر سامنے آتی ہے تو پھر وہ نہ باپ کی

عزت کو خاطر میں لاتی ہے، اورنہ بیٹے اور شوہر کو خاطر میں لاتی ہے، پھر تو کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔حیاءاور شرم ایک بڑاپردہ اورآڑ ہے، اورہرانسان کے مزاج میں اللہ تعالیٰ نے یہ وصف رکھاہے،اگر یہ وصف ختم کردیاجائے ،اورایسی محنت کی جائے کہ مزاج میں سے یہ مادّہ ختم ہوجائے؛توپھروہ ہر طرح کااقدام کرنے کے لئے تیار ہوجائے گااور کوئی طاقت اس کوروک سکتی نہیں ہے۔"بےحیاء باش وہرچہ خواہی کُن" بے شرم بنواور پھر جوچاہو کرو۔گجراتی میں کہاوت ہے:

"નાંગા ને ન્હાવાનું અને નિચોડવાનુ શું"

یعنی ننگے بن گئے توبس پھرسب کچھ ختم ہوگیا۔جب آدمی میں سے حیاء ختم ہوجاتی ہے تو اس کا مزاج اسی قسم کا بن جاتاہے۔اسی لئے حیاء کی بڑی اہمیت ہے، اسلام نے اپنے اخلاقی نظام کی بنیاد جن چیزوں پررکھی ہے اس میں عفت اورحیاء بنیادی حیثیت رکھتی ہے،اسی لئے اخلاقی نظاموں کو برباد کرنے والے جتنے بھی لوگ ہیں ان کی پہلی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آدمی میں سے حیاء کے مادّہ کوختم کردیاجائے،جب یہ مادّہ ختم ہوجائے گا تو پھرآدمی ساری برائیاں آسانی سے قبول کرتاچلاجائے گا۔

حضوراکرم (ﷺ) کی شرم وحیاء

حدیث ۶۸۴:-

وعن أبي سعيدٍ الخدری رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله (ﷺ) أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ العَذْرَاءِ فی خِدْرِهَا، فَإِذَا رَأَى شَيْئاً يَكْرَهُهُ عَرَفْنَاهُ فی وَجْهِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

قَالَ العلماءُ: حَقِيقَةُ الحَيَاءِ خُلُقٌ يَبْعَثُ عَلَى تَرْكِ القَبِيحِ، وَيَمْنَعُ مِنَ التَّقْصِيرِ فی حَقِّ ذِي الحَقِّ.

وَرَوَيْنَا عَنْ أَبِي القاسم الْجُنَيْدِ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: الحَيَاءُ: رُؤيَةُ الآلاءِ - أَيْ النِّعَمِ - ورُؤْيَةُ التَّقْصِيرِ، فَيَتَوَلَّدُ بَيْنَهُمَا حَالَةٌ تُسَمَّى حَيَاءً. (وَاللهُ أعلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِاکرم (ﷺ) شرم وحیاء میں کنواری لڑکی سے جو اپنے پردہ میں ہو کہیں زائد بڑھے ہوئے تھے، جب آپ کو کوئی بات ناگوار ہوتی تو ہم آپ کے چہرہ سے پہچان لیتے (حضور (ﷺ) غایتِ شرم کی وجہ سے اظہارِ ناپسندیدگی بھی نہ فرماتے تھے)

افادات:- **"کنواری لڑکی اپنے پردہ میں ہو"** کے دو مطلب علماء نے لکھے ہیں۔ ایک جماعتِ علماء نے یہ فرمایا ہے کہ: اس سے پردہ نشین کنواری مراد ہے کہ وہ اس کنواری لڑکی سے جو باہر پھرتی ہو، بہت زیادہ شرمیلی ہوتی ہے، گو کنواری ہر ایک ہی شرم دار ہوتی ہے۔ اسی لیے شریعت نے کنواری لڑکی کے نکاح کی اجازت کے لیے اس کے سکوت کو کافی بتایا ہے کہ کنواری کے لیے شرم طبعی چیز ہے، اور بالخصوص پردہ دار لڑکی۔

اور بعض علماء نے پردہ نشین سے وہ لڑکی مراد لی ہے جو پردہ میں تربیت دی گئی ہو کہ اس کو عورتوں سے بھی پردہ کرایا گیاہو۔چناں چہ باہر پھرنے والی عورتوں سے اس کا پردہ کرانا بہت سے خاندانوں میں آج بھی مروج ہے۔یہ لڑکی جس قدر شرمیلی ہوگی ظاہر ہے۔

دوسرا مطلب بعض علماء نے اپنے پردہ میں ہونے سے کنایہ بتایاہے شبِ عروس کا۔کہ کنواری لڑکی پہلی شب میں جس قدر شرمیلی ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔

باب حفظ السر

کسی کے بھید کی حفاظت کرنا

رازداری سے کام لینا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رازداری کے اصول:

نیا عنوان قائم کیا ہے کہ کسی آدمی نے اپنے کسی معاملہ میں ،اپنی کسی بات میں،یا آپ کے ساتھ کئے گئے کسی سلوک میں آپ سے یہ امید قائم کی کہ آپ اس کو راز میں رکھیں گے، کسی کے سامنے اس کا اظہار نہیں کریں گے؛تو پھر آپ کی یہ ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ اس راز کی حفاظت کریں،کسی کے سامنے اس کا اظہار نہ کریں،البتہ اگر وہ بات خلافِ شرع ہے اوراس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے،تو پھر اس کے راز کالحاظ رکھنالازم نہیں ہے۔ مثلاً:کسی نے آپ کو بتلایا کہ میں فلاں کے گھر میں چوری کرنے والا ہوں ،اوردیکھو!یہ راز کی بات ہے ،تم کسی کو بتلانا مت۔اب آپ بھی یہ سوچیں کہ شریعت میں رازداری کی تاکید آئی ہے،اس کا لحاظ کرتے ہوئے آپ کسی کو واقف نہ کریں ؛تو یہ صحیح نہیں ہے۔اس لیے کہ وہ آدمی جو حرکت کرنے والا ہے وہ تو گناہ کا کام ہے،اس کے نتیجہ میں خدا کے دوسرے بندے کو نقصان پہنچنے والا ہے،اس کو نقصان سے بچانے کے لیے اس کے اس راز سے آگاہ کر دیا جائے تو یہ عمل شریعت کے رازداری والے حکم کے خلاف شمار نہیں ہو گا۔

صریح راز:

اب یہ راز کی جو بات ہوتی ہے اس میں کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ بات کرنے والا خود ہی زبان سے صاف صاف کہہ دیتا ہے کہ یہ بات مَیں آپ کو راز کے طور پر بتا رہا ہوں؛ تب تو بات صاف ہے، اور اس صورت میں اس کو راز ہی سمجھا جائے گا، اس کی حفاظت کرنا ضروری ہو جائے گا، اس کا کسی کے سامنے اظہار کرنا غلط کام ہو جائے گا، اس میں اپنی طرف سے کوئی دوسرا مطلب نکالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

راز کا انداز:

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان سے اس بات کا اظہار تو نہیں کرتا کہ یہ راز ہے، لیکن وہ انداز ایسا اختیار کرتا ہے جس کی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اپنی بات کو راز میں رکھنا چاہتا ہے، جیسے: آپ کو اپنے پاس بلا کر وہاں موجود دوسرے لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ ذرا ہٹ جایئے، مَیں ان سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ یا آپ سے بات شروع کرنے سے پہلے اِدھر اُدھر برابر دیکھا کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے، اور اطمینان کرنے کے بعد آپ سے بات کی؛ تو اس صورت میں اگرچہ اس نے اپنی زبان سے یہ نہیں کہا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ راز کے طور پر ہے، لیکن جو انداز اختیار کیا گیا وہ خود بتلا رہا ہے کہ یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے وہ بطورِ راز اور بھید کے

ہے، آپ کو اس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرنا ہے۔اسی لیے حدیث میں آتا ہے، حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: بات کرنے سے پہلے کوئی آدمی اگر دائیں بائیں دیکھے اور پھر وہ کوئی بات آپ سے کہے؛ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ راز کی بات ہے،اب آپ کو اس بات کی حفاظت کرنی ضروری ہے۔

یہ بھی راز ہے:

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپس کے کچھ معاملات رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں ایک فریق کے دوسرے فریق کے ساتھ کچھ مخصوص تعلقات ہوتے ہیں جن کی شریعت کی طرف سے اجازت بھی دی گئی ہے،ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سلوک کرتے ہیں، مثلاً: میاں بیوی کا تعلق ورشتہ ہے جن کی بنیاد پر آپس میں کچھ معاملات اور باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سب کے سامنے انجام نہیں دی جاتیں ؛وہ بھی راز ہیں۔شریعت اس کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی، جیسا کہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے،اور اس کے اظہار پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ اس لیے آدمی یہ نہ سمجھے کہ مرد اپنے دوستوں کے سامنے ،یا عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ان باتوں کو ظاہر کر سکتی ہے۔شریعت نے اس کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔

یا کاروباری اعتبار سے دو آدمی شریک اور پارٹنر ہیں ،اپنے کاروبار سے تعلق رکھنے والے کچھ معاملات اور چیزیں ہیں جن سے کسی اور کو کوئی نقصان بھی نہیں ہے،تو وہاں پر بھی ان راز اور

بھیدوں کالحاظ کیاجائے گا،اگرچہ بعد یہ شراکت باقی نہ بھی رہے تب بھی ان کوایک دوسرے کی ان چیزوں کا لحاظ رکھناچاہیے۔

حضور (ﷺ) کے رازدار کی رازداری:

بہرحال! شریعت نے جن آداب اور حسنِ اخلاق کی تعلیم دی ہے،ان میں سے یہ بھی ہے کہ راز اور بھید سے تعلق رکھنےوالی چیزوں کاکسی کے سامنےاظہارنہ کیاجائے ۔حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کونبی ٔکریم (ﷺ) نے ایک راز کی بات بتلائی تھی۔غزوۂ تبوک کے موقعہ پر بعض منافقین جوساتھ میں آئے تھے انہوں نے سازش اور اسکیم تیار کی تھی کہ تبوک جانے کاراستہ بڑا طویل ہے اورراستہ میں پہاڑیاں اور بڑی سخت گھاٹیاں آتی ہیں،ان میں سے ایک پہاڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے(نعوذباللہ) اندھیرے میں حضورِاکرم (ﷺ) پر حملہ کرکے آپ کا کام تمام کردیاجائے،وہ منافقین لشکر میں شامل تھے،اللہ تبارک وتعالیٰ نےاس سازش سے حضورِاکرم(ﷺ) کوآگاہ کردیا اور ان منافقین کے نام بھی حضورِاکرم (ﷺ) کوبتلادیئے تھے، پھرحضور (ﷺ)نےان کے ناموں کاتذکرہ بطورِرازکے حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے کیا اور ان منافقین کے نام بھی آپ (ﷺ) نے ان کو بتلائے جن کے متعلق بذریعۂ وحی اللہ تعالیٰ نے یہ بتلادیا تھا ان کی موت نفاق پرہی آنے والی ہے، جن کوتوبہ نصیب ہونے والی تھی ان کے نام نہیں بتلائے تھے،اس لیے کہ منافقین کی بڑی تعدادایسی تھی جن کوموقع بموقع اللہ تعالیٰ نے توبہ

کی توفیق عطا فرمائی تھی اوران کی موت ایمان پر آئی تھی، لیکن بعض ایسے بھی تھے جن کی نفاق کی حالت ہی میں موت آئی، اور اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم ﷺ کو ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے بھی منع فرمادیا تھا، انہی میں سے منافقین کا سردار عبداللہ بن اُبی بھی تھا۔ اس کے جو بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا، وہ مخلص مؤمن تھے۔ اور چوں کہ عبداللہ بن اُبی ظاہری طور پر اپنے آپ کو مسلمان بتلاتا تھا، جتنے بھی منافقین تھے وہ سب اپنی زبان سے تو ایمان ہی ظاہر کرتے تھے، اور حضور ﷺ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اہلِ ایمان والا ہی معاملہ کیا جاتا تھا، یعنی جیسے ایک مسلمان کی جان ومال محفوظ ہے اسی طرح ان کی بھی جان و مال محفوظ سمجھی جاتی تھی، اس کے علاوہ اور معاملات کا بھی حال تھا، ان کے ساتھ کافروں جیسا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ عبداللہ بن اُبی کی طرف سے بہت سے مواقع پر ایسے کام رونما ہوئے تھے کہ جن کی وجہ سے اس کا منافق ہونا سب کے سامنے واضح ہوچکا تھا، بہت سے مواقع پر اس نے مسلمانوں کو اور خود حضورِ اکرم ﷺ کو نقصان پہنچانے کی کوششیں کی تھیں۔ جب عبداللہ بن اُبی کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے حضرت عبداللہ نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے، آپ تشریف لاکر اس کے جنازہ کی نماز پڑھایئے۔ حضور ﷺ تشریف لے گئے، جب جنازہ رکھا گیا اور آپ نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور نماز شروع کرانا ہی چاہتے تھے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور حضور کا کرتہ پکڑلیا اور کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا رہے ہیں؟ اس نے فلاں وقت یہ حرکت کی تھی، فلاں وقت یہ حرکت کی تھی۔ اسلام کے خلاف

اس نے جو جو حرکتیں تھیں وہ سب گنوائیں اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق خود فرمایا ہے کہ اگر آپ ستّر مرتبہ بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کریں، تب بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے؛ پھر بھی آپ اس کی نمازِ جنازہ پڑھائیں گے؟ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سنتے رہے، جب وہ خاموش ہوگئے تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ان کی جنازہ کی نماز پڑھانے سے مجھے صاف صاف منع نہیں فرمایا ہے۔ خیر! آپ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور ابھی آپ وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ آیت ﴿وَلَا تُصَلِّ عَلَىٰٓ أَحَدٍ مِّنْهُم مَّاتَ أَبَدًا وَلَا تَقُمْ عَلَىٰ قَبْرِهِۦٓ﴾ نازل ہوئی، اور اس طرح آئندہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا، اور آپ کو یہ بھی بتا دیا کہ منافقین میں کون کون ہیں جن کی موت نفاق پر آنے والی ہے، اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے نام حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی بتلادیئے تھے، لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کبھی کسی صحابی کے سامنے ان کے ناموں کا اظہار نہیں کیا اسی لیے ان کا لقب "صاحبُ سرِّ رسولِ اللہ" یعنی "حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رازدار" تھا، البتہ چوں کہ ان کو معلوم تھا کہ فلاں فلاں کی موت نفاق پر آنے والی ہے اس لئے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد جب کسی کا انتقال ہوتا تو بعض محتاط صحابہ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بات کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے اور خبر نکلواتے تھے کہ دیکھو! جنازہ کی نماز میں حضرت حذیفہ موجود ہیں یا نہیں؟ اگر وہ حاضر ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی شریک ہوجاتے، ورنہ نہیں جاتے تھے۔ اور ان کا کسی کے جنازہ میں حاضر نہ ہونا اس بات کا قرینہ اور علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ منافق تھا۔ بہرحال! یہ تو دوسرے دیکھتے تھے اور اندازہ لگا

لیتے تھے،لیکن حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا۔اور یہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی وفات کے بعد ایسا کرتے تھے،اس لیے کہ جب تک نبیٔ کریم (ﷺ) موجود تھے وہاں تک تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا،آپ (ﷺ) جس کی جنازہ کی نماز پڑھیں ،اس سے معلوم ہوجاتا تھا کہ یہ مؤمن ہے، توسب لوگ بھی پڑھ لیتے تھے۔

رازامانت ہوتے ہیں :

میں یہ عرض کررہاتھاکہ کسی نے بھی کوئی چیز بطورِ رازاور بھید کے بتلائی ہو،اس کا لحاظ کرنا ضروری ہے،اس لیے کہ راز ایک طرح کی امانت ہے، اور جس طرح امانت کی پاسداری ضروری ہے؛اسی طرح رازاور بھید کی حفاظت بھی ضروری ہے۔چوں کہ اس نے آپ پر اعتمادو بھروسہ کیا ہے اس لئے اس کے خلاف کوئی کام نہیں کیا جاسکتا؛ ورنہ وہ خیانت قراردیا جائے گا۔

عہد کے بارے میں سوال ہوگا:

باری تعالیٰ کاارشاد نقل کیا:﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْؤُولًا﴾جو عہدو پیمان اورایگریمنٹ ہیں ان کوپوراکرو،اس لیے کہ قیامت کے روزآپس کے عہدو پیمان کے متعلق پوچھ ہوگی کہ ان کوپوراکیایانہیں ؟ان کے حقوق کو اداکیایانہیں؟جو راز اور بھید ہوتے ہیں وہ بھی ایک طرح کے عہدہی ہوتے ہیں،اس لیے ان کوپوراکرنا بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص:

حدیث ۶۸۵:-

عن أَبِي سعيدن الخدری رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِنَّ مِنْ أَشَرِّ النَّاسِ عِنْدَ اللهِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلَ يُفْضِي إِلَى الْمَرْأَةِ وتُفْضِي إِلَيْهِ ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے برے مرتبہ والا اورسب سے بدترین آدمی وہ ہے کہ جو تنہائی میں اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کے لیے بے پردہ ہوا، اوربیوی بھی شوہر کے لیے بے پردہ ہوئی (میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ہے، ان کا اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور صحبت کے لیے ستر کھولا جائے گا) پھر وہ آدمی اپنی بیوی کا بھید لوگوں کے سامنے ظاہر کرتا پھرے۔

افادات:- یعنی شوہر ہونے کی حیثیت سے تنہائی میں جو معاملہ اپنی بیوی کے ساتھ انجام دیا جاتاہے، اور میاں بیوی کے تعلقات کے نتیجہ میں آپس جو کچھ بھی ہورہاہے؛ ظاہر ہے کہ وہ سب ایک طرح کا بھید اورراز ہے، اس لیے اگر شوہر کسی کے بھی سامنے - چاہے وہ جگری دوست ہی کیوں نہ ہو- اس کا اظہار کرتاہے؛ تو قیامت کے روز ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں بدترین شخص ہوگا۔یہی حکم عورت کا بھی ہے کہ اگر عورت اپنی سہیلیوں کے سامنے ایسی چیزوں کا اظہار کرتی ہے۔

چوں کہ عام طور پر یہ چیزیں مردوں کی طرف سے زیادہ پیش آتی ہیں، اس لیے مردوں کا تذکرہ کیا گیا، لیکن آج ایسا زمانہ آگیا ہے کہ عورتیں مردوں کے مقابلہ میں ایسی باتیں زیادہ کہنے لگی ہیں۔ بہر حال! یہ حکم دونوں کے لیے ہے کہ میاں بیوی کا آپس کا معاملہ ایک طرح کا راز ہے جس کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا جاسکتا۔

رازداری کا ایک واقعہ:

حدیث ٦٨٦:-

وعن عبدِ الله بن عمر رضی الله عنهما: أنَّ عمرَ رضی الله عنه حِيْنَ تَأَيَّمَتْ بِنْتُهُ حَفْصَةُ، قَالَ: لَقِيتُ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ رضی الله عنه، فَعَرَضْتُ عَلَيْهِ حَفْصَةَ، فَقُلْتُ: إنْ شِئْتَ أَنْكَحْتُكَ حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ؟ قَالَ: سَأَنْظُرُ فِي أَمْرِي. فَلَبِثْتُ لَيَالِيَ ثُمَّ لَقِيَنِي، فَقَالَ: قَدْ بَدَا لِي أَنْ لاَ أَتَزَوَّجَ يَوْمِي هَذَا. فَلَقِيتُ أَبَابَكْرٍ رضی الله عنه، فقلتُ: إنْ شِئْتَ أَنْكَحْتُكَ حَفْصَةَ بِنْتَ عُمَرَ؟ فَصَمتَ أَبُو بَكْرٍ رضی الله عنه، فَلَمْ يَرْجِعْ إِلَيَّ شَيْئاً! فَكُنْتُ عَلَيْهِ أَوْجَدَ مِنِّي عَلَى عُثْمَانَ. فَلَبِثَ لَيَالِيَ ثُمَّ خَطَبَهَا النَّبِيُّ (ﷺ)، فَأَنْكَحْتُهَا إِيَّاهُ. فَلَقِيَنِي أَبُو بَكْرٍ، فَقَالَ: لَعَلَّكَ وَجَدْتَ عَلَيَّ حِيْنَ عَرَضْتَ عَلَيَّ حَفْصَةَ فَلَمْ أَرْجِعْ إِلَيْكَ شَيْئاً؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ. قَالَ: فَإِنَّهُ لَمْ يَمْنَعْنِي أَنْ أَرْجِعَ إِلَيْكَ فِيمَا عَرَضْتَ عَلَيَّ إِلاَّ أَنِّي كُنْتُ عَلِمْتُ أَنَّ النبيَّ (ﷺ) ذَكَرَهَا، فَلَمْ أَكُنْ لأُفْشِيَ سِرَّ رسول الله (ﷺ)، وَلَوْ تَرَكَهَا النَّبِيُّ (ﷺ) لَقَبِلْتُهَا. (رواه البخاری)

((تَأَيَّمَتْ)) أيْ: صَارَتْ بِلاَ زَوْجٍ، وَكَانَ زَوْجُهَا تُوُفِّيَ. ((وَجَدْتَ)): غَضِبْتَ

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (راز سے تعلق رکھنے والا ایک واقعہ) بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (جو بعد میں اُم المؤمنین بنیں) کے پہلے شوہر کا جب انتقال ہوا (جن کا نام خُنَیس بن حذافہ سہمی تھا، غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے، غزوۂ اُحد میں زخمی ہوئے اور اسی میں ان کا انتقال ہوا) تو وہ بیوہ ہوئیں۔ جب عدت پوری ہوگئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: اگر تم چاہو اور تمہارے دل میں رغبت ہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دیدوں (گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی کا پیغامِ نکاح لے کر بذاتِ خود گئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بات کی) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جواب میں اس وقت تو یہ کہا کہ میں سوچوں گا، پھر چند دن گزرنے کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مجھ سے ملے اور کہا: سوچنے کے بعد مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مَیں آپ کی صاحبزادی سے نکاح کرنا نہیں چاہتا (حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) اس کے بعد میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملا اور ان سے کہا: اگر تم چاہو تو مَیں اپنی بیٹی حفصہ کو تمہارے نکاح میں دینے کے لیے تیار ہوں۔ میری اس پیشکش اور درخواست پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا (نہ ہاں کہا اور نہ منع کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) مجھے ان پر حضرت عثمانؓ کے مقابلہ میں زیادہ ناراضگی ہوئی (اس لیے کہ انہوں اگرچہ "نا" کہا، لیکن جواب تو دیا، اور یہ تو کچھ بولتے ہی نہیں) خیر! پھر چند دن گزرے تھے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حفصہ کے لیے پیغامِ نکاح بھیجا، تو مَیں نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نکاح کرادیا۔ جب نکاح ہوگیا اس کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ میرے پاس ملاقات کے لیے آئے اور کہا: فلاں موقع پر تم نے مجھے اپنی صاحبزادی کے ساتھ نکاح کے لیے پیشکش کی تھی اور مَیں خاموش رہا تھا، شاید اس کی وجہ سے تم کو برا معلوم ہوا ہے، اور تم مجھ سے ناراض ہو؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ میں نے جواب اس

لیے نہیں دیا تھا کہ ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) نے میرے سامنے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ کیا تھا (اور آپ (ﷺ) کے اندازِ تذکرہ سے مَیں یہ سمجھا تھا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کا ارادہ ان کے ساتھ نکاح کرنے کا ہے۔ اگرچہ یہ بات آپ کو معلوم نہیں تھی لیکن مجھے تو معلوم تھی، اس لیے جب آپ نے میرے سامنے ان کے نکاح والی بات پیش کی تو چوں کہ وہ بات میرے علم میں تھی، اس لیے میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور یہ سوچا کہ آپ (ﷺ) نے جو تذکرہ کیا ہے جس سے آپ کا ارادہ معلوم ہو رہا ہے) لیکن آئندہ چل کر اگر نبی کریم (ﷺ) ان سے نکاح نہیں کریں گے ،اور مجھے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ نبی کریم (ﷺ) کا ارادہ نکاح کرنے کا نہیں ہے، تو مَیں آپ کی پیشکش قبول کرلوں گا (اس لیے جواب میں مَیں نے نہ "نا" کہا، اور نہ "ہاں" کہا۔ اگر "نا" کا جواب دیتا تو دروازہ بند ہو جاتا، اور اگر ہاں کہتا تو جب حضور (ﷺ) نے ایک بات ارشاد فرمائی تھی اس کا لحاظ نہ رہتا۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ: پھر آپ مجھے بتا دیتے نا کہ ایسی ایسی بات ہے۔ اس وقت کیوں نہیں بتایا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا) مَیں حضورِ اکرم (ﷺ) کا بھید کیسے کھول سکتا ہوں (یعنی جو خلاصہ میں ابھی کر رہا ہوں۔ یہی خلاصہ اگر میں اس وقت کرتا تو چوں کہ حضور (ﷺ) نے میرے سامنے تذکرہ کیا تھا اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ حضور (ﷺ) کا نکاح کرنے کا ادارہ ہے، اور یہ بات آپ (ﷺ) نے میرے سامنے ایک راز کے طور پر کہی تھی، اگر میں تمہارے سامنے وہ راز بتلا دیتا تو مطلب یہ ہوتا کہ میں حضور (ﷺ) کے راز کو تمہارے سامنے کھول رہا ہوں، اب جبکہ وہ معاملہ ہو چکا ہے تو آپ کی ناراضگی دور کرنے کی غرض سے میں اس بات کی وضاحت کر رہا ہوں)

نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟:

افادات:- یہاں ایک مسئلہ اور آگیا کہ نکاح کا پیغام لڑکے والے بھیجیں یا لڑکی والے؟ ویسے عورت کے احترام کا تقاضہ یہی ہے کہ لڑکے والوں کی طرف سے پیغام بھیجا جائے اور رشتہ کے لیے مطالبہ کیا جائے کہ ہم اپنے لڑکے کا تمہاری لڑکی سے رشتہ چاہتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے برعکس دوسری شکل جائز ہی نہیں، بلکہ اگر کسی موقع پر دیکھا کہ کوئی لڑکا نیک ہے اور جگہ بھی اچھی ہے اور ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ ہے، تو اس صورت میں لڑکی والے سامنے چل کر درخواست کریں اور مطالبہ کریں کہ اگر تم اپنے لڑکے کا ہماری لڑکی سے نکاح کرانا چاہو، تو ہم رشتہ دینے کے لیے تیار ہیں؛ یہ بھی شریعت سے ثابت ہے۔ دیکھو! حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ کے لیے خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ اگر تم چاہو تو میں اپنی بیٹی حفصہ کا نکاح تم سے کر دوں۔

ایک اور روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اکرم (ﷺ) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ میری بہن سے نکاح کر لیجیے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے پوچھا: کیا تم ایسا چاہتی ہو؟ اس لیے کہ کسی کے شوہر کے نکاح میں کوئی دوسری عورت آئے یہ تو عام طور پر عورت کا مزاج نہیں ہے، اس لیے حضور (ﷺ) نے ان کا امتحان لینے کے لیے پوچھا۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کے نکاح ہوں، اور آپ

کسی اور سے بھی نکاح تو کرہی رہے ہیں ،اور کسی بھی عورت کا آپ کے نکاح میں آنا اس کے لیے دنیاوآخرت میں بڑی سعادت کی بات ہے،تومیں یہ چاہتی ہوں کہ یہ سعادت میری بہن کو نصیب ہوجائے۔ حضور (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے ارشاد فرمایا: وہ میرے لیے حلال نہیں ہے، اس لیے کہ کسی عورت کے نکاح میں ہوتے ہوئے اس کی بہن سے نکاح کرنا حرام ہے۔ بہرحال! امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "الجامع الصحیح"میں مستقل ایک عنوان قائم کیاہے:باب عَرْضِ الإِنْسَانِ ابْنَتَهُ أَوْ أُخْتَهُ عَلَى أَهْلِ الْخَيْرِ ،اس کے تحت اس روایت کولائے ہیں ،جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی والوں کی طرف سے پیشکش کی جاسکتی ہے۔(بخاری شریف: رقم الحدیث:۵۱۲۳)

آج ہمارے سماج میں اس کو معیوب سمجھ کرلڑکی والے بیٹھے رہتے ہیں یہاں تک کہ لڑکی کی عمربڑی ہوجاتی ہے اور پھرزندگی بھر اس کانکاح نہیں ہوپاتا۔اس لیے معلوم ہوجاناچاہیے کہ اگرچہ بہترشکل تووہی تھی کہ انتظارکیاجاتا ،لیکن جب دیکھ رہے ہیں کہ وہ شکل نہیں بن رہی ہے تو پھراپنی طرف سے پیش قدمی کرکے معاملہ کونمٹانے کی ضرورت ہے،اس انتظار میں بیٹھے رہناکہ سامنے سے رشتہ آئےتو شادی کریں گے اور رشتہ نہ آئےتولڑکیوں کے نکاح نہ کرنا، یہاں تک کہ ساری زندگی اسی طرح گزر جائے،یہ پسندیدہ نہیں ہے،اس کے نتیجہ میں پھربہت ساری برائیاں پھیلتی ہیں۔

فوائدِ حدیث :

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر آپ کے کسی طرزِ عمل سے کسی کو ناراضگی ہوئی ہو، اور اسی وقت اس بات کا خلاصہ کرنے میں دوسری کوئی خرابی لازم آتی ہو تو آپ اس وقت خاموشی اختیار کر سکتے ہیں، بعد میں جب وہ خرابی نہ رہے، تو پھر آپ اس بات کا خلاصہ کر کے اس ناراضگی کو دور کرلیں۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے تذکرہ کیا تو انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارادہ ان سے نکاح کرنے کا ہے، تو آپ پیغام بھیجیں گے ہی! اس لیے اگر میں ابھی سے کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اس لیے کہ اس وقت تو صرف آپ کا ارادہ معلوم ہوا تھا، اب معلوم نہیں کہ اس ارادہ میں پختگی آکر آپ اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں یا نہیں؟ اس لیے یہ چیز راز ہی کی تھی، اور انہوں نے اس کا لحاظ کیا۔ لیکن ہم لوگ ایسے معاملات میں ذرا فاسٹ (Fast) چل جاتے ہیں، اور یہی سوچنے لگ جاتے ہیں کہ جب ارادہ کا اظہار کیا ہے تو اگر میں ابھی کہہ دوں تو اس میں کیا حرج ہے! اگر سامنے والے نے کہا ہو کہ آپ کہہ دینا تب تو ٹھیک ہے، لیکن جب اس نے کہا نہیں ہے، بلکہ صرف اپنے ارادہ کا اظہار کیا ہے تو ہمیں حق نہیں پہنچتا کہ اس بات کا کسی کے سامنے اظہار کریں۔

اور یہاں حضور (ﷺ) نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ یہ بات راز کی ہے، بلکہ جس انداز سے تذکرہ کیا تھا اس سے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ میرے سامنے اس کا تذکرہ فرمارہے ہیں، کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی اپنے کسی ارادہ کا اظہار صرف ہمارے ہی سامنے کرے، کسی اور کے سامنے نہ کرے، جس سے پتہ چلے کہ وہ آئندہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے، تو یہ بھی اس کا راز ہے جس کا کسی دوسرے کے سامنے اظہار ہونا نہیں چاہیے۔

حضور (ﷺ) کے مرض الوفات کا واقعہ:

حدیث ۶۸۷:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كُنَّ أزْوَاجُ النَّبِيِّ (ﷺ) عِنْدَهُ، فَأقْبَلَتْ فَاطِمَةُ رضی اللہ عنہا تَمْشِي، مَا تُخْطِئُ مِشيتُها مِنْ مِشْيَةِ رسولِ الله (ﷺ) شَيْئاً، فَلَمَّا رَآهَا رَحَّبَ بِهَا، وقال: مَرْحَباً بِابْنَتِي. ثُمَّ أجْلَسَهَا عَنْ يَمِينِهِ أَوْ عَنْ شِمَالِهِ ثُمَّ سَارَّهَا، فَبَكَتْ بُكَاءً شَدِيداً. فَلَمَّا رَأى جَزَعَهَا، سَارَّهَا الثَّانِيَةَ، فَضَحِكَتْ. فقلتُ لَهَا: خَصَّكِ رسولُ الله (ﷺ) مِنْ بَيْنِ نِسَائِهِ بِالسِّرَارِ، ثُمَّ أنْتِ تَبْكِينَ! فَلَمَّا قَامَ رسولُ الله (ﷺ) سَألْتُهَا: مَا قَالَ لَكِ رسولُ الله (ﷺ)؟ قالت: مَا كُنْتُ لأُفْشِي عَلَى رسول الله (ﷺ) سِرَّهُ. فَلَمَّا تُوُفِّيَ رسولُ الله (ﷺ) قُلْتُ: عَزَمْتُ عَلَيْكِ بِمَا لِي عَلَيْكِ مِنَ الحَقِّ لَمَا حَدَّثْتِنِي مَا قَالَ لَكِ رسول الله (ﷺ)؟ فقالت: أمَّا الآن فَنَعَمْ. أمَّا حِينَ سَارَّنِي فی المَرَّةِ الأُولَى، فأخْبَرَنِي أنّ جِبْرِيلَ كَانَ يُعَارِضُهُ القُرآنَ فی كُلِّ سَنَةٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ، وَأنَّهُ عَارَضَهُ الآنَ مَرَّتَيْنِ، وَإِنِّي لا أُرَى الأجَلَ إِلاَّ قَدِ اقْتَرَبَ، فَاتَّقِي اللهَ وَاصْبِرِي، فَإِنَّهُ نِعْمَ السَّلَفُ

أَنَا لَكِ، فَبَكَيْتُ بُكَائِي الَّذِي رَأَيْتِ. فَلَمَّا رَأَى جَزَعِي سَارَّنِي الثَّانِيَةَ فَقَالَ: يَا فَاطِمَةُ! أَمَا تَرْضَيْنَ أَنْ تَكُونِي سَيِّدَةَ نِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ أَوْ سَيِّدَةَ نِسَاءِ هٰذِهِ الْأُمَّةِ؟ فَضَحِكْتُ ضَحِكِي الَّذِي رَأَيْتِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام ازواجِ مطہرات مرض الوفات میں آپ کے پاس بیٹھیں ہوئی تھیں، اسی درمیان حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں، ان کی چال حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چال سے ذرّہ برابر بھی فرق نہیں رکھتی تھی (جس طرح حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) چلتے تھے، ہوبہو اسی انداز سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا چلتی تھیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی اس بیماری میں اپنی چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو آتے ہوئے دیکھا) تو ان کو مرحبا اور خوش آمدید کہا (معلوم ہوا کہ آنے والے کا "Wel Come" کرنا چاہیے، تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میری آمد پر ان کو مسرت ہے، یہ بھی آنے والے کا ایک طرح کا اکرام ہے کہ اس کا استقبال اس انداز سے کیا جائے جس سے اس کا جی خوش ہو جائے۔ مہمان کے ساتھ جو آداب برتے جاتے ہیں ان میں پہلا ادب یہی ہے۔ اس معاملہ میں بھی ہمارے یہاں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں دیکھو! حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:) "مَرْحَبًا بِابْنَتِي" پیاری بیٹی! آؤ، تمہارا آنا باعثِ مسرت ہے۔ پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو اپنے پاس بٹھایا، اور ان کے کان میں رازدارانہ انداز میں کوئی بات ارشاد فرمائی، جس کو سن کر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بہت روئیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب ان کی اس بے صبری اور تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ ان کے کان میں رازدارانہ طور پر کوئی بات ارشاد فرمائی جس کو سن کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا ہنس پڑیں اور خوش ہو گئیں، ان کا غم دور ہو گیا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے کہا: یہاں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام ازواجِ مطہرات بیٹھی ہوئی ہیں ان کو چھوڑ کر حضور

(ﷺ)نے تمہارے کان میں ایک بات کہی، جو تمہارے لیے بڑے فخر کی چیز تھی؛ پھر بھی تم رونے لگیں ؟ پھر جب حضور (ﷺ) وہاں سے ہٹے۔اور بعض روایتوں میں ہے کہ جب وہ خود وہاں سے اُٹھیں تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان سے پوچھا : حضور (ﷺ) نے تمہارے کان میں کیا بات کہی تھی؟ذرا مجھے بھی بتاؤ۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: میں حضور (ﷺ) کے بھید کو کھولوں گی نہیں (جب کہ سب موجود تھیں اور میرے کان میں یہ بات کہی،اس کا مطلب ہی یہ تھا کہ وہ بات ان سب کے سامنے ظاہر کرنے جیسی نہیں ہے،اگر سب کو بتانی ہوتی تو حضور(ﷺ)میرے کان میں کیوں فرماتے؟اس لیے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے انکار کر دیا اور نہیں بتلایا)حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب حضور(ﷺ) کا انتقال ہو گیا اس کے بعد مَیں نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو قسم دے کر کہا: میرا تم پر ماں ہونے کی حیثیت سے حق ہے ،اس کا واسطہ دے کر مَیں تم کو تاکید کرتی ہوں کہ حضور (ﷺ) نے تم سے جو کہا تھا وہ مجھے بتاؤ۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا: ہاں ! اب وہ بات بھید نہیں رہی،اس لیے اب بتانے میں بھی کوئی اشکال نہیں،لہٰذا میں بتاتی ہوں۔پہلی مرتبہ حضور(ﷺ)نے رازدارانہ انداز میں میرے کان میں جو بات ارشاد فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ: حضرت جبرئیل علیہ السلام ہر سال رمضان المبارک میں میرے ساتھ قرآنِ پاک کا دَور ایک مرتبہ کرتے تھے،لیکن اس سال دو مرتبہ دَور کیا(حضور(ﷺ) نے حضرت جبرئیل کو سنایا اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور (ﷺ) کو سنایا)اس سے مَیں یہ سمجھتا ہوں کی میری موت کا وقت قریب آگیا ہے، اور اس بیماری میں ہی میری موت آنے والی ہے،اس لیے تم اللہ سے ڈرتی رہنا اور صبر سے کام لینا،اس لیے کہ میں تمہارے لیے بڑا اچھا پیش رو ہوں۔اس پر مَیں رو پڑی تھی جیسا کہ آپ نے دیکھا تھا کہ بڑا سخت رونا آیا تھا۔جب حضور (ﷺ) نے میری تکلیف کو دیکھا تو پھر دوبارہ رازدارانہ انداز میں مجھ

سے ایک بات ارشاد فرمائی: اے فاطمہ! کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ تم ایمان والی عورتوں کی سردار بنائی جاؤ گی، یا اس امت کی عورتوں کی تم سردار ہوگی؟ (گویا اتنا بڑا شرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا) تو میں خوشی میں ہنس پڑی جیسا آپ نے دیکھا۔

افادات:- یہاں یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ دیکھئے! حضور (ﷺ) نے ایک بات بطورِ راز کے ان کے کان میں ارشاد فرمائی تھی تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اتنا لحاظ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو حضور (ﷺ) کی بڑی لاڈلی زوجۂ مطہرہ ہیں، ان کے پوچھنے پر بھی ان کو نہیں بتلایا۔

"فَرَطٌ" یعنی پیش رو۔ جیسے اگر ہمیں بمبئی جانا ہو، تو ہمارا کوئی آدمی ہم سے پہلے بمبئی پہنچ جائے اور ہمارے لیے وہاں قیام کی سہولت کا نظم کر لے؛ اسی کو "فَرَطٌ" یعنی پیش رو سے تعبیر کرتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا کہ کسی قافلہ کو سفر کر کے جہاں جانا ہوتا تھا، تو کچھ لوگ پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے تھے، اور قیام کی تیاریاں کر لیتے تھے، خیمے لگا دیتے تھے، پانی وغیرہ کا انتظام کر لیتے تھے، تاکہ بعد میں آنے والوں کو دشواری پیش نہ آئے۔ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں: مَیں بھی پہلے جا رہا ہوں، تاکہ تم بعد میں آؤ تو وہاں تیاریاں ہو جائے۔

بہر حال! حضور (ﷺ) نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اپنی وفات کی اطلاع دی اور حضور (ﷺ) کی تمام ازواجِ مطہرات وہاں بیٹھی ہوئی تھیں، اور کسی بھی عورت کے لیے اپنے شوہر کی موت کا تصور سوہانِ روح ہوتا ہے، اس لیے حضور اکرم (ﷺ) اس چیز کو ان کے سامنے ظاہر کرنا نہیں

چاہتے تھے،اور یہ بات حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے رازدارانہ انداز میں صرف حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بتلائی۔ اور ظاہر ہے وہ بیٹی تھی اور ایک بیٹی کے لیے بھی اپنے باپ کی جدائی بڑی تکلیف دہ ہوا کرتی ہے ،تو اس پر وہ روپڑیں ،ان کی تسلی کے لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری بات ارشاد فرما کر اپنی وفات کی اطلاع دینے سے ان کو جو رنج وتکلیف ہوئی تھی اس کی تلافی فرمادی۔

بعض بھید ہمیشہ کے لیے بھید ہوتے ہیں :

حدیث ٦٨٨ :-

وعن ثَابِتٍ عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَى عَلَيَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) وَأنَا أَلْعَبُ مَعَ الغِلْمَانِ، فَسلم عَلَيْنَا، فَبَعَثَنِی إِلَى حاجَةٍ، فَأَبْطَأتُ عَلَى أُمِّي. فَلَمَّا جِئْتُ، قالت: مَا حبَسَكَ؟ فقلتُ: بَعَثَنِی رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) لِحَاجَةٍ، قالت: مَا حَاجَتُهُ؟ قُلْتُ: إنَّهَا سرٌّ. قالت: لا تُخْبِرَنَّ بِسرِّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) أحداً. قَالَ أَنَسٌ: وَاللهِ لَوْ حَدَّثْتُ بِهِ أحداً لَحَدَّثْتُكَ بِهِ يَا ثَابِتُ. (رواہ مسلم وروی البخاری بعضہ مختصراً)

ترجمہ:-(حضرت ثابت بنانی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کے خاص شاگرد اور خادمِ خاص تھے اور حضرت اَنس رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خادمِ خاص تھے)تو حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:ایک مرتبہ جب کہ میں بچہ تھا اور بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے پاس تشریف لائے،سلام کیا اور مجھے ایک کام کے لیے بھیجا۔چوں کہ میں ایک کام سے گیا تھا اس وجہ سے گھر پر والدہ کے پاس دیر سے پہنچا،تو میری والدہ نے پوچھا: دیر سے کیوں آئے؟میں نے کہا: حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک کام کے لیے بھیجا تھا۔ کہا:کس کام کے لیے بھیجا تھا؟مَیں نے کہا:وہ راز کی بات ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک بھید

ہے،اس لیے مَیں نہیں بتاؤں گا۔اس پر والدہ نے بھی کہا: ٹھیک ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھید کسی کو بھی مت بتانا۔بعدمیں جب اس واقعہ کو حضرت ثبات بنانی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرمارہے تھے اس وقت کہاکہ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: اے ثابت!اگروہ بات مَیں کسی سے کہتاتوتم سے کہتا(لیکن میں نے کسی سے نہیں کہی، اورنہ کبھی کسی کو کہوں گا)

افادات:-اس روایت کولاکر یہ بتاناچاہتے ہیں کہ بعض بھیداور راز ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو کبھی بھی کسی کونہیں بتائے جاتے۔دیکھو!اوپر آیاکہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نےاپنی وفات کی خبردی تھی، توحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد وہ بات بھید نہیں رہی اس لیے اگراس کا اظہار کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ فرمایاتھاتویہ نہیں کہا جاسکتاکہ بھید کھولا۔یاجیسے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہاسے نکاح کا ارادہ فرمایا تھا توجب تک کہ نکاح نہیں ہواتھاوہاں تک وہ بھیدکی بات تھی،لیکن جب نکاح ہوگیاتو اب وہ بات بھیدکی نہیں رہی،بلکہ ساری دنیاکے سامنے آگئی۔اب اگرکوئی کہے کہ پہلے مجھ سے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ کہاتھاتواس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔لیکن بعض بھید اورراز ایسے ہوتے ہیں کہ جوہمیشہ کے لیے ہی بھید ہوتے ہیں۔اس روایت کویہاں لاکر یہی بتاناچاہتے ہیں کہ دیکھو!حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعدحضرت اَنس رضی اللہ عنہ حضرت ثبات بنانی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کہتے ہیں کہ اگروہ بات کسی سے کہتاتووہ تم سے کہتا، لیکن میں کسی کونہیں کہوں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بعض راز ایسے ہوتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے راز اور بھید کی ہی حیثیت رکھتے ہیں۔اب وہ کون سے بھید ہوتے ہیں ؟ تو یہ ہر آدمی کی اپنی اپنی سمجھداری کی بات ہے ،آدمی اپنی عقل سے اس کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

الوفاء بالعهد وإنجاز الوعد

عہد وپیمان اور وعدہ پورا کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَأَوْفُوا بِالعَهْدِ إِنَّ العَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً . (الاسراء:۳۴)﴾

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ . (النحل:۹۱)﴾

وقال تعالیٰ :﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ. (المائدۃ:۱)﴾

وقال تعالیٰ:﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لاَ تَفْعَلُونَ كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لاَ تَفْعَلُونَ. (الصف:۲،۳)﴾

عہد و پیمان کو پورا کرنے کا اہتمام :

عنوان قائم کیاہے:عہد و پیمان(جس کو گجراتی میں قرار (કરાર) اور انگریزی میں ایگریمنٹ(Agreemant) کہتے ہیں)اور کسی بھی طرح کے وعدہ کو پورا کرنے کا اہتمام کرنا۔

اسلام نے جن اخلاق اور اعمالِ صالحہ کی تعلیم دی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آدمی کسی کے ساتھ جو بھی عہد وپیمان اور وعدہ کرے اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرے ، یہ ایک ضروری چیز ہے اور قرآنِ کریم اور نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں اس کی بڑی تاکید ہے۔ اس سلسلہ میں چند آیتیں پیش کی ہیں :-

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً (الاسراء:۳۴)﴾ جو عہد وپیمان، قرار (ﺇﻗﺮﺍﺭ)اور ایگریمنٹ(Agreemant)تم کسی کے ساتھ کرو؛ اس کو پورا کرو۔اس لئے کہ جو عہد و پیمان کیا جاتا ہے،اس کے متعلق کل کو قیامت میں سوال ہوگا اور پوچھا جائے گا کہ جو عہد وپیمان تم نے کیا تھا اس کو پورا کیا یا نہیں؟مطلب یہ ہے کہ اگر اس کو پورا کرنے میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے یا اس کو پورا نہیں کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر سزا دی جائے گی۔

کامیاب اہلِ ایمان کی نشانیوں میں سے یہ ہے:

قرآنِ پاک میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (المؤمنون:۱)﴾ کامیاب ہونے والے اہلِ ایمان کے کچھ اوصاف،نشانیاں اور علامتیں بتلائی گئی ہیں،ان میں ایک وصف یہ بھی بیان کیا ہے:﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ(٨)﴾ جو اپنی امانتوں اور عہدوپیمان کی رعایت کرتے ہیں،اس کا خیال رکھتے ہیں۔جو عہدو پیمان کسی کے ساتھ کیا گیا ہے اس کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں،اس میں اپنی طرف سے ذرّہ برابر بھی کوتاہی کا ارتکاب نہیں کرتے۔جب یہ ایسی چیز ٹھہری کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق سوال ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کا اہتمام کرنا بھی ضروری ٹھہرا۔

اسی کو دوسری جگہ فرمایا:﴿وَأَوْفُوا بِعَهْدِ اللهِ إِذَا عَاهَدْتُمْ (النحل:۹۱)﴾جب تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہدوپیمان کرلیا تو اس کو پورا کرنے کا اہتمام کرو۔

قرآنی ایک اصول:

فقہاء نے لکھا ہے کہ قرآنِ پاک اور احادیث سے جو احکام ثابت ہوتے ہیں ان کی اصولی چیزوں میں سے یہ بھی ہے کہ جس چیز کا حکم امر کے صیغہ کے ساتھ دیا جائے اس کا کرنا ضروری ہوتا ہے ،الاّیہ کہ اگر اسی کلام میں کوئی ایسا قرینہ ،یا دلیل موجود ہو جس سے وجوب کے علاوہ دوسرا کوئی حکم ثابت ہوتا ہو۔لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو اس صورت میں اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہوتا ہے۔

یہاں بھی امر کا صیغہ استعمال کیا گیا یعنی حکم دیا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر جو تم عہد وپیمان کرتے ہو؛ اس کو پورا کرو، اس میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔لہٰذا ان احکام پر عمل کرنا ضروری اور لازم ہے۔

زندگی کے معاملات عہد وپیمان ہیں :

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ(المائدۃ:۱)﴾ اے ایمان والو! وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ ان کو پورا کرو۔آپس میں جو عقد اور معاملات کئے جاتے ہیں وہ بھی ایک طرح کا عہد وپیمان ہے۔جیسے :آدمی کسی کے ساتھ اجارہ کا معاملہ کرتا ہے، بیع وشراء یعنی خرید وفروخت کا معاملہ کرتا ہے؛ یہ بھی ایک طرح کا عہد وپیمان ہے۔خرید وفروخت میں جب سب باتیں طے ہو گئیں،

اس کے بعد ان میں سے کوئی ایک آدمی اپنے اس کئے گئے وعدہ اور عہد وپیمان سے پھر جائے، جیسے: دیکھا کہ دوسرا آدمی زیادہ پیسے دے رہا ہے، تو پہلے والے کو انکار کر دیا کہ اب میں تیرے ساتھ معاملہ نہیں کرنا چاہتا، حالاں کہ شرائط کے خلاف کوئی ایسی بات پائی نہیں گئی ہے، محض اس لئے کہ اس کو قیمت زیادہ مل رہی ہے اور دنیوی اعتبار سے کچھ زیادہ فائدہ نظر آرہا ہے، یا اس سودے کو مکمل کرنے کی صورت میں بظاہر اپنا کچھ نقصان نظر آرہا ہے، جیسے: اس مال کا بھاؤ گھٹ گیا اس لئے سودے سے پھر رہا ہے؛ ایسی بہت ساری صورتیں ہیں جو اس حکم میں داخل ہیں

اس آیت "أَوْفُوا بِالْعُقُودِ" میں باری تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ وہ عقد جو آپس میں کرتے ہو؛ ان کو پورا کرو۔ خرید وفروخت اور اجارہ وغیرہ کے بھی جتنے معاملات آپس میں کئے جاتے ہیں وہ سب اس حکم میں داخل ہیں، یہاں تک کہ نکاح کا معاملہ بھی اس میں داخل ہے۔ ایک مرد جب کسی عورت کے ساتھ نکاح کرتا ہے، تو عقدِ نکاح کے ذریعہ گویا وہ اس بات کی گارنٹی (Guarantee) دیتا ہے کہ میں بیوی کے حقوق کو ادا کروں گا۔ اب اگر شوہر کی طرف سے اس کے حقوق کی ادائیگی میں کمی آئے گی تو اِس عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے کا جو حکم اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا گیا تھا اس میں اس کی طرف سے کوتاہی پائی گئی، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی پوچھ ہوگی۔

اس آیت میں گویا آدمی کی پوری زندگی کو سمیٹ لیا گیاہے، اس لئے آدمی یہ نہ سمجھے کہ زندگی کامیرا کوئی حصہ اورپارٹ(Part) ایساہے جو اس میں داخل نہیں ہے؛بلکہ زندگی کی تقریباً ساری چیزیں اس حکم میں آجاتی ہیں۔

یہ بڑی خطرناک چیز ہے:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ﴾ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جس کو کرتے نہیں ؟یعنی آپ نے جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، عہدوپیمان ، عقد اور وعدہ کیا،اب اگراس کو آپ پورانہیں کرتے تواسی حکم میں آگئے کہ ایک بات جو تم نہیں کرتے توپھر کہتے ہی کیوں ہو! اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ بات بڑی ناراضگی کی اور اللہ کے غضب کو جوش میں لانے والی ہے۔تم نے کسی سے وعدہ کیا اور اس کو پورا نہیں کیاتو یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جن چیزوں کی خاص طورپر تعلیم دی ہے، جو اخلاق اپنی اُمت کوسکھلائے ہیں ،جن چیزوں کی طرف متوجہ کیا ہے،اس میں ایک یہ بھی ہے کہ وعدہ کو پورا کرو، عہد و پیمان کو بجالاؤ،اس عہد وپیمان کے خلاف کوئی چیز نہ کرو۔

معاشرہ میں ہونے والی کوتاہیاں :

جیسے:ایک آدمی کسی کے یہاں ملازم ہوا،توملازمت اورسروس کے لئے جو ایگریمنٹ کیا جاتاہے،اس میں دونوں طرف سے معاملات کئے جاتے ہیں اور ساری باتیں طے ہوتی ہیں، مثلاً:آپ کواپنااتنا وقت دینا ہے،اور سامنے والے کی طرف سے کہہ دیاجاتاہے کہ اتنی تنخواہ دی جائے گی۔اِس کویوں کرناہے،اور اس کے بدلہ میں اُس کویوں کرناہے۔یہ ایک معاملہ اور معاہدہ ہوا،اب دونوں کے لئے اس کو پورا کرنا ضروری ہے۔

آج کل عام طور پر ہمارے معاشرہ میں ایسامزاج بنتا جارہا ہے کہ دونوں طرف سے کوتاہیاں برتی جارہی ہیں ، اِدھر جس کے ذمہ کچھ کام دیئے گئے وہ بھی اپنے کام کو انجام دینے میں کوتاہی کا ارتکاب کرتاہے،اس کوجو وقت دینا چاہیے وہ پورا وقت نہیں دیتا، اس میں کمی کرتاہے، تویہ اس کے عہد وپیمان کے خلاف ہوجائے گا۔اُدھر سامنے والی جوپارٹی(Party)اور فریق ہے اس کی طرف سے یہ ہوتا ہے کہ اس نے اگرکام پورا کردیا،تووہ پورا (Paymant) نہیں کرتا،پوری تنخواہ نہیں دیتا ،اس میں سے کچھ کاٹ لیتاہے ،یا وقت پر نہیں دیتا۔جب آپ نے کسی ٹھیکیدار کوکوئی کام سونپا اور پورامعاملہ طے کرلیااور کام پورا ہوگیا؛توپھر اسے پیسے کیوں نہیں دیئے جارہے ہیں؟ٹال مٹول کی جارہی ہے کہ کل دیں گے،بعدمیں دیں گے،لیٹ (Late) کرتے جارہے ہیں،تاخیر ہوتی جارہی ہے ،یہاں تک کہ اگرکسی مزدورسے کوئی مزدوری کروائی جاتی

ہے تو اس کی مزدوری ادا کرنے تک میں سخت کوتاہی اور حق تلفی کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ اس کی داستانیں ہیں کہ جب ہم سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ اور ایسا بھی نہیں کہ آدمی کے پاس پیسے نہ ہوں، بلکہ پیسے موجود ہوتے ہوئے بھی مزدور کی مزدوری نہیں دیتے، حالاں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکید فرمائی ہے کہ مزدور کا پسینہ سوکھے اس سے پہلے اس کی مزدوری ادا کردو۔ اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جس نے کسی مزدور کی مزدوری ادا نہیں کی، تو کل کو قیامت میں مَیں اس کی طرف سے دعویٰ دائر کروں گا اور مدعی بنوں گا۔ قیامت میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کے وکیل بن کر آجائیں اور اس کی طرف سے دعویٰ دائر کردیں؛ تو اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ کتنا اہم معاملہ ہے!

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ چند آیتیں نمونہ کے طور پر پیش کی ہیں، ورنہ قرآنِ پاک میں اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔ آگے روایتیں پیش کر رہے ہیں۔

منافق کی نشانی اور ہمارا معاشرہ:

حدیث ٦٨٩:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه أن رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قال: آيَةُ المُنَافِقِ ثَلَاثٌ: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

زَادَ فِي رِوَايَةٍ لِمسلم: وإنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: منافق کی نشانیاں تین ہیں: جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، جب اس کے پاس کوئی چیز امانت کے طور پر رکھی جائے تو اس میں خیانت کا ارتکاب کرے

مسلم شریف کی روایت میں ہے:- وہ آدمی چاہے نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں۔

افادات:- جس آدمی میں یہ علامتیں پائی جائیں گویا اس کو خالص مؤمن نہیں کہہ سکتے، اس میں نفاق والی صفات پائی جاتی ہیں۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچانے کا پورا اہتمام کرے۔ ہمارے اس عنوان اور موضوع سے تعلق رکھنے والی چیز دوسری ہے:

"وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ" جب وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے۔

"وعدہ" میں یکطرفہ معاملہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی سامنے والے سے کہے۔ اور "عہد وپیمان" میں دونوں طرف سے وعدے ہوتے ہیں۔ تو جہاں دونوں طرف سے وعدہ ہو؛ اس کو "عہد" سے تعبیر کرتے ہیں، اور جہاں ایک طرف سے عہد ہوتا ہے اس کو "وعدہ" کہا جاتا ہے، دونوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ جہاں دونوں طرف سے وعدہ کیا گیا ہے وہاں دونوں کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کریں ، اور جہاں ایک طرف سے وعدہ کیا گیا ہو تو وہاں اس ایک کے لئے ضروری ہے کہ اس کی پابندی کرے، تو وعدہ کرنے کے بعد وعدہ خلافی کرنا منافق کی

علامت قرار دی گئی ہے، ایک مؤمن کے لئے ضروری ہے کہ اپنے آپ کو ایسی بری باتوں سے بچانے کا اہتمام کرے۔

اب وعدہ کے سلسلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آدمی نے وعدہ کیا، اس وقت تو دل میں پختہ ارادہ تھا کہ میں اس کو پورا کروں گا، لیکن اس کے بعد حالات کچھ ایسے بدلے کہ اب اُس وعدہ میں جو چیز کی ذمہ داری لی تھی اس کو ادا کرنے کی اس میں طاقت نہیں رہی، اس کے خلاف صورتیں پیدا ہو گئیں، تو اس صورت کے اندر شرعاً اس کو معذور سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ایسی صورت نہیں ہے، یا یہ ہے کہ جس وقت وعدہ کیا تھا اسی وقت دل میں چور تھا، جیسے بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسی وعدہ خلافی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا جس میں وعدہ کرتے وقت ہی آدمی کے دل میں یہ ہوتا ہے کہ اس وعدہ کو پورا نہیں کرنا ہے؟

آج کل یہ چیزیں عام ہوتی جارہی ہیں کہ جب کہہ رہا ہوتا ہے اسی وقت دل میں خیال ہوتا ہے کہ یہ بات پوری نہیں کرنی ہے۔ بعض مرتبہ کہتے ہیں کہ سوچو! کیا کہہ رہے ہو؟ تو وہ کہتا ہے: مولوی صاحب! آپ کیوں فکر کرتے ہو، یہ تو ایسے ہی کہنے کی باتیں ہیں، جو کہہ رہا ہوں اس کو کرنا کہاں ہے؟ تو یہ پورے نفاق کی علامت ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے بڑی سخت وعیدیں ارشاد فرمائی ہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے:"وَإِنْ صَامَ وَصَلَّى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ" وہ آدمی چاہے نماز پڑھتاہواورروزہ رکھتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ میں مسلمان ہوں،پھر بھی حضور(ﷺ) فرماتے ہیں کہ جس میں یہ تین باتیں پائی جاتی ہیں تو وہ منافق ہے۔کتنی سخت وعید ہے ! اس لیے ایسی بری باتیں جن کو نبی ٔکریم (ﷺ) نے نفاق کہا ہے،ان سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

باطن کچھ ،اور ظاہر کچھ:

نفاق کیاہے؟نبی ٔکریم (ﷺ) کے زمانہ میں ایک گروہ اور جماعت تھی جو اپنے آپ کو اپنی زبان سے مؤمن اور مسلمان ظاہر کرتے تھے،لیکن دل میں وہ بات نہیں تھی دل میں ان کا عقیدہ اس کے خلاف تھا۔گویا باطن کچھ تھا اورظاہر کچھ اورکرتے تھے؛ ایسےلوگ منافق کہے جاتے تھے۔تویہ آدمی بھی جب اپنے آپ کو کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں تو اس کو چاہیے کہ ایمان کے تقاضوں کو پورا کرتارہے، اور ایمان کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ آدمی جو وعدہ اور عہد وپیمان کرے؛ اس کو پورا کرے۔جب وہ وعدہ کو پورانہیں کررہا ہے توگویا مؤمن والی شان اور مؤمن والی بات نہیں ہے، بلکہ منافقوں والا عمل اور خصلت ہوگئی۔اسی لئے حضورِاکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ یہ آدمی منافق ہے؛ گویا ایسا آدمی مخلص مؤمن نہیں کہا جائے گا۔

منافق کی چار علامتیں :

حدیث ۰ ۶۹ :-

وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما: أَنَّ رسول اللہ (ﷺ) قَالَ : أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً ، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا أُؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس آدمی میں چار باتیں ہوں گی وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات ہوگی گویا اس میں نفاق کی ایک بات پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے (جب تک کہ چھوڑے گا نہیں وہاں تک گویا یہ برائی اس میں موجود ہے) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب کوئی عہد وپیمان کرے تو اس کو توڑ دے، اس کی خلاف ورزی کرے۔ اور جب کسی کے ساتھ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

افادات:- گویا منافق کی چار علامتیں بتلائی ہیں۔ اس روایت کو یہاں اس جزو "وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ" کی وجہ سے لائے ہیں ، کہ جب کوئی عہد وپیمان کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اس کو توڑ دے؛ یہ نفاق کی ایک علامت ہے۔

وعدہ پورا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ:

دیکھو !وعدہ کو پورا کرنے کا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔غزوۂ بدر کا واقعہ ہے۔حضرت حذیفہ بن یمان اوران کے والد حضرت یمان رضی اللہ عنہما دونوں اپنے گھر پر مسلمان ہوئے،اسلام لانے کے بعد ہجرت کرکے وہ مدینہ منورہ جارہے تھے، ابوجہل مشرکین کا لشکر لے کر مسلمانوں کے مقابلہ اور اپنے تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لئے جارہا تھا۔غزوۂ بدر اسی لئے تو پیش آیا تھا۔راستہ میں یہ دونوں باپ بیٹا حضرت حذیفہ اور حضرت یمان رضی اللہ عنہما کو ابوجہل کے لشکر نے گرفتار کرلیا، ان کو ابوجہل کے پاس لایا گیا۔اس نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ کہا : مدینہ منورہ جارہے ہیں۔پوچھا: کیوں؟ کہا: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ملاقات و زیارت اوران کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے۔اس نے کہا: وہ تو لشکر لے کر ہمارے مقابلہ کے واسطہ نکلے ہیں، اس لئے تم دونوں کو ہم نہیں چھوڑیں گے ،اپنی تحویل ہی میں رکھیں گے،اس لئے کہ اگر ہم نے تم کو چھوڑ دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اپنے دشمن کے لشکر میں ہم نے دو سپاہیوں اور لڑنے والوں کا اضافہ کردیا،اس لئے ہم تم کو جانے نہیں دیں گے۔ان دونوں باپ بیٹوں نے وعدہ کیا کہ ہم کو چھوڑو،تمہارے مقابلہ میں لڑنے کے لئے ہم نہیں آئیں گے،ہم تو خالص ملاقات اور زیارت کرنے جارہے ہیں ،چناں چہ اس وعدہ پر ان دونوں کو چھوڑدیا گیا، اب یہ دونوں حضرات نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جاکر ملے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لشکر لے کر نکل رہے تھے ،انہوں نے اپنا پورا قصہ سنایا کہ ایسی صورت پیش آئی۔اس کے بعد انہوں عرض کیا: اے اللہ کے

رسول! آپ مشرکین اور کفار کے مقابلہ کے لئے تشریف لے جارہے ہیں ؛ہمیں بھی ساتھ چلنے کی اجازت دیجئے۔

اس وقت حالات یہ تھے کہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان یہ پہلی جنگ تھی جس کو قرآنِ پاک نے یوم الفرقان، فیصلہ کے دن سے تعبیر کیا گیا۔ گویا یہ وہ جنگ ہے جس نے کفر اور اسلام کے درمیان امتیازی خط کھینچ دیا اور فیصلہ کر دیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسی جنگ کے لئے تشریف لے جارہے ہیں، اور پھر حالات ایسے تھے کہ اُدھر مشرکین کا لشکر ہر طرح کے سازوسامان سے لیس تھا، تمام ہتھیار ان کے پاس موجود تھے، تعداد کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک ہزار کی تعداد تھی۔ اور اِدھر مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور سازو سامان کے اعتبار سے دیکھا جائے تو صرف ستر (۷۰) اونٹ، دو (۲) گھوڑے اور آٹھ (۸) تلواریں تھیں۔ تلواریں بھی سب کے پاس نہیں تھیں، کسی کے پاس ڈنڈا تھا، کسی کے پاس نیزہ تھا، تو کسی کے پاس اور کچھ تھا۔ ایسے موقع پر ظاہر ہے کہ جتنے آدمی زیادہ بڑھیں؛ اتنی ہی قوت اور طاقت بڑھے گی۔ جنگی حکمتِ عملی اور وقتی مصلحت کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ اپنے کسی ایک آدمی کو بھی کھویا نہ جائے، بلکہ اپنے ساتھ رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اور ادھر یہ باپ بیٹے دونوں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کررہے ہیں کہ اللہ کے رسول! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم بھی آپ کے ساتھ شریک ہوں۔ لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: نہیں! تم ان سے وعدہ کر چکے ہو۔ انہوں نے کہا: اللہ کے

رسول! وہ تو گردن پر تلوار رکھ کرلیا گیا وعدہ تھا۔آپ (صلی اللہ علیہ وسلم)نے فرمایا: نہیں!جب تم نے وعدہ کر لیا ہے،تو اب تم کو ہم شریک ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔

دیکھو!آدمی کے عمل کی پختگی کا پتہ ایسے موقع پر ہی چلتا ہے جب حالات ناسازگار اور ناموافق ہوں ،ایسے حالات میں کوئی آدمی شریعت پر عمل کرکے بتلائے تو سمجھا جاسکتاہے کہ یہ شریعت پر عمل کے معاملہ میں پختہ ہے۔حالات کی سازگاری کے موقع پرتو ہر آدمی آسانی سے عمل کرلیتا ہے۔یہاں ان کی طرف سے اصرار ہورہاتھا لیکن نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عملی طورپر ان کے وعدہ کوپورا کرکے بتلادیا۔ہم اور آپ ہوتے تو تاویلیں کرلیتے کہ دشمن کے مقابلہ کاوقت ہے،اسلام اور کفر کا سوال ہے،اسلام کو قوت پہنچانا ضروری ہے، ایسے موقع پر یہ سب تھوڑا ہی دیکھا جاتاہے،اور معلوم نہیں کیاکیا تاویلیں کی جاتیں،لیکن نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے ان کو اجازت نہیں دی اور وہ شریک نہ ہوپائے۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام میں وعدہ اور عہدوپیمان کوپورا کرنے کاکتنا زیادہ اہتمام اور کتنی سخت تاکید ہے کہ نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسے موقع پر بھی ان کواپنے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی۔

عہد پورا کرنے کا بے مثال نمونہ:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق بعض حضرات اعتراض کی باتیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے زمانۂ خلافت میں چوں کہ

ان کا پایۂ تخت شام میں تھااوررومی سلطنت کی سرحدیں اس وقت شام کے ساتھ ملی ہوئی تھیں، تورومیوں کے ساتھ ان کا مقابلہ ہوتا رہتا تھا۔ایک موقع پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے رومی بادشاہ کے ساتھ ایک مدت تک کے لئے صلح کرلی کہ اتنی مدت تک ہم اور آپ آپس میں جنگ اور لڑائی نہیں کریں گے۔جب صلح کی وہ مدت ختم ہونے جارہی تھی اورکچھ دن باقی تھے، تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ ابھی کچھ دن باقی ہیں ،مَیں اپنے لشکر کو لے جاکرسرحدوں (Boarder) پر بٹھادوں ، ان کو یہ اندازہ ہی نہیں ہو گا کہ صلح کی مدت پوری ہوتے ہی یہ لوگ حملہ کردیں گے،وہ تو سمجھ رہے ہوں گے کہ صلح کی مدت پوری ہوگی اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوتا ہے؟ اس لئے انہوں نے ایک تدبیر سوچی کہ اپنا لشکر وہاں لے جاکرلگادوں ،چناں چہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے سرحدپر اپنا لشکر لگا دیا۔ابھی صلح کا زمانہ چل رہا تھا اور صلح کے زمانہ کے درمیان لڑائی شروع کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا،بلکہ ارادہ یہ تھاکہ جہاں صلح کی مدت پوری ہوگی-جیسے آج بارہ بجے ٹائم ختم ہوگا اوربارہ بج کرایک منٹ پر-فوراً حملہ کردیں گے۔ چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔پہلے سے وہاں لشکر بٹھادیا گیاتھااور اچانک ایسا کیا گیاجس کا رومیوں کو وہم وگمان اور خیال بھی نہیں تھااس لیےانہوں نے دفاع کی کوئی تدبیر بھی نہیں کی تھی۔جب اس طرح حملہ کیاگیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر دشمن کے علاقہ میں آگےبڑھتا ہی چلاگیا اور بہت سارا علاقہ فتح کرلیا، اوربرابر آگے بڑھ رہے تھے کہ دیکھا پیچھے سے ایک گھوڑے سوارآرہا ہے اور کہہ رہاہے : ”أَللّٰہُ أَکْبَرُ، أللّٰہُ أَکْبَرُ! وَفَاءٌ لَاغَدَرًا،وَفَاءٌ لَاغَدَرًا“ اے

ایمان والو! ٹھہر جاؤ، مؤمن کا شیوہ عہد و پیمان کو پورا کرنا ہے،اس کی خلاف ورزی کرنا نہیں ہے۔یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ رک گئے۔جب وہ قریب آئے تودیکھاوہ حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ تھے،انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا: میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد سنا ہے :مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ، فَلَا يَحُلَّنَّ عُقْدَةً، وَلَا يَشُدَّنَّهَا، حَتَّى يَنْقَضِيَ أَمَدُهَا أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ. (تفسیر ابن کثیر،الانفال،آیت نمبر: ۵۸) جب کسی قوم کے ساتھ صلح کے لئے کوئی عہدوپیمان کیا ہو،تو نہ اس کی گرہ کو کھولے،اورنہ اس کو سخت مضبوط کرے، جب تک کہ اس کی مدت پوری نہ ہو، یا یہ ہے کہ ان کو پہلے سے کھلم کھلا بتلادیا جائے کہ ہمارا اور آپ کے درمیان عہد و پیمان باقی نہیں ہے۔

ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جب صلح کا زمانہ چل رہا ہے اس میں آپ کا اپنے لشکر کو لے جاکر سرحدوں کے اوپر بٹھا دینا ،جب کہ وہ یوں سمجھ رہے ہیں کہ ابھی کوئی ایسی تدبیر کی نہیں جائے گی،یہ آپس کی صلح کے تقاضہ کے خلاف ہے،یہ کاروائی بھی آپ کو صلح کی مدت کے پوری ہونے کے بعد کرنی چاہیے تھی، صلح کی مدت چل رہی ہے اورآپ یہ کاروائی کر رہے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے، اس لئے آپ نے یہ جو کیا ہے وہ ایک طرح کی عہد شکنی ہے۔یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے لشکر کوواپسی کا حکم دیا اور دشمن کاوہ پورا علاقہ جو فتح کرلیا گیا تھا خالی کردیااوراپنے لشکروں کو واپس بلا لیا گیا۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھاہے اور علماء فرماتے ہیں کہ مذاہب کی تاریخ میں کوئی دوسرا مذہب ایسا نمونہ پیش نہیں کرسکتا جس میں فتح شدہ علاقہ اس طرح واپس کردیا گیا ہو۔

آج کے حالات کا موازنہ:

دشمن کے معاملہ میں تو آج کی تہذیب یافتہ دنیا جو اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کی علمبردار کہتی ہے، وہ کیاکچھ دھندھے نہیں کرتی ہے؛وہ ہم اورآپ سب جانتے ہیں۔ آپ لوگ بھی اخبارات پڑھتے ہیں اس میں دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ کیسی کیسی حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن یہاں دیکھئے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ماننے والے ،آپ پر ایمان لانے والے ،آپ کے گرویدہ لوگوں نے دنیا کو یہ نمونہ بتا دیا کہ فتح کیا ہوا علاقہ بھی محض اس شک کی وجہ سے واپس کردیا کہ کہیں ہمارا یہ عمل حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد کے خلاف نہ ہوجائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے انصاف کی ایک جھلک:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس زمانہ میں بیت المقدس کو فتح کیا تو وہاں جو غیر مسلم یہود و نصاریٰ وغیرہ آباد تھے، ان کے ساتھ عقدِ جزیہ کامعاملہ کیا گیا،یعنی ان کو معاہِدبنایا گیااوران کے ساتھ عہد کیا گیا۔اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم جن کو اس بات کی گارنٹی دی جاتی ہے کہ تمہاری جان ومال کی ہماری طرف سے حفاظت کی جائے گی، لیکن اس کے معاوضہ

میں تم سے ایک مخصوص مقدار رقم جزیہ اور ٹیکس کے طور پر لی جائے گی، جن کے ساتھ اس طرح کا معاہدہ ہوتا ہے اس کو عربی زبان میں "مُعَاهِدْ" کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ عہد اور عقدِ ذمہ کیا گیا ہے، اسی لیے ان کو ذمی بھی کہا جاتا ہے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک موقع پر زیادہ لشکر کی ضرورت پیش آئی، تومشورہ میں یہ بات آئی کہ وہ لشکر جو بیت المقدس والے علاقہ کی حفاظت کے لئے رکھا گیا ہے، اس کو وہاں سے ہٹا کر سرحد (Boarder) پر بھیج دیا جائے، اس لئے کہ وہاں اس وقت شدید ضرورت ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھیک ہے، اس لشکر کو وہاں سے بلا کر اس جگہ بھیجا تو جائے گا، لیکن چوں کہ یہ لشکر ہم نے وہاں غیر مسلموں کی جان ومال کی حفاظت کے لئے رکھا تھا، اور ہم نے ان سے حفاظت کا عہد کیا ہے اور اسی پر ہم جزیہ بھی لیتے ہیں، اس لئے اس سال کا جو جزیہ ان سے لیا ہے وہ ہم واپس کریں گے۔ چناں چہ اعلان کیا گیا اور جو رقم ان سے جزیہ کے طور پر وصول کی گئی تھی ان کو واپس کی گئی کہ ہم اپنے اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں اور ہم نے تم سے تمہارے تحفظ کا وعدہ کیا تھا، اسی تحفظ کے لئے یہ لشکر یہاں رکھا تھا، لیکن جب اس لشکر کو یہاں سے ہٹا رہے ہیں تو تمہاری وہ رقم بھی واپس کی جا رہی ہے۔ یہی وہ اخلاق تھے جن کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام قبول کرتے تھے۔

آج ضرورت ہے اس بات کی...:

آج اس زمانہ میں بھی کوئی مسلمان اگر نبی کریم (ﷺ) کی انہی ساری تعلیمات کو اپنا کر زندگی گزارے گا، تو اس گئے گزرے دور میں بھی اس کا وہ عمل لوگوں کے لئے ایمان کی دعوت کا ذریعہ بنے گا۔ دعوت صرف زبانی چیز نہیں ہے، بلکہ اصل دعوت تو عمل کی ہے۔ آپ دیکھئے کہ جاوا سماترا اور چین کے علاقہ میں اسلام کہاں سے پہنچا! وہاں کیا کوئی داعی پہنچے تھے؟ نہیں! بلکہ وہاں تجارت کرنے والے پہنچے تھے، لیکن انہوں نے نبی کریم (ﷺ) کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق تجارت کی، تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نبی کریم (ﷺ) کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنائیں۔

آج ہمارا اسلام مسجدوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، ہم یوں سمجھتے ہیں کہ پانچ وقت نماز پڑھ لی، بس کافی ہے۔ نماز اپنی جگہ پر بہت اہم چیز ہے، بلکہ ساری ہی عبادتیں اہم ہیں، لیکن اسلام صرف عبادات کا نام نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ میں بار بار بتلا چکا ہوں کہ اسلام کئی شعبوں کا نام ہے، اس میں اخلاق بھی ہیں، معاملات بھی ہیں، معاشرت بھی ہے، اور عبادات بھی ہیں۔ اس لئے ہمیں ہر چیز کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ بلکہ لوگوں کے ساتھ جن چیزوں کا واسطہ پڑتا ہے وہ تو معاشرت، معاملات اور اخلاق ہے۔ آپ بازار میں جائیں گے تو بازار والوں کو معلوم نہیں ہے کہ آپ نماز کیسی خشوع و خضوع والی پڑھتے ہیں۔ جس کے ساتھ آپ سودا اور

خرید وفروخت کررہے ہیں اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ آپ کتنی لمبی نماز پڑھتے ہیں،اور نماز میں کتنی تلاوت کرتے ہیں ،یہ سب وہ نہیں جانتا، وہ آپ کی نماز نہیں دیکھتا،بلکہ آپ اس کے ساتھ جو سودا کریں گے اور اس میں امانت کے تقاضوں کوجب پورا کریں گے؛ تو یہی چیزاس پر اثرانداز ہوگی۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان چیزوں کا اہتمام کریں۔

وعدہ پورا کرنے کا ایک اور نمونہ:

حدیث ١٩٦:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ لی النبیُّ (ﷺ) :لَوْ قَدْ جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَعْطَيْتُكَ هكَذَا وَهكَذَا وَهكَذَا .فَلَمْ يَجِئْ مَالُ الْبَحْرَينِ حَتَّى قُبِضَ النَّبِيُّ (ﷺ) .فَلَمَّا جَاءَ مَالُ الْبَحْرَيْنِ أَمَرَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ عنہ .فَنَادَى:مَنْ كَانَ لَهُ عِنْدَ رسول الله (ﷺ) عِدَةٌ أَوْ دَيْنٌ؛ فَلْيَأْتِنَا .فَأَتَيْتُهُ وَقُلْتُ لَهُ:إِنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) قَالَ لِي كَذَا وَ كَذَا .فَحَثَى لِي حَثْيَةً فَعَدَدْتُهَا ،فَإِذَا هِيَ خَمْسُمِئَةٍ ،فَقَالَ لِي :خُذْ مِثْلَيْهَا .(متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (ﷺ) نے مجھ سے وعدہ فرمایاکہ اگر بحرین کا مال آگیا تومیں تمہیں اتنادوں گا،اتنا دوں گا،اتنا دوں گا(لپ بھر کر تین مرتبہ فرمایاکہ اتنادوں گا۔نبیؐ کریم (ﷺ) کی حیاتِ طیبہ میں سب سے زیادہ خراج بحرین کے علاقہ سے آتا تھا اسی کے متعلق آپ (ﷺ)نے ان سے وعدہ کیا تھاکہ وہ جب آئے گا تو تم کومیں اتنا دوں گا)اب بحرین کا وہ خراج والا مال آئےاس سے پہلے حضورِ اکرم (ﷺ) کی وفات ہوگئی۔پھرجب بحرین کا مال آیا

تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے-جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جانشین بنائے گئے تھے - اعلان کرایا کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی سے وعدہ فرمایا ہو، یا حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر کسی کا کوئی مطالبہ باقی ہو تو وہ آئے اور اپنا مطالبہ، یا نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے جو وعدہ کیا ہو تو وہ میرے پاس سے وصول کر کے لے جائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں گیا اور عرض کیا کہ مجھے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین لپیں بھر کر یہ فرمایا تھا (کہ اگر بحرین کا مال آیا تو میں تمہیں اتنا اتنا اتنا دوں گا) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک لپ بھر کر مجھے درہم دیئے، میں نے جب وہ گنے تو پانچ سو (۵۰۰) تھے، پھر مجھ سے کہا کہ ایسے ڈبل یعنی ایک ہزار اور لے لو (آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین لپوں کا وعدہ فرمایا تھا تو اس طرح حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وعدہ کے مطابق کل پندرہ سو (۱۵۰۰) درہم دیئے۔)

افادات:- دیکھو! اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک حکمران ہونے کی حیثیت سے وعدہ فرمایا تھا، تو جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انتقال فرما جانے کے بعد آپ کی جگہ پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ مقرر کئے گئے تو انہوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ مجھ سے پہلے اس جگہ پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بحیثیت حکمران کے جو جو وعدے کئے تھے وہ مجھے پورے کرنے ہیں۔

آج کل ہمارے یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ کوئی پیڑھی (نسل) چل رہی ہے، اس کے ذمہ دار نے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، اب وہ نہیں رہا اور اس کی جگہ پر کوئی دوسرا آیا، جیسے بیٹا آیا، تو وہ کہتا ہے کہ انہوں نے کہا تھا، ہم نہیں جانتے۔ ارے بھائی! یہ کوئی بات ہوئی؟ اس طرح دنیا

میں زندگی گزاری جاتی ہے؟ یہ غلط طریقہ ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپ جب اس کے ذمہ دار ہونے کی حیثیت سے آئے ہیں تو آپ اسی طرح کا معاملہ کیجئے۔ بہر حال! یہ عہد و پیمان بہت اہم چیز ہے۔

یہ عملی عہد و پیمان ہے:

اب عہد وپیمان اور وعدہ کے متعلق ایک اہم چیز یاد رکھیے۔ وعدہ اور عہدو پیمان کبھی صرف زبان سے ہوتا ہے، کبھی تحریر سے ہوتا ہے، اور کبھی زبان سے تو نہیں بولا جاتا، لیکن عملی طور پر عہدوپیمان ہوتا ہے، جیسا کہ ہم اس ملک میں اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے رہتے ہیں تو گویا ہم نے اس ملک کے ساتھ یہ عہد وپیمان کر رکھا ہے کہ یہاں کے قوانین کی ہم پابندی کریں گے، الّا یہ کہ کوئی قانون ایسا ہو جو شریعت کے خلاف ہو، اور جس پر عمل کرنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی لازم آئے؛ تو وہاں پھر قاعدہ یہ ہے: لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ، خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی بات مانی نہیں جائے گی۔ اگر کوئی مسلمان حکمران ہوتا اور وہ کوئی حکم شریعت کے خلاف دیتا تو اس کو بھی ہم بجا نہیں لاتے، گناہ کے کام میں کسی کی بھی فرمانبرداری نہیں کی جاتی، یا ظلم کی کوئی بات ہے تو ظلم کی بات میں تو اپنے بچاؤ کے لئے کچھ کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے تو پھر ان قوانین کی پابندی ضرور کرنی چاہیے، اُس میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، مثلاً ٹرافک (Traffic) کے قانون ہیں، تو ان کا بھی

لحاظ کرنا چاہیے، جولوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں ،اس لئے اس کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے، تمام قوانین کی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر آپ یوں سمجھ کر کریں گے کہ میں اکیلا کروں گا تو اس سے کیا نقصان ہو جائے گا؟ تو آپ کا یہ سوچنا صحیح نہیں ہے ،اس لیے کہ جب آپ نے خلاف ورزی کی تو اس کو دیکھ کر دوسرے نے بھی کی، اس طرح یہی چیز قانون شکنی اور لوگوں کی جان ومال کے غیر محفوظ ہونے کا ذریعہ بنے گی۔ اس لئے ایسے تمام امور میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اسی طرح اگر ٹرین (Train) میں سفر کر رہے ہیں تو یہ صحیح نہیں ہے کہ بغیر ٹکٹ کے سفر کریں ،ہر حال میں ٹکٹ (Ticket) لے کر ہی سفر کرنا چاہیے۔

اسی طرح آپ نے جب الیکٹرسٹی والوں کے پاس سے لائن لی ہے تو آپ کے یہاں اس کا میٹر بھی لگایا گیا ہے، اب اس میں ذرّہ برابر بھی کمی نہ کیجئے، بلکہ اس کا بل پورا پورا دیجئے اور اس عہد وپیمان کی حفاظت کیجئے، ورنہ اس حکم کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ اور بھی بہت سی چیزیں اس حکم میں آجاتی ہیں۔

الامر فی المحافظة علیٰ ما اعتادہ من الخیر

نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا

۲۱/ ذی الحجہ ۱۴۲۱ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۷/ مارچ ۲۰۰۱ء

معمولات کی پابندی کیجئے:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب قائم کیا ہے اس میں بتلانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے جن آداب کی ہمیں تعلیم دی ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ کسی آدمی نیکی کے نیکی کے جو کام شروع کئے ہیں اور جن کاموں کا اپنے آپ کو عادی بنایا ہے، جو اچھے معمولات اور نیکی کے مختلف کام اپنا رکھے ہیں؛ تو اب اس کو چاہیے کہ ان پر پابندی سے عمل کرتا رہے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس سلسلہ کو باقی رکھو، بلاوجہ اس کو چھوڑ مت دو۔

مطلب یہ ہے کہ فرائض اور واجبات تو وہ ہیں کہ جو شریعت نے آدمی کے اوپر ضروری قرار دیئے ہیں، ان کو تو کرنا ہی کرنا ہے، اگر نہیں کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کا نافرمان اور گنہگار قرار دیا جائے گا۔ ان کے علاوہ ایسے اچھے کام جو اس نے اپنے طور پر اپنا رکھے ہیں، مثلاً: ہر مہینہ، یا ہر سال میں ایک مرتبہ، یا عید کے موقع پر یا رمضان میں دو سو، پانچ سو، ہزار روپے کسی کو دینے کا معمول بنایا ہے، تو اب شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ یہ سلسلہ ختم نہ کرو، بلکہ جاری رکھو۔ کسی بھی نیکی کے کام کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دینا شریعت کو پسند نہیں ہے، شریعت یہ چاہتی ہے کہ وہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ یہ تو گویا ایک پودا ہے جو آپ نے لگایا ہے، اب جب لگا ہی چکے ہیں

تو اس کو پانی دیتے رہو، اس کی حفاظت کرتے رہو، تاکہ وہ پلے اور بڑھے ، پھل پھول لائے، اور اس سے آپ کو بھی اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچے۔

اللہ تعالیٰ نے بھی ان کو معمول چھوڑنے نہیں دیا:

پہلے بھی کئی مرتبہ یہ قصہ گزر چکا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ایک عزیز اور رشتہ دار حضرت مسطح بن اثاثہ رضی اللہ عنہ جو ان کی خالہ زاد بہن کے بیٹے تھے اور غریب تھے، مہاجر تھے اور نیک آدمی تھے، اصحابِ بدر میں سے تھے ان -کی مدد کرتے تھے اور یہ سلسلہ انہوں نے جاری رکھا تھا۔ ایک موقعہ ایسا آیا کہ منافقین کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی گئی، تو یہ بھی منافقین کے جھانسے میں آ گئے، اور آزمائش میں پھنس گئے، ان کی زبان سے بھی وہی چیزیں نکل گئیں۔ بعد میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی براء ت نازل ہوئی، معاملہ صاف اور واضح ہو گیا کہ ان پر جو تہمت لگائی گئی تھی وہ غلط تھی۔ تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بلاوجہ نہیں، بلکہ اس وجہ سے کہ انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں پر لگائی گئی تہمت والے معاملہ میں حصہ لیا تھا- یوں سوچا کہ میں ان کی جو مدد کیا کرتا تھا وہ نہیں کروں گا۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ بھلائی کا کوئی سلوک کرتا رہتا ہے، پھر کبھی موقع آتا ہے کہ اسی رشتہ دار نے کوئی نادانی کر لی، کوئی غلط کام کر لیا، تو اب یہ سوچتا ہے کہ اس نے ایسا کام کر لیا؟ اب اس کو نہیں دیں گے۔ اسی طرح حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

نے بھی قسم کھالی کہ اب ان کو نہیں دوں گا اور وہ سلسلہ بند کردیا، اس پر باری تعالیٰ نے مستقل آیت نازل فرمائی: ﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ ایسی قسم کوئی کھاتا ہے کہ میں نیکی کا کام نہیں کروں گا؟ اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی کہ ایسی قسمیں نہیں کھانی چاہئیں۔ بھائی! نیکی کے یہی کام تو تمہاری نجات کا ذریعہ ہیں۔ کون سا نیکی کا کام اللہ تعالیٰ کو پسند آجائے، اور کل قیامت میں ہماری نجات کا ذریعہ بن جائے؛ یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہی ہماری نجات اور ہمارے گناہوں کو بخشوانے کا ذریعہ بن جائے، اسی کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے؟ فوراً حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی بات سے رجوع کرلیا۔

بتلانا یہ ہے کہ ہر نیکی کے کام کے لیے یہی طرز ہے، حالاں کہ وہ کام کوئی فرض اور واجب نہیں تھا، لیکن شریعت یہ کہتی ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو جب ایک بھلائی کے اوپر ڈالا ہے، تو سیدھی سادی بات یہ ہے کہ اب اس راستہ سے اپنے آپ کو ہٹانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے۔

اس سے نقصان پہنچتا ہے:

کسی کے ساتھ آپ نے دوستی کی، اس کے پاس آتے جاتے ہیں، اُٹھتے بیٹھتے ہیں، ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اور پھر ایک دم سے جانا بند کر دیا؛ تو صحیح نہیں ہے۔ ارے بھائی! پہلے سے دوستی ہی نہ کرتے تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن جب دوستی کی اور تعلقات بڑھائے، پھر اچانک سے کٹ کر دئے؛ تو یہ کوئی اچھی بات ہے؟ یہ ناپسندیدہ ہے، اور اس سے نقصان پہنچتا ہے۔

معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے:

تو نیکی اور بھلائی کے جتنے بھی کام ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے اور رشتہ استوار کرنے کا ذریعہ ہیں، اور ایسے تمام کاموں سے متعلق یہ ایک ادب ہے کہ کوئی بھی معمول ہو، اس کو بلاوجہ نہ چھوڑیئے، مثلاً: روزانہ قرآنِ پاک کے ایک پارہ کی تلاوت کا آپ نے معمول بنایا، تو اب بلاوجہ اس کو نہ چھوڑیئے۔ یا آپ کسی کلمہ کی تسبیح پڑھتے ہیں، تو اب پڑھتے رہیے، یا کوئی نیکی کا کام کرتے ہیں، تو کرتے رہیے۔ چوں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ آداب سکھلا رہے ہیں تو نیکی کے معمولات کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ آپ اس کی محافظت اور پابندی کیجئے، اگرچہ کوئی فرض اور واجب نہیں ہے لیکن آپ نے بھلائی کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے تو اس کو جاری رکھیے، نیکی اور

بھلائی کا کوئی بھی سلسلہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو شروع کرنے کے بعد چھوڑ دیا جائے بلکہ اس کو ترقی دینی چاہیے۔

اس آیت کے ساتھ ایک ظلم ہوا:

چناں چہ پہلی آیت پیش کی ہے:﴿إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ اس آیت کے ساتھ ایک ظلم یہ ہوا کہ لوگ اس کو علامہ اقبال کے ایک شعر کے ساتھ جوڑ کر۔جو انہوں نے اپنی جگہ کہا ہے۔اس آیت کا مطلب بھی وہی بیان کرتے ہیں ، حالاں کہ وہ مطلب بیان کرنا بالکل غلط ہے۔اس آیت کی تفسیر اپنی جگہ پر ہے۔وہ شعر یہ ہے :-

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
جسے نہ ہو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

پھر اس کے ساتھ یہ آیت بھی اٹیچڈ (Atteched) کر دیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔اس آیت کا مطلب الگ ہے، آپ قرآنِ پاک کی کسی بھی تفسیر کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے اس میں وہ مطلب نہیں ملے گا۔

اس آیت کا صحیح مطلب:

اس آیت کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی قوم و خاندان، کوئی جماعت و کمیونٹی نے نیکی کا راستہ اپنے لیے چن لیا اور اس راہ پر وہ چل رہی ہے، اور اس نیکی کے راستہ پر چلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بھی اس پر اپنی نعمتوں کا سلسلہ جاری کر دیا ہے۔ اس لیے کہ ظاہر ہے کہ کوئی خاندان کسی نیکی کا سلسلہ شروع کر دے، مثلاً: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام ، غریبوں کی مدد، مسکینوں اور بیواؤں کے حال پر توجہ، لوگوں کے ساتھ سخاوت وغیرہ، اور بھی نیکی کے جتنے سلسلے ہیں ، ان کو اگر کوئی خاندان اپنا لے، ان پر عمل شروع کر دے؛ تو ظاہر ہے کہ اس کی برکتیں بھی تو ظاہر ہوں گی۔ نیکی کے ان کاموں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان کے ساتھ اسی جیسا معاملہ کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی برکتوں کے سلسلے شروع ہوں گے، اسی کو اس آیت میں بتلایا گیا ہے: ﴿إِنَّ اللهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ کسی قوم کے نیک راہ پر چلنے کی وجہ سے، بھلائی کے راستہ پر لگنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنے انعامات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کبھی ختم نہیں کریں گے جب تک کہ وہ قوم خود اپنا راستہ نہ بدل دے، اور نیکی کا وہ راستہ نہ چھوڑ دے۔ جیسے نیکی کے کاموں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو تندرستی دے رکھی ہے، عزت و دولت بھی دے رکھی ہے، تو اللہ تعالیٰ

اپنی یہ نعمتیں اس وقت تک نہیں چھینیں گے جب تک کہ نیکی کا اختیار کردہ راستہ وہ خود نہ بدلے گی، لیکن جہاں اس نے اپنا راستہ بدل دیا تو اب وہ نعمتیں بھی باقی نہیں رہتیں۔

نعمتوں کے سلسلے اس وقت تک بند نہیں ہوتے:

عام طور پر ہوتا ایسا ہی ہے کہ کسی خاندان اور قوم کے بڑوں نے، اسلاف اور (વડીલો) نے کوئی نیک سلسلہ شروع کیا جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں بھی اس خاندان کو شاملِ حال ہوتی ہیں ،اور وہ خاندان ترقی پر آتا ہے،وہ جماعت و کمیونٹی ایک طرح کی ترقی پر آتی ہے، لیکن اس خاندان و قوم کی اور اس جماعت و کمیونٹی کی بعد میں آنے والی نسل کو یہ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں ہمارے بڑوں کی کن نیکیوں اور اچھے کاموں کی وجہ سے ملی ہیں ،وہ اچھے کام جو ان کے بڑے کرتے تھے اور وہ سلسلہ جو اس خاندان میں جاری تھا، جیسے: نمازوں کا اہتمام، زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام ،نیکی کے کاموں کا اہتمام ،غریبوں کے ساتھ بھلائی؛ یہ سارے سلسلے جاری تھے، انہیں کی وجہ سے یہ نعمتیں بھی اللہ تعالیٰ نے جاری کر رکھی تھیں۔ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ہم نے نعمتوں کے یہ سلسلے جو ان کے ساتھ جاری کئے ہیں وہ ہم بند نہیں کریں گے ﴿لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ﴾ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جو نعمتیں دیتا ہے وہ ان سے ہٹاتا نہیں ہے، واپس لیتا نہیں ہے۔ کب تک؟ ﴿حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ یہاں تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے۔ ان کی نیکی والی حالت بدل گئی ،تو پھر نعمتوں والی حالت بھی بدل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے نیکی کی

وجہ سے عزت دی تھی، اب دوسری پیڑھی (نسل) آئی اور نیکی و بھلائی کے راستہ پر قائم نہیں رہی، انہوں نے دیکھا کہ دولت کی ریل پیل ہے، تو یہ نہیں سوچا کہ یہ ریل پیل اللہ تعالیٰ نے کیوں دی تھی (وہ توبڑوں کی نیکی کی وجہ سے دی تھی) اب دولت کی ریل پیل میں آکر وہ گناہوں میں مبتلا ہوگئے، نیکی کا راستہ چھوڑدیا، بھلائی کے وہ کام جوان کے بڑوں کی طرف سے کئے جاتے تھے اور ایک سلسلہ جاری تھا وہ سلسلہ باقی نہیں رہا، تو پھر دھیرے دھیرے نعمتیں بھی ان سے چھنتی جائے گی اور ایک دن آئے گا کہ وہ سب ختم ہوجائے گا۔ اس آیت کا صحیح مطلب یہی ہے۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ کسی آدمی نے کسی نیکی کا راستہ اختیار کیا ہو تو اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے، چوں کہ نیکی کے راستہ کو اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی نعمتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اگر نیکی کا راستہ چھوڑدوگے تو نعمتوں کا سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا۔ باقی اس کا وہ جو مطلب لیتے ہیں کہ ”خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی“ وہ بالکل صحیح نہیں ہے، اس آیت کی صحیح تفسیر تو وہی ہے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے بیان کی۔

حضرت مولانا سعید احمد خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سوال:

ایک بات لطیفہ کے طور پر سناتا ہوں، ہمارے اکابر میں حضرت مولانا سعید احمد خانصاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جن کا قیام ایک طویل مدت تک مدینہ منورہ میں رہا اور حضرت وہاں جانے والے حجاج

کے ساتھ بڑی شفقتیں فرمایا کرتے تھے، جنہوں نے ان کی وہ شفقتیں دیکھی ہیں وہ جانتے ہیں۔ میرا جب بھی جانا ہوتا تھا تو حضرت کے پاس جاکر بیٹھا کرتا تھا، حضرت ہماری دعوت بھی کیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا کی عادت یہ تھی کہ کوئی مولوی اور عالم ملاقات کے لیے آتے تو کچھ سوالات بھی فرماتے تھے ان سوالات میں ایک سوال اس آیت کی تفسیر کے متعلق بھی فرماتے تھے ﴿إِنَّ اللهَ لاَيُغَيِّرُ مَابِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ﴾ مولوی صاحب! اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ عام طور پر مولوی صاحبان وہی "خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی" والی بات چلا دیتے تھے، حالاں کہ اس آیت کی وہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ وہ ایک الگ بات ہے جو کہی گئی ہے، اور اس آیت کا مطلب تو یہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا۔ آپ کسی بھی تفسیر کی کتاب کو اُٹھا کر دیکھ لیجئے، اس میں یہی وضاحت ملے گی، اور اسی مطلب کی بنیاد پر امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کو اس عنوان کے تحت ذکر کیا ہے۔

تم اس پگلی بوڑھیا کی طرح نہ بنو:

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿وَلاَ تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِن بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثاً﴾ اے لوگو! تم اس پگلی بڑھیا کی طرح نہ بنو، جو محنت سے سوت کاتتی، پھر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

مکہ مکرمہ کے اندر ایک مجنونہ عورت تھی، اس کی عادت یہ تھی کہ دن بھر سوت کاتتی تھی، اور دن پورا ہونے پر اپنا کاتا ہوا سوت توڑ پھوڑ کر ختم کر دیتی تھی، پھر دوسرے دن پھر سے سوت

کاتتی تھی۔ گویا دن بھر جو محنت کرتی وہ ضائع کر دیتی۔ اسی کو باری تعالیٰ نے مثال کے طور پر پیش فرما کر ایک نصیحت کی کہ: تم اپنے اعمال کے معاملہ میں ایسا مت کرنا کہ نیکی کے کام کرو اور پھر کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو کہ تمہارے وہ سارے کام ضائع و برباد ہو جائیں۔

معمولات چھوڑنے سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے:

﴿وَلَا یَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ یہ ایک آیت کا ٹکڑا ہے، اس سے پہلے یہ ہے ﴿اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِکْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ ایمان والوں کے لیے کیا وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد کی طرف جھکیں؟ اور اللہ تعالیٰ نے جو احکام اتارے ہیں ان کی اطاعت و ادائیگی کے لیے اور ان پر عمل کرنے کے لیے متوجہ ہوں؟ اور ایمان والوں کو چاہیے کہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو ان سے پہلے کتاب دی گئی۔ یعنی امتِ محمدیہ سے پہلے جو اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) آئے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکام کو چھوڑ دیا اور ایک زمانہ تک نافرمانیوں میں مبتلا رہے، توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی اور نافرمانیوں کا زمانہ ان پر طویل ہو گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر طویل زمانہ تک نیکیوں کا سلسلہ چھوڑے رہتا ہے تو اس کی وجہ سے دل میں سختی آجاتی ہے، پھر اس نیکی کا دوبارہ شروع کرنا بھاری اور مشکل ہو جاتا ہے۔

رہبانیت کیسے شروع ہوئی:

﴿وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً وَّرَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کے متعلق باری تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحمت کا مادہ بھر دیا، اور رہبانیت (یعنی دنیا کو چھوڑ چھاڑ کر اللہ کی عبادت میں مشغولی) والا طریقہ ان لوگوں نے اختیار کیا (باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) وہ طریقہ ہم نے ان پر لازم نہیں کیا تھا۔ ”رُہبان“ کا اصلی ترجمہ تو ”اللہ کا ڈر اور خوف“ ہے۔

بنی اسرائیل کے اندر ہوا یہ تھا کہ جب ایسے بادشاہ آئے جو دنیا کے اندر ایسے منہمک ہوئے جس کے نتیجہ میں انہوں نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات کو توڑنا شروع کیا، تو دین دار طبقہ جو اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنے والا تھا انہوں نے ان کو ان غلط حرکتوں سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن چوں کہ ان کے پاس حکومت کی طاقت تھی، حکومت و پیسے کی طاقت ہی کی وجہ سے وہ نافرمانی میں مبتلا ہوئے تھے، تو انہوں نے ان روکنے والوں کو قتل کر دیا۔ پھر دوسرا طبقہ آیا، انہوں نے دیکھا کہ اگر ہم ان کو روکنے جائیں گے تو یہ ہمیں بھی قتل کر دیں گے۔ گویا انہوں نے اپنے اندر ان کو روکنے کی طاقت نہیں پائی اور ان کو یہ بھی ڈر لگا کہ اگر ہم ان کے ساتھ رہیں گے تو ہم بھی ایسے ہی بن جائیں گے، تو اپنے دین کی حفاظت کی نیت سے انہوں لوگوں سے علاحدگی اختیار کر لی اور جنگلوں میں اور ایسے علاقوں میں چلے گئے جہاں زیادہ لوگ نہ بستے ہوں تاکہ

وہاں رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام پر چلنا ان کے لیے آسان ہو جائے اور سنسان علاقوں میں بند مکان بنا کر عبادتوں میں مشغول ہو گئے اور لوگوں سے میل جول بالکل ختم کر لیا۔ یہی رہبانیت والا طریقہ کہلایا۔ اللہ تعالیٰ کے ڈر سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اس طرح آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام پر باقی اور قائم رکھ سکے۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے:

ویسے شریعتِ محمدیہ میں رہبانیت نہیں ہے، بلکہ اصل تو یہ ہے کہ آدمی لوگوں میں مل جل کر رہے اور اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرے، لیکن اگر کسی آدمی کے لیے اپنے دین کو بچانا سوائے اس کے ممکن ہی نہ ہو کہ لوگوں سے علاحدگی اختیار کرلے، تو جیسا کہ حدیث کی کتابوں میں ہے اور بخاری شریف میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس پر مستقل باب قائم کیا ہے: "إِنَّ مِنَ الدِّيْنِ اَلْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ" فتنوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے لوگوں سے دوری اختیار کرسکتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک زمانہ آئے گا کہ فتنے ایسے عام ہو جائیں گے کہ لوگوں کے درمیان میں رہتے ہوئے آدمی کے لیے اپنے دین کی حفاظت مشکل ہو جائے گی، اس وقت بعض لوگ ایسے ہوں گے جو بکریاں وغیرہ مویشی لے کر پہاڑ کی ایسی چوٹیوں پر چلے جائیں گے کہ جہاں گھاس پانی ملتا ہو گا، وہاں بکریاں چَراتے رہیں گے اور اپنے دین کی حفاظت کریں گے۔

دینداروں کے لیے بھی یہی وقت آزمائش کا ہوتا ہے:

بہر حال! ان لوگوں نے بھی رہبانیت والا طریقہ اختیار کرلیا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے ان کو ایسا طریقہ اختیار کرنے کے لیے کہا نہیں تھا، بلکہ انہوں نے اپنے طور پر اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے اور دین پر قائم رہنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ جب اس نیت سے یہ طریقہ اختیار کیا تھا تو پھر چاہیے تھا کہ اس کا اہتمام کرتے رہتے اور اس کو نہ چھوڑتے، لیکن جب ان کی توجہ الیٰ اللہ، دینداری، تقویٰ و پرہیزگاری، ان کی نیکوکاری کو دیکھ کر لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے- اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ آدمی جب تقویٰ اختیار کرتا ہے تو پھر لوگوں کا رجحان و میلان بھی ادھر ہوتا ہے- تو پھر یہ لوگ اپنے دین پر اور جس احتیاط پر ان کو قائم رہنا چاہیے تھا اس پر قائم نہیں رہے اور دنیا کی طلب میں پڑ گئے۔ تو رہبانیت والا طریقہ اصل میں تو اپنے آپ کو بے دینی اور دنیا طلبی سے بچانے کے لیے شروع کیا تھا، لیکن اسی کے نتیجہ میں جب لوگوں کا اُدھر رجوع ہوا تو دنیا طلبی میں پڑ گئے۔

آج بھی جب آدمی دین کی محنت کرتا ہے اور دین کے لیے قربانیاں دیتا ہے، تو لوگ اس کی نیکی اور تقویٰ کی وجہ سے عقیدت مندی کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، اور یہی اس کے لیے زیادہ آزمائش کا وقت ہوتا ہے، اگر لالچ میں آکر شریعت والے طریقہ کو چھوڑ کر دنیا طلبی میں پڑ جائے گا تو پھر ناس مارلے گا اور اپنا نقصان ہی نقصان کرلے گا۔ اسی کو باری تعالیٰ

فرماتے ہیں :﴿فَمَارَعَوْهَاحَقَّ رِعَايَتِهَا﴾جو طریقہ اختیار کیا تھا اس کی پوری حفاظت اور رعایت نہیں کرسکے۔یعنی اللہ تعالیٰ نے تو واجب نہیں کیا تھا لیکن جب انہوں نے اس طریقہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے شروع کیا تھاتو پھر چاہیے تھا کہ اس کی پابندی کرتے،لیکن انہوں نے پابندی نہیں کی۔

اس آیت میں ان کی جو مذمت اور برائی کی گئی ہے ،وہ ان کے اس طریقہ کو اختیار کرنے پر نہیں کی گئی ہے،بلکہ اس راہ کو اختیار کرنے کے بعد چھوڑ دینے پر کی گئی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ ہر وہ عمل جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واجب نہیں کیا گیا، لیکن کوئی آدمی اپنے طور پر نیکی اور بھلائی کا کام سمجھ کر اس کو شروع کر رہا ہے تو پھر اس کو چاہیے کہ اس کو نہ چھوڑے،بلکہ اس کی پوری پابندی کرے؛یہی شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہے۔ اس آیت کو یہاں لا کر یہی بتلایا چاہتے ہیں۔

اے عبداللہ !فلاں جیسے مت بنیو:

حدیث ۶۹۲:-

وعن عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ لی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) :يَاعَبْدَاللهِ،لَاتَكُنْ مِثْلَ فُلَانٍ كَانَ يَقُوْمُ اللَّيْلَ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ.

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے (کسی کی طرف اشارہ فرما کر) مجھ سے فرمایا: اے عبداللہ! فلاں جیسے مت بنو کہ وہ راتوں کو اُٹھا کرتا تھا (تہجد پڑھتا تھا) پھر اس نے رات کو اُٹھنا چھوڑ دیا۔

افادات:-دیکھئے! تہجد پڑھنا فرض اور واجب نہیں ہے ، لیکن جب کسی نے یہ عمل شروع کیا تو شریعت یہ چاہتی ہے کہ اس کو چھوڑا نہ جائے، اب تو ہر حال میں اس کو باقی رکھنا ہی چاہیے۔

آج کل ہمارے طبقہ میں یہ مزاج عام ہو گیا ہے کہ جوش میں آ کر ایک دو مہینہ تک کچھ معمولات:-تہجد، اوابین یا چاشت شروع کرتے ہیں، اور یہ صرف عبادتوں کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ نیکی کا کوئی بھی کام ہو، جیسے: کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا سلسلہ شروع کیا؛ پھر اس کو چھوڑ دیتے ہیں۔ گویا ہماری طبیعتوں میں تلوُّن مزاجی ہے یعنی ہماری طبیعت ایک طرح کی نہیں ہے بلکہ رنگ بدلتی رہتی ہے۔ اگر نیک بن گئے تو جنید بغدادی کو بھی شکست دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پھر برائی پر آتے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کو بھی ہرا دیں گے۔ بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے ،بلکہ کوئی بھی طریقہ ہو،اس میں اعتدال ومیانہ روی سے چلئے۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ آپ اعتدال کو اختیار کریں ،جیسا کہ پہلے بھی آ چکا کہ نیکی کے جس کام پر مداومت کی جائے وہی اللہ تعالیٰ کو زیادہ پسند ہے، چاہے وہ چھوٹا سا ہی کیوں نہ ہو۔

پانی کا صرف ایک قطرہ اگرایک زمانہ تک برابر ٹپکتا رہتا ہے تو پتھر کے اندر بھی سوراخ کر دیتا ہے، لیکن اگر پانی کا ایک ٹینک بھی ایک ساتھ بہاڈالو، تو اس سے کچھ فرق پڑنے والا نہیں ہے۔

مداومت کا نتیجہ:

انگلینڈ میں ہمارے ایک ملنے والے دوست ہیں ، انہوں نے ایک مولوی صاحب کا مقولہ میرے سامنے نقل کیا۔پاکستان کے ایک مولانا صاحب آئے ہوئے تھے،انہوں نے ایک پتھریلی زمین میں جہاں صرف پتھر ہی ہوتے ہیں ،اس میں کسی جگہ کچھ سبزہ نکلا ہوا دیکھ کر مجھ سے بہت اچھی بات کہی کہ: دیکھو! پتھر بھی جب ایک جگہ پڑا رہا اور اس نے جگہ نہیں بدلی اور اس کے آس پاس تھوڑی سی مٹی تھی تو اس پر بھی سبزہ نکل آیا۔لیکن اگر کسی جگہ مٹی ہی مٹی ہو اور اس کی بار بار کھدائی کرتے رہو، الٹ پلٹ کرتے رہو؛ تو کبھی اس میں گھاس کا ایک تنکا بھی اُگنے والا نہیں ہے۔حالاں کہ پتھر کی خاصیت یہ ہے اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا ، لیکن وہ بھی جب ایک جگہ پڑا رہا تو اس میں نمو اور اُگانے کی کچھ صلاحیت آگئی ،اور مٹی میں نمو کی خاصیت ہے لیکن اس میں جب الٹ پلٹ ہوتی رہی تو اس میں کچھ بھی نہیں اُگتا۔ معلوم ہوا کہ درحقیقت کسی بھی عمل کو اثر انداز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس پر مداومت ہو۔

ساری خرابی یہیں سے آتی ہے:

ہمارا مزاج تو ایسا ہے کہ ہم دو روز تہجد پڑھتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ تیسرے دن جبرئیل آنے ہی چاہئیں، تب کچھ بات بنے گی۔ نہیں بھائی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ کرتے رہو، کرتے رہو، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس نیکی کے کام کی توفیق دی ہے، یہی بہت بڑی بات ہے، اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟ دوسرا کوئی بدلہ چاہو ہی مت۔ دراصل ساری خرابی یہیں سے آتی ہے کہ ہم دوسرے بدلے چاہنے لگتے ہیں۔ ارے بھائی! یوں سوچو کہ ہم اپنی زبان سے "اللہ" کا جو نام لے رہے ہیں؛ یہی اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا مقابلہ اور کوئی چیز نہیں کرسکتی، اگر اس پر جنت نہ بھی ملے تب بھی "اللہ" کا نام لینا خود جنت سے بڑی نعمت ہے؟ پھر اس پر ہی کیوں خوش نہ ہوؤں؟ دوسرا کوئی بدلہ کیوں چاہوں؟

ہم لوگ ذکر اسی لیے چھوڑ دیتے ہیں کہ ہم اپنے جی میں ایسا سوچتے ہیں کہ جب ہم نے ذکر شروع کیا تو پھر ہمارے کاروبار میں برکت کیوں نہیں ہوتی؟ ہماری آمدنی (આવક) بڑھ کیوں نہیں گئی؟ ابھی تک تین ہزار کا نفع ہوتا تھا، اب چار ہزار کا نفع کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ میں کئی سال سے چلّہ دے رہا ہوں، برابر نماز پڑھ رہا ہوں، اب تو تہجد، اشراق وچاشت بھی شروع کر دی ہے، پابندی سے درس میں حاضری دیتا ہوں، اتناسب کر رہا ہوں، لیکن کوئی "Response" نہیں مل رہا ہے۔ گویا یہ سب کر کے کیا ہم اللہ تعالیٰ پر احسان کر رہے ہیں؟ ارے بھائی! اللہ تعالیٰ نے

اس سب کی توفیق دی اور ہم نے اپنی زبان سے اس کا نام لیا؛یہی بہت بڑی اور اصل نعمت ہے، اب اس کے بدلہ میں اور کیا مانگتے ہو !

ذکر میں دل نہیں لگتا، پریشان کیوں ہوتے ہو؟:

سیدالطائفہ حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا: حضرت !میں ذکر کرتا ہوں لیکن اس میں جی نہیں لگتا؟ حضرت نے فرمایا: بھائی ! اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عضو یعنی زبان کو اپنی یاد میں لگایا ہے۔ در حقیقت یہ بھی بہت بڑی نعمت ہے۔اس لیے کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ یہی زبان اللہ کا نام لینے کے بجائے گالیاں بکتی، یا اور کوئی گناہ کا کام کرتی، اللہ تعالیٰ نے اس کو گناہ سے بچا کر اپنی یاد میں لگایا؛یہی کتنی بڑی نعمت ہے۔اب اس پر اس کا شکر ادا کرو، تو قاعدہ ہے ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں نعمتوں میں اضافہ کروں گا،اس لیے اگر اس پر شکر کرو گے تو پھر آگے چل کر دل بھی لگے گا۔ پریشان کیوں ہوتے ہو کہ دل نہیں لگتا، زبان سے ذکر کرنے پر بھی ثواب تو ملتا ہے۔

خلاصۂ باب:

اگر آپ نماز پابندی سے پڑھتے ہیں ،تو بس! پڑھتے رہیے، یہ نہ سوچئے کہ میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں ،پھر بھی مجھے بخار کیوں آیا؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو پانچ وقت کی نماز پابندی سے

پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی یہ اس کی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی کو کروڑہا کروڑ روپے مل جائیں اور وہ نماز سے محروم ہے، اس کے مقابلہ میں آپ جو پنج وقتہ نماز پڑھتے ہیں؛ یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے کروڑہا کروڑ روپے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اگر آپ کا ایمان یہ ہے تو پھر آپ دوسرے کسی چکّر میں کیوں پڑتے ہیں؟ اس لیے اس کا اہتمام کرتے رہیں۔

یہ ساری باتیں ہیں، ان کو ذہن میں بٹھالیجیے، اور دوسرے کسی چکّر میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔

استحباب طیب الکلام وطلاقة الوَجه عند اللقاء

خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ:﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ (الحجر:۸۸)

وقال تعالیٰ:﴿وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ﴾ (آل عمران:۱۵۹)

ہر کس و ناکس کو مسخر کرنے والا نسخہ:

آداب کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کے پسندیدہ ہونے کا بیان۔

یہ بھی ایک ادب ہے کہ آدمی جب کسی کے ساتھ ملاقات کرے، اس وقت اپنا چہرہ ہنستا ہوا رکھے، اور جب بات کرے تو اچھے طریقہ سے بات کرے۔ بھائی! اس میں تو جیب میں سے کچھ پیسے بھی خرچ نہیں ہوتے ہیں۔ یہ ایسا عجیب وغریب نسخہ اور عمل ہے جو ہر کس و ناکس، دشمنوں اور دوستوں، اپنوں اور پرایوں کو مسخر کرنے والا ہے جو لوگ اس قسم کا مزاج رکھتے ہیں ان سے لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اور آج کل تو تجارت میں یہ بہت ہی بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے کہ لوگوں کا بڑی خوش دلی کے ساتھ چہرہ ہنستا رکھتے ہوئے استقبال کیا جائے، بلکہ اب تو یہ ایک مستقل فن ہو چکا ہے جس کی تربیت دی جاتی ہے، لوگ اس طرز کو سیکھ کر سلیس مین شپ (Sales Man Ship) کرتے ہیں اور اسی پر سروس اور ملازمتیں ملتی ہیں۔ حالاں کہ

شریعت نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب بھی آپ کسی سے ملیں تو ملاقات کے وقت دو چیزوں کا خیال رکھئے ،ایک یہ کہ بات چیت اچھے انداز سے کیجئے، جس کو خوش کلامی کہا جاتا ہے، اور دوسرا یہ کہ چہرہ ہنستا ہوا رکھئے۔اور کمال تو یہ ہے کہ اس کو نیکی کا کام قرار دیا، گویا آپ اس عمل کو کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوگا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت بھی ادا ہوگی۔

یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہے:

حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ تو یہ تھا کہ ایسے لوگ جو واقعۃً اپنے غلط رویے اور اپنی بد عملی کی وجہ سے لوگوں کے ساتھ اچھی طرح سے پیش نہیں آتے تھے،اور ان کا معاملہ ٹھیک نہیں ہوتا تھا، جس کی وجہ سے وہ اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے؛اس کے باوجود بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں جب ایسے لوگ حاضر ہوتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے بھی نرم گفتگو فرماتے اور ہنس کر بات فرماتے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ یہی تھا۔

مدارات؛ جس کو دل جوئی کرنا کہتے ہیں ،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ خوش خُلقی سے اور ظاہری طور پر اچھے انداز سے پیش آنا۔امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں ایک عنوان قائم کیا ہے:"بَابُ الْمُدَارَاةِ مَعَ النَّاسِ"اس میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ: بہت سے لوگوں کے سامنے ہم مسکراتے ہیں ، حالاں کہ ہمارے دل ان پر لعنت کر رہے ہوتے

ہیں ({ २३२८ [illegible] })یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے دل ان سے خوش نہیں ہوتے، لیکن اس کے باوجود جب ہم ان سے ملتے ہیں تو ہم ان کے ساتھ ہنستے ہوئے چہرہ سے ملاقات کرتے ہیں۔

اسلام نے جو آداب سکھائے ہیں ان میں سے یہ بھی ہے: "إِدْخَالُ السُّرُوْرِ" کسی کے دل میں مسرت داخل کرنا۔ کوئی بھی ہو، جب آپ اس سے ہنس کر ملاقات کریں گے، اور نرم طریقہ سے اچھی بات کریں گے، تو اس کا دل خوش ہو گا، یہ بھی بہت بڑی نیکی کا کام ہے۔ یہ ایک ایسا ادب اور شریعت کی ایسی تعلیم ہے کہ آج ہم اس کی طرف سے بہت غفلت اور بے پرواہی سے کام لیتے ہیں۔

آدمی کے لئے بڑی بری چیز ہے:

ایک مرتبہ ایک صاحب نے نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے آپ کے گھر کے باہر سے اجازت مانگی کہ میں اندر آسکتا ہوں۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے جب ان کی آواز سنی تو ان کو پہچان لیا اور فرمایا: "بِئْسَ ابْنُ الْعَشِيرَةِ" یہ آدمی اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے، اس کے بعد ان کو آنے کی اجازت دی۔ جب وہ آکر بیٹھے تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے ان کے ساتھ بہت ہی نرمی سے گفتگو کی۔ جب وہ صاحب چلے گئے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضورِ اکرم (ﷺ) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے ان کے متعلق تو یہ فرمایا تھا، لیکن جب وہ آپ کے پاس آئے تو آپ نے ان کے ساتھ بڑے نرم انداز میں گفتگو فرمائی؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: اے

عائشہ! آدمی کے لئے یہ بات بڑی بری ہے کہ اس کی بدخلقی کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑدیں (بخاری شریف:باب المُدَارَاۃِ مَعَ النَّاسِ) مطلب یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق جو کہا تھا کہ یہ اپنے قبیلہ کا بڑا برا آدمی ہے،وہ ان حالات کی وجہ سے کہا تھا جو اس میں تھے ،لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بھی اس کے ساتھ برائی سے ہی پیش آؤں ؟مجھے تو اپنے اخلاق کو باقی رکھنا ہیں۔

میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں !:

قاضی یحیٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ بڑے قاضی گزرے ہیں ، ایک مرتبہ ان کو ہارون الرشید کے یہاں رات گزارنے کا موقع ملا۔ہارون الرشید اپنے وقت کا بہت بڑا بادشاہ تھا۔پہلے بھی کسی موقع پر میں بتلا چکا ہوں کہ ان کی سلطنت اور حکومت اتنی بڑی تھی کہ ایک مرتبہ ایک بادل جارہا تھا جس کو خطاب کرتے ہوئے ہارون الرشید نے کہا تھا: اے بادل!تو کہیں بھی جاکر برس، تیرے پانی سے جو غلہ پیدا ہوگا، اس کا خراج میرے ہی خزانہ میں آنے والا ہے۔خیر! قاضی یحیٰ بن اکثم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ رات میں بادشاہ سلامت کو پانی کی ضرورت پیش آئی تو کسی خادم کو آواز دی کہ ذرا پانی پلاؤ۔تو وہ نیند میں سے اُٹھا اور کہنے لگا: دن میں بھی چین نہیں ،رات میں بھی چین نہیں لینے دیتے،اوراس طرح بڑبڑاتے ہوئے پانی لاکر دیا،اپنے وقت کے اتنے بڑے بادشاہ کو اس طرح کہہ رہا تھا، وہ تو اس کی گردن کٹوا سکتا تھا،لیکن اس نے کچھ نہیں کہا۔ قاضی یحیٰ بن اَکثم رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے کہا: امیر المؤمنین!ایک زرخرید غلام (یعنی کوئی نوکر نہیں

تھا بلکہ غلام تھا جس کو آقا اپنی ملکیت میں رکھتا ہے) نے آپ کے ساتھ ایسا معاملہ کیا اور آپ نے اس کو کچھ بھی تنبیہ نہیں کی؟ اس پر کوئی ایکشن بھی نہیں لیا؟ تو ہارون الرشید نے کہا: بھائی! وہ بد خُلقی سے پیش آیا تو اس کی وجہ سے میں اپنے اخلاق کیوں خراب کروں؟ جیسے: کتے کی عادت کاٹنے کی ہے، تو اگر وہ آپ کو کاٹ لے؛ تو کیا آپ بھی اس کو کاٹ لیں گے؟ نہیں نا! سیدھی سی بات ہے۔ اس لئے حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کی بد خلقی کی وجہ سے ہمیں اپنے اخلاق خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ شریعت ہمیں یہی تعلیم دیتی ہے، اور سمجھ لیجئے کہ شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہی ہے۔

اندازہ لگایئے کہ کتنا اچھا ادب سکھایا ہے! آج اسی تعلیم کو اگر ہم اپنا لیں تو ہمارے سماج و معاشرہ کے بہت سارے مسئلے حل ہوسکتے ہیں، لیکن ہمارا حال تو یہ ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر دوسروں سے بد گمان ہو جاتے ہیں اور اسی بد گمانی کی بنیاد پر بد خلقی کرتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہت ساری خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، تعلقات میں کشیدگیاں آتی ہیں اور پھر بہت سارے لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر شریعت کی اس تعلیم پر ہم عمل کرلیں تو معاملہ بہت ہی آسان ہو جائے۔

یہ ہمارا مزاج ہے:

پھر اپنے گھر کے لوگوں کے ساتھ تو اور زیادہ اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ آج کل معاملہ الٹ گیا ہے، آدمی پرایوں کے ساتھ تو بہت ہنس بول کر باتیں کرتا ہے، لیکن جب گھر میں جاتا ہے تو اس کا موڈ ہی چینج (Change) ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ آدمی ہے ہی نہیں۔ چہرہ بھی بڑا بھیانک بنا کر جاتا ہے، گھر والے بھی اس کو دیکھ کر سہم جاتے ہیں کہ پتہ نہیں آج کیا بلا اور اُفتاد ہم پر آنے والی ہے، وہ بھی "یَارَبِّ سَلِّمْ سَلِّمْ" کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ ہمارا مزاج ایسا ہے، حالاں کہ آدمی کے اخلاق تو گھر والوں کے ساتھ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پرایا آدمی آ گیا اور اس کے ساتھ آپ نے ہنس بول کر باتیں کر لیں؛ تو یہ اخلاق نہیں ہیں۔ اخلاق تو یہ ہیں کہ ۲۴ گھنٹے جن کو آپ سے واسطہ پڑتا ہے، وہ آپ کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟ آپ کے متعلق ان کا (Opinion) کیا ہے؟

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک عورت کے متعلق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا کہ: وہ نماز بھی خوب پڑھتی ہے، روزے بھی خوب رکھتی ہے، اور بڑی عبادت گزار ہے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: اس کا معاملہ پڑوسیوں کے ساتھ کیسا ہے؟ عرض کیا: ٹھیک نہیں ہے؛ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: وہ جہنمی ہے۔ دوسری عورت کے متعلق عرض کیا: وہ فرض نماز تو پڑھ لیتی ہے، لیکن

نوافل کا اہتمام نہیں کرتی۔ پوچھا: پڑوسیوں کے ساتھ معاملہ کیسا ہے؟ کہا: بہت اچھا ہے؛ تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: وہ جنتی ہے۔ (مسند احمد۔ حدیث نمبر:۹۶۷۳)

وہ اخلاق کس کام کے!:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ آدمی کے اخلاق کا ساری دنیا میں خوب چرچہ ہو، اور اس کے گھر والے ہی اس سے خوش نہ ہوں؛ تو وہ اخلاق کس کام کے! جیسے: آپ کی سخاوت سے پوری دنیا فیض اُٹھا رہی ہو، اور گھر والے ہی بھوکے مرتے ہوں؛ تو ایسے آدمی کو کوئی سخی کہے گا؟ آپ کے اخلاق کی ساری دنیا تعریف کرتی ہو، اور گھر والوں کو شکایت ہو کہ وہ تو گھر میں آکر کبھی ہمارے ساتھ ہنس کر بات ہی نہیں کرتے۔ عام طور پر بیویوں کو شوہروں سے یہی شکایت رہتی ہے کہ ابھی باہر تو خوب ہنس بول رہے تھے، اور گھر میں جب آئے تو ان کا چہرہ ہی بدل گیا، گھر میں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بالکل ہی بدل گئے۔ یہ مناسب طریقہ نہیں ہے۔ اگر کسی چیز پر تنبیہ کی تھی وہ اپنی جگہ پر ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ۲۴ر گھنٹے آپ منہ بسورے ہوئے، لیجیو دیجیو، اپنے آپ کو لئے دئے رہتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آدمی ہنس بول کر رہے۔ حدیثِ پاک میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ آدمی گھر والوں کے ساتھ کس طرح رہے، ان کے ساتھ بالکل بے تکلّف رہے ، ان کے اوپر بوجھ بن کر نہ رہے کہ آپ جب گھر میں جائیں تو وہ یہی دعا کرتے رہیں کہ یہ مصیبت

یہاں سے کب ٹلے ،بلکہ گھر کے اندرایسے بن کر رہیے کہ وہ یہ چاہیں کہ یہ گھر میں سے نہ جائیں؛ تب کوئی بات ہے۔

بہرحال!بوقتِ ملاقات لوگوں سے ہنستے ہوئے ملنااوراچھے طریقہ سے بات کرنامستحب ہے، یہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ اور کارِ ثواب ہے، اور یہ نیکی ہم مفت میں حاصل کرسکتے ہیں ،اس کے لئے پیسے خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، اور بہت ہی آسان بھی ہے۔

اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھنا:

باری تعالیٰ کاارشاد نقل کیا:﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ نبیٔ کریم (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)کو تاکید کی گئی: ﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيۡنَيۡكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعۡنَا بِهِۦٓ أَزۡوَٰجًا مِّنۡهُمۡ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ﴾ دنیا کے مختلف گروہوں (کفاراور مشرکین،یہودونصاریٰ)کو دنیا کی نعمتیں ہم نے برتنے کے لئے دی ہیں ، ان کے پاس دولت کتنے دنوں تک رہے گی؟جب تک دنیا میں ہیں وہاں تک ہے،پھر ان کے ہاتھ سے چھین لی جائے گی،اورپھران کے ساتھ جو معاملہ ہونے والاہے وہ ہوکر رہے گا ، اس لیےان کی طرف آپ اپنی آنکھیں بھی نہ اُٹھایئے۔اوراپنےلوگوں کے ساتھ کیاکرناہے؟﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ﴾ ایمان والوں کے سامنے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھیے۔

دیکھو! صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق قرآنِ پاک میں کہا گیا ہے : ﴿أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ آپس میں رحمدل اور کفار کے معاملہ میں سخت تھے۔ آدمی کے دل میں ایمان جتنا زیادہ سرایت کرتا جاتا ہے، اتنا ہی یہ وصف آدمی کے اندر پیدا ہوتا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اپنوں کے ساتھ شفقت کا معاملہ ہونا چاہیے۔

اگر آپ بد خُلق اور سخت دل ہوتے :

باری تعالیٰ فرماتے ہیں ﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ دیکھو! باری تعالیٰ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خطاب کرکے یہ فرما رہے ہیں کہ اگر آپ بد خلق اور سخت دل ہوتے؛ تو یہ لوگ (یعنی صحابۂ کرام) آپ کے پاس سے بکھر جاتے۔ حالاں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ جو محبت تھی وہ سب جانتے ہیں، اس کے باوجود باری تعالیٰ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہیں کہ: اے ہمارے رسول! اگر آپ ایسے ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے کب سے بکھر جاتے، کوئی آپ کے پاس نہ ٹھہرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اچھے اخلاق اور اچھا سلوک، لوگوں سے ہنس کر ملنا، اچھی طرح سے باتیں کرنا اور اچھے طریقہ سے پیش آنا؛ یہ لوگوں کو آدمی سے قریب کرتا ہے، اگر یہ طریقہ اپنایا جائے گا تو غیر بھی آپ سے قریب ہو جائیں گے، اور اگر اس کے برخلاف معاملہ کیا جائے گا تو اپنے بھی دور ہو جائیں گے۔ اس لئے شریعت نے ہمیں اس ادب کی تعلیم دی ہے۔

کم از کم اسی کی عادت ڈال لی جائے:

حدیث ۶۹۳:-

عن عدی بن أبي حاتم رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ (ﷺ): اتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ، فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَبِكَلِمَةٍ طَيِّبَةٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عدی بن أبي حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ؛ چاہے کھجور کے آدھے حصہ کے ذریعہ سے ہی ہو۔ اگر کسی کے پاس صدقہ کرنے کے لئے آدھی کھجور بھی نہیں ہے؛ تو اچھی بات کسی کو کہہ کر ہی سہی۔

افادات:- یعنی اگر آپ کے پاس کھجور کا آدھا دانہ ہے اور اس کا آپ نے صدقہ کر دیا تو اس سے اللہ تعالیٰ کی جو خوشنودی حاصل کی جائے گی، وہ بھی آپ کو جہنم کے عذاب سے بچانے کا ذریعہ بنے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کے ساتھ اچھی طریقہ سے بات کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی اور رضامندی عطا کرتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی جہنم سے بچ جاتا ہے۔ کتنا آسان نسخہ ہے! دوسرے اعمال کے مقابلہ میں یہ بہت آسان عمل ہے، اگر کوئی آدمی کم از کم اسی کی عادت ڈال لے، تو دن بھر میں جتنے آدمیوں سے ہنس کر ملے گا اور اچھی طرح بات کرے گا، اتنی ہی نیکیاں اس کے نامۂ اعمال میں بڑھتی جائیں گی۔

اس پر بھی صدقہ کا ثواب:

حدیث ۲۹۴:-

وعن أبی ھریرۃ رضی اللہ عنہ **أن النبی** (ﷺ) **قَالَ: وَالكَلِمَةُ الطَّيِّبَةُ صَدَقَةٌ**

ترجمہ:--حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: اچھی بات بھی صدقہ ہے۔

افادات:--یعنی صدقہ کرنے سے جس طرح ثواب ملتا ہے، اسی طرح اگر آپ لوگوں سے اچھی طرح بات کریں گے،اس پر بھی اتنا ہی ثواب ملے گا۔بھائی!صدقہ میں آپ نے پیسے خرچ کرکے ظاہری بھلائی کا معاملہ کیا، اور اس میں آپ نے اپنے اخلاق کے ذریعہ معنوی طور پر بھلائی کا معاملہ کیا، تو جو ثواب اس میں ملتا ہے، وہی ثواب اس میں بھی ملے گا۔اس لئے اگر کسی کے پاس روپیہ پیسے نہیں ہیں کہ وہ خرچ کرکے صدقہ کا ثواب حاصل کرسکتاہو،تو بھلی باتیں کہہ کر اورلوگوں سے اچھے طریقہ سے پیش آکر بھی صدقہ کا ثواب حاصل کرسکتا ہے۔

ہنستے چہرے سے ملاقات بھی نیکی ہے:

حدیث ۲۹۵:-

وعن أبی ذرٍّ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ لی رسول اللہ** (ﷺ)**: لاَتَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئاً ،وَلَوْ أنْ تَلْقَى أخَاكَ بوَجْهٍ طَلْقٍ.**

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کسی بھی نیکی کے کام کو معمولی مت سمجھو، چاہے تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو۔

افادات:- اس روایت میں ایک تعلیم تو یہ ہے کہ نیکی کا کام چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں ہو، اس کو معمولی نہ سمجھو۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی گنہگار ہے، برائیوں میں پھنسا ہوا ہے، نیکی کے کام نہیں کرتا، پھر کبھی اس کو چھوٹی سی نیکی کا کام کرنے کا موقع مل گیا، تو شیطان اس کے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ تیری تو ساری زندگی گناہوں میں گزر رہی ہے، تو نماز تو پڑھتا نہیں، روزے تو رکھتا نہیں، دوسرے فرائض بھی ادا نہیں کرتا؛ اب یہ چھوٹی سی نیکی کرنے سے تجھے کیا فائدہ ملے گا؟ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ایسا مت سوچو، کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھو۔ اس لئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی چھوٹا سا نیکی کا کام خلوصِ دل سے کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقبول ہو جاتا ہے اور اس کام سے اللہ تعالیٰ ایسا خوش ہو جاتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں پھر نیکی کے بڑے بڑے کام کرنے کی بھی توفیق دی جاتی ہے۔ وہاں تو شاہی معاملہ ہے، کبھی چھوٹی سی بات پر خوش ہو جائیں تو بخش دیں۔ اس لئے کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، اور اسی طرح کسی بھی گناہ کو چھوٹا سمجھ کر کرنا بھی نہیں چاہیے۔

دوسری تعلیم یہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے ہنستا ہوا چہرہ رکھ کر ملاقات کرو، یہ بھی ایک نیکی ہے،اس کی اپنے اندر عادت ڈالو، اس کو معمولی مت سمجھو،اگر اسی کا اہتمام کروگے؛ تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ دوسری نیکیوں کی توفیق دے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ ملاقات کرنا ،چاہے اندرونی طور پر حالات اور معاملات جو کچھ بھی ہوں ، لیکن کسی کے ساتھ جب ملاقات کرو تو اس طرح سے ملو کہ اس کی طبیعت پر کوئی کدورت نہ آئے۔ایسا نہ ہو کہ ہر وقت اپنا منہ ایسا رکھتے ہیں جیساکہ (اَرنڈی کا تیل) دِیوِیل(laɑ')پیا ہوا ہو۔نہیں بھائی !اپنا چہرہ ہمیشہ ہنستا ہوا رکھنا بھی ایک ادب و نیکی ہے۔

استحباب بیان الکلام وإیضاحه للمخاطب وتکریره لیفهم إذا لم یفهم

بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو؛ تو مکرر کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گفتگو کے آداب:

ایک اور عنوان قائم کیاہے کہ: جو آپ کا مخاطب ہےیعنی جس سے آپ گفتگو کرر ہے ہیں اس کے سامنے آپ کا اپنی بات کوایسے اندازسے واضح طورپر کرنا کہ وہ آپ کی بات سمجھ جائے۔اوراگرآپ کاخیال یہ ہو کہ ایک مرتبہ کہنے سے آپ کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے تو دوسری مرتبہ کہہ دیجئے،اوردوسری مرتبہ سے بھی وہ نہیں سمجھا تو تیسری مرتبہ کہئے۔ آپ کی طرف سے کوشش یہ ہوکہ اس کو سمجھانے کا اہتمام کریں ، خاص کرکہ جب استاذ پڑھاتاہے اور شاگرد کی طرف سے مطالبہ ہوتواس میں اس چیز کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ دین کی کوئی بات آپ کسی کو بتلا رہے ہیں اور اسے سمجھ میں نہیں آئی تو دوبارہ بتلایئے، تیسری مرتبہ بھی سمجھایئے،جب تک کہ اس کی سمجھ میں نہ آئے آپ اس کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ اوراگرآپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے دو یا تین مرتبہ بولنے سے وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کی طرف سے اس میں کوئی کمی نہیں ہونی چاہیے۔نبی کریم ﷺ اس چیز کا اہتمام فرماتے تھے۔

کلام کا ایک ادب:

حدیث ٦٩٦:-

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ أنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) كَانَ إِذَا تَكَلَّمَ بِكَلِمَةٍ أعَادَهَا ثَلاثاً حَتَّى تُفْهَمَ عَنْهُ، وَإِذَا أتَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سَلَّمَ عَلَيْهِمْ ثَلاثاً.

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب نبی کریم (ﷺ) کوئی بات ارشاد فرماتے تھے تو تین مرتبہ اس کو دوہراتے تھے تاکہ لوگ سمجھ جائیں۔اور جب سلام فرماتے تھے تو وہ بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پہلی مرتبہ بولنے میں سب تک آواز نہیں پہنچتی،اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔یا کوئی جملہ کسی کے کانوں میں پورا نہیں پہنچ پایا، بولنے والا تو پورا بولا لیکن سامنے والے کے کانوں تک آواز نہیں پہنچی اس لئے دوسری مرتبہ بولنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔تو اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کو سمجھانے کے لئے اور ان کے کانوں تک پوری بات پہنچانے کے لئے دوسری مرتبہ کہنا پڑے گا؛تو پھر دوسری مرتبہ بولئے۔یا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ مخاطب کے انداز اور اس کے چہرے سے یہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے پوری بات سنی نہیں ہے اور آپ کو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دوبارہ بولوں گا تو وہ سمجھ جائے گا؛تو پھر آپ کو اعادہ کرنا چاہیے۔حضور (ﷺ) کا یہی معمول تھا۔اسی طرح جب کوئی اہم بات ہوتی تھی تب بھی آپ (ﷺ) لوگوں تک پہنچانے کے لئے تین مرتبہ ارشاد فرماتے تھے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ دوسری یا تیسری مرتبہ بولنے سے سامنے والے تک آواز پہنچ جائے گی اور وہ سمجھ جائے گا تو پھر آپ کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ایسے موقع پر یہ نہ سوچئے کہ دوبارہ کون بولتا ہے ،خواہ مخواہ زحمت اٹھانی پڑے گی۔

اورآپ (ﷺ) جب سلام فرماتے تھے تب بھی تین مرتبہ فرماتے تھے۔اس کی تشریح علماء نے یہ لکھی ہے کہ کبھی بڑا مجمع ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میں آواز سب تک نہیں پہنچتی تو تین مرتبہ سلام فرماتے کہ پہلے سامنے سلام کیا، پھر دائیں کیا، پھر بائیں کیا، تاکہ تمام لوگوں تک آواز پہنچ جائے۔

آپ (ﷺ) کا کلام بھی ایسا ہی ہوتا تھا:

حدیث ۷۹۶:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: كَانَ كَلَامُ رسول الله (ﷺ) كَلَاماً فَصْلاً، يَفْهَمُهُ كُلُّ مَنْ يَسْمَعُهُ.** (رواه أبو داود.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کی گفتگو بالکل واضح اور الگ الگ ہوتی تھی، ہر سننے والا اس کو سمجھ جاتا تھا۔

افادات:- یعنی آپ (ﷺ) اتنا جلدی نہیں بولتے تھے کہ ایک کلمہ دوسرے میں اس طرح جڑ جائے کہ سننے والے کو سمجھنے میں دشواری پیش آئے، جیسے بعض لوگ جلدی جلدی بولتے

ہیں تو اس میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک کلمہ دوسرے میں مل جانے کی وجہ سے سننے والوں کو سمجھ میں نہیں آتا، بلکہ آپ (ﷺ) اس طرح گفتگو فرماتے کہ ہر حرف آپ کی زبانِ مبارک سے اچھی طرح سے ادا ہوتا تھا۔ یہ بھی بولنے کے آداب میں سے ہے۔ متکبر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات پوری نہیں بولتے ، ایک آدھ بات ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ حضورِ اکرم (ﷺ) کی عادتِ شریفہ ایسی نہیں تھی، آپ اطمینان سے ہر کلمہ اور ہر لفظ الگ الگ کرکے ارشاد فرمایا کرتے تھے تاکہ ہر سننے والا اس کو سمجھ جائے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مضمون ہی دقیق اور باریک ہوتا ہے، بولنے والا الفاظ تو پورے بولتا ہے اور بات بھی پوری پہنچ جاتی ہے، لیکن سامنے والے کی عقل اس کو حل نہیں کرپاتی؛ وہ ایک الگ چیز ہے۔ اور ایک یہ ہوتا ہے کہ بات پورے طور پر کانوں تک نہ پہنچنے کی وجہ سے آدمی وہ بات سمجھ نہیں سکتا، یہاں اسی کو بتلانا مقصود ہے کہ آپ اس طرح بولو کہ بات ہر ایک تک پورے طور پر پہنچ جائے تاکہ کسی کو دشواری نہ ہو۔ یہ بھی زندگی گزارنے کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

باب إصغاء الجليس لحديث جليسه الذى ليس بحرام وإستنصات العالم والواعظ حاضرى مجلسه

اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم وواعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے کے لئے خاموش کرنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس کے آداب:

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ ایک ہم نشین کا اپنے دوسرے ہم نشین کی ایسی بات کی طرف کان دھرنا اور دھیان سے سننا جو بری نہیں ہے؛ یہ بھی آداب میں سے ہے۔ یعنی کوئی آدمی جب کوئی بات کہتا ہے تو آپ اس بات کو دھیان سے سنیں۔

نبی کریم (ﷺ) کی مجلس کا جو حال حدیثِ پاک میں بیان کیا جاتا ہے وہ شمائل میں موجود ہے کہ آپ کی مجلس میں جب کوئی آدمی بات کرتا تھا تو سب لوگ خاموشی سے اس کو سنتے تھے اور دھیان دیتے تھے، ایسا نہیں ہوتا تھا کہ سب ہی بول رہے ہیں۔ اس لیے ایک آدمی جب اپنی بات سے فارغ ہو جائے، پھر دوسرا بولے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کا کلام چل رہا ہے، اسی درمیان میں دوسرا اور تیسرا بھی بولنا شروع کردے کہ اب کوئی بھی کسی کی بات صحیح طریقہ سے سن ہی نہیں پا رہا ہے۔

پھر یہ بھی ہے کہ ہم نشین اور ایک ہی مجلس میں پاس بیٹھنے والا آپ سے کوئی بات کرتا ہے تو اس کی بات کی طرف دھیان دینا اور غور سے سننا؛ یہ بھی اس کا حق ہے۔ ہاں! اگر وہ کوئی نامناسب اور غلط بات کر رہا ہے جو کرنی نہیں چاہیے، جیسے: کسی کی غیبت کر رہا ہے اور کوئی غلط

بات کررہا ہے؛تو پھر اس کو سننے کی ضرورت نہیں ہے،اس کی طرف سے آپ دھیان ہٹالیجئے۔ لیکن اگر وہ بات غلط نہیں ہے اور شرعاً کوئی ناجائز بھی نہیں ہے ،تو پھر آپ کو اس کی بات کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

اور عالم وواعظ کا مجلس کے حاضرین کو خاموش کرنا،جیسا کہ کبھی ہوتا ہے کہ مجلس میں شورو شغب اُٹھ رہا ہے،تو اگر کوئی کہے کہ بھائی!چپ رہو، اور دھیان سے سنو۔تو اپنی بات سنوانے کے لیے خاموشی کا مطالبہ کرنا اور چپ ہونے کے لیے کہنا؛یہ بھی جائز ہے،بلکہ یہ مجلس کے آداب میں سے ہے۔

لوگوں کو خاموش کردو:

حدیث ۶۹۸:-

عن جریر بن عبدِاللہِ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ لی رسول اللہ** (ﷺ) **فی حَجَّةِ الْوَدَاعِ: اسْتَنْصِتِ النَّاسَ. ثُمَّ قَالَ: لاَ تَرْجِعُوا بَعْدِی کُفَّاراً یَضْرِبُ بَعْضُکُمْ رِقَابَ بَعْضٍ.** (متفقٌ علَیْهِ)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبیٔ کریم (ﷺ) نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ: لوگوں کو خاموش کردو(ان کو خاموش رہنے کی تاکید کرو۔جب لوگ خاموش ہوگئے اور نبیٔ کریم (ﷺ) کی طرف متوجہ ہوگئے اس کے بعد حضور (ﷺ) کو جو خطبہ دینا تھا وہ شروع فرمایا)اس میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی اور صحابۂ کرام کو تاکید فرمائی کہ میرے دنیا سے جانے

کے بعد کافروں جیسے مت بن جائیو کہ کافر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارتے ہیں ،ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں ،تم لوگ آپس میں ایسا معاملہ مت کرنا۔

افادات:- نبی ٔکریم (ﷺ) کچھ نصیحت اوروعظ فرمانا چاہتے تھے، اورلوگ اپنی اپنی باتوں میں مشغول تھے،اگر آپ (ﷺ) اسی حالت میں بولنا شروع فرما دیتے،تو بہت سی مرتبہ ایسی حالت میں پتہ بھی نہیں چلتا کہ کوئی بات کہی جارہی ہے،اس لیے بولنے والے کو بھی چاہیے کہ پہلے ان کو خاموش کرے،پھر جو کچھ کہنا ہو وہ کہے۔ دیکھو! حضورِ اکرم (ﷺ) نے بھی اس بات کا اہتمام فرمایا کہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ لوگوں سے کہو کہ خاموش ہوجائیں۔چناں چہ حضرت جریر رضی اللہ عنہ نے اعلان کیا۔

جیسا کہ مائک میں کہا جاتا ہے کہ بھائیو! خاموش ہوجاؤ اوردھیان دو اور سنو،پھر بات کہی جاتی ہے۔ یہاں اس روایت کو لاکر یہی بتانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ ثابت ہے،اوراسی طرح ہونا بھی چاہیے۔

باب الوعظ والاقتصادفیه

وعظ و نصیحت میں میانہ روی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شریعت کی ایک اہم تعلیم:

نیا عنوان قائم کیا ہے: وعظ کہنا، نصیحت کرنا اور اس میں میانہ روی سے کام لینا۔

یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے۔ دیکھو! کوئی کام کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو، لیکن اس میں بھی شریعت یہ کہتی ہے کہ اعتدال سے کام لو۔ بڑے سے بڑا صاحبِ علم اور بڑے سے بڑا شیریں کلام اور نصیحت کی اچھی اچھی باتیں کہنے والا بھی اگر بار بار کہتا رہے گا تو لوگ تنگ آجائیں گے، اُکتا جائیں گے، اُوب جائیں گے، اکتاہٹ پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے نصیحت کے معاملہ میں کوئی ایسا انداز اختیار کرنا کہ لوگ دین کی باتوں سے اُکتاہٹ محسوس کرنے لگیں؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ جیسے: اگر بریانی بھی روزانہ کھاتے رہیں گے تو کیا ہوگا؟ دو دن کے بعد طبیعت کہے گی کہ بس کرو، اب تو کچھ دال آجائے تو اچھا ہے۔

معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو، لیکن ہر ایک چیز کے لیے موقع و محل ہوتا ہے۔ شریعت نے دین کی باتیں لوگوں تک پہنچانے اور وعظ و نصیحت اور تقریر کرنے کے معاملہ بھی یہی تاکید کی ہے کہ اس میں بھی آپ اتنا مبالغہ سے کام نہ لیں، اس کی اتنی کثرت نہ کریں کہ پھر لوگ آپ کو دیکھ کر ہی چھپنے لگیں۔ بعض لوگوں کا ایسا مزاج ہوتا ہے تو

پھر لوگ ان سے بھاگتے ہیں۔ اگر ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آج فلاں مسجد میں فلاں صاحب گئے ہیں تو اس دن مسجد بدل ڈالیں گے، اس مسجد میں نماز پڑھنے جائیں گے ہی نہیں، ایسا اس لیے ہوا کہ اس نصیحت پر عمل نہیں کیا گیا، اس لیے اس بات کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ادۡعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِٱلۡحِكۡمَةِ وَٱلۡمَوۡعِظَةِ ٱلۡحَسَنَةِ﴾ اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف لوگوں کو دانائی و حکمت کے ساتھ، بھلے طریقہ سے نصیحت کر کے اور سمجھا کر دعوت دیجیے۔ بھلے طریقہ سے جو نصیحت کی جاتی ہے اس کی بہت سی شکلیں ہیں، ان میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ نصیحت کرنے کے معاملہ میں مبالغہ سے کام نہ لیا جائے، موقعہ بموقعہ، ہفتہ میں ایک یا دو مرتبہ ہو؛ بس۔ اس سے زیادہ نہیں، اور روزانہ تو بالکل بھی نہیں۔

حکمتِ تربیت یہی ہے:

حدیث ٦٩٩:-

وعن أَبي وائلٍ شقيقِ بن سَلَمَةَ، قَالَ: كَانَ ابنُ مَسْعُودٍ -رضی اللہ عنہ- يُذَكِّرُنَا في كُلِّ خَمِيسٍ، فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحمانِ! لَوَدِدتُ أنَّكَ ذَكَّرْتَنَا كُلَّ يَومٍ، فَقَالَ: أمَا إنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذَلِكَ أنِّي أكْرَهُ أنْ أُمِلَّكُمْ، وَإنِّي أتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ رسول الله (ﷺ) يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((يَتَخَوَّلُنَا)): يَتَعَهَّدُنَا.

ترجمہ:- حضرت ابووائل شقیق بن سلمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (جو بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، صحابہ میں ان کا علمی مقام بہت اونچا تھا) ہر جمعرات کو ہمیں نصیحت کرتے تھے۔ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے درخواست کی کہ: اے ابوعبدالرحمن! ہماری دلی خواہش اور تمنا یہ ہے کہ آپ روزانہ وعظ کہیں (معلوم ہوا کہ ایسا کہنے والے بھی ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک دو کے کہنے کی وجہ سے آپ یہ وطیرہ اختیار کرلیں) تو اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ بات اس چیز سے مجھے باز رکھتی ہے کہ میں تمہیں اکتاہٹ میں ڈال دوں (یعنی میں روزانہ نصیحت کر سکتا ہوں، لیکن اگر میں ایسا کروں گا تو میرا یہ عمل اور میرا یہ طریقہ وطرز تم لوگوں کو اکتاہٹ میں مبتلا کردے گا، پھر تم لوگ اکتا جاؤ گے) اس لیے میں موقع و محل اور وقت دیکھ کر تمہیں نصیحت کرتا ہوں (اور اس کی دلیل یہ بتلائی) جیسا کہ نبی کریم ﷺ بھی موقع و محل دیکھ کر نصیحت فرماتے تھے، اس ڈر سے کہ کہیں ہم لوگ اکتاہٹ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

افادات:- "تَخَوُّل" کہتے ہیں کہ کسی کی تربیت اور نگرانی کے معاملہ میں سمجھ داری سے کام لینا۔ نصیحت وتقریر اور دین کی باتیں جو کہی جاتی ہیں اس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی دینی تربیت ہو۔

حضورِ اکرم ﷺ سے بڑھ کر اچھی نصیحت کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے؟ اور صحابہ سے بڑھ کر محبت اور توجہ سے سننے والے اور کون ہو سکتے تھے؟ اس کے باوجود حضور ﷺ روزانہ نصیحت اس لیے نہیں فرماتے تھے کہ کہیں یہ لوگ اکتا نہ جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی

تربیت کا ایک طریقہ ہے،اس چیز کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔تربیت اور حکمتِ تربیت کے خلاف ہے کہ آدمی اس چیز کا اہتمام نہ کرے۔اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کی تربیت اور تعلیم مقصود ہوتی ہے جب وہ اکتاہٹ محسوس کرنے لگتے ہیں،پھر یا تو وہ اس کو چھوڑ جاتے ہیں،یا ساتھ رہتے ہیں تب بھی اس کی باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے۔

فقاہت کی علامت:

حدیث ۷۰۰:-

وعن أبي اليقظان عمار بن ياسر رضی اللہ عنہما قَالَ:سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول:إنَّ طُوْلَ صَلاَةِ الرَّجُلِ، وَقِصَرَ خُطْبَتِهِ،مَئِنَّةٌ مِنْ فِقْهِهِ،فَأَطِيْلُوا الصّلاَةَ وَأَقْصِرُوا الْخُطْبَةَ.

((مَئِنَّةٌ)) أيْ:عَلاَمَةٌ دَالَّةٌ عَلَى فِقْهِهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا کہ: آدمی کی نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی فقاہت اور سمجھ داری کی علامت اور نشانی ہے؛اس لیے تم نماز کو لمبا کرو اور خطبہ کو مختصر کرو۔

افادات:- جیسے جمعہ کے دن نماز لمبی ہو اور خطبہ نماز کے مقابلہ میں مختصر اور(Short) ہونا چاہیے۔آج کل معاملہ بالکل اُلٹ گیا ہے،خطبے لمبے لمبے ہوتے ہیں اور نمازیں مختصر ہوتی ہیں،

حالاں کہ نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ نماز کا لمبا ہونا اور خطبہ کا مختصر ہونا آدمی کی سمجھ داری کی علامت ہے۔

وعظِ مختصر، مگر پُر اثر:

حدیث ۱۰۷:-

وعن مُعاوِيَةبن الحكم السُّلَمى رضی اللہ عنہ قَالَ: بَيْنَا أنَا أُصَلّى مَعَ رسول الله (ﷺ) إذْ عَطَسَ رَجُلٌ مِنَ الْقَوْمِ، فَقُلْتُ: يَرْحَمُكَ اللهُ، فَرَمَانِي الْقَوْمُ بِأَبْصَارِهِمْ. فَقُلْتُ: وَاثُكْلَ أُمِّيَاهُ، مَا شَأْنُكُمْ تَنْظُرُونَ إِلَيَّ؟ فَجَعَلُوا يَضْرِبُونَ بأيديهم عَلَى أَفْخَاذِهِمْ فَلَمَّا رَأَيْتُهُمْ يُصَمِّتُونَنِي لٰكِنّى سَكَتُّ، فَلَمَّا صَلّى رسول الله (ﷺ)، فَبِأَبِي هُوَ وَأُمِّي، مَا رَأَيْتُ مُعَلِّماً قَبْلَهُ وَلاَ بَعْدَهُ أَحْسَنَ تَعْلِيماً مِنْهُ، فَوَاللهِ مَا كَهَرَنى، وَلاَ ضَرَبَنِي، وَلاَ شَتَمَنِي. قَالَ: إنَّ هٰذِهِ الصَّلاَةَ لاَ يَصْلُحُ فِيهَا شَيْءٌ مِنْ كَلاَمِ النَّاسِ، إِنَّمَا هِيَ التَّسْبِيحُ وَالتَّكْبِيرُ وَقِراءةُ القُرْآنِ، أَوْ كَمَا قَالَ رسول الله (ﷺ). قلتُ: يَا رسول الله! إنّي حَدِيثُ عَهْدٍ بِجَاهِلِيَّةٍ، وَقَدْ جَاءَ اللهُ بِالإِسْلاَمِ، وَإِنَّ مِنّا رِجَالاً يَأْتُونَ الْكُهّانَ قَالَ: فَلاَ تَأْتِهِمْ. قُلْتُ: وَمِنّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُونَ؟ قَالَ: ذَاكَ شَيْءٌ يَجِدُونَهُ فى صُدُورِهِمْ فَلاَ يَصُدَّنَّهُمْ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاویہ بن حکم سُلَمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور (ﷺ) کے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ رہا تھا (یہ نئے نئے اسلام لائے تھے) نماز کے دوران ہی ایک آدمی کو چھینک آئی (چھینکنے والے نے الحمدللہ نہیں کہا تھا، لیکن ان کو یہ معلوم تھا کہ چھینک کھانے والے کو جواب میں یرحمک اللہ کہنا چاہیے) تو میں نے نماز ہی میں یرحمک اللہ کہہ دیا (دراصل ان کو یہ پتہ ہی

نہیں تھا کہ نماز میں بولنے کی ممانعت ہے،اور صحابہ نماز میں ہونے کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے،اس لیے)لوگ میری طرف گھورنے لگے،تو میں بول پڑا کہ میری ماں مجھے روئے، تم لوگ مجھے گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟ جب میں یہ بولا تو لوگ اپنی رانوں پر اپنے ہاتھ مارنے لگے۔یعنی اس طرح وہ ان کو یہ بتلانا چاہتے تھے کہ بھائی! تم خاموش رہو۔تو مَیں سمجھ گیا کہ یہ مجھے چپ کرانا چاہتے ہیں ("لٰكِنِّي سَكَتُّ"۔ شرّاح فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ)مجھے جوش تو بہت آیا کہ ان کو کچھ کہوں لیکن پھر بھی مَیں خاموش رہا اور کچھ بولا نہیں (یہ پورا قصہ تو نماز کے دوران پیش آیا تھا اور جماعت سے نماز ہو رہی تھی۔آگے جو بات آرہی ہے اسی کی تعلیم دینا چاہتے ہیں) حضرت معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نماز سے فارغ ہوئے،میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ، مَیں نے کسی سکھانے والے کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اچھا سکھانے والا آپ سے پہلے یا آپ کے بعد نہیں دیکھا۔اللہ کی قسم! حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نہ مجھے ڈانٹا،نہ مجھے مارا،نہ مجھے لتاڑا، بلکہ اپنے قریب بلا کر فرمایا: بھائی! یہ تو نماز ہے،اور نماز کے باہر جس طرح باتیں کرتے ہیں ، نماز کی حالت میں ایسی باتیں کرنے کی گنجائش نہیں ہے (بلکہ نماز میں خاموش رہنا چاہیے)نماز میں تو سبحان اللہ، اللہ اکبر کہا جاتا ہے، قرآنِ پاک کی تلاوت کی جاتی ہے(نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جو تم نے کیں۔انہوں نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نصیحت کرنے کا جو انداز دیکھا اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو جس محبت سے سمجھایا،اس سے ان کا حوصلہ بڑھا،اور انہوں نے موقع غنیمت سمجھ کر ایک بات پوچھ لی کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توجہ میری طرف منعطف ہے تو چلو! ایک بات پوچھ لوں)انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو اسلام سے دور تھے،اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام عطا فرمایا، ہمارے یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کاہنوں کے پاس جاتے

ہیں۔ حضور (ﷺ) نے ان سے فرمایا: تم ان کے پاس مت جائیو(اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔اس پر انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ کیوں نہ جاؤں،بلکہ بس حضور(ﷺ) نے فرمادیاتواب بات خلاص ہوگئی)پھرپوچھا:ہم میں بعض لوگ وہ ہیں جوبدشگونی لیتے ہیں۔تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: وہ ایک کھٹکا سا ہےجواس کی وجہ دل میں پیدا ہوجاتا ہے، لیکن پھر بھی اس کی وجہ سے اس کام کو چھوڑنہ دے (بلکہ اپنا کام پوراکرڈالے)

افادات:-"نماز میں ایسی باتیں نہیں ہوتی جوتم نے کیں"نصیحت کے طورپرآپ (ﷺ) نے بس اتنی ہی بات ارشاد فرمائی۔کہنے کی بات اتنی ہی تھی،وہ کہہ دی، دوسراکوئی ردِّعمل آپ (ﷺ) نے نہیں کیا۔اگرہم اور آپ ہوتے توپہلے زیادہ وقت تو مارپٹائی میں لیتے، اور کام کی جو چیزہے اس میں توایک منٹ لگاتے۔لیکن حضور (ﷺ) اپنے عمل سے اس بات کی تعلیم دے رہے ہیں کہ جواصل چیزہے اس کی طرف دھیان دو،دوسری چیزیں چھوڑو۔جب کوئی آدمی ایسا کرے گاتواس کااثر سامنےوالے پر زیادہ اچھاپڑے گا،ہم یوں سمجھتے ہیں کہ مارپٹائی میں زیادہ اثر پڑے گا۔ہاں ! اگرپہلے سے بتادیا ہے اوروہ آدمی ان باتوں سے واقف ہے، اس کے باوجود وہ قصداًایسا کرتا ہے،تووہ الگ بات ہے۔

کاہن نہیں تو عامل!:

کاہن وہ لوگ ہوتے ہیں جو آئندہ پیش آنے والے معاملات کے متعلق خبر دینے کا دعویٰ کرتے ہیں، جن کو ”جوتشی“ کہا جاتا ہے۔ آج کل بھی بہت سے لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے۔ جو مسلمان ہیں وہ جوتشیوں کے پاس تو کم ہی جاتے ہوں گے، لیکن عاملوں کے پاس جاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ آئندہ کا کیا معاملہ ہے ؟اس کے بارے میں دیکھ کر کچھ بتاؤ، حالاں کہ وہ غیب تھوڑا ہی جانتا ہے۔ یہ مزاج دھیرے دھیرے اسی طرف ڈھلتا جارہا ہے، اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

غلط عقیدہ:

بدشگونی کا مطلب یہ ہے کہ کسی کام کو کرنے سے پہلے کسی چیز کو دیکھ کر اس کام سے رک جانا۔ زمانۂ جاہلیت میں کسی آدمی کو سفر درپیش ہوتا، یا کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلتا؛ تو دیکھتا کہ کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ہے یا نہیں، اگر کوئی پرندہ بیٹھا ہوا ملتا، وہ اس کی طرف کنکر پھینکتا، اگر وہ پرندہ اُڑ کر دائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ اس کام میں کامیابی ہوگی، اور اگر وہ بائیں طرف جاتا تو سمجھتا کہ ناکامی ہوگی اور واپس ہو جاتا تھا۔

آج کل ہمارے سماج میں بھی بہت سے لوگ ایسا سمجھتے ہیں ، جیسے: باہر نکلے اور بلّی سامنے سے گزر گئی، تو کہتے ہیں کہ سارا معاملہ خراب ہو گیا، اور پھر جس کام کے ارادہ سے گھر سے نکلے تھے اس کو چھوڑ کر واپس آجاتے ہیں کہ بلّی راستہ کاٹ گئی، اب معاملہ مشکل ہے، اس کام میں کامیابی نہیں ہوگی۔ اچھا بھائی! بلّی کا سامنے سے گزرنا اتنا زیادہ موئثر ہے کہ اس نے آپ کے کام پر ہی اثر ڈال دیا؟ یہی بد شگونی ہے، اسلام ایسا عقیدہ رکھنے کی اجازت نہیں دیتا۔

اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا:

اور ایک بات یہ بھی یاد رہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی واپس تو نہیں ہوتا، لیکن دل میں کھٹکا سا رہ جاتا ہے۔ ویسے ایک آدمی شریعت کے مسئلہ کو جانتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، لیکن پھر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پرانا مزاج ہونے کی وجہ سے دل میں وسوسہ سا پیدا ہو جاتا ہے کہ اب کیا ہوگا۔ یعنی اپنا ارادہ ترک نہیں کرتا اور اس کام کو چھوڑ بھی نہیں دیتا، گھر واپس بھی نہیں ہو جاتا، بلکہ اپنے کام کے لیے آگے تو بڑھتا ہے، لیکن دل میں ایک کھٹکا سا رہتا ہے، تو اس کے لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کھٹکا پیدا ہو گیا ہو تب بھی اپنا کام کر ڈالے، اس کام چھوڑ نہ دے۔ بس ! اس طرح اس نے شریعت کے حکم پر عمل کر لیا، اب اس کے بعد بھی وہ کام نہ ہو تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی وجہ سے نہیں ہوا ، بلکہ اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں تھا اس وجہ سے وہ کام نہیں ہوا۔

بہر حال! یہاں تو یہ روایت یہی بتانے کے لیے لائے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی تعلیم وتربیت کا طریقہ کیسا تھا۔

حدیث ۷۰۲:-

وعن العِرْباض بن سارِيَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: وَعَظَنَا رسول الله (ﷺ) مَوْعِظَةً وَجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوبُ، وَذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُونُ...وَذَكَرَ الْحَدِيثَ وَقَدْ سَبَقَ بِكَمَالِهِ فِى بَابِ الْأَمْرِ بِالْمُحَافَظَةِ عَلَى السُّنَّة.**

افادات:- اس حدیث کو اس باب میں لاکر نبیٔ کریم (ﷺ) کے وعظ کا ایک نمونہ پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آپ (ﷺ) کے وعظ کی کیفیت کیا ہوا کرتی تھی۔

(یہ حدیث پہلے بھی کئی ابواب میں گزرچکی ہے، اوراس کی تفصیل باب الامر بالمحافظة علی السنة۔ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد:۳/ حدیث نمبر: ۱۵۷/ صفحہ ۲۰۸ تا ۲۱۰ پر گزرچکی ہے۔ مرتب)

باب الوقار والسكينة

سنجیدگی اور اطمینان کی عادت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ آداب کا بیان چل رہا ہے جس میں زندگی گزارنے کی تمیز اور آداب سکھائے جارہے ہیں۔ حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کتاب الادب کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایک مؤمن کی زندگی کس طرح ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر ہر قدم پر مؤمن کو کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے، اسی سلیقہ اور تمیز کو ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس سلسلہ میں مختلف ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ باب کا عنوان قائم کیا ہے: ”الوقار والسکینۃ“ وقار اور اطمینان کا بیان

زندگی کا اہم ادب:

وقار یعنی سنجیدگی اور طبیعت کے اندر جماؤ اور ٹھیراؤ کا ہونا۔ کسی آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جو اس کی طبیعت میں بے صبری پیدا کرنے والا ہو، تو اس سے متاثر ہوکر بے صبری کا اظہار نہ کرے؛ بلکہ تحمل اور بردباری سے کام لے۔ کوئی ایسی بات پیش آئی جو آدمی کی طبیعت میں اشتعال اور غصہ وجوش دلانے والی ہے، تو اس سے متاثر ہوکر مشتعل نہ ہو، جوش وغصہ میں نہ آجائے، بلکہ اپنے اوپر کنٹرول اور قابو رکھے۔ مجلس کے اندر اور لوگوں کے سامنے

آدمی کو اپنے مزاج اور طبیعت پر قابو رکھتے ہوئے اس طرح رہنا چاہیے کہ سامنے والے کی طرف سے کی جانے والی بدسلوکی یا نامناسب برتاؤ سے متأثر ہوئے بغیر سنجیدگی اور اطمینان کا اظہار کرنا چاہیے؛ اسی کو وقار اور سکینہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدمی کسی حال میں بھی وقار اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ کسی کی بھی طرف سے آپ کے ساتھ کیسا ہی معاملہ کیوں نہ کیا جائے جس کے نتیجہ آپ کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہو سکتا ہے، طبیعت میں بے صبری آسکتی ہے، جوش اور غصہ آسکتا ہے، لیکن آپ اپنے اوپر قابو رکھتے ہوئے ان ساری چیزوں سے متأثر ہوئے بغیر وقار اور سنجیدگی کا معاملہ کریں۔

''وَقَرَ'' کا معنیٰ کسی چیز کا کسی جگہ پر ٹھیر جانا اور جم جانا۔ گویا آپ کی طبیعت میں ایسا ٹھیراؤ اور جماؤ ہو کہ سامنے والا آپ کو اپنی اصل جگہ سے ہٹا نہ سکے، اشتعال دلانے والی چیز آپ کو مشتعل نہ کر سکے، جوش دلانے والی چیز آپ کو جوش میں نہ لائے؛ اسی کو ''وقار'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بھی شریعت کی ایک اہم تعلیم ہے کہ آدمی ہمیشہ وقار کا مظاہرہ کرے اور سنجیدگی سے رہے۔

ہر معاملہ میں تواضع :

اس سلسلہ میں آیتِ کریمہ پیش کی ہے: ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا﴾ اللہ تعالیٰ نے سورۂ فرقان میں اپنے مخصوص بندوں کی کچھ صفات بیان کی ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ ہے کہ رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں، گویا ان کی ہر

حرکت اور معاملہ سے تواضع ظاہر ہوتی ہے،ان کی چال میں بھی تواضع ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی بیماروں کی طرح بالکل آہستہ آہستہ چلے،بلکہ آدمی اپنی رفتار سے چلے،خود نبی کریم ﷺ کی رفتار میں تیزی تھی جیسا کہ حدیث پاک میں آتا ہے:"كَأَنَّمَا الْأَرْضُ تُطْوىٰ لَهُ"آپ اس طرح چلتے تھے کہ گویا زمین آپ کے لیے لپیٹی جارہی ہے۔معلوم ہوا کہ عاجزی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیماروں کی طرح چلے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ وہ بالکل آہستہ آہستہ بیماروں کی طرح چل رہاہے،اس سے پوچھا:کیابات ہے؟تم بیمار ہو؟اس نے کہا:نہیں۔ توایک کوڑا مارا اور کہا:نوجوان ہوکراس طرح چلتےہو؟اس طرح مت چلو۔اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ آدمی کی چال میں تکبر،بڑائی اوراتراہٹ ہو،اس سے بھی شریعت نے منع کیا ہے،آدمی کی ہر ادااورطریقہ سے تواضع ٹپکنی چاہیے،ہر معاملہ میں فروتنی ظاہر ہونی چاہیے۔

رحمٰن کے بندوں کی صفت:

﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾اور جہالت کا برتاؤکرنے والے لوگ جب ان سے مخاطب ہوتے ہیں تو وہ جواب میں کہتے ہیں:صاحب سلامت رہو۔"جاہلون"سے مراد"اَن پڑھ" نہیں ہے،بلکہ کبھی پڑھا لکھا آدمی بھی جہالت بھرا سلوک کرتاہے،اور کبھی بے پڑھالکھاآدمی بھی بڑا باتمیزاوراچھاسلوک کرتاہے۔تو یہاں"جاہلون" کہہ کرایسے لوگ مراد ہیں جو کسی کے

ساتھ جیسا مناسب، انسانیت والا، مروت و شرافت والا برتاؤ کرنا چاہیے، ویسا برتاؤ نہ کریں، بلکہ نادانی اور جہالت بھرا برتاؤ کریں؛ جس کو ہم اپنی زبان میں ''اُلٹی بات کرنے والا'' کہتے ہیں۔ تو ایسا آدمی جب گفتگو کرے تو اس کے جواب میں مشتعل نہ ہو جائے، جوش اور غصہ میں نہ آجائے، بلکہ سلامتی والی ایسی بات کہے کہ سامنے والا اپنی حرکت سے اس کو جو الجھانا چاہتا ہے وہ الجھا نہ سکے۔ یہاں ﴿سَلَامًا﴾ سے مراد ''السلام علیکم'' کہنا نہیں ہے، بلکہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اپنے آپ کو اس سے بچالے۔ سامنے والے کے سلوک کا تقاضہ تو یہ تھا کہ یہ اس سے الجھ جاتا، اور اس کے ساتھ لڑ بھڑ جاتا، لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ صبر و تحمل اور بردباری سے کام لیتا ہے، اور وقار و سنجیدگی سے پیش آتا ہے۔

اس آیت کے دوسرے جزو ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴾ کا تعلق وقار اور سنجیدگی سے ہے، اس لیے کہ ظاہر ہے کوئی آدمی کسی کے ساتھ جب جہالت بھرا سلوک کرتا ہے تو طبیعت میں جوش پیدا ہوتا ہے، بے چینی اور بے صبری ہوتی ہے، آدمی کی طبیعت چاہتی ہے کہ سامنے والا ہمارے ساتھ جو معاملہ کررہا ہے تو اس کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے، لیکن ایسے ہی وقت پر وہ اپنے اوپر قابو رکھتا ہے، اور ضبطِ نفس سے کام لیتا ہے، اور سامنے والے کے جہالت بھرے سلوک کے جواب میں یہ جہالت والا معاملہ نہیں کرتا، بلکہ ایسی حرکتوں سے اپنے آپ کو بچالے جاتا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے مقبول و مخصوص بندوں کی جو صفات و خوبیاں ہیں ان میں سے ایک خوبی یہ بھی ہے؛ اسی کو ''وقار'' سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار کا ایک پہلو یہ بھی ہے:

حدیث ۷۰۳:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: مَا رَأَيْتُ رسول الله** (ﷺ) **مُسْتَجْمِعاً قَطُّ ضَاحِكاً حَتَّى تُرَى مِنهُ لَهَوَاتُهُ، إِنَّمَا كَانَ يَتَبَسَّمُ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

((اللَّهَوَاتُ)) جَمْعُ لَهَاةٍ: وَهِيَ اللَّحْمَةُ الَّتي في أقْصى سَقْفِ الْفَمِ.

ترجمہ:-حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو کبھی کھل کھلا کر اور خوب جم کر اس طرح ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ آپ کے منھ کے اندر کا کوّا نظر آتا ہو، اگر کبھی کوئی بات ہنسی کی ہوا کرتی تھی تو آپ (ﷺ) صرف مسکراتے تھے۔

افادات:-یہ آپ (ﷺ) کے وقار کی بات تھی۔یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وقار کے ایک دوسرے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں۔حلق کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا لٹکا ہوا ہوتا ہے، جب آدمی کِھل کِھلا کر زور سے ہنستا ہے، تو سامنے والے کو وہ نظر آتا ہے؛ اسی کو ہم اپنی زبان میں کوّا کہتے ہیں۔مسکرانے کا مطلب یہ ہے کہ صرف ہونٹ کھلیں ، آواز بھی پیدا نہ ہو، اور آدمی کے دندان نظر آئیں ، جس کو تبسم کہتے ہیں۔بہت سی مرتبہ ہنسانے والے ہنساتے ہیں ، مگر یہ اپنے آپ پر ایسا ضبط اور کنٹرول رکھتا ہے، اور اس کا ایسا اثر نہیں لیتا کہ بے قابو ہو جائے، لوٹ پوٹ ہو جائے، اور خوب زور زور سے ہنسنے لگے، اس لیے کہ یہ طریقہ بھی وقار کے خلاف ہے۔

وقار کا ایک پہلو وہ بھی بتایا تھا کہ غصہ دلانے والا جہالت بھری بات کرتا ہے تو اس کے جواب میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں کرتا، بلکہ اپنے آپ کو بچالیتا ہے۔ اور وقار کا ایک پہلو یہ بھی بتایا کہ ہنسانے والا ہنسانے کی بات کرتا ہے، یا کوئی ایسی بات پیش آگئی جس سے آدمی ہنسنے میں بے قابو ہو جائے، تب بھی یہ اپنے آپ کو بے قابو ہونے سے بچاتا ہے۔ وقار کا ایک طریقہ اور انداز یہ بھی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ وقار کے اندر دونوں چیزیں ملحوظ رکھنی چاہئیں، جوش و غصہ والی بات سے اتنا زیادہ غصہ بھی نہ ہو جائے، اور ہنسانے والی بات پر اتنا بے قابو ہو کر ہنسنا بھی شروع نہ کر دے، بلکہ اپنے آپ پر ضبط اور کنٹرول رکھے، اسی کا نام وقار اور سنجیدگی ہے، اور شریعت نے اس کی تعلیم دی ہے۔

الندب الی اتیان الصلاۃ والعلم ونحوهما من العبادات بالسکینۃ والوقار

نمازاور علمی مجالس میں سکون و وقار سے آنا

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں :

نماز، علم کی مجلس ،یاعبادات کے قبیل کی کوئی چیز؛جس میں آدمی حاضری دیا کرتا ہے،وہاں بھی آدمی ایسی عجلت نہ دکھائے کہ طبیعت بے قابو ہو جائے،بلکہ ایسی جگہوں پر بھی وقار،اطمینان وسکون کے ساتھ پہنچے۔شریعت کسی بھی حال میں وقار کو چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔

تقویٰ کی علامت:

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے:﴿وَمَن يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِن تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے دین کی نشانیوں کاادب کرتا ہے؛یہ اس کے دل کے اندر اللہ تعالیٰ کے خوف اورڈر کی علامت ہے۔"شعائر"یعنی کسی بھی مذہب اوردین کی علامتیں اورنشانیاں جن کو دیکھ کروہ مذہب والے پہچانے جاتے ہیں ، جیسے: نماز اسلام کے شعائر میں سے ہے،اس لیے اس کے ادب کالحاظ رکھنا ضروری ہے اوراس کے ادب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی اتنی جلد بازی اور عجلت نہ کرے کہ بھاگنے دوڑنے کی نوبت آئے،بلکہ اطمینان وسکون کے ساتھ نماز کے لیے مسجد میں آئے۔ دوسری کسی بھی علمی ودینی مجالس میں حاضری دیتے وقت اطمینان وسکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

گویاوقاراورسنجیدگی کی جو تعلیم ہمیں دی گئی ہے اس کالحاظ یہاں تک کیا گیاکہ عبادات کی حاضری کے موقع پر بھی اس کوملحوظ رکھاگیا ہے۔چوں کہ عبادات وہ طریقے ہیں جن سے آدمی اللہ تعالیٰ کوراضی کرتاہے،توان کے بارے میں کسی کویہ خیال ہوسکتا تھاکہ جلدبازی اورعجلت سے کام لینا شاید مطلوب وپسندیدہ ہو۔تو یہ روایت لاکریہ بتلارہے ہیں کہ ایسانہیں ہے،بلکہ وقار اورسنجیدگی کے متعلق شریعت کی جو تعلیم ہے اس کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے، اس کالحاظ تو وہاں بھی ہوناچاہیے۔

دوڑنا؛وقاراورسنجیدگی کے خلاف ہے:

حدیث ۷۰۴:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله (ﷺ) يقول: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ، فَلاَ تَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَسْعَونَ، وَأْتُوهَا وَأَنْتُمْ تَمْشُونَ، وَعَلَيْكُمُ السَّكِينَةُ، فَمَا أَدْرَكْتُم فَصَلُّوا، وَمَا فَاتكُمْ فَأَتِمُّوا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

زادمسلِمٌ في روايةٍ لَهُ: فَإنَّ أحَدَكُمْ إِذَا كَانَ يَعْمِدُ إِلَى الصَّلاَةِ فَهُوَ فِي صَلاَةٍ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سناکہ:جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے ،یانمازشروع ہوچکی ہو؛ تو اس میں شریک ہونے کے لیے دوڑتے ہوئے نہ آؤ،بلکہ چلتے ہوئے اور سکون کے ساتھ آؤ۔اب امام کے ساتھ نماز کاجتناحصہ مل گیاوہ امام کے ساتھ پڑھ لو،اورجتنا چھوٹ گیا اس کوبعدمیں پورا کرلو۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ: تم میں کوئی آدمی جب نماز کے ارادہ سے چلتا ہے تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔

افادات:–مثلاً: مسجد میں آئے اور دیکھا کہ جماعت شروع ہوچکی ہے اور امام صاحب رکوع میں ہیں، تو بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ رکعت پانے کے لیے دوڑتے ہیں۔اس روایت میں یہی فرمایا کہ دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عام رفتار سے آؤ، اگر اس میں معمولی تیزی ہو تو کوئی حرج کی بات بھی نہیں ہے، لیکن جس رفتار کو دوڑنے سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی اجازت نہیں ہے۔دوڑنا؛ وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے، اس لیے کہا گیا کہ دوڑ کر نہ آؤ بلکہ چل کر آؤ۔یعنی نماز میں شریک ہونے کے لیے اپنی عام چال میں کوئی فرق آنا نہیں چاہیے، وقار و سنجیدگی والی چال کے ساتھ ہی نماز میں شریک ہونا بھی نماز کے آداب میں سے ایک ادب ہے۔

حاصل شدہ کے لیے بھاگنا لاحاصل:

اب یہ سوال کہ سکون کے ساتھ آنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ کوئی رکعت چھوٹ جائے؟ تو کہا گیا کہ آپ تو اطمینان ہی سے آیئے، امام کے ساتھ نماز کا جتنا حصہ مل جائے وہ امام کے ساتھ پڑھ لیجئے، اور جتنا چھوٹ جائے اس کو بعد میں پورا کرلیجئے۔ مسلم شریف کی روایت میں جو زیادتی ہے اس کے ذریعہ ایک اشکال کا جواب دیا ہے کہ آدمی دوڑتا اس لیے ہے کہ میں جلدی سے نماز میں شریک ہوکر نماز کا ثواب حاصل کرلوں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ: کوئی

آدمی جب نماز کے ارادے سے چلتاہے تووہ نماز ہی کے حکم میں ہے۔ گویا آپ گھر سے چلے تو آپ کا میٹر چالو ہوگیا، اب فکر کاہے کی ہے۔ آپ اسی لیے دوڑتے تھے کہ نماز کا ثواب لیناہے، تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی نماز کے ثواب کا میٹر شروع ہوچکا ہے، اب آپ اطمینان رکھئے، اوراپنی پُروقار چال سے چلتے ہوئے نماز میں شریک ہویئے، بھاگنے دوڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے دوڑنے کا مقصد ثواب کوحاصل کرناتھا، وہ تو نماز کے ارادہ سے چلنے سے ہی حاصل ہوچکاہے۔

جلدبازی نیکی نہیں ہے:

حدیث ۷۰۵:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أَنَّهُ دَفَعَ مَعَ النَّبِيِّ (ﷺ) يَوْمَ عَرَفَةَ فَسَمِعَ النبيُّ (ﷺ) وَرَاءهُ زَجْراً شَدِيداً وَضَرْباً وَصَوْتاً لِلإبِلِ، فَأَشَارَ بِسَوْطِهِ إلَيْهِمْ، وقال: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! عَلَيْكُمْ بالسَّكِينَةِ، فَإنَّ الْبِرَّ لَيْسَ بالإيضَاعِ.

((الْبِرُّ)): الطَّاعَةُ. وَ((الإيضَاعُ)): الإسْرَاعُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم (ﷺ) عرفات کے دن (غروبِ آفتاب کے بعد میدانِ عرفات سے مزدلفہ کی طرف) روانہ ہوئے۔ جب آپ روانہ ہوئے توجولوگ حج میں شریک تھے وہ سب بھی آپ کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ اب حضور (ﷺ) تو آگے تشریف لے جا رہے تھے تو آپ نے اپنے پیچھے سے محسوس کیا اورسنا کہ لوگ

اپنے جانوروں کو(تیز چلانے کے لیے) خوب جھڑک رہے ہیں اور ان کی پٹائی کررہے ہیں اوراونٹوں کو آوازدے رہےہیں۔تو آپ (ﷺ) نے اپنے کوڑے کے ذریعہ سے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:اے لوگو!سکون اور اطمینان کولازم پکڑو، اپنے جانوروں کوجھڑک کراوران کی پٹائی کرکے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے،اس لیے کہ جانوروں کو تیز دوڑانا کوئی عبادت اور نیکی نہیں ہے

باب اکرام الضیف

مہمان کا اعزاز واکرام کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عمل:

مہمان نوازی بھی آداب میں سے ہے۔باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هَلۡ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيۡفِ إِبۡرَاهِيمَ الۡمُكۡرَمِينَ﴾ کیا آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باعزت مہمانوں کا قصہ پہنچا؟ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے حضرت کو سلام کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کیا(اور دل میں سوچا) نئے لوگ معلوم ہوتے ہیں ،جانے پہچانے لوگ نہیں ہیں،شناسا نہیں ہیں۔پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام دھیرے سے اپنے گھر والوں کے پاس سرک گئے، اور تازہ بھنا ہوا بچھڑا لے کر آئے، اپنے مہمانوں کے سامنے پیش کیا اور فرمانے لگے : ﴿أَلَا تَأۡكُلُونَ﴾ کھاتے نہیں ؟ یہ آیتِ کریمہ لاکر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مہمان نوازی والا عمل بتلایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام کے پاس ان کے یہاں پیدا ہونے والے بچے کی بشارت دینے کے لیے تین فرشتے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل اور حضرت اسرافیل علیہم السلام کو انسانی شکلوں میں بھیجا تھا۔اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام بھی بوڑھی ہوچکی تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام خود بھی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکے تھے، مگر اللہ تعالیٰ کو ان دونوں کو بیٹا دینا منظور تھا جس کی بشارت دینے کے لیے ان تین فرشتوں کو بھیجا

اور یہ تینوں انسانی شکل میں ان کے گھر مہمان بن کر پہنچے، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کو پہچان نہیں پائے، بلکہ سمجھے کہ کوئی انسان ہیں جو ہمارے یہاں مہمان آئے ہیں۔اس لیے کہ آنے والے دونوں قسم کے ہوتے ہیں ، بعض ایسے ہوتے ہیں جن سے پہلے سے شناسائی اور جان پہچان ہوتی ہے، اور بعضوں سے پہلے سے جان پہچان نہیں ہوتی، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دل میں سوچا کہ آنے والے نئے معلوم ہوتے ہیں۔

تب مجوسی ایمان لے آیا:

ویسے بھی مہمان نوازی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جاری فرمودہ سنت ہے، آپ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جب کھانے بیٹھتے تھے تو جب تک کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا وہاں تک کھانا حلق سے نہیں اترتا تھا، اگر کوئی مہمان نہیں ہوتا تھا تو مہمان تلاش کرنے کے لیے باہر نکلتے تھے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اسرائیلیات سے ایک قصہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی مہمان نہیں تھا تو اس کی جستجو اور تلاش میں نکلے، ایک مجوسی نظر آیا، اس کو ساتھ لے آئے، کھانے کے لیے ساتھ بٹھایا اور اس سے کہا: بسم اللہ کہو اور کھانا شروع کرو۔اس نے کہا: کون اللہ؟ میں نہیں جانتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو اُٹھا کر روانہ کر دیا۔جب وہ باہر نکلا تو اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ: اے ابراہیم! ہم تو اس کو زندگی بھر کھلاتے رہے، اور تم سے ایک مرتبہ بھی کھلایا نہ گیا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً دوڑے اور اس کو سمجھا بجھا کر ساتھ لے آئے

کہ میرے ساتھ ہی کھانا کھاؤ۔اس نے کہا: جب تک مجھے یہ نہیں بتلاؤ گے کہ مجھے نکالا کیوں تھا، پھر دوبارہ بلا کر کیوں لائے؛وہاں تک میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتلایا:تو نے اس اللہ کا نام نہیں لیا جس نے ہمیں پیدا کیا اور روزی دی،اس کے بہت سارے انعامات و احسانات ہیں ،اسی کی نعمتیں ہم استعمال کرتے ہیں ، تجھے اس کا نام لینا چاہیے،لیکن میں نے جب بسم اللہ پڑھنے کو کہا تو تو نے یہ جواب دیا کہ کون اللہ ؟میں نہیں جانتا،اس پر مجھے غصہ آیا اور میں نے تجھے روانہ کر دیا،لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی کہ میں تو اس کو ابتدائے زندگی سے آج تک کھلا رہا ہوں،تو میں تجھے بلا کر لے آیا؛ اب کھانا شروع کر۔یہ سن کر وہ آدمی ایمان لے آیا۔

آیت سے مستفاد احکام:

یہاں یہ آیت لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھئے!حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے یہاں آنے والے ان مہمانوں کی میزبانی کا اتنا زیادہ اہتمام کیا کہ وہ آکر بیٹھے تو آہستہ سے ان کے پاس سے سرک گئے،اور بھونا ہوا تازہ بچھڑا لا کر ان کے سامنے پیش کیا۔

﴿فَرَاغَ﴾کا مطلب ہے: آدمی کا آہستہ سے سرک جانا،اس طرح اُٹھنا کہ پاس والوں کو پتہ بھی نہ چلے۔اس سے معلوم ہوا کہ جب مہمان آئے تو فوری طور پر جو کچھ موجود ہو،اسی سے اس کا اکرام کرنا چاہیے،تکلّف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔بعد میں مزید جو اہتمام ہو سکتا ہو وہ کر لے ۔

”انہوں نے مہمانوں کے سامنے لا کر کھانا پیش کیا“ اس سے بعض حضرات یہ بھی استدلال کرتے ہیں کہ مہمانوں کو مکلّف نہیں کرنا چاہیے کہ آپ چلئے ، بلکہ وہ جہاں بیٹھے ہوں وہیں کھانا لا کر پیش کیا جائے۔

چوں کہ وہ فرشتے تھے اس لیے انہوں نے کھانے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھائے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو متوجہ کیا کہ کھاؤ، کیوں نہیں کھاتے؟ ان کے نہ کھانے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذرا خوف بھی محسوس کیا، اس لیے کہ اُس زمانہ کا رواج یہی تھا کہ کوئی کسی کے یہاں کسی برے ارادہ سے جاتا تو اس کے یہاں کا کھانا نہیں کھاتا تھا(آج کل تو اسی کا کھا کر اسی کو تکلیف پہنچاتے ہیں۔ خیر!) انہوں نے کہا کہ: ہم تو فرشتے ہیں ، ہم کھاتے پیتے نہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام کا مہمانوں کا اکرام:

دوسری آیت پیش کی:﴿وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ﴾ یہی فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے کی بشارت دینے کے لیے آئے تھے، یہاں سے فارغ ہونے کے بعد حضرت لوط علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے پاس پہنچے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں قیام پذیر تھے، وہاں سے چند میل کے فاصلے پر حضرت لوط علیہ السلام کی آبادی تھی، فرشتے انسانی شکل میں بے ریش اور خوبصورت تھے، اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم لواطت کی برائی میں مبتلا تھی، ان خوبصورت شکل والے لڑکوں کو دیکھ کر وہ لوگ اپنے جذبات لے کر دوڑے ہوئے آئے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے ان لوگوں سے

کہا کہ: تمہارے گھروں میں جو تمہاری بیویاں ہیں وہ میری بیٹیوں کا درجہ رکھتی ہیں ، وہ تمہارے لیے پاکیزہ اور حلال ہیں،ان سے اپنی ضرورت پوری کرو۔ یہ میرے مہمان ہیں، ان کے معاملہ میں تم اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور مہمانوں کے معاملہ میں مجھے رسوانہ کرو۔کیاتم میں کوئی سمجھ دار آدمی نہیں ہے؟دیکھئے! حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے مہمانوں کے اکرام کے معاملہ میں اتنا زیادہ اہتمام فرمایا اور قوم کی طرف سے کی جانے والی ناروا حرکت سے بچانے کی پوری کوشش کی، اس لیے اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔

مہمان نوازی؛ایمان کا تقاضہ:

حدیث ٦٠٧:-

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ النبيَّ (ﷺ) قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ. وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:تم میں سے جو آدمی اللہ تعالیٰ اورآخرت کے دن پرایمان رکھتاہو،اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا اکرام کرے۔اورجو آدمی اللہ تعالیٰ اورآخرت پرایمان رکھتاہواس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے (اپنے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرے)

اور جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے (یعنی اگر کچھ بولنا ہی ہو تو زبان سے بھلی بات بولے، ورنہ خاموشی اختیار کرے۔)

افادات:- مہمان نوازی ان صفات میں سے ہے جس کا اہتمام زمانۂ جاہلیت میں بھی کیا جاتا تھا، اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے آپ جن کاموں کا خاص طور پر اہتمام فرماتے تھے ؛ان میں سے ایک کام یہ بھی تھا چناں چہ حدیثِ پاک میں ہے کہ جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر غارِ حراء میں سب سے پہلی وحی نازل ہوئی، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے تین مرتبہ کہا کہ پڑھیے، آپ نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، تو انہوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دبوچا، اس کے بعد پھر آپ سے کہا تو آپ نے پڑھا، جب وہاں سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے گھر پر واپس آئے تو چوں کہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ فرشتہ سے ملاقات ہوئی تھی، اس سے آپ کو اپنی جان کا اندیشہ لاحق ہوا، تو آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے کہا: "اِنِّيْ خَشِيْتُ عَلٰى نَفْسِيْ" مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے تسلی کے لیے جو باتیں ارشاد فرمائیں، ان میں یہ فرمایا تھا: "كَلَّا! وَاللهِ لَا يُخْزِيْكَ اللهُ أَبَداً" ہرگز نہیں ! آپ کو اپنی جان کے متعلق فکر رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہیں کریں گے "اِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ. وَتَحْمِلُ الْكَلَّ. وَتَقْرِي الضَّيْفَ" آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں ، مہمان نوازی کرتے ہیں (بخاری شریف) اس سے پتہ چلا کہ مہمان نوازی ان خوبیوں میں سے ہے جن کا قدیم زمانہ سے

اہتمام چلا آرہا ہے، خود نبیٔ کریم (ﷺ) نے بھی اس کی تاکید اور تعلیم فرمائی ہے۔ گویا ایمان کی علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی اپنے مہمان کا اکرام کرے۔

آج کل تو لوگ ایسی مصیبتوں میں مبتلا ہو گئے کہ اب تو یہ سب کام بھی بوجھ پڑتے ہیں، جب سے ٹی وی کی مصیبت آگئی ہے تو مہمان کے آنے پر ناگواری کا اظہار کیا جاتا ہے، اگر آدمی ٹی وی دیکھنے بیٹھا ہو اور مہمان آجائے تو اُٹھ کر اس کی طرف توجہ کرنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

مہمان اور میزبان کے لیے ہدایات:

حدیث ۷۰۷:-

وعن أَبِي شُرَيْحٍ خُوَيْلِدِ بن عمرو الخُزَاعِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ جَائِزَتَهُ. قالوا: وَمَا جَائِزَتُهُ يَا رسول الله؟ قَالَ: يَوْمُهُ وَلَيْلَتُهُ، وَالضِّيَافَةُ ثَلَاثَةُ أَيَّامٍ، فَمَا كَانَ وَرَاءَ ذَلِكَ فَهُوَ صَدَقَةٌ عَلَيْهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفي رواية لِمسلمٍ: لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يُقِيمَ عِنْدَ أَخِيهِ حَتَّى يُؤْثِمَهُ. قالوا: يَا رسول الله! وَكَيْفَ يُؤْثِمُهُ؟ قَالَ: يُقِيمُ عِنْدَهُ، وَلَا شَيْءَ لَهُ يُقْرِيهِ بِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو شریح خویلد بن عمرو خزاعی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے، اور خصوصی اہتمام کرے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خصوصی اہتمام کیا

ہے؟ آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایک دن اور رات (گویا مہمان کی آمد پر دو وقت اس کے اکرام کے لیے کوئی مخصوص چیز (Special Item) بنانی چاہیے، اسی کو "جائزہ" سے تعبیر کیا گیا) ویسے میزبانی تین دن ہے (باقی دو دن کوئی خاص تکلّف کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو خود کھاتا ہے وہی مہمان کو کھلائے ہاں! ایک دن مہمان کے لیے اس کا اکرام کرتے ہوئے تکلّف بھی کرے) تین دن کے بعد مہمان کا کوئی حق نہیں ہے، اس کے بعد بھی میزبان اس کو کھلاتا پلاتا رہے، تو وہ اس کی طرف سے ایک طرح کا صدقہ سمجھا جائے گا۔

(اسی بات کو دوسری روایت میں اس طرح فرمایا گیا ہے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کے یہاں اتنا ٹھہرے کہ اپنے بھائی کو گناہ میں ڈال دے (یعنی مہمان بن کر گئے تو واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے، بوریا بستر لے کر فیوی کول لگا کر وہیں جم کر پڑ گئے) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! گناہ میں کیسے ڈالے گا؟ تو حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اس کے یہاں اتنا قیام کرے کہ اس کے پاس میزبانی کے لئے کچھ بھی نہ رہے، پھر وہ بے چارہ قرض لینے یا کوئی دوسری شکل اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ مہمان کو کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرنا چاہیے، اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں! صاحبِ خانہ یا جس کے یہاں آپ گئے ہیں اس کے ساتھ آپ کے مراسم ایسے ہیں کہ وہ خود اصرار بھی کرتا ہے، اور آپ کا اس کے یہاں ٹھہرنا اس

کوناگوار نہیں گزرتا بلکہ وہ خوش ہوتا ہے ؛تواس صورت میں حکم بدل جائے گا۔ورنہ اصل حکم تو یہی ہے کہ کسی کے یہاں زیادہ سے زیادہ تین دن قیام کرے، اس سے زیادہ نہیں۔

إستحباب التبشير والتهنئة بالخير

کسی کو مبارک باد دینے کا پسندیدہ ہونا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ

مبارک باد دینا پسندیدہ ہے:

کسی کے دل کو خوش کرنا دیکھنے میں ایک چھوٹی سی چیز ہے، لیکن شریعت کی نگاہوں میں بہت بڑی نیکی ہے۔اور آدمی جن مختلف طریقوں سے نیکی حاصل کرسکتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ایسی خوش کن خبر جو سامنے والے کے لیے مسرت اور خوشی کا باعث ہو اس کو بشارت کے طور پر سامنے والے کو سنانا؛ تاکہ اس کا جی خوش ہو، اور کسی اچھی بات پر مبارک باد دینا؛ یہ بھی اسلام کی نگاہ میں محبوب اور پسندیدہ ہے۔

اگر اس پر عمل ہو جائے!:

آج کل دلوں میں حسد، بغض اور کینہ کے نتیجہ میں ہم لوگوں کا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ ہمارے ساتھ رہنے والے کسی بھائی کے یہاں کوئی ایسی بات پیش آئے جو اس کے لیے باعثِ مسرت ہو، تو ہم اس کو مبارک باد دینے میں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ ایسے موقع پر اسلام ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ آپ خوشی کے موقع پر اس کو مبارک باد دیجئے، اور اگر یہ خوشی کی اطلاع اس

تک نہیں پہنچی ہے تو آپ جلدی سے اس اطلاع کو اس تک پہنچا کر اس کا جی خوش کیجئے۔ یہ بھی ایک مسلمان کا حق ہے، اور اسلام نے یہ تعلیم دی ہے، اگر ان تعلیمات پر عمل عام ہو جائے تو اس کی وجہ سے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق جو میل، عداوت، بغض اور کینہ ہوتا ہے وہ سب ختم ہو جائے۔

اسلامی معاشرے کو باہم جوڑنے والی:

قدیم زمانہ میں ہمارے یہاں اس کا رواج تھا اور آج بھی جہاں سادگی ہے وہاں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ گھروں میں جہاں قریبی تعلق ہوتا ہے وہاں بھی اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے، مثلاً: کسی کے یہاں بیٹا پیدا ہوا تو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ بچہ کے باپ کو جلدی سے خوشخبری سنا کر اس سے کچھ ہدیہ وصول کریں۔ خوشخبری سنانے والے کا جی خوش کرنا بھی ثابت ہے اور اس کی بھی تاکید آئی ہے، ایسا آج کل بھی ہوتا ہے، لیکن ہم نے اس کو صرف اپنے ہی گھر کے اندر محدود کر رکھا ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک مسلمان بھائی کا رشتہ دوسرے مسلمان بھائی کے ساتھ وہی ہے جو ایک انسان کا اپنے سگے بھائی کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ تو جیسے وہاں اس بات کی کوشش کی جاتی ہے، وہی معاملہ اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ بھی ہونا چاہیے۔

جیسے کسی نے ملازمت کے لیے درخواست دے رکھی تھی، اور آپ کو پتہ چل گیا کہ اس کی ملازمت لگ گئی، تو آپ فوراً بھاگے دوڑے اس کے پاس جائیے اور اس کو خوشخبری سنائیے، اس

سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور وہ یہ سمجھے گا کہ اس کی اس خوشی میں آپ بھی اس کے ساتھ شریک ہیں۔ یہ چیز اسلامی معاشرے کو آپس میں جوڑنے والی ہے۔

ہمارے آداب اہلِ یوروپ نے اپنا لئے:

اسلام نے یہی سب آداب ہمیں سکھائے ہیں، لیکن ہم ان آداب کو بھول گئے اور یوروپین تہذیب میں وہ لوگ انہیں آداب کو اپناتے جارہے ہیں اور خوش کن خبر کو اس انداز سے پیش کرنے کا بڑا اہتمام کرتے ہیں، حالاں کہ وہ ایک نمائش ہوتی ہے۔ ایک صاحب اپنا قصہ سنانے لگے کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک گئے، جب وہاں اترے اور امیگریشن کے اندر پارسپورٹ دیا، تو چوں کہ پارسپورٹ پر ولادت کی تاریخ (Birth date) لکھی ہوئی ہوتی ہے، تو اتفاق کی بات کہ وہ جس روز وہاں پہنچے وہی ان کی تاریخِ پیدائش تھی۔ کاؤنٹر پر جس نے ان کا پارسپورٹ لیا اس نے سب سے پہلے ان کو مبارک باد دی کہ آج آپ کا برتھ ڈے (Birth day) ہے، ہماری طرف سے مبارک باد قبول کیجئے، حالاں کہ اس کا اس سے نہ کوئی رشتہ تھا، نہ وہ اس کا پڑوسی تھا، اور نہ کوئی تعلق تھا، ایک نووارد اس ملک میں گیا تھا لیکن وہ لوگ ان چیزوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں۔ اور آج ہم الٹا کرتے ہیں، ہمارے یہاں ان چیزوں کا اہتمام تو دور کی بات رہی، بلکہ اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی کی خوشی کی بات کو دبایا جائے، حالاں کہ اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کسی کی خوشی کے موقع پر آدمی خوشی کا اظہار کرے تا کہ

اپنے مسلمان بھائی کے سامنے یہ ظاہر ہو کہ میری خوشی پر وہ بھی خوش ہے،اس سے اس کی خوشی دوبالا اور دوگنی ہو جائے گی،اس کی مسرت میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور مقصد تو یہی ہے۔ یہی چیز اسلامی معاشرے اور سماج کو قوت پہنچانے والی ہے۔

اپنا بنانے کا گُر:

پھر اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ ایک دوسرے کی مصیبت کے موقع پر بھی وہ آپس میں کام آئیں گے۔ آپ کسی کی خوشی کے موقع پر کسی کے ساتھ شرکت کریں گے تو یقیناً آپ کی غمی کے موقع پر وہ آپ کے ساتھ شریک ہونا پسند کرے گا۔ وہ یاد رکھے گا کہ فلاں خوشی کے موقع پر آپ نے مبارک بادی تھی،تو اگر آپ پر کوئی آڑا وقت آ گیا تو وہ دوڑا ہوا آئے گا،حالاں کہ وہ ایک معمولی بات تھی کہ آپ نے ذرا سا خوشی کا اظہار کیا تھا، لیکن اس عمل سے آپ نے اس کو اپنا بنا لیا۔

قرآنی دلائل:

یہی تعلیمات اور زندگی کے آداب ہیں جو ہمیں سکھائے جا رہے ہیں، انھی تعلیمات کو اس باب میں بتلاتے ہیں کہ کسی کو خوشی کے موقع پر بشارت سنانا مستحب و پسندیدہ ہے،اسلام کی نگاہوں میں یہ چیز اچھی ہے، اس کو انجام دینا چاہیے،اسی کی تلقین کی گئی اور ترغیب دی گئی ہے۔

اس موقع پر قرآنِ پاک کی بہت ساری آیتیں پیش کی ہیں ،جن میں بشارت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:﴿فَبَشِّرۡ عِبَادِ الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ﴾ باری تعالیٰ حضورِ اکرم (ﷺ) سے فرماتے ہیں کہ میرے وہ بندے جو میرے کلام کو سن کر اس کی پیروی کرتے اور اس پر عمل کا اہتمام کرتے ہیں آپ ان کو بشارت سنا دیجئے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے اس کے احکام پر عمل کرنے کی توفیق دی، اس پر اللہ تعالیٰ آپ کو اجر و ثواب اور جنت عطا فرمائے گا۔

﴿يُبَشِّرُهُمۡ رَبُّهُمۡ بِرَحۡمَةٍ مِّنۡهُ وَرِضۡوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمۡ فِيۡهَا نَعِيۡمٌ مُّقِيۡمٌ﴾ جنتیوں کو اللہ تعالیٰ بشارت سنائیں گے اپنی خاص رحمتوں اور رضامندی اور باغات کی، جن میں ان کو اور بھی نعمتیں ملیں گی اور ہمیشہ کا ٹھکانہ ملے گا۔ گویا یہ وہ کام ہے جس کو خود اللہ تعالیٰ بھی کریں گے کہ اپنے بندوں کو خوش کرنے کے لیے اپنی طرف سے خوشخبریاں سنائیں گے۔ جیسے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بیٹے کے کامیاب ہونے کی اطلاع آئی تو باپ کہتا ہے کہ کوئی اس کو نہ بتائے ،میں خود بتاؤں گا۔ اس کے دل میں بیٹے کی قدر ہوتی ہے،وہ اس کو خوش کرنا اور اس کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو اپنی طرف سے اس کو اطلاع دینے کا اہتمام کرتا ہے۔جب باری تعالیٰ اپنے بندوں کو اعزاز دینا چاہتا ہے تو ان کو ایسی بشارت خود ہی سناتا ہے۔

﴿وَأَبۡشِرُوا بِالۡجَنَّةِ الَّتِي كُنتُمۡ تُوعَدُونَ﴾ قیامت کے روز باری تعالیٰ اہلِ ایمان سے فرمائیں گے: خوشخبری سن لو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ اگر نیک کام کروگے تو جنت ملے گی، تو آج دیکھ لو، یہ مل رہی ہے، اب خوش ہو جاؤ۔

﴿فَبَشَّرۡنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیٹا ہونے کی خوشخبری فرشتوں کے ذریعہ سنائی اس کو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَبَشَّرۡنَاهُ﴾ ہم نے بشارت دی۔ یعنی یہ اطلاع دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیجا تھا، گویا بشارت دینے والے اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

قرآنِ پاک کی ان آیتوں کے ذریعہ سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے، لیکن اپنے خلیل کے ساتھ محبت کا اظہار کرنے اور ان کے اعزاز کے واسطے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنا اہتمام کیا جارہا ہے! تو ہمیں بھی آپس میں ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی چیز آپس کے تعلقات کو بڑھانے والی اور محبت میں اضافہ کرنے والی ہے۔

﴿وَلَقَدۡ جَاءَتۡ رُسُلُنَا إِبۡرَاهِيمَ بِالۡبُشۡرَىٰ﴾ ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بشارت اور خوشخبری لے کر آئے۔ باری تعالیٰ نے ان کو خوش خبری سنانے کے لیے باقاعدہ فرشتے بھیجے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر آپ بھی کسی کو کوئی خوش خبری سنانے کے لیے ٹیلیفون، خط، ٹیلی گرام، یا آدمی بھیجنے کا اہتمام کریں؛ تو یہ ثابت ہے، خود باری تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرمارہے ہیں۔

﴿وَامْرَأَتُهُ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحٰقَ وَمِن وَّرَاءِ إِسْحٰقَ يَعْقُوبَ﴾ فرشتے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے یہاں مہمان بن کر بیٹے کی بشارت سنانے کے لیے آئے؛ توحضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہلیہ حضرت سارہ بھی مہمانوں کی خدمت کے لیے (پردہ کی آڑ میں) موجود تھیں، وہ ہنسیں، اور ہم نے ان کو حضرت اسحاق کے پیدا ہونے کی بشارت سنائی اور ان کے یہاں جو بیٹا پیدا ہوگا اس کا نام یعقوب ہوگا۔

﴿فَنَادَتْهُ الْمَلَآئِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى﴾ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام کے یہاں بیٹا یحییٰ پیدا ہونے کی بشارت فرشتوں کے ذریعہ سے دلوائی۔

یہ ساری آیتیں لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ یہ خوشخبری سنانا کتنا عمدہ کام ہے کہ اللہ تعالیٰ خود بھی اس کا اہتمام کررہے ہیں، تو ظاہر ہے ہمیں بھی ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایک موتی کے مکان کی خوشخبری:

حدیث ۷۰۸:-

عن أَبي إبراهيم، ويقال: أَبو محمد، ويقال: أَبو معاوية عبد الله بن أَبي أوفى أنّ رسولَ الله (ﷺ) بَشَّرَ خَدِيجَةَ رضی اللہ عنہا بِبَيْتٍ فِي الْجَنَّةِ مِنْ قَصَبٍ لَا صَخَبَ فِيهِ، وَلَا نَصَبَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((الْقَصَبُ)): هُنَا اللُّؤْلُؤُ الْمُجَوَّفُ. وَ((الصَّخَبُ)): الصِّيَاحُ وَاللَّغَطُ. وَ((النَّصَبُ)): التَّعَبُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن ابی اَوفیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو جنت کے اندر ایک ایسے مکان کی خوشخبری سنائی جو ایسے موتی کا بنا ہوا ہو گا جو اندر سے کھوکھلا ہو گا (یعنی اس مکان کے چاروں طرف موتی کا خول چڑھا ہوا ہو گا) جس میں نہ کوئی شورشغب ہو گا اور نہ کوئی تھکن ہو گی (بڑے سکون سے وہاں زندگی گزرے گی)

افادات:- نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب غارحراء میں عبادت میں مشغول ہوتے تھے تو موقع بموقع حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ٹفن پہنچانے کا کام کرتی تھیں یعنی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو توشہ پہنچاتی تھیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام غارِ حراء میں نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس موجود تھے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا توشہ لے کر آرہی تھیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جب ان کو آتے ہوئے دیکھا تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہا: باری تعالیٰ ان کو سلام فرماتے ہیں، آپ ان کو سلام پہنچا دیجئے اور بشارت سنا دیجئے کہ باری تعالیٰ ان کو جنت میں ایک ہی موتی سے بنا ہوا محل عطا فرمائیں گے، ایسا محل جس میں کوئی شوروشغب اور تھکن نہیں ہو گی۔ (بخاری شریف: باب تَزوِیجُ النَّبِیِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) خَدِیجَۃَ وَفَضْلُھَا)

اس سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مقام معلوم ہوتا ہے۔ اور اُمہات المؤمنین میں ان کا مقام سب سے اونچا ہے، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیشہ ان کی تعریف میں رطب اللسان رہتے تھے۔

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مناقب:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ازواج میں کسی عورت پر اتنی غیرت نہیں آتی جتنی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پر آتی تھی، حالاں کہ ان کا انتقال میرے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نکاح میں آنے سے پہلے ہوچکا تھا، لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کا اتنی کثرت سے تذکرہ فرماتے تھے کہ مجھے ان پر رشک آتا تھا اور غیرت آتی تھی۔ (بخاری شریف: باب تزويج النبي (صلی اللہ علیہ وسلم) خديجة وفضلها)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نکاح میں آنے سے پہلے باری باری دو مردوں کے نکاح میں رہی تھیں، جس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نکاح میں آئیں اس وقت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عمر شریف پچیس (۲۵) سال تھی اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر چالیس (۴۰) سال تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کبھی حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا تذکرہ بڑی محبت سے فرماتے تو میں کہتی: اُس بڑھیا کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک جوان عورت عطا فرمائی ہے، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے: میری تمام اولاد انہی سے ہیں (بخاری شریف: باب تزويج النبي (صلی اللہ علیہ وسلم) خديجة وفضلها) حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تمام اولاد سوائے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے انہی سے ہیں۔ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھے، باقی چاروں بیٹیاں اور سب صاحبزادے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ہیں۔

اور حضورِ اکرم (ﷺ) پر سب سے پہلے ایمان لانے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ حضور اکرم (ﷺ) کو تسلی دینے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ اپنا سب مال حضور (ﷺ) کے لیے قربان کرنے والی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا۔ انہی کی وجہ سے نبیٔ کریم (ﷺ) کو بڑی تقویت رہی۔ ان کے انتقال والے سال ہی ابوطالب کا بھی انتقال ہوا جس کی وجہ سے حضورِ اکرم (ﷺ) کو بڑی پریشانیوں کا سامنا ہوا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) نے جنت کی بشارتیں سنائیں :

حدیث ۷۰۹:-

وعن أَبي موسىٰ الأشعرى رضی اللہ عنہ أَنَّهُ تَوَضَّأَ فى بَيْتِهِ، ثُمَّ خَرَجَ، فَقَالَ: لَأَلْزَمَنَّ رسولَ الله (ﷺ) . وَلَأَكُونَنَّ مَعَهُ يَوْمِى هَذَا، فَجَاءَ الْمَسْجِدَ، فَسَأَلَ عَنِ النَّبِيِّ (ﷺ) . فقالوا: وجَّهَ هاهُنَا، قَالَ: فَخَرَجتُ عَلَى أَثَرِهِ أَسأَلُ عَنْهُ ، حَتَّى دَخَلَ بِئْرَ أريسٍ، فَجَلَسْتُ عِندَ البَابِ حتَّى قضى رسولَ الله (ﷺ) حاجتهُ وتوضأ ، فقمتُ إليهِ فإذا هو قد جلسَ على بئرِ أريسٍ وتوسَّطَ قُفَّهَا ، و كشفَ عنْ ساقيهِ ودلاّهُما فى البئرِ ، فسلمتُ عَليهِ ثمَّ انصَرفتُ ، فجلستُ عِندَ البابِ ، فقُلْتُ: لأَكُونَنَّ بَوَّابَ رسولِ اللهِ (ﷺ) الْيَوْمَ ، فَجَاءَ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ عنہ فَدَفَعَ الْبَابَ ، فقلتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: أَبُو بَكْرٍ ، فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ ، ثُمَّ ذَهبْتُ ، فقلتُ: يَا رسولَ الله ، هَذَا أَبُو بَكْرٍ يَستَأْذِنُ . فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ . فَأَقْبَلْتُ حَتَّى قُلْتُ لأَبِي بَكْرٍ: ادْخُلْ وَرسولُ الله (ﷺ) يُبَشِّرُكَ بِالْجَنَّةِ . فَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ حَتَّى جَلَسَ عَنْ يَمِينِ النَّبِيِّ (ﷺ) مَعَهُ فى القُفِّ ، وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فى البِئْرِ كَمَا صَنَعَ رسولُ الله (ﷺ) ، وَكَشَفَ عَنْ سَاقَيْهِ ، ثُمَّ رَجَعْتُ وَ جَلَسْتُ ، وَقَدْ تَرَكْتُ أَخِي يَتَوَضَّأُ وَيَلْحَقُنِي ، فقلتُ : إِنْ يُرِدِ اللهُ

بِفُلانٍ - يُرِيدُ أَخَاهُ - خَيْرًا يَأْتِ بِهِ . فَإِذَا إِنْسَانٌ يُحَرِّكُ الْبَابَ، فقلت: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُمَرُ بن الخَطَّابِ، فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ جِئْتُ إِلَى رسول الله (ﷺ)، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ وَقُلْتُ: هَذَا عُمَرُ يَسْتَأْذِنُ. فَقَالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ. فَجِئْتُ عُمَرَ، فقلتُ: أَذِنَ وَيُبَشِّرُكَ رسول الله (ﷺ) بِالْجَنَّةِ، فَدَخَلَ فَجَلَسَ مَعَ رسول الله (ﷺ) فِي القُفِّ عَنْ يَسَارِهِ وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِي البِئْرِ، ثُمَّ رَجَعْتُ فَجَلَسْتُ، فَقُلْتُ: إِنْ يُرِدِ اللهُ بِفُلَانٍ خَيْرًا - يَعْنِي أَخَاهُ - يَأْتِ بِهِ، فَجَاءَ إِنْسَانٌ فَحَرَّكَ الْبَابَ. فَقُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ: عُثْمَانُ بن عَفَّانَ. فقلتُ: عَلَى رِسْلِكَ، وجِئْتُ النَّبِيَّ (ﷺ) فأَخْبَرْتُهُ، فقالَ: ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ مَعَ بَلْوَى تُصِيبُهُ. فَجِئْتُ، فقلتُ: ادْخُلْ وَيُبَشِّرُكَ رسولُ الله (ﷺ) بِالْجَنَّةِ مَعَ بَلْوَى تُصِيبُكَ فَدَخَلَ فَوَجَدَ الْقُفَّ قَدْ مُلِئَ، فَجلس وِجَاهَهُمْ مِنَ الشِّقِّ الآخرِ.

قَالَ سَعِيدُ بْنُ الْمُسَيِّبِ: فَأَوَّلْتُهَا قُبُورَهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وزاد في رواية: وأمرني رسولُ الله (ﷺ) بحفظِ الباب. وفيها: أَنَّ عُثْمَانَ حِينَ بَشَّرَهُ حَمِدَ اللهَ تَعَالَى، ثُمَّ قَالَ: اللهُ الْمُسْتَعَانُ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے گھر میں وضو کیا، پھر گھر سے باہر آئے اور اپنے جی میں سوچا کہ آج کے پورے دن میں حضورِ اکرم (ﷺ) کے ساتھ ہی رہوں گا۔ چناں چہ اسی ارادہ سے وہ مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے، لوگوں سے پوچھا: حضور (ﷺ) کہاں ہیں ؟ لوگوں نے بتلایا کہ اس طرف تشریف لے گئے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جو سمت مجھے بتلائی گئی تھی مَیں اس طرف چلا اور لوگوں سے پوچھتا جاتا تھا کہ حضور اس طرف آئے؛ تو کہاں ہیں ؟ لوگوں نے بتایا کہ حضور (ﷺ) بیرِ اَریس میں داخل ہوئے ہیں (مسجد قباء کے سامنے ایک باغ تھا اسی میں ایک کنواں تھا،

اس کنویں کا نام بیئرِ اَرِیس تھا نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی کبھار اس باغ میں تشریف لے جاتے اوراس کنویں کا پانی نوش فرماتے اوراس کنویں کے کنارے سے اپنے پاؤں کنویں کے اندر لٹکا کر سکون و راحت حاصل کرنے کے لیے بیٹھتے،اس روز بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) وہیں تشریف لے گئے تو حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے۔وہ فرماتے ہیں کہ) مَیں اس باغ کے پاس پہنچ کراس کے دروازے پر بیٹھ گیا،نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی باغ میں کچھ دور اپنی حاجت پوری فرمانے کے لیے تشریف لے گئے تھے،یہاں تک کہ جب آپ قضائے حاجت کے بعد واپس تشریف لائے اوروضوفرمایاتومَیں اُٹھ کر حضورکے پاس پہنچا،اس وقت حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کنویں پر آکر تشریف فرماہوچکے تھے،اور آپ نے اس کے ایک طرف بیٹھ کراپنی پنڈلیاں کھول کرکنویں میں پاؤں لٹکا رکھے تھے۔مَیں نے سلام کیااور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر آپ اجازت دیں تومَیں پہرہ داری کروں کہ باغ کے دروازہ پربیٹھوں اورآپ کی اجازت کے بغیرکسی کواندرنہ آنے دوں۔حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:ٹھیک ہے۔دوسری روایت میں ہے کہ خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو دربانی کا حکم دیا۔چناں چہ وہ دروازہ کے پاس بیٹھ گئے، اور اپنے جی میں طے کرلیا کہ آج میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دربانی کے فرائض انجام دوں گا۔کچھ دیربعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائےاور دروازہ کو دھکا دیا۔مَیں نے پوچھا: کون؟انہوں نے کہا: ابو بکر۔مَیں نے کہا: آپ ٹھہر جایئے، ابھی اندرنہیں آسکتے،پہلے میں حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اجازت لے لوں۔پھرمیں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس گیا اورعرض کیا:یارسول اللہ!ابو بکراندرآنے کی اجازت چاہتے ہیں۔حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ان کواندرآنے کی اجازت دو،اورجنت کی خوشخبری بھی سناؤ(بس!یہاں تویہ روایت اسی بات کو بتلانے کے لیے لائےہیں کہ آپ نے خوشخبری سنانے کا فرمایا)حضرت ابوموسیٰ اَشعریؓ فرماتے ہیں : مَیں دروازہ

کی طرف آیا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا: اندر تشریف لائیے اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے آپ کو جنت کی خوشخبری دی ہے۔ چناں چہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اندر آئے اور حضورِ اکرم (ﷺ) کنویں کے جس کنارے پر پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھے تھے، وہیں آکر حضور (ﷺ) کی دائیں طرف بیٹھ گئے، اورانہوں نے بھی اپنے پاؤں اسی طرح کنویں کے اندر لٹکادیئے جس طرح حضورِ اکرم (ﷺ) نے لٹکائے تھے اور اپنی پنڈلیاں بھی اسی طرح کھول دیں جس طرح حضورِ اکرم (ﷺ) نے کھولی تھیں۔ حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں: پھر مَیں کنویں کے پاس سے لوٹ کر دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا (چوں کہ ان کو تو آج دربانی کرنی تھی) حضرت ابوموسیٰ کہتے ہیں: جس وقت مَیں گھر سے وضو کرکے نکلا تھا تو اپنے بھائی کو وضو کرتا ہوا چھوڑ آیا تھا، اس لیے میں نے اپنے جی میں سوچا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کو میرے بھائی کی بھلائی منظور ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو یہاں ضرور لائیں گے، اس لیے کہ آج تو حضور (ﷺ) جنت کی بشارت سنا رہے ہیں، کاش! وہ بھی آجائے (اس سے معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اپنے متعلقین میں سے کسی کے لیے ایسی چیز کی تمنا کرے تو پسندیدہ ہے) ابھی میں دل میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دیکھا کہ کوئی دروازے کو دھکا دے رہا ہے۔ میں نے پوچھا: بھائی! کون ہو؟ انہوں نے کہا: عمر بن خطاب ہوں۔ حضرت ابوموسیٰ نے کہا: ٹھہر جایئے، پھر حضور (ﷺ) کے پاس حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ حضرت عمر دروازہ پر ہیں اور اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضور (ﷺ) نے فرمایا: ان کو اندر آنے کی اجازت دیدو اور ان کو بھی جنت کی خوشخبری سنادو۔ مَیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ حضور (ﷺ) نے اندر آنے کی اجازت دی اور آپ کو جنت کی بشارت ارشاد فرمائی۔ چناں چہ وہ داخل ہوئے اور حضور (ﷺ) کی بائیں طرف بیٹھ گئے، اور انہوں نے بھی اپنے پاؤں کنویں میں لٹکادیئے۔ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: پھر مَیں دروازہ کے پاس آیا اور بیٹھ گیا اور دل میں وہی تمنا کرنے لگا کہ کاش! میرا بھائی آجاتا، آج بڑا اچھا موقع ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو اس کے لیے خیر منظور ہے تو ضرور اس کو بھیج

دیں گے۔اتنے میں کوئی آدمی آیااوردروازہ کو ہلانے لگا۔میں نے پوچھا:کون ہو؟ انہوں نے جواب دیا:میں عثمان بن عفان ہوں۔میں نے ان سے بھی کہا: ٹھہر جایئے،ابھی آپ اندر نہیں آسکتے۔اس کے بعد مَیں حضورِاکرم (ﷺ) کے پاس حاضر ہوا اوراطلاع کی۔حضورِاکرم (ﷺ) نے فرمایا:ان کواندرآنے کی اجازت دو اورجنت کی بشارت سناؤ اس آزمائش کے ساتھ جو اللہ تعالیٰ ان کی کریں گے۔مَیں نے کہا:اندر آجایئے اور حضوراکرم (ﷺ) آپ کو جنت کی بشارت سنارہے ہیں اس آزمائش کے ساتھ جو آپ کو پہنچنے والی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ بشارت سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء فرمائی اور کہا اللہ تعالیٰ ہی مدد فرمانے والاہے۔جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضورِاکرم (ﷺ) کنویں کے جس کنارہ پر تشریف فرما تھے وہ بھر چکا تھا، حضور کے دائیں بائیں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بیٹھ چکے تھے،وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی،اس لئے کنویں کے سامنے والے دوسرے کنارہ پر جو جگہ خالی تھی وہ وہاں بیٹھ گئے۔

اس روایت کے نقل کرنے والے حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ (جو بڑے تابعی ہیں) فرماتے ہیں کہ اس روایت کا مطلب میں نے یہ لیا کہ ان حضرات کو جہاں جہاں بیٹھنے کا موقع ملا،وہ ان کی قبروں سے عبارت ہے۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے حضراتِ شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ اسی حجرۂ شریفہ میں بننے دیں ،اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر جنت البقیع میں ہے،لیکن اگر آپ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی قبر پر جاکر کھڑے رہیں اور دیکھیں تو وہاں سے گنبدِ خضراء بالکل سامنے سیدھ میں نظر آئے گا،ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہے۔

میرے پہلے سفرِ حج کا واقعہ:

مَیں پہلی مرتبہ جب حج میں گیا تھا تو وہاں ایک بڑے صالح بزرگ تھے، مدت سے وہاں جماعت کے کام میں لگے ہوئے تھے، اور مدینہ منورہ کی ساری زیارت گاہوں سے خوب واقف تھے، اور چوں کہ اس سے اگلے سال ۹ےء میں ایک واقعہ پیش آیا تھا جس کی وجہ سے جماعت کے کام کرنے والوں پر بڑی سختی اور نگرانی تھی۔ جب مَیں مدینہ منورہ پہنچا تو میں نے ساتھیوں سے کہا کہ مسجدِ نبوی اور یہاں کی دوسری تاریخی جگہوں کی زیارت کرنا چاہتا ہوں، اگر کوئی واقف کار آدمی ہو تو رہنمائی ملے۔ مولانا اسماعیل صاحب بدات اور دوسرے ایک دو آدمیوں نے کہا کہ دَھار (ﷺ) (مہاراشٹر کے ایک علاقہ کا نام ہے) کے فلاں بڑے میاں ہیں وہ بہت اچھا بتلائیں گے، ان سے ملو۔ مَیں ان سے ملا، انہوں نے کہا: آج کل میری نگرانی ہو رہی ہے، تم اگر میرے سامنے بیٹھو گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے، اس لیے میرے پاس اس طرح بیٹھنا جیسے کوئی آدمی صف میں بیٹھتا ہے، مَیں تھوڑی تھوڑی چیزیں بتاتا رہوں گا۔ وہ مسجدِ نبوی کی چیزیں بتاتے اور پھر کہتے کہ جاؤ! تم دیکھ کر آؤ، مَیں دیکھ کر آتا اور رپورٹ دیتا کہ ایسی ایسی ہے، تو وہ کہتے کہ ہاں! ٹھیک ہے۔

ایک مرتبہ انہوں نے یہی قصہ سنایا، لیکن انہوں نے اس میں ایک چیز کا اضافہ کیا تھا، مجھے تو آج تک کسی روایت میں وہ چیز نہیں ملی، مَیں تلاش میں بھی ہوں کہ مل جائے۔ وہ اضافہ یہ تھا کہ اس کے بعد ایک اور آدمی آئے اور دروازہ کھٹکھٹایا، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ

نے پوچھا: کون ہو؟ آنے والے نے کہا: مَیں علی بن اَبی طالب ہوں۔ انہوں نے کہا: یہیں ٹھہرو، مَیں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اجازت لے لوں۔ حضرت ابو موسیٰ اَشعری حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچے اور کہا کہ حضرت علیؓ اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ان کو جنت کی بشارت سنادو اور اندر آنے کی اجازت نہیں ہے، چناں چہ ان کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بنی۔

حضرت سعید بن مسیب رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کی قبور کی جو تعبیر فرمائی وہ یہ ہے کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی قبریں تو بالکل حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بنیں، حضرت عثمانؓ ساتھ میں نہیں ہیں، لیکن مدینہ منورہ ہی میں بالکل سامنے ہیں، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قبر مدینہ منورہ میں نہیں بن پائی۔

خیر! یہاں تو بشارت سنانے کی مناسبت سے یہ روایت پیش کی ہے کہ دیکھو! حضرت اَبو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے جا کر یہ خوشخبریاں بڑے خوش ہو کر سناتے رہے۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ مجھے تو یہ خوشخبری نہیں دی جا رہی ہے تو پھر مَیں جا کر دوسروں کو کیوں سناؤں۔ ہمارے جیسے ہوتے تو ایسا ہی سوچتے کہ مجھے تو کوئی بشارت نہیں مل رہی، تو پھر یہ سارے چکر اور آنٹے پھیرے (چکر لگانا) کیوں مارتا رہوں

یقین سے کلمہ پڑھنے پر جنت کی بشارت:

حدیث ۱۰۷:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا قُعُوداً حَوْلَ رسولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) وَمَعَنَا أَبُو بَكْرٍ وَعُمَرُ رضی اللہ عنہما في نَفَرٍ، فَقَامَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) مِنْ بَيْنِ أَظْهُرِنَا فَأَبْطَأَ عَلَيْنَا، وَخَشِينَا أَنْ يُقْتَطَعَ دُونَنَا وَفَزِعْنَا فَقُمْنَا، فَكُنْتُ أَوَّلَ مَنْ فَزِعَ. فَخَرَجْتُ أَبْتَغِي رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) حَتَّى أَتَيْتُ حَائِطاً للأنصَارِ لِبَنِي النَّجَارِ، فَدُرْتُ بِهِ هَلْ أَجِدُ لَهُ بَاباً؟ فَلَمْ أَجِدْ! فَإِذَا رَبِيعٌ يَدْخُلُ فِي جَوْفِ حَائِطٍ مِنْ بِئْرٍ خَارِجَهُ - وَالرَّبِيعُ: الجَدْوَلُ الصَّغِيرُ - فَاحْتَفَزْتُ، فَدَخَلْتُ عَلَى رسولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: ((أَبُو هُرَيْرَةَ؟)) فقلتُ: نَعَمْ، يَا رسولَ الله، قَالَ: ((مَا شَأنُكَ؟)) قُلْتُ: كُنْتَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا فَقُمْتَ فَأَبْطَأْتَ عَلَيْنَا، فَخَشِينَا أَنْ تُقْتَطَعَ دُونَنَا، ففزعنا، فَكُنْتُ أوّلَ مَنْ فَزِعَ، فَأَتَيْتُ هَذَا الحَائِطَ، فَاحْتَفَزْتُ كَمَا يَحْتَفِزُ الثَّعْلَبُ، وهؤلاء النَّاسُ وَرَائِي. فَقَالَ: يَا أَبَا هُرَيرَةَ. وَأَعْطَانِي نَعْلَيْهِ، فَقَالَ: اذْهَبْ بِنَعْلَيَّ هَاتَيْنِ، فَمَنْ لَقِيتَ مِنْ وَرَاءِ هَذَا الحَائِطِ يَشْهَدُ أَنْ لا إله إلاَّ الله مُسْتَيْقِناً بِهَا قَلْبُهُ، فَبَشِّرْهُ بِالجَنَّةِ.....وَذَكَرَ الحديثَ بطوله.. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما بھی کچھ صحابہ کے ساتھ موجود تھے کہ اچانک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان سے اُٹھے اور آبادی سے باہر تشریف لے گئے، جب آپ نے واپس آنے میں دیر کردی تو سب کو فکر لاحق ہوئی کہ پتہ نہیں کیا بات ہوئی، اس لیے سب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلاش و جستجو میں نکلے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے بے چینی مجھے پیدا ہوئی تھی اس لئے میں آپ کو تلاش کرنے کے لئے نکلا، یہاں تک کہ انصار کے قبیلہ بنو نجّار کا ایک باغ تھا اُس کے متعلق مجھے خیال ہوا کہ آپ

شاید اندر ہوں گے، تو مَیں اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے کے لیے اس باغ کے چاروں طرف چکّر لگانے لگا، لیکن مجھے راستہ نہیں ملا، اس باغ میں پانی جانے کے لیے ایک چھوٹی سی نہر تھی جو مجھے نظر آئی تو میں نے اپنے جسم کو سکیڑا، جیسے لومڑی سکیڑتی ہے ،اور اس چھوٹی سی نہر سے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس باغ میں تشریف فرماہیں۔جب حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے دیکھا تو پوچھا: ابوہریرہ ہو؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ یہاں کیوں آئے؟ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے درمیان تشریف فرما تھے، پھر اچانک اُٹھ گئے اور واپس آنے میں دیر ہوگئی تو ہم سب پریشان ہوگئے، اور ہمیں اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ہو، اس لئے ہم سب بے چین ہوگئے اور سب سے پہلے بے چینی مجھے ہوئی، اس لئے میں اس باغ میں اپنے جسم کو اس طرح سکیڑ کر اندر داخل ہوا جیسے لومڑی کسی جگہ گھستی ہے۔ دوسرے لوگ بھی میرے پیچھے پیچھے آرہے ہیں (جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اس بے چینی کو دیکھا اور ظاہر ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تعلق ومحبت کی بنا پر یہ بے چینی پیدا ہوئی تھی، تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے چاہا کہ اس کی تلافی ہو جائے اور ان کا جی خوش ہو جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھے اپنے نعلین مبارک علامت اور نشانی کے طور پر عطا فرمائے اور ارشاد فرمایا: میرے یہ دونوں جوتے لے کر جاؤ اور اس باغ کے باہر جو بھی ایسا آدمی تمہیں ملے جو دل کے یقین کے ساتھ ”لا الٰہ الا اللہ“ کا اقرار کرتا ہو؛ اس کو جنت کی بشارت سنا دینا۔

افادات:-یہ روایت پہلے بھی آچکی ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ وہ نعلین مبارک لے کر باہر نکلے، سب سے پہلے ملاقات حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوگئی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تو خوشی

خوشی جوتے لے کر جارہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: ابوہریرہ! کیا بات ہے؟ کہا: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ جوتے ہیں جو آپ نے مجھے عنایت فرمائے ہیں اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ جو بھی لا الٰہ الّا اللہ کا سچے دل سے اقرار کرنے والا تمہیں ملے؛ اس کو جنت کی بشارت سنادو؛ تو لیجئے میں آپ کو جنت کی بشارت سناتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ٹھہرو! اور واپس چلو۔ اب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھیجا تھا اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے سے واپس تھوڑے ہی لوٹتے، انہوں نے واپس لوٹنے میں تأمّل کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کے سینے پر ایک ہاتھ مارا جس سے وہ نیچے زمین پر گر پڑے۔ اب دیکھا کہ واپس لوٹنا ہی پڑے گا، لٰہذا لوٹے۔ آگے حضرت ابوہریرہ اور پیچھے حضرت عمر۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ رو رہے تھے اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عرض کیا کہ: آپ کے ارشاد کے مطابق میں تو جارہا تھا، راستہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مل گئے اور انہوں نے میرے سینے پر ایسے زور سے ہاتھ مارا کہ میں تو نیچے گر گیا اور مجھ سے کہا کہ ایسی بشارت مت سناؤ اور واپس لوٹو۔ اتنے میں حضرت عمرؓ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ نے ان کو اپنے جوتے عنایت فرما کر بھیجا تھا؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: ایسی بشارت سنانے کے لیے بھیجا تھا؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا نہ کیجئے، لوگوں کو عمل کرنے دیجئے، کیوں کہ اگر صرف دل کے یقین کے ساتھ کلمہ پڑھ لینے پر جنت کی بشارت سن لیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ عمل کے معاملہ میں کمزوری آجائے، لوگ

یوں سوچنے لگیں کہ جنت تو مل ہی گئی ہے، حالاں کہ جنت کے تو بہت سے درجات ہیں، اس لیے یہ بشارت نہ سنایئے۔ تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ٹھیک ہے ، اگر مناسب نہیں ہے تو بشارت سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔

نوٹ:-یہ قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد:۷/امید کے بیان میں آیا تھا، وہاں تفصیلی وضاحت کر چکا ہوں۔

مختصر آپ بیتی از حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ:

حدیث ۱۱۷:-

وعن ابن شماسة، قَالَ: حَضَرْنَا عَمْرو بنَ العَاصِ رضی اللہ عنہ وَهُوَ فی سِيَاقَةِ الْمَوْتِ، فَبَكَى طَوِيلاً، وَحَوَّلَ وَجْهَهُ إِلَى الجِدَارِ، فَجَعَلَ ابْنُهُ، يَقُولُ: يَا أَبَتَاهُ! أمَا بَشَّرَكَ رسول الله (ﷺ) بكَذَا؟ أمَا بَشَّرَكَ رسولُ الله (ﷺ) بِكَذَا؟ فَأقْبَلَ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: إنَّ أَفْضَلَ مَا نُعِدُّ شَهَادَةُ أنْ لا إلهَ إلاَّ الله، وَأنَّ مُحَمَّداً رسول اللهِ، إنِّي قَدْ كُنْتُ عَلَى أطْبَاقٍ ثَلاَثٍ: لَقَدْ رَأيْتُنِي وَمَا أحَدٌ أشَدُّ بُغْضاً لرسولِ الله (ﷺ) مِنِّي، وَلاَ أحَبَّ إلَيَّ مِنْ أنْ أكُونَ قدِ اسْتَمْكَنْتُ مِنْهُ؛ فَقَتَلْتُه، فَلَوْ مُتُّ عَلَى تلك الحَالِ، لَكُنْتُ مِنْ أهْلِ النَّارِ. فَلَمَّا جَعَلَ اللهُ الإسلامَ فی قَلْبِي، أتَيْتُ النبيَّ (ﷺ) فقُلْتُ: ابسُطْ يَمِينَكَ فَلأُبَايِعكَ، فَبَسَطَ يَمِينَهُ، فَقَبَضْتُ يَدِي، فَقَالَ: ((مَا لَكَ يَا عَمْرُو؟)) قلتُ: أردتُ أنْ أشْتَرِطَ. قَالَ: ((تَشْتَرِطُ مَاذا؟)) قُلْتُ: أنْ يُغْفَرَ لِي، قَالَ: ((أمَا عَلِمْتَ أنَّ الإسلامَ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ، وَأنَّ الهِجْرَةَ تَهْدِمُ مَا كَانَ قبلَهَا، وَأنَّ الحَجَّ يَهْدِمُ مَا كَانَ قَبْلَهُ؟)) وَمَا كَانَ أحَدٌ أحَبَّ إلَيَّ مِنْ رَسُولِ الله (ﷺ) وَلاَ أجَلَّ فی عَينِي مِنْهُ وَمَا كُنْتُ أُطِيقُ أنْ أملأ عَينِي مِنْهُ؛ إجلالاً لَهُ، ولو سُئلت أن

أصفه مَا أطقت، لأنی لَمْ أكن أملأ عینی مِنْهُ، ولو مُتُّ عَلَى تِلْكَ الحالِ لَرَجَوْتُ أن أكُونَ مِنْ أهْلِ الْجَنّةِ. ثُمَّ وَلِينَا أَشْيَاءَ مَا أدْرِي مَا حَالِي فِيهَا ؛ فَإِذَا أنَا مُتُّ فَلاَ تَصحَبنِّي نَائِحَةٌ وَلاَ نَارٌ، فَإِذا دَفَنْتُمُونِي، فَشُنُّوا عَلَيَّ التُّرابَ شَنّاً، ثُمَّ أقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْرَ مَا تُنْحَرُ جَزورٌ، وَيُقْسَمُ لَحْمُهَا، حَتَّى أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ، وَأنْظُرَ مَا أُرَاجِعُ بِهِ رُسُلَ رَبِّي. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابن شماسہ فرماتے ہیں ہم لوگ حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے ،وہ بالکل موت کی گھڑی میں تھے ، دیر تک روتے رہے،اپنا چہرہ دیوار کی طرف پھیرلیا،ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ (بھی صحابی ہیں) ان سے کہنے لگے: اباجان! کیا آپ کو حضورِاکرم (ﷺ) نے فلاں چیز کی بشارت نہیں دی؟کیا حضورِاکرم (ﷺ) نے فلاں چیز کی بشارت نہیں سنائی؟ (حضورِاکرم (ﷺ) نے ان کو جو جو بشارتیں دی تھیں وہ یاد دلانے لگے،چوں کہ موت کاوقت تھا اوروہ رورہے تھے ،تو دل کے اندر امید پیدا کرنے کے لیے وہ ساری چیزیں یاددلارہے تھے،یہ سن کر) انہوں نے اپنا چہرہ لوگوں کی طرف متوجہ کیااورکہنے لگے : سب سے عمدہ چیز جو ہم نے اپنے ساتھ سامان کے طور پر لی ہے وہ کلمۂ شہادت لاالٰہ الااللہ محمدرسول اللہ کی گواہی ہے۔پھر فرمانے لگے:میرے اوپر تین دَور گزرے ہیں ،ایک دَورتووہ تھاکہ نبیِ کریم (ﷺ) کی دشمنی میرے دل میں بھری ہوئی تھی، حضور (ﷺ) کامجھ سے بڑادشمن اور کوئی نہیں تھا،اُس زمانہ میں مجھے یہ چیز بہت پسند تھی کہ اگر مجھے موقع مل جائے تومَیں آپ کو قتل کردوں ، اگراس حالت میں میری موت آتی تویقیناًمیں جہنمی ہوتا۔

پھرجب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی محبت ڈالی،تومَیں حضوراکرم (ﷺ) کی خدمت میں حاضرہوااور درخواست کی کہ اپنا دستِ مبارک آگے بڑھایئے، مَیں آپ کے

ہاتھ پر اسلام کی بیعت کرنا چاہتا ہوں (یعنی مسلمان ہونا چاہتا ہوں) جب حضور ﷺ نے اسلام کی بیعت لینے کے واسطے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا، تو مَیں نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا، حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! کیا بات ہے؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مَیں ایک شرط کرنا چاہتا ہوں حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا شرط کرنا چاہتے ہو؛ کرو۔ مَیں نے کہا: اس شرط پر اسلام لاؤں گا کہ میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں، اور میری مغفرت ہو جائے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عمرو! تمہیں معلوم نہیں کہ اسلام تو اپنے سے پہلے کے سارے گناہوں کو ختم کر دیتا ہے، اور ہجرت اس سے پہلے کے سارے گناہوں کو مٹا دیتی ہے، اور حج بھی اس سے پہلے کئے ہوئے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے (اس جگہ پر اسلام کے متعلق لکھا ہے کہ اسلام لانے سے تو اس کا نامۂ اعمال ایک دم کلین وصاف ہو جاتا ہے، ایسا جیسا کہ آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہو، لیکن ہجرت اور حج کے متعلق لکھا ہے کہ اس سے صغیرہ گناہ معاف ہوں گے، کبیرہ گناہ نہیں، اگرچہ بعضوں نے کبیرہ کے متعلق بھی لکھا ہے، لیکن راجح قول وہی ہے) پھر تو میرا یہ حال ہو گیا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے زیادہ محبوب اور باعزت میری نگاہوں میں اور کوئی نہیں رہا، بلکہ حضور ﷺ کا میرے دل میں اتنا زیادہ احترام تھا کہ مَیں آنکھیں بھر کر حضور ﷺ کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کوئی مجھے پوچھے کہ حضور ﷺ کے چہرۂ انور کی کیفیت بیان کرو تو مَیں بیان نہیں کر سکتا، کیوں کہ میں کبھی حضورِ اکرم ﷺ کو نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتا تھا؛ پھر کیسے بیان کروں؟ (جو چیز آدمی غور سے اور پورے

اطمینان سے دیکھے اس کو بیان کرسکتا ہے،اور جس کو پورے اطمینان سے نہ دیکھ پاتا ہو، تو کیسے بیان کرے گا)اگر اس وقت میری موت آگئی ہوتی تو مجھے امید تھی کہ یقیناً میں جنتی ہوتا۔

اس کے بعد بہت سارے اختیارات ہمارے حوالے کئے گئے(یعنی بعد میں حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی، کچھ اختیارات استعمال کرنے کی نوبت آئی)اس کے بعد اب میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا حال کیا ہے۔اس لئے دیکھو!جب میری موت ہوجائے تو کوئی رونے والی عورت اورآگ میرے جنازہ کے ساتھ نہ جائے(زمانۂ جاہلیت میں دستور تھا کہ جب کسی کا جنازہ لے جاتے تھے ،توساتھ میں آگ بھی لے جاتے تھے، اور رونے والی عورتیں سینہ اورچہرہ کوٹتی ہوئی اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرتی ہوئی ساتھ میں چلتی تھیں ،اس لیے انہوں نے تاکید کردی کہ میرے ساتھ ایسا نہ ہو۔بہت سی جگہوں پر غیر مسلموں میں آج بھی ایسا رواج ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اگر اس کے خاندان والوں کی طرف سے اس بات کا اندیشہ یا رواج ہو کہ وہ کسی بدعت کا ارتکاب کریں گے، تو اس کو چاہیے کہ تاکید کے ساتھ اس بات کی وصیت کرجائے کہ میرے مرنے کے بعد ایسا کچھ مت کرنا، اس کے بعد بھی اگر وہ کریں گے تو مرنے والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں رہے گی)اور جب مجھے دفن کرچکو تو میری قبر پر مٹی ڈال دینا، پھر میری قبر کے پاس اتنی دیر تک ٹھہرنا جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم کردیا جاتا ہے (تقریباًبیس پچیس منٹ)تاکہ

تمہارے ذریعہ مجھے اُنس حاصل ہو،اور میں دیکھ لوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے فرشتوں کو مَیں کیاجواب دیتا ہوں۔

چوں کہ دفن کے بعد فوراً فرشتے آتے ہیں تو اس وقت اہلِ خاندان کو چاہیے کہ قبر کے پاس بیس پچیس منٹ ٹھہریں اور کلمۂ طیبہ کا ورد کریں، تلاوتِ قرآن میں مشغول رہیں اور مرنے والے کے لیے دعا کا اہتمام کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کو منکر نکیر کے سوال کے جواب میں ثبات قدمی نصیب کرے اور اس سے صحیح جواب دلوائے؛یہ مناسب ہے، بہر حال! یہاں تو اس روایت کو اس بنیاد پر لائے ہیں کہ ان کے صاحبزادہ نے نبیٔ کریم (ﷺ) کے ارشادات کے مطابق ان کو بشارت سنائی،اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کو خوشخبری دینا اور بشارت سنانا ثابت ہے۔

باب وداع الصاحب ووصیته عند فراقه للسفر وغیره والدعاء لَهُ وطلب الدعاء مِنْهُ

اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا، اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَوَصَّى بِهَا إِبْرَاهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يَا بَنِيَّ إِنَّ اللهَ اصْطَفَى لَكُمُ الدِّينَ فَلاَ تَمُوتُنَّ إِلاَّ وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ. أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ، إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي؟ قَالُوا نَعْبُدُ إِلَهَكَ وَإِلَهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَهاً وَاحِداً وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرة: ۱۳۲، ۱۳۳)

جدائی کے موقع کے چار آداب:

باب کا عنوان ہے: اپنے ساتھی، عزیز، اپنی اولاد یا اپنے ملنے والوں کو جدائی کے موقع پر الوداع کہنا، اور جو نصیحت کی بات ان کے مناسبِ حال ہو وہ کہنا۔ جدائی چاہے سفر کی وجہ سے ہو رہی ہو، پھر وہ سفر تجارتی ہو، حج کا ہو، تبلیغ کی غرض سے ہو، یا طلبِ علم کے لیے ہو، یا وہ جدائی کسی اور وجہ سے ہو رہی ہو، جیسے: ایک آدمی بالکل آخری گھڑی میں ہے اور وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اب میں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جدائی چاہے وقتی ہو، یا مستقل ہو، جب بھی اپنے عزیزوں، رفقاء اور دوستوں سے جدائی کی گھڑی آئے، تو آداب میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ ان کو الوداع کہے، اور دوسرا ادب یہ ہے کہ ان کو وصیت، تاکیدی نصیحت اور بھلائی کی بات کہے جو ان کے مناسبِ حال ہو۔

”وصیت“ دراصل اس نصیحت کی بات کو کہتے ہیں جو کوئی آدمی کسی کو رخصت کے وقت کرتا ہے۔ویسے روزانہ عام حالات میں جو کہا جاتا ہے اس کو نصیحت کہیں گے، لیکن یہی نصیحت کی بات جب جدائی کے موقع پر- چاہے جدائی وقتی ہو یا ہمیشہ کی ہو- کہی جاتی ہے تو اس کو ”وصیت “سے تعبیر کرتے ہیں جس میں تاکید زیادہ ہوا کرتی ہے۔

تو یہ چاروں چیزیں آداب میں سے ہیں :-

۱:-الوداع کہنا۔

۲:- کچھ نصیحت کرنا۔

۳:-اس کے لیے دعا کرنا۔

۴:-اپنے واسطے اس سے دعا کی درخواست کرنا۔

ان کا بھی ہمیں اپنی زندگیوں میں اہتمام کرنا چاہیے،اسی کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

دو پیغمبروں کی اپنے بیٹوں کو وصیت:

اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی دو آیتیں پیش کی ہیں۔حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو دین پر قائم رہنے اور کلمہ کو مضبوطی سے پکڑنے کی وصیت کی

تھی، چناں چہ ان کی وصیت کے الفاظ ذکر کیے: اے میرے بیٹو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا ہے (تم کو دینِ اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اس کی ہدایت عطا فرمائی جس کی وجہ سے تم نے اس دین کو قبول کیا، اور اب تک اسی پر قائم ہو، اسی پر عمل کر رہے ہو) تو اب تمہاری موت نہ آئے مگر ایسی حالت میں کہ تم اسلام ہی پر قائم ہوؤ۔ گویا دینِ اسلام کو مضبوطی سے تھامے رہنا، اور مضبوطی سے تھامنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو اپنی زندگیوں میں عملی جامہ پہناؤ کہ تمہارا اٹھنا بیٹھنا سونا جاگنا، چلنا پھرنا؛ غرضیکہ تمہاری ہر حرکت وسکون اور تمہارا ہر کام اسی کے مطابق ہو، تب ہی کہا جائے گا کہ تم اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامے ہوئے ہو۔

اور پھر اسی حال میں تمہیں موت آئے، اس لیے کہ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ فلاں حالت میں مجھے موت آئے، تو ظاہر ہے کہ موت کا کوئی وقت اور گھڑی مقرر نہیں ہے، کسی کے متعلق بھی گارنٹی کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کون سے دن، کون سی گھڑی میں، کتنے بجے موت آنے والی ہے۔ لہٰذا اگر کوئی یہ چاہتا ہو کہ اس کی موت ایمان پر آئے تو اس کو چاہیے کہ ایمان کو ہمیشہ تھامے رہے، اور ایسا طریقہ اختیار کرے کہ کسی حال میں بھی اپنے آپ کو ایمان سے جدا نہ ہونے دے، اس لیے کہ معلوم نہیں کب موت آجائے۔ جب ایمان کو ہمیشہ کے لیے تھامے رکھے گا، تو ظاہر ہے کہ جب بھی موت آئے گی اسی حالت میں آئے گی۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے: ”تَمُوْتُوْنَ كَمَا تَعِيْشُوْنَ، وَتُحْشَرُوْنَ كَمَا تَمُوْتُوْنَ (تفسیر روح البیان)“ موت اسی حالت میں آئے گی جس حالت میں تم زندگی گزارتے ہو، اور جس حالت میں موت آئے گی

اسی میں تم اٹھائے جاؤ گے۔ کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی حالت میں زندگی گزارتا ہے، تو موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔ اور اگر کوئی آدمی معصیت اور نافرمانی کی حالت میں زندگی گزارتا ہے، گناہوں میں لت پت ہے، اسی میں مشغول ہے تو ظاہر ہے کہ موت بھی اسی حالت میں آئے گی۔ اس لیے اگر آپ چاہتے ہیں کہ اچھی حالت میں موت آئے، تو اپنا حال درست کرلو، پھر اسی حال پر مرو گے۔ اور جس حالت میں موت آئے گی اسی حالت میں تم اُٹھائے جاؤ گے۔ اگر اچھی حالت میں موت آئی ہے تو اچھی حالت میں اٹھائے جاؤ گے اور اگر خدانخواستہ بری حالت میں موت آئی ہے تو بری حالت میں اٹھائے جاؤ گے۔

دیکھو! حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام نے اپنی اولاد کو جو وصیت فرمائی، اپنی موت کے وقت جو تاکید فرمائی وہ یہ تھی کہ: دین کا دامن تھامے رکھیو، دین کو ہاتھ سے جانے مت دینا، اس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔

بیانِ واقعہ کا نرالا انداز:

خاص طور سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا قصہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ذکر کیا، تو ہمیں غور کرنا ہے کہ کیوں ذکر کیا؟ ظاہر ہے کہ قرآنِ پاک میں ماضی کے واقعات تاریخی حیثیت سے نہیں ذکر کئے جاتے بلکہ اس کا مقصد یہ ہوا کرتا ہے کہ ہمیں عبرت حاصل ہو، اور اس سے کچھ سبق لیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس واقعہ کو ایک عجیب ونرالے انداز

سے قرآنِ پاک میں ذکر کیا، باری تعالیٰ سوال کرتے ہیں کہ: ﴿أَمۡ كُنتُمۡ شُهَدَآءَ إِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوبَ الۡمَوۡتُ﴾ کیا تم لوگ اس وقت موجود تھے جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا؟ یہ آیت حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی، تو اس کے سب سے پہلے مخاطب حضورِ پاک (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں اور آپ کے واسطے سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد قیامت تک آنے والی پوری امتِ محمدیہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا زمانہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ سے سیکڑوں سال پہلے کا ہے تو ان کی موت کے وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں کیسے موجود ہوتے؟ نہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) اس وقت موجود تھے، نہ صحابۂ کرام موجود تھے، اور نہ ہم آپ موجود تھے۔ دراصل یہ انداز اختیار فرما کر آگے جو بات کہی جانے والی ہے اس کی اہمیت اور تاکید بتانا مقصود ہے، جیسے کوئی واقعہ اور حادثہ آپ کے سامنے پیش آیا ہو تو اس کو بیان کرنے کا ایک انداز یہ ہوتا ہے کہ بھائی! فلاں نے فلاں کو جو بات کہی تھی اس وقت تم وہاں تھے؟ وہ کہے گا کہ نہیں ! میں وہاں موجود نہیں تھا، تو آپ کہیں گے کہ میں وہاں تھا، اس لیے میں بتلاتا ہوں کہ کیا ہوا تھا۔ یہ انداز دراصل سامنے والے کو کسی چیز کی طرف متوجہ کرنے کے واسطے ہوتا ہے۔ باری تعالیٰ نے بھی یہاں وہی انداز اختیار کیا۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے لوگوں کو سمجھانے کے واسطے سارے انداز اور طریقے وہی اختیار کئے جو آپس کی بات چیت میں اختیار کئے جاتے ہیں۔ کسی آدمی کو متوجہ کرنے کے لیے یہ بھی ایک انداز اور طریقہ ہے

جو اپنایا جاتا ہے۔ گویا باری تعالیٰ یہ سوال کرتے ہیں کہ جس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا اس وقت آپ لوگ وہاں موجود تھے؟ ظاہر ہے کہ موجود نہیں تھے، تو باری تعالیٰ فرمانا چاہتے ہیں کہ مَیں تھا، بتاؤں کہ کیا ہوا تھا؟ اللہ تعالیٰ تو ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی موت کی گھڑی آئی تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو جمع کیا اور ان سے سوال کیا۔

خاندانِ نبوت:

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا معلوم ہو جانا چاہیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کون تھے؟ آپ اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ بنو اسرائیل پورا ایک خاندان ہے جن کے اندر سینکڑوں انبیاءِ کرام مبعوث ہوئے، اس لیے کہ ان کے بعد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جتنے بھی نبی آئے وہ سب بنو اسرائیل ہی میں آئے۔ اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کا دوسرا نام ہے، ان کے بارہ بیٹے تھے انہی سے بارہ خاندان پھیلے، انہی کی ساری اولاد کو بنو اسرائیل کہا جاتا ہے، پھر ان بنو اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو خصوصی معاملہ ہوا وہ بھی عجیب وغریب ہے، اور اسی خاندان میں نبوت کا سلسلہ جاری رہا۔ اور دیکھئے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خود اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے والد حضرت اسحاق علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں، ان کے دادا حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر نبی ہیں جن کو ابو الانبیاء کہا جاتا ہے، اس لیے کہ حضرت ابراہیم

علیہ السلام کی بعثت کے بعد دنیا میں جتنے بھی انبیاء آئے وہ سب کے سب انہی کی نسل سے ہیں۔ اوران کے چچاحضرت اسماعیل علیہ السلام بھی نبی ہیں ؛ گویاپوراگھرانہ نبوت کاگھرانہ ہے،اس لیے ظاہرہے کہ وہاں کون سی چیز کے چرچے ہوں گے! جیسے: تاجرگھرانہ میں تجارت کے چرچے ہوتے ہیں کھیتی باڑی والے گھرانہ میں کھیتی باڑی کے چرچے ہوتے ہیں ، جیساگھرانہ ہوتاہے اس میں ویسے ہی چرچے ہوتے ہیں ؛ توآخران کا کام کیاتھا؟ پورے خاندان کاکام ہی لوگوں کو اللہ کی توحید اورنبی کی رسالت پر ایمان لانے کی دعوت دیناتھا،ان کی زندگیاں اسی میں گزرتی تھیں،اپنی صلاحیتوں کواسی کے لیے استعمال کرتے تھےاوراسی کے لیے ساری مشقتیں اُٹھاتے تھے، گویاان کی زندگی کامقصداورمشن یہی تھا۔

فکرکیاکرے؟:

نیزسوچنے کی بات یہ ہے کہ باپ خوداللہ کے نبی ہیں اوران بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں ،توباپ اپنے بیٹوں کو-جن میں ایک اللہ کے نبی موجود ہیں -جمع کرکے وصیت کررہےہیں اوراس میں یہ سوال کررہےہیں : ”مَاتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ بَعۡدِیۡ؟“ اے میرے بیٹو!تم میرے بعد کس کی عبادت کروگے؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ بھی کوئی کرنے کاسوال تھا؟ ظاہر ہے کہ ان کے گھرمیں دعوت کے چرچے ہوتے تھے،ان کی

زندگیاں اسی میں کھپ گئی تھیں ، ساری صلاحیتیں اسی میں استعمال ہوئی تھیں ،اب موت کے وقت بیٹوں سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ میرے بعد تم کس کی پوجا کروگے!

یہ ایک واقعہ پہلے پیش آیاہے،تو آخراس واقعہ کو قرآنِ پاک میں کو خصوصیت کے ساتھ ایک نرالے انداز میں کیوں ذکر کیا گیا؟دراصل اس سے ہم لوگوں یعنی قیامت تک آنے والی امتِ محمدیہ کوایک سبق دینا منظور ہے کہ ایک آدمی جب دنیاسے جارہاہو تو اس کواپنی اولاد اوراپنے خاندان کے متعلق اگر فکر کرنی ہے تو کیا کرے ؟

آج کے دَور کی تصویر کشی:

ہم اورآپ تصور کریں کہ کسی کو معلوم ہوجائے کہ میرے دنیاسے جانے کا وقت آچکا ہے، ڈاکٹروں نے بھی کہہ دیا،اپنی صحت کو دیکھتے ہوئے خود اس کو بھی اندازہ ہوگیا، گھروالے بھی سمجھ رہے ہیں کہ یہ زیادہ دنوں کا مہمان نہیں ہے، دس بارہ گھنٹہ کی مہمانی ہے، ایسے وقت میں وہ سب کو جمع کرے کہ فلاں بیٹادبئی میں ہے،فلاں سعودیہ میں ہے، فلاں انگلینڈ میں ہے:ان سب کوبلالو۔آج اگر کوئی آدمی اپنی اولاد کو جمع کرے توذرا دل پر ہاتھ رکھ کرسچ بتاؤکہ وہ کیاکہے گا؟باپ اگر فیکٹری کامالک ہے تو کہے گاکہ دیکھوبیٹا!بڑی محنت سے میں نے یہ فیکٹری قائم کی ہے،اپناخون پسینہ ایک کیا ہے،اپنی ساری زندگی اس کے اندرلگائی ہے،دیکھنا!میرے بعد اس کو

برباد مت کردینا، دشمنوں کو ہنسنے کا موقع مت دینا، بلکہ اور زیادہ ترقی ہو ایسی شکلیں اختیار کرنا، مل جل کر کے کام کرنا۔ یہی کہے گانا!

اگر وہ کسان ہے اس کی کئی ایکڑ زمین ہے تو وہ کہے گا: یہ ساری زمینیں، یہ سب باغات جو نظر آرہے ہیں، یہ سب کچھ نہیں تھا، بنجر پڑا ہوا تھا، میں نے بڑی محنتیں کی ہیں، رات دن اس کے پیچھے ایک کردیا ہے، اب یہ سب تمہارے لیے چھوڑ کر جارہا ہوں، دیکھنا! کہیں برباد نہ کردینا۔ آج اگر کوئی آدمی نصیحتیں کرے گا تو یہی کرے گا، اور کیا کرے گا؟ ہمارا مزاج ہی ایسا بنا ہوا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ قرآنِ پاک میں ذکر کرکے بتلایا کہ یہ سب چیزیں وصیت کی نہیں ہیں کہ فیکٹریوں میں اضافہ کرنا، زمینوں کو ترقی دینا، تجارت بڑھادینا، آج اگر دس لاکھ کا ٹرن اوور(TurnOver) ہے تو پچاس لاکھ کا کردینا؛ بلکہ فکر کی چیز اگر ہے تو یہ ہے کہ میرے بعد میری اولاد کون سا دین اختیار کرے گی؟ کس کی عبادت کرے گی؟

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد سے کیا یہ گمان ہوسکتا تھا کہ وہ کسی اور خدا کی عبادت کریں گے؟ یہ تو نبیوں کی اولاد تھی، ان کا باپ نبی، دادا نبی، پردادا نبی، دادا کا بھائی نبی؛ پھر بھی حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے پوچھ رہے ہیں کہ میرے بعد کس کی پوجا کروگے؟ ان سے اور کچھ توقع کی ہی نہیں جاسکتی تھی، اس کے باوجود تاکید کے واسطے پوچھا جارہا ہے، اور بیٹوں نے بھی جو جواب ان کی شایانِ شان تھا وہی دیا: ”نَعۡبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ آبَائِكَ إِبۡرَاهِيمَ وَإِسۡمَاعِيلَ وَإِسۡحَاقَ“ ابا جان! آپ بے فکر

رہیے، آپ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد آپ کے معبود ہی کی ہم عبادت کریں گے۔ پھر مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے آباء واجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اور حضرت اسحاق علیہم السلام کا جو معبود ہے اسی کی عبادت کریں گے، وہ کون ہے؟ ''إِلٰهًا وَاحِدًا'' وہی ایک معبود اللہ تعالیٰ۔ اس طرح پوری وضاحت کر دی گئی، اب اس کے بعد تو کچھ پیچیدگی باقی ہی نہیں رہی تھی، پھر بھی آگے فرمایا: ''وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ'' اور ابا جان! ہم اسی کا حکم مانیں گے، اور اسی کی بات پر چلیں گے۔ اس طرح سے بیٹوں نے اپنے والد کو مکمل اطمینان دلا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب حضرت یعقوب علیہ السلام جیسے پیغمبر کو اپنی اولاد کے متعلق- جن میں ایک اللہ کا نبی ہے- یہ فکر لاحق ہے کہ میرے بعد میری اولاد کس کی عبادت کرے گی، اور کون سا دین اختیار کرے گی؛ تو کیا اِس زمانہ میں ہمیں اپنی اولاد کے متعلق یہ فکر نہیں ہونی چاہیے؟ آج تو اس فکر کی اور زیادہ سخت ضرورت ہے۔ اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ ہماری طرف سے اس کا اہتمام ہونا چاہیے، اور ایسی وصیت سے پہلے اولاد کے لیے ایسی کوشش بھی ہونی چاہیے۔

اب آگے وصیت کے متعلق کچھ روایتیں پیش کرتے ہیں۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وصیت:

حدیث ۲۱۷:-

فمنها حديث زيد بن أرقم رضی اللہ عنہ -الَّذِي سبق في بَابِ إكرام أهْلِ بَيْتِ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) - قَالَ: قَامَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) فِينَا خَطِيباً، فَحَمِدَ اللهَ، وَأثْنَى عَلَيْهِ، وَوَعَظَ وَذَكَّرَ، ثُمَّ قَالَ: ((أمَّا بَعْدُ، ألاَ أيُّهَا النَّاسُ، إنَّمَا أنَا بَشَرٌ يُوشِكُ أنْ يَأتِيَ رَسُولُ رَبِّي فَأُجِيبَ، وَأنَا تَارِكٌ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ، أوَّلَهُمَا: كِتَابُ اللهِ، فِيهِ الْهُدَى وَالنُّورُ، فَخُذُوا بِكِتَابِ اللهِ وَاسْتَمْسِكُوا بِهِ))، فَحَثَّ عَلَى كِتَابِ اللهِ، وَرَغَّبَ فِيهِ، ثُمَّ قَالَ: ((وَأهْلُ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ في أهْلِ بَيْتِي)) (رواه مسلم، وَقَدْ سَبَقَ بِطُولِهِ.)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے درمیان خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے، پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان فرمائی اور لوگوں کو نصیحت کی، اللہ تعالیٰ کی یاد دلائی، اور فرمایا: حمد وصلوٰۃ کے بعد! اے لوگو، سنو! میں ایک انسان ہوں، قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایلچی اور بلانے والا میرے پاس آئے اور میں اس کے بلاوے پر لبیک کہوں (یعنی موت کا فرشتہ آئے گا تو مجھے دنیا سے جانا ہوگا) اس لیے میں تمہارے درمیان دو مضبوط چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں (ان کو اگر تم مضبوطی سے پکڑلوگے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے) ایک اللہ تعالیٰ کی کتاب (یعنی قرآن پاک کہ) اسی میں ہدایت کاراستہ، لوگوں کے لیے رہنمائی اور روشنی موجود ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی کتاب کو پکڑو اور مضبوطی کے ساتھ اس کو تھامے رہو (مطلب یہ ہے کہ اس پر عمل کرو۔ پکڑنے اور تھامنے سے ہاتھ میں پکڑنا مراد نہیں ہے، بلکہ عمل کرنا مراد ہے) چنانچہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو

قرآنِ پاک پر عمل کے لیے خوب ابھارا اور ترغیب دی۔ اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، کہ ان کے سلسلہ میں مَیں تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈراتا ہوں (یعنی ان کے حقوق کو بھی ادا کرنا)

دیکھو! یہاں نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جب یہ اندازہ ہوا کہ میرے دنیا سے جانے کا وقت اب قریب آرہا ہے تو آپ نے امت کو یہ وصیت فرمائی، اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

مناسبِ حال معاملہ اور نصیحت:

حدیث ۷۱۳:-

وعن أَبِي سليمان مالِك بن الحُوَيْرِثِ رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَيْنَا رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) وَنَحْنُ شَبَبَةٌ مُتَقَارِبُونَ، فَأَقَمْنَا عِنْدَهُ عِشْرِينَ لَيلَةً، وَكَانَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) رَحِيماً رَفيقاً، فَظَنَّ أنَّا قد اشْتَقْنَا أَهْلَنَا، فَسَأَلَنَا عَمَّنْ تَرَكْنَا مِنْ أَهْلِنَا، فَأَخْبَرْنَاهُ، فَقَالَ: ((ارْجِعُوا إِلَى أَهْلِيكُمْ، فَأَقِيمُوا فِيهِمْ، وَعَلِّمُوهُم وَمُرُوهُمْ، وَصَلُّوا صَلاَةَ كَذَا فِي حِيْنِ كَذَا، وَصَلُّوا كَذَا فى حِيْنِ كَذَا، فَإِذَا حَضَرَتِ الصَّلاَةُ فَلْيُؤَذِّنْ لَكُمْ أحَدُكُمْ وَلْيَؤُمَّكُمْ أَكْبَرُكُمْ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

زاد البخاري في رواية لَهُ: ((وَصَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي)).

وَقَوْلُه: ((رحِيماً رَفِيقاً)) رُوِيَ بِفاءٍ وقافٍ، وَرُوِيَ بقافين.

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت مالک بن حُوَیرِث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ (یعنی یہ اور ان کے قبیلہ کے کچھ نوجوان) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے حال یہ کہ ہم سب ہم عمر اور نوجوان تھے (یہ لوگ اپنے علاقہ سے خاص دین سیکھنے کے لیے حاضر ہوئے تھے) ہم نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں بیس روز قیام کیا، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) بڑے مہربان اور نرم دل تھے۔ جب بیس روز ہو گئے تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے محسوس کیا کہ ہمارے دلوں میں ہمارے گھر والوں کا شوق پیدا ہوا ہے (ایسا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اب ان کو گھر والے یاد آرہے ہیں) تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم سے پوچھا کہ تمہارے گھر پر کون کون ہے؟ (ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے: یہ ساری تفصیلات حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھیں) ہم نے آپ کو سب تفصیل بتلائی (تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سمجھ گئے کہ ان کو گھر کی یاد آرہی ہے اس لیے کہ بیس دن ہو گئے تھے) تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازخود ارشاد فرمایا: بھائیو! تم لوگ گھر جاؤ (اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم و تربیت اور تبلیغ وغیرہ امور کے اندر جس آدمی کو لگایا جائے اس میں اس کے مزاج اور اس کی طبیعت کے تقاضوں کا بھی خیال رکھا جائے، ان سے ہٹ کر اگر کچھ کرنے جاؤ گے تو پھر یہ چیز نبھے گی نہیں، اور اس میں استقامت نہیں ہوگی۔ دیکھو! ان کو فقط بیس دن گزرے تھے، لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے مزاجوں سے محسوس کیا کہ اب ان کے دلوں میں گھر کا خیال آرہا ہے، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازخود پوچھ لیا کہ گھر پر کس کو چھوڑ کر آئے ہو، ساری تفصیل سننے کے بعد آپ نے فیصلہ کیا کہ اب تم لوگ گھر جاؤ) اور اپنے خاندان کے لوگوں میں قیام کرو، اور (یہاں جو سیکھا ہے وہ) ان کو سکھاؤ (مقامی کام کرو) ان کو اللہ کی باتوں کا حکم کرو، اور فلاں

وقت میں فلاں نماز اور فلاں وقت میں فلاں نماز پڑھو (پانچوں وقت کی نماز کے اوقات بتلائے) اور جب نماز کا وقت آئے تو ایک آدمی اذان کہے، اور تم میں جو بڑا ہے وہ تمہاری امامت کرائے۔

افادات:- دیکھو! جب یہ لوگ رخصت ہو رہے تھے تو نبی کریم (ﷺ) نے ان کو نماز کی اور خاندان والوں کو دین سکھلانے کی تاکید فرمائی، اور نماز کا طریقہ بتلایا۔ اس روایت کو لاکر بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جب کسی سے جدائی کا وقت آئے تو اس کے مناسبِ حال نصیحت کرنی چاہیے۔ جیسے: آپ اپنے بچے کو مدرسہ میں پڑھنے کے لیے بھیج رہے ہوں تو ظاہر ہے کہ اس کے مناسبِ حال بات یہی ہے کہ اس سے کہا جائے کہ بیٹا! وہاں جاکر محنت سے پڑھنا۔ اگر آپ کا لڑکا بڑا ہے اور وہ تجارتی سفر کے لیے بیرون جا رہا ہے، یا ملک ہی میں کہیں لمبی ٹور پر جا رہا ہے، تو اس کے مناسب آپ نصیحت کریں گے، مثلاً: سفر میں نماز کا خیال رکھنا، اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا، برائیوں سے دور رہنا، اور اپنے کام کی طرف توجہ دینا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جب بھی کسی سے جدائی کا وقت آئے، تو اس کو اس کے مناسبِ حال نصیحت کی جائے، خاص طور پر دین کی حفاظت کی طرف توجہ دلائی جائے۔

اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو:

حدیث ۷۱۴:-

وعن عمرَ بن الخطاب رضی اللہ عنہ قَالَ: اسْتأْذَنْتُ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فی العُمْرَةِ فَأَذِنَ، وقال: ((لاَ تَنْسَانَا يَا أُخَيَّ مِنْ دُعَائِكَ)) فقالَ كَلِمَةً ما يَسُرُّنِي أنَّ لِي بِهَا الدُّنْيَا

وفی روایة قَالَ: ((أَشْرِكْنَا يَا أُخَيَّ فی دُعَائِكَ))

(رواه أَبُو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عمرہ کے لیے جانے کی اجازت طلب کی، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اجازت مرحمت فرمائی، اور کہا: اے میرے پیارے بھائی! اپنی دعاؤں میں ہمیں مت بھولیو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسا جملہ ارشاد فرمایا کہ ساری دنیا ملتی تو اس سے وہ خوشی نہ ہوتی جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد سے ہوئی۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ بڑا بھی اپنی چھوٹے سے دعا کی درخواست کرے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جب کوئی آدمی کسی ایسی جگہ پر جارہا ہو جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ وہاں دعا قبول ہوتی ہے، تو ان جانے والوں سے دعا کی درخواست کرنی چاہیے۔ باب کے عنوان میں یہ بھی تھا: ان کے لیے دعا کرنا اور ان سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرنا۔ تو کوئی آدمی کسی بھی سفر میں جارہا ہو تو چوں کہ مسافر کی دعا قبول ہوتی ہے، تو اس سے بھی دعا کی درخواست کی جائے۔

کسی کو رخصت کرتے وقت کی دعائیں:

حدیث ۷۱۵:-

وعن سالم بن عبد الله بن عمر: أنَّ عبدَ اللهِ بن عُمَر رضی اللہ عنہ ما كَانَ يَقُولُ للرَّجُلِ إِذَا أَرَادَ سَفراً أُدْنُ مِنِّي حَتَّى أُوَدِّعَكَ كَمَا كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يُوَدِّعُنَا. فَيَقُولُ: ((أَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكَ، وَأَمَانَتَكَ، وَخَوَاتِيمَ عَمَلِكَ))

(رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت سالم- جو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے ہیں ان سے روایت ہے کہ جب کوئی آدمی سفر کا ارادہ رکھتا اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتا تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے کہ: مجھ سے قریب آؤ تاکہ میں تم کو اسی طرح رخصت کروں جس طرح نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو رخصت فرماتے تھے، پھر یہ دعا دیتے تھے: **"میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیتا ہوں تیرے دین کو، تیری امانت کو، اور تیرے اعمال کے انجام کو"** (اور جو چیز اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دی جائے وہ کبھی ضائع نہیں ہوا کرتی)

افادات:- معلوم ہوا کہ سفر میں جانے والے اپنے ساتھیوں کو اپنے پاس سے اس طرح رخصت کرنا چاہیے۔

حدیث ۷۱۶:-

وعن عبدِالله بن يزيدَ الخطْمِيِّ الصحابيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) إِذَا أَرَادَ أنْ يُوَدِّعَ الجَيشَ، قَالَ: ((أَسْتَوْدِعُ اللهَ دِينَكُمْ، وَأَمَانَتَكُمْ، وَخَوَاتِيمَ أَعْمَالِكُمْ)) (حديث صحيح، رواه أبو داود وغيره بإسناد صحيح.)

اس روایت میں بھی اوپر والی دعا کا تذکرہ ہے کہ نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کسی لشکر کو رخصت فرماتے تھے تو یہی دعا دیتے تھے۔

حدیث ۷۱۷:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبی (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فَقَالَ: يَا رسولَ الله! إنِّي أُرِيدُ سَفراً، فَزَوِّدْنِي، فَقَالَ: ((زَوَّدَكَ اللهُ التَّقْوَى)) قَالَ: زِدْنِي قَالَ: ((وَغَفَرَ ذَنْبَكَ)) قَالَ: زِدْنِي، قَالَ: ((وَيَسَّرَ لَكَ الْخَيْرَ حَيْثُمَا كُنْتَ))

(رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ مع مختصر تشریح:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں سفر کا ارادہ رکھتا ہوں، آپ مجھے (دعا اور نصیحت کا) توشہ دیجئے۔ نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تجھے تقویٰ سے مالا مال فرمائے (اس سے معلوم ہوا کہ سفر کرنے والے کو دعا دینی چاہیے) اس نے پھر درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! مزید (دعا) دیجئے۔ تو نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تیرے گناہوں کو معاف کرے۔ اس نے پھر درخواست کی کہ: کچھ اور (دعا) دیجئے، تو نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے فرمایا: تو جہاں کہیں بھی رہے اللہ تعالیٰ تیرے لیے بھلائی کے راستے آسان کر دے۔

افادات:-اوپر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دعا کی درخواست کی تھی اور یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا دی۔ معلوم ہوا کہ جو رخصت ہو رہا ہو اس کو دعا دینی بھی چاہیے اور اس سے دعا کی درخواست بھی کرنی چاہیے۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

الاستِخارة والمشاورة

استخارہ اور مشورہ کرنا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اللهُ تَعَالَى: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

وقال تعالى: وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (الشورىٰ: ۳۸) أي: يَتَشَاوَرُونَ بَيْنَهُمْ فِيهِ

مشورہ کی اہمیت:

دو چیزیں ہیں: استخارہ اور مشورہ۔ استخارہ؛ اللہ تبارک وتعالیٰ سے کیا جاتا ہے، اور مشورہ؛ امانتدار، سمجھدار، خیر خواہ اور تجربہ کار آدمی سے کیا جاتا ہے۔ مشورہ کے سلسلہ میں آیت پیش کی ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس بات کا حکم دیا کہ اہم معاملات میں آپ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیجئے۔ حالاں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ تعالیٰ نے جو علم، عقل، سمجھ، اور سوجھ بوجھ عطا فرمائی تھی؛ وہ اعلیٰ، کامل ومکمل تھی، نوعِ انسانی میں کسی کے لیے بھی وہ علم، عقل وسمجھ اور ایسا کمال متصوَّر نہیں ہو سکتا، اور ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ گویا عالَمِ غیب سے علوم کا القاء مختلف طریقوں سے ہوتا ہی رہتا تھا، اس کے باوجود اہم معاملات میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔ گویا اس طریقہ کو اللہ تعالیٰ انسانوں میں اور امتِ مسلمہ کے اندر جاری فرمانا چاہتے ہیں، اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کا حکم دیا گیا۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کبھی اپنی رائے چھوڑ دیتے تھے:

اسی لیے اہم معاملات میں حضورِ اکرم (ﷺ) کی عادتِ شریفہ تھی کہ مشورہ فرماتے تھے، بلکہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی معاملہ میں آپ (ﷺ) کی کوئی رائے ہوتی، لیکن مشورہ میں بات رکھی گئی اور لوگوں کا زیادہ رجحان دوسری بات کی طرف دیکھا تو آپ (ﷺ) دوسری بات کو اختیار فرما لیتے۔ یا کسی کی طرف سے کوئی بات پیش کی گئی اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے محسوس کیا کہ اسی کو اختیار کیا جانا چاہیے، تو اگرچہ آپ کی اپنی رائے دوسری ہوتی تھی، اس کے باوجود ان کی رائے کو اختیار فرما لیتے۔

غزوۂ اُحد کے مشورہ کا منظر:

چناں چہ غزوۂ اُحد کے موقع پر جب نبیٔ کریم (ﷺ) کو یہ اطلاع ملی کہ مکہ والے ایک لشکر لے کر مدینہ منورہ پر چڑھائی کے ارادہ سے روانہ ہو چکے ہیں، تو اس لشکر کے ساتھ مقابلہ کہاں ہو؟ اس سلسلہ میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے مشورہ کے لیے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کیا۔ مشورہ کے لیے بیٹھنے سے پہلے حضورِ اکرم (ﷺ) نے ایک خواب بھی دیکھا تھا کہ میں ایک محفوظ قلعہ میں ہوں، ایک گائے ذبح کی جا رہی ہے، اور اپنی تلوار کو آپ نے ہلایا اور سونتا، تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ کر گر گیا، پھر دوبارہ اس کو حرکت دی تو وہ پہلے سے زیادہ عمدہ نظر آنے لگی۔ محفوظ قلعہ سے

اشارہ مدینہ منورہ کی آبادی کی طرف تھا کہ اگر اس میں رہ کر مقابلہ کیا جائے گا تو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی آدمی محفوظ قلعہ میں رہ کر دشمن کا مقابلہ کرے، اور جو گائے ذبح ہوتے ہوئے دیکھی، اس سے اشارہ ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف تھا جو اس غزوہ کے موقع پر شہید ہوئے تھے۔ اور پہلی مرتبہ جو تلوار سونتی تو اس کا اگلا حصہ ٹوٹ گیا اس سے بھی اشارہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اسی جماعت کی طرف تھا جو شہید ہوئی، اور دوبارہ اس کو سونتا اور پہلے سے عمدہ نظر آئی، اس سے اس کے بعد کی جو کامیابیاں ملنے والی تھیں ان کی طرف اشارہ تھا۔

خیر! نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو مشورہ کے لیے مسجدِ نبوی ہی میں جمع کیا، اور مشورہ میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی جو بات پیش فرمائی اس سے تمام حضرات نے یہی سمجھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کو ترجیح دے رہے ہیں اور پسند فرمارہے ہیں ، خواب میں بھی اسی کی طرف اشارہ تھا، اور حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی رائے شریف بھی یہی تھی۔

غزوۂ بدر کا مختصر خاکہ :

لیکن بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم جن کو غزوۂ بدر میں مقابلہ کے لیے میدان میں آنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ اگر موقع ملے تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دینِ اسلام کے واسطے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دے کر بہادری کے جوہر دکھلائیں۔ ان کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع اس لیے نہیں ملا تھا کہ غزوۂ بدر اچانک پیش آیا تھا، پہلے سے ایسی کوئی بات

ذہنوں میں نہیں تھی کہ دشمن سے مقابلہ ہوگا۔مکہ والوں کا ایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہا تھاجس کے تعاقب میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابۂ کرام کو لے کر روانہ ہوئے تھے ، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بھی وہم وگمان میں نہیں تھا کہ مکہ مکرمہ سے کوئی لشکر روانہ ہوگا اور اس سے مقابلہ کی نوبت آئے گی،بس اچانک مقابلہ کی نوبت آگئی اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کامیابی عطا فرمائی۔

جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قافلہ کے تعاقب کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہونے والے تھے، تو آپ نے اعلان فرمایا کہ کون تیار ہے؟معلوم ہوا ہے کہ مکہ والوں کاایک تجارتی قافلہ شام سے واپس آرہاہے،اورمکہ جارہا ہے، اس وقت وہاں جو موجود تھے وہ اسی حالت میں تیار ہوگئے، بعضوں نے کہاکہ ہم ذراتیاری کرلیں ؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : نہیں !جو موجود اور تیارہیں وہ آجائیں۔بہرحال!تین سوتیرہ کے قریب صحابہؓ روانہ ہوئے، اور بعدمیں جوہوا وہ ہوا۔تو یہ سب کچھ اچانک ہوا تھا،اس لیے بہت سوں کوشرکت کاموقع نہیں ملاتھا اوران کی تمنائیں دل ہی دل میں رہ گئی تھیں۔

افسوس کاتدارک:

اسی لیے بدرکے واقعہ کےبعد بعض حضرات ِصحابہ کوجیسے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت اَنس بن نضررضی اللہ عنہ کوتو بہت زیادہ افسوس رہ گیا تھا،وہ کہنے لگے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنے دشمنوں سے پہلاہی مقابلہ تھا،افسوس کی بات ہے کہ میں اس میں شریک نہ ہوسکا،اگراللہ

تعالیٰ نے مجھے آئندہ دشمن کے مقابلہ میں آنے کا موقعہ دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لیں گے کہ میں کیا کرتا ہوں، یعنی میں برابر دشمن کا مقابلہ کروں گا۔ یہ انہوں نے قسم کھاکر کہا تھا۔ اور پھر غزوۂ احد کے موقع پر انہوں نے بہادری کے ایسے جوہر دکھلائے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ -جو انصار میں بڑے بہادر اور ایسے ہی سخت مزاج سمجھے جاتے تھے جیسے مہاجرین میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تھے، وہ- فرماتے ہیں کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ایک وقت حضرت اَنس بن نضر رضی اللہ عنہ تلوار لے کر آگے بڑھ رہے تھے، میرے پاس سے گزرتے ہوئے کہنے لگے: اے معاذ! کدھر چلے، میرے ساتھ چلو، اُدھر اُحد پہاڑ کی طرف جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے، یہ کہہ کر وہ آگے بڑھے اور دشمن کا مقابلہ کیا اور شہید ہوئے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: انہوں نے ایسا مقابلہ کیا تھا کہ میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔

غزوۂ اُحد کا مشورہ:

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں بہت سوں کو شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس لیے ان کی دلی تمنائیں تھیں کہ آئندہ اگر ایسا موقع آئے گا تو ہم بھی اللہ کے واسطے اور دینِ اسلام کے واسطے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ دیں گے۔ اس وقت جب مشورہ کے لیے بیٹھے اور معلوم ہوا کہ مکہ سے لشکر روانہ ہوا ہے، تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا رجحان اور ارادہ ظاہر فرمادیا کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔

چناں چہ عبداللہ بن اُبی جو منافقین کا سردار تھا اور ظاہری طور پر اسلام لے آیا تھا، وہ ایک تجربہ کار صاحبِ رائے آدمی تھا، اسی لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لانے سے پہلے مدینہ والوں نے اسی کو اپنا سردار اور بادشاہ بنانا طے کرلیا تھا، لیکن جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کرکے یہاں تشریف لائے اور اسلام پھیلا تو اس کا سارا نظام گڑبڑ ہوگیا، اسی کا تو اس کو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حسد تھا کہ ان کے آنے سے میرا سارا کھیل بگڑ گیا، اسی پر وہ جلتا اور کڑھتا تھا، اور اسی وجہ سے اس میں منافقت آئی تھی۔ خیر! اس سے بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مشورہ لیا، تو اس نے یہ مشورہ دیا کہ آج تک مدینہ کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ باہر کے کسی دشمن نے جب بھی حملہ کیا اور مدینہ کے رہنے والوں نے مدینہ میں رہ کر ان کا جواب دیا، تو مدینہ والے کبھی ناکام نہیں ہوئے اور دشمن کو ہمیشہ منھ کی کھانی پڑی۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر اندر رہ کر مقابلہ کریں گے تو مرد تو باہر نکل کر دشمن سے لڑیں گے اور عورتیں بھی چھتوں سے دشمنوں پر پتھراؤ کرسکیں گی۔

لیکن جن کو غزوۂ بدر میں موقع نہیں ملا تھا ان کی رائے یہ تھی کہ باہر میدان میں جاکر جواب دینا چاہیے، اندر رہ کر مقابلہ کرنا تو ہماری بزدلی سمجھی جائے گی۔ نوجوان پارٹی اسی طرف تھی، اور ان کی طرف سے مطالبہ تھا کہ مدینہ منورہ سے باہر جاکر مقابلہ کیا جائے، کچھ بڑوں نے بھی اس رائے میں ان کا ساتھ دیا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اگر مدینہ سے باہر جاکر مقابلہ کا فیصلہ نہ کیا گیا تو میں کھانا نہیں کھاؤں گا، جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ ان

لوگوں کا شوق اور جذبہ یہ ہے، تو آپ نے فیصلہ کردیا کہ ٹھیک ہے! مدینہ سے باہر جا کر مقابلہ کریں گے۔

وہ جمعہ کا دن تھا، حضورِ اکرم (ﷺ) نے لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھائی اور تقریر فرمائی، جس میں اللہ کے راستہ میں دشمن کے مقابلہ میں بہادری کے جوہر دکھلانے کے لیے ترغیب دی، اسی میں عصر کا وقت ہوگیا، تو عصر کی نماز پڑھا کر آپ (ﷺ) اپنے حجرۂ مبارکہ میں تیاری کے واسطے تشریف لے گئے، جب آپ (ﷺ) اندر تشریف لے گئے تو یہ نوجوان جنہوں نے مدینہ منورہ سے باہر جا کر مقابلہ پر اصرار کیا تھا، ان کو دوسروں نے سمجھایا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کا رجحان کیا تھا وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟ تم نے بلاوجہ حضور (ﷺ) کی مرضی کے خلاف اتنا زور لگایا کہ آپ کو یہ فیصلہ کرنا پڑا۔ مطلب یہ ہے کہ بڑوں نے ان کو ذرا ڈانٹا اور متنبہ کیا تو ان کی بھی سمجھ میں بات آئی کہ بات تو ٹھیک ہے۔ اب حضورِ اکرم (ﷺ) تو تیاری کے واسطے حجرۂ مبارکہ میں تشریف لے گئے تھے، اس لیے آپ (ﷺ) زرہ پہن کر، تلوار ہاتھ میں لے کر، ترکش اور کمان لٹکا کر میدانِ جنگ میں جانے کی پوری تیاری فرما کر جب باہر تشریف لائے، تو ان نوجوانوں نے -جن کو اصرار کرنے پر لوگوں نے سمجھایا تھا- عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری طرف سے آپ کی بے ادبی اور گستاخی ہوئی، آپ کا رجحان اور ارادہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، ہم لوگوں نے اصرار کیا جس کی وجہ سے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا، اگر آپ کا ارادہ ہو تو مدینہ ہی میں رہ کر مقابلہ کرنے کا فیصلہ فرما دیجیے۔ حضورِ اکرم (ﷺ)

نے ارشاد فرمایا: اللہ کا نبی جب ایک مرتبہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے میدان میں نکلیں گے ،تو پھر مقابلہ کئے بغیر واپس نہیں لوٹتا،اب تو میں تیار ہو کر آگیا ہوں۔اسی کو قرآنِ پاک میں بتلایا گیا:﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾پہلے اچھی طرح مشورہ کرلو،پھر جب کوئی فیصلہ کرلیا اور ارادہ مضبوط ہو گیا ؛تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

اس کو مشورہ کہتے ہیں :

آج کل تو ایک مصیبت یہ بھی ہوگئی کہ مشورہ مشورہ نہیں رہا،بلکہ پہلے سے فیصلہ کرلیتے ہیں۔ہمارے یہاں طلبہ کا کوئی معاملہ پیش آتا ہے اور مہتمم صاحب کو لگتا ہے کہ یہ قابو میں نہیں آئے گا،تو مہتمم صاحب ان سے کہتے ہیں کہ جاکر مفتی صاحب سے مشورہ کرلو۔وہ میرے پاس آتے ہیں،جب میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا؟ تو وہ پوری بات بیان کردیتے ہیں کہ ایسا ایسا ہوا ہے،اور ایسا کرنے کا ارادہ ہے۔تو میں کہتا ہوں کہ آپ نے تو فیصلہ کرلیا،اب مشورہ کس بات کا کرنے آئے ہو؟جب ایک چیز طے کرلی،تو اب مشورہ کا سوال ہی نہیں رہا۔مشورہ کا مطلب تو یہ ہے کہ آپ نے کوئی چیز طے نہیں کی،بلکہ پہلے اپنی بات رکھ دی ،اب اس پر لے دے ہوگی،اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے؛اس کو مشورہ کہتے ہیں۔

اس کا نام مشورہ نہیں :

لیکن آج کل عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے ایک چیز کا فیصلہ کر لیا جاتا ہے، پھر دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانے کے واسطے مشورہ ہوتا ہے کہ میں فلاں مولانا صاحب کے پاس گیا تھا تو انہوں نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا۔ ارے بھائی! تم کو تو یہی کرنا تھا، بس مشورہ کا تو بہانہ ہے، اس کا نام مشورہ نہیں ہے۔ مشورہ تو یہ ہے کہ آدمی کوئی فیصلہ نہ کرے، اپنی بات پوری دیانتداری کے ساتھ ان کے سامنے رکھ دے۔ اتنا ضروری ہے کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ آدمی امانتدار ہو، حدیثِ پاک میں آتا ہے: "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ"(سنن ابوداود: باب فِي الْمَشُورَةِ) اور جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کی بھی ذمہ داری ہے کہ مشورہ لینے والے کے حق میں جس چیز کو وہ بہتر سمجھتا ہو اسی چیز کا مشورہ دے، چاہے اس میں مشورہ دینے والے کا بھی نقصان ہوتا ہو۔

مشورہ کے بعد کیا ہوا فیصلہ نہ بدلے:

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ مشورہ میں پہلے سے فیصلہ نہیں کیا جاتا اور فیصلہ کر لینے کے بعد اس کو بدلا نہیں جاتا۔ ہمارے یہاں ایک مصیبت یہ بھی ہوگئی ہے کہ فیصلہ کر لینے کے بعد بیوی نے کچھ کہہ دیا، عورتوں نے دو باتیں کہہ دیں کہ یوں کرو تو پہلا فیصلہ بدل دیتے ہیں کہ اچھا

چلو! یوں کر لیتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی تیسرا آیا اس نے کچھ اور کہا تو پھر فیصلہ بدل دیا، اسی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ہمارے کسی کام میں برکت نہیں ہوتی۔ اسلام کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ اس لیے پہلے سے اچھی طرح مشورہ ہونا چاہیے، اور اس مشورہ میں جب ایک فیصلہ ہو گیا تو اب دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے، لیکن آپ اسی فیصلہ کے مطابق چلیے، سیدھی سادی بات ہے ﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ﴾ جب فیصلہ کر لیا تو اب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے آگے بڑھو۔

عورتوں سے مشورہ:

عام طور پر جب عورتوں کے سامنے بات آتی ہے تو پھر بڑے بڑے سمجھ دار بھی اپنا فیصلہ بدل ڈالتے ہیں، اگر ان سے مشورہ کرنا ہے تو پہلے سے ان کے سامنے بھی بات رکھو۔ ویسے عام طور پر عورتوں سے مشورہ لینے کو پسند نہیں کیا گیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو فرماتے ہیں: "شَاوِرُوْهُنَّ وَخَالِفُوْهُنَّ" ان سے مشورہ کرو اور اس کی مخالفت کرو ({ﷺ ۲۳۲۷})اگرچہ عورت بھی کبھی کبھی اچھا مشورہ دیا کرتی ہے، ایک واقعہ یاد آگیا تو سنا دیتا ہوں۔

صلحِ حدیبیہ کے موقعہ پر جب صلح ہو گئی جس میں انہوں نے ایک شرط یہ بھی لگائی تھی کہ اگرچہ مسلمان احرام باندھ کر آئے ہیں لیکن اس سال تو ان کو عمرہ کے لیے بیت اللہ جانے نہیں دیں گے، البتہ آئندہ سال آکر تین دن یہاں رہ کر عمرہ کر سکتے ہیں، اور سوائے تلواروں کے اور کوئی ہتھیار ساتھ میں نہ لائیں اور وہ تلوار بھی نیام میں ہونی چاہیے۔ اور بھی شرائط تھیں

جو نبی ٔکریم (ﷺ) نے منظور فرمالیں اور نبی ٔکریم (ﷺ) نے فیصلہ کرلیا کہ ٹھیک ہے اس سال واپس جائیں گے۔ صحابہ ٔ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ صلح بہت گراں گزری، کہنے لگے کہ ہم عمرہ کے لیے وہاں سے یہاں تک آگئے ہیں، اب یہ ہم کو کیوں روکتے ہیں، ہم لڑلیں گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی ضبط نہ ہوسکا اور عرض کیا: یارسول اللہ! کیا آپ نبی ٔ برحق نہیں؟ نبی ٔکریم (ﷺ) نے فرمایا: کیوں نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: بیشک۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: پھر یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا: میں اللہ کا رسول اور برحق نبی ہوں، اس کے حکم کے خلاف نہیں کر سکتا اور وہ میرا معین اور مددگار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ ہم بیت اللہ کا طواف کریں گے؟ نبی ٔکریم (ﷺ) نے فرمایا: ہاں! لیکن میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال طواف کریں گے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے بھی یہی عرض کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی لفظ بلفظ وہی جواب دیا جو آپ (ﷺ) کی زبانِ مبارک سے نکلا تھا۔ بہرحال! حضورِ اکرم (ﷺ) نے لڑائی نہیں ہونے دی اور صلح کرلی۔ جب یہ طے ہوگیا کہ واپس جانا ہے تو نبی ٔکریم (ﷺ) نے حضراتِ صحابہ کو حکم دیا کہ اپنے جانور ذبح کردو، سر منڈوادو، اور احرام کھول دو۔ لیکن سب اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے رہے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے سنا ہی نہیں۔ یہ دیکھ کر حضورِ اکرم (ﷺ) کو بہت تکلیف ہوئی کہ مَیں ایک چیز کا حکم دے رہا ہوں، لیکن کوئی آگے ہی نہیں بڑھتا، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سنا ہی نہ ہو۔ آپ

(ﷺ) اپنے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں ساتھ تھیں، حضور (ﷺ) نے ان کو سارا واقعہ بیان فرمایا کہ ایسا ہوا۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے، انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے جو بات کہی وہ انہوں نے سنی ہی نہیں، اس لیے کہ یہ صلح ان کو اتنی ناگوار ہوئی ہے کہ ان کے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں (جب کسی چیز کا غم زیادہ ہوتا ہے تو آدمی کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں) اس لیے ان لوگوں نے کچھ سنا ہی نہیں ہے، آپ ان کو یہ حکم نہ دیجئے کہ جانور ذبح کر کے بال کٹوادو، اور احرام کھول دو، بلکہ آپ ان کے سامنے اپنا جانور ذبح کیجئے، بال منڈوا دیجئے اور اپنا احرام کھول دیجئے، جب وہ آپ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھیں گے تو خود بخود آپ کی اتباع کریں گے۔ چناں چہ حضورِ اکرم (ﷺ) باہر تشریف لائے اور جانور ذبح کیا آپ کو قربانی کرتا ہوا دیکھ کر سب لوگ اپنے جانوروں کو ذبح کرنے کے لیے ایسے لپک پڑے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ دیں گے۔

آمدم بر سرِ مطلب:

تو بات چل رہی تھی کہ جس سے مشورہ کیا جائے وہ تجربہ کار، سمجھ دار، امانت دار اور خیر خواہ ہو۔ حضورِ اکرم (ﷺ) سے بڑھ کر کس کی عقل کامل ہو سکتی ہے اور آپ سے بڑھ کر کس کا علم کامل اور مکمل ہو سکتا ہے، پھر آپ پر باری تعالیٰ کی طرف سے وحی بھی آتی تھی، اس

کے باوجود باری تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا: "وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ" اور حضور (ﷺ) نے اس حکم پر عمل کیا، اور بہت سی مرتبہ آپ (ﷺ) کا اپنا رجحان کچھ اور ہوتا تھا اس کے باوجود آپ (ﷺ) نے دوسروں کی رائے پر فیصلہ کیا جیسا کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہوا۔

صدیق کی رائے صادق:

اسی طرح صلحِ حدیبیہ کے موقع پر جب نبیٔ کریم (ﷺ) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کا احرام باندھ کر روانہ ہوئے تو آپ (ﷺ) نے پہلے سے بُسر بن سفیان نامی ایک جاسوس کو مکہ مکرمہ بھیجا تاکہ وہ مکہ والوں کے حالات سے باخبر کرے، جب نبیٔ کریم (ﷺ) غدیر الاشتات {(بخاری ۲۳۹۸)} پر پہنچے تو آپ کے جاسوس نے آکر اطلاع دی کہ تمام مکہ والے جمع ہو گئے ہیں اور اطراف سے تمام قبائل کو بھی جمع کر لیا ہے، اور دودھ دینے والی اونٹنیوں اور پانی کا انتظام کر لیا ہے، اور انہوں نے طے کیا ہے کہ جو ہونا ہو وہ ہو، لیکن آپ (ﷺ) اور آپ کے ساتھیوں کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اور خالد بن ولید - جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، ان - کو مقدمۃ الجیش کے طور پر دو سو سواروں کو لے کر روانہ کر دیا ہے جو مقامِ غمیم میں پہنچ گئے ہیں، جب یہ اطلاع نبیٔ کریم (ﷺ) کو ملی تو آپ نے مشورہ کے لیے حضراتِ صحابہ کو جمع کیا کہ ایسی اطلاع آئی ہے، اب بتاؤ! کیا کرنا ہے؟ اور آپ (ﷺ) نے اپنی رائے پیش کی کہ میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ مکہ کے آس پاس کے جو قبیلے والے مکہ والوں کا ساتھ دینے کے واسطے

پہنچے ہوئے ہیں ،ان کے علاقے لڑنے والوں سے خالی ہوگئے ہیں ،ہم ان کے علاقوں پر جاکر حملہ کردیں،جب ان کو اطلاع ملے گی کہ مسلمانوں نے ہمارے علاقوں پر حملہ کیاہے تووہ مکہ والوں کوچھوڑ کراپنے علاقوں کی حفاظت کے لیے آجائیں گے،اوراگرنہیں آئیں گے تونقصان اُٹھائیں گے۔حضرت ابو بکرصدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کےرسول !ہم اور آپ تومدینہ منورہ سے عمرہ کے ارادے سے نکلے ہیں،اس لیے ہم توعمرہ کے لئے آگے بڑھتےرہیں ،ہم کوان کے کسی علاقہ پرحملہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے،ہاں!اگرمکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے کوئی ہمیں روکے گاتوہم اس کامقابلہ کریں گے۔حضور ﷺ نے ان کی رائے قبول فرمالی۔

اس واقعہ سے میں یہ بتلاناچاہتاہوں کہ حضورِاکرم ﷺ کومشورہ کاحکم بھی دیاگیا اوربہت سے مواقع پر دوسروں کی رائے اپنی رائے سے مخالف تھی پھر بھی حضور ﷺ نے ان کی رائے قبول فرمالی۔اس طرح آپ ﷺ نےایک سنت جاری فرمائی کہ اہم معاملات میں خاص طور پرمشورہ کرناچاہیے ،اورجوحضرات کسی بھی لائن کے ذمہ دار ہیں ان کوتواورزیادہ اہتمام کرناچاہیے،جیسے:گھر کا ذمہ دارہوتو اس کوچاہیے کہ گھرکے دوسرےافراد جومشورہ کے قابل ہوں،ان سے مشورہ کرے۔یا خاندان کے دوسرے جوخیرخواہ لوگ ہوں ، ان سے مشورہ کرے۔جماعت کاکام ہے تو اس کے ذمہ داروں سے مشورہ کریں۔

بہر حال! مشورہ ایک بہت اہم چیز ہے، اور اس کی خاص تاکید فرمائی گئی ہے، اسی کو حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مَاخَابَ مَنِ اسْتَخَارَ، وَلَانَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ (المعجم الأوسط: ٦٦٢٧) جس نے استخارہ کیا وہ کبھی ناکام نہیں ہوگا، اور جس نے مشورہ کیا وہ کبھی پچھتائے گا نہیں۔ اس سے مشورہ اور استخارہ دونوں کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب انہی دو چیزوں کی اہمیت کو بتلانے کے لیے قائم کیا ہے۔ دو آیتیں مشورہ والی پیش فرمائی ہیں اور روایت استخارہ والی لا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک آیت ﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)﴾ ہوئی، اور دوسری آیت ہے ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸)﴾ اہلِ ایمان کے معاملات آپس کے مشورہ سے طے ہوتے ہیں۔ گویا مشورہ کو ایمان والا ہونے کی علامت بتلایا گیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ مشورہ ہو، اس کے اندر بڑی برکتیں ہیں، جہاں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے، وہاں اس کے بڑے اچھے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

استخارہ کی تعلیم اور اس کی اہمیت:

حدیث ۷۱۸:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يُعَلِّمُنَا الاسْتِخَارَةَ فى الأُمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ القُرْآنِ، يَقُولُ: إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالأَمْرِ، فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ مِنْ غَيْرِ الفَرِيضَةِ، ثُمَّ ليقل: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ العَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلاَ أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلاَّمُ

الْغُيُوبِ. اللَّهُمَّ إِنْ كُنتَ تَعْلَمُ أَنَّ" هَذَا الأَمْرَ" خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ، فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي، ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ. وَإِنْ كُنتَ تَعْلَمُ أَنَّ" هَذَا الأَمْرَ" شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي (أَوْ قَالَ) عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ؛ فَاصْرِفْهُ عَنِّي، وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِيَ الْخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ أَرْضِنِي بِهِ. (قَالَ): وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ. (رواہ البخاری۔)

ترجمہ:۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم لوگوں کو تمام معاملات میں استخارہ کرنا اس طرح سکھاتے تھے جیسے قرآنِ پاک کی سورت سکھاتے تھے۔ چناں چہ فرماتے تھے کہ جب تمہیں کوئی معاملہ پیش آئے تو چاہیے کہ (اگر مکروہ وقت نہ ہو تو) دو رکعت نفل پڑھے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے: اے اللہ! میں تیرے علم کے ذریعہ سے تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں، اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو قدرت اور طاقت نہیں ہے، اور سارا علم تو تیرے پاس ہی ہے، میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔ اور تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔ اے اللہ! اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ "**یہ کام**" جس کا میں ارادہ کر رہا ہوں، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے، یا فوری طور پر میرے اس کام میں بھلائی ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرما دے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کر دے اور پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔

اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ "**یہ کام**" میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، اور میری دنیوی زندگی کے اعتبار سے، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے اور اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے؛ تو اے اللہ! اس کام کو مجھ سے

پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے۔ اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کردے، پھر مجھے اس پر راضی کردے۔

اہتمام استخارہ کی وجہ:

افادات:- حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآنِ پاک کی سورتیں جس اہتمام اور تاکید سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو سکھاتے تھے، اسی اہتمام اور تاکید کے ساتھ استخارہ اور اس کی دعا بھی صحابہ کو سکھاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے اپنے اہم معاملات کے فیصلے کرنے کے لیے عجیب وغریب طریقے اختیار کر رکھے تھے، جن کی بنیادیں صرف توہمات اور خیالات پر تھیں اور ان کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زمانۂ جاہلیت میں رائج ان توہّمات پر مبنی سارے طریقوں کو منع فرمادیا، اور ایک بہترین چیز امت کو عطا فرمائی۔

کہانت:

وہ مختلف طریقے کیا تھے جو اس زمانہ میں رائج تھے؟

ایک طریقہ "**کہانت**" تھا۔ "**کاہن**" وہ آدمی کہلاتا ہے جو مستقبل کی خبریں بتائے؛ جس کو ہم جوتشی کہتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں کاہنوں کا بڑا رواج اور دَور دورہ تھا کوئی قبیلہ ایسا نہیں تھا جس میں کوئی کاہن نہ ہو اور وہ قبیلے والے اپنے اہم معاملات میں اس کی خدمت میں حاضر ہوتے

تھے، اور چوں کہ وہ دعویدار ہوتا تھا کہ آئندہ جو باتیں پیش آنے والی ہیں وہ مَیں جانتا ہوں، اس لیے لوگ اس سے پوچھتے تھے کہ مثلاً: ہم اپنے لڑکے کی شادی فلاں جگہ کرانا چاہتے ہیں، ٹھیک رہے گا یا نہیں؟ پھر وہ اپنے حساب سے کہتا کہ، ہاں صحیح ہے؛ تو وہ کرتے تھے۔ یا کوئی پوچھتا کہ: ہم یہ تجارت کرنا چاہتے ہیں، فلاں کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں، فلاں سفر کرنا چاہتے ہیں، ایسے مختلف اہم کاموں کے سلسلہ میں کاہنوں کے پاس جاتے تھے اور کاہن ویسے ہی مشورہ نہیں دیتا تھا، بلکہ جانے والا پہلے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا تھا جو عام طور پر سو درہم ہوتے تھے، یہ معمولی رقم نہیں ہوتی تھی بلکہ بڑی رقم ہوتی تھی، اس کے بعد وہ اپنی حاجت پیش کرتا تھا کہ مَیں اس مقصد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ جو رقم پیش کی جاتی تھی اسی کو حدیث میں **"حُلْوَانُ الْكَاهِنِ"** کاہن کی شیرینی اور مٹھائی کہا گیا ہے۔ ہماری زبان میں بھی مٹھائی بول کر مٹھائی مراد نہیں لی جاتی، جیسے: کہتے ہیں کہ بھائی! مٹھائی لاؤ یعنی کوئی چیز لاؤ۔ اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے حرام کمائی کی جو چیزیں بتلائی ہیں اس میں "حلوان الکاہن" بھی ہے، یعنی کاہن کی خدمت میں اس مقصد کے لیے جو کچھ پیش کیا جاتا تھا؛ چوں کہ ایک غلط کام کے لیے ہوتا تھا، اس لیے وہ کمائی بھی حرام ہے۔

زَجر:

دوسرا طریقہ "زَجر" کا تھا، یعنی کبھی کسی کام کا ارادہ کرتے تھے تو جانوروں کی آوازیں سنتے تھے۔ اس زمانہ میں بعض قبیلہ کے لوگ ایسے ہوتے تھے جو جانوروں کی آوازوں کے ماہر ہوتے

تھے، وہ ان کی آواز سن کر بتاتے تھے کہ اس جانور کی اس آواز کا مطلب یہ ہے کہ تم کو یہ کام نہیں کرنا چاہیے، اس میں کامیابی نہیں ہوگی، کبھی کہتے کہ کرو؛ کامیابی ہوگی۔ اسی طرح باہر نکلے اور کوئی جانور سامنے سے گزر گیا، جیسے: بلّی سامنے سے گزری، تو سمجھتے تھے کہ یہ کام نہیں کرنا ہے، آج بھی ایسا ہوتا ہے کہ بلّی اگر راستہ کاٹ جائے تو بعض لوگ واپس گھر میں گھس جاتے ہیں، یعنی تمہاری قسمت کا سارا فیصلہ اس بلّی ہی نے کرڈالا۔ جب ہمارا ایمان تقدیر پر ہے کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ طے کر چکے ہیں، تو بلّی کے گزر جانے سے اس میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے؟ اسی کو **"زجر"** والا طریقہ کہتے تھے۔

تطیُّر اور طیرہ:

ایک تیسرا طریقہ بھی تھا، جس کو **"تطیُّر اور طیرہ"** کہتے ہیں، یعنی شگون اور فال لینا۔ اس میں یہ کرتے تھے کہ گھر سے باہر نکلے اور کوئی پرندہ بیٹھا ہوا دیکھا تو کنکر مار کر اس کو اڑاتے تھے، اگر وہ اُڑ کر دائیں طرف گیا تو سمجھتے تھے کہ اس کام میں کامیابی ہوگی اور بائیں طرف جاتا تو سمجھتے تھے کہ ناکامی ہوگی۔ دائیں طرف جانے والے پرندے کو یہ لوگ **"سوانح"** کہتے تھے، اور بائیں طرف جانے والے کو **"بوارح"** کہتے تھے۔

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ یہ معاملہ عقل کے بالکل خلاف ہے یا نہیں! ایک جانور اگر اُڑا، تو اس کو تمہارے کام سے کیا لینا دینا۔ وہ اگر دائیں طرف اڑا تو کامیابی اور بائیں طرف اڑا تو ناکامی؛ یہ

کوئی سمجھ میں آنے والی بات ہے؟ عقل اس کو تسلیم کر سکتی ہے؟ یہ سب توہُّمات ہیں، اسلام ایسی چیزوں کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ اسلام تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین و توکل اور بھروسہ کرنے اور اسی سے امیدیں قائم کرنے کا سبق دیتا ہے۔

اِسْتِقْسَام بِالْأَزْلَام:

ایک اور طریقہ "**إِسْتِقْسَام بِالْأَزْلَام**" کا تھا۔ تیروں کے پاسے ڈالے جاتے تھے۔ ویسے تیر میں تو آگے لوہے کا نوکیلا حصہ اور پیچھے پَر ہوتا ہے، لیکن اس کام کے لیے جو تیر ہوتے تھے اس میں آگے اور پیچھے کچھ نہیں ہوتا تھا، صرف لکڑی ہوتی تھی، اور ایسے کل سات تیر ہوتے تھے۔ ایک تیر پر لکھا ہوتا تھا: "أَمَرَنِي رَبِّيْ" مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا۔ دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: "نَهَانِيْ رَبِّيْ" مجھے میرے رب نے اس کام سے منع کیا۔ یہ دو تیر ہوئے، تین تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: "وَاحِدٌ مِّنْكُمْ" دوسرے پر ہوتا تھا: "مِنْ غَيْرِكُمْ" تیسرے پر لکھا ہوتا تھا: "مُلْصَقٌ"۔ دو تیر اور ہوتے تھے، ایک پر لکھا ہوتا تھا: "اَلْعَقَلُ" اور دوسرے پر لکھا ہوتا تھا: "اَلْغَفَلُ"؛ اس طرح کل سات تیر ہوئے۔

عام طور پر ان کے یہاں کوئی جھگڑا کسی کے نسب کے بارے میں ہوتا کہ یہ تمہارے قبیلے سے ہے یا نہیں؛ تو اس جھگڑے کے لیے تو وہ تین تیر استعمال کئے جاتے تھے۔ اور اگر کسی کے قتل کا معاملہ ہو، اور اس سے خون بہا اور دیت لینی ہو، تو اس کے لیے اخیری دو تیر استعمال کئے

جاتے تھے۔ان کے علاوہ اور کوئی بھی اہم کام ہوتا تھاتواس کے لیے پہلے والے دو تیر استعمال ہوتے تھے۔اورچوں کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے، اور ہر قبیلے کاایک بت ہواکرتا تھا،اوروہ بت جس مکان اوربت خانے میں رکھا ہوتا تھا اس کے پجاری کی بہت ساری ذمہ داریاں اور ڈیوٹیاں ہوتی تھیں،ان میں سے ایک ذمہ داری اورڈیوٹی یہ بھی تھی کہ لوگوں کے معاملات میں مشورہ دےاورفیصلہ کرے۔یہ سب تیر الگ الگ تھیلوں میں اس پجاری کے پاس اسی بت خانے میں رکھے ہوتے تھے۔اب مثلاً:کسی کوسفر کرناہوتاتووہ مندر کے اس پجاری کے پاس جاتا اس کوہدیہ پیش کرتا،پھرسوال کرتا کہ: ایک تجارتی سفر کا ارادہ ہے ،اس سلسلہ میں کیا فیصلہ ہے؟تووہ دو تیر والا چمڑے کاایک تھیلا نکالتا۔اور بعض روایتوں میں ہے کہ وہ دو تیرنکال کر اس پر کپڑاڈال دیتاتھا،آنکھیں بندکرکے کچھ بڑبڑاکرایک تیر اُٹھاتاتھا اور اس پر دیکھتاکہ کیا لکھاہوا ہے،اگروہ تیر ہوتا جس پر"أَمَرَنِي رَبِّيْ"لکھاہوتاتھاکہ مجھے میرے رب نے اس کام کو کرنے کا حکم دیا؛توکہتایہ سفر کرو، اس میں کامیابی ہے۔اور اگردوسراتیرنکلتاجس پر لکھا ہوتا تھا "نَهَانِيْ رَبِّيْ"مجھےمیرے رب نےاس کام سے منع کیا؛توکہتاکہ یہ سفرکرنےجیسانہیں ہے۔اور یہاں رب بول کروہی بت مرادہوتاتھاجو اس مندر میں رکھاہوتاتھا،اوراس کی بنیاد توہّم پر تھی۔یہ سارے طریقے زمانۂ جاہلیت میں رائج تھے،اوراس کابڑارواج تھا۔

ایک غلط رواج:

آج کل بھی فال کے نام پر بہت کچھ کیا جاتا ہے، جیسے: بعض لوگ کرتے ہیں کہ قرآن کھولو ایک دو صفحات اِدھر اُدھر سے دیکھ کر کہتے ہیں کہ، یہ کرو، اور یہ مت کرو۔ ان سے پوچھئے کہ یہ طریقہ کہیں کسی حدیث میں آیا ہے؟ بالکل نہیں۔ اور بعض طریقے تو زمانۂ جاہلیت والے طریقوں سے بالکل مشابہ ہو جاتے ہیں، اس لیے ان سارے طریقوں کو چھوڑ کر حضورِ اکرم (ﷺ) نے استخارہ کا طریقہ بتایا ہے؛ وہ کرو۔

استخارہ کی لغوی تحقیق:

استخارہ عربی زبان کا لفظ ہے، اور عربی زبان کے مصدر استفعال سے ہے۔ اب اس کا مادہ کیا ہے؟ تو بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ استخارہ "خیر" سے مشتق ہے، 'سین' اور 'تاء' طلب کا معنٰی دینے کے لیے آتے ہیں، یعنی اللہ تعالٰی سے خیر اور بھلائی طلب کرنا۔ گویا جو کام کرنا ہے اس میں اللہ تعالٰی سے خیر کا سوال کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا جائے جو حضورِ اکرم (ﷺ) نے بتلایا۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا مادہ "خِیَرَۃٌ" ہے، جس کا معنٰی ہے انتخاب اور فیصلہ۔ جیسے قرآنِ پاک میں ہے: ﴿مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ﴾ تو استخارہ یعنی اللہ تعالٰی سے فیصلہ مانگنا کہ اے اللہ! میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں، تو ہی اس کام میں میرے لیے فیصلہ کر دے کہ مَیں کروں یا نہ کروں۔

استخارہ کن کاموں میں کیا جائے؟:

"إِذَا هَمَّ أَحَدُكُمْ بِالأَمْرِ" یعنی جب تم کو کوئی معاملہ پیش آئے۔ یہاں کون سا معاملہ مراد ہے؟ تو سمجھنا چاہیے کہ ایک تو روزمرّہ کے معاملات ہوتے ہیں جن کو امورِ عادیہ کہا جاتا ہے، جیسے: کھانا، پینا، سونا، دوکان اور کاروبار پر جانا وغیرہ؛ اس کے لیے استخارہ نہیں کیا جائے گا، یہ تو روزمرّہ کے امورِ عادیہ ہیں۔

کچھ کام وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اور شریعت کی طرف سے لازم اور ضروری کئے گئے ہیں، جیسے: پنج وقتہ نماز پڑھنا، روزے رکھنا، حج کرنا وغیرہ۔ تو اب مَیں حج کروں یا نہ کروں؟ ایسا استخارہ نہیں کیا جائے گا۔ جب تم پر حج فرض ہو گیا ہے تو وہ تو کرنا ہی کرنا ہے، اس میں استخارہ کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ مَیں نماز پڑھنے کے لیے جاؤں یا نہ جاؤں؟ یہ استخارہ کی چیز نہیں ہے۔ جو چیز شریعت کی فرض و واجب کی ہوئی ہے؛ اس میں استخارہ کیا کرنا؟

کچھ کام حرام اور ممنوع ہیں، ان کے بارے میں استخارہ کرنا کہ مثلاً: فلاں جگہ ڈاکہ ڈالنا ہے؛ جاؤں یا نہ جاؤں؟ جیسے: بعض لوگ (لاٹری کا) نمبر پوچھنے کے لیے جاتے ہیں۔ ارے بھائی! یہ تو حرام کام ہے جو کرنے کا ہے ہی نہیں۔ تو جو حرام اور ناجائز کام ہیں ان کے لیے بھی استخارہ نہیں ہے۔

استخارہ توان کاموں میں ہوتا ہے جو جائز ہیں ، یا کم از کم مستحب ہیں کہ جن کے کرنے میں ثواب ہے، اور نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں، جیسے: فلاں گاؤں میں مسجد بنانی ہے، تو بناؤں یا نہ بناؤں؟ اس کا استخارہ کرسکتے ہیں۔ اس لیے کہ مسجد نہ بنانے پر کوئی گناہ ہونے والا نہیں ہے۔ یا مسجد تو بنانی ہی ہے لیکن کون سے گاؤں یا شہر میں بناؤں، اس کا استخارہ کرسکتے ہیں۔ تو استخارہ ناجائز کام کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ جائز اور مباح کام کے لئے ہوتا ہے۔ مثلاً: آپ کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اب کون سا کاروبار کروں ، کپڑوں کی دلالی کا کروں، دوکان کھولوں ، ہوٹل کھولوں ، فلاں کام کروں، یا فلاں کروں ؛ کئی چیزیں آپ کے سامنے ہیں اور مختلف لوگوں نے مختلف باتیں رکھی ہیں کہ تمہارے لیے فلاں چانس ہے، اور فلاں چانس بھی ہے، اور وہ سب جائز کام ہیں؛ تو اب آپ استخارہ کیجئے، پھر فیصلہ کیجئے۔

یا مثلاً: کوئی سفر درپیش ہے، اور اس کے معاملہ میں تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں۔ یا مثلاً: نکاح کا معاملہ ہے، لڑکی کا رشتہ کرنا ہے، اور تردد ہے کہ کروں یا نہ کروں؛ تو اس سلسلہ میں استخارہ کرلیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی اہم کام ہو، جو روزمرّہ کا نہ ہو، بلکہ زندگی میں ایک آدھ بار کیے جانے والے کاموں میں سے ہو؛ ایسے کاموں میں آدمی کو چاہیے کہ استخارہ کرے، بس! شرط یہ ہے کہ وہ جائز کام ہو۔

مسنون استخارہ:

"دورکعت نفل پڑھے": اور یہ یادرہے کہ ایسا بھی ضروری نہیں ہے کہ سوتے وقت ہی ہو، کبھی بھی نماز پڑھ کر دعا کرلیجئے، بس مکروہ وقت نہیں ہونا چاہیے۔ ہاں! یہ ہے کہ اطمینان اور یکسوئی والا استخارہ وہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے دو رکعت پڑھ کر دعا کرلی جائے، پھر سنت کے مطابق دائیں کروٹ پر رخ کرکے سوجائے، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے، اس دعا کے پڑھنے کے بعد سوجانے والی بات کسی حدیث میں نہیں آئی ہے، اگر آپ نے دورکعت نماز پڑھ کر استخارہ والی دعا پڑھ لی، تو مسنون استخارہ ہوگیا اور حدیث پر عمل ہوگیا۔ یہ یاد رہے۔

دعا کے آداب:

حدیث میں دعا کے آداب آئے ہیں، تو آداب کا تقاضہ ہے کہ اس دعا سے پہلے ان کا بھی لحاظ کرلیا جائے۔ دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ دعا کی شروعات اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے کی جائے، جیسے: کسی کے نام درخواست لکھتے ہیں اور عرضی لے کر جاتے ہیں تو اپنی بات پیش کرنے سے پہلے اس کے القاب و آداب لکھے جاتے ہیں کہ، آپ ایسے ہیں اور ویسے ہیں، لوگوں کی حاجتوں کی طرف توجہ کرنے والے ہیں، مَیں بھی آپ کی خدمت میں اس امید پر یہ درخواست پیش کررہا ہوں کہ اس کو آپ قبول فرمائیں گے۔ یہ پورا ایک طریقہ ہے، اسی کو تمہید کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو اپنی حمد بہت پسند ہے، اس لیے دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی جائے۔

یہ سب حمد وثناء ہی ہے:

بعض لوگ سوچتے ہیں کہ حمد کے لیے عربی کے الفاظ کہاں سے یاد کریں؟ تو بھائی الحمد شریف تو سب کو یاد ہی ہوتی ہے ،وہ اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، نماز میں پڑھی جانے والی ثناء بھی حمد ہی ہے، تیسرا اور چوتھا کلمہ بھی اللہ تعالیٰ کی حمد ہی ہے، آیت الکرسی بھی حمد ہی ہے، ان میں سے کوئی بھی پڑھ لو۔ یہ سب آسانی کے لیے بتلارہا ہوں ،اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء آگئی۔ پھر دعا کو قبولیت سے قریب کرنے والی چیز نبی کریم ﷺ پر درود ہے، اس لیے حمد وثناء کے بعد درود پڑھو، سب سے اعلیٰ درود وہی ہے جو نماز کے اندر پڑھا جاتا ہے جس کو درودِ ابراہیمی کہتے ہیں، اس کے علاوہ بھی دوسرے درود پڑھنا چاہو تو پڑھو، اس کے بعد پھر استخارہ والی یہ دعا پڑھو۔

دعائے استخارہ کی تشریح:

”أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ“ اے اللہ! مَیں تیرے علم کے ذریعہ تجھ سے خیر کا سوال کرتا ہوں۔ جیسے: کوئی ہم سے زیادہ جاننے والا ہوتا ہے تو ہم اس سے کہتے ہیں کہ بھائی! اس سلسلہ میں آپ

ہی بتاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ کا علم ساری چیزوں کو محیط ہے، تو اس میں آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر و بھلائی یا فیصلہ مانگتا ہے۔

”وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ“ اور تیری طاقت سے میں طاقت چاہتا ہوں۔ ہم لوگوں نے اپنا ذہن ایسا بنالیا کہ ہماری سوچ اسباب و وسائل تک محدود ہوگئی۔ جیسے: ایک آدمی تجارت کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے جگہ اور جتنے کونٹیکٹ (Contact) ضروری ہیں وہ، اور ایڈورٹائز وغیرہ؛ یہ ساری چیزیں اختیار کرلیتا ہے، پھر وہ آدمی سمجھتا ہے کہ اب مَیں کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہیں آکر ہم سے غلطی ہو جاتی ہے، حالاں کہ ایک مؤمن کی نظر ان اسباب و وسائل کی طرف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے، اسباب و وسائل کو سبب کے درجہ میں اختیار کرے، لیکن نظر مسبب الاسباب اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہی ہونی چاہیے، بھروسہ و اعتماد اسی پر ہو، کرنے والا وہی ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں: ”عَرَفْتُ رَبِّي بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ“ مَیں نے اپنے رب کو اپنے پختہ ارادوں کے ٹوٹنے پر پہچانا۔ آدمی کیسے کیسے پکّے ارادے کرتا ہے اور اس کے لیے کیسی لمبی چوڑی پلاننگ کرتا ہے، لیکن ساری پلاننگ زلزلہ کے ایک جھٹکے میں ختم ہو جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے انسان کی ساری پلاننگ کی کیا حیثیت ہے؟

جب جیب کٹی:

ایک آدمی گھوڑا خریدنے جارہا تھا، کسی نے پوچھا: کہاں جارہے ہو؟ کہا: گھوڑا خریدنے۔ پوچھنے والے نے کہا: ان شاء اللہ کہو۔ تو وہ کہتا ہے: اس میں ان شاء اللہ کیا کہنا! میرے پاس پیسے ہیں، بازار جارہا ہوں، وہاں گھوڑے بکنے کے لیے آئے ہیں، میں خریدنے کے لیے جارہا ہوں، اگر پسند آگیا تو لے لوں گا؛ اب اس میں کیا باقی رہ گیا۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے بھائی! جاؤ۔ دوسرے دن بازار لگنے والا تھا، یہ آدمی گیا، رات میں ایک مسافر خانہ میں آرام کیا، اسی میں اس کی جیب کٹ گئی۔ صبح اُٹھ کر دیکھتا ہے تو پیسے ہی نہیں ہیں، اب کیا گھوڑا خریدتا! واپس لوٹ رہا تھا، وہی آدمی ملا تو پوچھنے لگا کہ بھائی! کیا ہوا؟ گھوڑا نہیں خریدا؟ تو یہ کہتا ہے: بس! ان شاء اللہ میں جارہا تھا، ان شاء اللہ وہاں پہنچا، ان شاء اللہ رات کو سو گیا، ان شاء اللہ صبح جب اُٹھا تو دیکھا کہ ان شاء اللہ میری جیب کٹ گئی تھی، تو ان شاء اللہ اب مَیں واپس ہورہا ہوں۔ جب جیب کٹی تو سبق سمجھ میں آگیا، اور ایسا آیا کہ جہاں ان شاء اللہ نہیں کہنا چاہیے وہاں بھی ان شاء اللہ منھ سے نکل رہا ہے۔

دعائے استخارہ کی روح:

اسی لیے اسباب اختیار کرنے کے بعد بھی مؤمن کی نگاہ اور اعتماد تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہی پر ہونی چاہیے؛ اسی کا نام توکل ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کا توکل یہی ہے کہ بظاہر سب کچھ نظر آرہا ہے،

ایک پائی کی بھی کمی نہیں ہے، دل کا یقین کہتا ہے کہ یہ کام ہو کر رہے گا؛ پھر بھی اس پر بھروسہ نہ ہو۔ مؤمن تو ہر وقت یہی کہتا کہ اگر اللہ تعالیٰ کرے گا تو ہو گا۔ استخارہ کی دعا میں یہی سکھایا گیا ہے۔ توکل یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد و بھروسہ، تفویض یعنی اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ کرنا۔ جیسے: ہمارا چھوٹا بچہ کہتا ہے کہ ابا جان! میرے پاس یہ سب کچھ ہے، لیکن آپ جو فیصلہ کریں گے، مَیں تو اسی پر چلوں گا؛ تو آپ اندازہ لگایئے کہ باپ کو اس بچہ کے ساتھ کیسا تعلق ہو گا؟ پھر باپ پوری کوشش کرے گا کہ یہ کام پورا ہونا ہی چاہیے۔ تو ہم جب اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیں گے اور کہیں گے کہ: اے اللہ! میں نے یہ اسباب تو اپنی جگہ پر اختیار کر لیے، لیکن میرے علم اور میری قدرت کی کیا حیثیت ہے، تیرا علم تیری قدرت اور تیرا فیصلہ ہی سب کچھ ہے، تو جو کرے اسی پر میں آس اور امید لگائے ہوئے بیٹھا ہوں؛ تو پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کیا کرتا ہے۔

دراصل نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات ہر مؤمن کا مزاج یہی بنانا چاہتی ہے۔ اسباب کے اختیار کرنے سے منع نہیں کیا، بلکہ اسباب کا حکم دیا کہ اسباب اختیار کرو، لیکن نظر ان اسباب پر نہیں ہونی چاہیے، بلکہ نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔ اسی کو کہتے ہیں: "وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ" اے اللہ! تیری طاقت سے مَیں طاقت حاصل کرنا چاہتا ہوں، میرے اندر قدرت اور طاقت ہی کہاں ہے، قدرت والا تو تو ہی ہے، تیری ذات ہی سے مَیں مدد و قدرت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

”وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ“ اور اے اللہ !میں تیرے بڑے فضل کا سوال کرتا ہوں، میرا تجھ پر کوئی حق نہیں ہے۔ کیا بندے کی اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی ہے؟ وہ دے تو اس کا فضل ہے، اور اگر نہ دے تو اس سے چھین کر کون لے سکتا ہے؟ اس لیے کہا کہ: اے اللہ !تیرا فضل بہت بڑا ہے، اسی فضلِ عظیم کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔

آگے فرمایا: ”فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ أَقْدِرُ“ اس لیے کہ تو قدرت رکھتا ہے، میرے اندر تو کوئی قدرت اور طاقت نہیں ہے۔

”وَتَعْلَمُ وَلاَ أَعْلَمُ“ اور سارا علم تو تیرے پاس ہے، مَیں تو کچھ جانتا بھی نہیں ، اس کام کا آئندہ کیا نتیجہ ہونے والا ہے، اور آگے پیچھے، اندر باہر اس کے کیا اثرات ہیں ؛ وہ سب تو جانتا ہے، مَیں تو جانتا بھی نہیں۔

”وَأَنْتَ عَلاَّمُ الْغُيُوبِ“ اور تو تو غیب کی باتوں کو بھی جاننے والا ہے۔

دعا کا عجیب وغریب انداز:

یہ سب کہنے کے بعد اب آگے کہا جا رہا ہے کہ: اے اللہ !اگر تیرے علم میں یہ ہے کہ ”یہ کام“ جس کا مَیں ارادہ کر رہا ہوں ، اس میں میرے لیے میرے دین کے اعتبار سے، دنیوی

زندگی کے اعتبار سے، انجام کار اور نتیجہ کے اعتبار سے بھلائی ہے؛ تو اس کام کو تو میرے لیے آسان کردے، اور میری تقدیر میں لکھ دے۔ دیکھو! جتنی بھلائیاں ہو سکتی ہیں، وہ سب مانگ لیں۔

اور بعض روایتوں میں ہے کہ فوری طور پر میرے اس کام میں میرے لیے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہے، تو اے اللہ! اس کام کو میرے لیے مقدر فرمادے، اور اس کا فیصلہ کر دے کہ یہ کام ہو جائے، اور اس کام کو میرے لیے آسان بھی کردے، پھر اس کام میں میرے لیے برکت رکھ دے۔

اور اے اللہ! اگر تو نے اپنے علم میں یہ بات طے کی ہے کہ **"یہ کام"** میرے لیے میرے دین، میری دنیوی زندگی، اور میرے انجام کار کے اعتبار سے برا ہے، اس میں میرے لیے بھلائی نہیں ہے، تو اس کام کو مجھ سے پھیر دے، اور مجھے اس سے پھیر دے، اور پھر بھلائی جہاں کہیں بھی ہو، اس کا میرے لیے فیصلہ کر دے، اور پھر مجھے اس پر راضی کر دے۔

بہت سی مرتبہ کوئی بات ہماری بھلائی کی ہوتی ہے، لیکن ہمارا دل اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پھر بعد میں کہتے ہیں کہ یار وہی ٹھیک تھا۔ اس لیے کہا کہ اس وقت میں اس کو دل سے مان لوں۔

غور کیجئے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے کیسا کیسا مانگا ہے! کیسی عجیب و غریب چیزیں ہیں! ایک بندہ جب اپنے کسی کام میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح سوال کرے گا کہ گویا اپنا سب کچھ اللہ

تعالیٰ کے حوالہ کررہاہے اوراس کے بعد آگے بڑھ رہا ہے،تو اندازہ لگایئے کہ کبھی وہ ناکام ہوسکتاہے؟ اوراگرخدانہ کرے کبھی ظاہری طور پر کوئی ناکامی ہوئی؛ تب بھی اس کادل مطمئن رہے گا۔

"هٰذَاالْأَمْرَ" کہتے وقت اس کام کادل میں تصور کرلے،یازبان سے اس کام کوبولے۔یہ استخارہ کاطریقہ ہے۔

دیکھئے !نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیسی بہترین تعلیم دی ہے!ایک بندے کواللہ تعالیٰ کے ساتھ بالکلیہ جوڑدیا،جیساکہ پہلے بچہ کی ایک مثال دی تھی۔اسی طرح ہمارانوجوان بیٹاہے جس کے پاس سب کچھ ہے،اس میں ساری صلاحیتیں ہیں اس کے باوجود سب کچھ اباکے حوالہ کردے کہ آپ جو کہیں گے وہی ہو گا،تو اباجان کبھی کوئی ایسی شکل سوچیں گے ہی نہیں جس میں ناکامی ہو، بلکہ اس کو پورے طورپر کامیاب کراکرہی رہیں گے۔اسی طرح بندہ جب اپنے آپ کوپورااللہ تعالیٰ کے حوالہ کردے گااوراللہ تعالیٰ ہی سے توفیق مانگے گااور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پرچلے گا؛تو پھروہ ضرورکامیاب ہو گا۔

استخارہ کے بعد پتہ کیسے چلے؟:

اب استخارہ کے بعد فیصلہ خواب میں نظر آنا چاہیے یا نہیں ؟تو یہ دھیان رہے کہ خواب کا نظر آنا تو کوئی ضروری نہیں ہے۔ہاں ! کبھی آ بھی جاتا ہے کہ آدمی اس کام کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے، گویا اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام کرو، کبھی اس کام سے دور ہوتے ہوئے اور بچتے ہوئے دیکھتا ہے، یہ اشارہ ہوتا ہے کہ یہ کام مت کرو۔لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

اور اگر کوئی خواب تو نظر نہیں آیا، مگر استخارہ کرنے سے پہلے اس کام کو کرنے کا آپ کے دل میں جو خیال تھا وہ استخارہ کے بعد اور زیادہ جم گیا اور مضبوط ہو گیا،وہ خیال اور قوی ہو گیا؛یہ بھی اس بات کی علامت ہے کہ اس کام کو کرو۔یا اس کام کا ارادہ استخارہ کے بعد کم ہو گیا؛تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ مت کرو۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ استخارہ کے بعد اپنے کسی محسن سے مشورہ کیا تو اس نے کہا کہ کرو،تو یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس استخارہ کے نتیجہ میں اس کے دل میں ڈالا ہے کہ اس سے کہو کہ اس کام کو کرے؛لہٰذا اس کو کرلو۔یا اس نے منع کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں منع کرنے کا خیال ڈالا، یہ اسی استخارہ کا اثر ہوتا ہے؛لہٰذا مت کرو۔

استخارہ کتنے دن ؟:

اب استخارہ کتنے دنوں تک کیا جائے؟ تو فقہاء نے لکھا ہے کہ سات دن تک کیا جائے، اور اگر جلدی ہو تو ایک ہی دن میں سات مرتبہ یہ دعا پڑھ لی جائے۔

اور بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ یہ دعا پڑھ لینے کے بعد وہ کام کرڈالو، جو خیر ہو گی وہی کام اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ سے کروائے گا۔

دوسرے سے استخارہ کرایا جاسکتا ہے؟

تو اس سلسلہ میں مَیں نے کسی کتاب میں دیکھا نہیں ہے، اور پہلے پہل جب میں نے سنا کہ کسی دوسرے سے استخارہ کروایا جاتا ہے، تو مجھے بھی عجیب وغریب لگا کہ اپنا کام ہے اور دوسرے سے کیسے استخارہ کروایا جائے؟ لیکن اپنے بزرگوں میں سے بعض کے یہاں سنا کہ فلاں صاحب نے ان سے استخارہ کروایا اور انہوں نے کرکے دیا تو پھر ہم بھی ماننے والے بن گئے۔ ورنہ کسی کتاب میں مَیں نے یہ طریقہ دیکھا نہیں ہے کہ اپنا استخارہ دوسرے سے کرواؤ۔ یہاں اہلِ علم موجود ہیں، ان میں اگر کسی نے کسی کتاب میں دیکھا ہو، تو مجھے بھی بتادیں؛ تاکہ میرے علم میں اضافہ ہو جائے۔

إستحباب الذهاب

الیٰ العید الخ

عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب کا عنوان:

آداب کا بیان چل رہاہے ،ایک اور ادب بتلایا جارہاہے کہ :عید کی نماز کے لیے جاتے ہوئے اورواپسی میں،اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں ،اسی طریقہ سے حج کے لیے،اللہ کے راستہ میں جہاد کے لیے،جنازہ کی شرکت کے لیے،اورجتنے بھی نیکی کے کام ہیں، ان سب میں مستحب یہی ہے کہ اگر ایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے؛تاکہ نیکی کی جگہیں زیادہ سے زیادہ ہوجائیں۔

قیامت کی کچہری کے گواہ:

دراصل یہ بات تو قرآنِ پاک کی آیت اوراحادیث سے ثابت ہے کہ بندے کے اعمال کے متعلق قیامت میں اللہ تعالیٰ جن گواہوں کو قائم فرمائیں گے،ان میں زمین کے وہ حصے بھی ہوں گے جہاں اس نے وہ اعمال کیے تھے۔ آدمی جو بھی اعمال کرتا ہے ان کے متعلق مختلف گواہ قیامت کے دن پیش کیے جائیں گے ،جیسے:کورٹ کا دستور ہے کہ مجرم کے خلاف ثبوت مہیا کیے جاتے ہیں اور ان ثبوت کو پیش کرنے کے بعد اس کے اوپر جرم ثابت کیا جاتا ہے، پھر سزا کا فیصلہ سنایا جاتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہی کارروائی کی جائے گی،اگرچہ اللہ

تعالیٰ ساری چیزیں جانتے ہیں،وہ دانا وبینا ہیں،سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے،اس کے باوجود اللہ تعالیٰ حجت قائم کرنے کے لیے بندوں کے خلاف گواہ پیش کریں گے، اور ان گواہوں کے ذریعہ ان کے گناہوں کو ثابت کیا جائے گا،اوراس کے بعد سزا سنائی جائے گی۔ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿يَوۡمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخۡبَارَهَا﴾ اس دن زمین اپنی خبریں سنائے گی۔اس کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ جو بھی اعمال اچھے یا برے اس نے زمین پر کیے ہیں ، قیامت کے روز زمین کا وہ حصہ اور ٹکڑا اس کے متعلق گواہی دے گا۔

اسی طرح دوسرے گواہ انسان کے اعضاء ہوں گے وہ بھی گواہی دیں گے۔اس لیے کہ جب آدمی کو پیش کیا جائے گا اور اس نے گناہ کیے ہوں گے تو دنیا کی طرح مجرم اوّلِ وہلہ میں ازخود اپنے گناہ کا اقرار نہیں کرے گا،اس کی کوشش یہی ہوگی کہ ان سے انکار کردے ، پھر جب دیکھے گا کہ انکار سے بات بننے والی نہیں ہے،اور میرے خلاف چاروں طرف سے گواہ قائم ہوچکے ہیں ،اگر انکار کروں گا تب بھی میری بات سنی جانے والی نہیں ہے؛توپھر مجبوراً اقرار کرے گا۔

تطبیقِ آیات:

بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک آدمی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کچھ سوالات کیے کہ قرآنِ پاک کی کچھ آیتوں میں آپس میں تعارض ہے، ایک آیت سے

ایک بات معلوم ہوتی ہے اور دوسری آیت سے دوسری بات ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے پوچھا: وہ کیا ہے؟ اس نے کہا: قرآنِ پاک کی بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں گے اور بات چیت ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاموشی سی طاری ہوگی، کسی کو دم مارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اور بعض آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنے گناہوں سے انکار کریں گے کہ ہم نے کبھی کفر و شرک نہیں کیا تھا: "وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ"۔ اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: پہلے تو وہ لوگ خاموش رہیں گے، لیکن اس کے بعد دیکھیں گے کہ لوگوں کو طلب کیا جاتا ہے اور ان سے پوچھا جاتا ہے، اس موقع پر اہلِ ایمان کو بھی طلب کیا جائے گا اور لوگوں سے چھپا کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو سوالات کیے جائیں گے کہ تم نے یہ عمل کیا تھا؟ یہ عمل کیا تھا؟ بندۂ مؤمن اس کا اقرار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اس کے گناہوں کو معاف کردو۔ یہ دیکھ کر کفار آپس میں کہیں گے کہ یہاں تو معاملہ بہت آسان ہے، جو بات کہی جاتی ہے اس کو مان لیا جاتا ہے۔ چناں چہ وہ اسی بنیاد پر انکار کریں گے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی زبان پر مہر لگادی جائے گی، پھر ان کے ہاتھ اور دوسرے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ ان گواہی دینے والوں میں زمین کے حصے بھی ہوں گے جہاں وہ عمل کئے تھے۔

(بخاری شریف، کتاب التفسیر: سورہ حم سجدہ)

زمین وآسمان روتے ہیں:

بلکہ حدیثِ پاک میں آتاہے کہ آدمی کاجب انتقال ہوتاہے توزمین کے جن حصوں پروہ نیک اعمال کرتا تھا اور اس کے نیک اعمال آسمان کے جن دروازوں سے اوپر پہنچائے جاتے تھے،زمین کا وہ حصہ اور آسمان کا وہ دروازہ اس کی موت پر روتے ہیں۔اسی کو قرآن نے کہا کہ ”ان کافروں کی ہلاکت پرزمین اور آسمان نہیں روئے“ (سورۂ دخان)اس کی تفسیر میں حضراتِ مفسرین نے لکھاہے کہ اہلِ ایمان جونیک اعمال کرنےوالے ہوتےہیں ان کی موت پرزمین روتی ہے،اورزمین کے وہ حصے جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کیاکرتا تھا؛ وہ بھی روتےہیں (شعب الایمان:۳۰۱۸)اس لئے کہ زمین کے جس حصہ پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے ،وہ خوش ہوتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے استعمال کیاگیا۔توجب بندۂ مؤمن مرجاتا ہے تو زمین کا وہ حصہ اور جگہ ویران ہوجاتی ہے ؛لہٰذا وہ روتی ہے۔مسلمان کی موت پر چاہے انسان روئے یا نہ روئے،لیکن وہ جگہ ضرور روتی ہے ،اور آسمان کے جن دروازوں سے اعمال جاتے تھے وہ بھی روتے ہیں۔

زیادہ گواہ تیار کرلو:

مطلب یہ ہے کہ یہ ساری جگہیں گواہی دیتی ہیں ،اور اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ ساری چیزیں نوٹ کی جاتی ہیں۔اسی لیے حدیث ِپاک میں آتاہے کہ اللہ کی تسبیح کو انگلیوں پر گنا کرو،کیوں کہ وہ قیامت کے دن گواہی دیں گی(ترمذی:باب ماجاء في عقد التسبیح بالید. ابوداود: باب التسبیح بالحصی)جہاں وہ گناہوں کو بتائے گی،وہیں وہ یہ بھی بتائے گی کہ ان پر تم نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا تھا۔کہنے کا حاصل یہ ہے کہ زمین کے وہ حصے جہاں پر آدمی عبادت کرتا تھاوہ بھی اس کے حق میں گواہی دیں گے۔اس لیے شریعت کی نگاہ میں یہ بات مطلوب ہے کہ آدمی زیادہ سے زیادہ زمین کے حصے اپنی گواہی کے لیے تیار کرے۔اسی لیے آپ نے دیکھا ہو گا کہ آدمی فرض نماز پڑھنے کے بعد تھوڑی سی جگہ بدل کر نفل اورسنت پڑھتاہے،اس میں جہاں اوربہت ساری حکمتیں ہیں ،وہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح گویادو جگہیں قیامت کے دن آپ کے حق میں گواہی دیں گی۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نےباب قائم کیاہے کہ :عید کی نماز کے لیے جاتےہوئےایک راستہ استعمال کرواورواپسی میں دوسرے راستہ سے لوٹو؛یہ مستحب ہے۔چوں کہ عید کی نمازایک عبادت ہے،اس کی ادائیگی کے لیے جب آدمی جائے گا تو کوئی نہ کوئی راستہ تو اختیار کرے گا۔

عمل چھوٹا سا؛ فضیلت بڑی:

اسی طرح بیمار کی خبر گیری اور عیادت کے لیے جانے آنے میں بھی مختلف راستہ اختیار کرنا پسندیدہ ہے۔ کسی بیمار کی بیمار پرسی بھی بہت بڑا نیکی کا کام ہے۔ آج کل اس کی طرف سے بھی بہت غفلت برتی جاتی ہے، اگر کچھ تعلق ہو تو کرلیتے ہیں ، ورنہ نہیں کرتے،حالاں کہ ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن پر حق ہے،اس لئے اہلِ محلہ اور اہلِ مسجد میں سے کسی کے متعلق جب دیکھیں کہ وہ نظر نہیں آرہا ہے، تو حق ہے کہ اس کی عیادت کے لیے جائیں؛اس پر بڑا ثواب ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی عیادت کے لیے صبح کے وقت گیا تو شام تک ستر ہزار (۷۰۰۰۰)فرشتے اس کے لیے دعا کرتے ہیں اور کوئی شام کو گیا تو صبح تک ستر ہزار(۷۰۰۰۰) فرشتے دعا کرتے ہیں۔حدیثِ پاک میں یہاں تک آتا ہے کہ کوئی آدمی جب کسی مریض کی عیادت کے لیے جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں دوڑتا ہوا جاتا ہے۔ایک چھوٹا سا عمل ہے؛ لیکن اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

یہ اہتمام صرف عید میں نہیں :

اس لیے بیمار کی عیادت، حج،اللہ کے راستہ میں جہاداور جنازہ کی شرکت کے لیےاور اس جیسے جتنے بھی نیکی کے کام ہیں ،ان کے لیے اگر آپ جارہے ہیں توکوئی نہ کوئی راستہ تواختیار کرنا

ہی پڑے گا،اس لیے وہاں سنت یہی ہے کہ اگرایک راستہ سے جائے تو دوسرے راستہ سے لوٹے۔یہ حکم صرف عید کی نماز کی سنت نہیں ہے،آج کل لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں ،اس لیے عید کی نماز کے لیےاس کااہتمام بھی کرتے ہیں ، حالاں کہ ایسا نہیں ہے،بلکہ عید کی نماز کے علاوہ تمام عبادات کے کاموں میں یہی حکم ہے۔جنازہ کی شرکت،بیمار کی عیادت وغیرہ؛ سارے نیکی کام کے لیے ایک راستہ سے جائیں اور دوسرے راستہ سے لوٹیں۔اس کی وجہ وہی ہے کہ آدمی جب چل کران راستوں سے گزرے گاتو قیامت میں زمین کے وہ حصے آپ کے حق میں گواہی دیں گے کہ:اے اللہ!یہ بندہ عید کی نماز پڑھنے کے لیے مجھ پر سے چل کر گیا تھا ،اور واپس لوٹتےوقت مجھ پر سے چل کرلوٹا تھا۔بیمار کی عیادت کے لیے مجھ پر چل کر گیا تھا اور وہاں سے واپسی میں مجھ پر سے چل کرلوٹا تھا۔یہ بھی آداب میں سے ہے۔اس لیے جب ان اعمال کو انجام دیں تو ساتھ ساتھ ان چیزوں کا بھی اہتمام کریں۔

آپ ﷺ کی ذات نمونہ ہے:

نیکی کے جتنے بھی اعمال بتائے گئے ہیں ان کوانجام دینے کے طریقے بھی نبیٔ کریم ﷺ نے بتائے ہیں ، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات کو نمونہ بنا کر بھیجا ہے،اس لیے ہر کام کواسی طریقہ کے مطابق انجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے جو حضور ﷺ نے بتائے ہیں؛تب ہی وہ عمل مقبول ہو گا۔جیسے: اگر آپ کسی جگہ پر کسی چیز کے بنانے کا آرڈر (Order) دیں اور آپ

نے اس کا ایک نمونہ بھی دے رکھا ہے، پھر اگر بنانے والا اس نمونہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر کرے گا تو آپ اس چیز کو (Reject) اور رَد کر دیں گے کہ یہ ہمارے آرڈر کے مطابق نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ نمونہ میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنا چاہیے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ با برکات کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے ہر عمل کے واسطہ نمونہ بنایا ہے، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ آپ کی ذات انسانوں کے لیے نمونہ ہے، جب نمونہ ہے تو پھر ہر چھوٹے بڑے عمل میں اسی کو دیکھا جائے گا، تبھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا۔ اس لیے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طرزِ عمل:

حدیث ۹ ۱ ۷:-

عن جابر رضی اللہ عنہ **قَالَ: كَانَ النبی** (صلی اللہ علیہ وسلم) **إِذَا كَانَ یومُ عیدٍ خَالَفَ الطَّرِیقَ.** (رواہ البخاری)

قَوْله: ((خَالَفَ الطَّرِیقَ)) یعنی: ذَهَبَ فی طریقٍ، وَرَجَعَ فی طریقٍ آخَرَ.

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب عید کا دن ہوتا تھا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) عید کی نماز کے لیے ایک راستہ سے تشریف لے جاتے تھے اور دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے۔

افادات:- اس کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ عبادت کی جگہ زیادہ سے زیادہ ہو

حدیث ۷۲۰:-

وعن ابن عُمَرَ رضی اللہ عنہما أَنَّ رسول الله (ﷺ) كَانَ يَخْرُجُ مِنْ طريق الشَّجَرَةِ ، وَ يَدْخُلُ مِنْ طَرِيقِ الْمُعَرَّسِ.وَإِذَا دَخَلَ مَكَّةَ،دَخَلَ مِنَ الثَّنِيَّةِ الْعُلْيَا،وَيَخْرُجُ مِنَ الثَّنِيَّةِ السُّفْلَى. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آپ (ﷺ) جب حج کے لیے یا جہاد کے لیے یا کسی اور کام کے لیے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے،تو شجرہ والے راستہ سے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے ،اور مُعَرَّس والے راستہ سے مدینہ منورہ میں واپس داخل ہوتے تھے(گویا داخل ہونے کے لیے الگ راستہ اور نکلنے کے لیے دوسرا راستہ اسی مقصد کے لیے اختیار کیا گیا،اور ان سفروں میں حج کے بھی اسفار ہوتے تھے، تو)جب آپ (ﷺ) حج یا عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے تومکہ کا جو بالائی حصہ یعنی جنۃ المُعلیٰ والا راستہ ہے ،اُدھر سے آپ مکہ مکرمہ میں داخل ہوتے تھے اور وہ جو ذیلی راستہ ہے،اُدھر سے واپس لوٹتے تھے(گویا اس طریقہ سے آپ نے یہ تعلیم دی کہ آدمی ایک راستہ سے جائے اور دوسرے راستے سے آئے۔لہٰذا ہم اپنے تمام عبادت کے کاموں میں اس کا اہتمام کریں۔)

استحباب تقدیم

الیمین فی کل ما ھو من

باب التکریم

ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

استحباب تقديم اليمين فى كل مَا هومن باب التكريم كالوضوءِ وَالغُسْلِ وَالتَّيَمُّمِ،وَلُبْسِ الثَّوْبِ وَالنَّعْلِ وَالخُفِّ وَالسَّرَاوِيلِ وَدُخولِ الْمَسْجِدِ وَالسِّوَاكِ،وَالاكْتِحَالِ وَتقليمِ الأظفار،وَقَصِّ الشَّارِبِ،وَنَتْفِ الإبْطِ وَحلقِ الرَّأسِ،وَالسّلامِ مِنَ الصَّلاَةِ،وَالأكْلِ والشُّربِ وَالمُصافحَةِ وَاسْتِلاَمِ الحَجَرِ الأَسْوَدِ والخروجِ منَ الخلاءِ والأخذ والعطاء وغيرِ ذٰلِكَ مِمَّا هُوَ فى معناه.

ويُسْتَحَبُّ تَقديمُ اليسارِ فى ضدِ ذٰلِكَ ، كالامْتِخَاطِ وَالبُصَاقِ عن اليسار، ودخولِ الخَلاءِ والخروج من المَسْجِدِ،وخَلْعِ الخُفِّ والنَّعْلِ والسراويلِ والثوبِ،والاسْتِنْجَاءِ وفِعلِ المُسْتَقْذرَاتِ وأشْبَاه ذٰلِكَ

عنوان کی وضاحت:

ایک اور ادب بتلارہے ہیں کہ جو اچھے اور عزت کے کام سمجھے جاتے ہیں ان کو انجام دینے میں داہنی طرف سے شروعات ہونی چاہیے۔ایک آدمی وضو کرنا چاہتا ہے تو پہلے داہنا ہاتھ دھوئے، پھربایاں ہاتھ دھوئے۔اسی طرح جہاں جہاں دایاں اوربایاں ممکن ہو؛وہاں ایسا کرے۔ اورجہاں دایاں بایاں ممکن نہ ہو،تو وہاں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔یہی حال غسل کا ہے کہ

جب غسل کے لیے بیٹھے تو بدن کے دائیں حصہ پر پہلے پانی ڈالے، پھر بائیں حصہ پر ڈالے۔ اسی طرح تیمم میں جب ہاتھوں پر ہاتھ پھیرے تو پہلے سیدھے ہاتھ پر ،پھر اُلٹے ہاتھ پر پھیرے۔اسی طرح جب کپڑے پہنے توازار میں پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیرڈالے،پہلے سیدھی آستین پھر اُلٹی آستین پہنے۔جوتے پہننے میں بھی پہلے سیدھا پیر پھر اُلٹا پیر۔موزہ میں بھی پہلے دائیں پھر بائیں میں پہنے۔مسجد میں داخل ہوتے وقت پہلے دعاودرود پڑھ لے اورپہلے سیدھا پیر، پھر اُلٹا پیر داخل کرے۔جب مسواک کرے تو پہلے داہنی جانب پھر بائیں جانب۔سرمہ لگانے میں پہلے داہنی جانب ،پھر بائیں جانب۔ناخن کاٹنے میں پہلے دایاں ہاتھ ،پھر بایاں ہاتھ ، پہلے دایاں پیر، پھر بایاں پیر۔اسی طرح جب مونچھیں کاٹے تودائیں طرف سے شروع کرے اور بائیں جانب ختم کرے۔بغل کے بالوں کو اکھاڑنے میں بھی اس کاخیال رکھے۔بغل کے بالوں کواکھاڑنا مسنون ہے،اگر کسی آدمی کے لئے بال کا اکھاڑنا ممکن نہیں ہے کہ اکھاڑنے میں تکلیف ہوتی ہے؛توکوئی حرج نہیں ہے۔ویسے اگر عادت ڈال لی جائے تو پھر آسان ہوجاتا ہے،اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔اُکھاڑنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بغل میں بدبو نہیں رہتی۔

نماز کا سلام جب پھیرا جائے گا تو پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف۔ کھانے میں بھی اپنے سامنے جو چیز ہے اس میں سے دائیں طرف سے، دائیں ہاتھ سے کھائے۔پینے میں بھی دائیں ہاتھ سے پیے۔مصافحہ کرنے میں ہاتھ ملاتے ہیں ، تو اس میں بھی دایاں ہاتھ ملائے۔حجرِ اسود کو بوسہ دے تودائیں طرف سے بوسہ دیں گے،بیت الخلاء سے باہر نکلنے میں پہلے دایاں پیر،

پھر بایاں پیر۔کوئی چیز آپ لے رہے ہیں ،یا دے رہے ہیں ، تو لینے میں دایاں ہاتھ سے لیں ، اور دینے میں بھی دایاں ہاتھ استعمال کریں۔بہت سے لوگ ان چیزوں کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس کی وجہ سے معاملہ اُلٹ جاتا ہے۔اصل ضرورت اس کی ہے کہ کچھ دنوں تک دھیان اور توجہ سے ان کاموں کو کیا جائے تو ان شاء اللہ خود بخود عادت پڑجائے گی، بچوں کو بھی اسی کی عادت ڈالی جائے، کچھ دنوں تک اگر اس کی عادت ڈالیں گے تو خود بخود وہ اسی طرح کرنا شروع کردیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایسا کام جس میں عزت کا پہلو نکلتا ہو ،اس میں دائیں طرف سے شروعات کیا کریں۔اور اگر معاملہ اُلٹا ہے کہ اس میں عزت کا پہلو نہیں ہے تو اس صورت میں پہلے بائیں طرف سے کیا جائے گا۔ چناں چہ آپ ناک صاف کرنا چاہتے ہیں ،تھوکنا چاہتے ہیں ،تودائیں طرف نہیں تھوکیں گے، بلکہ بائیں طرف تھوکیں گے، اور بیت الخلاء میں داخل ہوں گے تو پہلے بایاں پیر اندر رکھیں گے ،پھر دایاں پیر۔مسجد میں داخل ہونا توعزت کی چیز ہے ،لیکن مسجد سے نکلنا اس کے برعکس ہے، اس لیے پہلے بایاں پیر نکالیں گے،پھر دایاں پیر۔استنجاء بائیں ہاتھ سے کریں گے۔اسی طرح جتنے بھی کام ہیں ان کے اندر اسی بات کا خیال رکھا جائے۔توجتنے بھی اچھے کام ہیں ان میں ادب یہ ہے کہ آدمی دائیں طرف سے شروع کرے،اور جو اس کے برعکس ہے اس میں بائیں طرف سے شروع کرنا چاہیے۔یہ ایک عنوان قائم کیا ہے ،اوراس کے تحت اسی کے متعلق آیتیں اورروایتیں پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک آیت پیش کی ہے:﴿ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَؤُوا كِتَابِيَهْ (الحاقة: ۱۹)﴾ جو اللہ کے نیک بندے ہوں گے ان کو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کا نامۂ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا۔ گویا داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا؛ یہ ان کی نجات کی علامت قرار دیا۔اور وہ اتنے خوش ہوں گے کہ مارے خوشی کے لوگوں کو بتاتے پھریں گے، جیسے: کسی آدمی کا رِزَلٹ آیا ،اور وہ اعلیٰ نمبر سے کامیاب ہوا؛تو وہ اس کو بند کرکے جیب میں نہیں رکھ دیتا،بلکہ دوستوں کو بتاتا پھرتا ہے کہ دیکھو! یہ میرا رزَلٹ آیا ہے۔ویسے ہی اس آیت میں ہے کہ جس کو اس کا نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا وہ لوگوں سے کہے گا کہ:لو! میرا نامۂ اعمال پڑھو۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کی پسند:

حدیث ۷۲۱:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: كَانَ رسولُ الله (ﷺ) يُعْجِبُهُ التَّيَمُّنُ فى شَأْنِهِ كُلِّهِ : فى طُهُورِهِ ، وَتَرَجُّلِهِ ، وَتَنَعُّلِهِ** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:—حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کو ہر اچھے کام (جو عزت و اکرام اور نعمت کے سمجھے جاتے ہیں ،ان)میں دائیں طرف سے ابتداء کرنا پسند تھا۔ چناں چہ آپ جب وضو فرماتے تھے تو دائیں طرف سے شروع کرتے تھے (دایاں ہاتھ،پھر بایاں ہاتھ۔دایاں پیر،پھر بایاں پیر۔

اسی طرح غسل کرنے میں جیسا کہ بتلایا گیا) اور سر پر کنگھا کرنے میں پہلے دائیں طرف، پھر بائیں طرف(ڈاڑھی میں کنگھی کرتے تو پہلے دائیں طرف،پھر بائیں طرف کرتے۔یہی سنت اور مستحب طریقہ ہے)اور جوتے پہننے میں بھی پہلے دائیں پیر میں ،پھر بائیں پیر میں پہنتے تھے۔

افادات:-چند دنوں تک اس کا اہتمام کرنا پڑتا ہے ،یہاں تک کہ جب آدمی کی طبیعت اس کی عادی بن جاتی ہے تو اس کے بعد خود بخود عمل کرنا آسان ہوجاتا ہے، شروع میں ذرا توجہ رکھنی پڑتی ہے۔اوراگرتوجہ اور اہتمام نہیں رکھتےتو شیطان اُلٹا ہی کروا تا ہے، اسی لیے لوگ جب مسجد سے نکل رہے ہوں تو کھڑے ہو کر دیکھیے،جو توجہ کرکے جوتےپہننےوالے ہوں گے، وہی دایاں جوتاپہلے پہنیں گے،ورنہ شیطان اُلٹا ہی ڈالوائے گا۔اسی طرح مسجد میں آنے والے جب جوتے نکالتے ہیں ؛وہاں بھی شیطان اُلٹا ہی کرواتاہے۔اس لئے چند دنوں تک کچھ توجہ کرنی پڑے گی۔

حضورِاکرم (ﷺ) کا عمل:

حدیث ۷۲۲:-

وعنهاقالت : كَانَتْ يَدُ رسول الله (ﷺ) الْيُمْنَى لِطُهُورِهِ وَطَعَامِهِ، وَكَانَتِ الْيُسْرَى لِخَلَائِهِ وَمَا كَانَ مِنْ أَذًى.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دایاں ہاتھ غسل وغیرہ اور کھانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اور استنجاء، یا کوئی گندی چیز ہوتی (مثلاً: ناک صاف کرنی ہوتی، تو) بایاں ہاتھ استعمال ہوتا تھا۔

یہی تو کمالِ نبی ہے:

افادات:- یہ سب زندگی کے آداب ہیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سکھائے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایسا تھا جیسے ایک شفیق اور مہربان باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ باپ اپنے بچوں کو ہر چیز سکھاتا ہے، اگر وہ نہیں سکھائے گا تو بچوں کو یہ سب آداب معلوم بھی نہیں ہو سکیں گے۔

اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہی انداز اور طریقۂ تربیت غیروں کے لیے باعثِ اعتراض بنا۔ ابن ماجہ شریف میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک مرتبہ ان سے بطور استہزاء ومذاق کہا: "إِنِّي أَرىٰ صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِرَاءَةَ" میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی (یعنی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)) تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قضائے حاجت کے موقعہ پر کیا کرنا چاہیے وہ بھی ہمیں بتایا کہ ہم قبلہ کی طرف رخ کر کے نہ بیٹھیں، دائیں ہاتھ سے استنجاء نہ کریں، تین سے کم پتھر پر اکتفاء نہ کریں، لید اور

ہڈی وغیرہ سے استنجاء نہ کریں (ابن ماجہ:۳۱۶) گویا آپ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے ہر ہر چیز بتائی اوراس کی تعلیم بھی دی کہ بیٹھنے میں کیسی ہیئت اختیار کریں ،کون سے ہاتھ سے استنجاء کریں ،کون سے ہاتھ سے نہ کریں ؛یہی تو آپ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کا کمال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لیے آپ کو بھیجا تھا اس میں چھوٹی سے چھوٹی بات بھی آپ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے نہیں چھوڑی جس کی طرف متوجہ نہ کیا ہو۔یہ سب وہی تعلیمات ہیں۔اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے عملی طور پر بتلایاکہ کون سے کام دائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں ،او رکون سے کام بائیں ہاتھ سے کیے جاتے ہیں۔اگر ہمارا بچہ بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے،یا گلاس پکڑ تا ہے ،تو ہم اس کو ٹوکتے نہیں ،حالاں کہ اس کو محبت سے ٹوکا اور بتایا جاناچاہیے کہ :بیٹا!ایسا نہیں کیا کرتے۔اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے ہر ہر چیز بتلائی ہے، لیکن آج کل ہم لوگوں کا مزاج ایسابنتا جارہاہے کہ ایسی کوئی چیز ہوتو کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری شان کے خلاف ہے۔

آج کل کی بدتہذیبی کی بڑی وجہ:

آج کل عام طور پر بد تہذیبی اور بے ادبی عام ہوتی جارہی ہے ،اس کی وجہ یہی ہے کہ ماں باپ اور بڑوں کی طرف سے تربیت اورادب سکھانے کے معاملہ میں کوتاہی برتی جاتی ہے،وہ یوں سمجھتے ہیں کہ اس کو یہ بات کیاکہی جائے؟نہیں بھائی!ان کو ہرہر چیز بتلانی چاہیے،اگر باپ اپنے بیٹے کو نہیں سکھائے گا تو آخراس کو کب آئے گا؟ پھر اگر بیٹااسی طرح رہے گاتو بعد میں لوگ

باپ ہی پر الزام دیں گے کہ باپ نے اس کو کھانے پینے کا طریقہ بھی نہیں سکھایا۔اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی طرف توجہ کی جائے۔ آگے روایت آئے گی وہاں معلوم ہو گا کہ نبی کریم ﷺ چھوٹوں اور بڑوں ہر ایک پر برابر نگرانی رکھتے تھے،اگر کسی سے کوئی چیز ادب کے خلاف ہو جاتی،تو فوراً آپ اس پر تنبیہ فرماتے تھے،ٹوکتے تھے اور نصیحت فرماتے تھے۔

تربیت کا موثر ترین طریقہ:

آج ہمارا معاملہ یہ ہو گیا ہے کہ پہلے تو ٹوکتے نہیں ہیں ،نہ اس کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں ،پھر اگر لوگوں کی طرف سے کچھ کہا جاتا ہے تو غصہ میں آکر اس کی پٹائی شروع کر دیتے ہیں۔تربیت کا یہ طریقہ نہیں ہے۔چھوٹوں کو محبت سے بتلایا جاتا ہے، بلکہ چھوٹا ہو یا بڑا؛کوئی بات آپ جتنی محبت سے ان کو بتائیں گے، اس پر اتنی ہی زیادہ اثر انداز ہو گی۔

ایک صحابی کی روایت پہلے گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نماز کے اندر کسی کو چھینک آئی،اس پر وہ نماز کی حالت میں ''یرحمک اللہ ''کہنے لگے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سبحان اللہ سبحان اللہ کہنے لگے۔یہ سوچ رہے ہیں کہ مجھ سے ایسا کیا کام ہو گیا کہ سب ایسا کہہ رہے ہیں۔ مَیں نے بولنا شروع کیا کہ مَیں نے ایسا کیا کہا ،تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ ان کو معلوم نہیں تھا کہ نماز میں بول نہیں سکتے۔پھر صحابہ نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارنا شروع کیا۔ خیر!یہ کہتے ہیں کہ مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن مَیں رک گیا۔پھر نماز کے بعد حضور ﷺ نے مجھے بلایا۔وہ صحابی فرماتے

ہیں: "وَاللهِ مَا ضَرَبَنِيْ وَلَا قَهَرَنِيْ وَلَا شَتَمَنِيْ" آپ (ﷺ) نے مجھے نہ مارا، نہ ڈانٹا، نہ مجھ پر غصہ کیا؛ بلکہ بڑی محبت سے فرمایا کہ: یہ نماز ہے اور نماز میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، اس میں دنیا کی باتیں اور دوسری چیزیں نہیں ہوتیں۔ اب غور کیجئے کہ وہ تو بڑا آدمی تھا، تو پھر چھوٹوں کو تو اور زیادہ محبت سے بتانے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم یا تو کہتے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آتے ہیں تو ڈنڈا لے کر آگے بڑھتے ہیں، ہمارا حال ایسا ہے:-

اگر غفلت سے باز آیا؛ جفا کی
تلافی کی بھی ظالم نے؛ تو کیا کی

پہلے تو کہیں گے ہی نہیں، اور جب کہنے پر آئیں گے؛ تو پٹائی کریں گے۔ **گویا ہمیں پٹائی کے علاوہ تعلیم و تربیت کا اور کوئی طریقہ آتا ہی نہیں ہے، حالاں کہ یہ بالکل غلط طریقہ ہے۔** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے اپنی پوری زندگی میں کسی عورت کو، کسی غلام کو، بلکہ کسی جانور تک کو نہیں مارا۔

شان کے خلاف نہیں:

تو بات چلی تھی کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک یہودی نے اعتراض کے طور پر ایک بات کہی تھی کہ میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے ساتھی تم کو ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ پیشاب پاخانہ کا طریقہ بھی بتاتے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ آپ سید الانبیاء اور سید الاولین والآخرین

ہیں، اگلوں پچھلوں کے سردار ہیں ، لیکن کبھی آپ نے یہ نہیں سوچا کہ کیا میں ان کو پیشاب پاخانے کا طریقہ بتاؤں؟ یہ میری شان کے مطابق ہے؟ آپ (ﷺ) تو ہر چیز سکھانے کے لیے آئے تھے، اور آپ (ﷺ) نے وہ پورا پورا امت کو سکھادیا۔ آج کل ہمارا مزاج ایسا بنتا جارہا ہے کہ فلاں کام تو میری شان کے خلاف ہے، بلکہ اگر کوئی اس کی طرف دھیان دیتا ہو، تو دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ: ارے مولانا! آپ اس میں کیوں دخل دیتے ہیں؟ آپ کی شان تو بڑی اونچی ہے۔ خود تو کرتے نہیں، اور کوئی بے چارہ کررہا ہے، تو اس کو روکنے کی کوششیں کرتے ہیں۔

آپ بیتی:

ہمارے یہاں مدرسہ میں کسی زمانہ میں طلباء کی نگرانی میرے ذمہ تھی، جب نماز کے اور دوسرے اوقات میں مَیں دارالاقامہ (Boarding) میں جاتا تھا تو بعض لوگ کہتے تھے کہ: آپ حدیث کی بڑی بڑی کتابیں پڑھاتے ہیں؛ اور آپ وہاں جاتے ہیں؟ مَیں کہا کرتا تھا کہ: ہم نہیں جائیں گے تو کون جائے گا؟ اور ان بچوں کو کون سکھائے گا؟ ان کی نگرانی کون کرے گا؟

آج کل بچے جو بگڑتے جارہے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کی روک ٹوک نہیں ہے ، ان کی نگرانی اور نگہداشت نہیں ہے۔ ان کو تو ہر ہر چیز پر نگرانی کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ آپ کسی بچے کو ٹوکیں گے، اور جب وہ دیکھے گا کہ میری غلط حرکت پر ٹوکا جارہا ہے، تو پھر دوسری

مرتبہ وہ چونکے گا، اور ایسا نہیں کرے گا۔ لیکن اگر اس نے دیکھ لیا کہ کوئی ٹوکنے والا نہیں ہے، تو دھیرے دھیرے معاملہ آگے بڑھتا جائے گا۔

تربیت کا اصل طریقہ:

آپ احادیث کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ کسی بھی بڑے یا چھوٹے کی طرف سے کوئی ایسی بات پیش آتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس پر فوراً تنبیہ فرماتے۔ وہاں کوئی مارپٹائی نہیں ہوتی تھی، بلکہ بس ٹوک دیا کرتے تھے کہ: یہ جو ہوا وہ مناسب نہیں ہوا، یوں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن آج کل ہمارا مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی کو کچھ کہو مت۔ اگر کہتے ہیں تو اُسے برا معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ کچھ کہنے کا ماحول ہی نہیں رہا۔ لیکن یاد رکھئے! پھر بھی اگر آپ کسی کو محبت سے کہیں گے تو وہ ضرور سنے گا، ڈانٹ ڈپٹ اور پٹائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مزاج اور تربیت کا طریقہ یہی تھا۔

عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ہماری کوتاہیاں:

حدیث ۷۲۳:-

وعن أم عطية رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ لهن في غَسْلِ ابْنَتِهِ زَيْنَبَ رضی اللہ عنہا: إِبْدَأْنَ بِمَيَامِنِهَا، وَمَوَاضِعِ الْوُضُوءِ مِنْهَا.

ترجمہ:- حضرت اُم عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا جب انتقال ہوا(توان کو غسل تو عورتیں دے رہی تھیں، لیکن نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پردہ کے پیچھے سے ان کو غسل دینے کا طریقہ بتلا رہے تھے کہ اس طرح غسل دو) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد فرمارہے تھے کہ: ان کے دائیں طرف سے غسل دیناشروع کرو،اوروضو بھی دائیں طرف سے کراؤ۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ پردہ کے اہتمام کے ساتھ عورتوں کو بھی تعلیم دی جاسکتی ہے،لیکن ہماری تو پوری زندگی گزر جاتی ہے ، کبھی ہم نے معلوم ہی نہیں کیا کہ گھر کی عورتیں کس طرح کپڑے دھوتی ہیں ؟کس طرح بچوں کو استنجاء کرواتی ہیں ؟ بعض عورتوں کوتو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی کپڑا اگر ناپاک ہوجائے تواس کواس طرح دھویا جائے کہ دھونے والا اپنی طاقت کے مطابق اس کواتنا نچوڑے کہ اس میں قطرہ بھی باقی نہ رہے، دوسری اورتیسری مرتبہ بھی اسی طرح نچوڑے،جس کی وجہ سے بہت سی جگہوں پرتوکپڑے پاک ہونے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

چھوٹے بچے ان کے ساتھ ہوتے ہیں ،ان کا پیشاب پاخانہ کپڑوں پر گرجاتاہے تواس کو کس طرح صاف و پاک کیا جائے؛اس کا طریقہ ان کو معلوم نہیں ہوتا، ان ساری چیزوں کی اپنے گھروں میں نگرانی کی ضرورت ہے۔ایک دو مرتبہ بتلائیں گےتو وہ آسانی سے عمل کرنےلگ جائیں گی۔ہم تو اِدھر دھیان ہی نہیں دیتے۔بچہ اگر کہیں فرش پرپیشاب پاخانہ کردے،تو اس فرش کوکس طرح پاک کرتی ہیں ؟یا کپڑوں پر پیشاب پاخانہ کردے توکپڑوں کوکس طرح

پاک کرتی ہیں ؟چارپائی پر یالحاف پر پیشاب پاخانہ کردے،تواس لحاف کوکس طرح پاک کرتی ہیں ؟یہ سب کبھی ہم نے ان سے پوچھا؟ اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہے۔حالاں کہ یہ ساری چیزیں دھیان دینے کی ہیں ،اگریہ سب ہوگاتب ہی شریعت کی دوسری تعلیمات پر عمل ہوگا۔ جب پاکی و ناپاکی کا ہی اہتمام نہیں ہوگا؛ توپھر نمازیں کیسے درست ہوں گی اور دوسری باتیں کیسے ٹھیک ہوں گی؟

یہاں دیکھئے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے انتقال پرجو عورتیں ان کوغسل دے رہی تھیں ،نبیٔ کریم (ﷺ) خودان کوپردہ کی آڑ میں سے بیٹھ کر غسل کا طریقہ بتلارہے ہیں کہ وضو اور غسل میں دائیں طرف سے ابتداء کرو۔

مردہ کوجب غسل دیتےہیں توپہلے اس کووضوکرایاجاتاہے،پھربائیں کروٹ پرلٹاکر دائیں کروٹ پرپانی ڈالتے ہیں ،پھردائیں کروٹ پرلٹاکربائیں کروٹ پر پانی ڈالتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ آپ (ﷺ) نے باقاعدہ طریقہ بتلایا اور اس میں بھی آپ نے دائیں طرف سے شروع کرنے کی تلقین فرمائی۔

ان چیزوں کی طرف بھی توجہ ہو:

حدیث ۷۲۴:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا انْتَعَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِالْيُمْنَى، وَإِذَا نَزَعَ فَلْيَبْدَأْ بِالشِّمَالِ. لِتَكُنِ الْيُمْنَى أَوَّلَهُمَا تُنْعَلُ، وَآخِرَهُمَا تُنْزَعُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی جوتا پہنے، تو دائیں پاؤں سے شروع کرے، اور جب نکالے تو بائیں پاؤں سے شروع کرے؛ تاکہ دائیں پاؤں میں پہلے جوتا جائے اور آخر میں نکالا جائے۔

افادات:- آستین کو چڑھانے اور اُتارنے میں بھی یہی طریقہ ہے۔ جوتا پہننے کے لئے بھی نبیٔ کریم (ﷺ) نے اہتمام سے ہدایت دی۔ کیا ہم نے بھی اپنے بچوں کو کبھی اس کی طرف متوجہ کیا؟ کیا ہم نے زندگی میں کبھی بھی اپنے بچوں کو بٹھا کر ان کو جوتا پہننے کا طریقہ بتایا؟ ہمیں نبیٔ کریم (ﷺ) کی ان تعلیمات کو سیکھنے کی ضرورت ہے کہ جب آپ (ﷺ) نے اتنے اہتمام سے آدابِ زندگی ہمیں بتائے ہیں، تو ہم ان کی طرف سے اتنی غفلت کیوں برتیں؟ ہم ان کو سیکھنے اور سکھانے کا اہتمام نہیں کرتے، حالاں کہ یہ تو ہماری ذمہ داری ہے۔ اس لئے اِدھر توجہ ہونی چاہیے۔

۲۵۷ حدیث:-

وعن حفصة رضی اللہ عنہا أَنَّ رسول الله (ﷺ) كَانَ يجعل يَمِينَهُ لِطَعَامِهِ وَشَرَابِهِ وَثِيَابِهِ، وَيَجْعَلُ يَسَارَهُ لِمَا سِوَى ذَلِكَ

ترجمہ:- اُمّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) اپنے دائیں ہاتھ کو کھانے، پینے اور کپڑوں کے لیے استعمال فرماتے تھے (مطلب یہ ہے کہ اچھے کاموں کے لئے استعمال کرتے

تھے اوران کی شروعات دائیں ہاتھ سے کرتے تھے)اور بائیں ہاتھ کو اس کے برعکس کام یعنی گندی چیزوں میں (مثلاً: قضائے حاجت وغیرہ کے لئے) استعمال فرماتے تھے۔

حدیث ۷۲۶:-

وعن أبي هُريرة رضی اللہ عنہ أنّ رسول الله (صلى الله عليه وسلم) قَالَ: إِذَا لَبِسْتُمْ، وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ، فَابْدَأُوا بِأَيَامِنِكُمْ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلى الله عليه وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب تم لباس (کرتہ، پائجامہ وغیرہ) پہنو، یا وضو کرو؛ تواپنی دائیں جانب سے شروع کرو۔

افادات:- اب ہم لوگ وضو میں تواس کا اہتمام کرتے ہیں لیکن کپڑے پہننے میں بہت سے لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے، حالاں کہ نبی کریم (صلى الله عليه وسلم) اُمت کو بڑے اہتمام سے اس کی تاکید فرما رہے ہیں۔

حدیث ۷۲۷:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ الله (صلى الله عليه وسلم) أتَى مِنىً، فَأَتَى الْجَمْرَةَ فَرَمَاهَا ثُمَّ أَتَى مَنْزِلَهُ بِمِنىً ونحر، ثُمَّ قَالَ لِلحَلاَّقِ: ((خُذْ)) وأشَارَ إِلَى جَانِبِهِ الأَيْمَنِ، ثُمَّ الأَيْسَرِ، ثُمَّ جَعَلَ يُعْطِيهِ النَّاسَ (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفي رواية: لما رَمَى الجَمْرَةَ، وَنَحَرَ نُسُكَهُ وَحَلَقَ، نَاوَلَ الحَلاَّقَ شِقَّهُ الأَيْمَنَ فَحَلَقَهُ ثُمَّ دَعَا أَبَا طَلْحَةَ الأَنْصَارِيَّ رضی اللہ عنہ فَأَعْطَاهُ إِيَّاهُ، ثُمَّ نَاوَلَهُ الشِّقَّ الأَيْسَرَ. فَقَالَ: (احلِقْ) فَحَلَقَهُ فَأعْطَاهُ أَبَا طَلْحَةَ، فَقَالَ: (اقْسِمْهُ بَيْنَ النَّاسِ)

ترجمہ:۔حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) حج کے موقع پر منیٰ میں تشریف لائے تو جمرہ کے پاس تشریف لے گئے ، اس کی رمی فرمائی، پھر منیٰ میں جہاں آپ کی قیامگاہ تھی وہاں تشریف لے گئے اور جانور ذبح کیا(قربانی کی) پھر بال کاٹنے والے سے فرمایا: میرے بال کاٹو، اس وقت آپ نے اپنے سر کے دائیں حصہ کی طرف اشارہ کیا، پھر بائیں طرف اشارہ کیا؛پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) وہ بال لوگوں کو عطا فرمانے لگے۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت أبو طلحہ أنصاری رضی اللہ عنہ کو بلا کر بال ان کے حوالے کئے اور فرمایا: یہ لوگوں میں تقسیم کردو۔ چناں چہ انہوں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بال مبارک لوگوں کے اندر تقسیم کئے۔

افادات:۔اس سے ہمیں ایک بات یہ سیکھنے ملی کہ جب ہم کسی نائی کے پاس بال بنوانے جائیں ،تو پہلے دائیں طرف ،پھر بائیں طرف سے بال کٹوانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

کتاب آداب الطعام

کھانے کے آداب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب التسمية في أوله والحمد في آخره

کھانے سے پہلے بسم اللہ اور کھانے کے بعد الحمدللہ پڑھنا

آدابِ زندگی:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے کھانے کے آداب بتلارہے ہیں۔

جیساکہ بتایاتھاکہ زندگی گزارنے کاجوعمدہ سے عمدہ طریقہ ہوسکتا ہےوہ پورا نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نےہمیں سکھایاہے۔کھاناکھاناہوتوکس طرح کھایا جائے،کوئی چیز پینی ہو توکس طرح پی جائے، لیٹناہوتوکیسے لیٹیں ، قضائے حاجت کیسے کریں،"معاشرت" یعنی لوگوں کے ساتھ مل جل کرجوزندگی گزارتے ہیں توکس کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے، باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ، بھائی کے ساتھ ،بہن کے ساتھ ،بیوی کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ کس طرح کا معاملہ کرناچاہیے، اس کی ساری تفصیلات بتائی ہیں ؛ یہی "معاشرت" کہلاتی ہے،اوریہ سب" آدابِ معاشرت "کہلاتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : آج کل لوگوں نے دین کو صرف عبادت کے اندرمحدود کر رکھا ہے کہ نماز روزہ وغیرہ جو عبادتیں ہیں ان کا اہتمام کیا جاتا

ہے،اور ”معاشرت“یعنی زندگی گزارنے کا جوطریقہ ہےاس کے متعلق تویوں سمجھتے ہیں کہ شریعت نے کوئی ہدایت دی ہی نہیں ہے،اس معاملہ میں ہم آزادہیں جس طرح چاہیں کریں ؛حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے۔شریعت میں تو ہرہر چیز کے متعلق مکمل تفصیلات بتلائی گئی ہیں۔

کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنے کافائدہ:

حدیث ۷۲۸:-

وعن عُمَرَ بنِ أبي سَلمة رضی اللہ عنھما قَالَ: قَالَ لی رسول الله (ﷺ) : ((سَمِّ اللهَ، وَكُلْ بِيَمِينكَ، وكُلْ مِمَّا يَلِيكَ)) متفقٌ عَلَيْهِ

ترجمہ مع تشریح:-حضرت عمربن أبو سلمہ رضی اللہ عنھما (جو اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادہ ہیں ،ان کے پہلے شوہرحضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ سے پیدا ہوئے تھے،حضرت اُبوسلمہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کانکاح نبیٔ کریم (ﷺ) کے ساتھ ہواتویہ اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ لے کرحضور (ﷺ) کے یہاں آئی تھیں ،اس لیے حضرت عمر بن اُبوسلمہ رضی اللہ عنھما نبیٔ کریم (ﷺ) کی تربیت ونگرانی میں تھے ایک مرتبہ وہ کھانے کے لیے بیٹھے تھے،خود)فرماتے ہیں (کہ میرا ہاتھ اِدھر اُدھر گھومنے لگا،جیسے:بچوں کی عادت ہوتی ہے کہ اِدھر ہاتھ مارا، اُدھر ہاتھ مارا۔تو) حضورِ اکرم (ﷺ) نے مجھے(تین چیزیں)بتلائیں ۱: کھانے سےپہلے بسم اللہ پڑھو۲:اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ ۳:اپنے سامنے سے کھاؤ (اِدھر اُدھرسے مت کھاؤ۔)

افادات:-باب کا عنوان بھی یہی قائم کیا ہے کہ کھانے کے معاملہ میں پہلا ادب یہ ہے کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھے اور اللہ کا نام لے۔ آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ روزی اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی مَیں استعمال کررہا ہوں ، کھارہا ہوں ، پی رہا ہوں ،پہن رہاہوں ؛ یہ سب چیزیں کس کی دی ہوئی ہیں؟ جتنی بھی چیزیں ہیں ان سب میں پہلے یہ دیکھنا ہے کہ یہ ساری نعمتیں کہاں سے آئی ہیں ؟ اللہ تعالیٰ ہی نے عطا فرمائی ہیں اور اسی کی دی ہوئی ہیں، تو جس نے مجھے دی ہے اسی کے نام سے میں اس کو استعمال کرنا شروع کروں۔ کھانا جس نے دیاہے تو کھانا شروع کرنے سے پہلے مجھے اسی کا نام لیناچاہیے، تبھی تو اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہو گا اور اس کا استحضار رہے گا، پھر اس کے احکامات پر عمل کی توفیق ہوگی، اور پھر اس کی ذات کے ساتھ رشتہ قوی ہو گا۔

مثلاً: ایک آدمی کو کھانا کھلایا جائے اور بتلایا جائے کہ فلاں صاحب کی طرف سے دعوت ہے، تو اس کے دل میں داعی کے متعلق شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، پھر شکر کا یہی جذبہ داعی کے ساتھ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ پھر اگر بار بار یہی سلسلہ ہوتا رہے تو یہی چیز آگے جا کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی طرف آمادہ کرے گا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت آدمی اگر یہ سوچے کہ میں جو کھانا کھانے جارہا ہوں ، یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے؛ تو اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ رشتہ مضبوط ہو گا۔

کیا ہم نے کبھی سوچا؟:

اور کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام چلایا ہے؟ ہم روٹی توڑ کر کھاتے ہیں لیکن کیا کبھی سوچا کہ یہ روٹی کس طرح بنی؟ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے فضائلِ صدقات میں لکھا ہے کہ ایک بزرگ کے یہاں ایک شخص مہمان ہوئے، روٹیاں رکھی گئیں، تو جیسے بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اُلٹ پُلَٹ کر دیکھتے ہیں کہ کون سی پکی ہے، اور کون سی جلی ہوئی ہے، تاکہ ان میں جو اچھی ہو اسی کو نکال کر کھائیں۔ انہوں نے بھی اُلٹ پُلَٹ کرنا شروع کی تو ان بزرگ نے کہا: کیا دیکھتے ہو؟ ایک روٹی جو تیار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے، اس پر تین سو ساٹھ (۳۶۰) محنتیں لگ چکی ہیں۔

ظاہر ہے کہ آدمی ذرا سوچے تو سہی کہ دانہ زمین کے اندر بویا جاتا ہے، تو زمین میں بونے سے پہلے زمین کو ہَل کے ذریعہ نرم کیا جاتا ہے، پھر اس کے اندر کھاد ڈالی جاتی ہے، پانی ڈالا جاتا ہے۔ پھر جو پانی بارش کے ذریعہ سے آتا ہے، اس کے متعلق سوچے کہ بارش کیسے تیار ہوئی؟ سورج کی گرمی سمندروں کے اوپر پڑی، وہاں سے بھاپ اٹھی، بادل بنے، اور معلوم نہیں کیسے کیسے فرشتے ان بادلوں کو کہاں کہاں سے چلا کر کہاں لے گئے، اور کہاں انہوں نے پانی برسایا، پھر یہ پانی زمین کے اندر گیا، پھر زمین میں بیج ڈالا گیا، اس کی پوری نگرانی کی گئی، پھر زمین سے کونپل نکلی۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ اس کی کونپل کتنی نازک ہوتی ہے کہ ایک

چھوٹا سا بچہ بھی انگلی مار کر اس کو مسل کر رکھ دے، لیکن اللہ تعالیٰ نے سخت زمین کو پھاڑ کر اسے باہر نکالا، پھر وہ بڑھا اور اس کے اندر سے دانہ نکلا، اور اس دانہ کے اوپر سورج کی گرمی لگی، اس نے اس کو پکایا، اور نہ معلوم کیا کیا محنتیں ہوئیں، نگرانی اور چوکیداری کرنے والوں نے چوکیداری اور نگرانی کی، پھر اس کی کٹائی ہوئی، کھلیان لے جایا گیا، وہاں جانوروں کے ذریعہ سے دانے اور بھوسے کو الگ کیا گیا، پھر وہ بازار میں پہنچا، پہلے بڑے بیوپاری کے پاس گیا، پھر چھوٹے بیوپاری کے پاس گیا، اور پتہ نہیں کہاں کہاں ہوتا ہوا یہاں آیا، پھر چکّی میں پیسا گیا، اس کے بعد آٹا تیار ہوا اور اب اس کو پکایا گیا۔ آدمی سوچے تو سہی کہ ایک روٹی کے تیار ہونے میں کتنی محنتیں ہوئیں؟ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکاراند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

بادل، ہوا، اور چاند و سورج؛ یہ سب اللہ تعالیٰ نے تمہاری خدمت کے لیے ایک نوکر کی طرح بے گار کے طور پر لگا رکھے ہیں۔ نوکر تو وہ ہوتا ہے جسے ہمیں تنخواہ بھی دینی پڑتی ہے، لیکن اگر کوئی حاکم کسی کو زبردستی پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے اور کہے کہ یہ کام کرو، اور اس کے اوپر کوئی مزدوری بھی نہ دی جائے؛ اسے بے گاری کہتے ہیں۔ تو اس کائنات کی جتنی بھی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے بے گار رکھ دی ہیں، یعنی ہماری خدمت کے لیے مقرر کی ہیں، اس پر ہمیں کوئی تنخواہ و معاوضہ نہیں دینا پڑتا۔ یہ سورج کی روشنی اور گرمی استعمال کر رہے

ہیں، اگر بِل دینا پڑتا تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ بجلی کا بِل ادا کرنے سے ہم عاجز ہو جاتے ہیں، تو سورج کی روشنی کا بِل کہاں ادا کر پاتے؟ اسی طرح ہَوا استعمال کر رہے ہیں اگر اس کا میٹر لگا دیا جاتا؛ تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ تو یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مفت میں مل رہی ہیں، اس لیے آدمی کھانا کھانے کے لیے جب بیٹھے تو اس کو سوچنا چاہیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو استعمال کرنے جا رہا ہوں، اسی لئے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرما رہے ہیں کہ: جس ذات نے ہمیں یہ کھانا دیا ہے پہلے اسی کا نام لے کر کھانا شروع کرو، اور بسم اللہ پڑھو، تا کہ اس کے ساتھ تعلق قائم ہو، اس کی محبت دل کے اندر پیدا ہو۔ ہمارے سامنے تو جب کھانا آتا ہے تو ہم بھوک کی وجہ سے ایسے بے تاب ہوتے ہیں کہ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں، بسم اللہ بھی یاد نہیں رہتی، کبھی یہ سوچتے ہی نہیں کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ حالاں کہ صرف ایک لمحہ کے لئے استحضار کر لینے کی ضرورت ہے۔ آدمی ذرا سوچے کہ اس وقت مجھ سے اللہ کا نام کیوں بلوایا جا رہا ہے!

ایک ہی نعمت میں کئی نعمتیں:

ہمارے اکابر فرماتے ہیں: صرف کھانا ہی نعمت نہیں ہے، بلکہ جس وقت آدمی کھانا کھا رہا ہے، اسی وقت اللہ تعالیٰ کی کئی اور نعمتوں کو بھی وہ استعمال کر رہا ہے۔ جیسے: اگر کھانا بغیر لذت کا ملتا، تب بھی ہمیں کھانا ہی پڑتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی نہیں کیا کہ صرف کھانا دے دیا، بلکہ لذت والا کھانا دیا۔ تو خود کھانا ایک نعمت ہے، پھر جو لذت اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر رکھی وہ دوسری

نعمت ہے۔ پھر عزت کے ساتھ اللہ تعالیٰ ہمیں دے رہے ہیں ، ورنہ ایسا ہوتا کہ بے عزتی کے ساتھ ڈال دیا جاتا جیسے: بعضوں کے سامنے ذلت کے ساتھ ڈال دیا جاتا ہے، ہمارے ساتھ ایسا تو نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے عزتی کے ساتھ کھلایا۔ پھر بھوک دی، یہ مستقل ایک نعمت ہے، ورنہ کھانا بھی ہو، لذت بھی ہو، اور عزت کے ساتھ دسترخوان پر بٹھاکر ہمیں کھلائیں، لیکن ہمارے اندر کھانے کا تقاضہ ہی نہ ہوتا، بھوک ہی نہ لگتی؛ تو کھانے کا کیا لطف آتا! معلوم ہوا کہ بھوک بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے۔ پھر جس وقت ہم کھانا کھارہے ہوتے ہیں تو عافیت کے ساتھ کھارہے ہوتے ہیں ۔ ورنہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو کھانا بھی ملا، لذت والا بھی ملا، عزت کے ساتھ ملا، بھوک بھی لگی ہوئی ہے، لیکن کوئی مصیبت آگئی ، ایک دم سے کوئی عزیز بیمار ہوگیا، کسی پر ہارٹ کا حملہ ہوگیا؛ تو اب کھانا کھارہے ہیں، لیکن بالکل بے دلی کے ساتھ کھارہے ہیں، اس میں عافیت نہیں ہے، جب آدمی عافیت کے ساتھ کھانا کھاتا ہے تو پُرسکون انداز سے کھاتا ہے۔ اچھا! پھر دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانے کا مزہ بھی الگ ہی ہوتا ہے، اس لئے کہ اکیلے بیٹھ کر کھانے کی صورت میں اتنا نہ کھاپاتا، جتنا دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر کھاسکتا ہے۔ تو غور کرو کہ اس ایک نعمت کے اندر بے شمار نعمتیں شامل ہوجاتی ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ آدمی ان سب چیزوں کو سوچے، جب آدمی یہ ساری چیزیں سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرے گا، اور پھر اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا، اسی تعلق کو پیدا کرنے کے لیے ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو۔

مضطر کو روزی پہنچانے کا سرکاری انتظام:

اورواقعہ یہ ہے روزی کے معاملہ میں اگر آدمی غور کرے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ روزی کے لیے کیسا عجیب وغریب انتظام فرماتے ہیں۔حضرت مولانا علی میاں صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا سنایا ہوا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں ، ان کو یہ واقعہ افغانستان کے مجددی خاندان کے ایک بزرگ نے بتایا تھا، وہ اپنے خاندان کے بڑے صاحبِ رسوخ عالم بھی تھے ،جس زمانہ میں ظاہر شاہ افغانستان کا حکمران تھااس زمانہ میں ایک موقعہ پران کو بادشاہ کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ ہم آپ کوایک خاص سفارت کے لیےایک خاص پیغام لے کرموسکو (Moscow) بھیجناچاہتے ہیں، آپ تیاری کرلیں۔چناں چہ انہوں نےتیاری کرلی ،ہوائی جہاز کا سفر تھا، گھر والوں نے ان کوایک بڑاساٹفن تیارکرکے دیاکہ ہوائی جہازمیں کھاناتوملے گا،لیکن کیا معلوم وہ کیسا ہوتا ہے،اس لئے یہ کھاناساتھ لے جایئے،بہت بڑے ٹفن میں بہت کچھ بناکر دیاتھا۔اچھا! ان کویہاں سے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ پہلے آپ کوکابُل سے دو شنبہ (جو وہیں ایک مقام کا نام ہے)جاناہے،پھر وہاں سے آگے جانے کی ہدایت وہیں سے دی جائے گی،پیغام آنےتک آپ کو ایئرپورٹ کےلاؤنج ہی میں انتظارکرنا ہے۔

یہ کہتے ہیں کہ میں دوشنبہ پہنچااور لاؤنج میں بیٹھاہوااس انتظار میں تھا کہ آگے کیاہدایت ملتی ہے۔بیٹھے بیٹھے شیشہ میں سے مَیں نے ایک منظر دیکھا کہ باہرایک کوڑادان تھا،اس کے

پاس ایک عورت آئی اور کوئی چیز اُٹھاکر کپڑے میں لپیٹی اور جلدی جلدی جانے لگی۔ مَیں اُٹھااور باہر نکل کراس سے پوچھا: یہ کیاہے؟ وہ کہنے لگی: یہ میرامعاملہ ہے۔انہوں نے کہا: مجھے بتاؤ۔ جب دیکھاتو ایک مری ہوئی مرغی تھی جو اس عورت نے اٹھائی تھی، حالاں کہ وہ عورت شریف معلوم ہورہی تھی ،اس سے کہا: یہ کیوں لے جارہی ہو؟اس نے کہا: میری حالت ایسی ہے کہ میرے لیے اس وقت اس کا کھانا جائز ہے۔ فوراً ان کو خیال آیا،اس سے کہاکہ: اس کو پھینک دو اور ٹھہرو۔ پھر انہوں نے وہ ٹفن جوگھر سے ساتھ لائے تھے، جس میں وافر مقدار میں کھاناتھاوہ پورااُٹھاکر اس عورت کے ہاتھ میں دے دیاکہ اس کو لے جاؤ،اورواپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے نام کا اعلان ہوا،ان کو بلایا گیااور بتایا گیاکہ آپ کو جس مقصد کے لیے وہاں بھیجا جارہا تھا،اب اس کی ضرورت نہیں رہی،اس لئے آپ واپس آجائیں ، وہ واپس گھر آگئے اور سوچنے لگے کہ، آخر مجھے وہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟ بہت سوچنے کے بعد نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اس عورت کو ٹفن پہنچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرکاری طور پر یہ انتظام کیا تھا۔

دوسروں کے نام سے کھلاتے ہیں:

اس لیے مَیں دوستوں سے کہاکرتاہوں کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتاہے کہ ہمارے یہاں کسی بڑے آدمی نے کہلوایا کہ فلاں وقت آپ کے یہاں آرہے ہیں،اور کھاناکھائیں گے،اس لیےان بڑے آدمی کے شایانِ شان کھانا تیار کروایا جاتاہے، لیکن وقت آنے پر اطلاع ملتی ہے

کہ وہ نہیں آئیں گے،اور پھر دوسرے کچھ مہمان آجاتے ہیں ،لہٰذا ان کے سامنے وہ کھانا رکھا جاتا ہے۔اب یہ مہمان اگر پہلے سے اطلاع بھی کرتے تو ان کے لیے اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کو یہی سارے پکوان کھلانا منظور تھے تو دوسرے کے نام سے ان کے لئے انتظام کروایا گیا۔

چیونٹی کی روزی کا منظر:

ہم نے اپنے بچپن میں ایک مضمون پڑھا تھا۔ مضمون نگار نے تصورات کے اندر ایک عمدہ منظر قائم کیا تھا کہ افغانستان کے فلاں علاقہ میں بادام کا ایک باغ ہے ، وہاں بادام لگے، جب سیزن آیا تو بادام اتارے گئے،ان کو بوریوں میں بھرا گیا، وہاں سے پاکستان لائے گئے، وہاں کے بازار میں بکے، ایک بیوپاری اسے ہندوستان لایا،دہلی کے کسی بازار میں فروخت ہوکر سورت آئے،اور سورت کے بیوپاری سے آپ نے خریدے، اپنے گھر لائے،پھر کسی مولوی صاحب کی دعوت کی تو اس میں زردہ پکایا جس میں وہی بادام ڈالا گیا، ان صاحب نے کھایا، اور کھاتے وقت دانتوں کے اندر اس بادام کے کچھ ذرّات رہ گئے، وہ واپس لوٹ رہے تھے، پلیٹ فارم پر بیٹھ کر خلال کر رہے تھے کہ اس خلال کے دوران ایک ذرّہ دانت میں سے نکلا، انہوں نے اسے پھینکا،وہاں ایک چیونٹی تھی اس نے اس کو اُٹھالیا۔

یہ سارا ایک تصوراتی منظر قائم کیا گیا ہے جس سے وہ یہی بتانا چاہتا ہے کہ چیونٹی کی روزی تو اتنی سی ہی ہے، اس کو تھوڑا کلو دو کلو چاہیے،اس کو تو ایک دو ذرّے ہی چاہئیں ،اس کی روزی پہنچانے کا اللہ تعالیٰ نے کیسا عجیب انتظام کیا کہ اتنی دور ایک چیز پیدا ہوئی جو اس کی روزی تجویز تھی تو اس تک پہنچائی۔کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ اس چیونٹی کے منھ کے اندر جو ذرّہ پہنچا ہے،وہ کہاں سے کس طرح آیا؟ حقیقت کی دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں ؛لیکن ہم غور نہیں کرتے۔

روزی کا انتظام ؛ہمارے بس کی بات نہیں :

ہم بھی بہت سی مرتبہ کیلا کھا کر اس کا چھلکا پھینک دیتے ہیں اور کوئی بکری آکر اس کو اُٹھا کر کھا لیتی ہے۔اب سوچنے کی ضرورت ہے کہ وہ کیلا کہاں تیار ہوا تھا،کہاں کہاں سے ہو کر ہمارے ہاتھ میں آیا،ہم نے کھایا اور چھلکا پھینکا،اور اس بکری نے کھایا اب بکری کی روزی تو یہی چھلکا ہے،اس کو کیلا نہیں کھانا ہے،اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لیے چھلکا ہی مقدر ہے ،لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے یہ چھلکا کہاں سے بھجوایا؛ یہ سوچنے کی بات ہے۔اس لیے صرف انسان ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ہر مخلوق کے واسطے- چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، چیونٹی ہو یا بکری -روزی کا انتظام کیا ہے،ہر ایک کو اللہ تعالیٰ روزی پہنچا رہا ہے اور روزی پہنچانے کا اس نے جو ذمہ لے رکھا ہے اس کو وہ پورا کر رہا ہے۔انسان اگر یہ چیز سوچے تو واقعہ یہ ہے اس میں اس

کے لئے بڑی عبرت کا سامان موجود ہے، کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ یہ کام کر سکے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعوت:

حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی حکومت دی تھی کہ اس سے پہلے نہ کسی کو ملی اور نہ بعد میں کسی کو ملے گی۔ ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: باری تعالیٰ! مَیں ایک سال کے لیے تمام مخلوق کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے کہا : اے سلیمان! یہ تمہارے بس کا کام نہیں ہے۔ کہا: ایک مہینے کی۔ کہا: نہیں کراسکتے۔ کہا: ایک ہفتہ کی۔ کہا: نہیں کراسکتے۔ کہا: ایک دن کی۔ تو کہا: نہیں کراسکتے ، لیکن اچھا چلو، تم کہتے ہو تو ایک دن کی کر کے دیکھ لو۔ انہوں نے کھانا پکوانا شروع کیا، ان کے تابع تو جنات بھی تھے، انہوں نے جنات اور انسان سب کو کام پر لگایا، اور تمام جگہوں سے بہت سارا کھانا منگوایا اور آٹھ روز تک پکوایا جاتا رہا۔ پھر سمندر کے کنارے دستر خوان لگایا گیا، اس لئے کہ اتنی بڑی جگہ اور کہاں ملتی۔ اور جو کھانا پکوایا تھا وہ سب وہاں رکھ دیا، پھر سوچا کہ کس سے شروعات کی جائے، تو خیال آیا کہ سمندر کی مخلوق سے ابتداء کی جائے، چناں چہ اعلان کرایا۔ ایک مچھلی باہر آئی اور ذرا سی دیر میں سب کچھ چٹ کر گئی اور کہنے لگی کہ اور کچھ ہے؟ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: اب کیا چاہیے؟ اس نے کہا: ابھی تو میری بھوک باقی ہے۔ پھر اس مچھلی نے کہا: آج جو کھایا اس کا ڈبل روزانہ ایک وقت کھاتی

ہوں اور جب سے میں پیدا ہوئی ہوں میرا اللہ مجھے دو وقت برابر کھلا رہا ہے، لیکن اے سلیمان! آج تمہاری دعوت کی وجہ سے مجھے بھوکا رہنا پڑا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کہنے لگے: روزی دینا اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے، کسی انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ ہی تمام مخلوق کو روزی پہنچانے والا ہے۔

تو بسم اللہ پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے وہ ویسے ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے ذریعہ بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق پیدا کیا جارہا ہے۔ صرف اپنے خیال، زاویۂ نگاہ، اور سوچنے کے انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے، اگر ادھر دھیان دیا جائے گا تو دھیرے دھیرے یہی چیز اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ بنے گی۔

اس روایت میں ایک ادب یہ بتلایا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھی جائے۔ اور دیکھو! حضرت عمر بن آبو سلمہ رضی اللہ عنہما چھوٹے بچے تھے، لیکن چھوٹا سمجھ کر حضور ﷺ نے ان کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ ان کو ہدایات دیں اور آداب سکھائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پچھلے کئی ابواب سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے زندگی کے آداب سے متعلق نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو تعلیمات ہیں ان کو پیش کرنا شروع کیا ہے، چناں باب کا عنوان قائم کیا تھا: "اَلتَّسْمِيَةُ فِيْ أَوَّلِهٖ وَالْحَمْدُ فِيْ آخِرِهٖ" کھانے سے پہلے اللہ کا نام لینا اور کھانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء اور تعریف بیان کرنا۔ یہ کھانے کے آداب میں سے ہے۔ اس باب میں کھانے کے آداب سے متعلق دو چیزیں بتائی ہیں۔ گزشتہ مجلس میں ایک آچکی ہے، آج حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کررہے ہیں۔

شروع میں نہیں تو جب یاد آئے:

حدیث ۷۲۹:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) :إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَذْكُرِ اسْمَ اللهِ تَعَالَى، فإِنْ نَسِيَ أَنْ يَذْكُرَ اسْمَ اللهِ تَعَالَى فِي أَوَّلِهِ، فَلْيَقُلْ: بسم اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب کھانے کا ارادہ کرے؛ تو اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور اگر کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو درمیان میں جب بھی اس کو یاد آئے؛ "بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ" پڑھ لے۔

افادات:- صرف "بسم اللہ" کہا تب بھی سنت تو ادا ہو جائے گی، اور اگر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پوری پڑھے تو بہت اچھا ہے اور عام طور پر کھانے سے پہلے یہ دعا پڑھی جاتی ہے: "بِسْمِ اللّٰہِ وَبَرَکَۃِ اللّٰہِ" (المستدرک علی الصحیحین للحاکم النیسابوري / حدیث نمبر:۷۰۸۴) اصل تو یہ ہے کہ کھانے کا عمل جب شروع ہو، اس وقت اللہ کا نام لیا جائے؛ یہی مستحب اور ادب ہے، لیکن اگر کوئی آدمی شروع میں اللہ کا نام لینا بھول جائے اور درمیان میں یاد آجائے تو یہ نہ سمجھے کہ میں تو محروم ہو گیا، بلکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا بھی طریقہ بتادیا کہ درمیان میں جب یاد آجائے تو "بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَهٗ وَاٰخِرَهٗ" پڑھ لے یعنی اللہ کا نام شروع میں بھی اور آخر میں بھی لیتا ہوں (سنن ابی داود ، باب التَّسْمِيَةِ عَلَى الطَّعَامِ) ایک روایت میں یہ بھی ہے: "بِسْمِ اللّٰہِ أَوَّلَهٗ وَأَوْسَطَهٗ وَاٰخِرَهٗ" شروع میں، درمیان میں اورآخر میں اللہ کا نام لیتا ہوں (تحفۃ الذاکرین بعدۃ الحصن الحصین من کلام سید المرسلین / ص:۱۹۲)

بہر حال! نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بھی ایک طریقہ بتادیا۔ کھانے کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا کوئی فرض اور واجب نہیں ہے کہ اگر چھوٹ گیا تو اس کی قضاء کی جائے، لیکن ایک نیک عمل ہے، اور شریعت کی تعلیمات ہمیں یہ بتلاتی ہیں کہ جو کسی عمل کا اپنے آپ کو پابند بنائے، اس کو چاہیے کہ اپنے عمل پر اہتمام کے ساتھ پابندی کے ساتھ عمل کرتا رہے، اس کو چھوڑنے کی نوبت نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ نے جب کسی ایک لائن اور طریقہ سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور نیکیاں حاصل کرنے کی توفیق دی اور نیکی حاصل کرنے کا جو طریقہ آپ نے اپنی زندگی میں جس وقت جس اعتبار اور جس لائن سے بھی اپنا رکھا ہے، وہ طریقہ اگر کسی وجہ

سے اپنے وقت پر چھوٹ گیا تو اس کو دوسرے وقت ادا کرلو،اگر چہ وہ فرض اور واجب نہیں،نہ اس کی قضاء واجب ہے، لیکن جب وہ نیکی کا ایک کام ہے جو ہم اپنے نامۂ اعمال میں اس وقت پر اندراج نہ کرسکے، اور درمیان یا اخیر میں یاد آگیا ،تو اسی وقت پڑھ لیں۔

حضرت فقیہ الامت رحمۃ اللہ علیہ کا معمول:

ہمارے بزرگوں نے اسی حکم سے ایک اور بات بتلائی ہے۔ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خادمِ خاص حضرت مولانا ابراہیم صاحب پانڈور افریقی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ:بعض مرتبہ سفر میں دیکھا کہ کسی وجہ سے حضرت کے نوافل جن کا معمول ہوا کرتا تھا وہ ادا نہیں ہوپائے،مثلاً:مغرب کے بعد اوابین کی عادت تھی، اور کسی وجہ سے وہ ادانہ ہو پائے ،جیسے: نماز کے بعد کچھ لوگوں سے ملنا ہے،یابیان کا پروگرام رکھ دیا گیاہے،اگر اوابین میں مشغول ہوتے ہیں تو جو لوگ سننے کے لیے بیٹھے ہیں ان کو انتظار کرنا پڑتاہے،ان کوانتظار کی زحمت نہ ہواس لیے ضروری سمجھاجاتاہے کہ اپنی اوابین کوروک کر آدمی پروگرام میں مشغول ہو، تو مولانافرماتے ہیں : حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھاکہ مغرب کے بعد وہ نوافل ادا کرنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ عشاء تک بیان میں مشغولی رہی تو جب عشاء کی اذان ہوتی تھی تو عشاء کی سنتیں ادا فرماتے تھے اور ساتھ میں ان نوافل کو بھی ادا فرمالیتے تھے

حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل:

حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء میں سے تھے،ان کے متعلق لکھا ہے کہ:ایک مرتبہ کسی جگہ جارہے تھے،مغرب کے بعد وہاں پہنچنا تھا، لیکن وقت پر نہیں پہنچ پائے، راستہ میں مغرب کی نماز پڑھنے کی نوبت آئی تو اس خیال سے کہ وہاں لوگ انتظار میں ہوں گے مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعت سنتِ مؤکدہ ادا کیں اور اوابین چھوڑ کر جہاں جانا تھا وہاں پہنچے،لوگ پہلے سے انتظار ہی میں تھے، بیان میں مشغول ہوگئے، اسی میں عشاء کا وقت آگیا۔عشاء کے بعد پھر کچھ دیر تک مشغولی رہی۔بعد میں ساتھیوں سے پوچھا:بھائی !اوابین کا کیا ہوا ؟کہا: حضرت!وہ تو چھوٹ گئیں،اس لیے کہ پروگرام میں مشغول ہوگئے تھے،اگر اوابین میں مشغول ہوتے تو لوگوں کو انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑتی، تو حضرت نے اپنے ماتحتوں کی تربیت کے لیے بتایا کہ جب عشاء کی اذان ہوئی تو اذان اور نماز کے درمیان میں جو وقت ملا تھا،ہم نے تو اس وقت اوابین بھی ادا کرلی۔پھر فرمایا: اگر چہ یہ فرض اور واجب نہیں،لیکن جب ہم اس کے عادی ہوگئے ہیں کہ اپنے نامۂ اعمال میں روزانہ اتنی نفل کا ثواب لکھوائیں،تو آج کیوں خالی جانے دیں ،اگر اس مقررہ وقت پر نہ لکھوا پائے تو بعد میں جب اللہ تعالیٰ موقعہ دے اس وقت اس کا اہتمام کرلینا چاہیے۔بزرگوں سے یہی چیزیں سیکھنے کی ہوتی ہیں۔

ہمارے دیگر اکابر کو بھی دیکھا کہ وہ اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ کوئی معمول وقت پر ادا نہ ہوپایا تو دوسرے وقت میں اس کو- قضاء کی نیت سے نہیں، لیکن -ادا کرلیتے ہیں، اس لیے کہ جس نیک عمل کی پابندی کر رہے تھے، کیوں اس عمل سے محروم رہیں۔اس روایت میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو طریقہ بتایا کہ کھانے کے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی اور درمیان میں یاد آگیا تو آدمی یہ سوچے کہ شروع میں تو نہیں پڑھ سکا تو اب درمیان میں تو پڑھ لوں۔

مسنون دعائیں ؛حفاظت کا ذریعہ:

حدیث ۷۳۰:-

وعن جابرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : سَمِعْتُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقولُ : إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ، فَذَكَرَ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ لأَصْحَابِهِ : لاَ مَبِيْتَ لَكُمْ وَلاَ عَشَاءَ. وَإِذَا دَخَلَ فَلَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ دُخُولِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ : أَدْرَكْتُمُ المَبِيْتَ ؛ وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ : أَدْرَكْتُمُ المَبِيْتَ وَالْعَشَاءَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا ذکر کرتا ہے، دعا پڑھتا ہے، اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے تو اس وقت کی دعا پڑھتا ہے؛ تو شیطان اپنے لشکر سے کہتا ہے :اس گھر میں نہ تو قیام کی گنجائش ہے اور نہ کھانے کا کوئی انتظام ہے۔اور جب آدمی اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان اپنے لشکر سے

کہتا ہے: تم کو اس گھر میں ٹھکانہ تو مل گیا۔ اور جب کھانے کے لیے بیٹھتا ہے اور بسم اللہ نہیں پڑھتا ، تو شیطان اپنے رفقاء سے کہتا ہے: ٹھکانہ بھی مل گیا اور کھانا بھی مل گیا۔

افادات:- لہٰذا جب آدمی گھر میں داخل ہو تو وہ دعا پڑھ لینی چاہیے جو نبی کریم (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم) نے ہمیں سکھائی ہے: اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلِجِ ، وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ ، بِسْمِ اللهِ وَلَجْنَا ، وَبِسْمِ اللهِ خَرَجْنَا ، وَعَلَى اللهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا (سنن ابی داود: ۵۰۹۶) اگر دعا یاد نہ ہو تو اس کو لکھ کر گھر کے دروازہ پر لگا دو ؛ تاکہ جب داخل ہو تو اس پر نظر پڑے تو یاد آجائے، ایک مدت تک جب یہ معاملہ رہے گا تو ان شاء اللہ عادت پڑ جائے گی، اور پھر آسان ہو جائے گا۔

پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ایک تو ان دعاؤں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک خاص نسبت پیدا ہوتی ہے، جب آدمی موقع بہ موقع، ہر کام میں ہر چیز پر اللہ تعالیٰ کا نام لے گا اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں بیٹھے گی، اللہ کی ذات کے ساتھ تعلق قائم ہو گا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ہر وقت باقی رہے گی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ اس طرح آدمی اللہ تعالیٰ سے خیر مانگ رہا ہے، یعنی کہ میرا گھر میں داخل ہونا بھی بہتر اور اچھے انداز میں ہو۔ کیوں کہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی غیر موجودگی میں گھر میں کیا ہوا ہے، ہو سکتا ہے کہ گھر میں داخل ہوئے اور بیوی نے کہا کہ بچہ کو بخار ہے۔ جب پہلے ہی سے بہتری مانگ لی اور کوئی پریشان کن خبر سن لی یا اور کوئی پریشانی

سے واسطہ پڑا، توچوں کہ پہلے ہی سے دعا مانگ لی ہے کہ بہترین داخل ہونانصیب ہو،تواللہ تعالیٰ خیرعطافرمادیں گے۔اس کے بعد جب گھر سے نکلنے کا وقت آئے تواللہ تعالیٰ اچھے انداز سے نکلنانصیب کرے۔یہ نہیں کہ داخل ہوئے تو پتہ چلاکہ بچہ بیمار ہے تو نکلنا بھی اچھا نہیں ہوا،اگر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لی ہے تو دونوں چیزیں اچھے انداز میں مل جائیں گی، اورجیساکہ پہلے بھی بتایا تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات میں ان چیزوں کا خاص اہتمام کیا گیاہے۔

شیطانی اثرات کاتوڑ:

حضرات انبیاء ہدایت کے لیے دنیا میں آتے ہیں ، اور اللہ کی مخلوق کا اللہ کی ذات سے تعلق قائم کرتے ہیں ،ہر چیز میں اور ہر موقع پر ان کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اپنےرب سے جُڑے، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق قائم ہو،اس کے لئے مختلف طریقے اور راستے بتلاتے ہیں۔اور شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے دورہو،اس کا تعلق کم ہو،یا کٹ جائے۔انسان کا بچہ جونہی دنیا میں قدم رکھتا ہے، اسی وقت سے یہ سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔حدیثِ پاک میں آتا ہے،نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:بچہ جب پیدا ہوتا ہےتو وہ روتا ہے،اس لیے کہ جب وہ دنیا میں قدم رکھتا ہے تو شیطان اس کے دل کو چھوتا ہے(بخاری شریف:باب وإنی أعیذھا بك وذریتھا من الشیطان الرجیم)تو ایک نئی چیز جو آج تک اس کو پیش نہیں آئی تھی وہ اس کوپیش آتی ہے،جس کی وجہ سے وہ بچہ ایک طرح کا اجنبی پن محسوس کرتا ہے، اور روتا ہے۔

دراصل شیطان کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل پر وسوسہ اندازی کی قدرت دی ہے،اس سے زیادہ اور کچھ طاقت اس کے پاس نہیں ، وہ ڈنڈا لے کر آپ سے گناہ نہیں کروائے گا ،اور نہ آپ کا ہاتھ پکڑ کر گناہ کروائے گا،اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اتنی ہی طاقت دی گئی ہے کہ وہ انسان کے دل میں وسوسہ اندازی کر سکے،اور اسی کے ذریعہ وہ آدمی کو گناہوں پر آمادہ کرتا ہے۔اب وہ ماں جس کے پیٹ میں بچہ ہے اس کے دل پر تو وسوسہ اندازی کر سکتا ہے،لیکن اس کو اتنی طاقت نہیں کہ جب تک وہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہے اس کو ٹچ (Touch) بھی کر سکے،کیوں کہ وہ بچہ ابھی تک دنیا میں نہیں آیا ہے۔جتنے انسان دنیا میں آچکے ہیں ان پر تو وہ اپنا تصرف کر سکتا ہے ،لیکن اس بچہ پر نہیں ،اس لیے کہ جب تک وہ ماں کے پیٹ میں ہے دوسرے عالم میں ہے، حالاں کہ وہ ماں کے پیٹ میں ہے،ماں کا دل بھی اندر ہے اور اس کا بھی دل اندر ہی ہے،لیکن ماں کے دل پر تصرف کر سکتا ہے،اس بچہ کے دل پر تصرف نہیں کر سکتا، کیوں کہ بچہ ابھی دنیا کی چیز نہیں بنا،لیکن اس کے پیدا ہوتے ہی شیطان پہنچ جاتا ہے اور اس کے دل کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

شیطان اپنے کام میں بہت ہوشیار ہے، اس لیے کہ اس کی محنت کا میدان انسان کا دل ہے،اور نیا انسان دنیا میں آیا تو جہاں محنت کرنی ہے وہاں جائزہ لینے کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ جیسے:چور جب کسی مکان میں چوری کرنے والا ہوتا ہے تو ایک دم سے وہاں نہیں پہنچ جاتا، بلکہ دو چار روز آگے پیچھے سے پلاننگ کرتا ہے ،جائزہ لیتا ہے کہ وہ مکان کہاں ہے، اور کہاں

سے داخل ہونا ہے، ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد وقت آنے پر وہ اپنا کام کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کا معاملہ بھی ہے کہ بچہ جب بڑا ہوگا اس وقت وہ مکلّف ہوگا، لیکن دنیا میں اس کے آتے ہی شیطان دیکھ لیتا ہے کہ میرا ایک نیا شکار دنیا میں آیا ہے، اس کا جائزہ لے لو۔ جیسے: دوا بنانے والی کمپنی اپنی دوا فروخت کرنے کے لیے سیلس مین رکھتی ہے، ان کو جیسے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شہر میں کسی ڈاکٹر نے نیا شفاء خانہ کھول دیا ہے، تو فوراً وہ پہنچ جاتے ہیں کہ ہماری محنت کا نیا میدان ہے ، ان سے ملاقات کرتے ہیں۔ شیطان بھی جب دیکھتا ہے کہ کوئی نیا بچہ دنیا میں آیا ہے تو اس کے دل کو جاکر ٹٹولتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس کا بدل رکھا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ بچہ جب پیدا ہو تو جو آلائشیں ماں کے پیٹ سے لے کر نکلا ہے اس کو دھونے کے بعد غسل دے کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ یہ اذان و اقامت کے جو کلمات کہلوائے جارہے ہیں وہ شیطان کے انہی اثرات کو دور کرنے کا کام کرتے ہیں جو اس بچہ کے دل کو چھونے کے نتیجہ میں آتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت اور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں، ان کو گویا اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ بچہ اگرچہ ابھی کچھ جانتا نہیں ہے، لیکن اس کا دل ٹیپ ریکارڈر جیسا ہے، اس میں وہ چیز محفوظ ہوگی اور وقت آنے پر اپنا کام کرے گا۔

خود ہی موقع دیں ؛ پھر پریشان ہوں !

اب شیطان اپنے اثرات ڈالنے ، اپنی زمین ہموار کرنے اور وسوسہ اندازی کے واسطے ابھی سے محنت کررہاہے۔ جیسے کسی کے اوپر محنت کرنی ہوتی ہے، تو پہلے ماحول کو ساز گار بنایاجاتاہے ، جب ماحول سازگار ہوجائے گا،اس کے بعداس پر محنت کی جائے گی۔اسی لئے اس حدیثِ پاک میں بتایاگیاکہ آدمی جب گھر میں داخل ہوتاہے، توشیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ کا نام نہ لے،اس لیے کہ آدمی جب اللہ کا نام لئے بغیرگھر میں داخل ہوتاہے تو شیطان کو بھی اندر آنے کا موقع مل جاتا ہے ،وہ اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ آج رات تم کو یہاں ٹھہرنے کا موقع مل گیا ،گویا قیام کی بکنگ ہوگئی۔پھرجب کھانے کے لیے بیٹھا اوربسم اللہ نہیں پڑھی تو کھانے کی بھی بکنگ ہوگئی۔ اب یہ ہوگا کہ جب شیطان پورے لشکر کے ساتھ گھرمیں داخل ہوچکا،تو ویسے باہر رہ کر بھی وسوسہ اندازی کرسکتا تھا، لیکن اب وسوسہ سازی کے لیے جس قسم کا ماحول مطلوب ہے وہ اس کوحاصل ہوگیا،اب اور اچھے انداز میں وہ اپنی محنت کرے گا اورگمراہ کرے گا۔پھر جب اس کوکھانا مل جائے گا تو اب کھانے میں شریک ہوجائے گا،اس لیے کھانے کی جوبرکت اور نورانیت ہے وہ حاصل نہیں ہوگی، اس کے بعد شیطان کو مزید وسوسہ اندازی کا موقع مل جائے گا۔

اسی لیے حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ: جب گھر میں داخل ہوؤ تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر داخل ہونا اور جب کھانے کے لیے بیٹھو تو اللہ کا نام لینا، کیوں کہ شیطان کا کام ہے کہ وہ انسان کی ہر چیز میں اپنا حصہ لگانا چاہتا ہے، اس کے گھر میں، کھانے میں، رہائش گاہ میں؛ یہاں تک کہ مرد جب اپنی بیوی کے ساتھ ہم بستری کرتا ہے، تو اس صحبت میں بھی شیطان شریک ہونا چاہتا ہے۔ اس لیے اس موقعہ پر بھی دعا سکھائی گئی ہے۔ وہ دعا یہ ہے: ”بِسْمِ اللهِ، أَللّٰهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا“

اسی طرح آدمی جب بیت الخلاء میں جاتا ہے تو وہاں بھی شیطان اس کی شرمگاہ سے کھیلنے کی کوشش کرتا ہے، اس وقت بھی تعلیم دی گئی کہ پہلے بسم اللہ کہو اور پھر یہ دعا پڑھو: ”أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ“ یہ ساری دعائیں معمولی نہیں ہیں، بلکہ ان دعاؤں کے ذریعہ ہمارا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم ہوتا ہے، اور اسی کے ذریعہ شیطان کے حملوں سے حفاظت کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ ہم ان دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے، گویا کہ ہم نے خود شیطان اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقع دیا، پھر جب شیطان کی وسوسہ اندازی ہوتی ہے تو پریشان ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم پہلے سے شیطان کو ماحول ساز گار بنانے اور اپنے اوپر حملہ کرنے کا موقعہ ہی کیوں دیں ؟ اگر ان دعاؤں اور ان ساری تعلیمات کا اہتمام کریں گے تو اس کے حملوں سے محفوظ ہوجائیں گے، اور اگر تھوڑے بہت ہو بھی گئے تو جب اللہ تعالیٰ سے پناہ حاصل

کریں گے تو شیطان کے شر سے جلدی اور آسانی سے بچ جائیں گے۔اس لیے اس کا خاص اہتمام خود بھی کرنا چاہیے اور اپنے گھر والوں کے پاس بھی کرانا چاہیے۔

شیطان کا ہاتھ میرے ہاتھ میں :

حدیث ۱۳۷:-

وعن حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ كُنَّا إِذَا حَضَرْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) طَعَاماً، لَمْ نَضَعْ أَيدِينَا حَتَّى يَبْدَأَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ) ، فَيَضَعَ يَدَهُ، وإِنَّا حَضَرْنَا مَعَهُ مَرَّةً طَعَاماً، فَجَاءتْ جَارِيَةٌ كَأَنَّهَا تُدْفَعُ، فَذَهَبَتْ لِتَضَعَ يَدَهَا فِى الطَّعَامِ فَأَخَذَ رسول الله (ﷺ) بِيَدِهَا، ثُمَّ جَاءَ أَعْرَابِيٌّ كَأَنَّمَا يُدْفَعُ، فَأَخَذَ بِيَدِهِ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ (ﷺ) : إِنَّ الشَّيْطَانَ يَسْتَحِلُّ الطَّعَامَ أَنْ لَا يُذْكَرَ اسْمُ اللهِ تَعَالَى عَلَيْهِ، وَإِنَّهُ جَاءَ بِهٰذِهِ الجارية لِيَسْتَحِلَّ بِهَا، فَأَخَذْتُ بِيَدِهَا، فَجَاءَ بِهٰذَا الأعرَابِيِّ لِيَسْتَحِلَّ بِهِ، فَأَخَذْتُ بِيَدِهِ، وَالَّذِى نَفْسِى بِيَدِهِ، إِنَّ يَدَهُ فِى يَدِى مَعَ يَدَيْهِمَا .. ثُمَّ ذَكَرَ اسْمَ اللهِ تَعَالَى وَأَكَلَ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جب کھانے کے لیے نبیِ کریم (ﷺ) کے ساتھ کسی دعوت یا کھانے میں حاضر ہوتے تھے تو ہم کھانے کے لیے اپنے ہاتھ آگے نہیں بڑھاتے تھے یہاں تک کہ نبیِ کریم (ﷺ) کھانا شروع فرمائیں۔ایک مرتبہ ایک دعوت کے موقعہ پر ہم لوگ نبیِ کریم (ﷺ) کے ساتھ موجود تھے، کھانا دستر خوان پر چن دیا گیا، ابھی نبیِ کریم (ﷺ) نے کھانا شروع نہیں فرمایا تھا، اپنا دستِ مبارک آگے نہیں بڑھایا تھا کہ ایک بچی تیزی کے ساتھ آئی، ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی دھکے دے کر اس کو لا رہا ہے ، اس نے کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو نبیِ کریم (ﷺ) نے اس کا ہاتھ پکڑ

لیا(یعنی اس کو کھانے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی)اس کے بعد ایک دیہاتی تیزی سے آیااور اس نے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھاناچاہاتوحضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا(کھانے کے اندرہاتھ ڈالنے نہیں دیا، اس لیے کہ اس نے بھی بسم اللہ نہیں پڑھی تھی)اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، شیطان اس کھانے کو اپنے لیے حلال کرلیتا ہے۔پھر حضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے ؛شیطان کا ہاتھ ان دونوں کےہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔اس کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نےبسم اللہ پڑھ کرکھاناشروع فرمایا۔

فوائد حدیث :

افادات:–اس روایت سے مندرجۂ ذیل امورمعلوم ہوئے:-

۱:– یہ بھی ادب میں سے ہے کہ بڑوں کے ساتھ جب کھانے کے لیے بیٹھےہوں تو جب تک بڑے کھانا شروع نہ کریں ، چھوٹوں کو کھاناشروع نہیں کرنا چاہیے، جب وہ شروع کریں تب دوسروں کو چاہیے کہ کھانا شروع کریں۔حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتےہیں کہ حضراتِ صحابہ کایہی معمول تھا۔

۲:– یہ بھی معلوم ہوا کہ جو آدمی اپنے چھوٹوں کو اپنے ساتھ لے کر کھانے کے لیے بیٹھا ہو،اس کو چاہیے کہ ان کی نگرانی کرے کہ انہوں نے بسم اللہ پڑھی یا نہیں ، اگر نہ پڑھی ہوتو

ان کو کھانا کھانے نہ دے، ان کا ہاتھ پکڑ لے،اور کہے کہ پہلے بسم اللہ پڑھو، اس کے بعد کھانا شروع کرو۔ تربیت کا یہی تقاضہ ہے۔ دیکھیے! یہاں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بچی کا ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کو ادب سکھانا چاہیے۔

آج کل تو ماں باپ اس کا اہتمام ہی نہیں کرتے ، جب بچہ کی مرضی ہوگی تو کھائے گا، خادمہ اورنوکرانی اس کو کھلا دے گی، ماں باپ اپنی اپنی مرضی سے کھائیں گے۔ماں باپ کو یہ پرواہ ہی نہیں کہ بچوں کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلائیں کہ ان کو کھانے کے آداب سے واقفیت ہو؛حالاں کہ ماں باپ کے لیے ضروری ہے کہ باقاعدہ خود بیٹھ کر بچوں کو اپنے ساتھ بٹھائیں اور اس کا اہتمام کرائیں۔

نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو چاہیے اپنے چھوٹوں اورماتحتوں کی نگرانی کرے،ان کی طرف سے اگران آداب کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی ہوتواس پر ٹوکے اور آئندہ آداب کے اہتمام کے ساتھ تمام کاموں کی ادائیگی کی تاکید کرے۔

۳:- در اصل شیطان اپناہاتھ ڈال کر اس کھانے کو اپنے لیے حلال کرنا چاہتا تھا،اس لیے وہ اس بچی کو دوڑاتا ہوا لایا، وہ چاہتا تھا کہ یہ بچی بغیر بسم اللہ پڑھے جلدی سے اس کھانے میں ہاتھ ڈال دے،تاکہ اس کو واسطہ بناکر اس کھانے میں شریک ہوجائے،لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے

بچی کا ہاتھ پکڑلیا۔جب اس نے دیکھا کہ میں اس تدبیر میں کامیاب نہیں ہوا تو دیہاتی کو لے آیا، وہ دوڑا ہوا آیا اور اس نے بھی بغیر بسم اللہ کہے ہاتھ آگے بڑھا کر کھانا چاہا، تو حضور (ﷺ) نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا، اس لیے کہ اگر حضور (ﷺ) اس کو کھانے دیتے تو شیطان اس کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

شروع میں نہیں ؛ تو اخیر میں سہی:

حدیث ۷۳۲:-

وعن أُمَيَّةَ بن مَخْشِيٍّ الصحابيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (ﷺ) جَالِسًا، وَرَجُلٌ يَأْكُلُ، فَلَمْ يُسَمِّ اللهَ حَتَّى لَمْ يَبْقَ مِنْ طَعَامِهِ إِلَّا لُقْمَةٌ، فَلَمَّا رَفَعَهَا إِلَى فِيهِ، قَالَ: بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَآخِرَهُ، فَضَحِكَ النَّبِيُّ (ﷺ) ثُمَّ قَالَ: مَا زَالَ الشَّيْطَانُ يَأْكُلُ مَعَهُ، فَلَمَّا ذَكَرَ اسْمَ اللهِ اسْتَقَاءَ مَا فِي بَطْنِهِ. (رواه أبوداود والنسائی)

ترجمہ:- حضرت اُمیّہ بن مَخْشِی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) تشریف فرما تھے، ایک آدمی کھانا کھا رہا تھا، کھانے کے شروع میں اس نے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی (اس لیے شیطان بھی کھانے میں اس کے ساتھ شریک تھا۔اس آدمی کو تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن نبیِ کریم (ﷺ) دیکھ رہے تھے) یہاں تک کہ اس کے کھانے میں سے ایک ہی لقمہ باقی بچا تھا کہ اس کو یاد آگیا کہ میں نے شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھی ہے، لہٰذا اس نے فوراً کہا: " بِسْمِ اللهِ أَوَّلَهُ وَاٰخِرَهُ"، یہ منظر دیکھ کر نبیِ کریم (ﷺ) ہنس پڑے،

پھر ارشاد فرمایا: شیطان برابر اس آدمی کے ساتھ شریک رہا، آخر میں جب اس نے یہ دعا پڑھی تو شیطان نے کھایا ہوا قے کردیا(یعنی شیطان اس کھانے کو ہضم نہیں کرسکا۔)

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اخیر میں بھی یاد آجائے تو پڑھ لے۔ بعض لوگ سوچتے ہیں کہ شروع میں نہیں پڑھی تو اب اخیر میں کیا پڑھنی؟ یہ بھی شیطانی دھوکہ ہے۔ جو طریقہ ہمیں بتایا گیا ہے ہمیں تو اس پر عمل کرنا ہے۔ اس طرح کی سوچ اور خیال بھی شیطانی وسوسہ ہے، شیطان اپنے کھانے کو محفوظ کرنا چاہتا ہے۔

بعض لوگوں کا مزاج اعتراض والا ہوتا ہے اور آج کل عموماً ایسا مزاج بن گیا ہے کہتے ہیں کہ جب شیطان نے قے کردی تو اس سے ہمیں کیا فائدہ ملا؟ ایک صاحب نے ایک مرتبہ یہی سوال کیا تھا۔ اس کا جواب ظاہر ہے کہ شیطان کو اس کھانے میں شریک ہونے کی وجہ سے وسوسہ اندازی کا اچھا موقع فراہم ہو جاتا ہے ،اور شیطان کے اثرات کھانے میں آجاتے ہیں ، لیکن جب بسم اللہ پڑھ لی گئی، چاہے آخری لقمہ سے پہلے ہی کیوں نہ ہو،اور شیطان نے قے کردی،تو اب شیطان کو اس راہ سے اس پر قابو پانے کا موقع نہیں ملے گا۔ معلوم ہوا کہ آخری لقمہ پر بھی یاد آجائے تو بسم اللہ پڑھ لی جائے۔

بسم اللہ کی برکت:

حدیث ۷۳۳:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: كَانَ رسولُ الله (ﷺ) يَأْكُلُ طَعَاماً فى سِتَّةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ، فَجَاءَ أَعْرَابِيٌّ، فَأَكَلَهُ بِلُقْمَتَيْنِ. فَقَالَ رسولُ الله (ﷺ): أَمَا إِنَّهُ لَوْ سَمَّى لَكَفَاكُمْ. (رواہ الترمذی.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) چھ رفقاء کے ساتھ کھانا کھارہے تھے کہ ایک دیہاتی آیااس نے دو لقموں میں کھانا ختم کر دیا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: یہ آدمی اگر بسم اللہ پڑھتا تو یہ کھانا تم سب کو کافی ہو جاتا۔

افادات:- شیطان کے شریک ہونے سے کھانے کی برکت ختم ہو گئی۔ کھانے کی برکت یہی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا نام لے، اور سب شریک ہونے والے بھی اللہ کا نام لیں؛ تاکہ شیطان کو کسی ایک کے واسطہ سے بھی کھانے میں شریک ہونے کا موقع نہ ملے۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ مؤمن ایک آنت سے کھاتا ہے (یعنی کم غذا سے اس کا پیٹ بھر جاتا ہے) اور غیر مسلم سات آنت سے کھاتا ہے (خوب ڈٹ کر کھاتا ہے) (باب المؤمن یأکل فی معی واحد) آپ غور کرنا کہ ان کے کھانے کی مقدار مسلمانوں کے کھانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ آپ اگر چاہیں تو عملی طور پر تجربہ کرکے دیکھ لیں، وہ زیادہ ہی کھائیں گے۔ اور جو مسلمان بسم اللہ

نہیں پڑھتے وہ بھی زیادہ ہی کھائیں گے۔بسم اللہ پڑھ کر جولوگ کھانے کا اہتمام کرتے ہیں توکم غذا میں اللہ تعالیٰ ان کوسکون عطا فرمادیتے ہیں۔

اوربسم اللہ کوجتنے یقین کے ساتھ پڑھنے والا ہوگا اتنی ہی اس کے کھانے کی مقدار گھٹتی جائے گی۔اس لیے ہم اہل اللہ کو دیکھیں گے کہ کم غذا میں بھی ان کا کام چل جاتا ہے۔

دسترخوان اُٹھانے کی دعا:

حدیث ۷۳۴:-

وعن أبي أُمامَة رضی اللہ عنہ أنَّ النبيَّ (ﷺ) كَانَ إِذَا رَفَعَ مَائِدَتَهُ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلّٰهِ حَمْداً كَثِيراً طَيِّباً مُبَارَكاً فِيهِ، غَيْرَ مَكْفِيٍّ، وَلاَ مُوَدَّعٍ، وَلاَ مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) جب دسترخوان اٹھاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: ”تمام تعریف اللہ کے واسطے ہے ،بہت زیادہ پاکیزہ اور برکت والی تعریف۔اس کھانے کی شکرانہ کے ذریعہ سے کفایت نہیں کی گئی(یعنی جیسا شکر کاحق ہے ویساشکرہم نے ادا نہیں کیا) اور نہ اس کو چھوڑا جارہا ہے۔اور اے ہمارے رب! نہ ہم اس سے بے پرواہی اختیار کررہے ہیں۔“

افادات:- انسان کی عادت ہے کہ اس کو جس چیز کی حاجت ہوتی ہے اورجس چیز کا وہ محتاج ہوتا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتا ہے، اور جب وہ چیز نظر آتی ہے تولپک کراس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس پر حملہ کردے

گا، لیکن جہاں اس کی اس سے ضرورت پوری ہوگئی کہ بس! اس چیز کی طرف سے بے پرواہی اختیار کرلیتا ہے۔ کھانا: اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، جب بھوک کی وجہ سے ہم کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں، اس وقت کھانے کی طرف ہماری طبیعت کی جو رغبت، میلان وکشش ہوتی ہے، وہ ظاہر ہے۔ لیکن جب پیٹ بھر جاتا ہے اور کھانے سے ہم اپنے ہاتھ کھینچتے ہیں، تو وہ کشش اور میلان جو شروع میں تھا اب باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے کسی کو یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کیا یہ کھانے کی طرف سے ایک طرح کا استغناء اور بے پرواہی ہے؟ اس دعا کے ذریعہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ عرض کررہا ہے کہ: اے اللہ! میں جو ہاتھ کھینچ رہا ہوں وہ اس لیے نہیں کہ مجھے ضرورت نہیں ہے، بلکہ مجھے تو اس کی ضرورت ہے، مَیں تو ابھی تھوڑی دیر (چارپانچ گھنٹے) کے بعد دوبارہ اسی احتیاج و بے چینی اور رغبت و میلان کے ساتھ کھانے کی طرف دوبارہ ہاتھ بڑھانے والا ہوں، اس وقت بے پرواہی کی وجہ سے ہاتھ نہیں ہٹایا جارہا ہے، اور اس کھانے کے شکرانہ کا جو حق تھا، وہ بھی ہم پوری طرح ادا نہیں کرسکے۔

گناہوں کی معافی کی بشارت:

حدیث ۷۳۵:-

وعن معاذ بن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ) :مَنْ أَكَلَ طَعَاماً فقال: أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی أَطْعَمَنِی هٰذَا، وَرَزَقَنِیهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّی وَلَا قُوَّةٍ؛ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ. (رواہ أبو داود والترمذی)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کھانا کھائے پھر یہ دعا پڑھے: تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور یہ کھانا مجھے میری کسی تدبیر اور طاقت کے بغیر روزی کے طور پر عطا فرمایا (یعنی مجھ میں یہ طاقت نہیں تھی کہ میں یہ کھانا حاصل کرتا) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

افادات:- کھانے کے دو ادب بتانے کے لیے یہ باب قائم کیا تھا، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھنا یعنی اللہ کا نام لینا، اور آخر الحمد للہ یعنی اللہ کی تعریف وشکر ادا کرنا۔ پہلی مجلس میں بتا چکا ہوں کہ کھانے کی جو چیز ہمارے سامنے آتی ہے وہ کتنی محنتوں کے بعد تیار ہوتی ہے، اگر ہم خود ان ساری محنتوں کو استعمال کر کے کھانا تیار کرنا چاہتے تو نہیں کر سکتے، یہ تو اللہ تعالیٰ کا نظام ہے جس کے نتیجہ میں یہ ساری چیزیں ہم تک پہنچتی ہیں۔ اور ہم نے جو کھانا کھایا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے، اس پر شکر تو ویسے بھی ادا کرنا چاہیے تھا، اس کی حمد وثناء ہمارے لیے ضروری ہے ہی، لیکن یہاں شکر ادا کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انعام دیا جاتا ہے کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، اس لیے کہ کبیرہ تو بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے۔ بہر حال! اس عمل پر گناہوں کی معافی کی بشارت بھی ہمیں سنائی جا رہی ہے۔ غور کیجئے کہ کتنا آسان نسخہ ہے!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر عمل کے اہتمام کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

باب لا یعیب الطعام واستحباب مدحه

کھانے میں عیب نہ نکالے اور اس کی خوبی بیان کرنے کا پسندیدہ ہونا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ کھانے کے آداب کا بیان چل رہا ہے،اسی سلسلہ میں آج ایک باب قائم کرتے ہیں : کھانے میں نہ کوئی عیب نکالے اور نہ کھانے کی برائی کرے۔اور دوسری بات یہ کہ اس کی تعریف کرنے کا پسندیدہ ہونا۔

کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں :

حدیث ۷۳۶:-

وعن أبي هُريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: مَا عَابَ رسولُ الله (ﷺ) طَعَاماً قَطُّ ،إن اشْتَهَاهُ أكَلَهُ، وَإنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا، نہ کبھی اس کی برائی کی۔اگر پسند ہوتا تو آپ اس کو تناول فرمالیتے اور کھالیتے ،اور اگر پسند نہ ہوتا تو اس کو چھوڑ دیتے۔

افادات:- کھانا :یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق ہے ،اس کی نعمت ہے، اس کا ایک عطیہ ہے،تو حق یہ ہے کہ آدمی اس نعمت اور عطیے کے اوپر کوئی عیب نہ لگائے ،اگر طبیعت کی رغبت ہے اور وہ چیز پسند ہے تو شوق سے کھائے،اور اگر پسند نہیں ہے تو اس کی برائی نہ بیان کرے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ اگر کھانا پسند نہیں ہے تو بس اس کی برائی کا دفتر کھول

دیتے ہیں، ایسا کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے رزق، اس کی نعمت اور عطیہ کی ناقدری کرتا ہے، آپ کو اگر پسند نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ چیز بے کار ہے:-

نہیں ہے کوئی بھی چیز نکمی زمانہ میں
کچھ بھی بے کار نہیں قدرت کے کارخانہ میں

اللہ تعالیٰ نے دنیامیں جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں ان کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور موجود ہے۔ ظاہری اعتبار سے وہ چیز چاہے کتنی ہی بری معلوم ہو، لیکن تکوینی اعتبار سے اس کا وجود اپنے اندر کسی نہ کسی فائدہ، حکمت اور مصلحت کو لیے ہوئے ہوتا ہے، سانپ اور بچھو جیسے موذی اور تکلیف دینے والے جانوروں کا وجود بھی مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کائنات میں جو پیدا کیا ہے، اس کا بھی کوئی مقصد اور مصلحت ہے جس کو اللہ تعالیٰ ہی بخوبی جانتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیزوں کی مصلحتوں کا انسان کہاں احصاء کر سکتا ہے اور تمام مصلحتوں کو کہاں جان سکتا ہے؟ کوئی چیز اگر آپ کے اور ہمارے علم میں نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔

مکھی کی پیدائش کا ایک فائدہ:

ایک متکبر بادشاہ ایک مرتبہ اپنے محل میں تکبر کے ساتھ تخت پر بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس نے اڑایا، پھر آکر بیٹھ گئی، پھر اڑایا، پھر آگئی۔ بعض مکھیاں

ضدی ہوتی ہے کہ جتنا بھی اڑاؤ، واپس آکر بیٹھ جاتی ہے(ویسے مکھی کو عربی زبان میں "ذُبَابٌ" کہتے ہیں۔ذَبَّ ،یَذُبُّ کا معنیٰ کسی چیز کو بھگانااور دور کرنا، اور"اٰبَ ، یَؤُبُ"کا معنیٰ لوٹنا؛تو "ذُبَّ" اور"آبَ" مل کر"ذُبَابٌ" بناہے،کُلَّمَاذُبَّ آبَ یعنی اس کو بھگایاگیا تووہ پھر لوٹ کر آئی،اسی سے عربی زبان میں اس کانام "ذُبَابٌ" بناہے، اس کی خاصیت ہی یہ ہے کہ اس کوبھگاؤتووہ پھر آئے گی۔) تو اس بادشاہ نے اس کودو تین مرتبہ بھگایالیکن وہ پھر آکر بیٹھی تووہ بادشاہ کہنے لگا : معلوم نہیں کہ اللہ میاں نے یہ مکھیاں کیوں پیداکی ہیں؟اس کے اندر کوئی منفعت تو ہے نہیں، صرف نقصان ہی نقصان نظر آتاہے۔ایک اللہ والے وہاں بیٹھے ہوئے تھے،انہوں نے کہا:اس کا ایک فائدہ اس سے بڑا اور کیاہوسکتا ہے کہ تیرے جیسے مغرور اور متکبر انسان کے غرور کو توڑ رہی ہے،اللہ تعالیٰ نے اس مکھی کے ذریعہ تجھے بتادیاکہ اللہ تعالیٰ کی یہ چھوٹی سی معمولی مخلوق اگر تجھے ستاناچاہے اور تو اپنے آپ کو اس سے بچانا چاہے تب بھی اس کوروک نہیں سکتا۔باربار تو اسے بھگارہاہے اوروہ واپس آکر بیٹھ رہی ہے، تجھ میں تواتنی بھی طاقت نہیں کہ اسے اپنے پاس سے ہٹاسکے اوردربار سے نکال سکے،تو اس نے تیرے غروراور تکبرکوخاک میں ملادیا،اس سے بڑا فائدہ اور کیاہوسکتاہے!

بچھو کے ذریعہ جان بچائی:

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیرِ کبیر میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر بہت تفصیل سے کئی صفحات کے اندر لکھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی شانِ ربوبیت کو بیان کرتے ہوئے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بزرگ دریائے دجلہ کے کنارہ جارہے تھے، انہوں نے ایک بڑا سا بچھو دیکھا جو تیزی سے چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ اتنا بڑا بچھو یہاں کیسے آگیا، تو یہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ کچھ دور کنارے کنارے چل کر جب آگے پہنچے تو دیکھا کہ دریا میں سے ایک کچھوا باہر آیا، یہ بچھو اس کے اوپر سوار ہو گیا اور وہ کچھوا دریا پار کرنے لگا۔ ان بزرگ نے دیکھا تو انہوں نے بھی سامنے والے کنارے پر جانے کے لیے ایک کشتی کرایہ پر لی، اس میں بیٹھے اور سامنے والے کنارہ پر پہنچے، تو وہ کچھوا بھی اس بچھو کو لے کر سامنے والے کنارہ پر پہنچ چکا تھا، وہاں وہ بچھو اُترا اور آگے بڑھنے لگا۔ یہ بزرگ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے، ایک جگہ جاکر دیکھا کہ ایک نوجوان شراب پی کر بے ہوش پڑا ہے اور اس کے پاس شراب کا گلاس پڑا ہوا ہے، اور ایک بڑا اژدہا اپنا پھن پھیلائے ہوئے اس کو کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ اتنے میں یہ بچھو وہاں پہنچا اور ایک دم کود کر اس اژدہے کے پھن میں ایک ڈنک مارا جس کی وجہ سے وہ اژدہا گرا اور مر گیا۔ پھر وہ بچھو وہاں سے واپس روانہ ہو گیا، دریا کے کنارے پر پہنچا، اسی کچھوے پر سوار ہوا اور وہ اس کو لے کر روانہ ہوا۔ یہ سارا قصہ ان بزرگ نے دیکھا تو سوچنے لگے کہ اللہ تبارک و

تعالیٰ کی شان دیکھو کہ بظاہر تو یہ جانور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی جان لیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ انسانوں کی جان کی حفاظت کا بھی کام لیتے ہیں۔جب وہ نوجوان ہوش میں آیا تو ان بزرگ نے اس کو بتایا کہ تو توشراب کے نشے میں مدہوش تھا، اور تیری حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسا ایسا انتظام کیا۔یہ سن کر اس کو احساس ہوا ، اور اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی توفیق دی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بھی چیز دنیا میں بے کار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں دنیامیں بنائی ہیں وہ کسی نہ کسی مقصد اور منفعت کے لیے ہیں ، اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے۔

پاخانہ کے کیڑے سے علاج !:

ایک کتاب ''قلیوبی''نامی ہمارے بچپن میں پڑھی تھی جس میں عجیب و غریب قصے لکھے ہوئے ہیں ،ایک قصہ یاد آتا ہے۔پاخانہ کا ایک کیڑا ہوتا ہے جو پیٹ کے اندر پیدا ہوتا ہے، جسے ہم لوگ کِرَم کہتے ہیں ،پاخانہ کے ساتھ نکلتا ہے اور اسی میں چلا جاتا ہے۔ایک مرتبہ اس کو دیکھ کر ایک صاحب سوچنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیوں پیدا کیا ہے،بے کار معلوم ہوتا ہے، اس کا کوئی مقصد تو سمجھ میں نہیں آتا،ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا۔ایک مدت کے بعد اس کی آنکھ میں ایک بیماری ہوگئی، مختلف ڈاکٹروں اور حکیموں سے بہت علاج کرایا،بڑی رقمیں خرچ

کیں، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ایک بہت پرانہ تجربہ کار طبیب تھا، کسی نے کہا کہ اس کا تجربہ بہت زیادہ ہے اس کے پاس جاؤ، وہ صاحب اس کے پاس گئے، اس نے سارے حالات پوچھے، پھر کہا: پاخانہ کا جو کیڑا ہوتا ہے اس کو پیس کر آنکھ میں لگاؤ، کبھی کبھی یہ بیماری اس سے ٹھیک ہوجاتی ہے۔ وہ آدمی سمجھ گیا کہ میری زبان سے جو جملہ نکلا تھا تو اللہ تعالیٰ نے میری عبرت اور سزا کے لیے مجھے اس بیماری میں مبتلا کیا ہے۔ اس لیے ہمیشہ کچھ بھی بولنے میں آدمی کو بہت ہی احتیاط کرنی چاہیے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ’’اَلْبَلَآءُ مُؤَکَّلٌ بِالْمَنْطِقِ‘‘ مصیبت بولنے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ بہت سی مصیبتوں کو ہم بول کر دعوت دیتے ہیں، کوئی بڑا بول آدمی بول دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو وہ پسند نہیں آتا، پھر اللہ تعالیٰ اس کے اسی بول پر اس کو آزمائش میں ڈال دیتے ہیں۔

یہ کس مرض کی دوا ہے؟:

سید غوث علی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے ان کے حالات میں ’’تذکرۂ غوثیہ‘‘ نامی ایک کتاب ہے، اس میں ان کے ملفوظات کے اندر ایک لطیفہ لکھا ہے کہ: ایک چھپکلی ایک دیوار پر لٹکی ہوئی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا تو باری تعالیٰ سے عرض کیا: یا اللہ! اس کو کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! یہ چھپکلی بھی کب سے

مجھ سے یہی پوچھ رہی ہے کہ: اے اللہ! موسیٰ کو آپ نے کیوں پیدا کیا؟ یہ کس مرض کی دوا ہے؟ اگرچہ یہ تو ایک لطیفہ ہے، لیکن سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ جیسے: ہم بچوں کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں، تو وہ بچے بھی ہمارے متعلق بہت کچھ تبصرے کرتے ہیں جن کو کبھی کبھی سننے کی ضرورت ہے، اس سے آدمی کو پتہ چل جاتا ہے

کھانے کی نعمت، اور ہمارا طرزِ عمل:

خیر! مَیں نے عرض کیا تھا کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی نعمت اور عطیہ ہے، اس کا دیا ہوا رزق ہے، اور اس میں بڑی مصلحتیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے جب اس کو پیدا کیا اس وقت اپنی توجہ اس کی طرف منعطف فرمائی، اس سے اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، ہمیں اگر وہ چیز پسند نہیں ہے اور اچھی نہیں لگتی ہے، تو نہ کھائیں، کوئی زبردستی تو نہیں ہے، لیکن اس کی برائی بیان کرنے میں اپنی زبان کو اور وقت کو لگانے کی آپ کو کس نے اجازت دی؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے۔ نبیِ کریم ﷺ کا معمول بتایا کہ آپ کو اگر وہ چیز پسند آتی تو کھالیتے اور اگر پسند نہ آتی تو چھوڑ دیتے۔ اسلام نے یہی تعلیم دی ہے کہ کھانے پینے کی چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، اس کی قدر اور تعظیم کرنی چاہیے، ادب کرنا چاہیے۔

آج کل تو کھانے کی ایسی بے عزتی ہوتی ہے کہ اللہ کی پناہ! جو کھانا بچتا ہے اس کو لوگ کوڑے دان میں ڈال دیتے ہیں، خاص کر ہوٹلوں میں اور دعوتوں میں تو بڑی بے دردی اور بے

رحمی کے ساتھ کھانے کو ضائع و برباد کیا جاتا ہے، حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک ایک دانہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے اور بہت ہی قیمتی ہے۔

نعمت کی قدردانی کا عجیب واقعہ:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ بیان کرتے تھے۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، راندیر ہی میں ان کا مزار ہے۔ ہمارے مدارس میں سنن ابوداؤد پڑھائی جاتی ہے، عام طور پر اس کی سند میں میاں صاحب آتے ہیں۔ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مَیں ایک مرتبہ ان کے یہاں گیا، کھانے کا وقت ہوا تو انہوں کہا کہ آپ بھی کھانے میں شریک ہوجایئے، ہم کھانے کے لیے بیٹھے، جب ہم کھانے سے فارغ ہوچکے تو مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ مَیں دسترخوان لپیٹنے لگا تاکہ اندر جو کچھ ہے اس کو باہر پھینک آؤں۔ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیا کررہے ہو؟ میں نے کہا: حضرت! دسترخوان صاف کرنے کے لیے لپیٹ رہا ہوں۔ تو میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: دسترخوان صاف کرنا آتا ہے؟ مَیں نے کہا: حضرت! یہ بھی کوئی علم اور فن ہے جو سیکھنے کی ضرورت ہو؟ فرمایا: ہاں! اسے بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ پھر کہا: لاؤ! مجھے دو۔ انہوں نے میرے پاس سے لے لیا، اس کو پھر سے کھولا، اور ہم لوگ کھاتے وقت ہڈیاں چوس کر اس پر ڈالتے ہیں، اسی طرح کچا گوشت نکال کر ڈال دیتے

ہیں، تو میاں صاحبؒ نے اس طرح کا گوشت الگ کیا، ہڈیاں الگ کیں ، روٹی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو الگ کیا، چھوٹے چھوٹے ذرّات کو الگ کیا۔ اس طرح کل چار حصے بنائے، پھر فرمانے لگے: دیکھو! یہ جو کچا گوشت ہے اس کو میں فلاں جگہ پر رکھوں گا، وہاں بلی آتی ہے اور اس کو معلوم ہے کہ میری غذا وہاں رکھی ہوئی ہوتی ہے ،وہ آکر اس کو کھالے گی۔ اور یہ جو ہڈیاں ہیں، اس کو فلاں جگہ رکھوں گا، وہاں کتے آتے ہیں اور ان کو معلوم ہے کہ یہاں ہماری غذا رکھی جاتی ہے، وہ آکر کھالیں گے۔ اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑوں کو اوپر کی دیوار پر رکھ دوں گا، کوے اور چیلیں آکر لے لیں گے۔ اور یہ چھوٹے چھوٹے ذرات کو گھر میں جہاں چونٹیوں کے بِل ہیں ان کے پاس رکھ دوں گا تو وہ کھالیں گی؛ اس لیے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی نعمت ہے، ہم اس کو نہیں کھاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی دوسری مخلوق کے لیے رزق بنایا ہے، تو ہم اس کو کیوں ضائع کریں!

جنوں کی خوراک کا نظام:

اسی لیے آپ کو معلوم ہوگا کہ استنجاء کے آداب جہاں بیان کیے جاتے ہیں وہاں حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ہڈی سے استنجاء کرنے سے منع کیا۔ کیوں؟ حدیث میں اس کی وجہ بھی بتلائی ہے کہ ذبح کیے ہوئے جانوروں کی ہڈیاں جو ہم کھانے کے بعد چوس کر صاف کرکے ڈال دیتے ہیں وہ جنوں کی خوراک ہے۔ اگر کوئی جِن اللہ کا نام لے کر

اس کو اُٹھاتاہےتو اس پر ایسا ہی گوشت چڑھا دیا جاتاہے جیسے اس پر اصل میں تھا۔ جنوں کی خوراک کے لیےاللہ تعالیٰ کا یہ ایک نظام ہے،اسی لیے آپ (ﷺ) نے ہڈیوں سے استنجاء کرنےسے منع فرمایاکہ جو آدمی اس سے استنجاء کرے گاتو گویا کہ اس کو بے کاراور ضائع کررہا ہے،جو چیز جنوں کی خوراک کے کام آسکتی تھی،اب ان کے کام میں نہیں آئے گی۔ اسی طرح کوئلےسے استنجاء کرنےسے بھی منع کیاہے، کیوں کہ کوئلہ جنوں کے جانوروں کی خوارک ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت نے بڑی تاکید فرمائی ہے کہ کوئی نعمت ضائع نہ ہونے پائے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بڑی قدر ہونی چاہیے۔

ایک گھونٹ پانی کی قدر:

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ کوئی آدمی پانی پیتا اور بچا ہوا پھینک دیتا تو حضرت بہت سخت ناراض ہوتے کہ بھائی!پانی کیوں پھینک دیا۔اور واقعہ یہ ہے کہ یہ پانی ہمیں اتنی آسانی سے وافر مقدار میں بغیرزحمت کے مل جاتا ہے اس لیے ہمیں اس کی قدر نہیں ہے۔میں نے پہلے بتایاتھا کہ چندسال پہلے جب کَنُڈلا({ ષ્મ ૨૩૩૪ })میں سمندری طوفان آیا تھاتووہاں رفاہی کام کے لیے ہمارے یہاں سے یوسف علی بھائی گئے تھے،انہوں نےبتلایاکہ جب ہم پہلی مرتبہ وہاں پہنچے توہمارے پاس پینے کے پانی کی بوتلیں تھیں جسے دیکھ کربیسیوں آدمی جمع ہوگئے اور کہنے

لگے کہ: اس میں سے ایک ایک گھونٹ ہمیں دو۔ جن کو پانی میسر نہیں ہوتا ان سے پوچھو کہ اس ایک گھونٹ کی کتنی قدر ہے!

عبرت انگیز واقعہ:

اوراس ایک گھونٹ پر بلکہ ایک قطرہ پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کیسا کیسا معاملہ کیا جاتا ہے! ایک عجیب وغریب قصہ یاد آگیا تو سنادیتا ہوں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات میں یہ قصہ لکھا ہوا ہے کہ ایک آدمی کا انتقال ہوگیا، کسی نے اس کو خواب میں دیکھا کہ عذاب میں مبتلا ہے، اس نے پوچھا: تیرے ساتھ یہ معاملہ کیوں ؟ اس نے کہا: میرے گناہوں کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہوں۔ اس نے پوچھا: تیرے پیچھے کوئی دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کرنے والا نہیں؟ اس نے کہا: میری ایک لڑکی ہے، تم اس کو جاکر کہو کہ وہ میرے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کرے اور یہاں بھیجے۔ وہ صبح اُٹھا اور معلوم کیا کہ فلاں کا مکان کہاں ہے، وہاں پہنچا تو دیکھا کہ مکان پر تالا پڑا ہوا ہے۔ لوگوں سے پوچھا: اس کی ایک لڑکی تھی وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے بتلایا: وہ تو بڑی بداخلاق نکلی، کوٹھے پر بیٹھ گئی اور بدکاری میں مبتلا ہوگئی، اس وقت کسی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ پوچھا: مجھے اس سے ایک کام ہے، کہاں ملے گی؟ کسی نے بتلایا کہ: وہ اپنے کسی آشنا اور دوست کے ساتھ دریائے جمنا پر نہانے کے واسطے گئی ہے۔ یہ آدمی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنے دوست کے ساتھ پانی سے کھیل رہی ہے۔ اب یہ سوچنے لگا کہ

میں اس کو بتلاؤں بھی یا نہیں، لیکن پھر سوچا کہ ایک مرے ہوئے آدمی نے اپنی بیٹی کے نام ایک پیغام دیا ہے؛ تو میں پہنچا ہی دوں۔ چناں چہ اس نے وہیں کنارے پر کھڑے کھڑے اس کو مخاطب کرکے کہا کہ: مَیں نے خواب میں تیرے باپ کو دیکھا کہ وہ عذاب میں مبتلا ہے اور اس نے میرے ذریعہ تجھ تک یہ پیغام کہلوایا ہے کہ تو اس کے لیے کچھ ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کر۔ اب وہ تو اپنی مستی میں تھی، اور چلّو میں پانی لے کر اپنے آشنا کے اوپر ڈال رہی تھی، اس میں سے ایک چلّو اس کے اوپر ڈال کر کہنے لگی: لو! یہ میرے ابّا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے۔ یہ بیچارہ تو بہت شرمندہ ہوا اور واپس چلا آیا کہ اب اس کو کیا کہا جائے۔ دوسری رات کو خواب میں دیکھا تو اس کا باپ اچھی حالت میں تھا۔ اس نے کہا: مَیں تو تیرے پیغام کو پہنچانے کے لیے تیری بیٹی کے پاس گیا تھا، لیکن اس کا ایسا ایسا معاملہ ہے اور اس نے تو مجھے اس طرح سے جواب دیا اور میرے ساتھ بھی ایسا سلوک کیا۔ اس پر اس نے کہا: اس کا عمل اس کے ساتھ؛ لیکن وہ چلّو بھر کر اس نے جو پانی تیرے اوپر یہ کہہ کر ڈالا تھا کہ یہ ابّا کے ایصالِ ثواب کے لیے ہے، اس پانی کا ایک قطرہ ایک جانور کے منھ میں گرا جو ندی کے کنارہ پر دو روز سے پیاسا پڑا ہوا تھا، اور اندر جا کر پانی پی سکنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا، اُس ایک قطرے سے اس جانور کی پیاس بجھ گئی، اس کا ثواب مجھے ملا اور اسی پر اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت کر دی۔

اس سے آپ اندازہ لگایئے کہ پانی کا ایک قطرہ کتنا قیمتی ہے کہ ایک آدمی کو عذاب سے بچا سکتا ہے؛ تو پھر ایک گھونٹ کتنا قیمتی ہوگا! لیکن ہم اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو یونہی ضائع کر دیتے

ہیں۔پرانے زمانہ میں ہمارے دیہاتوں میں دیکھا کہ کھانا اگر بچتا تھا تو وہ لوگ اس کو پھنکنے کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ مختلف قسم کے غریب غرباء، بھنگی چمار، مزدور قسم کے لوگ ہر آبادی کے اندر رہتے ہی ہیں ؛ان کو دے دیا جائے۔آج کل اس کی بالکل پرواہ نہیں کی جاتی ،اور بچا ہوا کھانا ایسے ہی پھینک دیتے ہیں۔لہٰذا اس بات کا ضرور اہتمام ہو کہ کھانا اللہ تعالیٰ کی قیمتی نعمت ہے جو ضائع نہیں ہونی چاہیے۔

اکابر کی کڑھن:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیماری کے زمانہ میں ایک آدمی دودھ لایا،حضرت نے نوش فرماکر ایک دوگھونٹ بچ گئے تھے اس کو وہیں رکھ دیا اور حضرت کی آنکھ لگ گئی، جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ وہ دودھ وہاں نہیں ہے۔ایک صاحب کھڑے تھے ان سے پوچھا کہ یہاں دودھ رکھا تھا؛ کہاں گیا؟انہوں نے کہا: مَیں نے پھینک دیا۔اس پر حضرت بہت ناراض ہوئے کہ اللہ کے بندے!وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت تھی،تو نے اس کو پھینک کیوں دیا؟ تو ہی پی جاتا،ورنہ کسی جانور کو پلا دیتا تب بھی کارآمد تو ہوتا۔ایسے ہی پھینکنا کیا معنٰی رکھتا ہے!

ہمارے بزرگوں کے یہاں اس بات کا بڑا اہتمام رہتا تھا کہ کوئی چیز بھی ضائع ہونے نہ پائے،اگر ایک ذرّہ بھی ضائع ہو جاتا تو اس پر بہت کڑھتے۔ کبھی کسی پھل کا مزہ تھوڑا سا بدل جاتا ہے ،یا ایک طرف سے تھوڑا سا زیادہ پک جانے کی وجہ سے بہت سی طبیعتیں اس کو کھانا پسند

نہیں کرتیں ،توحضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں دیکھا کہ اگر کوئی پھل اس طرح کا ہوجاتا تھا تو حضرت ایک مخصوص انداز سے فرماتے تھے کہ :کون اس کو وصول کرے گا؟ یہ سن کر جن کی طبیعتیں اس کو پسند نہیں کرتی تھیں وہ بھی مانگ لیا کرتے تھے،اور جب کوئی اس کو کھالیتا تو حضرت کو اس پر بڑی خوشی ہوتی تھی کہ یہ چیز ضائع ہونے سے بچ گئی۔

اور واقعہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے،اس لیے ضائع نہیں ہونی چاہیے،اگر اس کی ناقدری ہوجاتی ہے تو بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی دوسری بہت ساری نعمتوں سے محروم ہوجاتا ہے،اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔

پسند و ناپسند کے معاملہ میں معتدل تعلیم:

یہاں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کھانے کے معاملہ کا ایک ادب بتلایا :"مَاعَابَ رسولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) طَعَامًاقَطُّ" حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی کسی کھانے پر عیب نہیں لگایا"إن اشْتَهَاهُ أَكَلَهُ وَإِنْ كَرِهَهُ تَرَكَهُ"،اگر طبیعت میں رغبت ہوتی تو آپ تناول فرمالیتے ،اور اگر رغبت نہیں ہوتی تو نہیں کھاتے تھے۔اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر چیز ہماری طبیعت کو پسند ہی ہو،بعض کھانے ایسے بھی ہوتے تھے جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طبیعت کو بھی پسند نہیں تھے لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی اس کی برائی نہیں فرماتے تھے،اس پر عیب نہیں لگاتے تھے۔

طبیعت کا کسی چیز کی طرف میلان اور اس کو پسند کرنا، نہ کرنا؛ ایک غیر اختیاری چیز ہے، یہ طبیعت کا ایک تقاضہ ہوتا ہے ، کبھی طبیعت کسی چیز کو پسند کرتی ہے اور کبھی کسی چیز کو ناپسند کرتی ہے۔ تو اگر آپ کی طبیعت کو یہ کھانا ناپسند ہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے ، اور یہ کوئی ضروری بھی نہیں کہ ہر چیز کو آپ پسند ہی کیجئے، لیکن یہ ہے کہ اگر آپ کی طبیعت کو پسند نہیں ہے تو آپ اس کی برائی نہ کریں ، اس پر عیب نہ لگائیں ، اس کی خوردہ گیری نہ کریں۔ اگر عیب لگائیں گے تو یہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی ناقدری ہوگی، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

سرکہ بہت اچھا سالن ہے:

حدیث ۷۳۷:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) سَأَلَ أَهْلَهُ الأُدُمَ، فقالوا : مَا عِنْدَنَا إِلاَّ خَلٌّ، فَدَعَا بِهِ، فَجَعَلَ يَأْكُلُ، ويقول: نِعْمَ الأُدُمُ الخَلُّ، نِعْمَ الأُدُمُ الخَلُّ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ اپنے گھر والوں سے سالن مانگا (کہ روٹی کے ساتھ کھانے کے لیے کوئی سالن ہے؟) گھر والوں نے کہا: ہمارے پاس تو صرف سرکہ ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کہا: لاؤ۔ پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سرکہ میں روٹی ڈوبا ڈوبا کر کھانے لگے اور فرمانے لگے: سرکہ بہت اچھا سالن ہے، سرکہ بہت اچھا سالن ہے۔

سال بھر کا اناج بھر لینا توکل کے خلاف نہیں:

افادات:–حالاں کہ حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کا معمول یہ تھا کہ تمام ازواجِ مطہرات کے لیے سال بھر کا غلہ بھر دیا کرتے تھے۔اس سے علماء نے یہ بھی ثابت کیاہے کہ جولوگ سال بھر کا اناج خرید کررکھ لیتے ہیں؛یہ توکل اور تقویٰ کے خلاف نہیں ہے،خود نبیٔ کریم (ﷺ) ازواجِ مطہرات کوسال بھر کادے دیا کرتے تھے،لیکن ازواج بھی تو آپ ہی کی تھیں جو کثرت سے صدقہ وخیرات کرنے والی تھیں،اس لیے ان کوسال بھر کا جو دیاجاتاتھاوہ اپنی خوشی سے اللہ کے راستہ میں خرچ کردیتی تھیں۔اسی لیے حدیثِ پاک میں آتاہے،حضرت عائشہ رضی اللہ عنہافرماتی ہیں کہ تین تین چاند ہم ایسے دیکھتے تھے کہ حضورِاکرم (ﷺ)کے گھرمیں آگ نہیں جلتی تھی، چولہانہیں جلتاتھا۔پوچھاگیا:پھر کیا کرتے تھے؟فرمایا: کھجورکھاکراس پر پانی پی لیتے تھے:یہی ہماری غذا ہواکرتی تھی۔

کھانے کی اوربنانے والے کی تعریف:

خیر!یہ روایت لاکرباب کاجوعنوان قائم کیاتھااس کے دوسرے جزو ”اِسْتِحْبَابُ مَدْحِهٖ“ کو ثابت کرناچاہتے ہیں۔دیکھو!آپ (ﷺ) سرکہ کی تعریف فرمارہے ہیں،حالاں کہ ہم لوگ تو سرکہ کوکبھی سالن کے طور پر استعمال بھی نہیں کرتے،کبھی زبان کے چٹاخے کے لیے کچھڑا،

حلیم وغیرہ میں ڈال لیتے ہیں، ورنہ اگر سالن کی جگہ پیش کر دیا جائے کہ آج تو سالن میں سرکہ ہی ہے، روٹی اور سرکہ کھالو؛ تو کون ہے جو اس پیشکش کو بہ رضا و رغبت قبول کرلے؟ طبیعت پر بڑا گراں گزرے گا کہ اچھا! سالن کی جگہ پر سرکہ کھائیں؟ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سرکہ کھا رہے ہیں اور تعریف فرما رہے ہیں کہ: بڑا اچھا سالن ہے، بڑا اچھا سالن ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کھانے کی تعریف کرنی چاہیے، اس لیے کہ یہ بھی نعمت کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے، جیسے: کوئی آدمی کوئی چیز لاکر پیش کرے، اور آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بڑی عمدہ چیز ہے، آپ نے تو بڑے موقع سے یہ چیز پیش کی۔ بس! آپ کے ان دو جملوں سے اس کا جی خوش ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کے شکر کا حق ادا ہو جائے گا۔

پھر یہ ہے کہ اگر وہ سالن ہے تو جس نے وہ سالن بنایا ہے اس کی محنت کا بھی تو حق ہے کہ اس کا شکریہ ادا کیا جائے۔ اس نے اس سالن کو بنانے کے واسطے دھواں برداشت کیا، آگ کی گرمی برداشت کی، اپنا وقت لگایا، تکلیف وزحمت اٹھائی، اور آپ اتنے بخیل بن رہے ہیں کہ آپ کی زبان سے اس کی تعریف کے دو بول بھی نہیں نکل رہے ہیں؟ یہ کیسی بات ہوئی! ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کا حق ہے کہ آپ کہیں کہ ماشاء اللہ! بہت اچھا کھانا بنایا ہے۔

حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت حکیم الامت نوراللہ مرقدہٗ کے خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی عارفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم نے لکھاہے کہ حضرت ایک قصہ بیان کیا کرتے تھے: ایک مرتبہ ایک آدمی نے ان کی دعوت کی، وہ حضرت سے بیعت تھے، اور ان کی گھر والی بھی حضرت سے بیعت تھی، حضرت وہاں کھانے کے لئے تشریف لے گئے۔ اور حضرت کی عادت تھی کہ کھانے کے بعد گھر والوں کا شکریہ ادا کیا کرتے تھے کہ آپ نے کھانا پکایا، ماشاء اللہ بڑا لذیذ اور اچھا و عمدہ پکا تھا۔ اللہ والے دوسروں کا جی خوش کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

معترض کا حال مکھی جیسا:

اس پر بھی بعض لوگوں کو اعتراض ہوتا ہے۔ اگر کسی نے ایسا کہہ دیا تو بعض لوگ اس کو غلط جامہ پہناتے ہیں، حالاں کہ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے یہ دو جملے بولنے میں کیا حکمت ہے، اللہ والے دراصل گھر والوں کی دلجوئی کرنا چاہتے ہیں، اور یہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔ لیکن جن کا مزاج ہی ٹیڑھا ہو اور جس کی طبیعت ہی میں کجی ہو، ان کا حال مکھی جیسا ہوتا ہے: مکھی جب کسی باغ میں جائے گی تو پورے باغ میں پھل اور پھول ہیں، لیکن کسی کونہ میں پاخانہ پڑا ہو گا تو وہ سب چھوڑ کر وہیں جائے گی اور اسی پر بیٹھے گی، پورے باغ میں پھل ہوتے ہیں وہ

اس کو نظر ہی نہیں آتے، پاخانہ ہی نظر آتا ہے۔ تو جن لوگوں کا مزاج تنقیدی اور عیب جوئی والا ہوتا ہے، وہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں۔

خیر! حضرت ڈاکٹر عارفی رحمۃ اللہ علیہ جب کھانے سے فارغ ہو کر جانے لگے تو چوں کہ گھر والی بھی بیعت تھی اس لئے پردہ کے پیچھے سے اس نے بھی سلام کیا، حضرت نے سلام کا جواب دینے کے بعد شکریہ کے کلمات کہے کہ: آپ نے کھانا ماشاء اللہ بڑا عمدہ پکایا تھا، ہمیں بہت پسند آیا۔ ایسا کہنا بھی چاہیے تا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا ہو، اور ان کا حوصلہ بڑھے، دلجوئی بھی ہو جائے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے اس کہنے پر پردے کے پیچھے سے رونے کی اور سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ حضرت ڈاکٹر صاحب بھی سہم گئے کہ پتہ نہیں، کیا بات ہوئی! کیا میری طرف سے کوئی ایسی چیز پیش آئی کہ وہ خاتون رونے لگ گئی۔ حضرت نے پوچھا: کیا میری طرف سے کوئی تکلیف پیش آئی؛ تو میں معافی چاہتا ہوں۔ تو اس خاتون نے رونے کو ضبط کرتے ہوئے کہا: نہیں حضرت! ایسا کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ یہ جو آپ کے ساتھ میرے شوہر کھڑے ہیں نا، چالیس سال سے کھانا پکا کر ان کو کھلا رہی ہوں، آج تک ایک دن بھی انہوں نے ایسا کوئی جملہ نہیں کہا ہے کہ تم نے کھانا بہت اچھا پکایا، آج آپ کی دعوت تو ہم نے پہلی مرتبہ کی اور آپ یہ کہہ رہے ہیں؛ اس لئے میرا جی بھر آیا۔

اس کا احسان اور ہمارا بخل!:

آپ اور ہم اس مجلس میں جتنے بھی بیٹھے ہوئے وہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ یہ واقعہ ہے یا نہیں ؟ ہم کبھی ایسا کرتے ہیں ؟حالاں کہ وہ بیچاری ہماری جو خدمتیں کرتی ہے، اس کا مسئلہ بھی مَیں آپ کو بتادوں (یہاں سے آواز گھروں تک بھی جارہی ہے ،خواتین بھی سن رہی ہیں)مسئلہ کے اعتبار سے بیوی کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ کے لیے کھانا پکائے، بلکہ وہ آپ سے یہ مطالبہ کرسکتی ہیں کہ ہمیں پکا پکایا کھلاؤ،لیکن جب وہ پکاکر ہمیں دے رہی ہے تو وہ ہم پر بڑا احسان کررہی ہے۔جب وہ اتنابڑا احسان کررہی ہے تو ہم اتنے کیوں بخیل بن رہے ہیں کہ ہماری زبان سے اس کی تعریف کا ایک جملہ بھی نہیں نکلتا؟ہم صرف اتنا ہی کہہ دیں کہ آج کھانا بہت اچھا اور عمدہ پکایا ہے۔

بیوی کے مزاج سے واقفیت رکھنا سنت طریقہ ہے:

واقعہ یہ ہے کہ جس کے دل پر گزرتی ہے وہی اس چیز کو محسوس کرسکتا ہے۔ایک عورت جو آپ کے ساتھ پوری زندگی گزاررہی ہے؛اس کے مزاج سے واقفیت رکھو۔ویسے شوہر کے لیے ضروری ہے کہ اپنی بیوی کی دلجوئی کرتا رہے اوراس کے مزاج کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کرتا رہے۔پہلے بھی ایک حدیث گزری ہے اس کو تازہ کرادیتا ہوں۔نبی ٔکریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے

ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اے عائشہ! جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو تو وہ بھی مَیں جان لیتا ہوں، اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو تو وہ بھی مَیں جان لیتا ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ یہ کیسے جان لیتے ہیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جب تم مجھ سے خوش ہوتی ہو اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی نوبت آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو: "لَا! وَرَبِّ مُحَمَّدٍ" محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کی قسم۔ اور جب تم مجھ سے ناراض ہوتی ہو، اور دورانِ گفتگو کسی بات پر قسم کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو تم یوں کہا کرتی ہو: "لَا! وَرَبِّ اِبْرَاهِيمَ" اس وقت میرا نام نہیں لیتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! صرف آپ کا نام ہی زبان سے نہیں لیتی، ورنہ میرے دل میں تو آپ کی محبت بھری ہوئی ہے

عرض یہ کرنا ہے کہ دیکھئے! نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے مزاج کا کیسا مطالعہ کیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مزاج کب کیسا ہوتا ہے؛ وہ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پتہ چلتا تھا۔

ہم اگر واقف نہیں تو بیوی کے مزاج سے!:

ہماری تو ساری زندگیاں بیوی کے ساتھ گزر جاتی ہیں لیکن ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ بیوی کا مزاج کیا ہے! کبھی ہم نے اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا! کبھی اس کا مطالعہ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی! آپ فیکٹری اور دکان کے ایک ایک نوکر کے مزاج سے واقف ہیں، اپنی آفس

کے ہر ہر ملازم کے مزاج سے واقف ہیں کہ کس سے کب کس طرح کام لینا ہے، اگر واقف نہیں تو بیوی ہی کے مزاج سے واقف نہیں۔ یہ بات تو ٹھیک نہیں ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ وہ بیچاری اتنی خدمتیں کرتی ہے کہ آپ کے کپڑے دھوتی ہے، کھانا پکا کر دیتی ہے، بستر تیار کرتی ہے، لہٰذا اگر نیند نہ آئی ہو تب بھی کہہ دو کہ ماشاءاللہ! کیسا عمدہ بستر تیار کیا تھا کہ لیٹتے ہی آنکھ لگ جانے والی تھی، اس سے اس کا جی خوش ہو جائے گا۔ اور ایک مسئلہ آپ کو بتا دیتا ہوں کہ جن مواقع پر شریعت نے توریہ (یعنی خلافِ واقعہ بات) کی اجازت دی ہے، اس میں بیوی کو خوش کرنے والی بات بھی ہے۔

تو کھانے کی تعریف بھی ہونی چاہیے، یہ حرص و لالچ کی علامت نہیں ہے، بلکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت اور آپ کا طریقہ ہے۔

بَاب مَا يقوله من حضر الطعام وهو صائم إِذَا لَمْ يفطر

دعوت میں حاضر ہونے والا اگر روزہ دار ہے تو کیا کہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعوت قبول کرنا سنت ہے:

حدیث ۷۳۸:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : إِذَا دُعِيَ أَحَدُكُمْ فَلْيُجِبْ، فَإِنْ كَانَ صَائِماً فَلْيُصَلِّ، وَإِنْ كَانَ مُفْطِراً فَلْيَطْعَمْ.

قَالَ العلماءُ: معنى ((فَلْيُصَلِّ)): فَلْيَدْعُ، ومعنى ((فَلْيَطْعَمْ)): فَلْيَأْكُلْ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کو کھانے کے لیے دعوت دی جائے تو قبول کرنی چاہیے (روزہ ہو تب بھی دعوت قبول کرو اور اس کے مکان پر تشریف بھی لے جاؤ) اگر آپ روزہ دار ہیں تو اس کے گھر جا کر (چاہے کھانا مت کھانا، لیکن) اس کے لیے دعا کر دیجئے۔ اور اگر روزہ نہیں، تو کھانا بھی کھا لیجئے۔

افادات:- اگر میزبان کا کھانے کے لیے اصرار ہو، اور مہمان کے نہ کھانے سے میزبان کی دل شکنی کا اندیشہ ہو، تو میزبان کی دلجوئی کے واسطے اس مہمان کے لیے نفل روزہ توڑنے کی اجازت ہے، پھر بعد میں اس کی قضا کر لے۔ یہ بات صرف نفل روزہ کی ہے، فرض یا قضا روزہ

رکھا ہو تو نہیں توڑنا چاہیے۔ ویسے اس کے مکان پر جا کر کہہ دے کہ مَیں روزہ سے ہوں، اور دعا کر دے۔

ایک مؤمن کے دوسرے مؤمن پر جو حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ حق بھی ہے کہ اگر کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے تو دعوت قبول کرنی چاہیے۔ دعوت کے قبول کرنے کے لیے کچھ شرائط بھی ہیں (اس موضوع کی تفصیل [جلد:۴/ص:۲۵۷ تا ۲۶۵] پر دیکھئے۔ مرتب)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہمان اگر دعا دینے پر اکتفاء کرتا ہے تو میزبان کو اس پر بھی راضی ہو جانا چاہیے، بلاوجہ کھانے پر اصرار نہ کرے، خاص کر کھانے کی وجہ سے مہمان کو تکلیف ہوتی ہو تو پھر کیوں اصرار کیا جائے۔ مقصد تو مہمان کو خوش کرنا اور دعا لینا ہے ،اور جب دعا مفت میں مل رہی ہے تو پھر آپ کیوں فیس دینا چاہتے ہیں؟

بَاب مَا یقوله من دُعِیَ إِلَی طَعَامٍ فَتَبِعَهُ غیره

کسی کو کھانے کی دعوت دی گئی، اور کوئی دوسرا بھی اس کے ساتھ ہو گیا، تو وہ کیا کہے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

طفیلی کے احکام:

حدیث ۷۳۹:-

عن أَبِي مسعود البَدْرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: دعا رَجُلٌ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) لِطَعَامٍ صَنعَهُ لَهُ خَامِسَ خَمْسَةٍ، فَتَبِعَهُمْ رَجُلٌ، فَلَمَّا بَلَغَ البَابَ، قَالَ النَّبِيّ (صلی اللہ علیہ وسلم): إِنَّ هَذَا تَبِعَنَا، فَإِنْ شِئْتَ أَنْ تَأْذَنَ لَهُ، وَإِنْ شِئْتَ رَجَعَ. قَالَ: بل آذَنُ لَهُ يَا رَسُولَ الله. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ پانچ آدمیوں کی دعوت کی (گویا اس نے یوں کہا: اے اللہ کے رسول! آپ کے ساتھ مزید چار آدمیوں کی یعنی کل پانچ کی مَیں دعوت کرتا ہوں، ان چار کی آپ ہی تعیین فرمالیجئے) جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لے جارہے تھے تو مزید ایک آدمی ساتھ ہو گیا (کل چھ ہوگئے) جب میزبان کے دروازہ پر پہنچے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے میزبان سے کہا: یہ ایک زائد آدمی ہمارے ساتھ آگیا ہے، اب اگر تم اس کو اجازت دو تو آئے گا، ورنہ چلا جائے گا۔ میزبان نے کہا: اے اللہ کے رسول! مَیں اس کو اجازت دیتا ہوں (بے تکلفی کی بات تھی تو وہ بھی شریک ہو گیا)

افادات:- ویسے بلا اجازت چپکے سے کسی کی دعوت میں شریک ہو جانا، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ شادیوں کے کھانوں میں چپکے سے پہنچ جاتے ہیں اور دعوت وصول کر کے آجاتے ہیں؛ یہ جائز نہیں ہے۔ پرانے زمانہ میں مستقل ایک طبقہ تھا جن کو طفیلی کہا جاتا تھا۔ علامہ

ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کا مستقل ایک رسالہ ہے، جس میں انہوں نے طفیلیوں کے اس قسم کے قصہ بیان کئے ہیں کہ وہ مختلف حیلے بہانوں سے لوگوں کے یہاں دعوتوں میں پہنچ جاتے تھے، ایسوں کے لیے تو حدیث پاک میں وعید آئی ہے، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی جو بغیر دعوت کے کہیں چلا جائے اور کھاکر آجائے وہ چور بن کر گھستا ہے اور غاصب و ڈاکو بن کر نکلتا ہے (ابوداود شریف: باب مَا جَاءَ فِي إِجَابَةِ الدَّعْوَةِ) اس لیے ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

جہاں وہ برا ہے؛ وہاں یہ بھی برا ہے:

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ اگر میزبان کی طرف سے اجازت دی جائے تب بھی کھانے سے انکار کیا جائے۔ جہاں وہ برا ہے وہاں یہ بھی برا ہے، جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اتفاق سے ان کو دعوت نہیں دی گئی تھی، اور وہ پہنچ گئے، اب صاحبِ خانہ بڑے شوق اور رغبت سے ان کو دیکھ کر خوش ہو کر کہتا ہے: آیئے، تشریف لایئے، لیکن یہ یوں سوچتا ہے کہ مجھے پہلے سے دعوت کیوں نہیں دی تھی، اس لیے میں نہیں کھاتا۔ اب ساری دنیا سمجھا رہی ہے کہ آجاؤ، بھائی! آجاؤ۔ صاحبِ خانہ بھی اس کا پیر پکڑ رہا ہے، تب بھی یہ جناب کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ بھی بہت برا ہے۔ شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ دعوت کے لیے ایسا کوئی اصول نہیں ہے کہ پہلے سے کہا جائے تو ہی دعوت؛ اور اگر وقت پر کہا جائے تو عداوت۔

ایسا کسی حدیث میں نہیں آیا ہے۔ جو لوگ ایسا مزاج رکھتے ہیں انہوں نے اگر کہیں کسی حدیث میں دیکھا ہو تو ہمیں بھی بتادیں تاکہ ہم دوسروں کو بتاسکیں۔

گم راہ طفیلی کا قصہ:

ایک طفیلی کا قصہ ہے کہ چند شعراء کسی بادشاہ کی خدمت میں جا رہے تھے، ایک طفیلی نے دیکھا تو یوں سمجھا کہ دعوت ہوگی، اس لیے وہ بھی ساتھ ہوگیا، اس کو پتہ نہیں تھا کہ یہ شاعر لوگ ہیں، اور بادشاہ کی شان میں قصیدہ کہنے کے لیے جا رہے ہیں، اب ان کے ساتھ اندر داخل تو ہوگیا، جب وہ سب دربار میں پہنچے تو بادشاہ کی طرف سے اجازت ملی اور تمام شاعروں نے اپنا اپنا قصیدہ پیش کیا اور انعام پایا۔ یہ اخیر میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ میں تو دعوت سمجھ کر آیا تھا، یہاں تو مَیں پھنس گیا؛ اب کیا کروں۔ جب اس کی باری آئی تو پوچھا گیا: آپ کون ہیں؟ اس نے کہا: "وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ وَأَنَا مِنَ الْغَاوِيْنَ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ" میں ان گمراہوں میں سے ہوں جو شعراء کی اتباع کرتے ہوئے یہاں پہنچ گئے ہوں۔

دعاء

أَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ سَیِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ
کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زندگی کے جو آداب تعلیم و تلقین فرمائے ہیں، اے اللہ! ایک ایک ادب کو پورے عظمت واحترام کے ساتھ اختیار کرتے ہوئے اپنی زندگیوں میں اپنانے کی تو ہمیں توفیق وسعادت نصیب فرما۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اپنی مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلا کر نامرضیات سے پوری پوری حفاظت فرما۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ نفس و شیطان کی شرارتوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما، جو پریشان حال ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما۔ جو حاجت مند ہیں ان کی حاجتوں کو پوری فرما۔ اے اللہ! تمام مصائب، آفات وبلاؤں سے تیری پوری مخلوق کی پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! جس آندھی اور طوفان کے خطرے بتائے جاتے ہیں، اس سے تیری مخلوق کی پوری پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ان بلاؤں کو تو محض اپنے فضل سے ہٹالے۔ ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری جن بداعمالیوں کی وجہ سے یہ بلائیں آسکتی ہیں، محض اپنے فضل سے ان بداعمالیوں کو معاف فرما۔ اپنی شانِ کریمی سے معاف فرما۔ تمام شرکاءِ مجلس کی اور جنہوں نے بھی دعاؤں کی درخواستیں کی ہیں ان کی بھی جائز مرادوں کو پورا

فرما۔ نبی کریم (ﷺ) نے جتنی خیر و بھلائی تجھ سے مانگی وہ سب ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما، اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے جن شرور اور برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری امت کی حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

باب الأكل مِمَّا يليه ووعظه وتأديبه من يسيء أكله

اپنے سامنے سے کھانا اور خلافِ ادب کھانے والے کو نصیحت کرنا اور ادب سکھانا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کے آداب کی نصیحت:

حدیث ۷۴۰:-

عن عمر بن أبي سَلَمَة رضی اللہ عنہما قَالَ : كُنْتُ غُلاماً فی حِجْرِ رسولِ الله (ﷺ) وَ كَانَتْ يَدِی تَطِيشُ فی الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لی رسولُ الله (ﷺ) : يَا غُلامُ، سَمِّ اللهَ تَعَالَى، وَكُلْ بِيَمِينِكَ، وَكُلْ مِمَّا يَلِيكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عمر بن ابو سلمہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں چھوٹا بچہ تھا اور حضورِ اکرم (ﷺ) کی تربیت ونگرانی میں تھا، ایک مرتبہ کھانے کے دوران میرا ہاتھ پیالہ میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا تو نبی کریم (ﷺ) نے مجھے فرمایا: اے بچے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ، اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ، اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔ (یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے)

حدیث ۷۴۱:-

عن سلمة بن الأَكْوَعِ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً أَكَلَ عِنْدَ رَسُولِ الله (ﷺ) بِشِمَالِهِ. فَقَالَ: كُلْ بِيَمِينِكَ. قَالَ: لا أَسْتَطِيعُ. قَالَ: لاَ اسْتَطَعْتَ! مَا مَنَعَهُ إِلاَّ الكِبْرُ! فَمَا رَفَعَهَا إِلَى فِيهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم (ﷺ) کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے اس سے فرمایا: دائیں ہاتھ سے کھائو (تو حق بات

کو قبول نہ کرتے ہوئے)اس نے جواب میں کہا:میں دائیں ہاتھ سے کھانہیں سکتا(حالاں کہ ایسی بات نہیں تھی۔وہ دائیں ہاتھ سے کھاسکتا تھا لیکن اس نے تکبر کی وجہ سے انکار کیا تھااور بات نہیں مانی)توحضورِاکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ٹھیک ہے! اب نہیں کھاسکوگے(حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں)اس کے بعد کبھی وہ اپنادایاں ہاتھ اٹھاہی نہیں سکا (ہمیشہ کے لئے اس کادایاں ہاتھ بیکار ہوگیا۔)

(نوٹ:-یہ روایت پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے۔جلد:۸/روایت نمبر۶۱۳ پر بھی گزری ہے۔مرتب۔)

النّهى عن القِرَانِ بين تمرتين ونحوهما إِذَا أُكل جماعة إِلاَّ بإذن رفقته

مجمع کے ساتھ کھاتے وقت کھجور وغیرہ دو، دو نہ لے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کھانے کے آداب میں ایک اورادب بتلارہے ہیں کہ جب کئی آدمی مل کر کھانا کھارہے ہوں اور سب کے لیے مشترک طور پر کھانا رکھا گیا ہو، مثلاً: اگر کھائی جانے والی چیز کھجوریں ہیں ؛ تو کھانے والے ان کھجوروں کو دو دو دانے نہ اٹھائیں ،بلکہ ایک ایک دانہ اُٹھا کر استعمال کریں۔مطلب یہ ہے کہ کھانے کے دوران کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرناچاہیے جس کی وجہ سے ساتھ میں کھانے والوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔یہ ایک بہت اہم تعلیم ہے جو نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں دی ہے۔

ساتھ بیٹھ کر کھانے کے اہم آداب:

حدیث ۷۴۲:-

عن جَبَلَة بن سُحَيم قَالَ: أصَابَنَا عَامُ سَنَةٍ مَعَ ابن الزُّبَيْرِ؛ فَرُزِقْنَا تَمْراً، وَكَانَ عبدُ الله بن عمر رضی اللہ عنہما **يَمُرُّ بنا ونحن نَأكُلُ، فيقولُ: لاَ تُقَارِنُوا، فإنَّ النَّبِيَّ** (صلی اللہ علیہ وسلم) **نَهَى عنِ القِرَانِ، ثُمَّ يقُولُ: إلاَّ أنْ يَسْتَأذِنَ الرَّجُلُ أخَاهُ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جبلہ بن سُحَیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ قحط پڑ ا(قحط کے زمانہ میں ویسے بھی کھانے پینے کی چیزوں کی قلت ہوا کرتی ہے) توہمیں حکومت کی طرف سے کچھ کھجوریں مل گئی اورہم سب ساتھ بیٹھ کر کھارہے تھے،جب حضرت عبد

اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس سے گزرے تو فرمایا: کھانے کے دوران دو دو کھجوریں ایک ساتھ نہ اُٹھاؤ، اس لیے کہ نبی کریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے دو کھجوریں ساتھ اُٹھانے سے منع کیا ہے، البتہ اگر آدمی اپنے بھائی سے اجازت سے لے لے (اور وہ بہ رضا و رغبت اجازت دیدے، تو دو دو کھجوریں بھی ایک ساتھ اُٹھا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر انگور کھا رہے ہیں، تو دو دانہ انگور کے ایک ساتھ نہ اُٹھائے جائیں۔)

افادات:- یہاں ایک خاص تعلیم دی گئی ہے کہ ہر وہ چیز جس میں سب کا حق ہو- جیسے کہ یہاں جو کھانا رکھا گیا تھا اس میں سب برابر کے شریک تھے، اور سب کا برابر کا حق تھا- تو اس چیز میں سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے ہر آدمی کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ کسی دوسرے کی حق تلفی نہ ہو، کوئی بھی دوسرے سے زیادہ وصول نہ کر لے، یہ بہت ضروری تعلیم ہے۔ جب سب ساتھ مل کر کھا رہے ہوں تو ایک ساتھ دو کھجوریں اُٹھانے سے نبی کریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے جو منع فرمایا اس کی بنیاد یہی ہے۔

ہاں! اگر آپ اپنی ذاتی کھجوریں خرید کر لائے ہیں، تو پھر وہاں دو کیا، چار بھی ایک ساتھ اُٹھا کر کھا سکتے ہیں۔ لیکن اگر سب نے مل کر خریدی ہیں، یا کسی اور نے سب کے لیے رکھی ہیں، مثلاً: کسی کے یہاں دعوت ہے، اور وہاں سب کے سامنے کھانا رکھا گیا ہے، تو اس صورت میں جتنے بھی کھانے والے ہیں ان تمام کا اس کھانے میں برابر کا حق ہے، گویا سب شریک ہیں اور یہ چیز مشترک ہے، اب آپ کو اس میں سے اپنا حق وصول کرنا ہے، اور اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا ہے کہ اپنا حق وصول کرتے ہوئے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس کی وجہ سے

دوسروں کے حق میں کمی آجائے اور حق تلفی ہوجائے۔ دو کھجوریں ایک ساتھ اُٹھانے سے جو منع فرمایا ہے اس کی وجہ یہی ہے۔

آپ کسی کے یہاں دعوت میں جائیں تو ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ داعی کی جانب سے ہر ایک کے سامنے الگ الگ پلیٹ رکھی گئی ہے، جیسے: آئس کریم ہر ایک کو الگ الگ پلیٹ میں دی گئی ہے ،تو اس صورت میں چمچ میں آپ زیادہ لیں ،یا کم لیں ، اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے، کیوں کہ پلیٹ میں آپ کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ آپ پورا کررہے ہیں، کسی دوسرے کے حصہ میں آپ ہاتھ نہیں مار رہے ہیں۔ لیکن اگر ایک ہی پلیٹ میں آئس کریم رکھی گئی ہے اور کہا گیا کہ سب اس میں سے کھاؤ،تو اس صورت میں آپ اپنے چمچ میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اٹھائیں ،جس سے دوسروں کے حق میں کمی آتی ہو؛اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آپ اس انداز سے کھایئے کہ دوسرے کے حق کو ضائع کرنے والے نہ بنیں۔

یا جیسے آج کل عام طور پر دعوتوں میں ایک بڑے برتن میں سالن لا کر رکھ دیا جاتا ہے، دوسرے برتن میں چاول رکھ دیے جاتے ہیں،اور ہر ایک کے سامنے خالی پلیٹ ہوتی ہے،تا کہ ہرایک اپنے طورپر نکال کر کھائے،تواس میں بھی یہ بات ملحوظ رہے کہ جو چیز آپ نکال رہے ہیں اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ سالن والا بڑا برتن ہاتھ میں آگیا تو ساری بوٹیاں پہلے ہی اپنی پلیٹ میں نکال لیتے ہیں اوربعد والے صرف شوربے پر قناعت کرتے ہیں؛ایسا نہ کریں۔آپ کو دیکھنا ہے کہ برتن میں یہی ایک سالن آیا ہے،اور اس میں اتنی بوٹیاں ہیں کہ اگرسب کو برابر تقسیم کی جائے تو میرے حصہ میں ایک یا دو بوٹیاں ہی آتیں ،توجب آپ پہلے نکال رہے ہیں تو اپنی پلیٹ میں ایک یا دو سے زیادہ بوٹیاں نہ نکالیں ، تاکہ ہر ایک کو اس کے حصہ کے بقدر مل جائے۔بعضوں کی جوعادت ہوتی ہے کہ پہلے برتن ہاتھ میں آ جانے کی صورت میں پورااپنی پلیٹ میں ہی اتارلیتے ہیں،یہ بالکل غلط طریقہ ہے،اس میں دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس صورت میں تو آپ زیادہ وصول کرکے گویا اپنے بھائی کا حق مار رہے ہیں ،یہ گناہ ہے۔حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہی نقل فرماتے ہیں۔اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ جب بھی کسی کے دسترخوان پر جائیں تو یہ چیز ہمیشہ ملحوظ رہنی چاہیے،اپنی پلیٹ میں زیادہ اتارلیناعار کی چیز سمجھی جاتی ہے ،اوراس کوبدتہذیبی پر محمول کیا جاتا ہے۔

مہذب گیر تعلیم:

ایک مؤمن کو اللہ تعالیٰ اورآپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے جو بھی آداب تعلیم دیئے گئےہیں وہ سب ایسے ہیں کہ جس سے آدمی مہذب اور با ادب بنتاہے۔زندگی کے تمام شعبوں میں یہی

تعلیم ہے کہ آپ اپنا حق وصول کرنے میں ایسا کوئی طریقہ اختیار نہ کریں جس سے دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہو۔

مثلاً: ٹرین میں آپ کو سفر کرنا ہے، آپ نے سورت سے بمبئی کا ٹکٹ لیا، جب اسٹیشن پر پہنچے اور ٹرین میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ دوسرے پیسنجر ابھی آئے نہیں ہیں، اب آپ نے سیٹیں خالی دیکھ کر اپنا بستر بچھالیا اور ایک کے بجائے چار سیٹوں پر قبضہ کرکے لیٹ گئے، حالاں کہ آپ نے جو کرایہ ادا کیا ہے جس کی وجہ سے آپ کا حق تو صرف ایک سیٹ کا بنتا ہے، لیکن آپ دوسری تین سیٹوں پر جو قبضہ کررہے ہیں، تو اس طرح ظاہر ہے کہ آپ بعد میں آنے والوں کی حق تلفی بھی کررہے ہیں اور دوسروں کو تکلیف میں بھی ڈال رہے ہیں، پھر ہوتا یہ ہے کہ بعد میں آنے والے تو کھڑے ہیں اور آپ آرام سے لیٹے ہوئے ہیں، یہ بالکل گناہ کا کام ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ ایک تو آپ نے اپنے حق سے زیادہ وصول کیا اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی حق تلفی بھی کی، یعنی دوسرے لوگ اگر موجود نہ ہوتے تب بھی آپ ایک سے زیادہ سیٹ پر بیٹھ کر ایک سیٹ سے زیادہ وصول کرنے والے قرار دیئے جاتے۔

ترقی کا راز:

کسی زمانہ میں پڑھا تھا کہ ایک صاحب یورپ کے کسی سفر پر گئے تھے، انہوں نے بتلایا کہ فرانس میں ٹرین میں سفر کررہا تھا، دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہے اور اس پر خوب نیند

طاری ہے، باقی سیٹیں خالی تھیں،پورا ڈبہ خالی تھا لیکن وہ بیٹھے بیٹھے اپنی نیند پوری کررہاتھا۔میں نے اس سے کہا:باقی سیٹیں خالی ہیں،لیٹ جاؤ۔تو اس نے کہا: میں نے کرایہ ایک ہی سیٹ کا دیا ہے،اس لیے مجھے ایک ہی سیٹ استعمال کرنے کا حق ہے، چاہے باقی سیٹیں خالی ہیں لیکن مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔یوروپ والوں کی ترقی کارازیہی ہے،اس لیے کہ دنیاتو دارالاسباب ہے۔

اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زندگی گزارنے کا جو طریقہ ہمیں تعلیم فرمایا ہےاس میں ایسی تعلیمات ہیں جس میں دنیا وآخرت دونوں کی بھلائی،راحت اور فائدہ موجودہے۔معاشرت یعنی زندگی گزارنے اور آپس کے تعلقات کو نبھانے کاجوطریقہ بتلایا ہےاس میں اگرہم شریعت کے احکام کا لحاظ کریں گےتوہماری دنیوی زندگی بھی راحت و آرام،سکھ، چین واطمینان والی بن جائے گی۔اور اگرہم شریعت کالحاظ صرف عبادات، نماز،روزہ وغیرہ میں کریں،اور معاشرت،اخلاق ومعاملات میں نہ کریں ؛تو دنیوی اعتبارسے پریشانیوں کا شکارہوں گے۔یوروپ والے اگرچہ ایمان نہیں رکھتے جس کی وجہ سے آخرت کی نجات یعنی جہنم سے بچاؤ تو نصیب نہیں ہوگا ،لیکن معاشرت کے اندران چیزوں کو وہ اپنائےہوئے ہیں جن کی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں تعلیم دی ہےجس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیوی اعتبار سےوہ راحت ، چین اوراطمینان سے ہیں۔

اسی طرح وہ لوگ معاملات کے اندر دیانت وامانت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہیں کسی چیز میں کوئی عیب ہے ،اور دیکھنے میں چاہے وہ چیز معمولی ہو لیکن وہ فوراً بتا دیتے ہیں کہ اس میں یہ نقص ہے۔استعمال شدہ چیز کے بارے میں بتادیتے ہیں کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے۔بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ خریدنے والا چاہے کتنا ہی ماہر ہو لیکن اس کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ چیز استعمال شدہ ہے مگر وہ بتا دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت بھی برابر ترقی کر رہی ہے، کاروبار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ہمارے یہاں یہ ہے کہ ہم اپنے کاروبار میں غبن اور دھوکہ بازی سے کام لیتے ہیں ،تو اچھا خاصہ کاروبار چل رہا ہوتا ہے،لیکن تھوڑی سی دھوکے بازی کے نتیجہ میں سارا اعتماد ختم ہو جاتا ہے اور ہمیشہ کے لیے آدمی نقصان اُٹھاتا ہے۔

شرعی قانون پر عمل کا ایک کافر کو فائدہ:

کسی رسالہ میں پڑھا تھا کہ جنوب کے کسی علاقہ میں ایک صاحب تھے، وہاں بارش نہیں ہوئی پھر بھی ان کی کھیتی باڑی کو نقصان نہیں ہوا، دوسروں کی کھیتیوں کو روگ لگتے،لیکن اس کی کھیتی کو کبھی کوئی روگ بھی نہیں لگتا تھا، بارش کی کمی کی وجہ سے دوسروں کی پیداوار میں کمی آتی تھی لیکن اس کو کبھی کمی نہیں ہوتی تھی۔کسی نے پوچھا: بھائی !کیا بات ہے؟اس نے کہا:میں نے پڑھا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں یہ حکم ہے کہ اگر بارش کے پانی سے کھیتی ہو تو دسواں حصہ،اور اگر خود پانی پلایا ہو تو بیسواں حصہ نکال کر اس کا صدقہ کیا جائے؛مَیں جب سے اس پر

عمل کرتاہوں تو آج تک کبھی میری کھیتی کو نقصان نہیں ہوا۔ توشریعت کا قانون بہت قیمتی ہے، وہ بھلے ہی کافر تھالیکن اس نے دنیا میں اس حکم پر عمل کیاتودنیوی طور پراس کاجوفائدہ ہے وہ اس کوحاصل ہوا،اگرچہ ایمان نہ ہونے کی وجہ سے آخرت کافائدہ نہیں ملے گا۔

معاملہ کتنا سنگین ہے:

خیر !مَیں یہ بتلارہاتھاکہ مشترک چیزوں کے استعمال کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتایا ہے کہ ایساکوئی طرزاختیار نہ کیاجائے جس میں کسی کاحق مارا جائے،یاکسی کوتکلیف ہو۔مثلاً:ہم ٹرین میں سفر کررہے ہیں،اوردوسروں کی سیٹوں پر قبضہ کرکے سوگئے اوردوسرے لوگ کھڑے رہے توقرآنِ پاک میں آیاہے: ﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ﴾جوساتھی تھوڑی دیر کے لیے ساتھ ہوگیااس کا بھی حق ہے،لیکن اس طرح ہم نےاس کی حق تلفی کی۔دوچار گھنٹے کے بعدوہ اورہم جدا ہوگئے ،پھر چند سالوں کے بعدکسی کے بتانے سے ہمیں احساس ہوا کہ ہم نے یہ جو کیاتھا وہ غلط تھا اور گناہ کا کام تھا،اب توبہ کی توفیق ہوئی توجولوگ موجود ہیں اورجن کو جانتے بھی ہیں ان سےتومعافی مانگ لیں گے ،لیکن وہ ساتھی جو سفرمیں ہنگامی طورپر ساتھ ہوگیاتھاجس کو تو ہم جانتے بھی نہیں ہیں ،اورنہ اس کاکوئی ایڈریس ہے، ہم نے اس کی جوحق تلفی کی ہےاس کی تلافی کاکیاراستہ ہوگا!اب چاہےراتوں کواللہ تعالیٰ کے سامنے ہم کتنا ہی روئیں،

لیکن جب تک وہ معاف نہ کرے وہاں تک معاف ہونے والا نہیں ہے، اس لیے سوچو کہ معاملہ کتنا سنگین ہے!۔

معمولی سی غفلت سے حرام کا ارتکاب:

اسی لیے جو چیزیں مشترک ہوا کرتی ہیں اس میں سے اپنے حق کی وصول یابی کے لیے شریعت نے ہمیں باقاعدہ یہ طریقہ بتلایا ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ جس سے کسی کو تکلیف بھی نہ ہو، اور کسی کا حق بھی مارا نہ جائے۔ مثلاً: گھر میں یا دار الاقامہ (Boarding) میں چند لوگ ساتھ میں رہتے ہیں، تو سب کے غسل کے واسطے ایک ہی بالٹی ہوتی ہے، یا بیت الخلاء میں لوٹا ہوتا ہے، تو اس کو مشترک سمجھ کر استعمال کیا جائے، اور پھر استعمال کرکے اسی جگہ رکھا جائے جہاں اس کی جگہ متعین ہوتی ہے۔

آج کل ایک مزاج ایسا بن گیا ہے کہ ایسی چیزوں کو استعمال کے بعد جہاں جی چاہا ڈال دیتے ہیں، جب دوسرے آدمی کو ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اس کی مقررہ جگہ پر تلاش کرتا ہے، اور جب اس کو وہ نہیں ملتی تو تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حرام ہے۔ ایک معمولی سی غفلت کی بنا پر ہم حرام کام کا ارتکاب کرلیتے ہیں، اور دوسروں کو تکلیف میں ڈال دیتے ہیں۔

اسی طرح بیت الخلاء مشترک استعمال کی چیز ہے، تو آپ اس کو استعمال کر کے اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے وہ اپنایئے، اس میں پانی ڈالنے اور فلش کرنے کا اہتمام بھی ضروری ہے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ فراغت کے بعد نجاست کو ویسا ہی چھوڑ کر نکل آتے ہیں، اگر ہم کبھی جاتے ہیں اور ایسی صورت پیش آتی ہے تو ہماری طبیعت اس کا بڑا برا اثر لیتی ہے اور اس سے ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے، ہم سوچتے ہیں کہ کیسے نامعقول آدمی نے اس کو استعمال کیا ہے؟ پھر اگر ہم بھی ایسی ہی شکل اختیار کریں تو اس کا نتیجہ بھی تو یہی نکلے گا؛ حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تو جب آپ بیت الخلاء کو استعمال کر رہے ہیں تو فراغت کے بعد اس کی صفائی کا جو طریقہ ہے اس کو عمل میں لاتے ہوئے اس کو صاف کر کے نکلیے، ایسا نہیں کہ ویسا ہی چھوڑ کر نکل آئے۔ اسی طرح چھوڑ دینے کی شکل میں دوسروں کو جو تکلیف ہوگی اس کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

اہلِ یوروپ کے یہاں اصول کی پابندی:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مَیں انگلینڈ میں ٹرین کے اندر سفر کر رہا تھا، مجھے استنجاء کا تقاضہ ہوا تو میں بیت الخلاء کے پاس گیا، وہاں دیکھا کہ ایک خاتون کھڑی ہوئی تھی تو مَیں یوں سمجھا کہ اندر کوئی ہے، اس کے نکلنے کے انتظار میں یہ کھڑی ہے، مَیں واپس جا کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر دیکھا تو وہ عورت وہیں کھڑی تھی، مَیں بیت الخلاء کے پاس گیا تو دیکھا کہ دروازہ پر لکھا ہوا تھا کہ خالی ہے، تو مَیں

نے اس خاتون سے کہا: اگر آپ اندر جانا چاہتی ہیں تو جائیں، ورنہ مَیں جاؤں؟ اس نے کہا: مَیں ایک خاص وجہ سے یہاں کھڑی ہوں، دراصل مَیں اپنی ضرورت کے لیے اندر گئی تھی، فراغت کے بعد فلش کرنا چاہتی تھی کہ ٹرین اسٹیشن پر آکر کھڑی ہوگئی، اب چوں کہ اندر لکھا ہے کہ جب گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہو تو بیت الخلاء کو استعمال بھی نہ کیا جائے اور فلش بھی نہ کیا جائے، اب مَیں اس انتظار میں ہوں کہ گاڑی چلے تو مَیں فلش کرکے اس کو صاف کروں۔

دیکھئے! یوروپ والے اصول کی پابندی کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ڈابھیل میں:

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ جس زمانہ میں ڈابھیل میں قیام تھا، تو جہاں آج بھی اساتذہ کی قیام گاہ ہے، اس کے سامنے اس وقت بیت الخلاء تھے، آج کل تو وہ بند کردیئے گئے ہیں، انہی بیت الخلاء میں حضرت شاہ صاحب تشریف لے جاتے تھے، پانی باہر سے لے کر جانا پڑتا تھا، اور اس کا قدمچہ جو بنا ہوا تھا وہ فلش کے انداز کا بنا ہوا تھا، اور ایسے انداز کا جو بیت الخلاء بنا ہوا ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ڈالنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو حضرت شاہ صاحبؒ فراغت کے بعد بار بار باہر سے لوٹے میں پانی بھر کر لے جاتے اور ڈالا کرتے تھے، تاکہ اندر بدبو بھی باقی نہ رہے اور کسی کے استعمال کے نتیجہ میں جو بدبو پیدا ہوتی ہے اس بدبو سے بھی بعد میں جانے والے کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

دیکھو! ہمارے اکابر اس کا بھی کتنا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ تو کسی بھی مشترک چیز کو اس طرح استعمال کرنا جس سے دوسروں کو تکلیف ہو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

مشترک کاروبار کی بد نظمی:

اسی طرح ہمارے یہاں جو کاروبار عام طور پر مشترک ہوتے ہیں ، اس کے اندر بھی ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ سب کو برابر کا حق ملے، یعنی سب کے حقوق اور حصے معلوم ہونے چاہئیں۔ آج کل ہمارے سماج میں یہ بھی ایک مصیبت ہے کہ باپ کے ساتھ کاروبار میں جب بیٹے وغیرہ شریک ہوتے ہیں تو ہر ایک کا کتنا حصہ رہے گا وہ متعین نہیں کیا جاتا، کسی بھی تعین کے بغیر ساتھ میں کام کرتے ہیں۔ اگر شروع میں کہا جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ ایک باپ کی اولاد ہے، اس کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایسی بھی کیا غیریت دکھلانی؟ لیکن پھر ہوتا یہ ہے کہ جب بڑوں کی شادی ہو جاتی ہے اور ان کی اولاد ہوتی ہے، تو ایک کے یہاں چار اولاد ہوئی اور دوسرے کے یہاں ایک ہی ہے، تیسرے کے یہاں دس ہے، اب چقمق شروع ہوتی ہے کہ دس والا تو بہت کھاتا پیتا ہے، اس کے یہاں زیادہ پیسہ استعمال ہوتا ہے، اور اس کے یہاں زیادہ چیزیں جاتی ہیں۔ اب اگر کسی کے یہاں شادی کی نوبت آئی تو کہا جاتا ہے کہ اس کے یہاں تو زیادہ خرچ کیا گیا، میرے یہاں کے موقع پر کم خرچ کیا گیا۔ ایک زمانہ تک یہ سلسلہ چلتا ہے، لیکن یہی چیزیں دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہتی ہیں ، اور دلوں کے اندر میل پیدا ہوتا رہتا ہے، پھر یہی لاوا

کسی دن جب باہر آتا ہے، تو ایسا آتا ہے کہ زندگی بھر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اسی بدنظمی کی وجہ سے ہوتا ہے جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ شریعت تو یہ کہتی ہے کہ پہلے ہی سے سب کے حصے متعین کردئے جائیں۔ والد کو بھی چاہیے کہ سب کے حصے ان کی حیثیت کے مطابق طے کردے کہ منافع (Profit) میں سے ہر ایک کو اتنا اتنا حصہ دیا جائے گا؛ تاکہ بعد میں پریشانی کی نوبت ہی نہ آئے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا عمل:

گھر کی چیزیں بھی متعین کردی جانی چاہئیں، ایک ہی گھر میں سب ساتھ رہتے ہیں تو کون کس چیز کا مالک ہے، اس کا بھی خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: آج اگر میرا انتقال ہوجائے تو میری چیزوں کے معاملہ میں کسی کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اس لیے کہ حضرت کی دو اہلیہ تھیں، اور حضرت فرماتے تھے کہ: مَیں نے لکھ دیا ہے کہ بڑی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور چھوٹی اہلیہ کے گھر میں جو بھی ہے وہ ان کا ہے، اور میری چیزیں خانقاہ کے میرے کمرے میں رکھی ہوئی ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وصیت نامہ:

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مولانا محمد تقی صاحب فرماتے ہیں کہ: آخری زمانہ میں جب صاحب ِفراش تھے تو ان کا یہ حال تھا کہ اگر پانی منگاتے اور ہم گلاس میں پانی لاتے تو پانی پی لینے کے بعد تقاضہ فرماتے کہ یہ گلاس لے جاؤ، اگر کبھی وہیں رکھ کر ہم کسی دوسرے کام میں مشغول ہوجاتے تو بہت ناراض ہوتے۔ایک مرتبہ ہم نے پوچھا کہ: ابّا جان! اگر کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے گلاس یا برتن لے جانے میں ذرا دیر ہوجاتی ہے؛ تو آپ اتنا زیادہ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟تب فرمایا: بات دراصل یہ ہے کہ مَیں نے اپنے وصیت نامہ میں یہ لکھا ہے کہ میرے اس کمرے میں جتنی چیزیں ہیں اس کا مالک میں ہوں، اور گھر میں دوسری جگہوں میں جو چیزیں ہیں اس کی مالک تمہاری والدہ ہیں ،اب اگر تم وہاں سے میرے لیے کوئی چیز برتن وغیرہ لائے اور فراغت کے بعد میں فوراً بھیجنا چاہتا ہوں لیکن تم لے جانے میں دیر کرتے ہو تو مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ خدانہ کرے اس دوران اگر میری موت آگئی اور یہ برتن میرے کمرے میں رہا تو میرے وصیت نامہ میں لکھے ہوئی تحریر کے مطابق لوگ یوں سمجھیں گے کہ یہ میرے کمرے میں ہے، اس لیے اس کا مالک میں ہوں، اوراس کو بھی میراث میں شمار کرلیں گے۔

خلاصہ ٔ روایت:

بہر حال! یہ ساری چیزیں ہیں جس کا لحاظ بہت ضروری ہے۔ مشترک چیزوں میں دوسروں کی حق تلفی نہ ہو، یہ بھی بہت ضروری ہے، اور اپنا حق بھی اپنی حد کی مقدار میں ہی وصول کرنا چاہیے، اس کا بھی ہمیں پورا خیال رکھنا چاہیے۔

اسی کو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو کھجوریں ساتھ لینے سے منع فرمایا۔ ہاں! ساتھی اگر اجازت دیں تو اس صورت میں کوئی بات نہیں۔ یا دوسری شکل یہ ہے کہ میزبان نے کھانے کا اتنی وافر مقدار میں انتظام کیا ہے کہ اگر آپ دو دو چار چار کھجوریں ایک ساتھ اُٹھائیں گے تب بھی کسی دوسرے کا حق ضائع ہونے والا نہیں ہے، جس کو جتنا چاہیے اتنا ملے گا، تو اس صورت میں بھی گنجائش ہے۔

باب مَا یقوله ویفعله من یأکل وَلاَ یشبع

کھانے سے سیری نہیں ہوتی؛ کیا کرے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیا باب قائم کیاہے کہ جو آدمی کھانا کھائے پھر بھی اس کا پیٹ نہ بھرتا ہو؛تو وہ کیا طریقہ اختیار کرے؟اوراس بے برکتی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا کہے؟

الگ الگ کھانے کی نحوست:

حدیث ۷۴۳:-

عن وَحْشِيِّ بن حرب رضی اللہ عنہ أَنَّ أصحابَ رسولِ الله (ﷺ) قالوا: يَارسولَ الله، إِنَّا نَأْكُلُ وَلاَ نَشْبَعُ ؛ قَالَ: فَلَعَلَّكُمْ تَفْتَرِقُونَ. قالوا : نَعَمْ. قَالَ: فَاجْتَمِعُوا عَلَى طَعَامِكُمْ، وَاذْكُرُوا اسْمَ اللهِ، يُبَارَكْ لَكُمْ فِيهِ. (رواہ أبو داود)

ترجمہ:- حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنھم میں سے کچھ لوگوں نے آکر نبیٔ کریم (ﷺ) سے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم کھاتے ہیں اور پیٹ نہیں بھرتا (کھاتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتاہے کہ جیسے بھوکے ہی ہیں) حضور (ﷺ) نے فرمایا: ایسا معلوم ہوتاہے تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟(ساتھ میں مل بیٹھ کر نہیں کھاتے) انہوں نے کہا: جی ہاں ! ایساہی ہے۔ تو حضور (ﷺ) نے

فرمایا: ساتھ مل کر کھایا کرو (الگ الگ مت کھاؤ) اور کھاتے وقت اللہ کا نام لیا کرو، اس میں تمہیں برکت دی جائے گی۔

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ اگر آدمی شروع میں بسم اللہ نہیں پڑھتا، اللہ کا نام نہیں لیتا تو شیطان کھانے میں شریک ہوجاتا ہے اس کی وجہ سے برکت ختم ہوجاتی ہے۔ تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ دو کام کرنے ہیں، ایک تو شروع میں بسم اللہ پڑھو، اور دوسرا یہ کہ ساتھ میں مل کر کھاؤ، الگ الگ مت کھایا کرو، گویا بے برکتی سے بچنے کا یہ ایک طریقہ بتلایا۔

الأمر بالأكل من جانب القصعة والنهي عن الأكل من وسطها

برتن کے ایک طرف سے کھانے کا حکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کا ایک اورادب:

یہ بھی آداب میں سے ہے کہ برتن کے بیچ میں سے نہ کھائے، یا چاروں طرف ہاتھ نہ مارے؛اس لیے کہ اگرسب طرف سے کھائے گا اور کھانا بچے گا تووہ اس قابل نہیں رہے گا کہ دوسرا آدمی اس کو استعمال کرے۔اور بہت سی مرتبہ ایساہوتاہے کہ دوسرے لوگ ایسے کھانے کواستعمال کرنے سے کراہیت اورناگواری محسوس کرتے ہیں اگر ایک طرف سے کھایاہوگاتوجو کھانابچا ہوا ہوگاوہ ایسامحسوس ہوگا کہ کسی نے اس کو کھایا نہیں ہے،اور دوسرےلوگ اس کو استعمال کرنا چاہیں گے تو کریں گے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے اب اگربرکت اترنے کی جگہ ہی آپ نے اُڑادی؛توپھر برکت کہاں آئے گی؟جیسے: ہیلی کوپٹر کاجو ہیلی پیڈہوتاہے ، وہی اگرآپ نے نکال دیاتواب ہیلی کوپٹرکہاں اُترے گا؟ حضور ﷺ فرماتےہیں کہ: برکت بیچ میں اترتی

ہے،اس لیے اس جگہ کو باقی رکھو،ورنہ برکت نہیں اترے گی۔اور یہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی بتلائی ہوئی بات ہے،اس لیے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ بیچ میں ہی کیوں اترتی ہے، دوسری طرف کیوں نہیں اترتی؟

برکت برتن کے بیچ میں اترتی ہے:

حدیث ۲۴۴:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما عن النبيِ (ﷺ) قَالَ: البَرَكَةُ تَنْزِلُ وَسَطَ الطعَامِ؛ فَكُلُوا مِنْ حَافَتَيْهِ، وَلاَ تَأكُلُوا مِنْ وَسَطِهِ. (رواه أبو داود والترمذي)

ترجمہ:—حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: برکت؛ کھانے کے بیچ میں اترتی ہے، اس لیے اس کے کناروں سے کھاؤ،بیچ میں سے مت کھاؤ۔

حدیث ۲۴۵: -

وعن عبد الله بن بُسْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ للنَّبِيِّ (ﷺ) قَصْعَةٌ يُقَالُ لَهَا: الغَرَّاءُ يَحْمِلُهَا أرْبَعَةُ رجالٍ؛ فَلَمَّا أضْحَوْا وَسَجَدُوا الضُّحَى أُتِيَ بِتِلْكَ الْقَصْعَةِ؛ يعني وَقَدْ ثُرِدَ فِيهَا فَالتَفُّوا عَلَيْهَا. فَلَمَّا كَثُرُوا جَثَا رسول الله (ﷺ). فَقَالَ أعرابيٌّ: مَا هذِهِ الجِلْسَةُ؟ فَقَالَ رسولُ الله (ﷺ): إنَّ اللهَ جَعَلَنِي عَبْداً كَرِيماً، وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّاراً عَنِيداً. ثُمَّ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): كُلُوا مِنْ حَوَالَيْهَا، وَدَعُوا ذِرْوَتَهَا؛ يُبَارَكْ فِيهَا. (رواه أبو داود بإسنادٍ جيد) ((ذِرْوَتها)): أعْلاَهَا بكسر الذال وضمها.

ترجمہ:-حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کا ایک بڑا پیالہ تھا جس کا نام "غَرَّآء" تھا، وہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں کھانا رکھنے کے بعد اس کو چار آدمی چار طرف سے اُٹھاتے تھے، اور کئی آدمی ایک ساتھ بیٹھ کر اس میں کھا لیا کرتے تھے۔ایک روز صبح لوگوں نے چاشت کی نماز ادا کرلی تو وہ پیالہ لایا گیا اور اس میں ثرید تیار کیا گیا تھا ("ثرید" یعنی گوشت کے شوربہ میں روٹیاں توڑ کر ڈال دی جائیں اور وہ نرم ہو جائیں ؛یہ ثرید کہلاتا ہے، جس کو ہم "ملیدہ" کہتے ہیں)اور لوگ اس کے اِرد گرد بیٹھ گئے۔جب زیادہ آدمی ہوگئے تو نبیٔ کریم (ﷺ) دوزانو سرسری نشست سے بیٹھ گئے(جب لوگ زیادہ ہو جاتے ہیں تو جگہ بھی تنگ پڑتی ہے اور لوگوں کو کھل کر جم کر بیٹھنے کی نوبت نہیں آتی۔تو آپ (ﷺ) بھی سرسری نشست سے بیٹھ گئے)ایک دیہاتی نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو اس طرح بیٹھا ہوا دیکھا تو کہنے لگا: یہ بیٹھنا کیسا ہے؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے شریف غلام بنایا ہے، متکبر و سرکش نہیں بنایا ہے(یعنی جم کر بیٹھنے والی اور زیادہ جگہ روکنے والی نشست اور بیٹھک سرکش اور متکبر لوگوں کی ہے)پھر حضور (ﷺ) نے فرمایا: اس کے کناروں پر سے کھاؤ، اور بیچ کا حصہ چھوڑ دو؛ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت نازل ہوتی رہتی ہے۔

کراھیۃ الأکل متکئاً

ٹیک لگاکر کھانے کاناپسندیدہ ہونا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کے آداب کابیان چل رہاتھا،ایک اورعنوان قائم کیا ہے کہ ٹیک لگاکر کھانے کا ناپسندیدہ اورمکروہ ہونا۔چناں چہ روایت لائے ہے۔

کھانے کے لیے حضوراکرم (ﷺ) کی پسندیدہ بیٹھک:

حدیث ۷۴۶:-

عن أَبِي جُحَيْفَةَ وَهْبِ بن عبد الله رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : لاَ آكُلُ مُتَّكِئاً .(رواہ البخاری)

قَالَ الخَطَّابِيُّ : المُتَّكِئُ هاهُنَا : هُوَ الجالِسُ مُعْتَمِداً عَلَى وِطَاءٍ تحته . قَالَ : وأرادَ أنَّهُ لا يَقْعُدُ عَلَى الوِطَاءِ وَالوَسَائِدِ كَفِعْلِ مَنْ يُرِيدُ الإكْثَارَ مِنَ الطَّعَامِ ، بل يَقْعُدُ مُسْتَوفِزاً لاَ مُسْتَوطِئاً ، وَيأكُلُ بُلْغَةً . هَذَا كلامُ الخَطَّابِيِّ . وأشارَ غَيْرُهُ إِلَى أنَّ الْمُتَّكِئَ هُوَ المائِلُ عَلَى جَنْبِهِ . والله أعلم .

ترجمہ:- حضرت ابوجُحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

افادات:- ٹیک لگانے سے کیا مراد ہے؟ بعض حضرات نے ٹیک لگانے کا مطلب یہ بیان کیاہے کہ کوئی آدمی کھانے کے لیے دائیں طرف یا بائیں طرف جھک کر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تواس کو "ٹیک لگانا" کہیں گے، جس کو عربی میں "إِتِّكَاء" کہتے ہیں۔ لیکن علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے ایک مطلب ذکر کیا ہے کہ آدمی نیچے کوئی چیز بچھا کر جم کر بیٹھ کر کھائے۔ جس آدمی کا ارادہ پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ہوتا ہے ،وہ یہ کوشش کرتا ہے کہ ذرا اچھی طرح جم کر بیٹھے تاکہ برابر کھاسکے۔

دیکھو! پہلے سے زیادہ کھانے کی جو نیت ہوتی ہے اس کو اسلام پسند نہیں کرتا، نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیم بھی یہ نہیں ہے، بلکہ ہمیں تو یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کھانا تو زندگی باقی رکھنے کے لیے بقدرِ ضرورت ہوتا ہے، اس لیے آدمی کھانے کو اپنی زندگی کا مقصود نہ بنائے۔ جو لوگ کھانے کو زندگی کا مقصود بنائے ہوئے ہوتے ہیں ان کا مزاج اور سوچ ہی یہ ہوا کرتی ہے کہ اس طرح کھانے کے لیے بیٹھو کہ خوب اطمینان سے برابر جم کر کھانا وصول کرسکیں۔ یہاں علامہ خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اپنے نیچے کوئی اچھا بچھونا بچھا کر اور نرم چیز رکھ کر جم کر بیٹھنے سے نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا اور اس کو پسند نہیں کیا۔ بلکہ کھانے کے لیے نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نشست اور بیٹھک سرسری ہوا کرتی تھی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جم کر نہیں بیٹھتے تھے، بلکہ ایک آدمی کوئی کام عجلت اور جلدی میں انجام دینا چاہتا ہو تو وہ جس طرح بیٹھتا ہے، اسی طرح بیٹھتے تھے۔ جیسے: آپ کسی کے ساتھ عجلت میں بات کرنے کے لیے بیٹھتے ہیں تو اکڑو بیٹھ جاتے ہیں ،یا ایسی

بیٹھک ہوتی ہے کہ بس جلدی سے فارغ ہو کر اُٹھ جاؤں گا۔ معلوم ہوا کہ کھانے کے لیے بھی اسی انداز کی بیٹھک ہونی چاہیے کہ جس میں آدمی جم کر نہ بیٹھے، بلکہ سرسری نشست ہو۔ سرسری بیٹھک کو عربی میں "إِسْتِيْفَازْ" کہتے ہیں کہ اگر اُٹھنے کے لیے کہا جائے تو دیر نہ لگے۔ جب آدمی جم کر بیٹھتا ہے تو اُٹھنے میں ذرا تکلّف ہوتا ہے اور دیر لگتی ہے، اور جو سرسری نشست ہوتی ہے اس میں اُٹھنے میں دیر نہیں لگتی، بلکہ آدمی فوراً کھڑا ہو جاتا ہے۔ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کھانے کے لیے اسی طرح کی ہیئت، اور بیٹھک و نشست کو پسند فرماتے تھے کہ جس میں جم کر نہ بیٹھا جائے، اور زیادہ کھانے کا ارادہ بھی نہ ہو۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بقدرِ ضرورت یعنی اتنا تھوڑا سا کھانا کھاتے تھے کہ جس سے آدمی کی جان بچ جائے اور ضرورت پوری ہو جائے، جس کو بقدرِ سدِّ رَمَق کہا جاتا ہے۔ ہمیں بھی یہی تعلیم دی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کھانے کے لیے اس نوع کی بیٹھک اختیار کرنا جس میں پہلے ہی سے زیادہ کھانے کا ارادہ ہو اس کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پسند نہیں فرمایا، اور اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "لَآ آكُلُ مُتَّكِئاً" میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا، یعنی جم کر بیٹھ کر نہیں کھاتا، بلکہ میرا کھانا سرسری نشست کے ساتھ بڑی عجلت میں ہوا کرتا ہے۔

ویسے بھی کھانا ایک طبعی ضرورت ہے جس کو آدمی پورا کرتا ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اس میں اپنا زیادہ وقت صرف نہ کرے،بلکہ کم سے کم وقت میں اپنی اس ضرورت کو پوری کرلے۔

بیٹھک کا اصولی طریقہ:

حدیث ۷۴۷:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ **قَالَ:رَأَيْتُ رسولَ الله (ﷺ) جَالِساًمُقْعِياًيَأْكُلُ تَمْراً.** (رواہ مسلم)

((المُقْعِي)):هُوَالَّذِي يُلْصِقُ أَلْيَتَيْهِ بالأرض،وَيَنْصِبُ سَاقَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے آپ (ﷺ) کو دیکھا کہ آپ اُکڑو بیٹھے ہوئے کھجور تناول فرمارہے تھے۔

افادات:- ''مُقْعِياً''کا مطلب یہ ہے جیسا کہ خود علامہ نووی رضی اللہ عنہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ: آدمی اپنی سرین زمین کے ساتھ ملاکرپاؤں کی پنڈلیاں کھڑی کرکے بیٹھے،اس کو عربی میں ''إِقْعَآء''کہتے ہیں ،اسی کو ہم ''اُکڑو بیٹھنا'' کہتے ہیں۔

اب کھانے کے لیے بیٹھک کون سی ہونی چاہیے؟تو اصولی طور پر علماء نے لکھا ہے کہ: آدمی کھانے کے لیے ایسی نشست اختیار کرے جس میں کھانے کا اکرام ظاہر ہوتاہو۔اگرایک

آدمی کرسی پر ٹیک لگا کر پیچھے ہو کر اس طرح بیٹھتا ہے کہ گویا کھانے کی طرف سے استغناء اور بے فکری معلوم ہوتی ہے کہ وہ محتاج نہیں ہے بلکہ کھانا اس کی طرف آرہا ہے؛ اس کو پسند نہیں کیا گیا، بلکہ آدمی اس انداز سے بیٹھے جس سے یہ پتہ چلے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت یعنی کھانے کا محتاج ہے، اور جس ہیئت میں زیادہ سے زیادہ تواضع وانکساری معلوم ہوتی ہو، ایسی ہی بیٹھک پسندیدہ ہے۔

اب بیٹھنے والوں اور جو کھانا رکھا جاتا ہے دونوں کی سطح اگر یکساں ہو تو زیادہ پسندیدہ ہے۔ چناں چہ زمین پر کوئی دستر خوان - چاہے وہ چمڑے، پلاسٹک، یا کپڑے کا ہو - بچھا کر اس پر کھانا رکھا جائے اور آدمی بھی زمین پر ہی بیٹھے، یعنی کوئی نرم بچھونا نہ بچھائے؛ یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ ہاں! کوئی باریک بچھونا بچھایا جائے جس سے آرام مقصود نہ ہو، بلکہ زمین کی گرد سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایسی بیٹھک جس میں آدمی کی تواضع وانکساری کا پتہ چلتا ہو اور کھانے کی تعظیم و احترام معلوم ہوتی ہو، اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھانے، اور کھانے اور کھانے والے کی سطح دونوں کے یکساں ہونے کو زیادہ پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق:

اب کھانے والے کی تواضع والی بیٹھک اور ہیئت کیا ہو؟ تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے شامی میں تین طرح کی بیٹھکیں ذکر کی ہیں :-

۱:-"اُکڑو" یعنی آدمی سرین پر بیٹھے اور گھٹنوں کو کھڑا رکھے؛اسی کو انہوں نے پہلا درجہ دیا ہے۔

۲:-"دو زانو" یعنی جیسے ہم نماز میں قعدہ کے اندر بیٹھتے ہیں ، لیکن اس میں یہ ہے کہ نماز میں بیٹھنے کے دوران توبائیں پاؤں کو بچھا کر دائیں پاؤں کو کھڑا رکھتے ہیں ، اور کھانے کے لیے بیٹھنے میں دونوں پاؤں کو بچھایا جائے گا،اورایک کی پشت دوسرے پر رکھ کراور آگے کی طرف جھک کر بیٹھیں گے۔

۳:-اور تیسری ہیئت یہ ہے کہ بایاں پاؤں نیچے موڑکر،اور دایاں پاؤں کھڑا رکھ کر بیٹھے۔

یہ تین ہیئتیں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ترتیب سے ذکر کی ہیں کہ یہ تینوں ہیئتیں گویا عاجزی و انکساری والی ہیں ، ان میں سے کوئی بھی اختیار کرے۔

ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟:

اب یہ بات آتی ہے کہ ٹیبل کرسی پر کھانا کیسا ہے؟ تو پہلے زمانہ کے اندر وہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ بات باقی نہیں رہی، اس لیے نفس جائز ہونے میں تو کوئی کلام نہیں ہے۔ اسی لیے علماء فرماتے ہیں کہ کرسی ٹیبل پر کوئی آدمی کھائے گا تو وہ جائز ہے، البتہ اگر زمین پر بیٹھ کر کھائے گا تو یہ نشست سنت سے زیادہ قریب ہے، اور اس میں انکساری پائی جاتی ہے اور ثواب کا حق دار زیادہ ہوگا، اس لیے کبھی اگر ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی نوبت آجائے تو اس کو منع نہیں کریں گے، بلکہ اس کی گنجائش ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا طرز:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ ٹیبل کرسی پر بیٹھ کر کھایا، اور چوں کہ اُس زمانہ میں ٹیبل کرسی کا اتنا زیادہ چلن نہیں تھا جتنا آج کل ہے، اور اُس وقت یہ متکبرین کا شعار سمجھا جاتا تھا، اس لیے حضرت نے ان کے تشبہ سے بچنے کے لیے ٹانگیں اوپر لے لیں، یعنی کرسی کے اوپر دونوں ٹانگیں لے لیں اور کھانا کھایا۔ لیکن اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں ہے، بلکہ جواز کی حیثیت سے اس کی بھی پوری گنجائش ہے۔ باقی یہ ہے کہ سنت سے زیادہ قریب یہی ہے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب استحباب الأكل بثلاث أصابع واستحباب لعق الأصابع، وكراهة مسحها قبل لعقها واستحباب لعق القصعة وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها وجواز المسحه بعد اللعق بالساعد والقدم وغيرها

کھانے کا ایک ادب / تین انگلیوں سے کھانا:

اس باب میں کھانے کے چند اورآداب بتارہے ہیں۔ایک تو یہ کہ آدمی کھانا تین انگلیوں سے کھائے ،نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) عام طور پر تین انگلیوں سے ہی کھانا کھاتے تھے ویسے چار سے بھی آپ کا کھانا ثابت ہے،اور ایک موقعہ پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پانچ انگلیاں بھی استعمال فرمائی ہیں، لیکن عام طور پر آپ تین انگلیوں سے ہی کھاتے تھے، بیچ کی انگلی، شہادت کی انگلی اور انگوٹھا۔ اور طبی اعتبار سے بھی اس کو اس لیے پسند قرار دیا گیاہے کہ اس میں لقمہ اتنا ہی بنتا ہے جو منھ میں جاکر اچھی طرح چبے گا اور ہاضمہ میں بھی سہولت رہے گی،جب کہ پانچ انگلیوں میں لقمہ بڑا ہوگا اور چبانے میں دیر لگے گی اور ہضم میں بھی پریشانی ہوگی، لیکن اس کے باوجود کسی آدمی کو پانچ انگلیوں کے بغیر چلتا ہی نہیں تو جائزہے،لیکن اولیٰ یہ ہے کہ آدمی تین انگلیوں سے کھانے کی کوشش کرے۔

آج کل ہمارے زمانہ کے کھانے ایسے ہوتے ہیں جو اس زمانہ کے کھانے جیسے نہیں رہے، ہمارے زمانہ کے کھانے ذرا نرم قسم کے بنتے ہیں کہ اس کا لقمہ بنانے کے لیے پانچ انگلیاں استعمال میں لانی پڑتی ہیں۔ ویسے روٹی کا لقمہ اگر آپ تین انگلیوں سے لیں گے تو آسانی سے لقمہ بن جائے گا، اور کھچڑی تین انگلی سے لینے میں ذرا دشواری ہو جاتی ہے، اس لیے اگر کوئی آدمی پانچ انگلیاں استعمال کرتا ہے تو جواز میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

چھوٹے چھوٹے لقمے لینا:

دوسرا یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے لقمہ اگر لیں گے تو سیری جلدی ہو جائے گی یعنی آپ کی بھوک کا تقاضہ جلدی ختم ہو جائے گا، اسی طرح پانی پینے میں بھی اگر آپ چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیں گے تو سیری جلدی ہو جائے گی۔ گویا کم کھانے سے ضرورت پوری ہو جائے گی، اس لیے بھی یہ طریقہ پسندیدہ ہے۔

انگلیاں چاٹ لینا:

ایک اور ادب یہ بتلایا ہے: انگلیاں چاٹنا۔ اس لیے کہ جب آدمی کھانے سے فارغ ہوتا ہے تو انگلیوں پر بھی کچھ کھانا لگا ہوا رہ جاتا ہے، اگر ہاتھ دھونا ہے تو دھونے سے پہلے، یا اگر کسی وجہ سے ہاتھ دھوتے نہیں ہیں، بلکہ ٹیشو پیپر یا کسی اور چیز سے پونچھ رہے ہیں، تو اس صورت

میں بھی پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ دھونے یا پونچھنے سے پہلے انگلیاں نہ چاٹنے کی صورت میں کھانے کے وہ اجزاء جو انگلیوں پر رہ گئے ہیں، ان کو دھونے میں نکال دینا، یا پونچھنے میں ضائع کر دینا ناپسندیدہ ہے، کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ تو انگلیوں کا چاٹنا بھی آداب میں سے ہے۔

پرانا عیب؛ آج کا فیشن / لطیفہ:

جو لوگ جدید فیشن کے حامی ہوتے ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کو فیشن ہی کے تابع بنا رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ انگلیاں چاٹنا بظاہر کچھ ناشائستگی سی معلوم ہوتی ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہے کہ فیشن کیا چیز ہے؟ تو ذہن میں بٹھا لیجئے کہ فیشن کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ فیشن کا حال تو یہ ہے کہ وہ بدلتا رہتا ہے، پہلے زمانہ میں جس کو عیب سمجھا جاتا تھا؛ آج وہی فیشن سمجھا جاتا ہے۔

حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب 'مذہب اور سائنس' نامی ہے، اس میں انہوں نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ انسان کا مزاج تغیر پسند ہے، پھر لکھا ہے کہ ایک آدمی نے کپڑا خریدا اور دوڑتا ہوا گھر جا رہا تھا۔ کسی نے پوچھا: اتنی تیزی سے کیوں دوڑ رہے ہو؟ تو کہنے لگا: اس لیے دوڑ کر جا رہا ہوں کہ جلدی سے اس کو پہن لوں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس کو پہننے سے پہلے ہی فیشن بدل جائے۔

تو فیشن کا حال یہ ہے کہ بدلتا رہتا ہے۔اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو طریقہ بتلایا ہے اسی پر ہمیں فخر کرنا چاہیے۔جو لوگ فیشن کو اور جدید طور وطریق کو پسند کرتے ہیں اس میں انہوں نے اپنے آپ کو ختم کر دیا ہے، اپنا لباس بھی بدل دیا،اپنے آداب واطوار بدل دیئے، اپنا چہرہ مہرہ اور شکل وصورت تک بدل دی، اس کے باوجود یہ لوگ تو راضی ہونے والے ہیں ہی نہیں: ﴿وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرة:١٢٠)﴾ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمادیا ہے کہ یہود ونصاریٰ کبھی آپ سے خوش ہونے والے نہیں ہیں ،یہاں تک کہ آپ اپنا مذہب چھوڑ کر ان کا مذہب اختیار نہ کرلیں ، آپ اپنے مذہب پر باقی رہتے ہوئے کبھی ان کو خوش نہیں کرپائیں گے اس لیے ہمارے لیے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہی فخر کی چیز ہے۔ جیسے وہ لوگ فیشن پر فخر کرتے ہیں ،ہمیں سنتوں پر فخر کرنا چاہیے۔

فیشن کا حال !:

اور فیشن کا حال تو یہ ہے کہ پہلے جس چیز کو برا سمجھا جاتا تھا وہی چیز آج کل فیشن سمجھی جاتی ہے، جیسے:پہلے زمانہ میں کھڑے کھڑے کھانے کو عیب سمجھا جاتا تھا،لیکن آج کل بوفے سسٹم ایسا نکلا ہے کہ ہاتھ میں پلیٹ لے کر کھڑے رہو۔اور جب کھانا کھولا جاتا ہے تو سب ٹوٹ پڑتے ہیں اور چھینا جھپٹی ہوتی ہے ،اورایک ہی پلیٹ میں ساری چیزیں ایک ساتھ لے کر

کھڑے کھڑے جانوروں کی طرح کھاتے ہیں ،اوراسی کو فیشن سمجھا جارہاہے۔ یہ کون سا طریقہ ہے!پہلے اسی کو برا سمجھا جاتا تھا،لیکن آج یہی چیز اچھی سمجھی جارہی ہے۔

لباس کے معاملہ میں بھی دیکھ لیجئے کہ مرد جتنازنانہ بنتاجائے گا،وہ اچھا سمجھا جاتاہے اور عورت جتنی مردانی بنتی جائے اسی کوپسندیدہ سمجھتے ہیں۔یہ فیشن کا حال ہوگیا ہے۔امریکہ جانا ہوا تھاتووہاں دیکھاکہ لوگ بھوؤں میں سوراخ کرواتے ہیں ،اوربالی جیسا لٹکاتے ہیں ،زبان کے اندر سوراخ کرواکر اس کے اندر کڑا ڈالتے ہیں۔رخسار کے اوپر سوراخ کرکے بالی ڈالتے ہیں، اوریہ سب مرد کرتے ہیں۔مَیں نے پوچھا:یہ کیا مصیبت ہے؟توبتلایا کہ: آج کل یہی فیشن ہے۔

آنکھوں دیکھاواقعہ:

اوریہ فیشن اپنانے والے کیسے مست ہوتے ہیں ! مجھے خوب یاد ہے،بہت سال پہلے کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ میں دہلی گیاتھا، وہاں فتح پوری مسجد کے پاس چاندنی چوک ہے،مَیں وہاں گیا تومَیں نے دوچاریوروپین کودیکھاجنہوں نے بالکل عورتوں جیسا لباس پہنا ہوا تھا،کان میں بالیاں ڈالی ہوئی تھیں، گلے کے اندر کچھ دانے والی تسبیح وغیرہ لٹکائی ہوئی تھیں ،وہ بازارمیں سے گزر رہے تھے اورتمام دوکان والے ان کودیکھ کر ہنس رہے تھے ،لیکن ان کے اوپر ذرّہ برابر بھی کوئی اثر نہیں ہورہاتھا۔میں دیکھ کر سوچ رہا تھاکہ سب لوگ ان کودیکھ کر ہنس رہے ہیں لیکن ان کو کوئی پرواہ نہیں ہے، بلکہ اپنے لباس پراوراس ہیئت پران کواتنااطمینان اورشرح صدر

ہے کہ ساری دنیا ہنس رہی ہے پھر بھی وہ اپنے حال میں مست ہیں۔اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم نبیٔ کریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کا طریقہ اپنا رہے ہیں اور کسی ایک نے کوئی بات کہہ دی تو اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں ،حالاں کہ سنتوں کو اپنانے کے معاملہ میں ہمارا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ کوئی کچھ بھی کہے ہمیں اس کی بالکل پرواہ ہی نہ ہو۔

یہ دل و دماغ میں نوٹ کرلو:

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا قصہ معروف ہے کہ وہ کسریٰ کے دربار میں تشریف لے گئے تھے ،وہاں کھانا کھا رہے تھے، کھانے کے دوران لقمہ نیچے گر گیا، تو جیساکہ نبیٔ کریم (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) نے ارشاد فرمایاہے کہ:لقمہ اگر گر جائے تو اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑو،بلکہ اس کو اُٹھاکر صاف کرکے کھا لو۔چناں چہ جب انہوں نے اٹھا کر صاف کرکے کھانا چاہا تو آپ کے ساتھ آپ کا جو ایرانی خادم وغلام تھا، اس نے کہا کہ آقا!یہ چیزیں یہاں معیوب سمجھی جاتی ہیں،لوگ آپ کو ایساکرتے ہوئے جب دیکھیں گے تو سوچیں گے کہ انہوں نے کبھی کھانا دیکھابھی ہے یانہیں؟ آپ کونادیدہ کہیں گے۔تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جوجواب دیاتھاوہ ہمیں اپنے دل و دماغ میں نوٹ کرلینا چاہیے،فرمایا:”أَأَتْرُكُ سُنَّةَ حَبِيْبِیْ لِهٰؤُلَآءِ الْحُمَقَآءِ؟“ ان بے وقوفوں کے لیے مَیں اپنے حبیب کی سنت کو چھوڑدوں گا؟

نبی کریم (ﷺ) کی ہر ہر سنت کو ہمیں اس تصور کے ساتھ اپنانا ہے کہ جس وقت ہم وہ سنت ادا کر رہے ہوں تو یہ سوچیں کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں ﴿قُلْ إِنْ كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، میرے طریقوں پر چلو، میری سنتیں اپناؤ؛ تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ جس وقت ہم نبی کریم (ﷺ) کی سنت پر عمل کر رہے ہوں تو یہی تصور اپنے دل ودماغ میں تازہ رکھنا چاہیے کہ ہم حضور (ﷺ) کے طریقے کو اپنا رہے ہیں، تو اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں محبوب ہیں تو اب ساری دنیا ہمیں کچھ بھی سمجھتی ہو اور کچھ بھی کہتی ہو، ہمارا مذاق اُڑاتی ہو؛ اس سے ہمیں کیا فرق پڑتا ہے!

لوگ سمجھیں مجھے محرومِ وقار و تمکیں
پر وہ نہ سمجھیں کہ مری بزم کے قابل نہ رہا

ہمیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت چاہیے، ان دنیا داروں کی عزت کا کیا ہے، آج اگر کسی نے واہ واہ کر بھی دی، تو اس سے ہماری کون سی دنیا بن جانے والی ہے، اور کون سی دولت گھر میں آجانے والی ہے! اس لیے اس کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

ایک بزرگ کا عمل:

انگلیوں کو چاٹنے سے پہلے دھولینا، یا پونچھ لینا نا پسندیدہ ہے،اس لیے کہ اس میں غذا ضائع ہوتی ہے۔ ہمارے اکابر میں سے حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتیؒ تھے ان کے متعلق لکھا ہے کہ کھانے کے بعد کلی کے لیے پانی منہ میں لے کر اس کو بھی نگل لیتے تھے، تاکہ غذا کے جو اجزاء منہ کے اندر ہیں وہ بھی ضائع نہ ہوں۔ ہم لوگ تو پہلی کلی کا پانی منہ سے باہر نکال دیتے ہیں، اور وہ پہلی کلی کا پانی باہر نہیں نکالتے تھے بلکہ پی جاتے تھے؛ تاکہ غذا کے وہ اجزاء بھی بے کار نہ جائیں۔

پلیٹ صاف کرنے والے ادب کی تفصیل:

اسی طرح کھانے کے برتن کو بھی صاف کرلینا اور چاٹ لینا پسندیدہ ہے۔ لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ آپ نے غذا پوری کرلی ہو۔ پہلے تو یہ ہے کہ آدمی شروع ہی سے اپنی پلیٹ کے اندر اندازہ لگا کر کھانے کی اتنی ہی مقدار نکالے جس کے متعلق اس کا خیال یہ ہو کہ مَیں اس کو آسانی سے پورا کرلوں گا۔ پھر جب کھانا پورا ہو جائے تو اب پلیٹ کے اندر کھانے کے جو اجزاء چپکے ہوئے ہیں، ان کے متعلق شریعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کو ضائع ہو جانے دے، بلکہ ان کو بھی صاف کرلو۔ اس کی وجہ آگے حدیث کے اندر آرہی ہے، لیکن اگر پلیٹ

میں پہلے ہی سے کھانا زیادہ ہے اور اسی میں سے کھانے کے لیے کہا گیا ہے تو اس صورت میں پہلا طریقہ جو بتلا چکا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، تو اب اپنے سامنے کی جگہ کو اچھی طرح صاف کرلیا جائے اور باقی کھانا اس انداز سے چھوڑا جائے کہ دوسرا آدمی اگر اس کو کھانا چاہے تو اس کی طبیعت کو ناگواری محسوس نہ ہو۔

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ پلیٹ میں جتنا کھانا ہو وہ سب پورا ہی کیا جائے۔ حالاں کہ ایسا ضروری نہیں ہے، بلکہ اصل سنت یہ ہے کہ اگر آپ پلیٹ کا کھانا پورا کر چکے ہیں، تو اب کھانے کے جو اجزاء پلیٹ کے اندر چپکے رہتے ہیں اس کو صاف کر لیجئے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر پلیٹ میں ایک کلو ہے تو ایک کلو کھانا ہی پڑے گا، چاہے آپ کی طاقت ہو یا نہ ہو۔

ایک قصہ:

کئی سال پہلے کا قصہ ہے، ایک مرتبہ گنگوہ جانا ہوا، ہم لوگ رات میں دیر میں پہنچے تھے، وہاں معلوم کیا کہ کوئی ہوٹل ہے؟ ایک پرانا ہوٹل ملا، وہاں کھانے کے لیے گئے۔ ہم سب بھوکے تھے، کھانے کے لیے بیٹھے۔ جب کھانا آیا تو اس کو پورا نہیں کر سکے، پلیٹ میں کھانا بچ گیا۔ وہاں کے دیہاتی لوگ بیٹھے ہوئے تھے، وہ یوپی کی دیہاتی انداز میں کہنے لگے: اجی مولوی جی! تم نے پلیٹ کو صاف نہیں کیا؟ مَیں نے کہا: یہ کھانا ہی ہم سے پورا نہیں ہوا؛ تو صاف کرنے کا کیا مطلب! اس لیے کہ پلیٹ صاف کرنے کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ پلیٹ کا کھانا اگر ہم پورا

کرلیتے اور چند دانے بچ جاتے تو ان کو صاف کرنا مستحب ہے، باقی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پلیٹ کے اندر جتنا کھانا آیا ہے وہ سب پورا ہی کیا جائے۔اس پر ایک دیہاتی کہنے لگا:اجی یہ مولوی تو باتیں بناوے ہے۔خیر!تو اصل مسئلہ اپنی جگہ پر یہی ہے کہ جب پلیٹ کا بڑا حصہ کھا چکے ہیں تو اب اس کے اندر جو اجزاء رہ گئے ہیں ان کو صاف کرلیا جائے،اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ اسی میں برکت ہو۔

"وأخذ اللقمة الّتي تسقط منه وأكلها" اسی طریقہ سے وہ لقمہ جو کھانے کے درمیان ہاتھ سے گر جائے،تو اس کو اُٹھالینا اور صاف کر کے کھا لینا بھی مستحب ہے۔

"وجواز مسحها بعد اللعق بالساعد والقدم" اور آدمی کھانے سے فارغ ہو کر اپنی انگلیاں چاٹ چکا ہے، اور دھونے کے لیے پانی موجود نہیں ہے،یا ہاتھ بہت زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں، جیسے: کبھی ہم کسی ہوٹل میں ناشتہ کرتے ہیں ،چائے بسکٹ وغیرہ کھالیے؛تو ہاتھ دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی، تو ایک ہاتھ کو دوسرے میں مل کر صاف کرلیتے ہیں ،یا پیر سے صاف کرلیں ؛تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے

انگلیاں چاٹنا اور چٹوانا:

حدیث ۷۴۸:-

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَاماً فَلَا يَمْسَحْ أَصَابِعَهُ حَتَّى يَلْعَقَهَا أَوْ يُلْعِقَهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی کھانا کھا چکے، تو اپنی انگلیوں کو نہ پونچھے جب تک اس کو خود چاٹ نہ لے، یا کسی کو چٹوا نہ لے۔

افادات:- بچے: بڑوں کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں، جیسے: چھوٹے بچوں کو ماں اپنی انگلیاں چاٹنے کے لیے دیتی ہے، تو وہ بڑی خوشی سے چاٹتے ہیں، تو آپ خود اپنی انگلیاں چاٹ لیجیے، یا پھر کوئی ایسا ہو جو آپ کی انگلیاں چاٹنا اپنی سعادت سمجھتا ہو؛ اس سے چٹوا لیجیے۔ یا کوئی پالتو جانور بلی وغیرہ ہے، اور وہ آپ کے ساتھ رلی ملی ہوئی ہے، اگر اس کو دیں گے تو وہ صاف کر لے گی، تو اس سے صاف کروا لیجیے مطلب یہ ہے کہ انگلی کے اوپر کھانے کے جو اجزاء لگے ہوئے ہیں، ان کو آپ بے کار نہ جانے دیں، بلکہ ان کو خود کام میں لے لیں، یا کسی اور کے کام میں آجائیں۔

حدیث ۷۴۹:-

وعن كعب بن مالك رضی اللہ عنہ قَالَ: رأيتُ رسولَ الله (ﷺ) يَأْكُلُ بِثَلَاثِ أصابعَ، فإذا فَرَغَ لَعِقَهَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو دیکھا کہ آپ تین انگلیوں سے کھارہے تھے، اور جب آپ کھانے سے فارغ ہوئے تو آپ نے تین انگلیوں کو چاٹ لیا۔

افادات:-چاٹنے میں ترتیب یہ ہے کہ پہلے درمیان کی انگلی کو، پھر شہادت کی انگلی کو،اور پھر انگوٹھے کو چاٹیں گے۔

حصولِ مقاصد کا نام برکت ہے:

حدیث ۷۵۰:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) أمر بلعق الأصابع والصحفة ، وقال : إِنَّكُمْ لاَ تَدْرُونَ فی أَيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے انگلیوں کو بھی چاٹنے کا حکم دیا اور پلیٹ کو صاف کرنے کا بھی حکم دیا(یہ دونوں ادب پہلے بتا چکا ہوں۔اور اس کی وجہ یہ بتائی)اس لیے کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کھانے کے کون سے حصے میں ہے۔

افادات:-ہو سکتا ہے کہ کھانے کا وہ حصہ جو تمہاری انگلیوں کے اوپر لگا ہوا ہے اسی میں برکت ہو۔

برکت کیا چیز ہے؟اور برکت کا مطلب کیا ہے؟برکت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس مقصد کے لیے کھانا کھا رہا ہے وہ مقصد اس کو حاصل ہو۔ہر چیز میں یہی قاعدہ ہے۔جیسے:ایک آدمی

کماتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے، اور پیسے اس لیے لاتا ہے تاکہ محنت مزدوری سے حاصل کی ہوئی کمائی سے اس کی ضرورتیں پوری ہوں۔ اگر اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہورہی ہیں تو وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میری کمائی میں برکت نہیں ہے۔ بھائی! کیسے معلوم ہوا کہ برکت نہیں ہے؟ تو کہتا ہے کہ: میری ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں۔ تو جو کام جس مقصد کے لیے کیا جاتا ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا حاصل ہوجائے ؛ اسی کا نام برکت ہے۔

جیسے: آپ ملازمت کرتے ہیں اور آپ کو تنخواہ پانچ ہزار روپے ملتی ہے، لیکن ان سے آپ کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں ، یہ پانچ تو ختم ہوجاتے ہیں اور آپ لوگوں سے مانگتے پھرتے ہیں ، اور آپ کی ضرورتیں باقی رہتی ہیں، تو یوں سمجھا جائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت نہیں ہے۔ لیکن اگر آپ پانچ سو تنخواہ لاتے ہیں لیکن اس سے آپ کی ضرورتیں پوری ہوجاتی ہیں، تو اس صورت میں یوں کہا جائے گا کہ آپ کی کمائی میں برکت ہے۔ اس فرق کو اچھی طرح سمجھنا اور دل نشین کرنا چاہیے۔

تو کھانے کی برکت کا مطلب یہ ہے کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتا ہے اس میں نمبر اول پر یہ ہے کہ آدمی اپنی بھوک مٹائے، اس کے بعد دوسرا مقصد یہ ہے کہ کھا کر لذت حاصل کرے اور راحت پائے، پھر یہ کھانا پیٹ میں جائے اور اس سے خون بنے، اور اس کو

طاقت حاصل ہو، اور پیٹ میں جاکر وہ ہضم ہو۔تو یہ ساری چیزیں کھانے کے مقاصد میں سے ہیں ،لہٰذا اگر یہ ساری چیزیں حاصل ہو ں تو کہا جائے گا کہ کھانے میں برکت ہے۔

لیکن کوئی آدمی کھا رہا ہے اور اس سے اس کو شکم سیری ہو ہی نہیں رہی ہے ، پیٹ بھر ہی نہیں رہاہے،تویوں کہیں گے کہ اس کے کھانے میں برکت نہیں ہے۔یا پیٹ تو بھر گیالیکن بد ہضمی ہو گئی،اس کھانے سے خون بننا چاہیے تھالیکن نہیں بنا،تب بھی کہاجائے گا کہ برکت نہیں ہوئی۔اس سے جو راحت پہنچنی چاہیے تھی وہ نہیں پہنچی، بلکہ کھانے کے بعد پیٹ میں درد ہو گیا،کوئی بیماری ہو گئی،تو یہ بے برکتی ہی ہے۔یا اس سے جو طاقت حاصل ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی ،ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہارے پیٹ میں جو کھاناجاتاہے وہ ویسے ہی نکل جاتاہے،اس سے بدن کو جو فائدہ ملنا چاہیے وہ نہیں ملتا،تو یہ بے برکتی ہے۔خلاصہ یہ ہوا کہ کھانا جن مقاصد کے لیے کھایا جاتاہے، وہ مقاصد پورے طور پر حاصل ہوں ؛اسی کا نام برکت ہے۔

حصولِ اسباب اصل نہیں :

آج کل ہم مادیت اوراسباب کے ایسے غلام بن گئے ہیں کہ ہماری نگاہوں میں مادّہ ہی مادّہ اوراسباب ہی سب کچھ ہیں ،اسی کے اِردگرد ہماری سوچ گھومتی رہتی ہے،چیزوں کے جو حقائق ہیں اس کی طرف سے ہم غفلت برتتے ہیں،حالاں کہ اسباب مقصود نہیں ہیں ،بلکہ اسباب جس چیز کے لیے مہیا کیے جاتے ہیں،وہ اصل مقصود ہے۔اگر آپ نے اسباب مہیا کیے لیکن اصل

مقصود حاصل نہیں ہوا، تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ جیسے: آپ نے مکان بنوالیا،اور اس میں کمرہ بھی بہترین اور شاندار بن گیا، اوراس کے اندر شاندار مسہری بھی آپ نے بچھوادی،اس کے اوپر اچھاسا گدّا لگوادیا،بہترین چادر اور تکیے بھی لگوادیئے، کمرے کا پورا فرنیچر بھی ایسا شاندار ہے جس کو دیکھ کر کمرہ میں جی لگتا ہے، A.C بھی لگالیا،یہ سب انتظامات کیے؛ لیکن رات کو سوتے ہیں تو نیند ہی نہیں آتی،اب نیند کا کیا کریں گے؟ حالاں کہ یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے تاکہ ہمیں راحت ملے اور نیند پوری حاصل کرکے ہم اپنے جسم میں نشاط کی کیفیت پاویں ،اپنی اس ضرورت کو پورا کریں،اب یہ سارے اسباب تومہیا کرلیے،لیکن نیند ہمارےاختیار میں نہیں ہے،وہ اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں ، اللہ تعالیٰ چاہے گا تواپنی یہ نعمت عطا فرمائے گا، ورنہ سارے اسباب کے ہوتے ہوئے بھی وہ چیز آپ کو حاصل نہیں ہوگی۔

آپ نے مال خوب کمالیااور شاندار سے شاندار چیزیں خریدیں ،اچھاباورچی لائے،اچھا سے اچھا کھانا پکوایا،دسترخوان پر انواع واقسام کے کھانے لگوادیئے، یہ سب کرکے جب کھانے کے لیے بیٹھے توبھوک ہی نہیں لگتی؛اب بھوک کہاں سے لاؤگے؟ بھوک تواللہ تعالیٰ ہی ڈالتاہے۔یابھوک تولگی اور کھانا بھی کھایا،لیکن ہضم نہیں ہوتا اوراس سے خون نہیں بنتا۔

تومعلوم ہوا کہ ان چیزوں کے جو مقاصد ہیں وہ حاصل ہوں ؛اسی کا نام برکت ہے۔اگر آدمی ملازمت یا تجارت وکاروبار کرکے خوب مال ودولت اورپیسے کمائے،تویہ سب اسباب ہوئے،

ان سب کے بعد جو اصل چیز ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے ،ان سب کے بعد بھی اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو وہ چیز حاصل ہو گی؛ ورنہ نہیں ہو گی۔

یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟:

تو حضورِ اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ برکت کس میں ہے؟تم چاہتے ہو کہ اس کھانے کے ذریعہ سے تمہارا مقصد حاصل ہو؟اس کھانے سے تمہیں قوت ملے ؟خون بنے؟اوراس سے تمہاری صحت مضبوط ہو؟یہ سب چاہتے ہو تو حضور (ﷺ) کی اس ہدایت پر عمل کرو کہ اگر تمہاری انگلیوں پر کھانے کے ذرّات لگے ہوئے ہیں تو ان کو چاٹ لو،ضائع نہ جانے دو۔پلیٹ کے اندر کھانے کے ذرّات بچے ہوئے ہیں، اس کو صاف کرلو؛ہو سکتا ہے کہ برکت اسی میں ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطائے برکت کا جو فیصلہ کیا جاتا ہے کہ اس کھانے پر اس کے اثرات اور مقاصد کا مرتب ہونا؛وہ دراصل اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدردانی پر ہوتا ہے،جو آدمی ان ذرّات کو ضائع کرتا ہے ،گویا وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری کرتا ہے، اور جو ناقدری کرے گا تو قاعدہ ہے ﴿وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ. (ابراھیم:7)﴾ اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔تو اس سے بڑا سخت عذاب اور کیا ہو گا کہ آدمی کھانا کھائے اور اس سے جو مقصد ہے وہ حاصل نہ ہو۔یہ بے برکتی نہیں تو اور کیا ہے؟

اگر برکت حاصل کرنا چاہتے ہو تو...:

اس لیے نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔اور یہ برکت حضورِاکرم (ﷺ) کے طریقہ کو اپنانے ہی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اگر فیشن کے پیچھے پڑا رہے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ سب کچھ ہوگا لیکن برکت نہیں ہوگی۔ پھر وہ ڈاکٹروں کے چکروں میں پڑا رہتا ہے، اور کہتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب! کھانا ہضم نہیں ہوتا، خون نہیں بنتا، جسم میں قوت وطاقت نہیں آتی۔ارے بھائی! پہلے یہ سب کرلو، نبی کریم (ﷺ) نے جو ہدایتیں دی ہیں، کھانے کی برکت جس چیز سے حاصل ہوتی ہے؛ وہ کرلو، تو پھر ان شاء اللہ کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔

لقمہ گر جائے تو اُٹھا لو:

حدیث ۱۵۷:-

وعنه أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا وَقَعَتْ لُقْمَةُ أحَدِكُمْ، فَلْيَأخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أذىً، وَلْيَأْكُلْهَا، وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ، وَلاَ يَمْسَحْ يَدَهُ بِالمِنْدِيلِ حَتَّى يَلْعَقَ أصَابِعَهُ، فَإنَّهُ لاَ يَدْرِى فى أيِّ طَعَامِهِ البَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: لقمہ اگر گر جائے تو اس کو اُٹھا لو، اور جو کچھ گرد وغبار لگا ہو اس کو صاف کرلو اور کھالو، شیطان کے لیے نہ چھوڑدو، اور کھانے سے

فارغ ہونے کے بعد رومال سے ہاتھ نہ پونچھو یہاں تک کہ انگلیوں کو چاٹ لو ، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

حدیث ۷۵۲:-

وعنه أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ : إنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ أحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَأْنِهِ، حَتَّى يَحْضُرَهُ عِنْدَ طَعَامِهِ. فإِذَا سَقَطَتْ لُقْمَةُ أحدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ أذىً، ثُمَّ لِيَأْكُلْهَا وَلاَ يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فإذا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ أصابِعَهُ. فإِنَّهُ لا يَدْرِى فى أيِّ طعامِهِ البَرَكَةُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: شیطان تمہاری ہر ہر چیز میں حصہ لگانے کے لیے تمہارے پاس آجاتا ہے، یہاں تک کہ کھاتے وقت بھی تمہارے پاس آتا ہے، لہٰذا جب کوئی لقمہ گر جائے تو اس پر سے مٹی وغیرہ کو صاف کر کے پھر اس کو کھالیا کرو، اس لقمہ کو شیطان کے لیے مت چھوڑو، اور جب کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو اپنی انگلیوں کو چاٹ لو، اس لیے کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے۔

افادات:- جو لقمہ گرا ہے وہ اگر اتنا زیادہ خراب اور گرد و غبار میں ملوث ہو گیا ہو کہ صاف کر کے بھی کھانا ممکن نہیں ہے، تو اس کو چھوڑ دینے کی اجازت ہے، لیکن پھر بھی کوشش یہ ہو کہ وہ کسی جانور چیونٹی وغیرہ کو کھلا دیا جائے، اس کو ویسے ہی چھوڑ دینا کہ اس سے کسی کو بھی فائدہ نہ پہونچے، یہ گویا شیطان کے لیے چھوڑنا ہوا؛ اس لیے حضورِ اکرم (ﷺ) نے اس سے منع فرمایا ہے۔

یا کوئی ایسی چیز گری ہے جس کو اُٹھا کر کھانا ممکن ہی نہیں، جیسے: شوربہ گر گیا تو اس کو کیسے اُٹھایا جاسکتا ہے، لہٰذا وہاں تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر صاف کر کے فائدہ اُٹھانا ممکن ہے، جیسے: روٹی کا ٹکڑا ہے کہ اس کو آسانی سے اُٹھا کر صاف کرسکتے ہیں؛ تو صاف کر کے کھالینا چاہیے۔ اگر اُٹھا کر نہیں کھائے گا تو یہ تکبر کی علامت اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری ہے، گویا اسے شیطان کے لیے چھوڑنا ہے ؛ تو پھر برکت نہیں رہے گی۔

حصولِ برکت کے لیے ان چیزوں کا اہتمام کرو:

حدیث ۷۵۳:-

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (ﷺ) إِذَا أَكَلَ طَعَاماً، لَعِقَ أَصَابِعَهُ الثَّلَاثَ، وقال: إِذَا سقطت لُقْمَةُ أَحَدِكُمْ فَلْيَأْخُذْهَا، ولْيُمِطْ عنها الأذى، وليَأْكُلْهَا، وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَان. وأَمَرَنَا أن نَسْلُتَ القَصْعَةَ، وقال: إِنَّكُمْ لَا تَدْرُونَ فِي أَيِّ طَعَامِكُمُ البَرَكَةُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) جب کھانا تناول فرمالیتے تھے تو (کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ دھونے سے پہلے یا رومال وغیرہ سے پونچھنے سے پہلے) اپنی تینوں انگلیوں کو چاٹ لیا کرتے تھے (تاکہ کھانے کے بچے ہوئے اجزاء ہاتھ پر لگے نہ رہ جائیں، اور دھونے کی وجہ سے ضائع نہ چلے جائیں، اس کی وجہ وہی ہے کہ کھانے کے کون سے حصہ میں برکت ہے یہ ہمیں معلوم نہیں، لہٰذا آدمی کو اس بات کا حریص ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے دانہ دانہ پر جو برکتیں رکھی ہیں ان کو حاصل کرے) اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: کھانے کے دوران اگر لقمہ گر جائے، تو اس کو اُٹھالو، اور اس

پر جو بھی گرد وغیرہ لگی ہے اس کو دور کرلو، اور اس کو کھالو، اس کو شیطان کے لیے نہ چھوڑدو (اگر اس کو ویسے ہی چھوڑدیں گے تو وہ ضائع ہو جائے گا، گویا شیطان اس سے فائدہ اُٹھالے گا) اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ پیالے کو صاف کرلو (پھر آخر میں آپ (ﷺ) نے اس کی وجہ بھی بتلائی کہ اوپر جتنے بھی احکام و آداب بتائے گئے وہ اس لیے ہیں کہ) کھانے کے کون سے حصے میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہے (تو اس برکت کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں ان چیزوں کا اہتمام کرنا چاہیے)

"وُضُوءِ مِمَّامَسَّتِ النَّار" کا مسئلہ:

حدیث ۷۵۴:-

وعن سعيد بنِ الحارث: أنّه سأل جابراً رضی اللہ عنہ عنِ الوُضُوءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ، فَقَالَ: لا. قَدْ كُنَّا زَمَنَ النبيِّ (ﷺ) لا نَجِدُ مِثْلَ ذَلِكَ الطَّعامِ إلاَّ قليلاً. فإذا نَحْنُ وجَدْنَاهُ، لَمْ يَكُنْ لنا مَنَادِيلُ إلاَّ أكُفَّنا، وسَوَاعِدَنَا، وأقْدامَنَا، ثُمَّ نُصَلِّي وَلاَ نَتَوَضَّأُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت سعید بن حارث نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے جو چیز آگ پر پکائی گئی ہو اس کو کھانے کے بعد وضو کرنے کے متعلق پوچھا۔ تو انہوں نے کہا: اب ایسا نہیں ہے، نبیٔ کریم (ﷺ) کے زمانہ میں ایسا کھانا ہمیں بہت کم میسر ہوتا تھا (مطلب یہ ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر کھجوروں پر گزارہ ہوتا تھا، یا دودھ پی لیا اور کھجور استعمال کرلی۔ پکا ہوا کھانا، گوشت یا روٹی وغیرہ چیزیں بہت کم میسر ہوتی تھی) اور جب کبھی ہمیں یہ ملتا تھا تو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ پر اس کھانے کا جو اثر لگا ہوتا تھا اس کو صاف کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس رومال نہیں ہوتے تھے، بس یہی ہماری ہتھیلیاں اور بازو اور پیر ہوتے

تھے، اسی پر ہم اپنے ہاتھ کی چکنائی کو صاف کر لیتے تھے (پہلے بتاچکا ہوں کہ کوئی ایسی چیز کھائی ہے کہ جس کی وجہ سے ہاتھ زیادہ ملوث نہیں ہوئے ہیں تو اس صورت میں کوئی آدمی ہاتھ نہ دھوئے، اور رومال سے، یا ہتھیلی پر، یا بازوؤں پر، یا پاؤں کے تلوؤں پر مَل لے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے) اور اسی حالت میں ہم نماز پڑھ لیتے تھے، نیا وضو نہیں کرتے تھے۔

افادات:- شروع اسلام میں یہ حکم تھا کہ آگ پر پکی ہوئی چیز کو اگر آدمی کھائے تو اس کے بعد اس کو وضو کرنا پڑتا تھا، گویا اس سے اس کا وضو ٹوٹ جایا کرتا تھا، اس لیے شریعت کا یہ حکم تھا کہ آدمی دوبارہ وضو کرے، پھر نماز پڑھے، لیکن بعد میں یہ حکم باقی نہیں رہا۔ اب اگر آگ پر پکی ہوئی چیز کوئی آدمی استعمال کرتا ہے تو اس کے بعد پانی وغیرہ سے اپنا منھ صاف کرلے، تاکہ کھانا کھانے کی وجہ سے منھ میں کھانے کی چکنائی اور جو اثرات ہیں وہ دور ہو جائیں، اور نماز کے دوران اس کھانے کا مزہ اور اثر باقی نہ رہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تكثير الأيدي علَى الطعام

کھانے میں جتنے کھانے والے زیادہ ہوں گے اتنی ہی اس کھانے میں برکت زیادہ ڈالی جائے گی۔

دو کا کھانا تین کو، تین کا چار، چار کا آٹھ کو کافی ہو جائے گا:

حدیث ۷۵۵:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : طَعَامُ الاثنينِ كافِي الثلاثةِ، وطَعَامُ الثَّلاثَةِ كافي الأربعة. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہو جاتا ہے، اور تین کا چار کو کافی ہو جاتا ہے۔

حدیث ۷۵۶:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول : طَعَامُ الوَاحِدِ يَكْفِي الاثْنَيْنِ، وَطَعَامُ الاثْنَيْنِ يَكْفِي الأَرْبَعَةَ، وَطَعَامُ الأَرْبَعَةِ يَكْفِي الثَّمَانِيَةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:۔حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہے، اور دو کا چار کے لیے کافی ہے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

افادات:۔ایک خاص مقصد کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے۔ہوتا یہ ہے کہ مثلاً: ہم نے اپنے حساب سے کھانا تیار کیا، کھانے کے لیے بیٹھے ہوئے ہیں کہ دو چار مہمان آگئے،تو ایسے موقع پر صاحبِ خانہ اور مالکِ مکان یہ سوچنے لگتا ہے کہ یہ مہمان آگئے، اب کیا ہوگا؟اس کی وجہ سے اس کی طبیعت کے اندر آنے والوں کی طرف سے جھجک سی پیدا ہوتی ہے ،اور وہ یوں سوچنے لگتا ہے کہ ان کو کھانے میں شریک کیا جائے یا نہیں۔

اب یہ جو سوچ آرہی ہے کہ کھانا تو کم لوگوں کے حساب کا بنایا ہے، یہ آدمی بڑھ گئے،تو اب کیا ہوگا؟تو نبی کریم (ﷺ) ہمیں بتلاتے ہیں کہ بھائی! آپ کیوں فکر کرتے ہو، تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا،یعنی جتنا کھانا دو آدمی کے لیے پکایا تھا اور دونوں آدمی پیٹ بھر کر ڈکار لے کر کھا سکتے تھے،اسی کھانے میں تین آدمی اپنی ضرورت پوری کرلیں گے،بھلے ہی وہ دو آدمی ڈکاریں نہیں لے سکیں گے،لیکن تینوں کی بھوک تو اس سے مٹ جائے گی،اور کھانے کا تقاضہ باقی نہیں رہے گا ،اور اصل تو یہی ہے۔

دوسری روایت میں اورزیادہ وسعت کردی گئی۔کافی ہونے کا مطلب وہی ہے کہ جس کھانے کوایک آدمی پیٹ بھر کراور شکم سیر ہوکر کھاتا ہے،اگر دو آدمی کھائیں گے تودونوں کی ضرورت اس سے پوری ہوجائے گی۔اسی طرح دوکاچار کے لیے اور چار کا آٹھ کے لیے کافی ہے۔

ہم کسے مہمان سمجھتے ہیں ؟:

مہمان کے لیے بھی ہم نے اپنے ذہنوں میں ایک معیار بنایاہے کہ کوئی رشتہ دار ہو،یاکوئی ملنے والاہو،کوئی دوست ہو،یاہماری سطح کاہو،ہمارے اسٹیٹس کا آدمی ہو؛تواس کوتوہم مہمان سمجھتے ہیں۔ اوراگرکوئی اجنبی ہے جس کے ساتھ کوئی جان پہچان نہیں ہے،رشتہ داری اوردوستی نہیں ہے،یاوہ ہماری سطح کانہیں ہے،ذراغریب آدمی ہے؛تواس کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔حالاں کہ شریعت کی نگاہوں میں مہمان عام ہے،جو آدمی بھی آپ کے گھر آیا ہو،چاہے وہ غریب ہو، وہ آپ کامہما ن ہے اور قابلِ اکرام ہے،اس کی عزت کرناضروری ہے۔اب آنے والے کے کپڑے پھٹے پرانے ہیں توکیا ہوا،وہ بھیک مانگنے تونہیں آیاہے۔ہمارامزاج ایسا بن چکاہے کہ اگر ایسی ہیئت کاکوئی آدمی آگیاتواس کوبھکاری ہی سمجھتے ہیں ،ایسانہیں ہوناچاہیے،بلکہ وہ مہمان ہے،اس کی عزت کرو، کھانے کاوقت ہے تو اس کوبھی کھانے میں شریک کرلو۔ خیر !اچانک آنےوالے کی وجہ سے آدمی کے دل میں کوئی کدورت اورناراضگی نہیں ہونی چاہیے،اور کسی کو جھڑکناتوبالکل ہی نہیں چاہیے۔

نہایت عبرت آموز واقعہ:

کتابوں میں ایک قصہ لکھا ہے جو کسی زمانہ میں پیش آیا تھا"المستطرف فی کل فن مستظرف" میں موجود ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں بھی ہے کہ ایک آدمی ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ کھانا کھارہا تھا، مرغی پکی ہوئی تھی، کوئی اجنبی آگیا اور اس نے کہا: مَیں بھوکا ہوں، مجھے کچھ کھانا کھلاؤ۔ تو بجائے اس کے کہ اس کا اکرام کیا جاتا، اس کو کھانے میں بھی شریک کرلیا جاتا؛ وہ آدمی غصہ ہوگیا اور اس کو جھڑک کر وہاں سے بھگا دیا۔ اب جس نے یہ کیا تھا وہ صاحبِ حیثیت اور مالدار آدمی تھا، اتفاق کی بات کہ اس کے برے دن آئے، مال بھی ہاتھ سے نکل گیا، اور اتنی بھی حیثیت نہیں رہی کہ بیوی کا نفقہ ادا کرسکے اور اس کی ضرورتیں پوری کرسکے، مجبور ہوکر کہ بیوی کو طلاق دینی پڑی۔ اس کے بعد اس عورت نے ایک اور آدمی سے نکاح کرلیا جو مالدار اور صاحبِ حیثیت تھا، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ عورت اپنے اس دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھارہی تھی، مرغی پکائی گئی تھی، باہر کوئی مانگنے والا آیا تو اس نے بیوی سے یوں کہا: یہ پورا تھال اُٹھاکر اس مانگنے والے کو دے دو۔ یہ عورت مانگنے والے کو دینے کے لیے باہر گئی اور دے کر جب واپس آئی تو رو رہی تھی، شوہر نے پوچھا: کیوں رو رہی ہو؟ اس نے بتلایا کہ یہ مانگنے والا میرا سابق شوہر تھا اور جس زمانہ میں مَیں اس کے نکاح میں تھی تو ایک مرتبہ ایسا قصہ پیش آیا تھا کہ ہم دونوں میاں بیوی کھانا کھارہے تھے، اسی دوران ایک

آدمی آیا، اس نے اپنی ضرورت ظاہر کی کہ مَیں بھوکا ہوں ، لیکن اس نے اس سائل کو دھمکا کر اور جھڑک کر وہاں سے نکال دیا تھا، پھر اس کے حالات برے ہوگئے، تو وہ مجھے طلاق دینے پر مجبور ہوگیا، پھر میرا تمہارے ساتھ نکاح ہوگیا، اورآج وہ اس حالت میں آیا، اس کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔تو اس شوہر نے کہا: وہ آدمی جس کو جھڑک دیا تھا؛ میں ہی تھا۔

یہ بات تودل میں بٹھا ہی لو:

بہر حال! میں پہلے بھی بار بار یہ عرض کرچکا ہوں کہ جس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں ہے، اس لئے کوئی آدمی یہ نہ سوچے کہ میرے پاس علم ہے ، دولت ہے، صلاح وتقویٰ ، نیکی اور دینداری ہے، جس کو جو بھی نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، وہ سب محض اس کا فضل ہے، ہماری کسی صلاحیت اور قابلیت کو اس میں بالکل دخل نہیں ہے۔یہ چیز ہمیشہ ہمارے پیش نظر رہنی چاہیے۔یہ بات تودل میں بٹھا ہی لو کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ میری صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر نہیں ہے، سب کچھ اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جب چاہے لے لے، اس سے کوئی بعید نہیں ہے۔اس لیے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہی ہے کہ ہمیں جو تعلیمات دی گئی ہیں ان کا اہتمام کیا جائے۔حدیث میں آتا ہے: ’’لَاتُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيُعَافِيَهُ اللهُ وَ يَبْتَلِيَكَ‘‘ (المعجم الکبیر للطبرانی:۱۷۵۹۳) اپنی کسی بھائی کی کسی بھی مصیبت کے اوپر خوشی کا اظہار مت کرو،

کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو تواس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔

خلاصۂ کلام:

توحضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ تعلیم ہے کہ دو کا کھانا تین کے لیے کافی ہو جائے گا، یا تین کا کھانا چار کے لیے کافی ہو جائے گا؛ وہ دراصل ایسے مواقع کے لیے ہی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر لوگ اگر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس تعلیم کو مد نظر رکھیں تو کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی، دل بڑا کرتے ہوئے کہے: بھائی سب آجاؤ، اللہ تعالیٰ اس کھانے میں برکت دیدیں گے۔ آدمی دل میں جھجک محسوس نہ کرے کہ کیا ہو گا۔ اگر کھانا ختم ہو جائے تو کہہ دو کہ بھائی! جو کھانا تھا وہ پیش کر دیا گیا، اب کھانا ختم ہو گیا ہے۔ اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

باب أدب الشرب

پینے کے آداب

واستحباب التنفس ثلاثاً خارج الإناء

و كراهة التَّنَفُّس فى الإناء واستحباب إدارة الإناء عَلَى الأيمن

فالأيمن بعد المبتدء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پینے کے آداب:

اس عنوان میں کئی چیزیں بتاتے ہیں :-

ایک تو یہ ہے کہ پینے کی کوئی بھی چیز ہو،پانی،دودھ یااور کوئی مشروب ہو؛ اس کو ایک سانس میں نہ پیے،بلکہ تین سانس سے پیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب سانس لینے کاوقت آئے توبرتن کے اندر سانس نہ لے،بلکہ برتن سے منھ ہٹاکرسانس لے۔برتن کے اندر سانس لینامکروہ ہے۔

اورتیسری بات یہ ہے کہ پینے کی چیز پی کربچاہواکسی دوسرے کودیناہے تواس کاطریقہ یہ ہے کہ دائیں طرف سے ابتداء کی جائے۔

حدیث۷۵۷:-

عن أنس رضی اللہ عنہ **أنَّ رسول الله** (ﷺ) **كَانَ يَتَنَفَّسُ فِى الشَّرابِ ثَلاثاً** (متفق عَلَيْهِ) **يعني:يتنفس خارجَ الإناءِ.**

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) پینے کے دوران (برتن کو منھ سے ہٹاکر) تین مرتبہ سانس لیتے تھے۔

حدیث ۷۵۸:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ قال رسول اللہ (ﷺ) :لاَتَشْرَبُوا وَاحِداً كَشُرْبِ البَعِيرِ، وَلَكِنِ اشْرَبُوا مَثْنَى وَثُلاَثَ،وَسَمُّوا إِذَا أَنْتُمْ شَرِبْتُمْ ،وَاحْمَدُوا إِذَا أَنْتُمْ رَفَعْتُمْ . (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایک سانس میں اونٹ کی طرح نہ پیو(اونٹ کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ پانی پینے کے لیے منھ ڈالتا ہے تو پورا پینے کے بعد ہی منھ اونچا کرتا ہے)بلکہ پینے کے دوران دو یا تین مرتبہ سانس لو۔اور جب پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو،اور جب پانی پی چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، حمد بیان کرو (الحمدللہ کہو)

افادات:- اگر پی جانے والی چیز کی مقدار قلیل ہے ،مثلاًایک ہی گھونٹ ہے،تو اس صورت میں ایک سانس میں پینے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن پھر بھی کوئی آدمی سنت پر عمل کی حرص میں اس کو بھی تقسیم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس جذبہ پر اس کو ثواب عطا فرمائیں گے۔ اور نبی ٔکریم (ﷺ) نے ایک سانس میں پینے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ حرمت کے لیے نہیں ہے،بلکہ آداب کے قبیل سے ہے،اگر کوئی آدمی ایک ہی مرتبہ میں پی لیتا ہے،تو فقہاء نے لکھا ہے کہ وہ بھی جائز ہے لیکن خلافِ اولیٰ ہے، اور پینے کے دوران برتن کو منھ سے ہٹا کر دو یا تین سانس لینا مستحب اور آداب میں سے ہے

نہی ٔارشاد اور نہی ٔتحریم :

دیکھو! نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانیں مختلف ہیں ، کبھی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے رسول ہونے کی حیثیت سے کسی چیز سے منع فرماتے ہیں،اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب اس چیز کا کرنا حرام اور ممنوع ہے،اگر کوئی آدمی اس کو کرے گا تو گنہگار ہو گا۔اور نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک حیثیت شفیق باپ اور مہربان مربی کی ہے،اس لیے کبھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسیچیز سے اسی حیثیت سے منع فرماتے ہیں اوراس ممانعت کا تعلق حلت وحرمت سے نہیں ہوتا؛اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں نہی ٔارشاد کہتے ہیں، کتابوں میں یہ جملہ آتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس ممانعت کا تعلق از قبیلِ نہی ٔارشاد ہے،یعنی نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم)نے اپنی امت کو اچھے آداب سکھانے کی غرض سے کسی کام کو کرنے سے منع فرمایا۔ تو ایک سانس میں پینے سے جو ممانعت فرمائی ہے وہ بھی از قبیلِ نہی ٔتحریم نہیں،بلکہ از قبیلِ نہی ٔارشاد ہے،یعنی ایک فائدہ کی چیز ہے جس کی نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کو تاکید فرمارہے ہیں، جیسے ایک شفیق باپ اور مہربان مربی اپنے ماتحتوں کی تربیت کرتے ہوئے ایسی چیزوں کی بھی تلقین کرتا ہے جو ان کے لیے مفید اور کارآمد ہوتی ہیں،یعنی وہ کام کوئی واجب اور ضروری نہیں ہوتے،پھر بھی وہ کہتا ہے کہ ایسا کرو اورایسا مت کرو۔تو یہ ”ایسا مت کرو“جو کہا گیا وہ اس لیے نہیں کہ وہ کام حرام اورگناہ ہے، بلکہ اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ اچھا نہیں ہے، نامناسب ہے،

خلافِ اولیٰ ہے، بہتر نہیں ہے۔ اسی لیے فقہاء نے لکھا ہے کہ ایک سانس میں پینا جائز تو ہے، لیکن بہتر نہیں ہے۔

میٹھے پانی کا عجیب وغریب قدرتی نظام:

اور پینا شروع کرو تو بسم اللہ پڑھو یعنی اللہ کا نام لو، جس طرح کھانا شروع کرو تب بھی اللہ کا نام لینے کا حکم فرمایا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے وقت جو اللہ کا نام لینے کا کہا گیا ہے وہ دراصل اس بات کو یاد دلایا جارہا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت ہے، لہٰذا جس ذات نے یہ نعمت ہمیں دی ہے اس کا نام لو اور اس کی قدر کرتے ہوئے اس کو استعمال کرو۔

اور ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ پانی اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے! اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لیے پانی کا ذخیرہ سمندروں کے اندر رکھا ہے، لیکن وہ پانی تو کڑوا اور کھارا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے نمکیات رکھے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر وہ میٹھا ہوتا تو وہ خراب ہو جاتا اور بگڑ جاتا، اس لیے کہ اس میں جانور مرتے رہتے ہیں اور میٹھے پانی میں جانور مریں تو وہ پانی بہت جلدی سڑ جاتا اور اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسے نمکیات رکھے کہ ساری دنیا کی گندگیاں وہاں جاتی ہیں اور مختلف قسم کے جانور اس میں مرجاتے ہیں، اس کے باوجود وہ پانی انہیں نمکیات کی وجہ سے خراب نہیں ہوتا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا کہ اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سمندروں سے پانی لے آؤ، اس لیے کہ سمندر کا پانی تو کڑوا ہے، اس سے براہِ راست اس

کی ضرورت پوری نہیں ہوسکتی۔ تو پانی کا ذخیرہ تو سمندر میں کیا، پھر اللہ کی مخلوق جہاں جہاں بسی ہے وہاں اس کے پہنچانے کا یہ انتظام کیا کہ سمندر کے اندر مانسون کے ذریعہ بادل تیار ہوتے ہیں، بادل سمندر کے اندر ہی سے اُٹھتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا قدرتی نظام بنادیا اور ایسی مشین بنادی ہے کہ مانسون کے ذریعہ بادل میں جب پانی بھرتا ہے تو ساری نمکیات سمندر ہی میں رہ جاتے ہیں اور خالص میٹھا پانی اس میں جمع ہوتا ہے، اور پھر وہ بادل اللہ تعالیٰ دنیا کی مختلف جگہوں پر۔ جہاں اللہ کی مخلوق بسی ہوئی ہے۔ پہونچاتے ہیں اور وہ وہاں پانی برساتے ہیں، اب بارش کا تو مخصوص زمانہ اور موسم ہوتا ہے، اگر یہ حکم ہوتا کہ سال بھر کی اپنی ضرورت کا پانی اسی موسم میں بھرلو، تو اتنی بڑی ٹنکی کہاں سے لاتے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے بھی نظام بنایا کہ پہاڑوں پر جہاں بارش برستی ہے وہاں اس پانی کو برف کی شکل میں جمادیا، گویا وہ فریج میں محفوظ ہے، جب گرمیوں کا زمانہ آتا ہے تو وہ پگھلتا ہے اور ندیوں، دریاؤں کے ذریعہ بستیوں میں پہنچتا ہے۔ اور دوسری شکل یہ بھی بنائی کہ بارش کا برسا ہوا پانی زمین کے اندر جذب کرادیا، زمین کے اندر پانی کے ذخیرے موجود ہیں، گویا زمین کے اندر نالیاں سی بنادیں اور ٹیوب لگادئے ہیں، جب ہم زمین کو کھودیں گے تو اندر سے ہمیں پانی ملے گا۔ اس لیے آدمی سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو میٹھا پانی پہنچانے کے لیے کیسا عجیب و غریب نظام بنایا ہے؟ اس لیے کہا گیا کہ سوچو کہ یہ نعمت کس کی دی ہوئی ہے، پھر اسی کا نام لے کر اس کو استعمال کرو، اور اس کا شکر ادا کرو۔

شکر گزار بندہ کی دعائیں:

جب پانی پی کر فارغ ہو تو الحمد للہ کہو۔ "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَرْوَانَا" تمام تعریف اس ذات کے لیے ہے جس نے ہمیں سیراب کیا۔ حضرت نوح علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے: "إِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا" وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب بھی وہ کوئی نعمت استعمال کرتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔ جیسے: کھانا کھاتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَطْعَمَنِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَجَاعَنِیْ" اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے کھلایا، اگر وہ چاہتا تو بھوکا رکھتا۔ جب پانی پیتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ سَقَانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَظْمَأَنِیْ" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے پانی پلایا، اگر وہ چاہتا تو پیاسا رکھتا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ كَسَانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَعْرَانِیْ" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے لباس پہنایا، اگر وہ چاہتا تو بغیر لباس کے ننگا رکھتا۔ جوتا پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ حَذَّانِیْ، وَلَوْ شَاءَ أَحْفَانِیْ" اللہ کا شکر ہے کہ جس نے مجھے جوتا پہنایا، اگر وہ چاہتا تو ننگے پیر رکھتا۔ اور قضائے حاجت کے بعد کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ أَخْرَجَ عَنِّیْ أَذَاهُ، وَلَوْ شَاءَ حَبَسَهٗ" اللہ کا شکر ہے جس نے تکلیف دہ چیز کو مجھ سے نکال دیا، اگر وہ چاہتا تو اس کو اندر ہی روک دیتا (جامع البیان في تفسیر القرآن للطبري: سورۃ بنی اسرائیل) تو واقعہ یہ ہے کہ آدمی سوچے کہ اس میں میری کون سی محنت اور صلاحیت کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے یہ سب نعمتیں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی کسی بھی نعمت کو آدمی جب استعمال کرے تو اس موقع پر جو جو دعائیں بتلائی گئی ہیں ان کا اہتمام کرے، اور وہ

دعائیں اسی لیے بتلائی ہیں کہ شروع میں اللہ کا نام لیا جائے گا تو اس نعمت کے دینے والے کی طرف دھیان جائے گا، پھر استعمال کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے تاکہ اس نعمت کا حق ادا ہو، اس کی ناقدری نہ ہو۔

برتن میں سانس نہ لے:

حدیث ۷۵۹:-

وعن أَبِي قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ **: أَنَّ النبيَّ (ﷺ) نَهَى أَنْ يُتَنَفَّسَ فى الإناءِ.** (متفق عَلَيْهِ)

يعنى: يتنفس فى نفس الإناءِ.

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے برتن کے اندر سانس لینے سے منع فرمایا۔

افادات:- بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ پانی پینے کے دوران گلاس منھ سے ہٹاتے ہی نہیں، اسی میں سانس لیتے ہیں؛ حالاں کہ اس سے منع کیا گیا ہے۔ برتن سے منھ ہٹا کر سانس لینا چاہیے، اس لیے کہ پانی بہت نازک اور صاف شفاف چیز ہے، آدمی جب اندر سانس لے گا تو سانس کے اثرات اندر آجائیں گے۔ بیڑی سگریٹ پینے والا اگر اندر ہی سانس لے گا تو اس کی بدبو کا اثر اندر آجائے گا، پھر اس بچے ہوئے پانی کو اگر کوئی دوسرا استعمال کرنا چاہے گا تو فوراً اس کی

طبیعت گھن کرے گی،اس لیے اندر سانس لینے سے منع کیا گیا ہے کہ پانی کے اندر سانس لے کر اس کو آلودہ مت کیجئے، برتن کو منھ سے ہٹا کر سانس لیجئے۔

اَلْاَیْمَنَ فَالْاَیْمَنَ:

حدیث ۷۶۰:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ الله (ﷺ) أُتِيَ بِلَبَنٍ قَدْ شِيبَ بماءٍ، وَعَنْ يَمِينِهِ أعْرَابِيٌّ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَبُو بَكْرٍ رضی اللہ عنہ ، فَشَرِبَ، ثُمَّ أَعْطَى الأعْرابيَّ، وقال: ((الأَيْمَنَ فالأَيْمَنَ)) (متفق عَلَيْهِ)

قَوْله: ((شِيب)) أيْ: خُلِطَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) کے پاس دودھ لایا گیا جس میں پانی کی ملاوٹ تھی، آپ کے دائیں طرف ایک دیہاتی بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب آپ (ﷺ) دودھ پی کر فارغ ہوئے تو آپ نے بچا ہوا اس دیہاتی کو عطا فرمایا اور ارشاد فرمایا: "اَلْأَیْمَنَ فَالْأَیْمَنَ"

حدیث ۷۶۱:-

وعن سهلِ بن سعدٍ رضی اللہ عنہ أنَّ رسول الله (ﷺ) أُتِيَ بِشرابٍ، فَشَرِبَ مِنْهُ وَعَنْ يَمِينِهِ غُلامٌ، وَعَنْ يَسَارِهِ أَشْيَاخٌ، فَقَالَ للغُلامِ: أتَأْذَنُ لِي أنْ أُعْطِيَ هؤُلاَءِ؟ فَقَالَ الغُلامُ: لا واللهِ، لا أُوثِرُ بنَصيبي مِنْكَ أحَداً. فَتَلَّهُ رسول الله (ﷺ) في يَدِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قَوْله: ((تَلَّهُ)) أيْ وَضَعَهُ. وهذا الغلامُ هُوَ ابْنُ عباس رضی اللہ عنہما.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پینے کی کوئی چیز لائی گئی، جب آپ پی چکے تو آپ کی دائیں طرف ایک بچہ بیٹھا ہوا تھا اور بائیں طرف بڑی عمر کے بزرگ لوگ تھے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بچہ سے کہا: کیا تم اس بات کی اجازت دیتے ہو کہ مَیں اپنا بچا ہوا ان بڑے لوگوں کو دوں؟ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ آپ کا بچا ہوا ہے جس میں میرا حصہ ہے، اور مَیں وہ کسی دوسرے کو دینا نہیں چاہتا، چناں چہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کے ہاتھ میں زور سے تھما دیا۔

افادات:- عرب میں یہ رواج تھا کہ جب دودھ دوھتے تھے تو اس میں تھوڑا سا پانی میں بھی ملا دیتے تھے، اس کی وجہ سے دودھ میں ٹھنڈک بھی آجاتی تھی اور پینے کے لیے مرغوب بھی ہوجاتا تھا۔ لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ پینے کے لیے تو دودھ پانی کی ملاوٹ کی اجازت ہے، بیچنے کے لیے پانی کی ملاوٹ کی اجازت نہیں ہے، اگر اس میں پانی ملایا گیا ہے تو گاہک سے کہہ دیا جائے کہ اندر پانی ملایا گیا ہے۔

اس باب میں ایک ادب یہ بھی بتلایا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور وہی برتن کسی دوسرے کو پینے کے لیے دینا چاہتا ہے تو دائیں طرف والے کو دے۔ اس روایت میں دیکھو کہ دائیں طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے تھے جن کا مقام و مرتبہ حضرات انبیاء کے بعد انسانوں میں سب سے افضل ہیں، اس کے باوجود چوں کہ وہ بائیں طرف تھے، اور آداب

میں سے یہ ہے کہ جو دائیں طرف ہو اس کو دیا جائے، تو نبی کریم (ﷺ) نے اس ادب کی رعایت فرمائی۔

دوسری روایت میں جو آیا تو وہ بچے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے، نبی کریم (ﷺ) کی وفات کے وقت ان کی عمر دس سال تھی، تو ظاہر ہے اس وقت چھوٹے لڑکے تھے۔ چوں کہ "الایمن فالایمن" والا اصول بتلایا گیا ہے۔ حالاں کہ پینے کی جو چیز لائی گئی تھی اس کے مالک خود حضورِ اکرم (ﷺ) تھے، آپ اپنی مرضی سے جس کو چاہتے دے سکتے تھے، لیکن اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی کہ دینے کی شروعات داہنی طرف سے کرو، اس لیے خود حضورِ اکرم (ﷺ) نے بھی اس کا اہتمام فرمایا کہ بائیں طرف بڑے لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور دائیں طرف ایک لڑکا بیٹھا ہوا تھا، اور اصول کا تقاضہ یہ ہے کہ اس لڑکے ہی کو دیا جائے، ادھر بڑے لوگ تھے جس کی وجہ سے خیال یہ ہوا کہ ان کا اکرام کیا جائے۔ جب نبی کریم (ﷺ) نے ان سے اجازت مانگی تو ان کو چاہیے تھا کہ اجازت دیدیتے، لیکن چوں کہ وہ بھی حضور (ﷺ) کے بچے ہوئے کے حریص تھے تو انہوں نے سوچا کہ اگر آپ (ﷺ) اپنی مرضی واختیار سے دینا چاہتے تو دے سکتے تھے، لیکن جب حضور (ﷺ) اجازت ہی مانگ رہے ہیں تو میں ہی فائدہ کیوں نہ اُٹھاؤں؛ اس لیے انہوں نے کہا: مَیں تو اپنا حصہ کسی کو نہیں دوں گا۔

ایک مسئلہ:

اور یہ ادب اس وقت ہے جبکہ وہ چیز ہمیں پینے کے لیے مالک بنا کر دی گئی ہو، لیکن اگر پینے کی جو چیز ہمیں دی وہ کسی اور کی ہے، تو پھر اس صورت میں پی کر بچا ہوا اسی کو دے دیا جائے جو لایا ہے، پھر وہ جس کو چاہے دے، اگرچہ اس کو چاہیے کہ دائیں طرف والے کو دے، لیکن ہم تو پی کر اسی کو دیں۔

ان دونوں روایتوں میں یہی ادب سکھایا گیا ہے کہ کسی نے کوئی چیز پی، اور بچا ہوا آگے دینا چاہتا ہے؛ تو اس کا دَور داہنی طرف سے چلانا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

كراهة الشرب من فم القربة ونحوها وبيان أنه كراهة تنزيه لا تحريم

مشکیزہ اور بڑے برتن سے منہ لگا کر پینے کی ممانعت اور اس کی وجہ:

مشکیزہ یا اس جیسی کوئی بڑی چیز، یا کوئی بڑا برتن جس میں پانی رکھا ہوا ہو، جیسے: آج کل پلاسٹک کے گوٹ، یا کیربے ہوتے ہیں، تو اس سے براہِ راست منہ لگا کر پینا کیسا ہے؟ باب کا عنوان لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ ایسے بڑے برتن سے منہ لگا کر پینا منع ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔ ورنہ جو چھوٹے برتن ہوتے ہیں، جیسے: گلاس، پیالہ وغیرہ؛ وہ تو پینے کے واسطے ہی ہوتے ہیں، اس کی ممانعت نہیں ہے۔ اور یہ ممانعت بھی آداب کے قبیل سے ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بڑے برتن میں جو پانی ہے اس میں کوئی مضر چیز ہے، جیسے پانی خراب ہو گیا ہے، یا اندر کوئی سپولیا ہے، یا کوئی چھوٹا سا جانور گھس گیا ہے، اب اگر آپ منہ لگا کر پئیں گے تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیٹ کے اندر آ جائے اور نقصان ہو جائے جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے مشکیزہ سے براہِ راست پیا، تو اندر ایک چھوٹا سا سپولیا تھا وہ ان کے پیٹ میں چلا

گیا۔تو اگر اس برتن میں سے کسی چھوٹے برتن گلاس وغیرہ میں نکالیں گے تو ہمیں نظر آجائے گا کہ اندر کیا ہے،اس لیے یہ ادب بتلایا ہے۔اور یہ ممانعت بھی از قبیلِ تحریم نہیں ،بلکہ اس طرح پینا خلافِ اولیٰ ہے۔

حدیث ۷۶۲:-

عن أَبِي سعيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ **قَالَ:نَهَى رسول الله** (ﷺ) **عن اخْتِنَاثِ الأَسْقِيَةِ . يعني : أن تُكْسَرَ أفواهُها،وَيُشْرَبَ مِنْهَا .** (متفق عَلَيْه)

ترجمہ:-حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے اس بات سے منع فرمایا کہ مشکیزہ کا منھ توڑ کر اس سے پیا جائے،یا اس کو موڑ کر پیا جائے۔

حدیث ۷۶۳:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ **قَالَ:نَهَى رسول الله** (ﷺ) **أن يُشْرَبَ مِنْ فِيِّ السِّقَاءِ أَوْ القِرْبَةِ.** (متفق عَلَيْه)

ترجم:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے بڑے برتن یا مشکیزہ سے منھ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔

افادات:-دو شکلیں ہیں ،ایک تو یہ ہے کہ چمڑے کا بڑا مشکیزہ ہوتا ہے اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے،تو اس سے براہِ راست پینے میں آگے کا جو منھ ہوتا ہے،اس کو موڑ دیتے ہیں ،اس لیے کہ اس کے منھ پر ہاتھ لگنے کی وجہ سے میل کچیل لگا ہوا ہوتا ہے،جب آدمی اسی سے منھ

لگا کر پینا چاہتا ہے تو اس کی طبیعت چاہتی ہے کہ صاف جگہ سے پیوں ،اس لیے بعض لوگ ایسا کرتے تھے کہ اس مشکیزہ کے سرے کو اس طرح موڑتے ہیں کہ اندر کا حصہ باہر آجاتا ہے، اور چوں کہ اندر کا حصہ بالکل صاف شفاف ہوتا ہے تو اس کو منھ لگا کر پیتے ہیں۔اب اگر سب ہی اس طرح اس کا منھ موڑ کر پئیں گے تو چند مرتبہ کے بعد مشکیزہ کا منھ کٹ جائے گا اور پھر وہ مشکیزہ استعمال کے قابل نہیں رہے گا،اس لیے نبی کریم (ﷺ) نے مشکیزہ کے منھ کو اس طرح موڑ کر پینے سے منع فرمایا

اس سے ایک اصول معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کو استعمال کرنے کے لیے ایسا طریقہ اپنانا، جس کے نتیجہ میں آئندہ چل کر وہ چیز بے کار ہو جائے؛شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

اس میں دوسرا نقصان یہ بھی ہے کہ بڑا برتن ہونے کی وجہ سے اس میں پانی زیادہ ہوتا ہے، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پانی زیادہ مقدار میں حلق کے اندر چلا جاتا ہے، اور یہ چیز آدمی کے لیے مضر ہوتی ہے۔

حضور (ﷺ) نے مشکیزہ سے منھ لگا کر پیا:

حدیث ۷٦۴:-

وعن أم ثابتٍ كَبْشَةَ بنتِ ثابتٍ أُختِ حَسّانَ بن ثابتٍ رضی اللہ عنہا. قالت : دخل عَلَيَّ رسولُ الله (ﷺ) فَشَرِبَ مِنْ فِيّ قِرْبَةٍ مُعَلَّقَةٍ قَائِماً ،فَقُمْتُ إِلَى فِيهَا فَقَطَعْتُهُ.(رواہ الترمذی،وقال:حدیث حسن صحیح)

وإنّما قطعتها: لِتَحفظَ مَوْضِعِ فَمِ رسولِ الله (ﷺ) وَتَتَبَرّكَ بِهِ، وتَصُونَهُ عَن الابْتِذَال. وهذا الحديث محمولٌ عَلَى بيان الجواز، والحديثان السابقان لبيان الأفضل والأكمل. والله أعلم.

ترجمہ:-حضرت اُمِ ثابت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) ان کے یہاں تشریف لائے، ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا اس کو منھ لگا کر کھڑے کھڑے پانی پیا (وہ فرماتی ہیں کہ جس جگہ نبیِ کریم (ﷺ) نے منھ لگا کر پانی پیا تھا) اس جگہ کو میں نے کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

افادات:-اس حصہ کو برکت کے واسطے کاٹ ڈالا کہ نبیِ کریم (ﷺ) کا منھ جہاں لگا ہے وہ چیز اپنے پاس برکت کے لیے رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نیک بندوں کی استعمال کی ہوئی چیز کو آدمی برکت کے واسطے اپنے پاس رکھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

برکت کے معاملہ میں بھی لوگوں میں افراط و تفریط ہے، بعض لوگ برکت کے معاملہ میں اتنے آگے بڑھے ہوئے ہیں کہ اسی کو کافی سمجھتے ہیں، دوسرے کسی عمل کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ اور بعض لوگ اس کو بالکل بدعت سمجھتے ہیں؛ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔

روایتوں میں تطبیق:

اب دیکھیے! اوپر تو ممانعت آئی تھی اور یہاں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اس طرح پیا؟ تو پہلے بتلا چکا ہوں کہ وہ ممانعت حرمت کے لیے نہیں ہے کہ اس طرح پینا حرام ہے، بلکہ اس طرح پینے کے مقابلہ میں کسی برتن میں نکال کر پینے میں فائدہ زیادہ ہے۔اسی لیے ایک موقع پر خود نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منھ لگا کر پی کر بتادیا کہ اگرچہ اچھا نہیں ہے ،لیکن جائز ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب کراھة النفخ فی الشرب

پینے کی چیز میں پھونک نہ مارے:

پینے کے آداب میں ایک ادب یہ بھی ہے کہ جو چیز پی جارہی ہے تو پینے کے دوران اس میں پھونک نہ مارے۔ایک تو ہے اندر سانس لینا اور ایک ہے پھونک مارنا، تو پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا ہے۔

حدیث ۷۶۵:-

عن أَبي سعيد الخدری رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) نَهَى عَنِ النَّفْخِ فی الشَّرَاب، فَقَالَ رَجُلٌ: القَذَاةُ أراها فی الإناءِ فَقَالَ: أهرقها. قَالَ: إِنِّي لا أَرْوَى مِن نَفَسٍ وَاحِدٍ؟ قَالَ: فَأَبِنِ القَدَحَ إِذاً عَنْ فِيكَ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔اس پر ایک آدمی نے سوال کیا: اگر اس میں کوئی تنکا نظر آجائے؛تو کیا کیا جائے ؟اس کو کیسے نکالے ؟حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اتنا پانی بہادو (کہ اس کے ساتھ وہ چیز گر جائے، پھونک مارے بغیر بھی یہ مقصد حاصل ہوجائے گا) پھر اس آدمی نے کہا: مَیں ایک سانس میں شکم سیر ہوکر

پانی نہیں پی سکتا؟ (یعنی تھوڑا سا پانی میرے لیے کافی نہیں ہوتا، مجھے زیادہ پانی پینا پڑتا ہے اور جب زیادہ پانی پیوں گا تو پینے میں دیر لگے گی اور اس دوران سانس لینے کی ضرورت پیش آئے گی، اور برتن میں پھونک مارنے سے اور ہوا چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے؛ تو اب کیا کروں؟) حضور (ﷺ) نے فرمایا: جس برتن میں پی رہے ہو (گلاس، برتن یا پیالی وغیرہ) اس کو منہ سے الگ کردو (پھر سانس لے لو، گویا اس گلاس یا پیالہ کو منہ سے لگا ہوا رکھنے کی حالت میں سانس نہ لو، تاکہ سانس کا اثر اندر جانے نہ پائے)

افادات:- کبھی تو وہ چیز گرم ہوتی ہے اس کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بعض لوگ اس میں پھونک مارتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تنکا وغیرہ کوئی چیز اس میں گری ہوئی ہوتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے پھونک ماری جاتی ہے؛ تو چاہے پینے کی چیز پانی ہو، چائے ہو، یا اور کوئی چیز ہو؛ اس میں پھونک مارنے سے نبئ کریم (ﷺ) نے منع فرمایا ہے۔ پہلے بھی بتایا گیا تھا کہ یہ کراہت تنزیہی ہے، یعنی ادب کے خلاف ہے۔ ایسا نہیں کہ کوئی ایسا کام کرے گا تو اس نے حرام کام کرلیا اور گناہ کا ارتکاب ہوگیا۔ بلکہ کسی چیز کو پینے کا جو پسندیدہ انداز ہے اور ہمیں پینے کی جو تہذیب بتائی گئی ہے اس کے خلاف سمجھا جائے گا۔

حدیث ٧٦٦:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما. أَنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) نهى أن يُتَنَفَّسَ فى الإناءِ أَوْ يُنْفَخَ فِيهِ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جس برتن میں پانی یا کوئی اور چیز پی جارہی ہے اس میں سانس لینے اور پھونک مارنے سے نبیٔ کریم (ﷺ) نے منع فرمایا۔

افادات:- ویسے بھی پانی بڑی نازک چیز ہے، آدمی کے سانس لینے اور پھونک مارنے کی وجہ سے آدمی کے منھ کا اثر پانی میں آجاتاہے۔ اگر بدبو ہے تو بدبو کا اثر آجاتاہے، خاص کرکے اگر آدمی بیڑی سگریٹ پینے والا ہو تو اس کے اثرات پانی میں آجائیں گے،اور اگرپانی بچ گیاتو دوسروں کے پینے کے قابل نہیں رہے گا، آدمی کی طبیعت اس سے کراہت اور گھِن کرے گی۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب بیان جواز الشرب قائماً

وبیان أنَّ الأکمل والأفضل الشرب قاعداً

کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل:

ایک اور ادب بتلا رہے ہیں کہ پانی یا جو بھی پینے کی چیز ہو وہ اگرچہ کھڑے ہو کر پینا جائز تو ہے، لیکن اچھا اور بہتر یہ ہے کہ بیٹھ کر پیئے، اس سلسلہ میں ایک روایت حضرت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا کی پچھلے باب میں گزر چکی کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے مکان پر تشریف لے گئے اور جو مشکیزہ لٹک رہا تھا اس کا منہ کھول کر آپ نے کھڑے کھڑے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی نوش فرمایا، اس سے کھڑے کھڑے پانی پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ایک اور روایت لا رہے ہیں۔

حدیث ۷۶۷:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ: سَقَیْتُ النَّبِیَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) مِنْ زَمْزَمَ. فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ. (متفق عَلَیْهِ)

ترجمہ:-حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَیں نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زمزم پلایا، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہوکر نوش فرمایا۔

حدیث ۷۶۸:-

وعن النَّزَّالِ بن سَبْرَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: أَتَى عَلِيٌّ** رضی اللہ عنہ **بَابَ الرَّحْبَةِ، فَشَرِبَ قائِماً، وقال: إِنِّي رَأَيْتُ رسولَ الله** (صلی اللہ علیہ وسلم) **فَعَلَ كما رَأَيْتُمُونِي فَعَلْتُ.** (رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت نزّال بن سبرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کے چوک کے پاس تشریف لائے اوروہاں کھڑے ہوکر پانی پیا۔اور فرمایا:مَیں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایسا کرتے ہوئے دیکھاجیساکہ تم لوگوں نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

افادات:-اس باب میں کھڑے ہوکرپینے کے سلسلہ میں دونوں قسم کی روایتیں لارہے ہیں۔بعض روایتیں وہ ہیں جن میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہوکر پینے سے منع فرمایا، جیسے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کریں گے:"أَنَّهُ نَهٰى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِماً" آدمی کھڑے ہوکر پیے اس سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا۔بلکہ مسلم کی ایک روایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:"لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ قَائِماً، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِيء" کوئی آدمی کھڑے ہوکرہرگزنہ پیے،اگر بھول سے کھڑے ہوکرپی لیاہو تو قے کردے۔
بہر حال! ان روایتوں سے کھڑے ہوکر پانی پینے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

اور کچھ روایتیں وہ پیش کریں گے جس میں آپ (ﷺ) نے پانی کھڑے ہوکر نوش فرمایا، جس سے کھڑے ہوکر پینے کی اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما. کی یہی روایت اور حضرت علی والی روایت پیش کی ہے۔تواب دونوں طرح کی روایتوں کے پیشِ نظر اہلِ علم نے ان میں جوڑ پیدا کرنے کے لیے مختلف باتیں کہی ہیں۔

بعض حضرات کھڑے ہوکر پینے والی روایت -جس سے اجازت معلوم ہوتی ہے- اسی کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ زیادہ قوی ہیں اور عمل اسی پر ہے۔اور ممانعت والی روایتوں کو اس درجہ کی قوی نہیں مانتے۔

بعضوں نے یہ کہا : پہلے کھڑے ہوکر پینے کی اجازت تھی، پھر ممانعت ہوگئی،یعنی وہ حضرات ممانعت والی روایتوں کو ناسخ مانتے ہیں۔

بعضوں نے کہا: پہلے ممانعت تھی، پھر اجازت والا حکم آگیا۔

چکی کا پاٹ:

لیکن محققین اس طرف گئے ہیں کہ کھڑے ہو کر پینے کی جو روایتیں ہیں وہ بیانِ جواز کے لیے ہیں کہ آپ (ﷺ) اس کا جائز ہونا بتارہے ہیں۔اور ممانعت والی روایت سے اس کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے ،یعنی ادب کے خلاف ہے کہ آدمی کھڑے ہوکر پیئے۔

دورِ حاضر کے ہمارے بعض اکابر فرماتے ہیں: اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ موجود ہے تو پھر کھڑے ہو کر پینا مکروہ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کے لیے مناسب جگہ نہیں ہے، جیسے: اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہیں، یا کوئی ایسی جگہ پر ہیں کہ بیٹھنا چاہیں تب بھی نہیں بیٹھ سکتے؛ تو پھر وہاں کھڑے ہو کر پانی پینے میں کوئی کراہت بھی نہیں، ایسی جگہوں پر کھڑے ہو کر پینا بلا کراہت درست ہے۔

اور بعضوں نے کہا ہے کہ کھڑے ہو کر پینا مضر ہے، اس وجہ سے شفقتاً منع فرمایا ہے، اس لیے کہ جب آدمی کھڑے ہو کر پیتا ہے تو سانس کی رگیں پوری طرح کھلی ہوئی ہوتی ہیں، اور پانی سیدھا معدہ میں پہنچتا ہے جس کی وجہ نقصان ہو سکتا ہے، بیٹھ کر پینے میں اس نقصان سے حفاظت ہو جاتی ہے۔

البتہ دو پانی ایسے ہیں جن کو کھڑے ہو کر پینے کی اجازت ہے۔ ایک تو زمزم، اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے زمزم کھڑے ہو کر پیا، جیسا کہ ابن عباسؓ کی روایت پیش فرمائی کہ مَیں نے آپ (ﷺ) کو زمزم پلایا تو آپ نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۔

زمزم کو کھڑے ہو کر پینے کی تفصیل:

آب زمزم جو کھڑے ہو کر پیا جاتا ہے؛ تو واقعۃً زمزم کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے؟ اس کے آداب میں سے ہے؟ یا صرف جائز ہے؟ تو بعض حضرات علماء اس طرف گئے ہیں کہ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا مستحب ہے، چناں چہ احناف میں سے صاحبِ دُرِّ مختار علامہ علاء الدین حصکفی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی لکھا ہے کہ مستحب ہے۔ لیکن اس کی شرح جو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے، انہوں نے اسی موقع پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔ اور لکھا ہے کہ کم سے کم کراہت ہی ختم ہو جائے، وہی بڑی بات ہے، چہ جائیکہ علامہ حصکفی رحمۃ اللہ علیہ استحباب کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور نبی کریم (ﷺ) نے زمزم جو کھڑے ہو کر نوش فرمایا اس کی وجہ بتلائی ہے کہ حج کے موقع پر جب آپ طواف سے فارغ ہوئے اور زمزم پینے کے لیے تشریف لے گئے تو چوں کہ پانی پلانے کی ذمہ داری حضرت عباس رضی اللہ عنہما -جو آپ (ﷺ) کے چچا تھے، ان کی۔ اور ان کے خاندان کی تھی، وہی یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس موقع پر جب مَیں نے حضورِ اکرم (ﷺ) کو زمزم پلایا، تو آپ نے کھڑے ہو کر پیا۔ اس کی وجہ بھی لکھی جاتی ہے کہ وہاں بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ ہی نہیں تھی، کنویں سے پانی نکالا جاتا تھا اور پوری

جگہ پانی سے تر رہتی تھی، لوگوں کا مجمع بھی زیادہ تھا،اس وجہ سے بیٹھنے کا موقع نہیں تھا،تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کھڑے ہوکر زمزم نوش فرمایا۔

بہرحال!علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ جن کی اسی کتاب سے عام طور پر ہمارے مفتیانِ کرام فتویٰ دیا کرتے ہیں ،اور ہم بھی اسی کتاب کا حوالہ بار بار دیتے ہیں، انہوں نے تو یہی لکھا ہے کہ زمزم کا پانی کھڑے ہوکر پینا صرف جائز ہے،وہ مستحب کے قائل نہیں۔اور مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے اکابر میں ہیں ،دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی بھی رہے ہیں، بعد میں پاکستان میں بھی مفتیٔ اعظم رہے،ان کا بھی رجحان یہی تھا کہ زمزم کا پانی کھڑے ہوکر پینا صرف جائز ہے، مستحب نہیں۔اس لیے جو لوگ زمزم کو کھڑے ہوکر پینے کا اہتمام کرتے ہیں کہ بیٹھے ہوئے ہوتے ہیں اور جب زمزم آتا ہے تو کھڑے ہوجاتے ہیں ،اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کھڑے ہیں اور مل گیا تو کھڑے کھڑے پی لیجئے،لیکن بیٹھے ہیں تو خاص کھڑے ہونے کا اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہاں !جو لوگ اس کو مستحب کہتے ہیں ان کے اعتبار سے کوئی آدمی کھڑے ہوکر پیئے: تو گنجائش ہے ۔لیکن اگر کوئی آدمی کھڑے ہوکر نہیں پیتا،تو ہمارے یہاں اس کا اتنا زیادہ رواج ہوگیا ہے کہ سارے لوگ اُسے گھورتے ہیں، جیسے اس نے کوئی بڑا جرم کر دیا ہو؛ یہ طریقہ صحیح

نہیں ہے۔ مَیں نے یہ پوری وضاحت اس لیے کردی تاکہ مسئلہ کی نوعیت معلوم ہوجائے، اور مسئلہ صاف ہوکر سامنے آجائے۔

اور زمزم کو کھڑے ہوکر پینے کی دوسری وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ زمزم جتنا زیادہ پیا جائے گا؛ اتنا ہی پسندیدہ ہے، اور اس کی ترغیب بھی دی گئی ہے، اور کم پینا منافق کی علامت بتلایا گیا ہے، اس لیے کھڑے ہوکر پئیں گے تو زیادہ پیا جائے گا۔ بہرحال! زمزم کو کھڑے ہوکر پینے کی اجازت کے اندر کوئی کلام نہیں،

وضو کا بقیہ بھی کھڑے ہوکر پی سکتے ہیں:

اور دوسرا وضو کا بچا ہوا پانی ہے۔ جیسا کہ روایت پیش کی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ کوفہ کے چوک میں وضو کیا۔ پھر فرمایا: مَیں نے نبیِ کریم (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا جیسا کہ تم نے مجھے کرتے ہوئے دیکھا۔

تو علماء لکھتے ہیں کہ وضو کے بچے ہوئے پانی میں اللہ تعالیٰ نے شفاء رکھی ہے۔ شیخ عبدالغنی نابلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَیں جب کبھی بیمار ہوا اور مَیں نے اس کا اہتمام کیا کہ وضو کے بچے ہوئے پانی کو کھڑے ہوکر اس نیت سے پیا کہ اللہ تعالیٰ مجھے شفاء دے؛ تو مجھے شفاء ہوگئی۔

تو یہ دو پانی ہیں: زمزم اور وضو کا بچا ہوا؛ جن کو کھڑے ہوکر پی سکتے ہیں۔

کھڑے ہو کر کھانا پینا؟:

حدیث ۷۶۹:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما. قَالَ: کُنَّا عَلَى عهدِ رسول الله (ﷺ) نَأْكُلُ وَنَحْنُ نمشِي، وَنَشْرَبُ ونَحْنُ قِيامٌ.

(رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (ﷺ) کے زمانہ میں ہم چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے، اور کھڑے ہوئے پی لیا کرتے تھے۔

افادات:- کھڑے ہو کر پینے کے سلسلہ میں تو پوری وضاحت کے ساتھ بتلادیا کہ یہ جائز ہے، لیکن خلافِ اولیٰ ہے۔ اور اگر بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہے تو اس صورت میں اس کو خلافِ اولیٰ بھی نہیں کہیں گے۔

اور دوسری بات اس روایت میں بتلائی کہ چلتے ہوئے کھالیا کرتے تھے تو حضرت أنس رضی اللہ عنہ کی روایت آگے آنے والی ہے کہ ان سے کھڑے ہو کر کھانے کے متعلق پوچھا گیا تھا تو انہوں نے اس کو برا عمل بتلایا ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ عام طور پر جو کھانا اہتمام کے ساتھ کھایا جاتا ہے کہ اس کے لیے دسترخوان وغیرہ بچھاتے ہیں اور مقررہ اوقات کے کھانے ہوتے ہیں؛ تو وہ تو کھڑے ہو کر کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن کوئی ایسی چیز جس کو کھڑے ہو کر کھانا عیب نہیں سمجھا جاتا،

جیسے چاکلیٹ، دانے چنے، پان وغیرہ؛ کہ آدمی چلتے چلتے کھالیا کرتا ہے؛ تواس کی اجازت ہے۔ باقی اپنے مقررہ اوقات کا کھانا، جس کو ہم لنچ اورڈنر، "غَدَآء" اور "عَشَآء" کہتے ہیں تووہ چلتے چلتے کھانے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

آج کل ایک نیا سسٹم اورطریقہ بوفے والا چلاہے، شادیوں کے موقع پر ٹیبلوں کے اوپر سب کھانے رکھ دیئے جاتے ہیں ،اورلوگ اپنی پلیٹ میں لے کر کھڑے اورچلتے پھرتے کھالیتے ہیں ؛یہ طریقہ درست نہیں ہے۔

حدیث ۷۷۰:-

وعن عمرو بن شعیب، عن أبیه، عن جَدِّهِ رضی اللہ عنہ قَالَ: رأیتُ رسول الله (ﷺ) يَشْرَبُ قَائِماً وقَاعِداً. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد سے اوروہ اپنے دادایعنی حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو کھڑے کھڑے بھی اوربیٹھ کر بھی پیتے ہوئے دیکھا۔

حدیث ۷۷۱:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ عن النبيِّ (ﷺ): أنه نَهى أن يَشْرَبَ الرَّجُلُ قَائِماً قَالَ قتادة: فَقُلْنَا لأَنَسٍ: فالأَكْلُ؟ قَالَ: ذَلِكَ أَشَرُّ - أَوْ أَخْبَثُ - (رواہ مسلم)

وفی روایة لَهُ:- أَنَّ النبيَّ (ﷺ) زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قائِماً.

ترجمہ:۔حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے کھڑے کھڑے پانی پینے سے منع فرمایا۔ اس روایت کوحضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے نقل کرنے والے حضرت قتادہؒ جو تابعی ہیں وہ فرماتےہیں کہ ہم نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے پوچھاکہ کھڑے کھڑے کھانے کے متعلق کیافرماتے ہیں ؟توانہوں نے فرمایا: یہ تواورزیادہ براہے(یعنی کھڑے ہوکر تو بالکل کھانا نہیں ہوناچاہیے)

اوردوسری روایت میں ہے کہ آپ (ﷺ) نے کھڑے ہوکرپانی پینے پر تنبیہ فرمائی، اور اس سے منع فرمایا۔

حدیث ۷۷۲:۔

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ) : لاَ يَشْرَبَنَّ أحَدٌ مِنْكُمْ قَائِماً ، فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِيءْ.

(رواہ مسلم)

ترجمہ:۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:کوئی آدمی کھڑے کھڑے پانی نہ پیئے،اوراگرکسی نے بھول سے کھڑے ہوکرپی لیا تو اس کو قے کردے۔

افادات:۔مسئلہ کی تفصیلی وضاحت کرچکاہوں کہ کھڑے کھڑے پینا خلافِ اولیٰ ہے،جس کو مکروہِ تنزیہی کہتے ہیں یعنی ادب کے خلاف ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

استحباب کون ساقی القوم آخرھم شرباً

پلانے والا خود اخیر میں پیئے:

ایک اورادب بتلارہے ہیں کہ اگر کوئی آدمی پانی یااور کوئی مشروب دوسروں کو پلارہا ہو، تو ادب یہ ہے کہ خود اخیر میں پیئے۔آج کل تولوگ اپنا پہلے ہی نکال لیتے ہیں حالاں کہ ایسانہیں کرناچاہیے ، ادب یہ ہے کہ پہلے سب کوپلادو، اخیر میں خود پیو۔

حدیث ۷۷۳:-

عن أَبِي قتادة رضی اللہ عنہ عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: ساقی القوم آخِرُهُمْ شُرْباً . (رواہ الترمذی،وقال:حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) سے نقل فرماتے ہیں کہ لوگوں کو پلانے والااخیر میں ہوتاہے(یعنی اخیر میں پیاکرتاہے۔)

ایک واقعہ :

افادات:- پہلے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت گزر چکی ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو راستہ میں پڑا ہوا دیکھا، انہوں نے کئی وقت سے کھانا نہیں کھایا تھا جس کی وجہ سے ایک دم نڈھال تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے تو انہوں نے ان سے کوئی آیت پوچھی۔ مقصد یہ تھا کہ سوال کے نتیجہ میں میرے حال کا ان کو کچھ پتہ چل جائے گا اور جواب دیتے ہوئے اپنے ساتھ لے جائیں گے اور کچھ کھلا بھی دیں گے، لیکن وہ تو جواب دے کر آگے بڑھ گئے۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ گزرے تو ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مجھے دیکھ کر سمجھ گئے اور مسکراتے ہوئے فرمایا: ابوہریرہ! مَیں نے کہا: جی ہاں ۔ فرمایا: چلو۔ اپنے ساتھ لے چلے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گھر کے اندر تشریف لے گئے تو یہ بھی اجازت لے کر داخل ہوئے۔ گھر والوں سے پوچھا: کچھ ہے؟ بتلایا گیا کہ فلاں جگہ سے ہدیہ میں دودھ آیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول تھا کہ کوئی چیز اگر صدقہ کے طور پر آتی تو اس کو اصحابِ صفہ کے پاس بھیج دیا کرتے، اور اگر ہدیہ کے طور پر کچھ آتا تو ان کو بلا لیا کرتے اور خود بھی شریک ہو جاتے۔ جب گھر والوں نے دودھ کا پیالہ دیا تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اصحابِ صفہ کو بلا لاؤ۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں اپنے دل میں سوچنے لگا کہ پیالہ میں دودھ ہی کتنا ہے! یہ تو میرے لیے ہی کافی نہیں ہے، اور ان کو

بلانے کے لیے بھیج رہے ہیں، پھر جب میں بلا کر لاؤں گا تو مجھے ہی کہیں گے کہ تقسیم کرو، پھر تو میرے حصے میں کیا بچے گا؟ لیکن جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد تھا تو اس پر عمل کیے بغیر چارۂ کار بھی نہیں تھا، اس لیے گئے اور بلا کر لائے۔ جب اصحابِ صفہ آکر بیٹھے تو جیسا سوچا تھا اسی کے مطابق حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ابوہریرہ! سب کو پلاؤ۔ اب وہ باری باری سب کو دے رہے ہیں اور وہ پی کر واپس کر رہے ہیں۔ جب سب کو پلا چکے تو آخیر میں انہوں نے وہ پیالہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دستِ مبارک میں دیا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ پیالہ اپنے دستِ مبارک میں رکھ کر فرمایا: ابوہریرہ! اب تو میرے اور تمہارے علاوہ کوئی باقی نہیں رہ گیا؟ حضرت ابوہریرہ نے کہا: جی ہاں! اے اللہ کے رسول۔ تو پھر مجھ سے فرمایا: اچھا لو! اور اب تم پیو۔ مَیں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں نے پیا۔ پھر فرمایا: اور پیو۔ میں اور پیا۔ فرمایا: اور پیو، یہاں تک کہ مَیں نے کہا: اے اللہ کے رسول! اب تو اندر جانے کا راستہ نہیں، پھر اخیر میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نوش فرمایا۔ تو یہ بھی آداب میں سے ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب جواز الشرب من جمیع الأوانی الطاهرة غیر الذهب والفضة وجواز الکرع -وَهُوَ الشرب بالفم من النهر وغیره بغیر إناء ولا ید- وتحریم استعمال إناء الذهب والفضة فی الشرب والأکل والطهارة وسائر وجوه الاستعمال

ترجمة الباب :

ہر قسم کے پاک برتن میں پینے کا جائز ہونا سوائے سونے اور چاندی کے۔ کوئی بھی برتن ؛ چاہے لکڑی، مٹی، چینی، تانبے، پیتل یا لوہے کا بنا ہوا ہو؛ اس کا استعمال جائز ہے۔ہاں ! سونے اور چاندی کے برتن میں کوئی چیز کھانے یا پینے کی اجازت نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی برتن اگر پاک ہے تو اس کے اندر کھانے اور پینے کی اجازت ہے۔ایک بات تو یہ ہوئی۔

دوسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کوئی آدمی پانی میں منھ ڈال کر براہِ راست پیئے۔ایک طریقہ تو ہے کہ پانی کسی برتن میں لے کر پینا۔دوسرا طریقہ ہے کہ پانی ہاتھ اور چلُّو میں لے کر پینا۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ پانی کسی نہر یا تالاب اور حوض میں ہے اور اس میں سیدھا منھ ڈال کر

پینا، جیسے: جانور منھ ڈال دیتا ہے، جس کو عربی میں ”کَرْع“ کہتے ہیں ؛ یہ بھی جائز ہے، اس طرح بھی پی سکتے ہیں ، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس طرح پینا ثابت ہے۔

اور تیسری بات یہ بتلاتے ہیں کہ کھانے پینے اور طہارت حاصل کرنے اور دوسرے تمام استعمالات میں سونے چاندی کے برتنوں کا حرام ہونا۔یعنی سونے چاندی کے برتن نہ تو کھانے پینے کے لیے ، اور نہ کسی دوسرے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں ، جیسے: استنجاء کا لوٹا بنا کر اس میں پانی بھر کر استعمال کرنا، یا کسی اور کام میں استعمال کرنا، جیسے: سونا چاندی کی سرمہ دانی، قلم وغیرہ؛ تو یہ سب بھی جائز نہیں۔

یہ غلط فہمی نہ رہے:

سونے اور چاندی کے زیور کا استعمال عورت کے لیے جائز ہے ، مرد کے لیے نہیں۔چاندی کی انگوٹھی اگر ساڑھے تین ماشہ سے کم کی ہے؛ تو مرد کے لیے اس کے پہننے کی اجازت ہے، لیکن سونے کی بالکل جائز نہیں۔سونے چاندی کے زیورات کے علاوہ اور کوئی بھی چیز جیسے برتن وغیرہ ہو؛ تو اس کی نہ تو مردوں کے لیے استعمال کی اجازت ہے،نہ عورتوں کے لیے۔عورتوں کو بھی جو اجازت ملی ہے وہ فقط زیورات کی ملی ہے۔اس لیے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ عورتوں کو سونے چاندی کے زیورات کی اجازت ہے تو ان کے لیے دوسری چیزیں برتن وغیرہ کی بھی اجازت ہوگی،عورتیں بھی زیورات کے علاوہ کسی اور استعمال میں نہیں لا سکتیں۔

پتھر کے برتن کا استعمال:

حدیث ۷۷۴:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: حَضَرَتِ الصَّلَاةُ، فقامَ مَن كَانَ قَرِيبَ الدَّارِ إِلَى أَهْلِهِ، وبَقِيَ قَوْمٌ، فأُتِيَ رسول الله (ﷺ) بِمِخْضَبٍ مِنْ حِجَارَةٍ، فَصَغُرَ المِخْضَبُ أَنْ يَبْسُطَ فِيهِ كَفَّهُ، فَتَوَضَّأَ القَوْمُ كُلُّهُمْ. قالوا: كَمْ كُنْتُمْ؟ قَالَ: ثَمَانِينَ وزيادة. متفق عَلَيْهِ، هذه رواية البخاری.

وفی رواية لَهُ ولمسلم:- أَنَّ النَّبِيَّ (ﷺ) دَعَا بِإِنَاءٍ مِنْ ماءٍ، فَأُتِيَ بِقَدَحٍ رَحْرَاحٍ فِيهِ شَيْءٌ مِنْ ماءٍ، فَوَضَعَ أصابعَهُ فِيهِ. قَالَ أنسٌ: فَجَعلْتُ أَنْظُرُ إِلَى الماءِ يَنْبُعُ مِنْ بَيْنِ أَصَابِعِهِ، فَحَزَرْتُ مَنْ تَوضَّأَ مَا بَيْنَ السَّبْعِينَ إِلَى الثَّمَانِين.

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نماز کا وقت آیا، جن کے مکانات قریب تھے وہ تو اپنے گھروں پر وضو وغیرہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے پہنچ گئے، کچھ لوگ رہ گئے جن کے مکانات قریب نہیں تھے۔ نبی کریم (ﷺ) کے پاس پتھر کا ایک برتن لایا گیا جس میں بہت کم پانی تھا، اور وہ برتن اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ کوئی آدمی اس میں سے چلّو بھر سکے۔ نبی کریم (ﷺ) نے اس میں ہاتھ ڈال دیا اور سب لوگوں نے اس پانی سے وضو کیا۔ پوچھا: کتنے آدمی تھے؟ تو بتلایا: اسّی (۸۰) سے کچھ زیادہ آدمی تھے۔

دوسری روایت مسلم شریف میں ہے جس میں یہ ہے کہ: نبی کریم (ﷺ) نے برتن میں پانی منگوایا، تو ایک پیالہ لایا گیا جو زیادہ گہرا نہ تھا (جو برتن گہرا نہ ہو اس کو "رَحْرَاح" کہتے ہیں) اس

میں تھوڑاساپانی تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی انگلیاں مبارک اس میں رکھ دیں ،توانگلیوں کے اندر سے پانی پھوٹنے لگا،اورستر (۷۰)سے اسّی (۸۰) کے درمیان لوگوں نے اس پانی سے وضوکیا۔

افادات:-گویااس چھوٹے سے برتن میں جوپانی تھانبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ معجزہ ہواکہ آپ کی برکت سے اس میں اتنی زیادتی ہوگئی کہ سب نے اس سے وضوکرلیا یہاں توصرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ: دیکھو!وہ برتن پتھر کا تھا۔معلوم ہواکہ پتھر کے بنے ہوئے برتن کو بھی استعمال کرسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ پاک ہو۔

پیتل کے برتن کااستعمال:

حدیث ۷۷۵:-

وعن عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ **قَالَ: أَتَانَا النبيُّ** (صلی اللہ علیہ وسلم) **فَأَخْرَجْنَا لَهُ مَاءً فِي تَوْرٍ مِنْ صُفْرٍ فَتَوَضَّأَ.** (رواہ البخاری)

ترجمہ :-حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے یہاں تشریف لائے،ہم نے پیتل کے ایک پیالہ میں آپ کے لیے پانی نکالا،تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے وضوفرمایا۔

افادات:-معلوم ہواکہ پیتل کابرتن بھی استعمال کرسکتے ہیں۔البتہ فقہاء فرماتے ہیں کہ پیتل یاتانبے کابرتن ہو،خاص کرتانبے کاہو؛تواس کو قلعی کرالینازیادہ مناسب ہے، تاکہ غیروں کی مشابہت لازم نہ آئے۔

نہر میں منھ ڈال کر پینا:

حدیث ۷۷٦:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) دَخَلَ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ، وَمَعَهُ صَاحِبٌ لَهُ، فَقَالَ رسول الله (ﷺ): إِنْ كَانَ عِنْدَكَ مَاءٌ بَاتَ هٰذِهِ اللَّيْلَةَ فِي شَنَّةٍ وَإِلَّا كَرَعْنَا. (رواه البخاری)

ترجمہ :- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ایک انصاری صحابی کے یہاں تشریف لے گئے، آپ کے ساتھ آپ کے ایک صحابی بھی تھے۔آپ نے ان سے پوچھا: اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ؛ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منھ ڈال کر پی لیتے ہیں۔

افادات:- یہ قصہ بخاری شریف اور شمائل میں کچھ تفصیل کے ساتھ موجود ہے، یہاں انہوں نے مختصر کر دیا ہے۔ایک مرتبہ حضورِ اکرم (ﷺ) کے اوپر بھوک کا تقاضہ تھا، کچھ وقت سے فاقہ تھا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی یہی حال تھا، وہ باہر آئے تاکہ نبی کریم (ﷺ) کی زیارت کر کے کچھ تسلی حاصل کریں، حضور (ﷺ) بھی باہر تشریف لائے، حضور (ﷺ) نے فرمایا: چلو! فلاں صحابی کے پاس جائیں۔ایک انصاری حضرت ابو الہیثم رضی اللہ عنہ کا کھجوروں کا باغ تھا، وہاں پہنچے، ان کی گھر والی سے پوچھا: وہ کہاں ہیں؟ اس نے بتایا: وہ تو پانی لینے کے لیے گئے ہیں، اتنے میں وہ بھی پہنچ گئے، نبی کریم (ﷺ) کو تشریف لایا ہوا دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور بار بار عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تشریف لے آئے۔

آپ کو بٹھایا اور جلدی سے بکری کا دودھ دوہا اور پیش کیا۔ کھانے کے لیے بکری ذبح کرنا چاہتے تھے تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو دودھ دیتی بکری ہو وہ مت کاٹنا۔ اس کے بعد انہوں نے کھجوریں لاکر رکھیں۔ اسی موقع کا یہ قصہ ہے کہ آپ (ﷺ) نے ان سے پوچھا: اگر تمہارے پاس رات بھر مشکیزہ میں رکھا ہوا پانی ہو تو لاؤ۔ اس لیے کہ رات بھر مشکیزہ میں رہا ہوا پانی ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ورنہ تو ہم تمہاری اس چھوٹی سی بہتی ہوئی نہر میں منھ ڈال کر پی لیتے ہیں۔ حالاں کہ اس کی نوبت نہیں آئی، لیکن اس سے یہ معلوم ہوا کہ منھ ڈال کر پینا بھی جائز ہے۔ یہاں آپ نے یہ ”کَرَعْنَا“ جو فرمایا کہ ”منھ ڈال کر پی لیتے ہیں“ اسی مناسبت سے اس روایت کو اس باب میں پیش کیا ہے۔

یہ ان کے لیے دنیا میں ؛ تمہارے لیے آخرت میں :

حدیث ۷۷۷:-

وعن حذیفة رضی اللہ عنہ **قَالَ: إنَّ النبیَّ (ﷺ) نَهَانَا عَنِ الحَرِیرِ وَالدِّیبا جِ، والشُّربِ فی آنِیَةِ الذَّهَب والفِضَّةِ، وقال: هی لَهُم فی الدُّنیَا، وهِیَ لَکُم فی الآخِرَةِ.** (متفقٌ عَلَیه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ (ایک موقع پر انہوں نے پانی پینے کے لیے منگوایا، تو آپ کا جو خادم اور غلام مجوسی تھا، وہ چاندی کے برتن میں پانی لے کر آیا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے لے کر اس کے اوپر مارا، لوگوں کو تعجب بھی ہوا، تو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں

پہلے بھی اس کو منع کرچکاہوں اس کے باوجود اس میں لایا،اس لیے میں نے اس کومارا،پھر فرمایا:) نبیٔ کریم (ﷺ) نے ہم کو ریشم اوردیباج کے پہننے سے منع فرمایا ہے (دیباج:موٹے قسم کا ریشم ہوتاہے) اور سونے چاندی کے برتن میں پانی پینے سے بھی منع فرمایا۔اورفرمایا:یہ ان کے لیے (یعنی غیر مسلموں اور کفارکے لیے) دنیامیں ہے (اللہ تعالیٰ نےیہ چیزیں دنیامیں ان کو دی ہیں،اس لیےوہ استعمال کرلیں) اور تمہارے لیے آخرت میں ہیں۔

جہنم کی آگ اُنڈیل رہاہے:

حدیث ۷۷۸:-

وعن أُمِّ سلمة رضی اللہ عنہا: أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: الَّذِی يَشْرَبُ فی آنِيَةِ الفِضَّةِ، إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فی بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ. (متفقٌ عَلَيهِ)

وفی رواية لمسلم: إِنَّ الَّذِی يَأْكُلُ أَوْ يَشْرَبُ فی آنِيَةِ الفِضَّةِ وَالذَّهَبِ.

وفی رواية لَهُ: مَنْ شَرِبَ فی إِنَاءٍ مِنْ ذَهَبٍ أَوْ فِضَّةٍ، فَإِنَّمَا يُجَرْجِرُ فی بَطْنِهِ نَاراً مِنْ جَهَنَّمَ.

ترجمہ:–حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:جو آدمی چاندی کے برتن میں پانی پیئے؛گویاوہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہاہے۔

دوسری روایت میں ہے:جو آدمی چاندی اورسونے کے برتن میں کھائے یاپیے۔

ایک اورروایت میں ہے:جو آدمی سونے اورچاندی کے برتن میں پیئے، گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہاہے۔

افادات:- نبیٔ کریم (ﷺ) نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ سونے چاندی کے برتن میں کھانا پینا جائز نہیں ہے،اس کے استعمال سے آدمی اپنے آپ کو بچائے

تمت بالخیر

کتَاب اللِّبَاس

لباس کا بیان

باب إستحباب الثوب الأبیض

وجواز الأحمر والأخضر والأصفر والأسود

وجوازہ من قطن و کتان وشعر وصوف وغیرھا إلاَّ الحریر

☑ سفید لباس مستحب ہے۔لال ، ہرا،پیلا، اور کالا جائز ہے

☑ روئی، کتان ،بال اوراون کا لباس جائز ہے

☑ (مردوں کے لیے)ریشم جائز نہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ

وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا. أما بعد:-

قَالَ اللّٰہ تَعَالٰی : یَا بَنِی آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاساً یُّوَارِی سَوْآتِکُمْ وَرِیشاً وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِكَ خَیْرٌ .
(الأعراف:۲٦)

وقال تَعَالٰی: وَجَعَلَ لَکُمْ سَرَابِیلَ تَقِیکُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِیلَ تَقِیکُمْ بَأْسَکُمْ (النحل:۸۱)

یہاں سے ایک نیا عنوان ” کتابُ اللِّبَاس“ شروع کررہے ہیں ،اس میں لباس سے متعلق جو آداب اور ہدایتیں ہیں ان کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور ہدایات انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو شامل ہیں ،اسی میں رہن سہن اور معاشرت کا شعبہ بھی ہے جس سے متعلق بھی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تفصیلی ہدایات عطا فرمائی ہیں۔ معاشرت میں ایک چیز لباس بھی ہے جس کے متعلق بھی بہت ساری ہدایتیں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی اور بہت ساری باتیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عمل سے ثابت ہوتی ہیں جن کو علماء نے کتابوں میں تفصیل سے لکھا ہے۔

شیطانی دھوکہ

بعض لوگ کہتے ہیں کہ لباس سے متعلق شریعت کی پابندی کوئی ضروری نہیں ہے، جیسا لباس چاہو پہن لو،بس آدمی کا باطن اچھا ہونا چاہیے ،ظاہر جیسا بھی ہو؛یہ سب محض شیطانی دھوکہ ہے۔ آدمی کے ظاہر کا اس کے باطن پر اثر پڑا کرتا ہے، اور شریعت نے صرف باطن ہی نہیں، بلکہ ظاہر سے متعلق بھی ہدایتیں اور تعلیمات دی ہیں۔ قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: وَ ذَرُوۡا ظَاهِرَ الۡاِثۡمِ وَبَاطِنَهٗ، کچھ ظاہری گناہ ہیں اور کچھ اندر کے (چھپے ہوئے) گناہ ہیں؛ان سب کو چھوڑ دو۔ تو دیکھئے! ظاہر سے متعلق بھی ہدایت ہے اور باطن سے متعلق بھی ہے، روح سے متعلق بھی ہدایت دی ہے اور جسم سے متعلق بھی ہدایت دی ہے۔اور یہ کہنا کہ آدمی کا باطن اچھا ہونا چاہیے، ظاہر میں جس طرح کا لباس چاہو پہنو،اس میں کوئی پابندی نہیں ؛یہ بات بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ باطن جیسا ہوتا ہے ،ظاہر پر اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے،اور آدمی اپنا ظاہر جس طرح کا بناتا ہے،باطن اس سے متاثر ہوتا ہے۔

...تو برقعہ بھی پہن لیجیے

حضرت مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:بعض لوگ یوں کہتے ہیں کہ جب ہمارے دل میں ایمان ویقین ہے،اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد ہے اور ہم شریعت کے

سارے احکام کو تسلیم کرتے ہیں ، ہمارا عقیدہ درست ہے ، ہمارا عمل بھی صحیح ہے، تواب اگر ہم ظاہری طور پر جیسا بھی لباس پہن لیں ، چاہے یہود جیسا، چاہے نصاریٰ اور غیر مسلموں جیسا؛ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ الزامی جواب کے طور پر فرماتے ہیں کہ: جب آپ مرد ہیں، آپ کے اندر مردانگی اور قوت وشجاعت ہے، ہمت وہیبت اور صَوْلت ہے؛ تو پھر آپ عورتوں کا سا لباس پہن لیجیے! اپنی بیوی کی شلوار پہن لیجیے! اس کا کرتہ پہن لیجیے! دوپٹہ سر پر اوڑھ لیجیے! ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لیجیے! کانوں میں بالیاں لگالیجیے! گلے کے اندر ہار پہن لیجیے! برقعہ بھی چڑھالیجیے! اور اس طرح جاکر اپنی آفس میں ٹیبل پر بیٹھیے، کم سے کم ایک دن کے لیے ایسا کرلیجیے! اور کوئی آدمی اگر کچھ کہے تو اس سے آپ کہیے گا کہ میں تو مرد ہوں، مجھ میں شجاعت وبہادری ہے، مردوں والی قوت اور طاقت ہے، ساری چیزیں مردوں والی ہے، اگر میں نے لباس عورتوں والا پہن لیا؛ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ظاہر ہے کہ آپ اس کو گوارا نہیں کریں گے۔ تو جیسے اس کو گوارا نہیں کرتے، اسی طرح دوسری چیزوں میں بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے۔

جب خاتون کی ڈاڑھی اُگی:

دوسری بات یہ ہے کہ اس زمانہ کے تمام ماہرین نفسیات اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ آدمی جیسا ظاہر اختیار کرتا ہے اس کے باطن پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ ظاہری اعتبار سے آپ اپنی شکل وصورت اگر عورتوں جیسی بنائیں گے کہ عورتوں کا سا لباس پہنیں، یا مخنثوں کا سا لباس پہنیں،

ان جیسی حرکتیں کرنے لگیں ،ان جیسی زبان استعمال کریں ، ان جیسالہجہ آپ استعمال کریں، جب چند روزتک آپ ایسا کریں گے؛ تووہی اثرات آپ کے اندر ظاہر ہوں گے۔

ابوداود شریف میں روایت موجود ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عورتوں کوبال منڈانے سے منع فرمایا(۱) یوروپ کا قصہ ہے، کسی زمانہ میں اخبارمیں ایک عورت کے متعلق آیاتھاکہ اس نے بال منڈانے شروع کئے کہ اس میں کیاحرج ہے،جب ایک زمانہ تک بال منڈاتی رہی؛تواس کو ڈاڑھی آناشروع ہوگئی۔

داغ؛ باطن کی خرابی کا اثر

تویہ کہناکہ آدمی کے ظاہرکااس کے باطن کے اوپرکوئی اثرنہیں پڑتا،صرف باطن درست ہوناچاہیے؛یہ بات صحیح نہیں ہے۔بعض اکابر اس کوایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ: دیکھو!ہر پھل کاایک ظاہر ہوتاہے اورایک باطن ہوتاہے،اگراس کاباطن خراب ہےتواس کااثرظاہر کے اوپرداغ کی شکل میں نمایاں ہوگا۔اگرظاہرمیں داغ نظر آرہےہیں اورکوئی آدمی یوں کہے کہ اس کا باطن اچھاہے؛تویہ بات مانی نہیں جاسکتی۔اس لئےظاہرکے متعلق یہ دعویٰ کرناکہ ظاہر جیسابھی ہو،اگرباطن درست ہے تواس کی وجہ سےکوئی فرق نہیں پڑتا؛یہ محض ایک شیطانی دھوکہ ہے۔

اسلامی کٹ میں توسع ہے:

لباس کے سلسلہ میں بھی اسلام نے جو ہدایات دی ہیں وہ بڑی معتدل ہیں ، ویسے لباس کی کوئی خاص وضع قطع اور تراش خراش اور خاص کٹ متعین نہیں کی کہ اسی کٹ کا لباس پہنئے، بلکہ لباس کے متعلق کچھ اصولی ہدایتیں شریعت کی طرف سے دی گئی ہیں ،ان اصولی ہدایتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اگر آدمی اپنا لباس تیار کرائے تو وہ شرعی لباس کی حدود میں آجاتا ہے، اور ایسا لباس استعمال کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

لباس کے دو مقصد

چناں چہ یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اللباس کا عنوان قائم کر کے پہلا باب قائم کیا ہے جس سے معلوم ہو گا کہ کپڑا کس قسم کا ہونا چاہیے۔اس سلسلہ میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا: ﴿یَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَرِیۡشًا وَلِبَاسُ التَّقۡوٰی ذٰلِکَ خَیۡرٌ﴾ اے انسانو! ہم نے تمہارے اوپر لباس اتارا جو تمہاری شرم کی چیز کو چھپاتا ہے، اور وہ تمہارے لیے زینت ہے،اور تقویٰ کا لباس بڑا اچھا اور بہتر ہے۔

"سَوۡاٰت"، "سَوۡءَۃٌ" کی جمع ہے، ایسی چیز جس کو ظاہر کرنے سے آدمی شرم محسوس کرتا ہے، اور جس کو چھپانا آدمی کی طبیعت کا تقاضہ ہے۔

پہلا مقصد

علماء لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو بنیادی چیزیں بتلائی ہیں :- ایک تو یہ کہ ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا جو تمہاری پوشیدہ چیز کو چھپاتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں مردوں اور عورتوں میں جسم کے کچھ حصے کے متعلق یہ حکم دیا کہ اس کو چھپایا جائے، جس کو عربی زبان میں ”عَوْرَۃٌ“ کہتے ہیں ،اور اردو، فارسی میں اس کو”ستر“ کہتے ہیں۔”ستر“کا ترجمہ ہوتا ہے چھپانا یعنی یہ چھپانے کی چیز ہے۔اور ”عَوْرَۃٌ“ جو عربی لفظ ہے اس کا ترجمہ بھی چھپانا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے حدیث ِ پاک میں آتا ہے: ”اَلْمَرْأَۃُ عَوْرَۃٌ“ (سنن ترمذی:باب المرأۃ عورۃ) عورت چھپانے کی چیز ہے۔ اردو میں عورت کو عورت اسی لیے کہتے ہیں کہ یہ چھپانے کی چیز ہے۔

مرد اور عورت کا ستر

خیر! مَردوں کے لیے ناف سے لے کر گھٹنے کے نیچے تک کا حصہ چھپانا ضروری ہے،اس کو مَرد ظاہر نہیں کر سکتا۔عورت کے چہرہ اور ہاتھ کی ہتھیلیوں کے علاوہ اس کا سارا جسم ستر میں داخل ہے اور اس کو چھپانا ضروری ہے۔الاّ یہ کہ علاج کی ضرورت ہو تو ضرورت کی مقدار جس کے سامنے ظاہر کرنا ضروری ہو؛ ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

ستر پوشی میں تین باتوں کی رعایت ضروری:

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ﴾ ہم نے تمہارے اوپر ایسا لباس اتارا جو تمہارے ستر کو چھپاتا ہے۔تو یہ چھپانے کا جو مسئلہ ہے ،اس میں تین چیزوں کی رعایت ضروری ہے،تب ہی ستر پوشی کا فریضہ ادا ہو گا ویسے بھی آدمی پر ایمان کے بعد سب سے پہلا فریضہ اپنے ستر کو چھپانے کا عائد ہوتا ہے یہاں تک کہ تنہائی میں بھی اللہ تعالیٰ کے حق کے طور پر آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ستر کو چھپائے رکھے۔تو ستر چھپانے میں تین باتوں کی رعایت کی جائے گی۔

لباس ناقص نہ ہو

①:- ایک تو یہ کہ لباس چھوٹا نہ ہو،یعنی ایسا نہ ہو جو ستر کے پورے حصہ کو نہ چھپائے۔ جیسے:کوئی مرد پائجامہ کی جگہ نیکر اور چڈی پہنتا ہے،تو یہ ایک ایسا لباس ہے جو آدمی کے پورے ستر کو نہیں چھپاتا،بلکہ اس میں ستر کا کچھ حصہ کھلا رہتا ہے، ایسا لباس پہننا جائز نہیں ہے۔یا عورتیں ایسا لباس استعمال کریں کہ بدن کا کچھ حصہ کھلا رہتا ہو، مثلاً:بعض عورتیں سر کھلا رکھتی ہیں، حالاں کہ سر کے بال بھی ستر میں داخل ہیں،اسی لیے اگر نماز کی حالت میں کھل گئے تو نماز درست نہیں ہو گی۔اسی طرح بعض عورتیں اونچی آستین کا لباس پہنتی ہیں۔مردوں کی آستین

اگر پوری گٹوں تک نہ ہوں، بلکہ کچھ اوپر بھی ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے (ویسے نبیٔ کریم (ﷺ) کے کرتہ شریف کی آستین گٹوں تک ہوا کرتی تھی جیسا کہ آگے آئے گا) تو اگر مرد کی آستین اونچی ہے تب بھی کوئی حرج کی بات نہیں، اس لیے کہ اس کا ستر تو چھپا ہوا ہے، لیکن عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے، اس لیے کہ ایسے لباس میں بدن کا کچھ حصہ کھلا رہ جائے گا۔ یا جیسے کہ بعض عورتیں آدھی آستین کا کرتہ پہنتی ہیں، اور بعض تو ایسا کرتہ پہنتی ہیں کہ بالکل آستین ہی نہیں ہوتی، پورا بازو، ہاتھ اور کہنی وغیرہ ساری چیزیں نظر آتی ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ تو لباس میں پہلی بات تو یہ ہے وہ ناقص یعنی ادھورا نہ ہو، بلکہ ایسا ہو جو پورے ستر کو ڈھانپ لیتا ہو۔

باریک نہ ہو

②:- دوسرے وہ اتنا موٹا ہو کہ اس سے جسم کے اندر کا حصہ جھلکتا نہ ہو، یعنی اتنا باریک لباس نہ ہو کہ جسم کے اندر کا ستر والا حصہ نظر آتا ہو۔ اگر باریک ہو گا تو اس صورت میں لباس ہونے کے باوجود چوں کہ لباس کا مقصد (ستر پوشی) پورا نہیں ہوتا، اس لیے ایسا لباس پہننا بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔ اب جو عورتیں باریک لباس پہنتی ہیں جیسے باریک ڈوپٹہ، یا باریک کرتہ جس کی وجہ سے بال، بازو وغیرہ نظر آتے ہیں؛ تو یہ جائز نہیں ہے۔

چست نہ ہو

③:- تیسری بات لباس میں یہ بھی ہونی چاہیے کہ وہ چست نہ ہو، بلکہ اتنا ڈھیلا ہو کہ جسم کی ساخت، بناوٹ اور بدن کا فگر (Figure) نظر نہ آتا ہو۔ اس لیے کہ ستر میں دو چیزیں ہیں، ایک تو کھال کی رنگت؛ کہ گوری ہے، یا کالی ہے۔ اور دوسرا اس کا سائز؛ یہ دونوں چیزیں چھپانا ضروری ہیں۔ اب اگر کسی نے باریک لباس پہنا ہے تو اس صورت میں اندر کی کھال نظر آئے گی، تب تو دونوں باتیں حاصل نہیں ہوئیں اگر لباس موٹا تو ہے لیکن اتنا چست ہے کہ اس کی وجہ سے اس عضو کی بناوٹ، سائز اور اُبھار پورے طور پر نظر آتا ہے، جیسا کہ ایسی پتلون پہنی ہے کہ کولہے برابر نظر آتے ہیں، شرمگاہ پورے پوری نظر آتی ہے؛ تو ایسا لباس بھی جائز نہیں ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے چاہے رنگت نظر نہیں آتی، لیکن سائز تو نظر آتا ہے، اور شریعت نے اس عضو کو چھپانے کا جو حکم دیا اس میں دونوں چیزوں کا لحاظ کیا گیا ہے کہ سائز اور ساخت بھی سامنے والے کو نظر نہ آنی چاہیے، اور رنگت بھی نظر نہ آنی چاہیے۔ اس لیے اگر لباس چست ہے تو اس صورت میں بھی اس کا ایک مقصد حاصل نہیں ہوتا تو ایسا لباس بھی جائز نہیں۔ تو مردوں کے لیے بھی ایسی پتلون پہننا کہ موٹی تو ہو لیکن بالکل چست ہو؛ جائز نہیں ہے۔ یا عورتوں کے لیے پورے جسم میں کوئی بھی ایسا لباس استعمال کرنا جس سے جسم کی ساخت نظر آتی ہو؛ جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اگر یہ تین شرطیں پائی جائیں گی تب ہی ستر والا مقصد حاصل ہوگا، اگر ان تین میں سے کوئی ایک بات بھی نہیں ہے تو ایسا لباس پہننا جائز نہیں ہوگا۔

لباس والی ننگی عورتیں

نبیؐ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسی عورتوں کے اوپر لعنت فرمائی جو لباس پہنی ہوئی ہونے کے باوجود ننگی ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ ننگی کا مطلب یہ ہے کہ یا تو ان کا لباس ایسا ہے جو پورے ستر کو ڈھانپتا نہیں ہے، جیسے بازو اور ہاتھ کھلے رہتے ہیں اور اسکرٹ (Scurt) ہوتا ہے تو پنڈلیاں کھلی ہوتی ہیں، تو ایسا لباس پہننے والیاں عاریات یعنی ننگی کے اندر داخل ہیں۔ ظاہر کے اعتبار سے اگرچہ اپنے جسم پر لباس ڈالے ہوئے ہیں لیکن حقیقت میں وہ ننگی ہیں کہ ان کا ستر کھلا ہوا ہے۔ یا مرد اگر نیکر اور چڈی پہنے ہوئے ہیں تو اس میں گھٹنے اور ران کا کچھ حصہ کھلا رہتا ہے؛ تو یہ بھی جائز نہیں ہے۔

اور دوسری شکل یہ ہے کہ لباس پورے جسم پر پڑا ہوا تو ہے لیکن اتنا باریک ہے کہ اندر سے جسم جھلکتا ہے، تو اس صورت میں بھی یوں کہا جائے گا کہ کپڑا پہنے ہوئے ہونے کے باوجود ننگی ہیں۔

اور تیسری شکل یہ ہے کہ وہ پورے جسم کے اوپر ہے، موٹا بھی ہے، لیکن اتنا چست ہے کہ اس کی وجہ سے اعضاء کی ساخت نظر آتی ہے، تو وہ بھی اس وعید میں داخل ہوگا۔ نبی کریم

(ﷺ) نے ان عورتوں کے متعلق وعید ارشاد فرمائی ہے کہ جو لباس پہنے ہوئے ہونے کے باوجود بھی ننگی ہوتی ہیں (ا) مسلم شریف کی روایت ہے: ”کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ مُمِیلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُءُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ الْبُخْتِ الْمَائِلَةِ “وہ (اپنی زیب وزینت، اپنے بناؤ سنگھار، اپنی چال ڈھال کی وجہ سے) دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے اور کھینچنے والی ہیں (یعنی ایسا انداز اختیار کرتی ہیں کہ دوسرے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں) اور وہ خود بھی اپنے ناز و انداز سے دوسروں کی طرف مائل ہونے والی ہیں۔ اور ان کے سر بُختی اونٹ کے کوہان کی طرح ہوتے ہیں۔

پہلے دور کے شرّاح کے زمانہ میں یہ فیشن رائج نہیں ہوا تھا، اس لیے وہ تو بے چارے اس جملہ کی تشریح کرتے ہی رہ گئے کہ اس کا کیا مطلب ہے؟ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کی عورتوں کو دیکھ کر نبی کریم (ﷺ) نے یہ ارشاد فرمایا ہے۔ اور آپ کا ارشاد ایسا عجیب و غریب ہے کہ اِس زمانہ کی عورتیں جس نے نہ دیکھی ہوں وہ تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ان کے سر بُختی اونٹ کے کوہان کی طرح کیسے ہوں گے۔ سروں کے اوپر بالوں کو ایسا بنایا جاتا ہے جیسے بُختی اونٹ کی کوہان ہو۔ نبی کریم (ﷺ) نے اس پر بڑی وعید فرمائی ہے۔ اور یہ ساری فتنے کی چیزیں ہیں، اس لیے فتنوں کے دروازوں کو بند کرنے کی ضرورت ہے۔

ان دروازوں کو بند کرو؛ورنہ...

آج کل لباس کے معاملہ میں خاص کر عورتوں پر ان کے گھر کے مردوں کو جیسی نگرانی رکھنی چاہیے اور جو تنبیہ کرنی چاہیے اس باب میں بڑی غفلت ہو رہی ہے۔ ہمارے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر عورتیں جس قسم کا لباس پہن کر باہر آتی ہیں ،بہت سوں کے سر کھلے ہوئے ہوتے ہیں،لباس بھی باریک ہوتا ہے جس کی وجہ سے اندر کا جسم جھلکتا ہے،یا ایسی ساڑیاں پہنے ہوئے ہوتی ہیں جس کی وجہ سے پیٹ ،پیٹھ اور دوسری چیزیں نظر آتی ہیں ۔ ایسے ناتمام لباس پہننا حرام ہے اور اس پر بڑا سخت گناہ ہے اوراس سے بچانے کی ضرورت ہے۔ ان فتنوں کو اگر روکا نہیں گیا اوران دروازوں کو اگر بند نہیں کیا گیا،تو پھر ہمارے لیے دوسرے مسائل کا دروازہ کھل جائے گا﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ (الشوری:۳۰)﴾ جو بھی مصیبتیں تم پر آتی ہیں وہ سب تمہارے کرتوتوں کی وجہ سے آتی ہیں اوراللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں کو تو معاف کر دیتا ہے۔ آج کل عام طور پر جانی اور مالی اعتبار سے جو بے چینی اور بدامنی ہوا کرتی ہے،ان کے اوراسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ لباس کے معاملہ میں عورتوں کی طرف سے جو بے احتیاطیاں ہونے لگیں ،ان کے اوپر قدغن لگائی نہیں جاتی، اس پر جو روک تھام ہونی چاہیے وہ نہیں ہوئی۔

فیشن کیا ہے؟

عجیب ہے اِس زمانہ کا فیشن کہ عورتوں کو ننگا کیا جارہا ہے اور مردوں کا لباس ساتر ہوتا ہے۔ ابھی امریکہ جانا ہوا، تو وہاں میں یہی کہتا تھا کہ دیکھو! شریعت نے مردوں کا ستر تو ناف سے گھٹنے تک مختصر رکھا، اس کے باوجود آپ جہاں بھی دیکھیں گے مرد جو لباس پہنتے ہیں وہ پورے جسم کو چھپانے والا ہوتا ہے، اور عورتیں جو لباس پہنتی ہیں اس میں جسم کا اکثر حصہ نظر آتا ہے۔ یہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ شیطان نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے، یہ خواہشات کی پیروی ہے، اور لوگوں کی اندرونی ہوس کو بھڑکانے کا کام ہے۔

فیشن کیا ہے؟ فیشن دراصل لوگوں کو شیطانی چکر میں ڈالنے کا ایک طریقہ ہے کہ آدمی صحیح لباس کے بجائے اس لباس کو اختیار کرتا ہے۔ اس لیے شریعت کی طرف سے لباس کے معاملہ میں یہ ہدایت ہے کہ وہ ستر کو چھپانے والا ہو۔ اور چھپانے والا اسی وقت ہو گا جب کہ اس میں یہ تین باتیں ہوں گی۔

دوسرا مقصد

﴿وَرِيْشًا﴾ اور یہ لباس جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتارا گیا ہے تمہارے لیے زینت کا بھی سبب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لباس سے زینت کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اسی لیے آرائش

اورآسائش کی اجازت ہے۔آسائش یعنی لباس کے اندر کوئی ایسی شکل اختیار کرنا کہ راحت حاصل ہوجائے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے حیثیت دی ہے اس لیے پندرہ روپیہ فی میٹر کے بدلہ پچیس روپیہ فی میٹر والا کپڑا خرید تا ہے تاکہ جسم کو راحت ہو؛تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔اسی طریقہ سے آرائش یعنی شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے بقدرِ ضرورت زینت اختیار کرنے کی بھی اجازت ہے،اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے لباس کوزینت کا سبب بنایا ہے۔البتہ زینت کے باب میں بھی کچھ حدود ہیں۔مردوں کے لیے ایسی زینت اختیار کرنا جو عورتوں کے خاص امتیازات میں سے ہو، اور عورتوں کے لیے ایسی زینت اختیار کرنا جو مردوں کے مشابہ بنانے والی ہو؛ اس کی اجازت نہیں۔

زنانے مرداور مردانی عورتیں

اسی لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایسے مردوں کے اوپر لعنت کی گئی جو عورتوں کی مشابہت کرنے والے ہوں ،اورایسی عورتوں کے اوپر لعنت کی گئی جو مردوں کی مشابہت اختیار کرنے والی ہیں۔عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ:لَعَنَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ(بخاری شریف، کتاب الباس ۵۸۸۵) میں اس کا ترجمہ کیا کرتا ہوں :”زنانے مرداور مردانی عورتوں پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لعنت فرمائی ہے“ یعنی وہ مرد جو مرد ہونے کے باوجود زنانے بنتے ہیں اوران کی مشابہت اختیار کرتے ہیں ،اوروہ عورتیں جو عورت ہونے کے باوجود مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔یہ طریقہ شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے۔

دو باتوں کا خیال رہے

دوسری چیز یہ ہے کہ وہ لباس تکبر میں ڈالنے والا نہ ہو۔ ایسا لباس جو آدمی کو فخر اور غرور میں ڈالنے والا ہو، اور اس سے بڑائی اور تکبر مقصود ہو کہ لوگ مجھے دیکھیں اور بڑا سمجھیں، اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف میں کتاب اللباس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ جملہ نقل کیا ہے: كُلْ مَاشِئْتَ وَالْبَسْ مَاشِئْتَ. مَاأَخْطَأَتْكَ اثْنَتَانِ؛ سَرَفٌ، وَمَخِيلَةٌ. "جو چاہو کھاؤ، اور جو چاہو پہنو بس دو باتوں کا خیال رکھنا، ایک تو اسراف یعنی فضول خرچی، اور دوسرا غرور و تکبر؛ ان دونوں سے اپنے آپ کو بچانا۔ اپنی حیثیت سے زیادہ کا لباس خرید کر پہننا فضول خرچی ہے، اپنی حیثیت کا خیال ضروری ہے، ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دی ہے، اور اس کے مناسب وہ لباس اختیار کرتا ہے، تو اس کو پسندیدہ قرار دیا ہے۔ بلکہ ایسا آدمی اگر گھٹیا لباس پہنے تو اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔

پھر فقیروں کا سا بھیس کیوں ؟

ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی کو دیکھا کہ وہ پھٹا پرانا لباس پہنے ہوئے ہیں تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان سے پوچھا کہ تمہارے پاس مال ہے؟ انہوں نے کہا: ہاں ہے۔ پوچھا: کونسا مال ہے؟ کہا: اونٹ، بکریاں، گھوڑے، غلام سب ہیں۔ تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ

کی اس نعمت کا اثر تمہارے جسم پر نظر آنا چاہیے۔(سنن ترمذی،باب ماجاء فی الاحسان والعفو،حدیث نمبر:۲۱۳۷/المعجم الکبیر للطبرانی:۱۵۹۵۴) جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال دیا ہے تو فقیروں کا سا بھیس بنا کر کیوں پھرتے ہو؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنی مالی حیثیت کے مطابق ،اس کے مناسب قیمت کا لباس آدمی کو پہننا چاہیے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اثر جسم پر ظاہر ہو۔ہاں ! اگر اپنی حیثیت سے زیادہ کا لباس پہنے گا تو وہ فضول خرچی میں شمار ہو گا،اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔یعنی حیثیت تو ہے پندرہ روپے فی میٹر والا کپڑا خریدنے کی، اور استعمال کر رہا ہے پچاس روپے فی میٹر والا؛تو یہ جائز نہیں ہے۔ہاں!پچاس روپے فی میٹر والی حیثیت ہے تو پچاس روپے والا بھی پہن سکتا ہے،اس کی اجازت ہے،بلکہ پہننا چاہیے، تاکہ لوگ اس کے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں ،بہ شرطیکہ آدمی اس لباس کی وجہ سے تکبر میں نہ پڑے۔

صحابہ اور ہمارے قلب کا حال

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شاندار جبہ پہن کر خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے،جب نماز سے فارغ ہو کر گھر آئے تو وہ جبہ اتار دیا اور قسم کھائی کہ آئندہ اس کو نہیں پہنوں گا۔پوچھا گیا:کیوں ؟یہ پہننا جائز تو ہے؟تو اس کی وجہ بتلائی کہ یہ قیمتی جبہ تھا، اس کو پہن کر میرے دل میں ذرا سا غرور پیدا ہوا،مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہوں،اس جبہ کی وجہ سے میرے دل میں بڑائی آئی،اس لیے آئندہ اس لباس کو

استعمال نہیں کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ صاف وشفاف قلب والے تھے اس لیے فوری طور پر انہوں نے اس کا اثر محسوس کر لیا۔ جیسے کوئی کپڑا بالکل سفید برّاق اور صاف وشفاف ہو، تو اس پر معمولی سا داغ بھی فوراً محسوس کر لیا جاتا ہے۔ ان حضرات کا حال ایسا ہی تھا۔ ہمارے قلوب کا حال تو ایسا ہے جیسے کسی کپڑے پر بے شمار داغ لگے ہوئے ہوں اور اس پر اگر ایک آدھ داغ اور لگ جائے تو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ غرور اور کبر کے متعلق فیصلہ آدمی اپنے ہاتھ میں نہ رکھے، بلکہ کسی کو اپنے اوپر سرپرست بنائے، اور اپنا حال اس کے سامنے پیش کر کے اس سلسلہ میں اس سے مشورہ لے کہ یہ غرور اور کبر میں داخل ہے یا نہیں۔ بہت سی مرتبہ ایک آدمی غرور وتکبر میں مبتلا ہوتا ہے اور اپنے متعلق یوں سمجھتا ہے کہ میں تکبر میں مبتلا نہیں ہوں، لیکن اگر کسی ماہر کے سامنے اس کا حال رکھا جائے تو وہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ تو تکبر ہے۔

خلاصہ یہ کہ وہ لباس غرور اور تکبر پیدا کرنے والا نہ ہو۔ اور اس لباس میں مرد عورتوں کی مشابہت اختیار نہ کرے، اور عورت مردوں کی مشابہت اختیار نہ کرے۔

تشبہ اور مشابہت کا فرق

ایک چیز ہے تشبّہ یعنی غیروں کی مشابہت اختیار کرنا، اس سے بھی بچنے کی ضرورت ہے۔ اور ایک ہے مشابہت۔ ایک ہے بالارادہ کسی جیسا بننا؛ یہ تشبہ ہے، اور ایک یہ ہے کہ اس نے کسی کے جیسا بننے کا ارادہ تو نہیں کیا تھا لیکن اس جیسا نظر آرہا ہے؛ یہ مشابہت ہے۔ ان دونوں

میں فرق ہے۔تشبہ کے بارے میں ابوداود شریف میں روایت ہے: مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ (سنن ابی داود:باب فِي لُبْسِ الشُّهْرَةِ) جو آدمی کسی قوم کے ساتھ تشبہ اختیار کرتا ہے وہ ان میں سے ہے۔اسی لیے ایسا لباس اختیار کرنا جو غیروں کا شعار اور امتیاز سمجھا جاتا ہو،ان کی مخصوص چیز سمجھی جاتی ہو، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

تشبہ کے درجات

ویسے تشبہ کے کئی درجے ہیں۔ایک ہے عقائد اور عبادات میں غیروں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا،ان جیسا عقیدہ رکھنا،یا جیسے وہ بتوں کے سامنے سجدہ کرتے ہیں یہ بھی غیر اللہ کے سامنے سجدہ کرنے لگے،وہ جس چیز کی پوجا کرتے ہیں ،یہ بھی پوجا کرنے لگے؛یہ تو کفر ہے۔

اور اگر ان کا شعار اختیار کرتا ہے؛تو حرام ہے،مثلاً مجوسیوں کی مخصوص ٹوپی پہن لی۔ یا ہندو اور مشرک لوگ زُنّار اور جنوئی (જનોઈ) باندھتے ہیں،اس نے بھی اپنے جسم پر جنوئی (જનોઈ)لٹکالی۔یا وہ اپنے قومی لباس کے طور پر دھوتی پہنتے ہیں ،تو مسلمان کے لیے دھوتی پہننا حرام ہے۔(دھوتی کا تعلق مذہبی لباس سے نہیں ہے ، قومی لباس سے ہے۔)

قومی اور مذہبی شعار میں فرق

دیکھو! دو چیزیں ہوتی ہیں ، ایک مذہبی شعار ہوتا ہے اور ایک قومی شعار ہوتا ہے، زُنّار اور جنوئی مذہبی شعار ہے، دھوتی مذہبی شعار نہیں ، بلکہ قومی شعار ہے، یعنی یہ عام طور پر غیر قوم کا لباس سمجھا گیا ہے۔ مذہبی شعار بھی حرام ہے اور قومی شعار بھی حرام ہے، لیکن مذہبی شعار میں حرمت زیادہ ہے۔ لہٰذا قومی شعار میں کافروں ، فاسقوں اور فاجروں کی مشابہت اختیار کرنا حرام ہے جیسے عام طور پر آج کل نوجوان فلموں میں کام کرنے والے ایکٹروں جیسا لباس بناتے ہیں، انہی جیسے بالوں کی تراش وخراش بنواتے ہیں ، جوتے بھی انہی کی طرح کے پہنتے ہیں ، چہرہ مہرہ بھی ویسا ہی بنواتے ہیں ، اور نیت یہی ہوتی ہے کہ ہم بھی ویسے ہی نظر آویں۔ یا لڑکیاں فلموں میں کام کرنے والی ایکٹریس (Actress) کی طرح لباس پہنیں اور یوں چاہیں کہ ہم بھی ویسی ہی نظر آویں ؛ تو یہ تشبہ ہوا یعنی پہنتے وقت ہی خود کو اس جیسا بنانے کا ارادہ ہے، اس پر یہ وعید آئی ہے" مَنۡ تَشَبَّہَ بِقَوۡمٍ فَھُوَ مِنۡھُمۡ "، جو آدمی کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کرے وہ ان میں سے ہے۔

عام عادات میں تشبہ

خلاصہ یہ ہوا کہ عقائد وعبادات میں تشبہ سے تو آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ اور اگر قومی یا مذہبی شعار میں تشبہ اختیار کیا ہے ، تو یہ حرام ہے۔ اور حرمت کی شدت ایک میں زیادہ ہے اور ایک

میں کم ہے۔اور عام عادات میں اگر آدمی انہی جیسا بننے کی نیت سے مشابہت اختیار کرتا ہے،تو یہ بھی تشبہ ہے؛اور یہ مکروہِ تحریمی ہے،یعنی یہ بھی حرام کے قریب گناہ ہے۔اور اگر ان جیسا بننے کی نیت اور ارادہ نہیں ہے،لیکن ان کے جیسا لباس پہن لیا،تو یہ مکروہ اور ناپسندیدہ ہے، لیکن تحریمی نہیں۔یہ تشبہ نہیں ،بلکہ مشابہت کہلاتی ہے۔

تو میں یہ عرض کررہا تھا کہ تشبہ سے شریعت نے منع کیا ہے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خاص طور پر اس سے بچنے کی تاکید فرمائی۔علامہ ابن تیمیہ رضی اللہ عنہ کی مستقل ایک کتاب ہے: "اقتضاء الصراط المستقیم ومخالفۃ اصحاب الجحیم" جس میں غیروں کے ساتھ مشابہت کے سلسلہ میں جو باتیں ہیں وہ بڑی تفصیل سے بتلائی ہیں۔اور اردو میں حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب دو حصوں میں "التشبّہ فی الاسلام" ہے۔ اہلِ علم کے لیے بڑی مفید ہے،اس میں تفصیل سے اس مسئلہ کا جائزہ لیا ہے۔

لا! میں تجھے رنگ دوں

تشبہ بڑی خطرناک چیز ہے،یہی آدمی کو کفر تک لے جانے والی ہے،اس لیے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو فرمایا ہے کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان میں سے ہے،گویا اسی میں اس کا شمار کیا جائے گا۔

چناں چہ حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ صفت نیک آدمی تھے، ایک مرتبہ ہولی کے دن جارہے تھے، پان کھایا ہوا تھا، ایک مریل قسم کے گدھے کو دیکھا تو مزاحیہ یہ کہتے ہوئے پان کی پیک اس پر ڈالی کہ آج تجھے کسی نے نہیں رنگا، لا! میں تجھے رنگ دوں۔ انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا کہ بہت اچھی حالت میں ہیں، لیکن ان کے ہونٹوں کے اوپر ایک چھوٹا سا سانپ رینگ رہا ہے۔ دیکھنے والے نے پوچھا: ہونٹ کے اوپر یہ سانپ کیسا؟ تو انہوں نے کہا کہ ایسا ایسا ہوا تھا اور میں نے یہ جملہ کہتے ہوئے اس گدھے پر پان کی پیک ڈالی تھی، اس کی وجہ سے مجھے یہ عذاب دیا جارہا ہے۔

باوجود توجہ کے وہ ظلمت دور نہیں ہوئی

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی ہی میں ایک اور قصہ لکھا ہے، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک آدمی کے متعلق فرمایا کہ اس کا اٹھنا بیٹھنا کافروں کے ساتھ تھا، اور اس کے دل میں ان کی محبت تھی تو انتقال کے وقت اس کی زبان کے اوپر کلمہ نہیں آرہا تھا۔ حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے بڑی توجہ اور کوشش کی کہ اس کے دل پر جو اندھیرا ہے وہ دور ہو، لیکن باوجود توجہ اور کوشش کے وہ ظلمت دور نہیں ہوئی، اور بغیر کلمہ کے وہ آدمی دنیا سے گیا۔

ایک عبرت ناک واقعہ

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح تذکرۃ الرشید میں حضرت کے ملفوظات میں لکھا ہے کہ ایک مولوی صاحب تھے، انتقال کے بعد ان کو دفن کیا گیا، پھر کسی وجہ سے ان کی قبر کھولنے کی ضرورت پیش آئی۔ جب قبر کھودی گئی، تو اس میں وہ نہیں تھے بلکہ ایک لیڈی یعنی انگریز عورت تھی۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ کیسی بات ہے۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ وہ عورت خفیہ طور پر اسلام لے آئی تھی اور اس کے انتقال پر اس کے مذہب والوں نے تو اس کو عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کیا تھا، لیکن یہ مولوی صاحب کبھی کبھار بولا کرتے تھے کہ عیسائیوں میں یہ بہت اچھا ہے کہ ان کے یہاں غسلِ جنابت نہیں ہے۔ اس جملہ کا یہ اثر ہوا کہ ان کی جگہ پر اس لیڈی کی لاش تھی اور جب اس لیڈی کی قبر کو کھولا گیا تو اس کی جگہ پر ان مولوی صاحب کی لاش تھی۔

تو تشبہ بڑی خطرناک چیز ہے، اس لیے آدمی کو لباس کے معاملہ میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے، اور غیروں کے ساتھ کسی بھی معاملہ میں تشبہ سے بچنے کی نبی کریم (ﷺ) نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ لہٰذا اگر ارادہ کر کے کوئی آدمی یہ کام کر رہا ہے تو یہ تو بہت خطرناک ہے، اور اگر ارادہ کے بغیر ہے تب بھی پسندیدہ نہیں ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

کوٹ پتلون کا مسئلہ

اب رہا کوٹ پتلون کا مسئلہ ! تو کسی زمانہ میں کوٹ پتلون انگریزوں کا مخصوص لباس سمجھا جاتا تھا، لیکن اب وہ بات نہیں رہی، اس لیے اس کو مکروہِ تحریمی تو نہیں کہیں گے۔ اس پر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مولوی لوگ بھی مسئلے بدلتے رہتے ہیں۔ تو ایک بات یاد رہے کہ ایسی بات نہیں ہے، بلکہ مسئلہ کی حقیقت یہ ہے کہ کسی زمانہ میں کوٹ پتلون انگریزوں کا مخصوص قومی لباس، قومی نشان و شعار تھا، مذہبی نہیں۔ تو قومی نشان ہونے کی وجہ سے اس جیسا لباس پہننے کو مکروہِ تحریمی قرار دیا گیا تھا، لیکن پھر اس کی اتنی کثرت ہوئی کہ یہ ان کا قومی نشان و شعار اور قومی لباس نہیں رہا، بلکہ سب لوگ پہننے لگے اور انگریزوں کی خصوصیت نہیں رہی، اس لیے اس کو مکروہ بھی نہیں کہیں گے۔

لیکن ایک بات یاد رہے کہ شرط یہ ہے کہ وہ پتلون تنگ نہ ہو ، اگر اتنی تنگ ہے کہ اعضاء کی ساخت نظر آتی ہے، تو وہ ممنوع ہوگی جیسا کہ میں نے شروع میں اصول بتلادیا۔ دوسرا یہ کہ وہ پتلون ٹخنوں سے اونچی ہو، اگر ٹخنوں سے نیچی ہے، تو ناجائز ہے۔ کیوں کہ مردوں کے لباس کے لئے شریعت نے ایک اصول یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ ٹخنوں سے اونچا ہونا چاہیے۔ یہ اصول عورتوں کے واسطے نہیں ہے، مردوں کے لئے ضروری ہے کہ ان کا لباس ٹخنوں کو ڈھانپنے والا نہ ہو، اگر ٹخنوں کے نیچے لٹکتا ہے تو اس پر ممانعت آئی ہے۔ لہٰذا اگر پتلون

میں یہ دو باتیں نہیں ہیں ،تو اس کو مکروہ بھی نہیں کہیں گے،اور اس کو پہننے کی اجازت ہے، اگرچہ اس کو پسندیدہ نہیں سمجھا گیا ہے،اس لیے کہ صلحاء اور نیک لوگوں کا لباس نہیں ہے، اور ہر زمانہ میں نیک لوگ جو لباس پہنا کرتے ہیں اس کو اختیار کرنا پسند کیا گیا ہے۔

لباس کے اصول

بہرحال!لباس کے سلسلہ میں چند اصول میں نے بتلائے:-

ا:- ساتر ہو۔یعنی ستر کو چھپانے والا ہونا چاہیے،اور ساتر اسی وقت ہو گا جب اس میں وہ تین باتیں پائی جائیں جو اوپر تفصیل سے بیان ہوئیں۔

۲:- اس لباس کو پہن کر آدمی فخر و مباہات ،غرور اور دکھلاوے میں مبتلا نہ ہو۔اگر دکھلاوے کے لئے پہنا ہے ،یا اس سے تکبر پیدا ہوتا ہے؛تو یہ ناجائز اور ممنوع ہے،اور اس کو گناہ قرار دیا گیا ہے۔

یا اسراف اور فضول خرچی ہوتی ہے،اپنی حیثیت سے زیادہ کا پہنتا ہے تب بھی اس کی اجازت نہیں ،گناہ ہے۔

۳:- تیسرا یہ کہ مرد کے لیے ایسا لباس پہننا جس میں عورت کی مشابہت رنگ اور تراش خراش (کٹنگ) کے اعتبار سے لازم آتی ہو؛تو اس کی اجازت نہیں ہو گی۔

ریشم اور آرٹ سلک کا حکم

ریشمی لباس مرد کے لئے جائز نہیں ، البتہ عورتوں کے لئے اجازت ہے۔ آج کل جو بناوٹی ریشم ہوتا ہے ،جس کو آرٹ سلک کہا جاتا ہے، اس کی تو مرد کے لئے بھی اجازت ہے حقیقی ریشم مرد کے لئے ممنوع ہے،بناوٹی ریشم حقیقی ریشم کے حکم میں نہیں ہے،پھر بھی وہ صلحاء کے لئے پسندیدہ نہیں ہے،اس لئے آدمی کو اپنے مناسبِ حال لباس اختیار کرنا چاہیے۔

سرخ رنگ کا لباس مردوں کے واسطے مکروہ قرار دیا گیا ہے۔ویسے نبی کریم (ﷺ) کا حال آگے روایت میں آئے گا کہ آپ نے سرخ جوڑا پہنا تھا۔تو اس کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ وہ خالص سرخ رنگ نہیں تھا،خالص سرخ رنگ ہو تو وہ مکروہ ہے، اگر سرخ رنگ میں دوسرے رنگ کی ملاوٹ ہے، جیسے سرخ رنگ کی دھاری کی اجازت ہے۔نبی کریم (ﷺ) نے بھی جو لباس پہنا تھا وہ سرخ دھاری والا تھا۔البتہ خالص سرخ ہو تو اس کو احناف کے یہاں مکروہ قرار دیا گیا ہے۔

اور اس میں غیروں کی مشابہت لازم آتی ہو تو اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔

کیا اونچا پائجامہ عیب ہے؟

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اونچا پائجامہ اچھا نہیں لگتا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا صلحِ حدیبیہ کے موقعہ کا قصہ پہلے بھی کہیں گزر چکا ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) عمرہ کے ارادہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر جب نکلے تو مشرکینِ مکہ نے یہ طے کر لیا کہ ان کو عمرہ کے لئے جانے نہیں دیں گے، پھر صلح کی گفتگو ہوئی، اس موقعہ پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنا پیغام لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ والوں کے پاس بھیجا تھا کہ ہم لڑنے کے واسطے نہیں آئے ہیں، ہم تو بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، ہم کو زیارت کر لینے دو، پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔ یہ پیغام پہنچانے کے لئے پہلے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا، تو انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ جانتے ہیں کہ ان مشرکین کو میرے ساتھ کیسی دشمنی ہے، اس کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زیادہ مناسب ہیں۔ بہر حال! حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا، جب وہ روانہ ہوئے تو مکہ میں پتہ چل گیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آرہے ہیں، تو ان کے خاندان کے لوگ ان کا استقبال کرنے کے لئے باقاعدہ شہر سے باہر آئے اور اپنے ساتھ لے گئے اور کہا کہ آپ کو کوئی انگلی بھی نہیں لگا سکتا، ہم آپ کی حفاظت کریں گے، آپ جس مقصد کے لئے آئے ہیں وہ پورا کیجئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیغام جو مشرکین کے نام تھا وہ پہنچایا، اس موقعہ پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی لنگی ٹخنوں سے اونچی تھی اور مکہ والے ٹخنوں سے

نیچا لباس پہنتے تھے ،بلکہ ایسا لباس جو زمین سے گھسٹتا ہو، اور اس سے زمین پر نشان بنتا چلا جائے،اس کو اپنے لئے فخر سمجھتے تھے۔تو ان کے خاندان کے کسی آدمی نے ان سے یوں کہا کہ آپ اپنا ٹخنہ ڈھانپ لیجئے،اوراپنی لنگی ذرا نیچی کرلیجئے ،یہاں کے لوگ اس کو عیب سمجھتے ہیں ۔یہ سن کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ھٰکَذَا إِزْرَۃُ صَاحِبِنَا“(مُصنف ابن أبي شيبة.غَزْوَۃُ الْحُدَيْبِيَةِ.) میرے حبیب(ﷺ) کی لنگی اسی طرح اونچی رہتی ہے ،میں اپنی لنگی نیچی نہیں کروں گا۔ہر مسلمان کی سوچ یہی ہونی چاہیے کہ یہ نبی کریم (ﷺ) کا طریقہ ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں سوسائٹی اور معاشرہ کے اندر رہنا ہے، ہم اگر ایسا لباس پہنیں گے تو لوگ طعنہ دیں گے۔تو بھائی!ان طعنوں کو کب تک دیکھتے رہو گے؟

ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے
زمانہ تم پہ ہنستا ہی رہے گا

دوسروں کے طعنوں کی وجہ سے ہم اپنا حال کیوں بدل لیں۔تو لباس کے سلسلہ میں جو اصولی باتیں تھیں وہ عرض کردیں ،ان کا آدمی کو خیال رکھنا چاہیے۔

لباس اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے

ایک اورآیت پیش کی ہے:﴿وَجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيلَ تَقِيكُم بَأْسَكُمْ (النحل:۸۱)﴾ اس آیت میں باری تعالیٰ نے لباس کواپنے احسان کے طورپر ذکرکیا، کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے قمیص بنائے جوتم کوگرمی سے بچاتے ہیں (چوں کہ وہاں عام طورپرموسم گرم رہتاتھا اس لئے اس کاذکرکیا،ورنہ لباس جس طرح آدمی کو گرمی اوردھوپ سے بچاتاہے ،اسی طرح سردی سے بھی بچاتاہے۔)اورایسے قمیص بھی بنائے جوتم کوآپس کی گرفت اورایک دوسرے کی تکلیف سےبچاتے ہیں(جنگ کے موقعہ پرآدمی زرہ پہنتاہےجولوہے کی بنی ہوئی قمیص ہواکرتی ہے)توان دونوں قمیصوں یعنی کپڑے کی بنی ہوئی اورلوہے کی بنی ہوئی کو اللہ تعالیٰ نے بنایاہے اور ان لباسوں کواپنے احسان کے طورپرذکرکیا۔معلوم ہواکہ لباس اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اور اس سلسلہ میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جوہدایت دی اس کاہمیں خیال کرناچاہیے۔

انگریز کے کہنے سے گھٹنے بھی کھول دیئے...

حضرت مولانااحتشام الحق تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کاایک مقولہ یادآیا،وہ فرمایاکرتے تھے کہ اللہ کے رسول(صلی اللہ علیہ وسلم) کے کہنے سے ایک مسلمان اپنے ٹخنے بھی کھولنے کے لئے تیارنہیں ،اورانگریز کے

کہنے سے گھٹنے بھی کھول دیئے، نیکریں پہن لیں۔ انگریز کی اتباع میں لوگوں نے نیکر پہن کر گھٹنے تک کھول دیئے اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع میں ٹخنے کھولنے کو تیار نہیں ہوتے۔

کیا میری ذات میں نمونہ موجود نہیں؟

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی کو دیکھا کہ ان کی لنگی ٹخنے سے نیچی ہے تو ان سے کہا: اِرْفَعْ إِزَارَكَ، فَإِنَّهُ أَتْقَى وَأَبْقَى، اپنی لنگی اونچی کرو کہ یہ زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے اور کپڑے کو دیر تک باقی رکھنے والا ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! معمولی سی دو پیسے کی تو لنگی ہے، اس کے ٹخنے سے نیچی ہونے سے کیا ہوگا؟ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیا میری ذات میں تمہارے لئے نمونہ موجود نہیں ہے؟ وہ صحابی فرماتے ہیں کہ مَیں نے دیکھا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لنگی آدھی پنڈلی تک تھی۔ (شمائل ترمذی/باب ما جاء فی صفة إزار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)) اس لئے آدھی پنڈلی تک ہو تو اچھا اور سنت ہے۔

سنت طریقہ اور اس کی قسمیں

دیکھو! سنت کا مطلب ہے کہ وہ طریقہ جو دین کے اندر پسندیدہ اور رائج ہو، چاہے وہ فرض اور واجب نہ ہو، لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اور آپ کے بعد خلفاء راشدین نے اس کے اوپر مواظبت کی ہو۔ سنت کی دو قسمیں ہیں: سننِ ہدیٰ اور سننِ زوائد۔ سننِ ہدیٰ: وہ طریقے ہیں جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کر کے بتلائے، تاکہ امت اس کا اتباع کرے۔ جیسے جماعت کے ساتھ نماز

پڑھنا، اذان، اقامت، نیز وہ طریقے جن کی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکید فرمائی ہے؛ ان کو سننِ مؤکدہ بھی کہتے ہیں۔ جو ان کو چھوڑے گا وہ قابلِ ملامت ہے اور اس کا چھوڑنا برا ہے۔

سننِ زوائد جن کو سننِ عادیہ بھی کہتے ہیں۔ یعنی جو کام نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عادت کے طور پر کیئے۔ جیسے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عمامہ استعمال فرمایا، مخصوص کرتہ استعمال فرمایا، مخصوص لنگی استعمال فرمائی، یا آپ کی گریبان سینہ کے اوپر تھی۔ کوئی آدمی اگر ان طریقوں کی اتباع حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت کی پیروی ہی کی نیت سے کرتا ہے تو وہ باعثِ ثواب ہے۔ اگر اتباع کی نیت نہیں ہوگی تو اس صورت میں ثواب نہیں ملے گا۔ یہ چونکہ سننِ عادیہ کے قبیل سے ہیں، اس لئے اگر کوئی آدمی ان طریقوں کو اختیار نہ بھی کرے تو وہ قابلِ ملامت نہیں۔

مسنون لباس کا اصول

خلاصہ یہ ہوا کہ شریعت کے بتلائے ہوئے اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے شرعی حدود میں جو لباس پہنا جائے وہ مسنون لباس کہلائے گا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سنت لباس وہ ہے جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود استعمال فرمایا، یا جس کی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اجازت دی، جو طرز و طریقہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتلایا ہے۔

باب کا عنوان

لباس کے سلسلہ میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان قائم کیا تھا سفید کپڑے کا مستحب اور پسندیدہ ہونا۔ویسے تو ہر رنگ کا کپڑا پہن سکتے ہیں اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی مختلف رنگ کے کپڑے بوقتِ ضرورت یا موقع بموقع استعمال فرمائے ہیں ،لیکن سفید کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پسند فرمایا اور اکثر و بیشتر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا لباس سفید ہی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے فرمایا ”احمر“ یعنی ایسا سرخ لباس جو دوسرے رنگ کی ملاوٹ والا ہو، سبز ، پیلا، کالا: یہ سب رنگ کے لباس پہننا بھی جائز ہے۔اسی طرح ”قطن “یعنی سوتی لباس، کتان، بال اور اون کا لباس پہننا بھی جائز ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مختلف طریقے کے لباس(جیسے آج کل کی نئی ایجادات کی وجہ سے جو کپڑے بنائے جاتے ہیں جیسے نائلون ،ٹیف لون اور مختلف معدنیات سے جو چیزیں بنتی ہیں) استعمال کرنا جائز ہے،سوائے ریشم کے۔ اور ریشم کے متعلق بھی جیسا کہ اوپر میں نے بتایا کہ اصلی ریشم حرام ہے، لیکن بناوٹی ریشم جس کو آرٹ سلک کہا جاتا ہے وہ جائز ہے، لیکن اس سے بھی بچنا اچھا ہے۔

پسندیدہ رنگ کون سا؟

حدیث ۷۷۹:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أَنَّ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: الْبَسُوا مِنْ ثِيَابِكُمُ الْبَيَاضَ، فَإِنَّهَا مِنْ خَيْرِ ثِيَابِكُمْ، وَكَفِّنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ. (رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اپنے کپڑوں میں سفید لباس پہنو، اس لئے کہ یہ اچھا لباس ہے۔ اور سفید کپڑوں میں ہی اپنے مردوں کو بھی کفن دو۔

حدیث ۷۸۰:-

وعن سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: قَالَ رسول الله** (ﷺ) **:اِلْبَسُوا البَيَاضَ؛ فَإِنَّهَا أَطْهَرُ وَأَطْيَبُ، وَكَفِّنُوا فِيهَا مَوْتَاكُمْ.** (رواه النسائي والحاكم، وقال: حديث صحيح)

ترجمہ:- حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: سفید لباس پہنو، اس لئے کہ وہ زیادہ پاکیزہ اور عمدہ ہے اور اس میں اپنے مردوں کو کفن دیا کرو۔

لیکن تو چیزے دیگری

حدیث ۷۸۱:-

وعن البراءِ رضی اللہ عنہ **قَالَ: كَانَ رسول الله** (ﷺ) **مَرْبُوعاً، وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ فِى حُلَّةٍ حَمْرَاءَ مَا رَأَيْتُ شَيْئاً قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهُ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) میانہ قد تھے (نہ لانبے تھے اور نہ پستہ قد تھے، لیکن درمیانی قد کے ہونے کے باوجود آپ (ﷺ) کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ جب آپ مجمع میں چلتے تھے تو آپ اونچے نظر آتے تھے، یہ حضور اکرم (ﷺ) کا معجزہ تھا) اور ایک مرتبہ میں نے آپ (ﷺ) کو سرخ جوڑے میں دیکھا تو آپ سے زیادہ حسین کسی اور کو نہیں پایا۔

آفاقہا گردیدہ ام ، مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن توچیزے دیگری

افادات:- گویا نبی کریم (ﷺ) سفید لباس کی تاکید فرمارہے ہیں ،اس لئے یہ رنگ مستحب، اچھا اور پسندیدہ ہے،اس کو عام حالات میں آدمی اختیار کرے، اور سفر یا کسی دوسری ضرورت کی وجہ سے رنگین لباس استعمال کرتا ہے تو نبی کریم (ﷺ) سے یہ بھی ثابت ہے۔یا بلا ضرورت بھی رنگین لباس استعمال کرتا ہے تو جائزہے، ممنوع نہیں ہے۔اور کفن بھی سفید ہو تو اچھا ہے،ویسے رنگین کفن بھی دیا جاسکتا ہے۔البتہ وہ رنگ جو عورتوں کے ساتھ مخصوص سمجھے جاتے ہیں ان کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے، جیسے آج کل پرنٹنگ ہوتی ہے تو بعض پرنٹ ایسی ہوتی ہے جو عورتوں ہی کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ،توایسی مخصوص پرنٹ کا لباس بھی اگر مرد استعمال کرے تو اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

اور تیسری روایت میں سرخ سے مراد علماءاور شرّاح نے لکھا ہے کہ خالص سرخ نہیں تھا، بلکہ اس زمانہ میں یمن سے جو چادریں آتی تھیں اس کے اوپر سرخ رنگ کی دھاریاں ہوا کرتی تھیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے پچھلی مجلس میں ایک نیا عنوان "کتاب اللباس" شروع کیا تھا، اس سلسلہ میں جو اصولی اور بنیادی ہدایات تھیں وہ آپ کے سامنے پیش کی جاچکی ہیں، اسی کے متعلق روایات کو پیش کیا جارہا ہے۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سرخ جوڑا پہننا

حدیث ۷۸۲:-

وعن أبي جُحَيفَةَ وَهْب بن عبد الله رضی اللہ عنہ قَالَ: رَأيتُ النبيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) بِمكَّةَ وَهُوَ بالأَبْطَحِ في قُبَّةٍ لَهُ حَمْرَاءَ مِنْ أَدمٍ، فَخَرَجَ بِلالٌ بِوَضُوئِهِ، فَمِنْ نَاضِحٍ وَنَائِلٍ، فَخَرَجَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) وعليه حُلَّةٌ حَمْرَاءُ، كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى بَيَاضِ سَاقَيْهِ، فَتَوَضّأَ وَأَذَّنَ بِلالٌ، فَجَعَلْتُ أَتَتَبَّعُ فَاهُ هاهُنَا وَهَاهُنَا، يقولُ يَمِيناً وشِمالاً: حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ، حَيَّ عَلَى الفَلاَحِ، ثُمَّ رُكِزَتْ لَهُ عَنَزَةٌ، فَتَقَدَّمَ فَصَلَّى يَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ الْكَلْبُ وَالْحِمَارُ لاَ يُمْنَعُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

(العَنَزَة) بفتح النون: نحو العُكَّازَة.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوجحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مکہ مکرمہ، بطحاء میں دیکھا کہ آپ چمڑے کے بنے ہوئے سرخ خیمے میں قیام پذیر تھے (یہ حجۃ الوداع کا واقعہ ہے۔ جب نماز کا وقت ہوا) تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ وضو کا پانی لے کر آئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وضو فرمایا، کچھ لوگ جن کو وہ پانی ہاتھ لگ گیا، انہوں نے اس کو اپنے بدن پر مل لیا، اور جن کو ہاتھ نہیں لگا انہوں نے

ان کے بدن کو ہاتھ لگا کر اپنے بدن پر ملا۔(اس لیے کہ نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) وضو فرماتے تھے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اس پانی کو لے کر بطورِبرکت اپنے جسم پر مل لیا کرتے تھے۔) پھر (جب نماز کا وقت آیا تو) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خیمے سے باہر تشریف لائے اور آپ کے جسم پر سرخ جوڑا تھا(اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لنگی اتنی اونچی تھی کہ) میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پنڈلی کی سفیدی کو دیکھ رہا تھا(اس سے لباس کے دوسرے ادب کی طرف بھی اشارہ کرنا مقصود ہے جیسا کہ آگے صراحتاً آئے گا کہ لنگی وغیرہ میں نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ آپ آدھی پنڈلی تک پہنا کرتے تھے،اور آپ نے اس کی تاکید بھی فرمائی) پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وضو فرمایا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اذان دی،اور میں حضرت بلال کے منھ کو اِدھر اُدھر گھومتا ہوا دیکھ رہا تھا،یعنی حی علیٰ الصلوۃ کہتے وقت دائیں طرف چہرہ پھیر رہے تھے،اور حی علیٰ الفلاح کہتے وقت بائیں طرف پھیر رہے تھے،اس کے بعد ایک چھوٹا سا نیزہ(جو آدمی کی کمر تک آجائے) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے سترہ کے لئے گاڑا گیا (یہ بھی نماز کے آداب میں سے ہے کہ کوئی آدمی کھلی جگہ نماز ادا کررہا ہو اور سامنے سے لوگوں کے گزرنے کا امکان ہو تو اس صورت میں اپنے سامنے کوئی لکڑی یا اور کوئی چیز گاڑدے جو سترہ کا کام دے) چناں چہ نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) آگے بڑھے اور لوگوں کو نماز پڑھائی، اور آپ کے سامنے(سُترہ کے آگے) سے کتا اور گدھا گزر رہا تھا لیکن ان کو گزرنے سے روکا نہیں جارہا تھا۔

افادات:- چنانچہ حدیبیہ والے قصہ میں بھی مذکور ہے کہ حضرت ابو مسعود ثقفی رضی اللہ عنہ جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے،وہ جب نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس مشرکین کی طرف

سے گفتگو کرنے کے لئے آئے، پھر واپس جاکر انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نبی کریم ﷺ کے ساتھ محبت والا جو تعلق دیکھا تھا اس کا تذکرہ کیا، اس میں یہ بھی بیان کیا کہ میں نے دیکھا کہ جب حضور اکرم ﷺ وضو کرتے ہیں تو آپ کے اعضاءِ مبارکہ سے گرنے والے پانی کو لینے کے لیے صحابہ آپس میں لڑتے ہیں، جن کے ہاتھ لگ گیا وہ اپنے بدن پر ملتا ہے، اور جن کے ہاتھ نہیں لگا وہ اس سے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس روایت میں بھی اسی بات کو بتلایا گیا ہے۔

بس! یہاں تو یہ روایت اسی چیز کو بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ عنوان میں یہ بھی تھا کہ مختلف رنگ کا لباس آدمی استعمال کر سکتا ہے۔ اور پچھلی مجلس میں بھی حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ والی روایت کے تحت بتلا دیا تھا کہ جو سرخ جوڑے کا تذکرہ ہے تو وہ خالص سرخ رنگ کا نہیں تھا بلکہ اس زمانہ میں یمن سے ایسی چادریں بن کر آیا کرتی تھیں جن میں سرخ رنگ کی دھاریاں ہوا کرتی تھیں، باقی سفید کپڑا ہوتا تھا، اسی ملے جلے رنگ کے کپڑے سے آپ کے لئے جوڑا تیار کیا گیا تھا۔ جیسے آج کل بھی رومال آتے ہیں جن میں سفید اور سرخ رنگ ملا جلا ہوتا ہے لیکن اس کو سرخ رومال ہی کہا جاتا ہے۔ مسئلہ بتلا چکا ہوں کہ احناف کے نزدیک مردوں کے لئے خالص سرخ رنگ کا لباس مکروہ ہے۔ ہاں! اگر دوسرے رنگ کی ملاوٹ ہے جیسا نبی کریم ﷺ کا جوڑا تھا تو اس میں کراہت نہیں۔

”اورآپ کے سامنے(سُتْرہ کے آگے)سے کتااور گدھا گزر رہا تھا لیکن ان کو گزرنے سے روکا نہیں جارہا تھا۔“ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی اگر سترہ لگا کر نماز ادا کر رہا ہو اور سترہ کے آگے سے گزرنے والے گزریں تو کوئی حرج کی بات نہیں ، اس کی وجہ سے نہ تو نماز پر کوئی زد پڑتی ہے اور نہ گزرنے والے گنہ گار قرار دیئے جاتے ہیں۔سترہ لگانے کا مقصد ہی یہ ہے۔

یہاں تو اس روایت کو لانے سے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد نبیِ کریم (ﷺ) کے لباس کے رنگ کو بتلانا ہے کہ آپ نے سرخ رنگ کی دھاری والا لباس زیب تن فرمایا ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) کا سبز جوڑا پہننا

حدیث ۷۸۳:-

وعن أَبِي رِمْثَةَ رِفَاعَةَ التَّيْمِيِّ رضی اللہ عنہ **قَالَ: رأيتُ رسولَ الله (ﷺ) وعليه ثوبانِ أخضَرَانِ.** (رواه أبو داود والترمذي بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابورِمْثَہ رفاعہ تیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم (ﷺ) کو ایسی حالت میں دیکھا کہ آپ کے جسم پر سبز رنگ کے دو کپڑے تھے۔

افادات:–اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے سبز رنگ کا لباس بھی زیب تن فرمایا ہے۔اور پہلے بتلا چکا ہوں کہ سفید کے علاوہ دوسرے رنگ کا لباس -بشرطیکہ وہ رنگ عورتوں کے ساتھ مخصوص نہ ہو- بھی پہن سکتے ہیں۔

حضور اکرم (ﷺ) کے عمامہ کا رنگ

حدیث ۷۸۴:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ : أَنَّ رسول الله (ﷺ) دَخَلَ يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاء .(رواه مسلم)

حدیث ۷۸۵:-

وعن أَبي سعيد عمرو بن حُرَيْثٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى رسول الله (ﷺ) وعليه عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ، قَدْ أَرْخَى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ .(رواه مسلم)

وفي روايةٍ لَهُ: أَنَّ رسول الله (ﷺ) خَطَبَ النَّاسَ، وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ.

ترجمہ:–حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم (ﷺ) فتح مکہ کے دن مکہ مکرمہ میں ایسی حالت میں داخل ہوئے کہ آپ کے سر مبارک پر سیاہ عمامہ تھا۔

دوسری روایت حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کی لائے ہیں جس میں یہ ہے کہ وہ منظر اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے، گویا میں اس وقت حضور اکرم (ﷺ) کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ

کے سر مبارک پر سیاہ رنگ کا عمامہ ہے اور اس کے دونوں کناروں کو نبی کریم (ﷺ) نے اپنے کندھوں کے درمیان ڈال رکھا ہے۔

افادات:- عمامہ جب باندھا جاتا ہے تو ایک کونہ شملہ والا ہوتا ہے اور دوسرا اوپر سے نکالا جاتا ہے۔ ان دونوں روایتوں سے آپ (ﷺ) کے عمامہ کے رنگ کا سیاہ ہونا معلوم ہوا۔ ویسے آپ ((ﷺ)) سے سفید، سیاہ اور سبز رنگ کا عمامہ ثابت ہے۔

حضور اکرم ((ﷺ)) کا کفن اور اس کا رنگ

حدیث ٧٨٦:-

وعن عائشة رضی الله عنها قالت : كُفِّنَ رسول الله (ﷺ) فی ثلاثةِ أَثْوَاب بيضٍ سَحُولِيَّةٍ مِنْ كُرْسُفٍ، لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلاَ عِمَامَةٌ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((السَّحُولِيَّة)) بفتح السين وضمها وضم الحاء المهملتين : ثيابٌ تُنْسَبُ إِلَى سَحُول : قَرْيَة باليَمنِ ((وَالكُرْسُف)): القُطْنُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کو تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا جو مقام سحول کے سوتی کپڑے تھے، جن میں نہ قمیص تھا اور نہ عمامہ تھا۔

افادات:- ’’سَحُوْل‘‘ کی وضاحت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے خود فرمائی ہے کہ یمن میں ایک آبادی کا نام ہے جہاں کا سوتی کپڑا اس زمانہ میں لوگوں میں مشہور تھا اور لوگ اس کو استعمال کیا کرتے تھے۔ اور سفید کپڑوں ہی میں کفن دینا سنت ہے، اس روایت سے آپ (ﷺ) کے کفن کا سفید ہونا بتلانا مقصود ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) کا (Printed) منقش چادر استعمال کرنا

حدیث ۷۸۷:-

وعنها، قالت: خرج رسول الله (ﷺ) ذات غَدَاةٍ، وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مرَحَّلٌ مِنْ شَعرٍ أَسْوَد. رواه مسلم.

((المِرْط)) بكسر الميم: وَهُوَ كساءٌ وَ((المُرَحَّلُ)) بالحاء المهملة: هُوَ الَّذِي فِيهِ صورةُ رحال الإبل، وهِيَ الأَكْوَارُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ایک روز صبح کے وقت باہر تشریف لائے ایسی حالت میں کہ آپ کے جسم مبارک کے اوپر کالے بالوں سے بنی ہوئی ایسی چادر تھی جس کے اوپر اونٹ کے کجاوے کے نقش بنے ہوئے تھے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ کپڑوں کے اوپر کسی غیر ذی روح یعنی غیر جاندار کی تصویر بنی ہوئی ہو، جیسے چاند، تارے وغیرہ؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اونی لباس

حدیث ۷۸۸:-

وعن المغيرة بن شُعْبَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنْتُ مَعَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) ذاتَ لَيْلَةٍ في مسير، فَقَالَ لی: ((أَمَعَكَ مَاءٌ؟)) قلتُ: نَعَمْ، فَنَزَلَ عَنْ رَاحِلَتِهِ فَمَشَى حَتَّى تَوَارَى في سَوَادِ اللَّيْلِ، ثُمَّ جَاءَ فَأَفْرَغْتُ عَلَيْهِ مِنَ الإِدَاوَةِ، فَغَسَلَ وَجْهَهُ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ مِنْ صُوفٍ، فَلَمْ يَسْتَطِعْ أَنْ يُخْرِجَ ذِرَاعَيْهِ مِنْهَا حَتَّى أَخْرَجَهُمَا مِنْ أَسْفَلِ الْجُبَّةِ، فَغَسَلَ ذِرَاعَيْهِ وَمَسَحَ بِرَأْسِهِ، ثُمَّ أَهْوَيْتُ لأَنْزِعَ خُفَّيْهِ، فَقَالَ: ((دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ)) وَمَسَحَ عَلَيْهِمَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی رواية: وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ شَامِيَّةٌ ضَيِّقَةُ الكُمَّيْنِ.

وفی رواية: أَنَّ هٰذِهِ القَضِيَّةَ كَانَتْ فی غَزْوَةِ تَبُوك.

ترجمہ:- حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ ایک سفر میں رات کے وقت مَیں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تھا (علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے دوسری روایت کا حوالہ دیا کہ یہ واقعہ غزوۂ تبوک کا ہے) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے پوچھا: کیا تمہارے پاس پانی ہے؟ مَیں نے کہا: جی ہاں! ۔ چناں چہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی سواری سے اترے اور چل کر اتنی دور پہنچے کہ رات کی اندھیری میں نگاہوں سے اوجھل ہوگئے (اس سے معلوم ہوا کہ آدمی قضائے حاجت کے لئے ایسی جگہ جائے کہ لوگوں کی نظروں میں نہ آئے) جب واپس تشریف لائے تو مَیں نے (آپ کو وضو کرانے کے لئے) برتن میں سے پانی ڈالنا شروع کیا، آپ نے اپنا چہرۂ مبارک دھویا (اور ہاتھ دھونے کا وقت آیا تو چوں کہ) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اون کا جبہ پہنے

ہوئے تھے (جس کی آستین تنگ ہونے کی وجہ سے اوپر چڑھ نہ سکیں اور) آپ (ﷺ) اپنی دونوں کلائیاں کھول نہ سکے تو آپ (ﷺ) نے دونوں ہاتھ اپنے جبہ کے نیچے سے نکال کر دھوئے، پھر سر کا مسح فرمایا (جب پاؤں دھونے کا وقت آیا تو) مَیں نے ہاتھ بڑھائے تاکہ آپ (ﷺ) کے پیر سے چمڑے کے موزے نکالوں (اور آپ (ﷺ) پیر دھو سکیں) تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: ان کو چھوڑ دو (موزے نہ نکالو) اس لئے کہ مَیں نے یہ دونوں پاؤں پاک ہونے کی حالت میں موزوں کے اندر ڈالے تھے (اس سے معلوم ہوا کہ موزے باوضو ہونے کی حالت میں پہنے ہوں تب ہی ان پر مسح کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں) اور پھر آپ (ﷺ) نے ان موزوں پر ہی مسح فرمالیا

ایک روایت میں ہے کہ آپ (ﷺ) تنگ آستین والا شامی جبہ زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔

افادات:–اس روایت کو لاکر دو چیزیں بتلانا چاہتے ہیں ،ایک تو یہ کہ آپ (ﷺ) کا جبہ اون کا بنا ہوا تھا۔باب کے عنوان میں تھا کہ لباس سوتی ہو، یا اونی، یا بالوں کا بنا ہوا؛ سب پہن سکتے ہیں۔ تو یہ جبہ اون کا بنا ہوا تھا۔اور دوسری بات یہ کہ سفر کی ضرورت کی وجہ سے آپ (ﷺ) نے تنگ آستین والا جبہ زیب تن فرمایا تھا۔اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر کی ضرورتوں کے پیشِ نظر اپنی سہولت کے لیے اس کے مناسب رنگ یا بناوٹ کا کوئی لباس آدمی پہنے؛ تو اس کی اجازت ہے۔

چمڑے کے موزوں پر مسح کا مسئلہ

اگر کوئی آدمی چمڑے کے موزے پہنے ہوئے ہو اور موزوں پر مسح کرنے کے لئے جو شرطیں ضروری ہیں ان کی رعایت کی گئی ہو، یعنی وہ موزے اُس نوع کے ہوں، اور پورا وضو کر کے پاکی کی حالت میں پہنے ہوں اور اس کے بعد وضو ٹوٹا ہو، تو جب دوبارہ وضو کرنے لگے، اس وقت پاؤں دھونے کے بجائے چمڑے کے موزوں پر صرف مسح کر لینا کافی ہے۔

خلاصۂ باب

پورے باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ دو چیزیں بتلانا چاہتے تھے۔ایک تو لباس کا رنگ کیسا ہو؟ تو بتلایا کہ ہر رنگ کا لباس آدمی استعمال کر سکتا ہے، ہاں! سفید لباس مستحب اور پسندیدہ ہے، اور اس سلسلہ میں شروع میں روایتیں بھی پیش کیں۔

دوسرا یہ کہ ریشم کو چھوڑ کر باقی ہر لباس؛ چاہے سوتی ہو، اونی ہو، ٹاٹ کا بنا ہوا ہو بال کا بنا ہوا ہو، یا آج کل کے مصنوعی لباس ہوں؛ سب ہی استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

بَاب إِسْتِحْبَابِ الْقَمِيْص

کرتہ کا استعمال پسندیدہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جسم ڈھانپنے کی دو شکلیں

جسم کو ڈھانپنے کی دو شکلیں ہیں اور اُس زمانہ میں دونوں طریقے رائج تھے، بعض لوگ کھلا جوڑا پہنتے تھے یعنی جسم کا نچلا حصہ چھپانے کے لئے ایک چادر لنگی کے طور پر استعمال کی جاتی تھی جو سلی ہوئی نہیں ہوتی تھی، جیسی احرام کی چادر ہوتی ہے۔اور اوپر والا حصہ ڈھانپنے کے لئے بھی ایسی ہی ایک چادر الگ سے ہوتی تھی جس سے جسم کا اوپر والا حصہ ڈھانپا جاتا تھا۔ اوپر والے حصے کو ڈھانپنے کے لئے جو کپڑا استعمال کیا جاتا تھا؛اس کو عربی میں ”ردآء“ کہتے ہیں ،اور نچلا حصہ ڈھانپنے کے لئے جو کپڑا استعمال کیا جاتا تھا؛اس کو”ازار“ کہتے ہیں ۔ان دونوں کی بناوٹ اور ساخت میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا استعمال کے فرق کی وجہ سے نام میں فرق ہوگیا ہے۔ تو لباس کے استعمال کا ایک طریقہ کھلے ہوئے لباس کا تھا، جیسے: احرام میں ہوا کرتا ہے، اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس طرح کا لباس استعمال فرماتے تھے۔

دوسرا طریقہ یہ بھی تھا کہ اوپر والا حصہ ڈھانپنے کے لئے سلا ہوا لباس استعمال کرتے تھے، جیسے: کرتہ ۔اور نچلا حصہ ڈھانپنے کے لئے بھی سلا ہوا لباس استعمال کرتے تھے: جس کو ہم

"پائجامہ" کہتے ہیں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جسمِ اطہر کے اوپر والے حصہ کو ڈھانپنے کے لئے تو سلا ہوا لباس یعنی کرتہ استعمال کیا ہے، جس کو عربی میں "قمیص" کہتے ہیں، اور یہ روایتوں سے ثابت ہے

قمیص سے کیا مراد ہے؟

اردو یا گجراتی زبان میں لفظ "قمیص" بولتے ہیں اس سے مراد ایک مخصوص طرز کا بنا ہوا لباس ہوتا ہے جو آدھی کمر تک سلا ہوا ہوتا ہے (جس کو شرٹ کہا جاتا ہے) عربی کے لفظ "قمیص" سے وہ مراد نہیں ہے، حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اصطلاحات اور زبان کے بدلنے کی وجہ سے الفاظ کے معانی میں فرق پڑ جاتا ہے ایک لفظ "قمیص" عربی میں بولا جاتا ہے، اس سے ایک مخصوص لباس مراد ہوتا ہے جو آدھی پنڈلیوں تک ہوتا ہے، اور پورے جسم کو ڈھانپ لیتا ہے، جیسے: عربی کرتہ ہوتا ہے۔ اور ایک لفظ "قمیص" ہمارے یہاں اردو میں بولتے ہیں، وہ ایک مخصوص طرز کا لباس ہے جو ہمارے یہاں بنتا اور استعمال ہوتا ہے (جس کو شرٹ کہا جاتا ہے)

جیسے: لفظ "جیب" ہے۔ عربی زبان میں بھی لفظ "جیب" بولا جاتا ہے، جس کا معنٰی گریبان ہوتا ہے، یعنی سلے ہوئے لباس میں سر ڈالنے کے لئے سینے کے پاس جو کھلا ہوا اور کٹا ہوا حصہ رکھا جاتا ہے، اس کو عربی میں "جیب" کہتے ہیں، اور ہماری اردو میں جیب (کیسہ) "ખિસ્સું" کو کہتے ہیں۔

یا جیسے علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لفظ ”خُفّ“ موزہ ہے۔ اُس زمانہ میں جب ”خُفّ“ بولا جاتا تھا تو اس وقت نائلون کے موزے تو تھے بھی نہیں، اور نہ اس کا تصور تھا تو ”خُفّ“ بول کر چمڑے کا بنا ہوا موزہ مراد لیا جاتا تھا۔ اور اب ”خُفّ“ بول کر ”جُرّاب“ مراد لیا جاتا ہے۔ تو یہاں بھی ”قمیص“ سے کرتہ مراد ہے، اور اس کا مستحب ہونا بتلاتے ہیں۔

کرتہ زیادہ پسندیدہ ہے

دراصل بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ جسم کا اوپر والا حصہ ڈھانپنے کے لئے دو طریقے ہیں، ایک تو یہ کہ آپ کھلی ہوئی چادر استعمال کرتے ہوئے اوپر والے حصے کو ڈھانپ لیں اور نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت ہے۔ دوسری شکل یہ ہے اس مقصد کے لئے مخصوص طرز سے بنا ہوا کپڑا استعمال کریں؛ جس کو کرتہ کہا جاتا ہے۔ اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کھلی ہوئی چادر کے مقابلہ میں کرتہ استعمال کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں آدمی آزاد رہتا ہے، یعنی اوپر والے حصہ کو چھپانے کے لئے اگر چادر جسم پر ڈالیں گے تو اس کو سنبھالنے کی آپ کو فکر کرتے رہنا پڑے گی، جبکہ سلا ہوا کپڑا ایک مرتبہ پہننے کے بعد آپ کو سنبھالنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اس کی طرف سے آپ بے فکر ہو جایئے، یعنی آدمی ”Free“ اور آزاد ہو جاتا ہے۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے۔ اور دوسرا یہ ہے کہ اس میں چادر کے مقابلہ میں زینت بھی زیادہ ہے، اور ستر کے

کھلنے کا بھی اندیشہ نہیں رہتا۔اس لئے ان وجوہات کے پیشِ نظر نبی ٔکریم (ﷺ) کرتہ کو چادر کے مقابلہ میں زیادہ پسند فرماتے تھے۔چناں چہ روایت پیش کرتے ہیں ۔

کیا آپ (ﷺ) سے پائجامہ پہننا ثابت ہے؟

حدیث ۷۸۹:-

عن أُمِّ سَلَمَةَ رضی الله عنها قالت : كَانَ أَحبُّ الثِّيَابِ إِلَى رسول الله (ﷺ) الْقَمِيص .(رواه أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی ٔکریم (ﷺ) کو کپڑوں میں زیادہ پسندیدہ کرتہ تھا (انہی وجوہات کی بناء پر جو اوپر بتلائیں)

افادات:- اب رہا پائجامہ کا مسئلہ !تو روایتوں سے اتنی بات تو ثابت ہے کہ نبی ٔکریم (ﷺ) بازار تشریف لے گئے،پائجامہ پسند فرمایا اور خریدا، لیکن نبی ٔکریم (ﷺ) نے پہنا بھی ہے یا نہیں؟ تو یہ چیز اہلِ سیر (سوانح نگاران) کے درمیان مختلف فیہ ہے۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ خریدا اسی لئے تھا کہ پہنیں تو پہنا بھی ہے۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پہننے کی الگ سے کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔بہر حال !یہ دونوں باتیں کہی گئی ہیں ، لیکن پسند فرمانا محقق ہے۔

بَابُ صِفَةِ طُولِ الْقَمِيصِ وَالْكُمِّ وَالْإِزَارِ وَطَرْفِ الْعِمَامَةِ وتحريمِ إِسْبَالِ شيءٍ من ذٰلك علىٰ سبيلِ الْخُيَلَآءِ، و كراهته مِنْ غيرِ خُيَلَآءِ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لباس کی لمبائی کتنی ہو؟

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ:-

①:-کرتہ ،آستین ، لنگی اور ازار کی لمبائی کتنی ہونی چاہیے ؟

②:-عمامہ کا کنارہ کہاں تک لٹکا سکتے ہیں ؟کیا اتنا لمبا بھی رکھ سکتے ہیں کہ پیچھے سے زمین پر گھسٹتا رہے؟جس کو"شملہ بقدرِ علم" کہا جاتا ہے۔پہلے کسی زمانہ میں یہ بھی ایک فیشن چلا تھا کہ شملہ اتنا لمبا رکھتے تھے کہ وہ زمین پر گھسٹتا تھا،حالاں کہ یہ مکروہ ہے۔

③:-اوران میں سے کسی بھی چیز کو بطورِ تکبر اتنا لٹکانا کہ ٹخنوں سے نیچے یا ٹخنوں تک پہنچ جائے؛تو یہ حرام ہے۔

④:-اور اگر بغیر تکبر کے ہو تو مکروہ ہے۔

لباس کے اصول میں ایک اصول یہ ہے کہ ایسا لباس جو ٹخنوں کو ڈھانپنے والا یا ٹخنوں سے نیچے جانے والا ہو؛اس کا استعمال مردوں کے لئے جائز نہیں ہے،عورتوں کو تو ستر ڈھانپنے کی وجہ سے پہننا ہی ہے۔

ٹخنے ڈھپ جانے والا مسئلہ صرف پائجامہ اور لنگی سے متعلق نہیں ہے، اس باب کے عنوان میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بتلا دیا کہ اس لمبائی میں سب چیزیں آجاتی ہیں صرف پائجامہ لنگی اور پتلون ہی نہیں، کرتہ بھی اگر اتنا لمبا ہے جس سے آپ کے ٹخنے ڈھپ جاتے ہیں، اور ٹخنوں سے نیچے تک چلا جاتا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے، یہ بھی حرام والے حکم میں داخل ہے۔

عربی کرتہ کے شوقین متوجہ ہوں

ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ شوق میں عربی کرتہ استعمال کرتے ہیں جو اتنا لمبا ہوتا ہے کہ ٹخنے ڈھپ جاتے ہیں، اور ان کا خیال یہ ہوتا کہ ٹخنے ڈھپنے والا حکم صرف پائجامہ، لنگی اور پتلون کے بارے میں ہے؛ یہ خیال درست نہیں ہے۔ کرتہ بھی اگر اتنا لمبا ہو جس سے ٹخنے ڈھپ جائیں؛ تو یہ درست نہیں ہے۔ اگر کسی نے عرب میں ایسا دیکھا ہو تو یہ غلط رواج ہے، وہ لوگ اس کو فیشن کے طور پر لمبا رکھ کر ہاتھ میں لے کر چلتے ہیں۔ پچھلی مجلس میں بتلا چکا ہوں کہ زمانۂ جاہلیت میں اتنی لمبی چادر رکھتے تھے کہ چلتے وقت گھسٹتی تھی، اور زمین پر اس کے نشان پڑتے تھے۔ دیوان حماسہ میں قیس کے شعر کا ایک مصرع ہے:

إِذَا مَا اصْطَبَحْتُ أَرْبَعاً خَطَّ مِئْزَرِي

میں نے آج صبح کے وقت چار گلاس شراب کے چڑھائے اور پھر اس شان سے باہر نکلا کہ میرے پائجامہ کے زمین کے اوپر نشان پڑ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اس کو فخر کی چیز

سمجھتے تھے۔ آج کل بعض عرب بھی ایسا کرتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ عمامہ کا شملہ بھی کسی نے اتنا لمبا رکھا ہو کہ وہ ٹخنوں تک پہنچ جائے تو یہ بھی ممنوع ہے۔

اگر ٹخنے ڈھانکنا تکبر سے نہ ہو تو؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بات یہ کہی ہے: "وتحریم إسبال شيء من ذلك على سبيل الخيلاء، وكراهته من غير خيلاء" ٹخنوں کو ڈھانپنے کے سلسلہ میں جو روایتیں آرہی ہیں ان میں سے بہت ساری روایتیں وہ ہیں جن میں یہ لفظ آتا ہے کہ جو آدمی اپنی لنگی یا پائجامہ کو ڈھیلا چھوڑ دے، جس کی وجہ سے "بطورِ تکبر" ٹخنے ڈھپ جائیں تو اس کے لئے یہ وعید ہے کہ اس کا وہ حصہ جہنم میں ڈالا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ اس قید کی وجہ سے بہت سارے علماء اس طرف گئے ہیں کہ اگر تکبر کے طور پر کوئی بھی لباس ایسا رکھتا ہے جو ٹخنے کے نیچے تک چلا جائے جس کی وجہ ٹخنے ڈھپ جائیں؛ تو یہ حرام ہے۔ اور تکبر کی وجہ سے نہ ہو تو مکروہِ تنزیہی ہے۔

لیکن محققین اس طرف گئے ہیں کہ چاہے تکبر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں مکروہِ تحریمی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہی ہے، اور ہمارے اکابر بھی اسی کے قائل ہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ یہ ساری روایتیں محدثین لباس کے باب میں لاتے ہیں۔

اور تکبر خود اپنی جگہ پر بہت بڑا گناہ اور حرام ہے،، چاہے پائجامہ ڈھیلا اور نیچا رکھے یا نہ رکھے۔ اگر کوئی آدمی پائجامہ اونچا رکھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تب بھی گناہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پائجامہ کا نیچا رکھنا مستقل ایک گناہ ہے اس لئے محققین کہتے ہیں کہ پائجامہ نیچا رکھنا دونوں صورتوں میں حرام ہے، البتہ اتنی بات ہے کہ تکبر کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو اس کی شدت اور حرمت کا پاور بڑھ جائے گا، اور اگر تکبر نہیں ہے تو اس کی شدت کم ہوگی۔ ہاں ! اگر بلا ارادہ ، بے خبری میں آدمی کا پائجامہ ڈھیلا ہوکر ٹخنوں تک پہنچ جائے؛ تو اس کو حرام نہیں کہیں گے۔

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "فیض الباری" کے حاشیہ میں ،اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے "تکملہ فتح الملہم" میں لکھا ہے کہ: یہاں صاحبِ شریعت نے لباس کو ٹخنوں کے نیچے لے جانے ہی کو تکبر کی علامت قرار دیا ہے، جیسے شریعت نے سفر کے اندر قصر کی اجازت دی ہے، یا رمضان میں سفر کرے تو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے کہ بعد میں اس کی قضاء کرلے؛ تو وہاں خود سفر ہی کو مشقت کی علامت قرار دے دیا گیا۔ آدمی کا سفر میں نکلنا یہ خود ایک مشقت کی چیز ہے، چاہے ایر کنڈیشنڈ گاڑی (راجدھانی اور شتابدی) میں سفر کرے، یا ہوائی جہاز میں سفر کرے۔ اس لئے کہ جو لوگ سفر کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ راجدھانی میں سفر کریں یا ہوائی جہاز میں ،وہ مشقت سے خالی نہیں ہوتا، جو لوگ سفر نہیں کرتے ان کو اس کا اندازہ نہیں۔ تو سفر خود مشقت کی علامت ہے، اسی طرح

آدمی کا اپنے لباس کو اس طرح پہننا کہ ٹخنے ڈھپ جائیں ،یہی کبر کی علامت سمجھی جائے گی؛ اس لئے یہ ممنوع ہے۔ہاں اگر غیر اختیاری طور پر کسی سے ایسا ہو گیا تو اس کو معذور سمجھا جائے گا۔

حضور اکرم (ﷺ) کی آستین کی لمبائی

حدیث ۷۹۰:-

عن أسماءَ بنتِ يزيدَ الأنصاريَّةِ رضى الله عنها قالت: كَانَ كُمُّ قَمِيص رسولِ الله (ﷺ) إِلَى الرُّسْغِ. (رواه أبو داود والترمذى، وقال: ((حديث حسن))

ترجمہ:- حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ: نبی کریم (ﷺ) کے کرتہ کی آستین گٹّوں تک ہوتی تھی۔

افادات:- کرتہ کی آستین گٹّوں تک رکھنی چاہیے،اگر اس سے چھوٹی ہو گی تو مرد کے لئے تو جائز ہے، لیکن عورتیں اس سے چھوٹی نہیں رکھ سکتیں ، اس لئے کہ ان کا ستر کھل جائے گا، جیسا کہ پہلے بتلا چکا ہوں۔

نظرِ رحمت سے محروم

حدیث ۷۹۱:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أَنَّ النبیَّ (ﷺ) قالَ: مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللهُ إِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. فَقَالَ أَبُو بكر: يَا رسول الله، إِنَّ إِزَارِى يَسْتَرْخِي إِلاَّ أَنْ أَتَعَاهَدَهُ. فَقَالَ لَهُ رسول الله (ﷺ): إِنَّكَ لَسْتَ مِمَّنْ يَفْعَلُهُ خُيَلاءَ. (رواه البخاری وروی مسلم بعضه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے اپنا لباس تکبر کی وجہ سے ڈھیلا رکھا (جس سے ٹخنے ڈھپ گئے) تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول! میری لنگی بہت ڈھیلی رہتی ہے مگر یہ کہ میں اس کا بہت دھیان رکھوں (حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جسم کی ساخت ایسی تھی کہ اگر دھیان نہ رکھا جائے تو لنگی ڈھیلی ہو کر نیچے اتر جایا کرتی تھی اور اس کی وجہ سے کبھی ٹخنہ ڈھپ جاتا تھا، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنی یہ معذوری بیان کی) تو حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم ان لوگوں میں نہیں ہو جو یہ کام تکبر کی وجہ سے کرتے ہیں۔

حدیث ۷۹۲:-

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: لا يَنْظُرُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى مَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَراً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس آدمی کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے جس نے تکبر کی وجہ سے اپنی لنگی کو ڈھیلا چھوڑا (یعنی اتنا کہ ٹخنے ڈھپ گئے)

افادات:-انہیں روایتوں کی وجہ سے بہت سے علماء اس طرف گئے ہیں کہ تکبر کی وجہ سے نہ ہو؛تو مکروہِ تنزیہی ہے۔لیکن محققین کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی لنگی بے خبری میں بلا قصد نیچے اتر جاتی تھی،وہ اپنے ارادہ سے اس کو ڈھیلا نہیں چھوڑتے تھے۔اور میں بتلا چکا ہوں کہ بے خبری میں اگر ایسا ہو گیا ہو،تو عدمِ جواز کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،اور وہاں تکبر کی بھی بات نہیں پائی جاسکتی، تکبر کا سوال تو وہیں پیدا ہو گا جہاں آدمی جان بوجھ کر ٹخنے چھپائے۔

وہ جہنم میں ہے

حدیث ۷۹۳:-

وعنه عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: مَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ مِنَ الْإِزَارِ فَفِي النَّارِ.(رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے،نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: لنگی،پائجامہ یا لباس کا جو حصہ ٹخنوں سے نیچے ہو ؛وہ جہنم میں ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ وہ عضو جہنم میں جائے گا، اور ایسا تو ہو گا نہیں کہ اتنا عضو کاٹ کر صرف اسی کو جہنم میں بھیجا جائے، بلکہ اس کی وجہ سے صاحبِ عضو بھی جہنم میں جائے گا اور عذاب بھگتے گا۔

بعضوں نے کہا: مقصود یہ ہے کہ وہ لباس بھی ساتھ جہنم میں بھیجا جائے گا کہ تمہارا یہ لباس جسے تم تکبر سے ٹخنوں کے نیچے لٹکا کر استعمال کرتے تھے، اور اس کو اپنے لئے خوبی کی چیز سمجھتے تھے؛ لو! آج یہی لباس تم کو جہنم میں لے گیا اور خود بھی جہنم میں پہنچا اس طرح گویا مزید اس کو رسوا کرنا مقصود ہو گا۔ جیسے کوئی ایسی چیز جس کی وجہ سے اس کی ہلاکت ہوئی ہو، ساتھ میں اس چیز کو رکھا جاتا ہے، مثلاً کفار جن بتوں کی پوجا کرتے ہیں قیامت کے روز ان کفار سے کہا جائے گا: ﴿إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ تم اور اللہ کے سوا جو تمہارے معبود تھے وہ سب جہنم کا ایندھن ہیں۔ یعنی ان بتوں کو بھی جہنم میں ڈالا جائے گا، حالاں کہ بت تو پتھر یا لکڑی کے ہیں اور بظاہر ان کا کوئی قصور نہیں ہے لیکن ان کو اس لئے جہنم میں ڈالا جائے گا تاکہ ان کفار کو مزید حسرت ہو کہ؛ جن کی ہم عبادت کرتے تھے وہ خود ہی اپنے آپ کو جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکے، تو ہمیں کیا بچائیں گے؟

ناکام و نامراد لوگ

حدیث ۷۹۴:-

وعن أَبِي ذر رضی اللہ عنہ عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: ثلاثةٌ لايُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ القِيَامَةِ، وَلاَ يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلاَ يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. قَالَ: فقرأها رسول الله (ﷺ) ثلاثَ مِرارٍ، قَالَ أَبُو ذرٍّ: خَابُوا وَخَسِرُوا! مَنْ هُمْ يَارسول الله؟ قَالَ: المُسْبِلُ، وَالمَنَّانُ، وَالمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالحَلِفِ الكَاذِبِ. (رواه مسلم)

وفي رواية لَهُ: المُسْبِلُ إِزَارَهُ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان سے بات نہیں کریں گے، ان کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے، اوران کو گناہوں سے پاک نہیں کریں گے (یعنی معاف نہیں کریں گے) اوران کے لئے دردناک عذاب ہے۔ نبی کریم (ﷺ) نے یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ لوگ تو بڑے خسارے اور گھاٹے میں ہیں؛ کون ہیں یہ؟ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: لباس کو ٹخنوں سے نیچے رکھنے والا۔ احسان کرکے جتلانے والا۔ اور تیسرا وہ آدمی جو اپنے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ چلائے اور بیچے۔

حدیث ۷۹۵:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: الإسْبَالُ في الإزار، وَالقَمِيصِ، وَالعِمَامَةِ، مَنْ جَرَّ شَيْئاً خُيَلاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللهُ إِلَيْهِ يَوْمَ القِيَامَةِ. (رواه أبو داود والنسائي بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی لنگی، پائجامہ، کرتہ اور عمامہ کو تکبر سے لٹکائے گا؛ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔

طعن و تشنیع سے نہ ڈریں

افادات:- غور کرو کہ پہلا گناہ کتنا بڑا ہے! بہت سے لوگ محض فیشن کے نام پر ٹخنوں سے نیچا لباس پہنتے ہیں ،ان کو اگر سمجھایا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ مولوی صاحب! کیا کریں ؛ ہمیں اسی سوسائٹی میں رہنا ہے، اگر اونچا پہنتے ہیں تو لوگ ہمیں شرمندگی میں ڈالتے ہیں ، طعن و تشنیع کرتے ہیں ،عار دلاتے ہیں۔ ارے بھائی! اگر آپ شریعت پر عمل کریں گے تو طعن و تشنیع تو ہو گی ہی۔ حضراتِ انبیاء کرام پر بھی طعن و تشنیع کی گئی،اوران کے جو حقیقی متبعین اور پیروکار تھے ان پر بھی طعن و تشنیع کی گئی۔ اگر آپ شریعت پر عمل کریں گے تو آپ پر بھی طعن و تشنیع کرنے والے کریں گے، آپ کب تک ایسی باتوں کا خیال کرتے رہیں گے؟ اسی سوسائٹی اور تہذیب کے نام سے اگر فیشن کو اختیار کریں گے تو کل قیامت میں جب عذاب ہو گا تو سوسائٹی کے وہ لوگ بچانے کے لیے آنے والے نہیں ہیں ؛اس لیے ایسوں کی باتوں پر دھیان و توجہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اور لوگوں کا یہ بھی عجیب مزاج بنتا جارہا ہے کہ اگر کوئی آدمی شریعت پر چلنے کا اہتمام اور شریعت کے احکام کی پابندی کرتا ہے، تو لوگ اس کو کوئی ایسا لقب دیتے ہیں کہ جس سے اس کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں ، جیسے: کوئی آدمی ملازمت میں نہ رشوت لیتا ہے، نہ غلط کاموں میں حصہ لیتا ہے، تو اس کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں کہ: دیکھو! پاگل معلوم ہوتا ہے، اس بیسویں صدی

میں اس طرح تو کہیں زندہ رہا جاتا ہے؟ میں تو کہا کرتا ہوں کہ جب لوگ اس طرح پاگل کہیں تو اس پر خوش ہونا چاہیے کہ یہ تو ہمارے اس امتحان میں کامیاب ہونے کی علامت ہے؛ نہ کہ برا ماننے کی چیز ہے۔

فیشن؛ ذہنیت کو مرعوب کرنے کا طریقہ

اور فیشن کا بھی عجیب جنون ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، پھٹا ہوا پائجامہ ہوتا ہے ،اس میں الگ الگ رنگ کے پیوند لگے ہوئے ہیں ، اور ڈورے لٹک رہے ہیں ، ایسا معلوم ہوتا کہ پاگل ہوں ۔ جمعہ کے دن صبح کی نماز میں ایک طالب علم کو دیکھا کہ ایسا ہی پائجامہ پہن کر آیا تھا، تو میں نے اس کو بلایا اور کہا: بیٹا! یہ کیا پہن رکھا ہے؟ جاؤ! بدل کر آؤ۔ فیشن کے نام پر ان سے جو چاہو کام کروالو؛ وہ خوشی خوشی کرلیں گے۔ اور فیشن کیا ہے؟ فلموں میں کام کرنے والے اور کھیلوں کے اندر آگے رہنے والے اور اس قسم کے جو لوگ ہوتے ہیں ان کو پیسے دے کر لوگوں کی ذہنیت کو مرعوب کیا جاتا ہے، اور دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ دار مختلف طریقوں سے لوگوں کے پیسوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس طرح کی ساری شکلیں اختیار کرتے ہیں کہ دیکھو! فلاں نے بھی اپنے لئے اس چیز کو تجویز کیا ہے، پھر لوگ بھی انہیں کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

ہر وقت گناہ جاری رہتا ہے

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کا ایک رسالہ ہے ''ڈاڑھی کا وجوب'' اس میں ایک بات ارشاد فرمائی ہے کہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ جس وقت آدمی وہ گناہ کر رہا ہوتا ہے اسی وقت اس میں مبتلا ہوتا ہے، جیسے آدمی زنا کرتا ہے تو جب تک زنا کر رہا ہے وہاں تک اس میں مبتلا ہے، اب اس زنا کا گناہ اس کے نامۂ اعمال میں رہے گا، لیکن زنا کے ختم ہو جانے کے بعد وہ زنا میں مبتلا نہیں ہے۔ اسی طرح شراب پینے والا ہے، جب تک اس کے ہاتھ میں شراب کا گلاس ہے اور شراب منہ میں ڈال رہا ہے، وہاں تک گناہ میں مبتلا ہے، اب اس کا گناہ اس کے نامۂ اعمال میں ہے، لیکن پی چکنے کے بعد وہ اس گناہ میں مبتلا نہیں ہے۔ اور بعض گناہ ایسے ہیں کہ جو چوبیس گھنٹے برابر جاری رہتے ہیں، جیسے: ڈاڑھی کا مونڈنا۔ اگر ڈاڑھی مونڈی ہے، تو ڈاڑھی کا مونڈا ہوا ہونا؛ یہ مستقل الگ گناہ ہے، اگر وہ سو رہا ہے تب بھی گناہ میں ہے، نماز میں ہے تب بھی گناہ میں ہے۔ تو یہ گناہ ایسا ہے جو ہر وقت برابر چل رہا ہے۔ ٹخنوں سے نیچے جو لباس ہوتا ہے اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کا گناہ بھی ہر وقت چل رہا ہے۔ اگر وہ ٹخنوں سے نیچے ہونے کی حالت میں نماز پڑھ رہا ہے؛ تب بھی ایک حرام کام میں مبتلا ہے۔

لینے کے دینے

''وَالْمَنَّان'' دوسرا آدمی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بات نہیں کریں گے اور جس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے اور جس کے گناہ معاف کرکے پاک صاف نہیں کریں گے؛ وہ احسان کرکے جتلانے والا ہے۔ آج کل اس کا عام رواج ہوگیا ہے۔ صلہ رحمی کا بیان آیا تھا وہاں بھی بتلایا تھا کہ رشتہ داروں کے ساتھ کچھ سلوک کرتے ہیں اور ان کی طرف سے ذرا سی کوئی بات پیش آئی تو جو احسان کیا ہوگا وہ زبان سے فوراً نکال دیتے ہیں ﴿لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذٰى﴾ جو آدمی احسان کرکے جتلا دیتا ہے اس کا ثواب بھی گیا اور اوپر سے مصیبت سر پڑی۔

تیسرا آدمی

''وَالْمُنَفِّقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ'' جو اپنے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ چلا رہا ہو اور بیچ رہا ہو مثلاً: یہ سامان تو ایسا عمدہ ہے اور فلاں جگہ کا بنا ہوا ہے، اور ایک آدمی اس کو پانچ سو میں مانگ رہا تھا وغیرہ وغیرہ؛ اس کے لیے بھی اوپر والی وعید ہے۔ تو یہ تین بڑے خطرناک گناہ ہیں۔

توحید تو یہ ہے ...

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ شب براءت میں جن لوگوں کو معاف نہیں کرتے ان میں ٹخنوں سے نیچے لباس لٹکانے والا بھی ہے(شعب الایمان)اس لئے دیکھنے میں یہ معمولی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن کتنا بڑا گناہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ اتنا سخت ناراض ہوتے ہیں ، اگر ذرا سا لباس اوپر پہن لیں گے تو اس سے آپ کے ایٹی کیٹ کے اوپر کوئی فرق پڑنے والا نہیں ہے اور آپ کی تہذیب پر بھی کوئی آنچ نہیں آئے گی، بلکہ اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے،اور ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے اپنے آپ کو بچالے جائے گا۔ بس یہی بہت بڑی بات ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالَم سے خفا میرے لئے ہے

لوگ چاہے کچھ بھی کہتے رہیں ، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر آدمی اپنی ہیئت درست بنالے تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائیں گے ۔ اور اصل خوشی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ دنیا میں لوگ خوش بھی ہو جائیں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بتلایا تھا کہ پائجامہ لنگی وغیرہ جس سے ٹخنے ڈھپ جائیں اس کو پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ آدھی پنڈلی تک رکھنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔

معاشرت کی اہم نصیحتیں

حدیث ۷۹۶:-

وعن أبي جُرَيٍّ جابر بن سُلَيم رضی اللہ عنہ قَالَ: رَأَيْتُ رَجُلاً يَصْدُرُ النَّاسُ عَنْ رَأْيِهِ، لا يَقُولُ شَيْئاً إِلاَّ صَدَرُوا عَنْهُ، قُلْتُ: مَنْ هَذَا؟ قالوا: رسولُ الله (ﷺ). قُلْتُ: عَلَيْكَ السَّلامُ يَا رسول الله - مرّتين - قَالَ: (لاَ تَقُلْ: عَلَيْكَ السَّلامُ، عَلَيْكَ السَّلامُ تَحِيَّةُ المَوْتَى، قُلْ: السَّلامُ عَلَيْكَ) قَالَ: قُلْتُ: أَنْتَ رسول الله؟ قَالَ: (أنَا رسول الله الَّذِي إِذَا أَصَابَكَ ضُرٌّ فَدَعَوْتَهُ كَشَفَه عَنْكَ، وَإِذَا أَصَابَكَ عَامُ سَنَةٍ فَدَعَوْتَهُ أَنْبَتَهَا لَكَ، وَإِذَا كُنْتَ بِأَرْضٍ قَفْرٍ أَوْ فَلاَةٍ فَضَلَّتْ رَاحِلَتُكَ، فَدَعَوْتَهُ رَدَّهَا عَلَيْكَ) قَالَ: قُلْتُ: اعْهَدْ إِلَيَّ. قَالَ: (لاَ تَسُبَّنَّ أحَداً) قَالَ: فَمَا سَبَبْتُ بَعْدَهُ حُرّاً، وَلاَ عَبْداً، وَلاَ بَعِيراً، وَلاَ شَاةً. (وَلاَ تَحْقِرَنَّ مِنَ المَعْرُوفِ شَيْئاً، وأَنْ تُكَلِّمَ أخَاكَ وَأَنْتَ مُنْبَسِطٌ إِلَيْهِ وَجْهُكَ، إنَّ ذَلِكَ مِنَ المَعْرُوفِ، وَارْفَعْ إِزَارَكَ إِلَى نِصْفِ السَّاقِ، فَإِنْ أَبَيْتَ فَإِلَى الكَعْبَيْنِ، وَإِيَّاكَ وَإِسْبَالَ الإزَارِ فَإنَّهَا مِنَ المَخِيلَةِ. وَإنَّ الله لاَ يُحِبُّ المَخِيلَةَ؛ وَإنِ امْرُؤٌ شَتَمَكَ وَعَيَّرَكَ بِمَا يَعْلَمُ فِيكَ فَلاَ تُعَيِّرْهُ بِمَا تَعْلَمُ فِيهِ، فَإِنَّمَا وَبَالُ ذَلِكَ عَلَيْهِ.

(رواه أبو داود والترمذي بإسناد صحيح، وقال الترمذي: حديث حسن صحيح)

ترجمہ :-حضرت جابربن سُلَیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ لوگ ان کی باتوں کو قبول کرتے ہیں ،وہ جو کہتے ہیں لوگ اس کو عملی جامہ پہناتے ہیں ،وہ جو کہہ دیتے ہیں لوگ اس کو اختیار کرلیتے ہیں۔مَیں نے لوگوں سے پوچھا:یہ کون ہیں ؟لوگوں نے بتلایا: یہ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں۔ مَیں نے ملاقات کی اوردومرتبہ کہا:"علیک السلام یارسول اللہ" حضوراکرم (ﷺ) نے فرمایا: "علیک السلام" مت کہو،یہ مُردوں کا سلام ہے(اس زمانہ میں شعراء اپنے اشعاراور قصیدوں میں جب مردوں کے لیے سلام کا صیغہ استعمال کرتے تھے تو اسی طرح کہا کرتے تھے کہ "علیک" کو مقدم کرتے تھے، اس لیے حضوراکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ)"السلام علیک "کہو۔خیر! اس کے بعد انہوں نے کہا: کیا آپ اللہ کے رسول ہیں؟ نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا : میں اس اللہ کارسول ہوں کہ جب تم کو کوئی تکلیف پہنچے اورتم اس کو پکارو تو اللہ تعالیٰ تمہاری اس تکلیف کو دور کردے۔اگرتم کو قحط سالی پیش آئے اورتم اللہ تعالیٰ سے دعاکرو تو وہ تمہارے لیے کھیتی اورغلہ اُگائے۔اور جب تم کسی صحراء اور (ویرانہ)میں ہو، اور تمہاری سواری کا جانورگم ہوجائےاورتم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو اللہ تعالیٰ اس کو لوٹادے۔مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) سے کہا: آپ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:اکسی کو گالی مت دینا، برا بھلامت کہنا،کسی کو برے الفاظ سے مخاطب مت کرنا۔فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے اس نصیحت فرمانے کے بعدمیں نے کبھی کسی کو برابھلانہیں کہا،نہ کسی آزاد کو،نہ کسی غلام کو،نہ اونٹ کو، نہ بکری کو۔(پھر آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا)۲ نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی مت سمجھنا،۳اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ ایسی حالت میں بات کروکہ تمہاراچہرہ کھلاہواہو، مسکراتے اورہنستے چہرہ سے بات کرنا؛یہ بھی نیکی کاکام ہے(اس سے سامنے والے کاجی خوش ہوجاتا ہے اورہمارا کچھ خرچ نہیں ہوتا)۴اپنی لنگی کو آدھی پنڈلی تک اونچارکھو۔اگر آدھی پنڈلی تک رکھنا نہیں چاہتے تو ٹخنوں سے اوپراوپر تک رکھ سکتے ہو۔اور لنگی یاپائجامہ کو ٹخنوں سے نیچے

لیجانے سے بچو، **اس لیے کہ یہ تکبر کی بات ہے**، اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتے۔ ۵ اگر کوئی آدمی تمہیں گالی دے، یا عار دلائے کسی ایسی بات پر جو تمہارے اندر موجود ہے، تو اب آپ کسی ایسے عیب کی وجہ سے جو اُس میں ہے؛ اُسے شرم مت دلاؤ، اس لیے کہ اس نے جو حرکت کی ہے اس کا گناہ اور وبال اُس پر ہے۔

تو گفتار؛ وہ کردار

افادات:—یہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی امتیازی صفت تھی کہ اگر وہ نبی ٔ کریم (ﷺ) سے درخواست کرتے کہ آپ ہمیں کوئی نصیحت فرمایئے، یا نبی ٔ کریم (ﷺ) از خود کسی بات پر ان کو تنبیہ فرماتے، تو بس! نبی ٔ کریم (ﷺ) کا ایک مرتبہ ارشاد فرمادینا ان کی زندگی بھر کے لیے کافی ہو جاتا تھا۔ یہاں دیکھو! انہوں نے نبی ٔ کریم (ﷺ) سے نصیحت کی درخواست کی اور نبی ٔ کریم (ﷺ) نے جواب میں فرمایا: کسی کو گالی مت دینا تو اس کو انہوں نے ایسا پلّے باندھ لیا کہ انسان تو انسان؛ جانور تک کو کبھی گالی نہیں دی۔ بقول اقبال:

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار؛ وہ کردار، تو ثابت؛ وہ سیّارا

نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی مت سمجھنا

”**نیکی کے کسی بھی کام کو معمولی مت سمجھنا۔**“ عام طور پر آدمی سوچتا ہے کہ یہ تو چھوٹا سا کام ہے، اور اس کو عملی جامہ نہیں پہناتا۔ گویا اس کام کو معمولی سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں تعلیم دی کہ نیکی کا کام تو کرنا ہی ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو، یا بڑا؛ اس لیے کہ پتہ نہیں کونسی نیکی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو کر ہمارے لیے نجات کا ذریعہ بن جائے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقولہ ہے: نیکی کے کام کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑو مت، اور گناہ کے کام کو چھوٹا سمجھ کر کرو مت؛ پتہ نہیں کونسی نیکی ہمارے لیے نجات کا ذریعہ بن جائے اور پتہ نہیں کونسا گناہ ہلاکت کا سبب بن جائے۔

پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا ہی تکبر کی علامت ہے

یہاں تو یہ روایت اسی مقصد کے لیے لائے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان صحابی کو جو نصیحتیں فرمائیں ان میں یہ بھی تاکید فرمائی کہ لنگی آدھی پنڈلی تک رکھو۔ اور اگر آدھی پنڈلی تک رکھنا نہیں چاہتے تو ٹخنوں سے اوپر اوپر تک رکھ سکتے ہو، ٹخنے ڈھکنے نہیں چاہئیں لیکن پسندیدہ بات یہ ہے کہ آدھی پنڈلی تک ہو، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ یہی تھا۔

”اور لنگی یا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے تک لے جانے سے بچو، اس لیے کہ یہ تکبر کی بات ہے، اور اللہ تعالیٰ تکبر کو پسند نہیں کرتے“ دیکھو! اس روایت میں پائجامہ کو ٹخنوں سے نیچے لے جانے ہی کو تکبر کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ اور گزشتہ درس میں مَیں نے بتلایا تھا کہ علماءِ محققین کا رجحان اسی طرف ہے کہ: کوئی آدمی لنگی، پائجامہ وغیرہ ٹخنوں سے نیچے پہنتا ہے، تو یہ ہر حال میں مکروہِ تحریمی ہے ، چاہے تکبر سے ہو یا تکبر کے بغیر ہو؛ اس لیے کہ ٹخنوں سے نیچے پہننے ہی کو علامتِ کبر قرار دیا گیا ہے۔

تم ایسا مت کرو

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک اور نصیحت فرمائی کہ اگر کوئی آدمی تمہیں گالی دے ، یا کسی ایسی بات پر عار دلائے جو تمہارے اندر موجود ہے یعنی تمہارا کوئی عیب لوگوں کے سامنے ظاہر کرکے تمہیں شرم دلائے، تو اب آپ اس کے کسی ایسے عیب کی وجہ سے جو جانتے ہیں کہ اُس میں ہے؛ اُس کو شرم مت دلایئے۔ ہماری عادت تو یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی ہماری کسی کمزوری کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرکے ہمیں شرمندہ کرنا چاہے تو ہم فوراً اس کی کسی بات کو ظاہر کرکے کہتے ہیں کہ تو بھی تو ایسا ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے نصیحت فرمائی کہ اگر کوئی تمہارے ساتھ ایسا کرے تو اگر تم اس کے کسی عیب سے واقف ہو، تو اس کو عار مت دلاؤ؛ اس لیے کہ اس نے یہ جو حرکت کی ہے اس کا گناہ اس پر ہے۔

ٹخنوں سے نیچے کپڑ الٹکانے والے کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے

حدیث ۷۹۷:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: بينما رَجُلٌ يُصَلِّي مسبلٌ إِزَارَهُ، قَالَ لَهُ رسول الله (ﷺ): ((اذْهَبْ فتَوَضَّأْ)) فَذَهَبَ فتوَضّأَ، ثُمَّ جَاءَ، فقَالَ: ((اذْهَبْ فتَوَضّأْ)) فقَالَ لَهُ رجُلٌ: يَارسول اللهِ! مَا لَكَ أَمَرْتَهُ أَنْ يَتَوَضّأَ ثُمَّ سَكَتَّ عَنْهُ؟ قَالَ: إِنَّهُ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ مُسْبِلٌ إِزَارَهُ، وَإِنَّ اللهَ لَا يَقْبَلُ صَلَاةَ رَجُلٍ مُسْبِلٍ.

(رواه أَبُو داود بإسناد صحيح عَلَى شرط مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک آدمی ایسی حالت میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی لنگی، یا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا تھا، نبی کریم (ﷺ) نے اس سے فرمایا: جاؤ! وضو کر کے آؤ۔ وہ گیا، وضو کر کے آیا، تو نبی کریم (ﷺ) نے دوبارہ فرمایا: جاؤ! وضو کر کے آؤ۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ نے اس کو وضو لوٹانے کی تاکید فرمائی، پھر خاموش ہو گئے؟ (یعنی وضو لوٹانے کے بعد نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا) تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: یہ آدمی ٹخنوں سے نیچے لنگی رکھ کر نماز پڑھ رہا تھا اور ایسے آدمی کی نماز اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے۔

افادات:- نبی کریم (ﷺ) نے وضو لوٹانے کی تاکید اس لیے فرمائی تھی تاکہ اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔

کوئی ایسی بات کہتے جایئے !

حدیث ۷۹۸:-

وعن قيس بن بشر التَّغْلِبِيِّ ، قَالَ : أَخْبَرَنِی أَبِي - وكان جَلِيساً لأَبِي الدرداء - قَالَ: كَانَ بِدمَشْق رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) يقال لَهُ سهل بن الْحَنْظَلِيَّةِ وَكَانَ رَجُلاً مُتَوَحِّداً قَلَّمَا يُجَالِسُ النَّاسَ ، إِنَّمَا هُوَ صَلاةٌ ، فإذا فَرَغَ فَإِنَّمَا هُوَ تَسْبِيحٌ وَتَكْبِيرٌ حَتَّى يَأْتِي أَهْلَهُ.

فَمَرَّ بنا وَنَحْنُ عِنْدَ أَبِي الدَّرداء ، فَقَالَ لَهُ أَبُو الدرداءِ : كَلِمَةً تَنْفَعُنَا وَلاَ تَضُرُّكَ. قَالَ: بَعَثَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) سَرِيَّةً فَقَدِمَتْ ، فَجَاءَ رَجُلٌ مِنهم فَجَلَسَ في المَجْلِسِ الَّذِي يَجْلِسُ فِيهِ رسُولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) ، فَقَالَ لِرَجُلٍ إِلَى جَنْبِهِ : لَوْ رَأَيْتَنَا حِينَ التَقَيْنَا نَحْنُ وَالعَدُوُّ ، فَحَمَلَ فُلانٌ وطَعَنَ ، فَقَالَ : خُذْهَا مِنِّي ، وَأَنَا الغُلامُ الغِفَارِيُّ ، كَيْفَ تَرَى في قَوْلِهِ ؟ قَالَ : مَا أُرَاهُ إِلاَّ قَدْ بَطَلَ أَجْرُهُ . فَسَمِعَ بِذلِكَ آخرُ ، فَقَالَ : مَا أَرَى بِذلِكَ بَأساً ، فَتَنَازَعَا حَتَّى سَمِعَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) ، فَقَالَ: ((سُبْحَانَ الله ؟ لاَ بَأْسَ أَنْ يُؤجَرَ وَيُحْمَدَ)) فَرَأَيْتُ أَبَا الدَّرْدَاء سُرَّ بِذلِكَ ، وَجَعَلَ يَرْفَعُ رَأسَهُ إِلَيْهِ ، وَيَقُولُ : أأَنْتَ سَمِعْتَ ذَلِكَ مِنْ رَسُولِ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) ؟ فيقول : نَعَمْ ، فما زال يُعِيدُ عَلَيْهِ حَتَّى إِنِّي لأَقُولُ لَيَبْرُكَنَّ عَلَى رُكْبَتَيْهِ.

قَالَ : فَمَرَّ بِنَا يَوماً آخَرَ ، فَقَالَ لَهُ أَبُو الدَّرْداء: كَلِمَةً تَنْفَعُنَا وَلاَ تَضُرُّكَ ، قَالَ قَالَ لنا رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : المُنْفِقُ عَلَى الخَيْلِ ، كَالبَاسِطِ يَدَهُ بالصَّدَقَةِ لاَ يَقْبضُهَا .

ثُمَّ مَرَّ بِنَا يوماً آخَرَ ، فَقَالَ لَهُ أَبُو الدَّرْداء : كَلِمَةً تَنْفعنا وَلاَ تَضُرُّكَ ، قَالَ : قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : نِعْمَ الرَّجُلُ خُرَيمٌ الأُسَدِيُّ ! لولا طُول جُمَّتِهِ وَإسْبَالُ إزَارِهِ ! فَبَلَغَ ذَلِكَ خُرَيْماً فَعَجَّلَ ، فَأَخَذَ شَفْرَةً فَقَطَعَ بِهَا جُمَّتَهُ إِلَى أُذُنَيْهِ ، وَرَفَعَ إزَارَهُ إِلَى أَنْصَافِ سَاقَيْهِ.

ثُمَّ مَرَّ بِنَا يَوماً آخرَ فَقَالَ لَهُ أَبُو الدَّرْداء: كَلِمَةً تَنْفَعُنَا وَلاَ تَضُرُّكَ، قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: إِنَّكُمْ قَادِمُونَ عَلَى إِخْوانِكُمْ، فَأَصْلِحُوا رِحَالَكُمْ، وَأَصْلِحُوا لِبَاسَكُمْ حَتَّى تَكُونُوا كَأَنَّكُمْ شَامَةٌ فِى النَّاسِ؛ فإِنَّ الله لاَ يُحِبُّ الفُحْشَ وَلاَ التَّفَحُّش. (رواه أبو داود بإسنادٍ حسنٍ، إلاَّ قيس بن بشر فاختلفوا فى توثيقِهِ وتضعيفِهِ. وَقَدْ روى لَهُ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت قیس بن بشر تغلبی کہتے ہیں کہ ان کے والد حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔وہ فرماتے ہیں کہ دمشق میں نبی کریم (ﷺ) کے ایک صحابی حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ رہا کرتے تھے جو تنہائی پسند آدمی تھے،ان کو لوگوں سے ملنا جلنا زیادہ پسند نہیں تھا(نماز پڑھنے کے لیے مسجد آتے تھے)جب نماز سے فارغ ہوجاتے تو تسبیح و تکبیر میں مشغول ہوجاتے ،یہاں تک کہ فارغ ہوکر گھر چلے جاتے۔لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے نہیں تھے۔

ایک روز ہم حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے تو حضرت سہل رضی اللہ عنہ وہاں سے گزرے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: کوئی ایسی بات کہتے جایئے جس میں ہمارا فائدہ ہو،اورآپ کا نقصان نہ ہو (جب حضرت ابوالدرداء جیسے صحابی نے یہ درخواست کی)تو فوراً انہوں نے فرمایا:ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لشکر کی ایک ٹکڑی بھیجی، جب وہ لوگ اپنی اس مہم کو سر کرکے واپس آئے تو اس لشکر کا ایک آدمی اس مجلس میں آکر بیٹھا جس میں نبی کریم (ﷺ) بھی تشریف فرماتھے، اوراپنے پاس بیٹھنے والے ایک آدمی سے اس نے کہا: جب ہمارا مقابلہ دشمن کے ساتھ ہوااس وقت اگر تم ہمیں دیکھتے تو ہمارے

لشکر کی ٹکڑی میں سے فلاں آدمی نے دشمن پر حملہ کرتے ہوئے اور نیزہ چلاتے ہوئے یوں کہا کہ لو! میری طرف سے یہ وار قبول کرو، مَیں قبیلۂ غِفار کا بہادر نوجوان ہوں۔

(مطلب یہ ہے کہ دشمن سے مقابلہ کے وقت اپنی بہادری کے اظہار کے لیے اس نے یہ جملہ کہا۔ویسے تو کوئی ایسی بات اپنی زبان سے کہنا جس میں اپنی بڑائی ظاہر ہوتی ہو،شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی، لیکن بعض مواقع میں کسی مصلحت کے پیشِ نظر اگر ضرورت ہو تو اس کی گنجائش دی گئی ہے،مثلاً دشمن کے مقابلہ میں دشمن کو زیر کرنے کے لیے اور ان کے اوپر اپنا رعب ڈالنے کے لیے ایسا کہنا کہ: آجاؤ! میرے مقابلہ میں ، کون ہے جو میرا مقابلہ کرے گا؟ تو ایسا کہنے کی اجازت ہے۔

جنگِ اُحد کے موقعہ پر نبیٔ کریم (ﷺ) نے فرمایا: یہ تلوار اس کا حق ادا کرنے کی شرط پر میرے پاس سے کون لے گا؟ایک صحابی حضرت ابوُدجانہ سماک بن خَرَشَہ رضی اللہ عنہ نے مانگی اور وہاں سے بڑے اِتراتے ہوئے اپنی بہادری کا تذکرہ کرتے ہوئے نکلے، جب نبیٔ کریم (ﷺ) نے ان کو اس طرح اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: ویسے تو یہ چال اللہ تعالیٰ کو بہت ناپسند ہے، مگر لڑائی کے میدان میں دشمن پر اپنا رعب ڈالنے کے واسطے اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ (سیرۃ المصطفی،کتب خانہ مظہری، جلد ۲، ص:۱۹۳۔بحوالہ البدایہ والنہایۃ))

اس کا یہ جملہ نقل کرنے کے بعد وہ پوچھتا ہے کہ: اس کا یہ جملہ تمہارے نزدیک کیا حیثیت رکھتا ہے؟اس کو ایسا کہنا چاہیے تھا؟یہ اچھی بات ہوئی یا بری بات ہوئی؟اس نے کہا: مَیں تو یوں

سمجھتا ہوں کہ اس کا ثواب اور اجر ضائع ہو گیا (یعنی اس نے اپنے کارنامہ کے لیے اپنی بڑائی کے الفاظ استعمال کیے، گویا اس نے یہ کام دکھلاوے کے واسطے کیا، اس لیے اس کا ثواب ختم ہو گیا۔ اس آدمی نے اپنا تبصرہ اور ''Review'' پیش کیا) ایک اور آدمی بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا، اس نے جب یہ بات سنی تو کہا: میرے نزدیک تو ایسا کہنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ دشمن کے مقابلہ میں ایسا کہنے کی اجازت ہے۔ ان دونوں میں بحث شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ان دونوں کی آواز نبی کریم (ﷺ) کے گوش مبارک میں پڑی، تو آپ (ﷺ) نے فرمایا: سبحان اللہ؟ (یہ جملہ تعجب کے موقع پر کہا جاتا ہے، یعنی یہ بھی کوئی آپس میں لڑنے جھگڑنے کی چیز ہے؟) اس میں کیا حرج کی بات ہے کہ اپنی بہادری کی تعریف بھی کی جائے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر بھی ملے (مطلب یہ ہے کہ جب دشمن کے مقابلہ میں اس نے یہ جملہ کہا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں تھی۔)

(بشر تغلبی کہتے ہیں کہ جب حضرت سہل بن حنظلیہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم (ﷺ) کی یہ بات نقل فرمائی) تو حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو میں نے دیکھا کہ یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور اپنا سر اونچا کرتے ہوئے کہا: کیا تم نے خود حضور اکرم (ﷺ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے؟ حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! حضور اکرم (ﷺ) کو یہ فرماتے ہوئے میں نے خود سنا ہے۔ اور حضرت سہل رضی اللہ عنہ بار بار یہ کہتے ہوئے کہ ''جی ہاں! میں نے خود سنا ہے'' حضرت ابو الدرداء

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے اتنے قریب آگئے کہ مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں حضرت سہل رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے گھٹنوں پر بیٹھ نہ جائیں۔

بشر تغلبی کہتے ہیں کہ پھر کسی اور دن حضرت سہل رضی اللہ عنہ ہمارے پاس سے گزرے تو حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: کوئی بات کہتے جایئے جس سے ہمارا کچھ فائدہ ہو اور آپ کا کوئی نقصان نہ ہو۔ اس پر حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: آدمی اپنے (اس) گھوڑے پر (جس کو جہاد میں شریک ہونے کے لیے پال رکھا ہے) جو کچھ خرچ کرتا ہے، وہ ایسا ہے جیسے کسی نے صدقہ کرنے کے لیے اپنے ہاتھ کھول دیئے ہوں اور مسلسل صدقہ کئے جارہا ہو (اُس کو جیسا ثواب ملتا ہے اِس کو بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے۔)

خُرَیم اَسدی اچھے آدمی ہیں اگر...

(بشر تغلبی کہتے ہیں کہ) پھر کسی اور دن حضرت سہل رضی اللہ عنہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی مجلس کے پاس سے گزر رہے تھے تو حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: کوئی بات کہتے جایئے جس سے ہمیں فائدہ پہنچے اور آپ کا کوئی نقصان نہ ہو۔ اس پر حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے کہا: ایک روز نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی مجلس میں فرمایا: حضرت خریم بن فاتک اسدی رضی اللہ عنہ بڑے اچھے آدمی ہیں اگر ان کے بال زیادہ لمبے نہ ہوتے اور ان کی لنگی ٹخنوں سے نیچے نہ ہوتی۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ جملہ حضرت خریم رضی اللہ عنہ کو پہنچا اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی منشاء معلوم ہوئی تو

فوراً اس پر عمل کرلیا کہ چاقو لیا اور اپنے بالوں کو کاٹ دیا یہاں تک کہ کانوں کی لَو تک کرلیے، اور اپنی لنگی آدھی پنڈلی تک اونچی کرلی۔(یہاں اس روایت کو اسی بات کو بتلانے کے لیے پیش کیا ہے)

اللہ تعالیٰ برائی کو پسند نہیں کرتے

(بشر تغلبی کہتے ہیں کہ) پھر کسی اور دن حضرت سہل رضی اللہ عنہ ہمارے پاس سے گزر رہے تھے تو حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے پھر ان سے کہا: کوئی بات کہتے جایئے جس سے ہمیں فائدہ پہنچے اور آپ کا کوئی نقصان نہ ہو۔ انہوں نے کہا: میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب تم اپنے بھائیوں کے پاس پہنچنے والے ہوتو اپنے کجاووں اور سواریوں کو ٹھیک کرلو اور اپنے لباس بھی درست کرلو، یہاں تک کہ تمہارا حال ایسا ہوجائے جیسے جسم میں تِل کا ہوا کرتا ہے (کسی حسین چہرے پر تِل ہوتو اس تِل کی وجہ سے چہرے کی خوبصورتی میں کمی نہیں آتی بلکہ اضافہ ہوجاتا ہے) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ برائی کو پسند نہیں کرتے۔

پائجامہ آدھی پنڈلی تک ہونا چاہیے

حدیث ۷۹۹:-

وعن أَبِي سعيد الخدريِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِزْرَةُ المُسْلِمِ إِلَى نِصْفِ السَّاقِ، وَلاَ حَرَجَ- أَوْ لاَ جُنَاحَ- فِيمَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الكَعْبَيْنِ، فَمَا كَانَ أَسْفَلَ مِنَ الكَعْبَيْنِ فَهُوَ فی النَّارِ، وَمَنْ جَرَّ إِزَارَهُ بَطَراً لَمْ يَنْظُرِ اللهُ إِلَيْهِ. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيحٍ)

ترجمہ:– حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: مؤمن کی لنگی (یا پاجامہ) آدھی پنڈلی تک ہونا چاہیے (یہ پسندیدہ صورت ہے) اور اگر اس سے نیچے ٹخنوں سے اوپر ہو تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اور جو کپڑا ٹخنوں سے نیچے ہو گا وہ جہنم میں جائے گا، اور جس نے اپنی لنگی کو تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے لٹکایا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔

عبد اللہ! اپنی لنگی اونچی کرو

حدیث ۸۰۰:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: مررتُ عَلَى رسولِ الله (ﷺ) وفی إِزَارِی استرخاءٌ، فَقَالَ: يَا عَبدَ الله، ارْفَعْ إِزَارَكَ. فَرَفَعْتُهُ ثُمَّ قَالَ: زِدْ. فَزِدْتُ، فَمَا زِلْتُ أَتَحَرَّاهَا بَعْدُ. فَقَالَ بَعْضُ القَوْمِ: إِلَى أَيْنَ؟ فَقَالَ: إِلَى أَنْصَافِ السَّاقَيْنِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:– حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرا گزر نبی کریم (ﷺ) کے پاس سے ہوا اور میری لنگی نیچی تھی، تو نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: اے عبد اللہ! اپنی لنگی اونچی کرو۔ میں نے ذرا اونچی کرلی۔ پھر آپ (ﷺ) نے فرمایا: اور اونچی کرو۔ تو میں نے اور اونچی کرلی۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں

برابر اس کا خیال رکھتا ہوں۔ کسی نے پوچھا: لنگی کہاں تک ہونی چاہیے؟ تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: آدھی پنڈلی تک۔ (یہی مستحب اور پسندیدہ ہے۔)

عورتیں کیا کریں؟

حدیث ۱۰۸۰:-

وعنه، قَالَ: قَالَ رسولُ الله (ﷺ): مَنْ جَرَّ ثَوْبَهُ خُيَلاءَ لَمْ يَنْظُرِ اللهُ إِلَيْهِ يَوْمَ القِيَامَةِ. فَقَالَتْ أُمُّ سَلَمَةَ: فَكَيْفَ تَصْنَعُ النِّسَاءُ بِذُيُولِهِنَّ؟ قَالَ: يُرْخِينَ شِبْراً. قالت: إِذاً تَنْكَشِفُ أَقْدَامُهُنَّ. قَالَ: فَيُرْخِينَهُ ذِرَاعاً لاَ يَزِدْنَ. (رواه أَبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنا لباس (لنگی، پائجامہ، پتلون، کرتہ) تکبر کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچا رکھے گا، تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ رحمت سے نہیں دیکھیں گے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! عورتیں کیا کریں؟ (کیا وہ بھی اونچا رکھیں؟) تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: عورتیں (آدھی پنڈلی سے) ایک بالشت نیچا رکھیں۔ انہوں نے عرض کیا: آدھی پنڈلی سے ایک بالشت نیچا رکھنے میں تو پاؤں کھل جائیں گے۔ تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تو پھر ایک ہاتھ نیچا رکھیں، اس سے زیادہ نہیں۔

افادات:- یعنی اتنا نیچا نہیں کہ زمین کے ساتھ گھسٹنے لگے کہ اس صورت میں کپڑے ناپاک ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ ہاں! پورا پاؤں ڈھپ جائے؛ یہ عورتوں کے لیے ضروری ہے

إستحباب ترك الترفع في اللباس تواضعاً

تواضع وانکساری کے پیشِ نظر
اونچے اور عمدہ لباس کا چھوڑ دینا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تواضع اورانکساری کے پیشِ نظر کسی آدمی کا اونچے اور عمدہ لباس کو چھوڑدینا، تاکہ طبیعت کے اندر بڑائی کا مادّہ پیدا نہ ہو۔

پہلے بتلادیا تھا کہ آدمی کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق لباس استعمال کرنے کی اجازت ہے، بلکہ استعمال کرنا چاہیے۔ لیکن اعلیٰ لباس پہننے کی صورت میں اگر یہ اندیشہ ہو کہ طبیعت کے اندر تکبر اور بڑائی پیدا ہو جائے گی، اس سے بچنے اور اپنی طبیعت میں تواضع وانکساری پیدا کرنے کے لیے اگر معمولی لباس پہنتا ہے؛ تو یہ پسندیدہ ہے۔

قیامت کے روز ایمان کا جوڑا ملے گا:

حدیث ۸۰۲:-

وعن معاذ بن أنسٍ رضی اللہ عنہ أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: مَنْ تَرَكَ اللِّبَاس تَوَاضُعاً لله، وَهُوَ يَقْدِرُ عَلَيْهِ، دَعَاهُ اللهُ يَومَ القِيَامَةِ عَلَى رُؤُوسِ الخَلاَئِقِ حَتَّى يُخَيِّرَهُ مِنْ أيِّ حُلَلِ الإيمَانِ شَاءَ يَلْبَسُهَا. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن اَنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی عمدہ لباس پہن سکتا تھا (لیکن) اللہ کے واسطے تواضع وانکساری اختیار کرتے ہوئے اس کو چھوڑدیا (اور معمولی لباس

اختیار کیا)تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کو تمام لوگوں کے سامنے بلائیں گے، یہاں تک کہ اس کو اختیار دیں گے کہ ایمان کے جوڑوں میں سے جونسا پسند ہو پہن لو۔

افادات:- کیوں کہ اس نے اپنی حیثیت اونچی ہونے کے باوجود محض اللہ کے واسطے تواضع کے پیشِ نظر معمولی لباس اختیار کیا تھا۔ایک تو شکل یہ ہے کہ حیثیت ہے اور معمولی لباس بخل کی وجہ سے پہنتا ہے؛اس کی تو اجازت نہیں ہے۔پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایک آدمی کے جسم پر معمولی لباس دیکھ کر نبیٔ کریم (ﷺ) نے پوچھا کہ تمہارے پاس مال ہے؟ کہا: ہے۔ پوچھا: کون سا ہے؟ کہا: ہر طرح کا مال ہے۔ تو فرمایا: پھر تو اس کا اثر تمہارے جسم پر نظر آنا چاہیے۔ وہاں نبیٔ کریم (ﷺ) نے یہ محسوس کیا تھا کہ اس آدمی نے عمدہ لباس پہننے کی قدرت ہونے کے باوجود معمولی لباس پر اکتفاء بخل کی وجہ سے کیا ہے،تو اس پر کیا ثواب ملے گا؟ہاں !اگر اللہ کے واسطے تواضع و انکساری کے پیشِ نظر ایسا کرتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے لیے قربانی دینا ہے، تو پھر اس کے ساتھ انعام والا معاملہ کیا جائے گا۔

إستحباب التوسّط فی اللّبَاس وَلاَ یقْتصر عَلیٰ مَا یزْری بِهِ لِغَیْرِ حاجۃٍ وَلاَ مقْصُودٍ شرْعی

لباس کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنا اور بغیر کسی حاجت اور بغیر کسی شرعی مقصد کے ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جو عیب کا ذریعہ ہو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لباس کے معاملہ میں میانہ روی اختیار کرنا،نہ بہت اعلیٰ ہو،اور نہ بہت گھٹیا ہو؛بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق پہنے۔اور بغیر کسی حاجت اور بغیر کسی شرعی مقصد کے ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جو عیب کا ذریعہ ہو کہ لوگ اس کی وجہ سے اس پر تنقید کریں۔

پہلے بھی بتلادیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے وسعت دی ہو تو آدمی عمدہ لباس استعمال کرے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)لباس کے معاملہ میں کوئی خاص اہتمام نہیں فرماتے تھے،جو میسر آگیا وہ پہن لیا کرتے تھے۔عمدہ لباس بھی پہنا ہے،ایک مرتبہ ایک جوڑا دوہزار دینار کی قیمت کا زیب تن فرمایا ہے،دینار سونے کا سکہ ہوتا ہے، گویا آج کل کے حساب سے نوے کیلو سونے کی قیمت ہوتی ہے،اتنا قیمتی لباس پہننا بھی ثابت ہے۔

نعمت کا اثر بندہ پر دِکھنا چاہیے:

حدیث ۸۰۳:-

عن عمرو بن شعیب عن أبیہِ عن جَدِّہِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) : إِنَّ اللہَ یُحِبُّ أَنْ یُرَی أَثَرُ نِعْمَتِہِ عَلَی عَبْدِہِ. (رواہ الترمذی،وقال:حدیث حسن)

ترجمہ:- عمرو بن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اس کی نعمت کا اثر اس کے بندے کے اوپر نظر آئے۔

افادات:- عمدہ لباس تکبر کی وجہ سے نہ پہنے، بلکہ اس نیت سے پہنے کہ اے اللہ! تو نے ایک نعمت دی ہے اس کی قدردانی کرتے ہوئے میں پہن رہا ہوں۔ اگر عمدہ لباس پہن کر یہ سمجھے گا کہ میں بڑا بن گیا، تو گناہ کی بات ہو جائے گی۔ اور یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو دل سے تعلق رکھتی ہیں، اس لیے آدمی اپنے دل کو ٹٹول کر معلوم کر لے کہ جذبہ کیا ہے۔ جیسے: باپ اپنے بیٹے کو کھانے پینے میں ہر طرح کی وسعت دیتا ہو، اس کے باوجود بیٹا بھوکا رہتا ہو اور کمزور ہوتا جا رہا ہو، تو باپ کو اس کی یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

باب تحریم لباس الحریر عَلَی الرجال وتحریم جلوسهم عَلَیْهِ

ریشمی لباس کا استعمال مردوں کے لیے حرام ہے عورتوں کے لیے جائز ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جو دنیا میں ریشم پہنے:

حدیث ۸۰۴:-

عن عمر بن الخَطَّابِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللہ (ﷺ) : لاَتَلْبَسُوا الحَرِيرَ؛ فَإِنَّ مَنْ لَبِسَهُ فِي الدُّنْيَا لَمْ يَلْبَسْهُ فِي الآخِرَةِ.(متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:-حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:ریشم مت پہنو،جو آدمی دنیا میں ریشم پہنے گاوہ آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔

حدیث ۸۰۵:-

وعنه قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللہ (ﷺ) يقول:إِنَّمَا يَلْبَسُ الحَرِيرَ مَنْ لاَ خَلاَقَ لَهُ.وفی رواية للبخاری: مَنْ لاَ خَلاَقَ لَهُ فِي الآخِرَةِ.

قَوْله: ((مَنْ لاَ خَلاقَ لَهُ)) أَيْ: لاَ نَصِيبَ لَهُ.

ترجمہ:-حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا:ریشم وہی مرد پہنتاہے جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔

حدیث ۸۰۶:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللہ (ﷺ): مَنۡ لَبِسَ الحَرِيرَ فی الدُّنۡيَا لَمۡ يَلۡبَسۡهُ فی الآخِرَةِ. (متفقٌ عَلَيۡهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: دنیا میں جو آدمی ریشم پہنے گا، وہ آخرت میں نہیں پہن سکے گا۔

افادات:- چوں کہ اس نے ریشم پہن کر ایک گناہ کا کام کیا، تو جب تک اس گناہ کی سزا نہ بھگت لے، جنت میں نہیں جائے گا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنت میں جا کر بھی اس کی طبیعت میں قدرتی طور اس کا تقاضہ ہی پیدا نہ ہو۔ اس لیے کہ جنت کے بارے میں آتا ہے: "وَلَكُمۡ فِيهَا مَا تَشۡتَهِىٓ أَنۡفُسُكُمۡ" جو جی چاہے گا وہاں وہ ملے گا، اس لیے ایسا نہیں ہو گا کہ جی چاہے اور نہ ملے

میری امت کے مردوں پر یہ دونوں حرام ہیں

حدیث ۸۰۷:-

وعن علی رضی اللہ عنہ قَالَ: رأيتُ رسولَ اللہ (ﷺ) أخَذَ حَرِيراً، فَجَعَلَهُ فی يَمِينِهِ، وَذَهَباً، فَجَعَلَهُ فی شِمَالِهِ، ثُمَّ قَالَ: إنَّ هذَيۡنِ حَرَامٌ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيحٍ)

ترجمہ:–حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا کہ آپ نے ریشم کو اپنے داہنے ہاتھ میں لیا، اور سونے کو بائیں ہاتھ میں پکڑا، پھر (دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) فرمایا: اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں چیزیں میری امت کے مردوں پر حرام کردی ہیں۔

حدیث ۸۰۸:-

وعن أَبِي موسى الأَشْعَرِی رضی اللہ عنہ **أَنَّ رسول الله** (صلی اللہ علیہ وسلم) **قَالَ: حُرِّمَ لِبَاسُ الحَرِيرِ وَالذَّهَبِ عَلَى ذُكُورِ أُمَّتِي، وَأُحِلَّ لِإِنَاثِهِمْ.** (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:–حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ریشمی لباس اور سونا میری امت کے مردوں کے لیے حرام کردیا گیا ہے، اور ان کی عورتوں کے لیے اجازت دی گئی ہے۔

حدیث ۸۰۹:-

وعن حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: نَهَانَا النَّبِيُّ** (صلی اللہ علیہ وسلم) **أَنْ نَشْرَبَ فِی آنِيَةِ الذَّهَبِ وَالفِضَّةِ، وأَنْ نَأْكُلَ فِيهَا، وعَنْ لُبْسِ الحَرِيرِ وَالدِّيبَاجِ، وأَنْ نَجْلِسَ عَلَيْهِ. (رواہ البخاری)**

ترجمہ:–حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں منع کیا کہ ہم سونے چاندی کے برتنوں میں کھائیں پیئیں۔ اور ریشم و دیباج کو پہنیں اور اس پر بیٹھیں۔

افادات:–ریشم اور سونے چاندی کے زیور عورتیں پہن سکتی ہیں، شریعت نے ان کی کمزوری پر رحم کیا کہ وہ صبر نہیں کرسکیں گی، اس لیے ان کو یہ دونوں استعمال کرنے کی اجازت ہے۔

جواز لبس الحریر لمن بِهٖ حِکَّۃ

کسی عذر کی وجہ سے ریشم کا استعمال

جیسے کسی کو کھجلی ہوگئی، اب اگر وہ سوتی لباس استعمال کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کی تکلیف بڑھ جاتی ہے، تو اس کو ریشم استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم غزوہ کے سفر میں تھے ، وہاں اور کوئی تدبیر ممکن نہیں تھی، اور کھجلی سے بچاؤ کے لیے سوائے ریشمی کپڑے کے اور کوئی لباس استعمال کرنا مفید نہیں تھا، تو ضرورت کی وجہ سے ضرورت کی حد تک اجازت دی گئی۔

حدیث ۸۱۰:-

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: رَخَّصَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) لِلزُّبَيْرِ وعَبْدِ الرَّحْمانِ بن عَوْفٍ رضی اللہ عنہما فی لُبْسِ الحَرِيرِ لِحَكَّةٍ كَانَتْ بِهِما. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت زبیر اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خارش کی وجہ سے ریشمی لباس پہننے کی اجازت دی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

النھی عن افتراش جلود النمور والرکوب عَلَيهَا

چیتے کی کھال بچھا کر بیٹھنے کی ممانعت

ایک اور باب قائم کیا ہے کہ چیتے کی کھال بچھا کر اس پر بیٹھنا، یا چیتے کی کھال کو گھوڑے کی زین پر رکھ کر اس پر سواری کرنے کی ممانعت۔

یہ دراصل متکبر لوگوں کا طریقہ اور شیوہ ہونے کی وجہ سے منع ہے، اس کے استعمال کی وجہ سے آدمی کے مزاج میں کبر پیدا ہوتا ہے، اس لیے نبی کریم (ﷺ) نے اس سے منع فرمایا ہے۔ یہ حکم حرمت کا نہیں ہے بلکہ کراہت کا ہے، یعنی مناسب نہیں ہے۔

حدیث ۱۱۸:-

عن معاویۃ رضی اللہ عنہ قالَ: قالَ رسول اللہ (ﷺ): لاتَرْكَبُوا الخَزَّ، ولاَالنِّمَارَ.

(حدیث حسن، رواہ أبوداود وغیرہ بإسناد حسن)

ترجمہ:- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ریشم بچھا کر اس پر سواری مت کرو، اور نہ چیتے کی کھال پر سواری کرو۔

حدیث ۲ ۱ ۸:-

وعن أَبِي المليح، عن أبيه رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) نَهَى عَنْ جُلُودِ السِّبَاعِ. (رواه أبو داود والترمذیؒ والنسائیؒ بأسانيد صحاح)

وفي رواية للترمذي: نَهَى عَنْ جُلُودِ السِّبَاعِ أَنْ تُفْتَرَشَ.

ترجمہ:- ابو ملیح اپنے والد سے نقل کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے درندوں کی کھالوں (کو بچھا کر اس) پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔

مَا یقول إِذَا لبس ثوباً جدیداً أَوْ نعلاً أَوْ نحوہ

نیا کپڑا، نیا جوتا، وغیرہ پہنتے وقت کیا دعا پڑھے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نیا لباس پہننے کی دعا

لباس کے قبیل کی کوئی بھی نئی چیز پہنے، جیسے: نیا کرتہ، نیا پائجامہ، نئی صدری؛

تو اس وقت کیا دعا پڑھنی چاہیے؟

حدیث ۸۱۳:-

عن أَبي سعيد الخُدريِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذَا اسْتَجَدَّ ثَوباً سَمَّاهُ بِاسْمِهِ - عِمَامَةً، أَوْ قَمِيصاً، أَوْ رِدَاءً - يقولُ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ أنْتَ كَسَوْتَنِيهِ، أَسْأَلُكَ خَيْرَهُ وَخَيْرَ مَا صُنِعَ لَهُ، وَأَعوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ وَشَرِّ مَا صُنِعَ لَهُ. (رواه أَبُو داود والترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کوئی نیا کپڑا پہنتے تھے تو اس کا نام لیتے تھے، عمامہ ہوتا تو فرماتے عمامہ، کرتہ ہوتا تو فرماتے کرتہ، چادر ہوتی تو فرماتے چادر۔ اور پھر یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! تیری ہی تعریف ہے کہ تو نے مجھے یہ لباس پہنایا، اے اللہ! اس لباس کے اندر جو بھلائی رکھی گئی ہے اور جن اچھے مقاصد کے لیے یہ لباس بنایا گیا ہے (یعنی ستر عورت، یا سردی و گرمی سے بچاؤ) اس کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اور اے اللہ! اس لباس کی برائی اور جن برے مقاصد کے لیے یہ لباس استعمال کیا جاتا ہے، اس کی برائی سے مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

افادات:۔مثلاً بعض لوگ لباس پہن کر فخر کرتے ہیں ،اِتراتے ہیں ،تو اے اللہ! اس لباس کو پہن کر اِترانے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

ہر نئی چیز استعمال کرنے کی یہی دعا ہے

جب بھی کوئی نئی چیز آدمی کے ہاتھ میں آئے اور اس کا استعمال شروع کرے، اس موقعہ پر اس دعا کو پڑھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ گویا اس طریقہ سے ہر کام میں بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم کرایا گیا ہے کہ کوئی نئی چیز آپ کے پاس آئی تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بھی کیجئے کہ اس نے یہ نعمت آپ کو عطا فرمائی،اور ساتھ ہی ساتھ اس چیز کے اندر جو بھلائی رکھی گئی ہے اس کا سوال کیجئے اور جو برائی رکھی گئی ہے اس سے پناہ طلب کیجئے۔

جیسے:ہم نئی گاڑی لائے،تو ہمیں کبھی یاد نہیں رہتا کہ یہ دعا پڑھیں : اے اللہ! تو نے محض اپنے فضل سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے،اس کے اندر جو خیر و بھلائی ہے اس کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں ، اور اس میں جو شر و برائی ہے اس سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔اگر ہم اس دعا کا اہتمام کریں گے تو ان شاء اللہ اس کے شر سے حفاظت ہو گی۔

آداب النوم والاضطجاع

سونے اور لیٹنے کے آداب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے جس میں لیٹنے اور سونے کے آداب بیان کرنا چاہتے ہیں۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات عین شفقت و محبت کا تقاضا

پہلے بھی بتلایا تھا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ اور سلوک اپنی امت کے ساتھ وہی ہے جو باپ کا اپنی اولاد کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماں باپ اپنی اولاد کو ہر چیز سکھاتے ہیں کہ بیٹا! کھانا اس طرح کھایا جاتا ہے، بات اس طرح کی جاتی ہے، لباس اس طرح پہنا جاتا ہے، لوگوں کے ساتھ ملاقات اس طرح کی جاتی ہے، اور ان کے ساتھ اس انداز سے گفتگو کی جاتی ہے۔ اگر ہم نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات اور تعلیمات کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ آدمی کی زندگی سے تعلق رکھنے والی کوئی چیز، کوئی حالت اور کوئی کیفیت حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایسی نہیں چھوڑی جس کے متعلق اپنی امت کی رہنمائی نہ کی ہو، ہر چیز کا طریقہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتلا دیا، جیسے: ایک شفیق باپ اپنی اولاد کو ہر چیز سکھاتا ہے۔ یہی تو وہ چیز تھی جو غیروں کے لئے موجبِ اعتراض بنی۔ بعض یہودیوں نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے سوال کیا تھا: ﴿إِنِّي أَرَى صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ كُلَّ شَيْءٍ حَتَّى الْخِرَاءَةَ (سنن ابن ماجہ/ کتاب الطہارۃ:۳۱۶)﴾ تمہارے یہ ساتھی (نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم)) تم کو ہر

ہر چیز سکھاتے ہیں، یہاں تک کہ استنجاء کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں! ہمیں ہر چیز بتاتے ہیں، یہاں تک کہ نبی کریم (ﷺ) نے ہمیں یہ بھی ہدایت دی کہ ہم استنجاء کے وقت قبلہ کی طرف چہرہ اور پیٹھ نہ کریں۔ گویا آپ (ﷺ) کا ان طریقوں کو سکھانا تو عین شفقت اور محبت کا تقاضا ہے، اور آپ (ﷺ) کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس مقصد کے لئے بھیجا ہے اسی کی تکمیل ہے۔

یہاں سونے اور لیٹنے کے متعلق آداب بتلائے جا رہے ہیں۔

عجیب و غریب دعا

حدیث ۸۱۴:-

عن البَرَاءِ بن عازِبٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رسول الله (ﷺ) إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ نَامَ عَلَى شِقِّهِ الأَيْمَن، ثُمَّ قَالَ: اللَّهُمَّ أَسْلَمْتُ نفسى إِلَيْكَ، وَوَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ، وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ، رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ، لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ، آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ، وَنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ.

(رواه البخاری بهذا اللفظ فی کتاب الأدب من صحیحه)

حدیث ۸۱۵:-

وعنه، قَالَ: قَالَ لى رسول الله (ﷺ): إِذَا أَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوءَكَ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلَى شِقِّكَ الأَيْمَن، وَقُلْ...)) وذَكَرَ نَحْوَهُ، وفيه: ((وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَقُولُ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) جب سونے کے لیے اپنے بستر پر تشریف لاتے تھے تو اپنی داہنی کروٹ پر لیٹتے تھے، اور یہ دعا پڑھتے تھے۔

دوسری روایت میں انہوں نے یہ بات بھی بتلائی ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے باقاعدہ ان کو مخاطب بنا کر فرمایا: جب تم اپنی خواب گاہ میں آؤ، اپنے بستر پر پہنچو، یعنی سونے کا ارادہ کرو، تو پہلا کام تو یہ کرو کہ جیسا نماز کے لئے وضو کرتے ہیں ایسا وضو کرو، اور داہنی کروٹ پر لیٹ جاؤ، پھر یہ دعا پڑھو (یہ ایک طویل دعا ہے جو نبی کریم (ﷺ) نے سوتے وقت پڑھنے کے لئے بتلائی ہے اس دعا کے عجیب و غریب الفاظ ہیں اور اس میں توکل اور تفویض کی عجیب شان پائی جاتی ہے) "اَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِيْ إِلَيْكَ" اے اللہ! میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالے کر دیا، مَیں نے اپنی جان کو تیرے تابع بنا دیا "وَوَجَّهْتُ وَجْهِيْ إِلَيْكَ" اور مَیں نے اپنا چہرہ اور اپنا رخ تیری طرف کر دیا "وَفَوَّضْتُ أَمْرِيْ إِلَيْكَ" اور مَیں نے اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا "وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِيْ إِلَيْكَ" اور اپنی پشت کو مَیں نے تیری پناہ میں دے دیا۔ "رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ" اے اللہ! تجھ سے امیدیں بھی وابستہ ہیں اور تیرا ڈر اور خوف بھی ہے "لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ" اے اللہ! پناہ اور نجات کی جگہ تیرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے "آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ أَنْزَلْتَ، وَنَبِيِّكَ الَّذِيْ أَرْسَلْتَ" اے اللہ! جو کتاب تو نے اتاری ہے اس پر مَیں ایمان لایا، اور جس نبی کو تو نے بھیجا اس پر بھی میرا ایمان ہے (حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا) "وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَقُوْلُ" آخری کلام تمہاری زبان کا یہی ہونا چاہیے (اگر اسی حالت میں سو گئے اور موت آ گئی؛ تو ایمان پر موت آئے گی)

یہ محبت کا تقاضہ ہے

افادات:- سونے کے لئے جو وضو کیا جائے گا اس کا طریقہ تو وہی ہے جو نماز کے وضو کا ہے، لیکن سونے کے لئے وضو کرنا فرض و واجب نہیں ہے، بلکہ آداب میں سے ہے یعنی مستحب اور پسندیدہ ہے۔ حضرات علماء فرماتے ہیں کہ فرائض اور واجبات اللہ تبارک و تعالیٰ کی عظمت کا حق ہیں، اس کی عظمت و کبریائی کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی فرائض اور واجبات کا اہتمام کرے اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ محبت کے حقوق کا تقاضہ یہ ہے کہ مستحبات اور آداب کا اہتمام کرے۔ یہاں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ نہیں فرمایا کہ جب آپ سونے کے لئے جائیں تو وضو کرنا فرض اور واجب ہے، بلکہ ایک ہدایت فرمائی کہ جب آپ سونے کے لئے جاؤ تو وضو کرلو۔ اس سے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی منشاء معلوم ہوتی ہے کہ آپ کس چیز کو پسند کرتے ہیں اور اس وقت کیا کیا کام کرنے چاہئیں، آپ اگر کسی مفتی اور عالم سے پوچھیں گے کہ سوتے وقت وضو کرنا فرض یا واجب ہے؟ تو وہ جواب میں یہی فرمائیں گے کہ نہیں۔ اگر وضو نہیں کروگے تو کوئی گناہ نہیں ہو گا، بغیر وضو کے بھی آپ سو سکتے ہیں۔ لیکن نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے امت کو سونے کا جو طریقہ بتلایا اس میں یہ رہنمائی فرمائی ہے کہ سونے کا جب ارادہ کرو تو وضو کرلو۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ چیز پسند ہے کہ آپ کا اُمتی وضو کر کے سوئے۔

کسی کو جب کسی کے ساتھ محبت ہوتی ہے، تو مُحِب اور عاشق اس بات کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ میرے محبوب کو کونسی چیزیں پسند ہیں ،کون سے کام اورباتیں ہیں ، کون سی کیفیتیں اور حرکتیں ہیں ؛جن سے وہ خوش ہوتاہے۔کہیں سے ذرا سی بھنک لگ جائے، بلکہ کوئی آدمی ایسے ہی مذاق میں کہہ دے کہ تمہارا محبوب فلاں چیز کو بہت پسند کرتاہے ،تو اس کو اس کے لئے چاہے کتنی ہی قربانی کیوں نہ دینی پڑے،وہ اس کو کرڈالتاہے، اس لئے کہ وہ تو عاشق اور محب ہے،وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح سے مَیں اپنے محبوب کی توجہ کو اپنی طرف پھیرلوں ۔

...توجینے کا مزہ آجائے

جب ہم یہ ساری تفصیل بیان کرتےہیں تو بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ یہ کام واجب اور ضروری تونہیں ؟اگر نہیں کریں گے تو گناہ تو نہیں ہو گا؟اورجب بتایاجاتاہے کہ نہ کرنے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا؛توپھروہ لوگ اس کام کونہیں کرتے۔مَیں ان سےپوچھتا ہوں کہ کھانے کا اصل مقصد کیاہے؟ظاہرہےکہ آدمی کےبدن کوطاقت حاصل ہو،اس لئےکہ آدمی جب چلتا پھرتاہےتوبدن کی قوت اورانرجی(Energy)استعمال ہوتی ہے،اس کی جگہ پر نئی قوت، نئی انرجی اور نیا پاورحاصل کرنےکےلئے کھانے پینے کی چیزیں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔اس کے لئے تو صرف گیہوں کی روٹی بغیرسالن کے استعمال کرلیں ؛تومَیں سمجھتاہوں کہ اطباء اور ڈاکٹر کہیں گےکہ زیادہ مفید ہے، اس سے آدمی کوزیادہ انرجی اور قوت حاصل ہوگی۔لیکن اس کے باوجود

کھانے کے معاملہ میں ہم لوگ بہت سارے تکلفات کا اہتمام کرتے ہیں، پتہ نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ دستر خوان کے اوپر اچار ، کچومر اور سلاڈ رکھا گیا، پاپڑ اور فلاں چٹنی بھی رکھی گئی، اب اگر کوئی پوچھے کہ یہ سب چیزیں کیا کھانے کے لوازمات اور واجبات ہیں؟ تو وہ ہی جواب دیں گے کہ نہیں! کوئی ضروری نہیں ، لیکن اس کے بغیر کبھی ہمارے حلق سے نوالہ اترتا ہی نہیں ہے۔ ہم لوگ وہاں تو اتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔

اسی طرح ہم لوگ لباس پہنتے ہیں۔ لباس کا مقصد سردی گرمی سے بچاؤ اور اپنے ستر کو ڈھانپنا ہے؛ تو کپڑے دھو کر ویسے ہی پہن لیں، ان کو استری کرنے اور کریز دور کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے اوپر خوشبو چھڑکنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ، اس سب کے بغیر بھی مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے معلوم نہیں کیا کیا جاتا ہے ؟ تو جب ہم اپنے شوق کو پورا کرنے اور نفس کی خواہشات کے لئے ان ساری چیزوں کی طرف دھیان دیتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ کی اور نبی کریم ﷺ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آداب اور مستحبات کے قبیل سے جو اعمال بتائے جاتے ہیں ، اگر ان کا بھی اہتمام کرلیں ؛ تو ہماری زندگیوں میں چار چاند لگ جائیں اور جینے کا مزہ آجائے۔ اس لیے محبت کے حقوق میں سے ہے کہ آدمی آداب کا اہتمام کرے۔

سونے کے آداب ... پہلا ادب

حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما کو ہدایت فرمائی کہ پہلا کام تو یہ کرو کہ جب سونے کا ارادہ کرو؛ تو وضو کرلو۔ اگر پہلے سے وضو ہو تو تازہ وضو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ مقصد یہ ہے کہ آدمی سوتے وقت با وضو لیٹے۔ ویسے جب آنکھ لگ جائے گی اور نیند طاری ہوگی تو وضو خود بخود ٹوٹ جائے گا، لیکن اس کے باوجود مقصد یہ ہے کہ جب نیند طاری ہو؛ تو آپ باوضو ہو ں۔

دوسرا ادب

دوسرا ادب بتایا کہ داہنی کروٹ پر لیٹو۔ بخاری شریف کی روایت میں اس کی صراحت موجود ہے (روایت آگے آرہی ہے) کہ دائیں کروٹ پر لیٹ کر دائیں رخسار کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ دیں۔ یہ بھی آداب میں سے ہے۔ یہ بھی سونے کی ابتداء میں ہو گا، جب آدمی سونے کے لئے لیٹے تو اس طرح لیٹے کہ جب اس پر نیند آئے تو ایسی حالت میں آئے۔ پھر نیند میں آپ کروٹ بدلیں، دائیں سے بائیں کروٹ پر چلے گئے ؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ بس! ادب اور مستحب ادا ہوگیا او ر آپ کو وہ فضیلت حاصل ہوگئ جو مطلوب تھی۔

تیسرا ادب اور خاص تاکید:

پھر وہ دعا پڑھو جو اوپر ترجمہ میں گذری۔ اور یہ دعا سکھا کر حضور اکرم (ﷺ) نے خاص ہدایت فرمائی کہ تمہاری زبان سے آخر میں یہی کلمات نکلیں ، اس کے بعد کچھ اور بات مت کرو۔ سونے سے پہلے اور نیند طاری ہونے سے پہلے آخری جملے اور آخری کلام جو آپ کی زبان سے نکلے؛ وہ یہی کلمات اور دعا ہو۔

یہ ایک فطری امر ہے

نبی کریم (ﷺ) نے سوتے وقت یہ دعا کیوں سکھائی؟ آدمی جب صبح میں اٹھتا ہے اس کے بعد سے دن بھر کی اپنی مصروفیات، کاروبار ، تجارت، دوکان داری، اور گھر کے کام کاج میں لگا رہتا ہے۔ مثلاً: اپنے بچہ کے ایڈمیشن کا معاملہ تھا ،تو اس کا جہاں ایڈمیشن کرانا تھا، اس کے لئے جس جس سے ملنا تھا ان سب سے مل کر آئے ،اس کے لئے فارم بھرنا تھا؛ تو وہ بھرا۔

یا کوئی ملازم چلا گیا، اس کو سمجھا بجھا کر دوبارہ لانا ہے، تو اس سے کونٹیکٹ (Contact) کیا۔ کسی نے کہا کہ فلاں صاحب اگر اس کو سمجھائیں گے تو وہ سمجھ جائے گا اور واپس کام پر آجائے گا، تو ان صاحب کے پاس گئے اور ان سے رابطہ کر کے اس کو سمجھایا۔

اسی طرح آئندہ مہینے میں کہیں سفر کرنا ہے جس کا ٹکٹ بک کروانا تھا، تو فلاں سے کہا کہ ٹکٹ بک کرادو۔ پھر جب وہاں پہنچیں گے تو وہاں ہوٹل بک کرانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ معاش اور کاروبار سے تعلق رکھنے والے بے شمار معاملات ہوتے ہیں، اوراس کے لیے آدمی نہ معلوم دن بھر کیا کیا کوششیں کرتا رہتا ہے۔ یہ سارے کام کرنے کے بعد رات کو جب بستر پر لیٹتا ہے؛ تو ایک فطری امر ہے کہ جب آنکھ بند کرے گا تو دن بھر کا سارا نقشہ اس کے سامنے آئے گا کہ آج میں کام پر گیا، فیکٹری پر پہنچا تو وہاں ایسا معاملہ تھا، اس کو اس طرح سلجھایا تھا، اور ملازمت کے سلسلہ میں یہ دشواری اور پرابلم (Problem) تھی، اس کو حل کرنے کے لئے میں نے یہ کوشش کی۔ بچے کے ایڈمیشن کے سلسلہ میں جو معاملہ تھا اس کو حل کرنے کے لئے فلاں فلاں تدبیریں کیں، ایڈمیشن کا فارم تو بھر دیا ہے، فیس بھی دے کر آیا ہوں، اب پتہ نہیں ایڈمیشن ملے گا یا نہیں۔ ٹکٹ بک کرانے کے لئے دیا تھا، پتہ نہیں کیا ہوتا ہے۔ میرا فلاں کام سرکاری دفتر میں پھنسا ہوا ہے، اس کے لئے میں نے یہ کوشش کی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے مناظر ایک ایک کر کے اس کے دماغ میں آتے ہیں، جس جس کام کی دن بھر محنت کی تھی؛ وہ سب اندیشوں اور توہمات کی شکل میں آدمی کے دماغ کے پردے پر آرہے ہیں۔

تو دانی حساب کم و بیش را

ایسے موقعہ پر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو دعا سکھائی ہے اس پر غور کرو کہ: ایک مؤمن کو کس سوچ کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ایک غیر مسلم اور کافر تو سارا دارومدار اپنی کوشش پر رکھتا ہے، اسی لئے وہ کبھی اطمینان حاصل نہیں کرپاتا، لیکن مؤمن کا معاملہ تمام کوششوں کے بعد اللہ تعالیٰ کے حوالے ہو جاتا ہے۔ بس! اس دعا میں یہی سکھایا ہے کہ: اے اللہ! دن بھر تو مَیں نے یہ سارے جھمیلے اختیار کئے، دوڑ دھوپ کی، اور جو کچھ میرے بس میں تھا وہ سب مَیں کر چکا؛ اب اے اللہ! مَیں اپنی ذات کو بھی تیرے حوالے کرتا ہوں، اور اپنا رخ بھی تیری طرف کرتا ہوں، اور اپنے سارے معاملات بھی تیرے حوالے کرتا ہوں۔ تو ہر چیز کا مالک ہے، ہر کام کو انجام دینے والا ہے، تیرے حکم کے بغیر کوئی بھی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ اے اللہ! اپنی پشت کو مَیں نے تیری پناہ میں دے دیا۔ آپ اندازہ لگایئے کہ اس دعا کے اندر کتنی زیادہ تفویض ہے!

"تفویض" یعنی اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا۔ یہ بہت اونچی صفت ہے، اور اس کی وجہ سے آدمی بہت بڑی بڑی فکروں سے نجات پا جاتا ہے۔ جب ہم نے کام کر لیا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا کہ: اے اللہ! اس میں کامیابی ڈال دے؛ تو گویا آدمی نے اپنا سارا رخ اور اپنی ساری توجہات کو اللہ تعالیٰ کی طرف پھیر دیا۔ بقول کسے:

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم وبیش را

امید وخوف:

اس کے بعد کہا: اے اللہ! تجھ ہی سے امیدیں وابستہ ہیں اور تیرا ڈر اور خوف بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی اپنی رحمت سے کام بنانے والا ہے، دینے والا بھی وہی ہے، تو ایک طرف تو اسی کی ذات کے ساتھ ہمیں توقعات قائم ہیں، لیکن دوسری طرف اپنی بداعمالیوں، نافرمانیوں، اپنی معصیتوں اور گناہوں کی وجہ سے ڈر بھی لگتا ہے کہ معلوم نہیں؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اب کیا معاملہ ہوگا! اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کو دیکھ کر امید بھی قائم ہے اور اپنے گناہ اور نافرمانی اور اپنے جرائم کو سوچ کر ڈر بھی لگتا ہے۔

کہ جز تو پناہے دگر نیستم:

اے اللہ! پناہ اور نجات کی جگہ تیرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ یعنی اگر تو ہمیں پکڑے اور عذاب دینے لگے، ہم پر مصیبتیں نازل کرنے لگے؛ تو تیرے اس عذاب سے اور تیری دی ہوئی اس مصیبت سے سوائے تیرے کوئی اور نہیں بچا سکتا۔

جالینوس بڑا حکیم گزرا ہے، حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ و السلام کا ہم عصر تھا، اس نے ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: اگر آسمان کو کمان، اور مصائب، آلام اور تکالیف کو تیر، اوراللہ تعالیٰ کواس کمان سے تیر چلانے والا فرض کرلیا جائے، گویا اللہ تعالیٰ آسمان سے تکلیفوں ومصائب اورآلام کے تیر چلا رہے ہیں؛ تو اس سے بچنے کی کیا شکل ہے؟ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواب دیا: تیر انداز کے تیروں سے بچنے کی شکل یہی ہے کہ جو تیرانداز کے پہلو میں جاکر کھڑا ہوجائے؛ تو تیراس کو نہیں لگیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حالات پیش آتے ہیں اس میں ہماری آزمائش ہے اور وہ ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہیں، اس لئے اگرہم اس سے بچنا چاہتے ہیں تو اس کی شکل یہی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ ہی کی پناہ حاصل کرلیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔

ایک بچہ بھی یہ سمجھتا ہے:

ایک بزرگ نے دیکھا کہ ایک بچے کی ماں اس کی پٹائی کررہی تھی، اب وہ جتنا مار رہی تھی، وہ بچہ اتنا ہی اس کی گود میں چڑھ رہا تھا۔ وہ مار رہی ہے، پٹائی کررہی ہے؛ پھر بھی وہ بچہ اسی کی گود میں آرہا ہے۔ وہ بزرگ کہنے لگے: دیکھو! ایک بچہ جس چیز کو سمجھ رہا ہے؛ وہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ایک بچہ بھی سمجھتا ہے کہ ماں کی پٹائی اور اس کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف سے

نجات کا راستہ کہیں اور نہیں ہے، صرف ماں کی گود ہی ہے ، اس لئے ماں اس کو پیٹ رہی ہے، اس کے باوجود وہ اس کی گود میں ہی گھسنے کی کوشش کر رہا ہے۔

تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔ "رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ" اے اللہ! تجھ ہی سے امیدیں بھی وابستہ ہیں اور تیرا ہی ڈر اور خوف بھی ہے۔ "لاَ مَلْجَأَ وَلاَ مَنْجا مِنْكَ إِلاَّ إِلَيْكَ" تیری طرف سے بھیجے گئے عذاب اور مصیبت سے پناہ اور بچاؤ کی جگہ تیرے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔

دعا کے دو سبق: رجوع الیٰ اللہ اور یادِ آخرت

گویا مسنون دعاؤں کے ذریعہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں یہ تعلیم دے رہے ہیں کہ ہماری توجہ ہر آن اللہ تعالیٰ کی طرف ہونی چاہیے۔ اس دعا میں دو چیزیں سکھائی ہیں: ① **اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع** ② **آخرت کی یاد**۔ ہم جو بھی گناہ کرتے ہیں وہ دراصل آخرت اور موت کو بھول کر کرتے ہیں، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی تعلیمات کے ذریعہ ہمیں یہ سکھا رہے ہیں کہ اپنا تعلق، رشتہ اور رابطہ اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ جوڑا جائے، ہر ہر کام میں جو مختلف دعائیں سکھائی گئی ہیں کہ: اٹھو؛ تو یوں پڑھو۔ گھر میں داخل ہو؛ تو یوں پڑھو۔ وغیرہ وغیرہ؛ اس کے ذریعہ بار بار اللہ تعالیٰ کا نام بلوایا جا رہا ہے، جب آدمی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا نام بار بار لیتا رہے گا، تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار دل کے اندر پیدا ہوگا؛ پھر یہی چیز آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچائے گی۔

تہجد کے بعد مسنون آرام کی کیفیت:

حدیث ۸۱۶:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: كَانَ النبيُّ** (ﷺ) **يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ إِحْدَى عَشرَةَ رَكْعَةً. فَإِذا طَلَعَ الفَجْرُ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ، ثُمَّ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الأَيْمَن حَتَّى يَجِيءَ الْمُؤَذِّنُ فَيُؤْذِنَهُ.** (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) رات میں گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے (تہجد کی ۸/رکعت، اوروتر کی تین رکعت) پھر جب صبحِ صادق طلوع ہوجاتی تو دو ہلکی رکعتیں (فجر کی سنتیں) پڑھ لیتے، اس کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے؛ یہاں تک کہ مؤذن اطلاع دیتا۔

افادات:- جو لوگ رات کا ایک معتدبہ حصہ، ایک تہائی حصہ، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں؛ یہ سونا ان کے لئے ایک طرح کی راحت کا سبب بنتا ہے، اوراس طرح ان کوسہولت ہوجاتی ہے۔ نبیِ کریم (ﷺ) کی سنت بھی ہے کہ آپ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے، تھوڑی دیر کے لئے آنکھ بھی لگ جاتی تھی، آپ خراٹے بھی لینے لگتے تھے، پھر جب مؤذن آتا اور آپ کو اطلاع کرتا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے، تو آپ تشریف لے جاتے، اور سوجانے کے باوجود آپ (ﷺ) وضو کی تجدید نہیں کرتے تھے، اس لئے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی نیند سے ان کا وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ ہماری نیند کی وجہ سے ہمارا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

سونے اور اُٹھنے کی مسنون دعاؤں کا فلسفہ

حدیث ۷۸۱:-

وعن حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ (ﷺ) إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ مِنَ اللَّيْلِ وَضَعَ يَدَهُ تَحْتَ خَدِّهِ، ثُمَّ يَقُولُ: اللَّهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيَا. وَإِذَا اسْتَيْقَظَ قَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَمَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورِ (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) رات کو جب اپنے بستر پر لیٹتے تھے تو آپ (اپنادایاں ہاتھ، دائیں رخسار کے نیچے) رکھتے، اور یہ دعا پڑھتے: ”اللَّهُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوتُ وَأَحْيَا“ اے اللہ! تیرے ہی نام سے میں مروں گا بھی، اور تیرے ہی نام سے زندہ بھی ہوؤں گا۔(یعنی تیرے ہی نام سے سوتا ہوں، اور تیرے ہی نام سے جاگوں گا۔) اور جب آپ بیدار ہوتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے: ”الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَمَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ“ تمام تعریف اسی اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کیا، اور اسی کی طرف دوبارہ زندہ ہو کر لوٹنا ہے۔

افادات:- اس لیے کہ نیند چھوٹی موت ہے۔ حدیث پاک میں بھی کہا گیا ہے: ”اَلنَّوْمُ أَخُو الْمَوْتِ (شعب الایمان:۴۴۱۶)“ نیند موت کا بھائی ہے، موت کا چھوٹا سا نمونہ ہے۔ اس لئے ایک مؤمن یہ چاہتا ہے کہ اس کی موت اللہ کے نام پر آئے، تو اب اس کی بھی مشق کرائی جاتی ہے کہ سوتے وقت اس دعا کے پڑھنے کا اہتمام کرو کہ: اے اللہ! تیرے ہی نام سے مرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے زندہ ہوؤں گا۔ اور ابھی تو خیر ہے کہ اس چھوٹی سی موت کے بعد دوبارہ دنیا کے اندر

آئے ہیں، مگر ایک بڑی موت ایسی آنے والی ہے کہ اس کے بعد دوبارہ دنیا میں آنا نصیب نہیں ہوگا۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کی طرف دوبارہ زندہ ہو کر لوٹنا ہے، گویا اس طرح ہمیں آخرت یاد دلائی گئی۔

﴿وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى﴾ جو آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کے تصور سے ڈرا، یعنی جب گناہ کا دل میں خیال آیا اور نفس نے کہا کہ گناہ کرلو؛ اس وقت یہ سوچا کہ: آج اگر یہ گناہ کرلوں گا، اور ایک دن زندہ ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے جب پیش ہوؤں گا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے پوچھا جائے گا کہ: تونے یہ نافرمانی کیوں کی؟ تو مَیں کیا جواب دوں گا؟ اس ڈر سے اپنے نفس کو خواہش کے مطابق عمل کرنے سے روکا؛ تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا یہی وہ تصور ہے جس کو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر مؤمن کے دل و دماغ میں مختلف طریقوں سے رچا اور بسا دینا چاہتے ہیں یعنی اگر یہ تصور ہمارے دل و دماغ میں بیٹھ جائے کہ ہمیں دوبارہ زندہ ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے؛ تو آدمی کی زندگی میں انقلاب آجائے۔ پھر وہ کوئی بھی گناہ اور نافرمانی کا کام ہرگز نہیں کرسکتا

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی یاد کو دل میں بسانے کا یہ ایک طریقہ بتلایا ہے۔ یہ دونوں دعائیں ہیں، آپ چاہیں تو دونوں دعائیں پڑھ لیں، چاہیں تو کوئی بھی ایک دعا پڑھ لیں؛ سنت ادا ہوجائے گی۔

لیٹنے کے چار طریقے

حدیث ۸۱۸:-

وعن يَعيشَ بن طِخْفَةَ الغِفَارِيِّ رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ أَبي: بينما أَنَا مُضْطَجِعٌ فِي الْمَسْجِدِ عَلَى بَطْنِي إِذَا رَجُلٌ يُحَرِّكُنِي برجلِهِ، فَقَالَ: ((إِنَّ هذِهِ ضِجْعَةٌ يُبْغِضُهَا اللهُ))، قَالَ: فَنظَرْتُ، فَإِذَا رسولُ الله (ﷺ). (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:- حضرت یعیش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ابا (حضرت طِخفہ رضی اللہ عنہ) نے کہا: ایک مرتبہ مَیں مسجد کے اندر پیٹ کے بل (اُوندھا) لیٹا ہوا تھا، اچانک (محسوس ہوا کہ) کوئی شخص اپنے پاؤں کے ذریعہ مجھے حرکت دے رہا ہے، اور کہہ رہا ہے: لیٹنے کا یہ طریقہ ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے (گویا اس طرح لیٹنا جائز نہیں ہے) مَیں نے دیکھا تو وہ نبی کریم (ﷺ) تھے۔

افادات:- دیکھو! لیٹنے کے چار ہی طریقے ہوسکتے ہیں:- [۱]: اُوندھا لیٹنا [۲]: چت لیٹنا [۳]: بائیں کروٹ پر لیٹنا [۴]: دائیں کروٹ پر لیٹنا۔ اب اُوندھا لیٹنے کی تو شریعت میں اجازت ہی نہیں، یہ طریقہ تو اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے، اِلّا یہ کہ کوئی معذور ہو، یا علاج کی وجہ سے ایسا کرنا پڑے؛ تو بات دوسری ہے۔ اور چت لیٹنے کے متعلق لکھا ہے کہ یہ اطباء کا سونا ہے۔ اور بائیں کروٹ پر لیٹے گا تو دل چوں کہ بائیں طرف ہوتا ہے، تو اس صورت میں دل کو قرار زیادہ ملے گا اور اس کی وجہ سے آدمی پر غفلت والی نیند طاری ہو گی۔ اس لیے شریعت نے کہا کہ دائیں کروٹ پر

لیٹو۔ ایک تو دائیں طرف کا طریقہ بھی حاصل ہو جائے گا، اور دل معلق اور لٹکا ہوا رہے گا جس کی وجہ سے غفلت والی نیند نہیں آئے گی۔

تو شریعت میں سونے کی اجازت تو دی جا رہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ سونے کا طریقہ بھی بتلایا جا رہا ہے؛ تاکہ غفلت طاری نہ ہو۔ اور جیسا کہ شروع میں کہا تھا کہ آپ دائیں کروٹ پر لیٹے، پھر بائیں کروٹ پر ہو گئے، یا چت ہو گئے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ لیکن اُوندھا ہر گز نہ لیٹے، اس کو تو بالکل ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

بچوں کو بھی اس کا عادی بنایا جائے

آج کل بچے عام طور پر اُوندھے سوتے ہیں، اور یہ عجیب حال ہو گیا ہے کہ گھر والے بھی ان کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس لیے جب کبھی بچہ اُوندھا لیٹا ہو تو ضرور اس کی اصلاح کی جائے۔ بچپن سے جس چیز کی عادت ڈالی جاتی ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ جو آداب شریعت نے ہمیں سکھائے ہیں، وہی سارے آداب ہمیں بچوں کو بتانے ہیں، اور اسی انداز پر ہمیں ان کی پرورش اور تربیت کرنی ہے، اس لئے اگر بچہ اُوندھا لیٹا ہو تو محبت سے سمجھا کر اس کو سیدھا، یا دائیں کروٹ پر لیٹنے کی عادت ڈالی جائے۔

بغیر ذکر اللہ کی مجلس وبال ہے

حدیث ۸۱۹:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن رسول الله (ﷺ) قَالَ: مَنْ قَعَدَ مَقْعَدًا لَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى فِيهِ، كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللهِ تَعَالَى تِرَةٌ، وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضجعاً لاَ يَذْكُرُ اللهَ تَعَالَى فِيهِ، كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللهِ تِرَةٌ. (رواه أبو داود بإسنادٍ حسن)

((التِّرَةُ)): بكسر التاء المثناة من فوق، وَهِيَ: النقص، وقِيلَ: التَّبعَةُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی ایسی مجلس میں بیٹھا جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا گیا؛ تو یہ مجلس کل قیامت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے لئے وبال کا سبب ہوگی۔ اور جو آدمی اس طرح سویا جس میں اس نے اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کیا؛ تو یہ سونا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے وبال وپرسش کا سبب بنے گا۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن کی کوئی مجلس اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی نہیں ہونی چاہیے۔ ہم لوگ گپ شپ کرنے کے لئے مجلس قائم کرتے ہیں تو پوری مجلس غفلت کی نذر ہو جاتی ہے (روایتوں میں نبی کریم (ﷺ) نے مجلس کا کفارہ بھی بتلایا ہے) ہماری کوئی مجلس اللہ کے ذکر سے خالی نہیں ہونی چاہیے۔ مؤمن کی شان یہ ہے کہ ہر وقت اللہ کو یاد کرتا رہے۔

جنتی جب جنت میں چلے جائیں گے، اس کے بعد ان کو اگر افسوس ہوگا تو اپنے اُن اوقات کا ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے خالی گزرے تھے (شعب الایمان: ۵۰۹/ فصل فی ادامۃ ذکر اللہ عزوجل) حالاں کہ جنت میں پہنچ

گئے اور جو مقصدِ زندگی تھا وہ حاصل ہوگیا، کامیاب ہوگئے، لیکن اس کے بعد بھی جب وہاں ذکر کا اجروثواب دیکھیں گے تو افسوس ہو گا کہ: ہائے !ہمارا اتنا سارا وقت بے کار چلا گیا۔اس لیے زندگی کے جو اوقات ہیں وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑی عظیم نعمت اور نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔

اسی طرح لیٹنے کے دوران بھی کچھ نہ کچھ قرآنِ پاک کی تلاوت، اللہ کے ذکر میں مشغول رہنا چاہیے، جس لیٹنے میں اللہ تعالیٰ کو یاد نہیں کیا جاتا ہے؛ایسا لیٹنا بھی وبال و پرسش اور افسوس کا ذریعہ بن جائے گا۔

قدرتی نظام؛ ایک عجیب نعمت

نیند ؛ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ایک عجیب نعمت ہے،اللہ تعالیٰ نے قدرتی طورپر ایسا نظام بنایا ہے کہ جہاں رات آئی کہ لوگوں کے اوپر نیند طاری ہوجاتی ہے: ﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً﴾ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے دن کو روزی کی دوڑ دھوپ اور اپنے کام کاج کے لئے رکھا، اور رات کو آرام وسکون کا ذریعہ بنایا۔ جہاں رات آتی ہے ہر جاندار-انسان، چرند وپرند درندوں اور پالتو جانوروں -پر نیند کی کیفیت اور غنودگی طاری ہوجاتی ہے، گویا یہ وقت ہی نیند لانے والا ہے۔ نیند کے باب میں ا للہ تعالیٰ اگر لوگوں کو اختیار دیدیتے کہ جس کی جب مرضی ہو، بس!ایک سوئچ دبادے گا تو اس کو نیند آجائے گی؛تو سوچئے کیا ہوتا! کوئی آدمی آٹھ بجے سو رہا ہے، دوسرا گیارہ بجے سورہا ہے، تیسرا چار

بجے سو رہا ہے ، پھر جب چار بجے،تو آٹھ بجے والا اُٹھ گیااور کھٹ کھٹ کرنے لگا،اب وہ چار بجے والے کو سونے نہیں دے رہاہے،اس طرح سارا نظام بگڑجاتااور بہت دشواری پیش آسکتی تھی،لیکن اللہ تعالیٰ نے رات کا وقت ہی ایسا رکھاکہ سب پر نیند طاری ہوجاتی ہے، کھٹ کھٹ کرنے والا کوئی بھی جاگتاہی نہیں،سب نیندمیں مشغول ہوتے ہیں۔اگر پوری دنیا کےلوگ مل کر کوئی کانفرنس کرتے کہ فلاں وقت میں ہی ہم سب کو سونا ہے؛تو یہ بات ناممکن تھی،یہ تو اللہ تعالیٰ کا ایک عجیب نظام اور بڑی نعمت ہے؛ اس لئے جس ذات نے یہ نعمت عطا فرمائی، اس کی یاد تو ہونی ہی چاہیے ،اس کی یادکےبغیر جو وقت گزرے گا؛ گویایہ غفلت ہوگی اورآدمی کوایسی غفلت سے اپنے آپ کوبچانا چاہیے۔

جواز الاستلقاء عَلَى القفا ووضع إحدى الرِّجلين عَلَى الأخرى إِذَا لم يخف انكشاف العورة وجواز القعود متربعاً ومحتبياً

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سونے اور بیٹھنے کے آداب کا سلسلہ چل رہا ہے۔سونے اور بیٹھنے کا مسنون اور مستحب طریقہ بتلادیا؛اب جو جائز شکلیں ہیں وہ بتلا رہے ہیں اسی مناسبت سے ایک عنوان قائم کیا ہے : کوئی آدمی اگر چت لیٹنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے۔

ویسے لیٹنے کا افضل اور بہتر طریقہ بتلادیا تھا کہ سوتے وقت شروع میں آدمی داہنی کروٹ کے اوپر لیٹے،بعد میں اگر کروٹ بدل جائے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔اب چت لیٹنے کی شکل میں ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ آدمی پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹے، تو اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر ستر کے کھل جانے کا اندیشہ اور خطرہ نہ ہو؛ تو اس صورت میں پاؤں پر پاؤں رکھ کر بھی سو سکتا ہے۔

بیٹھنے کے دو طریقے ہیں :- [۱] چوکڑی (ચોકડી) مار کر چہار زانو بیٹھنا۔ [۲] گوٹ مار کر بیٹھنا ؛ ان دونوں کا حکم بتلائیں گے۔روایتوں میں اس کی تفصیل آرہی ہے ۔

حدیث ۸۲۰:-

عن عبدِ اللهِ بن زيد رضی اللہ عنہما أنَّه رأى رسولَ الله (ﷺ) مُسْتَلْقِياً في الْمَسْجِدِ، وَاضِعاً إحْدَى رِجْلَيْهِ عَلَى الأُخْرَى. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجد میں اس طرح چت لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ نے اپنے ایک پاؤں مبارک کے اوپر دوسرا پاؤں مبارک رکھا ہوا تھا۔

افادات:-اس روایت سے دو چیزوں کو ثابت کرنا چاہتے ہیں ، ایک تو یہ کہ آدمی چت لیٹنا چاہے ؛تو اس کی اجازت ہے۔

پاؤں پر پاؤں رکھ کر سونا جائز ہے یا نہیں ؟

دوسرے یہ کہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر سونا۔تو اس طرح سونے کے متعلق حدیثِ پاک میں ممانعت بھی آئی ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پاؤں پر پاؤں رکھ کر سونے سے منع فرمایا(صحیح مسلم. باب فِی مَنْعِ الاِسْتِلْقَاءِ عَلَی الظَّهْرِ وَوَضْعِ إِحْدَی الرِّجْلَيْنِ عَلَی الأُخْرَی. حدیث نمبر:۵۶۲۳)اور اوپر والی روایت میں صحابی بیان فرمارہے ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجدِ نبوی میں اس حال میں لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ پاؤں پر پاؤں رکھے ہوئے تھے،یہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا عمل ہے۔علماءِ کرام نے دونوں روایتوں میں مختلف طریقوں سے تطبیق دی ہے۔

بعض حضرات یوں فرماتے ہیں کہ شروع میں ممانعت تھی، بعد میں اجازت ہوگئی اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عمل ہی اس کے جواز کی دلیل ہے۔

تطبیق کی ایک شکل

لیکن علماء کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ چوں کہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر جو لیٹا جاتا ہے اس میں خطرہ ہوتا ہے کہ آدمی کا ستر کھل جائے ، خصوصاً اُس زمانہ میں جبکہ عام طور پر لنگی اور وہ بھی بغیر سلی ہوئی پہننے کا رواج تھا، دورِ نبوت میں کپڑوں کے سلسلہ میں اتنی وسعت بھی نہیں تھی جو بعد میں ہوئی، لنگی بھی بعض مرتبہ بڑی تنگ ہوا کرتی تھی، ایسی حالت میں آدمی اگر پاؤں پر پاؤں رکھ کر سوئے تو قوی اندیشہ رہتا ہے کہ ستر کھل جائے، اس لیے اگر پاؤں پر پاؤں رکھ کر سونے کی وجہ سے ستر کھل جاتا ہے یا ستر نظر آتا ہے؛ تو پھر پاؤں پر پاؤں رکھ کر سونا جائز نہیں ۔ اور اگر ستر نہیں کھلتا؛ تو اس طرح لیٹنے کی اجازت ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جو عنوان قائم کیا ہے اس میں یہی شرط لگائی ہے: "اذا لم یخف انکشاف العورۃ" اگر کوئی آدمی پاؤں پر پاؤں رکھ کر چت لیٹے، اور ستر کے کھلنے کا اندیشہ نہ ہو؛ تو اس طرح لیٹنا جائز ہے۔ گویا دونوں روایتیں اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ ممانعت اپنی جگہ پر ہے اور وہ اسی صورت میں ہے جبکہ اس طرح لیٹنے کی وجہ سے ستر کھل جانے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر اس طرح لیٹنے کی صورت میں ستر کھلنے کا کوئی اندیشہ اور خطرہ نہیں ہے ؛ تو اجازت ہے۔ ممانعت ایک مخصوص حالت کے لئے ہے، اور اجازت بھی ایک مخصوص حالت کے لئے ہے۔ چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی یہی تطبیق دی ہے۔

شیخ الشیخ حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے عالی

لیکن ہمارے شیخ الشیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور تطبیق دی ہے کہ: راوی یہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مسجدِ نبوی میں پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹا ہوا دیکھا۔ اس میں راوی نے یہ صراحت نہیں کی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک پاؤں کھڑا کیا تھا اور دوسرا پاؤں اس کے اوپر رکھا تھا، بلکہ پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹنے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ ایک پاؤں کھڑا کرکے دوسرا پاؤں اس کے اوپر رکھا جائے، جیسے عام طور پر ہوتا ہے؛ اس صورت میں ستر کے کھلنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں پاؤں سیدھے ہوں اور ایک پاؤں کے اوپر دوسرا پاؤں رکھ کر آدمی سوئے؛ اس صورت میں ستر کے کھلنے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔

توجس حدیث میں ممانعت آئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس طرح سونا کہ ایک پاؤں کھڑا ہو، اور دوسرا پاؤں اس کے اوپر رکھا ہو۔ لیکن اگر دونوں پاؤں سیدھے ہوں اور ایسی حالت میں ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھ کر آدمی لیٹے، تو چاہے لنگی ہو؛ ستر کھلنے سے اور زیادہ حفاظت ہوجاتی ہے، اس لیے راوی نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جس طرح لیٹے ہوئے دیکھا اس کو اسی شکل پر محمول کیا جائے گا۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے عنوان کے اندر دو چیزیں بتلائی تھیں ،دونوں یہاں ثابت ہو گئیں ایک توچت لیٹنے کا ثبوت ہو گیا،اوردوسرا پاؤں پر پاؤں رکھ کر لیٹنے کی اجازت بھی معلوم ہو گئی۔

چہارزانو بیٹھنا

حدیث ۸۲۱:-

وعن جابربن سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ : كَانَ النبيُّ (ﷺ) إِذَا صَلَّى الفَجْرَ تَرَبَّعَ فِى مَجْلِسِهِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ حَسْنَاء. (حديث صحيح،رواه أبو داود وغيره بأسانيد صحيحة)

ترجمہ:- حضرت جابربن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) جب فجر کی نماز سے فارغ ہوتے تھے تواپنی اسی جگہ پر(چوکڑی (آلتی پالتی)مارکر)چہارزانو بیٹھ جاتے تھے؛یہاں تک کہ سورج اچھی طرح طلوع ہو جاتا۔

افادات:- احادیث میں اس بات کی فضیلت آئی ہے کہ آدمی فجر کی نماز سے فارغ ہوکر اسی جگہ سورج طلوع ہونے تک بیٹھا رہے اور ذکر میں مشغول رہے، پھر اشراق کی دورکعت پڑھ کر اُٹھے؛ تو اس کوحج اور عمرہ کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔(سنن ترمذی، باب ذکر ما يستحب من الجلوس في المسجد بعد صلاۃ الصبح حتی تطلع الشمس۔حدیث نمبر:۵۸۶)

یہاں تو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مسجد میں بھی آدمی چہار زانو بیٹھ کر اپنا وظیفہ پورا کرے، قرآنِ پاک کی تلاوت کرے ، تو بیٹھ سکتا ہے، اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔اور دعا بھی اگر اس طرح بیٹھ کر مانگے؛تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے ، اس کی اجازت ہے۔

گوٹ مار کر بیٹھنا

حدیث ۸۲۲:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما **قَالَ:رأيتُ رسول الله** (ﷺ) **بفناءِ الكَعْبَةِ مُحْتَبِياً بِيَدَيْهِ هكَذا . وَوَصَفَ بِيَدَيْهِ الاحْتِبَاءَ،وَهُوَ القُرْفُصَاءُ.** (رواہ البخاری)

ترجمہ :- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو کعبہ شریف کے (سامنے) صحن میں دونوں ہاتھوں سے گوٹ مار کر بیٹھا ہوا دیکھا۔پھر انہوں نے اس طرح بیٹھ کر بتلایا (کہ آدمی زمین پر اپنی سرین رکھ کر دونوں پاؤں کھڑے کر کے ان کو پکڑ لے؛یہی احتباء کہلاتا ہے اور اسی کو ”قُرْفُصَآء“ بھی کہتے ہیں۔)

افادات:- حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ :احتباء میں دونوں شکلیں ہیں ،ایک تو وہی کہ آدمی سرین کے اوپر بیٹھ کر پاؤں کھڑے کر کے گھٹنے اونچے کر لے،اور اپنے ہاتھوں سے گول دائرہ بنالے۔اور دوسری شکل یہ ہے کہ ہاتھ کھلے چھوڑ دے اور کوئی کپڑا رومال وغیرہ اپنی

کمر کے پیچھے سے آگے لا کر گرہ لگا دے ؛یہ بھی احتباء ہے ، البتہ "قرفصاء" وہ کہلاتی ہے جس میں صرف ہاتھ کا دائرہ بنا کر گوٹ مار کر بیٹھا ہو۔

بہر حال!اس طرح بیٹھنا بھی جائز ہے ،بلکہ بہت سے حضرات نے اس کو سنت بھی بتلایا ہے، اگرچہ اس طرح کی بیٹھک کے سنت ہونے پر بعض حضرات نے کلام کیا ہے، لیکن مستحب ہونے پر کسی کو کلام نہیں ہے کہ اس طرح بیٹھنا پسندیدہ ہے۔

ہاں !ایک بات یادرہے کہ اگر کوئی آدمی لنگی پہنے ہوئے ہے، اوراس طرح بیٹھنے کی صورت میں ستر کے کھلنے کا اندیشہ ہے؛ تو پھر اس کی اجازت نہیں ہے۔ حدیث ِپاک میں آتا ہے: نبیٔ کریم (ﷺ) نے دو قسم کی بیٹھکوں سے منع فرمایا، اس میں یہ بھی ہے کہ اس طرح اکڑوں یا گوٹ مار کر بیٹھے کہ ستر کے اوپر کوئی کپڑا نہ ہو، اور ستر کھلا رہے ؛تو یہ حرام ہے۔

حدیث ۸۲۳:-

وعن قَيْلَةَ بنْتِ مَخْرَمَةَ رضی اللہ عنہا قالت : رأيتُ النَّبِيَّ (ﷺ) وَهُوَ قَاعِدٌ الْقُرْفُصَاءَ ،فَلَمَّا رَأَيْتُ رسولَ الله (ﷺ) الْمُتَخَشِّعَ فِي الْجِلْسَةِ؛ أُرْعِدْتُ مِنَ الْفَرَقِ. (رواه أبو داود والترمذي)

ترجمہ:-حضرت قَیْلَہ بنت مَخْرَمہ رضی اللہ عنہا (صحابیہ)فرماتی ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو گوٹ مار کر (یعنی پاؤں کھڑے کر کے ہاتھ سے گول دائرہ بنا کر)بیٹھے ہوئے دیکھا۔جب میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ایسی خشوع اور تواضع والی ہیئت میں بیٹھے ہوئے دیکھا تو مارے خوف کے مَیں لرز گئی۔

افادات:- کبھی کوئی بڑا آدمی بالکل عاجزانہ شکل اختیار کرکے بیٹھا ہو، اور کوئی آدمی اس کو اچانک دیکھ لے؛ تو دیکھنے والے پر ایک خاص خوف اور ہیبت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

حدیث ۸۲۴:-

وعن الشَّرِيدِ بن سُوَيْدٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ: مَرَّ بِي رسولُ الله (ﷺ) وَأَنَا جَالِسٌ هكَذَا، وَقَدْ وَضَعْتُ يَدِيَ الْيُسْرَى خَلْفَ ظَهْرِي، وَاتَّكَأْتُ عَلَى أَلْيَةِ يَدِي، فَقَالَ: أَتَقْعُدُ قِعْدَةَ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ؟** (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:- حضرت شرید بن سوید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کا گزر میرے پاس سے ہوا اور مَیں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اپنا بایاں ہاتھ اپنی پشت کے پیچھے اس طرح رکھا تھا کہ اس کے اوپر پیچھے کی طرف ٹیک لگایا تھا۔ نبی کریم (ﷺ) نے تنبیہ فرمائی کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہوا؛ ان کی طرح بیٹھتے ہو؟

افادات:- گویا اس بیٹھک کو حضور اکرم (ﷺ) نے ناپسند فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اُٹھنے بیٹھنے میں بھی فساق وفجار اور ایسے لوگوں کی ہیئت اختیار کرنا جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں معتوب ومغضوب ہیں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اسی لئے اس طرح کھڑا ہونا کہ کمر کے پیچھے ہاتھ سے ٹیک لگایا ہو؛ اس کی بھی ممانعت آئی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے اور کھڑے رہنے کے سلسلہ میں ہر ایسی ہیئت اختیار کرنا جو فساق وفجار، معتوب اور مغضوب لوگوں کا طریقہ ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آدمی اپنے آپ کو ایسی ہیئت سے بچائے۔

بہر حال! اس عنوان کے تحت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بات تو یہ بتلائی کہ آدمی چت لیٹ سکتا ہے، دوسرے یہ کہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر پاؤں کھڑا کر کے بھی لیٹ سکتا ہے، بشرطیکہ ستر کھلنے کا اندیشہ نہ ہو۔ چوکڑی مار کر بھی بیٹھ سکتا ہے اور گوٹ لگا کر بھی بیٹھ سکتا ہے۔

باب فی آداب المجلس والجلیس

مجلس کے آداب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس عنوان کے تحت یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ بیٹھنے کے آداب کیا ہیں ،اور ہم نشینوں کے ساتھ کس طرح کے آداب برتے جائیں۔

گنجائش نکال دو

حدیث ۸۲۵:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولَ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم): لا يُقِيمَنَّ أَحَدُكُمْ رَجُلاً مِنْ مَجْلِسِهِ ثُمَّ يَجْلِسُ فِيهِ، وَلَكِنْ تَوَسَّعُوا وَتَفَسَّحُوا. وكَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا قَامَ لَهُ رَجُلٌ مِنْ مَجْلِسِهِ لَمْ يَجْلِسْ فِيهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں کوئی کسی کو اس جگہ سے نہ اٹھائے جہاں وہ بیٹھا ہوا ہو، کہ پھر خود اس کی جگہ بیٹھ جائے۔لیکن ذرا کشادہ ہو جاؤ ، اور گنجائش نکال دو۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے لیے جب کوئی اپنی جگہ سے اُٹھتا تھا تو آپ اس جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے۔

افادات:- ایک تو یہ ہے کہ کسی آدمی کی مملوک اور اس کی ذاتی جگہ ہے، جیسے اس کا اپنا گھر یا ذاتی کمرہ ہے، یا بیٹھنے کی مخصوص جگہ ہے، وہاں کوئی دوسرا آکر بیٹھ گیا؛ تو ظاہر ہے کہ وہ خود مالک

ہے،اور مالک کی اجازت کے بغیر کوئی بیٹھا ہو،بلکہ اجازت لیکر بھی بیٹھا ہو؛تو اس کو اختیار ہے کہ وہاں سے اس کو ہٹائے۔

پبلک مقامات کا حکم

اوردوسری شکل یہ ہے کہ ایک عام جگہ ہے،جو کسی کی مخصوص مِلک نہیں ہے،جیسے: مسجد ہے،اسٹیشن کی کرسیاں ہیں ،یاکوئی پارک اور باغیچہ ہے جہاں سب لوگ آتے جاتے ہیں ،وہ کسی کی ملکیت نہیں ہے ،بلکہ ہر ایک کو وہاں بیٹھنے کی اجازت ہے،ایسی کسی جگہ پر اگرکوئی آدمی آکر پہلے سے بیٹھ گیا ہے،جیسے: ایک آدمی مسجد میں آکر امام کے پیچھے والی جگہ پر بیٹھ گیا،تو یہ ایسی جگہ ہے جہاں ہر ایک کو بیٹھنے کی اجازت ہے،اورجو پہلے آکر بیٹھے اور قبضہ جمائے،وہ اس جگہ کا زیادہ حقدارہے-یہ حقِ اسبقیت کہلاتاہے-اب بعدمیں آنے والا کوئی آدمی اس کو وہاں سے اُٹھا نہیں سکتا ،الاَّیہ کہ وہ آدمی خود اپنی مرضی سے اٹھ کر چلا جائے،یانماز کا وقت ختم ہوگیا اوردوسری نماز کے وقت وہ جگہ خالی ہوگئی، توپھر دوسرا آدمی وہاں بیٹھ سکتا ہے۔

بعض لوگوں کامزاج ہوتاہے کہ مسجدمیں اپنے لیےایک جگہ مقرر کی ہوئی ہوتی ہے اگر کوئی پہلے آکروہاں بیٹھ جاتا ہےتویہ آکراس کوہٹادیتےہیں؛یہ جائز نہیں ہے۔حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ لکھاہے،ہرایسی مباح جگہوں کایہی حکم ہے،اورہم میں سے اکثرلوگ اس مرض میں مبتلا ہیں۔

دوسرے کی چپل ہٹا کر اپنی نہ رکھے:

اسی طرح مسجد میں جہاں جوتے نکالے جاتے ہیں اس کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ ایک مباح جگہ ہے، ہر آدمی وہاں جوتے نکال سکتا ہے۔ ایک آدمی نے آکر دیکھا کہ کونے پر ایک جگہ خالی ہے تو اس نے اپنے جوتے نکال کر وہاں رکھ دیئے، تو اب اس جگہ کا وہ حق دار ہو گیا، جب تک کہ وہ خود اپنے جوتے وہاں سے نہ ہٹائے وہاں تک کسی دوسرے کو اس جگہ کے استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ لیکن ہم لوگوں کی عادت کیا ہوتی ہے! کسی نے پہلے سے کونہ میں اچھی جگہ دیکھ کر اپنے جوتے رکھے ہیں، ہم بعد میں آکر لات مار کر اس کے جوتے ہٹا دیتے ہیں اور اس جگہ پر اپنے جوتے رکھ دیتے ہیں، پھر کوئی تیسرا آتا ہے تو وہ بھی لات مار کر اس کے جوتے ہٹا دیتا ہے، اس طرح پہلے والے کے جوتے اور دور چلے جاتے ہیں، پھر جب پہلے والا بے چارہ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلتا ہے تو اپنی جگہ پر اپنے جوتے تلاش کرتا ہے، لیکن وہاں نہیں ملتے تو وہ پریشان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے، اور اس کی اجازت نہیں ہے۔

ٹرین میں زیادہ جگہ روکنا:

ٹرین کے اندر بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی پہلے سے آکر بیٹھ گیا تو اب آپ اس کو وہاں سے ہٹا نہیں سکتے۔ جو لوگ پہلے سے جگہ روکتے ہیں؛ اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔ گر آپ

پہلے آئے ہیں تو آپ بیٹھ جایئے، دوسروں کے لئے جگہ رکھنے کا آپ کو حق نہیں دیا گیا ہے، دوسرا جو بھی آرہا ہے وہ ٹکٹ لے کر آرہا ہے، اس کا بھی پورا پورا حق ہے۔پہلے جہاں کھانے کا مسئلہ آیا تھا وہاں پوری تفصیل بتلادی تھی۔

بعض لوگ زیادہ جگہ روکتے ہیں ؛ اس کی بھی اجازت نہیں ہے۔اگر جگہ پُر ہوگئی ہے تو کسی کو اُٹھا تو نہیں سکتے،لیکن جو پہلے سے بیٹھے ہوئے ہیں وہ ذرا کھسک کر اور پھیلاؤ کم کر کے آنے والے کے لئے جگہ کر دیں اور کچھ گنجائش نکال لیں؛تو البتہ اس کی اجازت ہے، اگر جگہ میں گنجائش ہو تو ان بھی کو منع نہیں کرنا چاہیے۔بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ خوب چوڑے ہو کر بیٹھتے ہیں،بعد میں جو لوگ آتے ہیں تو وہ کھڑے رہتے ہیں ،یہ دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ سب پریشان ہیں تب بھی ذرہ برابر حرکت کرنے کا نام نہیں لیتے:ایسا نہیں کرنا چاہیے،بلکہ آپ ان کے لئے گنجائش نکال دیجئے، ہاں ! آپ پریشانی میں مبتلا نہ ہوں ، لیکن آپ نے زیادہ کشادگی سے جو فائدہ اٹھار کھا ہے ،تو اپنے بھائی کے لئے ذرا گنجائش نکال لو۔

اگر کوئی اپنی جگہ ہمارے لیے چھوڑدے:

تیسری بات یہ بھی ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خاندانی یا علمی لحاظ سے کسی فضیلت کا حامل کوئی بڑا آدمی آتا ہے تو اس کے اکرام وادب کے طور پر، یا اجر وثواب حاصل کرنے کی نیت سے آدمی اُٹھ جاتا ہے ،اوراس سے اپنی جگہ بیٹھنے کے لئے درخواست کرتا ہے۔تو اگر بغیر کسی جبر اور

دباؤ کے ازخود اُٹھ گیاہےتب تو الگ بات ہے۔لیکن بعض مرتبہ عقیدت مند لوگ زبردستی اُٹھواتے ہیں کہ:حضرت آ رہے ہیں ،یہ جگہ خالی کرو؛ایسا کرنا بالکل صحیح نہیں ہے۔وہ دیکھ کر ازخود اُٹھ جائے،یا اس کو متوجہ کیا گیا اور وہ اپنی مرضی سے اٹھا ؛تو دوسری بات ہے۔لیکن اگر اٹھنے کے لیے اس کا جی تو چاہتا نہیں تھا اِن لوگوں نے زبردستی قبضہ کرلیا؛تویہ صحیح نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول بتلایا گیا کہ اگر کوئی آدمی از خود اٹھ جاتا تب بھی آپ اس کی جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے،وہ خیال فرماتے تھے کہ ہو سکتا ہے وہ شرما حضوری میں کھڑا ہوگیاہو۔اس لیے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتاہے کہ اندر سے دل تو نہیں چاہتا،لیکن اگر نہ اُٹھے تواچھا بھی نہیں لگتا،اس لیے بادلِ ناخواستہ اٹھ جاتاہے۔علماء نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما مزید احتیاط اور تقویٰ کے پیشِ نظر اس جگہ پر نہیں بیٹھتے تھے، باقی مسئلہ یہی ہے کہ وہ از خود اُٹھا ہو،تواس نے اپنا حق آپ کے لئے چھوڑ دیا،اس لیے آپ بیٹھ سکتے ہیں ۔

ایثار بالقُرَب:

ایک بات اور ہے، مثلاً:ایک آدمی پہلے سے آکر مسجد میں پہلی صف میں بیٹھا ہوا ہے،تو اب وہ کسی دوسرے کے لئے پہلی صف والی جگہ خالی کرے؛جو ”اِیْثَار بِالْقُرَبْ“ کہلاتاہے کہ نیکی کے کاموں میں اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دینا؛یہ جائز ہے یا نہیں ؟ توفقہاء نے اس پر

مستقل کلام کیاہے کہ دوصورتیں الگ الگ ہیں۔ایک صورت تو یہ ہے کہ اپنی ضروریات و خواہشات کی تکمیل کے معاملہ میں ایثار سے کام لینا،مثلاً:مَیں کھانا کھا رہاہوں ، اور آپ آگئے تومَیں نے کھاناچھوڑدیااور آپ کے لئے پیش کردیا، آپ کواپنےاوپرترجیح دی؛یہ تو اچھی بات ہےاورنیکی کاکام ہے۔قرآنِ پاک میں اس پر تعریف کی گئی ہے:﴿يُؤۡثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمۡ وَلَوۡ كَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٞ﴾ان چیزوں میں تو اپنی خواہش کے مقابلہ میں دوسروں کوترجیح دی جائے۔

لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ پہلی صف میں آپ کوموقع ملاتھاجو ایک عبادت کی چیز ہے، آپ اس کو چھوڑ کر وہ جگہ دوسرے کودے رہے ہیں ؛ تواس پر فقہاء نے کلام کیا ہے۔بعض تو اس کی اجازت نہیں دیتے کہ آپ عبادت کے معاملہ میں بے پرواہی برت رہے ہیں ،گویا آپ یہ سمجھ کرہٹ رہے ہیں کہ مجھے پہلی صف کی ضرورت نہیں ہے؛ اس لیے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ:اپنے آپ کو پہلی صف کا محتاج سمجھتے ہوئے اکراماً اگر کوئی آدمی اپنی جگہ خالی کرے؛ تو اس کی گنجائش ہے۔ہاں ! جہاں خالص عبادت کا معاملہ ہو وہاں اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

پہلے بیٹھنے والازیادہ حق دار ہے:

حدیث ۸۲۶:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **أنَّ رسول الله** (ﷺ) **قَالَ: إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَجْلِسٍ، ثُمَّ رَجَعَ إِلَيْهِ، فَهُوَ أَحَقُّ بِهِ.**
(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب مجلس سے اُٹھا، پھر لوٹ کر آیا؛ تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

افادات:- یہاں دوسرا مسئلہ بتارہے ہیں کہ مثلاً: ایک آدمی مسجد میں آکر پہلے سے بیٹھا ہوا ہے، ابھی نماز نہیں ہوئی ہے اور اس کو کوئی عذر پیش آگیا، جیسے پیشاب کا تقاضا ہوا، یا وضو ٹوٹ گیا، تو وہ مجبوراً اپنے اس تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے اُٹھ کر گیا، اور ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسی شکل اختیار کی کہ جس سے لوگ یہ سمجھیں کہ وہ دوبارہ آنے والا ہے، جیسے: اپنا رومال، قلم، یا کوئی اور چیز رکھ دی، تو چوں کہ وہ پہلے سے بیٹھا ہوا تھا اس لیے اس جگہ کا وہی حق دار ہے، وہ وضو کرنے کے لئے گیا اس دوران کوئی آدمی آکر وہاں بیٹھ گیا تو یہ اس کو وہاں سے اُٹھا سکتا ہے، اس لئے کہ یہ اپنی اس جگہ کو چھوڑ کر نہیں گیا تھا، بلکہ مجبوری کی وجہ سے وضو کرنے کے لیے گیا تھا، اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو ہم سب بھی سمجھ سکتے ہیں۔ ایسا معاملہ ٹرین میں بہت پیش آتا ہے کہ کوئی آدمی سیٹ کے اوپر بیٹھا ہوا اور پیشاب کے لئے جائے، تو سارا ڈبہ کھڑا ہو تب بھی کوئی شخص اس کی جگہ پر اپنا حق نہیں سمجھتا، جب وہ واپس آتا ہے تو لوگ خود سمجھ جاتے ہیں کہ وہ چھوڑ کر نہیں گیا تھا، اس لیے اس جگہ پر اسی کا حق ہے۔ ہاں! اگر اس جگہ کو چھوڑ کر چلا

گیا ہو ،اور کوئی ایسی علامت بھی نہیں رکھی تھی،بلکہ اس کے انداز ہی سے معلوم ہورہا تھا کہ یہ جگہ چھوڑ کر جارہا ہے ،تو اب وہ کسی کو نہیں اُٹھا سکتا۔

اپنی جگہ رکوانا:

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ خود آئے بغیر کسی دوسرے کے ذریعہ سے جگہ پر قبضہ کراتے ہیں کہ کسی دوسرے نے اس کے لئے رومال رکھ دیا؛تو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ہاں! خود آکر بیٹھا ہو اور کسی وجہ سے جانے کی نوبت آئی ہو؛تو اس صورت میں رومال وغیرہ رکھ سکتے ہیں

بعد میں آنے والا مجلس کے کنارے بیٹھے:

حدیث ۸۲۷:-

وعن جابر بن سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ: كُنَّا إِذَا أَتَيْنَا النَّبِيَّ** (ﷺ) **جلَسَ أَحَدُنَا حَيْثُ يَنْتَهِي.** (رواہ أبو داود والترمذی ،وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب نبیٔ کریم (ﷺ) کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے ،تو جہاں مجلس ختم ہوتی تھی وہیں بیٹھ جاتے تھے۔

افادات:- جیسے ہماری یہ مجلس پہلے سے لگی ہوئی ہے اور بعد میں کوئی نیا آدمی آیا جو لوگوں کو چیر کر آگے آنے کی کوشش کرے؛تو یہ برا ہے۔یہ تو سب لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہوا اِس کی

شریعت اجازت نہیں دیتی، بلکہ شریعت یہ کہتی ہے کہ جب آپ بعد میں آئے ہیں تو جہاں مجلس ختم ہورہی ہے اور آخری آدمی جہاں بیٹھا ہے، وہیں بیٹھ جایئے؛ یہ بھی آدابِ مجلس میں سے ہے۔ چاروں کناروں کے آخری حصے میں جہاں بیٹھنا چاہو بیٹھو لیکن بیچ میں نہ آؤ۔ بیچ میں آنا دوسروں کو تکلیف پہنچانا ہے۔

لوگوں کو چیر کر آگے نہ بڑھے:

حدیث ۸۲۸:-

وعن أَبِي عبد الله سَلْمَان الفارسي رضی اللہ عنہ **قَالَ: قَالَ رسول الله** (ﷺ) **: لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ، وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ، أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ، ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الإِمَامُ، إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الأُخْرَى.** (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کوئی آدمی جمعہ کے روز غسل کرے اور اپنی طاقت کے مطابق پاکی حاصل کرے (پورے جسم کی صفائی کرے) تیل لگائے، خوشبو (ہو تو) استعمال کرے، پھر وہ اپنے گھر سے مسجد جانے کے لئے اس شان سے نکلے کہ مسجد میں پہنچنے کے بعد دو آدمیوں کے درمیان تفریق نہ کرے (بیٹھے ہوئے لوگوں کو چیر کر آگے نہ جائے) پھر اللہ تعالیٰ نے جو توفیق دی وہ نماز پڑھے (یعنی نفل، سنت) پھر امام جب خطبہ دینے لگے تو خاموشی سے سنتا رہے؛ تو اس کے اس جمعہ سے لے کر آئندہ جمعہ تک کے سارے (صغیرہ) گناہ معاف ہو ہی جائیں گے۔

افادات:-اس لئے کہ کبیرہ گناہ تو آدمی جب تک توبہ نہ کرے وہاں تک معاف نہیں ہوتے۔

اس روایت کو صرف اس نکتہ کی طرف متوجہ کرنے کے لئے لائے ہیں کہ جب آپ مسجد میں داخل ہوں اور لوگ صفیں بنا کر بیٹھے ہوئے ہوں ، تو آپ ان کو چیر کر آگے نہ بڑھیں؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔البتہ اگر آگے کی جگہیں خالی ہیں اور لوگوں نے پیچھے صفیں بنالیں ہیں؛ تو فقہاء لکھتے ہیں کہ: آگے کی جگہوں کو خالی رکھ کر پیچھے صف بنانے والوں نے گویا اپنی رعایت کا حق ختم کردیا،یعنی ہمیں ان کے ساتھ رعایت کرنی چاہیے تھی کہ ہم ان کو چیر کر آگے نہ جائیں، لیکن انہوں آگے جگہیں خالی چھوڑ کر اپنی رعایت کا حق خود ہی ختم کردیا ؛اس لئے ایسی صورت میں کوئی آدمی لوگوں کو چیر کر آگے کی خالی جگہیں پُر کرنا چاہے؛ تو کرسکتا ہے۔

دو کے بیچ میں نہ گھسے:

حدیث ۸۲۹:-

وعن عمرو بن شُعَيب، عن أبيهِ،عن جَدِّهِ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: لاَ يَحِلُّ لِرَجُلٍ أَنْ يُفَرِّقَ بَيْنَ اثْنَيْنِ إِلاَّ بِإِذْنِهِمَا .(رواه أبو داود والترمذی،وقال:حدیث حسن)

وفي رواية لأبي داود: ((لاَ يُجْلَسُ بَيْنَ رَجُلَيْنِ إِلاَّ بِإِذْنِهِمَا)).

ترجمہ:–حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی کے لئے جائز نہیں کہ دو آدمیوں کے درمیان تفریق کرے ؛ مگر ان دونوں کی اجازت سے۔

افادات:–دوسری روایت کے الفاظ سے اس بات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔دو آدمی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی آدمی آ کر ان کے بیچ میں آڑ ڈال کر بیٹھ گیا؛ تو یہ برا سمجھا جائے گا۔ ان کی اجازت کے بغیر اس طرح بیچ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ اگر ان کی اجازت کے بغیر درمیان میں بیٹھے گا تو ان کے لئے ناگواری اور تکلیف کا باعث ہوگا ،اور کسی مؤمن کو کسی بھی طرح تکلیف پہنچانے کی اجازت نہیں ہے

حلقہ کے بیچ میں نہ بیٹھے:

حدیث ۸۳۰:-

وعن حذیفة بن الیمان رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول اللہ (ﷺ) لَعَنَ مَنْ جَلَسَ وَسَطَ الحَلْقَةِ. (رواہ أبو داود بإسنادٍ حسن)

وروی الترمذی عن أبي مِجْلَزٍ: أَنَّ رَجُلاً قَعَدَ وَسَطَ حَلْقَةٍ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: مَلْعُونٌ عَلَى لِسَانِ مُحَمَّدٍ (ﷺ). أَوْ لَعَنَ اللهُ عَلَى لِسَانِ مُحَمَّدٍ (ﷺ). مَنْ جَلَسَ وَسَطَ الحَلْقَةِ. (قَالَ الترمذی: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:–حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے اس آدمی پر لعنت فرمائی جو حلقہ کے بیچ میں بیٹھ جائے۔

دوسری روایت میں ہے : ایک آدمی حلقہ کے بیچ میں آکر بیٹھ گیا، توحضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا آدمی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی ملعون ہے۔یا یہ فرمایا: ایسے آدمی پر جو حلقہ کے بیچ میں آکر بیٹھ جائے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانی اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

افادات:۔۔مطلب یہ ہے کہ لوگ دائرہ بناکر گفتگو میں مشغول ہیں ،بات چیت کررہے ہیں اور کوئی آدمی آکران سب کو چیر کران کے بیچ میں بیٹھ جائے،تو اس کو ایسا نہ کرنا چاہیے تھا کہ اس سے منع کیا گیا ہے ،پھر بھی کرتا ہے تو ایسے آدمی پر لعنت ہے۔

آرام سے بیٹھیں :

حدیث ۸۳۱:۔

وعن أَبِي سعيدٍ الخدريِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعتُ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقول: ((خَيْرُ المَجَالِسِ أوْسَعُهَا .)) (رواه أبُو داود بإسنادٍ صحيح عَلَى شرط البخاري)

ترجمہ:۔۔حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: بہترین مجلس وہ ہے جس میں کشادگی ہو۔

افادات:۔۔یعنی بیٹھنے والے بغیر کسی تنگی کے آرام سے بیٹھیں ، جگہ میں اگر وسعت ہے تو تنگی کرنے کی ضرورت نہیں ،ہر ایک اپنی حیثیت کے مطابق آرام سے بیٹھے ،تاکہ سب لوگ

اخیر تک اطمینان سے بیٹھ سکیں، کسی کے لئے تکلیف اور پریشانی کا بھی باعث نہ ہو؛ اس کو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہتر مجلس فرمایا ہے۔

کفارۂ مجلس:

حدیث ۸۳۲:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) : مَنْ جَلَسَ فِى مَجْلِسٍ فَكَثُرَ فِيهِ لَغَطُهُ، فَقَالَ قَبْلَ أَنْ يَقُومَ مِنْ مَجْلِسِهِ ذٰلِكَ ''سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ'' إِلاَّ غُفِرَ لَهُ مَا كَانَ فِى مَجْلِسِهِ ذٰلِكَ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کوئی کسی مجلس میں بیٹھا اور اس میں بے ہودہ اور لایعنی باتوں کی کثرت ہوئی تو اگر اس جگہ سے اٹھنے سے پہلے یہ پڑھ لے: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، تو اس مجلس میں جتنی بے ہودگی ہوئی؛ وہ سب اللہ تعالیٰ معاف کردیں گے۔

حدیث ۸۳۳:-

وعن أبي بَرْزَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يقولُ بِأَخَرَةٍ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَقُومَ مِنَ الْمَجْلِسِ: ((سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ)) فَقَالَ رَجُلٌ:

یَارسولَ الله ! إنَّكَ لَتَقُول قَوْلاً مَا كُنتَ تَقُولُهُ فِيمَا مَضَى ؟ قَالَ : ((ذَلِكَ كَفَّارَةٌ لِمَا يَكُونُ فِى الْمَجْلِسِ))(رواه أبو داود. ورواه الحاكم أبو عبد الله فى " المستدرك " من رواية عائشة رضى الله عنها وقال: صحيح الإسناد)

ترجمہ:- حضرت ابو برزہ اَسلمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) حیاتِ طیبہ کے آخری زمانہ میں جب مجلس سے اُٹھنے والے ہوتے تو یہ دعا پڑھا کرتے تھے :((سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ))ایک آدمی نے پوچھا:اے اللہ کے رسول! آج کل (مجلس کے اخیر میں) آپ ایسی دعا پڑھتے ہیں جو پہلے نہیں پڑھتے تھے؟(یعنی پہلے آپ کا اس دعا کے پڑھنے کا معمول نہیں تھا،اب آپ نے معمول بنا لیا ہے)تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: مجلس میں جو بے ہودگیاں اور لایعنی ہو جایا کرتی ہیں ؛ یہ دعا اس کے لئے کفارے کا کام دیتی ہے۔

غفلت کی تلافی:

افادات:- ہر وہ مجلس جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہو، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اوپر درود نہ بھیجا گیا ہو، قیامت کے روز ایسی مجلس ان مجلس والوں کے لیے باعثِ حسرت ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں بیٹھنے والوں کے اوپر شروع سے لے کر آخر تک ایسی غفلت طاری رہی کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کی نوبت ہی نہیں آئی، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود نہیں بھیجا گیا، تو وہ پچھتائیں گے کہ :کاش! اس مجلس میں ہم شریک نہ ہوئے ہوتے، اس حسرت کو دور کرنے

کے لئے نبی کریم (ﷺ) نے ایک طریقہ بتلا دیا۔ یہ بھی نبی کریم (ﷺ) کی شفقت اور محبت کی بات ہے کہ امت کی طرف سے اگر غفلت کا ارتکاب ہو گیا تو اس کی تلافی کی شکل بھی بتلا دی۔

لیکن ایک بات یاد رہے کہ اس مجلس میں جو صغیرہ گناہ ہوئے ہیں وہ اس دعا سے معاف ہوں گے، اگر کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کیا گیا ہے، مثلاً: کسی کی غیبت کی گئی ہے، جھوٹ بولا ہے، کسی کی تحقیر کی گئی ہے، کسی کا استہزاء اور ٹھٹھا کیا گیا ہے؛ تو کفارۂ مجلس والی دعا سے بھی وہ معاف نہیں ہوں گے، ان کے لئے توبہ ضروری ہے۔ ویسے "أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ" اگر دل کی توجہ کے ساتھ، معنیٰ کا استحضار کرتے ہوئے پڑھے گا؛ تو اس صورت میں وہ گناہ بھی معاف ہو سکتے ہیں۔

مجلس میں پڑھنے کی دعا:

حدیث ۸۳۴:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: قَلَّمَا كَانَ رسول الله (ﷺ) يَقُومُ مِنْ مَجْلِسٍ حَتَّى يَدْعُوَ بِهٰؤُلَاءِ الدَّعَوَاتِ: اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُولُ بِهِ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيكَ، وَمِنْ طَاعَتِكَ مَا تُبَلِّغُنَا بِهِ جَنَّتَكَ، وَمِنَ الْيَقِينِ مَا تُهَوِّنُ بِهِ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا، اَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا، وَأَبْصَارِنَا، وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا، وَاجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا وَاجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلَى مَنْ ظَلَمَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى مَنْ عَادَانَا، وَلَا تَجْعَلْ مُصِيبَتَنَا فِي دِينِنَا، وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا، وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا، وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَرْحَمُنَا. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی مجلس سے بہت کم اٹھتے تھے مگر دعا کے یہ کلمات ضرور پڑھ کر لیا کرتے تھے (گویا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا معمول اس دعا کا بھی تھا) اے اللہ! اپنی اتنی خشیت اور اتنا خوف ہمیں عطا فرما جو ہمارے اور تیری نافرمانی کے درمیان رکاوٹ بن جائے، اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری کی اتنی توفیق عطا فرما جس کے ذریعہ تو ہمیں جنت تک پہنچادے، اور ہمیں یقین کی اتنی مقدار عطا فرما جس کے ذریعہ دنیا کی مصیبتیں ہمارے لئے آسان کردے۔ اے اللہ! تو ہمارے کانوں، ہماری آنکھوں اور ہمارے دوسرے قویٰ کے ذریعہ ہمیں فائدہ پہنچا جب تک کہ تو ہمیں زندہ رکھے (اور ان سارے اعضاء کو ہمارے بعد تک باقی رکھ) اور ہمارا وارث بنا۔ اور ہمارا انتقام ان لوگوں پر رکھ جو ہم پر ظلم کریں، اور جو ہم سے عداوت و دشمنی رکھنے والے ہیں ان کے مقابلہ میں تو ہماری مدد کر۔ اور ہمارے دین کے اندر کوئی نقص اور کمی نہ آنے دے۔ دنیا کو ہماری فکروں کا غالب حصہ، اور ہماری کوششوں کی انتہا نہ بنا۔ اور جو ہم پر رحم نہ کریں ایسے دشمنوں کو ہم پر مسلط نہ فرما۔

گناہ کیوں ہوتا ہے؟:

افادات:- اس دعا کے اندر چند باتیں قابلِ توجہ ہیں :-

[1] آدمی گناہوں کا جو ارتکاب کرتا ہے وہ خوف وخشیت کی کمی کی وجہ سے کرتا ہے، اس لیے سوال کیا گیا کہ: ہمیں اپنا اتنا خوف عطا فرما کہ تیرے اس خوف کے نتیجہ میں ہم تیری نافرمانی سے باز رہیں۔ نیز یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ خوف کے لئے حد بندی کردی گئی کہ اتنا ہی خوف عطا فرما جو نافرمانی سے باز رکھنے کا ذریعہ بن جائے۔ اس لیے کہ کبھی خوف اتنا زیادہ

ہو جاتا ہے کہ آدمی مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے؛ تو وہ پسندیدہ نہیں ہے، اس لیے خوف کی اتنی ہی مقدار مطلوب ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ کی نافرمانی سے آدمی کو باز رکھنے والی ہو۔

ٹینشن کی وجہ؛ یقین کی کمی:

۲ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری پر ملنے والے اجر و ثواب کا، اور پیش آنے والے حالات و آزمائشوں پر اللہ تعالیٰ کے یہاں جو اجر و ثواب ملنے والا ہے اس کا بھی اتنا زیادہ استحضار اور اعتماد و یقین ہو کہ ذرا سی بھی تکلیف اور بیماری آئی، سر میں درد ہوا، یا اور کوئی نقصان ہو گیا؛ تو سوچے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مجھے اجر ملے گا۔ اگر آدمی یہ سوچ لے تو سارے حالات اور پریشانیاں اس کے لئے آسان ہو جائیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: مؤمن کو کانٹا بھی چبھتا ہے تو اس پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملتا ہے (صحیح مسلم: ۶۷۲۶، باب ثَوَابِ الْمُؤْمِنِ فِيمَا يُصِيبُهُ مِنْ مَرَضٍ أَوْ حُزْنٍ أَوْ نَحْوِ ذَلِكَ حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا)

حدیثِ پاک میں آتا ہے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دنیا میں جن لوگوں پر مصیبتیں اور بیماریاں آئیں تھیں ان کو قیامت کے روز جب اجر و ثواب ملے گا؛ اس کو دیکھ کر عافیت والے لوگ- جن پر دنیا میں کوئی مصیبت نہیں آئی تھی- تمنا کریں گے: کاش! دنیا میں ہمارے جسموں کو قینچیوں سے کاٹا جاتا (سنن ترمذی: ۲۵۸۲۔ باب من أحد یموت إلاّ ندم) مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارا یہ یقین بن جائے کہ جو بھی مصیبت آتی ہے وہ فائدہ سے خالی نہیں ہے، مثلاً: تجارت نہیں چل رہی ہے، تو آدمی یہ

یقین رکھے کہ کوئی بات نہیں، یہ مصیبت ہمارے لئے آخرت کے اجر و ثواب کا باعث ہے، تو کبھی پریشانی اور ٹینشن نہیں ہوگا۔ جتنے بھی ٹینشن ہیں؛ وہ یقین کی کمی کی وجہ سے ہیں۔

مرتے دم تک تمام قویٰ سلامت رہیں:

۳ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ابھی مرا نہیں کہ اس سے پہلے ہی بینائی رخصت ہوجاتی ہے، شنوائی یعنی سننے کی صلاحیت رخصت ہوجاتی ہے، دوسرے اعضاء جیسے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگتے ہیں، دماغ کی قوت، حافظہ جواب دینے لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام طور پر آدمی کے قویٰ جو اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں، وہ سارے بڑھاپے میں دھیرے دھیرے کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں؛ تو نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی: اے اللہ! جب تک تو ہمیں زندہ رکھے اس وقت تک ہماری ساری صلاحیتیں برابر کام کرتی رہیں، کسی میں کوئی کمی نہ آئے، کان اپنا کام کرتے رہیں، آنکھیں اپنا کام کرتی رہیں، دوسرے قویٰ اپنا کام کرتے رہیں؛ بلکہ ہم جب دنیا سے جائیں تو وہ موجود اور باقی ہوں۔ ان کو وارث بنا یعنی اخیر زندگی تک باقی رکھ۔

دین پر مصیبت نہ آئے:

۴ اور ہمارے دین کے اندر کوئی نقص اور کمی نہ آنے پائے۔ مصیبت کا اثر اگر دنیا پر پڑا کہ تجارت میں کوئی نقصان ہوگیا، کوئی اور بیماری آگئی، تو وہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے، لیکن

جو مصیبت دین کے معاملہ میں آئی، جیسے: پہلے نمازوں کی پابندی تھی، اب نمازیں چھوٹنے لگیں، جماعت چھوٹنے لگی، تلاوت کا اہتمام تھا، لیکن اب وہ اہتمام باقی نہیں رہا؛ اسی کو مانگا گیا کہ: اے اللہ! یہ مصیبت نہیں آنی چاہیے، اس لیے کہ یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔

دنیا کی فکر غالب نہ ہو:

۵ اور دنیا کو ہماری فکروں کا غالب حصہ نہ بنا، اور نہ ہماری کوششوں کی انتہا بنا۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ جب بھی ہم کچھ سوچیں تو دنیا ہی کو سوچیں، اور جو بھی محنتیں کریں؛ دنیا ہی کے لئے کریں، بلکہ دنیا کے لئے ہماری سوچ اور ہماری محنت ضرورت کے بقدر ہو، باقی ساری سوچ اور محنت آخرت کے لئے ہو۔

۶ اے اللہ! جو لوگ ہم پر رحم نہ کریں ایسے دشمنوں کو ہم پر مسلط نہ فرما۔ معلوم ہوا کہ جو بے رحم دشمن مسلط کیے جاتے ہیں وہ ہمارے گناہوں ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ یہ دعا مانگتا رہے۔

باعثِ حسرت مجلس:

حدیث ۸۳۵:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): مَا مِنْ قَوْمٍ يَقُومُونَ مِنْ مَجْلِسٍ لَا يَذْكُرُونَ اللهَ تَعَالَى فِيهِ، إِلَّا قَامُوا عَنْ مِثْلِ جِيفَةِ حِمَارٍ، وَكَانَ لَهُمْ حَسْرَةٌ. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو لوگ ایسی مجلس سے اُٹھتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کیا ہو، تو وہ اس مجلس سے ایسے اُٹھتے ہیں جیسے مرے ہوئے گدھے پر سے اُٹھے ہوں، اور یہ مجلس ان کے لئے قیامت کے روز حسرت کا باعث ہوگی۔

جس مجلس میں ذکر نہ ہو:

حدیث ۸۳۶:-

وعنه، عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: مَا جَلَسَ قَوْمٌ مَجْلِساً لَمْ يَذْكُرُوا اللهَ تَعَالَى فِيهِ، وَلَمْ يُصَلُّوا عَلَى نَبِيِّهِمْ فِيهِ، إِلَّا كَانَ عَلَيْهِمْ تِرَةٌ؛ فَإِنْ شَاءَ عَذَّبَهُمْ، وَإِنْ شَاءَ غَفَرَ لَهُمْ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبیِ کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ: لوگوں نے جو مجلس بھی ایسی لگائی جس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ ہوا، اور جس میں ان کے نبی (ﷺ) پر درود شریف نہ پڑھا گیا؛ وہ مجلس ان پر وبال ہوگی، اگر اللہ تعالیٰ چاہے گا تو اس پر ان کو عذاب دے گا اور اگر چاہے گا تو معاف کردے گا۔

دست بکار ،دل بیار :

حدیث ۸۳۷:-

وعنه، عن رسول الله (ﷺ) قَالَ: مَنْ قَعَدَ مَقْعَداً لَمْ يَذْكُرِ اللهَ تَعَالَى فِيهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللهِ تِرَةٌ، وَمَنِ اضْطَجَعَ مَضْجَعاً لاَ يَذْكُرُ اللهَ تَعَالَى فِيهِ كَانَتْ عَلَيْهِ مِنَ اللهِ تِرَةٌ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: جو آدمی ایسی جگہ بیٹھا جہاں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کیا گیا؛ تو وہ بیٹھک اس کے لیے وبال ہوگی۔ اور جو کہیں لیٹا جس میں اللہ تعالیٰ کو یاد نہ کیا گیا؛ تو وہ لیٹنا اس کے لئے وبال ہوگا۔

افادات:- اس لیے جو بھی مجلس ہو اس میں آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہونا چاہیے۔ بزرگوں نے لکھا ہے کہ: دل کا حال وہی ہونا چاہیے جو ”قطب نما“ کا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں نے ”قطب نما“ تو دیکھا ہوگا ! اس کو آپ کسی بھی حالت میں رکھو؛ اس کی سوئی ہمیشہ شمال کی طرف ہی رہتی ہے۔ اسی طرح ہم بھی کیسی ہی مجلس میں ہوں، دوستوں میں ہوں، اپنے کاروبار میں مشغول ہوں ؛ بس! ہمارا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، آدمی اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ رہے ، اسی کی طرف ہمارے دل کی سوئی لگی رہے؛ تب ہی قلب کو سکون حاصل ہوگا اور یہی مطلوب ہے۔

نبی کریم (ﷺ) نے جتنی بھی دعائیں بتلائی ہیں کہ کھانے سے پہلے یہ دعا پڑھو ، آخر میں یہ دعا پڑھو، سونے سے پہلے یہ دعا پڑھو، اٹھو تو یہ دعا پڑھو، اور بھی جو دعائیں رکھی گئی ہیں ان کا مقصد یہی ہے کہ آدمی کسی حالت میں بھی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو۔ ہر کام کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی یاد کرلی، پھر آخر میں بھی اللہ تعالیٰ کی یاد کرلی؛ تو بیچ والے حصہ میں اگر کچھ غفلت بھی رہی؛ تو اس کی تلافی ہو جائے گی، اور شروع اور آخر کی وجہ سے ان شاء اللہ وہ معاف ہو جائے گی۔

دن کے شروع میں اللہ تعالیٰ سے عہد:

بعض بزرگ فرماتے ہیں : آدمی صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اسی جگہ بیٹھے بیٹھے اپنے معمولات پورے کرکے جب اُٹھنے والا ہو، تو اٹھنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کرلے: "أَللّٰهُمَّ إِنَّ صَلوٰتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ" اے اللہ ! میری نماز، میری عبادت ، میرا جینا اور میرا مرنا؛ تیرے ہی لیے ہے۔ اے اللہ! آج کے دن میں ابھی اُٹھنے سے لے کر شام کو سونے تک مَیں جو کچھ بھی کروں گا؛ میرے سارے کام تیرے ہی لیے ہوں گے۔ اس طرح ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے عہد کرلے، پھر دن بھر کوشش میں لگا رہے اور اِدھر دھیان رہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کی نوبت نہ آئے۔ ویسے عہد کرلیا یہ بھی ان شاء اللہ کافی ہو جائے گا۔ اگر اس کا اہتمام کرلے گا تو ان شاء اللہ یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے ہمیں اس

بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہماری کوئی مجلس اللہ تعالیٰ کی یاد، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود سے خالی نہ ہو۔ درود شریف بھی ایک طرح کا عمدہ ذکر ہی ہے۔

باب الرؤیا
وما یتعلق بها

خواب
اور اس سے متعلقہ چیزوں کا بیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سونے اور مجلس کے آداب کا بیان چل رہا تھا۔ آدمی خواب سونے کی حالت ہی میں دیکھتا ہے، اسی مناسبت سے خواب اور اس کے متعلقات کو بیان فرماتے ہیں۔

اچھے خوابوں کی حیثیت:

حدیث ۸۳۸:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ:سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبوَّةِ إلاَّ المُبَشِّرَاتِ. قالوا: وَمَا المُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا: نبوت میں سے سوائے مبشرات (خوش کرنے والی خبروں) کے اور کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: مبشرات (خوش کرنے والی خبریں) کیا چیز ہے؟ تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اچھے اور نیک خواب۔

جو زبان کا سچا؛ وہ خواب کا بھی سچا:

حدیث ۸۳۹:-

وعنه: أَنَّ النبيّ (ﷺ) قَالَ: إِذَا اقْتَرَبَ الزَّمَانُ لَمْ تَكَدْ رُؤْيَا الْمُؤْمِنِ تَكْذِبُ، وَرُؤْيَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءاً مِنَ النُّبُوَّةِ. (متفق عليه)

وفی روایة: أَصْدَقُكُمْ رُؤْيَا، أَصْدَقُكُمْ حَدِيثاً.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب زمانہ قریب ہوگا تو مؤمن کا خواب جھوٹا نہیں ہوگا، اور مؤمن کا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ ایک اور روایت میں یہ بھی ہے: تم میں سب سے زیادہ سچا خواب اس کا ہے جس کی بات سچی ہو۔

افادات:- یعنی جو زبان کا سچا وہ خواب کا بھی سچا ہے۔ گویا آدمی کی زبان کی سچائی کا اثر خوابوں پر بھی پڑتا ہے۔ جو زبان کا جھوٹا ہوتا ہے اس کو خواب بھی جھوٹے ہی نظر آتے ہیں۔

چھیالیسویں حصہ کا مطلب:

خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ جو بتلایا گیا، علماء نے اس کی ایک توجیہ یہ لکھی ہے کہ جب نبیٔ کریم (ﷺ) پر وحی آنے کا سلسلہ شروع ہوا اس سے پہلے نبیٔ کریم (ﷺ) کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سچے خواب دکھلانے شروع ہوئے، جیسا کہ بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی اور بعض دیگر روایتیں ہیں، اور جو چیز آپ خواب میں دیکھتے تھے، بیداری میں وہ چیز بالکل صبح کی روشنی کی طرح واضح ہو کر سامنے آجاتی تھی، یعنی وہ خواب ایک دم سچا ہو جاتا تھا، اور وہ واقعات جن کی طرف خواب میں آپ کی رہنمائی کی جاتی تھی، قریبی زمانہ ہی میں بیداری میں آپ (ﷺ)

اس کو سچا ہوتا دیکھا کرتے تھے، اور یہ سلسلہ چھ مہینہ تک جاری رہا، پھر وحی کا آنا شروع ہوا۔ اور وحی کا سلسلہ شروع ہوا وہاں سے وفات تک کا زمانہ تیئس سال کا ہے۔ تو چھ مہینوں کی نسبت تیئس سال کے ساتھ اگر دیکھی جائے تو وہ تیئس کا چھیالیسوں حصہ ہوتی ہے، اسی مناسبت سے خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا گیا ہے۔

نبی کا خواب وحی ہوتا ہے:

اور نبوت کو نبوت جو کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہی بتلائی جاتی ہے کہ اس کا اصل مادہ ''نونؔ، باؔء، ہمزہؔ'' ہے، اور خبر کو عربی زبان میں ''نَبَأٌ'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنے بندوں میں سے بعض کو چن لیا جاتا ہے، پھر فرشتوں کے ذریعہ اور دوسرے طریقوں سے ان پر وحی بھیجی جاتی ہے جو وہ لوگوں کو بتلاتے ہیں۔ وحی کے مختلف طریقے ہیں، کبھی فرشتہ بھیجا جاتا ہے، کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دل میں کوئی بات ڈال دی جاتی ہے، کبھی خواب کے ذریعہ وہ چیز بتلائی جاتی ہے۔ تو وہ شخصیت جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیب کی خبریں آتی ہوں؛ ان کو ''نبی'' کہا جاتا ہے۔

اور جن مختلف طریقوں کے ذریعہ ان شخصیات کو غیب کی خبریں بتلائی جاتی ہیں ان میں ایک طریقہ سچے خواب کا بھی ہے، اور سچے خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، لیکن جھوٹے اور ڈراؤنے خواب شیطان کی طرف سے ہوتے ہیں، جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شیطان

بندہ ٔ مومن کو پریشان کرنے اورڈرانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کرتا ہے۔اور بہت سی مرتبہ سچے خوابوں کے ذریعہ بعض وہ واقعات اور حالات جو مستقبل کے زمانہ میں پیش آنے والے ہوتے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ بندہ ٔ مؤمن کو آگاہ کر دیتے ہیں۔

تونبی کے حق میں خواب بھی وحی کا ایک طریقہ ہوا کرتا ہے، اس لئے نبی کا خواب وحی کے حکم میں ہے، جیسے: حضرت ابراہیم علی نبیّنا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کررہے ہیں، تواس کووحی سمجھ کراس کا تذکرہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا جارہا ہے۔تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کو جو باتیں پہنچائی جاتی تھیں،اس کا ایک طریقہ یہ بھی تھا۔اب نبوت تو ختم ہوچکی، نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی ہیں، آپ کے بعد کوئی اورنبی تو آنے والے نہیں ہیں، لیکن کائنات میں پیش آنے والے بعض واقعات سے متعلق بعض چیزوں کااشارہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو سچے خواب کے ذریعہ دیدیتے ہیں، اس معنیٰ کرسچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں، اسی کو مبشرات سے تعبیر کیاجاتاہے کہ کسی نے کسی کے حق میں، یااپنے حق میں کوئی اچھی چیز دیکھی۔اور کبھی ایسا بھی ہوتاہے کہ کسی بندے کودوسرے کے حق میں کوئی چیز دکھلائی جاتی ہے کہ فلاں کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کوئی خیر اور بھلائی پہنچنے والی ہے،پھر وہ بیان کرتا ہے کہ فلاں کے متعلق میں نے یہ خواب دیکھا؛تویہ بھی مبشرات کے قبیل سے ہی ہوتا ہے۔

خواب شرعی حجت نہیں:

لیکن خواب کے معاملہ میں ایک بات یاد رہے کہ اس کو اس کی حد میں رکھنے کی ضرورت ہے۔لوگوں کا مزاج اس سلسلہ میں دو طرح کا ہے،بعض تو وہ ہیں جو اس کے اوپر بالکلیہ اعتبار اور اعتماد نہیں کرتے اور اس کو کوئی حیثیت ہی نہیں دیتے؛ یہ بھی صحیح نہیں ہے جبکہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ فرمارہے ہیں،اور خوش کرنے والی کوئی چیز اگر خود دیکھے، یا کوئی دوسرا دیکھے ، تو اس کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مبشرات فرمارہے ہیں ؛اس سے معلوم ہوا کہ اس کا کوئی درجہ اور مقام تو ہے۔لیکن اتنا بھی نہیں جتنا کہ آج کل بعض لوگ دیتے ہیں اور خواب میں دیکھی ہوئی چیز کے متعلق یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے وحی کے ذریعہ سے آئی ہوئی چیز سو فیصد پختہ ہوا کرتی ہے ایسے ہی یہ خواب کی چیز بھی ہے۔یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ہم اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ نبی کے علاوہ کسی کا بھی خواب شرعی طور پر حجت نہیں بن سکتا۔نیک آدمی بھی جو خواب دیکھے اس کا وہ خواب شرعی حجت اور دلیل نہیں ہے۔

کیا اچھا خواب دیکھنے کے بعد اعمال چھوڑدے:

تو یہ خواب بندۂ مؤمن کو خوش کرنے کا کام کرتے ہیں ،اس سے آدمی اپنے حق میں اچھی امیدیں اور توقعات تو قائم کرسکتا ہے،اور خواب دکھلائے جانے کو -چاہے اس کو دکھلایا گیا ہو یا

کسی اور کو دکھلایا گیا ہو- اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے فالِ نیک سمجھ سکتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے خواب ہی پر اعتماد کر کے بیٹھ جانا، اور یوں سمجھ لینا کہ خواب میں یہ چیز دکھلائی گئی، اس لئے اب یہ مقام اور مرتبہ مجھ کو مل ہی گیا، اب مجھے کسی عمل کی ضرورت نہیں؛ تو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اور نہ ایسے خواب کا اتنا مقام ہے۔ اصل مدارِ نجات آدمی کے بیداری کے اعمال پر ہے۔

بعض لوگ اپنے خواب کی وجہ سے یوں سمجھتے ہیں کہ ہم نے بہت بڑا مرتبہ حاصل کرلیا۔ حضرت خواجہ محمد معصوم صاحب سرہندی مجددی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے نمبر کے صاحبزادے ہیں، اور حضرت مجدد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین مقرر کیئے گئے تھے، ان کے مکتوبات میں ہے، کسی مرید نے کوئی خواب دیکھا تو اس کو تنبیہ فرمائی کہ: اگر خواب میں کسی کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا گیا؛ تو کیا اس کی وجہ سے وہ بادشاہ بن گیا؟ یعنی مَیں اور آپ اگر خواب میں یہ دیکھیں کہ ہم کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی مل گئی ہے؛ تو کیا دوسرے دن اُٹھ کر یوں کہیں گے کہ مَیں وزیرِ اعظم بن گیا؟

اچھے خواب کا اشتہار نہ دے:

اس لیے خواب کی وجہ سے آدمی اپنے متعلق بہت زیادہ خوش فہمی میں نہ رہے، اور اس کی وجہ سے اعمال کی طرف سے غفلت برتنا بڑی کوتاہی کی بات ہے۔ جیسے کسی نے خواب میں دیکھا

کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے میرے لئے جنت کا فیصلہ کردیا تو ساری دنیا میں اس کا اشتہار دینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے، اس خواب کی وجہ سے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے اچھی امید قائم کرے، لیکن اعمال میں کوتاہی نہ کرے ، بلکہ اور زیادہ اعمال کا اہتمام کرے۔

اور خواب تو اپنی جگہ پر خواب ہے، مَیں آپ کو پہلے بھی بتلا چکاہوں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتنا اونچا مقام رکھتے تھے ، اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ولی بھی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور صحابہ میں سب سے اونچے مقام پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جن کے متعلق ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ انبیاء کرام کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں ، ان کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی کیفیت:

ایک مرتبہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) مختلف اعمال کا تذکرہ کررہے تھے کہ جو روزے رکھنے والے ہیں ان کو باب الرّیان سے جنت میں داخل کیاجائے گا ،اور فلاں عمل کرنے والے کو فلاں دروازہ سے داخل کیاجائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ نیکی کے مختلف اعمال کرنے والوں کو اسی نیکی کی مناسبت سے جنت کے اُس دروازہ سے داخل کیاجائے گا۔ اس پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! جس کے حق میں جنت کے ایک

دروازہ سے بھی داخل ہونے کا فیصلہ کر دیا گیا تو اس کو ضرورت نہیں ہے کہ دوسرے دروازہ سے جائے، اس کی نجات کے لئے وہ بات کافی ہے ، لیکن پوچھنے کی حد تک میں پوچھ رہا ہوں کہ کوئی ایسا بھی اللہ کا بندہ ہو گا جس کو جنت کے تمام دروازوں سے داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی؟ تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: ہاں! اور امید کرتا ہوں کہ وہ آپ ہوں گے (بخاری شریف: باب الریان للصائمین)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق اور بھی بہت ساری روایتیں ہیں ، حالاں کہ یہ وہ حضرات تھے جن کو نبی کریم (ﷺ) نے اپنی زبانِ مبارک سے جنت کی خوش خبریاں سنائیں ، عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں ،اس کے باوجود حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ فرماتے تھے : کاش ! میں کوئی سبزہ ہوتا جس کو کوئی جانور کھا جاتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ (ﷺ) نے فرمایا: اے عمر! تم جس گلی سے گذرتے ہو شیطان راستہ بدل دیتا ہے (بخاری و مسلم) لیکن اس کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ سے –جو حضور اکرم (ﷺ) کے راز دار تھے، جن کو نبیٔ کریم (ﷺ) نے تمام منافقین کے نام بتلائے تھے - کہتے تھے: اے حذیفہ! ذرا بتلاؤ! آپ کو حضور (ﷺ) نے منافقین کی جو فہرست بتلائی ہے اس میں کہیں عمر کا نام تو نہیں ؟

جن حضرات کو حضور (ﷺ) نے بالمشافہہ جنت کی خوشخبریاں سنائیں۔نعوذ باللہ ! ایسا نہیں تھا کہ ان کو حضوراقدس (ﷺ) کے ارشادات پر شک و شبہ ہو،بلکہ آپ (ﷺ) کی باتوں پر ان حضرات کو ایسایقین تھا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا،لیکن حضور (ﷺ) کی زبانِ مبارک سے براہِ راست ان خوشخبریوں کوسننے کے باوجود وہ لوگ اعمال کے معاملہ میں غفلت نہیں برتتے تھے،اوراپنے معاملہ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتے تھے،بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے تھے۔

اور ہماراحال یہ ہے کہ کسی ایک نے آکرسنادیاکہ آپ کے متعلق میں نے خواب دیکھا کہ آپ تو بڑے اونچے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں ،اور نور کی بارش ہو رہی ہے ؛تو بس!ہم ایسے مطمئن ہوکر بیٹھ جاتے ہیں کہ اب کسی عمل کی ہمیں ضرورت ہی نہیں۔یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔جو آدمی ایسے خواب سننے کے بعد اعمال کی طرف سے غفلت برتے،اس کے لئے بڑی ہلاکت کی بات ہے ،حالاں کہ ایسا خواب سننے کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھتے ہوئے اعمال میں مزید کوشش کرنی چاہیے۔

شیطان اور شیخ جیلان رحمۃ اللہ علیہ :

بعض مرتبہ بیداری میں ایسی کوئی چیز ہوجاتی تب بھی اللہ کے مخصوص بندے اس معاملہ میں غفلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ سیدنا حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ:ایک مرتبہ آپ عبادت میں مشغول تھے، اچانک ایک بادل نظر آیا ،پھر ایک نور نظر

آیا اور اس نور کے اندر سے ایک آواز آئی: اے عبد القادر! تم پر سے ہم نے احکام کو اٹھالیا، اب شریعت کے احکام کے آپ مکلف نہیں رہے؛ آپ کو عبادت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ شیطانی دھوکہ ہے۔ انہوں نے سوچا کہ شریعت کے احکام تو اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہیں اٹھائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کا اتنا اونچا مقام تھا، ان سے بھی یہ معاف نہیں کئے گئے؛ تو میرے اوپر سے یہ چیزیں کہاں معاف ہو سکتی ہیں ؟ چناں چہ فوراً انہوں نے لاحول پڑھا اور کہا: اے مردود! ہٹ جا؛ بس اتنا کہنا تھا کہ ایک دم اندھیرا سا چھا گیا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آواز آئی: اے عبد القادر! آپ اپنے علم کی وجہ سے بچ گئے؛ ورنہ میں نے اس طریقہ سے بہت سے نیک بندوں کو گمراہ کیا ہے۔ حضرت نے کہا: اے مردود! مَیں اپنے علم کی وجہ سے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے فضل کی وجہ سے بچ سکا۔ عارفین لکھتے ہیں کہ یہ دوسرا داؤ پہلے سے بھی زیادہ خطرناک تھا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ مبشرات اپنی جگہ پر اہمیت رکھتے ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی اعمال کے سلسلہ میں کوتاہی برتے۔ اگر کسی کے متعلق کوئی چیز نظر آئے تو اس کو اپنے متعلق اللہ تعالیٰ سے امیدیں تو قائم کرنی چاہئیں، لیکن پھر اعمال کے اندر ذرّہ برابر کوتاہی سے کام نہ لے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہے، اور عمل کے اندر اور زیادہ مشغول رہے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوائی گئی یہ بشارت اس کے لئے حقیقت اور فالِ نیک ثابت ہو۔ دلیل یہ ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب قیام اللیل میں مجاہدہ فرماتے اور حضرت

عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا عرض کرتیں کہ آپ اتنی محنت کیوں کرتے ہیں ؟ آپ کو تو اللہ تعالیٰ نے معاف فرمادیا ہے، تو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ”أَفَلَا أَكُونَ عَبدًا شَكُورًا“

خواب میں حضور اکرم (ﷺ) کی زیارت کے لیے کوئی عمل کرنا:

حدیث ۸۴۰:-

وعنه، قَالَ : قَالَ رسول الله (ﷺ) : مَنْ رَآنِي فِى الْمَنَامِ فَسَيَرَانِي فِى الْيَقْظَةِ - أَوْ كَأَنَّمَا رَآنِي فِى الْيَقْظَةِ - لَا يَتَمَثَّلُ الشَّيْطَانُ بِي.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا : جس نے مجھے خواب میں دیکھا ؛وہ مجھے بیداری میں دیکھے گا۔یا یہ فرمایا: گویا اس نے مجھے بیداری میں دیکھا، اس لئے کہ شیطان میری شکل اختیار نہیں کرسکتا۔

افادات:- حضور اکرم (ﷺ) کو خواب میں دیکھنے کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ بغیر کسی کوشش کے حضور اکرم (ﷺ) کی زیارت خواب کے اندر نصیب ہوجائے؛ تو یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔باقی اس کے لئے اعمال کا اہتمام کرنا جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ فلاں نماز پڑھی اور پھر اتنی مرتبہ درود پڑھا؛ تو حضور اکرم (ﷺ) کی زیارت ہوگئی۔تو اس سلسلہ میں علماء کے بھی دو گروہ ہیں، بعض حضرات نے اس کے لئے وظیفے بھی بتلائے ہیں ، خود بھی کرتے تھے اور دوسروں کو بھی کرنے کی اجازت دیتے تھے۔

زیارت کا بہترین عمل:

اور بعض حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ تکلف کرکے ان چیزوں کے اندر پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کے بجائے آدمی نبی کریم (ﷺ) کی سنتوں کی پیروی کا اہتمام کرے، جتنا زیادہ اتباعِ سنت کا اہتمام کرے گا؛ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ خواب میں حضور اکرم (ﷺ) کی زیارت بھی نصیب فرمادیں گے۔

ایک مرتبہ ایک آدمی نے آکر حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا: حضرت! کوئی ایسا وظیفہ بتلادیجئے کہ خواب میں حضور اکرم (ﷺ) کی زیارت ہوجائے۔ تو جواب میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بھائی! بڑا حوصلہ ہے۔ ہمیں تو گنبدِ خضراء ہی خواب میں نظر آجائے؛ تو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آکر کسی نے کہا: حضرت! دعا فرمادیجئے، یا کوئی وظیفہ بتلایئے کہ خواب میں حضور اکرم (ﷺ) کی زیارت نصیب ہوجائے۔ تو حضرت نے بھی جواب میں یہی فرمایا: بھائی! جو تم کہہ رہے ہو وہ بڑی جرأت کی بات ہے، ہم تو بہت ڈرتے ہیں کہ پتہ نہیں! ہم اس کا حق ادا کرسکیں گے یا نہیں۔ زیارت کا جو ادب ہے؛ وہ ہم سے ادا ہوسکے گا یا نہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ کسی سے ان کی ملاقات کا از خود مطالبہ کرے، تو وہاں تو آداب کی رعایت کرتے ہوئے جانا پڑے گا۔ اور اگر کوئی بڑی شخصیت از خود اس کے یہاں آجائے، تو آداب کی توفیق بھی دی جائے گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اگر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت از خود کرادیں گے؛ تو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آداب کی رعایت کی توفیق بھی دی جائے گی۔ لیکن اگر آدمی از خود اہتمام کرتا ہے تو اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ کہیں کسی ادب کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے۔ اس لئے بعض حضرات اس معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت:

ہمارے اکابر کا حال تو یہ تھا کہ مدینہ منورہ کی حاضری پر بھی روضۂ مبارک پر ڈرتے ڈرتے حاضر ہوتے تھے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں صوفی اقبال صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ: حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اقدامِ عالیہ کی طرف سے سلام پیش فرماتے تھے۔ یعنی جالی کے سامنے جو سوراخ بنے ہوئے ہیں جہاں سے عام طور پر صلوٰۃ و سلام پڑھا جاتا ہے وہاں سے تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا چہرۂ انور بالکل سامنے آتا ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کبھی ادھر سے سلام نہیں پڑھتے تھے، بلکہ قدمِ مبارک کی طرف سے سلام پڑھتے تھے۔ ایک دو مرتبہ حضرت مواجہہ شریف پر گئے تو کسی نے پوچھا: اس روز آپ کیوں تشریف لے گئے تھے؟ فرمایا: حضرت مولانا اسعد صاحب تھے، ان کے ساتھ گیا تھا، یا حضرت جی مولانا یوسف صاحب تھے؛

ان کے ساتھ گیا تھا، ورنہ مجھ اکیلے کی جرأت نہیں ہوتی کہ کبھی سامنے جاؤں۔ ان حضرات کا تو یہ حال تھا۔ اس لئے خواب میں از خود دیکھنے کی کوشش کرنے کی اگر چہ گنجائش تو ہے، لیکن اس میں خطرات بھی بہت ہیں۔

اگر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دوسرے حلیہ میں دیکھا:

دوسرا یہ کہ ”نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جس نے خواب میں دیکھا اس نے حضور ہی کو دیکھا، اس لئے کہ شیطان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل نہیں بنا سکتا“ اس سے کیا مراد ہے؟

اس سلسلہ میں متقدمین کے یہاں تو یہ تھا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو حلیۂ شریفہ تھا (یعنی آپ کا چہرۂ انور، آپ مبارک آنکھیں، اور آپ کے ہونٹ مبارک، اور آپ کی داڑھی مبارک، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل و صورت اور آپ کا حلیۂ مبارکہ جو کتابوں میں لکھا ہے) اگر اسی حلیۂ شریفہ میں دیکھا ہے؛ تب تو صحیح ہے، ورنہ نہیں۔

چناں چہ شمائل ترمذی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے آکر ایک آدمی نے کہا: مَیں نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خواب میں دیکھا ہے۔ تو اس سے پوچھا: اچھا بتلاؤ! تم نے جس شخصیت کو خواب میں دیکھا؛ ان کا حلیہ کیسا تھا؟ جب اس نے حلیہ بیان کیا اور وہ ہو بہو وہی تھا جو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تھا؛ تب کہا: ہاں! تم نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا ہے۔ (شمائل ترمذی/بَابُ: مَا جَاءَ فِي رُؤْيَةِ رَسُولِ اللّٰهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فِي الْمَنَامِ)

اس لئے ہماری ایک جماعت جس میں بڑے بڑے اکابر ہیں ،اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما خود بھی ہیں،وہ فرماتے ہیں: دیکھنے والے نے اسی حلیۂ شریفہ میں دیکھا ہو جو آپ کا تھا؛تب تو صحیح ہے۔بلکہ ان میں سے بعض حضرات نے تو یہاں تک کہا کہ :وفات کے وقت نبیٔ کریم (ﷺ) کا جو حلیہ تھا اسی حلیہ میں دیکھا ہو ؛تب تو درست ہے۔اگرچہ انہی میں سے بعض حضرات اس طرف بھی گئے ہیں کہ پوری حیاتِ طیبہ میں آپ (ﷺ) کا جو حلیہ رہا تھا، جوانی والا حلیہ میں دیکھا ہو یا بڑھاپے والے حلیہ میں دیکھا ہو،مطلب یہ ہے کہ پوری حیاتِ طیبہ کے کسی بھی دور میں آپ (ﷺ) کا جو حلیہ رہا ہے، اس میں سے کسی بھی حلیہ میں دیکھا ہو؛تب تو آپ (ﷺ) ہی کو دیکھا ،ورنہ نہیں ۔

جب کہ دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ: ایسا نہیں ہے،بلکہ دوسرے حلیہ میں بھی اگر دیکھا ہو،اس صورت میں بھی کہا جائے گا کہ آپ (ﷺ) ہی کو دیکھا۔

چناں چہ ہمارے اکابر میں اس سلسلہ میں یہ تین خیال ہیں :-

ا :-حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے : نبیٔ کریم (ﷺ) کا حلیہ جو کتابوں میں ہے، اس حلیہ میں دیکھا ہو تو دیکھا ؛ورنہ نہیں۔

۲:- حضرت شاہ رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: اپنے زمانہ کے اہلِ صلاح اور نیک لوگوں میں سے کسی کی شکل میں دیکھا ہو، تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا، دوسری کسی شکل میں دیکھا ہو؛ تو نہیں۔

۳:- لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: کسی بھی شکل میں دیکھا ہو، لیکن خواب دیکھتے وقت خواب دیکھنے والے کے دل کو یقین ہو کہ میں جس شخصیت کو دیکھ رہا ہوں، وہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، تو چاہے جس شکل میں بھی دیکھا ہو، اس نے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کو دیکھا ہے۔

دینداری جانچنے کا معیار:

اب جو شکل دیکھی ہے وہ اگر ایسی ہے جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شایانِ شان نہیں ہے؛ تو کیا حکم ہے؟ تو اس سلسلہ میں کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دیکھنے والے کی دینداری میں کچھ کمزوری و کوتاہی ہے۔ گویا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خواب میں زیارت آدمی کی دینداری کو جانچنے کا معیار ہے کہ وہ دینداری میں کس مقام پر ہے۔ چناں چہ نواب قطب الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مظاہرِ حق میں یہی بات لکھی ہے کہ اہلِ سلوک کے یہاں یہ ایک آلہ ہے، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جس حلیہ میں دیکھا ہوگا اسی مناسبت سے اس کے متعلق اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے تدین میں کس مقام پر ہے۔

اور حضور اکرم (ﷺ) نے یہ بھی فرمایا: جس نے مجھے خواب میں دیکھا وہ مجھے بیداری میں بھی دیکھے گا۔ علماء فرماتے ہیں: یہ حکم حضور اکرم (ﷺ) کے زمانہ کا ہے، یعنی نبیؐ کریم (ﷺ) جب تک لوگوں کے درمیان موجود رہے آپ نے پردہ نہیں فرمایا تھا، وہاں تک اگر کوئی آدمی کسی اور جگہ آپ کو خواب میں دیکھتا تو اس کے لئے گویا حضور (ﷺ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کو بیداری میں بھی میری زیارت کروائے گا۔ لیکن آپ (ﷺ) کی وفات کے بعد کسی نے دیکھا تو اس کے لئے یہ حکم نہیں ہے۔

روضۂ اقدس کی زیارت نصیب ہوگی:

حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ: حضور اکرم (ﷺ) کے زمانہ میں جو آدمی آپ (ﷺ) کو خواب میں دیکھتا تو یہ گویا اس کے لئے بشارت تھی کہ اس کو بیداری میں بھی دیکھنا نصیب ہوگا۔ اور اِس زمانہ میں جس نے خواب میں دیکھا تو گویا یہ اس کے لئے اس بات کی بشارت ہے کہ اس کو روضۂ اقدس کی زیارت نصیب ہوگی۔ بہرحال! حضراتِ علماء کے اس سلسلہ میں یہ سارے نظریات ہیں۔

شیطان کا حضور (ﷺ) کی شکل نہ بنا سکنے کی وجہ:

”لَا یَتَمَثَّلُ الشَّیْطَانُ بِی“ شیطان میری شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس بات پر قدرت نہیں دی ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) کی شکل اختیار کرے۔ اس کی وجہ علماء نے لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں ایک نام ”ہادی“ یعنی ”ہدایت دینے والا“ ہے۔ اور اللہ کا ایک نام ”مضل“ یعنی ”گمراہ کرنے والا“ بھی ہے۔ گمراہی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آتی ہے، اور ہدایت بھی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات میں دونوں باتیں موجود ہیں۔ ہدایت اور ضلالت؛ یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفتیں ہیں۔ حضور اکرم (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے اسم ہادی کا مظہر ہیں، اور شیطان اللہ تعالیٰ کے اسم مضل کا مظہر ہے۔ تو جو ذات اسم ہادی کا مظہر ہو اس کی شکل اختیار کرنے کی قدرت اسم مضل کے مظہر کو نہیں دی گئی۔

اچھا یا برا خواب دیکھے؛ تو کیا کرے؟:

حدیث ۱۸۴۱:-

وعن أَبِي سعيدٍ الخدرِيِّ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ سَمِعَ النبيَّ (ﷺ) يقول: إِذَا رَأَى أَحَدُكُمْ رُؤْيَا يُحِبُّهَا، فَإِنَّمَا هِيَ مِنَ اللهِ تَعَالَى، فَلْيَحْمَدِ اللهَ عَلَيْهَا، وَلْيُحَدِّثْ بِهَا- وفي رواية: فَلَا يُحَدِّثْ بِهَا إِلَّا مَنْ يُحِبُّ- وَإِذَا رَأَى غَيْرَ ذٰلِكَ مِمَّا يَكْرَهُ فَإِنَّمَا هِيَ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَلْيَسْتَعِذْ مِنْ شَرِّهَا، وَلَا يَذْكُرْهَا لِأَحَدٍ؛ فَإِنَّهَا لَا تَضُرُّهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی ٔکریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تم میں سے کوئی آدمی جب ایسا خواب دیکھے جو اسے پسند ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، لہٰذا بیدار ہونے کے بعد اس پر اللہ کی حمد بیان کرے(الحمدللہ کہے) پھر جو آدمی ایسا ہو جو اس سے محبت رکھتا ہے اس کے سامنے اس کا تذکرہ کرے۔ اور اگر کوئی ایسا خواب دیکھے جو پسند نہیں ہے (برا خواب دیکھے) تو وہ شیطان کا اثر ہے، لہٰذا جب بیدار ہو تو شیطان کے شر سے پناہ مانگے(یعنی "أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" پڑھے) اور پھر اس کا کسی کے سامنے تذکرہ نہ کرے ؛تو(ان شاء اللہ) اس کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

افادات:- اچھا خواب دیکھے تو اللہ کا شکر ادا کرے اور جو آدمی محبت رکھتا ہو اور جو خیر خواہ ہو؛ ایسے دوست کے سامنے تذکرہ کرے۔ کسی ایسے آدمی کے سامنے تذکرہ نہ کرے جو خیر خواہی نہیں کرتا، اس لئے کہ اچھا خواب ہمارے لئے اچھی علامت ہے، اور جو خیر خواہ اور بھلائی چاہنے والے کے سامنے اگر بیان کروگے تو وہ خوش بھی ہو گا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی اچھی تعبیر بھی سوچے گا، اور جو برائی چاہنے والا ہو گا وہ اس کو سن کر مزید ضیق اور تنگی میں مبتلا ہو گا، اور اس کا کوئی اچھا مطلب بھی نہیں لے گا؛ تو اس سے کچھ نقصان پہنچ سکتا ہے۔

برا خواب شیطان کا اثر ہوتا ہے، اس کے نقصان سے بچنے کی ترکیب یہی ہے کہ جب سو کر اٹھے تو "أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" پڑھے۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ بائیں طرف تین

مرتبہ تھتکار دے،اور پھر اس کا کسی کے سامنے تذکرہ نہ کرے؛ تو ان شاء اللہ اس کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

بعض لوگ کوئی برا خواب دیکھتے ہیں تو ڈرتے رہتے ہیں ، حضور اکرم (ﷺ) نے اس خواب کے شر سے بچنے کا بہترین طریقہ بتلا دیا کہ کسی کے سامنے اس کو بیان مت کرو، اور آنکھ کھلتے ہی ”أَعُوذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھ کر بائیں طرف تین مرتبہ تھو تھو کر لو۔

براخوب ؟ پرواہ نہیں :

حدیث ۸۴۲:-

وعن أَبِي قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ النبيُّ (ﷺ) : الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ -(وفی روایة) الرُّؤْيَا الحَسَنَةُ- مِنَ اللهِ، وَالحُلُمُ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَمَنْ رَأَى شَيْئاً يَكْرَهُهُ فَلْيَنْفُثْ عَنْ شِمَالِهِ ثَلَاثاً، وَلْيَتَعَوَّذْ مِنَ الشَّيْطَانِ؛ فَإِنَّهَا لا تَضُرُّهُ.**

(متفقٌ عَلَيْهِ)

((النَّفْثُ)): نَفْخٌ لَطِيفٌ لا رِيقَ مَعَهُ

ترجمہ :- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا : اچھا خواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے،اور برا خواب شیطان کی طرف سے ہے۔پس جو آدمی ایسا خواب دیکھے جسے ناپسند سمجھتا ہے، تو تین مرتبہ بائیں طرف تھو تھو کرلے، اور ”أَعُوذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ“ پڑھ لے؛تو ان شاء اللہ اس کا کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

افادات:-چناں چہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں ان کا جملہ بخاری شریف میں نقل کیا گیا ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) کا یہ ارشاد سننے سے پہلے مَیں جب کوئی برا خواب دیکھتا تھا تو بہت ڈرتا اور پریشان رہتا تھا، کہ اب کیا ہو گا؟ لیکن حضور اکرم (ﷺ) کا یہ ارشاد سننے کے بعد خطرناک خواب دیکھتاہوں تب بھی مجھے کوئی پرواہ نہیں رہتی۔بس! بیدار ہونے کے بعد فوراً "أَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" پڑھنے کے بعد تین مرتبہ تھتکار لیا کرتا ہوں۔اب مجھے یقین ہے کہ ان شاء اللہ کوئی نقصان نہیں ہو گا۔حضور اکرم (ﷺ) نے کیسی بہترین ترکیب بتلادی۔

برا خواب دیکھتے ہی آنکھ کھل جائے ؛تو کیا کرے؟ :

حدیث ۸۴۳:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ (ﷺ) قَالَ: إِذَا رَأَى أَحَدُكُمُ الرُّؤْيَا يَكْرَهُهَا ،فَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهِ ثَلَاثًا، وَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ ثَلَاثًا، وَلْيَتَحَوَّلْ عَنْ جَنْبِهِ الَّذِي كَانَ عَلَيْهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب کوئی ایسا خواب دیکھے جسے وہ پسند نہیں کرتا، تو اسے چاہیے کہ بائیں طرف تین مرتبہ تھتکار دے اور تین مرتبہ "أَعُوْذُبِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھے، اور کروٹ بدل لے۔

افادات:- ایک تو یہ ہے کہ برا خواب دیکھا اور صبح اُٹھا، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فوراً آنکھ کھل جاتی ہے پھر دوبارہ سونا ہے، اس کے لئے ترکیب بتلائی کہ برا خواب دیکھا اور آنکھ کھل گئی تو پہلے تین مرتبہ بائیں طرف تھتکار کر، تین مرتبہ "أَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ" پڑھ لے، اور پہلے جس کروٹ پر سویا ہوا تھا اس کروٹ کو بدل لے۔ دور اِن نیند اگر آنکھ کھل جائے، تو یہ حکمتِ عملی بتائی۔

سب سے بڑا بہتان:

حدیث ۸۴۴:-

وعن أَبِي الأَسقعِ واثِلَةَ بن الأسقعِ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رسولُ الله** (ﷺ) **: إِنَّ مِنْ أَعْظَمِ الفِرَى أَنْ يَدَّعِىَ الرَّجُلُ إِلَى غَيرِ أَبِيهِ، أَوْ يُرِى عَيْنَهُ مَا لَمْ تَرَ. أَوْ يَقُولَ عَلَى رسول الله** (ﷺ) **مَا لَمْ يَقُلْ.** (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ آدمی اپنی نسبت اپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف کرے (اپنے باپ کے نام کی جگہ پر دوسرے آدمی کا نام لکھنا بہت بڑا بہتان ہے) اور اپنی آنکھ کو وہ چیز دکھلائے جو اس نے نہیں دیکھی۔ اور حضور اکرم (ﷺ) کی طرف نسبت کرکے ایسی بات کہے جو آپ (ﷺ) نے نہیں فرمائی۔

افادات:- بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کسی سے کوئی منفعت اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے کہہ دیتے ہیں کہ آپ کے متعلق تو مَیں نے ایسا عمدہ خواب دیکھا کہ آپ تو جنت

میں سیر کررہے تھے۔ یہ سن کر وہ خوش ہو گیا، پھر اس سے اپنا مقصد نکلوالیا، حالاں کہ ایسا کوئی خواب اس نے نہیں دیکھا تھا۔ یا کبھی کسی پر رعب جمانے اور ڈرانے کے لئے جھوٹا خواب بیان کردیتے ہیں ؛ تو یہ بہت بڑا بہتان ہے۔

اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنا تو بیداری کے اندر بھی برا ہے، لیکن خواب کی طرف جھوٹی نسبت کرنا بہت زیادہ برا ہے۔ اس لئے کہ شروع میں آیا تھا کہ خواب کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ بتلایا گیا ہے، اس لئے اس میں جھوٹ بولے گا تو گویا وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ چیز بتلائی گئی ہے، اس صورت میں جھوٹ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہورہی ہے، اس لئے اس پر بڑی سخت وعید فرمائی گئی ہے۔

چناں چہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ جو آدمی ایسا کرے گا، قیامت کے دن اس کو جَو یا گیہوں کے دو دانے دیئے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ ان دونوں میں گرہ لگاؤ، اور وہ ہرگز گرہ نہیں لگا سکے گا اور اس کو عذاب ہوتا رہے گا (بخاری شریف:بَاب مَنْ كَذَبَ فِي حُلُمِهِ) اب دیکھنے میں تو یہ ایک معمولی چیز نظر آتی ہے، لیکن اس پر اتنا سخت عذاب ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) کی طرف غلط بات کی نسبت کرے کہ حضور اکرم (ﷺ) نے یوں فرمایا، حالاں کہ حدیث میں ایسا نہیں آیا ہے؛ تو یہ بھی بہت بڑا بہتان ہے اور اس پر بڑی سخت وعید ہے، حدیث پاک میں آتا ہے حضور اکرم (ﷺ) فرماتے ہیں : مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ

مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (بخاری ومسلم) جو آدمی جان بوجھ کر میری طرف غلط بات کی نسبت کرے، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ لہٰذا خواب کے متعلق بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

اس روایت میں تین باتیں آئیں ، ایک خواب سے متعلق بھی ہے اس لئے یہ روایت اس باب میں پیش فرمائی۔

كتَاب السَّلَام

سلام کے احکام و آداب

باب فضل السلام و الامر بافشائه

سلام کی فضیلت

اور

سلام کو عام کرنے کا حکم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیا عنوان قائم کیا ہے: "کتاب السلام" سلام سے متعلق احکام وآداب اور اس سے تعلق رکھنے والی چیزیں۔ اس عنوان کے ماتحت بہت سارے ذیلی عنوانات ہیں۔ پہلا عنوان ہے: سلام کی فضیلت اور شریعت کی طرف سے سلام کو عام کرنے کا حکم۔ یعنی نہ صرف سلام کرو، بلکہ سلام کو پھیلاؤ۔

اجازت لیے بغیر داخل نہ ہو:

حدیثِ پاک میں ہر مسلمان کو -چاہے اس کو آپ پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں -سلام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ آیتیں پیش کی ہیں۔ سب سے پہلے سورۂ نور کی ایک آیت ہے جس میں استیذان کا حکم دیا گیا ہے کہ کسی کے گھر میں جب آدمی داخل ہونا چاہے، تو پہلے اجازت لے لے۔ زمانۂ جاہلیت میں اگر کوئی آدمی کسی کے گھر میں داخل ہونا چاہتا تو اجازت لینا ضروری نہیں سمجھا جاتا تھا، بس! سیدھے اندر داخل ہو جاتا تھا، خاص کر ملنے جلنے والوں اور رشتہ داروں کے لئے تو اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جب پردہ کا حکم نازل کیا گیا تو اس کے بعد کسی کے گھر میں داخل ہونے کے واسطے اجازت لینے کو ضروری قرار دیا گیا۔ یہ اتنا مہتم بالشان اور اہم حکم ہے کہ اس کو بیان کرنے کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے کئی آیتیں نازل

فرمائیں، لیکن ہمارے معاشرہ میں اس کی طرف سے بڑی غفلت برتی جارہی ہے ،بہت سے دیندار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس معاملہ میں غفلت برتتے ہیں ۔

استیذان کب؟اور کب نہیں ؟:

باری تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا (النور :۲۷)﴾ اے ایمان والو !نہ داخل ہوؤان گھروں میں جو تمہارے گھروں کے علاوہ ہیں، یہاں تک کہ پہلے اجازت لے لو اور گھر والوں کو سلام کرلو۔ایک تو وہ گھر جو آدمی کا اپنا مخصوص ہے، جس میں وہ تنہا رہتا ہے،اس کے علاوہ کوئی اور اس کے اندر رہائش پذیر نہیں ہے، یہاں تک کہ ماں باپ ، بھائی بہن اور دوسرا کوئی بھی نہیں رہتا۔یا اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے،بچے وغیرہ بھی نہیں رہتے کہ اگر جائے تو تالا لگا کر جائے،اورآئے تو تالا کھول کر بسم اللہ کہہ کر داخل ہوجائے؛تو اس میں داخل ہونے کے لئے کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

اور اگر گھر کی ملکیت باپ کی ہے، اسی میں وہ رہتا ہے اور اس گھر میں تنہا نہیں ہے بلکہ اس کے ماں باپ ، بھائی بہن، اور دوسرے اعزہ بھی رہائش پذیر ہیں ۔یا کسی پرائے آدمی کا گھر ہے؛تو ان تمام صورتوں میں گھر میں داخل ہونے سے پہلے آدمی کو اجازت لینی یا اطلاع کرنی چاہیے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ بات خاص طور پر سکھائی تھی۔

کیا تم یہ چاہتے ہو کہ...؟:

ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میں گھر میں میری ماں کے ساتھ رہتا ہوں، کیا میں گھر میں اجازت لے کر جاؤں؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں۔ اس نے پھر کہا: میرے گھر میں صرف میری ماں ہی رہتی ہے؛ پھر بھی؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا: ہاں! پھر بھی۔ اس نے پھر کہا: مَیں تو ان کی خدمت کرتا ہوں؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کیا تم یہ چاہتے ہو کہ ماں کو ننگی حالت میں دیکھو؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: پھر اجازت لے کر داخل ہوؤ۔ (موطا: باب الاستیذان)

اس لئے کہ آدمی گھر میں جب تنہا ہوتا ہے، تو بہت سی مرتبہ اس کو اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ستر کھولنے کی نوبت آتی ہے، جیسے: کسی کو ران میں کوئی تکلیف ہے، جب لوگوں کے درمیان ہوتا ہے تو ستر نہیں کھول پاتا، اس لئے جب دیکھتا ہے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے، تو اس موقعہ کو غنیمت سمجھتا ہے کہ لاؤ! ذرا دیکھ لوں کیا تکلیف ہے اور دوا بھی لگا لوں۔

یا کبھی کپڑے بدلنے کی غرض سے آدمی یہ سمجھ کر کپڑے نکالتا ہے کہ گھر کا دروازہ بند ہے، اور گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اب وہ ستر کھول کر بیٹھا ہے اور کوئی آدمی گھر میں گھس آیا؛ تو کیا منظر ہو گا؟

اسی چیز کی طرف نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے متوجہ کیا کہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی اماں اکیلی رہتی ہیں، اور اس موقعہ پر انہوں نے کسی ضرورت سے یہ سمجھ کر اپنا ستر کھول رکھا ہے کہ گھر میں مَیں

تنہا ہوں، کوئی اور نہیں ہے، اور آپ بغیر اجازت کے اندر گھس گئے، تو اس صورت میں آپ کے لئے ایسی نوبت آئے گی کہ آپ کی نظر ان کے ستر پر پڑے گی۔ اس لئے آدمی کے لئے ضروری قرار دیا گیا کہ چاہے ماں باپ، بھائی بہن، یا دوسرے رشتہ دار رہتے ہوں؛ تب بھی اجازت لے کر گھر میں جائے۔

تب اجازت لینا ضروری نہیں:

البتہ گھر میں اکیلی بیوی ہو، اس کے علاوہ اور کوئی نہ ہو، تو چوں کہ شوہر کے لئے اپنی بیوی کے ستر کو دیکھنا جائز ہے، اس لئے وہاں اجازت لینا ضروری نہیں ہے، لیکن اس کے باوجو بہتر اور مناسب طریقہ یہ ہے کہ وہاں پر بھی کچھ کھٹکا کر کے جائے، باہر سے ذرا آواز کر دے، جس سے وہ سمجھ جائے کہ شوہر گھر میں آرہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کی بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جب بھی مکان میں تشریف لاتے تھے تو کھٹکا کر دیا کرتے تھے، حالاں کہ گھر میں مَیں تنہا ہوا کرتی تھی۔ (مسند احمد: ۳۶۱۵)

اگر اپنا ذاتی گھر ہے اور اس میں دوسرے لوگ بھی رہتے ہیں، تو وہاں اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ صرف اطلاع دیدے کہ مَیں آرہا ہوں۔ اور اگر پرایا گھر ہے تو وہاں اجازت لینے کے بعد صاحبِ مکان کی طرف سے اجازت ملنے کا انتظار کیا جائے گا۔ اس اجازت طلب کرنے کو قرآن کریم نے عجیب انداز سے پیش کیا ہے: ﴿حَتّٰى تَسْتَأْنِسُوا﴾ اگرچہ عام طور پر

حضراتِ مفسرین نے لفظ﴿تَسۡتَأۡنِسُوا﴾کا ترجمہ ”اجازت لو“کیا ہے۔لیکن ”اِسۡتِیۡنَاس“جو عربی زبان کا لفظ ہے،اس کا ترجمہ ہوتا ہے کسی کو مانوس بنانا،انسیت حاصل کرنا، کسی کی طبیعت میں ہماری طرف میلان اور ہمدردی پیدا کرنا۔گھر میں داخل ہونے سے پہلے اجازت لینا؛یہ گھر والے کے دل میں آپ کے لئے ایک طرح کی انسیت پیدا کرتا ہے۔جب آپ اپنی کوئی ضرورت یا کام لے کر کسی کے یہاں جا رہے ہیں ،تو ظاہر ہے کہ آپ کو اس کے ساتھ اس انداز سے پیش آنا چاہیے کہ اس کی طبیعت پر بوجھ نہ ہو۔

آپ اپنی ضرورت لے کر کسی کے پاس گئے اور بغیر اجازت لئے ہی اس کے گھر کے اندر گھس گئے ،توصاحبِ مکان فوراً اَپ سیٹ(Upset) ہوجائے گا،اس کی طبیعت آپ کی طرف سے متنفر ہوجائے گی، اس کے بعدجب آپ اپنی بات پیش کریں گےتووہ دھیان نہیں دے گا،آپ اپنی ضرورت اس کے سامنے رکھیں گے تو اس کے پورا کرنے کی طرف بھی وہ توجہ نہیں دے گا۔اس کے برخلاف اگر آپ نے داخل ہونےسےپہلے مناسب طریقہ سے ادب و شرافت کےساتھ اجازت طلب کی ہوتی کہ مَیں آپ کے مکان پرحاضر ہوسکتا ہوں، مجھے اندرآنے کی اجازت ہے،تووہ بھی سوچتاکہ کوئی شریف آدمی آیا ہے،جی ہاں!تشریف لایئے، اب”السلام علیکم“کہیے اور داخل ہوجایئے۔تواجازت لیناگویا صاحبِ خانہ کی انسیت حاصل کرنا ہے،اس میں ہمارا فائدہ ہی فائدہ ہے،کوئی نقصان نہیں ہے۔ تو اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے

گھروں میں داخل ہوؤ تو پہلے اجازت لو﴿تَسْتَأْنِسُوا﴾اُنس حاصل کرو،اوراس کا طریقہ یہ ہے ﴿وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا﴾ گھروالوں کوسلام کرو۔

اجازت کیسے لے؟:

اب اجازت کس طرح لی جائے؟تو عام طورپر علماءیہ فرماتے ہیں اور احادیث سے بھی ثابت ہے کہ اجازت لینے کے لئے پہلے سلام کیاجائے: **"السلام علیکم ورحمۃ اللہ، میں احمد ہوں، آناچاہتاہوں ، مجھے اجازت ہے ؟**"جب اجازت مل جائےتودوبارہ سلام کرکے داخل ہوجائے (پہلے جوسلام کیاگیا وہ اجازت حاصل کرنے کے واسطے تھا) ساتھ ہی اپنانام بھی بولے۔

ابوداودشریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ قبیلۂ بنوعامر کے ایک آدمی نے آکر حضور اکرم (ﷺ) سے یوں کہا:"أَأَلِجُ"،میں داخل ہوسکتاہوں ؟"وُلُوج"عربی زبان میں کسی تنگ جگہ میں داخل ہونےکوکہتے ہیں،جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں گھس سکتا ہوں ۔توحضور اکرم (ﷺ) نےاپنے خادم سے کہاکہ: باہر جاکر اس آدمی کو اجازت لینے کا طریقہ بتلاؤ ،اس سے کہو کہ یوں کہے:"السلام علیکم"،"أَأَدْخُلُ"۔"أَأَلِجُ"،نہ کہے۔ خادم جاکر اس سے کہے ،اُس سے پہلے ہی اس آدمی نے باہر سے آپ (ﷺ) کی یہ باتیں سن لیں ، تو اس نے اسی طرح کہا:السلام علیکم ورحمۃ اللہ "أَأَدْخُلُ"۔ حضوراکرم (ﷺ) نے کہا:"أُدْخُلْ" آجاؤ۔(ابوداودشریف:۵۱۷۷/باب کیف الاستئذان)

تو پہلا سلام استیذان یعنی اجازت حاصل کرنے کے لئے ہے، سلام کے ساتھ اپنا نام بھی کہنا چاہیے، تاکہ اس کو پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے کہ کون ہو؟ اور اگر کبھی کسی وجہ سے نام نہ بول پائے اور پوچھا کہ کون ہو؟ تو جواب میں صرف یہ نہ کہے کہ: مَیں؛ بلکہ اپنا نام لینا چاہیے کہ فلاں ہوں۔

سب ہی "مَیں" ہیں:

ایک آدمی ایک مرتبہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے پاس گیا، اجازت طلب کی۔ پوچھا: کون ہو ؟ اس نے نام نہیں بتایا اور کہا: مَیں۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے کہا: میرے دوستوں اور ملنے والوں میں "مَیں" نام کا کوئی آدمی نہیں ہے۔ پھر انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضور اکرم (ﷺ) کے یہاں گئے، دروازہ کھٹکھٹایا، حضور اکرم (ﷺ) نے پوچھا: کون ہو ؟ کہا: "أَنَا" مَیں۔ حضور اکرم (ﷺ) نے ناگواری کے ساتھ فرمایا: "أَنَا، أَنَا"؟ یعنی "مَیں" کہنے سے کیا پتہ چلے گا کہ کون ہے؟ سبھی "مَیں" ہیں۔

جواب ملنے کا انتظار کیجئے:

اور اجازت طلب کرنے کے لئے سلام کیا گیا تو اس کے بعد آپ جواب کا انتظار کیجئے، یعنی اتنا موقع دیجئے کہ وہ جواب دے سکے۔ اتنا انتظار کرنے کے بعد بھی اگر جواب نہ ملے، تو پھر

دوبارہ اجازت طلب کرنے کی غرض سے سلام کیجئے، پھر موقع دیجئے۔ اس کے بعد بھی جواب نہ ملے، تو پھر تیسری مرتبہ سلام کرکے اجازت طلب کیجئے، اس پر بھی جواب نہ ملے، یا صاحبِ خانہ کی طرف سے کہا جائے کہ مَیں اس وقت ملنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، یا آپ سے نہیں مل سکتا؛ تو بغیر کسی ناگواری کے، کچھ بھی برا مانے بغیر چپ چاپ وہاں سے خوشی کے ساتھ واپس تشریف لے جایئے، اس لئے کہ قرآن پاک میں ہے: ﴿فَاِنۡ قِيۡلَ لَـكُمُ ارۡجِعُوۡا فَارۡجِعُوۡا هُوَ اَزۡكٰى لَـكُمۡ﴾ جب گھر والوں کی طرف سے یہ کہا جائے کہ واپس جایئے، میں ابھی نہیں مل سکتا؛ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ واپس ہو جاؤ، اسی میں تمہارے لئے پاکیزگی اور بھلائی ہے۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس بات کا حکم دیا ہے۔

آج کل تو ہم کسی کے یہاں گئے ہوں اور خاص کر وہ ملنے والا کوئی چھوٹا ہو، اور اجازت طلب کرنے پر اس کی طرف یوں کہا جائے کہ ابھی واپس تشریف لے جائیں ؛تو ہے کوئی اس کو ہضم کرنے والا! معلوم نہیں کیا کیا کر ڈالے گا۔ لیکن اللہ کے بعض بندے ایسے بھی تھے جو اس حکم پر عمل کے شوقین تھے۔

ایسے بھی تھے:

کتب تفسیر میں لکھا ہے: ایک بزرگ کہتے ہیں : پوری زندگی میں اس کوشش میں رہا کہ اس حکم پر عمل کرنے کا موقعہ ملے۔ مَیں لوگوں کے گھر پر جاتا تھا اور اجازت طلب کرتا تھا کہ کوئی

اللہ کا بندہ یوں کہہ دے کہ: واپس جاؤ، تاکہ اس کے اس کہنے پر میں واپس ہوجاؤں اور اللہ تعالیٰ کے اس "اِرْجِعُوْا" والے حکم پر عمل ہوجائے، لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ ایسے بھی شوقین تھے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر عمل کرنے کی خاطر انہوں نے یہ طرز اختیار کیا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ تین مرتبہ کے بعد اگر جواب نہ ملے؛ تو واپس ہوجانا چاہیے اس لئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ آدمی کسی مشغولی میں ہوتا ہے، مثلاً: غسل کررہا ہے، یا بیت الخلاء میں ہے، یا نماز پڑھ رہا ہے؛ تو وہ آپ کو اجازت دینے کی حالت میں نہیں ہوتا۔ ہمیں خود بہت سی مرتبہ ایسی نوبت آتی ہے کہ گھر میں اکیلے ہیں، اور بیت الخلاء میں داخل ہوئے، ابھی حاجت کے لئے بیٹھے کہ اِدھر کسی نے گھنٹی بجانا شروع کی، اب ہماری طبیعت بے چین ہوجاتی ہے، ایسے وقت مَیں دعا کرتا ہوں کہ: اللہ کرے کہ اس کی بے چینی دور ہوجائے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ گھنٹی بجانے کا سلسلہ شروع کرتے ہیں تو ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اور دروازہ بھی ایسی زور سے مسلسل کھٹکھٹاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ جج صاحب کی طرف سے گرفتاری کا وارنٹ لے کر آئے ہیں۔ ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔

میں یہ عرض کررہا تھا کہ اجازت کا مقصد ہی استیناس یعنی اُنس پیدا کرنا ہے۔ اس لئے اجازت طلب کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ بھی اُنسیت والا ہی ہونا چاہیے، وحشت اور نفرت پیدا کرنے والا نہیں ہونا چاہیے، اور اگر انکار کیا جائے تو واپس لوٹ جانا چاہیے۔

گھنٹی(Door Bell)بجانے کا طریقہ:

جس زمانہ میں یہ آیتیں نازل ہوئیں اُس زمانہ میں گھر بھی بڑے نہیں ہوا کرتے تھے، دروازہ ذرا سا کھٹکھٹاتے تھے تو آواز اندر پہنچ جاتی تھی، لیکن آج کل تو گھر بڑے بڑے ہیں، اگر دروازے پر "السلام علیکم" بولیں، تو گھر کے اندر پتہ بھی نہیں چل سکتا، اس لئے کوئی مناسب صورت اختیار کی جائے، جیسا کہ آج کل گھنٹی (Door Bell) رکھی جاتی ہے اس کو بجایا جاسکتا ہے۔ لیکن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ گھنٹی(Door Bell) بجانے میں بھی وہی اصول مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کرے جو وحشت اور نفرت پیدا کرنے والا ہو۔ بعض لوگ گھنٹی پر ایسا انگوٹھا دبادیتے ہیں کہ چھوٹے بچے جو سوئے ہوئے ہوتے ہیں وہ بھی چونک کر بیدار ہوجاتے ہیں اور چلّاکر رونا شروع کردیتے ہیں، پھر گھر والوں کو ان کو منانا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ ایک نئ مصیبت ہوگئی ہے۔ اس لئے گھنٹی بھی آہستہ سے بجائی جائے کہ اندر آواز پہنچ جائے، اور آدمی کو پتہ چل جائے کہ کوئی آیا ہے۔ پھر گھنٹی بجانے کے بعد اتنا انتظار کیجئے کہ وہ آدمی کسی کام میں مشغول ہو، جیسے: کتاب کا مطالعہ کررہا ہو، تو کم ازکم بند کرکے کتاب رکھے، اور اُٹھ کر باہر آئے۔ یا وہ کھانا کھارہا ہو تو اپنا لقمہ پورا کرکے ہاتھ صاف کرکے آئے۔ یا کسی اور کام میں مشغول ہے، تو اس کو مہلت دیجئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بجائی، پھر بجائی، اور بجاتے ہی چلے جارہے ہیں۔ بلکہ تھوڑی دیر موقعہ دیجئے، پھر

دیکھا کہ کوئی جواب نہیں مل رہا ہے تو اب دوسری مرتبہ بجائیے، پھر تھوڑی دیر موقعہ دیجئے، پھر کوئی جواب نہیں ملے، تو اب تیسری مرتبہ بجائیے، اور تیسری مرتبہ کے بعد بھی جواب نہ ملے؛ تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ واپس ہو جائیے، وہاں دھرنا دے کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دعا لینے کی حرص:

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مرتبہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ -جو انصار کے سرداروں میں سے تھے، ان- کے یہاں تشریف لے گئے، اور اجازت طلب کرنے کی غرض سے آپ نے السلام علیکم کہا، انہوں نے اندر سے آواز سنی، لیکن جواب زور سے نہیں دیا، بلکہ اس امید پر آہستہ سے دیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا جواب نہیں سنیں گے تو دوسری مرتبہ سلام کریں گے، اور اس بہانے سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا مل جائے گی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا لینے کی حرص میں ان کا دوسرے پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ اس موقعہ پر علماء نے لکھا ہے کہ دعا لینے کی حرص میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو انتظار کرنا پڑا، اور یہ چیز ادب کے خلاف ہوگئی، اس طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ ورنہ عام طور پر آدمی یوں سوچتا ہے کہ بڑی شخصیت میرے یہاں تشریف لائی ہے، اس لئے مجھے تو آگے چل کر جلدی سے ان کے قدموں میں گرنا چاہیے۔ ان کو چاہیے تھا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس جلدی سے پہنچ جاتے، لیکن اس تصور سے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعا ملے، انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری مرتبہ سلام کیا، اس کا بھی

انہوں نے آہستہ سے جواب دیا تو حضور اکرم (ﷺ) نے تیسری مرتبہ سلام کیا، اس وقت بھی انہوں نے آہستہ ہی جواب دیا تو حضور (ﷺ) واپس لوٹنے لگے۔ ان کو پتہ نہیں تھا کہ تین مرتبہ اجازت لینے کا حکم ہے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اب حضور (ﷺ) کی آواز نہیں آ رہی ہے، تو باہر نکلے، اور دیکھا کہ حضور اکرم (ﷺ) واپس لوٹ رہے ہیں تو آپ سے لپٹ گئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں آپ کی آواز سن رہا تھا اور جواب بھی دے رہا تھا لیکن زور سے اس لئے نہیں دیا کہ آپ دوبارہ سلام کریں، اور مجھے آپ کی دعا ملے۔

(ابو داود شریف: ۵۱۸۷/ باب کَمْ مَرَّةٍ يُسَلِّمُ الرَّجُلُ فِي الاِسْتِئْذَانِ)

خیر! تو استیذان یعنی اجازت لینے کا اور استیناس کا حکم دیا گیا ہے۔

ایک عمل، تین دعائیں:

﴿فَإِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِنْ عِنْدِ اللهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً (النور:۶۱)﴾ پھر جب گھروں میں داخل ہوؤ، تو اپنے گھر والوں پر سلام کرو، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت والا اور پاکیزہ تحفہ ہے۔ "عَلَى أَنْفُسِكُمْ" اپنے اوپر یعنی گھر کے اندر جو رہتے ہیں وہ اپنے ہی لوگ ہیں، ان کو سلام کرو۔ اللہ تعالیٰ نے سلام کا جو طریقہ بتلایا ہے وہ بڑا پاکیزہ اور برکت والا ہے۔ یہ بھی نبی کریم (ﷺ) کی تعلیمات اور شریعتِ اسلامیہ کی برکات میں سے ہے کہ اس نے مسلمانوں کو آپسی ملاقات کے وقت جو طریقہ سکھایا ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں میں کوئی ملتا ہے تو

کہتاہے: گڈمارننگ (Good Morning) کوئی کہتاہے: گڈایوننگ(Good Evening) کوئی کہتا ہے: نمستے۔کوئی کہتا ہے: نمسکار۔کوئی آداب کہتاہے۔ہمیں ایسا نہیں کہنا چاہیے۔آداب کہنے سے اس کویاآپ کو کیافائدہ پہنچا؟ظاہر ہے کہ کچھ بھی نہیں۔اسلام نے آپسی ملاقات کے وقت جوطریقہ سکھایاوہ ایک دعاہے،اوردعامیں بھی سلاؔم سکھایا۔اورسلاؔم اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔"السلام علیکم" تم پرسلامتی ہو۔"ورحمۃ اللہ" اور اللہ کی رحمت ہو۔" وبرکاتہٗ "اور اللہ کی برکتیں ہوں۔ایک ہی عمل میں تین دعائیں ہیں۔

ایک مرتبہ ایک آدمی حضور (ﷺ) کے پاس آیااور کہا: السلام علیکم۔حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا:دس۔دوسرا آیا، اس نے کہا : السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: بیس۔ تیسراآیااور اس نے کہا: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: تیس۔ (ابوداودشریف:۵۱۹۷/باب کَیْفَ السَّلَامُ) یعنی پہلے کو دس نیکیاں ملیں ،دوسرے کو بیس ،اور تیسرے کو تیس نیکیاں ملیں ، اس لئے کہ اس نے تین الفاظ کہے۔

سلام ہی جامع ہے:

زمانۂ جاہلیت میں ایساماحول تھا کہ کسی کی جان ، مال، عزت او رآبرو دوسرے سے محفوظ نہیں تھی،جب کوئی آدمی کسی کو سامنے سے آتا ہوا دیکھتا،یادونوں کا آمنا سامناہوتا تو ہر ایک دوسرے کی طرف سے خطرہ محسوس کرتاتھا کہ وہ کچھ کر ڈالے گا ،میری جان پر حملہ کردے گا،یا

میرا مال چھین لے گا۔ یہ اُس سے ڈرتا تھا اور وہ اِس سے ڈرتا تھا۔ اسلام نے سکھایا کہ جب آپس میں ملو تو ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ“ کہو، گویا اس کو سلامتی کی دعا دی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں سلامت رکھے، تم پر سلامتی ہو۔ اب جو آدمی تمہاری سلامتی کے لئے دعائیں کررہا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ تمہاری جان ومال، عزت و آبرو پر کیسے حملہ کرے گا؟ گویا دعا کے ساتھ ساتھ اس نے اطمینان دلایا کہ آپ میری طرف سے پوری طرح مطمئن رہیے، میری طرف سے نہ آپ کی جان پر کوئی دست درازی اور زیادتی ہوسکتی ہے، نہ مَیں آپ کا مال چھینوں گا، اور نہ آپ کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالوں گا۔

بہرحال! سلام کا یہ طریقہ بڑا بابرکت ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا ہے۔ اس لئے غیروں کے طریقوں کو اختیار مت کرو۔ اگر اس ”گڈ مارننگ“ کو دعا پر محمول بھی کیا جائے، تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ آپ کی صبح اچھی ہو۔ تو کیا شام بری ہوجائے؟ اور ہمارے یہاں تو سلام کے اندر کسی ایک وقت کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے عام سلامتی کی دعا کرائی جارہی ہے۔ اس لئے ہمیں آپس میں اسی کو رائج کرنا اور اسی پر عمل کرنا چاہیے۔

سلام کا جواب اچھے طریقہ سے دو:

﴿وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا﴾(النساء:۸۶) جب تمہیں کسی کی طرف سے سلام کیا جائے تو تم اس سے اچھے طریقہ سے سلام کا جواب دو، یا اسی طرح جواب دو۔

کسی نے ہمیں ”السلام علیکم “کہاتو قرآن پاک کی یہ آیت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ تم اس کا جواب اس سے عمدہ اوراچھادو،یعنی اس نے”السلام علیکم“ کہا تو آپ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ“ کہئے،اس نے صرف سلامتی کی دعا دی،تو آپ نے سلامتی کے ساتھ ساتھ رحمت کی دعا بھی دیدی۔ اور اگر کوئی کہے: ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ “،تو آپ جواب میں کہیے:” وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“” سلامتی ، رحمت اوربرکت:تینوں کی دعا دیدو۔ ویسے سلام کے آداب میں سے یہی ہے کہ سلام کرنے والایہی دوالفاظ کہے: ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ “۔لیکن اگر سلام کرنےوالےنےتینوں ”السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ “کہہ دیا؛تو اب اس سے آگے تو ہے نہیں،اس لئے اسی طرح جواب دے دو : ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ ۔

ایک آدمی نے آکر حضوراکرم (ﷺ) کو سلام کیا:” السلام علیکم “۔ حضور (ﷺ) نے جواب میں فرمایا:” وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ“۔اس کے بعد ایک اورآدمی نے آکر کہا: ”السلام علیکم و رحمۃ اللہ “ توحضور اکرم (ﷺ) نے جواب میں فرمایا:” وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“۔اس کےبعد تیسرے آدمی نے آکر کہا:” السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ“ تو حضور (ﷺ) نے جواب میں فرمایا:” وعلیکم“ تم پر بھی یہ ساری دعائیں ہوں۔ اس نے شکایت کی:اے اللہ کے رسول! پہلے والےنےسلام کیا تو آپ نے ایک بڑھا کر کہا، دوسرے والے نے کہا تو اس پر بھی آپ نےایک بڑھا کر کہا ،اور جب میں نے تینوں چیزیں کہیں ، تو آپ نے صرف ” وعلیکم“ فرمایا؟ توحضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا : تم نے کچھ چھوڑاہی نہیں ؛تواب کیاکروں ،اس لئے

صرف " وعلیکم" کہا(المعجم الکبیر،حدیث نمبر:۵۹۹۱) جو سلام تو نے کیا وہی دعا میں نے تجھے دیدی کہ یہی تینوں چیزیں؛سلامتی، اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تجھ پر بھی نازل ہوں۔معلوم ہوا کہ اگر ممکن ہو تو ویسا ہی جواب دو،یا اس سے اچھا جواب دو۔

سلام کا طریقہ نیا نہیں ہے:

باری تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿هَلْ أَتَاكَ حَدِيثُ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ الْمُكْرَمِينَ إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ سَلَامٌ.(الذاریات:۲۴،۲۵)﴾کیا تمہارے پاس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عزت والے مہمانوں کا قصہ آیا کہ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے کہا: تم پر سلام ہو،اس کے جواب میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی کہا:تم پر بھی سلام ہو۔

یہ آیت لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ سلام کا یہ طریقہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اگلے انبیاء علیہم السلام کے درمیان بھی جاری فرمایا تھا۔اس سلسلے میں آگے حضرت آدم علیہ السلام والی روایت بھی لا رہے ہیں۔

سلام حقِ اسلام :

حدیث ۸۴۵:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما أنَّ رجلاً سأل رسول الله (ﷺ) : أيُّ الإسْلاَمِ خَيْرٌ ؟ قَالَ : تُطْعِمُ الطَّعَامَ، وَتَقْرَأُ السَّلاَمَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ.(متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر و بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبیٔ کریم (ﷺ) سے پوچھا: کہ کون سااسلام بہتر ہے؟(یعنی اسلام کا کون سا عمل اچھااور بہتر ہے ؟)تو حضوراکرم (ﷺ) نے جواب میں فرمایا: کھانا کھلاؤ، اور سلام کرواس کو بھی جس کو پہچانتے ہو، اوراس کو بھی جس کو نہیں پہچانتے۔

افادات:- یہاں پر یہ روایت اسی لئے لائے ہیں کہ سلام پہچان پر موقوف نہیں ہے ،بلکہ یہ اسلام کا ایک حق اوراخوتِ اسلامی کا تقاضا ہے،بس آپ کو معلوم ہے کہ یہ مسلمان بھائی ہے تو آپ سلام کیجئے، آپ پہچانتے ہو ں ،یانہ پہچانتے ہوں۔ہاں ! اگر اس کے اندر کوئی ایسی پہچان ہی نظر نہیں آتی جس کی وجہ سے یہ کہہ سکیں کہ یہ مسلمان ہے؛ تو الگ بات ہے۔جیساکہ بعض مرتبہ ایساہوتا ہے کہ کوئی آدمی سامنے سے آتا ہوا نظر آیا،یاکچھ لوگ بیٹھے ہوئے نظر آئے، اب جی چاہتا بھی ہے کہ ان کو سلام کیا جائے، لیکن ان کے اوپر کوئی ایسی علامت ہی نظر نہیں آتی جو ان کے مسلمان ہونے کی نشاندہی کرتی ہو،اس لیے مجبوری میں نہیں کیا جاتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غیر مسلم ہوں۔

سلام کی ابتداء:

حدیث ۸۴۶:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ **عن النبيِّ (ﷺ)۔ قَالَ: لَمَّا خلقَ اللهُ آدَمَ (ﷺ)۔ قَالَ: اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلَى أُولئِكَ- نَفَرٍ مِنَ المَلائِكَةِ جُلُوس- فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّونَكَ، فَإِنَّهَا تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيتِكَ. فَقَالَ: السَّلامُ عَلَيْكُمْ، فقالوا: السَّلامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللهِ، فَزَادُوهُ: وَرَحْمَةُ اللهِ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا: دیکھو! وہاں فرشتوں کی ایک جماعت بیٹھی ہوئی ہے، جاکر ان کو سلام کرو، اور غور سے سنو کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں؛ پس تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام وہی ہے۔ چناں چہ حضرت آدم علیہ السلام نے جاکر کہا: ”السلام علیکم“ تو فرشتوں نے جواب میں کہا: ”السلام علیک ورحمۃ اللہ۔ گویا فرشتوں نے ”ورحمۃ اللہ“ کا اس میں اضافہ کیا۔ (اس لئے ہمارا بھی طریقہ یہی ہونا چاہیے)

افادات:- اس روایت کو لاکر بتلانا چاہتے ہیں کہ سلام کی ابتداء کیسے ہوئی۔

سات چیزوں کا حکم:

حدیث ۸۴۷:-

وعن أبي عُمَارة البراءِ بن عازِبٍ رضی اللہ عنہما **قَالَ: أمرنا رسول الله** (صلی اللہ علیہ وسلم) **بِسَبْعٍ: بِعِيَادَةِ المَرِيضِ، وَاتِّبَاعِ الجَنَائِزِ، وَتَشْمِيتِ العَاطِسِ، وَنَصْرِ الضَّعِيفِ، وَعَوْنِ المَظْلُومِ، وَإفْشَاءِ السَّلاَمِ، وَإبْرَارِ المُقسِمِ.** (متفقٌ عَلَيهِ، هَذَا لفظ إحدى روايات البخاری)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم کو سات چیزوں کا حکم دیا: ① بیمار کی خبر گیری کا۔ ② اور جنازوں کے پیچھے پیچھے جانے کا۔ ③ کسی کو چھینک آئے اور وہ "الحمد للہ" کہے تو اس کے جواب میں "یرحمک اللہ" کہنے کا۔ ④ کمزور آدمی کی مدد کرنے کا۔ ⑤ مظلوموں کی مدد کرنے کا۔ ⑥ سلام کو پھیلانے کا۔ ⑦ کوئی آدمی قسم دے تو اس کو قسم میں بری کرنے کا۔

افادات:- کوئی آدمی بیمار ہو تو اس کی خبر لینے کے لئے جانا چاہیے، اس میں بھی پہچان وغیرہ ضروری نہیں ہے۔ جیسے: کوئی پڑوسی بیمار ہے اور آپ کے علم میں ہے، تو اس کی خبر گیری کریں؛ یہ مسلمان کا ایک حق ہے۔

"کمزور کی مدد" میں تو یہ ہے کہ کوئی بوجھ اٹھانا چاہتا ہے، اور نہیں اٹھا پاتا، آپ نے اس کی مدد کی۔ اور "مظلوم کی مدد" کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی طرف سے کسی پر زیادتی کی جارہی ہے، اور آپ اس زیادتی کو دور کرنے میں اس کی مدد کریں۔ دونوں میں یہ فرق ہے۔

"سلام کو پھیلانے کا حکم دیا" مطلب یہ ہے کہ [۱] سلام کرو، [۲] زور سے کرو، [۳] اور ہر ایک کو کرو؛ تب ہی افشاء السلام یعنی سلام کو پھیلانے والے حکم پر عمل ہو گا۔

"کسی کو قسم میں بری کرنا" مطلب یہ ہے کہ کسی آدمی نے اپنے متعلق قسم کھائی اور اس کا اس قسم سے بری ہونا آپ کے تعاون پر موقوف ہے، مثلاً: کسی نے آپ کو دعوت دی اور قسم کھالی کہ خدا کی قسم! مَیں آپ کو اپنے گھر لے جاکر ہی رہوں گا، اب آپ کہیں کہ جاؤ! میں نہیں آتا؛ تو اس صورت میں وہ اپنی قسم میں حانث ہو جائے گا۔ اس کو اس قسم کے ٹوٹنے سے بچانا آپ کے ہاتھ میں ہے ، اگر آپ اس کے یہاں چلے جائیں گے تو اس کی قسم پوری ہو جائے گی اور وہ کفارہ سے بچ جائے گا۔

یا کسی نے قسم کھا کر کہا کہ میری یہ ضرورت پوری کر دیجیے، جب تک میری ضرورت پوری نہیں کریں گے، میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا۔ اب آپ کہتے ہیں کہ جا! نہیں کروں گا۔ تو نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اپنی قسم میں حانث ہو جائے گا، اگر آپ بغیر کسی زحمت کے اس کو اس کی قسم میں بری کر سکتے ہیں اور اس کو حانث ہونے سے بچا سکتے ہیں ؛ تو اس کی ضرورت پوری کیجیے اور اس کو قسم سے بری کیجیے۔

سلام کا قدرتی اثر:

حدیث ۸۴۸:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ) : لاَ تَدْخُلُوا الجَنَّةَ حَتَّى تُؤمِنُوا، وَلاَ تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَوَلاَ أَدُلُّكُمْ عَلَى شَيْءٍ إِذَا فَعَلْتُمُوهُ تَحَابَبْتُمْ ؟ أَفْشُوا السَّلاَمَ بَيْنَكُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم جنت میں داخل نہیں ہوسکتے یہاں تک کہ ایمان والے بن جاؤ، اور ایمان والے نہیں بن سکتے یہاں تک کہ آپس میں محبت کرنے لگو۔ اور کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں کہ جب تم اس کو کرو تو آپس میں محبت کرنے لگو؟ آپس میں سلام کو پھیلاؤ۔

افادات:- ظاہر ہے کہ آپ جب کسی کو سلام کریں گے تو آپ کی محبت اس کے دل میں خودبخود پیدا ہوجائے گی، یہ قدرتی چیز ہے۔ آپ لوگوں کو جتنا زیادہ سلام کریں گے، ان شاء اللہ ان کے دلوں میں آپ کے واسطے، اور وہ سلام کریں گے تو آپ کے دل میں ان کے واسطے محبت پیدا ہوگی۔ اس لئے سلام کو عام کیجئے۔

حدیث ۸۴۹:-

وعن أَبِي يوسف عبد الله بن سلام رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: يَا أَيُّهَا النَّاسُ! أَفْشُوا السَّلاَمَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصِلُوا الأَرْحَامَ، وَصَلُّوا وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الجَنَّةَ بِسَلاَمٍ. (رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:–حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور رشتہ داروں کے حقوق کو ادا کرو، اور رات کو لوگ سوئے ہوئے ہوں اس وقت نماز پڑھو؛ سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

اہلِ معرفت کی دوربینی:

حدیث ۸۵۰:-

وعن الطُّفَيْل بن أُبَيِّ بن كعبٍ: أنَّه كَانَ يأتي عبد الله بن عمر فيغدو مَعَهُ إِلَى السُّوقِ، قَالَ: فإذَا غَدَوْنَا إِلَى السُّوقِ، لَمْ يَمُرَّ عَبدُ الله عَلَى سَقَّاطٍ، وَلاَ صَاحِبِ بَيْعَةٍ، وَلاَ مِسْكِينٍ، وَلاَ أحدٍ؛ إلاَّ سَلَّمَ عَلَيْهِ. قَالَ الطُّفَيلُ: فَجِئْتُ عبدَ الله بن عُمَرَ يَوْماً، فَاسْتَتْبَعَنِي إِلَى السُّوقِ، فَقُلْتُ لَهُ: مَا تَصْنَعُ بِالسُّوقِ، وَأنْتَ لا تَقِفُ عَلَى البَيْعِ وَلاَ تَسْأَلُ عَنِ السّلَعِ، وَلاَ تَسُومُ بِهَا، وَلاَ تَجْلِسُ فِي مَجَالِسِ السُّوقِ؟ وَأقُولُ: اجْلِسْ بِنَا هاهُنَا نَتَحَدَّث، فَقَالَ: يَا أَبَا بَطْنٍ -وَكَانَ الطُّفَيْلُ ذَا بَطْنٍ- إِنَّمَا نَغْدُو مِنْ أَجْلِ السَّلاَمِ، فنُسَلِّمُ عَلَى مَنْ لَقِيْنَاهُ. (رواه مالك في الموطّأ بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:–حضرت طفیل بن ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مَیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آتا تو وہ میرے ساتھ بازار جاتے تھے، جب ہم بازار پہنچتے تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کسی سامان بیچنے والے کے پاس سے، یا کسی تاجر کے پاس سے، یا کسی غریب کے پاس سے، یا کسی اور آدمی کے پاس سے بھی گزرتے تو اس کو سلام کرتے۔ طفیل کہتے ہیں کہ ایک دن مَیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بازار چلنے کے لئے کہا۔ مَیں نے عرض کیا: آپ بازار کیوں جاتے ہیں؟ آپ وہاں کوئی چیز خریدتے تو ہیں نہیں، اور نہ کسی سے بھاؤ تال کرتے ہیں، کسی سے خرید و فروخت کی

بات چیت بھی نہیں کرتے ، بازار میں جو مجلسیں لگتیں ہیں ان میں بھی نہیں بیٹھتے۔اس لئے یہیں تشریف رکھئے،ہم کچھ بات چیت کرتے ہیں۔توحضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے کہا: اے پیٹو!(حضرت طفیل کا پیٹ بڑا تھا)ہم تو بازاراس لئے جاتے ہیں ؛تاکہ جو بھی ہمیں ملے اس کو سلام کریں۔

افادات:-دیکھو!آپ کسی کو سلام کریں گے تو وہ جواب دے گا،اورجواب میں دعا بھی ہے،اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی گزرے ہیں جو دعائیں لینے کے لئے سلام کرتے تھے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں،حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا پیر ہیں ، آج بھی ان کا مزار بغداد میں موجود ہے ، اب تو بڑا شاندار بنایا جارہاہے، ان کے مزار کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ وہاں جاکر ان کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ سے جو دعا مانگی جاتی ہے وہ قبول ہوتی ہے۔ ہمیشہ اللہ کا ذکر کرتے رہتے تھے ، ایک مرتبہ نائی ان کی حجامت بنانے کے لئے آیا،جب مونچھ کاٹنے کا وقت آیاتو ان کے ہونٹ اللہ کاذکرکرنے کی وجہ سے حرکت کررہے تھے،نائی نے کہا:حضرت! ہونٹ کی حرکت ذرادیر کے لئے بند کردیں ،تاکہ مَیں مونچھ کاٹ سکوں،توحضرت نے فرمایا:واہ بھئی واہ! توتو اپنا کام کرتارہے،اور میں اپنا کام نہ کروں !

ایک مرتبہ وہ جارہے تھے، ایک سقّہ (پانی پلانے والا) آواز لگا رہاتھا : اللہ اس آدمی پر رحم کرے جومجھ سے پانی لے کرپئے،انہوں نے فوراً پیسے دیئے،اور پانی لے کرپی لیا۔جب آگے بڑھے توخادم نے کہا: حضرت! آپ کاتوروزہ تھااورآپ نے پانی پی لیا ؟حضرت نے کہا : دیکھو

بھائی! وہ ایک دعا دے رہا تھا کہ جو مجھ سے پانی لے کر پیئے ، اس پر اللہ تعالیٰ رحم کرے۔ روزے کی تو مَیں بعد میں قضاء کرلوں گا ، لیکن یہ دعا پھر مجھے کہاں ملتی؟ تو حقیقت یہ ہے کہ بعض اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کی دعائیں حاصل کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

طفیل بن ابی بن کعب اتنے بڑے صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ روزانہ بازار فقط اس لئے جاتے تھے کہ جو ملے اس کو سلام کریں، اور وہ اس کا جواب دے۔ اور سلام کرنا یہ بھی ثواب کا کام ہے، اور جب سامنے والا جواب دے گا تو اس میں دعائیں ملیں گی۔ اس لئے سلام بڑی فضیلت کی چیز ہے، اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے

باب کیفیة السلام

سلام کا طریقہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلام کے آداب کا بیان چل رہا ہے ، اسی سلسلہ میں انہوں نے عنوان قائم کیا ہے کہ سلام کرنے کا طریقہ کیا ہو ؟

سلام کے الفاظ کی وضاحت:

جو آدمی سلام کی ابتداء کرے وہ "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس کو سلام کیا جارہا ہے، چاہے وہ ایک ہو، یا زیادہ ؛ "علیکم" جمع کا صیغہ استعمال کیا جائے۔ حالاں کہ "علیکم" عربی زبان کے اندر جمع کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس کے باوجود اگر سامنے ایک آدمی ہے تب بھی "علیکم" ہی کہیں گے ، "علیک" نہیں کہیں گے، اس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ایک ہونے کی صورت میں بھی جمع کا صیغہ تعظیم و تکریم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، جیسے: ہماری بول چال میں ایک آدمی ہو تب بھی "تم" بولتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ جس کو سلام کیا جارہا ہے اس کے ساتھ فرشتے بھی موجود ہیں جو اس کے اعمال لکھتے ہیں، جن کے متعلق روایتوں میں صراحتاً موجود ہے کہ ہر آدمی کے ساتھ دو فرشتے ہوتے ہیں جو اس کے اعمال لکھنے کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں، ایک نیکیاں لکھتا ہے، دوسرا گناہ لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سارے فرشتے ہر انسان کے ساتھ ہوتے ہیں

جو اس کی حفاظت کے لئے اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں۔اس لئے آدمی جب بھی سلام کرے گا تو ’’السلام علیکم‘‘ کہے گا کہ تم پر سلام ہو،اس صورت میں صرف اس انسان ہی کی نیت نہ کرے، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان فرشتوں کی بھی نیت کرلے جو اس کے ساتھ نامۂ اعمال لکھنے ، اور اس کی حفاظت کے لئے لگے ہوئے ہیں۔اور ظاہر ہے کہ جیسے وہ جواب دیتا ہے ،ایسے ہی فرشتے بھی جواب دیں گے اور فرشتوں کی دعا مل جائے گی اوران کی دعائیں تو مقبول ہوتی ہیں۔اس لئے سلام میں ان کی بھی نیت کا خیال رکھے۔

جیسے: آدمی جب نماز سے فارغ ہوتا ہے، تو پہلے دائیں طرف ’’السلام علیکم ورحمۃ اللہ‘‘ کہہ کر سلام پھیرتا ہے۔علماء نے لکھا ہے کہ اس وقت اس کو یہ نیت ضرور کرنی چاہیے کہ میری داہنی طرف جتنے بھی لوگ صفوں میں ہیں ،اگر امام بھی دائیں طرف ہو تو اس کی مستقل نیت کرے،اور ساتھ ہی ساتھ جتنے بھی فرشتے دائیں طرف ہیں ان سب کو سلام کرتا ہوں ،اس صورت میں جتنے بھی آدمیوں اور فرشتوں کی اس نے نیت کی ہوگی، ان تمام کو سلام کرنے کا اجر وثو اب ملے گا۔اسی طرح جب بائیں طرف سلام پھیرے، تو جتنے لوگ بائیں طرف اگلی اور پچھلی صفوں میں ہیں،اور اگر امام بائیں طرف ہے تو امام کے لئے مستقل نیت کرے، اور ساتھ ہی ساتھ جتنے بھی فرشتے اس طرف ہیں ان تمام کے لئے بھی سلام کی نیت کرے۔تو جمع کا جو صیغہ لایا گیا ہے اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ انسان کے ساتھ ساتھ فرشتوں کی بھی نیت

کرلی جائے۔اس لئے جس کو سلام کیا جارہاہے وہ اکیلا ہو تب بھی جمع کا صیغہ کا استعمال کریں گے،اور ”السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ“ کہیں گے۔

اورجواب دینے والا جواب میں ”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ “کہے،یعنی ”واؤ“ بڑھائے، اور ”علیکم“کو لفظ” السلام “کے اوپر مقدم کرے۔شریعت نے سلام کرنے اورجواب دینے کے لئے یہی طریقہ سکھایا ہے، اورجواب دینے والا بھی وہی نیت کرے کہ میں اس کو سلام کررہا ہوں،اور جو فرشتے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں ان کو بھی سلام کررہاہوں۔

دس ،بیس ، تیس:

حدیث ۸۵۱:-

عن عِمْرَانِ بن الحصين رضی اللہ عنہما قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ (ﷺ)، فَقَالَ: السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ، فَرَدَّ عَلَيْهِ ثُمَّ جَلَسَ، فَقَالَ النبيُّ (ﷺ): عَشْرٌ. ثُمَّ جَاءَ آخَرُ، فَقَالَ: السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ، فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقَالَ: عِشْرُونَ. ثُمَّ جَاءَ آخَرُ، فَقَالَ: السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ، فَرَدَّ عَلَيْهِ فَجَلَسَ، فَقَالَ: ثَلاثُونَ.

(رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:–حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک آدمی نبیِ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا:” السلا م علیکم“ آپ (ﷺ) نے اس کا جواب دیا ،پھر وہ آدمی بیٹھ گیا تو حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:”عَشْرٌ“ دس۔پھر دوسرا آدمی آیا اس نے کہا:” السلام علیکم و رحمۃ اللہ“ حضور (ﷺ) نے اس کا

بھی جواب دیا، جب وہ بیٹھ گیا تو حضوراکرم (ﷺ) نے فرمایا: "عِشْرُونَ" بیس۔ پھر تیسرا آیا اس نے کہا: "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس کا بھی جواب دیا،جب وہ بیٹھ گیا تو حضور (ﷺ) فرمایا: "ثَلَاثُونَ" تیس۔

افادات:۔پہلے نے فقط" السلام علیکم" کہا تھا تو اس کے متعلق فرمایا: دس نیکیاں ملیں۔ دوسرے نے" ورحمۃ اللہ" کا اضافہ کیا تو اس کے لئے نیکیوں میں بھی اضافہ ہوا کہ بیس نیکیاں ملیں۔اور تیسرے نے "وبرکاتہ" کا بھی اضافہ کیا تو اس کے متعلق فرمایا: تیس نیکیاں ملیں ۔

جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ جن الفاظ میں سلام کیا گیا ہے انہیں الفاظ میں یا ان سے بہتر الفاظ میں جواب دیا جائے۔اس لئے کسی نے کہا:" السلام علیکم" تو آپ جواب میں کہیں:"وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" ۔اگر کسی نے کہا:" السلام علیکم و رحمۃ اللہ" تو آپ جواب میں "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہئے۔اوراگر اس نے سلام میں پورا ہی کہہ دیا ہے، تو آپ جواب میں اتنا ہی کہیں گے۔

جب کوئی سلام کہلائے:

حدیث ۸۵۲:-

وعن عائشۃَ رضی اللہ عنہا قالت: قَالَ لی رسولُ اللہ (ﷺ): هَذَا جِبريلُ يَقْرَأُ عَلَيْكِ السَّلَامَ. قالت: قُلْتُ: وَعَلَيْهِ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ.(متفقٌ عَلَيْهِ)

وهكذا وقع في بعض رواياتِ الصحيحين: ((وَبَرَكَاتُهُ)) وفي بعضها بحذفِها، وزِيادةُ الثقةِ مقبولة.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: یہ جبرئیل (یہاں تشریف فرما ہیں اور) تم کو سلام کہہ رہے ہیں۔ تو میں نے جواب میں کہا: "وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔

افادات:- اس روایت کو لاکر ایک مسئلہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کوئی آدمی اگر کسی پر سلام کہلوائے تو اس کو چاہیے کہ جس نے سلام کہلوایا ہے اس کو بھی جواب دے، اور سلام لے کر آنے والے کو بھی شریک کرے۔ جیسے کسی نے آپ کو کہا کہ: فلاں آدمی نے آپ کو سلام کہا ہے، تو آپ یوں کہئے: "وعلیکم وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ"۔

اب پہلے کس کو ذکر کرے؟ تو دونوں طرح کی باتیں آئی ہیں، بعض حضرات نے کہا کہ یہ سامنے موجود ہے اس لئے پہلے اس کو "وعلیکم" کہو، اس کے بعد "وعلیہ السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہو۔ لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سلام بھجوانے والا اصل ہے، یہ تو صرف قاصد ہے، اس لئے پہلے "علیہ" کہو، پھر "وعلیکم" کہو۔

بہرحال! کسی نے سلام کہلوایا ہو تو اس کے جواب دینے کا طریقہ یہی ہے کہ جس نے سلام کہلوایا ہے اس کو بھی جواب دے، اور جو سلام لے کر آیا ہے اس کو بھی ساتھ میں شریک کرے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب کوئی کہتا ہے کہ فلاں نے سلام کہلوایا ہے، تو صرف "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہتے ہیں۔ جب "وعلیکم السلام" بولیں گے تو جو لانے والا

ہے، صرف اسی کو جواب ملا، بھیجنے والے کو جواب کہاں ملا؟اس لئے کہ ''علیکم'' عربی زبان کا لفظ ہے جو سامنے والے (مخاطب) کے لئے بولا جاتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اوراس کی برکتیں ہوں۔اب جس نے کہلوایا ہے اس کا تو جواب ہوا ہی نہیں ۔اس لئے ''علیہ ''بھی بولنا چاہیے، جس کا مطلب ہوگا کہ ان پر اور تم پر سلامتی ہو اوراللہ کی رحمتیں اوراس کی برکتیں ہوں ۔اگر''علیہ'' نہیں کہا تو جس نے سلام کہلوایا ہے اس کا جواب نہیں ہوگا،اس لئے یہ طریقہ سیکھ لینا چاہیے۔

بہت سے ہمارے بھائی اس سلسلہ میں جانتے نہیں اورجواب میں صرف ''وعلیکم السلام'' بولنے پر اکتفاء کرتے ہیں،توان پرسلام کے جواب کی ذمہ داری باقی رہ جاتی ہے،اس لئے کہ سلام کرنا سنت ہے،لیکن اس کاجواب دیناواجب ہے۔لہٰذا جو جاننے والے ہیں ان کو بھی چاہیے کہ جب کبھی ایسی نوبت آئے اور پتہ چلے کہ سلام پہنچانے والے کوجواب دینے کاطریقہ ان کومعلوم نہیں ہے،تومحبت سے ان کوطریقہ سکھادیں کہ اس کاجواب اس طرح دیاجاتا ہے۔

جب بڑے مجمع کوسلام کرے:

حدیث ۸۵۳:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ **أَنَّ النَّبِيَّ** (ﷺ) **كَانَ إِذَا تكلم بِكَلِمَةٍ أَعَادَهَا ثَلاثاً حَتَّى تُفهَمَ عَنْهُ، وَإِذَا أَتَى عَلَى قَوْمٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ سلم عَلَيْهِمْ ثَلاَثاً.** (رواہ البخاری)

وهذا محمولٌ عَلَى مَا إِذَا كَانَ الْجَمْعُ كَثِيراً.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) جب کوئی کلمہ ارشاد فرماتے تو تین مرتبہ دُوہراتے ؛تاکہ لوگ سمجھ جائیں ۔اورجب کسی قوم اور مجمع کے پاس تشریف لاتے اوران کو سلام فرماتے تو تین مرتبہ سلام کرتے۔

افادات:- یعنی اگر مجمع بڑاہوتوایک مرتبہ بولنے سے ہوسکتا ہے کہ تمام لوگوں تک آوازنہ پہنچے،اس لئے بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دائیں طرف کہے، ایک مرتبہ بائیں طر ف کہے اورایک مرتبہ سامنے کہے۔اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ ایسے ہی مطلقاً تین مرتبہ کہے۔لیکن یہ طریقہ ہر کلمہ میں نہیں تھابلکہ جو اہم بات ہوتی تھی کہ وہ لوگوں کو یاد رہ جائے اور اچھی طرح سمجھ لیں ،ایسے ہی جملہ کو دوتین مرتبہ دوہراتے تھے،اس لیے کہ ہوسکتا ہے پہلی مرتبہ برابر سننے کو نہ ملا ہو، تو دوسری اورتیسری مرتبہ میں سن لیں ۔یہ آپ (ﷺ) کی عادت شریفہ تھی۔

جب نائمین کوسلام کرے:

حدیث ۸۵۴:-

وعن المِقْدَادِ رضی اللہ عنہ فی حدیثِهِ الطویل، قَالَ : كُنَّا نَرْفَعُ لِلنَّبِيِّ (ﷺ) نَصِيبَهُ مِنَ اللَّبَنِ، فَيَجِيءُ مِنَ اللَّيْلِ ،فَيُسَلِّمُ تَسْلِيماً لَا يُوقِظُ نَائِماً ،وَيُسْمِعُ الْيَقْظَانَ. فَجَاءَ النَّبِيُّ (ﷺ) فَسَلَّمَ كَمَا كَانَ يُسَلِّمُ.(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی ایک لمبی روایت ہے(جس میں پورا قصہ بیان کرتے ہیں جب وہ نبیٔ کریم (ﷺ) کے یہاں مہمان ہوئے تھے،اسی میں یہ بھی فرمایا) کہ ہم نبیٔ کریم (ﷺ) کے لئے آپ کے حصہ کا دودھ رہنے دیتے تھے (یعنی دودھ آتا تو سب اپنا اپنا حصہ پی لیتے، اور نبیٔ کریم (ﷺ) کے حصے کا دودھ بچاکررکھ دیتے تھے،جب آپ رات کو تشریف لاتے تواپنے حصے کا دودھ نوش فرمالیا کرتے تھے)جب آپ (ﷺ) رات کو تشریف لاتے(اور ہم لوگ سو گئے ہوتے) تو آپ (ﷺ) ایسی آواز سے سلام فرماتے کہ اگر کوئی سویا ہوا ہوتا تو اس کی نیند میں خلل نہ آتا، اور جو بیدار ہوتا وہ سن لیتا۔

افادات:- اس روایت میں معاشرت کاایک ادب سکھایاہے کہ آدمی جب کہیں باہر سے رات کے وقت اپنے گھرمیں آئےاور گھرکے لوگ سوئے ہوئے ہوں ،یاکمرے میں اور بھی ساتھی سوتے ہیں اوروہ سوچکے ہیں ؛ تواس کو چاہیے کہ گھر کا دروازہ اس انداز سے کھول کر گھرمیں داخل ہو،سلام کرے ،اپنا بستر ٹھیک کرے، اور دوسری اپنی ضرورتیں پوری کرے کہ کسی کی نیند خراب نہ ہو۔

کسی کی نیند خراب کرنا حرام ہے:

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ شور مچاتے ہوئے آتے ہیں ، اور صرف اپنے گھر اور کمرے والوں ہی کی نہیں ،بلکہ پڑوسیوں تک کی نیند خراب کرڈالتے ہیں ؛ یہ بالکل غلط طریقہ ہے جو جائزنہیں۔یہ تولوگوں کوتکلیف پہنچانا ہوا اور لوگوں کوتکلیف پہنچانا حرام ہے، شریعت اس کی

اجازت نہیں دیتی۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تو ہمیں یہ طریقہ بتلایا کہ آپ جب ایسے وقت آئیں تو آپ کو ایسا انداز اختیار کرنا چاہیے کہ جو بیدار ہوں ان کو سلام کی آواز پہنچ جائے تا کہ ان کا حق ادا ہو جائے ،اور جو سو رہے ہوں ان کی نیند میں کوئی خلل نہ ہو،اس طرح ان کی بھی رعایت ہو جائے گی۔ یہ آدابِ معاشرت میں سے ہے اور اس کی رعایت کرنا ضروری ہے۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ سلام؛ جس کی شریعت میں بہت زیادہ تاکید ہے اور جو سامنے والے کے لئے دعا کا لفظ ہے،اس کے اندر بھی اتنا اہتمام کیا گیا،تو دیگر چیزوں میں تو کتنا زیادہ لحاظ کیا جانا چاہیے۔

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ رات کے وقت زور زور سے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈ بجاتے ہیں، اگر چھٹی کا دن ہوا،تو رات بھر کھیلتے ہیں اور ایسا شور مچاتے ہیں کہ پورے محلے والوں کی نیند خراب کر ڈالتے ہیں۔ حالاں کہ سونے کے اوقات میں ایسا کوئی طریقہ اختیار کرنے کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی جس سے کسی کی نیند خراب ہو،اس لیے کہ کسی کی نیند خراب کرنا حرام ہے۔

ہاتھ سے سلام :

حدیث ۸۵۵:-

وعن أسماء بنتِ يزيد رضی اللہ عنہا أَنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) مَرَّ في المَسْجِدِ يَوْماً ،وَعُصْبَةٌ مِنَ النِّسَاءِ قُعُودٌ، فَأَلْوَى بِيَدِهِ بالتَّسْلِيمِ ۔

وهذا محمول عَلَىٰ أَنَّه (ﷺ) جَمَعَ بَيْنَ اللَّفْظِ وَالإِشَارَةِ، وَيُؤَيِّدُهُ أَنَّ فِي رِوَايَةِ أَبِي داود: فَسَلَّمَ عَلَيْنَا.

ترجمہ:- حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ایک مرتبہ مسجد میں سے گزرے اور عورتوں کی ایک جماعت وہاں بیٹھی ہوئی تھی، تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ کرکے زبان سے سلام کیا۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کا یہی مطلب بیان فرمایا ہے کہ آپ (ﷺ) نے زبان سے سلام اور ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔ چناں چہ ابوداؤد شریف کی روایت میں صراحتاً موجود ہے کہ آپ (ﷺ) نے سلام کیا اور ہاتھ سے اشارہ بھی کیا۔

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس کو سلام کیا جارہا ہے وہ کچھ دوری پر ہے، اور اندازہ یہ ہے کہ ہماری آواز وہاں تک نہیں پہنچے گی، اس صورت میں اگر ہاتھ سے بھی اشارہ کردیا جائے جس سے اس کو یہ اندازہ ہو جائے کہ مجھ کو سلام کیا گیا، تو اس کی اجازت ہے۔ باقی کوئی آدمی اگر زبان سے "السلام علیکم" نہیں بولتا، صرف ہاتھ سے اشارہ کردیتا ہے، تو اس سے سلام والی سنت ادا نہیں ہوگی۔ سلام والی سنت ادا کرنے کے لئے زبان سے بولنا ضروری ہے۔

علیک السلام کہنا:

حدیث ۸۵۶:-

وعن أَبِي جُرَيٍّ الهُجَيْمِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: أتيت رسول الله (ﷺ) فقلتُ: عَلَيْكَ السَّلامُ يَا رسول الله. قَالَ: ((لاَ تَقُلْ عَلَيْكَ السَّلاَمُ، فَإِنَّ عَلَيْكَ السَّلاَمُ تَحِيَّةُ المَوْتَى)) (رواه أبو داود والترمذی، وقال: ((حديث حسن صحيح))، وَقَدْ سبق بِطُولِهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو جُرَی ہُجَیمی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا: "علیک السلام یارسول اللہ" (اُس زمانہ میں مُردوں کے لئے سلام کا یہی طریقہ استعمال کیا جاتا تھا) اس لئے حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: "علیک السلام "مت کہو، اس طرح تو مُردوں کو سلام کیا جاتا ہے(بلکہ یوں کہنا چاہیے" السلام علیکم"۔ اسی طرح سلام کرنا چاہیے، لفظ "السلام" پہلے ہو، اور "علیک "بعد میں ہو۔ جواب میں "وعلیکم السلام " کہیں گے۔)

باب آدب السلام

سلام کے آداب کا بیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلام کے کچھ اور آداب :

حدیث ۸۵۷:-

عن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: ((يُسَلِّمُ الرَّاكِبُ عَلَى المَاشِي، وَالمَاشِي عَلَى القَاعِدِ، وَالقَلِيلُ عَلَى الكَثِيرِ)) متفقٌ عَلَيهِ.

وفی روایة للبخاری: ((والصغيرُ عَلَى الكَبِيرِ)).

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سوار آدمی پیدل چلنے والے کو سلام کرے، چلنے والا بیٹھے ہوئے کو سلام کرے ، چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے۔اور ایک روایت میں ہے کہ چھوٹا بڑے کو سلام کرے۔

افادات:- جب راستہ میں دو آدمی ملاقات کررہے ہیں اوران کا آمنا سامنا ہورہا ہے،ان میں ایک پیدل ہے اوردوسرا گھوڑے ،یا اسکوٹر یا اور کسی سواری پر سوار ہے؛تو ادب یہ ہے کہ

سوار آدمی پیدل چلنے والے کو سلام کرے۔ چوں کہ سواری کی وجہ سے اس کی حالت پیدل چلنے والے کے مقابلہ میں ذرا اونچی ہے ،تو اس خیال سے کہ شاید سواری پر بیٹھنے کی وجہ سے اس کا دماغ آسمان پر نہ پہنچ گیا ہو،اس کو نیچے اتارنے کے لئے کہاجارہاہے کہ تم اس کو سلام کرو۔ یوں نہ سمجھو کہ میں قیمتی موٹر میں سوار ہوں ، وہ فٹ پاتھ پر چل رہا ہے،وہ مجھے سلام کرے؛مَیں کیوں سلام کروں ؟ شریعت اس کو تواضع سکھارہی ہے ، اس لئے اس کو مکلف کیا گیا۔لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اگروہ سلام نہ کرےتو پیدل چلنے والایوں کہے کہ اس نے سلام نہیں کیا،تو میں بھی سلام نہیں کرتا۔ نہیں بھائی!اگر اس نے نہیں کیا ؛تواب آپ اس کوسلام کر لیجئے۔جو سلام میں پہل کرے گا اس کو فضیلت حاصل ہوگی۔

اورایک ادب یہ بتایاکہ ایک آدمی بیٹھا ہوا ہےاوردوسرا وہاں سے گزر رہا ہے ،تو چوں کہ گزرنے والا آنے والے کے حکم میں ہے ،جیسے:کوئی آدمی مکان میں داخل ہوتو داخل ہونے والے کو چاہیے کہ جولوگ مکان میں پہلےسے موجود ہیں ان کو سلام کرے، اسی طرح چلنے والا بھی بیٹھنے والے کے حق میں ایسا ہی ہے کہ وہ آرہاہے اور یہ پہلے سے موجود ہے؛اس لئے اس کو چاہیے کہ وہ بیٹھے ہوئے کوسلام کرے۔

اورچھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے۔مطلب یہ ہے کہ اِدھرسے آنے والوں کی تعدادزیادہ ہے،اور اُدھر سے آنے والے دو تین آدمی ہیں ،تودو تین آدمیوں کو چاہیے کہ بڑی جماعت کو سلام کرے، اس لئے کہ بڑی جماعت کازیادہ حق ہے۔

اورجو عمر یا مقام و مرتبہ کے اعتبار سے چھوٹا ہو،تو ظاہر ہے کہ اس کا فرض ہے کہ بڑے کی تعظیم اور ادب بجا لائے، اور تعظیم و ادب میں سے یہ بھی ہے کہ اس کو سلام کرے، لیکن اگر چھوٹے نے سلام نہیں کیاتو بڑے کو چاہیے کہ اس کو سلام کرے۔

اب ایک شکل یہ ہے کہ ادھر سے بھی ایک پیدل آرہاہے،اور اُدھر سے بھی ایک پیدل آرہاہے،اب حالت کے اعتبار سے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی جاسکتی؛ تو اس صورت میں کیا ہونا چاہیے؟اسی کو اگلی روایت میں بتلانا چاہتے ہیں۔

سلام میں کون پہل کرے؟:

حدیث ۸۵۸:-

وعن أَبِي أُمَامَةَ صُدَيِّ بن عجلان الباهِلِي رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِاللهِ مَنْ بَدَأَهُمْ بِالسَّلامِ.

ورواه الترمذي عن أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قِيلَ: يَا رسول الله! الرَّجُلانِ يَلْتَقِيَانِ أَيُّهُمَا يَبْدَأُ بِالسَّلاَمِ؟ قَالَ: أَوْلاَهُمَا بِاللهِ تَعَالَى (قَالَ الترمذي: هَذَا حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت أبو أمامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا:جو اللہ کا سب سے زیادہ مقرب بندہ ہوگا؛وہ سلام میں ابتداء کرے گا۔

ایک اورروایت میں ہے: نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا گیا:اے اللہ کے رسول! دوآدمی ملاقات کریں توکون سلام میں ابتداء کرے؟تونبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا:ان دونوں میں جو اللہ کا مقرب ہوگا؛وہ سلام میں ابتداء کرے گا۔

افادات:- گویاسلام میں ابتداء کرنےکو اللہ تعالیٰ کے قرب کی علامت بتلایا گیاہے ؛ تاکہ لوگ اس میں سبقت کرنے سے کام لیں گے۔معلوم ہوا کہ یہ بڑی فضیلت کی چیز ہے۔

سلام اور شیخ الادب رحمۃ اللہ علیہ :

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے مدرس تھے ،اپنے اساتذہ سے ان کے متعلق سنا کہ کوئی بھی ان سے سلام میں سبقت نہیں کرسکتا تھا، چھوٹے سے چھوٹا طالب علم ہو،یا بڑے سے بڑا کوئی بھی ہو، ہمیشہ وہی سلام کرتے تھے۔ایک صاحب کہنے لگے کہ ایک مرتبہ مَیں چھپ گیااورجب مولانا آئےتواچانک نکل کرمولاناکوپہلے سلام کردیا۔گویا اپنے اس عمل کوفخرکے طورپربیان کرتےتھے کہ مَیں نےسلام میں ان سے سبقت کی۔

توبعض ایسے حضرات بھی ہیں جواس کا اہتمام کرتے ہیں ،اس لیے کہ یہ بڑی فضیلت کی چیز ہے۔

باب استحباب اعادة السلام على من تكرر لقاؤهٗ على قرب بأن دخل ثم خرج، ثم دخل فى الحال، أو حال بينهما شجرة ونحوها

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بار بار سلام کرے:

یہاں ایک اور ادب بتلاتے ہیں کہ جس سے بار بار ملاقات کی نوبت آئے تو بار بار سلام کرنا چاہیے۔ مثلاً: ایک آدمی کسی ضرورت سے گھر سے باہر نکلا اور پانچ منٹ کے بعد واپس آ گیا تو اس کو چاہیے کہ گھر والوں کو سلام کرے، یوں نہ سوچ کہ ابھی تو میں یہاں سے گیا تھا، اب دوبارہ آیا ہوں؛ تو اب کیا ضرورت ہے کہ میں سلام کروں۔ نہیں! بلکہ یہ بھی مستحب ہے کہ بار بار سلام کرے۔

یا مثلاً دو آدمی جا رہے تھے اور ان کے درمیان میں درخت یا کوئی دیوار حائل ہو گئی، پھر وہ دونوں ملے ؛ تو دوبارہ سلام کریں۔ روایت پہلے بھی آ چکی ہے۔

حدیث ۸۵۹:-

عن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ فی حديثِ المسيءِ صلاته : أنّه جَاءَ فَصَلَّى، ثُمَّ جَاءَ إلَى النَّبِيِّ (ﷺ) فَسَلَّمَ عَلَيْهِ، فَرَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ، فَقَالَ: ارْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ. فَرَجَعَ فَصَلَّى، ثُمَّ جَاءَ فَسَلَّمَ عَلَى النَّبِيِّ (ﷺ)، حَتَّى فَعَلَ ذَلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم (ﷺ) مسجد میں تشریف فرما تھے، ایک آدمی آکر نماز میں مشغول ہوا، نماز سے فارغ ہوکر لوٹ رہاتھاتو حضور (ﷺ) کو سلام کیا، آپ نے سلام کاجواب دیا (اورچوں کہ اس نے جلد بازی میں نماز پڑھی تھی اس لئے) حضوراکرم (ﷺ) نے اس کو تاکید فرمائی کہ:جاؤ! دوبارہ نماز پڑھو، اس لئے کہ تم نے (برابر)نمازنہیں پڑھی۔وہ دوبارہ گیا،نمازپڑھ کرپھرلوٹا(حضوراکرم (ﷺ) وہیں تشریف فرما تھے)اس نے سلام کیا، حضوراکرم (ﷺ) نے اس کو دوبارہ نماز پڑھنے کے لئے بھیجا ، پھر تیسری مرتبہ اسی طرح ہوا۔

افادات:- جب بھی وہ آدمی حضور اکرم (ﷺ) کے سامنے آیا،اس آدمی نے سلام کیا اور حضورنےجواب دیا۔اس نے یہ نہیں سوچاکہ پہلی مرتبہ تو میں سلام کرچکا ہوں؛اب دوسری مرتبہ سلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس لئے مستحب یہی ہے۔

حدیث ۸۶۰:-

وعنه عن رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا لَقِيَ أَحَدُكُمْ أَخَاهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ، فَإِنْ حَالَتْ بَيْنَهُمَا شَجَرَةٌ، أَوْ جِدَارٌ، أَوْ حَجَرٌ، ثُمَّ لَقِيَهُ، فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی جب اپنے بھائی کی ملاقات کرے توسلام کرے، اگر درمیان میں درخت، کوئی دیوار، یا کوئی پتھر آڑے آجائے، پھر دوبارہ ملاقات ہو ؛ تو پھر سلام کرلے۔

افادات:–دو آدمی ساتھ چل رہے تھے، اور درمیان میں کوئی ایسا راستہ آیا کہ اس کو اِدھر سے جانا پڑا اوراس کو اُدھر سے نکلنا پڑا، تو پھرجب دوبارہ ملیں ؛ توسلام کرلیں ۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

استحباب السلام اذا دخل بیتہ

گھر میں داخل ہوتے وقت سلام کا اہتمام مستحب ہے:

جب کوئی آدمی اپنے گھر میں داخل ہو تو سلام کا اہتمام کرے؛ یہ بھی مستحب ہے۔ بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ اپنی بیوی کو کیا سلام کرنا؟ گویا اس کو اس لائق بھی نہیں سمجھا کہ اسے سلام کیا جائے؟ ایک آدمی سے کہا کہ بھائی! تم جب گھر میں جاتے ہو تو سلام کرتے ہو؟ تو وہ کہنے لگا (એને હું સલામ કરવાનું.?) اس کو کیا سلام کرنا؟ تو یہ بہت بری بات ہے۔ نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ جب بھی گھر میں تشریف لے جاتے تھے تو گھر والوں کو سلام فرماتے تھے۔

قرآنِ پاک کی یہ آیت شروع باب میں بھی آچکی ہے: ﴿فَإِذَا دَخَلْتُم بُيُوتًا فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُبَارَكَةً طَيِّبَةً﴾ جب تم اپنے گھروں میں جاؤ تو سلام کرو۔ "فَسَلِّمُوا عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ" ان کو سلام کررہے ہو گویا خود اپنی ہی ذات کو سلام کررہے ہو۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ کوئی آدمی کسی ایسے گھر میں داخل ہو، جہاں کوئی بھی موجود نہ ہو، یعنی گھر خالی ہے، اور خود ہی تالا کھول کر اندر داخل ہوا ہے، تب بھی اس کو "**السلامُ علَیْنا وعلیٰ عِبادِ اللہِ الصّالِحِیْن**" کہنا چاہیے تاکہ وہاں اللہ کے جو نیک بندے؛ جن اور فرشتے وغیرہ ہیں ان پر سلام ہو جائے۔

آسان قیمتی ہدیہ:

حدیث ۸۶۱:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ لی رسول الله (ﷺ): يَا بُنَيَّ! إِذَا دَخَلْتَ عَلَى أَهْلِكَ، فَسَلِّمْ، يَكُنْ بَرَكَةً عَلَيْكَ، وعلى أَهْلِ بَيْتِكَ.** (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضوراکرم (ﷺ) نے مجھے تاکید فرمائی کہ: اے میرے پیارے بیٹے! جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو ان کو سلام کرو، یہ تمہارے اور تمہارے گھر والوں کے لئے برکت کا ذریعہ ہوگا۔

افادات:- معلوم ہوا کہ سلام کی وجہ سے گھروں میں برکت ہوتی ہے۔ اگر گھر والوں کو "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہہ کر تین تین دعائیں دیدیں؛ تو ان کے لئے اس سے بڑا ہدیہ اور کیا ہو سکتا ہے!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علی الصبیان

بچوں کو سلام کرنا:

حدیث ۸۶۲:-

عن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّهُ مَرَّ عَلَى صِبْيَانٍ، فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ. وقال: كَانَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) يَفْعَلُهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ بچوں کے پاس سے گزرے تو بچوں کو سلام کیا، پھر یہ بات نقل کی کہ: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح کرتے تھے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ چھوٹے بچے کو بھی سلام کرنا چاہیے۔ اس سے ایک تو آدمی میں تواضع آتی ہے، دوسرا یہ کہ ان بچوں کی تربیت ہوتی ہے، وہ سیکھتے ہیں کہ سلام کس طرح کیا جانا چاہیے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے بڑے مقام، عظیم مرتبہ اور عظمت کے باوجود اس بات کا اہتمام کرتے تھے؛ تو ہمیں تو اور زیادہ اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور اگر ہم ایک مرتبہ اہتمام کریں گے تو دوسری مرتبہ بچے خود سبقت کریں گے، اس طرح ان کو تعلیم بھی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ اچھا طریقہ تو وہی ہے کہ چھوٹا بڑوں کو سلام کرے، لیکن ان کو سکھانا بھی تو ایک اہم ضرورت ہے، اس لئے ہم اسی نیت سے سلام کرتے رہیں۔

باب سلام الرجل علی زوجته والمرأة من محارمه وعلی أجنبية وأجنبيات لا یخاف الفتنة بهن وسلامهن بهذا الشرط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہاں ایک اور ادب بتلاتے ہیں: آدمی کا اپنی بیوی کو سلام کرنا۔ یا محرم عورت- جیسے ماں، بہن، خالہ، پھوپھی اور نانی، دادی-کو سلام کرنا۔ یا اسی طرح ایک یا کئی اجنبیہ عورتوں کو سلام کرنا، لیکن اجنبی عورتوں کے سلام کے سلسلہ میں یہ قید لگائی کہ جب کسی قسم کے فتنہ کا ڈراور اندیشہ نہ ہو۔ یا ایسی بوڑھی عورت ہو کہ اس کی طرف دل میں شہوت پیدا ہونے کا سوال ہی نہ ہو؛ تو اس کو بھی سلام کرسکتے ہیں ،ایسی عورت کے لیے کتبِ فقہ کے اندر ”عَجُوْزًا شَوْهَاء“ کے الفاظ آتے ہیں ۔ اور اگر وہ اجنبیہ عورت نوجوان ہے، جس کو سلام کرنے سے دل میں شہوت، یا فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہے؛ تو اس صورت میں سلام نہ کرے۔ اور اگر سلام اس عورت نے کیا ہو تو دل میں جواب دے، زبان سے جواب نہ دے۔ ہاں ! اگر اس کے محارم

وہاں موجود ہوں اوراس نے سلام کیاہو،تو اس صورت میں اس کاجواب دینے میں کوئی فتنہ کا اندیشہ نہیں ہے؛ تب گنجائش ہے۔

خاندان کی بوڑھی عورتوں کوسلام کرنا:

حدیث ۸۶۳:-

عن سهل بن سعدٍ رضی اللہ عنہ قال: كَانَتْ فِينَا امْرَأَةٌ-وفی رواية: كَانَتْ لَنَا عَجُوزٌ-تَأْخُذُ مِنْ أُصُولِ السِّلْقِ فَتَطْرَحُهُ فِي القِدْرِ، وَتُكَرْكِرُ حَبَّاتٍ مِنْ شَعِيرٍ، فَإِذَا صَلَّيْنَا الْجُمُعَةَ، وَانْصَرَفْنَا، نُسَلِّمُ عَلَيْهَا، فَتُقَدِّمُهُ إِلَيْنَا.

(رواه البخاری.)

قوله: ((تُكَرْكِرُ)) أيْ: تَطْحَنُ.

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان میں ایک عورت تھی۔دوسری روایت میں ہے کہ وہ بہت بوڑھی تھی، وہ ایک ہنڈیاکے اندر کچھ چقندر اور جَوکے دانے پیس کر پکا کرر کھ لیا کرتی تھی۔جب ہم جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعداس کے پاس سلام کے لئے جاتے تھے، تو وہ ہمارے سامنے پیش کردیا کرتی تھی۔

افادات:- بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ہم جمعہ کے دن کا انتظار کرتے تھے، اور ہمیں اس دعوت کاانتظار رہتاتھا۔جب ہم سلام کرنے کےلئے جاتےتھے تو وہ ہمارے سامنے وہی کھاناپیش کرتی تھی، اس لئے ہم جمعہ کا دن آنے پر بڑے خوش ہوتے تھے۔

اس روایت کو لاکر یہ بتلاتے ہیں کہ وہ عورت ایسی بوڑھی تھی کہ کسی قسم کے فتنہ میں پڑنے کا اندیشہ نہیں تھا، تو ان کو سلام کرنے کے لئے جاتے تھے۔ اس طرح اگر وہ محرم ہے، جیسے: دادی، نانی، خالہ، بہن وغیرہ؛ تب بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، ان کو سلام کرسکتے ہیں۔

فتنہ کا اندیشہ نہ ہو تو کسی بھی نامحرم کو سلام کا جواب دینا:

حدیث ۸۶۴:-

وعن أُمِّ هَانِيءٍ فاخِتَةَ بنتِ أَبي طالب رضی اللہ عنہا **قالت: أتيت النبيَّ** (ﷺ) **يَوْمَ الفَتْحِ وَهُوَ يَغْتَسِلُ، وَفَاطِمَةُ تَسْتُرُهُ بِثَوْبٍ، فَسَلَّمْتُ... وَذَكَرَتِ الحديث.** **(رواه مسلم)**

ترجمہ:- حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا جن کا نام فاختہ ہے (حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں) فرماتی ہیں کہ فتحِ مکہ کے موقعہ پر جب نبیٔ کریم (ﷺ) مکہ مکرمہ تشریف لائے، تو مسجد حرام جانے سے پہلے آپ نے غسل فرمایا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کپڑے سے پردہ کئے ہوئے تھیں۔ جس وقت حضور اکرم (ﷺ) غسل فرمارہے تھے، اس وقت میں آئی اور سلام کیا۔ پھر حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا نے باقی حدیث بیان کی۔

افادات:- حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا نے کہا: میں نے اپنے خاندان کے ایک آدمی کو پناہ دے رکھی ہے (انہوں نے اپنے دیور کو پناہ دے رکھی تھی) اور میرے بھائی علی (رضی اللہ عنہ) اس کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ تو نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ تم نے جس کو پناہ دی، اس کو ہم نے بھی پناہ دیدی۔

یہاں تو یہ روایت اس لئے لائے کہ حضرت اُم ہانی رضی اللہ عنہا نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چچا زاد بہن ہیں، انہوں نے سلام کیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا جواب دیا۔

حدیث ۸۶۵:-

وعن أسماء بنتِ يزيدَ رضی اللہ عنہا قالت: مَرّ عَلَيْنَا النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فِي نِسوَةٍ فَسَلَّمَ عَلَيْنَا. (رواه أبو داود والترمذی وقال: حديث حسن. وهذا لفظ أبي داود)

ولفظ الترمذی: أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) مَرَّ فی المَسْجِدِ يَوْماً، وَعُصْبَةٌ مِنَ النِّسَاءِ قُعُودٌ، فَأَلْوَى بِيَدِهِ بِالتَّسْلِيمِ.

ترجمہ:- حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم عورتوں کے پاس سے گزرے، تو آپ نے ہمیں سلام فرمایا۔

دوسری روایت میں ہے: نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مرتبہ مسجد میں سے گزرے، عورتوں کی ایک جماعت وہاں بیٹھی ہوئی تھی، تو آپ نے ہاتھ سے اشارہ کرکے زبان سے سلام کیا۔

افادات:- یہ روایت اوپر بھی گزر چکی ہے۔ بس! یہاں قید وہی ہے کہ اگر عورتوں کو سلام کرنے میں کوئی فتنہ نہ ہو تو ان کو سلام کرنے کی اجازت ہے، ورنہ نامحرم عورتوں کو سلام نہیں کرسکتے

باب تحریم ابتدائنا الکافر بالسلام و کیفیۃ الرد علیھم واستحباب السلام عَلَی أھل مجلسٍ فیھم مسلمون و کفار

غیر مسلموں کو سلام میں پہل نہ کی جائے اور مخلوط مجمعوں میں سلام کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا غیر مسلموں کو سلام کر سکتے ہیں؟

سلام کا ایک اور ادب بتلاتے ہیں کہ کافروں کو سلام کرنے میں ہماری طرف سے پیش قدمی اور ابتداء نہیں ہونی چاہیے۔ فقہاء لکھتے ہیں کہ کسی دوسرے طریقہ سے غیر مسلم کی خیریت تو پوچھ سکتے ہیں، لیکن ان کو ابتداءً سلام کے الفاظ نہ کہیں۔ اور اگر وہ ''السلام علیکم'' کہیں، تو ان کو جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہنا چاہیے، یعنی تم پر۔ اور جس مجلس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں ہیں؛ تو مسلمانوں کی نیت سے سلام کر سکتے ہیں۔

حدیث ۸۶۶:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: لاَتَبْدَأُوا الْيَهُودَ وَلاَ النَّصَارَى بِالسَّلامِ، فَإِذَا لَقِيتُمْ أَحَدَهُمْ فِى طَرِيقٍ فَاضْطَرُّوهُ إِلَى أَضْيَقِهِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل مت کرو،اور جب راستہ میں ان سے ملو تو ان کے لئے راستہ مت چھوڑو۔

حدیث ۸۶۷:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم): إِذَاسَلَّمَ عَلَيْكُمْ أَهْلُ الْكِتَابِ فَقُولُوا: وَعَلَيْكُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اگر اہلِ کتاب تم کو سلام کریں تو جواب میں تم "وعلیکم" کہو۔

حدیث ۸۶۸:-

وعن أُسَامَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) مَرَّ عَلَى مَجْلِسٍ فِيهِ أَخْلاَطٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُشْرِكِينَ - عَبَدَةِ الأَوْثَانِ- وَالْيَهُودِ فَسَلَّمَ عَلَيْهِم النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ایسے مجمع کے پاس گزرے جس میں مسلمان ، مشرکین ،بت پرست اور یہود ؛سب مخلوط تھے،تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس مجمع کو سلام کیا۔

افادات:-پہلی روایت میں یہ بتلایا کہ یہود و نصاریٰ اور غیر مسلموں کو سلام کرنے میں ہماری طرف سے ابتداء نہیں ہونی چاہیے۔اور جب راستہ میں ان سے ملاقات ہو، تو ان کے لئے راستہ نہ چھوڑو، بلکہ آپ اپنا راستہ چلتے رہو، خاص کر جب کہ وہ ذِمّی-یعنی اسلامی حکومت کے شہری- ہوں ؛تو اس صورت کے اندر اسلام کی سربلندی برقرار رکھنے کے لئے اس طرح کا انداز اختیار کرنا چاہیے جس سے ان کی تعظیم لازم نہ آتی ہو، بلکہ ایسی کوئی شکل اختیار کرنا جائز نہیں ہے جس میں ان کی تعظیم ہو، ایسا کرنا گناہ ہے، اس سے بچا جائے۔

دوسری روایت میں یہ بتلایا کہ اگر وہ سلام کریں ؛مثلاً کسی یہودی نے " السلام علیکم" کہا ،تو آپ جواب میں صرف " وعلیکم" کہیے۔حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اسی طرح کہا کرتے تھے۔

یہودی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ بہت شرارت کرتے تھے۔روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کچھ یہودی آئے اور انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو شرارت کے طور پر کہا: "اَلسَّامُ عَلَيْكُمْ"۔"سام" عربی زبان میں موت کو کہتے ہیں۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مَیں ان کا مطلب سمجھ گئی، تو میں نے جواب میں ان کو کہا :"وَعَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ"۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اری! چھوڑو بھی۔ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں نرمی کو پسند کرتے ہیں۔ دوسری روایت میں ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عائشہ کو تاکید فرمائی: "عَلَيْكِ بِالرِّفْقِ"، ذرا نرمی سے کام لو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں : مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ

نے سنا نہیں! انہوں نے کیا کہا؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: مَیں نے کیا جواب دیا وہ تم نے نہیں سنا؟ مَیں نے جواب دیا: "وَعَلَيْكُمْ" تم پر بھی۔ (بخاری شریف: ۶۳۹۵/باب الدُّعَاءِ عَلَى الْمُشْرِكِينَ/باب لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَاحِشًا وَلَا مُتَفَحِّشًا) گویا جو چیز تم ہمیں کہہ رہے ہو، ہم اسی کو آپ کی طرف لوٹا رہے ہیں۔ اس لئے کہ اگر کسی کی طرف سے ہمارے ساتھ زیادتی ہو تو قرآنِ پاک کا حکم ہے: "وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ" اگر بدلہ لینا ہی ہو تو اتنا ہی لے سکتے ہو جتنی اس نے زیادتی کی ہے، اگر کچھ اور آگے بڑھیں گے؛ تو یہ ہماری طرف سے تعدی ہو جائے گی۔ اس لئے ہمارا عمل یہی ہونا چاہیے۔

تیسری روایت میں بتلایا: اگر کسی مجمع میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے لوگ ہوں تو اس صورت میں "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا جائے لیکن نیت صرف مسلمانوں کو سلام کرنے کی کی جائے گی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب استحباب السلام اذا قام من المجلس وفارق جلساءہٗ أو جلیسہ

جب مجلس سے اُٹھے، یا ساتھیوں کو الوداع کہے یا کسی ساتھی سے رخصت ہو؛ تو سلام کرنا چاہیے

بعض لوگ رخصتی کے موقع پر سلام کو درست نہیں سمجھتے، یہاں اس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رخصتی کا سلام کرنا چاہیے۔

حدیث ۸۶۹:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رسول الله** (ﷺ) **: إِذَا انْتَهى أَحَدُكُمْ إِلَى الْمَجْلِسِ فَلْيُسَلِّمْ، فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَقُومَ فَلْيُسَلِّمْ، فَلَيْسَتِ الأُولَى بِأَحَقّ مِنَ الآخِرَةِ.** (رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی کسی ایسی مجلس میں پہنچے جہاں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں؛ تو اس کو چاہیے کہ سلام کرے۔ اور جب وہاں سے

واپس لوٹنے کا ارادہ کرے؛تب بھی سلام کرے، اس لئے کہ پہلے والا سلام، آخری والے سلام سے زیادہ اہم نہیں ہے۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ جس طرح پہلے والا سلام کرنا چاہیے، اسی طرح اخیر میں رخصتی پر بھی سلام کرکے وہاں سے اُٹھے۔

باب الاستیذان وآدابه

کسی کے یہاں جانے پر اجازت لینے کے احکام و آداب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سلام کے سلسلہ میں ایک عنوان قائم کیا ہے: جب کوئی آدمی کسی کے گھر جائے تو اجازت لے کر داخل ہونا چاہیے۔اور اجازت لینے کا طریقہ کیا ہے ؟اس کے احکام بیان کرنا چاہتے ہیں۔

سلام کا بیان جہاں شروع ہوا تھا وہاں بتلادیا تھا کہ اسلام میں ”استیذان“ یعنی کسی کے گھر میں اجازت لے کر داخل ہونے اور بغیر اجازت کے داخل نہ ہونے کا بڑا اہتمام اور تاکید ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عرب میں رواج تھا کہ کوئی آدمی کسی کے گھر جاتا تو یونہی بغیر اجازت کے داخل ہوجاتا تھا، لیکن قرآنِ پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سلسلہ میں مستقل پورے دو رکوع(سورۃ:۲۴،النور/رکوع:۱۰ و ۱۴)نازل فرمائے ہیں ،جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے،اوراس کی باقاعدہ پوری تفصیل بتلائی کہ کون کون لوگ اجازت لیں ، کون سے گھروں میں اجازت لینی چاہیے، کون سے اوقات میں اجازت کا اہتمام کرنا چاہیے،خود گھر کے رہنے والوں کو کس طرح اہتمام کرنا چاہیے؛یہ ساری تفاصیل اس میں بتلائی گئی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں پردہ کا چوں کہ وہ اہتمام نہیں ہوتا جو شریعت میں مطلوب ہے، اس لئے استیذان والے سلسلہ میں بھی ہمارے یہاں بڑی کوتاہیاں برتی جاتی ہیں ۔ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی طرف توجہ اور اہتمام کیا جائے۔

اس باب میں جو آیت پیش کی ہے وہ پہلے بھی پیش کر چکے ہیں:﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا (سورة:۲۴،النور/ آية:۲۷)﴾اے ایمان والو! تم اپنے گھر کے علاوہ کسی دوسرے کے گھر میں داخل نہ ہو ؤجب تک کہ اجازت نہ لے لو، اور گھر والوں کو سلام نہ کرلو۔معلوم ہوا کہ پہلے اجازت لینی چاہیے اور اجازت لینے کے لئے سلام کرنا چاہیے۔ایک سلام اجازت طلب کرنے کے لئے ہوتا ہے، اور ایک سلام اجازت مل چکنے کے بعد داخل ہونے کے لئے ہوتا ہے۔

جب فاروقِ أعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت أشعری رضی اللہ عنہ سے گواہ طلب کیے:

حدیث ۸۷۰:-

عن أَبِي موسى الأشعري رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) : الاسْتِئْذَانُ ثَلاثٌ، فَإِنْ أُذِنَ لَكَ وَإِلاَّ فَارْجِعْ (متفقٌ عَلَيْهِ).

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ أشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے ارشاد فرمایا:اجازت طلب کرنا تین مرتبہ ہے،اگران تین مرتبہ میں تمہیں اجازت مل جائے تو ٹھیک ہے؛ورنہ آپ واپس لوٹ جایئے۔

افادات:- یہاں ایک قصہ بھی ہے جو انہوں نے چھوڑدیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے خلافت کے کاموں میں مصروف تھے،اسی دوران حضرت ابوموسیٰ أشعری رضی اللہ عنہ ان کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے اوراجازت طلب

کی۔چوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے کام میں مصروف تھے اس لئے انہوں نے اس وقت اجازت نہیں دی، خاموش رہے۔ایک مرتبہ اجازت طلب کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کچھ نہیں کہا، پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسری مرتبہ انہوں نے اجازت طلب کی، پھر بھی جواب نہیں ملا، تیسری مرتبہ اجازت طلب کی، پھر بھی جواب نہیں ملا تو وہ واپس تشریف لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے کاموں سے جب فارغ ہوئے تو فرمایا: ابھی مَیں نے ابو موسیٰ کی آواز سنی تھی کہ وہ اجازت طلب کر رہے تھے، ان کو بلاؤ۔جب آدمی باہر گیا تو دیکھا کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ موجود نہیں ہیں، اس نے آکر کہا کہ وہ تو چلے گئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ان کو بلاؤ۔ آدمی گیا اور بلالایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم واپس کیوں چلے گئے؟ انہوں نے کہا: مَیں نے نبیٔ کریم ﷺ سے سنا ہے کہ اجازت تین مرتبہ طلب کرنی چاہیے، اگر مل جائے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر اجازت نہ دی جائے، یا صاف صاف انکار کر دیا جائے کہ آپ واپس تشریف لے جایئے ؛دونوں صورتوں میں واپس لوٹ جانا چاہیے۔ اور حدیث بھی یہی ادب بتلاتی ہے۔ قرآنِ پاک میں بھی ہے:﴿وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا (سورۃ:۲۴،النور/ آیۃ:۲۸)﴾ اس آیت میں صاف حکم ہے کہ اگر گھر والے کی طرف سے یہ کہہ دیا جائے کہ آپ اس وقت واپس تشریف لے جایئے، مَیں ملاقات کی پوزیشن میں نہیں ہوں، یا اس وقت میرے پاس ملاقات کے لئے گنجائش اور موقع نہیں ہے، تو آپ برا نہ مانئے، بلکہ واپس تشریف لے جایئے۔

حضرت ابوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سنا کر عرض کیا کہ مَیں نے تین مرتبہ اجازت طلب کی تھی اور آپ کی طرف سے اجازت نہیں ملی، اس لئے مَیں واپس چلا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا جو ارشاد نقل کر رہے ہو؛ اس پر تمہارے پاس کوئی گواہ موجود ہے؟ اگر ہے تو گواہ پیش کرو؛ ورنہ مَیں سزا دوں گا۔ یہ سن کر حضرت ابوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سوچ میں پڑ گئے اور گھبرائے ہوئے واپس لوٹے کہ مَیں نے تو نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد سنا ہے، دوسرے کن کن لوگوں نے سنا ہے، یہ مجھے معلوم نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد سنا نہیں تھا۔

چناں چہ اس موقعہ پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کتاب الاحکام میں ایک باب لائے ہیں کہ یہ ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بڑے بڑے صحابہ کے علم میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کوئی بات نہ آئی ہو، اور اس باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہی قصہ ذکر کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد معلوم نہیں تھا۔

بہرحال! حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے گواہ کا مطالبہ کیا تو وہ گواہ تلاش کرنے کے لئے نکلے، بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت موجود ہے کہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ جو سید الانصار ہیں، ان کی مجلس لگی ہوئی تھی جہاں سب انصار ہی بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ گھبرائے ہوئے وہاں پہنچے اور کہا: تم میں سے کسی نے نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد سنا ہے؟ کہ تین مرتبہ اجازت

طلب کرو، اگر مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ واپس چلے جاؤ۔ اس لئے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے اس بات پر گواہ طلب کئے ہیں۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ جو اس مجلس کے صدر نشین تھے انہوں نے کہا: یہاں جتنے لوگ موجود ہیں سب نے حضور اکرم (ﷺ) کا یہ ارشاد سنا ہے، اور آپ کی گواہی کے لئے اس مجلس میں جو سب سے چھوٹی عمر کا آدمی ہے اس کو ہم بھیجیں گے۔ چناں چہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: اس مجلس میں سب سے چھوٹی عمر کا میں ہی تھا، حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے کہا: ان کے ساتھ جاؤ، اور گواہی دو۔ چناں چہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور گواہی دی، تب کہیں ان کی جان چھوٹی۔

گواہ طلب کرنے کی تکوینی وجہ:

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس موقع پر ایک چیز ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ: یہاں حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو معاملہ پیش آیا اس کی ایک تکوینی وجہ بھی تھی۔ ہوا یہ تھا کہ حضور اکرم (ﷺ) کی حیاتِ طیبہ میں ایک موقعہ پر قبیلہ اَشعر کے لوگوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم (ﷺ) کے پاس سواری طلب کرنے کے لئے بھیجا کہ آپ ہمارے لئے سواری طلب کیجئے۔ تو حضرت ابو موسیٰ

اَشعری رضی اللہ عنہ حضوراکرم (ﷺ) کے پاس ایسے موقعہ پر پہنچے کہ حضور اکرم (ﷺ) کسی پر کسی وجہ سے ناراض تھے۔انہوں نے سواری طلب کی اور حضور اکرم (ﷺ) کے پاس اس وقت سواری نہیں تھی، اس لئے نبیٔ کریم (ﷺ) نے جواب میں ارشاد فرمایا: میرے پاس سواری نہیں ہے۔پھر حضور (ﷺ) نے قسم کھالی کہ مَیں تمہیں سواری نہیں دوں گا۔حضرت ابوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ تو واپس چلے آئے،اس کے بعد حضوراکرم (ﷺ) کے پاس کہیں سے سواری کے جانور آگئے تو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا کہ ابھی ابوموسیٰ سواری طلب کرنے کے لئے آئے تھے،ان کو بلاؤ۔بلوایا گیا پھر فرمایا:سواری کے یہ جانور لے جاؤ ،حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سواری کے جانور لے کر چلے گئے۔

جس وقت حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سواری طلب کرنے کے لئے آئے تھے اس وقت ان کے ساتھ ان کے قبیلے کے دو آدمی اور بھی ساتھ تھے۔جب حضور (ﷺ) نے سواری کے جانور عنایت فرمائے اوروہ ان کو لے کر اپنے قبیلے کے لوگوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ:دیکھو!حضور (ﷺ) نے سواری کے جانور تو عنایت فرمادئے لیکن پہلی مرتبہ جب میں گیا تھا اور سواری طلب کی تھی تو حضور اکرم (ﷺ) نے انکار فرمایا تھا اور قسم کھالی تھی کہ میں سواری نہیں دوں گا۔کہیں ایسا تو نہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) اپنی قسم بھول گئے۔اگرایسی حالت میں یہ سواری کے جانور حضور (ﷺ) نے ہمیں عطا فرمائے ہوں ،اور ہم حضو ر (ﷺ) کو لاعلمی میں رکھ کر جانور لے لیں ، تو ہمارے لئے اس میں برکت نہیں ہوگی، اس لئے حضور (ﷺ)

کو خبر کرنی چاہیے۔اور ان دو آدمیوں سے- جو پہلی مرتبہ ان کے ساتھ تھے-کہا: تم میرے ساتھ گواہی دینے کے لئے چلو، تاکہ تم گواہی دے سکو۔ چناں چہ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ان دو آدمیوں کو لے کر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے سواری نہ دینے کا ارادہ فرمایا تھا اور اس پر قسم کھائی تھی کہ نہیں دوں گا، اور دونوں گواہ بھی پیش کیے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ: مجھے اپنی قسم یاد تھی، لیکن یہ سواری کے جانور میں نے نہیں دیئے، اللہ تعالیٰ نے دیئے ہیں۔اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اگر میں کسی بات پر قسم کھالوں اور پھر مجھے یہ پتہ چلے کہ اس کے خلاف میں خیر اور بھلائی ہے؛ تو مَیں اپنی قسم توڑ دیتا ہوں اور کفارہ دیدیتا ہوں۔

شرّاح فرماتے ہیں کہ کچھ چیزیں تکوینیات کے قبیل سے ہوتی ہیں ۔اس موقعہ پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی گواہ طلب نہیں کئے تھے ، لیکن حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ نے گواہی کے لئے دو آدمی لے جانے کا اہتمام اپنی طور پر کیا، تو اس کی تکوینی سزا یہ بھگتی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ان کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا۔

استیذان کے وقت تاک جھانک نہ کرے:

حدیث ۱۷۸:-

وعن سهلِ بنِ سعدٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رسول الله** (ﷺ) **: إِنَّمَا جُعِلَ الاستِئذَانُ مِنْ أَجْلِ البَصَرِ.** (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اجازت لینے کا حکم نگاہ کو کسی کے گھر میں بلا اجازت ڈالنے سے بچنے کے لئے دیا گیا ہے۔

افادات:- کسی کے گھر میں اس وقت تک داخل نہیں ہونا چاہیے جب تک داخل ہونے کی اجازت نہ مل جائے۔ یہ حکم شریعت نے اس لئے دیا ہے کہ اگر آپ بغیر اجازت کے داخل ہو جائیں گے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی کسی ایسی ہیئت میں بیٹھا ہو جس حالت میں کوئی اس کو دیکھے، یہ اس کو ناپسند ہو، یا کوئی ایسی چیز اس کے گھر میں موجود ہو جس پر کسی اجنبی کی نگاہ پڑنے کو وہ گوارہ نہ کرتا ہو؛ اس لئے اگر پہلے سے اجازت لے لیں گے تو وہ جن چیزوں کو آنے والے سے چھپا کر رکھنا چاہتا ہے؛ ان کو یہ چھپا دے گا پھر داخل ہونے کی اجازت دے گا۔ اب اگر آپ باہر کھڑے اجازت تو طلب کر رہے ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے گھر میں جھانک بھی رہے ہیں جیسا کہ بعضوں کی عادت ہوتی ہے، تو اس اجازت کا کیا فائدہ ہوا؟ اس لئے اس روایت میں اجازت طلب کرنے کا طریقہ بتلایا جا رہا ہے کہ اس طرح اجازت نہ لو کہ آپ اندر جھانک رہے ہو، بلکہ دروازہ کے سامنے سے ہٹ کر ایک کنارے پر ایسے کھڑے ہو کر اجازت

طلب کرو کہ تمہاری نگاہ بھول سے بھی اندر نہ پڑنے پائے، پھر جب اجازت مل جائے تب ہی گھر میں داخل ہونا چاہیے۔

گھس سکتا ہوں، یا آسکتا ہوں :

حدیث ۸۷۲:-

وعن رِبْعِيِّ بن حِرَاشٍ قَالَ : حَدَّثَنَا رَجُلٌ مِن بَنِي عَامِرٍ أَنَّهُ اسْتَأْذَنَ عَلَى النَّبِيِّ (صلى الله عليه وسلم) وَهُوَ فِي بيتٍ، فَقَالَ : أَأَلِجُ ؟ فَقَالَ رسول الله (صلى الله عليه وسلم) لِخَادِمِهِ: أُخْرُجْ إِلَى هَذَا ، فَعَلِّمْهُ الاسْتِئْذَانَ. فَقُلْ لَهُ : قُلِ : السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ، أَأَدْخُلُ ؟ فَسَمِعَهُ الرَّجُلُ، فَقَالَ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ أَأَدْخُلُ ؟ فَأَذِنَ لَهُ النَّبِيُّ (صلى الله عليه وسلم) فدخل. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ربعی بن حراش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قبیلہ بنو عامر کے ایک آدمی نے مجھے یہ قصہ بیان کیا کہ اس نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گھر میں داخل ہونے کی اجازت چاہی، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) گھر ہی میں تشریف فرما تھے، اس نے کہا: أَأَلِجُ؟ (جس کا لفظی ترجمہ یوں ہوتا ہے کہ کیا میں اندر گھسوں؟) تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے خادم سے فرمایا: باہر جاؤ اور اس آدمی کو اجازت طلب کرنے کا طریقہ سکھاؤ، اس سے کہو کہ یوں کہے: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ، أَأَدْخُلُ؟ "السلام علیکم" کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ اس آدمی نے باہر ہی سے یہ بات سن لی اور فوراً کہا: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ ، أَأَدْخُلُ؟ "السلام علیکم" کیا میں داخل ہو سکتا ہوں؟ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں ! آجاؤ؛ تو پھر وہ داخل ہوا۔

افادات:- کسی چیز کو تعبیر کرنے کے لئے اچھا لفظ استعمال کرنا چاہیے۔ اگر کوئی آدمی یوں کہے: ”کیا مَیں آپ کے گھر میں گھس سکتا ہوں“ اس کے بجائے کہے: ”کیا مَیں آپ کے گھر میں داخل ہو سکتا ہوں“ تو آپ ہی غور کیجئے کہ مفہوم تو دونوں کا ایک ہی ہے، لیکن دوسرے جملہ میں جو ادب ہے وہ پہلے میں نہیں ہے۔ ادب اور تعبیر کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق ہے۔

یہاں پر اس آدمی نے اجازت طلب کرنے کے لئے ایک تو سلام نہیں کیا، اور پھر ان الفاظ میں اجازت مانگی؛ تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے اپنے خادم کے ذریعہ اس کو اجازت لینے کا طریقہ سکھانے کو فرمایا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی آدمی اجازت طلب کرنے کے لئے خلافِ ادب الفاظ و کلمات استعمال کرے تو اس کو اجازت دینے سے روک سکتے ہیں اور اس کو ادب سکھایا جاسکتا ہے۔

یادگار تنبیہ

حدیث ۸۷۳:-

عن كِلْدَةَ بن الحَنْبل رضی اللہ عنہ قَالَ: أَتَيْتُ النبيَّ (ﷺ) فَدَخَلْتُ عَلَيْهِ وَلَمْ أُسَلِّمْ، فَقَالَ النَّبِيُّ (ﷺ): ارْجِعْ فَقُلْ: السَّلَامُ عَلَيْكُمْ، أَأَدْخُلُ؟ (رواه أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت کلدۃ بن حنبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس حاضر ہوا، اور بغیر سلام کے آپ کے گھر میں داخل ہو گیا، تو حضور اکرم (ﷺ) نے مجھ سے فرمایا: واپس جاؤ اور کہو: السلام علیکم ، کیا مَیں آسکتا ہوں ؟

افادات:- معلوم ہوا کہ کسی آدمی کی تعلیم و تربیت کی غرض سے اگر اس طرح کا معاملہ کیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ چوں کہ کسی بڑے کی طرف سے بطور تنبیہ کے اگر ایسا کیا جاتا ہے، تو یہ تنبیہ ایسی ہوتی ہے کہ پھر زندگی بھر یاد رہ جاتی ہے، اور اس سے اس غلطی کی ہمیشہ کے لئے اصلاح ہو جاتی ہے، اس لئے ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔

باب بیان أن السنة اذا قیل للمستأذن: من انت؟ أن یقول فلان، فیسّمی نفسه بما یعرف به من اسم أو کنیة وکراهیة قوله أنا ونحوها

اجازت طلب کرنے والے سے جب پوچھا جائے: کون ہو؟ تو جواب میں وہ اپنا نام بتائے، یا وہ لقب، کنیت یا صفت جس سے وہ مشہور ہو۔

”مَیں ہوں“ نہ کہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

گھر والے کے پوچھنے پر جواب دینے کا مسنون طریقہ:

جب کوئی آدمی کسی کے گھر میں جانے کی اجازت طلب کرے، اور گھر والے کی طرف سے پوچھا جائے کہ کون ہو؟ تو جواب میں وہ اپنا نام، یا وہ لقب، کنیت اور صفت جس سے وہ مشہور ہو بتائے۔ مطلب یہ ہے کہ گھر والے کو پتہ چل جائے کہ فلاں آدمی اجازت طلب کر رہا ہے۔ جواب میں یوں نہ کہے کہ: مَیں ہوں۔ یا ایسا لفظ استعمال نہ کرے جس سے گھر والوں کو پتہ نہ چل سکے کہ کون ہے۔ اس لئے کہ گھر والے کے پوچھنے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ اجازت طلب کرنے والی شخصیت کون ہے، تاکہ وہ فیصلہ کر سکے کہ اس کو اندر آنے کی اجازت دوں یا نہ دوں۔ جب آپ اپنا نام لیں گے تب ہی تو اس کو پتہ چلے گا کہ آپ کون ہیں؟ ''مَیں'' یا کوئی ایسا لفظ جس سے تعارف نہ ہوتا ہو؛ تو مقصد حاصل نہیں ہو گا۔

حدیث ۸۷۴:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ فی حدیثه المشهور فی الإسراءِ، قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): ثُمَّ صَعِدَ بِي جِبْرِيلُ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَاسْتَفْتَحَ، فقِيلَ: مَنْ هذَا؟ قَالَ: جِبْرِيل. قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ: مُحَمَّدٌ. ثُمَّ صَعِدَ إِلَى السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ، فاسْتَفْتَحَ، قِيلَ: مَنْ هَذَا؟ قَالَ: جِبْرِيل. قِيلَ: وَمَنْ مَعَكَ؟ قَالَ: مُحَمَّدٌ. وَالثَّالِثَةِ وَالرَّابِعَةِ وَسَائِرِهِنَّ وَيُقَالُ فِي بَابِ كُلِّ سَمَاءٍ: مَنْ هَذَا؟ فَيَقُولُ: جِبْرِيلُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے (حدیث کی کتابوں میں) معراج کا مشہور واقعہ نقل کیا گیا ہے جس میں نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب حضرت جبرئیل علیہ السلام مجھے لے کر آسمانوں کے اوپر پہنچے، اور پہلے آسمان کا دروازہ کھلوایا، تو اندر سے پوچھا گیا: کون ہو؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: میں جبرئیل ہوں۔ پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہیں؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر دوسرے آسمان کا دروازہ کھلوایا، تو اندر سے یہی پوچھا گیا: کون ہو؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب میں کہا: میں جبرئیل ہوں۔ پوچھا گیا: آپ کے ساتھ کون ہیں؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: محمد (ﷺ) ہیں۔ پھر تیسرے چوتھے اور تمام آسمانوں پر یہی صورت پیش آئی کہ (جب دروازہ کھلوانے کے لئے درخواست کی جاتی تو) اندر سے سوال کیا جاتا کہ کون ہو؟ اس کے جواب میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کہتے: میں جبرئیل ہوں۔

افادات:- حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنا نام لیتے تھے کہ میں جبرئیل ہوں، یہ نہیں کہتے تھے کہ میں ہوں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر گھر والے کی طرف سے ساتھ میں آنے والوں کے متعلق پوچھا جائے تو اس کا بھی نام بتلانا چاہیے کہ میرے ساتھ فلاں ہے۔

حدیث ۸۷۵:-

وعن أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ: خَرَجْتُ لَيْلَةً مِنَ اللَّيَالِي، فَإِذَا رسول الله (ﷺ) يَمْشِي وَحْدَهُ، فَجَعَلْتُ أَمْشِي فِي ظِلِّ القمرِ، فَالْتَفَتَ فَرَآنِي، فَقَالَ: مَنْ هَذَا؟ فقلتُ: أَبُو ذَرٍّ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک رات گھر سے باہر نکلا (چاندنی رات تھی) مَیں نے دیکھا کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اکیلے تشریف لے جارہے ہیں، تو مَیں بھی ذرا دور ہٹ کر چاند کی روشنی میں چلنے لگا۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور پوچھا: کون ہو؟ مَیں نے کہا: ابوذر ہوں۔

افادات:- دیکھو! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب پوچھا: کون ہو؟ تو انہوں نے جواب میں اپنا نام بتلایا۔ بعض لوگ "مَیں" بولتے ہیں، یا چپ چاپ رہتے ہیں، کچھ بولتے ہی نہیں؛ یہ بھی غلط ہے۔ جب پوچھا جائے کہ کون ہو؟ تو اپنے متعلق بتلادے۔

یہ قصہ پہلے بھی کسی موقعہ پر تفصیل سے آچکا ہے کہ اس کے بعد حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اچھا! میرے ساتھ چلو، تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ چلے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بستی سے باہر تشریف لے گئے، ایک جگہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بٹھایا اور فرمایا کہ جب تک مَیں نہ آؤں، یہاں سے نہ ہٹنا، اس کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حضرت جبرئیل سے ملاقات اور گفتگو ہوئی۔

حدیث ۸۷۶:-

وعن أُمِّ هانيءٍ رضی اللہ عنہا قالت: أتيتُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَهُوَ يَغْتَسِلُ وَفَاطِمَةُ تَسْتُرُهُ، فَقَالَ: مَنْ هٰذِهٖ؟ فقلتُ: أنا أُمُّ هَانِيءٍ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت اُم ہانی علیہم السلام فرماتی ہیں کہ میں ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئی تو آپ غسل فرمارہے تھے، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پردہ کئے ہوئے تھیں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے پوچھا: کون ہے؟ مَیں نے کہا: مَیں اُم ہانی ہوں۔ (یہ روایت پچھلی مجلس میں گزرچکی)

”مَیں“ کہنا؛ صحیح جواب نہیں :

حدیث ۸۷۷:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ **قَالَ: أَتَيْتُ النبيَّ** (ﷺ) **فَدَقَقْتُ البَابَ، فَقَالَ: مَنْ هَذَا؟ فَقُلتُ: أَنَا، فَقَالَ: أَنَا، أَنَا! كَأَنَّهُ كَرِهَهَا.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نبی کریم (ﷺ) کے پاس حاضر ہوا اور دروازہ کھٹکھٹایا تو آپ (ﷺ) نے پوچھا: کون ہو؟ مَیں نے کہا: ”مَیں“۔ تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ”مَیں، مَیں“ (کیا کرتے ہو؟) گویا آپ (ﷺ) نے اس جواب کو ناپسند فرمایا۔

افادات:- اس لئے کہ ”مَیں“ کہنے سے تعارف تو ہوتا نہیں، اس لیے اس جواب پر آپ (ﷺ) نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا کہ: یہ ”مَیں“ کوئی جواب تھوڑا ہی ہے

ان سب روایتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ جب پوچھا جائے کہ کون ہو؟ تو جواب میں اپنا نام بتلائے؛ تاکہ پوچھنے والا پہچان لے۔

إستحباب تشميت العاطس اذا حمد الله تعالىٰ وكراهة تشميته اذا لم يحمد الله تعالىٰ وبيان آداب التشميت والعطاس والتثاؤب

چھینک کھانے والے کو جواب دینے کا مستحب ہونا:

اگر وہ الحمدللہ کہے

اگر وہ الحمدللہ نہ کہے تو اس کو جواب نہ دیا جائے

اور چھینک کھانے اور جمائی لینے کے آداب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسبابِ چستی پسندیدہ، اسبابِ سستی ناپسندیدہ:

حدیث ۸۷۸:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أنَّ النبيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: إنَّ اللهَ يُحِبُّ العُطَاسَ، وَيَكْرَهُ التَّثَاؤُبَ، فَإذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ وَحَمِدَ اللهَ تَعَالَى كَانَ حَقّاً عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ سَمِعَهُ أنْ يَقُولَ لَهُ: يَرْحَمُكَ اللهُ، وَأمَّا التَّثَاؤُبُ فَإنَّمَا هُوَ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَإذَا تَثَاءبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَرُدَّهُ مَا اسْتَطَاعَ، فَإنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا تَثَاءبَ ضَحِكَ مِنْهُ الشَّيْطَانُ.

(رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک و تعالیٰ چھینک کو پسند کرتے ہیں، اور جمائی لینے کو ناپسند کرتے ہیں، جب کوئی آدمی چھینک کھاکر الحمدللہ کہے تو جو مسلمان بھی اس کو سنے اس پر ضروری ہے کہ جواب میں یرحمک اللہ کہے۔ اور جمائی لینا شیطان کے اثر سے ہوا کرتا ہے، اس لئے اگر کسی کو جمائی آنے لگے تو جتنا ہوسکے اس کو روکنے کی کوشش کرے، اس لئے کہ تم میں سے جب کسی کو جمائی آتی ہے (اور وہ اپنا منھ چوڑا کرتا ہے) تو شیطان اس پر ہنستا ہے۔

افادات:- چھینک اور جمائی دونوں غیر اختیاری چیزیں ہیں تو پھر اس میں پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا کیا مطلب؟ جو چیز آدمی کو غیر اختیاری طور پر پیش آئے اس کے بارے میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کیا بتلانا چاہتے ہیں؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جمائی آنے کے کچھ

اسباب ہوا کرتے ہیں، جیسے آدمی زیادہ کھائے تو اس کی وجہ سے سستی رہتی ہے اور اسی کے نتیجہ میں جمائی آتی ہے۔ گویا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ آدمی کا ایسے اسباب اختیار کرنا جس کے نتیجہ میں جمائیاں آنے لگیں؛ اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے، اس لئے آدمی زیادہ نہ کھائے اور اپنی طبیعت پر سستی نہ طاری کرے۔

اور چھینک کو جو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے وہ اس لئے کہ اطباء لکھتے ہیں کہ چھینک کا آنا صحت کی علامت ہے، اور چھینک کی وجہ سے آدمی کے دماغ کے خلیوں میں جو کچھ رکاوٹیں ہوتی ہیں وہ دور ہو جاتی ہیں، اور آدمی ایک طرح کا نشاط محسوس کرتا ہے۔ چھینک سے پہلے آدمی کی طبیعت میں سستی تھی، چھینک آجانے کے بعد اس کی طبیعت میں نشاط اور چستی آجاتی ہے، اس لئے اس کو پسندیدہ قرار دیا گیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ چستی کے اسباب کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں اور سستی کے اسباب کو ناپسند کرتے ہیں۔ اس لئے مؤمن کو بھی اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ ہمیشہ ایک دم ایکٹیو (Active) اور چست رہے، اس کو اللہ تعالیٰ پسند کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب بھی بیٹھیں گے تو ٹانگیں اونچی کر کے اس پر سر رکھ دیں گے کہ نیند اور سستی نہ آتی ہو؛ تب بھی آنے لگے۔ گویا ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ "آجا نیند؛ مجھے پکڑ لے" "آسستی؛ میرے اوپر سوار ہو جا" اس کو شریعت پسندیدہ قرار نہیں دیتی۔ آدمی کو چاہیے کہ سستی کے اسباب کو اپنے سے دور بھگائے۔

اور کوئی آدمی چھینک کھا کر الحمدللہ کہے تو شریعت نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہا جائے یعنی اللہ تجھ پر رحم کرے۔ یہ چھینک کھانے والے کا جواب ہے۔ رہا جمائی کا معاملہ، جس کو ہم گجراتی میں ''બગાસા'' کہتے ہیں؛ تو وہ شیطان کا اثر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے اگر کسی کو جمائی آنے لگے تو جتنا ہو سکے اس کو روکنے کی کوشش کرے، یعنی ایسی تدبیر کرے کہ جمائی نہ آنے پائے۔

ایک لطیفہ

یہاں گجراتی والا جمائی (داماد) مراد نہیں ہے۔ کسی بڑھیا نے کہیں بیان میں سن لیا تھا کہ جمائی آئے تو اس کو روکنے کی کوشش کرو۔ تو جب بھی وہ اپنے داماد کو آتا ہوا دیکھتی تھی تو فوراً دروازہ بند کر لیا کرتی تھی۔

خیر! اگر کسی کو جمائی آنے لگے تو جتنا ہو سکے اس کو روکنے کی کوشش کرے، اس لئے کہ تم میں سے جب کسی کو جمائی آتی ہے اور وہ اپنا منہ چوڑا کرتا ہے تو شیطان اس پر ہنستا ہے۔ دراصل مؤمن کے ساتھ جب کوئی بھی ایسا معاملہ ہوتا ہے جس میں مؤمن کی شان کے خلاف کوئی بات ہو، یا مؤمن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہو؛ تو اس پر شیطان کو خوشی ہوتی ہے۔ اور جمائی کے اندر جب آدمی کا منہ کھلتا ہے اور منہ کی ہیئت اور شکل ذرا بگڑ جاتی ہے؛ تو اس پر بھی شیطان خوشی مناتا اور ہنستا ہے۔ اسی لئے آدمی کو جمائی کو روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ فقہاء نے لکھا ہے

کہ آدمی کو جب جمائی آنے لگے تو یہ تصور کرے کہ حضور اکرم (ﷺ) اور انبیاء کرام علیہم السلام کو جمائی نہیں آتی تھی؛ تو وہ رک جائے گی اور نہیں آئے گی۔ (شامی) اس لئے جمائی کو روکنے کی کوشش کرے، اس کے باوجود اگر آئے تو منہ پر ہاتھ رکھ لے۔

چھینکنے اور جمائی لینے کے آداب

حدیث ۸۷۹:-

وعنه عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَلْيَقُلْ: الحَمْدُ لله، وَلْيَقُلْ لَهُ أَخُوهُ أَوْ صَاحِبُهُ: يَرْحَمُكَ الله. فَإِذَا قَالَ لَهُ: يَرْحَمُكَ الله، فَلْيَقُلْ: يَهْدِيكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جب کسی کو چھینک آئے تو اس کو چاہیے کہ "الحَمْدُ لله" کہے، اور اس کا بھائی یا ساتھی (جو وہاں موجود ہو، جب وہ "الحَمْدُ لله" سنے تو) جواب میں "يَرْحَمُكَ الله" کہے۔ اور جب یہ "يَرْحَمُكَ الله" کہے تو اب چھینک کھانے والا جواب میں اس کو یہ دعا دے: "يَهْدِيكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ" کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ہدایت دے اور تمہاری حالت کو درست رکھے۔

افادات:- چھینک کھانے پر "الحَمْدُ لله" کہنا تو مستحب ہے، لیکن اسکے جواب میں "يَرْحَمُكَ الله" کہنا واجب ہے، اگر نہیں کہو گے تو گنہ گار ہو گے، اور "يَهْدِيكُمُ اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ" کہنا واجب نہیں ہے، بلکہ مستحبات میں سے ہے۔

حدیث ۸۸۰:-

وعن أبي موسىٰ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقولُ: إِذَا عَطَسَ أَحَدُكُمْ فَحَمِدَ اللهَ فَشَمِّتُوهُ. فَإِنْ لَمْ يَحْمَدِ اللهَ فَلَا تُشَمِّتُوهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جب کسی کو چھینک آئے اور وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے، تو تم اس کے جواب میں "يَرْحَمُكَ الله" کہو، لیکن اگر وہ "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" نہ کہے، تو تم جواب میں "يَرْحَمُكَ الله" بھی مت کہو

افادات:- معلوم ہوا کہ اگر چھینکنے والا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہے تب ہی ہم کو جواب میں "يَرْحَمُكَ الله" کہنا ہے۔ اور اگر ہم نے اس کا "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہنا نہ سنا ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں: "يَرْحَمُكَ الله، إِنْ حَمِدتَّ اللهَ" یعنی اگر تو نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہا ہے تو میں بھی "يَرْحَمُكَ الله" کہتا ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی دور ہوتا ہے، اس کی چھینک کی آواز تو ہمیں آئی، لیکن اس نے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہا یا نہیں، یہ ہمیں پتہ نہیں چلا، تو ایسے وقت ہم یوں بول سکتے ہیں۔

حدیث ۸۸۱:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ عَطَسَ رَجُلَانِ عِنْدَ النبيِّ (ﷺ) فَشَمَّتَ أَحَدَهُمَا وَلَمْ يُشَمِّتِ الآخَرَ. فَقَالَ الَّذِي لَمْ يُشَمِّتْهُ: عَطَسَ فُلَانٌ فَشَمَّتَّهُ، وَعَطَسْتُ فَلَمْ تُشَمِّتْنِي؟ فَقَالَ: هَذَا حَمِدَ اللهَ، وَإِنَّكَ لَمْ تَحْمَدِ اللهَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) کے پاس دو آدمیوں کو چھینک آئی، ان میں سے ایک کو تو حضور اکرم (ﷺ) نے جواب میں "یرحمک اللہ" کہا، اور دوسرے کو نہیں کہا۔ تو جس کو

"یرحمک اللہ" نہیں کہا تھا، اس نے شکایت کی کہ: اے اللہ کے رسول! آپ نے فلاں کو "یرحمک اللہ" کہا، اور مجھے نہیں کہا؟ تو حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اس نے "الحمدللہ" کہا تھا (اس لئے میں نے "یرحمک اللہ" کہا) اور تو نے "الحمدللہ" نہیں کہا۔

حدیث ۸۸۲:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله (ﷺ) إِذَا عَطَسَ وَضَعَ يَدَهُ أَوْ ثَوْبَهُ عَلَى فِيهِ، وَخَفَضَ -أَوْ غَضَّ- بِهَا صَوْتَهُ. شك الراوي. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کو جب چھینک آتی تھی، تو اپنا ہاتھ یا کپڑا اپنے منہ پر رکھ لیتے تھے، اور اپنی آواز کو پست کرتے تھے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ جب چھینک آئے تو ہاتھ یا کپڑا منہ پر رکھ لینا چاہیے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ چھینک کے اندر بلغم یا تھوک کا کچھ حصہ باہر آتا ہے، اور قریب والے آدمی کے چہرے یا اس کے کپڑوں پر جا گرتا ہے، اور یہ چیز اس کے لئے ناگواری کا باعث ہوتی ہے، اس لئے حضور اکرم (ﷺ) کا یہی معمول تھا اور تعلیم بھی یہی ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ چھینک کی سخت آواز بھی کپڑا رکھنے کی وجہ سے دب جائے گی، اس لئے کہ بعض مرتبہ اس آواز کی وجہ سے چھوٹا بچہ ڈر جاتا ہے اور رونے لگتا ہے، اس لئے آواز کو پست کرنے کی تعلیم ہے۔

حدیث ۸۸۳:-

وعن أبي موسىٰ رضی اللہ عنہ قَالَ : كَانَ اليَهُودُ يَتَعَاطَسُونَ عِنْدَ رسول اللهِ (ﷺ)، يَرْجُونَ أنْ يَقُولَ لَهُمْ : يَرْحَمُكُم الله، فَيَقُولُ : يَهْدِيكم اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُم.

(رواه أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہودی رسول اللہ (ﷺ) کی مجلس میں آکر اس امید پر چھینکیں کھایا کرتے تھے کہ حضور اکرم (ﷺ) جواب میں ان کو "یرحمک اللہ" کہیں، لیکن حضور اکرم (ﷺ) ان کو "یرحمک اللہ" نہیں کہتے تھے، بلکہ "يَهْدِيكم اللهُ وَيُصْلِحُ بَالَكُمْ" کہا کرتے تھے کہ اللہ تمہیں ہدایت دے اور تمہارا حال ٹھیک کرے۔ (یہودیوں کی شرارتیں چلتی رہتی تھیں۔)

حدیث ۸۸۴:-

وعن أبي سعيد الخدری رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): إِذَا تَثَاءبَ أَحَدُكُمْ فَلْيُمْسِكْ بِيَدِهِ عَلَى فِيهِ؛ فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جب کسی کو جمائی آئے، تو اپنا ہاتھ منھ پر رکھ لے، اس لئے کہ جس وقت منھ کھولتا ہے تو شیطان اندر گھستا ہے۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جمائی آئے اس وقت بھی ہاتھ رکھ لینا چاہیے، اور ادب یہ ہے کہ بایاں ہاتھ رکھے، تاکہ اگر کوئی ملوث کرنے والی چیز ہو تو بایاں ہاتھ ملوث ہو، دایاں ہاتھ ملوث ہونے کی نوبت نہ آئے۔

استحباب المصافحة عند اللقاء وبشاشة الوجه وتقبيل يد الرجل الصالح، وتقبيل ولده شفقة ومعانقة القادم من سفر وكراهية الانحناء

ملاقات کے وقت مصافحہ کا مستحب ہونا چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنا، نیک آدمی کے ہاتھ چومنا، اور اپنی اولاد کو محبت سے بوسہ دینا اور اگر کوئی آدمی سفر سے واپس آئے تو اس سے معانقہ کرنا اور جھکنے کا ناپسندیدہ ہونا

۲۵/رجب المرجب ۱۴۲۲ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱۳/اکتوبر ۲۰۰۱ء

سلام کا بیان چل رہا ہے اور چوں کہ مصافحہ بھی سلام کی تکمیل ہی ہے، اس لئے جب کسی آدمی سے ملاقات ہو تو سلام کے ساتھ مصافحہ بھی کرنا مستحب ہے۔ اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ سلام کرنا چاہیے، ایسا نہیں کہ سلام تو کر رہے ہیں لیکن منھ بگڑا ہوا ہے، اس سے تو سلام کا سارا مزا ہی کرکرا ہو جاتا ہے۔ اور سلام کے وقت نیک آدمی کا ہاتھ اس کی تعظیم اور ادب کے طور پر چومنا بھی اچھا ہے۔ اور اگر چھوٹا بچہ ہے تو اس کو شفقت اور محبت کی وجہ سے چومنا بھی پسندیدہ ہے۔ اور کوئی آدمی اگر سفر سے آیا ہے تو اس سے معانقہ کرنا۔ اور آدمی سلام اس طرح نہ کرے کہ پورا جھک جائے جس کو فرشی سلام کہتے ہیں۔ اگر جھکنے کی شکل پیدا ہو جائے تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا ہی سنت ہے:

حدیث ۸۸۵:-

عن أبي الخطاب قتادة رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ لأَنَسٍ: أَكَانَتِ المُصَافَحَةُ فِي أَصْحَابِ رسولِ الله (ﷺ)؟ قَالَ: نَعَمْ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا نبی کریم (ﷺ) کے صحابہ کے درمیان مصافحہ کا رواج اور دستور تھا؟ کہا: جی ہاں۔

افادات:- جب دو آدمی آپس میں ملیں اس وقت ان کو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا چاہیے۔ ''مصافحہ'' یعنی ایک آدمی کی ہتھیلی والا حصہ دوسرے آدمی کی ہتھیلی والے حصہ سے ملایا جائے۔ ہتھیلی ''صَفۡحَۃُ الۡیَدِ'' کہلاتی ہے۔ اور مصافحہ کی کامل سنت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کیا جائے اور دونوں ہاتھ سے کیا جائے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ چوں کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا غیروں کا شعار اور ان کا طریقہ ہے؛ اس لئے اس سے بچا جائے۔

بعض لوگ دو ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کو بدعت قرار دیتے ہیں؛ ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وہ لوگ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کرتے ہیں۔ حالاں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو مصافحہ کا مستقل باب قائم کیا ہے جس میں مصافحہ کا سنت ہونا بتلایا ہے، اور پھر دوسرا باب قائم کیا: ''بَابُ الۡأَخۡذِ بِالۡیَدَیۡنِ'' یعنی دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا، اور اس میں انہوں نے یہ اثر ذکر فرمایا: حضرت حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے محدّث گزرے ہیں، انہوں نے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا۔ اور پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی لائے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ کو ایسی حالت میں تشہد سکھلائی کہ میرا ہاتھ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ یہ روایت بخاری شریف میں موجود ہے۔ (بخاری، حدیث نمبر: ۶۲۶۵)

"میرا ہاتھ حضور اکرم (ﷺ) کے دونوں ہاتھوں میں تھا" سے استدلال کرتے ہوئے غیر مقلدین یوں کہتے ہیں کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہیے۔ ارے بھائی! جب صراحت موجود ہے کہ میرا ہاتھ حضور اکرم (ﷺ) کے "**دونوں ہاتھوں**" میں تھا؛ تو اب کچھ بھی کہنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟ اور رہا ان کا یہ کہنا کہ "کَفِّی" "میرا ہاتھ" ! تو اس میں اس بات کی تصریح کہاں ہے کہ انہوں نے ایک ہی ہاتھ سے مصافحہ کیا تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ ان کا ایک ہی ہاتھ ہو گا، خاص کر جبکہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم (ﷺ) کے ساتھ ادب و تعظیم کا جو معاملہ کرتے تھے اس کے پیشِ نظر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) تو اپنے دونوں ہاتھ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے بڑھائیں اور وہ اپنا صرف ایک ہی ہاتھ دیں !

یہاں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جو کہا، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ وہ اپنے لئے فخر کی ایک چیز بیان کر رہے ہیں۔ ویسے تو حضور اکرم (ﷺ) کے بھی دونوں ہاتھ تھے، اور انہوں نے بھی دونوں ہاتھ ہی بڑھائے تھے؛ تو اب یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ حضور اکرم (ﷺ) کا ایک ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ اس لئے کہ جب بھی دو آدمی مصافحہ کریں گے، تو ہر ایک کا ایک ہی ہاتھ دوسرے کے دونوں ہاتھوں میں ہو گا۔ اب یہاں تعبیر کی ایک شکل یہ تھی کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ یوں کہتے کہ حضور اکرم (ﷺ) کا دستِ مبارک میرے

دونوں ہاتھوں میں تھا۔ لیکن چوں کہ اپنی سعادت اور فخر کے طور پر ایک چیز بیان کرتے ہیں، اوراس تعبیر میں سعادت زیادہ ہے کہ میرا ہاتھ حضور اکرم (ﷺ) کے دوہاتھوں میں تھا، اس لئے انہوں نے یہ تعبیر اختیار کی، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مصافحہ کے وقت ان کا ایک ہی ہاتھ تھا۔ اور اگر مان لو کہ ایک ہی ہاتھ تھا تب بھی حضور اکرم (ﷺ) کے تو دونوں ہاتھ اسی روایت سے ثابت ہورہے ہیں۔

ہمارے شیخ الشیخ حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ بھوپال تشریف لے گئے وہاں کچھ غیر مقلدین ملاقات کے لئے آئے اور ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہا، تو حضرتؒ نے دونوں ہاتھ بڑھا کر فرمایا: مصافحہ اس طرح ہوتا ہے۔ اس پر ان میں سے ایک آدمی فوراً بول پڑا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں: "کَانَ کَفِّي بَیْنَ کَفَّیَّ الخ" میرا ہاتھ حضور اکرم (ﷺ) کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضور اکرم (ﷺ) کے تو دو ہی ہاتھ تھے نا! اب غور کرلو کہ سنت پر ہم عمل کررہے ہیں، یا آپ؟ نبی کریم (ﷺ) کا عمل تو دونوں ہاتھوں سے مصافحہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال! دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کو سنت قرار دیا گیا ہے۔

مصافحہ کے موجد:

حدیث ۸۸۶:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: لَمَّا جَاءَ أَهْلُ الْيَمَنِ، قَالَ رسولُ الله (ﷺ): قَدْ جَاءَكُمْ أَهْلُ الْيَمَنِ. وَهُمْ أَوَّلُ مَنْ جَاءَ بِالْمُصَافَحَةِ. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یمن کے لوگ حضور (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضور (ﷺ) نے فرمایا: تمہارے پاس یمن والے آئے، اور یہی وہ لوگ ہیں جو سب سے پہلے مصافحہ کا طریقہ لائے۔

حدیث ۸۸۷:-

وعن البراءِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): مَا مِنْ مُسْلِمَيْنِ يَلْتَقِيَانِ فَيَتَصَافَحَانِ إِلاَّ غُفِرَ لَهُمَا قَبْلَ أَنْ يَفْتَرِقَا. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت براء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: دو مسلمان جب آپس میں ملتے ہیں اور مصافحہ کرتے ہیں، تو جدا ہونے سے پہلے دونوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

افادات:- دیکھو! مصافحہ کی کتنی بڑی فضیلت ہے! لیکن ساتھ میں سلام بھی کرنا چاہیے، اس لئے کہ مصافحہ تو سلام کی تکمیل ہے، صرف مصافحہ کرے اور سلام نہ کرے؛ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔

مصافحہ، معانقہ، بوسہ؛ کیا کرے، کیا نہیں ؟

حدیث ۸۸۸:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: يَارسولَ اللهِ! الرَّجُلُ مِنَّا يَلْقَى أخَاهُ أَوْ صَدِيقَهُ، أينحَنِي لَهُ؟ قَالَ: لاَ. قَالَ: أَفَيَلْتَزِمُهُ وَيُقَبِّلُهُ؟ قَالَ: لاَ. قَالَ: فَيَأْخُذُ بِيَدِهِ وَيُصَافِحُهُ؟ قَالَ: نَعَمْ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی یا کسی دوست سے ملاقات کرتا ہے، تو کیا اس وقت جھک سکتا ہے؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: نہیں۔ اس نے کہا: اس سے معانقہ کرکے اس کو بوسہ دے سکتا ہے؟ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: نہیں۔ اس آدمی نے پوچھا: اچھا! اس کا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کر سکتا ہے؟ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جی ہاں! یہ کر سکتا ہے۔

دست بوسی وقدم بوسی

حدیث ۸۸۹:-

وعن صَفْوَانَ بن عَسَّالٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ يَهُودِيٌّ لِصَاحِبِهِ: اذْهَبْ بِنَا إِلَى هَذَا النَّبِيِّ، فَأَتَيَا رسولَ الله (صلی اللہ علیہ وسلم)، فَسَألاهُ عَنْ تِسْعِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ... فَذَكَرَ الْحَدِيثَ إِلَى قَوْلِهِ: فقَبَّلا يَدَهُ وَرِجْلَهُ، وقالا: نَشْهَدُ أنَّكَ نَبِيٌّ.

(رواہ الترمذی وغیرہ بأسانید صحیحۃٍ)

ترجمہ:۔حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے اپنے ایک ساتھی سے کہا: ہمیں اس نبیؑ(یعنی حضوراکرم (ﷺ)) کے پاس لے چلو۔دونوں حضور اکرم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اورانہوں نے ”تِسع آیاتٍ بَیِّنَاتٍ“یعنی نو آیات ِبینات کے متعلق سوال کیا(یہ ایک لمبی روایت ہے جس کو مختصر کرتے ہوئے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ) حضور اکرم (ﷺ) نے ان کے سوالات کے جوابات دیئے،توان دونوں نے نبیؑ کریم (ﷺ) کے دست ِمبارک اورپاؤں کو بوسہ دیا، اور کہنے لگے: ہم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نبیؑ ہیں۔

افادات:۔بس!یہاں اس روایت کولاکریہ بتلاناچاہتے ہیں کہ انہوں نے حضور اکرم (ﷺ) کے دست ِمبارک کو بوسہ دیامعلوم ہواکہ کوئی آدمی قابلِ تعظیم ہو،جیسے: استاذ، باپ، یا کوئی بڑاعالم؛تواس کےہاتھ کو بوسہ دے سکتے ہیں ،اسی طریقہ سے ماں باپ کے پاؤں کو بھی بوسہ دے سکتے ہیں،لیکن کوئی ایسی شکل جوعبادت کی ہو،وہ نہ پائی جانی چاہیے ، اس سے بچتے ہوئے اس کی اجازت ہے۔

حدیث ۸۹۰:۔

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قِصَّۃً،قَالَ فِیھَا: فَدَنَوْنَامِنَ النَّبِیِّ (ﷺ) فَقَبَّلْنَا یَدَہٗ

(رواہ أبُو داود)

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ایک قصہ نقل کیاجاتاہے(اس قصے کویہاں انہوں نے چھوڑدیاہے) اخیر میں یہ ہے کہ ہم نبیؑ کریم (ﷺ) کے قریب ہوئےاورآپ کے دست مبارک کو بوسہ دیا۔

یہاں یہ روایت اسی نسبت سے لائے ہیں کہ ہاتھ کو بوسہ دیا جاسکتا ہے۔

حدیث ۸۹۱:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: قَدِمَ زَيْدُ بْنُ حَارِثَةَ الْمَدِيْنَةَ وَرسولُ الله (ﷺ) فِى بَيتِى، فَأَتَاهُ فَقَرَعَ البَابَ، فَقَامَ إِلَيْهِ النبيُّ (ﷺ) يَجُرُّ ثَوْبَهُ، فَاعْتَنَقَهُ وَقَبَّلَهُ.**

(رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ جب مدینہ منورہ آئے تو۔ (آتے ہی) نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت حضور اکرم (ﷺ) میرے مکان میں تشریف فرماتھے، انہوں نے آکر حضور کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا، تو حضو ر (ﷺ) اپنا کپڑا گھسیٹتے ہوئے اٹھے اور حضرت زید کو گلے سے لگایا اور بوسہ دیا۔

افادات:- اس سے معانقہ یعنی گلے سے لگانا اور بوسہ دینے کو بتلانا چاہتے ہیں۔

حدیث ۸۹۲:-

وعن أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ لی رسول الله (ﷺ): لاَ تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئاً، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ.** (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے مجھ سے فرمایا: کسی بھی نیکی کے کام کو معمولی نہ سمجھو، چاہے اپنے بھائی سے ہنستے چہرے کے ساتھ ملاقات ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- بعض مرتبہ آدمی کسی کام کو یہ سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے کہ یہ چھوٹا سا تو کام ہے، اس کو کیا کریں ! پہلے بھی بتلایا جاچکا ہے کہ نیکی بہر حال نیکی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اوراللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی مغفرت کا پروانہ حاصل ہونے کا ذریعہ بن جائے۔اس لئے کہ کب کونسی نیکی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہوتی ہے ، اس کے متعلق کوئی بات گارنٹی سے کہی نہیں جاسکتی۔اس لئے نبیٔ کریم (ﷺ) نے تاکید فرمائی کہ کسی بھی نیکی کے کام کو چھوٹا سمجھ کر چھوڑ مت دو، بلکہ اس کو انجام دیدیا کرو

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمان بھائی سے ملاقات کے وقت اپنا چہرہ ہنستا ہوا رکھنا چاہیے،کیوں کہ ملاقات کرنا ایک مستقل نیکی ہے، اور ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ملنا الگ نیکی ہے ،اس پر بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ثواب ملتا ہے، اور اس سے مسلمان بھائی کا جی بھی خوش ہوتا ہے۔

یہ جذبۂ شفقت کا ہی تقاضہ ہے

حدیث ۸۹۳:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ:قَبَّلَ النبيُّ (ﷺ) الحَسَنَ بنَ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہما فَقَالَ الأَقْرَعُ بن حَابِسٍ : إنَّ لِي عَشَرَةً مِنَ الْوَلَدِ مَا قَبَّلْتُ مِنْهُمْ أحَداً. فَقَالَ رسول الله (ﷺ) : مَنْ لاَ يَرْحَمْ لاَ يُرْحَمْ ! (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے(اپنے نواسے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے)حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کوبوسہ دیا(دیہات کے رہنے والے ایک صحابی حضرت)اقرع بن حابس رضی اللہ عنہ وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا: میرے دس بچے ہیں ،لیکن میں نے توآج تک کسی ایک کو بھی بوسہ نہیں دیا! تو نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا:جو آدمی رحم،شفقت اورمہربانی کا معاملہ نہیں کرتا،اس کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم اور شفقت کا معاملہ نہیں کیاجاتا۔

افادات:- بعض روایتوں میں یہ بھی ہے:'' أَوَأَمْلِكُ لَكَ أَنْ نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ قَلْبِكَ الرَّحْمَةَ. (بخاری شریف : باب رَحْمَةِ الْوَلَدِ وَتَقْبِيلِهِ وَمُعَانَقَتِهِ.)'' تمہارے دل سے اللہ تعالیٰ نے شفقت نکال دی؛تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے ؟ مطلب یہ ہے کہ یہ تو شفقت اور مہربانی کا تقاضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نےبندوں کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا کیاہے،اوراس جذبہ کا تقاضایہ ہے کہ جب اس کے سامنے کوئی چھوٹا بچہ آتا ہے تو اس کا جی چاہتاہے کہ محبت سے اس کو بوسہ دے۔

چوں کہ انہوں نےباب کا جوعنوان قائم کیاتھااس میں بچوں کو محبت سے بوسہ دینا بھی تھا،اسی نسبت سے یہ روایت لائے ہیں۔

كتابُ عيادةِ الْمَرِيْض، وتشييع الميت، والصلاة عليه، وحضور دفنه،

بیمار کی خبر گیری اور تیمار داری۔ کوئی انتقال کر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ جانا۔ جنازہ کی نماز پڑھنا۔ تدفین کے وقت حاضر رہنا، دفن کے بعد اس کی قبر کے پاس تھوڑی دیر ٹھہر جانا "دعائے تَثَبُّت" یعنی نکیرین کے سوال کے وقت اس کے ثابت قدم رہنے کی دعا کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب عیادۃ المریض

عیادت؛ حقِ مسلم سمجھ کر کریں،رواجِ سماج سمجھ کر نہیں :

بیمار کی عیادت بھی ایک مستقل نیکی کا کام ہے اور جو حقوق ایک مؤمن کے دوسرے پر لازم کئے گئے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی کا ذریعہ ہے، اوراللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے؛یہ سمجھ کر آدمی کو بیمار کی عیادت کے لئے جانا چاہیے۔

ایک بات خاص طورپریا درکھنی چاہیے کہ بعض نیکی کے کام وہ ہیں جن کو ہم انجام تو دیتے ہیں،لیکن اپنے معاشرہ کے رواج اور چلن کی وجہ سے جس وقت ان کاموں کو انجام دے رہے ہوتے ہیں تب ہمارے دل میں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم نیکی کررہے ہیں ،بلکہ عام طورپر ہم ایک رسم و رواج کے طورپراوربدلہ کی کارروائی کے طورپر کرتے ہیں۔جیسے: ایک آدمی بیمار ہواتوہم سب اس کی خبر گیری کے لئے جاتے ہیں ،ہمارے معاشرہ میں یہ سلسلہ ہے، لیکن عام طورپر آدمی سوچتا ہے کہ جب میں بیمارہوا تھاتویہ آدمی میری خبرپوچھنے کے لئے میرے گھر آیا تھا۔میرابیٹا بیمارہوا تھاتب بھی آیاتھا،چلو !اب مَیں بھی اس کے پاس ہوآؤں۔حالاں کہ یہ ایک مؤمن کاحق ہے،اور اللہ تعالیٰ نے ایمان والی نسبت سے اہلِ ایمان کے درمیان

ایک عالمی رشتہ قائم کیاہے، اور ایمان والوں کی مستقل برادری او رپریوار(પરીવાર) بنایا ہے ،اسی نسبت سے آپسی حقوق قائم کئے ہیں۔تو ایک مؤمن کا دوسرے مؤمن پر یہ حق ہے کہ چاہے کوئی اور پہچان نہ ہو،تب بھی جب معلوم ہو کہ فلاں مسلم بھائی بیمار ہے تو اس کی عیادت اور خبر گیری کے لئے جائے،اور اسی حیثیت سے جانا چاہیے،اسی طرح جنازہ میں شرکت بھی اسی حیثیت سے ہونی چاہیے۔

نیت ٹٹول لیں :

بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ہماری سوسائٹی اور سماج میں چلن ہے،ہم ان چیزوں کو انجام دیتے ہیں،جیسے:رشتہ داروں کے ساتھ موقعہ آنے پر بھلائی کا سلوک کرلیتے ہیں ،کسی کا انتقال ہوا تو جنازہ میں حاضری دیدیتے ہیں ،کوئی بیمار ہوا تو اس کی خبر گیری کے لئے جاتے ہیں ، لیکن عام طور پر ایسا مزاج بنتا جارہاہے کہ یہ کام ہم اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر نہیں،بلکہ ایک رسم و رواج اور بدلہ کی کارروائی کے طور پر کرتے ہیں۔اگر ایسے جذبہ سے کریں گے تو پھر وہ عبادت نہیں کہلائے گی اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

شیطان ہمارا ازلی دشمن ہے، وہ ہماری ہر چیز میں اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ہمیں نقصان پہنچے۔اب دیکھئے !یہ سب نیکی کے کام ہیں اور ہمیں اس کی تاکید کی گئی ہے نبی کریم (ﷺ)نے بڑے اہتمام سے اس کا حکم دیاہے جیساکہ روایتوں میں موجود ہے، اور ہم ان

کاموں کو انجام بھی دیتے ہیں ، لیکن جس وقت ہم ان کاموں کو انجام دے رہے ہوتے ہیں اس وقت ہمارے دل میں دور دور بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ ہم یہ اس لئے کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، نبی کریم (ﷺ) کی سنت ہے ،اور شریعت نے مؤمن ہونے کی حیثیت سے ہم پر یہ حق لازم کیا ہے؛ بلکہ دوسرے جذبات اور خیالات کارفرما ہوتے ہیں ،تو پھر وہ اجرو ثواب اور بڑے بڑے وعدے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اعمال پر کئے گئے ہیں حاصل نہیں ہوں گے۔ اس لئے بڑی بڑی نیکیاں جن کا آگے ذکر آرہا ہے ان پر اجروثواب اسی صورت میں حاصل ہو گا جب ہم ان کو اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر ، اور ایک مؤمن کا حق سمجھتے ہوئے اللہ ہی کے واسطے انجام دیں گے، اگر رسم و رواج یا بدلہ کی کاروائی کے طور پر کریں گے؛ تو یہ چیز حاصل نہیں ہو گی۔ لہٰذا جب ہم وہ کام کر ہی رہے ہیں تو اس بات کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔ ہمارے اکابر اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔

بنیاد وہی ہو:

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق سنا کہ :ایک مرتبہ ایک جنازہ میں جانے سے پہلے سوچنے لگے کہ اس جنازہ میں کس لئے جا رہا ہوں ؟ فلاں کا باپ ہے، فلاں کا بھائی ہے، فلاں کا بیٹا ہے؛ اس لئے جا رہا ہوں؟ یا ایک مؤمن کا جنازہ ہے اس لئے جا رہا ہوں۔ عام طور پر جب ہم لوگ جنازوں میں جاتے ہیں ،تو اس کے پسِ پردہ یہی چیز مؤثر ہوتی ہے کہ فلاں کے ابا

کا انتقال ہوا اس لئے چلو، یعنی اگر یہ اس کا باپ نہ ہوتا تو ہم نہ جاتے۔ حالاں کہ شریعت نے ہمیں جو تعلیم دی ہے اس میں یہ نکتہ ملحوظ رکھنے کے لئے کہا ہے کہ ایک مؤمن ہونے کی حیثیت سے آپ جایئے، اس کے ساتھ ساتھ کسی اور حیثیت کو بھی ملحوظ رکھنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن اصل بنیاد وہی ہونی چاہیے۔

ہمیں حضور نے حکم دیا...:

حدیث ۸۹۴:-

عن البَرَاءِ بن عازِبٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: أَمَرَنَا رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) بِعِيَادَةِ الْمَرِيضِ وَاتِّبَاعِ الجَنَازَةِ، وَتَشْمِيتِ العَاطِسِ، وَإِبْرَارِ الْمُقْسِمِ، وَنَصْرِ الْمَظْلُومِ، وَإِجَابَةِ الدَّاعِي وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہمیں بیمار کی خبر گیری، جنازوں کے ساتھ چلنے، کوئی آدمی چھینک کھا کر الحمد للہ کہے تو اس کے جواب میں یرحمک اللہ کہنے، قسم دینے والے کو اس کی قسم میں بری کرنے، مظلوم کی مدد کرنے، دعوت دینے والے کی دعوت قبول کرنے، اور سلام کو پھیلانے کا حکم دیا ہے۔

افادات:- چوں کہ بیماری کی حالت میں بیمار کے اندر ایک خاص شکستگی پیدا ہو جاتی ہے، آدمی اپنی طبیعت پر تنگی اور پریشانی محسوس کرتا ہے، آپ جب اس کی عیادت اور خبر گیری کے لئے جائیں گے تو اس کی وجہ سے اس کو خوشی اور فرحت محسوس ہوگی۔

قسم دینے والے کو اس کی قسم میں بری کرنا۔مثلاً : کسی آدمی نے آپ کو قسم دے کر کسی چیز کا مطالبہ کیااور آپ اس کامطالبہ پوراکرسکتے ہیں ،اگر آپ اس کام کوانجام نہیں دیں گے تو اندیشہ یہ ہے کہ وہ اپنی قسم میں حانث ہو جائے گا، اور اس پر کفارہ واجب ہوجائے گا؛ تو اس کو اس کی قسم میں حانث ہونے اور کفارہ واجب ہونے سے بچانے کے لئے آپ کوچاہیے کہ وہ کام کردیں۔

یہاں یہ روایت اس لئے پیش کی ہے کہ اس میں پہلے نمبر پر بیمار کی خبر گیری کے لئے جانے کاحکم دیاگیاہے۔

مسلمان کے مسلمان پرپانچ حقوق:

حدیث ۸۹۵:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: حَقُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ خَمْسٌ: رَدُّ السَّلَامِ، وَعِيَادَةُ الْمَرِيضِ، وَاتِّبَاعُ الْجَنَائِزِ، وَإِجَابَةُ الدَّعْوَةِ، وَتَشْمِيتُ الْعَاطِسِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نےارشاد فرمایا : ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کےاوپرپانچ حقوق ہیں :-سلام کا جواب دینا(یہ واجب ہے) بیمار کی خبری گیری کرنا۔جنازہ کےساتھ جانا۔دعوت کو قبول کرنا۔چھینک کھانے والا ”الحمدللہ“ کہےتو” یرحمک اللہ“ سے جواب دینا۔

افادات:- اگر کوئی خبر گیری کرنے والا نہیں ہے، اور خبر گیری نہ کرنے کی صورت میں اس کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے ،تو اس کی خبر گیری ضروری ہے، اگر کوئی نہیں کرے گا اور فوت ہوجائے گا تو سب گنہگار ہوں گے۔اور اگر کوئی ایسا خبر گیری کرنے والا ہے کہ یہ ضائع ہونے سے بچ جائے گا تو دوسروں کے لئے سنت ہے۔

بندہ سے اللہ تعالیٰ کی شکایت:

حدیث ۸۹۶:-

وعنه،قَالَ:قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : إنَّ اللهَ-عزوجل-يَقُولُ يومَ القِيامَةِ: يَاابْنَ آدَمَ! مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِي! قَالَ: يَارَبِّ! كَيْفَ أعُودُكَ وَأنْتَ رَبُّ العَالَمِينَ؟! قَالَ: أمَا عَلِمْتَ أنَّ عَبْدِي فُلاناً مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ! أمَا عَلِمْتَ أنَّكَ لَوْ عُدْتَهُ لَوَجَدْتَنِي عِنْدَهُ! يَا ابْنَ آدَمَ، اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ أُطْعِمُكَ وَأنْتَ رَبُّ العَالَمِينَ؟! قَالَ: أمَا عَلِمْتَ أنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِي فُلانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ! أمَا عَلِمْتَ أنَّكَ لَوْ أطْعَمْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي! يَا ابْنَ آدَمَ، اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِي! قَالَ: يَا رَبِّ، كَيْفَ أسْقِيكَ وَأنْتَ رَبُّ العَالَمِينَ؟! قَالَ: اسْتَسْقَاكَ عَبْدِي فُلاَنٌ فَلَمْ تَسْقِهِ! أمَا عَلِمْتَ أنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهُ لَوَجَدْتَ ذَلِكَ عِنْدِي! (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز اللہ تعالیٰ انسان سے کہیں گے :اے ابن آدم ! میں بیمار ہوا تو میری خبر لینے کے لئے نہیں آیا؟انسان کہے گا: باری تعالیٰ!میں آپ کی خبر لینے کیسے آتا؟ آپ تو سارے جہانوں کے پالنے والے ہیں ، آپ کہاں

بیمار ہوسکتے ہیں ۔باری تعالیٰ فرمائیں گے:تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا، لیکن تو اس کی خبر لینے کے لئے نہیں گیا تھا۔تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کی عیادت کے لئے جاتا ، تو مجھے بھی اس کے پاس پاتا (یعنی میری رضامندی تجھے حاصل ہوتی)

پھر باری تعالیٰ فرمائیں گے:اے انسان !میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھ کو کھانا نہیں دیا؟انسان عرض کرے گا: باری تعالیٰ!میں بھلا آپ کو کیا کھانا دیتا؟آپ تو سارے جہانوں کے پالنے والے ہیں ۔باری تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے اس کو کھانا نہیں دیا تھا۔کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اس کو کھانا دیتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔(یعنی کھانا دینے کا ثواب تجھے یہاں حاصل ہوتا)

پھر باری تعالیٰ کہیں گے: اے انسان! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے مجھے پانی نہیں پلایا؟ بندہ عرض کرے گا:باری تعالیٰ! میں کیسے آپ کو پانی پلاتا؟آپ تو سارے جہانوں کے پالنے والے ہیں؟باری تعالیٰ فرمائیں گے: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا۔تجھے معلوم نہیں کہ اگر تو اسے پانی پلاتا تو اس کا ثواب یہاں پاتا۔

افادات:- کیسی عجیب وغریب روایت ہے!اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں کے ساتھ کیسا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بیمار کی خبر گیری کے لئے جانے کو اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ گویا میری خبر لینے کے لئے آیا۔ایک بھوکے کے کھلانے کو تعبیر کرتے ہیں کہ مجھے کھلایا، ایک پیاسے کے پانی پلانے کو تعبیر کرتے ہیں کہ مجھے پلایا۔یہ چھوٹے

چھوٹے اعمال ہیں لیکن ان کاموں کا اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنا اونچا مقام ہے! ان پر عمل کرنے سے بڑا مقام حاصل ہوتا ہے۔

بیمار کی عیادت کے فضائل:

حدیث ۸۹۷:-

وعن أَبِي موسىٰ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسولُ الله (صلى الله عليه وسلم): عُودُوا المَرِيضَ، وَأَطْعِمُوا الجَائِعَ، وَفُكُّوا العَانِيَ. (رواه البخاری) ((العَانِي)): الأَسِيرُ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضوراکرم (صلى الله عليه وسلم) نے ارشاد فرمایا: بیمار کی خبر لو، یعنی تیما داری کے لئے جاؤ۔ بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔ اور قیدی کو چھڑاؤ۔

افادات:- اگر کسی مسلمان بھائی کو دشمنوں نے قید کرلیاہے تواس کو چھڑاؤ۔ اس روایت میں بیمار کی خبر لینے کا حکم دیا گیا ہے اس لئے یہاں لائے ہیں ۔بتلانا چاہتے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے بیمار کی خبر لینے کا مستقل حکم دیاہے۔

حدیث ۸۹۸:-

وعن ثوبان رضی اللہ عنہ عن النبی (صلى الله عليه وسلم) قَالَ: إِنَّ المُسْلِمَ إِذَا عَادَ أَخَاهُ المُسْلِمَ ، لَمْ يَزَلْ فی خُرْفَةِ الجَنَّةِ حَتَّى يَرْجِعَ. قِيلَ: يَارَسولَ الله! وَمَا خُرْفَةُ الجَنَّةِ؟ قَالَ: جَنَاهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:۔حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ایک مسلمان جب اپنے بیمار بھائی کی خبر کے لئے جاتا ہے، تو وہ برابر جنت کے خرفہ میں رہتاہے یہاں تک کہ واپس لوٹے۔پوچھا گیا کہ جنت کے خرفہ کیاہیں ؟توارشاد فرمایا: جنت کے میوے اور پھل۔

افادات:۔ گویا اس کے اس عمل پر اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں جنت کے پھل ملیں گے۔

دومنٹ میں سترہزارفرشتوں کی بارہ گھنٹوں کے لئے ڈیوٹی:

حدیث ۸۹۹:-

وعن عليّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله (ﷺ) يَقُولُ: مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَعُودُ مُسْلِماً غُدْوةً إلاَّ صَلَّى عَلَيْهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ حَتَّى يُمْسِي، وَإنْ عَادَهُ عَشِيَّةً إلاَّ صَلَّى عَلَيْهِ سَبْعُونَ أَلْفَ مَلَكٍ حَتَّى يُصْبحَ، وَكَانَ لَهُ خَرِيفٌ في الْجَنَّةِ. (رواه الترمذي،وقال: حديث حسن)

((الخَرِيفُ)): الثَّمرُ الْمَخْرُوفُ، أيْ: الْمُجْتَنَى.

ترجمہ:۔حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی مسلمان کسی مسلمان کی عیادت یعنی تیارداری کے لئے صبح کے وقت جاتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لئے دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔اور اگر شام کو کسی مسلمان کی خبر گیری کے لئے گیاتو صبح تک ستّر ہزار فرشتے اس کے لئے دعا کرتے ہیں۔اوراس کے لیے جنت میں پھل اور میوے تیار ہوتے ہیں۔

افادات:- دیکھئے! کتنا بڑا ثواب ہے کہ ایک چھوٹا سا عمل اور دو منٹ کا کام ہے لیکن ستّر ہزار فرشتوں کو بارہ گھنٹے کے واسطے کام میں لگا دیا۔

غیر مسلم کی عیادت:

حدیث ۹۰۰:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ غُلَامٌ يَهُودِيٌّ يَخْدُمُ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم)، فَمَرِضَ، فَأَتَاهُ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَعُودُهُ، فَقَعَدَ عِنْدَ رَأْسِهِ، فَقَالَ لَهُ: ((أَسْلِمْ)) فَنَظَرَ إِلَى أَبِيهِ وَهُوَ عِنْدَهُ؟ فَقَالَ: أَطِعْ أَبَا الْقَاسِمِ، فَأَسْلَمَ، فَخَرَجَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم)، وَهُوَ يَقُولُ: ((الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَنْقَذَهُ مِنَ النَّارِ)) (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت کرتا تھا، آپ کے کام کاج کر دیا کرتا تھا، وہ بیمار ہو گیا، جب حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو معلوم ہوا تو آپ اس کی خبر گیری کے لئے گئے اور اس کے سرہانے بیٹھے اور اس سے کہا: اسلام لے آ۔ (اس کا باپ وہیں موجود تھا) وہ اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگا (گویا باپ سے پوچھ رہا تھا کہ میں ان کی بات مانوں؟) باپ نے کہا: ابو القاسم جو کہہ رہے ہیں ان کی بات کو مان لو (یعنی ایمان لے آؤ۔ یہودی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ابو القاسم ہی کہا کرتے تھے) چناں چہ وہ اسلام لے آیا (اس کے بعد اس کا انتقال ہو گیا) نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) وہاں سے یہ کہتے ہوئے باہر تشریف لائے کہ اس اللہ کی تعریف ہے جس نے اسے جہنم سے چھٹکارا دیدیا (یعنی موت سے پہلے ایمان کی توفیق دی اور جہنم سے بچ گیا۔)

افادات:–اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی غیر مسلم پڑوسی ہو، یا کسی غیر مسلم کے ساتھ کاروباری لائن سے، یا کسی اور نسبت سے تعلق ہو، اور وہ بیمار ہو جائے تو اس کی بھی خبر گیری اور تیمارداری کے لئے آدمی کو جانا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس باب میں یہی بات بتلانا چاہتے ہیں کہ بیمار کی خبر گیری کرنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔اور نبی کریم (ﷺ) کی سنت ہے۔

اب بیمار کے پاس جب خبر گیری کے لئے جائے تو اس کے کیا احکام ہیں، اور وہاں جاکر کیا کہنا چاہیے، اور کس طرح خبر دریافت کرنی چاہیے، اس کو اگلے باب میں بتلا رہے ہیں۔

باب مایدعیٰ للمریض

بیمار کے لئے کیا دعا کی جائے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پھوڑے پھنسی اور زخم کا دم:

حدیث ۱۰۹:-

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) كَانَ إِذَا اشْتَكَى الإِنْسَانُ الشَّيْءَ مِنْهُ، أَوْ كَانَتْ بِهِ قَرْحَةٌ أَوْ جُرْحٌ، قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) بِأُصْبُعِهِ هكَذا -وَوَضَعَ سُفْيَانُ بْنُ عُيَيْنَةَ الرَّاوِى سَبَّابَتَهُ بِالأَرْضِ ثُمَّ رَفَعَهَا- وقال: بِسمِ اللهِ، تُرْبَةُ أَرْضِنَا، بِرِيقَةِ بَعْضِنَا، يُشْفَى بِهِ سَقِيمُنَا، بِإِذْنِ رَبِّنَا. (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب کوئی آدمی بیمار ہوتا یعنی اس کو کوئی زخم، یا پھوڑا پھنسی ہوتی تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی انگلی لعابِ مبارک سے تر کرکے زمین کے اوپر رکھتے (اس پر مٹی لگ جاتی) راوی حضرت سفیان بن عینیہ (جو بڑے محدث ہیں انہوں) نے انگلی زمین پر رکھی پھر اٹھا کر بتلایا (کہ اس طرح کرتے تھے۔ پھر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی وہ انگلی اس پھوڑے، پھنسی، یا زخم پر رکھتے تھے)

اور یہ دعاپڑھتے تھے جس کا ترجمہ یہ ہے: اللہ کے نام سے ،ہماری زمین کی مٹی، ہم میں سے کسی کے لعاب کے ذریعہ سے،ہمارے بیمار کو شفا دی جائے گی،اللہ کے حکم سے۔(تواس سے وہ زخم ٹھیک ہو جاتا تھا)

افادات:–معلوم ہوا کہ کوئی پھنسی یا زخم ہوجائے تو اس موقعہ پر ایسا کیا جائے۔بیمار خود بھی کرسکتا ہے،اور دوسرا بھی کر سکتاہے، بشرطیکہ کوئی شرعی رکاوٹ موجود نہ ہو، جیسے نامحرم عورت ہو،تو وہاں یہ عمل نہیں کریں گے۔

عیادت کی دعا:

حدیث ۹۰۲:-

وعنها أنَّ النَّبيَّ (ﷺ) كَانَ يَعُودُ بَعْضَ أَهْلِهِ يَمْسَحُ بِيدِهِ اليُمْنَى، ويقولُ: اللَّهُمَّ رَبَّ النَّاسِ، أَذْهِب البَأْسَ، اشْفِ أَنْتَ الشَّافِي لاَ شِفَاءَ إلاَّ شِفَاؤكَ، شِفَاءً لاَ يُغَادِرُ سَقماً . (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:–حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) اپنے گھروالوں میں سے کسی کی عیادت کے لئے جب تشریف لے جاتے تو اپنا داہنا ہاتھ اس کی پیشانی یا جسم پر پھیرتے تھےاور یہ دعاپڑھتے، جس کا ترجمہ یہ ہے :اے اللہ !لوگوں کے پروردگار،بیماری دورکردے اور تندرستی دے،تو ہی تندرستی دینے والا ہے،تندرستی تیری ہی دی ہوئی ہے ، ایسی تندرستی دے کہ کوئی بیماری باقی نہ رہ جائے۔

افادات:–یہ دعا بھی پڑھنی چاہیے، ہم لوگ عیادت کے لئے تو جاتے ہیں ، لیکن عیادت کے موقعہ پر جو دعائیں پڑھنی چاہیے ان کا اہتمام نہیں کرتے،اس وقت ہمیں یاد ہی نہیں رہتا

اوراس کا خیال ہی نہیں آتا کہ یہ دعائیں بھی یاد کرلینی چاہئیں۔اگر عربی میں یہ دعایادنہ ہوتو اس کاترجمہ اور مفہوم ہی ادا کرلیا کریں ؛تب بھی یہ دعا ہو جائے گی۔کوئی لمبی دعانہیں ہے، مختصر سی ہے،یاد کرلینی چاہیے۔

حدیث ۹۰۳:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ **أنه قَالَ لِثَابِتٍ رحمه الله: أَلَا أَرْقِيكَ بِرُقْيَةِ رسول الله** (ﷺ)؟ **قَالَ: بَلَى. قَالَ: اللَّهُمَّ رَبَّ النَّاسِ، مُذْهِبَ الْبَأْسِ، اشْفِ أَنْتَ الشَّافِي، لَا شَافِيَ إِلَّا أَنْتَ، شِفَاءً لَا يُغَادِرُ سَقَماً.** (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ نے حضرت ثابت رحمۃ اللہ علیہ سے کہا: میں تم کو نبی کریم (ﷺ) والی جھاڑ پھونک نہ کردوں؟(یعنی حضوراکرم (ﷺ) کسی بیمار کو جو دعا پڑھ کر دم کرتے تھے اس طرح دم کر دوں ؟) انہوں نے کہا: کیوں نہیں ! ضرور۔توحضرت انس رضی اللہ عنہ نے اوپر والی دعا پڑھی (اور پھردم بھی کردیا)

حدیث ۹۰۴:-

وعن سعدِ بن أَبِي وقاصٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ: عَادَنِي رسول الله** (ﷺ) **فَقَالَ: اَللَّهُمَّ اشْفِ سَعْداً، اَللَّهُمَّ اشْفِ سَعْداً، اَللَّهُمَّ اشْفِ سَعْداً.** (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے تو نبی کریم (ﷺ) ان کی عیادت کے لئے آئے اور آپ نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ ! سعد کو شفا دے، اے اللہ !سعد کو شفا دے، اے اللہ !سعد کو شفا دے۔

نبوی پین کلر(Pain Killer):

حدیث ۹۰۵:-

وعن أَبِي عبدِالله عثمان بنِ أَبِي العاصِ رضی اللہ عنہ **: أنّه شَكَا إِلَى رسول الله (ﷺ) وَجعاً يجِدُهُ فی جَسَدِهِ، فَقَالَ لَهُ رسول الله (ﷺ) : ضَعْ يَدَكَ عَلَى الَّذِي يَألَمُ مِنْ جَسَدِكَ وَقُلْ : بسمِ اللهِ ثَلاثاً، وَقُلْ سَبْعَ مَرَّاتٍ : أعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أجِدُ وَأُحَاذِرُ.** (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عثمان بن أبي العاص ثقفی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم (ﷺ) سے اپنے جسم میں درد کی فریاد کی (ان کو کسی جگہ درد تھا تو کہا : اے اللہ کے رسول! مجھے یہاں درد رہتا ہے) تو حضور اکرم (ﷺ) نے ان سے کہا: درد والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر پڑھو:- بسم اللہ، بسم اللہ، بسم اللہ۔ پھر سات مرتبہ یہ دعا پڑھو :- أعُوذُ بِعِزَّةِ اللهِ وَقُدْرَتِهِ مِنْ شَرِّ مَا أجِدُ وَأُحَاذِرُ" ترجمہ :- اے اللہ! تیری قدرت اور عزت کے واسطے سے میں پناہ چاہتا ہوں اس درد اور تکلیف کے شر سے جس کو میں محسوس کر رہا ہوں اور آئندہ مجھے جس کا خطرہ ہے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ خود بیمار ہی اپنا ہاتھ درد والی جگہ پر رکھ کر تین مرتبہ بسم اللہ پڑھے اور پھر سات مرتبہ یہ دعا پڑھے۔

تو مریض کو شفا ہو ہی جائے گی:

حدیث ۹۰۶:-

وعن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہما عن النبیِّ (ﷺ) قَالَ: مَنْ عَادَ مَرِيضاً لَمْ يَحْضُرْهُ أَجَلُهُ، فقالَ عِنْدَهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ: أَسْأَلُ اللهَ العَظيمَ، رَبَّ العَرْشِ العَظيمِ، أنْ يَشْفِيَكَ، إلاَّ عَافَاهُ اللهُ مِنْ ذَلِكَ المَرَضِ.

رواه أبُو داود والترمذی، وقال: ((حديث حسن))، وقال الحاكم: ((حديث صحيح عَلَى شرط البخاری)).

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کوئی آدمی کسی ایسے بیمار کی خبر گیری کے لئے جائے جس کی موت مقدر نہیں ہے (یعنی اس بیماری میں اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے موت نہیں رکھی ہے، اور اچھا ہونے والا ہے) اور سات مرتبہ یہ دعا پڑھے:- أَسْأَلُ اللهَ العَظيمَ، رَبَّ العَرْشِ العَظيمِ، أنْ يَشْفِيَكَ " **ترجمہ:** میں سوال کرتا ہوں عظمت والے رب سے، اس اللہ سے جو عظمت والے عرش کا مالک ہے؛ وہ تم کو تندرستی دیدے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو اس بیماری سے تندرستی دے ہی دے گا۔

افادات:- یعنی ابھی موت مقدر نہیں ہے تو تندرستی ضرور مل جائے گی۔ یہ دعا بھی بڑی مختصر سی ہے، اس کو بھی یاد کرلینا چاہیے۔ کوئی بھی دعا یاد کرلو تا کہ بیمار کی خبر گیری کے جو آداب ہیں ان پر عمل کرتے ہوئے اس کے پاس جا کر پڑھ سکو۔

ایک اور دعا:

حدیث۹۰۷:-

وعنه أنَّ النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) دَخَلَ عَلَى أَعْرَابِيٍّ يَعُودُهُ، وَكَانَ إِذَا دَخَلَ عَلَى مَنْ يَعُودُهُ، قَالَ: لَا بَأْسَ، طَهُورٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک دیہاتی کے پاس برائے عیادت تشریف لے گئے، اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جب کسی بیمار کی عیادت کے لئے جاتے تو فرمایا کرتے تھے: کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے چاہا تو یہ بیماری تمہارے لئے گناہوں سے پاکی کا ذریعہ بنے گی۔

افادات:- اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے کہ بندہ مؤمن کو ذرا سی بھی تکلیف پہنچتی ہے، کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ سے اس کے گناہ کو معاف کرتے ہیں، اور درجات کو بلند کرتے ہیں۔ یہ بیماری بھی آئی تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اس بیماری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گناہوں سے پاک کریں گے۔

روح الامین کا الصادق الامین پر دَم:

حدیث۹۰۸:-

وعن أَبِي سعيد الخدری رضی اللہ عنہ أن جِبريلَ أتَى النَّبِيّ (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَالَ: يَامُحَمَّدُ اشْتَكَيْتَ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: بِسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ، اللهُ يَشْفِيكَ، بِسمِ اللهِ أرقِيكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور پوچھا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کو کچھ تکلیف ہے؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جی ہاں۔ تو انہوں نے یہی دعا پڑھی: "بِسْمِ اللهِ أَرْقِيكَ، مِنْ كُلِّ شَيْءٍ يُؤْذِيكَ، مِنْ شَرِّ كُلِّ نَفْسٍ أَوْ عَيْنٍ حَاسِدٍ، اللهُ يَشْفِيكَ، بِسمِ اللهِ أرقِيكَ." **ترجمہ:** اللہ تعالیٰ کے نام سے دم کرتا ہوں ہر اس چیز پر جو آپ کے لئے تکلیف کا باعث ہے، اور پناہ مانگتا ہوں ہر جاندار کے شر سے، اور حاسد کی نگاہِ بد سے، اللہ تعالیٰ آپ کو شفا دے، پھر اللہ تعالیٰ کے نام سے دم کرتا ہوں۔

افادات:- یہ سب دعائیں یاد نہ ہوں تو اتنا مختصر تو ضرور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو تندرستی دے، جیسے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا کی تھی۔

تو اسے جہنم نہیں کھائے گی:

حدیث ۹۰۹:-

وعن أَبِي سعيد الخدری وأبِي هريرة رضی اللہ عنہما: أَنَّهُمَا شَهِدَا عَلَى رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم)، أَنَّهُ قَالَ: مَنْ قَالَ: لَاۤ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَاللهُ أَكْبَرُ، صَدَّقَهُ رَبُّهُ، فَقَالَ: لَاۤ إِلٰهَ إِلَّاۤ أَنَا وَأَنَا أَكْبَرُ. وَإِذَا قَالَ: لَاۤ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، قَالَ: يقول: لَاۤ إِلٰهَ إِلَّاۤ أَنَا وَحدِي لَا شَرِيكَ لِي. وَإِذَا قَالَ: لَاۤ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ لَهُ المُلْكُ وَلَهُ الحَمْدُ، قَالَ: لَاۤ إِلٰهَ إِلَّاۤ أَنَا لِي

الْمُلْكُ وَلِيَ الْحَمْدُ. وَإِذَا قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ، قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِي. وَكَانَ يَقُولُ: مَنْ قَالَهَا فِي مَرَضِهِ ثُمَّ مَاتَ لَمْ تَطْعَمْهُ النَّارُ. (رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ یہ دونوں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق گواہی دیتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی کہتا ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ أَكْبَرُ" اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور اللہ ہی بڑا ہے، تو اللہ تعالیٰ بندے کی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں: "لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا وَأَنَا أَكْبَرُ" میرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے اور میں ہی بڑا ہوں۔ اور بندہ جب یہ کلمات کہتا ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ" اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، وہی تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا وَحْدِي، لَا شَرِيكَ لِي" میرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں ہی یکتا عبادت کے لائق ہوں، میرے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ اور بندہ جب کہتا ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ" اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، ساری حکومت اور سارے اختیارات اللہ ہی کے دستِ قدرت میں ہیں، اور تمام تعریفیں اسی کے لئے سزاوار ہیں۔ تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں: "لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا، لِيَ الْمُلْكُ وَلِيَ الْحَمْدُ" میرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، میرے ہی ہاتھ میں سارے اختیارات ہیں اور میں ہی تعریف کے لئے سزاوار ہوں۔ اور جب بندہ یہ کلمات کہتا ہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ" اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور گناہوں سے بچنے کی قوت اور نیکی کے کام کرنے کی طاقت نہیں، مگر اللہ ہی کی توفیق سے۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: "لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا، وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِي" میرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق

نہیں اور گناہوں سے بچنے اور نیکی کے کام کی طاقت میری توفیق کے علاوہ نہیں مل سکتی۔ جب کوئی آدمی یہ کلمات اپنی بیماری کے زمانہ میں کہتا ہے، پھر اس کو موت آجاتی ہے تو جہنم کی آگ اس کو نہیں کھا سکتی۔

اِدھر تعریف، اُدھر پذیرائی:

افادات:- دیکھو! جب بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی شان اوراس کی عظمت و کبریائی کے کلمات کہتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کا کتنا اونچا مقام ہے اور کیسی پذیرائی ہوتی ہے؟ ورنہ معمولی درجے کا آدمی کسی بڑے سیٹھ صاحب کی تعریف کرے تووہ سیٹھ ادھر کان بھی لگانے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ لیکن یہاں بندے کی طرف سے پیش کی جانے والی تعریف اور توصیف، اوراللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کے جو الفاظ ادا کئے جاتے ہیں اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسی پذیرائی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کے ان کلمات کا خودہی جواب دیتے ہیں اور تصدیق کرتے ہیں۔

یہاں پر اس آخری ارشاد کی وجہ سے لائے ہیں کہ آدمی کو اپنی بیماری کے زمانہ میں ان ہی کلمات کو کہنا چاہیے، اگر اس زمانہ میں موت آگئی تو پھر جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا۔

استحباب سؤال اهل المريض عن حاله

بیمار کے گھر والوں سے بیمار کے متعلق دریافت کرنا

۲/شعبان المعظم ۱۴۲۲ھ بسم اللہ الرحمن الرحیم ۲۰/اکتوبر ۲۰۰۱ء

عیادت: نہ ہو شکایت:

ایک شکل یہ ہے کہ آپ خود بیمار کی عیادت اور خبر گیری کے لئے تشریف لے جائیں، لیکن یہ روزانہ ممکن نہیں ہوتا، اور روزانہ جانا بیمار کے لئے بھی تکلیف کا باعث ہوتا ہے، اس لئے بیماری کے زمانہ میں کبھی کبھار ہی اس کی نوبت آتی ہے۔

پہلے بتلایا تھا کہ بیماری کے زمانہ میں کوئی آدمی کسی کی خبر گیری کے لئے جائے تو اس کو چاہیے کہ زیادہ دیر تک نہیں بیٹھنا چاہیے۔ عیادت کے آداب میں سے یہ ہے کہ بیمار کے پاس تھوڑی دیر ہی بیٹھے۔ حدیث پاک میں آتا ہے: "اَلْعِيَادَةُ فُوَاقَ نَاقَةٍ" عیادت: اونٹنی کا دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے برابر ہوتی ہے۔

"فُوَاق" کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ صبح کو دودھ دوہا جاتا ہے اور شام کو دوہا جاتا ہے، ان دونوں کے درمیانی وقفہ کو "فُوَاق" کہتے ہیں۔ لیکن یہ وقفہ تو لمبا ہوتا ہے۔ اور "فُوَاق"

کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جانور کو دوہنے کے درمیان دوہنے والا اس کے تھن کے سرے پر انگلی رکھ کر دباتا ہے، جب ایک مرتبہ دباتا ہے تو جو دودھ نیچے آیا ہوا ہوتا ہے وہ باہر نکل آتا ہے، پھر دبانے والا تھن کو چند سیکنڈ کے لئے چھوڑ دیتا ہے، پھر دباتا ہے۔ تو چند سیکنڈ کے لئے جو چھوڑا تھا اسی کو عربی میں "فُوَاق" کہتے ہیں۔ یہاں یہی مطلب مراد لیا گیا ہے کہ کوئی آدمی کسی بیمار کی خبر گیری کے لئے جائے، تو زیادہ دیر وہاں نہ بیٹھے، بلکہ گیا، چند منٹ میں خیر خیریت معلوم کی، اور واپس لوٹ آیا۔ چوں کہ بیماری کی حالت میں مختلف ضرورتیں ہوتی ہیں، کبھی آرام کا تقاضہ ہوتا ہے، کبھی بیمار کی طبیعت تنہائی چاہتی ہے، اب اگر کوئی آدمی جا کر ایسا بیٹھ گیا کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتا؛ تو بیمار کے لئے پریشانی کا باعث ہوتا ہے۔

اے اللہ! عیادت کا طریقہ سکھلا:

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ میں واقعہ ذکر کیا ہے کہ حضرت سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کچھ لوگ عیادت کے لئے گئے اور وہاں دعا کی درخواست کی غرض سے بیٹھے رہے، اٹھ ہی نہیں رہے تھے، جب کچھ دیر کے بعد موقعہ ملا تو پھر درخواست کی کہ حضرت! دعا کر دیجئے۔ حضرت نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی: اے اللہ! ہم کو بیمار کی عیادت کا طریقہ سکھلا۔ اس طرح گویا ان کو اپنی کوتاہی پر تنبیہ فرمائی۔

دروازہ باہر سے بند کردینا:

ایک اور واقعہ ذکر کیاہے (اس میں انہوں نے نام نہیں لکھاہے، لیکن دوسری جگہ میں نے نام بھی پڑھا)کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب عیادت کے لئے گئے،اورایسے بیٹھے کہ اٹھنے کانام ہی نہیں لیتے تھے۔جیسے بعض لوگ فیوی کول (Fevicol) کا ڈبہ لے کرجاتے ہیں،ایسے چپکے رہتے ہیں کہ اٹھتے ہی نہیں۔تووہ بھی اٹھنے کانام نہیں لے رہے تھے۔جب کافی دیر ہوگئی تو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے : ایک تو بیماری کی تکلیف ہے اورآنےوالے بھی عجیب لوگ ہوتے ہیں کہ جلدی جانے کانام ہی نہیں لیتے۔اس پر وہ صاحب کہنے لگے:حضرت!اگرآپ اجازت دیں تو دروازہ بند کردوں؟حضرت نے کہا: ہاں ! بالکل ٹھیک ہے،لیکن باہر سے بند کرنا۔

اس لئے ضروری ہے کہ بیمار کا خیال رکھا جائے۔ہاں بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں کہ بیمارکے ساتھ ان کا تعلق ایساہوتاہے کہ ان کے دیر تک بیٹھنے کی وجہ سے بیمارکوتکلیف نہیں، بلکہ راحت ہوتی ہے،بلکہ بیمار خود چاہتا ہے کہ یہ بیٹھیں ؛ ایسے لوگ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں، یعنی ان کے لئے اس بات کی اجازت ہے کہ وہ چاہیں تودیرتک بیٹھ سکتے ہیں ،لیکن اگران کوبھی یہ اندازہ ہوکہ بیماراس وقت تنہائی چاہتاہے تو وہاں سے اٹھ جاناچاہیے۔

خیر! مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ ہر وقت بیمار کے پاس آنا جانا ممکن نہیں ہوتا، لیکن یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک مرتبہ خیریت پوچھ کر آئے تو پھر اس کی کوئی خیریت ہی معلوم نہیں کرتے، بلکہ اس کے گھر والوں سے اس کے متعلق پوچھتے رہنا چاہیے، یہ باب اسی بات کو بتلانے کے لئے قائم کیا ہے کہ یہ بھی مستحب ہے کہ بیمار کے گھر والوں سے بیمار کے متعلق دریافت کرے، مثلاً: آپ کی اہلیہ بیمار تھی، اب کیا حال ہے؟ آپ کا بیٹا بیمار تھا، اب کیسا ہے؟ آپ کے والد صاحب بیمار تھے، اس وقت ان کی طبیعت کیسی ہے؟ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آدمی پھر ان کے احوال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دعا کرے گا، اور دوسرا یہ کہ جن کی خیرت پوچھی جارہی ہے ان کی بھی تسلی ہوجائے گی۔ چناں چہ اسی کا استحباب اور پسندیدہ ہونا بتلانے کے لئے یہ روایت پیش کی ہے۔

وفات کے دن صبح حضور اکرم (ﷺ) کی کیفیت:

حدیث ۹۱۰:-

عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ عليَّ بْنَ أَبِي طالب رضی اللہ عنہ خَرَجَ مِنْ عِنْدِ رسولِ اللہ (ﷺ) فِي وَجَعِهِ الَّذِي تُوُفِّيَ فِيهِ، فقالَ النَّاسُ: يَا أَبَا الحَسَنِ! كَيْفَ أَصْبَحَ رَسُولُ اللہِ (ﷺ)؟ قَالَ: أَصْبَحَ بِحَمْدِ اللہِ بَارِئاً. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) کی جس بیماری میں وفات ہوئی، اسی بیماری کے زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) کے حجرۂ شریفہ سے باہر نکلے، تو بعض ایسے

لوگوں نے -جو اندر نہیں جاسکتے تھے- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے ابوالحسن! اللہ کے رسول (ﷺ) نے صبح کیسی حالت میں کی؟ (یعنی آپ کی طبیعت کیسی ہے؟) تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا: الحمدللہ! آپ نے صحت کی حالت میں صبح کی ہے۔

افادات:-یہ اسی روز کا واقعہ ہے جس دن حضوراکرم (ﷺ) کی وفات ہوئی، اس دن صبح کے وقت آپ (ﷺ) کی طبیعت بہت اچھی ہوگئی تھی، لیکن آپ (ﷺ) کی یہ صحت ہنگامی تھی، اسی دن زوال کے وقت آپ (ﷺ) کا انتقال ہوگیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ما یقول من أیس من حیاتہٖ

جس کو اندازہ ہوجائے کہ اب میری موت کا وقت قریب آ چکا ہے؛ وہ کیا دعا کرے ؟

حدیث ۱۱۹:-

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت: سَمِعْتُ النبیَّ (ﷺ) وَهُوَ مُسْتَنِدٌ إِلَيَّ، يَقُولُ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وارْحَمْنِي، وأَلْحِقْنِي بالرَّفِيقِ الأَعْلَى. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مَیں نے نبیؐ کریم (ﷺ) کو یہ فرماتے ہوئے سنا اور آپ (ﷺ) مجھ سے سہارا لیے ہوئے تھے :اے اللہ !میری مغفرت فرما دے ،اور مجھ پر رحم کر،اور مجھے رفیق اعلیٰ میں پہنچادے۔

افادات:- آپ (ﷺ) کے انتقال سے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضوراکرم (ﷺ) کو بٹھاکر اپنے جسم کا سہارادیئے ہوئے تھیں،اس موقعہ پر نبیؐ کریم (ﷺ) یہ دعا مانگ رہے تھے۔

یہ موت مانگنا نہیں ہے:

”وَأَلْحِقْنِي بِالرَّفِيقِ الْأَعْلَىٰ“ اس دعا میں عافیت کے ساتھ موت مانگی جارہی ہے، یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے (اور جیسا کہ پہلے بھی آیا تھا) کہ موت کی دعا تو نہیں کرنی چاہیے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح بخاری میں مستقل باب قائم کیا ہے جس میں یہ بتلایا ہے کہ موت کی دعا نہیں مانگنی چاہیے، اور اس موقعہ پر جہاں اور روایتیں موت کی دعا کی ممانعت کے سلسلہ میں پیش کی ہیں، وہیں یہ روایت بھی لائے ہیں۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ اس وقت نبی کریم ﷺ کی حالت ایسی تھی کہ آپ ﷺ کو یقین ہوچکا تھا کہ اب میری موت کا وقت آ چکا ہے، اور جب کسی آدمی کو یہ یقین ہوجائے کہ اب مَیں عنقریب دنیا سے رُخصت ہونے والا ہوں تو اس وقت اگر اچھی موت کی دعا کرتا ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ یہ موت مانگنا نہیں ہے، اس لئے کہ اس کو یہ یقین ہوچکا ہے کہ موت تو آہی رہی ہے، البتہ اچھی حالت میں موت آئے اس کی دعا مانگی جاسکتی ہے۔

ممانعت تو اس کی ہے:

جس چیز کی ممانعت آئی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی مصیبت کی وجہ سے موت کا سوال کرے۔ حالات ایسے آگئے، پریشانی ایسی لاحق ہوئی کہ اس پریشانی سے گھبرا کر سوال کرتا ہے کہ: اے

اللہ! مجھے موت دیدے ؛تواس کوشریعت نے پسند نہیں کیاہے کہ یہ بزدلی کی علامت ہے۔ مؤمن کی شان تویہ ہے کہ حالات کا مقابلہ کرےاور حالات کے مناسب تدبیریں اختیار کرے،یہ نہیں کہ گھبراکرموت کا سوال کرنے لگے۔

موت کی حالت شدت والی ہے:

حدیث ۹۱۲:-

وعنھاقالت:رَأیتُ رسولَ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) وَھُوَ بِالْمَوْتِ، عِنْدَہُ قَدَحٌ فِیهِ مَاءٌ، وَھُوَ یُدْخِلُ یَدَہُ فی الْقَدَحِ، ثُمَّ یَمْسَحُ وَجْھَہُ بِالْماءِ، ثُمَّ یَقُولُ: أَللّٰھُمَّ أَعِنِّی عَلَی غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَسَکَرَاتِ الْمَوْتِ. (رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے نبیؑ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا حال یہ کہ آپ موت کے قریب جاچکے تھے(یعنی موت کی حالت آپ پر طاری ہوچکی تھی) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ایک پیالہ رکھا ہوا تھاجس میں پانی تھا،اور آپ اپنے دستِ مبارک کو اس پیالہ میں داخل کرتے اورپھروہ پانی اپنے چہرے کے اوپر لگالیتے تھے، اورساتھ ہی ساتھ یہ فرماتے تھے: اے اللہ !موت کی سختیوں اور موت کی شدتوں پر میری مدد فرما۔(موت کی حالت بڑی سختی اورشدت والی ہوتی ہےاس لئے اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے مدد کاسوال کیا۔

باب استحباب وصية أهل المريض ومن يخدمه بالإحسان إليه واحتماله والصبر عَلَى مَا يشق من أمره وكذا الوصية بمن قرب سبب موته بحدأَوْ قصاص ونحوهما

بیمار کے گھر والے اور وہ لوگ جو اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، ان کو بیمار کے ساتھ اچھا سلوک کرنے اور اس کو برداشت کرنے اور صبر و تحمل سے کام لینے کی تاکید

اور جس آدمی کی موت کا کوئی سبب یقینی ہو. جیسے حد جاری کی جانے والی ہے یا جس سزا میں موت یقینی ہے. یا قصاص وغیرہ کی وجہ سے قتل کیا جانے والا ہے تو اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی تاکید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب گھر کے لوگ بیمار کی تیمار داری میں لگے ہوئے ہوتے ہیں تو بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی بیماری طول پکڑ لیتی ہے، اس کے نتیجے میں گھر والوں کی طبیعتوں پر بھی کبھی گرانی ہو جاتی ہے، اور خدمت کرتے کرتے چڑچڑا پن آ جاتا ہے؛ تو گھر والوں کو تاکید کی جا رہی ہے کہ بیمار کی طرف سے ایسی کچھ صورت پیش آئے تو اس کو برداشت کرو اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو، چڑ چڑے پن والا معاملہ مت کرو۔ وہ تو بیماری کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے، لیکن آپ اس کے ساتھ اس کے جواب میں ویسا سلوک نہ کرو۔

سماج کے ایک غلط مزاج کی اصلاح :

حدیث ۹۱۳:-

عن عِمران بن الحُصَيْنِ رضی اللہ عنہما **أنَّ امْرَأَةً مِن جُهَيْنَةَ أتَت النَّبِيَّ** (ﷺ) **وَهِيَ حُبْلَى مِنَ الزِّنَا، فَقَالَت: يَا رسول الله! أَصَبْتُ حَدّاً فَأَقِمْهُ عَلَيَّ. فَدَعَا رسولُ الله** (ﷺ) **وَلِيَّهَا، فَقَالَ: أَحْسِنْ إِلَيْهَا، فَإِذَا وَضَعَتْ فَأْتِنِي بِهَا. فَفَعَلَ، فَأَمَرَ بِهَا النَّبِيّ** (ﷺ)**، فَشُدَّت عَلَيْهَا ثِيَابُهَا، ثُمَّ أَمَرَ بِهَا فَرُجِمَت، ثُمَّ صَلَّى عَلَيْهَا.** (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قبیلۂ جہینہ کی ایک عورت نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئی ایسی حالت میں کہ زنا کی وجہ سے حاملہ تھیں۔ اس نے آکر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسا گناہ کیا ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزا کی میں حقدار ہوں، آپ

مجھ پر اس سزا کو جاری کیجئے (چوں کہ اس وقت تو وہ حالتِ حمل میں تھی، اگر اسی حالت میں اس کو سنگسار کیا جاتا تو ظاہر ہے کہ پیٹ میں جو بچہ تھا وہ بھی موت کا شکار ہو جاتا، حالاں کہ اس کا تو کوئی قصور تھا نہیں)اس لئے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس عورت کے ولی بلا کر (ان کے حوالہ کیا اور) تاکید فرمائی کہ اس کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا۔ جب بچہ پیدا ہو جائے تو پھر میرے پاس لے آنا(تا کہ اس پر حد جاری کی جائے) چناں چہ اس کے ولی نے ایسا ہی کیا۔ جب بچہ پیدا ہو گیا تو اس کو لے کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آیا، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سنگساری (پتھر مارنے) کا حکم دیا، اس کے کپڑے اچھی طرح باندھ دیئے گئے (تا کہ سنگساری کے دوران کہیں سے ستر کھلنے نہ پائے) اور اس کو سنگسار کر دیا گیا، پھر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی۔

افادات:- میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے لکھا ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام کتنا اونچا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے احکام کو جاری کرنے کے لئے انہوں نے اپنے آپ کو برضاو رغبت پیش کیا۔

(اس کی تفصیل حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد اول، صفحہ ۱۸۲ تا ۱۹۹ پر آچکی ہے۔ ضرور ملاحظہ فرمالیں۔ مرتب۔)

ہمارے سماج میں ایسا مزاج ہے کہ کسی آدمی سے اگر کسی جرم کا صدور ہو جائے تو اس کو سزا تو دیتے ہی ہیں ، لیکن اس کے ساتھ ایسا حقارت اور ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے کہ

اللہ کی پناہ! حالاں کہ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ دیکھو! مجرم کا جرم اپنی جگہ پر ہے، اس جرم کی پاداش میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو سزا مقرر کی گئی ہے وہ ضرور دیجئے، اس سزا کے اس پر جاری کرنے کے معاملہ میں ذرا بھی رحم نہیں کرنا ہے، لیکن سزا بس سزا تک رہے، اس کے علاوہ باقی جو معاملات تذلیل وتوہین کے کئے جاتے ہیں اور اس کو بے آبرو کیا جاتا ہے، شریعت اس کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ بخاری شریف میں روایت ہے "إِذَا زَنَتْ أَمَةُ أَحَدِكُمْ فَتَبَيَّنَ زِنَاهَا فَلْيَجْلِدْهَا الْحَدَّ، وَلَا يُثَرِّبْ عَلَيْهَا" (باب بیع المدبر) نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اگر کسی کی باندی زنا کرے اور اس کا زنا ثابت ہو جائے تو آقا کو چاہیے کہ اس پر حد جاری کرے لیکن اس پر طعن و تشنیع نہ کرے، ہمارے سماج میں طعن و تشنیع والا بہت بڑا روگ ہے، حالاں کہ اس کی کسی بھی حال میں اجازت نہیں۔

شریعت کی تعلیم کتنی اعلیٰ ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے اس عورت کے ولی کو بلا کر ان کے حوالہ کیا اور تاکید فرمائی کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ یہ نہیں فرمایا: اس کو ذلت کے ساتھ رکھیو اور ایک کال کوٹھری میں ڈال دیجیو اور روزانہ اس کو رسوا کیجیو۔ یہی اسلام کی تعلیمات کا حسن ہے جس کو اختیار کرنا چاہیے۔

بَاب جواز قول المريض : أنَا وجع ، أَوْ شديد الوجع أَوْ مَوْعُوكٌ أَوْ وارأساه ونحو ذلك وبيان أنَّه لا كراهة في ذلك إِذَا لَمْ يكن عَلَى سبيل التسخط وإظهار الجزع

بیمار کا یہ کہنا کہ میں بیمار ہوں، یا مجھے بہت تکلیف ہے، یا مجھے بخار ہے۔ یا یوں کہنا کہ ہائے! سر میں بہت درد ہے اگر کوئی بیمار ایسا کوئی جملہ کہتا ہے اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرنا اور بے صبری ظاہر کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنی بیماری سامنے والے کو بتلانا اور اپنی کیفیت کو ظاہر کرنا مقصود ہے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب کوئی آدمی بیمار ہوتا ہے تو بیماری کی شدت کی وجہ سے اس کی طبیعت کے اندر بے چینی اور بے صبری پیدا ہوتی ہے، اور اسی بے صبری میں وہ چلّاتا اور شور مچاتا ہے کہ میں مر گیا، مجھے یہ تکلیف ہو رہی ہے، اور یوں ہوا اور توں ہوا۔

دیکھو! شور مچانے کے دو سبب ہو سکتے ہیں، ایک تو یہ کہ شور مچا کر نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرنا چاہتا ہے، چناں چہ ایسے لوگوں کی زبان سے تو جو جملے اور الفاظ نکلتے ہیں وہ الگ ہی ہوتے ہیں، جیسے: نعوذ باللہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ''کیا مَیں ہی ملا تھا؟''۔ ''اور کوئی نہیں تھا؟''۔ ''میرے اوپر ہی یہ مصیبت کیوں آئی؟'' وغیرہ یہ تو بڑی خطرناک چیز ہے اور اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

اور اگر کسی آدمی کا مقصد شور مچا کر اللہ تبارک و تعالیٰ کے فیصلے پر ناراضگی کا اظہار کرنا نہیں ہے، بلکہ اپنی تکلیف کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا ہے۔ جیسے: کوئی کہے: ''مجھے بہت شدید تکلیف ہو رہی ہے، میرے لئے دعا کریں''۔ یا وہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی، تو بالکل بے چین ہو کر زبان سے یہ بولتا ہے ''اس کا کوئی علاج اور تدبیر کرو'' اس میں اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے پر ناراضگی مقصود نہیں ہے، تو اس صورت میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کا شدّتِ بخار:

حدیث ۹۱۴:-

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ **قَالَ: دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ (ﷺ) وَهُوَ يُوعَكُ، فَمَسِسْتُهُ، فَقلتُ: إِنَّكَ لَتُوعَكُ وَعَكاً شَدِيداً، فَقَالَ: أَجَلْ! إِنِّي أُوعَكُ كَمَا يُوعَكُ رَجُلانِ مِنْكُمْ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ شدید بخار میں مبتلا تھے، مَیں نے اپنے ہاتھ سے نبی کریم (ﷺ) کے جسمِ اطہر کو چھوا (جو لوگ عیادت کے لئے آتے ہیں تو بخار کی کیا کیفیت ہے، یہ دیکھنے کے لئے آدمی کے بدن کو چھوتے ہیں) تو مجھے محسوس ہوا کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کو شدید بخار ہے۔ چناں چہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو تو بڑا سخت بخار ہے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: جی ہاں! تم میں سے دو آدمیوں کو جتنا بخار ہوتا ہے، اتنا مجھ اکیلے کو ہوتا ہے۔

افادات:- دیکھو! حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جب نبی کریم (ﷺ) سے کہا کہ آپ کو تو بڑا سخت بخار ہے، تو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: جی ہاں۔ آپ نے اپنے بخار کو چھپایا نہیں، بلکہ ظاہر فرمایا کہ تم میں سے دو آدمیوں کو جتنا بخار ہوتا ہے، اتنا مجھ اکیلے کو ہوتا ہے۔ چناں چہ روایتوں میں ہے کہ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو ثواب بھی تو دوہرا (ڈبل) ملتا ہے نا! تو آپ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جی ہاں

(بخاری شریف:۵٦۴۸) (جیسا آدمی ہوتا ہے اسی کے مناسب معاملہ ہوتا ہے) یہاں تو یہ روایت اس لئے لائے ہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) نے اپنے بخار کا اظہار فرمایا۔

صحابی کا اظہارِ مرض:

حدیث ۹۱۵:-

وعن سعدِبن أَبِي وقاصٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءنی رسولُ الله (ﷺ) يَعُودُنِي مِنْ وَجَعٍ اشْتَدَّ بِي، فقلتُ: بَلَغَ بِي مَا تَرَى، وَأَنَا ذُو مَالٍ، وَلاَ يَرِثُنِي إِلاَّ ابْنَتِي.. وذكر الحديث. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سعد بن اَبي وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری بیماری سخت ہو گئی حضور اکرم (ﷺ) میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔مَیں نے کہا:میری حالت یہاں تک پہنچ چکی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں (یعنی میں تو اس بیماری میں بالکل مرنے کے قریب ہوگیا ہوں)اور آپ جانتے ہیں کہ میرے پاس مال ہے ،اور میرے وارثوں میں میری صرف ایک بیٹی ہی ہے۔آگے پورا قصہ ہے(یہ قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین جلداول صفحہ ٦٨ تا ۷۱ پر گزرچکاہے۔مرتب۔)

افادات:- یہ روایت یہ بتلانے کے لئے لائے ہیں کہ دیکھو ! حضرت سعد بن اَبي وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنی بیماری کو ان الفاظ میں نبیِ کریم (ﷺ) کے سامنے پیش کیا کہ اے اللہ کے رسول! میری جو حالت ہے وہ آپ دیکھ رہے ہیں ،اور میں بیماری میں یہاں تک پہنچ چکاہوں کہ اب میرے بچنے کی بالکل امید نہیں ہے۔اور حضور اکرم (ﷺ) نے اس کی کوئی تردید نہیں فرمائی۔

حضوراکرم (ﷺ) نے بھی ان کی بات سن کر برقرار رکھا، معلوم ہوا کہ آدمی اپنی حالت اس طرح بیان کرسکتا ہے۔

اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا کا اظہارِ دردِ سر:

حدیث ۹۱۶:-

وعن القاسم بن محمد قَالَ قالت عائشةُ رضی اللہ عنہا **:وَارَأْسَاهُ! فَقَالَ النَّبِيُّ (ﷺ): بَلْ أَنَا، وَارَأْسَاهُ! ...وذکر الحدیث.** (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت قاسم بن محمد فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سر میں درد تھا، جب حضوراکرم (ﷺ) ان کے گھر پر پہنچے تو وہ (اپنے سر کے درد کو ظاہر کرتے ہوئے) کہنے لگیں: ہائے میرا سر (یعنی درد کی شدت کی وجہ سے میرا سر بالکل اُڑا جارہاہے) یہ سن کر حضور اکرم (ﷺ) نے جواب میں ارشاد فرمایا: بلکہ ہائے میرا سر۔ (یعنی مجھے سر درد کی شدید تکلیف ہے۔)

افادات:- یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جس میں نبیٔ کریم (ﷺ) کا مرض الوفات شروع ہوچکا تھا، اسی زمانہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سر میں درد تھا، پھر حضوراکرم (ﷺ) نے یہ بھی فرمایا: اگر اس بیماری میں تمہارا انتقال ہوگیا تو میں موجود ہوں، میں تمہاری جنازہ کی نماز پڑھ لوں گا اور تمہارے لئے دعائے مغفرت کروں گا۔ (سنن بیہقی:۱۷۰۳۱)

یہاں تو صرف اتنا بتلانا ہے کہ دیکھو! حضور (ﷺ) کے سامنے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے سر کے درد کی تکلیف کو ان الفاظ میں پیش کیا، اور حضور (ﷺ) نے بھی ان کو اپنے سر کے درد کی تکلیف بتلائی۔ معلوم ہوا کہ کسی آدمی کو کوئی تکلیف ہو تو اپنی وہ تکلیف سامنے والے کو بتلانے کے لئے اگر ظاہر کرتا ہے ؛تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔بس! اتنا ہے کہ اس میں شکایت کا پہلو نہیں ہونا چاہیے۔اس کو آدمی اس انداز سے بیان نہ کرے کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شکایت کا احساس ہونے لگے۔

باب تلقین المحتضر : لآ إِلٰہ إِلّا اللّٰہُ

جس کی موت کا وقت قریب ہو
اس کو "لآ إِلٰہ إِلّا اللّٰہُ" کی تلقین کرنا
یہ بھی آداب اور مستحبات میں سے ہے۔

حدیث ۹۱۷:-

عن معاذ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللہ (ﷺ) : مَنْ کَانَ آخِرَ کَلَامِہٖ لآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ دَخَلَ الْجَنَّۃَ. (رواہ أبو داود والحاکم، وقال: صحیح الإسناد)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس کا آخری کلام "لآ إِلٰہ إِلّا اللّٰہُ" ہو؛ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

افادات:- اب ظاہر ہے کہ اس کا آخری کلام "لآ إِلٰہ إِلّا اللّٰہُ" ہو جائے، اس کے لئے کوشش کے طور تلقین کی جائے گی۔ چناں چہ آگے اسی کو پیش کرتے ہیں۔

حدیث ۹۱۸:-

وعن أَبِی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللہ (ﷺ) : لَقِّنُوا مَوْتَاکُمْ لآ إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اپنے مرنے والوں کو"لا الٰہ الاّ اللہ "کی تلقین کرو۔

افادات:-یعنی جس کی موت کا وقت قریب آگیاہواوراندازیہ ہو کہ اب نزع شروع ہوچکاہے،تو اس کو" لاإلٰہ الَّااللہ "کی تلقین کرنی چاہیے۔اور تلقین کا طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں،وہ ذراآواز سے اس طرح کلمہ پڑھتے رہیں کہ اس کے کان میں آواز پہنچے،تاکہ ان کو پڑھتا ہوا سن کر خود ہی"لاإلٰہ الَّا اللہ" پڑھے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ اس سے یوں کہا نہ جائے کہ تم کلمہ پڑھو،تلقین کا یہ طریقہ نہیں ہے،اس لئے کہ کبھی موت کی شدت اور سختی ایسی ہوتی ہے کہ اگراس کو کلمہ پڑھنے کے لئے کہا جاتاہےتواس شدت کی وجہ سے آدمی انکارکردیتاہے۔اس لئےیوں نہیں کہناچاہیے کہ "لاإلٰہ الَّا اللہ" پڑھو، بلکہ وہاں موجودلوگ ذراآواز سے پڑھتے رہیں،ان کو پڑھتا ہوا سن کر ان شاء اللہ وہ بھی پڑھ لے گا۔

باب ما یقوله بعد تغمیض المیت

جب کسی کا انتقال ہو جائے تو کتابوں میں لکھا ہے کہ آداب میں سے یہ ہے کہ اس کی آنکھیں اگر کھلی ہیں تو بند کر دی جائیں۔ منھ کھلا ہے تو کپڑے کی پٹی کو ٹھوڑی کے نیچے سے لے کر سر کے اوپر باندھ دیا جائے، تاکہ منھ کھلا نہ رہ جائے۔ اسی طرح پیٹ کے اوپر کوئی وزنی چیز رکھ دی جائے تاکہ پیٹ پھولنے نہ پائے۔ اور اعضاء: ہاتھ پاؤں وغیرہ کو سیدھا کر دیا جائے، اس لئے کہ فوری طور پر روح نکلی ہے تو اس کا جسم نرم ہے، اس وقت اعضاء ٹھیک ہو سکتے ہیں، اگر اس وقت ٹھیک کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا تو پھر تھوڑی دیر کے بعد جب جسم مکمل طور پر ٹھنڈا ہو جائے گا، پھر اس کے اعضاء کو سیدھا کرنا چاہیں گے، تب بھی نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے آداب میں سے یہ ہے کہ مرنے والے کے جسم کو اچھی ہیئت میں کر لیا جائے، یہاں آنکھیں بند کرنے والی چیز کو حدیث سے ثابت کرتے ہیں۔

موت کے وقت اور بعد کیا کرے؟ کیا نہیں؟

حدیث ۹۱۹:-

عن أُم سلمة رضی اللہ عنہا قالت: دَخَلَ رسولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) عَلَى أَبِي سَلَمَةَ وَقَدْ شَقَّ بَصَرُهُ، فَأَغْمَضَهُ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّ الرُّوحَ إِذَا قُبِضَ، تَبِعَهُ الْبَصَرُ. فَضَجَّ نَاسٌ مِنْ أَهْلِهِ، فَقَالَ: لَا تَدْعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ، فَإِنَّ الْمَلَائِكَةَ

يُؤَمِّنُونَ عَلَى مَا تَقُولُونَ. ثُمَّ قَالَ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِأَبِي سَلَمَةَ، وَارْفَعْ دَرَجَتَهُ فِي الْمَهْدِيِّينَ، وَاخْلُفْهُ فِي عَقِبِهِ فِي الْغَابِرِينَ، وَاغْفِرْ لَنَا وَلَهُ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ، وَافْسَحْ لَهُ فِي قَبْرِهِ، وَنَوِّرْ لَهُ فِيهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے اوران کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی تھیں (یعنی ان کا انتقال ہوگیا تھا اور آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں) نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کی آنکھوں کو اپنے دستِ مبارک سے بند کیا اور فرمایا: آدمی کی روح جب قبض کی جاتی ہے تو اس روح کو جاتے ہوئے آنکھیں دیکھتی ہیں (اسی لئے آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں، لہٰذا آدمی کے انتقال کے بعد اس کی آنکھوں کو بند کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اس بات سے) گھر والوں نے (سمجھ لیا کہ حضرت اَبو سلمہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا ہے، اس لئے انہوں) نے شور مچایا تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے گھر والوں کو تنبیہ فرمائی کہ اپنے لئے اس موقعہ پر اچھائی ہی کی دعا کرنی چاہیے (ایسی مصیبت کے موقعہ پر بعض مرتبہ عورتیں دعا کے ایسے الفاظ اپنی زبان سے نکالتی ہیں جو بجائے فائدہ کے نقصان کا سبب بنتے ہیں) اس لئے کہ فرشتے تمہاری دعاؤں پر آمین کہتے ہیں، اس کے بعد حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! ابو سلمہ کی مغفرت فرما، اور ہدایت پائے ہوئے لوگوں میں ان کے درجہ کو بلند فرما، اور جو لوگ پیچھے رہ گئے ہیں تو ان کا جانشین بن جا (مطلب یہ ہے کہ ان کے ذریعہ جو ضرورت پوری ہوتی تھی تو ان ضرورتوں کی خزانۂ غیب سے کفالت فرمالے) اے سارے جہانوں کے پروردگار! ہماری بھی مغفرت فرما اور ان کی بھی مغفرت فرما، اوران کی قبر کو کشادہ فرما اور ان کے لئے ان کی قبر میں روشنی کردے۔

افادات:- اس لئے ہمارے اکابر اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ جب کسی کی موت سے متعلقین اور قریبی رشتہ داروں (جیسے باپ کا انتقال ہوا تو اس کی اولاد۔ یا شوہر کا انتقال ہوا تو بیوی وغیرہ) پر ایک خاص کیفیت ہوتی ہے، اس کیفیت میں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف ایک خاص تعلق اور رجوع نصیب ہوتا ہے، اس لئے ان حالات سے فائدہ اٹھالینا چاہیے اور ایسے موقع پر اچھی اچھی دعائیں کرلینا چاہیے ،یہ دعائیں قبول ہونے کا وقت ہوتا ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: لوگ اس حالت و کیفیت اور وقت کو رونے دھونے میں ضائع کردیتے ہیں، حالاں کہ یہی وہ وقت ہوتا ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر جو مانگنا ہو مانگ لے۔ ایسی قیمتی چیزوں کو ہم خود ہی نادانی میں ضائع کردیا کرتے ہیں ،ایسا نہیں ہونا چاہیے اور رونے دھونے کی بجائے مرنے والے کے لئے اس طرح کی دعا مانگنی چاہیے ،یہی چیز ہے جس کا فائدہ ہوتا ہے۔

باب ما یقال عند المیت
وَمَا یقوله من مات له میت

جب کسی کا انتقال ہو جائے اور آپ وہاں پہنچیں؛
تو آپ کو کیا کہنا چاہیے؟

اور جس کے کسی عزیز کا انتقال ہوا ہو؛ وہ خود کیا کہے؟

اس دعا کی برکت سے بہت بہتر بدل ملا:

حدیث ۹۲۰:-

وعن أُم سَلَمة رضی اللہ عنہا قالت قَالَ رسول الله (ﷺ) «إِذَا حَضَرتُمُ المَرِيضَ أَو المَيِّت، فَقُولُوا خَيْراً، فَإِنَّ المَلائِكَةَ يُؤَمِّنُونَ عَلَى مَا تَقُولُونَ. قالت: فَلَمَّا مَاتَ أَبُو سلَمة، أَتَيْتُ النَّبيَّ (ﷺ)، فقلت: يَا رسولَ الله! إِنَّ أَبَاسَلَمَة قَدْ مَاتَ، قَالَ: قُولِي: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي وَلَهُ، وَأَعْقِبْنِي مِنْهُ عُقْبى حَسَنَةً. فقلتُ: فَأَعْقَبَنِي اللهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ لِي مِنْهُ: مُحَمَّداً (ﷺ)».

رواه مسلم هكذا: ((إِذَا حَضَرتُمُ المَرِيضَ، أَو المَيِّتَ))، عَلَى الشَّكِّ، ورواه أَبُو داود وغيره: ((الميت)) بلا شَكٍّ.

ترجمہ:- حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی بیمار یا کسی مرنے والے کے پاس پہنچو (یعنی جس کے اوپر موت کے حالات طاری ہو چکے ہوں اور وہ سکرات کے عالم میں ہو، روح قبض کی جارہی ہے) تو وہاں اپنی زبان سے اچھی بات اور دعائیہ کلمات کہو، اس لئے کہ اس وقت آپ جو بات کہتے ہیں، فرشتے اس پر آمین کہتے ہیں۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب میرے شوہر ابو سلمہ کا انتقال ہوا، تو میں نبیٔ کریم (ﷺ) کے پاس حاضر ہوئی، اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ابو سلمہ کا انتقال ہو گیا، تو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: یوں کہو: اے اللہ! تو میرے اور ان کے گناہوں کو معاف فرما، اور مجھے ان کا اچھا بدلہ اور اچھا جانشین عطا فرما۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی اس تلقین اور ارشاد پر مَیں نے یہ دعا پڑھ لی، تو اللہ تعالیٰ نے اس دعا کی برکت سے میرے شوہر ابو سلمہ کے بدلہ میں ایسی ذات (یعنی نبیٔ کریم (ﷺ)) عطا فرمائی جو اُن سے بہت اچھی تھی۔

افادات:- بیمار کی عیادت کے لئے جائے تو وہاں اچھے کلمات کہنے چاہئیں کہ اللہ تعالیٰ تندرستی دے، اطمینان رکھو، اچھے ہو جاؤ گے۔ اور کسی کی موت کا وقت ہو تو وہاں بھی اس کے مناسب اچھے کلمات کہنے چاہئیں، جیسے اپنے کسی عزیز کا انتقال ہو جائے تو یوں کہنا چاہیے: اے اللہ! میرے گناہوں کو بھی معاف فرمادے اور اس کے بھی گناہوں کو معاف فرمادے۔

"وَأَعْقِبْنِي مِنْهُ عُقْبىً حَسَنَةً":- اگر فوت شدہ کوئی ایسی چیز ہے کہ جس کا دنیا میں بدل مل سکتا ہے، مثلاً: شوہر ہے، بیوی ہے، اولاد ہے؛ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا بدل دنیا میں دے سکتے ہیں، اس لیے دعا مانگی گئی کہ اس سے اچھا بدل عطا فرما۔ اور اگر وہ کوئی ایسی چیز ہے جس کا بدل

نہیں ہے، جیسے: ماں باپ؛ کہ ان کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا، اس لئے اس دعا میں "عُقْبیً حَسَنَةً" کہا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اچھا معاوضہ عطا فرما۔ یعنی اگر دنیوی اعتبار سے بدل مل سکتا ہے تو وہ دے، ورنہ اُخروی اعتبار سے اچھا اجر و ثواب عطا فرما۔

فَأَعْقَبَنِي اللهُ مَنْ هُوَ خَيْرٌ لِي مِنْهُ : مُحَمَّداً (صلی اللہ علیہ وسلم) ":- اللہ تعالیٰ نے اس کا بہت اچھا بدل نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل میں عطا فرمایا، اس لئے کہ عدت کے بعد حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نکاح میں آئیں۔

دوسری روایت میں ہے، وہ فرماتی ہیں کہ جس وقت میں یہ دعا مانگ رہی تھی تو اپنے جی میں سوچ رہی تھی کہ ابوسلمہ سے اچھا مجھے کون ملے گا؟ لیکن جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ نکاح ہوا، تب پتہ چلا کہ واقعی اس دعا کی برکت سے بہت بہتر بدل ملا۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس موقعہ پر جو دعا ہمیں بتلائی ہے، ہمیں تو ایمان و یقین کے ساتھ اس دعا کو پڑھنا چاہیے اور اس دعا کے اثرات کا انتظار کرنا چاہیے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں : "أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ" بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسی امید قائم کرتا ہے، اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی لئے دعا کے آداب میں سے ایک ادب یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ جب دعا کرے تو اس یقین کے ساتھ دعا کرے کہ میری دعا ضرور قبول ہوگی۔

حدیث ۹۲۱:-

وعنها قالت سَمِعْتُ رسولَ الله (ﷺ) يقول: مَا مِنْ عَبْدٍ تُصيبُهُ مُصِيبَةٌ. فَيَقُولُ: إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ، اللَّهُمَّ أَجِرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَاخْلُفْ لِي خَيْراً مِنْهَا؛ إِلاَّ أَجَرَهُ اللهُ تَعَالَى فِي مُصِيبَتِهِ وَأَخْلَفَ لَهُ خَيْراً مِنْهَا. قالت: فَلَمَّا تُوُفِّيَ أَبُو سَلَمَةَ قلتُ كَمَا أَمَرَنِي رسولُ الله (ﷺ) فَأَخْلَفَ اللهُ لِي خَيْراً مِنْهُ رسولَ الله (ﷺ).

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کسی بندہ کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے اوروہ یہ پڑھتاہے: "إِنَّا للهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ" اے اللہ! اس مصیبت میں تو مجھے ثواب عطافرما، اور اس مصیبت کی وجہ سے مجھے جو نقصان پہنچا ہے اس کا مجھے اچھابدلہ دے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کواس کی اس مصیبت میں اجروثواب عطا فرماتے ہیں، اورجونقصان ہوااس کا اچھا بدلہ دنیا اورآخرت میں عطافرماتے ہیں۔ چناں چہ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ابوسلمہ کاانتقال ہواتو نبیٔ کریم (ﷺ) نے جیساجھے حکم دیا ویساہی میں نے پڑھا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے بدلہ میں مجھے نبیٔ کریم (ﷺ) عطافرمائے۔

افادات:- کسی کاانتقال ہوجانا بھی مصیبت کی ایک قسم ہے۔ یہ روایت پہلی روایت کے مقابلہ میں عام ہے، وہاں توصرف موت کاتذکرہ تھا، اِس روایت میں ہر مصیبت کا تذکرہ ہے۔ جیسے تجارت میں گھاٹااور خسارہ ہوگیا، کوئی چیز ٹوٹ گئی، کوئی نقصان ہوگیا، کوئی چیز گم ہوگئی؛ یہ سب اس میں آجاتاہے۔

ہم ان دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے ، چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں ان کو سیکھ لینا چاہیے۔ تکلیفیں ومصیبتیں اور حالات تو ہر وقت آتے ہی رہتے ہیں ،اور ہم لوگ شکایتیں کرتے رہتے ہیں کہ یوں ہوا، فلاں ہو گیا، نقصان و گھاٹا ہو گیا، جب یہ دعا یاد کرلیں گے اور حضوراکرم (ﷺ) کے ارشاد کے مطابق یقین کے ساتھ اس کو پڑھیں گے تو ان شاءاللہ اجر بھی ملے گا اور جو نقصان ہوا ہے اس کا بدلہ بھی عطا فرمائیں گے۔

بچہ کے انتقال پر صبر کی عظیم فضیلت:

حدیث ۹۲۲:-

وعن أبي موسىٰ رضی اللہ عنہ أنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا مَاتَ وَلَدُ العَبْدِ قَالَ اللهُ تَعَالَى لِمَلائِكَتِهِ: قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِي؟ فيقولون: نَعَمْ. فيقولُ قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهِ؟ فيقولونَ: نَعَمْ. فيقولُ: مَاذَا قَالَ عَبْدِي؟ فيقولونَ: حَمِدَكَ وَاسْتَرْجَعَ فيقول اللهُ تَعَالَى: ابْنُوا لِعَبْدِي بَيْتاً في الجَنَّةِ، وَسَمُّوهُ بَيْتَ الحَمْدِ.

(رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب کسی کا بچہ انتقال کر جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے پوچھتے ہیں: تم نے میرے بندہ کے بچے کی روح قبض کرلی؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ تو باری تعالیٰ پوچھتے ہیں: تم نے میرے بندہ کے دل کے ٹکڑے کو لے لیا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں: اچھا! تو میرے بندہ نے کیا کہا؟ فرشتے

کہتے ہیں : باری تعالیٰ! اس بندہ نے تو تیری تعریف کے کلمات کہے، اور ”اناللہ وانا الیہ راجعون“ پڑھا۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں : میرے بندہ کے لئے جنت میں ایک مکان بناؤ، اور اس مکان کا نام ”بیت الحمد“ رکھو۔

افادات:- دیکھو کتنا بڑا بدلہ ملا! یہاں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ بندہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو کیسا تعلق ہے! بندہ تو ایسے موقعہ پر شور مچاتا ہے، آہ وواویلا کرتا ہے، شکوے شکایتیں کرتا ہے۔ اُدھر اللہ تعالیٰ سب جانتے ہوئے بھی فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا، اور بندہ نے زبان سے کیا جملے کہے؟ معلوم ہوا کہ یہ جو حالات پیش آتے ہیں ؛ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہیں۔ ایک مُحِب اپنے محبوب کو، یا محبوب اپنے مُحِب کو آزماتا ہے۔ تو بندہ جب ایمان کا دعویٰ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو ان حالات کے ذریعہ آزماتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں کہ اس نے کیا کہا ہے، لیکن چوں کہ فرشتوں کے سامنے بندہ کی تعریف کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

یہ وہی فرشتے ہیں جنھوں نے انسان کی پیدائش کے وقت کہا تھا: ”أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ“ باری تعالیٰ! آپ روئے زمین پر ایسے انسانوں کو پیدا کرنے جارہے ہیں جو دنیا میں خون بہائیں گے اور فساد پھیلائیں گے؟ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بندہ جب بھی کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھتے ہیں : تم تو کہتے تھے کہ فساد مچائے گا۔ تمہارے دعوے کا کیا ہوا؟

جب کسی کے بچے کی روح قبض کی گئی تو وہی فرشتے جو روح قبض کرنے کے لئے گئے تھے، ان ہی سے باری تعالیٰ پوچھتے ہیں : میرے بندہ کے جگر کے ٹکڑے کی روح قبض کرلی تو اس نے

کیا کہا؟ فرشتے گواہی دیتے ہیں ، گویا ان کی گواہی نوٹ کروائی جاتی ہے۔ حالاں کہ باری تعالیٰ تو سب جانتے ہیں لیکن ان پر حجت و دلیل قائم کرنے کے لئے ان سے ہی بلوایا جاتا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں: باری تعالیٰ! اس نے کوئی شکوہ شکایت نہیں کی، اور تیرے فیصلے پر راضی رہا اور تیری حمد بیان کی۔ باری تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنواتے ہیں جس کا نام ”بیت الحمد“ ہوتا ہے۔

ان تعلیمات کو عام کرو:

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ ساری تعلیمات اگر ہر وقت ہمارے پیشِ نظر رہیں تو ہمیں جو حالات، تکلیفیں اور مصائب پیش آتے ہیں اور مختلف طریقوں سے ہم جو آزمائے جاتے ہیں اور ان مواقع پر ہم جو جزع فزع اور شکوے شکایتیں کرتے ہیں اس کی نوبت ہی نہ آئے۔ ایسے مواقع پر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث ہمارے سامنے آئے گی اور ہم یقین کے ساتھ اس پر عمل کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہتر ہی معاملہ ہو گا۔

حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ دیکھئے کہ ایک عورت ہے لیکن حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کو ایک بات بتلادی کہ مصیبت آئی تو یہ پڑھ لو، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجر ملے گا اور اس کا اچھا بدلہ بھی ملے گا۔ چناں چہ انہوں نے اسی یقین کے ساتھ وہ دعا پڑھی، تو فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان سے اچھا شوہر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شکل میں عطا فرمایا۔

بہر حال! اصل کمی و کمزوری ہماری ہے کہ ہم حضور اکرم (ﷺ) کی ان تعلیمات سے ناواقف ہیں، جانتے ہی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر ہر موقعہ پر ان تعلیمات پر عمل کریں کسی بھی حال میں حضور اکرم (ﷺ) نے ہمیں بغیر ڈائرکشن (Direction) کے تنہا چھوڑا ہی نہیں ہے، ہر ہر موقعہ پر کیا کرنا چاہیے وہ موجود ہے، اب یہ ہماری کمزوری اور ناواقفیت ہے کہ ہم ان تعلیمات کو جانتے نہیں ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہ وواویلا کرتے ہیں اور شکوے شکایتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں اور اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

لہٰذا یہ ساری چیزیں سن کر ان کو نوٹ کرنا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے ، لوگوں کو بتلانا چاہیے اور ان کو عام کرنا چاہیے ۔ آج ہمارے معاشرہ اور سماج میں سے یہ ساری چیزیں نکل گئیں، پرانے زمانہ میں لوگوں میں یہ چیزیں تھیں کہ کوئی معاملہ پیش آتا تو بڑے بتلاتے تھے کہ اس موقعہ پر یہ پڑھو، یہ کرو۔ اور آج تو جو لوگ جانتے ہیں وہ بھی کسی کو سکھانے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان تعلیمات کو ہر ہر گھر میں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں ایسا کوئی معاملہ پیش آئے، وہاں اگر دوسری باتیں ہوں تو فوراً ان کو متوجہ کرو کہ اس موقعہ پر حضور اکرم (ﷺ) کی تعلیم یہ ہے ، اس لئے یوں کہو، پھر دیکھو کہ اس کا اثر کیا ہوتا ہے؟

مصیبت کے وقت کا مراقبہ:

حدیث ۹۲۳:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ : يقولُ اللهُ تعَالَى : مَالِعَبْدِي الْمُؤمِن عِنْدِي جَزَاءٌ إِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا، ثُمَّ احْتَسَبَهُ إِلَّا الْجَنَّةَ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ فرماتے ہیں (یہ حدیثِ قدسی ہے) جب مَیں کسی بندہ کی دنیا کی چیزوں میں سے کسی بھی پسندیدہ چیز کو لے لیتاہوں، اوروہ بندہ اس پر ثواب کی امید رکھتاہے؛ تومیرے اس بندہ کے لئے میرے یہاں جنت کے علاوہ اور کوئی بدلہ نہیں ہے۔

افادات:- ”صَفِيَّهُ“ پسندیدہ اور محبوب چیز؛ اس میں اولاد بھی آجاتی ہے اوردوسری جو محبوب چیزیں ہوتی ہیں وہ بھی سب آجاتی ہیں۔ اسی لئے روایتوں میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کی بینائی لے لیتے ہیں اوروہ آدمی صبر کرتاہے تواللہ تعالیٰ اس کو جنت دیتے ہیں۔

ہمارے اکابر میں حضرت گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ گزرے ہیں، اخیر عمر میں حضرت کو موتیا نکل آیاتھا، اوراس زمانہ میں موتیاکا آپریشن اتنا آسان نہیں ہوتاتھا جتنا آج کل ہوتاہے۔ لوگوں نے کہاکہ اس کا آپریشن کرنا پڑے گا جس میں لیٹے رہنا پڑے گا اور سجدہ بھی اشارہ سے کرنا پڑے گا۔ حضرت نے فرمایا: نہیں بھائی! مجھے یہ گوارہ نہیں کہ سجدہ اشارہ سے کروں۔ لوگوں نے کہا:

حضرت !صرف ایک دن کا معاملہ ہے۔تو اس پر فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے بغیر اختیار کے ایک بشارت عطا فرمائی ہے؛ تو اب مَیں اس کو کیوں چھوڑدوں ؟

”ثُمَّ احْتَسَبَهُ“ کسی عمل پر اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھنا ”احتساب“ کہلاتا ہے۔یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیز تھی،میرے پاس امانت تھی،جب تک میرے پاس رہی؛ تب تک رہی،اب اس نے مجھ سے لے لی،اس میں اس کی مصلحتیں ہیں ،وہ مالک و مختار ہے ،لہٰذا اس پر مجھے صبر کرنا چاہیے،اس پر اللہ تعالیٰ مجھے اجر وثواب دے گا۔کوئی بھی مصیبت آنے پر یہ سوچ لینا چاہیے۔

جو دیا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ،اور جو لے گا وہ بھی اللہ ہی کا:

حدیث ۹۲۴:-

وعن أسَامَةَ بن زَيدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ:أَرْسَلَتْ إِحْدٰى بَنَاتِ النَّبِيِّ (ﷺ) إِلَيْهِ تَدْعُوهُ وَتُخْبِرُهُ أَنَّ صَبِيًّا لَهَا-أَوْابْناً-فِي الْمَوْتِ .فَقَالَ للرسول:ارْجِعْ إِلَيْهَا . فَأَخْبِرْهَا أَنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى مَا أَخَذَ وَلَهُ مَا أَعْطَى, وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمّى، فَمُرْهَا، فَلْتَصْبِرْ وَلْتَحْتَسِبْ))...وذكر تمام الحديث.(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی صاحبزادیوں میں سے ایک نے آپ (ﷺ) کے پاس ایک آدمی کے ذریعہ آپ کو بلانے کے لئے پیغام بھیجا(یہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا تھیں جو نبیٔ کریم (ﷺ) کی بڑی صاحبزادی ہیں ،ان کا ایک چھوٹا بیٹا ایسا بیمار ہوا کہ بالکل جاں کنی کے عالم میں

تھا،سانس تیز چلنے لگی،ان کو اندازہ ہو گیا کہ اب یہ زندہ نہیں رہے گا تو انہوں نے ابّا پر کہلوایا کہ آپ تشریف لائیے)میرا بچہ بالکل آخری حالت میں ہے ،تو حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی قاصد کے ذریعہ یہ بات کہلوائی کہ بھائی!تم بیٹی کے پاس جاؤ اور ان کو بتلاؤ کہ جو دیا،وہ بھی اللہ تعالیٰ کا ہے،اور جو لے گا وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ہر چیز کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے،اس لئے میری بیٹی سے کہہ دو کہ صبر سے کام لے اور اللہ تعالیٰ سے اس پر ثواب کی امید رکھے(اس پر ملنے والا اجر و ثواب اس نعمت کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے) وذکر تمام الحدیث

افادات:- اولاد کے ہم مالک تو ہیں نہیں ،یہ تو اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جس سے ہمیں ایک مدت کے لئے خوش ہونے اور فائدہ اُٹھانے کا موقعہ دیا گیا ہے، اولاد جب چھوٹی ہوتی ہے تو آدمی اس سے خوش ہوتا ہے، اور جب بڑی ہوتی ہے تو اس سے راحت پہنچتی ہے۔ اور در حقیقت یہ اسی کی چیز تھی،اب اسی نے لے لی۔

ایک عورت کے صبر کا عجیب قصہ:

حضرت اُم سُلَیم رضی اللہ عنہا حضرت انس رضی اللہ عنہ کی والدہ تھیں۔روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے والد کے انتقال کے بعد حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا،ایک بچہ پیدا ہوا جو بیمار تھا، اسی دوران حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کہیں سفر میں نکلے، رات کو جب واپس آئے تو بچہ کا انتقال ہو چکا تھا۔سفر سے آتے ہی پوچھا کہ بچہ کا کیا حال ہے؟ تو

حضرت اُم سُلَیم نے جواب دیا: پہلے سے زیادہ آرام میں ہے(اور واقعہ بھی یہی ہے کہ پہلے تو بیماری کی تکلیف میں تھا، جب انتقال ہو گیا تو اس بیماری کی تکلیف سے آرام میں ہو گیا) اس جواب سے وہ یوں سمجھے کہ طبیعت ٹھیک ہے

حضراتِ شُرّاح نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو چاہیے کہ شوہر جب گھر میں آئے تو ایسی کوئی خبر جو اس کی طبیعت پر فوری اثر کرنے والی ہو، اس کے سامنے نہ رکھے، وہ ذرا اطمینان حاصل کر لے ، اس کے بعد کہے۔

خیر! انہوں نے کہا: کھانا لاؤ، تو کھانا پیش کیا، کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کہا: بستر کا انتظام کرو، ان کو ضرورت تھی وہ پوری کی، اس وقت تک بھی بتایا نہیں کہ اس بچہ کا انتقال ہو چکا ہے، جب ضرورت سے فارغ ہوئے اور آرام ہو گیا تو پھر صبح سے پہلے کہا: بچے کا انتقال ہو گیا ہے اس کے غسل اور کفن دفن کا انتظام کرو۔

دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ یہ خبر دینے سے پہلے انہوں نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کوئی آدمی کوئی چیز امانت کے طور پر تمہیں دے، پھر تم سے وہ چیز واپس مانگے؛ تو کیا آپ ناراض ہوں گے؟ انہوں نے کہا: نہیں! کیوں ناراض ہوؤں گا؟ اس کی چیز ہے ، وہ اس کا مالک ہے، جب مانگے گا تو ضرور واپس کروں گا۔ تو پھر حضرت اُم سُلَیم رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک بچہ بطور امانت کے دیا تھا، وہ اس کا مالک تھا ، اس نے ہم سے واپس لے لیا،

اب اس کے کفن دفن کا انتظام کرو۔ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کو بڑا ناگوار گزرا کہ میں نے یہ سب کر لیا تب تک تم نے بتایا نہیں؟ پھر صبح حضور اکرم (ﷺ) کی خدمت میں یہ قصہ عرض کیا، تو حضور (ﷺ) نے ان کو برکت کی دعا دی۔ روایتوں میں ہے کہ اس صحبت سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام عبداللہ رکھا جس کی اولاد میں نو بڑے عالم پیدا ہوئے۔ (بخاری و مسلم)

(یہ قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد ۱/ ص: ۳۲۳ تا ۳۳۰ پر تفصیل سے موجود ہے۔ مرتب۔)

اس روایت میں حضور اکرم (ﷺ) یہی ارشاد فرماتے ہیں کہ: ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اگر کوئی چیز گئی تو یوں سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے واپس لے لی۔ "وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِأَجَلٍ مُسَمًّى" اور ہر چیز کا اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک وقت مقرر ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے اولاد دی، تو اس کے لئے ایک وقت مقرر ہے، اس کی زندگی طے ہے، جتنے دن وہ لے کر دنیا میں آیا ہے اتنے ہی دن رہے گا۔ اور کوئی چیز ہے، جیسے: آپ کو موٹر کار دی، اس کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وقت مقرر ہے وہیں تک وہ آپ کے پاس رہے گی۔ مکان، دوکان، جاندار، بے جان؛ ہر چیز کا یہی قاعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جتنی بھی چیزیں دے رکھی ہیں؛ ہر ایک چیز کے واسطے اللہ تعالیٰ کے پاس ایک وقت مقرر ہے۔ انسان کی آنکھیں، ہاتھ، پاؤں، اعضاء بدن، مال و دولت، مکان، دوکان، تجارت، فیکٹری؛ یہ ساری چیزیں ایک مقررہ وقت تک کے لئے دی جاتی ہیں، جب وہ وقت ختم ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ واپس لے لے گا۔

یہ روایت پہلے (جلد اول، صفحہ ۲۶۳ تا ۲۶۶ پر بھی) آچکی ہے۔جب نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس قاصد کے ذریعہ صاحبزادی کو صبر کا پیغام بھجوایاتواس کے جواب میں ان صاحبزادی صاحبہ نے قسم دے کر دوبارہ پیغام بھیجاکہ میں آپ کو قسم دیتی ہوں کہ آپ ضرور تشریف لایئے، تونبیٔ کریم (ﷺ) ان کے پاس تشریف لائے اوردوسرے بڑے بڑے صحابہ بھی ساتھ ہولئے،جب آپ (ﷺ) اپنی صاحبزادی کے پاس پہنچے تو اس چھوٹے بچہ کو۔جس کی جاں کنی کی حالت تھی۔ اُٹھاکرآپ کے گود میں دیاگیا،اس وقت اس کی سانس بہت تیزچل رہی تھی۔اس کی یہ حالت دیکھ نبیٔ کریم (ﷺ) کی آنکھ سے آنسوٹپکا،توحضرت سعدبن عبادہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!یہ کیا؟ وہ یہ سمجھے کہ اللہ کے رسول ہیں اس لئےایسے وقت آپ کی آنکھوں سے آنسونہیں نکلنے چاہئیں۔تو حضوراکرم (ﷺ) نے فرمایا: محبت وشفقت کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے ہرانسان کے دل میں رکھاہے؛یہ اسی کااثرہے۔وہ انسان ہی کیاجس کے دل میں محبت وشفقت کا جذبہ نہ ہو؟ روایتوں میں آتاہے کہ آپ (ﷺ) کے اس بچہ کوگود میں لینے کے بعد سانس کی وہ تیزی ختم ہوگئی اور بچہ ٹھیک وتندرست ہوگیا،بعد میں وہ زندہ بھی رہا۔

اس روایت پر ’’فیض الباری‘‘میں حضرت علامہ انورشاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات ارشادفرمائی ہے کہ: اس بچہ کی جاں کنی کی بالکل اخیری حالت تھی لیکن نبیٔ کریم (ﷺ) کے گودمیں دینے کے بعدوہ ٹھیک ہوگیا؛تویوں کہاجاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضوراکرم (ﷺ) کے ذریعہ سے بھی مردوں کوزندہ کیاہے۔

باب جواز البکاء عَلَی المیت بغیر ندب وَلاَنیاحة

مرنے والے کے اوپر بغیر آہ وواویلا

اور نوحہ کے ارادہ ونیت کے رونا جائز ہے

زمانۂ جاہلیت میں رونے کی کچھ شکلیں تھیں ،ایک شکل نوحہ کی تھی۔جو پرانے لوگ ہیں جنھوں نے غیر مسلموں کو دیکھا ہوگا وہ سمجھیں گے کہ ان کے یہاں جب کسی کا انتقال ہوتا ہے، تو خاص رونے کے لئے عورتیں جمع ہوتی ہیں،وہ باتیں کرتے ہوئے آتی ہیں اور جہاں محلّے کا نکّڑ آتا ہے کہ زور زور سے رونا شروع کردیتی ہیں ، چھوٹے بچے ساتھ میں ہوتے ہیں وہ بھی گھبرا جاتے ہیں کہ اچانک کیا ہوگیا۔پھر گھومتے ہوئے سینہ کوٹتی ہیں ،اپنے چہرے پر طمانچے لگاتی ہیں،بالوں کو بکھیرتی ہیں اور ترنم کے ساتھ رونے کی آوازیں نکالتی ہیں؛یہ نوحہ کہلاتا ہے جو حرام ہے۔ اوراسی میں یہ بھی ہوتا تھا کہ جو عورت کسی کے یہاں رونے جاتی تھی اس کو نوٹ کیا جاتا تھا۔جیسے: شادی بیاہ کے موقعہ پر نوٹ کیا جاتا ہے کہ فلاں نے کتنا دیا،تاکہ جب اس کے یہاں شادی بیاہ کا موقعہ ہوتو اتنا ہی دیا جائے،اسی طرح یہاں بھی نوٹ کیا جاتا تھا کہ کون سی عورت ہمارے یہاں رونے آئی،تاکہ جب اس کے یہاں موقعہ آئے تو ہم بھی رونے کے واسطے اس کے وہاں جائیں،

یہ بھی حرام ہے اور یہ بھی اس زمانہ کا ایک خاص انداز تھا۔ اور جس کے گھر پر جتنی زیادہ عورتیں نوحہ کرتیں اس کو اتنا ہی بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا، بلکہ لوگ وصیت کرتے تھے کہ میرے مرنے کے بعد نوحہ کرنے کا خوب اہتمام کرنا، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ بڑی شخصیت تھی۔ حضور اکرم (ﷺ) نے اس سے منع فرمایا ہے۔

دوسری شکل "ندبہ" کی تھی۔ اس میں نوحہ کی طرح پروفیشنل طریقہ سے رونا تو نہیں ہوتا، لیکن انداز وہی ہوتا ہے کہ مرنے والے پر زور زور سے کہا جاتا ہے کہ آپ تو میرے لئے ماویٰ وملجا تھے، اور اس زمانہ میں بولتے تھے: "وَاجَبَلَاہْ، وَارَأْسَاہْ، وَاملْجَاہْ" ہائے میرا پہاڑ، ہائے میرے سر تاج، ہائے میری پناہ۔ آپ تو ایسے تھے، اور یوں کرتے تھے، آپ تو ہاتھ لگا دیتے تھے تو یوں ہو جاتا تھا؛ اور پورا ایک سلسلہ چلتا تھا؛ یہ ندبہ کہلاتا ہے۔ شریعت میں اس کی بھی اجازت نہیں ہے، یہ بھی حرام ہے۔

تو یہ دونوں چیزیں ممنوع ہیں، باقی کسی کے انتقال کی وجہ سے دل میں غم کا ہونا ضروری ہے، اس غم کی وجہ سے آنکھ کے آنسو نکل آئیں، تو اس سے شریعت نے منع بھی نہیں کیا ہے، یا شدتِ غم کی وجہ سے رونے کی آواز کا بلند ہو جانا بھی منع نہیں ہے۔ اس باب میں یہی بتلانا چاہتے ہیں :-

رونے کی وجہ سے میت کو عذاب دیا جاتا ہے؟:

أَمَّا النِّيَاحَةُ فَحَرَامٌ وَسَيَأْتِي فِيهَا بَابٌ فِي كِتَابِ النَّهْيِ، إِنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَى. وَأَمَّا الْبُكَاءُ فَجَاءَتْ أَحَادِيثُ بِالنَّهْيِ عَنْهُ، وَأَنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ، وَهِيَ مُتَأَوَّلَةٌ وَمَحْمُولَةٌ عَلَى مَنْ أَوْصَى بِهِ، وَالنَّهْيُ إِنَّمَا هُوَ عَنِ الْبُكَاءِ الَّذِي فِيهِ نَدْبٌ، أَوْ نِيَاحَةٌ، وَالدَّلِيلُ عَلَى جَوَازِ الْبُكَاءِ بِغَيْرِ نَدْبٍ وَلاَ نِيَاحَةٍ أَحَادِيثُ كَثِيرَةٌ، مِنْهَا:

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نوحہ حرام ہے، اور آگے جہاں ممنوع باتوں کا بیان آئے گا وہاں اس سلسلہ میں مستقل باب لائیں گے۔ رونے کے سلسلہ میں بہت سی روایتوں میں ممانعت آئی ہے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے: "إِنَّ الْمَيِّتَ لَيُعَذَّبُ بِبُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ (بخاری شریف: باب قَوْلِ النَّبِيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) يُعَذَّبُ الْمَيِّتُ بِبَعْضِ بُكَاءِ أَهْلِهِ عَلَيْهِ إِذَا كَانَ النَّوْحُ مِنْ سُنَّتِهِ)" مرنے والے کو اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً رونا جائز نہیں۔ لیکن دوسری روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ اُس زمانہ میں لوگ باقاعدہ وصیت کرتے تھے کہ میرے مرنے کے بعد روئیو، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے۔ تو جس آدمی نے وصیت کی ہو اور اس کے نتیجہ میں لوگ روئیں تو وہ گنہ گار ہوگا، اور لوگوں کے رونے پر اس مرنے والے کو عذاب بھی ہوگا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ اس نے وصیت تو نہیں کی، لیکن کسی علاقہ میں مرنے والے کی موت کے بعد اس طرح رونے کا رواج ہے، اور مرنے والے کو معلوم ہے کہ ایسا ہوتا ہے، تو علماء نے لکھا

ہے کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وصیت کر جائے کہ میرے مرنے کے بعد رونا مت۔ اس کی وصیت کے باوجود بھی وہ روئیں گے تو اس صورت میں مرنے والے کو ان شاء اللہ کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اور اگر اس کو معلوم ہے کہ لوگ روتے ہیں، اس کے باوجود اس نے ممانعت کی وصیت نہیں کی؛ تو اس صورت میں وہ گنہ گار ہوگا اور لوگوں کے رونے کی وجہ سے اس کو عذاب بھی ہوگا۔

اس لیے غور کرنے کی بات یہ ہے کہ رونے والے اس پر رو رہے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہم اس کی خیر خواہی کر رہے ہیں، لیکن اُلٹا اس کے لئے عذاب کا ذریعہ بن رہے ہیں۔

عذاب تو زبان کی وجہ سے ہوتا ہے:

حدیث ۹۲۵:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أَنَّ رسول الله (ﷺ) عاد سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ، وَمَعَهُ عَبْدُ الرَّحْمانِ بْنُ عَوفٍ، وَسَعدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ، وَعَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْعُودٍ رضی اللہ عنہم. فَبَكَى رسولُ الله (ﷺ). فَلَمَّا رَأَى القَوْمُ بُكَاءَ رسولِ الله (ﷺ) بَكَوْا، فَقَالَ: أَلَا تَسْمَعُونَ؟ إِنَّ اللهَ لَا يُعَذِّبُ بِدَمْعِ العَيْنِ، وَلَا بِحُزْنِ القَلْبِ، وَلَكِنْ يُعَذِّبُ بِهٰذَا أَوْ يَرْحَمُ. وَأَشَارَ إِلَى لِسَانِهِ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (ﷺ) حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی عیادت کے لئے تشریف لائے، اس وقت آپ (ﷺ) کے ساتھ عبد الرحمٰن بن عوف، سعد بن أبی وقاص

اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم بھی تھے،ان کی حالت دیکھ کر نبیؐ کریم (ﷺ) روئے،جب لوگوں نے آپ کا رونا دیکھا تو لوگ بھی رونے لگے۔ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کیا تم لوگ سنتے ہو؟ اللہ تعالیٰ آنکھ کے آنسو اور دل کے غم کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا، لیکن اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے، یا رحم فرماتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے حضور اکرم (ﷺ) نے زبان کی طرف اشارہ فرمایا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کی موت پر آنکھوں میں آنسو آگئے، دل میں غم کی کیفیت پیدا ہوئی، تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، یہ تو فطری اور طبعی چیز ہے، لیکن زبان سے جو آہ وواویلا اور شکوہ شکایت کرتے ہیں ،اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ اور گرفت ہوگی۔

ہر انسان کے دل میں جذبۂ رحمت رکھا ہے:

حدیث ۹۲۶:-

وعن أُسَامَة بن زَيدٍ رضی اللہ عنہما أنَّ رسول الله (ﷺ) رُفِعَ إِلَيهِ ابنُ ابْنَتِهِ وَهُوَ فِي المَوتِ، فَفَاضَتْ عَيْنَا رسولِ اللهِ (ﷺ). فَقَالَ لَهُ سَعدٌ: مَا هَذَا يَا رسولَ الله؟! قَالَ: هٰذِهِ رَحْمَةٌ جَعَلَهَا اللهُ تَعَالَى فى قُلُوبِ عِبَادِهِ، وَإِنَّمَا يَرْحَمُ اللهُ مِنْ عِبَادِهِ الرُّحَمَاءَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم (ﷺ) کے پاس آپ کی بیٹی کا بیٹا (یعنی نواسہ) اُٹھا کر دیا گیا اور بالکل موت کی حالت میں تھا، اس کی یہ کیفیت دیکھ کر نبیؐ کریم (ﷺ) کی مبارک آنکھ میں آنسو آگئے، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! یہ کیا؟ (وہ یوں سمجھے کہ یہ

چیز کہیں شانِ نبوت کے خلاف تو نہیں) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے سعد! یہ تو محبت اور رحمت وشفقت کا جذبہ ہے جو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں ودیعت فرمایا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے انہیں بندوں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرے۔

افادات:- حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کے سو حصے ہیں اور اس میں سے ایک حصہ دنیا میں رکھا ہے، اسی کی وجہ سے جانور بھی اپنے بچوں سے محبت رکھتے ہیں۔ ہر انسان کے دل میں جذبۂ رحمت رکھا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ کوئی آدمی جب کسی کو بھی تکلیف کی حالت میں دیکھتا ہے، چاہے وہ کوئی بھی ہو، اپنا بچہ ہو، یا کسی اور کا بچہ ہو، بلکہ بعض مرتبہ کسی جانور کو بھی تکلیف کی حالت میں جب دیکھتا ہے؛ تو اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور پسیج جاتا ہے۔

غمگین ہونا اور آنسو نکلنا برا نہیں :

حدیث ۹۲۷:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) دَخَلَ عَلَى ابْنِهِ إِبْرَاهِيمَ - رضی اللہ عنہ - وَهُوَ يَجُودُ بِنَفْسِهِ، فَجَعَلَتْ عَيْنَا رسولِ الله - (صلی اللہ علیہ وسلم) - تَذْرِفَانِ. فَقَالَ لَهُ عبدُ الرحمٰنِ بن عَوف: وأنت يَا رسولَ الله؟! فَقَالَ: يَا ابْنَ عَوفٍ! إِنَّهَا رَحْمَةٌ. ثُمَّ أَتْبَعَهَا بِأُخْرَى، فَقَالَ: إِنَّ العَيْنَ تَدْمَعُ والقَلبَ يَحْزَنُ، وَلاَ نَقُولُ إِلاَّ مَا يُرْضِي رَبَّنَا، وَإِنَّا لِفِرَاقِكَ يَا إِبرَاهِيمُ لَمَحزُونُونَ. (رواہ البخاری، وروی مسلم بعضہ)

ترجمہ:۔حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لائے ایسی حالت میں کہ ان کی روح قبض ہورہی تھی (ان کی یہ کیفیت دیکھ کر) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے، یہ دیکھ کر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ بھی رورہے ہیں ؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے ابن عوف! یہ تو محبت وشفقت کا تقاضہ ہے (جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں رکھی ہے، ایسی کیفیت دیکھ کر غیر اختیاری طور پر آنسو آہی جاتے ہیں) پھر (دوسری بات ارشاد) فرمائی کہ آنکھ آنسو گراتی ہے، دل غم کرتا ہے، اور ہم وہی بات کہیں گے جو ہمارے رب کو خوش کرنے والی ہو، اے ابراہیم! ہم تمہاری جدائی پر غمگین ہیں۔

افادات:۔خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کی موت پر اگر آنکھوں سے آنسو نکلیں ، دل میں غم ہو، تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ بعض مرتبہ شدت غم میں آواز ذرا تیز ہوجاتی ہے وہ بھی ممنوع نہیں ہے، ہاں بہ تکلّف ایسا نہ کرے۔

الکف عن ما یری من المیت من مکروہ

میت میں کوئی نامناسب بات نظر آئے تو اس کو چھپانا چاہیے

میت کے سلسلہ میں احکام چل رہے تھے، ایک باب قائم کیا ہے کہ مرنے والے کے جسم میں ناپسندیدہ بات ،یاکوئی بری چیز دیکھے تو اس کولوگوں کے سامنے ظاہر کرنے سے بچنا چاہیے۔چناں چہ اس سلسلہ میں روایت لائے ہیں ۔

حدیث ۹۲۸:-

وعن أَبِي رافع أسلم مولى رسول الله (ﷺ) أَنَّ رسولَ الله (ﷺ) قَالَ: مَنْ غَسَّلَ مَيتاً فَكَتَمَ عَلَيْهِ، غَفَرَ اللهُ لَهُ أَرْبَعِينَ مَرَّةً. (رواه الحاكم، وقال: صحيح عَلَى شرط مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی نے میت کو غسل دیااور غسل کے دوران کوئی ناگوار اور نامناسب چیز اس کے علم میں آئی اوراس نے اس کوچھپایا تو اللہ تعالیٰ چالیس مرتبہ اس کی مغفرت فرمائیں گے(کسی گناہ کو چالیس مرتبہ بھی کیا ہو گا پھر بھی اس کو معاف کردیں گے)

افادات:- مثلاً: میت کے جسم سے بدبو آئی، یا اس کے چہرہ کے اندر سیاہی آگئی، یا چہرہ مسخ ہو گیا، یا بعض مرتبہ بدن میں کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ غسل کے دوران ایسی کوئی نامناسب چیز میت میں نظر آگئی؛ تو لوگوں کے سامنے اس کو ظاہر نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اس کو چھپائے۔ اسی لیے غسل دینے میں شریک ہونے والوں کے لیے بتایا گیا ہے کہ وہ امانتدار اور صالح قسم کے لوگ ہونے چاہئیں، تاکہ ایسی کوئی چیز نظر آجائے تو اس کو ظاہر نہ کریں۔ اور اس کی بڑی فضیلت ہے کہ جو آدمی ایسی چیز کو چھپائے گا تو اللہ تعالی چالیس مرتبہ اس کی مغفرت فرمائیں گے یعنی اگر کسی گناہ کو چالیس مرتبہ کیا ہوگا پھر بھی اس کو معاف کر دیں گے۔

ویسے علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی بدعت، یا کسی حرام اور کبیرہ گناہ کا ارتکاب علانیہ طور پر کرتا تھا، مثلاً: کوئی آدمی گویّا (Pop Singer) تھا، یا کھلّم کھلّا سود خور تھا، یا لوگوں کے اوپر ظلم ڈھاتا تھا، اور ایسے آدمی کے مرنے کے وقت اس کے جسم میں کوئی ایسی چیز نظر آئے، تو اس کو چھپایا نہ جائے، بلکہ اس کو ظاہر کیا جائے؛ تاکہ لوگ اس قسم کے جرم سے بچیں، جب لوگوں کے سامنے یہ چیز آئے گی کہ یہ آدمی ایسا کرتا تھا تو ایسا ہو گیا؛ تو ان کو عبرت ہوگی۔ ورنہ عام طور پر ایسی چیزیں نظر آئے تو اس کو ظاہر نہ کرے بلکہ اس کو چھپائے۔ ہاں! اگر کوئی اچھی چیز نظر آئے، مثلاً: اس کے جسم میں سے خوشبو آئی، یا چہرہ کے اندر نورانیت نظر آئی، تو اس کو پوشیدہ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کو ظاہر کرنا چاہیے۔

الصلاة عَلَى الميت وتشييعه

وحضور دفنه وكراهة اتباع النساء الجنائز

وَقَدْ سَبَقَ فَضْلُ التَّشْيِيعِ

نماز جنازہ کا بیان

جنازہ کے ساتھ جانا اور تدفین میں شریک ہونا

اور عورتوں کا دفن میں شریک ہونا مکروہ ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نمازِ جنازہ اور تدفین میں شریک ہونے کی فضیلت:

حدیث ۹۲۹:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ): مَنْ شَهِدَ الجَنَازَةَ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا، فَلَهُ قِيرَاطٌ، وَمَنْ شَهِدَهَا حَتَّى تُدْفَنَ، فَلَهُ قِيرَاطَانِ. قِيلَ: وَمَا القِيرَاطَانِ؟ قَالَ: مِثْلُ الجَبَلَيْنِ العَظِيمَيْنِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ؐکریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی جنازہ میں حاضر ہوا، یہاں تک کہ نماز پڑھنے تک اس کے ساتھ شریک رہا، اس کو ایک قیراط ثواب ملے گا۔اور جو نماز کے بعد دفن میں بھی شریک رہا، اس کو دو قیراط ثواب ملے گا۔پوچھا گیا: قیراط سے کیا مراد ہے؟ تو نبی ؐکریم (ﷺ) نے جواب میں ارشاد فرمایا: دو بڑے پہاڑوں کے برابر۔

افادات:- قیراط ایک درہم کے چھٹے حصہ کو بھی کہا جاتا ہے۔لیکن یہاں قیراط سے دو بڑے پہاڑوں کے برابر مقدار مراد ہے یعنی ثواب کا بہت بڑا حصہ۔ تو جو آدمی جنازہ کی نماز میں بھی شریک رہا اور دفن میں بھی شریک ہوا؛ اس کو دو قیراط کے برابر ثواب ملے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ صرف جنازہ کی نماز پر اکتفاء نہ کیا جائے ،بلکہ اگر موقعہ اور وقت ہو تو آدمی کو چاہیے کہ دفن میں بھی شریک ہو جائے۔

آج کل عام مزاج یہ بن گیا ہے کہ جنازہ کی نماز میں شریک ہو کر چلے جاتے ہیں۔ اگر کوئی ضروری کام ہے تو بات دوسری ہے، لیکن اس میں بھی حکم یہ ہے کہ جنازہ کی نماز کے بعد اگر جانا چاہتے ہیں تو جنازہ کے ولی سے اجازت لینی چاہیے یعنی اس کو کہہ کر جائے۔ اگر اس کو کہے بغیر جائے گا تو کوئی حرام کام نہیں ہو گا اور گناہ بھی نہیں ہو گا، لیکن آداب میں سے ہے، اور اچھا تو یہ ہے کہ دفن میں شریک ہو جائے۔ اس میں کوئی زیادہ وقت بھی نہیں لگتا، بیس پچیس منٹ کا معاملہ ہوتا ہے، اور اتنا بڑا ثواب مل جاتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جنازہ کی نماز میں شریک ہو کر چلے جاتے تھے، جب یہ روایت سامنے آئی تو بڑا افسوس کرتے ہوئے کہنے لگے: لَقَدْ ضَيَّعْنَا قَرَارِيطَ كَثِيرَةً (صحیح بخاری: ۱۳۲۵/ صحیح مسلم: ۲۲۳۲) ہم نے تو بہت سے قیراطوں کا نقصان کر دیا۔ وہ حضرات اس کا اہتمام کرتے تھے۔

حدیث ۹۳۰:-

وعنه أنَّ رسولَ الله (ﷺ) قَالَ: مَنِ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إيمَاناً وَاحْتِسَاباً وَكَانَ مَعَهُ حَتَّى يُصَلَّى عَلَيْهَا وَيُفرَغَ مِنْ دَفْنِهَا فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الأَجْرِ بِقِيرَاطَيْنِ كُلُّ قِيرَاطٍ مِثْلُ أُحُدٍ، وَمَنْ صَلَّى عَلَيْهَا، ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ، فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطٍ. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی مسلمان کے جنازہ میں ایمان اور احتساب کے ساتھ گیا، اور جنازہ کے ساتھ رہا یہاں تک کہ نماز پڑھی گئی اور دفن

سے بھی فارغ ہوگیا ؛تو وہ آدمی دو قیراط لے کر واپس لوٹتا ہے ،اور ہر قیراط اُحد پہاڑ کے برابر ہے۔اور جس آدمی نے نماز پڑھی اور دفن سے پہلے لوٹ آیا؛ تو وہ ایک قیراط لے کر لوٹے گا۔

افادات:- کسی بھی عمل کے قبول ہونے کے لیے ایمان شرط ہے، اگر ایمان نہیں ہے تو وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہی نہیں ہوتا۔اور ایمان کے ساتھ احتساب بھی ہو،"احتساب" یعنی وہ عمل خالص اللہ تعالیٰ کے خاطر کرنا، او راس امید کے ساتھ اس عمل کو انجام دینا کہ اس پر اللہ تعالیٰ مجھے ثواب دیں گے؛ اسی کا نام "احتساب" ہے۔تو اگر کوئی آدمی جنازہ کے ساتھ گیا اور یہ دونوں شرطیں ہیں تو وہ فضیلت حاصل ہوگی۔اگر یہ ارادہ ہے کہ فلاں کو دِکھانے کے لیے جانا پڑے گا، تو پھر وہ بات نہیں رہے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو چاہیے کہ جب جنازہ کے ساتھ جائے تو نماز اور دفن دونوں میں شریک رہے۔ بعض لوگ جنازہ کے ساتھ جاتے ہیں لیکن نماز میں شریک نہیں ہوتے،الگ کھڑے ہوجاتے ہیں،ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا بات ہے،الگ کیوں کھڑے ہو؟ تو کہتے ہیں:وضو نہیں ہے؛تو ان کو کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

عورتوں کو قبرستان جانے سے روکا گیا:

حدیث ۹۳۱:-

وعن أم عطية رضی اللہ عنہا **قالت: نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَلَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا.** (متفقٌ عَلَيْهِ) **ومعناه: وَلَمْ يُشَدَّدْ فِى النَّهْيِ كَمَا يُشَدَّدُ فِى الْمُحَرَّمَاتِ.**

ترجمہ:- حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم (عورتوں) کو جنازوں کے ساتھ جانے سے منع کیا گیا، اور یہ ممانعت کوئی پکی نہیں۔ (جیسے: حرام چیزوں سے شدت اور قوت کے ساتھ روکا جاتا ہے، بلکہ ناپسند قرار دیا گیا۔)

افادات:- عورتوں کو جنازہ کے ساتھ جانا اور قبرستان میں جانا کیسا ہے؟ اس سلسلہ میں احناف کے یہاں دونوں باتیں لکھی گئی ہیں۔ بعضوں نے اس کو حرام بتایا ہے، اس لئے کہ عام طور پر جب عورتیں کسی قبر پر جاتی ہیں تو اگر وہ کسی رشتہ دار کی قبر ہوئی تو نوحہ کرے گی، روئے دھوئے گی، حالاں کہ رونے دھونے سے منع کیا گیا ہے، اور نوحہ حرام ہے۔ اور اگر اللہ کے کسی نیک بندے اور بزرگ کی قبر ہوگی تو بدعت میں مبتلا ہوگی، اس سے حاجتیں مانگے گی۔ اس لئے منع کیا گیا ہے کہ عورتوں کو قبرستان نہیں جانا چاہیے۔

اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اگر اس کی طرف سے ان دوباتوں کا خطرہ نہ ہو ،اور جوان بھی نہیں ہے بلکہ بوڑھی ہے؛ تو اس صورت میں جانے کی گنجائش ہے۔ لیکن پھر بھی بہتر بات یہی کہی گئی کہ عورتوں کو قبرستان جانے سے روکا جائے۔

باب استحباب تکثیر المصلین علی الجنازۃ وجعل صفوفھم ثلاثۃ فاکثر

نمازِ جنازہ میں شریک ہونے والوں کی تعداد کا زیادہ ہونا پسندیدہ ہے اور صفیں تین یا اس سے زیادہ بنائی جائیں؛ یہ بھی اچھا ہے

ویسے ایک بات ضرور ہے کہ کسی کے جنازہ میں بہت زیادہ لوگ شریک ہوں تو اس کی مغفرت کا ذریعہ بنتا ہے، لیکن زیادہ لوگوں کو جنازہ میں شریک کرنے کے لیے تدفین میں تاخیر کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ مستقل باب لاکر اس کا حکم بتائیں گے، بلکہ فقہ کی کتابوں میں تو یہاں تک مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کسی کا جمعہ کے دن انتقال ہوگیا جنازہ تیار ہوگیا، اور ساری تیاریاں بھی مکمل ہوگئیں، اس کے بعد محض اس لیے نمازِ جنازہ کو جمعہ کی نماز کے وقت تک مؤخر (لیٹ) کرنا کہ جمعہ کی نماز میں زیادہ لوگ آئیں گے اور جنازہ میں زیادہ لوگ شریک ہوں گے؛ تو فقہاء اس کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ ہاں ! اتنی تاخیر تو کی جاسکتی ہے کہ غسل اور کفن سے فارغ ہوجائیں اور ادھر قبر تیار ہوجائے ، اتنا وقت تو لگانا ہی پڑے گا، اس کے بغیر تو بات بنے

گی ہی نہیں، لیکن سب تیاریاں مکمل ہوچکنے کے بعد زیادہ لوگ آویں اس لیے تاخیر کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

سو آدمی جنازہ پڑھیں تو مغفرت:

حدیث ۹۳۲:-

عن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: قَالَ رسولُ الله** (صلی اللہ علیہ وسلم) **: مَا مِنْ مَيِّتٍ يُصَلِّي عَلَيْهِ أُمَّةٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، يَبْلُغُونَ مِئَةً كُلُّهُمْ يَشْفَعُونَ لَهُ إِلَّا شُفِّعُوا فِيهِ.**

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: وہ میت جس کے اوپر مسلمانوں کی ایک جماعت نے نماز پڑھی جن کی تعداد سو کے برابر ہوجائے کہ ان میں سے ہر ایک اس کی سفارش کرتا ہے (یعنی دعائے مغفرت کرتا ہے) تو اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو قبول کر لیتے ہیں اور اس دعا پر مرنے والے کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

افادات:- جو بھی جنازہ کی نماز پڑھنے والا ہوتا ہے وہ جنازہ کے لئے دعائے مغفرت ہی کرتا ہے، گویا یہی اس کے لیے سفارش ہوئی۔ تو معلوم ہوا کہ کسی کے جنازہ میں سو آدمی شریک ہوئے تو یہ اس کے لیے مغفرت کا پروانہ ہے۔ یہ مسلم شریف کی روایت ہے۔

چالیس آدمی جنازہ پڑھیں تو مغفرت:

حدیث ۹۳۳:-

عن ابن عباسٍ رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رسول اللہ (ﷺ) یقول: مَا مِنْ رَجُلٍ مُسْلِمٍ يَمُوتُ، فَيقومُ عَلَى جَنَازَتِهِ أَرْبَعُونَ رَجُلاً لَا يُشْرِكُونَ بِاللهِ شَيْئاً إِلَّا شَفَّعَهُمُ اللهُ فِيهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کسی مسلمان کا انتقال ہو جائے اور اس کے جنازہ پر چالیس آدمی نماز کے لیے کھڑے ہوں جو ایسے ہوں کہ، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتے ہوں (یعنی مسلمان ہوں) تو اللہ تعالیٰ مرنے والے کے حق میں ان کی سفارش قبول فرمالیتے ہیں اور اس کی مغفرت فرمادی جاتی ہے۔

افادات:- اوپر والی روایت میں سو کی تعداد بتائی تھی اور اس روایت کے مطابق تو چالیس پر بھی یہ فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔

جس کے جنازہ میں تین صفیں ہوں:

حدیث ۹۳۴:-

وعن مرثدِ بن عبدِ اللہ اليَزَنِيِّ، قَالَ: كَانَ مَالِكُ بن هُبَيْرَةَ رضی اللہ عنہ إِذَا صَلَّى عَلَى الْجَنَازَةِ، فَتَقَالَّ النَّاسَ عَلَيْهَا، جَزَّأَهُمْ عَلَيْهَا ثَلَاثَةَ أَجْزَاءٍ، ثُمَّ قَالَ: قَالَ رسول اللہ (ﷺ): مَنْ صَلَّى عَلَيْهِ ثَلَاثَةُ صُفُوفٍ فَقَدْ أَوْجَبَ. (رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت مرثد بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت مالک بن ہُبیرہ رضی اللہ عنہ جب جنازہ کی نماز پڑھاتے اور لوگ کم نظر آتے تو ان کے تین حصے بنالیتے تھے اور فرماتے تھے کہ: نبیؐ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس آدمی پر تین صفوں نے نمازِ جنازہ پڑھی، تو اس کے لیے جنت واجب ہو جائے گی۔

افادات:- شرّاح نے لکھا ہے کہ اگر صرف سات آدمی ہیں ، تو ایک آدمی امام بنے، پہلی صف میں تین آدمی، دوسری صف میں دو، اور تیسری صف میں ایک آدمی کھڑا ہو جائے۔اس طرح سات آدمیوں سے بھی تین صفیں پوری ہو جائیں گی، اور اگر زیادہ ہوں تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ بہر حال ! تین صفوں پر بھی یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

نماز جناہ کی دعائیں :

اب کیا دعائیں پڑھی جائیں ؟ تو ایک دعا تو وہی ہے جو بالغ مرد و عورت کے لئے پڑھی جاتی ہے:

أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَ مَيِّتِنَا، وشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا وَصَغِيرِنَا وَ كَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا، اللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوفَّهُ عَلَى الإِيمَان،"

اور بھی دعائیں ہیں جو آگے آ رہی ہیں۔

حدیث ۹۳۵:-

عن أَبِي عبد الرحمان عوف بن مالك رضی اللہ عنہ قَالَ: صَلَّى رسول الله (ﷺ) عَلَى جَنَازَةٍ، فَحَفِظْتُ مِنْ دُعَائِهِ، وَهُوَ يَقُولُ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ، وَعَافِهِ وَاعْفُ عَنْهُ، وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ، وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ، وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ

وَالبَرَدِ، وَنَقِّهِ مِنَ الخَطَايَا كَمَا نَقَّيْتَ الثَّوْبَ الأَبْيَضَ مِنَ الدَّنَسِ، وَأَبْدِلْهُ دَاراً خَيْراً مِنْ دَارِهِ، وَأَهْلاً خَيراً مِنْ أَهْلِهِ، وَزَوْجاً خَيْراً مِنْ زَوْجِهِ، وَأَدْخِلهُ الجَنَّةَ، وَأَعِذْهُ مِنْ عَذَابِ القَبْرِ، وَمِنْ عَذَابِ النَّارِ" حَتَّى تَمَنَّيتُ أن أَكُونَ أنَا ذَلِكَ الْمَيِّت. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوعبد الرحمن عوف بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ایک جنازہ کی نماز پڑھائی، اس نماز میں نبیٔ کریم (ﷺ) نے جو دعا فرمائی وہ میں نے یاد کرلی۔ نبیٔ کریم (ﷺ) یہ دعا پڑھ رہے تھے: **ترجمہ:-** یا اللہ! تو اس کے گناہوں کو معاف فرما، اور اس پر رحم فرما، اس کو عافیت عطا فرما، اس سے در گذر فرما، میزبانی میں اس کا اکرام فرما، اس کی قبر کو کشادہ فرما، اس کے گناہوں کو پانی سے اور برف سے اور اُولوں سے دھودے۔ اس کو گناہوں سے بالکل پاک کردے، جیسے: سفید کپڑے کو میل کچیل سے پاک صاف کیا جاتا ہے، یہاں اس کا جو گھر تھا اس کے بدلہ میں اس سے اچھا گھر اس کو عطا فرما، اس کے گھر والوں سے اچھے گھر والے دے، اس کی بیوی سے اچھی بیوی دے، اس کو جنت میں داخل کردے اور اس کو عذابِ قبر اور جہنم سے بچائے رکھیو۔ حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ (جو اس روایت کے نقل کرنے والے ہیں) فرماتے ہیں کہ (جب نبیٔ کریم (ﷺ) کی یہ دعامیں نے سنی تو) میں دل میں تمنا کرنے لگا: کاش! اس میت کی جگہ پر میری میت ہوتی (تاکہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی یہ دعائیں مجھے نصیب ہوتیں)

افادات:- "وَأَكْرِمْ نُزُلَهُ" کوئی مہمان جب کسی کے یہاں جاتا ہے تو شروع میں اس کے سامنے بطور اکرام کے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے اس کو "نُزُل" کہتے ہیں، گویا یہ عالَمِ برزخ میں پہنچا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا جائے۔

"وَوَسِّعْ مُدْخَلَهُ" "مُدْخَل" یعنی داخل ہونے کی جگہ، اس سے قبر مراد ہے۔

گنہگار کو چین نصیب نہیں ہوتا:

"وَاغْسِلْهُ بِالْمَاءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ" علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ: پانی کے ساتھ "اَلثَّلْجِ" برف، اور "اَلْبَرَدِ" اولوں کا تذکرہ کیا ہے، حالاں کہ کسی بھی گندگی اور میل کچیل کو دور کرنے کے لئے صرف پانی کافی ہے، لیکن گویا یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بارش کے ساتھ آسمان سے جو اُولے گرتے ہیں ان کا کوئی مصرف نہیں ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ آدمی جب گناہ کرتا ہے تو جہاں اس کے قلب کے اندر گندگی پیدا ہوتی ہے، وہیں ایک طرح کی حرارت اور گناہ کی گرمی بھی پیدا ہوتی ہے، جس کی وجہ سے گنہگار کو بے چینی ہوتی ہے، گنہگار کو کبھی چین اور سکون نصیب نہیں ہوتا، جب تک وہ توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کر لے وہاں تک یہ کیفیت دور نہیں ہوتی، اور وہی اس کو بے چین کئے رہتی ہے۔ تو یہاں برف اور اُولوں کا تذکرہ کیا، گویا گناہوں کے نتیجہ میں جو حرارت اور بے چینی پیدا ہوتی وہ بھی اللہ تعالیٰ دور کر دے۔

پہلی دعا کے ساتھ یہ دعا بھی پڑھ لی جائے، اور اُس دعا کو چھوڑ کر صرف یہ دعا بھی پڑھ سکتے ہیں، اور دونوں دعائیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

دیگر مختلف دعائیں:

حدیث ۹۳۶:-

وعن أبي هريرة وأبي قتادة وأبي إبراهيم الأشهلي، عن أبيه -وأبوه صحابيٌّ- رضی الله عنهم -عن النبيِّ (ﷺ): أنَّهُ صَلَّى عَلَى جَنَازَةٍ، فَقَالَ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا، وَصَغِيرِنَا وَكَبِيرِنَا، وَذَكَرِنَا وَأُنْثَانَا، وشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا، اللّٰهُمَّ مَنْ أَحْيَيْتَهُ مِنَّا فَأَحْيِهِ عَلَى الإِسْلَامِ، وَمَنْ تَوَفَّيْتَهُ مِنَّا فَتَوَفَّهُ عَلَى الإِيمَان، اللّٰهُمَّ لاَ تَحْرِمْنَا أَجْرَهُ، وَلاَ تَفْتِنَّا بَعدَهُ.

(رواه الترمذی من رواية أبي هريرة والأشهلي. ورواه أبو داود من رواية أبي هريرة وأبي قتادة. قَالَ الحاكم: ((حديث أبي هريرة صحيح عَلَى شرط البخاری ومسلم))، قَالَ الترمذی: ((قَالَ البخاری: أصَحُّ رواياتِ هَذَا الحديث رواية الأشْهَلِيِّ، قَالَ البخاری: وأصح شيء فی هَذَا الباب حديث عَوْفِ ابن مَالِكٍ))

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ، حضرت ابو قتادہ اور ابوابراہیم اشہلی اپنے والد سے جو صحابی تھے -رضی اللہ عنہم- نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ایک جنازہ کی نماز پڑھائی اور آپ نے یہ دعا فرمائی: اے اللہ! تو مغفرت فرمادے ہمارے زندوں کی، اور معاف فرمادے ہمارے مردوں کے گناہوں کو۔ ہمارے چھوٹوں اور بڑوں کے گناہوں کو۔ ہمارے مَردوں اور عورتوں کے گناہوں کو۔ اور ہمارے جو موجود ہیں ان کو اور جو موجود نہیں ہیں ان کو۔ اے اللہ! تو ہم میں سے جس کو زندہ رکھے اس کو اسلام پر زندہ رکھیو۔ اور ہم میں سے جس کو موت دے اس کو ایمان پر موت عطا فرمائیو۔ اے اللہ! اس کے مرنے پر ہم جو صبر کریں اس کے اجر و ثواب سے ہمیں محروم نہ کیجیو، اور اس کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد ہمیں فتنہ میں نہ ڈالیو۔

افادات:- جتنے بھی ظاہری اعمال ہیں: نماز، روزہ، حج وغیرہ ان پر اسلام کا اطلاق ہوتا ہے، اور زندگی میں یہ سارے اعمال انجام دیئے جاتے ہیں، اس لیے زندگی کے ساتھ لفظِ اسلام کو جوڑا۔ اور موت کے وقت اعمال کرنے کا وقت باقی نہیں رہتا، ایمان ایسی چیز ہے جس کا تعلق دل کے یقین سے ہے، اس لیے یہاں ایمان کا تذکرہ کیا۔ اور اللہ کے مقبول بندے جب دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو لوگوں کے لیے باعثِ فتنہ ہوتے ہیں، اس لیے اس دعا میں اس کو بھی شریک کر لیا ہے کہ اس کے بعد فتنہ میں مبتلا نہ کرنا۔

حدیث ۹۳۷:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله (ﷺ) يقول: إِذَا صَلَّيْتُمْ عَلَى المَيِّتِ، فَأَخْلِصُوا لَهُ الدُّعاءَ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب تم میت کے اوپر نماز جنازہ پڑھو؛ تو سچے دل سے اس کے لئے دعا کرو (اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمالیتے ہیں)

حدیث ۹۳۸:-

وعنه عن النبيِّ (ﷺ) في الصَّلاةِ عَلَى الجَنَازَةِ: أَللَّهُمَّ أَنْتَ رَبُّهَا، وَأَنْتَ خَلَقْتَهَا، وأنت هَدَيْتَهَا للإِسْلامِ، وَأنتَ قَبَضْتَ رُوحَهَا، وَأَنْتَ أَعْلَمُ بِسِرِّهَا وَعَلانِيَتِهَا، وَقَدْ جِئْنَاكَ شُفَعَاءَ لَهُ، فَاغْفِرْ لَهُ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جنازہ کی نماز میں یہ دعا بھی پڑھی: اے اللہ! اس میت کا تو ہی رب اور پروردگار ہے، تو نے ہی اس کو پیدا کیا، اور تو نے ہی اس کو اسلام کی ہدایت عطا فرمائی، تو نے ہی اس کی روح کو قبض کیا، تو اس کے چھپے اور کھلے گناہوں کو بخوبی جانتا ہے۔ اے اللہ! ہم تیرے حضور میں اس کی سفارش کرنے کے لئے حاضر ہوئے ہیں؛ لہٰذا تو اس کے گناہوں کو معاف کردے۔

حدیث ۹۳۹:-

وعن وَاثِلَة بنِ الأَسْقَعِ رضی اللہ عنہ قَالَ: صَلَّى بِنَا رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، فَسَمِعْتُهُ يَقُولُ: أَللّٰهُمَّ إِنَّ فُلَانَ ابْنَ فُلَانٍ فِي ذِمَّتِكَ وَحَبْلِ جِوَارِكَ، فَقِهِ فِتْنَةَ الْقَبْرِ، وَعَذَابَ النَّارِ، وَأَنْتَ أَهْلُ الْوَفَاءِ وَالْحَمْدِ؛ اللّٰهُمَّ فَاغْفِرْ لَهُ وَارْحَمْهُ، إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت واثلہ بن اسقع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ہم کو ایک مسلمان کی نماز جنازہ پڑھائی، تو میں نے آپ کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا: اے اللہ! فلاں بن فلاں (یہاں مرنے والے کا نام لیا) تیرے حضور میں آیا ہے، ہم نے اسے تیرے عہد وپیمان میں دیا، اور ہم اسے تیرے حوالہ کرتے ہیں، لہٰذا تو اس کی قبر کے فتنہ اور جہنم کے عذاب سے حفاظت فرمائیو۔ اے اللہ! تو وعدہ کو پورا کرنے والا اور تعریف کے لائق ہے۔ اے اللہ! تو اس کو بخش دے، اس پر رحم فرما، بیشک تو ہی معاف کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

حدیث ۹۴۰:-

وعن عبدِاللہ بنِ أبي أَوْفی رضی اللہ عنہما : أَنَّهُ كَبَّرَ عَلَى جَنَازَةِ ابْنَةٍ لَهُ أَرْبَعَ تَكْبِيرَاتٍ، فَقَامَ بَعْدَ الرَّابِعَةِ كَقَدْرِ مَا بَيْنَ التَّكْبِيرَتَيْنِ يَسْتَغْفِرُ لَهَا وَيَدْعُو، ثُمَّ قَالَ: كَانَ رسول اللهِ (ﷺ) يَصْنَعُ هكَذَا.

وفي رواية : كَبَّرَ أَرْبَعاً فَمَكَثَ سَاعَةً حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُكَبِّرُ خَمْساً، ثُمَّ سَلَّمَ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ. فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْنَا لَهُ: مَا هَذَا؟ فَقَالَ: إِنِّي لاَ أَزِيدُكُمْ عَلَى مَا رأيتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) يَصْنَعُ، أَوْ: هكَذَا صَنَعَ رسول اللہ (ﷺ). (رواہ الحاکم، وقال: حدیث صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن اَبی اَوفیٰ رضی اللہ عنہما نے اپنی ایک بیٹی کے جنازہ پر جو نماز پڑھائی اس میں چار تکبیریں کہیں ، چوتھی تکبیر میں اتنی دیر کھڑے رہے جتنی دو تکبیروں کے درمیان میں کھڑے رہتے ہیں اور اس میں میت کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہے ،پھر فرمایا: نبیِ کریم (ﷺ) اسی طرح کرتے تھے۔

دوسری روایت میں ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد اتنی دیر ٹھہرے کہ ہمیں یہ خیال ہوا کہ پانچویں تکبیر کہیں گے،لیکن پھر بغیر تکبیر کہے ہی سلام پھیر دیا۔جب پیچھے مڑے تو ہم نے کہا: یہ کیا کیا؟(یعنی چوتھی تکبیر کے بعد اتنا زیادہ توقف کیوں کیا؟)تو اس پر فرمایا: میں نے کچھ زیادہ نہیں کیا،بلکہ جتنا نبیِ کریم (ﷺ) کو کرتے ہوئے دیکھا ؛ویسا ہی کیا۔

افادات:- اس سے یہ بتانا ہے کہ چوتھی تکبیر کے بعد بھی دعا کر سکتے ہیں

باب الاسراع بالجنازة

جنازہ کو جلدی لے جانا

حدیث ۹۴۱:-

عن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبيِّ (ﷺ) قَالَ: أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ، فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً، فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا إِلَيْهِ، وَإِنْ تَكُ سِوَى ذَلِكَ، فَشَرٌّ تَضَعُونَهُ عَنْ رِقَابِكُمْ.

وفي روايةٍ لمسلمٍ: ((فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا عَلَيْهِ)). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنازہ کو جلدی سے لے چلو۔ اگر وہ نیک ہے تو ایک بھلائی کی چیز ہے جس کی طرف تم اس کو بڑھا رہے ہو، اور اگر وہ برا ہے تو ایک برائی ہے جس کو تم اپنی گردنوں سے اتار رہے ہو۔

افادات:- جنازہ کو جلدی سے جلدی لے جانے کا حکم ہے، لیکن اتنی جلدی نہیں ہونی چاہیے کہ میت ہلنے لگے، بلکہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ایسی تیزی ہو کہ میت پُرسکون رہے۔

اگر وہ نیک ہے تو اس کی نیکی کا بدلہ دلوانے کے لئے جلدی پہنچانا چاہیے۔ اور اگر وہ برا ہے تو پھر کیوں برائی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھتے ہو، جتنا جلدی نیچے اتارو، اتنا اچھا ہے۔

حدیث ۹۴۲:-

وعن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النبي (ﷺ) يقُولُ: إِذَا وُضِعَت الجَنَازَةُ، فَاحْتَمَلَهَا الرِّجَالُ عَلَى أعنَاقِهِمْ، فَإِنْ كَانَتْ صَالِحَةً، قالت: قَدِّمُونِي، وَإِنْ كَانَتْ غَيْرَ صَالِحَةٍ، قَالَتْ لأَهْلِهَا: يَا وَيْلَهَا أَيْنَ تَذْهَبُونَ بِهَا؟ يَسْمَعُ صَوْتَهَا كُلُّ شَيْءٍ إِلاَّ الإِنْسَانَ، وَلَوْ سَمِعَ الإِنسَانُ لَصَعِقَ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب جنازہ لے جانے کے لئے رکھا جاتا ہے اور لوگ اس کو اپنے کندھوں پر اٹھاتے ہیں تو اگر وہ نیک ہوتا ہے تو وہ اپنے اٹھانے والوں سے کہتا ہے: مجھے جلدی سے آگے بڑھاؤ۔ اور اگر وہ نیک نہیں ہوتا تو اٹھانے والوں سے کہتا ہے: ہائے افسوس! تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ اس کی یہ پکار سوائے انسان کے ہر کوئی سنتا ہے۔ اگر انسان سن لے تو بیہوش ہو کر گر پڑے۔

افادات:- ایمان بالغیب کا مطلب ہی یہ ہے کہ جو چیزیں ہمارے سامنے نہیں ہیں، محض نبیٔ کریم (ﷺ) کے ارشاد پر ہم ان کو مانتے ہیں، ورنہ پھر ایمان بالغیب نہیں رہے گا۔ پھر بھی کبھی کبھی اللہ تعالیٰ لوگوں کی عبرت کے واسطے کچھ چیزیں ظاہر کر دیتے ہیں۔

باب تعجيل قضاء الدَّين عن الميت والمبادرة إِلَى تجهيزه إلا أن يموت فجأة فيترك حَتَّى يُتَيَقَّنَ مَوْتُه

میت کے قرض کی ادائیگی

اور

اس کی تیاری میں جلدی کا اہتمام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

میت کے قرض کی ادائیگی کا اہتمام

بیماری اور موت سے متعلق احکامات کی تفصیل چل رہی ہے،اس سلسلہ میں عنوان قائم کیاہے:مرنے والے کے دَین یعنی قرض کی ادائیگی میں جلدی کی جائے۔یعنی جس آدمی کا انتقال ہوگیا اس پر لوگوں کے جو حقوق ہیں ، چاہے مالی ہوں یا جانی؛ ان کی ادائیگی اور معاف کرانے کے معاملہ میں عجلت سے کام لیا جائے۔بلکہ اکابر کے یہاں تو دستور رہا ہے کہ دفن کرنے سے پہلے ہی اس کی ادائیگی اور مطالبات کی معافی کا اہتمام کیاکرتے تھے۔ویسے شرعی طور پر بھی دُیون کی ادائیگی کو مقدم رکھا گیا ہے۔

وراثت کی تقسیم کے احکام... پہلا حق:

جہاں وراثت کی تقسیم کے احکام بیان کیے ہیں وہاں مرنے والا جو مال چھوڑکر جاتا ہے، اس میں فقہاء نے بالترتیب چار چیزیں لکھی ہیں :-

ا :- اس کے چھوڑے ہوئےمال میں پہلا حق یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کی تجہیز وتکفین درمیانی طریقہ سے بغیر فضول خرچی اور بغیر بخل کے سنت کے مطابق کی جائے۔یعنی اس

کے غسل کا انتظام کیا جائے، کفن کا انتظام کیا جائے، جہاں بغیر پیسوں کے زمین میسر نہیں ہوتی وہاں پر قبر کے لیے اگر زمین خریدنا ضروری ہو تو وہ خریدی جائے؛ یہ تجہیز و تکفین کہلاتی ہے۔

اب چھوڑے ہوئے مال سے مراد فقط نقد پیسے نہیں ہیں، بلکہ جو کچھ بھی اس نے چھوڑا ہے، جیسے: مکان، دوکان، زمین، زیورات، مکان کا سامان وغیرہ، اور لوگوں سے جو قرضے وصول کرنے ہیں، ان سب کو "ترکہ" کہتے ہیں۔ "مَاتَرَکَهُ الْمَیِّتُ" مرنے والا موت کے وقت جتنی بھی چیزیں مال کے قبیل سے چھوڑ کر جائے؛ وہ "ترکہ" ہے۔

بعض غلط رواج:

بعض چیزیں وہ ہیں جن کو لوگوں نے کفن کا حصہ سمجھ لیا ہے، لیکن شرعی طور پر وہ اس میں داخل نہیں ہیں، مثلاً: نہلانے کے لیے نیا برتن لانے کا اہتمام کیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ صحیح نہیں ہے، جو برتن موجود ہے اسی کو استعمال کیا جائے۔ یا بعض مرتبہ اس کے مرنے کے بعد تیجہ کیا جاتا ہے، اور زیارت کے نام سے جو کھانا کھلایا جاتا ہے، وہ بھی مرنے والے کے مال میں سے کیا جاتا ہے؛ یہ بھی درست نہیں ہے۔ بلکہ اگر ورثاء میں نابالغ موجود ہیں تو ان کی اجازت کا بھی اعتبار نہیں کیا گیا ہے، اور اس صورت میں اگر اس مال میں سے کھانا پکایا گیا ہے تو فقہاء نے لکھا ہے کہ اس کا کھانا بھی جائز نہیں ہے، اور ویسے بھی وہ تو بدعت ہے۔ یا بعض جگہ پر امام صاحب کے مصلّے کا رواج ہے کہ کفن کے علاوہ زائد کپڑا لایا جاتا ہے جو نماز پڑھانے

والے کے لیے مصلّے کے طور پر بچھایا جاتا ہے، اور وہ کپڑا پھر امام صاحب ہی کو دے دیا جاتا ہے؛ یہ بھی اس میں داخل نہیں ہے۔

بہرحال! سنت کے مطابق جو کفن ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے لیے تین اور عورتوں کے لیے پانچ، درمیانی قسم کے ایسے کپڑے خریدے جائیں جو وہ اپنی زندگی میں پہنتا تھا، اور غسل کے لیے پانی اور پانی گرم کرنے وغیرہ کا سارا خرچہ اس میں سے دیا جائے گا۔

دوسرا حق:

۲:- نمبر دو پر یہ ہے کہ اس کے قرضہ کو ادا کیا جائے، جب تک اس کے مال میں سے اس کے تمام قرضے ادا نہیں کئے جائیں گے وہاں تک اس کے ورثاء کو اس کے مال میں سے ایک پائی بھی لینا جائز نہیں ہے۔ جب تک کہ اس کا قرضہ ادا نہ کیا جائے وہاں تک ورثاء کا حق لگتا ہی نہیں ہے۔

ہمارے معاشرہ وسماج میں عام طور پر رواج یہ ہے کہ ورثاء مال لے کر بیٹھ جاتے ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس کا قرضہ ادا کرنا ہے، تو کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، ادا کردیں گے۔ حالاں کہ قرض خواہوں کو حق ہے کہ اس کی زمین ومکان اور جو کچھ ہے اس کو بیچ کر کے بھی اپنا قرضہ وصول کریں، ان کی رضامندی کے بغیر ورثاء کا مکان ودوکان اور مال لے کر بیٹھ جانا شرعاً درست نہیں ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس نے جتنی بھی چیزیں چھوڑی ہیں ان میں سے پہلے اس کا

قرضہ ادا کرو، اگر وہ اتنا مال چھوڑ کر مرا ہے اس کے باوجود ورثاء ادا نہیں کریں گے؛ تو ورثاء ذمہ دار ہیں اور وہ حق مارنے والے کہلائیں گے۔اس باب میں اسی کو بتاتے ہیں کہ مرنے والے کی طرف سے اس کا قرضہ اور اس کے اوپر جو مطالبے ہیں ان کو ادا کرنے میں جلدی کی جائے۔

چناں چہ آپ ﷺ کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ لایا جاتا تھا تو دریافت فرماتے تھے کہ اس کے اوپر کوئی قرضہ ہے؟ اگر بتلایا جاتا کہ ہے،تو آپ ﷺ دریافت فرماتے کہ اس کی ادائیگی کے لیے مال چھوڑا ہے؟ اگر بتلایا جاتا کہ جی ہاں ! چھوڑا ہے،تب تو حضور اکرم ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھاتے تھے۔اور اگر جواب میں یہ بتلایا جاتا کہ قرضہ کی ادائیگی کے لئے مال نہیں چھوڑا ہے تو نبیٔ کریم ﷺ فرماتے تھے کہ تم لوگ نماز پڑھ لو۔اس کی نماز جنازہ آپ ﷺ ادا نہیں فرماتے۔لیکن یہ معمول شروع زمانہ میں تھا، بعد میں جب فتوحات کا سلسلہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ کو بھی مال کی فراوانی عطا فرمائی تو اگر کوئی ایسا ہوتا جس نے قرضہ کی ادائیگی کے لئے مال نہ چھوڑا ہوتا،تو نبیٔ کریم ﷺ اپنی طرف سے اس کا قرضہ ادا فرماتے اور نماز ادا فرماتے تھے۔یا بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم دیکھتے کہ یہ آدمی اپنے قرضہ کی وجہ سے نبیٔ کریم ﷺ کی نماز سے محروم ہو رہا ہے، تو مجمع میں سے کوئی کہتا کہ اللہ کے رسول! میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں ؛تب نبیٔ کریم ﷺ اس کی نماز پڑھاتے تھے۔

تو میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ کتنی اہم چیز ہے کہ اس قرضہ کی وجہ سے جس کی ادائیگی کے لیے اس نے مال نہ چھوڑا ہوتا تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑی اہم چیز ہے، لیکن ہمارے سماج میں اس کی طرف سے بڑی غفلت ولاپرواہی برتی جاتی ہے۔

آج کل لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ مال ہوتا ہے، پھر بھی قرضہ ادا نہیں کرتے۔ پیسوں کے ہوتے ہوئے قرضوں کی ادائیگی میں تاخیر شرعاً پسندیدہ نہیں ہے ، اگر قرضہ کی ادائیگی کے لئے پیسے ہیں؛ تو اولین وہلہ میں قرضہ ادا کرو۔ ہوتا یہ ہے کہ پیسے ہیں اور ان کو غیر ضروری کاموں میں خرچ کرتے ہیں ، لوگوں کی بڑی بڑی دعوتیں ہو رہی ہیں اور قرضہ ادا کرنے کی فکر نہیں۔ ایسے آدمی کی دعوت کھانے کو بھی فقہاء نے مکروہ لکھا ہے کہ اگر کسی کے اوپر قرضہ ہے وہ ادا نہیں کرتا اور دعوتیں کر رہا ہے تو اس کی دعوت میں شریک نہ ہوا جائے۔

ارواحِ ثلاثہ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ حضرت نواب قطب الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں ہیں ، حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں بھی تھے، ایک مرتبہ انہوں نے دعوت کی، تو حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انکار کیا کہ مَیں تمہاری دعوت میں نہیں آؤں گا۔ نواب صاحب بھی بڑے بزرگ اور اللہ کے مقبول بندے تھے۔ انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ دیکھیے! مَیں نے آپ کی دعوت کی، تو آپ نے قبول فرمالی، لیکن انہوں نے قبول نہیں کی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: بھائی مظفر حسین! کیا بات ہے؟

کیا تمہیں تقویٰ کا ہیضہ ہوگیا ہے؟ کیا تمہیں نواب صاحب کی کمائی میں کوئی شبہ ہے؟ کیوں ان کی دعوت میں نہیں جاتے؟ مفتی صاحب نے فرمایا: نہیں حضرت! ان کی کمائی میں بالکل شبہ نہیں ہے، لیکن وہ مقروض ہیں، اور ہیں تو نواب؛ اگر چہ بگڑے ہوئے ہیں (مطلب یہ کہ دیندار بن گئے ہیں اور سدھر گئے ہیں، لیکن دنیادار لوگ ان کو بگڑا ہوا کہتے ہیں) جب نواب ہیں تو دعوت میں تکلّفات کریں گے، تو اتنا پیسہ جو وہ دعوت میں لگا رہے ہیں اگر وہ قرضہ ادا کرنے میں لگائیں؛ تو یہ زیادہ ضروری ہے۔ یہ سن کر شاہ صاحب نے فرمایا: ہاں بھائی! بات تو ٹھیک ہے، مَیں بھی نہیں جاؤں گا۔ کہاں تو ڈانٹ رہے تھے، اور اب خود ہی جانے سے انکار کر دیا۔

تو مَیں تو یہ مسئلہ بتلانا چاہتا ہوں کہ آج کل لوگوں کا مزاج بن گیا ہے کہ لوگوں کے قرضہ باقی ہیں، بے چارہ قرض خواہ پریشان ہے، اس کا مطالبہ ہے اور اس سے وعدے ہو رہے ہیں۔

دَین اور قرض میں فرق:

ویسے شریعت کی اصطلاح میں دو چیزیں الگ الگ ہیں۔ ایک ''دَین'' کہلاتا ہے اور دوسرا ''قرض'' کہلاتا ہے، قرض بھی دَین ہی کی ایک قسم ہے۔ لیکن قرض کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے کسی کے پاس سے نقد رقم لی، تو اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر اس نے آپ کو ایک سال کی بھی مہلت دی ہو کہ ایک سال کے بعد ادا کرنا، لیکن وہ دوسرے دن آ کر یوں کہے کہ میرے پیسے

دیدو؛ تو دینے پڑیں گے۔ مسئلہ یہی ہے۔ قرض خواہ نے آپ کو جو مہلت دی گئی ہے، اس مہلت سے پہلے بھی اگر وہ مطالبہ کرنا چاہے؛ تو اس کو شرعاً حق ہے۔

ہاں! اگر آپ نے کسی سے کوئی مال خریدا، اور اس میں وعدہ کیا کہ میں اس کی قیمت دو مہینہ بعد ادا کروں گا، تو دو مہینہ سے پہلے اس کو مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اگر وہ وقت سے پہلے مطالبہ کرے تو آپ انکار کرسکتے ہیں کہ میں ابھی نہیں دوں گا، دومہینہ کے بعد دوں گا۔ لیکن اگر نقد رقم لی ہے اور اس میں چاہے دومہینہ کا وعدہ ہو، لیکن اگر دو دن کے بعد آکر مانگے تو مسئلہ کی رو سے وہ مانگ سکتا ہے۔

مقروض کو جنت میں داخلہ نہیں ملتا:

لیکن عام طور پر ہمارے یہاں نقد رقموں کے قرضوں کی ہی باتیں چلتی ہیں کہ لوگوں سے قرضے لیے ہوئے ہیں اور ان سے وعدے بھی کئے ہوئے ہیں، اور بیچارے قرض خواہ وعدے کے مطابق صبر بھی کرتے ہیں ، اور جب وعدہ کا وقت آتا ہے تو وہ بیچارہ پہلے تو ایک مدت تک انتظار میں رہتا ہے کہ اب آئے گا، آج آئے گا، ایک دو مہینے تو ایسے ہی گزر جاتے ہیں ،جب وہ نہیں آتا تو تب قرض خواہ بیچارہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس جاتا ہے اور مطالبہ کرتا ہے، تب بھی نہیں دیتا اور بڑے دھڑلّے سے جواب دیتا ہے کہ دیں گے، کھا نہیں گئے! اور دوسری طرف منگنی کی دعوتیں ہو رہی ہیں اور بیٹیوں کی شادی بیاہ میں لین دین وغیرہ کی فضول خرچیاں ہو رہی

ہیں، اور دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح پر جا رہے ہیں ، لیکن قرضہ ادا نہیں ہو رہا ہے۔ جب آپ نے اپنی زندگی میں ادا نہیں کیا تو آپ کے مرنے کے بعد اولاد کیا ادا کرے گی؟ اور یاد رکھیے کہ اگر اسی طرح قرضہ چھوڑ کر جائیں گے تو جب تک یہ قرضہ باقی رہے گا اس کے لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے یہ وعید سنائی گئی کہ اسے جنت میں داخلہ نہیں ملتا۔

مَدیون شہید:

ایک آدمی اللہ کے راستہ میں شہید ہوا، تو شہادت کے متعلق حدیثِ پاک میں یہ فضیلت آئی ہے کہ شہید کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں ؛ سوائے دَیْن کے۔ اگر دَیْن ہے تو اس کی روح کو بھی جنت سے روک دیا جاتا ہے، اس کو داخلہ نہیں ملتا۔ اتنی سخت وعید ہے۔

اس لیے بھائیو! اپنی زندگی میں اپنے قرضوں کی ادائیگی کا اہتمام کر لو۔ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے مرنے کے بعد ورثاء ادا کر دیں گے۔ جب آپ کے پاس مال موجود ہے تو اس کو خرچ کر ڈالو۔ اگر کوئی پلاٹ ہے تو بیچ ڈالو اور قرضہ ادا کر دو۔ آپ کے مرنے کے بعد ورثاء یہ پلاٹ تقسیم کر کے بیٹھ جائیں گے، کوئی بھی آپ کا قرضہ ادا کرنے کی فکر نہیں کرے گا، اگرچہ ان کی ذمہ داری ہے، لیکن اس کے باوجود پہلے ذمہ داری تو آپ ہی کی ہے۔ اس لیے قرضوں کی ادائیگی کا اہتمام ہونا چاہیے اور قرضوں کی ادائیگی میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس پر بڑی سخت وعیدیں ہیں

رات کا غم ،دن کی شرم:

اور ویسے بھی بلاضرورت قرض لینے کو شریعت نے پسند نہیں کیا ہے۔ آج کل ایک مزاج یہ بھی بنتا جارہا ہے کہ کوئی ضرورت نہیں ہوتی پھر بھی بلاوجہ قرضے لئے جارہے ہیں۔ حالاں کہ یہ بھی صحیح بات نہیں ہے۔ حضراتِ محدثین تو حدیث کی کتابوں میں قرضہ لینا جائز ہونا بتلانے کے لیے باقاعدہ باب قائم کرتے ہیں، کیوں کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے جواز میں شبہ ہوسکتا تھا، تو محدثین باب قائم کرکے بتادیتے ہیں کہ ضرورت کے وقت لے سکتے ہیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: قرضہ رات کا غم اور دن کی شرم ہے (رواه الديلمى عن عائشة مرفوعا. السلسلة الضعيفة للالبانى. وقال: ضعيفٌ جداً) قرضہ کی وجہ سے آدمی مارے شرم کے دن میں گھر سے نہیں نکلتا اور غم کی وجہ سے رات بھر نیند نہیں آتی۔

تو میں یہ بتلا رہا تھا کہ مرنے والے نے جو مال چھوڑا ہے اس میں وارثوں کا حق لگتا ہی نہیں جب تک کہ قرضہ ادا نہ کیا جائے، اس لیے مرنے والے کے قرضہ کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔ اب مان لیجیے کہ اس کا قرضہ پندرہ لاکھ ہے اور مرنے والے نے جو بنگلہ اور زمین وغیرہ چھوڑی ہے، وہ سب ملا کر کل بارہ لاکھ ہوتے ہیں، تو اس بنگلے وغیرہ میں کسی بھی وارث کا کوئی حق نہیں لگے گا، بلکہ سب رقم قرضہ کی ادائیگی میں دیدی جائے گی۔ اب ہمارے یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ ہاں! اگر ورثاء قرض خواہوں کو راضی کرلیں، ان سے بات کریں کہ: بھائی! ہم اس

مکان میں رہتے ہیں ،یہ ہمارے پاس رہنے دیا جائے،اور ہم آپ کا قرضہ اتنی مدت میں ادا کر دیں گے،اور قرض خواہ منظور کرلیں ؛تب تو گنجائش ہے۔ لیکن ان کی منظوری اور ان کو راضی کئے بغیر اس میں رہنا درست نہیں ہے،یہ ان کا حق ہے۔اگر اسلامی حکومت ہو تو قاضی کے یہاں باقاعدہ دعویٰ کر کے اس گھر کو خالی کروا کر قرض خواہ اپنا قرضہ وصول کرسکتے ہیں۔

تیسرا حق

۳:- میت نے جو وصیت کی اگر وہ شریعت کے مطابق ہو۔مطلب یہ ہے کہ ① تہائی مال یا اس سے کم کی ہو،② کسی جائز چیز کی وصیت کی ہو،③ وارث کے حق میں وصیت نہ کی ہو؛ان تین شرطوں کے ساتھ جو وصیت کی گئی ہو وہ پوری کی جائے۔

چوتھا حق

۴:- اس کے بعد ہر ایک وارث کا جو حصہ شریعت نے رکھا ہے اس کے مطابق وارثوں کے درمیان تقسیم کیا جائے۔گویا وارثوں کا حق چوتھے نمبر پر آتا ہے اور ہمارے سماج میں وہ پہلے ہی لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام

تو اس باب میں ایک بات تو یہ بتائی گئی کہ میت کی طرف سے قرضہ کی ادائیگی کا خاص اہتمام کیا جائے۔ اور دوسری بات یہ بتلائی کہ مرنے والے کی موت کے فوراً بعد اس کو تیار کرنے میں جلدی کی جائے یعنی غسل دے کر جلدی سے جلدی کفن پہنایا جائے، قبر کھود کر دفن کرنے میں جلدی کی جائے، بلاوجہ دیر نہ کی جائے۔

البتہ اچانک موت آجائے تو جب تک موت کا یقین نہ ہو وہاں تک غسل نہ دیا جائے۔ طبیب اور ڈاکٹروں سے معلوم کر کے یہ یقین حاصل کر لینا تو ضروری ہے کہ انتقال ہو گیا ہے، جب موت کا یقین ہو جائے تو پھر اس کی تجہیز و تکفین میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ موت کا یقین ضروری ہے کیوں کہ بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں آدمی بے ہوش پڑا ہوتا ہے، جیسے: ایک بیماری سکتہ (Coma) ہوتی ہے، اگر کسی کو سکتہ (Coma) طاری ہو جاتا ہے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے انتقال ہو گیا ہو، جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوتی، اور بعض مرتبہ لوگ مردہ سمجھ کر غسل دے کر دفن کر دیتے ہیں۔

مردہ سمجھ کر دفن کردیئے گئے مفسّر:

فوائد الفواد میں شیخ نظام الدین بُستی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے، بہت بڑے عالم تھے، ایک مرتبہ بیمار ہوئے، ان پر سکتہ طاری ہوا، لوگوں نے مردہ سمجھ کر غسل دے کر دفن کر دیا۔ قبر میں ان کو ہوش آیا اور محسوس کیا کہ مجھے لوگوں نے قبر میں رکھ دیا ہے، ایک دم مضطرِب و پریشان ہوئے کہ اب کیا کروں۔ ان کو یاد آیا کہ چالیس مرتبہ سورۂ یٰس پڑھنے سے پریشانی اور اضطراب دور ہوتا ہے، تو انہوں نے سورۂ یٰس پڑھنی شروع کی، انتالیسویں مرتبہ جب پڑھ رہے تھے تو دیکھا کہ کوئی قبر کھود رہا ہے، تو انہوں نے پڑھنا جاری ہی رکھا، لیکن آواز پست کر دی، اور چالیسویں مرتبہ آہستہ پڑھا، تاکہ وہ آواز سن کر بھاگ نہ جائے۔ دراصل ایک کفن چور آیا اور اس نے قبر کھودنی شروع کی، یہاں تک کہ جب قبر کھل گئی تو وہ اپنے کفن کے ساتھ باہر نکل آئے، س کفن چور نے جب دیکھا کہ مردہ بیٹھ گیا تو مارے ہیبت کے وہ مر گیا۔ دن کا وقت تھا انہوں نے سوچا کہ اگر میں اسی وقت بستی میں جاؤں گا تو لوگ مجھے دیکھ کر وحشت زدہ ہوں گے، اس لیے قبرستان ہی میں ٹھہرے رہے، جب رات ہوئی تو محلے میں سے اپنے نام کی آواز دیتے ہوئے گزرے کہ مَیں فلاں ہوں، مجھے مردہ سمجھ کر لوگوں نے دفن کر دیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے قبر سے نکلوایا۔ اس طرح اعلان کرتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔ اس کے بعد تو اتنا زندہ رہے کہ قرآن پاک کی ایک تفسیر لکھی۔

نمازِ جنازہ میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو:

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اتنا یقین کرلینا چاہیے کہ موت ہوچکی ہے یا نہیں ، تا کہ غلط فہمی میں کہیں مردہ سمجھ کر دفن نہ کر دیا جائے۔اور جب موت کا یقین ہو جائے تو تجہیز و تکفین میں دیر نہیں کرنی چاہیے،بس!صرف اتنی مہلت دی جائے کہ غسل دے کر اس کو تیار کر دیا جائے ادھر قبر تیار ہو جائے۔اور گزشتہ مجلس میں بھی بتلا چکا ہوں کہ اگر کسی کا انتقال جمعہ کے دن صبح ہو گیا اور قبر وغیرہ کا انتظام بھی ہو چکا،تو پھر محض اس لیے جمعہ کی نماز تک مؤخر نہ کیا جائے کہ جمعہ کے اندر لوگ زیادہ آتے ہیں تو جنازہ کی نماز میں بھی لوگ زیادہ ہو جائیں گے۔اس کو فقہاء نے مکروہ لکھا ہے۔

مؤمن کی جان اپنے قرضہ میں لٹکی رہتی ہے:

حدیث ۹۴۳:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبی (ﷺ) قال:نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتَّى يُقْضَى عَنْهُ.(رواہ الترمذی،وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: مؤمن کی جان اپنے قرضہ میں لٹکی اور رُکی رہتی ہے،یہاں تک کہ اس کی طرف سے ادائیگی کر دی جائے۔

افادات:–دوسری حدیثوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ اس کو جنت میں داخلہ نہیں ملتا، جب تک کہ اس کا دَیْن ادا نہ کردیا جائے۔اس لیے دَیْن کی ادائیگی میں تاخیر نہ کی جائے، مرنے والے کو دفن کرنے سے پہلے یہ سب صاف کرلیا جائے۔

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ: میرے والد صاحب کا جب انتقال ہوا اور نماز کے واسطہ جنازہ لایا گیا، تو نماز سے پہلے میں نے دو تین مرتبہ اعلان کیا کہ: اگر میرے والد صاحب پر کسی کا کوئی مطالبہ ہو تو وہ کہے: میں ابھی ادا کردوں۔ جب کہا گیا کہ کسی کا کوئی مطالبہ نہیں ہے تب حضرت نے نماز پڑھائی۔ہمارے اکابر کے یہاں اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے

مسلمان کی لاش کے لیے مناسب نہیں ہے کہ....:

حدیث ۹۴۴:-

وعن حُصَيْنِ بن وَحْوَحٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ طَلْحَةَ بْنَ الْبَرَاءِ بن عَازِبٍ رضی اللہ عنہما مَرِضَ، فَأَتَاهُ النَّبِيُّ (ﷺ) يَعُودُهُ، فَقَالَ: إِنِّي لاأرى طَلْحَةَ إِلاَّ قَدْ حَدَثَ فِيهِ الْمَوْتُ، فَآذِنُونِي بِهِ، وَعَجِّلُوا بِهِ، فَإِنَّهُ لاَ يَنْبَغِي لِجِيفَةِ مُسْلِمٍ أَنْ تُحْبَسَ بَيْنَ ظَهْرَانَيْ أَهْلِهِ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:–حضرت حُصَیْنِ بن وَحْوَح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت طلحہ بن براء بن عازب رضی اللہ عنہما بیمار ہوئے تو نبیِ کریم (ﷺ) ان کی خبر گیری کے لیے تشریف لے گئے۔ان کو دیکھ کر فرمایا: مَیں محسوس کر رہا ہوں کہ طلحہ کے اندر موت کے آثار نمودار ہوچکے ہیں (یعنی اب وہ زندہ نہیں رہیں گے) جب

ان کا انتقال ہو جائے تو مجھ کو اطلاع دینا ،اور ان کو دفن کرنے میں جلدی کرنا،اس لیے کہ مسلمان کی لاش کے لیے مناسب نہیں ہے کہ گھر والوں کے درمیان روک کر رکھی جائے۔

افادات:۔معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد اس کے دفن میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے،جتنا جلدی ہوسکے اس کا انتظام کرنا چاہیے۔

باب الموعظة عند القبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قبر کے پاس وعظ و نصیحت کرنا

ویسے تو جہاں موقعہ ہو نصیحت کی جاسکتی ہے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک مرتبہ ایک جنازہ کی تدفین میں گئے ، ابھی قبر پوری طرح تیار نہیں ہوئی تھی، کھودی جارہی تھی، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دیکھا کہ ابھی دیر ہے، اس موقعہ پر آپ نے نصیحت فرمائی۔

حدیث ۱۶۴۵:-

عن علی رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا فِي جَنَازَةٍ فِي بَقِيعِ الغَرْقَدِ، فَأَتَانَا رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم) فَقَعَدَ، وَقَعَدْنَا حَوْلَهُ وَمَعَهُ مِخْصَرَةٌ فَنَكَّسَ وَجَعَلَ يَنْكُتُ بِمِخْصَرَتِهِ . ثُمَّ قَالَ : مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ إِلاَّ وَقَدْ كُتِبَ مَقْعَدُهُ مِنَ النَّارِ وَمَقْعَدُهُ مِنَ الجَنَّةِ. فقالوا: يَا رسولَ الله! أَفَلا نَتَّكِلُ عَلَى كِتَابِنَا؟ فَقَالَ: اعْمَلُوا، فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ... وذكر تَمَامَ الحديث. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ جنت البقیع میں ایک جنازہ میں شریک تھے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے اور بیٹھ گئے اور ہم بھی آپ کے آس پاس بیٹھ گئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس ایک چھوٹی

سی لکڑی تھی، آپ نے اپنا سر جھکا دیا اور اس لکڑی کے ذریعہ زمین کو کریدنے لگے۔ اس کے بعد نبی کریم (ﷺ) نے بطورِ نصیحت ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے لیے اس کا جو ٹھکانہ جنت میں ہے اور جو ٹھکانہ جہنم میں ہے؛ وہ لکھ دیا گیا ہے (یعنی اگر وہ جہنمی ہے تو جہنم کا ٹھکانہ، اور اگر جنتی ہے تو جنت کا ٹھکانہ لکھ دیا گیا ہے) حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہماری تقدیر کی اس تحریر اور نوشتہ پر ہم بھروسہ نہ کرلیں؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے جواب میں ارشاد فرمایا: عمل کرتے رہو، ہر ایک کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی کام آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔

افادات:- فقہاء نے لکھا ہے کہ قبرستان پہنچ کر جنازہ کو جب کندھوں سے اتار دیا جائے تو قبرستان میں بھی بیٹھ سکتے ہیں، تدفین کے انتظار میں کھڑا رہنا ہی ضروری نہیں ہے، جیسے قبر نہیں کھدی ہے، یا قبر تو کھد چکی ہے، اور میت کو قبر میں اتارا جارہا ہے، اتنی دیر تک کوئی آدمی بیٹھے؛ تو اس کی اجازت ہے۔ ہاں! جب تک جنازہ کندھوں پر سے اتارا نہ گیا ہو؛ وہاں تک بیٹھا نہ جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سوال:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ جس کو جنت ملنی ہے اس کے لئے جنت بھی لکھی جاچکی ہے اور جس کو جہنم ملنی ہے وہ بھی لکھی جاچکی؛ تو اب عمل کی زحمت کیوں اُٹھائی جائے! جو ملنا طے ہے وہ ملنا ہی ہے؛ پھر عمل کی تکلیف میں کیوں پڑیں؟

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمان السنہ میں لکھا ہے کہ یہاں تقدیر کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے۔ حضراتِ صحابہ کو یہاں (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کے بارے نہیں، بلکہ اپنے عمل کے معاملہ میں اشکال ہوا، اس لیے انہوں نے سوال یہ کیا کہ: اے اللہ کے رسول! جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنتی کا جنت میں جانا اور جہنمی کا جہنم میں جانا طے کیا جا چکا ہے؛ تو اعمال سے کیا حاصل ہو گا؟ ہم اعمال کی محنت میں کیوں پڑیں ؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا تھا: **"عمل کی زحمت اور مشقت میں ہم کیوں پڑیں ؟"** اس لیے کہ عمل تو مشقت کا کام ہے نا! نمازیں پڑھنا، روزے رکھنا، دین کے اور کام انجام دینا۔ تو ہم ان ساری مشقتوں میں کیوں پڑیں؟ اسی نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھے رہیں ؟ تو حضور اکرم ﷺ نے جو جواب ارشاد فرمایا اس کا حاصل یہ ہے کہ: **"یہ مشقت کی چیز ہے ہی نہیں ، بلکہ اللہ تعالیٰ نے جس کے لیے جو لکھا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہی کام آسان کر دیا گیا ہے۔"** مطلب یہ ہے کہ تم بیٹھنا چاہو گے تب بھی نہیں بیٹھ سکو گے، ہر آدمی وہی کام کرے گا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اگر وہ جنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو جنت والے اعمال اس کے لیے آسان کر دیئے جائیں گے، اور وہ اپنے شوق اور رغبت سے انہی اعمال کو انجام دے گا، اس کے لیے وہ زحمت کی چیز نہیں ہو گی۔ اور جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہنم مقدر فرمائی ہے تو وہ جہنم والے اعمال کو انجام دے گا، اس میں اس کے لیے کوئی مشقت نہیں ہو گی۔

جیسے آپ دیکھتے ہیں کہ جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں ، بظاہر جن کے لیے خیر کے فیصلے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو ایمان پر موت نصیب فرماتے ہیں : ان کے لیے نمازوں کا پڑھنا آسان ہوتا ہے ،بلکہ جہاں نماز کا وقت آیا اور اذان کی آواز سنی تو ان کو چین ہی نہیں پڑتا جب تک کہ نماز نہ پڑھ لیں۔ جب تک کہ مسجد نہ جائیں اور نماز نہ پڑھ لیں وہاں تک کھانا بھی اچھا نہیں لگتا، کسی کے ساتھ بات کرنا بھی بوجھ معلوم ہوتا ہے، اسی طرح جتنے بھی خیر کے اعمال ہیں ان کو انجام دینے میں ان کے لیے کوئی دشواری نہیں ہوتی، بلکہ اس عمل کے لیے اس کی طبیعت بے چین اور بے کل رہتی ہے، جب تک اس عمل سے فارغ نہ ہوجائیں وہاں تک ان کو سکون نہیں ملتا، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس عمل کو اتنا آسان کردیا۔ اور اگر ان سے یہ کہا جائے کہ ایک گھونٹ شراب پی لو، تو آپ جان سکتے ہیں کہ وہ مرنا تو گوارا کرلیں گے لیکن ایک گھونٹ حلق سے نیچے اتارنا ان کے لیے گوارا نہیں ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ مجھے مار ڈالو لیکن شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگائیں گے۔ ان میں سے کسی سے کہو کہ یہ چھری کسی کی پاؤں میں گھونپ دو، اور مارنا نہیں ہے، بلکہ بس! ذرا سا زخمی کرنا ہے، تو وہ کہے گا کہ اس کی کیا بات کرتے ہو، میں تو ایک گالی بھی نہیں بول سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جتنے بھی گناہ کے کام ہیں ان سے وہ اتنا ڈرتے ہیں کہ ان کی طبیعت اس کے لیے آمادہ ہی نہیں ہوتی، اگر ان کو جان کی دھمکی دیدی جائے تب بھی وہ گناہ نہیں کریں گے، ان کے لیے کسی کو قتل کرنا کیا! کسی کو گالی دینا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جو لوگ انہیں کاموں میں لگے ہوئے ہیں جن کے لیے دوسری چیز مقدر ہے، ان کے لیے کسی کو قتل کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، شراب پینا بہت آسان ہے، وہ لوگ تو اسی میں لگے لپٹے رہتے ہیں۔ ان کے لیے زنا کرنا اور کسی کی عزت سے کھلواڑ کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سارے گناہ کے کام ان کے لیے بالکل آسان ہیں، اب اگر انہیں کے پاس جاکر کہیں کہ ذرا ایک مرتبہ سبحان اللہ کہو؛ تو دیکھو کیا ہوتا ہے؟ حالاں کہ سبحان اللہ زبان سے کہا جاتا ہے، اور بڑا آسان عمل ہے، لیکن آپ اس کے پاس یہ کلمہ پڑھوا لیجیے، سبحان اللہ کہلوا لیجیے؟ نہیں کہے گا۔ اعذار کرتا رہے گا، لیکن کہہ کر نہیں دے گا۔ اس کے لیے کسی کو قتل کر دینا آسان ہے۔

تو میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ حضور اکرم (ﷺ) کے جواب کا حاصل یہی ہے کہ عمل کرتے رہو؛ تمہاری تقدیر میں کیا لکھا ہے وہ تو تمہیں معلوم نہیں ۔ فیصلہ تو ہو چکا ہے لیکن ہمیں بتلایا نہیں گیا ہے، اس لیے ہمیں تو عمل کرتے رہنا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک کے لیے وہی عمل آسان کر دیا جاتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ اگر جنت کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو جنت والے اعمال اس کے لیے آسان ہیں اور وہ بڑی رغبت اور بڑے شوق سے ان کو انجام دیتا ہے۔ اور اگر جہنم کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو جہنم والے اعمال اس کے لیے آسان کر دیئے جاتے ہیں ۔ اس لیے تم لوگ جو کہہ رہے ہو کہ عمل کی مشقت میں کیوں پڑیں؟ نوشتۂ تقدیر پر بھروسہ کر کے بیٹھے نہ رہیں ؟ تو سن لو کہ یہ مشقت کی چیز ہے ہی نہیں۔

وہ تو آٹومیٹک چیز ہے جو چلتی رہے گی، اور یہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے حق میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔

باب الدعاء للميت بعد دفنه والقعود عند قبره ساعة للدعاء لَهُ والاستغفار والقراءة

میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے لیے دعا کرنا

قبر کے پاس تھوڑی دیر بیٹھ کر دعا کرنا

اس کے لیے مغفرت طلب کرنا اور وہاں قرآنِ پاک کی تلاوت کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حدیث ۹۴۶:-

وعن أَبي عمرو-وقيل:أَبُو عبدالله،وقيل:أَبُو ليلى عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ **قَالَ:كَانَ النبيُّ (ﷺ) إِذَا فَرِغَ مِن دَفْنِ المَيِّتِ وَقَفَ عَلَيْهِ،وقال:اسْتَغْفِرُوا لأَخِيكُمْ،وَسَلُوا لَهُ التَّثْبِيتَ،فَإِنَّهُ الآنَ يُسأَلُ.** (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی ٔ کریم (ﷺ) میت کی تدفین سے فارغ ہونے کے بعد وہاں ٹھہرتے تھے،اور فرماتے تھے: اپنے بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرو اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے ثابت قدمی مانگو،اس لیے کہ اس وقت اس سے سوال کیا جارہا ہے۔

افادات:-"**ثابت قدمی**" کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کو دفن کر دیا گیا تو اس کے پاس منکر اور نکیر دو فرشتے سوال کرنے کے لیے آئیں گے، اس وقت وہ مضبوطی سے جمارہے اس کی دعا کرو۔ جیسے کوئی آدمی کورٹ میں جاتا ہے تو کہہ کر جاتا ہے کہ بھائی! ہمارے لیے دعا کرنا کہ معاملہ ٹھیک ہو۔ اسی طرح حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمیں تاکید فرمارہے ہیں کہ وہاں اس سے سوالات کا معاملہ چل رہا ہے، اس لیے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے ثابت قدم رکھے، اور اس سے صحیح صحیح جوابات دلوائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تدفین کے بعد وہاں ٹھہر کر اس کے لیے دعائے مغفرت اور تثبیت کی دعا کرنی چاہیے۔ اسی لیے اس وقت کی دعاؤں میں یہ دعا بھی کی جاتی ہے: "أَللّٰهُمَّ ثَبِّتْهُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ" اے اللہ! قولِ ثابت یعنی کلمۂ طیبہ کے ذریعہ اس کو استقامت عطا فرما۔

جب دفن کر چکو تو اتنی دیر قبر کے پاس ٹھہرنا:

حدیث ۷۴۹:-

وعن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ قَالَ: إِذَا دَفَنْتُمُونِي، فَأَقِيمُوا حَوْلَ قَبْرِي قَدْرَ مَا تُنْحَرُ جَزُورٌ، وَيُقَسَّمُ لَحْمُهَا حَتّٰى أَسْتَأْنِسَ بِكُمْ، وَأَعْلَمَ مَاذَا أُرَاجِعُ بِهِ رُسُلَ رَبِّي. (رواه مسلم. وَقَدْ سبق بطوله.)

قَالَ الشَّافِعِيُّ رَحِمَهُ اللهُ: وَيُسْتَحَبُّ أَنْ يُقْرَأَ عِنْدَهُ شَيْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ، وَإِنْ خَتَمُوا الْقُرْآنَ عِنْدَهُ كَانَ حَسَنًا.

ترجمہ:- حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ (کا جب انتقال ہونے لگا تو وفات سے پہلے انہوں) نے وصیت فرمائی تھی کہ جب تم لوگ مجھے دفن کر چکو تو میری قبر کے پاس اتنی دیر ٹھہرے رہنا جس میں ایک اونٹ ذبح کرکے اس کا گوشت تقسیم کردیا جائے، تاکہ میں تم سے انس حاصل کروں ، اور میں جان لوں کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوؤں کو میں کیا جواب دیتا ہوں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : تدفین کے بعد وہاں ٹھہر کر قرآن پڑھنا پسندیدہ ہے۔اور اگر کوئی آدمی خود وہاں ٹھہر کر ایک قرآن پورا کرنے کا اہتمام کرلے تو بہت ہی اچھا ہے۔

افادات:- بیس، پچیس منٹ یا آدھا گھنٹہ وہاں ٹھہرنا چاہیے،اس لیے کہ زندوں کا وہاں ٹھہر کر دعا وذکر اور تلاوت کی وجہ سے مردہ کو انس حاصل ہوتا ہے، حالاں کہ وہ قبر میں اکیلا ہوتا ہے، لیکن لوگ باہر کھڑے رہ کر دعا کر رہے ہیں تو اس کی وجہ سے اس کو ایک طرح کی انسیت حاصل ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تدفین کے بعد لوگوں کو اور خاص کرکے رشتہ داروں کو چاہیے کہ وہاں ٹھہر کر دعا و تلاوت کا اہتمام کریں ،اس کی وجہ سے مردے کو جوابات دینے میں تقویت ملتی ہے اور مدد حاصل ہوتی ہے۔

قرآنِ پاک کے ختم کی جو بات ہے ،اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی کو پیسے دے کر قرآن پڑھنے کے لیے بٹھایا جائے،بلکہ رشتہ دار اور احباب خود پڑھیں۔اگر پیسے دے کر قرآنِ پاک پڑھائیں گے تو علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جب کوئی آدمی پیسے لے کر پڑھے گا تو خود

اس کو ہی ثواب نہیں ملے گا۔جب اس کو ہی نہیں ملے گا تو وہ کیا دے گا؟جیسے : گجراتی میں کہاوت ہے :-"કુંવા માં હોય તો હવાડા માં આવે"جب اسی کو ثواب نہیں ملا تو وہ بخشے گا کیا؟جب آپ پڑھیں گے تو اس پر آپ کو ثواب ملے گا، وہی ثواب آپ بخشتے ہیں۔گویا آپ نے کچھ کمایا تو اسی کو آپ اپنے کھاتے میں سے اس کے کھاتے میں ٹرانسفر(Transfer)کرتے ہیں۔لیکن جب آپ ہی کی کمائی نہیں ہوئی اور آپ کے کھاتے میں ہی جمع نہیں ہوا تو آپ کیا ٹرانسفر(Transfer) کریں گے؟معلوم ہوا کہ جو آدمی پیسے لے کر قرآن پڑھتا ہے اس کو کچھ بھی ثواب نہیں ملتا ہے،اس لیے اس کو منع کیا گیا ہے۔

باب الصدقة عن الميت والدعاء لهٗ

میت کی طرف سے صدقہ اوراس کے لیے دعا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیماری اور موت سے متعلق احکام وآداب کا سلسلہ چل رہاہے۔ایک اور باب قائم کیاہے کہ مرنے والے کی طرف سے صدقہ کرنااوراس کے لیے مغفرت اور رفعِ درجات کی دعاکرنا؛ ان دونوں چیزوں کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

چناں چہ ایک آیت کریمہ لائے ہیں:﴿وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (الحشر:۱۰)﴾ (یہ سورۂ حشر کی ایک آیت کا حصہ ہے ،اس سے پہلے مہاجرین اورانصار کاتذکرہ کیاگیاہے، اس کے بعدباری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ)وہ لوگ جو ان (یعنی مہاجرین و انصار اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم)کے بعد آئےان کاایک وظیفہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی دعاؤں میں باری تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں کہ:اے اللہ!ہمارے گناہوں کو بھی معاف فرمادے اور ہم سے پہلے جو ایمان لائے ان کے گناہوں کو بھی معاف فرمادے۔یہاں تو یہ بات ثابت کرناچاہتے ہیں کہ ان لوگوں کی دعاؤں میں ایک وظیفہ یہ بھی تھاکہ جومسلمان ان سے پہلے دنیاسے جاچکے ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں ۔ اس سے مرنے والے کے لیے دعا کا ثبوت ہوگیا۔

یہاں انہوں نے صدقہ کاعنوان قائم کیاہے۔تو یہ مسئلہ اہلِ سنت کے یہاں مسلّم ہے کہ کسی عبادت کا ثواب اگرکوئی آدمی میت کو پہنچانا چاہے،توپہنچا سکتا ہے۔اور اس میں جومالی عبادت

ہے یعنی صدقہ وغیرہ ؛تواس کے ثواب کے متعلق تو تمام اہلِ سنت والجماعت کا اتفاق ہے، احناف،شوافع سب کے نزدیک مالی عبادت کا ثواب میت کو پہنچتا ہے۔البتہ اہلِ اسلام میں ایک جماعت معتزلہ کی گزری ہے،وہ اس بات کے قائل تھے کہ کسی کے عمل کا ثواب دوسرے کو نہیں ملا کرتا،اوروہ دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں ﴿وَأَن لَّيۡسَ لِلۡإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ آدمی جو کچھ محنت کرتا ہے وہی اس کو ملتا ہے۔اس آیت کے متعلق اہلِ سنت والجماعت فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق سعیٔ ایمانی سے ہے۔

مفتی صاحب کا ایک آیت کا مطلب سمجھنے کے لیے دیوبند سے گنگوہ کا رات میں پیدل سفر

ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ بیان کرتے تھے کہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندی عثمانی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مفتی تھے، وہ جلالین شریف پڑھایا کرتے تھے،ایک مرتبہ رات کے وقت یہ آیت﴿وَأَن لَّيۡسَ لِلۡإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ﴾ ذہن میں آئی کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو وہ کوشش ومحنت کرے۔تو خیال آیا کہ میت کو ایصالِ ثواب کا مسئلہ تو ہمارے یہاں مسلّم ہے،اور یہ آیت اُس کے خلاف ہے؟بس اسی وقت اُٹھے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری دینے کے لیے رات ہی کو

چل پڑے اور دیو بند سے گنگوہ پیدل گئے ، تہجد کے وقت گنگوہ پہنچے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تہجد کے لیے وضو فرمارہے تھے ،اس وقت ان کو دیکھا تو پوچھا: کیا بات ہے؟ کہا: حضرت! لیٹے لیٹے یہ خیال آیا اور میں نے یوں سوچا کہ اگر اسی طرح کا ایک اشکال لے کر دنیا سے جاؤں گا؛ تو میرے ایمان کا کیا حشر ہو گا؟ مجھے نیند نہیں آئی اور میں نے سوچا کہ آپ کی خدمت میں حاضری دے کر اس کا حل معلوم کرلوں۔ اسی وقت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اس سے سعیٔ ایمانی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ایک کا ایمان لانا کسی دوسرے کی طرف سے کافی نہیں ہو گا، جیسے بیٹے نے ایمان قبول کرلیا تو اس کا ایمان لانا باپ کے لیے کافی نہیں ، ایمان ایک ایسا عمل ہے کہ جو کرے گا اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا، کسی دوسرے کی طرف سے ایمان لانا کافی نہیں ہے۔ لیکن ایمان لا چکنے کے بعد دوسرے اعمال کے متعلق کیا حکم ہے؟ تو اس سلسلہ میں احناف تو اس طرف گئے ہیں کہ عبادت چاہے مالی ہو یا جانی (بدنی) ہو؛ دونوں کا ثواب مرنے والے کو پہنچایا جاسکتا ہے، مثلاً: ایک آدمی نماز پڑھ کر، قرآنِ پاک کی تلاوت کر کے اس کا ثواب پہنچانا چاہے؛ تو پہنچا سکتا ہے۔ صدقہ اور خیرات کر کے، قربانی کر کے اس کا ثواب پہنچانا چاہے تو وہ بھی پہنچا سکتا ہے۔ جبکہ شوافع کے یہاں مالی عبادت کا ثواب تو پہنچایا جا سکتا ہے، لیکن بدنی عبادت کے وہ قائل نہیں ہیں۔ لیکن متأخرینِ شوافع تلاوت کے ثواب کو تسلیم کرتے ہیں۔

اسی لیے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب قائم کیا: ”باب الصدقة عن الميت“ مرنے والے کی طرف سے صدقہ اور خیرات کرنا۔ چوں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ شافعی المسلک ہیں اس لیے

عنوان کے اندر اس قید کا اہتمام کیا کہ مرنے والے کی طرف سے صدقہ ،خیرات کرے تو اس کا ثواب مرنے والے کو پہنچتا ہے۔

اور یہ بھی یادرہے کہ ایصالِ ثواب مرنے والے ہی کے لیے نہیں ہے ،بلکہ زندوں کو بھی کیا جاسکتا ہے۔اس کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ہم نے کمایا اور اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروادیا، اب اگر میں یوں کہوں کہ میرے اکاؤنٹ میں سے فلاں کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر (Transfer) کردو؛تو ہو جائے گا۔اسی طریقہ سے عمل کرنے والے نے عمل کرکے جو ثواب حاصل کیا،تو اب وہ اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرتا ہے کہ باری تعالیٰ!نماز پڑھ کر، صدقہ وخیرات کرکے، تلاوت کرکے جو ثواب مجھے حاصل ہوا ہے، وہ میری طرف سے فلاں کو دیدے؛تو ہو جاتا ہے۔

حدیث ۹۴۸:-

عن عائشة رضی اللہ عنہا أَنَّ رجلاً قَالَ للنبيِّ (ﷺ): إِنَّ أُمِّي افْتُلِتَتْ نَفْسُهَا وَأُرَاهَا لَوْ تَكَلَّمَتْ تَصَدَّقَتْ فَهَلْ لَهَا أَجْرٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ .(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم (ﷺ) سے عرض کیا کہ: میری والدہ اچانک انتقال کرگئی،اب میرا خیال ہے کہ اگر ان کو کچھ بولنے کا موقعہ ملتا تو وہ ضرور یہ کہتی کہ:میری طرف سے صدقہ کیجیو۔اگرچہ انہوں نے تو ایسی کوئی وصیت نہیں کی، لیکن اگر مَیں اس کی طرف سے صدقہ کروں گا؛ تو کیا اس کا ثواب ان کو ملے گا؟ نبی کریم (ﷺ) نے جواب میں ارشاد فرمایا: جی ہاں۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی مرنے والے کی طرف سے صدقہ کرکے اس کا ثواب پہنچانا چاہے تو پہنچایا جاسکتا ہے۔

حدیث ۹۴۹:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا مَاتَ الإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب آدمی کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع اور ختم ہوجاتا ہے؛ البتہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب اس کو پہنچتا رہتا ہے:- ایک صدقۂ جاریہ۔ یا علم کی ایسی بات جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یا نیک اولاد جو اس کے لیے دعائے خیر کرتی رہے۔

افادات:- کوئی ایسا نیکی کا کام کرلیا جس سے لوگ اس کے مرنے کے بعد بھی فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں، جیسے: مسجد بنادی، تو اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، مدرسہ بنادیا، واٹرورکس بنادیا، کوئی مسافرخانہ بنادیا، اور اپنا مال خرچ کرکے کوئی ایسی چیز بنا کر گیا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس سے فائدہ اٹھارہے ہیں؛ تو اس کا ثواب اس کو ملتا رہے گا، اسی کو صدقۂ جاریہ کہتے ہیں۔

کوئی علم کی بات چھوڑی کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، جیسے: کوئی کتاب تصنیف کردی، کسی کو علمی بات سکھا دی، کسی بچہ کو قرآن پڑھنا سکھادیا، اب وہ

بچہ زندگی بھر قرآن پڑھتا رہے گا، تو چوں کہ اس کے قرآن سیکھنے میں اس کا حصہ تھا؛ تو جب تک وہ قرآن پڑھتا رہے گا، اس کو ثواب ملتا رہے گا۔ اب اگر اس بچے نے دوسرے کو سکھایا، اور اس نے تیسرے کو سکھایا، تو یہ سلسلہ چلتا رہے گا، تو اس کو بھی ثواب میں حصہ ملتا رہے گا۔ "مَنْ سَنَّ فِي الإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً فَعُمِلَ بِهَا بَعْدَهُ كُتِبَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا (مسلم:۶۹۷۵) کسی نے کوئی اچھا طریقہ جاری کر دیا تو اس کا ثواب اس کو ملے گا اور جو اس پر عمل کرتا رہے گا اس کا ثواب بھی اس کو ملتا رہے گا۔

اپنے پیچھے اولادِ صالح چھوڑی جو ماں باپ کے لیے دعا کرتی ہے۔ بس! اس روایت کو اس باب میں لانے کا مقصد یہی جملہ ہے۔ اس لیے کہ باب کے عنوان میں تھا "والدعاء له" مرنے والے کے لیے دعا کرنا۔ تو دیکھو! اولاد جب ماں باپ کے لیے دعا کرتی ہے، تو اولاد کی اس دعا سے ماں باپ کو فائدہ پہنچتا ہے۔

باب ثناء الناس عَلَی المیت

لوگوں کا مرنے والے کی تعریف کرنا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ

حدیث ۹۵۰:-

عن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: مَرُّوا بِجَنَازَةٍ، فَأَثْنَوْا عَلَيْهَا خَيْراً، فَقَالَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم): وَجَبَتْ. ثُمَّ مَرُّوا بِأُخْرَى، فَأَثْنَوْا عَلَيْهَا شَرّاً، فَقَالَ النبي (صلی اللہ علیہ وسلم): وَجَبَتْ. فَقَالَ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ: مَا وَجَبَت؟ فَقَالَ: هَذَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ خَيْراً، فَوَجَبتْ لَهُ الجَنَّةُ، وهَذَا أَثْنَيْتُمْ عَلَيْهِ شَرّاً، فَوَجَبَتْ لَهُ النَّارُ، أَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللهِ في الأَرْضِ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگ ایک جنازہ کو لے کر گزرے، اس جنازہ کو دیکھ کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مجلس میں جو لوگ موجود تھے انہوں نے اس جنازہ والے کے متعلق اچھی بات کہی اور اس کی تعریف کی کہ: بہت اچھا آدمی تھا، نیک و صالح تھا۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سن کر ارشاد فرمایا: اس کے لیے واجب ہوگئی۔ اس کے بعد ایک دوسرا جنازہ وہاں سے گزرا، اس کو دیکھ کر وہاں موجود لوگوں نے اس کی برائی کی کہ بہت برا آدمی تھا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ سن کر ارشاد فرمایا: اس کے لیے بھی واجب ہوگئی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو اس مجلس میں موجود تھے انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا چیز واجب ہوگئی؟ پہلے کے متعلق بھی آپ فرماتے ہیں کہ واجب ہوگئی، اور دوسرے کے متعلق بھی آپ نے فرمایا: واجب ہوگئی۔ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: پہلا آدمی جس کے متعلق تم لوگوں نے اچھی بات

کہی تھی اوراس کی تعریفیں کی تھیں ؛ اس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔اور دوسرا آدمی جس کے متعلق تم نے برے کلمات کہے تھے ؛ اس کے لیے جہنم واجب ہوگئی۔تم لوگ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے گواہ ہو۔

افادات:- مؤمنین کی جماعت جس کے متعلق یہ کہے کہ اچھا آدمی تھاتو ان کے اس کہنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کردیتے ہیں۔اہلِ ایمان کے دل میں کسی کی اچھائی کا آنا یہ خوداس کے جنتی ہونے کی علامت ہے۔عام طورپر دیکھاہوگا کہ مرنے کے بعدلوگ خوبیاں ہی بیان کرتے ہیں ،بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق براکہنے کی نوبت آتی ہے۔ورنہ اگر کسی سے بعض برے اعمال بھی سرزد ہوئے ہوتے ہیں ،پھر بھی اس کے مرنے کے بعد اس کی اچھائیاں اورخوبیاں یاد کرتے ہیں ، تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتاہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ وہ اس کی خوبیاں بیان کررہےہیں ،یہ گویااس بات کی علامت ہے کہ اس کے لیےجنت کا فیصلہ ہوا ہے۔اس لیے اہلِ ایمان کی طرف سے لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ قدرت کے فیصلے کی طرف اشارہ ہواکرتاہے:۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

حدیث ۹۵۱:-

وعن أَبِي الأَسْوَدِ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَدِمْتُ المَدِينَةَ ، فَجَلَسْتُ إِلَى عُمَرَ بنِ الخَطَّاب رضی اللہ عنہ فَمَرَّتْ بِهِمْ جَنَازَةٌ ، فَأُثْنِيَ عَلَى صَاحِبِهَا خَيْراً ، فَقَالَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ : وَجَبَتْ ثُمَّ مُرَّ بِأُخْرَى فَأُثْنِيَ عَلَى صَاحِبِهَا خَيْراً ، فَقَالَ عُمَرُ رضی

رضی اللہ عنہ :وَجَبَتْ . ثُمَّ مُرَّ بِالثَّالِثَةِ فَأُثْنِيَ عَلَى صَاحِبِهَا شَرّاً ، فَقَالَ عُمر : وَجَبَتْ . قَالَ أَبُو الأسودِ : فقلتُ : وَمَا وَجَبَتْ يَاأَمِيرَالمُؤمِنِينَ ؟ قَالَ : قُلْتُ كما قالَ النبي (صلی اللہ علیہ وسلم) : أَيُّمَا مُسْلِمٍ شَهِدَلَهُ أَرْبَعَةٌ بِخَيرٍ ، أَدْخَلَهُ اللهُ الجَنَّةَ . فَقُلْنَا : وَثَلاثَةٌ ؟ قَالَ : وَثَلاثَةٌ . فقلنا : وَاثْنَانِ ؟ قَالَ : وَاثْنَانِ . ثُمَّ لَمْ نَسْأَلْهُ عَنِ الواحِدِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابو الاسود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ آیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا، ان کے پاس سے ایک جنازہ گزرا تو اس کے متعلق اچھی بات کہی گئی (یعنی لوگ اس کی تعریف کرنے لگے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لیے واجب ہوگئی پھر دوسرا جنازہ گزرا، لوگوں نے اس کی بھی تعریف ،تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس کے لیے بھی واجب ہوگئی۔ پھر تیسرا جنازہ گزرا، تو لوگوں نے اس کی برائی کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: واجب ہوگئی۔ ابو الاسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین ! کیا واجب ہوگئی؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا : میں نے وہی بات کہی جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمائی تھی۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا : ہر وہ مسلمان جس کے متعلق چار آدمی گواہی دیں کہ اچھا آدمی تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کر دیتے ہیں (کتنا آسان ہے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر کسی کے متعلق تین آدمی گواہی دیں کہ اچھا آدمی تھا؟ تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد فرمایا: اگر تین آدمی کہیں تب بھی اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمادیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر کسی کے متعلق دو آدمی کہیں کہ اچھا آدمی تھا؟ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ارشاد فرمایا: اگر دو آدمی بھی کسی کے لیے ایسا کہیں تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ جنت میں داخل فرمادیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر ہم نے ایک کے متعلق نہیں پوچھا۔ بس ! دو تک بات آکر رک گئی۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کا اہلِ ایمان کے دلوں میں مرنے والے کے متعلق اچھائی ڈالنا اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے جنت کا فیصلہ ہوا ہے۔

باب فضل من مات له اولاد صغار

جس کی نابالغ اولاد انتقال کر جائے تو والدین کے حق میں اس کی کیا فضیلت ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جس کے تین بچے انتقال کرجائیں

حدیث ۹۵۲:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَمُوتُ لَهُ ثَلَاثَةٌ لَمْ يَبْلُغوا الحِنْثَ، إلاَّ أدْخَلَهُ اللهُ الجَنَّةَ بِفَضْلِ رَحْمَتِهِ إيَّاهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس مسلمان کے تین بچے بالغ ہونے سے پہلے انتقال کرجائیں؛ اس کو اللہ تعالیٰ ان بچوں پر مہربانی کی وجہ سے جنت میں داخل کریں گے۔ یا ان بچوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کردیتے ہیں۔

حدیث ۹۵۳:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): لاَ يَمُوتُ لأَحَدٍ مِنَ المُسْلِمِينَ ثَلاَثَةٌ مِنَ الوَلَدِ، لاَ تَمَسُّهُ النَّارُ إلاَّ تَحِلَّةَ القَسَمِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وَ((تَحِلَّةُ القَسَمِ)) قول الله تَعَالَى: ﴿وَإنْ مِنْكُمْ إلاَّ وَارِدُهَا﴾

وَالوُرُودُ: هُوَ العُبُورُ عَلَى الصِّرَاطِ، وَهُوَ جِسْرٌ مَنْصُوبٌ عَلَى ظَهْرِ جَهَنَّمَ، عَافَانَا اللهُ مِنْهَا.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس مسلمان کے تین بچے انتقال کرجائیں، اس کو جہنم نہیں چھوئے گی، مگر قسم پوری کرنے کی حد تک۔

افادات:- قسم پوری کرنے کا کیا مطلب ؟ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک کے اندر ایک چیز کا فیصلہ کردیا ہے ﴿وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا﴾ تم میں سے ہر ایک کو جہنم کے اوپر سے گزرنا ہے، کوئی آدمی ایسا نہیں جو جہنم پر سے نہ گزرے۔ جہنم کے اوپر باقاعدہ ایک پل ڈالا جائے گا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا، اور لوگوں کو اس کے اوپر سے گزرنے کو کہا جائے گا جیسے جیسے اعمال ہوں گے، اس کے مطابق لوگ گزریں گے۔ بعض وہ ہوں گے جو کوندتی ہوئی بجلی کی طرح گزر جائیں گے۔ بعض وہ ہوں گے جو تیز ہوا کی طرح گزر جائیں گے۔ اور بعض تیز رفتار گھوڑوں کی طرح گزر جائیں گے۔ اور بعض وہ ہوں گے جو گرتے پڑتے کسی بھی طرح سے پار ہو جائیں گے اور بہت سے وہ ہوں گے کہ جہنم کے آنکڑے ان کو اپنے اندر کھینچ لیں گے اور وہ کٹ کر جہنم میں گر جائیں گے۔

بہر حال! پل صراط کا مرحلہ بڑا کٹھن ہے، اور نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ہر کسی کو اس کے اوپر سے گزرنا ہے، اور یہ آدمی جس کے تین بچوں کا انتقال ہوگیا ہے، اس کو بھی جہنم کے اوپر سے گزرنا تو ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جہنم کی آگ کو اسے چھونے نہیں دیں گے، ان بچوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس کو جہنم سے بچالیں گے۔

حدیث ۹۵۴:-

وعن أَبِي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ قَالَ: جَاءتِ امْرَأَةٌ إِلَى رسولِ الله (ﷺ) فَقَالَتْ: يَا رسولَ الله! ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِيثِكَ، فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ نَفْسِكَ يَوْماً نَأْتِيكَ فِيهِ تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللهُ. قَالَ: اجْتَمِعْنَ يَوْمَ كَذَا

وَكَذَا. فَاجْتَمَعْنَ، فَأَتَاهُنَّ النَّبِيُّ (ﷺ) فَعَلَّمَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَهُ اللهُ. ثُمَّ قَالَ: مَا مِنْكُنَّ مِنِ امْرَأَةٍ تُقَدِّمُ ثَلَاثَةً مِنَ الْوَلَدِ إِلَّا كَانُوا لَهَا حِجَابًا مِنَ النَّارِ. فَقَالَتِ امْرَأَةٌ: وَاثْنَيْنِ؟ فَقَالَ رسول الله (ﷺ): وَاثْنَيْنِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک عورت نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کرنے لگی: اے اللہ کے رسول! آپ کی باتیں تو مرد ہی اُڑا لے جاتے ہیں (یعنی آپ کے ارشادات سے مرد ہی فائدہ اٹھاتے ہیں اور انہیں کو سننے کا موقع ملتا ہے، ہمیں تو پردہ کی وجہ سے آپ کی مجلس میں حاضر ہونے اور آپ کے ارشادات سننے کا موقع نہیں ملتا) اس لیے آپ ایک دن ہمارے لیے بھی مقرر فرما دیجیے کہ ہم اس دن آپ کی خدمت میں حاضری دیں اور آپ ہمیں وہ باتیں سکھائیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر اتاری ہیں (اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی تعلیم کے لیے الگ سے کوئی وقت مقرر کیا جاسکتا ہے) تو حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اچھا! فلاں فلاں دن تم لوگ جمع ہوجایا کرنا۔ چناں چہ عورتیں جمع ہوگئیں، اور نبی کریم (ﷺ) ان کے پاس تشریف لائے اور وہ باتیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ پر نازل فرمائیں، وہ ان کو سکھلائیں۔ پھر حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: تم میں سے جس عورت نے تین بچوں کو آگے بھیج دیا (یعنی جس کے تین بچوں کا انتقال ہوگیا) وہ اس کے لیے جہنم سے آڑ بن جائیں گے۔ ایک عورت نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر دو ہوں تو؟ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اگر دو ہوں تب بھی۔

افادات:- ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اگر ایک ہو تو؟ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: اگر ایک ہو تو بھی۔ پھر حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد

فرمایا: اگر ادھورا ساقط ہوجائے گاتو وہ بھی اپنے ماں باپ کو اپنی نال کے ذریعہ کھینچ کر جنت میں لے جائے گا۔ بہرحال! یہ بڑے ثواب کی چیز ہے۔

ہمارے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ کے بچوں کا بھی بچپن کے اندر انتقال ہوا ہے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ: مَیں نے اپنی اہلیہ سے کہا کہ اس پر رونے دھونے کی ضرورت نہیں ہے، ہمارا اپنا کیا ہوا کوئی عمل ہوتو اس میں تو بڑے اشکالات و احتمالات ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں؛ نیت درست ہے یا نہیں؟ اخلاص کے ساتھ کیا ہے یا نہیں ؟ ہر عمل میں ریا اور نمود کا اندیشہ رہتا ہے۔ اور پھر معلوم نہیں کہ ہم نے وہ عمل صحیح طریقہ سے انجام دیا ہے یا نہیں؟ لیکن ہمارا جو بچہ انتقال کر گیا اس میں ہمارے کسی عمل کو دخل نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر جنت کا وعدہ ہے۔ اس لیے یہ تو بہت آسان سودا ہے۔ (احقر مرتب عرض کرتا ہے :- ہمارے حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے بچوں کا بھی بچپن میں انتقال ہوا ہے۔ اس طرح اللہ پاک نے حضرت کو اپنے شیخ سے اس معاملہ میں بھی متابعت نصیب فرمائی۔ باری تعالیٰ ان بچوں کو حضرت اور گھر والوں کے لیے ذخیرۂ آخرت وباعث اجر و ثواب بنائے۔ آمین۔) تو جن لوگوں کے بچوں کا بچپن ہی میں انتقال ہوجاتا ہے ان کے لیے یہ بڑی بشارت ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے تو یہاں تک پوچھا کہ: اے اللہ کے رسول! جس کا کوئی بچہ فوت نہیں ہوا ہو؛ تو اس کے لیے کیا ہوگا؟ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میری موت بھی امت کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے ، جو آدمی میری جدائی پر صبر کرے گا؛ اللہ تعالیٰ اسے بھی جنت میں داخل فرمادیں گے اور جہنم سے بچالیں گے۔

ویسے اہلِ ایمان کے دلوں میں نبی کریم (ﷺ) کی محبت اورآپ کے ساتھ عشق ہے،جب آپ کا تصور آتاہے تواہلِ ایمان کی تمناہوتی ہے کہ کاش!ملاقات کی نوبت آتی، اوراس طرح آپ کی جدائی صدمہ کاباعث ہوتی ہے،اس پر صبر کرنے پر بھی نبی ٔکریم (ﷺ) نے یہ بشارت سنائی ہے۔

بَاب البكاء والخوف عِنْدَ المرور بقبور الظالمين ومصارعهم وإظهار الافتقار إِلَى الله تَعَالَى والتحذير من الغفلة عن ذلك

ظالموں کی قبروں کے پاس سے گزرتے وقت رونا اوراللہ تعالیٰ سے ڈرنا

اوران کوجہاں عذاب ہوا ہے اس جگہ پر رونااور اللہ تعالیٰ کے سامنے گریہ وزاری کا اظہار کرنااور غفلت سے اپنے آپ کوبچانا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایسی جگہ جہاں اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا ہو، اور اس کے نتیجہ میں نافرمانیوں میں مبتلا ہونے والوں کو ہلاک کیا گیا ہو، ایسی جگہوں سے گزرتے وقت آدمی کو چاہیے کہ ڈرتا ہوا اور روتا ہوا وہاں سے گزرے؛ یہی اس کی تلافی ہے۔

جہاں اللہ تعالیٰ کا عذاب آئے وہاں سے گزرنے کا طریقہ

حدیث ۹۵۵:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أَنَّ رسول اللہ (ﷺ) قَالَ لِأَصْحَابِهِ -يعني لَمَّا وَصَلُوا الْحِجْرَ- دِيَارَ ثَمُودَ-: لَا تَدْخُلُوا عَلَى هَؤُلَاءِ الْمُعَذَّبِينَ إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ، فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا بَاكِينَ، فَلَا تَدْخُلُوا عَلَيْهِمْ، لَا يُصِيبُكُمْ مَا أَصَابَهُمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفی روايةٍ قَالَ: لَمَّا مَرَّ رسول اللہ (ﷺ) بِالْحِجْرِ، قَالَ: لَا تَدْخُلُوا مَسَاكِنَ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ، أَنْ يُصِيبَكُمْ مَا أَصَابَهُمْ، إِلَّا أَنْ تَكُونُوا بَاكِينَ. ثُمَّ قَنَّعَ رسول اللہ (ﷺ) رَأْسَهُ وَأَسْرَعَ السَّيْرَ حَتَّى أَجَازَ الْوَادِي.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے اپنے صحابہ سے اس وقت یہ فرمایا جب کہ وہ مقامِ حجر سے جو قوم ثمود کی آبادیاں تھیں گزرے کہ: ان عذاب دیئے ہوؤں کے گھروں اور ان کی آبادیوں سے نہ گزرو، مگر ایسی حالت میں کہ تم رو رہے ہو۔ اور اگر تم رو نہ رہے ہوؤ، تو وہاں سے مت گزرنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جو عذاب ان پر آیا تھا وہ تم پر بھی آجائے۔

افادات:- یہ غزوۂ تبوک کا واقعہ ہے ،اس موقعہ پر جب نبیٔ کریم (ﷺ) تبوک تشریف لے جارہے تھے،راستہ میں مقامِ حجر پڑتا ہے جہاں قومِ ثمود آباد تھی، جن پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا تھااوروہ ہلاک وبرباد ہوئے تھے۔جب اس علاقہ سے گزر رہے تھے تونبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنے صحابہ کو یہ تنبیہ فرمائی تھی، حالاں کہ ان پر عذاب آئے ہوئے توصدیاں بیت چکی تھیں۔

یہ بڑی خطرناک روش ہے

اس سے معلوم ہوا کہ وہ علاقے جہاں پراللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہو، آدمی کووہاں بلاوجہ نہیں جانا چاہیے۔آج کل تو ایسی جگہوں کولوگوں نے تفریح گاہیں بنا رکھا ہے وہاں لوگ باقاعدہ تفریح کے لیے جاتے ہیں،پھروہاں اللہ تعالیٰ کویاد کرنااور اپنی بداعمالیوں سے ڈرنا اور ان پر رونا تودور کی بات رہی،بس!وہاں لوگ پکنک کے طورپر ہنسی مذاق کے لیے جاتے ہیں ؛ یہ بڑی خطرناک روش ہے۔حالاں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی تعلیم تویہ ہے کہ اگر کبھی ایسی جگہوں سے مجبوراً گزرنا پڑے توہماری کیفیت یہ ہوکہ رورہے ہوں اورڈررہے ہوں، کہیں ایسانہ ہوکہ اللہ تعالیٰ کا وہ عذاب ہم پر بھی آجائے،اگرڈریں گےاورروئیں گےتوامیدہےکہ اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے گا۔

ایساکوئی علاقہ جہاں کوئی بیماری اورروگ پھیلاہواہو،عام بیماری چل رہی ہو، جیسے :طاعون اورہیضہ پھیلاہواہو،وہاں کوئی نہیں جاتا،اور اگرکسی وجہ سے مجبوراً جانا پڑتا ہے توایسی تدبیریں

اختیار کی جاتی ہیں کہ اس سے اپنے آپ کو بچاسکے، پرہیز اختیار کیا جاتا ہے؛اسی طریقہ سے کسی ایسے علاقہ میں جہاں اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا ہو ، وہاں بھی نہیں جانا چاہیے ،اوراگر کسی وجہ سے وہاں سے مجبوراً گزرنے کی نوبت آئے، تو اس کے لیے تدبیر یہی ہے کہ روتا ہوا اور اللہ سے ڈرتا ہوا اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہو اوہاں سے گزرے،اوراس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان جیسا عذاب ہم پر آجائے۔

کتاب آداب السفر

سفر کے آداب

استحباب الخروج یوم الخمیس

واستحبابہ اول النہار

جمعرات کے دن اور

دن کے ابتدائی حصہ میں سفر کی شروعات کا مستحب ہونا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یہاں سے نیا مضمون شروع فرما رہے ہیں، جس میں سفر کے آداب کو بتلائیں گے۔اس عنوان کے تحت انہوں نے مختلف ابواب قائم کیے ہیں۔

سفر کی تحقیق

"سفر" عربی زبان کا لفظ ہے۔"سَفَرَ یَسۡفِرُ"کا اصل معنٰی کھولنا،واضح کرنا اور کسی چیز کو بیان کرنا۔سفر کو سفر اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں آدمی کے اخلاق وعادات رفقاء کے سامنے کھلتے ہیں،اسی لیے آپ اگر کسی آدمی کی پہچان کرنا چاہیں تو اس کے ساتھ سفر کرو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی سے پوچھا کہ فلاں آدمی کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا:بہت اچھا آدمی ہے۔پوچھا:تم نے کبھی اس کے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا ہے؟اس نے کہا:کوئی معاملہ تو نہیں کیا۔پھر پوچھا: اچھا! کبھی اس کے ساتھ سفر کرنے کی نوبت آئی ہے؟تو اس نے کہا: اس کی بھی کبھی نوبت نہیں آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:"لَعَلَّكَ رَأَیۡتَهٗ یُصَلِّیۡ؟" پھر تو تم نے اس کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔اس نے کہا: جی ہاں!وہ نماز کا بہت زیادہ اہتمام کرتا ہے اور نہایت خشوع وخضوع سے ادا کرتا ہے(قواعد السلف الذهبية فی الأخوة الإیمانية) معلوم ہوا کہ کسی آدمی کے اچھا ہونے کی رائے قائم کرنے کے لیے صرف

عبادت کرتے ہوئے دیکھ لینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے معاملات کی درستگی بھی ضروری ہے۔ اور سفر سے بھی چوں کہ آدمی کے اخلاق نمایاں ہوتے ہیں اس لیے اس کو عربی زبان میں سفر کہا جاتا ہے۔

بعض سفر ضروری ہیں

سفر بھی انسان کی زندگی میں پیش آنے والے حالات میں سے ایک حالت ہے، انسان کی دو ہی حالتیں ہو سکتی ہیں، یا تو حضر یعنی اپنے وطن میں مقیم ہوگا، یا پھر سفر کر رہا ہوگا۔ اصل حالت تو حالتِ حضر ہی ہے، لیکن ضرورت میں حالتِ سفر بھی پیش آجاتی ہے، اور شریعت نے بھی مختلف ضرورتوں کے پیشِ نظر سفر کی اجازت دی ہے، بلکہ بعض صورتوں میں سفر کو ضروری قرار دیا ہے، مثلاً: کسی آدمی پر حج فرض ہو یعنی اپنے وطن سے مکہ جانے کی استطاعت ہو، اور اپنا نفقہ اور اپنی غیر حاضری میں اپنے گھر والوں کا نفقہ موجود ہو؛ تو اس صورت میں حج فرض ہو جاتا ہے۔ بعض حالات میں جہاد کے لیے سفر کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ بعض حالات میں علم حاصل کرنے کے لیے سفر کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ بعض سفر ضروری ہو جاتے ہیں۔

ویسے علماء نے لکھا ہے کہ آدمی یا تو دفعِ مضرت کے لیے سفر کر رہا ہوگا، یا جلبِ منفعت کے لیے سفر کر رہا ہوگا۔ دفعِ مضرت یعنی کسی طرح کے نقصان اور تکلیف سے بچنے کے لیے سفر کرنا، اس کے اسفار میں ایک سفر ہجرت ہے کہ آدمی جہاں رہتا ہے وہاں شریعت کے احکام پر عمل

اس کے لیے ممکن نہیں ہے،رکاوٹیں پیش آرہی ہیں،جیسے نمازادانہیں کرسکتا،شریعت کے دوسرے فرائض انجام نہیں دے سکتا؛ تواس صورت میں اس جگہ کو چھوڑنے کا شریعت کی طرف سے حکم دیا گیا ہے۔

فتحِ مکہ کے بعد ہجرت نہیں:

شروع اسلام میں جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایمان و اسلام کی دعوت پیش کی اور مکہ مکرمہ میں لوگ اسلام میں داخل ہونے لگے،پھر ہجرت کا حکم نازل ہوا،اس وقت تو مکہ مکرمہ میں کسی کاایمان قابلِ قبول ہی نہیں ہوسکتاتھاجب تک کہ وہ ہجرت نہ کرے ، اس وقت توہجرت کاسفر ضروری تھا، لیکن جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمادیاکہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیےمکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کاجوسفر کیاجاتا ہے،اب جبکہ مکہ مکرمہ فتح ہوچکا اوروہ دارالاسلام بن چکا ؛ اب یہاں سے ہجرت کے سفر کی ضرورت نہیں رہی؛اسی کو”لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ“کہہ کربیان فرمایا۔لیکن اس کے باوجود علماء نے لکھا ہے کہ حالات بدلتے رہتے ہیں، آدمی جس جگہ قیام پذیرہےوہاں رہتے ہوئےاگراس کے لیے اسلامی احکام پر عمل ناممکن ہے تو اس صورت میں اس جگہ کوچھوڑکرکسی ایسی جگہ جاناجہاں اسلامی احکام کو عملی جامہ پہنا سکے یہ ضروری ہے؛ اسی کو سفر ہجرت کہاجاتا ہے۔

طلبِ حلال کے لیے سفر:

اور سفر ہجرت بعض حالات میں ضروری قرار دیا گیاہے، جیسے: ایک آدمی جہاں رہتا ہے وہاں حلال روزی میسر نہیں، یا وہاں حرام کا اتنازیادہ غلبہ ہے کہ حلال ناممکن ہوگیاہے، تواس صورت میں اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری کسی ایسی جگہ پر جانا ضروری ہوجاتا ہے جہاں وہ حلال حاصل کرسکے۔ یہ سفر بھی دفعِ مضرت ہی کے لیے قرار دیا گیا ہے۔

جان ومال کی حفاظت کے لیے سفر:

یامثلاً ایک آدمی جہاں پر قیام پذیر ہے وہاں کی آب وہوا اس کو ناموافق ہے، اس کی وجہ سے وہ بیمار رہتا ہے اور ہمیشہ پریشانی میں مبتلا رہتاہے، اطباء اور معالجین نے اس کو یہ بتلایا کہ تمہارے لیے مناسب یہی ہے کہ تم اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ چلے جاؤ، تونبیٔ کریم (ﷺ) نے اس کی بھی اجازت دی ہے، ابوداؤد شریف میں روایت موجود ہے۔ ہاں ! اگر کسی علاقہ میں کوئی عام بیماری پھیل جائے، جیسے: طاعون یاہیضہ؛ تواس صورت میں اس جگہ کو چھوڑ کر جانے کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

اسی طریقہ سے کسی جگہ پر رہتے ہوئے جان کا اندیشہ ہے، تواس صورت میں اپنی یااپنے اہل وعیال کی جان کی حفاظت کے لیے اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا چاہے؛ تو اس کی

اجازت دی گئی ہے۔اسی طریقہ سے کسی جگہ پر رہتے ہوئے مال کی حفاظت ممکن نہیں ہے تو اس صورت میں مال کی حفاظت کے لیے بھی اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونا چاہے ؛تو اس کی بھی اجازت دی گئی ہے۔

اور جلبِ منفعت یعنی کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جو سفر کیا جاتا ہے، جیسے: حج و عمرہ کے لیے سفر کرنا، طلبِ علم اور جہاد کے لیے سفر کرنا، اپنے رشتہ دار، عزیز و اقارب اور دوست واحباب کی ملاقات کے لیے سفر کرنا؛یہ سب اس کے اندر داخل ہے۔علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے سفر کی یہ مختلف شکلیں بتلائی ہیں۔

سفر شرعی،سفر غیر شرعی:

ویسے احکام کے بدلنے اور نہ بدلنے کے اعتبار سے بھی سفر کی دو قسمیں کی گئی ہیں :-

[۱] سفر شرعی [۲] سفر غیر شرعی۔

سفر شرعی کا مطلب یہ ہے کہ ایسا سفر جس کی وجہ سے احکام بدل جاتے ہیں۔شریعت کے بعض احکام میں مسافر کو شریعت کی طرف سے خصوصی رعایتیں دی گئی ہیں،مثلاً:رمضان المبارک میں سفر ہورہا ہے اور سفر کی مشکلات اور مشقتوں کی وجہ سے روزہ چھوڑنا چاہے،اور گھر آنے کے بعد اس کی قضا کرلے؛تو شریعت کی طرف سے اس کی اجازت ہے۔یہ ایک طرح کی رخصت ہے جو سفر کی وجہ سے اس کو دی گئی ہے۔

اسی طریقہ سے سفر میں یہ بھی ہے کہ چار رکعات والی نمازوں کو دو رکعات ادا کرے۔اور بھی کچھ احکام ہیں جو سفر کی وجہ سے بدلتے ہیں، مثلاً: چمڑے کے موزے پہن رکھے ہیں، تو حالتِ سفر میں تین دن مسح کرنے کی اجازت دی گئی ہے، جبکہ حالتِ اقامت میں ایک دن کا حکم ہے۔اسی طرح مسافر کے لیے مسجد کے اندر سونے اور کھانے کی اجازت دی گئی ہے۔ بہر حال! بعض احکام ہیں جو سفر کی وجہ سے بدلتے ہیں ؛اسی کو سفر شرعی کہتے ہیں۔

سفر شرعی کی مسافت:

اور یہ سفر احناف کے یہاں تین دن کا ہونا چاہیے۔اُس زمانہ میں عام طور پر لوگ قافلوں کی شکل میں اونٹ اور دوسری سواریوں پر سفر کرتے تھے ، تو دن کا اکثر حصہ سفر میں گزارا جاتا تھا،اور رات میں آرام کرتے تھے ،اوراس وقت دن بھر میں جو مسافت طے کی جاتی تھی وہ ایک منزل کے برابر ہوتی تھی؛ ایسے تین دن کی مسافت کا سفر ہو تو اس کو یہ اجازت دی گئی ہے۔ بعد میں فقہاء نے حالات کو دیکھتے ہوئے اس کے لیے انگریزی اڑتالیس میل کی تحدید فرمادی ہے۔ ہمارے اکابر کا قول یہی ہے۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب نے اپنے فتاویٰ میں جو لکھا ہے اس سے بعد میں رجوع فرمالیا ہے،اور اڑتالیس میل والے قول کو ہی تسلیم کیا ہے۔اور یہ اڑتالیس میل موجودہ ناپ کے اعتبار سے سوا ستتر (۷۷¼) کلو میٹر ہوتا ہے۔کوئی آدمی اپنے وطن سے سوا ستتر (۷۷¼) کلومیٹر کی دوری کے ارادہ سے نکلے؛تو وہ مسافر بن جاتا ہے۔اور یہ مسافتِ سفر اپنے وطن

کی آبادی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں سے شمار کی جائے گی۔ایسا نہیں کہ آپ یہاں نشاط سوسائٹی میں رہتے ہیں تواپنے گھر سے سوا ستتر (۷۷¼) کلو میٹر شمار کریں ،بلکہ اگر آپ ممبئی کی طرف سفر کرنا چاہتے ہیں،تو ممبئی کی طرف جاتے ہوئے جہاں سورت شہر کی مسلسل آبادی ختم ہوتی ہے وہاں سے سوا ستتر (۷۷¼) کلومیٹر کا حساب لگایا جائے گا۔اب اگر آپ کو جہاں جانا ہے وہ گھر سے توسوا ستتر (۷۷¼) کلو میٹر ہو تا ہے، لیکن جہاں شہر کی مسلسل آبادی ختم ہوتی ہے وہاں سے سوا ستتر (۷۷¼) کیلو میٹر نہیں ہوتا ؛ تو اس صورت میں آپ شرعی مسافر قرار نہیں دیئے جائیں گے۔

قصر ضروری ہے:

اور ایک مرتبہ مسافر بننے کے بعد چار رکعات والی نمازیں دو رکعات پڑھنا احناف کے یہاں ضروری ہے۔احناف کے یہاں قصر رخصتِ اسقاط ہے یعنی شریعت نے مسافر کے لیے چار رکعات رکھی ہی نہیں ،بلکہ دو ہی رکھی ہیں ، جیسے: فجر کی دو رکعات ہیں ،اگر کوئی آدمی فجر کی نماز دو کے بجائے چار پڑھنا چاہے تو وہ صحیح نہیں ہے، اسی طریقہ سے مسافر کے حق میں ظہر کی چار رکعات ہے ہی نہیں ،بلکہ دو ہی رکعات ہیں۔ ایسا نہیں کہ چار ہے اور دو سے کام چلا سکتے ہو،بلکہ مسافر کے حق میں ظہر کی نماز دو ہی رکعات ہے،اس لیے اگر مسافر چار رکعات پڑھے گا تو وہ درست نہیں ہے۔اور ایک مرتبہ مسافر بن جانے کے بعد یہی حکم باقی رہے گا۔ہاں! اگر کسی جگہ جاکر پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہاں پوری نماز پڑھے گا۔یہ

ساری تفصیلات ہیں،اگر اس سلسلہ میں کوئی مسئلہ معلوم نہ ہو تو اہلِ علم حضرات سے دریافت کرلیا جائے یہ سفر شرعی کہلاتا ہے، جس میں احکام بدلتے ہیں۔

بعض سفر وہ ہیں کہ ان میں چاررکعات والی نماز اورروزہ میں گنجائش کا حکم نہیں بدلتا،وہ سفر شرعی سے کم مسافت کا ہوتاہے۔اگرچہ اس کے اندر بھی کچھ گنجائشیں ہیں ، مثلاً:کوئی آدمی سفر کی حالت میں سواری پر بیٹھے بیٹھے اشارہ سے نفل نماز پڑھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے،اس کے لیے سوا ستتر(۷۷¼) کیلومیٹر کا سفر ہونا ضروری نہیں ہے، جیسے اگر آپ سورت سے نوساری جاناچاہیں اور وہ یہاں سے سوا ستتر(۷۷¼)کلومیٹر نہیں ہے ،تب بھی آپ سواری پر بیٹھے ہوئے ہونے کی حالت میں نفل نماز پڑ سکتے ہیں اس کے علاوہ بھی کچھ رخصتیں اور گنجائشیں مطلق سفر پر دی گئی ہیں اس میں سوا ستتر (۷۷¼) کیلومیٹر کی قید نہیں ہے، جیسے:مسجد میں سونے کی اجازت ہے،تو وہ اس مسافر کے لیے بھی ہے،اس کے لیے سوا ستتر (۷۷¼)کلو میٹر والا مسافر ہونا ضروری نہیں ہے یہ سفر کے کچھ احکام ہیں ،اور شریعت نے سفر کی مشقتوں کے پیشِ نظر یہ آسانیاں دے رکھی ہیں۔

سفر کے لیے کون سادن اوروقت مستحب ہے؟:

چوں کہ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ مختلف چیزوں کے آداب بیان کررہے ہیں ، اس لیے یہاں سے سفر کے آداب بیان کرناچاہتے ہیں ۔چناں چہ انہوں نےپہلے باب کاعنوان قائم کیا:-

إِسْتحبابُ الْخُرُوجِ يَوْمَ الْخَمِيْسِ وَأَوَّلَ النَّهَارِ" سفر کی شروعات کون سے دن ہونی چاہیے؟ ویسے اگر ضرورت ہے توکسی بھی دن نکل سکتا ہے، لیکن اگر کوئی کام اپنے اختیار کا ہو تو بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے سفر کو جمعرات کے دن اور وہ بھی دن کے ابتدائی حصہ میں شروع کرے۔ گویا دن کے اعتبار سے جمعرات، اور وقت کے اعتبار سے صبح؛ یہ دو چیزیں سفر کے لیے بہتر اور مستحب قرار دی گئی ہیں۔

حدیث ۹۵۶:-

عن كعب بن مالك رضی اللہ عنہ **أَنَّ النبيَّ (ﷺ) خَرَجَ فى غَزْوَةِ تَبُوكَ يَوْمَ الْخَمِيسِ، وَكَانَ يُحِبُّ أَنْ يَخْرُجَ يَوْمَ الْخَمِيسِ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

وفى رواية فى الصحيحين: لَقَلَّمَا كَانَ رسولُ الله (ﷺ) يَخْرُجُ إِلاَّ فى يَوْمِ الْخَمِيسِ.

ترجمہ:- حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) غزوۂ تبوک کے لیے جمعرات کے دن نکلے، اور نبیِ کریم (ﷺ) سفر کے لیے جمعرات کے دن نکلنا پسند فرماتے تھے۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ بہت کم نبیِ کریم (ﷺ) نکلتے تھے مگر جمعرات کے دن (یعنی عام طور پر جمعرات کے دن ہی آپ کا سفر ہوتا تھا۔)

افادات:- غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب نبیِ کریم (ﷺ) غزوہ کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اس میں شریک نہ ہو پائے تھے، ان کے ساتھ دو صحابی اور

بھی تھے ،پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی تھی۔یہ لمبی چوڑی ایک روایت ہے جس کا ایک حصہ یہاں پیش فرمایا ہے۔(پوری روایت حدیث کے اصلاحی مضامین، ۱/ ۱۵۰-۱۸۰ پر گزر چکی ہے۔من شاء فلیراجع۔مرتب۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر پروگرام بنانا اپنے ہاتھ میں ہے کہ جس دن بھی ہم چاہیں نکل سکتے ہیں؛تو بہتر ہے کہ آدمی اپنے سفر کی ابتداء جمعرات کے دن کرے۔دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ کبھی کبھار نبیٔ کریم (ﷺ) پیر کے دن بھی سفر شروع فرماتے تھے ،لیکن عام طور آپ (ﷺ) کا سفر جمعرات کو ہوتا تھا۔آگے دوسری روایت لاکر وقت بتاتے ہیں۔

امت کے لیے حضور (ﷺ) کی برکت کی دعا:

حدیث ۹۵۷:-

وعن صخر بن وَداعَةَ الغامِدِيِّ الصحابِيِّ رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ الله (ﷺ) قَالَ: أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لأُمَّتِي فِي بُكُورِهَا. وَكَانَ إِذَا بَعَثَ سَرِيَّةً أَوْ جَيْشاً بَعَثَهُمْ مِنْ أَوَّلِ النَّهَارِ. وَكَانَ صَخْرٌ تَاجِراً، وَكَانَ يَبْعَثُ تِجَارَتَهُ أَوَّلَ النَّهَارِ، فَأَثْرَى وَكَثُرَ مَالُهُ. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت صخر بن وداعہ غامدی صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے دعا فرمائی ہے:اے اللہ! میری امت کے لیے دن کے شروع (یعنی صبح) میں برکت رکھ دے (اسی لیے حضورِ اکرم (ﷺ) کی عادتِ شریفہ بیان کرتے ہیں کہ) آپ (ﷺ) صحابۂ کرام کی ٹکڑی کہیں روانہ کرنا چاہتے تھے،یا کوئی لشکر کہیں بھیجنا ہوتا تھا؛تو دن کے شروع وقت روانہ فرماتے تھے۔اور حضرت صخر رضی اللہ عنہ جو اس روایت کے راوی ہیں وہ

تجارت کرتے تھے۔اس لیے وہ جب اپنا تجارتی قافلہ روانہ کرتے تھے،یا خود جانا ہوتا تھا تو دن کے شروع میں جاتے تھے(اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ)ان کے مال میں اللہ تعالیٰ نے خوب برکت دی،اور وہ کثیر المال ہوگئے۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تجارتی سفر میں بھی آدمی اگر اس کا اہتمام کرے تو اس سے تجارت میں برکت ہوگی۔اکثر لوگ بے برکتی کی شکایتیں کرتے ہیں،تو شریعت نے اس طرح کے چھوٹے چھوٹے نسخے بتائے ہیں ان کو بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔اب تو مصیبت یہ ہوگئی کہ پہلے تو دکانیں بھی صبح کی نماز کے بعد جلدی کھل جایا کرتی تھیں،لیکن اب تو سونے کا عام مزاج ایسا بن گیا ہے کہ گیارہ بجے سے پہلے دوکانیں کھلنے کا سوال ہی نہیں رہا۔بہر حال! سفر میں وقت کے اعتبار سے صبح کے وقت کو بہتر قرار دیا گیا ہے۔تو یہ دو چیزیں ہوگئیں کہ دن جمعرات کا ہونا چاہیے اور وقت صبح کا ہو۔اگر سفر کا نظام اپنے اختیار میں ہے تو اپنے نظامِ سفر کو اس طرح ترتیب دے۔یہ آدابِ سفر میں سے ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب استحباب طلب الرفقة وتأميرهم عَلَى أنفسهم واحداً يطيعونه

اکیلے سفر نہ کریں اور امیر مقرر کرلیں

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ آدمی اکیلا سفر نہ کرے، بلکہ سفر کے لیے رفقاء تلاش کرے، اور جب رفقاء ہو جائیں تو وہ سب مل کر اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالیں جس کی وہ اطاعت کریں، یعنی سفر کے معاملہ میں وہ اس کی باتوں کو برابر مانیں۔ اس لیے کہ سفر کے دوران مختلف حالات پیش آتے ہیں، کسی چیز کے سلسلہ میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے، مثلاً: یہاں قیام کرنا چاہیے یا نہیں؟ کس گاڑی سے سفر کریں؟ کس گاڑی سے واپس ہونا ہے؟ دو ساتھی ایک گاڑی کا کہتے ہیں اور دوسرے ساتھی دوسری گاڑی کا نام بتاتے ہیں، اور بعض کہتے ہیں کہ ہم تو فلاں گاڑی ہی سے جائیں گے، تم کو آنا ہو تو آؤ؛ ایسی گڑبڑیں ہو جاتی ہیں، اس لیے پہلے سے کسی کو امیر بنالیا جائے اور امیر کو چاہیے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشورہ لے، اور جو جو مشورہ دے اس سے اس کی وجہ بھی پوچھے کہ تم نے فلاں سواری، یا فلاں ٹرین کا جو مشورہ دیا ہے اس میں کیا فائدہ ہے؛ تاکہ ان

سب مشوروں کو تول کر اس کے مطابق امیر اپنی رائے سے فیصلہ کر سکے۔اور جب کسی ایک کو امیر بنادیا گیا تو اس کے حکم پر سب کو چلنا ضروری ہے۔اسی کو عنوان میں کہا گیا کہ ”یطیعونه“ صرف نام کا امیر نہ بنایا جائے،بلکہ سفر سے تعلق رکھنے والے تمام امور میں اس کی پوری پوری اطاعت ہو۔

اکیلے سفر کا جتنا نقصان مَیں جانتا ہوں ..

حدیث ۹۵۸:-

عن ابن عمرَ رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) :لَوْأنَّ النَّاسَ يَعْلَمُونَ مِنَ الوحدَةِ مَا أعْلَمُ، مَا سَارَ رَاكِبٌ بِلَيْلٍ وَحْدَهُ!.(رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اکیلے سفر کرنے میں کیا نقصان ہے، اس کو مَیں جتنا جانتا ہوں اتنا اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے؛ تو کوئی سوار رات کو اکیلے سفر نہ کرے۔

افادات:- اس زمانہ میں عام طور پر راستوں میں بد امنی تھی،اکیلے سفر کرنا آدمی کے جان و مال کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہوا کرتا تھا،اسی لیے حضور اکرم (ﷺ) نے خاص طور پر تاکید فرمائی، اور لوگ بڑے مجمع اور قافلوں کی شکل میں ہی سفر کرتے تھے۔ہاں !اگر کہیں امن وامان کی صورت حال ہے تو اکیلے سفر کی بھی اجازت ہے،البتہ کسی قافلہ کے ساتھ سفر کرنا آداب میں

سے ہے، فرض اور واجب نہیں ہے، لیکن جیسا کہ بتلایا کہ ان آداب کی رعایت کرتے ہوئے کوئی آدمی چلے تو اس میں اللہ تعالیٰ نے بڑی خیر وبرکت رکھی ہے۔

لفظ ''قافلہ''نیک فال ہے:

قافلہ کو عربی زبان میں '' قافلہ ''اسی لیے کہتے ہیں کہ'' قَفَلَ یَقْفُلُ ''کا معنٰی ہے ''لوٹنا''۔ قافلہ یعنی لوٹ کر آنے والی جماعت۔ حالاں کہ ابھی تو یہ لوگ سفر میں جارہے ہیں، لیکن اہلِ عرب کے یہاں ایک مزاج تھا کہ وہ لوگ کسی چیز کا نام رکھنے میں نیک فالی لیا کرتے تھے، ایسا نام رکھتے تھے جس کا اچھا معنٰی نکلے۔تو یہ جماعت جو سفر میں جارہی ہے اس کا نام پہلے ہی سے'' قافلہ''رکھا،یعنی لوٹ کر آنے والی جماعت۔کیوں کہ اس زمانہ میں جو لوگ سفر کے لیے نکلتے تھے تو بدامنی اور جان ومال کے خطرہ کی وجہ سے ان کی واپسی کے متعلق اندیشہ رہتا تھا،اس لیے یہ لوگ جب جارہے ہیں اسی وقت سے کہا جارہا ہے کہ'' قافلہ'' جارہا ہے۔یعنی نام کے اندر ہی ایسا معنٰی رکھ دیا کہ جب کئی آدمیوں کی زبان سے ایک ہی لفظ بولا جائے گا تو معلوم نہیں کس کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے،اس کا بول قبول ہوجائے، تو یہ قافلہ سلامتی کے ساتھ واپس آجائے،یعنی صرف جانے والا ہی نہ رہے بلکہ واپس آنے والا بھی بن جائے۔

’سَاعَةٌ‘ اور ’سَلِيمٌ‘ بھی نیک فال ہے:

جیسے: عربی زبان میں سانپ کے ڈسے ہوئے کو ”سَلِیم“ کہتے ہیں۔ حالانکہ ”سَلِیم“ کا معنیٰ: وہ آدمی جو سلامتی والا ہے، لیکن جس کو سانپ کاٹ لے، عام طور پر وہ سلامت نہیں رہتا، بلکہ مرجاتا ہے، تو جس کو سانپ کاٹ لے اس کا نام ہی اہلِ عرب نے ”سَلِیم“ رکھ دیا۔ اب کوئی پوچھے کہ وہ کون ہے تو کہیں گے: ”هُوَسَلِيمٌ“۔ یہ سلیم ہے۔ جب کئی لوگوں کی زبان سے سلیم کا لفظ نکلے گا، تو ہوسکتا ہے کسی کی زبان سے نکلا ہوا بول قبول ہوجائے اور اس کی جان بچ جائے۔ اسی طرح قیامت کو ”سَاعَةٌ“ کہتے ہیں۔ ”سَاعَةٌ“ یعنی ایک لمحہ اور ایک گھڑی تو گویا ”سَاعَةٌ“ نیک فالی کے طور پر کہا گیا ہے۔ ویسے تو قیامت کا دن بڑا لمبا دن ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ اس کو ہمارے لیے ایک لمحہ اور ایک گھڑی کے برابر بنا دے۔ میں نے یہ سب مثالیں نیک فالی کی دی ہیں۔

تو مَیں یہ عرض کررہا تھا کہ اس زمانہ میں عام طور پر بد امنی تھی، اس کی وجہ سے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تاکید فرمائی کہ اکیلے سفر کرنے کا جو نقصان میں جانتا ہوں، وہ اگر لوگوں کو معلوم ہوجائے تو کوئی بھی سوار رات میں اکیلا سفر نہیں کرے گا۔ اسی لیے رات کے سفر میں دن کے سفر کے مقابلہ میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

سفر کے ساتھی کم از کم تین ہوں :

حدیث ۹۵۹:-

وعن عمرِو بن شُعَيْبٍ، عن أبيه، عن جَدِّهِ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : الرَّاكِبُ شَيْطَانٌ ، وَالرَّاكِبَانِ شَيْطَانَانِ، وَالثَّلَاثَةُ رَكْبٌ.**

(رواه أبو داود والترمذی والنسائی بأسانيد صحيحةٍ، وقال الترمذی: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اکیلا سوار ایک شیطان ہے، دو سوار دو شیطان ہیں ، اور تین سوار قافلہ ہیں۔

افادات:- یہ ارشاد فرماکر گویا نبیِ کریم (ﷺ) نے اس بات کی طرف رہنمائی فرمائی کہ سفر میں کم سے کم تین آدمی ہونے چاہئیں۔ یہ زیادہ مناسب ہے۔

حدیث ۹۶۰:-

وعن أَبِي سعيد وأبي هُريرة رضی اللہ عنہما **قالا : قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : إِذَا خَرَجَ ثَلَاثَةٌ فی سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوا أَحَدَهُمْ.** (حديث حسن، رواه أبو داود بإسنادٍ حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تین آدمی سفر کے لیے نکلیں تو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر بنالینا چاہیے۔

افادات:- یہ آداب سفر میں سے ہے، اور اس میں بڑی برکت ہے۔

چار، چار سو، چار ہزار اور بارہ ہزار کی فضیلت

حدیث ۹۶۱:-

عن ابن عبّاسٍ رضی اللہ عنہما عن النبیِّ (ﷺ) قَالَ : خَيْرُ الصَّحَابَةِ أَرْبَعَةٌ ، وَخَيْرُ السَّرَايَا أَرْبَعُ مِئَةٍ ، وَخَيْرُ الْجُيُوشِ أَرْبَعَةُ آلَافٍ، وَلَنْ يُغْلَبَ اثْنَا عَشَرَ أَلْفاً مِنْ قِلَّةٍ. (رواہ أبو داود والترمذی وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نبیِ کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں : بہتر رفقاءِ سفر چار ہیں ، اور لشکر کی بہترین ٹکڑی چار سو کی ہے، اور بہترین لشکر وہ ہے جس میں چار ہزار آدمی ہوں ،اور بارہ ہزار کی نفری کمیِ عدد کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہو گی۔

افادات:- یعنی سفر میں چار آدمی ہوں تو وہ سب سے اچھی شکل ہے۔اس کی تشریح کرتے ہوئے علماء نے لکھاہے کہ سفر میں عام طورپر دو ضرورتیں پیش آتی ہیں ، کبھی کھانے پینے کے انتظام کرنے کے لیے جانا پڑتا ہے،تو چار ہونے کی صورت میں دو آدمی اس کے لیے جائیں گے،اور یہاں سامان کی حفاظت کے لیے دو ساتھی رہیں گے،یعنی ہر جماعت میں دو دو رہیں گے۔اور چار سے کم ہونے کی صورت میں یہ ہو گا کہ اگر کھانے پینے کے انتظام کے لیے دو گئے ہیں تو سامان کی حفاظت کے لیے ایک ہی کو رہنا پڑے گا۔ یا حفاظت کے لیے دو کو بٹھایا تو انتظام کے لیے ایک کو بھیجنا پڑے گا۔اور دو کی صورت میں تو دونوں جگہ ایک ایک ہی رہیں گے۔اور اگر صرف

ایک ہے تو اس کے لیے تو دشواری ہی دشواری ہے کہ اگر پانی پینے کے لیے بھی جانا ہے تو سامان کی حفاظت کی فکر ہے کہ کیا کروں!

آج کل ٹرینوں کے سفر میں پاس پڑوس والے کے ساتھ اُنس پیدا کر کے اس کو اپنا معتمد بنالیا جائے تو کام چل سکتا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ آپ اس کو سامان سونپ کر بیت الخلاء میں جائیں اور وہی آدمی سامان لے کر روانہ ہوجائے۔ اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: بہترین رفقاءِ سفر چار ہیں۔

''سَرِیَّۃ'' لشکر کی چھوٹی ٹکڑی کو کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیجا کرتے تھے۔ ویسے اہلِ سیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) خود شریک نہ ہوں اور صرف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیج دیں؛ تو وہ ''سریہ'' کہلاتا ہے، ورنہ وہ ''غزوہ'' کہلاتا ہے۔ یہاں مراد مطلق ٹکڑی مراد ہے کہ لشکر کی بہترین ٹکڑی وہ ہے جس میں چار سو آدمی ہوں۔

اور بارہ ہزار کی نفری کمیٔ عدد کی وجہ سے کبھی مغلوب نہیں ہوگی۔ ہاں! کسی اور وجہ سے جیسے اپنے عجب و کبر میں مبتلا ہونے، یا سامان کی قلّت، یا کسی اور وجہ سے مغلوب ہوجائے؛ تو بات دوسری ہے، لیکن تعداد کی کمی کی وجہ سے وہ کبھی مغلوب نہیں ہوسکتی۔

باب آداب السير والنزول والمبيت والنوم فى السفر واستحباب السُّرَى والرفق بالدواب ومراعاة مصلحتها وأمر من قصّر فى حقها بالقيام بحقها وجواز الإرداف عَلَى الدابة إِذَا كانت تطيق ذلك

چلنے، ٹھہرنے، شب گزاری اور سفر میں سونے کے آداب:

چوپایوں کے ساتھ نرمی اور ان کا خیال رکھنے کا بیان:

جو ان کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھنے کے معاملہ میں کوتاہی کرے، اسے تاکید:

چوپایہ اگر مضبوط ہو تو اپنے پیچھے کسی کو سوار کرسکتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سفر میں کہیں اترنے،اوررات میں کہیں قیام کرنے اور سونے کے کچھ آداب اس باب میں بتلاتے ہیں ۔اسی طرح سواریوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ برتنے کا حکم دیا گیا ہے، اور جو آدمی سواری کے جانور کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اس کو ان کے حقوق کی ادائیگی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔اور اگر جانور میں اتنی طاقت ہے کہ وہ دو یا تین آدمی کی سواری کو برداشت کر سکتا ہے؛ تو سواری کے جانور کے اوپر دوسرے کو بٹھانے کی اجازت ہے۔

آج کل تو سواریاں جاندار نہیں ہوتیں ،بلکہ بے جان ہوتی ہیں ،جیسے: موٹر سائیکل، یا سائیکل، یا اسکوٹر اور موٹر کار؛ تو وہاں بھی ایک اصول یادرکھیں کہ کسی بھی چیز کو اس طرح استعمال کرنا جس کی وجہ سے اس کو نقصان پہنچے؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔اس لیے وہاں بھی اس بات کا ضرور خیال رکھا جائے گا کہ اگرچہ جاندار پر ظلم کا مسئلہ تو نہیں ،لیکن اگر ایک سائیکل کے اوپر چار آدمی سوار ہو گئے ،یا ایک اسکوٹر کے اوپر پانچ آدمی سوار ہو گئے ،جس کی وجہ سے اس سواری کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

آپ کو یاد ہو گا کہ پہلے جہاں پینے کے آداب بتائے تھے وہاں یہ بھی بتایا تھا کہ چمڑے کے مشکیزہ کے منھ کو موڑ کر پانی پینے سے نبی کریم (ﷺ) نے منع فرمایا ہے۔اور اس کی وجہ بتلائی تھی کہ اگر اس کا منھ بار بار موڑا جائے گا تو وہ ٹوٹ جائے گا ، اور پھر پورا مشکیزہ استعمال کے

قابل نہیں رہے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ کوئی چیز اپنی ہی کیوں نہ ہو،لیکن اس کو اس طرح استعمال کرنا جس کی وجہ سے اس چیز کو نقصان پہنچے ؛شریعت اس کو پسند نہیں کرتی۔

دورانِ سفر اس بات کا بھی خیال رکھو:

حدیث ۹۶۲:-

عن أَبِي هُرَيرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : إِذَا سَافَرْتُمْ فِي الْخِصْبِ، فَأَعْطُوا الإِبلَ حَظَّهَا مِنَ الأَرْضِ، وَإِذَا سَافَرْتُمْ فِى الجَدْبِ، فَأَسْرِعُوا عَلَيْهَا السَّيْرَ، وَبَادِرُوا بِهَا نِقْيَهَا، وَإِذَا عَرَّسْتُمْ، فَاجْتَنِبُوا الطَّرِيقَ؛ فَإِنَّهَا طُرُقُ الدَّوَابِّ، وَمَأْوَى الهَوَامِّ بِاللَّيْلِ. (رواہ مسلم)

مَعنَى ((أَعْطُوا الإِبلَ حَظَّهَا مِنَ الأَرْضِ)) أَيْ: ارْفُقُوا بِهَا فى السَّيْرِ لِتَرْعَى فى حَالِ سَيرِهَا، وَقوله: ((نِقْيَهَا)) هُوَ بكسر النون وإسكان القاف وبالياءِ المثناة من تحت وَهُوَ: المُخُّ، معناه: أَسْرِعُوا بِهَا حَتَّى تَصِلُوا المَقصِدَ قَبْلَ أَنْ يَذْهَبَ مُخُّهَا مِنْ ضَنْكِ السَّيْرِ. وَ((التَّعْرِيسُ)): النُزولُ فى اللَّيلِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی سرسبز و شاداب علاقہ میں سفر کرو، تو اونٹ کو اس زمین کا حق اور حصہ عطا کرو۔ اور جب خشک علاقہ میں سفر کرو؛ تو جلدی سے اور تیزی سے سفر کرو۔اور اس کا گودا ختم ہونے سے پہلے سفر پورا کرلو۔ اور جب تم رات کو کہیں قیام کرو تو راستہ سے ہٹ کر ٹھہرو۔

افادات:- اگر آدمی اونٹ پر سفر کررہا ہے اور کسی ایسے علاقہ سے گزر رہا ہے جہاں کھانے کے لیے سبزہ اور گھاس ہے، تو ظاہر ہے کہ جانور کی طبیعت بھی اس گھاس کو کھانے کو چاہے گی، اس لیے نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ایسا مت کرو کہ تیزی سے گزرجاؤ، اور اونٹ کو چرنے کا موقع نہ دو، بلکہ اس کو چرنے کا موقع دو؛ تاکہ اس کا بھی حق ادا ہو۔ہاں ! اگر خشک علاقہ سے گزرنا ہو تو تیزی سے گزر جاؤ تاکہ اگر اونٹ کو کھانے کی ضرورت ہو تو آگے جاکر کسی سبز علاقہ میں اس کی ضرورت پوری ہوجائے۔

دورانِ سفر اہلِ خانہ کو کھلاتے پلاتے چلو:

☑ اس تعلیم کو مدِّنظر رکھتے ہوئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ اگر آپ اپنے خاندان کو لے کر سفر کررہے ہیں اور کسی ایسے علاقہ سے گزررہے ہیں کہ جہاں کھانے پینے کی مناسب چیزیں مل رہی ہیں، بچے بھی ساتھ میں ہیں اور ان کا بھی جی چاہ رہا ہے؛ تو ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بخل سے کام لیتے ہوئے کوئی چیز نہ خریدیں ، بلکہ ان سب کو کھلاتے پلاتے چلو۔یہ میرا استنباط ہے۔

☑ **"اور اس کا گودا ختم ہونے سے پہلے سفر پورا کرلو"** مطلب یہ ہے کہ سفر میں جانور کو اتنا نہ تھکاؤ کہ اس کے پیروں کی ہڈیوں کا گودا بھی ختم ہوجائے۔کسی بھی چیز سے اتنا زیادہ کام مت لو کہ اس کی صلاحیت ہی ختم ہوجائے، اگر جانور ہو تو تھک کر بے کار ہوجائے۔یا مثلاً موٹر کار ایسی

ہے کہ چلانے کی وجہ سے گرم ہو جاتی ہے ،تو اس کو اتنا مت چلاؤ کہ انجن گرم ہو کر پھٹنے لگے؛اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

☑ **"اور جب تم رات کو کسی جگہ پر قیام کرو تو راستہ سے ہٹ کر ٹھہرو"** اس زمانہ میں سفر کرتے کرتے تھک جاتے تھے تو راستہ میں کہیں قیام کر لیتے تھے،تو اس کے لیے یہ ہدایت دی ہے کہ راستہ سے ہٹ کر قیام کرے۔اس لیے کہ راستہ تو گزر گاہ ہے ،اگر آپ راستوں پر سو جائیں گے تو آنے جانے والوں کو تکلیف ہوگی،اس لیے راستہ سے ہٹ کر اپنے قیام و آرام کا انتظام کرو۔

اب اگر کوئی یوں کہے کہ ہمارا پورا قافلہ ہے،اس لیے کسی اور کا آنے جانے کا امکان ہی نہیں ہے۔تو نبی کریم (ﷺ) فرماتے ہیں کہ ان راستوں سے جس طرح انسان گزرتے ہیں اسی طرح یہ راستے جانوروں کی بھی گزر گاہ ہے،اور زمین میں جو کیڑے مکوڑے ہوتے ہیں وہ بھی وہیں سے گزرتے ہیں۔اس لیے جب راستوں سے ہٹ کر قیام کروگے تو ان کی تکلیفوں سے بھی بچ سکو گے۔

نماز فوت ہونے کا اندیشہ ہو؛ تو کیسے سوئے؟:

حدیث ۹۶۳:-

وعن أبي قتادة رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صلى الله عليه وسلم) إِذَا كَانَ فِي سَفَرٍ، فَعَرَّسَ بِلَيْلٍ اضْطَجَعَ عَلَى يَمِينِهِ، وَإِذَا عَرَّسَ قُبَيْلَ الصُّبْحِ نَصَبَ ذِرَاعَهُ، وَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلَى كَفِّهِ. (رواه مسلم)

قَالَ العلماءُ: إِنَّمَا نَصَبَ ذِرَاعَهُ لِئَلاَّ يَسْتَغْرِقَ فِى النَّوْمِ، فَتَفُوتَ صَلاَةُ الصُّبْحِ عَنْ وَقْتِهَا أَوْ عَنْ أَوَّلِ وَقْتِهَا.

ترجمہ:- حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سفر میں ہوتے اور رات کو کہیں قیام فرماتے؛ تو داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے (جیسا کہ سونے کا ادب اور مسنون طریقہ ہے) اور اگر صبح سے کچھ پہلے کہیں اترتے اور قیام فرماتے تو اپنے بازو اور کلائی کو کھڑا کر کے اپنی ہتھیلی پر سر رکھ کر لیٹتے (یعنی پورے لیٹ کر نہیں سوتے تھے)

افادات:- مثلاً فجر میں ایک گھنٹہ باقی ہے، اگر آپ اچھی طرح پڑ کر سو جائیں گے، تو رات بھر تو سفر کیا تھا، نتیجہ یہ ہوگا کہ نماز فوت ہو جائے گی، یا قضاء ہو جائے گی، لہٰذا اگر اس وقت سونا ہی ہے تو ایسی نیند جو گہری ہو اور جس میں غفلت طاری ہو جائے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ طریقہ بتلایا ہے، اس طرح سونے سے غفلت کی نیند نہیں ہوگی اور نماز کے فوت ہونے سے حفاظت ہو جائے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اگر کسی ایسے وقت سونے کا ارادہ کر رہا ہو کہ دیر سے جاگنے کی وجہ سے نماز کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، تو ایسی کوئی شکل اختیار کرنی چاہیے کہ نماز فوت نہ ہو۔ اس لیے ایک شکل تو یہ ہے اگر سب کو لیٹ کر ہی سونا ہے تو اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک کو- جس کے متعلق اطمینان ہو- جاگنے کے لیے مقرر کر دیا جائے کہ صبح صادق ہوتے ہی سب کو جگا دینے کی تمہاری ذمہ داری ہے، تاکہ سب لوگ وقت پر نماز پڑھ لیں۔

جب حضور اکرم (ﷺ) کی نماز قضا ہوئی:

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) جب غزوۂ خیبر سے لوٹ رہے تھے تو فجر سے کچھ پہلے آپ نے قیام فرمایا، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مقرر کر دیا کہ سب کو جگانے کی ذمہ داری تمہاری رہے گی، اور سب سوگئے۔ فجر میں زیادہ دیر نہیں تھی گھنٹہ دو گھنٹہ ہوں گے۔ اب حضرت بلال رضی اللہ عنہ بجائے سونے کے کجاوے سے اپنی کمر لگا کر مشرق کی طرف جہاں سے فجر کی روشنی نمودار ہوتی ہے چہرہ کر کے بیٹھ گئے کہ جیسے ہی صبح کی روشنی نمودار ہو گی تو مَیں سب کو اٹھا دوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر تھا اس لیے وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئے، اور ایسے سوئے کہ سورج نکل گیا اور دھوپ تیز ہونے لگی لیکن ان کی آنکھ نہیں کھلی۔ سب سے پہلے نبیٔ کریم (ﷺ) اُٹھے، آپ نے حضرت بلال کو آواز دی: بلال! کیا بات ہے؟ وہ کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! میری بھی آنکھ لگی رہ گئی۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا: اس جگہ سے ہٹو؛ یہ شیطان

کی جگہ ہے۔سب وہاں سے ہٹ کر دوسری جگہ گئے اور وضو کرکے جماعت کے ساتھ نمازادا فرمائی۔

(بخاری شریف. باب الصَّعِيدُ الطَّيِّبُ وَضُوءُ الْمُسْلِمِ يَكْفِيهِ مِنَ الْمَاءِ. حدیث نمبر:۳۳۱)

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اگر اخیری وقت میں سونا ہے تو آدمی ایسا انتظام کرکے سوئے کہ نماز فوت ہونے کی نوبت نہ آئے۔

رات کے وقت فاصلے لپیٹ دیئے جاتے ہیں:

حدیث ۹٦۴:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله (ﷺ): عَلَيْكُمْ بِالدُّلْجَةِ، فَإِنَّ الأَرْضَ تُطْوَى بِاللَّيْلِ. (رواه أبو داود بإسناد حسن) ((الدُّلْجَةُ)): السَّيْرُ فِي اللَّيْلِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم اندھیرے سے فائدہ اٹھاؤ؛اس لیے کہ رات کے وقت زمین لپیٹی جاتی ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ سفر کا کچھ حصہ رات کے اندھیرے میں بھی طے کرلینا چاہیے، اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے عجیب بات رکھی ہے کہ اندھیرے میں زمین لپیٹ دی جاتی ہے،سفر زیادہ کٹ جاتا ہے اور آسان ہو جاتا ہے۔

قیام قریب قریب کریں:

حدیث ۹۶۵:-

وعن أبي ثَعلَبَةَ الخُشَنِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ النَّاسُ إِذَا نَزَلُوا مَنْزِلاً تَفَرَّقُوا فى الشِّعَابِ وَالأَوْدِيَةِ. فَقَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم): إِنَّ تَفَرُّقَكُمْ فِي هذِهِ الشِّعَابِ وَالأَوْدِيَةِ إِنَّمَا ذلِكُمْ مِنَ الشَّيْطَانِ! فَلَمْ يَنْزِلُوا بَعْدَ ذَلِكَ مَنْزِلاً إِلاَّ انْضَمَّ بَعْضُهُمْ إِلَى بَعْضٍ. (رواه أبو داود بإسناد حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں) صحابہ جب سفر کے دوران کسی جگہ پر اترتے تھے تو گھاٹیوں اور وادیوں میں پھیل جاتے تھے (سب منتشر ہو جاتے تھے اور ہر ایک اپنا اپنا انتظام کر کے سونے کی جگہ کر لیتا تھا) تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تمہارا ان گھاٹیوں اور وادیوں میں منتشر و متفرق ہو جانا؛ یہ شیطان کا اثر ہے (یعنی ایسا مت کرو، بلکہ مل جُل کر رہو) حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اس ہدایت کے بعد حضراتِ صحابہ جب کہیں قیام کرتے تھے تو ایک دوسرے کے قریب قریب اور مل جُل کر ٹھہرا کرتے تھے۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سفر کے دوران کسی جگہ پر قیام کی نوبت آئے تو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ ایک آدمی یہاں ہے اور دوسرا اپنا سامان اور تھیلا لے کر دوسرے کونہ میں چلا گیا، اور تیسرا اس سے آدھے فرلانگ دور جا کر پڑا ہوا ہے؛ بلکہ سب قریب رہیں، تاکہ سب ایک دوسرے کی مدد کو پہنچ سکیں۔

رحمتِ عالم (ﷺ) کی صفتِ رحمت کا ایک نمونہ:

حدیث ٩٦٦:-

عن سهل بن عمرو - وقيل: سهل بن الربيع بن عمرو الأنصاري المعروف بابن الحنظلِيَّة، وَهُوَ من أهل بيعة الرِّضْوَانِ رضی اللہ عنہ قَالَ: مَرَّ رسولُ الله (ﷺ) بِبَعِيرٍ قَدْ لَحِقَ ظَهْرُهُ بِبَطْنِهِ، فَقَالَ: اتَّقُوا الله في هذِهِ البَهَائِمِ المُعجَمَةِ، فَارْكَبُوهَا صَالِحَةً، وَكُلُوهَا صَالِحَةً. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت سہل بن عمرو المعروف بابن الحنظلیہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور وہ اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) ایک اونٹ کے پاس سے گزرے جس کی پیٹھ پیٹ سے مل چکی تھی (یعنی بہت دبلا ہوگیا تھا۔ اس کے مالک نے اس کو کھانا پینا برابر نہیں دیا ہوگا) تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ان گونگے اور بے زبان جانوروں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور ان پر سواری بھی کرو تو ایسی حالت میں کہ وہ سواری کے لائق ہوں، اور ان کو کھاؤ تو ایسی حالت میں کہ وہ کھانے کے لائق ہوں۔

افادات:- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ میں سب سے اونچا مرتبہ اصحابِ بدر کا ہے، ان کے بعد دوسرے نمبر پر اہلِ بیعتِ رضوان کا ہے، اسی لیے محدثین کی بھی یہ عادت رہی ہے کہ کوئی صحابی بدری، یا اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہوتا ہے؛ تو اس کے نام کے ساتھ عام طور پر اس کا بھی تذکرہ کر دیتے ہیں۔

ارشادِ نبوی کا مطلب یہ ہے کہ ان کو برابر کھلاؤ پلاؤ، تاکہ وہ ہٹے کٹے رہیں ، اور ایسی حالت میں ان پر سواری کرو۔ اور اگر کھانا ہو تب بھی ان کو کھلا پلا کر ہٹے کٹے بناؤ، پھر ذبح کر کے کھاؤ۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اتنا دبلا پتلا ہو جائے کہ اِدھر سے سوئی ڈالو تو اُدھر نکل جائے، اور صرف ہڈی اور چمڑا رہ گیا ہے؛ پھر کاٹ کر کھاؤ۔

اسلام نے جانوروں کا بھی حق بتایا ہے۔ جو جانور کا مالک ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے حقوق کو ادا کرے۔ آپ نے سنا ہو گا مشہور روایت ہے کہ ایک عورت نے بلی پال رکھی تھی، اس کو چھوڑتی بھی نہیں تھی کہ وہ اپنے طور پر اپنی غذا تلاش کر لیتی، اور اس کے کھانے پینے کا بھی برابر انتظام نہیں کیا تھا، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے اس کو جہنم میں ڈالا۔

(بخاری شریف: بابُ فَضْلِ سَقْيِ الْمَاءِ)

اور ایک فاحشہ عورت نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلایا اس پر اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرما دی، اور اس کو جنت میں داخل کیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے اسی موقعہ پر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا تھا: "يَا رَسُولَ اللهِ! وَإِنَّ لَنَا فِي الْبَهَائِمِ أَجْرًا؟" ان جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر بھی ہمیں اجر و ثواب ملے گا؟ تو نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: "فِي كُلِّ ذَاتِ كَبِدٍ رَطْبَةٍ أَجْرٌ" ہر تر جگر والے یعنی جاندار کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے پر ثواب ملے گا (بخاری شریف: باب رَحْمَةِ النَّاسِ وَالْبَهَائِمِ)

اگر کتے کو بھی پانی پلاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اجر دے گا۔

نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں اونٹ کی فریاد:

حدیث ۹۶۷:-

وعن أَبي جعفر عبد الله بن جعفر رضی اللہ عنہما قَالَ: أردفني رسولُ الله (ﷺ) ذَاتَ يَوْمٍ خَلْفَهُ، وَأَسَرَّ إِلَيَّ حَدِيثاً لا أُحَدِّثُ بِهِ أحداً مِنَ النَّاسِ، وَكَانَ أحَبَّ مَا اسْتَتَرَ بِهِ رسولُ الله (ﷺ) لِحَاجَتِهِ هَدَفٌ أَوْ حَائِشُ نَخْلٍ. يَعنِي: حَائِطَ نَخْلٍ. (رواه مسلم هكَذَا مُختصراً)

وزادَ فِيهِ البَرْقَانِي بإسنادِ مسلم - بعد قَوْله: حَائِشُ نَخْلٍ - فَدَخَلَ حَائِطاً لِرَجُلٍ مِنَ الأَنْصَارِ، فَإذا فِيهِ جَمَلٌ، فَلَمَّا رَأَى رَسولَ الله (ﷺ) جَرْجَرَ وذَرَفَتْ عَيْنَاهُ، فَأَتَاهُ النَّبِيُّ (ﷺ)، فَمَسَحَ سَرَاتَهُ - أيْ: سِنَامَهُ - وَذِفْرَاهُ فَسَكَنَ، فَقَالَ: مَنْ رَبُّ هَذَا الجَمَلِ؟ لِمَنْ هَذَا الجَمَلُ؟ فَجَاءَ فَتَىً مِنَ الأَنْصَارِ، فَقَالَ: هَذَا لِي يَا رسولَ الله. قَالَ: أفَلاَ تَتَّقِي اللهَ في هذِهِ البَهِيمَةِ الَّتي مَلَّكَكَ اللهُ إيَّاهَا؟ فَإنَّهُ يَشْكُو إلَيَّ أنَّكَ تُجِيعُهُ وتُدْئِبُهُ.

(رواه أَبُو داود برواية البرقاني)

قَوْله ((ذِفْرَاهُ)): هُوَ بكسر الذال المعجمة وإسكان الفاءِ، وَهُوَ لفظ مفرد مؤنث. قَالَ أهل اللغة: الذِّفْرى: الموضع الَّذِي يَعْرَقُ مِنَ البَعِيرِ خَلف الأُذُنِ، وَقوله: ((تُدْئِبُهُ)) أيْ: تتعبه.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ایک روز مجھے اپنے پیچھے بٹھالیا، اور ایک بات بطورِ راز کے مجھ سے ارشاد فرمائی جو میں کسی کو نہیں بتلاؤں گا۔ اور نبی کریم (ﷺ) جب قضائے حاجت کے لیے تشریف لے جاتے تھے تو کسی آڑ والی جگہ میں جانا پسند فرماتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی آپ ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے تو ایک اونٹ کو دیکھا۔ جب اس اونٹ نے نبی کریم

(ﷺ) کو دیکھا تو وہ بڑ بڑایا (یعنی اس نے آواز نکالی) پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نبی کریم (ﷺ) اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کو سکون دلانے کے لیے اس کی کوہان اور کان کے پچھلے حصہ پر آپ نے ہاتھ پھیرا جس سے وہ مطمئن ہو گیا اور اس نے رونا بند کر دیا۔ پھر آپ نے پوچھا: اس اونٹ کا مالک کون ہے؟ ایک انصاری نوجوان آگے بڑھا اور کہا: اے اللہ کے رسول! یہ اونٹ میرا ہے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: ان جانوروں کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ سے نہیں ڈرتے جن کا اللہ تعالیٰ نے تمہیں مالک بنایا ہے؟ یہ اونٹ مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ تو اسے بھوکا رکھتا ہے اور (کام کرنے میں) تھکا دیتا ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) کے مشابہ صحابی:

افادات:- یہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب ہیں۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نبی کریم (ﷺ) کے چچازاد بھائی ہیں، ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اور وہاں مسلمانوں کے سردار تھے، پھر فتحِ خیبر کے موقعہ پر وہاں سے مسلمانوں کی جماعت کو لے کر لوٹے، اور غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ ہیں، یہ بھی صحابی ہیں اور شکل وشباہت میں نبیٔ کریم (ﷺ) کے بہت زیادہ مشابہ تھے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ ان کو نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنی سواری پر پیچھے سوار فرمالیا۔ اس باب کے عنوان میں ایک بات یہ بھی آئی تھی کہ اگر سواری کے جانور میں ایک سے زیادہ سوار کا بوجھ برداشت کرنے کی طاقت ہو تو دوسرے کو بھی اپنے ساتھ سوار کر سکتے ہیں۔

اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے جانور سے بھی اس کی طاقت کے مطابق کام لینا چاہیے، وقت پر اس کو کھانا دینا چاہیے۔ اب ذرا سوچو کہ جانور کو کھانا نہ دینے پر یہ تنبیہ فرمائی جارہی ہے؛ تو جو لوگ اپنے بیوی بچوں کے کھانے پینے کا انتظام نہیں کرتے اور قصداً اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں ؛ ان کے لیے کیا وعید ہوگی!

منزل پر پہنچتے ہی سواری سے سامان اتاردو:

حدیث ۹۶۸:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا إِذَا نَزَلْنَا مَنْزِلاً، لاَ نُسَبِّحُ حَتَّى نَحُلَّ الرِّحَالَ. (رواه أبو داود بإسناد على شرط مسلم)

وَقَوْلُه: ((لا نُسَبِّحُ)): أيْ لاَ نُصَلِّي النَّافِلَةَ، ومعناه: أنَّا - مَعَ حِرْصِنَا عَلَى الصَّلاَةِ - لا نُقَدِّمُهَا عَلَى حَطِّ الرِّحَالِ وَإرَاحَةِ الدَّوَابِّ.

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم جب کسی جگہ اترتے تھے تو نماز شروع نہیں کرتے تھے جب تک کہ کجاوے نہ کھول دیں (یعنی پہلے کجاوے کھول کر اونٹوں کو فارغ کر دیتے تھے۔)

افادات:- اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے کہ سواری کے جانور کے اوپر اگر کچھ بوجھ ہے، تو جب اپنی منزل پر پہنچو؛ تو پہلا کام یہ کرو کہ اس کے اوپر سے بوجھ اتار دو، تاکہ وہ فارغ ہو کر ہلکا ہو جائے اور اس کو سکون ہو جائے۔ اگر اس کے اوپر بوجھ لادا ہوا ہے، اور آپ لوگوں سے

مصافحہ اور ملاقاتیں کررہے ہیں ، نماز پڑھ رہے ہیں ؛ تو یہ طریقہ صحیح نہیں ہے،اور یہ بات اپنی منزل پر پہنچ جانے کی ہے ،درمیانِ سفر کی نہیں ہے

اس روایت سے معلوم ہوا کہ سواری کے جانور پر بوجھ لادا ہوا ہونے کی حالت میں دوسرے کاموں میں مشغول نہیں ہونا چاہیے،اس لیے کہ یہ جانور کو تکلیف دینے والی بات ہے، اس کو شریعت نے پسند نہیں کیا۔اور یہ بھی آداب میں سے ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب إعانة الرفيق

ساتھی کی مدد کرنا

سفر کے آداب کا سلسلہ چل رہاہے۔ عنوان ہے:" بابِ إِعَانَةِ الرَّفِيْق" سفر کے ساتھی اور رفقاء کی مدد کرنا۔ مطلق مدد کے سلسلہ میں ایک روایت پہلے بھی گزر چکی ہے جس میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ ارشاد فرمایا کہ: جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگاہوا ہوتا ہے تب تک اللہ تعالیٰ اس کی مدد میں ہوتے ہیں۔

سفر میں ہر زائد چیز حاجت مند کودیدے:

حدیث ۹۶۹:-

وعن أَبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ فِي سَفَرٍ إِذْ جَاءَ رَجُلٌ عَلَى رَاحِلَةٍ لَهُ، فَجَعَلَ يَصْرِفُ بَصَرَهُ يَمِيناً وَشِمَالاً، فَقَالَ رسولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم): مَنْ كَانَ مَعَهُ فَضْلُ ظَهْرٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لاَ ظَهْرَ لَهُ، وَمَنْ كَانَ لَهُ فَضْلُ زَادٍ فَلْيَعُدْ بِهِ عَلَى مَنْ لاَ زَادَ لَهُ. فَذَكَرَ مِنْ أَصْنَافِ المَالِ مَا ذَكَرَهُ، حَتَّى رَأَيْنَا، أَنَّهُ لاَ حَقَّ لأَحَدٍ مِنَّا فِي فَضْلٍ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک سفر میں تھے ایک آدمی اپنی اونٹنی کے اوپر سوار آیا اور اپنی نگاہیں دائیں بائیں پھیرنے لگا(ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ضرورت مند تھا اور کسی ایسے آدمی کو تلاش کر رہا تھا جو اس کی مدد کرے) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس کے پاس زائد سواری ہو، وہ ایسے آدمی کو دیدے جس کے پاس سواری نہ ہو (مثلاً: کسی کے پاس دو اونٹ یا دو گھوڑے ہوں،وہ) اپنے رفقاء میں جس کے پاس سواری نہیں ہے اس کو دیدے،اور اگر کسی کے پاس توشہ زائد ہو تو اپنے ایسے بھائی کو دیدے جس کے پاس توشہ نہ ہو (حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ) اس موقعہ پر صرف سواری اور توشہ کا تذکرہ نہیں فرمایا، بلکہ سفر میں ضرورت کی جتنی چیزیں ہوا کرتی ہیں ان سب کا اسی انداز میں تذکرہ فرمایا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس اندازِ گفتگو سے ہمیں ایسا اندازہ ہوا کہ جس کسی کے پاس جو بھی چیز زائد ہے اس میں اس کا کوئی حق ہے ہی نہیں۔

افادات:- جیسے: جس کے پاس پانی زیادہ ہو،وہ اس کو دے جس کے پاس پانی نہیں ہے، اگر برتن زائد ہوں تو وہ اپنے بھائی کو دے جس کے پاس برتن نہیں ہیں،اگر کپڑے زائد ہوں تو وہ اپنے اس بھائی کو دے جس کے پاس کپڑے نہیں ہیں ، اگر جوتے زائد ہوں تو وہ اپنے اس بھائی دیدے جس کے پاس جوتے نہیں ہیں۔اس ارشاد سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) گویا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جس کے پاس جو چیز بھی زائد ہے وہ اس کو اپنے پاس رکھے نہ رہے ،بلکہ اپنا جو بھائی اس چیز کا ضرورت مند ہے اس کو دیدے۔ آدمی کو اپنا مزاج اسی نوع کا بنانا چاہیے۔اگر وہ چیز ہماری ضرورت میں استعمال ہوتی ہے تب تو ٹھیک ہے، لیکن جو چیز زائد ہو،اپنے استعمال کی نہ ہو تو

بہت سے ایسے بھائی مل جائیں گے جن کو اس چیز کی ضرورت ہے، اوران کے پاس نہ ہونے کی وجہ سے وہ تکلیف ومشقت میں مبتلاہیں ،خاص طور پر سفر میں اس بات کا اور زیادہ اہتمام ہوناچاہیے۔

دوسروں کا بھی خیال رکھے:

حدیث ۹۷۰:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ (ﷺ) :أَنَّهُ أَرَادَ أَنْ يَغْزُوَ، فَقَالَ : يَامَعْشَرَ الْمُهَاجِرِينَ وَالأَنْصَارِ ! إن مِنْ إِخْوَانِكُمْ قَوْماً ، لَيْسَ لَهُمْ مَالٌ، وَلاَ عَشِيرَةٌ، فَلْيَضُمَّ أَحَدُكُمْ إِلَيْهِ الرَّجُلَيْنِ، أَو الثَّلاَثَةَ، فَمَا لأَحَدِنَا مِنْ ظَهْرٍ يَحْمِلُهُ إِلاَّ عُقْبَةٌ كَعُقْبَةٍ، يَعْني أحدهم، قَالَ: فَضَمَمْتُ إِلَيَّ اثْنَيْنِ أَوْ ثَلاثَةً مَالِي إِلاَّ عُقْبَةٌ كَعقبة أحَدِهِمْ مِنْ جَمَلِي.

ترجمہ:-حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ایک مرتبہ کسی جہاد میں جانے کا فیصلہ کیا تو مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :اے مہاجرین اور انصار کی جماعت!تمہارے بھائیوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے پاس نہ مال ہے، نہ خاندان ہے (کہ خاندان والے ان کی مدد کریں)اس لیے تم میں سے جس کے پاس سواری ہو؛وہ ایسے دو یا تین آدمیوں کواپنے ساتھ ملالے۔راوی کہتے ہیں کہ ہم میں سے جن کے پاس سواری تھی ہم ان کوباری باری سوار کرلیتے تھے۔ چناں چہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ساتھ دویا تین ساتھیوں کو ملالیااور میرے اس اونٹ میں خود میرا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا میرے ان ساتھیوں کا تھا(یعنی جتنی دیر وہ سوار ہوتے تھے اتنی ہی دیر میں بھی سوار ہوتا تھا۔ ایسا نہیں کہ سواری کا مالک ہونے کی حیثیت سے مَیں اپنے لیے سواری کا حق زیادہ رکھوں)

افادات:- ظاہر ہے کہ جہاد میں جانے کے لیے توشہ، سواری، ہتھیار اور جو چیزیں اس سے تعلق رکھتی ہیں ان کی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے، اور جو لوگ جہاد میں شرکت کرنا چاہتے ہیں، ان میں بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس سواری نہیں ہوتی، بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کے پاس توشہ نہیں ہوتا، بہت سوں کے پاس ہتھیار نہیں ہوتے؛ ایسے موقعہ پر نبی کریم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ جہاد میں جانے سے پہلے لوگوں کو مدد کرنے کی ترغیب دیتے تھے۔ جیسے غزوۂ تبوک کے موقعہ پر بڑی تنگی کا وقت تھا تو نبی کریم ﷺ نے لوگوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کی ترغیب دی کہ جو لوگ اللہ کے راستہ میں جہاد میں جارہے ہیں، ان کو دو؛ تاکہ جو لوگ نادار ہوں ان کو دے کر ان کو بھی جہاد کے لیے تیار کیا جائے۔

☑ **"ہم میں سے جن کے پاس سواری تھی ہم ان کو باری باری سوار کرلیتے تھے"** جیسے غزوۂ بدر کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ جس اونٹ پر سوار ہوتے تھے اس پر اور دو صحابی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کو باری باری سوار فرمالیا کرتے تھے۔

امیر ہر رفیق کی فکر کرے:

حدیث ۹۷۱:-

وعنه، قَالَ: كَانَ رسول الله ﷺ يَتَخَلَّفُ فِى المَسِير، فَيُزْجِى الضَّعِيف، وَيُرْدِفُ وَيَدْعُو لَهُ. (رواه أبو داود بإسناد حسن)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سفر میں پیچھے رہ جاتے اور (جو) کمزور (پیچھے رہ جاتا اس کو) آگے بڑھاتے اور جس کی سواری کام نہ کررہی ہوتی، اس کو اپنے پیچھے بٹھالیتے تھے، اور اس کے لیے دعا بھی فرمادیتے تھے۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو امیر ہو، اس کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اپنے رفقاء میں سے کوئی پیچھے نہ رہ جائے، اور اگر کوئی اپنی کمزوری کی وجہ سے پیچھے رہ جاتا ہو، تو جب تک اس کو آگے نہ بڑھادے، وہاں تک امیر خود آگے نہ بڑھے۔ مطلب یہ ہے کہ سفر کے دوران اپنے رفقاء اور ساتھیوں کے ساتھ تعاون کا معاملہ ہونا چاہیے۔ اپنا سامان اگر چڑھادیا ہے تو اپنے ساتھیوں کا سامان رکھنے میں ان کی مدد کرنی چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب ما یقول اذا رکب الدابۃ للسفر

سفر میں جب اپنی سواری پر سوار ہونے لگے؛ تو کیا دعا پڑھے؟

قَالَ اللہ تَعَالَی:وَجَعَلَ لَكُمْ مِنَ الْفُلْكِ وَالأَنْعَامِ مَا تَرْكَبُونَ لِتَسْتَوُوا عَلَى ظُهُورِهِ ثُمَّ تَذْكُرُوا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ إِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ وَتَقُولُوا سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ. (الزخرف: آیت نمبر:-۱۳،۱۲)

باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے کشتیاں، چوپائے اور مویشی پیدا کیے جن پر تم سواری کرتے ہو، تاکہ جب تم ان کی پشت پر اچھی طرح سوار ہو جاؤ؛ تو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرو اور یہ دعا پڑھو: ﴿سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ﴾ (ترجمہ) پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارے لیے مسخر اور تابع کر دیا اور ہم اس کو اپنے قابو میں کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے (جیسے: گھوڑا، ہاتھی، اونٹ اور بیل یا جن جانوروں کو سواری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے ان کا جسم اس نوع کا بنایا ہے کہ

اگر وہ انسان کو ختم کرنا چاہیں تو بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو انسانوں کے لیے ایسا مسخر کر دیا ہے کہ انسان اپنے فائدہ کے لیے جس طرح چاہتا ہے ان کو استعمال کرتا ہے۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی ہے اور یہ ایک نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو عطا فرمائی ہے۔)

﴿وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ﴾ اور (جس طرح اس وقت ہم ایک سفر میں روانہ ہو رہے ہیں اسی مناسبت سے آخرت کی یاد دلائی کہ ایک بہت بڑا سفر آخرت کا درپیش ہے اس کو یاد کرو کہ) ہم ایک دن ہمارے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں (گویا سفر کے موقع پر آدمی یہ بھی یاد رکھے۔)

حدیث ۹۷۲:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) كَانَ إِذَا اسْتَوَى عَلَى بَعِيرِهِ خَارِجاً إِلَى سَفَرٍ، كَبَّرَ ثَلاثاً، ثُمَّ قَالَ: سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ، وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ. اللّٰهُمَّ إنا نسألك فى سفرنا هذا البرّ والتّقوى، ومنَ العملِ ما ترضى، اللّٰهُمَّ هَوِّن عَلَيْنَا سَفَرَنَا هَذَا، وَاطْوِ عَنَّا بُعْدَهُ. اللّٰهُمَّ أَنْتَ الصَّاحِبُ فى السَّفَرِ، والخَلِيفَةُ فى الأَهْلِ. اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ المَنْظَرِ، وَسُوءِ المُنْقَلَبِ فى المالِ وَالأَهْلِ وَالوَلَدِ. وَإِذَا رَجَعَ قَالَهُنَّ وَزَادَ فِيهِنَّ: آيِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ. (رواه مسلم)

مَعْنَى ((مُقْرِنِينَ)): مُطِيقِينَ. وَ((الوَعْثَاءُ)) بفتحِ الواوِ وإسكان العين المهملة وبالثاء المثلثة وبالمد وَهِيَ: الشِّدَّةُ. وَ((الكَآبَةُ)) بِالمَدِّ، وَهِيَ: تَغَيُّرُ النَّفْسِ مِنْ حُزْنٍ وَنَحْوِهِ. وَ((المُنْقَلَبُ)): المَرْجِعُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب سفر کے لیے تشریف لے جاتے اور اپنے اونٹ کے اوپر اچھی طرح بیٹھ جاتے تھے تو تین مرتبہ اللہ اکبر پڑھتے تھے، اور اس کے بعد یہ دعا پڑھتے:-(ترجمہ) پاک ہے وہ ذات جس نے اس جانور کو ہمارے لیے مسخر اور تابع کر دیا اور ہم اس کو اپنے قابو میں کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اور ہم ایک دن ہمارے رب کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ اے اللہ! ہم ہمارے اس سفر میں تجھ سے نیکی اور فرمانبرداری، اور گناہوں سے حفاظت کا سوال کرتے ہیں (یعنی نیک کام کی مجھے توفیق ہوتی رہے اور گناہوں سے بچتا رہوں) اور ایسے عمل کی توفیق ملے جس سے تو راضی ہو، اے اللہ! ہمارے اس سفر کو تو ہمارے لیے آسان کر دے، اور اس کی دوری کو ہمارے لیے لپیٹ دے (یہ سفر ایسا آسان کر دے کہ جلدی سے طے ہو جائے) اے اللہ! ہمارے اس سفر میں تو ہی ہمارا رفیق ہے، اور ہمارے گھر والوں کا تو ہی محافظ ہے (ہماری غیر موجودگی میں گھر والوں کی تو حفاظت کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ آدمی جب سفر میں جاتا ہے تو اس کو یہ بھی فکر ہوتی ہے کہ میری غیر موجودگی میں گھر میں پتہ نہیں کیا صورت پیش آئے گی؛ اس لیے اپنی غیر موجودگی میں اللہ تعالیٰ ہی سے محافظ بن جانے کی درخواست کی جا رہی ہے) اے اللہ! میں تجھ سے پناہ چاہتا ہوں سفر کی مشقت اور پریشانی سے (عام طور پر سفر میں تکلیف و پریشانی پیش آتی ہے، اس سے حفاظت کی دعا مانگی جا رہی ہے) اور برے منظر سے، اور برے لوٹنے سے مال میں، اور گھر میں اور اولاد میں (مطلب یہ ہے کہ اس سفر میں کوئی ایسی چیز پیش نہ آئے جو تکلیف دہ ہو۔ اور اسی طرح جب واپس لوٹوں تو گھر والوں میں مال و اولاد میں بھی کوئی بری چیز یا بری حالت دیکھنے کی نوبت نہ آئے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی سفر سے واپس لوٹتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ فلاں بیمار ہو گیا، فلاں کے

ساتھ یہ صورت پیش آئی؛ تو اس سے بھی پناہ چاہی گئی) جب نبی کریم (ﷺ) سفر سے واپس لوٹتے تھے تو اس وقت بھی ان کلمات کو پڑھتے تھے اور یہ اضافہ فرماتے تھے: ”آئِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ“ہم واپس لوٹ رہے ہیں، اور اپنے گناہوں سے توبہ کر رہے ہیں، اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی تعریف وحمد بیان کرتے ہیں۔

ان دعاؤں کا بھی اہتمام ہو

حدیث ۹۷۳:-

وعن عبد الله بن سَرجِسَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسول الله (ﷺ) إِذَا سَافَرَ يَتَعَوَّذُ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ، وَكَآبَةِ المُنْقَلَبِ، وَالْحَوْرِ بَعْدَ الكَوْنِ، وَدَعْوَةِ المَظْلُومِ وَسُوءِ المَنْظَرِ فِى الأَهْلِ وَالمَالِ. (رواہ مسلم)

هكذا هُوَ فى صحيح مسلم: ((الْحَوْرِ بَعْدَ الكَوْنِ)) بالنون، وكذا رواه الترمذى والنسائى. قَالَ الترمذى: وَيُرْوَى ((الكَوْرُ)) بالراءِ، وَكِلاهما لَهُ وجه.

قَالَ العلماءُ: ومعناه بالنون والراءِ جميعاً: الرُّجُوعُ مِنَ الاسْتِقَامَةِ أَوِ الزِّيَادَةِ إِلَى النَّقْصِ. قالوا: وِرواية الرَّاءِ مَأخُوذَةٌ مِنْ تَكْوِيرِ العِمَامَة وَهُوَ لَفُّهَا وَجَمْعُهَا ورواية النون، مِنَ الكَوْنِ، مَصْدَرُ كَانَ يَكُونُ كَوناً: إِذَا وُجِدَ وَاسْتَقَرَّ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) جب سفر کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے تھے سفر کی مشقت، اور لوٹنے کی تکلیف، حالات کی درستگی کے بعد تبدیلی پیدا ہو جانے سے (یعنی پہلے حالات ٹھیک ہوں اور پھر برائی آجائے) مظلوم کی بددعا سے (یعنی ایسا نہ ہو کہ سفر میں مجھ

سے کسی پر کوئی ایسی زیادتی ہو جائے کہ وہ بد دعا دیدے) اور برے منظر سے اپنے گھر والوں اور مال میں (یعنی سفر سے واپسی میں کوئی ایسی چیز دیکھنے کی نوبت آنے سے حفاظت کی دعا مانگی گئی)

افادات:- دیکھو! ہم سفر میں سہولت کے لیے اپنے طور پر جہاں بہت ساری تیاریاں کرتے ہیں؛ وہیں ان دعاؤں کا بھی خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ سفر کی سہولت اور مشقت، پریشانی اور تکلیف سے بچنے کے جتنے بھی اسباب آدمی اختیار کرتا ہے، ان تمام اسباب میں تاثیر ڈالنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے، اس لیے اصل تو یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ اسباب و وسائل پر اعتماد و بھروسہ کر کے نہ بیٹھے، چاہے کیسی ہی تیاریاں کیوں نہ کی ہوں، کیسے ہی سامان سہولت و راحت و آسانی کے آپ نے مہیا کیوں نہ کئے ہوں۔ اس کے باوجود ان پر اعتماد کرنے کے بجائے رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور سارا اعتماد اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت اور اس کے فضل و کرم پر ہو۔

سفر کی دعا پر مغفرت:

حدیث ۹۷۴:-

وعن عَلِي بن ربيعة، قَالَ: شهدت عليّ بن أَبي طالب رضی اللہ عنہ أُتِيَ بِدَابَّةٍ لِيَرْكَبَهَا، فَلَمَّا وَضَعَ رِجلَهُ فِي الرِّكَابِ، قَالَ: بِسْمِ اللهِ. فَلَمَّا اسْتَوَى عَلَى ظَهْرِهَا، قَالَ: الْحَمْدُ للهِ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ، وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ. ثُمَّ قَالَ: الحمْدُ للهِ، ثَلاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ قَالَ: اللهُ أَكْبَرُ، ثَلاثَ مَرَّاتٍ، ثُمَّ قَالَ: سُبْحَانَكَ إِنِّي ظَلَمْتُ

نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، ثُمَّ ضَحِكَ، فَقِيلَ: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! مِنْ أَيِّ شَيْءٍ ضَحِكْتَ؟ قَالَ: رَأَيْتُ النَّبِيَّ (ﷺ) فَعَلَ كَمَا فَعَلْتُ ثُمَّ ضَحِكَ، فَقُلْتُ: يَا رسول الله، مِنْ أَيِّ شَيْءٍ ضَحِكْتَ؟ قَالَ: ((إِنَّ رَبَّكَ تَعَالَى يَعْجَبُ مِنْ عَبْدِهِ إِذَا قَالَ: اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي، يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ غَيْرِي))

رواه أبو داود والترمذي، وقال: ((حديث حسن))، وفي بعض النسخ: ((حسن صحيح)). وهذا لفظ أبي داود.

ترجمہ:- حضرت علی بن ربیعہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھا، ان کے پاس سواری کا جانور لایا گیا تاکہ اس پر سوار ہوں، جب انہوں نے رکاب میں اپنا پاؤں رکھا تو بسم اللہ پڑھی (اس سے معلوم ہوا کہ آج کل اگر بس، ٹرین یا کسی بھی سواری پر سوار ہونے کے لیے آدمی جب اندر پاؤں رکھے؛ تو بسم اللہ پڑھنی چاہیے) اور جب اچھی طرح سوار ہوگئے تو یہ دعا پڑھی: "الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هَذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ، وَإِنَّا إِلَى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُونَ" اس کے بعد تین مرتبہ "الحمد للہ" پڑھا۔ اس کے بعد تین مرتبہ "اللہ اکبر" پڑھا۔ اس کے بعد پڑھا "سُبْحَانَكَ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ" (ترجمہ) اے اللہ! تیری ذات پاک ہے، میں نے گناہوں کے ذریعہ سے اپنے اوپر ظلم کیا ہے، تو میرے گناہوں کو معاف کر دے، اس لیے کہ تیرے سوا کوئی بھی گناہوں کو معاف نہیں کر سکتا۔ یہ دعا پڑھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ مسکرائے۔ ان سے پوچھا گیا کہ: آپ کس بات پر مسکرائے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: مَیں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو دیکھا کہ آپ نے اسی طرح کیا جیسا کہ میں نے ابھی کیا، اور پھر آپ بھی اسی طرح مسکرائے تھے، تو میں نے پوچھا تھا: اے اللہ کے رسول! آپ کیوں مسکرائے؟ تو حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا تھا: جب بندہ "اغْفِرْ لِي ذُنُوبِي" کہتا ہے (اے اللہ! تو میرے گناہوں کو معاف کر دے، تیرے سوا میری مغفرت کوئی نہیں کر سکتا) تو اللہ تعالیٰ بندے سے خوش ہوتے

ہیں اور فرماتے ہیں کہ:ہاں !میرا بندہ جانتا ہے کہ میرے علاوہ اس کے گناہوں کو کوئی معاف نہیں کر سکتا۔ (بس !خوش ہو کر اللہ تعالیٰ بندے کو معاف کر دیتے ہیں۔)

افادات:- یہ حضراتِ صحابہ کا کمالِ اتباع ہے۔ اور احادیث کو یاد رکھنے کا سب سے مضبوط طریقہ یہی ہے۔ دین کی جتنی بھی باتیں آدمی سنتا ہے ان کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس کے مطابق عمل کرے،جب کسی بات پر چند مرتبہ عمل کرے گا تو پھر وہ بات کبھی بھول نہیں سکتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب تكبير المسافرِ إِذَا صعد الثنايا وشبهها وتسبيحه إِذَا هبط الأودية ونحوها والنهي عن المبالغة برفع الصوتِ بالتكبير

مسافر دورانِ سفر جب کسی ٹیلہ یا اونچی جگہ پر چڑھے تو اللہ اکبر پڑھے اور جب نیچی جگہ اتر رہا ہو؛ تو سبحان اللہ کہے اور جب بھی کوئی ذکر کرے تو آہستہ آواز میں کرے

حدیث ۹۷۵:-

عن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنَّا إِذَا صَعِدْنَا كَبَّرْنَا، وَإِذَا نَزَلْنَا سَبَّحْنَا. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دورانِ سفر (کوئی بھی سفر ہو، حج وعمرہ کا، جہاد کا، یا تجارت کا ہو) جب ہم کسی اونچی جگہ پر چڑھتے؛ تو اللہ اکبر کہتے تھے، اور جب کسی نیچی جگہ پر اترتے تھے؛ تو سبحان اللہ کہتے تھے۔

افادات:- یہ بھی سفر کے آداب میں سے ہے۔ حج یا عمرہ کے لیے جاتے ہیں تو آپ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے جگہ جگہ پر "اللہ اکبر" لکھا ہوا دیکھا ہوگا، وہ ایسی ہی جگہ ہوتی ہے جہاں چڑھائی آتی ہے، اور کہیں "سبحان اللہ" لکھا ہوا ہوتا ہے، وہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں سے نیچے اترنا ہوتا ہے۔

حدیث ۹۷۶:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ (ﷺ) وجيُوشُهُ إِذَا عَلَوا الثَّنَايَا كَبَّرُوا، وَإِذَا هَبَطُوا سَبَّحُوا. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) اور آپ کے لشکر والے جب دورانِ سفر کسی اونچائی اور ٹیلہ وغیرہ پر چڑھتے تھے؛ تو اللہ اکبر پڑھتے تھے۔ اور جب کہیں نیچائی کی طرف اترتے تھے تو سبحان اللہ پڑھتے تھے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ سب کو کہنا چاہیے، کسی ایک کا کہنا سب کی طرف سے کافی نہیں ہے۔ ہر ایک کو دعاؤں اور تکبیرات کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حدیث ۹۷۷:-

وعنه قَالَ: كَانَ النَّبِى (صلى الله عليه وسلم) إِذَا قَفَلَ مِنَ الحَجِّ أَوِ العُمْرَةِ، كُلَّمَا أَوْفَى عَلَى ثَنِيَّةٍ أَوْ فَدْفَدٍ كَبَّرَ ثَلاثاً، ثُمَّ قَالَ: لاَ إِلهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ وَلَهُ الحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيءٍ قَدِيرٌ. آيِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، سَاجِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ، صَدَقَ اللهُ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الأَحْزَابَ وَحْدَهُ. (متفقٌ عَلَيهِ)

وفى رواية لمسلم: إِذَا قَفَلَ مِنَ الجيُوشِ أَوِ السَّرَايَا أَوِ الحَجِّ أَوِ العُمْرَةِ.

قَوْلُهُ: ((أَوْفَى)) أيْ: ارْتَفَعَ، وَقَوْلُه: ((فَدْفَدٍ)) هُوَ بفتح الفائَينِ بينهما دال مهملة ساكِنة، وَآخِرهِ دال أخرى وَهُوَ: ((الغَلِيظُ المُرْتَفِعُ مِنَ الأَرْضِ)).

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب حج یا عمرہ سے لوٹتے تھے، اور مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لشکر کے ساتھ جہاد سے لوٹتے تھے؛ تو(دورانِ سفر) جب کسی اونچی جگہ یا ٹیلہ کے اوپر آپ چڑھ رہے ہوتے تھے، تین مرتبہ ”اللہ اکبر“ پڑھتے تھے۔ اور پھر پڑھتے تھے: (ترجمہ) اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی یکتا اور تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، ساری حکومت اور ملک اسی کا ہے، اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ہم لوٹ رہے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع و توبہ کرتے ہیں، اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں، اللہ ہی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اور اللہ ہی کی حمد و ثناء بیان کرتے ہیں، اللہ نے اپنا وعدہ سچا کر دکھلایا، اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور تمام لشکروں کو تنِ تنہا شکست دی۔

افادات:- غزوۂ احزاب کے موقعہ پر اللہ تعالیٰ نے جو مدد فرمائی تھی، اسی کے نتیجہ میں تمام لشکر شکست کھا کر واپس لوٹے تھے، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی اس دعا میں اللہ تعالیٰ کی اسی مدد اور نعمت کا تذکرہ فرمایا ہے۔

حدیث ۹۷۸:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ : أَنَّ رجلاً قَالَ: يَا رسول الله ! إِنِّي أُرِيدُ أَنْ أُسَافِرَ فَأَوْصِنِي، قَالَ: عَلَيْكَ بِتَقْوَى اللهِ، وَالتَّكْبِيرِ عَلَى كُلِّ شَرَفٍ. فَلَمَّا وَلَّى الرَّجُلُ، قَالَ: أَللَّهُمَّ اطْوِ لَهُ الْبُعْدَ، وَهَوِّنْ عَلَيْهِ السَّفَرَ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے درخواست کی: اے اللہ کے رسول! میں سفر میں جارہا ہوں آپ مجھے نصیحت فرمائیے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اللہ کا تقویٰ، اس کا خوف اورڈر لازم پکڑو، اور ہر اونچی جگہ پر اللہ اکبر کہو۔ جب وہ چلا گیا تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا کی: اے اللہ! اس کی دوری لپیٹ لے، اور اس کے سفر کو آسان کردے

حدیث ۹۷۹:-

وعن أَبِي موسى الأشعرِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: كنّا مَعَ النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) في سَفَرٍ، فَكُنَّا إِذَا أَشْرَفْنَا عَلَى وَادٍ، هَلَّلْنَا وَكَبَّرْنَا وَارتَفَعَتْ أَصْوَاتُنَا، فَقَالَ النبيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم): يَاأَيُّهَا النَّاسُ! ارْبَعُوا عَلَى أَنْفُسِكُمْ، فَإِنَّكُمْ لاَ تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلاَ غَائِباً، إِنَّهُ مَعَكُمْ، إِنَّهُ سَمِيعٌ قَرِيبٌ. (متفقٌ عَلَيْهِ) ((ارْبَعُوا)) بفتحِ الباءِ الموحدةِ أيْ: ارْفُقُوا بِأَنْفُسِكُمْ.

ترجمہ:- حضرت اَبوموسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک سفر میں تھے (غزوۂ خیبر سے واپسی کا قصہ ہے) جب ہم کسی وادی میں اونچائی پر چڑھتے ؛تو ”لاالٰہ الاّ اللہ و اللہ اکبر“ پڑھتے تھے (اس روایت میں ”لاالٰہ الاّ اللہ“ کا اضافہ ہوا) اور ہماری آوازیں بہت بلند ہوتی تھیں (ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو زحمت وتکلیف میں ڈالے بغیر معمول کے مطابق بلند آواز سے پڑھے ؛اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن ایسی بلند آواز جس میں خود پڑھنے

والا بھی مشقت میں پڑ جائے، جس کو ہمارے یہاں چلّانے سے تعبیر کرتے ہیں؛ تو اس کی اجازت نہیں ہے) تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اپنے اوپر نرمی اور آسانی کرو (معلوم ہوا کہ وہ لوگ آواز بلند کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ سے کام لے رہے تھے) تم ایسی ذات کو نہیں پکار رہے ہو جو بہری اور غائب ہو، بلکہ وہ تو تمہارے ساتھ ہے، سننے والی اور قریب ہے۔

افادات:- اس لیے کہ زور سے آواز لگانے کی ضرورت دو میں سے کسی ایک وجہ ہی سے پیش آتی ہے، یا تو جس کو پکار رہے ہیں وہ بہرہ ہے اس لیے زور سے اور عام معمول سے بلند آواز سے بولنے کی ضرورت پڑتی ہے، یا جس کو ہم پکار رہے ہیں وہ دور ہے، تو اگر ہم آہستہ یا عام معمول کے مطابق بولیں گے تو وہ سن نہیں پائے گا، اس لیے ہمیں ذرا بلند آواز سے بولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہو جو نہ دور ہے اور نہ بہرا ہے، بلکہ قریب ہے اور سننے والا ہے؛ اس لیے چلّانے کی ضرورت نہیں ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب استحباب الدعاء فی السفر

سفر میں دعا کا مستحب ہونا

مسافر کو چاہیے کہ سفر میں دعاؤں کا اہتمام کرے، اس لیے کہ قبولیت اور اجابتِ دعا کی جو حالت اور اوقات بتائے ہیں ، جیسے: لیلۃ القدر، جمعہ کے دن میں کوئی ایک ساعت اور گھڑی ایسی ہوتی ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے، افطار کا وقت۔اسی طرح بعض مقامات ہیں جہاں دعا قبول ہوتی ہے،جیسے: مطاف میں ،ملتزم پر، صفااور مروہ پر۔اسی طریقہ سے بعض حالات میں بھی دعا قبول ہوتی ہے، انہیں میں سے ایک حالت سفر کی بھی ہے، اس لیے سفر میں بھی دعا کا اہتمام کرنا چاہیے اوراس موقعہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔آدمی جب سفر میں ہوتا ہے توروزمرّہ کے جوکام ہوتے ہیں وہ بھی نہیں ہوتے،آدمی بالکل فارغ ہوتا ہے؛تو پڑھنے پڑھانے اور دعامیں مشغول رہنا چاہیے، بے کارچیزوں میں پڑنے سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ بعض لوگ سفر میں وقت گزارنے کے لیے گانے سنتے ہیں،اوردوسری لغویات میں مصروف رہتے ہیں،اورکہتے ہیں کہ ٹائم پاس کے لیے کچھ توہوناچاہیے۔اس لیے یہاں اس چیز کی طرف متوجہ کیا

گیا کہ دعا کا اہتمام کرے۔ویسے بھی یہ حالت دعا کی قبولیت کی ہے تو اپنے لیے ، اہل خاندان اور پوری امت کے لیے خوب دعائیں کرے۔

تین دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں :

حدیث ۹۸۰:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسولُ الله (صلى الله عليه وسلم): ثلاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لاَ شَكَّ فِيهِنَّ: دَعْوَةُ المَظْلُومِ، وَدَعْوَةُ المُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الوَالِدِ عَلَى وَلَدِهِ

رواه أبو داود والترمذی، وقال: ((حديث حسن)). وليس فی رواية أبي داود: ((عَلَى وَلَدِهِ))

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیؐ کریم (صلى الله عليه وسلم) نے ارشاد فرمایا: تین دعاؤں کے قبول ہونے میں کوئی شک اور تردّد نہیں۔ ۱: مظلوم کی دعا ۲: مسافر کی دعا ۳: باپ کی بد دعا اپنے بیٹے کے لیے۔

افادات:- ان تینوں حالتوں میں انکساری اور رجوع و انابت کی ایک خاص کیفیت پائی جاتی ہے:-

۱: مظلوم :- جس پر ظلم وزیادتی کی گئی ہو تو ظاہر ہے کہ ظلم کے نتیجہ میں اس کی طبیعت میں انکساری ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت کی کیفیت پائی جاتی ہے۔

۲: مسافر:- ظاہر ہے کہ گھر پر رہتے ہوئے جو آرام و راحت ، سکون و اطمینان اور چین ملتا ہے، وہ سفر میں نہیں ملتا، آدمی کچھ نہ کچھ تکلیف محسوس کرتا ہی ہے۔ سفر جتنی بھی راحت کا

ہو، طبیعت میں ایک طرح کی بے چینی اور بے کلی ہوتی ہے، اور یہی حالت اس کی دعا کو قبولیت سے زیادہ قریب کرنے والی ہے۔

۳: باپ:- ظاہر ہے کہ باپ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی اولاد کے لیے بد دعا نہیں کرسکتا، لیکن لامحالہ بیٹے کی طرف سے کوئی بہت زیادہ خطرناک صورت پائی گئی، اور کوئی ناروا معاملہ کیا گیا، جس کی وجہ سے وہ بد دعا کرنے پر مجبور ہوا۔

لیکن مسافر کی دعا قبول ہونے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی روزی اور اس کا لباس حلال ہو۔ اس لیے کہ حدیثِ پاک میں ہے({ FR 2039 }) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی پراگندہ بال اور غبار آلود چہرے والا آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاکر دعا کرتے ہوئے "یاربّ، یاربّ" کہتا ہے، لیکن اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام؛ اس کی دعا کہاں قبول ہو سکتی ہے؟ اس لیے مسافر کی دعا کے قبول ہونے کے واسطے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اس کی غذا حلال ہو، لیکن مظلوم اور باپ کے لیے یہ شرط نہیں ہے۔

باب ما یدعو به اذا خاف الناس او غیرھم

جب کسی سے خطرہ ہو تو کیا دعا پڑھے:

دورانِ سفر ایسے حالت بھی پیش آتے ہیں جن میں کسی کی طرف سے خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہم پر حملہ نہ کردے، خاص کر کہ اُس زمانہ میں سفر مامون و محفوظ نہیں ہوتا تھا، سامان لوٹ لیے جانے کا اندیشہ رہتا تھا، قافلوں پر حملے ہوتے رہتے تھے، جان ومال کا خطرہ رہتا تھا، تو اگر کسی کی طرف سے خطرہ محسوس کرے تو اس صورت میں دعا کے کیا الفاظ استعمال کرنے چاہئیں؛ اس باب میں اس کو بتلاتے ہیں۔

حدیث ۹۸۱:-

عن أَبِي موسىٰ الأشعرِيِّ رضی اللہ عنہ **أَنَّ رسولَ الله** (ﷺ) **كَانَ إِذَا خَافَ قَوْماً، قَالَ: أَللَّهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِي نُحُورِهِمْ، وَنَعُوذُبِكَ مِنْ شُرُورِهِمْ. (رواہ أبو داود والنسائی بإسنادٍ صحیحٍ)**

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم (ﷺ) کسی قوم (یا جماعت) کی طرف سے خطرہ محسوس کرتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: (ترجمہ) یا اللہ! ہم تیری ہی ذات کو ان کے مقابلہ میں کردیتے ہیں اور ان لوگوں کے شر سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔

افادات:-یہ دعا جنگ کے موقعہ کے ساتھ خاص نہیں ہے، کسی سے بھی کوئی خطرہ ہو، جیسے: سرکاری اہلکاروں کی طرف سے خطرہ ہو، یا کسی اور کی طرف سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو؛ تو ایسے موقعہ پر یہ دعا پڑھی جاسکتی ہے۔ اور سامنے کوئی غیر مسلم ہی ہو یہ بھی ضروری نہیں، بلکہ کسی مسلمان کی طرف سے جان، مال، عزت و آبرو کا کوئی خطرہ ہو تو اس موقعہ پر بھی یہ دعا پڑھ کر حفاظت مانگی جاسکتی ہے۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی کے اندر لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب تقسیمِ ملک کے وقت دہلی میں فسادات ہوئے، تو بابو ایاز صاحب (تبلیغی پرانے احباب واقف ہوں گے کہ نظام الدین مرکز بنگلہ والی مسجد کے دروازے سے بالکل لگ کر جو ہوٹل تھا، وہ انہیں کا تھا۔ آج کل تو وہ سب ٹوٹ کر نیا بن گیا ہے) بنگلہ والی مسجد میں مقیم حضرات کے لیے سودا لینے کے واسطے جاتے تھے، حالات بڑے کشیدہ تھے، اور آپس میں بہت مار کٹائی ہو رہی تھی، خاص کر مسلمانوں کو سکھوں کی طرف سے بہت ضرر پہنچ رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ تانگہ میں آرہے تھے، تو اسی میں کچھ سکھ بھی بیٹھے ہوئے تھے، وہ ان کو دیکھ کر کہنے لگے: ہم تجھے قتل کر ڈالیں گے۔ یہ ان کو کہنے لگے: تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ ان کو یہی کہتے رہے اور یہ ان کو یہی جواب دیتے رہے، یہاں تک کہ نظام الدین آگیا اور یہ اطمینان سے اتر کر مسجد پہنچ گئے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ان سے فرمایا: تم نے اتنے اطمینان سے ان کو یہ جواب کیسے دیا؟ تو انھوں نے کہا: مَیں نے یہ دعا سن

رکھی تھی، مَیں اسی کا ورد کررہاتھا، اور مجھے یقین تھا کہ اس دعا کی برکت سے وہ لوگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔

لہٰذا آدمی اگر یقین کے ساتھ ان چیزوں کو پڑھتا اور عمل کرتا ہے، تو فوری طور پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔اس لیے کسی بھی عمل کے اثر کے ظاہر ہونے میں جو کمی ہوتی ہے، اس میں ہمارے ہی کسی قصور و کوتاہی کو دخل ہوتا ہے۔

باب ما يقول إذا نَزَلَ مَنْزِلاً

دورانِ سفر جب کہیں قیام کے لیے اترے؛ تو اس وقت کیا پڑھنا چاہیے؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پڑاؤ ڈالنے کی دعائیں:

حدیث ۹۸۲:-

عن خولة بنت حَكِيمٍ رضی اللہ عنہا قالت: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يَقُولُ: مَنْ نَزَلَ مَنْزِلاً ثُمَّ قالَ: أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ، لَمْ يَضُرَّهُ شَيْءٌ حَتَّى يَرْتَحِلَ مِنْ مَنْزِلِهِ ذٰلِكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب مسافر سفر کے دوران کسی منزل پر قیام کرے اور یہ پڑھے: اللہ تعالیٰ کے کامل کلمات کے ذریعہ میں پناہ حاصل کرتا ہوں ہر اس چیز کے شر سے جس کو اس نے پیدا کیا؛ تو جب تک اس منزل سے روانہ نہیں ہوگا وہاں تک کوئی چیز اس کو تکلیف نہیں دے گی۔

افادات:- اس لیے کہ نہیں معلوم اس جگہ قیام کے دوران کس کی طرف سے کیا افتاد، کیا تکلیف اور کیا ایذاء پیش آجائے، اس لیے ہر مخلوق کے شر سے پناہ چاہی گئی

ہر مسافر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کسی جگہ قیام کی نوبت آئے تو اس دوران اللہ تعالیٰ اس کو ہر افتاد، پریشانی اور ایذاء و تکلیف سے بچائے رکھے، کون مسافر ایسا ہو گا جس کا جی یہ نہ چاہتا ہو؟ تو اس کے لیے نبی کریم (ﷺ) نے بڑا آسان نسخہ بتادیا اور گارنٹی دے رہے ہیں، اطمینان دلا رہے ہیں کہ جب تک وہ وہاں سے روانہ نہیں ہو گا وہاں تک کوئی تکلیف اس کو پہنچنے والی نہیں۔

حدیث ۹۸۳:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: كَانَ رسول الله (ﷺ) إِذَا سَافَرَ فَأَقْبَلَ اللَّيْلُ، قَالَ: يَا أَرْضُ! رَبِّي وَرَبُّكِ اللهُ، أَعُوذُ بِاللهِ مِنْ شَرِّكِ وَشَرِّ مَا فِيكِ، وَشَرِّ مَا خُلِقَ فِيكِ، وَشَرِّ مَا يَدِبُّ عَلَيْكِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ أَسَدٍ وَأَسْوَدٍ، وَمِنَ الْحَيَّةِ وَالْعَقْرَبِ، وَمِنْ سَاكِنِ الْبَلَدِ، وَمِنْ وَالِدٍ وَمَا وَلَدَ. (رواه أبو داود)

وَ((الأَسْوَدُ)): الشَّخْصُ، قَالَ الْخَطَّابِيُّ: وَ((سَاكِنُ الْبَلَدِ)): هُمُ الْجِنُّ الَّذِينَ هُمْ سُكَّانُ الأَرْضِ. قَالَ: وَالْبَلَدُ مِنَ الأَرْضِ: مَا كَانَ مَأْوَى الْحَيَوانِ، وَإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ بِنَاءٌ وَمَنَازِلُ. قَالَ: وَيَحْتَمِلُ أَنَّ الْمُرَادَ: ((بِالْوَالِدِ)) إبليس: ((وَمَا وَلَدَ)): الشَّيَاطِينَ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) جب سفر کرتے اور رات آتی تو آپ (زمین کو مخاطب کرکے) فرماتے: اے زمین! میرا اور تیرا مالک اللہ ہے، مَیں اللہ کی پناہ حاصل کرتا ہوں تیرے شر سے، تیرے اندر جو چیزیں ہیں ان کے شر سے، تیرے اندر جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں (انسان، جانور) ان کے شر سے۔ اور وہ تمام جانور جو تیرے اوپر رینگتے اور چلتے ہیں ان کے شر سے۔

اور مَیں پناہ حاصل کرتاہوں شیر، اژدھے کے شر سے (جنگلوں اورویران جگہوں کے اندر اس زمانہ میں یہ چیز عام تھی)اورسانپ و بچھو سے اور اس بستی میں رہنے والوں سے ،اور والد واولاد سے۔

افادات:-"ساکن البلد "سے کیامرادہے؟علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ علامہ خطابیؒ کے حوالہ سے نقل فرماتے ہیں کہ:جہاں کوئی جاندار بستاہو،چاہے وہاں مکانات اور گھر نہ ہوں،لیکن کوئی بھی جانداروہاں آباد ہو؛اس کو عربی میں "**بلد**" سے تعبیر کرتے ہیں ۔علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں کہ کسی بھی آبادی میں جب آدمی ٹھہرتا ہے تووہاں جانوراور جنات وغیرہ رہتے ہی ہیں،توجو بھی وہاں آباد ہوں؛چاہے وہ جن ،شیاطین ہوں ،یااور جاندار ،سانپ بچھو،اژدہے،شیر وغیرہ ؛ ہر ایک کے شر سے پناہ مانگی جارہی ہے۔

"والد"سے مرادشیطان ہے،اور"ولد"سے اس کی اولادمرادہے(یعنی شیطان اور اس کی اولاد سے پناہ چاہی جارہی ہے۔)

دورانِ سفر ان ساری چیزوں کی طرف سےتکلیف اورایذاء پہنچ سکتی ہے،تو نبیٔ کریم ﷺ نےاپنی اس دعامیں ان تمام کوشامل فرمالیا۔اس دعا کا اہتمام کرنے سے آدمی ہر طرح کے شر سے محفوظ رہتا ہے، اس لیے ان دعاؤں کو بھی یاد کرنے کا اہتمام کرلینا چاہیے۔

باب استحباب تعجيل المسافر الرجوع إِلَى أهله إِذَا قضى حاجته

کام جب مکمل ہو جائے تو گھر لوٹنے میں جلدی کرنا چاہیے

آدمی سفر میں جائے اور سفر کی ضرورت پوری ہو جائے، جس کام کے لیے گیا تھا وہ پورا ہو جائے؛ تو اب جلدی سے گھر لوٹ آنا چاہیے، وہاں پڑا نہ رہے، اس لیے کہ سفر تو ایک عارضی حالت ہے، اصل حالت تو حضر اور قیام ہی کی ہے، اس لیے ضرورت کے پیشِ نظر ایک عارضی حالت اختیار کی گئی تھی، جب ضرورت پوری ہو گئی تو اب آدمی کو چاہیے کہ اپنے گھر لوٹ جائے۔

حدیث ۹۸۴:-

عن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله (ﷺ) قَالَ: السَّفَرُ قِطْعَةٌ مِنَ العَذَابِ، يَمْنَعُ أَحَدَكُمْ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ وَنَوْمَهُ، فَإِذَا قَضَى أَحَدُكُمْ نَهْمَتَهُ مِنْ سَفَرِهِ، فَلْيُعَجِّلْ إِلَى أَهْلِهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ) ((نَهْمَتُهُ)): مَقْصُودُهُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے (یعنی آدمی کو دورانِ سفر مشقتیں، تکالیف اور دشواریاں پیش آتی ہی ہیں) آدمی کے کھانے پینے اور اس کی نیند سے رکاوٹ بنتا ہے، اس لیے جس مقصد کے لیے سفر کیا تھا وہ پورا ہو جائے تو آدمی کو چاہیے کہ جلدی سے گھر لوٹ جائے۔

افادات:- سفر میں کھانا نصیب توہوتا ہے لیکن جس اطمینان وسکون سے اور جس طرح طبیعت ومزاج کے مطابق گھر پر رہ کر آدمی کھانے پینے اور نیند کی ضرورت پوری کر سکتا ہے؛ دورانِ سفر ایسا موقعہ نصیب نہیں ہوتا، اور سفر کیسا ہی آرام دہ کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں کبھی نہ کبھی پریشانی ہوتی ہی ہے، کھانے میں وہ لطف نہیں ملتا، جو گھر پر رہ کر ملتا ہے۔ گویا سفر آدمی کی ان بنیادی ضرورتوں کے پورا ہونے میں رکاوٹ کا سبب بنتا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ ایک طرح کی سزا اور عذاب ہی ہوا، اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ جب یہ عذاب ہی کا ایک حصہ ہے تو کسی آدمی کو یہ نہیں چاہیے کہ اپنے اختیار سے اس عذاب کو باقی رکھے، ایک ضرورت کے پیشِ نظر یہ حالت اختیار کی گئی تھی، جب ضرورت پوری ہو جائے تو اس حالت کو بھی ختم کر دینا چاہیے۔ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہی ہدایت ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب استحباب القدوم علی أهله نهاراً وکراهته فی اللیل لغیر حاجة

آدمی کا اپنے گھر دن کے وقت لوٹنا اور بلاضرورت رات کے وقت لوٹنے کا ناپسندیدہ و مکروہ ہونا

اس ادب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی جب دن میں آئے گا تو گھر والوں کو رات تک مہلت مل جائے گی۔اس لیے کہ عام طور پر آدمی جب سفر سے لوٹتا ہے تو فطری تقاضہ کے پیشِ نظر اپنی جنسی ضرورت پوری کرنے کے لیے اس کا میلان گھر والوں کی طرف ہوتا ہے، اگر رات کے وقت پہنچے گا تو گھر والوں کو اس کے لیے تیاری کا موقع نہیں ملے گا، اس لیے دن میں پہنچنے کو پسندیدہ، اور رات میں پہنچنے کو ناپسند کیا ہے۔ یہ ادب اُس زمانہ کے اعتبار سے تھا، آج اِس زمانہ میں اسباب ووسائل مہیا ہیں جن کے پیشِ نظر اگر آپ پہلے سے اپنی آمد کی اطلاع کر دیں تو رات کو پہنچنے میں بھی کوئی اشکال نہیں، کیونکہ رات کو واپس لوٹنے سے منع کرنے کی جو علت تھی وہ نہیں رہی۔ پہلے زمانہ میں فون یا ٹیلی گرام وغیرہ سے اطلاع کرنا ممکن نہیں تھا، قافلوں میں

سفر ہوتے تھے، اور معلوم نہیں کہ قافلہ کب پہنچتا ہے، اگر رات کے وقت پہنچ گیا تو گھر والوں کو معلوم ہی نہیں ہے کہ آج شوہر صاحب کی تشریف آوری ہے کہ ان کے استقبال کی کچھ تیاریاں کی جاسکیں، اور عام طور پر عورتوں کا مزاج یہ ہوتا ہے کہ شوہر کی غیر حاضری میں کھانے پینے اور زیب وزینت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتیں، اس طرف سے غفلت برتی جاتی ہیں، اب اگر بیوی نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا ہے کہ شوہر اس حالت میں اس کو دیکھنا پسند نہیں کرتا اور اچانک رات میں پہنچ گئے اور ایسی حالت میں بیوی کو دیکھ لیا، تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے طبیعت میں ایک طرح کی نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے، حالاں کہ یہ ایک وقتی حالت ہوتی ہے ، لیکن بعض مرتبہ یہی نفرت دائمی بن جاتی ہے، اور آگے جاکر ازدواجی حقوق کی ادائیگی یا ازدواجی تعلقات کے باقی رہنے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ اس لیے شریعت کی طرف سے جو ہدایتیں دی جاتی ہیں ان میں بڑی مصلحتیں ہیں۔ اور شریعت نے میاں بیوی کے تعلقات کے معاملہ میں بڑا اہتمام اس بات کا کیا ہے کہ کوئی بھی بات ایسی نہیں ہونی چاہیے جو آپس کے تعلقات کی صفائی و شفافی میں رخنہ اندازی اور ذراسا بھی میل پیدا کرنے والی اور دلی محبت میں ذراسی بھی کمی لانے والی ہو، بلکہ میاں بیوی ہونے کی حیثیت سے دونوں کے تعلقات ایسے بے تکلّفانہ ہونے چاہئیں کہ دونوں میں سے کسی کے دل میں دوسرے کے متعلق ادنیٰ سا بھی تردّد و شبہ اور بدگمانی نہیں ہونی چاہیے، دونوں ایک دوسرے کے سارے حالات سے پورے طور پر واقف ہوں ، میاں بیوی کے

درمیان اس انداز کا تعلق ہونا چاہیے کہ کوئی بھی آکر کچھ بھی کہہ دے تو وہ جواب دے کہ مجھے سب معلوم ہے۔

ایک روایت یاد آگئی، ابوداود شریف میں ہے({ FR 3809 })عورت جب غسل کرلے تو مرد اس کے بچے ہوئے پانی سے غسل نہ کرے، اور مرد کے غسل کے بچے ہوئے پانی سے عورت غسل نہ کرے، ہاں! اگر دونوں ساتھ غسل کرلیں تو بہت مناسب ہے۔ اس روایت میں طہارت کا ایک مسئلہ ہے جس کو ائمہ نے موضوعِ بحث بنایا ہے، لیکن ہمارے اکابرمیں سے حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس روایت میں جو ہدایتیں دی گئی ہیں کہ مرد کے غسل کے بچے ہوئے پانی سے عورت اور عورت کے غسل کے بچے ہوئے پانی سے مرد غسل نہ کرے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ دونوں جب جنابت کا غسل کررہے ہیں تو ایسی بھی اجنبیت کیا ہورہی ہے کہ وہ اس کا انتظار کررہا ہے اور یہ اس کا انتظار کررہی ہے، دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر ایک ہی برتن سے غسل کرلیں تاکہ دونوں کے تعلقات کی بے تکلفی باقی رہے۔ اس لیے کہ انبیاء رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات کی خوشگواری پورے طور پر باقی رہنی چاہیے، اور شیطان اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ میاں بیوی کے تعلقات میں رخنہ اندازی ہو، تاکہ اس کے نتیجہ میں آپس میں جھگڑے ہوں اور حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہو اور یہی چیز آگے جاکر دونوں کے لیے دوسرے

گناہوں میں مبتلا ہونے، یا ازدواجی تعلقات کے ٹوٹنے کا ذریعہ بنے۔ اور شیطان کے نزدیک اس کے چیلوں میں سب سے زیادہ محبوب وہی ہے جو میاں بیوی میں پھوٹ ڈال کر آیا ہو۔

روایتوں میں آتا ہے کہ شیطان شام کے وقت سمندر کے اوپر اپنا تخت بچھا کر اپنے چیلوں سے رپورٹ وصول کرتا ہے کہ کیا کارگزاریاں ہیں؟ کوئی کہتا ہے کہ: ایک آدمی نماز پڑھنے جا رہا تھا، مَیں نے وسوسہ ڈال کر نماز سے روک دیا۔ ہر ایک اپنے کارنامے بیان کرتا ہے۔ شیطان سب کی سن لیتا ہے۔ ایک شیطان کہتا ہے کہ میں نے میاں بیوی کے درمیان جھگڑا کرایا، یہاں تک کہ طلاق اور جدائیگی کی نوبت آگئی، یہ سن کر شیطان بہت خوش ہوتا ہے اور اس کو گلے سے لگاتا ہے کہ کام تو تو نے کیا ہے!

(صحیح مسلم۔ باب تَحْرِيشِ الشَّيْطَانِ وَبَعْثِهِ سَرَايَاهُ لِفِتْنَةِ النَّاسِ وَأَنَّ مَعَ كُلِّ إِنْسَانٍ قَرِينًا. حدیث نمبر: ۷۲۸۴)

رات میں اچانک گھر نہ آئے:

حدیث ۹۸۵:-

عن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ الله (ﷺ) قَالَ: إِذَا أَطَالَ أَحَدُكُمُ الغَيْبَةَ فَلَا يَطْرُقَنَّ أَهْلَهُ لَيْلاً.

وفي روايةٍ: أَنَّ رسول الله (ﷺ) نَهَى أَنْ يَطْرُقَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ لَيْلاً. (متفقٌ عَلَيْه)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب لمبے زمانہ تک گھر سے غیر حاضر رہا ہو (یعنی طویل زمانہ تک سفر میں رہا ہو) تو رات میں اچانک گھر نہ آئے۔ ایک روایت میں ہے کہ رات کے وقت اپنے گھر والوں کے پاس اچانک واپس لوٹنے سے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمایا۔

افادات:- ایک صورت تو یہ ہے کہ صبح کہیں گئے اور رات واپس لوٹے؛ تب تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے۔ ممانعت تو اس صورت میں ہے کہ آپ ایک طویل زمانہ کے لیے سفر پر گئے، گھر والوں کو پتہ بھی نہیں ہے کہ کب لوٹنے والے ہیں، اور آپ اچانک رات میں پہنچ گئے۔ ہاں! اگر آپ نے پہلے سے اطلاع کر دی ہے (جیسے آج کل وسائل ہیں) کہ میں رات میں دو بجے پہنچنے والا ہوں ؛ تو پھر رات میں کسی بھی وقت پہنچنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

بغیر اطلاع کے اچانک گھر پہنچنے کی خرابیاں :

نیز رات اس طرح اچانک پہنچنے میں دوسری ایک گڑبڑ بھی ہے۔ وہ یہ کہ گھر والوں کے دل میں بدگمانی پیدا ہو سکتی ہے کہ کیا میرے شوہر کو میرے متعلق کچھ شک ہے کہ اس طرح رات میں اچانک آ گئے؟ یہ چیز بھی میاں بیوی کے تعلقات کی خوشگواری میں خلل ڈالنے والی ہے۔ بدگمانی کی بنیادیں اسی طرح پڑتی ہیں، اور یہی چیز بعض مرتبہ بعض عورتوں کو بداخلاقی پر آمادہ کرتی ہیں۔ یعنی ویسے تو وہ پاکیزہ و پاکدامن ہوتی ہیں، لیکن اگر شوہر کی طرف سے بلاوجہ ایسا کوئی معاملہ کیا

جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھنے لگتی ہے کہ شوہر مجھ پر بدگمانی کررہا ہے، تو بعض عورتیں ضد میں آکر سوچتی ہیں کہ اچھا! یہ میرے متعلق بدگمانی کرتا ہے، اب تو میں بھی ایسا کر کے ہی بتاؤں گی۔اس سے معلوم ہوا کہ رات میں اچانک آنے کی وجہ سے جب یہ چیز پیدا ہوسکتی ہے، تو جو لوگ اپنی بیوی کے اوپر کھلّم کھلاّ بدگمانی کا اظہار کرتے ہیں؛اس کی شریعت کہاں اجازت دے سکتی ہے۔یہ بڑا برا سلوک ہے جس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔

ایک تو یہ ہے کہ برائی کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو،اس پر خاموش رہنا بھی بہت برا ہے، اس کو دَیُّوثی سے تعبیر کیا گیا ہے،اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔اور بلاوجہ شک وشبہ کرنا بھی برا ہے،اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ان دونوں باتوں سے شریعت نے منع کیا ہے۔

حدیث ۹۸۶:-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ الله (صلى الله عليه وسلم) لايَطْرُقُ أهْلَهُ لَيلاً ،وَكَانَ يَأْتِيهِمْ غُدْوَةً أَوْ عَشِيَّةً. متفقٌ عَلَيْهِ

((الطُّرُوقُ)): المَجيءُ فِي اللَّيلِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) (جب سفر سے واپس لوٹتے تو) اپنے گھر والوں کے پاس رات کے وقت میں نہیں آتے،(بلکہ) صبح یا شام میں آتے تھے۔

افادات:- میں نے اس کی وجہ بتلادی ہے۔اگر پیشگی اطلاع ہو تو گنجائش ہے۔بس! پیشگی اطلاع کا اہتمام ہونا چاہیے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب مايقول اذا رجع، وإذا رأى بلدته

جب سفر سے واپس لوٹے اور اپنے شہر کی عمارتوں پر نظر پڑے؛ تو کیا دعا پڑھے؟

فِيهِ حَدِيثُ ابنِ عمرَ السَّابِقُ فی باب تكبيرِ المسافِرِ إِذَا صَعِدَ الثَّنَايَا.

واپسی کے سفر کے متعلق ایک روایت پچھلے باب میں بھی گزرچکی جس میں یہ تھا کہ مسافر جب اونچائی پر چڑھے تو تکبیر پڑھنی چاہیے۔اور ”آيِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ لِرَبِّنَا حَامِدُونَ“ والی دعا بھی گزرچکی ہے، اسی دعا کو دوسری روایتوں میں لارہے ہیں

حدیث ۹۸۷:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: أَقْبَلْنَا مَعَ النَّبِيِّ (صلى الله عليه وسلم) حَتَّى إِذَا كُنَّا بِظَهْرِ الْمَدِينَةِ، قَالَ: ((آيِبُونَ، تَائِبُونَ، عَابِدُونَ، لِرَبِّنَا حَامِدُونَ)) فَلَمْ يَزَلْ يَقُولُ ذَلِكَ حَتَّى قَدِمْنَا المَدِينَةَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم (صلى الله عليه وسلم) کے ساتھ سفر سے لوٹے، یہاں تک کہ جب مدینہ منورہ ہماری نگاہوں کے سامنے آگیا، تو حضوراکرم (صلى الله عليه وسلم) نے یہ دعا پڑھی: ہم لوٹ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وتوبہ کرتے ہیں، اللہ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور اپنے پروردگار ہی کی حمد و ثناء

اور تعریف کررہے ہیں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کلمات کو برابر پڑھتے رہے یہاں تک کہ ہم مدینہ منورہ کے اندر داخل ہوگئے۔

افادات:-اس سے معلوم ہوا کہ اپنی آبادی کے مکانات جب نظر آنا شروع ہوں تو اس وقت یہ دعا پڑھنا شروع کرے اور برابر پڑھتا رہے، یہاں تک کہ شہر میں داخل ہوجائے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب استحباب ابتداء القادم بالمسجد الذی فی جوارہ وصلاتہ فیہ رکعتین

سفر سے واپس لوٹے تو پہلے قریب کی مسجد میں جائے، دو رکعات پڑھے

ایک اور ادب بتاتے ہیں کہ آدمی جب سفر سے لوٹے تو جو مسجد اس کے مکان کے پاس ہو سب سے پہلے اس میں جائے، وہاں دو رکعت ادا کرے پھر اپنے گھر جائے۔ یہاں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے جو پہلے بھی آئی تھی۔ غزوۂ تبوک میں وہ شریک نہیں ہوسکے تھے جس کا واقعہ انہوں نے تفصیل سے بیان کیا ہے جس میں انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک معمول بیان کیا ہے۔ (پوری روایت حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد اول، ص: ۱۵۰ تا ۱۸۰ گزرچکی ہے۔ مرتب۔)

حدیث ۹۸۸:-

عن كعب بن مالك رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ الله (ﷺ) كَانَ إِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ، بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ فَرَكَعَ فِيهِ رَكْعَتَيْنِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) جب کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تھے تو پہلے مسجد میں تشریف لے جاتے، وہاں دو رکعت ادا فرماتے (اور جب صحابہ کو اطلاع ہوتی تو وہ ملاقات کے لیے وہیں آجاتے تھے، پھر آپ گھر جاتے، یہ بھی آداب میں سے ہے۔)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بَابُ تَحْرِيمِ سفرِ الْمَرْأَةِ وَحْدَهَا

عورت کا اکیلے سفر کرنا حرام ہے

سفر کے سلسلہ میں پہلے تفصیل بتاچکا ہوں کہ سفر شرعی کی مقدار کا سفر اگر عورت بغیر محرم کے کرے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اور اگر اس سے کم کا سفر ہو، اور اس میں خطرہ ہو؛ تو اس صورت میں اس کے لیے بلاضرورت نکلنا جائز نہیں، اور اگر کسی ضرورت سے

نکلے تو اس بات کا اہتمام ہوناچاہیے کہ شوہریا محارم میں سے کوئی ساتھ ہو۔اوراگر کوئی خطرہ نہ ہوتوبوقتِ ضرورت اجازت ہے۔

حدیث ۹۸۹:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) : لَا يَحِلُّ لامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ تُسَافِرُ مَسِيرَةَ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ عَلَيْهَا .(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں کہ ایک دن رات کی مسافت کا سفر کرے؛ مگر ایسی حالت میں کہ اس کے ساتھ کوئی ذی رحم محرم ہو۔

افادات:–"**ذی رحم محرم**"کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا رشتہ دار جس کے ساتھ نکاح کرنا ہمیشہ کے لیے حرام ہو، جیسے: باپ ،دادا،پردادا؛اوپر تک۔بیٹا،پوتا ، نواسہ یا اس سے جو پیدا ہواہو،نیچے تک۔یابھائی، بھتیجہ ،بھانجہ ،یاان کا بیٹاوغیرہ؛یہ سب محارم ہیں ۔اس روایت میں ایک دن اوررات کا تذکرہ آیا ہے،اوراس سلسلہ میں روایتیں مختلف آئی ہیں،جن کوسامنے رکھ کرعلماء نے تین دن اوررات کے متعلق تو عدمِ جواز کاحکم دیاہے،لیکن اس سے کم میں بھی اگر خطرہ ہوتوبچنا چاہیے۔

حدیث ۰۹۹۰:-

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أَنَّهُ سَمِعَ النبيَّ (ﷺ) يقول: لَا يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ إِلَّا وَمَعَهَا ذُو مَحْرَمٍ، وَلَا تُسَافِرُ الْمَرْأَةُ إِلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ. فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَارسولَ الله، إِنَّ امْرَأَتِي خَرَجَتْ حَاجَّةً، وَإِنِّي اكْتُتِبْتُ فِي غَزْوَةِ كَذَا وَكَذَا؟ قَالَ: انْطَلِقْ، فَحُجَّ مَعَ امْرَأَتِكَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کوئی (اجنبی) مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی اختیار نہ کرے مگر یہ کہ اس عورت کے ساتھ اس کا کوئی ذی رحم محرم موجود ہو (کیوں کہ شیطان کی طرف سے وسوسہ اندازی اور گناہ میں مبتلا کردینے کا بڑا قوی خطرہ لگا ہوا رہتا ہے) اور عورت سفر نہ کرے مگر اپنے ذی رحم محرم کے ساتھ۔ ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میری عورت سفر حج کے لیے جارہی ہے، اور میرا نام فلاں غزوہ میں جانے کے لیے لکھا گیا ہے (اب کیا کیا جائے؟) حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تو بھی جا اور اپنی عورت کے ساتھ حج کر۔

افادات:۔مطلب یہ ہے کہ اب تجھے غزوہ میں نہیں جانا چاہیے، اس لیے کہ تیری عورت بغیر محرم کے یا بغیر شوہر کے اکیلی حج کے لیے جائے، اس کی اجازت نہیں ہے، تو اس کے ساتھ سفر حج میں جا۔

کتَابُ الفَضَائِل

بابُ فضل قراءة القرآن

قرآن کریم پڑھنے کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَ نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَ مِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أما بعد:

یہ محبت کی بات ہے

اب تک مختلف اعمال کے آداب کا بیان چل رہا تھا، وہ سلسلہ ختم ہوا، اب یہاں سے کتاب الفضائل شروع کر رہے ہیں یعنی مختلف اعمال انجام دینے پر کیا فضیلتیں حاصل ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ خالق ومالک اور حاکم ہے، اس کے حاکم ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ حکم دے کر بندوں کو پابند کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جہاں خالق ومالک اور حاکم ہے وہیں بندوں سے بہت ہی زیادہ محبت رکھنے والا بھی ہے، اسی لیے شریعت کے جن اعمال و احکام کو انجام دینے کی تاکید کی گئی ہے (جیسے: نماز،

روزہ، حج، زکوٰۃ، قرآنِ پاک کی تلاوت، تسبیح و تحمید اور دوسرے اعمال جن کو اوامر کہتے ہیں) وہاں اللہ تعالیٰ صرف حکم دے دیتا تب بھی اس کو حق تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی کمالِ محبت اور کمالِ رحمت سے حکم دینے ہی پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ جن اعمال کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کے فضائل بھی بتلائے۔

جیسے: باپ اپنے بیٹے کو ایک کام کے کرنے کے لیے کہتا ہے کہ بیٹا! یوں کرو۔ تو باپ ہونے کے ناتے وہ صرف حکم دیدے تب بھی کافی ہے، لیکن چوں کہ باپ کو بیٹے کے ساتھ محبت و شفقت بھی ہوتی ہے، اس لیے باپ صرف حکم نہیں دیتا بلکہ ساتھ ہی ساتھ وہ کام کرنے کے فوائد بھی بتاتا ہے، گویا فوائد بتلا کر وہ اس کام کے کرنے کے لیے بیٹے کی طبیعت کے اندر جذبہ اور آمادگی پیدا کرتا ہے، باپ کا یہ طرز دراصل بیٹے کے ساتھ محبت کا تقاضہ ہوتا ہے۔ جہاں صرف حاکمانہ انداز ہوتا ہے وہاں فوائد نہیں بتائے جاتے، جیسے: حکومتیں کوئی حکم اور آرڈر جاری کرتی ہیں تو اس کے فوائد نہیں بتلاتیں، وہ تو صرف حکمرانی کرنا چاہتے ہیں اس لیے آرڈر جاری کردیتے ہیں کہ یہ کرو اور وہ کرو، اگر نہیں کروگے تو ایسا ہو جائے گا۔ ہاں! جو حُکّام اپنی رعایا کے ساتھ رابطہ مضبوط رکھنا چاہتے ہیں اور جہاں محبت کا رشتہ بھی ہوتا ہے، شفقت کا معاملہ بھی ہوتا ہے، وہاں صرف آرڈر جاری کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جاتا، بلکہ وہاں یہی طرز اختیار کیا جاتا ہے کہ جس کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اس کے فوائد بھی بتائے جاتے ہیں، تاکہ ان کو سن کر دل میں شوق و رغبت اور آمادگی پیدا ہو۔

تو ترغیب اور فضائل کے قبیل کی چیزیں دراصل اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں کے ساتھ موجود محبت کا نتیجہ ہوتی ہیں، جیسا کہ پہلے بھی حدیث میں پڑھا اور سنا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ

محبت کا جتنا تعلق ہے، اس کا سواں (۱۰۰) حصہ بھی بندوں کو آپس میں حاصل نہیں ہے۔ ایک ماں اپنے بچے سے جو محبت کرتی ہے، اللہ تعالیٰ اس سے کئی گنا زیادہ اپنے بندوں پر مہربان ہے، اسی مہربانی اور الفت ورحمت کا تقاضہ ہے کہ شریعت کی طرف سے جن اعمال کے کرنے کا حکم دیا گیا، وہاں صرف حکم دے کر بات ختم نہیں کر دی گئی، بلکہ ان اعمال واحکام کی بجا آوری پر کیا کیا فوائد حاصل ہوں گے وہ بھی بتلائے گئے، اسی لیے احادیث کی جو کتابیں ہیں ان میں مستقل ایک عنوان ''فضائل'' کا ہوتا ہے۔

مصنّفین نے کتبِ احادیث کو لکھنے کے مختلف انداز اختیار کئے ہیں۔ بعض مصنّفین نے نبیٔ کریم ﷺ کے تمام ارشادات کو آٹھ موضوعات (Subject) پر تقسیم کیا ہے، اور وہ حضرات اپنی کتابوں میں آٹھوں موضوع کی روایات کو لاتے ہیں؛ انہیں میں سے ایک موضوع فضائل کا بھی ہے۔ شریعت نے جن اعمال کے کرنے کا حکم دیا ہے ان کے فوائد اور فضیلتیں بتلا کر بندوں کو ان اعمال کے کرنے کی ترغیب دی ہے اور ان کے دلوں میں شوق پیدا کیا ہے۔ یہاں سے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) یہی سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ آگے بہت سارے اعمال کے فضائل آئیں گے، اور وہ عمل چاہے وجوب، استحباب یا سنت کا درجہ رکھتا ہو؛ ان سب کے فضائل اور فوائد بتلائے گئے ہیں؛ تا کہ ان کو سن کر بندہ شوق اور رغبت کے ساتھ ان اعمال کو انجام دے۔

اور جہاں ترغیبی پہلو ہوتا ہے، وہیں دوسرا پہلو ترہیبی بھی ہوتا ہے، اس لیے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو شوق و ترغیب دلانا کافی نہیں ہوتا، اس لیے ترہیب اور ڈرانے والا پہلو بھی رکھا گیا

ہے، اوراس موضوع پر ''الترغیب والترہیب''نامی مستقل کتابیں بھی ہیں، جن میں اعمال کے کرنے پر کیافوائداور فضائل ہیں، اور نہ کرنے پر کیا نقصانات اور سزائیں ہیں؛ وہ بتلائے جاتے ہیں۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے پہلا عنوان قائم کیا ہے: '' فَضْل قِرَاءَةِ الْقُرْآن'' قرآنِ پاک کی تلاوت اور قراءت کے فضائل۔ ویسے تو قراءت کا یہ عمل فرض وواجب نہیں ہے، ہاں! نماز کے اندر تلاوتِ قرآن رکن کا درجہ رکھتی ہے، لیکن خارجِ نماز یہ ایک ایسا عمل ہے جس کی شریعت نے تاکید کی ہے، لیکن فرض اور رکن کا درجہ نہیں دیا۔ قرآنِ پاک اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے جو انسانوں کی ہدایت کے واسطے نبیٔ کریم ﷺ پر اتاری گئی ہے، اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے، اور اس کو سمجھ کر اپنی زندگی میں اُتارا جائے، لیکن جہاں یہ بات ہے، وہیں صرف اس کا پڑھنا بھی بہت زیادہ باعث خیر وبرکت ہے، اس کی تلاوت کے بھی مستقل فوائد ہیں۔ چناں چہ اس باب میں قرآنِ پاک کی تلاوت کے فوائد بتلانا چاہتے ہیں۔

مسائل کا علم فرض ہے، فضائل کا نہیں

فضائل کی کتابوں کی تعلیم کا مقصد صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ اس کو سن کر آدمی ان اعمال کے کرنے پر آمادہ ہو۔ جیسے: آپ کسی کے سامنے نماز کے فضائل بیان کریں تو ان کو سن کر اس کے دل میں نماز کا شوق پیدا ہوگا، لیکن جب عمل کا نمبر آئے گا تو عمل اس وقت تک درست نہیں ہوگا جب

تک اس کے مسائل سے آدمی واقف نہ ہو، اس لیے عمل کے لیے مسائل تو ریڑھ کی ہڈی کے مانند ہیں۔ ہمارے تبلیغی جماعت کے سلسلہ کے اندر صرف فضائل پر اکتفاء اس لیے کیا جاتا ہے کہ مسائل کے اندر ائمہ کے اختلافات ہیں، اور تبلیغی جماعت کا مقصد اُمت کو اعمال کا شوق دلانا ہے، اسی لیے اس کام کے بنیادی اصول میں یہ چیز شامل کی گئی ہے کہ صرف فضائل بیان کرنے پر اکتفاء کیا جائے، مسائل کو چھیڑا نہ جائے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی مسئلہ کا بالکل نام ہی نہ لیا جائے، اس لیے کہ آپ جب کسی کو فضائلِ نماز سنائیں گے تو اس کے دل میں نماز کا شوق پیدا ہو گا، لیکن جب وہ عمل پر آمادہ ہو گا تو نماز کو بغیر مسائل کی واقفیت کے صحیح طریقہ پر نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی لیے فضائل کا علم سیکھنا فرض نہیں ہے، لیکن مسائل کا علم سیکھنا فرض ہے، اگرچہ اس کا نمبر شوق اور رغبت کے بعد آتا ہے، اس لیے تبلیغی جماعت کے مصالح کے پیشِ نظر اس کو چھیڑا نہیں گیا، لیکن اس کا مطلب اور مقصد ہر گز یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی جب فضائل سن کر کسی عمل کے لیے تیار ہو تو اس کو مسائل نہیں بتلائے جائیں۔ خیر! یہاں سے فضائل کا سلسلہ شروع کرتے ہیں اور پہلا باب قرآنِ پاک کی تلاوت کے فضائل کا قائم کیا ہے۔

قرآن قیامت میں شفیع بنے گا

حدیث ۹۹۱:-

عن أبي أمامة (رضی اللہ عنہ) قال سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ: اقْرَؤُوا القُرْآنَ؛ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ القِيَامَةِ شَفِيعاً لأَصْحَابِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ باہلی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قرآنِ پاک کی تلاوت کرو، اس لیے کہ قرآنِ پاک اپنے لوگوں کے لیے قیامت کے دن شفاعت کرے گا۔

افادات:- ”لأَصْحَابِهِ“ یعنی قرآن والے۔ اور یہ عام ہے جس میں اس کا پڑھنا پڑھانا، سمجھنا سمجھانا، اور اس پر عمل کرنا؛ سب آجاتا ہے، قرآن والوں کا لفظ ان سب کے لیے بولا جائے گا۔ ہاں! اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ صرف پڑھنے کا تعلق ہو۔

اللہ تعالیٰ کا کلام قیامت کے روز کسی کے لیے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اگر سفارش کردے؛ تو پھر اس کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی؟ اس کی نجات کے لیے تو یہی کافی ہے۔ اس روایت سے قرآنِ پاک کی تلاوت کی فضیلت معلوم ہوئی کہ اس کے نتیجہ میں آدمی کو قرآنِ کریم کی سفارش نصیب ہوتی ہے۔

حدیث ۹۹۲:-

وعن النَّوَّاسِ بنِ سَمْعَانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: يُؤْتَى يَوْمَ القِيَامَةِ بِالْقُرْآنِ وَأَهْلِهِ الذين كَانُوا يَعْمَلُونَ بِهِ فِي الدُّنْيَا تَقْدُمُه سورَةُ البَقَرَةِ وَآلِ عِمْرَانَ، تُحَاجَّانِ عَنْ صَاحِبِهِمَا (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔حضرت نواس بن سمعان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی ٔکریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے روز قرآنِ پاک کو اور قرآن والوں کو لایا جائے گا (قرآن والے کون ہیں؟) جو دنیا میں اس پر عمل کا اہتمام کرتے تھے۔ آگے آگے سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران ہوں گی، اور ان کی طرف سے یہ دونوں سورتیں دفاع کریں گی۔

افادات:۔جیسا کہ مَیں نے اوپر کہا تھا کہ کم سے کم درجہ قرآن پڑھنے والوں کا ہے، اور اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ وہ اس پر عمل کا اہتمام کرے۔ تو جو لوگ قرآن کی ان دو سورتوں کی تلاوت کرتے تھے، ان کے احکام پر عمل کرتے تھے، اس کے تقاضوں کو پورا کرتے تھے، یہ دونوں سورتیں گویا ان کو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے کی کوشش کریں گی۔ یہ بہت بڑی چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام کسی کے لیے سفارشی بن جائے، اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہو سکتی ہے!

تم میں سے بہترین لوگ

حدیث ۹۹۳:۔

وعن عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:۔حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآنِ پاک سیکھیں اور سکھائیں۔

افادات:- سیکھنے کے بھی مختلف درجات ہیں، کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی قرآنِ پاک کے الفاظ سیکھے، اوراس کے بعد دوسروں کوسکھلائے۔پہلادرجہ اندر دیکھ کر سیکھنا؛جس کو ہم ''ناظرہ'' کہتے ہیں۔اس سے اوپر کادرجہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے الفاظ کوزبانی سیکھے اور سکھائے؛جس کو ہم ''حفظ'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے اوپر کادرجہ یہ ہے کہ اس کے معانی،مطالب اور مقاصد کو سمجھے کہ قرآنِ کریم ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے، قرآن کریم کے اندر انسانیت کو کیاپیغام دیا گیا ہے، اوراس میں کیااحکام دیئے گئے ہیں۔یہ سب سیکھنے اور سمجھنے کے بعدان مقاصد کوپوراکرے، اوراس پر عمل کااہتمام کرے۔گویایہ تمام چیزیں قرآنِ پاک کوسیکھنے اور سکھانے میں آجاتی ہیں۔اب اگرکوئی آدمی ان سب چیزوں کاجامع ہو؛تونورٌ علیٰ نور۔اس کو سارے ہی فضائل علیٰ وجہ الکمال حاصل ہوں گے؛ورنہ کم سے کم درجہ ناظرہ کاہے۔

اس نے قرآن کی ناقدری کی

اسی لیے ملاعلی قاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے نقل کیاہے کہ کسی آدمی نے قرآنِ پاک سیکھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ نعمت عطافرمائی، اس کے بعد کسی اور صاحبِ نعمت کو اپنے سے افضل سمجھا؛تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک کی شکل میں جو نعمت اس کو دی گئی ہے، اس نے اس کی ناقدری کی (تاریخ الکبیر امام بخاری،۳/۳۱۱۔شعب الایمان،۴/۱۷۸) گویا دنیامیں سب سے اونچی نعمت اگر کوئی ہوسکتی ہے تووہ قرآنِ پاک

ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو عطا فرماتا ہے۔ ویسے بھی قرآنِ پاک دین کی بنیاد اور اصل ہے، دین کے سارے علوم کا منبع ہے، اسی لیے قرآنِ پاک کی ہر ہر چیز کی فضیلت آئی ہے۔

شرحِ احیاء میں علامہ زبیدی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نقل کیا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں وہ لوگ بھی ہوں گے جو مسلمانوں کے بچوں کو قرآنِ پاک پڑھاتے تھے، اور وہ لوگ بھی ہوں گے جو بچپن میں قرآنِ پاک سیکھتے ہیں اور بڑے ہونے کے بعد تلاوت کا اہتمام کرتے ہیں (اللآلی المصنوعۃ ۱/ ۱۸۱۔ شعب الایمان ۱/ ۱۶۰) معلوم ہوا کہ ناظرہ قرآنِ پاک پڑھانے پر بھی یہ فضیلت حاصل ہو گی۔

قرآنِ پاک سیکھنے کے بعد کیا؟

یہ مضمون خاص طور پر اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ ہمارے سماج و معاشرہ میں بچوں کے لیے قرآنِ پاک کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، مکتب سے اُٹھنے کے بعد اگر اس بچے کا سلسلہ کسی مدرسہ سے جڑ گیا تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر وہ اسکول یا کالج میں چلا گیا یا کسی دنیوی لائن تجارت وغیرہ میں لگ گیا، تو مکتب کے زمانہ میں جو قرآنِ پاک سیکھا تھا تلاوت اور قراءت کا اہتمام نہ کرنے کی وجہ سے آدمی وہ بھی بھول جاتا ہے، حالاں کہ قرآنِ پاک کا حق ہے کہ آدمی روزانہ اس کے کچھ متعین حصہ کی تلاوت کرے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ بہترین ہے وہ شخص جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

ابوعبدالرحمٰن سُلمی (رحمۃ اللہ علیہ) اور خدمتِ قرآن

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی اس روایت کو نقل کرنے والے ابوعبدالرحمٰن عبداللہ بن حبیب سُلَمِی (رحمۃ اللہ علیہ) ہیں، بخاری شریف میں جہاں یہ روایت آئی ہے وہاں ان کا مقولہ نقل کیا ہے کہ یہی وہ حدیث ہے جس نے مجھے یہاں بٹھایا ہے۔ چناں چہ اس جملہ کی شرح کرتے ہوئے شارحِ بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن سُلَمِی (رحمۃ اللہ علیہ) پوری زندگی اسی مشغلہ یعنی لوگوں کو قرآنِ پاک کے سکھانے میں لگے رہے، اور لکھا ہے کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت سے لے کر حجاج بن یوسف کے دورِ امارت تک یہی کام کیا۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی خلافت کے آخری سال سے حجاج بن یوسف کی امارت کے اوّل سال تک اڑتیس (۳۸) سال ہوتے ہیں اور حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت کے پہلے سال سے لے کر حجاج بن یوسف کی امارت کے آخری سال تک بہتّر (۷۲) سال ہوتے ہیں؛ گویا اڑتیس (۳۸) سے لے کر بہتّر (۷۲) سال کے درمیان تک انہوں نے قرآنِ پاک کی تعلیم و تعلّم کا مشغلہ رکھا۔ یہی وہ روایت ہے جس کے پیشِ نظر اللہ کے مقبول بندوں نے اپنی زندگیاں اسی کام کے لیے وقف کر دیں۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑی فضیلت کی چیز ہے۔

اور ایک بات یہ ہے کہ یہاں "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" "واو" کے ساتھ آیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خود بھی سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھلایا، یعنی دونوں کام کئے۔ اور بعض روایتوں میں "أَوْ" کے ساتھ بھی آیا ہے، یعنی "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ أَوْ عَلَّمَهُ" (مسند احمد / حدیث نمبر: ۴۱۳) جس کا

مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس نے قرآن سیکھا، یا سکھایا، یعنی جو آدمی دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی کرے گا؛ اس کو یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

ماہرِ قرآن کو دوہرا اجر

حدیث ۹۹۴:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: قَالَ رسول الله ﷺ: اَلَّذِی یَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَھُوَ مَاھِرٌ بِهٖ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ. وَالَّذِی یَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَیَتَتَعْتَعُ فِیهِ وَھُوَ عَلَیْهِ شَاقٌّ لَهٗ أَجْرَانِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی قرآنِ پاک کو پڑھتا ہے، اور وہ اس کا ماہر ہے، تو وہ باعزت اور نکوکار فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ اور جو آدمی قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے اور اس میں اٹکتا ہے جس کی وجہ سے قرآنِ پاک کی تلاوت والا عمل اس کو بھاری معلوم ہوتا ہے؛ تو اس کو دو ثواب ملیں گے۔

افادات:- ماہر یعنی بہت عمدگی کے ساتھ پڑھتا ہے اور خوب پڑھتا ہے، یعنی دونوں باتیں ہوں کہ زیادہ پڑھے اور اچھا پڑھے۔

"باعزت اور نکوکار فرشتے" یعنی جو فرشتے اللہ تعالیٰ کا پیغام اپنے بندوں کے پاس لے کر آتے ہیں، خاص کر حضرت جبرئیل (علیہ السلام) اور ان کا قافلہ۔ اس لیے کہ اصل وحی لانے والے تو حضرت جبرئیل (علیہ السلام) ہی ہیں، لیکن جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی آیتیں اور سورتیں وہ ہیں کہ جب

حضرت جبرئیل (علیہ السلام) ان کو لے کر آتے تھے تو فرشتوں کی ایک بڑی جماعت ساتھ میں ہوتی تھی، گویا قرآنِ پاک کو لانے والے قافلہ میں وہ بھی شامل ہیں۔ تو جو جماعت اوپر سے نیچے قرآنِ پاک لانے والی ہے وہی عمل یہ بندہ بھی کرتا ہے کہ یہ خود بھی پڑھتا ہے اور دوسروں تک پہنچاتا ہے؛ اسی مناسبت سے اس کو ان فرشتوں کے ساتھ مقام عطا کیا جائے گا۔

اٹکنے کی مشقت کا اجر

"اٹکتا ہے" یعنی ابھی تک اس کو قرآنِ پاک پڑھنے میں مہارت اور پریکٹس نہیں ہوئی، اس لیے پڑھنے میں اٹکتا ہے۔ جس کام کی بھی آدمی کو پریکٹس نہیں ہوتی وہ کام کرنا اس کو بھاری معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس تلاوتِ قرآن والے عمل کو چھوڑتا نہیں ہے، تو اس کو دو ثواب ملیں گے؛ ایک تو قرآنِ پاک کی تلاوت کا، اور دوسرا اس تلاوت میں مشقت و تکلیف اُٹھانے کا۔ گویا اس کو دوہرا اجر ملے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ آدمی عمدہ پڑھنے والوں سے بڑھ جائے گا، بلکہ ان کا تو ایک مخصوص مقام ہے جو ان کو اپنی حیثیت کی وجہ سے حاصل ہوگا، اور اس کو اس مشقت کی وجہ سے الگ سے اجر دیا جائے گا۔ دین کے اندر جتنے بھی اعمال ہیں ان کی خصوصیت یہی ہے کہ آپ ان میں سے کسی بھی عمل کو انجام دیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر جو جو فضیلتیں بتائی گئی ہیں وہ ساری ہی حاصل ہوں گی۔

معنوی چیزوں کو محسوس چیزوں سے سمجھو

حدیث ۹۹۵:

عن أبي موسىٰ الأشعرى (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ : مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِى يَقْرَأُ الْقُرْآنَ مَثَلُ الْأُتْرُجَّةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَ طَعْمُهَا طَيِّبٌ وَ مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِى لَا يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ التَّمْرَةِ، لَارِيحَ لَهَا وَطَعْمُهَا حُلْوٌ. وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِى يَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الرَّيْحَانَةِ، رِيحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ. وَمَثَلُ الْمُنَافِقِ الَّذِى لَايَقْرَأُ الْقُرْآنَ كَمَثَلِ الْحَنْظَلَةِ، لَيْسَ لَهَا رِيحٌ وَطَعْمُهَا مُرٌّ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ مؤمن جو قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے اس کی مثال ترنج کی طرح ہے کہ اس کی خوشبو بھی بڑی عمدہ ہوتی ہے اور مزہ بھی بڑا اچھا ہوتا ہے (ایمان والے کے دل میں جو صفتِ ایمان ہے، اس کو تو مزہ اور ذائقہ سے تشبیہ دی، اور وہ قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا ہے تو اس کی وجہ سے جو مہک پھیل رہی ہے اس کو خوشبو کے ساتھ تشبیہ دی) اور وہ مؤمن جو قرآنِ پاک کی تلاوت نہیں کرتا اس کا حال کھجور کی طرح ہے کہ اس میں کوئی خوشبو تو نہیں ہوتی، لیکن اندر مٹھاس بہت اچھی ہوتی ہے (تو جو مؤمن قرآنِ پاک کی تلاوت نہیں کرتا اس کے قلب میں ایمان ہے، جس کی وجہ سے مزہ تو میٹھا ہے، لیکن چوں کہ تلاوت نہیں کرتا اس لیے باہر اس کا پتہ نہیں چلتا) اور اس منافق (یعنی وہ آدمی جس کے دل میں ایمان نہ ہو، لیکن باہر ایمان کا اظہار کرے، اس) کی مثال جو قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے اس پھول کی طرح ہے جس کی خوشبو تو بہت اچھی ہے، لیکن اس کا مزہ کڑوا ہے (قلب میں ایمان نہ ہونے کی وجہ سے اندر تو کڑواہٹ ہے لیکن تلاوت کی مہک باہر پھیلتی ہے) اور اس منافق کی مثال جو قرآن بھی نہیں پڑھتا ہے حنظل جیسی ہے کہ اس میں خوشبو بھی نہیں ہے اور اندر سے مزہ بھی کڑوا ہے (اسی کو کریلا اور نیم چڑھا کہتے ہیں)۔

افادات:-دین کی بعض چیزوں کو سمجھانے کے لیے حضراتِ انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) مثالیں استعمال کرتے ہیں، کوئی مضمون ایسا ہوتا ہے کہ مخاطب کے ذہن میں بٹھانے کے لیے اور آسانی سے مخاطب کی سمجھ میں آجائے اس کے لیے کسی دوسری چیز سے تشبیہ دے کر سمجھایا جاتا ہے۔ یہ بھی علم کا مستقل شعبہ ہے، اور اس میں حضرات انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اسی لیے محدثین احادیث کی کتابوں میں مستقل ایک عنوان "کتاب الامثال" کا قائم کرتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے بھی بہت سی چیزوں کو مثالوں کے ذریعہ سے سمجھایا ہے، جیسے فضائل کی تعلیم میں نماز کے بارے میں آپ نے پڑھا اور سنا ہوگا کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ نے صحابہ سے سوال کیا کہ کسی آدمی کے گھر کے سامنے ایک نہر بہہ رہی ہو، اور وہ روزانہ اس میں پانچ مرتبہ غسل کرے؛ تو بتلاؤ کہ اس کے جسم پر کچھ بھی میل کچیل رہے گا؟ صحابہ نے کہا: نہیں رہے گا۔ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی پانچ وقت کی نماز پڑھے وہ گناہوں سے ایسا ہی پاک وصاف ہو جاتا ہے۔

دیکھو! گناہوں کی معافی کو سمجھانے کے لیے نبیٔ کریم ﷺ نے ایک مثال دی اور بات کو بڑی آسانی سے سمجھا دیا۔ تو معنوی چیزوں کو محسوس چیزوں کے ساتھ پیش کر کے سمجھایا جاتا ہے۔ اس روایت میں بھی قرآنِ پاک کی تلاوت کرنے والا اور نہ کرنے والا، اور اس میں بھی مؤمن اور منافق؛ اس چیز کو حضورِ اکرم ﷺ محسوس چیز سے تشبیہ دے کر سمجھایا ہے۔

”ترنج“ موسمبی اور سنترہ جیسا ایک پھل ہوتا ہے، جس کو ہمارے یہاں ” میٹھا لیموں “ کہتے ہیں، عرب کے علاقہ میں بہت زیادہ ہوتا ہے، لیکن ہمارے یہاں زمین کے موافق نہ ہونے کی وجہ سے اس کا اصلی ذائقہ نہیں پایا جاتا۔ بہت سے پھل ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کو ناموافق زمین میں بویا جائے تو وہ پیدا تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کی جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ پورے طور پر ظاہر نہیں ہوتیں، جیسے آم کو ناموافق زمین میں بویا جائے تو اگرچہ اس پر پھل تو آئیں گے لیکن اس کے اصل خواص نہیں آئیں گے۔

خیر! تو یہ ترنج عرب علاقوں میں کثرت سے پایا جاتا ہے ، اور اس کے بہت سے خواص اور فائدے بتلائے گئے ہیں، ایک فائدہ یہ بھی بتلایا ہے کہ یہ پھل جس گھر میں ہوتا ہے وہاں جن نہیں آتے۔ جو لوگ جنات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تعویذ لینے عاملوں کے پاس دوڑتے رہتے ہیں، ان کو چاہیے کہ یہ پھل اپنے گھر کے کسی کونے میں لٹکا دیں۔

عزت دلانے اور ذلیل کرنے والی کتاب

حدیث ۹۹۶:-

عن عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ أَقْوَاماً وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کتاب (یعنی قرآنِ پاک) کی وجہ سے بہت سی قوموں کو سربلندی اور عزت عطا فرماتے ہیں، اور اسی قرآن کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔

افادات:- جو لوگ قرآنِ پاک کو پڑھتے پڑھاتے، سمجھتے اور دوسروں کو سمجھاتے ہیں، خود عمل کرتے ہیں اور اپنی زندگی میں اس کو اتارتے ہیں، پھر دوسروں کو بھی عمل کی ترغیب دیتے ہیں اور اس کے حقوق کو ادا کرتے ہیں؛ اللہ تعالیٰ ان کو عزت و سربلندی عطا فرماتے ہیں۔ اور جو لوگ اس کے حقوق کو ادا نہیں کرتے، نہ پڑھتے ہیں، نہ سمجھتے ہیں، نہ عمل کرتے ہیں؛ تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔ گویا اس قرآن ہی کو اللہ تعالیٰ نے عزت وذلت کا معیار بنایا ہے، اس لیے جو لوگ جس مقدار میں اس کے حقوق کو ادا کریں گے، اسی مقدار میں اللہ تعالیٰ عزت دیں گے۔ جس میں ساری چیزیں آجاتی ہیں اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ملتا ہے، اور اگر حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام تو کرتے ہیں لیکن پورا پورا نہیں ہے، جیسے: جو لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں لیکن عمل کا اہتمام نہیں کرتے، یا عمل تو کرتے ہیں لیکن اس میں کوتاہی کرتے ہیں، تو وہ بالکل ذلیل تو نہیں ہوں گے، لیکن عزت کا اعلیٰ معیار ان کو حاصل نہیں ہوگا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے قوموں کی عزت اور ذلت کو اسی کے ساتھ جوڑ دیا ہے:-

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر	❁	اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک کو چھوڑنے کی وجہ سے رسوائی آتی ہے۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے نافع بن عبد الحارث کو مکہ کا گورنر بنایا تھا، اور ان کی عادت تھی کہ اپنے گورنروں کا جائزہ لیتے رہتے تھے، ایک مرتبہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ان سے پوچھا: تم نے جنگلات کا حاکم کس کو بنایا ہے؟ انہوں نے کہا: ابن اَبزیٰ کو۔ پوچھا: یہ ابن اَبزیٰ کون ہے؟ کہا: ہمارا ایک غلام ہے۔ فرمایا: ایک غلام کو تم نے حاکم بنایا؟ انہوں نے جواب دیا: وہ قرآن کا پڑھنے والا ہے، تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فوراً کہا: ہاں! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ سے عزت عطا فرماتے ہیں۔ اگرچہ وہ غلام ہے لیکن چوں کہ اس نے قرآنِ پاک پڑھا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اونچا مقام عطا فرمایا۔ اور جو آدمی قرآن کو چھوڑتا ہے اس کو یہ چیز حاصل نہیں ہوتی۔

اسی لیے یہ روایت بعض کتبِ حدیث بیہقی وغیرہ میں ذرا تفصیل سے آئی ہے جس میں یہ بھی ہے: ”مَنْ بطّأَبِهِ عَمَلُهٗ ، لَمْ يُسْرَعْ بِهٖ نَسَبُهٗ“ جس کو اس کا عمل پیچھے رکھے گا تو پھر اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ نسب کی شرافت اپنی جگہ پر ہے، لیکن جو آدمی نسبی شرافت کے باوجود اعمال کے معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے، تو عملی کمزوری کی وجہ سے وہ پیچھے رہ جائے گا؛ پھر اس کا نسب اس کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔

قابلِ رشک آدمی

حدیث ۹۹۷:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) عن النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الْقُرْآنَ، فَهُوَ يَقُومُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالاً فَهُوَ يُنْفِقُهُ آنَاءَ اللَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ. (متفقٌ عَلَيْهِ) ((والآنَاءُ)): السَّاعَاتُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حسد جائز نہیں ہے مگر دو چیزوں میں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو قرآنِ پاک عطا فرمایا ہو (یعنی جس نے قرآنِ پاک سیکھا ہو، اور اچھی طرح پڑھتا ہو) پھر وہ اس قرآن کو لے کر دن رات کھڑا رہتا ہو (یعنی نمازوں میں کھڑے ہو کر پڑھتا رہتا ہو، اسی طریقہ سے عملی طور پر مستعد ہو اور عمل کا اہتمام کرتا ہو، تو یہ آدمی اس قابل ہے کہ اس کو دیکھ کر تمنا کی جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ چیز عطا فرما دے) اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو، اور وہ اس کو رات دن اللہ کے راستہ میں خرچ کرتا ہو۔

افادات:- کسی کے پاس صرف مال دیکھ کر رشک نہیں کر سکتے، بلکہ جو آدمی اس مال کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات میں بے دھڑک اور بے دریغ خرچ کرتا ہو؛ تو وہ آدمی اس قابل ہے کہ آپ اس پر رشک کریں اور تمنا کریں کہ اے اللہ! مجھے بھی ایسا بنا تاکہ مَیں بھی اسی طرح نیکی کے کاموں میں مال خرچ کروں۔

"حسد" اس کو کہتے ہیں کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملی ہو، تو اس کی اس نعمت کو دیکھ کر دل میں جلن پیدا ہو، اور یہ خیال پیدا ہو کہ مجھے مل جائے اور اس کے پاس نہ رہے؛ یہ تو حرام کام ہے۔ تو پھر یہاں دو چیزوں میں کیسے جائز ہے؟ علماء نے اس حدیث کے مطلب کو واضح کیا ہے۔ ایک مطلب

تو یہ بیان کیا ہے کہ اگر حسد جائز ہوتا تو ان دو چیزوں میں جائز ہوتا۔ دوسرا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ یہاں حسد بول کر غبطہ مراد ہے، جس کو اردو میں رشک کرنا کہتے ہیں، یعنی کسی صاحبِ نعمت سے اس نعمت کے چھن جانے کی تمنا نہ کرے، بلکہ اس کی نعمت دیکھ کر دل میں یہ تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس کے پاس بھی وہ نعمت باقی رکھے اور مجھے بھی ایسی نعمت حاصل ہو جائے۔ تو علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں حسد بول کر غبطہ اور رشک مراد ہے۔ اس لیے کہ انسان کا مزاج ایسا ہے کہ جب کسی کے پاس کوئی اچھی چیز دیکھتا ہے تو اس کے دل میں بھی یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ مجھے بھی یہ چیز مل جائے۔ تو گویا حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ہر چیز دیکھ کر دل میں ایسی تمنا نہ کرو؛ ہاں! یہ دو چیزیں اس قابل ہیں کہ اگر کسی کے اندر وہ نظر آئیں تو آپ اپنے دل میں یہ تمنا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ عطا فرمادے۔

ٹینشن دور کرنے کا نسخہ

حدیث ۹۹۸:-

وعن البراءِ بن عازبٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ: كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُورَةَ الْكَهْفِ، وَعِنْدَهُ فَرَسٌ مَرْبُوطٌ بِشَطَنَيْنِ، فَتَغَشَّتْهُ سَحَابَةٌ، فَجَعَلَتْ تَدْنُو، وَجَعَلَ فَرَسُه يَنْفِرُ مِنْهَا، فَلَمَّا أَصْبَحَ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ وَذَكَرَ ذٰلِكَ لَهُ، فَقَالَ: تِلْكَ السَّكِينَةُ تَنَزَّلَتْ لِلْقُرآنِ.

((الشَّطَنُ)) بفتحِ الشينِ المعجمة والطاءِ المهملة: الحَبْلُ.

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک صحابی سورۂ کہف کی تلاوت کر رہے تھے، اور ان کے پاس ان کا گھوڑا دوہری (ڈبل) رسّی سے بندھا ہوا تھا (ان کی اس تلاوت کی وجہ سے) ایک بادل سا ان کے اوپر سایہ ڈالنے لگا اور قریب ہونے لگا، یہ منظر دیکھ کر ان کا گھوڑا بدکنے لگا (دوسری روایت میں ہے کہ وہیں قریب میں ان کا بچہ بھی لیٹا ہوا تھا، ان کو ڈر لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گھوڑا بدک کر بچہ کو نقصان پہنچا دے۔ اس لیے انہوں نے تلاوت کا سلسلہ بند کر دیا تو وہ بادل اوپر چلا گیا) جب صبح ہوئی تو نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کا تذکرہ کیا (کہ اے اللہ کے رسول! آج رات ایسا قصہ پیش آیا) یہ سن کر نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ایک سکینہ تھا جو قرآنِ پاک کی وجہ سے نازل ہو رہا تھا۔

افادات:- "**سکینہ**" کی مختلف تشریحات کی گئی ہیں، ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک خاص کیفیت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک پڑھنے والے کے اوپر طاری کی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں اس کو ایک خاص قسم کا سکون و اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ بعضوں نے اس کی شکل و صورت بھی بیان کی ہے، لیکن اس کا اصل اثر جو دل پر ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل کو سکون و طمانینت نصیب ہوتی ہے۔

آج اس زمانہ میں جب کہ ہر آدمی اپنے دل کی بے چینی کی شکایت کر رہا ہے، اور ہر ایک ٹینشن میں ہے، ہر کوئی یہی کہتا ہے کہ مَیں بہت پریشان ہوں؛ اور اس کے لیے بزرگوں سے وظیفے پوچھتے رہتے ہیں؛ تو سکون و اطمینان حاصل کرنے کے لیے اس سے عمدہ نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآنِ پاک کی تلاوت کا اہتمام کیا جائے۔

ہر ہر حرف الگ الگ عمل

حدیث ۹۹۹:-

وعن ابن مسعودٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: مَنْ قَرَأَ حَرْفاً مِنْ كِتَابِ اللهِ فَلَهُ حَسَنَةٌ ، وَالحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا ، لاَ أقول : ألم حَرفٌ ، وَلكِنْ : أَلِفٌ حَرْفٌ ، وَلاَمٌ حَرْفٌ ، وَمِيمٌ حَرْفٌ . (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآنِ پاک کا ایک حرف پڑھا اس کو ایک نیکی ملے گی، اور ایک نیکی دس کے برابر ہے (گویا ایک حرف پر دس نیکی ہوئی) میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے، بلکہ الف ایک حرف ہے، اور لام ایک حرف ہے، اور میم ایک حرف ہے۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف اعمال پر مختلف اجر کے وعدے کئے گئے ہیں، اور کہیں دس گنا، کہیں سو گنا، کہیں سات سو گنا ملتا ہے۔ اور پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ ثواب پورے عمل کا ہوتا ہے، جیسے نماز کا اتنا ثواب ہے، اور روزہ کا اتنا ثواب ہے، تو اسی طرح اگر آپ سورۂ فاتحہ پڑھیں تو پوری سورۂ فاتحہ ایک عمل ہے، اس لیے قاعدہ کے مطابق تو اس پورے عمل پر دس نیکیاں ملتیں، لیکن نبی کریم ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس پورے عمل میں ایسا نہیں ہے بلکہ سورۂ فاتحہ کے ہر ہر حرف پر آپ کو ایک ایک نیکی ملے گی۔ دوسرے اعمال میں تو مجموعی طور پر ایک عمل شمار کیا جاتا ہے، جیسے حج کروگے تو اس کی یہ فضیلت ہے، نماز پڑھوگے تو اس کی یہ فضیلت ہے، اور روزہ رکھوگے تو اس کی یہ فضیلت ہے، لیکن قرآنِ پاک کی تلاوت میں ایسا نہیں ہے کہ اگر پانچ پارے پڑھے تو یہ ایک عمل

ہوا، بلکہ ان پانچ پاروں میں جتنے حروف آئے ہیں ہر ہر حرف پر ایک نیکی، اور ایک نیکی دس گنا: تو اندازہ لگایئے کہ کتنا بڑا ثواب ملا۔ گویا اس کے ہر ہر جزو کو الگ الگ عمل شمار کیا گیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں: "الم" سے مراد حروفِ مقطعات ہیں یعنی وہ حروف جو الگ الگ کرکے پڑھے جاتے ہیں۔ حروف دو طرح کے ہیں، عام دستور تو یہ ہے کہ جب ایک حرف کو دوسرے حرف کے ساتھ ملا کر لکھا گیا ہو، جیسے "عینؔ، باؔء اور داؔل" کو ملا کر لکھا گیا ہے تو "عَبْد" پڑھیں گے، الگ الگ نہیں پڑھیں گے۔ حروف سے کلمات بنتے ہیں اور کلمات جوڑ کر پڑھے جاتے ہیں، لیکن قرآنِ پاک کے اندر بعض حروف ایسے ہیں جو ملا کر لکھے جاتے ہیں تب بھی ان کو الگ الگ ہی پڑھتے ہیں، جیسے سورۂ بقرہ کے شروع میں الف، لام اور میم کو ملا کر لکھا ہوا ہے تو ہم اس کو "اَلَمْ" نہیں پڑھتے حالاں کہ قاعدہ کا تقاضہ تو یہی تھا کہ "اَلَمْ" پڑھا جاتا لیکن الفؔ، لامؔ، میمؔ پڑھتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ قرآنِ پاک کو جب تک کسی کے پاس پڑھنا نہ سیکھا جائے وہاں تک پڑھنا نہیں آسکتا، اس لئے کہ جو آدمی اپنی عقل سے پڑھے گا وہ اس کو الفؔ، لامؔ، میمؔ نہیں پڑھے گا، بلکہ "اَلَمْ" پڑھے گا۔ خیر! بعضوں نے کہا کہ اس سے مراد حروفِ مقطعات ہیں، لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: اس سے مراد "أَلَمْ تَرَ كَيْفَ" اور اس طرح کے دوسرے کلمات ہیں جو آیتوں کے شروع میں بھی ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک کی پوری تلاوت ایک عمل نہیں، بلکہ ہر ہر حرف الگ الگ عمل شمار ہوتا ہے، اور اس کے مطابق اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ثواب دیا جاتا ہے۔

ویران گھر

حدیث ۱۰۰۰:-

وعن ابن عباسٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ قَالَ رسول اللہ ﷺ: إِنَّ الَّذِی لَیۡسَ فِی جَوۡفِهِ شَیۡءٌ مِنَ الۡقُرۡآنِ کَالۡبَیۡتِ الۡخَرِبِ

(رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن صحیح).

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ آدمی جس کے دل میں قرآن کا کوئی حصہ نہ ہو؛ ویران گھر کی طرح ہے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ ہر مؤمن کو قرآنِ پاک کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور یاد کرلینا چاہیے۔ ویسے بھی قرآنِ پاک کی اتنی مقدار کا زبانی یاد کرنا فرضِ عین ہے جس کا نماز کے اندر پڑھنا فرض ہے۔ اور جتنی مقدار کا پڑھنا واجب ہے، اتنی مقدار یاد کرنا واجب ہے۔ اور جتنی مقدار پڑھنا سنت ہے اتنی مقدار کا یاد کرنا سنت ہے۔ اس لیے آدمی اپنی طاقت اور حیثیت کے مطابق قرآنِ پاک کا زیادہ سے زیادہ حصہ یاد اور محفوظ کرلے؛ تو اچھا ہے۔

"ویران گھر کی طرح ہے" حضرت شیخ (نور اللہ مرقدہٗ) فرماتے ہیں کہ: فارسی میں مثل مشہور ہے: "خانۂ خالی را دیو می گیرد" جو گھر ویران ہوتا ہے اس پر شیطانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے، اسی طرح جس دل اور جسم میں قرآنِ پاک کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہیں ہوتا اس کے اوپر شیاطین کا تسلط ہو جاتا ہے۔ ہاں! اگر وہاں قرآنِ پاک ہوگا تو فرشتوں کی برکتیں شاملِ حال ہوں گی۔

صاحبِ قرآن کون ہے؟

حدیث ۱۰۰۱:-

وعن عبداللهِ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) عن النبيِّ ﷺ قَالَ: يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ: اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِى الدُّنْيَا ، فَإِنَّ مَنْزِلَتَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا. (رواه أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں: صاحبِ قرآن (یعنی قرآن والے) سے (قیامت کے روز) کہا جائے گا کہ قرآنِ پاک پڑھتا جا، اور جنت کے درجات چڑھتا جا (ترقی کرتا جا) اور اُسی طرح ٹھہر ٹھہر کر ترتیل کے ساتھ پڑھ جس طرح تو دنیا کے اندر پڑھتا تھا؛ اس لیے کہ جنت میں تیرا مقام قرآنِ پاک کی وہ آخری آیت ہے جو تو پڑھے گا۔

افادات:- صاحبِ قرآن (قرآن والے) سے کون مراد ہے؟ تو ملا علی قاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے مرقاۃ شرحِ مشکوٰۃ میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ یہاں قرآن والا بول کر حافظِ قرآن مراد لیا گیا ہے۔ گویا اس کا قرآنِ پاک کے ساتھ خصوصی تعلق ہونے اور قرآنِ پاک یاد کرلینے اور محفوظ کرلینے کی وجہ سے اس کو صاحبِ قرآن کہا گیا ہے۔

اور بعض حضرات نے فرمایا: جو آدمی حافظ نہیں ہے، لیکن ناظرہ بھی خوب کثرت سے پڑھتا رہتا ہے، اور کئی کئی پارے روزانہ پڑھتا ہے؛ وہ بھی صاحبِ قرآن کے مصداق میں آجاتا ہے۔

ترتیل کسے کہتے ہیں؟

ترتیل کے سلسلہ میں حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے تفسیر فتح العزیز میں لکھا ہے کہ: چند چیزوں کی رعایت کرتے ہوئے جب آدمی قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے تو اس کو ترتیل سے تلاوت کرنا کہتے ہیں:۔

ا:۔ تصحیح حروف؛ یعنی وہ تمام حروف جن سے قرآنِ پاک کے کلمات بنے ہیں، ان کو اپنے مخارج سے صحیح طریقہ سے ادا کرنا بہت ہی ضروری ہے۔ بہت سے لوگ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں لیکن حروف کو صحیح مخارج سے ادا کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے، تو پھر تلاوت کی جو فضیلت اور ثواب ہے وہ ان کو حاصل نہیں ہوگا، بلکہ جیسا کہ بعض روایت میں آتا ہے کہ بہت سے قرآن پڑھنے والے ایسے ہیں کہ وہ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور قرآن ان پر لعنت کرتا ہے (احیاء علوم الدین، ۲/ ۳۲) تو حروف کو صحیح طریقہ سے ادا نہ کرنے کی وجہ سے وہ لوگ اس وعید کے مصداق بنتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ صحیح طریقہ سے حروف کی ادائیگی سیکھ لی جائے، اگر یہ کمزوری ہے تو ہر ایک کو چاہئے کہ اس کی طرف خصوصی توجہ دے، محنت کرے اور اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ ہمارے اکابر میں حضرت شاہ ابرار الحق صاحب ہردوئی (رحمۃ اللہ علیہ) اس کی طرف بہت زیادہ توجہ دلاتے تھے اور اہتمام فرماتے تھے، یہاں تک کہ بڑے بڑے علماء بھی جب آپ کی خدمت میں پہنچتے تھے؛ ان کو بھی اس سلسلہ میں بخشتے نہیں تھے اور بڑی تاکید فرماتے تھے، بلکہ ان سے بھی نورانی

قاعدہ درس کے طور پر پڑھواتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بہت اہم چیز ہے، اس کی طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ تو ایک تصحیح حروف ہے۔

۲:- دوسری چیز رعایتِ اوقاف۔ یعنی قرآن پڑھتے ہوئے کہاں ٹھہرنا چاہیئے اور کہاں ملا کر پڑھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ بہت سی مرتبہ آدمی غلط جگہ پر ٹھہر جاتا ہے، یا جہاں ملانا نہیں چاہیئے اس کو ملا کر پڑھتا ہے، تو معنیٰ بدل کر کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے اس لیے قرآن پڑھتے ہوئے کہاں ٹھہرنا ہے اور کہاں نہیں ٹھہرنا؛ یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ اس موضوع پر بھی ماہرینِ قراءت نے مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

۳:- اشباعِ حرکات۔ یعنی زبر، زیر، پیش کو پورے طور پر ادا کرنے کی کوشش کرنا۔ بہت سے لوگ جلدی اور عجلت سے پڑھنے کے شوق میں حرکات کو پورے طور پر ادا نہیں کرتے، یہ بہت غلط طریقہ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ مَیں ٹھہر ٹھہر کر ترتیل سے سورۃ اذا زلزلت الارض اور دوسری چھوٹی سورتیں پڑھوں؛ یہ مجھے زیادہ پسند ہے اس سے کہ جلدی جلدی سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران پوری کر دوں۔ تو بہت سے لوگ اس شوق میں ان چیزوں کی رعایت نہیں کرتے تاکہ تلاوتِ قرآن کی مقدار بڑھ جائے؛ تو یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔

۴:- چوتھی چیز یہ ہے کہ جہاں مدّ یا تشدید ہو، اس کو پوری طرح ادا کرنے کی کوشش کی جائے

۵:- پانچواں: آدمی ذرا سا جہر اور آواز کے ساتھ پڑھے۔

۶:- چھٹا: آواز میں درد کی کیفیت پیدا کرے۔ یعنی پڑھنے والا اس انداز سے پڑھے کہ سننے والے کو محسوس ہو کہ اس کے دل میں خوفِ خدا ہے۔

۷:- ساتویں چیز یہ ہے کہ جہاں آیتِ رحمت ہو وہاں ٹھہر جائے اور اللہ کی رحمت کا سوال کرے۔ اسی طریقہ سے جہاں آیتِ عذاب آئے وہاں بھی ٹھہر جائے اور اللہ کے عذاب سے پناہ چاہے۔

آدمی جب ان سات چیزوں کی رعایت کرے گا تب کہا جائے گا کہ اس نے ترتیل کے ساتھ قرآنِ پاک پڑھا۔ اب ہمارے یہاں اس ساتویں بات کا تو اہتمام ہی نہیں کیا جاتا، پڑھے لکھے لوگ بھی اس طرف دھیان نہیں دیتے، حالاں کہ اسلاف کے حالات میں لکھا ہے کہ پڑھتے پڑھتے ایسے مواقع پر ٹھہر جاتے تھے اور دعا میں مشغول ہو جاتے تھے۔ لہٰذا اہلِ علم کو خاص طور پر متوجہ کرنے کے لیے عرض کر رہا ہوں کہ اس بات کا خوب اہتمام کریں، آج اس کیفیت کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنت کے درجات بھی قرآنِ پاک کی آیتوں کے بقدر ہیں۔ علامہ دانی (رحمۃ اللہ علیہ) جو تجوید و قراءت کے ائمہ میں سے شمار ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی آیتیں چھ ہزار ہیں اس پر تو سب کا اتفاق ہے، اس کے بعد کی تعداد میں قراء کے یہاں اختلاف ہے۔ گویا قرآنِ پاک کی چھ ہزار سے زیادہ آیتیں ہیں، اور اسی تعداد کے مطابق جنت کے درجات بھی ہیں۔

اب یہاں کون سے درجات مراد ہیں؟ تو حضرت شیخ (نور اللہ مرقدہٗ) کی رائے عالی تو یہ ہے کہ نفسِ ایمان پر جنت میں داخلہ تو نصیب ہو جائے گا، اس کے بعد ترقیٔ درجات کے اعتبار سے فرمایا گیا ہے کہ قرآنِ پاک پڑھتے جاؤ، اور جنت کے درجات میں ترقی کرتے جاؤ۔ اس لیے آدمی جب قرآنِ پاک حفظ کرے گا اور پھر اس کو پڑھنے کا اہتمام بھی کرے گا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اتنے ہی درجات سے اس کو مالامال فرمائیں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

باب الأمر بتعهد القرآن والتحذير عن تعريضه للنسيان

قرآنِ پاک کو یاد کر لینے کے بعد اس کو یاد رکھنے کا اہتمام کرنا

دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک تو قرآنِ پاک کا حفظ یاد کر لینا، اس کے بعد دوسری چیز یہ ہے اس کو یاد رکھنے کا اہتمام کرنا۔ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بچپن میں ماں باپ اپنے شوق اور توجہ سے بچہ کو درجۂ حفظ میں بٹھا دیتے ہیں اور بچہ بھی اس وقت قرآنِ پاک کو یاد کر لیتا ہے، لیکن بڑے ہونے کے بعد پھر اس کو یاد رکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ ابھی گذشتہ دنوں ہمارے کچھ احباب نے یہاں سورت میں حفاظ کے لیے مخصوص انداز سے ایک کوشش شروع کی تھی کہ حفظ کر لینے کے بعد اس کی طرف سے جو لوگ غفلت کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کو پڑھنے کے معاملہ میں، حفظ یاد رکھنے کے معاملہ میں اور پھر عمل کے معاملہ میں بھی کمزوریاں آجاتی ہیں؛ ان سب کو دور کیا جائے۔ یہ بہت اہم چیز ہے جس کی طرف توجہ کرنی چاہیے، اسی کو اس عنوان میں بتلاتے ہیں کہ یاد کر لینے کے بعد اس کی طرف سے غفلت برت کر اس کو بھولنے سے بچایا جائے۔

قرآن اونٹ سے جلدی چھوٹ جاتا ہے

حدیث ۱۰۰۲:-

عن أَبِي موسیٰ (رضی اللہ عنہ) عن النبيِ ﷺ قَالَ: تَعَاهَدُوا هَذَا القُرْآنَ فَوَالَّذِى نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَهُوَ أَشَدُّ تَفَلُّتاً مِنَ الإِبِلِ فِي عُقُلِهَا (متفق علیہ)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآنِ پاک کی حفاظت کرو، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! یہ قرآن اس سے جلدی چھوٹ جانے والا ہے جتنی جلدی اونٹ اپنی رسی میں سے چھوٹ جاتا ہے۔

افادات:- یعنی اس کو یاد کرلینے کے بعد یاد رکھنے اور حفاظت کا اہتمام کرنا چاہیے، اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ روزانہ اس کی تلاوت کی جائے، اس پر عمل کا اہتمام کیا جائے اور اس کے حقوق کی رعایت وآداب کا بھی اہتمام کیا جائے۔ قرآنِ پاک کو جتنا کثرت سے پڑھیں گے اتنا ہی وہ محفوظ رہے گا۔

پہلے بھی کبھی مَیں بتلاچکا ہوں کہ جس طرح گائے کے گلے میں باقاعدہ پٹہ ڈالا جاتا ہے، اور رسّی سے اس کو باندھا جاتا ہے، اس طرح اونٹ کو باندھا نہیں جاتا، بلکہ عربی رومال کے اوپر عرب حضرات جو پٹہ جیسا رکھتے ہیں جس کو ''عقال'' کہتے ہیں وہ اسی سے ماخوذ ہے۔ تو اونٹوں کے آگے والے پیروں میں ''عِقَال'' لگا دیتے ہیں، اور اونٹوں کا جہاں باڑا ہوتا ہے جس میں سو دو سو اونٹ رہتے ہیں، وہاں

سب اونٹوں کے پاؤں میں ”عقال“ لگا کر چھوڑ دیتے ہیں، اور ان کی نگرانی کے لیے ایک آدمی مقرر ہوتا ہے تاکہ وہ بھاگ نہ جائیں۔ اگر ان کی طرف سے ذرّہ بھی غفلت برتی جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ رسّی جو پاؤں میں ڈالی جاتی ہے اس کو نکال کر کوئی اونٹ بھاگ جائے۔ اور جانور کی عادت ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ جب بدک جاتا ہے اور ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے تو پھر اس کو قابو میں لانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آپ نے دیکھا ہوگا کہ جن لوگوں نے قرآنِ پاک کو یاد تو بڑی آسانی سے کر لیا ہوتا ہے، لیکن نہ پڑھنے اور غفلت کے نتیجہ میں بھول گئے، تو پھر دوبارہ قرآنِ پاک کو یاد کرنا ان کے لیے بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآنِ پاک کا حق یہ ہے کہ اس کو کثرت سے پڑھا جائے اور اس کو یاد رکھنے کا اہتمام کیا جائے۔

ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ حافظ آدمی روزانہ کم سے کم تین پاروں کی تلاوت کا اہتمام کرے، اور اگر ایک منزل یا اس سے زیادہ جتنی اس کی طاقت ہو پڑھے تو بہت اچھا ہے، لیکن حافظ کو کم سے کم تین پاروں کا اہتمام تو کرنا ہی چاہیے۔

حدیث ۱۰۰۳ :-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إنَّمَا مَثَلُ صَاحِبِ الْقُرْآنِ كَمَثَلِ الإِبِلِ المُعَقَّلَةِ، إنْ عَاهَدَ عَلَيْهَا أَمْسَكَهَا، وَإنْ أَطْلَقَهَا ذَهَبَتْ (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: صاحبِ قرآن (یعنی حافظِ قرآن) کی مثال بندھے ہوئے اونٹ کی طرح ہے کہ اگر اس کی نگرانی کی جائے تو وہ محفوظ رہے گا، اور اگر اس کی طرف سے غفلت برتی جائے، تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔

افادات:- مسلم شریف کی روایت میں یہ زیادتی ہے کہ جب حافظِ قرآن رات کو اُٹھ کر قرآنِ کریم کی تلاوت کرتا رہے گا تو قرآن کو محفوظ رکھے گا، لیکن اگر قیام اللیل میں تلاوت نہیں کرے گا؛ تو قرآنِ کریم کو بھول جائے گا۔

قرآن کریم بھول جانے پر وعیدات

حدیثِ پاک میں آتا ہے، حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کے ثواب میرے روبرو پیش کئے گئے یہاں تک کہ اس تنکے اور خس و خاشاک کا ثواب بھی پیش ہوا جس کو آدمی مسجد سے باہر نکالتا ہے، اسی طرح امت کے گناہ بھی مجھ پر پیش کئے گئے تو میں نے ان میں اس سے بڑھ کر اور کوئی گناہ نہیں دیکھا کہ کسی شخص کو قرآنِ پاک کی کوئی سورت یا کوئی آیت یاد ہو اور پھر وہ اس کو بھول گیا ہو۔ (ترمذی وابوداود)

ایک روایت میں ہے، حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص قرآنِ پاک پڑھے پھر اس کو بھول جائے تو قیامت کے روز وہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کوڑھی

ہو کر (یا ہاتھ کٹا ہوا ہونے کی حالت میں) حاضر ہو گا۔ (کوڑھ وہ بیماری ہے کہ جس سے ہاتھ پیر وغیرہ اعضاء گل سڑ جاتے ہیں اور انسانی بدن کا گوشت گل سڑ کر گر جاتا ہے۔)

جمع الفوائد میں یہ روایت نقل فرمانے کے بعد آیتِ ذیل کو دلیل بنایا ہے: إِقْرَءُوْا إِنْ شِئْتُمْ ﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَى ، قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنتُ بَصِيرًا ، قَالَ كَذَٰلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَٰلِكَ الْيَوْمَ تُنسَى﴾ اگر تم چاہو تو دلیل کے طور پر یہ آیتیں پڑھ کر دیکھ لو: ”جو شخص ہمارے ذکر (قرآن) سے اعراض کرتا ہے اس کی زندگی تنگ کر دیتے ہیں، اور قیامت کے روز اس کو اندھا کر کے اُٹھائیں گے (کوڑھی بھی اندھے کے حکم میں ہے) وہ عرض کرے گا کہ: یا اللہ! میں تو آنکھوں والا تھا، مجھے اندھا کیوں اُٹھایا؟ ارشاد ہو گا: اس لیے کہ تیرے پاس ہماری آیتیں آئی اور تو نے ان کو بھلا دیا، پس آج تو بھی اسی طرح بھلا دیا جائے گا۔ یعنی تیری کوئی اعانت نہیں“۔

جس نے قرآنِ کریم کی (حفظ یا ناظرہ) تعلیم حاصل کی، اور پھر قرآن کو لٹکا کر رکھ دیا، نہ اس کی منزل پڑھی، اور نہ اس کو دیکھنا تک گوارا کیا؛ تو قرآنِ کریم قیامت کے دن ایسے آدمی کے ساتھ چمٹا ہوا آئے گا اور کہے گا: اے رب العالمین! تیرے اس بندے نے مجھے بالکل نظر انداز کر رکھا تھا، پس میرے اور اس کے درمیان فیصلہ فرمایئے (ظاہر ہے کہ وہاں اس آدمی کو کوئی چھڑانے والا نہ ہو گا، اور قرآن کے حق میں فیصلہ صادر ہو کر ایسے آدمی کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ (والعیاذ باللہ) (جامع الاحکام قرطبی)

تفسیر قرطبی میں اسد بن موسیٰ کی کتاب سے مروی ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دوزخ کے درمیان ایک میدان ہے جس سے خود دوزخ روزانہ سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ اس میدان میں ایک کنواں ہے جس کے شر سے دوزخ اور وہ میدان دونوں روزانہ پناہ مانگتے ہیں۔ اس کنویں میں (زہر دار، سخت آواز) ایک سانپ رہتا ہے، اس سانپ کے شر سے روزانہ دوزخ، میدان اور کنواں تینوں؛ سات مرتبہ پناہ مانگتے ہیں، اس کنویں کو اللہ پاک نے ان بدبخت حفاظِ قرآن کے عذاب کے لیے مقرر فرمایا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے نبیٔ کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ کسی مسلمان کا یہ کہنا کتنا برا ہے کہ مَیں فلاں فلاں آیت بھول گیا، بلکہ اس کو کسی گناہ کی نحوست کی وجہ سے وہ آیت بھلادی گئی ہے (لٰہذا وہ استغفار کرے) اور تم قرآن کا تکرار کرتے رہا کرو، کیوں کہ وہ بغیر تکرار کے آدمیوں کے سینوں سے چوپایوں سے بھی جلدی اور تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

عبد اللہ بن مبارک کی کتاب الزہد سے نقل کیا گیا ہے کہ جس آدمی نے قرآن سیکھا، پھر بھول گیا، اس کے بارے میں یہ بات یقینی ہے کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے (جس کی سزا میں اس کو قرآن بھلادیا گیا) اس کی دلیل یہ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ﴾ تمھیں جو مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچتی ہے، اور بہت سے گناہوں کو تو اللہ تعالیٰ ویسے ہی معاف فرمادیتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ

قرآنِ پاک کا بھول جانا سب سے بڑی مصیبت ہے ، لہٰذا وہ لامحالہ کسی گناہ ہی کی وجہ سے پہنچی ہے۔(کتاب الزہدلابن مبارک، حاشیہ تبیان۔ص:۲۸)

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انتہائی بڑا گناہ جس کی میری امت کو قیامت کے دن پوری پوری سزا ملے گا یہ ہے کہ امت میں سے کسی کو کتاب اللہ کی کوئی سورت یاد ہو، اور پھر وہ اس کو بھول گیا ہو۔(قیام اللیل)

عکرمہ اور مجاہد دونوں کا قول ہے کہ جب کوئی قرآن سیکھے اور پھر اس کو بھُلا دے، قیامت کے دن قرآنِ پاک آئے گا اور اس سے کہے گا: اگر تو مجھے یاد رکھتا تو آج مَیں تجھے اونچے درجے پر پہنچادیتا، لیکن تو نے غفلت و کوتاہی برتی، لہٰذا مَیں بھی آج تیری اس خدمت سے قاصر ہوں۔(قیام اللیل)

قرآنِ پاک کو بھول جانے والے کے لیے اور بھی بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے حفظِ قرآن کی نعمت عطا فرمائی ہے اس کی نہایت ہی قدر کریں، اور اس کی قدر یہی ہے کہ اس کو کثرت سے پڑھا جائے۔

باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن

وطلب القراءۃ من حسن الصوت والاستماع لها

ایک اور عنوان قائم کیا ہے کہ قرآنِ پاک پڑھنے میں آدمی کو یہ کوشش بھی کرنی چاہئے کہ اپنی مقدور بھر جتنی اچھی آواز سے پڑھ سکتا ہو؛ اس کا اہتمام کرے۔ اور جو اچھی طرح پڑھتے ہیں ان سے سننے کی درخواست کرنا بھی قرآنِ پاک کے آداب میں سے ہے۔

بوقتِ تلاوت یہ مراقبہ کیا جائے

حدیث ۱۰۰۴:-

وعن أبی هريرةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول: مَا أَذِنَ اللهُ لِشَیءٍ مَا أَذِنَ لِنَبِیٍّ حَسَنِ الصَّوْتِ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

مَعْنَى ((أَذِنَ اللهُ)): أی اسْتَمَعَ، وَهُوَ إِشَارَةٌ إِلَى الرِّضَا والقَبولِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ کسی چیز کی طرف اتنی توجہ نہیں دیتے جتنی اس نبی کی طرف توجہ فرماتے ہیں جو اچھی آواز والے ہوں اور قرآنِ پاک کو جہراً پڑھیں۔

افادات:- ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی قرآنِ پاک کے حقوق وآداب کی پوری پوری رعایت کرتے ہوئے ہی پڑھیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کوئی بھی بندہ جب قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خاص طور پر اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ اسی لیے اکابر فرماتے ہیں کہ آدمی قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے وقت یہ تصور کرے کہ: **"میں پڑھ رہا ہوں اور اللہ تعالیٰ میری تلاوت کو سن رہے ہیں اور توجہ فرمارہے ہیں"** جیسے کوئی بڑا آدمی سن رہا ہو تو آدمی کیسے اہتمام کے ساتھ حقوق وحدود اور آداب کی رعایت کرتے ہوئے تلاوت کرتا ہے، اسی طرح پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

لحنِ داودی عطا کیے ہوئے صحابی

حدیث ۱۰۰۵:-

وعن أبي موسى الأشعري (رضی اللہ عنہ) أنَّ رسولَ الله ﷺ قَالَ لَهُ: لَقَدْ أُوتِيتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ. (متفقٌ عليه)

وفي رواية لمسلمٍ: أنَّ رسولَ الله ﷺ قَالَ لَهُ: لَوْ رَأَيْتَنِي وَأَنَا أَسْتَمِعُ لِقِراءَتِكَ الْبَارِحَةَ.

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: تم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت داوٗد (علیہ السلام) کی خوش الحانی کا ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔

افادات:- "مِزْمَار" اصل میں بنسری کو کہتے ہیں جس میں سے سریلی آواز نکلتی ہے۔ حضرت داوٗد (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے خوش الحانی یعنی اچھی آواز عطا فرمائی تھی جس سے وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب

زبور- جو ان پر نازل کی گئی تھی کی تلاوت کرتے تھے، اوران کی تلاوت کی طرف تمام مخلوقات متوجہ ہوتی تھیں۔

حضرت ابو موسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہ) ایک صحابی ہیں، ایک مرتبہ وہ رات میں قرآنِ پاک کی تلاوت کررہے تھے، نبی ٔکریم ﷺ دیر تک ان کی تلاوت کو توجہ سے سنتے رہے، دوسرے روز حضرت اَبو موسیٰ (رضی اللہ عنہ) سے نبی ٔکریم ﷺ نے فرمایا: تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ کل رات تم قرآنِ پاک کی تلاوت کررہے تھے، تو مَیں اس کو خوب توجہ اور دھیان سے سن رہا تھا۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت اَبو موسیٰ (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ سن رہے ہیں "لَحَبَّرْتُ تَحْبِیْراً"، تو مَیں اور اچھا کر کے پڑھتا، یعنی آپ نے جو سنا وہ تو اچھا ہی تھا، لیکن اگر مجھے پتہ ہوتا کہ آپ توجہ سے سن رہے ہیں تو مَیں اور زیادہ عمدہ طریقہ سے پڑھتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم کو اچھی طرح پڑھنا شریعت کی نگاہوں میں مطلوب ہے۔ اوراللہ کے کسی نیک و مقبول بندہ کو سنانے کے لیے اوراس کو مزید مسرت ہو اس کے لیے مزید اچھا کر کے پڑھنا ریا میں داخل نہیں ہے، بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی میں داخل ہے۔

حضور ﷺ کی تلاوت کا منظر

حدیث ۱۰۰۶:-

وعن البَرَاءِ بنِ عازِبٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ سَمِعْتُ النبيَّ ﷺ قَرَأَ فِي الْعِشَاءِ بِالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ، فَمَا سَمِعْتُ أحداً أحْسَنَ صَوْتاً مِنْهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبی ٔکریم ﷺ کو قراءت فرماتے ہوئے سنا کہ آپ نے عشاء کی نماز میں سورۂ والتین کی تلاوت فرمائی، اور آپ سے اچھی آواز والا مَیں نے کسی کو نہیں سنا۔

افادات:- حضورِ اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تمام کمالات پورے طور پر عطا فرمائے تھے، آپ ﷺ کی آواز بھی ایسی ہی عمدہ تھی، تو ظاہر ہے کہ آپ ﷺ جیسی عمدہ قراءت اور کس کی ہو سکتی ہے!

بہر حال! آداب میں سے یہ ہے کہ آدمی جب قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہا ہو تو اچھے سے اچھے ڈھنگ سے پڑھنے کی کوشش کرے۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ اہلِ عشق اور گانے بجانے والے جس طرح آوازیں اور سُریں نکالتے ہیں اس سے اپنے آپ کو بچائے، اسی لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قرآن کو اہلِ عرب کے لہجہ میں پڑھو، اہلِ عشق اور گانے بجانے والوں کے لہجوں میں نہ پڑھو (مشکوٰۃ المصابیح) اس پر بھی بہت سخت وعیدات آئی ہیں۔

قرآن کو اچھی آواز سے پڑھنا چاہیے

حدیث ۱۰۰۷:-

وعن أبي لُبَابَةَ بشير بن عبد المنذر (رضی اللہ عنہ) أنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا. (رواه أبو داود بإسنادٍ جيدٍ)

معنى ((يَتَغَنَّى)): يُحَسِّنُ صَوْتَهُ بِالْقُرْآنِ.

ترجمہ:- حضرت ابولبابہ بشیر بن عبد المنذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآنِ کریم کو اچھی آواز سے نہیں پڑھا؛ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ قرآنِ پاک کو پڑھنے میں اچھے طرز کی کوشش کرنی چاہیے۔ بعضوں نے "يَتَغَنَّ" کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی نعمت عطا فرمائی ہو، اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی اس نعمت ہی کے اوپر قناعت کرے، دوسری کسی چیز کو حاصل کرنے کی طرف دھیان نہ دے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن والی نعمت عطا فرمائی، پھر دنیا کی کسی دوسری نعمت کو- جو کسی اور کو دی گئی- اپنے سے بہتر سمجھا؛ اس نے اللہ تعالیٰ کی قرآن والی نعمت کی ناقدری کی۔ اس لیے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک دیا ہو اس کو گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسی بڑی نعمت عطا فرمائی ہے کہ اس کے بعد اب مجھے کسی اور نعمت کی ضرورت نہیں ہے۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) "مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ" کا مطلب یہ بیان فرماتے ہیں: "مَنْ لَمْ يَضَعِ الْقُرْآنَ مَوْضِعَ غِنَآءٍ" یعنی آدمی کا مزاج اور طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ بعض مرتبہ اس کا جی چاہتا ہے

کہ کچھ گائے اور ترنم سے کچھ پڑھے، ایسے موقعہ پر بعض لوگ اشعار وغیرہ گاتے ہیں، تو حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو قرآنِ کریم جیسی نعمت عطا فرمائی ہے، اس لیے جب طبیعت میں ایسا کوئی تقاضہ پیدا ہو تو قرآن ہی کو اچھی آواز سے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دوسری چیزوں کو گُنگنا کر اپنا وقت اس میں لگانے کے بجائے قرآن کریم ہی میں اپنا وقت لگانا چاہیے۔

دوسرے سے قرآن سننا

حدیث ۱۰۰۸:-

وعن ابن مسعودٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ لِی النَّبِیُّ ﷺ: اقْرَأْ عَلَیَّ الْقُرْآنَ فقلتُ: یا رسولَ اللهِ، أَقْرَأُ عَلَیْكَ، وَعَلَیْكَ أُنْزِلَ؟! قَالَ: إِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَسْمَعَهُ مِنْ غَیْرِی. فَقَرَأْتُ عَلَیْهِ سُورَةَ النِّسَاءِ، حَتَّى جِئْتُ إِلَى هٰذِهِ الآیَة: ﴿فَكَیْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِیدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِیداً﴾ قَالَ: حَسْبُكَ الآنَ. فَالْتَفَتُّ إِلَیْهِ، فَإِذَا عَیْنَاهُ تَذْرِفَانِ. (متفقٌ عَلَیْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: مجھے قرآنِ پاک پڑھ کر سناؤ۔ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں آپ کو پڑھ کر سناؤں؟ حالاں کہ آپ پر تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک نازل ہوا ہے؟ (مَیں بھلا آپ کو کیا پڑھ کر سناؤں!) حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: مَیں چاہتا ہوں کہ دوسرے کی زبان سے قرآنِ پاک کو سنوں۔ چناں چہ مَیں نے نبی کریم ﷺ کو سورۂ نساء پڑھ کر سنائی۔ یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچا ﴿فَكَیْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِیدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى

هٰٓؤُلَآءِ شَهِيۡدًا ﴾ (جس کا ترجمہ یہ ہے: کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت کے لیے ایک گواہ مانگیں گے، اور ہم آپ کو اے نبی! ان لوگوں کے اوپر یعنی آپ کی امت کے اوپر گواہ کے طور پر طلب کریں گے۔) تو حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: بس! ٹھہر جاؤ (دورانِ تلاوت تو مَیں نیچے دیکھ رہا تھا، حضور کے ارشاد فرمانے پر جب تلاوت پوری کر دی اور) آنکھ اٹھائی تو دیکھا کہ نبیٔ کریم ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

افادات:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) بڑے عمدہ قرآن پڑھنے والوں میں سے تھے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کو جن لوگوں سے سیکھنے کی تاکید فرمائی ان میں حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) بھی ہیں۔ اور عنوان میں یہ بات بھی آئی تھی کہ اچھی آواز والے سے کبھی کبھی قرآنِ پاک سننا بھی چاہیے۔ اور اس کی وجہ لکھی ہے کہ خود پڑھنے میں آدمی کو بعض مرتبہ ایسا تدبّر و تفکّر نہیں ہوتا اور ایسی توجہ نہیں ہوتی جو دوسرے سے سننے میں ہوتی ہے، تو یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے امت کو یہ طریقہ بھی سکھایا۔

ایک موقعہ کا قصہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ رات کو عشاء کی نماز کے بعد حضورِ اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مَیں بھی بیٹھتا تھا، وہ دونوں مسلمانوں کے معاملات میں مشورہ کرتے تھے، مَیں بھی وہاں موجود ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ جب ہم وہاں سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک آدمی مسجد میں نماز کے اندر قرآنِ پاک پڑھ رہا ہے، آپ ﷺ کھڑے ہو کر سننے لگے، اور دیر تک سنتے رہے، وہ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) تھے۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو

آدمی یہ چاہتا ہو کہ قرآنِ کریم کو اسی طرح تر و تازہ سنے جس طرح کہ وہ نازل ہوا ہے، تو اس کو چاہیے کہ وہ ابن مسعود سے سنے (مسند احمد) خیر! حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) بہترین قاریوں میں سے تھے۔

"حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بس! ٹھہر جاؤ" اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی سے اگر قرآنِ پاک سننے کی فرمائش کی ہو، اور وہ پڑھ رہا ہو پھر سننے والے کی طبیعت یہ چاہے کہ اب وہ پڑھنے کا سلسلہ موقوف کر دے تو اس کو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بھائی! ٹھہر جاؤ۔ اس طرح ٹھہرنے کے لیے کہنا ادب کے خلاف نہیں ہے۔ دیکھو! حضرت ابن مسعود تلاوت کر رہے تھے تو نبی کریم ﷺ نے بھی کہا کہ بس کرو، ٹھہر جاؤ۔

بہر حال! قرآنِ پاک کی تلاوت کرنا اور دوسروں سے سننے کا اہتمام کرنا؛ یہ بھی نبی کریم ﷺ کا ایک طریقہ ہے۔

باب الحث علیٰ سور وآیات مخصوصة

قرآنِ پاک کی بعض سورتوں اور آیتوں کے فضائل

قرآنِ پاک کی تلاوت کے فضائل بیان کرنے کے بعد اب قرآنِ پاک کی بعض مخصوص سورتوں اور مخصوص آیات جن کے فضائل احادیث میں آئے ہیں ان میں سے بعض کو بیان کررہے ہیں۔

قرآنِ پاک کی سب سے بڑی سورت

حدیث ۱۰۰۹:-

عن أَبِي سَعِيدٍ رَافِعِ بن الْمُعَلَّى (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ لی رسولُ اللهِ ﷺ: أَلاَ أُعَلِّمُكَ أَعْظَمَ سُورَةٍ فِي الْقُرْآن قَبْلَ أَنْ تَخْرُجَ مِنَ الْمَسْجِدِ؟ فَأَخَذَ بِيَدِي، فَلَمَّا أَرَدْنَا أَنْ نَخْرُجَ، قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنَّكَ قُلْتَ: لأُعَلِّمَنَّكَ أَعْظَمَ سُوْرَةٍ فِي الْقُرْآنِ؟ قَالَ: اَلْحَمْدُ للهِ رَبِّ العَالَمِين، هِيَ السَّبْعُ المَثَانِي وَالْقُرْآنُ العَظِيمُ الَّذِي أُوتِيتُهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید رافع بن معلی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: تمہارے مسجد سے نکلنے سے پہلے قرآنِ پاک کی (فضیلت ورتبہ، عظمت وبزرگی کے اعتبار سے) جو سب سے بڑی سورت ہے؛ وہ مَیں تم کو نہ سکھلاؤں؟ پھر نبی کریم ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا (اور آپ چلنے لگے، یہ بھی ساتھ ساتھ چلنے لگے) جب ہم مسجد سے نکلنے لگے تو میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے فرمایا تھا کہ مسجد سے نکلنے سے پہلے (فضیلت و

عظمت کے اعتبار سے) قرآنِ پاک کی جو سب سے بڑی سورت ہے وہ مَیں تمھیں بتاؤں گا (اب ہم مسجد سے نکل رہے ہیں؛ لہٰذا بتلایئے) چناں چہ نبیٔ کریم ﷺ نے بتلایا: وہ سورۂ الحمد شریف ہے (یہ سورت اجر و مرتبہ کے اعتبار سے قرآنِ پاک کی سب سے بڑی سورت ہے) یہی سبعِ مثانی اور القرآن العظیم ہے

افادات: بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ابو سعید رافع بن معلی (رضی اللہ عنہ) نماز پڑھ رہے تھے، نبیٔ کریم ﷺ نے نام لے کر ان کو پکارا، نماز میں ہونے کی وجہ سے وہ جواب نہ دے سکے، سلام پھیرنے کے بعد جب حاضرِ خدمت ہوئے تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مَیں نے تم کو بلایا لیکن تم نے جواب نہیں دیا؟ انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! مَیں نماز میں تھا، اس لیے جواب نہیں دیا۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: قرآنِ پاک کی یہ آیت تم نے نہیں پڑھی ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (الانفال:۲۴)﴾ اللہ اور اس کا رسول جب تمھیں پکاریں کسی ایسی چیز کے لیے جس میں تمھاری روحانی زندگی ہے، تو تم ان کی پکار کا جواب دو۔ گویا حضورِ اکرم ﷺ کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ میرے اس پکارنے پر نماز کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی تم کو جواب دینا چاہیے تھا۔ چناں چہ علماء نے لکھا ہے حضورِ اکرم ﷺ کی پکار اور بلاوے کا جواب دینا ضروری ہے چاہے آدمی نماز کی حالت میں ہو۔

اب نماز کی حالت میں جواب دینے سے نماز ٹوٹے گی یا نہیں؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہا ہے، احناف اور مالکیہ اس طرف گئے ہیں کہ نماز فاسد ہو جائے گی اور اس کو لوٹانی پڑے گی۔ شوافع اس طرف گئے ہیں کہ نماز فاسد بھی نہیں ہو گی۔

"یہی سبع مثانی اور القرآن العظیم ہے" یہ دراصل اس آیت کی طرف اشارہ ہے ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعاً مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْآنَ الْعَظِيْمَ﴾ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان بتلاتے ہوئے نبیٔ کریم ﷺ کو فرمایا کہ ہم نے تم کو ایسی سات آیتیں دی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور قرآنِ عظیم عطا فرمایا ہے۔ اس روایت میں نبیٔ کریم ﷺ نے اسی کی تشریح فرمادی کہ قرآنِ پاک میں جن آیتوں کو اللہ تعالیٰ نے بطورِ احسان کے عطا فرمانے کا تذکرہ فرمایا ہے وہ سات آیتیں سورۂ فاتحہ کی ہیں۔ بلکہ اپنے مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے اس سورت کو "وَالْقُرْآنُ الْعَظِيْمُ الَّتِيْ أُوْتِيْتُهُ" فرمایا کہ یہ قرآنِ عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے، گویا پورے قرآن کا اطلاق اس سورت پر کیا گیا ہے علماء نے لکھا ہے کہ قرآنِ پاک میں جتنے بھی مضامین اور چیزیں تفصیل سے بیان کی گئی ہیں ان سب کا خلاصہ اجمالی طور پر اور مختصراً سورۂ فاتحہ میں آگئے ہیں۔ گویا پورا قرآنِ پاک تفصیلی قرآن ہے اور سورۂ فاتحہ اجمالی قرآن ہے۔ اس سے سورۂ فاتحہ کی فضیلت کا پتہ چلتا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ثواب کے اعتبار سے اس کا مقام بڑا اونچا ہے۔

سلسلۂ چشتیہ کا ایک معمول

اور اس کے بڑے فوائد بھی ہیں، خاص طور پر بیماریوں سے شفا پانے کے سلسلہ میں اس کی خصوصی تاثیر ہے کہ اگر اس کو پڑھ کر کسی بیمار پر دم کیا جائے تو اس بیماری سے وہ شفا پاتا ہے۔ اور

حاجتیں پوری ہونے کے سلسلہ میں بھی بہت فائدہ مند ہے۔ چناں چہ حضرت شیخ (نوراللہ مرقدہٗ) نے لکھاہے اور ہمارے مشائخ فرماتے ہیں کہ سلسلۂ چشتیہ کا یہ معمول ہے کہ اگر کسی کو کوئی ضرورت پیش آئے تو فجر کی سنت اور فرض کے درمیان چالیس دن تک روزانہ اکتالیس مرتبہ سورۂ فاتحہ کو بسم اللہ سمیت اس طرح پڑھے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی میم ؔ کو الحمدللہ کی الف کے ساتھ ملائے؛ توان شاءاللہ اس کی وہ حاجت ضرورپوری ہوگی۔

سورۂ اخلاص تہائی قرآن کے برابر ہے

حدیث ۱۰۱۰:-

وعن أبي سعيدن الخدری (رضی اللہ عنہ) أنّ رسول الله ﷺ قَالَ فی "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" وَالَّذِی نَفْسِی بِيَدِهِ إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ.

وفی روايةٍ: أن رسول الله ﷺ قَالَ لأَصْحَابِهِ: أَيَعْجِزُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَقْرَأَ بِثُلُثِ الْقُرْآنِ فِي لَيْلَةٍ. فَشَقَّ ذَلِكَ عَلَيْهِمْ، وَقَالُوا: أَيُّنَا يُطِيقُ ذَلِكَ يَا رسولَ الله؟ فَقَالَ: قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ، اللهُ الصَّمَدُ: ثُلُثُ الْقُرْآنِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے سورۂ اخلاص کے متعلق ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کہ یہ (سورۂ اخلاص) تہائی قرآن کے برابر ہے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے فرمایا: کیاتم میں سے کوئی ہر رات تہائی قرآن پڑھنے سے عاجز ہے؟ (یعنی تم میں سے کوئی آدمی یہ کرسکتا ہے کہ روزانہ تہائی قرآن پڑھے؟ ظاہر ہے

کہ روزانہ تہائی قرآن پڑھنا بڑا مشکل تھا)اس لیے نبیٔ کریم ﷺ کا یہ سوال اور مطالبہ حضراتِ صحابہ کو گراں گزرا (اور ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں ہے کہ ہر رات ایک تہائی قرآن پڑھ سکے)اس لیے انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ !اس کی کون طاقت رکھ سکتا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے اس کا آسان طریقہ بتلایا: "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" والی پوری سورت ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔

افادات:- ایک مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھنے سے تہائی قرآن پڑھنے کے برابر ثواب ملے گا۔ بعضوں نے مضامین کے اعتبار سے بھی بتلایا ہے کہ قرآنِ پاک کے اندر جو مضامین بیان کئے گئے ہیں اس میں ایک بنیادی مضمون توحید کا ہے،اور وہ سورۂ اخلاص کے اندر بیان کیا گیا ہے۔اس سے اس سورت کی فضیلت معلوم ہوئی۔

حدیث ۱۰۱۱:-

وعنه: أَنَّ رَجُلاً سَمِعَ رَجُلاً يَقْرَأُ: ((قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ)) يُرَدِّدُهَا فَلَمَّا أَصْبَحَ جَاءَ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ وَكَانَ الرَّجُلُ يَتَقَالُّهَا. فَقَالَ رسول الله ﷺ: ((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّهَا لَتَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ)) (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ایک صحابی نے دوسرے صحابی کو پڑھتے ہوئے سنا کہ رات کو تہجد کی نماز میں ہر رکعت میں "قل ھو اللہ أحد" ہی کو پڑھ رہے تھے(بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ دوسری سورت بھی پڑھتے تھے لیکن ساتھ میں سورۂ اخلاص بھی پڑھتے تھے) تو سننے والے صحابی صبح میں نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کا تذکرہ ایسے ہلکے انداز سے کیا کہ گویا اس کو معمولی اور کم سمجھا ہو۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا:(اس کو معمولی نہ سمجھو) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے: یہ سورت تہائی قرآن کے برابر ہے۔

افادات:- اس لیے اگر اس سورت کو تین مرتبہ پڑھ لو تو پورے ایک قرآن کا ثواب ملے گا۔ چناں چہ ایک روایت میں ہے کہ کوئی آدمی اگر سورۂ اخلاص کو بارہ مرتبہ پڑھے گا تو اس کو چار قرآن کا ثواب ملے گا۔

حدیث ۱۰۱۲:-

وعن أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِی: قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ ((إِنَّهَا تَعْدِلُ ثُلُثَ الْقُرْآنِ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے سورۂ قل ھواللہ أحد کے بارے میں ارشاد فرمایا: اس کا ثواب ایک تہائی قرآن کے برابر ہے۔

سورۂ اخلاص سے محبت جنت میں داخل کرائے گی

حدیث ۱۰۱۳:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ! إِنِّي أُحِبُّ هٰذِهِ السُّورَةَ: قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ. قَالَ: إِنَّ حُبَّهَا أَدْخَلَكَ الْجَنَّةَ.

(رواه الترمذی، وقال: ((حديث حسن)). ورواه البخاری فی صَحِيحِهِ تعليقاً)

ترجمہ:- حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مَیں اس سورت (یعنی) "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" کو پسند کرتا ہوں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس کی محبت تجھے جنت میں داخل کرے گی۔

افادات: ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے کسی نے بتلایا: فلاں آدمی ہر نماز کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد کوئی سورت پڑھتا ہے اور پھر سورۂ اخلاص بھی پڑھتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اس آدمی کو بلا کر پوچھا: بھائی! تو ایسا کیوں کرتا ہے؟ اس نے جواب میں کہا: مجھے یہ سورت بہت پیاری لگتی ہے اور بڑی محبوب ہے۔ یہ سن کر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کی محبت تجھے جنت میں داخل کر دے گی۔

معوذتین کی فضیلت واہمیت

حدیث ۱۰۱۴:-

وعن عقبةَ بنِ عامرٍ (رضی اللہ عنہ) أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: أَلَمْ تَرَ آيَاتٍ أُنْزِلَتْ هذِهِ اللَّيْلَةَ، لَمْ يُرَ مِثْلُهُنَّ قَطُّ؛ {قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الفَلَقِ} وَ {قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ} (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: آج رات جو آیتیں نازل ہوئیں وہ تمہیں معلوم ہیں؟ ایسی آیتیں نہ دیکھی گئیں اور نہ سنی گئیں۔ اور وہ ”قل أعوذ برب الفلق“ اور ”قل أعوذ برب الناس“ ہیں۔

افادات:-"ایسی آیتیں نہ دیکھی گئیں اور نہ سنی گئیں" یعنی تعوّذ اور شر ورو برائیوں سے اللہ کی پناہ حاصل کرنے کے معاملہ میں ان دونوں سورتوں کے مضامین ایسے بے نظیر و بے بدل ہیں کہ کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ سننے کے بعد بھی مجھ پر کوئی زیادہ اثر نہیں ہوا اور میں نے کوئی رسپونس (Response) نہیں دیا تو اس روز فجر کی نماز میں نبی کریم ﷺ نے صرف ان ہی دونوں سورتوں کو پڑھا اور نماز کے بعد فرمایا: کیسا لگا؟ یعنی عام طور پر فجر کی نماز میں طویل قراءت کی جاتی ہے، لیکن اس روز انہی دو سورتوں پر اکتفاء فرما کر بتلا دیا کہ یہ دو سورتیں ایسی ہیں کہ جو کافی ہو سکتی ہیں۔ اس سے ان دونوں سورتوں کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

حدیث ۱۰۱۵:-

وعن أَبِي سَعِيدٍ الخُدرِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ : كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ يَتَعَوَّذُ مِنَ الجَانِّ ، وَعَيْنِ الإِنْسَانِ ، حَتَّى نَزَلَتْ المُعَوِّذَتَانِ، فَلَمَّا نَزَلَتَا ،أَخَذَ بِهِمَا وَتَرَكَ مَا سِوَاهُمَا . (رواہ الترمذی،وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جنات اور انسان کی نظر بد وغیرہ سے مختلف کلمات اور الفاظ کے ذریعہ سے پناہ مانگتے تھے۔ لیکن جب یہ دو سورتیں ("قل أعوذ برب الفلق" اور "قل أعوذ برب الناس") نازل ہوئیں تو نبی کریم ﷺ نے پناہ حاصل کرنے کے لیے انہی دو سورتوں کو اختیار کر لیا، باقی سارے کلمات چھوڑ دیئے۔

افادات:- جیسے روایتوں میں آتا ہے کہ کوئی بچہ لایا جاتا تھا تو نبی کریم ﷺ یہ کلمات پڑھتے تھے:

"أُعِيذُكَ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّهَامَّةٍ، وَّمِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَّامَّةٍ" احادیث میں اس کے علاوہ بھی مختلف کلمات آئے ہیں جن میں جنات، شیطان اور انسان کی نظرِ بد سے پناہ چاہی گئی ہے، لیکن تعوّذ یعنی مختلف شرور سے پناہ حاصل کرنے کے معاملہ میں یہ دونوں سورتیں ایسی جامع ہیں کہ ان کو پڑھ لینے کے بعد کسی اور کلمہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

سورۂ تبارک کی فضیلت

حدیث ۱۰۱۶:-

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: مِنَ الْقُرْآنِ سُورَةٌ ثَلَاثُونَ آيَةً شَفَعَتْ لِرَجُلٍ حَتَّى غُفِرَلَهُ وَهِيَ: تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: ((حديث حسن)). وفي رواية أبي داود: ((تَشْفَعُ)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قرآن پاک کے اندر ایک سورت تیس آیتوں پر مشتمل ہے، اس نے ایک آدمی کی سفارش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت کر دی؛ اور وہ سورت "سورۂ تبارک الذی" ہے۔

افادات:- اس سے سورۂ تبارک کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، اور نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: قرآنِ پاک کی یہ ایسی سورت ہے کہ میں پسند کرتا ہوں کہ میرے ہر امتی کے دل میں ہو، یعنی اس کو

یاد کرلے۔ سورۂ یٰسین کے متعلق بھی نبی کریم ﷺ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہے۔ اس لیے آدمی کو یہی کوشش کرنی چاہیئے کہ سورۂ یٰسین اور سورۂ تبارک زبانی یاد کرلی جائے۔ اور حدیثِ پاک میں یہ بھی آتا ہے سورۂ تبارک کی تلاوت آدمی کو عذابِ قبر سے بچاتی ہے۔

اواخرِ سورۂ بقرہ کی فضیلت

حدیث ۱۰۱۷:-

وعن أَبِي مسعودٍ البَدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) عن النبیﷺ قَالَ: مَنْ قَرَأَ بِالآيَتَيْنِ مِنْ آخر سُورَةِ البَقَرَةِ فی لَيْلَةٍ كَفَتَاهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قِيلَ: كَفَتَاهُ الْمَكْرُوهَ تِلْكَ اللَّيْلَةَ، وَقِيلَ: كَفَتَاهُ مِنْ قِيامِ اللَّيْلِ.

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود بدری انصاری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی سورۂ بقرہ کے آخر کی دو آیتیں " آمن الرسول سے آخر تک" رات میں پڑھے گا؛ تو وہ دونوں اس کے لیے کافی ہو جائیں گی۔

افادات:- علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے **"کافی ہو جانے"** کے دو مطلب بتلائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس رات میں ہر برائی سے حفاظت کے لیے ان دونوں آیتوں کا پڑھنا کافی ہو جائے گا۔ اور دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا ہے کہ یہ آیتیں قیام اللیل کی طرف سے کافی ہو جائیں گی۔ آدمی رات میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے، اور قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہے، تو گویا ان دونوں آیتوں کا پڑھ لینا اس کی طرف سے کافی ہو جائے گا۔

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ

حدیث ۱۰۱۸:-

وعن أبی هريرة (رضی اللہ عنہ) أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: لَا تَجْعَلُوا بُيُوتَكُمْ مَقَابِرَ. إِنَّ الشَّيْطَانَ يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِي تُقْرَأُ فِيهِ سُورَةُ الْبَقَرَةِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ۔ شیطان اس گھر سے بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے۔

افادات:- قبرستان نہ بنانے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ اپنے گھروں میں مردوں کو دفن مت کرو۔ اور ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جیسے قبرستان میں جو رہتے ہیں (یعنی مردے) وہ تلاوت نہیں کرتے، تو تم بھی ایسے نہ رہو کہ گھروں میں قرآنِ پاک کی تلاوت نہیں ہو رہی ہے، نمازیں نہیں پڑھی جا رہی ہیں، بلکہ اس بات کی عادت ڈالو کہ اپنے گھروں میں نفل نمازوں کا اور قرآنِ پاک کی تلاوت کا اہتمام ہو رہا ہو۔ اور لکھا ہے کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جاتی ہے اس گھر میں جن کا اثر نہیں رہتا۔ اس روایت سے سورۂ بقرہ کی فضیلت معلوم ہوئی۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت

حدیث ۱۰۱۹:

وعن أُبَيِّ بنِ كَعبٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: يَا أَبَا الْمُنْذِرِ! أَتَدْرِي أَيُّ آيَةٍ مِنْ كِتَابِ اللهِ مَعَكَ أَعْظَمُ؟ قُلْتُ: {اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الحَيُّ القَيُّومُ} فَضَرَبَ فِي صَدْرِي، وقال: لِيَهْنِكَ العِلْمُ أَبَا الْمُنْذِرِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے (جن کی کنیت ابوالمنذر رہے) کہ ایک روز نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا: اے ابوالمنذر! تمہارے پاس قرآنِ پاک کی جو آیتیں ہیں اور قرآنِ پاک کا جو حصہ تم حفظ کئے ہوئے ہو اس میں (مرتبہ اور اجر و ثواب کے اعتبار سے) سب سے بڑی آیت کون سی ہے؟ مَیں نے عرض کیا: اللهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الحَيُّ القَيُّومُ (یعنی آیۃ الکرسی) تو نبی کریم ﷺ نے خوش ہو کر میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: اے ابوالمنذر! تمہیں علم مبارک ہو (تم نے بڑا صحیح جواب دیا)۔

افادات:- حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) بڑے اونچے درجے کے صحابی ہیں اور تمام صحابہ میں قرآنِ پاک کی قراءت کے سب سے زیادہ جاننے والے تھے، ان کو ”أَقْرَءُهُمْ أُبَيٌّ“ کا لقب دیا گیا ہے، بلکہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ان سے کہا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ مَیں ”سورۂ لم یکن الذین“ پڑھ کر تم کو سناؤں۔ انہوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا اللہ تعالیٰ نے میرا نام لے کر کہا؟ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! تمہارا نام لے کر کہا۔ اس پر ان کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آگئے۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ رتبہ کے اعتبار سے قرآنِ پاک کی سب سے بڑی آیت ”آیۃ الکرسی“ ہے۔

آیۃ الکرسی کی فضیلت بیان کرنے والے کا عجیب قصہ

حدیث ۱۰۲۰:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: وَكَّلَنِي رسولُ الله ﷺ بِحِفْظِ زَكَاةِ رَمَضَانَ، فَأَتَانِي آتٍ فَجَعَلَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ، فَأَخَذْتُهُ فقُلتُ: لأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رسولِ الله ﷺ، قَالَ: إِنِّي مُحْتَاجٌ، وَعَلَيَّ عِيَالٌ، وَبِي حَاجَةٌ شَدِيدَةٌ، فَخَلَّيْتُ عَنْهُ، فَأَصْبَحْتُ، فَقَالَ رسول الله ﷺ: يَا أَبَا هُريرة! مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ البَارِحَةَ؟ قُلْتُ: يَا رسول الله! شَكَا حَاجَةً وَعِيَالاً، فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبيلَهُ. فَقَالَ: أَمَا إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُودُ. فَعَرَفْتُ أَنَّهُ سَيَعُودُ، لقولِ رسول الله ﷺ فَرَصَدْتُهُ، فَجَاءَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ، فَقُلتُ: لأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رسول الله ﷺ. قَالَ: دَعْنِي فَإِنِّي مُحْتَاجٌ، وَعَلَيَّ عِيَالٌ لاَ أَعُودُ، فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبيلَهُ، فَأَصْبَحْتُ فَقَالَ لي رسول الله ﷺ: يَا أَبَا هُريرة! مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ البَارِحَةَ؟ قُلْتُ: يَا رسول الله، شَكَا حَاجَةً وَعِيَالاً، فَرَحِمْتُهُ فَخَلَّيْتُ سَبيلَهُ. فَقَالَ: إِنَّهُ قَدْ كَذَبَكَ وَسَيَعُودُ. فَرَصَدْتُهُ الثَّالِثَةَ، فَجَاءَ يَحْثُو مِنَ الطَّعَامِ فَأَخَذْتُهُ، فَقُلتُ: لأَرْفَعَنَّكَ إِلَى رسولِ الله ﷺ. وهذا آخِرُ ثلاثِ مَرَّاتٍ أَنَّكَ تَزْعُمُ أَنَّكَ لاَ تَعُودُ. فَقَالَ: دَعْنِي فَإِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ يَنْفَعُكَ اللهُ بِهَا، قُلْتُ: مَا هُنَّ؟ قَالَ: إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ آيَةَ الكُرْسِيِّ، فَإِنَّهُ لَنْ يَزَالَ عَلَيْكَ مِنَ الله حَافِظٌ، وَلاَ يَقْرَبُكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ، فَخَلَّيْتُ سَبِيلَهُ، فَأَصْبَحْتُ، فَقَالَ لي رسول الله ﷺ: مَا فَعَلَ أَسِيرُكَ البَارِحَةَ؟ قُلْتُ: يَا رسول الله، زَعَمَ أَنَّهُ يُعَلِّمُنِي كَلِمَاتٍ يَنْفَعُنِي اللهُ بِهَا، فَخَلَّيْتُ سَبيلَهُ. قَالَ: مَا هِيَ؟ قُلْتُ: قَالَ لي: إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ فَاقْرَأْ آيَةَ الكُرْسِيِّ مِنْ أَوَّلِهَا حَتَّى تَخْتِمَ الآيَة: {اللهُ لاَ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الحَيُّ القَيُّومُ} وقال لي: لاَ يَزَالُ عَلَيْكَ مِنَ اللهِ حَافِظٌ، وَلَنْ يَقْرَبَكَ شَيْطَانٌ حَتَّى تُصْبِحَ. فَقَالَ النبيُّ ﷺ: أَمَا إِنَّهُ قَدْ صَدَقَكَ وَهُوَ كَذُوبٌ، تَعْلَمُ مَنْ تُخَاطِبُ مُنْذُ ثَلاَثٍ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قُلْتُ: لاَ. قَالَ: ذَاكَ شَيْطَانٌ. (رواه البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) اپنا قصہ سناتے ہیں کہ ایک مرتبہ رمضان المبارک میں صدقۂ فطر کے اندر جو کھجوریں آئی تھیں اس کا ڈھیر لگا ہوا تھا جس کی نگرانی کی ذمہ داری حضور اکرم ﷺ نے مجھے سونپی۔ رات کے وقت میں نے ایک آدمی کو دیکھا کہ آیا اور اس ڈھیر میں سے لپ بھر کر کھجوریں نکالنے لگا (گویا چوری کر رہا تھا) میں نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ: صبح کے وقت مَیں تجھے حضور اکرم ﷺ کے پاس لے جاؤں گا۔ اس نے معذرت کرنی شروع کی کہ: مَیں محتاج آدمی ہوں، میرے بال بچے ہیں، بہت ضرورتمند ہوں، مہربانی کرو اور چھوڑ دو۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: مَیں نے اس کو چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی اور نبی ٔکریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے مجھ سے پوچھا: ابوہریرہ! گزشتہ رات تمہارے اس قیدی کا کیا ہوا؟ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے اس کو گرفتار کیا تھا اور اس سے کہا کہ آپ کی خدمت میں پیش کروں گا، لیکن اس نے معذرت کی کہ بڑا محتاج ہوں اور بال بچے والا ہوں؛ مجھے چھوڑ دو، مجھے اس کے حال پر رحم آیا، اس لیے میں نے چھوڑ دیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اس نے جھوٹ بولا اور وہ دوبارہ چوری کرنے کے واسطے آئے گا۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے فرمادیا تو مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ چناں چہ دوسری رات میں اس کے انتظار ہی میں رہا، وہ آیا اور جو کھجوریں رکھی تھیں اس میں سے لپیں بھرنے لگا، میں نے پھر گرفتار کرلیا اور اس سے کہا: آج تو تجھے حضور ﷺ کے پاس ضرور لے جاؤں گا۔ اس نے پھر بہانے شروع کئے کہ: میں محتاج ہوں، ضرورت مند ہوں، بال بچے والا ہوں؛ مجھے چھوڑ دو، اب کبھی نہیں آؤں گا۔ مجھے رحم آگیا اور میں نے پھر اس کو چھوڑ دیا۔ جب صبح کو حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضور ﷺ نے پوچھا: ابوہریرہ! رات میں تمہارے قیدی کا کیا معاملہ ہوا؟ مَیں نے کہا: یارسول اللہ! اس نے اپنی محتاجی اور بال بچوں کی شکایت کی، تو میں نے رحم کھایا اور چھوڑ دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: آج بھی جھوٹ بول کر گیا ہے، لیکن پھر آئے گا۔

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ تیسری رات پھر میں نے انتظار کیا کہ جب حضورﷺ نے فرمادیا ہے تو ضرور آئے گا۔ چناں چہ آج بھی وہ آیا اور لپیں بھرنے لگا تو مَیں نے اس کو پکڑ لیا اور کہا: آج تو حضورﷺ کے پاس ضرور لے جاؤں گا۔ یہ تیسری مرتبہ آیا ہے اور ہر وقت تو یہی کہتا ہے کہ اب نہیں آؤں گا، لیکن پھر آتا ہے، اس لیے آج تو چھوڑنے والا نہیں ہوں۔ اس پر اس نے کہا: مجھے چھوڑ دو، مَیں تمہیں چند کلمات سکھاتا ہوں جس سے اللہ تعالیٰ تمہیں فائدہ پہنچائیں گے۔ میں نے پوچھا: وہ کلمات کیا ہیں؟ تو اس نے کہا: جب تم بستر پر پہنچو تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو، اس کی وجہ سے تم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حفاظتی دستہ بطورِ محافظ مقرر کر دیا جائے گا اور صبح تک کوئی شیطان تمہارے قریب بھی نہیں آسکے گا۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: جب اس نے یہ بتلایا تو مَیں نے اس کو چھوڑ دیا۔ جب صبح ہوئی اور مَیں نبی ٔ کریمﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپﷺ نے پوچھا: ابوہریرہ! کل رات تمہارے قیدی کا معاملہ کیا ہوا؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس نے مجھے کہا کہ چند کلمات وہ مجھے سکھائے گا، چناں چہ اس کی بنیاد پر میں نے اس کو چھوڑ دیا۔ حضورﷺ نے پوچھا: وہ کلمات کون سے ہیں جو اس نے سکھائے؟ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا: اس نے مجھ سے کہا کہ جب تم رات کو بستر پر سونے جاؤ تو آیۃ الکرسی پڑھ لیا کرو، اور اس نے یہ بھی کہا کہ اگر تم یہ پڑھ لوگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری حفاظت کے لیے ایک پہرے دار مقرر ہوگا اور شیطان صبح تک تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ اس پر حضورِ اکرمﷺ نے ارشاد فرمایا: تھا تو وہ جھوٹا؛ لیکن یہ بات اس نے سچ کہی۔ پھر حضورِ اکرمﷺ نے حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا: تین دن سے روزانہ تمہارا جس سے واسطہ پڑ رہا تھا، جانتے ہو وہ کون تھا؟ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا: مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون تھا۔ تو حضورِ اکرمﷺ نے فرمایا: وہ شیطان تھا۔

افادات:۔ معلوم ہوا کہ جھوٹا بھی کبھی سچ بولتا ہے۔ اور اس روایت سے آیۃ الکرسی کی فضیلت بھی معلوم ہوئی۔

دجّالی فتنوں سے حفاظت کا عمل

حدیث ۱۰۲۱:-

وعن أَبِي الدرداءِ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: مَنْ حَفِظَ عَشْرَ آيَاتٍ مِنْ أَوَّلِ سُورَةِ الكَهْفِ، عُصِمَ مِنَ الدَّجَّالِ.

وفي رواية: ((مِنْ آخِرِ سُورَةِ الكَهْفِ)) رواهما مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی سورۂ کہف کی شروع کی دس آیتیں یاد کرلے (دوسری روایت میں ہے کہ آخری دس آیتیں یاد کرلے، اور اس کو روزانہ صبح وشام پڑھا کرے) تو وہ دجال کے فتنوں سے محفوظ رہے گا۔

افادات:- ویسے راجح قول یہی ہے کہ شروع کی دس آیتیں جو یاد کرلے گا اور پڑھتا رہے گا تو وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ دجال الگ ہے اور اس کے فتنے الگ چیز ہیں۔ اس لیے موجودہ دور میں آدمی اس کا اہتمام کرے تو ان شاء اللہ اس کے ایمان کی حفاظت ہوگی، اور فتنوں سے بچا رہے گا۔

دو نور اور دو روشنیاں

حدیث ۱۰۲۲:-

وعن ابنِ عَبَّاسٍ (رضی اللہ عنہما) بَيْنَمَا جِبْرِيلُ (علیہ السلام) قَاعِدٌ عِنْدَ النبی ﷺ سَمِعَ نَقِيضاً مِنْ فَوقِهِ، فَرَفَعَ رَأْسَهُ، فَقَالَ: هَذَا بَابٌ مِنَ السَّمَاءِ فُتِحَ اليَوْمَ وَلَمْ يُفْتَحْ قَطُّ إِلاَّ اليَوْمَ، فنَزَلَ منهُ مَلَكٌ، فقالَ: هذا مَلَكٌ نَزلَ إلى الأرضِ لم يَنْزِلْ قطّ إلاّ اليومَ فَسلَّمَ وقال: أَبْشِرْ بِنُورَيْنِ أُوتِيتَهُمَا لَمْ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قَبْلَكَ: فَاتِحَةُ الكِتَابِ، وَخَوَاتِيمُ سُورَةِ البَقَرَةِ، لَنْ تَقْرَأَ بِحَرْفٍ مِنْهَا إِلاَّ أُعْطِيتَه. (رواه مسلم)

((النَّقِيضُ)): الصَّوْتُ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کے پاس حضرت جبرئیل (علیہ السلام) بیٹھے ہوئے تھے کہ آسمان سے کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آئی، حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نے اپنا سر اٹھایا اور فرمایا: یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج ہی کھولا گیا ہے، اس سے پہلے کبھی وہ کھولا نہیں گیا تھا، اور اس میں سے ایک فرشتہ روئے زمین پر آج ہی اترا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں اترا تھا۔ پھر اس فرشتے نے آکر نبیٔ کریم ﷺ کو سلام کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! ان دو نوروں اور دو روشنیوں کی بشارت اور خوشخبری سن لیجئے جو آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیے گئے ہیں، اور آپ سے پہلے کبھی کسی نبی کو یہ دو نور اور دو روشنیاں نہیں دی گئیں۔ ایک تو سورۂ فاتحہ، اور دوسرا سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتیں۔ ان میں ایسی دعائیں ہیں کہ ان کو جب پڑھا جائے گا تو اللہ تعالیٰ وہ عطا فرمائیں گے۔

بَابُ اِسۡتِحۡبَابِ الۡاِجۡتِمَاعِ عَلَى الۡقِرَاءَةِ

قرآنِ پاک کی تلاوت کے لئے جمع ہونے کا مستحب ہونا

درس وتدریس پر چار انعامات

حدیث ۱۰۲۳:-

عَنۡ أَبِيۡ هُرَيۡرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللهِ ﷺ مَا اجۡتَمَعَ قَوۡمٌ فِيۡ بَيۡتٍ مِنۡ بُيُوۡتِ اللهِ يَتۡلُوۡنَ كِتَابَ اللهِ وَيَتَدَارَسُوۡنَهُ بَيۡنَهُمۡ اِلَّا نَزَلَتۡ عَلَيۡهِمُ السَّكِيۡنَةُ وَغَشِيَتۡهُمُ الرَّحۡمَةُ وَحَفَّتۡهُمُ الۡمَلَائِكَةُ وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيۡمَنۡ عِنۡدَهٗ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی قوم اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر میں جمع ہو کر اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتی ہے اور آپس میں اس کے پڑھنے پڑھانے، درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھتی ہے؛ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر سکینہ نازل ہوتا ہے، اور اللہ کی رحمت اس کو ڈھانپ لیتی ہے، اور فرشتے اس کو گھیر لیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ اپنے پاس جو مجمع (فرشتوں کا) ہے اس میں اس کا تذکرہ فرماتے ہیں۔

افادات:- یہاں گھر بول کر عام مراد ہے، چاہے وہ مسجد ہو، مدرسہ ہو، مکتب ہو، یا کوئی ایسی جگہ ہو جہاں بیٹھ کر لوگ قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں اور سیکھتے سکھاتے ہیں۔

" سکینہ "کی تشریح کرتے ہوئے مختلف باتیں کہی گئی ہیں ، بعض حضرات فرماتے ہیں : یہ فرشتوں کی ایک جماعت ہے ۔ بعض کہتے ہیں : یہ ایک طشت ہے جس میں انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے قلوب کو غسل دیا گیا۔ بعض حضرات کہتے ہیں: اس سے مراد طمانینت وسکون کی وہ کیفیت ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے قلوب پر نازل کی جاتی ہے۔

جو لوگ کہیں جمع ہو کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی کتاب کی تلاوت کرتے ہیں ، ان کے مختلف قسم کے اکرام اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے کئے گئے۔ ایک تو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینہ نازل ہوا، دوسرا اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور تیسرا فرشتے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، اور سب سے بڑا اکرام یہ ہے کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں کے سامنے تذکرہ کرتے ہیں، اس سے زیادہ بڑا انعام اور اکرام بندوں کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے:۔

" ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے "

بَابُ فَضْلِ الْوُضُوْءِ

وضو کی فضیلت کا بیان

چوں کہ فضائل کا بیان چل رہا ہے، اس لیے اس باب میں وضو کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں۔ قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے، یہ وہ آیت ہے جس میں وضو کے اعضاء کا تذکرہ ہے اور وضو کی تفصیل بتائی گئی ہے، اس لئے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کو یہاں ذکر کیا ہے۔

﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلَاةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَکُمْ الخ﴾ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہونے کا ارادہ کرو، تو اپنے چہروں کو دھوؤ، اور ہاتھوں کو کہنیوں تک، اور سر کا مسح کرو اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔

اعضاءِ وضو چمک دار ہوں گے

حدیث ۱۰۲۴:-

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ أُمَّتِيْ يُدْعَوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِيْنَ مِنْ آثَارِ الْوُضُوْءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُّطِيْلَ غُرَّتَهٗ فَلْيَفْعَلْ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: میری امّت قیامت کے روز ایسی حالت میں بلائی جائے گی کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے اعضاء وضو کے نشانات کی وجہ سے چمکدار ہوں گے (اس لیے) جو آدمی اپنے چمک کے نشان کو بڑا بنانا چاہے اس کو چاہئے کہ ایسا کرے۔

افادات:- چوں کہ وضو میں ہاتھ، پاؤں اور چہرہ دھویا جاتا ہے، تو وضو کے ان آثار کے نتیجہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ ان اعضاء کو قیامت کے روز ایک مخصوص چمک اور نور عطا فرمائیں گے۔ یہ سارے اعضاء چمک رہے ہوں گے اور روشن ہوں گے۔

”غُرّ“ اور ”مُحَجَّل“ دراصل ایسے گھوڑے کو کہتے ہیں جس کی پیشانی بھی سفید ہو اور اس کے اگلے اور پچھلے پاؤں میں بھی سفیدی ہو، اور وہ گھوڑے بہت عمدہ ہوتے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ آدمی کو خاص اہتمام سے وضو کرنا چاہئے اور وضو میں جتنا حصہ دھویا جاتا ہے اس سے کچھ زائد حصہ دھونے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یعنی ہاتھ کہنیوں تک دھوئے جاتے ہیں، تو اس کو چاہیے کہ کہنیوں

سے کچھ اوپر تک دھوئے۔ اسی طرح ٹخنوں تک پاؤں دھوئے جاتے ہیں تو کچھ زیادہ اوپر تک دھوئے؛ تاکہ چمک کے نشانات بڑے ہو جائیں۔

حدیث ۱۰۲۵:-

وَعَنْهُ قَالَ سَمِعْتُ خَلِيلِي ﷺ يَقُولُ: تَبْلُغُ الْحِلْيَةُ مِنَ الْمُؤْمِنِ حَيْثُ يَبْلُغُ الْوُضُوءُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آقا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: مؤمن کے زیور (اور اس کے لئے وہ چمکتی چیز جس سے اللہ تعالیٰ مؤمن کے اعضاء کو مزین کریں گے) اس جگہ تک پہنچیں گے جہاں تک وضو کا پانی جاتا ہے۔

اچھی طرح وضو کرنے کی فضیلت

حدیث ۱۰۲۶:-

وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِهِ

ترجمہ:- حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی وضو کرے اور اچھے طریقے سے وضو کرے، تو اس کے گناہ اس کے جسم سے نکلتے ہیں یہاں تک کہ ناخن کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں

افادات:-دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے پانی منگوایا اور باقاعدہ پورا وضو کیا، پہلے دونوں ہاتھ گٹّوں تک دھوئے، اس کے بعد چہرے کو تین مرتبہ دھویا، پھر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک تین تین مرتبہ دھویا، پھر سر کا مسح کیا، پھر پاؤں کو ٹخنوں تک تین تین مرتبہ دھویا، اس کے بعد فرمایا: حضور ﷺ کو میں نے اسی طرح وضو کرتے ہوئے دیکھا۔ پھر نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا کہ جو آدمی وضو کرے اور اچھے طریقے سے وضو کرے، تو اس کے گناہ اس کے جسم سے نکلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ناخن کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔

اس لیے وضو کے اعضاء کو اچھی طرح دھونے کا اہتمام کرنا چاہیے اور بڑے اطمینان اور پوری توجہ کے ساتھ وضو کرنا چاہیے تاکہ جلد بازی میں کوئی حصہ خشک نہ رہ جائے۔ بعض لوگ آکر جلدی جلدی سے پانی چہرے پر اور ہاتھوں پر پھیر دیتے ہیں جس کی وجہ سے بہت سی مرتبہ دھوئے جانے والے اعضاء کا تھوڑا سا حصہ خشک رہ جاتا ہے اور وضو نہیں ہوتا۔

البتہ اس سلسلہ میں علماء نے لکھا ہے کہ وضو کی وجہ سے صغیرہ یعنی چھوٹے گناہ دھلیں گے، کبیرہ گناہ تو توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، بلکہ جتنے بھی اعمالِ صالح کے نتیجے میں گناہوں کی معافی کا احادیث میں ذکر آیا ہے، اس سے مراد صغائر ہی ہیں، اس لئے کہ بعض روایتوں میں "مَالَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرُ" کی قید آئی ہے کہ جب تک اس نے کبائر کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ اب کبائر کے معاف کرانے کے لئے توبہ ضروری ہے۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) اپنے والد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ: مؤمن کی شان یہ ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں کبیرہ گناہ ہونے ہی نہیں چاہئیں، اس لئے کہ اس کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ جب اس سے کوئی کبیرہ گناہ صادر ہو جائے، تو جب تک کہ توبہ کر کے اور رو دھو کر اللہ تعالیٰ سے اس کی معافی نہ کروالے؛ وہاں تک اس کو چین ہی نہ آئے؛ اس لئے اس کے نامۂ اعمال میں کبائر ہوتے ہی نہیں۔ ہاں! صغائر نادانستہ طور پر وجود میں آجاتے ہیں اور اس کو خیال بھی نہیں ہوتا، تو ایسے گناہ اس طرح کے اعمال سے دُھل جاتے اور صاف ہو جاتے ہیں

حدیث ۱۰۲۷:-

وَعَنْهُ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ تَوَضَّأَ مِثْلَ وَضُوْئِيْ هٰذَا ،ثُمَّ قَالَ مَنْ تَوَضَّأَ هٰكَذَا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ وَكَانَتْ صَلَاتُهُ وَمَشْيُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ نَافِلَةً.

ترجمہ:۔۔حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے اسی طرح وضو فرمایا جیسا مَیں نے وضو کیا (جیسا کہ ابھی اوپر بتلایا کہ انہوں نے پانی منگوا کر باقاعدہ سنّت طریقہ کے مطابق وضو کر کے لوگوں کو بتلایا) اور پھر یہ ارشاد فرمایا کہ جس نے اس طرح وضو کیا اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے، اور اس کا اس وضو کے ذریعہ نماز پڑھنا اور مسجد تک چل کر جانا؛ یہ زائد رہے گا۔

افادات:۔۔یعنی گناہ تو وضو سے ہی معاف ہو گئے اور نماز پڑھنا اور مسجد تک چل کر جانا گویا نفع میں رہے گا اور یہ اعمال مزید درجات کی بلندی کا سبب بنیں گے۔

حدیث ۱۰۲۸:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُسْلِمُ - أَوِ الْمُؤْمِنُ - فَغَسَلَ وَجْهَهُ، خَرَجَ مِنْ وَجْهِهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ نَظَرَ إِلَيْهَا بِعَيْنَيْهِ مَعَ الْمَاءِ، أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ، فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ، خَرَجَ مِنْ يَدَيْهِ كُلُّ خَطِيئَةٍ كَانَ بَطَشَتْهَا يَدَاهُ مَعَ الْمَاءِ، أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ، فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ، خَرَجَتْ كُلُّ خَطِيئَةٍ مَشَتْهَا رِجْلَاهُ مَعَ الْمَاءِ، أَوْ مَعَ آخِرِ قَطْرِ الْمَاءِ، حَتَّى يَخْرُجَ نَقِيًّا مِنَ الذُّنُوبِ)) رواه مسلم

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مسلمان یا مؤمن بندہ وضو کرتا ہے اور وضو میں اپنے چہرے کو دھوتا ہے تو اس کے چہرے سے ہر وہ گناہ جس کی طرف اس نے اپنی آنکھوں کے ذریعہ سے نگاہ کی تھی (یعنی آنکھوں سے صادر ہوئے تھے) پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ دُھل جاتے ہیں۔ اور جب ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھوں سے وہ تمام گناہ نکل جاتے ہیں جو اس نے اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر کئے تھے، پانی کے ساتھ یا پانی کے آخری قطرے کے ساتھ۔ اور جب پاؤں دھوتا ہے تو وہ تمام گناہ جس کی طرف پاؤں چل کر گئے تھے وہ سارے گناہ دُھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ وضو سے فارغ ہوتا ہے تو گناہوں سے بالکل پاک صاف ہوتا ہے (یعنی ظاہری پاکی بھی ملتی ہے اور گناہوں سے روحانی پاکی بھی حاصل ہو جاتی ہے)

افادات:- امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) اور بعض دوسرے اللہ کے بندے ایسے بھی گزرے ہیں جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ لوگوں کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے تھے تو وضو کے گرنے والے پانی سے ان کو پتہ چل جاتا تھا کہ اس سے فلاں فلاں گناہ صادر ہوئے ہیں۔

حضور ﷺ امتیوں کو قیامت میں کیسے پہچانیں گے؟

حدیث ۱۰۲۹:-

وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَتَى الْمَقْبَرَةَ فَقَالَ :السَّلاَمُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُؤْمِنِينَ ، وَإِنَّا إِنْ شَاءَ اللهُ بِكُمْ لاَحِقُونَ. وَدِدْتُ أَنَّا قَدْ رَأَيْنَا إِخْوانَنَا. قالوا : أَوَلَسْنَا إِخْوَانَكَ يارسول الله ؟ قَالَ: أَنْتُمْ أَصْحَابِي، وَإِخْوَانُنَا الَّذِينَ لَمْ يَأْتُوا بَعْدُ. قالوا : كَيْفَ تَعْرِفُ مَنْ لَمْ يَأْتِ بَعْدُ مِنْ أُمَّتِكَ يَا رَسول الله ؟ فَقَالَ: أَرَأَيْتَ لَوْ أَنَّ رَجُلاً لَهُ خَيلٌ غُرٌّ مُحَجَّلَةٌ بَيْنَ ظَهْرَيْ خَيْلٍ دُهْمٍ بُهْمٍ،أَلا يَعْرِفُ خَيْلَهُ ؟ قالوا : بَلَى يارسول الله . قَالَ : فَإِنَّهُمْ يَأْتُونَ غُرّاً مُحَجَّلِينَ مِنَ الْوُضُوءِ، وأَنَا فَرَطُهُمْ عَلَى الحَوْضِ.

ترجمہ مع تشریح: حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں تشریف لائے اور قبرستان میں داخل ہوتے وقت آپ نے یہ دعا پڑھی: "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ" (جب قبرستان میں داخل ہوں تو یہی دعا پڑھنی چاہیے، جس کا ترجمہ ہے کہ تم پر سلامتی ہو اے ایمان والوں کی بستی، اور ہم بھی ان شاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں) حضور اکرم ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: میری دلی خواہش تھی کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے (جب حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا) تو حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم تو میرے صحابہ اور ساتھی ہو، ہمارے بھائی تو وہ ہیں جو ابھی تک دنیا میں نہیں آئے ہیں، بعد میں آئیں گے۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کے جو امّتی ابھی تک دنیا میں تشریف نہیں لائے اور جن کو آپ نے اپنی مبارک آنکھوں سے نہیں دیکھا، قیامت میں آپ ان لوگوں کو دوسری امتوں کے درمیان میں کیسے پہچانیں گے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اچھا بتلاؤ! اگر کسی آدمی کے ایسے گھوڑے ہوں جن کی پیشانی اور پاؤں سفید

ہوں اور وہ ایسے گھوڑوں کے درمیان میں ہوں جو پورے سیاہ ہوں، یا ایک ہی رنگ کے ہوں (یعنی ان کی پیشانیوں اور پاؤں کے رنگ میں سفیدی نہ ہو) تو وہ اپنے گھوڑوں کو پہچان لے گا یا نہیں؟ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! (جب نشانی موجود ہے تو پھر ضرور پہچان لے گا) تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امّت کے جو لوگ ہوں گے ان کے وضو کے نتیجے میں ان کے چہروں اور ان کے ہاتھوں پاؤں پر روشنی ہوگی اور وہ روشن چہرے اور چمکدار ہاتھ، پاؤں لے کر آئیں گے، مَیں ان کو پہچان لوں گا کہ یہ میری امّت کے لوگ ہیں اور مَیں ان سے پہلے حوضِ کوثر پر پہنچوں گا (تاکہ ان کے لئے پانی کا انتظام کروں)۔

افادات:- موت تو ہر ایک کو آنے والی ہے، پھر ان شاء اللہ کہنا کیا معنٰی رکھتا ہے؟ تو اصل میں ایمان کے ساتھ موت آنے کی تو کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی، اس لیے یہ جملہ بڑھایا کہ ان شاء اللہ ایمان پر موت آئے گی اور اللہ تعالیٰ نے اگر چاہا تو ہم تم لوگوں سے ملنے والے ہیں۔

"فَرَط" جب کوئی قافلہ سفر میں جاتا ہے تو قافلہ والے جہاں آگے پڑاؤ ڈالنے والے ہوتے ہیں اس جگہ پر پہنچنے سے پہلے کچھ لوگوں کو پہلے سے بھیج دیا جاتا ہے، تاکہ وہ قافلہ کے پڑاؤ کے لئے قیام وغیرہ کی سہولتیں مہیا کریں۔ قافلہ والوں کے لئے آگے سے جاکر جو انتظام کرتے ہیں؛ ان کو فرط کہتے ہیں، جیسے ٹور کے جانے سے پہلے اس کا آرگنائزر (Organiser) وہاں جاکر مکان اور ساری سہولتوں کا انتظام کرلیتا ہے کہ ٹور کے آتے ہی ان کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

ناپسندیدہ حالات میں اچھی طرح وضو کرنے کی فضیلت

حدیث ۱۰۳۰ :-

وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَلاَ أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللهُ بِهِ الْخَطَايَا، وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟ قالوا: بَلَى يَا رسول الله، قَالَ: إِسْبَاغُ الْوُضُوءِ عَلَى الْمَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الْخُطَا إِلَى الْمَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ، فَذٰلِكُمُ الرِّبَاطُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں ایسا عمل نہ بتلاؤں کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو مٹاتے ہیں، اور درجات کو بلند کرتے ہیں؟ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: کیوں نہیں اے اللہ کے رسول! (ضرور بتلایئے) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ناپسندیدہ حالات میں وضو کو پورے پورے طور پر کرنا، اور مسجد کی طرف خوب قدموں کا اٹھانا (یعنی پانچوں وقت نماز کے لئے مسجد کی طرف جانا) اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا؛ یہی ہے سرحدوں کی حفاظت اور نگرانی، یہی ہے سرحدوں کی حفاظت اور نگرانی۔

افادات:- ”اسباغ“ کا مطلب یہ ہے کہ تمام اعضاء پر پورے طور پر پانی پہنچانا اور اچھی طرح وضو کرنا۔ مثلاً: سردی کے زمانہ میں ٹھنڈا پانی ہو اور وضو کرنے کا موقعہ آئے تو آدمی کو ذرا بھاری معلوم ہوتا ہے، لیکن اس وقت بھی آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والے اس اجر وثواب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلند کئے جانے والے ان درجات کی امید میں پورے اطمینان کے ساتھ اچھے طریقہ سے اعضاء کو دھوئے اور جلد بازی سے کام نہ لے۔

ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، یا تو نوافل کے بعد فرائض کا انتظار کرنا، یا ایک فرض نماز کے بعد دوسری فرض نماز کا انتظار کرنا کہ کب وقت آئے اور میں فرض ادا کروں ۔ جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ سات آدمی اللہ کے سائے میں ہوں گے جس روز اللہ کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، اس میں ایک وہ آدمی ہے جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو کہ نماز سے جب لوٹتا ہے تو دل مسجد ہی میں اٹکا رہتا ہے کہ دوسری نماز کا وقت کب آئے اور میں مسجد پہنچوں۔

بورڈر کی حفاظت اور سیکورٹی کے لیے فوج رکھی جاتی ہے جو وہاں ڈیوٹی دیتی ہے؛ اس کو ''رباط'' کہتے ہیں۔ گویا یہ اعمال وہ ہیں جو دشمن اور شیطان کی طرف سے کئے جانے والے حملے سے بچاؤ اور حفاظت کا سبب بنتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو آدمی ہمیشہ باوضو رہتا ہے؛ شیطان اس پر حملہ نہیں کر سکتا، اس لئے ہمیشہ باوضو رہنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اور نمازوں کا دلی طور پر انتظار رہے اور مسجد کی طرف چل کر جانے کا اہتمام ہو۔ یہ تینوں اعمال وہ ہیں جن کو ''رباط'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا ان اعمال کو شیطان کی طرف سے کئے جانے والے حملے سے بچاؤ اور حفاظت میں بڑا دخل ہے۔

پاکی آدھا ایمان ہے

حدیث ۱۰۳۱:-

وَعَنْ أَبِي مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: الطُّهُوْرُ شَطْرُ الْإِيْمَانِ.

ترجمہ:— حضرت ابومالک اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پاکی آدھا ایمان ہے۔

افادات:— یہ روایت صبر کے بیان میں (جلد اول، ص:۲۴۳، ۲۴۲ پر بھی) گزر چکی ہے۔ اس جملہ کی ایک تشریح یہ بھی کی گئی ہے کہ اعمال کے دو درجے ہیں، ایک تخلیہ۔ دوسرا تحلیہ۔ جیسے: آپ غسل کریں تو اس کا ایک درجہ تو میل کچیل کو صاف کرنا ہوتا ہے۔ اور اس کے بعد دوسرا درجہ خوشبو وغیرہ استعمال کر کے اپنے آپ کو مزیّن کرنا ہوتا ہے۔ تو ہر عمل میں پاکی کا اہتمام یہ آدھا عمل اور پہلا درجہ ہوا کرتا ہے، اسی لئے اس کو شطر الایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں

حدیث ۱۰۳۲:-

وَعَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَامِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبْلِغُ أَوْ فَيُسْبِغُ الْوُضُوْءَ ثُمَّ يَقُوْلُ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ إِلَّا فُتِحَتْ لَهٗ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَاءَ. (رواہ مسلم)

وَزَادَ التِّرْمِذِيُّ:- أَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ.

ترجمہ مع تشریح وافادات:— یہ روایت مسلم شریف (باب الذِّكْرِ الْمُسْتَحَبِّ عَقِبَ الْوُضُوْءِ) میں ہے، وہاں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے جس کو انہوں نے یہاں بیان نہیں کیا۔

حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اونٹوں کو چرانے کے لئے ہم کئی لوگ ہوتے تھے، ہر ایک کی باری مقرر کر دی گئی تھی کہ سب کی طرف سے ایک چرائے اور دوسرے لوگ اپنے کام میں مشغول رہیں۔ ایک مرتبہ اونٹوں کی چرانے کی میری باری تھی، شام کو سارے اونٹوں کو چرا کر میں گھر پہنچا اور اونٹوں کو چھوڑ کر سیدھا مسجد گیا تو دیکھا کہ نبی کریم ﷺ اس وقت کچھ ارشاد فرمارہے تھے، اس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی وضو کرے اور دو رکعت نماز تحیۃ الوضو کے طور پر ادا کرے، اس کے لئے جنّت واجب ہو جاتی ہے۔ جب میں مسجد میں داخل ہو رہا تھا تو حضور اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ ارشاد میں نے سنا اس پر مَیں بول پڑا: ”مَا أَجْوَدَ هٰذِهٖ“ یہ تو بہت عمدہ بات ہے۔ جب میں نے یہ کہا تو پیچھے سے کسی کی آواز آئی: ”اَلَّتِي قَبْلَهَا أَجْوَدُ“ اس سے پہلے حضور اکرم ﷺ نے جو بات ارشاد فرمائی وہ اور زیادہ عمدہ اور بڑھیا تھی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ بات کہنے والے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) تھے۔ پھر انھوں نے کہا: تم ابھی آئے ہو، اس سے پہلے جو بات حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی وہ تم نے نہیں سنی، اور وہ بات یہی ہے جس کو اس روایت میں نقل کیا ہے کہ) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو آدمی وضو کرتا ہے اور اچھے طریقہ سے وضو کرتا ہے، پھر کلمۂ شہادت ”أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ“ پڑھتا ہے، تو جنّت کے آٹھوں دروازے اس کے لئے کھول دئے جاتے ہیں، جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔

افادات:- چھوٹا سا عمل ہے، وہاں تو دو رکعت پڑھنے کی بات تھی لیکن یہاں تو دو رکعت پڑھے بغیر صرف وضو کر کے کلمۂ شہادت پڑھ لینے پر یہ فضیلت حاصل ہوتی ہے کہ جنّت کے آٹھوں

دروازے کھول دئے جاتے ہیں کہ جس سے چاہے داخل ہو جائے۔ اس لئے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ اس سے پہلے والی بات اس سے بھی بڑھیا اور عمدہ تھی۔

ترمذی شریف کی روایت میں یہ ہے کہ کلمۂ شہادت کے ساتھ یہ دعا بھی پڑھ لے: "أَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ التَّوَّابِيْنَ وَاجْعَلْنِيْ مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ" اے اللہ! مجھے زیادہ سے زیادہ تیری طرف رجوع ہونے والوں اور پاکی حاصل کرنے والوں میں سے بنا۔ یہ ظاہری پاکی ہے اور توبہ روحانی اور باطنی پاکی ہے۔ اس سے وضو کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

بَابُ فَضْلِ الْأَذَانِ

اذان کی فضیلت کا بیان

اذان کی ابتدا کیسے ہوئی؟

نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اس وقت پنج وقتہ نمازوں کے لیے بلانے کے واسطے کوئی مستقل نظام نہیں تھا، نماز کے اوقات میں لوگ اپنے طور پر اندازہ لگا کر مسجد میں حاضر ہو جایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح آنے میں بڑی دشواری تھی، کوئی بہت جلدی پہنچ گیا تو اس کو دیر تک انتظار رہتا تھا اور کوئی نماز ہو جانے کے بعد پہنچتا تھا، اس کی وجہ سے پریشانی لاحق ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اس سلسلہ میں مشورہ کے لئے جمع ہوئے کہ کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ لوگ نماز کے وقت پر اس طرح پہنچیں کہ کسی کو کوئی پریشانی لاحق نہ ہو، اس مشورہ میں مختلف تجاویز سامنے آئیں کسی نے کہا: آگ جلادی جائے جس کو دیکھ کر لوگ آجایا کریں اس پر یہ بات آئی کہ آگ تو آتش پرستوں کا شعار ہے، وہ اس کی پوجا کرتے ہیں، اس لئے اس سے بچنا ضروری ہے۔

کسی نے کہا: ناقوس بجا دیا کریں۔ ناقوس کا مطلب یہ ہے کہ دو لکڑیاں ہوتی ہیں، ایک لمبی اور دوسری چھوٹی؛ اور چھوٹی والی لکڑی کو بڑی لکڑی پر مار کر بجایا جاتا ہے جس سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب ناقوس والی تجویز رکھی گئی تو نصاریٰ کا تذکرہ آیا کہ یہ نصاریٰ کا طریقہ اور علامت ہے، وہ اپنے یہاں عبادت کے واسطے جمع کرنے کے لئے اسی کو استعمال کرتے ہیں، اگر ہم اس کو استعمال کریں گے تو ان کے ساتھ تشبہ لازم آئے گا۔

کسی نے کہا: سینگ کو منہ لگا کر اس سے آواز نکالی جائے۔ جب یہ تجویز پیش کی گئی تو یہودیوں کا تذکرہ آیا کہ یہودیوں کے وہاں عبادت کے واسطے بلانے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، ان سے مشابہت لازم آئے گی۔

اخیر میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے یہ تجویز پیش کی کہ ایسا کیوں نہ کریں کہ ایک آدمی کو بھیج دیا جائے جو لوگوں کو نماز کے وقت بلالیا کرے، چناں چہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) سے کہا کہ آپ ایسا کیا کریں کہ ”اَلصَّلٰوۃُ جَامِعَۃٌ“ کے الفاظ سے اعلان کر دیا کریں۔ حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) جگہ جگہ گھوم کر اس طرح لوگوں کو بلالیا کرتے تھے، لیکن پانچ وقت اس طرح کرنے میں ان کے لئے بڑی دشواری تھی۔ اس مجلس میں ایک صحابی حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ (رضی اللہ عنہ) بھی موجود تھے، ان کی طبیعت پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ اس بارے میں بہت متفکر رہے کہ اس کے لئے کوئی مناسب تدبیر اللہ تعالیٰ ذہن میں ڈال دیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا قانون و دستور ہے کہ جب کوئی آدمی کسی بات کی فکر اوڑھ لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی کو اس کا ذریعہ بنا دیا کرتے ہیں، اگرچہ کرنے والی ذات تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے خواب میں ان کو ایک فرشتہ دکھلایا جو ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے اذان کے وہ کلمات کہے جو ہم سب جانتے ہیں کہ پہلے چار مرتبہ ”اَللّٰہُ أَکْبَرُ“ پھر دو مرتبہ ”أَشْھَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ“ پھر دو مرتبہ ”أَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ“ اس طرح پوری اذان دیکھی۔ جب وہ سو کر اٹھے تو بڑے خوش تھے، نبی کریم ﷺ کی خدمت میں آکر انہوں نے خواب سنایا کہ اللہ کے رسول! میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ دوسرے حضرات نے بھی اسی طرح کا خواب دیکھا جنہوں نے آکر بیان کیا۔ نبی

کریم ﷺ نے حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) سے فرمایا: تم یہ کلمات اونچی جگہ پر کھڑے ہو کر کہہ دیا کرو؛ اس طرح اذان کی شروعات ہوئی۔ اور اذان دینا بڑا نیکی کا کام ہے، اذان کو اسلامی شعار قرار دیا گیا ہے۔ اس باب میں اس کی فضیلت بتلاتے ہیں۔

اذان کا ثواب حاصل کرنے کے واسطے قرعہ اندازی

حدیث ۱۰۳۳:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَآءِ وَالصَّفِّ الْأَوَّلِ، ثُمَّ لَمْ يَجِدُوْا إِلَّا أَنْ يَّسْتَهِمُوْا عَلَيْهِ لَاسْتَهَمُوْا عَلَيْهِ. وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي التَّهْجِيْرِ لَاسْتَبَقُوْا إِلَيْهِ. وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان دینے میں اور پہلی صف میں نماز پڑھنے میں کیا فضیلت ہے، اور پھر ان کو ان دو کاموں کے لیے قرعہ اندازی اور چِٹھی ڈالنے اور ڈرو (Draw) کرنے کی ضرورت پیش آئے؛ تو ضرور قرعہ اندازی کریں گے۔ اور اگر معلوم ہو جائے کہ جلدی سے نماز میں حاضری کی کیا فضیلت ہے؛ تو لوگ دوڑتے ہوئے اور سبقت کرتے ہوئے مسجد میں آئیں گے۔ اور اگر معلوم ہو جائے کہ عشاء اور فجر کی نماز میں کیا فضیلت ہے تو اس میں حاضری دینے کے واسطے لوگ گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے مسجد میں آئیں گے۔

افادات:- اذان اور پہلی صف کی فضیلت اتنی زیادہ ہے کہ اگر اس کے ثواب کا لوگوں کو پتہ چل جائے تو اس کو حاصل کرنے کے لئے یکبارگی اتنے زیادہ لوگ آجائیں گے کہ ان کو مطمئن کرنے کے لئے سوائے قرعہ اندازی کے کوئی اور طریقہ اختیار نہ کیا جائے گا۔ اس لئے کہ کسی چیز کے کئی طلبگار ہوں اور وہ چیز سب کو مل نہ سکتی ہو، تو سب کو اطمینان دلانے کے لئے یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ قرعہ اندازی کرو، جس کا نام نکلے گا اس کو دیں گے، پھر جس کا نام نہیں نکلتا تو وہ اپنی قسمت پر روتا ہے۔

اسی طرح حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جلدی سے نماز میں حاضری کی کیا فضیلت ہے، یہ معلوم ہو جائے؛ تو لوگ دوڑتے ہوئے آئیں۔ لیکن آج تو ہمارا حال یہ ہو گیا ہے کہ نماز کے معاملہ میں بہت سستی برتتے ہیں، اگر کبھی جلدی آ بھی جاتے ہیں، اور معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تو بہت دیر ہے، تو وضو کر کے باہر ہی کھڑے ہو جاتے ہیں اور صحن میں باتیں کرتے رہتے ہیں، جماعت خانہ میں آکر دو رکعت پڑھنے کی یا تسبیح میں مشغول ہونے کی توفیق نہیں ہوتی، گویا جلدی آکر افسوس ہوتا ہے کہ ہم اتنی جلدی کیوں آگئے۔ ایسا ہمارا جو مزاج بنا ہوا ہے اس کی اصلاح کی سخت ضرورت ہے۔

اور عام طور پر لوگ عشاء اور فجر میں سستی کرتے ہیں اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ: عشاء اور فجر کی نماز کی فضیلت اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے تو گھٹنوں کے بل گھسٹتے ہوئے مسجد میں آئیں۔

بہر حال! اس روایت میں سب سے پہلے اذان کی فضیلت کا حال معلوم ہوا، اسی کے پیشِ نظر اس باب میں ذکر کی ہے۔

قیامت کے روز موٗذنوں کا اعزاز

حدیث ۱۰۳۴:-

وَعَنْ مُعَاوِيَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: اَلْمُؤَذِّنُوْنَ أَطْوَلُ النَّاسِ أَعْنَاقاً يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

ترجمہ:- حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اذان دینے والے قیامت کے روز لوگوں میں سب سے زیادہ لمبی گردنوں والے ہوں گے۔

افادات:- جو آدمی اونچا ہوتا ہے، وہ کسی چیز کو اچھے طریقہ سے دیکھ سکتا ہے اور اس کو دیکھ کر اطمینان حاصل کر سکتا ہے۔ گویا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اذان دینے والے اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت کا نظارہ سب سے زیادہ اچھی طرح کر سکیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے فائدہ اٹھانے کا دوسروں کے مقابلہ میں ان کو زیادہ موقعہ ملے گا

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے روز گرمی کی شدّت اور تکلیف کا یہ عالم ہوگا کہ لوگوں کو پسینہ آئے گا، کسی کا پسینہ اس کے منھ تک پہنچا ہوا ہوگا، گویا پسینے نے اس کو لگام دے رکھی ہوگی۔ لیکن اذان دینے والے اونچی گردن والے ہوں گے، تو گویا ان کو وہ تکلیف نہیں ہوگی اور ان کا پسینہ ان کی گردنوں کے اونچا ہونے کی وجہ سے منھ تک نہیں پہنچ پائے گا۔

بلند آواز سے اذان دینا پسندیدہ ہے

حدیث ۱۰۳۵:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ أَنَّ أَبَا سَعِيْدٍ الْخُدْرِيَّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ لَهُ: إِنِّيْ أَرَاكَ تُحِبُّ الْغَنَمَ وَالْبَادِيَةَ فَإِذَا كُنْتَ فِيْ غَنَمِكَ أَوْ بَادِيَتِكَ فَأَذَّنْتَ لِلصَّلَاةِ فَارْفَعْ صَوْتَكَ بِالنِّدَاءِ فَإِنَّهُ لَا يَسْمَعُ مَدَى صَوْتِ الْمُؤَذِّنِ جِنٌّ وَلَا إِنْسٌ وَلَا شَيْءٌ إِلَّا شَهِدَ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَالَ أَبُوْ سَعِيْدٍ سَمِعْتُهُ مِنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ ۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عبدالرحمن فرماتے ہیں کہ حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) نے ان سے کہا: میں تم کو دیکھتا ہوں کہ تم بکریوں اور جنگل کو پسند کرتے ہو (یعنی تم کو بکریوں سے محبت ہے بکریاں پالتے ہو اور ان کو چرانے کے لئے جنگل میں قیام اختیار کرتے ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جنگل میں رہو گے تو نماز بھی وہیں پڑھنے کی نوبت آئے گی) تو جب تم اپنی بکریاں چرا رہے ہو اور نماز کا وقت آئے تو نماز کے لئے اذان دو، اور اپنی آواز کو بلند کرو، اس لئے کہ موذن کی آواز کی گونج کو جو کوئی بھی سنتا ہے، چاہے جنّات ہوں، انسان ہوں؛ یا اور کوئی بھی چیز ہو؛ وہ سب قیامت کے روز اس کے حق میں گواہی دیں گی۔ حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہا: مَیں نے یہ ارشاد نبی کریم ﷺ سے سنا ہے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اذان کو جتنی زیادہ بلند آواز سے دے سکتے ہوں دینی چاہیے؛ یہ پسندیدہ اور مطلوب ہے۔ اور جس کے بھی کان میں موذن کی آواز خواہی نخواہی پڑے گی، وہ سب لوگ قیامت کے روز اس کے حق میں گواہی دیں گے، چاہے ان کا جی چاہے یا نہ چاہے کہ: اے اللہ!

اس بندے نے تیرا نام بلند کیا تھا اور تیرے بندوں کو تیری عبادت کے لئے دعوت دی تھی۔ اس روایت سے اذان کی بہت ہی بڑی فضیلت معلوم ہوئی۔

اذان سے شیطان بھاگتا ہے

حدیث ۱۰۳۶:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِذَا نُوْدِيَ بِالصَّلَاةِ أَدْبَرَ الشَّيْطَانُ لَهُ ضُرَاطٌ، حَتّٰى لَا يَسْمَعَ التَّأْذِيْنَ. فَإِذَا قُضِيَ النِّدَآءُ أَقْبَلَ، حَتّٰى إِذَا ثُوِّبَ لِلصَّلَاةِ أَدْبَرَ، حَتّٰى إِذَا قُضِيَ التَّثْوِيْبُ أَقْبَلَ، حَتّٰى يَخْطِرَ بَيْنَ الْمَرْءِ وَنَفْسِهِ، يَقُوْلُ اُذْكُرْ كَذَا، وَاذْكُرْ كَذَا، لِمَا لَمْ يَذْكُرْ مِنْ قَبْلُ حَتّٰى يَظَلَّ الرَّجُلُ مَا يَدْرِيْ كَمْ صَلّٰى.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب نماز کے لئے اذان کہی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر زور سے ریح نکالتے ہوئے بھاگتا ہے، پھر جب اذان پوری ہو جاتی ہے تو واپس آجاتا ہے، یہاں تک کہ جب نماز کی تکبیر (اقامت) کہی جاتی ہے (تو چوں کہ یہ بھی اذان ہی کا حصہ ہے) اس لیے پھر سے وہ بھاگتا ہے یہاں تک کہ جب اقامت پوری ہو جاتی ہے تو پھر واپس آجاتا ہے، اور آدمی جب نماز شروع کرتا ہے تو اس کے دل اور نماز کے درمیان میں آڑ بن جاتا ہے، چناں چہ آکر وہ اس کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے کہ فلاں چیز یاد کرو، فلاں چیز یاد کرو، اور وہ باتیں جو نماز سے پہلے اس کو کبھی یاد بھی نہیں آتی تھیں، وہ باتیں یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی کو یہ یاد بھی نہیں رہتا کہ کتنی رکعتیں پڑھیں۔

افادات:- جیسا کہ اوپر بتلایا کہ جس کے کان میں بھی اذان کی آواز پڑے گی اس کو قیامت کے روز اذان دینے والے کے حق میں گواہی دینی پڑے گی۔ بھلا شیطان اس چیز کو کیسے گوارا کر سکتا ہے؟ جس چیز کے خلاف وہ ہمیشہ کوشش کرتا ہو اسی کے بارے میں مجبوراً گواہ بن کر جانا پڑے؛ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ اس لئے جب اذان دی جاتی ہے تو شیطان پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہے۔ اور اس پر اذان کا ایسا بوجھ پڑتا ہے کہ زور سے ہوا نکل جاتی ہے، جیسے کبھی کوئی آدمی زیادہ وزنی چیز اٹھالیتا ہے تو اس کی ریح خارج ہو جاتی ہے، اسی طرح شیطان کی طبیعت پر بھی اذان کا اتنا بوجھ پڑتا ہے کہ اس کی ریح خارج ہو جاتی ہے، اور اتنا دور چلا جاتا ہے کہ اس کو اذان کی آواز نہ آئے تاکہ قیامت کے روز اس کو گواہی دینی نہ پڑے۔ پھر نماز کے وقت آکر نمازی کے دل میں ایسے ایسے وسوسے ڈالتا ہے گویا کیسٹ چلتی رہتی ہے، حالاں کہ نماز سے پہلے اپنے کام میں مشغول تھا تب بھی کبھی ادھر دھیان نہیں گیا تھا، لیکن جہاں نماز شروع کی کہ سارے دن کی چیزیں اور ساری باتیں شیطان یاد دلاتا ہے، یہاں تک کہ آدمی یہ بھی بھول جاتا ہے کہ کتنی رکعتیں پڑھی۔

دو رکعت تو پوری کرلیتا

امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس ایک آدمی آیا اور عرض کیا: حضرت! میں نے ایک جگہ پر دراہم کی تھیلی دفن کی ہے، لیکن اب بھول گیا ہوں کہ وہ جگہ کونسی ہے، کوئی علاج بتلایئے تاکہ جگہ یاد آجائے؟ امام صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: ایسا کرو کہ وضو کرو اور دو رکعت نماز کی نیت باندھ لو، اور

خوب توجہ اور دھیان سے نماز پڑھنا۔ چناں چہ اس نے جیسے ہی وضو کرکے نماز کی نیت باندھی کہ شیطان نے اس کو جگہ یاد دلادی۔ اب اس نے نماز بھی توڑ دی اور آکر شکریہ ادا کیا۔ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا: اللہ کے بندے! وہ دو رکعت تو پوری کر لیتا۔

میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ مانگو

حدیث ۱۰۳۷:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ (رضی اللہ عنہما) أَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِذَا سَمِعْتُمُ الْمُؤَذِّنَ، فَقُوْلُوْا مِثْلَ مَا يَقُوْلُ، ثُمَّ صَلُّوْا عَلَيَّ، فَإِنَّهُ مَنْ صَلَّى عَلَيَّ صَلَاةً، صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ بِهَا عَشْرًا، ثُمَّ سَلُوا اللهَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ، فَإِنَّهَا مَنْزِلَةٌ فِي الْجَنَّةِ لَا تَنْبَغِيْ إِلَّا لِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِ اللهِ وَأَرْجُوْ أَنْ أَكُوْنَ أَنَا هُوَ . فَمَنْ سَأَلَ لِيَ الْوَسِيْلَةَ حَلَّتْ لَهُ الشَّفَاعَة.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبئ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب تم اذان کی آواز سنو تو مؤذن جو کلمات کہے وہی تم بھی کہو (یعنی مؤذن نے کہا کہ اللہ اکبر اللہ اکبر، تو آپ بھی اسی طرح اللہ اکبر اللہ اکبر کہو) اس کے بعد میرے اوپر درود بھیجو، پھر میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ مانگو، یہ جنّت میں ایک اونچا درجہ ہے جو اللہ کے بندوں میں سے صرف ایک ہی کو ملے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ وہ بندہ جس کو یہ مقام دیا جائے گا وہ میں ہی ہوں۔ اس لیے جو میرے لئے وسیلے کی دعا کرے گا اس کے لئے میری شفاعت ضروری اور واجب ہو جائے گی (یعنی قیامت کے روز مَیں اس کی سفارش کروں گا۔)

اذان کا جواب کیا دیا جائے؟

افادات:-" مؤذن جو کلمات کہے وہی تم بھی کہو" اس سے علماء نے یہ بتلایا کہ اس نے جہاں پہلے دو کلمے کہے اور خاموش ہوا، تو آپ بھی وہی کہہ دیجئے، اسی طرح ساتھ ساتھ جواب کا سلسلہ چلتا رہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر وہ آگے بڑھ گیا تو جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے کہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر جواب دینے کا خیال نہیں رہا اور جواب دینا بھول گئے، پھر درمیانِ اذان خیال آیا تو شروع سے جو کلمات کہے گئے ہیں ان کا جواب دیا جا سکتا ہے۔

اس روایت میں ہے **"مؤذن جو کلمات کہے جواب میں وہی کلمات کہتے جاؤ"** اس کا تو تقاضہ یہ ہے کہ جب مؤذن "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" کہے، تو ہمیں بھی "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" ہی کہنا چاہیے اور جب "حَيَّ عَلَى الفلاح" کہے تو ہمیں بھی "حَيَّ عَلَى الفلاح" ہی کہنا چاہیے؛ لیکن دوسری روایتوں میں یہ آتا ہے کہ جب مؤذن "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" اور "حَيَّ عَلَى الفلاح" کہے تو آدمی کو بجائے "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" اور "حَيَّ عَلَى الفلاح" کے "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم" کہنا چاہیے۔ دونوں روایتوں سے بظاہر الگ الگ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے جواب میں بعضوں نے کہا کہ: کبھی یہ کہے، اور کبھی وہ کہے، یعنی کبھی "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" کے جواب میں "حَيَّ عَلَى الصَّلٰوة" کہے، اور کبھی "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْم" کہے۔ اور بعضوں نے کہا کہ دونوں کہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" کے جواب میں "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" ہی کہنے پر ایک اشکال ہوتا ہے، اس لیے کہ "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" کا مطلب تو ہوتا ہے کہ "آؤ نماز کے لئے" تو جیسے ایک آدمی ہمیں کہے: "آؤ نماز کے لئے" اور اس کے جواب میں ہم بھی کہیں: "آؤ نماز کے لئے" تو یہ جواب نہیں ہوتا بلکہ مذاق کی سی شکل ہو جاتی ہے۔

اس کا جواب دیا گیا ہے کہ وہ جو ہمیں کہتا ہے " آؤ نماز کے لئے" اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جیسے کوئی بلانے کے لئے آتا ہے اور کہتا ہے کہ "چلئے"۔ جب بلانے والا "چلئے" کہتا ہے تو سامنے والا بھی کہتا ہے کہ "چلئے" اور چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اور دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ وہ آپ کو کہہ رہا ہے "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" "چلئے نماز کے واسطے"۔ اور آپ اپنے جی میں کہہ رہے ہیں اور اپنے نفس کو خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" "چل نماز کے واسطے اُٹھ"۔ گویا مؤذن نے ہمیں خطاب کیا اور ہم اپنے نفس کو خطاب کریں؛ تو اس صورت میں کوئی اشکال باقی نہیں رہے گا۔

اور جس روایت میں "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْم" کہنا آیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی آدمی کے اندر گناہ سے بچنے کی قوت نہیں، اور کسی بھی عبادت کو کرنے کی طاقت نہیں، جب تک کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق نہ دی جائے۔ گویا یہاں مؤذن کی طرف سے کہا جا رہا ہے: "حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ" نماز کے لئے آؤ۔ تو جواب میں یہ کلمات کہے جا رہے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ نماز

ایک بہت اونچا عمل ہے، جب تک اللہ تعالیٰ اس کی توفیق نہ دے وہاں تک کسی آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ گویا ہم اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق طلب کرتے ہیں، اور وہی توفیق دینے والا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی اُمت سے ایک فرمائش

حضور اکرم ﷺ ہم سے فرمارہے ہیں کہ میرے لئے وسیلہ مانگو۔ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی (نور اللہ مرقدہٗ) جو حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلفاء میں سے تھے وہ فرماتے تھے کہ: حضور اکرم ﷺ کے ہم پر بڑے احسانات ہیں آپ ہی کے صدقہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان عطا فرمایا، اور ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے توسّل سے امّت کو عطا فرمائی ہیں، اور حضور اکرم ﷺ نے اپنی امّت سے کبھی اپنے لئے ایسا کوئی کام نہیں کہا کہ میرے واسطے فلاں کام کرلو، سوائے ایک چیز کے؛ کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے وسیلہ مانگو؛ اور ہم اس میں بھی کوتاہی کریں جس کے صدقہ و طفیل ہمیں سب کچھ ملا، اس کے لئے ہم اتنا بھی کرنے کے روادار نہ ہوں؛ تو اس سے زیادہ بے مروّتی اور کیا ہوسکتی ہے؟ اس لئے اذان کی آواز سننے کے بعد اذان کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ اذان پوری ہونے پر اس دعا کو پڑھنے کا ضرور اہتمام کیا جائے۔ اور پھر اس میں ہمارا ہی بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جو میرے لئے وسیلہ کی دعا کرے گا؛ اس کے لئے میری شفاعت ضروری اور واجب ہو جائے گی۔

مقامِ وسیلہ، ایک نکتہ

" وسیلہ " وہی مقام ہے جس کے ملنے پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے نبی کریم ﷺ کو شفاعت کا اختیار دیا جائے گا، جب کسی نے آپ ﷺ کے لیے اس مقام کے ملنے کی دعا کی، تو ظاہر ہے آپ ﷺ اس کے لئے ضرور شفاعت فرمائیں گے۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے یہ مقام حضور اکرم ﷺ کے لیے ہی تجویز کیا ہے، لیکن جب ہم ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم کے پاس ابو داؤد شریف پڑھتے تھے اس وقت حضرت نے ایک بات ارشاد فرمائی تھی جو اس وقت سے مجھے یاد رہ گئی ہے۔ حضرت نے فرمایا تھا کہ: دیکھئے! اصل تو یہ مقام و مرتبہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ ہی کی قسمت میں لکھا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے واسطے ایک شرط لگائی گئی ہے کہ جس کے لئے اس مرتبہ کو مانگنے والے اتنی تعداد میں ہوں گے، انہی کو یہ مقام دیا جائے گا، گویا جس کو اتنے ووٹ ملیں گے اسی کو یہ مقام و منصب ملے گا۔ ویسے بھی امّتِ محمدیہ کی تعداد دوسری امتوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے، پھر جب کہ دن میں پانچ مرتبہ اذان دی جاتی ہے تو ہر اذان کو سن کر اس امّت کے افراد آپ ﷺ کے لیے روزانہ پانچ مرتبہ یہ مقام ملنے کی دعا کرتے رہیں گے، تو ظاہر ہے آپ ﷺ کے لیے اس مرتبہ کی دعا کرنے والوں کی تعداد بڑھ جائے گی۔ ویسے تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ ہی کے لیے یہ مقام مقدّر فرمایا ہے، لیکن ظاہری طور پر جو سبب رکھا اس کو اختیار کرنے کے لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے

لئے وسیلہ مانگو، اور یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچنے پر نبی کریم ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ تو اس مقام کے ملنے میں جس نے بھی اپنی دعا لگائی ہوگی، حضور اکرم ﷺ اس کی سفارش ضرور فرمائیں گے، جیسے آپ کسی کو چن کر پارلیمنٹ میں بھیجیں، تو وہ آپ کا بھی کام کرتا ہے کہ اس نے ہم کو ووٹ دیا تھا تو اس کا یہ کام کر دو۔ خیر! یہ تو صرف ایک نکتہ کی بات ہے۔

اذان کے جواب کی حیثیت کیا ہے؟

حدیث ۱۰۳۸:-

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا سَمِعْتُمُ النِّدَاءَ فَقُولُوا كَمَا يَقُولُ الْمُؤَذِّنُ.

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم اذان کی آواز سنو تو جس طرح مؤذن کہتا ہے اسی طرح تم بھی کہو۔

افادات:- چوں کہ "قُوْلُوْا" امر کا صیغہ ہے، اس لیے اذان کا جواب دینا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ واجب ہے، سنّت ہے، یا مستحب؟ احناف میں سے مشائخ کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ اذان کا جواب دینا واجب اور ضروری ہے، لیکن علامہ شامی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس پر بحث و تحقیق کرنے کے بعد آخری بات لکھی ہے کہ اذان کے جواب دو طرح دیئے جاتے ہیں، ایک تو زبانی، اور ایک عملی۔ اذان کا عملی جواب دینا تو ضروری ہے۔ اذان دینے والا اذان کے ذریعہ آپ کو اللہ کے گھر میں بلا رہا ہے کہ

آجاؤ، اور مسجد میں آکر نماز ادا کرلو۔ گویا مسجد کی طرف چلنا عملی جواب ہے، اور یہ واجب اور ضروری ہے۔ اور زبان سے جواب دینا سنّت و مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔

کون شفاعت کا محتاج نہیں؟

حدیث ۱۰۳۹:-

وَعَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ قَالَ حِيْنَ يَسْمَعُ النِّدَاءَ: أَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ آتِ مُحَمَّداً نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَّحْمُوْداً نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّه؛ حَلَّتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اذان کی آواز سن کر یہ دعا پڑھی: أَللّٰهُمَّ رَبَّ هٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَالصَّلَاةِ الْقَائِمَةِ، آتِ مُحَمَّداً نِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ، وَابْعَثْهُ مَقَاماً مَّحْمُوْداً نِ الَّذِيْ وَعَدْتَّه، (حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں) قیامت کے روز اس کے لئے میری شفاعت ضروری ہو جائے گی

افادات: اذان کا جواب دینے پر یہ بہت بڑی فضیلت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی شفاعت حاصل ہوتی ہو۔ اور ہم میں سے کون ہے جو آپ کی شفاعت کا محتاج نہ ہو؟ اس لئے یہ بہت آسان طریقہ ہے، اس کی عادت بنالو کہ جہاں اذان کی آواز سنو، فوراً جواب دینے میں مشغول ہو جاؤ اور آخر میں یہ دعا بھی پڑھنے کا اہتمام کرو۔

ایک چھوٹا سا عمل؛ اور گناہ معاف

حدیث ۱۰۴۰:-

وَعَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَّهُ قَالَ: مَنْ قَالَ حِيْنَ يَسْمَعُ الْمُؤَذِّنَ: أَشْهَدُ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، رَضِيتُ بِاللهِ رَبّاً، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولاً، وَبِالإِسْلاَمِ دِيناً، غُفِرَ لَهُ ذَنْبُهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت سعد بن اَبی وقاص (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی مؤذن کو اذان دیتے ہوئے سنے اور اس پر یہ کہے: "أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، رَضِيْتُ بِاللهِ رَبّاً، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً، وَبِالْاِسْلَامِ دِيْناً" تو اس کے گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں۔

افادات:- دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤذن جب "أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کہے، تو اس کے جواب میں "أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ" کہے، پھر یہ کہے "أَشْهَدُ أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، رَضِيْتُ بِاللهِ رَبّاً، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلاً، وَبِالْاِسْلَامِ دِيْناً"

بہت چھوٹا سا عمل ہے اور اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے گناہوں کی معافی کا وعدہ ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک چھوٹے سے رسالہ میں ایسے چھوٹے چھوٹے اعمال جمع کئے ہیں جن پر احادیث میں سارے گناہوں کے معاف ہونے کی بشارت سنائی گئی ہے اور ان کو شائع کیا ہے، اُسی میں ایک عمل یہ بھی ہے، اس کی بھی عادت بنالو۔

یہ دربار کھلنے کا وقت ہے

حدیث ۱۰۴۱:-

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَلدُّعَآءُ لَا يُرَدُّ بَيْنَ الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ.

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اذان اور اقامت کے درمیان دعارَد نہیں کی جاتی۔

افادات:- یہ بھی ایک اہم فضیلت ہے کہ اذان کے بعد سے لے کر نماز کھڑی ہونے تک کے وقفہ میں جو دعا کی جاتی ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبول کی جاتی ہے۔ حضرت مجدّد الف ثانی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ یہ دربار کھلنے کا وقت ہے، جیسے بادشاہوں کے یہاں دربار کے اوقات ہوتے ہیں اور اس وقت جو آدمی جاکر اپنی درخواست پیش کرتا ہے تو اس کی وہ درخواست رد نہیں کی جاتی، اسی طرح اذان ہوتے ہی گویا اللہ تعالیٰ کا دربار کھل گیا، اب اقامت ہونے تک جو دعا کی جائے گی وہ ان شاء اللہ قبول ہی ہوگی۔

بَابُ فَضۡلِ الصَّلَوَاتِ

نمازوں کی فضیلت کا بیان

نماز کی تاثیر/ایک عمدہ مثال

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا:﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ یقیناً نماز بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے روکتی ہے۔

"فَحْشَآء" اس گناہ کے کام کو کہتے ہیں جس کا گناہ ہونا ہر آدمی سمجھتا ہے، چاہے وہ عالم ہو یا جاہل، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ؛ جیسے: زنا، شراب، قتل، چوری؛ یہ سب ایسے کام ہیں کہ ان کا برا ہونا ہر آدمی سمجھتا ہے؛ ایسے کاموں کو "فَحْشَآء" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جس کام کو تمام شریعت والے برا کہتے ہوں؛ اس کو "مُنْكَر" کہتے ہیں۔ اس آیت میں نماز کی ایک خاصیت بتلائی گئی ہے کہ جو آدمی نماز کو اس کے شرائط، حدود و قیود کے ساتھ ادا کرتا ہے، یہ نماز اس کو گناہ اور برائی کے کاموں سے روکنے کا ذریعہ بنتی ہے۔

بعضوں کو اشکال ہوتا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو نماز پڑھتے ہیں، اس کے باوجود گناہ میں مبتلا رہتے ہیں؟ جیسا کہ حدیثِ پاک میں بھی آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبیِ کریم ﷺ سے بھی پوچھا گیا کہ: فلاں آدمی نماز کی پابندی کرتا ہے، اس کے باوجود چوری کا ارتکاب بھی کرتا ہے، حالاں کہ قرآنِ کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ نماز بے حیائی اور گناہ کے کاموں سے روکتی ہے؟ تو نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: عنقریب یہ نماز اس کو گناہ سے روک دے گی، چناں چہ بعد میں وہ آدمی اپنی حرکت سے تائب ہوا۔ اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ عمل کرتے کرتے

ایک وقت آنے پر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ آدمی کا جیسا جیسا مزاج ہوتا ہے، ویسا ویسا اثر ظاہر ہونے میں وقت لگتا ہے، جیسے: دوائیوں کا اثر کسی پر جلدی ہوتا ہے اور کسی پر دیر سے ہوتا ہے۔ آدمی اگر دوائی کا استعمال جاری رکھے گا تو ایک وقت آئے گا کہ دوائی اپنا اثر دکھلائے گی، اور بیماری دور ہوگی۔ اسی طریقہ سے نماز کی اپنی تاثیر ہے، اگر ان شرائط کے ساتھ ادا کی جاتی رہے گی تو ان شاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ آدمی کو برائیوں سے روک دے گی۔

پانچوں نمازوں کی مثال

حدیث ۱۰۴۲:-

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: أَرَأَيْتُمْ لَوْ أَنَّ نَهْراً بِبَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ مِنْهُ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّاتٍ هَلْ يَبْقَى مِنْ دَرَنِهِ شَيْئٌ؟ قَالُوْا: لَا يَبْقَى مِنْ دَرَنِهِ شَيْئٌ. قَالَ: فَذٰلِكَ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ يَمْحُو اللهُ بِهِنَّ الْخَطَايَا.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) سے سوال کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: اچھا یہ بتلاؤ! اگر تم میں سے کسی کے دروازہ پر ایک نہر بہہ رہی ہو اور وہ دن میں پانچ مرتبہ اس میں غسل کرتا ہو؛ تو کیا اس کے جسم پر کوئی میل کچیل باقی رہے گا؟ حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے جواب میں عرض کیا: کوئی میل باقی نہیں رہے گا۔ حضور اکرم ﷺ نے پھر ارشاد فرمایا: پانچوں نمازوں کا حال بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان نمازوں کے ذریعہ گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

حدیث ۱۰۴۳:-

وَعَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَثَلُ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسِ كَمَثَلِ نَهْرٍ جَارٍ غَمْرٍ عَلَى بَابِ أَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ مِنْهُ كُلَّ يَوْمٍ خَمْسَ مَرَّةٍ.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانچ نمازوں کا حال ایسا ہے جیسے تم میں سے کسی کے دروازہ پر بہنے والی گہری نہر ہو اور وہ اس میں ہر دن پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو۔

مثال ایک علمی قوت

افادات:- مثال ایک علمی قوت ہے جس کے ذریعہ دقیق سے دقیق اور باریک سے باریک اور مشکل سے مشکل چیزوں کو موٹی موٹی مثالوں کے ذریعہ اس طرح آسان اور حل کر دیا کرتے ہیں کہ اَن پڑھ سے اَن پڑھ اور جاہل سے جاہل آدمی بھی اس کو سمجھ لیا کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ یہ علمی قوت حضراتِ انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو خصوصیت کے ساتھ عطا فرماتے ہیں، پھر ان کے صدقہ اور طفیل میں ان کے جانشین اہلِ علم کو بھی یہ چیز عطا کی جاتی ہے۔ اسی لئے حدیث کے موضوع پر لکھی جانے کتابوں میں مستقل ایک عنوان ”کتاب الامثال“ کا آتا ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے جن جن مسائل کو مثالوں کے ذریعہ سے حل فرمایا اور سمجھایا ہے، ان ساری مثالوں کو بیان کیا جاتا ہے۔ حدیث کے موضوع پر جو کتابیں لکھی جاتی ہیں اس کی مختلف قسمیں ہیں، انہی میں ایک قسم ”جامع“ ہے، یعنی حدیث کی ایسی کتاب جس میں حدیث کے آٹھوں عنوانات سے تعلق رکھنے والی حدیثیں جمع کی گئی ہوں۔ ان آٹھوں

عنوانات میں سے ایک عنوان "امثال" کا بھی ہے۔ تو نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ قوت علیٰ وجہ الاتم عطا فرمائی تھی کہ آپ مشکل سے مشکل اور باریک سے باریک مسائل کو مثالوں کے ذریعہ سے پیش فرماتے تھے، تاکہ سننے والے آسانی سے سمجھ سکیں۔ اس روایت میں بھی نماز کی افادیت کو نبیٔ کریم ﷺ نے ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے۔

صحبتِ اہل اللہ کی تاثیر / ایک واقعہ

حضرت قاری محمد طیب صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی تقریر میں مثال کی افادیت کو واضح کرنے کے لئے حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے۔ حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مریدین اور خدّام میں ایک صاحب "اللہ دین" نامی تھے، وہ اَن پڑھ آدمی تھے، لیکن حضرت کی صحبت پائے ہوئے تھے۔ ان کا پیشہ اور کاروبار جانور ذبح کرکے گوشت فروخت کرنے کا تھا جس کو قصاب کہا جاتا ہے۔ ویسے بھی اَن پڑھ تھے اور پیشہ و کاروبار بھی ایسا تھا کہ جس میں علم کی ضرورت نہیں پڑتی ہے، لیکن حضرت کی صحبت کی وجہ سے ان کی سمجھ بڑی اعلیٰ تھی۔ اہل اللہ اور اہلِ علم کی صحبت کی یہ تاثیر ہے کہ جو آدمی ان کے پاس بیٹھتا رہتا ہے، چاہے وہ پڑھا لکھا ہوا نہ ہو، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی برکت سے اس کی سمجھ کو بھی مجلّٰی اور مصفّٰی کردیتے ہیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے ایک سوال کیا کہ: حضرت! نیک لوگوں کے پڑوس میں دفن ہونے کو شریعت نے پسندیدہ قرار دیا ہے۔ احادیث میں آتا ہے کہ آدمی انتقال کے بعد اپنے دفن ہونے کے لئے اور اپنی قبر کے لئے

ایسی جگہ تلاش کرے کہ جہاں نیک لوگ دفن ہوئے ہوں، حالاں کہ دفن ہونے والا اگر نیک آدمی ہے تو اس کے اعمالِ صالحہ اس کے لئے مفید اور کار آمد ہوں گے، اور اگر وہ خود گنہگار ہے تو وہ اپنے گناہوں کے ساتھ دفن ہوگا، اور نیک آدمی کا پڑوس ملنے کے باوجود اس کے گناہ اس کے لئے عذاب کا سبب بن سکتے ہیں؛ تو پھر اس پڑوس کا فائدہ کیا ہو؟ اب دیکھو! انہوں نے عالمِ برزخ سے تعلق رکھنے والا ایک دقیق سوال کیا تھا، اگر حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) عالمِ برزخ کے احوال پر بحث کرتے: تو وہ بیچارے کیا سمجھتے؟ اس لیے حضرت نے فرمایا: ٹھیک ہے، پھر کبھی ہم تمہارے اس سوال کا جواب دیں گے۔ مجلس جاری تھی، گرمی کا زمانہ تھا، تھوڑی دیر بعد خود انہوں نے ہی محسوس کیا کہ گرمی زیادہ ہو رہی ہے، تو پنکھا لے کر جھلنے کے واسطے کھڑے ہوگئے۔ حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے پوچھا: اللہ دین! یہ کیا کر رہے ہو؟ کہا: حضرت! پنکھا جھل رہا ہوں۔ پوچھا: کس کو جھل رہے ہو؟ کہا: آپ کو۔ پوچھا: میرے پاس جو بیٹھے ہوئے ہیں ان کو بھی پنکھا جھل رہے ہو؟ انہوں نے کہا: نہیں! میں ان کو پنکھا کیوں جھلنے لگا! یہ نہ تو میرے استاذ ہیں، نہ پیر؛ مَیں تو صرف آپ کو ہی پنکھا جھل رہا ہوں۔ حضرت نے پوچھا: ٹھیک ہے، تم پنکھا تو مجھے ہی جھل رہے ہو، لیکن ان کو بھی تو ہوا لگ رہی ہے یا نہیں؟ کہا: جی ہاں! لگ رہی ہے۔ تو حضرت نے فرمایا: یہی تمہارے سوال کا جواب ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتوں کے جھونکے جب ان نیک لوگوں پر چلیں گے؛ تو وہ گنہگار جو ان کے پڑوس میں دفن ہے؛ وہ کیسے محروم رہ سکتا ہے! اس کو بھی ان جھونکوں سے ضرور نفع ہوگا۔ اس لیے دفن ہونے کے لئے نیک لوگوں کا جوار اور پڑوس تلاش کرنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔

نبی کریم ﷺ کے پڑوس میں دفن ہونے کی درخواست

اس پر ایک واقعہ یاد آگیا تو سنا دیتا ہوں۔ کتابوں میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا ایک واقعہ آیا ہے کہ جب ان پر حملہ ہوا اور ان کو یہ یقین ہو گیا کہ اب مَیں زندہ نہیں رہوں گا اور اسی زخم میں مَیں دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں، تو انہوں نے اپنی اس تمنّا کا اظہار کیا کہ نبی کریم ﷺ جہاں مدفون ہیں، وہیں دفن ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ اور چوں کہ وہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کا کمرہ تھا، اس لئے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنے صاحبزادہ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کو بھیجا کہ امّ المؤمنین حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس جاؤ، اور ان کے سامنے میری اس خواہش کا اظہار کرو کہ عمر درخواست کرتا ہے کہ اگر آپ اجازت دیں تو نبی کریم ﷺ کے پڑوس میں مجھے بھی دفن ہونے کی سعادت حاصل ہو۔ چناں چہ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) گئے، اور انہوں نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے اس سلسلہ میں اجازت طلب کی۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا کہ: ویسے تو یہ جگہ میں نے اپنے لئے رکھی تھی اور میری تمنّا یہ تھی کہ مَیں یہاں دفن ہوتی، لیکن مَیں امیر المؤمنین حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو اپنے اوپر ترجیح دیتی ہوں۔ چناں چہ انہوں نے اجازت دے دی حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے آکر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس بات کی دی، تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) بہت خوش ہوئے اور ان کا شکریہ ادا کیا، لیکن پھر بھی تاکید کر دی کہ میرے انتقال کے بعد جب جنازہ لے کر جاؤ تو دوبارہ اجازت لینا، کہیں ایسا نہ ہو کہ میری زندگی میں میری آنکھوں کی شرم کی وجہ سے جی نہ چاہنے کے باوجود انہوں نے اجازت دے دی ہو۔ موت کے بعد

جب اجازت طلب کروگے تو وہ رکاوٹ باقی نہیں رہے گی، اگر اس وقت بھی اجازت دے دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا، ورنہ عام قبرستان میں دفن کر دینا۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، جب جنازہ لے کر وہاں پہنچے تو حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے دوبارہ اجازت مانگی، حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: میں پہلے ہی اجازت دے چکی ہوں۔ چناں چہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ جہاں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو دفن کیا گیا ہے، ان کے بعد ان کے پڑوس میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو دفن کیا گیا۔

پھر حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی شدتِ احتیاط دیکھئے۔ مشکوٰۃ شریف میں روایت موجود ہے، وہ فرماتی ہیں کہ جب تک میرے حجرہ میں حضور اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) مدفون تھے تب تک تو میں اندر جانے میں کسی قسم کے پردہ کا اہتمام نہیں کرتی تھی، اس لئے کہ اس میں ایک میرے شوہر ہیں، اور ایک میرے ابّا ہیں اور ان سے پردہ کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن جب سے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) یہاں دفن ہوئے ہیں، کبھی بھی میں نے وہاں کوئی ایسا کپڑا نہیں ہٹایا جو حجاب اور پردہ کے خلاف ہو۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کتنی زیادہ احتیاط کرتی تھیں۔

بہر حال! یہ واقعہ میں نے نمونہ کے طور پر سنایا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ نبی کریم ﷺ کے پڑوس میں دفن ہونے کی سعادت ملے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیز شریعت کی نگاہوں میں مطلوب اور پسندیدہ ہے۔

خلاصہ کلام

خیر !تو مَیں عرض کر رہا تھا کہ مثال ایک عجیب وغریب چیز ہے۔ دیکھو! حضرت نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے عالمِ برزخ سے تعلق رکھنے والا جو مشکل مسئلہ تھا اس کو ایک حسّی مثال دے کر سمجھا دیا۔ نبیٔ کریم ﷺ بھی عالمِ آخرت اور دین کی بہت سی باتوں کو۔جو معنویات سے تعلق رکھنے والی ہوا کرتی ہیں۔ ظاہری مثالوں کے ذریعہ سے سمجھاتے ہیں تا کہ سیدھی سادی سمجھ رکھنے والے ایک امّتی کے لئے دین کا مشکل مسئلہ سمجھنا آسان ہو جائے۔ تو نماز کی وجہ سے آدمی کے گناہ جو دھلتے ہیں اس کو سمجھانے کے لئے اس روایت میں بھی نبیٔ کریم ﷺ نے ایک مثال دی۔ البتہ علماء نے لکھا ہے کہ یہاں گناہوں سے مراد صغائر اور چھوٹے گناہ ہیں، اس لئے کہ کبیرہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک کہ توبہ نہ کرے۔

دوسری روایت میں بھی نبیٔ کریم ﷺ نے وہی بات ارشاد فرمائی ہے جو پہلی روایت میں آئی تھی، لیکن اس میں نہر کی دو صفتیں بیان فرمائی ہیں۔ بہنے والی نہر جو ۱ بہت زیادہ پانی والی ہو۔ اور ۲ گہری ہو۔ ویسے بھی جس نہر کا پانی بہتا ہو وہ صاف شفاف ہی ہوتا ہے، اور جو پانی بہتا نہیں ہے بلکہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہتا ہے، اس میں میل کچیل اور بدبو سی آجاتی ہے۔

نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں

حدیث ۱۰۴۴:-

وَعَنْ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَجُلاً أَصَابَ مِن امْرَأَةٍ قُبْلَةً، فَأَتَى النبيَّ ﷺ فَأَخْبَرَهُ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى : أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِنَ اللَّيْلِ، إِنَّ الحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (هود: ۱۱۴) فَقَالَ الرَّجُلُ أَلِيَ هَذَا؟ قَالَ: لِجَمِيعِ أُمَّتِي كُلِّهِمْ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک صاحب نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا، پھر (انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا تو) وہ فوراً حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے پاک کیجئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿أَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِنَ اللَّيْلِ، إِنَّ الحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ (هود: ۱۱۴) نماز قائم کیجئے دن کے دونوں کناروں پر، اور رات کی کچھ گھڑیوں میں، بیشک نیکیاں گناہوں کو مٹادیتی ہیں۔ اس آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا یہ حکم خاص میرے لئے ہے (یا پھر عام قانون ہے؟) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری پوری امّت کے لئے (یہ قانون عام) ہے۔

افادات:- دوسری روایتوں میں ہے کہ وہ کھجور بیچنے والا آدمی تھا، ایک عورت کھجور خریدنے آئی جس کو دیکھ کر اس کے دل میں اس کی طرف میلان اور کشش ہوئی، تو اس سے کہا کہ اندر اچھی کھجوریں ہیں، جب وہ عورت اندر گئی تو بوسہ لے لیا، پھر اس کو اپنی اس حرکت پر پچھتاوا ہوا کہ میں نے بڑے گناہ کا کام کر لیا، تو خود ہی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں نے ایک ایسا گناہ کر لیا ہے جس کی وجہ سے حد واجب ہو جاتی ہے، آپ مجھ پر حد جاری کیجئے۔

"حد" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جن کے کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ سزائیں مقرر کر دی گئی ہیں، جیسے: چوری کرنے والے کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے، زنا کرنے والا اگر شادی شدہ نہ ہو تو اس کو سو کوڑے لگائے جاتے ہیں، اور اگر شادی شدہ ہو تو اس کو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس آدمی نے بھی چوں کہ عورت کا بوسہ لیا تھا جو منھ کا زنا ہی تھا، اور زنا کی اصل سزا یہی ہے، اس لیے وہ یوں سمجھا کہ میرے اوپر حد واجب ہو گئی، تو حاضر خدمت ہو کر عرض کیا کہ: مجھ پر سزا جاری کر کے مجھے پاک کر دیجیے۔

حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا حال

حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) معصوم نہیں تھے، اس لیے ان میں سے بعض حضرات سے گناہوں کا صدور ہوا ہے، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تربیت کے اثرات سے گناہوں کے صدور کے بعد جب تک وہ اپنے آپ کو گناہ کی نجاستوں سے پاک وصاف نہیں کر لیتے تھے ان کو چین نہیں آتا تھا، یعنی ان کے دل میں ایک بے چینی سی پیدا ہو جاتی تھی، اور نیند حرام ہو جاتی تھی، ان کا کھانا پینا چھوٹ جاتا تھا، مجلسِ نبوی میں حاضر ہو کر درخواست کرتے تھے: اے اللہ کے رسول! مجھ سے یہ قصور اور کوتاہی ہو گئی ہے، اب آپ مجھے پاک کر دیجیے۔ اور ہمارا حال تو یہ ہے کہ ہم لوگ تو گناہ کرتے رہتے ہیں اور کبھی دل میں کوئی بے چینی پیدا ہی نہیں ہوتی۔ یہاں بھی ان صحابی سے ایک گناہ

وجود میں آیا لیکن ان کے قلب میں ایسی بے چینی پیدا ہوئی کہ فوراً وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ مجھے پاک کیجئے۔

﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِنَ اللَّيْلِ﴾ نماز قائم کیجئے دن کے دونوں کناروں پر اور رات کی کچھ گھڑیوں میں۔ اس میں کون سی نمازیں مراد ہیں؟ بعضوں نے کہا کہ دو کنارے بول کر فجر و عصر کی نماز مراد لی گئی ہے، اور رات کی گھڑیاں بول کر مغرب اور عشاء مراد لی گئی ہیں۔ بعض حضرات نے دن کے دونوں کناروں سے فجر و مغرب مراد لی ہے، اور ﴿وَزُلَفاً مِنَ اللَّيْلِ﴾ سے عشاء مراد لی ہے۔

﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ بیشک نیکیاں گناہوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ اس آیت نے آکر ایک اصول بتلادیا کہ نیکی کے جتنے بھی کام ہیں وہ آدمی کے گناہوں کو مٹادیتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے یہ آیت ان صحابی کو سنائی اور اطمینان دلایا کہ تم نے ہمارے ساتھ جماعت سے نماز پڑھ لی تو تمہارا وہ گناہ معاف ہو گیا۔

پنج وقتہ نمازوں کا اہتمام کفارۂ ذنوب

حدیث ۱۰۴۵:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ مَالَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانچوں نمازیں اور ایک جمعہ کی نماز دوسرے جمعہ تک؛ درمیان میں ہونے والے گناہوں کے لئے کفّارہ ہیں؛ جب تک کہ کبائر کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

افادات:–"مَالَمْ تُغْشَ الْكَبَائِرُ" سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آدمی اگر کبیرہ گناہ کرتا ہے تو اس صورت میں پانچوں نمازیں اور جمعہ سے لے کر جمعہ مطلق گناہوں سے معافی کے لیے کفّارہ نہیں بنیں گی۔ لیکن عام طور پر شرّاح اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کبائر معاف نہیں ہوں گے، ورنہ صغائر کے لئے یہ کفّارہ بن جائیں گی۔

حدیث ۱۰۴۶:

وَعَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ مَا مِنِ امْرِءٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَكْتُوْبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهَا وَخُشُوْعَهَا وَ رُكُوْعَهَا اِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوْبِ مَالَمْ تُؤْتَ كَبِيْرَةٌ وَذٰلِكَ الدَّهْرُ كُلَّهُ.

ترجمہ:–حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو مسلمان فرض نماز کے وقت اچھے طریقہ سے وضو کرتا ہے، اور نماز کے خشوع کا اہتمام کرتا ہے، اور تمام ارکان اچھے طریقے سے ادا کرتا ہے؛ تو یہ نماز اس سے پہلے جتنے بھی گناہ ہو چکے ہیں ان کے لئے کفّارہ بن جاتی ہے، جب تک کوئی کبیرہ گناہ نہ کیا گیا ہو، اور زندگی بھر کے لئے یہی قاعدہ ہے۔

افادات:–اس سے معلوم ہوا کہ وضو کی ادائیگی میں عجلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اطمینان کے ساتھ تمام فرائض اور سنن وآداب کی ادائیگی کے ساتھ بڑے اہتمام سے وضو کرنا

چاہیے۔اور نماز میں بھی خشوع کا اہتمام کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ ہونی چاہیے، نماز کے ارکان رکوع سجدہ وغیرہ بھی اچھے طریقہ سے ادا کرنے چاہئیں۔

ایسے تمام اعمال سے کبیرہ گناہ معاف نہیں ہوتے بلکہ صغیرہ ہی معاف ہوتے ہیں۔ اور یہ ایک دن کی اور ایک نماز کی بات نہیں ہے، بلکہ زندگی بھر کے لئے یہی قاعدہ ہے کہ آدمی اگر پانچوں نمازیں اچھے طریقہ سے پورے اہتمام کے ساتھ اس کے حقوق و حدود کی رعایت کرتے ہوئے ادا کرتا ہے، تو اس سے آدمی کے صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَالْعَصْرِ

فجر اور عصر کی نماز کی فضیلت کا بیان

فجر اور عصر کی نماز کی فضیلت کا بیان

حدیث ۱۰۴۷:-

عَنْ أَبِي مُوْسٰی (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ. ((الْبَرْدَانِ)) : الصُّبْحُ والعَصْرُ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دو ٹھنڈے وقت کی نماز پڑھے گا (یعنی فجر اور عصر) تو جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

افادات:- اللہ تعالیٰ جس کو ان دو نمازوں کی توفیق دیں گے وہ ان شاء اللہ دوسری نمازوں کا بھی اہتمام کرے گا، اس لئے کہ فجر کا وقت عام طور پر سونے اور سستی کا ہوتا ہے اور آدمی نیند کی محبت میں اس نماز کو چھوڑ دیتا ہے۔ بہت سے دوسری نمازوں کو اہتمام سے ادا کرنے والے بھی فجر کے معاملہ میں کوتاہی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور عصر کا وقت عام طور پر کاروبار و تجارت کی مشغولی، اور دنیا کے کاموں میں انہماک کا ہوتا ہے؛ تو اس وقت آدمی اپنی ان تمام مشغولیات کو چھوڑ کر اور کاروبار سے ہٹ کر نماز کا اہتمام کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کا کوئی طبعی تقاضہ اور دنیوی تقاضہ نماز کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا، اور ان دونوں نمازوں کا اہتمام اس بات کی دلیل ہے؛ تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ آدمی پانچوں نمازوں کا بھی اہتمام کرے گا اور اس کی وجہ سے جنّت میں داخل ہو جائے گا۔

حدیث ١٠٤٨ :-

وَعَنْ أَبِي زُهَيْرٍ عُمَارَةَ بْنِ رُوَيْبَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: لَنْ يَّلِجَ النَّارَ أَحَدٌ صَلَّى قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا يَعْنِي الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ.

ترجمہ :- حضرت عُمارہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی سورج کے طلوع ہونے سے پہلے (یعنی فجر) اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے کی نماز (یعنی عصر) پڑھے؛ تو وہ جہنم میں داخل نہیں ہوگا۔

افادات:- اس روایت میں بھی وہی بات ہے کہ جو ان دونوں کا اہتمام کرے گا اس کو دوسری نمازوں کے اہتمام کی توفیق بھی ان شاء اللہ آسانی سے نصیب ہوگی۔

فجر پڑھنے والا اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں

حدیث ١٠٤٩ :-

وَعَنْ جُنْدُبِ بْنِ سُفْيَانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ : مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ، فَهُوَ فِي ذِمَّةِ اللهِ، فَانْظُرْ يَا ابْنَ آدَمَ! لَا يَطْلُبَنَّكَ اللهُ مِنْ ذِمَّتِهِ بِشَيْءٍ.

ترجمہ:- حضرت جندب بن سفیان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے فجر کی نماز پڑھی وہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں آگیا، پس اے انسان! اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت کے متعلق تم سے کوئی مطالبہ نہ کرے۔

افادات:-مطلب یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فجر کی نماز کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی حفاظت سے نکل جاؤ۔ یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جس آدمی نے فجر کی نماز ادا کر کے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں دیدیا ہے، اس کے ساتھ ظلم وزیادتی کر کے تم اللہ تعالیٰ کی پکڑ کے مورِدنہ بن جانا۔

فجر اور عصر میں فرشتوں کی حاضری

حدیث ۱۰۵۰:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: يَتَعَاقَبُوْنَ فِيْكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ، وَيَجْتَمِعُوْنَ فِيْ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ، ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ، فَيَسْئَلُهُمُ اللهُ وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ: كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ؟ فَيَقُوْلُوْنَ تَرَكْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ۔

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے باری باری تمہارے درمیان حاضری دیتے ہیں، فجر اور عصر کی نماز میں دونوں وقت کے فرشتے جمع ہو جاتے ہیں، پھر جن فرشتوں نے تمہارے درمیان رات گزاری جب وہ آسمان پر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میں پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں حالاں کہ اللہ تعالیٰ خوب واقف ہیں کہ اے فرشتو! تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ فرشتے جواب دیتے ہیں: باری تعالیٰ! ہم ان کو نماز پڑھتا ہوا چھوڑ کر آئے، اور جب ہم پہنچے تھے تب بھی وہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔

افادات:-رات کے فرشتے عصر کے وقت آجاتے ہیں جو فجر تک رہتے ہیں، اور دن کے فرشتے فجر کی نماز میں آجاتے ہیں اور عصر کی نماز تک رہتے ہیں۔ ظہر کی نماز میں صرف دن والے فرشتے ہوتے ہیں، اسی طریقہ سے مغرب اور عشاء کی نماز میں صرف رات والے فرشتے ہوتے ہیں، لیکن فجر اور عصر کی نماز میں دونوں وقت کے فرشتے جمع ہو جاتے ہیں، یہ گویا ان دونوں نمازوں کی خصوصیت ہے۔

اور اللہ تعالیٰ باوجودیکہ خوب واقف ہیں پھر بھی فرشتوں کی زبان سے گواہی دلواتے ہیں، کیوں کہ یہی وہ فرشتے تھے جنھوں نے انسان کی پیدائش کے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی درخواست پیش کی تھی: ﴿أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ باری تعالیٰ! آپ زمین میں ایسی مخلوق کو پیدا کرنے والے ہیں جو فساد پھیلائے گی اور خون بہائے گی، حالاں کہ ہم تیری پاکی بیان کرتے ہیں اور تیری تکبیر کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ باقاعدہ فرشتوں سے پوچھ کر ان کی زبان سے اقرار کرواتے ہیں کہ یہی تو وہ مخلوق ہے جن کے متعلق تم کہتے تھے کہ فساد مچائے گی؟ دیکھو تم ہی آکر بتلا رہے ہو کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اور جب گواہی دینے کی بات آہی گئی تو جو پوچھا گیا تھا وہ تو بتلایا ہی، ساتھ ہی ساتھ دوسری ایک چیز بھی بتلادی کہ جب ہم فجر کے وقت لوٹے تو نماز پڑھتا ہوا چھوڑ کر آئے تھے، لیکن عصر کے وقت جب ہم ڈیوٹی پر حاضری دینے کے واسطے گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز ہی میں مشغول تھے۔

”كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِي؟“ اے فرشتو! تم جب یہاں آئے تو میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑ کر آئے؟ اس سے معلوم ہوا کہ آخری حالت ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

دیدارِ باری تعالیٰ کی کیفیت و منظر

حدیث ۱۰۵۱:-

وَعَنْ جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ الْبَجَلِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَنَظَرَ إِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، فَقَالَ: إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ، لَا تُضَامُّونَ فِي رُؤْيَتِهِ، فَإِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ لَّا تُغْلَبُوا عَلَى صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا، فَافْعَلُوا.

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے، نبیٔ کریم ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھ کر ارشاد فرمایا: تم لوگ قیامت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار اسی طرح کروگے جیسے اس چاند کو دیکھ رہے ہو، کہ اس کو دیکھنے میں کوئی دھکّا پیل اور تکلیف نہیں ہو رہی ہے۔ اس لیے اگر تم سے ہو سکے کہ وہ نماز جو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے ہوتی ہے (یعنی فجر) اور جو نماز سورج کے غروب ہونے سے پہلے پڑھی جاتی ہے (یعنی عصر) ان کے معاملہ میں مغلوب نہ بنو؛ تو ایسا کرو (یعنی ان دونوں کا خصوصی اہتمام کرو)

افادات:- اگر بڑے سے بڑا مجمع ہو، اور سب بیٹھے ہوئے ہوں، تب بھی ہر آدمی اپنے کسی ساتھی کو ذرا سا بھی نقصان اور تکلیف پہنچائے بغیر چاند کو دیکھ سکتا ہے۔ لیکن اگر زمین پر کوئی چیز ہو، اور بڑا مجمع ہو تو اس کو دیکھنے میں دھکّا پیل ہو ہی جاتی ہے، کوئی سر اونچا کرتا ہے تو پیچھے والا کہتا ہے کہ بھائی! ذرا بیٹھ جاؤ، مجھے بھی دیکھنا ہے۔ اور جو چیز اوپر ہوتی ہے وہاں اس کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

"مغلوب نہ بنو" مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں نمازیں (فجر اور عصر) تم سے کسی حال میں بھی چھوٹنی نہیں چاہئیں۔ معلوم ہوا کہ کل کو قیامت میں اہلِ جنّت کو اللہ تعالیٰ کا جو دیدار نصیب ہو گا اس میں ان دونوں نمازوں کو بڑا دخل ہے۔

ویسے حدیثِ پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ جنتیوں کو جنّت میں اللہ تعالیٰ کا جو دیدار ہو گا وہ انہی دو اوقات فجر اور عصر میں ہو گا، اور جو آدمی ان دونوں نمازوں کا اہتمام کرتا ہے اس کو دونوں اوقات میں دیدار نصیب ہو گا۔ اور جنّت میں جنتیوں کو جو سب سے اونچی چیز نصیب ہو گی وہ دیدارِ خداوندی ہو گا۔ باری تعالیٰ جنتیوں سے پوچھیں گے کہ تم خوش ہو؟ تو وہ کہیں گے: ہاں! ہم بہت خوش ہیں۔ باری تعالیٰ پوچھیں گے: اور کوئی نعمت چاہیے؟ جنّتی کہیں گے: باری تعالیٰ! سب کچھ مل گیا ہے، اب کسی چیز کی کمی ہے، نہ ضرورت۔ باری تعالیٰ فرمائیں گے: اب میں تمہیں ایک ایسی چیز دیتا ہوں جس کا تم کو تصوّر بھی نہیں ہو گا۔ پھر باری تعالیٰ اپنا دیدار کروائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کا دیدار سب سے اونچی چیز ہے، اور سب سے بڑی نعمت ہے جو جنتیوں کو جنّت میں دی جائے گی، اور وہ انہیں دو نمازوں کے اہتمام پر نصیب ہو گی۔

حدیث ۱۰۵۲:-

وعن بُرَيْدَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ، فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت بریدہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے عصر کی نماز چھوڑ دی؛ اس کے سارے اعمال بے کار ہو گئے۔

بَابُ فَضْلِ الْمَشْيِ إِلَى الْمَسَاجِدِ

مسجدوں کی طرف چل کر جانے کی فضیلت کا بیان

اسلام میں مساجد کی اہمیت

اللہ تبارک وتعالیٰ نے عبادات میں نماز کا حکم دیا اور جو عبادات بندوں پر لازم کی گئی ہیں ان میں نماز بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اور ان نمازوں کی ادائیگی کے لئے اسلام نے ایک نظام مقرر کیا گیا ہے۔ ویسے تمام مسلمان پنج وقتہ نمازیں اپنے اپنے گھروں میں بھی ادا کرسکتے تھے، لیکن اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کی ادائیگی کے لئے مستقل مکانات تعمیر کروائے، جن کو مساجد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اور یہ حکم دیا کہ ان مساجد میں ہی فرض نمازیں ادا کرو۔ اسی لیے اسلام میں مساجد کی بڑی اہمیت اور خاص مقام و کردار ہے، اور نماز کی ادائیگی کے لئے جو مسجدیں بنوائی گئی ہیں اس میں بڑی حکمتیں و مصلحتیں بھی ہیں، جو لوگ ان نمازوں کو اپنے گھروں میں ادا کرلیتے ہیں تو اس سے اگرچہ فرض ادا ہو جاتا ہے، ان کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے، نماز کا ذمہ ساقط ہو کر ان پر نماز باقی نہیں رہتی، لیکن ان نمازوں کی ادائیگی کے لئے اسلام نے جو نظام مقرر کیا ہے کہ نمازوں کو باقاعدہ مسجدوں میں جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے، وہ مصالح حاصل نہیں ہوتی۔ اس باب میں انہیں فضیلتوں کو بیان کرنا

چاہتے ہیں کہ جو لوگ نماز کی ادائیگی کے لئے چل کر مسجد جاتے ہیں ان کے اس عمل کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا قدر و قیمت ہے!

مسجد جانے والے کا عنداللہ اکرام

حدیث ۱۰۵۳:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ أَوْ رَاحَ، أَعَدَّ اللهُ لَهُ فِي الْجَنَّةِ نُزُلاً كُلَّمَا غَدَا أَوْ رَاحَ. (متفقٌ عَلَيْه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی صبح یا شام کے وقت (نماز کو ادا کرنے کے لئے) مسجد گیا؛ تو جب بھی وہ جائے گا، چاہے صبح یا شام کو؛ اللہ تعالیٰ جنّت میں اس کا اکرام کرتے ہوئے اس کے لئے کھانا تیار کرواتے ہیں۔

افادات:- جیسے: کوئی مہمان کسی کے گھر جاتا ہے تو گھر والا آنے والے مہمان کا اکرام کرتے ہوئے اس کی خدمت میں کھانے پینے کی کوئی بھی چیز پیش کرتا ہے۔ تو اس گھر والے کی طرف سے مہمان کے سامنے اس کے اکرام کے طور پر جو چیز پیش کی جاتی ہے؛ اسی کو عربی میں "نُزُل" کہتے ہیں۔ گویا مسجد کی طرف جانے والا اللہ تعالیٰ کا مہمان ہوتا ہے، اور جیسے دنیوی اعتبار سے شریف میزبان اپنے گھر آنے والے مہمان کا اکرام کرتا ہے؛ اسی طرح جب بھی بندہ مسجد میں جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس

کے گھر جانے والے مہمان کا اکرام کرتے ہوئے جنّت میں اس کے لئے اکرام کے طور پر ناشتہ اور کھانا تیار کرواتے ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہاں تیار کروایا تو اس سے اس کو کیا فائدہ پہنچا؟ اس کا جواب دیتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ یا تو اس وقت اگر اس کو موت آگئی تو اس سے اس کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملے گا۔ یا نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد کے ذریعہ سے بندوں تک یہ بات پہنچا کر یہ احساس دلایا گیا ہے کہ جب آپ مسجد کی طرف جارہے ہیں تو اس تصور کے ساتھ مسجد پہنچئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنّت میں آپ کے واسطے خوان تیار رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کا اکرام کیا جارہا ہے۔

گھر سے باوضو مسجد جانے کی فضیلت

حدیث ۱۰۵۴:-

وَعَنْهُ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: مَنْ تَطَهَّرَ فِي بَيْتِهِ، ثُمَّ مَضَى إِلَى بَيْتٍ مِنْ بُيُوتِ اللهِ، لِيَقْضِيَ فَرِيْضَةً مِنْ فَرَائِضِ اللهِ؛ كَانَتْ خُطُوَاتُهُ إِحْدَاهَا تَحُطُّ خَطِيْئَةً وَالْأُخْرَى تَرْفَعُ دَرَجَةً. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے گھر میں طہارت و پاکی حاصل کرے (یعنی وضو کرلے) اور پھر اللہ تعالیٰ کے گھروں میں سے کسی گھر کی طرف آگے بڑھے (یعنی مسجد جائے) تاکہ اللہ کے فرائض میں سے کسی فریضہ کو ادا کرے؛ تو وہ قدم جو مسجد کی طرف اٹھیں گے؛ ہر ایک قدم اس کے ایک گناہ کو مٹائے گا اور ہر دوسرا قدم اس کے درجہ کو بلند کرے گا۔

افادات:–ویسے مسجد میں بھی وضو کرنے کا انتظام ہوتا ہے اور وہاں وضو کرنا درست بھی ہے، لیکن اپنے گھر سے وضو کر کے طہارت مکمل کر کے مسجد کی طرف چلنا بہت زیادہ ثواب کا کام ہے، اس لئے ہمیں عادت یہی بنانی چاہئے کہ اپنے گھروں ہی سے تیاری کر کے مسجد جانے کے لئے نکلیں۔

مسجد سے دور گھر والے کے لیے خوشخبری

حدیث ۱۰۵۵:-

وَعَنْ أُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ لَا أَعْلَمُ أَحَداً أَبْعَدَ مِنَ الْمَسْجِدِ مِنْهُ وَكَانَتْ لَا تُخْطِئُهُ صَلَاةٌ. فَقِيلَ لَهُ: لَوِ اشْتَرَيْتَ حِمَاراً تَرْكَبُهُ فِي الظَّلْمَاءِ وَفِي الرَّمْضَاءِ. قَالَ: مَا يَسُرُّنِي أَنَّ مَنْزِلِي إِلَى جَنْبِ الْمَسْجِدِ، إِنِّي أُرِيدُ أَنْ يُكْتَبَ لِي مَمْشَايَ إِلَى الْمَسْجِدِ وَرُجُوعِي إِذَا رَجَعْتُ إِلَى أَهْلِي. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ قَدْ جَمَعَ اللهُ لَكَ ذٰلِكَ كُلَّهُ. (رواه مُسلِم)

ترجمہ مع تشریح:–حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک انصاری صحابی کا مکان مسجد سے بہت دور تھا، اس سے زیادہ دور مکان والا کوئی آدمی میرے علم میں نہیں ہے، اور ان کی کوئی بھی نماز نہیں چھوٹتی تھی (یعنی ہر نماز میں باقاعدہ پابندی سے جماعت کے ساتھ حاضری دینے کے لئے مسجد میں آتے تھے) ایک مرتبہ ان سے کہا گیا: اگر تم ایک گدھا سواری کے واسطے خرید لو، تاکہ اس پر سوار ہو کر مسجد آتے جاتے رہو، تو تمہارے لئے آسانی ہو جائے گی۔ اس لئے کہ رات کو اندھیرا ہوتا ہے، اور دن میں گرمی کے زمانہ میں دھوپ سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس پر انہوں نے کہا: میرے لئے یہ بات بھی خوش کن نہیں (یعنی مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے) کہ میرا مکان مسجد کے برابر میں ہو (میرا مکان دور ہے اور وہاں سے میں آتا جاتا ہوں اور مسجد میں نماز کے لئے آنے جانے کی تکلیف اور مشقّت اٹھا رہا

ہوں، یہی مجھے زیادہ پسند ہے) اس لیے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا مسجد آنا اور مسجد سے واپس گھر لوٹنا؛ دونوں اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھے جائیں (حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں نے حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے اس گفتگو کا تذکرہ کیا تو) حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اس کو بتلادو کہ) اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے یہ دونوں باتیں جمع فرمادیں (یعنی دونوں ثواب عطا فرمادئے)۔

افادات:–عام طور پر ہم یہی سمجھتے ہیں کہ نماز کے لئے مسجد آنے کا ثواب لکھا جاتا ہے، لیکن اس روایت میں ان صحابی نے دوسری بات بھی کہی کہ میں نماز کے بعد جب واپس لوٹوں تو میری واپسی بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھی جائے۔یعنی مسجد آنا تو لکھا ہی جاتا ہے، لیکن میں چاہتا ہوں کہ واپس گھر لوٹنے کا ثواب بھی لکھا جائے، اور اپنی اسی خواہش کا اظہار کیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت ابی بن کعب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مجھے اس کا یہ جملہ کہ **"مجھے یہ بھی پسند نہیں ہے کہ میرا مکان مسجد کے پڑوس میں ہو"** بڑا بھاری معلوم ہوا۔ اگرچہ انہوں نے پسند نہ ہونے کی وجہ آگے بتلائی کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے گھر کے دور ہونے کے نتیجہ میں میرا مسجد آنا اور واپس گھر لوٹنا؛ دونوں اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب کے طور پر لکھے جائیں۔ پھر بھی حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ کے سامنے اس کا تذکرہ کیا، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسے بتلادو کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں باتیں عطا فرمادیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کا مکان مسجد سے دور ہو گا اس کے باوجود مشقّت اٹھا کر مسجد آئے گا اور تمام نمازوں میں جماعت کے ساتھ حاضری کا اہتمام کرے گا، تو اتنا ہی نہیں کہ مسجد آنے کا ثواب لکھا جائے گا، بلکہ ظاہر ہے کہ واپسی میں بھی اس کو اتنی ہی مشقّت ہو گی؛ تو اس کا بھی اس کو ثواب ملے گا۔

دورِ نبوی کا واقعہ

حدیث ۱۰۵۶:-

وَعَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: خَلَتِ الْبِقَاعُ حَوْلَ الْمَسْجِدِ فَأَرَادَ بَنُوْسَلِمَةَ أَنْ يَّنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ، فَبَلَغَ ذٰلِكَ النَّبِيَّ ﷺ. فَقَالَ لَهُمْ: بَلَغَنِيْ أَنَّكُمْ تُرِيْدُوْنَ أَنْ تَنْتَقِلُوْا قُرْبَ الْمَسْجِدِ؟ قَالُوْا: نَعَمْ يَارَسُوْلَ اللهِ! قَدْ أَرَدْنَا ذٰلِكَ. فَقَالَ: يَابَنِيْ سَلِمَةَ! دِيَارَكُمْ، تُكْتَبْ آثَارُكُمْ. دِيَارَكُمْ؛ تُكْتَبْ آثَارُكُمْ. فَقَالُوْا: مَا يَسُرُّنَا أَنَّا كُنَّا تَحَوَّلْنَا.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مسجدِ نبوی کے قریب کچھ زمینیں خالی تھیں (یعنی پہلے تو وہاں لوگ آباد تھے لیکن کچھ لوگ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں چلے گئے) تو قبیلۂ بنو سلمہ کے لوگوں نے (جو مسجدِ نبوی سے دور، شہر کے کنارہ پر آباد تھے) ارادہ کیا کہ مسجد کے قریب (جو جگہیں خالی ہوئی ہیں ان کو خرید کر اپنے مکانات تعمیر کرلیں، اور یہیں) منتقل ہو جائیں (جیسے عام طور پر آدمی کی خواہش ہوتی ہے کہ مسجد کے قریب والا مکان مل جائے تو خرید لیں، تاکہ نماز کے لیے آسانی ہو جائے) جب نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا (کہ وہ لوگ قریب والی جگہ خرید کر یہاں منتقل ہونا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ وہ لوگ شہر کے جس علاقہ میں آباد تھے وہ مدینہ منورہ کا بالکل کنارے والا حصہ تھا، اور مصلحت کا تقاضہ یہ تھا کہ شہر کے کنارے پر بھی آبادی باقی رہنی چاہیے تاکہ شہر کی حفاظت ہو۔ اگر وہ

لوگ یہاں منتقل ہوجائیں گے تو شہر کا کنارہ والا حصہ خالی ہوجائے گا اور شہر کو خطرہ لاحق ہو گا،اس لیے حضوراکرم ﷺ نے پہلے تو انہیں سے تحقیق فرمائی کہ یہ بات صحیح بھی ہے یا نہیں۔ چناں چہ دریافت فرمایا کہ اے بنو سلمہ! مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم لوگ اپنی آبادی چھوڑ کر مسجد کے قریب منتقل ہونا چاہتے ہو (کیا میں نے صحیح سنا ہے؟) انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہمارا ایسا ہی ارادہ ہے۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے بنو سلمہ! اپنے موجودہ مکانات کو لازم پکڑے رہو (یعنی وہاں سے مت ہٹنا) تم وہاں سے چل کر جو مسجد نبوی تک آتے ہو، تو تمہارے تمام نشاناتِ قدم اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھے جاتے ہیں، اور اس پر تم کو ثواب دیا جاتا ہے (پھر دوبارہ ارشاد فرمایا) تم اپنے مکانوں کو لازم پکڑے رہو؛ تم لوگ وہاں سے چل کر مسجد نبوی تک آتے ہو، تو تمہارے تمام نشاناتِ قدم اللہ تعالیٰ کے یہاں لکھے جاتے ہیں (یہ سن کر) ان حضرات نے کہا: ہمارے لئے یہ بات خوشی کی نہیں کہ ہم وہاں سے منتقل ہوکر یہاں آجائیں۔

افادات:- اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگرچہ مکان کا مسجد سے قریب ہونا آدمی کے لئے سعادت کی بات ہے، اور جماعت کے حاصل ہونے کے لئے آسانی کا ذریعہ بھی ہے، لیکن اگر دوسری کوئی مصلحتیں اس کے مقابلہ میں موجود ہوں، تو پھر ان مصلحتوں کو بھی ترجیح دی جائے گی۔ جیسے: دورِ حاضر میں بھی بعض جگہوں پر کالونیاں بنی ہوئی ہیں اور وہاں مسجد بھی بنی ہوئی ہے، اب مسلمان معمولی خطروں کی وجہ سے ان کالونیوں میں سے اپنے مکانات فروخت کرکے دوسری جگہوں پر منتقل ہو رہے ہیں، جس کے نتیجہ میں وہاں کی مسجدیں ویران ہوجائیں گی۔ اس لئے مسجد کی آبادی کو برقرار رکھنے کے لئے وہاں کے رہنے والوں کو اس بات کی تاکید کی جائے کہ بھائیو! تم لوگ وہیں رہو؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس چیز کی طرف خاص طور پر دھیان و توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

دیکھئے! قبیلۂ بنو سلمہ مدینہ منورہ کے جس حصہ میں آباد تھا، اگر وہ لوگ وہاں سے منتقل ہو کر مسجد نبوی کے قریب آجاتے تو وہ حصہ خالی ہو جاتا اور اُدھر سے دشمنوں کی طرف سے خطرہ لاحق ہو جاتا؛ جس سے حفاظت کے لئے نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو مسجد نبوی کے قریب آنے کی اجازت نہیں دی، اور ان کو اس بات کی ترغیب دی کہ تم اپنی جگہوں پر ہی رہو۔ رہی یہ بات کہ دور پڑتا ہے، تو اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ جتنا دور سے چل کر آؤ گے اس پر تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنا ہی زیادہ ثواب بھی تو لکھا جائے گا، تمہارے تمام نقشِ قدم اللہ تعالیٰ کے یہاں محفوظ رہیں گے۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی خواہش ظاہر فرمائی کہ وہیں رہو، تو وہ لوگ فرمانے لگے: اب ہمیں بھی یہیں رہنا پسند ہے، اگر مسجد کے قریب آنے کے لئے ہمیں کہا بھی جائے تو ہم آنے کو پسند نہیں کریں گے۔

انفرادی تقاضہ پر اجتماعی مصلحت کو ترجیح

اس سے معلوم ہوا کہ کبھی انفرادی مصلحتوں کے مقابلہ میں اجتماعی مصلحتوں کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ مسجد کے قریب مکان ہونا اور اس کی وجہ سے آسانی پیدا ہونا؛ یہ انفرادی مسئلہ اور تقاضہ تھا، لیکن شہر کے باہر کا علاقہ خالی ہو جانے کی وجہ سے خطرات پیدا ہو جانا؛ یہ اجتماعی مصلحت تھی۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے

انفرادی تقاضہ کے مقابلہ میں اجتماعی مصلحت کو ترجیح دی، اور ان کو وہیں رہنے کی تاکید فرمائی، اور ان حضرات نے بھی بخوشی و مسرّت حضور اکرم ﷺ کے اس فیصلے کو قبول کرلیا۔

زیادہ ثواب پانے والے نمازی

حدیث ۱۰۵۷:-

وَعَنْ أَبِي مُوْسٰی (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: اِنَّ أَعْظَمَ النَّاسِ أَجْراً فِي الصَّلَاةِ ؛ أَبْعَدُهُمْ اِلَيْهَا مَمْشًى فَأَبْعَدُهُمْ. وَالَّذِيْ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ حَتّٰی يُصَلِّيَهَا مَعَ الْاِمَامِ، أَعْظَمُ أَجْراً مِنَ الَّذِيْ يُصَلِّيْ ثُمَّ يَنَامُ. (متفقٌ علَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أبو موسیٰ أشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نمازیوں میں سب سے زیادہ ثواب پانے والا وہ آدمی ہے جو سب سے زیادہ دور سے چل کر نماز کے لئے آئے۔ اور جو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کے لئے انتظار کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ امام کے ساتھ (جماعت سے) نماز ادا کرتا ہے، تو وہ اس آدمی کے مقابلہ میں زیادہ ثواب پاتا ہے جو جلدی سے نماز پڑھ کر سو جاتا ہے۔

افادات:- جماعت میں شریک ہونے والوں میں جس کا مکان مسجد سے جتنا زیادہ دور ہوگا اور وہاں سے چل کر مسجد میں آکر جماعت میں حاضری دے گا، وہ لوگوں میں ثواب کے اعتبار سے اتنا ہی زیادہ بڑھا ہوا ہوگا۔

اسی طرح عشاء کی نماز کا وقت شروع ہوا تو کوئی آدمی سوچتا ہے کہ ابھی تو مسجد میں عشاء کی جماعت میں بہت دیر ہے، اس لئے گھر پر ہی نماز پڑھ کر جلدی سے سو جاتا ہے، اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی جماعت کا انتظار کرتا ہے اور جماعت سے عشاء پڑھتا ہے؛ تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس دوسرے آدمی کو زیادہ ثواب ملے گا۔

نورِ کامل کی بشارت

حدیث ۱۰۵۸:-

وَعَنْ بُرَيْدَةَ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: بَشِّرُوا الْمَشَّائِينَ فِي الظُّلَمِ إِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّورِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ. (رواه أبو دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ)

ترجمہ:- حضرت بریدہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ اندھیریوں میں مسجد کی طرف کثرت سے چل کر آتے ہیں، ان کو قیامت کے روز کے پورے پورے نور کی خوش خبری سنا دو۔

افادات:- یعنی قیامت کے روز اللہ تبارک و تعالیٰ ایسے لوگوں کو کامل نور عطا فرمائیں گے، جیسا کہ قرآنِ پاک میں بھی ہے کہ اہلِ ایمان جب قیامت کے روز چلیں گے تو ان کا نور ان کے آگے دائیں بائیں ہو گا، اسی روشنی میں وہ چلیں گے۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اندھیرے کی وجہ سے آدمی مسجد نہیں جاتا اور گھر پر ہی نماز پڑھ کر سونے کی سوچتا ہے۔ یہاں بتلایا گیا کہ اگرچہ یہ مشقّت کی چیز ہے، لیکن اگر یہ مشقّت تم اُٹھالوگے تو اس پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے تم کو اجر ومقام بھی ویسا ہی دیا جائے گا۔

کفارہ سیئات ورفعِ درجات کے تین اعمال

حدیث ۱۰۵۹:-

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَلا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يَمْحُو اللهُ بِهِ الخَطَايَا، وَيَرْفَعُ بِهِ الدَّرَجَاتِ؟ قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: إِسْبَاغُ الوُضُوءِ عَلَى المَكَارِهِ، وَكَثْرَةُ الخُطَا إِلَى المَسَاجِدِ، وَانْتِظَارُ الصَّلاَةِ بَعْدَ الصَّلاَةِ، فَذَلِكُمُ الرِّبَاطُ، فَذَلِكُمُ الرِّبَاطُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم کو ایسا عمل نہ بتلاؤں کہ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرتے ہیں اور درجات کو بلند فرماتے ہیں۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: کیوں نہیں، اے اللہ کے رسول! ضرور بتلایئے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تکلیف دہ حالات میں کامل طریقہ سے وضو کرنا۔ مسجد کی طرف کثرت سے پاؤں اُٹھانا۔ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ یہی سرحدوں کی حفاظت ہے۔ یہی سرحدوں کی حفاظت ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ٹھنڈی کے زمانہ میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا آدمی کے لئے نہایت ہی مشقّت کا سبب ہوتا ہے، اس کے باوجود ایک آدمی سردی کے زمانہ میں وضو کرتے ہوئے

بڑے اہتمام کے ساتھ تمام سنتوں کو ادا کرتا ہے، جلدی میں سنتوں کو چھوڑ کر وضو نہیں کرتا۔ یا کبھی آدمی بیمار ہوتا ہے تو بیماری کی وجہ سے وضو کرنا اس کو بھاری معلوم ہوتا ہے، لیکن کوئی آدمی بیماری کے باوجود وضو کی مشقّت کو برداشت کرتا ہے اور سنت کے مطابق وضو کرنے کا اہتمام کرتا ہے؛ تو یہ چیز گناہوں کو معاف کرنے والی اور درجات کو بلند کرنے والی ہے۔ کسی کا گھر مسجد سے دور ہے اس کے باوجود جماعت سے نماز پڑھنے کا اتنا اہتمام کرتا ہے کہ ہر حال میں جماعت سے نماز کے لیے مسجد پہنچتا ہے؛ تو یہ چیز بھی گناہوں کو معاف کرنے والی اور درجات کو بلند کرنے والی ہے۔

ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا، جیسے مغرب کی نماز پڑھ لی، لیکن اب دل میں یہ انتظار رہے کہ کب عشاء کا وقت ہو اور عشاء پڑھ لوں۔ یا ظہر پڑھ لی اور اب دل میں یہ انتظار رہے کہ کب عصر کا وقت ہو اور عصر پڑھ لوں۔ گویا ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرتا ہے، اور ہر وقت دل پر یہی فکر سوار رہتی ہے۔

یہ تین چیزیں سرحدوں کی حفاظت ہیں۔ جیسے سرحدوں پر فوج کو بٹھا کر دشمن کے حملوں سے بچنے کا اہتمام کیا جاتا ہے، اسی طرح جو آدمی ان تین اعمال کا اہتمام کرے گا تو وہ نفس و شیطان کے حملوں سے اپنے آپ کو بچالے گا۔ اس لئے کہ انسان کے دو ہی دشمن ہیں، ایک نفس اور دوسرا شیطان؛ ان دونوں کی شرارتوں اور ان کی طرف سے پہنچنے والے ضرر سے بچنے میں یہ تین اعمال بہت زیادہ موئثر ہیں، چناں چہ جو لوگ ان کا اہتمام کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔

اُس کے صاحبِ ایمان ہونے کی گواہی دو

حدیث ۱۰۶۰:-

وَعَنْ أَبِيْ سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: إِذَا رَأَيْتُمُ الرَّجُلَ يَعْتَادُ الْمَسَاجِدَ فَاشْهَدُوْا لَهُ بِالْإِيْمَانِ. قال اللهُ عز و جل: إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ آمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ : الآية. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم جب کسی آدمی کو دیکھو کہ وہ مسجد میں برابر حاضری دیتا ہے (یعنی ہر نماز میں مسجد میں آتا ہے) تو تم اس کے لئے ایمان کی گواہی دو (یعنی ایسے آدمی کے متعلق تم کہہ سکتے ہو کہ یہ آدمی صاحبِ ایمان ہے) حضور اکرم ﷺ دلیل میں فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ کی مسجدوں کو وہی لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں (اور یہ آدمی جب مسجد میں حاضری کا اہتمام کرتا ہے تو اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے گھر کو آباد کرنے والا ہے۔ اور قرآن میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسجدوں کو آباد کرنے والے اہلِ ایمان ہیں؛ تو تم بھی اس کے صاحبِ ایمان ہونے کی گواہی دو۔)

بَابُ فَضْلِ إِنْتِظَارِ الصَّلَاةِ

نماز کے انتظار کی فضیلت

نماز کے انتظار میں جو زحمت ہوتی ہے اس پر بھی بڑی فضیلت ہے، پہلے زمانہ میں جب گھڑیاں نہیں تھیں تو جماعت کھڑی ہونے کے اوقات بھی مقرر نہیں تھے۔ خود نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں نماز اسی وقت کھڑی ہوتی تھی جب آپ تشریف لاتے تھے، اسی طرح خلفائِ راشدین کے زمانہ میں بھی یہی معمول تھا کہ خلیفہ خود ہی نماز پڑھاتے تھے، جب وہ آتے تھے تو نماز کھڑی ہوتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اذان ہوئی تو دس منٹ کے بعد ہی جماعت کھڑی ہوگئی، کبھی دس منٹ کے بعد ہو جاتی تھی اور کبھی گھنٹہ آدھا گھنٹہ بھی لگ جاتا تھا، وقت کی کوئی تعیین نہیں تھی، اس لیے پہلے سے آنے والے کو کبھی انتظار بھی کرنا پڑتا تھا۔ آج کل ہم لوگوں سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا، مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ہمارا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ بالکل اخیری وقت میں مسجد پہنچتے ہیں، اور اگر کبھی جلدی پہنچ گئے تو جماعت خانہ میں داخل نہیں ہوتے، باہر ہی کھڑے رہتے ہیں، حالاں کہ جماعت کے اوقات مقرر ہیں اس کے باوجود مسجد میں داخل ہونا اور مسجد میں بیٹھ کر نماز کا انتظار کرنا بھی ہمارے لیے باعثِ مشقّت ہے، حالاں کہ اس کی بڑی فضیلت ہے اسی کو اس باب میں بتلاتے ہیں۔

آدمی نماز ہی میں شمار ہوتا ہے

حدیث ۱۰۶۱:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: لَا يَزَالُ أَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاةٍ مَا دَامَتِ الصَّلَاةُ تَحْبِسُهُ، لَا يَمْنَعُهُ أَنْ يَّنْقَلِبَ إِلَى أَهْلِهِ إِلَّا الصَّلَاةُ. (متفقٌ عَلَيْه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی برابر نماز ہی میں شمار ہوتا ہے جب تک کہ وہ نماز کی وجہ سے مسجد میں رکا رہتا ہے، اس کو اپنے گھر جانے سے سوائے نماز کے اور کوئی چیز مانع نہ ہو۔

افادات:- یعنی وہ گھر اس لئے نہیں جارہا ہے کہ ابھی نماز نہیں ہوئی ہے۔ نماز کا جو انتظار کیا جارہا ہے، اس میں بھی اس کو اتنا ہی ثواب ملتا ہے جتنا نماز پڑھنے میں ملتا ہے۔

فرشتوں کی دعائے رحمت

حدیث ۱۰۶۲:-

وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَلْمَلَائِكَةُ تُصَلِّيْ عَلَى أَحَدِكُمْ مَا دَامَ فِيْ مُصَلَّاهُ الَّذِيْ صَلَّى فِيْهِ، مَالَمْ يُحْدِثْ، تَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْلَهُ، أَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ. (رواہ البُخَارِيُّ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس آدمی کے لیے فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں جو اپنی نماز کی اس جگہ پر بیٹھا رہے جہاں اس نے نماز پڑھی ہے، جب تک اس کا وضو نہ ٹوٹے۔ فرشتے کہتے ہیں: اے اللہ! اس کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! اس پر رحمت نازل کر۔

افادات:- جو آدمی نماز پڑھنے کے بعد اسی جگہ باوضو بیٹھا رہے اس کو فرشتوں کی دعا حاصل ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ باوضو وہیں کیوں بیٹھا رہے گا؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ دوسری نماز کے انتظار میں بیٹھے، اور پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ فرض کے بعد دوسرے فرض ہی کے انتظار میں بیٹھے، بلکہ فرض کے بعد نفل کے انتظار میں بھی بیٹھے گا تو یہ فضیلت حاصل ہوگی، مثلاً: فجر کے بعد اشراق کے انتظار میں، یا عصر کے بعد مغرب کے انتظار میں وہیں بیٹھا رہے، اور تسبیح تلاوت وغیرہ میں مشغول رہے؛ تب بھی یہ فضیلت حاصل ہوگی۔

نماز کے انتظار میں جو وقت گزرا

حدیث ۱۰۶۳:-

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَخَّرَ لَيْلَةً صَلَاةَ الْعِشَآءِ إِلَى شَطْرِ اللَّيْلِ، ثُمَّ أَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهِ بَعْدَ مَا صَلَّى، فَقَالَ: صَلَّى النَّاسُ وَرَقَدُوْا، وَلَمْ تَزَالُوْا فِيْ صَلَاةٍ مُنْذُ انْتَظَرْتُمُوْهَا. (رواه البُخَارِي)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے عشاء کی نماز آدھی رات تک مؤخر کی (یعنی آپ ﷺ دیر سے تشریف لائے اور آدھی رات کو عشاء کی نماز پڑھائی) پھر آپ ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور

فرمانے لگے کہ: لوگوں نے تو اپنی اپنی نمازیں پڑھ لیں اور سو گئے، لیکن تم لوگ جب تک نماز کے انتظار میں رہے؛ نماز پڑھنے والوں ہی کے حکم میں رہے (یعنی تم کو اب تک نماز پڑھنے والوں جیسا ثواب ملتا رہا)۔

افادات:- خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے جماعت کے کھڑا ہونے میں تاخیر ہو جائے تو شور مچانے اور ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ بیچارے امام صاحب کبھی کسی وجہ سے دو چار منٹ لیٹ ہو گئے؛ تو مسجد میں ایک ہنگامہ قائم ہو جاتا ہے کہ یہ دو منٹ ہم کو انتظار کیوں کروایا۔ ارے بھائی! اتنا انتظار کرنے میں آپ کو ثواب ہی ملا، آپ کے یہ دو منٹ بے کار نہیں گئے۔ اگر آپ یہ سوچ لیں تو اس ہنگامہ سے بھی بچ سکتے ہیں، اور بلا وجہ امام صاحب کو مخدوش بنانے سے بھی اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں۔ اس لئے کہ ظاہر ہے قصداً تو ایسا ہوا نہیں ہو گا، کسی وجہ سے اگر کبھی ایسا ہوا تو ایسی چیزوں کو برداشت بھی کر لینا چاہئے۔ لیکن ہم لوگوں میں یہ سوچ نہیں رہی۔ اگر ان چیزوں کا اہتمام کریں تو ان شاء اللہ یہ فضیلتیں بھی حاصل ہو جائیں گی۔

بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الْجَمَاعَةِ

باجماعت نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان

باجماعت نماز پڑھنے کی فضیلت کا بیان

حدیث ۱۰۶۴:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ أَفْضَلُ مِنْ صَلَاةِ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِيْنَ دَرَجَةً.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: جماعت کی نماز تنہا نماز کے مقابلہ میں ستائیس (۲۷) درجہ بڑھ کر ہے۔

افادات:- یعنی اکیلے نماز پڑھنے کی صورت میں جو ثواب ملتا ہے، جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں اس کے مقابلہ میں ستائیس (۲۷) گنا زیادہ ثواب ملے گا۔ ہم لوگوں کو دنیوی اعتبار سے اگر معمولی نفع حاصل ہوتا ہو تو اس کے لئے کتنی مشقتیں اٹھاتے ہیں۔ جیسے اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہاں نشاط سوسائٹی میں بیٹھ کر اپنا مال بیچیں گے تو اس کی قیمت سو روپیہ ملے گی اور اسٹیشن پر جاکر بیچیں گے تو وہاں ستائیس سو روپیہ قیمت ملے گی، تو اگر یہاں سو آدمی بھی ہم سے لینے کے لئے اصرار کریں گے تب بھی ہم اپنا مال فروخت نہیں کریں گے، وہیں جاکر ٹھیلہ لگائیں گے تاکہ ستائیس گنا قیمت حاصل ہو۔ یہ تو میں نے ایک مثال بیان کی ہے، ورنہ اگر یہاں سو ملتے ہوں اور وہاں دو سو ملتے ہوں تب بھی ہم کسی حال میں یہاں فروخت کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں گے۔ جب دنیوی معمولی نفع کے خاطر ہم اتنی مشقّت اٹھاتے ہیں؛ تو اخروی اعتبار سے کیوں نہیں اٹھاتے؟ ایک آدمی گھر پر تنہا نماز پڑھتا ہے تو اس کو جتنا ثواب ملتا ہے، اس کے مقابلہ میں مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر

ستائیس گنا زیادہ ثواب ملتا ہے؛ تو اب ظاہر ہے کہ اس ستائیس گنا ثواب حاصل کرنے کے لئے کتنا اہتمام کرنا چاہیے

جماعت کی اہمیت اسلاف کی نظر میں

آج ہم لوگوں کی نگاہوں میں اخروی اور دینی امور کی وہ اہمیت اور قدر نہیں رہی جو ہمارے اسلاف کی نگاہوں میں تھی، اس لئے ہم اس کا وہ اہتمام نہیں کرتے؛ جو وہ کرتے تھے، وہ حضرات تو اس کے لئے بڑی مشقتیں اٹھاتے تھے۔ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد ہیں، ان کے ایک شاگرد محمد بن سلمہ تھے، بڑے مشائخِ حنفیہ میں سے گزرے ہیں، بڑے عالم اور بزرگ تھے۔ ۱۰۲/ سال کی عمر پائی، اور روزانہ دو سو (۲۰۰) رکعات نفل ادا کیا کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سوائے ایک مرتبہ کے چالیس سال تک تکبیرِ اولیٰ فوت نہیں ہوئی اور وہ ایک مرتبہ بھی اس وقت ہوئی جب ان کی والدہ کا انتقال ہوا تو ان کی تجہیز و تکفین کی مشغولی کی وجہ سے تکبیرِ اولیٰ فوت ہوئی تھی۔

ایک مرتبہ ان کی جماعت کی نماز فوت ہوگئی، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ سوچ کر کہ جماعت کے ساتھ پڑھتا تو ستائیس گنا ثواب ملتا؛ اس نماز کو ستائیس مرتبہ ادا کیا (ہم میں کوئی ہے جو اس چیز کا اہتمام کرے؟) خیر! اس کے بعد جب میں سویا تو خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے: اے ابن سلمہ!

فرشتوں کی آمین کا بدل کیا ہوگا؟ دراصل یہ ایک حدیثِ پاک کی طرف اشارہ تھا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب آدمی جماعت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، اور امام سورۂ فاتحہ پوری کرتے ہوئے ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ پڑھتا ہے؛ تو تم آمین کہو، اس لئے کہ فرشتے بھی اس وقت آمین کہتے ہیں، جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ ہو جاتی ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیتے ہیں۔ گویا جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی صورت میں امام کی قراءت میں سورۂ فاتحہ کے مکمل ہونے پر جو آمین کہی جائے گی، صرف اس آمین کی یہ فضیلت ہے۔ گویا ان کو خواب میں اس بات پر تنبیہ کی گئی کہ آپ نے ستائیس مرتبہ نماز تو پڑھ لی، لیکن جماعت کے ساتھ پڑھنے کی صورت میں امام کی قراءت پر جو آمین کہتے ہیں، وہ فضیلت اب آپ کو کہاں حاصل ہوگی؟

حقیقت یہ ہے کہ جماعت کی نماز کا جو ثواب ہے اور اس پر جو مختلف چیزیں حاصل ہوتی ہیں، اگر کوئی آدمی تنہا ہزار مرتبہ پڑھ لے؛ تب بھی وہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔

حدیث ۱۰۶۵:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ صَلَاةُ الرَّجُلِ فِيْ جَمَاعَةٍ تُضَعَّفُ عَلَى صَلَاتِهِ فِيْ بَيْتِهِ وَفِيْ سُوْقِهِ خَمْساً وَّعِشْرِيْنَ ضِعْفاً. وَذٰلِكَ أَنَّهُ إِذَا تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ، لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا الصَّلَاةُ، لَمْ يَخْطُ خَطْوَةً إِلَّا رُفِعَتْ لَهُ بِهَا دَرَجَةٌ، وَحُطَّتْ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةٌ. فَإِذَا صَلَّى لَمْ تَزَلِ الْمَلَائِكَةُ تُصَلِّيْ عَلَيْهِ مَا دَامَ فِيْ مُصَلَّاهُ، مَا لَمْ يُحْدِثْ، تقولُ: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَيْهِ، اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ، وَلَا يَزَالُ فِيْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرَ الصَّلَاةَ.

(متفقٌ عَلَيهِ، وهذا لفظ البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر، اس کے اپنے گھر میں، یا بازار میں (یعنی اپنی دوکان پر) نماز پڑھنے کے مقابلہ میں پچّیس گنا ثواب ملتا ہے (نبی کریم ﷺ اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ تنہا کے مقابلہ میں جماعت کا ثواب پچیس گنا کیوں ہے؟) اس لئے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے اور اچھے طریقہ سے (وضو کے تمام سنن وآداب کی پوری رعایت کرتے ہوئے) وضو کرتا ہے، پھر مسجد کے لئے چلتا ہے، اور اس کو گھر سے نماز کے علاوہ کوئی اور چیز نکال نہیں رہی ہے، تو وہ قدم نہیں اٹھائے گا مگر یہ کہ اس کے ہر ہر قدم پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔ پھر نماز پڑھ کر (دوسری نماز کے انتظار میں، یا تسبیحات وغیرہ میں) اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہتا ہے (مثلاً: فجر کے بعد اشراق کے انتظار میں بیٹھا رہا، یا عصر کے بعد مغرب کے انتظار میں بیٹھا رہا) تو جب تک اس کا وضو نہیں ٹوٹتا تب تک فرشتے برابر اس کے لئے رحمت کی دعا کرتے رہتے ہیں (فرشتے یہ دعا کرتے ہیں) اے اللہ! اس پر اپنی رحمت بھیج، اور اس کے ساتھ مہربانی کا معاملہ فرما۔ اور جب تک آدمی نماز کے انتظار میں ہوتا ہے تو یوں سمجھا جائے گا کہ وہ نماز ہی میں ہے، اس کو وہی ثواب ملے گا جو نماز میں ملا کرتا ہے۔

افادات:- یہاں ایک سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اوپر کی روایت میں ستائیس گنا کا تذکرہ ہے، اور اس روایت میں پچّیس گنا بتلاتے ہیں۔

تو علماء نے ان دونوں روایتوں کو جوڑنے کے لئے مختلف باتیں کہی ہیں۔ بعضوں نے کہا: یہ لوگوں کے حالات کے اعتبار سے ہے، بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کو پچّیس گنا ثواب ملتا ہے، اور بعض لوگوں کو ستائیس گنا ملتا ہے۔ آدمی کے اخلاص، اس کے دل کی نیت، اور مشقت اٹھانے کی وجہ سے ثواب کی مقدار میں بھی فرق پڑجاتا ہے

بعضوں نے کہا: نمازوں کی وجہ سے فرق ہے کہ جہری نمازوں میں ستائیس گنا ثواب ملے گا، اور سرّی نمازوں میں پچیّس گنا ملے گا۔

اور بعضوں نے کہا: فجر اور عشاء کی نماز میں جماعت کی حاضری مخصوص حالات کے پیشِ نظر ذرا مشکل ہوا کرتی ہے، اس لئے ان دونوں میں ستائیس گنا ملے گا، اور باقی نمازوں میں پچیّس گنا ملے گا۔

بعضوں نے کہا: اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے امّتِ محمدیہ پر نعمتوں، عنایتوں اور فضل وکرم کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا تھا، اور اس میں اضافہ ہوتا رہتا تھا، اس لیے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بتلایا گیا کہ پچیّس گنا ثواب ملے گا، پھر اس میں اضافہ کرتے ہوئے بتلایا گیا کہ اب ستائیس گنا ثواب ملے گا۔

یہاں ''خَمْساً وَّعِشْرِیْنَ ضِعْفاً '' کہا ہے۔ اور اوپر کی روایت میں ''دَرَجَةً'' کہا ہے۔ اس کی توجیہ بعض حضرات نے یہ فرمائی کہ پچیس گنا المضاعف ثواب ملے گا۔ یعنی ایک کا دو، پھر دو کا چار، اور چار کا آٹھ، آٹھ کا سولہ، سولہ کا بتّیس، بتّیس کا چوسٹھ، چوسٹھ کا ایک سو اٹھائیس؛ اس طرح بڑھاتے جاؤ ؛اس صورت میں ایک جماعت کا ثواب تین کروڑ پینتیس لاکھ چوّن ہزار چارسو بتّیس (۳۳۵۵۴۴۳۲) درجہ ہوتا ہے۔

اور پہلے بھی بتلادیا تھا کہ شریعت کی نگاہ میں مطلوب یہ ہے کہ آدمی گھر ہی سے وضو کر کے نماز کے لیے چلے، کسی وجہ سے اگر کہیں باہر سے آرہا ہے اور وضو کا موقع نہیں ہے تو مسجد میں کرلے،

یا کبھی مسجد کے اندر تھا اور وضو ٹوٹ گیا؛ تو الگ بات ہے، ورنہ کوشش یہی ہونی چاہیے کہ گھر ہی سے وضو کر کے نماز کے لئے چلے۔

"خالص نماز کے واسطے ہی مسجد آتا ہے" کوئی اور مقصد یا دنیوی غرض نہیں ہوتی؛ مثلاً: آج مسجد چلو تا کہ فلاں کام بھی ہو جائے گا اور اس کے ساتھ نماز بھی پڑھ لیں گے؛ تو ہر قدم پر ایک درجہ بلند ہوتا ہے اور ایک گناہ معاف ہوتا ہے۔

"وضو نہیں ٹوٹا" کی قید اس لئے لگائی کہ وضو ٹوٹنے کے بعد نماز کا انتظار باقی نہیں رہتا۔ نماز کا انتظار تو نماز کی تیاری کے اسباب کے ساتھ ہی ہوا کرتا ہے، اس لئے وضو ٹوٹ جانے کے بعد فوراً وضو کر لینا چاہیے۔

پھر تو مسجد میں آؤ ...

حدیث ۱۰۶۶:-

وَعَنْهُ قَالَ أَتَى النَّبِيَّ ﷺ رَجُلٌ أَعْمٰى فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! لَيْسَ لِي قَائِدٌ يَقُوْدُنِيْ إِلَى الْمَسْجِدِ. فَسَأَلَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَنْ يُّرَخِّصَ لَهُ. فَيُصَلِّيَ فِيْ بَيْتِهِ فَرَخَّصَ لَهُ فَلَمَّا وَلّٰى دَعَاهُ فَقَالَ لَهُ: هَلْ تَسْمَعُ النِّدَآءَ بِالصَّلَاةِ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَأَجِبْ. (رواه مُسلِم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک نابینا صحابی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے مسجد تک لانے والا کوئی رہبر نہیں ہے۔ گویا انھوں نے حضور ﷺ سے یہ پوچھنا چاہا کہ ان کو گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے؟ (یا جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے کے لئے مسجد ہی میں آنا پڑے گا) تو حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے حالات کو دیکھتے ہوئے، ان کی یہ بات سن کر (کہ لانے والا کوئی رہبر ہے نہیں) ان کو گنجائش اور اجازت دی (کہ ٹھیک ہے، تم گھر پر نماز پڑھ لیا کرو) جب یہ جواب سن کر وہ جانے لگے تو حضورِ اکرم ﷺ نے ان کو بلایا اور پوچھا: کیا تمہارے کان میں اذان کی آواز آتی ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! آتی ہے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پھر تو مسجد میں آؤ۔

افادات:- فقہاء نے لکھا ہے کہ کوئی آدمی نابینا ہو، تو اس کے لیے جماعت کی حاضری ضروری نہیں ہے، اگر جماعت کے بجائے گھر پر نماز پڑھنا چاہے تو اس کی اجازت ہے، لیکن ایک مؤمن کی غیرتِ ایمانی کا تقاضہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے منادی کی آواز سنے تو اس کے بعد گھر پر ہی رہنے کے بجائے مسجد میں آئے۔ نبی کریم ﷺ نے جو اعلیٰ طریقہ ہے وہ ان کو بتلایا۔

حدیث ۱۰۶۷:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ وَقِيلَ عَمْرِو بْنِ قَيْسٍ اَلْمَعْرُوفِ بِابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ الْمُؤَذِّنِ (رضی اللہ عنہ) أَنَّهُ قَالَ يَارَسُولَ اللهِ إِنَّ الْمَدِينَةَ كَثِيرَةُ الْهَوَامِّ وَالسِّبَاعِ. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ تَسْمَعُ حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ، فَحَيَّهَلاً.

(رَوَاهُ أَبُو دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ حَسَنٍ) ومعنى ((حَيَّهَلاً)): ((تعال))

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن اُم مکتوم (رضی اللہ عنہ) (جو نبی کریم ﷺ کے موذن بھی تھے، ان) سے منقول ہے کہ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ! مدینہ منورہ میں زہریلے جانوروں (یعنی سانپ بچھو وغیرہ) اور درندوں کی کثرت ہے (درندے بھی قریب سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور وہ نابینا تھے، ان کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مسجد میں تنہا آنے کی صورت میں ان زہریلے جانوروں کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچ جائے؛ اس لیے کہ مجھے نظر تو آتا نہیں؛ تو کیا مجھے گھر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے؟) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”حَيَّ عَلَى الصَّلَاةِ، حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ“ کی آواز آتی ہے؟ انھوں نے کہا: جی ہاں ! آتی ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تب تو تم کو مسجد میں آنا چاہیے (ان کو بھی نبی کریم ﷺ کی طرف سے اعلیٰ مقام کی ترغیب دی گئی)۔

ائمہ کی نظر میں جماعت کی اہمیت

حدیث ۱۰۶۸:

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ، فَيُحْتَطَبَ، ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلَاةِ، فَيُؤَذَّنَ لَهَا، ثُمَّ آمُرَ رَجُلاً فَيَؤُمَّ النَّاسَ، ثُمَّ أُخَالِفَ إِلَى رِجَالٍ، فَأُحَرِّقَ عَلَيْهِمْ بُيُوتَهُمْ.

(متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے: میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں، وہ جمع کی جائیں، اس کے بعد کسی سے کہوں کہ وہ نماز کے لئے اذان کہے، پھر کسی آدمی کو مقرر کروں کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائے، جب جماعت کھڑی ہو تو پھر مَیں ایسے لوگوں کے پاس جاؤں جو جماعت کی نماز میں حاضری نہیں دیتے؛ اور ان کے گھروں کو آگ لگا دوں

افادات:- اس سے جماعت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ اسی لئے بعض ائمہ اس طرف گئے ہیں کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے، امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اگرچہ جمہور علماء کے نزدیک بغیر جماعت کے بھی نماز تو ادا ہو جاتی ہے، لیکن ادائے ناقص اور ادھوری ہو جاتی ہے، کامل نماز وہی ہے کہ آدمی جماعت کے ساتھ ادا کرے۔ اور احناف کے یہاں جماعت سنّتِ مؤکدہ ہے، اگر کوئی آدمی اس کے چھوڑنے کی عادت بنالے، اور کسی بستی کے سب لوگ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا نہیں کرتے تو حاکمِ وقت کو چاہئے کہ ان کو اس پر مجبور کرے، اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کے ساتھ قتال وجہاد کرے، یا جنگ کر کے ان کو اس پر آمادہ کرے۔ اور کوئی آدمی جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کی عادت بنالیتا ہے، تو وہ فاسق کہلاتا ہے اور اس کی شہادت اور گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس لئے جماعت کی بڑی اہمیت ہے۔

جس کو یہ پسند ہو کہ قیامت میں...

حدیث ۱۰۶۹:-

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ ﷺ قَالَ مَنْ سَرَّهُ يَلْقَى اللهَ تَعَالَى غَداً مُسْلِماً فَلْيُحَافِظْ عَلَى هٰؤُلَاءِ الصَّلَوَاتِ حَيْثُ يُنَادَى بِهِنَّ. فَإِنَّ اللهَ شَرَعَ لِنَبِيِّكُمْ ﷺ سُنَنَ الْهُدَى، وَإِنَّهُنَّ مِنْ سُنَنِ الْهُدَى، وَلَوْ أَنَّكُمْ صَلَّيْتُمْ فِى بُيُوتِكُمْ كَمَا يُصَلِّي هٰذَا الْمُتَخَلِّفُ فِي بَيْتِهِ لَتَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ، وَلَوْ تَرَكْتُمْ سُنَّةَ نَبِيِّكُمْ لَضَلَلْتُمْ. وَلَقَدْ رَأَيْتُنَا وَمَا

يَتَخَلَّفُ عَنْهَا إِلاَّ مُنَافِقٌ مَعْلُومُ النِّفَاقِ، وَلَقَدْ كَانَ الرَّجُلُ يُؤْتَى بِهِ، يُهادَى بَيْنَ الرَّجُلَيْنِ حَتَّى يُقَامَ فِى الصَّفِّ. (رَوَاهُ مُسلِم)

فی روایة لَهُ قَالَ: إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ عَلَّمَنَا سُنَنَ الْهُدَى، وَإِنَّ مِنْ سُنَنِ الْهُدَى الصَّلَاةَ فِى الْمَسْجِدِ الَّذِى يُؤَذَّنُ فِيهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جس آدمی کو یہ پسند ہو کہ کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ سے مسلمان ہونے کی حالت میں ملے؛ تو وہ ان نمازوں کی پابندی وہاں کرے جہاں نمازوں کے لئے آواز دی جاتی ہے (یعنی اذان کہی جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسجد میں جاکر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے) اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمہارے نبی ﷺ کے لئے ایسے طریقوں کو جاری فرمایا ہے جو ہدایت کا ذریعہ ہیں، اور (پانچوں وقت کی نماز) جماعت کے ساتھ ادا کرنا بھی ہدایت کے راستوں میں سے ہے۔ اگر تم ان نمازوں کو اپنے گھروں میں پڑھنے لگو گے جیسا کہ فلاں پیچھے رہنے والا گھر میں پڑھ لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنے نبی ﷺ کی سنّت کو چھوڑنے والے قرار دیئے جاؤگے اور اگر نبی ﷺ کی سنّت کو (جو ہدایت کا ذریعہ ہے) چھوڑ دوگے؛ تو تم گمراہ ہو جاؤگے۔ (حضرت ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں) مَیں نے (دورِ صحابہ میں) دیکھا ہے کہ جماعت سے غیر حاضر نہیں رہتا مگر وہی آدمی جو ایسا منافق ہوتا تھا جس کا نفاق بالکل کھلا ہوا ہو (نبی کریم ﷺ کے زمانہ اور صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کے دور میں جماعت کی غیر حاضری کی ہمت منافق لوگ بھی نہیں کرتے تھے، سب ہی مسجد میں آجاتے تھے) اور کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ کوئی بیمار آدمی جماعت کے لئے مسجد میں لایا جاتا تھا تو وہ دو آدمیوں کے درمیان گھسِٹتا ہوا صف میں لاکر کھڑا کر دیا جاتا تھا۔

ایک روایت میں ہے: حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں ایسے طریقے سکھائے ہیں جن میں سراسر ہدایت ہی ہدایت ہے، اوران میں سے ایک طریقہ یہ بھی سکھایا ہے کہ ہم نمازوں کو ان مسجدوں میں ادا کرنے کا اہتمام کریں جہاں اذان دی جاتی ہے۔

شریعت کی نگاہوں میں فرائض کی اہمیت

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ جماعت بڑی اہم چیز ہے۔ فرائض کی اہمیت شریعت کی نگاہوں میں بہت زیادہ ہے، اس کو ادا کرنے کے لئے جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کا ہتمام ہونا چاہئے۔ خود نبیٔ کریم ﷺ نے اپنے مرض الوفات میں جماعت کا اتنا زیادہ اہتمام فرمایا کہ اس بیماری میں آپ پر بار بار بے ہوشی طاری ہو جاتی تھی، ہوش میں آنے پر آپ پانی منگوا کر وضو فرماتے تھے، یہاں تک کہ دو تین مرتبہ ایسا ہونے کے بعد آپ دو آدمیوں کے سہارے مسجد میں تشریف لاتے۔ روایتوں میں ہے کہ ایسی حالت میں تشریف لائے کہ آپ کے پیر زمین پر گھسٹ رہے تھے، یعنی پیر اُٹھانے کی بھی آپ ﷺ میں سکت اور طاقت نہیں تھی، اس کے باوجود حضورِ اکرم ﷺ نے جماعت کا اہتمام فرمایا۔

حضرت سلیمان بن ابی حثمہ (رضی اللہ عنہ) چھوٹے صحابی ہیں، حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں پیدا ہو گئے تھے، تھے، لیکن کم عمر تھے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا معمول تھا کہ نماز میں کسی کو غیر حاضر پاتے تو اس کے متعلق تفتیش فرماتے کہ فلاں کیوں نہیں آیا۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمان بن ابی حثمہ (رضی اللہ عنہ) فجر کی نماز میں غیر حاضر تھے، تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) صبح میں جب بازار کی طرف نکلے تو ان کے گھر ہوتے ہوئے گئے

اوران کی والدہ شفاسے پوچھا کہ آج صبح کی جماعت میں سلیمان حاضر نہیں تھے؛ کیا بات ہے؟ ان کی والدہ نے کہا: دراصل وہ رات بھر عبادت میں مشغول رہے، صبح صادق کے وقت ان کی آنکھ لگ گئی، اس لئے جماعت میں حاضر نہیں ہوسکے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اس وقت ارشاد فرمایا: میں فجر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کروں، یہ مجھے اس کے مقابلہ میں زیادہ پسندیدہ ہے کہ رات بھر عبادت کروں اور میری فجر کی جماعت چھوٹ جائے۔

اس لئے باجماعت نماز کا بڑا اہتمام ہوناچاہیے، اس کی طرف سے غفلت اور لاپرواہی بہت مضر اور خطرناک چیز ہے۔

باجماعت نماز کا اہتمام شیطان سے حفاظت کا ذریعہ

حدیث ۱۰۷۰:-

وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِي قَرْيَةٍ وَلَا بَدْوٍ لَا تُقَامُ فِيهِمُ الصَّلَاةُ إِلَّا قَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَةَ.

ترجمہ:—حضرت ابودرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کسی بستی، دیہات یا جنگل میں تین آدمی آباد ہوں، اور وہاں جماعت کے ساتھ نماز قائم نہ کی جائے تو شیطان ان پر قابو پالیتا ہے، اس لئے تم جماعت کو لازم پکڑو، اس لئے کہ بھیڑیا ان بکریوں کو کھالیتا ہے جو اکیلی ہوں۔

افادات:– مطلب یہ ہے کہ معمولی اور ایسی چھوٹی بستی جہاں صرف دو تین آدمی ہی رہتے ہوں؛ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم دو تین آدمی ہیں اس لیے تنہا نماز پڑھ لیں گے۔ نہیں! بلکہ ان کو بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جہاں کہیں بھی آباد ہوں، چاہے دو تین گھرانے ہی کیوں نہ ہوں؛ ان کو بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا انتظام کرنا چاہیے۔

جو بکریاں ریوڑ کی شکل میں ہوتی ہیں؛ بھیڑیا ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا، ہمیشہ بھیڑیا اسی بکری پر حملہ کرتا ہے جو تنہا اور اکیلی ہو۔ اگر آپ بھی جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کریں گے تو شیطان کو آپ پر قابو پانے کا موقع نہیں ملے گا، اور اگر آپ تنہا رہیں گے تو شیطان کو آپ پر حملہ کرنے اور آپ کو گمراہ کرنے کا موقع ملے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماعت کے ساتھ نماز کا اہتمام شیطان کے اپنے اوپر مسلّط ہونے سے حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے، اسی لیے جو آدمی گھر میں نماز پڑھے گا اس کو نماز کا کوئی اہتمام نہیں رہے گا اور ایسے آدمی کو شیطان کبھی بھی کاہلی اور سستی میں مبتلا کر سکتا ہے۔

بَابُ الْحَثِّ عَلٰی حُضُوْرِ الْجَمَاعَةِ فِی الصُّبْحِ

فجر اور عشاء کی جماعت میں حاضری کی ترغیب

فجر اور عشاء کی جماعت میں حاضری کی ترغیب

حدیث ۱۰۷۱:-

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ صَلَّى الْعِشَآءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ، وَمَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّمَا صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ.

وَفِيْ رِوَايَةِ التِّرْمِذِيْ: عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ شَهِدَ الْعِشَآءَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ لَهُ قِيَامُ نِصْفِ لَيْلَةٍ، وَمَنْ صَلَّى الْعِشَآءَ وَالْفَجْرَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ لَهُ كَقِيَامِ لَيْلَةٍ.

ترجمہ:- حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی، گویا اس نے آدھی رات قیام کیا (یعنی آدھی رات تہجد پڑھنے پر جو ثواب ملے گا وہ عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے پر ملے گا) اور جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی، گویا وہ پوری رات عبادت میں مشغول رہا (اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف صبح کی نماز پر پوری رات کا ثواب ملتا ہے) اسی لئے دوسری روایت لائے جس میں حضور اکرم ﷺ کا ارشاد اس بات کی وضاحت کرتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: جو آدمی عشاء کی نماز میں جماعت کے ساتھ حاضر ہوا؛ تو اس کو آدھی رات نماز پڑھنے کا ثواب ملے گا۔ اور جو عشاء اور فجر جماعت کے ساتھ پڑھے گا؛ گویا وہ پوری رات عبادت میں مشغول رہا۔

افادات:- دیکھئے! کتنا بڑا ثواب ہے کہ جماعت کے ساتھ اگر کوئی آدمی عشاء اور فجر کا اہتمام کرتا ہے تو گویا اس کو پوری رات عبادت کا ثواب ملے گا۔ جماعت کی نماز کی کتنی زیادہ اہمیت ہے؟

حدیث ۱۰۷۲:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالصُّبْحِ، لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ عشاء اور فجر کی نماز میں کیا فضیلت اور ثواب ہے؛ تو وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے سرین کے بل گھسٹ کر مسجد تک آئیں۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ اگر پاؤں پر کھڑے ہو کر چلنے کی طاقت نہ ہو تو جیسے بچّہ سرین سے گھِسٹ کر چلتا ہے اس طرح گھِسٹ کر مسجد آنا پڑے؛ تب بھی اس فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے لوگ مسجد میں آئیں گے۔

فجر اور عشاء منافقین پر بڑی شاق ہے

حدیث ۱۰۷۳:-

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَيْسَ صَلَاةٌ أَثْقَلَ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ. وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) ہی سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی نماز منافقین پر فجر اور عشاء سے بڑھ کر بھاری نہیں ہے (یعنی فجر اور عشاء کی نماز کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا منافقین کے لئے بڑا شاق

اور گراں ہے) لیکن اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نمازوں میں کیا فضیلت ہے تو وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے سرین سے گھِسٹ کر بھی آئیں گے۔ یا جیسے بچّہ گھٹنوں پر چلتا ہے اس طرح چل کر بھی آئیں گے۔

افادات:- بعض روایتوں میں ہے کہ ان منافقین کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو یہ امید ہو کہ دو کھری ملے گی تو اس کے لئے بھی ضرور حاضری دیں گے۔

اس روایت میں انسان کا ایک مزاج بتلایا ہے کہ معمولی دنیوی نفع کو حاصل کرنے کے واسطے وہ مشقت برداشت کرتا ہے۔ جیسے اگر پتہ چل جائے کہ فجر کی نماز کے بعد نان خطائی تقسیم ہونے والی ہے تو سب لوگ جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں گے، یا اگر اعلان ہو جائے کہ آج عشاء کی نماز کے بعد کولڈ ڈرنک (ColdDrink) تقسیم ہونے والا ہے تو پوری مسجد بھر جائے گی۔ یہ سب دراصل اسی مزاج کا اثر ہے جو حضورِ اکرم ﷺ نے منافقین کا بتلایا ہے کہ دنیوی معمولی فائدہ کے لئے وہ اتنی کوشش کرتے ہیں، اور آخرت کا اتنا بڑا فائدہ مل رہا ہے اس کی طرف اہتمام اور توجہ نہیں ہے۔

بَابُ الْأَمْرِ بِالْمُحَافَظَةِ عَلَى الصَّلَوَاتِ الْمَكْتُوبَاتِ وَالنَّهْيِ الْأَكِيدِ وَالْوَعِيدِ الشَّدِيدِ فِي

پنج وقتہ فرض نمازوں کی پابندی کی تاکید اور ان کو چھوڑنے پر سخت وعید

پنج وقتہ فرض نمازوں کی پابندی کی تاکید اور چھوڑنے پر سخت وعید

پانچ وقت کی نمازیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فرض کی گئی ہیں، ان کی پابندی کی قرآنِ پاک میں اوراحادیثِ مبارکہ میں بڑی تاکید کی گئی ہے اوران کے چھوڑنے پر سخت عذاب کی دھمکیاں سنائی گئی ہیں، اس باب میں انہیں کو بیان کررہے ہیں۔

قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے: ﴿حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰى﴾ پانچوں وقت کی نمازوں کی پابندی کرو، اور خاص طور پر درمیانی نماز کا اہتمام کرو۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس سے مراد عصر کی نماز ہے۔

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ اس آیت سے پہلے کفّار اور مشرکین کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا تھا، پھر آگے فرمایا گیا کہ: اگر وہ اپنے کفر وشرک سے توبہ کرلیں اور نمازوں کو قائم کرنے لگیں اور زکوۃ دینے لگیں؛ تو پھر ان کا راستہ چھوڑدو، یعنی پھر ان کے ساتھ قتال نہ کیا جائے، اس لیے اب تو ان کو مسلمان ہوجانے کے ناطے سے وہی سارے حقوق حاصل ہیں جو ان مسلمانوں کو حاصل ہیں جو پہلے سے مسلمان ہیں۔ تو ایک کافر ومشرک کے ساتھ قتال کا جو حکم دیا گیا تھا، اس کے ختم ہونے کے لئے بھی جن چیزوں کو ضروری قرار دیا گیا، اس میں ایک چیز نمازوں کو قائم کرنا بھی ہے۔

سب سے افضل عمل کون سا؟

حدیث ۱۰۷۴:-

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَيُّ الأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: الصَّلَاةُ عَلَى وَقْتِهَا. قلتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: بِرُّ الوَالِدَيْنِ. قلتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: الجِهَادُ فِي سَبِيْلِ اللهِ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: کونسا عمل سب سے بہتر ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا۔ میں نے پھر سوال کیا: اس کے بعد سب سے بہتر عمل کون سا ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ماں باپ کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرنا۔ میں نے پھر پوچھا: اس کے بعد کونسا عمل سب سے بہتر اور افضل ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کی طرف سے نماز کے لیے کچھ اوقات مقرر کئے گئے ہیں، نبی کریم ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنا سب سے افضل عمل ہے، اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حدیث ۱۰۷۵:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، ایک تو اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور نبیٔ کریم ﷺ اللہ کے رسول ہیں (یعنی کلمۂ شہادت کا اقرار کرنا) دوسرا نماز کو قائم کرنا، تیسرا زکوٰۃ کو ادا کرنا، چوتھا بیت اللہ شریف کا حج کرنا، اور پانچواں رمضان کے روزے رکھنا (گویا یہ پانچ اعمال دین کی بنیاد ہیں)

حدیث ۱۰۷۶:۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللهِ وَيُقِيْمُوْا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوْا ذٰلِكَ عَصَمُوْا مِنِّيْ دِمَاءَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ اِلَّا بِحَقِّ الْاِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے ساتھ (یعنی کفّار و مشرکین کے ساتھ) قتال کروں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نمازوں کو قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، پس اگر وہ ان اعمال کو کرنے لگیں تو ان کے ساتھ قتال کا سلسلہ موقوف کیا جائے گا۔ اور وہ لوگ مجھ سے اپنی جان و مال کو محفوظ کرلیں گے؛ البتہ اسلام کا مطالبہ ان پر باقی رہا۔ اور ان کا حساب اللہ تعالیٰ پر ہے۔

افادات:۔یہاں تو یہ روایت اس بات کو بتلانے کے لیے لائے ہیں کہ نماز قائم کرنا ان اعمال میں سے ہے جس کی وجہ سے آدمی کا جان و مال محفوظ ہوجاتا ہے۔ (اس روایت کی تفصیل حدیث کے اصلاحی مضامین ج ۶ / ۴۲۹ تا ۴۳۳ پر ملاحظہ کرلیں۔ مرتب۔)

نبی کریم ﷺ کی حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) کو نصیحتیں

حدیث ۱۰۷۷:-

وَعَنْ مُعَاذٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ بَعَثَنِي رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِلَى الْيَمَنِ فَقَالَ: إِنَّكَ تَأْتِيْ قَوْماً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَادْعُهُمْ إِلَى شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَإِنْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوْا لِذٰلِكَ فَإِيَّاكَ وَكَرَائِمَ أَمْوَالِهِمْ وَاتَّقِ دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَإِنَّهُ لَيْسَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ۔

ترجمہ:- حضرت معاذ بن جبل (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے یمن کے ایک حصہ کا حکمران اور گورنر بنا کر بھیجا (اس موقع پر نبی کریم ﷺ نے کچھ نصیحتیں فرمائیں) چناں چہ آپ نے ارشاد فرمایا: اے معاذ! تم جن لوگوں کے پاس جارہے ہو وہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس آسمانی کتاب موجود ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے اگلے نبیوں پر اتاری تھی (وہ لوگ اس کے ماننے والے ہیں) اس لیے ان کو پہلے (اسلام کی) دعوت دینا، اگر وہ اس بات کا اقرار کرلیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں تو پھر ان کو بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر رات اور دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں (یہی بتلانے کے لئے اس روایت کو لائے ہیں) پھر جب وہ ان نمازوں کو پڑھنے لگیں تو ان کو بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوٰۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے وصول کی جائے گی اور ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ پھر جب یہ بات بھی مان لیں (اور زکوٰۃ دینے کے لئے آمادہ ہو جائیں) تو ان کے بہترین مال کو وصول کرنے سے بچیو۔ اور مظلوم کی بددعا سے بھی بچیو، اس لئے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی حجاب اور آڑ نہیں ہے۔

افادات:- اس زمانہ میں عام طور پر مویشی اور جانوروں کی زکوٰۃ ہوا کرتی تھی، لوگوں کے پاس اونٹ، بکریاں، گائے وغیرہ ہی ہوا کرتے تھے جن کی زکوٰۃ کی وصول یابی کے لئے آدمی جاتا تھا۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے تاکید فرمائی تھی کہ جو جانور ایک دم عمدہ ہوں وہ نہ لئے جائیں، اور جو بالکل گھٹیا قسم کا ہو وہ بھی وصول نہ کیا جائے، بلکہ درمیانی قسم کا جانور لیا جائے جو نہ بالکل گھٹیا اور نہ بالکل بڑھیا ہو۔ گویا حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب وہ لوگ اپنے مال کی زکوٰۃ نکالنے لگیں تو پھر تم بھی ان کے مال میں جو سب سے اعلیٰ درجہ کا مال ہو، وہ مت لینا؛ بلکہ درمیانی قسم کا مال وصول کرنا۔

اور مظلوم کی بددعا سے بچنا، اس لئے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی حجاب اور آڑ نہیں ہے۔ مظلوم کی بددعا سیدھی پہنچتی ہے، بیچ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی:-

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

مظلوم کی آہ سے بچنا کہ جب وہ دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے قبولیت استقبال کے لئے آتی ہے۔

ترکِ نماز؛ شرک وکفر تک پہنچنے کا سبب

حدیث ۱۰۷۸:-

وَعَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَبَيْنَ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ.

ترجمہ:–حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مَیں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: آدمی اور شرک و کفر کے درمیان نماز چھوڑنے ہی کا فرق ہے۔

افادات:–یعنی کوئی آدمی اگر نماز چھوڑ دے گا تو گویا وہ شرک و کفر تک پہنچ گیا، اس نے شیطان کو اپنے اوپر ان چیزوں کے آزمانے کا موقع دے دیا۔ جو آدمی نماز چھوڑتا ہے، شیطان کو اس کے اوپر تمام گناہوں میں مبتلا کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز بڑی اہم چیز ہے۔

حدیث ۱۰۷۹:-

وَعَنْ بُرَيْدَةَ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اَلْعَهْدُ الَّذِیْ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمُ الصَّلَاةُ فَمَنْ تَرَكَهَا فَقَدْ كَفَرَ.

ترجمہ:–حضرت بریدہ اَسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ عہد وپیمان جو ہمارے اور ان (منافقین) کے درمیان ہے؛ وہ صرف نماز ہے، جس آدمی نے نماز چھوڑ دی گویا اس نے دین کا انکار کیا۔

افادات:–مطلب یہ ہے کہ جب تک کہ وہ نماز ادا کرتے رہیں گے، ہم ان کے ساتھ مسلمانوں والا معاملہ کرتے رہیں گے اور جب نماز چھوڑ دی تو اب ان کے ساتھ مسلمان والا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

تارکِ نماز کے متعلق صحابہ اور علماء کے نظریے

حدیث ۱۰۸۰:-

وَعَنْ شَقِيْقِ بْنِ عَبْدِ اللهِ التَّابِعِيِّ الْمُتَّفَقُ عَلَى جَلَالَتِهِ رَحِمَهُ اللهُ قَالَ: كَانَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ ﷺ لَا يَرَوْنَ شَيْئاً مِنَ الْأَعْمَالِ تَرْكُهُ كُفْرٌ، غَيْرَ الصَّلَاةِ.

ترجمہ:- حضرت شقیق بن عبد اللہ (رحمۃ اللہ علیہ) جو تابعی ہیں جن کے مقام اور جلالتِ شان پر تمام حضرات کا اتفاق ہے ان سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے صحابہ اعمال میں سے کسی چیز کے چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے، سوائے نماز کے۔

افادات:- یعنی نماز ایک ایسا عمل تھا کہ اگر کوئی آدمی اس کو چھوڑ دیتا تو حضراتِ صحابہ ایسے آدمی کو کافر سمجھتے تھے۔ نماز کے سلسلہ میں ائمہ اربعہ کے یہاں بھی بڑی تاکید ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل، حضرت عبد اللہ بن مبارک اور امام اسحاق بن راہویہ رحمۃ اللہ علیہم اسے کافر کہتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ: کوئی آدمی اگر جان بوجھ کر نماز چھوڑ دے؛ تو وہ کافر و مرتد ہو گیا، اسلام سے نکل گیا۔ اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کو قتل کر دیا جائے، الّا یہ کہ وہ توبہ کر کے دوبارہ اسلام قبول کر لے اور نماز شروع کر دے؛ تب تو چھوڑا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔

حضرت امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: جان بوجھ کر نماز چھوڑنے کی وجہ سے مرتد تو نہیں ہو گا، لیکن ان کے یہاں ایسے آدمی کی سزا قتل ہے۔ ایسے آدمی کو زندہ نہیں رکھا جائے گا، بلکہ حاکمِ مسلمان ایسے آدمی کو قتل کر دے گا۔

حضرت امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: جان بوجھ کر نماز چھوڑنے سے آدمی مرتد تو نہیں ہوتا، اوراس کو قتل بھی نہیں کریں گے، لیکن حاکمِ مسلمان ایسے آدمی کو جیل میں ڈال دے گا، اور جیل میں اس کو سزادی جاتی رہے گی، یہاں تک کہ وہ یا تو نماز پڑھنا شروع کردے، یا اسی حال میں اس کا انتقال ہوجائے، لیکن اس کو جیل سے چھوڑیں گے نہیں۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوا ہوگا کہ نماز کتنی اہم چیز ہے۔ حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے یہاں تو اس کے چھوڑنے کو کفر سمجھا جاتا تھا۔ آج اس کی طرف سے اتنی غفلت ہے کہ ہمارے معاشرے کا ایک بڑا حصّہ وہ ہے جو نماز ادا نہیں کرتا۔ حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی نگاہوں میں وہ کفر تک پہنچا ہوا سمجھا جاتا تھا۔ بہر حال! یہ بڑی اہم چیز ہے جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ ہر ہر محلہ میں، اوراس کے تمام مکانوں میں، اور کم سے کم اپنے اپنے گھروں میں تو اس کا اہتمام کیا جائے اور ایسی کوشش کی جائے کہ ہمارے گھر میں کوئی آدمی ایسا نہ ہو جو نماز چھوڑنے والا ہو۔ اگر ہر محلہ میں ایسی کوشش کی جائے گی؛ تو ان شاء اللہ اس میں کامیابی ہوسکتی ہے۔

نوافل بھی بہت کارآمد ہیں

حدیث ۱۰۸۱:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلَاتُهُ، فَإِنْ صَلَحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ، فَإِنِ انْتَقَصَ مِنْ فَرِيْضَتِهِ شَيْئاً، قَالَ الرَّبُّ

عَزَّوَجَلَّ: اُنْظُرُوْا ! هَلْ لِعَبْدِىْ مِنْ تَطَوُّعٍ. فَيُكَمَّلُ مِنْهَا مَا انْتَقَصَ مِنَ الْفَرِيْضَةِ. ثُمَّ يَكُوْنُ سَائِرُ أَعْمَالِهِ عَلَى هٰذَا.

ترجمہ:– حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندے کے اعمال میں سے قیامت کے روز سب سے پہلے نماز کا حساب لیا جائے گا، اگر نماز والا خانہ برابر نکلا تو وہ آدمی کامیاب اور بامراد ہوگا، اور اگر اس میں کوئی خرابی نکلی تو وہ ناکام اور نامراد ہوگا۔ اور اگر بندے کے فرائض میں کچھ کمی رہ جائے گی تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے: دیکھو! میرے بندے کے پاس کچھ نوافل ہیں یا نہیں؟ اگر کچھ نوافل ہوں گے تو فرائض کی کمی ان نوافل کے ذریعہ پوری کی جائے گی۔ پھر دوسرے تمام اعمال میں اسی قاعدہ کے مطابق حساب وکتاب ہوگا۔

افادات:– مدارس میں ایک کتاب "کریما" نامی پڑھائی جاتی ہے، اس میں نماز کے متعلق بیان کیا گیا ہے:–

روزِ محشر کہ جاں گداز بود ❖ اوّلیں پرسش نماز بود

محشر کے دن جب دھوپ اور شدّتِ گرمی کی وجہ سے آدمی پگھل رہے ہوں گے اس وقت سب سے پہلا سوال نماز کے متعلق کیا جائے گا۔ اس لئے کوئی آدمی اگر نماز کا اہتمام کرلے تو امید کی جاسکتی ہے کہ اس کی برکت سے کل کو قیامت میں اس کا معاملہ آسان ہو جائے گا۔

ہم میں سے بہت سے لوگ نوافل کا اہتمام نہیں کرتے۔ اگر کوئی سمجھاتا ہے تو کہتے ہیں کہ ہمارے فرائض ہی کا ٹھکانہ نہیں، تو پھر نوافل کہاں پڑھیں؟ حالاں کہ ایسا نہیں سوچنا چاہیے، جب

معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں فرائض میں ہونے والی کمی نوافل سے پوری کی جائے گی؛ تو پھر اس کی بھی مقدور بھر کوشش اور اہتمام ہونا چاہیے۔

اسی طرح تمام اعمال کا معاملہ ہو گا کہ روزے کے فرائض میں جو کمی رہ گئی ہو گی وہ نفل روزوں کے ذریعہ سے پوری کی جائے گی۔ زکوٰۃ میں جو کمی رہ گئی ہو گی؛ وہ نفل صدقات سے پوری کی جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفل اعمال کا بھی آدمی کو اہتمام کرنا چاہیے۔

بَابُ فَضْلِ الصَّفِّ الْأَوَّلِ وَالْأَمْرِ بِإِتْمَامِ الصُّفُوْفِ الْأُوَلِ وَتَسْوِيَتِهَا

پہلی صف کی فضیلت اور اگلی صفوں کو مکمل و درست کرنا اس میں خالی جگہ نہ چھوڑنا

اگلی صفوں کو مکمل کرنا اور اس میں خالی جگہ نہ چھوڑنا

حدیث ۱۰۸۲:

عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ (رضی اللہ عنہما) قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ: أَلَا تَصُفُّوْنَ كَمَا تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَكَيْفَ تَصُفُّ الْمَلَائِكَةُ عِنْدَ رَبِّهَا؟ قَالَ يُتِمُّوْنَ الصُّفُوْفَ الْأُوَلَ وَيَتَرَاصُّوْنَ فِي الصَّفِّ. (رواہ مُسلِم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت جابر بن سمرہ (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ تشریف لائے (مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ ہم لوگ ٹولیاں اور حلقے بنابنا کر بیٹھے ہوئے تھے، حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا بات ہے کہ میں تم کو حلقے بنا کر بیٹھا ہوا دیکھ رہا ہوں) کیا تم اُس طرح صفیں نہیں بناتے جس طرح فرشتے اپنے رب کے سامنے صفیں بناتے ہیں؟ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! فرشتے اللہ تعالیٰ کے سامنے کس طرح صف بندی کرتے ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگلی صفوں کو پہلے مکمل کرتے ہیں اور مل مل کر کھڑے رہتے ہیں (بیچ میں خالی جگہ نہیں چھوڑتے)۔

اذان دینے اور پہلی صف کی فضیلت

حدیث ۱۰۸۳:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَوْ يَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَاءِ وَالصَّفِّ الْأَوَّلِ ثُمَّ لَمْ يَجِدُوْا إِلَّا أَنْ يَّسْتَهِمُوْا عَلَيْهِ لَاسْتَهَمُوْا. (متفقٌ علَيه)

ترجمہ:۔حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان دینے اور پہلی صف میں نماز پڑھنے کی کتنی فضیلت ہے اور پھر وہ اس کو حاصل نہ کرسکیں سوائے اس کے کہ قرعہ اندازی ہو؛ تو ضرور قرعہ اندازی کریں۔

افادات:۔مطلب یہ ہے کہ اگر اتنے لوگ اس کے طلب گار ہوں کہ سب کو پہلی صف میں جگہ نہیں مل سکتی، یا سب کو اذان دینے کا موقعہ نہیں دیا جاسکتا اور کہا جائے کہ اس کے لئے قرعہ اندازی کرنے کی ضرورت پڑے گی، تو اس کے لئے بھی لوگ آمادہ ہو جائیں گے۔

بہترین صف کون سی؟

حدیث ۱۰۸۴:۔

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: خَيْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ أَوَّلُهَا، وَشَرُّهَا آخِرُهَا. وَخَيْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ آخِرُهَا، وَشَرُّهَا أَوَّلُهَا.(رواہ مُسلِم)

ترجمہ:۔حضرت ابوہریرہ(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مردوں کی بہترین صف پہلی صف ہے، اور ان کی سب سے بری صف آخری صف ہے۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے آخر میں ہے اور بری صف پہلی ہے۔

افادات:- پہلی صف آگے ہوتی ہے اور امام کے قریب ہوتی ہے، عورتوں سے دور ہوتی ہے۔ عورتوں کو نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں مسجد میں آنے کی اجازت تھی، بعد میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں ان کی خرابیوں کی وجہ سے ان کو روک دیا گیا۔ عورتوں سے دور ہونے کی وجہ سے پہلی صف میں ہر اعتبار سے خوبی ہی خوبی ہے۔ اور پچھلی صف عورتوں سے قریب ہوگی اس لئے اس کو برا بتلایا۔ اور عورتوں کی بہترین صف سب سے آخر میں ہوگی اور بری صف پہلی ہے کیونکہ وہ مردوں سے قریب ہوتی ہے، جتنی قریب ہوگی اتنے وسوسوں اور فتنوں کے مواقع زیادہ ہوں گے۔

جو پیچھے رہے گا؛ اس کو پیچھے ہی رکھا جائے گا

حدیث ۱۰۸۵:-

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ رَأَى فِي أَصْحَابِهِ تَأَخُّراً، فَقَالَ لَهُمْ: تَقَدَّمُوا، فَأْتَمُّوا بِي، وَلْيَأْتَمَّ بِكُمْ مَنْ بَعْدَكُمْ، لَا يَزَالُ قَوْمٌ يَتَأَخَّرُونَ، حَتَّى يُؤَخِّرَهُمُ اللهُ.

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے صحابہ میں پیچھے رہنے کا جذبہ محسوس کیا تو ارشاد فرمایا: آگے بڑھو اور میرے پاس کھڑے رہو، پھر جو بعد میں آئیں وہ تمہارے پیچھے کھڑے رہیں، لوگ برابر پیچھے ہٹتے چلے جائیں گے؛ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بھی ان کو پیچھے کر دے گا۔

افادات:- بعض لوگ بہت پہلے سے مسجد میں آجاتے ہیں لیکن مسجد کے کونے میں بیٹھے رہتے ہیں، جب جماعت کھڑی ہوتی ہے تو دوسروں کو پہلی صف میں جانے کا اشارہ کرتے ہیں اور پھر اخیری صف ہی میں کھڑے ہونے کی کوشش کرتے ہیں؛ یہ "تَأَخُّر" کہلاتا ہے۔ پیچھے رہنے والا یہ جو مزاج ہے اس کو نبیٔ کریم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا ہے۔ جب نبیٔ کریم ﷺ نے یہ محسوس کیا کہ صحابۂ کرام پہلی صف کا جیسا اہتمام کرنا چاہیے وہ نہیں کررہے ہیں، یا پہلی صف میں آکر بیٹھنا چاہیے وہ نہیں کرتے: تو اس پر ان کو ٹوکا۔

جو آدمی دین کے کاموں میں پیچھے رہنے کا مزاج بنائے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو پیچھے رکھیں گے۔ بلکہ بعض روایتوں میں تو ہے: لَا يَزَالُ قَوْمٌ يَتَأَخَّرُونَ عَنِ الصَّفِّ الْأَوَّلِ حَتَّى يُؤَخِّرَهُمُ اللهُ فِي النَّارِ (سنن أبوداود. باب صف النسآء و كراهية التاخر عن الصف الاول) جو آدمی ہمیشہ پہلی صف سے پیچھے رہتا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو پیچھے کرکے جہنم میں ڈال دے گا۔ یعنی ابھی تو پہلی صف سے پیچھے رہتا ہے لیکن ایک وقت آئے گا کہ پیچھے رہنے والا یہ جذبہ آدمی کو یہاں تک پہنچائے گا کہ نیکی کے کاموں کو چھوڑنے والا بن جائے گا اور یہی چیز عذابِ جہنم کا سبب بنے گی۔ اس لیے ایک مؤمن کا مزاج نیکی کے کاموں میں سبقت کرنے والا ہونا چاہئے، پیچھے رہنے والا مزاج نہیں ہونا چاہیے۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہو کہ وہ آگے بڑھے اور اس کو پہلی صف میں جگہ ملے۔

صفوں کی عدمِ درستگی کا دنیوی نقصان

حدیث ۱۰۸۶:-

وَعَنْ أَبِي مَسْعُودٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَمْسَحُ مَنَاكِبَنَا فِي الصَّلَاةِ، وَيَقُولُ: اسْتَوُوا وَلَا تَخْتَلِفُوا فَتَخْتَلِفُ قُلُوبُكُمْ، لِيَلِنِي مِنْكُمْ أُولُو الْأَحْلَامِ وَالنُّهَى ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ.

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود انصاری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نماز کے وقت ہمارے کندھوں پر ہاتھ رکھتے تھے (یعنی کندھے پر ہاتھ رکھ کر صفوں کو درست کرتے تھے) اور فرماتے تھے: صفیں سیدھی کرو، آگے پیچھے نہ رہو؛ ورنہ تمہارے دلوں میں اس کا اثر پہنچے گا تم میں جو بالغ اور عقلمند ہوں وہ میرے قریب رہیں، پھر وہ جو ان کے قریب ہوں، پھر وہ جو ان کے قریب ہوں۔

افادات:- دیکھو! صفوں کے درست نہ کرنے کا اثر دلوں تک پہنچتا ہے کہ اس کے نتیجہ میں دلوں میں بغض پیدا ہوتا ہے۔ تسویۂ صفوف یعنی صفوں کی درستگی کا دنیوی اعتبار سے بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو لوگ صفوں کی درستگی کا اہتمام کرتے ہیں ان کے دلوں میں آپس میں جوڑ اور تعلق و محبت پیدا ہوتی ہے، اور جو لوگ صف درست نہیں کرتے ان کے دلوں میں آپس میں توڑ اور عداوت و نفرت پیدا ہوتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر صفیں درست نہیں کرو گے تو تمہارے دلوں میں بھی اسی طرح سے اختلاف اور نفرت پیدا ہو گی۔

پھر ایک اور بات ارشاد فرمائی کہ تم میں جو بالغ اور عقلمند ہیں وہ میرے قریب رہیں۔ یعنی بڑی عمر کے اہلِ علم اور سمجھدار لوگوں کو پہلی صف میں ہونا چاہیئے، اس لئے کہ کبھی امام کو لقمہ دینے کی ضرورت پیش آتی ہے اور کبھی مسائل کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر اہلِ علم اور سمجھدار آگے نہیں ہوں گے تو پھر لقمہ کون دے گا؟ اور بوقتِ ضرورت جگہ کون سنبھالے گا؟ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بالغ اور بڑی عمر کے اور اہلِ علم ہیں، ان کو خود ہی صفوں میں آگے رہنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

صفوں کی درستگی تکمیلِ نماز کا حصہ

حدیث ۱۰۸۷:-

عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ، فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصَّفِّ مِنْ تَمَامِ الصَّلَاةِ.

وَفِيْ رِوَايَةِ الْبُخَارِيْ: فَإِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی صفیں درست کرو، اس لئے کہ صفوں کا درست کرنا؛ نماز کے مکمل ہونے کا ایک حصہ ہے۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ صفوں کا درست کرنا نماز کے قائم کرنے کا ایک حصہ ہے۔

افادات:- چوں کہ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ﴿أَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ نماز قائم کرو۔ تو نماز قائم کرنے میں جہاں نماز کے ارکان، فرائض، واجبات، سنتیں ادا کرنا داخل ہے؛ وہیں صفوں

کو درست کرنا بھی نماز کے قائم کرنے کا ایک حصہ ہے۔اس لیے جو لوگ صفوں کو درست کرنے کا اہتمام نہیں کرتے؛یوں سمجھا جائے گا کہ وہ نماز کے قائم کرنے والے حکم میں کوتاہی کے مرتکب ہیں۔

حدیث ۱۰۸۸:-

وعنه، قَالَ: أُقِيمَتِ الصَّلاَةُ فَأَقْبَلَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ ﷺ بِوَجْهِهِ، فَقَالَ: ((أَقِيمُوا صُفُوفَكُمْ وَتَرَاصُّوا؛ فَإِنِّي أَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِي)) (رواه البُخَارِيُّ بلفظه، ومسلم بمعناه)

وفی روایة للبخاری: وَكَانَ أَحَدُنَا يُلْزِقُ مَنْكِبَهُ بِمَنْكِبِ صَاحِبِهِ وَقَدَمَهُ بِقَدَمِهِ.

ترجمہ:- حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ (ایک مرتبہ) نماز کے لیے اقامت کہہ دی گئی،اس کے بعد حضور اکرم ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے پھر فرمایا:اپنی صفیں درست کرو،اورآپس میں خوب لگ کر کھڑے رہو اس لیے کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے بھی دیکھتا ہوں۔

افادات:- یعنی میں نماز کے لیے قبلہ کی طرف رخ کرکے کھڑا ہو گیا،یہ سمجھ کر صفوں کی درستگی کے معاملہ میں غفلت و کوتاہی سے کام نہ لو کہ مجھے معلوم نہیں،بلکہ میں تم کو اپنی پشت کی طرف سے بھی اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں۔

صفیں درست کرو؛ورنہ...

حدیث ۱۰۸۹:-

وَعَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ أَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُسَوِّيْ صُفُوْفَنَا حَتّٰى كَأَنَّمَا يُسَوِّيْ بِهَا الْقِدَاحَ، حَتّٰى رَأٰى أَنَّا قَدْ عَقَلْنَا عَنْهُ، ثُمَّ خَرَجَ يَوْماً فَقَامَ حَتّٰى كَادَ يُكَبِّرُ فَرَأٰى رَجُلاً بَادِياً صَدْرُهُ مِنَ الصَّفِّ، فَقَالَ: عِبَادَ اللّٰهِ لَتُسَوُّنَّ صُفُوْفَكُمْ أَوْ لَيُخَالِفَنَّ اللّٰهُ بَيْنَ وُجُوْهِكُمْ.

ترجمہ:—حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تم یا تو اپنی صفوں کو درست کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں میں اختلاف ڈال دیں گے، یا تمہارے چہروں کو پھیر دیں گے۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے یہ ارشاد کس موقع پر فرمایا تھا۔ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہماری صفوں کو درست کرنے کا اتنا اہتمام فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ذریعہ تیروں کو درست کیا جا رہا ہو (اور آپ ﷺ کا یہ معمول تھا کہ روزانہ صفیں اسی طرح درست فرمالیا کرتے تھے) یہاں تک کہ جب نبی کریم ﷺ نے محسوس کیا کہ ہم لوگ یہ بات بخوبی سمجھ اور سیکھ گئے ہیں (تو پھر روزانہ صفوں کو سیدھا کرنا چھوڑ دیا۔ اس لیے کہ جس چیز کی عادت ڈالنی تھی اس کی عادت پڑ چکی، اور صحابہ از خود صفیں سیدھی کرنے کا اہتمام کرنے لگے؛ تو نبی کریم ﷺ نے کندھے پکڑ کر صفیں درست کرنا چھوڑ دیا، صرف دیکھ لیا کرتے تھے کہ صفیں درست ہیں یا نہیں) پھر ایک دن نبی کریم ﷺ تشریف لائے اور اپنے مصلّے پر کھڑے ہوئے اور تکبیر کہہ کر نماز شروع کرنا چاہتے ہی تھے کہ آپ کی نظر پڑی کہ ایک آدمی کا سینہ صف سے آگے نکلا ہوا ہے، تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے اللہ کے بندو! صفیں درست کرو، ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کو پھیر دیں گے۔

افادات:- "قِدَاح" تیروں کی جو لکڑیاں ہوتی تھیں ان میں لوہا ڈالنے سے پہلے بڑے اہتمام سے ان کو پوری طرح سیدھا کیا جاتا تھا، اس لئے کہ اگر لکڑی برابر سیدھی نہ ہو، تو پھر تیر نشانہ پر نہیں جائے گا۔ تو صحابی فرماتے ہیں کہ ہم لوگوں کی صفوں کو نبیٔ کریم ﷺ اتنے اہتمام سے درست کرتے تھے کہ ان صفوں پر تیروں کی لکڑیاں رکھ کر معلوم کیا جاسکتا تھا کہ وہ سیدھی ہیں یا نہیں۔

چہروں کو پھیرنے کا مطلب بعضوں نے یہ بیان کیا ہے کہ: دلوں میں نفرت بیٹھ جائے گی اور دلوں میں آپس میں بغض پیدا ہوگا جس کے نتیجہ میں تم میں سے ہر ایک اپنا چہرہ دوسرے سے پھیرنے کی کوشش کرے گا۔ جیسا کہ آپس میں جب اختلاف ہوتا ہے تو ایک کو دیکھ کر دوسرا اپنا منھ پھیر لیتا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ: صفوں کو درست نہ کرنے کا نتیجہ چہروں کے بگڑنے کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ گویا یہ چیز چہروں کے مسخ ہو جانے کا سبب بن سکتی ہے، اس لئے اس سے خاص طور پر بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اگلی صف والوں پر رحمت بھیجتے ہیں

حدیث ۱۰۹۰:-

وَعَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ : كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَخَلَّلُ الصَّفَّ مِنْ نَاحِيَةٍ إِلَى نَاحِيَةٍ يَمْسَحُ صُدُوْرَنَا وَمَنَاكِبَنَا وَيَقُوْلُ لَا تَخْتَلِفُوْا فَتَخْتَلِفَ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ يَقُوْلُ إِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلَى الصُّفُوْفِ الْأَوَّلِ.

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ صف میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ تک تشریف لے جاتے تھے، اور ہمارے سینوں اور کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے تھے کہ سیدھے کھڑے ہیں یا نہیں۔ اور یہ بھی ارشاد فرماتے تھے: آگے پیچھے مت کھڑے رہو، ورنہ تمہارے دلوں پر اس کا اثر پڑے گا۔ اور فرماتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اگلی صف والوں پر رحمت بھیجتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتے ہیں اور فرشتے ان کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں)۔

بڑا وعدہ اور سخت وعید

حدیث ۱۰۹۱:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَقِيْمُوا الصُّفُوْفَ وَحَاذُوْا بَيْنَ الْمَنَاكِبِ، وَسُدُّوا الْخَلَلَ، وَلِينوا بِأَيْدِي إِخْوَانِكُمْ، ولاَ تَذَرُوا فُرُجَاتٍ لِلشَّيْطَانِ، وَمَنْ وَصَلَ صَفّاً وَصَلَهُ اللهُ، وَمَنْ قَطَعَ صَفّاً قَطَعَهُ اللهُ. (رواه أبو دَاوُدَ بإسناد صحيح)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: صفیں سیدھی کرو اور کندھے ایک دوسرے کے برابر رکھو (یعنی تمہارا اور پاس والے کا کندھا سیدھا ہونا چاہیے) اور بیچ میں خالی جگہ ہو تو اس کو پُر کرلو (ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دو آدمی کے بیچ میں ایک بالشت کی جگہ خالی رہ جائے) اور اپنے بھائیوں کے ہاتھ میں نرم بن جاؤ۔ اور شیطان کے لئے خالی جگہ بیچ میں مت چھوڑو (اگر بیچ میں خالی جگہ رہ جاتی ہے تو شیطان آکر وہاں کھڑا ہو جاتا ہے) اور جو آدمی صف کو جوڑے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے جوڑے گا، اور جو آدمی صف کو کاٹے گا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی رحمت سے کاٹے گا۔

افادات:- اس روایت میں صف سیدھی کرنے پر وعدہ بھی بڑا ہے، بہت سخت وعید بھی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے ایک آدمی صف میں برابر کھڑا نہیں ہے، بعد میں آنے والا محسوس کرتا ہے کہ صف برابر نہیں ہے، تو اس کو ٹھیک کرنے کے لئے کبھی کسی کا کندھا پکڑتا ہے، ایسے موقعہ پر بعض آدمیوں کی عادت ہوتی ہے کہ اکڑ جاتے ہیں، نماز میں کچھ کہہ تو سکتے نہیں، لیکن اپنے کندھے اور جسم کو اکڑا کر اس سے گویا اپنے اختلاف کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں، تو نبیٔ کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا مت کرو، بلکہ اپنے بھائیوں کے ہاتھوں میں نرم بن جاؤ یعنی اگر کوئی صف درست کرنے کے لئے کبھی کسی موقعہ پر تم کو ہاتھ لگائے تو اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ وہ جو کروانا چاہتا ہے وہ کرلو اور صف کو برابر ٹھیک کرلو۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ صف کو جوڑنے کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، اور ذرّہ برابر بھی کوتاہی نہ ہو کہ جس کے نتیجہ میں صف کے ٹوٹنے کی نوبت آجائے۔

شیطان صف کی درمیانی خالی جگہ میں گھس جاتا ہے

حدیث ۱۰۹۲:-

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: رُصُّوْا صُفُوْفَكُمْ، وَقَارِبُوْا بَيْنَهَا وَحَاذُوْا بِالْأَعْنَاقِ، فَوَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهِ! إِنِّيْ لَأَرَى الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ مِنْ خَلَلِ الصَّفِّ كَأَنَّهَا الْحَذَفُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی صفوں کو مضبوط رکھو، اور صفوں کو قریب قریب رکھو (یعنی صفوں کے درمیان میں بھی جتنی ضرورت ہو اتنا ہی فصل ہونا چاہیے تاکہ

پچھلی صف والے اطمینان سے سجدہ کر سکیں، ایسا نہ ہو کہ پہلی اور دوسری صف کے درمیان دس پندرہ فٹ کی دوری رکھی جائے)اور گردنیں آپس میں مقابلہ میں رکھو (کندھوں سے کندھا ملا کر رکھیں گے تو اس کے نتیجہ میں گردنیں بھی ایک لائن میں آجائیں گی۔ پھر حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، مَیں شیطان کو دیکھ رہا ہوں کہ صف کے درمیان اس طرح داخل ہو جاتا ہے جیسے چھوٹی بکریاں (گھس جاتی ہیں)۔

افادات:- ”رُصُّوْ“ ”رَصَاصُ“ سے ماخوذ ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوتی ہے، اسی طرح درمیان میں کوئی خالی جگہ نہ رہے

”حَذَفٌ“ یمن میں چھوٹی چھوٹی سیاہ بکریاں ہوا کرتی ہیں جو معمولی جگہ بھی پاتی ہیں تو گھس جاتی ہیں، اسی طرح شیطان بھی جب صف میں ذرا سا فصل دیکھتا ہے تو اندر گھس کر اپنی کاروائی شروع کر دیتا ہے، اس لئے نمازیوں کو چاہیے کہ صفوں کے درمیان میں ذرّہ برابر بھی فصل اور خالی جگہ نہ چھوڑیں۔

صفوں کی ترتیب

حدیث ۱۰۹۳:-

وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: أَتِمُّوا الصَّفَّ الْمُقَدَّمَ ثُمَّ الَّذِيْ يَلِيْهِ، فَمَا كَانَ مِنْ نَقْصٍ فَلْيَكُنْ فِيْ الصَّفِّ الْمُؤَخَّرِ. (رواه أبو داود بإسناد حسن)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلی صف کو مکمل کرو، پھر اس کے بعد والی (اسی طرح ترتیب سے یکے بعد دیگرے صفوں کو مکمل کرتے رہو) یہاں تک کہ جو کمی رہ جائے وہ اخیری صف میں رہے۔

افادات:- ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ پہلی صف بھی ادھوری ہے، دوسری بھی ادھوری ہے، تیسری بھی ادھوری ہے، بلکہ جب تک کہ پہلی صف مکمل نہ ہو وہاں تک دوسری صف شروع نہ کی جائے۔

صفوں کی ترتیب کے سلسلہ میں حضور اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: "وَسِّطُوا الْإِمَامَ" امام کو بیچ میں رکھو۔ فقہاء نے اس کا طریقہ یہی بتلایا ہے کہ جب امام کھڑا ہو تو پہلا آدمی امام کے پیچھے کھڑا ہو، اس کے بعد پھر دائیں طرف، پھر بائیں طرف، پھر دائیں طرف، پھر بائیں طرف؛ اسی طرح ہر آنے والا دیکھتا رہے کہ کس طرف زیادہ لوگ کھڑے ہیں، جدھر کم لوگ ہوں اس طرف وہ کھڑا ہو جائے، اسی طرح پہلی صف مکمل ہو گی۔ چوں کہ نبی کریم ﷺ نے امام کو بیچ میں رکھنے کا حکم دیا ہے، اس لیے ہر مصلّی اس بات کا خیال رکھے کہ امام بیچ میں رہے، اور اس کا طریقہ وہی ہو گا جو ابھی بتلایا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ دائیں طرف آٹھ دس آدمی کھڑے ہوتے چلے گئے اور بائیں طرف ایک دو آدمی ہی ہیں، اس صورت میں تو دائیں طرف والا صف کا حصہ لمبا ہو گیا اور بائیں طرف والا چھوٹا رہا؛ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام بیچ میں نہیں آپایا۔

ہاں! اگر قریب ہی میں یہ کمی پوری ہونے کی امید ہو، مثلاً نمازی مسلسل آرہے ہیں، تو اس صورت میں اگر ایک طرف دو چار آدمی زیادہ ہو گئے، اور ایک دو منٹ بعد دوسری طرف بھی آگئے

تو کوئی اشکال کی چیز نہیں ہے۔ لیکن اگر ایسی امید نہیں ہے، بلکہ خیال یہ ہے کہ صف اسی طرح آخر تک رہے گی، تو اس صورت میں پہلے ہی سے ہر آنے والے کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ اور پہلی صف جب مکمل ہو جائے اس کے بعد دوسری صف شروع کی جائے، پہلی صف میں جگہ ہوتے ہوئے دوسری صف شروع کرنا درست نہیں ہے۔

دائیں جانب کی صف والوں پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی رحمت

حدیث ۱۰۹۴:-

وَعَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّوْنَ عَلٰى مَيَامِنِ الصُّفُوْفِ. (رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ بِإِسْنَادٍ عَلٰى شَرْطِ مُسْلِمٍ وَفِيْهِ رَجُلٌ مُخْتَلَفٌ فِيْ تَوْثِيْقِهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دائیں جانب کی صف والوں پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتے ہیں اور اس کے فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔

افادات:- لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صف کی دائیں جانب والا حصہ حاصل کرنے کے لئے صفوں کی اس ترتیب کی خلاف ورزی کی جائے جو نبی کریم ﷺ نے بتلائی ہے، بلکہ اسی طریقہ اور ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اگر دائیں طرف کھڑے رہ سکتے ہیں؛ تب ہی یہ فضیلت حاصل ہوگی، اس لیے وہ طریقہ تو ملحوظ رکھنا ہی چاہیے

اگرچہ اس روایت پر امام بیہقی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کلام کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: صحیح اس طرح ہے: ”اِنَّ اللہَ وَمَلَائِکَتَہُ یُصَلُّوْنَ عَلَی الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ صُفُوْفاً“ (پہلے بھی ایک روایت آچکی ہے کہ) جو لوگ صفوں کو جوڑنے کا اہتمام کرتے ہیں، اور بیچ میں خالی جگہ نہیں رہنے دیتے، ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتے ہیں اور اللہ کے فرشتے بھی ان کے لئے رحمت کی دعائیں کرتے ہیں۔ اس صورت میں تو پھر کوئی اشکال باقی ہی نہیں رہے گا۔

سلام کے بعد امام صاحب کس طرف رخ کریں؟

حدیث ۱۰۹۵:-

وَعَنِ الْبَرَاءِ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: کُنَّا اِذَا صَلَّیْنَا خَلْفَ رَسُوْلِ اللہِ ﷺ أَحْبَبْنَا أَنْ نَکُوْنَ عَنْ یَمِیْنِہٖ یُقْبِلُ عَلَیْنَا بِوَجْھِہٖ فَسَمِعْتُہُ یَقُوْلُ: رَبِّ قِنِیْ عَذَابَكَ یَوْمَ تَبْعَثُ أَوْ تَجْمَعُ عِبَادَكَ.

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے تو اس بات کو پسند کرتے تھے کہ آپ ﷺ کی دائیں طرف کھڑے رہیں، اس لیے کہ آپ ﷺ اپنے چہرے سے اسی طرف متوجہ ہوتے تھے، اور (سلام کے بعد) میں نے حضورِ اکرم ﷺ کو یہ دعا فرماتے ہوئے سنا: **اے اللہ! تو اپنے بندوں کو جب قیامت کے روز دوبارہ زندہ کر کے اُٹھائے گا؛ اس روز مجھے اپنے عذاب سے محفوظ رکھیو۔**

افادات:- سلام پھیرنے کے بعد جب مصلّیوں کی طرف رخ پھیرنے کا وقت آتا تھا تو عام طور پر نبی کریم ﷺ دائیں طرف رخ پھیرتے تھے۔ یہ طریقہ پسندیدہ تو ہے لیکن آدمی اس کو ضروری

نہ سمجھے، اس لیے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کی روایت موجود ہے کہ کوئی آدمی اگر ضروری سمجھتا ہو کہ دائیں طرف ہی سے گھومنا چاہیے، تو اس نے اپنی نماز میں شیطان کا حصہ رکھ دیا، اس لیے کہ میں نے بہت سی مرتبہ حضور اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ بائیں طرف چہرہ گھماتے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ طریقہ بھی حضور ﷺ سے ثابت ہے، البتہ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا تھا کہ آپ دائیں طرف گھوم کر نمازیوں کی طرف اپنا رخ فرما کر بیٹھا کرتے تھے۔

یہ محبت کی بات ہے

حضراتِ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) کو نبی کریم ﷺ کے ساتھ جو محبت اور تعلق تھا اس کی وجہ سے وہ لوگ ہر وقت آپ کے دیدار کے متمنی رہا کرتے تھے، اسی کے پیشِ نظر وہ حضرات اس بات کو پسند کرتے تھے کہ دائیں طرف کھڑے رہیں تاکہ سلام پھیرنے کے بعد مصلّیوں کی طرف جب چہرہ پھیرنے کا وقت آئے تو چوں کہ اکثر حضور اکرم ﷺ دائیں طرف رخ پھیرتے ہیں تو آپ کے چہرے پر ہماری نظر پہلے پڑ جائے۔ یہ محبت کی بات ہے۔ اور حضور اکرم ﷺ یہ دعا امّت کی تعلیم کے لئے کیا کرتے تھے، اس لئے کہ اصل میں تو یہ دعا امّت ہی کے لئے ہے۔

بہر حال! اس روایت کو اور اگلی روایت کو لا کر صف کے دائیں طرف والے حصہ کے بہتر ہونے کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ میں نے بتلا دیا کہ دائیں طرف کو حاصل کرنے میں صفوں کی

ترتیب کے سلسلہ میں جو ہدایتیں دی گئی ہیں اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ اگر صف کی بائیں طرف کوئی نہیں ہے اور آپ دائیں طرف کھڑے ہو گئے، تو گویا صف کے بنانے میں جو ترتیب بتلائی گئی ہے اس کی رعایت نہیں ہو گی، اور ویسے بھی یہ برا معلوم ہوتا ہے۔

امام کو بیچ میں رکھو، اور خالی جگہ پُر کرو

حدیث ۱۰۹۶:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: وَسِّطُوْا الْإِمَامَ وَسُدُّوْا الْخَلَلَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: امام کو بیچ میں رکھو، اور خالی جگہ پُر کرو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ہر آنے والا اس انداز سے کھڑا ہو کہ امام بیچ میں رہے، امام تو اپنی جگہ پر رہے گا لیکن مصلّی ایک ہی طرف کھڑے ہونا شروع کریں گے تو اس صورت میں امام بیچ میں نہیں رہے گا، اس لئے یہ بتلایا گیا کہ ہر آنے والا صف کی پوزیشن کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے لئے کھڑے ہونے کا فیصلہ کرے۔ اگر دیکھ رہا ہے کہ دائیں طرف لوگ زیادہ ہیں تو بائیں طرف کھڑا رہے، اور اگر بائیں طرف زیادہ ہیں تو دائیں طرف کھڑا رہے؛ تاکہ امام کو بیچ میں رکھنے والا نبیٔ کریم ﷺ کا جو حکم ہے اس پر عمل ہو جائے۔ اور صفوں کی خالی جگہوں کو پُر کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے، پہلے بھی روایت گزر چکی ہے، نبیٔ

کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی صف کو جوڑے گا؛ اللہ تعالیٰ اس کو جوڑے گا، اور جو صف کو کاٹے گا؛ اللہ تعالیٰ اس کو کاٹے گا۔ صف کو نہ جوڑنے پر بہت سخت وعید بھی ہے، اس لئے اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔

فَضْلُ السُّنَنِ الرَّاتِبَةِ مَعَ الْفَرَائِضِ وَبَيَانِ أَقَلِّهَا وَأَكْمَلِهَا وَمَا بَيْنَهُمَا

سننِ موکدہ کی تعداد اور اس کی فضیلت

فرض نمازیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بندوں کے لئے لازم کی گئی ہیں ان کو اپنے اوقات میں ادا کیا جاتا ہے، اس میں فرض کے علاوہ بھی کچھ نمازیں اس سے پہلے اور بعد میں رکھی گئی ہیں، جیسے: فجر میں دو رکعات فرض ہے، لیکن اس سے پہلے دو رکعات بطورِ سنّت ادا کروائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ظہر میں اصل فرض تو چار رکعات ہے، لیکن اس سے پہلے چار رکعات اور بعد میں دو رکعات ہیں۔ تو فرض نماز کے علاوہ جو رکعتیں سنّت اور نفل کے طور پر ادا کی جاتی ہیں ان کی فضیلت کو اس باب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

روزانہ بارہ رکعات سنتِ موکدہ پڑھنے پر جنت کا مکان

حدیث ۱۰۹۷:-

عَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ أُمِّ حَبِيْبَةَ رَمْلَةَ بِنْتِ أَبِي سُفْيَانَ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يُصَلِّي لِلّٰهِ تَعَالٰى كُلَّ يَوْمٍ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً تَطَوُّعاً غَيْرَ الْفَرِيْضَةِ؛ إِلَّا بَنَى اللهُ لَهُ بَيْتاً فِي الْجَنَّةِ، أَوْ إِلَّا بُنِيَ لَهُ بَيْتٌ فِي الْجَنَّةِ. (رواہ مُسلِمٌ)

ترجمہ:- امّ المؤمنین حضرت امّ حبیبہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو مسلمان بندہ اللہ تعالیٰ کے واسطے ہر روز بارہ رکعتیں نفل فرض کے علاوہ ادا کرے گا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنّت میں ایک مکان بنائے گا، یا یہ کہ اس کے لئے جنّت میں ایک مکان بنایا جائے گا۔

افادات:- اس سے مراد سنتِ موکدہ ہے جو فرائض کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ فجر سے پہلے دو سنّت، ظہر سے پہلے چار رکعت اور بعد میں دو، مغرب کے بعد دو، اور عشاء کے بعد دو؛ یہ کل بارہ ہو جاتی ہیں۔ ان کی ادائیگی کی بڑی تاکید آئی ہے، اور ان میں بھی فجر کی دو سنتوں کی سب سے زیادہ تاکید آئی ہے، حتّٰی کہ سفر میں بھی نبیٔ کریم ﷺ اس کو نہیں چھوڑتے تھے۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ فجر کی سنّت کا اہتمام کرو، چاہے تمہیں گھوڑے روند ڈالیں (ابوداود، ۱/۴۰۲) مطلب یہ ہے کہ چاہے کیسے ہی حالات اور تکلیف کیوں نہ ہو، اس کو پابندی سے ادا کرنا چاہیے۔

بہر حال! یہ سننِ مؤکدہ جن کو سننِ رواتب بھی کہتے ہیں، ان کی ادائیگی کی بڑی تاکید ہے۔ اسی لئے فقہاء فرماتے ہیں کہ جو آدمی ان سنتوں کو چھوڑے گا وہ ملامت کے قابل ہے، اور جو اس کا عادی بن جائے گا اس کی شہادت بھی قابلِ قبول نہیں۔ آج کل اس کی طرف سے بڑی بے رغبتی برتی جاتی ہے، بہت سے لوگ مسجد میں آتے ہیں اور وقت ہونے کے باوجود ان کو پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے؛ یہ بالکل غلط طریقہ ہے جو قابلِ ترک ہے۔ بہر حال! ان کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

حدیث ۱۰۹۸:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) قَالَ : صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْمَغْرِبِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَآءِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں، اور ظہر کے بعد دو رکعتیں، اور جمعہ کی نماز کے بعد دو رکعتیں، اور مغرب کے بعد دو رکعتیں، اور عشاء کے بعد دو رکعتیں ادا کیں۔

افادات:- اس روایت میں ظہر سے پہلے دو رکعت کا تذکرہ ہے، اور فجر سے پہلے کی دو رکعت کا تذکرہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ دوسری روایتوں میں ہے، اس لیے فقہاء نے ان ساری روایتوں کے مجموعے کو سامنے رکھتے ہوئے ان بارہ رکعتوں کی تاکید فرمائی ہے جو مَیں اوپر بتلا چکا ہوں۔

اذان واقامت کے درمیان سنتیں

حدیث ۱۰۹۹:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلَاةٌ. قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَآءَ. (متفق علیہ)

اَلْمُرَادُ بِالْأَذَانَيْنِ: اَلْأَذَانُ وَالْإِقَامَةُ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مغفَّل (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبئ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دونوں اذانوں کے درمیان میں نماز ہے، دونوں اذانوں کے درمیان میں نماز ہے، دونوں اذانوں کے درمیان میں نماز ہے۔ تیسری مرتبہ میں فرمایا کہ جو آدمی پڑھنا چاہے۔

افادات:- دواذان سے مراد اذان اور اقامت ہے۔ اوران کے درمیان میں جو نماز کا تذکرہ کیا ہے اس سے مراد نفل یا سنّت ہے۔ ویسے تو تمام نمازوں میں فرض سے پہلے سنن ہیں، جیسے: فجر سے پہلے دو، ظہر میں چار، عصر میں بھی چار یا دو سنتِ غیر مؤکدہ ہیں، اسی طرح عشاء میں بھی فرض سے پہلے چار غیر مؤکدہ ہیں، لیکن مغرب کی نماز سے پہلے سنّت ہے یا نہیں ؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے۔ احناف کے نزدیک مغرب کی اذان کے بعد اور مغرب کی فرض سے پہلے کوئی سنّت نہیں ہے۔ حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ مباح کا درجہ ہے یعنی جائز ہے، کوئی آدمی اگر پڑھنا چاہے؛ تو پڑھ سکتا ہے، باقی اس کے مستحب اور سنّت ہونے کا حکم نہیں لگائیں گے۔ ہاں! شوافع کے نزدیک مستحب ہے۔ اس کی تفصیل مغرب کی سنتوں کے بیان میں آگے آئے گی۔

بَابُ تَاكِيدِ رَكْعَتَيْ سُنَّةِ الصُّبْحِ

فجر کی دو سنتوں کی تاکید

جیسا کہ ابھی بتلایا کہ بارہ رکعتیں سنت ادا کی جاتی ہیں، ان میں فجر کی دو سنتیں بھی آجاتی ہیں، لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس باب میں اس کو الگ سے بیان کرتے ہیں۔

حدیث ۱۱۰۰:-

عَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَدَعُ أَرْبَعًا قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْغَدَاةِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں کو، اور فجر سے پہلے دو رکعتوں کو کبھی نہیں چھوڑتے تھے۔

افادات:- دیکھو! اس روایت میں ظہر سے پہلے کی چار رکعت کا تذکرہ آیا ہے۔ اور فجر سے پہلے کی دو رکعتوں کا بڑا اہتمام ہے۔

حدیث ۱۱۰۱:-

وَعَنْهَا قَالَتْ: لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى شَيْءٍ مِنَ النَّوَافِلِ أَشَدَّ تَعَاهُدًا مِنْهُ عَلَى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ.

ترجمہ:– حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ فرض کے علاوہ دوسری نمازوں میں کسی نماز کا اتنا زیادہ اہتمام اور پابندی نہیں کرتے تھے جتنی فجر کی دو رکعتوں کا اہتمام فرماتے تھے۔

حدیث ۱۱۰۲:-

وَعَنْهَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: رَكْعَتَا الْفَجْرِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا.

ترجمہ:– حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: فجر کی دو رکعتیں؛ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے ان سب سے بہتر ہے۔

افادات:– ویسے تو دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر تو ایک مرتبہ سبحان اللہ کہنا بھی ہے، لیکن عام طور پر آدمی دنیا کے حصول میں مشغولی کے نتیجہ میں جن چیزوں کو چھوڑا کرتا ہے ان میں سنتیں بھی ہیں، اس لئے خاص طور پر اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا فجر کی سنتوں کا اہتمام / ایک واقعہ

حدیث ۱۱۰۳:-

وَعَنْ أَبِي عَبْدِاللهِ بِلَالِ بْنِ رِبَاحٍ (رضی اللہ عنہ) مُؤَذِّنِ رَسُولِ اللهِ ﷺ أَنَّهُ أَتَى رَسُولَ اللهِ ﷺ لِيُؤْذِنَهُ بِصَلَاةِ الْغَدَاةِ فَشَغَلَتْ عَائِشَةُ (رضی اللہ عنہا) بِلَالًا بِأَمْرٍ سَأَلَتْهُ عَنْهُ حَتَّى أَصْبَحَ جِدًّا فَقَامَ بِلَالٌ فَآذَنَهُ بِالصَّلَاةِ وَتَابَعَ أَذَانَهُ، فَلَمْ يَخْرُجْ رَسُولُ اللهِ ﷺ. فَلَمَّا خَرَجَ صَلَّى بِالنَّاسِ فَأَخْبَرَهُ أَنَّ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) شَغَلَتْهُ بِأَمْرٍ سَأَلَتْهُ عَنْهُ حَتَّى أَصْبَحَ

جِدًّا، وَأَنَّهُ أَبْطَأَ عَلَيْهِ بِالْخُرُوجِ. فَقَالَ يَعْنِيْ النَّبِيَّ ﷺ: إِنِّيْ كُنْتُ رَكَعْتُ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! إِنَّكَ أَصْبَحْتَ جِدًّا. قَالَ: لَوْ أَصْبَحْتُ أَكْثَرَ مِمَّا أَصْبَحْتُ لَرَكَعْتُهُمَا وَأَحْسَنْتُهُمَا وَأَجْمَلْتُهُمَا.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) جو حضورِ اکرم ﷺ کے مؤذن تھے ان سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ وہ نبیٔ کریم ﷺ کے پاس فجر کی نماز کا وقت ہو جانے کی اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئے (حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) کا معمول تھا کہ وہ اپنے وقت پر اذان دے دیا کرتے تھے اور جب جماعت کا وقت قریب ہوتا تو نبیٔ کریم ﷺ کو اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی اسی عادت کے مطابق فجر کی نماز کی تیاری کی اطلاع دینے کے لئے حاضر ہوئے تو) حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے حضرت بلال سے کوئی بات دریافت کی اور اُس میں ان کو مشغول کر دیا (ان کے اس سوال و جواب کی گفتگو میں ذرا تاخیر ہوگئی) یہاں تک کہ صبح خوب روشن ہوگئی (حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو جواب دینے کے بعد) حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) (نے محسوس کیا کہ آج اُجالا زیادہ ہو چکا ہے، تو) نبیٔ کریم ﷺ کو اطلاع دینے لگے (کہ اے اللہ کے رسول! فجر کا وقت ہوگیا ہے) اور مسلسل اطلاع دیتے رہے، لیکن ان کے بار بار اطلاع کرنے کے باوجود نبیٔ کریم ﷺ اپنے حجرہ سے فوراً نہیں نکلے، بلکہ کچھ دیر بعد باہر تشریف لائے اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) نے (بار بار متوجہ کرنے کی معذرت کے طور پر) نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا: (اے اللہ کے رسول!) حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے مجھ سے ایک بات پوچھی تھی، اس گفتگو میں مجھے ایسا مشغول کر دیا کہ صبح کا اُجالا زیادہ ہو گیا (پھر میں نے آپ کو وقت ہو جانے کی اطلاع دی) لیکن آپ نے بھی نماز کے لیے نکلنے میں دیر فرمائی۔ اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (جب تم نے مجھے جماعت کی اطلاع دی) اس وقت میں فرض سے پہلے کی دو رکعت سنتوں کی ادائیگی میں مشغول تھا۔ حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! صبح تو بہت زیادہ ہو چکی تھی (اس کے باوجود آپ دو رکعت کی ادائیگی میں مشغول ہوئے؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آج

جتنی دیر ہوئی اُس سے بھی زیادہ دیر ہو جاتی ؛تب بھی میں ان دو رکعتوں کو ادا کرتا اور (مختصر انداز میں ، لیکن ہر ہر رکن کو) پورے طور پر ادا کرتے ہوئے اچھے طریقے سے پڑھتا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ چاہے جتنی بھی دیر ہو جاتی، لیکن جب تک یہ دو رکعتیں ادا نہ کرلیتا؛ وہاں تک نماز پڑھانے کے لئے باہر نہ نکلتا۔ اس سے فجر کی دو سنتوں کی تاکید اور اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

بَابُ تَخْفِيفِ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ

وَبَيَانِ مَا يُقْرَأُ فِيهِمَا وَبَيَانِ وَقْتِهِمَا

فجر کی دو سنتیں مختصر اور ہلکی پڑھی جائیں

اس میں قراءت کیا ہو؟ اس کا وقت کیا ہے؟

حدیث ۱۱۰۴:-

عَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ بَيْنَ النِّدَاءِ وَالْإِقَامَةِ مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لَّهُمَا: يُصَلِّي رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ إِذَا سَمِعَ الْأَذَانَ فَيُخَفِّفُهُمَا حَتَّى أَقُولَ هَلْ قَرَأَ فِيهِمَا بِأُمِّ الْقُرْآنِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: كَانَ يُصَلِّي رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ إِذَا سَمِعَ الْأَذَانَ وَيُخَفِّفُهُمَا وَفِي رِوَايَةٍ إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ فجر کی اذان اور اقامت کے درمیان نبی کریم ﷺ بہت مختصر دو رکعت ادا فرماتے تھے۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) ہی سے دوسری روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی اذان سنتے تھے تو فجر کی دو سنتیں ادا فرماتے تھے، اور بہت مختصر ادا فرماتے تھے۔ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں (اتنی مختصر ہوتی تھیں کہ) میں اپنے جی میں سوچتی تھی کہ آپ نے سورۂ فاتحہ بھی پڑھی یا نہیں۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ ہے: جب آپ ﷺ اذان سنتے تھے (اور حضور ﷺ کے زمانہ میں صبحِ صادق ہوتے ہی فوراً اذان ہوتی تھی) تو فوراً آپ دو رکعت سنّت ادا فرماتے تھے اور ہلکی اور مختصر پڑھتے تھے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ صبحِ صادق طلوع ہوتے ہی آپ وہ ادا فرما لیتے تھے۔

افادات:- ان تمام روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی دو سنتوں میں نبیٔ کریم ﷺ طویل قرأت نہیں فرماتے تھے۔ اب کیا پڑھتے تھے تو آگے مستقل آرہا ہے۔ اسی دوسری روایت کے پیشِ نظر امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک ان سنتوں میں صرف سورۂ فاتحہ ہی پڑھی جائے گی، اور کوئی سورۃ نہیں ملائی جائے گی۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ فجر کی دو سنتیں صبحِ صادق طلوع ہوتے ہی پڑھنا پسندیدہ ہے، اور مختصر پڑھنا بھی پسندیدہ ہے، اور گھر پر پڑھی جائے یہ بھی پسندیدہ ہے۔ اس لیے ان تینوں چیزوں کا اہتمام کیا جائے۔

صبحِ صادق تا طلوعِ آفتاب صرف دو سنتیں اور دو فرض

حدیث ۱۱۰۵:-

وَعَنْ حَفْصَةَ (رضی اللہ عنہا) أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ لِلصُّبْحِ وَبَدَا الصُّبْحُ، صَلَّى رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا طَلَعَ صَلَّى الْفَجْرَ لَا يُصَلِّي إِلَّا رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

ترجمہ:- امّ المؤمنین حضرت حفصہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ جب مؤذن فجر کی اذان دیتا تھا اور صبحِ صادق نمودار ہوتی تھی تو نبی کریم ﷺ دو رکعت (فجر کی سنتیں) مختصر ادا فرماتے تھے۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ ہے کہ جب صبح صادق طلوع ہوتی تھی تو حضور اکرم ﷺ صرف یہی دو رکعتیں (یعنی سنتیں) مختصر ادا فرماتے تھے۔

افادات:- ویسے مسئلہ بھی یہی ہے کہ صبح صادق طلوع ہونے کے بعد فجر کی فرض پڑھنے تک درمیان میں صرف یہ دو سنتیں ہی پڑھ سکتے ہیں، اور کوئی نفل نہیں پڑھ سکتے، ہاں! اگر کوئی آدمی قضاء نماز پڑھنا چاہے، تو پڑھ سکتا ہے۔

بعض لوگ مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے، اور بعض لوگ صبح صادق کے وقت کو صحیح طور پر معلوم نہ رکھنے کی وجہ سے صبح صادق ہو جانے کے بعد بھی تہجد کے نام سے نوافل پڑھتے رہتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ اگر صبح صادق ہو جانے کے بعد کسی نے تہجد کی نیت سے دو رکعت پڑھ لی، اور بعد میں گھڑی دیکھ کر معلوم ہوا کہ صبح صادق تو ہو چکی تھی؛ تو یہ دو رکعتیں سنّت کی طرف سے کافی ہو جائیں گی، اب اس کو الگ سے سنّت پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور، یہ مسئلہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ فجر کے دو فرض پڑھنے کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک کوئی نفل پڑھنا جائز نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ صبح صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک نوافل میں صرف دو سنتیں اور دو فرض ہی پڑھ سکتے ہیں، ہاں! کوئی آدمی قضاء پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔

فجر کی دو سنتیں اوّل وقت پڑھنا پسندیدہ ہے

حدیث ۱۱۰۶:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) قَالَ : کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یُصَلِّی مِنَ اللَّیْلِ مَثْنٰی مَثْنٰی وَیُوْتِرُ بِرَکْعَۃٍ مِنْ آخِرِ اللَّیْلِ، وَیُصَلِّی الرَّکْعَتَیْنِ قَبْلَ صَلَاۃِ الْغَدَاۃِ، وَکَأَنَّ الْأَذَانَ بِأُذُنَیْہِ۔

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات میں (تہجد کی نماز) دو دو رکعتیں کر کے ادا فرماتے تھے (چوں کہ رات کا اندازہ نہیں ہوتا ہے کہ کتنی باقی ہے، اس لئے ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیا کرتے تھے) اور اخیر میں جب یہ اندازہ ہوتا کہ اب صبح صادق ہونے والی ہے، تو مزید ایک رکعت ملا کر وتر ادا فرما لیتے تھے۔ اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعت ایسے وقت ادا فرماتے تھے گویا آپ کے کانوں میں اذان کی آواز آرہی ہے۔

افادات:- حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ وتر ایک رکعت ملانے سے ہی ہوتی ہے، گویا دو دو رکعتیں پڑھتے رہے، اب آخری دو رکعت میں کھڑے ہو کر ایک رکعت کا اضافہ کر لیا تو وہ وتر ہو گئی۔ اور صبح صادق ہوتے ہی اذان ہوتی تھی، تو اذان کی آواز سنتے ہی آپ فجر کی دو سنتیں ادا فرماتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فجر کی دو سنتیں بالکل اوّل وقت میں پڑھنی چاہئیں۔

فجر کی سنتوں کی مسنون قراءت

حدیث ۱۱۰۷:-

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ (رضی اللہ عنہما) أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَقْرَأُ فِيْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فِي الْأُوْلٰى مِنْهُمَا ؛ قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا الْآيَةُ الَّتِيْ فِي الْبَقَرَةِ. وَفِي الْآخِرَةِ مِنْهُمَا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: فِي الْآخِرَةِ الَّتِيْ فِيْ آلِ عِمْرَانَ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فجر کی دو سنتوں میں پہلی رکعت میں سورۂ بقرہ کی آیت "قُوْلُوْا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا" پڑھتے تھے، اور دوسری رکعت میں "آمَنَّا بِاللّٰهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ" تلاوت فرماتے تھے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ دوسری رکعت میں سورۂ آلِ عمران کی آیت "تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ" پڑھتے تھے۔

افادات:- ان سب آیتوں میں ایمانیات، ایمان اور اخلاص سے متعلق مضمون ہے، اس لئے ان کے پڑھنے کو پسند فرماتے تھے۔

حدیث ۱۱۰۸:-

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَرَأَ فِيْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ" وَ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ".

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی دو رکعتوں میں (یعنی سنتوں کی) پہلی رکعت میں "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ" اور دوسری میں "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" پڑھی۔

حدیث ۱۱۰۹:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) قَالَ رَمَقْتُ النَّبِيَّ ﷺ شَهْرًا، وَكَانَ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ قَبْلَ الْفَجْرِ "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ" وَ"قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ".

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں مہینہ بھر تک نبی کریم ﷺ کو برابر دیکھتا رہا کہ آپ فجر کی دو سنتوں میں پہلی رکعت میں "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ" اور دوسری رکعت میں "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" تلاوت فرماتے تھے۔

افادات:- بعض روایتوں میں ہے کہ چوبیس روز تک دیکھا۔ اور بعض روایتوں میں چالیس روز تک کا ذکر بھی آیا ہے کہ چالیس دن تک میں آپ ﷺ کو برابر دیکھتا رہا کہ آپ ہمیشہ فجر کی دو سنتوں میں پہلی رکعت میں "قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ" اور دوسری رکعت میں "قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ" تلاوت فرماتے تھے۔ نبی کریم ﷺ عام طور پر انہیں دو سورتوں کو پڑھتے تھے، اور کبھی کبھی سورۂ بقرہ والی آیتیں بھی ہوتی تھیں۔

اِسْتِحْبَابِ الْاِضْطِجَاعِ بَعْدَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ عَلٰى جَنْبِهِ الْأَيْمَنِ وَالْحَثُّ عَلَيْهِ سَوَاءٌ كَانَ تَهَجَّدَ بِاللَّيْلِ أَمْ لَا

فجر کی دو سنتوں کی ادائیگی کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹنے کا مستحب وپسندیدہ ہونا اور اس کی ترغیب؛ چاہے رات کو تہجد پڑھی ہو یا نہ پڑھی ہو

دو سنتوں کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹنے کا مستحب و پسندیدہ ہونا

حدیث ۱۱۱۰:-

عَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا صَلَّى رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب فجر کی دو سنتیں ادا فرمالیتے تھے؛ تو دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے۔

افادات:- یہ نبی کریم ﷺ کا عمل تھا، آگے قولی روایت بھی آرہی ہے۔

فجر کی دو سنتوں کے بعد تھوڑی دیر کے لئے لیٹ جانا اور پیر لمبے کرنا کیسا ہے؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلاف والا ہے۔ ائمہ میں سے امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) اس کے سنّت ہونے کے قائل ہیں۔ دوسرے بعض حضرات اس کے سنّت ہونے کے قائل نہیں ہیں، چوں کہ امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) شافعی المسلک ہیں اس لئے اس کی سنیت کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے یہ عنوان قائم کیا ہے۔

صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) میں سے بعض حضرات جیسے: حضرت ابوہریرہ، حضرت اَنس حضرت اَبو موسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہم) اس کے استحباب کے قائل ہیں۔

بعض علماء اُس کے واجب ہونے کے قائل ہیں، چناں چہ علامہ ابن حزم (رحمۃ اللہ علیہ) جو ظاہری المسلک ہیں، وہ تو یوں فرماتے ہیں کہ فجر کی دو سنتوں کے بعد تھوڑی دیر لیٹنا ضروری ہے، اگر نہیں لیٹو گے تو فجر کی فرض ہی ادا نہیں ہو گی، اگرچہ ان کے علاوہ اور کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے۔

بعض حضرات نے اس کو بدعت کہا ہے، چناں چہ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) میں سے حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اور ائمہ میں سے امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) اس کے بدعت ہونے کے قائل ہیں۔ بعضوں نے اس کو خلافِ اولیٰ بتلایا ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ فجر کی سنّت اور فرض کے درمیان فصل کرنے کے لئے لیٹ جائے یا اور کوئی کام کرلے، یعنی چاہے تو لیٹ جائے، چاہے تو گھر والوں کے ساتھ بات چیت کرے، یا اور کوئی کام کرلے۔

بعضوں نے کہا کہ گھر میں ہو تو لیٹنا سنت ہے، مسجد میں نہیں، ورنہ تو مسجد مسافر خانہ بن جائے گی۔ اور بعضوں نے کہا کہ جو لوگ رات کو تہجد پڑھتے ہیں اور تہجد میں مشقت اٹھاتے ہیں ان کے لئے سنت ہے، دوسروں کے لئے نہیں۔

لیکن احناف کا قول اس بارے میں یہ ہے کہ یہ نبی کریم ﷺ کی سننِ عادیہ میں سے ہے، سننِ تشریعیہ میں سے نہیں۔ لہٰذا کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ کی اتباع میں ثواب کی نیت سے ایسا کرے تو امید ہے کہ اس کو ثواب ملے گا، باقی ہم اس کو سنت قرار نہیں دیتے۔ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی ایک روایت مصنّف عبد الرزّاق اور طبرانی میں موجود ہے جس میں صاف صاف فرمایا گیا ہے کہ نبیٔ

کریم ﷺ فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹتے تھے لیکن اس لئے نہیں کہ سنّت ہے، بلکہ اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ تہجد کی ادائیگی میں بہت مشقت اٹھاتے تھے اور بہت دیر تک تہجد میں مشغول رہتے تھے جس کی وجہ سے تھک جاتے تھے، تو تھوڑی دیر آرام کے لئے اور جسم کو کچھ راحت پہونچانے کے لئے لیٹ جاتے تھے۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی اس روایت نے بات صاف کر دی کہ آپ ﷺ کا یہ عمل سنّت ہونے کی وجہ سے نہیں تھا۔ اس لیے کوئی آدمی رات بھر عبادت میں مشغول رہا، یا گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک نوافل اور عبادت کی وجہ سے تھکن ہوئی اور فجر کی سنتوں کے بعد پانچ سات منٹ لیٹ جائے؛ تو اجازت ہے۔ یہاں لفظ اضطجاع آیا ہے جس کا مطلب نیند لینا نہیں ہوتا، بلکہ تھوڑی دیر سُستانا یعنی لیٹ جانا ہوتا ہے۔

حدیث ۱۱۱۱:-

وَعَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي فِيمَا بَيْنَ أَنْ يَّفْرُغَ مِنْ صَلَاةِ الْعِشَاءِ إِلَى الْفَجْرِ إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوتِرُ بِوَاحِدَةٍ فَإِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَتَبَيَّنَ لَهُ الْفَجْرُ وَجَاءَهُ الْمُؤَذِّنُ قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ ثُمَّ اضْطَجَعَ عَلَى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ هٰكَذَا حَتّٰى يَأْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلْإِقَامَةِ.

قَوْلُهَا: ((يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ)) هٰكَذَا هُوَ فِي مُسْلِمٍ. وَمَعْنَاهُ بَعْدَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ عشاء کی نماز کے بعد سے فجر تک یعنی درمیان رات کا جو وقت ہوتا ہے اس میں گیارہ رکعتیں تہجد کے طور پر پڑھتے تھے، اور اس میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے پھر اخیر میں ایک رکعت ملا کر وتر پڑھتے تھے۔ پھر جب صبحِ صادق طلوع ہو جاتی اور موذن فجر کی اذان کہہ کر خاموش

ہو جاتا تو آپ دو رکعت ہلکی اور مختصر پڑھتے، پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک کہ اقامت یعنی تکبیر کا وقت آتا تو موؤذن آکر اطلاع کرتا۔

افادات:- پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جب اقامت کا وقت آتا تھا تو حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) آکر حضور اکرم ﷺ کو اطلاع کرتے تھے پھر حضور گھر سے مسجد میں تشریف لاتے تھے۔

حدیث ۱۱۱۲:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فَلْيَضْطَجِعْ عَلَى يَمِينِهِ. (رواہ ابوداود والترمذی باسناد صحیحۃ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب فجر کی دو سنتیں ادا کرلے؛ تو دائیں کروٹ پر لیٹ جائے۔

افادات:- یہ قولی روایت ہے یعنی حضور ﷺ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس سلسلہ میں محدثین نے کلام کیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کا عمل تو یہ تھا لیکن حضور کے ارشاد کے طور پر اس کو صرف ایک راوی عبدالواحد بن زیاد ہی نقل کرتے ہیں، دوسرے تمام راویوں نے حضور اکرم ﷺ کے عمل کے طور پر اس روایت کو پیش کیا ہے، ارشاد کے طور پر نہیں۔

ویسے فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنے والی یہ روایت امام زہری سے ان کے تمام شاگرد نقل کرتے ہیں، لیکن ان کے ایک شاگرد امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) بھی ہیں جو یہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ تہجد کے بعد

تھوڑی دیر لیٹ جاتے تھے، اس کے بعد دو رکعت ادا فرماتے تھے، اسی لئے امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) فجر کی دو سنتوں کے بعد لیٹنے کے بدعت ہونے کے قائل ہیں۔

بہر حال! یہ مسئلہ روایتوں کے اختلاف کی وجہ سے ائمہ میں بھی اختلاف والا ہے، امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) اس کی سنیت کے قائل ہیں۔ تفصیل اوپر بتا چکا ہوں۔

بَابُ سُنَّةِ الظُّهْرِ

ظہر کی سنتوں کا بیان

حدیث ۱۱۱۳:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ الظُّهْرِ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَهَا.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ظہر سے پہلے دو رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں ادا کیں۔

افادات:- ظہر کے بعد دو رکعت سنّتِ مؤکدہ ہونے پر تمام ائمہ کا اتفاق ہے، لیکن ظہر سے پہلے کتنی رکعتیں سنّتِ مؤکدہ ہیں؟ تو شوافع کے یہاں دو ہیں، جب کہ احناف اور حنابلہ کے یہاں چار ہیں۔

حدیث ۱۱۱۴:-

وَعَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَدَعُ أَرْبَعاً قَبْلَ الظُّهْرِ۔

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ ظہر سے پہلے چار رکعات کبھی چھوڑتے نہیں تھے۔ (یعنی ہمیشہ چار رکعات پڑھتے تھے)

حدیث ۱۱۱۵:-

وَعَنْهَا قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي فِي بَيْتِي قَبْلَ الظُّهْرِ أَرْبَعاً، ثُمَّ يَخْرُجُ، ثُمَّ يَدْخُلُ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، وَكَانَ يُصَلِّي بِالنَّاسِ الْمَغْرِبَ، ثُمَّ يَدْخُلُ، فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، وَيُصَلِّي بِالنَّاسِ الْعِشَاءَ، وَيَدْخُلُ بَيْتِي، فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ.
(رَوَاهُ مُسلِم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے میرے حجرہ میں چار رکعات ادا فرماتے تھے اس کے بعد مسجد میں تشریف لے جاتے تھے اور لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، پھر نماز پڑھا کر جب گھر میں واپس تشریف لاتے تھے تو دو رکعات ادا فرماتے تھے۔ اور لوگوں کو مغرب کی نماز پڑھانے کے بعد مکان میں تشریف لا کر دو رکعات ادا فرماتے تھے۔ اور لوگوں کو جب عشاء کی نماز پڑھاتے تھے، پھر میرے کمرے میں تشریف لا کر دو رکعات ادا فرماتے تھے۔

افادات:- اب دیکھئے! حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) والی روایت میں ظہر سے پہلے دو رکعات کا تذکرہ ہے، اور اس روایت میں چار کا تذکرہ ہے۔ اس لئے جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ظہر سے پہلے چار رکعتیں سنّت ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اصل میں تو چار رکعات سنّتیں ہیں جو حضور ﷺ گھر میں ادا فرماتے تھے، اور جب مسجد میں تشریف لاتے تو آپ تحیۃ المسجد کے طور پر دو رکعت ادا فرماتے اور چوں کہ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) مسجد ہی میں حضور ﷺ کو دیکھتے تھے، اس لیے ان کی روایت میں جو دو رکعت کا ذکر ہے، اس کو تحیۃ المسجد پر محمول کیا جائے گا۔

شوافع یوں فرماتے ہیں کہ آپ نے گھر میں جو چار رکعت ادا فرمائی وہ فئِ زوال ہے، جیسے: اشراق، چاشت اور اوّابین ہیں، اس طرح ایک نماز فئِ زوال بھی ہے، یعنی زوال ہوتے ہی فوراً چار رکعات ادا

کرنی چاہئے۔ چوں کہ جب سورج ایک دم سر پر ہوتا ہے، اس وقت نماز نہیں پڑھی جاتی، پھر جب سورج ڈھلتا ہے تو قبولیت کے دروازے کھلتے ہیں، تو اس وقت فَیِٔ زوال پڑھی جائے جس کا تذکرہ کتابوں میں آتا ہے تو وہ حضرات ان چار رکعات کو فَیِٔ زوال بتلاتے ہیں، اور ابن عمر (رضی اللہ عنہما) جو دو رکعت نقل کرتے ہیں اس کو سنّت بتلاتے ہیں۔ بہر حال دونوں باتیں ثابت ہیں۔

اور اس روایت میں ظہر کے بعد کی دو رکعات، مغرب کے بعد کی دو رکعات، اسی طرح عشاء کے بعد دو رکعات کا تذکرہ ہے جو سنّتِ مؤکدہ ہیں۔ اور ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں کا بھی تذکرہ آگیا جو کہ سنّتِ مؤکدہ ہیں، اور فجر سے پہلے کی دو رکعتوں کا تذکرہ اس روایت میں نہیں آیا، لیکن پچھلے باب میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) ہی کی روایت گزری ہے جس میں فجر سے پہلے کی دو رکعتوں کا تذکرہ آگیا تھا۔ اس طرح دن میں کل بارہ رکعتیں سنّتِ مؤکدہ ہیں، اسی کو اکثر حضرات نے اختیار کیا ہے، احناف و حنابلہ کے یہاں بارہ ہی سنتِ مؤکدہ ہیں۔ اور شوافع کے یہاں دس ہیں، وہ حضرات ظہر سے پہلے چار کے بجائے دو رکعات کے قائل ہیں۔

ظہر سے پہلے اور بعد کی سنتوں کی پابندی پر فضیلت

حدیث ۱۱۱۶:-

وَعَنْ أُمِّ حَبِيبَةَ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ حَافَظَ عَلَى أَرْبَعِ رَكَعَاتٍ قَبْلَ الظُّهْرِ وَأَرْبَعٍ بَعْدَهَا، حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ.

ترجمہ:- حضرت امِّ حبیبہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی ظہر سے پہلے چار رکعتوں اور ظہر کے بعد چار رکعتوں کی پابندی کرے؛ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم پر حرام قرار دیں گے۔

افادات:- اس روایت میں ظہر کے بعد بھی چار رکعتوں کا تذکرہ آیا ہے، لیکن چوں کہ عام طور پر حضور اکرم ﷺ ظہر کے بعد دو ہی پڑھتے تھے، اور قولی روایت میں بھی دو کا تذکرہ ہے، اس لئے علماء فرماتے ہیں کہ ظہر کے بعد دو سنّتِ مؤکدہ اور دو غیر مؤکدہ ہیں جس کو ہم نفل کہتے ہیں، اس طرح چار رکعتیں ہیں۔

اس وقت بھی آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں

حدیث ۱۱۱۷:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ سَائِبٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي أَرْبَعاً بَعْدَ أَنْ تَزُوْلَ الشَّمْسُ قَبْلَ الظُّهْرِ، وَقَالَ: إِنَّهَا سَاعَةٌ تُفْتَحُ فِيْهَا أَبْوَابُ السَّمَاءِ، فَأُحِبُّ أَنْ يَّصْعَدَ لِيْ فِيْهَا عَمَلٌ صَالِحٌ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن سائب (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سورج ڈھلنے کے بعد ظہر سے پہلے چار رکعات ادا فرماتے تھے، اور یہ ارشاد فرماتے تھے کہ یہ وہ گھڑی ہے جس میں آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں؛ اس لیے میں پسند کرتا ہوں کہ ایسے وقت میں میرا کوئی نیک عمل اوپر جائے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت اعمالِ صالحہ کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں لہٰذا آدمی کو اس وقت بھی نیک اعمال کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ظہر سے پہلے کی سنتیں چھوٹ جائیں تو!

حدیث ۱۱۱۸:-

وَعَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا لَمْ يُصَلِّ أَرْبَعاً قَبْلَ الظُّهْرِ صَلَّاهُنَّ بَعْدَهَا.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر سے پہلے کی چار رکعات اگر نہیں پڑھ پاتے تھے، تو ظہر کے بعد ان کو ادا فرماتے تھے۔

افادات:- ظہر سے پہلے کی چار رکعت سنّتِ مؤکدہ ہے، اگر کسی وجہ سے ادا نہ ہو پائی، مثلاً: ایسے وقت مسجد میں پہنچے کہ جماعت کھڑی ہو چکی ہے، تو فرض کے بعد ان کو ادا کیا جائے۔ اب ظہر کے بعد کب ادا کرے؟ ظہر کے بعد کی دو سنتوں کے بعد یا اس سے پہلے؟ تو فقہ کی کتابوں میں دونوں باتیں لکھی ہیں۔ لیکن ابن ماجہ شریف میں نبی کریم ﷺ کا عمل بتلایا گیا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی ظہر سے پہلے کی چار رکعت کبھی چھوٹ جاتی تھیں تو آپ ﷺ اس کو ظہر کے بعد کی دو رکعتوں کے بعد ادا فرماتے تھے۔ اس لئے اسی کے مطابق پہلے دو رکعت پڑھ لے، اس کے بعد چھوٹی ہوئی چار سنتیں ادا کر لے۔

بَابُ سُنَّةِ الْعَصْرِ

عصر کی سنتوں کا بیان

عصر کے بعد تو کوئی سنت یا نفل نہیں ہے، لیکن عصر سے پہلے چار رکعتیں سنتِ غیر موکدہ ہیں۔

حدیث ۱۱۱۹:-

عَنْ عَلِيٍّ بْنِ أَبِيْ طَالِبٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ قَبْلَ الْعَصْرِ أَرْبَعَ رَكْعَاتٍ، يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ بِالتَّسْلِيْمِ عَلَى الْمَلَائِكَةِ الْمُقَرَّبِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُؤْمِنِيْنَ۔

ترجمہ:- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ عصر سے پہلے چار رکعات ادا فرماتے تھے اور ان میں ملائکہ مقربین اور مسلمین و مؤمنین پر سلام بھیجتے تھے۔

افادات:- تشہد میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِاللهِ الصَّالِحِيْنَ" پڑھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ دو رکعات پر قعدہ کرتے تھے، اس سے عصر سے پہلے چار رکعات بتلانا چاہتے ہیں، لیکن میں بتلا چکا ہوں کہ وہ سنتِ غیر موکدہ ہیں۔

حدیث ۱۱۲۰:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: رَحِمَ اللهُ امْرَأً صَلَّى قَبْلَ الْعَصْرِ أَرْبَعاً۔

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس پر رحم کرے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے۔

حدیث ۱۱۲۱:-

وَعَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي قَبْلَ الْعَصْرِ رَكْعَتَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ عصر سے پہلے دو رکعات ادا فرماتے تھے۔

افادات:- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے چار کی روایت بھی منقول ہے، اسی لئے فقہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ عصر سے پہلے چار رکعت، یا دو رکعت ہیں۔ چار پڑھے تو اچھا ہے، ورنہ دو رکعتیں پڑھ لے۔ لیکن چار یا دو جو بھی پڑھی جائے گی، وہ موٴکدہ نہیں، بلکہ غیر موٴکدہ ہے۔

بَابُ سُنَّةِ الْمَغْرِبِ بَعْدَهَا وَقَبْلَهَا

مغرب کے بعد اور پہلے کی سنتوں کا بیان

فضائل کا بیان چل رہا ہے اسی سلسلہ میں نمازوں کے فضائل بیان کئے، پھر پنج وقتہ نمازوں میں جو سننِ قبلیہ و بعدیہ ہیں ان کا بیان کیا۔ اس باب میں مغرب سے پہلے اور بعد کی سنتوں کو بیان کر رہے ہیں۔

احناف کے یہاں مغرب کے بعد دو رکعت سنّتِ مؤکدہ ہے، اور دو رکعت مستحب کا درجہ رکھتی ہے۔ اور بہت سارے فقہاءِ احناف نے ان دو سنّتِ مؤکدہ کے علاوہ بطورِ مستحب اور چھ رکعات لکھی ہے؛ جن کو اوّابین کہا جاتا ہے، کبیری وغیرہ میں بھی اس کی تصریح موجود ہے۔ تو مغرب کی نماز کے بعد تو سنتیں ہیں، البتہ مغرب کی اذان کے بعد فرض سے پہلے احناف کے یہاں نہ سنتیں ہیں اور نہ مستحب ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ غروبِ آفتاب کے بعد مغرب کی فرض نماز ادا کرنے میں دیر کرنے کو منع کیا گیا ہے، اور اس سے پہلے نوافل میں مشغول ہونا فرض کی ادائیگی میں تاخیر کا سبب بنتا ہے، اس لئے حنفیہ مغرب کے فرض سے پہلے نماز کے استحباب یا سنّیت کے قائل نہیں ہیں۔ البتہ حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ اس وقت نفل پڑھنا جائز اور مباح ہے، اگر کوئی پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتا ہے۔

اس لیے اگر کبھی کسی وجہ سے جماعت کھڑی نہیں ہوئی، جیسے: رمضان میں اذان کے بعد روزہ دار افطار کر کے آجائیں اس حساب سے چند منٹ کے لئے انتظار کیا جاتا ہے، اس وقت اگر کوئی آدمی پہلے سے مسجد میں موجود ہے، روزہ افطار کر کے فارغ بیٹھا ہوا ہے اور اس کو معلوم ہے کہ ابھی جماعت کھڑی ہونے میں چار پانچ منٹ باقی ہیں، اس وقت اگر وہ نفل کے طور پر دو رکعت پڑھنا چاہے؛ تو اس کی اجازت ہے۔ ویسے بھی اس کے نماز پڑھنے کی وجہ سے جماعت کھڑی ہونے میں تاخیر کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ جماعت تو روزہ داروں کی رعایت میں دیر سے ہی کھڑی ہونے والی ہے۔

اور امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں مغرب سے پہلے بھی دو رکعت سنّت ہے، اور بھی بہت سارے حضرات اس کے قائل ہیں، جب ہم لوگ حج و عمرہ کے لیے جاتے ہیں تو وہاں پر دیکھتے ہیں کہ مغرب کی اذان کے بعد لوگ دو رکعت پڑھتے ہیں، اس وقت ہم بیٹھے بیٹھے سوچیں کہ کیا کریں تو چلو! ہم بھی اگر دو رکعت پڑھ لیں؛ تو جائز ہے۔ یا جیسے کسی نے پہلے سے طواف کر رکھا تھا، اور طواف کی واجب نماز باقی تھی، اس وقت اگر وہ پڑھنا چاہے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے یہاں مغرب کے فرض سے پہلے سنّت اور مستحب نہیں ہے، باقی بطورِ نفل کے اس وقت پڑھنا جائز ہے۔

اس کتاب ریاض الصّالحین کے مصنف علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) چوں کہ شافعی المسلک ہیں، اور ان کے مسلک کے اعتبار سے یہ سنّت یا مستحب کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے انہوں نے اسی سلسلہ کی روایتیں اس باب میں پیش کی ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں کہ مغرب کے بعد کی نوافل کے لئے حضرت

عبداللہ بن عمر اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہم) کی روایت پچھلے باب میں گزر چکی ہے، جس میں یہ آیا تھا کہ نبیٔ کریم ﷺ مغرب کے بعد دو رکعت ادا فرماتے تھے۔ اور جن بارہ رکعتوں کی پابندی پر نبیٔ کریم ﷺ نے جنّت میں گھر کا وعدہ فرمایا ہے جن کو سننِ رواتب اور سننِ موکدہ کہتے ہیں، اس کی فہرست بھی آپ کو اس وقت بتائی گئی تھی، دیگر احادیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے، اس میں مغرب کے بعد کی دو رکعتیں بھی ہیں۔

یہاں مغرب کی فرض سے پہلے کے سلسلہ میں بھی کچھ روایتیں لاتے ہیں۔

مغرب کی فرض سے پہلے دو رکعت سنت ہے یا نہیں؟

حدیث ۱۱۲۲:-

وَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مُغَفَّلٍ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: صَلُّوْا قَبْلَ الْمَغْرِبِ. قَالَ فِي الثَّالِثَةِ لِمَنْ شَآءَ. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مغفل (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے دو مرتبہ ارشاد فرمایا: مغرب سے پہلے نماز پڑھو۔ اور تیسری مرتبہ میں یہ فرمایا: جو پڑھنا چاہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے۔

افادات:- **"جو پڑھنا چاہے"** اسی جملہ کی وجہ سے احناف یہ کہتے ہیں کہ دراصل عصر کی نماز کے بعد سے غروبِ آفتاب تک نوافل پڑھنے کی ممانعت تھی، اب جیسے ہی آفتاب غروب ہوا تو وہ ممانعت ختم ہوگئی۔ یہ بات اور رہی کہ آفتاب کے غروب ہونے کی وجہ سے اب ہمیں مغرب کی فرض ادا کرنی

ہے، لیکن نوافل پڑھنے کی ممانعت جو عصر کے بعد سے شروع ہوئی تھی، وہ ممانعت غروبِ آفتاب پر ختم ہو چکی، اس لئے اب اگر کوئی آدمی اس طرح پر نفل پڑھنا چاہے کہ اس کی وجہ سے مغرب کی فرض نماز میں تاخیر کی نوبت نہ آتی ہو، تو اس کے لیے اس پابندی کو اٹھایا جا رہا ہے اور حضورِ اکرم ﷺ فرما رہے ہیں: ”صَلُّوْا“ پڑھو۔

اصولِ فقہ کا ایک قاعدہ

ویسے بھی فقہاء اور اہلِ عربیت کے یہاں یہ قانون ہے کہ ”صَلُّوْا“ امر کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ ہے ”پڑھو“، اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ واجب اور ضروری ہے۔ اس لیے کہ امر کے صیغہ سے اگرچہ ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن اصولِ فقہ کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کسی چیز کی پابندی ہو، پھر اس پابندی کو اٹھانے کے لیے امر کا صیغہ استعمال کیا جائے، تو وہ اس کام کے ضروری ہونے کی دلیل نہیں ہوتی، بلکہ صرف جائز ہونے کی دلیل ہوتی ہے، جیسے: استاذ کے پاس سبق ہو رہا ہو تو سبق کے دوران طلباء کو اٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی، لیکن جب سبق پورا ہو گیا اور اب استاذ کہے کہ جاؤ۔ تو یہ ”جاؤ“ کہنا امر کا صیغہ تو ہے، جس سے ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہاں ”جاؤ“ کہنا ضروری قرار دینے کے لئے نہیں ہوتا، بلکہ یہ بتلانے کے لئے ہوتا ہے کہ اب تک تو سبق ہو رہا تھا اور آپ پر جانے کی پابندی اور ممانعت تھی، اب سبق ختم ہو چکا ہے؛ لہٰذا جو جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔

یا جیسے: شریعت کا حکم یہ ہے ﴿لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ﴾ جب احرام باندھ لو تو خشکی کے جانوروں کا شکار کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور قرآنِ پاک میں یہ بھی ہے: ﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ جب تم اپنا احرام کھول دو، تو شکار کرو۔ "فَاصْطَادُوا" امر کا صیغہ ہے کہ شکار کرو۔ اس کا مطلب سب حضرات یہی بیان کرتے ہیں کہ حالتِ احرام میں شکار کی جو ممانعت تھی، اس آیت ﴿وَإِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوا﴾ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ وہ ممانعت ختم ہوگئی۔ وہاں "شکار کرو" کا مطلب کوئی بھی یہ نہیں بیان کرتا کہ جو بھی احرام کھولے اس کے لئے شکار کرنا ضروری ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ احرام کی وجہ سے شکار پر جو پابندی عائد ہوئی تھی وہ پابندی اب ختم کر دی گئی، لہٰذا اب اگر کوئی آدمی شکار کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔

اسی طرح اس روایت میں بھی نبیٔ کریم ﷺ نے جو ارشاد فرمایا: "صَلُّوا قَبْلَ الْمَغْرِبِ" مغرب سے پہلے نماز پڑھو، اس کا مطلب یہی ہے کہ عصر کے بعد سے اب تک نفل پر پابندی عائد ہوئی تھی اور ممانعت تھی، لیکن غروبِ آفتاب کی وجہ سے وہ ممانعت ختم ہوگئی۔ اسی لیے اخیر میں حضور اکرم ﷺ نے وہ جملہ بڑھا دیا: "لِمَنْ شَاءَ" جو چاہے۔ یہ جملہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جو "صَلُّوا" کہا گیا ہے وہ تاکید اور ضروری ہونا بتلانے کے لئے نہیں ہے، بلکہ لگی ہوئی اس پابندی کو اٹھانے کے لئے ہے، اور اسی لئے یہی جملہ حنفیہ کی دلیل بھی ہے۔ حنفیہ اسی جملہ کی بنیاد پر یوں کہتے ہیں کہ مغرب سے پہلے دو رکعت سنّت نہیں ہے، ہاں! البتہ جائز ہے، اگر کوئی پڑھ لے تو اس کو منع نہیں کریں گے، باقی اس کو ہم سنّت اور مستحب کا درجہ نہیں دیتے۔ البتہ شوافع کے یہاں یہ سنّت اور مستحب کا درجہ رکھتی ہے۔

حدیث ۱۱۲۳:-

وَعَنْ أَنَسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ كِبَارَ أَصْحَابِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ يَبْتَدِرُوْنَ السَّوَارِيَ عِنْدَ الْمَغْرِبِ.

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ٔکریم ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کو دیکھا کہ مغرب (کی اذان کے بعد) ستونوں کی (آڑ میں نماز پڑھنے کے لئے) سبقت کرتے تھے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ مغرب کی نماز سے پہلے وہ لوگ نفل پڑھا کرتے تھے۔ صاحبِ کتاب یہ روایت لاکر ان دونفلوں کا سنّت یا مستحب ہونا ثابت کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ خود نبی ٔکریم ﷺ کا پڑھنا ثابت نہیں ہے۔ کسی روایت میں نہیں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے خود پڑھی ہو۔ آپ ﷺ کا ارشاد تو آیا ہے، اور اس کے متعلق ابھی اوپر عرض کردیا کہ وہ فقط جواز کو بیان کرنے کے لئے ہے، سنّیت بتانے کے لیے نہیں ہے، اور صحابہ ٔکرام پڑھتے تھے لیکن حضور ﷺ نے منع نہیں فرمایا، یہ جواز کی دلیل ہے، اور احناف بھی جائز ہونے کے قائل ہیں۔

حدیث ۱۱۲۴:-

وَعَنْهُ قَالَ: كُنَّا نُصَلِّيْ عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ قَبْلَ الْمَغْرِبِ، فَقِيْلَ: أَكَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ صَلَّاهُمَا؟ قَالَ: كَانَ يَرَانَا نُصَلِّيْهِمَا، فَلَمْ يَأْمُرْنَا وَلَمْ يَنْهَنَا. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم ﷺ کے زمانہ میں غروبِ آفتاب کے بعد مغرب کے فرض سے پہلے ہم لوگ دو رکعت پڑھتے تھے۔ حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا گیا: کیا حضورِ اکرم ﷺ بھی پڑھتے تھے؟ حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: ہم کو پڑھتا ہوا دیکھتے تھے، لیکن ہم کو نہ حکم کرتے تھے، نہ روکتے تھے۔

افادات:–خود حضورِ اکرم ﷺ نے نہیں پڑھی ہے، اسی لئے جیسا کہ میں نے عرض کیا احناف اس کو سنّت نہیں کہتے، البتہ جائز ہے اور پڑھ سکتے ہیں۔

حدیث ۱۱۲۵:–

وَعَنْهُ قَالَ: كُنَّا بِالْمَدِينَةِ، فَإِذَا أَذَّنَ الْمُؤَذِّنُ لِصَلَاةِ الْمَغْرِبِ ابْتَدَرُوا السَّوَارِيَ فَرَكَعُوا رَكْعَتَيْنِ حَتَّى إِنَّ الرَّجُلَ الْغَرِيبَ لَيَدْخُلُ الْمَسْجِدَ فَيَحْسَبُ أَنَّ الصَّلَاةَ قَدْ صُلِّيَتْ مِنْ كَثْرَةِ مَنْ يُصَلِّيهِمَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:–حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ ہم لوگ مدینہ منورہ میں ہوتے تھے، اور مؤذن مغرب کی اذان دے کر فارغ ہوتا تھا تو صحابۂ کرام ستونوں کی آڑ میں (نماز پڑھنے کے واسطے) سبقت کرتے تھے، اور اس سے پہلے کہ حضورِ اکرم ﷺ آگے بڑھیں اور نماز شروع کریں؛ جلدی جلدی دو رکعتیں پڑھ لیتے تھے، یہاں تک کہ (باہر سے آیا ہوا نیا اور) اجنبی آدمی ان حضرات کو اس کثرت سے نماز پڑھتا ہوا دیکھتا؛ تو اس کو گمان ہونے لگتا تھا کہ شاید مغرب کی نماز ہو چکی ہے۔ (مسلم شریف کی روایت ہے)

اس لیے کہ نماز کے بعد تو سب لوگ سنتیں پڑھتے ہی ہیں، ایسا ماحول بن جاتا تھا کہ نیا آدمی یہی سوچتا کہ کیا نماز پوری ہو گئی؟

افادات:–ان ساری روایتوں کی وجہ سے وہ حضرات تو اس کو مستحب اور سنّت کا درجہ دیتے ہیں، لیکن احناف ان ساری روایتوں کی وجہ سے بھی مستحب کا درجہ نہیں مانتے، البتہ جواز کے قائل ہیں۔

سُنَّةُ الْعِشَاءِ بَعْدَهَا وَقَبْلَهَا

عشاء کی نماز کے بعد اور اس سے پہلے کی سنتیں

فِيه حديث ابن عمر السابق: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ، وحديث عبد الله بن مُغَفَّلٍ: بَيْنَ كُلِّ أَذَانَيْنِ صَلاةٌ. (متفق عَلَيْهِ. كما سبق)

اس باب میں حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کی روایت ہے جس میں عشاء کے بعد بھی دو سنتوں کا تذکرہ ہے۔ اسی لئے بارہ رکعتوں میں یہ دو بھی شمار کرائی گئی ہے۔ ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو عشاء کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ عشاء کے بعد دو رکعت سنّتِ مؤکدہ ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مغفل (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے جس میں حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد نقل فرمایا گیا ہے کہ ہر دو اذان یعنی اذان اور اقامت کے درمیان نماز ہے۔ اس حدیث کی وجہ سے عشاء سے پہلے بھی سنّت کا پتہ چلتا ہے، لیکن احناف کے یہاں عشاء سے پہلے چار رکعتیں مستحب ہیں، اور دو پڑھنا چاہے؛ تو فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے، جیسے عصر سے پہلے بھی چار اور دو کا تذکرہ آتا ہے۔ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی۔

بَابُ سُنَّةِ الْجُمُعَةِ

جمعہ کی سنتوں کا بیان

فِيهِ حَدِيثُ ابْنِ عُمَرَ السَّابِقُ أَنَّهُ صَلَّى مَعَ النَّبِيِّ ﷺ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ.

ترجمہ:– حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ جمعہ کے بعد میں نے دو رکعتیں ادا کی۔

حدیث ۱۱۲۶:–

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ فَلْيُصَلِّ بَعْدَهَا أَرْبَعاً.

ترجمہ:– حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے جو آدمی جمعہ کی نماز پڑھ چکے، اس کو چاہیے کہ اس کے بعد چار رکعت ادا کرے۔

افادات:– پہلی روایت سے جمعہ کے بعد دو رکعتوں کا سنّت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس دوسری روایت سے جمعہ کے بعد چار رکعات کا سنّت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے نزدیک تو جمعہ کے بعد چار رکعات ہی سنّتِ موکدہ ہیں، البتہ آپ کے دونوں شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہما کے یہاں مزید دو رکعتیں ہیں۔ اسی لئے ہم سب عام طور پر چھ پڑھتے ہیں، اور پہلے چار، پھر دو رکعت پڑھنی چاہئیں۔ ویسے کوئی آدمی پہلے دو پھر چار پڑھے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔ حضرت

مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے دونوں ترتیب لکھی ہے، لیکن مناسب ترتیب یہی ہے کہ جمعہ کی فرض کے بعد پہلے چار پھر دو پڑھے، اور صرف چار پڑھ لے تب بھی کافی ہے، اور مزید دو پڑھے تو صاحبین کے قول کے مطابق وہ بھی سنّتِ موکّدہ ہے، اور اس کے پھر دو رکعتیں نفل کا درجہ رکھتی ہیں۔

حدیث ۱۱۲۷:-

وَعَنِ ابْنَ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يُصَلِّي بَعْدَ الْجُمُعَةِ حَتَّى يَنْصَرِفَ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ فِي بَيْتِهِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے بعد جب تک لوٹ نہ جاتے تھے کوئی نماز ادا نہیں فرماتے تھے، پھر گھر پہنچ کر دو رکعت پڑھتے تھے۔

افادات:- اس سے جمعہ کے بعد دو رکعت کا ثبوت ہوتا ہے جو صاحبین کا قول ہے۔ ویسے چار تو سب کے نزدیک ہیں، اور صاحبین کے قول کے مطابق مزید دو رکعتیں سنّتِ موکّدہ ہیں۔

بَابُ اِسْتِحْبَابِ جعل النَّوَافِلِ فِي الْبَيْتِ سَوَاءُ الرَّاتِبَةُ وَغَيْرُهَا وَالْاَمْرِ بِالتَّحَوُّلِ لِلنَّافِلَةِ مِنْ مَوْضِعِ الْفَرِيْضَةِ أَوِ الْفَصْلِ بَيْنَهُمَا بِكَلَامٍ

نفل نمازوں کا گھر میں پڑھنا اور فرض ونوافل کی جگہوں کو بدلنا

یہاں ایک اور مسئلہ بتلانا چاہتے ہیں کہ نفل نمازوں کا گھر میں پڑھنا شریعت کی نگاہ میں زیادہ پسندیدہ ہے، نوافل میں سنّتِ مؤکدہ اور غیر مؤکدہ سب داخل ہیں، یہاں تک کہ پانچ وقت کی فرائض سے پہلے اور بعد میں جو سنّتِ مؤکدہ اور غیر مؤکدہ ہیں ان کو بھی گھر میں پڑھنا مستحب اور زیادہ مناسب ہے۔ لیکن لوگوں کے حالات اور مشغولیات کو دیکھ کر سننِ رواتب کے چھوٹ جانے کی وجہ سے فقہاء نے سننِ رواتب کو مسجد میں پڑھنے کی اجازت دی ہے، بلکہ بعضوں نے کہا کہ مسجد ہی میں پڑھ لی جائے، اس لیے کہ ہم لوگوں کا مزاج گھروں میں نماز پڑھنے کا بنا ہوا نہیں ہے، سلام پھیر کر جب مسجد سے نکلتے ہیں تو باہر کھڑے رہ کر آدھا ایک گھنٹہ تو باتیں کریں گے، اسی میں سنتیں اور وتر تک بھی بھول جاتے ہیں، اس لیے کہا گیا کہ مسجد ہی سے پڑھ کر نکلو، تاکہ ثواب سے محرومی کی نوبت نہ آئے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جہاں فرض نماز ادا کی ہے اس جگہ سے ذرا ہٹ کر نفل (سنن موکدہ یا غیر موکدہ) کو ادا کیا جائے۔ اور اگر اسی جگہ پڑھتے ہیں تو فرض اور نفل کے درمیان میں گفتگو کا ذرا فاصلہ کر دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ شریعت یہ بھی چاہتی ہے کہ نمازوں میں ہر نماز کا الگ الگ مقام باقی رہے، فرض نماز جو امام کے پیچھے جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اس کا اپنا ایک مقام ہے، اور سنتیں، نوافل، مستحبات؛ الگ نمازیں ہے، تو دونوں کی الگ الگ حیثیتیں نمایاں اور ممتاز ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے، اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر خلط ملط نہ ہونے پائے؛ تا کہ ہر آدمی فرق سمجھے کہ ابھی تک فرض ہو رہی تھی اور اب سنّت اور نفل پڑھی جا رہی ہے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ اسی جگہ ادا نہ کی جائے۔ اور خاص کر امام کو تاکید کی گئی ہے کہ سلام کے بعد اپنی ہیئت بدل دے، اور لوگوں کو بھی اپنی ہیئت ایسی بنا لینی چاہیے تا کہ نئے آنے والے کو یہ معلوم و محسوس ہو جائے کہ فرض نماز ختم ہو چکی ہے۔ اگر سلام کے بعد امام اور مقتدی سب اسی طرح بیٹھے رہیں گے، تو نئے آنے والے کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ سلام پھیرا جا چکا ہے، اور ہو سکتا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر کہ ابھی تو اخیری قعدہ چل رہا ہے، نیت باندھ کر قعدہ میں بیٹھ جائے، اس لیے تاکید کی گئی کہ بیٹھک کو بدل دو اور امام بھی گھوم جائے، یا اپنی جگہ چھوڑ دے، پھر تو آنے والے کو احساس ہو جائے گا۔ یہ بھی ضروری ہے اور شریعت یہ بھی چاہتی ہے، تا کہ کسی کو غلط فہمی کی نوبت نہ آئے، اسی لیے یا تو جگہ بدل دو، یا درمیان میں بات چیت کے ذریعہ فصل کر لو، ویسے گفتگو کے مقابلہ میں جگہ بدلنے والی شکل زیادہ مناسب ہے۔

گھروں کو قبرستان مت بناؤ

حدیث ۱۱۲۸:-

عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: صَلُّوا أَيُّهَا النَّاسُ فِي بُيُوتِكُمْ فَإِنَّ أَفْضَلَ الصَّلَاةِ صَلَاةُ الْمَرْءِ فِي بَيْتِهِ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ.

ترجمہ:- حضرت زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھو، اس لئے کہ فرض نماز کے علاوہ آدمی کی بہترین اور افضل نماز وہ ہے جو گھر میں ہو۔

حدیث ۱۱۲۹:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اجْعَلُوا مِنْ صَلَاتِكُمْ فِي بُيُوتِكُمْ، وَلَا تَتَّخِذُوهَا قُبُوراً.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری نمازوں کا کچھ حصہ گھروں میں بھی ہونا چاہئے، اور گھروں کو قبریں مت بناؤ۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جیسے قبرستان میں مردے سوئے ہوئے ہوتے ہیں اور وہ نماز نہیں پڑھتے، ایسے ہی تمہارے گھر بھی قبرستان نہیں ہونے چاہئیں بلکہ نمازوں کا سلسلہ گھروں میں ہونا چاہئے۔ اس روایت میں تو صاف جملہ موجود ہے کہ اپنے گھروں میں نماز کا کچھ حصہ مقرر کرو، اور گھروں کو قبر نہ بناؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ گھر میں نوافل کا اہتمام کرتے رہنا چاہئے۔

بعض روایتوں میں مطلق آیا ہے کہ گھروں کو قبرستان مت بناؤ۔ اس حدیث کا ایک مطلب یہی بیان کیا گیا ہے جو ابھی اوپر گزرا۔ لیکن اس کا دوسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ گھروں کو قبرستان مت بناؤ کہ جیسے ہم قبرستان جاتے ہیں تو مردے ہماری کوئی میزبانی نہیں کرتے، ایسے ہی آپ بھی اپنے گھروں کو قبرستان مت بناؤ، یعنی ایسا نہ ہو کہ کوئی آپ کے گھر آئے اور خالی لوٹ کر جائے، بلکہ آنے والے کو کچھ کھلاؤ پلاؤ، اس کو روکھا سوکھا واپس مت بھیجو۔

گھر کی مسجد ہونی چاہیے

حدیث ۱۱۳۰:-

وَعَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا قَضَى أَحَدُكُمْ صَلَاتَهُ فِيْ مَسْجِدِهِ فَلْيَجْعَلْ لِبَيْتِهِ نَصِيْباً مِنْ صَلَاتِهِ، فَإِنَّ اللهَ جَاعِلٌ فِيْ بَيْتِهِ مِنْ صَلَاتِهِ خَيْراً.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی مسجد میں اپنی نماز مکمل کرلے (یعنی فرض ادا کرلے) تو اب نماز کا کچھ حصہ گھر میں بھی ادا کرے، اس لئے کہ نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گھر میں خیر وبرکت مقدر فرماتے ہیں۔

افادات:- اس سے یہ معلوم ہوا کہ گھر میں بھی نماز کا اہتمام کرنا چاہیے۔ حدیثِ پاک میں بھی اس بات کی تاکید آئی ہے کہ گھر میں ایک مقام اور جگہ نماز کی ادائیگی کے لئے مخصوص کرلینی چاہیے،

جس کو گھر کی مسجد کہا جاتا ہے، پھر اس جگہ کو پاک صاف رکھنے اور وہاں پر خوشبو کی دھونی دینے کا اہتمام کیا جائے، اور گھر کے تمام لوگوں کو چاہیئے جب بھی کوئی نماز ادا کریں تو اسی جگہ پر ادا کریں۔

نیا گھر بنانے والے متوجہ ہوں

بھائی! گھر میں جب ہر کام کے لئے الگ کمرے نام کے ساتھ متعین ہوتے ہیں، جیسے: کھانا پکانے کے لئے باورچی خانہ اور کچن (Kitchen) متعین ہے، اور کھانا کھانے کے لئے الگ کمرہ (Dining Room) متعین ہے، اور لیٹنے کے لئے الگ کمرہ (Bed Room) متعین ہے، اور مہمانوں کو بٹھانے کے لئے الگ کمرہ (Drawing Room) متعین ہے، اور ہم نے تو سنا کہ آج کل جتنے نئے مکانات بننے لگے ہیں تو نقشہ بنانے والے آرکیٹیکٹ اس میں ٹی وی رکھنے کے لئے بھی الگ روم رکھتے ہیں۔ جب ان ساری چیزوں کے روم موجود ہیں، اگر نہیں ہے تو صرف نماز کا روم نہیں ہے! حالاں کہ ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ اس کے گھر میں نماز والی جگہ پہلے ہونی چاہیے۔ اس لئے جو اہلِ وسعت ہیں، وہ جب اپنے مکان کا نقشہ بنانے کے لئے کسی آرکیٹیکٹ کو دیں تو اس کو پہلے ہی سے تاکید کر دیں کہ ہمارے گھر میں ایک کمرہ نماز کے لئے الگ ہونا چاہیے۔

ہر آدمی یہ دو باتیں نوٹ کرلے

اور جیسے بیت الخلاء اور غسل خانہ وغیرہ بنائے جاتے ہیں اسی طرح وضو کی جگہ بھی الگ سے ہونی چاہیے، اس لیے کہ عام طور پر غسل خانوں میں وضو کے لئے بیٹھتے ہیں تو چھینٹے اڑتے ہیں، اور غسل خانہ میں پوری احتیاط کے ساتھ اپنے کپڑوں کو بچاتے ہوئے وضو کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے اگر آپ الگ سے بیٹھک والا وضو خانہ بنادیں گے، جیسے: مسجدوں میں وضو خانے بنے ہوتے ہیں؛ تو اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ کوئی آدمی اگر غسل خانہ میں ہے تو وضو کرنے والے کو اس کے باہر نکلنے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا، آدمی وضو کی بیٹھک پر وضو کرلے گا۔ اس لئے ہر ایک کو یہ چیز نوٹ کرلینی چاہئے تاکہ وہ آئندہ اپنے گھروں کی تعمیر میں ان دو چیزوں -وضو کی جگہ اور نماز کی جگہ کا خیال رکھے۔ اور جب نماز کی جگہ متعین ہو جائے گی تو رمضان المبارک میں گھر کی عورتوں میں سے اگر کسی کو اعتکاف کرنے کا ارادہ ہوگا تو اس کی جگہ متعین ہوگی، اور وہ آسانی سے اعتکاف بھی کرسکے گی۔

صحابی کا اہتمام / ایک واقعہ

بہرحال! نبی کریم ﷺ تاکید فرماتے ہیں کہ گھروں میں بھی نماز پڑھتے رہو، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گھروں میں خیر وبرکت مقدر فرمادیں گے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے گھروں میں مسجد بنانے کی بھی

تاکید فرمائی، اور گھر کی وہ جگہ جو نماز کے لئے متعین کی جائے اس کو خوشبو کی دھونی دے کر معطر رکھنے کی بھی تاکید فرمائی ہے، صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) اس کا اہتمام کرتے تھے۔ بخاری شریف میں یہ قصہ موجود ہے۔

حضرت عتبان بن مالک (رضی اللہ عنہ) ایک صحابی ہیں، اخیر عمر میں ان کی بینائی کمزور ہوگئی تھی اس لیے وہ مسجد آنے جانے سے معذور تھے، حضور اکرم ﷺ سے انھوں نے اجازت طلب کی کہ: اے اللہ کے رسول! میری بینائی کمزور ہے، جب بارش ہوتی ہے تو راستے پانی سے بھر جاتے ہیں اور میرے لئے وہاں سے گزرنا مشکل ہو جاتا ہے، اگر مجھے اجازت مل جائے تو مَیں گھر میں نماز پڑھ لوں۔ ان کو اجازت مل گئی، پھر انھوں نے ایک درخواست پیش کی کہ: اے اللہ کے رسول! آپ میرے گھر تشریف لائیں اور برکت کے طور پر کسی جگہ نماز ادا فرمالیں؛ تاکہ اس جگہ کو مَیں نماز کے لئے متعین کرلوں۔ نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: کسی روز ہم آئیں گے، چناں چہ دوسرے روز نبیٔ کریم ﷺ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کو ساتھ لے کر ان کے گھر تشریف لے گئے، اور داخل ہوتے ہی پوچھا: کون سی جگہ نماز پڑھوانی ہے؟ انھوں نے جگہ بتلائی، تو حضور اکرم ﷺ نے دو رکعت ادا فرمائی۔ روایتوں میں یہ بھی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے دو رکعت پڑھیں اس درمیان میں انہوں نے کچھ پکا کر تیّار کرلیا۔ محلے والوں کو بھی پتہ چل گیا تو وہ بھی جمع ہوگئے، اور جو کچھ پکا تھا اس میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ وہ سب بھی شریک ہوگئے (بخاری شریف / کتاب الصلٰوۃ، باب المساجد فی البیوت) ہمارے یہاں بھی کسی شخصیت کی آمد پر اس طرح کا جو اہتمام ہوتا ہے، اس روایت سے اس کا ثبوت ہو جاتا ہے۔

فرض کے بعد سنت یا نفل اس جگہ سے ہٹ کر پڑھنی چاہیے

حدیث ۱۱۳۱ :-

وَعَنْ عُمَرَ بْنِ عَطَاءٍ أَنَّ نَافِعَ بْنِ جُبَيْرٍ أَرْسَلَهُ إِلَى السَّائِبِ ابْنِ أُخْتِ نَمِرٍ يَسْأَلُهُ عَنْ شَيْءٍ رَآهُ مِنْهُ مُعَاوِيَةُ فِي الصَّلَاةِ. فَقَالَ: نَعَمْ، صَلَّيْتُ مَعَهُ الْجُمُعَةَ فِي الْمَقْصُورَةِ فَلَمَّا سَلَّمَ الْإِمَامُ قُمْتُ فِي مَقَامِي فَصَلَّيْتُ فَلَمَّا دَخَلَ أَرْسَلَ إِلَيَّ فَقَالَ لَا تَعُدْ لِمَا فَعَلْتَ. إِذَا صَلَّيْتَ الْجُمُعَةَ فَلَا تَصِلْهَا بِصَلَاةٍ حَتَّى تَتَكَلَّمَ أَوْ تَخْرُجَ فَإِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ أَمَرَنَا بِذٰلِكَ أَنْ لَّا نُوْصِلَ صَلَاةً بِصَلَاةٍ حَتَّى نَتَكَلَّمَ أَوْ نَخْرُجَ.

ترجمہ:- عمر بن عطاء کہتے ہیں کہ نافع بن جبیر نے ان کو سائب کے پاس بھیجا جو نمر کے بھانجے ہوتے ہیں تاکہ ان سے پوچھے کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) سے نماز کے سلسلہ میں کوئی بات دیکھی یا سیکھی ہو، یا کوئی واقعہ تمہیں معلوم ہو؛ تو بتلاؤ۔ انہوں نے کہا: ہاں! ایک مرتبہ میں نے ان کے ساتھ جمعہ کی نماز ''مقصورہ'' میں پڑھی۔ جب امام نے سلام پھیرا تو جہاں میں نے جمعہ کی نماز ادا کی تھی وہیں کھڑا ہو گیا اور اسی جگہ بعد کی سنتیں پڑھیں۔ جب حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) گھر تشریف لے گئے تو میرے پاس ایک آدمی بھیجا اور مجھے بلوایا، جب میں گھر پہنچا تو مجھ سے کہا: آج تم نے جو حرکت کی وہ آئندہ مت کرنا۔ جب جمعہ کی نماز پڑھ چکو تو اسی جگہ دوسری نماز پڑھ کر دونوں کو جوڑ مت دیجیو، بلکہ اس جگہ سے ہٹ کر نماز پڑھنا یا کسی سے بات کرلینا، اس لئے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ہم کو اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ ہم ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ جوڑ نہ دیں۔ یا تو درمیان میں بات کرلیں یا جگہ بدل دیں۔

افادات: مقصورہ یعنی کیبن (Cabin)۔ دراصل جب حضرت علی (رضی اللہ عنہ) مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو ان پر حملہ ہوا، جس طرح حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) پر بھی ہوا تھا

اور اسی میں وہ شہید ہو گئے تھے، اور حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) پر بھی اس روز حملہ ہونے والا تھا، لیکن اتفاقاً اس روز حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) بیماری کی وجہ سے تشریف نہیں لا سکے، دوسرا آدمی آیا اور وہ اس حملہ کا شکار ہو گیا۔ اصل میں تین آدمیوں نے آپس میں طے کیا تھا کہ ان تین یعنی حضرت معاویہ، حضرت علی اور حضرت عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہم) کو ختم کرنا ہے، جب یہ معاملہ سامنے آیا تو حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے مسجد میں جہاں وہ کھڑے رہتے تھے ایک کمرہ نما کیبن (Cabin) بنادی تھی تا کہ اس میں نماز پڑھنے والا محفوظ ہو جائے؛ اسی کو مقصورہ کہا ہے۔ اس کی ابتدا حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنے زمانہ میں اپنی حفاظت کے لئے کی تھی، اسی کمرے میں نماز ادا فرماتے تھے اور دو چار آدمی جو خاص ہوتے تھے ان کو بھی شریک کر لیا جاتا تھا، باقی لوگ باہر رہتے تھے، اور یہ کمرہ اور کیبن (Cabin) پہلی صف میں ہوتی تھی۔ عام طور پر ایسی کیبن (Cabin) والی جگہ بادشاہانِ وقت بنایا کرتے تھے اور وہ پہلی صف ہی میں ہوتی تھی۔

اسی لیے فقہاء نے ایک بحث یہ بھی کی ہے کہ وہ جگہ پہلی صف میں داخل ہے یا نہیں؟ چوں کہ اس میں ہر ایک کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی اور پہلی صف کسی کے لئے مخصوص نہیں ہونی چاہیے، جو پہلے آئے اس کو حق ملنا چاہیے، اس لئے بعض فقہاء کہتے ہیں کہ مقصورہ والی جگہ پہلی صف میں داخل نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے ان سب چیزوں کا بھی کتنا خیال کیا۔ یہ بحث شامی میں بھی ہے، اور اسی بحث کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو گیا کہ صف کے بیچ میں اگر منبر آجاتا ہے تو اس کی وجہ سے وہ پہلی صف نہیں رہتی، حالاں کہ وہ مسئلہ ہی دوسرا ہے۔

"حضور اکرم ﷺ نے ہم کو اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ ہم ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ جوڑ نہ دیں، یا تو درمیان میں بات کرلیں یا جگہ بدل دیں" اسی لئے فقہاء فرماتے ہیں کہ فرض نماز ادا کرنے کے بعد اسی جگہ پر سنت پڑھنے کے بجائے آدمی کو تھوڑا سا آگے پیچھے دائیں بائیں ہٹ جانا چاہیے، اس میں دوسرا فائدہ یہ بھی ہے کہ کل کو قیامت میں وہ جگہیں جہاں آپ نے عبادات ادا کی ہیں اور نمازیں پڑھی ہیں آپ کے لئے شہادت اور گواہی دیں گی۔ تو جتنی جگہ بدل بدل کر نماز پڑھو گے اُتنے ہی زیادہ گواہ اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کے لئے تیّار ہوں گے۔

بَابُ الْحَثِّ عَلَى صَلَاةِ الْوِتْرِ وَبَيَانِ أَنَّهُ سُنَّةٌ مُؤَكَّدَةٌ وَبَيَانِ وَقْتِهِ

وتر کی نماز کی ترغیب، وتر سنّتِ مؤکدہ ہے اور اس کے وقت کا بیان

وتر کی نماز کے متعلق ائمہ کے درمیان اختلاف والا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت کیا ہے؟ یعنی وتر واجب ہے، یا سنّتِ مؤکدہ ہے؟ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) اس کو واجب قرار دیتے ہیں، اور دیگر حضراتِ ائمہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ اس کو سنّتِ مؤکدہ بتلاتے ہیں، اور ہر ایک کے پاس اپنے اپنے موقف کے دلائل موجود ہیں۔ چوں کہ اس کتاب ریاض الصالحین کے مصنف علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) شافعی المسلک ہیں، اس لئے انہوں نے عنوان میں یہ جملہ فرمایا کہ وتر سنّتِ مؤکدہ ہے۔ اور وتر کی نماز کے سنّت ہونے کے سلسلہ میں ائمہ ثلاثہ نے جس روایت سے استدلال کیا ہے اسی کو پہلے پیش کیا ہے۔

حدیث ۱۱۳۲:-

عَنْ عَلِيٍّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: اَلْوِتْرُ لَيْسَ بِحَتْمٍ كَصَلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ، وَلٰكِنْ سَنَّ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ، قَالَ: إِنَّ اللهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ، فَأَوْتِرُوْا يَاأَهْلَ الْقُرْآنِ. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: ((حديث حسن

ترجمہ :- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ وتر کی نماز فرض نماز کی طرح لازم اور ضروری نہیں ہے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس کو سنّت قرار دیا ہے۔ پھر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یکتا (ایک) ہے، اور طاق عدد ہی کو پسند کرتا ہے، اس لئے اے اہلِ قرآن! تم وتر پڑھا کرو۔

افادات:- عدد دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک جفت یعنی جوڑی والا جیسے: دو، چار، چھ، آٹھ، دس؛ علیٰ ھٰذا القیاس۔ اور دوسرا "وتر" اور طاق عدد؛ جس کو "اِکائی" عدد بولتے ہیں، جیسے: ایک، تین، پانچ، سات، نو؛ علیٰ ھٰذا القیاس۔

حضراتِ ائمہٗ ثلاثہ وتر کو سنّت قرار دیتے ہیں، واجب نہیں مانتے، اور ان کی دلیل یہی روایت ہے۔ لیکن امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ وتر؛ فرض نماز کی طرح ضروری اور لازم تو نہیں ہے، لیکن وتر کا درجہ فرض سے گھٹا ہوا اور سنّت سے بڑھا ہوا ہے۔ اصل میں بات یہاں جاکر اٹکی ہے کہ امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں فرض اور سنّت کے درمیان میں بھی ایک درجہ وجوب کا ہے، یعنی بعض چیزیں فرض ہیں، بعض چیزیں سنّت ہیں، اور بعض چیزیں درمیانی درجہ یعنی واجب کی حیثیت رکھتی ہیں اور دوسرے ائمہ کے یہاں فرض اور سنّت کے درمیان کوئی اور درجہ نہیں ہے۔

تو اتنی بات تو طے ہے کہ وتر کی نماز فرض نہیں ہے، جیسا کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے: "اَلْوِتْرُ لَيْسَ بِحَتْمٍ كَصَلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ" وتر کی نماز فرض نماز کی طرح لازم اور ضروری نہیں ہے۔ جب اس درجہ کی نہیں ہے تو پھر حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ وتر یعنی یکتا ہے، اور طاق عدد کو پسند کرتا ہے، اس لئے اے اہلِ قرآن واہلِ ایمان! تم بھی وتر ادا کیا کرو۔ اس جملہ کی وجہ سے ائمۂ ثلاثہ نے فرمایا کہ جب فرض نہیں ہے، تو سنّت ہے، اس لیے کہ ان کے یہاں فرض اور سنت کے درمیان میں اور کوئی درجہ ہے ہی نہیں۔

لیکن امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: اس کو وہ درجہ اور حیثیت تو حاصل نہیں جو فرض نماز کو حاصل ہے، البتہ سنّتِ مؤکدہ سے بڑھ کر ہے۔ اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جہاں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لئے یہ ارشاد فرمایا ہے، وہیں آگے یہ بھی تو ارشاد فرمایا: "فَأَوْتِرُوا يَا أَهْلَ الْقُرْآنِ" اور "أَوْتِرُوا" امر کا صیغہ ہے جو عربی گرامر کے لحاظ سے کسی کام کے کرنے کا حکم دینے کے لیے لایا جاتا ہے۔ گویا نبی کریم ﷺ نے حکم دیا کہ اے اہلِ قرآن یعنی اے مسلمانو! تم وتر پڑھو۔ اس سے واجب اور ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ اس کو ضروری اور لازم کا وہ درجہ حاصل نہیں ہے جو فرض نماز کا ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایک اور روایت ہے جس کو انہوں نے یہاں ذکر نہیں کیا لیکن ابو داود شریف میں ہی موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا: "اَلْوِتْرُ حَقٌّ فَمَنْ لَّمْ يُوتِرْ فَلَيْسَ مِنَّا" وتر واجب اور ضروری ہے، جو آدمی وتر نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اس

روایت سے وتر کا واجب اور ضروری ہونا معلوم ہوتا ہے، اس لئے امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) اس کو واجب بتلاتے ہیں۔

اسی لئے بعض حضرات تو یوں کہتے ہیں کہ حقیقت میں جو حضراتِ ائمہ ثلاثہ اس کو سنّت قرار دیتے ہیں تو ان کے نزدیک بھی وتر کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے، لیکن چوں کہ ان کے یہاں واجب والا درجہ نہیں تھا، اس لئے انھوں نے اس پر سنّت والا حکم لاگو کیا، اور امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں واجب والا درجہ ہے، اس لئے انھوں نے واجب کا حکم لگایا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ ایک ضروری نماز ہے، اس پر تو سب کا اتفاق ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ سنّتِ مؤکدہ سے بڑھ کر اس کی تاکید ہے، اگرچہ فرض جتنا اس کا مقام نہیں ہے، اور کسی کے یہاں بھی اس کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

وتر کے متعلق آپ ﷺ کا معمول

حدیث ۱۱۳۳:-

عَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: مِنْ كُلِّ اللَّيْلِ قَدْ أَوْتَرَ رَسُولُ اللهِ ﷺ مِنْ أَوَّلِ اللَّيْلِ وَمِنْ أَوْسَطِهِ وَمِنْ آخِرِهِ وَانْتَهَى وِتْرُهُ إِلَى السَّحَرِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ روزانہ رات میں وتر کی نماز ادا فرماتے تھے، بعض مرتبہ آپ نے رات کے ابتدائی حصہ میں وتر ادا فرمائی ہے، بعض مرتبہ رات کے درمیانی حصہ میں، اور کبھی رات کے آخری حصہ میں ادا فرمائی ہے؛ البتہ آپ ﷺ کا آخری عمل یہی تھا کہ (رات کے آخری حصہ میں) سحر کے وقت ادا فرماتے تھے۔

افادات:- نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں کبھی بھی وتر کی نماز نہیں چھوڑی۔ سننِ مؤکدہ تو کبھی آپ نے ادا نہیں بھی فرمائی، تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ ضروری اور واجب نہیں ہے، لیکن وتر کا چھوڑنا آپ ﷺ سے ثابت نہیں ہے، اسی لئے امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کو وجوب کا درجہ دیا ہے۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی اس روایت سے وتر کی نماز کا وقت بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ عشاء کی نماز کے ادا کرنے کے بعد سے وتر کا وقت شروع ہوتا ہے، اور صبحِ صادق تک رہتا ہے، اس درمیان میں آپ جب چاہیں وتر کی نماز ادا کر سکتے ہیں، چناں چہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ نے وتر کی نماز رات کے شروع حصہ میں ادا فرمائی ہے، درمیانی حصہ میں یا اخیری حصہ میں؟ تو جواب میں انہوں نے یہ ارشاد فرمایا جو اوپر روایت میں مذکور ہے کہ نبی کریم ﷺ سے سارے ہی عمل ثابت ہیں، البتہ آپ ﷺ کا آخری عمل یہی تھا کہ آپ رات کے آخری حصہ میں سحر کے وقت ادا فرماتے تھے۔ اسی لئے وتر کی نماز کو رات کے آخری حصہ میں ادا کرنا پسندیدہ اور اچھا قرار دیا گیا ہے

وتر کے متعلق آپ ﷺ کی تاکید

حدیث ۱۱۳۴:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: اجْعَلُوا آخِرَ صَلَاتِكُمْ بِاللَّيْلِ وِتْرًا.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری رات کی آخری نماز وتر کو بناؤ۔

افادات:- اگر کوئی آدمی تہجد پڑھنے کا عادی ہے، اور اس کو اطمینان ہے کہ تہجد میں آنکھ کھل ہی جائے گی، تو اس کو چاہیے کہ وتر کی نماز تہجد کے بعد ادا کرے۔ اور اگر خطرہ ہے کہ پتہ نہیں کہ آنکھ کھلے گی یا نہیں؛ تو پھر وتر کو خطرہ میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، سونے سے پہلے پڑھ لو اور سو جاؤ؛ تو آخری نماز وتر ہو ہی جائے گی۔

حدیث ۱۱۳۵:-

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: أَوْتِرُوا قَبْلَ أَنْ تُصْبِحُوا.

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: صبح سے پہلے وتر کی نماز پڑھ لو۔

افادات:- گویا اس کا وقت صبحِ صادق تک رہتا ہے، اس سے پہلے پہلے پڑھ لیا کرو۔ اگر آخر رات میں پڑھے تو بہت مناسب ہے، لیکن اخیر رات میں پڑھنے کے معاملہ میں خطرہ ہو کہ ممکن ہے کہ آنکھ نہ کھلے اور چھوٹ جائے؛ تو اس صورت میں پڑھ کر سویا کرو۔

حدیث ۱۱۳۶:-

عَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي صَلَاتَهُ بِاللَّيْلِ، وَهِيَ مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَإِذَا بَقِيَ الْوِتْرُ أَيْقَظَهَا فَأَوْتَرَتْ.

وَفِي رِوَايَةٍ لَهُ: فَإِذَا بَقِيَ الْوِتْرُ قَالَ قُومِي فَأَوْتِرِي يَا عَائِشَةُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات میں دیر تک تہجد ادا فرماتے تھے، اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سامنے لیٹی ہوئی رہتیں اور نبی کریم ﷺ اپنی نماز ادا فرماتے رہتے، جب آپ کی وتر باقی رہ جاتی تھی تو آپ ﷺ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو اُٹھا دیا کرتے تھے اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) بھی وتر ادا کرلیتی تھیں۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ جب وتر باقی رہ جاتی تو حضور اکرم ﷺ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے فرماتے: اے عائشہ! اٹھو؛ اور وتر پڑھ لو۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ سامنے اگر عورت لیٹی ہوئی ہو تب بھی آدمی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کوئی اٹھانے والا موجود ہے کہ ابھی اگر ہم سوجائیں گے تو فلاں وقت فلاں صاحب اٹھادیں گے اور ہم رات کے آخری حصہ میں وتر ادا کرلیں گے؛ تو سوسکتے ہیں اور رات کے آخری حصہ میں اُٹھ کر وتر ادا کرلی جائے۔

حدیث ۱۱۳۷:-

عَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: بَادِرُوا الصُّبْحَ بِالْوِتْرِ.

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد نقل فرماتے ہیں: صبح آنے سے پہلے وتر پڑھنے میں سبقت کرو۔

افادات:۔یعنی صبحِ صادق سے پہلے وتر ادا کرلو۔ عشاء کے بعد سے وتر کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور صبحِ صادق تک رہتا ہے، اور اس میں بھی جتنی تاخیر سے پڑھیں گے اتنا ہی پسندیدہ ہے۔

حدیث ۱۱۳۸:۔

عَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ خَافَ أَنْ لَّا يَقُوْمَ مِنْ آخِرِ اللَّيْلِ فَلْيُوْتِرْ أَوَّلَهُ. وَمَنْ طَمِعَ أَنْ يَّقُوْمَ آخِرَهُ فَلْيُوْتِرْ آخِرَ اللَّيْلِ. فَإِنَّ صَلَاةَ آخِرِ اللَّيْلِ مَشْهُوْدَةٌ، وَذٰلِكَ أَفْضَلُ.

ترجمہ:۔حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کو یہ ڈر ہو کہ رات کے آخری حصہ میں اٹھ نہیں سکے گا اس کو چاہیے کہ شروع رات میں وتر ادا کرلے۔ اور جس کو یہ امید ہو کہ رات کے آخری حصہ میں اٹھ جائے گا تو رات کے آخر میں وتر ادا کرے، اس لئے کہ رات کے آخر میں جو نماز ادا کی جاتی ہے وہاں فرشتے بھی موجود رہتے ہیں اور یہ افضل وقت بھی ہے۔

افادات:۔ہر آدمی اپنے متعلق فیصلہ کرلے کہ اٹھ سکے گا یا نہیں۔ اگر اُٹھنے کی امید اور یقین ہو تو آخری حصہ میں پڑھی جائے۔ اور جس آدمی کو یہ اندیشہ ہو کہ اٹھ نہیں پاؤں گا تو اس کو چاہیے کہ پہلے پڑھ لے، اس کے بعد سوئے۔

بَابُ فَضْلِ صَلَاةِ الضُّحىٰ وَبَيَانِ أَقَلِّهَا وَأَكْثَرِهَا وَأَوْسَطِهَا وَالحَثِّ عَلَى الْمُحَافَظَةِ عَلَيْهَا

چاشت کی نماز کی فضیلت۔ اس کی کم سے کم مقدار، درمیانی مقدار، اور زیادہ سے زیادہ مقدار کا بیان اور اس کی پابندی کی ترغیب

چاشت کی نماز کی فضیلت۔ اور اس کی پابندی کی ترغیب

سورج جب اونچے چڑھ جائے اور موسم میں گرمی آجائے اس وقت زوال سے آدھ پون گھنٹہ پہلے تک جو نماز پڑھی جاتی ہے؛ اس کو صلوٰۃ الضحیٰ یعنی چاشت کی نماز کہتے ہیں، ویسے محدثین اور فقہاء کے یہاں اشراق اور چاشت الگ الگ نماز نہیں ہے، لیکن صوفیاء ان دونوں کو الگ الگ نماز بتلاتے ہیں۔ سورج کے طلوع ہونے کے بعد وقتِ مکروہ نکلنے پر فوراً جو دو یا چار رکعت ادا کی جاتی ہے؛ وہ اشراق کہلائے گی، اور ایک چوتھائی دن گزرنے کے بعد جب دھوپ میں تیزی آجاتی ہے اس وقت جو نماز ادا کی جائے؛ اس کو چاشت کہتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ طلوعِ آفتاب سے زوال تک کا جو وقت ہے اس کو آپ دو حصوں میں تقسیم کر دیں، پہلے آدھے حصہ میں جو نماز پڑھی جائے گی؛ وہ اشراق کہلائے گی۔ اور بعد والے نصف حصہ میں جو پڑھی جائے گی وہ چاشت کہلائے گی۔

محبوب کی تین وصیتیں

حدیث ۱۱۳۹:-

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: أَوْصَانِي خَلِيلِي ﷺ بِصِيَامِ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ وَرَكْعَتَيِ الضُّحَى وَأَنْ أُوتِرَ قَبْلَ أَنْ أَرْقُدَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میرے محبوب ﷺ نے مجھے وصیت فرمائی کہ مَیں ہر مہینہ میں تین دن روزے رکھوں اور چاشت کی دو رکعت پڑھوں اور سونے سے پہلے وتر پڑھ لوں۔

افادات:- اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے تین باتوں کی تاکیدی نصیحت فرمائی ہے:-

۱:- ایک تو یہ کہ ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھے۔ اب تین دن کون سے ہوں؟ شروع میں، بیچ میں، اخیر میں۔ ایّامِ بیض یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ پہلی، دوسری، تیسری تاریخ میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ اور اخیر میں بھی رکھ سکتے ہیں؛ جیسا جیسا موقع۔ اور قاعدہ ہے کہ ایک عمل پر دس گنا ثواب ملتا ہے، تو تین روزوں پر تیس روزوں کا ثواب ملے گا، اس طرح حکماً پورے مہینے کے روزوں کا ثواب مل جائے گا۔

۲:- چاشت کی نماز پڑھے۔ اب چاشت کی نماز کا حکم کیا ہے؟ تو احناف، مالکیہ اور حنابلہ کے یہاں تو مستحب ہے، اور شوافع کے یہاں سنّت ہے، اور اس کی کم سے کم مقدار دو رکعت ہے۔

۳:- سونے سے پہلے وتر ادا کرلی جائے۔ چوں کہ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کا علمی مشغلہ رہتا تھا جس کی وجہ سے رات کو دیر سے سوتے تھے اور صبح میں تہجد کے وقت اُٹھنے کی توقع نہ ہوتی تھی، اس لئے

حضور اکرم ﷺ نے ان کو سونے سے پہلے وتر کی تاکید فرمائی، لیکن جیسا کہ اوپر بتلایا تھا اگر آدمی کو رات کو اُٹھنے کی توقع وامید اور یقین ہو تو پھر اُٹھنے کے بعد وتر ادا کرے۔ اسی لئے امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: "وَالْاِیْتَارُ قَبْلَ النَّوْمِ اِنَّمَا یُسْتَحَبُّ لِمَنْ لَّایَثِقُ بِالْاِسْتِیْقَاظِ آخَرَ اللَّیْلِ" جو آدمی آخری رات میں اٹھنے کی امید نہ رکھتا ہو، اس کے لئے سونے سے پہلے وتر پڑھ لینا مستحب ہے اور اگر اٹھنے کی امید ہو تو آخری رات میں پڑھنا افضل ہے۔

ہر جوڑ کی طرف سے صدقہ

حدیث ۱۱۴۰:-

وَعَنْ أَبِي ذَرٍّ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: يُصْبِحُ عَلَى كُلِّ سُلَامَى مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ وَيُجْزِئُ مِنْ ذٰلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحٰى.

ترجمہ:- حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر آدمی کے ہر جوڑ کی سلامتی پر صدقہ ضروری ہے، لہٰذا ہر تسبیح صدقہ ہے، ہر الحمدللہ کہنا صدقہ ہے، ہر لا الٰہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے، ہر اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے، کسی کو بھلی بات کا حکم کرنا بھی صدقہ کا ثواب رکھتا ہے، کسی کو بری بات سے روکنا بھی صدقہ کا ثواب رکھتا ہے، اور چاشت کی دو رکعت ان سب کی طرف سے کافی ہو جائے گی۔

افادات:- بعض روایتوں میں ہے کہ آدمی کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، آدمی جب صبح کرتا ہے تو ہر جوڑ کی سلامتی پر ایک صدقہ واجب ہوتا ہے، گویا تین سو ساٹھ صدقے واجب ہوئے، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ چاشت کی دو رکعتیں ان سب کی طرف سے کافی ہو جائیں گی۔ یعنی اگر آدمی چاشت کی دو رکعت ادا فرمالے تو تین سو ساٹھ جوڑوں کی سلامتی پر جو صدقے واجب ہوئے تھے وہ سب ادا ہو جائیں گے۔ اس سے چاشت کی فضیلت بھی معلوم ہوئی، اور ساتھ ہی ساتھ اس کی کم سے کم مقدار بھی معلوم ہوئی۔

چاشت کی کتنی رکعتیں ہیں؟

حدیث ۱۱۴۱:-

عَنْ عَائِشَةَ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الضُّحَى أَرْبَعاً وَيَزِيْدُ مَاشَاءَ اللهُ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ چاشت کی چار رکعت نماز ادا فرماتے تھے، اور کبھی اس میں زیادتی بھی فرمادیتے تھے۔

افادات:- زیادتی کتنی ہو؟ تو فقہاء نے بارہ تک کی اجازت دی ہے کہ چاشت کی زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت پڑھی جاسکتی ہے۔

حدیث ۱۱۴۲:-

وَعَنْ أُمِّ هَانِئٍ فَاخِتَةَ بِنْتِ أَبِي طَالِبٍ (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: ذَهَبْتُ إِلَى رَسُولِ اللهِ ﷺ عَامَ الْفَتْحِ، فَوَجَدْتُهُ يَغْتَسِلُ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهِ صَلَّى ثَمَانِيَ رَكَعَاتٍ وَذٰلِكَ ضُحًى.

ترجمہ:- حضرت امّ ہانی (رضی اللہ عنہا) جو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کی بہن ہیں جن کا نام فاختہ تھا فرماتی ہیں کہ: فتحِ مکہ والے سال میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس وقت آپ غسل فرما رہے تھے۔ جب آپ ﷺ غسل سے فارغ ہوئے تو آپ نے آٹھ رکعت نماز ادا کی، اور وہ چاشت کا وقت تھا۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ چاشت کی آٹھ رکعت بھی ادا کی جاسکتی ہیں، چار یا آٹھ رکعات چاشت کا درمیانی درجہ ہے۔

بَابُ تَجْوِيزِ صَلَاةِ الضُّحَى مِنْ اِرْتِفَاعِ الشَّمْسِ اِلَى زَوَالِهَا وَالْأَفْضَلُ أَنْ تُصَلِّيَ عِنْدَ اِشْتِدَادِ الْحَرِّ وَارْتِفَاعِ الضُّحَى

چاشت کے وقت کی تفصیل

اس باب میں چاشت کا وقت بتلاتے ہیں۔ ویسے مختصراً یہی کہا جاتا ہے کہ جب سورج اونچا ہو جائے اور وقتِ مکروہ ختم ہو جائے، وہاں سے چاشت کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور زوال تک رہتا ہے، لیکن اس کی تفصیل کو ذرا ذہن نشین کرنے کی ضرورت ہے۔

دیکھو! پہلے مَیں آپ کو طلوع اور غروب کے وقت کے سلسلہ میں جو فرق ہے وہ بتلاتا ہوں۔ سورج طلوع ہونے کے بعد جب اس کی سرخی ختم ہو کر اس میں اتنی روشنی آجائے کہ آنکھیں اس کے سامنے ٹِکا نہ سکیں؛ تو وقتِ مکروہ ختم ہو گیا، اور اس میں اندازاً پندرہ بیس منٹ لگتے ہیں، لیکن یہ یاد رہے کہ منٹوں کی تعداد متعین نہیں ہے، اس لیے کہ گرمی کے زمانہ میں سورج کے طلوع ہونے کے بعد چند منٹوں ہی میں دھوپ میں تیزی آجاتی ہے، اور سردی کے زمانہ میں تیزی آنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ اس لیے جو لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ ٹائم ٹیبل میں طلوع کا جو وقت لکھا ہوا ہوتا ہے اس پر دس منٹ بڑھا دیں تو کافی ہے؛ یہ صحیح نہیں ہے۔ حالاں کہ ٹائم ٹیبل بنانے والے ہمارے بھائی الحاج جناب عبد الحفیظ صاحب منیار نے اس کی ہدایات میں لکھا ہے کہ اس ٹائم ٹیبل میں سورج کے طلوع ہونے کا وہ

وقت لکھا ہے کہ جب سورج کا پہلا کنارہ نکلتا ہے، اس لئے کہ پہلا کنارہ نظر آتے ہی نماز پڑھنا ممنوع ہو جاتا ہے، اور غروب کے وقت میں لکھا ہے کہ جب سورج کا آخری کنارہ ڈوبتا ہے، اس لیے طلوع کے وقت میں سورج کا پہلا کنارہ نظر آنے کا وقت لکھا ہوا ہے، اور غروب میں سورج کا آخری کنارہ آنکھوں سے اوجھل ہو جائے اور پورا سورج چھپ جائے وہ وقت لکھا ہوا ہے۔ اور سورج کو پورا نکلنے میں تقریباً پونے تین منٹ لگتے ہیں، اب اگر آپ نے ٹائم ٹیبل میں لکھے ہوئے وقت سے دس منٹ کا حساب لگایا، تو پورا سورج نکلنے کے بعد سوا سات منٹ ہی رہ گئے، اور اتنی دیر میں کیا ہوتا ہے وہ دیکھ لیجئے۔ اس لیے یہ طے نہ کرلیا جائے کہ دس ہی منٹ بعد وقتِ مکروہ ختم ہو جاتا ہے، بلکہ جیسا موقع ہو اس کے مطابق معاملہ کیا جائے، اور اس میں احتیاط کی ضرورت ہے۔

توجب سورج طلوع ہونے کے بعد اونچائی پر آجائے وہاں سے چاشت کا وقت شروع ہوتا ہے۔ میں نے پہلے بھی بتلایا تھا کہ حضراتِ محدثین کے یہاں اشراق بھی چاشت ہی کا ایک حصہ ہے، گویا وہ حضرات چاشت اور اشراق میں فرق نہیں کرتے بلکہ اشراق کو بھی چاشت ہی کا نام دیتے ہیں، اسی لیے انہوں نے یوں کہا کہ سورج اونچا ہوتے ہی چاشت کا وقت شروع ہو گیا، اور زوال سے پہلے تک رہتا ہے، اگرچہ افضل یہ ہے کہ جب گرمی میں تیزی آجائے اس وقت چاشت پڑھو یعنی دیر سے پڑھو۔

اصلی صلاۃ الاوّابین

حدیث ۱۱۴۳:

عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّهُ رَأَى قَوماً يُصَلُّونَ مِنَ الضُّحَى، فَقَالَ: أَمَا لَقَدْ عَلِمُوا أَنَّ الصَّلَاةَ فِي غَيْرِ هٰذِهِ السَّاعَةِ أَفْضَلُ، إِنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: صَلَاةُ الْأَوَّابِينَ حِينَ تَرْمَضُ الْفِصَالُ. (رواه مسلم.)

((تَرْمَضُ)) بفتح التاء والميم وبالضاد المعجمة، يعني: شدة الحر.

وَ((الفِصَالُ)) جَمْعُ فَصِيلٍ وَهُوَ: الصَّغِيرُ مِنَ الإِبِلِ.

ترجمہ:—حضرت زید بن اَرقم (رضی اللہ عنہ) نے کچھ لوگوں کو دیکھا کہ دھوپ میں تیزی آنے سے پہلے ہی چاشت کی نماز ادا فرما رہے تھے، ان کو اس طرح نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر فرمایا: ان کو معلوم ہے کہ یہ نماز اس کے علاوہ دوسرے وقت میں (یعنی سورج ذرا اونچا ہو جائے اور دھوپ میں تیزی آجائے اس وقت) پڑھنا بہتر ہے، اس لئے کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں ان کی نماز اُس وقت ہوتی ہے جب کہ اونٹ کے بچّوں کے پاؤں جلنے لگیں۔

افادات:—"فِصَال"، "فَصِيلٌ" کی جمع ہے یعنی اونٹ کا چھوٹا بچّہ۔ دھوپ میں جب تیزی آئے گی تو گرمی ہوگی، اور گرمی میں آپ کھلے پیر چلیں گے تو پاؤں جلیں گے، اور اونٹ کے پاؤں نہیں جلتے، لیکن بچّہ چوں کہ نازک ہوتا ہے اس لیے اس کے پاؤں جلتے ہیں، اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب دھوپ

میں تیزی آجاتی ہے اور جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ تقریباً ساڑھے دس گیارہ کا وقت ہوتا ہے؛ یہی چاشت کا وقت ہے۔

دیکھو! حدیث میں لفظِ اوّابین چاشت کی نماز کے لیے بولا گیا ہے، اور مغرب کی نماز کے بعد جو نفل نماز پڑھی جاتی ہے جس کو ہم اوّابین کی نماز کہتے ہیں، وہ اطلاق حدیث میں نہیں آیا ہے۔ عربی زبان میں ''اَوّاب'' اسے کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف خوب رجوع ہونے والا، اور اپنے گناہوں سے توبہ کرنے والا ہو۔ جو بندے اللہ تعالیٰ کی طرف کثرت سے رجوع ہوتے ہیں اور اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں وہ چاشت کی نماز کا بھی، اور مغرب کے بعد پڑھی جانے والی نمازوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں، اس لیے لغوی اور ڈکشنری معنیٰ کے اعتبار سے دونوں نمازوں کو ''اوّابین'' کہا جاسکتا ہے۔

بَابُ الْحَثِّ عَلَى صَلَاةِ تَحِيَّةِ الْمَسْجِدِ بِرَكْعَتَيْنِ وَكَرَاهَةِ الْجُلُوسِ قَبْلَ أَنْ يُّصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ فِيْ أَيِّ وَقْتٍ دَخَلَ وَسَوَاء صَلَّى رَكْعَتَيْنِ بِنِيَّةِ التَّحِيَّةِ أَوْ صَلَاةً فَرِيْضَةً أَوْسُنَّةً رَاتِبَةً أَوْ غَيْرَهَا

تحیۃ المسجد کی ترغیب اور وہ دو رکعت ہے،

جس وقت بھی مسجد میں داخل ہو،

اس کے پڑھنے سے پہلے بیٹھنا ناپسندیدہ ہے،

چاہے تحیہ کی نیت سے دو رکعت پڑھے، یا کوئی فرض نماز ادا کرلے،

یا سنّتِ مؤکدہ ادا کرلے، یا اور کوئی نماز ادا کرلے

تحیۃ المسجد کی ترغیب اور، اس کے پڑھنے سے پہلے بیٹھنا ناپسندیدہ ہے،

مسجد کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی جب مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے فوراً دو رکعت پڑھ لے۔ شوافع کے یہاں تو اگر بیٹھ گیا تو تحیۃ المسجد کا وقت ختم ہو گیا، لیکن احناف کے یہاں بھی افضل تو یہی ہے کہ بیٹھنے سے پہلے پڑھے لیکن بیٹھنے کے بعد بھی دوبارہ اٹھ کر پڑھ سکتا ہے۔ اور یہ تحیۃ المسجد دراصل تحیۃ ربِّ المسجد ہے، یعنی مسجد کا جو مالک ہے (یعنی اللہ تعالیٰ) اس کے حضور میں ہم سلام کر رہے ہیں۔ جیسے اگر ہم کسی کے مکان میں جائیں اور صاحبِ مکان سامنے موجود ہو پھر بھی اس کو ہم سلام نہ کریں اور ویسے ہی بیٹھ جائیں؛ تو یہ اچھی بات سمجھی جاتی ہے؟ نہیں؛ بلکہ یہ ایک طرح کی گستاخی بے مروتی اور بے ادبی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح یہ دو رکعت دراصل تحیۃ ربِّ المسجد ہے کہ مالکِ مسجد (یعنی اللہ تعالیٰ) کے حضور میں ہم سلام کر رہے ہیں؛ یہ بھی آدابِ مسجد میں سے ہے۔

لاج رہ جائے

ویسے بھی مسجد ایک ایسی جگہ ہے جو نماز کی ادائیگی ہی کے لئے بنائی گئی ہے، اب کوئی آدمی ایسی جگہ میں جائے اور نماز پڑھے بغیر ہی واپس چلا آئے؛ یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا، جیسے مثال کے طور پر میں کہا کرتا ہوں کہ کوئی آدمی ہوٹل میں جائے اور ٹیبل پر پانچ دس منٹ بیٹھ کر واپس چلا آئے؛ تو لوگ کیا کہیں گے؟ ہوٹل تو اس لئے بنائی گئی ہے کوئی اس میں آئے تو کچھ ناشتہ کر لے، کچھ کھا لے اور کھانا

نہیں کھاتا تو کم سے کم ایک پیالی چائے ہی پی لے، تاکہ ہوٹل میں آنے کی لاج رہ جائے۔ اگر ویسے ہی بیٹھ کر واپس آجاؤ گے؛ تو یہ بڑا برا سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اور نماز ادا کرنے ہی کے لئے بنایا گیا ہے، اب اگر ایک آدمی مسجد میں آئے، کچھ دیر تک رکے، اور دو رکعت بھی نہ پڑھے، اور ویسے ہی واپس چلا جائے؛ تو یہ بھی برا سمجھا جائے گا۔ ہاں! اتنی بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ نماز چوں کہ نفل ہے، اس لیے احناف کے یہاں ضروری ہے کہ مکروہ وقت نہ ہو، اگر مکروہ وقت ہو گا تو نہیں پڑھ سکتے، لیکن شوافع کے یہاں فجر اور عصر کے بعد بھی اگر مسجد میں داخل ہو گیا تو پڑھ سکتا ہے، اس لیے کہ ان کے یہاں اس وقت نفل پڑھنے کی گنجائش ہے۔ اسی لئے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کوئی قید بھی نہیں لگائی۔

اب اگر کوئی آدمی مسجد میں آنے کے بعد سیدھا فرض نماز ادا کرنے لگا، جیسے ظہر کے لیے آیا اور دیکھا کہ جماعت ہو رہی ہے اور اس میں شریک ہو گیا۔ یا دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کے بجائے سیدھی چار رکعت سنّتِ مؤکدہ کی نیت باندھ لی؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اس صورت میں تحیّہ والا مقصد حاصل ہو گیا، جیسے: کوئی آدمی ہوٹل میں گیا اور سیدھے کھانے کا آرڈر دیدیا، پہلے چائے یا اسٹارٹر وغیرہ کوئی چیز نہیں لی؛ تب بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

اس چیز کی طرف توجہ دی جائے

حدیث ۱۱۴۶:-

عَنْ أَبِي قَتَادَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلَا يَجْلِسْ حَتَّى يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب مسجد میں داخل ہو تو جب تک کہ دو رکعت نہ پڑھ لے تب تک نہ بیٹھے۔

حدیث ۱۱۴۷:-

عَنْ جَابِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَالَ صَلِّ رَكْعَتَيْنِ.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ مسجد میں تشریف فرما تھے، اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا: دو رکعت پڑھ لو۔

افادات:- آج کل اس کا رواج بہت کم ہو رہا ہے، مثلاً: شادی کی مجلس ہوتی ہے تو لوگ مسجد میں آ کر بس بیٹھ جاتے ہیں، اور آدھ گھنٹہ، گھنٹہ بیٹھتے ہیں، اور مسجد میں آ کر اپنا کام نمٹا کر چلے جاتے ہیں لیکن دو رکعت نہیں پڑھتے، حالاں کہ چاہیے تو یہ تھا کہ آتے ہی پہلے دو رکعت پڑھنے کا اہتمام کیا جاتا۔ اس لیے اس کی طرف خاص توجہ دی جائے۔

بَابُ اِسْتِحْبَابِ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْوُضُوءِ

وضو کے بعد دو رکعت مستحب ہے

وضو کے بعد دو رکعت مستحب ہے

اس باب میں وضو کے بعد دو رکعت کے استحباب کو بتلانا چاہتے ہیں جس کو تحیۃ الوضو کہتے ہیں۔ کوئی آدمی اگر وضو کرے تو چوں کہ وضو نماز کی ادائیگی کا ذریعہ ہے، ویسے تو اُس وضو سے جب چاہے نماز پڑھ سکتے ہیں، لیکن وضو نماز ہی کے لئے کیا جاتا ہے، اس لئے وضو کرتے ہی اوّلین فرصت میں نماز ادا کرلی جائے، تو یہ اس سے فوری طور پر فائدہ اٹھانا ہوگا۔ اس کی بھی فضیلت ہے اسی کو بیان کرنے کے لئے روایت لائے ہیں۔

ایک قابلِ اُمید عمل

حدیث ۱۱۴۸:-

عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ لِبِلَالٍ: يَابِلَالُ! حَدِّثْنِيْ بِأَرْجَى عَمَلٍ عَمِلْتَهُ فِي الْإِسْلَامِ. فَإِنِّي سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ. قَالَ: مَا عَمِلْتُ عَمَلاً أَرْجَى عِنْدِيْ مِنْ أَنِّي لَمْ أَتَطَهَّرْ طُهُوْرًا فِيْ سَاعَةٍ مِنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ إِلَّا صَلَّيْتُ بِذٰلِكَ الطُّهُوْرِ مَا كُتِبَ لِيْ أَنْ أُصَلِّيَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) سے ایک مرتبہ پوچھا: اے بلال! تم نے اسلام میں کوئی ایسا عمل کیا ہو تو بتلاؤ جو تمہاری نگاہوں میں سب سے زیادہ قابلِ امید ہو، اس لئے کہ میں نے جنّت میں اپنے آگے تمہارے جوتوں کی کھڑکھڑاہٹ سنی ہے (اس کے جواب میں) حضرت بلال

(رضی اللہ عنہ) نے کہا: میری نگاہوں میں سب سے زیادہ پُر امید عمل (جو میں نے کیا وہ) یہ ہے کہ رات دن میں کسی وقت جب مَیں وضو کرتا ہوں، تو اس وضو سے اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہوا اتنی نماز ادا کر لیتا ہوں۔

افادات:- کسی کو یہ اشکال نہ ہو کہ حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) جنت میں نبیٔ کریم ﷺ سے آگے کیسے ہو گئے؟ جواب یہ ہے کہ خادم بھی مخدوم سے آگے چلا کرتا ہے، اور یہاں ان کا آگے چلنا گویا خدمت ہی کے طور پر ہے۔ اور یہ بھی خادم کے لئے شرف کی ایک چیز ہے۔

اس سے تحیۃ الوضو کی فضیلت معلوم ہوئی کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی وجہ سے حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) کو جنت میں اتنا اونچا مقام عطا کیا گیا۔

بَابُ فَضْلِ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَوُجُوبِهَا وَالْاِغْتِسَالِ لَهَا وَالطِّيبِ وَالتَّبْكِيرِ اِلَيْهَا، وَالدُّعَاءِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَالصَّلَاةِ عَلَى النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فِيهِ. وَبَيَانُ سَاعَةِ الْاِجَابَةِ، وَاِسْتِحْبَابِ اِكْثَارِ ذِكْرِ اللّٰهِ بَعْدَ الْجُمُعَةِ

یوم جمعہ کی فضیلت، جمعہ کی نماز کا فرض اور ضروری ہونا، جمعہ کی نماز کی ادائیگی کے لئے غسل کرنا، خوشبو کا استعمال کرنا، جمعہ کی ادائیگی کے لئے مسجد جلدی پہنچنا، جمعہ کے دن دعاؤں کا اہتمام کرنا، نبی کریم ﷺ پر درود شریف کا اہتمام، ساعتِ اجابت کا بیان، جمعہ کی نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرنا

یوم جمعہ کی فضیلت، جمعہ کے دن دعاؤں کا اہتمام، نبی کریم ﷺ پر درود شریف کا اہتمام، اور ساعتِ اجابت کا بیان،

جمعہ کے دن کے یہ سارے آداب واعمال ہیں جن کو علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس عنوان میں ذکر کیا ہے اور اُسی کے مناسب روایتیں پیش کریں گے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے امّتِ محمدیہ کو جن مخصوص نعمتوں اور فضائل سے مالامال کیا ہے ان میں سے ایک جمعہ کا دن بھی ہے۔ ہفتہ میں یہ ایک دن ہے جو تمام دنوں کا سردار ہے اور بڑی فضیلت والا دن ہے۔ دن کے انتخاب کے متعلق اگلی امتوں کو اختیار دیا گیا تھا، چناں چہ یہود نے بجائے جمعہ کے ایک دن لیٹ (Late) یعنی سنیچر کو پسند کیا، گویا ان سے چوک ہوگئی۔ اور نصاریٰ نے ایک دن اور لیٹ (Late) کیا یعنی اتوار کو پسند کیا۔ اللہ تعالیٰ نے امّتِ محمدیہ کو اصل فضیلت والا دن یعنی جمعہ عطا فرمایا۔ اسی لئے روایتوں میں آتا ہے، نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہود تم پر اس وجہ سے حسد کرتے ہیں کہ تم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جمعہ کا دن دیا گیا ہے۔ دراصل اللہ تعالیٰ کے یہاں جو پہلے سے منتخب اور پسندیدہ دن تھا؛ وہی امّتِ محمدیہ کو ملا۔

قرآنِ پاک کی آیت پیش کی: ﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللهِ وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾ جب جمعہ کی نماز مکمل ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ تعالیٰ

کا فضل تلاش کرو، یعنی روزی کے لئے کوشش کرو، اور اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرو؛ تاکہ تم کامیابی سے ہم کنار ہو جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی نماز کے بعد کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کا اہتمام کرنا چاہیے۔

سب سے بہترین دن

حدیث ۱۱۴۹:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: خَيْرُ يَوْمٍ طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ يَوْمُ الْجُمُعَةِ، فِيْهِ خُلِقَ آدَمُ، وَفِيْهِ أُدْخِلَ الْجَنَّةَ، وَفِيْهِ أُخْرِجَ مِنْهَا.

ترجمہ:– حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جن دنوں میں سورج طلوع ہوتا ہے، ان میں سب سے بہترین دن جمعہ کا ہے۔ اسی دن میں حضرت آدم (علیہ السلام) پیدا کئے گئے تھے، اسی دن اللہ تعالیٰ نے ان کو جنّت میں داخل کیا، اور اسی دن جنّت سے نکالے بھی گئے۔

افادات:– ہفتہ کے دنوں میں افضل ترین دن جمعہ کا ہے، اور سال کے دنوں میں افضل دن عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ کا ہے۔ اور اگر عرفہ کا دن جمعہ کو پڑ جائے؛ تو پھر نورٌ علیٰ نورٍ؛ دونوں فضیلتیں جمع ہو جائیں گی۔

ساری مخلوقات زمین و آسمان وغیرہ اور دنوں میں پیدا ہوئیں لیکن ساری کائنات کا خلاصہ اور پیدائش کا مقصود یعنی حضرت انسان کے جدِّ امجد حضرت آدم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن

پیدا کیا۔ اور جمعہ ہی کے دن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم (علیہ السلام) کو جنّت میں داخل کیا اور جمعہ ہی کے دن جنّت سے نکالے بھی گئے۔

اب یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جمعہ کے دن پیدا کیا جانا، اور جمعہ کے دن جنّت میں داخل ہونا؛ تو ایک فضیلت کی بات تھی، لیکن جنت سے نکالے جانے میں کونسی فضیلت تھی جس کو یہاں ذکر کیا ہے؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جنّت سے نکال کر دنیا میں لائے گئے تب ہی تو انبیاء اور اولیاء وجود میں آئے، ان کا جنّت سے نکال کر دنیا میں بھیجا جانا اللہ کے مقبول بندوں، انبیاء و اولیاء وغیرہ کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنا؛ اس معنیٰ کر یہ خیر ہی کی چیز تھی۔

جمعہ کے اہتمام پر دس دنوں کے گناہ معاف

حدیث ۱۱۵۰:-

وَعَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوَضُوْءَ ثُمَّ أَتَى الْجُمُعَةَ، فَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ؛ غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ وَزِيَادَةُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ. وَمَنْ مَسَّ الْحَصَى فَقَدْ لَغَا.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے وضو کیا اور اچھا وضو کیا (یعنی وضو کے تمام آداب اور سنتوں کی رعایت کرتے ہوئے وضو کیا) پھر جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں آیا اور خطبہ کی طرف کان لگائے اور خاموش رہا (خطبہ کے دوران بات چیت یا لغویات میں مشغول نہیں رہا) تو اس جمعہ سے

لے کر دوسرے جمعہ تک اور مزید تین دن (یعنی کل دس دن کے) اس کے گناہ معاف کر دئے جائیں گے اور جس نے کنکریوں کو چھوا؛ اس نے لغو کام کیا۔

افادات:- خطبہ کے دوران کسی قسم کے کھیل میں مشغول نہ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس زمانہ میں مسجد میں پختہ فرش اور قالین وغیرہ بچھے ہوئے نہیں ہوتے تھے، بلکہ عام طور پر ریت اور کنکریاں ہوتی تھیں، جو لوگ غفلت والے ہوتے تھے وہ کنکریوں میں مشغول رہتے تھے، جیسے: آج کل لوگ کپڑے اور انگلی، گھڑی، موبائل وغیرہ میں مشغول ہوتے ہیں اور ان سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ان ساری چیزوں سے توجہ ہٹا کر پورے طور پر خطبہ سننے کی طرف توجہ دیں گے تب تو یہ فضیلت حاصل ہوگی، اور اگر اِدھر اُدھر مشغول رہا تو پھر یہ فضیلت حاصل نہیں ہوگی۔

حدیث ۱۱۵۱:-

وَعَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ :الصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ ، وَالْجُمُعَةُ إِلَى الْجُمُعَةِ ، وَرَمَضَانُ إِلَى رَمَضَانَ ؛ مُكَفِّرَاتٌ مَا بَيْنَهُنَّ إِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ .

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانچوں نمازیں اور جمعہ سے لے کر جمعہ کی نماز، اور رمضان سے لے کر دوسرے رمضان؛ یہ سب درمیان کے گناہوں کے لئے کفّارہ ہیں جب تک کہ آدمی کبائر سے بچے۔

افادات:- یہ روایت پہلے بھی آگئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ سارے اعمال وہ ہیں جن کی وجہ سے آدمی کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ اور پہلے بھی بتلایا تھا کہ وضو کی وجہ سے، نمازوں کی وجہ سے،

اور روزوں کی وجہ سے جو گناہ معاف ہوتے ہیں؛ وہ صغائر یعنی چھوٹے گناہ ہوتے ہیں، بڑے گناہ تو جب تک آدمی توبہ نہ کرے تب تک معاف نہیں ہوتے۔

جمعہ چھوڑنے سے باز آجائیں، ورنہ

حدیث ۱۱۵۲:-

وَعَنْهُ وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ (رضی اللہ عنہم) أَنَّهُمَا سَمِعَا رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ عَلَى أَعْوَادِ مِنْبَرِهِ: لَيَنْتَهِيَنَّ أَقْوَامٌ عَنْ وَدْعِهِمُ الْجُمُعَاتِ، أَوْ لَيَخْتِمَنَّ اللهُ عَلَى قُلُوْبِهِمْ، ثُمَّ لَيَكُوْنُنَّ مِنَ الْغَافِلِيْنَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ اور حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم) سے روایت ہے کہ ان دونوں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپ منبر پر خطبہ دے رہے تھے: لوگ جمعہ کی نمازوں کو چھوڑنے سے باز آجائیں، ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر لگا دیں گے، پھر وہ ہمیشہ کے لئے غافل بن جائیں گے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ جمعہ کی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ اور جمعہ کی نماز چھوڑنے پر اتنی سخت وعید ہے کہ آدمی کے لئے دل پر مہر لگنے کا سبب بنتا ہے، اس کے بعد آدمی سے نیکی کی توفیق چھن جاتی ہے۔

جمعہ کے غسل کا حکم

حدیث ۱۱۵۳:-

وَعَنِ ابْنَ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا جَاءَ أَحَدُكُمُ الْجُمُعَةَ؛ فَلْيَغْتَسِلْ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لئے آئے؛ تو غسل کرلے۔

افادات:- جمعہ کا غسل ایک زمانہ میں ضروری اور واجب تھا جس زمانہ میں مسلمان خود ہی محنت مزدوری کا کام کرتے تھے، اور کپڑوں کی کمیابی کی وجہ سے کپڑے بدلنے کی نوبت بھی نہیں آتی تھی، پھر وہ ملک بھی گرم تھا اور مسجد کی چھت ایک دم سروں کے قریب تھی، اس کی وجہ سے اگر غسل نہ ہوتا اور کپڑے نہ بدلے گئے ہوتے تو بھیڑ کی وجہ سے ایک دوسرے کے پسینے کی بدبو سے لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی؛ تو نبی کریم ﷺ نے غسل کو ضروری قرار دیا تھا۔ لیکن پھر بعد میں مالی وسعت ہوگئی اور کپڑوں کی بھی بہتات ہوگئی، دیگر سہولتیں ہوگئیں، تو پھر اس کی فرضیت باقی نہیں رہی، لیکن اس روایت اور آگے والی روایت کی وجہ سے ظاہر یہ آج بھی جمعہ کے غسل کے وجوب کے قائل ہیں۔

حدیث ۱۱۵۴:-

وَعَنْ أَبِي سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: غُسْلُ يَوْمِ الْجُمُعَةِ وَاجِبٌ عَلَى كُلِّ مُحْتَلِمٍ. (متفق عليه)

المراد بِالْمُحْتَلِمِ: الْبَالِغُ. وَالْمُرَادُ بِالْوَاجِبِ وُجُوبُ اخْتِيَارٍ، كَقَوْلِ الرَّجُلِ لِصَاحِبِهِ: حَقُّكَ وَاجِبٌ عَلَيَّ.

ترجمہ:– حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جمعہ کے دن ہر بالغ پر غسل واجب ہے۔

حدیث ۱۱۵۵:–

وَعَنْ سَمُرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَنْ تَوَضَّأَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَبِهَا وَنِعِمَتْ، وَمَنِ اغْتَسَلَ فَالْغُسْلُ أَفْضَلُ.

ترجمہ:– حضرت سمرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی نے جمعہ کے دن وضو کیا تو بہت اچھا کیا، اور اگر غسل کیا تو اور زیادہ اچھا کیا، اور یہی افضل ہے۔

افادات:– اکثر علماء فرماتے ہیں کہ اس روایت سے تاکید مقصود ہے، اگر کوئی آدمی غسل نہیں کرے گا تو وہ گنہگار نہیں ہو گا جیسا کہ دوسری روایت میں ہے۔ ویسے جمعہ کا غسل سنّت ہے، اسی لئے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ یہاں وجوب سے مراد وجوبِ اختیاری ہے، یعنی ایسا واجب نہیں ہے کہ جس کے چھوڑنے پر گناہ ہو، بلکہ جمعہ کا غسل سنت اور آداب میں سے ہے۔

جمعہ کے غسل کا وقت

اب غسل کب کرنا چاہیے؟ ویسے صبحِ صادق کے بعد کبھی بھی کر سکتے ہیں، اگر اس سے پہلے کوئی آدمی غسل کرلے گا تو سنّت ادا نہیں ہو گی۔ اور جس غسل میں وضو کیا گیا ہے، اسی وضو سے جمعہ کی نماز ادا کرے تو زیادہ مناسب ہے۔ اگر کسی کو اطمینان ہو کہ صبح جلدی غسل کرلوں گا، اور اس میں کیا

ہوا وضو جمعہ کی نماز تک باقی رہے گا؛ تو بہت اچھا ہے، اس کے باوجود اگر درمیان میں وضو ٹوٹ گیا تو پھر سے وضو کرلے، اور جمعہ کی سنّت کی طرف سے وہی غسل کافی ہے۔ اور اگر اسی وضو سے جمعہ کی نماز ادا کرنے کی غرض سے تاخیر کی اور ۹ یا ۱۰ ؍ بجے غسل کیا؛ تب بھی کوئی حرج کی بات نہیں، بلکہ یہی زیادہ مناسب ہے۔

دوسری روایت کو لاکر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ جمعہ کا غسل جو اوپر کی روایت میں واجب بتلایا ہے وہ واجب نہیں رہا، بلکہ صرف وضو پر بھی اکتفا کرلے تو درست ہے

جمعہ کی سنتیں اور آداب

حدیث ۱۱۵۶:-

وَعَنْ سَلْمَانَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ، وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ، أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ، ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ، إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَى. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی جمعہ کے دن غسل کرتا ہے اور اپنی طاقت کے مطابق پاکی حاصل کرتا ہے، بالوں میں تیل لگاتا ہے، گھر میں خوشبو ہو تو استعمال کرتا ہے (اور صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہے پھر مسجد میں جاتا ہے) اور دو آدمیوں کے درمیان جدائی نہیں کرتا (یعنی کسی کو

پھلانگ کر آگے نہیں جاتا) پھر اللہ تعالیٰ نے جو مقدر فرمایا اتنی نماز پڑھتا ہے، اور جب امام خطبہ دیتا ہے تو خاموش بیٹھتا ہے؛ تو اس کے اِس جمعہ سے لے کر دوسری جمعہ تک کے تمام گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں۔

افادات:- جمعہ کے دن لوگوں کی گردنوں کو پھلانگ کر آگے جانے پر بڑی سخت وعید آئی ہے، کوئی آدمی اگر ایسا کرے گا تو قیامت کے دن اس کو پُل بنایا جائے گا، لیکن اگر اگلی صفوں میں جگہیں خالی ہیں اور پیچھے کی صفوں میں بیٹھنے والوں نے وہ جگہیں پُر نہیں کی ہیں، تو پھر اس صورت میں فقہاء نے لکھا ہے کہ آگے کی صف کو پُر کرنے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی علاج ہی نہیں ہے، اس لیے اگر کوئی آدمی لوگوں کو پھلانگ کر آگے جائے تو اس کی اجازت ہے، اس لیے کہ انہوں نے خود ہی پیچھے بیٹھ کر اپنی حرمت کو ختم کیا ہے۔

دیکھو! اس روایت میں جمعہ کی سنتوں اور آداب میں سے کئی چیزیں بتلائی گئی ہیں۔ ایک تو جمعہ کا غسل کرلے، اگر ناخن بڑھ گئے ہوں تو ان کو کاٹ لے، اگر بال بڑھ گئے ہوں تو ان کو ٹھیک کروالے، بغل کے بال بڑھ گئے ہوں تو ان کو صاف کرلے، زیرِناف کے بال صاف کرلے، پھر غسل کرے، اس کے پاس جو خوشبو ہو وہ خوشبو لگائے، پھر صاف شفّاف دُھلے ہوئے کپڑے جو اپنے پاس ہوں پہنے، ان میں بھی اگر سفید ہوں تو زیادہ پسندیدہ ہیں، اگر عمامہ استعمال کرے تو اس کو بھی پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، پھر مسجد کے لئے روانہ ہو جائے۔

جمعہ کی تیاری اور اہتمام جمعرات سے کرنی چاہیے

امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ قرنِ اوّل میں لوگ جمعہ کی تیاری جمعرات سے شروع کر دیتے تھے، اس لیے آدمی استغفار کا اہتمام کرے، اللہ کا ذکر بڑھا دے، دعائیں کرے کہ کل جمعہ کا دن آرہا ہے اس کو کما حقہ' وصول کر پاؤں۔ اور کل جو کپڑے پہننے ہیں ان کو تیار کر کے ابھی سے رکھ دے تاکہ کل کپڑوں کی تیاری میں وقت ضائع نہ ہو۔ آج کل ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ عین وقت پر استری لے کر کپڑوں کو استری کرنے کے لئے بیٹھیں گے، یہ تو وقت ضائع کرنا ہی ہوا، حالاں کہ پہلے سے تیاری کرنی چاہئے تاکہ جمعہ کے دن کی گھڑیاں ضائع نہ ہونے پائیں۔

امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ بھی لکھا ہے کہ اکابر فرماتے تھے کہ جو آدمی جمعہ کی اگلے روز سے تیاری کرے یہ اس کی سعادت کی بات ہے۔ اور بڑا بدنصیب ہے وہ آدمی جو جمعہ کی صبح کو یہ پوچھے کہ آج کون سا دن ہے۔ مطلب یہ کہ اس کو یہ بھی پتہ نہیں کہ آج کون سا دن ہے، اس لیے پہلے سے آدمی کو اس کی تیاری کرنی چاہئے۔

ایسے بھی تھے

اُس زمانہ میں بجلی تو تھی نہیں، اس لیے یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ میں لوگ سحری کے وقت سے چراغ لے کر جمعہ کی نماز کے لئے نکل جاتے تھے، اور بہت سے لوگ صبحِ صادق ہوتے ہی جمعہ کی نماز

کی ادائیگی کے لئے مسجد چلے جاتے اور جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد واپس لوٹتے تھے۔ اور بعض لوگ تو فارغ ہونے کے بعد بھی وہیں ذکر میں مشغول رہتے تھے اور دیر سے واپس گھر لوٹتے تھے۔ بہر حال! اُس زمانہ میں جمعہ کی ادائیگی کے لئے فجر کے وقت سے نکلنے کا عام رواج تھا۔

جمعہ کے لیے مسجد پہنچنے کے پانچ درجے

حدیث ۱۱۵۷:-

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ غُسْلَ الْجَنَابَةِ، ثُمَّ رَاحَ فِى السَّاعَةِ الأُوْلَى، فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَدَنَةً. وَمَنْ رَاحَ فِى السَّاعَةِ الثَّانِيَةِ، فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَقَرَةً. وَمَنْ رَاحَ فِى السَّاعَةِ الثَّالِثَةِ، فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ كَبْشاً أَقْرَنَ. وَمَنْ رَاحَ فِى السَّاعَةِ الرَّابِعَةِ، فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ دَجَاجَةً. وَمَنْ رَاحَ فِى السَّاعَةِ الْخَامِسَةِ، فَكَأَنَّمَا قَرَّبَ بَيْضَةً. فَإِذَا خَرَجَ الإِمَامُ، حَضَرَتِ الْمَلَائِكَةُ يَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

قَوْله: ((غُسْلُ الْجَنَابَةِ)) أَيْ غُسْلاً كَغُسْلِ الْجَنَابَةِ فِى الصِّفَةِ.

ترجمہ:— حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے جمعہ کے دن جنابت کی طرح غسل کیا (یعنی واجبات، سنتیں اور مستحبات کی پوری رعایت کے ساتھ مکمل طریقہ سے غسل کیا) پھر پہلی گھڑی میں مسجد پہنچ گیا تو گویا اس نے اونٹ کی قربانی کی۔ اور جو دوسری گھڑی میں پہنچا، گویا اس نے گائے کی قربانی کی۔ اور جو تیسری گھڑی میں پہنچا، گویا اس نے سینگ دار مینڈھے کی قربان کی۔ اور جو چوتھی گھڑی میں پہنچا، گویا اس نے

مرغی کی قربانی کی۔ اور جو پانچویں گھڑی میں پہنچا، گویا اس نے اللہ کے راستہ میں انڈا پیش کیا۔ پھر جب امام خطبہ دینے کے لئے آتا ہے تو فرشتے مسجد میں حاضر ہو جاتے ہیں اور خطبہ سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

افادات:- بعضوں نے کہا کہ دوسری حدیث میں "مَنِ اغْتَسَلَ وَغَسَّلَ"(۱) کے الفاظ آتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ بہتر قرار دیا گیا ہے کہ آدمی اگر اپنی بیوی سے شبِ جمعہ میں صحبت کرلے اور پھر غسل کرے تو بہت اچھا ہے، تاکہ نگاہ کی پاکیزگی اور طبیعت کی یکسوئی بھی حاصل ہو جائے۔

امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ پہلی گھڑی سے مراد صبحِ صادق کے بعد کا ابتدائی وقت ہے، یعنی صبحِ صادق ہوتے ہی غسل کرکے تیّار ہو کر جمعہ کی نماز پڑھنے کے ارادہ سے مسجد پہنچ جائے، تو اس کو اونٹ کی قربانی کرنے کا جو ثواب ملتا ہے اُتنا ثواب ملے گا۔ اور دوسری گھڑی سے مراد سورج طلوع ہونے کے بعد وقتِ مکروہ ختم ہونے سے پہلے کا وقت ہے۔ اور تیسری گھڑی سے مراد اشراق کا وقت ہے۔ اور چوتھی اور پانچویں گھڑی سے مراد چاشت کا وقت (یعنی دس، گیارہ بجے سے زوال سے پہلے پہلے تک کا وقت) ہے، اور جہاں زوال ہو گیا تو اب یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

---

(۱)

عَنْ أَوْسِ بْنِ أَوْسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَغَسَّلَ وَبَكَّرَ وَابْتَكَرَ وَدَنَا وَاسْتَمَعَ وَأَنْصَتَ كَانَ لَهُ بِكُلِّ خَطْوَةٍ يَخْطُوهَا أَجْرُ سَنَةٍ صِيَامُهَا وَقِيَامُهَا.

قَالَ مَحْمُودٌ قَالَ وَكِيعٌ: اغْتَسَلَ هُوَ وَغَسَّلَ امْرَأَتَهُ. قَالَ وَيُرْوَى عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ الْمُبَارَكِ أَنَّهُ قَالَ فِي هَذَا الْحَدِيثِ: مَنْ غَسَّلَ وَاغْتَسَلَ، يَعْنِي غَسَلَ رَأْسَهُ وَاغْتَسَلَ. (سنن ترمذی، باب ماجاء فی فضل الغسل یوم الجمعۃ)

قابلِ اصلاح طرزِ عمل

آج کل عام طور پر ہم لوگوں کا مزاج یہ بن گیا ہے کہ ہم زوال کے بعد ہی مسجد میں آتے ہیں، حالاں کہ اس وقت تو یہ ساری فضیلتیں ختم ہو جاتی ہیں، اس لیے اُس سے پہلے آنے کا اہتمام کرنا چاہیے، اخیری درجہ میں زوال سے کم از کم ایک دو گھنٹہ پہلے تو مسجد میں آ ہی جائے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ فرشتے رجسٹر لے کر مسجد کے دروازے پر بیٹھتے ہیں اور آنے والوں کا نام درج کرتے ہیں۔ بعض روایتوں میں یہ آیا ہے کہ چاندی کے اوراق اور سونے کے قلم ہوتے ہیں، اُس سے وہ لکھتے ہیں۔ اور جو آدمی ہمیشہ کا جلدی آنے کا عادی ہوتا ہے پھر کسی دن وہ نہیں آپاتا، تو فرشتے آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ فلاں آدمی اب تک نہیں آیا؛ کیا بات ہے، وہ تو ہمیشہ جلدی آتا ہے۔ پھر فرشتے دعا کرتے ہیں کہ: اے اللہ! اگر اس کو کوئی بیماری ہو گئی ہو؛ تو اچھا کر دے۔ کچھ تکلیف ہو؛ تو دور کر دے۔ کسی پریشانی میں مبتلا ہو گیا ہو؛ تو اس کی پریشانی کو دور کر دے۔ اگر کسی غفلت میں پڑ گیا ہو؛ تو اس کی غفلت کو ختم کر دے تاکہ وہ جلدی سے آجائے۔ جیسے جو آدمی دوستوں کی محفل میں ہمیشہ پہنچنے کا عادی ہو اور کسی دن نہ آئے تو سب کیسی فکر کرتے ہیں، فرشتوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ جو آدمی مسجد میں آنے کا عادی ہو اور کسی دن اپنے وقت پر نہیں پہنچ سکا تو فرشتے آپس میں مذاکرہ کرتے ہیں اور اس کے لئے دعا کرتے ہیں کہ اس کی جو رکاوٹ ہو وہ اللہ تعالیٰ دور کر دے تاکہ وہ جلدی سے مسجد میں آجائے، لیکن جب زوال ہو جاتا ہے تو فرشتے اپنے رجسٹر بند کر کے مسجد

میں آجاتے ہیں، اس کے بعد جو آتا ہے وہ نماز کے حق کی وجہ سے آتا ہے، اس کو جمعہ کی فضیلت حاصل نہیں ہوتی۔

جمعہ کے دن ایک گھڑی

حدیث ۱۱۵۸:-

وَعَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ ذَكَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَقَالَ: فِيهَا سَاعَةٌ لَا يُوَافِقُهَا عَبْدٌ مُسْلِمٌ، وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي يَسْأَلُ اللهَ شَيْئاً، إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ. وَأَشَارَ بِيَدِهِ يُقَلِّلُهَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے جمعہ کے دن کا تذکرہ کیا اور فرمایا: اس دن میں ایک گھڑی ایسی ہے کہ کوئی مسلمان جب اس کو پالیتا ہے اس حال میں کہ وہ نماز میں ہو، یا اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہو، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ سے جو چیز بھی مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو وہ عطا کر دیتے ہیں۔ اور آپ ﷺ نے ہاتھ کے اشارہ سے فرمایا کہ: وہ وقت بہت کم ہوتا ہے۔

افادات:- مطلب یہ کہ چند سیکنڈوں یا کچھ منٹوں کا وقت ہوتا ہے، اس گھڑی میں جو مانگتا ہے وہ قبول ہوتا ہے۔ وہ گھڑی کون سی ہے؟ اللہ تعالیٰ نے وہ گھڑی جمعہ کے دن میں رکھی ہے، اور اس سلسلہ میں بہت ساری باتیں کہی گئی۔ علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی زوال سے لے کر امام کے خطبہ سے فارغ ہونے تک، اور عصر سے لے کر مغرب تک مشغول رہے گا، یقیناً اس کو وہ گھڑی مل جائے گی اور یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی، اس لئے اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب (نور اللہ مرقدہٗ) کو دیکھا کہ حضرت اس کا بڑا اہتمام فرماتے تھے کہ زوال سے پہلے مسجد پہنچ جاتے تھے اور پھر کسی سے بھی بات چیت نہیں فرماتے تھے۔ اسی طرح عصر کے بعد بھی کسی سے بات نہیں کرتے تھے اور مغرب تک مراقبہ و دعا وغیرہ میں مشغول رہتے تھے۔ اس لیے آدمی اگر ان دو اوقات کا اہتمام کرلے تو امید ہے کہ ان شاء اللہ اس کو وہ گھڑی حاصل ہو جائے گی۔

حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت ہے کہ جمعہ کے دن جب سورج غروب ہونے کے قریب ہوتا تو پہلے سے اپنی خادمہ کو بھیج دیتی تھیں کہ جاؤ اور سورج کو دیکھتی رہو، جب سورج غروب ہونے کے قریب ہو تا یعنی دس، پندرہ منٹ باقی رہ جاتے تو وہ آکر اطلاع کرتی تھی، اور حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) دعا میں مشغول ہو جاتی تھیں اور فرماتی تھی کہ یہی وہ گھڑی ہے کہ جس میں دعا قبول ہوتی ہے۔

حدیث ۱۱۵۹:-

وَعَنْ أَبِي بُرْدَةَ بْنِ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ عَبْدُ اللهِ بْنَ عُمَرَ (رضی اللہ عنہما) : أَسَمِعْتَ أَبَاكَ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ فِي شَأْنِ سَاعَةِ الْجُمُعَةِ؟ قَالَ قُلْتُ: نَعَمْ! سَمِعْتُهُ يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: هِيَ مَا بَيْنَ أَنْ يَجْلِسَ الْإِمَامُ إِلَى أَنْ تُقْضَى الصَّلَاةُ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) صحابی ہیں ان کے صاحبزادے حضرت ابو بردہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا: تم نے اپنے ابا کو جمعہ کی گھڑی کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے کوئی روایت بیان فرماتے ہوئے سنا؟ انھوں نے کہا: جی ہاں! میں نے ان کو سنا ہے، وہ فرماتے تھے کہ میں نے نبیؐ

کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: وہ گھڑی امام کے خطبہ کے لئے بیٹھنے سے لے کر نماز ختم ہونے تک ہے۔ (جب امام خطبہ کے لئے بیٹھ جائے تو زبان سے دعا نہیں کر سکتے لیکن دل سے آدمی دعا کر سکتا ہے۔)

جمعہ کے دن کثرت سے درود بھیجا کرو

حدیث ۱۱۶۰:-

وَعَنْ أَوْسِ بْنِ أَوْسٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: إِنَّ مِنْ أَفْضَلِ أَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَأَكْثِرُوْا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيْهِ، فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوْضَةٌ عَلَيَّ.

ترجمہ:- حضرت أوس بن أوس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبئ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے دنوں میں سب سے افضل دن جمعہ کا دن ہے، اُس دن مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو، تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

افادات:- جمعہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن میں نبئ کریم ﷺ پر کثرت سے درود پڑھے۔ ویسے جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد ایک مخصوص درود کی فضیلت آئی ہے، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے اسّی مرتبہ اگر یہ درود شریف پڑھا جائے: "أَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدِ نِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَسَلِّمْ تَسْلِيْماً" تو اس کے اسّی سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور اسّی سال کی عبادت کا ثواب لکھا جاتا ہے۔ جمعہ کے دن اور بھی درودوں کی فضیلت آئی ہے، اس لیے ان درودوں کے پڑھنے کا جمعہ کی رات میں جمعہ کے دن میں اہتمام کیا جائے۔ اکابر کے یہاں اس کا اہتمام ہوتا تھا کہ شبِ جمعہ میں وہ

خصوصیت کے ساتھ درود پڑھا کرتے تھے۔ ویسے کوئی آدمی وظیفے یا معمول کے طور پر شبِ جمعہ میں کچھ مقدار مقرر کرلے تو زیادہ پسندیدہ ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ میرے اوپر پیش ہوتا ہے، اور حضور ﷺ اس کی طرف خصوصی توجہ فرماتے ہیں۔ بہر حال! آدمی کو اس کا بہت ہی اہتمام کرنا چاہیے۔

سورۂ کہف کا بھی اہتمام ہو

جمعہ کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں سورۂ کہف پڑھی جائے، شبِ جمعہ میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ علامہ شامی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ جمعہ کے دن عصر سے پہلے پہلے پڑھ لے، اس لیے کہ عصر پر فرشتوں کی ڈیوٹی بدل جاتی ہے، اور اگلے دن والے فرشتے آجاتے ہیں، اس لئے اس سے پہلے سورۂ کہف آدمی پڑھ لے گا تو وہ اس کے لئے نور بنتی ہے

بَابُ اِسْتِحْبَابِ سُجُوْدِ الشُّكْرِ عِنْدَ حُصُوْلِ نِعْمَةٍ ظَاهِرَةٍ أَوِانْدِفَاعِ بَلِيَّةٍ ظَاهِرَةٍ

اگر کوئی نعمت حاصل ہوئی یا کوئی مصیبت ٹل گئی، تو اس پر سجدۂ شکر پسندیدہ اور مستحب ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتیں جو ہر آن اور ہر گھڑی ہمارے اوپر بارش کی طرح برستی رہتی ہیں، ان کے شکرانہ کے طور پر ہی تمام عبادات مقرر کی گئی ہیں، لیکن اس کے باوجود بعض موقعوں پر کوئی مخصوص نعمت اللہ تعالیٰ کی حاصل ہوتی ہے جس کو بندہ بھی محسوس کرتا ہے کہ خصوصی چیز مجھے حاصل ہوئی ہے، یا کوئی بڑی مصیبت جس کا اندیشہ تھا وہ ٹل جاتی ہے؛ تو ایسے موقعوں پر شکرانہ کے نام سے کم از کم دو رکعت نماز ادا کر لینا، یا اگر اس کا موقع نہیں ہے تو شکر کی ادائیگی کی نیت سے صرف ایک سجدہ ہی کر لینا سجدۂ شکر کہلاتا ہے جو مستحب و پسندیدہ ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے شکرانہ کے طور پر ایک اچھی چیز ہے، آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نبیٔ کریم ﷺ سے مختلف مواقع پر سجدۂ شکر ثابت ہے۔

غزوۂ بدر کے موقع پر حضور اکرم ﷺ نے جنگ کے ختم ہونے پر پوچھا تھا کہ ابوجہل کا کیا ہوا؟ کوئی اس کی خبر لے کر آؤ۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَیں نے کہا کہ میں معلوم کر کے آتا ہوں۔ وہ میدانِ جنگ میں گئے جہاں زخمی پڑے ہوئے تھے، دیکھا کہ ابوجہل بالکل آخری حالت میں پڑا ہوا ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کے سینے پر چڑھ گئے اور کہنے لگے: تو ہی تو ابوجہل ہے؟ اس نے اس حالت میں بھی کہا: ”لَقَدِ ارتَقَیتَ یَا رُوَیعَ الغَنَمِ مُرتَقیً صَعباً“ اے بکریوں کے چرواہے! تو بڑے اونچے مشکل مقام پر چڑھ گیا ہے۔ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تجھے رسوا کیا۔ اس نے کہا: کیوں ؛ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے تجھے ذلیل کیا، تو قتل ہوا اور اب مر رہا ہے۔ اس نے کہا: تم نے ایک آدمی ہی کو تو قتل کیا ہے، اس میں کونسا تیر مارا؟ خیر! اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح نصیب فرمائی۔ تو ابوجہل نے کہا: میری طرف سے محمد (ﷺ) کو بتلانا کہ میرے دل میں تمہارا بغض اور کینہ پہلے جتنا تھا اس وقت اس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر ابوجہل نے پوچھا: تیرا ارادہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: میں تو تیرا سر قلم کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا: میری تلوار سے کاٹنا، وہ بڑی تیز ہے، اور ذرا نیچے سے کاٹنا تاکہ دوسرے سروں میں میرا سر اونچا نظر آئے۔ بہرحال! اس کا سر کاٹ کر حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے سامنے اس کا سر لا کر ڈالا، اور کہا: اے اللہ کے رسول! یہ اللہ کے دشمن ابوجہل کا سر ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہو کہ یہ اسی کا سر ہے؟ کہا: جی ہاں۔ تو حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور فوراً سجدہ میں گر گئے۔

بہر حال! مختلف مواقع پر نبیٔ کریم ﷺ سے سجدۂ شکر کرنا یا شکرانہ کی دو رکعت ادا کرنا ثابت ہے ،بلکہ ابن ماجہ شریف کی روایت میں ہے کہ اِس موقع پر آپ ﷺ نے دو رکعات ادا فرمائی۔ پھر حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے ابو جہل کے ساتھ ہوئی گفتگو بھی سنائی تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ میری امت کا فرعون ہے جو حضرت موسیٰ کے فرعون سے بھی بڑھ کر ہے کہ وہ تو مرتے مرتے کلمہ پڑھنے پر آمادہ ہو گیا تھا، لیکن یہ تو مرتے مرتے بھی ایسی ہی باتیں کر گیا۔

اسی سلسلہ میں روایت پیش کرتے ہیں:

حدیث ۱۱۶۱:-

عن سعد بن أَبي وقاص (رضی اللہ عنہ) قَالَ: خَرَجْنَا مَعَ رسولِ الله ﷺ مِنْ مَكَّةَ نُرِيدُ المَدِينَةَ، فَلَمَّا كُنَّا قَرِيباً مِنْ عَزْوَرَاءَ، نَزَلَ ثُمَّ رَفَعَ يَدَيْهِ فَدَعَا اللهَ سَاعَةً، ثُمَّ خَرَّ سَاجِداً، فَمَكَثَ طَويلاً، ثُمَّ قَامَ فَرَفَعَ يَدَيْهِ سَاعَةً، ثُمَّ خَرَّ سَاجِداً - فَعَلَهُ ثَلاثاً - وقال: ((إنِّي سَأَلتُ رَبِّي، وَشَفَعْتُ لأُمَّتِي، فَأَعْطَانِي ثُلُثَ أُمَّتِي، فَخَرَرْتُ سَاجِداً لِرَبِّي شُكْراً، ثُمَّ رَفَعْتُ رَأسِي، فَسَأَلْتُ رَبِّي لأُمَّتِي، فَأَعْطَانِي ثُلُثَ أُمَّتِي، فَخَرَرْتُ سَاجِداً لِرَبِّي شُكْراً، ثُمَّ رَفَعْتُ رَأسِي، فَسَأَلْتُ رَبِّي لأُمَّتِي، فَأَعْطَانِي الثُّلُثَ الآخرَ، فَخَرَرْتُ سَاجِداً لِرَبِّي)) (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لیے روانہ ہوئے، راستہ میں ایک مقام "عَزْوَرَاء" پڑتا تھا، جب ہم وہاں پہنچے تو نبیٔ کریم ﷺ اپنی سواری سے نیچے اترے اور آپ نے ہاتھ اٹھا کر تھوڑی دیر تک اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی، اس کے بعد آپ سجدہ میں گر گئے، اور دیر تک سجدہ میں رہے، پھر کھڑے ہوئے اور کچھ دیر تک آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، پھر آپ سجدہ میں گر گئے اور دیر تک

سجدہ میں رہے، پھر اٹھے اور کچھ دیر تک ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی، پھر سجدہ میں گر گئے، اور دیر تک سجدہ میں رہے (گویا تین مرتبہ ایسا کیا) اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پہلی مرتبہ جب میں نے دعا کی تو میں نے اپنی امت کی مغفرت کے متعلق اللہ تعالیٰ سے سفارش کی اور سوال کیا، تو اللہ تعالیٰ ایک تہائی امت کی مغفرت کا وعدہ فرمادیا تو میں اس کے شکرانہ کے طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گیا اور دیر تک سجدہ میں پڑا رہا۔ پھر میں اٹھا اور دوبارہ اپنی امت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے مزید ایک تہائی امت کے گناہوں کو معاف کرنے کا مجھ سے وعدہ فرمایا جس کے شکرانہ میں مَیں سجدہ میں گر گیا اور دیر تک سجدہ میں رہا، پھر میں نے سر اٹھایا اور اللہ تعالیٰ سے اپنی بقیہ امت کے لیے دعا کی، چناں چہ اللہ تعالیٰ نے آخری تہائی حصہ کی بھی مغفرت کا وعدہ فرمادیا، تو اس کے شکرانہ میں بھی مَیں اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ میں گر گیا۔

افادات:- تو دیکھئے! حضور اکرم ﷺ نے اپنی امت کی مغفرت اور ان کے گناہوں کی معافی کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور سفارش فرمائی، اور جوں جوں قبول ہوتی گئی اس پر نبیٔ کریم ﷺ بطور شکرانہ کے سجدہ فرماتے رہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی خصوصی نعمت کے حصول پر آدمی کو سجدۂ شکر بجالانا چاہیے۔

بَابُ فَضۡلِ قِيَامِ اللَّيۡلِ

تہجد کی نماز کی فضیلت

قَالَ اللهُ تَعَالٰی: وَمِنَ اللَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ عَسَى أَن يَبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحۡمُوداً.

وَقَالَ تَعَالٰی: تَتَجَافٰی جُنُوبُهُمۡ عَنِ الۡمَضَاجِعِ.

وَقَالَ تَعَالٰی: كَانُوا قَلِيلاً مِّنَ اللَّيۡلِ مَا يَهۡجَعُونَ.

تہجد کی نماز کی فضیلت بیان کرنے کے لئے یہ باب قائم کیا ہے۔

فرائض کے بعد نوافل و سنن نمازوں میں تہجد کی نماز بڑی اہمیت کی حامل ہے، ایک روایت میں ہے کہ فرائض کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والی نماز اگر کوئی ہے تو وہ تہجد کی نماز ہے۔ شروع اسلام میں جب کہ پنج وقتہ نمازیں فرض نہیں ہوئی تھیں اس وقت سورۂ مزمل نازل ہوئی تھی اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے تہجد کی نماز کو فرض کیا تھا ﴿يَا أَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ قُمِ اللَّيۡلَ اِلَّا قَلِيلاً نِصۡفَهُ أَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيلاً أَوۡزِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡآنَ تَرۡتِيلاً﴾ شروع میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ پر اور اس وقت جو حضرات بھی ایمان لائے تھے ان سب کے لئے رات کی یہ نماز (تہجد) فرض قرار دی تھی، ان آیتوں کے ذریعہ آدھی رات یا رات کا دو تہائی حصہ یا ایک تہائی حصہ یعنی رات کا بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارنے کی تاکید کی گئی، چناں چہ حضور اکرم ﷺ اور تمام اہلِ ایمان اس وقت اس کا اہتمام کرتے

تھے اور رات رات بھر یا آدھی رات یا دو تہائی رات یا ایک تہائی رات تہجد میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزارتے تھے، یہ سلسلہ ایک روایت کے مطابق ایک سال تک اور ایک روایت کے مطابق آٹھ یا نو مہینہ تک رہا، اس کے بعد اسی سورۂ مزمل کی آخری آیت ﴿عَلِمَ أَن لَّن تُحْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَؤُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآن﴾ نازل ہوئی۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ پھر تہجد کی فرضیت ختم ہو گئی، لیکن مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ اس کے بعد بھی فرضیت تو باقی ہی رہی، البتہ پوری رات یا آدھی یا پونی رات تک کھڑے رہنے کا جو حکم تھا وہ ختم ہو گیا، اگر کوئی آدمی تھوڑے سے حصہ میں بھی نماز کا اہتمام کرے گا تو فرض ادا ہو جائے گا، پھر شبِ معراج میں جب پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئی اس وقت تہجد کی فرضیت ختم ہو گئی۔

اس کے بعد حضور اکرم ﷺ کے لئے فرض رہی یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں بعض حضرات تو یہ فرماتے ہیں کہ امّت پر سے یہ فرض ساقط ہو گیا لیکن نبی کریم ﷺ کے لئے فرضیت باقی رہی، لیکن راجح قول یہی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے لئے بھی فرض نہیں تھی اس کے باوجود بھی آپ ﷺ اس کا بہت ہی اہتمام فرماتے تھے۔

”مقامِ محمود“ پر فائز فرمائیں گے

﴿وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهِ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسرائیل) قرآنِ کریم کی تلاوت کے لیے رات کے کچھ حصہ میں آپ اپنی نیند کو قربان کیجئے ﴿نَافِلَةً لَّكَ﴾ یہ فرض کے علاوہ آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے زائد فریضہ ہے ﴿عَسٰى أَن يَبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحْمُوداً﴾ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو مقامِ محمود پر فائز فرمائیں گے۔

”مقامِ محمود“ یہ ایک مقام ہے جو نبی کریم ﷺ ہی کو عطا کیا جائے گا، آپ کے علاوہ کسی اور کو یہ مقام حاصل نہیں ہو گا۔ یہی وہ مقام ہے جس پر آپ فائز ہونے کے بعد پوری انسانیت کے لئے سفارش فرمائیں گے، جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ قیامت میں جب انسانوں کو دوبارہ صور پھونک کر پیدا کیا جائے گا اور میدانِ حشر میں اوّلین و آخرین سب جمع ہوں گے، حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر قیامت تک جتنے بھی انسان پیدا ہوں گے سب کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں حساب وکتاب کے لئے پیش کیا جائے گا، اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ بھی تجلّی افروز ہوں گے، سورج بالکل سروں پر سوا نیزے کے قریب ہو گا، گرمی کی شدّت کی وجہ سے لوگ اپنے اپنے گناہوں کے مطابق پسینے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے، ابھی حساب وکتاب کا سلسلہ شروع نہیں ہو گا، سب لوگ انتظار میں ہوں گے، لیکن انتظار کرتے کرتے بالکل تنگ آجائیں گے کہ کب حساب وکتاب کا سلسلہ شروع ہو۔ پھر لوگوں کے درمیان آپس میں کانا پھونسی شروع ہو جائے گی کہ کیا بات ہے کہ حساب وکتاب نہیں ہو رہا ہے، سب لوگ

کہیں گے کہ کچھ کرو، اللہ کے مقبول بندوں میں سے کسی سے سفارش کرواؤ تاکہ اللہ تعالیٰ حساب و کتاب کا سلسلہ شروع کریں۔ اب کس سے جاکر کہیں؟ تو لوگ کہیں گے کہ حضرت آدم (علیہ السلام) ہم سب کے ابّا ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا، فرشتوں کو ان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا، جنّت میں ان کو رکھا گیا، ان کے یہ سارے فضائل مسلّم ہیں، چناں چہ سب لوگ جاکر پہلے ان کی یہی خوبیاں بیان کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دستِ قدرت سے براہِ راست پیدا فرمایا، پھر فرشتوں کو آپ کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا، جنّت میں آپ کو ٹھہرایا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام چیزوں کا علم عطا فرمایا، ان کی جو جو خوبیاں قرآن مجید میں آئی ہیں ان سب کا تذکرہ کریں گے، پھر ان سے درخواست کریں گے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے ہماری سفارش کیجئے کہ حساب وکتاب کا سلسلہ شروع ہو جائے، اِس پار یا اُس پار جو بھی فیصلہ ہو گا ہمیں منظور ہے، لیکن انتظار کی یہ زحمت برداشت نہیں ہوتی۔ حضرت آدم (علیہ السلام) جواب میں فرمائیں گے: آج اللہ تعالیٰ ایسے غصّے میں ہیں کہ اس سے پہلے کبھی ایسے غصّے میں نہیں تھے، اور نہ آئندہ کبھی ایسے ہوں گے، مجھے تو اپنا ہی فکر ہو رہا ہے کہ مجھے ایک چیز سے منع کیا گیا تھا، اس کے باوجود مجھ سے اللہ تعالیٰ کا وہ حکم ٹوٹا، کہیں ایسا نہ ہو کہ میں سفارش کرنے جاؤں اور اسی کے متعلق مجھ سے پوچھ ہو جائے، اس لیے میری تو ہمت نہیں ہو رہی ہے، تم حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس جاؤ، وہ لوگوں کے درمیان اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول ہیں۔ لوگ ان کے پاس جائیں گے، وہ بھی معذرت کریں گے، اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا حوالہ دیں گے کہ ان کے پاس جاؤ۔ لوگ ان کے پاس جائیں گے اور ان سے درخواست کریں گے، وہ بھی معذرت کریں گے، اور حضرت موسیٰ

(علیہ السلام) کا حوالہ دیں گے، لوگ ان کے پاس جائیں گے، وہ بھی معذرت کریں گے، اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا حوالہ دیں گے، وہ بھی معذرت کر کے نبی کریم ﷺ کا حوالہ دیں گے کہ ان کے پاس جاؤ، وہی ہیں جن کی اگلی پچھلی خطاؤں کو اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا ہے، چناں چہ سب لوگ حضور اکرم ﷺ کے پاس آئیں گے۔

پھر حضور اکرم ﷺ باری تعالیٰ کے حضور میں جا کر سجدہ ریز ہو جائیں گے اور سفارش کریں گے، آپ ﷺ کی اسی سفارش کے بعد حساب و کتاب کا سلسلہ شروع ہو گا۔ گویا آپ ﷺ کی سفارش سے تمام لوگوں کو یہ فائدہ پہنچا کہ حساب و کتاب کا سلسلہ شروع نہیں ہو رہا تھا اور لوگ پریشانی میں مبتلا تھے، سب کی وہ پریشانی دور ہوئی، اس لئے کہ جب تک حساب و کتاب کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا تو ہر آدمی پریشانی میں مبتلا تھا، انبیاء بھی، مؤمنین بھی، کفّار بھی؛ سب ہی پریشانی میں تھے، اس سفارش کا فائدہ ہر ہر انسان کو پہنچا، اسی لئے اس سفارش کو شفاعتِ کبریٰ یعنی بڑی سفارش کہتے ہیں اور اسی کو ”مقامِ محمود“ بھی کہا جاتا ہے۔

یہاں دیکھئے! حضور اکرم ﷺ کو تہجد کا حکم دیا گیا۔ تہجد، ہجود سے مشتق ہے جو الفاظِ متضادہ میں سے ہے، عربی میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ایک ہی لفظ ہے لیکن اس کے الٹ سلٹ دونوں قسم کے معنیٰ ہوتے ہیں۔ تو ہجود کا ترجمہ نیند کا بھی آتا ہے اور بیداری کا بھی آتا ہے، گویا قرآنِ کریم کی تلاوت میں مشغول ہو کر اپنی نیند کو قربان کرو۔ لغت کے اعتبار سے تو عشاء کے بعد جو بھی نماز پڑھی جائے گی

اس کو تہجد کہیں گے، لیکن عرف یہ ہے کچھ سو کر اٹھنے کے بعد جو نماز پڑھی جائے گی وہ تہجد کہلائے گی۔ ویسے اگر کوئی آدمی عشاء کے بعد بھی تہجد پڑھ لے تو ان شاء اللہ ثواب حاصل ہونے کی امید ہے۔

تو حضورِ اکرم ﷺ کو باری تعالیٰ نے تہجد کا حکم دیا، اور اس پر جو نتیجہ مرتب ہوتا ہے وہ بتلایا ﴿عَسٰی أَن يَبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَاماً مَّحۡمُوداً﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے مقامِ محمود تجویز فرما رکھا ہے، لیکن آپ اس عمل کا اہتمام کریں گے تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ آپ کو یہ مقام عطا فرمائیں گے۔ اسی لئے لکھا ہے کہ جس طرح شفاعت کا اختیار نبی کریم ﷺ کو عطا فرمایا گیا ہے، اسی طرح دیگر انبیاء بھی سفارش کریں گے، اور اللہ تعالیٰ علماء اور اپنے نیک بندوں کو بھی سفارش کا حق دیں گے لیکن اسی وقت جبکہ آدمی تہجد کا اہتمام کرے، تب ہی اس کو یہ چیز حاصل ہو گی۔

بہر حال! یہ وہ نماز ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں خصوصی مقام اور قرب حاصل ہوتا ہے۔ اور یہی وہ نماز ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے وہ بندے جو اللہ کے عاشق ہوتے ہیں؛ تسلّی حاصل کرتے ہیں، اور رات کی تنہائیوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا جو عرض و معروض کرنا ہوتا ہے کرتے ہیں، جیسے: تنہائیوں میں ایک عاشق اپنے معشوق کے سامنے اپنی باتیں پیش کرتا ہے، اور یہی وہ نماز ہے جس کے نتیجہ میں آدمی کے مرتبے اللہ تعالیٰ کے یہاں بلند کئے جاتے ہیں۔

جب سے مجھے آدھی رات کی سلطنت ملی

پیرانِ پیر حضرت شاہ عبد القادر جیلانی (رحمۃ اللہ علیہ) کے زمانہ میں شاہِ سنجر کی سلطنت بڑی پھیلی ہوئی تھی، اُدھر حضرت پیرانِ پیر کے یہاں مہمان بہت کثرت سے آتے تھے اور مہمانوں کے کھانے پینے کا سلسلہ رہتا تھا، ایک مرتبہ بادشاہِ وقت نے یہ سوچ کر کہ حضرت کے یہاں خرچہ بہت ہے اپنے ملک کا ایک علاقہ جس کا نام "نیم روز" تھا اس کے متعلق ایک پروانہ لکھ کر حضرت پیرانِ پیر (رحمۃ اللہ علیہ) کے نام بھیجا کہ میں نے نیم روز کا پورا علاقہ اس کی آمدنی سمیت آپ کے لئے فارغ کر کے بطور جاگیر آپ کو دیدیا، تاکہ آپ کا خرچہ اس سے نکلتا رہے ("نیم روز" فارسی لفظ ہے جس کا ترجمہ دوپہر کا وقت یعنی "mid day" ہوتا ہے۔) جب یہ حکم حضرت کے پاس پہنچا تو حضرت نے جواب میں ایک شعر لکھ کر بادشاہ کے پاس بھیج دیا:-

چوں چترِ سنجری رخِ بختم سیاہ باد | گر در دلم بود ہوسِ ملکِ سنجرم
زاں گہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب | من ملکِ نیم روز بیک جَو نمی خرم

اُس زمانہ میں بادشاہوں کے تخت اوپر ایک چھتر سا لگا ہوا ہوتا تھا جو سیاہ رنگ کا ہوتا تھا اور سایہ ڈالنے کے لئے لگایا جاتا تھا وہ چھترِ شاہی کہلاتا تھا، اور یہ بادشاہوں کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی۔ چھتر پتی اسی مناسبت سے بولتے ہیں۔

سلطان سنجر کے یہاں بھی جب دربار منعقد ہوتا تھا تو اس کے تخت پر اس طرح کا چھتر لگا ہوا ہوتا تھا جس کا رنگ کالا تھا۔ تو حضرت نے فرمایا: سلطان سنجر کے اس چھتر کی طرح میرا نصیبہ بھی کالا ہو جائے اگر میرے دل میں بادشاہ کے ملک کی ذرّہ برابر بھی خواہش پیدا ہو۔ جب سے مجھے آدھی رات("mid night") کے ملک یعنی تہجد کی نماز کی اطلاع مل گئی اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض و معروض پیش کرنے کا سلسلہ جب سے میرے سامنے کھلا ہے، اس وقت سے اللہ تعالیٰ نے مجھے وہ دولت عطا فرمائی ہے کہ میں ملکِ "نیم روز" کو ایک جَو کے بدلہ میں بھی خریدنے کے لئے تیّار نہیں ہوں۔ یعنی تم نے تو ایک علاقہ مجھے دیا ہے، اگر تمہاری پوری سلطنت کی میرے دل میں صرف خواہش بھی ہو تو اس کو بھی میں اپنے لئے بدنصیبی سمجھتا ہوں۔

دیکھو! اللہ والے تو وہ تھے کہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری کو کتنی اہمیت دیتے تھے کہ بادشاہوں کی بڑی بڑی سلطنت کی بھی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں تھی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب بندوں کے واسطے اس وقت خصوصی دربار سجایا جاتا ہے، اور ان کو حاضری کی اجازت دی جاتی ہے، اور وہاں سے اعلان ہوتا ہے: ہے کوئی مغفرت طلب کرنے والا کہ میں اس کے گناہوں کو معاف کروں۔ ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کے سوال کو پورا کروں۔

ہماری بد بختی

حضرت شاہ وصی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے: اگر کہیں بادشاہِ وقت کی طرف سے اعلان ہو جائے کہ آج ایک عام دربار لگنے والا ہے اور کسی کو روکا نہیں جائے گا، جس کی جو حاجت ہو وہ آکر پیش کرے، ضرور پوری کی جائے گی؛ تو آپ ہی اندازہ لگایئے کہ لوگ وہاں کیسی بھیڑ اور ہجوم کریں گے؟ اور بادشاہوں کا بادشاہ اللہ تعالیٰ، جو سب کا خالق ومالک ہے، وہ روزانہ رات کے آخری حصہ میں دربار لگا کر اعلان کرتا ہے کہ: آؤ! اور اپنی حاجتیں مجھ سے مانگو، میں تمہاری حاجتیں پوری کرنے والا ہوں، لیکن اس سے بڑی بد بختی اور کیا ہوگی کہ اس وقت ہم غفلت کی نیند سوئے رہتے ہیں، پھر دن میں لوگوں کے دروازوں کے چکّر کاٹتے رہتے ہیں اور اپنے آپ کو ذلیل ورسوا کرتے ہیں۔

اس لیے حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مؤمن کی شان تو یہ ہونی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کا اہتمام کرلے۔ اخیر رات میں دو رکعت کی توفیق مل جانا بہت بڑی بات ہے، آدمی اگر اس کی عادت ڈالے گا تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص تعلق پیدا ہوگا۔ صالحین کا شیوا یہی بتایا گیا ہے کہ وہ اس نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں بھی اس کی بہت تاکید آئی ہے، اسی وجہ سے امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) دیگر ابواب میں تو دوچار روایتیں لاکر چھوڑ دیتے ہیں، لیکن رات کی نماز کی فضیلت کے سلسلہ می ں بہت ساری روایتیں پیش کی ہیں۔

﴿تَتَجَافٰی جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِع﴾ قرآنِ کریم میں اللہ کے نیک بندوں کی علامت اور نشانی بتلائی گئی ہے کہ ان کے پہلو یعنی ان کے جسم ان کی خوابگاہوں اور بستروں سے الگ رہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سوتے نہیں ہیں، اللہ کے سامنے عبادت میں مشغول رہتے ہیں۔

دوسری آیت پیش کی ہے: ﴿كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ﴾ رات میں بہت کم سوتے تھے۔ گویا ان کا زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت میں گزرتا تھا۔ معلوم ہوا کہ آدمی اگر اس کو لازم پکڑ لے: تو سارے مسائل کا حل ہے۔

حضرت مولانا الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا مقولہ

حضرت مولانا الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق سنا کہ کسی نے آکر عرض کیا: حضرت! بڑا سنگین معاملہ پیش آگیا ہے، اور حکومت سے بہت خطرہ ہے۔ پوچھا: کب ہے؟ بتایا کہ کل ہی ہے۔ فرمایا: ارے کیا گھبراتے ہو، بیچ میں رات ہے نا؛ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے رات میں ہم اللہ تعالیٰ سے عرض و معروض کرلیں گے، جیسے: اگر ہمیں کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو سوچتے ہیں کہ فلاں سے ملاقات کے بعد ہے نا، اس وقت دیکھ لیں گے۔ ایسے ہی اللہ کے ان نیک بندوں کو ان چیزوں کے اوپر اتنا زیادہ اعتماد رہتا تھا۔ اور ایک مؤمن کا مزاج بھی یہی ہونا چاہیے۔

شریف کی شرافت کا تقاضہ یہ نہیں...

حدیث ۱۱۶۰:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ النبيُّ ﷺ يقومُ مِنَ اللَّيْلِ حَتَّى تَتَفطَّرَ قَدَمَاهُ، فَقُلْتُ لَهُ: لِمَ تَصْنَعُ هَذَا، يَا رَسُولَ الله، وَقَدْ غُفِرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ؟ قَالَ: ((أَفَلَا أَكُونُ عَبْداً شَكُوراً!)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

وَعَنِ الْمُغِيرَةِ بن شُعبة نَحْوُهُ (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رات کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں (تہجد کے لئے) دیر تک کھڑے رہتے تھے جس کی وجہ سے آپ کے ﷺ قدمِ مبارک میں شگاف پڑ جاتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اتنی مشقت کیوں جھیلتے ہیں (اتنی دیر تک کھڑے رہتے ہیں کہ آپ کے پاؤں پھٹ جاتے ہیں) حالاں کہ قرآنِ پاک میں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مغفرت کی بشارت سنادی ہے کہ آپ کے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردیئے (اب تو آپ کو آرام سے سونا چاہیے) حضور اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: کیا مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟

افادات:- دیکھئے! اللہ کے جو مخصوص بندے ہوتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اسی جذبہ سے کرتے ہیں، کسی اور طمع ولالچ میں نہیں کہ یہ چیز مجھے مل جائے گی، یا میں فلاں سزا سے بچ جاؤں گا، بلکہ اصل عبادت یہی ہے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے ہوئے اسی جذبہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے آدمی کھڑا رہے، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرے اور اسی جذبہ سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے کہ میں اللہ کا شکر گزار بندہ بنوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں اس کا تقاضہ یہ نہیں ہے کہ

میں پڑ کر سو جاؤں، بلکہ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ میں رات بھر بیدار رہوں۔ جب اُس کریم آقا نے میرے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا تو میرا عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ میں بجائے آرام و غفلت میں پڑنے کے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑا ہو جاؤں۔

ایک شریف آدمی کے ساتھ جب احسان کا معاملہ کیا جاتا ہے تو اس کی شرافت اس کو چین سے بیٹھنے نہیں دیتی، شرافت اس پر دباؤ ڈالتی ہے کہ جب میرے ساتھ احسان کا معاملہ کیا گیا، تو اب محسن کے ساتھ اُسی کے مناسب سلوک کروں۔ اس کے برخلاف جب شرافت نہیں ہوتی اور کمینہ پن ہوتا ہے تو اس احسان کا بدلہ مناسب طریقہ سے دینے کے بجائے آدمی ناشکری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے مروّت اور شرافت کا تقاضہ بھی یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے اتنے سارے احسانات کے بدلہ میں اللہ کے حضور میں اپنے آپ کو کھڑا کرے اور شکرانے کے طور پر عبادت میں مشغول رہے۔

تم دونوں کیوں سو گئے؟

حدیث ۱۱۶۱:-

وعن علی (رضی اللہ عنہ): أَنَّ النبيَّ ﷺ طَرَقَهُ وَفَاطِمَةَ لَيْلاً، فَقَالَ: ((أَلَا تُصَلِّيَانِ؟)) (متفق علیہ)

((طَرَقَهُ)): أَتَاهُ لَيْلاً.

ترجمہ:- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ہمارے یہاں تشریف لائے تو (دیکھا کہ میں اور فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سورہے ہیں) آپ ﷺ نے پوچھا: (اچھا! تم دونوں سورہے ہو؟) نماز نہیں پڑھتے؟

افادات:- اس طرح گویا ان کو تنبیہ فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے ماتحتوں پر نگرانی ہونی چاہیے کہ نوافل میں بھی اگر کوتاہی ہورہی ہے تب بھی تنبیہ کی جانی چاہیے۔ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ہمیں متنبہ کیا کہ تم کیوں سو گئے ہو؟ تمہیں تو نماز میں مشغول ہونا چاہیے۔ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے جواب میں عرض کیا: ہماری جانیں اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اُٹھ کر نماز پڑھتے۔ دراصل آدمی کی عادت کٹ حجتی کی ہوتی ہے کہ دلیل بازی کرتا ہے، تو حضور اکرم ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: ﴿وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ انسان بڑا جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ گویا اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بتلائی ہے کہ انسان کا مزاج ایسا ہے کہ اپنے غلط عمل کو صحیح قرار دینے کے لئے کھوٹی کھوٹی دلیلیں کرتا ہے، یہ آیت پڑھتے ہوئے حضور ﷺ اپنی ران پر ہاتھ مارتے ہوئے واپس تشریف لے گئے، اور کچھ نہیں فرمایا۔

بہر حال! یہاں تو صرف اتنا ہی حصہ لائے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو حضور اکرم ﷺ نے متنبہ فرمایا کہ تم نماز نہیں پڑھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

عبد اللہ بڑے اچھے آدمی ہیں؛ اگر رات کو نماز پڑھتے

حدیث ۱۱۶۲:-

وعن سالم بن عبدِ اللہ بن عمر بن الخطاب عن أبیہِ (رضی اللہ عنہم): أَنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: ((نِعْمَ الرَّجُلُ عَبْدُ اللهِ، لَوْ كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيلِ)) قَالَ سالِم: فَكَانَ عَبدُ اللہِ بَعدَ ذٰلِكَ لا يَنامُ مِنَ اللَّيلِ إلَّا قَلِيلاً. (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے بڑے صاحبزادے ہیں، ان کے صاحبزادے حضرت سالم اپنے والد کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (دراصل اس وقت حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے کوئی خواب دیکھا تھا جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی بہن ام المؤمنین حضرت حفصہ (رضی اللہ عنہا) سے کیا اور انہوں نے اس خواب کا تذکرہ حضور اقدس ﷺ سے کیا تو حضور ﷺ نے سن کر ارشاد فرمایا:) عبد اللہ بڑے اچھے آدمی ہیں اگر رات کو نماز پڑھتے رہیں (یعنی تہجد کا اہتمام کریں تو بڑے اچھے آدمی ہیں) حضرت سالم کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد حضرت حفصہ (رضی اللہ عنہا) نے حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کو بتلایا، اس کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی یہ عادت ہوگئی کہ رات کا بہت کم حصہ سوتے تھے (حضور ﷺ کے اس ارشاد نے ان کی نیند اڑادی، پھر تو اکثر حصہ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔)

افادات:- ویسے بھی علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ پہلے زمانہ میں مدینہ والوں کا عام دستور تھا اور ان کی عادت تھی کہ جب عمر چالیس سال کی ہوجاتی تھی تو بستر لپیٹ کر رکھ دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ سونے کے دن گئے، اب تو آخرت کی تیاری کرنی چاہیے، اور رات کو سوتے نہیں تھے، بلکہ عبادت میں مشغول رہتے تھے۔

اے عبد اللہ! فلاں جیسا مت بنیو

حدیث ۱۱۶۳:

وعن عبد الله بن عمرو بن العاصِ (رضی اللہ عنہما) قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((يَا عَبْدَ اللهِ! لاَ تَكُنْ مِثْلَ فُلانٍ؛ كَانَ يَقُومُ اللَّيلَ فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيلِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: اے عبد اللہ! فلاں جیسا مت بنیو کہ وہ رات کو تہجد پڑھا کرتا تھا پھر چھوڑ دیا۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جب کوئی نیک عمل شروع کرے تو اس پر پابندی ہونی چاہیے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جوش میں چند روز کیا پھر چھوڑ کر بیٹھ گئے، یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔ جس عمل پر مداومت اور پابندی کی جاتی ہے وہی عمل اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، چاہے دو رکعت ہی ہو، مگر ہمیشہ اس کے پڑھنے کی عادت ہو۔ اور کم سے کم دو رکعت سے بھی یہ سنّت ادا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو اس کی بھی توفیق دی ہو تو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ بہت سے لوگ جماعت میں چلہ میں جاتے ہیں، وہاں تہجد شروع کرتے ہیں اور گھر آنے کے بعد چھوڑ دیتے ہیں؛ یہ بھی اسی میں داخل ہے۔ بہت سے لوگ رمضان میں شروع کرتے ہیں اور رمضان گزر جاتا ہے تو پھر چھوڑ دیتے ہیں؛ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایسا مت کرنا، جب عمل شروع کیا ہے تو اب پڑھتے رہو۔ ایک کام شروع

کیا ہے تو اس پر پابندی کا اہتمام کرنا چاہیے، پھر کسی روز اگر کسی وجہ سے آنکھ نہ کھلے؛ تو اشراق یا چاشت کے وقت اُتنی رکعتیں پڑھ لے؛ تو اللہ تعالیٰ اُتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے۔

تہجد کے اہتمام کے لئے شرائط

بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا جی تو چاہتا ہے لیکن اُٹھ نہیں پاتے۔ تو دیکھئے! بعض چیزوں کے اہتمام سے تہجد کے وقت اُٹھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے بڑی شرط تو یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرے، گناہوں میں مبتلا رہتے ہوئے عام طور پر تہجد کی توفیق نہیں ملتی۔

حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے مسجد میں ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ دعا مانگ رہا ہے اور خوب رو رہا ہے، میرے دل میں اس کے متعلق بدگمانی پیدا ہوئی کہ دکھانے کے لئے رو رہا ہے، میرے دل میں صرف یہ خیال آیا، میں نے اس بات کا زبان سے کسی کے سامنے اظہار بھی نہیں کیا، لیکن اس کے بعد چند روز تک رات کو تہجد کے لئے اٹھنے کی نعمت سے مَیں محروم ہو گیا۔ باوجود بہت کوشش کے بھی نہیں اُٹھ پایا، پھر میں نے صلوۃ التوبہ پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی: اے اللہ! مجھے معلوم ہو جائے کہ میرے کس گناہ کی وجہ سے میں تہجد کی نعمت سے محروم ہو گیا ہوں۔ تو میرے دل میں ڈالا گیا کہ تو نے فلاں آدمی کے متعلق ایسا ایسا سوچا تھا۔ اس کے بعد میں نے

اس گناہ سے خصوصیت سے توبہ کی؛ تو پھر دوبارہ توفیق میسر ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی وجہ سے آدمی اس سے محروم ہو جاتا ہے۔

پہلی چیز:- گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے، خاص کر فضول گوئی، بے کار باتیں، گپ شپ سے خاص بچنے کا اہتمام کرنا چاہیے، فضول گوئی کے نتیجہ میں بھی آدمی تہجد سے محروم رہتا ہے۔

دوسری چیز:- آدمی رات کو کچھ کم کھائے تا کہ زیادہ نیند نہ آئے۔

تیسری چیز:- اس کا بھی اہتمام ہو کہ بستر بہت زیادہ نرم نہ ہو۔

حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی روایت شمائل اور دوسری کتبِ حدیث میں موجود ہے کہ ان کے گھر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر صرف ایک ٹاٹ تھا۔ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم اس ٹاٹ کو ڈبل کر کے بچھا دیا کرتے تھے۔ ایک رات میں نے سوچا کہ اسی کو ڈبل کے بجائے چوہرا یعنی ڈبل کا ڈبل کرلوں تا کہ ذرا نرم ہو جائے، حالاں کہ وہ وہی ٹاٹ تھا جس کو ڈبل بچھاتے تھے، آج چوہرا کرنے کو سوچا تا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھوڑی راحت پہنچ جائے، چناں چہ ایسا کر کے بچھا دیا۔ صبح اٹھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: آج بستر کے طور پر میرے لئے کیا بچھایا تھا؟ بتایا: اے اللہ کے رسول ! وہی ٹاٹ تھا، جو روزانہ بچھاتے ہیں، ہاں ! اتنا کیا تھا کہ روزانہ ٹاٹ کو ڈبل کر کے بچھاتے تھے، آج چار گنا کر کے بچھایا تھا۔ اس پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں ! آج اس کی نرمی نے مجھے رات کو اُٹھنے سے روک دیا، یعنی میں وقت پر نہیں اُٹھ پایا اور دیر ہو گئی۔ تو جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نرم بستر کا یہ اثر ہو سکتا ہے تو میں اور آپ

اگر نرم بستر پر سوئیں گے تو ہمارا کیا ہو گا؟ اس لئے اس کا بھی اہتمام ضروری ہے کہ بستر کچھ ایسا رکھا جائے کہ ہمارا اُٹھنا آسان ہو جائے۔

چوتھی چیز:- اُٹھنے کے واسطے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے۔

وارِدِ روحانی غیرت مند مہمان ہے

پھر ایک ضروری بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ نیت کر کے سوتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دیں گے تو اُٹھیں گے۔ تو دیکھو! آدمی جب کسی اچھے کام کی نیت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے اسباب ضرور مہیا کئے جاتے ہیں، مثلاً: آپ نے نیت کی کہ آج مجھے تہجد پڑھنی ہے، تو تین بجے آپ کی آنکھ ضرور کھلے گی، اس وقت جو آنکھ کھلی تو بس سمجھ لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی مدد ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کی امید پوری کر دی کہ آپ کی نیند پوری ہو گئی اور آنکھ کھل گئی، لہٰذا اب ہمت کر کے اُٹھنا، وضو کرنا اور نماز کے لئے کھڑا ہونا آپ کا کام ہے۔ اس موقع پر شیطان اور نفس دونوں بیچ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں، یہ خیال ڈالتے ہیں کہ ابھی دو منٹ میں اُٹھتا ہوں، بس! جو دو منٹ کے لیے کروٹ لے کر سوتے ہیں تو ایسی گہری نیند میں آتی ہے کہ فجر کی نماز بھی قضا ہو جاتی ہے، پھر دوسرے دن اور بعد میں بھی تمنا کرتے ہی رہتے ہیں لیکن آنکھ نہیں کھلتی، وہ دراصل اس لیے کہ

اللہ تعالیٰ نے جو نعمت عطا فرمائی تھی اس کی ناقدری ہوئی جس کا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ پہلے دن وقت پر آنکھ کھلنا اور نیند کا پورا ہو جانا؛ یہ وارِد روحانی یعنی اللہ تعالیٰ کا مہمان ہے۔

وارِد روحانی کا مطلب یہ ہے کہ کسی نیک کام کرنے کا دل میں جذبہ پیدا ہونا، مثلاً: اللہ تعالیٰ نے پیسے دیئے تو دل میں خیال آیا کہ اس کو نیکی کے فلاں کام میں خرچ کرنا ہے، لیکن آپ نے کہا کہ ابھی جانے دو، پھر خرچ کروں گا۔ تو جیسے آپ کے گھر کوئی مہمان آئے اور دروازہ کھٹکھٹائے، اور آپ دروازہ نہ کھولیں؛ تو اگر وہ شریف اور باغیرت مہمان ہوگا تو ایسا جائے گا کہ دوبارہ کبھی آپ کے گھر کا رخ نہیں کرے گا۔ اسی طریقہ سے کسی نیک کام کا ارادہ دل میں آنا؛ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا ہوا ایک مہمان ہوتا ہے جو وارِد روحانی اور خدائی مہمان کہلاتا ہے، اس کی قدر یہی ہے کہ جیسے ہی دل میں خیال آئے فوراً اس پر عمل کر ڈالو، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوبارہ مزید توفیق ملے گی۔ لہٰذا جب ارادہ کر کے سوئے اور وقت پر آنکھ کھلی، تو پھر چاہے کتنی ہی سستی آئے؛ فوراً اٹھ جاؤ، اور کم سے کم دو رکعت پڑھ ہی لو، پھر نیند آئے تو سو جاؤ۔ اگر آج ایسا کرو گے تو دوسرے دن ان شاء اللہ دوبارہ توفیق ملے گی۔ اور اگر آج یوں سوچو گے کہ پانچ منٹ سو جاؤں پھر اٹھتا ہوں، تو پھر آج بھی سوئے رہو گے اور آئندہ کل بھی آنکھ کھلنے والی نہیں ہے۔ اس کے بعد جب تک اپنی اس حرکت سے توبہ نہیں کرو گے وہاں تک دوبارہ اُٹھنے کی توفیق ہونے والی نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح یاد رکھنا۔

اس کے کان میں شیطان پیشاب کر دیتا ہے

حدیث ۱۱۶۴:-

وعن ابن مسعودٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ:ذُكِرَ عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ رَجُلٌ نَامَ لَيْلَةً حَتَّى أَصْبَحَ ، قَالَ : ((ذَاكَ رَجُلٌ بَالَ الشَّيطَانُ فِي أُذُنَيْهِ-أَوْ قَالَ: فِي أُذُنِهِ-)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے ایک آدمی کا تذکرہ کیا گیا کہ وہ رات بھر سوتا رہا یہاں تک کہ صبح کر دی۔ تو نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ہاں! دراصل اس آدمی کے کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا تھا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا سوتا رہا کہ تہجد اور فجر کی نماز چھوٹ گئی، یہاں تک کہ دن نکل آیا۔

یہاں جو شیطان کے پیشاب کا تذکرہ ہے، تو جیسے انسان مختلف کام کرتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، قضائے حاجت کرتا ہے، صحبت کرتا ہے، اسی طریقہ سے شیطان بھی یہ سارے کام کرتا ہے، اس لئے اگر واقعۃً شیطان نے اس کے کان میں پیشاب کر دیا ہو؛ تو کوئی بعید بات نہیں ہے۔ چناں چہ بہت سے حضرات محدثین اسی کے قائل ہیں۔ اور شیطان کا پیشاب کرنا گویا اس کے ساتھ ایک طرح کا کھلواڑ کرنا ہے کہ شیطان نے اسے اتنا ذلیل اور رسوا بنا دیا اور اس کے ساتھ ایسا ٹھٹھا کیا کہ اس کے کان میں پیشاب کر دیا۔ جیسے: کوئی آدمی کسی کی تذلیل کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ میں تو فلاں پر تھوکتا ہوں۔

بعضوں نے کہا کہ شیطان کے پیشاب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے کانوں کو ایسا بوجھل بنادیا کہ اس کو اُٹھانے والی آوازیں اس کے کان تک نہیں پہنچیں۔ جیسے: کان میں اگر پانی چلا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے کان بوجھل ہوجاتا ہے اور سننے کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ اور عام طور پر آدمی کو نیند سے بیدار کرنے والی چیز اس کی قوتِ سامعہ ہی ہوتی ہے، یعنی کان کی سننے کی صلاحیت ہی کے نتیجہ میں آدمی نیند سے بیدار ہوتا ہے۔ تو یہاں بتلایا گیا کہ شیطان نے اس کے کان میں پیشاب کردیا یعنی شیطان نے اس کے کان کو ایسا بوجھل بنادیا کہ وہ اپنی نیند سے اٹھ نہیں پایا اور نماز ادا نہیں کرپایا۔ بہرحال! یہ اس کے حق میں ایک طرح کی وعید ہے۔

شیطان کا منتر؛ اور اس کا توڑ

حدیث ۱۱۶۵:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: يَعْقِدُ الشَّيطَانُ عَلَى قَافِيَةِ رَأْسِ أَحَدِكُمْ ، إِذَا هُوَ نَامَ ، ثَلاَثَ عُقَدٍ ، يَضْرِبُ عَلَى كُلِّ عُقْدَةٍ: عَلَيْكَ لَيْلٌ طَوِيلٌ فَارْقُدْ ، فَإِنِ اسْتَيقَظَ ، فَذَكَرَ اللهَ تَعَالَى انْحَلَّتْ عُقْدَةٌ ، فَإِنْ تَوَضَّأَ ، انْحَلّتْ عُقْدَةٌ ، فَإِنْ صَلَّى ، انْحَلَّتْ عُقَدُهُ كُلُّهَا ، فَأَصْبَحَ نَشِيطاً طَيِّبَ النَّفْسِ ، وَإلاَّ أَصْبحَ خَبيثَ النَّفْسِ كَسْلاَنَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((قافية الرَّأس)): آخِرُهُ.

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک کے سر کے پچھلے حصے پر شیطان تین گرہیں لگاتا ہے جب آدمی سوجاتا ہے، اور ہر ہر گرہ پر یہ کہتا جاتا ہے: ”ابھی رات بہت لمبی باقی ہے؛ سوئے رہو“ (لہٰذا شیطان کے اس منتر کا اثر اس کے دل ودماغ پر یہ ہوتا ہے کہ آنکھ کھلنے پر وہ یہی سوچتا ہے کہ ابھی رات لمبی ہے۔ لیکن) اگر آنکھ کھلنے پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیتا ہے (سوکر اُٹھنے کی دعا پڑھ لیتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرِ﴾ یا کلمہ پڑھ لیتا ہے، یا قرآنِ پاک کی کسی آیت کی تلاوت کرلیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ ذکر کی کوئی بھی شکل اختیار کرلیتا ہے) تو ایک گرہ کھل جاتی ہے، اس کے بعد اُٹھ کر اگر وضو کرلیتا ہے تو دوسری گرہ کھل جاتی ہے، پھر وضو کرنے کے بعد جب نماز پڑھ لیتا ہے تو تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے اور آدمی ایک دم چست، چاک وچوبند اور فریش (Fresh) ہوجاتا ہے (اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے تیار ہوجاتا ہے) اور اگر ان میں سے کسی ایک چیز میں بھی کمی ہوجاتی ہے تو پھر دن بھر اس کی طبیعت پر سستی اور کسل مندی طاری رہتی ہے۔

افادات:–شیطان گرہیں لگاکر گویا آدمی کے ساتھ سحر والا عمل کرتا ہے، جیسے: ساحرین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ کچھ پڑھ کر دھاگے پر گرہ لگاتے ہیں اور اس گرہ کے ذریعہ سے مسحور پر اپنے سحر کا اثر ڈالتے ہیں، اسی طریقہ سے جب انسان سوجاتا ہے تو شیطان بھی اس پر سحر کرتا ہے تاکہ وہ سویا رہے اور اُٹھ کر نماز پڑھنے نہ پائے۔ اب گرہیں کس پر لگاتا ہے؟ تو بعض روایتوں میں آتا ہے کہ وہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رسّی ہوتی ہے جس پر وہ گرہ لگاتا ہے۔ آدمی کے بالوں پر نہیں لگاتا، اس لئے کہ ہر ایک کے لئے بال کا ہونا ضروری نہیں۔

حضراتِ انبیاء؛روحانی معالج

"عَلَيْكَ لَيْلٌ طَوِيلٌ فَارْقُدْ" "ابھی رات بہت لمبی باقی ہے ،سوئے رہو" یہ شیطان کا منتر ہے،اسی کا اثر ہوتا ہے کہ جب آدمی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ سوچتا ہے کہ ابھی تو بہت دیر ہے، اور چادر کھینچ کر مزے سے سو جاتا ہے۔ شیطان کے اسی سحر اور گرہ لگانے کا اثر ہوتا ہے کہ آدمی کے دل پر یہی خیال غالب رہتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ شریعت نے اس کے منتر کے اثر کو دور کرنے کا طریقہ بھی بتلایا ہے کہ آدمی اگر ان کا اہتمام کرے تو وہ پوری چستی اور نشاط کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت میں اپنے آپ کو مشغول کر سکتا ہے۔

بہر حال! نبی کریم ﷺ نے چستی اور نشاط پیدا کرنے کے لئے بہت آسان طریقہ بتلادیا ہے، اگر آدمی اس پر عمل کرلے تو طبیعت میں نشاط پیدا ہو جائے گا اور شیطان نے سلانے کے لئے جو تدبیر کی تھی اس کا توڑ یہی ہے ۔ اس لئے کہ شیطان گمراہی کے راستوں پر لے جاتا ہے، اس کے لئے تدبیریں اور مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے، اور حضراتِ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہدایت کی راہوں پر چلاتے ہیں۔ شیطان گمراہ کرنے کی تدبیر اختیار کرتا ہے، تو حضرات انبیاء اس کا توڑ بتلاتے ہیں۔

جنت میں لے جانے والے تین اعمال

حدیث ۱۱۶۶:-

وعن عبد اللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) أنّ النبیّ ﷺ قَالَ: ((أيُّهَا النَّاسُ: أَفْشُوا السَّلامَ، وَأَطْعِمُوا الطَّعَامَ، وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ، تَدْخُلُوا الجَنّةَ بِسَلاَمٍ.)) رواه الترمذی، وقال: ((حدیث حسن صحیح))

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ، (پہچاننے والے اور نہ پہچاننے والے سب کو سلام کرو) کھانا کھلاؤ، اور رات کو نماز پڑھو جب لوگ سوئے ہوئے ہوں؛ سلامتی اور عافیت کے ساتھ جنّت میں داخل ہو جاؤ گے۔

افادات:- گویا یہ تین اعمال وہ ہیں جو آدمی کو جنّت میں لے جانے والے ہیں ان میں سے ایک عمل تہجد کی نماز بھی ہے۔ بس! یہاں تو اس روایت کو اسی مناسبت سے لئے لائے ہیں۔

افضل ترین نماز

حدیث ١١٦٧:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ: شَهْرُ اللهِ المُحَرَّمُ، وَأَفْضَلُ الصَّلاَةِ بَعْدَ الفَرِيضَةِ: صَلاَةُ اللَّيْلِ)) رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رمضان المبارک کے بعد بہترین روزے محرم کے ہیں، اور فرض نمازوں کے بعد سب سے افضل تہجد کی نماز ہے۔

افادات:- گویا رمضان کے علاوہ نفل روزوں میں محرم کے روزے رکھنے کی بڑی فضیلت ہے اور نفل نمازوں میں سب سے بہتر اور افضل تہجد کی نماز ہے۔

تہجد دو دو رکعتیں، اور اخیر میں وتر

حدیث ۱۱۶۸:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما): أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: ((صَلاةُ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، فَإِذَا خِفْتَ الصُّبْحَ فَأَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ)) (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات کی نماز دو دو رکعتیں ہیں (دو دو کر کے پڑھتے رہو) جب صبح صادق ہونے والی ہو تو دو کے ساتھ ایک رکعت ملا کر اس کو وتر بنا لو۔

حدیث ۱۱۶۹:-

وعنه، قَالَ: كَانَ النَّبيُّ ﷺ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ مَثْنَى مَثْنَى، وَيُوتِرُ بِرَكْعَةٍ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- انہی سے یہ بھی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ رات کی نماز دو دو رکعات کر کے ادا فرماتے تھے، اور (آخر میں ایک رکعت ملا کر) وتر پڑھتے تھے۔

افادات:- جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ جو آدمی تہجد پڑھنے کا عادی ہو، یا جس کو اخیر رات میں اُٹھنے کا یقین ہو؛ اس کو چاہیے کہ وتر اخیر میں پڑھے۔

حضور اکرم ﷺ کی رات کی نماز کی کیفیت

حدیث ۱۱۷۰:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ يُفْطِرُ مِنَ الشَّهْرِ حَتَّى نَظُنَّ أَنْ لاَ يَصُومَ مِنْهُ، وَيَصُومُ حَتَّى نَظُنَّ أَنْ لاَ يُفْطِرَ مِنْهُ شَيْئاً، وَكَانَ لاَ تَشَاءُ أَنْ تَرَاهُ مِنَ اللَّيْلِ مُصَلِّياً إِلاَّ رَأَيْتَهُ، وَلاَ نَائِماً إِلاَّ رَأَيْتَهُ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے علاوہ کسی مہینہ میں کبھی افطار جاری رکھتے تھے (یعنی روزے نہیں رکھتے تھے) یہاں تک کہ ہمیں گمان ہونے لگتا تھا کہ اس مہینہ میں روزے نہیں رکھیں گے، پھر جب روزہ رکھنا شروع کرتے تو رکھتے چلے جاتے تھے یہاں تک کہ ہم یہ سمجھنے لگتے تھے کہ اب آپ افطار نہیں کریں گے۔ اور رات کے کسی حصہ میں آپ ﷺ کو نماز پڑھتا ہوا دیکھنا چاہو تو دیکھ سکتے تھے، اور رات کے کسی حصہ میں سوتا ہوا دیکھنا چاہو تو سوتا ہوا دیکھ سکتے تھے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ سے رات کے مختلف اوقات میں تہجد پڑھنا ثابت ہے۔ آپ ﷺ کا شروع رات میں، رات کے درمیانی حصہ میں اور آخری حصہ میں اور پوری رات بھی قیام کرنا ثابت ہے؛ عام طور پر تو آدھی رات کے بعد ہی پڑھتے تھے جیسا کہ آگے روایتوں میں آرہا ہے۔ گویا آدمی کو جب بھی موقع میسر ہو اس میں تردّد نہیں کرنا چاہیے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ سے رات کے مختلف اوقات میں تہجد پڑھنا ثابت ہے۔

اُن کا حُسن! مت پوچھو

حدیث ۱۱۷۱:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) أنَّ رسول الله ﷺ كَانَ يُصَلِّي إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً - تَعْنِي فِي اللَّيْلِ - يَسْجُدُ السَّجْدَةَ مِنْ ذٰلِكَ قَدْرَ مَا يَقْرَأُ

أَحَدُكُمْ خَمْسِينَ آيَةً قَبْلَ أَنْ يَرْفَعَ رَأْسَهُ، وَيَرْكَعُ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلَاةِ الْفَجْرِ، ثُمَّ يَضْطَجِعُ عَلَى شِقِّهِ الأَيْمَنِ حَتَّى يَأْتِيَهُ الْمُنَادِي لِلصَّلاةِ. (رواه البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ رات میں گیارہ رکعتیں (آٹھ رکعات تہجد، اور تین رکعات وتر) پڑھتے تھے اور اس میں بھی سجدہ اتنا طویل فرماتے تھے کہ تم میں کا کوئی آدمی قرآنِ پاک کی پچاس آیتیں تلاوت کرلے (قرآن پاک کی پچاس آیتیں پڑھنے میں جتنی دیر لگتی ہے اتنا طویل سجدہ فرماتے تھے) پھر فجر سے پہلے دو رکعات سنت ادا فرماتے تھے، اس کے بعد دائیں پہلو پر لیٹ جاتے تھے، یہاں تک کہ مؤذن آکر نماز کا وقت ہونے کی اطلاع کرتا تھا (تو آپ اُٹھ جاتے تھے۔ فجر کی سنتیں پڑھ کر لیٹنے کا مسئلہ پہلے آچکا ہے)۔

حدیث ۱۱۷۲:-

وعنها، قالت: مَا كَانَ رسول الله ﷺ يَزِيدُ - فِي رَمَضَانَ وَلَا فِي غَيْرِهِ - عَلَى إِحْدَى عَشْرَةَ رَكْعَةً: يُصَلِّي أَرْبَعاً فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي أَرْبَعاً فَلَا تَسْأَلْ عَنْ حُسْنِهِنَّ وَطُولِهِنَّ، ثُمَّ يُصَلِّي ثَلَاثاً. فَقُلْتُ: يَا رسولَ اللهِ، أَتَنَامُ قَبْلَ أَنْ تُوتِرَ؟ فَقَالَ: ((يَا عَائِشَةُ، إِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعات سے زیادہ (تہجد) نہیں پڑھتے تھے، پہلے چار رکعات ادا فرماتے تھے اور ایسے عمدہ انداز سے پڑھتے تھے کہ اس کی عمدگی اور لمبے پن کا حال مت پوچھو (بڑی طویل، عمدہ قراءت کے ساتھ تمام آداب و مستحبات کی رعایت کرتے ہوئے ادا فرماتے تھے) پھر چار رکعات ادا فرماتے تھے کہ ان کی عمدگی اور لمباپن کا حال مت پوچھو، اور پھر تین رکعات وتر ادا فرماتے تھے۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ (ایک مرتبہ) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ وتر سے پہلے سو جاتے ہیں (پھر اُٹھ کر وضو بھی نہیں فرماتے؟) تو جواب میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے عائشہ! میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دل نہیں سوتا۔

افادات:- مسئلہ یہی ہے کہ حضراتِ انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی نیند سے ان کا وضو نہیں ٹوٹتا، ہم لوگوں کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔

اور دیکھو! تراویح الگ نماز ہے جو غیر رمضان میں نہیں پڑھی جاتی، یہاں تو ایسی نماز کا تذکرہ ہے جو رمضان اور غیر رمضان دونوں میں پڑھی جاتی ہے، اور وہ تہجد کی نماز ہے۔

پہلے دو دو کا تذکرہ آیا تھا اور یہاں چار کا تذکرہ آیا؟ تو حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا ہے کہ چار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک سلام سے چار ادا فرماتے تھے، بلکہ دو پر سلام فرمایا کرتے تھے، لیکن پہلی دو کے بعد فوراً کھڑے ہو جاتے تھے، اور چار کے بعد کچھ دیر وقفہ فرماتے تھے، پھر دوسری چار رکعات دو دو کر کے ادا فرماتے تھے۔

رات کی عبادت کی مختلف شکلیں

حدیث ۱۱۷۳:-

وعنها: أَنَّ النبيَّ ﷺ كَانَ يَنَامُ أَوَّلَ اللَّيلِ، وَيَقُومُ آخِرَهُ فَيُصَلِّي. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) ہی سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ رات کے شروع حصہ میں آرام فرماتے تھے، اور آخر میں اُٹھ کر نماز ادا فرماتے تھے۔

افادات:- آگے آئے گا کہ نبیٔ کریم ﷺ مرغ کی آواز سن کر اُٹھتے تھے۔ہمارے شیخ الشیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ مرغ پہلی مرتبہ آدھی رات پوری ہونے پر بولتا ہے، اس کے بعد رات کا آخری چھٹا حصہ جب باقی رہتا ہے اس میں بولتا ہے، پھر صبح صادق پر بولتا ہے۔

امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے رات کے حصوں کی تقسیم بتلائی ہے اور لکھا ہے کہ اللہ کے بعض بندے تو پوری رات اللہ کی عبادت کرنے والے ہوتے ہیں، جیسا کہ بہت سے اکابرِ تابعین سے منقول ہے۔ چناں چہ شرح احیاء میں شیخ ابو طالب مکی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ چالیس تابعین سے منقول ہے کہ وہ پوری رات جاگتے تھے، کبھی سوتے نہیں تھے حضرت سعید بن المسیب (رحمۃ اللہ علیہ) نے پچاس سال تک عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی اور بھی بہت سے تابعین سے رات بھر عبادت کرنا منقول ہے۔

حضرت امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کا بھی یہی معمول منقول ہے۔پہلے آپ آدھی رات عبادت کرتے تھے، ایک مرتبہ تشریف لے جارہے تھے تو ایک بڑھیا نے کسی سے کہا کہ یہ وہ نوجوان ہے جو رات بھر عبادت کرتا ہے، جب آپ نے یہ سنا تو سوچا کہ لوگ میرے متعلق یہ گمان کر رہے ہیں تو مجھے بھی رات بھر عبادت کرنی چاہیے، چناں چہ اس دن سے رات بھر عبادت کرنا شروع کر دیا۔

دوسری ترتیب:- آدھی رات عبادت والی ہے۔ بعض بندے آدھی رات عبادت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ بتلایا کہ شروع کی ایک تہائی رات میں آدمی آرام کرے، اس کے بعد اٹھ کر آدھی رات عبادت کرے، پھر آخر کے چھٹے حصہ میں آرام کرے۔

تیسری ترتیب:- ایک تہائی رات عبادت کی ہے۔اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلی آدھی رات میں آرام کرے گا، پھر تہائی رات عبادت کرے، اور پھر آخر کے چھٹے حصہ میں آرام کرے۔

چوتھی ترتیب:- یہ بتلائی ہے کہ چھٹا حصہ آرام کرے۔ اور وہ آدھی رات کے بعد والا اور آخری چھٹے سے پہلے والا وقت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ رات کے چھ حصے کرے، ان میں سے پہلے تین حصوں میں آرام کرے، اس کے بعد چوتھے یا پانچویں حصے میں اٹھ کر تہجد پڑھے، اور آخری حصہ میں آرام کرے۔

اور ایک ترتیب یہ بھی بتلائی ہے کہ اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے بغیر کسی تعین کے اٹھ کر عبادت میں مشغول ہو۔ اور آخری درجہ یہ بتلایا ہے کہ کم از کم دو یا چار رکعات ادا کر لے۔ اور اگر اس کی بھی

توفیق نہ ہو تو جب آنکھ کھلے بستر پر قبلہ رخ ہو کر بیٹھ جائے، اور اللہ تعالیٰ کا کچھ ذکر کر لے، دعا کر لے پھر لیٹ جائے؛ تاکہ رات کو اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے والوں میں اس کا شمار ہو جائے۔

نفس سے بہلا پھسلا کر کام لو

حضرت ڈاکٹر عبدالحی عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ جس طرح بچوں سے بہلا پھسلا کر کام لیا جاتا ہے ایسے ہی نفس سے بھی بہلا پھسلا کر کام لو، جیسے: بچے کو لالچ دے کر کام لیتے ہیں، کہ اتنا سا اور کر لو، چلو! دو کلمے اور پڑھ لو، تم کو یہ انعام دیں گے۔ جب آنکھ کھلے تو نفس تو یہ چاہے گا کہ سو جائیں، تو آپ نفس سے کہو کہ ذرا استنجاء کر لو، پھر سو جانا۔ جب استنجاء کر لو تو کہو کہ یہاں تک آ ہی گئے ہو تو وضو کر لو پھر سو جانا۔ جب وضو کر لیا تو کہو کہ کچھ دیر اللہ کو یاد کر لو۔ پھر کہو کہ دو رکعات ہی پڑھ لو۔ اس طرح بہلا پھسلا کر کرتے رہو گے تو عادت پڑ جائے گی۔

ایک اور طریقہ

حضرت عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نفس کو سمجھانے کے لیے ایک اور طریقہ بتلایا ہے کہ آدمی کا نفس سستی کر رہا ہو اور اُٹھنے کے لیے آمادہ نہ ہو، تو سوچو کہ اسی وقت اگر مجھے صدر جمہوریہ یا وزیر اعظم کی طرف سے بلاوا آجائے کہ آپ کو تمغہ دیا جانے والا ہے، آپ کا اعزاز کیا جانے والا ہے، لہٰذا اسی وقت

آپ آجایئے؛ تو کیا میں سستی کروں گا؟ نہیں کروں گا، بلکہ فوراً اُٹھ کر چلا جاؤں گا۔ حالاں کہ صدر جمہوریہ یا وزیر اعظم کے اختیار میں اللہ تعالیٰ نے ہماری دنیا و آخرت کے کسی مسئلہ کا حل نہیں رکھا ہے، سارے اختیارات تو اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ قدرت میں ہیں، تو اللہ تعالیٰ جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے وہ جب اپنا دربار سجا رہا ہے اور آپ کو دعوت دے رہا ہے کہ: **"ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اس کی مانگ کو پورا کروں۔ کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے کہ میں اس کی مغفرت کروں"** تو پھر اے نفس! تُو کیوں سستی کر رہا ہے؟ یہ سوچ کر آدمی اپنی طبیعت کو تیار کرے۔

مَیں نے ایک بری حرکت کا ارادہ کرلیا

حدیث ۱۱۷۴:-

وعن ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَيْلَةً، فَلَمْ يَزَلْ قَائِمًا حَتَّى هَمَمْتُ بِأَمْرِ سوءٍ! قيلَ: مَا هَمَمْتَ؟ قَالَ: هَمَمْتُ أَنْ أَجْلِسَ وَأَدَعَهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ تہجد میں شرکت کرلی، آپ برابر کھڑے رہے اور تلاوت میں مشغول رہے یہاں تک کہ میں نے ایک بری حرکت کا ارادہ کرلیا۔ پوچھا گیا: آپ نے کیا ارادہ کیا تھا؟ تو فرمایا: میں نے سوچا کہ میں بیٹھ جاؤں اور حضور اکرم ﷺ کو کھڑا چھوڑ دوں

افادات:- آپ ﷺ کے ادب کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ کے کھڑے رہنے کی صورت میں مجھے بیٹھنا نہیں چاہیے لیکن آپ نے اتنی دیر تک قیام فرمایا کہ میرے دل میں یہ خیال آنے لگا کہ آپ کو چھوڑ کر بیٹھ جاؤں۔

نفل کے اندر مستقل جماعت کی اجازت نہیں ہے، البتہ امام کے ساتھ اگر دو ہوں تو اس کی اجازت ہے۔ تین کے سلسلہ میں اختلاف ہے، اور تین سے زیادہ ہوں تو بالاتفاق نفل کی یہ جماعت مکروہ ہے۔

حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) کا تجربہ

حدیث ۱۱۷۵:-

وعن حذيفة -رضى الله عنه-، قَالَ: صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ذَاتَ لَيلَةٍ فَافْتَتَحَ البَقَرَةَ، فَقُلْتُ: يَرْكَعُ عِنْدَ المِئَةِ، ثُمَّ مَضَى، فقلتُ: يُصَلِّي بِهَا فِي رَكْعَةٍ فَمَضَى، فقلتُ: يَرْكَعُ بِهَا، ثُمَّ افْتَتَحَ النِّسَاءَ فَقَرَأَهَا، ثُمَّ افْتَتَحَ آلَ عِمْرَانَ فَقَرَأَهَا، يَقرَأُ مُتَرَسِّلاً: إِذَا مَرَّ بآيَةٍ فِيهَا تَسبيحٌ سَبَّحَ، وَإِذَا مَرَّ بسُؤَالٍ سَأَلَ، وَإِذَا مَرَّ بتَعَوُّذٍ تَعَوَّذَ، ثُمَّ رَكَعَ، فَجَعَلَ يَقُولُ: ((سُبْحَانَ رَبِّيَ العَظِيمِ)) فَكَانَ رُكُوعُهُ نَحواً مِنْ قِيَامِهِ، ثُمَّ قَالَ: ((سَمِعَ اللهُ لِمَنْ حَمِدَهُ، رَبَّنَا لَكَ الحَمْدُ)) ثُمَّ قَامَ طَويلاً قَريباً مِمَّا رَكَعَ، ثُمَّ سَجَدَ، فَقَالَ: ((سُبْحَانَ رَبِّيَ الأَعْلَى)) فَكَانَ سُجُودُهُ قَرِيباً مِنْ قِيَامِهِ. (رواه مسلم.)

ترجمہ مع افادات:- حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں ایک مرتبہ نمازِ تہجد میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ مَیں بھی شریک ہوگیا، آپ نے سورۂ بقرہ شروع فرمائی، میں اپنے جی میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید سو آیتیں تلاوت فرماکر آپ رکوع فرمائیں گے، لیکن جب سو آیتیں پوری ہوئیں تو آپ آگے بڑھ گئے، میں نے سوچا کہ شاید اس نماز (یعنی دو رکعات) میں سورت پوری فرمائیں گے، لیکن آدھی سورۂ بقرہ ہونے کے بعد آپ تو اور آگے بڑھے، تو میں نے اپنے جی میں سوچا کہ شاید سورۂ بقرہ پوری فرماکر آپ رکوع میں تشریف لے جائیں گے، لیکن سورۂ بقرہ پوری ہوئی تو آپ نے سورۂ نساء شروع فرمادی، اور وہ بھی پوری فرماکر سورۂ آل عمران شروع فرمادی، اور اس کو بھی پورا کردیا۔ اور تلاوت بھی نہایت اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر فرماتے تھے، اگر کسی ایسی آیت پر آپ کا گزر ہوا جس میں تسبیح ہے تو وہاں سبحان اللہ پڑھتے تھے، کہیں کسی نعمت کا تذکرہ آیا تو اس کی دعا فرمالیتے تھے اور کہیں کسی چیز سے پناہ مانگنے کا تذکرہ آیا تو آپ اس سے پناہ چاہتے تھے (یہ بھی آدابِ تلاوت میں سے ہے۔ ترتیل سے قرآنِ پاک پڑھنے کا جو حکم دیا گیا ہے، اس کی سات شرطیں بتلائی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آیاتِ رحمت پر آدمی رحمت کا سوال کرے آیاتِ عذاب پر اللہ کے عذاب سے پناہ مانگے) اس کے بعد آپ نے رکوع فرمایا، اور اس میں آپ سبحان ربی العظیم پڑھتے رہے، اور آپ کا یہ رکوع بالکل قیام جیسا طویل تھا، اس کے بعد آپ نے سمع اللہ لمن حمدہ، ربنالک الحمد کہا، اور قومہ میں بھی اتنا طویل کھڑے رہے جتنا رکوع میں رہے تھے، اس کے بعد آپ سجدہ میں تشریف لے گئے، اور اس میں بھی سبحان ربی الاعلیٰ پڑھتے رہے، اور آپ کا سجدہ بھی قیام جتنا لمبا ہوا۔ (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی اگر طویل قیام کرے تو رکوع، سجدہ بھی اسی مناسبت سے ہونا چاہیے)۔

سب سے افضل نماز

حدیث ۱۱۷۶:-

وعن جابر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سُئِلَ رسولُ الله ﷺ أيُّ الصَّلَاةِ أفْضَلُ؟ قَالَ: ((طُولُ القُنُوتِ)) (رواہ مسلم)

المرادبِ((القنوتِ)): القِيام.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کونسی نماز افضل ہے؟(یعنی کس طرح سے نماز کی ادائیگی بہتر ہے؟)توجواب میں ارشاد فرمایا: (جس نماز میں) لمبا قیام ہو(ظاہر ہے کہ لمبا قیام وہی ہوگا جس میں قراءت زیادہ کی جائے گی)

صلوٰۃ وصوم داؤدی

حدیث ۱۱۷۷:-

وعن عبدالله بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((أَحَبُّ الصَّلَاةِ إِلَى اللهِ صَلَاةُ دَاوُدَ، وَأَحَبُّ الصِّيَامِ إِلَى اللهِ صِيَامُ دَاوُدَ، كَانَ يَنَامُ نِصْفَ اللَّيْلِ وَيَقُومُ ثُلُثَهُ وَيَنَامُ سُدُسَهُ، وَيَصُومُ يوماً وَيُفْطِرُ يَوْماً)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نماز حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام والی نماز ہے۔اور سب سے زیادہ پسندیدہ روزے بھی

حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام والے روزے ہیں۔ حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ السلام شروع سے لے کر آدھی رات تک آرام فرماتے تھے اور پھر اُٹھ کر ایک تہائی حصہ نماز میں مشغول ہوتے تھے، پھر آخری چھٹا حصہ آرام فرماتے تھے، اور ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے۔

ہر رات میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے

حدیث ۱۱۷۸:-

وعن جابر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول: ((إِنَّ فِي اللَّيْلِ لَسَاعَةً، لَا يُوَافِقُهَا رَجُلٌ مُسْلِمٌ يَسْأَلُ اللهَ تَعَالَى خَيْرًا مِنْ أَمْرِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ إِلَّا أَعْطَاهُ إِيَّاهُ، وَذٰلِكَ كُلَّ لَيْلَةٍ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: رات میں ایک گھڑی ایسی ہوتی ہے کہ اس میں کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی بھلائیوں میں سے کوئی بھی بھلائی مانگے: تو اللہ تعالیٰ اس کو وہ عطا فرما ہی دیتے ہیں، اور وہ گھڑی ہر رات میں ہوتی ہے۔

افادات:- گویا اللہ تعالیٰ نے ہر رات میں ایک گھڑی ایسی رکھی ہے، لیکن وہ کونسی ہے وہ اس لیے نہیں بتلائی تاکہ اس کی تلاش میں آدمی پوری رات عبادت میں مشغول رہے۔ ویسے علماء نے لکھا ہے کہ چوں کہ آخری رات میں تہجد کو بہتر قرار دیا گیا ہے، اس لیے غالب یہی ہے کہ وہ رات کے آخری حصہ میں ہوتی ہے، اگرچہ اس کی تعیین نہیں ہے، جیسے: لیلۃ القدر پورے رمضان میں چھپی ہوئی ہے، اگرچہ آخری دس راتوں میں اس کا امکان زیادہ ہے۔ اسی طریقہ سے جمعہ کے دن میں ایک

گھڑی ایسی ہے جس میں دعا قبول ہوتی ہے، وہ بھی پورے دن میں ہوتی ہے اور اس کے سلسلہ میں جو روایتیں ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر دن کا زیادہ امکان ہے۔

پہلی دو رکعت ہلکی پڑھنی چاہیے

حدیث ۱۱۷۹:-

وعن أَبي هريرة (رضی اللہ عنہ) أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِنَ اللَّيْلِ فَلْيَفْتَتِحِ الصَّلاَةَ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب رات کو نماز کے لئے کھڑا ہو؛ تو دو ہلکی رکعتوں سے نماز شروع کرے۔

افادات:- یعنی پہلی دو رکعتیں ہلکی پڑھے اور اس کے بعد طویل پڑھے، اس لئے کہ جیسا اوپر گزرا کہ شیطان تین گرہیں لگاتا ہے، اُٹھ کر اللہ کا ذکر کرنے سے پہلی گرہ کھلتی ہے، وضو کرنے سے دوسری گرہ کھلتی ہے، اور نماز پڑھنے سے تیسری گرہ بھی کھل جاتی ہے، تو جس نماز سے تیسری گرہ کھلوانا ہے وہ دو رکعت ہلکی پڑھ لے، اس کے بعد پھر طویل نماز پورے نشاط اور چستی کے ساتھ ادا کرے۔

حدیث ۱۱۸۰:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسولُ الله ﷺ إِذَا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ افْتَتَحَ صَلاَتَهُ بِرَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ.

(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ رات کو جب تہجد شروع فرماتے تھے؛ تو ابتداء دو ہلکی رکعتوں سے کرتے تھے (یہ بھی آداب میں سے ہے)۔

اگر کسی کی تہجد فوت ہو گئی تو...

حدیث ۱۱۸۱:-

وعنها قالت: كَانَ رسول الله ﷺ إِذَا فَاتَتْهُ الصَّلَاةُ مِنَ اللَّيْلِ مِنْ وَجَعٍ أَوْ غَيْرِهِ، صَلَّى مِنَ النَّهَارِ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کی تہجد کی نماز اگر کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے فوت ہو جاتی تو آپ دن میں بارہ رکعتیں ادا فرماتے تھے۔

افادات:- اگر کسی کی تہجد فوت ہو گئی تو سورج طلوع ہونے کے بعد وقتِ مکروہ گزر جانے کے بعد سے لے کر چاشت تک کے درمیانی وقفہ میں بارہ رکعتیں پڑھ لے؛ تو اللہ تعالیٰ اُتنا ہی ثواب عطا فرمائیں گے جو تہجد پڑھنے پر ملتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی بھی کبھی تہجد فوت ہو جاتی تھی تو آپ اسی وقت میں بارہ رکعتیں ادا فرماتے تھے۔ تہجد کی زیادہ سے زیادہ مقدار بارہ رکعتیں بتلائی گئی ہیں۔

حدیث ۱۱۸۲:-

وعن عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهِ، أَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ، فَقَرَأَهُ فِيمَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وصلاة الظُّهْرِ، كُتِبَ لَهُ كَأَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے مقررہ وظیفے کی ادائیگی سے سورہا (یعنی رات میں کچھ رکعتیں ادا کرنے کا، یا قرآنِ پاک کی کچھ مقدار تلاوت کرنے کا معمول تھا اور آنکھ لگی رہی جس کی وجہ سے) پورا معمول، یا اس کا کچھ حصّہ چھوٹ گیا، پھر اس کو فجر اور ظہر کے درمیانی وقفہ میں ادا کرلیا؛ تو اس کے نامۂ اعمال میں ایسا ہی لکھا جائے گا جیسا کہ رات میں ادا کیا۔

افادات:- کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دم اخیر میں پانچ دس منٹ پہلے آنکھ کھلی، اور ویسے تو معمول زیادہ رکعات پڑھنے کا ہے، لیکن اخیر میں آنکھ کھلنے کی وجہ سے وضو کرکے دوچار رکعات ہی ادا کرنے کا موقعہ ملا اور روزانہ جتنی ادا کرتے ہیں وہ ادا نہیں کرپایا بلکہ کچھ حصّہ رہ گیا، تو وہ چھوٹا ہوا حصّہ یا پورا معمول اگر رہ گیا ہے اس کو فجر اور ظہر کے درمیانی وقفہ میں ادا کرلے؛ تو رات کو ادا کرنے پر جو ثواب ملتا وہی ثواب ملے گا ﴿وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا﴾ کی تفسیر یہی کی گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ رحم کرے

حدیث ۱۱۸۳:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ:قَالَ رسول الله ﷺ : ((رَحِمَ اللهُ رَجُلاً قَامَ مِنَ اللَّيْلِ، فَصَلَّى وَأَيْقَظَ امْرَأَتَهُ، فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فى وَجْهِهَا الْمَاءَ، رَحِمَ اللهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ، فَصَلَّتْ وَأَيْقَظَتْ زَوْجَهَا، فَإِنْ أَبَى نَضَحَتْ فِي وَجْهِهِ الْمَاءَ))

(رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ رحم کرے اس مرد پر جو رات کو تہجد کے لئے اٹھا، پھر اس نے تہجد کی نماز پڑھی اور اپنی بیوی کو بھی اٹھایا، اور بیوی نے اٹھنے سے جب انکار کیا تو اس کے چہرے پر پانی چھڑکا (تاکہ نیند اُڑ جائے) اور اللہ تعالیٰ رحم کرے اس عورت پر جو رات کو اٹھی اور تہجد کی نماز ادا کی، اس کے بعد اپنے شوہر کو بھی اٹھایا اور اس نے جب انکار کیا تو اٹھانے کے واسطے اس کے چہرے پر پانی ڈالا۔

افادات:- گویا حضور ﷺ نے ایسے مرد اور ایسی عورت کے لئے دعا فرمائی ہے جو نیکی کے کام میں ایک دوسرے کا تعاون اور مدد کرتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے ماتحتوں کو اُٹھانے کے لئے ایسی تدبیر اختیار کرنا- جو ان کی نیند کو اُڑانے والی ہو- جائز ہے، ایسا کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے۔

ذاکرین اور ذاکرات میں شمار

حدیث ۱۱۸۴:-

وعنه وعن أَبي سعيدٍ (رضی اللہ عنہما) قالا : قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ :((إِذَا أَيْقَظَ الرَّجُلُ أَهْلَهُ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّيَا ، أَوْ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ جَمِيعاً ؛ كُتِبَا فِي الذَّاكِرِينَ وَالذَّاكِرَاتِ)) (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب آدمی اپنے گھر والوں (بیوی) کو رات کے وقت اٹھاتا ہے، اور دونوں نماز ادا کرتے ہیں، یا دونوں مل کر دو رکعت ادا کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو ذاکرین اور ذاکرات میں شمار کرتے ہیں۔

افادات:- قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ أَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْرًا عَظِيْمًا﴾ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور کثرت سے ذکر کرنے والی عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور بڑے اجر کا جو وعدہ کیا ہے، ایسے لوگوں میں اللہ تعالیٰ ان کو شمار کرتے ہیں۔ فقط دو رکعت پڑھنے پر یہ وعدہ ہے، مگر بیوی کو اٹھا کر ساتھ میں پڑھنے پر یہ فضیلت ملتی ہے۔

جب نیند کا غلبہ ہو جائے

حدیث ۱۱۸۵:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) أنَّ النبیَّ ﷺ قَالَ:((إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ فی الصَّلاَةِ، فَلْيَرْقُدْ حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ، لَعَلَّهُ يَذْهَبُ يَسْتَغْفِرُ، فَيَسُبَّ نَفْسَهُ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب تہجد میں اونگھنے لگے تو اس کو چاہیے کہ سو جائے یہاں تک کہ اس کی نیند پوری ہو جائے، اس لئے کہ کوئی آدمی نماز میں اونگھ رہا ہو تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے لئے دعائے مغفرت کرنا چاہتا ہے اور بد دعا کر لیتا ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ایسی حالت میں نماز پڑھنا پسندیدہ نہیں ہے کہ اونگھ کا ایسا غلبہ ہو کہ کیا پڑھ رہا ہے وہ بھی پتہ نہیں۔ پڑھ کچھ رہا ہے اور زبان سے نکل کچھ اور ہی رہا ہے۔ ایسی صورت میں تھوڑی دیر سو جانا چاہیے تاکہ نیند کا غلبہ ختم ہو جائے، پھر اُٹھ کر نماز ادا کرو۔

حدیث ۱۱۸۶ :-

وعن أَبي هريرة قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((إِذَا قَامَ أَحَدُكُمْ مِنَ اللَّيْلِ، فَاسْتَعْجَمَ القُرْآنَ عَلَى لِسَانِهِ، فَلَمْ يَدْرِ مَا يَقُولُ، فَلْيَضْطَجِعْ .)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی اٹھ کر تہجد کے لئے کھڑا ہوا، اور اس کی زبان پر قرآن پڑھنا مشکل ہو گیا (یعنی نیند کے غلبہ کی وجہ سے قرآن پڑھا نہیں جا رہا ہے) اس کو پتہ ہی نہیں کہ کیا پڑھ رہا ہے، تو اس کو چاہیے کہ لیٹ جائے پھر تھوڑی دیر آرام کر کے اُٹھے (لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسا لیٹ جائے کہ وقت ہی ختم ہو جائے)۔

باب استحباب قیامِ رمضان

وَھُوَ التراویح

قیامِ رمضان یعنی تراویح مستحب ہے

فضائل کا بیان چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں قیامِ رمضان یعنی تراویح کا مستحب ہونا بتلاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ نے جو فضیلتیں ارشاد فرمائی ہیں وہ پیش کریں گے۔

ماہِ رمضان المبارک کی اہمیت

ماہِ رمضان المبارک اپنی خصوصیات کی وجہ سے اس قابل ہے کہ آدمی اس پورے مہینہ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ کردے، اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی یہ مطلوب ہے کہ بندہ سال بھر اپنے کاروبار اور اپنے مشاغل میں مشغول ومصروف رہا، تو اب ایک مہینہ ایسا بھی ہونا چاہیے جس میں آدمی اپنے سارے کاروبار ومشاغل کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے فارغ ہو جائے۔ اور اگر اس

کو مکمل چھوڑنا ممکن نہ ہو تو کم از کم آدمی سوچ کر یہ طے کرلے کہ کتنا زیادہ سے زیادہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی طرف مشغول ہونے کے لئے فارغ کر سکتا ہے۔ جتنا زیادہ سے زیادہ وقت فارغ کرے گا وہ اس کے لئے مفید اور کارآمد ہو گا۔

ویسے تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے واسطے ہی پیدا کیا ہے، جس کا تقاضہ یہ تھا کہ آدمی اپنے سارے اوقات اور پوری زندگی کے تمام لمحات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی میں مشغول رکھتا، لیکن یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم اور احسان وانعام ہے کہ اس نے انسانوں کو اپنی ضروریات کے واسطے بھی وقت کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ ہاں! کچھ عبادتیں ایسی ہیں جو فرض قرار دی گئی، جیسے: پنج وقتہ نماز، رمضان المبارک کے روزے وغیرہ؛ اور اس کے علاوہ باقی اوقات میں کچھ سنن و مستحبات رکھے گئے، اور پھر آدمی دوسرے اوقات کو اپنی ضروریات اور کاروبار میں استعمال کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اور جب سال بھر یہ سلسلہ رہتا ہے تو رمضان کا ایک مہینہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے لئے رکھا ہے جس میں یہ مطلوب ہے کہ بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔

خود نبیٔ کریم ﷺ بھی اس کا بڑا اہتمام اور بڑی تاکید فرماتے تھے۔ شعبان کے آخری جمعہ میں جو خطبہ ارشاد فرماتے تھے اس میں بھی نبیٔ کریم ﷺ رمضان کے سلسلہ میں صحابۂ کرام کو تاکید فرما کر اس کو زیادہ سے زیادہ وصول کرنے کی طرف متوجہ کرتے تھے، بلکہ رمضان کی اہمیت بتلانے کے لئے رجب کا چاند دیکھتے ہی یہ دعا سکھلائی گئی ہے: ﴿أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيْ رَجَبَ وَشَعْبَانَ

وَبَلِّغْنَا رَمَضَانَ﴾ اے اللہ! تو ہمیں رجب وشعبان میں برکت عطا فرما اور رمضان تک ہمیں پہنچادے۔ گویا رمضان اتنا قریب آگیا ہے تو اب ایسا نہ ہو کہ رمضان کی برکتیں اور اس کے انوار و فضائل سے فائدہ اٹھانے سے پہلے ہی دنیا سے جانے کی نوبت آجائے۔ جیسے: بوڑھی عورتیں جب ان کا پوتا یا نواسہ بڑا ہو جاتا ہے تو دعائیں کرتی ہیں کہ: اے اللہ! میں اس کی شادی دیکھ کر جاؤں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس سے پہلے جانے کا وقت آجائے۔ تو حضور ﷺ نے رمضان کی خاص اہمیت بتلانے کے لئے یہ دعا سکھلائی کہ دو مہینے پہلے سے جب آدمی دعا کا اہتمام کرے گا تو رمضان کے لئے تیاری بھی کرے گا۔ بہر حال! رمضان المبارک کی اپنی کچھ خصوصیات اور فضائل ہیں جیسا کہ آپ فضائلِ رمضان میں سنتے بھی ہیں۔

مراتبِ قرب کی کچھ منزلیں

اور اسی سلسلہ اللہ تعالیٰ نے نوافل کے قبیل سے ایک مستقل نماز رمضان کے مہینے میں مشروع فرمائی جو عشاء کی نماز کے بعد تراویح کے نام سے ادا کی جاتی ہے۔ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت اقدس تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلفاء میں سے تھے، وہ فرماتے تھے کہ: اللہ تبارک وتعالیٰ نے رمضان کے مہینے میں بندوں کے لئے مراتبِ قرب یعنی قرب کی کچھ منزلیں خصوصیت کے ساتھ الگ سے عطا فرمائی ہیں اس لئے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بندہ جب سجدہ میں ہوتا ہے تو اپنے رب سے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتا ہے، بندہ کی سب سے زیادہ قرب والی حالت وہ ہوتی ہے

جب بندہ سجدہ میں ہوتا ہے۔ تو گویا رمضان کے مہینہ میں اللہ تعالیٰ نے مزید بیس رکعتیں مشروع قرار دیں اوران کو سنّت بتلایا کہ ان کا اہتمام کیا جائے تاکہ بیس رکعتوں کی نسبت سے چالیس سجدے مزید بڑھ جائیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کا مزید قرب حاصل کرنے کا موقع ملے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اس مہینے میں بندوں کو یہ کہا کہ تم کو اپنے مزید قرب کے لئے موقع فراہم کرتا ہوں، اس سے تم فائدہ اٹھاؤ۔ خود نبی کریم ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا: اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کو فرض کیا اوراس کی تراویح کو سنّت قرار دیا۔ گویا اللہ تعالیٰ ہی کا یہ حکم ہے، اور حضور اکرم ﷺ اس سنّت کو عملی طور پر جاری فرماکر نمونہ پیش کرگئے، اس معنیٰ کر اس کو سنّت بھی کہا جاتا ہے۔

ایمان ویقین کی قوت کے ساتھ قیام

حدیث ۱۱۸۷:-

عن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے ایمان اوراحتساب کے ساتھ رمضان کا قیام کیا (یعنی تراویح پڑھی۔ یہاں قیام سے خاص تراویح کی نماز ہی مراد ہے) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردئے جائیں گے۔

افادات:-ایمان کا مطلب تو واضح ہے اس لئے کہ ایمان کے بغیر کوئی بھی عمل قابلِ قبول نہیں ،اس لیے ایمان نہ ہوتے ہوئے اگر کوئی آدمی چاہے کتنے ہی اعمال کرلے اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ قبول ہی نہیں ہوں گے، کسی بھی عمل کے قبول ہونے کے واسطے ایمان شرط ہے۔

اوراحتساب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے ثواب اوراجر کی امید رکھتے ہوئے خالص اللہ تعالیٰ کے لئے وہ عمل انجام دیا جائے ۔ ریا، شہرت،نام ونمود اوردکھلاوا مقصود نہ ہو،اللہ تعالیٰ کوراضی کرنے کے لئے،اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اوراللہ تعالیٰ ہی سے اس عمل کاثواب اوراجر حاصل کرنے کے لئے جو عمل کیاجاتاہے؛اس کواحتساب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

بعض حضرات نے ترجمہ کیاہے کہ ایمان ویقین کی قوت کے ساتھ قیام کیا۔ اس لئے کہ ایمان ویقین جتنازیادہ ہوگا اُتناہی اُس کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور میں کھڑاہونااورعبادت کرنا آسان ہوگا۔

پہلے بھی کئی مرتبہ یہ بات بتلاچکاہوں کہ ان اعمال پر گناہوں کی معافی کاجو وعدہ کیاگیاہے،اس سے صغیرہ گناہ کی معافی مراد ہے،اس لیے کہ کبیرہ گناہوں کے متعلق قرآن وحدیث سے یہ معلوم ہوتاہے کہ جب تک آدمی توبہ نہ کرے، وہاں تک وہ معاف نہیں ہوتے۔ حضرت شیخ (نوراللہ مرقدہٗ) نے اپنے والد صاحب کے حوالہ سے لکھاہے کہ مؤمن کی شان یہ ہے کہ اس کے نامۂ اعمال میں کبیرہ گناہ تو ہونے ہی نہیں چاہئیں۔ کسی مؤمن سے اگر کبھی کبیرہ گناہ سرزد ہو بھی جائے توجب تک توبہ کرکے اور رودھوکر،اس گناہ پر ندامت وپچھتاوے کااظہار کرکے اللہ تعالیٰ کو راضی نہ کرلے اور اس گناہ کو معاف نہ کروالے؛وہاں تک اس کو چین نہ آئے۔ اس لئے اگر کبھی مؤمن سے کبیرہ گناہ ہوا بھی ہو

تو وہ اس کے نامۂ اعمال میں باقی نہیں رہے گا۔ جیسے بابرکت راتیں اور بابرکت اوقات آتے ہیں جن میں خاص طور پر عبادت کا اہتمام کیا جاتا ہے، ان مواقع پر آدمی کچھ عبادات کرلیتا ہے اور ساتھ ساتھ اپنے گناہوں کو یاد کر کے دل میں ندامت وپچھتاوے کا جذبہ واحساس پیدا ہو جاتا ہے جس کا نام توبہ ہے؛ جس کے نتیجہ میں اس کے گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جب مؤمن کے نامۂ اعمال میں کبیرہ گناہ ہوں گے ہی نہیں، اور صغیرہ گناہ اس طرح معاف ہو جائیں گے، تو یہاں جو وعدہ کیا گیا اور جو فضیلت بتلائی گئی وہ اس کو حاصل ہو جائے گی۔

حدیث ۱۱۸۸:-

وعنه قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ يُرَغِّبُ فِي قِيَامِ رَمَضَانَ مِنْ غَيْرِ أَنْ يَأْمُرَهُمْ فِيهِ بِعَزِيمَةٍ، فيقولُ: ((مَنْ قَامَ رَمَضَانَ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ رمضان کے قیام کی ترغیب دیتے تھے اور لازمی طور پر حکم دئے بغیر اس کے فضائل بیان کر کے لوگوں کو اس پر اکساتے اور آمادہ کرتے تھے۔ اور حضور اکرم ﷺ نے ترغیب دینے کے لئے ایک جملہ یہ بھی ارشاد فرمایا: جو آدمی ایمان کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کو راضی اور خوش کرنے کی نیّت سے رمضان کے مہینے میں تراویح پڑھے گا؛ تو اس کے پچھلے سارے گناہ سب معاف کر دئے جائیں گے۔

افادات:- یہ نماز فرض اور واجب نہیں ہے، سنّت ہے، اور لزوم کی جو کیفیت فرائض میں ہوا کرتی ہے وہ اس میں نہیں ہے، لیکن نبی کریم ﷺ اس کی ترغیب دیتے تھے لٰہذا بڑے ذوق وشوق سے یہ عمل انجام دینا چاہیے۔

اتنی بے توجہی اور بے رغبتی!

رمضان کے مہینہ میں بہت سے لوگ تراویح پڑھتے ہی نہیں، اور بہت سے پڑھنے کے لئے آتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنے لئے بوجھ سمجھتے ہیں، حالاں کہ اس کی ادائیگی میں جس شوق ورغبت کا اہتمام ہونا چاہیے وہ ہماری طرف سے کماحقہ' ہو نہیں پاتا۔ بہت سی جگہ صرف سوا پارہ پڑھا جاتا ہے اس میں بھی کھڑا ہونا لوگوں کے لیے ایسا بھاری معلوم ہوتا ہے کہ جب تک کہ امام رکوع میں نہ جائے وہاں تک نیّت باندھتے ہی نہیں، اور پہلی رکعت کے انتظار میں رہتے ہیں کہ امام صاحب رکوع میں جائیں تو جلدی سے کھڑے ہو کر نیّت باندھ لیں، حالاں کہ تراویح جو مشروع کی گئی اس میں مختلف وجوہات اور حکمتیں ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ قرآنِ پاک کو پڑھا اور سنا جائے۔ جب آپ نیت ہی نہیں باندھیں گے تو قرآن پاک سننے کی سنّت ادا نہیں ہوگی۔ اس لئے شوق اور رغبت اور پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خصوصی نعمت سمجھتے ہوئے اس میں مشغول ہونا چاہیے کہ یہ مہینہ ہمیں عطا کیا گیا ہے، پتہ نہیں پھر یہ موقع دوبارہ ملے گا یا نہیں؛ اس لئے آدمی ذرّہ برابر بھی سستی وکاہلی سے اس میں کام نہ لے۔

بَابُ فَضۡلِ قِيَامِ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ وَبَيَانِ أَرۡجٰى لَيَالِهَا

لیلۃ القدر میں عبادت کی فضیلت

اور کون سی رات کے متعلق شبِ قدر ہونے کی زیادہ امید ہے

شبِ قدر اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ امّتِ محمدیہ کو عطا فرمائی ہے، روایتوں میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے امّتِ محمدیہ کی عمروں کا تذکرہ کیا، جیسا کہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ﴿أَعۡمَارُ أُمَّتِيۡ مَابَيۡنَ سِتِّيۡنَ إِلَى سَبۡعِيۡنَ﴾ میری امّت کی عمریں ساٹھ سے لے کر ستر کے درمیان ہے، عام طور پر امّتِ محمدیہ کے لوگ ساٹھ، ستر کے درمیان رخصت ہو جاتے ہیں، کوئی ذرا آگے بڑھ گیا تو بڑھ گیا، ورنہ عام طور پر یہی عمریں رہتی ہیں۔ اپنی امّت کی عمروں کو یاد کیا اور اس کے مقابلہ میں اگلی امّتوں کو جو عمریں دی گئی تھی اس کو جب نبیٔ کریم ﷺ نے دیکھا تو آپ کو یہ خیال ہوا کہ عبادات میں میری امّت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، جس کی وجہ سے

آپ ﷺ کے دل میں ایک غم کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو امّت کے ساتھ کتنا تعلق تھا کہ یہ چیز بھی آپ کے لئے باعثِ غم ہوئی، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ قدر اتاری گئی جس میں ارشاد فرمایا: ﴿لَیۡلَۃُ الۡقَدۡرِ خَیۡرٌ مِّنۡ اَلۡفِ شَھۡرٍ﴾ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اور ہزار مہینوں کا حساب لگایا گیا تو تراسی (۸۳) سال اور چار (۴) مہینے ہوتے ہیں۔ اور فرمایا گیا کہ اس سے بہتر ہے۔ اگر کوئی آدمی تراسی سال اور چار مہینے عبادت کرے اس کو شبِ قدر میں عبادت کا ثواب اس سے بھی زیادہ ملے گا۔ اور وہ زیادتی کتنی ہوگی وہ بھی اس میں نہیں بتلائی گئی ہے، تو ظاہر ہے کہ ایک رات کا اتنا زیادہ ثواب ہے۔ حضرت شیخ (نور اللہ مرقدہٗ) فرماتے ہیں کہ اگر کسی آدمی کو زندگی میں دس راتیں بھی مل جائیں تو یوں سمجھئے کہ آٹھ سو تینتیس سال (۸۳۳/ سال) بلکہ اس سے زیادہ عبادت کا ثواب ملے گا۔ اس لئے یہ بڑے اہتمام کی چیز ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ نے بنی اسرائیل کے ایک عابد کا تذکرہ کیا جس نے پانچ سو سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، یہ سن کر صحابہ کرام کو یہ خیال ہوا کہ ہمیں تو یہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا اور اس پر افسوس بھی ہوا کہ ہم باوجود چاہنے کے اس پر عمل نہیں کر سکتے؛ اس پر سورۂ قدر نازل ہوئی جس میں بتلایا گیا کہ شبِ قدر ایک ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اب ظاہر ہے اگر ایسی چند راتیں آدمی کو میسر ہو جائیں تو اس کی کامیابی اور مراد بر آنے کے لئے کافی ہے۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: ﴿اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنٰہُ فِیۡ لَیۡلَۃِ الۡقَدۡرِ﴾ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے قرآنِ پاک کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ پوری سورۃ ہی شبِ قدر کی فضیلت بیان کرنے کے لئے نازل کی گئی ہے۔

وَقَالَ تَعَالٰی:﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ﴾ہم نے قرآنِ پاک کو بابرکت رات میں نازل کیا۔ یہاں پر بھی شبِ قدر مراد لی گئی ہے۔

آگے اس کے فضائل اور اس میں قیام وعبادت کے فضائل بتلا رہے ہیں۔

حدیث ۱۱۸۹:-

وعن أبي هريرة (رضي الله عنه) عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ قَامَ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيمَاناً وَاحْتِسَاباً غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ.)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی لیلۃ القدر میں ایمان اور احتساب کے ساتھ کھڑا رہا (یعنی اس نے نماز پڑھی اور عبادت کی) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

افادات:- اس کی شرح کرتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ نماز پڑھنا ہی ضروری نہیں بلکہ عبادت کے دوسرے جتنے طریقے ہیں جیسے: تلاوت، دعا، تسبیحات وغیرہ؛ ان میں سے کسی بھی طریقۂ عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی، اور اپنے اوقات کو اس میں صرف کیا، تو اس کو یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

جو آدمی شبِ قدر کو تلاش کرنا چاہے

حدیث ۱۱۹۰:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما): أَنَّ رِجالاً مِنْ أَصْحَابِ النبيِّ ﷺ أُرُوا لَيْلَةَ القَدْرِ فی المَنَامِ فی السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَقَالَ رسول اللہ ﷺ: ((أَرَى رُؤْيَاكُمْ قَدْ تَوَاطَأَتْ فی السَّبْعِ الأَوَاخِرِ، فَمَنْ كَانَ مُتَحَرِّيهَا فَلْيَتَحَرَّهَا فی السَّبْعِ الأَوَاخِرِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے بہت سے صحابہ کو خواب میں شبِ قدر کا آخری سات راتوں میں ہونا دکھلایا گیا۔ جب صحابہ کرام نے اپنے یہ خواب حضور اکرم ﷺ کے سامنے بیان کئے تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سب کے خواب آخری سات راتوں کے متعلق متفق ہو رہے رہیں، اس لئے جو آدمی شبِ قدر کو تلاش کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔

افادات:- خواب میں یہ بتلایا گیا کہ رمضان کی آخری سات راتوں میں شبِ قدر ہے۔ اگر تیس کا مہینہ ہو تو آخری سات راتیں چوبیس سے لے کر تیس تک ہوتی ہیں، اور اگر انیتس کا مہینہ ہو تو تیئیس سے لے کر آخر تک ہوتی ہیں، ان ساری راتوں میں اس کو تلاش کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ کئی حضرات کا ایک ہی طرح کا خواب دیکھنا بھی اُس خواب کے سچا ہونے کی علامت ہے۔ یعنی ایک طرح کی چیز کئی لوگوں نے خواب میں دیکھی اور سب بیان کر رہے ہیں تو یہ گویا اس بات کی نشانی سمجھی جائے گی کہ یہ خواب سچا ہے، جیسا کہ اذان کے متعلق آتا ہے کہ جب نبیٔ

کریم ﷺ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ لوگوں کو نماز کے واسطے بلانے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کے لیے مشورہ ہوا اور جب کوئی بات طے نہیں ہوئی تو پھر رات کو بہت سے لوگوں نے خواب دیکھا جس میں اذان کا طریقہ بتلایا گیا۔ اس موقعہ پر بھی حضور اکرم ﷺ نے یہی فرمایا کہ تم سب لوگوں کے خواب ایک چیز پر متفق ہو رہے ہیں۔ یہاں پر بھی کئی لوگوں نے خواب دیکھے اور کئی لوگوں کا ایک طرح کا خواب دیکھنا اُس خواب کے سچا ہونے کی علامت ہے لہٰذا حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو آدمی شبِ قدر کو تلاش کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ آخری سات راتوں میں تلاش کرے۔ رمضان کے مہینے میں آخری سات راتوں میں جاگ لینا کوئی مشکل نہیں ہے، لوگ معمولی معمولی مقاصد کے لئے معمولی معمولی اغراض کے لئے چند ٹکوں، پیسوں کے خاطر رات بھر جاگتے ہیں۔ کوئی آدمی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے اور تراسی (۸۳) سال کی عبادت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اگر چند راتیں جاگ لے؛ تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو

حدیث ۱۱۹۱:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسولُ الله ﷺ يُجاوِرُ في العَشْرِ الأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ، ويقول: ((تَحَرَّوْا لَيْلَةَ القَدْرِ في العَشْرِ الأواخرِ منْ رَمَضَانَ)) (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ: حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے اورارشاد فرماتے تھے: شبِ قدر کو رمضان کے آخری عشرہ میں تلاش کرو۔

حدیث ۱۱۹۲:-

وعنھا (رضی اللہ عنہا) أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((تَحَرَّوْا لَيْلَةَ الْقَدْرِ فِي الْوَتْرِ مِنَ الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْ رَمَضَانَ)) (رواہ البخاری)

ترجمہ:-حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: شبِ قدر کو رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں تلاش کرو۔

افادات:-جمہور علماء یہی فرماتے ہیں کہ آخری عشرہ سے مراد اکیس (۲۱) سے لے کر آخر تک ہے؛ چاہے مہینہ انیتس (۲۹) کا ہو، یا تیس (۳۰) کا ہو۔ البتہ علّامہ ابن حزم (رحمۃ اللہ علیہ) جو بڑے عالم اور محدث گزرے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اگر مہینہ تیس (۳۰) کا ہو تو آخری عشرہ اکیس (۲۱) سے لے کر تیس (۳۰) تک کہا جائے گا، اور اگر انیتس (۲۹) کا ہو تو بیس (۲۰) سے لے کر انیتس (۲۹) تک شمار کیا جائے گا۔ لیکن چوں کہ اعتکاف کی ابتدا سب کے نزدیک بیس (۲۰) کی شام اور اکیس (۲۱) کی شب سے ہوتی ہے، اس لئے اکثر نے وہی مراد لیا ہے اور وہی راجح بھی ہے۔

شبِ قدر دو ہوتی ہیں

ویسے شبِ قدر کے متعلق بہت سارے اقوال ہیں، پچاس (۵۰) قول ہیں کہ کب ہوتی ہے۔ بعض حضرات اس طرف گئے ہیں، علّامہ ابن عربی (رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی کہا ہے کہ سال بھر میں گھومتی رہتی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: شبِ قدر دو ہوتی ہیں، ایک تو وہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے متعلق فیصلے ہوتے ہیں اور بڑے بڑے معاملات طے ہوتے ہیں؛ وہ تو سال بھر میں گھومتی رہتی ہے، اور قرآنِ پاک جس سال نازل ہوا وہ رمضان المبارک میں تھی۔ اس لیے کہ قرآن پاک کے نزول دو ہیں، ایک تو لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا تک جو یکبارگی ہوا ہے۔ اور دوسرا نزول آسمان دنیا سے حضور اکرم ﷺ پر؛ وہ تیئس (۲۳) سال تک مختلف اوقات میں اُترتا رہا۔ لہٰذا ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر جو اُتارا وہ اسی رات میں اتارا جو اس سال رمضان میں تھی۔

اور دوسری وہ رات جس میں دعائیں اور عبادتیں قبول ہوتی ہیں اور انوارات کا ایک خاص انتشار ہوتا ہے؛ وہ البتہ رمضان ہی میں ہوتی ہے۔ ویسے اکثر حضرات اِس طرف گئے ہیں کہ شبِ قدر رمضان ہی میں ہوتی ہے، اور رمضان میں آخری عشرہ ہی میں اور اس میں بھی آخری عشرہ کی طاق راتوں یعنی ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ اور ۲۹ میں ہوتی ہے۔ اگرچہ بعضوں نے پورے عشرہ ہی میں زیادہ تلاش کرنے کو کہا ہے، حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں اکیس (۲۱) تیئس (۲۳) اور چوبیس (۲۴) میں ہونا

روایتوں میں آیا ہے۔ اور حضرت ابی بن کعب (رضی اللہ عنہ) جو اکابرِ صحابہ میں سے ہیں وہ تو فرماتے ہیں کہ ستائیس (۲۷) ہی کو شبِ قدر ہوتی ہے۔ اس لیے آدمی کو رمضان المبارک کی راتوں میں خاص طور سے اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ آدمی کو پورے سال رات کی دو نمازوں یعنی مغرب اور عشاء کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اس لیے کہ فجر صبحِ صادق کے بعد ہوتی ہے لہٰذا وہ تو دن کی نماز میں آجاتی ہے۔ اس لیے کم سے کم یہ دو نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کرنے کا پورے سال اہتمام کروگے تو شبِ قدر میں عبادت ہو ہی جائے گی اور اس صورت میں بہت بڑا ثواب مل جائے گا اور یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) ان راتوں میں عبادات کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) رمضان کا پورا مہینہ سوتے نہیں تھے، رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) سے بھی پورا پورا قرآن ایک رات میں پڑھنا ثابت ہے۔

حضراتِ تابعین میں سے بہت سے حضرات وہ تھے جو سال بھر رات میں ہمیشہ جاگا کرتے تھے جیسا کہ پہلے بتلا چکا ہوں۔ حضرت سعید بن مسیّب (رحمۃ اللہ علیہ) جو اکابرِ تابعین میں سے ہیں ان کے متعلق ہے کہ پچاس سال تک انھوں نے عشاء کے وضو سے فجر کی نماز ادا کی۔

حضرت امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق بھی یہی ہے۔وہ حضرات رات بھر عبادت کا اہتمام کرتے تھے۔

حضرت شدّاد کے متعلق لکھا ہے،وہ فرماتے تھے:اے اللہ! جہنم کی آگ نے میری نیند اڑادی۔

حضرت صلہ بن اُشیَم (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق لکھا ہے کہ وہ رات بھر عبادت کرتے تھے اور جب سحر کا وقت ہوتا تو صبحِ صادق سے پہلے یہ دعا کرتے تھے: یا اللہ! اس بات کی تو مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں تجھ سے جنّت مانگوں،بس! جہنم کے عذاب سے مجھے بچالینا۔

بہر حال! یہ حضرات عبادت کرنے کے بعد ڈرتے رہتے تھے،انہیں کے اوصاف میں یہ آیت ہے ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ رات کے آخری حصہ میں وہ لوگ اپنے گناہوں سے معافی مانگتے ہیں۔ گویا رات بھر کی اپنی عبادت کو بھی وہ لوگ نیکی نہیں سمجھتے،بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ پتہ نہیں؛ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوئی یا نہیں۔

قرآنِ پاک میں ہے:﴿وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ وہ لوگ جب اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں تو ایسی حالت میں کرتے ہیں کہ ان کے دل ڈرے رہتے ہیں۔ کسی نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے پوچھا:﴿يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ کیا گناہ کرنے کے بعد ڈرے سہمے رہتے ہیں؟ انھوں نے فرمایا: ایسا نہیں ہے، گناہ کرنے کا تو سوال ہی نہیں، بلکہ ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ اعمالِ صالحہ انجام دینے کے بعد اس بات سے ڈرے رہتے ہیں کہ پتہ نہیں! ہمارا یہ عمل اللہ تعالیٰ کی

بارگاہ میں قبول بھی ہوا یا نہیں، اللہ تعالیٰ کے دربار کی شان کے مطابق ہے بھی یا نہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ منھ پر مار دیا جائے۔ اس لیے ہمیں بھی ان کیفیات کے ساتھ عبادات کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ہمارے معاشرہ کی عام وبا

آج ہم میں ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ مبارک رات ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ بڑی رات ہے؛ جاگو۔ حالاں کہ جاگنے کا مطلب صرف جاگنا نہیں ہے، بلکہ جاگ کر عبادت کرنا ہے۔ بہت سے لوگ صرف جاگنے ہی کو کافی سمجھتے ہیں، اور کسی بھی طریقے سے وقت گزاری، مجلس بازی، لطیفہ بازی، اور پتہ نہیں کیسے کیسے کاموں میں مشغول ہو جاتے ہیں، بعض لوگ گناہوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ نوجوان موٹر سائیکل لے کر گھومنے نکل جاتے ہیں، چوپاٹی کے چکّر لگاتے ہیں: یہ سب بالکل غلط طریقے ہیں۔ ارے اللہ کے بندو! اگر یہی سب کرنا تھا تو پھر تو سو گئے ہوتے یہ زیادہ اچھا تھا۔ یہ رات صرف جاگنے کی نہیں ہے، اور صرف جاگنا مقصود بھی نہیں ہے، بلکہ مقصود تو عبادت ہے، اگر جاگ کر اس کو ضائع کرنا ہے تو اس کے بجائے آدمی سو جائے یہ زیادہ اچھا ہے، تاکہ اتنا وقت گناہوں سے تو اپنے آپ کو بچا کر رکھ سکے۔

شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ پہلے بھی کبھی سنا چکا ہوں کہ ان کو ان کے والد صاحب نے بچپن ہی سے رات کو تہجد میں نماز کے لئے اٹھنے کی عادت ڈالی تھی۔ وہ خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ

ہم تہجد کی نماز کے لئے اٹھے، جب نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ دوسرے لوگ سو رہے تھے، میں اس وقت بچّہ تھا، میں نے والد صاحب سے کہا: یہ لوگ ایسے پڑے ہوئے ہیں جیسے کہ مردے پڑے ہوں۔ تو والد صاحب نے مجھ سے کہا: بیٹا! تو بھی اگر سویا رہتا تو زیادہ اچھا تھا اس بات سے کہ لوگوں کی غیبت میں مشغول ہوا۔

تو در حقیقت جاگنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہوا جائے اور ایسی مبارک راتوں اور ایسے مبارک اوقات میں چھوٹے بڑے ہر گناہ سے اپنے آپ کو بچانے کا خصوصیت کے ساتھ اہتمام کرنا چاہیے، خدانہ کرے ان راتوں میں اگر کوئی آدمی گناہ میں مبتلا ہو گیا تو جیسے ان راتوں میں عبادت کا ثواب بہت بڑا ہے، اسی طریقہ سے ان میں گناہ کی وجہ سے وبال بھی بہت بڑا ہے۔ جیسے: کوئی آدمی حرم میں جا کر عبادت کرے گا تو ایک لاکھ گنا ثواب ملتا ہے، اسی طرح وہاں اگر گناہ کرے گا تو گناہ کا وبال بھی اُسی مناسبت سے ہوا کرتا ہے۔

(بہرحال! جاگنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں وقت گزارا جائے۔)

اس طرف بھی توجہ کرنی چاہیے

حدیث ۱۱۹۳:-

وعنها (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسول الله ﷺ إِذَا دَخَلَ العَشْرُ الأَوَاخِرُ مِنْ رَمَضَانَ، أَحْيَا اللَّيْلَ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ، وَجَدَّ وَشَدَّ المِئْزَرَ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کا حال یہ تھا کہ جب رمضان کا آخری عشرہ آتا تھا تو آپ رات بھر عبادت میں مشغول رہتے تھے، اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے۔ آپ ﷺ خود بھی خوب جدّ جہد اور محنت سے کام لیتے تھے، اور آپ ﷺ ازار باندھ لیا کرتے تھے۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو اس بات کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔ بہت سے حضرات اپنے طور پر تو اس کا اہتمام کرتے ہیں لیکن اپنے گھر والوں پر توجہ نہیں کرتے، اگرچہ ان کو پوری رات نہ جگائے، لیکن ترغیب دے کر کچھ نہ کچھ اعمال کروانے کی عادت ڈالنی چاہیے، دھیرے دھیرے عادت پڑ جائے گی

"وَشَدَّ الْمِئْزَرَ" یعنی کسی کام کے لیے کمر باندھ لینا اور بالکل تیّار ہو جانا۔

حضور اکرم ﷺ کا طرزِ عمل

حدیث ۱۱۹۴:-

وعنها (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ يَجْتَهِدُ فِي رَمَضَانَ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهِ، وَفِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْهُ مَا لَا يَجْتَهِدُ فِي غَيْرِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ رمضان کے مہینہ میں عبادت وغیرہ میں اتنی مشقت اٹھاتے تھے کہ رمضان کے علاوہ میں اتنی نہیں اٹھاتے تھے، اور رمضان کے آخری عشرہ میں تو اتنی زیادہ جو اور کسی دن میں نہیں ہوا کرتی تھی۔

افادات:- جیسا کہ اوپر بتلایا تھا رمضان المبارک کا مہینہ خاص طور پر وصول کرنے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا مہینہ ہے۔ اس لئے آدمی کو خاص طور پر عبادت کی مشقت اُٹھانی چاہئے اور اس میں بھی آخری دس راتوں میں تو اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

شبِ قدر کی خاص دعا

حدیث ۱۱۹۵:-

وعنها (رضی اللہ عنہا) قالت: قُلْتُ: يَا رسول الله، أَرَأَيْتَ إِنْ عَلِمْتُ أَيُّ لَيْلَةٍ لَيْلَةُ الْقَدْرِ مَا أَقُولُ فِيهَا؟ قَالَ: ((قُولِي: اللَّهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّي)) (رواہ الترمذی، وقال: ((حديث حسن صحيح)).

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بتلائیے کہ اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کونسی رات شبِ قدر ہے؛ تو میں اس میں (خاص طور پر) کونسی دعا مانگوں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ دعا مانگو: "اَللّٰھُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ" اے اللہ! تو معاف کرنے والا ہے، معافی کو پسند کرتا ہے ؛لہٰذا میرے گناہوں کو معاف کر دے۔

افادات:- قربان جائیے حضراتِ صحابۂ کرام پر! کہ مبارک راتوں میں کیا مانگنا چاہئے وہ بھی انھوں نے حضور اقدس ﷺ سے پوچھ لیا اور حضور اکرم ﷺ نے وہ بتلا دیا؛ پھر بھی ہم اس کا اہتمام نہیں کرتے۔ ہم تو اپنے طور پر اپنے دماغ میں جن چیزوں کو لیے بیٹھے ہیں ؛انہیں کو مانگتے رہتے ہیں، حضور اکرم ﷺ نے جن چیزوں کی تاکید فرمائی ہے اور جن چیزوں کی تعلیم دی ہے؛ اُدھر ہمارا کبھی خیال بھی نہیں جاتا۔

اس دعا کے ذریعہ اتنی بڑی چیز منگوائی گئی ہے کہ اگر وہ مل جائے تو دونوں جہاں کی کامیابی مل گئی ﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ﴾ جو آدمی جہنم سے دور کر دیا گیا اور جنّت میں داخل کیا گیا تو وہی ہے حقیقی کامیاب۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر مغفرت کا پروانہ مل جائے، گناہوں سے معافی دیدی جائے؛ تو یہ سب سے بڑی کامیابی کی چیز ہے:-

من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر		قلمِ عفو بر گناہم کش

میں یہ نہیں کہتا کہ میری طاعتوں اور عبادتوں کو قبول کر لیا جائے، بلکہ میرے گناہوں پر معافی کا قلم پھیر دیا جائے۔ تو حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا پروانہ مل جانا؛ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لئے مغفرت کے طلب کرنے کا خاص اہتمام کرنا چاہیے۔

ہم لوگوں کا بھی عجیب مزاج بنا ہوا ہے کہ ہم اپنی دنیا کی اِدھر اُدھر کی ساری چیزیں مانگتے رہتے ہیں، لیکن بھولے سے بھی مغفرت مانگنے کی طرف دھیان نہیں جاتا، ہماری نگاہوں میں بس مانگنے کے لئے بھی دنیا ہی کی چیزیں ہیں، آخرت کی نعمتیں اور حضور اکرم ﷺ نے جو چیزیں مانگ کر بتلائی ہیں ان کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

فَضْلُ السِّوَاكِ وَخِصَالُ الْفِطْرَةِ

مسواک کے فضائل اور فطرت کی باتیں

اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اور ہر ہر مخلوق اپنے ایک الگ مخصوص مزاج، مخصوص اوصاف وخوبیوں اور امتیازی شانوں کی حامل ہوا کرتی ہے؛ اسی کو عربی میں فطرت اور جبلّت سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے: بہت سوں کے مزاج میں تیزی ہوتی ہے، اور ان کے متعلق لوگ کوشش کرتے ہیں کہ یہ تیزی باقی نہ رہے؛ تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو اس کی فطرت ہے، گویا اس کی پیدائش ہی اس انداز سے ہوئی ہے کہ تیزی والا مزاج اس کے اندر پایا جاتا ہے، اب چاہے کتنی ہی محنت کی جائے تب بھی وہ تیزی اس کے اندر سے نکلنے والی نہیں ہے۔ ہاں! اس پر اتنی محنت کی جاسکتی ہے کہ وہ غلط جگہ استعمال ہونے کے بجائے صحیح جگہ استعمال ہونے لگے۔ تو فطرت کی کچھ باتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر رکھی ہیں کہ وہ اپنی فطرت اور مزاج کی وجہ سے انہیں امور کو اختیار کرے گا۔ اور علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فطرتِ سلیمہ پر پیدا فرمایا، پھر انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کو دنیا میں بھیجا جو فطرتِ سلیمہ ہی کی دعوت دیا کرتے ہیں، تو گویا نبیوں کا طریقہ اور ان کی سنتیں فطرت ہی کا ایک حصہ ہیں، ہر نبی نے انسانوں کو انسانیت کی دعوت دی اور جو چیزیں امت تک پہنچائیں ان میں جن چیزوں کے کرنے کی طرف توجہ دلائی یا جن چیزوں سے روکا، دراصل

ہر آدمی کی فطرتِ سلیمہ اسی کا تقاضہ کرتی ہے۔اس لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ حضراتِ انبیاء(علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی سنتیں فطرت کی باتیں ہیں۔اس باب میں اصل تو مسواک کے فضائل کا عنوان قائم کیا ہے اور مسواک کو دین کی اہم سنتوں میں شمار کیا گیا ہے، مسواک کرنا سنّتِ موٴکدہ ہے۔

کن کن مواقع پر مسواک کی جائے؟

تو علماء نے لکھا ہے کہ وضو کے موقع پر، نماز کے موقع پر، نیند سے بیدار ہونے کے وقت، منہ میں اگر بدبو پیدا ہو جائے، یا دیر تک بولنے کی وجہ سے منہ کی بو میں فرق آجائے تو اس کو دور کرنے کے لئے، جب آدمی باہر سے گھر میں آئے؛ یہ مختلف اوقات بتائے گئے ہیں جن مواقع میں مسواک کے استعمال کو مستحب اور سنّت قرار دیا گیا ہے۔

مسواک وضو کی سنت ہے یا نماز کی؟

اور خاص طور پر جہاں نماز کا مسئلہ آتا ہے، تو امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: مسواک وضو کی سنّت ہے، یعنی وضو کرتے وقت اگر آپ نے مسواک استعمال کرلی اور مسواک کا اہتمام کیا تو اُس وضو سے جتنی بھی نمازیں ادا کریں گے، چاہے فرض ہو، یا نفل؛ ان تمام نمازوں کو مسواک کے ساتھ ادا کیا ہوا ہی کہا جائے گا، اور بغیر مسواک والی نماز پر مسواک والی نماز کو جو فضیلت دی گئی ہے؛ وہ

فضیلت آپ کو حاصل ہوجائے گی۔ لیکن امام صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) یہ بھی فرماتے ہیں :اگر وضو کرکے فوراً نماز ادا کی اور اس وضو میں بھی مسواک کرلی ہے وہ کافی ہو جائے گی، اور اگر وضو کئے ہوئے دیر ہوگئی ہے تو اس صورت میں نماز کے لئے الگ سے مسواک کرنا مستحب ہے، اگرچہ اس کو سنّتِ مؤکدہ قرار نہیں دیا ہے لیکن اچھا اور بہتر ہے، البتہ اگر کسی آدمی کو یہ ڈر ہو کہ مسواک کرنے کے نتیجہ میں مسوڑھوں کے کمزور ہونے کی وجہ سے خون نکل آئے گا تو پھر مسواک استعمال نہ کرے، ورنہ دوبارہ وضو کرنا پڑے گا۔

اور امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) اس طرف گئے ہیں کہ مسواک وضو کی سنت تو ہے ہی، لیکن نماز کی بھی الگ سے سنّت ہے ،اس لیے مسواک والی نماز کو بغیر مسواک والی نماز کے مقابلہ میں جو فوقیت و فضیلت حاصل ہے وہ تو اسی وقت حاصل ہوگی جب نماز کے لئے الگ سے مسواک کریں گے۔

وضو میں مسواک کب کی جائے؟

اس سلسلہ میں فقہ کی کتابوں میں دو باتیں لکھی ہیں، ایک تو یہ کہ وضو شروع کرنے سے پہلے یعنی گٹوں تک ہاتھ دھو کر پہلے مسواک کرلے۔ اور بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ کلّی کرتے وقت مسواک کی جائے، اور اسی وقت مسواک کرنے والے قول کو زیادہ راجح قرار دیا گیا ہے۔

مسواک کون سے درخت کی ہونی چاہیے؟

حدیث میں پیلو کا تذکرہ آیا ہے۔پیلو ایک درخت کی جڑ کی لکڑی ہوتی ہے جس میں ایک مخصوص قسم کی بو بھی ہوا کرتی ہے اور اس کا ایک مخصوص ذائقہ بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے دانتوں کی صفائی بھی ہوتی ہے، اسی کو ترجیح دی گئی ہے، باقی اس کے علاوہ اور ایسے درخت جن میں کچھ کڑواہٹ ہو اور اس کی لکڑی نرم ہو، اس سے بھی مسواک کی جاسکتی ہے۔ہاں! زہریلے درخت کی لکڑی، یا جو ایسی سخت ہو کہ ان کو استعمال کرنے کے نتیجہ میں دانتوں سے خون نکلنے یا مسوڑھوں کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہو، جیسے: بانس وغیرہ؛تو اس سے مسواک کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

مسواک کی مقدار کتنی ہونی چاہئے؟

تو اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب نئی استعمال کرنا شروع کرے تو لمبائی کے اعتبار سے ایک بالشت ہونی چاہیے،اور موٹائی کے اعتبار سے درمیانی انگلی کے بقدر ہو، اورزیادہ سے زیادہ انگوٹھے کے برابر موٹی ہونی چاہیے، اس سے زیادہ موٹی نہ ہو۔اور خود استعمال کرنے والے کی بالشت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ درمیانی قد کے انسان کی بالشت کا اعتبار کیا جائے گا۔

استعمال کا طریقہ کیا ہے؟

استعمال کرنے کا طریقہ یہ بتلایا ہے کہ مسواک کو مٹھی میں پکڑنے کے بجائے اس طرح پکڑا جائے کہ چھوٹی اُنگلی اخیری سرے پر رکھی جائے اور انگوٹھے اور بقیہ انگلیوں سے پکڑی جائے، اور پہلے دائیں طرف اوپر کے دانت، پھر بائیں طرف اوپر کے دانت، پھر دائیں طرف نیچے کے دانت، پھر بائیں طرف نیچے کے دانت، اس کے بعد پھر اندر کے حصہ میں بھی کی جائے، ڈاڑھوں پر بھی کی جاسکتی ہے۔ اور دانتوں کی چوڑائی کے اعتبار سے استعمال کی جائے گی، لمبائی کے اعتبار سے نہیں، اس لئے کہ اس طرح استعمال کرنے میں مسوڑھوں کو نقصان ہو سکتا ہے، اگرچہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حدیث میں ایسی کوئی تحدید نہیں ہے، اس لیے لمبائی کے اعتبار سے بھی استعمال کرسکتے ہیں۔

مسواک تین مرتبہ کی جائے، مثلاً: ایک مرتبہ اس کو پانی سے بھگا کر دائیں طرف اوپر، پھر بائیں طرف اوپر، پھر دائیں طرف نیچے، پھر بائیں طرف نیچے کرلی جائے۔ پھر دوبارہ پانی سے بھگا کر اسی طرح کی جائے، پھر تیسری مرتبہ بھگا کر اسی طرح کرلی جائے۔ اور استعمال کرنے کے بعد جو ریشے والا حصہ ہے اس کو اوپر کی طرف رکھ کر مسواک کو کھڑا رکھنا زیادہ مناسب ہے۔

اگر امّت کے مشقّت میں پڑنے کا ڈر نہ ہوتا...

حدیث ۱۱۹۶:-

عن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ): أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((لَوْلاَ أنْ أشُقَّ عَلَى أُمَّتِي - أوْ عَلَى النَّاسِ - لأَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ مَعَ كُلِّ صَلاَةٍ)) (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر میری امّت کے مشقّت میں پڑنے کا ڈر نہ ہوتا؛ تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا ان کو (وجوبی طور پر) حکم دیتا۔

افادات:- اور واجب قرار دینے کی صورت میں اگر کوئی آدمی ہر نماز کے وقت اس پر عمل نہ کرتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ آپ ﷺ کے اس حکم کے چھوڑنے کے نتیجہ میں امّت گنہگار ہو کر مشقت و مصیبت میں پڑ جاتی، اس لئے آپ ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کو واجب قرار نہیں دیا۔ باقی جیسا کہ ابھی بتلایا ہر نماز کے وقت مسواک کرنا مستحب ہے، لہٰذا استحباب والا حکم اب بھی موجود ہے، لیکن استحباب کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی نہیں کرے گا تو فضیلت سے محروم رہے گا، باقی گنہگار نہیں ہوگا۔ جبکہ وجوبی حکم دیا جاتا تو نہ کرنے کی صورت میں گنہگار ہوتا اور یہ چیز امّت کے لئے مشقّت اور تکلیف کی ہوتی۔

حضور ﷺ کا نیند سے بیدار ہوتے وقت کا معمول

حدیث ۱۱۹۷:-

وعن حُذَيْفَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رسول الله ﷺ إِذَا قَامَ مِنَ النَّوْمِ يَشُوصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ. (متفقٌ عَلَيْهِ) ((الشَّوْصُ)): الدَّلْكُ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ جب نیند سے اُٹھتے تھے تو اپنے دہنِ مبارک کو مسواک سے ملتے تھے (یعنی مسواک استعمال فرماتے تھے)

افادات:- جیسا کہ ابھی بتلایا جن مواقع میں مسواک کرنا مستحب ہے ان میں سے ایک موقع یہ بھی ہے کہ آدمی جب نیند سے بیدار ہو۔ نبیٔ کریم ﷺ نیند سے بیدار ہونے کے بعد مسواک کا استعمال فرماتے تھے ویسے بھی سونے کے نتیجہ میں منھ کی بو میں فرق آجاتا ہے، کچھ رطوبتیں بھی جمع ہو جاتی ہیں، مسواک استعمال کرنے کے نتیجہ میں منھ کی صفائی ہو جائے گی۔ سونے سے پہلے بھی مسواک کرنا مستحب ہے اور سو کر اٹھنے کے بعد بھی مسواک کرنا مستحب ہے۔

حدیث ۱۱۹۸:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كُنَّا نُعِدُّ لِرسولِ الله ﷺ سِوَاكَهُ وَطَهُورَهُ، فَيَبْعَثُهُ اللهُ مَا شَاءَ أَنْ يَبْعَثَهُ مِنَ اللَّيْلِ، فَيَتَسَوَّكُ، وَيَتَوضَّأُ وَيُصَلِّي (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ ہم (اُمّہات المؤمنین) نبی کریم ﷺ کے لئے آپ کی مسواک اور وضو کا پانی تیار کرکے رکھ دیا کرتی تھیں (یعنی آپ صبح اٹھیں گے تو آپ کو وضو کے لئے پانی کی ضرورت پیش آئے گی، اور مسواک استعمال فرمائیں گے) پھر اللہ تعالیٰ کو جب منظور ہوتا آپ کو اٹھاتا (یعنی اللہ تعالیٰ آپ کو رات کے کسی حصہ میں اٹھاتا تو) آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اٹھتے، مسواک فرماتے، وضو فرماتے اور نماز ادا فرماتے۔

افادات:- ازواجِ مطہرات رات ہی سے آپ ﷺ کے لئے مسواک اور وضو کے لیے پانی تیّار کرکے رکھ دیا کرتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عورت کے لئے مناسب ہے کہ اپنے شوہر کی خدمت میں اس کا بھی اہتمام کرے، کم سے کم پانی کا لوٹا ہی رکھ دے، تاکہ اس کو غیرت آئے اور وہ نماز کے لئے اٹھنے کی کوشش کرے۔

یہاں بتلایا گیا کہ مسواک ایک ایسی چیز ہے جس کا پہلے سے اہتمام کیا جانا چاہیے، جیسے: وضو کے پانی کا پہلے سے تیّار رکھنے کا اہتمام ہو اسی طرح مسواک کو بھی پہلے سے تیّار کرکے رکھا جائے تاکہ وقت پر اس کے استعمال میں کوئی دشواری اور رُکاوٹ پیش نہ آئے، ایسا نہیں کہ وقت پر ڈھونڈنا پڑے۔

حدیث ۱۱۹۹:-

وعن أنس (رضي الله عنه) قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((أَكْثَرْتُ عَلَيْكُمْ فِى السِّوَاكِ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: میں نے تم کو مسواک کے سلسلہ میں بہت زیادہ تاکید کردی ہے۔

افادات:- گویا حضورِ اکرم ﷺ نے حضراتِ صحابہ کو مسواک کی اتنی زیادہ تاکید فرمائی تھی کہ آپ کو خود بھی اس کا احساس ہوا اور آپ نے اس کا اظہار کیا کہ میں نے مسواک کے سلسلہ میں تم کو بہت مرتبہ کہا ہے۔

گھر میں داخل ہوتے وقت کا معمول

حدیث ۱۲۰۰:-

وعن شريح بن هانيءٍ، قَالَ: قلت لعائشة (رضی اللہ عنہا): بأَيِّ شَيْءٍ كَانَ يَبْدَأُ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ؟ قالت: بِالسِّوَاكِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت شریح بن ہانی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے پوچھا: جب نبیِ کریم ﷺ گھر میں تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلا کام کیا کرتے تھے؟ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے جواب میں فرمایا: مسواک کرتے تھے۔

افادات:- آدمی چوں کہ باہر ہوتا ہے تو بولنے کی بھی نوبت آتی ہے اور دیر تک بولنے کی وجہ سے بھی منھ کی بو میں فرق آجاتا ہے، جیسے دیر تک خاموش رہنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جب آدمی گھر میں داخل ہوتا ہے تو گھر والوں کے پاس قریب بیٹھنے اور ان سے بات کرنے کا موقع آتا ہے، لہٰذا پہلے سے

مسواک کرلی جائے، تاکہ منھ کی بدبو سے کسی کو تکلیف نہ ہو۔ ویسے بھی کسی مجمع میں حاضری کا موقع ہو اس وقت بھی مسواک کا اہتمام کیا جانا چاہیے۔

زبان پر بھی مسواک پھیرے

حدیث ۱۲۰۱:-

وعن أبي موسىٰ الأشعری (رضی اللہ عنہ) قَالَ: دَخلتُ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَطَرَفُ السِّوَاكِ عَلَى لِسَانِهِ. (متفقٌ عليهِ، وهذا لفظ مسلمٍ)

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ أشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت مسواک کی ایک طرف کا حصہ آپ کی زبان پر تھا (یعنی آپ ﷺ زبان پر مسواک استعمال فرمارہے تھے)۔

افادات:- یہاں ایک واقعہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ أشعری (رضی اللہ عنہ) سے ان کی قوم نے درخواست کی کہ ہمیں سواری کی ضرورت ہے، لہٰذا آپ جاکر سواری مانگئے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) حضور ﷺ کی خدمت میں جس وقت پہنچے اور جو منظر دیکھا اس کو بیان فرمارہے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبیٔ کریم ﷺ کی زبانِ مبارک پر مسواک کی نوک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسواک کا استعمال زبان کی صفائی کے لئے بھی کیا جاسکتا ہے، خاص کر سوکر اٹھنے کے بعد مسواک کا کچھ حصہ زبان پر بھی پھرالیا جائے تاکہ زبان پر جو رطوبتیں جمع ہوئی ہیں وہ دور ہوجائیں، اور اس کی وجہ سے آدمی کا گلا بھی صاف ہوجاتا ہے اور آواز بھی صاف ہوجاتی ہے۔

منھ کی صفائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ

حدیث ۱۲۰۲:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا): أنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: ((السِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ للرَّبِّ)) (رواه النسائی وابنُ خُزَيْمَةَ فی صحیحه بأسانيدَ صحيحةٍ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسواک منھ کی صفائی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ ہے۔

افادات:- مسواک کے جو فوائد ہیں ان میں سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ منھ کی صفائی ہوتی ہے، اوراللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ اور لکھا ہے کہ مسواک کے بے شمار فوائد میں سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ موت کے وقت آدمی کو کلمہ نصیب ہوتا ہے، یعنی ایمان پر موت آتی ہے اور مسواک کی برکت سے روح کے نکلنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔

پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں

حدیث ۱۲۰۳:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((الفِطْرَةُ خَمْسٌ، أَوْ خَمْسٌ مِنَ الفِطْرَةِ: الخِتَانُ، وَالاسْتِحْدَادُ، وَتَقْلِيمُ الأَظْفَارِ، وَنَتْفُ الإِبطِ، وَقَصُّ الشَّارِبِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

((الاستحْدَادُ)): حَلْقُ العَانَةِ، وَهُوَ حَلْقُ الشَّعْرِ الَّذِي حَولَ الفَرْجِ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں، ختنہ کرنا، زیرِ ناف بالوں کی صفائی کرنا، ناخنوں کو کاٹنا، بغل کے بالوں کو اکھاڑنا، اور مونچھوں کو کتروانا۔

افادات:- جیسا کہ شروع میں بتلایا تھا، فطرت کا معنیٰ حضراتِ انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا طریقہ اور سنّت ہے۔ پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں:-

[۱]:- اَلخِتَانُ: ختنہ کرنا۔ مرد کی شرم گاہ میں آگے ایک زائد چمڑی ہوتی ہے جس کو کاٹ دیا جاتا ہے تاکہ آگے کا حصہ کھل جائے؛ اسی کو ختنہ کرنا کہتے ہیں۔ یہ سنّت ہے اور انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کے طریقوں میں سے ہے۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنی ختنہ اسّی (۸۰) سال کی عمر میں کی تھی، جیسا کہ بخاری شریف میں روایت موجود ہے۔

[۲]:- وَالاسۡتِحۡدَادُ: زیرِ ناف بالوں کی صفائی کرنا۔ ناف کے نیچے اور شرمگاہ کے اوپر، اور دونوں شرم گاہ کے آس پاس کے بالوں کی صفائی کرنا تاکہ استنجاء میں کوئی دشواری نہ ہو، اور اس کی وجہ سے بال بھی ملوّث ہو کر آدمی کے لئے مزید ناپاکی کا ذریعہ نہ بنیں۔ ان بالوں کی صفائی اُسترے کے ذریعہ، یا پاؤڈر اور صابن وغیرہ استعمال کر کے کی جاسکتی ہے۔

ناخن کاٹنے کی ترتیب

۳:- وَتَقْلِيمُ الأَظْفَارِ: ہاتھ اور پاؤں؛ دونوں کے ناخنوں کو کاٹنا حضراتِ انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی سنّت ہے۔

ناخن کاٹنے کی ترتیب کے سلسلہ میں صریح طور پر کوئی روایت نہیں ہے، ہاں ! بزرگوں نے ترتیب بتلائی ہے، ہاتھوں کے ناخن میں دائیں ہاتھ کی انگشتِ شہادت کا ناخن پہلے کاٹا جائے، پھر بیچ والی بڑی انگلی، پھر اس کے برابر والی، پھر اخیر والی چھوٹی انگلی۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی، پھر اس کے بعد والی، پھر درمیانی بڑی انگلی، پھر اس کے بعد والی، اس کے بعد بائیں ہاتھ کا انگوٹھا، پھر دائیں ہاتھ کا انگوٹھا۔ عام طور پر فقہ کی کتابوں میں ناخن تراشنے کی یہی ترتیب لکھی ہے۔

پیروں کے ناخنوں میں دائیں پیر کی چھوٹی انگلی سے شروع کرکے انگوٹھے پر ختم کیا جائے، پھر بائیں پیر کے انگوٹھے سے شروع کرکے چھوٹی انگلی پر ختم کرے۔

بغل کے بال اُکھاڑنا

۴:-وَنَتْفُ الإِبِطِ: بغل کے بالوں کو اُکھاڑنا۔ بغل کے بالوں میں اصل تو اُکھاڑنا ہی ہے، اس کی وجہ سے بغل میں بدبو بھی نہیں رہتی، اور دوبارہ بال دیر سے نکلتے ہیں، اور مونڈنے کے نتیجہ میں بال جلدی نکل آتے ہیں اور بال سخت بھی ہوجاتے ہیں، جبکہ اُکھاڑنے کے نتیجہ میں سخت نہیں ہوتے۔

لیکن اگر کسی آدمی کو عادت نہ ہونے کی وجہ سے اُکھاڑنا دشوار ہو تو مونڈ لیا کرے، مونڈنے سے بھی سنّت حاصل ہو جائے گی ایک مرتبہ امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) بغل کے بال مونڈ رہے تھے، ایک آدمی نے کہا کہ اصل بغل کے بال اُکھاڑنا ہے، تو امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: اصل تو اس کا اُکھاڑنا ہی ہے لیکن ہم کمزوری کی وجہ سے اُکھاڑنے کی طاقت نہیں رکھتے تو مونڈ رہے ہیں۔

مونچھوں کا کتروانا

۵:- وَقَصُّ الشَّارِبِ: مونچھوں کا کتروانا بھی سنّت ہے۔ اب مونچھوں کے کترنے کے سلسلہ میں ایک طریقہ تو یہ بتلایا گیا ہے کہ اتنی مونچھ لے لی جائے کہ اوپر کے ہونٹ کا کنارہ بالکل کھل جائے، اس صورت میں کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہوگی۔ دوسرا طریقہ یہ بتلایا گیا ہے کہ مونچھوں کو اتنی کترے کہ جیسی بھویں ہوتی ہیں اُتنی مونچھیں رہ جائیں۔ اور تیسرا طریقہ جس کو بہتر قرار دیا ہے کہ اس طرح کترے کہ وہ بالکل صاف ہو جائے، مونڈنے کو پسند نہیں کیا گیا، اگرچہ احناف کے یہاں مونڈنا بھی جائز ہے، مکروہ نہیں۔ امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) مونچھوں کے مونڈنے کو مکروہ بتلاتے ہیں، لیکن حنفیہ کے یہاں مونڈنا جائز ہے، البتہ بہتر یہ ہے کہ قینچی سے اس انداز سے کترا جائے کہ مونڈنے جیسی صاف ہو جائیں۔

اور مونچھوں کے کنارے کے حصے اگر باقی رکھے جائیں تو اس کی بھی اجازت ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) اپنی مونچھوں کی صفائی میں دونوں طرف کے کنارے کو باقی رکھتے تھے۔ ویسے بھی مونچھوں کے کترنے کا مقصد یہ ہے کہ کھانے پینے میں دشواری نہ ہو، تو دونوں کناروں کو باقی رکھنے سے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی اس لیے اس کی اجازت دی گئی ہے۔

اور مدّت کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ آٹھ دن میں ناخن تراش لیتے تھے، پندرہ دن میں تراشنے کی بھی گنجائش ہے، چالیس دن سے پہلے پہلے ان ساری چیزوں کی صفائی کر لینی چاہیے، چالیس دن سے زیادہ تک چھوڑے رکھنا مکروہ ہے اور اس صورت میں آدمی گنہگار ہوگا۔

دس چیزیں انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی سنّت ہیں

حدیث ۱۲۰۴:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت قَالَ رسول الله ﷺ: ((عَشْرٌ مِنَ الفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ، وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ، وَالسِّوَاكُ، وَاسْتِنْشَاقُ المَاءِ، وَقَصُّ الأَظْفَارِ، وَغَسْلُ البَرَاجِمِ، وَنَتف الإِبْطِ، وَحَلْقُ العَانَةِ، وَانْتِقَاصُ المَاءِ)) قَالَ الرَّاوِي: وَنَسِيْتُ العَاشِرَةَ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ المَضْمَضَةُ.

قَالَ وَكِيعٌ -وَهُوَ أَحَدُ رُوَاتِهِ- انْتِقَاصُ المَاءِ: يَعْنِي الاسْتِنْجَاء. (رواہ مسلم)

((البَرَاجِم)) بالباء الموحدة والجيم: وهي عُقَدُ الأَصَابِعِ.

وَ((إِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ)) مَعْنَاهُ: لاَ يَقُصُّ مِنْهَا شَيْئاً.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دس چیزیں فطرت (یعنی انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی سنّت) میں سے ہیں: ۱۔ مونچھوں کو کترنا، ۲۔ ڈاڑھی کو بڑھانا (البتہ ایک مُشت سے زیادہ ہو تو اس زائد حصہ کو کترا جاسکتا ہے) ۳۔ مسواک کرنا، ۴۔ (وضو اور غسل میں) ناک میں پانی ڈالنا (وضو میں ناک میں پانی ڈالنا سنّت ہے اور غسل میں فرض ہے) ۵۔ ناخن تراشنا، ۶۔ جوڑوں کو دھونا، ۷۔ بغل کے بالوں کو اُکھاڑنا، ۸۔ زیرِ ناف بالوں کو مونڈنا، ۹ پیشاب پاخانہ سے فارغ ہونے کے بعد ڈھیلے سے استنجاء کرنے کے بعد پانی سے بھی صفائی کا اہتمام کرنا (صرف پانی استعمال کرنے کی بھی اجازت ہے) اس روایت کے نقل کرنے والے راوی کہتے ہیں کہ دسواں کیا فرمایا وہ میں بھول گیا لیکن غالب گمان یہ ہے کہ وہ کلّی کرنا ہے (اس لیے کہ منھ کی صفائی بھی انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کی سنتوں میں سے ہے۔ اور کلّی وضو میں تو سنّت ہے، لیکن غسل میں فرض ہے۔)

افادات:- ”إِسۡتِنۡشَاق“ کا مطلب یہ ہے کہ چلّو میں پانی لے کر ناک کے قریب لے جاکر زور سے سانس لے کر پانی کو اوپر کھینچنا پھر نکالنا تاکہ ناک کی صفائی ہو جائے؛ اس کو ”اسۡتِنۡشَاقُ الۡمَاءِ“ کہتے ہیں، یہ بھی انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا طریقہ ہے

”غَسۡلُ الۡبَرَاجِمِ“ ”بَرَاجِمۡ، بُرۡجُمَةٌ“ کی جمع ہے، انگلیوں کے جوڑ جہاں عام طور میل جم جاتا ہے، لیکن علماء نے لکھا ہے کہ یہ انگلیوں ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ بدن میں جہاں جہاں بھی جوڑ ہیں، وہ اگر وضو والے اعضاء ہے تو وضو میں، اور غسل میں تو پورے بدن کو دھونا ہی ہوتا ہے، لہٰذا ان تمام جوڑوں کو بڑے اہتمام کے ساتھ دھونا تاکہ میل اگر ہو تو وہ صاف ہو جائے، یہ بھی سنّت ہے۔

حضراتِ انبیاء (علیہم الصلوٰۃ والسلام) صفائی کی بہت زیادہ تاکید فرماتے ہیں، اس لیے ان جگہوں کی صفائی کی طرف خاص توجہ ہونی چاہیے جہاں میل جمنے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، اسی لئے اس کو الگ سے بیان کیا ہے۔

مونچھیں صاف کرو، ڈاڑھی بڑھاؤ

حدیث ۱۲۰۵:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) عن النبیِ ﷺ قَالَ: ((أَحْفُوا الشَّوَارِبَ، وَأَعْفُوا اللِّحٰی)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مونچھوں کو صاف کرو، اور ڈاڑھی کو بڑھاؤ۔

افادات:- ایک روایت میں آتا ہے کہ مونچھوں کو بڑھانا مجوس کا طریقہ ہے، تم ان کی مخالفت کرو۔ اور یہ بھی فرمایا کہ جو مونچھوں کو بڑھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ڈاڑھی کا بڑھانا نبیوں کا طریقہ ہے۔ ڈاڑھی کو بڑھانا واجب ہے اور اسلام کا شعار ہے، اور ڈاڑھی کو مونڈنا، یا ایک مشت سے کم کرنا حرام اور ناجائز ہے۔

میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے

جب نبیٔ کریم ﷺ نے دعوتِ اسلام دینے کے واسطے کسریٰ شاہِ ایران کے نام خط بھیجا تھا جس کو پڑھنے کے بعد اس کو بڑا غصّہ آیا اور کہنے لگا کہ میری رعیت کا ایک آدمی مجھے اس طرح برابر کا خطاب کرتا ہے، اس زمانہ میں یمن کا علاقہ ایران کے ماتحت تھا اور اس کو خراج ادا کیا کرتا تھا، تو کسریٰ نے یمن کے حاکم باذان کو لکھا کہ تم اس آدمی کو گرفتار کرنے کے لئے جن کا میرے پاس خط آیا ہے دو آدمی بھیجو۔ لہٰذا دو پہلوان قسم کے آدمی نبیٔ کریم ﷺ کے پاس اسی مقصد سے بھیجے گئے، اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر آپ ﷺ کو ایسی ہیبت عطا فرما رکھی تھی کہ جب وہ دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں مدینہ منورہ پہنچے تو آپ ﷺ پر نظر پڑتے ہی ان کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا اور وہ دونوں کانپنے لگے۔ حضور ﷺ نے ان سے پوچھا: تم دونوں کون ہو؟ اور کیوں آئے ہو؟ انہوں نے مقصد بتلایا۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا آقا جس کے حکم سے تم یہاں بھیجے گئے ہو، آج رات اس کے بیٹے نے اس کو قتل کر دیا ہے۔ چناں چہ انہوں نے تاریخ نوٹ کر لی، اور اسی کے مطابق ہوا تھا کہ وہ قتل کر دیا گیا تھا۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے جب دیکھا کہ ان کی ڈاڑھیاں مونڈی ہوئی ہیں اور مونچھیں بڑھی ہوئی ہیں تو آپ ﷺ نے ناگواری کے ساتھ اپنا چہرہ ان کی طرف سے پھیر لیا، حالاں کہ وہ دونوں مسلمان نہیں تھے۔ پھر حضور ﷺ نے ان سے پوچھا: تم نے اپنی شکل کیوں بگاڑ رکھی ہے کہ ڈاڑھیاں مونڈ رکھی ہیں اور مونچھیں بڑھا رکھی ہیں؟ انہوں نے کہا: ہمارے رب (یعنی کسریٰ) نے ہم

کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے رب نے تو مجھے یہ حکم دیا ہے کہ ڈاڑھی کو بڑھاؤں اور مونچھوں کو کترواؤں۔

تو دیکھئے! وہ دونوں مسلمان نہیں تھے پھر بھی نبی کریم ﷺ نے ان کی ایسی شکل وصورت سے ناگواری کا اظہار فرمایا۔ اس لیے ڈاڑھی رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، یہ اسلامی شعار ہے اور نبی کریم ﷺ بلکہ تمام انبیاء کرام (علیہم الصلوٰۃ والسلام) کا طریقہ اور سنّت ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بَابُ تَأْكِيْدِ وُجُوْبِ الزَّكٰوةِ وَبَيَانِ فَضْلِهَا وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهَا

زکوٰۃ کے واجب ہونے کا مؤکد اور پختہ ہونا

اس کی فضیلت اور اس سے متعلق دوسری چیزوں کا بیان

اس باب میں زکوٰۃ کے فضائل کو بیان کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں اس کے بے شمار فضائل موجود ہیں ان میں سے چند روایتیں اس باب میں پیش کی ہیں۔

زکوٰۃ فرائضِ اسلامیہ میں سے ایک فریضہ ہے، قرآنِ پاک میں جگہ جگہ نماز کے ساتھ اس کو بھی ادا کرنے کا تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے، جہاں اہلِ ایمان کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہاں اکثر ﴿وَأَقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ. يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكَاةَ﴾ ساتھ ساتھ آیا ہے، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو، وہ لوگ نماز کو قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ کو ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس کی تفصیلات قرآنِ پاک میں نہیں آئیں، بلکہ نبی کریم ﷺ نے بتلائی ہیں، لیکن نفسِ زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم قرآنِ پاک میں بے شمار مقامات پر آیا ہے، اور یہ اسلام کے فرائض میں سے ایک بنیادی فریضہ ہے۔

زکوٰۃ عربی زبان کا لفظ ہے جس کا ترجمہ بڑھنا اور پاک ہونا ہوتا ہے۔ چوں کہ زکوٰۃ کی نیت سے اپنے مال کی مقدار میں سے ڈھائی فی صد نکالنا دوسرے مال میں زیادتی اور بڑھوتری کا اور بقیہ مال کی پاکیزگی کا ذریعہ بھی بنتا ہے، اس لئے اس کو زکوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کے بنیادی مسائل

زکوٰۃ کے سلسلہ میں کچھ بنیادی مسائل ہیں:۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر آدمی پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ نماز اور روزہ کا معاملہ تو ایسا ہے کہ جو بھی بالغ ہو، چاہے مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا فقیر، مسافر ہو یا مقیم؛ اس پر نماز اور روزہ فرض ہے، لیکن زکوٰۃ کے سلسلہ میں شریعت کی طرف سے ایک مقدار متعین کی گئی ہے جس کو نصاب کہتے ہیں کہ وہ مخصوص آدمی جو مخصوص مقدار کا مخصوص زمانہ تک مالک بنے؛ تب ہی اس پر زکوٰۃ فرض ہو گی، ورنہ نہیں۔

پھر نصاب میں بھی شریعت نے بتلایا ہے کون سے مال میں زکوٰۃ فرض ہو گی، ہر طرح کے مال میں زکوٰۃ فرض نہیں۔ پھر کب فرض ہو گی وہ بھی بتلایا ہے۔ چناں چہ غنی یعنی مالدار پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اوراس پر بھی زکوٰۃ فرض ہونے کا ایک نصاب بتلایا گیا ہے کہ اگر چاندی ہو تو اُس زمانہ کے حساب سے دوسو درہم ہوں۔ اور دوسو درہم کی مقدار ہمارے پُرانے وزن کے اعتبار سے ساڑھے باون تولہ

ہوتی ہے، اور نئے وزن کے اعتبار سے ۳۵/ ۶۱۲ گرام ہوتی ہے۔ اوراگر سوناہو تو قدیم زمانہ کے حساب سے ۲۰/ مثقال ہوتا ہے،اورایک مثقال ساڑھے چار ماشہ کاہواکرتا تھا،لہٰذا ۲۰/ مثقال ہمارے پُرانے وزن کے حساب سے ساڑھے سات تولہ ہوتا ہے۔

تولہ کے سلسلہ میں ایک ضروری وضاحت

اور دیکھو! تولہ کالفظ آج کل بھی بولا جاتا ہے اور آج کل دس گرام کو تولہ کہتے ہیں، لیکن زکوۃ کے نصاب میں یہ وزن مراد نہیں ہے۔ دراصل تولہ کالفظ لوگوں کی زبان پر چڑھاہوا تھااور ایک پُرانی اصطلاح چلی آرہی تھی جو نیاوزن آنے کے بعد بھی باقی رہی، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ گرام ایک الگ وزن ہے جو اعشاریہ وزن سے تعلق رکھتا ہے۔ اور تولہ ایک الگ وزن ہے جس کا گرام کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں ہے، لیکن لوگ پُرانے وزن کے عادی ہونے کی وجہ سے تولہ بولتے ہیں۔ اب نئی نسل جو آئی اس کو تولہ سے کوئی لینادینا نہیں ہے، پُرانے لوگ تولہ جانتے تھے۔ اورآج کل دس گرام کو تولہ بولتے ہیں، ورنہ حقیقت میں دس گرام تولہ نہیں ہے، تولہ کا اصلی وزن پُرانے حساب سے بارہ ماشہ ہوتا ہے۔ اور گرام کے اعتبار سے تقریباً ساڑھے گیارہ گرام ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ساڑھے سات تولہ بول کر اگر آج کل کے حساب سے وزن دیکھیں گے تو پچھتر (۷۵) گرام ہو جائے گا، جو صحیح نہیں ہے۔ آج کل کے گرام کے وزن کے اعتبار سے ۴۹۰ / ۸۷ گرام وزن ہوتا ہے۔ خیر! یہ تو چاندی اور سونے کا نصاب ہوا۔

اس کے علاوہ جانوروں میں بھی زکوۃ کا نصاب ہے۔چوں کہ اُس زمانہ میں ان علاقوں میں جانوروں کوپالنے کارواج تھا تو اس کے لئے ایک مستقل نصاب شریعت نے بتلایاہے، اب ہمارے یہاں وہ چیز رائج نہیں ہے۔اور جانوروں کی زکوۃ کی تفصیل میں پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ پالے گئے ہوں، اور ساتھ ہی ساتھ سال کا اکثر حصہ وہ عام زمین میں مفت کا چر پھر کر کھاتے ہوں، تواس پر زکوۃ فرض ہوتی ہے۔ اوراگر اس کو مالک خود چارہ لا کر کھلاتا ہے تواس صورت میں اس پر زکوۃ نہیں ہے، چاہے وہ پالے ہوئے جانور کتنی ہی مقدار میں کیوں نہ ہوں۔ہاں !اگر تجارت کا سامان ہے تو اس میں زکوۃ آئے گی، جس کو مالِ نامی یعنی بڑھنے والا سامان کہا گیا ہے۔

خلاصہ کلام

اب ہمارے ماحول میں کن کن چیزوں میں زکوۃ واجب ہے،اس کو اگر آپ کو مختصر طور پر سمجھنا ہو تو یوں سمجھیے کہ (۱)سونا(۲) چاندی (۳)نقد روپیہ(۴) اور تجارت کا سامان؛ یہ کل چار چیزیں ہو جائیں گی۔

سونا چاندی اور روپیہ کا نصاب

اب سونا اور چاندی تو ایسی چیزیں ہیں کہ ان میں تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو؛ ویسے ہی آپ نے جمع کر کے رکھا ہو، یا عورتوں نے زیور کے طور پر خریدا ہو، تب بھی اس میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے اگر اس کے نصاب کی مقدار کا ہو۔

اور روپیہ پیسہ اگر اتنا ہو جو سونے اور چاندی کے نصاب کی کم سے کم مقدار کو پہنچ جائے۔ آج کل سونے کے مقابلہ میں چاندی سستی ہے، اس لئے چاندی کا جو نصاب چھ سو بارہ اعشاریہ پینتیس (۳۵/ ۶۱۲) گرام ہے، جس کی قیمت پچپن (۵۵) روپیہ گرام کے حساب سے چونتیس (۳۴) ہزار کے قریب میں نصاب پورا ہو جاتا ہے۔ اس لیے اگر کسی کے پاس کم سے کم چونتیس (۳۴) ہزار روپیہ ہوں اور اس پر کسی طرح کا قرض بھی نہیں ہے، اور دیگر ضرورتوں سے فارغ ہے؛ تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔

(۱) یہ قیمت اُس دن کی ہے۔

تجارت اور بیوپار کا سامان

دیکھو! بیوپار اور تجارت کا لفظ جب ہم بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں اس کا ایک خاص مفہوم آتا ہے کہ آدمی کوئی دوکان کھول کر بیٹھا ہو اور بیچنے کے لیے مال لایا ہو۔ یہاں زکوٰۃ کے معاملہ میں

تجارت کا سامان وہ کہلائے گا جو خریدتے وقت بیچنے کی نیت سے خرید اگیا ہو، چاہے دوکان لے کر نہ بیٹھا ہو۔ مثلاً: آپ نے زمین کا ایک پلاٹ خریدا، اور آپ کی نیت یہ ہے کہ اگر نفع ملے گا تو اس کو بیچ دوں گا؛ تو آپ کا یہ پلاٹ تجارت کا سامان کہلائے گا چاہے آپ ظاہری اعتبار سے لوگوں کی نگاہوں میں زمین کے تاجر نہیں ہیں۔ یا مثلاً آپ نے کوئی مکان خریدا اور خریدتے وقت آپ کی نیّت یہ تھی کہ اگر نفع ملے گا تو اس کو بیچ دوں گا؛ تو یہ تجارت کا سامان کہلائے گا۔ یا مثلاً: آپ نے کوئی گھڑی خریدی، اور آپ کی نیت یہ تھی کہ اگر دو پیسے ملیں گے تو میں اس کو بیچ دوں گا؛ تو چاہے آپ گھڑی کی دوکان کھول کر نہیں بیٹھے ہیں، اس کے باوجود آپ تاجر کہلائیں گے۔

ایک غلط فہمی کی وضاحت

یہ بات یاد رکھئے، خاص کر پلاٹ، مکان وغیرہ کے معاملہ میں تو بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں جب وہ اپنے زائد پیسوں سے زمین یا مکان وغیرہ خریدتے ہیں تو اسی نیّت سے خریدتے ہیں کہ جب زیادہ نفع ملے گا تو اسے بیچ ڈالیں گے، اور ان کو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ میرے پاس جو پلاٹ ہے وہ تجارت کا ہے وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں کہاں اس کا تاجر ہوں۔ تو شریعت کی نگاہ میں جو چیز خریدتے وقت بیچنے کی نیت ہو تو آپ اس کے تاجر کہلائیں گے، اس لئے کہ تجارت نام ہی خرید و فروخت کا ہے۔ اسی لئے جو چیز آپ کے گھر میں پیدا ہوئی اس میں نیت بیچنے کی ہو تب بھی وہ تجارت نہیں ہے، جیسے: ایک کسان آدمی ہے، اس کے کھیت میں چاول ہزار دو ہزار کونٹل کی پیداوار ہوئی،

اس کی نیت ہوئی کہ میں اس کو بیچوں گا، تو یہ چاول تجارت کا سامان نہیں ہے، اس لئے کہ اس نے خریدا نہیں، بلکہ اس کی زمین میں یہ پیدا ہوا ہے اب اگر یہ چاول دو سال بھی اس کے گھر میں پڑا رہے، تو اس پر ایک پائی بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی، ہاں! بیچنے کے بعد جب نقد پیسے آئیں گے تو اس کا مسئلہ میں نے بتا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ جو چیز خریدتے وقت ہی بیچنے کی نیت ہو، چاہے بیچنے کی نیت سے مٹّی ہی خریدیں؛ تو یہ تجارت کا سامان ہے۔ اس تفصیل کو اگر آپ سمجھ لیں تو زکوٰۃ کے حساب کو سمجھنے میں بہت آسانی ہو جائے گی۔

بہر حال! سونا، چاندی، نقد روپیہ اور تجارت کا سامان؛ ان چار مالوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کے پاس پیسے زیادہ ہوتے ہیں تو ان پیسوں کو نقد محفوظ رکھنے کے بجائے اس سے سونا یا چاندی خرید لیتے ہیں، یا زیورات کے طور پر محفوظ کرتے ہیں تو ان میں تو زکوٰۃ آتی ہے۔ لیکن اگر کسی نے ہیرے خریدے، تو ہیرے میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ ہاں! اگر بیچنے کی نیّت سے خریدے ہیں تو تجارت کا سامان ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہو گی، ورنہ نفس ہیرے میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ کوئی آدمی اگر یوں کہے کہ یہ سونے سے بھی زیادہ قیمتی چیز ہے، یا آج کل پلاٹینم خرید لیا جو سونے سے بھی زیادہ قیمتی دھات ہے، لیکن اس کے باوجود بیچنے کی نیت نہیں ہے تو اس صورت میں وہ تجارت کا سامان نہیں ہے، اور یہ سونا چاندی نہیں ہے اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔ میں یہ سمجھا رہا ہوں کہ کون سے مال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ تو بتلا دیا کہ وہ چار قسم کے اموال ہوئے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ وہ کتنی مقدار میں ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟ اس لئے کہ اگر کسی کے پاس سونا ہے لیکن ایک ہی تولہ ہے، یا چاندی ہے لیکن فقط دو چار تولے ہیں۔ یا روپیہ پیسے ہیں لیکن دو پانچ ہزار ہیں؛ تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ ان میں ایک مقدار ہے جو ابھی میں نے بتلائی، اور اس پر بھی جب پورا سال گزر جائے۔ آپ کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے، لیکن سال پورا ہونے سے پہلے آپ کے ہاتھ سے نکل گئے، چاہے خرچ ہو گئے یا چوری ہو گئے یا جو بھی ہوا؛ تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔ تو سال کا بھی پورا ہونا ضروری ہے۔ تو جس مال میں زکوٰۃ واجب ہوئی ہے اس مال کا چالیسواں حصہ یعنی ڈھائی فی صد ادا کرے، لیکن پورا حساب کر کے نکالنا ضروری ہے۔

زکوٰۃ دراصل امتحان

جو لوگ صاحبِ نصاب ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فریضہ سمجھتے ہوئے پوری خوش دلی کے ساتھ ادا کریں، اس کو اپنے اوپر بوجھ اور بار سمجھتے ہوئے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہم سے مال کا مطالبہ کیا، وہ تو بڑا غنی ہے لیکن اس نے ہم سے مانگا کہ میرے دیے ہوئے مال میں سے دو۔ اس میں بھی دراصل بندہ کا امتحان ہوتا ہے، جیسے: باپ اپنے چھوٹے بچّے کو سو یا پانچ سو روپیہ کا نوٹ دے، پھر وہی اس بچّے سے کہے کہ: بیٹا! لاؤ، مجھے دس روپیہ دو، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باپ دس روپیہ کا محتاج ہے، بلکہ باپ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس بیٹے کو میرے ساتھ کتنا تعلق ہے، میرے مانگنے پر وہ مجھے کتنا دیتا ہے، میرے کہنے پر خرچ کرنے پر کتنا آمادہ ہے۔ درحقیقت اللہ

تعالیٰ کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ عبدیت وبندگی کا جو تعلق ہے اس کو جانچنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے احکام دئے گئے ہیں کہ اپنے مال میں سے اتنا نکالو جس میں بندہ کا امتحان ہوتا ہے۔

گاہک کے دل میں داعیہ پیدا کرنے والا کون؟

حالاں کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا ہے۔ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ میں دوکان لے کر شام تک بیٹھتا ہوں، میں فیکٹری میں اتنی محنت کرتا ہوں، میں کھیتی باڑی میں اتنی محنت کرتا ہوں، صبح سے شام تک ہل چلاتا ہوں، بیج بوتا ہوں، یہ میری محنت کی کمائی ہے، حالاں کہ یہ سب صرف ذرائع اور اسباب ہیں، دینے والی ذات تو اللہ تعالیٰ ہی کی ہے، آپ تو زمین کے اندر بیج ڈالنے کے بعد اپنے ہاتھ کٹوا چکے، زمین میں بیج ڈالنے کے بعد پھر اندر سے کونپل نکال کر اس کو بڑھانے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ آپ دُکان لے کر بیٹھے ہیں تو آپ کا کام تو اتنا ہی ہے کہ دکان کھول کر بیٹھیں، آگے کسی کو ڈنڈا مار کر خریدنے کے لئے زبردستی کیا آپ لا سکتے ہیں؟ گاہک کے دل میں خریدنے کا جذبہ کس نے پیدا کیا؟ اس گاہک کو آپ کی دُکان پر کس نے بھیجا کہ وہ پیسے لے کر آئے اور آپ کی دکان ہی سے وہ چیز خریدے؟ ہم اور آپ دیکھتے رہتے ہیں کہ دو دُکاندار پڑوس پڑوس میں ہوتے ہیں، لیکن ایک کی دُکان خوب چل رہی ہوتی ہے اور دوسرے کی نہیں چلتی؛ حالاں کہ دونوں کے پاس ایک ہی کمپنی کا ایک ہی جیسا مال ہوتا ہے، اور بعض مرتبہ پڑوس والا اس کو کم قیمت پر دینے کے لئے تیّار ہوتا ہے، پھر

بھی لوگ اس کے پاس نہیں جاتے، اور دوسرے کے پاس سے زیادہ قیمت دے کر بھی خریدتے ہیں۔ تو اس کی دُکان سے خریدنے کا لوگوں کے دلوں میں داعیہ پیدا کرنے والا کون ہے؟ اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے اس میں آدمی کی صلاحیت کو کچھ بھی دخل نہیں ہے، محض اللہ تعالیٰ ہی کا فضل ہے اور اُسی کا دیا ہوا ہے، جن لوگوں کو یہ خیال ہے یا اپنے متعلق یہ خوش فہمی ہے کہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے اس میں میری صلاحیت کو دخل ہے، جس کو قرآنِ پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ بندے کو جب اللہ تعالیٰ کی نعمت کے طور پر کوئی چیز ملتی ہے تو اس کی عادت ہوتی ہے کہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میں اس کا حقدار تھا، میں نے محنت کی ہے، مجھ میں صلاحیت ہے، میں نے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا تو یہ تو مجھ کو ملنا ہی چاہیے، حالاں کہ ایسی بات نہیں ہے، بہت سی مرتبہ صلاحیت والوں کی ساری صلاحیتیں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور بغیر صلاحیت والے آگے نکل جاتے ہیں۔

مدار اگر عقل پر ہوتا تو... / ایک واقعہ

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لطیفہ کے طور پر ایک قصہ بیان فرمایا ہے، ایک مرتبہ ایک آدمی سفر میں جا رہا تھا، اونٹ پر دو بوریاں لادی ہوئی تھیں، راستہ میں پڑھے لکھے سمجھ دار قسم کے ایک صاحب مل گئے، انہوں نے پوچھا: بھائی! ان دونوں بوریوں میں کیا ہے؟ اس نے کہا: ایک بوری میں تو

گیہوں ہیں، اور دوسری میں ریت بھر رکھا ہے۔ پوچھا: ریت کیوں بھر رکھا ہے؟ دنیا میں ریت کی کیا کمی ہے کہ لادے جارہے ہو؟ اس نے کہا: ایک طرف تو گیہوں ہیں دوسری طرف کچھ نہیں تھا، اب توازن برابر رہے اس لیے ریت بھرا ہے۔ انہوں نے کہا: بیلنس کے لئے ایسا بھی کر سکتے تھے کہ اس بوری میں جتنے گیہوں ہیں، اس کے آدھے ایک طرف اور بقیہ آدھے دوسری طرف رکھ دیتے تب بھی بیلنس برابر ہو جاتا۔ اونٹ کا بوجھ کم ہو جاتا اور یہ تیز بھی چلتا، اس طرح سفر بھی جلدی پورا ہو جاتا۔ چناں چہ اس نے اس کے کہنے کے مطابق ریت والی بوری خالی کر دی اور گیہوں آدھے آدھے کر دیئے۔ پھر یہ دیہاتی اپنے جی میں سوچنے لگا کہ اس نے اتنا اچھا اور عمدہ مشورہ دیا، معلوم ہوتا ہے کہ بہت سمجھ دار آدمی ہے، لہٰذا اس کے پاس تو بہت کچھ مال ہوگا۔ چناں چہ وہ اپنے جی میں سوچنے لگا کہ میرے سو گائیں ہیں تو اس کے پاس تو زیادہ ہی ہوں گی۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا: بھائی صاحب! آپ کے پاس گائیں کتنی ہیں؟ اس نے جواب دیا: ایک بھی نہیں ہے۔ پوچھا: اچھا! تو بکریاں کتنی ہیں؟ اس نے کہا: ایک بھی نہیں۔ پوچھا: زمین کتنی ہے؟ اس نے کہا: کچھ بھی نہیں ہے۔ خود اپنے پاس جو کچھ تھا ان سب کا باری باری پوچھا، اور اس کے جواب میں اس نے کہا کہ میرے پاس ان سب چیزوں میں سے کچھ بھی نہیں ہے۔ تو اب یہ سوچنے لگا کہ اتنا عقلمند ہے اور اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، لہٰذا یہ تو بڑا منحوس آدمی ہے پھر کہنے لگا کہ میں تیری بات پر عمل نہیں کروں گا۔ شیخ سعدی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ روزی کا مدار اگر عقل اور صلاحیتوں پر ہوتا تو دنیا میں جتنے بھی کم عقل ہیں وہ سب بھوکے مرتے حالاں کہ عام طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے پاس پیسہ زیادہ ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ روزی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس دی ہوئی نعمت میں سے صرف ڈھائی فیصد کا مطالبہ کیا ہے، باقی ساڑے ستانوے فیصد ہمارے پاس رہتا ہے، اگر اُدھر سے یہ مطالبہ ہوتا کہ ساڑے ستانوے ہم کو دیدو، اور ڈھائی اپنے پاس رکھو؛ تب بھی صحیح تھا، لیکن یہ اس کا کرم ہے کہ معمولی مقدار کا مطالبہ کیا، اور وہ بھی سال میں ایک مرتبہ، اور وہ بھی اس مال میں جس پر سال گزرا ہو۔ اگر درمیان میں خرچ ہو گیا تو اب مطالبہ نہیں ہے۔ اور آج کل ہمارے یہاں تو ایسا قانون ہے کہ مال ہمارے ہاتھ میں آئے کہ فوراً اس میں سے ٹیکس کاٹ کر وصول کر لیا جاتا ہے۔

عبادات کا فلسفہ

اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ عبادات میں شریعت نے خصوصی رعایتیں دے رکھی ہیں۔ جو مالی عبادتیں ہیں جیسا کہ زکوۃ، صدقۃ الفطر اور قربانی؛ اس میں ایسی شرطیں رکھی ہیں تاکہ آدمی آسانی کے ساتھ ان کو ادا کر سکے۔ جو آدمی زکوۃ نکالتا ہے وہ اللہ کے واسطے نکالتا ہے، اس لئے کہ عبادت نام ہے بندہ کا اللہ تعالیٰ کے حضور میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنا۔ اس لئے کہ عبادت کا حقدار اللہ تعالیٰ ہی ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کی جاسکتی۔ تو مال جو نکالا جائے گا وہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے نکالا جائے گا۔ اسی لئے کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے، بلکہ بعض روایتوں میں بھی موجود ہے کہ آپ فقیر کو زکوۃ کے طور پر جو مال دیتے ہیں، وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس سے فقیر کے پاس آتا ہے۔ آپ نے اللہ تعالیٰ کو دیا اور اللہ تعالیٰ نے فقیر کو دیا۔ اس لئے کہ آپ

نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہ مال نکالا تھا۔ اب آپ پوچھیں کہ اللہ کے واسطے نکالا ہے، تو کہاں دیں؟ تو قرآنِ پاک ہی میں اللہ تعالیٰ نے بتلادیا ہے کہ فلاں فلاں جگہ دو، اگر وہاں دیدوگے تو یوں سمجھا جائے گا کہ گویا تم نے ہمارے یہاں جمع کرادیا۔

فقیر کا ویسا احترام کیوں نہیں؟

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ فقیر کو جب مالِ زکوۃ دیا جائے تو دل میں اس کی تحقیر اور تذلیل نہیں ہونی چاہیے۔ دیکھئے! ہم نماز کو مسجد میں ادا کرتے ہیں، مسجد ایک اسلامی فریضہ نماز کی ادائیگی کی جگہ ہے، تو ہم اس کا کتنا احترام کرتے ہیں؟ حالاں کہ یہ پتھر کی بنی ہوئی ایک عمارت ہے جہاں نماز (جو اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ ہے) ادا کی جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ کے اس فریضہ کی ادائیگی کی جگہ ہونے کی وجہ سے اس کی عظمت اور عزّت اتنی بڑھ گئی، اس کے بڑے آداب ہیں جن کی رعایت کی جاتی ہے، ہمارے دلوں میں اس کا احترام ہے، لیکن ایک فقیر کا ویسا احترام نہیں ہے، حالاں کہ وہ تو انسان ہے، اور یہ بھی ایک عبادت ادا کرنے کا محل اور مقام ہے، لہٰذا اس کا تو اور زیادہ احترام ہونا چاہیے۔

زکوٰۃ کے اسلامی نظام کا فائدہ

جن کو زکوٰۃ دی جاتی ہے ان کے متعلق آج کل جو تحقیر کے جذبات پائے جاتے ہیں، درحقیقت یہ چیز پیدا نہ ہونے پائے اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ کا ایک نظام بنایا تھا، اور وہ یہ تھا کہ آپ اپنی زکوٰۃ کو سرکاری خزانہ میں جمع کرادیں، وہاں سے مستحقین کے پاس جائے، اس صورت میں دینے والے کو بھی پتہ نہ چلے کہ ہماری زکوٰۃ کس کے پاس گئی ہے، اور لینے والوں کو بھی پتہ نہ چلے کہ ہمارے پاس جو مال آیا ہے وہ کس کا نکالا ہوا ہے، اگر وہ نظام چلے تو پھر آج کل جو گڑبڑیں ہورہی ہیں اس کی نوبت ہی نہ آئے۔

زکوٰۃ پر وعدے

بہر حال! زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ ہے اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے شمار وعدے ہیں۔ مال کی حفاظت، مال میں برکت، زیادتی اور بڑھوتری، مال کی پاکیزگی کہ اس کی ادائیگی کے نتیجہ میں دل میں پاکیزگی آتی ہے، بخل اور دوسرے رذائل سے دل پاک صاف ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے اس فریضہ کی ادائیگی کا خاص اہتمام ہونا چاہیے۔

دوسری آیت ہے: ﴿وَمَآ أُمِرُوٓا إِلَّا لِيَعۡبُدُوا ٱللَّهَ مُخۡلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ وَيُقِيمُوا ٱلصَّلَوٰةَ وَيُؤۡتُوا ٱلزَّكَوٰةَ وَذَٰلِكَ دِينُ ٱلۡقَيِّمَةِ﴾ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہی حکم دیا گیا ہے کہ خالص اللہ

کے لئے عبادت کریں، اور سب طرف سے رُخ پھیر کر ایک اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہوں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں؛ یہی یقین والوں کا طریقہ ہے۔

تیسری آیت ہے:﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا﴾ اے نبی! آپ مسلمانوں کے مال میں سے زکوٰۃ وصول کیجئے تاکہ اس کے ذریعہ سے ان کو پاک کریں، اور تزکیہ کریں۔ ﴿تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ﴾ دونوں کا ایک ہی معنیٰ ہے، گویا اس مال کو لے کر بقیہ مال کو گندگی سے پاک کیا جائے۔

صاحبِ نصاب کی چند ذمہ داریاں

جو لوگ صاحبِ نصاب ہیں زکوٰۃ کے سلسلہ میں ان کی چند ذمہ داریاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ زکوٰۃ کے لیے سال مقرر ہوتا ہے۔ مثلاً پہلے آپ کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن آج آپ کے پاس ایک لاکھ روپیہ آیا تو آج جو تاریخ ہے، آئندہ سال اسی مہینہ کی اسی تاریخ پر آپ کے اوپر زکوٰۃ کی ادائیگی فرض ہو جائے گی۔ بعض لوگ رمضان ہی کو لئے بیٹھے رہتے ہیں، حالاں کہ ان کو معلوم ہے کہ ہمارے پاس مال فلاں وقت آیا تھا تو اب رمضان کی وجہ سے تاخیر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں! اگر کسی کو یاد نہیں ہے کہ میرے پاس مال کب آیا تھا اور میرا زکوٰۃ کا وقت کب شروع ہوتا ہے، تو پھر اگر رمضان کی پہلی یا دسویں کا دن مقرر کر دیا تو بات دوسری ہے۔

دوسرے یہ کہ زکوٰۃ کا پورا پورا حساب لگایا جائے، بعض لوگ ایسے ہی اندازاً زکوٰۃ نکال لیتے ہیں، حالاں کہ اندازاً نکالنے کی صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زیادہ نکلے، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ جتنی مقدار واجب ہوئی ہے اس سے کم نکلے۔ اب اگر ایک روپیہ بھی کم نکلا تو گویا زکوٰۃ کا ایک روپیہ آپ کے پاس رہ گیا، اور حدیث میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: زکوٰۃ والا مال جس مال کے ساتھ ملے گا وہ اس بقیہ مال کو بھی ہلاک کر دے گا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ پورا پورا صحیح حساب کر کے زکوٰۃ ادا کرنے کا اہتمام کیا جائے۔

پھر یہ کہ جہاں دیا جارہا ہے اس کی بھی پوری تحقیق کی جائے کہ وہ مستحق ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ گھر میں بیٹھے ہیں اور دروازہ پر مانگنے والا آیا، تو اسی کو بغیر تحقیق کے اپنی زکوٰۃ دیدیتے ہیں۔ اور آج کل جو فقیر ہیں وہ تو پروفیشنل لوگ ہیں، حقیقت میں فقیر نہیں ہیں، اب انہیں دے کر یوں سمجھ لینا کہ ہماری ذمہ داری پوری ہوگئی؛ یہ بالکل درست نہیں ہے۔ بلکہ اپنے رشتہ داروں میں، محلّے میں، اپنی بستی میں ایسے لوگ جو حقیقت میں محتاج ہیں، لیکن وہ ہاتھ نہیں پھیلاتے: ایسے لوگوں کو تلاش کر کے ان تک زکوٰۃ کا مال پہنچانا اربابِ اموال کی ذمہ داری ہے۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ مَیں تو زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے گھر سے باہر نہیں نکلوں گا، اگر کوئی میرے گھر آکر مطالبہ کرے گا تب ہی دوں گا۔ بھائی! جیسے نماز ادا کرنے کے لئے گھر سے باہر نکلتے ہیں، حج ادا کرنے کے لئے نکلتے ہیں: اسی طریقہ سے زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے خود جائیں، تب ہی حقیقت میں اس کا حق ادا ہوا سمجھا جائے گا۔

اسلامی فاؤنڈیشن

حدیث ۱۲۰۶:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے (یعنی پانچ چیزیں اسلام کے لئے فاؤنڈیشن، بنیاد اور جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں) لا إله إلا الله محمد رسول الله کی گواہی دینا (یعنی اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں) نماز کو قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا، رمضان کے روزے رکھنا۔

افادات:- بس! اس روایت کو یہاں پر اسی لئے لائے ہیں کہ زکوۃ کو اسلام کی بنیاد اور جڑ بتلایا ہے۔

اگر اپنی بات میں سچا ہے تو کامیاب ہے

حدیث ۱۲۰۷:-

وعن طَلْحَةَ بن عبيد الله (رضی اللہ عنہ) قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رسولِ الله ﷺ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ ثَائِرُ الرَّأْسِ نَسْمَعُ دَوِيَّ صَوْتِهِ، وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُولُ، حَتَّى دَنَا مِنْ رسولِ الله ﷺ فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الإِسْلَامِ. فَقَالَ رسول

اللهﷺ:((خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِی الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ)) قَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُنَّ؟ قَالَ:((لاَ، إِلاَّ أَنْ تَطَّوَّعَ)) فَقَالَ رسول اللهﷺ:((وَصِيَامُ شَهْرِ رَمَضَانَ)) قَالَ:هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ؟قَالَ: ((لاَ إِلاَّ أَنْ تَطَّوَّعَ)) قَالَ: وَذَكَرَ لَهُ رسول اللهﷺ الزَّكَاةَ، فَقَالَ: هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا؟ قَالَ: ((لاَ، إِلاَّ أَنْ تَطَّوَّعَ)) فَأَدْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ: وَاللهِ لاَ أَزِيدُ عَلَى هَذَا وَلاَ أَنْقُصُ مِنْهُ، فَقَالَ رسول اللهﷺ: ((أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت طلحہ بن عبید اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا جو نجد کا رہنے والا تھا(سفر سے آیا تھا اس لئے) بال بکھرے ہوئے پراگندہ تھے، ہم اس کی آواز کی گنگناہٹ کو سن رہے تھے، لیکن وہ کیا بول رہاہے سمجھ میں نہیں آرہا تھا(جیسے بچّہ کو کوئی چیز لانے کے لئے بھیجتے ہیں کہ فلاں فلاں چیز لانا، تو وہ جاتے ہوئے پوری لسٹ بولتے ہوئے جاتا ہے تاکہ بھول نہ جائے۔اسی طرح وہ بھی سوالات پوچھنے کی نیت سے آیا تھا اس لیے وہ اپنے سوالات کو دُہرا رہا تھا، اوراس کی آواز ہمیں محسوس ہو رہی تھی) یہاں تک کہ جب وہ نبیٔ کریم ﷺ کے قریب ہوا تو اس نے وہی سوالات زور سے کئے، اب ہم نے سنا کہ وہ حضور ﷺ سے پوچھ رہا تھا کہ اسلام کیا ہے؟ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات اور دن میں پانچ نمازیں ادا کرنا۔اس نے پوچھا: ان پانچوں نمازوں کے علاوہ اور بھی کوئی نماز میرے اوپر فرض ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا: نہیں، بس یہی پانچ نمازیں ہیں، البتہ تو اپنے طرف سے نفل کے طور پر پڑھنا چاہے تو تجھے اختیار ہے۔ پ ذوالقعدۃ ر حضور ﷺ نے فرمایا: رمضان کے مہینہ کے روزے بھی اسلام کا ایک حصہ ہیں۔اس نے پوچھا: کیا اس کے علاوہ اور بھی روزے میرے اوپر فرض ہیں؟ آپ نے فرمایا: نہیں! رمضان کے روزے فرض ہیں، اس کے علاوہ تم نفل کے طور پر رکھنا چاہو تو رکھ سکتے ہو۔ پھر نبیٔ کریم ﷺ نے زکوۃ کا تذکرہ کیا، تو اس نے کہا: اس کے علاوہ بھی مالی عبادت میں اور کچھ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! البتہ تم نفل کے طور پر کچھ خرچ کرنا چاہو تو اختیار ہے(زکوۃ کے تذکرہ کی وجہ سے اس حدیث کو یہاں لائے ہیں) یہ سب سننے کے بعد وہ آدمی واپس یہ کہتا ہوا جا رہا تھا: اللہ کی قسم! نہ اس میں کمی کروں گا، نہ زیادتی کروں گا۔

حضور اکرم ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا: یہ آدمی اگر اپنی بات میں سچا ہے تو کامیاب ہے (اور جنّت میں چلا جائے گا)۔

افادات:- اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کمی نہ کرنے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، زیادتی نہ کروں گا اس پر بھی آپ ﷺ ﴿أَفْلَحَ﴾ کیوں فرمارہے ہیں؟ تو اس کا جواب دیا گیا ہے کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دو لفظ بولے جاتے ہیں لیکن مقصود ایک ہی ہوتا ہے، دوسرا مقصود نہیں ہوتا، جیسے: آپ خریدنے کے لئے جائیں اور دوکاندار سے قیمت پوچھیں کہ اس گھڑی کی قیمت کیا ہے؟ وہ کہے: سو روپیہ۔ تو خریدنے والا کہتا ہے کہ کچھ کمی بیشی؟ تو اس سوال سے پوچھنے والے کا مطلب بیشی نہیں ہوتا۔ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیا جائے۔

مالداروں سے لے کر فقیروں کو دی جائے

حدیث ۱۲۰۸:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) أَنَّ النبیَّ ﷺ بعث مُعاذاً (رضی اللہ عنہ) إِلَی الیَمَنِ فَقَالَ: ((اُدْعُهُمْ إِلَی شَهَادَةِ أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَأَنِّی رسول اللهِ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذٰلِكَ، فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ تَعَالَی، افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ خَمْسَ صَلَوَاتٍ فِی كُلِّ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ، فَإِنْ هُمْ أَطَاعُوا لِذٰلِكَ، فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً تُؤخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ، وتُرَدُّ عَلَی فُقَرَائِهِمْ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کو یمن کی طرف حاکم بنا کر بھیجا تھا (بعض حضرات کہتے ہیں کہ قاضی بنا کر بھیجا تھا) جب وہ روانہ ہو رہے تھے اس وقت حضور اکرم ﷺ نے ان کو ہدایت فرمائی کہ پہلے ان لوگوں کو اس بات کی دعوت دینا کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور مَیں (حضور ﷺ) اللہ کا رسول ہوں۔ جب وہ تمہاری اس دعوت کو قبول کرلیں تو ان کو بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جب وہ اس پر عمل کرنے لگیں تو ان کو بتلانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو مالداروں سے وصول کرکے فقیروں کو دی جائے گی (یہاں پر بھی زکوۃ کا تذکرہ ہے اس لئے اس روایت کو یہاں لائے ہیں)۔

وہ چیزیں جن پر جان ومال کی حفاظت کو موقوف رکھا گیا

حدیث ۱۲۰۹:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ:((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنْ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رسول الله، وَيُقِيمُوا الصَّلاةَ، وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ، فَإِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ، إِلاَّ بِحَقِّ الإِسْلاَمِ، وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ میں ان لوگوں سے (جو مشرک ہیں اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتے) قتال اور جنگ کروں یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوۃ ادا کریں۔ جب وہ لوگ ایسا کرنے لگیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور نبی کریم ﷺ کی رسالت کا اقرار

کرلیں اور نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا شروع کردیں) تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کرلیں گے، ہاں ! اگر اسلام کا کوئی حق باقی نکلتا ہے تو ان کی جان یا مال پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اوراس بات کا حساب لینے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے اوپر ہے (کہ انھوں نے کلمہ دل سے پڑھا ہے کہ نہیں ، اور نماز حقیقت میں دل سے ادا کرتے ہیں یا دکھلاوے کے طور پر ادا کرتے ہیں)۔

افادات:- مطلب یہ کہ ایمان لے آنے کے بعد ان کی جان اور مال کو ہاتھ لگانا درست نہیں اور اب تک ان کے ساتھ قتال و جہاد کا جو حکم دیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے کہ اب تو وہ خود بھی مسلمان ہو گئے ہیں، اب ان کی جان اور مال کی حفاظت کی گارنٹی دی گئی، البتہ اگر اسلام کا کوئی حق باقی نکلتا ہے تو اسلام کی طرف ان کی جان یا مال پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت دی گئی ہے۔ مثلاً: ان میں سے کسی نے کلمہ پڑھنے اور ایمان لانے کے بعد کسی مسلمان کو قتل کردیا، تو ظاہر ہے جس کو قتل کیا ہے اس کی جان کے بدلہ میں اس کی جان لینے کا حکم دیا گیا ہے، اب یہاں پر یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ یہ تو کلمہ پڑھنے والا ہے، اس لیے اس کو کیسے قتل کیا جائے؟ چوں کہ اس نے ایک کلمہ گو کو قتل کیا ہے اس لیے اسلام ہی نے حکم دیا ہے کہ اس کے بدلہ میں قصاص کے طور پر قتل کیا جانا چاہیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی جان محفوظ تھی، اس نے ایک کلمہ گو کی ناحق جان لے کر اپنی جان کی حفاظت کی جو گارنٹی ملی تھی اس کو ختم کردیا۔

یا مثلاً ایک آدمی نے شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کا ارتکاب کیا، تو اگر اسلامی حکومت ہو تو اس کی سزا سنگسار ہے، پتھر مار کر اس کی جان لے لیں گے، تو اس کی جان لینے کا حکم بھی اسلام ہی نے

دیاہے۔ مطلب یہ ہے کہ ویسے توکلمہ پڑھ لینے، نماز کو قائم کرلینے ،اورزکوٰۃ اداکرنے کی وجہ سے اس کی جان اورمال محفوظ ہو جاتا ہے البتہ جن صورتوں میں اور جہاں جہاں خود اسلام ہی اس کی ان کوتاہیوں اور قصوروں ،اوراس کے گناہ اور جرم کی وجہ سے اس کی جان یامال پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت دے گا،وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

﴿وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ﴾ اوران کاحساب لینے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کے اوپر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی یہ نہیں کہہ سکتاکہ محض دکھلانے کے واسطے ظاہری طورپر انھوں نے زبان سے اقرار کرلیا ہے،یا ہمارے دکھلانے کے واسطے نماز پڑھتے ہیں ،زکوٰۃ بھی ہمارے دکھلانے واسطے اداکرتے ہیں، اندرسے وہ مسلمان نہیں ہیں۔ ان کے دل کاحال کیاہے وہ اللہ تعالیٰ ان سے نمٹے گا۔ ہمیں اندر کی کھود کرید کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں تواس بات کا پابند بنایا گیاہے کہ ظاہری طورپر اسلام کے جو احکام ہیں ،اور ایک مسلمان پر اسلام کے ناطے سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو جب وہ اداکررہاہے، کلمہ کااقرار کررہاہے، نمازاداکررہاہے، زکوٰۃ اداکررہاہے؛ اب ہم ان کے ساتھ مسلمانوں والامعاملہ کریں گے،ان کی جان ومال محفوظ ہوجائے گی۔

بس !یہاں تویہ روایت اسی لئے لائے ہیں کہ جن چیزوں پر جان ومال کی حفاظت کو موقوف رکھا گیاہے ان میں سے ایک زکوٰۃ بھی ہے،جب تک زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں ہوگی تب تک اس کی جان ومال محفوظ نہیں ہوگی۔

نماز اور زکوۃ کے درمیان فرق کرنے والے سے جنگ

حدیث ۱۲۱۰:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: لَمَّا تُوُفِّيَ رسولُ الله ﷺ وَكَانَ أَبُو بَكْرٍ (رضی اللہ عنہ)، وَكَفَرَ مَنْ كَفَرَ مِنَ العَرَبِ، فقال عُمَرُ (رضی اللہ عنہ): كَيْفَ تُقَاتِلُ النَّاسَ وَقَدْ قَالَ رسول الله ﷺ: ((أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَقُولُوا لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، فَمَنْ قَالَهَا فَقَدْ عَصَمَ مِنِّي مَالَهُ وَنَفْسَهُ إِلاَّ بِحَقِّهِ، وَحِسَابُهُ عَلَى اللهِ)) فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: وَاللهِ لأُقَاتِلَنَّ مَنْ فَرَّقَ بين الصَّلاَةِ وَالزَّكَاةِ، فَإِنَّ الزَّكَاةَ حَقُّ المَالِ. وَاللهِ لَوْ مَنَعُونِي عِقَالاً كَانُوا يُؤَدُّونَهُ إِلَى رسولِ الله ﷺ لَقَاتَلْتُهُمْ عَلَى مَنْعِهِ. قَالَ عُمَرُ (رضی اللہ عنہ): فَوَاللهِ مَا هُوَ إِلاَّ أَنْ رَأَيْتُ اللهَ قَدْ شَرَحَ صَدْرَ أَبِي بَكْرٍ لِلقِتَالِ، فَعَرَفْتُ أَنَّهُ الحَقُّ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جب نبی کریم ﷺ کا انتقال ہوا اور حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) آپ کے جانشین ہوئے اور عرب کے بعض قبائل نے کفر کیا تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) سے عرض کیا: آپ لوگوں سے کیسے جنگ کریں گے جب کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ لا الٰہ الا اللہ کہیں۔ جب وہ اس بات کا اقرار کرلیں تو انہوں نے اپنے مال وجان کو میری طرف سے محفوظ کرلیا، سوائے اسلامی حق کے۔ پھر ان کے اندرون کا حساب اللہ تعالیٰ کے اوپر ہے (اس کا مطلب اوپر بتلایا جاچکا ہے) حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اللہ کی قسم! میں ان لوگوں سے جنگ کروں گا جنہوں نے نماز وزکوۃ کے درمیان فرق کیا ہے۔ اس لئے کہ زکوۃ مال کا حق ہے۔ اور اللہ کی قسم! نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زکوۃ کے نام سے ایک رسّی بھی جو جمع کرائی جاتی تھی اگر اس کے دینے سے کوئی انکار کرے گا تو میں اس کے انکار کرنے پر اس کے ساتھ جنگ کروں گا۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! جب میں نے دیکھا کہ اللہ

تعالیٰ نے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے سینے کو ان کے ساتھ اس معاملہ میں جنگ کرنے کے لئے منشرح کر دیا ہے تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہی حق ہے (اس سے زکوٰۃ کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، اور یہ فرائضِ اسلام میں سے ایک اہم فریضہ ہے)

افادات:- نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد عرب کے بعض قبائل نے اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا، اور بعض وہ تھے جو مرتد تو نہیں ہوئے تھے، لیکن نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے جو نظام مقرر کیا گیا تھا کہ مرکز کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے باقاعدہ آدمی بھیجے جاتے تھے جو لوگوں کی زکوٰۃ وصول کر کے بیت المال میں جمع کراتے، انہوں نے زکوٰۃ کو بیت المال میں جمع کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ اب جو لوگ مرتد ہو چکے تھے ان کے متعلق تو تمام صحابہ (رضی اللہ عنہم) کا اتفاق تھا کہ ان کے ساتھ قتال کیا جائے، لیکن جنھوں نے اسلام نہیں چھوڑا تھا اور بیت المال میں زکوٰۃ جمع کرانے سے انکار کیا تھا ان کے متعلق حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے درمیان گفتگو ہوئی، حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) ان لوگوں کے ساتھ بھی جنگ کرنے کے قائل تھے کہ جب تک کہ وہ اس حکم کو پورا نہیں کریں گے تب تک ہم ان کے ساتھ لڑیں گے۔ لیکن حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس سلسلہ میں اشکال اور تردّد تھا، وہ یہ کہتے تھے کہ یہ لوگ کلمہ گو تو ہیں، پھر ان کے ساتھ کیسے جنگ کی جائے؟ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) جواب میں فرماتے: اگر کچھ لوگ نماز کی ادائیگی سے انکار کر دیں تو ان کے ساتھ قتال کیا جائے گا یا نہیں؟

اسلامی شعائر کے معاملہ میں کوتاہی کرنے پر حاکم کو یہ حق پہنچتا ہے

اسلامی شعائر کے معاملہ میں کوتاہی کرنے کی وجہ سے حاکم کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ایسے لوگوں کے ساتھ جنگ کرے جب تک کہ دوبارہ اس کو ادانہ کرنے لگیں، بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جماعت کے ساتھ نمازادا کرنا اسلامی شعائر میں سے ہے۔ شعار کے معنٰی یہ ہیں کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جو مذاہب کی خاص خاص علامات ہوتی ہیں، اسی میں نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا بھی ہے، حالاں کہ جماعت فرض نہیں ہے، بعضوں نے واجب یا سنّتِ موٴکدہ کہا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا۔ تو جماعت کے ساتھ نماز کی ادائیگی اسلامی شعار یعنی مذہبِ اسلام کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، اگر کسی جگہ کے لوگ اس کو چھوڑ دیں تو حاکمِ وقت ان سے کہے گا کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنا شروع کرو۔ اگر وہ اس سے انکار کریں گے تو حاکم ان کے ساتھ جنگ کرے گا جب تک کہ وہ اس کو ادا کرنے والے نہ بن جائیں۔ یہاں پر زکوٰۃ کی ادائیگی کے معاملہ میں بھی حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) یہی فرماتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زکوٰۃ کے نام سے ایک رسّی بھی جو جمع کرائی جاتی تھی اگر اس سے کوئی انکار کرے گا تو میں ان کے ساتھ جنگ کروں گا۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ بعد میں اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اس پر اطمینان، تسلّی اور انشراحِ صدر عطا فرما دیا کہ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کی جو رائے ہے وہی حق ہے اس لئے کہ اگر اُس وقت کوتاہی کی جاتی تو آج انہوں نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا ہے، کل نماز کے معاملہ میں یہ بات آتی، اور یہی چیز لوگوں کے دین سے ہٹنے کا ذریعہ بنتی۔

جنت میں لے جانے والے پانچ اعمال

حدیث ۱۲۱۱:-

وعن أَبِي أَيُّوب (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رَجُلاً قَالَ للنبيِّ ﷺ: أَخبِرْنِي بعمل يُدخِلُنِي الجَنَّة. قَالَ: ((تَعْبُدُ اللهَ، وَلاَ تُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً وَتُقِيمُ الصَّلاَةَ، وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَتَصِلُ الرَّحِمَ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع افادات:- حضرت ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتلایئے جو مجھے جنّت میں لے جائے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ہی کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو، اور صلہ رحمی کرو (یعنی رشتہ داروں کے حقوق ادا کرو۔ دیکھو! جنّت میں جانا جن چیزوں پر موقوف رکھا گیا ہے ان میں ایک زکوۃ کی ادائیگی بھی ہے، اس سے اس کی اہمیت اور فضیلت کا پتہ چلتا ہے)۔

چلتا پھرتا جنتی

حدیث ۱۲۱۲:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ): أَنَّ أَعرَابياً أَتَى النبيَّ ﷺ فَقَالَ: يَارسولَ اللهِ! دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ إِذَا عَمِلْتُهُ، دَخَلْتُ الجَنَّةَ. قَالَ: ((تَعْبُدُ اللهَ لاَتُشْرِكُ بِهِ شَيْئاً، وتُقِيمُ الصَّلاَةَ، وتُؤتِي الزَّكَاةَ المَفْرُوضَةَ، وَتَصُومُ رَمَضَانَ)) قَالَ:

وَالذی نَفْسِی بِیَدِہِ، لا أزِیدُ عَلَی هَذَا. فَلَمَّا وَلَّی، قَالَ النبیُّ ﷺ: ((مَنْ سَرَّهُ أنْ یَنْظُرَ إِلَی رَجُلٍ مِنْ أهْلِ الجَنَّةِ، فَلْیَنْظُرْ إِلَی هَذَا)) (متفقٌ عَلَیْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی نے آکر نبیٔ کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسا عمل بتلایئے کہ جب میں وہ کروں تو جنّت میں پہنچ جاؤں (یعنی جنّت میں داخل کرنے والا عمل مجھے بتلایئے) تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، نماز قائم کرو، فرض زکوۃ ادا کرو اور رمضان المبارک کے روزے رکھو۔ اس پر اس نے کہا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے؛ میں اس میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کروں گا۔ جب وہ جانے لگا تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اس بات کو پسند کرتا ہو کہ کسی جنّتی کو دیکھے اس کو چاہیے کہ اس آدمی کو دیکھ لے۔

افادات:- چوں کہ اس آدمی نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے یہ عہد و پیمان کیا تھا کہ میں ان چیزوں پر برابر عمل کروں گا تو آپ ﷺ نے اس کے لیے جنت کی بشارت سنادی۔ ان میں ایک عمل زکوۃ کا بھی ہے۔

حدیث ۱۲۱۳:-

وعن جریر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: بَایَعْتُ النبیَّ ﷺ عَلَی إِقَامِ الصَّلاَةِ، وَإِیتَاءِ الزَّکَاةِ، وَالنُّصْحِ لِکُلِّ مُسْلِمٍ (متفقٌ عَلَیْهِ)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کے قائم کرنے، زکوۃ کے ادا کرنے اور ہر مسلمان کی خیر خواہی و بھلائی چاہنے پر نبی کریم ﷺ کے مبارک ہاتھوں پر بیعت کی (یعنی میں نے حضور اکرم ﷺ سے عہد کیا کہ میں ان تین چیزوں کا اہتمام کروں گا)۔

زکوۃ ادا نہ کرنے پر وعید

حدیث ۱۲۱۴:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((مَا مِنْ صَاحِبِ ذَهَبٍ، وَلاَ فِضَّةٍ، لا يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا إِلاَّ إِذَا كَانَ يَوْمُ القِيَامَةِ صُفِّحَتْ لَهُ صَفَائِحُ مِنْ نَارٍ، فَأُحْمِيَ عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ، فَيُكْوَى بِهَا جَنْبُهُ، وَجَبِينُهُ، وَظَهْرُهُ، كُلَّمَا بَرَدَتْ أُعِيدَتْ لَهُ فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ العِبَادِ فَيَرَى سَبِيلَهُ، إِمَّا إِلَى الجَنَّةِ، وَإِمَّا إِلَى النَّارِ)

قيل: يَا رسولَ الله! فالإبلُ؟ قَالَ: ((وَلاَ صَاحِبِ إبلٍ لا يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، وَمِنْ حَقِّهَا حَلْبُهَا يَوْمَ وِرْدِهَا، إِلاَّ إِذَا كَانَ يَوْمُ القِيَامَةِ بُطِحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ أَوْفَرَ مَا كَانَتْ، لاَ يَفْقِدُ مِنْهَا فَصِيلاً وَاحِداً، تَطَؤُهُ بِأَخْفَافِهَا، وَتَعَضُّهُ بِأَفْوَاهِهَا، كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ أُولاَهَا، رُدَّ عَلَيْهِ أُخْرَاهَا، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ، حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ العِبَادِ، فَيَرَى سَبِيلَهُ، إِمَّا إِلَى الجَنَّةِ، وَإِمَّا إِلَى النَّارِ)).

قِيلَ: يَا رَسولَ الله، فَالبَقَرُ وَالغَنَمُ؟ قَالَ: ((وَلاَ صَاحِبِ بَقَرٍ وَلاَ غَنَمٍ لاَ يُؤَدِّي مِنْهَا حَقَّهَا، إِلاَّ إِذَا كَانَ يَوْمُ القِيَامَةِ، بُطِحَ لَهَا بِقَاعٍ قَرْقَرٍ، لاَ يَفْقِدُ مِنْهَا شَيْئاً لَيْسَ فِيهَا عَقْصَاءُ، وَلاَ جَلْحَاءُ، وَلاَ عَضْبَاءُ، تَنْطَحُهُ

بِقُرُونِهَا، وَتَطَؤُهُ بِأَظْلَافِهَا كُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ أُولاَهَا، رُدَّ عَلَيْهِ أُخْرَاهَا، فِي يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهُ خَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ حَتَّى يُقْضَى بَيْنَ الْعِبَادِ، فَيَرَى سَبِيلَهُ، إِمَّا إِلَى الْجَنَّةِ وَإِمَّا إِلَى النَّارِ))

قِيلَ: يَا رسول الله فَالْخَيْلُ؟ قَالَ: ((الْخَيْلُ ثَلاَثَةٌ: هِيَ لِرَجُلٍ وِزْرٌ، وَهِيَ لِرَجُلٍ سِتْرٌ، وَهِيَ لِرَجُلٍ أَجْرٌ. فَأَمَّا الَّتِي هِيَ لَهُ وِزْرٌ فَرَجُلٌ رَبَطَهَا رِيَاءً وَفَخْراً وَنِوَاءً عَلَى أَهْلِ الإِسْلاَمِ، فَهِيَ لَهُ وِزْرٌ، وَأَمَّا الَّتِي هِيَ لَهُ سِتْرٌ، فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ، ثُمَّ لَمْ يَنْسَ حَقَّ اللهِ فِي ظُهُورِهَا، وَلاَ رِقَابِهَا، فَهِيَ لَهُ سِتْرٌ، وَأَمَّا الَّتِي هِيَ لَهُ أَجْرٌ، فَرَجُلٌ رَبَطَهَا فِي سَبِيلِ اللهِ لأَهْلِ الإِسْلاَمِ فِي مَرْجٍ، أَوْ رَوْضَةٍ فَمَا أَكَلَتْ مِنْ ذَلِكَ الْمَرْجِ أَوِ الرَّوْضَةِ مِنْ شَيْءٍ إِلاَّ كُتِبَ لَهُ عَدَدَ مَا أَكَلَتْ حَسَنَاتٌ وَ كُتِبَ لَهُ عَدَدَ أَرْوَاثِهَا وَ أَبْوَالِهَا حَسَنَاتٌ، وَلاَ تَقْطَعُ طِوَلَهَا فَاسْتَنَّتْ شَرَفاً أَوْ شَرَفَيْنِ إِلاَّ كَتَبَ اللهُ لَهُ عَدَدَ آثَارِهَا، وَأَرْوَاثِهَا حَسَنَاتٍ، وَلاَ مَرَّ بِهَا صَاحِبُهَا عَلَى نَهْرٍ، فَشَرِبَتْ مِنْهُ، وَلاَ يُرِيدُ أَنْ يَسْقِيَهَا إِلاَّ كَتَبَ اللهُ لَهُ عَدَدَ مَا شَرِبَتْ حَسَنَاتٍ))

قِيلَ: يَا رسول الله فَالْحُمُرُ؟ قَالَ: ((مَا أُنْزِلَ عَلَيَّ فِي الْحُمُرِ شَيْءٌ إِلاَّ هٰذِهِ الآيَةُ الْفَاذَّةُ الْجَامِعَةُ: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ﴾)) (متفقٌ عَلَيْهِ، وهذا لفظ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:— حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی سونے چاندی کا مالک ہو، پھر اس میں سے اس کا حق (یعنی زکوٰۃ) ادا نہ کرے تو قیامت کے دن سونے چاندی کی تختیاں بنائی جائیں گی اور جہنم کی آگ میں ان تختیوں کو گرم کیا جائے گا، پھر ان تختیوں کے ذریعہ اُس آدمی کے پہلو، پیشانی اور پُشت کو داغ لگایا جائے گا۔ جب وہ تختیاں ٹھنڈی ہونے لگیں گی تو پھر دوبارہ ان کو آگ میں تپایا جائے گا، اور یہ اُس دن میں ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے (یعنی میدانِ حشر میں) اور یہی سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ ہو جائے (یعنی یہ عذاب جہنم میں نہیں ہوگا، بلکہ جنت و جہنم کا فیصلہ ہونے سے پہلے میدانِ حشر میں ہوگا۔ پھر لوگوں کے حساب کتاب کے بعد جس کو جہنم میں جانا ہے اس کو جہنم میں بھیجا جائے گا جس کا جنّت

کے لئے فیصلہ ہوا ہے اس کو جنّت میں بھیجا جائے گا) تو وہ بھی اپنا راستہ دیکھ لے گا کہ جنّت کی طرف بھیجا جارہا ہے یا جہنم کی طرف۔

کسی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! (یہ تو اُس آدمی کا حال ہے جس کے پاس سوناچاندی تھا اوراس کا حق یعنی زکوٰۃ ادا نہیں کی تھی) اگر کسی کے پاس اونٹ ہوں اوراس نے ان کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو اس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اونٹ والا بھی جو اس کا حق ادا نہ کرے، جس کے حق میں (ایک تو زکوٰۃ ہے، اور) ایک حق یہ بھی ہے کہ اس کی باری کے دن اس کا دودھ دوہا جائے (اُس زمانہ میں اونٹ وغیرہ کا دودھ بیچا نہیں جاتا تھا، بلکہ اونٹوں کو پانی پلانے کے لئے گھاٹ پر لے جاتے تھے، وہیں ان کا دودھ دوہا جاتا تھا اور غرباء ومساکین میں جن کو دودھ کی ضرورت ہوتی تھی وہ پہلے سے وہاں آجایا کرتے تھے، ان کو ان کی ضرورت کے مطابق دودھ دیدیا جاتا تھا اور مالک اپنے لئے بھی رکھ لیتا تھا۔ گویا حاجتمندوں کو ان کی حاجت کے مطابق دودھ دینا بھی اونٹ کے حقوق میں سے ایک حق ہے، اُس وقت یہی عرف اور رواج تھا، بعد میں اس کی فروخت کی بھی اجازت ملی ہے، لہٰذا اگر کوئی آدمی اس کا دودھ بیچے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ خیر) جب قیامت کا دن آئے گا تو ان اونٹوں کے سامنے اس آدمی کو ایک چٹیل میدان میں لٹادیا جائے گا اور وہ اونٹ دنیا میں جیسی بڑی جسامت والے نظر آتے ہیں اس سے بھی بڑے نظر آئیں گے، یہاں تک کہ اُس کے پاس جو اونٹ تھے اس کا ایک سال کے چھوٹے سے بچّے کو بھی وہاں گُم نہیں پائے گا (مطلب یہ ہے کہ جتنے اونٹ تھے سب وہاں موجود ہوں گے) اور وہ اونٹ اپنے پاؤں سے اس آدمی کو روندیں گے، ان اونٹوں کو اس کے اوپر سے گزارا جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ وہ اونٹ اُس آدمی کو اپنے منہ سے کاٹیں گے، اور ایک مرتبہ تمام اونٹوں کی لائن پوری ہوجائے گی تو پھر دوبارہ اس کو شروع کیا جائے گا اور باربار یہی سلسلہ جاری رہے گا ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہے (یعنی میدانِ حشر میں) یہاں

تک کہ لوگوں کے درمیان حساب کتاب ہو جائے گا، پھر وہ اپنا راستہ دیکھ لے گا کہ جہنم کی طرف بھیجا جارہا ہے، یا جنّت کی طرف۔

پھر حضور ﷺ سے گائے اور بکری کے متعلق پوچھا گیا تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: گائے اور بکریوں کا مالک جو اس کا حق ادا نہیں کرتا (یعنی زکوٰۃ نہیں دیتا) اس کو بھی قیامت کے دن (میدانِ محشر میں) لٹایا جائے گا، پھر اس کی ان گایوں اور بکریوں کو لایا جائے گا، ان میں سے ایک بھی گائے اور بکری غیر حاضر نہیں ہوگی، اور ان گایوں کے سینگ مڑے ہوئے نہیں (بلکہ نوکیلے) ہوں گے، اور بغیر سینگ کی اور ٹوٹے ہوئے سینگ والی بھی کوئی گائے نہیں ہوگی پھر یہ سب اپنے پاؤں سے اس کو روندیں گی اور اپنے سینگوں سے اس کو ماریں گی۔ جب ایک مرتبہ وہ سب گزر جائیں گی تو دوبارہ پھر گزارا جائے گا اور یہ سلسلہ جاری رہے گا یہاں تک کہ لوگوں کا حساب وکتاب ہو جائے گا، اور پھر یہ بھی اپنا راستہ دیکھ لے گا کہ جنّت کی طرف بھیجا جارہا ہے یا جہنم کی طرف۔

پھر حضورِ اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: کسی کے پاس اگر گھوڑے ہوں، تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: گھوڑے تین طرح کے ہوتے ہیں (یعنی تین مقاصد سے پالے جاتے ہیں) ایک قسم تو اس کے پالنے والے کے لئے بوجھ ہے، دوسری قسم اس کے پالنے والے کے لئے پردہ پوشی کا ذریعہ ہے، اور تیسری قسم پالنے والے کے لئے اجر وثواب کا باعث ہے۔

پہلی قسم جو پالنے والے کے لئے بوجھ ہے وہ جس نے دکھلانے کے واسطے اور ریا ونمود اور فخر و غرور کے لئے گھوڑے پالے (تاکہ لوگ یوں کہیں کہ ماشاء اللہ اس کے پاس تو بڑے عمدہ عمدہ گھوڑے ہیں اور لوگوں کے سامنے اپنے گھوڑوں کے ذریعہ تکبر کرتا پھرے) اور مسلمانوں کے ساتھ عداوت و انتقام کے لئے پالتا ہے؛ تو ایسے گھوڑے اس کے لئے عذاب ہیں (اور قیامت میں ان کی وجہ سے اس کی گرفت ہوگی۔)

اور گھوڑوں کی دوسری قسم جو پردہ پوشی کا ذریعہ ہے، وہ آدمی جس نے گھوڑوں کو اللہ کے راستہ میں استعمال کرنے کے لئے پالا، پھر ان کی پشت میں اور ان کی گردنوں میں اللہ تعالیٰ کا جو حق تھا (گردن میں حق یعنی ان کی زکوٰۃ ادا کی۔ اور پشت میں حق کا مطلب یہ ہے کہ کسی ضرورت مند کی کسی ضرورت میں کام آیا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جہاں گھوڑے پالے جاتے ہیں، وہاں اطراف میں جن کے پاس سواری کا جانور نہیں ہوتا، اگر ان کے یہاں اچانک کوئی بیمار ہوگیا اور اس کو دیہات سے شہر کی طرف لے جانے کی ضرورت پیش آئی، تو ایسے موقعوں پر جن کے پاس اس قسم کی سواریاں ہوتی ہیں وہ مانگی جاتی ہیں۔ تو یہ بھی حق ہے کہ ضرورتمندوں کو ضرورت کے وقت سواری دی جائے، انکار نہ کیا جائے۔ تو ان کی پشت میں جو حق تھا وہ بھی بھولا نہیں بلکہ اس کو ادا کیا) تو ایسے گھوڑے اس کے پالنے والے کے لئے پردہ پوشی کا ذریعہ ہوں گے۔

اور وہ آدمی جس کے لئے گھوڑا پالنا اجر ہے وہ ہے جس نے گھوڑوں کو (صرف اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے نہیں پالا، بلکہ) اللہ کے راستہ میں مسلمانوں کے واسطے (جہاد میں استعمال کرنے کے لئے) پالا، اس کا گھوڑا چراگاہ میں جتنا بھی گھاس چرے گا تو ہر گھاس کے بدلہ میں اس کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور یہ گھوڑا اگر پیشاب پاخانہ بھی کرے گا تو اس پر بھی پالنے والے کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔

(اور ایسا ہوتا ہے کہ گھوڑے کو چرنے کے لئے بڑے میدان میں ایک دم سے چھوڑ نہیں دیتے، بلکہ ایک لمبی رسّی سے باندھ دیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جس رسّی سے باندھا ہوا ہوتا ہے، گھوڑا جوش میں آکر اس رسّی کو توڑ ڈالتا ہے، اور میدان میں ایک دو چکّر کاٹتا ہے، اس درمیان میں لید

بھی نکالتا جاتا ہے، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ) وہ رسّی جس سے اس کو باندھا گیا تھا اگر اس نے توڑ ڈالی، پھر ایک دو چکّر لگائے تو اس نے جتنے قدم اٹھائے ہیں ان کے بقدر اس کے مالک کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی، اور اس درمیان جو لید نکالی ہے اس پر بھی نیکیاں لکھی جائیں گی۔

اور اگر اس کا مالک اس گھوڑے کو لے کر کسی نہر کے پاس سے گزر رہا ہو، اور نہر پار کرتے ہوئے اس نے منھ ڈال کر پانی پی لیا حالاں کہ مالک کا ارادہ پانی پلانے کا نہیں تھا؛ تب بھی اس نے جتنا پانی پیا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مقدار میں اس کے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی (مطلب یہ ہے کہ ایسے گھوڑے کی ہر ہر چیز پر پالنے والے کے لیے نیکیاں لکھی جاتی ہیں)۔

پھر حضور اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کسی نے گدھے پال رکھے ہوں؟ تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: گدھوں کے سلسلہ میں میرے اوپر کوئی حکم نازل نہیں ہوا ہے، ہاں! ایک آیت ہے جس میں آدمی کے ہر عمل کے متعلق ایک اصول اور ضابطہ بتلا دیا گیا ہے ﴿فَمَنۡ يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ خَيۡرًا يَرَهُ وَمَنۡ يَعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ﴾ جس نے معمولی سی نیکی کی اس کا بدلہ بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں دیکھے گا، اور اگر ذرّہ برابر بھی برائی کی تو اس کی سزا بھی اس کو وہاں پر ملے گی۔

افادات:- یہ ایک لمبی روایت ہے جس میں زکوٰۃ کے ادا نہ کرنے پر عذاب کا تذکرہ ہے۔ اور اس میں ایک ایسا اصول ہے کہ آدمی کی زندگی کا ہر عمل اس کے ماتحت آجاتا ہے اور اس کا حکم بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ جس نے گدھے پالے اور اچھی نیت سے پالے ہیں تو وہ نیکی میں داخل ہے، اس کا بھی اس

کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر ملے گا۔ اور اگر کوئی بری نیت ہے تو یہ گناہ میں داخل ہے اور قیامت میں اس کو اس کی سزا ملے گی۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ گدھوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، البتہ اگر وہ تجارت کے ہوں تو اس میں زکوٰۃ ہوتی ہے، لیکن اگر پالے ہوئے ہیں تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

بَابُ وُجُوْبِ صَوْمِ رَمَضَانَ وَبَيَانِ فَضْلِ الصِّيَامِ وَمَا يَتَعَلَّقُ بِهِ

رمضان کے روزوں کا فرض ہونا، روزوں کی فضیلت اور اس سے متعلق دوسری چیزوں کا بیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

چناں چہ اس سلسلہ میں قرآنِ شریف کی یہ آیت جس کے نزول سے روزوں کی فرضیت کا حکم آیا تھا اس کو پیش کیا ہے:﴿یَا أَیُّھَا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِن قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ أَیَّاماً مَّعۡدُوۡدَاتٍ فَمَن کَانَ مِنکُم مَّرِیۡضاً أَوۡ عَلَی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ أَیَّامٍ أُخَرَ وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہُ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ فَمَن تَطَوَّعَ خَیۡراً فَھُوَ خَیۡرٌ لَّہُ وَأَن تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ إِن کُنتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ شَھۡرُ رَمَضَانَ الَّذِیَۡ أُنزِلَ فِیۡہِ الۡقُرۡآنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنَاتٍ مِّنَ الۡھُدَی وَالۡفُرۡقَانِ فَمَن شَھِدَ مِنکُمُ الشَّھۡرَ فَلۡیَصُمۡہُ وَمَن کَانَ مَرِیۡضاً أَوۡ عَلَی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ أَیَّامٍ أُخَرَ﴾(۱) اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں(۱) اسی طرح جیسے تم سے پہلے لوگوں پر روزے فرض کئے گئے تھے۔

(۱)ترجمہ:-اے ایمان والو! فرض کیا گیا تم پر روزہ جیسے فرض کیا گیا تھا تم سے اگلوں پر، تاکہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔ چند روز ہیں گنتی کے، پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر؛ تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے۔ اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا۔ پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے واسطے۔ اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لیے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ مہینہ رمضان کا ہے جس میں نازل ہوا قرآن، ہدایت ہے واسطے لوگوں کے، اور دلیلیں روشن راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی۔ سو جو کوئی پائے تم میں سے اس مہینہ کو تو ضرور روزے رکھے اس کے، اور جو کوئی ہو بیمار یا مسافر، تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیے اور دنوں سے۔(ترجمہ شیخ الہند)

صرف فرض کئے جانے میں یہ تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح ان پر فرض تھے تم پر بھی فرض کئے گئے ہیں، باقی تعداد اور کیفیت وغیرہ کے اعتبار سے پورے طور پر دونوں کو مساوی قرار دینا مقصود نہیں ہے۔ اس لئے کہ اگلی امتوں میں روزوں کی شکل یہ ہوا کرتی تھی کہ عشاء کی نماز کے بعد آدمی جب سو گیا تو وہیں سے روزہ شروع ہو جاتا تھا یعنی جیسے ہم لوگ اُٹھ کر سحری کرتے ہیں اور صبحِ صادق سے پہلے پہلے کھا پی سکتے ہیں، چاہے سوئے ہوں، یا نہ سوئے ہوں؛ ان کے یہاں ایسا نہیں تھا، بلکہ وہاں تو یہ تھا کہ جہاں آنکھ لگ گئی بس روزہ شروع ہو جاتا تھا۔ شروع اسلام میں بھی جب روزوں کی فرضیت ہوئی تو یہی طریقہ تھا کہ جہاں آنکھ لگ گئی کہ اب کھانا پینا، بیوی کے ساتھ صحبت کرنا؛ سب ممنوع ہو جاتا تھا اور روزہ شروع ہو جاتا تھا، لیکن حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) میں سے بعضوں کے ساتھ ذرا سخت حالات پیش آئے جیسا کہ روایتوں میں ہے کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حضور اکرم ﷺ کے پاس عشاء کی نماز کے بعد مشورہ کے لئے بیٹھتے تھے، ایک مرتبہ وہ وہاں سے دیر سے پہنچے، ان کو اپنی بیوی سے اپنی ضرورت پوری کرنے کا تقاضہ تھا، انہوں نے مطالبہ کیا تو بیوی نے جواب دیا کہ میری تو آنکھ لگ گئی تھی اور میں سو گئی تھی، گویا میرا روزہ شروع ہو گیا ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: میں تھوڑا ہی سویا تھا اور اپنی ضرورت پوری کر لی۔ اسی طرح حضرت ابی بن کعب (رضی اللہ عنہ) سے بھی نقل کیا جاتا ہے۔

بہر حال! کچھ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے ایسی صورت پیش آئی تو اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللهُ لَكُمْ

وَکُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ وَلاَ تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ تِلْكَ حُدُودُ اللهِ فَلاَ تَقْرَبُوهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾(۱) ۔

اس آیت سے گویا اس بات کی اجازت دیدی گئی کہ صبحِ صادق تک آپ اپنی بیویوں کے ساتھ صحبت کرسکتے ہیں اور اب روزہ صبحِ صادق سے شروع ہوگا، چاہے آنکھ لگی ہو یا نہ لگی ہو۔

اسی طرح کھانے پینے کے معاملہ میں بھی ہوا۔ قیس بن صرمہ (رضی اللہ عنہ) ایک غریب صحابی تھے، محنت مزدوری کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ دن بھر روزے سے تھے، فطار کے وقت گھر پہنچے، بیوی سے کہا: افطار کے لئے کچھ ہے؟ بیوی نے کہا: کچھ بھی نہیں ہے، پھر بیوی نے کہا: ٹھہرو! میں پڑوسی کے یہاں سے کچھ لے آتی ہوں، سورج تو غروب ہو ہی چکا تھا، بیوی پڑوسی کے یہاں کچھ لینے گئی اور جب وہاں سے واپس لوٹی تو دیکھا کہ ان کی تو آنکھ لگ گئی ہے، اب وہ کچھ لے کر تو آئی تھی لیکن چوں کہ ان کی آنکھ لگ گئی تھی

(۱) ترجمہ:- حلال ہوا تم کو روزہ کی رات میں بے حجاب ہونا اپنی عورتوں سے، وہ پوشاک ہیں تمہاری اور تم پوشاک ہو ان کی، اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنی جانوں سے، سو معاف کیا تم کو اور درگذر کی تم سے، پھر ملو اپنی عورتوں سے اور طلب کرو اس کو جو لکھ دیا ہے اللہ نے تمہارے لیے، اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ صاف نظر آئے تم کو دھاری سفید صبح کی جدا دھاری سیاہ سے، پھر پورا کرو روزہ کو رات تک، اور نہ ملو عورتوں سے جب تک کہ تم اعتکاف کرو مسجدوں میں، یہ حدیں باندھی ہوئی ہیں اللہ کی، سو ان کے نزدیک نہ جاؤ۔ اسی طرح بیان فرمایا ہے اللہ اپنی آیتیں لوگوں کے واسطے تاکہ وہ بچتے رہیں۔ (ترجمہ شیخ الہند)

اس لیے ان کا تو دوسرا روزہ شروع ہو گیا تھا اس لیے وہ کچھ کھا پی نہیں سکتے تھے، اس نے اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ پھر دوسرے دن روزہ پورا ہوا تو شام کو پھر یہی صورت پیش آئی کہ افطاری کے لئے کچھ تھا نہیں، بیوی نے کہا: میں پڑوسی کے یہاں سے کچھ لے کر آتی ہوں، وہ لینے گئی اور جب کچھ لے کر لوٹی تو دیکھا کہ ان کی آنکھ لگ گئی ہے، اب تو ان کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔ بہر حال! یہ بھی ایک سبب تھا۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگلی امتوں میں ایسا تھا کہ جب آدمی رات کو سو جاتا، وہیں سے روزہ شروع ہو جاتا تھا، صبح صادق کے آنے کا انتظار نہیں تھا، اسلام میں بھی شروع میں اسی طرح کا حکم دیا گیا تھا، بعد میں پھر اس میں تخفیف کر دی گئی اور صبح صادق سے روزہ کی ابتدا قرار دی گئی، چاہے کسی کی آنکھ لگی ہو یا نہ لگی ہو۔

اسی طریقہ سے روزوں کی تعداد کے سلسلہ میں بھی ہے، شروع اسلام میں دسویں محرم کا روزہ فرض ہوا تھا، اس کے بعد رمضان کی فرضیت آئی، یعنی پورے مہینہ کے روزے اس کے بعد فرض ہوئے۔ اور شروع میں جب روزوں کا حکم دیا گیا اس وقت بھی لوگ روزہ رکھنے کے عادی نہیں تھے، اس لیے شریعت کی طرف سے سہولت دی گئی تھی کہ روزہ رکھنا چاہو تو روزہ رکھ لو، اور اگر روزہ رکھنے کے بجائے فدیہ دینا چاہو یعنی ایک روزہ کے بدلہ میں غریب کو صدقۃ الفطر کی مقدار صدقہ کر دو ؛تب بھی کافی ہو جائے گا۔ ہمارے معاشرہ میں تو چوں کہ بچّوں کو بچپن ہی سے روزہ رکھواتے ہیں، اس لئے ان کو عادت پڑ جاتی ہے اور بڑے ہو کر آسانی سے روزے رکھ لیتے ہیں، لیکن جو پہلے سے عادی نہ ہوں ان کو آپ دیکھیں گے کہ چاہے پیٹ بھر کر سحری کھائی ہو تب بھی ان کے لیے شام تک بھوکا

رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تو گویا ان کو شروع میں روزہ رکھنے اور فدیہ دینے کے معاملہ میں اختیار دیا گیا تھا، اور یہ حکم کسی بیماری یا بڑھاپے پر موقوف نہیں تھا، لیکن بعد میں لوگ جب روزوں کے عادی ہو گئے تو پھر یہ آیت ﴿فَمَنۡ شَهِدَ مِنۡكُمُ الشَّهۡرَ فَلۡيَصُمۡهُ﴾ نازل ہوئی جس میں یہ حکم دیا گیا کہ اب تو ہر حال میں روزہ ہی رکھنا ہے، فدیہ سے کام نہیں چلے گا ﴿وَمَنۡ كَانَ مَرِيۡضاً أَوۡ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ البتہ کوئی آدمی بیمار ہو تو بیماری کی وجہ سے اس کو اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے اور افطار کر لے، پھر بیماری سے جب تندرست ہو جائے تو ان روزوں کی قضا کر لے۔ اسی طریقہ سے کوئی آدمی رمضان کے مہینہ میں سفر میں ہو تو سفر کی وجہ سے اس کو رخصت اور اجازت دی گئی کہ روزہ نہ رکھے اور افطار کر لے، بعد میں سفر سے جب واپس آئے تو دورانِ سفر جتنے روزے چھوٹے ہوں ان کی قضا کر لے۔ اب بھی یہی حکم باقی ہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الصِّيَامُ﴾ کے لفظ ”كُتِبَ“ سے مشائخِ صوفیاء نے روزہ کے آداب کے سلسلہ میں کچھ نکات پیدا کئے ہیں کہ تمہاری ذات پر جو روزے فرض کئے گئے ہیں تو ان روزوں کے کچھ حقوق کی ادائیگی بھی تمہارے جسم کے دوسرے اعضاء کے ذریعہ ہونی چاہیے۔ چناں چہ آنکھ کا بھی روزہ ہے، زبان کا بھی روزہ ہے، کان کا بھی روزہ ہے، اور دوسرے اعضاء کا بھی روزہ ہے۔

اس لیے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی روزہ کی حالت میں اپنی آنکھوں کو بد نظری سے بچائے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ وہ چیزیں جو روزہ کے علاوہ دیگر اوقات میں حلال ہیں، روزہ کے نام پر ان سے تو بچا جائے، جیسے: کھانا پینا اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت۔ ہم رمضان کے دنوں ہی میں رات کے وقت

کھاتے پیتے ہیں، اور رمضان کے علاوہ دن میں بھی کھاتے پیتے ہیں۔ تو حلال کام ایک عبادت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خاطر صبح صادق سے لے کر غروبِ آفتاب کے مقررہ وقت تک اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے روزہ کی مناسبت سے ہم نے چھوڑ دیئے۔ تو جب آدمی حلال کام چھوڑ کر روزہ رکھ رہا ہے، تو پھر ایسے کام جو روزہ کے علاوہ دیگر اوقات میں بھی حرام اور ممنوع ہوں، جیسے: بد نظری یعنی آنکھ کا گناہ، ٹی وی دیکھنا، ویڈیو اور سنیما دیکھنا؛ یہ سب کام روزہ کے علاوہ بھی ہر حال میں ممنوع ہیں؛ ان سے تو بطریقۂ اولیٰ بچنا چاہیے۔ آج کل لوگوں نے انہیں چیزوں کو روزہ میں ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے کہ ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں، گندی گندی فلمیں دیکھتے رہتے ہیں؛ پھر روزہ میں تاثیر کہاں رہے گی؟

آگے راویت آنے والی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے روزہ کو ڈھال قرار دیا ہے میدانِ جنگ میں آدمی دشمن کے حملہ سے بچاؤ کے لئے اپنے پاس ڈھال رکھتا ہے، جب دشمن تلوار کے ذریعہ سے حملہ اور وار کرتا ہے ڈھال سامنے کر دی جاتی ہے اور اس کے حملہ سے اپنے آپ کو بچالیا جاتا ہے۔ گویا شیطان ہمارے اوپر وار کرتا ہے اس سے بچاؤ کے واسطے روزہ ہی کو ایک طرح کی ڈھال قرار دیا گیا ہے، یا جہنم سے حفاظت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچنے کے لئے اس کو ڈھال بتلادیا ہے۔ ایک روایت میں ہے ﴿الصَّوْمُ جُنَّةٌ مَالَمْ يَخْرِقْهَا﴾ روزہ ڈھال ہے بشرطیکہ اس کو پھاڑ نہ ڈالے ڈھال جب پھٹ جاتی ہے تو پھر مقابلہ کے وقت دشمن کے حملہ سے حفاظت کا کام نہیں دیتی۔ اسی طرح روزہ کو بھی اگر ہم نے گناہوں کے ذریعہ سے خراب کر دیا تو گویا ڈھال کو بیکار کر دیا اور پھاڑ دیا، اب ایسا روزہ شیطان

کے حملہ سے حفاظت کا باعث نہیں بن سکتا۔اس لیے پہلی چیز تو یہ ہوئی کہ آدمی اپنی آنکھوں کی حفاظت کرے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان کی حفاظت کرے۔ روزہ کی حالت میں غیبت، چغلی، بہتان، لڑائی جھگڑا وغیرہ چیزوں سے بہت بچے۔ اگر کوئی ہم سے جھگڑا کرنے لگے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ میرا روزہ ہے، میں تیری کسی بات کا جواب نہیں دوں گا۔ اور اگر وہ نادان ہے اور سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا تو اپنے جی سے خود ہی خطاب کر کے کہہ دے کہ میرا تو روزہ ہے۔ تو زبان بھی ایک عضو ہے، روزہ میں اس کی حفاظت کا اہتمام ہونا چاہیے تب ہی زبان کا روزہ ہوگا۔ آج کل لوگ روزہ کی حالت میں غیبت کرتے رہتے ہیں، گویا لوگوں نے غیبت کو بھی ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ بنالیا ہے، بس! میری تیری میں لگے رہتے ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ کان کو بھی غیبت سننے سے، لڑائی جھگڑے سے، کسی کی بدگوئی، گانے اور موسیقی سننے سے بچایا جائے، بعض لوگ انہیں چیزوں کو روزہ میں ٹائم پاس کرنے کا ذریعہ بنالیتے ہیں، دن بھر گانے سنتے رہتے ہیں؛ تو ان صورتوں میں روزہ کا جو مقصد ہے وہ حاصل نہیں ہوتا۔

اسی طرح اپنے دوسرے اعضاء یعنی ہاتھ ، پاؤں کو بھی گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے، ورنہ جس روزہ کو ڈھال قرار دیا ہے ایسا روزہ پھر ڈھال نہیں بنتا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو آدمی روزہ کی حالت میں لغو چیزوں سے نہیں بچتا تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ بھوکا پیاسا رہے۔

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ﴾ تم پر روزے فرض کئے گئے ﴿كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ اسی طرح جیسے اگلی امتوں پر فرض کئے گئے۔ روزوں کی فرضیت میں انسان کے اعضاء بھی داخل ہیں ﴿أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ چند دنوں کے روزے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب روزوں کی فرضیت والا یہ حکم نازل فرمایا تو اس میں بھی بڑا پیارا انداز اختیار کیا، چوں کہ لوگ روزوں کے عادی نہیں تھے، اور روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا تو آگے حکم ہوا ﴿أَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ چند دنوں کے روزے ہیں ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ﴾ اور وہ رمضان کے مہینہ کے ہیں۔ وہ چند دن جن میں تم پر روزے فرض کئے گئے وہ فقط ایک ہی مہینہ ہے، اگر انیتس کو چاند ہو جائے تو انیتس (۲۹) ورنہ تیس (۳۰) روزے ہیں۔ ﴿الَّذِيْ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآن﴾ پھر رمضان کا یہ مہینہ ایسا بابرکت ہے جس میں لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف پورا قرآن پاک یکبارگی اتارا گیا، پھر آسمانِ دنیا سے نبیٔ کریم ﷺ پر تیئس (۲۳) سال کے عرصہ میں تدریجاً رمضان اور غیر رمضان میں اترتا رہا ﴿هُدًى لِّلنَّاس﴾ یہ وہی قرآن ہے جو لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ ہے ﴿وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ﴾ اور اس کا ایک ایک جزو اور ایک ایک آیت ہدایت کی روشن دلیل ہے اور حق وباطل میں تمیز کرنے والی ہے ﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ تم میں سے جو کوئی رمضان کا مہینہ تندرستی اور اقامت کی حالت میں پالے اس کو چاہیے کہ روزے رکھے ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضاً أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ اور اگر کوئی بیمار ہے، یا سفر میں ہے تو یہ گنتی دوسرے مہینہ میں پوری کرلے، یعنی ان روزوں کی بعد میں قضا کرلے۔

اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ مہینہ رکھا ہی اس لئے ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ تقویٰ حاصل کرلے ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ صفتِ تقویٰ پیدا کرنے کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے روزوں کو فرض کیا۔ تقویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو گناہوں اور اللہ کی نافرمانیوں سے بچائے۔ درحقیقت روزہ کی حالت میں آدمی کو اس بات کا مکمل استحضار رہتا ہے اور وہ اپنے دل ودماغ میں ہر وقت یہ بات تازہ رکھتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ جیسے ہی ایک آدمی نے روزہ کی نیت کرلی، تو پھر چاہے وہ کیسا ہی گیا گزرا آدمی کیوں نہ ہو، اور کیسا ہی گنہگار کیوں نہ ہو، لیکن جب ایک مرتبہ وہ یہ طے کرلیتا ہے کہ میں نے روزہ رکھا ہے، تو اب گرمی کے دن ہوں، وہ اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا ہو، دروازہ اندر سے بند ہو، کُنڈی لگی ہوئی ہو، اس کو پیاس بھی شدّت کے ساتھ لگ رہی ہو، حلق میں کانٹے چُبھ رہے ہوں، زبان سوکھ رہی ہو، کمرہ میں فریج موجود ہو اور اس میں ٹھنڈا پانی بھی رکھا ہوا ہو، اس کے باوجود وہ آدمی کبھی بھی اس پانی کو نہیں پیئے گا۔ حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ میں ابھی چُپکے سے پانی پی لوں تو یہاں کوئی بھی دیکھنے والا نہیں ہے، میں پانی پی کر بھی لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو روزہ دار ظاہر کرسکتا ہوں، اور شام کو افطار کے دسترخوان پر بڑی آزادی سے اپنے آپ کو روزہ دار ظاہر کرتے ہوئے شریک ہوسکتا ہوں، کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ روزہ کے معاملہ میں مَیں نے کوئی خیانت کی ہے؛ لیکن اس کے باوجود کوئی بھی ایسا نہیں کرتا۔ اس وقت گویا ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اسی لیے روزہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿اَلصَّوْمُ لِيْ وَأَنَا أَجْزِيْ بِهٖ﴾ روزہ میرے لئے ہے، اس لیے اس کا بدلہ بھی میں ہی دوں گا۔

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ یہ کیفیت جو دل میں پیدا ہوئی جس نے اس بات کو آپ کے دل و دماغ میں ہر وقت تازہ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، میں اگر پانی پی لوں گا تو اللہ تعالیٰ کے علم میں تو ہے، چاہے دنیا نے نہ دیکھا ہو، تو جیسے اُس وقت آدمی پانی نہیں پیتا اور یہ سوچتے ہوئے - کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے واسطے روزہ رکھا ہے اور جس کے لئے رکھا ہے وہ مجھے دیکھ رہا ہے -روزہ توڑنے کی کبھی جرأت نہیں کرتا، اسی تصور اور احساس کو اور اسی استحضار کو دل و دماغ میں اور زیادہ پھیلانے اور بڑھانے کی ضرورت ہے۔ یہ خیال صرف پانی پینے یا روزہ کے خلاف کام کرنے تک باقی نہ رہے، بلکہ جب آپ دکان پر بیٹھیں اور گاہک کے ساتھ کوئی معاملہ کر رہے ہوں، اُس وقت بھی آپ یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔ یا گھر والوں اور پڑوسیوں کے ساتھ کوئی معاملہ کر رہے ہوں، یا دنیا میں کہیں بھی کسی کے بھی ساتھ جب کوئی معاملہ کرنے لگیں تو یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، تو اس صورت میں کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی جرأت نہیں ہوگی، اللہ تعالیٰ کے ڈر کا یہ احساس روزہ کی حالت میں تو ہمارے دل میں ہوتا ہی ہے، اگر یہی احساس ایسا عام ہو جائے کہ روزہ تک محدود نہ رہے، اسی کو تقویٰ کہتے ہیں، اور روزہ کے ذریعہ یہی احساس پیدا کرنا مقصود ہے۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ روزہ میں تقویٰ کی ایک چھوٹی سی مشق کرائی گئی ہے، اسی کو آگے بڑھا کر پوری زندگی میں لانا ہے اور عملی جامہ پہنانا ہے۔ اگر ایسا کریں گے تو ان شاء اللہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہو جائے گا، اور روزہ کا یہی اصل فائدہ اور خصوصیت ہے۔

رمضان المبارک کے مہینہ میں روزہ کے علاوہ تراویح پڑھی جاتی ہے، نفلی عبادتیں، تلاوتِ قرآنِ کریم، ذکر و اذکاراور صدقہ وغیرہ کی کثرت کی جاتی ہے، لیکن زیادہ کوشش اس بات کی کرنی چاہئے کہ آدمی اپنے آپ کو ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچائے۔اس لئے کہ نفلی عبادت کا حال تو یہ ہے کہ اگر آپ کریں گے تو اس کا ثواب ملے گا، اور نہیں کریں گے تو کوئی گناہ ہونے والا نہیں ہے، اوراس پر کوئی گرفت اور پکڑ بھی نہیں ہوگی، لیکن خدانہ کرے اگر کوئی بھی گناہ کرلیا تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوگی اور عذاب ہوگا۔

ویسے بھی جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو کیسا ہی گیا گزرا آدمی کیوں نہ ہو، وہ بھی نہادھو کر مسجد میں آہی جاتا ہے اور تراویح میں شریک ہوجاتا ہے اور چھوٹی موٹی عبادتیں بھی کرلیتا ہے، اگر روزانہ نہیں تو رمضان میں اور جمعہ کے دن وہ بھی اہتمام کرلیتے ہیں، یا بڑی راتیں آتی ہیں تو روزانہ والوں کے مقابلہ میں ایسے لوگ پہلے سے آکر مسجد میں جگہوں پر قابض ہوجاتے ہیں۔تو نفلی عبادتوں کا اہتمام ہر کوئی کرلیتا ہے لیکن گناہوں سے بچنا بڑی اہم چیز ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا اہتمام کیا جائے۔اس آیت میں ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ کے ذریعہ سے یہی تعلیم دینا مقصود ہے کہ روزوں کے نتیجہ میں تم کو تقویٰ آجائے، اور آدمی اپنی زندگی میں تقویٰ والی صفت پیدا کرلے۔ گویا روزہ خود ہی تقویٰ کا ایک چھوٹا سا پروگرام اور نصاب ہے۔

ایک حدیثِ قدسی

حدیث ۱۲۱۵:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((قَالَ اللهُ -عزوجل-: كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ لَهُ إِلاَّ الصِّيَام، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، وَالصِّيَامُ جُنَّةٌ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ فَلاَ يَرْفُثْ وَلاَ يَصْخَبْ فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ فَلْيَقُلْ: إِنِّي صَائِمٌ وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ: لَخُلُوفُ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ. لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ يَفْرَحُهُمَا: إِذَا أَفْطَرَ فَرِحَ بفطره، وَإِذَا لَقِيَ رَبَّهُ فَرِحَ بِصَوْمِهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ، وهذا لفظ رواية البُخَارِي)

وفی روايةٍ لَهُ: ((يَتْرُكُ طَعَامَهُ، وَشَرَابَهُ، وَشَهْوَتَهُ مِنْ أَجْلِي، الصِّيَامُ لی وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا)).

وفی رواية لمسلم: ((كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يضاعَفُ، الحسنةُ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ. قَالَ اللهُ تَعَالَى: إِلاَّ الصَّوْمَ فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ؛ يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي. لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ، وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ. وَلَخُلُوفُ فِيهِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: انسان کا ہر عمل اس کے لئے ہے سوائے روزہ کے؛ کہ وہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دیتا ہوں (میرے لئے ہونے کی وجہ دوسری روایت میں یہ آئی ہے) کہ وہ اپنا کھانا پینا اور اپنی شہوت کو میرے لئے چھوڑ دیتا ہے۔ اور روزہ شیطان کے حملہ سے حفاظت کی ڈھال ہے، جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ بے کار باتیں نہ کرے اور نہ شور مچائے۔ اگر کوئی دوسرا برا بھلا کہے یا لڑنے لگے تو اس کو جواب میں کہہ دے کہ میرا روزہ ہے، پھر بھی

اگر وہ نہیں مانتا تو کم سے کم اپنے دل ہی سے کہہ دے کہ تیرا تو روزہ ہے۔ اور قسم ہے محمد ﷺ کی جان کی! روزہ دار کے منھ کی بدبو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔ روزہ دار کے لئے دو چیزیں خوشی کی ہیں جن سے وہ بہت خوش ہوگا، ایک تو افطار کے وقت جو کہ افطار سے ہوتی ہے، اور دوسری خوشی اللہ تعالیٰ سے ملنے کے وقت ہوگی۔

دوسری روایت میں ہے کہ (تمام اعمال کے بدلوں کے لئے تو فرشتوں کو بتلادیا گیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ہدایت اور اصول کے مطابق اعمال کا ثواب لکھتے رہتے ہیں) کسی عمل کا ثواب دس سے لے کر ستّر گنا تک، اور کسی عمل کا سات سو گنا تک لکھتے ہیں، لیکن روزہ کے ثواب کے متعلق اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ اس کا ثواب مَیں ہی دوں گا (گویا اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ اس کا ثواب کتنی مقدار میں ہے۔ اس لیے کہ روزہ میں ایک خاص چیز یہی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے تصور سے اور اُسی کے خاطر اپنے آپ کو بھوکا اور پیاسا رکھتا ہے۔)

ایک نو مسلم کے ایمان لانے کا قصہ

افادات:– قدرۃ اللہ شہاب ایک سرکاری آفیسر تھے، انھوں نے ”شہاب نامہ“ کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھی ہے۔ تقسیمِ ملک سے پہلے وہ یہیں تھے، تقسیم کے بعد اُدھر چلے گئے تھے۔ ایک مرتبہ سفیر کی حیثیت سے وہ بیلجیم (ہولینڈ) گئے ہوئے تھے۔ اس سفر کا ایک واقعہ انہوں نے لکھا ہے کہ میں ہولینڈ میں ایک پارک میں گیا، وہاں کے لوگ اپنے مذہب (یعنی عیسائیت) کے معاملہ میں بڑے متعصب تھے۔ اس کا بھی ایک نمونہ انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے یہاں اپنے بچّوں کو مذہب کے

معاملہ میں آزادی ہے۔ بچّے کی پیدائش کے بعد پیدائش کا جو فارم پُر کیا جاتا ہے اس میں اس بچّے کا نام اور دوسری ساری چیزیں لکھ کر مذہب والا خانہ خالی چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ بچّہ بڑا ہونے کے بعد جس مذہب کو اپنے لئے مناسب سمجھے اختیار کر سکتا ہے، اس وقت اس جگہ اس کا مذہب لکھا جائے گا۔ تو اس جگہ کو خالی چھوڑنے کے ساتھ ساتھ وہاں لکھ دیتے ہیں کہ بڑا ہو کر سوائے اسلام کے جو مذہب چاہے وہ اختیار کرے۔ گویا ان کو اسلام کے ساتھ اتنا زیادہ تعصب ہے۔

لیکن وہ لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں وہاں ایک پارک میں گیا، ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ عربی لہجہ میں قرآنِ پاک کی آواز سنی، تو میں سوچنے لگا کہ ہولینڈ کا رہنے والا قرآن پاک پڑھ رہا ہے؟ میں اس کے پاس پہنچا، سلام کیا، بات چیت میں اس نے مجھ سے پوچھا: تم کہاں کے ہو؟ میں نے کہا: میں پاکستان کا ہوں۔ اس سے نام پوچھا تو اس نے اپنا نام عبدالرحمن بتلایا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آپ کیسے اسلام لائے؟ تو اس نے کہا:- میرے اسلام لانے کی اصل بنیاد یہ ہوئی کہ میں اسٹیمر کا کپتان تھا۔ ایک مرتبہ ہماری اسٹیمر کراچی کی بندرگاہ پر کھڑی ہوئی، سخت گرمی کا زمانہ تھا، مزدور لوگ سامان منتقل کر رہے تھے اور سخت گرمی کی وجہ سے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے، میں نے ان مزدوروں کے لئے پانی پینے کا انتظام کیا، تو ایک بوڑھا آدمی تھا اس نے پانی نہیں پیا اور کہا کہ میرا روزہ ہے۔ میں اس کو اپنے کیبن میں لے گیا، دروازہ اندر سے بند کیا اور فریج میں سے بہترین جوس نکال کر اس کو دیا اور کہا کہ یہاں کوئی نہیں ہے، اس کو پی لو۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا کہ وہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے اس طرزِ عمل سے مجھے بہت تعجب ہوا، پھر میں نے اس کو بہت سمجھایا کہ بھائی! تم محنت

مزدوری کر رہے ہو، تمہیں پیاس لگی ہو گی۔ تو اس نے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے لیکن میرا روزہ ہے، اس لیے میں ابھی کچھ نہیں پی سکتا، شام کو جب غروبِ آفتاب ہو گا اس کے بعد پیوں گا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہاں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، اور میری طرف سے اتنا زیادہ اصرار ہے، یہ اتنا غریب آدمی ہے، اور اس کو کبھی اتنا عمدہ جیوس میسر بھی نہیں آیا ہو گا، اس کے باوجود اس حال میں بھی وہ پینے کے لیے تیّار نہیں ہوا۔ تو میرے دل میں خیال آیا کہ کوئی تو بات ہے جس کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کرتا۔ اسی واقعہ کی وجہ سے میرے دل میں ایمان آنا شروع ہوا اور اسی بنیاد پر میں ایمان لایا۔

شیطان کے حملوں سے حفاظت کی تدابیر

روزہ شیطان کے حملہ سے حفاظت کے لیے ڈھال ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ شیطان انسان کی رگوں میں ایسے چلتا ہے جیسا کہ خون؛ اس کے راستوں کو بھوک کے ذریعہ بند کرو۔ آدمی کا پیٹ جب بھرا ہوا ہو تب ہی خواہشیں ابھرتی ہیں اور خرمستیاں سوجھتی ہیں، پیٹ جب خالی ہو اور بھوک کی وجہ سے بے چینی ہو تو کبھی گناہ کا تصور نہیں آسکتا، بھوک آدمی کی قوتِ حیوانیہ کو قابو میں لانے والی ہے، اسی لئے اس کو ڈھال قرار دیا گیا کہ بھوک گناہوں سے حفاظت کا ذریعہ ہے۔ اسی لئے اکابر واسلاف کے زمانہ میں ریاضات ومجاہدات کے طریقے بتلائے گئے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کیا جائے ان میں اصولی طور پر چار چیزیں بتلائی گئی تھیں، ایک تقلیلِ طعام ہے کہ کھانا کم کر دیا جائے، دوسرا بولنا کم کر دیا جائے، تیسرا لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا جائے، اور چوتھا سونا کم کر دیا

جائے۔ گویا یہ چار چیزیں مجاہدات کی بنیاد ہیں۔ اور روزہ میں ایک چیز یہ ہوتی ہے کہ آدمی بھوکا رہتا ہے اس لئے اس کو ڈھال قرار دیا۔

دوسری روایت میں یہ بھی ہے: ﴿الصِّيَامُ جُنَّةٌ مَالَمْ يَخْرِقْهَا﴾ روزہ ڈھال ہے جب تک کہ آدمی اس کو پھاڑ نہ دے۔ اس لئے کہ ڈھال اگر پھٹی ہوئی ہو تو پھر وہ کام نہیں دے گی، اور اس کے ذریعہ سے آپ دشمن کے حملہ سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔ اسی طرح روزہ بھی شیطان کے حملہ سے اُسی وقت بچا سکے گا کہ جب آپ اس کو گناہوں کے ذریعہ سے پھاڑ نہ دیں۔

بندوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ایک نمونہ

روزہ دار کے منہ کی بدبو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔ یہ دراصل بندوں کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت اور بندوں کی قدر و عظمت کا ایک نمونہ ہے کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ کے خاطر بھوکا رہا جس کے نتیجہ میں معدہ کے خالی رہنے کی وجہ سے منہ میں بدبو پیدا ہوئی اس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں مشک کی خوشبو سے زیادہ قدر ہے۔

روزہ دار کے لئے دو چیزیں خوشی کی ہیں، ایک تو ہر روزہ دار جانتا ہے کہ افطار کا وقت آتا ہے تو کیسی خوشی ہوتی ہے، اور اسی روزہ کی وجہ سے کل اللہ تعالیٰ سے ملنے کا وقت آئے گا تو یہی روزہ چوں کہ

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہے، اس لئے وہاں پر بھی اس کو خوشی ہوگی، تو دنیا میں بھی خوشی ملتی ہے اور آخرت میں بھی خوشی ملے گی۔

روزہ دار کو جنت میں باب الریّان سے بلایا جائے گا

حدیث ۱۲۱۶:-

وعنه أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((مَنْ أَنْفَقَ زَوْجَيْنِ فِي سَبِيلِ اللهِ نُودِيَ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، يَا عَبْدَ اللهِ هٰذَا خَيْرٌ فَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّلَاةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّلَاةِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الْجِهَادِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الْجِهَادِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصِّيَامِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الرَّيَّانِ، وَمَنْ كَانَ مِنْ أَهْلِ الصَّدَقَةِ دُعِيَ مِنْ بَابِ الصَّدَقَةِ.)) قَالَ أَبُو بَكْرٍ (رضی اللہ عنہ): بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي يَا رسولَ الله! مَا عَلَى مَنْ دُعِيَ مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ مِنْ ضَرُورَةٍ، فهل يُدْعَى أَحَدٌ مِنْ تِلْكَ الْأَبْوَابِ كُلِّهَا؟ فَقَالَ: ((نَعَمْ، وَأَرْجُو أَنْ تَكُونَ مِنْهُمْ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے جوڑا جوڑا (یعنی دو دو چیزیں) اللہ کی راہ میں دینے کا اہتمام کیا (جیسے: کپڑے دئے تو جوڑی دیئے، بکری دی تو دو بکریاں دیں، اسی طرح اور چیزوں میں بھی اس کا اہتمام کیا) تو جنّت کے دروازوں سے اس کو پکارا جائے گا کہ اے اللہ کے بندے! یہ خیر ہے (اور جیسی نیکی کی ہوگی اس کے مطابق ہی جنت کے دروازوں سے اس کو پکارا جائے گا) اگر کسی نے نماز والی نیکی کی ہے تو نماز والے دروازہ سے پکارا جائے گا (جنّت میں ایک دروازہ باب الصلوۃ کے نام سے ہے، نمازیوں کو وہاں سے جنّت میں داخل کیا جائے گا) اور جس نے جہاد والا عمل کیا ہے، تو اس کو جہاد والے دروازہ سے بلایا جائے گا، اور اگر روزہ والا عمل کیا ہے تو اس کو جنّت میں باب الریّان سے بلایا جائے گا، اور کسی نے صدقہ وخیرات کی ہوگی تو باب

الصدقہ سے بلایا جائے گا۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، ان دروازوں میں سے اگر کسی ایک بھی دروازہ سے بلایا جائے تو پھر دوسرے دروازہ سے بلانے کی ضرورت تو نہیں ہے (مقصد تو جنّت میں داخل ہونا ہے، کسی ایک دروازے سے بھی بلایا جائے تو مقصد حاصل ہو گیا، لیکن میں پوچھنے کے طور پر پوچھ رہا ہوں کہ) کوئی ایسا بھی آدمی ہو گا جس کو جنّت کے تمام دروازوں سے پکارا جائے؟ حضور اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جی ہاں! اور مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ آدمی جتنی نیکیوں کا اہتمام کرتا ہے اسی کے مناسب اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاملہ کیا جاتا ہے۔ یہاں تو روزہ رکھنے والوں کو باب الریّان سے بلایا جائے گا اسی مناسبت سے یہ روایت لائے ہیں۔

حدیث ۱۲۱۷:-

وعن سهل بن سعد (رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((إِنَّ فِي الْجَنَّةِ بَاباً يُقَالُ لَهُ: الرَّيَّانُ، يَدْخُلُ مِنْهُ الصَّائِمُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، لاَ يَدْخُلُ مِنْهُ أحدٌ غَيْرُهُمْ، يقال: أَيْنَ الصَّائِمُونَ؟ فَيَقُومُونَ لاَ يَدخُلُ مِنْهُ أَحَدٌ غَيْرُهُمْ، فَإِذَا دَخَلُوا أُغْلِقَ فَلَمْ يَدْخُلْ مِنْهُ أَحَدٌ.)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جنّت میں ایک دروازہ ہے جس کو ریّان کہا جاتا ہے، قیامت میں روزہ دار اُس دروازہ سے داخل ہوں گے، اور روزہ داروں کے علاوہ کسی کو اُس دروازہ سے داخل ہونے کی اجازت نہیں ہو گی۔ چناں چہ اعلان ہو گا: روزہ دار کہاں ہیں؟ تو سب روزہ دار اٹھیں گے اور اس دروازہ سے ان کے علاوہ کوئی نہیں جا سکے گا، جب سب روزہ دار اُس دروازہ سے داخل ہو جائیں گے تو وہ دروازہ بند ہو جائے گا۔

روزہ داروں کے فضائل

حدیث ۱۲۱۸:-

وعن أبي سعيد الخدری (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْماً فی سَبِيلِ اللهِ إلاَّ بَاعَدَ اللهُ بِذَلِكَ الْيَوْمِ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ کے راستہ (یعنی جہاد) میں بھی روزہ رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اُس ایک دن کی وجہ سے جہنم سے ستّر سال دور کر دیں گے۔

حدیث ۱۲۱۹:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) عن النبیِ ﷺ قَالَ: ((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ إيمَاناً وَاحْتِسَاباً، غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ))

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے رمضان کے روزے ایمان کی حالت میں اور احتساب کی کیفیت کے ساتھ رکھے (احتساب یعنی اللہ تعالیٰ سے اجر وثواب کی امید رکھتے ہوئے) تو اس کے پچھلے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

حدیث ۱۲۲۰:-

وعنه (رضی اللہ عنہ) أنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: ((إِذَا جَاءَ رَمَضَانُ، فُتِحَتْ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ، وَغُلِّقَتْ أَبْوَابُ النَّارِ، وَصُفِّدَتِ الشَّيَاطِينُ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ حضوراکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب رمضان کا مہینہ آتا ہے تو جنّت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں (یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیکیوں کی توفیق عام ہو جاتی ہیں) اور جہنم کے دروازے بند کر دئے جاتے ہیں (اسی وجہ سے بہت سے لوگ جو عام دنوں میں گناہوں کے عادی ہوتے ہیں وہ بھی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کر لیتے ہیں) اور شیطانوں کو بیڑیوں میں جکڑ دیا جاتا ہے (یعنی قید کر دیا جاتا ہے، اس کے باوجود بھی جو تھوڑے بہت گناہ ہو جاتے ہیں وہ دراصل سال بھر کے گناہوں کا اثر ہوتا ہے۔)

حدیث ۱۲۲۱:-

وعنه أنَّ رسول اللهﷺ قَالَ: ((صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ غُبِيَ عَلَيْكُمْ، فَأَكْمِلُوا عِدَّةَ شَعْبَانَ ثَلاَثِينَ)) متفقٌ عَلَيْهِ، وهذا لفظ البخاري.

وفي رواية لمسلم: ((فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَصُومُوا ثَلاَثِينَ يَوْماً)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رمضان کا چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور شوال کا چاند دیکھ کر افطار کرو، اگر انیتس کو چاند نظر نہ آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔

بَابُ الْجُوْدِ وَفِعْلِ الْمَعْرُوْفِ وَالْإِكْثَارِ مِنَ الْخَيْرِ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ وَالزِّيَادَةِ مِنْ ذٰلِكَ فِي الْعَشْرِ الْأَوَاخِرِ مِنْهُ

رمضان کے مہینہ میں نیکی کے کام اور سخاوت کی کثرت ہونی چاہئے۔
خاص طور پر رمضان کے آخری عشرہ میں اور زیادہ ترقی ہونی چاہئے

حدیث ۱۲۲۲:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) قَالَ: كَانَ رسول الله ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ، وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ ، وَكَانَ جِبْرِيلُ يَلْقَاهُ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ ، فَلَرَسُولُ الله ﷺ حِيْنَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ أَجْوَدُ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ الْمُرْسَلَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، اور رمضان کے مہینہ میں جب حضرت جبرئیل (علیہ السلام) آکر نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ملتے تھے اس وقت آپ کی سخاوت میں اوراضافہ ہو جاتا تھا۔ اور رمضان کی ہر رات میں حضرت جبرئیل (علیہ السلام) آکر نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ملتے تھے اور قرآنِ پاک کا دور کرتے تھے۔ اور جب حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مال خرچ کرنے میں بادلوں اور پانی کو لانے والی ہواؤں سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔

افادات:–ویسے بھی جتنے کمال کے اوصاف ہوسکتے ہیں وہ تمام نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ اقدس میں پورے طور پر اور سب سے زیادہ موجود تھے۔ سخاوت بھی کمال کی ایک صفت ہے جو نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ بابرکات میں سب سے زیادہ تھی، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے کبھی کسی چیز کے متعلق انکار نہیں فرمایا، اگر آپ کے پاس وہ چیز ہوتی تو عنایت فرمادیتے ،ورنہ اس کا وعدہ فرمالیتے، یا اس آدمی سے یوں کہہ دیتے کہ کسی سے قرض لے لو بعد میں اس کی ادائیگی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

حضور اکرم ﷺ کی سخاوت کے نمونے

ایک مرتبہ ایک عورت نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اس نے لنگی کے لئے ایک کپڑا آپ کی خدمت میں پیش کیا اور یوں کہا :اے اللہ کے رسول! یہ میں نے اپنے ہاتھ سے تیّار کیا ہے تاکہ آپ کی خدمت میں پیش کروں ، لہٰذا آپ اسے قبول فرمایئے۔ آپ نے اس کو قبول فرمالیا اور اس وقت آپ کو اس کی ضرورت بھی تھی۔ روایت میں آتا ہے کہ اس وقت نبیٔ کریم ﷺ کے پاس کوئی دوسرا کپڑا نہیں تھا۔ چناں چہ آپ اپنے دولت کدہ پر تشریف لے گئے، اور جب دوبارہ واپس تشریف لائے تو اسی کو پہنے ہوئے تھے،جب آپ مجلس میں آکر تشریف فرما ہوئے تو ایک صحابی اس کو ہاتھ لگا کر دیکھنے لگے اور کہا: اے اللہ کے رسول !یہ تو بڑا اچھا کپڑا ہے، مجھے عنایت

فرمادیجئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ چناں چہ آپ دوبارہ اُس مجلس سے اُٹھے، مکان میں تشریف لے گئے، اور وہاں سے آپ نے وہ کپڑا نکال کر تہہ کرکے ان کے پاس بھیج دیا۔ حضورِ اکرم ﷺ کے تشریف لے جانے کے بعد تمام صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اُن صحابی کو تنبیہ کی کہ تم بھی عجیب آدمی ہو، یہ چیز ایسے موقع پر آئی تھی کہ نبیٔ کریم ﷺ کو اس کی سخت ضرورت تھی، اسی لیے آپ نے فوراً اپنی ضرورت کے لئے اس کو استعمال بھی فرمایا، اور تم نے اسی کو مانگ لیا؟ حالاں کہ تم کو معلوم ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ ہے کہ آپ کبھی انکار نہیں فرماتے۔

ایک مرتبہ بحرین سے مال آیا جس میں نوے ہزار درہم تھے، آپ نے وہ سارا مال مسجد کے صحن میں ڈلوا دیا اور اس کو تقسیم کرنا شروع کیا، شام ہونے سے پہلے وہ سارے دراہم تقسیم کردئے، ایک پائی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ نبیٔ کریم ﷺ کی سخاوت کا یہ عالم تھا۔ اسی کو فرمایا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے۔

آپ ﷺ کے پَرنواسے کے متعلق شاعر کی گواہی

عرب کا ایک بہت بڑا شاعر فرزدق گزرا ہے، اس نے امام زین العابدین حضرت علی بن حسین بن علی (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت حسین (رضی اللہ عنہ) کے صاحب زادے اور اکابرِ تابعین میں سے ہیں، ان کی شان میں ایک قصیدہ کہا ہے۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ آپ بیت اللہ کے طواف کے لئے تشریف لائے،

لوگوں کا مجمع تھا، اس وقت خاندانِ بنوامیہ کا ایک شہزادہ بھی وہاں موجود تھا، لیکن اس کی آمد پر کسی نے کوئی جگہ خالی نہیں کی، اور جب امام زین العابدین آئے تو لوگ ہٹ گئے اوران کو راستہ دے دیا، انھوں نے بڑے اطمینان سے طواف کیا۔ کسی نے شہزادے سے پوچھا: یہ کون ہیں ؟ حالاں کہ وہ جانتا تھا لیکن حسد کی وجہ سے اُس نے یہ جواب دیا کہ میں نہیں جانتا۔ فرزدق شاعر بھی وہاں موجود تھا اُس نے ان کی شان میں برجستہ ایک قصیدہ کہا جس میں ان کے اوصاف بیان کئے اور کہا کہ یہ وہ ہیں کہ جن کو حل بھی جانتا ہے اور حرم بھی جانتا ہے، انہیں میں ایک شعر یہ بھی ہے:

مَا قَالَ لَا قَطُّ إِلَّا فِيْ تَشَهُّدِهٖ ۞ لَوْلَا التَّشَهُّدُ لَكَانَتْ لَاۤئُهٗ نَعَمْ

انہوں نے سوائے کلمۂ شہادت کے اپنی زبان سے کبھی ”لا“ (یعنی ”نا“) نہیں کہا۔ اس میں لا الٰہ الاّ اللہ میں ”لا“ آتا ہے، اگر یہ کلمۂ شہادت نہ ہوتا تو ان کی زبان پر ”لا“ آتا ہی نہیں ۔ تو گویا نبیٔ کریم ﷺ کی سخاوت کا بھی یہ عالم تھا کہ کبھی کسی چیز کا انکار نہیں فرمایا۔

نبیٔ کریم ﷺ کا ہر رمضان کا معمول

رمضان المبارک کی ہر رات میں حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ قرآنِ پاک کا دَور کرتے تھے، حضرت جبرئیل حضور ﷺ کو قرآن سناتے تھے اور حضور ﷺ حضرت جبرئیل کو سناتے تھے، اور یہ معمول ہر رمضان کا تھا۔ ہمارے یہاں عام طور پر رمضان کے مہینہ میں حفاظ کے دَور کا

جورواج ہے وہ بھی نبیٔ کریم ﷺ سے ثابت ہے، اور آپ ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں یہ دَور دو مرتبہ ہوا۔

حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) سے آپ ﷺ کی سرگوشی

آپ ﷺ جب مرض الوفات میں تھے تو حضرت فاطمہ (رضی اللہ عنہا) آپ ﷺ کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئیں، حضور اکرم ﷺ نے سرگوشی کے انداز میں ان کے کان میں ایک بات کہی جس کو سن کر وہ رونے لگیں، ان کو روتا ہوا دیکھ کر نبیٔ کریم ﷺ نے پھر کوئی بات ارشاد فرمائی جس کو سن کر وہ ہنسنے لگیں۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے بعد میں ان سے پوچھا کہ حضور نے کیا فرمایا تھا؟ انھوں نے کہا کہ وہ ایک راز کی بات ہے، میں نہیں بتاؤں گی۔ حضور اکرم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے اپنے اُس تعلق اور رشتہ کا حوالہ دے کر جو حضور ﷺ کے ساتھ تھا پھر پوچھا کہ اب تو بتلاؤ۔ توانہوں نے کہا کہ: اب بتلاتی ہوں، پہلی مرتبہ حضور اکرم ﷺ نے سرگوشی فرماتے ہوئے فرمایا تھا کہ ہر سال حضرت جبرئیل (علیہ السلام) میرے ساتھ قرآنِ پاک کا ایک دَور کرتے ہیں، لیکن اس سال دو مرتبہ دَور کیا، اس سے میں یہ سمجھا ہوں کہ میری موت کا وقت اب قریب آگیا ہے، یہ سن کر میں رونے لگی تھی، میرا رونا دیکھ کر نبیٔ کریم ﷺ نے دوبارہ ایک بات ارشاد فرمائی، اب اس سلسلہ میں دو روایتیں ہیں کہ کیا فرمایا تھا، ایک روایت میں تو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: تم جنّت کی عورتوں کی سردار ہوگی۔

اور دوسری روایت میں یہ آیا ہے کہ: میرے گھر والوں میں سب سے پہلے تم مجھ سے آکر ملو گی، یعنی یہ جدائی کا زمانہ زیادہ طویل اور لمبا نہیں ہے؛ تو وہ سن کر میں ہنسنے لگی تھی۔

اور جس زمانہ میں حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نبی کریم ﷺ سے ملاقات کرتے تھے تو آپ ﷺ کی سخاوت انتہائی درجہ کو پہنچ جاتی تھی، آپ ﷺ مال خرچ کرنے میں بادلوں اور پانی کو لانے والی ہواؤں سے بھی زیادہ سخی ہو جاتے تھے۔ یعنی جو ہوا بادلوں کو اٹھا کر لے جاتی ہے اور لوگوں کے لئے سیرابی کا سامان مہیا کرتی ہے اور گھر بیٹھے لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتی ہے؛ اس سے بڑی سخاوت اور کیا ہو سکتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سخاوت اس سے بھی زیادہ ہو جایا کرتی تھی۔

روایت کا سبق

یہاں تو اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ عام حالت میں بھی نبی کریم ﷺ سخاوت فرماتے ہی تھے، لیکن رمضان میں سخاوت کا سلسلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ لہٰذا ایک مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہئے کہ نبی کریم ﷺ کی اتباع اور پیروی میں رمضان کے مہینہ میں سخاوت کا خوب اہتمام کرے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سال بھر ہاتھ روکے رکھے، جیسا کہ بعض لوگ کرتے ہیں کہ سال بھر کچھ نہیں دیتے، اگر کوئی سائل آ بھی گیا تو کہتے ہیں کہ ہم ابھی نہیں دیتے، رمضان میں آنا۔ آپ ﷺ کے یہاں سال بھر بھی سخاوت کا سلسلہ رہتا تھا اور رمضان میں تو بہت بڑھ جاتا تھا۔

اور بعض لوگ اپنی زکوٰۃ بھی رمضان ہی میں دیتے ہیں، حالاں کہ مسئلہ یہ ہے کہ سال پورا ہونے سے پہلے پہلے زکوٰۃ پوری ادا ہو جانی چاہیے۔ ہاں! اگر آپ کا سال رمضان میں پورا ہوتا ہے تو بات دوسری ہے۔ اور بعض لوگ صرف زکوٰۃ پر ہی اکتفا کرتے ہیں یہ بھی درست نہیں ہے، سخاوت صرف زکوٰۃ تک ہی محدود نہیں ہونی چاہیے، اس لیے کہ زکوٰۃ تو فرض ہے، اس کے علاوہ نفل کے طور پر بھی خوب خرچ کرنا چاہیے۔

اس سے بڑی حماقت کیا ہو گی؟

اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دی ہے اس کو جتنا خرچ کرے کم ہے، اور جتنا خرچ کرے گا وہ اُسی کے لئے کار آمد ہو گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے اور اس کو خرچ کرنے کا اختیار بھی دیا ہے تو اپنی زندگی ہی میں خرچ کر لیجئے، جب آپ دنیا سے رخصت ہو جائیں گے تو یہ مال آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گا، پھر خرچ کرنے کا اختیار آپ کے ہاتھ میں نہیں رہے گا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ اپنے ہاتھ میں اختیار ہے اُس وقت خرچ نہ کرنا اور بعد میں دوسروں سے توقع رکھنا؛ اس سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ جب اپنے ہاتھ میں اختیار ہوتا ہے اس وقت تو لوگ خرچ کرتے نہیں، اور یوں سوچتے ہیں کہ ہمارے بعد بچے ہمارے لئے خرچ کریں گے، حالاں کہ جب آپ نے خود اپنے ہاتھ سے خرچ کیا نہیں، تو دوسرا آپ کے لیے کیا خرچ کرے گا؟

اور رمضان میں صرف مال خرچ کرنا ہی نہیں بلکہ ہر نیکی کے کام میں اضافہ ہونا چاہیے۔ تلاوت، ذکر، تسبیحات، نوافل اور نیکی کے کام جتنے بھی ہوسکتے ہیں ان تمام نیکی کے کاموں میں رمضان میں اضافہ ہونا چاہیے۔ رمضان کا مہینہ یوں سمجھئے کہ نیکی کے کاموں کو انجام دینے کا سیزن اور موسم ہے، اس لئے اس میں زیادہ سے زیادہ نیکیوں کا اہتمام کیا جائے۔

حدیث ۱۲۲۳:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسول الله ﷺ إِذَا دَخَلَ العَشْرُ أَحْيَى اللَّيْلَ، وَأَيْقَظَ أَهْلَهُ، وَشَدَّ الْمِئْزَرَ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ رمضان کا جب آخری عشرہ آتا تو نبی کریم ﷺ پوری رات بیدار رہتے تھے اور اپنے گھر والوں کو بھی جگاتے تھے اور لنگی باندھ لیتے تھے۔

افادات:- یعنی عبادات میں بہت زیادہ مجاہدہ اور مشقت سے کام لیتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخری عشرہ میں ان چیزوں کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔

باب النهي عن تقدم رمضان بصوم بعد نصف شعبان إلاّ لمن وصله بما قبله، أو وافق عادة له بأن كان عادته صوم الإثنين والخميس فوافقه

نصف شعبان کے بعد رمضان سے پہلے روزے رکھنے کا ناپسندیدہ ہونا

عنوان کا خلاصہ

اگر کوئی آدمی شعبان کے شروع سے روزہ رکھتا چلا آیا ہے تب تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے اور کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن نصف شعبان کے بعد رمضان سے پہلے کوئی روزہ نہ رکھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ روزہ اس کے لئے کمزوری کا باعث ہو اور اس کے نتیجہ میں رمضان کے روزوں کی ادائیگی میں کچھ کمی اور کوتاہی ہو جائے۔ البتہ اگر اس کی عادت ہے، مثلاً: ہر ہفتہ میں پیر یا جمعرات کا روزہ رکھنے کی عادت ہے، تو پندرہ شعبان کے بعد جتنے پیر اور جمعرات آئیں گے اس میں وہ روزہ رکھے گا۔ یا مثلاً: ہر مہینہ کی اسلامی ۲۰، ۲۱، ۲۲ تاریخ کو روزہ رکھنے کی عادت ہے؛ تو شعبان کی بھی ۲۰، ۲۱، ۲۲ کو روزہ رکھے گا۔ یا اگر پچھلے رمضان کے روزوں کی قضا باقی ہے اور ابھی تک ان کی قضا کرنے کی نوبت نہیں آئی ہے اور آگے پھر دوسرا رمضان آرہا ہے، تو پندرہ شعبان کے بعد رمضان شروع ہونے سے پہلے بھی قضا روزے رکھ سکتا ہے، اور اگر ایسی کوئی وجہ نہیں ہے تو پھر روزہ رکھنے سے منع کیا گیا ہے، اور یہ ممانعت تحریمی نہیں ہے۔

شریعت کے حدود کی رعایت ضروری ہے

حدیث ۱۲۲۴:-

عن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((لاَ يَتَقَدَّمَنَّ أَحَدُكُم رَمَضَانَ بِصَوْمِ يَوْمٍ أَوْ يَوْمَيْنِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ رَجُلٌ كَانَ يَصُومُ صَومَهُ، فَلْيَصُمْ ذَلِكَ اليَوْمَ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی رمضان سے ایک دو دن پہلے روزے نہ رکھے، البتہ اگر وہ اُس دن روزہ رکھنے کا پہلے سے عادی ہو (مثلاً جمعرات اور جمعہ کا روزہ رکھتا ہے، یا پیر اور منگل کا روزہ رکھتا ہے، اور رمضان سے پہلے یہی دو دن آگئے) تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

حدیث ۱۲۲۵:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((لاَ تَصُومُوا قَبْلَ رَمَضَانَ، صُومُوا لِرُؤْيَتِهِ، وَأَفْطِرُوا لِرُؤْيَتِهِ، فَإِنْ حَالَتْ دُونَهُ غَيَايَةٌ فَأَكْمِلُوا ثَلاثِينَ يَوْماً)) (رواه الترمذي، وقال: ((حديث حسنٌ صحيح)).

((الغَيَايَةُ)) بالغين المعجمة وبالياءِ المثناةِ من تحت المكررةِ، وهي: السحابة.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رمضان سے (ایک دو دن) پہلے روزہ مت رکھو، (رمضان کا) چاند دیکھ کر روزہ رکھو، اور (عید کا) چاند دیکھ کر افطار کرو۔ اگر انتیس کو چاند نظر نہیں آیا، بادل بیچ میں رکاوٹ بن گیا، تو پھر تیس کی گنتی پوری کرو۔

حدیث ۱۲۲۶:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((إِذَا بَقِيَ نِصْفٌ مِنْ شَعْبَانَ فَلَا تَصُومُوا)) (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب شعبان کا آخری نصف باقی رہ جائے تو روزہ مت رکھو۔

افادات:- رمضان سے ایک دو دن پہلے روزہ رکھنے سے جو منع کیا گیا ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شریعت نے رمضان کے روزے انیتس یا تیس متعین کر دیئے ہیں، شریعت نے اس کے لئے جو مقدار متعین کی ہے اُس میں زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ جیسے: فجر کی دو رکعتیں فرض ہیں، اب اگر کوئی آدمی فجر کی دو رکعت فرض کے بجائے چار پڑھنا چاہے تو نہیں پڑھ سکتا۔ اسی طریقہ سے رمضان کا مہینہ انیتس یا تیس کا ہو گا، اگر دو دن پہلے سے روزے شروع کرے گا تو مہینہ سے بڑھ جائیں گے، اس لیے منع کیا ہے۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ یہ اہلِ کتاب کی پرانی عادت تھی اس سے بھی منع کرنا مقصود ہے جیسا کہ آگے آئے گا۔ لہٰذا شریعت نے جو حدود اور بورڈر مقرر کئے ہیں ان کی پوری رعایت ضروری ہے۔

روزوں کے سلسلہ میں شریعت نے ایک مقدار اور کمیت یعنی تعداد مقرر کی ہے اس میں بھی کوئی ایسی شکل اختیار کرنا جس کی وجہ سے تعداد کے اندر زیادتی ہو، شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی ہے۔ اسی لیے رمضان سے ایک دو دن پہلے سے روزہ رکھنے کو منع فرمایا ہے۔ ہاں ! اگر عادت ہے

جیسا کہ اوپر بتلایا گیا تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ اسی طرح رمضان ختم ہونے کے بعد تو عید ہی ہے، اور عید کا روزہ شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ دونوں طرف پابندی لگادی، گویا رمضان کی جو تعداد مقرر کی ہے اس میں نہ تو کمی ہونی چاہیے اور نہ زیادتی ہونی چاہیے۔ یہ بات تو کمیت کے اعتبار سے ہوئی۔

اور کیفیت کے اعتبار سے بھی یہی حکم ہے، جیسا کہ آگے آئے گا کہ افطار جتنا جلدی ہو وہ پسندیدہ ہے، اگر سورج غروب ہو گیا تو اب روزہ کھولنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ تو یہاں بھی دیکھیے کہ روزہ کا ایک وقت مقرر تھا تو اس کو زیادہ لمبانے کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ اسی طرح سحری میں جتنا لیٹ کرو کہ بالکل روزہ شروع ہونے سے پہلے پہلے سحری پوری کرو؛ وہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ تو روزہ کا جو وقت متعین کیا گیا ہے اس میں اُدھر بالکل اخیر میں کھائیں اور اِدھر فوراً افطار کرلیں، گویا جتنا وقت شریعت نے دیا ہے اتنا ہی استعمال کرنا اچھا ہے۔

اپنی مرضی پر چلنے کا نام عبادت نہیں

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ سارے جو احکامات دیئے گئے ہیں اور ان چیزوں کی جو تاکید کی گئی ہے وہ دراصل دین کے معاملہ میں غلو سے بچنے کے لیے ہے کہ دین کے معاملہ میں حد سے آگے بڑھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس لیے آپ ایسا مت کیجئے کہ آدھی رات کو سحری کرکے سو گئے اور روزہ بجائے ایک دن کا رکھنے کے ڈیڑھ دن کا رکھنے لگے۔ یہ صحیح طریقہ نہیں ہے۔ ایک تو یہ ہے کوئی آدمی اپنی سستی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے کہ رات کو ہی کھا کر سو جاتا ہے، تو اس میں گناہ تو نہیں ہے لیکن

پسندیدہ طریقہ بھی نہیں ہے۔اور اگر کوئی آدمی ضروری سمجھ کر ایسا کرے گا تو گنہ گار ٹھہرے گا۔ لہٰذا شریعت دین کے معاملہ میں غلو کی اجازت نہیں دیتی۔اس لیے کہ عبادت نام ہے اللہ اور رسول کے حکم کو بجالانے کا۔اپنی مرضی کے اوپر چلنے کا نام عبادت نہیں ہے۔

یوم الشک کے روزہ کا بیان

حدیث ۱۲۲۷:-

وعن أَبِي اليقظان عمارِ بن يَاسِرٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ: مَنْ صَامَ اليَوْمَ الَّذِي يُشَكُّ فِيهِ، فَقَدْ عَصَى أَبَا القَاسِمِ ﷺ. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: ((حديث حسن صحيح))

ترجمہ:- حضرت عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ جس نے یوم الشک کا روزہ رکھا اس نے ابو القاسم یعنی نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی نافرمانی کی۔

افادات:- یوم الشک یعنی شعبان کی تیسویں تاریخ کہ اس سے اگلی شب میں چاند نظر آنے کے امکانات تھے لیکن بادل ہونے کی وجہ سے چاند نظر نہیں آیا، ہو سکتا ہے کہ چاند ہوا ہو، اور نہ بھی ہوا ہو۔ تو چوں کہ چاند نظر نہیں آیا اس لیے رمضان شروع نہیں ہوا، لیکن شعبان کا تیسواں دن ہے اس کے متعلق یہ بھی احتمال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ پہلی رمضان ہو، ایسے موقع پر بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ احتیاط کے طور پر رکھ لو؛ تو شریعت نے اس سے منع کر دیا ہے۔ جب بادل کی وجہ سے چاند نظر نہیں

آیا اور رمضان ثابت نہیں ہوا؛ تو احتیاط کیسا؟ جب رمضان آیا ہی نہیں تو دل میں رمضان کا خیال رکھ کر روزہ کیوں رکھتے ہو؟ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہی یوم الشک کا روزہ کہلاتا ہے۔

ہاں! اگر آپ کی عادت کا دن ہے، مثلاً آپ ہر پیر کو روزہ رکھتے ہیں اور آج پیر ہے تو وہ روزہ رکھ سکتے ہیں۔ یا آپ پکی نفل کی نیت کرتے ہیں (ڈاوانڈول اور تذبذب والی بات نہیں کہ اگر اعلان ہو گیا تو رمضان کا ہو جائے گا، ورنہ نفل تو کہیں گیا ہی نہیں؛ تو اس کی تو اجازت نہیں ہے) اور دل میں دوسرا ارادہ بالکل بھی نہ ہو؛ یہی لوگ خواص کہلاتے ہیں اور انہیں کو روزہ رکھنے کی اجازت ہے۔ فقہ کی کتابوں میں خواص کی تعریف یہی کی گئی ہے کہ جو اپنی نیت پر کنٹرول رکھ سکتا ہو تو وہ روزہ رکھ سکتا ہے۔ اور جس کے دل میں ڈاوانڈول اور تذبذب ہو تو اس کو اس دن روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ویسے مسئلہ یہ ہے کہ بعد میں جا کر کہیں سے گواہی آگئی اور ثابت ہو گیا کہ یہ دن پہلی رمضان کا ہے تو ان لوگوں نے جو نفل روزہ رکھا تھا اور ان کی پکی نیت نفل کی ہی تھی؛ ان کا وہ روزہ رمضان ہی کا ہو جائے گا۔ لیکن نیت میں ڈاوانڈول اور تذبذب والے آدمی کو روزہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔

باب مَا یقال عند رؤیة الهلال

چاند دیکھ کر کیا پڑھنا چاہیے؟

پہلے بھی بتلایا تھا کہ شریعت نے ہر موقع پر دعاؤں کا اہتمام کرایا ہے، تاکہ آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے، مکان میں داخل ہو رہا ہے تو دعا۔ نکل رہا ہے تو دعا۔ بازار میں جا رہا ہے تو دعا۔ سونے لگا تو۔ بیدار ہوا تو۔ بیت الخلاء میں جا رہا ہے تو۔ باہر نکلا تو۔ ایک حالت سے دوسری حالت میں جہاں جہاں تبدیلی پیدا ہو رہی ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور متوجہ ہونے کی تاکید کی جا رہی ہے۔ یہ تو آدمی کے ذاتی حالات کی بات تھی۔ لیکن جہاں غیر اختیاری حالات ہیں جیسے اوقات کی تبدیلی ہوتی ہے، مثلاً: رات ختم ہوئی اور دن نکلا تو یہ دعا پڑھ لو، دن ختم ہوا اور رات آئی تو یہ دعا پڑھ لو۔ اور یہ تو دن و رات کی بات تھی، اگر ایک مہینہ ختم ہوا اور دوسرا نیا مہینہ شروع ہوا تو کہا گیا ہے کہ یہ دعا پڑھ لو۔ گویا ہر موقع پر بندہ کا اللہ تعالیٰ سے ربط و تعلق رہنا چاہیے۔ ان مسنون دعاؤں کے ذریعہ سے نبیٔ کریم ﷺ نے ایک بندہ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مستقل طور پر جوڑ دیا ہے۔ جب کوئی آدمی ان دعاؤں کا سمجھ کر اہتمام کرے گا تو ان معانی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا رہے گا۔ یہاں رمضان کا بیان چل رہا تھا اسی مناسبت سے یہ عنوان قائم کیا ہے کہ چاند دیکھ کر کیا دعا پڑھنی چاہیے۔ یہ دعا رمضان کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ ہر چاند کے موقع پر پڑھی جائے گی۔

حدیث ۱۲۲۸:-

عن طلحة بن عبيدِ الله (رضی اللہ عنہ) أنَّ النبيَّ ﷺ كَانَ إِذَا رَأَى الهِلاَلَ قَالَ: ((اللَّهُمَّ أَهِلَّهُ عَلَيْنَا بِالأَمْنِ وَالإِيمَانِ وَالسَّلاَمَةِ وَالإِسْلاَمِ، رَبِّي وَرَبُّكَ اللهُ، هِلَالُ رُشْدٍ وَخَيْرٍ)) (رواه الترمذي، وقال: ((حديث حسن))

ترجمہ:- حضرت طلحہ بن عبید اللہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ جب پہلا چاند دیکھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے: اے اللہ! اس چاند کو ہمارے اوپر طلوع کر اور روشن کر امن اور ایمان کے ساتھ۔ سلامتی اور اسلام کے ساتھ۔ اور (چاند کو خطاب کیا جارہا ہے کہ) میرا اور تیرا رب اللہ ہے۔ (چوں کہ کچھ لوگ وہ بھی ہیں جو چاند کی پوجا کرتے ہیں تو اس موقع پر توحید کا تقاضہ یہ بھی تھا کہ اس کے معبود نہ ہونے کا اعلان کر دیا جائے کہ تو عبادت کے لائق نہیں ہے، بلکہ تیرا اور میرا مالک و پروردگار اللہ تعالیٰ ہے۔ اور اے اللہ) یہ چاند (میرے لیے) ہدایت اور بھلائی والا بن کر طلوع ہو۔

افادات:- اب جس مہینہ کے شروع میں امن وامان، سلامتی واسلام ہدایت اور خیر و بھلائی کی دعا مانگی گئی ہو؛ تو ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اثرات سے ضرور مالامال کریں گے۔ ہم لوگ اپنی تمام چیزوں میں ہر طرح کا اہتمام کرتے ہیں لیکن نبی کریم ﷺ کی بتلائی ہوئی دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے۔ حالاں کہ یہ بڑی اہم دعا ہے، اگر مہینہ کے شروع میں یہ عامانگ لی، تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ اس دعا کی برکات ضرور ظاہر ہوں گی اور آدمی کو امن و سلامتی اور خیر و بھلائی اور ہدایت نصیب ہو گی۔

باب فضل السحور وتأخيره مَا لَمْ يخش طلوع الفجر

سحری کی فضیلت۔

جب تک کہ صبحِ صادق کے طلوع ہو جانے کا ڈر نہ ہو وہاں تک سحری کو مؤخر کرنا۔

برکت والا کھانا۔

حدیث ۱۲۲۹:-

عن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((تَسَحَّرُوا، فَإِنَّ فِي السُّحُورِ بَرَكَةً)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سحری کھاؤ، اس لیے کہ سحری میں برکت ہے۔

افادات:- سحری کو برکت والا کھانا کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو آدمی بغیر سحری کھائے روزہ رکھے گا تب بھی روزہ تو ہو جائے گا، لیکن ہو سکتا ہے کہ بغیر سحری کے روزہ رکھنے کی صورت میں کمزوری لاحق ہو، اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں رکاوٹیں پیدا ہوں، اس لیے کہ اگر سحری کھالیں گے تو دن بھر قوت رہے گی، اور اللہ تعالیٰ کے احکامات پورے کرنے میں کمزوری رکاوٹ نہیں بنے گی، اور یوں اس کی برکت کا ظہور ہو گا۔

دوسرا یہ کہ بعض لوگ بھوک کی وجہ سے دوسروں پر گرم ہوجاتے ہیں ان کا مزاج بگڑ جاتا ہے، اب اگر سحری کرلیں گے تو مزاج کے بگڑنے سے حفاظت ہوگی۔

تیسری بات یہ ہے کہ جب سحری کے ارادہ سے اٹھیں گے تو اللہ تعالیٰ دوچار رکعات پڑھنے کی بھی توفیق دیں گے، اس بہانہ سے تہجد بھی ہوجائے گی، اور کچھ نہ کچھ دعا بھی ہوجائے گی۔ پھر اگر اس موقع پر کوئی غریب مسکین آجائے گا تو اس کے ساتھ بھلائی کرتے ہوئے دوچار لقمہ میں اس کو بھی شریک کرلیں گے تو صدقہ کا ثواب بھی مل جائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ اس کے طفیل میں بہت ساری بھلائیاں ہوجائیں گی اس لیے اس کو برکت والا کھانا کہا گیا ہے۔

حدیث ۱۲۳۰:-

وعن زيدِ بن ثابتٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: تَسَحَّرْنَا مَعَ رسولِ اللهِ ﷺ ثُمَّ قُمْنَا إِلَى الصَّلَاةِ. قِيلَ: كَمْ كَانَ بينهما؟ قَالَ: قَدْرُ خَمْسِينَ آيَةً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت زید بن ثابت (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ سحری کھائی، پھر ہم نماز کے لیے اٹھے۔ پوچھا گیا کہ: تمہاری سحری اور نماز کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ تو جواب دیا کہ: قرآنِ پاک کی پچاس آیتوں کی مقدار (گویا دس پندرہ منٹ)

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ سحری بالکل آخری وقت میں کھائی جائے، اور اس میں وہی حکمت ہے جو اوپر بیان کی کہ روزہ میں زائد وقت لگنے نہ پائے

حدیث ۱۲۳۱:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) قَالَ: كَانَ لرسولِ الله ﷺ مُؤَذِّنَانِ؛ بِلَالٌ وَابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ، فَقَالَ رسول الله ﷺ: ((إِنَّ بِلالاً يُؤَذِّنُ بِلَيْلٍ، فَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يُؤَذِّنَ ابْنُ أُمِّ مَكْتُومٍ)) قَالَ: وَلَمْ يَكُنْ بَيْنَهُمَا إِلاَّ أَنْ يَنْزِلَ هَذَا وَيَرْقَى هَذَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے دو موٴذن تھے، ایک حضرت بلال اور دوسرے حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رضی اللہ عنہما)۔ حضور اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ: بلال رات میں اذان دیتے ہیں (یعنی ان کی اذان ایسے وقت میں ہوتی ہے کہ صبح صادق نہیں ہوئی ہوتی، اس لیے ان کی اذان سن کر کھانا پینا بند کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ) کھاتے پیتے رہو یہاں تک کہ ابن ام مکتوم اذان دیں۔ اس روایت کے ناقل حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ دونوں کی اذان میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا تھا کہ ایک اذان دے کر اترتا تھا اور دوسرا چڑھتا تھا۔

افادات:- حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) صبح صادق کو دیکھ کر اندازہ سے اذان دیتے تھے اور عبداللہ ابن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) چوں کہ نابینا تھے اس لیے جب تک لوگ بار بار کہہ کر ان کو اذان دینے کے لیے تیار نہ کرتے تھے وہاں تک وہ اذان نہیں دیتے تھے، اس لیے حقیقی صبح صادق ہونے کے بعد ہی عبداللہ بن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) کی اذان ہوتی تھی۔

ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزہ میں فرق

حدیث ۱۲۳۲:-

وعن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((فَصْلُ مَا بَيْنَ صِيَامِنَا وصِيَامِ أَهْلِ الكِتَابِ، أَكْلَةُ السَّحَرِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:–حضرت عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمارے اور اہل کتاب کے روزے میں سحری کھانے کا فرق ہے۔

افادات:–وہ سحری نہیں کھاتے اور ہم سحری کھاتے ہیں۔ پچھلی مجلس میں بتلادیا تھا کہ ان کے یہاں رات میں جیسے ہی آدمی کی آنکھ لگ جاتی تھی اور روزہ شروع ہو جاتا تھا، شروع اسلام میں بھی یہی حکم تھا، بعد میں یہ حکم ختم ہو گیا۔

باب فضل تعجیل الفطر وَمَا یفطر عَلَیۡہِ وَمَا یقوله بعد الإفطار

رمضان سے متعلق فضائل کا سلسلہ چل رہا تھا آج جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ایک بات تو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جب افطار کا وقت ہو جانے کا یقین ہو جائے تو فوراً افطار کر لینا چاہیے اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ اور دوسری بات یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کون سی چیز سے افطار کرنا مستحب اور پسندیدہ ہے۔ اور تیسری بات یہ کہ افطار کے بعد کون سی دعا پڑھنی چاہیے۔

لوگ بھلائی میں رہیں گے

حدیث ۱۲۳۳:-

عن سهل بن سعد (رضی اللہ عنہ) أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیۡرٍ مَا عَجَّلُوا الفِطۡرَ)) (متفقٌ عَلَیۡهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد ساعدی (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تک لوگ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے تب تک بھلائی میں رہیں گے۔

حدیث ۱۲۳۴:-

وعن أَبِي عطِیَّة قَالَ: دَخَلۡتُ أنَا وَمَسۡرُوقٌ عَلَى عائشة (رضی اللہ عنہا) فَقَالَ لَهَا مَسۡرُوق: رَجُلَانِ مِنۡ أَصۡحَابِ مُحَمَّدٍ ﷺ كِلَاهُمَا لا یَأۡلُو عَنِ الخَیۡرِ؛ أَحَدُهُمَا یُعَجِّلُ المَغۡرِبَ وَالإِفۡطَارَ، وَالآخَرُ یُؤَخِّرُ المَغۡرِبَ وَالإِفۡطَارَ؟

فَقَالَتْ: مَنْ يُعَجِّلُ المَغْرِبَ وَالإِفْطَارَ؟ قَالَ: عَبْدُ اللهِ - يعني: ابن مسعود - فَقَالَتْ: هٰكَذَا كَانَ رسولُ اللهِ يَصْنَعُ. قَوْله: ((لا يَأْلُو)) أَيْ: لَا يُقَصِّرُ فِي الخَيْرِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:-ابو عطیہ تابعی کہتے ہیں کہ میں اور حضرت مسروق حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس حاضر ہوئے، حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے حضرت مسروق نے عرض کیا: نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے دو آدمی ایسے ہیں جو بھلائی اور نیکی کو حاصل کرنے کے معاملہ میں ذرّہ برابر کوتاہی سے کام نہیں لیتے (گویا نیکی کرنے کے لیے ہر وقت تیار اور ریڈی رہتے ہیں، دونوں کا مزاج تو یہی ہے) لیکن دونوں میں سے ایک مغرب اور افطار میں جلدی کرتے ہیں، اور دوسرے دیر کرتے ہیں۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے پوچھا: وہ کون ہیں جو مغرب اور افطار میں جلدی کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں کہا: حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ)۔ تو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: نبی کریم ﷺ بھی اسی طرح کرتے تھے۔

شریعت میں دخل اندازی نہ کریں

افادات:-سورج کے غروب ہو جانے کا یقین ہوتے ہی جب افطار کرلیا کریں گے وہاں تک بھلائی میں رہیں گے۔ گذشتہ مجلس میں بھی بتلادیا تھا کہ شریعت کی طرف سے روزہ کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا ہے کہ روزہ صبح صادق سے شروع ہوتا ہے اور غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے، تو شریعت یہ چاہتی کہ یہ وقت جو مقرر کیا گیا ہے اس میں روزہ رکھنے والوں کی طرف سے زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے اگر کوئی آدمی اپنی سہولت کی وجہ سے آدھی رات کو سحری کھا کر سوگیا تو روزہ میں کوئی

اشکال نہیں ، لیکن پھر بھی شریعت کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ بالکل آخری وقت میں سحری کی جائے اس پر اجر وثواب زیادہ ملے گا۔

اسی طرح سے روزہ کا وقت غروب آفتاب پر ختم ہوتا ہے تو جیسے ہی آفتاب کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو اب افطار میں دیر نہیں کرنی چاہیے، جتنا جلدی افطار کریں گے اتنا ثواب زیادہ ملے گا،اس لیے اب افطار کرنے میں دیر کرنا ایک طرح کا غلو ہے ،اور میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جہاں شریعت کے احکام پر عمل کی شریعت کی طرف سے تاکید کی گئی ہے،وہیں ایک مزاج یہ بھی بنایا گیا ہے کہ ان احکام پر عمل کے معاملہ میں بندے اپنی طرف سے کوئی چیز نہ بڑھائیں۔ہم یوں سوچیں کہ سورج ڈوب گیا پھر بھی پندرہ منٹ اگر ٹھہر جائیں تو اس میں کیا حرج ہے،تو گویا اللہ تعالیٰ نے روزہ کا جو وقت مقرر کیا تھا اس میں ہم نے اپنی طرف سے پندرہ منٹ کا اضافہ کر دیا، گویا ہمارا یہ طرز شریعت میں ایک طرح کی دخل اندازی کہلاتی ہے،اس لیے اس کو پسند نہیں کیا ہے۔

یہ غلو ہے

اسی لیے دیکھو کہ وضو کے اندر بھی حکم یہ ہے کہ اعضاء تین تین مرتبہ دھوئے جائیں گے، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو آدمی ان کو تین سے زیادہ مرتبہ دھوئے گا تو اس نے گویا شریعت کی مقرر کی ہوئی حد سے تجاوز کیا"فقد تعدیٰ وظلم" اس نے زیادتی کی اور ظلم کیا۔حالاں کہ تین میں

ایک مرتبہ اگر اضافہ کیا تو اس میں تو کمال پیدا ہونا چاہیے، لیکن شریعت کہتی ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے، جب آپ کے لیے ایک حد مقرر کی گئی ہے تو آپ اپنی طرف سے ایک مرتبہ بڑھا کیوں رہے ہیں۔ دین پر عمل کے معاملہ میں ہم اپنی طرف سے کچھ اضافہ کرنا چاہیں تو یہ ایک طرح کا غلو شمار کیا گیا ہے۔

چار پانچ منٹ احتیاط کی جائے

روزہ کے وقت کے متعلق شریعت کی طرف سے جو تحدید کی گئی ہے کہ فلاں وقت شروع ہوتا ہے اور فلاں وقت ختم ہوتا ہے، آپ اس کا جتنا زیادہ اہتمام کریں گے اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ اسی لیے سحری میں جتنا لیٹ کیا جائے گا اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا اور سورج کے غروب ہو جانے کا یقین ہونے کے بعد افطار میں جتنی جلدی کی جائے گی اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ ہاں! یہ بات ضرور ہے کہ آفتاب کے غروب ہو جانے کا پورا پورا یقین ہونا چاہیے، اگر ہم نے اپنی آنکھوں سے آفتاب کو ڈوبتے ہوئے دیکھا ہے تب تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس صورت میں تو فوراً افطار کر لیجئے اور اگر آنکھوں سے غروب ہوتے ہوئے نہیں دیکھا ہے بلکہ اوقات کے سلسلہ میں جو ٹائم ٹیبل چھپے ہوئے ہیں ان پر اعتماد کیا جا رہا ہے، تو چوں کہ وہ ایک حسابی چیز ہے اور حساب میں انیس بیس ہو سکتا ہے، اور ساتھ ساتھ اس کی بنیاد گھڑی پر ہے، اور گھڑیاں بھی آگے پیچھے ہوا کرتی ہیں، اس لیے جو وقت ٹائم ٹیبل میں لکھا ہوا ہے، اس میں چار پانچ منٹ احتیاط کی جائے۔

مسجد کی گھڑی ریڈیو ٹائم پر رکھیے

پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اپنی گھڑی کا ٹائم درست رکھنے کا اہتمام کرنا بھی ضروری ہے، خاص کر کے رمضان کے دنوں میں تو بہت ہی ضروری ہے۔ ہمارے حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے فضائلِ رمضان کا تتمہ جو "اکابر کا رمضان" سے مشہور ہے اس میں حضرت رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کے حالات میں لکھا ہے کہ روزانہ طلوع اور غروب کے وقت لوگوں کو دیکھنے کے لیے بھیجتے تھے تاکہ گھڑی کا وقت صحیح رہے۔ جب آفتاب نکل رہا ہو تو اس کو دیکھ کر ٹائم ٹیبل میں طلوع کا جو وقت لکھا ہو وہی وقت گھڑی میں بھی لگا دیا جائے تاکہ وہ گھڑی اس کے مطابق رہے۔ تو ایک بات تو یہ ہے گھڑی کو درست رکھنے کا اہتمام کرنا ضروری ہے، اس لیے مسجدوں کے ذمہ دار چاہے وہ امام ہوں یا متولی ہوں، ان کو چاہئے کہ گھڑیوں کا وقت درست رکھنے کا خاص اہتمام کریں۔ اس کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے، بہت سی جگہوں پر دیکھا گیا کہ مسجد کی گھڑی پانچ پانچ منٹ آگے پیچھے ہوتی ہیں جس کی وجہ سے بہت گڑبڑ ہو جاتی ہے، اور کبھی وقت سے پہلے اذان دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ تو پہلی بات تو یہ ہوئی کہ آپ اپنی گھڑی کے وقت کو بالکل ریڈیو ٹائم پر رکھیے۔

تقویم کے استعمال کا طریقہ

دوسری بات یہ ہے کہ تقویم میں جو وقت لکھا گیا ہے تو چوں کہ وہ حسابی چیز ہے اس لیے اس پر تین یا پانچ منٹ کا اضافہ کرلیجئے۔ یہ دو چیزیں ضرور ہونی چاہئیں۔ بعض لوگوں کو اصرار ہوتا ہے کہ ٹائم ٹیبل میں وقت چھپا ہوا ہے اس میں بھی اضافہ کیوں کریں تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایک ٹائم ٹیبل تو سحری اور افطاری کا ہوتا ہے جو رمضان میں الگ سے شائع ہوتا ہے، اس میں تو احتیاط کی ہوئی ہی ہوتی ہے، اس میں جو وقت بتایا ہوا ہوتا ہے اسی وقت پر عمل کرلیا جائے، ٹائم ٹیبل بنانے والے نے خود ہی اس میں پہلے سے احتیاط کرلی ہے، اس لیے آپ کو مزید احتیاط کرنے کی ضرورت نہیں ہے، مگر یہ اسی وقت جب کہ آپ کی گھڑی بالکل درست ہو۔ لیکن نمازوں کے لیے جو ٹائم ٹیبل بنائے ہوئے ہیں اس میں غروب آفتاب کا جو وقت لکھا ہوا ہے اس کو آپ دیکھ رہے ہیں تو پھر اس سے پانچ منٹ بعد افطار کیجئے، اور سحری میں اس وقت سے دس منٹ پہلے فارغ ہو جایئے، احتیاط اسی میں ہے۔ لیکن اگر کسی کی گھڑی بالکل ٹھیک ہے اور عام ٹائم ٹیبل کے مطابق افطار کرتا ہے تو ہم روزہ خراب ہونے کا فتویٰ نہیں دیں گے، ہاں! احتیاط کا حکم ضرور دیں گے۔ باقی ان دونوں چیزوں کا یعنی گھڑی کے صحیح رکھنے کا اور احتیاط کا بھی اہتمام نہایت ضروری ہے۔

لطیفہ

ہمارے الحاج بھائی عبد الحفیظ صاحب منیار زید مجدہم جو ٹائم ٹیبل تیار کرتے ہیں اور ساری دنیا میں بھیجتے رہتے ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ لطیفہ سنایا جو سننے کے قابل ہے۔ انہوں نے کہا کہ کسی زمانہ میں مَیں نے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ گھوم پھر کر دیکھوں کہ سورت کی مسجدوں میں اذان تیار کیے ہوئے ٹائم ٹیبل کی ہدایات کے مطابق دی جاتی ہے یا نہیں، لہٰذا روزانہ الگ الگ مسجد میں مغرب کی نماز ادا کرتا تھا۔ ایک دن ایک مسجد میں پہنچا اور وہ مسجد بالکل ساحل دریائے تاپتی پر تھی جہاں سے غروبِ آفتاب صاف نظر آتا تھا۔ مؤذن صاحب نے مغرب کی اذان دینی شروع کی، تو میں نے ان سے کہا کہ مؤذن صاحب! ابھی وقت نہیں ہوا ہے۔ تو مؤذن صاحب مجھے کہنے لگے کہ: ٹائم ٹیبل دیکھو، اور گھڑیال دیکھو۔ میں نے ان سے کہا کہ: جناب وہ دیکھو! ابھی تو سورج نظر آرہا ہے (اصل میں مسجد کی گھڑی آگے تھی) جب انہوں نے سورج دیکھا تو خاموش ہو گئے۔ اس لیے گھڑی کو بھی صحیح رکھنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔

خیر! میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ جب سورج کے غروب ہونے کا یقین ہو جائے تو اب افطار میں تاخیر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اب تو جتنا جلدی افطار کرلیں گے اتنی ہی فضیلت آپ کو زیادہ حاصل ہوگی۔

ڈیڑھ دن کا روزہ میرے بس کا نہیں

اور افطار میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ہمارے حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ''اکابر کا رمضان'' ہی میں ایک واقعہ لکھا ہے، بطور لطیفہ سنا دیتا ہوں۔ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) کے والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) تھے جنہوں نے حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) کی بہت خدمت کی تھی، حضرت حکیم الامت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کو ان سے بڑی بے تکلّفی تھی، ایک مرتبہ وہ تھانہ بھون ملاقات کے واسطے مہمان بن کر تشریف لے گئے، رمضان کا مہینہ تھا، حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے پوچھا: آپ سحری کب کرتے ہیں؟ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے پوچھا: آپ کب کرتے ہیں؟ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا: مَیں تو صبحِ صادق سے ایک گھنٹہ پہلے کرتا ہوں۔ حضرت مولانا یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا: بھائی! ڈیڑھ دن کا روزہ تو میرے بس کا نہیں ہے (ایک گھنٹہ پہلے جو سحری کرلی جائے اس کو حضرت نے مزید آدھے دن سے تعبیر کیا) اس لیے کہ مَیں تو ایسے وقت سحری کرتا ہوں کہ دن بھر شک ہوتا رہے کہ روزہ ہوا بھی یا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بالکل آخری وقت میں سحری کرتا ہوں۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: دیکھو! ہم ایک کام کرتے ہیں، آپ کچھ اوپر آیئے اور مَیں کچھ نیچے اترتا ہوں۔ چناں چہ یہ طے ہوا کہ صبحِ صادق سے آدھا گھنٹہ پہلے سحری شروع کریں گے، تاکہ اپنے وقت پر اطمینان سے ختم ہو جائے۔ پھر جب افطار کے لئے بیٹھے تو (جیسا کہ آگے روایت آرہی ہے کہ جب پورب کی طرف سے رات آتی ہوئی نظر آئے اور پچھم کی طرف سورج غروب ہو جائے؛

تو افطار کا وقت ہو گیا) حضرت مولانا یحییٰ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے آسمان کی طرف دیکھا اور افطار شروع کر دیا۔ جب مولانا یحییٰ صاحب نے کھانا شروع کیا تو حضرت کے جو خدّام ساتھ تھے انہوں نے بھی افطار شروع کر دیا۔ اِدھر حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے یہاں کچھ احتیاط رہتی تھی، اس لیے کچھ وقت انتظار کر کے افطار کیا جاتا تھا، جب حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کھانا شروع نہیں کیا تو حضرت کے خدّام بھی انتظار میں بیٹھے رہے، حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے دیکھا کہ سب میرے انتظار میں ہیں تو تھوڑی دیر کے بعد فرمایا کہ: اگر ہم اپنے وقت کے مطابق افطار کرنے جائیں گے تو یہاں تو کچھ بچنے کا ہے نہیں؛ چلو! شروع کرو۔

خلاصہ یہ ہے کہ غروبِ آفتاب کا یقین ہو جائے تو آدمی کو افطار میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

عند اللہ محبوب بندہ

حدیث ۱۲۳۵:-

وعن أَبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((قَالَ اللهُ -عز وجل- أَحَبُّ عِبَادِي إِلَيَّ أَعْجَلُهُمْ فِطْراً))

(رواه الترمذي، وقال: ((حديث حسن))

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (حدیثِ قدسی ہے) میرے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب میرے نزدیک وہ ہے جو جلدی افطار کرنے والا ہو۔

افادات:- جلدی افطار کا مطلب یہ نہیں کہ غروبِ آفتاب سے پہلے افطار کر لے بلکہ غروبِ آفتاب کے بعد افطار میں دیر نہ کرے۔

حدیث ۱۲۳۶:-

وعن عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((إِذَا أَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هاهُنَا، وَأَدْبَرَ النهارُ مِنْ هَاهُنَا، وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ، فَقَدْ أَفْطَرَ الصَّائِمُ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے پورب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب رات اُدھر سے آجائے اور پچھم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ دن اِدھر سے چلا جائے اور سورج ڈوب جائے تو روزہ دار کے لئے افطار کا وقت ہو گیا۔

افادات:- یعنی پچھم کی طرف جب سورج ڈوبتا ہے تو فوراً مشرقی کنارہ پر سیاہی یعنی رات آنا شروع ہو جاتی ہے، تو اب روزہ دار افطار کے وقت میں داخل ہو گیا، لہٰذا اس کو فوراً افطار کر لینا چاہیے۔

اب افطار کا وقت آگیا

حدیث ۱۲۳۷:-

وعن أَبِي إبراهيم عبدِ اللهِ بنِ أَبِي أوفى (رضی اللہ عنہما) قَالَ: سِرْنَا مَعَ رسولِ اللهِ ﷺ وَهُوَ صَائِمٌ، فَلَمَّا غَرَبَتِ الشَّمْسُ، قَالَ لِبَعْضِ القَوْمِ: ((يَا فُلَانُ انْزِلْ فَاجْدَحْ لَنَا))، فَقَالَ: يَا رسول الله، لَوْ أَمْسَيْتَ؟ قَالَ: ((انْزِلْ

فَاجْدَحْ لَنَا)) قَالَ: إِنَّ عَلَيْكَ نَهَاراً، قَالَ: ((انْزِلْ فَاجْدَحْ لَنَا)) قَالَ: فَنَزَلَ فَجَدَحَ لَهُمْ فَشَرِبَ رسولُ الله ﷺ ثُمَّ قَالَ: ((إِذَا رَأَيْتُمُ اللَّيْلَ قَدْ أَقْبَلَ مِنْ هاهُنَا، فَقَدْ أَفْطَرَ الصّائِمُ)) وَأَشَارَ بِيَدِهِ قِبَلَ الْمَشْرِقِ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

قَوْله: ((اجْدَحْ)) بِجيم ثُمَّ دال ثُمَّ حاءٍ مهملتين أيْ: اخْلِطِ السَّوِيقَ بِالْمَاءِ

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن اوفیٰ (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں گئے اس وقت آپ ﷺ روزہ سے تھے، جب سورج ڈوب چکا تو آپ ﷺ نے کسی سے کہا (دوسری روایت میں ہے کہ حضرت بلال (رضی اللہ عنہ) سے کہا: اے بلال!) اترو اور ہمارے لئے ستّو گھولو (تاکہ ہم افطار کرلیں) تو جن صحابی سے کہا تھا انھوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ابھی ذرا ٹھہر جایئے۔ حضور ﷺ نے پھر سے فرمایا: اترو اور ستّو گھولو۔ ان صحابی نے پھر سے عرض کیا: ابھی تو دن ہے (یعنی اجالا بہت ہے) تو حضور ﷺ نے فرمایا: اترو اور ستّو گھولو۔ چناں چہ وہ اترے اور ستّو کو پانی میں ڈال کر تیار کیا اور نبیٔ کریم ﷺ نے اس کو پیا، پھر فرمایا: جب تم دیکھو کہ رات اِدھر (یعنی پورب کی طرف) سے آگئی تو روزہ دار کے لئے افطار کا وقت آگیا (گویا اور زیادہ اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جب سورج ڈوب گیا تو فوراً افطار کرلینا چاہیے۔)

ستو بنانے کی ترکیب (Recipe)

افادات:۔ستّو یعنی گیہوں کو آگ میں بھون لیا جاتا ہے اس کے بعد اس کو بڑا بڑا ہی پیس ڈالتے ہیں، پھر پانی میں ڈال کر نرم بنا کر پی لیتے ہیں، بعض لوگ اور زیادہ مرغوب بنانے کے لئے اس میں شکر

یا شہد ڈال لیتے ہیں۔ لیکن حدیث میں جس ستّو کا ذکر آتا ہے وہ تو وہی ہے جس کو پکانے کی بھی ضرورت نہیں ،بس! بھونے ہوئے گیہوں کو پیس ڈالتے ہیں اور اُسی کو پانی میں بھِگا کر پی لیا جاتا ہے، ؛اسی کو ستّو کہا جاتا ہے۔عام طور پر عرب لوگ سفر کے توشہ کے طور پر ستّو ہی رکھتے تھے۔

اس روایت میں بھی یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے افطار کے لئے جب ستّو گھولنے کا حکم دیا اور صحابی جواب میں یہ عرض کر رہے ہیں کہ اور کچھ وقت گزرنے دیا جائے ،تو آپ ﷺ نے زیادہ انتظار نہیں فرمایا، غروب کے بعد جلدی سے افطار فرمالیا۔

کھجور پانی سے افطار کی حکمت

حدیث ۱۲۳۸:-

وعن سلمان بن عامر الضَّبِّيِّ الصحابی (رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ ﷺ قَالَ ((إِذَا أَفْطَرَ أَحَدُكُمْ، فَلْيُفْطِرْ عَلَى تَمْرٍ، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ، فَلْيُفْطِرْ عَلَى مَاءٍ؛ فَإِنَّهُ طَهُورٌ)) (رواه أبو داود والترمذی، وقال: ((حديث حسن صحيح))

ترجمہ:- حضرت سلمان بن عامر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی افطار کرنا چاہے ہے تو کھجور سے افطار کرے۔ اور اگر کھجور موجود نہ ہو تو پانی سے افطار کرے کہ پانی پاک کرنے والا ہے۔

افادات:- بعض حضرات نے اس کی یہ حکمت بتلائی ہے کہ بھوکا رہنے کی وجہ سے آدمی کی بینائی ذرا کمزور سی ہونے لگتی ہے، اور میٹھے کی خاصیت یہ ہے کہ وہ بینائی کو تیز کرتا ہے اس لئے کھجور سے افطار کرنے کا حکم دیا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ عرب میں عام طور پر کھجور آسانی سے میسر ہو جاتی تھی اس لئے نبیٔ کریم ﷺ نے کھجور سے افطار کرنے کا حکم دیا، اور اگر کھجور میسر نہ ہو تو پانی تو ہر ایک کو میسر ہوتا ہی ہے۔

چوں کہ عنوان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ کونسی چیز سے افطار کیا جائے، اسی مناسبت سے یہ روایت لائے ہیں

رطب، تمر، پانی

حدیث ۱۲۳۹:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رسولُ الله ﷺ يُفْطِرُ قَبْلَ أَنْ يُصَلِّيَ عَلَى رُطَبَاتٍ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ رُطَبَاتٌ فَتُمَيْرَاتٌ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تُمَيْرَاتٌ حَسَا حَسَوَاتٍ مِنْ مَاءٍ. (رواه أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ مغرب کی نماز پڑھنے سے پہلے تازہ کھجوروں سے افطار فرماتے تھے۔ اور اگر تازہ کھجور نہیں ہوتی تھی، تو پھر عام کھجور سے افطار فرماتے تھے، اور اگر کھجوریں بھی نہ ہوتیں تو چند گھونٹ پانی نوش فرما کر افطار فرمالیتے تھے۔

افادات:- رطب یعنی تازہ کھجوریں جو نرم ہوتی ہیں۔ جب کھجوریں پکتی ہیں تو اندر سے بالکل نرم ہوتی ہیں، وہی رطب کہلاتی ہیں، اوران کو اس وقت ڈبّے میں بند نہیں کیا جاتا ہے، اگر اس وقت فوری طور پر ڈبّے میں بند کر دیں تو وہ خراب ہو جائیں گی، اس لیے ان کو کھلیان میں ڈال دیتے ہیں، جیسے: ہمارے یہاں گیہوں کاٹ کر اس کی بالیاں کھلیان میں ڈالتے ہیں، پھر اس پر بیل چلا کر دانے اور بھوسے کو الگ کرتے ہیں۔ تو جیسے کسان لوگ کھلیان بناتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ تازہ کھجوروں کو اتارنے کے بعد کھلیان میں ڈالتے ہیں اور کچھ مدّت تک وہیں رہنے دیتے ہیں، وہاں پڑے پڑے وہ ایسی ہو جاتی ہیں کہ اندر کی نرمی ختم ہو جاتی ہے، اور عام طور پر حاجی لوگ وہی کھجوریں لاتے ہیں؛ اُس کو عربی میں تمر کہتے ہیں۔ اور شروع میں جو تازہ کھجوریں ہوتی ہیں وہ رطب کہلاتی ہیں۔ بہر حال! اگر تازہ کھجور ہو تو عام کھجور کے مقابلہ میں اسی کو ترجیح حاصل ہوگی، اور اگر تازہ کھجور نہیں ہے تو عام کھجور سے افطار کرنا چاہیے، اور اگر یہ بھی نہ ہو تو پانی سے افطار کیا جائے، یا پھر کھانے کی کوئی بھی چیز ہو اس کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بَابُ أمْرِ الصَّائِمِ بِحِفْظِ لِسَانِهِ وَجَوَارِحِهِ عَنِ الْمُخَالَفَاتِ وَالْمُشَاتَمَةِ وَنَحْوِهَا

روزہ دار کو چاہیے کہ اپنی زبان اور دیگر تمام اعضاء کو آپس کے جھگڑوں اور گالی گلوچ وغیرہ سے محفوظ رکھے

پہلے بھی بتلایا تھا کہ اصل روزہ تو صبحِ صادق سے لے کر غروبِ آفتاب تک تین چیزوں (کھانے پینے اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت) سے بچنے کا نام ہے اور نیت بھی روزہ کی ہو تو وہ شرعی روزہ کہلائے گا۔

روزہ کے آداب

اب یہاں بتلانا چاہتے ہیں کہ اس روزہ کے آداب اور لوازمات میں سے یہ بھی ہے کہ روزہ دار جہاں کھانے پینے اور بیوی سے صحبت سے اپنے آپ کو بچا رہا ہے، حالاں کہ کھانا پینا اور اپنی بیوی کے ساتھ صحبت کرنا عام دنوں میں اور روزہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں حلال ہے، تو پھر حرام چیزوں سے تو بطریقۂ اولیٰ بچانا چاہیے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ روزہ دار کو چاہیے کہ اپنی زبان کی حفاظت کرے۔

گالی گلوچ ،غیبت ، تہمت ،بہتان،اور لایعنی یعنی گپ شپ وغیرہ یہ تمام ایسی چیزیں ہیں جو روزہ کے تقاضوں کے خلاف ہیں، بعض لوگ صرف گپ شپ کو ہی روزہ گزارنے کا ذریعہ بناتے ہیں، حالاں کہ ایسی تمام باتیں زبان سے نہیں نکالنی چاہئیں ،بلکہ زبان سے تو اللہ کا ذکر ہونا چاہیے، تسبیحات ، تلاوت میں مشغول رہے۔دوسری چیز آنکھوں کی حفاظت ہے۔ جن چیزوں کو دیکھنے سے منع کیا گیا ہے،ان سے اپنی آنکھوں کی حفاظت کرے،یاان کو دیکھنا جائز تو ہے لیکن ان کو دیکھنے میں کوئی فائدہ نہیں ہے، تو ایسی چیزوں کو دیکھنے سے بھی اپنے آپ کو بچائے۔اسی طریقہ سے غلط چیزوں کے سننے سے کان کی حفاظت کرنا،جیسا کہ پہلے بھی بتلادیا تھا کہ بعض لوگ ٹائم پاس کرنے کے لئے روزہ کی حالت میں ٹی وی دیکھتے ہیں، گانا سنتے ہیں، یا اس طرح کی دوسری چیزوں میں مشغول رہتے ہیں، تو اگرچہ فرض تو ادا ہو جائے گا لیکن اس سے روزہ کا اصل ثواب ختم ہو جائے گا۔

حدیث ۱۲۴۰:-

عن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ : ((إِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ أَحَدِكُمْ، فَلاَ يَرْفُثْ وَلاَ يَصْخَبْ، فَإِنْ سَابَّهُ أَحَدٌ أَوْ قَاتَلَهُ، فَلْيَقُلْ: إِنِّي صَائِمٌ))(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو، تو وہ نہ تو فحش بات کرے،اور نہ شور و شغب کرے۔اگر کوئی دوسرا اس کے ساتھ گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرے، تو اس سے کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔

افادات:۔ مجھے تیرے ساتھ گالی گلوچ اور جھگڑا کرنے کی فرصت نہیں ہے۔ بلکہ علماء نے لکھا ہے کہ اگر وہ نہیں مانتا تو اپنے جی سے کہے کہ تو روزہ سے ہے، تجھے اس کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"رفث" یعنی ایسا کلام جس میں شہوت ابھارنے والی یا بیوی سے صحبت وغیرہ سے متعلق باتیں ہوں۔

حدیث ۱۲۴۱ :۔

وعنه، قَالَ : قَالَ النبيُّ ﷺ : ((مَنْ لَمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّورِ وَالعَمَلَ بِهِ فَلَيْسَ للهِ حَاجَةٌ فِي أَنْ يَدَعَ طَعَامَهُ وَشَرَابَهُ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی (روزہ کی حالت میں) جھوٹ اور غلط کام (جن کی شریعت میں اجازت نہیں ہے) نہ چھوڑے؛ تو ایسے آدمی کی اللہ کو کوئی ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

افادات:۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس کے روزے کی کوئی پرواہ نہیں ہے، کیوں کہ روزہ کا مقصد تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے، جب آدمی اللہ تعالیٰ کی حلال کی ہوئی چیزوں سے اپنے آپ کو بچا رہا ہو، تو حرام چیزوں سے تو اور زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔

بَاب فِيْ مَسَائِل مِنَ الصَّوْم

روزے کے چند مسائل

بھول سے کھا پی لے تو؟

حدیث ۱۲۴۲:-

عن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا نَسِيَ أَحَدُكُمْ، فَأَكَلَ، أَوْ شَرِبَ، فَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ، فَإِنَّمَا أَطْعَمَهُ اللهُ وَسَقَاهُ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں کا کوئی آدمی بھول جائے کہ میرا روزہ ہے، اور اس نے بھول سے کچھ کھا پی لیا؛ تو اپنا روزہ پورا کرلے (مطلب یہ ہے کہ بھول سے کھانے پینے کی وجہ سے روزہ نہیں ٹوٹا) دراصل اللہ تعالیٰ نے اس کو کھلایا اور پلایا ہے۔

افادات:- اگر کسی کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ اس کا روزہ ہے، اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ بھول سے کھا رہا ہے تو اس کو یاد دلانا چاہیے یا نہیں؟ تو اگر کسی کے متعلق آپ کا یہ خیال ہے کہ وہ روزہ کی وجہ سے کمزور ہو چکا ہے، اس لیے یہ کچھ کھا لے تو ہی اچھا ہے، تو اس صورت میں آپ یاد نہ دلایئے، بلکہ اس کو کھا لینے دیجئے۔ بعد میں اس سے کہہ دو کہ آپ کا روزہ ہے۔ اور اگر آپ کا خیال یہ

ہے کہ اس کو روزہ کی وجہ سے کوئی کمزوری نہیں آئے گی تو شروع ہی میں بتادیجئے تاکہ وہ کھانے سے بچارہے۔

بحالتِ روزہ کلی اور ناک میں پانی ڈالنے کا طریقہ

حدیث ۱۲۴۳:-

وعن لَقِيط بن صَبِرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قُلْتُ: يَا رسول الله، أَخْبِرْنِى عَنِ الوُضُوءِ؟ قَالَ: ((أَسْبِغِ الوُضُوءَ، وَخَلِّلْ بَيْنَ الأَصَابِعِ، وَبَالِغْ فِى الاِسْتِنْشَاقِ، إِلاَّ أَنْ تَكُونَ صَائِماً)) رواه أبو داود والترمذى، وقال: ((حديث حسن صحيح)).

ترجمہ:- حضرت لقیط بن صبرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے وضو کے متعلق بتلایئے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وضو پورے طور پر کرو، اور انگلیوں کا خلال بھی کرو، اور ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ سے کام لو؛ مگر یہ اس وقت جبکہ تم روزہ سے نہ ہو۔

افادات:- اسباغ کا معنیٰ ہے وضو میں تمام اعضاء کو آداب و سنن اور مستحبات کی رعایت کرتے ہوئے پورے اطمینان سے اچھی طرح سے دھونا۔

ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ سے کام لینا یعنی جب ناک میں پانی چڑھاؤ تو اچھی طرح سانس سے اندر کھینچو تاکہ ناک کا بانسے اور نرم حصہ تک پانی پہنچ جائے، مگر یہ اس وقت جبکہ روزہ نہ ہو، اس لیے کہ روزہ کی حالت میں اگر اتنا زیادہ کھینچو گے کہ پانی حلق تک پہنچ جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اسی

لئے لکھاہے کہ ویسے تو جنابت کے غسل میں غرغرہ کرنا چاہیے، لیکن روزہ کی حالت میں آدمی اگر غسل کرے تو غرغرہ نہ کرے۔

بحالتِ جنابت روزہ شروع کرنا

حدیث ۱۲۴۴:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسول الله ﷺ يُدْرِكُهُ الفَجْرُ وَهُوَ جُنُبٌ مِنْ أَهْلِهِ، ثُمَّ يَغْتَسِلُ وَيَصُومُ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو فجر ایسی حالت میں پالیتی تھی کہ آپ کو غسل کی ضرورت ہوتی تھی (یعنی آپ اپنے اہل سے صحبت کئے ہوئے تھے) اس کے بعد آپ غسل کرتے تھے اور روزہ بھی رکھے ہوئے ہوتے تھے۔

افادات:- صحبت کے سلسلہ میں آپ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپ رات کے آخری حصہ میں تہجد سے فارغ ہونے کے بعد صحبت کرتے تھے، اور وہی زیادہ نشاط کا وقت ہوا کرتا ہے، پھر لیٹ جاتے تھے، کبھی ایسا ہوتا تھا کہ صبحِ صادق ہوئی اور ابھی غسل کرنا ہے تو آپ غسل کرتے تھے، اور آپ کا روزہ بھی رہتا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ کی حالت میں غسل کی حاجت ہوگئی، یا رات کا غسل باقی تھا اور صبحِ صادق کے بعد وہ فرض غسل کیا، تو اس کی وجہ سے روزہ پر کوئی زد نہیں پڑے گی، روزہ اپنی جگہ صحیح ہو جائے گا۔

حدیث ۱۲۴۵:-

وعن عائشة وأم سلمة (رضی اللہ عنہما) قالتا: كَانَ رسول الله ﷺ يُصبحُ جُنُباً مِنْ غَيْرِ حُلُمٍ، ثُمَّ يَصُومُ. متفقٌ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ اور حضرت امِّ سلمہ (رضی اللہ عنہما) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ بغیر احتلام کے جنابت کی حالت میں صبح کرتے تھے، پھر روزہ بھی رکھتے تھے۔

افادات:- بغیر احتلام کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیویوں کے ساتھ صحبت کے نتیجہ میں آپ ﷺ کو غسل کی ضرورت پیش آتی تھی اور صبح ہو جاتی تھی تو پھر آپ ﷺ غسل فرماتے تھے اور روزہ بھی رکھتے تھے۔

معلوم ہوا کہ جس کو غسل کی حاجت ہو، تو صبحِ صادق کے بعد غسل کرنے کی وجہ سے روزہ پر کوئی آنچ نہیں آتی ہے، روزہ اپنی جگہ پر صحیح ہو جائے گا۔

بَاب فضلِ صوم المُحرم وشعبان والأشهر الحُرُم

محرم، شعبان اور اشہر حرم کے روزوں کی فضیلت

حدیث ۱۲۴۶:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((أَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ رَمَضَانَ: شَهْرُ اللهِ المُحَرَّمُ، وَأَفْضَلُ الصَّلَاةِ بَعْدَ الفَرِيضَةِ: صَلَاةُ اللَّيْلِ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رمضان کے روزوں کے بعد بہترین روزے اللہ تعالیٰ کے مہینہ محرم کے ہیں۔ اور فرض نمازوں کے بعد افضل نماز رات کی نماز (یعنی تہجد) ہے۔

حدیث ۱۲۴۷:-

عن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: لَمْ يكن النبی ﷺ يَصُومُ مِنْ شَهْرٍ أَكْثَرَ مِنْ شَعْبَانَ، فَإِنَّهُ كَانَ يَصُومُ شَعْبَانَ كُلَّهُ.

وفی رواية: كَانَ يَصُومُ شَعْبَانَ إِلَّا قَلِيلاً. متفقٌ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ شعبان سے زیادہ روزے کسی اور مہینہ میں نہیں رکھتے تھے، گویا (یوں کہا جاسکتا ہے کہ) پورے شعبان ہی روزے رکھتے تھے۔

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ شعبان میں روزے رکھتے تھے مگر تھوڑے ہی دن (ایسے ہوتے تھے کہ ان میں روزہ رکھا ہوا نہ ہوتا تھا)۔

ایک صحابی کے روزہ رکھنے کی ترتیب

حدیث ۱۲۴۸:-

وعن مُجِيبَةَ البَاهِلِيَّةِ، عن أبيها أَوْ عمها أنه أتى رسولَ اللهِ ﷺ ثُمَّ انطَلَقَ فَأَتَاهُ بَعْدَ سَنَةٍ-وَقَدْ تَغَيَّرَتْ حَالُهُ وَهيئَتُهُ- فَقَالَ: يَا رسولَ الله، أَمَا تَعْرِفُنِي؟ قَالَ: ((وَمَنْ أَنْتَ))؟ قَالَ: أَنَا البَاهِلِيُّ الَّذِي جِئْتُكَ عامَ الأَوَّلِ. قَالَ: ((فَمَا غَيَّرَكَ، وَقَدْ كُنْتَ حَسَنَ الهَيْئَةِ!)) قَالَ: مَا أَكَلْتُ طَعَاماً مُنْذُ فَارقْتُكَ إلاَّ بِلَيْلٍ. فَقَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((عَذَّبْتَ نَفْسَكَ!)) ثُمَّ قَالَ: ((صُمْ شَهْرَ الصَّبْرِ، وَيَوماً مِنْ كُلِّ شَهْرٍ)) قَالَ: زِدْنِي، فَإنَّ بِي قُوَّةً. قَالَ: ((صُمْ يَوْمَيْنِ)) قَالَ: زِدْنِي، قَالَ: ((صُمْ ثَلاثَةَ أَيَّامٍ)) قَالَ: زِدْنِي، قَالَ: ((صُمْ مِنَ الحُرُمِ وَاتْرُكْ، صُمْ مِنَ الحُرُمِ وَاتْرُكْ، صُمْ مِنَ الحُرُمِ وَاتْرُكْ)) وقال بأصابِعه الثَّلاثِ فَضَمَّهَا، ثُمَّ أَرْسَلَهَا. (رواه أبوداود)

وَ((شَهْرُ الصَّبْر)): رَمَضَان.

ترجمہ: حضرت مُجیبہَ باہلیہ اپنے والد یاچچاسے روایت کرتی ہیں کہ وہ نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، پھر روانہ ہوگئے۔ اس کے ایک سال کے بعد دوبارہ حاضر ہوئے تو ان کا حال وہیئت بالکل بدلی ہوئی تھی، انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ نبیٔ کریم ﷺ نے پوچھا: کون ہو؟ انہوں نے کہا: میں قبیلۂ باہلہ کا وہ آدمی ہوں جو ایک سال پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا (اب

نبی کریم ﷺ نے ان کو پہچان لیا اور) فرمایا: تمہیں ایسا کیا ہو گیا کہ تم بالکل بدل گئے، حالاں کہ تم تو بہت اچھی حالت میں تھے؟ انہوں نے کہا: جب سے آپ سے جدا ہوا ہوں (اس دن سے آج تک) سوائے رات کے میں نے کھانا نہیں کھایا (یعنی مسلسل روزہ رکھتے چلا آرہا ہوں) یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالا۔ پھر فرمایا: صبر کے مہینہ (یعنی رمضان کے) روزے رکھو، اور ان کے ساتھ ہر مہینہ میں صرف ایک دن روزہ رکھا کرو۔ انہوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! زیادہ کی اجازت دیجئے کہ مجھ میں قوت ہے۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر مہینہ میں دو روزے رکھو۔ انہوں نے کہا: اور زیادہ کی اجازت دیجئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہر مہینہ میں تین روزے رکھو۔ انہوں نے کہا: اور زیادہ کی اجازت دیجئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اشہر حرم میں روزے رکھو اور چھوڑو، اشہر حرم میں روزے رکھو اور چھوڑو، اشہر حرم میں روزے رکھو اور چھوڑو، اور آپ نے تین انگلیوں کو ملا کر بتایا پھر ان کو چھوڑ دیا۔

افادات:- تین انگلیوں کو ملا کر بتانے کا مطلب تو یہ تھا کہ اشہر حرم میں تین روزے رکھو۔ پھر ان کو چھوڑنے کا معنٰی یہ تھا کہ اسی طرح تین روزے چھوڑو، یعنی تین دن روزے رکھو اور تین دن چھوڑو۔

حاصل یہ نکلا کہ آپ ﷺ نے ان کو پورے رمضان کے روزوں کا حکم دیا اور سات مہینوں میں ہر مہینے میں تین تین روزے رکھنے کا فرمایا۔

اب اشہر حرم کے جو چار مہینے بچے، ان میں ہر مہینہ میں پندرہ (۱۵) دن روزے رکھو، لیکن یہ پندرہ دن مسلسل نہیں بلکہ تین تین دن کے فصل سے۔ اس حساب سے ان کے سالانہ نفلی روزے اکیاسی (۸۱) ہوں گے۔

نوٹ:- اشہر حرم چار ہیں: ذوقعدہ، ذوالحجہ، محرم اور رجب۔

باب فضل الصوم وغیرہ فی العشر الأول من ذی الحجة

ذی الحجہ کے پہلے دس دنوں میں روزہ اور دوسرے اعمال کی فضیلت

روزہ کے معاملہ میں ذی الحجہ کے پہلے دس دن سے مراد نو (۹) دن ہیں، اس لیے کہ دسواں دن توعید کا ہوتا ہے جس میں روزہ رکھنا حرام ہے، البتہ دوسرے اعمال کے لیے دسواں دن بھی شمار کیا جائے گا۔

حدیث ۱۲۴۹:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((مَا مِنْ أَيَّامٍ، العَمَلُ الصَّالِحُ فِيهَا أَحَبُّ إِلَى اللهِ مِنْ هٰذِهِ الأَيَّام)) يعني أيام العشر. قالوا: يَا رسولَ اللهِ! وَلاَ الجِهَادُ فی سَبيلِ اللهِ؟ قَالَ: ((وَلاَ الجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ، إِلاَّ رَجُلٌ خَرَجَ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ، فَلَمْ يَرْجِعْ مِنْ ذٰلِكَ بِشَيْءٍ)) (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی بھی دن میں اللہ تعالیٰ کو نیک عمل اتنا زیادہ پسند نہیں ہے جتنا ان دس دنوں میں پسند ہے، اوران دس دنوں سے مراد ذی الحجہ کے پہلے دس دن ہیں۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ کے راستہ میں جہاد بھی؟ (یعنی اور دنوں میں اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے پر بھی وہ ثواب نہیں ملے گا جو ان دس دنوں میں عملِ صالح پر ملتا ہے؟) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اور دنوں میں جہاد والا عمل بھی ان دنوں میں دوسرے اعمالِ صالحہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا، البتہ وہ آدمی جو اپنی جان

ومال کے ساتھ جہاد کے لئے نکلا اور کسی بھی چیز کو لے کر واپس نہیں آیا (یعنی جان ومال دونوں اللہ کے راستہ میں قربان کر دئے) اس کا مقام زیادہ بلند ہے۔

افادات:– اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ان دس دنوں میں جہاں اور اعمال کی فضیلت ہے وہیں روزہ بھی اپنی فضیلت رکھتا ہے۔ ویسے دوسری روایتوں میں ان دنوں کے روزے کی فضیلت آئی ہے۔ اور جیسا کہ بتلایا دسویں تاریخ چھوڑ کر باقی نو (۹) دنوں میں روزہ کا معاملہ رہے گا۔

بَابُ فَضْلِ صَوْمِ يَوْمِ عَرفَةَ وَعَاشُوْرَاء وَتَاسُوْعَاء

یومِ عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ اور محرم کی نویں اور دسویں تاریخ کے روزہ کی فضیلت

یومِ عرفہ یعنی ذی الحجہ کی نویں تاریخ۔ عاشوراء یعنی محرم کی دسویں تاریخ۔ اور تاسوعاء یعنی محرم کی نویں تاریخ۔

حدیث ۱۲۵۰:-

وعن أَبِي قتادة (رضي الله عنه) قَالَ: سُئِلَ رسول الله ﷺ عن صَومِ يَوْمِ عَرَفَةَ، قَالَ: ((يُكَفِّرُ السَّنَةَ المَاضِيَةَ وَالبَاقِيَةَ)) رواه مسلم

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے نویں ذی الحجہ کے روزہ کے متعلق پوچھا گیا کہ اس کی کیا فضیلت ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ روزہ گذشتہ سال اور آئندہ ایک سال کے لئے کفّارہ ہو جاتا ہے۔

افادات:- یعنی ایک دن کا روزہ رکھنے کی وجہ سے گذشتہ پورے سال کے گناہ بھی معاف ہوں گے اور آنے والے سال کے گناہ بھی معاف ہوں گے۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی بتلادیا تھا گناہوں سے مراد صغائر ہیں۔ بہر حال! اتنی بڑی فضیلت ہے کہ دو سال کے گناہوں کے لئے کفّارہ ہو جائے

گا۔اور بعض حضرات نے اس سے ایک نکتہ یہ بھی نکالا ہے کہ جس نے یوم عرفہ کا روزہ رکھ لیا تو گویا اس کو آئندہ سال کی زندگی کی بھی گارنٹی مل جاتی ہے۔

حدیث ۱۲۵۱:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) **أَنَّ رسولَ الله ﷺ صَامَ يَومَ عاشوراءَ وَأَمَرَ بِصِيامِهِ.** (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دسویں محرم کا روزہ رکھا اور اس دن روزہ رکھنے کا حکم بھی دیا۔

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ رمضان کے روزے فرض ہوئے اس سے پہلے دسویں محرم کا روزہ فرض تھا، اور جب رمضان کے روزے فرض ہوئے اس کے بعد دسویں محرم کے روزے کی فرضیت والا حکم ختم ہو گیا، لیکن سنّیت اور استحباب آج بھی باقی ہے۔ چناں چہ جب نبی کریم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے اس دن کا روزہ رکھا تھا اور اس کا حکم بھی دیا تھا۔ اس لیے اس روایت میں ”أَمَرَ“ سے اگر فرض مراد ہے تو اس کی فرضیت ختم ہو چکی ہے۔ اور ”أَمَرَ“ سے مراد استحباب والا حکم ہے تو وہ حکم آج بھی باقی ہے۔

حدیث ۱۲۵۲:-

وعن أَبِي قتادة (رضی اللہ عنہ) **أَنَّ رسول الله ﷺ سُئِلَ عَنْ صِيامِ يَوْمِ عَاشُوراءَ، فَقَالَ: ((يُكَفِّرُ السَّنَةَ المَاضِيَةَ))**

رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے دسویں محرم کے روزہ کے متعلق پوچھا گیا (کہ اس کی کیا فضیلت ہے؟) تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گذشتہ سال کے گناہوں کا کفّارہ ہو جائے گا۔

افادات:- یعنی ایک سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں اور عرفہ کے روزہ کے متعلق فرمایا تھا کہ دو سال کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔

دسویں محرم کے روزہ کے ساتھ ایک روزہ ملانے کا حکم

حدیث ۱۲۵۳:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) قَالَ: قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((لَئِنْ بَقِيتُ إِلَى قَابِلٍ لَأَصُومَنَّ التَّاسِعَ))

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے دسویں محرم کے روزہ کے متعلق فرمایا کہ: اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو نویں کا بھی روزہ رکھوں گا۔

افادات:- اسلام نے عبادات کے بھی طریقے بتلائے ہیں اس میں اس بات کا اہتمام کیا گیا ہے کہ عبادات میں بھی غیر قوموں کی مشابہت لازم نہ آنے پائے، تو چوں کہ یہود بھی دسویں محرم کا روزہ رکھتے تھے اور وہ صرف ایک دن کا روزہ رکھتے تھے تو صرف دسویں محرم کا روزہ رکھنے کی صورت میں ان کے ساتھ مشابہت لازم آتی تھی، اس لیے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کا بھی

روزہ رکھوں گا، تاکہ نو اور دس دو دن کے روزے ہو جائیں، اور ان سے ہمارا طریقہ الگ ہو جائے۔ اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ عبادات میں بھی ان کے ساتھ مشابہت والی کسی شکل کو بھی پسند اور گوارہ نہیں کیا گیا؛ تو اب جو گناہ کے کام ہیں ان میں ان کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا کتنا زیادہ خطرناک ہو گا!

بہر حال! حضور اکرم ﷺ نے ارادہ تو فرمایا لیکن جیسا کہ دوسری روایتوں میں ہے آئندہ سال آپ موجود نہیں رہے اس لیے نویں محرم کا روزہ رکھنے کی نوبت نہیں آئی، لیکن آپ ﷺ کے اسی ارشاد کی وجہ سے آج بھی یہی حکم ہے کہ دسویں تاریخ کے ساتھ نویں کا بھی رکھا جائے، اور اگر کوئی آدمی نویں تاریخ کا نہیں رکھ سکا اور اس نے دسویں کا روزہ رکھا تو پھر گیارہویں کا روزہ بھی ملا دیا جائے کہ نویں کا روزہ رکھنے کا جو مقصد تھا غیروں کی مشابہت سے بچنا، وہ گیارہویں کا روزہ رکھنے سے بھی حاصل ہو جائے۔ پھر بھی اگر کسی نے صرف دسویں پر اکتفا کر لیا تو اگرچہ اچھا نہیں ہے، لیکن جائز ہے۔

باب استحباب صوم ستة أيام من شوال

شوّال کے چھ دن کے روزوں کا مستحب ہونا

حدیث ۱۲۵۴:-

عن أَبِي أيوب (رضي الله عنه) أَنَّ رسولَ الله ﷺ قَالَ : ((مَنْ صَامَ رَمَضَانَ ثُمَّ أَتْبَعَهُ سِتًّا مِنْ شَوَّالٍ، كَانَ كَصِيَامِ الدَّهْرِ)) رواہ مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابوایوب انصاری (رضي الله عنه) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی رمضان کے روزے رکھے، اس کے بعد شوال کے چھ دن کے روزے رکھے؛ تو اس کو سال بھر یا ہمیشہ روزہ رکھنے کا ثواب ملے گا۔

افادات:- اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں نیک عمل کا ثواب کم سے کم دس گنا ملتا ہے۔ اب رمضان کا پورا مہینہ روزے رکھے تو دس گنا کے حساب سے دس مہینوں کا ثواب ملا، اور شوال کے چھ روزے رکھیں گے تو ان کا ساٹھ دن کا ثواب ملا، اس طرح کل بارہ مہینے ہو جائیں گے، اس طرح گویا پورے سال کے روزوں کا ثواب مل جائے گا۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے رکھنے میں یہ حکمت ہے۔

باب استحباب صوم الإثنين والخميس

پیر اور جمعرات کے روزوں کا مستحب ہونا

حدیث ۱۲۵۵:-

عن أبي قتادة (رضی اللہ عنہ) أنّ رسول الله ﷺ سُئِلَ عَنْ صَومِ يَوْمِ الإِثْنَيْنِ، فَقَالَ: ((ذَلِكَ يَومٌ وُلِدْتُ فِيهِ، وَيَومٌ بُعِثْتُ، أَوْ أُنْزِلَ عَلَيَّ فِيهِ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پیر کے دن کے روزہ کی فضیلت کے متعلق پوچھا گیا، تو ارشاد فرمایا: یہ وہ دن ہے جس میں مَیں پیدا ہوا ہوں۔ اور اُسی دن میں مبعوث ہوا، مجھ پر پہلی وحی بھی اسی دن میں نازل ہوئی۔

افادات:- آپ ﷺ کی پیدائش پیر کے روز ہوئی، اور وفات بھی پیر کے روز ہوئی، اس میں تو کوئی تردّد اور اشکال نہیں ہے، یہ دونوں چیزیں صحیح روایت سے ثابت ہے، البتہ تاریخ کے معاملہ میں اختلاف ہے۔

پیر کے دن اللہ تعالیٰ نے نبیِ کریم ﷺ کی پیدائش فرماکر انسانیت پر ایک بڑا انعام واحسان فرمایاہے، اس معنیٰ کر پیر کے روز کو ایک خاص اہمیت اور خصوصی امتیازی شان حاصل ہے، اوراس معنیٰ کر پیر کے روزہ کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

حدیث ۱۲۵۶:-

وعن أَبِي هريرة (رضی اللہ عنہ) عن رسول الله ﷺ قَالَ: ((تُعْرَضُ الأَعْمَالُ يَوْمَ الإِثْنَيْنِ وَالخَمِيسِ، فَأُحِبُّ أَنْ يُعْرَضَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ)) رواه الترمذی، وقال: ((حدیث حسن))، ورواه مسلم بغیر ذِکر الصوم.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پیر اور جمعرات کے دن لوگوں کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ اس لیے میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میرے اعمال اللہ کے حضور ایسی حالت میں پیش کئے جائیں کہ میں روزہ سے ہوں۔

افادات:- اللہ تعالیٰ ویسے تو ہر ایک کے عمل سے واقف ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دنیا کا یہ نظام قائم کیا ہے تو اس میں باقاعدہ حکومت اور سلطنت کا ایک نظام قائم کیا جاتا ہے اور ہر چیز کے لئے ایک ترتیب بنائی جاتی ہے، اسی طرح بندوں کے اعمال اللہ کے حضور میں پیش کرنے کے لئے بھی ایک نظام ہے، اُسی کے ماتحت جو لوگ زندہ ہیں ان کے اعمال پیر اور جمعرات کو اللہ کے حضور میں پیش کئے جاتے ہیں۔

اسی لیے حرمین خاص کر مدینہ منورہ میں دیکھا کہ وہاں کے لوگ پیر اور جمعرات کے روزہ کا بڑا اہتمام کرتے ہیں ۔ مسلم شریف میں ایک روایت ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن جنّت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، اور بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوتے ہیں، تو ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا (یعنی ایمان والا ہوتا ہے) اس کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کا فیصلہ کیا جاتا ہے، البتہ جن دو آدمیوں کے درمیان دشمنی اور عداوت ہوتی

ہے، ان کے متعلق اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جاتا ہے کہ جب تک یہ دونوں صلح نہ کرلیں وہاں تک ان کا معاملہ پینڈ ینگ رکھو۔

اب دیکھئے! معمولی دشمنی کی وجہ سے اتنی بڑی فضیلت سے لوگ محروم رہتے ہیں! اس لیے آدمی کو چاہیے کہ اپنے قلب اور سینے کو لوگوں کی عداوت اور کینہ سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کرے۔ یہ بھی بہت بڑی عبادت ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی عبادت نہیں ہے۔

حدیث ۱۲۵۷:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قالت: كَانَ رسولُ الله ﷺ يَتَحَرَّى صَومَ الإِثْنَيْنِ وَالخَمِيس. (رواه الترمذی، وقال: ((حديث حسن)).

ترجمہ:- حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ پیر اور جمعرات کے روزہ کا اہتمام فرماتے تھے۔

باب استحباب صوم ثلاثة أيام من كل شهر

وَالْأَفْضَلُ صَوْمُهَا فِي الْأَيَّامِ الْبِيضِ ، وَهِيَ: الثَّالِثُ عَشَرَ، وَالرَّابِعُ عَشَرَ، وَالْخَامِسُ عَشَرَ وَقِيلَ: الثَّانِي عَشَرَ، وَالثَّالِثُ عَشَرَ، وَالرَّابِعُ عَشَرَ؛ والصَّحِيحُ الْمَشْهُورُ هُوَ الْأَوَّلُ

ہر مہینے میں تین روزوں کی فضیلت اور اس کا مستحب ہونا

ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھنا مستحب ہے۔ اور کسی بھی تین دن کے رکھ سکتے ہیں لیکن ایّامِ بیض کے روزے رکھنا زیادہ بہتر ہے۔ اور ایّامِ بیض تیرہویں ، چودہویں ، پندرہویں ہیں۔ اور دوسرا قول بارہ، تیرہ اور چودہ کا بھی ہے، لیکن پہلے والی بات یعنی تیرہ، چودہ اور پندرہ والی ہی زیادہ صحیح ہے۔

حدیث ۱۲۵۸:-

وعن أَبِي هريرة (رضي الله عنه) قَالَ: أَوْصاني خَلِيلِي ﷺ بِثَلاثٍ: صِيَامِ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، وَرَكْعَتَي الضُّحَى، وَأَنْ أُوتِرَ قَبْلَ أَنْ أَنَامَ. متفقٌ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میرے دوست ﷺ نے مجھے تین باتوں کی تاکید فرمائی: ایک تو ہر مہینہ میں تین دن کے روزے۔ دوسرا چاشت کی دو رکعت۔ اور تیسرا سونے سے پہلے میں وتر پڑھ لوں۔

افادات:- جو نصیحت بہت تاکید اور اہتمام سے کی جائے اس کو ''وصیّت'' کہا جاتا ہے۔ اور چوں کہ حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) طالبِ علم تھے، رات کو دیر تک طلبِ علم اور حدیثوں کو محفوظ رکھنے کے لئے جاگنے کی نوبت آتی تھی، تو ہو سکتا ہے کہ رات کے آخری حصہ میں آنکھ نہ کھل سکے، اس لیے سونے سے پہلے وتر کی نماز پڑھنے کی تاکید کی گئی۔ حالاں کہ وتر کے سلسلہ میں پہلے گزر چکا ہے کہ اگر کسی آدمی کو رات کے آخری حصہ میں اٹھنے کا یقین ہو تو اس صورت میں وتر کی نماز رات کے آخری حصہ ہی میں ادا کرنی چاہیے۔

حدیث ۱۲۵۹:-

وعن أَبِي الدرداءِ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: أوصانی حَبِيبِي ﷺ بِثَلاثٍ لَنْ أَدَعَهُنَّ مَا عِشتُ: بِصِيَامِ ثَلاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، وَصَلاةِ الضُّحَى، وبِأَنْ لاَ أَنَامَ حَتَّى أُوتِرَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میرے حبیب ﷺ نے مجھے تین باتوں کی تاکید فرمائی، جب تک میں زندہ رہوں گا کبھی بھی ان کو نہیں چھوڑوں گا۔ ایک تو ہر مہینہ میں تین دن کے روزوں کی۔ دوسرا چاشت کی نماز کی۔ اور تیسرا یہ کہ جب تک وتر نہ پڑھ لوں وہاں تک نہ سوؤں۔

افادات:- دیکھو! حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہما) دونوں کو یہی تاکید فرمائی گئی ہے۔

حدیث ۱۲۶۰:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((صَوْمُ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهِ)) متفقٌ عَلَيهِ.

ترجمہ:– حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر مہینہ میں تین دن کے روزے ہمیشہ کے روزوں کی طرح ہیں۔

افادات:– اس لئے کہ تین دن کے روزے رکھیں گے تو گویا اس کا دس گُنا ثواب ملے گا یعنی تیس دن کا ثواب ہو جائے گا۔ تو تین دن کے روزے رکھ کر پورے مہینہ کے روزوں کا ثواب حاصل کر لیا جائے، اس طرح پورے سال کے روزوں کا ثواب ہو جائے گا۔

حدیث ۱۲۶۱:-

وعن مُعاذة العدوية : أنها سألت عائشة (رضی اللہ عنہا): أَكَانَ رسول الله ﷺ يَصُومُ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ؟ قالت: نَعَمْ. فقلتُ: مِنْ أَيِّ الشَّهْرِ كَانَ يَصُومُ؟ قالت: لَمْ يَكُنْ يُبَالِي مِنْ أَيِّ الشَّهْرِ يَصُومُ. رواه مسلم.

ترجمہ:– حضرت معاذہ عدویہ سے منقول ہے کہ انھوں نے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے پوچھا: کیا نبی کریم ﷺ ہر مہینہ میں تین دن کے روزے رکھتے تھے؟ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے جواب میں فرمایا: جی ہاں۔ تو حضرت معاذہ نے پوچھا: مہینہ کے کون سے حصہ میں رکھتے تھے؟ (شروع میں، بیچ میں، یا آخر میں؟) تو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے جواب میں فرمایا: آپ ﷺ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ مہینہ کا کون سا حصہ ہے۔

افادات:– یعنی کبھی شروع میں ادا فرماتے تھے، یا کبھی درمیان میں، کبھی آخر میں۔ جیسا کہ بتلا دیا کہ پورے مہینہ میں کسی بھی تین دن کے روزے رکھو گے تو یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی؛ البتہ ایّامِ بیض میں روزے افضل ہیں۔

حدیث ۱۲۶۲:-

وعن أَبِي ذر (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ : ((إِذَا صُمْتَ مِنَ الشَّهْرِ ثَلَاثاً، فَصُمْ ثَلَاثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ)) رواه الترمذی، وقال: ((حدیث حسن)).

ترجمہ:- حضرت ابو ذر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم مہینہ میں تین روزے رکھو؛ تو تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں کا روزہ رکھو۔

حدیث ۱۲۶۳:-

وعن قتادة بن مِلْحَان (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ رسولُ الله ﷺ يَأْمُرُنَا بِصِيَامِ أَيَّامِ الْبِيضِ: ثَلَاثَ عَشْرَةَ، وَأَرْبَعَ عَشْرَةَ، وَخَمْسَ عَشْرَةَ. (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت قتادہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ ہم کو ایّامِ بیض یعنی چاند کے مہینہ کی تیرہویں، چودہویں اور پندرہویں کے روزوں کا حکم دیا کرتے تھے۔

حدیث ۱۲۶۴:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ لَا يُفْطِرُ أَيَّامَ الْبِيضِ فِي حَضَرٍ وَلَا سَفَرٍ. (رواه النسائي بإسنادٍ حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ایّامِ بیض میں کبھی افطار نہیں کرتے تھے (یعنی روزہ نہیں چھوڑتے تھے) چاہے حضر میں ہوں یا سفر میں۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ ان دنوں کے روزوں کا آپ ﷺ کتنا اہتمام فرماتے تھے۔

باب فضل من فطّر صائماً وفضل الصائم الذی یؤکل عندہ ودعاء الآکل للمأکول عندہ

روزہ دار کو افطار کرانے کی اور کھانے والوں کے سامنے روزہ دار کے صبر کرنے کی فضیلت اور کسی کے یہاں کھانا کھائے؛ تو کیا دعا دے؟

روزہ دار کو افطار کرانے کی فضیلت اور کھلانے والے کو دعا کا طریقہ

اس باب میں تین چیزیں بتلاتے ہیں کہ کوئی آدمی روزہ دار کو افطار کرائے تو اس کی کیا فضیلت ہے؟ اسی طریقہ سے ایک آدمی نے نفل روزہ رکھا ہے اور دوسرے لوگ اس کے پاس بیٹھ کر کھانا کھا رہے ہیں، اور چوں کہ اس نے روزہ رکھا ہوا ہے اس وجہ سے ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکتا، تو اس کے لئے کیا فضیلت ہے؟ اور جس کے وہاں کھانا کھایا جائے ان کے واسطے کھانے والے کا دعا کرنا۔

حدیث ۱۲۶۵:-

عن زید بن خالد الجُھَنِیِّ (رضی اللہ عنہ) عن النبی ﷺ قال: ((مَنْ فَطَّرَ صَائِماً ، كَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ ، غَيْرَ أَنَّهُ لاَ يُنْقَصُ مِنْ أَجْرِ الصَّائِمِ شَيْءٌ)) (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:۔ حضرت زید بن خالد جہنی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے روزہ دار کو افطار کرایا تو اس کو اُس روزہ دار کے برابر ثواب ملے گا (یعنی اُس روزہ رکھنے والے کو روزہ رکھنے پر جو ثواب ملا اِس کو روزہ افطار کرانے پر اتنا ہی ثواب ملے گا) اور اس کی وجہ سے روزہ دار کے ثواب میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی۔

افادات:۔ کتنی بڑی فضیلت ہے! اور افطار کرانا پیٹ بھر کر کھلانے پر موقوف نہیں ہے، صرف ایک کھجور کھلادی، یا لسّی پلادی، یا کولڈ ڈرنک پلادیا؛ تب بھی یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

حدیث ۱۲۶۶:۔

وعن أُمِّ عُمَارَةَ الأنصارِيَّةِ (رضی اللہ عنہا) أنَّ النبيَّ ﷺ دَخلَ عَلَيْهَا، فَقَدَّمَتْ إِلَيْهِ طَعَاماً، فَقَالَ: ((كُلِي)) فَقَالَتْ: إِنِّي صَائِمَةٌ، فَقَالَ رسول الله ﷺ: ((إنَّ الصَّائِمَ تُصَلِّي عَلَيْهِ المَلاَئِكَةُ إِذَا أُكِلَ عِنْدَهُ حَتَّى يَفْرَغُوا)) وَرُبَّمَا قَالَ: ((حَتَّى يَشْبَعُوا)) (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:۔ حضرت امِّ عُمارہ انصاریہ (رضی اللہ عنہا) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ ان کے گھر تشریف لائے تو انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کے لئے کھانا پیش کیا (جیسے ہمارے یہاں بھی جب کوئی مہمان آتا ہے تو کھانے کی چیز سے اس کی تواضع کی جاتی ہے) تو حضور اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: تم بھی کھاؤ۔ انہوں نے کہا: میرا تو روزہ ہے، اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کسی روزہ دار کے پاس بیٹھ کر لوگ کھا رہے ہوں تو اُس روزہ دار کے لئے فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں جب تک یہ لوگ کھا کر فارغ نہ ہو جائیں

افادات:۔ بعض روایتوں میں یہ ہے کہ جب تک یہ شکم سیر ہو کر کھانہ لیں وہاں تک فرشتے اُس روزہ دار کے لئے رحمت کی دعا کرتے ہیں۔ کیوں کہ اُس نے اللہ کے واسطے اپنے کھانے کے تقاضہ کو

روکا۔چوں کہ ایسے موقع پر جی میں ہوتا ہے کہ ان کے ساتھ شریک ہوا جائے، لیکن روزہ کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکتا تو اس کی جزا اور بدلہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ملے گا۔

حدیث ۱۲٦۷:-

وعن أنسٍ (رضی اللہ عنہ) أنَّ النبيَّ ﷺ جاءَ إلَى سعد بن عبادة (رضی اللہ عنہ) فَجَاءَ بِخُبْزٍ وَزَيْتٍ، فَأَكَلَ، ثُمَّ قَالَ النبي ﷺ: ((أَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُونَ، وَأَكَلَ طَعَامَكُمُ الأَبْرَارُ، وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ المَلَائِكَةُ)) رواه أبو داود بإسناد صحيح.

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) کے وہاں تشریف لے گئے تو وہ حضورِ اکرم ﷺ کے لئے روٹی اور زیتون کا تیل لائے، نبیٔ کریم ﷺ نے نوش فرمایا اس کے بعد ان کو یہ دعا دی: "أَفْطَرَ عِنْدَكُمُ الصَّائِمُوْنَ" روزہ دار لوگ تمہارے یہاں افطار کریں "وَأَكَلَ طَعَامَكُمُ الْأَبْرَار" اور نیک لوگ تمہارا کھانا کھائیں "وَصَلَّتْ عَلَيْكُمُ الْمَلَائِكَةُ" اور فرشتے تمہارے لئے دعاءِ رحمت کریں۔

افادات:- یہ دعائیہ کلمات ہیں، جس کے وہاں کھانا کھائے اس کے لئے یہ دعا کرنی چاہیے۔ایک اور دعا یہ بھی ہے: "أَللّٰهُمَّ أَطْعِمْ مَنْ أَطْعَمَنَا وَاسْقِ مَنْ سَقَانَا" اے اللہ! جس نے ہم کو کھلایا؛ تو ان کو کھلا، اور جس نے ہم کو پلایا؛ تو ان کو پلا۔ ایک دعا یہ بھی ہے: " أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِيْمَا رَزَقْتَهُمْ وَاغْفِرْلَهُمْ وَارْحَمْهُمْ " اے اللہ! تو ان کی روزی میں برکت دے، اور ان کے گناہوں کو معاف فرما، اوران پر رحمت نازل فرما۔

کتاب الاعتِکاف باب الاعتکاف فی رمضان

اعتکاف کا بیان

اعتکاف کا لغوی معنی ٹھہرنا،، اور چوں کہ اعتکاف میں مسجد کے اندر ہی ٹھہرا جاتا ہے؛ اس لئے اس کو اعتکاف کہا جاتا ہے۔ اعتکاف کا اصطلاحی معنیٰ یہ ہے کہ اعتکاف کی نیت سے اللہ کے واسطے روزہ کے ساتھ مسجد میں رُکنا۔

اعتکاف کئی قسم کا ہوتا ہے: (۱) سنتِ موٴکدہ علی الکفایہ (۲) واجب (۳) نفل تو رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف سنتِ موٴکدہ علی الکفایہ ہے۔ یعنی جس محلہ میں مسجد واقع ہے اس محلہ کا ایک آدمی بھی اعتکاف کرلے گا تو پورے محلہ والوں کی طرف سے یہ سنت ادا ہو جائے گی، اور جتنے لوگ کریں گے سب کو سنّت کا پورا پورا ثواب ملے گا، اور اگر کوئی بھی اعتکاف نہیں کرے گا تو سب گنہگار ہوں گے۔ اور اگر کسی نے اعتکاف کی نذر مانی ہے تو نذر کا اعتکاف واجب ہے۔ اور مسجد میں جب داخل ہو اُس وقت اعتکاف کی نیت کرلے کہ جتنی دیر مسجد میں رہوں گا اُتنی دیر اعتکاف میں رہوں گا، تو یہ اعتکاف نفل کہلائے گا۔

حضور اکرم ﷺ کا معمول

حدیث ۱۲۶۸:-

عن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ يَعْتَكِفُ العَشْرَ الأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ. متفقٌ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف فرماتے تھے (اسی لئے اس کو سنتِ مؤکدہ کہا گیا ہے)

حدیث ۱۲۶۹:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) أَنَّ النبيَّ ﷺ كَانَ يَعْتَكِفُ العَشْرَ الأَوَاخِرَ مِنْ رَمَضَانَ، حَتَّى تَوَفَّاهُ اللهُ تَعَالَى، ثُمَّ اعْتَكَفَ أَزْوَاجُهُ مِنْ بَعْدِهِ. متفقٌ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہمیشہ رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف کرتے تھے یہاں تک کہ آپ کا انتقال ہو گیا (یعنی وفات تک آپ ﷺ کا یہ معمول رہا) اور آپ ﷺ کے بعد آپ کی ازواج نے بھی یہ سلسلہ جاری رکھا (اس لیے عورتیں بھی اپنی گھر کی مسجد میں یعنی گھر میں جو جگہ نماز کے لئے مقرر کی گئی ہے، وہاں اعتکاف کر سکتی ہیں)۔

حدیث ۱۲۷۰:-

وعن أَبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: كَانَ النبيُّ ﷺ يَعْتَكِفُ فی كُلِّ رَمَضَانَ عَشْرَةَ أَيَّامٍ، فَلَمَّا كَانَ العَامُ الَّذِی قُبِضَ فِيهِ اعْتَكَفَ عِشْرِينَ يَوماً. رواہ البخاری

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ رمضان میں دس دن کا اعتکاف فرماتے تھے، لیکن جس سال حضور اکرم ﷺ کی وفات ہوئی اُس سال رمضان میں آپ ﷺ نے بیس دن کا اعتکاف فرمایا۔

افادات:- اُس سال قرآنِ کریم دو مرتبہ ختم ہوا تھا، اور اعتکاف بھی دس دن کے بجائے بیس دن کا فرمایا تھا۔ اعتکاف کے مستقل مسائل ہیں اور اس سلسلہ میں رسائل بھی چھپے ہوئے ہیں، ضرورت کے موقع پر ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

كِتَابُ الْحَجِّ

باب وجوب الحج وفضلہ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ فضائل کا سلسلہ چل رہا ہے، اسی سلسلہ میں آج عنوان قائم کیا ہے:-

فضائلِ حج

سب سے پہلے تو وہ آیت پیش کی جو حج کی فرضیت کے سلسلہ میں نازل ہوئی: ﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ اور اللہ کے واسطے لوگوں کے اوپر بیت اللہ کا حج ضروری ہے جو بھی وہاں پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جسے بیت اللہ تک جا کر واپس آنے کی استطاعت ہے اس پر حج فرض ہے۔

استطاعت سے کیا مراد ہے؟ اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا تھا: "الزَّادُ وَالرَّاحِلَةُ" توشہ اور سواری۔ یعنی آدمی جہاں رہتا ہے وہاں سے مکہ مکرمہ، منیٰ، عرفات وغیرہ جہاں حج کے مناسک اور افعال ادا کئے جاتے ہیں وہاں تک جانے اور آنے کا کرایہ، اور اتنی مدت کا اپنے سفر کا خرچہ، اور اپنے گھر والوں کا اور جن کا نفقہ اس کے اوپر واجب ہے ان سب کا خرچہ اس کے پاس موجود ہو۔ یہ دو باتیں ہوں تب ہی استطاعت کہلائے گی۔

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ العَالَمِينَ﴾ اور جو آدمی کفر اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجا نہیں لاتا تو اللہ تعالیٰ بندوں کی ان عبادتوں کا محتاج نہیں ہے۔

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے

حدیث ۱۲۷۱:-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) أن رسول الله ﷺ قال: بُنِيَ الإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رسولُ اللهِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ، وَحَجِّ البَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، ایک تو اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں، اور نماز قائم کرنا، زکوۃ ادا کرنا، بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔

افادات:- یہ روایت پہلے بھی (نماز، روزے وغیرہ کے بیان میں) آچکی ہے۔ جتنے بھی فرائض ہیں ان میں سب کے آخر میں ۹ھ میں حج کی فرضیت نازل ہوئی ہے، اور جس سال حج کی فرضیت والی آیت نازل ہوئی اس سال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو امیر الحج بنا کر بھیجا، اس کے بعد ۱۰ھ میں خود حضورِ اکرم ﷺ حج کے لیے تشریف لے گئے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ حج کی فرضیت کے بعد خود حضور اکرم ﷺ نے حج کی ادائیگی میں تاخیر کیوں فرمائی؟ اس کا ایک جواب تو یہ دیا گیا ہے کہ حج کی ادائیگی میں ایسی تاخیر جس میں یہ اندیشہ ہو کہ حج فوت ہو جائے گا اس کی ممانعت ہے، اور آپ ﷺ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی بتلا دیا گیا تھا کہ آپ آئندہ سال حج فرمائیں گے۔ اور دوسری حکمت بھی تھی کہ حج کا سلسلہ عرب میں شروع سے چلا آرہا تھا، اسلام سے پہلے عرب کے قبائل مختلف گروہ بنا کر حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ آتے تھے اور جاہلیت کے طریقہ کے مطابق حج کے افعال انجام دیا کرتے تھے، اور دورِ جاہلیت کی کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جو باقی رکھنے کے قابل نہیں تھی، مثلاً مشرک بھی حج کرتے تھے اور بیت اللہ کا طواف برہنہ حالت میں کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حج کے لئے بھیج کر پہلے سے ہی اس بات کا انتظام کر دیا گیا کہ جب حضورِ اکرم ﷺ حج کے لئے تشریف لائیں تو یہ ساری چیزیں ختم ہو چکی ہوں اور آپ ﷺ کی موجودگی میں یہ باتیں نہ ہوں، چناں چہ اس موقع پر جو اعلانات کئے گئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا: لَا يَحُجَّنَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ، وَلَا يَطُوفُ بِالْبَيْتِ عُرْيَانٌ (بخاری ومسلم) اس سال کے بعد کوئی مشرک بیت اللہ کے حج کے لئے نہیں آسکتا، اور کوئی آدمی ننگا اور برہنہ حالت میں بیت اللہ کا طواف نہیں کر سکتا۔ پھر حضور اکرم ﷺ نے ۱۰ھ میں حج فرمایا۔ جب آپ ﷺ نے حج کا ارادہ فرمایا تو اعلان کر دیا گیا، چناں چہ اس اعلان کے نتیجہ میں بے

شمار لوگ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ حج کے ارادہ سے چلے، ان کی تعداد کے سلسلہ میں اختلاف ہے، نوے ہزار اور اس سے بھی زیادہ بتلائی جاتی ہے۔

بہر حال! یہ پانچ اسلام کے بنیادی فرائض ہیں، اس میں حج بیت اللہ کا بھی شمار کیا گیا ہے، اسی لئے اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

زیادہ کھود کرید میں مت پڑو

حدیث ۱۲۷۲:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قال: خَطَبَنَا رسولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: أَيُّهَا النَّاسُ ! قَدْ فَرَضَ اللهُ عَلَيْكُم الحَجَّ فَحُجُّوا. فَقَالَ رَجُلٌ : أَ كُلَّ عَامٍ يَارَسولَ اللهِ؟ فَسَكَتَ ، حَتَّى قَالَهَا ثَلاثاً .فَقَالَ رسولُ اللهِ ﷺ : لَوْ قُلْتُ نَعَمْ لَوَجَبَتْ ، وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ .ثُمَّ قَالَ : ذَرُوْنِي مَا تَرَكْتُكُمْ ؛ فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِكَثْرَةِ سُؤالِهِمْ ، وَاخْتِلافِهِمْ عَلَى أَنْبِيَائِهِمْ .فَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيءٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ .وَإِذَا نَهَيْتُكُمْ عَنْ شَيْءٍ فَدَعُوهُ

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو خطبہ دیا، اس میں ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے، اس لئے تم حج کرو (جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا) تو ایک آدمی نے اٹھ کر سوال کیا: اے اللہ کے رسول ! کیا ہر سال (حج کرنا ضروری ہے؟) یہ سوال سن کر نبی کریم ﷺ خاموش رہے (آپ کی یہ خاموشی وحی کے انتظار میں تھی) یہاں تک کہ سوال کرنے والے نے تین مرتبہ یہی سوال

دہرایا تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر میں تمہارے اس سوال کے جواب میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال حج کی ادئیگی ضروری ہو جاتی اور پھر تم اس کو نہیں کرسکتے، پھر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تک مَیں تم کو چھوڑے رکھوں (یعنی کسی حکم کے سلسلہ میں مَیں اپنی طرف سے کوئی وضاحت نہ کروں) وہاں تک تم اس سلسلہ میں کچھ بھی پوچھامت کرو، کیوں کہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ کثرت سے سوال کرنے اور اپنے انبیاء کے ساتھ مخالفت کرنے کے نتیجہ میں ہلاکت میں مبتلا ہوئیں ہیں (اس لئے حضور اکرم ﷺ اپنی امت کو ہدایت فرمارہے ہیں کہ) میں اگر تمہیں کسی بات کے کرنے کا حکم دوں تو تم سے جو ہو سکے اس کے مطابق عمل کرلو (اور اس سلسلہ میں زیادہ پوچھ تاچھ میں مت پڑو۔ ڈیپ (Deep) میں مت جاؤ) اور اگر کسی چیز سے میں تم کو روک دوں؛ تو تم رک جاؤ۔

افادات:۔ بعض قوموں کو جب دین کا کوئی حکم دیا جاتا تھا تو اس کو سننے کے بعد اس حکم کو ظاہری حالت پر باقی رکھتے ہوئے اور تفصیلات میں گئے بغیر عمل کرنے کا اہتمام کرنے کے بجائے اس کی اندرونی چیزیں بار بار پوچھتے تھے، نتیجہ میں خود ہی دشواری اور تکلیف میں مبتلا ہوتے تھے۔ اس لئے کہ جوں جوں سوالات پوچھے جائیں گے ان کا جواب بھی دیا جائے گا، اور اس طرح پابندیاں عائد ہوتی چلی جائیں گی، جیسا کہ بنو اسرائیل میں ایک آدمی کا قتل ہو گیا تھا تو ان لوگوں نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) سے کہا: اے موسیٰ! آپ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کریں کہ کسی طرح قاتل کا علم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا گیا کہ ایک گائے خرید کر ذبح کرو اور اس کے جسم کا کچھ حصہ مرنے والے کے جسم پر رکھ دو، وہ زندہ ہو کر بتادے گا کہ کس نے اس کو قتل کیا ہے؟ یہ سن کر ان لوگوں نے تحقیقات شروع کردیں کہ وہ گائے کیسی ہونی چاہیے؟ کس رنگ کی ہونی چاہیے؟ جوں جوں وہ لوگ اس سلسلہ میں پوچھتے رہے، ان کے لئے قیدیں بڑھتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلے کوئی پابندی، کوئی قید اور شرط نہیں

لگائی گئی تھی، بغیر کسی قید اور شرط کے کسی بھی گائے کو لاکر ذبح کرتے ہوئے یہ حکم پورا کر لیتے؛ تو معاملہ آسان تھا لیکن انہوں نے خود ہی پوچھ کر اپنے لئے دشواریاں پیدا کر دیں۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ اپنی امت کو یہ ہدایت فرمارہے ہیں کہ اگلی امتوں کو دئے گئے بہت سارے احکام ایسے تھے جو انہوں نے اپنے نبیوں سے کثرتِ سوالات کے نتیجہ میں اپنے اوپر لازم کروائے، پھر ان کو نبھا نہ سکے۔ اور ہلاکت میں پڑے، لہٰذا اگر مَیں تمہیں کسی کام کے کرنے کا حکم دوں، تو تم سے جتنا ہو سکے اس کے مطابق عمل کر لو، زیادہ پوچھ تاچھ میں مت پڑو، اور اگر کسی چیز سے تمہیں روک دوں؛ تو رک جاؤ۔

بے ضرورت سوال کرنے کی ممانعت ہے

حضورِ اکرم ﷺ نے سوالات کرنے سے اس لئے بھی منع فرمایا کہ آپ کی موجودگی میں شریعت کے احکامات کے نزول کا سلسلہ جاری تھا، اس لئے حضور ﷺ سے سوال کرنے کی صورت میں یہ امکان تھا کہ اس سلسلہ میں مزید قید اور شرط والا کوئی نیا حکم بھی آجائے۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ وہ آدمی بڑا برا ہے کہ کوئی چیز حرام نہیں تھی لیکن اس کے سوال کرنے کے نتیجہ میں وہ حرام کی گئی۔ اگر وہ نہ پوچھتا تو اس چیز کے حرام ہونے کی نوبت نہ آتی، گویا اس کے سوال نے لوگوں کے لئے دشواری پیدا کر دی، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے منع کیا تھا، لیکن آپ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد اب یہ معاملہ نہیں رہا۔ گویا شریعت مکمل ہو چکی ہے، اب آدمی اپنے عمل کے واسطے

ضرورت کے مطابق اگر تفصیل پوچھے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، لیکن بلا ضرورت سوال کرنے کی ممانعت ہے، مثلاً: اس سوال کا تعلق عمل سے نہیں ہے، یا عمل کرنے کا ارادہ نہیں ہے، بس خواہ مخواہ بطور امتحان کے، یا بلا وجہ بحث میں پڑتے ہوئے پوچھنا چاہتا ہے؛ تو اس کو پسندیدہ قرار نہیں دیا گیا۔

حجِ مبرور

حدیث ۱۲۷۳:-

وعنه قال سُئِلَ النَّبِيُّ ﷺ: أَيُّ العَمَلِ أَفْضَلُ؟ قَالَ: إِيمَانٌ بِاللهِ وَرسولِهِ. قيل: ثُمَّ ماذا؟ قَالَ: الجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ. قِيلَ: ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: حَجٌّ مَبرُورٌ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

((المبرور)) هُوَ: الَّذِي لا يرتكِبُ صاحِبُهُ فِيهِ معصيةً.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: کونسا عمل افضل ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھنا۔ پھر پوچھا گیا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کے بعد کون سا عمل سب سے افضل ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔ پھر پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: حجِ مبرور۔

افادات:- اس قسم کے سوالات کے جوابات میں نبی کریم ﷺ نے حسبِ موقع- جیسا سوال کرنے والا، جیسا وقت ہوا- مختلف جوابات دئے ہیں، ایک ہی سوال اور جوابات مختلف ہونے کی

وجوہات پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ یہاں تو یہ روایت اسی لئے لائے کہ حجِ مبرور کی شریعت کی نگاہوں میں اتنی اہمیت ہے۔

اب حجِ مبرور کسے کہتے ہیں؟ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے خود ہی ایک بات بتلائی ہے کہ حج کرنے والا اپنے اس حج کے دوران اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرے؛ تو یہ حجِ مبرور کہلاتا ہے۔ چناں چہ احرام کی جو پابندیاں ہیں ان کے خلاف کوئی کام کرے گا تو وہ بھی ایک طرح کی معصیت اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہے، اس کے نتیجہ میں بھی حج مبرور نہیں رہتا۔ گویا اللہ تعالیٰ کے یہاں نیکی والا حج ہی قبول کیا جاتا ہے۔

حج میں قصداً جنایت کرنا

بعض لوگ حج کے دوران بعض ایسی چیزوں کے بارے میں پوچھتے ہیں جو احرام کی حالت میں نہیں کرنی چاہئیں کہ اس پر دم تو نہیں ہے؟ اگر دم ہے، تو ہم دم دے دیں گے، یا کفارہ ہے تو ہم وہ ادا کر دیں گے، اور اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو قصداً توڑتے ہیں، تو سمجھ لینا چاہیے کہ اگرچہ دم دینے سے تلافی تو ہو جائے گی؛ لیکن ایسا حج مبرور نہیں رہتا، دم تو اس لئے رکھا گیا ہے کہ آدمی سے نادانستہ طور پر کوئی غلطی ہو جائے؛ تو دم کے ذریعہ سے اس کی تلافی ہو جائے۔

گناہوں سے پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے...

حدیث ۱۲۷۴:-

وعنه قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: مَنْ حَجَّ، فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ، رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے حج کیا اور کوئی فحش بات نہیں کی، اور نہ کوئی فحش کام کیا (اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کو نہیں توڑا) تو وہ اپنے گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر لوٹے گا جیسا کہ اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔

افادات:- ظاہر ہے کہ جب بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو اس پر کوئی گناہ اور معصیت نہیں ہوتی، بالکل معصوم ہوتا ہے، گناہوں سے پاک صاف ہوتا ہے، جو آدمی حج کرتا ہے وہ بھی گناہوں سے اسی طرح پاک صاف ہو کر لوٹتا ہے، البتہ اس میں دو شرطیں لگائی ہیں، ایک یہ کہ کوئی فحش بات نہیں کی ہو۔ "رَفَث" کا معنیٰ ہے: کوئی بھی فحش کام کرنا، مثلاً: بیوی کے سامنے صحبت کی بات کرلی، تو یہ بھی "رفث" میں داخل ہے۔ اسی طرح "فسوق" کا مطلب ہے: اللہ تبارک وتعالیٰ کی نافرمانی۔ نافرمانی اور دنوں میں، دیگر حالات میں بھی ممنوع ہے، لیکن احرام کی حالت میں اس کی ممانعت زیادہ سخت ہوجاتی ہے۔ ہاں! بعض چیزیں وہ ہیں جو احرام کے علاوہ تو ممنوع نہیں ہے لیکن احرام کی حالت میں ممانعت ہے، اس سے بھی حج کے اندر خاص طور پر بچنا چاہیے، اگر ان سے نہیں بچے گا تو دم واجب ہو گا۔

یہاں پر بھی گناہوں سے پاک صاف ہو کر لوٹنے کے بارے میں عام طور پر علماء یہی فرماتے ہیں کہ اس سے صغائر مراد ہیں، جیسے دیگر عبادتوں کے سلسلہ میں بتلایا ہے؛ البتہ بعض حضرات اس طرف بھی گئے ہیں کہ حج کی وجہ سے صغائر اور کبائر سب ہی گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حجِ مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ کچھ نہیں

حدیث ۱۲۷۵:-

وعنه أن رسول الله ﷺ قال: العُمْرَةُ إِلَى العُمْرَةِ، كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالحَجُّ المَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلاَّ الجَنَّةَ.

(متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک عمرہ سے لے کر دوسرا عمرہ؛ درمیان کے گناہوں کے لئے کفارہ ہے، اور حجِ مبرور کا بدلہ جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے (گویا حج کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ جنت ہی میں بھیج دیں گے)۔

افادات:- یعنی ایک آدمی نے عمرہ کیا پھر ایک مدت کے بعد دوبارہ عمرہ کیا، تو ان دونوں عمروں کے درمیان کے زمانہ میں جو گناہ ہوئے ہیں، وہ سب معاف ہو جائیں گے۔ اس سے عمرہ اور حج کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

عورتوں کے لیے بہترین جہاد

حدیث ۱۲۷۶:-

وعن عائشة (رضی اللہ عنہا) قَالَتْ: قُلْتُ: يَا رسول الله! نَرَى الْجِهَادَ أَفْضَلَ الْعَمَلِ، أَفَلَا نُجَاهِدُ؟ فَقَالَ: لَكُنَّ أَفْضَلُ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُورٌ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد بہترین عمل ہے؛ تو کیا ہم (عورتیں) جہاد نہ کریں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عورتوں کے لیے بہترین جہاد حجِ مبرور ہے۔

افادات:- ویسے بھی روایتوں میں آتا ہے کمزوروں، بیماروں، بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کے لئے بہترین جہاد حجِ مبرور ہے۔ حج میں بھی آدمی کو بڑی مشقّت اٹھانی پڑتی ہے۔

عرفہ کے دن جہنم سے آزادی کا پروانہ

حدیث ۱۲۷۷:-

وعنها أن رسول الله ﷺ قال: مَا مِنْ يَوْمٍ أَكْثَرَ مِنْ أَن يَعْتِقَ اللهُ فِيهِ عَبْدًا مِنَ النَّارِ مِنْ يَوْمِ عَرَفَةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: کسی دن میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جہنم سے اتنا زیادہ آزاد نہیں فرماتے جتنا عرفہ کے دن۔

افادات:۔یعنی نویں ذی الحجہ کو جب لوگ میدانِ عرفات میں ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں اس دن اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کو جہنم سے آزاد کیا جاتا ہے،عام طور پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو میدانِ عرفات میں ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے گناہوں کو اللہ معاف کرکے ان کو جہنم سے آزادی کا پروانہ دیتے ہیں۔ اور اس دن میں جس کثرت سے بندوں کو جہنم سے آزاد کیا جاتا ہے کسی اور دن میں اتنی آزادی نہیں ملتی۔

رمضان کے عمرہ کی فضیلت

حدیث ۱۲۷۸:۔

وعن ابن عباس(رضی اللہ عنہما)أَنَّ النبیَّ ﷺ قَالَ:عُمْرَةٌ فی رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً-أَوْ حَجَّةً مَعِي.(متفق علیہ)

ترجمہ:۔حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:رمضان کے اندر عمرہ کرنا حج کے برابر ہے؛یا یہ فرمایا کہ:میرے ساتھ حج کرنے کے برابر ہے۔

افادات:۔ چناں چہ بعض روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ بعض صحابیات کا ارادہ نبی کریم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ کے قافلہ میں شریک ہوکر حج کرنے کا تھا، لیکن کسی وجہ سے وہ شریک نہیں ہو سکیں ، اور انھوں نے بطور شکایت نبی کریم ﷺ سے یہ بات عرض کی تو حضورِ

اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا: اچھا! رمضان میں عمرہ کرلو، تم کو میرے ساتھ حج کرنے پر جو ثواب ملتا، وہ اس عمرہ سے بھی مل جائے گا اس سے رمضان المبارک کے عمرہ کی فضیلت معلوم ہوئی۔

کیا بار بار حج عمرے کرنا غلط ہے؟

بہر حال! حج اور عمرہ کے بڑے فضائل ہیں، ان فضائل کے حصول کی غرض سے کوئی آدمی اگر ان اعمال کو انجام دیتا ہے تو وہ قابلِ تنقید نہیں ہے۔ آج کل ایک مزاج بنتا جارہا ہے کہ بعض لوگ انہی فضائل کے پیشِ نظر حج یا عمرہ کا اہتمام کرتے ہیں، تو دوسرے لوگ جن کو یہ توفیق بھی میسر نہیں ہوتی، وہ یوں کہتے ہیں کہ دیکھو نا! فلاں ہر سال عمرہ کرنے کے لئے جاتا ہے، اس میں اتنے پیسہ خرچ کرتا ہے، اور یہاں غریبوں کو جھونپڑے بنانے کی ضرورت ہے، اگر اتنے پیسے یہاں دیتا تو اس کا کیا چلا جاتا؟ درحقیقت ان پر اعتراض کرکے جو کام کروانا چاہتے ہیں اس کی بھی توفیق ان کو میسر نہیں ہوتی۔

تو دیکھو! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غریبوں کو جھونپڑا بنانے میں پیسہ دینا نیکی کا کام ہے، اور اگر وہ ضرورت کا تقاضہ ہے تو اس میں زیادہ نیکی ملے گی، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس آدمی کو آپ قابلِ تنقید قرار دیں۔ جب یہ آدمی خود اپنے پیسے خرچ کرکے جارہا ہے، تو اس کو چاہئے تھا کہ کسی بڑے سے پوچھتا کہ اس وقت میرے سامنے دو چیزیں ہیں، ان فضائل کے پیشِ نظر جو حج و عمرہ کے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ میں حج یا عمرہ کروں، لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ

میری نگاہوں کے سامنے کچھ غرباء ہیں جن کو ضرورت ہے۔یا فلاں اپنی بیٹیوں کا نکاح کرانے کے واسطے، یا جھونپڑے بنانے کے واسطے، یا فلاں کام کے واسطے، یا فلاں جگہ نیکی کا کام ہے؛ان دونوں میں سے میرے لئے اس وقت کیا زیادہ مناسب ہے۔یہ تو اس کو چاہئے تھا کہ پوچھتا کہ اب میں کیا کروں؟ اور اس کو جو بتایا جائے اس کے مطابق وہ عمل کرتا۔لیکن آپ بیچ میں دخل کیوں دیتے ہیں اور اس کو نشانہ اور ٹوپک (Topic) بناکر غیبتوں میں کیوں مبتلا ہوتے ہیں۔جو لوگ گناہوں کے کاموں میں خرچ کرتے ہیں ان کو کوئی کہنے نہیں جاتا، اس پر کوئی تنقید نہیں کرتا، جو لوگ نکاحوں اور منگنیوں میں ویڈیو لاکر اور دوسری جگہوں میں فضول خرچی کے طور پر ہزاروں لاکھوں کروڑوں روپے بلاوجہ اڑا دیتے ہیں؛ وہاں کوئی نہیں بولتا۔یہ بھی عجیب مزاج بنا ہوا ہے، یہ بالکل غلط طریقہ ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔

ہاں! اگر آپ کا اس سے تعلق ہے، تو تنقید کے طور پر نہیں بلکہ بطور مشورہ اس سے کہیں کہ بھائی! تم حج کے لیے جاتے ہو، تو اس سلسلہ میں تحقیق کر لو، جانکاروں سے پوچھ لو، اور اس معاملہ میں جو مناسب ہو اس پر عمل کرو، آپ اپنی طرف سے مشورہ نہ دیں۔باقی وہ جو کر رہا ہے اس کا عمل کوئی گناہ کا کام نہیں ہے۔وہ تو ایسے انداز سے لوگ بیان کرتے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا مجرم اور بڑا قابلِ نفرت ہو، اور ایسے انداز سے اس کے متعلق نفرت بھرے الفاظ بولتے ہیں۔حقیقت یہ ہوتی ہے کہ شریعت کے حکم کے پیشِ نظر نہیں ہوتا، بلکہ اپنا ایک اندرونی معاملہ ہوتا ہے، اسی دشمنی کو نکالنے کے

لئے ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ طریقہ غلط ہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی ہے، یہ یاد رہے۔ اس کا اہتمام کرنا چاہیئے۔

جب ہم کوئی عمل نیک نہیں کرپاتے تو کسی نیک عمل کرنے والے پر تنقید کیوں کریں۔ نیک اعمال کے مختلف درجے ہیں اس کی حیثیتیں ہیں، کوئی کم درجہ کا عمل کرتا ہے، تو اس پر اعتراض نہیں کیا جائے۔ وہ بھی نفل ہے، یہ بھی نفل ہے، وہ بھی کوئی فرض وواجب نہیں ہے، دونوں کام نفل ہیں، اب ان میں سے کسی کام کی حیثیت کسی خاص حالات کے پیش نظر بڑھ گئی، وہ بات دوسری ہے۔ یہ بات خود اس کو سوچنی چاہیئے تھی، لیکن اس نے اس کے علاوہ دوسرا نفلی کام کیا تو اس کی وجہ سے ہم اس کے اوپر تنقید کریں اور اس کو اپنی مجلسوں کا موضوع بنائیں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آج کل اس طرح کا جو مزاج بنتا جارہا ہے، وہ غلط ہے۔ ہاں! جو لوگ فضول خرچی میں پیسہ استعمال کرتے ہیں، غلط جگہوں پر اپنے پیسے کو استعمال کرتے ہیں، ان پر آپ تنقید بھی کرسکتے ہیں، کیوں کہ وہ گناہ کے کام ہیں، ان کی تنقید کیجئے، لیکن وہاں کسی کو تنقید کرنے کی جرأت ہوتی نہیں۔

حجِ بدل کی اجازت

حدیث ۱۲۷۹:-

وعنه أنَّ امرأةً قالت: يَا رسول الله، إنَّ فَرِيضَةَ اللهِ عَلَى عِبَادِهِ فِى الحَجِّ، أَدْرَكَتْ أَبِى شَيْخاً كَبِيراً، لاَ يَثْبُتُ عَلَى الرَّاحِلَةِ أَفَأَحُجُّ عَنْهُ؟ قَالَ: نَعَم. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کا فریضہ اس کے بندوں پر جو حج کی شکل میں ہے وہ حکم میرے ابا پر ایسے وقت آیا کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے ہیں (بڑھاپے کی وجہ سے) سواری پر جم کر بیٹھنے کی بھی طاقت نہیں رکھتے (اس لئے کہ سواری پر آدمی کو اپنے آپ کو سنبھالنا پڑتا ہے) کیا میں ان کی طرف سے حج کر سکتی ہوں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جی ہاں۔

حدیث ۱۲۸۰:-

وعن لقيط بن عامر رضي الله عنه أنه أتى النبي ﷺ فقال: إِنَّ أَبِي شَيْخٌ كَبِيرٌ لَا يَسْتَطِيعُ الحَجَّ، وَلَا العُمْرَةَ، وَلَا الظَّعَنَ قَالَ: حُجَّ عَنْ أَبِيكَ وَاعْتَمِرْ. (رواه أبوداؤد والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت لقیط بن عامر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: میرے ابا بہت زیادہ بوڑھے ہو چکے ہیں، نہ حج کی طاقت رکھتے ہیں نہ عمرہ کی، اور نہ سوار ہو کر سفر کرنے کی ان میں طاقت ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم اپنے ابا کی طرف سے حج بھی کرو اور عمرہ بھی کرو۔

افادات:- بعض عبادتیں ایسی ہیں کہ ان میں نیابت نہیں چلتی، جیسے نماز، روزہ۔ اگر کوئی آدمی نماز نہیں پڑھ سکتا، وہ دوسرے کو کہے کہ میری طرف سے نماز پڑھ لو؛ تو یہ نہیں چلے گا، اگر دوسرا پڑھے گا تو اس کی طرف سے کافی نہیں ہوگی، یہی حال روزہ کا ہے، لیکن حج ایسا عمل اور ایسی عبادت ہے کہ اس میں نیابت کر سکتے ہیں، حج دوسرے سے کرا سکتے ہیں؛ اسی کو حجِ بدل کہا جاتا ہے۔

ویسے عمرہ فرض تو نہیں ہے، لیکن اگر کوئی آدمی دوسرے کی طرف سے عمرہ کرے گا تو وہ بھی درست ہے۔ اب یہ ہے کہ کسی پر حج فرض ہو اور وہ نہیں جا سکتا تو دوسرے کو حج کے لئے بھیجے اس کے

لئے کچھ تفصیلات اور مستقل احکام ہیں، جو آدمی ایسا کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ جانکاروں اور مفتیوں سے مل کر اس سلسلہ میں معلوم کرے اور پھر اس کے مطابق عمل کرے۔

بچوں کو بھی حج کے لیے لے جاسکتے ہیں

حدیث ۱۲۸۱ :-

وعن السائب بن يزيد (رضی اللہ عنہ) قَالَ: حُجَّ بِی مَعَ رسولِ اللهِ ﷺ فی حجةِ الوَدَاعِ، وَأنَا ابنُ سَبعِ سِنِينَ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سائب بن یزید (رضی اللہ عنہ) ایک صحابی ہیں وہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع کے موقع پر حج میں لے جایا گیا، اس وقت میں سات سال کا تھا۔

افادات:- ان کے ماں باپ اور ان کے خاندان والے ان کو اپنے ساتھ حج میں لے گئے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کو بھی حج کے لئے لے جایا جاسکتا ہے، اور ماں باپ یا جو کوئی بھی بچے کو حج کے لیے لے جائیں گے ان کو بھی ثواب ملے گا۔ باقی یہ ہے کہ اس سے اس بچہ کا فرض ادا نہیں ہوگا، بالغ ہونے کے بعد اگر اس کے پاس مال آئے تو اس کا بچپن کا کیا ہوا حج فریضہ کی طرف سے کافی نہیں ہوگا۔

حدیث ۱۲۸۲:-

وعن ابن عباس (رضی اللہ عنہما) أَنَّ النبيَّ ﷺ لَقِيَ رَكْباً بالرَّوْحَاءِ فَقَالَ : ((مَنِ الْقَوْمُ ؟)) قالوا: المسلِمُونَ. قالوا : مَنْ أَنْتَ ؟ قَالَ : ((رسولُ اللهِ)). فَرَفَعَتِ امْرَأَةٌ صَبياً ، فَقَالَتْ : أَلِهَذَا حَجٌّ ؟ قَالَ : ((نَعَمْ ، وَلَكِ أَجْرٌ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیؐ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سفر حج میں ایک قافلہ سے مقامِ روحاء پر ملے (”روحاء“ ایک مقام ہے جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان آتا ہے) حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: تم کون لوگ ہو؟ انہوں نے کہا: ہم مسلمان ہیں۔ پھر انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے پوچھا: آپ کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اللہ کا رسول ہوں۔ (یہ سن کر) ایک عورت نے اپنے ہاتھ میں بچہ اٹھایا اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! اس بچہ کا بھی حج ہو گا؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: جی ہاں! اس کا بھی حج ہو جائے گا اور تمہیں ثواب ملے گا۔

افادات:- ظاہر ہے کہ بچہ کو حج کرانے میں ماں باپ کو مشقت لاحق ہوتی ہے۔ بعض تو بالکل چھوٹے ہوتے ہیں جو خود چل بھی نہیں سکتے، ان کو گود میں اُٹھا کر حج کرانا پڑتا ہے۔ یا جو چل سکتے ہیں ان کو بھی حج کرانے میں مشقت لاحق ہوتی ہے، اس لیے حج کرانے والے کو ثواب ملے گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس حج سے بچہ کا فریضہ ادا نہیں ہو گا، باقی اس کی وجہ سے حاجی بن جائے گا۔ اگر بچپن میں کسی نے حج کیا ہو تو ہمارے یہاں اس کو ”حاجی“ کہتے ہیں کہ وہ پکا حاجی ہو جاتا ہے، بڑے والے سے بھی بڑا حاجی ہوتا ہے، بلکہ ”حاجی“ اس کے نام کا جزو ہی بن جاتا ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کی بوقتِ حج ایک ہی سواری

حدیث ۱۲۸۳:-

وعن أنس (رضی اللہ عنہ) أن رسول الله ﷺ حَجَّ عَلَى رَحْلٍ وَكَانَتْ زَامِلَتَهُ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ایک سواری پر حج کیا اور یہی آپ کا بوجھ اٹھانے والا اونٹ بھی تھا۔

افادات:- اہلِ عرب جب سفر کرتے تھے تو دو طرح کے اونٹ ساتھ ہوتے تھے، بعض اونٹ وہ ہوتے تھے جو صرف بوجھ اٹھانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے، مسافر اپنا بوجھ لادنے کے لئے اس کو ساتھ رکھتا تھا۔ اور کچھ وہ ہوتے تھے جو سواری کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ تو جو اونٹ صرف بوجھ اٹھانے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے؛ ان کو "زَامِلَةٌ" کہتے ہیں، اور جو سواری کے لئے استعمال کئے جاتے تھے اس کو "رَاحِلَةٌ" کہتے تھے، ہر اونٹ سواری کرنے کے قابل نہیں سمجھا جاتا ہے۔ جیسے آج کل ہمارے یہاں بھی مشین سے بنی ہوئی گاڑیاں بھی دو طرح کی ہوتی ہیں، جیسے: ٹرک، ٹیمپو وغیرہ سواری کے لئے نہیں ہوتے، اگر کوئی سوار ہو جائے تو دوسری بات ہے، باقی وہ ٹرانسپورٹ کے لئے، اور سامان اٹھانے اور منتقل کرنے کے لئے ہوتی ہیں، سواری کے لئے تو دوسرے قسم کی گاڑیاں ہوتی ہیں۔

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے مقام کی بلندی کی وجہ سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آپ کی سواری کا جانور الگ ہوتا اور آپ کا سامان اُٹھانے والا جانور الگ ہوتا، آپ کو اس بات کا حق تھا لیکن اس کے باوجود حال یہ تھا کہ آپ کے ساتھ ایک ہی جانور تھا، اسی پر آپ سوار بھی تھے اور اسی کو بوجھ اٹھانے کے کام میں بھی استعمال فرمارہے تھے۔

اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے

حدیث ۱۲۸۴:-

وعن ابن عباسٍ (رضی اللہ عنہما) قَالَ: كَانَتْ عُكَاظُ، وَمَجِنَّةُ، وَذُو المَجَازِ أَسْوَاقاً فِي الجَاهِلِيَّةِ، فَتَأَثَّمُوا أَنْ يَتَّجِرُوا فِي المَوَاسِمِ فَنَزَلَتْ: {لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلاً مِنْ رَبِّكُمْ} (البقرة: ۱۹۷) فِي مَوَاسِمِ الحَجِّ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ عُکاظ، مَجِنَّہ اور ذُوالمجاز؛ یہ زمانۂ جاہلیت میں تین بازار تھے (جہاں حج کے زمانہ میں بھی بازار لگا کرتے تھے) تو لوگوں نے موسمِ حج میں اس میں تجارت کرنے کو اخلاص کے منافی سمجھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اگر حج کے دنوں میں تم کوئی چیز خرید و فروخت کرلو؛ تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔

افادات:- "**عُکاظ، مَجِنَّہ اور ذُوالمجاز**" یہ تین جگہیں تھی جہاں ہنگامی بازار اور میلے لگا کرتے تھے، اس کا مقصد ہی تجارت ہوتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں حج ہی کے دنوں میں وہاں پر بازار لگتے تھے اور لوگ تجارت بھی کرتے تھے۔ جب اسلام آیا تو چوں کہ اسلام نے ہر عمل کے متعلق تاکید فرمائی کہ

وہ عمل خالص اللہ کے واسطے ہونا چاہیے، اس لیے جو لوگ حج کے ارادہ سے آتے تھے وہ یوں سوچتے تھے کہ ہم تو حج کے لئے آئے ہیں، اگر ان بازاروں میں جا کر خرید و فروخت کریں گے، تو حج والا عمل جو خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہونا چاہیے، اس میں دوسری چیز کو ہم نے شامل کر لی۔ گویا یہ اخلاص کے منافی ہے، یہ سمجھ کر گویا انھوں نے حرج محسوس کیا۔ تو اس پر قرآنِ پاک میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلاً مِنْ رَبِّكُمْ (البقرۃ: ۱۹۷)﴾ اگر حج کے دنوں میں تم کسی چیز کی خرید و فروخت کر لو، اور تمہاری نیت حج ہی کے لئے آنے کی تھی، تجارت کے لئے نہیں تھی؛ تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔

اس لئے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آخری زمانہ میں اس امت کے حکام اور امراء تو سیر و تفریح کے لئے حج کریں گے، اور درمیانی طبقہ کے مالدار لوگ تجارت کے لئے حج کریں گے کہ ادھر سے مال لے گئے، ادھر سے مال لائے۔ اور علماء نام آوری کے لئے حج کریں گے کہ فلاں مولانا صاحب نے اتنے حج کئے، اور غرباء بھیک مانگنے کے لئے حج کریں گے۔ اور عام طور پر آج کل یہی دیکھا جا رہا ہے۔

اس لیے اگر آدمی کے سفر کا مقصد حج ہی ہے اور نیت خالص اللہ ہی کے لئے حج کرنے کی ہے، لیکن ضمنی طور پر ضرورت کی کوئی چیز خرید لی، یا کسی نے کوئی چیز مانگی کہ اگر آپ کو بیچنی ہو تو میں لے لوں اور آپ نے بیچ دی، یہاں سے سامان بیچنے کی نیت سے نہیں لے گئے تھے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور یہ عمل خلوصِ نیت کے منافی بھی نہیں ہے، بلکہ اس کی اجازت ہے۔

”محمود الرسائل“ کا تعارف

حضرت اقدس کے بیانات وافادات مختلف مواقع پر کتابی شکل میں شائع ہوتے رہے، جن میں سے دس رسائل کا مجموعہ بہ نام ” محمود الرسائل “شائع ہو چکا ہے، ان دس رسائل کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

(۱) نگاہ و شرمگاہ کی حفاظت:

انسانی آنکھ جب بے لگام ہو جاتی ہے تو اکثر فواحش کی بنیاد بن جاتی ہے، اسی لئے محققین کے نزدیک بدنظری ”ام الخبائث“ کے مانند ہے، ان دو سوراخوں سے ہی فتنے ابلتے ہیں اور معاشرہ میں عریانی و فحاشی کے پھیلنے کا سبب بنتے ہیں۔

حضرت مرشد العلماء نے اس بیان میں آیات کریمہ، احادیث مبارکہ اور عبرتناک واقعات کے ذریعہ کوشش کی ہے کہ شیطانی قوتوں کی طرف سے بے حیائی پھیلانے والی حیاسوز تدابیر سے اجتناب کیا جائے۔

(۲) رمضان المبارک کی تیاری:

اس بیان میں رمضان المبارک کو صحیح وصول کرنے کے لئے اپنے آپ کو مستعد کرنے کے حکیمانہ طریقے دلنشیں انداز میں بیان کئے ہیں۔

یہ دونوں رسالے مسجد انوار؛ سورت کی مجلس کا ایک حصہ ہے۔

(۳) جامعہ کے دو اہم خطاب:

احاطۂ جامعہ ڈابھیل کے دو بیان کو رسالہ کی شکل دے دی ہے۔

پہلا بیان: ۱۴۱۱ھ میں جامعہ کے مثالی مہتمم حضرت مولانا محمد سعید بزرگ کے وصال کے دوسرے روز جامعہ کے اجلاس تعزیت میں کیا تھا، جس میں تعزیت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا بیان: جامعہ کی انجمن، شعبۂ تقریر و تحریر کے موقع پر سالانہ اجلاس میں کیا ہے، جس میں مافی الضمیر کو فصاحت وبلاغت کے ذریعہ بیان کرنے کے مأخذ ومراجع کا ذکر ہے۔

(۴) فضلاء سے اہم خطاب:

حضرت مرشد العلماء کی پوری زندگی مدارس کے ماحول میں گزری، مدارس میں تیزی سے بڑھتے ہوئے انحطاط اور اس کی بنیادی روح کی کمزوری کا احساس انہیں اچھی طرح ہے۔ استاذ وشاگرد کا یہ خشک رسمی رشتہ جو کسی زمانہ میں عصری تعلیم گاہوں کا خاصہ تھا، اب ہمارے مدارس میں تدریجاً آرہا ہے، علم و تحقیق کا قافلہ کہاں پہنچ رہا ہے اور ہم ”پدرم سلطان بود“ کو اپنے فخر کے لئے کافی سمجھ رہے ہیں۔ مدارس کے فضلاء کی ذمہ داری، ان کے کردار کی بلندی اور ان میں صلاح و تقویٰ پیدا کرنے کے لئے ۷/ جمادی الاولیٰ ۱۴۳۳ھ میں دار العلوم سعادت دارین ستپون؛ بھروچ میں یہ بیان کیا گیا۔ مزید تفصیل اس کے ”پیش لفظ“ میں ملاحظہ کرلیں۔

(۵) حدیث کی حجیت اور اس کی حفاظت واشاعت:

۱۴۱۹ھ میں جامعہ علوم القرآن جمبوسر میں بخاری شریف کا افتتاح ہوا، افتتاح کے موقع پر حضرت نے حدیث شریف کی حجیت کے موضوع پر بلیغ بیان فرمایا تھا جس میں مغربی افکار سے بیحد مرعوب سر سید احمد اور ان کے رفیق مولوی چراغ علی اور عبد اللہ چکڑالوی کے انکار حدیث کے سلسلہ میں بنیادی

نظریات پر تردید بھی ہے۔ یہ بیان جمبو سر سے اسی وقت ''جامعہ علوم القرآن جمبوسر کا پہلا درس بخاری'' کے نام سے شائع شدہ رسالہ میں چھپا تھا۔

(۶) منگنی اور شادی کے مسائل کا حل:

۱۴۱۷ھ کے طویل استفتاء کا جواب ہے، جس میں منگنی اور شادی میں مروجہ رسوم کے قبائح کا مفصل و مدلل رد ہے۔ اخیر میں شب زفاف گزارنے کا اسلامی طریقہ دلنشیں انداز میں بتلایا ہے۔ اصل فتویٰ گجراتی زبان میں تھا، دارالافتاء جامعہ ڈابھیل کے دو فاضل مفتی طاہر سورتی اور مفتی شمعون احمد آبادی نے اردو میں منتقل فرمایا، **فجزاھم اللہ احسن الجزاء**۔ مفتی محمود صاحب بارڈولی زید مجدہ [مجاز فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے کہ موصوف نے گجراتی، اردو اور انگریزی زبان میں ان مسائل کی نشر و اشاعت کا خوب اہتمام کیا۔ ان کو چھوٹے چھوٹے کتابچوں اور پمفلٹوں میں چھپوا کر ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کیا، اب ان مسائل کو اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

(۷) حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں (رحمۃ اللہ علیہ) کی مقبولیت کا راز:

حضرت مولانا علی میاں (رحمۃ اللہ علیہ) کے وصال کے بعد ۳۰/ جولائی ۲۰۰۰ء ڈیوزبری برطانیہ میں M.C.F (مسلم کمیونٹی فارم) کے ذمہ داروں نے ایک تاریخی سمپوزیم قائم کیا، جس میں برطانیہ کے سرآوردہ اہل علم کے علاوہ دیگر ممالک کے اصحاب فضل و کمال کو مدعو کیا گیا تھا، یہ مقالہ اس سمپوزم کے لئے لکھا تھا۔ مقالہ سے پہلے احقر کا ''پیش لفظ'' ہے جس میں مزید تفصیل مذکور ہے۔

(۸) خطبۂ صدارت:

۱۹۹۵ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا بارہواں اجلاس احمد آباد میں منعقد ہوا، دو عظیم الشان سادات بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) اور مفتئ گجرات حضرت مفتی سید عبدالرحیم لاجپوری (رحمۃ اللہ علیہ) کے ایماء پر حضرت نے یہ خطبہ لکھا تھا۔ سامعین نے خطبہ کو خوب پسند کیا، بعض ارباب بصیرتِ نے اجلاس کا لُبّ لُباب قرار دیا۔ مزید تفصیل ’’مولانا علی میاں کی مقبولیت کا راز‘‘ کے مقدمہ میں ملاحظہ کیجئے۔

(۹) بیعت ہونے والوں کو ہدایت:

حضرت مرشد العلماء کو اللہ تعالیٰ نے علم ظاہر و باطن سے سرفراز فرمایا ہے۔ ایک طرف آپ مفتی و شیخ الحدیث ہیں تو دوسری طرف آپ پیرِ طریقت بھی ہیں، جس طرح طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتا ہے اسی طرح آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرماتے ہیں اور اِس وقت بے شمار روحانی مریض آپ کے زیر علاج ہیں، بیمار جس وقت آپ کے روحانی شفاخانہ میں داخل ہوتا ہے اس وقت اس سے علاج کا نسخہ اختیار کرنے اور بد پرہیزی سے بچنے کا عہد لیا جاتا ہے۔ یہ رسالہ رہروان سلوک کے لئے سرمایۂ بصیرت و مشعلِ راہ ہے۔ ۱۴۲۱ھ میں احمد آباد کے ایک مخلص خادم نے قلم بند کر کے اہل بیعت کی سہولت کے خاطر گجراتی میں شائع کیا تھا جس کو بعد میں اردو کے لبادہ میں ڈھال کر کے افادہ عام کر دیا گیا۔

(۱۰) مدارس کے سفراء کے ساتھ ہمارا سلوک ایک لمحۂ فکریہ:

ظاہر ہے کہ ہر مقصد کے حصول کے اپنے طریقے ہوتے ہیں، ہمارے اکابر (رحمۃ اللہ علیہ) نے سر زمین ہند میں مدارس کی داغ بیل ڈالی، ان کے بقاء کے لئے عوامی چندہ کا طریقہ اختیار فرمایا جو مدارس ملّت کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس کی برکات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ گجرات کے بعض علاقوں میں ان سفراء کے ساتھ بدسلوکی کی شکایت موصول ہوئی، حضرت کے حساس دل میں اس کی اصلاح کی فکر دامن گیر ہوئی، اسی وقت اس موضوع پر طویل مضمون املاء کروایا جس میں چندہ کا ثبوت، اکابر دیوبند کا عمل اور اس سلسلہ کے دوسرے واقعات مذکور ہیں، اصل مضمون اردو زبان میں تھا، جناب عبد القادر فاتی والا صاحب زید مجدہ نے اسے گجراتی زبان کا جامہ پہنایا اردو مضمون ماہنامہ ''اذان بلال'' آگرہ، گجراتی ماہنامہ ''الاصلاح'' سملک اور ہفتہ واری اخبار ''امید'' سورت میں قسط وار طبع ہوا، اب اسے بھی مجموعۂ ہٰذا کا جزء بنایا گیا ہے۔

ٹائٹل کے عناوین

جلی قلم سے ''کتاب الفضائل'' لکھنا ہے

تلاوتِ قرآن کے فضائل۔ قرآن یاد رکھنے کی تاکید۔ بعض سورتوں اور آیتوں کے فضائل۔ وضو کے فضائل۔ اذان کے فضائل۔ نماز اور جماعت کی تاکید اور فضائل۔ یوم جمعہ کے آداب و فضائل۔ تہجد کے فضائل۔ تراویح کے فضائل۔ لیلۃ القدر کے فضائل۔ خصال فطرت اور مسواک کے فضائل۔ زکوۃ کے فضائل اور بنیادی مسائل۔ روزہ کے فضائل و مسائل۔ حج کے فضائل

کتاب الجہاد

باب وجوب الجهاد وفضل الغدوة والروحة

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّآإِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لاَ شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً۔ أما بعد:-

فَأَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً، وَاعْلَمُوْآ أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ. (التوبة:٣٦)

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ، وَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ، وَعَسٰى أَنْ تُحِبُّوْا شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لاَ تَعْلَمُوْنَ. (البقرة:٢١٦)

فضائل کا سلسلہ چل رہا ہے، اسی مناسبت سے جہاد کے فضائل کو بیان فرمارہے ہیں ۔

جہاد کا معنیٰ اور اس کی قسمیں

”جہاد“ عربی زبان کا لفظ ہے، اور مصدر کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے۔ جس میں کسی کام کے کرنے یا ہونے کو بتلایا جائے؛ اس کو مصدر کہتے ہیں ۔جَاهَدَ يُجَاهِدُ مُجَاهَدَةً وَجِهَاداً، کا معنٰی کوشش کرنا، محنت ومشقت اٹھانا۔ یہ تو اس کا ڈکشنری اور لغت کے اعتبار سے ترجمہ ہوا۔ شریعت کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی کے لئے اپنی انتہائی کوشش کو صرف کرنا، یہاں تک کہ اس کے لئے مال وجان کی جو بھی قربانی دینی پڑے؛ اس سے دریغ نہ کرنا؛ اس کا نام ”جہاد“ ہے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں کہ جہاد کی کئی قسمیں ہیں: (۱) جہاد مع النفس (۲) جہاد مع الشیطان (۳) جہاد مع الکفار والمنافقین (۴) جہاد مع أھل المنکرات والبدعات والمظالم۔

پہلی قسم اور اس کے چار درجات ہیں

"جہاد مع النفس" یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے اجتناب کے سلسلہ میں آدمی کا اپنے نفس کے مقابلہ میں محنت و مشقت اٹھانا اور اپنی کوشش کو استعمال کرنا۔ پھر اس کے چار درجات بتلائے گئے ہیں ۔علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ان چاروں درجوں سے آدمی گزر جاتا ہے تب ہی "عالمِ ربانی" کہلاتا ہے۔ عالمِ ربانی ہونے کے لئے ان چاروں درجات سے گزرنا ضروری ہے۔

پہلا درجہ

۱ :- تحصیلِ علم: دین اور شریعت کے احکام کو جاننے کے لئے مشقت اٹھانا۔ کون سی باتوں سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور کون سے کاموں سے ناراض ہوتے ہیں؛ ان دونوں چیزوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ اور یہ وہ چیزیں ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے بندوں کو بتلاتے ہیں۔ ایک انسان کے حواس اور عقل میں اس بات کی صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے طور پر یہ معلوم کرلے کہ اللہ تعالیٰ کون سے کاموں سے راضی ہوتے ہیں اور کون سے کاموں سے ناراض ہوتے ہیں ، وحی اسی لئے اتاری جاتی ہے۔

ارے بھائی! ایک معمولی انسان کی رضامندی، عدم رضامندی بھی دوسرا انسان اپنی عقل وحواس سے معلوم نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے۔ آپ کون سی چیز سے راضی ہوں گے اور کون سی چیز سے ناراض ہوں گے، یہ مَیں نہیں کہہ سکتا جب تک کہ آپ مجھے نہ بتلائیں ۔اور مَیں کون سی چیز سے خوش ہوتا ہوں ، اور کون سی چیز سے ناراض ہوتا ہوں، جب تک کہ مَیں آپ کے سامنے وضاحت کے ساتھ نہیں بتلاؤں گا، وہاں تک آپ کو پتہ نہیں چلے گا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کون سے کاموں سے راضی ہوتے ہیں اور کون سے کاموں سے ناراض ہوتے ہیں یہ جب تک اللہ تعالیٰ خود ہی نہیں بتلائیں گے؛ کسی کو کیسے پتہ چلے گا۔ اسی چیز کو بتلانے کے لئے وحی نازل کی جاتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے بندوں میں سے بعض بندوں کو اس مقصد اوران خدمات کی انجام دہی کے لئے مخصوص کرلیتے ہیں، ان کو بذریعۂ وحی بتلایا جاتا ہے، اور پھر ان کو اس بات کا مکلف کیا جاتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی اس مرضی اور نامرضی کو اللہ کے بندوں تک پہنچائیں ۔

تو اللہ تعالیٰ کون سی چیزوں سے راضی ہیں اور کون سی چیزوں سے ناراض ہیں اس کا نام دین اور شریعت ہے۔ تو اسی دین اور شریعت کو سیکھنے کے لئے اپنے نفس سے مقابلہ کرنا، اوراس کے لئے مشقت اور تکلیف اٹھانا؛ یہ جہاد مع النفس کا پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ

۲:- تعمیل: جب اللہ تعالیٰ کے اوامر اور نواہی کا علم ہو گیا کہ کون سی چیزوں کے کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، اور کون سی چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے، تو اب دوسرا درجہ یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے کی خاطر اپنی طبیعت اور مزاج کو جمانے کے لئے اپنے نفس سے مقابلہ کرنا اور مشقت اٹھانا۔ اس کے لئے جو محنت اور کوشش کی جاتی ہے، یہ جہاد مع النفس کا دوسرا درجہ ہے۔

ہم نے یہ جان تو لیا کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اور دوسرے نیکی کے کام اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے والے ہیں۔ اور چوری، زنا، شراب نوشی، سود اور حرام خواہشاتِ نفس وغیرہ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والے کام ہیں، لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو کرنے کی چیزوں کو کرنے کے لئے مشقت اُٹھانی پڑتی ہے، اس کے لئے ہمیں اپنے نفس سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، اس کے لئے محنت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح بچنے کی چیزوں سے بچنے کے واسطے جو محنت و مشقت اٹھائی جاتی ہے؛ یہ جہاد مع النفس کا دوسرا درجہ ہے۔

تیسرا درجہ

۳:- **تعلیم و تبلیغ:** نمبر اول پر خود جان لیا، نمبر دو پر خود عمل کا اہتمام کیا، تو اب تیسرے نمبر پر درجہ آئے گا کہ جو اللہ کے بندے ان چیزوں کو نہیں جانتے ان کو سکھلانا اور ان تک اس کو پہنچانا۔ تعلیم و تبلیغ ساتھ ساتھ ہے، الگ الگ چیز نہیں ہے۔ تو اللہ کے بندوں تک پہنچانا اور سکھلانا؛ یہ کام بھی مشقت کا طالب ہے۔ اس میں بھی آدمی کو کوشش کرنی پڑے گی، اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرنا پڑے گا، مشقت اٹھانی پڑے گی۔ تو یہ جو مشقت اٹھائی جاتی ہے یہ جہاد مع النفس کا تیسرا درجہ ہے۔

چوتھا درجہ

۴:- **صبر:** جب آپ یہ کام شروع کریں گے تو اس کے اندر دوسروں کی طرف سے رکاوٹیں ڈالی جائیں گی، مخالفین اٹھیں گے، آپ کو یہ کام کرنے نہیں دیں گے۔ تو اب ان کی طرف سے جو رکاوٹیں ڈالی جائیں ، یا ان کی طرف سے جو تکلیفیں پہنچائی جائیں ، ان کو برداشت کرنا؛ یہ جہاد مع النفس کا چوتھا درجہ ہے۔

دوسری قسم اور اس کے دو درجے

جہاد کی دوسری قسم "جہاد مع الشیطان" ہے۔اس کے دو درجے ہیں :-

ا :-شکوک وشبہات: آدمی کے ایمان کو خراب کرنے کے لئے آدمی کے قلب اور دل میں شیطان شکوک وشبہات ڈالتا ہے، ان کو دور کرنے کے لئے کوشش کرنا، مشقت اٹھانا، محنت کرنا؛ یہ پہلا درجہ ہے۔جب اس درجہ سے آدمی پار ہو جاتا تو وہ **"مقامِ یقین"** پر فائز ہوتا ہے۔

۲ :-شہوات اور منکرات: آدمی کے ایمان اور عمل میں خرابی ڈالنے کے لئے شیطان انسان کی شہوتوں کو ابھارتا ہے، اس کی خواہشات کو برانگیختہ کرتا ہے، منکرات میں مبتلا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، تو ان سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے شیطان کا جو مقابلہ کیا جائے گا، جو محنت ومشقت برداشت کی جائے گی، اس کے لئے جو کوشش کی جائے گی: یہ جہاد مع الشیطان کا دوسرا درجہ ہے۔جب آدمی اس درجہ میں کامیاب ہوتا ہے تو وہ **"مقامِ صبر"** پر فائز ہوتا ہے۔

اور جب آدمی کو یہ دونوں چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی کو امامت اور پیشوائی کا منصب دیا جاتا ہے:﴿وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ

بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ﴾ ہم نے ان کے اندر سے ایسے ائمہ اور راہبر بنائے جو لوگوں کو ہمارے حکم سے ہدایت کا راستہ بتلاتے ہیں، جب انہوں نے صبر سے کام لیا، یعنی عمل کے سلسلہ میں شیطان کی طرف سے جو رکاوٹیں ڈالی جاتی تھی، اور ایمان کے معاملہ میں اس کی طرف سے جو شکوک وشبہات پیدا کئے جاتے تھے ان کا مقابلہ کیا۔

تیسری قسم اور اس کے چار مراتب ہیں

ان دونوں کے بعد "**جہاد مع الکفار والمنافقین**" کا نمبر آتا ہے۔ جو آدمی خود اپنے نفس ہی کو زیر نہ کر پایا ہو، شیطان کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوا ہو؛ بھلا وہ دوسروں سے کیا مقابلہ کرے گا۔ اس لئے ان دو درجوں کے بعد تیسرا درجہ "**جہاد مع الکفار والمنافقین۔**" آتا ہے۔ اس کے اندر بھی چار مراتب ہیں :-

[۱] جہاد بالقلب؛ دل سے جہاد کرنا۔

[۲] جہاد باللسان؛ زبان سے جہاد کرنا۔

[۳] جہاد بالمال؛ مال سے جہاد کرنا۔

[۴] جہاد بالنفس؛ جان سے جہاد کرنا۔

"جہاد مع الکفار والمنافقین" کے یہ چار درجے ہیں ، لیکن آج کل لوگ اس میں سے صرف ایک ہی چیز کو "جہاد بالنفس"۔ جس کو قتال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاد سمجھتے ہیں، حالاں کہ وہ تو جہاد کی ایک قسم اور اس کا ایک درجہ و مقام ہے۔

چوتھی قسم اور اس کے تین طریقے

چوتھی قسم "اہلِ منکرات، اہلِ بدعات، ظالموں" سے جہاد کرنا۔ جو لوگ شریعت کے خلاف امور میں پھنسے ہوئے ہیں، گناہوں میں جکڑے ہوئے ہیں بدعات کا شکار ہیں، لوگوں کی حقوق تلفی میں مبتلا ہیں ان کا مقابلہ اور ان کو ان حرکتوں سے باز رکھنے کے لئے جو محنت کی جاتی ہے؛ وہ بھی تین طرح کی ہے:-

۱ بالید؛ ہاتھ سے روکا جائے۔

۲ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو باللسان؛ زبان سے روکا جائے۔

۳ اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو بالقلب؛ دل سے اس کو برا سمجھے۔

"مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ ،فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ،فَإِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَذَالِكَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ" جو آدمی شریعت کے خلاف کوئی کام ہوتا ہوا دیکھے؛ تو اس کو اپنے ہاتھ

سے روکے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے روکے، اس کی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھے یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ تو یہ تین قسمیں ہوئیں ۔

تو اس طرح جہاد کی کل چار قسمیں اور تیرہ درجات ہوئے، ان میں سے ایک قسم یہ ہے کہ آدمی اپنے مال اور جان کو لے کر نکلے اور اپنی جان کو اللہ کے راستہ میں قربان کر دے جس کو قتال سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے؛ یہ جہاد کا اعلیٰ درجہ ہے۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عادت کے مطابق شروع میں کچھ آیات پیش کی ہیں :

قتال؛ مجبوری کا علاج ہے

﴿وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ (التوبة: ٣٦)

اور تم تمام مشرکین کے ساتھ قتال کرو جیسے وہ سب تمہارے ساتھ قتال کرتے ہیں، اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ تو انہیں کے ساتھ ہے جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں ۔

یہاں ایک بات یاد رہے، علماء لکھتے ہیں کہ: ”قتال“ تو مجبوری کے درجے کا علاج ہے، جیسے: اگر آپ کے جسم کے کسی عضو میں کوئی بیماری لگ گئی، کوئی زخم ہو گیا، تو پہلے مرہم سے آپ اس کا علاج کریں گے، اگر اسی سے اچھا ہو گیا تو ٹھیک ہے، اگر مرہم کارآمد نہیں ہوا، تو

پھر نشتر لگایا جاتا ہے، اس سے بھی اگر فائدہ نہیں ہوتا تو پھر آخر میں ڈاکٹر کہتا ہے کہ اس کو عضو کو کاٹ دو، ورنہ یہ سڑا آگے پھیلے گا اور پورے جسم کو خراب کرے گا۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دلوں پر مُہر لگ چکنے کی وجہ سے شیطانی طریقہ کار کو اپنا کر دین کی نشر واشاعت، اور دین کی راہوں میں ایسے روڑے اٹکاتے ہیں کہ ان کو راہ سے ہٹائے بغیر دین کا آگے بڑھنا مشکل ہو جاتا ہے؛ اسی کے لئے ''قتال'' کو مشروع کیا گیا ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ بطورِ علاج عضو کو کاٹنے والا درجہ ہے۔ اسی کو اس آیت میں کہا گیا کہ: تمام مشرکین کے ساتھ قتال کرو جیسے وہ سب مل کر تم سے قتال کرتے ہیں۔ یعنی جب تمہارے ساتھ مقابلہ کی نوبت آتی ہے تو وہ سب ایک ہو جاتے ہیں اور نیشنل ایلائنس (National Alliance) متحدہ محاذ قائم کرتے ہیں؛ تو آپ بھی ان کے مقابلہ کے لئے متحد ہو کر رہو۔

اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہو...

دوسری آیت پیش فرمائی ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ. (البقرة:۲۱٦)﴾ تم پر قتال کو فرض کیا گیا ہے اور یہ چیز تم کو ناپسند ہے اس لئے کہ ظاہر ہے کہ اس میں آدمی کو اپنے مال، یا اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے، تو طبیعت اس کے لئے کیسے آمادہ ہو گی، لیکن

ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند سمجھو لیکن اسی میں تمہارے لئے بھلائی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک چیز کو تم پسند کر رہے ہو لیکن اس میں تمہارے لئے برائی ہو۔ سارے حالات و حقائق سے اللہ تعالیٰ واقف ہے اور تم ساری چیزوں سے واقف نہیں ہو۔

قتال اور جہاد کے لئے نکلو...

﴿إِنْفِرُوا خِفَافاً وَثِقَالاً وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ﴾ (التوبة:۴۱) باری تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا کہ: قتال اور جہاد کے لئے نکلو ہلکے اور بھاری، یعنی اسباب اور وسائل تمہارے پاس پورے طور پر موجود ہوں تب بھی؛ اس کو بھاری سے تعبیر کیا گیا، اور پورے اسباب و وسائل نہ ہو تب بھی؛ اس کو ہلکے سے تعبیر کیا گیا، اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔

یہی بڑی کامیابی ہے

﴿إِنَّ اللهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللهِ

فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ وَذَالِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾(التوبة:۱۱۱) بے شک اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں سے خرید لیا ہے ان کی جانوں اور مالوں کو اس کے بدلے میں کہ ان کے لئے جنت ہے (گویا تمہاری جان اور مال کا اللہ تعالیٰ نے سودا کر لیا ہے، اور اس کی قیمت جنت مقرر کر دی گئی ہے، اور اس کے بدلہ میں تم سے تمہاری جان اور مال کا مطالبہ کیا گیا ہے، جب تم ایمان لے آئے اور اقرار کر لیا تو گویا اس سودے کو تم نے منظور کر لیا) اللہ کے راستہ میں لڑتے ہیں، دشمنوں کو قتل کرتے ہیں اور خود بھی قتل ہوتے ہیں۔ اور یہ چیز تورات، انجیل اور قرآن میں اللہ تعالیٰ کے ذمہ وعدہ کے طور پر ہے (اور اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر اپنے وعدہ، عہد و پیمان کو پورا کرنے والا اور کون ہو سکتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا کر کے رہے گا) پس تم خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے

﴿لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فَضَّلَ اللهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً وَكُلًّا وَعَدَ اللهُ الْحُسْنَى، وَفَضَّلَ اللهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا دَرَجَاتٍ مِنْهُ وَمَغْفِرَةً وَرَحْمَةً وَكَانَ اللهُ غَفُورًا رَحِيمًا﴾

(النساء:۹۵،۹۶) جو ایمان والے جہاد میں شریک نہیں ہوتے اور کسی قسم کی معذوری کے بغیر گھروں پر بیٹھے رہتے ہیں اور جو اللہ کے راستہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں (یہ دونوں) برابر نہیں ہوسکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جان اور مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کے اعتبار سے فضیلت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد فرضِ عین نہیں ہے، بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ اس لئے کہ اگر فرضِ عین ہوتا تو صرف اتنی بات نہیں ہوتی کہ دوسروں کو فضیلت عطا فرمائی جاتی، بلکہ نہ کرنے والے گنہ گار ٹھہرتے۔ اور ان میں سے ہر ایک سے اللہ تعالیٰ نے اچھے بدلہ کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت دی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے دئے جانے والے درجات، بخشش اور رحمت ہے، اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

عذاب سے بچانے والا کاروبار

﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ، تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ، يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ، ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، وَأُخْرٰى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِنَ اللهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ (الصف:۱۰-۱۳)﴾ اے ایمان والو! کیا میں تم کو

ایک ایسی تجارت (اور کاروبار بتلاؤں) جو تم کو دردناک عذاب سے نجات دے گا۔ (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اور اللہ کے راستے میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرو، یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ (جب تم یہ کرلوگے) تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور تم کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں ، اور ایسے عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ کے باغات میں بنے ہوئے ہیں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے، اور اس کے علاوہ بھی (تم کو اللہ تعالیٰ) وہ چیز (دے گا) جس کو تم پسند کرتے ہو (یعنی دنیوی اعتبار سے فوری فائدہ میں) اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوگی، اور (تمہیں) کامیابی (حاصل ہوگی) اور (دنیوی اعتبار سے بھی) ایمان والوں کو (اچھے ثمرات مرتب ہونے کی) خوش خبری سنادو۔

اس سلسلہ میں آیتیں بھی بے شمار ہیں ، اور جہاد کی فضیلت پر احادیث بھی بے شمار ہیں ۔ محدثین نے اس پر مستقل کتابیں لکھیں ہیں ، اور عام انداز سے حدیث کی جو کتابیں تصنیف کی گئی ہیں ان میں بھی مستقل عنوان قائم کرکے روایتیں پیش کی گئی ہیں ۔ یہاں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ چند روایتوں کو پیش کرتے ہیں :-

کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟

حدیث ۱۲۸۵:-

عن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ:سُئِلَ رسول الله-ﷺ-:أَيُّ العَمل أَفْضَلُ؟قَالَ:((إيمَانٌ بِاللهِ وَرَسُولِهِ)) قيلَ:ثُمَّ مَاذَا؟قَالَ:((الجهادُ فی سَبيلِ اللهِ)) قِيلَ : ثُمَّ مَاذَا ؟ قَالَ : ((حَجٌّ مَبْرُورٌ))

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا گیا: کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کونسا عمل (بہتر ہے)؟ فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کونسا (عمل اچھا ہے)؟ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: حج مبرور۔

حدیث ۱۲۸۶:-

وعن ابن مسعود -رضی الله عنه-، قَالَ : قُلْتُ : يَا رسولَ الله ! أَيُّ العَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللهِ تَعَالَى ؟ قَالَ : ((الصَّلاَةُ عَلَى وَقْتِهَا)) قُلْتُ : ثُمَّ أَيٌّ ؟ قَالَ : ((بِرُّ الوَالِدَيْنِ)) قلتُ : ثُمَّ أَيٌّ ؟ قَالَ : ((الجِهَادُ فی سَبيلِ اللهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ کے نزدیک کون سا عمل سب سے زیادہ محبوب (اور پسندیدہ) ہے؟ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:

وقت پر نماز ادا کرنا۔میں نے پوچھا: اس کے بعد کون سا؟ فرمایا: والدین کے ساتھ حسنِ سلوک (اور بھلائی کا معاملہ کرنا) میں نے عرض کیا: اس کے بعد کون سا؟ فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

حدیث ۱۲۸۷:-

وعن أبي ذرّ-رضی الله عنه-قَالَ: قُلْتُ: يَارسول الله! أيُّ العَمَلِ أفْضلُ؟ قَالَ: ((الإيمَانُ بِاللهِ، وَالجِهَادُ فی سَبِيلِهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

اللہ کے راستے میں ایک صبح یا شام

حدیث ۱۲۸۸:-

وعن أنس-رضی الله عنه-: أنَّ رسول الله-ﷺ-قَالَ: ((لَغَدْوَةٌ فی سَبيلِ اللهِ، أَوْ رَوْحَةٌ، خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا فِيهَا)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں صبح کے وقت یا شام کے وقت چلنا؛ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر ہے۔

افادات:-اس زمانہ میں جب پیدل یا اونٹوں وغیرہ کی سواریوں پر سفر کرتے تھے تو صبح کے وقت روانہ ہو کر دو چار گھنٹہ سفر کرنے کے بعد جب دھوپ تیز ہو جاتی تو آرام کرتے تھے، اور دوپہر کے وقت جب سورج ڈھل جاتا، دھوپ کی تیزی کم ہو جاتی تو شام کے وقت پھر دوبارہ سفر شروع کرتے۔ صبح کو جو سفر کیا جاتا تھا؛ اس کو ''غَدْوَةٌ'' اور شام والے سفر کو ''رَوْحَةٌ'' کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی صبح کے وقت دو تین گھنٹہ کا سفر، یا شام کا کچھ وقت اللہ کے راستہ میں سفر کرے، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر ہے۔

دیکھو! اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کو پورا کرنے کے لئے آدمی جب گھر سے نکلے گا تو اس کو یہ فضیلت حاصل ہو گی۔ چناں چہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے "باب السعي إلى الجمعة" (جمعہ کی نماز کے لئے آدمی کا گھر سے نکلنا) میں اس روایت کو بھی پیش کیا ہے۔

لوگوں میں بہتر کون؟

حدیث ۱۲۸۹ :-

وعن أَبِي سعيدٍ الخدريِّ - رضى الله عنه - قَالَ : أَتَى رَجُلٌ رسولَ اللهِ -ﷺ- فَقَالَ : أَيُّ النَّاسِ أَفْضَلُ ؟ قَالَ : ((مُؤْمِنٌ يُجَاهِدُ بِنَفْسِهِ وَمَالِهِ فِى سَبِيلِ اللهِ)) قَالَ : ثُمَّ مَنْ ؟ قَالَ : ((مُؤْمِنٌ فِى شِعبٍ مِنَ الشِّعَابِ يَعْبُدُ اللهَ وَيَدَعُ النَّاسَ مِنْ شَرِّهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا اور پوچھا: لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے؟ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: وہ ایمان والا جو اللہ کے راستہ میں اپنی جان و مال دونوں کے ذریعہ جہاد کرے۔ پھر پوچھا: اس کے بعد کون؟ فرمایا: وہ ایمان والا جو پہاڑ کی کسی گھاٹی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہو، اور لوگوں کو اپنی ایذارسانیوں سے محفوظ رکھے۔

افادات:- اپنی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں سے لوگوں کو بچائے رکھنا بھی بہت بڑی عبادت اور بہت اونچا مقام ہے۔ آج کل لوگ اس کا اہتمام نہیں کرتے، بلکہ بعضوں نے تو اپنی زندگی کا مشن ہی دوسروں کے درپئے آزار ہونا، دوسروں کو تکلیف پہنچانا بنالیا ہے، یہ بھی عجیب معاملہ ہے، حالاں کہ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ" حقیقی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذاءرسانیوں سے

دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ تو یہ بھی بہت اونچا مقام ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنی ایذا رسانیوں اور اپنے شر سے بچائے۔

اللہ کے راستہ میں ایک دن پہرہ دینے کے فضائل

حدیث ۱۲۹۰:-

وعن سهل بن سعد -رضی الله عنه-: أَنَّ رسول الله -ﷺ- قَالَ: ((رِبَاطُ يَوْمٍ فِي سَبِيلِ اللهِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، وَمَوْضِعُ سَوْطِ أَحَدِكُمْ مِنَ الجَنَّةِ خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا، وَالرَّوْحَةُ يَرُوحُهَا العَبْدُ فی سَبِيلِ اللهِ تَعَالَى، أَوِ الغَدْوَةُ، خَيْرٌ مِنَ الدُّنْيَا وَمَا عَلَيْهَا)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستہ میں ایک دن سرحدوں کی حفاظت کرنا (وہاں چوکی اور پہرہ دینا) دنیا اور دنیا میں جو کچھ بھی ہے اس سب سے بہتر ہے (یعنی اس کا اجر و ثواب دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے) اور جنت میں تم میں سے کسی کی ایک کوڑے کے برابر جگہ (یعنی وہاں کی چھوٹی سی جگہ) دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر ہے (یعنی اس کی قیمت دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں سے بڑھ کر ہے) اور کوئی بندہ اللہ کے راستہ میں شام کے وقت، یا صبح کے وقت چلے؛ یہ دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے اس سب سے بہتر ہے۔

افادات:–دشمنوں کے مقابلہ کے لیے سرحدوں پر جو فوج مقرر کی جاتی ہے، تا کہ وہاں پہرہ دیا جائے اور ملک کی حفاظت ہو؛ اس کو ”رباط“ کہتے ہیں۔

پہرہ دینے پر اتنا بڑا اجر کیوں ؟

حدیث ۱۲۹۱:-

وعن سَلْمَانَ - رضی الله عنه -، قَالَ : سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول : رِبَاطُ يَوْمٍ وَلَيْلَةٍ خَيْرٌ مِنْ صِيَامِ شَهْرٍ وَقِيَامِهِ، وَإِنْ مَاتَ جَرَى عَلَيْهِ عَمَلُهُ الَّذِي كَانَ يَعْمَلُ، وَأُجْرِيَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ، وَأَمِنَ الفَتَّانَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:–حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ایک دن رات کا اللہ کے راستہ میں پہرہ دینا پورے مہینہ کے روزے اور پورا مہینہ راتوں کو اللہ کے سامنے عبادت کے لئے کھڑا ہونے سے بہتر ہے، اور اگر اسی میں موت آگئی تو اس کا یہ عمل برابر جاری رہے گا۔ (یعنی قیامت تک اس کو اس عمل کا ثواب ملتا رہے گا) اور اس کی روزی بھی اس کے لئے جاری رہے گی، اور وہ آدمی قبر کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔

افادات:–پورے مہینہ تک آدمی روزہ رکھے اور رات بھر عبادت کرتا رہے، اس کے مقابلہ میں فقط ایک دن رات اللہ کے راستہ میں پہرہ دینے کا ثواب زیادہ ہے۔ اس لئے کہ

اس کی وجہ سے اللہ کے بے شمار بندے اپنے آپ کو اللہ کی عبادت کے لئے فارغ کر سکیں گے، ورنہ یہ ہو گا کہ اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری کا کسی کو بھی موقع نہیں ملے گا۔

جو عمل قیامت تک جاری رہے گا

حدیث ۱۲۹۲:-

وعن فَضَالَةَ بن عُبَيْد - رضى الله عنه - أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : كُلُّ مَيِّتٍ يُخْتَمُ عَلَى عَمَلِهِ إِلاَّ المُرَابِطَ فِي سَبِيلِ اللهِ، فَإِنَّهُ يُنمي لَهُ عَمَلُهُ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ، وَيُؤَمَّنُ فِتْنَةَ القَبْرِ. رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر مرنے والے کا عمل ختم ہو جاتا ہے، مگر اللہ کے راستہ میں سرحدوں کی حفاظت کرنے والا کہ قیامت تک اس کے عمل کا اجر بڑھتا رہے گا۔ اور قبر کے فتنہ سے اس کو محفوظ اور مامون رکھا جائے گا۔

افادات:- ظاہر ہے کہ موت کی وجہ سے عمل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے اور جو بھی اعمال آدمی کرتا ہے وہ موقوف ہو جاتے ہیں، مگر جو آدمی اللہ کے راستہ میں سرحد کی حفاظت پر مامور تھا اور اسی حالت میں اس کی موت آگئی، تو اس کا یہ عمل قیامت تک بڑھتا

رہے گا، انتقال کے بعد بھی اس کے اس عمل کے اندر اللہ تعالیٰ ترقی دیتے رہیں گے اور قیامت تک اس کو اس عمل کا اجر ملتا رہے گا۔

دیکھئے! بعض اعمال تو وہ ہیں جن کو صدقۂ جاریہ کی حیثیت دی گئی ہے، جیسے: ایک آدمی نے کسی کو علم پڑھایا، اس نے اس پر عمل کیا، پھر اس نے دوسرے کو پڑھایا، اس نے تیسرے کو پڑھایا۔ یا کسی آدمی نے کوئی نیکی کا ایسا کام کیا کہ اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں جیسے: مسجد تعمیر کر دی، مدرسہ تعمیر کر دیا، کنواں بنا دیا، اور مسافر خانہ تعمیر کیا؛ تو وہاں جو ثواب ملتا ہے وہ لوگوں کے اس کے عمل سے فائدہ اٹھانے کے نتیجہ میں ملتا ہے، لیکن یہاں پر اس کا عمل اس کے مقابلہ میں الگ ہے، وہ آدمی اللہ کے راستہ میں سرحدوں کی حفاظت کا جو کام کر رہا تھا، اس کی موت کی وجہ سے اس کے عمل کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا ہے؛ لیکن نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ اس کے باجود اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں اتنا قیمتی ہے کہ اس کی موت ہو چکنے کے باوجود اس کا یہ عمل قیامت تک بڑھتا رہے گا اور جب عمل بڑھتا رہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ثواب بھی اس کو ملتا رہے گا۔

ایک دن کا عمل ہزار دنوں سے بڑھ کر

حدیث ۱۲۹۳:-

وعن عثمان -رضی الله عنه-، قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقول: ((رِبَاطُ يَوْمٍ في سَبيلِ اللهِ، خَيْرٌ مِنْ أَلْفِ يَوْمٍ فِيمَا سِوَاهُ مِنَ المَنَازِلِ)) (رواه الترمذي، وقال: ((حديث حسن صحيح)).

ترجمہ:- حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ کے راستہ میں ایک دن سرحدوں کی حفاظت کرنا، شریعت کے دوسرے مراتب کے ہزار دنوں سے بڑھ کر ہے۔

افادات:- ایک دن کا عمل ہزار دنوں سے بڑھ کر ہے، اس لئے کہ اس کی وجہ سے شریعت کی حفاظت اور اس کی ترویج ہوتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں شریعت کے تمام اعمال پر عمل کرنا دوسرے آدمیوں کے لئے ممکن ہوتا ہے۔

جہاد اور شہادت کی اہمیت

حدیث ۱۲۹۴:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رسول الله ﷺ: تَضَمَّنَ اللهُ لِمَنْ خَرَجَ فِی سَبِيلِهِ، لا يُخْرِجُهُ إِلاَّ جِهَادٌ فِی سَبِيلِی، وَإِيمَانٌ بِی، وَتَصْدِيقٌ بِرُسُلِی، فَهُوَ عَلَيَّ ضَامِنٌ أَنْ أُدْخِلَهُ الجَنَّةَ، أَوْ أُرْجِعَهُ إِلَى مَنْزِلِهِ الَّذِی خَرَجَ مِنْهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ، أَوْ غَنِيمَةٍ. وَالَّذِی نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، مَا مِنْ كَلْمٍ يُكْلَمُ فِی سَبيلِ اللهِ، إِلاَّ جَاءَ يَوْمَ القِيَامَةِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ كُلِمَ؛ لَوْنُهُ لَوْنُ دَمٍ، وَرِيحُهُ رِيحُ مِسْكٍ. وَالَّذِی نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَوْلاَ أَنْ يَشُقَّ عَلَى المُسْلِمِينَ مَا قَعَدْتُ خِلاَفَ سَرِيَّةٍ تَغْزُو فِی سَبيلِ اللهِ أبداً، وَلكِنْ لاَ أجِدُ سَعَةً فأَحْمِلُهُمْ وَلاَ يَجِدُونَ سَعَةً، وَيَشُقُّ عَلَيْهِمْ أَنْ يَتَخَلَّفُوا عَنِّی. وَالَّذِی نَفْس مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ، لَوَدِدْتُ أَنْ أَغْزُوَ فِی سَبيلِ اللهِ، فَأُقْتَلَ، ثُمَّ أغْزُوَ فَأُقْتَلَ، ثُمَّ أغْزُوَ فَأُقْتَلَ)) رواه مسلم، وروى البخاری بعضه ((الكَلْمُ)): الجُرْحُ.

ترجمہ:- حضرت أبو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے نکلتا ہے، اور سوائے اللہ کے راستہ میں جہاد کے، اور اللہ پر ایمان لانے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کے کوئی اور غرض یا نیت اس کو گھر سے نہیں نکالتی (مطلب یہ ہے کہ دل میں کوئی اور جذبہ موجود نہیں ہوتا، مثلاً: شہرت، نام آوری، ریا اور نمود، غنیمت کا حصول، مالی اعتبار سے فائدہ؛ ایسی کوئی نیت نہ ہو) تو ایسے آدمی کے لئے اللہ تعالیٰ ذمہ داری اور گارنٹی لیتے ہیں کہ میرے اوپر ضروری ہے کہ اس کو جنت کے اندر داخل کروں گا (اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا اور چوں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا کریں گے، اس لئے یہاں اس کو ان الفاظ سے تعبیر کیا کہ میرے اوپر ضروری ہے کہ اگر شہید ہو گیا تو جنت میں جائے گا) یا اگر شہید نہیں ہوا تو میں اس کو اس کے گھر جہاں سے وہ نکلا تھا ثواب اور غنیمت کے ساتھ واپس

لوٹاؤں گا (پھر حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں :) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! جو زخم اللہ کے راستہ میں آدمی کو پہنچتا ہے، قیامت کے روز وہ ایسی حالت میں آئے گا جیسے آج ہی اس کو زخم لگا ہو (یعنی جس وقت زخم لگتا ہے تو اس میں سے خون نکلتا ہے، جوں جوں وقت گزرتا ہے، خون نکلنے کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے، لیکن قیامت کے روز میدانِ حشر میں جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو گا تو اس کے زخم کی وہی ہیئت اور شکل و صورت ہو گی جو زخم لگنے کے دن تھی، یعنی عین زخم لگتے وقت جیسے خون نکلا تھا ویسے ہی خون نکل رہا ہو گا) اس کا رنگ تو خون جیسا ہو گا لیکن اس میں سے خوشبو مشک کی آ رہی ہو گی۔

(پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! اگر مسلمانوں کے مشقت میں پڑ جانے کا خیال نہ ہوتا تو کسی جماعت کو رخصت کرنے کے بعد جو اللہ کے راستہ میں جہاد کر رہی ہو؛ میں گھر پر نہ بیٹھتا۔ اس لیے کہ خود ان کے پاس بھی جہاد میں شرکت کرنے کے لئے ضروری سامان موجود نہیں ہے، اور میرے پاس بھی اتنے اسباب نہیں ہیں کہ جتنے لوگ شریک ہونا چاہتے ہیں ان سب کے لئے انتظام کر سکوں ، اور میرے بغیر مدینہ منورہ میں ٹھہرنا ان کے لیے گرانی کا باعث ہو گا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! میری دلی خواہش یہ تھی کہ میں اللہ کے راستہ میں جہاد کروں اور شہید کیا جاؤں، پھر جہاد میں شریک ہوؤں اور شہید کیا جاؤں ، پھر جہاد میں شرکت کروں اور پھر شہید کیا جاؤں (بار بار شہادت میسر آتی رہے)۔

افادات:- صحابہ کی وہ جماعت جس کو نبیؐ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جہاد کے لئے روانہ فرماتے تھے اور خود حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم بنفس نفیس اس میں شریک نہ ہوتے تھے؛ اس کو "سریہ" کہتے ہیں۔ یہاں مطلق جماعت مراد ہے، حضوراکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ جہاد کے لئے مسلمانوں کی جماعت کو روانہ کرنے کے بعد مَیں کبھی بھی گھر پر نہ بیٹھتا، بلکہ میں بھی ان کے ساتھ جاتا، لیکن میرا ہمیشہ ہر جماعت کے ساتھ جہاد کے لئے جانا مسلمانوں کے لئے مشقت کا باعث ہوتا۔ اس لیے کہ اگر حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم خود بنفسِ نفیس جس جہاد میں شرکت فرمارہے ہوں تو ظاہر ہے کہ آپ کو اس میں جاتا ہوا دیکھ کر کون مسلمان ہو گا (خاص کر حضراتِ صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم) جو مدینہ منورہ میں رہ جائے۔ یعنی وہ اس غزوہ سے غیر حاضر رہ کر مدینہ منورہ میں قیام کو کسی حال میں بھی پسند نہ کرتے، بلکہ جب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تشریف لے جاتے تو آپ کے ساتھ حضراتِ صحابہ بھی نکلنے کو اپنے لئے ضروری سمجھتے، اور ظاہر ہے کہ جہاد میں جانے کے لئے سامان اور اسباب کی ضرورت پڑتی ہے، سواری ہونی چاہیے، ہتھیار ہونے چاہئیں ،اور اس زمانہ میں ہر ایک کے پاس یہ چیزیں میسر نہیں تھیں، اسی کو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ: خود ان کے پاس بھی جہاد میں شرکت کرنے کے لئے ضروری سامان موجود نہیں ہوتا ہے، اور میرے پاس بھی اتنے اسباب نہیں کہ جتنے لوگ شریک ہونا چاہتے ہیں ان سب کے لئے انتظام کر سکوں ، اس لئے ظاہر ہے کہ سب تو

شریک نہیں ہو سکیں گے، کچھ لوگ ایسے رہیں گے جو شریک نہیں ہو پائیں گے۔اب حضور ﷺ تو تشریف لے جائیں اوران کو مدینہ منورہ میں ٹھہرنا پڑ جائے تو یہ چیز ان کے لئے گرانی اور مشقت کا باعث ہوتی، اس لئے (حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ) مَیں ہر ایک جماعت جو اللہ کے راستہ میں جہاد کے واسطے جاتی ہے اس میں شریک نہیں ہوتا۔گویا آپ کا تمام جماعتوں کے ساتھ شرکت نہ کرنا محض امت کے لیے سہولت اور آسانی پیدا کرنے کے لئے تھا۔اس روایت سے جہاد اوراس میں شہادت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رنگ خون کا؛خوشبو مشک کی

حدیث ۱۲۹۵:

وعنه قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: مَا مِنْ مَكْلُومٍ يُكْلَمُ فِى سَبِيلِ الله إِلاَّ جَاءَ يَوْمَ القِيَامةِ، وَكَلْمُهُ يَدْمِي: اللَّوْنُ لَوْنُ دَمٍ، وَالرِّيحُ رِيحُ مِسكٍ. (متفق عليه)

ترجمہ:۔حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کو اللہ کے راستہ میں زخم لگا وہ قیامت کے روز ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے اس زخم میں سے خون نکل رہا ہو گا،اس کا رنگ تو خون جیسا ہو گا،لیکن اس میں سے خوشبو مشک جیسی آرہی ہو گی۔

حدیث ۱۲۹۶:-

وعن معاذٍ رضی اللہ عنہ عن النبیِّ ﷺ قَالَ:مَنْ قَاتَلَ فی سَبِیلِ اللہ من رَجُلٍ مُسْلِمٍ فُوَاقَ نَاقَةٍ ، وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ ، وَمَنْ جُرِحَ جُرْحاً فی سَبِیلِ اللہِ أَوْ نُكِبَ نَكْبَةً فَإِنَّهَا تَجِيءُ يَوْمَ القِيَامَةِ كَأَغْزَرِ مَا كَانَتْ: لَوْنُهَا الزَّعْفَرَانُ ، وَرِيحُهَا كَالْمِسْكِ. (رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: کوئی مسلمان اللہ کے راستہ میں تھوڑی دیر کے لئے بھی جہاد و قتال کے لئے نکلا تو اس کے لئے جنت واجب ہوگئی (غور کیجئے کہ کتنا اونچا عمل ہے) اور جو آدمی اللہ کے راستہ میں نکلنے کے بعد زخمی ہوا، یا اس کو کسی بھی طرح کی تکلیف پہنچی (تکلیف کی بہت ساری شکلیں ہیں) تو قیامت کے روز وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے زخم سے بہت زیادہ خون بہہ رہا ہوگا۔ اس کا رنگ تو زعفران جیسا ہوگا اور اس کی خوشبو مشک جیسی ہوگی۔

افادات:- "فُوَاقَ نَاقَةٍ" جانور کو دوہنے کے دوران دوہنے والا جانور کے تھن کا سرا پکڑ کر دباتا اور پمپنگ کرتا ہے، اس کی وجہ سے دودھ کی دھار نکلتی ہے، ایک مرتبہ دبانے پر اس میں جتنا دودھ ہوتا ہے وہ نکل جاتا ہے، پھر انگلی کو ہٹا لیتا ہے، جب انگلی ہٹاتا ہے اتنی دیر میں پھر دوبارہ اس میں دودھ آجاتا ہے، پھر دباتا ہے، اسی طرح دباتا اور چھوڑتا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ دودھ کی دھار نکلنے کے بعد تھن کے سرے میں دوسرا دودھ لانے کے لئے ایک لمحہ

کے لئے جو انگلی ہٹائی جاتی ہے، بیچ والا وقفہ جو چند سیکنڈ کا ہوتا ہے ،اس کو عربی میں "فُوَاقٌ" کہتے ہیں ۔

اپنے گھر کی ستر سال کی عبادت سے افضل ہے

حدیث ۱۲۹۷:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: مَرَّ رَجُلٌ مِنْ أَصْحَابِ رسولِ الله ﷺ بِشِعبٍ فِيهِ عُيَيْنَةٌ مِنْ مَاءٍ عَذْبَة ، فَأَعْجَبَتْهُ ، فَقَالَ : لَو اعْتَزَلْتُ النَّاسَ فَأَقَمْتُ فِی هَذَا الشِّعْبِ ، وَلَنْ أَفْعَلَ حَتَّى أَسْتَأْذِنَ رسولَ اللهِ ﷺ فذكَرَ ذَلِكَ لرسول الله ﷺ فَقَالَ : لاَ تَفعلْ، فَإِنَّ مُقامَ أَحَدِكُمْ فِي سَبيلِ اللهِ أَفْضَلُ مِنْ صَلاَتِهِ فِي بَيْتِهِ سَبْعِينَ عَاماً. أَلاَ تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللهُ لَكُمْ ، وَيُدْخِلَكُمُ الجَنَّةَ؟ أُغْزُوا فِی سَبيلِ الله،من قَاتَلَ فِی سَبِيلِ اللهِ فُوَاقَ نَاقَةٍ وَجَبَتْ لَهُ الجَنَّةُ.

(رواه الترمذی،وقال: حديث حسن)

وَ((الفُوَاقُ)): مَا بَيْنَ الحَلْبَتَيْنِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے صحابہ میں سے ایک صحابی کسی پہاڑی علاقہ کی گھاٹی سے گزرے (پہاڑ کے اندر جو راستہ ہوتا ہے؛ اس کو " شِعَبْ " یعنی گھاٹی کہتے ہیں) وہاں انہوں نے میٹھے پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ دیکھا، ان کو وہ منظر بڑا اچھا لگا تو انہوں

نے اپنے جی میں تمنا کی کہ اگر میں سب لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر اس گھاٹی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بیٹھ جاؤں تو بہت اچھا ہو (اس سے زیادہ اچھی اور کونسی جگہ ہو سکتی ہے۔ ان کے دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی، لیکن حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اپنے دل میں آنے والی کسی بھی تمنا کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہناتے تھے جب تک کہ حضور ﷺ کے سامنے پیش نہ کریں۔ اس لئے انہوں نے ایسا نہیں کیا کہ تمنا ہوئی اور وہیں بیٹھ گئے بلکہ سوچا کہ) میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا جب تک کہ حضور اکرم ﷺ سے اجازت نہ لے لوں (اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو اچھے کاموں کی تمنا پیدا ہو تب بھی اپنے بڑوں سے مشورہ کر لینا ضروری ہے) چناں چہ انہوں نے (اپنے ارادے کا) حضورِ اکرم ﷺ کے سامنے تذکرہ کیا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (تمہارا ارادہ کوئی برا نہیں تھا، لیکن) ایسامت کرنا، اس لیے کہ تم میں سے کسی کا اللہ کے راستہ میں جہاد کے لیے کھڑا ہونا؛ اپنے گھر کی ستر سال عبادت سے افضل ہے۔ کیا تم اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کر دے اور تم کو جنت میں داخل کر دے؟ (اگر ایسا چاہتے ہو) تو اللہ کے راستہ میں جہاد کرو۔ جو آدمی اللہ کے راستہ میں اونٹنی کے دودھ دوہنے کے درمیانی وقفہ کے برابر (یعنی تھوڑی دیر) بھی قتال کرے گا، اس کے لئے جنت واجب ہو جائے گی۔

جہاد کے برابر کوئی عمل نہیں

حدیث ۱۲۹۸:-

وعنه قَالَ : قيل : يَا رسولَ اللهِ ، مَا يَعْدِلُ الجهادَ فى سَبِيلِ اللهِ ؟ قَالَ: لاَتَسْتَطِيعُونَهُ. فَأعَادُوا عَلَيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلاَثاً كُلُّ ذَلِكَ يَقُولُ : لاَ تَسْتَطِيعُونَهُ! ثُمَّ قَالَ : مَثَلُ المُجَاهِدِ فِي سَبيلِ اللهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ القَائِمِ القَانتِ بآياتِ اللهِ لايَفْتُرُ مِنْ صِيَامٍ ، وَلاَ صَلاَةٍ ، حَتَّى يَرْجِعَ المُجَاهِدُ فى سَبِيلِ اللهِ. متفقٌ عَلَيْهِ، وهذا لفظ مسلمٍ

وفى رواية البخارى : أنَّ رَجُلاً قَالَ : يَا رسول الله ، دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ يَعْدِلُ الجِهَادَ ؟ قَالَ : ((لاَ أجِدُهُ)) ثُمَّ قَالَ : ((هَلْ تَسْتَطِيعُ إِذَا خَرَجَ المُجَاهِدُ أنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَكَ فَتقومَ وَلاَ تَفْتُرَ ، وَتَصُومَ وَلاَ تُفْطِرَ)) ؟ فَقَالَ : وَمَنْ يَسْتَطِيعُ ذَلِكَ ؟!.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت آبوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! اللہ کے راستہ میں جہاد کے برابر کون سا عمل ہے؟ (یعنی اور کوئی عمل ایسا ہے جو جہاد کی برابری کر سکتا ہو؟) حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا (جہاد کے برابر جو عمل میں بتاؤں گا) تم اس کو نہیں کر سکو گے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے دو یا تین مرتبہ یہی سوال پوچھا، اور حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہر بار یہی ارشاد فرماتے رہے کہ تم سے ہو نہیں سکے گا پھر حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے وہ آدمی جو روزہ دار ہو،

اللہ کے سامنے نماز کے لئے کھڑا ہو کر قرآنِ پاک کی تلاوت کرتا ہو، اور نماز، روزہ سے ذرہ برابر بھی تھکتا نہ ہو، یہاں تک کہ وہ مجاہد جہاد سے واپس آجائے (یعنی یہ آدمی جہاد کے لئے نکلا وہاں سے لے کر واپس آنے تک اسی میں مشغول رہے۔ مثلاً اس کو جہاد میں دس دن لگے اور ایک آدمی اپنے گھر میں اس کے نکلنے سے واپس آنے تک مسلسل دس روز تک اسی طرح بغیر تھکے ہوئے روزہ، نماز میں لگا رہے۔ اب ایسا تو کون کر سکتا ہے؟ اسی لیے حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو انجام نہیں دے سکتے)۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جو جہاد کے برابر ہو؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کے برابر میں کوئی بھی عمل نہیں پاتا۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا تم سے یہ ہو سکتا ہے کہ ایک مجاہد جہاد کے لئے نکلے، اور تم مسجد میں داخل ہو جاؤ اور اس کے واپس آنے تک بغیر تھکے ہوئے نماز پڑھتے رہو، اور روزہ کی بھی نیت کر لو اور اس کے واپس آنے تک افطار بھی نہ کرو؟ (ظاہر ہے کہ ایسا کون کر سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ جہاد کے عمل کا مقابلہ اور اس کی برابری نہیں ہو سکتی)۔

تلواروں کے سایہ میں

حدیث ۱۲۹۹:-

وعنه: أنَّ رسول الله ﷺ قالَ: مِنْ خَيْرِ مَعَاشِ النَّاسِ لَهُمْ، رَجُلٌ مُمْسِكٌ عِنَانَ فَرَسِهِ فِي سَبِيلِ اللهِ، يَطِيرُ عَلَى مَتْنِهِ، كُلَّمَا سَمِعَ هَيْعَةً أَوْ فَزْعَةً طَارَ عَلَيْهِ يَبْتَغِي الْقَتْلَ وَالْمَوْتَ مَظَانَّهُ أَوْ رَجُلٌ فِي غُنَيْمَةٍ فِي رَأْسِ شَعَفَةٍ مِنْ هَذَا الشَّعَفِ أَوْ بَطْنِ وَادٍ مِنَ الْأَوْدِيَةِ، يُقِيمُ الصَّلَاةَ، وَيُؤْتِي الزَّكَاةَ، وَيَعْبُدُ رَبَّهُ حَتَّى يَأْتِيَهُ الْيَقِينُ، لَيْسَ مِنَ النَّاسِ إِلَّا فِي خَيْرٍ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایک آدمی اپنے گھوڑے کی لگام کو پکڑے ہوئے اللہ کے راستہ میں نکلا ہو اور جہاں کوئی گھبراہٹ کی بات اور آواز سنے کہ فوراً گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر بھاگتا دوڑتا وہاں پہنچ جائے۔ پھر کہیں دوسری جگہ خطرے کی آواز سنے اور ذرا سا احساس ہو، تو شہادت اور موت کی تلاش میں فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر نکل پڑے (کہ وہاں جاؤں گا تو مجھے شہادت نصیب ہو گی۔ گویا یہ آدمی زندگی گزارنے کا بہترین طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے) یا وہ آدمی جو اپنی بکریوں کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹی پر، یا کسی وادی میں اپنی بکریوں کے ساتھ رہتا ہے، نماز قائم کر رہا ہے، زکوٰۃ ادا کر رہا ہے، اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہے، لوگوں کو اس کی طرف سے سوائے بھلائی کے اور کوئی بات نہیں پہنچ رہی ہے؛ یہاں تک کہ اس کو موت آجائے۔

مجاہد کے لیے جنت کے سو درجے

حدیث ۱۳۰۰:-

وعنه : أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : إِنَّ فِى الجَنَّةِ مِئَةَ دَرَجَةٍ أَعَدَّهَا اللهُ لِلْمُجَاهِدِينَ فِى سَبِيلِ اللهِ مَا بَيْنَ الدَّرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ.(رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے راہِ خدا میں جہاد کرنے والوں کے لئے تیار کر رکھے ہیں ، اور دو درجوں کے درمیان زمین و آسمان جتنا فاصلہ ہے۔

حدیث ۱۳۰۱:-

وعن أَبِي سعيد الخدرى رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسولَ اللهِ ﷺ قَالَ : مَنْ رَضِيَ بِاللهِ رَبّاً ، وَبِالإِسْلاَمِ دِيناً ، وَبِمُحَمَّدٍ رَسُولاً ، وَجَبَتْ لَهُ الجَنَّةُ . فَعَجِبَ لَهَا أَبُو سَعِيدٍ ، فَقَالَ : أَعِدْهَا عَلَيَّ يَا رسولَ اللهِ ، فَأَعَادَهَا عَلَيْهِ ، ثُمَّ قَالَ : وَأُخْرَى يَرْفَعُ اللهُ بِهَا العَبْدَ مِئَةَ دَرَجَةٍ فِى الجَنَّةِ ، مَا بَيْنَ كُلِّ دَرَجَتَيْنِ كَمَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالأَرْضِ . قَالَ : وَمَا هِيَ يَا رسول الله ؟ قَالَ : الجِهَادُ فِى سَبِيلِ اللهِ ، الجِهَادُ فِى سَبيلِ اللهِ . (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ کے رب ہونے ، اسلام کے دین ہونے اور نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی رسالت پر راضی ہو گیا؛ اس کے لئے جنت واجب ہے (جب میں نے یہ بات سنی) تو مجھے بہت اچھی معلوم ہوئی ، اس لیے میں نے عرض کیا:

اے اللہ کے رسول! یہ بات جو آپ نے ارشاد فرمائی اس کو دوبارہ ارشاد فرمایئے، تو حضوراکرم ﷺ نے یہ بات پھر دہرائی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ایک چیز اور بھی ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بندے کے سو درجے جنت میں بلند فرماتے ہیں ہر دو درجوں کے درمیان زمین وآسمان جتنا فاصلہ ہے۔ میں نے عرض کیا: وہ کونسی چیز ہے؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا، اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی دغدغہ، تردد اور شک وشبہ کا شکار نہیں رہتا اور جس آدمی کو پورا قلبی اطمینان ہو، وہی راضی رہ سکتا ہے، اگر قلبی اطمینان نہ ہو تو دل میں کہیں نہ کہیں ناراضگی آئے گی، اور ایسا آدمی سوچتا ہے کہ میں کہاں پھنس گیا۔ ایک مؤمن کو اپنے ایمان پر مسرت وخوشی ہوتی ہے، اور ایمان پر اطمینان بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت عطا فرمائی۔ اور جو آدمی اپنے ایمان پر مطمئن ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر راضی ہوتا ہے، حضورِ اکرم ﷺ کی رسالت پر اور اسلام کے دین ہونے پر خوش ہوتا ہے؛ اس کے لئے جنت واجب ہے۔

تلواروں کی چھاؤں میں

حدیث ۱۳۰۲:

وعن أَبي بكر بن أَبي موسى الأشعريِّ، قَالَ: سَمِعْتُ أَبي رضی اللہ عنہ وَهُوَ بِحَضْرَةِ العَدُوِّ، يقول: قَالَ رسول الله ﷺ: إنَّ أَبْوَابَ الجَنَّةِ تَحْتَ ظِلاَلِ السُّيُوفِ. فَقَامَ رَجُلٌ رَثُّ الهَيْئَةِ، فَقَالَ: يَا أَبَا مُوسَى! أأنْتَ سَمِعْتَ رسولَ الله ﷺ يقول هَذَا؟ قَالَ: نَعَمْ، فَرَجَعَ إِلَى أَصْحَابِهِ، فَقَالَ: أَقْرَأُ عَلَيْكُم السَّلاَمَ، ثُمَّ كَسَرَ جَفْنَ سَيْفِهِ فَأَلْقَاهُ، ثُمَّ مَشَى بِسَيْفِهِ إِلَى العَدُوِّ فَضَرَبَ بِهِ حَتَّى قُتِلَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ :- حضرت ابو بکر جو حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے ہیں ، وہ اپنے والد حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں جس وقت وہ دشمن کے مقابلہ پر تھے وہیں یہ بات چیت ہورہی تھی (حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ) فرمارہے تھے کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جنت کے دروازے تلواروں کی چھاؤں میں ہیں ۔ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد سن کر ایک آدمی اٹھا جس کی ہیئت ایسی تھی کہ بدن پر پھٹے پرانے کپڑے تھے (یعنی اس کی ظاہری حالت عمدہ نہیں تھی، معمولی حالت والا آدمی تھا) اور پوچھا: اے ابو موسیٰ! کیا آپ نے خود حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانِ مبارک سے یہ جملہ سنا ہے کہ آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ ارشاد فرمارہے تھے؟ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا: جی ہاں ! میں نے خود سنا ہے۔ یہ سن کر وہ آدمی اپنے ساتھیوں کے پاس گیا اور کہا: میں

تم سب کو سلام کرتا ہوں (گویا یہ میرا رخصتی کا سلام ہے) پھر اس نے اپنی تلوار کی میان کو توڑ کر پھینک دیا، اور تلوار لے کر دشمن کی طرف بڑھا اور جنگ میں مشغول ہوا؛ یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔

افادات:- "إنَّ أبْوَابَ الْجَنَّةِ تَحْتَ ظِلاَلِ السّيُوفِ" کیسا بہترین اور شیریں جملہ ہے۔ **"جنت کے دروازے تلواروں کی چھاؤں میں ہیں"** اس کلام کے اندر عجیب کشش ہے۔

جس نے اللہ کے راستہ کی دھول برداشت کی

حدیث ۱۳۰۳:-

وعن أَبي عبسٍ عبد الرحمان بن جَبْرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ما اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فی سَبيلِ اللهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ. (رواه البخاري)

ترجمہ: حضرت ابو عبس عبد الرحمن بن جبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس بندے کے پاؤں اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہوئے اس کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی۔

حدیث ۱۳۰۴:-

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: لاَ يَلِجُ النَّارَ رَجُلٌ بَكَى مِنْ خَشْيَةِ اللهِ حَتَّى يَعُودَ اللَّبَنُ فی الضَّرْعِ، وَلاَ يَجْتَمِعُ عَلَى عَبْدٍ غُبَارٌ فی سَبيلِ اللهِ وَدُخَانُ جَهَنَّمَ. (رواه الترمذي، وقال: ((حديث حسن صحيح)).

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ کے خوف سے رویا ہو؛ وہ جہنم میں نہیں جائے گا یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس لوٹ جائے (اور ظاہر ہے کہ دودھ تھن میں واپس نہیں لوٹ سکتا، اسی طرح یہ آدمی بھی جہنم میں داخل نہیں ہو سکتا) اور کسی بندے پر اللہ کے راستہ کی دھول اور جہنم کا دھواں جمع نہیں ہو سکتا (یعنی جس نے اللہ کے راستہ کی دھول کی تکلیف برداشت کی، تو جہنم کا دھواں کبھی نہیں کھائے گا یعنی جہنم میں داخل نہیں ہو گا)۔

دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی

حدیث ۱۳۰۵:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول عَيْنَانِ لاَ تَمَسُّهُمَا النَّارُ: عَيْنٌ بَكَتْ مِنْ خَشْيَةِ اللهِ، وَعَيْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فی سَبيلِ اللهِ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دو آنکھوں کو جہنم کی آگ نہیں چھوئے گی: ایک وہ آنکھ جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئی ہو۔ اور دوسری وہ آنکھ جو اللہ کے راستہ میں حفاظت کے لئے رات بھر جاگی ہو (یعنی جہاد میں پہرہ دینے

کے لئے جاگی ہو۔ جہاد میں چوکی دینے کے لیے کبھی رات بھر بھی جاگنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

بے جہاد مجاہد

حدیث ۱۳۰۶:-

وعن زید بن خالد رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قالَ: مَنْ جَهَّزَ غازياً في سَبيلِ اللهِ فَقَدْ غَزَا، وَمَنْ خَلَفَ غَازِياً في أَهْلِهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کو سامان مہیا کیا، گویا اس نے خود بھی جہاد میں شرکت کی۔ اور جس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے والے کے گھر والوں میں بھلائی کے ساتھ اس کی جانشینی کی؛ تو یہ بھی ایسا ہی سمجھا جائے گا گویا خود غزوہ میں شریک ہوا۔

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جہاد میں جانا چاہتا ہے لیکن اس کے پاس اسباب نہیں ہوتے۔ یہاں خود جہاد میں نہیں گیا لیکن جہاد میں جانے والے کے لئے سامان کا انتظام کر دیا، تو بروئے حدیث "الدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِه" نیکی کے کام میں مدد کرنے پر بھی ایسا ہی ثواب ملتا ہے جیسا کہ خود وہ کام انجام دیا ہو۔

ایک آدمی اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے گیا ہے، اس کی غیر حاضری کی وجہ سے گھر میں کھوٹ پڑتی ہے، جیسے: گھر والوں کو کوئی چیز منگوانی ہے، یا ان کا کوئی کام رُکا ہوا ہے، ان کے باہر کے کام انجام دینے والا کوئی نہیں ہے، وہ خود ہوتا تو سارے کام انجام دیتا، دوسرا آدمی اس کی جگہ پر وہ سارے کام کر رہا ہے، اس کے متعلق حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ یہ آدمی بھی ایسا ہی سمجھا جائے گا گویا وہ بھی غزوہ میں شریک ہوا ہے۔

بہترین صدقات

حدیث ۱۳۰۷:-

وعن أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول اللهﷺ: أَفْضَلُ الصَّدَقَاتِ، ظِلُّ فُسْطَاطٍ فی سَبِيلِ اللهِ وَمَنِيحَةُ خَادِمٍ فی سَبِيلِ اللهِ، أَوْ طَرُوقَةُ فَحْلٍ فِي سَبِيلِ اللهِ (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: بہترین صدقات یہ ہیں: اللہ کے راستہ میں کسی خیمہ کا سایہ، کسی خادم کا عطیہ، یا ایسی اونٹنی جو جفتی کے لائق ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جہاد کے لئے جاتے ہیں ان کو خیمہ کی بھی ضرورت پیش آتی ہے، تو اگر کسی آدمی نے خیمہ دیدیا۔ اسی طرح اپنے کاموں کو انجام دینے

کے لئے کسی نوکر اور خادم کی ضرورت ہوتی ہے وہ کسی نے مہیا کر دیا۔ ایسی اونٹنی دی جو جفتی کے لائق ہو، اس لیے کہ ایسی اونٹنی ہی سواری کے لائق بھی سمجھی جائے گی، ورنہ چھوٹا بچہ تو نہ جفتی کے لائق ہے، نہ سواری کے لائق ہے۔ یہ سب چیزیں اللہ کے راستہ میں کام آنے والی ہیں اس لیے ان سب پر بہترین صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔

مجاہد کو اپنا سامان دیدینے کی فضیلت

حدیث ۱۳۰۸:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ: أن فتیً مِنْ أَسْلَمَ قَالَ: یَا رسولَ اللہِ! إِنِّي أُرِیدُ الغَزْوَ وَلَیْسَ مَعِيَ مَا أَتَجَهَّزُ بِهِ، قَالَ: ائْتِ فُلاناً فَإِنَّهُ قَدْ كَانَ تَجَهَّزَ فَمَرِضَ. فَأَتَاهُ، فَقَالَ: إِنَّ رسولَ اللهِ ﷺ يُقْرِئُكَ السَّلاَمَ، ويقول: أَعْطِنِي الَّذِي تَجَهَّزْتَ بِهِ. قَالَ: يَا فُلاَنَةُ! أَعْطِيهِ الَّذِي كُنْتُ تَجَهَّزْتُ بِهِ، وَلاَ تَحْبِسِي عَنْهُ شَيْئاً، فَوَاللهِ لاَ تَحْبِسِي مِنْهُ شَيْئاً؛ فَيُبَارَكَ لَكِ فِيهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ قبیلۂ اسلم کا ایک نوجوان نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں جہاد میں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں لیکن میرے پاس سامانِ جہاد نہیں ہے (اس وجہ سے اپنے اس ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا) حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے فرمایا: تم فلاں کے پاس جاؤ، اس نے جہاد کے لئے ساری تیاریاں کر لی تھیں مگر وہ بیمار ہو گیا

ہے(بیماری کی وجہ سے وہ نہیں جاسکا ہے۔اس نے جو سامان اپنے لئے تیار کیا تھا اس سے وہ حاصل کر لو) چناں چہ وہ نوجوان اس کے پاس پہنچا اور کہا: حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو سلام کہا ہے اور فرمایا: تم نے جہاد کے لئے جو سامان تیار کیا ہے، وہ مجھے دیدو (جب اللہ کے رسول نے کہلوایا تو اب انکار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا) اس آدمی نے اپنی بیوی سے کہا: اے فلانی! میں نے اپنے لئے جو بھی سامان تیار کیا تھا وہ سب اسے دیدے، اور اس میں سے ایک بھی چیز روک کر مت رکھیو، اگر ایک چیز بھی روکے رکھو گی تو اس میں تمہارے لئے برکت نہیں ہو گی۔

افادات:- اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی پوری تیاری کر چکا ہوتا ہے، پھر کسی عذر کی وجہ سے نہیں جاسکتا، تو اگر دوسرا کوئی آدمی ایسا ہو جو جانا چاہتا ہو لیکن اس کے پاس اسباب و وسائل نہ ہوں، تو اس کو چاہیے کہ اپنا سامان اس کو دیدے، اس صورت میں وہ بھی ایک طرح سے اس کے ساتھ شریک ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں آگے حضور اکرم ﷺ کے مزید ارشاد بھی آرہے ہیں۔ اور پہلے بھی گزر چکا ہے کہ جو آدمی غازی کو سامان مہیا کرے گا وہ بھی ثواب میں اس کے ساتھ شریک ہے۔

مجاہد کے ثواب میں شرکت کی عمدہ ترتیب

حدیث ۱۳۰۹:-

عن أبي سعيد الخدری رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله ﷺ بَعَثَ إِلَى بَنِي لَحْيَانَ، فَقَالَ: لِيَنْبَعِثْ مِنْ كُلِّ رَجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا، وَالأَجْرُ بَيْنَهُمَا. (رواہ مسلم)

وفی روايةٍ لَهُ: ((لِيَخْرُجَ مِنْ كُلِّ رَجُلَيْنِ رَجُلٌ)) ثُمَّ قَالَ للقاعد: ((أَيُّكُمْ خَلَفَ الخَارِجَ فِي أَهْلِهِ وَمَالِهِ بِخَيْرٍ كَانَ لَهُ مِثْلُ نِصْفِ أَجْرِ الخَارِجِ)).

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بنو لحیان کی طرف ایک لشکر بھیجا (جس وقت آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم لشکر روانہ فرما رہے تھے) آپ نے ایک بات ارشاد فرمائی: ہر دو آدمیوں میں سے ایک آدمی نکلے اور ثواب دونوں کے درمیان برابر تقسیم ہو جائے گا۔

مسلم شریف کی دوسری روایت میں یہ بھی ہے: دو میں سے ایک آدمی نکلے۔ پھر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے گھر بیٹھنے والے سے فرمایا: جو آدمی اللہ کے راستہ میں جہاد کے لیے گیا ہے، اس کے گھر والوں، اس کے مال اور کاروبار وغیرہ میں جو اس کی نیابت کرے گا (یعنی نکلنے والا یہاں رہ کر گھر کی جو ضرورتیں پوری کرتا تھا، اور کام کاج کر لیا کرتا تھا، کاروبار انجام دیا کرتا تھا؛ وہ سب یہاں رہنے والا سنبھال لے گا) تو راہِ خدا میں نکلنے والے کا آدھا ثواب اِس کو بھی ملے گا۔

افادات:۔مطلب یہ ہے کہ دو بھائی کاروبار میں شریک ہیں ،تو ایک آدمی کاروبار سنبھال لے،اور دوسرے سے کہے کہ تم جاؤ،مَیں کاروبار سنبھالتا ہوں ۔جو لوگ اس طرح تقسیم کرلیں گے تو جانے والے کو جانے پر جو ثواب ملے گا اس ثواب میں یہاں جو اس کے کام کو سنبھالے ہوئے ہے وہ بھی شریک رہے گا۔یہ بھی ایک عمدہ ترتیب ہے۔

عمل تھوڑا؛اجر بڑا

حدیث ۱۳۱۰:۔

وعن البَرَاءِ رضی اللہ عنہ **قَالَ :أَتَى النبيَّ ﷺ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ بِالحَدِيدِ، فَقَالَ : يَارسولَ اللهِ، أُقَاتِلُ أَوْ أُسْلِمُ ؟ قَالَ : أَسْلِمْ، ثُمَّ قَاتِلْ. فَأَسْلَمَ ثُمَّ قَاتَلَ؛ فَقُتِلَ. فَقَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: عَمِلَ قَلِيلاً وَأُجِرَ كَثِيراً.** متفقٌ عَلَيهِ.وهذا لفظ البخاری.

ترجمہ :۔حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں ایک آدمی حاضر ہوا جو پورا لوہے میں ڈھکا ہوا تھا(مطلب یہ ہے کہ ہتھیار سے سجا ہوا تھا،جیسے آدمی جنگ کے لئے تیاری کرتا ہے کہ زراع اور خود پہنتا ہے، تلوار،نیزہ ڈھال وغیرہ لیتا ہے)اور اس نے پوچھا:اے اللہ کے رسول!میں جنگ کروں یا مسلمان ہو جاؤں ؟حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:پہلے مسلمان ہو جاؤ،اس کے بعد جنگ اور قتال کرو۔چناں چہ وہ اسلام لے آیا،اس کے بعد جنگ میں شریک ہوا؛یہاں تک کہ

شہید ہو گیا۔ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اس نے عمل تو بہت تھوڑا کیا، اور اجر و ثواب بہت بڑا پایا۔ (گویا اسلام لانے کے بعد عبادات کے قبیل سے کوئی اور عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی، بس! جہاد میں شریک ہوا اور اللہ تعالیٰ نے شہادت عطا فرمادی)۔

شہید ہی دنیا میں آنے کی تمنا کرے گا

حدیث ۱۳۱۱:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: ((مَا أَحَدٌ يَدْخُلُ الجَنَّةَ يُحِبُّ أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا وَلَهُ مَا عَلَى الأَرْضِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا الشَّهِيدُ، يَتَمَنَّى أَنْ يَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا، فَيُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ؛ لِمَا يَرَى مِنَ الكَرَامَةِ)).

وفی رواية: ((لِمَا يَرَى مِنْ فَضْلِ الشَّهَادَةِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی جنت میں ایک مرتبہ داخل ہو جائے گا وہ دوبارہ دنیا میں آنا پسند نہیں کرے گا، چاہے اس کے بدلہ میں روئے زمین پر جو کچھ ہے وہ سب اس کو دیدیا جائے، سوائے شہید کے؛ کہ وہ دنیا میں واپس آنے کی تمنا کرے گا، اس لیے کہ شہادت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جو اعزاز و اکرام، نوازشات، مقامات و مراتب حاصل ہوں گے، ان کو دیکھ کر وہ اس بات کی خواہش کرے گا کہ اس کو دس مرتبہ شہید کیا جائے۔

افادات:- شہید اس بات کی تمنا کرے گا کہ میں دنیا کی طرف باربار جاؤں اور شہید ہوتا رہوں، خود حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی اس کی تمنا فرمائی ہے، جیسا کہ پہلے روایتوں میں گزر چکا کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تین چار مرتبہ اپنی اس تمنا کا اظہار فرمایا۔

شہید کے سب گناہ معاف؛ سوائے...

حدیث ۱۳۱۲:-

وعن عبدِاللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما: أَنَّ رسولَ اللہ ﷺ قَالَ: يَغْفِرُ اللهُ لِلشَّهِيدِ كُلَّ شَيْءٍ إِلاَّ الدَّيْنَ. (رواہ مسلم)

وفی روایةٍ له: ((القَتْلُ فی سبیلِ اللہِ يُكَفِّرُ كُلَّ شیءٍ إِلاَّ الدَّيْنَ))

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ شہید کے ہر ہر گناہ کو معاف کر دیتے ہیں، سوائے بندوں کے حقوق کے۔ دوسری روایت میں بھی یہی مضمون ہے۔

افادات:- دَین؛ یعنی بندوں کا حق۔ اللہ تعالیٰ بندوں کا حق معاف نہیں کرتے۔ گویا شہادت ایسی فضیلت کی چیز ہے کہ اس پر آدمی کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں،

لیکن بندوں کا کوئی حق -قرضہ یا اور کوئی مطالبہ -باقی ہو جو اس نے ادا نہیں کیا ہو؛ وہ شہادت کے باوجود معاف نہیں ہوتا۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ ہے جس آدمی کے پاس ادا کرنے کی استطاعت ہو اس کے باوجود ادا نہ کرے۔ ہاں! ادا کرنے کا پکا ارادہ رکھتا تھا اور اس کے لئے کوشش بھی کر رہا تھا، لیکن اسباب ووسائل مہیا نہیں ہوئے یہاں تک کہ اسی حالتِ کوشش میں اس کو موت آگئی یا شہادت نصیب ہوگئی؛ تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ حق کو اپنی طرف سے کچھ دے کر اس کو راضی فرمالے گا اور اس کے لئے معافی کا سامان کر دے گا۔

بہر حال! اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ بندوں کے حق کا معاملہ بڑا اہم ہے، شہادت کی وجہ سے سارے گناہ معاف ہوجاتے ہیں لیکن قرضہ اور دوسرے حقوق جو بندوں کے ہیں وہ معاف نہیں ہوتے۔

حدیث ۱۳۱۳:-

وعن أَبي قتادة رضی اللہ عنہ: أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَامَ فِيهِم فَذَكَرَ أَنَّ الجِهَادَ فی سَبيلِ اللهِ، وَالإيمَانَ بِاللهِ؛ أَفْضَلُ الأَعْمَالِ. فَقَامَ رَجُلٌ، فَقَالَ: يَا رسولَ اللهِ! أرأَيتَ إنْ قُتِلْتُ فی سَبيلِ اللهِ، أتُكَفَّرُ عَنِّي خَطَايَايَ؟ فَقَالَ لَهُ رسول الله ﷺ: نَعَمْ، إنْ قُتِلْتَ فی سَبيلِ الله وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ. ثُمَّ قَالَ رسول الله ﷺ: كَيفَ قُلْتَ؟ قَالَ: أرَأَيتَ إنْ قُتِلْتُ فی سَبيلِ اللهِ،

أَتُكَفَّرُ عَنِّي خَطَايَايَ؟ فَقَالَ رسول الله ﷺ: نَعَمْ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ، إِلاَّ الدَّيْنَ؛ فَإِنَّ جِبْرِيلَ عليه السلام قَالَ لِي ذٰلِكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کے درمیان تقریر فرمائی، اس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کرنا، اور اللہ تعالیٰ کے اوپر ایمان لانا؛ تمام اعمال میں سب سے بہتر عمل ہے۔ یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ بتلایئے کہ اگر میں اللہ کے راستہ میں شہید کر دیا جاؤں؛ تو کیا میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جی ہاں! اگر تم اللہ کے راستہ میں ایسی حالت میں شہادت پاؤ کہ تم جم کر لڑ رہے ہو، اور اللہ تعالیٰ سے اپنے اس عمل پر ثواب کی امید رکھے ہوئے ہو ("احتساب" یعنی کسی عمل کو خالص اللہ کے لئے انجام دے کر اللہ تعالیٰ ہی سے اجر و ثواب کی توقع اور امید رکھنا) اور میدانِ جنگ میں آگے بڑھ رہے ہو، پیٹھ نہیں دکھا رہے ہو، اور ایسی حالت میں شہید ہوئے تو تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ آپ ﷺ نے یہ جواب ارشاد فرما چکنے کے بعد پھر دریافت کیا کہ تم نے کیا پوچھا؟ (گویا آپ نے اس کے پاس اس کا سوال پھر سے دہروایا) چناں چہ اس آدمی نے دوبارہ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ بتلایئے کہ اگر میں اللہ کے راستہ میں شہید کر دیا جاؤں تو میرے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے وہی جواب دوبارہ ارشاد فرمایا لیکن اس میں ذرا سا اضافہ فرما دیا: جی ہاں! اگر تم اللہ کے راستہ میں ایسی حالت میں شہادت پاؤ کہ تم صبر کے ساتھ جم کر مقابلہ کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ سے ثواب کی امید رکھے ہوئے

اخلاص کے ساتھ یہ کام انجام دے رہے ہو، آگے بڑھ رہے ہو، پیٹھ نہیں دکھا رہے ہو، اس حالت میں تم کو شہادت نصیب ہو جائے، تو تمہارے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؛ سوائے بندوں کے حق کے (بندوں کے حق معاف نہیں ہوں گے) ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر مجھے یہ بتلایا۔ (اس سے دَیْن، قرضوں اور بندوں کے دیگر حقوقِ مالی جو باقی رہ جاتے ہیں ان کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی طرف بہت زیادہ توجہ کی ضرورت ہے)۔

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

حدیث ۱۳۱۴:-

وعن جابر-رضی الله عنه-قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: أَيْنَ أَنَا يَا رسول الله! إِنْ قُتِلْتُ؟ قَالَ: ((فی الْجَنَّةِ)) فَأَلْقَى تَمَرَاتٍ كُنَّ فِي يَدِهِ، ثُمَّ قَاتَلَ حَتَّى قُتِلَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! اگر میں شہید کر دیا جاؤں تو میں کہاں ہوؤں گا؟ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جنت میں۔ (راوی فرماتے ہیں کہ) اس وقت اس آدمی کے ہاتھ میں کچھ کھجوریں تھیں جن کو وہ کھا رہا تھا، جب اس نے یہ جواب سنا تو وہ کھجوریں پھینک دیں اور میدانِ جنگ میں جا کر لڑائی میں مشغول ہو گیا

یہاں تک کہ شہید ہو گیا (گویا اتنا بھی انتظار نہیں رہا کہ کھجوریں کھانے تک جنت حاصل کرنے کو مؤخر کیا جائے۔)

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دِل کو

حدیث ۱۳۱۵ :-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: انْطَلَقَ رسولُ الله ﷺ وَأَصْحَابُهُ حَتَّى سَبَقُوا الْمُشْرِكِينَ إِلَى بَدْرٍ، وَجَاءَ الْمُشْرِكُونَ. فَقَالَ رَسولُ اللهِ ﷺ: لاَ يَقْدمَنَّ أَحَدٌ مِنْكُمْ إِلَى شَيْءٍ حَتَّى أَكُونَ أَنَا دُونَهُ. فَدَنَا الْمُشْرِكُونَ، فَقَالَ رسولُ الله ﷺ: قُومُوا إِلَى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّماوَاتُ وَالأَرْضُ. قَالَ: يَقُولُ عُمَيْرُ بنُ الحُمَامِ الأَنْصَارِيُّ رضی اللہ عنہ: يَا رسولَ اللهِ! جَنَّةٌ عَرْضُهَا السَّماوَاتُ وَالأَرْضُ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: بَخٍ بَخٍ؟ فَقَالَ رسولُ الله ﷺ: مَا يَحْمِلُكَ عَلَى قَولِكَ بَخٍ بَخٍ؟ قَالَ: لاَ وَاللهِ يَا رَسُولَ اللهِ إِلاَّ رَجَاءَ أَنْ أَكُونَ مِنْ أَهْلِهَا، قَالَ: فَإِنَّكَ مِنْ أَهْلِهَا. فَأَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرَنِهِ، فَجَعَلَ يَأْكُلُ مِنْهُنَّ، ثُمَّ قَالَ: لَئِنْ أَنَا حَيِيتُ حَتَّى آكُلَ تَمَرَاتِي هذِهِ إِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيلَةٌ، فَرَمَى بِمَا كَانَ مَعَهُ مِنَ التَّمْرِ ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتَّى قُتِلَ. (رواہ مسلم)

((القَرَن)) بفتح القاف والراء: هُوَ جُعْبَةُ النشَّابِ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ بدر کی طرف چلے یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے میدان میں پہنچ گئے، مشرکین بھی آئے اور پڑاؤ ڈالا۔

حضور ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی کسی چیز میں بھی آگے نہ بڑھے یہاں تک کہ میں اس سے پہلے پہنچوں اور اس سے کہوں (مطلب یہ ہے کہ مجھ سے پوچھے بغیر اور میرے حکم کے بغیر کوئی آدمی کوئی بھی کام نہ کرے) چناں چہ مشرکین جب قریب ہوئے اور مقابلہ کا وقت آیا تو نبیٔ کریم ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: اٹھو ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ حضرت عمیر بن حُمام انصاری رضی اللہ عنہ اٹھے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسی جنت جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہوگی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: جی ہاں ۔ انہوں نے کہا: واہ واہ۔ حضور ﷺ نے پوچھا: تم نے واہ واہ کیوں کہا؟ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اس امید میں واہ واہ کہہ رہا ہوں تاکہ میں بھی جنت والوں میں سے بن جاؤں ۔ حضور ﷺ نے فرمایا: تم بھی جنتی ہو۔ اس وقت وہ اپنے ترکش میں سے کھجوریں نکال کر کھانے لگے، پھر خیال آیا تو فرمانے لگے: اگر یہ کھجوریں پوری کرنے تک بھی میں زندہ رہا تو بڑی لمبی زندگی ہوگی۔ بس! فوراً وہ کھجوریں پھینک دیں اور مقابلہ میں آگے بڑھے، یہاں تک کہ شہید ہوگئے (گویا اتنی دیر تک زندہ رہنا بھی انہوں نے گوارا نہیں کیا) سچ ہے:-

دو عالم سے بیگانہ کرتی ہے دِل کو — عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

افادات:- کسی بھی چیز کی چوڑائی عام طور پر لمبائی کے مقابلہ میں پر کم ہوتی ہے، جب جنت کی چوڑائی آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے، تو پھر لمبائی کا کیا عالم ہوگا؟ اور یہ بھی

صرف سمجھانے کے لئے ہے، ورنہ آسمان اور زمین بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جہاد آدمی کو جنت میں لے جاتا ہے۔

جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

حدیث ۱۳۱۶:-

وعنه قَالَ: جَاءَ نَاسٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ أن ابْعَثْ مَعَنَا رِجَالاً يُعَلِّمُونَا الْقُرْآنَ وَالسُّنَّةَ. فَبَعَثَ إِلَيْهِمْ سَبْعِينَ رَجُلاً مِنَ الأَنْصَارِ يُقَالُ لَهُمْ: القُرّاءُ، فِيهِمْ خَالِي حَرَامٌ، يَقْرَؤُونَ القُرْآنَ، وَيَتَدَارَسُونَ بِاللَّيْلِ يَتَعَلَّمُونَ. وَكَانُوا بِالنَّهَارِ يَجِيئُونَ بِالْمَاءِ، فَيَضَعُونَهُ فى الْمَسْجِدِ، وَيَحْتَطِبُونَ فَيَبِيعُونَهُ، وَيَشْتَرُونَ بِهِ الطَّعَامَ لأَهْلِ الصُّفَّةِ، وَلِلْفُقَرَاءِ، فَبَعَثَهُمُ النَّبِيُّ ﷺ. فَعَرَضُوا لَهُمْ فَقَتَلُوهُمْ قَبْلَ أَنْ يَبْلُغُوا الْمَكَانَ. فَقَالُوا: اللَّهُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِيَّنَا أَنَّا قَدْ لَقِينَاكَ فَرَضِينَا عَنْكَ وَرَضِيتَ عَنَّا، وَأَتَى رَجُلٌ حراماً خَالَ أَنَسٍ مِنْ خَلْفِهِ. فَطَعَنَهُ بِرُمْحٍ حَتَّى أَنْفَذَهُ. فَقَالَ حَرَامٌ: فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ. فَقَالَ رسولُ الله ﷺ: إِنَّ إِخْوَانَكُمْ قَدْ قُتِلُوا وَإِنَّهُمْ قَالُوا: اللَّهُمَّ بَلِّغْ عَنَّا نَبِيَّنَا أَنَّا قَدْ لَقِينَاكَ فَرَضِينَا عَنْكَ وَرَضِيتَ عَنَّا. (متفقٌ عَلَيْهِ، وهذا لفظ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ آپ ہمارے ساتھ کچھ لوگوں کو بھیجئے جو ہم کو قرآن اور شریعت کے احکام سکھائیں (یہ درخواست کرنے والا قبیلہ سُلَیم کا ایک سردار تھا) حضور اکرم ﷺ نے ستر انصاری صحابہ

کو ان کے ساتھ بھیجا جو سب ہی قاری تھے۔ ان میں میرے ماموں حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ان حضرات کا مشغلہ قرآن پاک پڑھنا، راتوں میں قرآن سیکھنا سکھانا تھا، دن میں لوگوں کے لئے پانی لا کر مسجد میں رکھتے تھے، جنگلوں سے لکڑیاں چن کر لاتے تھے، ان کو فروخت کر کے صفہ والوں (''صفہ'' مسجد نبوی میں ایک چبوترہ تھا، جہاں ایسے لوگ پڑے رہتے تھے جو اپنے آپ کو دین سیکھنے کے واسطے فارغ کئے ہوئے تھے) اور فقیروں کے لئے کھانا خریدتے تھے (یہی ان حضرات کا مشغلہ تھا) ایسے لوگوں کو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے ساتھ بھیجا۔ جہاں بھیجا گیا تھا وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اسی قبیلہ کے ایک اور سردار نے (جس کو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ کد تھی اور دشمنی پر تلا ہوا تھا) اپنے قبیلے کے کچھ لوگوں کو ورغلایا، انہوں نے نہیں مانا تو دوسرے کچھ لوگوں کو تیار کیا اور ان کو حضراتِ صحابہ کے مقابلہ کے لئے بھیجا؛ چناں چہ وہ سب صحابہ شہید کر دیئے گئے (شہادت کے بعد جب اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ اکرام و اعزاز، مغفرت و بخشش کا معاملہ فرمایا، اس وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنی اس تمنا کا اظہار کیا کہ) اے اللہ! ہمارے نبی (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو ہماری طرف سے یہ پیغام بھیج دیجئے کہ جب ہم آپ سے ملے تو (آپ کی طرف سے ہمارے ساتھ اکرام و اعزاز کا یہ یہ معاملہ کیا گیا اور) اس پر ہم مطمئن و راضی ہیں، اور آپ (ہماری اطاعت و فرمانبرداری سے) راضی ہوئے (حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ بھی اسی قافلہ میں تھے، قافلہ کے سردار تو دوسرے صحابی تھے، لیکن حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو ایک خط عطا فرمایا تھا جو اس قبیلہ کے اسی سردار کو لکھوایا تھا جو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ دشمنی رکھتا تھا کہ تم جا کر اس کو پہنچانا۔ چناں چہ حضراتِ صحابہ کی یہ پوری جماعت تو دوسری جگہ پر ٹھہری رہی، اور قبیلے کے اس سردار کے پاس وہ خط پہنچانے کے لئے حضرت حرام بن ملحان

رضی اللہ عنہ پہنچے۔ جس وقت انہوں نے وہ خط اس سردار کے ہاتھ میں دیا تو اس نے ایک اور آدمی کو اشارہ کیا) جس نے پیچھے کی طرف سے ان کو نیزہ مارا جو آرپار ہوتا ہوا سینہ کی طرف نکلا (جس کی وجہ سے خون کا ایک فوارہ نکلا، جب انھوں نے خون نکلتا ہوا دیکھا تو اس خون کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اپنے چہرہ پر ملتے ہوئے) فرمایا: "فُزْتُ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ" کعبہ کے رب کی قسم! میں تو کامیاب ہو گیا (ان میں سے دو آدمی بچ گئے تھے، ان میں سے بھی ایک شہید ہو گئے، صرف ایک بچ گئے، ایک مدت بعد وہ آئے، اور سارا واقعہ حضورِ اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے سامنے پیش کیا، لیکن اس سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے یہ ساری بات بذریعۂ وحی حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کو بتلادی تھی۔ اور اس میں ان شہیدوں کی تمنا اور پیغام کا بھی تذکرہ تھا جو انہوں نے اللہ کے حضور میں ظاہر کی تھی کہ ہماری طرف سے یہ پیغام پہنچا دیا جائے) حضورِ اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے صحابہ سے فرمایا: تمہارے بھائی (جو وہاں بھیجے گئے تھے سب) شہید کر دئے گئے، اور وہ کہتے ہیں: اے اللہ! ہماری طرف سے ہمارے نبی کو یہ بات پہنچا دیجئے کہ ہم آپ سے ملے، ہم آپ سے اور آپ ہم سے خوش ہیں (یہ واقعہ سیرت کی کتابوں میں واقعۂ بیرِ معونہ کے نام سے ملتا ہے)۔

یہ غازی یہ تیرے پُر اَسرار بندے

حدیث ۱۳۱۷:-

وعنه قَالَ: غَابَ عَمِّي أَنَسُ بنُ النَّضْرِ رضی اللہ عنہ عن قِتَالِ بَدْرٍ، فَقَالَ: يَارسولَ اللهِ، غِبْتُ عَنْ أَوَّلِ قِتَالٍ قَاتَلْتَ الْمُشْرِكِينَ، لَئِنِ اللهُ أَشْهَدَنِي قِتَالَ الْمُشْرِكِينَ لَيَرَيَنَّ اللهُ مَا أَصْنَعُ. فَلَمَّا كَانَ

يَوۡمُ أُحُدٍ انۡكَشَفَ الۡمُسۡلِمُونَ فَقَالَ : اللَّهُمَّ إِنِّي اعۡتَذِرُ إِلَيۡكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَاءِ - يعني : أَصۡحَابَهُ - وَأَبۡرَأُ إِلَيۡكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَاءِ - يَعۡنِي : الۡمُشۡرِكِينَ - ثُمَّ تَقَدَّمَ فَاسۡتَقۡبَلَهُ سَعۡدُ بۡنُ مُعَاذٍ فَقَالَ : يَاسَعۡدَ بۡنَ مُعَاذٍ، الۡجَنَّةَ وَرَبِّ النَّضۡرِ، إِنِّي أَجِدُ رِيحَهَا مِنۡ دُونِ أُحُدٍ! فَقَالَ سَعۡدٌ : فَمَا اسۡتَطَعۡتُ يَا رسولَ اللهِ مَا صَنَعَ! قَالَ أَنَسٌ : فَوَجَدۡنَا بِهِ بِضعاً وَثَمَانِينَ ضَرۡبَةً بِالسَّيۡفِ، أَوۡ طَعۡنَةً بِرُمۡحٍ أَوۡ رَمۡيَةً بِسَهۡمٍ، وَوَجَدۡنَاهُ قَدۡ قُتِلَ وَمَثَّلَ بِهِ الۡمُشۡرِكُونَ، فَمَا عَرَفَهُ أَحَدٌ إِلَّا أُخۡتُهُ بِبَنَانِهِ. قَالَ أَنَسٌ : كُنَّا نَرَى - أَوۡ نَظُنُّ - أَنَّ هٰذِهِ الآيةَ نَزَلَتۡ فِيهِ وَفِي أَشۡبَاهِهِ : مِنَ الۡمُؤۡمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيۡهِ فَمِنۡهُمۡ مَنۡ قَضَى نَحۡبَهُ [الأحزاب، إِلَى آخرها]. (متفقٌ عَلَيۡهِ، وَقَدۡ سبق في باب المجاهدة)

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے موقع پر میرے چچا حضرت اَنس بن نضر رضی اللہ عنہ غیر حاضر تھے (پہلے بھی یہ روایت آچکی ہے، اس وقت بتلایا تھا کہ غزوۂ بدر اچانک پیش آیا تھا، مشرکین کے قافلہ کے متعلق حضور اکرم ﷺ کو اطلاع ملی تھی اور اس کے تعاقب کے لئے حضور ﷺ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا، اچانک روانگی ہوئی، جو لوگ موجود تھے وہ ساتھ ہو لئے، اس وجہ سے بہت سے حضراتِ صحابہ اس موقعہ پر شریک نہیں ہو سکے تھے۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کے چچا اَنس بن نضر رضی اللہ عنہ بھی اس میں شریک نہیں ہو پائے تھے جس کا ان کو بہت ہی افسوس تھا) چناں چہ انہوں نے اپنے اس افسوس کا اظہار حضور اکرم ﷺ کے سامنے ان الفاظ میں کیا کہ: اے اللہ کے رسول! مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کی سب سے پہلی جنگ ہوئی جس میں آپ تشریف لے گئے اور مَیں غیر حاضر رہا، اگر آئندہ مشرکین کے ساتھ ہونے والی جنگ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے حاضری کا موقعہ دیا تو اللہ تعالیٰ دیکھ لیں گے کہ مَیں کیا کرتا ہوں (مطلب یہ ہے کہ مَیں اس وقت اپنے

بہادری کے جوہر دکھلاؤں گا) چناں چہ جب اُحد کا دن آیا تو درمیان میں ایک موقعہ پر بہت سے مسلمان میدان سے ہٹنے لگے، اس وقت حضرت اَنس بن نضر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ! ان لوگوں (مسلمانوں) نے جو حرکت کی ہے اس پر مَیں تجھ سے معذرت چاہتا ہوں (گویا اس حرکت سے ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا اور ان کی طرف سے معافی کی درخواست بھی کر دی؛ کیوں کہ وہ مسلمان ہیں) اور مشرکین نے جو حرکت کی اس سے مَیں اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں (میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے) یہ کہہ کر میدان میں آگے بڑھے۔ راستہ میں ان کو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ملے (یہ بھی ایک انصاری صحابی ہیں جو اس جنگ میں شہید نہیں ہوئے، غزوۂ خندق کے موقعہ پر زخمی ہوئے اور اسی میں شہید ہوئے۔ بڑے جری اور بہادر تھے) تو کہنے لگے: اے سعد بن معاذ! نضر کے رب کی قسم! (یہیں) جنت ہے، میں اُحد کے پاس جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں ۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اے اللہ کے رسول! انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا؛ مجھ میں اس کی طاقت نہیں ہے اور انھوں نے جس بہادری اور جرأت کا اظہار کیا؛ میں وہ نہیں کر سکا۔ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: لڑائی ختم ہو چکنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ ان کے جسم کے اندر اَسّی (۸۰) سے زیادہ زخموں کے نشانات تھے، جس میں تلوار، نیزہ، اور تیر کے بھی تھے۔ اور مشرکین نے ان کا مُثلہ کر دیا تھا (یعنی کان ناک وغیرہ دوسرے اعضاء کاٹ دئے تھے۔ لاش کو بگاڑنے کے لئے یہ بھی ایک شکل کی جاتی تھی۔ ایک تو وہ زخمی ہوئے تھے اور ساتھ ہی مثلہ کر دیا گیا تھا، اس لئے ان کی انگلی کے) ایک پورے (کے تِل) کی وجہ سے صرف ان کی بہن نے ہی ان کو پہچانا (کہ یہ میرے بھائی اَنس بن نضر کی لاش ہے)۔

حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ سورۂ احزاب کی یہ آیت ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ﴾ حضرت اَنس بن نضر اور ان جیسے لوگوں کے سلسلہ ہی میں نازل ہوئی ہے (اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اللہ کے راستہ میں شہید ہونے والوں کے متعلق فرمایا ہے) ایمان والوں میں سے بہت سے آدمی وہ ہیں جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا اس کو پورا کر دکھلایا، پس بعض وہ ہیں جنہوں نے اپنی منت پوری کر دی، یعنی اللہ کے راستہ میں شہید ہونے کی جو منت مانی تھی، اور عزم کیا تھا؛ وہ پورا کر دیا۔ اور بہت سے وہ ہیں کہ جو ابھی انتظار کر رہے ہیں، اور اللہ سے کئے ہوئے عہد کو پورا کرنے والے ہیں ۔

غزوۂ احد: ایک منظر

افادات:-غزوۂ بدر ۲ھ میں پیش آیا تھا، اس کے بعد والے سال ۳ھ میں غزوۂ احد پیش آیا۔ غزوۂ احد کی تفصیل پہلے بتائی تھی کہ جس وقت جنگ شروع ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر پچاس تیر اندازوں کا ایک دستہ مقرر فرمایا تھا کہ تم یہاں پر نگرانی کرو، کہیں پیچھے سے کوئی حملہ نہ ہو جائے، اور ان کو تاکید فرمائی تھی کہ ہم چاہے

دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب ہوں یا ناکام؛ تمہیں اپنی اس جگہ کو نہیں چھوڑنا ہے۔ لیکن ہوا یہ کہ جب جنگ شروع ہونے کے بعد مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا اور ان کو کامیابی نظر آنے لگی، مشرکین نے میدان چھوڑ کر بھاگنا شروع کیا تو اس چھوٹی سی پہاڑی کے اوپر جو لوگ بٹھائے گئے تھے انہوں نے دیکھا کہ مالِ غنیمت سمیٹا جارہا ہے، تو وہ بھی نیچے اترنے لگے، ان کے سردار حضرت عبد اللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ: تم لوگ وہاں مت جاؤ، حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہمیں منع فرمایا ہے۔ ان لوگوں نے کہا: اب تو جنگ ختم ہو چکی ہے، اور مسلمان کامیاب ہو چکے ہیں۔ خیر! انہوں نے وہ جگہ چھوڑ دی، ان کے وہاں سے ہٹ جانے کے بعد یہ ہوا کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے -جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے- دیکھا کہ وہ حصہ خالی ہو چکا ہے تو ایک چکر کاٹ کر گھوڑے سواروں کا ایک دستہ لے کر پیچھے کی طرف سے حملہ آور ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے پاؤں میدان سے اکھڑ گئے۔ اس وقت حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کہنے لگے: ”أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعْتَذِرُ إِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَاءِ -يعني: أَصْحَابَهُ- وَأَبْرَأُ إِلَيْكَ مِمَّا صَنَعَ هٰؤُلَاءِ -يَعْنِي: الْمُشْرِكِينَ-“ اے اللہ! ان مسلمانوں نے جو حرکت کی، اس پر میں تجھ سے معذرت چاہتا ہوں ۔ گویا اس حرکت سے ناراضگی کا اظہار بھی کر دیا اور ان کی طرف سے معافی کی درخواست بھی کر دی؛ کیوں

کہ وہ مسلمان ہیں ۔اور مشرکین نے جو حرکت کی اس سے بھی مَیں اپنی براءت کا اظہار کرتا ہوں ۔

حضراتِ شراح لکھتے ہیں کہ ان کا اندازِ فصاحت وبلاغت دیکھئے کہ دونوں کی حرکتوں پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہے ہیں ، ایک طرف مشرکین نے جو حملہ کیا تھا اور حضور اکرم ﷺ کو گزند پہنچائی تھی اس پر بھی ،اور دوسری طرف بہت سے مسلمان حضرات نے جو میدان چھوڑا تھا اس سے بھی؛ لیکن دونوں کے لئے الفاظ الگ الگ استعمال فرمائے۔

جنت کی خوشبو

" میں اُحد کے پاس جنت کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں " یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں جائیں گے اور شہید ہو جائیں گے تو جنت نصیب ہو گی۔اسی کو انہوں نے ان الفاظ سے تعبیر کیا۔یا یہ مطلب ہے کہ ان کو واقعۃً جنت کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی،اس لئے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آدمی کی موت کا وقت جب قریب آتا ہے،تو جیسا آدمی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جاتا ہے۔چوں کہ یہ بھی اس کے فوراً بعد ہی شہید ہوئے تھے، تو گویا ان کی شہادت کا وقت قریب آچکا تھا، اس لیے

ہو سکتا ہے کہ ان کے پاس جنت کی نعمتیں اور خوشبوئیں لائی گئی ہوں ،اور انہوں نے حقیقۃً اس خوشبو کا احساس وادراک کیا ہو۔

جنت کی سیر ؛چند مناظر

حدیث ۱۳۱۸ :-

وعن سَمُرَةَ -رضی الله عنه-، قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ أتيَانِي، فَصَعِدَا بِي الشَّجرةَ فَأَدْخَلاَنِي دَاراً هِيَ أَحْسَنُ وَأَفْضَلُ، لَمْ أَرَ قَطُّ أَحْسَنَ مِنْهَا ، قالا : أَمَّا هذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ)).

رواه البخاری، وَهُوَ بعض من حديث طويل فِيهِ أنواع من العلم سيأتی فی باب تحريم الكذب إنْ شاء الله تَعَالَى.

ترجمہ :-حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک روز فجر کی نماز کے بعد حضور اکرم ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: آج رات میں نے خواب میں دوآدمیوں کو دیکھا جو مجھے لے کر درخت کے اوپر چڑھے اور مجھے ایک مکان میں داخل کیا جو سب سے عمدہ اور بہتر تھا،ایسا شاندار مکان میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا(میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟)تو ان دونوں نے کہا کہ: یہ مکان شہیدوں کا ہے۔

افادات:- یہ بخاری شریف کی ایک لمبی روایت کا حصہ ہے جس میں نبیٔ کریم ﷺ نے اپنے خواب کا تذکرہ فرمایا ہے، حضورِ اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ فجر کی نماز کے بعد سلام پھیر کر صحابہ ٔکرام رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہو کر ان سے دریافت فرماتے تھے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ اگر کوئی آدمی اپنا خواب بیان کرتا تو حضورِ اکرم ﷺ اس کی تعبیر ارشاد فرماتے۔ اور اگر خود حضور ﷺ نے کوئی خواب دیکھا ہوتا تو آپ اپنا خواب بیان فرما کر اس کی تعبیر بھی ارشاد فرماتے۔

یہ خواب بڑا لمبا چوڑا ہے، حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میرے پاس خواب میں دو آدمی آئے (حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی شکل میں بھیجے تھے) وہ دونوں مجھے اٹھا کر لے گئے، راستہ میں مَیں نے مختلف مناظر دیکھے، ایک جگہ دیکھا کہ ایک آدمی لیٹا ہوا پڑا ہے، دوسرا آدمی اس کے قریب کھڑا ہے جس کے ہاتھ میں بڑا پتھر ہے جو لیٹے ہوئے آدمی کے سر پر مارتا ہے جس سے اس کا سر کچل جاتا ہے اور وہ پتھر لڑھک کر دور چلا جاتا ہے۔ مارنے والا اس پتھر کو لینے کے لئے جاتا ہے اتنی دیر میں اس آدمی کا سر ٹھیک ہو جاتا ہے، پھر وہ مارتا ہے، یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان سے پوچھا: یہ کیا ہے؟ انہوں نے مجھ سے کہا: چلو چلو! آگے چلیں۔

یہ بھی دیکھا کہ ہم ایک مکان میں داخل ہوئے جو بڑا خوبصورت تھا، اس کے اندر باغ تھا جس میں بڑے اچھے اچھے بہترین پھول تھے، جیسے موسم بہار میں ہوتے ہیں، اور اس کی عمارت بھی بڑی شاندار تھی۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ توانہوں نے کہا: آگے چلو۔ اس کے بعد وہ دونوں مجھے لے کر درخت کے اوپر چڑھے اور مجھے ایک مکان میں داخل کیا جو پہلے مکان کے مقابلہ میں عمدہ اور بہتر تھا ایسا اچھا مکان اور ایسا شاندار باغ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ توانہوں نے کہا: آگے چلو۔ جب سارا سفر پورا ہو چکا تو آخر میں سب مناظر کی وجہ انہوں نے بتلائی کہ: وہ آدمی جو لیٹا ہوا تھا اور دوسرا اس کے سر پر پتھر مارتا تھا، یہ وہ آدمی تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک کی دولت عطا فرمائی، اس کے باوجود وہ سویا رہتا تھا، فرض نماز بھی چھوڑ دیتا اور قضا کر دیتا تھا؛ اس کو عالمِ برزخ میں یہ سزا دی جارہی ہے۔

اور پہلے والا جو شاندار مکان دیکھا تھا وہ جنت میں عام اہلِ ایمان کے لئے ہے۔ اور دوسرا مکان جو پہلے والے مکان سے بھی بڑھ کر تھا وہ شہیدوں کے واسطے ہے گویا جنت میں بھی عام جنتیوں کو جو شاندار مکانات اور باغ دیئے جائیں گے، اس سے بہتر مکانات شہداء کو ملیں گے۔ اس سے شہادت کا درجہ معلوم ہوتا ہے۔

شہید کے لیے جنت الفردوس

حدیث ۱۳۱۹:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ :أَنَّ أُمَّ الرُّبیعِ بنتَ البَرَاءِ وھی أُمُّ حَارِثَۃ بن سُرَاقَۃَ أتَتِ النبی ﷺ فَقَالَتْ: یَا رسولَ اللہِ! أَلاَ تُحَدِّثُنِی عَنْ حَارِثَۃَ - وَکَانَ قُتِلَ یَوْمَ بَدْرٍ - فَإِنْ کَانَ فی الجَنَّۃِ صَبَرْتُ، وَإِنْ کَانَ غَیْرَ ذٰلِکَ اجْتَہَدْتُ عَلَیْہِ فی البُکَاءِ، فَقَالَ: یَا أُمَّ حَارِثَۃَ! إِنَّہَا جِنَانٌ فی الجَنَّۃِ، وَإِنَّ ابْنَکِ أصابَ الفِرْدَوْسَ الأَعْلَی۔ (رواہ البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ام الربیع بنت براء رضی اللہ عنھا جو حارثہ بن سراقہ رضی اللہ عنہ کی ماں ہیں (اور حارثہ بن سراقہ ابھی بچے ہی تھے کہ غزوۂ بدر کے موقعہ پر شہید ہو گئے تھے، بچوں کو جنگ میں شرکت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی لیکن وہ تماشائی کی حیثیت سے پہنچ گئے تھے کہ ایک انجانا تیر آکر ان کو لگا اور اسی میں وہ شہید ہو گئے، اس حیثیت سے شہداءِ بدر میں سے ہیں۔ بعد میں کسی موقعہ پر) ان کی والدہ ام الربیع رضی اللہ عنھا حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئیں (ان کو اپنے بیٹے کی موت کا بڑا غم تھا) اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! حارثہ کے متعلق مجھے بتلایئے کہ وہ کہاں ہیں؟ اگر جنت میں ہے تب تو مَیں صبر کر لوں گی (بھلے ہی میرے پاس سے چلا گیا لیکن وہاں آرام سے تو ہے۔ جیسے: اپنے کسی عزیز کی جدائی پر آدمی اس تصور سے بھی صبر کر لیتا ہے کہ اگرچہ یہاں سے بہت دور چلا گیا لیکن وہاں آرام سے تو ہے۔ چوں کہ وہ شہید ہوئے تھے، اس لیے) حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اے ام حارثہ! جنت میں بھی اونچے نیچے مختلف طبقات ہیں، تمہارا بیٹا تو سب سے عمدہ

جنت میں ہے جس کو جنت الفردوس کہتے ہیں (اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ان کو شہادت کی وجہ سے یہ مقام حاصل ہوا)۔

فرشتوں کے پروں کے سائے میں

حدیث ۱۳۲۰:-

وعن جابر بن عبد الله رضی الله عنهما، قَالَ: جِيءَ بِأَبِي إِلَى النَّبِيِّ ﷺ قَدْ مُثِّلَ بِهِ، فَوُضِعَ بَيْنَ يَدَيْهِ، فَذَهَبْتُ أَكْشِفُ عَنْ وَجْهِهِ فَنَهَانِي قَوْمِي، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: مَا زَالَتِ الْمَلَائِكَةُ تُظِلُّهُ بِأَجْنِحَتِهَا.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے والد (حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ) کی لاش کو حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس لایا گیا (دیگر شہداء کی لاشیں بھی لائی گئی تھیں) اور حضور کے سامنے رکھ دیا گیا (ان سب کو چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ یہ صاحبزادے تھے اور ہر بیٹے کو اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے کا خیال ہوتا ہے، اس لیے) میں کپڑا ہٹا کر اپنے ابا کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا تو لوگوں نے مجھے روک دیا (کہ ایسا مت کرو۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ساری لاشیں وہاں سے ہٹا دی گئیں) تو حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: (جب سے وہ یہاں لا کر رکھے گئے تھے) فرشتے اپنے پروں سے ان پر برابر سایہ کیے رہے۔

اگر صفیہ کا خیال نہ ہوتا

افادات:–یہ غزوۂ احد کے شہداء کا واقعہ ہے۔ غزوۂ احد میں شہید ہونے والے مسلمانوں میں سے اکثر وہ تھے جن کا مثلہ کیا گیا تھا۔ دشمن کبھی مارتا ہے تو مارنے کے بعد اپنے غصہ کے جوش کو مزید ٹھنڈا کرنے کے لئے اس مری ہوئی لاش کے ساتھ بھی بے حرمتی کا سلوک کرتا ہے، جیسے: کان، ناک، اور دوسرے اعضاء کاٹ لیتا ہے، کبھی پیٹ چیر لیتا ہے، غزوۂ احد کے موقع پر بھی جو حضراتِ صحابہ شہید ہوئے تھے، ان میں سے بہت سوں کے ساتھ کافروں نے ایسا ہی معاملہ کیا تھا نبی کریم ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جن کو بارگاہِ نبوت سے سید الشہداء کا لقب ملا وہ بھی اسی غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے، اور ان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا تھا کہ ان کے کان، ناک اور دوسرے اعضاء کاٹ دیئے گئے تھے، یہاں تک کہ کوکھ چیر کر کلیجہ باہر نکال لیا گیا تھا۔ جب حضورِ اکرم ﷺ نے یہ منظر دیکھا تو آپ پر اس کا بڑا اثر ہوا، آپ سے دیکھا نہیں گیا۔ اور آپ نے ارشاد فرمایا: اگر مجھے صفیہ کا خیال نہ ہوتا تو میں ان کی لاش کو ایسے ہی رہنے دیتا، دفن نہ کرتا، تاکہ اس کو جانور کھا جاتے اور کل کو میدانِ حشر میں وہ جانوروں کے پیٹ سے باہر آتے۔ حضرت صفیہ حضورِ اکرم ﷺ کی پھوپھی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کی والدہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بہن

ہوتی ہیں ۔ پھر آپ نے قسم کھائی کہ: میں ان کے بدلہ میں اتنے آدمیوں کا مثلہ کروں گا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ کے لیے مثلہ کرنے کی ممانعت کا حکم آگیا۔ اگر آپ کے ہاتھ کوئی دشمن لگ جائے اور آپ سزا میں اسے قتل کریں تب بھی اس کے اعضاء کو کاٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

مثلہ دشمن کا بھی حرام ہے

دیکھو! جو آدمی قتل کا حقدار ہے، اس کی وجہ سے اس کو قتل کیا جائے گا، لیکن اس کی لاش کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا، یہ ممنوع اور حرام ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہر تقریر میں ہمیشہ اس بات کو ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مثلہ کرنے سے منع فرمایا ہے، اس لیے کہ عرب میں دشمنوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے کا عام رواج تھا۔ اسی موقع پر یہ آیت بھی نازل ہوئی: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُم بِهِ وَلَئِن صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِينَ﴾ اگر بدلہ لینا ہی ہے تو تمہارے ساتھ جیسا معاملہ کیا گیا اتنا ہی معاملہ کر سکتے ہو، اور اگر صبر کرو تو بہت اچھا ہے۔

بہر حال! اس روایت سے بھی شہید کی ایک فضیلت معلوم ہوئی کہ انتقال کے بعد دفن سے پہلے بھی ان کی لاش کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اکرام واعزاز کا کیسا معاملہ کیا جاتا ہے؟ دنیا والے چاہے جیسا سلوک کریں لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ معاملہ ہوتا ہے۔

بستر پر شہادت

حدیث ۱۳۲۱ :-

وعن سهل بن حنيف رضی اللہ عنہ : أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : مَنْ سَأَلَ اللهَ تَعَالَى الشَّهَادَةَ بِصِدْقٍ بَلَّغَهُ اللهُ مَنَازِلَ الشُّهَدَاءِ، وَإِنْ مَاتَ عَلَى فِرَاشِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت سہل بن حنیف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے شہادت طلب کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو شہیدوں کا مقام عطا فرماتے ہیں چاہے اس کو بستر پر موت آئے۔

نیت عمل سے بہتر ہے

حدیث ۱۳۲۲:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله صلی اللہ علیہ وسلم :مَنْ طَلَبَ الشَّهَادَةَ صَادِقاً أُعْطِيَهَا ولو لَمْ تُصِبْهُ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے سچے دل سے شہادت مانگی؛ تو اس کو وہ دی جاتی ہے (یعنی اس کا ثواب اس کو دیا جاتا ہے) چاہے اس کو شہادت میسر نہ آئے (یعنی واقعۃً وہ شہید نہیں ہوا لیکن اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت کا ثواب ضرور دیا جائے گا)۔

افادات:- معلوم ہوا کہ آدمی کسی فضیلت کا مرتبہ سچے دل سے طلب کرتا ہے، اور اس کے لئے اپنے طور پر سعی بھی کرتا ہے لیکن وہاں تک پہنچنے کی نوبت نہیں آتی؛ تب بھی اللہ تعالیٰ اس کو وہ فضیلت عطا فرماتے ہیں ۔ اسی کو کہا گیا: "نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ (۱) مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عملی طور پر تو ایسا ہو سکتا ہے

(۱)عن أبي حازم عن سهل بن سعد قال قال رسول الله ﷺ : نية المؤمن خير من عمله. هذا حَدِيث غريب من حديث أبي حازم وسهل لم نكتبه إلا من هذا الوجه. (حلية الاولياء لأبي نُعيم الأصبهاني)

کہ کسی کام کو انجام دینے میں اس کے سارے تقاضے، حقوق، شرطیں اور قیود کی پوری پوری رعایت نہ کر پائے، لیکن کوئی آدمی جب دل سے کسی چیز کی تمنا کرتا ہے تو اس میں تو کوئی کمی رکھتا ہی نہیں ہے؛ اسی کو تعبیر کیا گیا کہ نیت عمل سے بہتر ہے، اس لیے اگر سچے دل سے شہادت کی تمنا رکھتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ وہ مقام بھی عطا فرمادیتے ہیں

یا اللہ! پھر کبھی

لیکن یاد رہے کہ محض دکھلانے کے واسطے ایسی دعا نہ مانگے بلکہ واقعۃً دل میں شہادت کی طلب موجود ہو۔ ایسا نہیں کہ پہلے تو مانگے اور جب وقت آئے تو کہے کہ اس وقت نہیں، پھر کسی موقع پر دینا۔ جیسے: ہمارے ایک ساتھی ایک صاحب کا قصہ سنا رہے تھے کہ وہ ہمیشہ دعا کرتے رہتے تھے: یا اللہ! مجھے حرم میں موت آئے۔ ایک مرتبہ حج میں گئے اور بہت بیمار ہو گئے، زندگی کی امید نہیں رہی تو ان کو اپنی پرانی کی ہوئی دعائیں یاد آرہی تھیں کہ میں ہمیشہ دعا مانگتا رہتا تھا کہ حرم میں موت آجائے، تو کہیں ابھی ہی نہ مر جاؤں۔ تو وہ دعا کرنے لگے: یا اللہ! اب کے تو اچھا کر دے، دوسرے کسی موقع پر موت دیدینا۔ جب ایسا موقعہ آتا ہے تب سچی طلب کا پتہ چل جاتا ہے۔

عشقِ الٰہی کا کلوروفارم

حدیث ۱۳۲۳ :-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: مَا يَجِدُ الشَّهِيدُ مِنْ مَسِّ الْقَتْلِ إِلاَّ كَمَا يَجِدُ أَحَدُكُمْ مِنْ مَسِّ الْقَرْصَةِ (رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: قتل کی وجہ سے شہید کو اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے جیسی تم میں سے کسی کو ایک چٹکی کی وجہ سے ہوتی ہے (ہم جس کو چمٹی توڑنا، چٹکی لینا بولتے ہیں)

افادات:- لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ اوہو! وہ مارا گیا، اس کو قتل کیا گیا، اس کا گلا کاٹ دیا گیا، جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا، پتہ نہیں اس کو کتنی تکلیف ہوئی ہو گی، لیکن نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ اس کو ذرّہ برابر بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ جو آدمی بھی اللہ کے راستہ میں اللہ تعالیٰ کی خاطر جان دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ یہی معاملہ کیا جاتا ہے۔ گویا عشقِ الٰہی کا کلوروفارم اس کو سُنگھا دیا جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کو ذرّہ برابر بھی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا۔

جیسے: قربانی کا جانور جب ذبح کیا جاتا ہے اس کے متعلق بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کسی جانور کو ذبح کیا جاتا ہے تو اللہ کا نام سنتے ہی جانور ایسا مست و مدہوش ہو جاتا ہے کہ بس! جان دینے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے، وہ اس بات پر خوش ہو جاتا ہے کہ میرے اللہ کے نام پر مجھے ذبح کیا جارہا ہے، پھر اس کو کسی قسم کی تکلیف کا ذرّہ برابر بھی احساس نہیں ہوتا۔ گویا زبانِ حال سے کہہ رہا ہو:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب ایک جانور کا یہ حال ہو جاتا ہے؛ تو ان اللہ کے بندوں کا کیا حال ہوتا ہو گا جو اللہ کے واسطے اپنی جان دیدیتے ہیں۔

جنگ کے موقعہ پر آپ ﷺ کا ایک بیان و دعا

حدیث ۱۳۲۴:-

وعن عبد الله بن أَبِي أَوْفَى رضی اللہ عنہما أَنَّ رسولَ الله ﷺ فی بَعْضِ أَيَّامِهِ الَّتی لَقِيَ فِيهَا العَدُوَّ انْتَظَرَ حَتَّى مَالَتِ الشَّمْسُ ، ثُمَّ قَامَ فی النَّاسِ فَقَالَ :أَيُّهَاالنَّاسُ! لاتَتَمَنَّوا لِقَاءَ العَدُوِّ، وَاسْأَلُوا اللهَ العَافِيَةَ، فَإِذَا لَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا ؛ وَاعْلَمُوا أَنَّ الجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوفِ. ثُمَّ قَالَ: أَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الكِتَابِ،وَمُجْرِيَ السَّحَابِ، وَهَازِمَ الأَحْزَابِ، أَهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ . (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن اَوفیٰ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک موقع پر جب دشمن سے مد بھیڑ ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے سورج کے ڈھلنے کا انتظار کیا۔ جب سورج ڈھل گیا تو پہلے آپ ﷺ لوگوں میں تقریر فرمانے کے لئے کھڑے ہوئے، اس میں فرمایا: اے لوگو! دشمن سے مد بھیڑ کی تمنا مت کرو، اور اللہ تعالیٰ سے عافیت وسلامتی مانگو، لیکن اگر مد بھیڑ ہو جائے تو پھر جم کر رہو، اور جان لو کہ جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے دعا فرمائی: اے وہ اللہ! جس نے کتاب کو نازل فرمایا، بادلوں کو چلایا، دشمن کے لشکروں کو شکست دی؛ ان کو شکست دے اور ان کے مقابلہ میں ہماری مدد فرمایا۔

افادات:- عام طور پر حضورِ اکرم ﷺ زوال کے بعد دشمن پر حملہ کرتے تھے، بعض دفعہ صبح کے وقت بھی حملہ کرنے کی نوبت آئی ہے، لیکن آپ ﷺ نے اس کو زیادہ پسند فرمایا ہے، یہاں ایسا ہی ہوا۔

"پہلے آپ ﷺ نے لوگوں میں تقریر فرمائی" یہی آداب میں سے ہے کہ جہاد سے پہلے ان کو ترغیب دی جائے، جہاد کے فضائل بیان کئے جائیں، تاکہ لوگ ذوق وشوق کے ساتھ اس میں حصہ لیں، باری تعالیٰ کی طرف سے بھی آپ ﷺ کو یہی طریقہ بتلایا گیا ہے، چناں چہ ارشاد باری ہے: ﴿يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ﴾(الانفال:٦٥) ایسے مواقع پر جہاد کے فضائل بیان کر کے لوگوں کو آمادہ کیا جائے۔

"اے لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنامت کرو" یعنی اپنی طرف سے کبھی ایسا نہیں کہنا چاہیے کہ موقعہ آئے اور دو دو ہاتھ ہوں تو میں بھی بتادوں ۔ ایسا کہنا گویا اپنے قوتِ بازو پر ایک طرح کا اعتماد واِدّعاء ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے معاملہ میں بھی ایسی کوئی شکل اختیار کرنا جس میں اپنی طرف سے دعویٰ لازم آتا ہو؛ اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی فرمایا کہ اگر مڈبھیڑ ہو جائے تو پھر جم کر رہو۔ یہ بھی ایمان کے خلاف ہے کہ ایسے موقعہ پر آدمی پیٹھ دکھائے۔

آپ ﷺ نے دعا فرما کر یہ تعلیم دی کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے چاہے آپ نے اپنے طور پر کیسی ہی تیاری کیوں نہ کی ہو، پھر بھی وسائل پر نظر نہ ہو، بلکہ اعتماد اور نظر اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے، اسی سے مدد کی دعا کی جائے، یہ بہت ضروری ہے۔

دو دعائیں قبول ہی ہوتی ہیں

حدیث ۱۳۲۵:-

وعن سهل بن سعد رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ثِنْتَانِ لاَ تُرَدَّانِ، أَوْ قَلَّمَا تُرَدَّانِ: الدُّعَاءُ عِنْدَ النِّدَاءِ وَعِنْدَ البَأْسِ حِيْنَ يُلْحِمُ بَعْضُهُم بَعْضاً. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: دو دعائیں کبھی لوٹائی نہیں جاتی (یعنی قبول ہی ہوتی ہیں، رد نہیں ہوتی) یا بہت کم رد ہوتی ہیں: ایک تو اذان کے وقت کی دعا (یعنی جس وقت اذان ہو رہی ہو اس وقت جب آدمی دعا کرتا ہے تو وہ قبول ہوتی ہے) دوسرا جب دشمن کا مقابلہ ہو (دونوں دشمن ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو چکے ہوں اور مقابلہ میں مشغول ہوں؛ اس وقت جو دعا کی جاتی ہے وہ بھی قبول ہوتی ہے، رد نہیں ہوتی)۔

قتال کے موقعہ کی مسنون دعا

حدیث ۱۳۲۶:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ رسولُ اللهِ ﷺ إِذَا غزَا، قَالَ: اللَّهُمَّ أَنْتَ عَضُدِي وَنَصِيرِي، بِكَ أَحُولُ، وَبِكَ أَصُولُ، وَبِكَ أُقَاتِلُ. (رواه أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب جہاد فرماتے تھے تو یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! تو ہی میرا بازو ہے (یعنی تو ہی مدد کرنے والا ہے) تو ہی میرا مددگار ہے، تیری ہی (مدد) سے میں (ایک حالت سے دوسری کی طرف) منتقل ہوتا ہوں، اور تیری ہی (مدد) سے میں حملہ کرتا

ہوں اور تیری ہی مدد کے ذریعہ سے میں قتال اور جنگ کرتا ہوں (مطلب یہ ہے کہ تیری مدد کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا۔)

خوف کے وقت پڑھنے کی مسنون دعا

حدیث ۱۳۲۷:-

وعن أبي موسى رضی اللہ عنہ أنَّ النبيَّ ﷺ كَانَ إِذَا خَافَ قَوماً، قَالَ: اللَّهُمَّ إِنَّا نَجعَلُكَ في نُحُورِهِم، وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شُرُورِهِم. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جب کسی قوم کی طرف سے خطرہ محسوس ہوتا تھا تو آپ یہ دعا فرماتے تھے: اے اللہ! ہم ان کے مقابلہ کے لئے تجھے پیش کرتے ہیں (ہماری طرف سے تو ہی ان کا مقابلہ کرلے) اور ان کے شر سے ہم تیری پناہ چاہتے ہیں۔(اس طرح جب اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد مانگی جائے گی تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ دشمن کے مقابلہ میں مدد فرمائے گا۔)

تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے

اس دعا کی بڑی تاثیر ہے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ۱۹۴۷ء میں جب دہلی شہر میں بڑے سخت فسادات ہو رہے تھے، جان کے لالے پڑ رہے تھے، اُس زمانہ میں بابو ایاز صاحب تانگے میں بیٹھ کر بنگلے والی مسجد کی سبزی اور سامان وغیرہ خریدنے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جس تانگے میں واپس ہو رہے تھے، اس میں دو تین سکھ بھی سوار ہو گئے، وہ ان سے کہنے لگے کہ ہم تجھے قتل کر دیں گے، انہوں نے ان سے کہا: تم میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ کہتے رہے کہ: ہم قتل کر دیں گے اور یہ کہتے رہے کہ: تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں یہاں تک کہ نظام الدین آگیا اور وہ تانگے سے اتر گئے، اور آکر مجھ سے کہا کہ: آج تو ایسا ہوا۔ میں نے پوچھا کہ: آپ نے اتنے وثوق کے ساتھ کیسے کہا؟ تو انہوں نے کہا: میں یہ دعا پڑھتا رہا: اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَجْعَلُكَ فِیْ نُحُوْرِهِمْ، وَنَعُوْذُبِكَ مِنْ شُرُوْرِهِمْ.

واقعہ یہ ہے کہ دشمن کی طرف سے خطرات کے وقت اس دعا کی افادیت بہت زیادہ محسوس کی گئی ہے۔ فسادات کے موقع پر بھی لوگوں نے اس دعا کی بڑی تاثیر بتلائی۔ اس لیے ایسے مواقع پر اس کے پڑھنے کا اہتمام کیا جائے۔

گھوڑوں کی پیشانیوں میں بھلائی

حدیث ۱۳۲۸:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أَنَّ رسولَ اللہِ ﷺ قَالَ: الْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِی نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: گھوڑوں کی پیشانیوں میں قیامت تک کے لئے بھلائی باندھ دی گئی ہے (مزید وضاحت اگلی روایت میں ہے)۔

حدیث ۱۳۲۹:-

وعن عروۃ البارِقِیِّ رضی اللہ عنہ أَنَّ النبیَّ ﷺ قَالَ: الْخَيْلُ مَعْقُودٌ فِی نَوَاصِيهَا الْخَيْرُ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ: الأَجْرُ، وَالْمَغْنَمُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عروہ بارقی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: گھوڑوں کی اَیال (یعنی پیشانی کے بالوں) میں قیامت تک کے لئے بھلائی باندھ دی گئی؛ یعنی اجر و ثواب اور مالِ غنیمت۔

افادات:- گھوڑے کی گردن پر جو بال ہوتے ہیں، اس کو ”ناصیہ“ کہتے ہیں، چوں کہ گھوڑا جہاد کا آلہ ہے۔ تو اگر جہاد کی نیت سے گھوڑا پالا جائے گا تو جہاد کا ثواب بھی حاصل ہو گا اور اس سے مالِ غنیمت بھی ملتا ہے۔

انمول بول و براز

حدیث ۱۳۳۰:-

وعن أبي هريرة -رضى الله عنه- قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((مَنْ احْتَبَسَ فَرَساً فِي سَبِيلِ اللهِ، إِيمَاناً بِاللهِ، وَتَصْدِيقاً بِوَعْدِهِ، فَإِنَّ شِبَعَهُ، وَرِيَّهُ وروثَهُ، وَبَوْلَهُ فِي مِيزَانِهِ يَوْمَ القِيَامَةِ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے راستہ کے لئے گھوڑا پالا، محض اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتے ہوئے، اوراس کے وعدوں کو سچا سمجھتے ہوئے: تواس گھوڑے کا شکم سیر ہونا (یعنی گھوڑا جو چارہ کھائے گا) اس کا سیر اب ہونا، اس کا لید کرنا، اس کا پیشاب کرنا؛ یہ سب اعمال قیامت کے روز ترازو میں ثواب کے طور پر تولے جائیں گے۔

افادات:- کسی بھی عمل میں یہ دو باتیں نہایت ضروری ہیں، ایک تو ایمان کا تقاضہ ہو، اور دوسرا اس عمل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وعدہ کیا گیا ہے اس کے پورا ہونے کا دل سے یقین ہو؛ اسی کو "ایمان واحتساب" کہتے ہیں۔

لید اور پیشاب تو نجس چیزیں ہے، لیکن نامۂ اعمال کے ترازو میں ثواب کے طور پر یہ بھی تولی جائیں گی۔ گویا اللہ تعالیٰ کے یہاں آلۂ جہاد کا اتنا زیادہ اعزاز و اکرام ہے کہ ان پر بھی ثواب عنایت فرمائیں گے۔

اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کم سے کم ثواب

حدیث ۱۳۳۱ :-

وعن أَبِي مسعود رضی اللہ عنہ قَالَ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النبيِّ ﷺ بِنَاقَةٍ مَخْطُومَةٍ فَقَالَ: هٰذِهٖ فِي سَبِيلِ اللهِ، فَقَالَ رسول الله ﷺ: لَكَ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ سَبْعُ مِئَةِ نَاقَةٍ كُلُّهَا مَخْطُومَةٌ. (رواہ مسلم)

ترجمہ :- حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس ایک نکیل والی اونٹنی لے کر آیا (ناک کے اندر رسی پرو کر باندھی ہوئی تھی۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حوالہ کرتے ہوئے) کہا: یہ اللہ کے راستہ میں دیتا ہوں ۔ حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اس ایک اونٹنی کے بدلہ میں قیامت کے روز تجھے سات سو ایسی اونٹنیاں دی جائیں گی کہ ہر ایک کی نکیل لگی ہوئی ہوگی۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے کا کم سے کم ثواب سات سو گنا ملتا ہے، پھر جتنا اخلاص زیادہ ہوگا اسی حساب سے مزید ملے گا۔

سن لو! قوت تیر اندازی ہے

حدیث ۱۳۳۲ :-

وعن أَبِي حمادٍ-ويقال:أَبُو سعاد ، ويقال:أَبُو أسيدٍ ، ويقال : أَبُوعامِرٍ ويقال:أَبُوعمرو،ويقال : أَبُوالأسود ، ويقال : أَبُو عبسٍ - عُقبة بن عامِرٍ الجُهَنِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ وَهُوَعَلَى المِنبَرِ ، يقول :﴿وَأَعِدُّوالَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ﴾أَلاَ إنَّ القُوَّةَ الرَّمْيُ ، أَلاَ إنَّ القُوَّةَ الرَّمْيُ، أَلاَ إنَّ القُوَّةَ الرَّمْيُ (رواہ مسلم)

ترجمہ :-حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: (قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ :) دشمنانِ دین کے مقابلہ کے لیے تم سے جتنی بھی قوت فراہم ہو سکتی ہو وہ فراہم کرو اوراس کی تیاری کرو۔ سن لو! قوت سے مراد تیر اندازی ہے، سن لو! قوت سے مراد تیر اندازی ہے، سن لو! قوت سے مراد تیر اندازی ہے۔

افادات:- اُس زمانہ میں دشمن کے مقابلہ کا یہی ایک ایسا ذریعہ تھا جو بڑی آسانی سے دشمن کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اگر آدمی دور سے تیر چلائے تو ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے دشمنوں کا ذمہ دار اور سردار ہی ختم ہو جائے جس کی وجہ سے پورے لشکر کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے آلات اور اسباب تیار کئے جائیں جن سے کم محنت میں زیادہ فائدہ پہنچنے کی امید ہو۔

کوئی بھی اس سے عاجز نہ رہے

حدیث ۱۳۳۳:-

وعنه قَالَ : سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول : سَتُفْتَحُ عَلَيْكُمْ أَرْضُونَ، وَيَكْفِيكُمُ اللهُ، فَلاَ يَعْجِزُ أَحَدُكُمْ أَنْ يَلْهُوَ بِأَسْهُمِهِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ: تمہارے لئے زمینیں فتح ہوں گی (یعنی آئندہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ملک فتح کریں گے) اور اللہ تعالیٰ تم کو دشمنوں کے شر کی طرف سے کافی ہو جائے گا، لیکن تم میں سے کوئی آدمی اس بات سے عاجز نہ رہے کہ وہ اپنے تیروں کے ساتھ کھیلتا رہے (مطلب یہ ہے کہ ہر ایک آدمی کو کم سے کم تیر اندازی کی مشق تو کرتے ہی رہنا چاہیے)۔

وہ ہم میں سے نہیں

حدیث ۱۳۳۴:-

وعنه: أنَّه قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: مَنْ عُلِّمَ الرَّمْيَ، ثُمَّ تَرَكَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، أَوْ فَقَدْ عَصَى. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی تیر اندازی سکھلایا گیا (یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ ہنر اور کمال عطا فرمایا) پھر اس نے اس کو چھوڑ دیا (جس کی وجہ سے اس کا پہلے جیسا نشانہ نہیں رہا) تو وہ ہم میں سے نہیں ہے، یا (یہ فرمایا کہ) اس نے نافرمانی کی۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے دین کو تقویت پہنچانے کی کسی بھی نوع کی کوئی بھی صلاحیت عطا فرمائی ہو، پھر وہ آدمی اپنی اس صلاحیت کو اس مقصد کے لئے استعمال نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنی اس صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے اور پھر اس میں وہ صلاحیت باقی نہیں رہتی؛ تو اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوگی۔ اس میں ہر نوع کی صلاحیت آسکتی ہے۔

جس نے تیر اندازی سیکھنے کے بعد غفلت کی

حدیث ۱۳۳۵:-

وعنه رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يقول: إِنَّ اللهَ يُدْخِلُ بِالسَّهْمِ الوَاحِدِ ثَلَاثَةَ نَفَرٍ الجَنَّةَ: صَانِعَهُ يَحْتَسِبُ فِى صَنْعَتِهِ الخَيْرَ، وَالرَّامِي بِهِ، ومُنْبِلَهُ. وَارْمُوا وَارْكَبُوا، وَأَنْ تَرْمُوا أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ تَرْكَبُوا. وَمَنْ تَرَكَ الرَّمْيَ بَعْدَمَا عُلِّمَهُ رَغْبَةً عَنْهُ فَإِنَّهَا نِعْمَةٌ تَرَكَهَا. أَوْ قَالَ: كَفَرَهَا. (رواه أبو داود)

ترجمہ :-حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ ایک تیر کی وجہ سے تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرے گا: پہلا تو اس کو بنانے والا جس کی نیت بناتے وقت ہی خیر اور بھلائی کی تھی۔ دوسرا اس کا چلانے والا۔ اور تیسرا اس کو لاکر دینے والا (یعنی جو تیر چلارہا ہو اس کے ہاتھ میں لاکر دیتا ہے) پھر حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تیر اندازی کرو، گھڑ سواری بھی کرو؛ اور تمہارا تیر اندازی کرنا گھڑ سواری کے مقابلہ میں مجھے زیادہ پسند ہے۔ جس آدمی نے تیر اندازی سیکھنے کے بعد غفلت کرکے اس کو چھوڑ دیا تو اس نے ایک نعمت کی ناشکری کی (کہ اس کو اللہ کے راستہ میں استعمال کرنا چاہیے تھا لیکن اس کے بجائے اس نے اس کو ضائع کردیا)۔

اے بنو اسماعیل! تیر اندازی کرتے رہو

حدیث ۱۳۳۶ :-

وعن سَلَمَة بن الأكوع رضی اللہ عنہ قَالَ: مَرَّ النَّبِيُّ ﷺ عَلَى نَفَرٍ يَنْتَضِلُونَ فَقَالَ: ارْمُوا بَنِي إِسْمٰعِيلَ، فَإِنَّ أَبَاكُمْ كَانَ رَامِياً. (رواہ البخاری)

ترجمہ:-حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اے بنو اسماعیل! تیر اندازی کرتے رہو؛ اس لئے کہ تمہارے ابا بھی تیر انداز تھے۔

افادات:- قریش حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اسبابِ جہاد اختیار کرتے رہنا چاہیے، آدمی پہلے ہی سے ان چیزوں کی مشق کئے ہوئے تیار رہے۔

اللہ کے راستہ میں تیر چلانے کی فضیلت

حدیث ۱۳۳۷:-

وعن عمرو بن عبسة رضی اللہ عنہ **قَالَ :سَمِعۡتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول: مَنۡ رَمَى بِسَهمٍ فى سَبيلِ الله فَهُوَ لَهُ عِدۡلُ مُحَرَّرَةٍ.** (رواه أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ :- حضرت عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے اللہ کے راستہ میں ایک تیر چلایا؛ تو اس کے لئے ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہے۔

افادات:- کتنی بڑی فضیلت ہے ! غلام؛ بہت قیمتی چیز ہوا کرتی تھی، ایک غلام خرید کر کوئی آدمی آزاد کرے، اس پر جو ثواب ملتا ہے، اللہ کے راستہ میں صرف ایک تیر چلانے پر اتنا ہی ثواب ملتا ہے۔

جو اللہ کے راستہ میں خرچ کرے

حدیث ۱۳۳۸ :-

وعن أَبِي يحيىٰ خُرَيْم بن فاتِكٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: مَنْ أَنْفَقَ نَفَقَةً فى سَبيلِ اللهِ كُتِبَ لَهُ سَبْعُ مِئَةِ ضِعْفٍ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ :- حضرت ابو یحیٰی خُرَیم بن فاتِک اَسدی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے راستہ میں خرچ کیا، اس کے لئے سات سو گنا ثواب لکھا جائے گا (یہ تو کم سے کم درجہ ہے؛ پھر اللہ تعالیٰ جتنا زیادہ چاہیں عنایت فرمائیں)۔

اللہ کے راستہ میں نفلی روزہ کی فضیلت

حدیث ۱۳۳۹ :-

وعن أَبِي سعيد رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْماً فِي سَبيلِ اللهِ إِلاَّ بَاعَدَ اللهُ بِذٰلِكَ اليَوْمِ وَجهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفاً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بندہ اللہ کے راستہ میں ایک دن روزہ رکھتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کے بدلہ میں اس کے چہرے (اس کی ذات) کو جہنم کی آگ سے ستر سال دور کر دیتے ہیں۔

افادات:- جو آدمی اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے نکلا، اس درمیان نفل روزہ بھی رکھ لیا؛ تو اس کو جہنم سے ستر سال دور کر دیا جاتا ہے۔ کتنی بڑی فضیلت ہے۔!

حدیث ۱۳۴۰ :-

وعن أبي أُمَامَة رضی اللہ عنہ عن النبيﷺ قَالَ: مَنْ صَامَ يَوْماً في سَبيلِ اللهِ جَعَلَ اللهُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ النَّارِ خَنْدَقاً كما بَيْنَ السَّمَاءِ والأَرْضِ. (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے راستہ میں ایک دن روزہ رکھا؛ اللہ تعالیٰ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ایسی خندق حائل کر دیتے ہیں جس کی گہرائی زمین و آسمان کے درمیان کے فاصلہ کے برابر ہوتی ہے۔

افادات:- اور زمین و آسمان کے فاصلہ کے متعلق بعض روایتوں میں آتا ہے کہ پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔

جس کے دل میں جہاد کی تمنا بھی پیدا نہ ہو

حدیث ۱۳۴۱ :-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: قال رسول اللهﷺ: مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ، وَلَمْ يُحَدِّثْ نَفْسَهُ بِالغَزْوِ، مَاتَ عَلَى شُعْبَةٍ مِنَ النِّفَاقِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کا انتقال ایسی حالت میں ہوا کہ وہ کسی جہاد و غزوہ میں شریک نہیں ہوا، اور کبھی اس کے دل میں جہاد اور غزوہ میں شریک ہونے کی تمنا بھی پیدا نہیں ہوئی؛ تو وہ نفاق کی ایک خصلت پر دنیا سے رخصت ہوا۔(اس سے معلوم ہوا کہ مؤمن کے ایمان کا تقاضا ہے کہ اس کے دل میں جہاد کی آرزو اور تمنا ہو)۔

مجاہدِ بے جہاد

حدیث ۱۳۴۲ :-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ: كنا مَعَ النبيِّ ﷺ في غزاةٍ فقالَ: إنَّ بِالْمَدِينَةِ لَرِجَالاً مَا سِرْتُمْ مَسِيراً، وَلاَ قَطَعْتُمْ وَادِياً إِلاَّ كَانُوا مَعَكُمْ، حَبَسَهُمُ المَرَضُ.

وفي رواية: حَبَسَهُمُ العُذْرُ. وفي رواية: إِلاَّ شَرَكُوكُمْ فِي الأَجْرِ (رواه البخاري من رواية أنس، ورواه مسلم من رواية جابر واللفظ لَهُ.

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ تھے، اس وقت حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ ارشاد فرمایا کہ: مدینہ منورہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب تم سفر طے کررہے تھے، یا کسی وادی کو پار کررہے تھے؛ تو وہ لوگ بھی تمہارے ساتھ تھے (اگرچہ ظاہری جسموں کے اعتبار سے وہ مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہیں ؛ لیکن روحانی اور اجر و ثواب کے اعتبار سے وہ تمہارے ساتھ تھے) اس لیے کہ بیماری (اور دوسری روایت میں ہے کہ) عذر نے ان کو وہیں روک لیا (اور دل چاہنے کے باوجود وہ تمہارے ساتھ نہ آ سکے)۔ (اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی نے اللہ کے راستہ میں جانے کی نیت کرلی اور تیاری بھی کرلی، پھر کسی عذر کی وجہ سے رکاوٹ پیش آگئی تو اس کو پورا پورا اجر ملے گا)۔

اللہ کے راستہ میں کون؟

حدیث ۱۳۴۳:-

وعن أَبِي موسى رضی اللہ عنہ: أنَّ أعرابياً أتى النبيَّ ﷺ فقالَ: يا رسولَ اللهِ! الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُذْكَرَ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرَى مَكَانُهُ. وفي رواية: يُقَاتِلُ شَجَاعَةً، وَيُقَاتِلُ حَمِيَّةً. وفي رواية: يُقَاتِلُ غَضَباً، فَمَنْ في سبيل الله؟ فقالَ رسولُ اللهِ ﷺ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ العُلْيَا، فَهُوَ في سَبيلِ اللهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ: حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! ایک آدمی مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے قتال کرتا ہے، اور دوسرا آدمی اس لئے لڑتا ہے تاکہ لوگوں میں اس کا چرچا اور تذکرہ ہو اور شہرت ہو کہ فلاں بڑا مجاہد ہے، ایک اور آدمی اس لئے لڑتا ہے کہ لوگ اس کی بہادری کو دیکھیں (دوسری روایت میں اس کی تشریح "يُقَاتِلُ شَجَاعَةً" آئی ہے) اور ایک آدمی اپنے قبیلے، اپنی جماعت و برادری، اور اپنے خاندان کی حمایت میں لڑتا ہے، اسی کی خاطر اس کو غصہ آیا اور بدلہ لینے کے واسطے لڑائی میں شامل ہو گیا (لوگ ان مختلف نیتوں سے یہ کام کرتے ہیں) تو اللہ کے راستہ میں لڑنے والا کون کہلائے گا؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اس لئے لڑے تاکہ اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند ہو جائے؛ وہ اللہ کے راستہ میں شمار ہو گا۔

جس کو اعمال کا دنیا میں کچھ معاوضہ نہ ملا

حدیث ۱۳۴۴:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما، قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: مَا مِنْ غَازِيَةٍ، أَوْ سَرِيَّةٍ تَغْزُو، فَتَغْنَمُ وَتَسْلَمُ، إِلاَّ كَانُوا قَدْ تَعَجَّلُوا ثُلُثَيْ أُجُورِهُمْ، وَمَا مِنْ غَازِيَةٍ أَوْ سَرِيَّةٍ تُخْفِقُ وَتُصَابُ إِلاَّ تَمَّ لَهُمْ أُجُورهُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ جماعت یا سریہ جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے کے لیے جاتا ہے، پھر سلامتی کے ساتھ مالِ غنیمت لے کر

واپس لوٹتا ہے؛ تو انہوں نے اپنا بدلہ اور اجر و ثواب کا دو تہائی حصہ دنیا ہی میں وصول کر لیا۔ اور جہاد کے لئے جانے والی جو جماعت بغیر غنیمت کے زخمی ہو کر واپس لوٹتی ہے؛ ان کو پورا پورا ثواب دیا جاتا ہے۔

افادات:- اسی لئے بعد میں جب مسلمانوں کی فتوحات کا دور شروع ہوا تو جو حضرات صحابہ کرام اس وقت تک زندہ رہے وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے بعض رفقاء تو وہ ہیں جو دنیا سے ایسی حالت میں چلے گئے کہ انہوں نے اپنے اعمال کا کوئی بھی بدلہ دنیا میں نہیں پایا، ان کو پورا پورا بدلہ آخرت میں ملے گا۔ اور ہمیں دنیا میں بھی نعمتیں مل رہی ہیں، اس کی وجہ سے آخرت میں گویا کمی آئے گی۔

اور یہ بات تو ہے ہی کہ جس آدمی کو اس کے اعمال کے معاوضہ کے طور پر دنیا میں کچھ بھی نہیں دیا گیا، اس کو آخرت میں پورا پورا بدلہ ملے گا، اور جس کو یہاں کچھ بھی ملا، اس کے بقدر آخرت میں کچھ نہ کچھ تو کمی ہو ہی جائے گی۔

میری اُمت کی سیر و تفریح

حدیث ۱۳۴۵:-

وعن أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رجلاً قَالَ: يَا رسولَ اللهِ! ائْذَنْ لی فی السِّيَاحَةِ. فَقَالَ النبیُّ ﷺ: إِنَّ سِيَاحَةَ أُمَّتِي الجِهَادُ فی سَبيلِ اللهِ-عز وجل- (رواہ أبو داود بإسنادٍ جيدٍ)

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: ہم کو سیر و تفریح کی اجازت دیجیے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری امت کی سیر و تفریح اللہ کے راستہ میں جہاد ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جب جہاد کے لئے نکلے گا تو سیر و تفریح کا جو مقصد ہوتا ہے وہ بھی حاصل ہو جائے گا، اور اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی سربلندی بھی ہوگی۔ اور آدمی اگر صرف سیر و تفریح کے لئے جائے کہ اس سے کوئی دینی فائدہ حاصل نہ ہو؛ تو ایسی سیر و تفریح کس کام کی؟ ایسی تفریح تو صرف وطن چھوڑنا، پیسے خرچ کرنا اور سفر کی زحمت برداشت کرنا ہے۔

واپس لوٹنا جہاد میں جانے جیسا ہی ہے

حدیث ۱۳۴۶:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما عن النبيِّ ﷺ قال: قَفْلَةٌ كَغَزْوَةٍ. (رواه أبو داود بإسنادٍ جيدٍ)

((القَفْلَةُ)) : الرُّجُوعُ، وَالمراد: الرُّجُوعُ مِنَ الغَزْوِ بَعدَ فَرَاغِهِ؛ ومعناه: أنه يُثَابُ فی رُجُوعِهِ بعد فَرَاغِهِ مِنَ الغَزْوِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جہاد سے واپس لوٹنا اجر وثواب کے اعتبار سے ایسا ہی ہے جیسا کہ جہاد کے لیے جانا (یعنی جس طرح جانے والے کو ثواب ملتا ہے، جب وہ فارغ ہو کر واپس لوٹے گا تو اس صورت میں واپس لوٹنے پر بھی اتنا ہی ثواب ملے گا)۔

واپس آنے والوں کا استقبال کرنا چاہیے

حدیث ۱۳۴۷:-

وعن السائب بن يزيد رضی الله عنه قَالَ : لَمَّا قَدِمَ النبيُّ ﷺ مِنْ غَزْوَةِ تَبُوك تَلَقَّاهُ النَّاسُ، فَتَلَقَّيْتُهُ مَعَ الصِّبْيَانِ عَلَى ثَنِيَّةِ الوَدَاعِ. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيح بهذا اللفظ) ورواه البخاری:

قَالَ: ذَهَبْنَا نَتَلَقَّى رسولَ اللهِ ﷺ مَعَ الصِّبْيَانِ إِلَى ثَنِيَّةِ الوَدَاعِ.

ترجمہ:- حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم غزوۂ تبوک سے واپس لوٹے تو لوگ آپ کے استقبال کے لئے نکلے، میں بھی بچوں کے ساتھ "ثنیۃ الوداع" تک آپ کے استقبال کے لئے گیا۔

افادات:- اس روایت سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جو جماعت اللہ کے راستہ میں جہاد کے لئے ،حج کے لئے، طلبِ علم کے لئے ،یا دعوت و تبلیغ کے لئے گئی ہو،جب وہ واپس لوٹے تو ان کے استقبال کے لئے جانا چاہیے۔

جہاد میں کسی نہ کسی طریقہ پر حصہ لینا ضروری ہے

حدیث ۱۳۴۸:-

وعن أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ عن النبيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ لَمْ يَغْزُ، أَوْ يُجَهِّزْ غَازِياً أَوْ يَخْلُفْ غَازِياً فِي أَهْلِهِ بِخَيرٍ، أَصَابَهُ اللهُ بِقَارِعَةٍ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے غزوہ میں شرکت نہیں کی، یا کسی غازی کے سامان کی تیاری میں حصہ نہیں لیا، یا کسی غازی کی غیر حاضری میں اس کے گھر والوں کے ساتھ بھلائی میں نیابت نہیں کی (یعنی اس کی غیر حاضری میں گھر کے کام کاج میں

مدد اور تعاون نہیں کیا) تو اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو قیامت سے پہلے ہی بڑی سخت مصیبت میں مبتلا کریں گے۔(گویا جہاد کے اندر کسی طرح کا حصہ نہ لینے پر سخت وعید سنائی گئی ہے)۔

جہاد تینوں طریقوں سے ہوتا ہے

حدیث ۱۳۴۹:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ

(رواہ أبو داود بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: مشرکین کے ساتھ اپنے مال، جان اور زبان سے جہاد کرو۔(ان تینوں طریقوں سے جہاد ہوتا ہے جیسا کہ شروع باب میں تفصیل بتلائی تھی)۔

قتال کا مناسب وقت

حدیث ۱۳۵۰:-

وعن أبي عمرو-ويقال: أبو حكيم-النُّعمَانِ بن مُقرِّن رضی اللہ عنہ قَالَ: شَهِدتُ رسولَ اللهِ ﷺ إِذَا لَمْ يُقَاتِلْ من أوَّلِ النَّهَارِ أَخَّرَ القِتَالَ حَتَّى تَزُولَ الشَّمْسُ وَتَهُبَّ الرِّيَاحُ، وَيَنْزِلَ النَّصْرُ. (رواه أبوداؤد والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن مُقرِّن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ غزوات میں شریک رہا، اگر آپ دن کے ابتدائی وقت میں قتال شروع نہیں فرماتے تھے، تو سورج کے ڈھلنے تک قتال کو مؤخر فرماتے تھے؛ تاکہ ہوائیں چلنے لگیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد اترے۔

افادات:- عام طور پر تو یہ ہوتا تھا کہ اگر آپ ﷺ شروع دن میں وہاں پہنچ جاتے تو اس بات کا انتظار فرماتے تھے کہ اس بستی میں سے اذان کی آواز آئے، اگر اذان کی آواز آجاتی تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ لوگ ایمان اور اسلام پر قائم ہیں، پھر تو مقابلہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، ورنہ حضور اکرم ﷺ آگے بڑھتے تھے اور علی الصبح ہی قتال کی ابتداء فرمادیتے تھے۔ اور اگر علی الصبح قتال کی نوبت نہ آتی تو سورج کے ڈھلنے تک قتال کو مؤخر فرماتے تھے۔ پہلے بھی بتلایا تھا کہ دو ہی وقت قتال کے لئے زیادہ مناسب بتلائے گئے ہیں، ایک تو صبح کا اور دوسرا زوال کے بعد کا۔

تمنامت کرو، ہو جائے تو جم جاؤ

حدیث ۱۳۵۱ :-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ رسول اللهﷺ :لاَتَتَمَنَّوْالِقَاءَ العَدُوِّ، وَاسْأَلُوا اللهَ العَافِيَةَ، فَإِذَالَقِيتُمُوهُمْ فَاصْبِرُوا. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: دشمن سے مدبھیڑ کی تمنانہ کرو، اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، البتہ جب تم ان سے بھڑ جاؤ اور مقابلہ ہو جائے؛ تو پھر جم کر مقابلہ کرو۔

افادات:- یعنی تمہاری طرف سے یہ تمنا نہ ہو کہ دشمن سے مقابلہ اور دو دو ہاتھ ہو جائیں تو ہم بھی ان کو بتادیں ، اس لئے کہ اس طرح کی بات کرنا اپنی طاقت واسباب پر ایک طرح کے اعتماد و بھروسہ کی علامت سمجھی جاتی ہے، حالاں کہ مؤمن کا اعتماد اور بھروسہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہوتا ہے، اپنی ذات پر اور اسباب پر نہیں ۔ لیکن اگر مقابلہ ہو ہی گیا؛ تو پھر قدم پیچھے ہٹانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

لڑائی تو ایک چال ہے

حدیث ۱۳۵۲:-

وعنه وعن جابر رضی اللہ عنہما: أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: الحَرْبُ خَدْعَةٌ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أبو ہریرہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: لڑائی تو ایک چال ہے۔

افادات:- یعنی دشمن کے مقابلہ اور لڑائی میں مختلف تدبیریں اختیار کی جاتیں ہیں، چالیں چلی جاتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی چال پوری لڑائی کا پانسہ پلٹنے اور فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہو جاتی ہے، صرف طاقت پر دارومدار نہیں ہوا کرتا، خاص کر عصر حاضر میں، اور ہر زمانہ میں یہ چیز رہی ہے کہ آدمی مختلف تدبیروں کو بروئے کار لائے، صرف طاقت پر اعتماد نہ ہو۔ عام طور پر اس طرح کے مواقع پر تدبیریں ہی کارگر اور فیصلہ کن ثابت ہوتی ہیں ۔

باب بیان جماعۃ من الشھدآء فی ثواب الآخرۃ ویغسلون ویصلّٰی علیھم بخلاف القتیل فی حرب الکفار

شہیدوں کی فضیلت اور احکام

جہاد کے فضائل کا سلسلہ جاری تھا، اسی ضمن میں ذیلی عنوان کے طور پر یہ باب قائم کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو آخرت کے اعتبار سے شہیدوں کا مقام دیا جائے گا اور جو اجر و ثواب اور مقام و مرتبہ شہیدوں کو ملا کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بھی وہ سب کچھ عطا فرمائیں گے؛ البتہ دنیوی اعتبار سے ان کو غسل بھی دیں گے اور ان کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، بخلاف وہ آدمی جو لڑائی میں کافروں کے مقابلہ میں مارا جائے۔

شہید کی دو قسمیں ہیں

یہاں شہید کی دو قسمیں بتلائی ہیں: ایک تو وہ جس کے اوپر دنیوی اعتبار سے بھی شہید کا حکم جاری کیا جاتا ہے۔ اور دنیوی اعتبار سے شہید کا حکم یہ ہے کہ اس کو غسل نہیں دیا جاتا،

البتہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھی جائے گی اور دفن کریں گے، یہ حکم احناف کے نزدیک ہے۔ شافعیہ کے یہاں غسل بھی نہیں اور نمازجنازہ بھی نہیں ؛ بلکہ بغیر غسل دیئے ہوئے اور بغیر نمازِ جنازہ کے اس کو دفن کریں گے۔

اور دوسری قسم یہ ہے کہ جس پر دنیوی اعتبار سے تو شہید کا حکم جاری نہیں ہوتا، البتہ اخروی اعتبار سے ان کو شہیدوں کا مقام دیا جائے گا، ان کا حکم یہ ہے کہ غسل بھی دیا جائے گا اور نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی، اسی لئے عنوان میں فرمایا کہ ان کو غسل بھی دیں گے، اور نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔

احناف کے یہاں تو نمازِ جنازہ ہر حال میں پڑھی جاتی ہے، البتہ دنیوی اعتبار سے اگر شہید کا حکم جاری ہو تو اس کو غسل نہیں دیں گے۔ اور دنیوی اعتبار سے شہید کا حکم جاری ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ وہ دشمن کے ہاتھوں زخمی ہونے کے بعد لڑائی کے میدان ہی میں کوئی دنیوی فائدہ اور منفعت اٹھانے سے پہلے انتقال کر جائے، یعنی زخمی ہونے کے بعد اس کو علاج معالجہ، اور کچھ کھانے پینے کا موقع نہیں ملا اور انتقال ہو گیا؛ تو اس صورت کے اندر اس کو غسل نہیں دیں گے، صرف نمازِ جنازہ پڑھ کر دفن کیا جائے گا۔ اور شافعیہ کے یہاں اس پر نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی۔

اس عنوان کے ماتحت علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کچھ ایسے شہیدوں کو شمار کروا رہے ہیں کہ دنیوی اعتبار سے تو ان پر شہید کا حکم جاری نہیں ہوگا؛ لیکن اخروی اعتبار سے شہیدوں والا اجر و ثواب ملے گا۔ چناں چہ روایت لائے ہیں ۔

شہید پانچ ہیں

حدیث ۱۳۵۳:-

وعن أَبِي هريرة - رضى الله عنه - قَالَ : قَالَ رسول الله ﷺ: ((الشُّهَدَاءُ خَمْسَةٌ : المَطْعُونُ وَالمَبْطُونُ، وَالغَرِيقُ، وَصَاحِبُ الهَدْمِ، وَالشَّهِيدُ فى سَبِيلِ الله.(متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: شہید (یعنی جن کو آخرت میں شہداء کا درجہ دیا جائے گا اور شہیدوں کا اجر و ثواب ملے گا) وہ پانچ ہیں :

[۱] ایک تو وہ جس کا انتقال طاعون (پلیگ) کے اندر ہو جائے [۲] دوسرا وہ جو پیٹ کی بیماری میں انتقال کر جائے [۳] تیسرا وہ جو پانی میں ڈوب کر مر جائے [۴] چوتھا وہ جو (کسی مکان وغیرہ کی دیوار میں) دب کر مر جائے [۵] پانچواں وہ جو اللہ کے راستہ میں انتقال کر جائے۔

افادات:- ۱ طاعون اور پلیگ کی بیماری کو سورت والے اچھی طرح جانتے ہیں(۱)، اس بیماری میں انتقال کر جانے والے کو آخرت کے اعتبار سے شہیدوں والا ثواب ملے گا، باقی دنیوی اعتبار سے اس کو غسل وکفن دیں گے اور نمازِ جنازہ بھی پڑھی جائے گی۔

۲ پیٹ کی بیماری عام ہے، پیٹ کی جو بھی بیماری ہو اس میں جس کا انتقال ہو جائے اس کو بھی شہیدوں والا ثواب ملے گا۔

۳ پانی میں ڈوب کر مرنے والا، لیکن قصداً ڈوبنے والا مراد نہیں ہے، بلکہ مثلاً: کشتی میں کہیں جا رہے تھے، یا کسی وجہ سے کہیں گرا اور ڈوب گیا؛ تو وہ بھی شہید کا درجہ پائے گا۔

۴ کسی آدمی کے اوپر کوئی دیوار، یا مکان کی چھت وغیرہ گری اور اس میں دب کر انتقال ہو گیا؛ تو وہ بھی شہید کا ثواب پائے گا۔

۵ اور جو اللہ کے راستہ (میدانِ جنگ) میں انتقال کرے، تو اگر وہ شرطیں پائی جاتی ہیں

(۱) ۱۹۹۳ء میں سورت میں طاعون پھیلا تھا جس میں بہت لوگ مرے تھے، خصوصاً غیر مسلموں میں اموات زیادہ ہوئیں اور ان میں ایک قسم کا خوف وہراس پھیل گیا تھا۔

جو اوپر بتلائی تھی تب تو دنیوی اعتبار سے بھی شہید ہے اور اخروی اعتبار سے بھی شہید ہے، لیکن لڑائی میں نہیں مارا گیا بلکہ اللہ کے راستہ میں نکلا اور طبعی موت کی وجہ سے انتقال کر گیا تو اخروی اعتبار سے شہید کا درجہ پائے گا۔

حدیث ۱۳۵۴:-

وعنه قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((مَا تَعُدُّونَ الشُّهَدَاءَ فِيكُمْ؟)) قالوا: يَا رسولَ اللهِ، مَنْ قُتِلَ فِى سَبيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ. قَالَ: ((إِنَّ شهَدَاءَ أُمَّتِي إِذًا لَقَليلٌ))! قالوا: فَمَنْ هُمْ يَا رسول الله؟ قَالَ: ((مَنْ قُتِلَ فِى سَبيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِى سَبيلِ اللهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِى الطَّاعُونِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ مَاتَ فِى البَطْنِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَالغَرِيقُ شَهِيدٌ)) (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا: تم اپنے درمیان شہید کس کو شمار کرتے ہو؟ (یعنی کس کو شہید سمجھتے ہو؟) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! جو اللہ کے راستہ میں قتل کیا جائے؛ وہ شہید ہے (ہم تو اسی کو شہید سمجھتے ہیں) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اگر صرف اسی کو شہید کہیں گے جو اللہ کے راستہ میں قتل کر دیا جائے تو اس صورت میں میری امت کے شہداء کی تعداد بہت گھٹ جائے گی اور کم ہو جائے گی (حالاں کہ میری امت کے شہداء کی تعداد تو بہت زیادہ ہے) اس پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اللہ کے رسول! پھر تو آپ ہی بتلائیے کہ شہید کون کون ہیں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جو اللہ کے راستہ میں قتل کیا جائے؛ وہ شہید ہے۔ اور جو

اللہ کے راستہ میں انتقال کر جائے (یعنی دشمن کے ہاتھوں قتل ہونے کی نوبت نہیں آئی، جہاد کے لئے ہی نکلا تھا، لیکن جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی اور راستہ میں انتقال ہو گیا، یا کسی اور دینی کام کے لئے، جیسے: تعلیم کے لئے، تبلیغ کے لئے، حج کے لئے، عمرہ کے لئے نکلا تھا اور انتقال ہو گیا) تو وہ بھی شہید ہے۔ اور جس کا انتقال طاعون کی بیماری میں ہو جائے؛ وہ بھی شہید ہے۔ اور جس کا انتقال پیٹ کی بیماری میں ہو جائے؛ وہ بھی شہید ہے۔ اور جو آدمی پانی میں ڈوب کر انتقال کر جائے؛ وہ بھی شہید ہے۔

جو مال کی حفاظت میں قتل کر دیا جائے

حدیث ۱۳۵۵:-

وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنے مال کی حفاظت میں قتل کر دیا جائے؛ وہ شہید ہے۔

افادات:- جیسے کسی کے گھر میں چور چوری کرنے کے لئے گھسا، یا کوئی لٹیرا مال لوٹنے آیا، یا کوئی آدمی کسی کے پاس ناحق طریقہ سے مال لینے آیا، اور مال والا اپنے مال کی حفاظت کی خاطر اس کے مقابلہ کے لیے سینہ سپر ہو گیا اور ڈٹ گیا، اسی مقابلہ میں اس نے مارا اور مال

والے کا انتقال ہو گیا؛ تو وہ شہید ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ فسادات کے زمانہ میں کسی کی دوکان پر حملہ ہوا،اوروہ اگر اس کے جواب میں ڈٹ جائے اور مقابلہ کرے،اسی میں اگر موت واقع جائے تو اس کو شہید کا درجہ ملے گا۔

کچھ اور شہید بھی

حدیث ۱۳۵۶:-

وعن أَبي الأَعْوَر سعيد بن زيد بن عَمْرو بن نُفَيْل، أحَدِ العَشَرَةِ المَشْهُودِ لَهُمْ بِالْجَنَّةِ - رضی الله عنهم - قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول: ((مَنْ قُتِلَ دُونَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دَمِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ دِينهِ فَهُوَ شَهِيدٌ، وَمَنْ قُتِلَ دُونَ أهْلِهِ فَهُوَ شَهِيدٌ)) (رواه أبو داود والترمذي ، وقال : حديث حسن صحيح)

ترجمہ:-حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ جو ان دس لوگوں میں سے ہیں جن کے متعلق نبی کریم ﷺ نے جنت کی بشارت سنائی ہے(یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی بھی ہوتے ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ:جو آدمی اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا؛ وہ شہید ہے۔جو اپنی جان کی حفاظت میں مارا گیا؛ وہ بھی شہید ہے۔جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے مارا گیا؛ وہ بھی شہید ہے۔اور جو آدمی اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لئے مارا گیا؛ وہ بھی شہید ہے۔

افادات:-"دین کی حفاظت" مثلاً: مسجد کے اوپر حملہ ہوا، تو مسجد کی حفاظت دین کا معاملہ ہے، یا قرآن کی بے حرمتی ہو رہی تھی اس موقع پر ڈٹ گیا اور مقابلہ میں مارا گیا؛ تو وہ بھی شہید ہے۔

"اپنے گھر والوں کی حفاظت" مثلاً: اس کے بال بچوں اور گھر والوں پر حملہ ہوا اور وہ ان کی حفاظت کے لئے مقابلہ میں ڈٹ گیا، اور اسی میں اس کی موت واقع ہو گئی؛ تو وہ بھی شہید ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ میدانِ جہاد میں کفار کے مقابلہ میں جو مارا جائے صرف وہی شہید نہیں، بلکہ یہ سارے بھی شہداء میں شامل ہیں۔

حدیث ۱۳۵۷:-

وعن أبي هريرة -رضى الله عنه- قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رسول الله ﷺ فَقَالَ: يَا رسولَ اللهِ، أرَأيتَ إنْ جَاءَ رجلٌ يُرِيدُ أخْذَ مَالِي؟ قَالَ: ((فَلاَ تُعْطِهِ مَالَكَ)) قَالَ: أَرَأَيْتَ إنْ قَاتَلَنِي؟ قَالَ: ((قَاتِلْهُ)) قَالَ: أرَأَيْتَ إنْ قَتَلَنِي؟ قَالَ: ((فَأَنْتَ شَهِيدٌ)) قَالَ: أَرَأَيْتَ إنْ قَتَلْتُهُ؟ قَالَ: ((هُوَ فِي النَّارِ))

رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے آکر نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بتلایئے کہ اگر کوئی آدمی آکر میرا مال ناحق چھیننا چاہے؛ تو میں کیا کروں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کو مت دو۔ اس نے پوچھا: اگر میرے نہ دینے پر وہ مجھ سے لڑے؛ تو؟

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: تم بھی اس کا مقابلہ کرو۔ اس پر اس نے پوچھا: اس مقابلہ میں اگر وہ مجھے مار دے اور میری جان چلی جائے تو؟ حضور ﷺ نے فرمایا: تو تم شہید ہو۔ اس نے پوچھا: اگر میں اس کو مار دوں تو؟ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: وہ جہنم میں جائے گا۔

باب فضل العتق

غلام کو آزاد کرنے کی فضیلت

قال اللہ تعالیٰ: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ.وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَة.فَكُّ رَقَبَةٍ.

ہم اس سے دھوکہ کھائیں گے

اُس زمانہ میں آپس میں جو جنگیں ہوتی تھیں اور ایک دوسرے کے جو قیدی پکڑے جاتے تھے ان کو غلام بنایا جاتا تھا، اسی لیے اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کی بڑی فضیلت بتلائی ہے۔ قرآن اور احادیث میں اس کے بہت سارے فضائل آئے ہیں ۔ چناں چہ اسی کا نتیجہ تھا کہ حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کثرت سے غلاموں کو آزاد کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے تیس ہزار غلام آزاد کئے تھے، اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی بے شمار غلاموں کا آزاد کرنا ثابت ہے؛ بلکہ کسی غلام کو نماز پڑھتا ہوا دیکھتے تو اس کو آزاد کر دیتے تھے، جب غلاموں نے دیکھا کہ یہ تو اس طرح آزاد کر دیتے

ہیں، توانہوں نے بھی ان کے سامنے ان کو دکھلانے کے لئے نمازیں پڑھناشروع کردیں۔ لوگوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا: حضرت! یہ لوگ آپ کو دھوکہ دیتے ہیں، آپ کے سامنے اس طرح نمازیں پڑھتے ہیں تاکہ آپ ان کو آزاد کردیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے جواب میں فرمایا: جو اللہ کی خاطر ہمیں دھوکہ دے گا؛ تو ہم اس سے دھوکہ کھاجائیں گے۔

دشوار گزار گھاٹی

قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:﴿فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ﴾ کیوں نہ داخل ہوا وہ گھاٹی میں ؟ (پہاڑ کے اندر چلنے کے لیے جو دشوار گزار راستہ ہوتا ہے اس کو عربی میں ''عَقَبَةٌ'' اوراُردو میں گھاٹی کہتے ہیں) ایسے راستہ پر کیوں نہ چلا؟ اورایسے راستہ پر ہر آدمی چل نہیں پاتا۔اوریہاں آخرت کے اعتبار سے گھاٹی والا راستہ بتلایا ہے ﴿وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ﴾ اور آپ کو معلوم ہے کہ یہ دشوار گزار گھاٹی اور پہاڑی راستہ کیا ہے؟ اس سے مراد ظاہری اعتبار سے چلنے والا راستہ نہیں ہے، بلکہ آگے جو اعمال بتلائے ہیں وہ مراد ہیں، ان میں پہلا عمل ﴿فَكُّ رَقَبَةٍ﴾ غلام کو آزاد کرنا ہے ﴿أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ﴾ یا پھر فاقہ

والے دن غریب رشتہ داروں کو کھلانا ہے۔ چوں کہ ہر آدمی یہ اعمال نہیں کرپاتا کہ اس میں مال اورپیسے خرچ ہوتے ہیں ، اس لئے لوگوں کے لئے اس کے اوپر عمل کرنا دشوار ہوتاہے، اسی لئے قرآنِ پاک نے اس کو پہاڑکے دشوار گزار راستہ سے تعبیر کیا ہے۔

جہنم سے خلاصی کا پروانہ

حدیث ۱۳۵۸ :-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ : قَالَ لی رسول اللهﷺ: ((مَنْ أَعْتَقَ رَقَبَةً مُسْلِمَةً أَعْتَقَ اللهُ بِكُلِّ عُضْوٍ مِنْهُ، عُضْواً مِنْهُ فِی النَّارِ، حَتَّى فَرْجَهُ بِفَرْجِهِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اس غلام کے ہر عضو کے بدلہ میں اس آزاد کرنے والے کے ہر عضو کو جہنم سے آزادی عطا فرمائے گا؛ یہاں تک کہ اُس کی شرم گاہ کے بدلہ میں اِس کی شرم گاہ کو بھی جہنم سے آزادی عطا فرمائے گا۔ (ایک غلام آزاد کرنے پر کتنی بڑی فضیلت ہے، گویا جہنم سے آزادی اور خلاصی کا پروانہ مل گیا)۔

کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟

حدیث ۱۳۵۹ :-

وعن أبي ذرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ:قُلْتُ:يَا رسول الله!أيُّ الأعْمَالِ أفْضَلُ؟ قَالَ : الإيْمَانُ بِاللهِ، وَالجِهَادُ فی سَبيلِ اللهِ قَالَ: قُلْتُ: أيُّ الرِّقَابِ أفْضَلُ؟ قَالَ: أنْفَسُهَا عِنْدَ أهْلِهَا، وَأكْثَرُهَا ثَمَناً. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أبوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون سا عمل سب سے بہتر ہے (یعنی کس عمل میں ثواب زیادہ ہے؟) نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔ پھر میں نے پوچھا: کون سا غلام آزاد کرنا افضل ہے؟ فرمایا: جو مالک کے نزدیک سب سے عمدہ اور زیادہ قیمتی ہو (یعنی مالک کی نگاہ میں جس کی قدر و قیمت سب سے زیادہ ہو)۔

افادات:- ویسے قرآنِ پاک میں بھی ارشاد ہے: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ تم اس وقت تک ہرگز حقیقی نیکی حاصل نہیں کر پاؤ گے جب تک کہ اللہ کے راستہ میں اس چیز کو خرچ نہ کرو جو تمہیں سب سے زیادہ محبوب ہو۔ اس روایت میں بھی یہی فرمایا گیا کہ جو غلام تمہارے نزدیک (Top) اور محبوب ہو اور جو زیادہ قیمتی بھی ہو اس کو آزاد کرنا افضل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو زیادہ قیمتی ہوتا ہے وہی عام طور پر مالک کی نگاہوں میں زیادہ پسندیدہ اور نفیس سمجھا جاتا ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جتنا زیادہ قیمتی غلام آزاد کیا جائے گا اتنا ثواب زیادہ ملے گا۔

باب فضل الإحسان إلى المملوك

غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی فضیلت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ .(النسآء:۳۶)

باب کا عنوان

باب کا عنوان قائم کیا ہے: غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی فضیلت۔

پہلے زمانہ میں آپسی جنگوں میں جو قیدی پکڑے جاتے تھے ان کو غلام بنایا جاتا تھا، اور پچھلے باب میں بتلا دیا تھا کہ اسلام میں غلاموں کو آزاد کرنے کی بڑی فضیلت ہے، اور اُسی فضیلت کو حاصل کرنے کے لئے حضراتِ صحابہ؅ کثرت سے غلاموں کو آزاد

کرتے تھے، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تیس ہزار غلاموں کو آزاد کرنا بتلایا گیاہے۔ تو جس غلام کا آقا پورا مالک ہے اس کے ساتھ بھی اسلام نے اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی یہ آیت پیش کی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو، رشتہ داروں ، یتیموں ، مسکینوں کے ساتھ، اور وہ پڑوسی جو رشتہ دار ہیں، یا دور کا پڑوسی یعنی جو رشتہ دار نہیں ہیں ، یا تھوڑی دیر کے لئے جو آپ کے پاس (سفر میں، ٹرین میں ، بس میں یا کسی مجلس میں) بیٹھے (جیسے ابھی اس مجلس میں سب ایک گھنٹہ کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں تو یہ سب بھی ساتھی ہیں) اور مسافر کے ساتھ بھی بھلائی کا سلوک کرو﴿وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ اور جن کے آپ مالک ہیں ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔

رنگ ونسل کی بنیاد پر عار دلانا

حدیث ۱۳۶۰:-

وعنِ المَعْرُورِ بن سُوَيْدٍ، قَالَ : رَأيْتُ أبَا ذَرٍّ - رضى الله عنه -، وَعَلَيهِ حُلَّةٌ وَعَلَى غُلاَمِهِ مِثْلُهَا، فَسَألْتُهُ عَنْ ذَلِكَ، فَذَكَرَ أنَّهُ قَدْ سَابَّ رَجُلاً عَلَى عَهْدِ رسول الله ﷺ، فَعَيَّرَهُ بِأُمِّهِ، فَقَالَ النبيُّ ﷺ : ((إنَّكَ امْرُؤٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ. هُمْ إخْوَانُكُمْ وَخَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ الله تَحْتَ أيدِيكُمْ ، فَمَنْ كَانَ أخُوهُ تَحْتَ يَدِهِ، فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَأكُلُ، وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلاَ تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ ، فَإنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَأَعِينُوهُمْ)) (متفقٌ عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت معرور بن سوید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ (جو جلیل القدر صحابی ہیں ان) کو دیکھا کہ ان کے جسم پر ایک جوڑا (سوٹ) تھا، ان کے غلام کے جسم پر بھی اسی جیسا جوڑا (سوٹ) تھا، اس سلسلہ میں مَیں نے ان سے پوچھا: (کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے بتلایا: نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ میں ایک مرتبہ ان کا ایک آدمی کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا (آپس میں تو تو میں میں اور کچھ بولا چالی ہوگئی تھی) تو اس کو اس کی ماں کا نام لے کر عار دلائی تھی، اس پر حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تم ایک ایسے آدمی ہو کہ تمہارے اندر جاہلیت کی خو بُو اور خصلت موجود ہے۔ یہ انسان ہونے کے ناطے تمہارے بھائی ہیں (اگر ابھی تمہارے خادم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی حکمت کی بنیاد پر) ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ لہٰذا جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو (دیکھئے! غلام کو بھائی سے تعبیر کیا) تو اس کو چاہیے کہ خود جو کھاتا ہے اسی میں سے اس کو بھی کھلائے، اور

خود جو پہنتا ہے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے۔اور ان غلاموں کو ایسے کام نہ سونپو جو ان پر غالب آجائیں (یعنی جس کے انجام دینے میں ان کو تکلیف اور مشقت ہو۔ اور اگر مشقت والا کوئی کام کبھی سونپ دیا ہو)تو تم بھی ان کو سپورٹ (Support)اور مدد کرو(ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ ان کو مشقت والا کام سونپ کر خود آرام سے بیٹھ جائیں)۔

افادات:-بدن کے اوپر والے حصہ پر اوڑھنے کے لیے جو چادر استعمال کی جاتی ہے وہ، اور نیچے لنگی و تہبند کے طور پر جو چادر استعمال کی جاتی ہے وہ دونوں ایک ہی طرح کی ہوں ؛تو اس کو عربی میں ’’حُلَّۃٌ‘‘ کہتے ہیں ، جس کو ہمارے یہاں سوٹ بولا جاتا ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی آیا ہے کہ ایک جوڑا اعلیٰ قسم کا تھا اور دوسرا جوڑا گھٹیا قسم کا تھا،دونوں میں کی ایک ایک چادر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے جسم پر تھی،اور دوسری ایک ایک اس غلام کو دے رکھی تھی۔ان کے اوپر بھی ایک چادر اعلیٰ تھی اور ایک چادر گھٹیا تھی، اور غلام کے اوپر بھی ایسا ہی تھا؛اس طرح دونوں یکساں ہو گئے تھے۔حضرت معرور رضی اللہ عنہ نے جب یہ منظر دیکھا کہ جیسا لباس خود انہوں نے پہن رکھا ہے ایسا ہی لباس اپنے غلام کو بھی پہنا رکھا ہے،حالاں کہ عام دستور ایسا کرنے کا نہیں تھا تو سوچا کہ شاید کوئی وجہ ہو گی جس کی وجہ سے انہوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے،لہٰذا پوچھ لیا کہ: آپ نے جس طرح کا جوڑا پہن رکھا ہے ایسا ہی جوڑا اپنے غلام کو بھی پہنا دیا ہے؛ کیا بات ہے؟ عمدہ والی چادر جو آپ نے

اپنے غلام کو دے رکھی ہے وہ آپ خود لے لیتے تا کہ اعلیٰ قسم کی چادر کا سوٹ آپ کے پاس مکمل ہو جاتا، اور گھٹیا والی چادر اس غلام کو دیدیتے، اور چوں کہ وہ غلام ہے، وہ اپنے درجے کے مطابق سوٹ استعمال کر لیتا؟ اس پر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اپنا قصہ سنایا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کا کچھ جھگڑا ہو گیا تھا، اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ چوں کہ سیاہ فام اور کالے تھے اس لیے انہوں نے حضرت بلال کو یہ کہہ دیا تھا: "یَاابْنَ السَّوْدَآءِ" "اے کالی عورت کے بیٹے" اور ظاہر ہے کہ رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی کو عار اور شرم دلانا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔

کرامت و شرافت کا معیار

اسلام تو ذاتی اوصاف کو دیکھتا ہے، اسلام میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کس کا تعلق کون سے خاندان سے ہے۔ اگر کوئی اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کی ذات میں کوئی کمال موجود نہیں ہے تو اس کی خاندانی شرافت اس کے کسی کام نہیں آئے گی، اور کوئی آدمی نچلے خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن جو اوصاف اور کمالات اللہ تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ اور مطلوب ہیں جیسے: علم و عمل، صلاح و تقویٰ، اخلاص اور دینداری وغیرہ؛ یہ

ساری چیزیں اس میں موجود ہیں ؛تو وہ آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں اونچا سمجھا جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے یہی اصول بتلادیا ہے:﴿إِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللهِ أَتْقٰكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے سب انسانوں کو ایک مرد اور عورت (یعنی حضرت آدم اور حضرت حواء علیہاالسلام سے) پیدا کیا ہے اور پھر ان میں قبیلے اور خاندان بنائے، اور یہ قبیلے و خاندان بڑائی اور فخر و غرور کے لئے نہیں ہیں بلکہ صرف آپس کی پہچان کے لئے ہیں ، باقی اس کی بنیاد پر کوئی اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگے؛ تو اس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ جس میں تقویٰ زیادہ ہو اور جتنا زیادہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور گناہوں سے اپنے کو بچائے؛ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا ہی زیادہ باعزت ہو گا۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں میں خاندان پر فخر و غرور کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی، اور اُنہیں بنیادوں پر آدمی خاندان یا رنگ و نسل کے اعتبار سے کم درجہ والے آدمی کے ساتھ تعلق رکھنے کو اپنے لئے عار اور شرم کی چیز سمجھتا تھا، اور موقع آنے پر اسی کی وجہ سے اس کو شرم و عار بھی دلائی جاتی تھی۔ اس آیت میں کرامت و شرافت کا معیار بتلادیا گیا کہ جو آدمی اپنے آپ کو گناہوں سے جتنا زیادہ بچائے گا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنا ہی زیادہ مکرم اور معزز ہے، چاہے اس کا خاندان جو بھی ہو۔

حضراتِ صحابہ کی خاص شان

خیر! یہاں بھی یہی ہوا تھا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی کسی بات میں تُوتُو مَیں مَیں ہوگئی تو ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا: ''یَاابْنَ السَّوْدَآءِ'' ''اے سیاہ فام عورت کے بیٹے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جاکر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے شکایت کردی کہ: اے اللہ کے رسول! ان کے ساتھ میرا یہ معاملہ ہوا تو انہوں نے مجھے یہ کہہ کر عار دلائی (گویا ماں کی گالی دی) توچوں کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ پہلے غلام بھی رہ چکے تھے، اور جو آدمی پہلے غلام رہ چکا ہو اس کو بھی اس کے حق میں عار کی چیز سمجھا جاتا تھا اس لیے حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے فرمایا: تم ایک ایسے آدمی ہو کہ تمہارے اندر جاہلیت کی خوبُو اور خصلت موجود ہے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جب یہ ارشاد فرمایا تو مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس بڑھاپے میں جبکہ میری عمر اتنی زیادہ ہوگئی ہے، پھر بھی ابھی تک میرے اندر یہ بات موجود ہے؟ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جی ہاں، اب بھی موجود ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ یہ سن کر حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فوراً وہیں لیٹ گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا: میرے گال پر

پاؤں رکھو، اور جب تک حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ان کے رخسار پر پاؤں نہیں رکھے وہاں تک انہوں نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نہیں چھوڑا۔

دیکھئے! حضراتِ صحابہ کی کیسی خوش نصیبی ہے کہ اگر کسی بات پر ان کو ذراسی تنبیہ کر دی جاتی تو فوراً اس کو پلے باندھ لیتے اور اس پر عمل کے لئے آمادہ ہو جاتے۔ تمام حضراتِ صحابہ کی یہی خاص شان تھی کہ اگر ان کو کوئی نصیحت کر دی جاتی تو اس کو ایسا مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیتے تھے کہ کبھی اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسا کہ اگر کسی کو فرمادیا: ''لَاتَسْئَلْ'' کسی سے سوال مت کریو؛ تو پھر ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اپنا کوڑا بھی گر جاتا تو کسی سے مانگنا گوارہ نہیں کرتے تھے، سواری سے خود اترتے اور لے لیتے جو لوگ وہاں موجود ہوتے وہ کہتے کہ ہمیں کہہ دیا ہوتا تو ہم دیدیتے، تو اس پر فرماتے: ایسا نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ کسی سے مانگنا مت، اور یہ بھی مانگنے کی ایک شکل بن جاتی ہے۔

روایت کا سبق

اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے ایک تعلیم ارشاد فرمائی کہ کوئی آدمی پہلے کسی زمانہ میں غلام رہا ہو تو کیا ہوا، انسان ہونے کے ناطے تو وہ تمہارا بھائی ہی ہے، جیسے تم انسان ہو؛ وہ بھی انسان ہے۔ اب اگر اس وقت یہ تمہارے خادم ہیں تو اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی حکمت کی بنیاد پر ان کو تمہارے ماتحت کر دیا ہے، اور تمہارے ہاتھ میں ان کی باگ ڈور دیدی ہے، ورنہ جیسے تم انسان ہو، ایسے ہی یہ بھی انسان ہیں، جیسے تمہاری دو آنکھیں ہیں ان کی دو آنکھیں ہیں، جیسے تمہارے دو کان ہیں ان کے بھی دو کان ہیں، جیسا تمہارا چہرہ مہرہ ہے، ایسا ہی ان کا بھی ہے، ان سب چیزوں میں تم میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہاں! اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں جن کی بنیاد پر کسی زمانہ میں وہ کافر تھے، پھر گرفتار ہوئے تو بطورِ سزا غلامی کا طوق ان پر ڈال دیا گیا۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ غلام ہونے کی وجہ سے کوئی آدمی انسانیت سے نکل نہیں جاتا، جو انسانی شرف اور رتبہ تمہیں حاصل ہے، وہی شرف و رتبہ ان کو بھی حاصل ہے، اس لئے ان کو گھٹیا مت سمجھو اور اس کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی بھی غیر انسانی سلوک مت کرو۔ لہٰذا جس کے ماتحت اس کا بھائی ہو اس کو چاہیے کہ خود جو کھائے اسی میں

سے اس کو بھی کھلائے اور خود جو پہنے اسی میں سے اس کو بھی پہنائے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی نصیحت کی بناء پر میں نے جو پہنا اس کو بھی پہنایا، اور جیسا خود کھاتا ہوں ویسا ہی اپنے غلام کو بھی کھلاتا ہوں۔

اس پوری روایت میں نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید فرمائی ہے، کھانے پہننے کے معاملہ میں بھی اور دیگر کاموں کے معاملہ میں بھی ان کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرو، ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام نہ لو، اور اگر مشقت والا کوئی کام ان کو دیا ہو تو ساتھ میں تم بھی ان کی مدد کرو، اور ان کا اکرام بھی ہونا چاہیے، ان کے ساتھ کسی قسم کی بے عزتی کا معاملہ نہیں کرنا چاہیے۔

مروت کی تعلیم

حدیث ۱۳۶۱:-

وعن أَبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا أَتَى أَحَدَكُمْ خَادِمُهُ بِطَعَامِهِ، فَإِنْ لَمْ يُجْلِسْهُ مَعَهُ، فَلْيُنَاوِلْهُ لُقْمَةً أَوْ لُقْمَتَيْنِ أَوْ أُكْلَةً أَوْ أُكْلَتَيْنِ؛ فَإِنَّهُ وَلِيَ عِلاَجَهُ.)) (۱) (رواه البخاری)

((الأُكْلَةُ)) بضم الهمزة: وَهِيَ اللُّقْمَةُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کسی کا خادم کھانا بنا کر تیار کر کے لائے (اور پیش کرے) تو (اگر آقا اور سیٹھ اپنے ساتھ نہ بٹھائے تو کم سے کم) ایک دو لقمہ اس کے ہاتھ میں دیدے، اس لیے کہ اس کھانے کو تیار کرنے کی ساری ذمہ داری اس نے اُٹھائی ہے۔

افادات:- لفظِ خادم میں غلام اور ملازم دونوں آجاتے ہیں ۔ غلام کا تو آقا باقاعدہ مالک ہوتا ہے؛ اس کو بھی خادم کہا جاتا ہے، اور جو غلام نہیں ہے بلکہ کسی کا صرف ملازم ہے اور اجرت پر کام کرتا ہے؛ وہ بھی خادم کہلاتا ہے۔

اب اگر خادم کو اپنے ساتھ بٹھالے تو بہت ہی اچھا ہے، لیکن اگر کھانا اتنا نہیں ہے جو دونوں کو کافی ہو جائے، یا طبیعت اس کو اپنے ساتھ بٹھانے کے لئے آمادہ نہیں ہے تو کم سے کم ایک دو لقمے اس کو دیدو، اس لئے کہ یہ کھانا اس نے تیار کیا ہے، اور شروع سے لے کر آخر تک کھانے کی تیاری میں اسی نے محنت کی ہے، اس لیے اس کا جی بھی

(١) قال النووي في شرح صحيح مسلم: في هذا الحديث "الحث على مكارم الأخلاق، والمواساة في الطعام، لا سيما في حق من صنعه أو حمله ؛ لأنه ولي حره ودخانه ، وتعلقت به نفسه ، وشم رائحته ، وهذا كله محمول على الاستحباب.

اس میں اٹکا ہوا رہتا ہے، اب جس نے پورا کھانا تیار کیا ہو اگر اس کو آپ ایک لقمہ بھی نہ دیں اور سارا اکیلے خود ہی ہڑپ کر جائیں ؛تو یہ بڑی بے مروتی کی بات ہے، اور اس میں کیا خیر و برکت ہو سکتی ہے؟ اس لئے حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ: اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ بٹھا کر کھلایا جائے، اور اگر تم سے یہ نہیں ہو سکتا ہے تو کم سے کم ایک دو لقمے تو اس کے ہاتھ میں دے ہی دو کہ لو بھائی! تم بھی کھالو۔ جب وہ اتنا بھی کھالے گا تو اس کا جی جو اس کھانے میں اٹکا ہوا تھا وہ چھوٹ جائے گا، تب ہی آپ کے کھانے میں برکت بھی ہو گی، ورنہ برکت نہیں ہو گی۔

باب فضل المملوك الذی یؤدی حق الله وحق موالیه

اللہ تعالیٰ اور اپنے آقا کا حق ادا کرنے والے غلام کی فضیلت

ترجمۃ الباب

اس باب میں اس غلام کی فضیلت بیان فرمانا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتا ہے، اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر انسان پر اللہ تعالیٰ کے بھی حقوق ہیں اور اگر وہ کسی کا ماتحت اور غلام ہے تو اس آقا کے بھی حقوق ہیں ، اور ایک غلام کے لئے اپنے آقا کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حقوق کی ادائیگی اور دونوں کو نبھانا ذرا دشوار کام ہوتا ہے، گویا اس کے حالات سازگار نہیں ہوتے، ہو سکتا ہے کہ آقا کی طرف سے کام کا اتنا بوجھ ڈال دیا جائے کہ اس کے لیے اس بوجھ کے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھنا اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے حقوق کو ادا کرنا مشقت کا باعث ہو جائے، لیکن پھر بھی اگر وہ ان ساری تکالیف اور

مشقتوں کو برداشت کر کے اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتا ہے اور اپنے آقا کا حق بھی ادا کرتا ہے؛ تو اس کے لئے بڑی فضیلت ہے۔ اس باب میں اسی کو بتلاتے ہیں ۔

ایسے غلام کو دوہرا (ڈبل) ثواب ملے گا

حدیث ۱۳۶۲ :-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما : أَنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ : ((إِنَّ العَبْدَ إِذَا نَصَحَ لِسَيِّدِهِ، وَأَحْسَنَ عِبَادَةَ اللهِ، فَلَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ)) متفقٌ عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: غلام جب اپنے آقا کی خیر خواہی کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی اچھی طرح کرتا ہے؛ تو اس کو دوہرا (ڈبل) ثواب ملے گا۔

افادات:- گویا اس کے لیے رکاوٹیں تھیں ، ان رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود اپنی ڈیوٹی پوری ادا کرتا ہے، جو ذمہ داریاں اور کام آقا کی طرف سے اس کو سونپے گئے ہیں ان میں خیانت سے کام نہیں لیتا، بلکہ آقا کی پوری خیر خواہی کرتے ہوئے اور اس کی بھلائی چاہتے ہوئے ان کاموں کو صحیح طریقے سے انجام دیتا ہے؛ ایسا شخص دوہرے ثواب کا مستحق ہے۔

تو میں غلامی کی موت کو ترجیح دیتا

حدیث ۱۳۶۳:-

وعن أَبِي هريرة - رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((لِلْعَبْدِ الْمَمْلُوكِ الْمُصْلِحِ أَجْرَانِ)) وَالَّذِي نَفْسُ أَبِي هُرَيْرَةَ بِيَدِهِ! لَوْلَا الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَالْحَجُّ، وَبِرُّ أُمِّي؛ لَأَحْبَبْتُ أَنْ أَمُوتَ وَأَنَا مَمْلُوكٌ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: وہ غلام جو اپنے آقا کے کاموں کو خیر خواہی سے انجام دیتا ہے؛ اس کے لیے ڈبل اجر و ثواب ہے۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی تمنا کا اظہار فرماتے ہیں کہ: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں ابوہریرہ کی جان ہے! اگر اللہ کے راستہ میں جہاد، حج، اور میری ماں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کی خدمت کی ذمہ داریاں نہ ہوتیں؛ تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ غلامی کی حالت میں مروں۔

افادات:- آقا کی طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے غلام جہاد میں شریک نہیں ہو سکتا، آقا کی اجازت کے بغیر غلام حج بھی نہیں کر سکتا، اور ماں کی خدمت وہ کیسے انجام دے سکتا ہے جبکہ وہ تو آقا کا غلام ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ سارے کام نہ ہوتے تو میری یہ تمنا تھی کہ غلامی کی زندگی گزاروں۔

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ غلام یا نوکر قصداً آقا کو نقصان پہنچانے اور اس کے کام کو بگاڑنے کی کوشش اس انداز سے کرتا ہے کہ آقا کو پتہ نہ چلے، لیکن جو غلام ایسا نہیں کرتا، بلکہ دل سے آقا کے کاموں کو ٹھیک کرنے کی پوری خیر خواہی کے ساتھ کوشش کرتا ہے؛ تو اس کو دوہرا (ڈبل) ثواب ملتا ہے۔ گویا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ڈبل ثواب حاصل کرنے کی طمع اور لالچ میں غلام ہونے کی تمنا کر رہے ہیں، حالاں کہ غلامی تو آدمی کے لئے بری چیز سمجھی جاتی ہے۔

ڈبل ثواب پانے والے

حدیث ۱۳۶۴:-

عن أبي موسى الأشعري رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((المَمْلُوكُ الَّذِي يُحْسِنُ عِبَادَةَ رَبِّهِ، وَيُؤَدِّي إِلَى سَيِّدِهِ الَّذِي عَلَيْهِ مِنَ الحَقِّ، وَالنَّصِيحَةِ، وَالطَّاعَةِ، لَهُ أَجْرَانِ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: وہ غلام جو اپنے پرودگار کی عبادت بھی اچھے طریقے سے کرتا ہے، اور آقا کی خیر خواہی کرتے ہوئے اس کا حق بھی ادا کرتا ہے اور پوری فرمانبر داری کرتا ہے؛ تو اس کو ڈبل ثواب ملے گا۔

حدیث ۱۳۶۵ :-

وعنه، قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((ثَلاثَةٌ لَهُمْ أجْرَانِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِمُحَمَّدٍ. وَالعَبْدُ المَمْلُوكُ إِذَا أدَّى حَقَّ اللهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ. وَرَجُلٌ كَانَتْ لَهُ أَمَةٌ فَأَدَّبَهَا فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا وَعَلَّمَهَا فَأَحْسَنَ تَعْلِيمَهَا، ثُمَّ أَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا؛ فَلَهُ أَجْرَانِ)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں جن کو ڈبل ثواب ملے گا، ایک تو اہلِ کتاب کا وہ آدمی جو اپنے نبی پر ایمان لایا (اگر حضرت موسیٰ پر ایمان لایا تھا یعنی یہودی تھا۔ اور اگر حضرت عیسیٰ پر ایمان لایا تھا یعنی نصرانی تھا، اس کے بعد اسلام قبول کیا) اور حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر بھی ایمان لے آیا (تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا) دوسرا وہ غلام جو اللہ تعالیٰ کا حق بھی ادا کرتا ہو اور اپنے آقاؤں کا حق بھی ادا کرتا ہو۔ اور تیسرا وہ آدمی جس کے پاس کوئی باندی ہو، پھر اس کو ادب سکھلائے اور اچھا ادب سکھلائے اس کو تعلیم دے اور بڑی اچھی تعلیم دے، پھر اس کو آزاد کردے، اس کے بعد اس کے ساتھ نکاح کرلے؛ تو اس کو بھی دوہرا (ڈبل) اجر و ثواب ملے گا۔

افادات:- ظاہر ہے کہ کوئی آدمی جب ڈبل کام کرے گا تو اس کو ثواب بھی ڈبل ملے گا۔

جیسی محنت؛ ویسی برکت

یہاں علماء نے کچھ بحثیں کی ہیں جن کی بڑی تفصیلات ہیں ، علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی اچھی بات کہی ہے جو مَیں اوپر بتلا چکا ہوں کہ دراصل کوئی آدمی ایک کام ایسے مواقع میں انجام دیتا ہے جبکہ اسباب اور حالات اس کے خلاف ہوں ، حالات کے خلاف ہونے کے باوجود وہ اپنی ڈیوٹی برابر انجام دیتا ہے، تو ظاہر ہے اس میں اس کو مجاہدہ اور مشقت زیادہ لاحق ہوگی، تکلیف زیادہ اٹھانی پڑے گی؛ اس لیے اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب بھی زیادہ ملے گا ، جیسا کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو آدمی قرآنِ کریم کی تلاوت پوری مہارت کے ساتھ کرتا ہے؛ وہ تو ان مکرم فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے پیغام اور وحی لانے والے ہیں ۔ اور جو آدمی قرآنِ کریم کی تلاوت اس طرح کرتا ہے کہ اس کی زبان اٹکتی ہے اور پڑھنا اس کو دشوار ہوتا ہے، پھر بھی پڑھتا رہتا ہے؛ تو چوں کہ اس کو پڑھنے میں مشقت لاحق ہوتی ہے اس لیے اس کو ثواب بھی دوہرا ملتا ہے۔

اسی طرح یہاں پر بھی تین قسم کے جو لوگ ہیں ان کو مشقت زیادہ لاحق ہوتی ہے، پہلا تو غلام ؛ کہ اس کو آقا کے حقوق کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے حقوق نبھانا بڑا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے کہ کبھی حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ آقا کی طرف سے کچھ ایسی

فرمائشیں ہوتی ہیں کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنا مشکل ہو جاتا ہے، پھر بھی ان مشقتوں کو برداشت کرتے ہوئے وہ غلام دونوں کے حقوق ادا کرتا ہے؛ تو ظاہر ہے کہ اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔

اسی طریقہ سے اہلِ کتاب کا حال ہے کہ وہ حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر پہلے سے ایمان رکھتا ہے، اوران کی صداقت کا اعلان حضور اکرم ﷺ بھی فرمارہے ہیں، قرآنِ کریم میں بھی ان کا نبی بر حق ہونا بتلایا گیا ہے اوران پر ایمان لانے کو ایمان کا جزو قرار دیا گیا ہے، اس کے باوجود وہ حضور اکرم ﷺ کے اوپر ایمان لائے، حالاں کہ یہاں اس کے لئے اسباب ایسے تھے کہ نفس رکاوٹ بنتا اور یہ سمجھاتا کہ جب تم ان پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں حضور اکرم ﷺ پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی لئے تو یہود و نصاریٰ اپنے دین کو لئے بیٹھے رہے اور ایمان نہیں لائے۔ تو کسی آسمانی دین کو ماننے والے کے لیے نفس رکاوٹ بن سکتا تھا پھر بھی اگر وہ مجاہدہ کرکے حضور اکرم ﷺ پر ایمان لائے؛ تو ایسے آدمی کے لئے دوہرا (ڈبل) ثواب رکھا گیا ہے۔

اور جس باندی کی تعلیم و تربیت کی جائے وہ بڑی قیمتی بن جاتی ہے، پہلے اس کی جو قیمت ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں اس کی قیمت کئی گنا بڑھ جاتی ہے، اس لیے اس کو فروخت کرکے آقا بہت زیادہ فائدہ اُٹھا سکتا تھا، اس کے باوجود تعلیم و تربیت شدہ باندی کو آزاد

کر دیتا ہے، پھر اس کے ساتھ نکاح کرلیتا ہے، حالاں کہ جب وہ باندی تھی اس حالت میں بھی اس کو استعمال کر سکتا تھا، اور اس صورت میں اس کا کوئی حق بھی اِس پر لاگو نہ ہوتا، لیکن اس کو آزاد کر کے پہلے تو گویا اس کو اپنے برابر کا درجہ دیا، پھر اس کے ساتھ نکاح کر لیا؛ تو یہ بھی بڑی مشقت کا کام تھا اس لیے اس پر دوہرا ثواب ملے گا۔

باب فضل العبادۃ فی الھرج وھو الاختلاط والفتن ونحوھا

فتنوں اور حالات کے زمانہ میں عبادت کرنے کی فضیلت

ناموافق حالات میں معمولات کا اہتمام

فضائل کا سلسلہ چل رہا تھا، اسی ذیل میں آج عنوان قائم کیا ہے کہ: ’’حالات کے ناہموار و نامناسب ہونے اور فتنہ کے زمانہ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی عبادت کرنے کی فضیلت۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’ہرج‘‘ کا ترجمہ ’’اختلاط‘‘ کیا ہے۔ اور علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ ’’ہرج‘‘ کا ترجمہ ’’گڑبڑ‘‘ کرتے ہیں۔ یعنی جب حالات گڑبڑ والے ہو جائیں اور نئے نئے فتنے نمودار ہوں تو چوں کہ آدمی اپنے ماحول کے تابع ہوتا ہے اس لیے حالات کی گڑبڑی اور فتنوں کی وجہ سے آدمی کی طبیعت میں جو یکسوئی رہنی چاہیے وہ باقی نہیں رہتی، حالات کا قدرتی نتیجہ ہوتا ہے کہ آدمی ٹینشن میں رہتا ہے، لیکن اگر کوئی آدمی حالات کے ناموافق اور ناہموار ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کے حقوق کی ادائیگی میں کسی طرح کی کوتاہی کا مرتکب نہیں ہوتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کا سلسلہ پہلے سے جو چلا آرہا ہے اس کو برابر باقی اور جاری رکھتا ہے؛ تو اس کی بڑی فضیلت ہے۔

جب حالات آدمی کے مزاج اور طبیعت کے موافق ہوں اس وقت اگر کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، تسبیح پڑھتا ہے، تلاوت کرتا ہے، عبادات کا اہتمام کرتا ہے تو اگرچہ یہ

بھی بہت بڑی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی ہے، لیکن ان حالات میں چوں کہ آدمی کی طبیعت اور مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں پائی جاتی، تو گویا اس نے کوئی بہت بڑا مجاہدہ اور مشقت کا کام نہیں کیا۔ لیکن جب بیرونی حالات طبیعت کے خلاف اور ناہموار ہوں، زمانہ میں فتنہ و فساد پھیلا ہوا ہو، آدمی کی طبیعت میں یکسوئی، سکون و اطمینان باقی نہ ہو، ایسی حالت میں کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے، اپنے معمولات کی بجا آوری کا اہتمام کرے، جماعت کے ساتھ نماز کی پابندی کرے، نوافل اور تلاوت کا اہتمام جیسے پہلے کرتا رہا ہے اس کو جاری رکھے، تسبیحات اور دعاؤں کا اہتمام کرے، مطلب یہ ہے کہ معمولات کا سلسلہ جو پہلے سے جاری تھا، حالات کی ناہمواری اور گڑبڑ کی وجہ سے اس میں کوئی خلل نہ پڑنے دے؛ تو یہ بھی بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ اسی کو اس باب میں بیان کرتے ہیں ۔

فتنوں کے زمانہ میں عبادت کی فضیلت

حدیث ۱۳۶۶:-

عن مَعْقِلِ بن يسار رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((العِبَادَةُ فِى الهَرْجِ كَهِجْرَةٍ إِلَىَّ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ :-حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حالات کے ناموافق ہونے، گڑبڑ اور فتنوں کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا ایسا ہے جیسا ہجرت کرکے میرے پاس حاضری دینا۔

افادات:-جب حضور اکرم ﷺ ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اس زمانہ میں مکہ کا رہنے والا کوئی آدمی اگر ایمان لاتا تو اس کے ایمان کی تکمیل اور قبولیت اس بات پر موقوف تھی کہ وہ بھی ہجرت کرکے حضورِ اکرم ﷺ کے پاس مدینہ منورہ حاضر ہو، صرف کلمہ پڑھ کر وہیں رہ جانا کافی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ تو جیسے اس زمانہ میں جو لوگ ایمان لانے کے بعد نبی ٔکریم ﷺ کی خدمت میں حاضری دیتے تھے، آپ کے پاس قیام و رہائش اختیار کرتے تھے، ظاہر ہے کہ وہ بڑی فضیلت کی چیز تھی، اسی طریقہ سے کوئی آدمی حالات کی گڑبڑی اور فتنہ کے زمانہ میں اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کا اہتمام کرتا ہے تو اس کو وہی ثواب ملے گا۔

علاج ہی ہم چھوڑ دیتے ہیں

ہمارے ملنے والے احباب جب اپنے حالات بتاتے ہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ معمولات ادا کرتے ہو؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں: دراصل میں حالات میں پھنس گیا ہوں،

اس لیے معمولات چھوٹ گئے۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ ان حالات کا علاج تو یہی معمولات ہیں، آپ نے ان کا جو علاج تھا وہی چھوڑ دیا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا کہ کسی کو کہا جائے کہ: بھائی! دوا کھالو، اور وہ کہے کہ مولوی صاحب! کیا کروں ؛ بیماری بہت سخت ہوگئی ہے اس لیے دوا چھوڑ دی۔ تو ان سے یہی کہا جائے گا کہ بیماری اگر سخت ہوگئی تو پھر دوا اور زیادہ اہتمام سے کھانی چاہیے۔ اسی طرح اگر آپ حالات کا شکار ہوگئے تو اس کا علاج یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت اور زیادہ ہو، اللہ تعالیٰ سے خوب مدد مانگی جائے، جب یہ حالات ہمارے اختیار کے ہیں ہی نہیں، ہم ان کا کوئی علاج کر ہی نہیں سکتے اور ان پر قابو بھی نہیں پاسکتے، ان کو قابو میں لانے والی ذات جب وہی ہے تو اب اسی کے سامنے روؤ اور رجوع کرو۔ لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ جو علاج ہے اسی کو ہم چھوڑ دیتے ہیں ، تو پھر ہمارے حالات اور زیادہ سنگین شکل اختیار کرلیتے ہیں ۔ اس لیے ہمارے دوست واحباب جب ایسی باتیں کرتے ہیں کہ مجھ پر حالات آ گئے ، کاروبار ٹھپ ہوگیا، گھر والے اور بچے سخت بیمار ہوگئے؛ تو میں ان سے کہا کرتا ہوں کہ آپ پر حالات آئے تو معمولات اور زیادہ کرو، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری زیادہ کرو، جب اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغولی اختیار کروگے اور دعائیں کرو گے؛ تو یہ سب حالات اللہ تعالیٰ ہی دور کرے گا۔ لیکن جو اصل تھا وہ تو آپ نے چھوڑ دیا، اور دنیوی تدبیریں جن سے کچھ ہوتا نہیں ہے، وہ بھی آپ سے پوری نہیں ہو پارہی ہیں ۔

یہی استقامت ہے

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ حالات کے اندر معمولات ادا کرنے کی مخصوص فضیلت ہے۔ چوں کہ ایسے حالات میں آدمی اپنی طبیعت میں ایک قسم کی بے چینی محسوس کرتا ہے جس کی وجہ سے بعض مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ بیٹھتا ہے، جیسا کہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے، اس لیے اس کی فضیلت بتلانے کے لیے خاص یہ باب قائم کیا اور اس میں بتلایا گیا کہ ایسے حالات میں اگر آپ عبادات کا اہتمام کرتے ہیں، جیسے: جماعت کے ساتھ نمازوں کا، ذکر و تلاوت، تسبیحات اور گناہوں سے بچنا وغیرہ؛ اس باب میں ذرّہ برابر کوتاہی ارتکاب نہیں کرتے؛ تو یہی چیز آپ کے دین پر مضبوطی سے جمے رہنے کی علامت ہے اور یہی استقامت کہلاتی ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ حالات آگئے تو نا امید ہو کر گھر میں بیٹھ گئے، اب مسجد میں بھی حاضری نہیں دیتے، نماز بھی نہیں پڑھتے، تلاوت بھی نہیں ہوتی، ایسے ہی پڑے ہوئے ہیں، یہ طرزِ عمل تو حالات کو اور زیادہ خطرناک بنانے والا ہے۔

باب فضل السماحة فی البیع والشراء والأخذ والعطاء، وحسن القضاء والتقاضی وإرجاح المکیال والمیزان والنهی عن التطفیف وفضل إنظار الموسر المُعسِرَ والوضع عَنْهُ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللهُ تَعَالَی: وَمَا تَفۡعَلُوا مِنۡ خَیۡرٍ فَإِنَّ اللهَ بِهِ عَلِیۡمٌ. (البقرة:۲۱۵)

وقال تَعَالَی: وَیَا قَوۡمِ أَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیزَانَ بِالۡقِسۡطِ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ أَشۡیَاءهُم. (هود:۸۵)

وقال تَعَالَی: وَیۡلٌ لِلۡمُطَفِّفِیۡنَ الَّذِیۡنَ إِذَا اکۡتَالُوا عَلَی النَّاسِ یَسۡتَوۡفُوۡنَ وَإِذَا کَالُوۡهُمۡ أَوۡ وَزَنُوۡهُمۡ یُخۡسِرُوۡنَ أَلَا یَظُنُّ أُولَئِكَ أَنَّهُمۡ مَبۡعُوۡثُوۡنَ لِیَوۡمٍ عَظِیۡمٍ یَوۡمَ یَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ. (المطففین:۱۶)

اس باب میں معاملات کی نسبت سے فضیلت والے کچھ اعمال بتلانا چاہتے ہیں۔

اس بیان میں کیا ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ خرید وفروخت کے معاملہ میں آدمی چھوٹ چھاٹ سے کام لے، بہت کھینچاتانی نہ کرے۔ جیسا کہ بہت سے لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ کوئی گاہک آیا اور کسی چیز کا بھاؤ پوچھا، تو وہ کہتے ہیں کہ اس کا بھاؤ دس روپے ہیں۔ اگر گاہک کہتا ہے کہ کچھ کم کردو، تو صاحب کہتے ہیں کہ ایک پائی بھی کم نہیں ہوگی؛ لینا ہے تو لو۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر کچھ کم کرنے میں آپ کا نفع تھوڑا سا کم ہوجاتا ہو تو کم کردیجیے، اور یہ بھی ہدایت ہے کہ جو چیز بیچی جارہی ہے اس میں کچھ اضافہ اور زیادتی کرکے گاہک کو دی جائے۔ یہ تو بیچنے والے کو ہدایت ہے، اور عام طور پر بیچنے والے تو ایسا کرتے بھی ہیں لیکن خریدنے والے اس نصیحت پر عمل کرنے والے نہیں دیکھے گئے، جیسے: اس نے ساڑھے نو کا بھاؤ طے کیا تھا تو آپ دس کا نوٹ دیدیجئے اور کہیے کہ: بھائی! تم دس کا نوٹ رکھ لو۔ یہاں دونوں کی فضیلت بتائی جارہی ہے، صرف بیچنے والے ہی کے لیے ہدایت نہیں ہے، بلکہ خریدنے والے کو بھی چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے وسعت دے رکھی ہے تو قیمت کچھ زیادہ ہی دیدو، اس کی بھی خاص فضیلت ہے، ویسے بھی آپ اس رقم کو اِدھر اُدھر خرچ کرہی ڈالتے ہیں اور ضائع کرتے ہیں؛ تو اسی دکاندار کو کچھ زیادہ دیدو۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کے لینے یعنی اپنا حق وصول کرنے کے معاملہ میں درگزر سے کام لینا، اور دینے یعنی کسی کا حق ادا کرنے کے معاملہ میں بھی فراخی اور کشادہ دلی (bid! *Dli si!) سے کام لینا۔

تیسری بات یہ ہے کہ کسی کے قرضہ کی ادائیگی کے معاملہ میں اچھا انداز اختیار کرنا، یا کسی سے اپنا حق وصول کرنا ہے تو وصول کرنے میں بھی اچھا انداز اختیار کرنا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ ناپنے اور تولنے میں بھی اس بات کا خیال رکھنا۔ اگر کوئی چیز ناپ کر دینی ہے تو ناپنے میں ایک میٹر کے بجائے دوڈُورے بڑھا کر دیدو، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ پورے میٹر سے بھی کچھ کم کر دے۔ تول کر دینی ہے تو اس میں بھی کچھ جھکتا ہی تولنا چاہیے۔

پانچویں بات: ناپ تول میں کمی کی ممانعت اور حرمت کو بتانا ہے۔

چھٹی بات: "فضل إنظار الموسِر المُعْسِرَ" خوش حال آدمی کا تنگ دست آدمی کو مہلت دینا۔ مثلاً: ایک آدمی کے پاس آپ کے پیسوں کا مطالبہ ہے، اب آپ کہتے ہیں کہ تمہارا وعدہ پورا ہو رہا ہے، اس لیے میرے پیسے لاؤ، مگر قرضدار تنگ دست ہے، اس نے ادائیگی کے لئے اپنے طور پر کوشش بھی کی، لیکن انتظام نہیں ہو سکا، اور وہ درخواست کر رہا ہے کہ

کچھ اور مہلت دیدو، میں انتظام کرنے میں لگا ہوا ہوں ؛تو اب آپ کو بھی چاہیے کہ اس کو کچھ مہلت اور دیدو۔

ہمارے معاشرہ کی ایک بڑی کوتاہی

دو شکلیں الگ الگ ہیں ،ایک تو یہ ہے کہ ایک آدمی کے پاس مال ہے اور وہ ادا نہیں کر رہا ہے، جیسا کہ ہمارے سماج و معاشرہ میں بڑی کوتاہیاں ہوتی ہیں کہ قرضدار کے پاس قرضہ ادا کرنے کے لیے مال موجود ہوتا ہے لیکن قرض خواہ کو ادا نہیں کرتا،اور اِدھر اُدھر فضول خرچیاں کرتا پھرتا ہے، بغیر ضرورت کی چیزیں خرید رہا ہے، دوستوں کی پُر تکلّف اور شاندار دعوتیں ہو رہی ہیں ، اور قرض خواہ روزانہ دَھکّے کھاتے ہیں ان کو نہیں دیتا؛ ایسے آدمی کی تو دعوت بھی درست نہیں ہے۔اس لیے کہ کسی کے پاس اگر پیسے زائد ہیں تب تو دعوت کرے، مگر یہاں پیسے زائد کہاں ہیں ؟اس پر تو لوگوں کا حق ادا کرنا واجب ہے، لہٰذا اس کو چاہیے کہ پہلے وہ ادا کرے۔اب وہ تو ادا نہیں کر رہا ہے اور دعوتیں کر رہا ہے!شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔بلکہ اگر آپ کو معلوم ہو کہ وہ آدمی مقروض ہے

اورلوگوں کے قرضے ادا کرنے میں ڈھیل کرتا ہے اوراب آپ کی دعوت کرتا ہے؛ تو آپ اس کی دعوت قبول نہ کیجئے۔

حضرت نواب صاحب کی دعوت

حضرت نواب قطب الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مشکوٰۃ کی اردو شرح ''مظاہرِ حق'' کے مصنف ہیں ، حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، خاندانی اعتبار سے نواب تھے اور بڑے اہل اللہ میں سے تھے، اور بڑے جید عالم بھی تھے، ان کا ایک قصہ ارواحِ ثلاثہ میں لکھا ہے کہ:

ایک مرتبہ انہوں نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اجداد میں سے ہیں ان دونوں کی دعوت کی، مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تو ان کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نواب صاحب نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی، اس لیے کہ وہ ان دونوں کے استاذ تھے: حضرت! آپ نے تو میری دعوت قبول فرمالی اور مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ قبول نہیں کرتے، آنے سے انکار کرتے ہیں ۔

حضرت شاہ اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بلایا اور ڈانٹا کہ: ارے بھائی! کیا تم کو تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا ہے؟ تم ان کی دعوت کیوں قبول نہیں کرتے؟ کیا نواب صاحب کی کمائی حرام کی ہے؟ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: نہیں حضرت! حاشاو کلاّ: ایسی بات نہیں ہے، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ نواب صاحب مقروض ہیں اور ہماری دعوت کر رہے ہیں، اب اگرچہ بگڑے ہوئے ہیں؛ لیکن ہیں تو نواب ہی نا! (' بگڑے ہوئے کا مطلب یہ ہے کہ نیک لوگوں کی صحبت میں رہنے کے بعد اگرچہ نوابی والی پوری شان باقی نہیں رہی، لیکن پھر بھی کچھ تو اثر ہے ہی) اس لیے کچھ تکلّفات بھی کریں گے، تو جن پیسوں کو وہ ہماری اس دعوت میں لگا رہے ہیں؛ ان سے اپنا قرض کیوں ادا نہیں کر دیتے؟ قرض خواہوں کا حق ادا کرنے میں ٹال مٹول کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ بات سنی تو فرمایا: مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات تو بالکل ٹھیک ہے، اب تو ہم بھی دعوت میں نہیں جائیں گے۔ کہاں تو یہ تھا کہ ان کو ڈانٹ رہے تھے اور اب خود ہی فرما رہے ہیں کہ ہم بھی دعوت میں نہیں جائیں گے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی آدمی پر قرضہ ہو اور اس کے پاس رقم موجود ہو تو پھر قرضہ کی ادائیگی میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

قرض اور دَین میں فرق

دیکھو! دو چیزیں الگ ہیں ، ایک تو قرض کہلاتا ہے، اور دوسرا دَین کہلاتا ہے۔ قرض کا مطلب یہ ہے کسی کے پاس سے آپ نے نقد کچھ روپے اُدھار لیے، اور وعدہ کیا کہ میں ایک مہینہ کے بعد ادا کروں گا، تو قرض خواہ کو بھی چاہیے کہ وہ ایک مہینہ کا انتظار کرے، اس کے بعد مطالبہ کرے۔ لیکن اگر وہ ایک مہینہ کا انتظار کئے بغیر دوسرے ہی دن آکر مطالبہ کرے کہ میرے پیسے لاؤ؛ تو اس کو مانگنے کا حق ہے۔ اور جو مہلت دی جارہی ہے وہ قرض خواہ کی طرف سے ایک طرح کا احسان اور تبرّع ہے، اس پر مہلت دینا واجب نہیں ہے۔

اور دوسری چیز دَین ہے، اس میں یہ ہوتا ہے کہ آپ نے کسی دکاندار کے پاس سے کوئی مال اُدھار خریدا، اور معاملہ پہلے سے صاف کرلیا کہ ایک مہینہ کی اُدھاری پر میں تم سے یہ مال پانچ سو روپے میں خریدتا ہوں ، تو یہ پانچ سو روپے شریعت کی اصطلاح میں ”قرض“ نہیں، بلکہ ” دَین“ ہے، اور اس میں مانگنے والے پر ایک مہینہ کی پابندی کرنا واجب ہے، اس سے پہلے وہ نہیں مانگ سکتا۔ اگر وہ مانگے تو اگرچہ اِس کے جیب میں پیسے ہوں تب بھی یہ منع کرسکتا ہے کہ میں ابھی نہیں دیتا، جب وقت پورا ہوگا تب دوں گا۔ قرض اور دَین میں یہ فرق ہے۔

تنگ دست کو مہلت دیجئے

بہرحال! بات یہ تھی کہ کوئی آدمی تنگدستی کی وجہ سے ادائیگی کی طاقت نہیں رکھتا تو آپ کو چاہیے کہ اگرچہ وقت پورا ہو گیا ہے لیکن اور ذرا مہلت دیدو، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے: ﴿وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ﴾ اگر وہ تنگدست ہے تو اس کو خوش حالی آجانے تک مہلت دیدو۔ آپ مانگنے گئے تو اس نے کہا کہ میں نے کوشش کی کہ آپ کا قرض ادا کر دوں، اس کے لیے ہاتھ پیر بھی مارے؛ لیکن انتظام نہیں ہو سکا، اب مجھے کچھ اور مہلت دیدو، اور آپ کو بھی اس کی بات سن کر یقین ہو گیا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے تو اب آپ کی شرافت کا تقاضہ یہ ہے اور اسلامی تعلیم بھی یہی ہے کہ آپ اس کو مہلت دیجئے۔ اور دوسری بات یہ بھی ہے جب اس کے پاس ہیں ہی نہیں تو آپ زبردستی کر کے کیا کر لیں گے؟ ہاں! اگر پیسہ ہونے کے باوجود ادا نہیں کرتا تو اس کا مسئلہ الگ ہے، حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ" کسی کے پاس آپ کا قرض ادا کرنے کے لیے پیسے موجود ہیں اس کے باوجود ادا نہیں کرتا تو ادا نہ کرنا ظلم ہے۔ اس کا یہ ظلم صاحبِ حق کے لیے اس کی عزت وآبرو لینے کی اجازت دیتا ہے، یعنی مثلاً: لوگوں کے سامنے ذرا آواز سے چلّائے کہ میرے پیسے کیوں نہیں دیتا؟ کیا کھا جانے کا ارادہ

ہے؟ اس طرح کے دوچار جملے بولنے کا اس کو حق ہے، تاکہ اس کی رسوائی ہو اور وہ قرض ادا کردے، ایسا کرنے کا حق اس وقت ہے جب کہ اس کے پاس پیسے ہوں اور قرض ادا نہ کرے۔

یہ بھی یاد رکھئے

بلکہ ایک بات یہ بھی یاد رکھئے کہ اگر اس کے پاس پیسے ہیں اور نہیں دیتا تو قرض خواہ اس کی جیب میں سے زبردستی بھی لے سکتا ہے۔ دوسرا کوئی سامان ہو، جیسے: گھڑی یا اور کوئی چیز ہے تو نہیں لے سکتا، لیکن اگر پیسے ہوں تو زبردستی لے سکتا ہے، اگرچہ متأخرینِ فقہاءِ احناف نے اس کی بھی گنجائش دی ہے، لیکن اصل مسئلہ یہی ہے کہ آپ کا حق پیسے لینے کا ہے تو پیسے ہی لے سکتے ہیں اور کوئی چیز نہیں لے سکتے۔

ایک قدم آگے

تو بات یہ چل رہی تھی کہ ایک آدمی تنگدست ہے تو اس کو مہلت دو اور ادائیگی کے لیے موقع دو، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر فرمایا: ''والوضع عَنْہُ'' کچھ کم کردو اور معاف کردو، کچھ حصہ چھوڑ دو۔ جیسے: آپ نے دیکھا کہ دوچار مرتبہ میں اس کو مہلت دے چکا ہوں

لیکن اس سے ادائیگی نہ ہو سکی اور اب اس کے پاس کچھ آنے کی امید بھی نہیں ہے، تو آپ نے کہا کہ: جاؤ بھائی! میں نے معاف کر دیا۔ تو جہاں قرض دینے کی فضیلت ہے، وہیں اگر کوئی تنگدست ہو تو اس کو مہلت دینے کی بھی فضیلت ہے، اور اگر معاف کر دو گے تو اس کی بھی بڑی فضیلت ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ تم جو بھی نیکی کا کام کرو گے اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور جب وہ جانتا ہے تو آپ کو اس کا بدلہ ضرور دے گا۔ یہ سارے نیکی کے کام ہیں جو اوپر بتلائے گئے ہیں۔

یہ بڑی خطرناک چیز ہے

﴿وَيٰقَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ﴾ حضرت شعیب علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوم کو نصیحت فرمائی، اس لیے کہ ان کی قوم میں یہ بیماری تھی کہ وہ ناپ تول میں کمی کرتے تھے، پورا ناپ کر اور پورا تول کر نہیں دیتے تھے، جس کو ہماری زبان میں ”ڈنڈی مارنا“ کہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو ان لوگوں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو نصیحت فرمائی کہ: اے

میری قوم! ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا پورا دو، اور لوگوں کی چیزوں میں کمی مت کرو، ان کا حق پورا ادا کرو، کسی کے سامان میں جو کمی کی جاتی ہے یہ بڑی خطرناک چیز ہے اور کبیرہ گناہ ہے۔

ہلاکت ہو ان لوگوں کے لئے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ، الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ. وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ. أَلَا يَظُنُّ أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَبْعُوْثُوْنَ. لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ. يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ہلاکت ہو ان لوگوں کے لئے جو ناپ تول میں کمی کرتے ہیں، ان کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے ناپ تول کر وصول کرتے ہیں تو پورا پورا وصول کرتے ہیں، اور کسی کو جب ناپ کر یا تول کر دینے کا وقت آتا ہے تو کم کر کے دیتے ہیں۔ اپنا حق پورا وصول کرتے ہیں، اور دوسروں کا حق کم کر کے دیتے ہیں۔ (باری تعالیٰ فرماتے ہیں:) کیا ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک بڑے دن کے لیے ان کو اُٹھنا ہے، یعنی موت کے بعد قیامت کے لئے ان کو اُٹھنا ہے اور جو کچھ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو کر اس کا جواب دینا ہے۔ جس دن سب لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور میں جواب دہی کے لئے کھڑے ہوں گے۔

یہ بھی ڈنڈی مارنا ہی ہے

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے محدث اور ائمۂ فقہاء میں سے بڑے امام ہیں ،وہ فرماتے ہیں :"اَلتَّطْفِیْفُ فِیْ كُلِّ شَیْءٍ" تطفیف؛ہر چیز میں ہوا کرتی ہے، مثلاً:ایک آدمی نوکری کرتا ہے اور اپنے سیٹھ سے تنخواہ پوری وصول کرتا ہے، لیکن کام پورا نہیں کرتا اپنی ذمہ داری کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے؛تو یہ بھی تطفیف اور ڈنڈی مارنا ہی ہے اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ یا جیسے: بیوی سے خدمت برابر لے رہے ہیں ،اس کی ذمہ داریاں پوری پوری ادا کروا رہے ہیں ،اور آپ پر بیوی کے جو حقوق ہیں وہ پورے ادا نہیں کرتے؛تو یہ بھی تطفیف اور ڈنڈی مارنا ہی ہے۔ تمام حقوق کے اندر یہ قاعدہ جاری ہوتا ہے کہ سامنے والے سے آپ اپنا حق پورا وصول کرتے ہیں ، لیکن اس کا حق پورا ادا نہیں کرتے،تو یہ تطفیف یعنی ڈنڈ8ی مارنا ہی ہے۔

تم میں بہتر آدمی وہ ہے

حدیث ۱۳۶۷:-

عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رَجُلاً أَتَى النَّبِيَّ ﷺ يَتَقَاضَاهُ فَأَغْلَظَ لَهُ. فَهَمَّ بِهِ أَصْحَابُهُ. فَقَالَ رسولُ الله ﷺ: ((دَعُوهُ. فَإِنَّ لِصَاحِبِ الحَقِّ مَقَالاً)) ثُمَّ قَالَ: ((أَعْطُوهُ سِنّاً مِثْلَ سِنِّهِ)) قالوا: يَا رسولَ الله، لا نَجِدُ إِلاَّ أَمْثَلَ مِنْ سِنِّهِ. قَالَ: ((أَعْطُوهُ. فَإِنَّ خَيْرَكُمْ أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً)) (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضور اکرم ﷺ کے پاس آیا اور اپنا حق مانگا (دراصل حضورِ اکرم ﷺ نے اس کے پاس سے ایک جانور بطورِ قرض لیا تھا تو اس نے آکر کہا کہ میرا جانور لاؤ) اور بڑی سختی اور بے رخی کے ساتھ مطالبہ کیا (جب اس آدمی نے اپنا حق وصول کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ کے ساتھ ناروا سلوک کیا) تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو تنبیہ کرنے کا ارادہ کیا (گویا صحابہ اس کو ڈانٹنا چاہتے تھے کہ ایسی نازیبا حرکت کیوں کرتا ہے؟ جب حضورِ اکرم ﷺ نے محسوس کیا کہ یہ اپنا حق مانگنے میں میرے ساتھ جو سختی کر رہا ہے اس پر صحابہ کے تیور بدلے ہوئے ہیں) تو حضورِ اکرم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: اس کو چھوڑ دو (یعنی اس کو کچھ مت کہنا وہ حق والا ہے اور) حق والے کو کچھ کہنے کا حق ہے (یعنی وہ مجھے ایسی سخت باتیں بول رہا ہے اس پر تمہیں چیں بہ جبیں ہونے اور پیشانی پر بل لانے کی ضرورت نہیں ہے، وہ حق والا ہے اور اپنا حق وصول کرنے آیا ہے۔ ہمارے یہاں اگر کوئی ایسا کہے تو اس کا حق تو اپنی جگہ پر رہے گا، ہم خود ہی آستین چڑھا کر اس کو نمٹا دیں گے) پھر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس کا جانور جتنی عمر کا تھا اتنی عمر کا جانور اس کو دیدو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس کا آپ پر جتنی عمر کا جانور نکلتا ہے، اس عمر کا جانور ہمارے پاس نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑی عمر کا اور زیادہ قیمتی جانور ہے۔ تو حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: ٹھیک ہے وہی دیدو، اس لئے کہ تم میں بہتر آدمی وہ ہے کہ جو ادائیگی کے معاملہ میں بھی اچھا ہو۔

افادات:- اس کا جتنا حق تھا آپ اس سے بہتر چیز کسی شرط کے بغیر لوٹائیں تو پسندیدہ عمل ہے، مثلاً: اس کو سو روپے ہی لوٹانے ہیں اور وہ بھی سو روپے ہی کا مطالبہ کرتا ہے، لیکن آپ سو کے بدلہ میں ایک سو دس لوٹاتے ہیں؛ تو یہ سود میں شمار نہیں ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلے سے زیادہ دینے کی شرط بھی نہیں ہونی چاہیے اور اس کا رواج بھی نہیں ہونا چاہیے، اگر رواج اور (عُرف) بن گیا ہے تو وہ شرط کے حکم میں ہے اور اس صورت میں جو زیادتی ہوگی وہ سود کہلائے گا۔

اللہ تعالیٰ رحم کرے اس آدمی پر

حدیث ۱۳۶۸:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: رَحِمَ اللهُ رَجُلاً سَمْحاً إِذَا بَاعَ، وَإِذَا اشْتَرَى، وَإِذَا اقْتَضَى. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ رحم کرے اس آدمی پر جو بڑا نرم خو ہے، جب کوئی چیز بیچتا ہے تب بھی، اور جب کوئی چیز خریدتا ہے تب بھی، اور جب کسی سے اپنا حق وصول کرتا ہے تب بھی۔

افادات:- کسی چیز کے بیچنے کے معاملہ میں ، خریدنے کے معاملہ میں ، حق وصول کرنے کے معاملہ میں اس کی طبیعت میں اکھڑپن نہیں ہے؛ بلکہ اس کی طبیعت میں نرمی ہے، اور لوگوں کے ساتھ آسانی کا معاملہ کرتا ہے، تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کے اوپر رحم کرے۔ یہ دعائیہ جملہ ہے کہ گویا حضورِ اکرم ﷺ اس کے لئے دعا فرماتے ہیں۔

یا خبریہ جملہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ خبر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتے ہیں۔ دونوں مطلب اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔

قیامت کی تکلیفوں سے نجات

حدیث ۱۳۶۹:-

وعن أَبِي قتادة رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقول: مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُنَجِّيَهُ اللهُ مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَلْيُنَفِّسْ عَنْ مُعْسِرٍ أَوْ يَضَعْ عَنْهُ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کو اللہ تعالیٰ قیامت کی تکلیفوں سے نجات دے؛ تو اس کو چاہیے کہ تنگدست کے اوپر آسانی کرے، یا اس کے قرض کو معاف ہی کردے۔

افادات:- یعنی اگر کسی کے اوپر تمہارا حق نکلتا ہے، اور وہ تمہارا حق ادا کرنے سے قاصر ہے، تنگدستی کی وجہ سے اس میں طاقت نہیں ہے، تو آپ اس کو مہلت دیجیے، یا معاف ہی کردیجئے۔ اگر آپ ایسا معاملہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ قیامت کی سختیوں کو تمہارے لئے آسان کردیں گے اور اس سے تم کو نجات دیدیں گے۔

یہ تو بہت بڑا وعدہ ہے، اس لیے اگر کوئی آدمی اسی نیت سے ایسا معاملہ کرلے گا تو اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان شاء اللہ وہی معاملہ کیا جائے گا۔

ہم بھی تجھے چھوڑ دیتے ہیں

حدیث ۱۳۷۰:-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: كَانَ رَجُلٌ يُدَايِنُ النَّاسَ، وَكَانَ يَقُولُ لِفَتَاهُ: إِذَا أَتَيْتَ مُعْسِرًا فَتَجَاوَزْ عَنْهُ، لَعَلَّ اللهَ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا، فَلَقِيَ اللهَ فَتَجَاوَزَ عَنْهُ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی لوگوں کو ادھار مال دیتا تھا اوراس نے اپنے کارندے اور ملازم سے کہہ رکھا تھا کہ جب تم حق وصول کرنے کے لئے کسی کے پاس جاؤ اور وہ تنگدست ہو تو اس کو معاف کر دینا، شاید اللہ تعالیٰ ہم کو بھی اس کی برکت سے معاف کر دے۔ حضوراکرم ﷺ فرماتے ہیں: جب اس آدمی کا انتقال ہوا اوراللہ تعالیٰ کے سامنے وہ پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی چھوڑ دیا (کہ تو لوگوں کو چھوڑ دیتا تھا؛ جا! ہم بھی تجھے چھوڑ دیتے ہیں)۔

حدیث ۱۳۷۱:-

وعن أَبِي مسعود البدريِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: حُوسِبَ رَجُلٌ مِمَّنْ كَانَ قَبْلَكُمْ، فَلَمْ يُوجَدْ لَهُ مِنَ الخَيْرِ شَيْءٌ، إِلاَّ أنَّهُ كَانَ يُخَالِطُ النَّاسَ وَكَانَ مُوسِراً، وَكَانَ يَأْمُرُ غِلْمَانَهُ أنْ يَتَجَاوَزُوا عَنِ المُعْسِرِ. قَالَ اللهُ-عزوجل-: نَحْنُ أَحَقُّ بذَلِكَ مِنْهُ؛ تَجَاوَزُوا عَنْهُ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم سے پہلی امتوں میں کاایک آدمی اللہ تعالیٰ کے حضور میں حساب کے لئے پیش کیا گیا۔اس نے کوئی نیکی نہیں کی تھی البتہ اتنا تھا کہ وہ لوگوں کے ساتھ گھلا ملا رہتا تھا، اور خوش حال آدمی تھا، لوگوں کو اُدھار مال دیتا تھا، اوراس نے اپنے کارندوں اور اسٹاف سے کہہ رکھا تھا کہ جو آدمی تنگدست ہو اس کو چھوڑ دینا، اس سے مطالبہ مت کرنا۔جب وہ آدمی اللہ کے حضور پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: جب یہ ایک انسان ہو کر اپنے ہم جنس تنگ دستوں کو چھوڑ دیتا تھا تو ہم تو ایسا معاملہ کرنے کے زیادہ حق دار ہیں ۔ فرشتوں سے کہا: اس کو چھوڑ دو (دیکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنا آسانی والا معاملہ ہوا!)۔

تاجر کیسے نجات حاصل کرے؟

حدیث ۱۳۷۲:-

وعن حذیفة رضی اللہ عنہ قَالَ: أُتِيَ اللهُ تَعَالَى بِعَبْدٍ مِنْ عِبَادِهِ آتَاهُ اللهُ مَالاً، فَقَالَ لَهُ: مَاذَا عَمِلْتَ فِي الدُّنْيَا ؟ قَالَ: ((وَلاَ يَكْتُمُونَ اللهَ حَدِيثاً)) قَالَ: يَارَبِّ آتَيْتَنِي مَالَكَ، فَكُنْتُ أُبَايِعُ النَّاسَ، وَكَانَ مِنْ خُلُقِي الجَوَازُ، فَكُنْتُ أَتَيَسَّرُ عَلَى المُوسِرِ، وَأُنْظِرُ المُعْسِرَ. فَقَالَ اللهُ تَعَالَى: ((أَنَا أَحَقُّ بِذا مِنْكَ تَجَاوَزُوا عَنْ عَبْدِي)) فَقَالَ عُقْبَةُ بن عامِرٍ ، وأبو مسعودٍ الأنصاريُّ رضی اللہ عنهما : هكَذَا سَمِعْنَاهُ مِنْ فِي رسولِ اللهِ ﷺ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے حضور ایک ایسے بندہ کو لایا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دے رکھا تھا، باری تعالیٰ کی طرف سے سوال کیا جائے گا: دنیا میں تو نے کیا کارنامہ انجام دیا؟ راوی کہتے ہیں کہ بندے اللہ تعالیٰ کے حضور کسی بات کو چھپا تو نہیں سکیں گے (اس لیے کہ وہ تو عالم الغیب ہے، چھپی ہوئی باتوں کو بھی جاننے والا ہے، ہر چیز اس کے علم میں ہے) چناں چہ وہ بندہ باری تعالیٰ سے عرض کرے گا: باری تعالیٰ! آپ نے مجھے مال دیا تھا، جب میں لوگوں سے خرید و فروخت کرتا تھا تو میرا طریقہ یہ تھا کہ سب سے درگذر کرتا تھا، اگر کوئی آدمی خوش حال ہوتا جو میرا حق ادا کرنے پر قادر ہوتا تو اس کے ساتھ بھی میں آسانی کرتا تھا (کہ کچھ چھوڑ دیتا تھا کہ اتنی قیمت ہوتی ہے چلو! آپ اتنی ہی قیمت دیدو، ڈسکاؤنٹ (Discount) دیدیتا تھا) اور جس کے اوپر میرا حق ہوتا وہ اگر تنگدست ہوتا تھا، اور تنگدستی کی وجہ سے ادا نہیں کرسکتا تھا، یا اس کے پاس اس

وقت گنجائش نہیں ہوتی؛تو میں اس کو مہلت دیدیتا تھا(کہ اگر ابھی نہیں ہے تو کوئی بات نہیں ، جب آئے تب دیدینا،یہی میرا طریقہ کار تھا،اس کی بات سن کر)باری تعالیٰ فرمائیں گے:(جب تو بندہ ہو کر یہ معاملہ کرتا تھا،تو میں تو مالک الملک ہوں)اس طرح کا سلوک کرنے کا تیرے مقابلہ میں مَیں زیادہ حقدار ہوں ۔چناں چہ باری تعالیٰ فرشتوں سے فرمائیں گے:میرے اس بندے سے درگذر کرو۔جس وقت حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بیان کی،وہاں دوسرے دو صحابی حضرت عقبہ بن عامر اور حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے،ان دونوں نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے جب یہ روایت سنی تو دونوں حضرات فرمانے لگے:ہم نے بھی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانِ مبارک سے یہ ارشاد سنا ہے(گویا تین تین صحابی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے حوالہ سے اس واقعہ کو بیان فرما رہے ہیں)۔

افادات:–اس لیے اگر آپ تجارت اور کاروبار کر رہے ہیں تو یہ نہ سوچئے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیسے حاصل کر سکتا ہوں اور نجات کیسے پا سکتا ہوں ،مجھے تو عبادت کرنے، تسبیحات پڑھنے، تلاوت کرنے اور دیگر نفلی کام کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی اس راستہ سے بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کر سکتا ہے اور اپنے آپ کو آخرت میں نجات دلا سکتا ہے۔بہت آسان طریقہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے ساتھ آپ اپنے کاروبار میں اگر یہ روش اپنالیں کہ جن کے ساتھ آپ کا معاملہ پڑتا ہے ان کی پکڑ دھکڑ نہ کریں ،تو اس صورت میں آپ بھی اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ جائیں گے اور اللہ

تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ساتھ بھی درگذر کا معاملہ کیا جائے گا۔ آپ اپنی اسی تجارت کی لائن سے یہ مقصد حاصل کرسکتے ہیں ۔

عرش کا سایہ ایسے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے

حدیث ۱۳۷۳:-

وَعَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ:مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِراً أَوْوَضَعَ لَهُ أَظَلَّهُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِهِ يَوْمَ لاَ ظِلَّ اِلاَّ ظِلُّهُ.

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی کا کسی تنگدست کے ساتھ لین دین اور خرید و فروخت کا معاملہ پڑا (جس کے پاس اس وقت حق ادا کرنے کی طاقت اور سکت نہیں تھی) تو اس نے اس کو مہلت دی (کہ اچھا! جب تمہارے پاس پیسے آجائیں تب ادا کردینا) یا پھر اس نے اس میں سے کچھ معاف کردیا؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے روز اپنے عرش کے سائے میں جگہ دیں گے جب کہ اس کے عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔

افادات:- ایک روایت میں آتا ہے کہ سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا جس وقت اللہ کے عرش کے سائے کے علاوہ اور کوئی سایہ نہیں ہوگا، اُس روایت میں سات کا تذکرہ ہے۔ یہاں ایک اور آدمی کا تذکرہ ہے جو کاروبار میں

رہتے ہوئے بھی آسانی کے ساتھ یہ فضیلت حاصل کر سکتا ہے۔ آپ اس طرح کی روش اپنا لیں کہ جو لوگ تنگدست ہیں ان کے ساتھ درگزر سے کام لیں ، یا کچھ چھوڑ چھاڑ دیں ؛ تو اللہ تعالیٰ اس صورت میں آپ کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا۔ کتنا آسان طریقہ ہے!

کچھ جھکتا ہوا دیجیے

حدیث ۱۳۷۴ :-

وعن جابر رضی اللہ عنہ **أَنَّ النبيَّ ﷺ، اشْتَرَى مِنْهُ بَعِيراً بِوُقِيَّتَيْنِ وَدِرْهَمٍ أَوْ دِرْهَمَيْنِ، فَوَزَنَ لَهُ، فَأَرْجَحَ.** (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ان سے ایک اونٹ دو اَوْقیہ اور ایک درہم ، یا دو درہم میں خریدا (جب ان کی ادائیگی کا وقت آیا اور) حضورِ اکرم ﷺ نے ان درہموں کا وزن کروایا تو جھکتا ہوا تلوایا۔

افادات:- ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، تو دو اوقیہ یعنی اسّی درہم ہوئے اور ایک درہم یعنی اکیاسی (۸۱) یا دو درہم یعنی بیاسی (۸۲) درہم ہوئے۔ اور اس زمانہ میں درہم یعنی چاندی کا سکہ ہوتا تھا، اس کو تول کر وزن کر کے ادا کیا جاتا تھا۔

اس روایت کو پیش کر کے یہ تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ جب آپ کسی کو کوئی چیز بیچ رہے ہوں تو بالکل کٹوکٹ والی بات نہیں ہونی چاہیے، بلکہ کچھ جھکتا ہوا دیجیے، اسی میں اللہ تعالیٰ نے خیر وبرکت رکھی ہے، اور یہ فضیلت کی چیز ہے۔ ہماری شریعت ہمیں اس لائن سے بھی ایسی تعلیم دیتی ہے کہ معاملات کے اندر حسنِ سلوک اور اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

جھکتا ہوا تولو

حدیث ۱۳۷۵ :-

وعن أَبِي صَفْوَان سُوَيْدِ بنِ قيسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : جَلَبْتُ أَنَا وَ مَخْرَمَةُ العَبْدِيُّ بَزًّا مِنْ هَجَرَ ، فَجَاءنا النبيُّ ﷺ ، فَسَاوَمَنَا بسَرَاوِيلَ ، وَعِنْدِي وَزَّانٌ يَزِنُ بِالأَجْرِ ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لِلْوَزَّانِ : زِنْ وَأَرْجِحْ .

(رواہ أبو داود، والترمذی وقال : حدیث حسن صحیح)

ترجمہ :- حضرت ابو صفوان سوید بن قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مَیں اور مخرمہ عَبْدِی (یہ بھی ایک صحابی ہیں) ہجر (جو یمن میں ایک مقام کا نام ہے، وہاں) سے کپڑا لائے تو نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے اور پائجاموں کا سودا کیا (یعنی وہ کپڑا ہم سے خریدا) اور اس کی قیمت طے کی۔ اس وقت میرے پاس ایک تولنے والا آدمی موجود تھا (اس زمانے میں دراہم وغیرہ تولنے کے لئے مستقل آدمی ہوا کرتے تھے جو کانٹا لے کر گھومتے رہتے تھے، لوگ ان سے تلواتے تھے اور اس کی اجرت ادا کر دیتے تھے) نبی کریم ﷺ نے اس تولنے والے کو ہدایت فرمائی: تولو اور جھکتا ہوا تولو۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ آدمی تولنے میں یہی طریقہ اختیار کرے کہ ذراسا پلڑا جھکا ہوا ہو، تاکہ حق پورے طور پر ادا ہو سکے۔

کتاب اللباس (حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد:۱۰) میں بتلایا تھا کہ نبی کریم ﷺ سے پائجامہ خریدنا ثابت ہے، لیکن پہننے کے سلسلہ میں علماء کی دو رائیں ہیں، بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آپ نے خریدا تو پہنا بھی ہے۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ خریدا تو ہے لیکن پہننا ثابت نہیں ہے۔

کتاب العلم

باب فضل العلم تعلماً وتعلیماً للہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْماً.

قَالَ تَعَالٰى: قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

وَقَالَ تَعَالٰى: يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ

وَقَالَ تَعَالٰى: إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ

یہاں سے علم کی فضیلت بیان کرتے ہیں، اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی چند آیتیں اور احادیث پیش کرتے ہیں۔ ویسے علم کے فضائل کے سلسلہ میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ بعض حضرات نے تو اس پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائی ہیں جن میں ان ساری حدیثوں کو جمع کیا ہے۔

میرے علم میں زیادتی فرما

﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْماً﴾ اے نبی! آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہیے کہ اے میرے رب! میرے علم میں زیادتی فرما۔

دیکھئے! نبی کریم ﷺ تو علم کے سب سے اونچے مقام پر فائز تھے آپ ﷺ علم کے جس مقام پر فائز تھے پوری انسانیت میں کسی اور کے لئے اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ ایک روایت میں حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”أُوْتِيْتُ عِلْمَ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ“ مَیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگلوں اور پچھلوں سب کا علم دیا گیا ہوں۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنِ پاک میں آپ ﷺ کو یہ تاکید کی جارہی ہے کہ: اے نبی! آپ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہیے کہ اے اللہ! مجھے علم میں ترقی عطا فرما اور میرے علم میں اضافہ فرما۔ گویا جو علم آپ کے پاس پہلے سے موجود ہے اس پر قناعت نہ کریں۔ معلوم ہوا کہ علم ایک ایسی صفت ہے جس کے بارے میں کسی ایک درجہ اور مقام پر قناعت نہیں ہونی چاہیے، بلکہ آدمی اس میں ترقی اور اضافہ کرتا ہی رہے، اسی لیے ہمارے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ علم حاصل کرنے کی مدت ”مِنَ الْمَهْدِ اِلَى اللَّحْدِ“ گہوارے سے لے کر قبر میں پہنچنے تک کی ہے، یعنی آدمی پیدا ہو وہاں سے لے کر موت تک علم کے حصول کا سلسلہ جاری

رہنا چاہیے، کسی مقام پر پہنچ کر آدمی یہ نہ سمجھے کہ اب مَیں علم کے حصول سے فارغ ہو گیا ہوں ،بلکہ یہ سلسلہ اخیر تک جاری رہے۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

ہمارے اکابر میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں وہ فرماتے تھے کہ: جوں جوں عمر بڑھتی جا رہی ہے توں توں اپنی جہالت کا احساس بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ جب آدمی کے علم میں نئی نئی چیزیں آتی ہیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ وہ چیز ہے جس کو میں اب تک نہیں جانتا تھا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آدمی کی مجہولات کی تعداد اس کی معلومات کے مقابلہ میں زیادہ ہی ہے۔ کوئی آدمی چاہے کتنا ہی زیادہ علم حاصل کرلے لیکن جو چیزیں نہیں جانتا وہ جانی ہوئی چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ ہی ہوا کرتی ہیں ۔

جاننے والوں کی ذمہ داری زیادہ ہے

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿قُلۡ هَلۡ يَسۡتَوِى الَّذِيۡنَ يَعۡلَمُوۡنَ وَالَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ﴾ اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ جو جاننے والے ہیں اور جو نہیں جانتے؛ کیا برابر ہو سکتے ہیں ۔یعنی مقام،

درجہ، فضیلت اور اجر و ثواب کے اعتبار سے دونوں برابر نہیں ہو سکتے؟ ظاہر ہے کہ جاننے والوں کا مقام، درجہ اور فضیلت نہ جاننے والوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔ اور بعضوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ ذمہ داری اور فرائض منصبی کے اعتبار سے جاننے والوں کی ذمہ داریاں نہ جاننے والوں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ تم میں سے وہ لوگ جو ایمان والے ہیں اور ساتھ ہی ان کو علم بھی دیا گیا ہے تو اللہ تعالیٰ اس علم کی وجہ سے ان کے درجات بلند فرمائیں گے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اس کے بندوں میں علماء ہیں۔ آدمی کا علم جتنا زیادہ ہو گا اسی مقدار میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور خشیت و ڈر بھی اس میں بڑھا ہوا ہو گا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کو جاننے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خشیت بھی اتنا ہی زیادہ رکھنے والا ہوں۔ جتنی علم میں زیادتی ہو گی اتنی ہی خشیت بھی زیادہ ہو گی، جیسے: بادشاہ کے قریب رہنے والا وزیر چوں کہ بادشاہ کے کمالات سے زیادہ واقف ہوتا ہے تو اس کو ڈر بھی دوسروں کے مقابلہ میں اسی مناسبت سے زیادہ ہوتا ہے۔ بچہ سامنے والے کسی بڑے کی خوبیوں سے اتنا ہی بے فکر اور نڈر ہوتا ہے، لیکن جتنا بڑا ہوتا جاتا ہے اتنے ہی

کمالات اور خوبیاں اس کے علم میں آتی جاتی ہے تو پھر ڈر بھی اسی مناسبت سے بڑھتا جاتا ہے۔

جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ ہوتا ہے

حدیث ۱۳۷٦:-

وعن معاوية -رضی الله عنه- قَالَ: قَالَ رسول اللهﷺ: ((مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِی الدِّيْنِ))

(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو دین میں سمجھ عطا فرماتے ہیں (گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس کو دین کا علم اور دین کا فہم دیا گیا یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کیا گیا ہے)۔

حسد جائز نہیں؛ مگر دو باتوں میں

حدیث ۱۳۷۷:-

وعن ابن مسعود-رضی الله عنه-. قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((لاحَسَدَ إلاَّ فی اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ مَالاً، فَسَلَّطَهُ عَلَى هَلَكَتِهِ فِي الحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الحِكْمَةَ، فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيُعَلِّمُهَا)). (متفقٌ عَلَيْهِ)
والمراد بالحسدِ: الغِبْطَةُ، وَهُوَ أنْ يَتَمَنَّى مِثله.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: حسد جائز اور درست نہیں؛ مگر دو باتوں میں (حالاں کہ حسد تو حرام ہے لیکن دو طرح کے آدمیوں پر حسد کرسکتے ہیں) ایک آدمی تو وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا، پھر اس کو مال صحیح جگہ پر خرچ کرنے کی توفیق بھی دی۔ دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے حکمت (علم) عطا فرمایا اور وہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلے کرتا ہے، اور لوگوں کو بھی سکھلاتا ہے۔

حسد اور غبطہ کا مطلب

افادات:- حسد کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کسی کو کوئی نعمت عطا فرمائی جس کو دیکھ کر دوسرا آدمی یہ تمنا کرے کہ یہ نعمت اس کے پاس سے چھن جائے؛ اس کا نام حسد ہے، اور یہ تو حرام ہے۔ لیکن یہاں نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں کہ دو موقعوں پر حسد کی اجازت ہے۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہاں حسد بول کر حقیقۃً حسد مراد نہیں ہے، بلکہ "غبطہ" مراد ہے جس کو اردو میں "رشک" کہتے ہیں، اور رشک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی

کے پاس کوئی نعمت ہو اس کو دیکھ کر دوسرا آدمی اسی جیسی نعمت کی تمنا تو کرے، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے چھن جانے کی تمنا نہ کرے، بلکہ یہ تمنا کرے کہ اللہ تعالیٰ اس نعمت کو اس کے پاس باقی رکھتے ہوئے مجھے بھی اس جیسی نعمت عطا فرمائے، تو کسی کی کوئی نعمت دیکھ کر اسی جیسی نعمت خود کو بھی حاصل ہو ایسی تمنا کرنے کا نام غبطہ ہے

رشک کی چیز صرف مال نہیں

لفظ ''سَلَّطَهُ'' کا معنیٰ یہ ہے کہ مال اس کے دل ودماغ پر قابو اور کنٹرول کئے ہوئے نہیں ہے، بلکہ وہ خود مال کے اوپر کنٹرول کئے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ جو آدمی بخیل ہوتا ہے اس کے دل ودماغ پر مال قبضہ جمالیتا ہے، اور وہ خرچ ہونے ہی نہیں دیتا، لیکن یہاں وہ آدمی مال پر پورے طور پر کنٹرول کئے ہوئے ہے، جب خرچ کرنے کا موقعہ آتا ہے تو یہ بلا کسی تردّد کے خرچ کر دیتا ہے۔ تو دراصل یہاں رشک کی چیز صرف مال نہیں ہے بلکہ اس مال کو اللہ تعالیٰ کی بتلائی ہوئی جگہوں پر خرچ کرنے کی توفیق دیا جانا ہے۔ یہ دونوں چیزیں جمع ہوں تب تو رشک کی چیز ہے۔ ورنہ اگر صرف مال ہے اور وہ خرچ نہیں کرتا، یا غلط جگہوں پر خرچ کرتا ہے؛ تو یہ غبطہ اور رشک کی چیز نہیں ہے۔

صرف علم بھی نہیں ..

دوسرا آدمی وہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا، وہ اس علم کے ذریعہ لوگوں کو اس طرح فائدہ پہنچا رہا ہے کہ لوگوں کے نزاعات اور ان کے جھگڑوں کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ وہ علم دوسروں کو سکھلاتا بھی ہے؛ تو ایسا آدمی قابلِ رشک ہے۔ ایسے آدمی کو دیکھ کر یہ تمنا کی جاسکتی کہ اے اللہ! تو مجھے بھی ایسا علم عطا فرما، اور مجھے توفیق عطا فرما کہ اس علم کے ذریعہ تیرے حکم کے مطابق لوگوں کے نزاعات کے فیصلے کروں، اور دوسرے لوگوں کو بھی علم سکھلاؤں۔ تو گویا یہ دو آدمی اس قابل ہیں کہ ان کے اوپر رشک کیا جائے۔

ہدایت و علم سے فائدہ اُٹھانے والے

حدیث ۱۳۷۸:-

وعن أَبِي موسى -رضی اللہ عنه- قَالَ: قَالَ النبيُّ ﷺ: ((مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللهُ بِهِ مِنَ الهُدىٰ وَالعِلْمِ كَمَثَلِ غَيْثٍ أَصَابَ أَرْضاً؛ فَكَانَتْ مِنْها طَائِفَةٌ طَيِّبَةٌ قَبِلَتِ المَاءَ فَأَنْبَتَتِ الكَلأَ، وَالعُشْبَ الكَثِيرَ، وَكَانَ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ المَاءَ، فَنَفَعَ اللهُ بِهَا النَّاسَ، فَشَرِبُوا مِنْهَا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا،

وَأَصَابَ طَائِفَةً مِنْهَا أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قِيعَانٌ؛ لَا تُمْسِكُ مَاءً وَلَا تُنْبِتُ كَلأً. فَذٰلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقُهَ فِي دِينِ اللهِ، وَنَفَعَهُ مَا بَعَثَنِي اللهُ بِهِ، فَعَلِمَ وَعَلَّمَ. وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذٰلِكَ رَأْساً، وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم دے کر مجھے بھیجا ہے اس کی مثال بارش کی ہے جو آسمان سے کسی زمین پر برسی، اس زمین کا ایک حصہ تو وہ ہے جس نے اس پانی کو اپنے اندر جذب کر لیا، پھر اس پانی کی وجہ سے اس زمین نے گھاس اور سبزہ اُگایا (یعنی پانی کو اپنے اندر جذب کر کے لوگوں کو فائدہ پہنچایا کہ خوب سبزہ ہوا اور اس سے کھیتی باڑی میں پیداوار ہوئی)۔

دوسری زمین بالکل سخت ہے جس نے پانی کو اپنے اندر جذب تو نہیں کیا لیکن وہ پانی بہہ کر ختم بھی نہیں ہو گیا، بلکہ پانی کو اپنے اندر روک لیا، محفوظ اور (Reserved) کر لیا (وہ زمین زرخیز نہیں ہے، لیکن پانی کو اپنے اندر محفوظ رکھنے کی صلاحیت اس کے اندر ہے) تو اللہ تعالیٰ نے اس پانی کے ذریعہ سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا کہ لوگ وہاں سے پانی حاصل کر کے اپنے جانوروں کو پلانے اور کھیتیوں کو سیراب کرنے کی ضرورت پوری کرتے ہیں (یہ بھی فائدہ سے خالی نہیں ہے، اگرچہ اس نے خود تو فائدہ نہیں اٹھایا لیکن دوسروں کو فائدہ پہنچایا)۔

تیسری زمین بالکل چٹیل میدان ہے، وہاں ایسے گڑھے بھی نہیں ہیں جہاں پانی رُکا ہوا رہتا ہو، بالکل ہموار زمین ہے کہ جیسے ہی پانی گرتا ہے فوراً بہہ جاتا ہے (تو نہ خود اس زمین نے پانی اپنے اندر جذب

کر کے سبزہ وغیرہ اُگایا، اور نہ اس کو اپنے اندر محفوظ رکھا، گویا خود بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور دوسروں کو فائدہ اُٹھانے کے لئے اپنے پاس جمع بھی نہیں رکھا بلکہ بالکل ضائع کر دیا)۔

حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: یہی مثال ہے اس آدمی کی جس نے اللہ تعالیٰ کے دین میں سمجھ حاصل کی، اور جو علم اور ہدایت دے کر مجھے بھیجا گیا ہے اس سے خود بھی فائدہ اٹھایا کہ خود سیکھا اور دوسروں کو بھی سکھلایا (یہ تو پہلی قسم ہے)۔

دوسرا آدمی وہ ہے کہ میرے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت اور علم لوگوں کی طرف بھیجا ہے اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، نہ اس کو حاصل کیا اور نہ اپنے پاس محفوظ کیا۔ نہ خود فائدہ اٹھایا، نہ دوسروں کے لئے فائدہ کا ذریعہ بنا (وہ تیسری زمین کی طرح ہے)۔

افادات:- اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ذریعہ ہدایت اور علم کی یہ نعمتیں جو ہمارے پاس بھیجی ہیں ان کے ساتھ لوگوں کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا بارش کے ساتھ زمین کا ہوتا ہے۔ پہلی زمین جس نے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا، وہ آدمی ہے جو علم حاصل کرنے کے بعد خود بھی عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے، گویا خود بھی فائدہ حاصل کر رہا ہے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچا رہا ہے۔

دوسری زمین جس نے خود تو فائدہ نہیں اُٹھایا لیکن وہاں پانی جمع رہتا ہے، جیسے: تالاب اور بڑے بڑے گھاٹ ہوتے ہیں ، وہ آدمی ہے جو علم حاصل کرنے بعد عمل تو نہیں کرتا لیکن دوسروں کو پہنچاتا ہے، تو اس سے بھی دوسروں کو کچھ نہ کچھ فائدہ تو ملا۔

اور تیسری زمین بالکل ہموار میدان ہے جو اپنے اندر پانی کو روکے رکھنے کی بھی طاقت نہیں رکھتی، نہ اپنے اندر پانی روکے رکھتی ہے، نہ سبزہ اُگانے کی اس میں صلاحیت ہے۔

ایک آدمی کی ہدایت کا ذریعہ بن جاؤ

حدیث ۱۳۷۹:-

وعن سهل بن سعد -رضى الله عنه- : أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ لِعَلِيٍّ -رضى الله عنه- :((فَوَاللهِ! لأَنْ يَهْدِيَ اللهُ بِكَ رَجُلاً وَاحِداً خَيْرٌ لَكَ مِنْ أَنْ يَكُونَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ)). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ کسی ایک آدمی کو بھی سیدھا راستہ بتلادیں ، تم کسی ایک آدمی کے لئے بھی ہدایت کا ذریعہ بن جاؤ؛ تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

غزوۂ خیبر کا کچھ حال

افادات:- نبی کریم ﷺ نے یہ ارشاد غزوۂ خیبر کے موقعہ پر فرمایا تھا۔ قصہ یہ پیش آیا تھا کہ پہلے روز حضور اکرم ﷺ نے جھنڈا دے کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھیجا، انھوں نے اپنے بہادری کے جوہر دکھلائے، لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔ دوسرے روز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھیجا، لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔ اگلے روز کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کل میں ایک ایسے آدمی کو جھنڈا دوں گا جو اللہ اوراس کے رسول سے محبت کرتا ہے، اور اللہ اوراس کے رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں ۔ چناں چہ دوسرے دن صحابہ اس انتظار میں تھے کہ کس کی قسمت کھلتی ہے، اور حضورِ اکرم ﷺ کی طرف سے کس کو بلایا جاتا ہے۔ بلکہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس موقعہ پر بعض حضرات سامنے بھی آرہے تھے، جیسا کہ ایسے موقعوں پر جب کسی بڑے کی طرف سے کوئی چیز دی جانے والی ہو تو سب اپنا سر اونچا کرتے ہیں کہ شاید ہماری طرف توجہ ہو اور ہمارا نمبر لگ جائے۔

خیر ! حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا: علی کہاں ہیں ؟ دراصل اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آشوبِ چشم کی شکایت تھی (جس کو ہم ”آنکھ آنا“

کہتے ہیں)وہ وہاں موجود نہیں تھے، حضورِ اکرم ﷺ کو بتلایا گیا، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان کو بلاؤ۔ وہ بلائے گئے، حضورِ اکرم ﷺ نے اپنا لعابِ دہن ان کی آنکھوں میں لگایا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں فوراً ٹھیک ہو گئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر زندگی بھر کبھی مجھے آشوبِ چشم کی شکایت نہیں ہوئی۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کو جھنڈا دیا کہ مقابلہ کے لیے جاؤ۔ اس وقت انہوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! جو بھی اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ پر آئے اس کو قتل کر دوں ؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نہیں !بلکہ پہلے ان کو اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ اسلام اور ایمان قبول کر لیتے ہیں تو پھر ان کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں ، اور ان کی بھی وہی ذمہ داریاں ہوں گی جو ہماری ہیں ، اور ان کی جان ومال کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی جیسی ہماری جان ومال کی کی جاتی ہے۔ اور اگر وہ انکار کریں تو پھر ان سے جزیہ کا مطالبہ کرنا، اور اگر وہ اس سے بھی انکار کریں تو پھر ان کا مقابلہ کرنا اور ان سے لڑنا۔

اسی موقعہ پر نبیٔ کریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ کسی ایک آدمی کو بھی سیدھا راستہ بتلادیں اور تم کسی ایک آدمی کے لئے بھی ہدایت کا ذریعہ بن جاؤ یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ عرب میں سرخ اونٹ سب سے عمدہ مال سمجھا جاتا تھا، اگر کسی کے پاس ہوتے تو وہ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت اور صاحبِ

ثروت سمجھتا تھا۔ تو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: اگر آپ کے ذریعہ کسی کو اللہ تعالیٰ ہدایت دیدیں، تم کسی کی ہدایت اورراہِ راست پر آنے کا ذریعہ بن جاؤ؛ تو یہ دنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بھی بڑھ کر ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی آدمی کسی کے لئے ہدایت کا ذریعہ اسی وقت بنے گا جب کہ پہلے ہدایت کا علم اسے بھی حاصل ہو۔ گویا علم ہی کی برکت سے یہ چیز آدمی کو حاصل ہو سکتی ہے، اس مناسبت سے یہ روایت یہاں پیش کی ہے۔

دین کی ایک بات بھی دوسروں تک پہنچاؤ

حدیث ۱۳۸۰:-

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص: أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ : بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً، وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلاَ حَرَجَ، وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میری طرف سے لوگوں کو پہنچاؤ، چاہے وہ ایک آیت ہی ہو۔ اور بنو اسرائیل کی طرف سے جو باتیں تم تک پہنچتی ہیں ان کو بھی بیان کرسکتے ہو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں اور جو آدمی جان بوجھ کر میرے اوپر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانا جہنم کے اندر بنالے۔

افادات:- اگر کسی نے ایک آیت سنی ہے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ ایک آیت ہی تو ہے، اس کا لوگوں کے سامنے کیا اظہار کرنا؟ ایسا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ جس کو دین کا جتنا بھی علم پہنچا ہو وہ اس کو دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کے پاس دین کا جتنا بھی صحیح علم آجائے اس پر یہ فریضہ عائد ہو جاتا ہے کہ اس علم کو دوسروں تک پہنچائے۔ اسی لئے حجۃ الوداع کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا، اس میں آپ نے یہی فرمایا تھا: ”فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ“ جو لوگ موجود ہیں اور میری ان باتوں کو سن رہے ہیں وہ ایسے لوگوں تک یہ باتیں پہنچادیں جو یہاں موجود نہیں ہیں، جن تک یہ باتیں نہیں پہنچی ہیں۔ یہاں پر ”وَلَوْ آيَةً“ کہہ کر یہی بتلانا مقصود ہے کہ دین کا چھوٹے سے چھوٹا جزو بھی اگر کسی کے علم میں ہے تو اتنے علم کی بنیاد پر اس پر اتنی ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے کہ وہ بھی دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔

اسرائیلیات بیان کرنے کا حکم

”وَحَدِّثُوا عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ وَلَا حَرَجَ“ بنو اسرائیل کی طرف سے جو باتیں پہنچتی ہیں ان کی نوعیتیں مختلف ہیں، اگر وہ مسائل اور شرعی حکم سے تعلق رکھنے والی بات ہے تو

دوحال سے خالی نہیں ، یا تو نبی ٔ کریم ﷺ جو چیزیں لے کر آئے اور آپ پر جو وحی نازل ہوئی اورآپ نے جو ارشادات فرمائے ان کے ذریعہ سے اس بات کی تائید ہو گی، یا تردید ہو گی۔ اگر تردید ہوتی ہو تو پھر ظاہر ہے کہ اس کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ، الّا یہ کہ کوئی آدمی تردید کے طور پر اس کو بیان کرے کہ قرآنِ کریم کی فلاں آیت سے یا حضور ﷺ کے فلاں ارشاد سے اس کی تردید ہو رہی ہے، اس لئے اس کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ اور اگر تائید ہوتی ہے تو پھر قرآنِ پاک کی وہ آیت یا حضور ﷺ کا وہ ارشاد ہی کافی ہے، لہٰذا اس کو بیان کرنے کی کیا ضرورت رہی؟ حضور ﷺ کے پاک ارشادات ہی ان چیزوں سے بہت بڑھ کر ہیں ۔

اور ان کا کوئی قصہ اور عبرت کی بات جس کو سن کر آدمی کچھ نہ کچھ نصیحت حاصل کر سکتا ہے اس کو بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اگر شریعت کے کسی حکم سے ٹکراتی نہ ہو۔ چوں کہ بنی اسرائیل کا لمبا زمانہ گزرا ہے اور ان کے بہت سارے واقعات احادیث میں بھی آتے ہیں ، اس زمانہ کے کچھ حالات و واقعات اور ان کے نیک لوگوں کے قصّے اور ان کی عبرت کی باتیں نبی ٔ کریم ﷺ سے بھی نقل کی جاتی ہیں ، تو اس نوع کی باتیں اگر ان سے بھی براہِ راست ملی ہیں اور اس قصہ کے ذریعہ کوئی عبرت حاصل ہوتی ہے، سبق ملتا ہے، یا نصیحت حاصل ہوتی ہے

اوراس کو بیان کرنے سے شریعت کے کسی حکم پر کوئی زد بھی نہیں پڑتی تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کو بیان کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ہاں! احکام سے تعلق رکھنے والی چیز کو بیان کرنے کی اجازت نہیں۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ کی مجلس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ تورات کے چند اوراق لے کر حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تورات کے اوراق ہیں، یہ کہہ کر فوراً پڑھنا شروع کر دیا۔ اب وہ تو اندر دیکھ کر پڑھنے میں مشغول تھے، ادھر نبیٔ کریم ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ بدل گیا، آپ ﷺ کے چہرے پر ناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے، لیکن چوں کہ وہ تو پڑھنے میں مشغول تھے اس لیے ان کو پتہ ہی نہیں تھا کہ حضور کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ یہ منظر دیکھ رہے تھے، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو متنبہ کیا: ''ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا عُمَرُ، أَلَا تَرٰى مَا بِوَجْهِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ'' اے عمر! تمہاری ماں تمہیں روئے، تم دیکھتے نہیں کہ ناراضگی کی وجہ سے حضورِ اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کا کیا حال ہو رہا ہے؟ تب انہوں نے اُدھر سے رُخ ہٹا کر دیکھا تو ناراضگی کے آثار کو محسوس کیا، فوراً معافی مانگتے ہوئے کہنے لگے: ''نَعُوْذُ بِاللهِ مِنْ غَضَبِهٖ وَغَضَبِ رَسُوْلِهٖ، رَضِيْنَا بِاللهِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِيْناً وَبِمُحَمَّدٍ ﷺ نَبِيًّا وَّ رَسُوْلاً'' ہم اللہ اور اس کے رسول کی ناراضگی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور نبیٔ کریم

ﷺ کے اللہ کے نبی اور رسول ہونے پر راضی ہیں ۔ گویا اور کسی چیز کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔اس وقت نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آج اگر حضرت موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو ان کو میری پیروی کئے بغیر چارۂ کار نہیں تھا۔پھر ارشاد فرمایا:اگر آج حضرت موسیٰ ہوتے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کی پیروی کرتے تو گمراہ ہو جاتے۔ مطلب یہ تھا کہ شریعتِ اسلامیہ کے آنے کے بعد پچھلی تمام کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں ،اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔

بہرحال!اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے بنو اسرائیل کی باتیں بیان کرنے کی اجازت تو مرحمت فرمائی اور فرمایا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے،اس سے صرف وہی باتیں مراد ہیں جو عبرت کی ہوں،یا کسی قصہ سے کوئی سبق ملتا ہو اور کوئی نصیحت حاصل ہوتی ہو۔ اور اس نوع کی چیزیں احادیث میں بھی آئی ہیں ،اس کے علاوہ براہِ راست ان کی کتابوں اور تاریخ سے اگر اس نوع کی کوئی چیز ملے اور اس سے اسلام کے کسی حکم پر کوئی زد بھی نہ پڑتی ہو؛ تو اس کو بیان کرنے میں کوئی اشکال نہیں ہے۔

وہ اپنا ٹھکانا جہنم کے اندر بنالے

’’وَمَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ‘‘ جو آدمی میرے اوپر جان بوجھ کر جھوٹ باندھے وہ اپنا ٹھکانا جہنم کے اندر بنالے۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کی طرف کسی بات کی نسبت کرنا کہ یہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے، حالاں کہ وہ بات حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد نہیں فرمائی ہے تو وہ آدمی اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے۔ اسی لئے علماء میں سے بعض حضرات جیسے احناف میں سے علامہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ، اور شوافع میں سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ: کوئی آدمی یہ جانتے ہوئے کہ حضور ﷺ کا ارشاد نہیں ہے پھر بھی آپ کی طرف اس بات کو منسوب کرے؛ تو وہ کافر ہو جائے گا اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس لیے اس سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

حدیث نقل کرنے کے معاملہ میں صحابہ کا حال

حضورِ اکرم ﷺ کا یہی ارشاد تھا جس کی وجہ سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی حدیث کو بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے، بلکہ جو ارشاد انہوں نے حضور اکرم ﷺ سے براہِ راست سنا تھا اس کو بھی جب بیان کرنے کا وقت آتا تھا تو یوں کہا کرتے تھے کہ:

”حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اسی طرح، یا اس کے قریب قریب، یا اس جیسا ارشاد فرمایا ہے“۔ اسی حدیث اور وعید کی وجہ سے بعض حضراتِ صحابہ تو حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد نقل فرما کر کہتے ہی نہیں تھے کہ یہ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے۔ اسی لئے علماء نے حدیث کو بیان کرنے کے معاملہ میں بڑی احتیاط کا حکم دیا ہے۔

روایت بالمعنیٰ کا حکم

حدیث نقل کرنے کی ایک شکل تو یہ ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانِ مبارک سے جو الفاظ سنے ہیں ہو بہو وہی الفاظ یاد ہوں اور بیان کر دیں ؛تب تو کوئی اشکال نہیں ہے، لیکن اگر حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشاد فرمائے ہوئے الفاظ ہو بہو تو نہیں ہیں، ان الفاظ کا مفہوم اور مطلب کوئی آدمی اپنے الفاظ کے اندر بیان کرے؛ تو یہ درست ہے یا نہیں ؟ تو اگرچہ اکثر علماء نے اس کی اجازت دی ہے کہ وہ آدمی جو نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشادات کا مطلب بالکل صحیح سمجھا ہے اور اپنے الفاظ میں اگر اس کا مفہوم قریب قریب کہہ کر بیان کرے تو اس کی اجازت ہے۔ لیکن بعض حضرات اسی حدیث کی وجہ سے اس طرف گئے ہیں کہ روایت بالمعنیٰ یعنی مفہوم بیان کرنے کی اجازت نہیں ہے، ہو بہو وہی الفاظ یاد ہیں تو ہی بیان کئے جائیں ۔

جنّت کا راستہ

حدیث ۱۳۸۱ :-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : ((وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقاً يَلْتَمِسُ فِيهِ عِلْماً ، سَهَّلَ اللهُ لَهُ طَرِيقاً إِلَى الْجَنَّةِ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کوئی ایسا راستہ چلا جس پر چل کر وہ علم حاصل کرنا چاہتا ہے (یعنی علم حاصل کرنے کے لئے جو بھی طریقہ اور شکل اختیار کرے گا) تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنّت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں ۔

افادات:- گویا علم کا حاصل کرنا آدمی کے لئے جنّت تک پہنچنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ بھی علم کی بہت بڑی فضیلت ہے، لیکن یہ تب ہے کہ جو علم اس نے حاصل کیا ہے اس کے تقاضوں کو پورا کرے اوراس کے حقوق کی ادائیگی کا اہتمام کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جس کے لئے علم کی راہیں آسان کردیں تو امید یہی ہے کہ اس کے تقاضوں اور حقوق کی ادائیگی بھی اس کے لئے آسان کی جائے گی۔

اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ

حدیث ۱۳۸۲:-

وعنه أيضاً - رضی الله عنه -: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((مَنْ دَعَا إِلَى هُدىً كَانَ لَهُ مِنَ الأَجْرِ مِثْلُ أُجُورِ مَنْ تَبِعَهُ لاَ يَنْقُصُ ذَلِكَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئاً. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی ہدایت اور اچھی بات کی طرف لوگوں کو دعوت دے اور رہنمائی کرے؛ تو جتنے لوگ اس کی بات کی پیروی کریں گے اس کو ان سب کے برابر ثواب ملے گا، اور اس کو جو ثواب مل رہا ہے یہ ان لوگوں کے ثواب میں کمی نہیں کرے گا۔

افادات:- گویا ان کو اپنے عمل کا پورا پورا ثواب ملے گا لیکن چوں کہ وہ آدمی ان کے لئے اس علم و عمل کا ذریعہ بنا ہے اس لئے ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو بھی ثواب ملے گا، جیسا کہ حدیث میں آتا ہے: "اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهِ" بھلائی اور نیکی کی بات پر دلالت کرنے والا اور اچھی بات بتلانے والا، خیر کی طرف رہنمائی کرنے والا بھی عمل کرنے والے کی طرح ہے۔

صدقۂ جاریہ

حدیث ۱۳۸۳:-

وعنہ قَالَ: قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلاَّ مِنْ ثَلاثٍ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب انسان کا انتقال ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے (زندگی میں آدمی جو بھی نیک کام کیا کرتا ہے اس پر اجر و ثواب ملتا ہے، ظاہر ہے کہ موت کی وجہ سے وہ سلسلہ باقی نہیں رہتا) البتہ تین چیزیں ایسی ہیں (کہ مرنے کے بعد بھی ان کے اجر و ثواب کا سلسلہ جاری رہے گا) ایک تو صدقۂ جاریہ۔ دوسرے کوئی علمی چیز جس سے اس کی موت کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں۔ تیسرے نیک اولاد جو اس کے لئے دعائے خیر کرتی رہے۔

افادات:- "صدقۂ جاریہ" یعنی نیکی اور خیر کا کوئی ایسا کام کیا جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کا سلسلہ اس کے مرنے کے بعد بھی جاری ہے، جیسے: کہیں مسجد تعمیر کرادی کہ اس کی موت کے بعد بھی اس مسجد میں لوگوں کے نماز پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ یا کہیں مدرسہ تعمیر کروادیا، یا کہیں کنواں کھدوا دیا جس سے لوگ اور جانور فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یا کوئی مہمان خانہ، مسافر خانہ تعمیر کرادیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس طرح کے جتنے بھی کام ہیں جن

سے اس کی موت کے بعد بھی فائدہ پہنچ رہا ہے تو جب تک لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے وہاں تک اس کو بھی ثواب ملتا رہے گا؛ یہی صدقۂ جاریہ کہلاتا ہے۔

نفع بخش علم

"أَوْعِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهِ" یا کوئی علمی کام ایسا کیا جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی فائدہ اُٹھایا جاتا رہے، جیسے: کسی کو کوئی علمی بات سکھائی، کسی کو نماز پڑھنے کا طریقہ سکھایا؛ تو چاہے سکھانے والے کا انتقال ہو گیا، لیکن جس کو اس نے سکھایا ہے وہ جب تک نماز پڑھتا رہے گا، اُس کو تو اُس کے نماز پڑھنے پر ثواب ملتا رہے گا، لیکن چوں کہ اُس کو نماز سکھانے والا یہ تھا تو اِس کو بھی ثواب ملے گا۔ پھر اگر اُس نے کسی دوسرے کو نماز سکھائی اور اس نے کسی تیسرے کو سکھائی اور اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا تو جب تک وہ سلسلہ جاری رہے گا تب تک اس پہلے کے ثواب کا سلسلہ بھی ذریعہ اور واسطہ بننے کی وجہ سے جاری رہے گا۔

یا کوئی کتاب تصنیف کر دی جس کے ذریعہ لوگوں تک دین کی باتیں پہنچ رہی ہیں تو جب تک اس کتاب سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے تب تک اس کو بھی ثواب ملتا رہے گا۔ گویا علم سے فائدہ پہنچنے کی جو بھی شکل ہو وہ ساری شکلیں فائدہ مند علم میں داخل ہونے

کی وجہ سے مرنے کے بعد ثواب حاصل ہونے کا ذریعہ بنیں گی، چاہے کوئی آدمی اس کے لئے ایصالِ ثواب کا اہتمام کرے یا نہ کرے۔

نیک اولاد

"اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ یَدْعُوْ لَهٗ" یا نیک اولاد جو اس کے لئے دعائے خیر کرتی رہے۔ غور کیجئے کہ یہاں صرف اولاد نہیں کہا، بلکہ نیک اولاد کہا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو نیک بنانے کے لئے بھی آدمی کو محنت اور اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ اولاد ماں کے پیٹ ہی سے نیک بنی بنائی تو پیدا نہیں ہوتی، بلکہ پیدا ہونے کے بعد ماں باپ کی طرف سے ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا اگر اہتمام کیا جائے گا اسی کے نتیجہ میں وہ نیک بنے گی، اور نیک بنے گی تب ہی اس کے لئے دعائے خیر کا اہتمام بھی کرے گی، اور اس کی موت کے بعد یہ سلسلہ جاری رہے گا؛ تو اس کو اس کا ثواب ملتا رہے گا۔

دنیا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے؛ سوائے

حدیث ۱۳۸۴:-

وعنه قَالَ:سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول:((الدُّنْيَا مَلْعُونَةٌ ، مَلْعُونٌ مَافِيهَا، إِلاَّ ذِكْرَ الله تَعَالَى، وَمَا وَالاهُ، وَعَالِماً، أَوْ مُتَعَلِّماً)) (رواه الترمذی.وقال:حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دنیا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے، اور جو کچھ بھی دنیا میں ہے (وہ سب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہے) البتہ (اس قاعدہ سے چند چیزیں مستثنیٰ ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور نہیں ،بلکہ اللہ کی رحمت سے قریب ہیں، ایک تو) اللہ تعالیٰ کا ذکر اور جو اس کے قریب ہو، اور علم سکھانے والا، یا علم سیکھنے والا۔

افادات:- "وَمَا وَالَاہُ" میں "ہٗ" سے مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے یعنی جو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے قریب ہو، اس صورت میں ہر وہ چیز اس میں داخل ہو جائے گی جو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں معین ومددگار ہو، اور جس کو اختیار کرنے سے آدمی سہولت اور آسانی سے ذکر اللہ میں مشغول ہو سکے۔ چناں چہ بقدرِ ضرورت کھانا پینا، اور زندگی کے ضروری اسباب کو اختیار کرنا بھی اس میں داخل ہو گا۔

اور اُس صورت میں اللہ کا ذکر بول کر صرف زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر مقصود نہیں ہو گا بلکہ تمام طاعات اور وہ تمام چیزیں جو عبادات کے قبیل سے ہیں ،یعنی وہ تمام عبادتیں جن سے اللہ تعالیٰ کو راضی کیا جاتا ہے، اور جو چیزیں بھی ذکر اللہ میں معین ومددگار ہیں وہ سب "وَمَاوَالَاہُ" میں آجائیں گی۔

اور اگر ’’وَمَا وَالَاہُ‘‘ سے اللہ تعالیٰ کی ذات مراد لی جائے، تو یہاں مجلس میں اہلِ علم موجود ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ پہلی صورت میں ’’وَمَاوَالَاہُ‘‘میں ضمیر منصوب متصل ہے جو ذکر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے، اور دوسری صورت میں ضمیر لفظ ’’اللہ‘‘ کی طرف لوٹے گی **’سوائے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے، اور جو اللہ کے قریب ہو‘**۔ اللہ کے قریب وہ تمام چیزیں ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہیں ۔اس صورت میں پہلے جو لفظ ذکر اللہ آیا اس سے مخصوص ذکر مراد ہو گا جس کو ہم بھی اپنی عام بول چال اور عرف میں ذکر بولتے ہیں ۔

بہر حال !اس روایت میں یہ بتلادیا گیا کہ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت کے قبیل سے ہو وہ ملعون نہیں ہے، اور دنیا کی دوسری تمام چیزیں جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والی ہیں اور جن میں مشغولی کے نتیجہ میں آدمی اللہ تعالیٰ سے غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ سب ملعون ہیں ۔

علم کی اہمیت اور فضیلت

’’وَعَالِماً أَوْ مُتَعَلِّماً‘‘ اور علم سکھانے والا، اور علم سیکھنے والا؛ دونوں بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہونے والے قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں ،یعنی یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور

نہیں، بلکہ قریب ہیں۔اور غور کیجئے کہ اوپر ” وَمَا وَالَاہُ “کا جو مطلب بیان کیا تھا، علم بھی اس میں آجاتا تھا، اور جو لوگ علمی مشغلہ -سکھانے یا سیکھنے- میں ہیں وہ بھی ایک طرح کی عبادت ہونے کی وجہ سے اس میں شامل تھے، لیکن علم کی اہمیت کو بتلانے کے لئے نبیٔ کریم ﷺ نے خاص طور پر الگ سے اس کا تذکرہ فرمایا۔اس سے علم کی اہمیت اور فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے

حدیث ۱۳۸۵:-

وعن أنسٍ -رضی اللہ عنہ- قَالَ قَالَ رسولُ اللہ ﷺ: مَنْ خَرَجَ فی طَلَبِ العِلْمِ فَھُوَ فی سَبیلِ اللہِ حَتّٰی یَرْجِعَ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی علم حاصل کرنے کے لیے نکلا وہ اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ہے، یہاں تک کہ علم حاصل کرکے اپنے گھر واپس نہ لوٹ آئے۔

افادات:- ”اللہ تعالیٰ کے راستہ“ کا مفہوم عام ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کے لئے جو کام بھی کیا جائے گا، جیسے: کوئی آدمی نماز کے لئے نکلا، حج کی ادائیگی کے لئے نکلا،

دین کی تبلیغ کے لئے نکلا؛ علم حاصل کرنے کے لیے نکلنے والا؛ یہ سارے کام ”فی سبیل اللہ“ میں داخل ہیں۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب الجامع الصحیح میں باب قائم کیا ہے: ”بَابُ الْمَشْيِ إِلَى الْجُمُعَةِ“ جمعہ کی نماز کے لئے اپنے گھر سے چل کر نکلنا، اس کے تحت اس روایت کو ذکر کیا ہے جس میں ہے کہ جس کے قدم اللہ کے راستہ میں غبار آلود ہوئے، اللہ تعالیٰ اس کو جہنم پر حرام کردیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے لئے گھر سے نکلنا بھی اللہ کے راستہ میں نکلنے کے مفہوم میں داخل ہے(۱)۔

مؤمن تھوڑی خیر سے مطمئن نہیں ہوتا

حدیث ۱۳۸۶:-

وَعَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُولِ اللهِ ﷺ قَالَ: لَنْ يَّشْبَعَ مُؤْمِنٌ مِنْ خَيْرٍ حَتّٰى يَكُونَ مُنْتَهَاهُ الْجَنَّةَ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

(۱) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: حَدَّثَنَا الْوَلِيدُ بْنُ مُسْلِمٍ قَالَ: حَدَّثَنَا يَزِيدُ بْنُ أَبِي مَرْيَمَ قَالَ: حَدَّثَنَا عَبَايَةُ بْنُ رِفَاعَةَ قَالَ أَدْرَكَنِي أَبُو عَبْسٍ وَأَنَا أَذْهَبُ إِلَى الْجُمُعَةِ فَقَالَ: سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ: مَنِ اغْبَرَّتْ قَدَمَاهُ فِي سَبِيلِ اللهِ حَرَّمَهُ اللهُ عَلَى النَّارِ. (باب الْمَشْيِ إِلَى الْجُمُعَةِ)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ایمان والا بھلائی کی چیز سے سیر نہیں ہوتا (یعنی مؤمن کا پیٹ تھوڑی خیر سے مطمئن نہیں ہوتا) یہاں تک کہ اس کا انجام جنت ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ مؤمن کی شان یہ ہوتی ہے کہ اگر علم حاصل کرتا ہے تو پورا حاصل کرتا ہے یہاں تک کہ اس کو اپنے لئے جنت تک پہنچنے کا ذریعہ بنالیتا ہے۔

جیسے میری فضیلت تم پر

حدیث ۱۳۸۷:-

وَعَنْ أَبِي أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ: فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِي عَلَى أَدْنَاكُمْ. ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ حَتَّى النَّمْلَةَ فِيْ جُحْرِهَا وَحَتَّى الْحُوْتَ لَيُصَلُّوْنَ عَلَى مُعَلِّمِي النَّاسِ الْخَيْرَ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے کسی معمولی آدمی پر، اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اور آسمان و زمین کے رہنے والے، یہاں تک کہ چیونٹیاں

اپنے بل میں ،اور مچھلیاں بھی ان لوگوں کے لیے رحمت کی دعا کرتی ہیں جو لوگوں کو(علم) سکھانے والے ہیں۔

افادات:–ظاہر ہے کہ نبی ٔکریم ﷺ کو ساری انسانیت پر فضیلت حاصل ہے، اور آپ ﷺ تمام انبیاء کے سردار ہیں،تواب کسی معمولی انسان کے مقابلہ میں حضورِاکرم ﷺ کی فضیلت کیسی زبردست ہوگی!جیسے ایک معمولی آدمی کے مقابلہ میں فضیلت کا جو درجہ حضوراکرم ﷺ کو ہے وہی فضیلت کا درجہ ایک عالم کو عابد پر حاصل ہے،اس لیے کہ عابد صرف عبادت میں مشغول ہے،اس کا فائدہ اس کی اپنی ذات تک محدود ہے،اور ایک عالم علم سیکھنے کے بعد دوسروں کو سکھا کر اس کے فائدے کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

ہر مخلوق دعا کرتی ہے

اللہ تعالیٰ رحمت بھیجتے ہیں، فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں ،اورآسمان وزمین کی رہنے والی تمام مخلوقات؛یہاں تک کہ زمین پر رہنے والی چھوٹی سے چھوٹی مخلوق چیونٹی،اور سمندر میں رہنے والی مچھلیاں بھی اُس آدمی کے لئے دعائے رحمت کرتی ہیں جو لوگوں کو علم دین

سکھاتا ہو۔اس سے عالم کی کتنی بڑی فضیلت معلوم ہوئی کہ اس کے لئے تمام مخلوقات دعاؤں کا اہتمام کرتی ہے۔

فرشتے پر بچھاتے ہیں

حدیث ۱۳۸۸:-

وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاء رضی اللہ عنہ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يَقُولُ: مَنْ سَلَكَ طَرِيقاً يَبْتَغِي فِيهِ عِلْماً سَهَّلَ اللهُ لَهُ طَرِيقاً إِلَى الجَنَّةِ، وَإِنَّ المَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا لِطَالِبِ العِلْمِ رِضاً بِمَا يَصْنَعُ، وَإِنَّ العَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَمَنْ فِي الأَرْضِ حَتَّى الحِيتَانُ فِى المَاءِ، وَفَضْلُ العَالِمِ عَلَى العَابِدِ كَفَضْلِ القَمَرِ عَلَى سَائِرِ الكَوَاكِبِ، وَإِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، وَإِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَاراً وَلَا دِرْهَماً، وَإِنَّمَا وَرَّثُوا العِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ. (رواہ أبو داود والترمذی)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی کسی راستہ پر چلا (سفر کیا) اور اس کا مقصود علم حاصل کرنا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتے ہیں (یوں سمجھئے کہ طلب علم والا راستہ جنت کا راستہ ہے) اور فرشتے طالبِ علم سے خوش ہو کر (یعنی اس کے اس عمل پر اپنی مسرت اور خوشی کا اظہار کرتے ہوئے، یا طالبِ علم کے اکرام کے طور) اس کے لیے اپنے پروں کو بچھا دیتے ہیں۔ اور جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں؛ سب عالم کے لئے دعائے مغفرت کرتی ہیں، یہاں تک کہ پانی میں رہنے والی مچھلیاں

بھی۔اور عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت تمام ستاروں پر۔اور علماء نبیوں کے وارث ہیں ،اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام اپنے پیچھے دینار و درہم (روپے پیسے) نہیں چھوڑتے،بلکہ اپنے پیچھے علم چھوڑتے ہیں ،اس لیے جو آدمی بھی علم حاصل کرے اس کو چاہیے کہ خوب حاصل کرے۔

اس وجہ سے نبیوں کا وارث کہا گیا

افادات:- یعنی علم حاصل کرنے میں کوئی کمی نہ کرے،بلکہ خوب اہتمام کرے اور جتنا زیادہ علم حاصل کرے گا اُتنی ہی نبیوں کی میراث اس کو حاصل ہوگی۔

اب سوال یہ ہے کہ علماء کو نبیوں کا وارث کیوں کہا؟جواب یہ ہے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام اپنے پیچھے دنیا کا مال ومتاع نہیں چھوڑتے،بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعۂ وحی جو علم ان کو دیا جاتا ہے وہی علم اپنی امّت میں چھوڑ کر جاتے ہیں ،تو گویا علم نبیوں کی وراثت ہے،اور جو آدمی اس علم کو حاصل کرتا ہے ظاہر ہے کہ نبیوں کی وراثت حاصل کرتا ہے، اسی لئے اس کو نبیوں کا وارث قرار دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ اس کو ترو تازہ اور خوش حال رکھے۔

حدیث ۱۳۸۹ :-

وَعَنِ ابنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللہِ ﷺ يَقُوْلُ: نَضَّرَ اللہُ امْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئاً، فَبَلَّغَهُ كَمَا سَمِعَهُ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ.** (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ اس آدمی کے چہرے کو ترو تازہ رکھے (یعنی خوش رکھے) جس نے ہم سے کوئی بات سنی، اور پھر اس کو جیسا سنا تھا ویسا ہی دوسروں تک پہنچا دیا، اس لئے کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ جس کو پہنچایا گیا ہے وہ پہنچانے والے کے مقابلہ میں اس بات کو زیادہ محفوظ رکھتا ہے۔

حدیث پڑھنے پڑھانے کی سب سے بڑی فضیلت

افادات:- چوں کہ اہلِ علم کا مشغلہ یہی ہے، اولاً خود پڑھنا اور سیکھنا، پھر دوسروں کو سکھانا اور ان تک پہنچانا، اس لیے اس بشارت میں وہ بھی داخل ہیں۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے تقریرِ بخاری میں فرمایا ہے: علمِ حدیث پڑھنے پڑھانے کے بہت سارے فضائل ہیں ان میں سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ جو آدمی نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو سنے

پھر اس کو دوسروں تک پہنچائے، نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے یہ دعا فرمائی ہے کہ **"اللہ تعالیٰ اس کو تروتازہ اور خوش حال رکھے"۔**

کبھی ایسا ہوتا ہے...

دوسروں تک پہنچانے پر اس کو یہ فضیلت کیوں حاصل ہوئی ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی بات سنی اور وہ بات آپ نے دوسرے کسی کو پہنچائی، کچھ مدّت کے بعد آپ تو بھول گئے، لیکن جس کو بتلائی تھی اس نے اس بات کو برابر یاد رکھا اور وہ دوسروں کو بتلا رہا ہے اور اس بات کو برابر آگے پہنچا رہا ہے۔ اس لئے علمِ دین کی جو بھی بات آدمی سنے اس کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اس کو پہنچائے، تاکہ خدانہ کرے کبھی خود بھول بھی جائے تو چوں کہ دوسروں تک پہنچا چکا ہے؛ تو یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہے گا اور اس کے لئے صدقۂ جاریہ کا کام دے گا۔

آگ کی لگام پہنائی جائے گی

حدیث ۱۳۹۰ :-

وعن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: مَنْ سُئِلَ عن عِلْمٍ فَكَتَمَهُ، أُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنْ نَارٍ. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی سے علم کی کوئی بات پوچھی گئی اور جاننے کے باوجود اس نے اس کو چھپایا تو قیامت کے روز اس کو آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

افادات:۔ یہاں وہ علم مراد ہے جس کا سیکھنا عمل اور عقیدہ کی درستگی کے لئے ضروری ہو، جیسے: کوئی آدمی نماز درست کرنا چاہتا ہے اور اس سے متعلق آپ کو معلومات حاصل ہیں، اب وہ آپ کے پاس کوئی بات پوچھنے آیا اور آپ جاننے کے باوجود اس کو نہ بتلائیں؛ تو اس وعید میں داخل ہیں۔

غیر ضروری سوالات کا جواب نہ دیا جائے

باقی جو غیر ضروری سوالات ہوتے ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کی عادت ہی ہوتی کہ فضول چیزیں پوچھتے رہتے ہیں جن کا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، فضول بحثوں کے قبیل سے ہوتی ہیں؛ تو ایسی کوئی بات اگر کوئی آدمی پوچھے اور اس کا جواب نہ دیا جائے تو وہ آدمی اس وعید میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ ایسی باتیں جن کا نہ تو کوئی دنیوی فائدہ ہے، نہ دینی فائدہ

ہے؛ان کے متعلق تو خود علماء نے لکھا ہے جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب شامی میں جہاں مسائلِ شتّٰی ذکر کئے ہیں وہیں یہ لکھا ہے کہ: ایسے سوالات کا تو جواب دیا ہی نہ جائے، بلکہ ان کو بتلایا جائے کہ بھائی! اس سے ضروری اور اہم تو دوسری چیزیں ہیں ،ان میں مشغول ہو جایئے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ کوئی آدمی اس طرح کا فضول سوال کرتا تھا تو جواب میں لکھا کرتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ نے زندگی اس لئے نہیں دی ہے کہ آدمی اس طرح کی فضولیات میں اپنے اوقات کو ضائع کرے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں ان کو معلوم کرو اوراسی میں لگے رہو، اس طرح کی فضولیات سے اپنے آپ کو بچاؤ۔

دوسرا رُخ

یہاں تک تو اللہ کے واسطے علم حاصل کرنے کی جو فضیلتیں بتلائی گئی ہیں جیسا کہ اوپر گزرا کہ اگر کوئی آدمی علم حاصل کرنے کے لئے گھر سے نکلتا ہے، یا کوئی راستہ اختیار کرتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کے واسطے جنّت کا راستہ ہموار فرمادیتے ہیں اور اس کو جنّت تک

پہنچادیتے ہیں ۔اب جہاں یہ فضیلت ہے،وہیں علم حاصل کرنے کے معاملہ میں اگر کوئی آدمی بدنیتی کا شکار ہوتا ہے،جیسا کہ علم اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے،دین کے احکام سے واقفیت حاصل کرکے اس پر عمل کرکے اپنے آپ کو دنیا وآخرت کی کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے سیکھنے کے بجائے دنیا کا سازوسامان حاصل کرنے کے لیے سیکھتا ہے،اس کا مقصد یہ ہے کہ مدرسہ میں جاکر کچھ عربی آجائے گی تو خلیج (Gulf) کے کسی ملک میں جاکر نوکری کرلیں گے،یاکسی سفارت خانہ میں ملازمت مل جائے گی،یا اور کوئی ایسا مقصد ہے کہ جس سے دنیاہی کا فائدہ مدِّنظر ہوتو اس کے متعلق کیا وعیدات ہیں ؛ان کو آگے بیان فرماتے ہیں ۔

جنّت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا

حدیث ۱۳۹۱ :-

وَعَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ:((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ-عز وجل-لا يَتَعَلَّمُهُ إِلاَّ لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضاً مِنَ الدُّنْيَا .لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الجَنَّةِ يَوْمَ القِيَامَةِ)) يَعْنِي : رِيحَهَا . (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی نے ایسا علم جس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے (یعنی علمِ دین) سیکھا صرف اس واسطے کہ اس کے ذریعہ دنیا کا سازوسامان حاصل کرے؛ تو ایسا آدمی قیامت کے روز جنّت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ پائے گا۔

افادات:- ایک تو دنیوی علم ہوتا ہے، جیسے: کوئی آدمی ڈاکٹری پڑھے، وہ تو اسی لئے پڑھا جاتا ہے کہ ڈاکٹر بن کر مال کماؤں گا۔ وکالت کا علم بھی اسی لئے پڑھا جاتا ہے کہ وکیل بن کر خوب پیسے کماؤں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جتنے بھی دنیوی علوم وفنون ہیں ان کو کوئی آدمی اگر اسی مقصد اور نیت سے پڑھتا ہے تو اس کے لئے یہ وعید نہیں ہے، اس لئے کہ یہ علوم اسی واسطے ہیں کہ ان سے دنیوی فائدے حاصل کئے جائیں ، لیکن دین کا علم دنیا کمانے کے لئے ہے ہی نہیں ، بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اس کی رضا جوئی کے واسطے ہے، اور اس لئے ہے کہ آدمی اس کو حاصل کرنے کے بعد عمل کا اہتمام کرکے دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے بہرہ وَر ہو۔ اسی لئے فرمایا کہ ایسا علم جس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے (یعنی قرآن وحدیث کا علم) کسی نے اس لئے پڑھا کہ اس کے ذریعہ دنیا کی دولت کمائے (اس کے لئے بہت سخت وعید ہے کہ) قیامت کے روز جنّت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

علم اُٹھائے جانے کی شکل

حدیث ۱۳۹۲:-

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما **قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ :((إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعاً يَنْتَزِعهُ مِنَ النَّاسِ، وَلٰكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتّٰى إِذَا لَمْ يُبْقِ عَالِماً، اتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُوساً جُهَّالاً، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا))**.(متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ تعالیٰ علم اس طرح قبض نہیں کریں گے کہ لوگوں کے دلوں میں سے نکال دیں، لیکن علماء کو اُٹھا کر علم کو اُٹھائیں گے، یہاں تک کہ جب روئے زمین پر کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ ایسے لوگوں کو اپنا سردار اور پیشوا بنالیں گے جو حقیقی عالم نہیں ہوں گے، پھر دین کے معاملہ میں ان سے سوالات کریں گے، تو جہالت کی وجہ سے بغیر علم کے وہ لوگ فتوے دیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

افادات:- قیامت کے قریب ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ علم اٹھا لیا جائے گا، لیکن اللہ تعالیٰ علم کو اس طرح نہیں اٹھائیں گے کہ کوئی عالم رات کو سوئے گا تو عالم ہوگا اور جب صبح کو اٹھے گا تو اس کا سارا علم کمپیوٹر کی میمری (Memory) کی طرح مٹ گیا ہوگا، بلکہ جو حاملینِ علم ہوں گے وہ دھیرے دھیرے دنیا سے رخصت ہوتے چلے جائیں گے، اور ان کی

جگہ لینے والے ان کے جیسے دوسرے علماء پیدا نہیں ہوں گے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ علم بھی ختم ہو جائے گا۔

صرف مطالعہ کافی نہیں

اس سے معلوم ہوا کہ کتابوں اور کتب خانوں کا باقی رہ جانا حقیقی علم کے باقی رہنے کے لئے کافی نہیں ہے، بلکہ "اَلْعِلْمَ بِالتَّعَلُّمِ" اصل علم اسی کو کہا جاتا ہے جو سیکھنے سکھانے کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، علم کے حصول کے لیے صرف کتابوں کا مطالعہ کافی نہیں ہے، خاص کر علمِ دین میں تو سند کو بنیادی حیثیت قرار دی گئی، یہاں تک کہ الفاظ کا بھی صحیح پڑھنا اس وقت تک نہیں آتا جب تک کسی معتبر استاذ سے نہ سیکھا جائے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں ایک قصہ بیان کیا ہے۔ پہلے زمانہ میں جب ٹائپ والا پریس نیا نیا شروع ہوا تھا تو آپ پرانے زمانہ کی عربی کتابیں جو ٹائپ پریس میں چھپی ہوئی ہیں ان کو دیکھیں گے تو اس میں چند حروف جیسے: "راء" وغیرہ بہت زیادہ گول ہوتے تھے، اور اس میں یہ بھی ہوتا تھا کہ حروف بالکل جُڑے ہوئے نہیں ہوتے تھے، بلکہ ان کے درمیان میں ذرا فاصلہ رہتا تھا، اور "راء" "واو" جیسا معلوم ہوتا تھا۔ تو

حضرت فرماتے ہیں کہ میرے بھائی جناب اکبر علی صاحب جو انگریزی پڑھے ہوئے تھے وہ ایک مرتبہ ٹرین کے اَپَر کلاس(Upper Class)میں سفر کررہے تھے، اسی کلاس میں کوئی انگریز بھی تھا۔بھائی صاحب قرآنِ پاک کی تلاوت کرنا چاہتے تھے تو انہوں نے قرآن مجید کا نسخہ نکالا۔ انگریز نے پوچھا: یہ کیا ہے۔ انہوں نے کہا: یہ قرآن مجید ہے جو ہماری مذہبی کتاب ہے۔اس نے کہا: میں دیکھ سکتا ہوں ؟انہوں نے کہا: ضرور! لیجئے۔اس نے جب کھولا تو" الرٰ"سے کوئی سورۃ شروع ہورہی تھی،وہ اردو پڑھنا جانتا تھا، تو کہنے لگا: یہ"آلو" کیا لکھا ہوا ہے؟ انہوں نے اس کے ہاتھ سے قرآنِ پاک لے لیا اور کہا: دیکھیے! یہ ہماری مذہبی کتاب ہے جو بغیر سیکھے کوئی بھی نہیں پڑھ سکتا۔

اور واقعہ یہی ہے کہ کوئی کتنا ہی عربی کا ماہر کیوں نہ ہو،بغیر سیکھے ہوئے وہ ٹھوکر کھا ہی جائے گا۔اس نے "راء" کو"واو" اس لیے پڑھا کہ وہ ذرا گول لکھا ہوا تھا۔ لیکن آج کل جبکہ تحریر صاف آتی ہے، اور کمپیوٹر کی کتابت میں "الرٰ" کو صاف تحریر میں لکھا ہوا ہوتا ہے تب بھی اگر کوئی آدمی قرآنِ پاک کسی استاذ سے پڑھنا نہ سیکھا ہو تو یقیناً آج بھی وہ "الرٰ"کو"الف،لام،راء" الگ الگ نہیں پڑھے گا۔چوں کہ عام طور پر عربی میں حروفِ تہجی ملا کر لکھے اور پڑھے جاتے ہیں اس لیے کہ ان کو بھی ملا کر ہی لکھا جاتا ہے لیکن پڑھا الگ الگ جاتا ہے،اسی لیے ان کو حروفِ مقطعات کہتے ہیں ۔"قَطَّعَ يُقَطِّعُ تَقْطِيْع"کا معنٰی ہوتا

ہے، کاٹ کاٹ کر پڑھنا۔ گویا یہ وہ حروف ہیں کہ لکھنے میں تو ساتھ ساتھ لکھے گئے ہیں لیکن الگ الگ پڑھے جائیں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآنِ پاک ایسی کتاب ہے کہ جب تک کہ کوئی آدمی اس کو کسی استاذ سے باقاعدہ پڑھنا نہیں سیکھے گا، اس کو تلاوت کا طریقہ بھی معلوم نہیں ہوگا۔

حاصلِ کلام

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے قریب ایک زمانہ آئے گا کہ اللہ تعالیٰ علم کو اُٹھالیں گے، تو ایسا نہیں ہوگا کہ اچانک ان کے سینوں میں سے علم غائب ہوجائے گا، بلکہ اس کی شکل یہی ہوگی کہ جن کے سینوں میں علم محفوظ ہے وہ اہلِ علم دھیرے دھیرے دنیا سے رخصت ہوتے چلے جائیں گے، اور علم حاصل کرکے ان کے مقام پر فائز ہونے والے لوگ پیدا نہیں ہوں گے۔ گویا علم کی طلب کی طرف سے غفلت برتیں گے اور جس نوع کی علم کی طلب پہلے والوں میں تھی اور جیسے ان لوگوں نے علم حاصل کیا تھا، بعد والے ایسی محنت سے علم حاصل نہیں کریں گے۔ اور جب دنیا میں کوئی عالم باقی نہیں رہے گا تو لوگ کسی کو—یوں سمجھ کر کہ یہ کچھ جانتا ہے اور عالم ہے—اپنا سردار اور پیشوا بنالیں گے اور دین کے معاملہ میں اس سے سوالات پوچھیں گے اور وہ حقیقت میں عالم نہیں ہوگا، اس کو

جیسا علم سیکھنا چاہیے تھا اس نے ایسا سیکھا نہیں ہو گا، ظاہری شکل و صورت کے اعتبار سے اس کو عالم سمجھ کر علم کا منصب دے دیا جائے گا۔ جیسے: کوئی فنِ افتاء سے واقف نہ ہو لیکن اس کو مفتی کی مسند پر بٹھا دیا جائے، یا کسی کو قضاء کا علم نہ ہو اور اس کو قاضی کی مسند پر بٹھا دیا جائے؛ تو نتیجہ یہ ہو گا کہ جب ایسے لوگوں سے مسائل پوچھیں جائیں گے، تو چوں کہ وہ حقیقی مسئلہ تو جانتے نہیں ہوں گے، لہٰذا اپنی جہالت کے ذریعہ بغیر علم کے فتوے دیں گے، اس مسئلہ کا جو اصلی جواب ہونا چاہیے وہ نہیں دیں گے، دوسرا ہی کچھ بتائیں گے؛ نتیجہ یہ ہو گا کہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔

اسی لئے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے غالباً حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے: اس سے پہلے کہ علم اُٹھالیا جائے اس کے سیکھنے کا اہتمام کرو، تا کہ جب دنیا سے اہلِ علم رخصت ہونے لگیں تو ان کی جگہ لینے والے انہیں کی طرح کے دوسرے لوگ موجود ہوں اور علم کا یہ سلسلہ باقی رہے۔

اس روایت کو لا کر یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ علم کے سیکھنے کی طرف خصوصی توجہ ہونی چاہیے، اور ایک جماعت مسلمانوں میں ایسی ہونی چاہیے جو اپنے آپ کو اس کام کے لئے فارغ کر دے، تا کہ یہ فرضِ کفایہ ادا ہو تا رہے، اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کی علم کی ضرورتیں پوری ہوں۔

کِتَابُ حَمْدِ اللّٰہِ تَعَالیٰ وَشُکْرِہٖ

اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اور اس کے شکر کا بیان

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ: فَاذْکُرُوْنِیْٓ أَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ.

وَقَالَ تَعَالیٰ: لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَأَزِیْدَنَّکُمْ وَلَئِنْ کَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ.

وَقَالَ تَعَالیٰ: وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ.

وَقَالَ تَعَالیٰ: وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ.

مَیں تمہیں یاد کروں گا

نیا عنوان قائم کیا ہے کہ بندوں کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت حاصل ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور تعریف بیان کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس کا شکر ادا کرنے کا بھی اہتمام کیا جائے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: ﴿فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ﴾ تم مجھے یاد کرو؛ میں تمہیں یاد کروں گا۔ نبی کریم ﷺ نے حدیثِ شریف میں اس کی تشریح فرمائی ہے کہ: جب میرا بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اسے یاد کرتا ہوں، اگر وہ تنہائی میں مجھے یاد کرتا ہے تو میں تنہائی میں اس کو یاد کرتا ہوں، اور اگر وہ مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس سے بہتر مجمع میں اس کو یاد کرتا ہوں۔

﴿وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ﴾ اور میرا شکر ادا کرو، ناشکری نہ کرو۔ شکر یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کی قدردانی۔ اللہ تعالیٰ نے وہ نعمت جس مقصد کے لئے عطا فرمائی ہے اسی مقصد میں اس نعمت کو استعمال کرنا، گویا اس نعمت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اہتمام کرنا۔

شکر کا مراقبہ

شکر کے لئے ایک بات تو یہ ضروری ہے کہ آدمی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ساری نعمتوں کو یاد کرے اور سوچے کہ میرے حال پر اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتیں ہیں ۔ بعض نعمتیں تو وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک کو ملی ہیں ، جیسے: زندگی، جسم، اور جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو جو صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں ، جیسے: آنکھیں اور اس میں دیکھنے کی صلاحیت، کان اور ان میں سننے کی صلاحیت ، زبان اور اس میں بولنے اور چکھنے کی صلاحیت ، ہاتھ اور ان میں پکڑنے کی صلاحیت ، ناک اور اس میں سونگھنے کی صلاحیت ، پاؤں اور ان میں چلنے کی صلاحیت، اسی طرح دل و دماغ اور جسم کے اندر بے شمار اعضاء ہیں جو مختلف فوائد کے لئے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے ہیں ۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ ساری نعمتیں وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عام طور پر ہر ایک کو دی گئی ہیں ۔ پھر دیگر بیرونی نعمتیں عطا فرمائی ہیں ، جیسے: سورج ، چاند، زمین، آسمان، پانی ہوا وغیرہ جو باہر پائی جاتی ہیں اور جن سے فائدہ اُٹھانے میں اللہ تعالیٰ کے تمام بندے برابر کے شریک ہیں ۔

یہی شکر کی حقیقت ہے

اور کچھ نعمتیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخصوص طور پر ملتی ہیں ، جیسے: علم، عقل و فہم، حسن و جمال، کوئی کمال، منصب و عہدہ، یا مخصوص انداز کی دولت و ثروت وغیرہ؛یہ سب نعمتیں ایسی ہیں جو خصوصیت کے ساتھ کسی کسی کو ہی عطا فرمائی جاتی ہیں ۔ جب آدمی اللہ تعالیٰ کی ان ساری نعمتوں کو یاد کر کے اس بات کا استحضار رکھے گا کہ اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ اگر مَیں دنیا کی لاکھوں اور کروڑوں کی دولت بھی خرچ کرتا تب بھی مجھے وہ حاصل نہ ہوتیں ،یہ سب اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے میری طلب اور میرے کسی استحقاق و اہلیت کے بغیر مفت میں مجھے عطا فرمائی ہیں ،اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ گویا منعم کی محبت بھی شکر گذاری کا ایک درجہ ہے۔ اور اسی محبت کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت آسان ہوگی۔ جیسے: اللہ تعالیٰ نے آنکھیں دیں ،تو آنکھوں کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں جو ہدایات ہیں ان کے مطابق آنکھوں کو استعمال کرنا، اور جن چیزوں سے بچنے کا حکم دیا ہے ان سے بچنا۔ زبان ،کان،ہاتھ،پاؤں اور جتنے بھی اعضاء ہیں ؛ان کے استعمال کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے کہ فلاں فلاں کام میں ان کو لگاؤ؛ وہیں ان کو استعمال کرنا،اور فلاں فلاں

جگہوں سے بچاؤ تو اس سے بچانے کا اہتمام کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے پیسے دیئے ہیں ، عہدہ اور منصب دیا ہے، تو اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں صحیح طریقے سے استعمال کرنے کا اہتمام کرنا، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچانا؛ یہی شکر کی حقیقت ہے۔

فرماں برداری نصیب ہو گی

جیسے: کوئی نا معلوم آدمی ہمیشہ کسی کے واسطہ سے آپ کو کھانے پینے کا ماہانہ پورا خرچہ بھیجتا رہتا ہو، یا آپ کی ضروریات کا خیال رکھتا ہو، اگر کبھی آپ بیمار ہو گئے تو بہترین دوائیں بھیجتا ہو، آپ کے گھر میں کبھی کوئی اور ضرورت پیش آگئی تو اس کو پورا کرنے کا انتظام کرتا ہو؛ مطلب یہ ہے کہ موقع بموقع ساری ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کسی کی طرف سے آپ کے پاس چیزیں پہنچتی رہتی ہوں ، اور آپ کو معلوم بھی نہیں کہ بھیجنے والا کون ہے، تب بھی اندازہ لگایئے کہ آپ کے دل میں مُرسِل کے لئے محبت کے کتنے جذبات پیدا ہوں گے!

پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی ابتلاء اور آزمائش کے طور پر کوئی مصیبت اور پریشانی آئے گی تو آدمی اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نعمتوں کی طرف غور کرنے کی وجہ سے سوچے گا کہ

اللہ تعالیٰ کی اتنی ساری نعمتوں کے مقابلہ میں اگر ایک مصیبت آگئی تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ نے میری کسی مصلحت کو مدِّ نظر رکھا ہو گا۔ اگر کوئی بیماری آگئی تو کیا ہو گیا، پھر اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لئے وعدہ ہے کہ اس بیماری کی وجہ سے گناہ معاف ہوں گے اور درجات بلند ہوں گے۔ جو بھی تکلیف پہنچ رہی ہے وہ بیکار جانے والی نہیں ہے۔ اسی غور و فکر کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آدمی ہر وقت اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات میں ڈوبا ہوا سمجھے گا اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری کا اہتمام کرے گا

"مقام شکر" کی تین شرطیں

تو شکر میں اولاً: اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بار بار سوچ کر ان کا استحضار رکھنا۔ ثانیاً: اللہ تعالیٰ کی محبت کو دل میں تازہ رکھنا، اور ثالثاً: اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کے ذریعہ سے ان نعمتوں کا حق ادا کرنے کا اہتمام کرنا۔ شکر کے یہی تین مقامات اور درجات ہیں ؛استحضار، جس کی وجہ سے محبت، اور محبت کے نتیجہ میں اطاعت۔ جس کسی کو یہ تینوں مقامات حاصل ہو جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ اس کو "مقامِ شکر" حاصل ہو گیا۔

بس! ذرا سا بخار ہو گیا ہے

اللہ تعالیٰ کے جو نیک اور مقبول بندے ہوا کرتے ہیں وہ انہی چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کر کے اپنی کمزوریوں کو دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جتنی نعمتیں ہیں ان کا جیسا حق ادا کرنا چاہیے وہ میں ادا نہیں کر پایا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ نے حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب سے مشہور ہیں ، ان کا ایک قصہ لکھا ہے کہ:-

ایک مرتبہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیمار تھے اور اتنا سخت بخار تھا کہ کچھ مدہوشی کی سی کیفیت تھی، میں عیادت کے لیے حاضر ہوا ، جب ذرا افاقہ ہوا تو میں نے پوچھا: حضرت! کیا حال ہے ؟ فرمایا: الحمدللہ ! اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں مجھے حاصل ہیں اللہ تعالیٰ نے جسم عطا فرمایا، آنکھیں دیں جو دیکھنے کا کام کرتی ہیں ، کان دیئے ، زبان اور ناک دی، ہاتھ پاؤں دیئے، اور دیر تک یہ سب گنواتے رہے، اس کے بعد فرمایا: بس! ذرا سا بخار ہو گیا ہے۔

قابلِ اصلاح کیفیت

ہم لوگوں کا معاملہ ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سینکڑوں نعمتیں ہوتی ہیں لیکن اگر ذراسی کوئی تکلیف آگئی تو بس اسی تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں ،اور لوگوں کے سامنے اُسی کا رونا روتے رہتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہوئی اس آزمائش کو شکوہ و شکایت کے طور پر مجلسوں میں بیان کرتے رہتے ہیں ۔ہماری یہ کیفیت قابلِ اصلاح ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچایا جائے۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ کی جو نعمت جس مقصد کے لئے دی گئی ہے،اس کو اسی میں استعمال کرنے کا نام شکر ہے،اور اس کی حقیقی قدر دانی یہی ہے۔

حکمت کی بات

باری تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَأَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾اگر تم نے ہماری نعمتوں کا شکر ادا کیا اور اس کی قدر دانی کی تو ہم نعمتوں میں اضافہ کریں گے،اس کو اور بڑھائیں

گے۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرتے رہنا اوراس کا شکر کرتے رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں اضافہ کا سبب ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: جب کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی نعمت حاصل ہوتی ہے جو پہلے سے اس کے پاس نہیں تھی تو وہ بہت خوش ہوتا ہے، لیکن اب اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا باقی رہنا ایک الگ نعمت ہے۔ جیسے: اللہ تعالیٰ نے تندرستی عطا فرمائی، یہ ایک نعمت ہے، لیکن اب وہ تندرستی باقی رہے، تو یہ دوسری نعمت ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنکھیں عطا فرمائیں، یہ ایک نعمت ہے، اب آنکھوں کی بینائی باقی رہے؛ یہ اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمت ہے۔ آدمی کا حال ایسا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت نئی نئی حاصل ہوتی ہے تو بڑا خوش ہوتا ہے، لیکن جب وہ نعمت اس کے پاس باقی رہتی ہے تو اس نعمت کے ساتھ طبیعت کے مانوس ہو جانے کے نتیجہ میں اس نعمت کی قدر دانی کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتوں کو بار بار سوچ کر اس کے نعمت ہونے کے خیال کو اپنے دل میں تازہ کرتے رہو، اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہو۔ ورنہ طبیعت کے مانوس ہونے کے نتیجہ میں ناقدری پیدا ہوگی، پھر اللہ تعالیٰ اس نعمت کو چھین لیں گے، اور ”قدرِ نعمت بعدِ زوالِ نعمت“ عام طور پر نعمت چھن جانے کے بعد خیال آتا ہے کہ وہ کتنی بڑی نعمت تھی۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ وہ

اپنے پاس رہتے ہوئے خیال آئے اور اس کی قدر کرتے رہیں تو وہ نعمت باقی رہتی ہے، اور پھر اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اضافہ بھی ہوتا ہے۔

کہو: الحمد للہ

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ آپ کہہ دیجئے کہ ساری تعریفیں اور تمام خوبیاں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں ۔کسی کے کمال پر دنیا میں جتنی بھی تعریفیں کی جاتی ہیں وہ سب درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہوتی ہیں ۔ جیسے: ایک مکان بنایا گیا، اب اگر کوئی آدمی اس مکان کی تعریف کرے کہ بڑا شاندار مکان ہے، تو ظاہر ہے کہ مکان کی تعریف دراصل مکان بنانے والے کی تعریف ہے۔ اسی طرح دنیا میں جتنی بھی چیزوں کی تعریف کی جاتی ہے، ان سب کا پیدا کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور ساری تعریفوں کا حقدار وہی ہے۔

﴿وَاٰخِرُ دَعْوٰهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (اہلِ جنّت جب آپس میں گفتگو کریں گے تو) ان کا منتہائے کلام یہی ہو گا کہ ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار اور پالنے والا ہے۔

تعریف اور شکر؛ دونوں ہونا چاہیے

حدیث ۱۳۹۳:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه أنّ النبيّ ﷺ أُتِيَ لَيلَةَ أُسرِيَ بِهِ بِقَدَحَينِ مِن خَمرٍ وَلَبَنٍ، فَنَظَرَ إِلَيهِمَا فَأَخَذَ اللَّبَنَ. فَقَالَ جِبرِيل: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَاكَ لِلفِطرَةِ، لَو أَخَذتَ الخَمرَ غَوَت أُمَّتُكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ معراج کی رات میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں دو پیالے پیش کئے گئے، ایک شراب کا تھا اور دوسرا دودھ کا تھا (گویا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اختیار دیا گیا کہ دونوں میں سے جو چاہیں؛ لے لیں) تو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دونوں کو دیکھا اور دودھ والا پیالہ اُٹھالیا۔ اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے آپ کو فطرت اختیار کرنے کی رہنمائی فرمائی۔ اگر آپ شراب کو اختیار کرلیتے تو آپ کی امّت گمراہ ہوجاتی۔

افادات:- یہاں تو یہ روایت اس لئے لائے ہیں کہ دیکھو! آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا عمل عین فطرت کے مطابق تھا، اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرمائی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی سے جب بھی کوئی اچھا کام ظہور پذیر ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر ادا کرنا چاہیے کہ: اے اللہ! تیری حمد و ثناء اور تعریف ہے اور تیرا احسان ہے کہ تو نے مجھے اس کام کی توفیق عطا فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف کا بھی اہتمام کیا جائے اور اس کے شکر کا بھی اہتمام کیا جائے، جیسے: کوئی آدمی ہدیہ دیتا ہے تو ہم اس کی تعریف بھی کرتے ہیں اور دینے والے کا شکریہ بھی ادا کرتے ہیں ، اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے سلسلہ میں بھی یہی دونوں چیزیں ہونی چاہئیں ۔

...تو اُمت گمراہ ہو جاتی

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ لیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے آپ کو فطرت کو اختیار کرنے کی رہنمائی کی، آپ اگر شراب کو لیتے تو آپ کی امّت گمراہ ہو جاتی۔ اب یہ اشکال ہوتا ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر شراب کو اختیار کر لیتے تو اس سے امّت کی گمراہی کیسے جُڑی ہوئی تھی؟ تو اس کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ قاعدہ ہے "اَلنَّاسُ عَلَى دِيْنِ مُلُوْكِهِمْ" لوگ اپنے رہنماؤں کی راہ اور طریقے پر چلتے ہیں ۔ گویا نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدانخواستہ اگر شراب کو اختیار کر لیتے تو اس کا اثر امّت پر بھی پڑتا اور اُمت بھی شراب کو اختیار کرتی، اور پھر اس کے نتیجہ میں گمراہی کے تمام کام کرتی۔

...تو وہ اَدھورا رہتا ہے

حدیث ۱۳۹۴:-

وعنه عن رسول الله ﷺ قَالَ: كُلُّ أَمْرٍ ذِي بَالٍ لَا يُبْدَأُ فِيهِ بِالْحَمْدُ للهِ فَهُوَ أَقْطَعُ. (حديث حسن، رواه أبو داود وغيره.)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اہمیت والے مہتم بالشان کام کی شروعات اگر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء سے نہ کی جائے تو وہ ادھورا رہتا ہے (معلوم ہوا کہ ہر کام کی شروعات میں اللہ تعالیٰ کی حمد اور اس کی تعریف کا اہتمام کیا جانا چاہیے)۔

بیت الحمد

حدیث ۱۳۹۵:-

وَعَنْ أَبِي مُوسَى الْأَشْعَرِيِّ - رضی اللہ عنہ -: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((إِذَا مَاتَ وَلَدُ الْعَبْدِ قَالَ اللهُ تَعَالَى لِمَلَائِكَتِهِ: قَبَضْتُمْ وَلَدَ عَبْدِي؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيَقُولُ: قَبَضْتُمْ ثَمَرَةَ فُؤَادِهِ؟ فَيَقُولُونَ: نَعَمْ، فَيَقُولُ: مَاذَا قَالَ عَبْدِي؟ فَيَقُولُونَ: حَمِدَكَ وَاسْتَرْجَعَ، فَيَقُولُ اللهُ تَعَالَى: أَبْنُوا لِعَبْدِي بَيْتاً فِي الْجَنَّةِ، وَسَمُّوهُ بَيْتَ الْحَمْدِ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:۔حضرت اَبو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبیِ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب کسی کا چھوٹا بچہ انتقال کرجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے پوچھتے ہیں: تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کرلی؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ تو باری تعالیٰ دریافت فرماتے ہیں: تم نے اس کے دل کے ٹکڑے کو قبض کرلیا (یعنی اس بندہ کو اس بچہ سے اتنی محبت ہوتی ہے جیسے دل کا ٹکڑا ہو) تو فرشتے عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ باری تعالیٰ پوچھتے ہیں: تمہارے اس عمل پر میرے اس بندے نے کیا کہا؟ (کیا شور مچایا اور آہ و واویلا کیا؟) فرشتے عرض کرتے ہیں: (نہیں! بلکہ) تیرے اس بندے نے تیری حمد بیان کی اور "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن" پڑھا۔ تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے اس بندے کے لئے جنّت میں ایک مکان بناؤ اور اس کا نام "بیت الحمد" رکھو۔

اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں

حدیث ۱۳۹۶:-

وعن أنس -رضی اللہ عنہ- قَالَ: قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((إنَّ اللہَ لَيَرْضَى عَنِ العَبْدِ يَأكُلُ الأَكْلَةَ، فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا، وَيَشْرَبُ الشَّرْبَةَ، فَيَحْمَدُهُ عَلَيْهَا)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بندے سے خوش ہوتے ہیں جب وہ کوئی لقمہ کھاتا ہے اور اس پر الحمد للہ کہتا ہے، اور جب کوئی گھونٹ پیتا ہے اور اس پر الحمد للہ کہتا ہے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت کے حصول پر آدمی کو اللہ تعالیٰ کی تعریف اور الحمد للہ کہنے کا اہتمام کرنا چاہیے، یہی وہ چیز ہے جو بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم کرنے والی ہے، اوراسی وقت استحضار بھی پیدا ہوگا۔ دراصل ہم لوگ نعمتوں کو تو دیکھتے ہیں لیکن نعمتوں کے دینے والے کی طرف ہمارا دھیان نہیں جاتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ ان چیزوں کا اہتمام نہیں ہوتا، اگر حمد اور شکر کا اہتمام کیا جائے گا تو ان شاء اللہ نعمتوں سے ہٹ کر نعمتوں کے دینے والے کی طرف توجہ و دھیان جائے گا اور یہی چیز اس کے ساتھ تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ بنے گی۔

کِتَابُ الصَّلَاةِ عَلَى رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر درود بھیجنے کا بیان

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا مقام و مرتبہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ اللهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ، يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْماً﴾ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، (لہٰذا) اے ایمان والو! تم بھی نبی پر درور و سلام بھیجو۔

دیکھئے! اس آیتِ شریفہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کو دو باتوں یعنی "صلوٰۃ اور سلام" کا حکم دیا گیا ہے۔ سلام کے متعلق تو جیسا کہ روایت میں آتا ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی طرف سے التحیات سکھائی گئی تھی جس میں "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهٗ" ہے، گویا اس میں سلام کا طریقہ تو بتلا دیا گیا تھا کہ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر سلام کس

طرح بھیجا جائے، لیکن ابھی تک صلوٰۃ یعنی درود کا طریقہ نہیں بتلایا گیا تھا، اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو درود بھی سکھلایا۔

اور یہ آیت حضورِ اکرم ﷺ کی فضیلت پر دلالت کرنے والی ہے کہ دیکھو دوسرے انبیاء کا بھی بڑا اعزاز واکرام کیا گیا، جیسے: حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، اور بھی بہت سے نبیوں کو مختلف اعزازات واکرامات سے نوازا گیا، لیکن کسی نبی کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں کام اللہ تعالیٰ بھی کرتے ہیں لہٰذا ایمان والو! تم بھی یہ کام کرو۔ لیکن یہاں تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے یہ کام کرتے ہیں، تم بھی کرو۔ اس سے نبی کریم ﷺ کا مقام و مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنا اونچا ہے۔

ایک درود؛ دس رحمتیں

حدیث ۱۳۹۷:-

وعن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما: أنَّہ سمع رسول اللہ ﷺ یقول: ((مَنْ صَلَّی عَلَیَّ صَلاۃً ، صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ بِھَا عَشْراً)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے نبیِ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو مجھ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے، اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتے ہیں ۔

افادات:- دیکھئے ! ایمان والوں کو درود پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ تم رحمت بھیجو، پھر اس کا طریقہ یہ بتلایا گیا کہ اس طرح کہو: ”أَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلَی مُحَمَّد“ گویا ایمان والے اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ! ہم تجھ ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ پر رحمت بھیج۔

مجھ سے سب سے زیادہ قریب

حدیث ۱۳۹۸ :-

وعن ابن مسعود -رضی اللہ عنہ-: أنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: أَوْلَی النَّاسِ بِي یَوْمَ الْقِیَامَۃِ أَکْثَرُھُمْ عَلَیَّ صَلاۃً. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز تم لوگوں میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ ہو گا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجتا ہو۔

افادات:-اس روایت سے حضورِ اکرم ﷺ کے قرب کے حصول کا پتہ چلتا ہے، اس لئے آدمی کو اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے

حدیث ۱۳۹۹:-

وعن أوس بن أوس -رضی اللہ عنہ-. قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ مِنْ أَفْضَلِ أَيَّامِكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، فَأَكْثِرُوا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيهِ، فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوضَةٌ عَلَيَّ)). قَالَ: قالوا: يَا رسولَ اللهِ، وَكَيْفَ تُعْرَضُ صَلَاتُنَا عَلَيْكَ وَقَدْ أَرَمْتَ ؟! قَالَ: يقولُ: بَلِيتَ. قَالَ: إِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَى الأَرْضِ أَجْسَادَ الأَنْبِيَاءِ. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:-حضرت اَوس بن اَوس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے دنوں میں سب سے بہتر دن جمعہ ہے، اس دن میں مجھ پر کثرت سے درود بھیجو، اس لئے کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارا درود آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا، حالاں کہ آپ تو انتقال کے بعد مٹّی میں مل چکے ہوں گے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر نبیوں کے جسموں کو حرام کردیا ہے۔

افادات:- یعنی تمہارا یہ خیال صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دوسرے لوگوں کے جسم مٹّی میں مل جاتے ہیں لیکن نبیوں کے جسم محفوظ رہتے ہیں ۔

اس کی ناک غبار آلود ہو

حدیث ۱۴۰۰:-

وعن أَبي هريرة رضی الله عنه قَالَ : قَالَ رسول الله ﷺ: ((رَغِمَ أَنْفُ رَجُلٍ ذُكِرْتُ عِنْدَهُ فَلَمْ يُصَلِّ عَلَيَّ)). (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اس آدمی کی ناک غبار آلود ہو اور مٹی میں ملے ؛ جس کے سامنے میرا تذکرہ کیا گیا لیکن اس نے مجھ پر درود نہیں بھیجا (حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بد دعا فرمائی کہ ایسا آدمی ذلیل ورسوا ہو۔)

میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ

حدیث ۱۴۰۱:-

وعنه - رضی اللہ عنہ - قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((لاَ تَجْعَلُوا قَبْرِی عِیداً، وَصَلُّوا عَلَیَّ، فَإِنَّ صَلاَتَکُمْ تَبْلُغُنِی حَیْثُ کُنْتُمْ)). (رواه أبو داود بإسنادٍ صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: میری قبر کو عید گاہ نہ بناؤ (یعنی عرس کی طرح جمع ہونے کا اہتمام نہ کرو، بلکہ) میرے اوپر درود بھیجو، اس لئے کہ جہاں کہیں سے بھی تم مجھ پر درود بھیجو گے، وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ (حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں فرشتے اس کو پیش کرتے ہیں)۔

میں سلام کا جواب دیتا ہوں

حدیث ۱۴۰۲:-

عنه: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((مَا مِنْ أَحَدٍ یُسَلِّمُ عَلَیَّ إِلاَّ رَدَّ اللهُ عَلَیَّ رُوحِی حَتَّی أَرُدَّ عَلَیْهِ السَّلاَمَ)) (رواه أبو داود بإسنادٍ صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو کوئی بھی مجھ پر سلام بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھ پر میری روح کو لوٹا دیتے ہیں یہاں تک کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔

بخیل ہے وہ آدمی

حدیث ۱۴۰۳:-

عن علیؓ - رضی اللہ عنہ - قَالَ : قَالَ رسُولُ اللهِ ﷺ : ((البَخِیلُ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَهُ، فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ)). (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بخیل ہے وہ آدمی جس کے سامنے میرا تذکرہ کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔

افادات:- ظاہر ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کے جو احسانات پوری انسانیت کے اوپر ہیں کہ آپ کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے پوری امّت کو چاہے وہ امّتِ دعوت ہو، یا امّتِ اجابت؛ عمومی عذاب سے محفوظ رکھا ہے۔ اور ویسے بھی کائنات کے وجود میں آنے کا ذریعہ آپ ﷺ ہی بنے، اور خاص کر اہلِ ایمان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائیں وہ نبیٔ کریم ﷺ کے صدقہ اور طفیل ہی میں دی گئی ہیں ، اتنے بڑے محسن کا جب تذکرہ کیا جائے تو اس کا تقاضہ یہ تھا کہ آپ کے حق کی ادائیگی اور احسان شناسی کے طور پر آپ ﷺ پر درود بھیجنے کا اہتمام کیا جاتا۔ یعنی خود حضورِ اکرم ﷺ اس سلسلہ میں اگر کوئی تاکید نہ فرماتے تب بھی ہمیں خود ہی چاہیے تھا کہ آپ کے ان احسانات کو مدّ نظر رکھتے

ہوئے اور آپ کا حق سمجھ کر اس کی ادائیگی کے طور پر درود کا اہتمام کرتے، چہ جائیکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور خود نبی کریم ﷺ نے بھی تاکید فرمائی جیسا کہ اوپر گزرا۔ اس لئے جب حضورِ اکرم ﷺ کا تذکرہ ہو اور کوئی درود نہ بھیجے تو ایسے آدمی کے بخیل ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اور اس سے بڑا بخیل اور کون ہو گا کہ حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کے لئے صرف دو چھٹانک کی زبان ہلانی تھی اس میں بھی اس نے بخل سے کام لیا، اسی لئے حضور اکرم ﷺ اس کو بخیل سے تعبیر فرمارہے ہیں۔ اور ایسے آدمی کے لیے حضرتِ جبرئیل علیہ السلام نے بھی بد دعا فرمائی ہے، اور نبی کریم ﷺ نے اس پر آمین فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب بھی آدمی حضورِ اکرم ﷺ کا نامِ مبارک سنے تو اس کو درود شریف پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

اس نے جلد بازی کی

حدیث ۱۴۰۴:-

وعن فَضَالَةَ بنِ عُبَيْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعَ رسُولُ اللهِ ﷺ رَجُلاً يَدْعُو فِى صَلَاتِهِ لَمْ يُمَجِّدِ اللهَ تَعَالَى، وَلَمْ يُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ. فَقَالَ رسُولُ اللهِ ﷺ: ((عَجِلَ هٰذَا)) ثُمَّ دَعَاهُ، فَقَالَ لَهُ- أَوْ لِغَيْرِهِ-

: ((إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيدِ رَبِّهِ سُبْحَانَهُ، وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ يُصَلِّي عَلَى النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ يَدْعُو بَعْدُ بِمَا شَاءَ. (رواه أبو داود والترمذي، وقال: ((حديث حسن صحيح)).

ترجمہ:- حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک آدمی کو دعا کرتے ہوئے سنا جو اپنی نماز میں دعا کر رہا تھا، لیکن اس نے دعا سے پہلے نہ تو اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور بزرگی بیان کی، اور نہ حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس آدمی نے جلد بازی کی (یعنی دعا کا جو طریقہ ہے وہ صحیح طور پر بجا نہیں لایا) پھر نبی کریم ﷺ نے اس کو بلا کر، یا کسی دوسرے کے ذریعہ اس سے فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب نماز پڑھے اور دعا کرے تو اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے شروع کرے پھر نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے، پھر جو چاہے دعا کرے۔

افادات:- نماز میں بھی دعا کے مواقع ہیں جیسے آخری قعدہ میں تشہد کے بعد دعا کی جاتی ہے، نفل نمازوں کے سجدوں میں بھی دعا کی اجازت ہے۔ دعا کے لئے جن آداب کا اہتمام کرنا چاہیے اور جو چیزیں دعا کو قبولیت سے قریب کرنے والی ہیں ان کو انجام دیئے بغیر ہی جو آدمی دعا میں لگ گیا تو گویا اس نے بڑی جلد بازی کی۔

اور درود بھیجنے کا جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس میں گویا ہمیں اس بات کا احساس دلایا گیا کہ نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنے والا عمل اتنا اونچا ہے کہ بندہ خود انجام دے ہی نہیں سکتا، اسی لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کا جب حکم دیا گیا تو

یوں سکھلایا گیا کہ اس طرح کہو: اے اللہ! تو اپنی رحمتیں حضور اکرم ﷺ پر نازل فرما۔ گویا ہم تو اس لائق نہیں ہیں کہ حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنے کا حق ادا کر سکیں، اس لیے ہم آپ ہی سے درخواست کرتے ہیں کہ آپ ہی اپنی شایانِ شان رحمت اپنے حبیب ﷺ پر بھیجئے۔

ہر عمل میں قبول اور رَد کا احتمال ہے؛ سوائے درود شریف کے

اور حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے کہ ہر عمل میں دونوں احتمال ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ قبول ہو، اور ہو سکتا ہے رد کر دیا جائے، اور دعا بھی ایک عمل ہے اس میں بھی یہی دونوں احتمال ہیں، لیکن نبی کریم ﷺ پر درود بھیجنا ایسا عمل ہے کہ اس میں رد ہونے کا سوال ہی نہیں ہے، بلکہ وہ تو قبول ہی ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے آدمی دعا سے پہلے نبی کریم ﷺ پر درود بھیجے گا تو اس کے بعد کچھ اور دعائیں بھی کرے گا، اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ جیسے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد درود ہوتا ہے، اسی طرح دعا کے آخر میں بھی درود ہونا چاہیے، اور جب درود قبول ہی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی سے یہ بعید ہے کہ دعا کا شروع حصہ قبول کرے اور آخر کی دعا بھی قبول

کرے، لیکن بیچ کی دعا قبول نہ کرے۔اس لیے دونوں طرف شروع اورآخر میں درود شریف پڑھنا دعا کو قبولیت کے قریب کرنے والا ہے،اسی لئے دعا کے آداب میں ایک ادب یہ بھی بتلایا گیا ہے۔

درود کس طرح بھیجیں ؟

حدیث ۱۴۰۵ :-

وعن أبي محمدٍ كعبِ بن عُجْرَة رضى الله عنه قَالَ: خَرَجَ عَلَيْنَا النبيُّ ﷺ فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! قَدْ عَلِمْنَا كَيْفَ نُسَلِّمُ عَلَيْكَ، فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ قَالَ: قُولُوا: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ. اللَّهُمَّ بَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ، وعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ. (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہمارے پاس تشریف لائے،ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ پر کس طرح سلام پڑھا جائے وہ تو ہمیں معلوم ہے (جو ہم تشہد میں پڑھتے ہیں)اب ہم آپ پر درود کس طرح بھیجیں ؟ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اس طرح کہو: اے اللہ! رحمت بھیج حضرت محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر اور آپ کی آل پر جیسا کہ آپ نے رحمت بھیجی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر، بیشک آپ ستودہ صفات اور بزرگی والے ہیں ۔ اور اے اللہ !

برکت بھیج حضرت محمد ﷺ پر اور آپ کی آل پر جیسا کہ آپ نے برکت بھیجی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر، بیشک آپ ستودہ صفات اور بزرگی والے ہیں۔

افادات:- بعض روایتوں میں یہ آتا ہے کہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ سے اس روایت کے نقل کرنے والے تابعی فرماتے ہیں کہ حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ میں تم کو ایک ہدیہ نہ دوں، تمہاری خدمت میں ایک تحفہ پیش نہ کروں؟ ہم نے کہا: ضرور پیش کیجئے، تو انہوں نے یہ روایت بیان کی۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب قرآنِ پاک میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿إِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ اے ایمان والو! تم نبیٔ کریم ﷺ پر درود اور سلام بھیجو۔ تو ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ پر سلام کس طرح بھیجنا چاہیے وہ تو ہمیں معلوم ہے، جیسا کہ مجلس میں حاضر ہوتے ہیں تو "اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" کہتے ہیں، اسی طرح نماز میں تشہد کے اندر "اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ" ہے، لیکن اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صلوٰۃ یعنی درود بھیجنے کا بھی حکم دیا ہے، اوراس کا طریقہ ہمیں معلوم نہیں، اب آپ بتائیے کہ ہم درود کیسے بھیجیں؟ تو نبیٔ کریم ﷺ نے یہ طریقہ سکھایا جو اوپر روایت میں گزرا۔

یہاں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر اللہ تعالیٰ کے یہاں سے جو رحمتیں اور برکتیں نازل کی گئی تھی ان کا حوالہ دیا گیا، یہ محض تفہیم کے لئے ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جس کے ساتھ تشبیہ دی جائے وہ افضل ہی ہو، جیسے قرآنِ پاک میں ہے: ﴿اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ﴾ اللہ تعالیٰ کے نور کو ایک چیز کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ کا نور اس کی شایانِ شان ہے۔

درودِ ابراہیم کی تعلیم

حدیث ۱۴۰۶:-

وعن أَبِي مسعودٍ البدری -رضی الله عنه-، قَالَ: أَتَانَا رَسُولُ اللهِ ﷺ، وَنَحْنُ فِي مَجْلِسِ سَعدِ بن عُبَادَةَ -رضی الله عنه-، فَقَالَ لَهُ بَشِيْرُ بْنُ سَعدٍ: أَمَرَنَا اللهُ تَعَالَى أَنْ نُصَلِّيَ عَلَيْكَ يَا رَسُولَ اللهِ، فَكَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ فَسَكَتَ رَسُولُ اللهِ ﷺ حَتَّى تَمَنَّيْنَا أَنَّهُ لَمْ يَسْأَلْهُ، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((قُولُوا: اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ، وَالسَّلَامُ كَمَا قَدْ عَلِمْتُمْ)).

(رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو مسعود بدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (یہ ایک انصاری صحابی ہیں جو مقامِ بدر میں قیام پذیر تھے، اور غزوۂ بدر میں بھی شریک ہوئے تھے اس لئے ان کو بدری کہتے ہیں) ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اس وقت ہم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے (حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ انصار کے قبیلۂ خزرج کے سرداروں میں سے ہیں، اور جو بڑے لوگ ہوتے ہیں ان کی مجلسیں ہوا کرتی ہیں جہاں دوسرے لوگ بھی آکر بیٹھتے ہیں۔ تو ہم سیّد الخزرج حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم آپ کی طرف متوجہ ہوگئے۔ حضرت بشیر بن سعد جو حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا کہ ہم آپ پر درود بھیجیں، تو ہمیں اس کا طریقہ معلوم نہیں ہے، آپ بتلائیے۔ اس سوال کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے، اور آپ اتنی دیر تک خاموش رہے کہ ہم دل میں تمنّا کرنے لگے کہ کاش سوال کرنے والے نے سوال نہ کیا ہوتا (یہ بھی حضراتِ صحابہ کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی محبت اور تعلق کی بات ہے۔ کبھی کوئی آدمی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی بات پوچھتا اور اس کے جواب میں دیر ہو جاتی تو صحابہ فرماتے ہیں کہ ہم یہ تمنّا کرتے کہ کاش اس نے یہ نہ پوچھا ہوتا، اس لئے کہ دیر ہونے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سوال ناگوار گزرا ہو اور آپ اس کا جواب دینا پسند نہیں فرمارہے ہیں) پھر کچھ دیر بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ یوں کہو: "اے اللہ! درود اور رحمت نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر، جیسا کہ آپ نے رحمت بھیجی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر۔ اور اے اللہ! برکتیں نازل فرما محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آل پر، جیسا کہ آپ نے برکتیں

نازل فرمائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آل پر۔ بیشک آپ ستودہ صفات اور بزرگی والے ہیں ۔ اور سلام کا طریقہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے درود شریف کا جو طریقہ بتلایا اس سلسلہ میں آپ پر وحی نازل ہوئی اس کے بعد ہی بتلایا۔

اس درود شریف کو "درودِ ابراہیم" بھی کہتے ہیں ، اور درودِ ابراہیم کے مختلف صیغے ہیں جو حدیثوں میں وارد ہوئے ہیں ، ان میں سب سے مکمل صیغہ وہی ہے جو ہم نمازوں میں پڑھتے ہیں : "اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلیٰ إِبْرَاھِیْمَ وَعلیٰ آلِ إِبْرَاھِیْمَ، إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ. اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلیٰ إِبْرَاھِیْمَ وعلیٰ آلِ إِبْرَاھِیْمَ، إِنَّكَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ" اس کے علاوہ بھی معمولی فرق کے ساتھ دیگر صیغے آئے ہیں وہ سب ہی "درودِ ابراہیم" کہلاتے ہیں۔ ہر وہ درود جس میں نبی کریم ﷺ پر بھیجے جانے والے درود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھیجے گئے درود کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے؛ وہ سب "درودِ ابراہیم" ہی ہیں، اور تمام درودوں میں سب سے افضل درود "درودِ ابراہیم" ہے، اس لئے کہ نبی کریم ﷺ سے جب درود کا طریقہ پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے یہی بتلایا۔

ویسے کسی بھی درود شریف کے پڑھنے سے آپ ﷺ پر درود بھیجنے کا حق ادا ہو جائے گا، لیکن جو صیغے غیر ماثور ہیں وہ ان درودوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو حضورِ اکرم ﷺ ہی

سے نقل کئے گئے ہیں ۔ اور جو ماثور درود حضور اکرم ﷺ سے نقل کئے گئے ہیں ان میں بھی سب سے افضل ”درودِ ابراہیم“ ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے، اور اس پر سب حضرات علماء کا اتفاق ہے۔

حدیث ۱۴۰۷:-

وعن أَبِي حُمَيدٍ السَّاعِدِيِّ رضی الله عنه قَالَ: قالوا: يَارسولَ الله! كَيْفَ نُصَلِّي عَلَيْكَ؟ قَالَ: ((قُولُوا: اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى أَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ، وَبَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ، وَعَلَى أَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ)). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر درود کیسے بھیجیں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یوں کہو: اے اللہ! تو درود اور رحمت بھیج حضرت محمد ﷺ پر اور آپ کی بیویوں پر اور آپ کی اولاد پر، جیسا کہ آپ نے درود بھیجا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر۔ اور برکتیں نازل فرما حضرت محمد ﷺ پر اور آپ کی بیویوں پر اور آپ کی اولاد پر، جیسا کہ آپ نے برکت نازل فرمائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر بیشک آپ خوبیوں والے اور بزرگی والے ہیں (یہ بھی ”درودِ ابراہیم“ ہی ہے)

درود شریف بہت ہی بابرکت عمل ہے

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں درود شریف کے متعلق کچھ روایتیں پیش کی ہیں ۔اس کے علاوہ بھی درود شریف کے بڑے فضائل ہیں ، اس سلسلہ میں حضراتِ علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں ۔ عربی زبان میں علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کی " القول البدیع" بڑی مشہور و معروف اور بڑی تفصیلی کتاب ہے۔اردو زبان میں حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ کی " زادُ السعید" اور ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "فضائلِ درود" لکھی ہے جو آپ سب پڑھتے اور سنتے رہتے ہیں ۔

بہرحال! ہر آدمی کو درود شریف کا بہت ہی اہتمام کرنا چاہیے، یہ بہت ہی بابرکت عمل ہے۔ زندگی میں ایک مرتبہ تو درود شریف پڑھنا فرض ہے، اور کسی مجلس میں نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا تذکرہ آئے اس وقت بھی درود شریف پڑھنا چاہیے۔اب جس مجلس میں بار بار تذکرہ آئے تو بار بار پڑھیں یا ایک مرتبہ پڑھنا کافی ہے ؟ تو اس سلسلہ میں بعض حضرات تو فرماتے ہیں کہ جب بھی تذکرہ آئے ہر مرتبہ پڑھنا چاہیے۔اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ایک مجلس میں اگر بار بار تذکرہ آئے تو ایک مرتبہ تو پڑھنا واجب ہے،اور ہر مرتبہ پڑھنے کو مستحب قرار دیا گیا ہے۔

اور ویسے بھی اذکار کی لائن سے جو مختلف کلمات جیسے: تیسرا کلمہ، چوتھا کلمہ، استغفار اور دیگر کلمات جن کے فضائل مختلف احادیث میں آئے ہیں، ہم پڑھتے ہی ہیں وہیں درود شریف کا بھی ایک معمول ہمیں بنالینا چاہیے، نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کی تاکید فرمائی ہے۔

پریشانی ومصیبت سے نجات کا عمل

ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی کسی پریشانی ومصیبت اور تکلیف میں گرفتار ہو تو اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے سب سے اچھا طریقہ درود شریف کی کثرت ہے، اس لئے کہ جب کوئی امّتی درود شریف پڑھتا ہے تو فرشتے اس درود کو اس کی طرف سے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں بطورِ ہدیہ اور تحفہ کے پہنچاتے ہیں، اور حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی عادتِ شریفہ اپنی حیاتِ طیبہ میں یہ تھی کہ جب کوئی آدمی آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تھا تو ہمیشہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اس کے بدلہ میں اس سے بہتر چیز عطا فرمایا کرتے تھے، آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی شانِ کریمی کا یہ ایک عام معمول تھا، اب آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات کے بعد قبرِ شریف میں فرشتے امّتی کا وہ درود شریف والا ہدیہ اور تحفہ خدمتِ اقدس میں پیش کریں گے تو ظاہر ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق اس کا بدلہ ضرور دیں گے، اور

جب امتی درود شریف کا ہدیہ بھیجے گا تو آپ ﷺ دعا کی شکل میں بدلہ دیں گے، اس کی برکت سے پریشانیاں اور مصیبتیں دور ہو جائیں گی۔ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ پر ایک مرتبہ درود بھیجتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر دس رحمتیں بھیجتے ہیں، دس درجات بلند ہوتے ہیں اور دس گناہ معاف ہوتے ہیں۔ درود شریف کے اور بھی بے شمار فوائد ہیں جن کو حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے "فضائلِ درود" میں ذکر کئے ہیں۔ تو درود شریف بڑی اونچی چیز ہے

جس نے جو کچھ بھی پایا درود شریف کی کثرت ہی سے پایا

بعض اکابر تو فرماتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ بھی پایا وہ درود شریف کی کثرت ہی سے پایا۔ اور ہمارے اکابر کے یہاں یہ معمول رہا ہے کہ اپنے منتسبین کو اپنے معمولات میں درود شریف کی کثرت کرنے کی تاکید کرتے تھے۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روزانہ کم سے کم تین سو (۳۰۰) مرتبہ درود شریف پڑھنے کا اہتمام کرے کہ کثرت سے درود شریف پڑھنے کی فضیلت ہے، اور کثرت کی کم سے کم تعداد تین سو (۳۰۰) ہے۔

ہمارے اسلاف اور متقدمینِ علماء میں ایک بڑے عالم علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں جن کی بے شمار تصانیف ہیں ، علم کا کوئی فن ایسا نہیں ہے جس میں ان کی تصنیف نہ ہو،وہ اپنی عمر کے چالیس سال تک تصانیف میں مشغول رہے اور پھر فارغ ہو کر عبادات میں مشغول ہو گئے تھے۔

ان کو حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت بیداری کی حالت میں بھی بار بار ہوتی تھی، وہ بیسیوں مرتبہ بیداری کی حالت میں حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت سے مشرّف ہوئے ہیں، اور خواب میں بھی یہ سعادت میسر ہوتی تھی۔ ان سے پوچھا گیا کہ: آپ کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت نصیب فرمائی ہے کہ بیداری میں بھی حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت سے مشرّف ہوتے رہتے ہیں ؛لہٰذا ہمیں بتلایئے کہ آپ کو یہ رتبہ کس عمل کی بدولت نصیب ہوا؟ تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ :ایسا کوئی خاص عمل نہیں ہے، البتہ مَیں دن رات میں کثرت سے نبیٔ کریم ﷺ پر درودِ پاک پڑھنے کا اہتمام کرتا ہوں ؛شاید اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اپنا فضل فرمایا ہو۔

اور کسی آدمی کو خواب میں نبیٔ کریم ﷺ کی زیارت کا ہو جانا بڑی سعادت کی بات ہے،اوراس کا سب سے بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی اتباعِ سنّت کا اہتمام کرے، حضورِ اکرم ﷺ کے طریقوں اور سنتوں کو اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اختیار کرنے اور

اپنانے کی بھرپور کوشش اور اہتمام کرے،اس کی برکت سے خود بخود حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔ ویسے حضراتِ علماء نے زیارت حاصل کرنے کے لئے کچھ مخصوص طریقے بھی لکھے ہیں ،ان میں سے بعض طریقے حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے "فضائلِ درود" میں بھی نقل کئے ہیں

خواب میں زیارت کا وظیفہ!

لیکن اس سلسلہ میں ہمارے اکابر کے مزاج اور ذوق مختلف رہے ہیں ۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ایک آدمی نے آکر عرض کیا کہ حضرت!کوئی ایسا وظیفہ بتلادیجئے کہ خواب میں حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت ہوجائے۔حضرت نے جواب میں فرمایا:بھائی!ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے، تم بڑے حوصلے والے ہو کہ اس کے متعلق وظیفہ پوچھ رہے ہو۔کیوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت کے آداب کی رعایت بھی کرنی چاہیے، ہو سکتا ہے کہ ہم سے وہ رعایت نہ ہو سکے، اس لئے بہتر طریقہ تو یہی ہے کہ آدمی سنتوں کا خوب اہتمام کرے،اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خود بخود زیارت

کرائی جائے گی، اور جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نعمت دی جائے گی تو آداب کی ادائیگی کا اہتمام بھی کرایا جائے گا۔

اکابر کا صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کا معمول

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ صلوٰۃ وسلام پیش کرنے کے لئے جالی مبارک کے سامنے نہیں جاتے تھے، بلکہ اقدامِ عالیہ (یعنی نبیؐ کریم ﷺ کے قدمِ مبارک جس طرف ہیں) حضرت ہمیشہ وہیں سے سلام پیش کیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ کبھی سامنے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب سلام کے لئے حاضری دیتے تھے تو دور کا جو ستون ہے اس کے پیچھے مارے حیا کے چھپ کر کھڑے ہوتے تھے۔ ہمارے بزرگوں کی یہ بھی مختلف شانیں ہیں ۔

میری طرف سے لوگوں کو بتلادو

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جالی مبارک کے قریب جاتے ہیں اور چمٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے جی میں خیال آیا کہ سب لوگ جالی کے قریب جاتے ہیں، تو کیوں نہیں جاتا؟ تو تو بڑا محروم ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ حجرہ کے اندر سے گویا ایک آواز آرہی ہے کہ: ”میری طرف سے لوگوں کو بتلادو، جو آدمی میری سنتوں کا اہتمام کرتا ہے وہ مجھ سے قریب ہے؛ چاہے ہزاروں میل دور رہتا ہو۔ اور جو آدمی میری سنتوں کا اہتمام نہیں کرتا وہ مجھ سے دور ہے؛ چاہے میری جالی سے چمٹا ہوا کیوں نہ ہو۔ حقیقت تو یہی ہے۔

مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہی لوگ ہیں

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے جب یمن کا گورنر بناکر روانہ کیا، اس وقت ان کو سواری پر سوار کرایا اور حضور اکرم ﷺ خود پیدل تشریف لے جاکر ان کو رخصت فرمارہے تھے، اس موقع پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: اے معاذ! شاید آئندہ تمہاری ہم سے ملاقات نہ ہو، اور میری قبر پر سے تمہارا گزر ہو۔

یہ سن کر حضرت معاذ رونے لگے، حضور اکرم ﷺ کی مبارک آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے، آپ ﷺ نے اپنا چہرۂ انور مدینہ منورہ کی طرف پھیر لیا اور یہ بات ارشاد فرمائی: "إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِي الْمُتَّقُونَ مَنْ كَانُوا وَحَيْثُ كَانُوا" مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہی لوگ ہیں جو گناہوں سے بچنے والے ہیں جو لوگ بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی رہتے ہوں (مسند احمد)

سب سے بڑی سعادت کی بات

ظاہر ہے کہ ہر مسلمان حضورِ اکرم ﷺ کا حقیقی قرب چاہتا ہے، اور وہ سنّت ہی کے ذریعہ حاصل ہو گا، اس لئے کوشش یہی کرنی چاہیے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت بھی کرادے گا۔ اور اگر زندگی بھر زیارت نہ بھی ہوئی تو اس بات سے اپنے آپ کو محروم سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے سنتوں کی ادائیگی کے اہتمام کی توفیق مل جانا ہی سب سے بڑی سعادت کی بات ہے جو حاصل ہو رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سبھی کو اس دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین

كِتَابُ الْأَذْكَارِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بَابُ فَضْلِ الذِّكْرِ وَالْحَثِّ عَلَيْهِ

ذکر کی فضیلت اور اس کی ترغیب

قَالَ اللهُ تَعَالٰى: وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ. (العنکبوت:۴۵)

وَقَالَ تَعَالٰى: فَاذْكُرُوْنِيْٓ أَذْكُرْكُمْ. (البقرۃ:۱۵۲)

وَقَالَ تَعَالٰى: وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ. (الاعراف:۲۰۵)

یہاں سے ایک مستقل عنوان ”کتاب الاذکار“ شروع کر رہے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر سے متعلق جو مختلف ترغیبات قرآنِ پاک اور احادیث میں مختلف انداز سے

آئی ہیں ان کو مختلف ابواب اور عنوانات کے ماتحت بیان کریں گے۔ چناں چہ پہلا باب قائم کیا ہے: ’’ فَضْلُ الذِّكْرِ وَالْحَثِّ عَلَيْهِ ‘‘ ذکر کی فضیلت اوراس کی ترغیب۔

اللہ کا ذکر ہی کائنات کی روح ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر ہی کائنات کی روح ہے، ساری کائنات کا وجود اسی پر قائم ہے، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے ذکر کی برکت، اس کی لذت وحلاوت، اس کا سرور اوراس سے حاصل ہونے والی طمانینت وغیرہ چیزیں مستقل ہیں ، جولوگ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی لذت لے چکے ہیں وہی اس کو محسوس کر سکتے ہیں ۔ اوراگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کا ذکر کرنے کی تاکید اور فضیلت نہ ہوتی تب بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے احسانات وانعامات کا تقاضہ تھا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا، چہ جائیکہ قرآنِ پاک میں بے شمارآیتوں اور کتبِ احادیث میں بے شمارروایتوں کے اندر ذکر کی تاکید اور فضیلت وارد ہوئی ہے۔

ہنوز نامِ تو گفتن...

اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کی عظمت، بڑائی و کبریائی کے پیشِ نظر تو بندوں کی گندی زبانیں اس قابل نہیں تھیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لیتیں، جیسے: فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے:-

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ہنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

اگر مَیں اپنے منھ کو مشک اور گلاب سے ہزار بار دھوؤں تب بھی اے اللہ تیرا نام لینا نہایت ہی بے ادبی ہے۔ در حقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لینے کی ہماری زبانوں میں استعداد اور صلاحیت ہی نہیں ہے، یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم اور احسان ہے کہ بندوں کو اپنا نام لینے اور ذکر کرنے کی اجازت ہی نہیں؛ بلکہ حکم دیا ہے۔ اور ایسی بات نہیں ہے کہ اس حکم میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا کوئی فائدہ پوشیدہ ہو، اللہ تعالیٰ کی ذات تو بے نیاز ہے، وہ کسی فائدہ کی محتاج نہیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لینے میں ہمارا ہی فائدہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام لینے سے ہماری ہی گندگیاں دور ہوتی ہیں۔ جیسے: سبحان اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، تو مولانا روم فرماتے ہیں:

من نہ گردم پاک از تسبیحِ شاں پاک ہم ایشاں شوند وُ دُرفشاں

مولانا روم فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ یوں فرماتے ہیں کہ: بندوں کی تسبیح اور ان کے میری پاکی بیان کرنے سے ؛مَیں پاک نہیں ہوتا، بلکہ میری پاکی بیان کرنے سے خود وہی پاک ہوتے ہیں ، میرا نام لینے کی وجہ سے ان کی ہی گندگیاں دور ہوتی ہیں اور میرا نام لینے کی وجہ سے انہیں کے اندر کمالات اور خوبیاں پیدا ہوتی ہیں ۔

توحقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لینا بندوں کے لئے بڑی سعادت کی بات ہے، اوراللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے صرف اجازت مل جاتی تب بھی بڑی بات تھی، چہ جائیکہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا۔

اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں

چناں چہ ذکر اللہ کے سلسلہ میں جو آیاتِ قرآنیہ اوراحادیثِ نبویہ وارد ہوئی ہیں ان میں سے کچھ ہی یہاں پیش کرتے ہیں ۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ''فضائلِ ذکر'' میں بہت ساری آیتیں پیش فرمائی ہیں جو ہم اورآپ تعلیم کے حلقوں میں سنتے رہتے ہیں۔ پھر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مخصوص کلمات کے فضائل کے لئے بھی بے شمار آیتیں پیش کی

ہیں اور اس کے بعد احادیث بھی پیش کی ہیں۔ یہاں علامہ نووی بھی چند آیتیں پیش کرنے کے بعد فرمادیں گے: "وَالآيَاتُ فِي الْبَابِ كَثِيرَةٌ مَعْلُومَةٌ"۔

پہلی آیت لائے ہیں: ﴿وَلَذِكْرُ اللهِ أَكْبَرُ﴾ اللہ تعالیٰ کی یاد بہت بڑی چیز ہے، یعنی اگر کسی آدمی کو اللہ کا ذکر کرنے کی توفیق و سعادت مل جائے تو یہ اس کے حق میں بہت بڑی چیز ہے، اس سے بڑی اور کوئی نعمت نہیں ہو سکتی۔

باری تعالیٰ کا ایک اور ارشاد ہے: ﴿فَاذْكُرُونِيْ أَذْكُرْكُمْ﴾ تم مجھے یاد کرو؛ میں تمہیں یاد رکھوں گا۔

باری تعالیٰ حکم دیتے ہیں: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَّخِيفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلاَ تَكُنْ مِّنَ الْغَافِلِيْنَ﴾ تم اپنے رب کو اپنے دل میں یاد کرو صبح و شام، عاجزی کی حالت میں گڑگڑاتے اور ڈرتے ہوئے کہ آواز میں پستی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ ہو جاؤ۔

﴿وَاذْكُرُوا اللهَ كَثِيْراً لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہی ساری کامیابی اور خوبیوں کی جڑ ہے، جتنی بھی عبادتیں ہیں اور اوامر و نواہی کے قبیل کے جتنے بھی احکامات دئے گئے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی یاد ہی کے لئے ہیں۔

﴿إِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ ..... إِلَى قَوْلِهِ تَعَالَىٰ ..... وَالذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّأَجْراً عَظِيْماً﴾ سورۂ احزاب میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کے کچھ اوصاف وخوبیاں بیان کی ہیں ان میں ایک یہ ہے: ﴿وَالذَّاكِرِيْنَ اللهَ كَثِيْراً وَالذَّاكِرَاتِ﴾ وہ مرد جو اللہ تعالیٰ کو بہت کثرت سے یاد کرتے ہیں اور وہ عورتیں جو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان مردوں اور عورتوں کے لئے مغفرت اور بہت بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے، قیامت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نوازا جائے گا۔

﴿يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اذْكُرُوا اللهَ ذِكْراً كَثِيْراً وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّأَصِيْلاً﴾ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ یاد کرو اور صبح اور شام اس کی پاکی بیان کرو۔

جن کا اوڑھنا بچھونا اور غذا ہی اللہ تعالیٰ کی یاد تھی

اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی اصل ہے، اللہ کے ایسے بندے بھی گزرے ہیں کہ ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کی غذا اللہ تعالیٰ کی یاد تھی، بڑے حضرت رائپوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے ''فضائلِ رمضان'' اور ''اکابر کا رمضان'' میں واقعہ لکھا ہے کہ:

رمضان میں چائے کی چند فنجان نوش فرماتے تھے، وہی آپ کی غذا ہوتی تھی اور فرمایا کرتے تھے کہ: الحمد للہ اب تو جنّت کا مزہ آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ان کے لئے غذا تھی۔ قربِ قیامت میں جب دجال کا ظہور ہوگا تو ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ اہلِ ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی غذا کا کام دے گا، جب اس وقت غذا کا کام دے گا تو دیگر اوقات میں بھی غذا کا کام دے سکتا ہے۔

ذکر اللہ کی حلاوت ولذت

اور اس میں حلاوت اور لذت بھی ہے۔ حضرت سائیں توکل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں ایک بزرگ تھے، پنجاب میں انبالہ کے رہنے والے تھے، وہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرماتے تھے کہ: جب اللہ کا نام لیتا ہوں تو پورا منھ شکر سے بھر جاوے ہے۔ گویا ان کو معنوی نہیں بلکہ حسّی مٹھاس کا احساس ہوتا تھا:-

اللہ اللہ ایں چہ شیریں ہست نام۔۔۔۔ شیر و شکر می شود جانم تمام

بہر حال! اللہ تعالیٰ کے نام کو آدمی حرزِ جان بنالے اور اس کا خوب اہتمام کرے۔

اللہ تعالیٰ کی ہر " اطاعت" ذکر ہے

حدیث ۱۴۰۸:-

وعن أَبِي هريرة رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي الِمِيزَانِ، حَبِيبَتَانِ إِلَى الرَّحْمانِ: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللهِ العظيمِ)). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: دو کلمے ایسے ہیں جو زبان پر بہت ہلکے ہیں (یعنی ان کی ادائیگی مشکل نہیں ہے، چھوٹے اور مختصر ہیں آدمی بڑی آسانی سے ادا کرلیتا ہے) نامۂ اعمال جس ترازو میں تولے جائیں گے اس میں بہت بھاری ہیں (یعنی ان کلمات کے پڑھنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ثواب ملے گا وہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کی وجہ سے میزانِ عمل وزنی ہوجائے گا) اللہ تعالیٰ کو بہت پسند اور پیارے ہیں (اس لیے جو آدمی ان کو پڑھے گا وہ بھی اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جائے گا) وہ "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيمِ" ہیں۔

افادات:- اللہ تعالیٰ کے ذکر کی مختلف شکلیں ہیں، ایک تو یہی کلمات ہیں جو حدیث میں آئے، اس کے علاوہ کلمۂ طیبہ، تسبیح یعنی سبحان اللہ، تحمید یعنی الحمدللہ، تہلیل یعنی لا الٰہ الا اللہ، اور تکبیر یعنی اللہ اکبر؛ یہ سب ذکر ہی کے کلمات ہیں، اسی طرح درود شریف بھی ذکر میں شامل ہے، قرآنِ پاک کی تلاوت بھی ذکر میں داخل ہے، بلکہ آدمی کی طرف

چوبیس گھنٹے اللہ تعالیٰ کے جو بھی اوامر اور نواہی متوجہ ہوتے ہیں ، جیسے: نماز کے وقت میں نماز ادا کرنے کا حکم، اگر صاحبِ مال ہے تو اس کے وقت پر زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم، اسی طرح بندوں کے آپس کے حقوق کی ادائیگی کا حکم وغیرہ وغیرہ متوجہ ہوتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس لائن سے جو بھی احکام دئے گئے ہیں ان سارے احکام کو بجا لانا، یا جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے، جیسے: بد نگاہی اور بد زبانی سے بچانا، اسی طریقہ سے زنا، چوری، شراب نوشی اور دوسرے تمام گناہوں سے اپنے آپ کو بچانا، جیسے: بازار میں نکلے تو نفس کہتا ہے کہ بد نگاہی کا ارتکاب کرو، اس وقت آدمی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ نفس کہتا ہے کہ گانا سنو، تو اس سے اپنے آپ روکنا، خلاصہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے موقعہ بہ موقعہ جن جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچانا اور جن جن احکام کی بجا آوری کا حکم دیا گیا ہے ان کو انجام دینا؛ اسی کو ’’اطاعت‘‘ کہا جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ہر اطاعت ذکر میں داخل ہے۔

سب سے محبوب کلمات

حدیث ۱۴۰۹:-

وعنه - رضی اللہ عنه - قَالَ: قَالَ رسول اللہ ﷺ: لأَنْ أَقُولَ: سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلهِ، وَلاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ، أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں یہ کلمات "سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ" کہوں، یہ میرے نزدیک سورج جن چیزوں پر طلوع ہوتا ہے (یعنی ساری کائنات، تمام دنیا اور دنیا میں جو کچھ ہے) ان سب سے محبوب اور پسندیدہ ہیں (تو اب ظاہر ہے کہ ساری کائنات مل کر بھی اس کی قیمت بن سکتی ہے؟)۔

چوتھا کلمہ شیطان سے حفاظت کا ذریعہ

حدیث ۱۴۱۰:-

وعنه: أَنَّ رَسُولَ اللہ ﷺ قَالَ: ((مَنْ قَالَ: لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، فِي يَوْمٍ مِئَةَ مَرَّةٍ كَانَتْ لَهُ عَدْلَ عَشْرِ رِقَابٍ وَكُتِبَتْ لَهُ مِئَةُ حَسَنَةٍ، وَمُحِيَتْ عَنْهُ مِئَةُ سَيِّئَةٍ، وَكَانَتْ لَهُ حِرْزاً مِنَ الشَّيْطَانِ يَوْمَهُ ذٰلِكَ حَتَّى يُمْسِي، وَلَمْ يَأْتِ أَحَدٌ

بِأَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهِ إِلَّا رَجُلٌ عَمِلَ أَكْثَرَ مِنْهُ)) وقال: ((مَنْ قَالَ سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ فِي يَوْمٍ مِئَةَ مَرَّةٍ ، حُطَّتْ خَطَايَاهُ ، وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ الْبَحْرِ)). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے یہ کلمات دن میں سو مرتبہ کہے (یعنی چوتھا کلمہ) ”اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ، وہی یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ، سارا اختیار اسی کے قبضہ میں ہے، اور اسی کے لئے ساری خوبیاں اور تعریفیں ہیں ، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے“ تو اس کو دس غلاموں کے آزاد کرنے کے برابر ثواب ملے گا اور اس کے لئے سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور اس کے سو گناہ معاف کئے جائیں گے ، اور یہ کلمات اس دن شام تک اس کے لئے شیطان سے حفاظت کا ذریعہ بنیں گے۔ اور کوئی آدمی اس سے بڑھ کر اچھا عمل لے کر نہیں آ سکتا مگر وہی جس نے اس سے زیادہ مرتبہ یہی کلمات پڑھے ہوں ۔

دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ کسی آدمی نے ”سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ“ ایک دن میں سو مرتبہ کہہ لئے تو اس کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے چاہے سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں ۔

افادات:۔ جتنے بھی جنات اور شیاطین ، اور آسیب و سحر کے اثرات ہوتے ہیں ان سے حفاظت کے اندر یہ کلمات بہت زیادہ مجرّب اور مفید ہیں ، اس لئے کہ ساحرین بھی اپنے سحر کو شیاطین ہی کے ذریعہ لاگو کرتے ہیں اور اس کے لیے وہ لوگ پہلے شیاطین کی تعریف کرتے ہیں ، ان کی خدمت میں کچھ چڑھاوے چڑھاتے ہیں ، پھر انہیں سحر کے ذریعہ

سامنے والے پر مسلّط کر دیتے ہیں ۔ لیکن یہ کلمات یعنی چوتھا کلمہ تمام شیطانوں سے حفاظت کا ذریعہ بن جاتے ہیں ۔

اور جیسا کہ پہلے بھی کئی مرتبہ بتلایا گیا ہے کہ ان جیسی عبادتوں سے چھوٹے گناہ معاف ہوتے ہیں، یہ اصول صرف صغائر یعنی چھوٹے گناہوں کے لئے ہے، بڑے گناہوں کے متعلق اصول وہی ہے کہ جب تک آدمی ان سے توبہ نہ کرے وہاں تک معاف نہیں ہوتے۔

چار عرب غلام آزاد کرنے کا ثواب

حدیث ۱۴۱۱:-

وعن أَبِي أيوب الأنصاريِّ رضى الله عنه عن النَّبِيِّ ﷺ قَالَ : ((مَنْ قَالَ لاإِلٰهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ، وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ؛ عَشْرَمَرَّاتٍ. كَانَ كَمَنْ أَعْتَقَ أَرْبَعَةَ أَنْفُسٍ مِنْ وَلَدِ إِسْمَاعِيلَ)) (متفقٌ عَلَيْه)

ترجمہ:- حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" دس مرتبہ کہا، اس کو ایسا ثواب ملے گا جیسا کہ اس نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے چار غلاموں کو آزاد کیا (یعنی چار عرب غلام آزاد کرنے پر جو ثواب ملتا ہے وہ ثواب اس کو ملے گا)۔

افادات:- دیکھو! اگر ہمیں کسی دنیوی چیز کی لالچ دی جاتی ہے جو دنیوی اعتبار سے معمولی چیز ہوتی ہے، اس کو بھی حاصل کرنے کے لئے ہم بہت کچھ کر ڈالتے ہیں ، اور ان چھوٹے چھوٹے کلمات کے پڑھنے پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اتنے بڑے بڑے ثواب دیئے جارہے ہیں تو پھر اہلِ ایمان کو ان کی طرف کیسی رغبت کرنی چاہئے ؟۔

اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کلام

حدیث ۱۴۱۲:-

وعن أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((أَلاَ أُخْبِرُكَ بِأَحَبِّ الكَلاَمِ إِلَى اللهِ ؟ إِنَّ أَحَبَّ الكَلاَمِ إِلَى اللهِ: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ.)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ جو کلام پسندیدہ اور محبوب ہے وہ میں تم کو نہ بتلاؤں ؟ (پھر فرمایا:) اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب کلام "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ" ہے۔ (اس کلمہ کی بھی حدیث پاک میں بڑی فضیلت آئی ہے)۔

سبحان اللہ، الحمد للہ زمین و آسمان کے بیچ کے حصہ کو بھر دیتے ہیں

حدیث ۱۴۱۳:-

وعن أبي مالك الأشعري -رضی الله عنه- قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((الطُّهُورُ شَطْرُ الإِيمانِ، وَالحَمْدُ للهِ تَمْلأُ المِيزَانَ، وَسُبْحَانَ اللهِ وَالحَمْدُ للهِ تَمْلآنِ -أَوْ تَمْلأُ- مَا بَيْنَ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ))

(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابومالک اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: پاکی حاصل کرنا ایمان کا آدھا حصہ ہے۔ اور "الحمد للہ" میزانِ عمل کو بھر دیتا ہے۔ سبحان اللہ اور الحمد للہ؛ یہ دونوں زمین اور آسمان کے بیچ کے حصہ کو بھر دیتے ہیں۔

افادات:- ترمذی شریف کی روایت میں "نصف الایمان" بھی آیا ہے، ویسے "شطر" کا لفظ آدھے کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

آدھا ایمان کیوں؟

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں ایمان بول کر نماز مراد لی ہے کہ ایمان یعنی نماز جیسے قرآنِ کریم کی اس آیت ﴿وَمَا كَانَ اللهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ﴾ میں ایمان بول کر نماز مراد

لی گئی ہے۔ایسے ہی یہاں بھی ایمان بول کر نماز مراد لی گئی ہے، گویا نماز کا آدھا حصہ پاکی حاصل کرنا ہے،اگر آدمی پاکی حاصل کئے بغیر نماز پڑھے گا تو نماز معتبر ہی نہیں ہو گی۔

اور بعضوں نے کہا کہ یہاں ایمان بول کر ایمان ہی مراد ہے۔اب ایمان کے اندر تو بے شمار اعمال ہیں ، تو پھر پاکی کو آدھا ایمان کیوں قرار دیا گیا؟ تو علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایمان کا اور ہر ہر عمل کا ایک اصلی ثواب مقرر ہے کہ فلاں عمل پر اتنا ثواب دیا جائے گا، پھر کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عمل کرنے والے کے اخلاص اور رغبت، موقع و محل کو دیکھ کر اس ثواب میں اضافہ اور زیادتی کی جاتی ہے، جو اس کا انعامی ثواب کہلاتا ہے۔تو گویا حضورِ اکرم ﷺ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ پاکی حاصل کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعامی ثواب دیا جاتا ہے وہ ایمان کے اصلی ثواب کے آدھے کے برابر ہو جاتا ہے۔

مجھے کوئی کلام سکھلا دیجئے

حدیث ۱۴۱۴:-

وعن سعد بن أَبِي وقاصٍ - رضى الله عنه - قَالَ: جَاءَ أَعْرَابِيٌّ إِلَى رَسولِ اللهِ ﷺ فَقَالَ : عَلِّمْنِي كَلَامًا أَقُولُهُ . قَالَ : قُلْ : لاَ إِلٰهَ إِلاَّاللهُ وَحْدَهُ لَاشَرِيكَ لَهُ، اللهُ أَكْبَرُ كَبِيراً، وَالحَمْدُ للهِ كَثيراً، وَسُبْحَانَ اللهِ رَبِّ العَالَمِينَ، وَلاَ حَولَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ العَزِيزِ الحَكِيمِ. قَالَ: فهؤُلاءِ لِرَبِّي، فَمَا لِي؟ قَالَ: قُلْ: اللَّهُمَّ اغْفِرْلِي، وَارْحَمْنِي وَاهْدِنِي، وَارْزُقْنِي. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک دیہاتی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا کلام سکھلا دیجئے جو میں پڑھتا رہوں۔ اس پر حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: یہ کلمات پڑھتے رہو: "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللهُ وَحْدَہٗ لَا شَرِيْكَ لَهُ، اَللهُ أَكْبَرُ كَبِيْراً، وَالْحَمْدُ لِلهِ كَثِيْراً، وَسُبْحَانَ اللهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ" (یہ کلمات وہ ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد و تعریف اور اللہ تعالیٰ کی پاکی کا تذکرہ ہے) اس دیہاتی نے پھر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ سارے کلمات تو میرے رب کے لئے ہیں (یعنی ان میں تو اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کی گئی ہے) میرے لئے کیا؟ (یعنی کوئی ایسا کلمہ بتلا دیجئے جس سے میری حاجتیں پوری ہوں) حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: یوں کہا کرو: اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف کردے میرے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ فرما، مجھے ہدایت دے، اور مجھے روزی دے۔

نماز سے فارغ ہو کر پڑھے جانے والے مختلف کلمات

حدیث ۱۴۱۵:-

وعن ثَوبانَ -رضی الله عنه- قَالَ: كَانَ رَسولُ اللهِ ﷺ إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلاَتِهِ، اِسْتَغْفَرَ ثَلاثاً، وَقَالَ: ((اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلاَمُ، وَمِنْكَ السَّلاَمُ، تَبَارَكْتَ يَاذَا الجَلاَلِ وَالإِكْرَامِ)) قِيلَ لِلأَوْزَاعِيِّ -وَهُوَ أَحَدُ رواة الحديث: كَيْفَ الاسْتِغْفَارُ؟ قَالَ: يقول: أَسْتَغْفِرُ الله، أَسْتَغْفِرُ الله. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب نماز سے فارغ ہوتے تھے (یعنی سلام پھیرتے تھے) تو تین مرتبہ استغفار فرماتے تھے اور یہ دعا کرتے تھے: اَللّٰھُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَاالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (اس روایت کے راویوں میں) امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ (ہیں ان) سے کسی نے پوچھا کہ: آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کون سے الفاظ سے استغفار فرماتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ یوں فرماتے تھے: ”أَسْتَغْفِرُ الله، أَسْتَغْفِرُ الله“۔

افادات:- معلوم ہوا کہ نماز کا سلام پھیرنے کے بعد تین مرتبہ ”أَسْتَغْفِرُ الله“ کہنا چاہیے، یہ بھی ذکر ہی کی ایک قسم ہے، اور اس کے بعد یہ دعا پڑھے۔

حدیث ۱۴۱۶:-

وعن المغيرة بن شعبة رضى الله عنه: أَنَّ رسول الله ﷺ كَانَ إِذَا فَرَغَ مِنَ الصَّلَاةِ وَسَلَّمَ، قَالَ: ((لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اللَّهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)). (متفقٌ عَلَيْهِ.)

ترجمہ:- حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب نماز سے فارغ ہوتے تھے اور سلام پھیرتے تھے تو یہ کلمات پڑھتے تھے: اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، اے اللہ جو تو عطا فرمائے کوئی اس کو روک نہیں سکتا، جس چیز کو تو روک دے تو کوئی وہ دے نہیں سکتا، اور کسی مالدار کو اس کی مالداری نفع نہیں پہنچا سکتی۔

افادات:- یہ سب روایتیں اسی لئے پیش فرما رہے ہیں کہ آدمی کبھی یہ پڑھ لے، کبھی وہ پڑھ لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عمل کا اہتمام کرے۔

حدیث ۱۴۱۷:-

وعن عبدِ الله بن الزُّبَيْرِ رضى الله تعالىٰ عنهما أَنَّهُ كَانَ يَقُولُ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ، حِيْنَ يُسَلِّمُ: ((لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَلَا نَعْبُدُ إِلَّا إِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ مُخْلِصِينَ

لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ)) قَالَ ابْنُ الزُّبَيْرِ: وَكَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ يُهَلِّلُ بِهِنَّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ.

(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ وہ ہر فرض کی نماز کے سلام پھیر کر یہ کلمات پڑھتے تھے: "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ، وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِيَّاهُ، لَهُ النِّعْمَةُ، وَلَهُ الْفَضْلُ وَلَهُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ" اور حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما فرماتے تھے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بھی ہر فرض نماز کے بعد یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔

حدیث ۱۴۱۸:-

وعن أبي هريرة - رضى الله عنه -: أَنَّ فُقَرَاءَ الْمُهَاجِرِينَ أَتَوْا رسُولَ اللهِ ﷺ فقالوا: ذَهَبَ أَهْلُ الدُّثُورِ بِالدَّرَجَاتِ العُلَى، وَالنَّعِيمِ الْمُقِيمِ، يُصَلُّونَ كَمَا نُصَلِّي، وَيَصُومُونَ كَمَا نَصُومُ، وَلَهُمْ فَضْلٌ مِنْ أَمْوَالٍ، يَحُجُّونَ، وَيَعْتَمِرُونَ، وَيُجَاهِدُونَ، وَيَتَصَدَّقُونَ. فَقَالَ: ((أَلاَ أُعَلِّمُكُمْ شَيْئاً تُدْرِكُونَ بِهِ مَنْ سَبَقَكُمْ، وَتَسْبِقُونَ بِهِ مَنْ بَعْدَكُمْ، وَلاَ يَكُون أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنْكُمْ إِلاَّ مَنْ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُمْ؟)) قالوا: بَلَى يَا رسول الله، قَالَ: ((تُسَبِّحُونَ، وَتَحْمَدُونَ، وَتُكَبِّرُونَ، خَلْفَ كُلِّ صَلاَةٍ ثَلاثاً وَثَلاثِينَ))

قَالَ أَبُو صالح الراوي عن أَبي هريرة، لَمَّا سُئِلَ عَنْ كَيْفِيَّةِ ذِكْرِهِنَّ قَالَ: يقول: سُبْحَانَ اللهِ، وَالحَمْدُ للهِ واللهُ أَكْبَرُ، حَتَّى يَكُونَ مِنهُنَّ كُلُّهُنَّ ثَلاثاً وَثَلاثِينَ. (متفقٌ عَلَيهِ)

وزاد مسلمٌ فی روایته : فَرَجَعَ فُقَرَاءُ الْمُهَاجِرِينَ إِلَى رسولِ الله ﷺ فقالوا: سَمِعَ إِخْوَانُنَا أَهْلُ الأَمْوَالِ بِمَا فَعَلْنَا فَفَعَلُوا مِثْلَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ الله ﷺ: ((ذَٰلِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ)).

((الدُّثُورُ)) جمع دَثْر - بفتح الدال وإسكان الثاء المثلثة - وَهُوَ: المال الكثير.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں فقراءِ مہاجرین حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مال والے بلند درجات کو لے اُڑے (انہوں نے بلند درجات پر قبضہ کرلیا اور ہمیشہ کی نعمتیں انہوں نے ہی حاصل کرلیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: کیسے؟) تو انہوں نے عرض کیا: جس طرح ہم نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، جس طرح ہم روزہ رکھتے ہیں وہ بھی رکھتے ہیں، ان کے پاس مال زیادہ ہے جس کے ذریعہ وہ حج و عمرہ کرتے ہیں، جہاد میں شریک ہوتے ہیں اور اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں (ہمارے پاس تو مال ہے نہیں کہ ہم بھی یہ اعمال انجام دے سکیں) اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم کو ایسی چیز نہ سکھلاؤں جس پر عمل کر کے تم ان لوگوں کو پکڑ لو جو تم سے آگے بڑھ چکے ہیں، اور جو تمہارے بعد آنے والے ہیں ان سے تم آگے نکل جاؤ، اور تم سے کوئی آدمی افضل نہیں ہو سکتا مگر وہی جو اسی طرح کا عمل کرے؟ ان لوگوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتلائیے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ہر نماز کے بعد ۳۳/ مرتبہ تسبیح، ۳۳/ مرتبہ تحمید، اور ۳۳/ مرتبہ تکبیر کہہ لیا کرو۔

اس روایت کے ایک راوی ابو صالح ہیں وہ کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا: تسبیح کیسے پڑھیں ؟ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تینتیس مرتبہ یوں کہو: سُبْحَانَ اللہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَاللہُ أَکْبَرُ" (یہ سب ایک ساتھ بھی کہہ سکتے ہیں ،اور ہر کلمہ کو الگ الگ بھی کہہ سکتے ہیں)۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ زیادتی بھی ہے کہ اس کے بعد حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس فقراءِ مہاجرین حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے مالدار بھائیوں نے بھی وہ وظیفہ سن لیا اور وہ بھی اسی طرح کرنے لگے، اب تو وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

حدیث ۱۴۱۹:-

وعنه، عن رسولِ الله ﷺ قَالَ: ((مَنْ سَبَّحَ اللهَ فِی دُبُرِ كُلِّ صَلاَةٍ ثَلاثاً وَثَلاثِين، وحَمِدَ اللهَ ثَلاثاً وَثَلاثِين، وَ كَبَّرَ اللهَ ثَلاثاً وَثَلاثِين، وقال تَمامَ المِئَةِ: لاَ إلهَ إلاَّ اللهُ وَحدَهُ لا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ المُلْكُ وَلَهُ الحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيءٍ قَدِيرٌ، غُفِرَتْ خَطَايَاهُ وَإنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ البَحْرِ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی ہر (فرض) نماز کے بعد تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ، تینتیس مرتبہ اللہ اکبر، اور سویں مرتبہ "لَااِلٰهَ اِلَّا اللہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْكَ لَہٗ لَہُ الْمُلْكُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" پڑھے گا: تو اس کے سارے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے چاہے سمندر کی جھاگ کے مانند ہوں۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ گناہ چاہے کتنی ہی مقدار میں کیوں نہ ہوں ، ان تسبیحات کی وجہ سے وہ تمام گناہ معاف ہو جائیں گے۔

پہلے بھی بتلایا تھا کہ ایسے اعمال پر جن گناہوں کی معافی کی بشارت سنائی گئی ہے، اس سے صغائر یعنی چھوٹے گناہ مراد ہیں ، کبائر یعنی بڑے گناہ تو جب تک توبہ نہ کی جائے وہاں تک معاف نہیں ہوتے۔

مختلف تعداد کی وجہ

جو تسبیحات نماز کے بعد پڑھی جاتی ہیں اس سلسلہ میں روایتوں میں مختلف تعداد آئی ہے، ایک تو یہی ہے جو اس روایت میں گزرا۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ ''سبحان اللہ'' تینتیس (۳۳) مرتبہ، ''الحمدللہ'' تینتیس (۳۳) مرتبہ، اور ''اللہ اکبر'' چونتیس (۳۴) مرتبہ پڑھے۔ بعض روایات میں ان تسبیحات کی مقدار پچیس پچیس مرتبہ بھی آئی ہے۔ بعض میں گیارہ گیارہ کا عدد آیا ہے۔ بعض میں دس کا عدد وارد ہوا ہے، اور بعض میں تین بھی آیا ہے۔ ان سب روایات کو سامنے رکھ کر علماء نے فرمایا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی عجلت میں ہوتا ہے، وقت کی تنگی ہوتی ہے؛ اس وقت جو قلیل مقدار ہے اسی کو اگر

ادا کرلے گا تو ان شاء اللہ یہ فضیلت حاصل ہو جائے گی۔ جیسا موقعہ ہو اسی کے مطابق پڑھ لیا کرے۔

تسبیحاتِ فاطمی

روایتوں میں آتا ہے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کے پاس کچھ غلام اور باندیاں آئیں، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو پتہ چلا تو وہ یہ درخواست لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں (کہ اگر کوئی باندی خدمت کے لئے مل جائے تو گھر کے کام کاج میں کچھ راحت ہو جائے گی) حضورِ اکرم ﷺ گھر پر تشریف فرما نہیں تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنی بات کہی اور واپس اپنے گھر تشریف لے گئیں۔ جب حضور اکرم ﷺ رات کو تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتلایا کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اس مقصد کے لئے حاضر ہوئی تھیں تو حضورِ اکرم ﷺ اسی وقت رات کو ان کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس وقت ہم بستر پر لیٹ چکے تھے، حضورِ اکرم ﷺ کے تشریف لانے پر ہم نے اُٹھ کر بیٹھنا چاہا تو حضور ﷺ نے فرمایا: لیٹے رہو، پھر آپ ہم دونوں کے درمیان میں بیٹھ گئے، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آپ

کے اقدامِ عالیہ مبارکہ کی ٹھنڈک اپنے سینہ پر محسوس کی۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس سے بہتر چیز نہ بتلاؤں ، اوراس وقت آپ ﷺ نے یہ تسبیحات ان کو بتلائیں ۔ (ابوداود، ۲/۶۹۰، باب فی التسبیح عند النوم) اسی وجہ سے ان تسبیحات کو ”تسبیحاتِ فاطمی“ کانام دیا گیاہے۔

اس پر عمل کرنے پر جو وعدے اور بشارتیں بتلائی گئی ہیں وہ بھی مختلف ہیں ، جیسا کہ اس حدیث میں بتلایا گیا کہ ان کے پڑھنے کی وجہ سے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے، چاہے کتنی ہی بڑی مقدار میں کیوں نہ ہوں ۔اور اس کا ایک فائدہ یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ دن بھر کے کام کاج کے نتیجہ میں آدمی کو جو محنت اور مشقّت لاحق ہوتی ہے اور بدن میں جو تھکن محسوس ہوتی ہے،رات کو سوتے وقت ان تسبیحات کے پڑھنے کی وجہ سے وہ بھی دور ہو جائے گی۔

کبھی نقصان میں نہیں رہے گا

حدیث ۱۴۲۰ :-

وعن كعب بن عُجْرَةَ- رضی اللہ عنہ -عن رسولِ الله ﷺ قَالَ: ((مُعَقِّباتٌ لاَ يَخِيبُ قَائِلُهُنَّ-أَوْ فَاعِلُهُنَّ- دُبُرَ كُلِّ صَلاَةٍ مَكْتُوبَةٍ: ثَلاثٌ وَثَلاثُونَ تَسْبِيحَةً. وَثَلاثٌ وثَلاَثُونَ تَحْمِيدَةً ، وَأَرْبَعٌ وَثَلاَثُونَ تَكْبِيرَةً)) .رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چند کلمات جو نماز کے بعد کہے جاتے ہیں ایسے ہیں کہ جو آدمی ہر فرض نماز کے بعد ان کو کہہ لیا کرے گا- یا فرمایا کہ ان کو کر لیا کرے گا- وہ کبھی گھاٹے اور نقصان میں نہیں رہے گا۔ اس میں فائدے ہی میں رہے گا، پھر آپ ﷺ نے بتلایا: تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، بتلایا: تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ "اللہ اکبر"۔

افادات:- دو منٹ کا کام ہے اس لیے ہر فرض نماز کے بعد اور سوتے وقت بھی اس کی عادت بنا لینی چاہیے۔

چند بری خصلتوں سے پناہ

حدیث ۱۴۲۱:-

عن سعد بن أَبِي وقاص رضی الله عنه:- أَنَّ رسولَ الله ﷺ كَانَ يَتَعَوَّذُ دُبُرَ الصَّلَوَاتِ بِهٰؤُلاءِ الكَلِمَاتِ: أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعوذُ بِكَ مِنَ الجُبْنِ وَالبُخْلِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ أَنْ أُرَدَّ إِلَى أَرْذَلِ العُمُرِ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الدُّنْيَا، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ القَبْرِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ فرض نمازوں کے بعد ان کلمات کے ذریعہ دعا مانگا کرتے تھے: "اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں بزدلی اور بخیلی سے۔ اور اس

سے بھی میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ گھٹیا عمر تک پہنچ جاؤں ۔ اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں دنیا کے فتنوں سے۔ اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں قبر کے فتنوں سے۔“

افادات:- چند بری خصلتیں ایسی ہیں جن سے اس دعا میں پناہ چاہی گئی ہے، ایک بزدلی، دوسرے بخیلی یعنی اللہ تعالیٰ نے بندوں کے جو حقوق لازم کئے ہیں ان میں آدمی مال خرچ کرنے سے باز رہے؛ اس کو بخل کہا جاتا ہے۔

أَرْذَلِ الْعُمُرِ الخ:- عمر کی وہ منزل جہاں پہنچنے کے بعد آدمی کے اعضاء جواب دے جاتے ہیں ، اور آدمی کو اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں عطا فرمار کھی ہیں جیسے: سننے کی، دیکھنے کی، بولنے کی، چلنے کی؛ یہ ساری صلاحیتیں متأثر ہو جاتی ہیں ، اور اعضاء کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں ، آدمی کو کچھ یاد بھی نہیں رہتا، اس کا حافظہ بچّوں کی طرح ہو جاتا ہے؛ اسی کو ”أَرْذَلِ الْعُمُر“ سے تعبیر کیا گیا ہے، بہت سی مرتبہ کھانا کھالیا ہوتا ہے پھر بھی اگر ان سے پوچھیں تو کہتا ہے کہ: گھر والوں نے نہیں کھلایا۔

فِتْنَةِ الدُّنْيَا:- دنیا میں رہتے ہوئے آدمی کو جو بھی حالات پیش آتے ہیں اور جن کی وجہ سے آدمی آزمائشوں میں مبتلا ہوتا ہے؛ وہ سب مراد ہیں ۔

فِتْنَةِ الْقَبْرِ :-یعنی قبر میں منکر نکیر کے سوالات کے جوابات میں ، اور قبر آدمی کو بھینچے گی،اور قبر کے دیگر تمام حالات سے اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتاہوں ۔

حدیث مسلسل بالمحبة

حدیث ۱۴۲۲:-

وعن معاذ رضی الله عنه : أن رسُولَ اللهِ ﷺ أخذ بيده، وقال: ((يَامُعَاذُ! وَاللهِ إِنِّي لأُحِبُّكَ)) فَقَالَ : ((أُوصِيكَ يَا مُعَاذُ لاَ تَدَعَنَّ فِى دُبُرِ كُلِّ صَلاَةٍ تَقُولُ: اَللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ)). (رواه أبُو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: اے معاذ! اللہ کی قسم! مَیں تجھ سے محبت کرتاہوں ۔ پھر فرمایا: اے معاذ! مَیں تجھ کو تاکید کرتاہوں کہ ہر نماز کے بعد ان کلمات کو کہنا نہ چھوڑنا: **"اے اللہ! میری مدد فرما تیرے ذکر پر، اور تیری نعمتوں کا شکر ادا کرنے پر، اور تیری ایسی عبادت پر جو اچھے طریقے سے کی جاتی ہو"۔**

افادات:- حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت محدثین کے ذریعہ واسطہ درواسطہ ہم تک پہنچی، اس میں ہر استاذ اپنے شاگرد کو پہلے اس جملہ سے خطاب کرتاہے "وَاللهِ إِنِّي

لأُحِبُّكَ" اللہ کی قسم !مَیں تم سے محبت کرتا ہوں ،اور ہر نماز کے بعد یہ کہا کرو۔ اس حدیث کو محدثین کی اصطلاح میں " مسلسل بالمحبۃ" کہا جاتا ہے۔

قعدۂ اخیر میں پڑھی جانے والی مختلف دعائیں

حدیث ۱۴۲۳:-

وعن أبي هريرة-رضى الله عنه-: أنَّ رسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((إِذَا تَشَهَّدَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَعِذْ بِاللهِ مِنْ أَرْبَعٍ ، يقول : اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ جَهَنَّمَ وَمِنْ عَذَابِ القَبْرِ ، وَمِنْ فِتْنَةِ المَحْيَا وَالْمَمَاتِ،وَمِنْ شَرِّ فِتْنَةِ المَسِيحِ الدَّجَّالِ)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی آخری قعدہ میں جب تشہد پڑھ لے تو پھر چار چیزوں سے اللہ کی پناہ مانگے: اے اللہ ! جہنم کے عذاب سے، قبر کے عذاب سے، زندگی اور موت کی آزمائشوں سے، اور دجّال کے فتنہ کے شر سے: میں تیری پناہ چاہتا ہوں ۔

افادات:- دعا کے آداب میں سے یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد ہو اس لیے پہلے تشہد پڑھے، اس کے بعد درود شریف پڑھے، اس کے بعد یہ دعا پڑھے اور نماز کے آخری قعدہ میں اخیر میں جو دعا پڑھی جاتی ہے اس میں ایک یہ دعا بھی ہے۔

"دجّال کے فتنہ کے شر سے" بھی پناہ مانگنی چاہیے، دجال قربِ قیامت میں ایک شخص ظاہر ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ سے طرح طرح کی چیزیں ظاہر کروائیں گے، وہ نئی نئی شعبدہ بازیاں کرے گا، شروع میں تو نبوت کا اور بعد میں خدائی کا دعویٰ کرے گا، جو بھی اس کو مانے گا وہ ایمان سے نکل جائے گا۔ بڑا زبردست فتنہ ہوگا، اس سے بھی پناہ چاہی گئی ہے۔

حدیث ۱۴۲۴:-

وعن عليٍّ -رضی اللہ عنہ- قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللهِ ﷺ إِذَا قَامَ إِلَى الصَّلَاةِ يَكُونُ مِنْ آخِرِ مَا يَقُولُ بَيْنَ التَّشَهُّدِ وَالتَّسْلِيمِ: ((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَسْرَفْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ، وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، لا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو آخر میں تشہد اور سلام کے درمیان یہ دعا پڑھتے تھے: اے اللہ! جو گناہ میں نے پہلے کئے ہیں اور جو گناہ میں نے بعد میں کئے ہیں تو ان کو معاف کردے۔ اور جو گناہ میں نے چھپ کر کئے اور کھل کر کئے وہ بھی معاف کردے، اور گناہ کے ذریعہ سے میں نے اپنے اوپر جتنی بھی زیادتی کی ہو وہ بھی معاف کردے، اور میرے تمام گناہوں کو جن کو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے؛ معاف کردے (بہت سی مرتبہ آدمی گناہ کرکے خود تو بھول جاتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے علم میں سب موجود ہے اس لیے اس سے معافی گئی) تو ہی نیکیوں کے ذریعہ سے آگے بڑھانے والا اور گناہوں کے ذریعہ سے پیچھے رکھنے والا ہے (یا یہ

ترجمہ کریں گے کہ) نیکوں کو آگے بڑھانے والا اور گنہگاروں کو پیچھے کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔

رکوع اور سجدہ پڑھنے کے مختلف کلمات

حدیث ۱۴۲۵ :-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها ، قالت : كَانَ النبيُّ ﷺ يُكْثِرُ أنْ يَقُولَ فى رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ : ((سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وبِحَمْدِكَ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِى)) متفقٌ عَلَيْهِ

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اپنے رکوع اور سجدہ میں کثرت سے یہ تسبیح پڑھتے تھے: "سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ رَبَّنَا وبِحَمْدِكَ ، اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي" اے اللہ! اے ہمارے پروردگار، میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اور تیری تعریف کرتا ہوں ،اے اللہ! تو مجھے بخش دے۔

افادات:- آدمی کو نوافل میں ان تسبیحات کا اہتمام کرنا چاہیے، فرائض میں تو "سبحان ربی العظیم" اور "سبحان ربی الاعلیٰ" ہی پڑھنے کو زیادہ مناسب قرار دیا گیا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ سورۂ نصر جب نازل ہوئی اس میں یہ ہے: "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا" اسی پر عمل کرنے کے لیے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اس کا اہتمام فرماتے تھے۔

حدیث ۱۴۲۶:-

وعنها : أنَّ رسول اللهﷺ كَانَ يقولُ فى رُكُوعِهِ وَسُجُودِهِ: ((سبُّوحٌ قُدُّوسٌ رَبُّ المَلاَئِكَةِ وَالرُّوحِ)).

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم رکوع اور سجدہ میں یہ پڑھتے تھے: ہر قسم کے عیوب اور برائیوں سے بہت زیادہ پاک ہے، ملائکہ اور حضرت جبرئیل کا پروردگار ہے۔

حدیث ۱۴۲۷:-

وعن ابن عباس رضی الله عنهما: أنَّ رسولَ اللهﷺ قَالَ: ((فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ-عز وجل-وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِى الدُّعَاءِ، فَقَمِنٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: رکوع میں تو اپنے رب کی تعظیم بیان کرو (سبحان ربی العظیم اسی لیے کہا جاتا ہے) اور سجدہ میں دعا کا خاص اہتمام کیا کرو، اس لیے کہ بہت زیادہ لائق ہے کہ تمہاری یہ دعا قبول کی جائے۔

افادات:- فرائض کے بجائے نوافل کے اندر سجدہ میں ماثور دعاؤں کا اہتمام کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر کسی نے فرض کے سجدہ میں بھی کوئی ماثور دعا مانگ لی تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی۔

حدیث ۱۴۲۸:-

وعن أَبِي هريرة-رضی الله عنه -:أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : ((أَقْرَبُ مَا يَكُونُ العَبْدُ مِنْ رَبِّهِ وَهُوَ سَاجِدٌ،فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ)).(رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب (نماز کے اندر) سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے (جب یہ اللہ تعالیٰ کے قرب کا موقع ہے تو) اس میں دعا کی کثرت کا اہتمام کرو۔

افادات:-اس میں نفل میں جو سجدہ کیا جاتا ہے وہ بتلایا گیا ہے، دعا کے لیے مستقل سجدہ کرنے کو فقہاء پسند نہیں کرتے۔

حدیث ۱۴۲۹ :-

وعنه:أَنَّ رسُولَ اللهِﷺ كَانَ يَقُولُ فِی سجودِهِ:((اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لی ذَنْبِی كُلَّهُ: دِقَّهُ وَجِلَّهُ،وَأَوَّلَهُ وَآخِرَهُ ،وَعَلاَنِيَتَهُ وَسِرَّهُ)).(رواه مسلم)

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سجدہ میں یہ دعا پڑھتے تھے: ”اے اللہ! تو میرے سب گناہوں کو معاف کر دے، چاہے چھوٹے ہوں یا بڑے، اگلے اور پچھلے، کھلے اور پوشیدہ۔

حدیث ۱۴۳۰ :

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: افْتَقَدْتُ النَّبِيَّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ فَتَحَسَّسْتُ، فإذا هُوَ راكِعٌ - أَوْ سَاجِدٌ - يقول: ((سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ، لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أنت)).

وفي روايةٍ: فَوَقَعَتْ يَدِي عَلَى بَطْنِ قَدَمَيْهِ، وَهُوَ فِي الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوبَتَانِ، وَهُوَ يَقُولُ: ((اللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ، وأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ، لاَ أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک رات میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو بستر پر نہیں پایا تو میں نے آپ ﷺ کو ڈھونڈا اور تلاش کیا (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی فرماتی ہیں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ ازواجِ مطہرات میں سے کسی اور کے یہاں تو تشریف نہیں لے گئے۔ جب میں نے آپ کو دیکھا) تو آپ رکوع یا سجدہ میں ہیں اور یہ پڑھ رہے ہیں: ''سُبْحَانَكَ وَبِحَمْدِكَ لاَ إِلٰهَ إِلاَّ أَنْتَ'' (یہاں تو یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ رکوع سجدہ میں یہ تسبیح پڑھی جاسکتی ہے)۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ: میں آپ کو اندھیرے میں تلاش کررہی تھی، تو میرا ہاتھ آپ کے پاؤں کے تلوے پر پڑا، اس وقت آپ سجدہ کی حالت میں تھے اور آپ کے پاؤں کھڑے ہوئے تھے، اور آپ یہ دعا پڑھ رہے تھے: ''اے اللہ! میں تیری خوشنودی کے ذریعہ سے تیری ناراضگی سے پناہ چاہتا ہوں، اور تیرے درگذر کے ذریعہ سے تیری سزا سے پناہ چاہتا ہوں، اور تیرے عذاب سے تیری ہی پناہ چاہتا ہوں (اس لیے کہ اللہ کے عذاب سے اللہ کے علاوہ اور کوئی بچا نہیں سکتا) اے اللہ! تیری ثنا و حمد جیسی بیان ہونی چاہیے میں اس کا احاطہ نہیں کرسکتا (یعنی میں اس کا حق ادا نہیں کرسکتا) آپ تو ایسے ہی

ہیں جیسے آپ نے خود ہی اپنے کلام میں اپنی تعریف بیان فرمائی۔“ (یہ سب مختلف کلمات ہیں، موقع بموقع ان کے پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے)۔

ہر دن ہزار نیکیاں

حدیث ۱۴۳۱:-

وعن سعد بن أَبِي وقاصٍ رضى الله عنه قَالَ: كنا عِنْدَ رسول الله ﷺ فَقَالَ: ((أيعجزُ أحَدُكُمْ أنْ يَكْسِبَ فى كلِّ يومٍ أَلْفَ حَسَنَةٍ!)) فَسَأَلَهُ سَائِلٌ مِنْ جُلَسائِهِ: كَيْفَ يَكْسِبُ أَلْفَ حَسَنَةٍ؟ قَالَ: ((يُسَبِّحُ مِئَةَ تَسْبِيحَةٍ فَيُكْتَبُ لَهُ أَلْفُ حَسَنَةٍ، أَوْ يُحَطُّ عَنْهُ أَلْفُ خَطِيئَةٍ)). (رواه مسلم.)

قَالَ الحُمَيْدِيُّ: كذا هُوَ فى كتاب مسلم: ((أَوْ يُحَطُّ)) قَالَ البَرْقانى: ورواه شُعْبَةُ وأبوعَوَانَةَ، وَيَحْيَى القَطَّانُ، عن موسىٰ الَّذِي رواه مسلم من جهتِهِ فقالوا: ((ويحط)) بغير أَلِفٍ.

ترجمہ:- حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر تھے اس وقت آپ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اتنی سی بات سے بھی عاجز ہے کہ وہ ہر دن میں ایک ہزار نیکیاں کمالے؟ وہاں موجود لوگوں میں ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ایک ہزار نیکیاں کیسے کمائے گا؟ تو حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: سومرتبہ سبحان اللہ پڑھ لے تو اس کے لیے ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی، یا اس کے ایک ہزار گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اس روایت میں تو یہ آیا ہے کہ یا تو ہزار نیکیاں ملیں گی، یا ہزار گناہ معاف ہوں گے۔ لیکن دوسری روایت میں آیا ہے کہ ایک ہزار نیکیاں لکھی جائیں گی اور ایک ہزار گناہ معاف ہوں گے، یعنی دونوں چیزیں حاصل ہوں گی۔

ہر جوڑ پر روزانہ ایک صدقہ

حدیث ۱۴۳۲ :-

وعن أبي ذر رضي الله عنه: أنّ رسولَ الله ﷺ قالَ: ((يُصبحُ عَلَى كُلِّ سُلاَمَى مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ: فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنِ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزِىءُ مِنْ ذَلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنَ الضُّحَى))

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک پر اس کے ہر جوڑ کی سلامتی کے بدلہ میں روزانہ ایک صدقہ کرنا ضروری ہے (ایک روایت میں آتا ہے انسان کے جسم میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں، اب روزانہ تین سو ساٹھ صدقے کیسے دے گا؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ یہاں صدقہ سے مراد ہر نیکی ہے) چناں چہ ہر سبحان اللہ صدقہ کا حکم رکھتا ہے، ہر الحمد للہ صدقہ کا حکم رکھتا ہے، ہر لا الٰہ الا اللہ بھی صدقہ ہے، ہر اللہ اکبر صدقہ ہے، بھلی بات کا حکم کرنا صدقہ ہے، بری بات سے روکنا صدقہ ہے، ان سب کی طرف سے وہ دو رکعتیں کافی ہو جائیں گی جو چاشت کے

وقت ادا کی جائیں گی (چوں کہ آدمی جب نماز پڑھتا ہے تو سارے جوڑ کام میں لگتے ہیں اس وجہ سے وہ حق ادا ہو جاتا ہے)۔

چار کلمات تین تین مرتبہ

حدیث ۱۴۳۳:-

وعن أم المؤمنين جُوَيْرِيَةَ بنت الحارِث رَضِيَ اللهُ عنها: أنَّ النَّبِيَّ ﷺ خرجَ مِنْ عِنْدِهَا بُكْرَةً حِيْنَ صَلَّى الصُّبْحَ وَهِيَ فِي مَسْجِدِهَا ، ثُمَّ رَجَعَ بَعْدَ أَنْ أَضْحَى وَهِيَ جَالِسَةٌ. فقالَ: ((مَا زِلْتِ عَلَى الحالِ الَّتي فارقْتُكِ عَلَيْهَا ؟)) قالت : نَعَمْ ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ:((لَقَدْ قُلْتُ بَعْدَكِ أَرْبَعَ كَلِمَاتٍ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، لَوْ وُزِنَتْ بِمَا قُلْتِ مُنْذُ اليَوْمِ لَوَزَنَتْهُنَّ : سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ ، وَرِضَا نَفْسِهِ، وَزِنَةَ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ)). (رواہ مسلم)

وفي روايةٍ لَهُ:((سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، سُبْحَانَ اللهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ)).

وفي رواية الترمذي:((أَلا أُعَلِّمُكِ كَلِمَاتٍ تَقُولِينَهَا ؟ سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ خَلْقِهِ ، سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، سُبْحَانَ اللهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ، سُبْحَانَ اللهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ، سُبْحَانَ اللهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ)).

ترجمہ:۔حضرت ام المؤمنین جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنھا سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ صبح کے وقت (فجر کی نماز کے واسطے) ان کے پاس سے تشریف لے گئے اور یہ اپنی جائے نماز پر بیٹھی ہوئی تھیں ، پھر حضور اکرم ﷺ چاشت کے وقت واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ اپنی جائے نماز پر ہی بیٹھی ہوئی ہیں ، حضور اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم اس وقت سے اسی حالت پر بیٹھی ہو جس حالت پر میں تم کو چھوڑ کر گیا تھا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں ۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: تم سے جدا ہونے کے بعد میں نے چار کلمات تین تین مرتبہ کہے، تم نے صبح سے ابھی تک جتنی تسبیحات پڑھی ہیں ان کے برابر اگر ان کو رکھا جائے تو یہ ان پر غالب آجائیں اور ان کا وزن بڑھ جائے۔وہ چار کلمات یہ ہیں : ”سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، وَرِضَا نَفْسِهِ، وَزِنَةَ عَرْشِهِ، وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ“

بعض روایتوں میں یہ کلمات اس طرح بھی آئے ہیں :"سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ خَلْقِهِ، سُبْحَانَ اللهِ رِضَا نَفْسِهِ، سُبْحَانَ اللهِ زِنَةَ عَرْشِهِ، سُبْحَانَ اللهِ مِدَادَ كَلِمَاتِهِ" (دونوں طریقوں سے پڑھ سکتے ہیں)۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے: حضور ﷺ نے ام المؤمنین حضرت جویریہ رضی اللہ عنھا سے فرمایا: کیا میں تمہیں چند کلمات نہ سکھلاؤں جن کو تم کہتی رہو؟ (پھر یہی کلمات جو اوپر مختصر طور پر آئے تھے ان کو تفصیلاً تین تین مرتبہ پڑھ کر بتلائے)۔

ذکر کرنے والا زندہ، نہ کرنے والا مردہ

حدیث ۱۴۳۴:-

وعن أبي موسى الأشعري رضى الله عنه عن النبي ﷺ قَالَ ((مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لا يَذْكُرُهُ مَثَلُ الحَيِّ وَالمَيِّتِ)). (رواه البخاری)

ورواه مسلم فقال: ((مَثَلُ البَيْتِ الَّذِي يُذْكَرُ اللهُ فِيهِ، وَالبَيْتِ الَّذِي لا يُذْكَرُ اللهُ فِيهِ، مَثَلُ الحَيِّ والمَيِّتِ)).

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ آدمی جو اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور جو نہیں یاد کرتا، ان کی مثال ایسی ہے جیسے زندہ اور مردہ۔

افادات:- یعنی اللہ کو یاد کرنے والا ایسا ہے جیسے زندہ، زندگی کو ہر آدمی پسند کرتا ہے اس سے محبت رکھتا ہے۔ اور جو آدمی اللہ کو یاد نہیں کرتا وہ ایسا ہے جیسا کہ مردہ، موت سے ہر آدمی بھاگتا ہے، دور رہتا ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے دل کی زندگی اور موت مراد ہے کہ جو آدمی اللہ کو یاد کرتا ہے اور ذکر کرتا ہے اس کا دل زندہ ہے، اور جو آدمی اللہ کا ذکر نہیں کرتا ہے اس کا دل مردہ ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ نفع اور ضرر کے اعتبار سے فرمایا ہے کہ جو اللہ کو یاد کرتا ہے وہ ایسا ہے جیسے زندہ، کہ اس کو کوئی آدمی اگر کچھ کرے گا تو اس کو بھگتنا پڑے گا، جیسے زندہ کو کوئی مارے تو وہ بدلہ لے گا، لیکن مرے ہوئے کو کوئی مارے تو وہ انتقام نہیں لے گا۔ تو جو آدمی اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے اس کے ساتھ کوئی آدمی کوئی غلط معاملہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا انتقام لیا جائے گا۔ اور جو اللہ کو یاد نہیں کرتا اس کی طرف سے بدلہ لینے والا کوئی نہیں ہے۔

گمان کے مطابق معاملہ

حدیث ۱۴۳۵:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه: أنَّ رسولَ الله ﷺ قَالَ: ((يقول الله تَعَالَى: أنا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي، وَأَنَا مَعَهُ إِذَا ذَكَرَنِي، فإنْ ذَكَرَنِي في نَفْسِهِ، ذَكَرْتُهُ في نَفْسِي، وإنْ ذَكَرنِي في مَلَإٍ ذَكرتُهُ في مَلَإٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق معاملہ کرتا ہوں ۔ اور جب بندہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں ۔ اگر وہ مجھے اپنے جی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو جی میں

یاد کرتا ہوں ۔اور اگر وہ مجھے کسی جماعت اور مجمع میں یاد کرتا ہے تو جس مجمع میں یاد کیا، میں اس سے بہتر مجمع (یعنی فرشتوں کے مجمع) میں اس کو یاد کرتا ہوں ۔

شیطان دھوکہ نہ دے

افادات:- "بندہ میرے ساتھ جیسا گمان رکھتا ہے میں اس کے ساتھ اسی کے مطابق معاملہ کرتا ہوں" اس کا ایک مطلب تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ آدمی گناہ کرتا ہے، نافرمانیوں میں مبتلا ہوتا ہے، تو اپنے گناہوں سے ڈرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے مغفرت اور رحمت کی امید بھی رکھنی چاہیے۔ گناہ اپنی جگہ پر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت کو سامنے رکھتے ہوئے مغفرت کی امید رکھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کریں گے، لیکن یہ معاملہ گناہ سرزد ہو جانے کے بعد کا ہے۔ اگر کوئی آدمی گناہ کرتا جارہا ہے اور یہ کہتا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، معاف کردے گا؛ تو یہ نظریہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہ تو شیطانی دھوکہ ہے: "لَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡر" شیطان اللہ کے معاملہ میں تم کو دھوکہ نہ دے۔ یہ تو جس سے نادانستہ گناہ ہو گیا، اب اس کو ندامت ہے اور ڈر رہا ہے تو اس کو کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید رکھو۔

چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک نوجوان کا انتقال ہو رہا تھا، نبیٔ کریم ﷺ نے ان انصاری نوجوان سے پوچھا: تم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں اس وقت اپنے گناہوں سے ڈر بھی رہا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید بھی رکھے ہوئے ہوں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اس حالت میں جب کوئی آدمی اس کیفیت میں ہوتا ہے تو جس چیز کی امید ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو وہ عطا فرماتے ہیں اور جس چیز سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے امن نصیب فرماتے ہیں۔

کامیابی ہو ہی جائے گی

بعض حضرات فرماتے ہیں: اس سے مراد دعا، بیماری و تندرستی، اور روزی وغیرہ کے دوسرے معاملات ہیں کہ ان میں آدمی اللہ تعالیٰ سے جیسی امید رکھتا ہے اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ ہوتا ہے۔ جیسے دعا کرے تو اس امید کے ساتھ کرے کہ اللہ تعالیٰ میری دعا ضرور قبول فرمائیں گے، چناں چہ حدیثِ پاک میں بھی آتا ہے کہ دعا کی قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے دعا کرو تب ہی دعا قبول ہوگی۔ اسی وجہ سے حدیثِ پاک میں یہ بھی آیا ہے کہ بعض مرتبہ آدمی یوں کہتا ہے کہ میں نے بہت دعا کی لیکن قبول نہیں ہوتی، تو اس صورت

میں دعا قبول نہیں ہوتی۔ یا روزی کے لیے کوشش کرتے ہوئے یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والے ہیں ، پہلے سے نیت میں ڈانواں ڈول نہ ہو، اس لیے کہ جیسی امید رکھو گے ویسا ہی معاملہ ہو گا، لہٰذا پورے یقین کے ساتھ یہ امید رکھو کہ اللہ تعالیٰ مجھے ضرور روزی دیں گے، محروم نہیں کریں گے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ ویسا ہی معاملہ کریں گے۔ کوئی اور معاملہ ہو تو یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ مجھے ضرور کامیاب کریں گے؛ تو کامیابی ہو ہی جائے گی۔

فرشتوں کا مجمع بہتر کیوں ؟

"میں اس سے بہتر مجمع (یعنی فرشتوں کے مجمع) میں اس کو یاد کرتا ہوں " ویسے تو انسان اشرف المخلوقات ہے، پھر اس میں خواص البشر یعنی انبیاء علیہم السلام تو فرشتوں سے افضل ہی ہیں ۔ہاں !خواصِ ملائکہ جیسے حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل وغیرہ عام انسانوں سے افضل ہیں ،اس وجہ سے ان کے مجمع کو انسانوں سے بہتر کہا گیا۔ یا معصوم ہونے کی بناء پر فرشتوں کو انسانوں کے مقابلہ میں مخصوص فضیلت حاصل ہے،اس وجہ سے اس مجمع کو بہتر کہا گیا ہے۔

اگر کوئی چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ اُسے یاد کرے

بہر حال! یہاں تو یہ بتلایا گیا کہ جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو یاد کرتے ہیں ؛ تو اگر کوئی بندہ یہ چاہتا ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے یاد کرے تو اس کا طریقہ یہی ہے۔ اسی وجہ سے حدیثِ پاک میں یہ بھی آتا ہے کہ اگر وہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف دو بالشت بڑھتا ہوں اور اگر وہ میری طرف ایک ہاتھ آگے بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک باع یعنی چار ہاتھ آگے بڑھتا ہوں ۔ اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے ساتھ یہ سلوک ہو؛ تو یہ اس کے اختیار میں ہے اور اس کا طریقہ بھی بتلا دیا۔ ہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ جیسا معاملہ کریں گے ویسا ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ناراضگی کی علامت

اسی لیے بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے باری تعالیٰ سے پوچھا: اے اللہ! آپ بندہ سے راضی ہیں یا ناراض ؛ یہ کیسے معلوم ہو؟ تو جواب

ملا کہ وہ دیکھ لے کہ اللہ کے فیصلہ پر وہ راضی ہے یا ناراض ہے؟اس لیے اگر اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ہم راضی ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی ہم سے راضی ہیں۔ اوراگر خدانخواستہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ہم ناراض ہیں تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے ناراض ہیں۔

مفرِّدُون سبقت لے گئے

حدیث ۱۴۳۶:-

وعنه قَالَ:قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((سَبَقَ المُفَرِّدُونَ)) قالوا: وَمَاالمُفَرِّدُونَ؟يَارسولَ الله قَالَ:((الذَّاكِرُونَ اللهَ كثيراًوالذَّاكِرَاتِ)).رواه مسلم

وَرُوِى:((المُفَرِّدُونَ))بتشديد الراءِوتخفيفها والمشهُورُ الَّذِى قَالَهُ الجمهُورُ:التَّشْدِيدُ.

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیؐ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:مفرِّدُون سبقت لے گئے(سب سے آگے نکل گئے)صحابہ نے عرض کیا:اے اللہ کے رسول!مفرِّدُون کون لوگ ہیں؟ نبیؐ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا:وہ مرد اور عورتیں جو اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرتے ہیں۔

تمام اذکار میں سب سے افضل

حدیث ۱۴۳۷:-

وعن جابر -رضی الله عنه- قَالَ: سَمِعْتُ رسُولَ الله ﷺ يقولُ: ((أَفْضَلُ الذِّكْرِ: لا إلهَ إلاَّ اللهُ)).

(رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تمام اذکار میں سب سے افضل ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ“ ہے۔

افادات:- ذکر کے مختلف کلمات جیسے: سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ، وَاللهُ أَكْبَرُ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ، اوران کے علاوہ دیگر تمام کلمات پر اس کلمہ ”لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ“ کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ اس کو ان سب سے افضل قرار دیا گیا ہے۔

زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تروتازہ رہے

حدیث ۱۴۳۸:-

وعن عبد الله بن بسر -رضی الله عنه-: أَنَّ رجلاً قَالَ: يا رسول الله! إنَّ شَرَائِعَ الإسْلامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ، فَأَخْبِرْنِي بِشَيءٍ أَتَشَبثُ بِهِ قَالَ: ((لا يَزالُ لِسَانُكَ رَطباً مِنْ ذِكْرِ اللهِ)). (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن بسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اسلام کے احکام بہت زیادہ ہو گئے ہیں، اس لیے آپ مجھے ایسی کوئی چیز بتلا دیجئے جس کو میں پکڑ لوں (تو وہ دیگر تمام نوافل کی طرف سے کافی ہو جائے) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری زبان اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ہمیشہ تر و تازہ رہے۔

افادات:- پوچھنے والے کا مقصد یہ تھا کہ جو فرائض اور واجبات ہیں ان کو تو ہر حال میں ادا کرنا ہی ہے، لیکن ان کے علاوہ نوافل کے قبیل کے بہت سارے کام بتلائے گئے ہیں ان سب کو نبھانا میرے حالات کے پیشِ نظر میرے لئے بڑا مشکل ہے، اس لیے آپ مجھے کوئی ایسی چیز بتلا دیجئے جس کو میں پابندی سے کیا کروں تو دیگر تمام نوافل کی طرف سے کافی ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہاری زبان برابر اللہ تعالیٰ کے ذکر سے تر رہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہو گے تو ان شاء اللہ تمام نوافل کے ذریعہ جو چیز حاصل کی جاتی ہے وہ تمہیں ذکر کی مداومت پر حاصل ہو جائے گی۔

ذکر پر مداومت سے مقصدِ عبادت حاصل ہوتا ہے

دیکھو! تمام عبادات کی روح اور بنیاد اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی ہے، اور عبادات میں نماز بنیادی حیثیت رکھتی ہے جس کے متعلق قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿أَقِمِ

الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ نماز کو میری یاد کے واسطے قائم کرو۔ اور دیگر جتنی بھی عبادتیں ہیں ان ساری عبادتوں کا خلاصہ یہی ہے کہ ان کے ذریعہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد جمتی اور پیوست ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار نصیب ہوتا ہے اور جب استحضارِ حق ہو جاتا ہے تو پھر آدمی ہر وقت اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانے کا اہتمام کرتا ہے۔ اس لیے آدمی اگر اللہ تعالیٰ کے ذکر پر مداومت کرتا ہے تو جو مقصد اور روح ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ کوئی آدمی صرف ذکر کر لے کر ہی بیٹھ جائے اور یوں کہے کہ میں نماز نہیں پڑھتا، روزے نہیں رکھتا، میں تو صرف ذکر کر لیتا ہوں ۔ اس لیے جو عبادات شریعت کی طرف سے فرض قرار دی گئی ہیں ، یا جن کو واجب کا درجہ دیا گیا ہے؛ ان کو تو ہر حال میں انجام دینا ہی ہے، ہاں ! نوافل کے باب میں آدمی کو اختیار دیا گیا ہے کہ ان میں سے جتنا کر سکتا ہو کرے، اور اللہ تعالیٰ کو جس طریقہ سے بھی راضی کر سکتا ہو اور اس کی یاد کو اپنے دل میں بٹھا سکتا ہو اس کا اہتمام کرے۔

جنّت میں کھجور کا ایک درخت

حدیث ۱۴۳۹ :-

وعن جابر -رضی اللہ عنہ- عن النبی ﷺ قَالَ: مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللهِ وبِحمدِهِ؛ غُرِسَتْ لَهُ نَخْلَةٌ فِی الجَنَّةِ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ" کہا؛ اس کے لئے جنّت میں کھجور کا ایک درخت لگا دیا جاتا ہے۔

افادات:- ویسے بھی انسان کو جنّت کی جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں وہ اعمال کے بدلہ ہی میں حاصل ہوتی ہیں، اور جنّت کے درخت بھی اذکار کے مختلف کلمات پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دئے جاتے ہیں۔ اب یا تو آدمی کے پڑھتے ہی اس کے لئے پودا لگے گا، یا پہلے سے جنت میں پودے لگے ہوئے ہیں، جب کوئی آدمی یہ کلمات پڑھے گا تو ایک پودا اس کے نام پر الاٹ (Allot) کر دیا جاتا ہے۔ دونوں مطلب ہو سکتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتِ محمدیہ کو پیغام

حدیث ۱۴۴۰:-

وعن ابن مسعود -رضی اللہ عنہ- قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((لَقِيْتُ إِبْرَاهِيمَ لَيلَةَ أُسْرِيَ بِي، فَقَالَ: يَا مُحَمّدُ أَقْرِئْ أُمَّتَكَ مِنِّي السَّلاَمَ، وَأَخْبِرْهُمْ أنَّ الجَنَّةَ طَيِّبَةُ التُّرْبَةِ، عَذْبَةُ الماءِ، وأنَّهَا

قِيعَانٌ وأَنَّ غِرَاسَهَا : سُبْحَانَ اللهِ، والحَمْدُ للهِ، وَلاَ إِلهَ إِلاَّ اللهُ، واللهُ أَكْبَرُ)) .(رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: معراج کی رات جب میری ملاقات حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام سے ہوئی تو انہوں نے مجھ سے کہا: اے محمد (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم)! آپ اپنی امّت کو میری طرف سے سلام کہئے (جب یہ روایت ہم سنیں تو ہمیں جواب میں یوں کہنا چاہیے: "عَلَی إِبْرَاهِيمَ السَّلَامُ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ") اور ان کو یہ بتلائیے کہ جنّت کی مٹّی بڑی عمدہ ہے، پانی بڑا شیرین ہے، لیکن وہ چٹیل میدان ہے، اس کے پودے "سُبْحَانَ اللهِ، وَالْحَمْدُ لِلهِ، وَلَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَاللهُ أَكْبَرُ" ہیں۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جو آدمی ان تسبیحات کو جتنا زیادہ پڑھے گا اسی کے بقدر اس کے لئے جنّت میں پودے لگائے جائیں گے۔ اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسری روایتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنّت کی نعمتیں درخت وغیرہ پہلے سے اسی میں موجود ہیں، اور ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مؤمن کو جنّت کا جو درجہ دیا جائے گا وہ اس دنیا سے دس گنا بڑا ہوگا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جنت میں ایک حصہ تو وہ ہو جس میں باغات وغیرہ پہلے سے تیّار ہیں، اور کچھ حصہ خالی بھی ہو، اب آدمی جوں جوں ذکر کے کلمات پڑھتا جائے گا اسی کے حساب سے اس کے لئے جنت میں پودے لگتے رہیں گے، اور اس خالی حصہ کو بھرنے کا یہی طریقہ ہے۔

اعمال میں بنیاد ذکر اللہ ہی ہے

حدیث ۱۴۴۱ :-

عن أبي الدرداءِ - رضى الله عنه - قَالَ قَالَ رسُولُ الله ﷺ: أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ، وأزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ وأرْفَعِهَا فى دَرَجَاتِكُمْ، وَخيرٍ لَكُمْ مِنْ إنْفَاقِ الذَّهَبِ والفِضَّةِ، وَخَيْرٍ لَكُمْ مِنْ أن تَلْقَوا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوا أعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أعْنَاقَكُمْ؟ قَالُوا: بَلَى. قَالَ: ذِكرُ الله تَعَالَى (رواه الترمذى. قَالَ الحاكم أبو عبدالله: إسنادہ صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: مَیں تم کو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر عمل، اور ایسا عمل جو تمہارے پروردگار کے نزدیک تمہارے لئے سب سے زیادہ پاکیزہ، تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا، تمہارے لئے سونے و چاندی کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے سے بڑھ کر، اور تم دشمن سے میدانِ جنگ میں ملو، پھر تم ان کی گردن مارو اور وہ تمہاری گردن مارے؛ اس سے بھی بہتر نہ بتلاؤں؟ صحابہ نے عرض کیا: ضرور بتلائیے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے۔

افادات:- اوپر بتلایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی سارے اعمال کی اصل جڑ اور بنیاد ہے، ہاں کبھی وقتی ضرورت کے پیشِ نظر کسی دوسرے عمل کو بہتر بتلایا جاتا ہے، لیکن اصولی طور پر

اگر دیکھا جائے تو بنیادی حیثیت ذکر اللہ ہی کو حاصل ہے۔ اور ساری عبادتوں کے ذریعہ مقصود بھی یہی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی یاد کو اپنے دل میں جمائے۔

تسبیح، تحمید و تکبیر کی کثرت کا آسان طریقہ

حدیث ۱۴۴۲:-

وعن سعد بن أبي وقاص رضی الله عنه أنَّه دخل مَعَ رسُولِ الله ﷺ عَلَى امْرأةٍ وَبَيْنَ يَدَيْهَا نَوًى- أَوْ حَصًى -تُسَبِّحُ بِهِ فَقَالَ: ((أُخْبِرُكِ بِمَا هُوَ أَيْسَرُ عَلَيْكِ مِنْ هَذَا-أَوْ أَفْضَلُ-)) فَقَالَ:((سُبْحَانَ اللهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ فِى السَّمَاءِ، وسُبْحَانَ الله عَدَدَ مَا خَلَقَ فِى الأرْضِ، وسُبْحَانَ الله عَدَدَ مَا بَيْنَ ذَلِكَ، وسُبْحَانَ الله عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ، واللهُ أكْبَرُ مِثْلَ ذَلِكَ، والحَمْدُ للهِ مِثْلَ ذَلِكَ؛ وَلاَ إلَهَ إلاَّ اللهُ مِثْلَ ذَلِكَ، وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إلاَّ بِاللهِ مِثْلَ ذَلِكَ)) (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ وہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ ایک عورت کے یہاں تشریف لے گئے، اس کے سامنے کھجور کی گٹھلیاں یا کنکریاں رکھی ہوئی تھیں جن کے ذریعہ وہ عورت گن گن کر تسبیح پڑھ رہی تھی، حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: میں تجھے ایسی چیز بتلاؤں جو اس سے بھی زیادہ آسان ہے، یا اس سے بہتر ہے (یعنی اس میں زیادہ لمبا چوڑا گننے کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی اور مختصر میں معاملہ نمٹ جائے گا) پھر ارشاد فرمایا: سبحان اللہ (یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتا ہوں) جتنی چیزیں اللہ تعالیٰ نے آسمانوں میں پیدا فرمائی ہیں اس کے برابر، اور

ان تمام چیزوں کی تعداد کے برابر جو اللہ نے زمین میں پیدا فرمائی ہیں ، اور ان تمام چیزوں کی تعداد کے برابر جو اللہ نے زمین اور آسمان کے درمیان رکھی ہیں ، اور ان تمام چیزوں کی تعداد کے برابر جس کو اللہ تعالیٰ آئندہ پیدا کرے گا۔ اور اللہ اکبر (یعنی اللہ کی بڑائی) بھی اسی تعداد کے برابر۔ اور الحمد للہ ، لا الٰہ الا اللہ ، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ بھی (کہتا ہوں) بھی اسی طرح۔

افادات:- گویا "عَدَدَ مَا خَلَقَ فِيْ السَّمَاءِ، عَدَدَ مَا خَلَقَ فِيْ الْأَرْضِ، عَدَدَ مَا بَيْنَ ذٰلِكَ، عَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ" کہہ کر تمام چیزوں کو سمیٹ لیا گیا، اور اسی کے برابر اللہ تعالیٰ کی تسبیح ، تحمید ، تکبیر وغیرہ کہی گئی۔ ظاہر ہے کہ کوئی آدمی اگر سبحان اللہ بار بار پڑھے اور اس کو گنے ، اس کے مقابلہ میں یہ بالکل آسان طریقہ ہے۔

جنّت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ

حدیث ۱۴۴۳ :-

وعن أَبِي موسى - رضى الله عنه - قَالَ : قَالَ لى رسولُ الله ﷺ: ((أَلا أَدُلُّكَ عَلَى كَنْزٍ مِنْ كُنُوزِ الجَنَّةِ؟)) فقلت: بلى يَا رسولَ الله. قَالَ: ((لاحَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إِلاَّ بِاللهِ)) (متفق عَلَيهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم ﷺ نے مجھ سے فرمایا: کیا مَیں تم کو جنّت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتلاؤں ؟ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں ؛ اللہ کے رسول! ضرور بتلایئے۔ تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ.

افادات:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غزوۂ خیبر سے واپسی میں لوگ زور زور سے اللہ کا ذکر، تسبیح، تحمید اور تکبیر وغیرہ پڑھ رہے تھے۔ حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اس وقت میں اپنے دل میں آہستہ آہستہ ”لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّابِاللّٰہِ“ ہی پڑھ رہا تھا۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس طرح زیادہ زور لگا کر اپنے آپ کو مشقّت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، جس ذات کو تم پکار رہے ہو، وہ نہ تو بہت دور ہے، اور نہ تو بہرا ہے، بلکہ تمہارے قریب ہے، تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور سنتا ہے۔ اس لئے کہ آدمی کو زور سے بولنے کی ضرورت دو میں سے کسی ایک وجہ ہی سے پیش آتی ہے، یا تو جس کو پکارا جارہا ہے وہ دور ہے، اس لیے زور سے پکارا جاتا ہے تاکہ آواز اس تک پہنچے، یا وہ اونچا سنتا ہے تو اس کو سنانے کے لئے زور سے بولنا پڑتا ہے۔

علّامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام کلمات کے ثواب کی مقدار حدیث میں آئی ہے کہ سبحان اللہ پڑھنے کا اتنا ثواب، الحمد للہ پڑھنے کا اتنا ثواب، اللہ اکبر پڑھنے کا اتنا ثواب، لا الٰہ الا اللہ کا اتنا ثواب ہے۔ جیسا کہ اوپر گزرا کہ سبحان اللہ میزانِ عمل کو بھر دیتا

ہے، اور الحمدللہ آسمان اور زمین کے بیچ کی جگہ کو بھر دیتے ہیں ، تو سب کلمات کے ثواب کی مقدار حدیثِ پاک میں آئی ہے، لیکن "لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ" ایسا کلمہ ہے کہ اس کے متعلق معینہ مقدار کسی حدیث میں نہیں بتلائی گئی کہ اس کے پڑھنے پر کتنا ثواب ملے گا۔ چوں کہ اس کو جنّت کا خزانہ بتلایا ہے اور خزانہ کو ظاہر نہیں کیا جاتا ہے بلکہ چھپایا جاتا ہے، اس لئے اس کے ثواب کی مقدار کسی حدیث میں تعین کے ساتھ نہیں بتائی گئی۔

بَابِ ذِکْرِ اللهِ تَعَالٰی قَائِماً وَقَاعِداً وَمُضْطَجِعاً وَمُحْدِثاً وَجُنُباً وَحَائِضاً اِلَّا الْقُرْآنَ، فَلَا یَحِلُّ لِجُنُبٍ وَلَا حَائِضٍ

اس باب میں یہ بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے، لیٹے لیٹے، بغیر وضو اور بغیر غسل کی حالت میں، حیض کی حالت میں، غرض پاکی وناپاکی ہر حالت میں کرسکتے ہیں، البتہ قرآنِ پاک ایک ایسی چیز ہے کہ جنابت کی حالت ہو، یا عورت حائضہ ہو تو اس وقت تلاوت نہیں کی جاسکتی۔

سبحان اللہ، الحمدللہ، لاالٰہ الااللہ، اللہ اکبر، لاحول ولا قوۃ الا باللہ، درود شریف، دعا، استغفار وغیرہ؛ یہ سب ہی ذکر اللہ میں داخل ہیں، اوران تمام چیزوں کو آدمی باوضو اور بے وضو، غسل کئے ہوئے اور بغیر غسل کے؛ ہر حال میں کرسکتا ہے، اور قرآنِ پاک کی تلاوت بھی ذکر اللہ ہی کی ایک قسم ہے لیکن قرآنِ پاک کی تلاوت بغیر غسل نہیں کی جاسکتی۔

بندوں کی خِلقت کا مقصد

قرآنِ پاک کی آیت ہے:﴿إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُوْلِي الْأَلْبَابِ. اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللهَ قِيَاماً وَّقُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ آسمانوں اور زمین کی پیدائش، رات و دن کے آنے جانے میں عقلمندوں کے لئے بے شمار نشانیاں ہیں (اب عقل مند کون ہے؟ دنیا والوں کے یہاں عقلمندوں کے مختلف معیار ہیں، لیکن قرآنِ پاک عقل مند ان لوگوں کو کہتا ہے) جو اللہ تعالیٰ کو کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے اور پہلوؤں پر لیٹے لیٹے یاد کرتے ہیں ۔ دنیا یوں سمجھتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمالے، یا کوئی ڈگری حاصل کرلے تو وہ عقلمند ہے، لیکن قرآنِ پاک تو ان ہی لوگوں کو عقلمند کہتا ہے جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ، اس لئے کہ بندوں کی خِلقت کا مقصد ہی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور و فکر کرنا ہے، اس کے نتیجہ میں جب اللہ تعالیٰ کی توحید ان کے سامنے آتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں ۔ یہاں یہ آیت اسی لئے پیش کی ہے کہ کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے، لیٹے لیٹے ذکر کرنے کا ثبوت قرآنِ پاک سے ہوتا ہے۔

ذکر اللہ کے لیے کوئی قید نہیں

حدیث ۱۴۴۴:-

عن عائشۃ رَضِیَ اللہُ عنہا قالت: کَانَ رسُولُ اللہ ﷺ یَذْکُرُ اللہَ عَلَی کُلِّ أَحْیَانِہٖ. (رواہُ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تھے۔

افادات:- دیکھو! تمام عبادتوں کے لیے کچھ شرائط و قیود ہیں، جیسے: نماز پڑھنے کے لیے اوقات متعین کئے گئے ہیں، نوافل کے لیے بھی بعض اوقات ایسے ہیں جن میں نوافل نہیں پڑھ سکتے، پھر اس میں بھی قید لگائی گئی کہ ستر چھپا ہوا ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، باوضو ہو، جگہ پاک ہو، قبلہ کی طرف منہ ہو۔ مطلب یہ کہ ہر عبادت کو ادا کرنے اور اس کے درست ہونے کے لئے کچھ شرطیں اور قیدیں لگائی گئی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا ذکر ایک ایسی عبادت ہے جس کے لئے کوئی شرط اور قید نہیں ہے، بلکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر سکتے ہیں، چاہے وضو ہو، یا نہ ہو، جنابت کی حالت میں ہو، یا بغیر جنابت کے ہو، چاہے کھڑے ہو، لیٹے ہو، چل رہے ہو، یا بیٹھے ہو؛ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کیا جا سکتا ہے۔

شیطان بچہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا

حدیث ۱۴۴۵:-

عن ابن عباسٍ -رضی اللہ عنہما- عن النبیﷺ قَالَ: ((لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا أَتَى أَهْلَهُ قَالَ: بِسْمِ اللهِ ،اللَّهُمَّ جَنِّبْنَا الشَّيْطَانَ، وَجَنِّبِ الشَّيْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا، فَقُضِيَ بَيْنَهُمَا وَلَدٌ، لَمْ يَضُرَّهُ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی کے پاس (صحبت کے وقت) جائے اور یہ دعا پڑھے: شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے۔ اے اللہ! تو ہم کو شیطان سے بچا، اور جو تو ہمیں عطا کرے اس سے بھی شیطان کو دور رکھ۔ اگر اس صحبت کے نتیجہ میں ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے بچہ کا فیصلہ ہوا تو شیطان اس بچہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

افادات:- یہاں تو یہ روایت اسی لئے لائے ہیں کہ آدمی جب بیوی سے صحبت کا ارادہ کرے تو صحبت کرنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے۔ ویسے تو ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہیے لیکن کچھ حالتیں ایسی ہیں جن میں ذکر کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے، جیسے: آدمی قضائے حاجت میں مشغول ہو (یعنی پیشاب پاخانہ کر رہا ہو) تو اس وقت زبان سے اللہ تعالیٰ کا ذکر نہ کرے۔ اسی طرح بیوی سے صحبت کر رہا ہو تو اس وقت بھی زبان سے یہ دعا پڑھنے کی اجازت

نہیں ہے، بلکہ صحبت کے لیے ستر کھولنے سے پہلے یہ دعا پڑھ لے، اور اگر پڑھنا اس وقت بھول گیا، پھر بعد میں یاد آیا تو زبان ہلائے بغیر دل ہی دل میں ان کلمات کو پڑھ لے۔

شیطان کی محنت کا میدان آدمی کا دل ہے

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ بچّہ پیدا ہونے کے بعد جو روتا ہے وہ دراصل شیطان کے اس کے دل کو چھونے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی بچّہ دنیا میں آتا ہے تو فوراً شیطان پہنچ جاتا ہے اور اس کے دل کو ٹٹولتا ہے، چوں کہ شیطان کی ساری محنت کا محور اور مرکز آدمی کا دل ہی ہے، اللہ تعالیٰ نے شیطان کو صرف وسوسہ اندازی کی طاقت دی ہے، وہ ڈنڈا لے کر زبردستی ہم سے کوئی کام نہیں کرواسکتا، صرف ہمارے دل میں خیالات ڈال سکتا ہے۔ اور یہ بھی قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ جب تک بچّہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے اس وقت تک چوں کہ اس دنیا کا فرد نہیں بنا ہے، اس لئے ماں کے پیٹ میں رہتے ہوئے اس بچّے کے دل پر شیطان کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔ ہاں! اس کی ماں کے دل پر اثر ڈال سکتا ہے، اس لئے کہ وہ دنیا میں موجود ہے، لیکن بچّہ جب تک پیدا نہیں ہوتا وہاں تک وہ دوسرے عالم میں ہے، جب پیدا ہو گا تو اس دنیا کا حصہ بنے گا اور شیطان کی محنت کا میدان بنے گا، اگرچہ ابھی

بچہ ہے اور شریعت کا مکلف نہیں ہے لیکن شیطان اپنے کام اور مشن میں بڑا چوکنا ہے، اس کو آئندہ اسی پر محنت کرنی ہے، اس لیے فوراً پہنچ گیا اور بچہ کے دل کو ٹٹول لیا، جیسے چور کو رات میں جب کہیں چوری کرنی ہوتی ہے تو دن میں جا کر پہلے جگہ دیکھ لیتا ہے اور اس کا برابر جائزہ لے لیتا ہے۔

مَیں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ دوائی بنانے والی کسی کمپنی کے نمائندہ اور ایجنٹ کو جب پتہ چلتا ہے کہ سورت کے فلاں محلہ میں کوئی ڈاکٹر اپنا نیا کلینک (شفاخانہ) کھولنے والا ہے، تو اس کمپنی کا نمائندہ اور ایجنٹ فوراً پہنچ کر ملاقات کرتا ہے، اس لئے کہ اس کی محنت کا میدان کلینک ہی ہے۔ اسی طرح شیطان کی محنت کا میدان آدمی کا دل ہے، جب کوئی بچّہ دنیا میں آتا ہے تو شیطان فوراً پہنچ جاتا ہے اور بچّے کے دل کو ٹٹولتا ہے، اور چوں کہ آج تک بچّے کے قلب کو اس طرح کے کسی اثر سے واسطہ نہیں پڑا تھا، یہ پہلا موقعہ ہے کہ اجنبی اثر اس کے دل پر آیا ہے تو اسی اثر کی وجہ سے بچّے پر ایک طرح کی وحشت طاری ہوتی ہے اور وہ روتا ہے۔

اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت لے کر بھیجا ہے، اور شیطان گمراہی پھیلاتا ہے، تو شیطان کے اس بچہ کے دل ٹٹولنے کے نتیجہ میں جو اثر آیا اس کو دور کرنے کی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ تدبیر بتلائی کہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ سے جو آلائشیں لے کر نکلا ہے ان کو صاف کرنے کے بعد بچہ کے داہنے کان میں اذان کے کلمات({ FR 8319 })اور بائیں

کان میں اقامت کے کلمات کہے جائیں ، تاکہ شیطان کے اس کے دل کو چھونے کے نتیجہ میں جو اثر آیا ہے وہ ختم ہو جائے۔ شیطان اس کے دل میں اپنا بیج ڈالنا چاہتا تھا لیکن شریعت نے یہ تعلیم دے کر اس کے اثرات کو زائل کر دیا تاکہ آگے چل کر اس کے اثرات باقی نہ رہیں ۔ لہٰذا ہمیں ان تعلیمات کا اہتمام کرنا چاہیے۔

بَابُ مَا يَقُولُهُ عِنْدَ نَوْمِهِ وَاسْتِيْقَاظِهِ

سوتے اور بیدار ہوتے وقت کیا پڑھے؟

مسنون دعائیں ہی اللہ تعالیٰ سے جُڑنے کا آسان طریقہ ہے

حدیث ۱۴۴۶:-

عَنْ حُذَيْفَةَ وَأَبِي ذَرٍّ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَا: كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ، قَالَ: بِاسْمِكَ أَللّٰهُمَّ أَحْيَا وَأَمُوْتُ. وَإِذَا اسْتَيْقَظَ قَالَ: أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُوْرُ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بستر پر تشریف لے جاتے (یعنی جب لیٹ جاتے) تو یہ دعا پڑھتے: ”اے اللہ! تیرے ہی نام سے میں زندہ رہتا ہوں اور موت پاتا ہوں ۔ اور جب نیند سے بیدار ہوتے تو یہ دعا پڑھتے: تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے ہمیں موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کیا، اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

افادات:- آدمی پر جو مختلف حالات آتے ہیں ان تمام احوال میں نبی کریم ﷺ نے ہمیں پڑھنے کی دعائیں سکھائی ہیں ، گویا ہر حالت میں آدمی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے۔ جہاں آدمی ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتا ہے، جیسے: کھانا کھا رہے ہو

تو یہ دعا پڑھو، کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، لیٹتے وقت یہ دعا پڑھو، آنکھ کھولتے وقت یہ دعا پڑھو، گھر سے نکل رہے ہو تو یہ دعا پڑھو، گھر میں داخل ہو رہے ہو تو یہ دعا پڑھو، بازار جا رہے ہو تو یہ دعا پڑھو، مسجد میں داخل ہو رہے ہو تو یہ دعا پڑھو۔ یا ایک وقت سے دوسرے وقت میں کوئی تبدیلی آتی ہے، جیسے: صبح ہو تو یہ دعا پڑھو، شام ہو تو یہ دعا پڑھو، رات ہو تو یہ دعا پڑھو۔

آدمی پر مختلف حالات، مختلف اوقات اور مختلف کیفیتیں طاری ہوتی رہتی ہیں، ہر ہر موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے دعائیں سکھلائی ہیں؛ تاکہ بندہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے جُڑا رہے، اور اللہ تعالیٰ کی یاد اس کے دل میں بسی رہے، آدمی کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ یہ دعائیں ہی وہ آسان طریقہ ہے جس کے ذریعہ آدمی اللہ تعالیٰ کی یاد کو اپنے دل میں جما سکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار پیدا کر سکتا ہے، اور جب استحضار پیدا ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں جم جائے گی، تو پھر یہی چیز آدمی کو گناہوں سے روکنے کا سبب بنے گی۔ اس لیے کہ آدمی جو بھی گناہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غفلت کی وجہ سے کرتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا اگر استحضار ہو تو کبھی وہ گناہ نہیں کر سکتا۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں آتا ہے: ”لَايَزْنِي الزَّانِيْ حِيْنَ يَزْنِيْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ، لَايَسْرِقُ السَّارِقُ حِيْنَ يَسْرِقُ وَهُوَ مُؤْمِنٌ“ زنا کرنے والا اس حالت میں زنا نہیں کرتا کہ وہ مؤمن ہو، یعنی اگر اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار ہو تو وہ کبھی بھی زنا نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی اگر اس کے دل میں

استحضار ہو تو وہ چوری نہیں کر سکتا۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی یاد اگر دل میں جم جائے تو وہ آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور گناہوں سے باز رکھنے کا ذریعہ بنتی ہے، اسی لئے شریعت کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد جم جائے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا استحضار پیدا ہو جائے، اور عبادتیں بھی اسی لیے رکھی گئی ہیں، اور اسی کے پیشِ نظر دعاؤں کے مختلف طریقے بتلائے گئے ہیں اور ذکر اللہ کے اہتمام کی تاکید کی گئی ہے۔

بَابُ فَضْلِ حِلَقِ الذِّكْرِ وَالنَّدْبِ إِلٰى مُلَازِمَتِهَا وَالنَّهْيِ عَنْ مُفَارِقَتِهَا لِغَيْرِ عُذْرٍ

ذکر کے حلقوں کی فضیلت

اجتماعی طور پر اللہ کی یاد

اگر کچھ لوگ مل کر اللہ کے ذکر میں مشغول ہوں تو اس کی کیا فضیلت ہے، اور قرآن و حدیث میں ایسے حلقوں میں شرکت کو اور اس کے لازم پکڑنے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے، اور بلا عذر اس کو چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے۔

"وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ"

اے نبی! آپ اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رکھئے جو صبح اور شام اپنے رب کو پکارتے ہیں، اس عمل سے ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے، اور آپ اپنی نگاہوں کو ان سے ذرا بھی آگے نہ رکھئے۔

دیکھئے! اس آیت میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنے کا اور ان کی صحبت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا جارہا ہے جو صبح و شام اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں یعنی ذکر کا خوب اہتمام کرتے ہیں۔

کچھ حضرات کامل کر اللہ کی یاد میں مشغول ہونا پسندیدہ عمل ہے، اس کے نتیجہ میں آدمی کی طبیعت میں نشاط، تازگی اور ہمت پیدا ہوتی ہے، اور جب کئی لوگ مل کر اللہ کی یاد میں مشغول ہوں گے تو ان کے قلوب کو ذکر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جن انوار سے مالا مال کیا جاتا ہے ان انوار کا انعکاس ایک دوسرے پر پڑے گا جس کے نتیجہ میں دلوں کو تقویت حاصل ہوتی ہے اور فائدہ پہنچتا ہے۔

ذکر کے حلقوں کے متلاشی فرشتے اور ان کی کارگزاری

حدیث ۱۴۴۷:-

وعن أَبِي هريرة -رضی الله عنه-، قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((إنَّ للهِ تَعَالَى مَلائِكَةً يَطُوفُونَ فی الطُّرُقِ يَلْتَمِسُونَ أَهْلَ الذِّكْرِ، فإذا وَجَدُوا قَوْمَاً يَذْكُرُونَ اللهَ - عز وجل -تَنَادَوْا: هَلُمُّوا إِلَى حَاجَتِكُمْ، فَيَحُفُّونَهُمْ بِأَجْنِحَتِهِم إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا، فَيَسْأَلُهُمْ رَبُّهُمْ -وَهُوَأعْلَم-: مَايقولُ عِبَادي؟ قَالَ: يقولون: يُسَبِّحُونَكَ، ويُكَبِّرُونَكَ، وَيَحْمَدُونَكَ، ويُمَجِّدُونَكَ، فيقول: هَلْ رَأَوْنِي؟

فيقولونَ: لا واللهِ! مَا رَأَوْكَ.فيقولُ: كَيْفَ لَوْ رَأَوْنِي؟! قَالَ: يقُولُونَ: لَوْ رَأَوْكَ كَانُوا أَشَدَّ لَكَ عِبَادَةً، وَأَشَدَّ لَكَ تَمْجِيداً وأَكْثَرَ لَكَ تَسْبِيحاً. فَيقُولُ: فماذا يَسْألونَ؟ قَالَ: يقُولُونَ: يَسْأَلُونَكَ الجَنَّةَ. قَالَ: يقولُ: وَهل رَأَوْها؟ قَالَ: يقولون: لا واللهِ يَا رَبِّ مَا رَأَوْهَا. قَالَ: يقول: فَكيفَ لَوْ رَأَوْهَا؟ قَالَ: يقولون: لَوْ أَنَّهُمْ رَأَوْهَا كَانُوا أَشَدَّ عَلَيْهَا حِرْصاً وأشَدَّ لَهَا طَلَباً، وأَعْظَمَ فِيهَا رَغْبَةً. قَالَ: فَمِمَّ يَتَعَوَّذُونَ؟ قَالَ: يقولون: يَتَعَوَّذُونَ مِنَ النَّارِ، قَالَ: فيقولُ: وَهَلْ رَأَوْهَا؟ قَالَ: يقولون: لا واللهِ مَا رَأَوْهَا. فيقولُ: كَيْفَ لَوْ رَأَوْهَا؟! قَالَ: يقولون: لَوْ رَأَوْهَا كانوا أَشَدَّ مِنْهَا فِرَاراً، وأشَدَّ لَهَا مَخَافَةً. قَالَ: فيقولُ: فَأُشْهِدُكُمْ أَنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُم، قَالَ: يقولُ مَلَكٌ مِنَ المَلاَئِكَةِ: فِيهِم فُلاَنٌ لَيْسَ مِنْهُمْ، إنَّمَا جَاءَ لِحَاجَةٍ، قَالَ: هُمُ الجُلَسَاءُ لا يَشْقَى بِهِمْ جَلِيسُهُمْ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے ہیں جو راستوں میں گھومتے رہتے ہیں اور ذکر کرنے والوں کو تلاش کرتے رہتے ہیں (بعض فرشتے تو وہ ہیں جو نامۂ اعمال لکھنے کے لئے اور نگرانی کے لیے ہر ایک کے ساتھ مقرر ہیں، ان کے علاوہ فرشتوں کی ایک جماعت اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص اسی مقصد کے لئے مقرر کی گئی ہے کہ جہاں کہیں کچھ لوگ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہوں ان کو تلاش کرتے رہیں) چنانچہ جب وہ فرشتے ایسے لوگوں کو پالیتے ہیں جو اللہ کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں تو وہ ایک دوسرے کو آواز دیتے ہیں (کہ تم جس چیز کی تلاش میں نکلے ہو اور جس مقصد کے لئے گھوم پھر رہے ہو وہ یہاں موجود ہے، لہٰذا) تمہارے مطلوب کی طرف آجاؤ۔ چنانچہ وہ فرشتے ان ذکر کرنے والوں کو آسمانِ دنیا تک اپنے

پروں سے ڈھانپ لیتے ہیں (ذکر کرنے والے جب تک ذکر میں مشغول رہتے ہیں وہاں تک یہ سلسلہ رہتا ہے، اس کے بعد جب یہ فرشتے اپنی ڈیوٹی پوری کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے حضور جواب دہی کے لئے پیش ہوتے ہیں، تو) باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جاتا ہے حالاں کہ اللہ تعالیٰ تو سب جانتے ہیں (لیکن اس سوال سے فرشتوں کے سامنے ان بندوں کا اعزاز واکرام اور ان کے کارناموں کو اور زیادہ اجاگر کرنا مقصود ہوتا ہے) میرے بندے کیا کہتے ہیں؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: تیرے بندے تیری پاکی بیان کرتے ہیں، تیری کبریائی اور بڑائی بیان کرتے ہیں، تیری حمد وثنا اور تعریف بیان کرتے ہیں، اور تیری بزرگی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں سے پوچھا جاتا ہے (کہ وہ لوگ میری پاکی بیان کرنے، میری بزرگی اور بڑائی بیان کرنے میں اس طرح سے جو مشغول ہیں تو) کیا انھوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: نہیں اللہ کی قسم! انہوں نے آپ کو دیکھا تو نہیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوتا ہے: اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو ان کا حال کیا ہوتا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اگر تجھے دیکھ لیتے تو ان کی عبادت میں اور زیادہ شدت آجاتی، تیری بزرگی کو بیان کرنے میں وہ اور زیادہ مبالغہ سے کام لیتے، اور بہت کثرت سے تیری پاکی بیان کرتے (مطلب یہ ہے کہ اس وقت ان کے عمل کی جو کیفیت ہے، آپ کو دیکھنے کے بعد تو اس میں اور زیادہ ترقی ہوجاتی) پھر باری تعالیٰ فرشتوں سے سوال کرتے ہیں: وہ لوگ کیا مانگتے ہیں؟ (ان کی ڈیمانڈ کیا ہے؟) فرشتے عرض کرتے ہیں: جنّت کا سوال کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جاتا ہے: کیا ان لوگوں نے جنّت کو دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: انہوں نے جنّت کو دیکھا تو نہیں ہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جاتا ہے: اگر وہ جنّت کو دیکھ لیتے تو ان کا کیا حال ہوتا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اگر جنّت کو دیکھ لیتے تو اور زیادہ اس کی

حرص کرتے، اور کثرت سے اس کا سوال کرتے، اس کی طرف ان کی رغبت اور خواہش بہت زیادہ ہوتی۔ پھر باری تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوتا ہے: وہ کس چیز سے پناہ چاہ رہے تھے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ جہنّم سے پناہ مانگ رہے تھے۔ باری تعالیٰ پوچھتے ہیں: کیا انہوں نے جہنّم کو دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: جہنّم کو دیکھا تو نہیں ہے۔ باری تعالیٰ کی طرف سے سوال ہوتا ہے: اگر وہ جہنّم کو دیکھ لیے تو ان کا کیا حال ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اگر جہنّم کو دیکھ لیں تب تو اس سے بہت بھاگیں گے اور اس سے خوب ڈریں گے (جبکہ دیکھا نہیں ہے تب یہ کیفیت ہے تو اگر دیکھ لیں تب تو اور زیادہ اضافہ وترقی ہو جائے گی)۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے فرشتو! میں تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے ان تمام کو معاف کر دیا (جب باری تعالیٰ کی طرف سے ان کے متعلق یہ اعلان ہوتا ہے تو ان فرشتوں میں سے) ایک فرشتہ عرض کرتا ہے: (باری تعالیٰ) ان میں ایک آدمی ایسا بھی ہے (جس کا مقصد ذکر کے حلقے میں شریک ہونا نہیں ہے بلکہ) وہ تو کسی دوسرے کام کے لئے آیا تھا (فرشتہ یہ بات اس لئے عرض کرتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان فرشتوں سے ان بندوں کے حالات پوچھے گویا ان کو گواہ بنایا جارہا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کا فیصلہ کیا جارہا ہے، اور گواہ کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ جو حقیقتِ حال ہو وہ پوری پوری بیان کر دے، اس لئے حقیقتِ حال کے اظہار کے طور پر یہ فرشتہ عرض کرتا ہے کہ ایک آدمی ایسا ہے جس کا مقصد ذکر کرنا نہیں تھا) باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: یہ ایسے ہم نشین ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا محروم نہیں ہوتا (جو بھی ان کے پاس آکر بیٹھ جائے گا، چاہے جو بھی نیت لے کر آیا ہو، اس کی نیت اس کے ساتھ، مگر ان کے پاس بیٹھنے کے نتیجہ میں وہ بھی نواز دیا جائے گا

دنیاوالوں کاتو معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی چیز پر کسی کو انعام دینا ہوتا ہے تو اس کی خوب تحقیقات ہوتی ہیں کہ آدمی برابر ہے یا نہیں ۔ لیکن یہاں تو جو قانون میں نہیں آتا اس کو بھی نوازا جاتا ہے)۔

افادات:–اس روایت میں پہلی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذکر کرنے والوں کے عمل کے بارے میں اتنا زیادہ اہتمام کیا گیا کہ وہ مالک الملک، آسمان وزمین کا پیدا کرنے والا، جس کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے؛ وہ بھی کتنی زیادہ توجہ کے ساتھ فرشتوں سے پوچھ رہا ہے کہ تم کہاں سے آرہے ہو؟ وہ لوگ کیا کر رہے تھے؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی آکر ہمیں بتائے کہ میں فلاں بزرگ کی خدمت میں گیا تھا، یا فلاں وزیر کے پاس گیا تھا؛ وہ آپ کا حال پوچھ رہے تھے، اتنا سننے کے بعد آدمی پھولا نہیں سماتا اور ایسا خوش ہوتا ہے کہ اچھا! انہوں نے میرا حال دریافت کیا تھا؟ اور یہاں تو اللہ تبارک وتعالیٰ فرشتوں سے ذکر کرنے والوں کے متعلق پوچھ رہے ہیں ، اب اس سے بڑی نعمت اور اس سے بڑا اعزاز و اکرام ذکر کرنے والوں کا اور کیا ہو سکتا ہے!۔

یہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا

وفی روایۃلمسلمٍ : عن أَبي هريرة -رضی الله عنه -عن النبيِّ ﷺ قَالَ : ((إن للهِ مَلاَئِكَةً سَيَّارَةًفُضُلاً يَتَتَبَّعُونَ مَجَالِسَ الذِّكْرِ ، فَإذَا وَجَدُوا مَجْلِساً فِيهِ ذِكْرٌ ، قَعَدُوا مَعَهُمْ ، وَحَفَّ

بَعْضُهُمْ بَعْضاً بِأَجْنِحَتِهِمْ حَتَّى يَمْلَؤُوا مَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ السَّمَاءِ الدُّنْيَا ، فَإِذَا تَفَرَّقُوا عَرَجُوا وَصَعِدُوا إِلَى السَّمَاءِ، فَيَسْأَلُهُمُ اللهُ -عز وجل- وَهُوَ أَعْلَمُ -: مِنْ أَيْنَ جِئْتُمْ ؟ فَيَقُولُونَ: جِئْنَا مِنْ عِنْدِ عِبَادٍ لَكَ فِى الأَرْضِ: يُسَبِّحُونَكَ، وَيُكَبِّرُونَكَ، وَيُهَلِّلُونَكَ، وَيَحْمَدُونَكَ، وَيَسْأَلُونَكَ. قَالَ: وَمَاذَا يَسْأَلُونِي؟ قالوا: يَسْأَلُونَكَ جَنَّتَكَ. قَالَ: وَهَلْ رَأَوْا جَنَّتِي؟ قالوا: لا، أَيْ رَبِّ. قَالَ: فَكَيْفَ لَوْ رَأَوْا جَنَّتِي؟! قالوا: ويستجيرونك. قَالَ: وَمِمَّ يَسْتَجِيرُونِي؟ قالوا: مِنْ نَارِكَ يَا رَبِّ. قَالَ: وَهَلْ رَأَوْا نَارِي؟ قالوا: لا. قَالَ: فَكَيْفَ لَوْ رَأَوْا نَارِي؟! قالوا: وَيَسْتَغْفِرُونَكَ؟ فيقولُ: قَدْ غَفَرْتُ لَهُمْ، وَأَعْطَيْتُهُمْ مَا سَأَلُوا، وَأَجَرْتُهُمْ مِمَّا اسْتَجَارُوا. قَالَ: فيقولون: رَبِّ فيهِمْ فُلَانٌ عَبْدٌ خَطَّاءٌ إِنَّمَا مَرَّ، فَجَلَسَ مَعَهُمْ. فيقُولُ: ولهُ غَفَرْتُ، هُمُ القَومُ لاَ يَشْقَى بِهِمْ جَلِيسُهُمْ)).

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں کچھ زائد فرشتے ہیں جو گھومتے رہتے ہیں اور ذکر کی مجلسوں کو وہ تلاشتے رہتے ہیں۔ جب کسی ایسی مجلس کو پالیتے ہیں کہ جس میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے (حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس سے مرادوہ مجلسیں ہیں جن میں ذکر کی ساری ہی اقسام شامل ہیں جو پہلے گزر چکیں) تو ان کے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں اور ان میں سے ایک دوسرے کو اپنے پروں کے ذریعہ ڈھانپ لیتے ہیں یہاں تک کہ ذکر کی مجلس کی جگہ سے لے کر آسمان تک کے حصہ کو بھر دیتے ہیں (ساری فضاء میں فرشتے ہی فرشتے ہوتے ہیں۔ ان کو بیٹھنے کے لئے ہماری طرح جگہ کی ضرورت نہیں ہے) جب یہ ذکر کرنے والے اپنے ذکر سے فارغ ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں (اپنے اپنے گھروں پر چلے جاتے ہیں) تو یہ فرشتے بھی جو ان کو گھیرے ہوئے تھے آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں (جب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں تو

اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے کے باوجود سوال کرتے ہیں: تم کہاں سے آرہے ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں: اے اللہ! ہم تیرے کچھ ایسے بندوں کے پاس سے آئے ہیں جو زمین پر تیری تسبیح بیان کررہے تھے، تیری پاکی بیان کررہے تھے، تیری بڑائی بیان کررہے تھے، لا الٰہ الا اللہ پڑھ رہے تھے، تیری حمد وثنا بیان کررہے تھے، اور تجھ سے دعائیں کررہے تھے (معلوم ہوا کہ دعا کی مجلس بھی اس میں داخل ہے) باری تعالیٰ پوچھتے ہیں: وہ کیا دعا مانگ رہے تھے؟ فرشتے فرماتے ہیں: جنّت مانگتے ہیں۔ باری تعالیٰ پوچھتے ہیں: کیا ان لوگوں نے میری جنّت دیکھی ہے؟ فرشتے کہیں گے: نہیں۔ باری تعالیٰ فرمائیں گے: اگر وہ میری جنّت کو دیکھ لیتے؟ پھر فرشتے عرض کرتے ہیں: باری تعالیٰ! یہ تیرے بندے پناہ چاہ رہے تھے۔ پوچھا: کس چیز سے پناہ چاہ رہے تھے؟ فرشتوں نے کہا: اے رب تیری جہنّم سے۔ فرمایا: کیا انھوں نے میری جہنّم دیکھی ہے؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: اگر میری جہنّم دیکھ لیتے؟ پھر فرشتے عرض کرتے ہیں: وہ اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، استغفار کرتے ہیں۔ اس پر باری تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے ان کے گناہوں کو معاف کردیا، وہ جس چیز کا سوال کرتے ہیں ان کو میں نے دیدی، اور جس چیز سے پناہ مانگ رہے ہیں ان کو اس سے پناہ دیدی۔ فرشتے عرض کرتے ہیں: اے باری تعالیٰ! اس مجلس میں تیرا ایک گنہگار بندہ بھی تھا جو وہاں سے گزر رہا تھا (وہ تو بس ایسے ہی ان کے پاس بیٹھ گیا تھا) باری تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اس کو بھی معاف کردیا، یہ ایسے لوگ ہیں جن کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا (جس چیز سے ان کو نوازا جاتا ہے ان کے ساتھ دوسرے بھی اسی سے نوازے جاتے ہیں)۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

حدیث ۱۴۴۸:-

وعنه وعن أَبِي سعيدٍ رضی الله عنهما قالا: قَالَ رسولُ اللهﷺ: ((لايَقْعُدُ قَومٌ يَذكُرُونَ اللهَ-عزوجل-إِلَّاحَفَّتْهُمُ المَلائِكَةُ وغَشِيَتْهُمُ الرَّحْمَةُ وَنَزَلَتْ عَلَيْهِمُ السَّكِينَةُ؛ وَذَكَرَهُمُ اللهُ فِيمَن عِنْدَهُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب کچھ لوگ اللہ کے ذکر کے لئے بیٹھتے ہیں تو فرشتے ان کو گھیر لیتے ہیں ، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکینہ اور طمانینت نازل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ ان فرشتوں میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں جو اس کے پاس ہوتے ہیں ۔

افادات:- اللہ تعالیٰ ان کو اپنے یہاں یاد کرتے ہیں اس سے بڑی چیز اور کیا ہو گی؟ بندہ جہاں ذاکر ہوتا ہے وہیں اللہ کا مذکور بھی بن جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا مذکور ہو جانا بہت اونچی چیز ہے

ع ۔"ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے"

اور جب اللہ تعالیٰ کا مذکور ہو گا تو آپ اندازہ لگایئے کہ وہ کیا دنیا کی کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا ہے؟ اس لیے جو آدمی یہ چاہے کہ اپنے آپ کو ہر قسم کی بلا، مصائب اور آفات سے بچائے، اس کو چاہیے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔ جب وہ اللہ کے ذکر میں مشغول ہو گا تو اللہ تعالیٰ بھی اسی وقت اس کو یاد کر رہے ہوں گے۔

تین آدمیوں کا عمل اور اس پر فیصلہ

حدیث ۱۴۴۹:-

وعن أبي واقدٍ الحارث بن عوف -رضی الله عنه-: أنَّ رسولَ الله ﷺ بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ في المَسْجِدِ، والنَّاسُ مَعَهُ، إذْ أقْبَلَ ثَلاثَةُ نَفَرٍ، فأقْبَلَ اثْنَانِ إلَى رسُولِ اللهِ ﷺ، وَذَهَبَ واحِدٌ؛ فَوَقَفَا عَلَى رسولِ الله -ﷺ-. فأمَّا أحدُهما فَرَأَى فُرْجَةً في الحَلْقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا، وَأمَّا الآخرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ، وأمَّا الثَّالثُ فأدْبَرَ ذاهِباً. فَلَمَّا فَرَغَ رَسُولُ الله -ﷺ-، قَالَ: ((ألاَ أُخْبِرُكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلاَثَةِ: أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَوَى إِلَى اللهِ فآوَاهُ اللهُ إِلَيْهِ. وَأَمَّا الآخَرُ فاسْتَحْيَى فَاسْتَحْيَى اللهُ مِنْهُ، وأمّا الآخَرُ، فَأَعْرَضَ، فَأَعْرَضَ اللهُ عَنْهُ)). (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت حارث بن عوف رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجدِ نبوی میں تشریف فرما تھے، اور آپ کے پاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حلقہ لگائے ہوئے بیٹھے تھے، عین اس وقت تین

آدمی آئے۔ان میں کے دو آدمی نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی مجلس میں شریک ہونے کے لئے آگے بڑھے، اور ایک مجلس میں شریک نہیں ہوا، آگے چلا گیا۔وہ دو آکر وہاں کھڑے رہ گئے، پھر ان دو میں سے ایک آدمی نے دیکھا کہ جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں ان کے درمیان بیچ میں جگہ خالی ہے تو وہ اندر گھس کر اس جگہ پر بیٹھ گیا، اور دوسرا پیچھے ہی بیٹھ گیا۔اور تیسرا تو چل پڑا، مجلس میں شریک ہی نہیں ہوا (یہ سب منظر نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم دیکھ رہے تھے لیکن چوں کہ آپ کچھ گفتگو فرمارہے تھے اس لیے دورانِ گفتگو ان کے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا) جب آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اپنی بات سے فارغ ہو گئے تو ارشاد فرمایا: ان تین آدمیوں کے متعلق تمہیں کچھ نہ بتلاؤں؟ ایک (جو اندر آگیا اس) نے تو اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کی تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو اپنی پناہ میں لے لیا۔دوسرا شرمایا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے شرم کی (یعنی اس کو معاف کر دیا۔مطلب یہ ہے کہ وہ اندر تو نہیں گھسا، لیکن مجلس میں شریک ہو گیا اور پیچھے ہی بیٹھ گیا) اور تیسرے نے منھ موڑا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے منھ موڑ لیا۔

بڑی سعادت

حدیث ۱۴۵۰:-

وعن أَبِي سعيد الخدري رضي الله عنه قَالَ: خرج معاوية رضي الله عنه عَلَى حَلْقَةٍ فِي المَسْجِدِ، فَقَالَ: مَا أَجْلَسَكُمْ؟ قالوا: جَلَسْنَا نَذْكُرُ اللهَ. قَالَ: آللهِ مَا أَجْلَسَكُمْ إِلاَّ ذَاكَ؟ قالوا: مَا أَجْلَسَنَا إِلاَّ ذَاكَ قَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ اسْتَحْلِفْكُمْ تُهْمَةً لَكُمْ، وَمَا كَانَ أَحَدٌ بِمَنْزِلَتِي مِنْ رَسولِ اللهِ ﷺ أَقَلَّ عَنْهُ حَدِيثاً

مِنِّي: إِنَّ رسُولَ الله ﷺ خَرَجَ عَلَى حَلْقَةٍ مِنْ أَصْحَابِهِ فَقَالَ: ((مَا أَجْلَسَكُمْ؟)) قالوا: جَلَسْنَا نَذْكُرُ اللهَ وَنَحْمَدُهُ عَلَى مَا هَدَانَا لِلإِسْلَامِ، وَمَنَّ بِهِ عَلَيْنَا قَالَ: ((آللهِ مَا أَجْلَسَكُمْ إِلاَّ ذَاكَ؟)) قالوا: واللهِ مَا أَجْلَسَنَا إِلاَّ ذَاكَ. قَالَ: ((أَمَا إِنِّي لَمْ أَسْتَحْلِفْكُمْ تُهْمَةً لَكُمْ، ولكِنَّهُ أَتَانِي جِبرِيلُ فَأَخْبَرَنِي أَنَّ اللهَ يُبَاهِي بِكُمُ المَلاَئِكَةَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت اَبو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ مسجد میں ایک حلقہ پر سے گزرے، تو ان سے پوچھا: تم کو یہاں کونسی چیز نے بٹھایا ہے؟ (یہاں کیوں بیٹھے ہو؟) انہوں نے کہا: ہم تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے بیٹھے ہیں (ہمارا یہ حلقہ ذکر کا حلقہ ہے) اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہو کہ اسی چیز نے تم کو یہاں بٹھایا ہے؟ (اور کوئی مقصد و غرض تو نہیں ہے) انہوں نے کہا: صرف اسی چیز نے ہم کو یہاں بٹھایا ہے۔ اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے تم سے جو قسم لی وہ تم پر بد گمانی کی وجہ سے نہیں لی (یعنی میں نے تم سے قسم اس لیے نہیں لی کہ مجھے تمہارے اس جواب پر شبہ اور تردد تھا، اور مجھے تم سے کوئی بد گمانی تھی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، بلکہ میں نے جو قسم لی ہے وہ دراصل نبی کریم ﷺ کی اتباع اور پیروی میں لی کہ حضورِ اکرم ﷺ نے بھی ایسا ہی معاملہ کیا تھا، اس لئے میں نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کیا) اور حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ میرے جیسے رتبے والا اور کوئی نہیں (دراصل حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ خصوصی تعلق یہ تھا کہ ان کی بہن حضرت اُمِّ حبیبہ رضی اللہ عنھا نبی کریم ﷺ کے نکاح میں تھیں، گویا یہ حضورِ اکرم ﷺ کے برادرِ نسبتی تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ ایک بڑا رشتہ ہے جس کی وجہ سے آدمی کے ساتھ خصوصی تعلق ہوتا ہے۔ اور آج کل

تو یہ اتنا بڑا ابن رشتہ بن گیا ہے کہ اس کا درجہ سگے بھائی سے بھی بڑھ گیا ہے۔ تو ایک بات تو یہ ہوئی) اور پھر یہ کہ میں حضورِ اکرم ﷺ سے حدیثیں بھی کم بیان کرنے والا ہوں (یعنی حضورِ اکرم ﷺ کی روایتیں بھی میں زیادہ بیان نہیں کرتا، گویا اس باب میں بھی مَیں بڑا محتاط ہوں ۔ بعض حضراتِ صحابہ کو نبی کریم ﷺ کے ارشادات سننے کا موقع تو بہت ملا اور ان کے پاس آپ ﷺ کے ارشادات محفوظ بھی تھے، لیکن وہ اس ڈر سے بیان نہیں کرتے تھے کہ حضورِ اکرم ﷺ کی باتوں کو لوگوں تک پہنچانے میں ہم سے کوئی کوتاہی نہ ہو جائے جس کی وجہ سے حضورِ اکرم ﷺ کی اس وعید کے ہم مستحق ہو جائیں کہ جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا؛ وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم میں بنا لے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں کہ اس ڈر سے مَیں حدیث بھی بہت کم بیان کرتا ہوں ، لیکن آج تمہارا یہ منظر میں نے دیکھا تو مجھے نبی کریم ﷺ کا وہ ارشاد اور طرزِ عمل یاد آ گیا کہ) ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ صحابہ کے ایک حلقے پر سے گزرے جو مسجدِ نبوی میں بیٹھا ہوا تھا، حضورِ اکرم ﷺ نے ان سے یہی سوال کیا تھا کہ: تم کو کون سی چیز نے یہاں بٹھایا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا: اے اللہ کے رسول! ہم تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لئے بیٹھے ہیں ، اور یہاں بیٹھ کر اس بات پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کر رہے ہیں کہ اس نے ہم کو اسلام کی توفیق عطا فرمائی، اسلام جیسی نعمت سے ہمیں نوازا۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کو دوبارہ پوچھا تھا: کیا اللہ کی قسم کھا کر کہو گے کہ اسی چیز نے تم کو یہاں بٹھایا ہے (یعنی اسی لئے بیٹھے ہو، کوئی اور غرض نہیں ہے) ان حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا تھا کہ: ہم اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اسی چیز نے ہمیں یہاں بٹھایا ہے (ہماری اور کوئی غرض و مقصد نہیں ہے) اس پر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا کہ: میں نے تم سے کسی بد گمانی کی وجہ سے قسم نہیں لی، بلکہ

ابھی حضرتِ جبرئیل میرے پاس آئے تھے اور انھوں نے مجھے بتلایا کہ: اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ سے فرشتوں پر فخر کررہے ہیں (گویا فخریہ انداز میں فرشتوں سے فرمارہے ہیں کہ دیکھو میرے بندے مجھے یاد کررہے ہیں)

افادات:- اس سے بڑا عمل اور کیا ہوگا کہ بندہ کے اس عمل کو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے بطورِ فخر بیان کریں ؟ یہ تو بہت اونچا مقام ہے، اس کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو ذکر کرنے، اور ذکر کی مجالس کو قائم کرنے کی توفیق دیدے ان کے لئے یہ بڑی سعادت اور خوش قسمتی کی بات ہے، ان کو اس چیز کو بہت غنیمت سمجھنا چاہیے، اور جہاں کہیں بھی ایسی مجلسیں قائم ہوں ، اگر شریعت کے اصول کے مطابق ہوں، اور بدعت وخرافات سے پاک ہوں ؛ تو پھر آدمی ان سے دور نہ رہے، بلکہ ان میں شرکت کا اہتمام بھی کرنا چاہیے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق وسعادت عطا فرمائے

بَابُ الذِّكْرِ عِنْدَ الصَّبَاحِ وَالْمَسَاءِ

صبح اور شام اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرنا

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ.

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا.

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ.

فِيْ بُيُوْتٍ أَذِنَ اللّٰهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ.

إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ.

نیا عنوان قائم کیا ہے: صبح اور شام اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرنا۔

ذکر میں کچھ کلمات تو خالص ذکر ہی کے شمار ہوتے ہیں، جیسے: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، اللہ اکبر۔ اور کچھ دعائیہ کلمات ہیں، وہ بھی ذکر ہی میں داخل ہیں۔ شروع میں

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عادت کے مطابق قرآنِ کریم کی چند آیتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس میں صبح وشام اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کی تاکید آئی ہے۔

ذکر کے چند طریقے

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَّ خِيْفَةً﴾ اپنے پروردگار کو اپنے جی میں یعنی دل میں یاد کرو گڑگڑا کر اور ڈر کے ساتھ۔

دل میں یاد کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آدمی زبان کو بالکل حرکت نہ دے صرف دل ہی میں اللہ تعالیٰ کا استحضار کرے؛ جس کو ذکرِ قلبی کہا جاتا ہے۔ گویا زبان کو تالو سے لگا کر ایسا تصور باندھ کر بیٹھے کہ دل اللہ تعالیٰ کو یاد کر رہا ہے؛ یہ بھی ذکر کا ایک طریقہ ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دل سے بھی اللہ تعالیٰ کو یاد رکھے، اور ساتھ ہی زبان کو بھی حرکت دے؛ یہی اعلیٰ طریقہ ہے کہ زبان و دل دونوں کو اللہ کی یاد میں مشغول ہوں

اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی کا دل تو حاضر نہ ہو، صرف زبان سے اللہ کو یاد کرے، یہ بھی فائدے سے خالی نہیں ہے۔ اگرچہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں : -

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر این چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر تو سبحان اللہ ہے، اور دل میں گائے اور گدھے کے خیالات ہیں ،یعنی دنیا کی چیزیں گھوم پھر رہی ہیں ؛ایسی تسبیح کب اپنا اثر رکھتی ہے۔ لیکن حضرت حکیم الامّت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر میں ایک ترمیم فرمائی ہے:-

برزباں تسبیح و دردل گاؤ خر　　　　ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

زبان پر تو سبحان اللہ اور دل میں گائے اور گدھے کے خیالات ہیں ،ایسی تسبیح بھی اپنا اثر ضرور رکھتی ہے۔

اللہ کا پاک نام کتنی ہی غفلت سے لیا جائے: اثر رکھتا ہے

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں ایک واقعہ ذکر کیا ہے اور حضرت کی مجلس میں حضرت کی زبان سے بھی کئی مرتبہ سنا کہ: ایک مرتبہ حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں موجود تھے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بینائی رخصت ہو چکی تھی۔ تو حضرت نے پوچھا: بھائی! یہاں کون ہے؟ حضرت مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں عرض کیا: میں یحییٰ ہوں۔ پھر پوچھا: اور کون ہے؟ جواب دیا: الیاس ہے (یعنی حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت

مولانا یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی) اور کوئی نہیں ہے۔اس وقت حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے جوش سے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا پاک نام کتنی ہی غفلت سے لیا جائے، اپنا اثر رکھتا ہے۔

بعض مرتبہ لوگ یہ سوچ کر ذکر چھوڑ دیتے ہیں کہ دل اِدھر اُدھر کے خیالات میں مشغول رہتا ہے، ایسے ذکر سے کیا فائدہ ہوگا۔ان کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔جب دنیا کی معمولی چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ ان کا تصور کرنے اور نام لینے سے آدمی کے منہ میں پانی آجاتا ہے، جیسے: املی اور لیموں کا نام لینے سے منہ میں پانی آجاتا ہے؛ تو پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کا نام جب زبان پر آئے گا تو اس کا اثر دل پر نہیں آئے گا؟

﴿تَضَرُّعًاوَّخِيفَةً﴾ گڑگڑا کر اور ڈر کے ساتھ۔ذکر کے وقت یہی دونوں کیفیتیں ہونی چاہئیں۔ایک تو گڑگڑاتے ہوئے آہ وزاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف انابت ہو۔گویا دل پر اللہ کی یاد کا اثر ہو۔اور ساتھ ہی ساتھ اللہ کا ڈر بھی ہو۔

ذکرِ جہری درمیانی آواز سے ہی بتایا جاتا ہے

﴿وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ ایک شکل تو یہ ہے کہ آدمی دل ہی دل میں آہستہ آہستہ اللہ کا ذکر کرے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ زور سے تو ذکر کرے، لیکن ایسا چلّا کر کہ خود کا گلا بھی پھاڑ رہا ہے اور سننے والوں کے کان میں بھی شگاف پڑ رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے پہلے بھی سنایا تھا کہ غزوۂ خیبر سے واپسی میں کچھ لوگ زور زور سے تسبیح وغیرہ پڑھ رہے تھے، حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اس وقت میں اپنے دل میں آہستہ آہستہ ”لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ“ پڑھ رہا تھا۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اس طرح زیادہ زور لگا کر اپنے آپ کو مشقّت میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، جس ذات کو تم پکار رہے ہو، وہ نہ تو بہت دور ہے، اور نہ تو بہرا ہے، بلکہ تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہے اور سنتا ہے۔ تو بہت زور سے ذکر کرنے کے نتیجہ میں آدمی خود اپنے اوپر بھی زحمت ڈالتا ہے، اس لیے اس کو پسند نہیں کیا گیا۔ ہمارے سلسلہ میں جو ذکرِ جہری بتایا جاتا ہے اس میں بھی درمیانی جہر ہی بتایا جاتا ہے؛ اور اسی کو ﴿وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ کہا گیا ہے کہ جو آواز بہت زور کی ہوتی ہے اس سے ذرا کم آواز ہو، جس کو درمیانی آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

غافلوں میں سے نہ بنو

﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ صبح اور شام۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے آگے فرمایا ہے: قَالَ أَھْلُ اللُّغَةِ: الْاٰصَالُ جَمْعُ اَصِيْلٍ، وَهُوَ مَابَيْنَ الْعَصْرِ وَالْمغرب. "آصال" عربی میں جمع کا صیغہ ہے جس کا واحد "اصیل" ہے، عصر اور مغرب کے درمیانی وقت کو کہتے ہیں ۔ یہاں تو اس آیت کو اس لئے لائے کہ اس میں صبح وشام اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرنے کی تاکید آئی ہے۔ ﴿وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴾ اور غافلوں میں سے نہ بنو۔ اگر صبح اور شام دو وقتوں میں اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیا جائے تو ان شا اللہ غافلوں میں شمار نہیں ہوگا۔ ویسے تو یہی حکم ہے کہ آدمی ہر وقت اللہ تبارک وتعالیٰ کا استحضار رکھے لیکن شروع اور اخیر کے دونوں سرے اگر ملا لئے جائیں تو پھر درمیانی وقت میں اگر تھوڑی بہت غفلت ہو بھی گئی تو معاف ہو جائے گی۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا﴾ اس آیت میں تو صبح وشام کی اور زیادہ صراحت ہے۔ اپنے پروردگار کی تسبیح اور حمد بیان کرو سورج کے طلوع ہونے سے پہلے (یعنی صبح صادق کے بعد طلوعِ آفتاب سے پہلے) اور سورج کے غروب ہونے کے پہلے (یعنی شام کو عصر کے بعد غروبِ آفتاب سے پہلے)۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ بِالۡعَشِيِّ وَالۡإِبۡكَارِ﴾شام و صبح اپنے پروردگار کی حمد وثنا اور تسبیح بیان کرو۔ ”اَلۡعَشِيِّ مَابَيۡنَ زَوَالِ الشَّمۡسِ وَغُرُوۡبِهَا“ زوال سے لے کر غروبِ آفتاب تک یعنی ظہر کا وقت شروع ہوتا ہے وہاں سے لے کر شام تک کے وقت کو ”عشی“ کہا جاتا ہے۔

مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے

﴿فِيۡ بُيُوۡتٍ أَذِنَ اللهُ أَنۡ تُرۡفَعَ وَيُذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهُ﴾ایسے گھروں میں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کی تعظیم کی جائے اور ان کا ادب اور لحاظ رکھا جائے اور جس میں اللہ کے نام کا ذکر کیا جائے، ان گھروں میں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے ہیں ایسے لوگ جن کو تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔ یعنی وہ لوگ اگر تجارت میں مشغول ہوتے ہیں تب بھی ان کا دل اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتا۔

نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے دو حضرات کے متعلق روایتوں میں آیا ہے کہ ان میں سے ایک لوہار تھے جن کا حال یہ تھا کہ جب وہ لوہے کو گرم کرنے کے بعد اپنا ہتھوڑا اور گھن مارنے کے لئے اٹھاتے تھے، اور اذان کی آواز سنتے تھے تو اتنا بھی نہیں کہ ایک ہتھوڑا

مار کر کام بند کرتے، بلکہ اس ہتھوڑے کو پیچھے ہی چھوڑ دیتے تھے۔ اور دوسرے تاجر تھے، جب وہ تولنے کے لئے ترزاو میں سامان رکھتے اور پلڑا جھکنے والا ہوتا اور اذان کی آواز سن لیتے تو ترازو کو یوں ہی چھوڑدیتے تھے اور نماز کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ انہی کے متعلق قرآن نے "رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" کہا ہے کہ کسی چیز کا خریدنا اور بیچنا ان کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے خرید وفروخت کی اجازت دی ہے کہ آدمی حلال روزی کمانے کے واسطے مختلف طریقے اختیار کرے، یا اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے بھی خرید وفروخت کرنی پڑتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ان چیزوں میں ایسا مشغول کردے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جائے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کسی نے پوچھا کہ: نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جب گھر میں تشریف فرما ہوتے تو آپ کیا کرتے تھے؟ حضرتِ عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں فرمایا: گھر کے مختلف کاموں میں مدد فرمایا کرتے تھے، لیکن جب اذان کی آواز سنتے تھے تو فوراً اُٹھ جاتے تھے۔ گویا مؤمن کی شان بھی یہی ہونی چاہیے کہ اپنے کام کاج میں مشغول رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے غافل نہ ہو، جہاں اللہ کا بلاوا آجائے کہ فوراً ان چیزوں کو چھوڑ کر اُدھر متوجہ ہو جائے۔ اس آیت میں صبح وشام اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کا تذکرہ آیا ہے اسی مناسبت سے اس آیت کو یہاں لائے ہیں۔

حالات سے اللہ تعالیٰ بخوبی واقف ہے

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ظاہری اعتبار سے اللہ کے ذکر میں ہوتا ہے اور دل کہیں اور ہوتا ہے جیسا کہ اوپر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کا شعر پیش کیا تھا۔ ملّا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ میں نے ایک آدمی کو منیٰ کے بازار میں دیکھا کہ ہزاروں کی خرید وفروخت کر رہا ہے، لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی میں نے اس کے دل کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں پایا۔ گویا وہ تجارت میں مشغول تھا لیکن اس کا دل اللہ کی یاد میں مشغول تھا۔ اور دوسرے آدمی کو دیکھا کہ کعبہ کا غلاف پکڑے ہوئے رو رہا تھا لیکن ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا دل اللہ کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ اس لئے کسی کی ظاہری حالت کو دیکھ کر باطن کے متعلق کوئی حکم لگانے کا حق شریعت نے ہمیں نہیں دیا ہے، دل کے اندر کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالہ ہے۔ کوئی آدمی تاجر ہے اس بنیاد پر دنیادار ہونے کا حکم لگا دینا، اور ایک آدمی تسبیح لے کر مسجد میں بیٹھا رہتا ہے تو اس بنیاد پر دین دار ہونے کا حکم لگا دینا؛ اس کا حق ہمیں نہیں ہے، سب کے حالات سے اللہ تعالیٰ ہی بخوبی واقف ہے۔

ہر چیز اللہ کی یاد میں لگی ہوئی ہے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿إِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهُ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالإِشْرَاقِ﴾ہم نے پہاڑوں کو حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے تابع کر دیا کہ وہ ان کے ساتھ شام و صبح اللہ کی تسبیح پڑھتے ہیں ۔اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو بطورِ معجزہ یہ چیز عطا فرمائی تھی۔ویسے تو قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں :﴿وَإِن مِّن شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ﴾ ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتی ہے اوراللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے لیکن تم اس کو نہیں سمجھتے۔روایتوں میں آتا ہے کہ پانی جو بہہ رہا ہے وہ بھی اللہ کی یاد میں مشغول ہے،جب وہ ذکر کرنا بند کر دیتا ہے تو اس کا بہنا بند ہو جاتا ہے اور سڑنا شروع ہو جاتا ہے اسی طرح کپڑا جب تک اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہوتا ہے وہاں تک صاف شفاف رہتا ہے،جب اللہ تعالیٰ کی یاد سے غفلت میں پڑ جاتا ہے میلا ہو جاتا ہے۔بہر حال!ہر چیز اللہ کی یاد میں لگی ہوئی ہے،لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت داود علیہ السلام کو جو چیز عطا فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ جب وہ زبور پڑھتے تھے تو تمام مخلوقات بھی باقاعدہ حضرت داود علیہ السلام کے ساتھ تسبیح کرنے میں شریک ہو جاتی تھی۔

اجتماعی ذکر کا ثبوت

حضرت داود علیہ السلام پر جو کتاب نازل کی گئی تھی اس کا نام زبور ہے اور زبور میں شریعت کے حلال وحرام کے احکام نہیں تھے، بلکہ زبور کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی آیتیں تھی، گویا پوری زبور اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سے بھری ہوئی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے پہاڑ درخت چرند پرندسب کو بھی حکم دیا تھا کہ حضرت داود علیہ السلام جب زبور کی تلاوت کریں تو ان کے ساتھ حمد وثنا اور تسبیح میں وہ بھی مشغول ہو جایا کریں۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ اس سے اجتماعی ذکر کا ثبوت ہوتا ہے۔ اور اس آیت میں صبح وشام کا وقت بھی بتا دیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کے لئے بہترین اوقات صبح وشام کے ہیں۔

کوئی اس سے اچھا عمل لے کر نہیں آئے گا

حدیث ۱۴۵۱:-

وعن أَبِي هريرة -رضى الله عنه- قَالَ: قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((مَنْ قَالَ حِيْنَ يُصْبِحُ وَحِينَ يُمْسِي: سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، مِئَةَ مَرَّةٍ، لَمْ يَأْتِ أَحَدٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَفْضَلَ مِمَّا جَاءَ بِهِ، إِلاَّ أَحَدٌ قَالَ مِثْلَ مَا قَالَ أَوْ زَادَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی صبح اور شام کے وقت "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ" سو مرتبہ کہے تو قیامت کے روز کوئی آدمی اس سے اچھا عمل لے کر نہیں آئے گا، مگر وہ آدمی جس نے اسی جیسی تسبیح پڑھی ہو یا اس سے زیادہ پڑھی ہو۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تسبیح کے لئے کوئی تحدید نہیں ہے، جتنی زیادہ پڑھی جائے گی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اب صبح کی پڑھی جانے والی تسبیحات کے کلمات حدیثِ پاک میں مختلف وارد ہوئے ہیں، یہاں "سُبْحَانَ اللهِ وَ بِحَمْدِهٖ" آیا ہے۔ بعض روایتوں میں "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ" آیا ہے لہٰذا آدمی ان میں سے جو بھی پڑھنا چاہے پڑھ لے، اس فضیلت پر عمل ہو جائے گا۔

پوری رات حفاظت کی جائے گی

حدیث ۱۴۵۲ :-

وعنه، قَالَ: جَاءَ رجلٌ إِلَى النبيّ ﷺ قَالَ: يَا رسولَ الله مَا لَقِيْتُ مِنْ عَقْرَبٍ لَدَغَتْنِي البَارِحَةَ! قَالَ: ((أَمَا لَوْ قُلْتَ حِيْنَ أَمْسَيْتَ: أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ: لَمْ تَضُرَّكَ)).

(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! گزشتہ رات ایک بچھو نے مجھے ڈس لیا جس سے میں نے بڑی تکلیف اُٹھائی۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اگر شام کے وقت تو نے یہ کلمات کہہ دئے ہوتے: ”میں اللہ کی پناہ حاصل کرتا ہوں اس کے تام کلمات کے ذریعہ ان تمام چیزوں کے شر سے جن کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے“؛ تو وہ بچھو تجھ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکتا۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی آدمی نے شام کو یہ دعا پڑھ لی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری رات اس کی حفاظت کی جائے گی، کوئی چیز اس کو نقصان نہیں پہنچائے گی یعنی بچھو اور دوسرے زہریلے جانوروں کے اثرات سے محفوظ رہے گا ”مِنۡ شَرِّ مَا خَلَقَ“ میں جب جانور وغیرہ آگئے تو انسان بھی آجائیں گے۔

یقین میں مضبوطی پیدا کرنے والی دعائیں

حدیث ۱۴۵۳:-

وعنه عن النبيّ ﷺ أنّه كانَ يقولُ إذا أصبَحَ: ((اللّٰهُمَّ بِكَ أصبَحنَا وَبِكَ أمسَينَا وَبِكَ نَحيَا وَبِكَ نَمُوتُ وَإلَيكَ النُّشُورُ)) وإذا أمسى قَالَ: ((اللَّهُمَّ بِكَ أمسَينَا وبِكَ نَحيَا وَبِكَ نَمُوتُ وَإلَيكَ النُّشُورُ)) (رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب صبح ہوتی تھی تو نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یہ پڑھتے تھے: اے اللہ! تیری ہی قدرت اور طاقت دینے سے ہم نے صبح کی، اور تیری ہی قدرت اور طاقت دینے سے ہم شام کریں گے، اور تیری ہی قدرت سے ہم زندہ ہیں، اور تیری ہی قدرت سے ہم موت پائیں گے، اور تیری ہی طرف زندہ ہو کر دوبارہ لوٹنا ہے۔ اور جب شام ہوتی تو پڑھتے تھے: اے اللہ! تیری ہی قدرت اور طاقت دینے سے ہم نے شام کی، اور تیری ہی قدرت سے ہم زندہ ہیں، اور تیری ہی قدرت سے ہم موت پائیں گے، اور تیری ہی طرف زندہ ہو کر دوبارہ لوٹنا ہے۔

افادات:- پہلے بھی بتلایا تھا کہ مختلف اوقات میں مختلف اذکار اور دعائیں بتلائی گئی ہیں جن کے ذریعہ بندہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ جوڑا جاتا ہے کہ ہر وقت آدمی کی توجہ اور رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، آدمی ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے سوال کرے۔ مدد مانگے تو اللہ تعالیٰ سے مانگے۔ قدرت والا سمجھے تو اللہ تعالیٰ کو سمجھے۔ رجوع کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف کرے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف منسوب کرے؛ یہ ساری دعائیں ایمان ویقین میں مضبوطی پیدا کرنے والی ہیں۔

حدیث ۱۴۵۴:-

وعنه أَنَّ أَبَا بكرٍ الصديق رضی الله عنه قَالَ: يَارسول الله! مُرْنِى بِكَلِمَاتٍ أَقُولُهُنَّ إِذَا أَصْبَحْتُ وإِذَا أَمْسَيْتُ. قَالَ: ((قُلْ: اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمَاوَاتِ والأَرْضِ عَالِمَ الغَيْبِ والشَّهَادَةِ؛ رَبَّ كُلِّ

شَيْءٍ وَمَلِيكَهُ، أَشْهَدُ أَنْ لا إِلَهَ إِلاَّ أَنْتَ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِي وَشَرِّ الشَّيْطَانِ وَشِرْكِهِ)) قَالَ: ((قُلْهَا إِذَا أَصْبَحْتَ، وإِذَا أَمْسَيْتَ، وإِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ))

(رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کچھ ایسے کلمات کا حکم دیجیے جن کو میں صبح اور شام کہتا رہوں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ کلمات کہو: اے اللہ! جو زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے، موجود اور غائب ساری چیزوں کا جاننے والا ہے، ہر چیز کا پروردگار اور اس کا مالک و آقا ہے، میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں، میں تیری پناہ حاصل کرتا ہوں اپنے نفس کے شر سے (کہ میرا نفس مجھے خواہشات اور نافرمانی میں مبتلا نہ کر دے) اور شیطان کے شر سے، اور تیرے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے (یا شیطان کو میرے کام میں شریک ہونے سے) یہ فرما کر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب صبح ہو تب بھی، جب شام ہو تب بھی اور جب اپنے بستر پر پہنچو اس وقت بھی؛ یہ کلمات کہہ لیا کرو۔

ہر چیز کے شر سے محفوظ رہنے کے نسخے

حدیث ۱۴۵۵:-

وعن ابن مسعودٍ - رضی الله عنه - قَالَ : كَانَ نبيُّ الله ﷺ إِذَا أَمْسَى قَالَ :((أَمْسَيْنَا وأَمْسَى المُلْكُ للهِ، والحَمْدُ للهِ، لا إلهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ)) قَالَ الراوى : أُرَاهُ قَالَ فِيهِنَّ : ((لَهُ المُلْكُ وَلَهُ الحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِير ، رَبِّ أسْأَلُكَ خَيْرَ مَا فى هذِهِ اللَّيْلَةِ وَخَيْرَ مَا بَعْدَهَا ، وَأَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا فى هذِهِ اللَّيْلَةِ وَشَرِّ مَا بَعْدَهَا، رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنَ الكَسَلِ، وَسُوءِ الكِبَرِ، رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ عَذَابٍ فى النَّارِ، وَعَذَابٍ فى القَبْرِ)) وَإِذَا أَصْبَحَ قَالَ ذَلِكَ أيضاً ((أَصْبَحْنَا وأَصْبَحَ المُلْكُ للهِ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ جب شام کرتے تو یہ پڑھتے: ہم نے شام کی، اور ساری کائنات نے شام کی جس پر اللہ ہی کی ملکیت ہے، اور تمام تعریف اللہ ہی کے لئے ہے، اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ساتھ میں یہ کلمات بھی کہے: ”اسی کے لیے بادشاہی ہے اور اسی کے لیے تمام تعریفیں ہیں اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اے میرے رب! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان تمام بھلائیوں کا جو اس رات میں ہیں، اور اس کے بعد کی ساری بھلائیوں کا تجھ سے سوال کرتا ہوں ۔ اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس رات میں جو شر اور برائی ہے اس سے، اور اس کے بعد جو شر اور برائی ہو سکتی ہے اس سے بھی۔ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں سستی سے (کہ حقوق کی ادائیگی میں، تیری

عبادت واطاعت میں سستی آجائے)اور بڑھاپے کی برائی سے (یعنی جس بڑھاپے کے نتیجہ میں اللہ کے حکم پورا کرنے کے قابل نہ رہوں) اے اللہ! میں تیری پناہ حاصل کرتا ہوں جہنم کے عذاب سے، اور قبر کے عذاب سے۔ اور جب صبح کرتے تھے تب بھی یہی کلمات کہتے تھے، لیکن " أَمۡسَيۡنَا وَأَمۡسَى الۡمُلۡكُ لِلّٰهِ" کے بجائے "أَصۡبَحۡنَا وَأَصۡبَحَ الۡمُلۡكُ لِلّٰهِ" کہتے تھے۔

افادات:- ان کلمات کے پڑھنے کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ نے جو اذکار اور دعائیں بتلائی ہیں ان کی ظاہری برکات بھی ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی ہر قسم کے شر اور برائیوں سے محفوظ رہتا ہے، چاہے درندوں کی ہو، یا انسان و جن کی ہو۔ آج کل لوگ یہ شکایت بہت کرتے ہیں کہ باہر کا اثر ہو گیا، یا کسی نے کچھ کرا دیا، یہ ہوا اور فلاں ہوا۔ بھائیو! ان چیزوں کا اہتمام کر لو تو ان شاء اللہ ہر چیز کے شر اور برائی سے محفوظ رہو گے۔

حدیث ۱۴۵۶:-

وعن عبد الله بن خُبَيۡب (بضم الخاء المعجمة) رضی الله عنه قَالَ قَالَ لِی رَسولُ الله ﷺ: ((اقۡرَأۡ: قُلۡ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ، والمُعَوِّذَتَيۡنِ حِيۡنَ تُمۡسِی وَحِيۡنَ تُصۡبِحُ، ثَلاثَ مَرَّاتٍ تَكۡفِيكَ مِنۡ كُلِّ شَيۡءٍ)) (رواه أبو داود والترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن خبیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: جب شام ہو جائے تب بھی اور جب صبح ہو جائے تب بھی " قُلۡ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ (یعنی سورۂ اخلاص) اور معوذتین (یعنی

قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ، قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ) تین تین مرتبہ پڑھ لیا کرو؛ تمہارے لئے ہر چیز کی طرف سے کافی ہو جائیں گی۔

افادات:- لیجئے! اگر آپ کو اوپر والی دعائیں یاد نہ ہوں تو بالکل آسان نسخہ آگیا، تمام دعاؤں کے بدلہ میں یہی ایک عمل کافی ہو جائے گا، یا ہر مصیبت سے حفاظت کے لئے یہ عمل کافی ہو جائے گا۔ اس لیے اگر کسی کو کوئی اور دعائیں یاد نہ ہوں تو سورۂ اخلاص اور معوذتین تو ہر ایک کو یاد ہی ہوتی ہیں، صبح اور شام تین تین مرتبہ پڑھنے کا اہتمام کر لینا چاہیے، ان شاء اللہ ہر طرح سے حفاظت ہو گی۔

کوئی چیز نقصان نہیں پہنچائے گی

حدیث ۱۴۵۷:-

وعن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((مَا مِنْ عَبْدٍ يَقُولُ فِي صَبَاحِ كُلِّ يَوْمٍ وَمَسَاءِ كُلِّ لَيْلَةٍ : بِسْمِ اللهِ الَّذِي لا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهِ شَيْءٌ فِي الأَرْضِ وَلاَ فِي السَّمَاءِ وَهُوَ السَّمِيعُ العَلِيمُ، ثَلاثَ مَرَّاتٍ، إِلاَّ لَمْ يَضُرَّهُ شَيْءٌ)). (رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بندہ ہر دن کی صبح کو اور ہر رات کی شام کو تین مرتبہ یہ پڑھ لیا کرے: اس اللہ کے پاک نام سے جس کے ساتھ زمین و

آسمان میں کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی؛وہی سننے والا جاننے والا ہے؛ تو کوئی چیز اس کو نقصان نہیں پہنچائے گی (وہ ہر طرح کی آفت وبلا مصیبت وبیماری وغیرہ سے محفوظ رہے گا)۔

افادات:-اس روایت کے راوی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے اَبان بن عثمان رحمۃ اللہ علیہ پر فالج کا اثر تھا،جب انہوں نے یہ روایت بیان کی تو سننے والا ان کو تعجب سے دیکھنے لگا، گویا آپ یہ روایت بیان فرمارہے ہیں اور آپ پر ہی یہ بیماری کا حملہ ہوا؟ تو انہوں نے کہا: اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو مقدر فرمار کھا ہو وہ تو ہو کر ہی رہتی ہے ہوا یوں کہ جس دن مجھ پر فالج کا حملہ ہوا مَیں اس دن صبح میں یہ دعا پڑھنا بھول گیا تھا۔

افسوس! ہم نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور...

بہر حال! ہمیں ان دعاؤں کا پڑھنے کا اہتمام کرنا چاہیے، اسی میں ہماری دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیاں ہیں ، یہ دعائیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کا استحضار دل میں قائم ہو گا تو اس کی برکات سے ہم متمتع ہوں گے؛ لیکن افسوس کہ ہم نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا۔

آج کل تو مزاج یہ بن گیا ہے کہ صبح میں جب تک سماچار نہ سن لیں ، ریڈیو اور ٹی وی کھول نہ لیں، صبح کا اخبار دیکھ نہ لیں ؛ وہاں تک چین نہیں آتا۔ ہمارا عجیب معاملہ ہو گیا ہے کہ تسبیحات و معمولات بعد میں ادا کریں گے، پہلے اخبار دیکھیں گے، حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ اخبارات میں کیا ہوتا ہے، اگر پڑھنا ہے تو پہلے یہ سب کچھ کر لو اس کے بعد اخبار کو ہاتھ لگاؤ۔ اپنا مزاج ایسا بنالو کہ جب تک معمولات پورے نہ ہو جائیں اور سب تسبیحات و دعاؤں سے فارغ نہ ہو جائیں وہاں تک دوسری چیزوں میں اپنے آپ کو مشغول ہی نہ کرو۔ یہ جو مزاج بنتا جارہا ہے کہ جب اخبار ہاتھ میں آ گیا تو سب چھوڑ کر اسی میں لگ جاتے ہیں ، اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو تسبیح رہ جاتی ہے وہ رہ ہی جاتی ہے۔ اس لئے بھائی ذرا صبر کیجئے ، اپنے نفس پر کنٹرول کیجئے اور اپنا مزاج ایسا بنائیے کہ جب تک کہ ان سارے معمولات سے فارغ نہ ہو جائیں گے وہاں تک اور کوئی کام نہیں کریں گے۔ اشراق تک بیٹھنے کی فضیلت اس لیے بھی ہے کہ اگر مسجد ہی میں رہو گے تو سارے معمولات بھی مکمل ہو جائیں گے۔

صبح سونے کا مزاج؛ بڑی مصیبت

اب آج کل پوری دنیا میں عمومی طور پر صبح کو سونے کا مزاج ہو گیا ہے، یہ بھی بڑی مصیبت ہے۔ جیسے امریکہ نے نیو ورلڈ آرڈر جاری کیا ہے، وہ لوگ گلوبلائزیشن چاہتے ہیں، ایک نئی تہذیب جاری کرنا چاہتے ہیں کہ پوری دنیا کی عمومیت ایک ہی طرح سے رہے، سب لوگوں کے مزاج اس طرح کے بنا دیئے جائیں کہ چاہے وہ مسلمان ہو یا ہندو، یہودی ہو یا عیسائی؛ سب کا ایک ہی ٹائم ٹیبل ہونا چاہیے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اسی کا ایک حصہ ہے کہ سب لوگ جب صبح اُٹھیں تو اخبار ہی دیکھیں، ٹی وی ہی دیکھیں، پھر سو جائیں اور دیر سے اُٹھ کر ناشتہ کریں؛ یہ سب اسی نئی تہذیب کا اثر ہے۔

حالاں کہ اسلام میں صبح کے وقت سونے کی خاص ممانعت آئی ہے، اس وقت سونا آدمی کی روزی میں بے برکتی کا باعث ہوتا ہے، فجر کی نماز کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک سونے کو خصوصی طور پر منع لکھا ہے، بلکہ دنیا کی باتیں کرنا، دوسرے کسی کام میں مشغول ہونا، اخبار دیکھنا، ریڈیو سننا؛ اس طرح کے کسی بھی کام سے منع ہی فرمایا گیا ہے، اس وقت کو اللہ کے ذکر میں مشغول رکھنا چاہیے۔ اس لئے ایسا مزاج بنایا جائے، اور اگر کسی وجہ سے سونا ہی ہو تو کم از کم اشراق کے بعد سوئے۔

بیعت ہونے والوں کو خاص طور سے کہتا ہوں

جو لوگ مجھ سے بیعت ہوتے ہیں مَیں ان کو خاص طور سے کہتا ہوں کہ آپ لوگ اگر اتنا اہتمام کرلیں کہ صبح میں فجر کی اذان ہوتے ہی مسجد چلے جائیں اور اشراق تک وہیں رہیں؛ تو جتنے معمولات بتائے جاتے ہیں، قرآنِ پاک کی تلاوت ، تسبیحات، الحزب الاعظم، درود شریف وغیرہ؛ سب ہی آسانی سے پورے ہو جائیں گے۔ اور شام کی تسبیحات کو عصر کے بعد جب تک پورا نہ کرلیں؛ مسجد سے نہ نکلیں۔ لیکن عجیب مصیبت ہے کہ سلام پھیرتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان پیچھے سے کھینچتا ہو، فوراً اُٹھ کر باہر نکل جاتے ہیں ، حالاں کہ باہر کوئی کام نہیں ہوتا، مسجد ہی کے باہر بے کار کھڑے ہو رہتے ہیں ، لیکن مسجد کے اندر ٹکنا مشکل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح سمجھ نصیب فرمائے اور ان باتوں پر اہتمام سے عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

بَابُ مَا يَقُوْلُهُ عِنْدَ النَّوْمِ؟

سوتے وقت کے مسنون اذکار

حقیقی عقل مند

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ وَاخْتِلاَفِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُوْلِي الْأَلْبَابِ اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَاماً وَّقُعُوْداً وَعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ. رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

اس سلسلہ میں پہلے تو قرآنِ پاک کی آیت لائے جس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ (عقل والے کون ہیں ؟) جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو کھڑے کھڑے بیٹھے بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر (لیٹے لیٹے) یاد کرتے ہیں۔ گویا ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں اور سوتے وقت بھی بعض اذکار بتلائے گئے ہیں کہ فلاں دعا لیٹ کر پڑھے۔ بہر حال! اللہ کے

وہ بندے جو ہمیشہ اور ہر حالت میں کھڑے کھڑے، بیٹھے بیٹھے اور لیٹے لیٹے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے رہتے ہیں ، ان ہی کو اس آیت میں ''اولوا الالباب'' یعنی عقل مند کہا گیا ہے۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ انسان کی پیدائش ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت اور یاد کرنے کے لئے وجود میں آئی ہے، اب جو آدمی اپنے پیدا کئے جانے کے مقصد کو جتنا زیادہ پورا کرے گا اُتنا عقلمند کہلائے گا۔ جیسے ایک آدمی کمانے کے لئے بیرون ملک جاتا ہے، تو وہ جتنا زیادہ سے زیادہ وقت کمانے میں لگائے گا اس کو اتنا ہی بڑا عقلمند کہیں گے کہ جس مقصد اور کام کے لئے آیا ہے اسی میں اپنا وقت لگا رہا ہے۔ اسی طرح ظاہر ہے کہ بندوں کا بھی دنیا میں آنے کا جو مقصد ہے، اور جس کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے، اگر کوئی بندہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی کام میں لگائے گا تو وہ اتنا ہی زیادہ سمجھدار کہلائے گا۔

سوتے وقت کی دعا

حدیث ۱۴۵۸:-

وَعَنْ حُذَيْفَةَ وَأَبِي ذَرٍّ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ ، قَالَ : ((بِاسْمِكَ اللَّهُمَّ أَحْيَا وأَمُوتُ)). (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تھے یا لیٹ جاتے تھے (لفظ "اوٰی" کے دونوں معنیٰ کر سکتے ہیں: پناہ حاصل کرنا، اپنے بستر پر پہنچنا) تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ دعا پڑھتے تھے: اے اللہ! میں تیرے ہی نام کے ساتھ زندہ ہوں اور تیرے ہی نام کے ساتھ میری موت آئے گی، اسی پر مَیں مروں گا۔

افادات:- گویا آدمی کی زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے نام ہی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ سوتے وقت جو دعا عموماً پڑھی جاتی ہے: اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ أَمُوْتُ وَ أَحْيَا، وہ بھی ثابت ہے اور یہ بھی ہے۔

سوتے وقت کا عمل

حدیث ۱۴۵۹:-

وَعَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ **أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ لَهُ وَلِفَاطِمَةَ** رضی اللہ عنہا **إِذَا أَوَيْتُمَا إِلَى فِرَاشِكُمَا أَوْ إِذَا أَخَذْتُمَا مَضَاجِعَكُمَا فَكَبِّرَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَسَبِّحَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ وَاحْمَدَا ثَلَاثًا وَّثَلَاثِيْنَ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَلتَّسْبِيْحُ أَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: أَلتَّكْبِيْرُ أَرْبَعًا وَّثَلَاثِيْنَ.**

ترجمہ:- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان سے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: جب تم اپنا بستر پکڑ لو (یعنی جب بستر پر لیٹ جاؤ) تو تینتیس مرتبہ اللہ اکبر کہو، اور تینتیس

مرتبہ سبحان اللہ کہو، اور تینتیس مرتبہ الحمد للہ کہو۔ایک روایت میں ہے کہ چونتیس مرتبہ سبحان اللہ کہو۔ ایک اورروایت میں ہے کہ چونتیس مرتبہ اللہ اکبر کہو۔

افادات:-طبرانی کی روایت میں ہے کہ کوئی بھی ایک کلمہ چونتیس مرتبہ کہہ لو۔ تینتیس مرتبہ سبحان اللہ، تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور چونتیس مرتبہ اللہ اکبر۔یا چونتیس مرتبہ سبحان اللہ اور تینتیس تینتیس مرتبہ الحمد للہ اور اللہ اکبر۔یا سبحان اللہ اور اللہ اکبر تینتیس تینتیس مرتبہ ، اورالحمد للہ چونتیس مرتبہ ؛ہر طرح سے مقصد حاصل ہو جائے گا۔ یہی ’’تسبیحاتِ فاطمی‘‘ بھی کہلاتی ہیں جو نبی ٔکریم ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے خادم طلب کرنے پر خصوصیت سے ان کے گھر جاکر حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما دونوں کو تلقین فرمائی تھی،جیسا کہ اوپر مفصل قصہ گزر چکاہے۔ ان تسبیحات کا ان کے یہاں اتنا زیادہ اہتمام تھا کہ پوری زندگی برابر اس کا اہتمام فرماتے رہے، حتیٰ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنگِ صفّین کے موقعہ پر بھی میں نے ان کو نہیں چھوڑا۔

سونے کی ایک اور دعا

حدیث ۱۴۶۰:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: إِذَا أَوَى أَحَدُكُمْ إِلَى فِرَاشِهِ فَلْيَنْفُضْ فِرَاشَهُ بِدَاخِلَةِ إِزَارِهِ فَإِنَّهُ لَا يَدْرِي مَا خَلَفَهُ عَلَيْهِ، ثُمَّ يَقُوْلُ: بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِكَ أَرْفَعُهُ إِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَارْحَمْهَا، وَإِنْ أَرْسَلْتَهَا فَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهِ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ.**

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی اپنے بستر پر جائے تو اس کو اپنی لنگی کے اندرونی حصہ سے جھاڑ لے اس لئے کہ اس کو معلوم نہیں کہ اس بستر کو چھوڑ جانے کے بعد اس پر کیا کیا چیز آئی ہے۔ پھر یہ دعا پڑھے: اے اللہ! میں تیرا نام لے کر اپنے پہلو کو بستر پر رکھ رہا ہوں، اور تیرے نام ہی کے ساتھ اس کو اُٹھاؤں گا۔ اے اللہ! اگر تو میری روح کو اپنے پاس روکے رکھے تو اس کے ساتھ رحم اور مہربانی کا معاملہ کرنا، اور اگر (میری زندگی مقدر ہے اور) میری روح (نیند کی حالت میں تیرے دربار میں جو پہنچی تھی اس) کو تو چھوڑ دے: تو اس کی اسی طرح حفاظت کیجیو جس طرح تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت کیا کرتا ہے۔

افادات:- پہلے زمانہ میں سلی ہوئی لنگی نہیں ہوتی تھی، بلکہ جیسے احرام کی چادر ہوتی ہے ویسی ہی کھلی چادر ہوا کرتی تھی۔ گویا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر ایک کے پاس الگ سے کپڑا ہو، اس لیے لنگی کے اندونی حصہ سے جو زائد ہی ہوتا ہے اسی سے اپنا بستر جھاڑ لینا

چاہیے۔ آج کل تو رومال، چادر وغیرہ زائد کپڑے ہوتے ہیں ،اس زمانے میں ان لوگوں کے پاس پہننے کے لئے پورا لباس بھی نہیں ہوا کرتا تھا، نیچے لنگی ہوتی تو اوپر اوڑھنے کی چادر نہیں ہوتی، جب ایسا حال تھا تو پھر زائد کپڑے کا تصور کہاں کیا جاسکتا ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ایک ایسی تدبیر بتلادی کہ ستر چھپانے کے لئے جو کم سے کم درجہ ہے وہ تو ہر ایک پہنے ہوئے ہی ہوگا ، اسی سے جھاڑ لیا جائے۔ باقی یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ اسی سے جھاڑنا ضروری ہے، رومال ہو تو رومال سے بھی جھاڑ سکتے ہیں ۔ غرض یہ کہ بستر کو جھاڑنے کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرلینا چاہیے، اس لئے کہ معلوم نہیں کہ تمہارے بستر کو چھوڑ جانے کے بعد اس بستر پر کیا کیا چیز پہنچی ، گرد وغبار اور کوڑا کرکٹ آیا ہو، یا کوئی جانور بھی آسکتا ہے، خاص کر اُس زمانے میں تو ان کے پاس چراغ اور روشنی کا انتظام بھی نہیں ہوتا تھا، اگر بستر پر کوئی زہریلا جانور آگیا ہو تو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لئے جھاڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔

کیا یہ قابلِ اعتراض ہے؟

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان حضرات کے یہاں عام طور پر بستر کو کھلا چھوڑ کر جانے کا رواج تھا تب ہی تو جھاڑنے کی بات فرمائی۔ اگر بستر کو بند کرکے جانے کا رواج ہوتا تو اس

تاکید کی نوبت ہی نہ آتی۔ بعض جگہوں پر بستر لگے رہتے ہیں، چارپائی بچھی رہتی ہے تو اس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ بچھی کیوں رکھتے ہو۔ عام طور پر دیہاتوں میں تو یہ رواج ہی ہوتا ہے کہ چارپائی کو کھڑی کر دیتے ہیں، بستر بھی لپیٹ دیتے ہیں، لیکن شہروں میں بچھے ہوئے رکھنے کا رواج ہے جس پر بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں؛ تو ہم اسی روایت سے دلیل پیش کرتے ہیں کہ بستروں کو کھلا رکھنے کی بھی اجازت ہے، یہ کوئی قابلِ اعتراض چیز نہیں ہے۔

"اے اللہ! اگر تو میری روح کو اپنے پاس روکے رکھے تو اس کے ساتھ رحم اور مہربانی کا معاملہ کرنا" یہ دراصل قرآنِ پاک کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿اَللّٰهُ یَتَوَفَّى الْأَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِهَا﴾ جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح کو قبض کر لیتے ہیں اور جس کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا تو نیند کی حالت میں اس کی روح اللہ کے وہاں پہنچتی ہے ﴿فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰى عَلَیْهَا الْمَوْتَ﴾ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ نیند کی حالت میں روح وہاں پہنچی اور نیند ہی کی حالت میں اس کی موت مقدر ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اپنے پاس روکے رکھتے ہیں، اور جس کی موت مقدر نہیں ہے اس کو چھٹّی مل جاتی ہے تو پھر دوبارہ بیدار ہو کر اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاتا ہے۔ اس دعا کے الفاظ میں یوں کہا گیا ہے: "اِنْ أَمْسَكْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْهَا" اے اللہ! جب میں سو جاؤں اور اس وقت میری روح تیرے دربار میں پہنچے اور

تیرے یہاں اسی حالت میں میری موت مقدر ہے اور تو میری روح کو وہاں روک لے (یعنی میری موت ہو جائے) تو اس کے ساتھ رحمت اور مہربانی کا معاملہ کرنا۔ بہر حال! سوتے وقت یہ دعا بھی پڑھی جائے۔

ایک عمل یہ بھی ہے

حدیث ۱۴۶۱:-

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا أَخَذَ مَضْجَعَهُ نَفَثَ فِيْ يَدَيْهِ وَقَرَأَ بِالْمُعَوِّذَاتِ وَمَسَحَ بِهِمَا جَسَدَهُ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُمَا: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَوَى إِلَى فِرَاشِهِ كُلَّ لَيْلَةٍ جَمَعَ كَفَّيْهِ ثُمَّ نَفَثَ فِيْهِمَا فَقَرَأَ فِيْهِمَا: قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ، وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، وَقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا مَا اسْتَطَاعَ مِنْ جَسَدِهِ يَبْدَأُ بِهِمَا عَلَى رَأْسِهِ وَوَجْهِهِ وَمَا أَقْبَلَ مِنْ جَسَدِهِ يَفْعَلُ ذٰلِكَ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ.

قَالَ أَهْلُ اللُّغَةِ: (النَّفْثُ) نَفْخٌ لَطِيْفٌ بِلَا رِيْقٍ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب بستر پر تشریف لے جاتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں پر دم کرتے تھے اور معوذات پڑھتے تھے (معوذات سے مراد جیسا کہ دوسری

روایت میں ہے:قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ،قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، اور قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ“ یہ تین سورتیں ہیں)اور پھر ہاتھوں پر دم کر کے ہاتھوں کو اپنے پورے جسم پر پھیر دیتے تھے۔

دوسری روایت بخاری و مسلم میں ہے کہ: جب آپ ﷺ رات کو بستر پر تشریف لے جاتے تھے تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کو جمع کر کے ان میں دم کرتے تھے، پھر ان ہتھیلیوں پر یہ سورتیں ”قُلْ هُوَ اللهُ أَحَدٌ قُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ،اورقُلْ أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ“ پڑھتے تھے، پھر آپ اپنی ہتھیلیوں کو جسم پر پھیرتے تھے،ہاتھ پھیرنے کی شروعات سر، چہرے اور اگلے حصہ سے فرماتے تھے،اس کے بعد پچھلے حصہ پر پھیرتے تھے،اور جسم کے اگلے حصہ پر تین مرتبہ ایسا کرتے تھے۔

افادات:- دیکھئے !اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دم پہلے کیا گیا پھر پڑھا گیا۔ ویسے یہ بھی ہے کہ آپ پہلے پڑھ کر اس کے بعد دم کرتے تھے،اسی لئے اکثر حضرات نے اسی طریقہ کو زیادہ راجح قرار دیا ہے، لیکن بعض حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر پہلے بھی دم کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے،اس کے بعد پڑھ کر ہاتھوں کو بدن پر پھیر لیا جائے۔ اور ہاتھ پھیرنے کی بھی با قاعدہ ایک ترتیب ہے کہ ہاتھوں پر دم کر کے پہلے سر پر، پھر چہرے پر، پھر جسم کے اگلے حصہ پر،اس کے بعد جسم کے پچھلے حصہ پر پھیرا جائے۔ سوتے وقت کے جو اذکار و اعمال ہیں ان میں یہ بھی ایک عمل ہے،اس لیے اس عمل کو بھی کر لینا چاہیے۔

تو ایمان پر موت آئی

حدیث ۱۴۶۲:-

وعن البراءِ بنِ عازبٍ رضی اللہ عنہما **قَالَ : قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((إِذَا أَتَيتَ مَضْجعَكَ فَتَوَضَّأْ وَضُوءكَ لِلصَّلَاةِ، ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلَى شِقِّكَ الأَيْمن، وَقُلْ : اللَّهُمَّ أَسْلَمْتُ نَفْسِي إِلَيْكَ، وَوَجَّهْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ، وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِليكَ، وأَلْجَأْتُ ظَهرِي إِلَيْكَ، رَغْبَةً ورَهْبَةً إِليكَ، لا مَلْجَأَ وَلاَ مَنْجَا مِنْكَ إِلاَّ إِليكَ، آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِى أَنْزَلْتَ، وَبِنَبِيِّكَ الَّذِى أَرْسَلْتَ، فإِنْ مِتَّ مِتَّ عَلَى الفِطْرَةِ، وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَقُولُ))** متفق عَلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: جب تم اپنے بستر پر جاؤ (یعنی سونے کا ارادہ کرو) تو ایسا وضو کرلو جیسا تم نماز کے لئے وضو کرتے ہو، اس کے بعد اپنی دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ، پھر یہ دعا پڑھو: اے اللہ! میں نے تیری فرمانبرداری اختیار کرلی (میں تیرے سامنے پورے طور پر مطیع و فرمانبردار ہوگیا) اور میں نے اپنا سارا معاملہ تیرے حوالے کردیا۔ اور میں نے اپنی پشت کو تیری پناہ میں دے دیا تیری رحمت کی امید کرتے ہوئے اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہوئے، نہ تو جائے پناہ ہے اور نہ تو نجات کی جگہ ہے تجھ سے مگر تیری ہی طرف۔ اے اللہ! میں ایمان لایا اس کتاب پر جو تو نے نازل کی، اور تیرے اس نبی پر جس کو تو نے بھیجا۔ ان آداب کی رعایت کرتے ہوئے اگر تم سوگئے اور اسی حال میں موت آگئی تو ایمان اور فطرت پر موت آئی۔ اور یہ کلمات تمہاری زبان سے آخر میں نکلنے چاہئیں۔

افادات:- اگر پہلے سے وضو ہے تو کرنے کی ضرورت نہیں، اور نہیں ہے تو کرلینا چاہیے، گویا سونے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی باوضو سوئے، اس کو نیند ایسی حالت میں آئے کہ اس کا وضو ہو، اسی لئے اگر کوئی آدمی وضو کر کے لیٹا لیکن نیند آنے سے پہلے اس کا وضو ٹوٹ گیا تو بہتر یہ ہے کہ دوبارہ وضو کرلے، تاکہ مستحب پر عمل ہو جائے۔ پھر شروع نیند میں دائیں کروٹ پر لیٹنا بھی آداب میں سے ہے، بعد میں نیند کے دوران آدمی کروٹ بدل دے، یا چیت لیٹ جائے؛ تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں ہے، ہاں ! اوندھا نہ لیٹے۔ اوندھا لیٹنے سے منع کیا گیا ہے، بہتر یہی ہے کہ شروعات دائیں کروٹ سے ہونی چاہیے۔

اگر سکون حاصل کرنا چاہے

"وَفَوَّضْتُ أَمْرِيْ اِلَيْكَ" میں نے سارا معاملہ تیرے حوالے کر دیا۔ گویا دن بھر اپنے کام کاج میں لگ کر روزی کمانے اور اپنی ضروریات کے لئے ساری دوڑ دھوپ کے بعد بھی شام کو آدمی کی بے چینی ختم نہیں ہوتی، اس بے چینی کو ختم کرنے کا علاج یہی ہے کہ آدمی اپنا معاملہ یہ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دے:-

سپردم بتو مایۂ خویش را — تو دانی حسابِ کم و بیش را

اے اللہ! مجھ سے جو کچھ ہوا وہ میں نے کیا، اب میں نے اپنا سارا حال تیرے سامنے ہی پیش کر دیا؛ اب تو ہی جانے۔ جب تک کہ یہ کیفیت پیدا نہیں ہوگی وہاں تک ہمیں سکون نہیں آسکتا۔ آدمی اگر سکون حاصل کرنا چاہے تو اس کا یہی طریقہ ہے، ورنہ ٹینشن ہی ٹینشن ہے۔ آج کل لوگ ٹینشن میں رہتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان تعلیمات کی طرف دھیان نہیں ہے، اس لیے آدمی کو چاہیے کہ شریعت کے بتلائے ہوئے اصول کے مطابق کمانے اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی مقدور بھر کوشش کرے، پھر اخیر میں معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دے۔

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی...

”لَامَلْجَأَ وَلَامَنْجیٰ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ“ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کوئی آدمی بچنا چاہے تو اللہ ہی کی ذات میں اس کے لئے پناہ ہے، اور کہیں پناہ نہیں ۔ اللہ کے عذاب سے بچانے کے لئے دنیا کی کوئی طاقت پناہ نہیں دے سکتی، اللہ ہی کی پناہ میں آدمی آئے تب ہی اپنے آپ کو بچا سکتا ہے:-

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

جالینوس نے ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا: اگر آسمان کو کمان فرض کرلیا جائے، اوراللہ تبارک وتعالیٰ کو تیر کا چلانے والا، زمین نشانہ پر ہو اور مصائب کے تیر اوپر سے آرہے ہوں ؛تواب پناہ کی جگہ کہاں ہوگی؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: تیر چلانے والے کے پہلو ہی میں کھڑے ہوجاؤ تو پناہ مل جائے گی۔ معلوم ہوا کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرے گا تب ہی اس کو نجات ملے گی۔ ”وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَاتَقُوْلُ“ یہ کلمات تمہاری زبان سے آخر میں نکلنے چاہئیں اس سے معلوم ہوا کہ درمیان میں کوئی بات چیت کرلی تو دوبارہ پھر سے یہ دعا پڑھ لی جائے۔ اور صرف کلمات ہی نہیں بلکہ ان کا مطلب سمجھتے ہوئے تفویض و تسلیم کی کیفیت کو اپنے اندر پیدا کرتے ہوئے اگر اس دعا کا اہتمام کرے گا تو ان شاء اللہ اس کی برکات بھی حاصل ہوں گی۔

بستر پر جاکر نعمتوں کو سوچو

حدیث ۱۴۶۳:-

وَعَنْ أَنَسٍ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا أَوىٰ إِلىٰ فِرَاشِهِ قَالَ : اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَكَفَانَا وَآوَانَا، فَكَمْ مِمَّنْ لَا كَافِيَ لَهُ وَلَا مُؤْوِيَ.

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ جب اپنے بستر پر تشریف لے جاتے تو یہ دعا پڑھتے تھے: تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا اور ہماری تمام ضرورتوں کے لئے کافی ہو گیا اور ہمیں پناہ دی، بہت سے ایسے ہیں جن کی ضرورتوں کا کوئی پورا کرنے والا نہیں، اور ان کو پناہ دینے والا بھی کوئی نہیں۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں اپنے اوپر ہیں آدمی ان کو خوب سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کون کون سی نعمت عطا فرمائی ہے، دنیا میں بہت سے بندے ایسے ہیں جن کو یہ نعمتیں میسر نہیں ہیں، اس لیے آدمی ان باتوں کو سوچ کر اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرے۔

سوتے وقت کی ایک دعا اور ادب

حدیث ۱۴۶۴:-

وَعَنْ حُذَيْفَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْقُدَ وَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى تَحْتَ خَدِّهِ ثُمَّ يَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ. (رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ وَقَالَ حَدِيْثٌ حَسَنٌ)

وَرَوَاهُ أَبُوْ دَاوٗدَ مِنْ رِوَايَةِ حَفْصَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا وَفِيْهِ: أَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ جب سونے کا ارادہ کرتے تھے تو اپنا دایاں ہاتھ دائیں رخسار کے نیچے رکھتے تھے پھر یہ دعا پڑھتے تھے: اے اللہ! جس روز تو اپنے بندوں کو دوبارہ پیدا کرے گا اس روز اپنے عذاب سے مجھے بچائیو۔

دوسری روایت میں ہے کہ یہ دعا تین مرتبہ پڑھتے تھے۔

افادات:- گویا آدمی کو ہر وقت اللہ کے عذاب سے بھی ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کا استحضار رکھنا چاہیے۔ سونے کے آداب میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک تو وضو کا اہتمام کرے، دوسرے کچھ اذکار بتلائے ان کا اہتمام کرے، تیسرا دائیں کروٹ پر لیٹے چوتھا دائیں رخسار کے نیچے دایاں ہاتھ رکھے۔ سونے کے آداب میں اتنا ہی ہے۔

کیا قبلہ رخ سونا ادب ہے؟

اب سوتے وقت قبلے کی طرف رخ کرنا؛ تو کسی روایت میں صراحۃً نہیں آیا ہے، البتہ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔ امام ابو داؤد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب کے اخیر میں ایک باب قائم کیا ہے کہ: قبر میں مردے کا رخ قبلہ کی طرف کیا جاتا ہے، گویا انہوں نے اس روایت سے استدلال کرتے ہوئے یہ بتلایا ہے کہ نیند بھی موت ہی کی

طرح ہے، اس لیے اگر آسانی سے قبلہ کی طرف رخ ہو سکتا ہو تو کر لے۔ ورنہ اصل آداب میں تو اتنا ہی ہے کہ دائیں کروٹ پر دائیں رخسار کے نیچے دایاں ہاتھ رکھ کر لیٹ جائے اور پھر یہ سب دعائیں پڑھ لے جو اوپر بتلائی گئی ہیں۔

کِتَابُ الدَّعَوَات

دعاؤں کا بیان

بَابُ الأمر بالدعاء وفضله وبيان جمل من أدعيته ﷺ

نبی کریم ﷺ سے منقول مختلف دعاؤں کی فضیلت اور ان کا حکم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ.

وَقَالَ تَعَالٰى: اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ.

وَقَالَ تَعَالٰى: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ.

وَقَالَ تَعَالٰى: أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السوءَ.

کس سے مانگے؟

نیا عنوان ’’کتاب الدعوات‘‘ قائم کیا ہے۔ نبی کریم ﷺ سے جو مختلف دعائیں منقول ہیں ان کو اس عنوان کے تحت پیش کریں گے۔

"دعوات" دعوۃ کی جمع ہے۔ دعوۃ کا مطلب ہے" پکارنا اور مانگنا" صرف پکارنے کے لئے بھی دعوۃ کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اور کسی سے اپنی حاجت مانگنے کو دعا کہتے ہیں ۔ اور جب دعا کے لئے یہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے یہی مراد ہوتی ہے "کسی سے اپنی حاجت مانگنا" دعا کے سلسلہ میں قرآن و حدیث میں مستقل ہدایات موجود ہیں یہ بھی مختلف عبادتوں میں سے ایک اہم عبادت ہے کہ آدمی اپنی حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگے ۔ اسی لئے دعا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے نہیں کی جاسکتی۔

دعا امّتِ محمدیہ کی خصوصیت ہے

قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے:"وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِيٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ" تمہارے رب نے حکم دیا کہ تم مجھ سے مانگو، میں تمہاری مانگ پوری کروں گا۔

دعا بھی امّتِ محمدیہ کا امتیاز اور خصوصیت ہے۔ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: اگلی امتوں میں صرف حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہی کو حکم دیا جاتا تھا کہ تم دعا کرو؛ میں تمہاری دعا کو قبول کروں گا، ان کے امتیوں کو دعا مانگنے کا حق نہیں تھا، لیکن امّتِ محمدیہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سبھی کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ: مجھ سے مانگو ؛ میں

تمہاری مانگ پوری کروں گا اور تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا۔ گویا دعا امّتِ محمدیہ کی خصوصیت اور امتیاز ہے جو اللہ تعالیٰ نے دوسری امتوں کے مقابلہ میں اس کو عطا فرمایا ہے۔

قبولیتِ دعا کی بنیادی شرط

دعا کے سلسلہ میں کچھ آداب ہیں جن کی رعایت کے ساتھ دعا کی جاتی ہے تو وہ دعا قبولیت کے زیادہ قریب ہوا کرتی ہے۔ ویسے اللہ تبارک وتعالیٰ دعا کو قبول کرنے کے لئے آداب کا محتاج نہیں ہے، اگر کسی نے ان آداب کی رعایت کئے بغیر بھی دعا کی اور اللہ تعالیٰ چاہے تو اس دعا کو قبول کر کرسکتے ہیں، شیطان جیسی شخصیت نے بھی جب دعا کی کہ: مجھے قیامت تک مہلت دی جائے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت عطا فرمادی، تاہم دعا کے قبول ہونے کے لئے قرآن وحدیث سے کچھ آداب وشرائط معلوم ہوتے ہیں، اوران میں سب سے بنیادی ادب اور شرط یہ ہے کہ آدمی اپنا کھانا، پینا اور لباس حلال رکھے۔ احادیث میں بھی آیا ہے کہ کوئی آدمی یہ چاہتا ہو کہ اس کی دعا قبول ہو تو اس کو چاہیے کہ حلال روزی کا اہتمام کرے، نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کی تاکید فرمائی ہے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں جو سفر کی حالت میں ہوتے ہیں، اس وجہ سے

چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی دعا ضرور قبول ہوتی خاص طور پر جبکہ وہ پراگندہ حال اور پراگندہ بال ہوتے ہیں اور اللہ کے سامنے ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگتے ہیں ، لیکن چوں کہ ان کا کھانا، پینا اور لباس حرام ہوتا ہے اس لئے ان کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ معلوم ہوا کہ حرام غذا دعا کی قبولیت سے رکاوٹ بنتی ہے۔ آج کل ہمارے معاشرے میں حلال اور حرام کے معاملہ میں جو بے احتیاطیاں ہورہی ہیں وہ سب لوگ جانتے ہیں ، آپسی معاملات میں شریعت کے احکام کے مطابق حلال کا جیسا اہتمام ہونا چاہیے وہ پورے طور پر نہیں ہوتا، اسی لئے دعا کی قبولیت کے اندر بھی رکاوٹ رہتی ہے۔

دعا مانگنے کا طریقہ

باری تعالیٰ فرماتے ہیں :”اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَّخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ“ تم اپنے رب کو گڑ گڑا کر (آہ وزاری اور عاجزی کے ساتھ اپنی محتاجگی ظاہر کرتے ہوئے) آہستہ آہستہ پکارو؛ بیشک اللہ تعالیٰ حد سے آگے بڑھنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ معلوم ہوا کہ آدمی جن الفاظ میں دعا کر رہا ہے اس میں احتیاج کی شکل بھی ہونی چاہیے، آدمی اپنا لہجہ، اپنی ہیئت اور شکل وصورت بھی ایسی بنائے اور دل بھی ادھر ہی متوجہ ہو۔ اسی لئے حدیثِ پاک میں

آتا ہے کہ غافل دل کی دعا اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے۔ اور اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں دعا میں آہستگی مطلوب اور پسندیدہ ہے، اسی لئے جہری دعا کے مقابلہ میں سرّی دعا کو فضیلت دی گئی ہے۔ہاں ! اگر لوگوں کی تعلیم کی غرض سے، یا کسی خاص وقتی مصلحت کے پیشِ نظر دعا میں جہر اختیار کیا جائے تو جائز ہے، لیکن پسندیدہ یہی ہے کہ آدمی سراً دعا کا اہتمام کرے۔

”إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعتدین“ بیشک اللہ تعالیٰ (دعا کے معاملہ میں) حد سے آگے بڑھنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی کوئی ایسی چیز مانگ لینا جو ناجائز اور حرام ہو، یا آدمی اپنی حیثیت سے بڑھ کر کوئی مخصوص قید لگا کر دعا کرے، جیسے: عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے بیٹے دعا مانگ رہے تھے: اے اللہ! مجھے جنّت کے داہنے حصے میں سفید محل عطا فرما۔ انہوں نے سنا تو کہا: بیٹا! اللہ تعالیٰ سے جنّت مانگو (ابوداود شریف) معلوم ہوا کہ کسی طرح کی قید لگا کر مانگنا پسندیدہ نہیں ہے۔

دعامانگنے والے کی دعاقبول کرتاہوں

﴿وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ اے نبی! جب میرے بندے میرے متعلق سوال کریں (کہ میں ان سے قریب ہوں یادور؟ تو بتلادیجئے کہ) مَیں تو قریب ہوں ، دعامانگنے والے کی دعاقبول کرتاہوں جب وہ مجھ سے مانگتا ہے۔ دراصل کچھ دیہات کے رہنے والوں نے آکر حضور اکرم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ ہمیں بتلایئے ہمارا رب ہم سے قریب ہے تاکہ ہم آہستہ سے دعا کریں، یادور ہے تو زور سے پکاریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس آیت سے بھی بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ دعا آہستہ ہونی چاہیے، یہی پسندیدہ اور افضل ہے۔

مضطر کی دعاضرور قبول ہوتی ہے

﴿أَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْءَ﴾ وہ ذات کون ہے جو مضطر کی دعا کو قبول کرتی ہے جب کہ وہ دعا کرتا ہے اوراس کی تکلیف کو دور کرتی ہے۔ ”مضطر“ یعنی بے بس، جس کے سارے سہارے ختم ہوگئے ہوں ، سارے اسباب ووسائل کی طرف سے وہ مایوس ہوچکاہو، اس کی نگاہوں میں کوئی امید وتوقع باقی نہ رہی ہو، ساری امیدوں سے کٹ

کرجب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر اضطراری کیفیت کے ساتھ دعا کرتا ہے؛تواس کی دعاضرور قبول ہوتی ہے۔

دعاعبادت ہی ہے

حدیث ۱۴۶۵:-

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رضی اللہ عنہما عَنِ النبیﷺ قَالَ:اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبادَةُ.

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:دعاعبادت ہی ہے۔

افادات:-دعا بھی عبادت کی ایک قسم ہے،عبادت میں بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عبدیت اور عاجزی کو ظاہر کرتا ہے،اسی طرح دعا کے موقعہ پر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے بندے کی اپنی احتیاج اور عجز کو ظاہر کرنے کی وہی کیفیت ہوتی ہے تو عبادت کا جو مقصود ہے وہی دعامیں بھی پایاجاتاہے۔

جامع کلمات اختیار کرناپسندیدہ ہے

حدیث ۱۴۶۶:-

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ :كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدَعُ مَاسِوَى ذٰلِكَ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جامع دعاؤں کو(یعنی جن میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں)پسند فرماتے تھے، اور ان کے علاوہ باقی دعاؤں کو چھوڑ دیتے تھے۔

افادات:- چناں چہ آگے بھی اسی نوع کی دعائیں پیش کریں گے جو جامع کلمات کے ذریعہ مانگی گئی ہیں اوراحادیث میں وارد ہوئی ہیں ۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دعاؤں میں آدمی کو ایسی ہی دعاؤں کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے جن میں الفاظ کم اور معانی زیادہ ہوں اور وہ بنیادی ضرورتوں کو شامل ہوں ۔

بڑی جامع دعا

حدیث ۱۴۶۷:-

وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ : كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِ النَّبِيِّ ﷺ : أَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

زَادَ مُسْلِمٌ فِيْ رِوَايَتِهٖ قَالَ :وَكَانَ أَنَسٌ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّدْعُوَ بِدَعْوَةٍ دَعَا بِهَا وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّدْعُوَ بِدُعَاءٍ دَعَا بِهَا فِيْهِ

ترجمہ:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ زیادہ تر نبی ٔکریم ﷺ کی دعا یہ ہوا کرتی تھی: اے اللہ! ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا فرما، اور آگ کے عذاب سے ہماری حفاظت فرما۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ بھی ہے کہ: حضرت اَنس رضی اللہ عنہ جب ایک ہی دعا کرنا چاہتے تھے تو صرف یہی دعا کرلیتے تھے: "اَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ" اور جب لمبی دعا کرتے تھے تو اس میں اس دعا کو بھی ضرور شامل کرلیتے تھے۔

افادات:- اس دعا میں دنیا اور آخرت میں بھلائیوں کا جو سوال کیا گیا ہے، اس کی تشریح اور تفسیر کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا کی وہ ساری نعمتیں جو آدمی کو مطلوب ہوا کرتی ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں، جیسے: اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں مشغولی، علمِ نافع، عملِ صالح، نیک بیوی، فرماں بردار اولاد، کشادہ مکان، برکت والی روزی وغیرہ؛ یہ ساری چیزیں دنیا کی بھلائی کے اندر شامل ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دنیا کی بھلائی میں نیک بیوی کو خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اور آخرت کی بھلائیوں میں سب سے بڑی چیز جنّت ہے، آدمی کو اگر جنّت مل جائے اور جہنّم کے عذاب سے وہ بچا لیا جائے؛ تو آخرت کی ساری نعمتیں اس کو حاصل ہوجائیں گی۔ اس لیے یہ بڑی جامع دعا ہے جس میں دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیوں کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

ہدایت، تقویٰ، پاکیزگی، غنیٰ

حدیث ۱۴۶۸:-

وَعَنِ ابنِ مسعُودٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النبیﷺ کَانَ یَقُوْلُ: أَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَسْئَلُكَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ والْغِنٰی.

ترجمہ :- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت اور گناہوں سے بچنے، اور پاکیزگی، اور مالداری کا سوال کرتا ہوں ۔

افادات:- اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نصیب ہو جائے تو ظاہر ہے اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں کوئی کمی باقی نہیں رہتی۔ اس لیے اس دعا میں ’’الْھُدیٰ‘‘ فرمایا۔

اور اگر آدمی کو گناہوں سے حفاظت نصیب ہو جائے تو بہت بڑی نعمت ہے۔ اس لیے ’’التُّقٰی‘‘ فرمایا۔

اور ہر طرح کی برائیوں سے بچنے کے لیے ’’الْعَفَافَ‘‘ فرمایا۔ اس لیے کہ پاکیزگی کا اطلاق گناہوں سے بچنے پر بھی ہوتا ہے، اور لوگوں سے سوال کرنے سے آدمی کے بچنے پر بھی ہوتا ہے۔

جامع دعا

حدیث ۱۴۶۹:-

وَعَنْ طَارِقِ بِنْ أَشْيَمَ رضی اللہ عنہ قَالَ: كَانَ الرَّجُلُ إِذَا أَسْلَمَ عَلَّمَهُ النبی ﷺ الصَّلَاةَ ثُمَّ أَمَرَهُ أَنْ يَّدْعُوَ بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي، وَارْحَمْنِي، وَاهْدِنِي، وَعَافِنِي، وَارْزُقْنِي.

وَفِيْ رِوَايَةٍ لَهُ عَنْ طَارِقٍ أَنَّهُ سَمِعَ النبی ﷺ وَأَتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ: يَارَسُوْلَ اللهِ! كَيْفَ أَقُوْلُ حِيْنَ أَسْئَلُ رَبِّيْ؟ قَالَ: قُلْ: أَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي، وَارْحَمْنِي، وَعَافِنِي، وَارْزُقْنِي؛ فَإِنَّ هٰؤُلَاءِ تَجْمَعُ لَكَ دُنْيَاكَ وَآخِرَتَكَ.

ترجمہ:-حضرت طارق بن اَشیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اسلام قبول کرتا تھا تو نبی ٔکریم ﷺ اس کو نماز کا طریقہ سکھاتے تھے، پھر اس کو یہ حکم فرماتے تھے کہ وہ ان کلمات سے دعا کرے: اے اللہ! تو میرے گناہوں کو معاف کردے، اور مجھ پر رحم کر، اور مجھے راہِ راست دکھلا، اور مجھے عافیت نصیب فرما، اور مجھے روزی دے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت طارق فرماتے ہیں کہ میں سن رہا تھا کہ ایک آدمی نے آکر نبی ٔکریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! جب میں اللہ سے مانگوں تو کس طرح مانگوں؟ تو پھر حضورِ اکرم ﷺ نے اس کو یہ طریقہ بتلایا: تو یوں کہہ: اے اللہ! تو میرے گناہوں کو معاف کردے، مجھ پر رحم کر، مجھے عافیت عطا فرما اور مجھے روزی دے؛ یہ ایسے کلمات ہیں جن میں دنیا اور آخرت کی سب بھلائیاں آگئیں۔

افادات:۔مغفرت و رحمت؛ آخرت سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں ، اور عافیت و روزی ؛دنیاسے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں ۔اور’’عافیت ‘‘یعنی دلی طور پر اطمینان نصیب ہو، ذہنی طور پر چین و سکون اور بے فکری ہو،اور کسی مشقت کے بغیر نعمتیں حاصل ہو جائیں؛ اسی کو عافیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔گویا عافیت کا اطلاق دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیوں پر ہوتا ہے۔

مانگی تھی تلے کو، مل گئی اوپر کو

ہمارے حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب نوراللہ مرقدہٗ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے: پیارو! اللہ تعالیٰ سے کوئی بھی چیز مانگو تو کہو کہ عافیت کے ساتھ عطا فرما۔اور پھر ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ:۔

ایک آدمی سفر کر رہا تھا،سواری کے لیے کوئی جانور نہیں تھا اس لئے پیدل سفر کر رہا تھا۔جب چلتے چلتے تھک گیا تو دعا کرنے لگا: اے اللہ !سواری دیدے، گھوڑا دیدے، گھوڑی دیدے۔بار بار یہی دعا کرتا رہا،جب دیکھا کہ نہ گھوڑا مل رہا اور نہ گھوڑی مل رہی ہے،اور تھکن کا زیادہ احساس ہونے لگا تو بے چین ہو کر کہنے لگا: اے اللہ! گھوڑی کا بچہ ہی دیدے۔ خیر! پھر وہ تھکا ہارا راحت و آرام حاصل کرنے اور کچھ سستانے کے لیے ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا

کہ اتنے میں اس کے قریب سے ایک سپاہی ایک گھوڑی پر سوار جارہا تھا، اس کی وہ گھوڑی حاملہ تھی۔ اتفاق کی بات کہ وہیں اس کی گھوڑی کو بچہ پیدا ہوا۔ پیدا شدہ چھوٹا سا بچہ تھا، اس کو چلانا تو مناسب نہیں تھا، اس لیے اس سپاہی نے اس آدمی کو ایک ڈنڈا مار کر کہا: چل اُٹھ! اور اُس کے کندھے پر اس بچہ کو ڈالا اور کہا: اس کو لے کر میرے ساتھ آگے آگے چل۔ اب یہ کہنے لگا کہ: اے اللہ! مانگی تھی تلے کو، مل گئی اوپر کو۔ یعنی گھوڑی کا بچّہ مل تو گیا لیکن معاملہ الٹا ہو گیا کہ نیچے کے بجائے اوپر کو ملا، اگر نیچے ملا ہوتا تو میں سوار ہوتا، یہاں تو وہ مجھ پر سوار ہے۔ بہر حال! کوئی بھی چیز مانگی جائے تو عافیت کے ساتھ مانگی جائے۔

دلوں کو پھیرنے والے

حدیث ۱۴۷۰:-

وَعَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اَللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰى طَاعَتِكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! دلوں کو پھیرنے والے؛ ہمارے دلوں کو تو اپنی اطاعت اور فرماں برداری کی طرف پھیر دے۔

افادات:- آدمی کا دل خود اس کے اپنے اختیار میں بھی نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، اللہ تعالیٰ جس طرح چاہتے ہیں اس طرح تصرف فرماتے ہیں، اس لئے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کے لئے بھی توفیق اللہ تعالیٰ ہی سے مانگنی چاہیے جس کا طریقہ حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان الفاظ میں بتلادیا۔

اللہ کی پناہ چاہو

حدیث ۱۴۷۱:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: تَعَوَّذُوْا بِاللهِ مِنْ جَهْدِ الْبَلَاءِ وَدَرْكِ الشَّقَاءِ، وَسُوْءِ الْقَضَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَاءِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:-حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبیِ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: آزمائش کی سختی سے (یعنی مصیبت اور وہ بھی ایسی سخت جس کا برداشت کرنا مشکل ہو جائے) اور بد بختی کے پانے سے، اور تقدیر کی تکلیفوں سے، اور دشمنوں کے خوشیاں منانے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہو (یہ دعا ضرور کرتے رہنا چاہیے)۔

افادات:-"جَهْدِ الْبَلَاءِ، وَدَرْكِ الشَّقَاءِ" ان دونوں جملوں کے متعلق شرّاح فرماتے ہیں کہ: آدمی کے لئے ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن کا برداشت کرنا اس کے لئے دشوار ہو؛ اسی کو "جَهْدِ الْبَلَاءِ، وَدَرْكِ الشَّقَاءِ" تعبیر کیا گیا ہے۔

"جَہْدِ الْبَلَاءِ" کے سلسلہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ نقل کیا گیا ہے:
"کَثْرَۃُ الْعِیَالِ وَقِلَّۃُ الْمَالِ" اولاد زیادہ ہو، اور مال کم ہو؛ یہ بھی "جَھْدِ الْبَلَاءِ" ہی کی ایک شکل ہے۔

دین دنیا اور آخرت کی جامع دعا

حدیث ۱۴۷۲:-

وَعَنْهُ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: أَللّٰهُمَّ أَصْلِحْ لِي دِيْنِيَ الَّذِي هُوَ عِصْمَةُ أَمْرِي، وَأَصْلِحْ لِي دُنْيَايَ الَّتِي فِيْهَا مَعَاشِي، وَأَصْلِحْ لِي آخِرَتِي الَّتِي فِيْهَا مَعَادِي، وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ زِيَادَةً لِّي فِي كُلِّ خَيْرٍ وَاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَةً لِّي مِنْ كُلِّ شَرٍّ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! تو میرے لئے میرے دین کو درست کر دے جو میرے سارے معاملات کی بنیاد ہے اور تو میرے لئے میری دنیا کو درست کر دے جس میں میری موجودہ زندگی ہے۔ اور میرے لئے میری آخرت کو درست کر دے جس میں مجھے موت کے بعد پہنچنا ہے۔ اور میرے لئے میری زندگی کو ہر بھلائی میں زیادتی کا اور موت کو ہر برائی سے بچاؤ کا ذریعہ بنا۔

افادات:- یعنی سارے معاملات کا خلاصہ اور جڑ دین ہے، اگر دین کسی کو حاصل ہو گیا تو گویا دنیا اور آخرت کی تمام بھلائیاں اس کے ہاتھ آگئیں ، اس لیے تو دین کو درست کر دے۔ اور میری زندگی میں مجھے زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کی توفیق عطا ہو ، اور میری موت میرے لئے ہر برائی سے حفاظت کا ذریعہ بن جائے۔ یہ دعا بھی نہایت جامع ہے، اس کے مانگنے کا بھی خوب اہتمام کرنا چاہیے۔

میرے حالات ٹھیک کر دے

حدیث ۱۴۷۳:-

وَعَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قُلْ: اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ وَسَدِّدْنِيْ. وَفِيْ رِوَايَةٍ: اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ الْهُدٰى وَالسَّدَادَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ دعا کیا کرو: اے اللہ! مجھے سیدھا راستہ دکھلا، اور میری رہنمائی فرما، اور میرے حالات ٹھیک کر دے۔

اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں

حدیث ۱۴۷۴:-

وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ وَالْبُخْلِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ.

وَفِيْ رِوَايَةٍ: وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت اَنس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں عاجز و درماندہ ہونے سے (یعنی ایسا بے بس ہو جاؤں کہ کوئی کام کرنے کے قابل نہ رہوں) اور سُستی سے (بہت سی مرتبہ آدمی سستی کی وجہ سے نیک کاموں سے محروم رہتا ہے) اور بزدلی سے (آدمی کے اندر شجاعت اور جرأت ہو تو بہت سے نیک کاموں میں سبقت کرتا ہے، اور اگر مزاج میں بزدلی ہو تو اس صورت میں وہ بات نہیں رہتی۔ ویسے بزدلی ہی بعض مرتبہ میدانِ جنگ میں بھی پیچھے ہٹنے کا سبب بنتی ہے، اور میدانِ جنگ میں پیچھے ہٹنا کبیرہ گناہ ہے) اور بہت زیادہ بڑھاپے سے (بڑھاپا اس حد تک آجائے کہ دیکھنے، سننے، چلنے، پکڑنے کی صلاحیت متأثر یا ختم ہو جائے، دماغ بھی پورے طور پر کام نہ کرے، اسی کو سٹھیا جانے والی عمر کہتے ہیں جس میں آدمی کے قویٰ کام نہیں کرتے، اس سے بھی پناہ مانگی گئی۔ بعض روایت میں اسی کو "أَرْذَلِ الْعُمُرِ" کہا گیا ہے) اور کنجوسی سے (یعنی مال سے متعلق جو حقوق ہیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے کو "بخل" سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور قبر کے

عذاب سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں ۔اورزندگی کے فتنے سے(زندگی میں جو حالات آدمی کو پیش آتے ہیں جس کے نتیجہ میں بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، یا کسی آزمائش میں پھنس جاتا ہے؛یہ سب زندگی کے فتنے کہلاتے ہیں۔اور موت کے فتنے سے(موت کے وقت شیطان آکر گمراہ کرکے ایمان سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے؛یہ موت کا فتنہ ہے۔ان دونوں فتنوں سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں)۔

ایک روایت میں ہے: قرض کے بوجھ اور لوگوں کے مسلّط ہو جانے سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں (یعنی قرضہ کا ایسا بوجھ بن جائے جس کا اٹھانا ناقابلِ برداشت ہو اوراس کی ادائیگی ناممکن ہو جائے؛اس سے بھی پناہ مانگی گئی ہے۔اور لوگوں کا غلبہ یہ ہے کہ لوگ ایسے مسلّط ہو جائیں کہ صحیح طریقہ پر چلنے ہی نہ دیں ،اپنی ہی باتوں پر اصرار کریں ؛اس سے بھی پناہ چاہی گئی ہے)۔

امت کے افضل ترین فرد کو سکھائی گئی دعا

حدیث ۱۴۷۵:-

وَعَنْ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ رضی اللہ عنہ أَنَّهُ قَالَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ: عَلِّمْنِي دُعَاءً أَدْعُوْ بِهِ فِي صَلَاتِي، قَالَ: ((قُلْ : اللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْماً كَثِيراً ، وَلاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلاَّ أَنْتَ فَاغْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ، وارْحَمْنِي، إنَّكَ أَنْتَ الغَفُورُ الرَّحِيمُ)) (متفق عَلَيْهِ)

وفی روایةٍ : ((وفی بیتی)) وَرُوِیَ : ((ظلماً کثیراً)) ورُوِی : ((کبیراً)) بالثاء المثلثة وبالباء الموحدة؛ فینبغی أنْ یجمع بینهما فیقال : کثیراً کبیراً.

ترجمہ:- حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے نبیِ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے ایسی کوئی دعا سکھلایئے جو میں نماز میں پڑھا کروں۔ نبیِ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: یہ دعا پڑھو: اے اللہ! میں نے گناہوں کا ارتکاب کرکے اپنی جان پر بہت زیادہ ظلم کیا ہے، اور گناہوں کو صرف تو ہی معاف کر سکتا ہے، لہٰذا تو محض اپنے فضل سے میرے گناہوں کو معاف کر دے اور مجھ پر رحم فرما، تو ہی گناہوں کو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

افادات:- اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی کو ہمیشہ اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار کا اہتمام کرنا چاہیے، اس لیے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد پوری امت میں اور صحابہ کی جماعت میں بھی جو افضل ترین فرد ہیں جب انہوں نے حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے کوئی دعا سیکھنے کی درخواست کی تو حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے یہی دعا سکھلائی۔ لہٰذا ہمیں تو اور زیادہ اپنے گناہوں سے ڈرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنی چاہیے۔

نبی کریم ﷺ یہ دعا بھی فرمایا کرتے تھے

حدیث ۱۴۷۶:-

وعن أبي موسىٰ - رضى الله عنه - عن النَّبِيِّ ﷺ: أَنَّه كَانَ يَدْعُو بِهٰذَا الدُّعَاءِ: ((أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي خَطِيئَتِي وَجَهْلِي، وإسرافي فى أَمْرِى، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّى، أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي جِدِّى وَهَزْلِي؛ وَخَطَئِي وَعَمْدِى؛ وَكُلُّ ذٰلِكَ عِنْدِى، أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ، وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّى، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ، وأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ، وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! جو کام میں نے نادانستہ طور پر (بھول سے) کئے اور جو نادانی میں ہو گئے؛ ان سب کو معاف کردے۔ اور میں اپنے جس معاملہ میں حد سے آگے بڑھا ہوں اس کو بھی معاف کردے (اسراف کا معنٰی یہ ہے کہ شریعت نے جس کام کے لیے جو حدود مقرر کئے ہیں ان کی رعایت نہ کرنا) اور میرے ان گناہوں کو (بھی معاف کردے) جو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے۔ اے اللہ! تو میرے ان گناہوں کو بھی معاف کردے جو میں نے حقیقت میں کئے اور جو میں نے مذاق کے طور پر کئے، اور جو گناہ نادانستہ طور پر ہوئے، اور جو گناہ دانستہ طور پر کئے، یہ سارے ہی گناہ مجھ سے سرزد ہوئے ہیں۔ اے اللہ! معاف فرما میرے وہ تمام گناہ جو میں نے پہلے کئے، اور جو میں نے بعد میں کئے، اور جو گناہ میں نے چھپ کر کئے، اور جو میں نے علانیہ اور کھل کر کئے، اور وہ تمام گناہ جو تو مجھ سے زیادہ جانتا ہے؛ تو ہی نیکی کی توفیق دے کر آگے بڑھانے والا ہے، اور توفیق چھین کر پیچھے رکھنے والا ہے (یعنی اللہ تعالیٰ ہی کے حکم

سے آدمی نیکی بھی کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کے توفیق نہ دینے سے نیکی سے محروم رہتا ہے) اور تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

نہ کئے کی سزا سے پناہ

حدیث ۱۴۷۷:-

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہَا أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَقُوْلُ فِیْ دُعَائِہٖ : اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ أَعُوْذُ بِکَ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلْتُ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ أَعْمَلْ۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اس طرح دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں ان کاموں کے شر سے جو میں نے کئے، اور تیری پناہ چاہتا ہوں ان کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کئے (یعنی جو کام نہیں کئے پھر بھی اس کی سزا بھگتنی پڑے؛ اس سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں)۔

کچھ اہم دعائیں

حدیث ۱۴۷۸:-

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ : كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ زَوَالِ نِعْمَتِكَ، وَتَحَوُّلِ عَافِيَتِكَ، وَفُجَاءَةِ نِقْمَتِكَ، وَجَمِيْعِ سَخَطِكَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں سے ایک دعا یہ بھی تھی: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں تیری نعمت کے چھن جانے سے (یعنی تیری جو نعمت میرے پاس ہے وہ کہیں چھن نہ جائے) اور تیری دی ہوئی عافیت کے ہٹ جانے سے، اور تیری سزا کے اچانک آجانے سے، اور تیری ہر طرح کی ناراضگی سے۔

حدیث ۱۴۷۹:-

وَعَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رضی اللہ عنہ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ : أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْبُخْلِ وَالْهَرَمِ وَعَذَابِ الْقَبْرِ . أَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِيْ تَقْوَاهَا، وَ زَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا ، أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا . أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا . (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں عاجزی اور درماندگی سے (یعنی کوئی کام کرنے جیسا ہو اور نہ

کر سکوں ۔ اس لئے کہ یہ ایک ایسی کمزوری ہے کہ جس کے نتیجہ میں آدمی بہت سی بھلائیوں سے محروم رہتا ہے) اور سستی سے (سستی بھی بہت سے نیک کاموں کو انجام دینے میں رکاوٹ بن جاتی ہے) اور کنجوسی سے (جو حقوق مالی طور پر آدمی پر واجب ہوتے ہیں ان کی ادائیگی میں آدمی کے لئے مال کی محبت رکاوٹ بن جاتی ہے) اور سٹھیا جانے والی عمر سے (یعنی عمر کی وہ منزل جس میں جاکر آدمی کے قویٰ جواب دیدیتے ہیں اور عقل بھی جیسا کام کرنا چاہیے نہیں کرتی۔ بوڑھا آدمی بچّوں جیسا ہو جاتا ہے) اور قبر کے عذاب سے (اس لئے کہ یہی آخرت کی منزلوں میں سب سے پہلی منزل ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب قبر کا تذکرہ کرتے تھے بہت روتے تھے، کسی نے پوچھا: آپ آخرت کے تذکرہ پر بھی اتنا نہیں روتے جتنا قبر کے تذکرہ پر روتے ہیں، کیا بات ہے؟ جواب دیا کہ: نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایاہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں پہلی منزل ہے، اگر آدمی وہاں سے عافیت کے ساتھ پار ہو گیا تو آگے کی منزلیں آسان ہیں اور اگر وہیں پکڑ دھکڑ ہو گئی تو آگے کا معاملہ اور زیادہ مشکل ہے) اے اللہ! تو میرے نفس کو تقویٰ عطا فرما (یعنی گناہوں سے بچنے کے اہتمام کی صفت مجھ میں پیدا فرما) اور اس کو ہر قسم کی برائیوں اور گندگیوں اور برے اخلاق سے پاک کر، اس لئے کہ تو ہی ہے وہ بہترین ذات ہے جو اس کو پاک کر سکتی ہے، اور تو ہی اس کا مالک اور مولیٰ ہے۔ اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے (یعنی جس پر عمل کی توفیق نہ ہو) اور ایسے دل سے جس میں خشوع اور اللہ کا خوف اور ڈر نہ ہو، اور ایسے نفس سے جو سیر نہ ہوتا ہو (مطلب یہ ہے کہ نفس میں حرص ولالچ اتنی ہو کہ ضرورت سے زائد اپنے پاس موجود ہے، اس کے باوجود اس کی لالچ کی کوئی انتہا نہیں، یہ چیز ہلاکت کا ذریعہ بنتی ہے) اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔

حدیث ۱۴۸۰ :-

وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ : أَللّٰهُمَّ لَكَ أَسْلَمْتُ ، وَبِكَ آمَنْتُ ، وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ ، وَإِلَيْكَ أَنَبْتُ ، وَبِكَ خَاصَمْتُ ، وَإِلَيْكَ حَاكَمْتُ ، فَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ ، وَمَا أَخَّرْتُ ، وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ ، أَنْتَ الْمُقَدِّمُ ، وَأَنْتَ الْمُؤَخِّرُ ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ .

زَادَ بَعْضُ الرُّوَاةِ : وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ . (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اے اللہ! میں نے تیرے سامنے سپر ڈال دی (یعنی میں نے اپنے آپ کو تیرا فرماں بردار بنا دیا کہ جو حکم تو کرے اسی پر چلوں گا) اور میں تجھ ہی پر ایمان لایا اور تجھ ہی پر میں نے بھروسہ واعتماد کیا، اور اپنے تمام معاملات میں تیری ہی طرف رجوع کیا (اپنے تمام کاموں کے سلسلہ میں تیرے علاوہ کسی اور پر میری نظر نہیں ہے) اور اپنے دشمن کے ساتھ بھی تیری (مدد) ہی کے ذریعہ مقابلہ کیا، اور تیرے ہی سامنے اپنا فیصلہ پیش کیا (کوئی پیچیدہ معاملہ اگر در پیش ہو تو اس کو حل کرنے کے لئے قرآن اور حدیث ہی کو سامنے رکھوں گا) اے اللہ! تو معاف کر دے میرے ان گناہوں کو جو میں نے پہلے کئے، اور جو میں نے بعد میں کئے، اور جو میں نے چھُپ کر کئے، اور جو میں نے کھُل کر کئے۔ اے اللہ تو ہی آگے بڑھانے والا ہے اور تو ہی پیچھے کرنے والا ہے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ اور گناہوں سے بچنے کی قوت نہیں اور نیکی کرنے کی طاقت نہیں مگر تیرے ہی عطا کرنے سے۔

جہنم اوراس کے فتنوں ،مالداری وفقیری کے فتنوں سے پناہ

حدیث ۱۴۸۱ :-

وَعَنْ عَائِشَةَ رضی اللہ عنہا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَدْعُو بِهٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ: أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَعَذَابِ النَّارِ وَمِنْ شَرِّ الْغِنَى وَالْفَقْرِ. (رواہ ابوداود والترمذی وقال:حدیث حسن صحیح .وھٰذالفظ ابی داود)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کلمات کے ذریعہ سے بھی دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! آگ کے فتنے سے، جہنم کے عذاب سے اور مالداری اور فقر کی برائی سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں ۔

افادات:- جو چیزیں جہنم میں لے جانے والی ہیں ان کو جہنم کا فتنہ قرار دیا ہے۔ ایک تو خود جہنم سے بھی پناہ چاہی گئی اور جہنم کے فتنے یعنی وہ باتیں یا وہ حرکتیں اور کرتوت جو جہنم تک لے جانے والے ہیں ان سے بھی پناہ چاہی گئی۔

مالداری کے نتیجے میں آدمی میں گھمنڈ پیدا ہو جائے ،طبیعت میں کبر آجائے اور وہ دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے، خود پسندی میں مبتلا ہو جائے، جو مالی حقوق مال کی وجہ سے واجب ہوتے ہیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرنے لگے؛ یہ سب مال کے فتنے ہیں ان سے بھی پناہ چاہی گئی۔

اور فقیری کی برائی سے بھی پناہ چاہی گئی۔ فقیری کے نتیجے میں بہت سی مرتبہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے، خیانت کا مرتکب ہوتا ہے، رشوت لینے لگتا ہے، چوری کرنے پر آمادہ ہوتا ہے، اور معلوم نہیں کن کن برائیوں میں پھنس جاتا ہے۔ اور فقیری کی وجہ سے بعض مرتبہ وہ آدمی ان کے ساتھ حسد میں مبتلا ہوجاتا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے؛ یہ سب فقیری کی برائیاں ہیں جن سے پناہ چاہی گئی ہے۔

برے اخلاق، برے اعمال اور بری خواہشات سے پناہ

حدیث ۱۴۸۲:-

وَعَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ عَنْ عَمِّهِ وَهُوَ قُطْبَةُ بْنُ مَالِكٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْأَخْلَاقِ، وَالْأَعْمَالِ، وَالْأَهْوَاءِ.** (رواه الترمذی وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت قُطبَہ بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ یہ دعا کیا کرتے تھے: اے اللہ! برے اخلاق، برے اعمال اور بری خواہشات سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

افادات:- قلب خوبیوں یا برائیوں کی جن صفات سے متصف ہوتا ہے، اگر وہ خوبیاں ہیں تو "اچھے اخلاق" کہلاتی ہیں، اگر اور وہ برائیاں ہیں "برے اخلاق" کہلاتی ہیں۔

جیسے: تواضع، دنیا سے بے رغبتی وغیرہ دل کی اچھی صفات میں سے ہیں ۔ تکبر، حسد، بغض؛ یہ دل کی برائیوں میں سے ہیں ۔اور صرف تکبر ہی آدمی کو بہت ساری دوسری برائیوں میں ڈال دیتاہے، اسی کے نتیجہ میں آدمی دوسروں کے حقوق ادا نہیں کرتا دوسروں کو حقیر سمجھتاہے، اسی کی وجہ سے غصہ کرتا ہے اور لوگوں کے حق مارتا ہے۔ اسی طرح سے ایک برائی شہوت ہے جس کے نتیجہ میں آدمی زنا اور دوسری برائیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو قلب (دل) کی صفات کو'' اخلاق'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جو کام اعضاء سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے: چوری، زنا، رشوت لینا، جوا کھیلنا، شراب پینا؛ یہ سب برے اعمال ہیں ۔ گویا اس دعا میں برے اخلاق، برے اعمال اور دل میں جو بری خواہشات اور تمنائیں پیدا ہوتی ہیں ان تینوں سے پناہ چاہی گئی ہے۔

اعضاء کے شرور سے پناہ

حدیث ۱۴۸۳:-

وَعَنْ شَكَلِ بْنِ حُمَيْدٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ! عَلِّمْنِيْ دُعَاءً. قَالَ قُلْ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِيْ، وَمِنْ شَرِّ بَصَرِيْ، وَمِنْ شَرِّ لِسَانِيْ، وَمِنْ شَرِّ قَلْبِيْ، وَمِنْ شَرِّ مَنِيِّيْ. (رواہ ابوداود والترمذی وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت شکل بن حمید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی دعا سکھلائیے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے فرمایا یہ دعا پڑھو: اے اللہ! میں اپنے کان کے شر سے، اپنی آنکھ کے شر، اپنی زبان کے شر سے، اپنے دل کے شر سے اور اپنی منی کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

افادات:- "کان کا شر" یعنی کان کے ذریعہ میں ایسی چیزیں سنوں جن کے سننے سے منع کیا گیا ہے، جیسے: گانا، گالیاں، غیبت، تہمت وغیرہ۔ کان سے جس طرح اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ہوسکتی ہے، اسی طرح کان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں بھی مبتلا ہوجاتا ہے، تو کان کے ذریعہ سے جو نافرمانیاں وجود میں آتی ہیں وہ کان کا شر ہے جس سے پناہ چاہی گئی ہے۔

"آنکھ کا شر" یعنی جن چیزوں کو دیکھنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، جیسے: نامحرم کو دیکھنا، اسی طرح کی اور بھی جو برائیاں ہوسکتی ہیں تو وہ سب آنکھ کا شر ہے۔ اگر کوئی آدمی آنکھوں سے ایسے کام کرے گا تو گویا اس کی برائی اور شر میں مبتلا ہے۔

"منی کا شر" بول کر شرمگاہ مراد لی گئی ہے، اسی لئے کہ آدمی کے اندر مادّۂ منویہ جب جمع ہوتا ہے تبھی خواہشات اُبھرتی ہیں، اور یہی چیز آدمی کو بدکاری اور زنا میں مبتلا کرنے کا سبب بنتی ہے۔

دیکھو! ان دعاؤں کے ذریعہ سے ہمیں اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو اعضاء عطا فرمائے ہیں ان کو ہمیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری میں استعمال کرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے کاموں سے بچانا ہے۔ لٰہذا جہاں عملی طور پر آدمی اس کا اہتمام کرے، وہیں اللہ تعالیٰ سے دعاؤں کا بھی اہتمام کرے کہ اے اللہ! تیرے دئے ہوئے ان اعضاء اور نعمتوں کو تیری فرماں برداری میں استعمال کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما اور تیری نافرمانی میں استعمال کرنے سے ہماری حفاظت فرما۔

بیماریوں سے پناہ

حدیث ۱۴۸۴:-

وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ، وَالْجُنُوْنِ، وَالْجُذَامِ، وَسَيِّئِ الْأَسْقَامِ. (رواہ ابوداود باسناد صحیح)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں برص (یعنی سفید داغ کی بیماری) سے اور پاگل پن سے، اور جذام سے، اور تمام ہی بری بیماریوں سے۔

افادات:- جذام کو گجراتی میں ([illegible]) کہتے ہیں ،یہ ایک طرح کا سوداوی مادّہ ہوتا ہے جو جسم میں پھیل جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اعضاء بگڑنے اور جھڑنے لگتے ہیں ۔

برے ساتھی اور بری خصلت سے پناہ

حدیث ۱۴۸۵ :-

وَعَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ : أَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُوْعِ ، فَإِنَّهُ بِئْسَ الضَّجِيْعُ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخِيَانَةِ، فَإِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ یہ دعا کرتے تھے: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں بھوک سے، اس لئے کہ وہ بہت برا ساتھی ہے(جو آدمی کے ساتھ بستر میں لیٹے اس کو ’’ضَجِيْعٌ‘‘ کہتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ آدمی جب بھوکا ہوگا تو بھوک بستر میں بھی ساتھ رہے گی اور ایسی رہے گی کہ اس کی نیند بھی اڑادے گی)اور اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں خیانت سے، اس لئے کہ وہ بڑی بری خصلت ہے(جو آدمی کو اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے میں رکاوٹ بنتی ہے)۔

روزی کی آسانی اورادائیگیٔ قرض کے لیے مؤثر دعا

حدیث ۱۴۸۶:-

وَعَنْ عَلِيٍّ رضی اللہ عنہ أَنَّ مُكَاتَباً جَاءَهُ فَقَالَ : إِنِّي عَجِزْتُ عَنْ كِتَابَتِي ، فَأَعِنِّي . قَالَ : أَلَا أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ عَلَّمَنِيهِنَّ رَسُولُ اللهِ ﷺ ؟ لَوْ كَانَ عَلَيْكَ مِثْلُ جَبَلٍ دَيْناً ، أَدَّاهُ اللهُ عَنْكَ. قُلْ : أَللّٰهُمَّ اكْفِنِي بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ، وَأَغْنِنِي بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ. (رواه الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ایک مکاتب غلام ان کے پاس آیا اور عرض کیا: میں نے اپنے آقا کے ساتھ کتابت کا معاملہ کیا ہے، لیکن اس رقم کی ادائیگی سے میں عاجز ہوں ؛ آپ میری مدد کیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: میں تم کو ایسے کلمات نہ سکھلاؤں جو نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مجھے سکھلائے ہیں ؟ اگر تمہارے اوپر پہاڑ کے برابر قرضہ ہو گا تب بھی اللہ تعالیٰ اُتار دے گا۔ تم یہ کہا کرو: اے اللہ! تو اپنی حلال روزی کے ذریعہ حرام کی طرف سے مجھے کافی ہو جا، اور تو اپنے فضل کے ذریعہ تیرے علاوہ اور لوگوں کی طرف سے مجھے کافی ہو جا (یعنی تیرا فضل ایسا شاملِ حال فرمادے کہ مجھے کسی اور کی ضرورت نہ رہے)۔

افادات:- پہلے بھی بتلایا تھا کہ پہلے زمانہ میں غلام ہوا کرتے تھے، اور بعض غلاموں کو ان کے آقایوں کہہ دیا کرتے تھے کہ تم اتنے پیسے ادا کر دو تو میں تمہیں آزاد کر دیتا ہوں،

اس معاملہ کو عربی میں ”عقدِ کتابت“ کہتے ہیں ، اور ایسے غلام کو ”مکاتَب“ کہتے تھے، اور جو رقم ادا کرنی ہوتی تھی وہ ”بدلِ کتابت“ کہلاتی تھی۔

یہ بڑی موثر دعا ہے، ہمارے اکابر اس کا اہتمام کرتے تھے۔ لوگ عام طور پر قرض کی یا روزی کے معاملہ کی شکایتیں کرتے رہتے ہیں تو ان کو بتایا جاتا ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد سات سات مرتبہ اس کو پڑھنے کا اہتمام کرے، ان شاء اللہ قرضے سے بھی حفاظت ہو گی۔ جو قرض ہو گا وہ بھی ادا ہو جائے گا۔ اور روزی کا معاملہ بھی آسان ہو جائے گا۔

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی دو دعائیں

حدیث ۱۴۸۷:-

وَعَنْ عِمْرَانَ بْنِ الْحُصَيْنِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَلَّمَ أَبَاهُ حُصَيْناً كَلِمَتَيْنِ يَدْعُو بِهِمَا: أَللّٰهُمَّ أَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ، وَأَعِذْنِيْ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ. (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے والد حضرت حصین رضی اللہ عنہ کو دو دعائیں سکھلائیں کہ ان کو مانگتے رہنا: اے اللہ! میرے دل میں میری ہدایت ڈال دے (یعنی مجھے ایسے کاموں کی توفیق عطا فرما کہ اس کے نتیجہ میں میں سیدھے راستے پر چلتا رہوں؛ اسی کو الہام سے تعبیر کیا ہے) اور میرے نفس کے شر سے تو میری حفاظت فرما۔

اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو

حدیث ۱۴۸۸:-

وَعَنْ أَبِي الْفَضْلِ الْعَبَّاسِ بنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ رضی اللہ عنہ قَالَ قُلْتُ : يَارَسُوْلَ اللهِ! عَلِّمْنِي شَيْئاً أَسْأَلُهُ اللهَ تَعَالٰى قَالَ سَلُوا اللهَ الْعَافِيَةَ . فَمَكَثْتُ أَيَّاماً ، ثُمَّ جِئْتُ فَقُلْتُ : يَارَسُوْلَ اللهِ! عَلِّمْنِي شَيْئاً أَسْأَلُهُ اللهَ تَعَالٰى. قَالَ لِي: يَاعَبَّاسُ يَاعَمَّ رَسُوْلِ اللهِ! سَلُوا الْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ.

(رواہ الترمذی وقال حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت ابوالفضل عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ (جو نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے چچا ہیں) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی دعا سکھلا دیجئے کہ میں اللہ تعالیٰ سے وہی مانگتا رہوں۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ چند دن تک میں ٹھہرا رہا، پھر حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی دعا سکھلایئے کہ میں اللہ تعالیٰ سے وہی مانگتا رہوں۔ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اے اللہ کے رسول کے چچا عباس! اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت کے متعلق عافیت ہی مانگو۔

افادات:- گویا نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دو دو مرتبہ یہی دعا تلقین فرمائی، اس سے پتہ چلتا ہے کہ عافیت کتنی اہم چیز ہے۔ پہلے بھی بتلایا تھا کہ ہر قسم کا

سکون واطمینان، اور ہر برائی، بیماری اور مصیبت سے حفاظت کے لیے لفظِ ''عافیت'' بولا جاتا ہے؛ بلکہ لفظِ ''عافیت'' دنیا اور آخرت کی تمام نعمتوں کو شامل ہے۔

میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھ

حدیث ۱۴۸۹:-

وَعَنْ شَهْرِ بْنِ حَوْشَبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قُلْتُ لِأُمِّ سَلَمَةَ رضی اللہ عنھا: يَا أُمَّ الْمُؤْمِنِيْنَ! مَا كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ إِذَا كَانَ عِنْدَكِ؟ قَالَتْ: كَانَ أَكْثَرُ دُعَاءِهِ: يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلَى دِيْنِكَ. (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت شہر بن حوشب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ام المؤمنین حضرت سلمہ رضی اللہ عنھا سے پوچھا: اے ام المؤمنین! نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم جب آپ کے یہاں رات گزارتے تھے تو آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زیادہ تر دعا کیا ہوتی تھی؟ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنھا نے فرمایا: نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی اکثر دعا یہ ہوتی تھی: اے دلوں کو الٹ پلٹ کرنے والے؛ میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھ۔

افادات:- جسم کے اندر گوشت کا ایک ٹکڑا دل ہے لیکن وہ انسان کے اختیار میں نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے، وہ جو چاہتا ہے وہی دل میں پیدا ہوتا ہے اور پھر آدمی اسی کے مطابق کرتا ہے۔ جب دل کی یہ کیفیت ہے، اور دل میں آنے والی

تبدلیاں اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں ، اور اسی کے نتیجہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ایمان سے ہٹ کر کفر میں مبتلا ہو جاتا ہے؛ تو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں یہ دعا سکھائی کہ: اے دلوں کو پھیرنے والے! سب لوگوں کے دل تیرے ہی قبضۂ قدرت میں ہیں؛ تو میرے دل کو اپنے دین پر جمائے رکھ۔ گویا دین پر جمنا بھی اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق، اسی کے حکم اور ارادہ سے ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ سے اس کی اسی شان اور قدرت کو سامنے رکھتے ہوئے یہ دعا مانگی جائے۔

محبت کا سوال

حدیث ۱۴۹۰:-

وَعَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ رضی اللہ عنہ **قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَانَ مِنْ دُعَاءِ دَاوُدَ** علیہ السلام **: أَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَالْعَمَلَ الَّذِيْ يُبَلِّغُنِيْ حُبَّكَ، أَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ أَحَبَّ إِلَيَّ مِنْ نَفْسِيْ وَأَهْلِيْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ.** (رواه الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت داود علیہ السلام کی دعاؤں میں ایک دعا یہ تھی: اے اللہ! میں تجھ سے تیری محبت مانگتا ہوں (اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا دل میں پیدا ہونا بھی اللہ ہی کے حکم سے ہے، اس لئے یہ بھی اسی سے مانگی جائے) اور جو لوگ

تجھ سے محبت کرتے ہیں ان کی محبت بھی میں تجھ سے مانگتا ہوں (معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے لوگوں کے ساتھ محبت کرنی بھی چاہیے اور مانگنی بھی چاہیے) اور مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں ایسے عمل کا جو مجھے تیری محبت تک پہنچادے (ایسے تمام نیک اعمال جن کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اخلاص کے ساتھ کئے جائیں تو ان کے نتیجہ میں آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے ان کا بھی میں تجھ ہی سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے ان کی توفیق دیدے) اے اللہ !تو تیری محبت کو میرے نزدیک میری جان اور میرے گھر والوں اور ٹھنڈے پانی کی محبت سے بھی زیادہ محبوب کر دے (ایک آدمی کے دل میں اپنی جان، اپنے اہل وعیال، اور گرمی کے زمانہ میں ٹھنڈے پانی کی محبت زیادہ ہوتی ہے؛ لیکن یہ دعا مانگی جائے کہ اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ اپنی محبت ہمارے دل میں ڈال دے)۔

دعا میں "یَاذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ" بھی کہا کرو

حدیث ۱۴۹۱:-

وَعَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: أَلِظُّوْا بِیَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ.(رواہ الترمذی،ورواہ النسائی من روایۃ ربیعۃ بن عامر الصحابی،وقال الحاکم حدیث صحیح الاسناد)

(أَلِظُّوْا)بِکَسْرِ الَّامِ وَتَشْدِیْدِ الظَّاءِ الْمُعْجَمَۃِ مَعْنَاہُ:اِلْزَمُوْا ھٰذِہِ الدَّعْوَۃَ وَاَکْثِرُوْا مِنْھَا.

ترجمہ:- حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: یاذالجلال والاکرام کو لازم پکڑو (یعنی جب دعا مانگو تو کثرت سے اس کو کہا کرو)۔

افادات:- ہم جب دعا مانگتے ہیں تو اس میں ”أَللّٰھُمَّ ، یَاأَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن، یَا أَکْرَمَ الْأَکْرَمِیْن“ وغیرہ الفاظ کہتے ہیں ، تو اس روایت میں بتایا گیا کہ ”یَاذَاالْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ“ بھی کہو، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے اور دعا کو قبولیت کے قریب کرنے والے الفاظ ہیں ۔

جامع ترین دعا

حدیث ۱۴۹۲:-

وَعَنْ أَبِيْ أُمَامَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ دَعَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِدُعَاءٍ كَثِيْرٍ لَمْ نَحْفَظْ مِنْهُ شَيْئاً. قُلْنَا يَارَسُوْلَ اللهِ ! دَعَوْتَ بِدُعَاءٍ كَثِيْرٍ لَمْ نَحْفَظْ مِنْهُ شَيْئاً . فَقَالَ: أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلىٰ مَا يَجْمَعُ ذٰلِكَ كُلَّهُ؟ تَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَاسَئَلَكَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ ﷺ وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَااسْتَعَاذَ مِنْهُ نَبِيُّكَ مُحَمَّدٌ ﷺ. وَأَنْتَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَلَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ. (رواه الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بہت ساری دعائیں مانگیں (یعنی پوری زندگی میں بے شمار دعائیں مانگی اور امّت کو سکھلائیں)ان میں سے بہت کچھ ہم نے یاد نہیں رکھا۔ایک مرتبہ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول ! آپ نے بہت ساری دعائیں فرمائی ہیں جو ہم نے یاد نہیں رکھیں ،تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم کو ایک ایسی دعا نہ بتلاؤں جو ان ساری دعاؤں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے(یعنی ایک دعا ایسی بتلا دیتا ہوں کہ میں نے اپنی ساری زندگی میں

جتنی بھی دعائیں مانگیں وہ سب اس میں آجاتی ہیں) تم یہ دعا کیا کرو: اے اللہ! میں تجھ سے وہ تمام خیر اور بھلائی مانگتا ہوں جو تجھ سے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی، اور ان تمام شر اور برائی سے پناہ چاہتا ہوں جن سے نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پناہ چاہی، اور تجھ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے، اور سارے معاملات تیرے ہی اختیار میں ہیں ، اور کوئی آدمی گناہ سے بچ نہیں سکتا اور نیکی کی طاقت حاصل نہیں ہو سکتی مگر تیرے ہی حکم سے۔

افادات:–یہ ایک ایسی جامع دعا ہے جو ساری دعاؤں کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے، اس لیے اگر انہیں الفاظ میں جو اصل عربی میں ہیں یاد کرلی جائے تو بہت اچھا؛ ورنہ اردو میں چاہے تو یہ کہے: اے اللہ! حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جتنی بھی خیر اور بھلائی تجھ سے مانگی ہے ہم اس کا تجھ سے سوال کرتے ہیں اور حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جن شرور و برائیوں سے پناہ چاہی ہے، ہم ان تمام سے پناہ چاہتے ہیں ۔

ایک دعا

حدیث ۱۴۹۳:-

وَعَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رضی اللہ عنہ **قَالَ كَانَ مِنْ دُعَاءِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، وَالْغَنِيْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَالْفَوْزَ بِالْجَنَّةِ، وَالنَّجَاةَ مِنَ النَّارِ.** (رواہ الحاکم ابوعبداللہ: وقال حدیث صحیح علی شرط مسلم)

ترجمہ:-حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی تھی: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں ان تمام چیزوں کا جو تیری رحمت کو واجب کرنے والی ہیں (یعنی وہ تمام اعمال جن کے نتیجہ میں تیری رحمت حاصل ہوتی ہے ان کی مجھے توفیق عطا فرما) اور وہ تمام اعمال جو تیری مغفرت کو لازم کرنے والے ہیں اور (اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں) ہر گناہ سے حفاظت کا، اور ہر نیکی میں سے حصہ پانے کا اور (اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں) جنّت حاصل کر کے کامیابی پانے کا، اور جہنم سے بچ کر نجات پانے کا۔

بَابُ فَضْلِ الدُّعَآءِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ

غائبانہ دعا کی فضیلت

کسی بندۂ مؤمن کا اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرنے میں اس کی موجودگی میں دعا کرنے کے مقابلہ میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے، کسی کے سامنے تو ہوسکتا ہے کہ دل نہ چاہتا ہو لیکن اس کو خوش کرنے کے لئے کہہ دیا ہو، لیکن جبکہ وہ موجود نہیں ہے اس وقت جب دعا کی جائے گی؛ تو ظاہر ہے اس میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ قبول بھی ہوتی ہے۔

آیاتِ قرآنیہ

سورۂ حشر میں جہاں اللہ تعالیٰ نے مہاجرین اور انصار کا تذکرہ کیا ہے اس کے بعد فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ﴾ اور وہ لوگ جو اُن (یعنی مہاجرین وانصار) کے بعد آئے وہ اپنی دعاؤں میں یوں کہتے ہیں: اے

ہمارے رب !تو ہمارے گناہوں کو معاف کر دے، اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی معاف کر دے جو ہم سے پہلے ایمان لے آئے تھے (اور دنیا سے رخصت ہو گئے)۔

﴿وَاسۡتَغۡفِرۡ لِذَنۡۢبِكَ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ اے نبی! آپ اپنے گناہ کے لئے معافی چاہیے اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کے لئے بھی معافی چاہیے۔

باری تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا کہ انہوں نے یہ دعا کی تھی:

﴿رَبِّ اغۡفِرۡ لِىۡ وَلِوَالِدَىَّ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَوۡمَ يَقُوۡمُ الۡحِسَابُ﴾ اے میرے رب! تو مجھے معاف کر دے اور میرے والدین کو بھی اور تمام ایمان والوں کو بھی جس دن حساب ہو گا۔

معلوم ہوا کہ جو دعا مؤمنین مردوں اور عورتوں کے لئے کی جاتی ہے وہ سب چوں کہ غائب ہی ہوتے ہیں اس لئے وہ دعا قبول ہوتی ہے۔

قبولیت دعا کا گُر

حدیث ۱۴۹۴:-

وعن أبي الدرداء - رضی الله عنه - : أنَّه سَمِعَ رسولَ اللهِ ﷺ يقول : ((مَا مِنْ عَبْدٍ مُسْلِمٍ يدعُو لأَخِيهِ بِظَهْرِ الغَيْبِ إلاَّ قَالَ المَلَكُ : وَلَكَ بِمِثْلٍ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کوئی مسلمان بندہ اپنے بھائی کے لئے غائبانہ دعا کرتا ہے تو ایک فرشتہ کہتا ہے کہ تجھے بھی اتنا ہی نصیب ہو۔

حدیث ۱۴۹۵:-

وعنه: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ كَانَ يقول: ((دَعْوَةُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لأَخِيهِ بِظَهْرِ الغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ، عِنْدَ رَأْسِهِ مَلَكٌ مُوَكَّلٌ كُلَّمَا دَعَا لأَخِيهِ بِخَيْرٍ قَالَ الْمَلَكُ الْمُوَكَّلُ بِهِ: آمِينَ، وَلَكَ بِمِثْلٍ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ فرماتے تھے: مسلمان بھائی کی اپنے مسلمان بھائی کے لئے غائبانہ دعا قبول ہوتی ہے۔ ایک فرشتہ اس کے پاس ہی مقرر رہتا ہے، جب بھی وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے کسی بھلائی کی دعا کرتا ہے تو وہ مقرر فرشتہ کہتا ہے: اللہ تعالیٰ تیری اس دعا کو قبول کرلے، اور تجھے بھی یہی چیز نصیب ہو جائے۔

افادات:- اسی لئے اسلاف میں سے بہت سے حضرات کا معمول تھا کہ جب ان کی اپنی کوئی حاجت ہوتی تھی تو وہ اپنے ان بھائیوں کے لئے دعا کیا کرتے تھے جو انہیں جیسی حاجت والے ہوتے تھے، مثلاً: اگر کوئی آدمی بیمار ہے تو یہ دعا کرے: اے اللہ! تمام بیماروں کو تندرستی دے؛ تو ایک فرشتہ دعا کرے گا کہ: تمہیں بھی یہی چیز حاصل ہو جائے۔ اس طرح فرشتہ کی دعا خود اپنی بیماری کی شفا کے لئے حاصل ہو جائے گی۔ کوئی آدمی مقروض ہے

تو دعا کرے: اے اللہ! تمام مقروضوں کے قرضے اتار دے۔ کوئی آدمی بے گھر ہے تو وہ دعا کرے: اے اللہ! جتنے بھی بے گھر ہیں ان سب کو گھر عطا فرما۔ کسی کے کاروبار میں برکت نہیں ہو رہی ہے تو وہ دعا کرے: اے اللہ! سب کے کاروبار میں برکت عطا فرما؛ تو ایک فرشتہ کہے گا: "وَلَكَ بِمِثْلٍ" تمہارے حق میں بھی ایسا ہی ہو۔

اپنی غرض کا تقاضہ بھی یہی تھا

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو لوگ پوری امّت کے لئے کثرت سے دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کتنا زیادہ حاصل ہوتا ہوگا۔ یہ تو ہم لوگ اپنی تنگ نظری کی وجہ سے دعاؤں میں اس چیز کا اہتمام نہیں کرتے، ورنہ اپنی غرض کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ ایسی دعا مانگتے، تاکہ کم سے کم فرشتہ کی دعا حاصل ہو جاتی اور ہمارے ضرورتیں پوری ہو جاتیں۔ اسی لئے تمام اہل اللہ اور ان میں بھی جس کا جتنا اونچا مقام ہوتا ہے وہ اپنی ذات کے مقابلہ میں امّت کے لئے زیادہ سے زیادہ دعاؤں کا اہتمام کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے۔

بَابٌ فِیْ مَسَائِلِ مِنَ الدُّعَاءِ

دعا کے چند مسائل

احسان کا بڑا بدلہ

حدیث ۱۴۹۶:-

وَعَنْ أُسَامَةَ بْنِ زَيْدٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ : مَنْ صُنِعَ إِلَيْهِ مَعْرُوْفٌ فَقَالَ لِفَاعِلِهِ: جَزَاكَ اللهُ خَيْرًا، فَقَدْ أَبْلَغَ فِي الثَّنَآءِ. (رواہ الترمذی وقال حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس کے ساتھ کسی طرح کی بھلائی کا سلوک کیا گیا، پھر اس نے اس بھلائی کرنے والے کو جواب میں کہا: (جَزَاكَ اللهُ خَيْرًا) اللہ تعالیٰ تمہیں اچھا بدلہ دے؛ تو اس نے بھلائی کرنے والے کو بدلہ دینے میں بہت مبالغہ سے کام لیا (یعنی بہت بڑا بدلہ دیا)۔

افادات:- اس لئے کہ یہ جملہ کہنے والا گویا یوں کہنا چاہتا ہے کہ آپ نے میرے ساتھ جو احسان کیا، میں تو اس کا بدلہ دینے سے قاصر ہوں، اب میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی آپ کے اس احسان کا اچھا بدلہ عطا فرمائے۔ اور ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بدلہ دیا جائے گا وہ بہت بڑا بدلہ ہوگا۔ اگر یہ خود دیتا تو ویسا بدلہ نہیں دے سکتا تھا جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے دیا جائے گا۔ اس لئے واقعہ یہ ہے جو آدمی

احسان کرنے والے کو دعا کے طور پر یہ الفاظ کہتا ہے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے اس کے احسان کا بہت بڑا بدلہ دیا۔

بہت کچھ دیا جس نے دل سے دعا دی

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ جو مظاہر علوم سہارنپور کے ناظم تھے اور حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے اجل خلفاء میں تھے، حضرت قاری سیّد صدیق احمد صاحب باندوی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ و شیخ تھے، حضرت قاری صاحب کو انہیں سے اجازت حاصل تھی۔ میرٹھ کے رہنے والے ایک صاحب جو حضرت کے پاس آیا جایا کرتے تھے جو شاعر بھی تھے، ان کا تخلص تسکینؔ میرٹھی تھا، انہوں نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وہ مکاتیب جو خود انہی کے نام تھے اس کو "مکاتیبِ اسعد" کے نام سے جمع کیا ہے، اسی ضمن میں انہوں نے اپنا ایک شعر بھی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ جب میں نے حضرت کے سامنے اپنا یہ شعر پیش کیا تو حضرت نے اس کو بہت پسند فرمایا، اس میں اسی مضمون کو بیان کیا ہے:-

گدا کو بھی اہلِ کرم کم نہ سمجھیں۔۔۔۔ بہت کچھ دیا جس نے دل سے دعا دی

ظاہر ہے کسی فقیر کے ساتھ کوئی احسان و بھلائی کا معاملہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنی طرف سے اور تو کچھ نہیں دے سکتا لیکن دعا تو دے سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے جو آدمی اپنے احسان کرنے والے کو جواب میں یہ جملہ کہتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کر رہا ہے کہ: اے اللہ! اس نے میرے ساتھ جو احسان کیا ہے اب تو ہی اس کا بدلہ دیدے۔ اگر وہ اپنی طرف سے کوئی بڑے سے بڑا بدلہ دیتا تب بھی اس دعا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بدلہ دیا جائے گا وہ اس کی طرف سے دئے جانے والے بدلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ کر ہے جیسے: جب کوئی آدمی ہدیہ دے تو آداب میں سے یہ ہے کہ آپ بھی جواب میں اس کو اپنی حیثیت کے مطابق کچھ ہدیہ پیش کیجئے، اور ساتھ ہی ساتھ دعا بھی دیدیجئے۔ اس لئے بہت ضروری ہے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی احسان کا معاملہ کیا جائے تو اس کو ''جَزَاكَ اللّٰهُ خَيْرًا'' کے الفاظ سے دعا دینی چاہیے۔

اولاد و اموال کے لیے بد دعا مت کرو

حدیث ۱۴۹۷:-

وَعَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: لَا تَدْعُوْا عَلٰی أَنْفُسِكُمْ، وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی أَوْلَادِكُمْ، وَلَا تَدْعُوْا عَلٰی أَمْوَالِكُمْ، لَا تُوَافِقُوْا مِنَ اللّٰہِ سَاعَةً يُسْأَلُ فِيْهَا عَطَاءً فَيَسْتَجِيْبَ لَكُمْ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اپنے لئے بد دعا نہ کرو، اور اپنی اولاد کے لئے بھی بد دعا نہ کرو، اور اپنے اموال پر بھی بد دعا نہ کرو، کہیں وہ دعا اللہ تعالیٰ کی کسی ایسی گھڑی میں واقع نہ ہو جائے جس میں اللہ تعالیٰ سے جو چیز بھی مانگی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے لئے قبول کر لیتے ہیں۔

افادات:- بعض اوقات اور گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کی ہوتی ہیں، بندوں کو ان کا پتہ نہیں ہوتا کہ یہ قبولیت کی گھڑی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کا دستور ہے کہ ان گھڑیوں میں جو بھی مانگا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ دیدیا جاتا ہے۔

بعض مرتبہ آدمی حالات سے پریشان ہو کر ایسے کچھ جملے اپنی زبان سے نکال دیتا ہے جو بد دعا کے ہوتے ہیں، خاص کر عورتوں کی ایسی عادت زیادہ ہی ہوتی ہے، بات بات پر کہتی ہیں: ”میں مر کیوں نہیں جاتی۔ میں مر جاؤں، زمین میں گڑ جاؤں“ وغیرہ؛ تو اس روایت میں کہا گیا ہے کہ اپنے لئے بد دعا نہ کرو۔

اولاد کی طرف سے پریشانی کی کوئی بات ہوتی ہے تو بہت سی مرتبہ ناراض ہو کر کہتی ہیں: ''تو مر جائے، قبر میں گڑ جائے، تیرا ایسا ہو جائے؛ وغیرہ'' ۔ تو فرمایا کہ اپنی اولاد کے لئے بھی بددعا نہ کرو۔

''اور اپنے اموال پر بھی بددعا نہ کرو'' جیسے: سواری کا گھوڑا ہے، یا گائے بھینس کی طرف سے تکلیف کی کوئی بات پہنچی تو زبان سے بددعا کا جملہ نکل جاتا ہے، جیسے: یہ ختم بھی نہیں ہو جاتا، وغیرہ۔ اپنے کاروبار میں کبھی ایسا کوئی معاملہ پیش آتا ہے تو آدمی اسی کے متعلق بددعا کرنے لگتا ہے کہ یہ کاروبار بھی میرے لئے بڑی مصیبت ہے، اس سے جان بھی نہیں چھوٹتی۔ جب یہ ہاتھ سے چلا جائے گا تو پتہ چلے گا کہ یہ مصیبت تھی یا اور کچھ تھا۔

بہر حال! تو یہ تین چیزیں ہوئیں ، اپنے لئے، اپنی اولاد کے لئے، اور اپنے اموال کے لئے بددعا نہ کرو۔

... پھر آدمی زندگی بھر روتا پھرتا ہے

اور عام طور پر جب آدمی اپنے لئے، یا اپنی اولاد کے لئے، یا اپنے مال کے لئے بددعا کرتا ہے تو اگرچہ زبان سے تو ایسا بولتا ہو، لیکن حقیقت یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل نہیں چاہ رہا ہوتا

ہے کہ ایسا ہو ہی جائے۔ دراصل وہ اپنا غیظ وغضب اور ناراضگی کا اظہار کرنے کے لئے اپنی زبان سے ایسے جملے نکالتا ہے، حقیقت میں بددعا مقصود نہیں ہوتی، بلکہ دل کی بھڑاس نکالنی مقصود ہوتی ہے، لیکن دل کی بھڑاس کو بددعا کی شکل میں نکالتا ہے، تو حضور صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آپ کا دل تو نہیں چاہتا کہ ایسا ہو جائے لیکن وقت کے جس حصہ میں یہ جملہ آپ کی زبان سے نکلا وہ گھڑی اللہ تعالیٰ کے یہاں ان گھڑیوں میں سے تھی کہ اس میں جو بھی مانگا جائے اللہ تعالیٰ کے یہاں سے وہ دیدیا جاتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کا جملہ قبول کر لیا جاتا ہے اور اسی کے مطابق ہو جاتا ہے؛ تو پھر آدمی زندگی بھر روتا پھرتا ہے۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فضائلِ رمضان میں ایک جگہ پر لکھا ہے کہ: رمضان المبارک میں روزے کی حالت میں بعض مرتبہ عورتیں ناراض ہو کر ایسا جملہ بولتی ہیں اور جب اسی طرح ہو جاتا ہے تو پھر زندگی بھر روتی پھرتی ہیں ۔ بہر حال! اس میں دعا سے تعلق رکھنے والا ایک ادب بتلایا گیا ہے، آدمی کو اس کا بھی اہتمام کرنا چاہیے۔

بد دعا کی مثال گیند (Ball) جیسی ہے

پہلی بات تو یہ ہے کہ آدمی بد دعا کا مزاج ہی کیوں بنائے۔ بعض لوگوں کا مزاج ہی بات بات میں بد دعا دینے کا ہوتا ہے، بلکہ اس طرح سے وہ لوگوں کو ڈراتے رہتے ہیں کہ تمہارے لئے بد دعا کر دوں گا۔ حالاں کہ ایک بات یاد رہے کہ بد دعا لعنت ہے، اور لعنت یعنی کسی کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کرنا۔ اس کے متعلق حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب کوئی آدمی کسی پر لعنت اور بد دعا کرتا ہے تو وہ بد دعا آسمان پر جاتی ہے، لیکن آسمان پر جانے کے لئے اس کو جگہ نہیں دی جاتی، وہاں سے واپس بھیج دی جاتی ہے، تو وہ جس کے لئے کی گئی ہے اس کے پاس پہنچتی ہے، اگر وہ اس کا حقدار ہوتا ہے تب تو ٹھیک ہے، اس کو لگ جاتی ہے ، ورنہ پھر وہ اپنے لئے جگہ تلاش کرتی ہے، اور جب اس کو کوئی جگہ نہیں ملتی تو جس نے وہ لعنت اور بد دعا کی ہے اسی پر پڑ جاتی ہے۔

ہمارے اکابر میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث اور عالم گزرے ہیں ، بہت بڑے بزرگ بھی تھے، انہیں کے حوالہ سے ہمارے حضرت مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ: بد دعا اور لعنت کی مثال گیند (Ball) جیسی ہے، اس کو آپ نے کسی جگہ پھینک کر مارا، اب اگر وہ جگہ نرم ہے اور اپنے اندر اس گیند کو کیچ کر لیتی

ہے؛تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر وہ جگہ ایسی نہیں ہے جو اس گیند کو اپنے اندر جذب کر سکے، بلکہ وہ جگہ سخت ہے تو پھر وہ گیند دوبارہ لوٹ کر جس نے پھینکی ہے اسی کی طرف آجاتی ہے۔ بد دعا اور لعنت کا حال ایسا ہی ہے۔

اسی لئے عام طور پر ایسے لوگ جن کی عادت اپنی زبان سے بد دعائیہ جملے نکالنے کی ہوتی ہے وہ زندگی بھر پریشان ہی رہتے ہیں ، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے لئے بھی بد دعا کے جملے نکالتے ہیں جو بد دعا کے حقدار نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوٹ کر ان کے اوپر ہی آتی ہے، اور انہیں کے لئے مصیبت بن جاتی ہے۔

اسلاف اور بزرگوں کا طریقہ یہی رہا ہے

بہر حال! یہ بڑی خطرناک چیز ہے، اس لئے مزاج ہی ایسا بنایا جائے کہ آدمی کسی کے لئے بد دعا کرے ہی نہیں ۔ جیسے: ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ سنایا تھا کہ:

ایک بزرگ کشتی میں جارہے تھے، اسی کشتی میں کچھ لوگ شراب پی رہے تھے اور شراب پینے والوں کو جب نشہ چڑھتا ہے تو وہ لوگ کسی کو تماشا بنالیتے ہیں، سر پر ٹپلیاں مار مار کر اس سے دل لگی کرتے ہیں ، جس کو سر پیٹیا کہتے ہیں ۔ اب وہ بزرگ بیچارے کشتی میں

سوار تھے تو شرابیوں نے انہیں کو سرپیٹیا بنا کر ان کے ساتھ مذاق کا معاملہ شروع کر دیا۔ ان لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ ان کا مقام اللہ تعالیٰ کے یہاں کیا ہے۔ جب ان کے ساتھ یہ معاملہ شروع ہوا تو اللہ تعالیٰ کا غضب جوش میں آیا کہ ان لوگوں کو سزا دی جانی چاہیے، ان کو بھی اس کا احساس ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی کہ: اے اللہ! تو جس طرح ان لوگوں کو ہلاک کر سکتا ہے وہیں ان کو بری حرکتوں سے توبہ کی توفیق بھی تو عطا فرما سکتا ہے؛ اس لیے اے اللہ! میں تو تجھ سے یہی درخواست کرتا ہوں کہ تو ان سب کو توبہ کی توفیق عطا فرمادے۔ چناں چہ ان کی دعا کی برکت سے وہ سب لوگ اللہ والے بن گئے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنی زبان سے اگر کچھ کہنا ہی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے کچھ منظور ہی کروانا ہے تو کوئی بری بات کیوں منظور کروائے، اچھی بات منظور کروالو؛ تاکہ ان کا کام بن جائے اور اپنا بھی بن جائے۔ ہمارے اسلاف اور بزرگوں کا طریقہ یہی رہا ہے۔

سجدہ کی حالت میں کثرت سے دعا مانگا کرو

حدیث ۱۴۹۸:-

وَعَنْ أَبِيْ هرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ : أَقْرَبُ مَا يَكُوْنُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهٖ وَهُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَآءَ.(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے، اس لیے اس حالت میں کثرت سے دعا مانگا کرو۔

افادات:- اب سوال ہوتا ہے کہ نماز کے سجدہ میں دعا مانگی جاسکتی ہے؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ نمازیں دو طرح کی ہیں، ایک فرائض اور دوسری نوافل۔ فرائض میں تو جو تسبیحات بتلائی گئی ہیں انہیں کا اہتمام کیا جائے، خاص کر امام تو وہی پڑھے، کیونکہ امام کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ نماز میں اتنا طول نہ دے جس کی وجہ سے مصلّیوں کو دشواری پیدا ہو، البتہ نوافل کے سجدوں میں ماثور دعاؤں کی اجازت ہے۔ اگر کوئی ایسی دعا جو لوگوں کے کلام سے مشابہ ہو، یعنی قرآن وحدیث میں نہ آئی ہو، بلکہ ایسی چیز ہو جو لوگوں سے مانگی جاسکتی ہو، وہ مانگ لی تو اس صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی۔ معلوم ہوا کہ نوافل کے سجدوں میں ماثور دعائیں مانگی جاسکتی ہیں۔

ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے

حدیث ۱۴۹۹:-

وعنه: أَنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ: ((يُسْتَجَابُ لأَحَدِكُمْ مَا لَمْ يَعْجَلْ يقُولُ: قَدْ دَعْوتُ رَبِّي، فَلَمْ يُسْتَجبْ لِي)) (متفق عَلَيْهِ)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے ہر ایک کی دعا قبول ہوتی ہے جب تک کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لے (جلد بازی کا مطلب یہ ہے کہ) وہ کہتا ہے کہ میں نے تو بہت دعا کی لیکن میری دعا قبول نہیں ہوتی (اپنی طرف سے یہ طے کرلینا کہ اس دعا کا اثر دو چار دن میں ظاہر ہونا ہی چاہیے؛ یہی جلد بازی ہے)

وفی روایةٍ لمسلمٍ: ((لَا يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ، أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ، مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ. قيل: يَا رسولَ اللهِ! مَا الْإِسْتِعْجَالُ؟ قَالَ: ((يقول: قَدْ دَعَوْتُ، وَقَدْ دَعَوْتُ، فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيبُ لِي، فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَلِكَ، وَيَدَعُ الدُّعَاءَ.))

ایک اور روایت میں ہے: بندہ کی دعا برابر قبول ہوتی ہے جب تک کہ وہ کسی گناہ، یا قطعِ رحمی کی دعا نہیں کرتا (بس اتنی شرط ہے کہ) جلد بازی سے کام نہ لے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! جلد بازی کا کیا مطلب ہے؟ تو حضورِ اکرم ﷺ نے (وضاحت فرماتے ہوئے) ارشاد فرمایا: (جلد بازی کا مطلب یہ ہے کہ) آدمی یوں کہنے لگے کہ: میں نے تو دعا کی اور خوب کی، لیکن میں دیکھ نہیں رہا ہوں کہ میری دعا قبول ہو رہی ہو۔ گویا یہ کہہ کر وہ حسرت وافسوس کا اظہار کرے اور دعا کرنا چھوڑ دے۔

افادات:– اور ظاہر ہے کہ اگر آدمی دعا کرنا ہی چھوڑ دے گا تو نقصان خود اسی کا ہوگا، نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ اور اس کی عظمتِ شان میں کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔ اس لئے بندے کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے۔

اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہر دعا قبول کی جاتی ہے لیکن بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ اس دعا کا اثر دیر میں ظاہر ہوتا ہے، جیسا کہ قرآنِ پاک میں ہے: حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی تھی: ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلَىٰٓ أَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلَىٰ قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْأَلِيْمَ﴾ اس دعا پر حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین کہی تھی۔ تو دعا مانگنے والے بھی نبی تھے اور آمین کہنے والے بھی نبی تھے، اور باری تعالیٰ کی طرف سے بھی یہ کہہ دیا گیا: ﴿قَدْ أُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾ تمہاری دعا قبول کرلی گئی، لیکن اس کا اثر چالیس سال کے بعد ظاہر ہوا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دعا قبول بھی ہو جاتی ہے لیکن ہم یوں سمجھتے ہیں کہ آج ہی اس کا اثر ظاہر ہونا چاہیے، تب ہی وہ دعا قبول ہوئی، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں مصلحتیں ہیں، وہ ہماری مصلحتوں کو ہم سے بہتر جانتا ہے۔ جب بندہ کوئی چیز مانگتا ہے اور اس چیز کا دیا جانا اس کے حق میں خلافِ مصلحت ہوتا ہے، تو اگرچہ بندہ یوں سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مل جائے تو فائدہ ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اس کے لئے اس میں فائدہ نہیں ہے؛ تو اللہ تعالیٰ وہ چیز فوراً نہیں دیتے، اسی کو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستاں میں کہا ہے: ”پدر را عسل بسیار است، ولیکن پسر گرمی داراست“۔ باپ کے پاس شہد تو بہت

ہے، لیکن بیٹے کے مزاج میں گرمی ہے، اور شہد کی خاصیت بھی گرم ہے، اب بیٹا مانگتا ہے لیکن باپ کے پاس ہونے کے باوجود بھی نہیں دیتا، اس لیے کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر دے دوں گا تو اس کو نقصان ہو گا۔

اُو مصلحتِ تو از تو بہتر می داند

اسی طرح ہم جو کچھ بھی مانگتے ہیں اس کے بارے میں ہمارا ایمان و یقین ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں ہے، اور اللہ تعالیٰ بخیل بھی نہیں ہے، بلکہ سخیوں کا سخی ہے، اس نے ہمیں زندگی، اعضاء اور دنیا کی بہت ساری نعمتیں بغیر مانگے عطا فرمائی ہیں اور وہ ایسی ذات ہے جو مانگنے سے خوش ہوتا ہے اور نہ مانگنے سے ناراض ہوتا ہے۔ دنیا والوں کا حال تو یہ ہے کہ کیسا ہی محبت رکھنے والا ہو، باپ بھی جب بیٹے کی طرف سے فرمائشیں بہت بڑھ جاتی ہیں تو ناراضگی کا اظہار کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تو ایسی ذات ہے کہ مانگنے سے خوش ہوتی ہے۔ اب جس ذات کا حال ایسا ہو کہ اس کے خزانے بھرے ہوئے ہوں، اور وہ سخیوں کا سخی ہو، اور مانگنے سے خوش ہوتا ہو؛ پھر بھی ہمارے مانگنے کے باوجود فوراً نہ دے رہا ہو؛ تو اس

کا مطلب یہی ہے کہ ہماری مصلحت اسی میں ہے کہ وہ چیز ہمیں نہ ملے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی کہا ہے:-

آں کس کہ ترا تونگر نمی گرداند اُو مصلحتِ تو از تو بہتر می داند

وہ ذات جو تجھے مالدار نہیں بناتی، وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تیری بھلائی اسی میں ہے کہ یہ چیز تجھے نہ دی جائے اس لیے نہیں دے رہی ہے۔

دربند آں مباش...

بہر حال! بندے کا یہ کہنا کہ میں نے تو بہت دعائیں مانگیں لیکن قبول نہیں ہوئیں، نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے متعلق ایک طرح کی شکایت اور جلد بازی ہے، اور جلد بازی کرنے پر اللہ تعالیٰ کے یہاں دعا قبول نہیں کی جاتی۔ اس لیے دعا کی قبولیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی مانگتا رہے۔ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :-

حافظ! وظیفۂ تو دعا گفتن است و بس

دربندِ آں مباش کہ شنید یا نہ شنید

حافظ ! تمہارا کام تو دعا کرنا ہے، اب اس فکر میں نہ رہو کہ اس نے سنی یا نہیں سنی، بس ہم تو دعا کرتے رہیں گے۔ ہم تو بندے ہیں اور بندگی و عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہیں ، اگر نہیں بھی ملا تو مانگنے کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔اور چوں کہ دعا خود بھی عبادت ہے، اس لیے عبادت کا ثواب تو کہیں گیا ہی نہیں ۔

قبول ست گرچہ ہنر نیست

اور پھر یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو کر کہاں جائے گا؟ ایک بزرگ روزانہ عبادت کرتے تھے، اور روزانہ رات کے اخیری حصہ میں آواز آتی تھی کہ تم کچھ بھی کرو، ہمارے یہاں قبول نہیں ہے۔ ایک مرتبہ ان کا ایک مرید بھی وہاں موجود تھا، وہ آواز اس کے کان میں بھی پڑ گئی تو کہنے لگا: حضرت ! کیا آپ نے سنا نہیں ؟ انہوں نے کہا: کیا تو نے سنا؟ اس نے کہا: جی ہاں ! آپ کو یہ کہا جا رہا ہے کہ تم کچھ بھی کرو، ہمارے یہاں قبول نہیں ہے۔ ان بزرگ نے کہا: یہ آواز تو میں چالیس سال سے سن رہا ہوں۔ اس نے کہا: اس کے باوجود بھی آپ اسی میں لگے ہوئے ہیں ۔ انہوں نے کہا: اور کوئی جگہ اور دروازہ ہو تو بتاؤ، جہاں میں جاؤں ؟ بس انھوں نے جیسے ہی یہ جواب دیا تو آواز آئی:

قبول ست گرچہ ہنر نیستت
کہ جز ما پناہے دگر نیستت

ہم کو آپ کی عبادت قبول ہے اگرچہ اس میں کوئی ہنر نہیں ہے، کیوں کہ تمہارے لئے اور کوئی دروازہ بھی تو نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کے دربار میں تو بندگی اور عبدیت کا اظہار ہونا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ کا معاملہ ہے، وہ بڑی بے نیاز ذات ہے۔ خدا نہ کرے کوئی ایسی چیز زبان سے نکل گئی تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں ، اس لیے اس معاملہ میں آدمی کو بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

دو اَوقات کی دعا زیادہ سنی جاتی ہے

حدیث ۱۵۰۰:-

وعن أَبِي أُمامة رضی اللہ عنہ قَالَ : قيل لِرسولِ اللهِ ﷺ: أَيُّ الدُّعاءِ أَسْمَعُ ؟ قَالَ : ((جَوْفَ اللَّيْلِ الآخِرِ ، وَدُبُرَ الصَّلَوات المَكْتُوبَاتِ)) (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اللہ تعالیٰ کے یہاں کون سی دعا زیادہ سنی جاتی ہے؟ (یعنی جلدی قبول ہوتی ہے؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات کے آخری حصہ اور فرض نمازوں کے بعد کی۔

ہاتھ تو اخیر میں پھیرا جاتا ہے

افادات:- یہ دو اوقات ایسے ہیں جن میں آدمی دعا کا اہتمام کرے اس لیے کہ ان اوقات میں مانگی گئی دعائیں جلدی قبول ہوتی ہیں۔ ان میں ایک فرض نمازوں کے بعد بھی دعا قبول ہوتی ہے مگر ہم لوگوں کو اس وقت ایسی جلدی ہوتی ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد دعا کی نہ کی اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر اُٹھ جاتے ہیں، حالاں کہ دعا میں چہرہ پر ہاتھ پھیرنا تو اخیر میں ہے۔

دیکھو! دعا کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں کو سینے کے سامنے تک اٹھائے، ہاتھوں کا رُخ آسمان کی طرف ہو، اور دونوں ہاتھوں کے درمیان میں ذرا سا فصل ہو، اس ہیئت کے ساتھ دعا مانگے، پھر جب دعا ختم کرے تو دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیر لے۔ اصل تو ہاتھوں کا پھیرنا دعا کا تکملہ اور تتمہ ہے۔ لیکن یہاں دعا تو کی نہیں اور ویسے ہی ہاتھ چہرہ پر صرف پھیر لیے؛ اس کا کیا مطلب ہوا؟

تین میں سے ایک چیز ضرور ہوتی ہے

حدیث ۱۵۰۱ :-

وعن عُبَادَةَ بنِ الصامت - رضی الله عنه - : أنَّ رسولَ اللهِ -ﷺ- قَالَ : ((مَا عَلَى الأرْضِ مُسْلِمٌ يَدْعُو الله تَعَالَى بِدَعْوَةٍ إلاَّ آتَاهُ اللهُ إيَّاها ، أَوْ صَرفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا ، مَا لَمْ يَدْعُ بإثْمٍ ، أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ))، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ القَوْمِ : إِذاً نُكْثِرُ قَالَ : ((اللهُ أَكْثَرُ)). رواه الترمذی، وقال: ((حديث حسن صحيح)).

ورواه الحاكم من روايةِ أبي سعيدٍ وزاد فِيهِ : ((أَوْ يَدخِرَ لَهُ مِنَ الأَجْرِ مثْلَهَا))

ترجمہ:- حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا کوئی مسلمان بندہ ایسا نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے مگر یہ کہ اس نے اللہ تعالیٰ سے جو چیز مانگی ہے وہی اس کو عطا فرما دیتے ہیں، یا وہ چیز تو نہیں دیتے لیکن اس دعا کے بدلہ میں کوئی تکلیف و مصیبت اور برائی کو دور کر دیتے ہیں ؛ جب تک وہ کسی گناہ، یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا: (اے اللہ کے رسول!) جب ایسا ہے تو پھر ہم خوب دعائیں کریں گے (دعا کرنے میں کمی نہیں کریں گے) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ بھی خوب دینے والا ہے (جتنا چاہو مانگو، اس کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں ہے) حاکم کی روایت میں اتنی زیادتی ہے کہ اس دعا کو جمع رکھتے ہیں جس کا اجر قیامت میں ملے گا۔

افادات:–اس لیے ان تین میں سے ایک چیز ضرور ہوتی ہے۔پہلی تو یہ کہ اس نے جو چیز مانگی ، وہی چیز اس کو دیدیتے ہیں ، دوسری یہ کہ اس کے بدلہ میں کسی مصیبت وپریشانی سے بچالیتے ہیں ۔مثال کے طور پر آپ نے اللہ تعالیٰ سے ایک ہزار روپے مانگے ،اب یا تو ایک ہزار روپے مل گئے۔دوسری شکل یہ ہے کہ آپ کے بیٹے کو کوئی بیماری آنے والی تھی اور اس میں ہزار دوہزار خرچ ہونے والے تھے، لیکن اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے آنے والی اس بیماری کو دفع کردیااور وہ اس بیماری سے محفوظ رہا۔اور تیسری شکل یہ بھی ہوتی ہے کہ نہ تو وہ چیز دی گئی ،اور نہ تو اس کے بدلہ میں کوئی مصیبت دور کی گئی ، بلکہ وہ دعااللہ تعالیٰ کے یہاں ذخیرہ ہوگئی۔اب وہ اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں جمع رہتی ہے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا اتنا اجر عطافرمائیں گے کہ حدیثِ پاک میں آتاہے کہ جس جس دعا کا اثر دنیامیں نظر نہیں آیاتھا،بندہ جب اس کا اجر وثواب وہاں دیکھے گاتو یہ تمنا کرے گا کہ کاش!دنیامیں میری ایک بھی دعاقبول نہ ہوئی ہوتی،تو آج ان سب کابدلہ یہاں ملتا۔

دعائے کرب: نہایت مجرب

حدیث ۱۵۰۲:-

وعن ابنِ عباس رضی اللہ عنهما : أنَّ رسولَ اللہ -ﷺ- كَانَ يقولُ عِنْدَ الكَرْبِ : ((لا إلهَ إلاَّ اللهُ العَظِيمُ الحَليمُ، لا إلهَ إلاَّ اللهُ رَبُّ العَرْشِ العَظيمِ، لاَ إلهَ إلاَّ اللهُ رَبُّ السَّمَاواتِ، وَرَبُّ الأَرْضِ، وَرَبُّ العَرْشِ الكَرِيمِ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ مصیبت کے وقت یہ کہا کرتے تھے: اس اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو عظمتوں والا اور حلم والا ہے، اس اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو عرش کا مالک اور عظمتوں والا ہے۔ اس اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو آسمانوں اور زمین کا رب اور عرش کا مالک اور کرم والا مہربان ہے۔

تعریف مانگنے کے لیے ہی کی جاتی ہے

افادات:- کسی آدمی پر کوئی ناقابلِ برداشت مصیبت آجائے اس کے لیے یہ دعا بہت مجرب ہے۔ اس دعا میں دیکھا جائے تو کچھ مانگا نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کو اس کی صفات سے جب مخاطب کیا گیا تو اسی پر اللہ تعالیٰ اس کی تکلیف ضرور دور کریں گے، جیسے: کسی سخی کو کہا

جاتا ہے کہ آپ تو بڑے سخی ہیں ، آپ تو ایسے ایسے صفات والے ہیں ، وہاں کچھ مانگا نہیں جاتا کہ اتنا دو، بلکہ صرف تعریف کی جاتی ہے، اس لیے کہ معلوم ہے کہ جب اس کی تعریف کی جائے گی تو وہ دے گا ہی۔ تو جیسے کسی سخی کی تعریف کرنا خود ایک طرح کا سوال ہے، ٹھیک اسی طرح اس دعا میں بھی سوال کے طور پر کوئی چیز مانگی نہیں جا رہی ہے، اس کے باوجود کسی مصیبت کے وقت آدمی اللہ تعالیٰ کو جب ان کلمات سے پکارتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت کو دور کر دیتے ہیں ۔ جیسے: کوئی بھوکا کسی سخی کو یوں کہے کہ: آپ کی سخاوت تو بہت مشہور ہے اور آپ کے دروازہ سے کوئی بھی آدمی خالی نہیں لوٹتا، اور وہ جانتا ہے کہ یہ بھوکا ہے تو وہ فوراً اس کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اسی طرح کوئی بندہ کسی تکلیف و مصیبت میں گرفتار ہونے کے وقت اللہ تعالیٰ کو ان پاکیزہ ناموں سے پکارے گا تو اللہ تعالیٰ فوراً اس کی تکلیف کو دور کرے گا۔

دریں مژدہ گر جاں فشانم رواست

ایک حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جب بندہ ”اَللّٰھُمَّ“ کہتا ہے تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ”لَبَّیْكَ یَا عَبْدِیْ“ میرے بندے! میں حاضر ہوں ۔ اللہ تعالیٰ کی بھی کیا عجیب شان ہے! کتنی

عظمتوں اور کبریائی والی ذات ہے اس کے باوجود بندہ جب اس کو ''اے اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے، تو باری تعالیٰ فرماتے ہیں: اے میرے بندے! مَیں حاضر ہوں؛ اس جملہ پر تو آدمی کو مارے خوشی کے قربان ہو جانا چاہیے۔

نوٹ:- ''الادب المفرد'' میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مستقل عنوان قائم فرمایا ہے: ''بَابُ الدُّعَآءِ عِنْدَ الْكَرْبِ'' اس موقعہ پر حضرت اقدس دامت برکاتہم نے مزید تفصیل کے ساتھ بڑا موئثر درس دیا تھا؛ اس کو بھی پیش کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بَابُ الدُّعَآءِ عِنۡدَ الۡکَرۡبِ

مصیبت و پریشانی اور ناگہانی آفت کے وقت کی دعا

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم نے امت کو ہر ہر موقعہ پر کوئی نہ کوئی دعا سکھائی ہے، کوئی آدمی اچانک کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے، کوئی پریشانی لاحق ہو، کوئی پریشان کن اور غم و حزن میں ڈالنے والا معاملہ اور بے چین کرنے والا واقعہ اچانک پیش آجائے، اس وقت آدمی کیا کرے؟ تو اس موقعہ کی دعا بھی نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم نے بتلائی ہے۔ اس موقعہ کی مختلف دعائیں ہیں، اس باب میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دو دعائیں ذکر کی ہیں۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال کَانَ النَّبِیُّ ﷺ یَدۡعُوۡا عِنۡدَ الۡکَرۡبِ: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ الۡعَظِیۡمُ الۡحَلِیۡمُ، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَرَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِیۡمُ.

ترجمہ:۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّم کسی مصیبت اور پریشانی کے وقت، یا اچانک آنے والی تکلیف و بے چینی کے موقعہ پر یہ دعا فرمایا کرتے تھے: نہیں کوئی معبود اس اللہ کے سوا جو بڑی عظمت والا اور حلم و تحمل والا ہے۔ نہیں کوئی معبود سوائے اس اللہ کے جو آسمانوں اور زمین کا اور عرشِ عظیم کا رب ہے۔

افادات:–"رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ" میں "اَلْعَظِيْمِ" کو رب کی صفت بھی قرار دیا گیا ہے جس کا ترجمہ ہو گا: عرش کا عظمت والا رب۔ اور عرش کی صفت بھی قرار دیا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہو گا عظمت والے عرش کا رب۔ دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔

اس باب میں انہوں نے کل تین روایتیں پیش کی ہیں ،اس میں جو تیسری روایت ہے اس میں بھی تقریباً اسی دعا کو نقل کیا ہے جس میں تقریباً اسی جیسے ملتے جلتے الفاظ ہیں :

عن عبداللہ بن الحارث قال سمعتُ ابن عباس رضی اللہ عنہما یقول: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَقُوْلُ عِنْدَ الْكَرْبِ : لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ، اَللّٰهُمَّ اصْرِفْ شَرَّهٗ.

ترجمہ:–عبد اللہ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ نبیؑ کریم ﷺ کسی بھی مصیبت اور تکلیف کے وقت یہ دعا فرمایا کرتے تھے: اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو عظمت والا اور حلم والا ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں جو عرش عظیم کا رب ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور عرش کریم کا رب ہے۔ اے اللہ! یہ مصیبت جو پیش آئی ہے اس کے شر اور ضرر کو مجھ سے دور کر دے۔

ایک اشکال اور اس کے جوابات

افادات:- یہ دونوں روایتیں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ہی منقول ہیں۔ ان میں جو کلمات بطورِ دعا کے سکھائے گئے ہیں، اس سلسلہ میں حضراتِ علماء نے تفصیل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں ایک اشکال ہوتا ہے کہ ان کلمات میں دعا کے طور پر تو کوئی بھی چیز نہیں ہے؟ ان میں تو صرف تہلیل، تسبیح اور تحمید ہے؛ پھر یہ دعا کیسے ہوئی؟

اس کا جواب دیتے ہوئے حضراتِ علماء فرماتے ہیں کہ ان روایات میں شروعات کے کلمات بتلائے گئے ہیں کہ آدمی دعا سے پہلے یہ کلمات کہے، اس کے بعد جو دعا کرنی ہو کرے؛ تو دعا قبول ہوگی۔ چناں چہ دوسری روایت جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی پڑھی گئی، اس میں ان کلمات کے بعد آخر میں یہ جملہ بھی ہے: "أَللّٰهُمَّ اصْرِفْ شَرَّهٗ" اے اللہ! یہ جو مصیبت پیش آئی ہے اس کے شر اور ضرر کو تو مجھ سے دور کر دے۔ تو یہاں دعا کے کلمات بھی ہیں، اس کے شروع میں وہی تہلیل وغیرہ ہے۔

تعریف کا مطلب سوال ہی ہے

دوسرا جواب بھی دیا گیا ہے اور اسی کو زیادہ پسند بھی کیا گیا ہے کہ کبھی کسی چیز کی دعا کی جاتی ہے تو صاف لفظوں کے ذریعہ اس چیز کا نام لے کر مطالبہ کیا جاتا ہے، اور دعا کبھی بطورِ تعریض بھی ہوتی ہے۔ یعنی صاف صاف سوال نہیں کیا جاتا لیکن انداز بتلاتا ہے کہ سوال کیا جارہا ہے۔ جیسے: کوئی آدمی کسی سخی کی تعریف کرے، اور اس کے پاس جاکر کہے کہ آپ ایسے ہیں، آپ لوگوں کی حاجتیں پوری کرتے ہیں، لوگوں کے کام آتے ہیں، لوگوں کی پریشانیاں دور کرتے ہیں؛ تو اس کا مطلب سوال ہی ہوتا ہے، اگرچہ وہ اپنی زبان سے نہیں کہتا کہ آپ میری ضرورت پوری کیجئے، لیکن جو تعریف کررہا ہے، یہی گویا اس کی طرف سے ایک درخواست اور سوال ہے۔ ایسے ہی یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ کی تہلیل اور تسبیح بیان کی جارہی ہے اور صاف وصریح الفاظ میں سوال نہیں کیا جارہا ہے لیکن تعریضاً یہ سوال ہی ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے اس سلسلہ میں پوچھا گیا، تو انہوں نے جواب کا تیسرا انداز اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: حدیثِ پاک میں آتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کوئی بندہ اگر میری یاد میں مشغول ہوتا ہے اور میرے ذکر اور میری یاد میں مشغولی کی وجہ

سے اس کو مجھ سے دعا مانگنے اور سوال کرنے کا موقع نہیں ملتا؛ تو مَیں اس کو دعا کرنے والوں سے بھی زیادہ دیتا ہوں ۔ اور یہاں پر وہی شکل ہے۔

ان کلمات کے علاوہ اور بھی کلمات ہیں جو اچانک آنے والی مصیبت، پریشانی اور بے چینی کے موقعہ پر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بطور دعا کے سکھائے ہیں ، مصیبتیں دور کرنے کے لئے اور تکلیف و پریشانی سے نجات پانے کے لئے ان کلمات کو بڑا موثر قرار دیا گیا ہے، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الجامع الصحیح'' میں بھی انہیں کلمات کو اسی سند سے نقل کیا ہے۔ دعائے کرب کے یہ کلمات حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہیں ۔

دعائے کرب کیوں نہیں پڑھتے؟

اس حدیث کے ذیل میں شرّاحِ حدیث نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ:-

امام ابو بکر رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مَیں مقام اصفہان میں ابو نُعیم اصفہانی کی خدمت میں حدیث حاصل کرنے کے لئے قیام پذیر تھا، وہاں ایک عالم اور اللہ والے ابو بکر بن علی نامی تھے، کسی نے حاکمِ وقت سے ان کے متعلق غلط شکایت کی اور حاکم نے ان کو جیل میں بند کر دیا۔ امام ابو بکر رازی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مَیں نے خواب میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم

کو دیکھا، آپ کی دائیں طرف حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے جو مسلسل کوئی تسبیح پڑھ تھے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مجھ کو مخاطب کر کے فرمایا: اے ابو بکر! تم ابو بکر بن علی سے کہو کہ: بخاری شریف میں جو دعائے کرب ہے؛ وہ کیوں نہیں پڑھتے؟ اس کو پڑھو، اللہ تعالیٰ مصیبت دور کر دیں گے۔ چناں چہ مَیں نے بیدار ہونے کے بعد ان کے پاس جاکر حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ پیغام پہنچایا۔ انہوں نے اس کو پڑھا اور چند ہی دن میں ان کو جیل سے رہائی مل گئی۔

ان کا کوئی قصور نہیں

ایک اور واقعہ حضرت حسن -جو حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں ان کے متعلق لکھا ہے کہ: ولید بن عبد الملک جو بنو امیہ کے بادشاہوں اور خلفاء میں سے گزرا ہے، اس نے اپنے ماتحت حاکم عثمان بن حِبَّان کو لکھا کہ حسن بن حسن کو بلا کر لوگوں کے سامنے کھڑا کرو، اور ان کو سو کوڑے مارو۔ چناں چہ اس نے ان کو گرفتار کروایا اور کوڑے مارنے کے لئے کھڑا کیا۔ اسی وقت حضرت علی بن حسین امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ جو حسن بن حسن کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں انہوں نے کھڑے ہو کر اسی مجمع میں کہا: اے میرے

چچازاد بھائی! آپ وہ دعائے کرب کیوں نہیں پڑھتے؟ چناں چہ انہوں نے وہ پڑھی، اسی وقت حاکم نے اپنا سر جھکا لیا، پھر کچھ دیر بعد اپنا سر اُٹھا کر کہا: اس وقت اس آدمی کا چہرا مَیں نے دیکھا جس نے امیر المؤمنین کی خدمت میں ان کے متعلق غلط شکایت کی تھی، ان کو یہاں سے لے جاؤ، مَیں امیر المؤمنین کو خط لکھ دوں گا کہ ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

بیٹی! کبھی کوئی تکلیف پیش آئے تو ”دعائے کرب“ پڑھیو

حضرت حسن بن حسن ہی کے حوالہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے جب اپنی صاحبزادی کا نکاح کرایا تو اس کو رخصت کرتے ہوئے کہا: بیٹی! کبھی کوئی تکلیف پیش آئے؛ تو ”دعائے کرب“ پڑھیو۔

نفرت محبت سے بدل گئی

حضرت حسن بن حسن بن علی ہی فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حجاج بن یوسف نے مجھے بلوایا، جب مَیں اس کے سامنے پہنچا تو مَیں نے یہی کلمات پڑھے۔ حجاج کہنے لگا: مَیں نے تو

تم کو قتل کے ارادے سے بلوایا تھا، لیکن اب میرے دل میں تمہارے متعلق ایسی محبت جوش مار رہی ہے کہ کسی اور چیز کی محبت اتنی نہیں پاتا۔

یہ کلمات بہت موئثر ہیں، ان کا اہتمام کیا جائے۔ یہ کلمات مختلف طریقوں سے منقول ہیں، صلوٰۃ الحاجت کی دعا کے شروع میں بھی پڑھے جاتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سکھائی ہوئی ایک اور دعا

ان کے علاوہ اور کلمات بھی مصیبت و پریشانی کے موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطورِ دعا منقول ہیں۔ چناں چہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں، پہلے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، ان کے انتقال کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی بیماری میں ان کی ساری خدمت اور ان کے انتقال کے بعد ان کے غسل وغیرہ کا پورا کام انہوں نے ہی کیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں۔ بڑی جلیل القدر صحابیہ ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ مجھ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ کلمات جو تم کسی مصیبت کے وقت

پڑھو؛ مَیں تم کو نہ سکھاؤں؟ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یوں کہا کرو: أللهُ أللهُ رَبِّيْ لَا أُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً، اس کے بعد دعا کیا کرو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ نے اپنے گھر والوں کو جمع کیا، اور بعض روایتوں میں ہے کہ بنو ہاشم کو جمع کیا، اور دروازہ کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر اوپر کا سرا پکڑ کر فرمایا: مَیں تم کو ایک دعا سکھاتا ہوں، کسی بھی مصیبت کے وقت اس کو پڑھا کرو؛ ان شاء اللہ دور ہو جائے گی۔ پھر یہی دعا بتلائی: أللهُ أللهُ رَبِّيْ لَا أُشْرِكُ بِهٖ شَيْئاً۔

مَیں پسند کرتا ہوں

اس سلسلہ میں ایک اور دعا بھی ہے جو دوسری روایت میں آرہی ہے، وہ بھی نبیٔ کریم ﷺ سے منقول ہے:

حدثنا عبدالله بن محمد قال: حدثنا عبدالملك بن عمرو قال: حدثنا عبدالجليل عن جعفر بن ميمون قال: حدثني عبدالرحمن بن أبي بكرة أنَّهُ قَالَ لِأَبِيْهِ: يَاأَبَتِ! إِنِّيْ أَسْمَعُكَ تَدْعُوْا كُلَّ غَدَاةٍ: أَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ بَدَنِيْ، أَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ سَمْعِيْ، أَللّٰهُمَّ عَافِنِيْ فِيْ بَصَرِيْ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ. تُعِيْدُهَا ثَلَاثاً حِيْنَ تُمْسِيْ وَحِيْنَ تُصْبِحُ ثَلَاثاً. وَتَقُوْلُ: أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنَ الْكُفْرِ وَالْفَقْرِ،

أَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ. تُعِيْدُهَا ثَلَاثاً حِيْنَ تُمْسِيْ وَحِيْنَ تُصْبِحُ ثَلَاثاً. فَقَالَ: نَعَمْ، يَابُنَيَّ! سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ بِهِنَّ، وَأَنَا أُحِبُّ أَنْ أَسْتَنَّ بِسُنَّتِهٖ.

قَالَ وَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: دَعَوَاتُ الْمَكْرُوْبِ: أَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ أَرْجُوْ، وَلَا تَكِلْنِيْ إِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ، وَأَصْلِحْ لِيْ شَأْنِيْ كُلَّهٗ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ.

ترجمہ:- حضرت عبد الرحمن بن ابو بکرہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اپنے والد حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ سے کہا: ابا جان! مَیں سنتا ہوں کہ آپ روزانہ صبح کے وقت ان کلمات کے ذریعہ سے دعا کیا کرتے ہیں؟ اے اللہ! مجھے میرے جسم میں عافیت عطا فرما۔ اے اللہ! مجھے میرے کان میں یعنی سننے کی صلاحیت میں عافیت عطا فرما۔ اے اللہ! مجھے میری آنکھوں میں یعنی دیکھنے کی صلاحیت میں عافیت عطا فرما۔ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ۔ آپ اس دعا کو صبح کے وقت بھی تین مرتبہ پڑھتے ہیں اور شام کے وقت بھی تین مرتبہ پڑھتے ہیں ۔

اور آپ یہ دعا بھی کرتے ہیں : اے اللہ! مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں کفر اور فقر سے۔ اے اللہ! مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں عذاب قبر سے۔ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ۔ آپ صبح کے وقت بھی اور شام کے وقت بھی ان کلمات کو تین تین مرتبہ پڑھتے ہیں ۔ جواب میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جی ہاں؛ اے میرے بیٹے! مَیں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو یہ کلمات اسی طرح پڑھتے ہوئے سنے، اور مَیں پسند کرتا ہوں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے طریقے پر چلوں ۔

(اسی طرح کی ایک اور روایت ان کے ایک دوسرے صاحبزادے سے بھی منقول ہے،وہ فرماتے ہیں کہ مَیں نے اپنے والد کو نماز کے بعد یہ کلمات صبح اور شام پڑھتے ہوئے سنا تومَیں نے یاد کرلئے، اور مَیں بھی پڑھنے لگا۔جب میرے ابانے سنا تو پوچھا: تم یہ کلمات کہاں سے سیکھ کر پڑھتے ہو؟ انہوں نے کہا: مَیں نے آپ کو پڑھتے ہوئے سنا تو مَیں نے بھی یاد کرکے پڑھنا شروع کردئے۔اس پر ابانے کہا: ہاں !مَیں نے نبی ٔکریم ﷺ کو اسی طرح پڑھتے ہوئے سنا؛لہٰذا تم بھی اس کو پڑھا کرو)۔

پھر فرمایا: نبی ٔکریم ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: پریشان حال کی دعاؤں میں یہ بھی ہے: اے اللہ! مَیں تیری ہی رحمت کا امیدوار ہوں ، مجھے ایک لمحے کے لئے بھی میرے نفس کے حوالے نہ کیجیو، اور میرے سارے معاملات کو ٹھیک کردے، تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ۔

افادات:-کسی بھی پریشانی،مصیبت اور بے چینی کے وقت پڑھنے کے لئے نبی ٔکریم ﷺ نے یہ دعا بھی بتلائی ہے اور بزرگوں نے اس کو بھی بڑا موئثر لکھا ہے۔

چند اور دعائیں

اس کے علاوہ ایک اور دعا بھی ہے جس کی نبی کریم ﷺ نے تاکید فرمائی ہے: یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ أَسْتَغِیْثُ، آدمی مصیبت اور پریشانی کے وقت یہ دعا بھی پڑھے تو ان شاء اللہ اس کی پریشانی دور ہو جائے گی۔

اور ایک دعا یہ بھی ہے:- لَآ اِلٰهَ اِلَّآ أَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ. نسائی شریف اور ترمذی شریف میں حضرت سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دعا جو مچھلی والے نے مچھلی کے پیٹ میں پڑھی تھی (یعنی حضرت یونس علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے مچھلی کے پیٹ میں پڑھی تھی) اس دعا کے ذریعہ جب بھی کوئی مسلمان دعا کرے گا تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کی دعا کو قبول کرے گا۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ دعا حضرت یونس کے ساتھ خاص تھی یا تمام کے لئے عام ہے؟ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمام کے لئے عام ہے، کیا تم قرآنِ کریم میں یہ آیت نہیں پڑھتے؟ ﴿وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَكَذٰلِكَ نُنْجِی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾ حضرت یونس کو ہم نے غم و حزن اور پریشانی سے نجات دی اور ہم اسی طرح ایمان والوں کو بھی نجات دیتے ہیں۔ گویا اس دعا

میں ان کی تخصیص نہیں ہے، بلکہ جو مسلمان بھی کسی بھی مصیبت کے وقت یہ دعا پڑھے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو مصیبت سے ضرور نجات دے گا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے

بَابُ كَرَامَاتِ الْأَوْلِيَاءِ وَفَضْلِهِمْ

اللہ کے نیک بندوں کی کرامتیں اور ان کی فضیلتیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ اللہ تَعَالیٰ: أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ، أَلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ.

وَقَالَ تَعَالیٰ: وَهُزِّي إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً جَنِيّاً. فَكُلِي وَاشْرَبِي.

وَقَالَ تَعَالیٰ: كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقاً قَالَ يَامَرْيَمُ أَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ.

وَقَالَ تَعَالیٰ: وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللّٰهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ مِّرْفَقاً وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ.

کرامت کی وضاحت

اہل سنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں ۔ اللہ کے نیک بندوں کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے اعزاز واکرام کے طور پر کبھی ایسی چیز وجود میں لائی جاتی ہے جو عادت کے خلاف ہوتی ہے، اسی کو کرامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوام ذکر وطاعت؟

قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. أَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ. لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمَاتِ اللهِ، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ﴾ سنو! اللہ کے جو نیک بندے ہیں ان پر نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے (ولی اللہ کون ہیں ؟ تو قرآن پاک ہی بتلاتا ہے کہ) جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے بچتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے دنیوی زندگی اور آخرت میں خوشخبری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے کلمات اور فیصلوں میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

”ولی“ عربی زبان میں ”وَلِيَ يَلِيْ“ سے مشتق ہے، اس کا مطلب ہے: کسی کا قریبی اور دوست۔ ”ولی اللہ“ یعنی اللہ تعالیٰ کا قریبی اور اللہ کا دوست۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اطاعت

میں اس طرح لگے رہتے ہیں کہ ان سے کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں ہوتی، اور جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہتے ہوں ؛وہی ’’اللہ کے ولی‘‘ کہلاتے ہیں ؛اسی کیفیت کو صوفیا کے یہاں ’’دوامِ ذکر‘‘ اور ’’دوامِ طاعت‘‘ سے تعبیر کرتے ہیں ۔

دنیا میں جتنی بھی چیزیں موجود ہیں ان سب کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ ایک طرح کی نسبت اور تعلق قائم ہے، یہ بھی نسبت کا ایک درجہ ہے جو ہر ایک چیز کو حاصل ہے، لیکن یہاں نزدیکی اور نسبت کا ایک مخصوص درجہ مراد ہے جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرنے، اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچانے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حاصل ہوتا ہے۔ انہیں کے لیے فرمایا گیا کہ اللہ کے ایسے بندے جو ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری میں لگائے رکھتے ہیں ، اور اللہ کی نافرمانیوں سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں ؛ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب اگر یہ جنّت میں پہنچنے کے بعد کی حالت کا تذکرہ ہے تب تو بات بالکل واضح ہے کہ وہاں پر نہ کوئی خوف ہوگا، اور نہ غم ہوگا۔ اور اگر دنیا کی حالت کا تذکرہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ دنیا والے دنیا کے وقتی اور معمولی نقصان کے نتیجے میں ، یا نقصان کے پیش آنے کے

خطرات سے خوف اور غم محسوس کرتے ہیں ، اللہ کے مخصوص بندوں کو دنیا کی ان چیزوں کے نقصانات کی وجہ سے ایسا کوئی غم لاحق نہیں ہوتا، اور نہ وہ اس قسم کا خوف کرتے ہیں ۔

سب سے بڑی کرامت

﴿وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾ سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ولایت کے لئے ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ارتکاب کرتے ہوئے کوئی آدمی اللہ کا ولی نہیں بن سکتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ سب سے بڑی کرامت استقامت یعنی شریعت کی پابندی ہے، اور یہی اصل مطلوب ہے۔ اگر کوئی آدمی اپنی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا رہا، اور اللہ کی نافرمانیوں اور گناہوں سے بچا رہا، تو پھر چاہے زندگی بھر اس کے ہاتھ پر کسی کرامت کا ظہور نہ ہو؛ تب بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ اصل چیز تو دین پر جمنا اور سنت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ اگر کوئی آدمی ہوا میں اڑتا ہو اور پانی پر چلتا ہو، لیکن اس کی زندگی حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے لائے ہوئے دین اور سنت کے مطابق نہیں ہے، تو اس کا ہوا میں اڑنا اور پانی پر چلنا کارآمد نہیں ۔ اسی لئے کہا گیا ہے: "أَلْإِسْتِقَامَةُ فَوْقَ الْكَرَامَةِ" دین پر مضبوطی کے ساتھ جمنا اور سنت کے مطابق عمل کرنا؛ ہر کرامت سے بڑھ کر ہے۔

اب اگر کسی نبی، پیغمبر اور رسول کے ہاتھوں خلافِ عادت کسی چیز کا ظہور ہو تو وہ ”معجزہ“ کہلاتا ہے، اور کسی غیر نبی، اللہ کے نیک بندہ کے ہاتھوں اگر خلافِ عادت کسی چیز کا ظہور ہو تو وہ ”کرامت“ کہلاتی ہے۔ یہاں بھی قرآنِ پاک کی جو آیتیں پیش کر رہے ہیں وہ اللہ کے ایسے بندوں کے متعلق ہیں جو نبی نہیں تھے۔

کھاؤ پیو

﴿وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا. فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ﴾ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ حضرت مریم علیہا السلام کا واقعہ قرآنِ پاک میں موجود ہے، جب وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے حاملہ ہوئیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوگئی تو اس وقت باری تعالیٰ کی طرف سے ان کو کہا گیا تھا: اے مریم! کھجور کا درخت تمہارے لیے یہاں پیدا کر دیا ہے، اس کے تنے کو ہلاؤ، تو وہ آپ پر تازہ کھجوریں گرائے گا۔

جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی وہاں حضرت مریم علیہا السلام نقاہت کی وجہ سے پڑی ہوئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کے واسطے بطورِ کرامت کھانے پینے کا انتظام کر دیا کہ کھجور کا ایک درخت وہاں اُگا دیا اور اس پر تازہ کھجوریں بھی فوراً لگ گئیں اور ان کو

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی گئی کہ اس کو اگر ہلاؤ گی تو تمہارے اوپر تازہ کھجوریں گریں گی، ان کھجوروں کو کھاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے قریب جو چشمہ پیدا کر دیا ہے اس میں سے پیو۔

حضرت مریم علیہا السلام پیغمبر تو ہیں نہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں یہ چیز ظاہر کرائی جو ایک کرامت تھی اور اس کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ہے، اس لیے یہاں لائے

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

ایک اور آیت پیش کی ہے: ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ حضرت مریم علیہا السلام کے والد حضرت عمران بیت المقدّس کے خادموں میں سے تھے، اور ان کی والدہ نے منّت مانی تھی کہ مجھے جو بچّہ پیدا ہو گا اس کو میں اپنے یا گھر کے کام کاج میں نہیں لگاؤں گی، بلکہ بیت المقدّس کی خدمت کے لئے فارغ کر دوں گی۔ اس زمانہ میں اس طرح کی منّت مانی جاتی تھی کہ اپنی اولاد میں سے کسی کو اللہ کے گھر کی خدمت کے لئے فارغ کر دیا جائے، کسی دوسرے کاموں میں لگایا ہی نہ جائے۔ تو حضرت مریم اپنی والدہ کے پیٹ میں تھیں اسی زمانہ میں ان کے والد حضرت عمران کا انتقال ہو گیا، اور عام طور پر بیت المقدّس کی خدمت

کے لئے لڑکے کی منّت مانی جاتی تھی، لیکن جب بچّی پیدا ہوئی تو ان کی والدہ کو فکر لاحق ہوئی کہ میں نے تو اپنے پیٹ میں جو حمل تھا اس کے متعلق یہ منّت تھی کہ اس کو بیت المقدّس کی خدمت کے لئے فارغ کر دوں گی، اب یہ تو بچّی ہوئی، اور بیت المقدس کی ان ذمہ داریوں کو مرد اور لڑکا سنبھال سکتا ہے، یہ لڑکی کیسے سنبھال سکے گی؛ اب کیا کریں ؟ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ: آپ کی اس منّت کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول کر لیا گیا ہے، اب آپ اسی لڑکی کو اس خدمت کے لئے فارغ کر دو۔ چناں چہ ان کو فارغ کر دیا گیا۔ اب سوال آیا کہ اس بچّی کو کون سنبھالے گا؟ چوں کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی اہلیہ حضرت مریم علیہاالسلام کی خالہ تھیں ، تو خالو ہونے کے ناطے حضرت زکریا علیہ السلام نے مطالبہ کیا کہ میں اس بچّی کی پرورش کروں گا اور اس کو اپنے پاس رکھوں گا، اس لیے کہ اس کی خالہ بھی میرے نکاح میں ہے، لیکن بیت المقدّس کے دوسرے خدام نے کہا کہ: نہیں ! آپ ہم سے بڑھ کر اس کے حقدار نہیں ہیں ، لہٰذا صرف آپ کے کہنے سے یہ بچی آپ کے حوالے نہیں کی جائے گی۔

دراصل حضرت مریم علیہاالسلام کے والد بھی بیت المقدّس کے خدّام میں سے تھے، اس لیے سب خدام کو ان کے ساتھ عقیدت و محبت تھی لہٰذا ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ اس بچی کی پرورش وہ کرے۔ ویسے رشتہ داری کے لحاظ سے حضرت زکریا علیہ السلام ہی اس کے زیادہ

حقدار تھے، لیکن دوسرے حضرات بھی اپنا دعویٰ چھوڑنے کے لئے تیّار نہیں تھے، تو اب فیصلے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی گئی کہ نہر میں جو پانی جاری ہے اس میں وہ سب لوگ جو حضرت مریم علیہا السلام کو اپنی پرورش میں لینا چاہتے ہیں اپنا اپنا قلم ڈال دیں، جس کا قلم بہاؤ کے خلاف چلے گا وہی ان کی پرورش کا حقدار ہو گا۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا تو حضرت زکریا علیہ السلام کا قلم پانی کے بہاؤ کے خلاف چل دیا، اور وہی پرورش کے حقدار ٹھہرے اور انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کی پرورش کی ذمہ داری سنبھال لی۔ پھر انہوں نے حضرت مریم علیہا السلام کے لئے ایک کمرہ فارغ کر دیا کہ تم اسی میں رہو، اور حضرت زکریا علیہ السلام جب بھی کہیں باہر جاتے تو ان کی حفاظت کی خاطر اس کمرہ کو تالا لگا دیتے، لیکن جب واپس آتے اور تالا کھولتے تو وہاں ان کے پاس بہت سارے پھل فروٹ رکھے ہوئے دیکھتے۔ یہ دیکھ کر ان کو بہت تعجب ہوتا کہ یہاں تو کوئی بھی آیا گیا نہیں، خود مَیں ہی تالا لگا کر گیا تھا، پھر یہ پھل فروٹ کہاں سے آتے ہیں؟ اس کے جواب میں حضرت مریم علیہا السلام نے کہا: یہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے آیا ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بغیر حساب روزی عطا فرماتا ہے۔

بہر حال! حضرت مریم علیہا السلام کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ انتظام ہوا تھا، اور یہ ایک ایسی چیز تھی جو حضرت مریم علیہا السلام کے ہاتھوں خلافِ عادت ظاہر ہوئی تھی اور حضرت

مریم علیہا السلام پیغمبر بھی نہیں تھیں ،اس لیے یہ کرامت ہی ہوئی،اسی مناسبت سے یہ آیت پیش کی ہے۔

اصحابِ کہف کا قصہ

ایک اورآیت لائے ہیں جس میں اصحابِ کہف کے قصے کی طرف اشارہ کیا ہے: ﴿وَإِذِ اعْتَزَلْتُمُوهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ إِلَّا اللهَ فَأْوُوا إِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهِ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ أَمْرِكُمْ مِّرْفَقاً وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَإِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾

اصحابِ کہف کچھ نوجوان تھے جو اپنی قوم سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی طرف متوجہ ہوئے، یہ قصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد اور نبی کریم ﷺ کی ولادت سے پہلے کے درمیانی زمانہ کا ہے، ان کا بادشاہ دقیانوس بڑا ظالم اور بت پرست تھا، اپنے ظلم و زیادتی کے ذریعہ ہر ایک کو بت پرستی کے لیے مجبور کرتا تھا اس وجہ سے پوری قوم بت پرست تھی ،ان کا ایک سالانہ تیوہار اور میلا ہوتا تھا جس میں سب لوگ بستی سے باہر جاتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے اور اپنے بتوں کو راضی کرنے کے لئے ان کی پوجا بھی کرتے تھے ۔

چنانچہ اسی میلے اور تیوہار کے روز جب سب لوگ باہر میدان میں گئے ہوئے تھے اور بتوں کو راضی کرنے میں مشغول تھے، عین اسی وقت اسی قوم کے چند نوجوانوں کے دل میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ بات ڈالی کہ ہماری قوم یہ کیا کر رہی ہے؟ جن بتوں کو اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا اسی کی عبادت کر رہی ہے اور اسی کو معبود بنا رہی ہے؟ چناں چہ جب وہ سب پوجا کے اندر مشغول تھے اسی دوران ان میں سے ایک نوجوان وہاں سے ہٹ کر سب سے الگ ہو کر ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، دوسرے کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی بات ڈالی، وہ بھی اسی طرح وہاں آکر بیٹھا، تیسرا، چوتھا، پانچواں ، چھٹا؛ سب اسی طرح آکر وہاں بیٹھے، ان میں سے کوئی کسی کو پہچانتا نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کے دل میں یہی بات ڈالی اور ہر ایک اسی طرح اپنی قوم کے ان کرتوت اور بت پرستی سے بددل و متنفّر ہو کر ان سے ہٹ کر اسی درخت کے نیچے آیا۔

جب مہرِ سکوت ٹوٹی

اب ہر ایک اپنی جگہ پر خاموش بیٹھا ہوا تھا، اور چوں کہ بادشاہ بڑا ظالم تھا، اگر اس کو پتہ چل جاتا کہ یہ لوگ بت پرستی سے نفرت کرتے ہیں اور اس سے الگ ہو گئے ہیں تو اس

کی طرف سے سزا ملنے، بلکہ جان جانے کا اندیشہ تھا، اور ان میں سے ہر ایک کو یہی خطرہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی دوسرا میری حالت کے متعلق اس کو اطلاع کر دے، ہر ایک یہی سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں یہ کون ہے، اس لیے سب خاموش بیٹھے رہے۔ بہت دیر تک خاموشی والی کیفیت رہی، اس کے بعد ان میں سے ایک نے کہا: ہم کب سے یہاں آ کر بیٹھے ہیں، کوئی کچھ نہیں بولتا، چلو! ہم آپس میں بات چیت کر لیں چناں چہ ان میں سے ایک نے کہا: ہماری قوم جو کر رہی ہے اس کے متعلق میرے دل میں یہ آتا ہے کہ وہ کوئی اچھا کام نہیں کر رہی ہے، جن بتوں کو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے تراشا انہیں کی پوجا اور عبادت میں مشغول ہیں؟ یہ تو بالکل غلط حرکت ہے۔ دوسروں نے کہا: ہم بھی اسی جذبہ سے ان سے الگ ہو کر یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بس! اتنی ہی بات چیت سے سب کے خیالات نمایاں ہو گئے کہ ہم سب ایک ہی خیال کے ہیں اور ایک ہی جذبہ دل میں پیدا ہوا ہے، اسی لئے الگ ہوئے ہیں، اس لیے ہمیں ان سب سے علاحدگی اختیار کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہونا چاہیے۔ چناں چہ ایک جگہ مقرر کر کے وہ سب اللہ کی عبادت میں مشغول ہو گئے۔ ان کے حال کی اطلاع بادشاہ کو ہو گئی کہ کچھ نوجوان ایسے ہیں جو ہمارے دین سے الگ ہو گئے ہیں اور ہماری بت پرستی کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

چنانچہ بادشاہ نے ان کو دربار میں بلایا اور ان سے پوچھا: اللہ تعالیٰ نے ان کو ہمت دی اور انہوں نے بادشاہ کے سامنے حق کا اظہار کر دیا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو وہ بالکل غلط ہے۔ بادشاہ نے جب ان کی بات سنی تو بہت غصہ ہوا اور ان کو سزا دینے کا ارادہ کیا، لیکن چوں کہ وہ بھی اپنی قوم کے بڑے لوگوں کی اولاد میں سے تھے اس لیے بادشاہ نے فوری طور پر ان کو سزا نہیں دی، بلکہ ان کا شریفانہ لباس اتروا دیا اور کہا کہ تم لوگوں کو سوچنے کے لئے کچھ وقت دیا جاتا ہے تاکہ اپنے اس ارادہ سے باز آجاؤ، اور قوم پہلے سے جو کر رہی ہے اسی میں سب کے ساتھ شریک رہو، اگر تم اپنے اس نئے نظریہ سے باز نہیں آئے تو پھر مَیں تم سب کو قتل کر دوں گا۔

ڈسٹرب نہ کریں

جب ان کو کچھ مہلت ملی تو آپس میں مشورہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ: جب ہم ان لوگوں سے اور جس چیز کی یہ لوگ پوجا عبادت کرتے ہیں الگ ہو گئے ہیں، اور ایک اللہ ہی کی عبادت میں مشغول ہیں، ان کے عقائد اور اعمال سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر ہمیں چاہیے کہ ان کے درمیان رہنے کے بجائے کسی غار میں جا کر پناہ لے لیں،

وہاں اللہ تعالیٰ ہمارے لئے اپنی رحمت پھیلائے گا اور آسانی کا کوئی انتظام کردے گا۔ چناں چہ یہ مشورہ کرکے وہ لوگ آبادی چھوڑ کر ایک غار میں جاکر ٹھہر گئے، اور اللہ تعالیٰ نے ان کی اس غار والی قیام گاہ کو لوگوں کے اوپر مخفی رکھا، پھر جب وہ لوگ لیٹے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر نیند طاری کردی اور اسی نیند میں وہ تین سو سال تک سوتے رہے۔ یہ ان کی کرامت تھی کہ تین سو سال نیند میں رہنے کے باوجود ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، جیسے تندرست تھے ویسے ہی رہے، قدرتی طور پر وہ کروٹیں بھی بدلتے رہتے، اور ان کے لباس پر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اس غار میں قدرتی طور پر ایسا انتظام کردیا کہ وہاں ہوا اور روشنی کی آمد ورفت بھی تھی، لیکن دھوپ اندر نہیں جاسکتی تھی، وہ غار اس انداز سے بنا ہوا تھا کہ صبح میں جب دھوپ نکلتی تو ان کے غار سے ٹکرا کر دائیں طرف نکل جاتی، اور شام کو غروب کے وقت بائیں طرف ہو کر نکل جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ غار شمالاً ویمیناً ایسا بنا ہوا تھا کہ سورج کے طلوع اور غروب کے وقت میں بھی دھوپ اندر نہیں پہنچتی تھی، ہاں! روشنی اور ہوا پورے طور پر آتی جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لئے بطور کرامت یہ انتظام کیا گیا تھا۔

وہ تو سوتے رہے اور یہاں بادشاہ نے ان کو بہت تلاش کروایا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس غار والی جگہ کو ایسا مخفی رکھا کہ بہت جستجو کے بعد بھی ان کا کوئی پتہ نہیں چلا پایا، تو بادشاہ نے

ان کے نام سیسہ کی ایک تختی پر لکھوا کر اپنے خزانہ میں محفوظ کر لیے کہ اس نام کے کچھ نوجوان ہیں جن کے ایسے ایسے حالات ہیں، وہ اچانک ایسے غائب ہو گئے کہ ان کا پتہ ہی نہیں چلا۔

تین سو سال کے بعد وہاں کے حالات میں بہت کچھ انقلاب آچکا تھا، اللہ تعالیٰ نے وہاں والوں کو حق اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائی اور تین سو سال کے عرصہ میں وہاں پر سب ہی دینِ حق پر قائم ہو گئے، اس وقت وہاں جو بادشاہ تھا وہ بھی اہلِ حق ہی میں سے تھا، اس زمانہ میں ایک چرچا اور بحث یہ چھڑ گئی کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی نصیب ہو گی یا نہیں ؟ اہلِ حق میں سے ہونے کے باوجود بعض یہ کہتے تھے کہ ہاں ! دوبارہ زندگی ہو گی، اور بعض کہتے تھے کہ دوبارہ زندگی کیسی؟ آدمی جب مر جائے گا اور گل سڑ جائے گا، اس کا جسم مٹّی میں مل جائے گا؛ تو وہ دوبارہ پیدا کیسے ہو گا اب جو لوگ انکار کرتے تھے وہ کہتے تھے کہ اگر دوبارہ زندگی ہے تو دلیل سے ہمیں سمجھاؤ، اور دلیل سے سمجھانے کے بعد بھی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بادشاہ بھی بڑا متفکر تھا کہ ان کو کیسے سمجھایا جائے۔

روایتوں میں ہے کہ وہ اللہ کے حضور میں بہت گڑ گڑاتا تھا، ٹاٹ کا لباس پہن کر تنہائی میں جا کر رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا تھا کہ کوئی ایسی شکل پیدا ہو جائے کہ جو لوگ دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے ہیں ان کی سمجھ میں بات آجائے۔

جب جاگے دنیا بدلی ہوئی تھی

اِدھر ان لوگوں کو سوئے ہوئے تین سو سال پورے ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جب ان کی آنکھ کھولی تو ان کو بھوک کا احساس ہوا، انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی ایک آدمی کو بستی میں بھیجو، تاکہ وہ جا کر سب کے لیے کھانا لے آئے، اور دیکھو! ذرا چھپ چھپا کر جانا۔ چناں چہ ایک آدمی پیسے لے کر بازار پہنچا، جب وہ دکان پر پہنچا اور اس نے سکہ دیا تو دکاندار نے کہا: یہ سکہ کہاں سے لائے؟ دکاندار یوں سمجھا کہ اس کو پرانے زمانہ کا کوئی خزانہ ملا ہو گا، اس نے دوسرے دکانداروں کو جمع کیا اور سب نے اس کو پکڑ لیا۔ شدہ شدہ یہ بات بادشاہِ وقت تک پہنچی، تو بادشاہ نے اسے اپنے پاس بلا کر تمام حالات سے آگاہی چاہی، اس نے سب کچھ بتا دیا کہ ہمارا ایسا ایسا معاملہ ہے، تو بادشاہ اس کے ساتھ تمام لوگوں کو لے کر غار پر پہنچا اور ان سب سے ملاقات ہوئی۔ یہ واقعہ دیکھ کر گویا اب تو سب لوگوں کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ جب اللہ تعالیٰ ان کو تین سو سال تک اس طرح سلائے رکھنے اور زندگی کو باقی رکھنے پر قادر ہے؛ وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے پر کیوں قادر نہیں ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ بادشاہ کے ان سے ملاقات کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو موت عطا فرما دی۔

بہر حال! یہ ان کی کرامت تھی اسی نسبت سے اس واقعہ کو یہاں پر ذکر کیا ہے۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی کرامت

حدیث ۱۵۰۳:-

وعن أبي محمد عبد الرحمن بن أبي بكرٍ الصديق رضی اللہ عنہما: أَنَّ أَصْحَابَ الصُّفَّةِ كَانُوا أُنَاساً فُقَرَاءَ وَأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ مَرَّةً: ((مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ، فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ، وَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ أَرْبَعَةٍ، فَلْيَذْهَبْ بِخَامِسٍ بِسَادِسٍ)) أَوْ كما قَالَ، وأَنَّ أَبَا بكرٍ -رضي الله عنه- جَاءَ بِثَلاَثَةٍ، وانْطَلَقَ النبيّ ﷺ بعَشَرَةٍ، وأَنَّ أَبَابَكرٍ تَعَشَّى عِنْدَ النبيّ ﷺ، ثُمَّ لَبِثَ حَتَّى صَلَّى العِشَاءَ، ثُمَّ رَجَعَ، فَجاءَ بَعْدَ مَا مَضَى مِنَ اللَّيْلِ مَا شَاءَ اللهُ. قالت امْرَأَتُهُ: مَا حَبَسَكَ عَنْ أَضْيَافِكَ؟ قَالَ: أوَمَا عَشَّيْتِهِمْ؟ قالت: أَبَوْا حَتَّى تَجِيءَ وَقَدْ عَرَضُوا عَلَيْهِمْ، قَالَ: فَذَهَبْتُ أَنَا فَاخْتَبَأْتُ، فقالَ: يَاغُنْثَرُ، فَجَدَّعَ وَسَبَّ، وقالَ: كُلُوا لاَ هَنِيئاً. وَاللهِ لا أَطْعَمُهُ أَبداً. قَالَ: وايْمُ اللهِ مَا كُنَّا نَأْخُذُ مِنْ لُقْمَةٍ إلا ربا من أسفلِها أكثرَ منها حتى شبعوا، وصارتْ أكثرَ مما كانت قبلَ ذلك، فنظرَ إليها أبو بكر فقالَ لامرأتِهِ: يا أختَ بني فراسٍ ماهذا؟ قالت: لا وقُرَّةِ عيني لهي الآنَ أكثرُ منها قبلَ ذلكَ بثلاثِ مراتٍ! فأكل منها أبوبكرٍ وقال: إنَّما كانَ ذلكَ من الشيطانِ، يعني: يمينَهُ. ثم أكلَ منها لقمةً، ثُمَّ حَمَلَهَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَأَصْبَحَتْ عِنْدَهُ. وَكَانَ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ، فَمَضَى الأَجَلُ، فَتَفَرَّقْنَا اثْنَيْ عَشَرَ رَجُلاً، مَعَ كُلِّ رَجُلٍ مِنْهُمْ أُنَاسٌ، اللهُ أَعْلَمُ كَمْ مَعَ كُلِّ رَجُلٍ فَأَكَلُوا مِنْهَا أَجْمَعُونَ.

وَفِي رِوَايَةٍ: فَحَلَفَ أَبُو بَكْرٍ لا يَطْعَمُهُ، فَحَلَفَت المَرْأَةُ لا تَطْعَمُهُ، فَحَلَفَ الضَّيْفُ. -أو الأَضْيَافُ- أَنْ لاَ يَطْعَمُهُ أَوْ يَطْعَمُوهُ حَتَّى يَطْعَمَهُ. فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: هٰذِهِ مِنَ الشَّيْطَانِ! فَدَعَا بِالطَّعَامِ فَأَكَلَ وأَكَلُوا، فَجَعَلُوا لا يَرْفَعُونَ لُقْمَةً إِلاَّ رَبَتْ مِنْ أَسْفَلِهَا أَكْثَرُ مِنْهَا، فَقَالَ: يَا أُخْتَ بَنِي فِرَاسٍ، مَا هٰذَا؟ فَقَالَتْ: وَقُرَّةِ عَيْنِي إِنَّهَا الآنَ لأَكْثَرُ مِنْهَا قَبلَ أَنْ نَأْكُل، فَأَكَلُوا، وَبَعَثَ بِهَا إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَذَكَرَ أَنَّهُ أَكَلَ مِنْهَا.

وَفِي رِوايَةٍ: إِنَّ أَبَا بَكْرٍ قَالَ لِعَبْدِ الرَّحْمانِ: دُونَكَ أَضْيَافَكَ، فَإِنِّي مُنْطَلِقٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَافْرُغْ مِنْ قِرَاهُم قَبْلَ أَنْ أَجِيءَ، فَانْطَلَقَ عَبْدُ الرَّحْمانِ، فَأَتَاهُمْ بِمَا عِنْدَهُ، فَقَالَ: اطْعَمُوا؛ فقالوا: أَيْنَ رَبُّ مَنْزِلِنا؟ قَالَ: اطْعَمُوا، قالوا: مَا نَحنُ بِآكِلِينَ حَتَّى يَجِيءَ رَبُّ مَنْزِلِنَا، قَالَ: اقْبَلُوا عَنَّا قِرَاكُمْ، فَإِنَّهُ إِنْ جَاءَ وَلَمْ تَطْعَمُوا، لَنَلْقَيَنَّ مِنْهُ فَأَبَوْا، فَعَرَفْتُ أَنَّهُ يَجِدُ عَلَيَّ، فَلَمَّا جَاءَ تَنَحَّيْتُ عَنْهُ، فَقَالَ: مَا صَنَعْتُمْ؟ فَأَخْبَرُوهُ، فَقَالَ: يَا عَبْدَ الرَّحمانِ، فَسَكَتُّ: ثُمَّ قَالَ: يَا عَبْدَ الرَّحْمانِ، فَسَكَتُّ، فَقَالَ: يَا غُنْثَرُ أَقْسَمْتُ عَلَيْكَ إِنْ كُنْتَ تَسْمَعُ صَوتِي لَمَا جِئْتَ! فَخَرَجْتُ، فَقُلْتُ: سَلْ أَضْيَافَكَ، فقالُوا: صَدَقَ، أَتَانَا بِهِ، فَقَالَ: إِنَّمَا انْتَظَرْتُمُونِي واللهِ لا أَطْعَمُهُ اللَّيْلَةَ. فَقَالَ الآخَرُونَ: واللهِ لا نَطْعَمُهُ حَتَّى تَطْعَمَهُ فَقَالَ: وَيْلَكُمْ مَا لَكُمْ لا تَقْبَلُونَ عَنَّا قِرَاكُمْ؟ هَاتِ طَعَامَكَ، فَجَاءَ بِهِ، فَوَضَعَ يَدَهُ فَقَالَ: بِسْمِ اللهِ، الأُولَى مِنَ الشَّيْطَانِ، فَأَكَلَ وَأَكَلُوا. (متفق عَلَيْهِ)

قَوْله: ((غُنْثَرُ)) بغينٍ معجمةٍ مَضمُومَةٍ ثُمَّ نُونٍ ساكِنَةٍ ثُمَّ ثاءٍ مثلثةٍ وَهُوَ: الغَبِيُّ الجَاهِلُ. وقولُهُ: ((فَجَدَّعَ)) أَيْ شَتَمَهُ، والجَدْعُ القَطْعُ. قوله ((يَجِدُ عَلَيّ)) هُوَ بكسرِ الجِيمِ: أَيْ يَغْضَبُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد الرحمٰن (جو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، صحابی ہیں اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بڑے بھائی ہیں وہ) فرماتے ہیں کہ اصحابِ صفہ فقیر لوگ تھے (اس زمانہ کی مسجدِ نبوی کے ختم پر ایک چبوترہ بنا ہوا تھا، جو لوگ نبی ٔ کریم ﷺ کے پاس علم حاصل کرنے آتے تھے، وہ وہیں پڑے رہتے تھے، یہی ان کی قیام گاہ تھی، ان کی ضرورتوں کا تکفل اور ذمہ داری حضورِ اکرم ﷺ اور مسلمانوں نے سنبھال رکھی تھی، وہ حضرات حصولِ علم میں لگے رہتے تھے) ایک روز ایسا ہوا کہ اصحابِ صفہ کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا تو نبی ٔ کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ سے فرمایا: جس کے گھر دو آدمیوں کے کھانے کا انتظام ہو، وہ ان میں سے ایک کو ساتھ لے جائے۔ اور جس کے گھر چار آدمیوں کے کھانے کا انتظام ہو وہ ان میں سے دو ایک کو اپنے ساتھ لے جائے (مطلب یہ ہے کہ ہر ایک اپنے گھر کے کھانے میں چند اور آدمیوں کو بھی اپنی حیثیت اور طاقت کے مطابق شامل کرلیوے) چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ کی اس ہدایت پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی تین آدمیوں کو اپنے گھر لے گئے اور خود حضورِ اکرم ﷺ دس آدمیوں کو کھلانے کے واسطے اپنے گھر لے گئے۔ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تو شام کا کھانا حضور ﷺ کے پاس کھایا اور وہیں رہے، عشاء کی نماز ادا کی اور رات کا کچھ حصہ (جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا) گزرنے کے بعد جب گھر آئے تو ان کی اہلیہ نے کہا: آپ کے مہمانوں کی میزبانی سے کس نے آپ کو روک دیا (یعنی آپ کے گھر تو مہمان تھے پھر بھی آپ اتنی دیر سے آئے، گویا مہمانوں کا کھانا باقی ہے آپ کو اس کی فکر نہیں ہوئی؟) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم نے ان کو شام کا کھانا نہیں کھلایا؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اہلیہ نے کہا: ہم نے تو کھانا پیش کیا تھا لیکن انہوں نے کھانے سے انکار کیا اور کہا: جب تک صاحبِ خانہ نہیں آئیں گے وہاں تک ہم نہیں کھائیں گے۔

دوسری روایت میں ہے: انہوں نے کہا کہ ہم نے بہت اصرار کیا کہ کھالو، ورنہ وہ بہت ناراض ہوں گے، ہمیں ڈانٹیں گے، لیکن انہوں نے نہیں مانا۔ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں تو جاکر چھپ گیا، اس لئے کہ مجھے ڈر تھا کہ ابا مجھ پر غصہ ہوں گے اور اب میری خیر نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کو بہت برا بھلا کہا اور آواز دی: اے جاہل! تو کہاں ہے؟ دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں تجھے قسم دے کر کہتا ہوں کہ جہاں کہیں بھی ہے وہاں سے نکل۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں ڈرتے ڈرتے باہر آیا تو مجھ سے فرمایا: مہمانوں کو کھانا کیوں نہیں کھلایا؟ حضرت عبد الرحمٰن رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ان سے پوچھ لیجئے۔ مہمانوں نے کہا: ان کا کوئی قصور نہیں ہے، انہوں نے تو کھانا پیش کیا تھا، ہم نے ہی کھانے سے انکار کیا تھا۔ خیر! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مہمانوں کے سامنے کھانا رکھوایا، جب وہ آہی گئے تھے تو مہمانوں نے کہا: آپ بھی کھائیے، حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم لوگ کھاؤ، میں تو نہیں کھاؤں گا۔

یہاں روایت مختصر ہے، دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میری وجہ سے نہیں کھایا، اس لیے اب میں ہی نہیں کھاؤں گا اور قسم کھالی، مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ جب تک تم نہیں کھاؤگے ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ اب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: تم لوگوں نے یہ کیا کیا؟ یہ تو بہت برا ہوا، چناں چہ انہوں نے اپنی قسم توڑ دی اور کہا: لاؤ! کھانا لاؤ۔ چناں چہ کھانا رکھا گیا، انہوں نے سب سے پہلے بسم اللہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا تو مہمانوں نے بھی کھانا شروع کیا (اب کھانا کم تھا اور سب اسی میں سے کھا رہے تھے لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کھانا کم ہونے بجائے اس میں اضافہ ہو رہا

تھا) کہتے ہیں کہ: اللہ کی قسم! ہم کوئی لقمہ نہیں لیتے تھے مگر اس کے نیچے سے کھانا جتنا اٹھایا جاتا اس سے زیادہ بڑھ جاتا تھا، یہاں تک کہ سب نے پیٹ بھر کر کھالیا، پھر بھی کھانا شروع میں جتنا رکھا گیا تھا اس سے زیادہ ہی بچا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھا تو اپنی بیوی سے کہا: اے قبیلۂ بنو فراس والی! یہ کیا معاملہ ہے؟ وہ بھی کہنے لگی: میری آنکھوں کی ٹھنڈک! یہ کھانا تو پہلے جتنا تھا اس کے مقابلہ میں تین گُنا ہو گیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی اس میں سے کھایا اور کہا: میں نے کھانا نہ کھانے کی جو قسم کھائی تھی وہ دراصل شیطان کا اثر تھا، چناں چہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس میں سے کھایا اور بچا ہوا حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس بھی لے گئے۔ اور کہتے ہیں کہ ہمارے اور دیگر لوگوں کے درمیان معاہدہ اور مقررہ مدّت تھی وہ بھی پوری ہو گئی، ہم بارہ آدمی تھے، ہر ایک الگ الگ ہو گئے، اور ہر ایک کے ساتھ کچھ لوگ تھے۔

دوسری روایت میں یہ بھی ہے: جب مہمانوں نے کھانا نہیں کھایا، اور کہا: جب تک میزبان نہیں آئیں گے ہم نہیں کھائیں گے، اس کا جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہوں نے قسم کھالی کہ مَیں اس میں سے نہیں کھاؤں گا، یہ سن کر ان کی بیوی نے بھی قسم کھالی کہ میں بھی نہیں کھاؤں گی، اور مہمانوں نے بھی قسم کھالی کہ ہم بھی نہیں کھائیں گے۔ تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ تو شیطانی حرکت ہوئی۔ چناں چہ کھانا منگوایا خود بھی کھایا، مہمانوں نے بھی کھایا۔ اور جب بھی لقمہ ایک اٹھاتے تو نیچے سے زیادہ ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی سے کہا: اے قبیلۂ بنو فراس والی! یہ کیا معاملہ ہے؟ وہ بھی کہنے لگی: میری آنکھوں کی ٹھنڈک! یہ پہلے جتنا تھا اس کے مقابلہ میں تین گُنا ہو گیا ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بھی کھایا، اور کہا: میں نے کھانا نہ کھانے کی جو قسم کھائی تھی وہ

شیطان کا اثر تھا، پھر ایک لقمہ کھایا، اور بچا ہوا حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس بھی لے گئے اور تذکرہ کیا تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی اس میں سے کھایا۔

بہر حال! اس روایت کو یہاں لانے کا مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کھانے میں اتنی برکت رکھی تھی کہ اتنے سارے آدمیوں کے کھانے کے بعد بھی جتنا رکھا تھا اس میں اس سے کئی گُنا اضافہ ہو گیا، یہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی کرامت تھی۔

امّت کے مُحدّث

حدیث ۱۵۰۴:-

وعن أَبِي هريرة رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((لَقَدْ كَانَ فيما قَبْلَكُمْ مِنَ الأُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُونَ، فَإِنْ يَكُ فى أُمَّتِي أحدٌ فإِنَّهُ عُمَرُ)). (رواه البخاری. ورواه مسلم من رواية عائشة)

وفى روايتهما قَالَ ابن وهب: ((مُحَدَّثُونَ)) أَيْ مُلْهَمُونَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تم سے پہلی امتوں میں ”مُحَدّث“ لوگ ہوا کرتے تھے۔ اگر میری امّت میں ایسا کوئی ہو سکتا ہے تو وہ عمر ہیں۔

ابن وہب کے حوالہ سے ”مُحَدّث“ کا مطلب بیان کیا ہے کہ ایسے لوگ جن کے دلوں پر الہام ہوا کرتا ہے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و صداقت کی بات ڈالی جاتی ہے)۔

افادات:- آگے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت لائیں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب کسی چیز کے متعلق یوں کہتے: کہ میرا خیال ہے کہ یہ ایسا ہے، تو وہ ویسا ہی ہوتا تھا۔ گویا یہی وہ چیز تھی جس کو نبی کریم ﷺ نے "مُحَدَّث" اور "ملہَم" سے تعبیر کیا ہے۔

وہ مستجاب الدعوات تھے

حدیث ۱۵۰۵:-

وعن جابر بنِ سُمُرَةَ رضی الله عنهما، قَالَ: شَكَا أَهْلُ الكُوفَةِ سَعْداً يعني: ابنَ أَبِي وقاص رضی اللہ عنہ إِلَى عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، فعَزَلَهُ، واسْتَعْمَلَ عَلَيْهِمْ عَمَّاراً، فَشَكَوا حَتَّى ذَكَرُوا أَنَّهُ لا يُحْسِنُ يُصَلِّي، فَأَرْسَلَ إِلَيْهِ، فقَالَ: يَا أَبَا إِسْحَاق! إنَّ هَؤُلاَءِ يَزْعُمُونَ أَنَّكَ لا تُحْسِنُ تُصَلِّي، فَقَالَ: أَمَّا أنا واللهِ فَإنِّي كُنْتُ أُصَلِّي بِهِمْ صَلاَةَ رسولِ الله ﷺ لا أُخْرِمُ عَنْهَا، أُصَلِّي صَلاَتَيِ العِشَاءِ فَأَرْكُدُ فِي الأُولَيَيْنِ، وَأُخِفُّ فِي الأُخْرَيَيْنِ. قَالَ: ذلِكَ الظَّنُّ بِكَ يَا أَبَا إِسْحَاق، وأَرْسَلَ مَعَهُ رَجُلاً -أَوْ رِجَالاً- إِلَى الكُوفَةِ يَسْأَلُ عَنْهُ أَهْلَ الكُوفَةِ، فَلَمْ يَدَعْ مَسْجِداً إِلاَّ سَأَلَ عَنْهُ، وَيُثْنُونَ مَعْرُوفاً، حَتَّى دَخَلَ مَسْجِداً لِبَنِي عَبْسٍ، فَقَامَ رَجُلٌ مِنْهُمْ، يُقَالُ لَهُ أُسَامَةُ بْنُ قَتَادَةَ، يُكَنَّى أَبَا سَعْدَةَ، فقَالَ: أَمَا إِذْ نَشَدْتَنَا فَإنَّ سَعْداً كَانَ لا يَسِيرُ بالسَّرِيَّةِ وَلاَ يَقْسِمُ بالسَّوِيَّةِ، وَلاَ يَعْدِلُ فِي القَضِيَّةِ. قَالَ سَعْدٌ: أَمَا وَاللهِ لأَدْعُوَنَّ بِثَلاَثٍ: اللَّهُمَّ إنْ كَانَ عَبْدُكَ هَذَا كَاذِباً، قَامَ رِيَاءً، وَسُمْعَةً، فَأَطِلْ عُمُرَهُ

، وَأَطِلْ فَقْرَهُ، وَعَرِّضْهُ لِلْفِتَنِ. وَكَانَ بَعْدَ ذَٰلِكَ إِذَا سُئِلَ يَقُولُ: شَيْخٌ كَبِيرٌ مَفْتُونٌ، أَصَابَتْنِي دَعْوَةُ سَعْدٍ.

قَالَ عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ عُمَيْرٍ الرَّاوِي عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ: فَأَنَا رَأَيْتُهُ بَعْدُ قَدْ سَقَطَ حَاجِبَاهُ عَلَى عَيْنَيْهِ مِنَ الْكِبَرِ، وَإِنَّهُ لَيَتَعَرَّضُ لِلْجَوَارِي فِي الطُّرُقِ فَيَغْمِزُهُنَّ. (متفق عَلَيْهِ)

تشریح:- کوفہ؛ عراق کا ایک شہر ہے۔ کوفہ اور بصرہ یہ دونوں شہر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں آباد کئے گئے، دونوں آبادیاں نئی نئی تھیں اور یہ چھاؤنی بھی تھی، عام طور پر لشکر سے تعلق رکھنے والے لوگ وہیں رہائش پذیر ہوتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ کو وہاں کا گورنر بنایا تھا۔

حضرت سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ قبیلۂ بنو زہرہ سے تعلق رکھتے ہیں جو قریش کا ایک قبیلہ ہے، نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی والدہ حضرت آمنہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، اسی لئے بعض روایتوں میں حضرت سعد کو نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے رشتہ کے ماموں کہا گیا ہے ایک مرتبہ نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: یہ میرے ماموں ہیں، اگر کسی کے پاس ایسا ماموں ہو تو بتائے۔ یہ ان دس صحابہ میں سے بھی ہیں جن کو نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ایک ہی مجلس میں جنّت کی خوشخبری ارشاد فرمائی تھی۔ اور ان کے متعلق نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے یہ دعا بھی فرمائی تھی: "أَللّٰهُمَّ اسْتَجِبْ دُعَاءَ سَعْدٍ" اے اللہ! سعد کی دعا کو قبول فرما۔ اس کا اثر یہ تھا کہ وہ

مستجاب الدعوات تھے، جو بھی دعا کرتے تھے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جاتی تھی۔ اہلِ اسلام کا ایرانیوں کے ساتھ جو آخری مقابلہ ہوا تھا اس میں سپہ سالار یہی تھے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ان کے بڑے فضائل ہیں اور سب سے پہلے کوفہ کے گورنر یہی بنائے گئے تھے۔ اب آبادی میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں، بعض لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی شکایت کی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر دیا، لیکن یہ بات نہیں تھی کہ ان لوگوں کی شکایت درست تھی، بلکہ یہ فیصلہ احتیاط کے طور پر تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وصیت

اس لیے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جس وقت انتقال ہو رہا تھا تو اپنے پیچھے اپنا نائب اور جانشین مقرر کرنے کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو وصیت فرمائی تھی اس میں وہی چھ حضرات تھے جن کو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جنّت کی خوشخبری سنائی تھی اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی وفات کے وقت ان سے راضی تھے، ان حضرات میں حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ کا نام بھی تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا تھا: اگر حضرت سعد

بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ کو میرا جانشین مقرر کیا جائے تب تو ٹھیک ہے، لیکن اگر کوئی دوسرا مقرر ہو تو میں اس کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ کو کسی نہ کسی جگہ پر عہدہ و منصب ضرور دے، اس لئے کہ میں نے ان کو کسی خیانت یا کمزوری کی وجہ سے معزول نہیں کیا تھا۔

بہر حال! حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ پر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو گورنر مقرر کیا جو ایک جلیل القدر صحابی تھے۔ پھر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے متعلق جو شکایتیں پہنچی تھیں ان کی تحقیق کروائی۔ ویسے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ ان کی طرف سے جو گورنر اور حکمران مقرر کئے جاتے تھے ان کے متعلق اگر کوئی شکایت پہنچتی تو اس کی تحقیق کرتے، اگر شکایت صحیح ثابت ہوتی اور ان کو تنبیہ کرنا مناسب ہوتا تو تنبیہ کرتے، اور اگر معزول کرنا مناسب ہوتا تو معزول کر دیتے، اور اگر شکایت غلط ہوتی تو پھر شکایت کرنے والوں کو سزا دیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بطورِ احتیاط پہلا کام تو یہ کیا کہ ان کو منصب سے معزول کر دیا، اس کے بعد شکایت کی تحقیق کی۔

شکایت یہ تھی کہ وہ ٹھیک طریقے سے نماز نہیں پڑھاتے۔ چناں چہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلوایا اور فرمایا: اے ابو اسحاق! (یہ حضرت سعد کی کنیت تھی، اور عرب میں دستور تھا کہ کسی بڑے آدمی کو جب مخاطب کیا جاتا

تھا تو اس کا اعزاز اور تکریم یہی ہوتی تھی کہ اس کو کنیت کے ساتھ مخاطب کیا جائے) ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ نماز برابر نہیں پڑھاتے؛ کیا یہ بات ٹھیک ہے؟ حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اللہ کی قسم! مَیں ان کو اسی طریقے سے نماز پڑھاتا ہوں جیسی مَیں نے نبی کریم ﷺ کی نماز دیکھی ہے۔

(بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں اسلام لانے والوں میں ساتواں ہوں، اور میں سب سے پہلا وہ آدمی ہوں جس نے اسلام میں دشمن پر تیر چلایا، اور ہم درختوں کے پتّے کھاتے تھے جس کی وجہ سے ہمارے منھ اور ہونٹ کے کنارے پھٹ جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ دین کے لئے ہم نے اتنی ساری تکلیفیں اٹھائیں، اور ہم نبی کریم ﷺ کی صحبت میں بہت پہلے سے رہنے والے لوگ ہیں، اب اگر میری نماز بھی ٹھیک نہیں ہے تب تو میں تو گمراہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں مشقتیں اٹھائیں اور نماز بھی ٹھیک نہیں ہوئی تو گویا میرے ہاتھ سے دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی؛ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟) پھر کہا: میں نے نبی کریم ﷺ کو جس طرح نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اسی طرح نماز پڑھاتا ہوں، اس میں سے کوئی چیز بھی چھوڑتا نہیں ہوں ۔ جب عشاء کی نماز پڑھاتا ہوں تو پہلی دو رکعات کو لمبا کرتا ہوں (کیوں کہ اس میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورۃ بھی ملائی جاتی ہے جس میں قراءت لمبی ہوتی ہے) اور بعد والی دو رکعتیں ہلکی

کرتا ہوں۔ان کی یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ابو اسحاق! آپ کے متعلق میرا گمان یہی تھا۔یعنی ان لوگوں نے آپ کے متعلق جو شکایت کی تھی تو میں یہی سمجھتا تھا کہ یہ شکایت درست نہیں ہے، اس لیے کہ آپ جیسا آدمی جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت اٹھائی ہو اور جن پر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اطمینان ہو، اور جن کو بارگاہِ نبوت سے جنّت کی بشارت دی گئی ہو، اور اتنے پرانے اسلام لانے والے شخص بھلا نماز کے معاملے میں کوئی کوتاہی کیسے کرسکتے ہیں؟ لیکن چوں کہ بات کی تحقیق کرنا ضروری تھی اس لئے میں نے پوچھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ بلایا تھا اور یہ گفتگو مدینہ میں ہوئی تھی، جب ان کے جواب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اطمینان ہو گیا تو پھر دوسرا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان کے ساتھ کچھ لوگوں کو یا ایک آدمی کو کوفہ بھیجا کہ وہاں کی ہر مسجد میں جاکر اہلِ صلاح اور نیک لوگوں سے پوچھو کہ ان کے متعلق جو شکاتیں کی گئی ہیں؛ کیا درست ہیں؟ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے حضرت محمد بن مسلمہ کو بھیجا تھا جو ایک جلیل القدر صحابی ہیں اور قبیلۂ اوس سے تعلق رکھتے ہیں۔چناں چہ حضرت سعد بن اَبی وقاص اور حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہما نے نماز کے اوقات میں کوفہ کی ہر ہر مسجد والوں سے ملاقات کی۔حالاں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا مقام حضرت محمد بن

مسلمہ رضی اللہ عنہ سے بہت اونچا ہے۔ لیکن امیر المؤمنین کا حکم تھااس لیے ان کو مسجد میں لے جاتے اور اہلِ مسجد سے قسم دے کر پوچھتے کہ امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ان کے متعلق کچھ شکایتیں پہنچی ہیں ، جن کی تحقیق کے واسطے ان کو ساتھ لے کر مجھے بھیجا ہے، کیا آپ حضرات کو ان کے متعلق کوئی شکایت ہے؟ جس سے بھی پوچھتے سبھی ان کی خوبیاں بیان کرتے اور کہتے کہ ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے،ان کے اندر کوئی کمی نہیں ہے، یہ تو ہر طرح کی خوبی سے مزیّن ہیں ، کسی بھی مسجد والوں نے ان کی کوئی برائی نہیں کی۔ یہاں تک کہ جب مسجدِ بنو عبْس میں پہنچے اور یہی سوال پوچھاتو ایک آدمی کھڑا ہوا جس کا نام اسامہ بن قتادہ اور کنیت ابو سَعْدہ تھی اس نے کہا: جب آپ نے قسم دی ہے تو مجھے بولنا پڑے گا، ورنہ شکایت نہ کرتا، ان کی ایک شکایت تو یہ ہے کہ جب یہ کوئی لشکر کہیں بھیجتے ہیں توخود تو گھر بیٹھے رہتے ہیں ۔دوسری بات یہ ہے کہ جب مال تقسیم کرتے ہیں تو انصاف سے کام نہیں لیتے۔اور فیصلوں میں بھی انصاف نہیں کرتے۔حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا انصاف دیکھئے کہ وہ تو جانتے تھے کہ ان کے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے یعنی سب باتیں جھوٹی ہیں،اس کے باوجود انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے، بلکہ یوں کہا: اے اللہ! تیرا یہ بندہ اگر جھوٹا ہے اور محض شہرت اور دکھلاوے کے لئے کھڑا ہوا ہے تو اس کی عمر لمبی کر، اس کا فقر بڑھا دے، اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے۔

جب کوئی چھوٹا آدمی کسی بڑے آدمی کے متعلق کوئی اعتراض کرتا ہے تو اس کے دل میں یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے کہ میرے اس اعتراض کے نتیجہ میں میری شہرت ہو جائے گی کہ فلاں آدمی نے تو فلاں کو بھی نہیں چھوڑا اور اس کے متعلق شکایت کی۔ تو گویا اس آدمی کا کھڑے ہو کر یہ باتیں کہنا اسی جذبے سے تھا کہ مَیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ جیسے بڑے آدمی کے متعلق جب یہ سب کہوں گا تو مجھے لوگوں کے درمیان شہرت حاصل ہو جائے گی۔

ایک لطیفہ

ایک واقعہ یاد آیا بطورِ لطیفہ سنا دیتا ہوں ۔ ایک آدمی مشہور ہونا چاہتا تھا، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مشہور ہونے کے لئے کیا کروں ؛ تو اس نے جا کر زمزم کے کنویں میں پیشاب کر دی۔ اس کے بعد وہ جہاں بھی جاتا تو لوگ اس کی طرف انگلیاں اُٹھاتے کہ یہ وہی آدمی ہے۔ تو وہ خوش ہوتا کہ سب مجھے جانتے ہیں ۔

درحقیقت وہ خود بھی جانتا تھا کہ حضرت سعد بن أبی وقاص رضی اللہ عنہ میں یہ باتیں نہیں ہیں ۔ اس لیے کہ ایک شکل تو یہ ہوتی کہ واقعةً حضرت سعد رضی اللہ عنہ میں یہ باتیں نہیں تھی، لیکن سامنے والا اپنی معلومات کی وجہ سے یہی سمجھتا کہ ان میں یہ کمزوریاں ہیں ،

اس صورت میں تو وہ خود اپنے آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتا، بلکہ اپنے آپ کو صحیح سمجھتے ہوئے اعتراض کرتا، لیکن یہ آدمی تو خود بھی سمجھتا تھا کہ مَیں جھوٹا ہوں ، محض شہرت حاصل کرنے کے لیے اعتراض کر رہا تھا۔

حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کرنے والے راوی عبد الملک بن عمیر کہتے ہیں کہ حضرت سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ کی دعا کے اثر سے اس کا یہ حال ہوا کہ اس کی عمر بڑی لمبی ہوئی، یہاں تک کہ اس کی پلکیں بھی آنکھوں پر جھک گئی تھیں، اور فقر وفاقہ میں بھی مبتلا ہوا، اور ایسے فتنے میں مبتلا ہوا کہ راستہ چلتے ہوئے لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ یہ کیا حالت ہے؟ تو وہ جواب میں کہتا: میں فتنے میں مبتلا ایک بوڑھا ہوں جس کو سعد بن اَبی وقاص کی بد دعا لگ گئی ہے۔ اس میں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی کرامت ظاہر ہوتی ہے اس بنیاد پر اس روایت کو یہاں پیش کیا ہے۔

مجھے سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی بد دعا لگ گئی

حدیث ۱۵۰۶:-

وَعَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ أَنَّ سَعِيدَ بْنَ زَيْدِ بْنِ عَمْرِو بن نُفَيْلٍ خَاصَمَتْهُ أَرْوَى بِنْتُ أُوَيْسٍ إِلَى مَرْوَانَ بْنِ الْحَكَمِ وَادَّعَتْ أَنَّهُ أَخَذَ شَيْئاً مِنْ أَرْضِهَا فَقَالَ سَعِيدٌ: أَنَا كُنْتُ آخُذُ مِنْ أَرْضِهَا شَيْئاً بَعْدَ الَّذِيْ سَمِعْتُ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ مَاذَا سَمِعْتَ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ؟ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ أَخَذَ شِبْراً مِنَ الْأَرْضِ ظُلْماً طُوِّقَهُ إِلَى سَبْعِ أَرْضِيْنَ. فَقَالَ لَهُ مَرْوَانُ: لَا أَسْأَلُكَ بَيِّنَةً بَعْدَ هٰذَا فَقَالَ سَعِيدٌ: أَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَتْ كَاذِبَةً فَأَعْمِ بَصَرَهَا وَاقْتُلْهَا فِيْ أَرْضِهَا. قَالَ: فَمَا مَاتَتْ حَتّٰى ذَهَبَ بَصَرُهَا وَبَيْنَمَا هِيَ تَمْشِيْ فِيْ أَرْضِهَا إِذْ وَقَعَتْ فِيْ حُفْرَةٍ فَمَاتَتْ۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ: عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ بِمَعْنَاهُ وَأَنَّهُ رَآهَا عَمْيَاءَ تَلْتَمِسُ الْجُدُرَ تَقُوْلُ أَصَابَتْنِيْ دَعْوَةُ سَعِيْدٍ وَأَنَّهَا مَرَّتْ عَلٰى بِئْرٍ فِي الدَّارِ الَّتِيْ خَاصَمَتْهُ فِيْهَا، فَوَقَعَتْ فِيْهَا، فَكَانَتْ قَبْرَهَا

تشریح:- حضرت عروہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں۔ یہ صحابی نہیں ہیں، ان کے بڑے بھائی عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ صحابی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے ہیں، انہی سے روایت ہے کہ حضرت سعید بن زید بن عمرو بن نفیل رضی اللہ عنہ (جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وہی چچازاد بھائی ہیں جن کے نکاح میں حضرت عمر کی بہن فاطمہ تھیں، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا مشہور واقعہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے قتل کے ارادہ سے چلے تھے، راستے میں کسی نے

پوچھا: کہاں جارہے ہو؟انہوں نے اپنے ارادہ کا اظہار کیا تو اس نے کہا: پہلے اپنے گھر کی تو خبر لو، تمہارے بہن اور بہنوئی اسلام لاچکے ہیں،وہ بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ یہی تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ واپس ہوئے،ان کے گھر گئے تو دروازہ اندر سے بند تھا، اور قرآنِ پاک کی تعلیم ہورہی تھی،حضرت خبیب یا حضرت خباب ان کو قرآنِ پاک سکھارہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دروازہ کھٹکھٹایا تووہ چھپ گئے۔قصہ معلوم ومشہور ہے۔ان کے خلاف اَروٰی بنت اَوس نے مروان بن حکم کے یہاں دعوی دائر کیا(جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مدینہ منورہ کے گورنر تھے)کہ انہوں نے میری زمین پر ناجائز قبضہ کرلیا ہے مروان نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ: یہ عورت آپ کے متعلق کیا کہہ رہی ہے؟حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا: اس سلسلہ میں حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد براہِ راست سننے کے بعد بھی بھلامَیں اس کی زمین لے سکتا ہوں ؟ مروان بن حکم نے پوچھا؟ آپ نے حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے ایسا کون سا ارشاد سنا ہے؟حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جو آدمی کسی کی ایک بالشت زمین ناجائز طریقہ سے لے گا تو اللہ تعالیٰ کل قیامت کے روز سات زمینوں تک کی ایک بالشت زمین اس کے گلے میں طوق بناکر ڈالیں گے۔یہ سن کر مروان بن حکم نے کہا: آپ کے اس بیان کے بعد میں آپ سے کوئی گواہ نہیں مانگتا(گویا اس نے اس مقدمہ کو خارج کردیا)اس کے بعد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے اللہ! یہ عورت جس نے میرے خلاف دعوی دائر کیا ہے، اگر جھوٹی ہے تو اس کی آنکھوں کو اندھا کردے،اور اس کو اسی زمین میں موت دے(یعنی وہی زمین اس کے لئے

موت کا سبب بن جائے)راوی عروہ بن زبیر کہتے ہیں : آخر موت آنے سے پہلے وہ اندھی ہو گئی اور اسی زمین میں چل رہی تھی کہ ایک گڑھے میں گری اور اس کی موت ہو گئی۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ: محمد بن زید بن عبد اللہ کہتے ہیں : میں نے اس عورت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ اندھی ہو چکی تھی اور دیواروں کا سہارا لے کر ٹٹول ٹٹول کر چلتی تھی، اور لوگوں سے کہا کرتی تھی: مجھے سعید بن زید کی بد دعا لگ گئی۔ جس زمین کے متعلق اس نے حضرت سعید بن زید کے خلاف دعوی دائر کیا تھا اس میں ایک گھڑا تھا، ایک مرتبہ وہاں سے گزر رہی تھی کہ اس میں گری اور وہی زمین اس کی قبر بن گئی۔

افادات:- یہاں پر بھی حضراتِ صحابہ کی اسی انصاف پسندی کا نمونہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ پہلے ہی سے جانتے تھے کہ وہ عورت جھوٹی ہے، انھوں نے ناجائز طریقہ سے اس کی زمین نہیں لی تھی، پھر بھی احتیاط کے طور پر کہہ رہے ہیں کہ اگر اپنے دعوے میں جھوٹی ہے تب ہی اس کے ساتھ ایسا کرنا۔

طوق بنا کر گلے میں ڈالنے کا مطلب کیا ہے؟ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو اندر دھنسا دیا جائے گا اور چاروں طرف زمین ہو گی، یہ ایک طرح کا طوق ہی ہو گیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ ایک بالشت زمین کی ساتوں تہہ تک جتنی مٹّی ہو گی اس کو طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا اور اس کو اُٹھانے پر مجبور کیا جائے گا۔

چھ ماہ بعد بھی لاش جوں کی توں

حدیث ۱۵۰۷:-

وعن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما، قَالَ: لَمَّا حَضَرَتْ أُحُدٌ دعَانِي أَبِي من اللَّيلِ فقَالَ: مَا أُرَانِي إِلاَّ مَقْتُولاً فی أوَّلِ مَنْ يُقتَلُ من أصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ، وإنِّي لاأَتْرُكُ بَعْدِي أَعَزَّ عَلَيَّ مِنْكَ غَيْرَ نَفْسِ رسول الله ﷺ، وإنَّ عَلَيَّ دَيْناً فَاقْضِ، وَاسْتَوْصِ بِأَخَوَاتِكَ خَيْراً. فَأَصْبَحْنَا. فَكَانَ أَوَّلَ قَتِيلٍ، وَدَفَنْتُ مَعَهُ آخَرَ فی قَبْرِهِ، ثُمَّ لَمْ تَطِبْ نَفْسِي أنْ أتْرُكَهُ مَعَ آخَرَ. فَاسْتَخْرَجْتُهُ بَعْدَ سِتَّةِ أشْهُرٍ، فإذا هُوَ كَيَوْمِ وَضَعْتُهُ غَيْرَ أُذُنِهِ، فَجَعَلْتُهُ فی قَبْرٍ عَلَى حِدَةٍ. (رواہ البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت جابر رضی اللہ عنہ ان صحابہ میں سے ہیں جن سے بکثرت حدیثیں کتبِ حدیث میں منقول ہیں، ان کے والد حضرت عبد اللہ بن حرام رضی اللہ عنہ بھی صحابی ہیں اور غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔ اور پہلے بھی کسی بات کے ضمن میں آپ کو بتلایا تھا کہ نبی کریم ﷺ جمعہ کے دن عصر کی نماز کے بعد مسجدِ نبوی سے اُحد کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں ایک جگہ پر قیام کیا، حضرت جابر رضی اللہ عنہ اسی موقعہ کا یہ قصہ بیان کرتے ہیں کہ رات کو ابا نے مجھے بلایا اور فرمایا: مَیں اپنے متعلق یہ سمجھتا ہوں کہ شروع لڑائی ہی میں نبی کریم ﷺ کے صحابہ میں سے جو لوگ شہید ہوں گے، مَیں بھی شاید انہیں میں شہید ہونے والا ہوں، اور مَیں اپنے پیچھے حضورِ اکرم ﷺ کی ذات کے علاوہ تم سے زیادہ محبوب کسی اور کو نہیں چھوڑ رہا ہوں (یعنی رسول اللہ ﷺ تو مجھے تم سے بھی زیادہ محبوب ہیں، ہاں! آپ ﷺ کے بعد میری نگاہوں میں تم سب سے زیادہ محبوب ہو) اور میرے اوپر کچھ قرضہ

ہے تم اس کو ادا کر دینا۔ اور اپنی بہنوں کے متعلق بھلائی کی وصیت قبول کرو (جیسا کہ پہلے بتلایا تھا کہ ان کی نو بہنیں تھیں، اور یہ اپنے ابا کے اکیلے لاڈلے بیٹے تھے، ان کے ابا کو یہ خیال ہوا کہ میں شہید ہونے والا ہوں تو ان کو تاکیداً وصیت فرمائی کہ اپنی بہنوں کا خیال رکھنا) حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب صبح ہوئی تو غزوۂ احد میں سب سے پہلے شہید ہونے والے میرے ابا ہی تھے (یعنی ابا کا خیال بالکل صحیح ثابت ہوا۔ گویا ان کو جو بات پیش آنے والی تھی اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ہی الہام ہو گیا تھا، یہ ان کی ایک کرامت تھی۔ اور چوں کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کو بہت زخم پہنچے تھے، اور ستر (۷۰) سے زیادہ مسلمان شہید ہوئے تھے، سب کے لئے الگ الگ قبر کھودنا مشکل تھا، اس لئے نبیٔ کریم ﷺ نے ایک ایک قبر میں دو دو، تین تین حضرات کو دفن کرنے کا حکم دیا تھا حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:) میرے ابّا کی قبر میں ایک اور ساتھی بھی دفن کئے گئے۔ ایک مدّت کے بعد میرے جی نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میرے ابا کی قبر میں کسی اور کو رہنے دوں (گویا میرے جی میں آیا کہ مستقل قبر کھود کر اپنے ابا کو الگ دفن کر دوں) چناں چہ چھ مہینے کے بعد میں نے اس قبر سے ابا کی لاش نکالی تو دفن کے وقت ان کی جو کیفیت تھی اس وقت بھی بعینہٖ اسی کیفیت میں تھے، سوائے کان کے کہ اس پر زمین کا ذرا سا اثر آ گیا تھا، چناں چہ علاحدہ قبر کھود کر میں نے دفن کر دیا۔ (گویا ان کی لاش کا چھ مہینہ کے بعد بھی جوں کا توں محفوظ رہنا ان کی ایک طرح کی کرامت تھی اسی مناسبت سے اس روایت کو یہاں ذکر کیا ہے)۔

غیبی لائٹ

حدیث ۱۵۰۸:-

وعن أنس -رضی اللہ عنہ-: أنَّ رجلین مِنْ أصحاب النَّبِيِّ ﷺ خَرَجَا مِنْ عِنْدِ النَّبِيِّ ﷺ فی لَيْلَةٍ مُظْلِمَةٍ، وَمَعَهُمَا مِثْلُ الْمِصْبَاحَيْنِ بَيْنَ أَيْدِيهِمَا. فَلَمَّا افْتَرَقَا، صَارَ مَعَ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا وَاحِدٌ حَتَّى أَتَى أَهْلَهُ. (رواهُ البُخاری مِنْ طُرُقٍ)

وفی بَعْضِهَا: أَنَّ الرَّجُلَيْنِ أُسَيْدُ بنُ حُضير، وَعَبَّادُ بنُ بِشْرٍ رضی اللہ عنہما۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں (کہ ایک مرتبہ صحابۂ کرام نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے) رات دیر گئے اندھیرے میں (جب وہ حضرات آپ کے پاس سے اپنے گھر جانے کے لیے روانہ ہوئے تو) دو صحابی (حضرت اُسید بن حضیر انصاری، اور حضرت عبّاد بن بشر مہاجری رضی اللہ عنہما بھی) اپنے گھر کی طرف لوٹے (اندھیری رات میں راستہ نظر آئے اس کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دونوں کے لئے یہ انتظام ہوا کہ) ان کے آگے آگے چراغ کی طرح سے دو روشنیاں پیدا کردی گئیں (ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے آگے دو چراغ جل رہے ہیں، چناں چہ) دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، جب دونوں کا راستہ الگ ہونے والا تھا تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک چراغ ہوگیا یہاں تک وہ اپنے گھر پہنچ گئے (اللہ تعالیٰ کی طرف سے اندھیری رات میں ان کو راستہ دکھلانے

کے لئے چراغ کا قدرتی طور پر پیدا ہو جانا ان دونوں حضرات کی کرامت تھی، اسی مناسبت سے یہاں ذکر کیا ہے)۔

تین صحابیوں کا واقعہ

حدیث ۱۵۰۹:-

وعن أَبِي هريرة -رضى الله عنه- قَالَ: بعث رسول الله ﷺ عَشَرَةَ رَهْطٍ عَيْناً سَرِيَّة، وأمَّرَ عَلَيْهَا عاصِمَ بنَ ثَابِتٍ الأَنْصَارِيَّ - رضى الله عنه -. فانطلقوا حَتَّى إِذَا كَانُوا بالهَدْأَةِ؛ بَيْنَ عُسْفَانَ وَمَكَّةَ؛ ذُكِرُوا لِحَيٍّ مِنْ هُذَيْلٍ يُقال لَهُمْ: بَنُو لحيان، فَنَفَرُوا لَهُمْ بِقَرِيبٍ مِنْ مِئَةِ رَجُلٍ رَامٍ، فَاقْتَصُّوا آثَارَهُمْ. فَلَمَّا أحَسَّ بِهِمْ عَاصِمٌ وأَصْحَابُهُ، لَجَأُوا إِلَى مَوْضِعٍ، فَأَحاطَ بِهِمُ القَوْمُ، فَقَالُوا: انْزِلُوا فَأَعْطُوا بِأَيْدِيكُمْ وَلَكُمُ العَهْدُ وَالمِيثَاقُ أَنْ لا نَقْتُلَ مِنْكُمْ أحداً. فَقَالَ عَاصِمُ بنُ ثَابِتٍ: أَيُّهَا القَوْمُ، أَمَّا أنا، فَلاَ أَنْزِلُ عَلَى ذِمَّةِ كَافِرٍ: اللَّهُمَّ أَخْبِرْ عَنَّا نَبِيَّكَ ﷺ، فَرَمُوهُمْ بِالنَّبلِ فَقَتلوا عَاصِماً. وَنَزَلَ إِلَيْهِمْ ثَلاَثَةُ نَفَرٍ عَلَى العَهْدِ والمِيثاقِ، مِنْهُمْ خُبَيْبٌ، وَزَيدُ بنُ الدَّثِنَةِ وَرَجُلٌ آخَرُ. فَلَمَّا اسْتَمْكَنُوا مِنْهُمْ أَطْلَقُوا أَوْتَارَ قِسِيِّهِمْ، فَرَبطُوهُمْ بِهَا. قَالَ الرَّجُلُ الثَّالِثُ: هَذَا أَوَّلُ الغَدْرِ، واللهِ لا أَصْحَبُكُمْ إنَّ لِي بِهؤُلاءِ أُسْوَةً، يُرِيدُ القَتْلَى، فَجَرُّوهُ وعَالَجُوهُ، فأبى أنْ يَصْحَبَهُمْ، فَقَتَلُوهُ. وانْطَلَقُوا بِخُبَيبٍ، وزَيْدِ بنِ الدَّثِنَةِ، حَتَّى بَاعُوهُما بِمَكَّةَ بَعْدَ وَقْعَةِ بَدْرٍ؛ فابْتَاعَ بَنُو الحارِثِ بن عامِرِ بنِ نَوْفَلِ بنِ عبدِ مَنَافٍ خُبيباً، وكان خُبَيْبٌ هُوَ قَتَلَ الحَارِثَ يَوْمَ بَدْرٍ.

فَلَبِثَ خُبَيْبٌ عِنْدَهُمْ أَسِيراً حَتَّى أَجْمَعُوا عَلَى قَتْلِهِ، فَاسْتَعَارَ مِنْ بَعْضِ بَنَاتِ الْحَارِثِ مُوسَى يَسْتَحِدُّ بِهَا فَأَعَارَتْهُ، فَدَرَجَ بُنَيٌّ لَهَا وَهِيَ غَافِلَةٌ حَتَّى أَتَاهُ، فَوَجَدَتْهُ مُجْلِسَهُ عَلَى فَخِذِهِ وَالْمُوسَى بِيَدِهِ، فَفَزِعَتْ فَزْعَةً عَرَفَهَا خُبَيْبٌ. فَقَالَ: أَتَخْشَيْنَ أَنْ أَقْتُلَهُ؟ مَا كُنْتُ لِأَفْعَلَ ذَلِكَ. قَالَت: وَاللهِ مَا رَأَيْتُ أَسِيراً خَيْراً مِنْ خُبَيْبٍ. فَوَاللهِ لَقَدْ وَجَدْتُهُ يَوْماً يَأْكُلُ قِطْفاً مِنْ عِنَبٍ فِي يَدِهِ وَإِنَّهُ لَمُوثَقٌ بِالْحَدِيدِ وَمَا بِمَكَّةَ مِنْ ثَمَرَةٍ، وَكَانَتْ تَقُولُ: إِنَّهُ لَرِزْقٌ رَزَقَهُ اللهُ خُبَيْباً. فَلَمَّا خَرَجُوا بِهِ مِنَ الْحَرَمِ لِيَقْتُلُوهُ فِي الْحِلِّ، قَالَ لَهُمْ خُبَيْبٌ: دَعُونِي أُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، فَتَرَكُوهُ، فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ فَقَالَ: وَاللهِ لَوْلَا أَنْ تَحْسَبُوا أَنَّ مَا بِي جَزَعٌ لَزِدْتُ: اللَّهُمَّ أَحْصِهِمْ عَدَداً، وَاقْتُلْهُمْ بِدَداً، وَلَا تُبْقِ مِنْهُمْ أَحَداً. وَقَالَ:

فَلَسْتُ أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِماً ❁ عَلَى أَيِّ جَنْبٍ كَانَ لِلهِ مَصْرَعِي

وَذَلِكَ فِي ذَاتِ الْإِلَهِ وَإِنْ يَشَأْ ❁ يُبَارِكْ عَلَى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

وَكَانَ خُبَيْبٌ هُوَ سَنَّ لِكُلِّ مُسْلِمٍ قُتِلَ صَبْراً الصَّلَاةَ. وَأَخْبَرَ- يعنی: النبیﷺ- أَصْحَابَهُ يَوْمَ أُصِيبُوا خَبَرَهُمْ.

وَبَعَثَ نَاسٌ مِنْ قُرَيْشٍ إِلَى عَاصِمِ بْنِ ثَابِتٍ حِينَ حُدِّثُوا أَنَّهُ قُتِلَ أَنْ يُؤْتَوْا بِشَيْءٍ مِنْهُ يُعْرَفُ، وَكَانَ قَتَلَ رَجُلاً مِنْ عُظَمَائِهِمْ، فَبَعَثَ اللهُ لِعَاصِمٍ مِثْلَ الظُّلَّةِ مِنَ الدَّبْرِ فَحَمَتْهُ مِنْ رُسُلِهِمْ، فَلَمْ يَقْدِرُوا أَنْ يَقْطَعُوا مِنْهُ شَيْئاً. (رواہ البخاری)

قولُهُ: ((الهَدْأَةُ)): مَوْضِعٌ، ((والظُّلَّةُ)): السَّحَابُ. ((والدَّبْرُ)): النَّحْلُ. وَقَوْلُهُ: ((اقْتُلْهُمْ بِدَداً)) بِكَسْرِ الباءِ وفتحِهَا، فَمَنْ كَسَرَ قَالَ هُوَ جمع بِدَّةٍ بكسر الباء وهى النصيب ومعناه: اقْتُلْهُمْ حِصَصاً مُنْقَسِمَةً لِكُلِّ واحِدٍ مِنْهُمْ نَصيبٌ، وَمَنْ فَتَحَ قَالَ معناهُ: مُتَفَرِّقِينَ فى القَتْلِ واحداً بَعْدَ واحِدٍ مِنَ التَّبْدِيدِ.

سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کے متعلق لکھا ہے کہ ماہِ صفر ۴ھ میں پیش آیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے دو قبیلے عضل اور قارہ کے کچھ لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے قبیلے کے لوگ اسلام لا چکے ہیں، ان کو قرآنِ پاک سکھانے اور اسلامی احکام کی تعلیم دینے کے لئے آپ اپنے صحابہ میں سے کچھ حضرات کو ہمارے ساتھ بھیجئے تاکہ وہ وہاں آکر ہمیں قرآنِ پاک سکھائیں اور اسلامی احکام سے واقف کریں۔ ان کی درخواست پر نبی کریم ﷺ نے دس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کی سرکردگی اور امارت میں بھیجا، اس سے دو کام مقصود تھے، ایک تو ان لوگوں کی تعلیم مقصود تھی، اور دوسرے یہ کہ قریش کے حالات کی خبر بھی ملتی رہے گی۔ لیکن ان قبیلے والوں کا مقصد تو مسلمانوں کو دھوکا دینا تھا، اور اس بہانہ سے حضورِ اکرم ﷺ کے صحابہ میں سے چند لوگوں کو اپنے یہاں لے جاکر قتل کرنا تھا، اسی واقعہ کو اس روایت میں بیان کیا ہے۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو قریش کا حال اور خبریں معلوم کرنے کے لئے روانہ کیا اور ان کا امیر حضرت عاصم بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو بنایا، چناں چہ یہ حضرات مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے اور جب مقامِ ھَدْاَہ -جو عُسفان اور مکہ مکرمہ کے درمیان میں واقع ہے- پہنچے تو انہیں لوگوں نے ہذیل کی ایک شاخ بنو لحیان کو اُکسایا (کہ دیکھو! مدینہ منورہ سے مسلمانوں کی ایک جماعت آرہی ہے، ان کو گرفتار کرکے مکہ والوں سے کچھ رقم حاصل کرنے کا بڑا اچھا موقعہ ہے۔ اس لئے کہ مکہ والے مسلمانوں کے دشمن تھے، اگر ان کا کوئی بھی آدمی مکہ والوں کو مل جاتا تو وہ خریدنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس طرح انہوں نے قبیلۂ بنو لحیان کو وَرغلایا اور اس بات پر آمادہ کیا) چناں چہ ان کے دوسو آدمی -جن میں سو تو مشّاق تیر انداز تھے- مسلمانوں کا پیچھا کرنے کے لئے نکلے، اور ان کے چلنے کے آثار کو دیکھ دیکھ کر ان کی جستجو اور تلاش میں آگے بڑھے۔ حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں نے محسوس کیا (کہ کچھ لوگ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں اور ہمیں گرفتار کرنا چاہتے ہیں) تو یہ سب ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے، ان دوسو آدمیوں نے اس ٹیلے کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور ان سے کہا: تم لوگ نیچے آجاؤ، ہم تم سے وعدہ اور عہد و پیمان کرتے ہیں کہ تم میں سے کسی کو قتل نہیں کریں گے۔ حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: میں تو (ان کا مقابلہ کرتے ہوئے جان دینا پسند کرتا ہوں لیکن) کسی کافر کی امان میں جانا پسند نہیں کرتا (اور وہ حضرات ایسی جگہ میں ان حالات کے اندر گرفتار تھے کہ اب پتہ نہیں وہ زندہ رہیں گے یا مقابلہ میں مارے جائیں گے، اور پھر ان کی کوئی اطلاع مدینہ منورہ پہنچے گی یا نہیں، اس لیے کہ خبر پہنچانے والا تو کوئی تھا ہی نہیں) اس لیے انہوں نے دعا کی: اے اللہ! ہماری حالت

کی خبر حضورِ اکرم ﷺ کو کردینا (اور دوسری دعا یہ کی کہ: اے اللہ !میں تیرے دین کی حفاظت کے لئے کوشش کررہاہوں ،اب تومیرے جسم کی حفاظت کیجیو۔یہ دعاکرنے کے بعد حضرت عاصم نے نیچے اترنے سے انکار کردیااور) مقابلہ شروع کیا،ادھر سے ان تیر اندازوں نے ان پر تیر برسائے اور وہ شہید ہوگئے۔

مکھیوں کے جھنڈ اور سیلاب سے نعش کی حفاظت

(روایتوں میں آتا ہے کہ ان کی دونوں دعائیں قبول ہوئیں ،پہلی تو اس طرح سے کہ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی نبی ٔکریم ﷺ کو ان کے حالات سے آگاہ کردیا۔اوران کی لاش کی بھی اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی، جس کاقصہ یہ ہوا کہ دراصل حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ نے غزوۂ احد میں قریش کے کئی آدمیوں کو قتل کیا تھا،ان میں قریش کی ایک عورت سلافہ بنت سعد کے دو بیٹوں کو بھی قتل کیا تھا۔لہٰذا اس عورت نے اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی آدمی عاصم بن ثابت کی لاش یا کھوپڑی لاکر دے گا؛ تومَیں انعام میں اس کو سو اونٹ دوں گی۔اوراس نے قسم کھائی تھی کہ میں ان کی کھوپڑی میں شراب پیوں گی۔ جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ شہید ہوگئے ہیں تو سو اونٹ کی لالچ میں ان کی لاش کا سر کاٹنے کے لئے کچھ لوگ مکہ مکرمہ سے نکلے،جب وہاں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی لاش کی حفاظت کے لئے شہد کی مکھیوں کا پورا ایک جُھنڈ بھیج دیا جو کسی کو بھی لاش کے قریب

آنے نہیں دیتا تھا۔ ان لوگوں نے سوچا کہ رات کو اندھیرے میں جب یہ مکھیاں چلی جائیں گی تو ہم سر کاٹ لیں گے، لیکن رات کا اندھیرا ہو اس سے پہلے ہی بارش شروع ہوئی اور پانی اتنا آیا کہ ان کی لاش کو بہا کر لے گیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی لاش کی حفاظت فرمائی۔ یہ تو حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کا پورا قصہ ہوا۔

اور ان میں سے جب بھی کوئی شہید ہوتا تو وہ لوگ دوسرے کو پیش کش کرتے کہ دیکھو! ابھی بھی نیچے آجاؤ، تمہاری جان بچ جائے گی، لیکن انہوں نے مقابلہ کیا یہاں تک کہ ان میں سے سات صحابہ تو شہید ہو گئے، اس لیے کہ وہ دو سو آدمی تھے اور ان میں بھی سو تو بڑے مشّاق تیر انداز تھے، اور تین زندہ بچ گئے تو انہوں نے پھر سمجھایا کہ اب تو تم تین ہی بچ گئے ہو، تم ہمارا مقابلہ تو نہیں کر سکتے، نیچے آجاؤ، ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں قتل نہیں کریں گے۔ چناں چہ ان کے کہنے پر جو) تین باقی رہ گئے تھے وہ نیچے اتر آئے، ان میں ایک حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ، دوسرے حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ اور تیسرے عبد اللہ بن طارق رضی اللہ عنہ تھے۔ جب انہوں نے ان پر قبضہ کر کے اپنی تحویل میں لے لیا اور ان کی کمانیں کھول کر ان کی تانت سے ان کی مشکیں باندھنا شروع کیں تو یہ منظر دیکھ کر ان تین میں سے ایک عبد اللہ بن طارق رضی اللہ عنہ نے کہا: (جب تم نے ہمیں امان دیدی اور وعدہ کر لیا کہ تم ہمیں قتل نہیں کروگے تو پھر ڈوریوں سے ہمارے بازوؤں

کو باندھنے کا کیا مطلب ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری نیتوں میں خیر نہیں ہے) اس لیے مَیں تمہارے ساتھ آنے کے لئے تیار نہیں ہوں ، مَیں بھی اسی راہ (شہادت) کو پسند کرتا ہوں جو میرے دیگر سات ساتھیوں نے پسند کی، چناں چہ ان لوگوں نے ان کو زبردستی کھینچ کر اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے انکار کیا تو ان کو وہیں قتل کر دیا۔

اب دو صحابی یعنی حضرت خبیب اور حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہما رہ گئے، چناں چہ وہ لوگ ان دونوں کو مکہ مکرمہ لے گئے (چوں کہ ان لوگوں کو معلوم تھا کہ مکہ والے ان دونوں کو بڑی قیمت دے کر خرید لیں گے، انہوں نے ان کو پیسے کے لالچ ہی میں قید کیا تھا) چناں چہ ان دونوں کو مکہ مکرمہ میں بیچ دیا۔ یہ قصہ غزوۂ بدر کے بعد کا ہے۔

اطمینان رکھو؛ مَیں ایسا نہیں کروں گا

حارث بن عامر ایک قریشی آدمی تھا جو غزوۂ بدر میں مارا گیا تھا جس کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ ہی نے قتل کیا تھا، اس لیے اس کے بیٹوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو خرید لیا کہ ان کو باپ کے بدلہ میں قتل کریں گے، لیکن ان لوگوں نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو

خریدنے کے بعد فوراً قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اپنے یہاں کچھ دنوں تک قید رکھا۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس وقت حرمت والے مہینے چل رہے تھے، ان کے ختم ہونے کا انتظار کیا۔ یہاں تک کہ ایک دن حارث بن عامر کے گھر والوں نے فیصلہ کرلیا کہ آئندہ کل ان کو قتل کرنا ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو بھی یقین ہو گیا کہ آئندہ کل یہ لوگ مجھے قتل کرنے والے ہیں تو حارث بن عامر کے گھر میں جہاں وہ قید تھے وہیں انہوں نے ان کی ایک لڑکی سے اُسترہ مانگا، ان کا مقصد یہ تھا کہ زیرِ ناف وغیرہ کی صفائی کرلیں (اس سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ کسی آدمی کو جب کسی بھی طریقہ سے اپنی موت واقع ہونے کا یقین ہو جائے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ نہا دھولے اور اپنے زیرِ ناف اور بغل وغیرہ کی صفائی کرلے) اس لڑکی نے ان کو استرہ دیدیا (اور وہ اپنے کام میں لگ گئی) اسی درمیان اس کا ڈیڑھ دو سال کا چھوٹا سا بچّہ جو ابھی نیا نیا چلنا سیکھا تھا، وہ کھیلتے کھیلتے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچ گیا (حضرت خبیب رضی اللہ عنہ بیڑیوں میں بندھے ہوئے تھے، جب بچّہ قریب پہنچا تو) حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی ران پر بٹھالیا (وہ عورت اپنے کام میں مشغول تھی، اس کو پتہ ہی نہیں چلا کہ میرا بچّہ ان کے پاس پہنچ گیا ہے) اچانک جب اس کی نظر پڑی اور دیکھا کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے اس کے بچّے کو اپنی ران پر بٹھا رکھا ہے اور دوسرے ہاتھ میں استرہ ہے، یہ منظر دیکھ کر وہ ایک دم سہم گئی (ظاہر ہے

کہ وہ لوگ دوسرے روز حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے والے تھے، ان کو تو انتقام لینے کا اس سے اچھا موقعہ اور کہاں مل سکتا تھا، اس لیے وہ یہ سمجھی کہ اب تو ضرور کچھ نہ کچھ ہو گا، اس لئے دیکھتے ہی اس کے ہوش و حواس اُڑ گئے) اس کی گھبراہٹ کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے بھی محسوس کیا تو فرمایا کہ کیا تجھے یہ ڈر ہے کہ میں اس بچّے کو قتل کر دوں گا؟ تم اطمینان رکھو میں ایسا نہیں کروں گا (اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میدانِ جنگ میں بھی عورتوں، بوڑھوں اور بچّوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کو جب کافروں نے قید کیا ہو، اور اس کو یقین ہو جائے کہ وہ اس کو مار ڈالنے والے ہیں، ایسی حالت میں اس کے قبضے میں ان کا کوئی بچّہ یا اور کوئی فرد آ جائے تو اس کو چھیڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ چناں چہ انہوں نے بچّے کو کچھ نہیں کیا، کچھ دیر کھیل لگا کر چھوڑ دیا، حالاں کہ ان کو یقین تھا کہ یہ لوگ مجھے قتل کرنے والے ہیں، اگر انتقامی طور پر وہ کچھ کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے۔ بعد میں وہ عورت اسلام لے آئی) وہ بیان کرتی ہے کہ: اللہ کی قسم! خبیب سے اچھا قیدی میں نے نہیں دیکھا (اس سے زیادہ ان کے اخلاق اور کیا ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے ایسی حالت میں بھی کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی)۔

بے موسم پھل؛ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت

(پھر وہی عورت حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ بیان کرتی ہے کہ) ایک دن میں نے خبیب کے ہاتھ میں انگور کا ایک خوشہ دیکھا جس کو وہ کھا رہے تھے حالاں کہ وہ گھر کے ایک کونہ میں بیڑیوں میں بندھے ہوئے پڑے تھے، مزید برآں مکّے بازار میں بھی اس وقت وہ پھل نہیں ملتے تھے (اور اگر بازار میں مل رہے ہوتے تب بھی وہ تو بیڑیوں میں بندھے ہوئے تھے، ان کو انگور لا کر کون دیتا) وہ عورت کہا کرتی تھی: دراصل وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا ہوا رزق تھا جو خبیب کو کھلایا گیا تھا (یہاں تو اس قصہ کو لانے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں بے موسم پھل حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہونا ان کی کرامت تھی، اور اس باب کے شروع میں جو آیتیں پیش کی تھیں ان میں حضرت مریم علیہا السلام کا قصہ بتلایا تھا کہ حضرت زکریا علیہ السلام جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ ان کے پاس پھل رکھے ہوئے ہیں، حالاں کہ اس وقت وہ پھل بازار میں نہیں تھے۔ حضرت مریم علیہا السلام نبی نہیں تھیں، اور نبی کے علاوہ کسی صالح انسان سے خلافِ معمول کوئی بات صادر ہو؛ اسی کو کرامت کہتے ہیں اور کرامت کا تذکرہ قرآنِ پاک میں ہے۔ تو جیسے وہ حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت تھی ایسے ہی یہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی کرامت ہے)۔

مجھے کوئی پرواہ نہیں

خیر! دوسرے روز جب وہ لوگ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو حرم کے باہر لے گئے تاکہ ان کو قتل کریں تو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: مجھے موقعہ دو کہ میں دو رکعات نماز پڑھ لوں۔ ان لوگوں نے کہا: ٹھیک ہے پڑھ لو۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے دو رکعات ادا کیں، اس کے بعد کہا: اللہ کی قسم! اگر تم لوگ یہ گمان نہ کرتے کہ میں گھبرا گیا ہوں تو اور زیادہ نماز پڑھتا۔ پھر انہوں نے دعا فرمائی: اے اللہ! تو ان میں سے ایک ایک کو پکڑیو، اور ہر ایک کو الگ الگ ماریو، کسی کو مت چھوڑیو (چناں چہ ان کی یہ دعا قبول ہوئی، بعد ان میں سے کوئی نہیں بچا) اور انہوں نے یہ اشعار بھی پڑھے:-

فَلَسْتُ أُبَالِي حِيْنَ أُقْتَلُ مُسْلِماً ✿ عَلَى أَيِّ جَنْبٍ كَانَ لِلّٰهِ مَصْرَعِي

وَذٰلِكَ فِيْ ذَاتِ الْإِلٰهِ وَإِنْ يَشَأْ ✿ يُبَارِكْ عَلَى أَوْصَالِ شِلْوٍ مُمَزَّعِ

جب مَیں اسلام کی حالت میں قتل کیا جارہا ہوں تو مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کون سے پہلو پر اللہ کے واسطے میری جان جارہی ہے۔ یہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا ہے وہ اللہ کے واسطے ہو رہا ہے، اور اگر اللہ چاہے تو میرے جسم کے کٹے ہوئے ٹکڑوں میں بھی برکت پیدا کرسکتا ہے۔

راوی کہتے ہیں کہ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ پہلے وہ آدمی ہیں جنہوں نے ہر مسلمان کے لئے جو اس طرح گرفتار کرکے قتل کیا جائے نماز کا طریقہ جاری کیا (جب حضورِ اکرم ﷺ کے علم میں یہ واقعہ آیا تو آپ نے اس بات کو برقرار رکھا، اس لیے یہ ایک سنّت بھی ہے۔ لہٰذا اگر کسی کو دشمن گرفتار کرکے مارڈالنا چاہتے ہوں اور اس کو موقعہ ملے، یا دشمن ہی اس کو پوچھیں کہ بتا! تیری آخری خواہش کیا ہے؟ تو وہ یوں کہہ دے کہ میں دو رکعات نماز پڑھنا چاہتا ہوں۔ ایک مسلمان کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے)۔

”یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن“ کی برکت

روض الانف میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ایک قصہ لکھا ہے جو نبیِ کریم ﷺ کے منھ بولے بیٹے اور آپ کے لاڈلے تھے۔ ایک مرتبہ وہ طائف سے آرہے تھے، انہوں نے ایک خچر کرائے پر لیا، خچر والا راستہ میں ان کو ایک انجان جگہ پر لے گیا، جہاں انہوں نے دیکھا کہ کئی لوگ مرے پڑے ہیں۔ اس خچر والے نے فوراً اپنا نیزہ نکالا اور ان کو مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ یہ تو مجھے قتل کردے گا تو انہوں نے اس سے کہا: مجھے دو رکعات نماز پڑھنے کا موقعہ دے۔ اس نے کہا: یہ جتنے مردے پڑے

ہوئے ہیں ان سب نے دو رکعات نماز پڑھنے کی اجازت مانگی تھی، لیکن دو رکعات سے ان کا کوئی کام نہیں بنا۔ چلو! تم بھی جلدی سے پڑھ لو۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے دو رکعات نماز ادا کی اور اس کے بعد کہا: ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' تو غیب سے آواز سنائی دی: ''لَا تَقْتُلُوْہُ'' ان کو مار یو مت وہ آدمی گھبرا گیا، اِدھر اُدھر دیکھنے لگا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر وہ نیزہ لے کر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے پھر کہا: ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' پھر غیب سے وہی آواز آئی، پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی نہیں دکھا، پھر وہ آگے بڑھنا چاہتا ہی تھا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے تیسری مرتبہ ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' کہا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سوار نیزہ لے کر آیا، جس کے سرے پر آگ کا ایک شعلہ نکل رہا تھا، اس سوار نے خچر والے کو ختم کر دیا۔ پھر کہا: مَیں ایک فرشتہ ہوں جب آپ نے پہلی مرتبہ ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' کہا، تو مَیں ساتویں آسمان پر تھا، جب دوسری مرتبہ ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' کہا، تو میں پہلے آسمان پر آگیا تھا، اور آپ نے جب تیسری مرتبہ ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' کہا؛ تو میں یہاں پہنچ گیا۔ اسی موقعہ پر ایک روایت بھی ذکر کی ہے کہ جب کوئی آدمی مصیبت میں تین مرتبہ ''یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو یہ کہتا ہے کہ ''اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْن'' تیری طرف متوجہ ہے، مانگ کیا مانگتا ہے؟

چہرہ بسوئے قبلہ

جس دن حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو سولی دی گئی اسی دن حضورِ اکرم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو جب شہید کیا جانے لگا تو انہوں نے چاہا کہ ان کا چہرہ قبلے کی طرف ہو، لیکن ان لوگوں نے چہرہ قبلے کی طرف نہیں کیا، جب سولی دیدی گئی تو ان کا چہرہ خود بخود قبلے کی طرف ہو گیا، ان لوگوں نے چہرے کو قبلہ سے پھیر دیا تو دوبارہ قبلہ کی طرف ہو گیا، وہ لوگ بار بار قبلہ کی طرف سے پھیرتے تھے اور ان کا چہرہ خود بخود قبلے کی طرف ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ عاجز آکر ان لوگوں نے اسی حال میں چھوڑ دیا۔

لاش کو زمین نے اندر لے لیا

پھر ان کی لاش کی حفاظت کے لئے مکہ والوں نے چالیس آدمی مقرر کئے جو دن رات پہرہ دیتے تھے، تاکہ مسلمان آکر ان کی لاش نہ لے جائیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش لینے کے لئے مدینہ منورہ سے دو صحابہ حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہما کو بھیجا، یہ دونوں بڑے بہادر اور بہت عمدہ گھوڑے سوار تھے۔ وہ دونوں

حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش لینے کے لئے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ آئے۔ جس وقت وہ پہنچے تورات ہوچکی تھی اور چالیس دن گزر چکے تھے پھر بھی لاش جوں کی توں تھی اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اور جو چالیس آدمی ان کی نگرانی کے لئے مقرر تھے وہ سب سو رہے تھے۔ ان لوگوں نے بڑے اطمینان سے لاش اتاری، گھوڑے پر رکھی اور وہاں سے روانہ ہوگئے۔ جب ان لوگوں کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ لاش نہیں ہے تو وہ سب گھوڑے لے کر فوراً تلاش میں نکلے، یہ دونوں جارہے تھے ان کا پیچھا کیا، جب ان دونوں نے دیکھا کہ ہم پکڑے جائیں گے تو لاش کو زمین پر رکھ دیا، جیسے ہی لاش کو زمین پر رکھا گیا کہ فوراً زمین پھٹی اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش اندر چلی گئی، اور زمین برابر ہوگئی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کی لاش پر ان کافروں کو قدرت نہیں دی۔ یہ قصہ تو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کی لاش کا ہوا۔

حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کا قصہ

اب اس روایت میں حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ نہیں ہے کہ ان کا کیا ہوا؛ وہ بھی مَیں بتادیتا ہوں ۔ حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو صفوان بن اُمیہ نے خریدا، چوں کہ

صفوان کا باپ امیہ غزوۂ بدر میں مارا گیا تھا، اسی کے انتقام کے لئے اس نے حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ کو خریدا تھا کہ میں اپنے باپ کے بدلہ میں ان کو قتل کروں گا ان کو خریدنے کے بعد اس نے دیر لگانا مناسب نہیں سمجھا، اس لیے دوسرے ہی دن ان کو قتل کرنے کے لیے نستاس نامی اپنے غلام کے ساتھ حرم کے باہر مقامِ تنعیم میں جہاں لوگ عمرہ کے لئے جاتے ہیں اور حرم کے باہر کی سب سے قریبی جگہ وہی ہے۔ بھیج دیا، اس لیے کہ حرم میں قتل کرنے کو وہ لوگ بھی برا سمجھتے تھے۔ جب وہ قتل کے لئے لے جائے گئے اور مکہ والوں کو پتہ چلا تو وہ بھی تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے۔ ان کی قتل کی تیاری ہو رہی تھی تو تماشہ دیکھنے والوں میں ابوسفیان بھی تھے جو اس وقت تک اسلام لائے نہیں تھے اور مکہ والوں کے سردار تھے، انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے پوچھا: اے زید !سچ سچ بتلاؤ! آج اگر ہم تمہیں چھوڑ دیں اور تم اپنے گھر میں سلامت پہنچ جاؤ؛ اور تمہاری جگہ پر (حضرت) محمد (صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم) کو قتل کر دیا جائے (نعوذ باللہ منہ)؛ تو کیا تمہیں یہ گوارا ہے؟ جواب میں حضرت زید بن دثنہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم! حضورِ پاک صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا قتل ہونا تو دُور کی بات رہی، آپ کو اپنی جگہ پر رہتے ہوئے ایک کانٹا بھی لگ جائے اور مَیں اپنے گھر میں سلامت رہوں ؛ یہ بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ سن کر ابوسفیان نے کہا: مَیں نے آج تک کبھی کسی کو کسی کے ساتھ ایسا

محبت کرنے والا نہیں دیکھا جیسا محمد (ﷺ) کے رفقاء اور ساتھیوں کو ان سے محبت کرتے دیکھا۔ خیر! پھر ان کو شہید کر دیا گیا۔

وہ بے نیاز ذات ہے

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ کے اپنے بندوں کے ساتھ معاملات بھی بڑے عجیب وغریب ہیں ، ایک طرف تو دشمنوں کو ان کے قتل کرنے کا موقعہ دیتے ہیں ،اور دوسری طرف ان کے جسم کی اس طرح حفاظت بھی کرتے ہیں ۔ جیسے: حضرت زکریا علیہ السلام کو قتل کرنے کے لئے بنی اسرائیل پیچھے دوڑے تو وہ بھاگے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ کہیں پناہ نہیں مل رہی تھی، ایک درخت کے قریب پہنچے تو وہ پھٹا اور حضرت زکریا علیہ السلام اس کے اندر داخل ہو گئے تو وہ درخت پھر سے جُڑ گیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو درخت کے اندر چھپا لیا، لیکن ان کے کپڑے کا کچھ حصہ درخت کے باہر رہ گیا۔ وہ لوگ جب ان کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ اسی درخت میں چھپے ہوئے ہیں ، تو وہ لوگ آرہ لے کر آئے اور اس درخت کو اوپر سے چیرنا شروع کیا، جب آرہ ان کے سر کے قریب پہنچا اور انہوں نے آہ کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ

آہ مت کرنا، اگر آہ بھی کروگے تو ہم ان سب لوگوں کو ہلاک کردیں گے۔ یہاں بھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: دیکھو! ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے حفاظت کا انتظام کیا اور دوسری طرف ان لوگوں نے چیرنا چاہا تو آہ کرنے کی بھی اجازت نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بے نیاز ہے، اپنے بندوں کے ساتھ جس طرح چاہے پیش آئے۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ایک طرف تو دشمن کو موقعہ دیا کہ ان کو قتل کردیں، اور جب قتل ہوگئے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایسی آفتیں بھیجیں کہ ان کے قاتلوں میں سے ایک بھی نہیں بچا، سب کی موت بڑی عبرتناک ہوئی۔

بہر حال! اس قصہ میں کئی کرامتیں ظاہر ہوئیں، اسی لئے اس کو یہاں ذکر کیا ہے علّامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اولیاء اللہ کی کرامتوں کے سلسلہ میں بہت ساری حدیثیں ہیں، اس کتاب میں پہلے بھی کچھ روایتیں گزری ہیں، جیسے: ایک غلام کا قصہ گزرا جس کے ماں باپ نے جادوگر کے پاس جادو سیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا، وہ جادو سیکھنے کے لئے جاتا تھا، راستہ میں ایک راہب ملتا تھا۔ (پورا قصہ حدیث کے اصلاحی مضامین: ۱/ ۲۶۷ تا ۲۷۳ پر ہے) وہ بھی اس کی کرامت ہی تھی۔ اور بھی کئی قصے اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی کرامت

حدیث ۱۵۱۰:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: مَا سَمِعْتُ عمر رضی اللہ عنہ يقولُ لِشَيءٍ قَطُّ: إِنِّي لَأَظُنُّهُ كَذَا، إِلَّا كَانَ كَمَا يَظُنُّ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے ابا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب بھی کسی چیز کے متعلق یہ فرماتے ہوئے سنا کہ میرا خیال ہے کہ معاملہ ایسا ہے؛ تو وہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

افادات:- یعنی جو حقیقت ہوتی تھی وہی بات اللہ تعالیٰ ان کے دل میں ڈالتے تھے۔ پہلے بھی ایک روایت گزر چکی ہے کہ حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ: حضرت عمر میری امّت کے ان لوگوں میں سے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام ہوتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک طرح کی کرامت ہی ہے، اس لئے یہاں پر ذکر کیا ہے۔

كِتَابُ الأُمُوْرِ الْمَنْهِى عَنْهَا

بَابُ تَحْرِيْمِ الْغِيْبَةِ وَالْأَمْرِ بِحِفْظِ اللِّسَان

غیبت کی حرمت اور زبان کی حفاظت

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَنَشْهَدُ أَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ، صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْماً كَثِيْراً كَثِيْراً .

أما بعد:-

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيْهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوْهُ ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَحِيْمٌ﴾ (سورة الحجرات)

وقال تَعَالٰى : وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً. (سورة الإسراء)

وقال تَعَالٰى: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (سورة ق)

تمام گناہوں سے بچنا نہایت ضروری ہے

شریعت نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے ان کو گناہ کہتے ہیں اور اپنے آپ کو ان تمام گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرنا نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی آدمی نوافل کا زیادہ اہتمام نہیں کرتا لیکن اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہوں سے بچانے کا اہتمام کرتا ہے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ بہت اہم اور ضروری کام انجام دے رہا ہے، اس لیے کہ کوئی آدمی اگر نفل کام کرلے تو اس سے اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں اور اس کو اجر و ثواب ملتا ہے، اور اگر کوئی بھی نفل کام نہیں کرتا تو اس پر اس کو کوئی گناہ نہیں ہوتا اور اس کی پکڑ نہیں، اس کے مقابلہ میں کوئی آدمی اگر گناہ کا کام کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتے ہیں اور اس پر عذاب دیا جاتا ہے؛ اس لیے گناہوں سے اپنی حفاظت کرنا بہت ضروری ہے اور بہت اہمیت کا حامل ہے۔ ہم لوگ نوافل اور نیک کاموں کا جتنا زیادہ اہتمام کرتے ہیں، اتنا اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام نہیں کرتے؛ حالاں کہ یہ اس کے مقابلہ میں زیادہ ضروری ہے۔ چناں چہ علّامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ یہاں سے مستقل سلسلہ شروع کررہے ہیں جس میں گناہوں کو الگ الگ عنوان قائم کرکے بتلانا چاہتے ہیں، اور اس میں سب سے پہلا عنوان قائم کیا ہے: ”غیبت کا حرام ہونا، اور زبان کی حفاظت کا حکم“۔

کوئی کسی کی غیبت نہ کرے

"غیبت" ایک ایسا گناہ ہے جو ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں کثرت سے پایا جاتا ہے، حالاں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اپنے ارشادات میں اس سے بچنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ چناں چہ علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے اس سلسلہ میں آیاتِ قرآنیہ کا ایک نمونہ پیش کیا ہے:

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضاً أَيُحِبُّ أَحَدُكُمْ أَنْ يَأْكُلَ لَحْمَ أَخِيهِ مَيْتاً فَكَرِهْتُمُوهُ، وَاتَّقُوا اللهَ، إِنَّ اللهَ تَوَّابٌ رَحِيمٌ﴾ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے، کیا تم میں سے کوئی آدمی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم ناپسند کرتے ہو (کوئی بھی اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؛ تو پھر غیبت کیوں کرتے ہو؟ یہ بھی تو ایک طرح سے مردار بھائی کا گوشت کھانا ہی ہے) اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ بندوں کی توبہ کو بہت زیادہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

غیبت کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے تو یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ ترمذی شریف، ابوداود شریف وغیرہ کتابوں میں روایت موجود ہے، نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے پوچھا گیا: غیبت

کس کو کہتے ہیں ؟ تو آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ”ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ“ تمہارا اپنے بھائی کا ایسے انداز سے تذکرہ کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو۔ یعنی تم اپنے کسی بھائی کے حالات کا تذکرہ کرو، جو اس کی ذات سے، یا اعمال سے، یا اقوال سے تعلق رکھنے والے ہوں، جن چیزوں کو بھی اس کے ساتھ کوئی تعلق ہے ان کا تذکرہ ایسے انداز سے کرنا جو اس کو ناپسند ہو؛ یہ غیبت میں داخل ہے۔ یہاں تک کہ اگر کسی کی سواری کا بھی تذکرہ کیا، جیسے اس کی موٹر سائیکل یا کسی سواری کی برائی بیان کی کہ بڑی بیکار ہے؛ تو یہ بھی غیبت میں شمار کیا جائے گا اس لیے کہ اس کو یہ بھی پسند نہیں آتا۔ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! میں اپنے بھائی کی جن چیزوں کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ اگر اس میں موجود ہوں تب بھی غیبت ہے؟ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: تب ہی تو غیبت ہے، اگر وہ چیز اس میں موجود نہیں ہے تو پھر وہ غیبت نہیں بلکہ بہتان ہے۔

یہ انداز بڑا خطرناک ہے

علّامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے غیبت کے بیان میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ کسی کی غیبت کرتے ہیں اور ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ تم غیبت کر رہے ہو، تو وہ جواب میں بڑی جرأت کے ساتھ کہتے ہیں: مولوی صاحب! میں جو کہہ رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے (اس میں یہ باتیں موجود ہیں) اور میں تو اس کے سامنے بھی کہہ سکتا ہوں، مجھے اس کے

سامنے کہنے میں کوئی ڈر اور باک نہیں ہے۔ علّامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا ایسے انداز سے یہ جملہ کہنا بڑا خطرناک ہے کہ مَیں اس کے سامنے بھی کہہ سکتا ہوں اور مَیں جو باتیں بتلا رہا ہوں وہ اس میں موجود ہیں، اس طرح کہہ کر گویا وہ سامنے والے کو یہ تأثر دینا چاہتا ہے کہ میری حرکت بالکل درست ہے، اور میں اس کی جو برائی بیان کر رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے۔ تو اس طرح کہہ کر کیا وہ اس چیز کو جائز قرار دینا چاہتا ہے جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ پاک میں اور نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے احادیث میں حرام بتلایا ہے؟ اسی لئے بعض علماء نے اس جملہ کو کفریات میں شمار کیا ہے، لہٰذا اس سے بچنے کی سخت ضرورت ہے، یہ انداز بڑا خطرناک ہے۔ آدمی کو جب اس کی غلطی پر ٹوکا جائے تو اس کو اپنی غلطی کو تسلیم کر لینا چاہیے، اپنی غلطی کو درست قرار دینے کے لئے دلیل وحجّت کرنا بڑا خطرناک ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنے بھائی کا تذکرہ ایسے انداز سے کرنا جو اس کو ناگوار ہو؛ اسی کو غیبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور وہ برائی اس میں موجود ہے تب ہی تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ برائی اس میں موجود نہیں ہے تو اس صورت میں تو بہتان ہوگا، اور اس میں دوہرا (ڈبل) گناہ ہوگا۔ یہ غیبت کی حقیقت ہے اور اس سے بڑی سختی سے منع کیا گیا ہے۔

غیبت کی شناعت وقباحت

اور قرآنِ پاک کی جو آیت اوپر پیش کی ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے غیبت کی شناعت وقباحت اور برائی کو ایک عجیب مثال دے کر بتلایا ہے: ”کیا تم میں سے کوئی بھی آدمی یہ گوارا کرے گا کہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے؟ اس کو تو تم گوارا نہیں کرتے“ گویا غیبت کرنے کو مردار بھائی کے گوشت سے تعبیر کیا ہے۔

ایک تو یہ ہے کہ کسی کے سامنے ہی آپ اس کے عیوب بیان کریں؛ تو یہ بھی گناہ ہے؛ یہ ”لَمز“ میں داخل ہے جس پر قرآنِ پاک میں وعید آئی ہے: ﴿وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ﴾ کسی کے سامنے اس کے عیوب کو کھولنا ایسا ہی ہے جیسے کسی زندہ آدمی کا گوشت نوچنا۔ اور کسی کی غیر حاضری میں اس کی برائیوں کو بیان کرنا ایسا ہے جیسے اس کی لاش کا گوشت نوچنا۔ اس لیے کہ کسی کے سامنے اس کی برائی بیان کرنے میں تو اس کی طرف سے مدافعت اور (defence) کا قوی امکان ہوتا ہے، اسی لئے عام طور پر کسی کے سامنے اسی کی برائی بیان کرنے کی نوبت کم ہی آتی ہے، اور اگر ایسی نوبت آ بھی جاتی ہے تو اس کا سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چلتا ہے، ایک دو باتیں کہہ کر خاموش ہو جانا پڑے گا، ورنہ معاملہ آگے بڑھ سکتا ہے، سیدھی بات ہے۔ اس کے برخلاف غیبت کا معاملہ چوں کہ اس کی غیر حاضری میں ہوتا ہے، اس لئے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کی طرف سے مدافعت (defence) کا کوئی اندیشہ نہیں

ہوتا، اسی لیے معمولی آدمی بھی بڑی سے بڑی شخصیت کی برائیاں بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، اس میں بھی جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ سامنے والے کی طرف سے چوں کہ مدافعت نہیں ہوتی ہے اس لئے اس کا سلسلہ بھی طویل ہو جاتا ہے، اسی وجہ سے غیبت کی مجلس جب چلتی ہے تو گھنٹوں نکل جاتے ہیں، اس لئے خاص طور پر غیبت سے روکا گیا ہے کہ بڑا خطرناک گناہ ہے اور اس کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مجلسِ غیبت میں شرکت بھی غیبت ہے

حضرت میمون بن مہران رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں دیکھا کہ ان کو کوئی آدمی ایک حبشی کی لاش پیش کر کے کہہ رہا ہے کہ اس میں سے کھاؤ۔ انہوں نے کہا: میں اس کو کیوں کھاؤں؟ اس آدمی نے کہا: آپ نے فلاں مسلمان کے حبشی غلام کی غیبت کی ہے، اور غیبت کرنا مردار بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے، اس لیے آپ کو یہ کھانا چاہیے۔ انہوں نے کہا: میں نے تو اس کی کوئی غیبت نہیں کی، نہ میں نے اس کی کوئی برائی بیان کی؟ میں نے تو اس کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا؟ تو بتلایا گیا کہ فلاں جگہ اس کی غیبت ہو رہی تھی اور تم اس کو خاموشی کے ساتھ سنتے رہے، اس کی طرف سے کوئی جواب بھی نہیں دیا، اور نہ وہاں سے اپنے آپ کو دور کیا؛ تو یہ اس میں شرکت کے برابر ہی ہے۔ چناں چہ اس کے بعد وہ کبھی بھی ایسی کسی مجلس کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کا فریضہ ہے کہ اس کے سامنے جب کسی کی برائی بیان کی جائے تو اس کی طرف سے دفاع کرے۔ اگر وہ اس کے دفاع کی قدرت رکھتا ہے اس کے باوجود دفاع نہیں کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی گرفت ہوگی۔

لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑنا بڑا خطرناک

اور لوگوں کے عیوب کے پیچھے پڑنا بھی بڑا خطرناک گناہ ہے۔ حدیثِ پاک میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں کے عیوب کے درپے نہ رہو، اس لئے کہ کوئی آدمی مسلمان کے عیوب کے درپے ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے عیوب کے درپے ہو جاتے ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کسی کے عیوب کے درپے ہو جاتے ہیں تو وہ گھر کے اندر بھی کوئی برائی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو رسوا کر کے رہتے ہیں(۱)۔

بہر حال! غیبت بڑی خطرناک چیز ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے، حدیثِ پاک میں اس کی بڑی قباحت وشناعت آئی ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا: ”اَلْغِیْبَۃُ أَشَدُّ مِنَ الزِّنَا“ غیبت تو زنا سے بھی زیادہ بری ہے۔ صحابہ نے عرض کیا: زنا اور بدکاری سے بھی زیادہ خطرناک اور بری کیسے ہوگی؟ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بدکاری اور زنا سے آدمی جب توبہ کرلیتا ہے تو اس کا گناہ معاف ہو جاتا ہے لیکن جس کی غیبت کی ہے جب تک وہ معاف نہ کرے وہاں تک اس کا گناہ معاف نہیں ہوگا۔ گویا غیبت کی توبہ جس کی غیبت کی گئی ہے اس کے معاف کرنے پر موقوف ہے، کیوں کہ اس میں بندے کا حق ہے۔

(۱) عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ صَعِدَ رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم الْمِنْبَرَ فَنَادَى بِصَوْتٍ رَفِيعٍ فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ مَنْ قَدْ أَسْلَمَ بِلِسَانِهِ وَلَمْ يُفْضِ الإِيمَانُ إِلَى قَلْبِهِ، لاَ تُؤْذُوا الْمُسْلِمِينَ وَلاَ تُعَيِّرُوهُمْ وَلاَ تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ، فَإِنَّهُ مَنْ تَتَبَّعَ عَوْرَةَ أَخِيهِ الْمُسْلِمِ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ وَمَنْ تَتَبَّعَ اللهُ عَوْرَتَهُ يَفْضَحْهُ وَلَوْ فِي جَوْفِ رَحْلِهِ. (سنن الترمذی. باب مَا جَاءَ فِي تَعْظِيمِ الْمُؤْمِنِ)

غیبت کی معافی کا ایک مسئلہ

اب یہاں ایک مسئلہ آتا ہے کہ کسی نے کسی کی غیبت کی ہو تو اگر اس تک یہ بات پہنچ گئی کہ میرے متعلق فلاں صاحب نے یہ بیان کیا ہے تب تو تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب تک وہ معاف نہیں کرے گا وہاں تک معاف نہیں ہو گا۔ اور اگر اس کے علم میں یہ بات نہیں آئی تو صحابہ اور اکابر میں سے بعض حضراتِ علماء اس طرف گئے ہیں کہ اس صورت میں اس کے معاف کرنے پر موقوف نہیں ہے، اس کے بغیر بھی توبہ قبول ہو جائے گی اور اس کا گناہ معاف ہو جائے گا، لیکن اس کے لئے ایک شرط ہے، اس کو چاہیے کہ جن لوگوں کے سامنے اس نے غیبت کی تھی ان لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو جھٹلائے اور یوں کہے کہ میں نے تمہارے سامنے فلاں آدمی کی جو برائی کی تھی، وہ میں نے بہت غلط حرکت کی تھی اور برا کام کیا تھا۔ گویا اپنے اس فعل کی قباحت اور اپنی اس حرکت کی برائی کو ان کے سامنے ظاہر کرے، تب ہی جس کی غیبت کی تھی اس کے معاف کرنے پر موقوف نہیں ہے اور اس کی توبہ قبول ہو گی۔

کان آنکھ اور دل کے متعلق سوال ہو گا

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ جس چیز کا تمہیں علم نہیں ہے اس کے پیچھے مت پڑو اور اس کی ٹوہ

میں نہ لگے رہو، بیشک کان، آنکھ اور دل ان میں سے ہر ایک کا آدمی سے سوال کیا جائے گا۔ یعنی کان سے جو چیزیں سنی تھیں ان کا سننا جائز بھی تھا یا نہیں۔ گانے سنتے رہے، غیبت، بہتان اور تہمتیں سنتے رہے، گالیاں سنتے رہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کو سننے سے منع کیا گیا ہے اگر ان کو سنا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق جواب دینا پڑے گا۔

آنکھ کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ جو چیزیں آنکھ کے ذریعہ دیکھی تھیں کیا ان کا دیکھنا جائز بھی تھا یا نہیں؟ جن چیزوں کے دیکھنے سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے منع فرمایا ہے اگر وہ دیکھی ہیں اور اس سے توبہ نہیں کی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوگی۔

دل کے متعلق بھی سوال ہوگا کہ جن چیزوں کے خیالات دل میں پکائے تھے، اور جن چیزوں کا دل میں یقین رکھا تھا؛ کیا ان چیزوں کا یقین رکھنا اور ان خیالات کا پکانا شرعی اعتبار سے جائز اور درست تھا یا نہیں؟

سماج میں پائی جانے والی ایک برائی

آج کل بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ آدمی کسی کے متعلق بغیر دیکھے اور بغیر تحقیق کے صرف سنی سنائی پر ہی فیصلہ کرلیتا ہے، اور چوں کہ ہمارے سماج میں یہ برائی بہت کثرت سے چل رہی ہے اس لئے اس کو بیان کر رہا ہوں۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نور اللہ مرقدہٗ نے اپنی کتاب ”القول الجمیل“ میں چور کے معلوم کرنے کا ایک عمل لکھا ہے اور

ہمارے اکابر کے یہاں سے بھی عام طور پر عملیات اور تعویذات کے سلسلہ میں جو چیزیں دی جاتی ہیں وہ سب حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی اسی کتاب ''القول الجمیل'' سے لی گئی ہیں، تمام اکابر اسی کتاب کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں چور کی شناخت کا ایک عمل لکھا ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے اس عمل کو لکھنے کے بعد خاص طور پر اسی آیت کو ذکر کرکے تاکید فرمائی ہے کہ اس عمل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ جس کے متعلق معلوم ہو اسی کو چور سمجھا جائے، بلکہ اس عمل کے بعد اندرونی طور پر تحقیق کروگے تو پتہ چل جائے گا کہ حقیقت میں چور کون ہے، جو چور ہوگا اس کا واقعۃً پتہ چل ہی جائے گا، اور جب شرعی دلائل سے ثابت ہو جائے تب ہی اس پر چوری کا الزام لگایا جاسکتا ہے، باقی صرف عملیات کی بنیاد پر کسی کے متعلق فیصلہ کرلینا درست نہیں کہ بس یہی چور ہے۔ اور دیکھو! جب ہم کسی کو اپنی آنکھوں سے چوری کرتے ہوئے دیکھیں تب ہی تو کہہ سکتے کہ یہ چور ہے، اب ہم نے اپنی آنکھوں سے تو دیکھا نہیں، اور اس نے ہمارے سامنے اپنے چور ہونے کا اقرار بھی نہیں کیا، پھر کسی کے صرف کہہ دینے پر اس کے متعلق دل میں یہ سمجھ لینا کہ یہی چور ہے؛ یہ تو ایک ایسی چیز ہوئی کہ جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی ہے، اس لیے اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت ہوگی۔

یہ حرام ہے

آج کل ہمارے معاشرہ اور سماج میں بہت سے جھگڑے ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے: کسی کو ذرا سی بیماری ہوگئی، بخار ہوا اور جانے کا نام نہیں لیتا، یا دردِ سر ہوا اور اچھا نہیں ہو رہا ہے، اور کوئی پریشانی میں ہے؛ تو بس کسی عملیات والے کے پاس پہنچ جاتے ہیں، اور اگر اس نے کہہ دیا کہ آپ پر سحر ہے اور تمہارے گھر میں سے ہی کسی نے کیا ہے؛ تو عام طور پر خاندان میں بھائی بھائی کے، بھائی بہن کے، یا کسی چچازاد، ماموں زاد بھائیوں کے آپس کے چھوٹے موٹے جھگڑے اور کچھ نہ کچھ ناچاقیاں ہوتی ہی ہیں؛ تو فوراً گمان انہیں کی طرف جاتا ہے، اور انہیں پر الزام عائد کر دیا جاتا ہے، اور پھر اسی بنیاد پر بڑے جھگڑے اور لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں، حالاں کہ شریعت کسی بھی حالت میں اس کی اجازت نہیں دیتی۔ نہ تو کسی عامل کا اس طرح کہنا درست ہے، اور نہ کسی کے صرف کہنے کی بنیاد پر اس بات کو مان لینا جائز ہے، یہ سب حرام ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جادو کرنے والے کا نام نہیں بتلایا

دیکھو! بخاری شریف کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا گیا تھا، لبید بن اعصم ایک منافق تھا جس کی یہودیوں کے ساتھ ساز باز تھی، اسی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سحر کروایا تھا، اور اس سحر اور جادو کا اثر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر یہ ہوا کہ آپ ازواجِ مطہرات

میں سے کسی کے پاس صحبت کے لئے نہیں گئے ہوتے تھے تب بھی آپ کو یہ خیال ہوتا تھا کہ میں نے صحبت کی ہے۔ سحر کا یہ اثر آپ ﷺ پر ایک مدّت تک رہا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت بخاری شریف میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ پاک ﷺ میرے یہاں تشریف لائے اور دعا میں مشغول ہوگئے، پھر دعا کی، پھر دعا کی، بار بار دعا کرتے رہے۔اس کے بعد فرمایا: میں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی بیماری کے متعلق پوچھا تو اللہ تعالیٰ نے خواب میں دو فرشتے حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل کو میرے پاس بھیجا، ایک میرے سرہانے کھڑا ہوا اور دوسرا پاؤں کی جانب کھڑا ہوا، ایک نے دوسرے سے پوچھا: ان کو کیا ہوا ہے؟ دوسرے نے جواب دیا: ان کو جادو کیا گیا ہے۔ پوچھا: کس نے جادو کیا ہے؟ اس نے کہا: لبید بن اعصم نے کیا ہے۔ پوچھا: کون سی چیز میں جادو کیا ہے؟ اس نے کہا: کھجور کے شگوفہ میں رکھا ہے۔ پوچھا: کہاں رکھا ہے؟ اس نے کہا: فلاں کنویں میں پتھر کے نیچے رکھا ہے۔ یہ تمام چیزیں آپ کو بتلادی گئیں۔ چناں چہ جب آپ اٹھے تو آپ ﷺ نے اپنے ساتھ حضرت علی، حضرت عمار بن یاسر اور چند مخصوص صحابہ کو لیا، اور اس کنویں پر تشریف لے گئے، وہاں سے وہ سب نکلوایا۔ آپ ﷺ کا موم کا ایک پتلا بنایا گیا تھا، اس میں گیارہ سوئیاں چبھوئی گئی تھیں، اسی موقعہ پر معوذتین (قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس) نازل ہوئیں، جب اس کی ایک آیت پڑھتے تھے تو اس میں سے ایک سوئی نکلتی تھی اور آپ اپنے جسم میں اس کی تکلیف محسوس کرتے تھے، جیسے سوئی کھینچی جاتی ہے۔

بہر حال! اس جادو کا اثر زائل ہو گیا۔ روایتوں میں ہے کہ بعد میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ لوگوں کیوں کو بتلاتے نہیں کہ یہ کس نے کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے صحت دیدی، اب میں کسی مسلمان یا کافر کے خلاف فتنہ بھڑکانا نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ آپ کو معلوم تھا کہ اگر میں اس کا نام ظاہر کر دوں گا تو صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اگر کسی کو پتہ چل جائے کہ فلاں نے حضور ﷺ کے ساتھ ایسا کیا ہے تو کیا وہ بچ سکتا ہے؟۔

بلا دلیل الزامات!

دیکھو! نبی کا خواب وحی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو وحی کے ذریعہ بتلادیا تھا کہ فلاں آدمی نے آپ پر جادو کیا ہے، اس کے باوجود جب حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کہہ رہی ہیں پھر بھی آپ ﷺ اتنا اہتمام فرمارہے ہیں کہ کسی جملے کے نتیجے میں معاشرہ اور سماج میں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔ اور آج کل جب اس طرح کے واقعات پیش آتے ہیں تو بلا دلیل کے کسی پر بھی الزامات عائد کر دیئے جاتے ہیں اور خاندانوں میں آپس میں جھگڑے کروا دیئے جاتے ہیں؛ شریعت ایسی باتوں کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ اگر کوئی آدمی کسی عامل کے پاس جائے تو میری اتنی درخواست ہے کہ پہلے ہی اس سے کہہ دے کہ بھائی دیکھو! تم سے اگر اس کا

علاج ہو سکتا ہو تو کرنا، باقی تم کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ کس نے کیا ہے۔ اور اگر وہ کہے تو اس سے کہو کہ ہمیں بتلانا مقصود نہیں ہے۔ دراصل مصیبت یہ ہوتی ہے کہ جب کوئی عامل اپنے عمل کے معاملہ میں کوتاہ ثابت ہوتا ہے تو پھر وہ ایسی ویسی باتیں کر دیتا ہے۔ یا مثلاً علاج کروانے والا اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے کہ اتنے دنوں سے علاج کر رہے ہو اور ہمارے اتنے سارے پیسے خرچ ہو گئے، لیکن کیا بات ہے کہ ابھی تک کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے؟ تو پھر عامل کہتا ہے کہ اصل میں کوئی چیز دفن کی گئی ہے، جب تک وہ نکلے گی نہیں وہاں تک ٹھیک نہیں ہو گے۔ تو میں یوں کہتا ہوں کہ ایک سال سے علاج کر رہا تھا اور کچھ دفن کیا ہوا ہے وہ آج ایک سال کے بعد اس کو معلوم ہوا؟ دراصل یہ سب ایسی ہی بے کار باتیں ہوتی ہیں۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی بدگمانیوں پر خاص طور پر تاکید فرمائی ہے کہ کان، آنکھ اور دل کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہو گا۔

بڑا چوکس نگران

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ جب بھی کوئی آدمی کوئی بات کرتا ہے تو اس کے پاس ایک بڑا چوکس نگران مقرر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آدمی پر دو فرشتے مقرر کئے گئے ہیں، آدمی جب بھی کوئی بات زبان سے نکالتا ہے، چاہے وہ بات اس کے حق میں نفع بخش ہو، یا نقصان دہ ہو؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

جو فرشتے مقرر ہیں، وہ اس کی اس بات کو ریکارڈ کر لیتے ہیں، اور باقاعدہ درج کر لیتے ہیں؛ پھر قیامت میں نامۂ اعمال کھولے جائیں گے تو وہ ساری باتیں اس میں موجود ہوں گی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے نامۂ اعمال پھیلا دئے ہیں اور فرشتہ مقرر کر دیا ہے جو تمہاری ہر چیز کو نوٹ کر رہا ہے، اب چاہے تم بھلی بات کہو، یا بری، زیادہ کہو، یا کم؛ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لکھا جا رہا ہے، جب آدمی کی موت ہو جائے گی تو نامۂ اعمال لپیٹ کر اس کی گردن میں ڈال دیا جائے گا جو اس کے ساتھ قبر میں بھی رہے گا اور جب میدانِ حشر میں اُٹھایا جائے گا تو وہی نامۂ اعمال اس کے ساتھ ہو گا، اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ لو! اپنا نامۂ اعمال پڑھ لو۔ اس لیے ہر آدمی کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے ساتھ نگران فرشتہ مقرر ہے اگر کسی کو معلوم ہو جائے کہ حکومت کی طرف سے آدمی مقرر ہے اور میری ہر بات ریکارڈ کی جا رہی ہے؛ تو وہ آدمی حکومت کے خلاف کوئی بھی کام کرنے سے اپنے آپ کو کیسا بچاتا ہے؟ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتہ مقرر ہے اور وہاں جواب دینا ہے تو پھر اپنے آپ کو بڑا محتاط رکھنے کی ضرورت ہے۔

سلامتی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا

اعْلَمْ أَنَّهُ يَنْبَغِي لِكُلِّ مُكَلَّفٍ أَنْ يَحْفَظَ لِسَانَهُ عَنْ جَمِيعِ الْكَلَامِ إِلاَّ كَلَاماً ظَهَرَتْ فِيهِ الْمَصْلَحَةُ، وَمَتَى اسْتَوَى الْكَلَامُ وَتَرْكُهُ فِي الْمَصْلَحَةِ، فَالسُّنَّةُ الإِمْسَاكُ عَنْهُ، لِأَنَّهُ قَدْ يَنْجَرُّ الْكَلَامُ

الْمُبَاحُ إِلَى حَرَامٍ أَوْ مَكْرُوهٍ، وذٰلِكَ كَثِيرٌ فِى الْعَادَةِ، والسَّلَامَةُ لا يَعْدِلُهَا شَيْءٌ

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اپنی زبان کو ہر طرح کی باتوں سے بچائے، سوائے اس بات کہ جس کا فائدہ بخش ہونا ظاہر ہو۔ اور کسی کلام کے متعلق اگر یہ خیال ہو کہ اس کے بولنے میں بھی فائدہ ہے اور چھوڑنے میں بھی فائدہ ہے، یعنی دونوں پہلو برابر ہیں؛ تو اس صورت میں سنّت یہی ہے کہ آدمی اس سے بھی بچے، اس لئے کہ کوئی آدمی اگر جائز بات شروع کرے گا تو وہ حرام اور ناجائز تک پہنچادے گی، اور حرام اور ناجائز کلام کو چھوڑنے کے لئے جائز کلام بھی چھوڑنا پڑے گا، اور عام طور ایسا ہی ہوتا ہے، اس لیے سلامتی کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: آدمی اپنی زبان سے جو بھی کلام کرتا ہے وہ چار طرح کا ہوتا ہے:(۱) یا تو وہ پورا ہی مفید ہوتا ہے (۲) یا پورا ہی مضر ہوتا ہے (۳) یا کچھ مفید ہوتا ہے اور کچھ مضر ہوتا ہے (۴) نہ مفید ہوتا ہے، نہ مضر۔

پھر فیصلہ فرماتے ہیں کہ:(۱) جو مضر ہو اس سے تو اپنے آپ کو بچانا ہی ہے۔ (۲) جس میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی ہے؛ تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ فائدہ حاصل کرنے کے مقابلہ میں نقصان سے اپنے آپ کو بچانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اس لئے اس سے بھی اپنے آپ

کو بچانا ضروری ہے۔(۳) اور جس میں نہ فائدہ ہے، نہ نقصان ہے؛ اس میں اپنا وقت کیوں لگایا جائے؟ گویا اس سے بھی بچنا ضروری ہے۔(۴) اب ایک ہی طرح کا کلام رہ گیا کہ جس میں فائدہ ہی فائدہ ہے، وہی کلام اپنی زبان سے نکالنا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آدمی اپنی زبان سے جو چار قسم کے کلام نکالتا ہے ان میں سے تین سے تو اپنے آپ کو بچانا ہے۔ گویا ۷۵ ر فیصد کلام تو ختم ہی ہو گیا، اور ۲۵ ر فیصد رہ گیا ایک چوتھائی حصہ رہ گیا، باقی تین چوتھائی تو ختم ہو گئے، ان سے اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے۔

بھلی بات کہے یا خاموش رہے

حدیث ۱۵۱۱:-

عن أَبِي هريرة -رضى الله عنه- عن النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَاليَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْراً أَوْ لِيَصْمُتْ (متفق عَلَيْهِ)

وهذا صريحٌ فى أنَّهُ يَنْبَغى أنْ لَايَتَكَلَّمَ إلاَّ إذَا كَانَ الْكَلَامُ خَيْراً ، وَهُوَ الَّذِىْ ظَهَرَتْ مَصْلَحَتُهُ ، ومَتٰى شَكَّ فى ظُهُورِ المَصْلَحَةِ، فَلَا يَتَكَلَّم.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو؛ وہ بھلی بات کہے، یا خاموش رہے۔

افادات:- دیکھو! اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے دو ہی چیزیں بتلائی ہیں، پہلی یہ کہ اگر بھلی بات کہہ سکتے ہو تو کہو۔ اور دوسری یہ کہ چاہے وہ کلام جائز ہو لیکن اس میں فائدہ

نہیں ہے تو پھر خاموش رہو۔ علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صاف صاف بتلاتی ہے کہ کوئی بات بھلی ہو اور نیکی کی ہو؛ تب ہی آدمی اپنی زبان سے بولے، ورنہ خاموشی اختیار کرے۔ بے فائدہ جائز بات بھی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور بھلی بات سے وہی کلام مراد ہے جس کا دنیا یا آخرت کے اعتبار سے اس کا مفید ہونا دلیل سے ثابت ہو، اور جس بات کے متعلق آپ کو شک ہو کہ پتہ نہیں کہ اس میں کوئی فائدہ ہے یا نہیں؛ تو اس صورت میں خاموش رہنا ضروری ہے۔

ہیرے جواہرات اور ڈھیلے پتھر

اس بات کو مَیں ایک مثال سے یوں سمجھاتا ہوں کہ ایک آدمی کے سامنے میدان میں ہیرے جواہرات اور موتی پڑے ہوئے ہوں، اور دوسری طرف ڈھیلے اور پتھر پڑے ہوئے ہوں؛ اور کوئی آدمی ان جواہرات کو چھوڑ کر ڈھیلے پتھر اپنے دامن میں جمع کر لے؛ تو اس کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟ اگرچہ یہ ڈھیلے اور پتھر اس کے لئے مضر اور نقصان دہ نہیں ہیں، لیکن اس سے فائدہ بھی کیا ہے۔ اس کے مقابلہ میں اتنا ہی وقت اگر وہ جواہرات کو چن کر اپنے دامن میں جمع کرنے میں لگاتا تو کتنا اچھا تھا۔ جائز کلام کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ پتھر اور ڈھیلے، اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہونے کا حال ایسا ہی ہے جیسے کہ جواہرات و موتی؛ اب آدمی جتنا وقت جائز کلام اور باتوں میں لگاتا ہے، اگر اتنا ہی وقت وہ اللہ کے ذکر

میں لگائے تو زیادہ اچھا ہے۔اس لیے آدمی کو چاہیے کہ ذکر اللہ میں اپنے آپ کو مشغول رکھنے کا اہتمام کرے،اور اگر کوئی کلام کرے تو بھلی بات کہے؛ورنہ خاموش رہے۔

کون سا مسلمان افضل ہے؟

حدیث ۱۵۱۲:-

وعن أَبي موسیٰ رضی اللہ عنہ قَالَ : قُلْتُ : يَا رسولَ اللهِ ! أَيُّ الْمُسْلِمِينَ أَفْضَلُ ؟ قَالَ : ((مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ .)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول!کون سا مسلمان افضل اور بہترین ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:وہ جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔

افادات:-اس نوع کے سوال پر نبیٔ کریم ﷺ نے مختلف جوابات ارشاد فرمائے ہیں جس کی وجہ پہلے آچکی ہے(جلد:۶/ص:۴۸) یہاں بھی اسی نوع کا سوال کیا گیا کہ مسلمانوں میں کون سا مسلمان سب سے بہتر ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا:وہ جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں،یعنی اس کی زبان سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے اور اس کے ہاتھ سے بھی کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔دیکھئے!نبیٔ کریم ﷺ بہترین مسلمان ہونے کے لئے یہ وصف ارشاد فرما رہے ہیں۔

ایک اور روایت میں نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ”وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ، وَاللّٰہِ لَا یُؤْمِنُ“ اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں، اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں اللہ کی قسم! وہ آدمی مؤمن نہیں۔ جب تین مرتبہ قسم کھا کر نبی کریم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی، تو صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سہم گئے اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! کون؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ لَّا یَأْمَنُ جَارُہٗ بَوَائِقَہٗ“ جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے مامون و محفوظ نہ ہو (بخاری شریف) نبی کریم ﷺ کے کلام کی بلاغت دیکھئے! آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو اپنے پڑوسیوں کو تکلیف نہ پہنچاتا ہو، بلکہ یہ فرمایا کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے مامون و مطمئن نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ بعضوں کی طبیعت ذرا خطرناک قسم کی ہوتی ہے، اور ان سے اپنے پڑوسی کو ابھی تک کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی، لیکن ان کے مزاج اور طبیعت کو دیکھ کر پڑوسی یوں محسوس کرتے ہیں کہ اگرچہ آج تک اس نے کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی لیکن معلوم نہیں یہ کب کیا کر ڈالے۔ ایسے آدمی کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب یہ کیفیت بھی پائی جائے تو وہ مؤمن نہیں۔ دیکھو! ایسے آدمی کے ایمان کی حضورِ اکرم ﷺ نفی فرمارہے ہیں کہ وہ مؤمن ہی نہیں۔ اور اس روایت میں نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں میں بہترین مسلمان اس آدمی کو قرار دیا جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذاء رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، بلکہ ایک روایت یوں بھی ہے: ”اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ

اَلْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ" حقیقی مسلمان کہلانے کا حقدار وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیفوں اور ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، ویسے تو آپ کسی مفتی سے سوال کریں گے کہ ایک آدمی اپنی زبان اور ہاتھ سے لوگوں کو تکلیف پہنچاتا ہے، اور کلمہ بھی پڑھتا ہے؛ تو کیا وہ مسلمان ہے؟ تو کوئی بھی مفتی اس کے کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دے گا، لیکن حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یہ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی حقیقی معنیٰ میں مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔

اپنے ایمان و اسلام کی سند کے واسطے یہ کافی نہیں

آج ہمارے معاشرہ میں عام طور پر اس کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ ایک آدمی نماز پابندی سے پڑھتا ہے، وظائف کا پابند ہے، تلاوت وغیرہ بھی کرتا ہے، لیکن اس کی زبان اور اس کے ہاتھ کی ایذاءرسانیوں سے لوگ محفوظ نہیں، ہر ایک آدمی اس سے خطرہ محسوس کرتا ہے، اور وہ آدمی اپنے ایمان اور اسلام پر مطمئن ہے، لیکن حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قسم کھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کا پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے مطمئن اور مامون نہ ہو، وہ مؤمن نہیں ہے۔

بہر حال! یہ جو کیفیت ہمارے معاشرہ میں پائی جاتی ہے کہ لوگ اپنے ایمان و اسلام کی سند کے واسطے دینی اعمال کی پابندی کو کافی سمجھ لیتے ہیں؛ اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ اس لیے کہ

اللہ تعالیٰ نے انسان کو قدرتی طور پر ایسا بنایا ہے کہ وہ اکیلا زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر ہی رہنا پڑتا ہے، جیسے: ماں باپ، اہل و عیال، بھائی بہن، رشتے دار، پڑوسی، یا جن سے لین دین کے معاملات پڑتے ہیں۔ تو جن جن لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا ہو، ان میں کسی کو بھی اس کی ذات سے، اس کی زبان یا ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچے؛ تب ہی وہ اس لائق ہے کہ اس کو حقیقی مسلمان کہا جاسکے۔

زبان سے تکلیف پہنچانا ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ آسان

اوراس روایت میں ہاتھ اور زبان دونوں کا تذکرہ کیا ہے، لیکن پہلے زبان کا نام اس لئے لیا کہ زبان سے تکلیف پہنچانا ہاتھ کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے، اس لیے کہ ہاتھ کے لئے تو کچھ قوت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا، ہاتھ کے لئے تو سامنے موجود ہونا بھی ضروری ہے، جبکہ زبان تو غائبانہ بھی تکلیف پہنچاتی ہے، جیسے: کسی کی غیبت وغیرہ میں مشغول ہوتی ہے۔ اور غیبت کا سلسلہ جب شروع ہوتا ہے تو ایسا طول پکڑتا ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ ایک معمولی آدمی بھی کسی بڑے آدمی پر جس طرح چاہے کیچڑ اُچھال سکتا ہے۔ اور زبان حاضرین اور غائبین کسی کو بھی نہیں بخشتی؛ اس لئے اس کا تذکرہ پہلے کیا۔

جنّت کی گارنٹی

حدیث ۱۵۱۳:-

وعن سهل بن سعد، قَالَ: قَالَ رسُولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ يَضْمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الجَنَّةَ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو مجھے ضمانت اور گارنٹی دیدے اپنے اس عضو کی جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان کہ اس سے کوئی گناہ نہیں کرے گا) اور اپنے اس عضو کی جو دونوں ٹانگوں کے درمیان ہے (یعنی شرمگاہ کہ اس سے بھی کسی گناہ کا ارتکاب نہیں کرے گا) تو مَیں اس کو جنّت کی گارنٹی دیتا ہوں۔

افادات:- دیکھو! یہ دونوں اعضاء یعنی زبان اور شرمگاہ بڑے اہم ہیں، عام طور پر آدمی کا دین ان ہی دو اعضاء کے ذریعہ تباہ وبرباد ہوتا ہے، اسی لئے نبیٔ کریم ﷺ خاص طور پر تاکید فرمارہے ہیں کہ جو آدمی اپنے ان دو اعضاء کے متعلق مجھے گارنٹی دیتا ہو کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کبھی استعمال نہیں کرے گا تو میں اس کو جنّت کی گارنٹی دیتا ہوں۔ اس سے زبان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی حفاظت کتنی ضروری ہے۔ اور اس کی حفاظت کے نتیجہ میں آدمی کا آدھا دین محفوظ ہو جاتا ہے۔

ایک جملہ جہنم میں دور پھینک دیتا ہے

حدیث ۱۵۱۴:-

وعن أَبِي هريرة رضى الله عنه أنَّه سمع النبيّ ﷺ يقول: ((إِنَّ العَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بالكَلِمَةِ مَا يَتَبَيَّنُ فِيهَا يَزِلُّ بِهَا إِلَى النَّارِ أَبْعَدَ مِمَّا بَيْنَ المَشْرِقِ و المَغْرِبِ)) ومعنى: ((يَتَبَيَّنُ)) يُفَكِّرُ أنَّها خَيْرٌ أم لا. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کوئی بندہ جب کوئی کلمہ اپنی زبان سے نکالتا ہے اور اس کی اہمیت کا اس کو کوئی اندازہ بھی نہیں ہوتا، لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم میں اتنا دور پھسل جاتا ہے کہ جتنا مشرق اور مغرب کے درمیان کا فاصلہ ہے۔

افادات:- بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بغیر سوچے کوئی بات زبان سے نکال دیتا ہے، خاص طور پر ایسے لوگ جن کو لوگوں کو ہنسانے کی عادت ہوتی ہے، اور آج کل تو لوگوں کو ہنسانا بھی ایک قسم کا فن بن گیا ہے، عام طور پر اس میں آدمی ایسی ایسی باتیں زبان سے نکالتا ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی کفر تک پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ وہ کلمات اور باتیں جن کے زبان سے نکالنے کے نتیجہ میں آدمی کافر ہو جاتا ہے؛ ان سے بھی واقفیت رکھنا ہر ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔

پہلے تولو؛ پھر بولو

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس زمانہ میں تو یہ جاننا بہت ہی زیادہ اہم ہو گیا ہے، اس لئے کہ بہت سے لوگ اپنی جہالت اور ناواقفیت کی وجہ سے ایسے کلمات اپنی زبان سے نکال دیتے ہیں جن کے نتیجہ میں ایمان سے نکل جاتے ہیں، اور ان کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ ایسا بولنے کی وجہ سے میں ایمان سے نکل گیا ہوں۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا یہ ارشاد خاص طور پر ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ جو بات بھی ہم اپنی زبان سے نکالیں؛ بہت سوچ سمجھ کر نکالیں۔ اسی لیے ہمارے اکابر فرماتے ہیں کہ پہلے تولو؛ پھر بولو۔ پہلے سوچ لیجئے کہ میں جو بات اپنی زبان سے نکالنے جارہا ہوں اس کے نتیجہ میں کہیں مَیں اللہ تعالیٰ کے یہاں پکڑا تو نہیں جاؤں گا، مجھے اس کا جواب دینا ہے۔

ویسے زبان کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے بھی لگا سکتے ہیں کہ کفر اور اسلام کے لئے بھی زبان کے کلمات ہی کو بنیاد قرار دیا گیا ہے، ایک کافر کلمہ طیبہ پڑھنے ہی کی وجہ سے مسلمان ہوتا ہے، اپنے اسلام اور ایمان کا اظہار وہ اسی کلمہ کے ذریعہ کرتا ہے، جب تک کلمہ نہیں کہا تھا وہاں تک کافر تھا، جیسے ہی کلمہ ادا کیا، وہ مسلمان قرار دیا گیا، یعنی کلمہ کو بولنے سے پہلے وہ جہنمی تھا؛ کلمہ بول کر جنّتی بن گیا۔ اس لیے زبان سے جو بات بھی کہی جائے اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

بہت سوچ سمجھ کر بولیں

حدیث ۱۵۱۵:-

وعنه، عن النبیّ ﷺ قَالَ: ((إنَّ العَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللهِ تَعَالَى مَا يُلْقِي لَهَا بَالاً يَرْفَعُهُ اللهُ بِهَا دَرَجاتٍ، وإنَّ العَبْدَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللهِ تَعَالَى لا يُلْقِي لَهَا بَالاً يَهْوِي بِهَا فِي جَهَنَّمَ)). رواه البخاري

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بندہ کبھی اللہ کی خوشنودی کا کوئی ایسا کلمہ اپنی زبان سے نکالتا ہے کہ بولتے وقت اس کو اس کی پرواہ بھی نہیں ہوتی (یعنی اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ میں جو کلمہ اپنی زبان سے نکال رہا ہوں اس سے اللہ تعالیٰ مجھ سے اتنے راضی ہو جائیں گے، لیکن) اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے جنّت میں اس کے درجات بہت زیادہ بلند کر دیتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی کی کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے کہ بولتے وقت اس کی اس کو کوئی پرواہ بھی نہیں ہوتی، لیکن اس کی وجہ سے وہ جہنم کی گہرائی میں چلا جاتا ہے

افادات:- حضورِ اکرم ﷺ کا یہ ارشاد ہمیں اس بات کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ جو بات بھی ہم اپنی زبان سے نکالیں وہ بہت سوچ سمجھ کر نکالیں کہ کہیں اللہ تعالیٰ ناراض نہ ہو جائے اور اس کی وجہ سے کہیں ہماری گرفت نہ ہو جائے۔

ایک جملہ پر تا قیامت رضامندی یا ناراضگی کا فیصلہ

حدیث ۱۵۱۶:-

وعن أبي عبد الرحمٰن بِلالِ بن الحارِثِ المُزَنِيِّ رضی الله عنه: أنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((إنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ رِضْوَانِ اللهِ تَعَالَى مَا كَانَ يَظُنُّ أنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللهُ لَهُ بِهَا رِضْوَانَهُ إلَى يومِ يَلْقَاهُ، وإنَّ الرَّجُلَ لَيَتَكَلَّمُ بِالكَلِمَةِ مِنْ سَخَطِ اللهِ مَا كَانَ يَظُنُّ أنْ تَبْلُغَ مَا بَلَغَتْ يَكْتُبُ اللهُ لَهُ بِهَا سَخَطَهُ إلَى يَوْمِ يَلْقَاهُ)) (رواه مالك في المُوَطَّأ، والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت بلال بن حارث مزنی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کبھی کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی کوئی بات اپنی زبان سے نکالتا ہے (جس وقت وہ بول رہا ہوتا ہے) اس کو یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ یہ کلمہ مجھے اتنے اونچے مقام تک پہنچائے گا کہ اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لئے اس بندہ کے لئے اپنی خوشی لکھ دیتے ہیں۔ اور کبھی کوئی آدمی اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا کلمہ نکالتا ہے، اس وقت اس کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ کلمہ اس کو اس درجہ تک پہنچائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے قیامت تک کے لئے اپنی ناراضگی لکھ دیتے ہیں۔ (اس لیے بولنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے)

باتوں پر کنٹرول کرنے کی ایک تدبیر

افادات:- حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں (جن کی قبر راندیر کے قبرستان میں ہے) ہمارے اکابر میں سے گزرے ہیں، بڑے اونچے پائے کے بزرگ تھے اور صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ان کو بہت زیادہ مناسبت اور محبت تھی، مفتی صاحب ان کے شاگرد بھی تھے اور ان کے گھر آتے جاتے رہتے تھے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میرے داخل ہوتے ہی حضرت نے مجھ سے فرمایا: مولوی شفیع صاحب! آج تو ہم عربی میں بات کریں گے۔ مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ آج حضرت کو یہ کیا خیال آیا کہ عربی میں بات کرنے کو فرما رہے ہیں۔ مَیں نے عرض کیا: حضرت! کیا بات ہے؟ فرمایا: بس آج عربی میں بات کریں گے۔ جب میں نے بہت اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا: دیکھو! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے تم سے تعلق ہے اور جب تم آتے ہو تو بے تکلفی کی وجہ سے ہم سے باتوں میں احتیاط نہیں ہوتی، اس لیے زبان کی احتیاط کو حاصل کرنے کے لئے آج میں نے سوچا کہ تم سے عربی میں بات کروں، اس لئے کہ (پریکٹس اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے) روانی کے ساتھ عربی نہ میں بول سکتا ہوں، نہ آپ بول سکتے ہیں، جب ہم عربی میں بات کرنا چاہیں گے تو بہت

سوچ سوچ کر بڑی مشکل سے چند کلمات ادا کر سکیں گے، اس طرح اپنی باتوں پر کنٹرول کرنے کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

نصیحت آموز بات

پھر حضرت نے فرمایا: ہماری مثال تو اس آدمی جیسی ہے جو ایک لمبے سفر پر روانہ ہوا، اور گھر سے جب چلا تو اپنے ساتھ بہت ساری اشرفیاں لی تھیں، لیکن اپنی نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے بے دریغ خرچ کرتا رہا یہاں تک کہ چند اشرفیاں باقی رہ گئیں اور ابھی بہت لمبا سفر تو باقی ہے، جب اس کو خیال آئے گا کہ ابھی تو منزل بہت دور ہے، تو وہ بقیہ اشرفیوں کو کتنا سوچ سمجھ کر استعمال کرے گا کہ پتہ نہیں آگے کیا معاملہ اور ضرورت پیش آئے۔ اسی طریقہ سے ہماری زندگی کا ایک بڑا حصہ گزر چکا ہے، اب تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم نے اپنی گزشتہ زندگی کے لمحات جس بے دردی سے استعمال کئے ہیں ان پر توبہ و استغفار کریں، اور جو اوقات باقی رہ گئے ہیں اور تھوڑا بہت سرمایہ جو ہمارے ہاتھ میں بچ گیا ہے، اس کو بہت سوچ سمجھ کر اور بہت احتیاط سے خرچ کریں۔

اس کا خطرہ سب سے زیادہ ہے

حدیث ۱۵۱۷:-

وعن سفیان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: یَارسولَ اللہ! حدِّثنی بأَمْرٍ أَعْتَصِمُ بِہِ قَالَ: ((قُلْ: رَبِّیَ اللہُ ثُمَّ اسْتَقِمْ)) قُلْتُ: یَارسولَ اللہِ! مَا أَخْوَفُ مَا تَخَافُ عَلَیَّ؟ فَأَخَذَ بِلِسانِ نَفْسِہِ، ثُمَّ قَالَ: ((ھٰذَا)). (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت سفیان بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی بات بتلادیجئے جس کو میں مضبوطی سے تھام لوں۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: تم کہہ دو کہ میرا رب اللہ ہے؛ پھر اس پر جم جاؤ (یعنی اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کرنے کے بعد اس پر جمے رہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو اپنی زندگی میں اتارو) اس کے بعد میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ سب سے زیادہ میرے متعلق کس چیز کا ڈر رکھتے ہیں؟ (یعنی مجھے کونسی چیز سے سب سے زیادہ خطرہ لاحق ہے، اگر آپ بتلادیں تو میں اس سے احتیاط کروں اور اپنے آپ کو اس سے بچاؤں) تو حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی زبانِ مبارک پکڑ کر فرمایا: اس کا (خطرہ سب سے زیادہ ہے)۔

افادات:- اس لیے کہ زبان ہی آدمی کو معلوم نہیں کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ زبان کی کھیتیاں ہی آدمی کو جہنم میں ڈالتی ہیں۔ صحابۂ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اس نوع کے سوالات کرتے رہتے تھے، اور وہ صرف سوال

نہیں ہوتا تھا بلکہ آپ کی طرف سے جو بات بتلا دی جاتی تھی تو ان کی طرف سے زندگی بھر اس پر عمل بھی ہوا کرتا تھا۔

زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ

حدیث ۱۵۱۸:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ قَالَ رسول اللہ ﷺ: ((لَا تُكْثِرُوا الْكَلَامَ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ؛ فَإِنَّ كَثْرَةَ الْكَلَامِ بِغَيْرِ ذِكْرِ اللهِ تَعَالَى قَسْوَةٌ لِلْقَلْبِ! وإِنَّ أَبْعَدَ النَّاسِ مِنَ اللهِ الْقَلْبُ الْقَاسِي))

(رواہ الترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ گفتگو نہ کرو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ ہے، اور سخت دل اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دور ہوتا ہے۔

افادات:- پچھلی مجلس میں ایک مثال دے کر بتلایا تھا کہ ایک آدمی کے سامنے جواہرات و موتیوں کا ڈھیر پڑا ہوا ہو، اور کوئی آدمی اس کو بڑی آسانی سے جمع کر سکتا ہو، لیکن ان کو چھوڑ کر وہ پتھر وڈھیلے اپنے دامن میں بھر لے؛ تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیں وقت دیا ہے، اس وقت کے ذریعہ ہم اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے اور اس کا

ذکر کر کے نیکیوں کا بڑا ذخیرہ حاصل کر سکتے ہیں، لیکن اگر اس کو چھوڑ کر ہم لغویات اور دوسری چیزوں میں پڑ جائیں؛ تو ہمارے متعلق بھی وہی کہا جائے گا۔

ضرورت اور بلا ضرورت کلام کا فرق

اللہ کے ذکر کے علاوہ کی زیادہ گفتگو دل کی سختی کا ذریعہ ہے۔ جب آدمی بے کار بات اپنی زبان سے نکالتا ہے تو اس کی وجہ سے قلب پر ایک ظلمت چھا جاتی ہے حضرت تھانوی نوراللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں: ایک سبزی فروش اپنے کاروبار کی وجہ سے اور حلال روزی حاصل کرنے کے لئے دن میں ہزار مرتبہ بھی ”سبزی لے لو“ بولے گا، تب بھی اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، چوں کہ وہ حلال کاروبار میں لگا ہوا ہے، اور اس کا یہ بول ضرورت کی وجہ سے ہے۔ لیکن کوئی آدمی اگر بلا ضرورت ایک جملہ بھی اپنی زبان سے نکالتا ہے تو اللہ کی قسم! اس کی وجہ سے دل پر اتنی زیادہ ظلمت چھا جاتی ہے کہ اس کو میں بتلا نہیں سکتا۔

واقعہ یہی ہے کہ ہم لوگ بے کار گفتگو میں اپنے بہت سارے اوقات ضائع کر دیتے ہیں، اور اس کی وجہ سے اپنے قلب کو بھی بہت زیادہ تاریک اور ظلمت زدہ بنا دیتے ہیں، اسی لیے نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا کہ: اس کی وجہ سے قلب میں سختی آتی ہے، اور سخت دل اللہ تعالیٰ کی رحمت سے بہت زیادہ دور ہوتا ہے۔ یہ بہت اہم چیز ہے۔ فضول بات جس کا نہ

دینی فائدہ ہو، نہ دنیوی؛ اس سے اپنے آپ کو بچانا بہت ضروری ہے، اس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

جرُم چھوٹا؛ جُرُم بڑا

حدیث ۱۵۱۹:-

وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ (رضی اللہ عنہ) قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: مَنْ وَقَاهُ اللهُ شَرَّ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَشَرَّ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ، دَخَلَ الْجَنَّةَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی ِکریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کو اللہ تعالیٰ نے اُس کے اُس عضو کے شر سے بچا لیا جو دونوں جبڑوں کے درمیان ہے، اور اُس عضو کے شر سے بچا لیا جو ٹانگوں کے درمیان ہے؛ تو وہ جنّت میں داخل ہو گیا۔

افادات:- یعنی زبان اور شرمگاہ کی برائی سے جس کی حفاظت کر لی گئی؛ وہ آسانی سے جنّت میں داخل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ عام طور پر جہنم میں لے جانے والے یہی دو اعضاء ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے زبان کے ذریعہ سے صادر ہونے والے گناہوں کی تعداد بیس گنوائی ہے۔ اس موقعہ پر ایک بڑا بلیغ جملہ تحریر فرمایا ہے: ”جِرْمُهُ صَغِيْرٌ وَجُرْمُهُ كَبِيْرٌ“ زبان کی سائز تو چھوٹی ہے لیکن اس کا گناہ بہت بڑا ہے۔

نجات کا راستہ

حدیث ۱۵۲۰:

وَعَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا النَّجَاةُ؟ قَالَ: أَمْسِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ، وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ.

ترجمہ:- حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! نجات کا راستہ کیا ہے؟ (یعنی آدمی ایسا کونسا طریقہ اختیار کرے تو وہ دنیا و آخرت میں نجات پا سکتا ہے؟) نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اپنی زبان کو قابو میں رکھو۔ اور تمہارا گھر تم کو سموئے رکھے۔ اور اپنے گناہوں پر روتے رہو۔

افادات:- زبان اتنی چھوٹی سی ہے لیکن ہمارے قابو میں نہیں ہے، کوئی بھی آدمی گارنٹی سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اس کو اپنے قابو میں رکھا ہے، وہ ہمارے قابو سے باہر ہے، ضرورت اس کی ہے کہ اس کو قابو میں رکھا جائے۔

تمہارا گھر تم کو سموئے رکھے، یعنی آدمی کو اپنے گھر سے بلا ضرورت نکلنا نہیں چاہیے، اس لئے کہ عام طور پر گھر سے باہر ایسی باتیں پیش آتی ہیں جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا کرتی ہیں۔ آدمی جب گھر سے باہر نکلتا ہے تو بد نظری اور بدزبانی میں مبتلا ہوتا ہے، گھر کے باہر گناہوں کے ایسے ایسے اسباب پائے جاتے ہیں جو قدم قدم پر آدمی کو اپنے اندر

مبتلا کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لیے آدمی جتنا زیادہ اپنے گھر میں رہے گا، اتناہی زیادہ وہ گناہوں سے حفاظت میں رہے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کر ٹی وی اور انٹرنیٹ وغیرہ پر ناجائز چیزیں دیکھتا رہے۔

اپنے گناہوں پر روتے رہو۔ گناہوں پر رونے کی بھی عادت ڈالنی چاہیے، ہمارے یہی آنسو گناہوں کی سیاہی کو دھونے کا کام کرتے ہیں۔ ہر چیز کا ایک صابن ہوتا ہے جو اس کو صاف کرتا ہے، تو گناہوں کے ذریعہ سے قلب پر جو میل کچیل اور سیاہی چھا جاتی ہے، اس کو دور کرنے کا کیمیکل یہی آنسو ہیں، آدمی ندامت کے آنسو بہاتا رہے تو اس کے نتیجہ میں گناہ معاف ہو جائیں گے۔

سارے اعضاء کی زبان سے منت وسماجت

حدیث ۱۵۲۱:-

وَعَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ (رضی اللہ عنہ) عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا أَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَإِنَّ الْأَعْضَاءَ كُلَّهَا تُكَفِّرُ اللِّسَانَ، تَقُوْلُ: اِتَّقِ اللهَ فِيْنَا، فَإِنَّمَا نَحْنُ بِكَ فَإِنِ اسْتَقَمْتَ، اسْتَقَمْنَا. وَإِنِ اعْوَجَجْتَ، اِعْوَجَجْنَا.

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جب آدمی صبح کرتا ہے تو اس کے جسم کے سارے اعضاء زبان کے سامنے گڑگڑاتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں:

ہمارے معاملہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا، اس لئے کہ ہمارا سارا معاملہ تیرے اوپر موقوف ہے، اگر تو سیدھی رہی تو ہم بھی سیدھے رہیں گے، اور اگر تو ٹیڑھی ہوگئی تو ہم بھی ٹیڑھے ہوجائیں گے (ہمارا معاملہ اپنے قابو سے نکل جائے گا۔ گویا سارا دارومدار زبان پر ہے)۔

زبان؛ تمام دینی بنیادوں کی جڑ

حدیث ۱۵۲۲:-

وَعَنْ مَعَاذٍ (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قُلْتُ: يَارَسُوْلَ اللهِ! أَخْبِرْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيْ الْجَنَّةَ وَيُبَاعِدُنِيْ مِنَ النَّارِ؟ قَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ عَنْ عَظِيْمٍ، وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلَى مَنْ يَّسَّرَهُ اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِ. تَعْبُدُ اللهَ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا وَتُقِيْمُ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِي الزَّكَاةَ وَتَصُوْمُ رَمَضَانَ، وتَحُجُّ الْبَيْتَ)) ثُمَّ قَالَ: ((أَلَا أَدُلُّكَ عَلَى أَبْوَابِ الْخَيْرِ؟ الصَّوْمُ جُنَّةٌ، وَ الصَّدَقَةُ تُطْفِئُ الْخَطِيْئَةَ كَمَا يُطْفِئُ الْمَاءُ النَّارَ، وَصَلَاةُ الرَّجُلِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ)) ثُمَّ تَلَا: ﴿تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ﴾ حَتّٰى بَلَغَ ﴿يَعْمَلُوْنَ﴾ ثُمَّ قَالَ: ((أَلَا أُخْبِرُكَ بِرَأْسِ الْأَمْرِ، وَعَمُوْدِهٖ، وَذِرْوَةِ سِنَامِهٖ؟)) قُلْتُ: بَلٰى يَا رسولَ اللهِ. قَالَ: ((رَأْسُ الْأَمْرِ الْإِسْلَامُ، وَعَمُوْدُهُ الصَّلَاةُ، وَذِرْوَةِ سِنَامِهِ الْجِهَادُ)) ثُمَّ قَالَ: ((أَلَا أُخْبِرُكَ بِمِلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ؟)) قُلْتُ: بَلٰى يَارَسولَ اللهِ. فَأَخَذَ بِلِسَانِهٖ وقال: ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) قُلْتُ: يَارسولَ اللهِ! وإِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ؟ فقالَ: ((ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ! وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ إِلَّا حَصَائِدُ أَلْسِنَتِهِمْ؟)).

(رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن صحیح) وَقَدْ سبق شرحہ فی باب قبل هٰذَا)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا: اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسا عمل بتلایئے جو مجھے جنّت میں لے جائے، اور جہنم سے دور کردے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے ایک بہت بڑی بات پوچھی ہے، لیکن اتنا ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو جس کے لئے آسان کردے اس کے لئے بہت آسان ہے (اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ توفیق مانگتا رہے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال نہ ہو وہاں تک آدمی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی نہیں کرسکتا، اس لئے دعا کا اہتمام بہت ضروری ہے) اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو۔ پھر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: نیکیوں کے دروازوں کا پتہ نہ بتاؤں؟ روزہ ڈھال ہے (جس کے نتیجہ میں آدمی کی گناہوں سے اور شیطان کی شرارتوں سے عام طور پر حفاظت ہوتی ہے) اور صدقہ گناہوں کو اس طرح بجھادیتا ہے جس طرح پانی آگ کو بجھاتا ہے (گناہوں کے نتیجہ میں آدمی جہنم کی آگ کو بھڑکاتا ہے لیکن صدقہ اس کو بجھانے کا کام کرتا ہے) اور آدمی کا رات کے درمیان میں نماز پڑھنا۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ان کے پہلو خواب گاہوں سے جدا رہتے ہیں، اس وقت وہ اپنے رب کو ڈر اور لالچ کی حالت میں پکارتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ پس کسی کو بھی علم نہیں ہے ان نعمتوں کا جو ہم نے ان لوگوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک کے واسطے چھپا رکھی ہیں، وہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔

اس کے بعد حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان ساری چیزوں کی اصل اور بنیاد نہ بتلاؤں جس پر ان سب کا دارو مدار ہے، اور جو اس کا درمیانی ستون ہے (خیمہ کا درمیانی ستون ہوتا ہے تب ہی خیمہ قائم رہتا ہے، اگر وہی نہ ہو تو خیمہ کھڑا نہیں رہ سکتا) اور اس کی کوہان اور چوٹی ہے؟ (جس پر دین کی بلندی موقوف ہے) حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اللہ کے رسول! ضرور بتلایئے۔ تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان سب کا دارومدار اسلام پر ہے (یعنی آدمی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے حوالے کردے، اور عملی طور پر ان ساری چیزوں کو بجالائے) اور اس کا بنیادی ستون نماز ہے (اس لئے کہ جو آدمی نماز قائم کرے گا تو پورے دین کا قائم کرنا اس کے لئے آسان ہوجائے گا۔ اسی لئے دوسری روایت ہے: أَلصَّلَاةُ عِمَادُ الدِّيْنِ مَنْ أَقَامَهَا فَقَدْ أَقَامَ الدِّيْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّيْنَ" نماز دین کا بنیادی ستون ہے جس نے اس کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اس کو ڈھادیا اس نے دین کو ڈھادیا) اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان سب کا خلاصہ نہ بتلاؤں؟ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! ضرور بتلایئے۔ تو آپ ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک پکڑی اور فرمایا: اس کو روکے رکھو (یہ سب کی جڑ ہے) حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم جو بولیں گے اس پر بھی پکڑ اور گرفت ہوگی؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری ماں تم پر روئے (ایسا جملہ تاکید کے لئے بولا جاتا ہے) لوگوں کو جہنم میں ان

کے چہروں کے بل ان کی زبانوں کی کھیتیاں ہی ڈالیں گی (یعنی زبان کے بول کے نتیجہ میں ہی وہ جہنم میں اوندھے منھ ڈالے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ زبان بڑی خطرناک چیز ہے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے اس کو سارے دین کی بنیاد اور جڑ قرار دیا ہے)۔

جانتے ہو غیبت کیا ہے؟

حدیث ۱۵۲۳:-

وعن أَبِي هريرة -رضي الله عنه-: أنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ: ((أَتَدْرُونَ مَا الْغِيبَةُ؟)) قالوا: اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ، قَالَ: ((ذِكْرُكَ أَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ)) قِيلَ: أَفَرَأَيْتَ إِنْ كَانَ فِي أَخِي مَا أَقُولُ؟ قَالَ: ((إِنْ كَانَ فِيهِ مَا تَقُولُ، فقد اغْتَبْتَهُ، وإِنْ لَمْ يَكُنْ فِيهِ مَا تَقُولُ فَقَدْ بَهَتَّهُ.)) (رواه مسلم.)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) سے فرمایا: جانتے ہو غیبت کیا ہے؟ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارا اپنے بھائی کو اس انداز سے یاد کرنا جو اس کو ناپسند ہو۔ یہ سن کر حضورِ اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: اگر میرے اس بھائی میں وہ بات موجود ہو جو میں کہہ رہا ہوں؟ (تو آپ کیا فرماتے ہیں؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو بات کہہ رہے ہو اگر وہ اس میں موجود ہے؛ تب ہی تو غیبت ہے۔ اور اگر وہ بات اس میں موجود نہیں ہے؛ تب تو بہتان ہے۔

افادات:- بعض لوگ غیبت کرتے ہیں اور جب ان کو ٹوکا جاتا ہے تو کہتے ہیں: ارے! میں کوئی جھوٹ تھوڑا ہی بول رہا ہوں؛ یہ بات تو اس میں موجود ہے، گویا اس کا یہ جملہ کہ "مَیں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں" اس سے نعوذ باللہ وہ یوں کہنا چاہتا ہے کہ میرا غیبت کرنا جائز اور درست ہے، حالاں کہ جس چیز کو قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو، اور حضورِ اکرم ﷺ نے جس کی حرمت کے لئے بے شمار ارشادات فرمائے ہوں؛ کیا وہ اپنے عمل سے اس کو جائز ٹھہرانا چاہتا ہے؟ پہلے بھی میں نے بتلایا تھا کہ ایسے آدمی کے بارے میں علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بہت سے علماء نے اس پر کفر کا فتویٰ لگایا ہے۔ اس لئے اس سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

مسلمان کی جان، مال اور عزت وآبرو کی اہمیت

حدیث ۱۵۲۴:-

وعن أَبِي بَكْرة -رضی اللہ عنہ-: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ فِي خُطْبَتِهِ يَوْمَ النَّحْرِ بِمِنًى فِي حَجَّةِ الْوَدَاعِ: ((إِنَّ دِمَآءَكُمْ، وَأَمْوَالَكُمْ، وأَعْرَاضَكُمْ، حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو بکرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی ِکریم ﷺ نے حجۃ الوداع میں منیٰ کے میدان میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں یہ بھی فرمایا: تمہاری جان، تمہارا مال اور تمہاری عزت و آبرو

آپس میں ایسی ہی حرام ہے جیسا کہ آج کا دن، اس مہینہ میں، اس شہر کے اندر باحرمت و محترم ہے۔ سنو! کیا مَیں نے سارا دین تم لوگوں تک نہیں پہنچایا؟

افادات: اسلام میں حج فرض ہونے کے بعد نبی کریم ﷺ نے ۱۰ھ میں ایک ہی مرتبہ حج کیا ہے جس کو حجۃ الوداع کہا جاتا ہے، جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی تعداد شریک ہوئی، اور حضورِ اکرم ﷺ نے خود بھی بڑا اہتمام فرمایا تھا، پہلے باقاعدہ اعلان کرایا تھا کہ نبی کریم ﷺ حج میں تشریف لے جانے والے ہیں؛ لہٰذا اے لوگو! تم بھی تیاری کرو۔ چناں چہ اس سلسلہ میں حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے تفصیلی روایت موجود ہے کہ جب نبی کریم ﷺ کی روانگی کا وقت آیا تو مدینہ منورہ میں بہت بڑا مجمع جمع ہو گیا، ایک قول کے مطابق نوے ہزار کی تعداد تھی، اور اس سے زیادہ کی مقدار بھی بتلائی جاتی ہے۔ اسی حج میں دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں نبی کریم ﷺ نے ایک تقریر فرمائی تھی جس میں امت کو بطور ہدایت کچھ ایسی باتیں خاص طور پر ارشاد فرمائیں جو قیامت تک کے لئے اہمیت رکھتی تھی، کیوں کہ یہ ایک ایسا مجمع تھا جو اس سے پہلے نہ کبھی ہوا تھا اور نہ بعد میں ہونے والا تھا۔ چناں چہ آپ ﷺ نے باقاعدہ آدمی بھیج کر لوگوں کو پہلے خاموش کرایا کہ حضورِ اکرم ﷺ تقریر اور خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں، سب لوگ خاموش ہو جاؤ اور غور سے سنو۔ جب سب لوگ خاموش ہو گئے تو نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے کچھ سوالات کیے، ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ یہ کون سا مہینہ ہے؟ وہ ذی الحجہ کا

مہینہ تھا، حج اسی میں ہوتا ہے۔ ویسے بھی ملتِ ابراہیمی میں حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے برابر کچھ مہینے ایسے تھے جو حرمت والے مہینے قرار دیئے گئے تھے جن مہینوں میں جنگ کرنا، کسی کی عزت وآبرو پر ہاتھ ڈالنا بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ تین مہینے تو ایک ساتھ آتے ہیں؛ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم، اور چوتھا مہینہ رجب؛ یہ کل چار مہینے حرمت والے کہے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی اللہ تعالیٰ نے اس بات کو ارشاد فرمادیا ہے ﴿إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ﴾ ان بارہ مہینوں میں چار مہینے حرمت والے ہیں، انہیں میں ایک مہینہ ذی الحجہ کا بھی تھا، اور سب کو معلوم تھا کہ ذی الحجہ کا مہینہ چل رہا ہے، اس کے باوجود نبی کریم ﷺ آگے جو بات ارشاد فرمانے والے تھے اس کی اہمیت کو لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لئے یہ سوالات فرمائے، جیسے کوئی آدمی کسی کو اس کے باپ کے متعلق کچھ نصیحت کرنا چاہے تو پوچھتا ہے کہ یہ کون ہیں؟ بیٹا کہتا ہے کہ یہ میرے ابا ہیں۔ پھر کہتا ہے کہ تمہارے ابا ہیں نا؛ تو پھر ان کا یہ حق ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ کسی بات کی اہمیت کو کسی کے دل میں بٹھانے کے لئے یہ بھی ایک انداز ہے۔

تو نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) سے سوال کیا کہ ابھی کون سا مہینہ ہے؟ روایتوں میں آتا ہے کہ بعض مرتبہ نبی کریم ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم سے احکام میں کچھ تبدیلی بھی فرمادیا کرتے تھے، اس لیے اگرچہ حضراتِ صحابہ جانتے تھے کہ یہ ذی

الحجہ کا مہینہ ہے، لیکن یہ سمجھ کر کہ ذی الحجہ کا مہینہ ہونا تو سبھی کو معلوم ہے، اس کے باوجود بھی حضورِ اکرم ﷺ جب سوال فرمارہے ہیں، تو شاید آپ آج اس مہینے کا کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے، اسی خیال سے حضرات صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے جواب دینے کے بجائے کہا: اے اللہ کے رسول! اللہ اور رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے صاف پوچھا: کیا یہ ذوالحجہ نہیں ہے؟ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: جی ہاں اے اللہ کے رسول! یہ ذوالحجہ ہے۔

پھر آپ ﷺ نے سوال فرمایا: آج کون سا دن ہے؟ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو معلوم تھا کہ آج یوم النحر یعنی دسویں ذی الحجہ اور قربانی کا دن ہے۔ (''نحر'' قربانی کو کہتے ہیں، چوں کہ دسویں کو قربانی کا پہلا دن ہوتا ہے، اس لیے عربی میں اس کو ''یوم النحر'' کہتے ہیں) اب صحابہ جانتے تھے کہ آج یوم النحر ہے، لیکن جب نبیٔ کریم ﷺ نے سوال کیا تو وہی سوچ کر خاموش رہے کہ شاید حضور اکرم ﷺ اس دن کا کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے، اور یوں کہا: اللہ اور رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ تو نبیٔ کریم ﷺ نے پوچھا: کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: کیوں نہیں؟ آج یوم النحر ہی ہے۔

پھر آپ ﷺ نے سوال فرمایا: یہ کون سا شہر اور بستی ہے؟ (مکہ مکرمہ کا ایک نام ''اَلْبَلْدَۃُ'' بھی ہے، جیسے مدینہ منورہ کا نام مدینہ ہے، مدینہ عربی زبان میں شہر کو کہتے ہیں، اور ''بلدہ'' بھی شہر ہی کو کہتے ہیں) صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) جانتے تھے کہ یہ مکہ مکرمہ ہے،

لیکن یہی سمجھ کر کہ شاید اور کوئی نام تجویز فرمائیں گے عرض کیا: اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: کیا یہ مکہ مکرمہ نہیں ہے؟ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: کیوں نہیں؟۔

جب ذہنوں میں یہ چیزیں تازہ ہوگئیں کہ یہ وہ شہر ہے جس میں لوگوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کو محفوظ سمجھا جاتا ہے، اور اس بستی کے اس علاقے کے اندر کسی کی جان و مال، عزت و آبرو پر دست درازی بہت بڑا جرم گردانا جاتا ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ جس میں کسی کی جان و مال، اور عزت و آبرو پر ہاتھ اٹھانا بہت بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے، تو پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ دِماءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ، وأَعْرَاضَكُمْ، حَرَامٌ عَلَيْكُمْ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا﴾ دیکھے! اگر صرف مکہ مکرمہ ہوتا، اور آج دسویں ذی الحجہ نہ ہوتی، یا ذی الحجہ نہ ہوتا اور صرف یہ شہر مکہ ہوتا، تب بھی تم لوگ اس کی اتنی عزت کرتے کہ تم کسی کی جان و مال اور کسی کی عزت و آبرو کے اوپر ہاتھ اٹھانے کو بڑا جرم سمجھتے۔ یا آج کا دن ہوتا اور یہی مہینہ ہوتا دنیا کے کسی اور علاقے میں ہوتا، مکہ کی یہ بستی نہ ہوتی تب بھی آج کے دن تم کسی کی عزت و آبرو، اور جان و مال پر ہاتھ اٹھانے کو بہت بڑا جرم سمجھتے، تو آج یہاں تو گویا تاکید در تاکید در تاکید؛ تینوں چیزیں جمع ہوگئی ہیں، لہٰذا یہ باتیں ذہن نشین کرلو: بے شک تمہاری جان، تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں، جیسے آج کے دن کی حرمت، اس مہینہ کے اندر، اس شہر میں ہے۔

گویا اتنی تاکید فرمادی کہ آئندہ قیامت تک کے لئے بتلادیا کہ اب کسی مسلمان کی جان، کسی مسلمان کا مال، کسی مسلمان کی عزت و آبرو ایسی نہیں ہے کہ کوئی مخصوص دن ہو تب ہی محفوظ رہے گی، اور اس کے علاوہ دنوں میں ان پر ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ یا کسی مخصوص مہینہ میں تو محفوظ سمجھی جائے گی اور دیگر مہینہ میں نہیں۔ کسی مخصوص جگہ اور شہر میں تو محفوظ سمجھی جائے گی اور اگر وہ جگہ اور شہر نہ ہو تو اس پر ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے؛ ایسا نہیں ہے، بلکہ قیامت تک کے لئے تمام مسلمانوں کی جان ومال، عزت و آبرو ایسی محفوظ ہو گئی جیسے اس شہر کے اندر اس مہینے میں۔

پھر آپ ﷺ نے یہ باتیں ارشاد فرما کر حضراتِ صحابہ کو خطاب کیا: سنو! کیا میں نے اللہ تعالیٰ کا پیغام تم تک پہنچادیا؟ تمام صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: جی ہاں! آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچادیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا: اے اللہ! تو گواہ رہیو کہ یہ لوگ اس بات کی گواہی دے رہے ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ میں نے تیرا پیغام ان تک پہنچادیا۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی جان، مال اور عزت و آبرو کی اللہ تعالیٰ کے یہاں کتنی زیادہ قدر و قیمت ہے۔ آج ہمیں کسی سے معمولی سی ناراضگی ہو جاتی ہے تو اس کی بنیاد پر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے سامنے والے کی عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں، اور معلوم نہیں کیسے کیسے الزامات اس کے اوپر لگا دیتے ہیں۔ حالاں کہ شریعت

اس کی بھی کہاں اجازت دیتی ہے۔ لیکن آج کل ہمارا ایک عام مزاج بن گیا ہے، اچھے اور برے، دین دار اور بے دین سب کا حال یہی ہو گیا ہے کہ جہاں کسی کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کسی طرف سے کوئی بات پیش آتی ہے تو فوراً اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اس نے ایسا کیا ہی کیوں؟ اب مَیں بھی اس کو بتلا دوں گا۔ اور پھر پورے سماج اور سوسائٹی کے اندر اس کی بے عزتی کی جاتی ہے، اخباروں میں اس کے متعلق غلط باتیں چھپوائی جاتی ہے، اور اس کے متعلق ایسا غلط پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی پناہ!۔ یہ سب طرزِ عمل اس روایت کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ کسی کی غیبت کرنا گویا اس کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنا ہے، اور نبی کریم ﷺ نے ایک مسلمان کی عزت و آبرو کو وہی مقام دیا جو اپنی عزت و آبرو کا ہے، جیسا آپ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں ویسا ہی دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو کی حفاظت کا بھی اہتمام ہونا چاہیے۔

نقل اتارنا بھی غیبت ہے

حدیث ۱۵۲۵:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها ، قالت : قُلْتُ للنبيّ ﷺ : حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وكَذَا. قَالَ بعضُ الرواةِ : تَعْنِي قَصيرَةً ، فقالَ: ((لَقَدْ قُلْتِ كَلِمَةً لَوْ مُزِجَتْ بِمَاءِ البَحْرِ لَمَزَجَتْهُ !)) قالت: وَحَكَيْتُ لَهُ إنْسَاناً فَقَالَ: ((مَا أُحِبُّ أنِّي حَكَيْتُ ((إنْساناً وإنَّ لِي كَذَا وَ كَذَا)).

(رواه أبو داود والترمذي، وقال: حديث حسن صحيح)

ومعنى: ((مَزَجَتْهُ)) خَالَطَتْهُ مُخَالَطَةً يَتَغَيَّرُ بِهَا طَعمُهُ أَوْ رِيحُهُ لِشِدَّةِ نَتْنِهَا وَقُبْحِهَا . وهذا الحَدِيثُ مِنْ أبلَغِ الزَّواجِرِ عَنِ الغِيبَةِ. قَالَ الله تَعَالَى: وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الهَوَى إنْ هُوَ إلاَّ وَحْيٌ يُوحَى

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنھا) سے روایت ہے کہ میں نے ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ سے حضرت صفیہ (رضی اللہ عنھا) کی کمزوری کی طرف اشارہ کرنے کی غرض سے یوں کہا کہ آپ کے لئے صفیہ میں اتنا ہی کافی ہے کہ وہ یوں ہے (حضرت صفیہ (رضی اللہ عنھا) دراصل یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، ان کا باپ حُیّ بن اَخطب یہودیوں کا بڑا سردار تھا، جب خیبر فتح ہوا تو یہ بھی مالِ غنیمت کے طور پر آئیں، نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد کر کے ان سے نکاح فرمالیا۔ حضرت صفیہ (رضی اللہ عنھا) ذرا پستہ قد تھیں اور عام طور پر سوکنوں میں ایسی ویسی بات پیش آ ہی جاتی ہے، تو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنھا) نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا بلکہ صرف ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ پستہ قد (ٹھگنی) ہیں۔ ان کا یہ جملہ سن کر) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم نے ایک ایسی بات

اپنی زبان سے نکالی ہے کہ اگر اس کو سمندر کے پانی کے ساتھ ملا دیا جائے تو اس کی بو اور اس کے مزہ کو بھی بگاڑ دے (سمندر تو پوری دنیا کے اندر پھیلا ہوا ہے لیکن اس ایک جملے کے اندر اتنی زیادہ خرابی اور بگاڑ ہے کہ پورے سمندروں کے پانی کے مزہ کو بگاڑ سکتا ہے) اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کہتی ہیں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے ایک آدمی کی نقل اتاری، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجھے اتنا اتنا دیا جائے (یعنی بڑی دولت دی جائے) تب بھی میں کسی کی نقل اتارنا پسند اور گوارا نہیں کرتا (اس لیے کہ کسی کی نقل اتارنا بھی غیبت میں شامل ہے)۔

افادات:- علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے حضورِ اکرم ﷺ کے جملہ "مَزَجَتْهُ" کی تشریح فرمائی ہے کہ تم نے ایک ایسی بات کہی کہ اگر وہ سمندر کے پانی کے ساتھ ملادی جائے تو اس کی بدبو اور بدمزگی غالب آجائے۔ ظاہر ہے کہ ملائی جانے والی چیز کی مقدار اگر زیادہ ہو تب ہی اس کا مزہ دوسری پر غالب آسکتا ہے، لیکن اس ایک جملہ کا اثر اتنا خطرناک ہوتا ہے کہ چھوٹا جملہ ہو کر بھی سمندر پر غالب آجاتا ہے۔ اور غیبت سے روکنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ان میں یہ سب سے اعلیٰ درجہ کی بات ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾ نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور آپ کی باتیں آپ کی اپنی نہیں ہوتی بلکہ وہ وحی ہوتی ہیں۔ گویا آپ کی زبانِ مبارک سے جو جملہ نکلا وہ ایسا بلیغ ہے کہ غیبت کی برائی کو بیان کرنے کے لئے اس سے زیادہ بلیغ بات اور کوئی نہیں ہو سکتی

لوگوں کا گوشت کھانے والوں کی سزا کا منظر

حدیث ۱۵۲۶:-

وعن أنسٍ -رضی الله عنه- قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: لَمَّا عُرِجَ بِي مَرَرْتُ بِقَومٍ لَهُمْ أظْفَارٌ مِنْ نُحَاسٍ يَخْمِشُونَ وُجُوهَهُمْ وَصُدُورَهُمْ فَقُلْتُ: مَنْ هٰؤُلاءِ يَاجِبرِيلُ؟ قَالَ : هٰؤُلاءِ الَّذِينَ يَأكُلُونَ لُحُومَ النَّاسِ، وَيَقَعُونَ فِي أعْرَاضِهِمْ! (رواه أبو داود)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مجھے معراج میں لے جایا گیا تو میرا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا کہ جن کے ناخن تانبے کے تھے، اور ان سے وہ اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے اس منظر کو دیکھ کر حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ تو انہوں نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے ہیں اور ان کی عزت و آبرو کے پیچھے پڑے رہتے ہیں (یعنی غیبت کے ذریعہ لوگوں کی آبروریزی کرتے رہتے ہیں، ان کو اس کی یہ سزا دی جارہی ہے)۔

اس کی بالکل اجازت نہیں

حدیث ۱۵۲۷:-

وعن أبي هريرة -رضی الله عنه-: أنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ: ((كُلُّ المُسْلِمِ عَلَى المُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ وَعِرْضُهُ وَمَالُهُ)). رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: پورا مسلمان ہی دوسرے مسلمان پر حرام ہے، اس کی جان، عزت وآبرو، اور اس کا مال (کسی پر بھی ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں ہے)

افادات:- کوئی یہ نہ سمجھے کہ شریعت نے جان پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں دی ہے، تو مال پر یا عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت ہے؛ ایسا بالکل نہیں ہے، شریعت نہ اِس پر ہاتھ ڈالنے کی اجازت دیتی ہے اور نہ اُس پر؛ مسلمان تو پورا کا پورا دوسرے مسلمان کے حق میں حرام ہے، اس کو چھیڑنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

باب تحریم سماع الغیبة

وأمر من سمع غیبةً مُحرَّمةً بِرَدِّها والإنكارِ علی قائلها، فإنْ عجز أوْ لَمْ یقبل منه فارق ذٰلك المجلس إن أمكنه

غیبت سننا حرام ہے،

اور جو کسی کی غیبت ہوتی ہوئے سنے اس کو چاہیے کہ اس کا دفاع کرے؛

ورنہ وہ مجلس ہی چھوڑ دے

باب کا عنوان اور آیاتِ قرآنیہ

جس طرح غیبت کرنا حرام ہے، اسی طرح غیبت سننا بھی حرام ہے۔ کسی مجلس میں آپ کے سامنے کوئی آدمی کسی کی غیبت کر رہا ہے تو شریعت آپ کو اس بات کا حکم دیتی ہے کہ جس کی غیبت کی جارہی ہے اس کا ڈفینس اور بچاؤ کرو۔ اور اگر آپ اپنے اندر اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ اس کا ڈفینس کر سکیں، یا ڈفینس تو کر رہے ہیں لیکن سامنے والا اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے تو اگر ممکن ہو تو اس مجلس ہی سے ہٹ جائیے۔

باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ﴾ جب بری بات کو وہ لوگ سنتے ہیں تو اس سے منھ پھیر لیتے ہیں، وہیں بیٹھے نہیں رہتے۔

باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿والَّذینَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُونَ﴾ سورۂ مؤمنون میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی جو خوبیاں بیان کی ہیں، ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بری بات سے اپنا منھ پھیر لیتے ہیں، اس کی طرف دھیان نہیں دیتے، اس سے اعراض کرتے ہیں اور بے رخی برتتے ہیں۔

ایک اور آیت پہلے بھی گزر چکی ہے: ﴿إِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡؤُولاً﴾ بیشک کان، آنکھ اور دل میں سے ہر ایک کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا کہ آپ نے اپنے کان سے کوئی حرام اور ناجائز بات کیوں سنی۔ اس لیے کہ جس چیز کا بولنا ناجائز ہے اس کا سننا بھی ناجائز ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جیسے غیبت کرنا ناجائز ہے، اسی طریقہ سے غیبت سننا بھی ناجائز اور حرام ہے۔

ایسی مجالس میں بیٹھنا جائز نہیں ہے

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَا رَأَيۡتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِيٓ آيَٰتِنَا فَأَعۡرِضۡ عَنۡهُمۡ حَتَّىٰ يَخُوضُواْ فِي حَدِيثٍ غَيۡرِهِۦۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيۡطَٰنُ فَلَا تَقۡعُدۡ بَعۡدَ الذِّكۡرَىٰ مَعَ الۡقَوۡمِ الظَّٰلِمِينَ﴾ جو لوگ ہماری آیتوں میں جھگڑا کرتے ہیں اور ان کا انکار کرتے ہیں؛ اے نبی! (اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے پوری امت کو خطاب کیا جارہا ہے) آپ وہاں سے ہٹ جائیے یہاں تک کہ وہ دوسری کسی بات میں مشغول ہو جائیں (جو جائز ہے) اور اگر شیطان آپ کو

بھلا دے (یعنی آپ کو دھیان نہ رہے) اور بے خبری و غفلت میں آپ اس مجلس میں شریک ہو جائیں تو جب یاد آجائے تو پھر وہاں بیٹھے نہ رہیے (بلکہ فوراً وہاں سے ہٹ جایئے)۔

اسی آیت کی وجہ سے حضراتِ علماء فرماتے ہیں کہ ہر وہ مجلس جہاں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو رہی ہو، وہاں بیٹھنا جائز نہیں، اور اگر بھول سے بیٹھ گئے ہو تو یاد آنے کے بعد وہاں بیٹھے رہنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً: گانا بجانا ہو رہا ہو، یا غیبت ہو رہی ہو، یا کسی پر تہمت بازی ہو رہی ہو، یا کسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہو، یا کسی کی آبروریزی ہو رہی ہو، ٹی وی اور ویڈیو دیکھا جا رہا ہو؛ مطلب یہ ہے کہ جس مجلس میں ایسا کوئی بھی کام ہو رہا ہو جس کی شریعت کے اندر ممانعت ہے، تو وہاں بیٹھنا جائز نہیں ہے۔

اس کے چہرہ کو آگ سے دُور رکھا جائے گا

حدیث ۱۵۲۸:-

وعن أَبِي الدرداء رضی الله عنه عن النبِيِّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ رَدَّ عَنْ عِرْضِ أَخِيهِ، رَدَّ اللهُ عَنْ وَجْهِهِ النَّارَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)). (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو اپنے مسلمان بھائی کی عزت کی طرف سے دفاع کرے گا (مثلاً: کسی نے اس پر تہمت لگائی تو اس نے اس کی طرف سے دفاع اور ڈیفینس کیا) تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کے چہرہ سے آگ کو دور کر دے گا۔

افادات:- گویا آپ نے دنیا میں اپنے بھائی کی طرف سے دفاع کیا تھا، اس کی آبرو کی حفاظت کی تھی؛ تو اللہ تعالیٰ آپ کے چہرے کو جہنم کی آگ سے بچائیں گے۔ یہ نیکی کا کتنا بڑا کام ہے! آج کل یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی کے متعلق کوئی بات کہتے ہیں اور سننے والا یہ جانتا ہے کہ سامنے والا جو بات کہہ رہا ہے وہ بالکل غلط ہے، تب بھی اس کی تردید نہیں کی جاتی، بلکہ چپ رہتے ہیں اور خاموشی سے اس کو ہضم کر لیتے ہیں۔

چپ چاپ سنتے رہے

حضرت میمون بن مہران نور اللہ مرقدہٗ ایک تابعی اور بڑے بزرگ گزرے ہیں، وہ فرماتے تھے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک حبشی کی لاش میرے سامنے پیش کی گئی اور مجھ سے کہا گیا کہ اس میں سے کھاؤ۔ میں نے اس سے گھِن کی اور کہا کہ مجھے کیوں کہہ رہے ہو؟ تو مجھ سے کہا گیا کہ تم یہ کھا چکے ہو۔ میں نے کہا: میں نے اس کو کب اور کہاں کھایا؟ بتلایا گیا کہ فلاں حبشی غلام کی غیبت کی جا رہی تھی اور تم وہیں بیٹھے تھے۔ میں نے کہا: میں نے تو اس میں حصہ نہیں لیا تھا، تو مجھے بتلایا گیا کہ آپ چپ چاپ سنتے رہے، اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا۔ معلوم ہوا کہ غیبت سننا اور اس کی طرف سے دفاع نہ کرنا بھی بڑا گناہ ہے، اس سے بھی اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

نبی کریم ﷺ نے ڈفینس کیا

حدیث ۱۵۲۹:-

وعن عِتبَانَ بنِ مَالكٍ -رضی الله عنه-. فی حديثه الطويل المشهور الَّذِی تقدَّمَ فی بابِ الرَّجاء قَالَ: قام النبیّ ﷺ يُصَلِّي فقَالَ: ((أَيْنَ مالِكُ بنُ الدُّخْشُمِ؟)) فَقَالَ رَجُلٌ: ذَلِكَ مُنَافِقٌ لا يُحِبُّ اللهَ ولا رَسُولَهُ، فقَالَ النبيّ ﷺ: ((لاَ تَقُلْ ذَلِكَ، أَلاَ تَراهُ قَدْ قَالَ: لا إلهَ إلاَّ اللهُ يُرِيدُ بِذَلِكَ وَجْهَ اللهِ! وإنَّ اللهَ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ: لا إلهَ إلاَّ اللهُ يَبْتَغي بِذَلِكَ وَجْهَ اللهِ)).

(متفق عَلَيْهِ)

((وَعِتْبان)) بكسر العين عَلَى المشهور وحُكِيَ ضَمُّها وبعدها تاءٌ مثناةٌ مِن فوق ثُمَّ باءٌ موحدة و((الدُّخْشُم)) بضم الدال وإسكان الخاء وضم الشين المعجمتين.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عتبان بن مالک (رضی اللہ عنہ) کی ایک لمبی روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (واقعہ یہ ہوا کہ حضرت عتبان بن مالک (رضی اللہ عنہ) ایک صحابی تھے جن کی آنکھوں کی بینائی میں کچھ کمزوری آگئی تھی تو انہوں نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ: آپ کسی روز موقعہ نکال کر میرے گھر تشریف لائیں، چوں کہ میری آنکھوں میں کمزوری آگئی ہے، اس لیے جب اندھیرا ہوتا ہے، یا بارش ہوتی ہے؛ تو میں مسجد کی جماعت میں حاضر نہیں ہو سکتا، مَیں چاہتا ہوں کہ اپنے گھر میں نماز کے لئے کوئی جگہ مخصوص کرلوں، لہٰذا آپ تشریف لا کر وہاں دو رکعت نماز ادا فرما دیں۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے، کسی دن آجائیں گے۔ چناں چہ دوسرے یا تیسرے ہی روز نبی کریم ﷺ ان کے گھر

تشریف لے گئے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تشریف آوری کا جب محلہ میں پتہ چلا تو محلے کے بہت سارے لوگ جمع ہو گئے، جیسے کوئی بزرگ ہمارے محلہ میں تشریف لاتے ہیں اور لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ فلاں صاحب کے یہاں فلاں بزرگ آئے ہوئے ہیں تو بہت سے لوگ ملاقات کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی تشریف آوری کی مناسبت سے آپ کے سامنے پیش کرنے کے لئے انہوں نے کچھ پکایا تھا، جب محلے کے لوگ آکر بیٹھے، گفتگو اور باتیں ہو رہی تھیں اور دیکھا جا رہا تھا کہ کون کون آیا ہے۔ حضرت مالک بن دُخشم (رضی اللہ عنہ) بھی اسی محلے کے رہنے والے تھے، اتفاق کی بات کہ وہ اس مجلس میں حاضر نہیں تھے تو) حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کے متعلق کسی سے پوچھا: مالک بن دُخشم نظر نہیں آتے؛ کہاں ہیں؟ اس پر ایک آدمی کو بولنے کا موقع مل گیا، کہنے لگا: وہ تو منافق آدمی ہے، اللہ اور اس کے رسول سے اس کو محبت ہی کہاں ہے؟ اس پر حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ایسا مت کہو، تمہیں معلوم نہیں کہ اس نے سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ پڑھا ہے، اور جو آدمی سچے دل سے لا الٰہ الا اللہ پڑھتا ہے؛ اللہ تعالیٰ اس کو جہنم کے اوپر حرام کر دیتے ہیں۔

افادات:- دیکھئے! یہاں ایک آدمی نے جب مالک بن دُخشم کے متعلق نامناسب بات کہی تو نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فوراً ان کی طرف سے ڈفینس کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی کسی مسلمان کے متعلق ایسی کوئی بات سنے تو فوراً اس کی طرف سے دفاع کرنا چاہیے۔

تم نے بہت غلط بات کہی

حدیث ۱۵۳۰ :-

وعن كعب بن مالك -رضى الله عنه- فى حديثه الطويل فى قصةِ تَوْبَتِهِ وَقَدْ سبق فى باب التَّوبةِ. قَالَ: قَالَ النبيُّ ﷺ وَهُوَ جالِسٌ فى القومِ بِتَبُوكَ: ((مَا فَعَلَ كَعبُ بن مالكٍ؟)) فَقَالَ رَجلٌ مِنْ بَنِي سَلِمَةَ: يَارسولَ الله، حَبَسَهُ بُرْدَاهُ والنَّظَرُ فى عِطْفَيْهِ. فَقَالَ لَهُ مُعاذُ بنُ جبلٍ -رضى الله عنه: بِئْسَ مَا قُلْتَ، والله يَارسولَ الله! مَاعلمنا عَلَيْهِ إلاَّ خَيْراً، فَسَكَتَ رسُولُ الله ﷺ.

(متفقٌ عَلَيْهِ)

((عِطْفَاهُ)): جَانِبَاهُ، وهو إشارةٌ إلى إعجابِهِ بنفسِهِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت کعب بن مالک کی لمبی روایت جو ان کی توبہ کے سلسلہ میں (پہلی جلد میں) آچکی ہے اسی موقعہ کا یہ واقعہ بھی ہے (حضرت کعب بن مالک (رضی اللہ عنہ) غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوسکے تھے، حالاں کہ ان کے پاس غزوہ میں شریک ہونے کے لئے سواری واسباب موجود تھے، لیکن "آج جاتا ہوں، کل چلا جاؤں گا" کے خیال سے ان سے سُستی ہوگئی اور نہیں جاپائے یہاں تک کہ شرکت کا موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ حضرت کعب بن مالک (رضی اللہ عنہ) خود فرماتے ہیں کہ میں یوں سمجھتا تھا کہ جب تک حضور ﷺ پر وحی نہیں آئے گی آپ کو میری غیر حاضری کا پتہ نہیں چلے گا، اس لیے کہ بہت بڑا مجمع تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس لشکر کے اندر صحابہ کی تعداد ساٹھ ہزار اور ایک روایت کے مطابق پچاس ہزار تھی، اس لیے میرا نہ جانا بھی چھپا رہے گا، الاّ یہ کہ وحی آجائے۔ بہر حال! انہوں نے بعد میں تحقیق کی کہ میرے متعلق حضور نے پورے سفر میں کوئی تذکرہ تو نہیں کیا۔ بتلایا

گیا کہ جب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تبوک پہنچ گئے اور آپ کا وہاں چند روز قیام رہا، اسی پڑاؤ کے زمانہ میں) ایک دن نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی مجلس لگی ہوئی تھی اور آپ کو یاد آگیا تو آپ نے پوچھا: کیا بات ہے کہ کعب بن مالک نظر نہیں آتے؟ انہی کے قبیلہ بنو سلمہ کے ایک آدمی نے کہا: یا رسول اللہ! اس کو اپنی چادروں پر خود پسندی نے روک رکھا ہے (بعض لوگ اچھے لباس کی وجہ سے عجب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ میرے جیسا اچھا لباس پہننے والا اور کوئی نہیں۔ گویا اس آدمی نے ان پر ایک فقرہ کستے ہوئے یہ جملہ کہا کہ وہ اپنی خود پسندی میں ایسا پھنسا ہوا ہے کہ اس کو یہاں آنے کی فرصت نہیں ملی) جب اُس آدمی نے یہ بات کہی تو حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) نے (جو اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے) فوراً کہا: تم نے بہت غلط بات کہی۔ اے اللہ کے رسول! ہم کعب بن مالک (رضی اللہ عنہ) کے متعلق اچھا ہی گمان رکھتے ہیں (یعنی یہ آدمی ان کے متعلق جو کہہ رہا ہے کہ وہ خود پسندی میں مبتلا ہیں؛ یہ بات درست نہیں ہے۔ گویا حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) نے اس آدمی کی تردید کی) اس تردید پر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم خاموش رہے (گویا آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے خاموشی کے ذریعہ حضرت معاذ (رضی اللہ عنہ) کی تائید فرمائی)۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے سامنے اگر کسی مسلمان کی برائی کی جائے تو سننے والوں کا فریضہ اور ذمہ داری ہے کہ اس کی طرف سے دفاع کریں۔ شریعت کا ہمیں یہ حکم ہے کہ اگر وہ بات غلط ہو تو فوراً اس کی تردید کریں۔ اور اگر تردید کی طاقت نہ ہو تو وہاں سے اُٹھ جائیں۔ وہیں چپ چاپ بیٹھ کر باتوں کو سنتے رہنا گویا اس میں شریک ہونا ہے۔

باب بیان ما یباح من الغیبۃ

کن صورتوں میں غیبت کی اجازت ہے؟

زبان کی حفاظت سے متعلق بیان چل رہا تھا اسی سلسلہ میں آج ایک نیا عنوان قائم کر رہے ہیں: "باب بیان ما یباح من الغیبۃ" اس باب میں احادیث کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ بعض سورتیں ایسی ہیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے، اب وہ کون کون سی صورتیں ہیں اور کب گنجائش اور اجازت ہے؟ اسی کو آگے بیان کیا ہے۔

غیبت کی اجازت کے چھ سبب ہیں

إِعۡلَمۡ أَنَّ الۡغِيۡبَةَ تُبَاحُ لِغَرَضٍ صَحِيحٍ شَرۡعِيٍّ لَا يُمۡكِنُ الۡوُصُولُ إِلَيۡهِ إِلَّا بِهَا، وَهُوَ سِتَّةُ أَسۡبَابٍ"

اگر کوئی صحیح شرعی غرض اور سبب ایسا موجود ہو کہ غیبت کے بغیر اس مقصود کو حاصل کرنا ممکن ہی نہ ہو، تو اس صورت میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے، اور جن کی بنیاد پر غیبت کو درست قرار دیا گیا ہے ایسے اسباب کل چھ ہیں۔

پہلا سبب؛ فریاد رسی

الأَوَّلُ: التَّظَلُّمُ، فَيَجُوزُ لِلۡمَظۡلُومِ أَنۡ يَتَظَلَّمَ إِلَى السُّلۡطَانِ وَ الۡقَاضِي وَ غَيۡرِهِمَا مِمَّنۡ لَهُ وِلَايَةٌ، أَوۡ قُدۡرَةٌ عَلَى إِنۡصَافِهِ مِنۡ ظَالِمِهِ، فيقول: ظَلَمَنِي فُلَانٌ بِكَذَا.

پہلا سبب ’’التَّظَلُّمُ‘‘یعنی دادرسی اور فریادرسی۔ کسی پر ظلم ہوا، اس کا حق مارا گیا، اس پر کسی بھی قسم کی جانی، مالی، یا عزت و آبرو کے اعتبار سے زیادتی کی گئی، تو اب اس مظلوم کو اس بات کی اجازت ہے کہ اپنے اوپر ہوئے ظلم و زیادتی کو دور کرنے کے لئے اور انصاف چاہنے کے لئے حاکم ، بادشاہ یا قاضی کے سامنے، یا ایسے حضرات جو معاشرہ اور سماج میں قدرت والے اور صاحبِ اختیار ہیں جن کے پاس کچھ پاورس (Powers) ہیں اور وہ اس ظالم سے اس کا حق دلواسکتے ہیں ان کے سامنے جاکر فریاد کرے، اور ظاہر ہے کہ جب ان کے سامنے حالات پیش کرے گا تو اس کو کہنا پڑے گا کہ فلاں نے میری زمین لے لی، میرے پیسے لے لیے، میرے ساتھ اس طرح زیادتی کی، میری عزت و آبرو کو مجروح کیا؛ یہ ساری باتیں جو پیش کی جائیں گی وہ غیبت شمار نہیں ہوں گی۔ہاں! یہی سب باتیں اگر آپ دوسروں کے سامنے بیان کرتے ہیں تب تو وہ غیبت ہے ، لیکن اگر حاکم کے سامنے اس بات کو اس لیے پیش کررہے ہیں کہ حاکم اس سے آپ کا حق دلوانے کی طاقت رکھتا ہے اور ظلم کو دور کرسکتا ہے؛ تو یہ ایک مقصود ہے کہ اپنا حق وصول کرنے کے لئے حاکم کے سامنے حالات کو پیش کیا جائے، تاکہ اس کے ذریعہ اپنا حق وصول کیا جاسکے، اور جس نے آپ کی حق تلفی کی ہے اور آپ کا حق دبالیا ہے، آپ کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ کیا ہے، اس ظلم و زیادتی کو دور کیا جائے؛ تو اس کی اجازت ہے۔ یہ پہلا سبب ہے جس کی وجہ سے غیبت کی اجازت ہے۔

دوسرا سبب؛ گناہ سے روکنا

الثَّانی: الاسْتِعانَۃُ عَلَی تَغْیِیرِ المُنْکَرِ، وَرَدِّ العَاصِی إِلَی الصَّوابِ، فیقولُ لِمَنْ یَرْجُو قُدْرَتَہُ عَلَی إِزالَۃِ المُنْکَرِ: فُلانٌ یَعْمَلُ کَذا، فازْجُرْہُ عَنْہُ ونحو ذَلِكَ ویکونُ مَقْصُودُہُ التَّوَصُّلُ إِلَی إِزالَۃِ المُنْکَرِ، فَإِنْ لَمْ یَقْصِدْ ذَلِكَ کَانَ حَرَاماً.

دوسری صورت جس میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کسی گناہ اور معصیت میں مبتلا ہے، اس کو اس گناہ سے روکنے اور باز رکھنے کے لیے کسی سے مدد طلب کی جائے، تاکہ وہ اس گناہ اور معصیت سے روک دے۔ مثلاً: کسی کا بیٹا سینما دیکھتا ہے، اور ظاہر ہے کہ سینما دیکھنا حرام کام ہے، اب کوئی آدمی اس کے باپ کو شکایت کرے کہ تمہارا بیٹا سینما دیکھتا ہے، تو اس کا مقصد یہ ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو یہ گناہ کرنے نہ دے، اس گناہ سے روکے۔ اب کوئی آدمی اس شکایت کرنے والے سے یوں کہے کہ: تم نے تو باپ کے سامنے جا کر بیٹے کی غیبت کی، اور غیبت کرنا حرام ہے، تو اس سے کہا جائے گا کہ: جی ہاں؛ یہ غیبت ہی ہے، لیکن صحیح مقصد کے لیے اس کی اجازت ہے۔

اسی طرح کسی گنہ گار کو صحیح راہ پر لانے کے لئے اس کے حالات کسی کے سامنے پیش کرنا، تاکہ وہ اس کو اس گناہ سے دور رکھنے میں مدد گار بنے۔ جیسے: باپ کے سامنے بیٹے کی، استاذ کے سامنے شاگرد کی، حاکم کے سامنے محکوم کی، بڑے کے سامنے اس کے چھوٹے کی، یا ذمہ دار اور تربیت کرنے والے کے سامنے اس کے ماتحت کی شکایت کرنا کہ وہ فلاں فلاں غلط

کام کر رہا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کا بڑا اس کو اس برائی سے روکے، ان باتوں کے پہنچانے والے کا مقصد یہی ہو کہ وہ برائی ختم ہو جائے، اس کی سنیما دیکھنے کی عادت چھوٹ جائے، اگر جوا کھیل رہا ہے، شراب پیتا ہے تو وہ ان عادتوں سے باز آجائے، اسی لیے اس کی باتیں اوپر تک پہنچا رہا ہے؛ تب تو اس کا شکایت پہنچانا جائز اور درست ہے۔

اور اگر باپ تک بیٹے کی، یا استاد تک شاگرد کی، یا اوپر والے تک نیچے والے کی شکایت پہنچانے والے کا مقصد اس برائی کو دور کرنا نہیں ہے، بلکہ نیت یہ ہے کہ اس بہانے سے اس کو لوگوں کے سامنے اور زیادہ رُسوا کیا جائے، باپ سے کہتا ہے کہ تمہارا بیٹا ایسا کر رہا ہے، تم اپنے بیٹے کو روکتے نہیں؟ لوگوں کے سامنے باپ سے اس کے بیٹے کے متعلق اس طرح کہنا ہی علامت ہے کہ اس کی نیت اصلاح کی نہیں ہے، بلکہ رسوا کرنے کی ہے۔ اس لیے کہ باپ سے اگر یہی بات کہنی تھی تو تنہائی میں بھی کہہ سکتا تھا، لیکن اس کا مقصد بیٹے کو اس برائی سے روکنا نہیں ہے؛ بلکہ سارے لوگوں کے سامنے باپ کو شرمندہ کرنا ہے اور بیٹے کو بھی رُسوا کرنا ہے، اس وجہ سے یہ گناہ ہے۔

تیسرا سبب: مسئلہ دریافت کرنا

الثَّالِثُ: الاسْتِفْتَاءُ، فيقُولُ لِلمُفْتِي: ظَلَمَنِي أَبِي أَوْ أخي، أَوْ زوجي، أَوْ فُلانٌ بِكَذَا فَهَلْ لَهُ ذَلِكَ؟ وَمَا طَرِيقِي فِي الخلاصِ مِنْهُ، وتَحْصِيلِ حَقِّي، وَدَفْعِ الظُّلْمِ؟ وَنَحْوُ ذَلِكَ، فهذا جَائِزٌ لِلْحَاجَةِ، ولَكِنَّ الأحْوط

والأفضَلَ أنْ یقول: مَا تقولُ فی رَجُلٍ أَوْ شَخْصٍ، أَوْ زَوْجٍ، کَانَ مِنْ أمْرِهِ کذا؛ فَإِنَّهُ یَحْصُلُ بِهِ الغَرَضُ مِنْ غَیرِ تَعْیینٍ، وَمَعَ ذَلِكَ، فالتَّعْیینُ جَائِزٌ کَمَا سَنَذْکُرُهُ فی حَدِیثِ هِنْدٍ إنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَی.

تیسری صورت جس میں غیبت کو درست اور جائز قرار دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ: آدمی اپنے حالات کے متعلق کسی مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھے کہ مثلاً: میرے باپ یا بھائی نے میرے ساتھ یہ زیادتی کی ہے، یا شوہر نے بیوی کے ساتھ زیادتی کی، اس کی پٹائی کر دی، یا اس کا کوئی حق نہیں ادا کیا، اب بیوی مفتی صاحب سے سوال کرتی ہے کہ میرے شوہر نے میرے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے؟ اس کا یہ معاملہ کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں ہے تو مَیں اپنے آپ کو اس کے ظلم سے کس طرح بچا سکتی ہوں؟ میرے لئے کیا تدبیر ہے؟ آپ مجھے کیا ہدایت دیتے ہیں؟ میرا شوہر میرے ساتھ ایسا کرتا ہے؛ تو شرعاً وہ گنہ گار ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لئے کیا وعیدیں ہیں؟ اور بیوی کے اس پوچھنے کا مقصد یہ ہے کہ شوہر اپنی اس حرکت سے باز آجائے۔

یا کوئی آدمی سوال کرے کہ: فلاں نے میرے ساتھ یہ معاملہ کیا تو کیا اس کے لئے میرے ساتھ ایسا معاملہ کرنا جائز اور درست تھا؟ ذرا بتلایئے کہ میرے لئے اب اس سے بچنے کی کیا شکل ہے؟ میرے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے اس کو میں کیسے دور کر سکتا ہوں؟ شرعی حدود میں رہ کر مَیں ایسی کونسی تدبیر اختیار کروں کہ اس سے اپنا حق وصول کر لوں؟

مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ جو ظلم وزیادتی ہوئی ہو، اس کا شرعی حکم دریافت کرنے کے لئے، یا کسی سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے، یا اپنے اوپر ہونے والے ظلم کو دور کرنے کے لئے، یا جو آدمی زیادتی کر رہا ہے اس پر کیا وعیدات ہیں ان کو معلوم کرنے کے لئے اگر کوئی آدمی کسی مفتی صاحب سے جب اس طرح کا سوال کرے گا تو ظاہر ہے کہ سامنے والے کے حالات بیان کرنے ہی پڑیں گے، تو اسی کا حکم بتلایا کہ ضرورت کی وجہ سے یہ جائز اور درست ہے، یہ غیبت میں شمار نہیں ہوگا۔

لیکن اس میں بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے اور بہتر شکل یہ ہے کہ کھلم کھلا کہنے کی بجائے ذرا مبہم الفاظ میں کہے تو بہتر ہے، مثلاً: ’’میرے باپ نے میرے ساتھ یوں کیا‘‘ کہنے کی بجائے یوں کہے کہ ’’ایک باپ اپنے بیٹے کے ساتھ ایسا کر رہا ہے‘‘ اس کے لئے کیا حکم ہے؟ ’’ایک بھائی اپنے بھائی کے ساتھ یہ معاملہ کر رہا ہے‘‘ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ اگر یوں کہے کہ ’’ایسے آدمی کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ یوں کرتا ہو؟ ایسے آدمی کے متعلق شریعت کیا کہتی ہے جو اپنے بیٹے کے ساتھ یوں زیادتی کرتا ہو؟ ایسے آدمی کے لئے شریعت کا کیا حکم ہے جو اپنے بھائی کے ساتھ یہ معاملہ کرتا ہو؟ تو اس صورت میں ایک عام بات پوچھی جا رہی ہے، اور وہ شخصیت کون ہے اس کو سامنے لائے بغیر بھی پوچھنے والے کا مقصود حاصل ہو جائے گا۔ اب اگرچہ احتیاط یہی ہے کہ کھلم کھلا نام نہ لیا جائے اس کے

باوجود اگر کوئی آدمی اپنے بھائی، باپ کا نام لیتا ہے، یا بیوی اپنے شوہر کا کھلم کھلا نام لیتی ہے؛ تب بھی جائز ہے۔

چوتھا سبب؛ مسلمانوں کو کسی نقصان سے بچانا اور اس کی مختلف شکلیں

الرَّابِعُ : تَحْذِيرُ الْمُسْلِمِينَ مِنَ الشَّرِّ وَنَصِيحَتُهُمْ ،وَذٰلِكَ مِنْ وُجُوهٍ :

چوتھا سبب جس میں غیبت کی اجازت ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی پوری جماعت یا کوئی فرد کسی کی طرف سے کسی برائی میں مبتلا ہو سکتے ہیں؛ تو اس فرد کو یا اس شخصیت کو یا اس جماعت کو اس برائی اور نقصان میں پڑنے سے بچانے کے لئے کسی کا حال بتلایا دیا جائے (تفصیل آگے آرہی ہے) یا کسی کی خیر خواہی اور بھلائی چاہنے کے مقصد سے کسی کا حال بیان کیا جائے تو اس کی اجازت ہے۔ چناں چہ اس کی کئی شکلیں ہیں جن کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

پہلی شکل؛ جرح وتعدیلِ رواۃ

مِنْهَا: جَرْحُ الْمَجْرُوحِينَ مِنَ الرُّوَاةِ وَالشُّهُودِ ,وَذٰلَكَ جَائِزٌ بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِيْنَ ,بَلْ وَاجِبٌ لِلْحَاجَةِ.

پہلی شکل کو سمجھنے کے لیے کچھ تفصیل سنئے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشادات اور احادیث کے سلسلہ کو امت تک پہنچانے کے لیے بیچ میں کچھ واسطے آتے ہیں، یعنی نبی کریم ﷺ

سے ایک بات کسی صحابی نے سنی، ان سے دوسرے نے سنی، ان سے ان کے شاگرد نے، پھر ان سے ان کے شاگرد نے سنی، اس طرح واسطہ در واسطہ وہ بات ہم تک پہنچی، بیچ میں کہیں پانچ دس آدمی آئے، جن کو حدیث نقل کرنے والے کہا جاتا ہے، اب حضراتِ محدثین نے حدیث کی حفاظت کی خاطر ان افراد کی چھان بین کی تاکہ کوئی آدمی کوئی بھی غلط بات نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف منسوب نہ کردے، چوں کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جو بات نہیں کہی، اس کو یوں کہہ کر بیان کرنا کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے اس پر بڑی سخت وعید ہے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے: ”مَنْ کَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّداً فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ“ جو آدمی مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ اسی لیے حدیث بیان کرنے کے معاملہ میں حضراتِ علماء بہت احتیاط فرماتے ہیں بلکہ بعض حضراتِ صحابہ جنہوں نے براہِ راست نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانِ مبارک سے باتیں سنی تھیں، وہ بھی کبھی کبھی جب حدیث بیان کرتے تھے تو یوں نہیں کہتے تھے کہ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ ارشاد فرمایا ہے، بلکہ احتیاط کے طور پر یہاں تک فرماتے تھے کہ یوں فرمایا، یا اس جیسا، یا اس کے قریب قریب ارشاد فرمایا ہے۔

بہر حال! کوئی بات حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے نہیں کہی پھر بھی آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف اس کی نسبت کرنا بڑی خطرناک چیز ہے۔ تو جھوٹی باتوں کو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی طرف منسوب ہونے سے بچانے کے لیے محدثین نے بڑی محنتیں کی ہیں کہ جو لوگ بیچ میں واسطہ بن رہے ہیں؛ وہ

کیسے ہیں؟ آیا سچے لوگ ہیں، یا اپنے دنیوی معاملات میں جھوٹ سے کام لیتے ہیں؟ ایک آدمی لوگوں کے ساتھ جھوٹا معاملہ کرتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ اگر ہم سے کوئی بات بیان کرے گا تو ہم اس پر کیسے اعتماد اور بھروسہ کرسکتے ہیں؟ جب وہ دوسری باتوں میں جھوٹ بولتا ہے تو اللہ اور رسول کے معاملہ میں جب کوئی بات کہے گا تو اس پر بھروسہ اور اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ تو حدیث کے نقل کرنے والے راویوں کے متعلق محدثین نے جرح کی، یعنی ان کے اندر جو جو کمزوری تھی اس کو ظاہر کیا کہ یہ آدمی جھوٹ بولتا ہے، یہ آدمی حدیثیں گھڑتا ہے، یا اس آدمی کا حافظہ اتنا مضبوط نہیں ہے، اس کی یادداشت کمزور ہے، اور جب کسی کا حافظہ اور یادداشت ہی کمزور ہو تو وہ دوسروں کی بات پوری پوری بیان نہیں کرسکتا، اس میں اس سے گڑبڑ ہوسکتی ہے، لہٰذا اس نے جو روایت نقل کی ہے اس میں بھی ہوسکتا ہے کہ یادداشت اور حافظہ کے کمزور ہونے کی وجہ سے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے الفاظ کو پورے طور پر بیان نہ کیا ہو۔

بہر حال! جتنے بھی حدیث کے نقل کرنے والے راویوں پر حضراتِ محدثین کی طرف سے جرح کی گئی ہے اور ان کی کمزوریوں کو بیان کیا گیا ہے، اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک طرح کی غیبت ہے، لیکن چوں کہ یہ دین کا ایک اہم معاملہ ہے، اور حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے نام سے ایک چیز لوگوں کے سامنے پیش کی جارہی ہے، اگر خدانہ کرے وہ غلط ہوئی تو اس صورت میں پورا دین متاثر ہوتا ہے، اس لیے امت کی خیر خواہی کا تقاضا یہی تھا کہ بات صاف کردی جائے۔

اسی طرح گواہوں کے متعلق بھی یہی معاملہ ہے۔ہر زمانہ میں اسلامی حکومت میں قاضی اور جج کی یہ ذمہ داری رہتی ہے کہ جن لوگوں کو گواہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، ان کے اندرونی حالات کی باقاعدہ تحقیق کرائے کہ یہ آدمی لوگوں کے ساتھ معاملات اور سچائی میں کیسا ہے؟ اس لیے کہ جب وہ کسی معاملہ میں گواہ بن کر کورٹ میں آرہا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اس آدمی کی پوزیشن سماج، معاشرے اور سوسائٹی میں کیا ہے؟ اور اس کو کیا مقام حاصل ہے؟ یہ معلوم کرنا قاضی کی ذمہ داری ہے۔اس لیے کہ مثلاً کسی نے کسی پر دعویٰ کیا کہ میرا ایسا ایسا معاملہ ہے، اور جب اس سے پوچھا گیا کہ گواہ کون ہے؟ تو بتایا کہ فلاں آدمی ہے، تو اب اگر ایسا آدمی گواہ بن کر کورٹ میں جائے جس کی بات پر کوئی بھی اعتماد نہیں کرتا، سماج میں اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، سوسائٹی میں اس کی بات کا کوئی اعتبار ہی نہیں کیا جاتا، اور ساری دنیا جانتی ہے کہ یہ جھوٹ بولتا ہے، اور اس کے معاملات ٹھیک نہیں ہیں؛ تو پھر ایسے آدمی کی گواہی قابلِ قبول نہیں ہے۔

لہٰذا اسلامی حکومت کا جج قاضی جب گواہوں کے متعلق تحقیق کرے گا تو اس وقت لوگوں کی ذمہ داری ہوگی کہ اس کو بتائیں کہ فلاں آدمی کیسا ہے، اس میں کوئی کمی کمزوری ہو تو اس کو ظاہر کریں، بلکہ حاکم کی طرف سے ذمہ دار اور دیندار قسم کے ایسے لوگ مقرر ہوتے ہیں جو سارے لوگوں کے حالات سے باخبر ہوں، تاکہ جب ایسا کوئی معاملہ پیش آئے

تو ان سے پوچھا جائے کہ فلاں آدمی گواہی میں آیا ہے، بتاؤ وہ کیسا ہے؟ اگر وہ کہیں کہ صحیح آدمی نہیں ہے، تو ان کی گواہی کی بنیاد پر اس کی گواہی رد کردی جائے گی؛ اسی کو تعدیل کہتے ہیں۔

اسی کو اس عبارت میں بتایا ہے کہ گواہ یا راوی کی کمزوری کو ظاہر کرنے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ جائز ہے۔ اگر اس کو ناجائز کہیں گے تو نہ کوئی فیصلہ صحیح ہوسکے گا نہ کوئی روایت امت تک صحیح پہنچ سکے گی۔ بلکہ ایک اہم ضرورت کی وجہ سے جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے۔

جس کے متعلق تحقیق کی جائے اور اس کو معلوم ہے کہ اس میں فلاں کمزوری ہے تو اب اس کی ذمہ داری ہے کہ اس کمزوری کو بیان کردے، اس کے لئے خاموش رہنا جائز نہیں ہے۔ اگر قاضی کی طرف سے آپ کے پاس تحقیق آئی اور آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے محلے کا فلاں آدمی فلاں مسئلے میں گواہی دینے کے لئے آیا ہے، وہ کیسا ہے؟ اور آپ جانتے ہیں کہ اس میں یہ یہ کمزوری ہے تو آپ کو بتلانا ضروری ہے، اگر آپ نے چھپایا، تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کو عذاب دیا جائے گا، اس لیے کہ آپ نے نہیں بتلایا جس کی وجہ سے فیصلہ غلط ہوا۔

بہرحال! ایک شکل تو یہ ہوئی جس میں مسلمانوں کو برائی سے بچانے کے لیے کسی کی غیبت کی اجازت دی گئی ہے۔

سسرالی رشتہ داری

ومنها: المُشَاوَرَةُ فی مُصاهَرَةِ إنْسانٍ أو مُشارکتِهِ، أَوْ إیداعِهِ، أَوْ مُعامَلَتِهِ، أَوْ غیرِ ذٰلِكَ، أَوْ مُجَاوَرَتِهِ، ویجبُ عَلَی المُشَاوِرِ أنْ لا یُخْفِیَ حَالَهُ بَلْ یَذْکُرُ المَسَاوِیْٔ الَّتی فِیهِ بِنِیَّةِ النَّصیحَةِ.

کسی کو برائی سے بچانے کی اور شکلیں بھی ہیں، ان میں ایک شکل آپسی رشتہ داری کے معاملات کی ہے، مثلاً: ایک آدمی اپنی لڑکی کا رشتہ کسی کے یہاں کرنا چاہتا ہے، وہ آپ کے پاس آیا کہ فلاں لڑکے کا ہماری لڑکی کے واسطے پیغام آیا ہے، آپ مشورہ دیجئے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس لڑکے کے اندر یہ یہ کمزوریاں ہیں۔ یا لڑکا تو ٹھیک ٹھاک ہے لیکن خاندانی اعتبار سے اس کے گھرانے میں کسی قسم کی کمزوری ہے، اس کے باوجود آپ چپ رہے، اور ان باتوں کو ظاہر نہیں کیا؛ تو اس صورت میں آپ گنہگار ہوں گے۔ اس لیے کہ جب آپ سے مشورہ لیا جارہا ہے، تو آپ کی ذمہ داری ہے کہ جو بھی حقیقت حال ہو وہ بتلادیں کہ میرے نزدیک تمہارا یہ رشتہ مناسب ہے یا نہیں۔ جس سے بھی مشورہ لیا جارہا ہو وہ اس معاملہ میں امانتدار رہے، اور اس کی ذمہ داری ہے کہ صحیح صحیح مشورہ دے۔

موجودہ دور کی ایک خرابی

ہمارے اس زمانہ میں اس معاملہ میں ایک کمزوری آگئی ہے جس کی طرف میں نشاندہی کرنا چاہتا ہوں کہ جس سے مشورہ لیا جارہا ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ حقیقت کو سامنے رکھ

کر مشورہ دے، اس کی دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے، لیکن بہت سی مرتبہ لوگ ایسے موقعہ پر اپنی دشمنی نکالتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ایسی کوئی برائی نہیں ہے پھر بھی جھوٹ موٹ کہہ دیتے ہیں؛ تو ان کو تو اللہ تعالیٰ کو جواب دینا ہوگا۔ جیسے حقیقت میں کوئی برائی تھی اس کو بیان نہ کرنا گناہ ہے، اسی طرح اگر حقیقت میں کوئی برائی نہ ہو پھر بھی فقط اپنی دشمنی نکالنے کے لیے ایسا کہہ دینا کہ اس میں فلاں برائی ہے، تاکہ اس کے لڑکے کو وہ لڑکی نہ ملے؛ یہ بھی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر ایک چیز کا جواب دینا ہے۔ دنیا میں تو یہ کہہ کر چھوٹ جائے گا کہ مجھ سے تو مشورہ لیا گیا تھا، اس لیے میری ذمہ داری تھی کہ جو حقیقت حال ہو اس کو بتلادوں ، اس لیے میں نے حقیقی بات بتلائی ہے، اس میں کوئی غلط کام نہیں کیا ہے، لیکن اصل معاملہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور حقیقی معاملہ اسی سے ہے۔

یہ سب فتنوں کے اسباب ہیں

لیکن ایک بات اور بھی ہے، جیسا میں نے اوپر کہا تھا کہ قاضی کی ذمہ داری ہے کہ گواہوں کے متعلق تحقیق کرے۔ تو قدیم زمانہ میں قاضی گواہوں کے متعلق دونوں طریقوں سے تحقیق کراتا تھا، خفیہ طور پر بھی اور کھلم کھلا بھی۔ ظاہراً پوچھا جاتا تھا کہ یہ گواہ بن کر آیا ہے تو کیسا ہے؟ تو وہ تعدیل والا کہتا تھا کہ یہ برابر ہے یا برابر نہیں۔ لیکن بعد میں جب حالات کچھ ایسے ہوئے جس کی وجہ سے اس کے ساتھ لوگ دشمنی رکھنے لگے تو پھر

مشائخ نے کھلم کھلا کی جانے والی تعدیل کے متعلق فرمایا کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے کہ آپ کی بیٹی کا کوئی پیغام آیا اور آپ نے مشورہ لیا کہ فلاں کے یہاں سے پیغام آیا ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے؟ اب جس سے مشورہ لیا گیا اس نے دیانت اور امانتداری کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے جو بات بھی اس کے علم میں تھی اس کے مطابق بتلا دیا کہ دیکھو! وہ لڑکا ذرا آؤٹ لائن ہے۔ یا اس کا فلاں فلاں معاملہ بھی ہے۔ اب اس نے تو یہ مشورہ آپ کی خیر خواہی کے طور پر دیا، اور آپ اس پیغام کو رد کر رہے ہیں، تو آپ لوگوں سے یوں نہ کہیں کہ میں نے فلاں صاحب سے مشورہ کیا تھا۔ آج کل تو ایسا ہو گیا ہے کہ لوگ اپنے سر سے بلا کو ٹلانے کے لئے یوں کہہ دیتے ہیں کہ میں نے فلاں مولانا صاحب یا مفتی صاحب سے مشورہ کیا تھا، انہوں نے یہ مشورہ دیا؛ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ اسی بنا پر آج کل تو مشورہ دینا اور صحیح بات بتلانا مشکل ہو گیا ہے۔ جیسے: اُس کے لئے بات چھپانا درست نہیں تھا، اِس کے لئے بھی اس بات کو کھولنا جائز نہیں ہے؛ یہ سب فتنوں کے اسباب ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بہت سارے جھگڑے ایسی ہی باتوں سے پیدا ہوتے ہیں، اگر آپ اس رشتہ کو قبول کرنا نہیں چاہتے تو مت کیجئے، مگر اُس کو یہ نہ بتایئے کہ میں نے فلاں صاحب سے مشورہ کیا تھا تو اس نے یہ مشورہ دیا۔ بہر حال! یہ سسرالی رشتہ قائم کرنے کے لئے مشورہ کی بات ہوئی۔

یہ بھی غیبت میں شمار نہیں

دوسری بات کسی کے ساتھ پارٹنر شپ کی ہے۔ مثلاً ایک آدمی آیا کہ فلاں کے ساتھ میں پارٹنر شپ میں دھندہ کرنا چاہتا ہوں، آپ کیا مشورہ دیتے ہیں؟ پارٹنر شپ کے لئے جس کا نام لیا ہے اس کو آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں، اس کے اندر کے حال سے بھی خوب واقف ہیں کہ اس سے پارٹنر شپ کرنا ٹھیک ہے یا نہیں۔ اور آپ معاملہ کو برابر سمجھتے ہیں؛ تو اب آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس میں ایسی کوئی کمزوری اور عیب ہو جس کی وجہ سے اس کے ساتھ شرکت اور پارٹنر شپ کرنا ٹھیک نہیں ہے، اور اگر یہ اس کے ساتھ پارٹنر شپ کرلے گا تو بے چارہ بہت پریشان ہوگا اور روئے گا؛ تو اس صورت میں اس سے کہہ دیں کہ: دیکھو بھائی! صحیح بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ پارٹنر شپ کا معاملہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس کو غیبت میں شمار نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا کہنا جائز بلکہ بعض حالات میں ضروری ہے۔

ایک شکل یہ ہے کہ کوئی آدمی آپ کے پاس آیا اور کہا کہ: میں باہر ملک جارہا ہوں، مجھے اپنے پیسے یا فلاں چیز امانت رکھنی ہے، مَیں اپنا گھر فلاں صاحب کو سونپ کر جانا چاہتا ہوں، اور میرا سب کاروبار بھی ان کے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں، اب آپ جانتے ہیں کہ ان کا حال کیسا ہے؟ سارے لوگوں کے سامنے ان کا وہ حال کھلا ہوا نہیں ہے، لیکن آپ کو معلوم

ہے؛ تو اس صورت میں آپ کے لیے ضروری ہے کہ اس کو برائی اور نقصان سے بچانے کے لئے صحیح مشورہ دیں، چاہے تفصیل بیان نہ کریں، مختصراً ہی کہہ دیجئے۔

دارومدار نیت پر ہے

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ آپ کے خاموش رہنے کی صورت میں کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کو نقصان سے بچانے کے لئے اس کی خیر خواہی کے طور پر اگر آپ کوئی بات ظاہر کرتے ہیں، تو دل کی نیت سے تو اللہ تعالیٰ واقف ہے، سارا معاملہ اللہ تعالیٰ سے ہے، وہاں جواب دینا ہے، اگر آپ واقعۃً صحیح نیت سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو اس صورت میں جائز ہے۔

یا کسی کے پڑوس کا کوئی مکان بک رہا ہے، اور کوئی آدمی آیا کہ میں خریدنا چاہتا ہوں، میرے لیے لینا مناسب ہے یا نہیں؟ اب اگر آپ مناسب نہیں سمجھتے تو بتلا دیجئے کہ پڑوسی میں یہ کمزوری ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جس سے مشورہ لیا جا رہا ہے اس کے اوپر واجب اور ضروری ہے کہ اس کے سامنے جو حالات ہوں ان میں سے کسی چیز کو نہ چھپائے، بلکہ خیر خواہی کی نیت سے واضح کردے۔ اس کی نیت برائی ظاہر کرنے کی نہ ہو۔ بلکہ نیت یہ ہو کہ میرے پاس یہ جو پوچھنے کے لئے آیا ہے اس کی بھلائی اسی میں ہے۔

نیت بدل جائے گی تو حکم بدل جائے گا

دیکھو! نیت بدل جائے گی تو حکم بدل جائے گا۔ آپ اس کی بھلائی چاہنے کے لئے نہیں بلکہ اس کی برائی کرنا ہی چاہتے تھے اور یہ پوچھنے آیا تو آپ کو موقع مل گیا اور آپ نے اس کو خوب برا بھلا کہا کہ: وہ تو ایسا ہے، اور ویسا ہے۔ یہ کہتے ہوئے آپ کی نیت اس کی برائی کرنا ہے، آپ کی نیت سامنے والے کی بھلائی چاہنا نہیں ہے؛ تو گناہ اور حرام ہے، اور اگر مشورہ لینے آنے والے کی بھلائی چاہنے کی نیت سے وہی بات کہیں گے تو وہ کہنا واجب اور ضروری ہے۔

علمی یا عملی عقیدہ کی حفاظت کی خاطر

ومنها : إِذَا رأى مُتَفَقِّهاً يَتَرَدَّدُ إِلَى مُبْتَدِعٍ ، أَوْ فَاسِقٍ يَأْخُذُ عَنْهُ العِلْمَ وخَافَ أَنْ يَتَضَرَّرَ الْمُتَفَقِّهُ بِذَلِكَ، فَعَلَيْهِ نَصِيحَتُهُ بِبَيَانِ حَالِهِ، بِشَرْطِ أَنْ يَقْصِدَ النَّصِيحَةَ.

کوئی طالب علم یا دین سیکھنے والا دین سیکھنے کے لئے کسی کے پاس جا رہا ہے، اور جس کے پاس جا رہا ہے وہ بدعتی، یا فاسق اور بدکار آدمی ہے، اب اس طالب علم کو تو اس کا اندرونی حال معلوم نہیں ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے۔ یا آپ کو اس بات کا ڈر ہے کہ اگر یہ اس کی صحبت میں رہے گا تو نقصان اٹھائے گا، تو اگر وہ پوچھنے نہ بھی آیا ہو تب بھی آپ کی ذمہ داری تھی کہ اس کو حالات سے آگاہ کر دیتے۔

دیکھو! پہلی صورت میں تو مسئلہ یہ تھا کہ سامنے والا مشورہ لینے کے لیے آیا تھا، لیکن یہاں وہ آپ سے پوچھنے نہیں آیا ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہ علم اور دین سیکھنے کے لئے کسی پاس آتا جاتا ہے، تو اب اس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ اس کے حالات بیان بتا دیئے جائیں۔ بس! یہاں پر بھی وہی نیت کا مسئلہ نہایت ضروری ہے کہ اس کی نیت سامنے والے کی برائی نہ ہو، بلکہ نیت اس کی بھلائی چاہنا ہو۔

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

وَهٰذَا مِمَّا يُغْلَطُ فِيهِ. وَقَدْ يَحمِلُ المُتَكَلِّمَ بِذٰلِكَ الحَسَدُ، وَيُلَبِّسُ الشَّيطَانُ عَلَيهِ ذٰلِكَ، وَيُخَيِّلُ إِلَيهِ أَنَّهُ نَصِيحَةٌ فَلْيُتَفَطَّنْ لِذٰلِكَ.

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ایک ایسی بات ہے جس میں بہت سی مرتبہ غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ کیسے؟ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ یہ جس کے یہاں لوگ جاتے ہیں اُس پر اِس کو حسد ہے، اور اِس کے دل میں یہ ہے کہ یہ لوگ اُس کے یہاں کیوں جاتے ہیں؟ میرے پاس کیوں نہیں آتے، اس لیے یوں کہتا ہے کہ اُس میں تو فلاں فلاں کمزوریاں ہیں، وہاں مت جاؤ۔ اب دیکھو! یہاں خیر خواہی نہیں ہے، بلکہ اصل میں تو حسد کا جذبہ کام کر رہا ہے جو اِس کے دل کے اندر چھپا ہوا ہے، لیکن اس کو اوپر سے عنوان یہ دیا جا رہا ہے کہ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں۔ تو کبھی شیطان ایسی غلط فہمی میں ڈال دیتا ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ ایسے معاملات میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

یہ بھی غیبت نہیں

وَمِنها : أنْ یکونَ لَهُ وِلایَةٌ لا یقومُ بِهَا عَلَی وَجهِها : إمَّا بِأنْ لا یکونَ صَالِحاً لَهَا، وإما بِأنْ یکونَ فَاسِقاً ، أوْ مُغَفَّلاً ، وَنَحوَ ذٰلِكَ فَیَجِبُ ذِکْرُ ذٰلِكَ لِمَنْ لَهُ عَلَیْهِ ولایةٌ عامَّةٌ لِیُزِیلَهُ، وَیُوَلِّیَ مَنْ یُصلح. أوْ یَعْلَمَ ذٰلِكَ مِنهُ لِیُعَامِلَهُ بِمُقْتَضَی حالِهِ، وَلاَ یَغْتَرَّ بِهِ، وأنْ یَسْعَی فِی أنْ یَحُثَّهُ عَلَی الاسْتِقامَةِ أوْ یَسْتَبْدِلَ بِهِ.

ایک صورت یہ ہے کہ بڑے حاکم کی طرف سے کسی کو کوئی عہدہ سونپا گیا، اور اس عہدے کی نسبت سے اس پر جو ذمہ داریاں اور تقاضے عائد ہوئے ان کو وہ پورا نہیں کر سکتا، یا تو اس لیے کہ جو ذمہ داری عہدہ و منصب اور جو پوسٹ اس کو دی گئی ہے، دینے والے نے یہ سوچا کہ بڑا عالم ہے، لہٰذا اس کو یہ ذمہ داری سونپ دو، لیکن یہ جانتا ہے کہ اس پوسٹ کی نسبت سے جو کام آتے ہیں ان کو کرنے کی ان عالم صاحب میں صلاحیت نہیں ہے؛ اس لیے اگر یہ کام ان کو سونپا جائے گا تو وہ اس کو انجام نہیں دے سکیں گے۔ مثلاً: کسی کو قاضی کی پوسٹ پر مقرر کیا گیا، کورٹ میں جج مقرر کیا گیا، لیکن اس میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔ یا تو وہ آدمی جس کو یہ کام سونپا جا رہا ہے وہ فاسق ہے، اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں اور شریعت کی خلاف ورزی میں مبتلا ہے۔ یا غفلت کا شکار ہے (مطلب یہ ہے وہ اس ذمہ داری کو پوری کرنے کی لیاقت اور صلاحیت نہیں رکھتا) تو اس کو اوپر والے حاکم تک بات پہنچانا ضروری ہے کہ فلاں کو جو پوسٹ یا عہدہ دیا گیا ہے؛ اس میں اس عہدے کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اس عہدے کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یا صلاحیت تو ہے، یعنی علمی

اعتبار سے تو وہ مضبوط ہے، لیکن اس میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اس کام کو انجام دے سکے؛ تو اوپر والے حاکم تک یہ بات پہنچانا ضروری ہے؛ اس کو غیبت نہیں کہیں گے۔

اور اوپر والے حاکم کی امانت و دیانت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب اس کے علم میں یہ بات لائی جارہی ہے تو اس کی تحقیق کرے، اور اگر وہ بات صحیح ہو تو پھر اس کو اس منصب و عہدے سے ہٹادے۔ یا حاکم یہ سمجھتا ہے کہ اس کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے، اسی پوسٹ پر باقی رکھتے ہوئے اس کو ذراسی تنبیہ کردینے سے اس کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا، یعنی اگر اس کو ذرا کہہ دیں گے کہ: دیکھو! کام برابر کرو؛ ورنہ تم کو (Suspend) کر دیں گے اور اس عہدے سے ہٹادیں گے؛ تب تو کوئی حرج نہیں، اس وقت اس کو دھمکی دے دی جائے اور اس عہدہ پر باقی رکھا جائے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، یعنی اس میں صلاحیت ہی نہیں ہے، یا سدھار کی بھی امید نہیں؛ تو اس صورت کے اندر اس کو بدل دیا جائے۔

بہر حال! یہ سب صورتیں اور شکلیں مسلمانوں اور عام پبلک کو برائی اور نقصان سے بچانے کی تھیں جن میں غیبت کی اجازت ہے۔

پانچواں سبب: علانیہ مرتکب گناہ

الخامِسُ: أنْ يَكُونَ مُجاهِراً بِفِسْقِهِ أوْ بِدْعَتِهِ كالمُجاهِرِ بِشُرْبِ الخَمْرِ، و مُصادَرَةِ النَّاسِ، وأَخْذِ المَكْسِ، وجِبَايَةِ الأَمْوَالِ ظُلْماً، وَتَوَلِّي الأُمُورِ الباطِلَةِ، فَيَجُوزُ ذِكْرُهُ بِمَا يُجَاهِرُ بِهِ، وَيَحْرُمُ ذِكْرُهُ بِغَيْرِهِ مِنَ العُيُوبِ، إلاَّ أنْ يكونَ لِجَوازِهِ سَبَبٌ آخَرُ مِمَّا ذَكَرْنَاهُ.

غیبت کی اجازت کا پانچواں سبب یہ ہے کہ: کوئی آدمی کھلم کھلا اور علانیہ کسی گناہ کا مرتکب ہے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی آدمی چھپ کر شراب پیتا ہو، اس کا اظہار کرنا تو غیبت میں شمار ہو گا، لیکن ساری دنیا کے سامنے کھل کر شراب پیتا ہو اور آپ لوگوں کے سامنے کہیں گے کہ یہ شرابی ہے، تو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ نے کوئی نیا انکشاف نہیں کیا ہے، بلکہ وہ اپنی یہ حرکت ساری دنیا کے سامنے کر ہی رہا ہے۔ لیکن اس کے صرف اسی گناہ کا اظہار کیا جا سکتا ہے جو وہ کھلم کھلا کر رہا ہو، اس کے کسی دوسرے گناہ کا تذکرہ کرنے کی بالکل اجازت نہیں۔ یعنی مان لیجئے کہ وہ شراب تو کھلم کھلا پیتا ہے، لیکن زنا چھپ کر کرتا ہے؛ تو اس کے شراب پینے کا تذکرہ تو آپ کر سکتے ہیں، لیکن زنا کا تذکرہ نہیں کر سکتے۔ جو گناہ چھپ کر کر رہا ہے اس کا اظہار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کھلم کھلا لوگوں کے سامنے فسق یا بدعت میں مبتلا ہے، یا لوگوں کا مال چھین لیتا ہے، یا کوئی حاکم ظلماً ٹیکس وصول کرتا ہے، یا لوگوں کے پاس سے مال چھین لیتا ہے، یا غلط کام اور حرکتیں کرتا ہے، تو جو غلط کام کھلم کھلا کرتا ہے اس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے، لیکن اس میں دوسری جو کمزوریاں ہیں ان کو بیان کرنے کی اجازت نہیں۔ مثلاً: کسی نے کہا کہ: فلاں آدمی شراب پیتا ہے، تو دوسرا کہتا ہے کہ: ارے جانے دو نا یار! تم شراب کی بات کرتے ہو؟ وہ تو زنا بھی کرتا ہے، اور جوا بھی کھیلتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کی دوسری

برائیوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع کر دیا، حالاں کہ یہ دوسری باتیں چاہے اس میں ہیں، لیکن وہ ان کا ارتکاب کھلم کھلا نہیں کرتا؛ تو ان کو بیان کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

چھٹا سبب: پہچان کروانا

السَّادِسُ : التعرِيفُ. فإذا كَانَ الإنْسانُ مَعرُوفاً بِلَقَبٍ، كالأعْمَشِ، والأعرَجِ، والأَصَمِّ، والأعْمى، والأحْوَلِ، وغَيْرِهِمْ جاز تَعرِيفُهُمْ بذلِكَ، وَيَحْرُمُ إطْلاقُهُ عَلَى جِهَةِ التَّنْقِيصِ، ولو أمكَنَ تَعْرِيفُهُ بِغَيرِ ذَلِكَ كَانَ أَوْلَى.

اور چھٹا سبب یہ ہے کہ لوگوں میں کسی کی پہچان کروانے کے لئے اس کے کسی عیب اور کمزوری کا تذکرہ کیا جائے، مثلاً: بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی آدمی کسی نام سے مشہور ہو جاتا ہے، جیسے: ایک آدمی لنگڑا ہے، اور آپ یوں کہیں کہ وہ لنگڑا ہے؛ تب تو غیبت ہے، لیکن اگر اس کے نام کے ساتھ ہی لنگڑا مشہور ہو گیا، جیسے: مان لیجئے کہ کسی کا نام امتیاز ہے، آپ لوگوں سے کہیں کہ: امتیاز آیا تھا، تو لوگ پوچھتے ہیں کہ: کون امتیاز؟ صرف امتیاز کے نام سے اس کو کوئی پہچانتا ہی نہیں، اس لیے کہ وہ لنگڑے کے نام سے ہی مشہور ہے، تو آپ کہیں کہ: امتیاز لنگڑا؛ تو سامنے والا فوراً پہچان لیتا ہے۔ بعض مرتبہ کسی کا نام "کالیا" پڑ جاتا ہے، اب لوگ اس کو اسی نام سے پہچانتے ہیں، یعنی اس کے والدین نے اس کا حقیقی اور اصلی جو نام رکھا ہے اگر اس نام سے آپ کہیں کہ مثلاً: یوسف آیا تھا، تو سامنے والا پوچھتا ہے: کون یوسف؟ اب آپ کو کہنا پڑتا ہے کہ یوسف کالیا۔ حاصل یہ ہے کہ کوئی عیب ہی کسی

کے نام کا حصہ بن گیا ہو اور اسی نام سے وہ مشہور ہو گیا ہو، اگر آپ اس عیب والے حصہ کو ہٹا دیتے ہیں تو کوئی بھی اس کو نہیں پہچانتا، اس لیے اس کی پہچان کروانے کے لئے اسی عیب والے حصہ کو بیان کرنا ضروری ہو گیا ہے؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔

چناں چہ ہمارے اسلاف میں ایک بڑے محدث اور عالم بزرگ امام اعمش گزرے ہیں، وہ علم نحو کے امام تھے۔ وہ ''اعمش'' ہی کے نام سے مشہور تھے، اور جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی ہوں اس کو عربی میں ''اعمش'' کہتے ہیں۔ اگر دوسرا کوئی نام لیا جائے تو کوئی نہیں جانتا۔ اسی طرح ''اعرج'' لنگڑے کو کہتے ہیں، لیکن ایک بڑے محدث اور فقیہ تھے جن کا نام ہی عبدالرحمن اعرج ہے، وہ اسی نام سے مشہور ہیں، ان کو ''اعرج'' ہی سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طرح حاتم اصم بڑے بزرگ گزرے ہیں، ان کے بہت سے حالات اور واقعات آپ نے سنے ہوں گے، حالاں کہ ''اصم'' بہرے کو کہتے ہیں، لیکن وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح ''احول'' بھینگے کو کہتے ہیں، لیکن ایک بڑے عالم ''احول'' کے نام سے مشہور ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی ''اعمٰی'' کے نام سے مشہور ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی اسی طرح کے کسی لقب سے مشہور ہو چکا ہو، اور دوسرا کوئی نام لینے سے لوگ اس کو نہ پہچانتے ہوں اور مجبوراً یہی نام لینا پڑتا ہو؛ تو اس کی بھی اجازت ہے۔ لیکن وہاں پر بھی یہ لفظ عیب لگانے کی نیت سے نہ کہا جائے، بلکہ اس نیت سے ایسا نام لیا جائے تاکہ لوگ اس کو پہچان سکیں۔ اور اگر کوئی دوسرا نام لے کر اس کی پہچان کروائی جا سکتی ہو، تو پھر وہی شکل اختیار کرنی چاہیے۔ ہاں!

اگر ممکن ہی نہیں ہے جیسا کہ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کا اصلی نام ایسا چھپارہ جاتا ہے کہ گھر کے لوگوں اور قریب کے رشتہ داروں کو بھی پتہ نہیں ہوتا؛ تو پھر اس نام کو لینے کی اجازت ہے۔

فهذهِ ستَّةُ أسبابٍ ، ذَكَرَهَا العُلَمَاءُ وأكثَرُها مُجمَعٌ عَلَيهِ ، وَدَلائِلُهَا مِنَ الأحادِيثِ الصَّحيحَةِ مشهورَةٌ. فمن ذَلِكَ:

بہرحال! یہ چھ اسباب ہیں جن کی بنیاد پر غیبت کی اجازت دی گئی ہے، اور یہ چھ اسباب ایسے ہیں جن پر تمام علماء نے بالاتفاق اجازت دی ہے، اور احادیث سے اس کی دلیلیں بھی مشہور ہیں، چناں چہ اسی قبیل کی کچھ احادیث یہاں پیش کرتے ہیں۔

یہ اپنے قبیلے کا بڑا بُرا آدمی ہے

حدیث ۱۵۳۱:-

عن عائشة (رضی اللہ عنہا): أنَّ رجلاً اسْتَأْذَنَ عَلَى النبيّ ﷺ فقَالَ: ((ائْذَنُوا لَهُ، بِئْسَ أخُو العَشِيرَةِ)) (متفق عَلَيْهِ)

احتَجَّ بِهِ البخاري نور اللہ مرقدہٗ فی جوازِ غيبَةِ أهلِ الفسادِ وأهلِ الرِّيَبِ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضری کے لئے ایک آدمی نے (گھر کے باہر سے) اجازت مانگی (کہ میں اندر آسکتا ہوں؟ اس وقت حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) بھی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں) آپ

صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اس کو اندر آنے کی اجازت تو دیدو، لیکن یہ اپنے قبیلے کا بڑا بُرا آدمی ہے (پھر جب وہ شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بڑی محبت اور نرمی سے اس کے ساتھ بات چیت فرمائی، جب وہ آدمی چلا گیا تو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے ایک سوال کیا کہ: اے اللہ کے رسول! جب اس نے اجازت مانگی اس وقت تو آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: بڑا بُرا آدمی ہے، لیکن جب وہ آپ کے پاس آکر بیٹھا تو آپ نے بڑی محبت اور نرمی سے اس کے ساتھ گفتگو فرمائی؛ معاملہ سمجھ میں نہیں آیا؟ تو حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اے عائشہ! تم نے مجھے بد اخلاق کب پایا ہے؟)۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی بُرا ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بھی اس کے ساتھ برائی سے پیش آؤں؟ ایک برا آدمی اگر آپ کے پاس آجائے تو اس کی برائی اس کے ساتھ ہے، مگر آپ کے اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آئیں۔ حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے جواب کا حاصل یہی تھا کہ وہ برا تھا اس کا مطلب یہ تھوڑا ہے کہ مَیں بھی بد اخلاقی سے پیش آتا، مجھے تو اچھے اخلاق ہی سے اس کے ساتھ پیش آنا ہے۔ جیسے: کوئی شرابی آدمی آپ سے ملاقات کرنے کے لئے آیا تو کیا آپ اس کے شرابی ہونے کی وجہ سے اس کو دُھتکار دیں گے؟ اُس کا شرابی ہونا اپنی جگہ پر برا کام ہے، لیکن آپ تو اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آئیں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ ﷺ نے اس کے متعلق ایسا کیوں فرمایا تھا؟ تو حضراتِ علماء فرماتے ہیں: چوں کہ اس کے اندر آنے کے بعد حضور ﷺ اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آنے والے تھے، تو آپ کے اخلاق کا مظاہرہ کرنے سے حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہ) یا کسی دیکھنے والے کو کہیں یہ دھوکہ نہ ہو جائے کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے، اور پھر وہ کسی نقصان میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے آپ نے پہلے ہی اس کی خرابی اور برائی کو ظاہر فرما دیا۔ جیسے: ایک آدمی لوگوں کے ساتھ فراڈ کرتا ہے، وہ کسی وقت آپ کے پاس آرہا ہو، اور اس کو آتا ہوا دیکھ کر آپ اپنے پاس بیٹھنے والوں سے یوں کہہ دیں کہ یہ تو بڑا فراڈی آدمی ہے، لیکن جب وہ آپ کے پاس آکر بیٹھے تو آپ اس کے ساتھ بڑے اچھے اخلاق کا معاملہ کریں۔ تو یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کی خرابی بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو سمجھ لینا چاہیے کہ ضرورت اسی لیے تھی کہ آپ ایک ذمہ دار شخص ہیں ، اور جب وہ آپ کے پاس آرہا ہے تو چوں کہ آپ تو اس کے ساتھ اچھے اخلاق ہی سے پیش آنے والے ہیں ، اور آپ کے اس کے ساتھ اخلاق و محبت کا معاملہ کرنے کی وجہ سے پاس بیٹھنے والوں کو کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے اور کوئی یہ سمجھنے نہ لگے کہ ہم اس روز فلاں صاحب کی خدمت میں بیٹھے تھے، اور جب یہ آدمی آیا تھا تو انہوں نے اس کے ساتھ بڑی محبت کا معاملہ کیا تھا، اس کا مطلب ہے کہ یہ آدمی اچھا ہی ہو گا۔ اگر آپ کو ایسا اندیشہ اور ڈر ہو کہ اس کی

برائی کا اظہار نہ کیا گیا تو لوگوں کو اس کے ذریعہ سے نقصان پہنچے گا اور اچھائی کے اسی زعم میں لوگ دھوکے میں پڑ جائیں گے؛ تو آپ کو چاہیے کہ اس کی برائی سے اپنے پاس بیٹھنے والوں کو واقف کر دیں۔

بڑے آدمی کی یہ ذمہ داری ہے

بعض دھوکے بازوں کی عادت ہی ہوتی ہے کہ بڑوں کے پاس باقاعدہ آتے جاتے رہتے ہیں اور ان کے پاس بیٹھنے والوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ میرا ان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے، تو ایسے موقعہ پر اس بڑے آدمی کی یہ ذمہ داری ہے کہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو اس کی حالت سے واقف کر دے، تاکہ کسی کو اس سے دھوکے میں پڑنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اس روایت سے ایسے مواقع پر غیبت کا جواز ثابت ہوتا ہے، اسی لیے اس کو یہاں پیش کیا ہے۔

باب ما یباح من الغیبة

بعض صورتیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی

غیبت کا بیان چل رہا تھا، اس میں بعض وہ صورتیں ہیں جن میں غیبت کی اجازت دی گئی ہے، یعنی کسی آدمی کی کمزوری یا عیب کو ظاہر کرنا بعض صورتوں میں جائز اور درست ہے، جس کی تفصیل پچھلی مجلس میں آگئی تھی۔ ان ہی صورتوں میں یہ بھی ہے کہ اگر کسی آدمی کی شخصیت اور ذات میں کوئی برائی ہو اور اس سے پہنچنے والی اس برائی سے مسلمانوں کو بچانا اور ان کی خیر خواہی مقصود ہو؛ تو اس صورت میں اس کی اندرونی حالت سے لوگوں کو آگاہ کیا جاسکتا ہے۔

دونوں دین کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے

حدیث ۱۵۳۲:-

وعنها قالت قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ما أظن فلاناً وفلاناً يعرفان من ديننا شيئاً. (رواه البخاری)

قال الليث بن سعدٍ أحد رواة هذا الحديث: هذان الرجلان كانا من المنافقين.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کے متعلق (جو بظاہر اچھے تھے اور ان کے نفاق کا لوگوں کو علم نہیں تھا لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اللہ تعالیٰ نے منافقین

کے ناموں سے آگاہ کر دیا تھا، چناں چہ ایک موقعہ پر) فرمایا: میں نہیں سمجھتا کہ فلاں اور فلاں ہمارے دین کی باتوں سے کچھ بھی واقف ہوں۔

چناں چہ اس روایت کے راویوں میں ایک حضرت لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو بڑے امام بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ وہ دونوں آدمی منافقین میں سے تھے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے ان کی اندرونی حالت سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا؛ تاکہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ان کی شکل و صورت اور ظاہری حالت سے لوگوں کو یہ دھوکہ ہو سکتا تھا کہ وہ دین کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، اور اسی دھوکہ میں پڑ کر کوئی آدمی ان کی باتوں سے نقصان اٹھا سکتا تھا، اس لیے نبی کریم ﷺ نے حقیقتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے فرمادیا کہ وہ دونوں دین کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے۔ اور پہلے بھی بتلایا جا چکا ہے کہ کسی کی طرف سے پہنچنے والی برائی اور نقصان سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اگر اس کے حال سے واقف کرانے کی ضرورت پڑ جائے تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے۔

تکلیف سے بچالیا

حدیث ۱۵۳۳:۔

وعن فاطمة بنتِ قيسٍ رَضِيَ اللهُ عنها قالت : أتيتُ النبيَّ ﷺ فقلتُ : إنَّ أَبَا الجَهْم وَمُعَاوِيَةَ خَطَبَانِي ؟ فَقَالَ رسُولُ الله ﷺ: أمَّا مُعَاوِيَةُ؛ فَصَعْلُوكٌ لاَ مَالَ لَهُ. وأمَّا أَبُو الجَهْمِ؛ فَلاَ يَضَعُ العَصَا عَنْ عَاتِقِهِ. (متفق عَلَيهِ)

وفی روایۃ لمسلم: ((وَأَمَّا أَبُو الجَهْمِ فَضَرَّابٌ لِلنِّسآءِ))

وَهُوَ تفسیر لروایة: ((لایَضَعُ العَصَاعَنْ عَاتِقِهِ)) وقیل: معناہ: کثیرُ الأسفارِ

ترجمہ مع تشریح:- (حضرت فاطمہ بنت قیس (رضی اللہ عنہا) کو ان کے شوہر نے طلاق دیدی تھی، عدت کے زمانہ ہی میں نبی کریم ﷺ نے ان کو ہدایت کر دی تھی کہ اب جو بھی پیغام آئے، مجھ سے مشورہ کیے بغیر قبول مت کرنا، چناں چہ ان کی عدت پوری ہونے کے بعد جب ان کے پاس لوگوں کی طرف سے نکاح کے واسطے پیغامات آئے تو اس سلسلہ میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کو آگاہ کیا کہ) ابو جہم اور معاویہ نے میرے پاس پیغامِ نکاح بھیجا ہے (اب آپ ہی مشورہ دیجئے کہ دونوں میں سے کس کا پیغام قبول کروں؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: معاویہ تو ایک دم فقیر آدمی ہے، اس کے پاس مال ہے ہی نہیں (بھلا وہ تمہارا نفقہ کیا ادا کر سکیں گے؟) اور رہے ابو جہم! تو وہ اپنی لاٹھی کندھے سے نیچے اتارتے ہی نہیں۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ: ابو جہم عورتوں کی بہت پٹائی کرتے ہیں۔ اور اس کا ایک معنیٰ یہ بھی بتایا ہے کہ: ابو جہم سفر بہت کثرت سے کرتے ہیں۔

افادات:- حضورِ اکرم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ ہو سکتا ہے کہ معاویہ کے ساتھ نکاح کے نتیجہ میں تمہیں نفقہ کے سلسلہ میں مشقت اور تکلیف اٹھانی پڑے۔ اور جیسا کہ پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ مسلمانوں کو کسی کی طرف سے پہنچنے والی تکلیف سے بچانے کی شکلوں میں ایک یہ بھی تھا کہ کوئی آدمی رشتہ کے سلسلہ میں مشورہ کرنے کے لئے آیا ہو کہ

مثلاً: میں اپنی بیٹی کا رشتہ فلاں سے کرنا چاہتا ہوں؛ آپ کا کیا مشورہ ہے؟ تو اگر اس میں ایسا کوئی عیب ہو، جو اِزدواجی زندگی کے لئے نقصان کا باعث بن سکتا ہو؛ تو وہ بتلادینا ضروری ہے۔ اگر اس سے واقف نہیں کرے گا تو یہ ایک طرح کی خیانت ہوگی۔ یہاں پر بھی چوں کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) مالی اعتبار سے بالکل کمزور تھے، اس لیے نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا کہ: معاویہ تو بالکل فقیر آدمی ہے، اس کے پاس مال نہیں ہے، اس کے ساتھ نکاح کرکے کیا کروگی؟ اور ابوجہم اپنی لاٹھی کندھے سے نیچے اتارتے ہی نہیں، یعنی ہر وقت لاٹھی لیے پھرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ نکاح کروگی تو یہ حالات تم کو بھی پیش آئیں گے، ان کی طرف سے پٹائی کی نوبت آسکتی ہے؛ اب تم خود ہی سوچ لو اور فیصلہ کرلو۔ گویا حضور ﷺ نے ان کے ساتھ بھی نکاح کا مشورہ نہیں دیا۔ پھر آگے کیا ہوا اس کا تذکرہ یہاں نہیں ہے، لیکن دوسری روایتوں میں ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے اپنی طرف سے حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہ) کا نام لیا کہ تم ان سے نکاح کرلو۔ چناں چہ بعد میں انہی کے ساتھ نکاح ہوا، حالاں کہ اس وقت تک ان کی طرف سے پیغام نہیں آیا تھا۔

بہر حال! چوں کہ انہوں نے مشورہ طلب کیا تھا تو ان کو نقصان پہنچنے کی جو چیز تھی وہ بتلا دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی بات بتادینا غیبت میں شمار نہیں ہوتا۔

غزوۂ بنی المصطلق کا ایک واقعہ

حدیث ۱۵۳۴:-

وعن زيد بن أرقم رضى الله عنه قَالَ: خرجنا مَعَ رسُولِ الله ﷺ فی سَفرٍ, أصَابَ النَّاسَ فِيهِ شِدَّةٌ. فَقَالَ عبدُ اللهِ بن أُبَيّ: لَا تُنْفِقُوا عَلَى مَنْ عِندَ رسولِ اللهِ ﷺ حَتَّى يَنْفَضُّوا، وقال: لَئِنْ رَجَعْنَا إِلَى المَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الأَعَزُّ مِنْهَا الأَذَلَّ. فَأَتَيْتُ رسُولَ اللهِ ﷺ. فَأَخْبَرْتُهُ بِذٰلِكَ، فَأَرْسَلَ إِلَى عبدِ الله بن أُبَيّ, فَاجْتَهَدَ يَمِينَهُ: مَا فَعلَ. فقالوا: كَذَبَ زيدٌ رَسُولَ الله ﷺ. فَوَقَعَ فی نَفْسِی مِمَّا قَالُوهُ شِدَّةٌ حَتَّى أَنزلَ اللهُ تَعالَى تَصْدِيقِي: إِذَا جَاءكَ المُنَافِقُونَ. ثُمَّ دعاهُمُ النبیّ ﷺ لِيَسْتَغْفِرَ لَهُمْ فَلَوَّوْا رُؤُوسَهُمْ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت زید بن اَرقم (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں نکلے، اس سفر میں لوگوں کو بڑی تکلیف پہنچی (اس لیے کہ پانی کی قلت تھی) اسی موقعہ پر عبد اللہ بن اَبی نے کہا تھا: اللہ کے رسول کے ساتھ جو لوگ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آئے ہیں ان (مہاجرین) پر پیسہ خرچ مت کرو، یہاں تک کہ وہ خود ہی بھاگ جائیں گے۔ اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ: ہم لوگ جب مدینہ لوٹیں گے تو ہم میں جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال دے گا۔ حضرت زید بن اَرقم فرماتے ہیں کہ: میں حضور اکرم ﷺ کے پاس حاضر ہوا اور حضور کو اس کی باتوں سے واقف کیا۔ تو آپ ﷺ نے عبد اللہ بن اَبی کو بلوایا (اور اس سے تحقیق فرمائی تو) اس نے بہت تاکید کے ساتھ قسم کھا کر یوں کہا: میں نے ایسا کہا ہی نہیں ہے (وہ اپنی بات سے پھر گیا) حضرت زید بن اَرقم فرماتے ہیں: اس پر لوگ مجھے کہنے

لگے: کہ زید نے آکر حضور ﷺ کو غلط باتیں بتلائیں۔ لوگوں کی ان باتوں کی وجہ سے مجھے بڑی تکلیف ہوئی (دوسری روایتوں میں ہے کہ میں لوگوں سے منھ چھپاتا پھرتا تھا، اس لیے کہ جو بھی ملتا مجھے ڈانٹتا اور ملامت کرتا تھا) یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میری بات کی سچائی کو قرآنِ کریم میں اتارا ﴿إذا جاءك المنافقون﴾ چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ نے منافقین کو بلایا، تاکہ آپ ان کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں، تو انہوں نے انکار کرتے ہوئے اپنے سروں کو پھیر لیا (کہ ہم نہیں آتے۔)

افادات:- یہ واقعہ غزوۂ بنی المصطلق میں پیش آیا تھا، بنی المصطلق خزاعہ کی ایک شاخ ہے، یہ لوگ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان میں پانی کے ایک چشمے کے پاس آباد تھے، ان کے سردار حارث بن ابی ضرار کے متعلق نبیٔ کریم ﷺ کو اطلاع ملی کہ اس نے اپنے خاندان اور قبیلے کے چند لڑاکو لوگوں کو جمع کیا ہے، اور اس لشکر کے ذریعہ وہ مدینہ منورہ پر حملہ کا ارادہ رکھتا ہے، جب نبیٔ کریم ﷺ کو یہ اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے ایک صحابی بُریدہ بن حُصَیب اسلمی (رضی اللہ عنہ) کو حالات کی تحقیق کے لئے بھیجا کہ معلوم کرو کہ کیا واقعتاً ایسا ہی ہے چناں چہ انہوں نے آکر بتایا کہ بات بالکل صحیح ہے، اور ان لوگوں نے ایک لشکر جمع کیا ہے جو عنقریب مدینہ منورہ پر حملہ کرنے والا ہے۔ اس پر نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کریں؛ ہم ہی اپنا دفاع کیوں نہ کرلیں؟ چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ نے تیاری فرمائی اور صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا لشکر لے کر ان کی طرف روانہ ہوگئے، اب ان لوگوں کو تو یہ توقع تھی ہی نہیں کہ حضور ﷺ ان پر حملہ آور ہوں گے، اس لیے وہ

لوگ بڑے اطمینان سے ایک چشمے پر تالاب کے کنارے قیام پذیر تھے، حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اچانک وہاں پہنچ گئے، ان کے ساتھ مقابلہ ہوا، جس میں ان کے کچھ لوگ مارے گئے اور کچھ بھاگ گئے، بہت سارے قید پکڑے گئے اور بہت سارا مال اور اونٹ بکریاں غنیمت کے طور پر حاصل ہوا۔ اس لشکر میں مسلمانوں کے ساتھ بہت سے منافقین بھی مدینہ منورہ سے آئے ہوئے تھے کہ پہلے ہی سے مالِ غنیمت ملنے کی امید اور توقع تھی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اپنی عادتِ شریفہ کے مطابق وہیں قیام پذیر تھے اسی دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک جگہ پانی کے ایک گڑھے میں تھوڑا سا پانی تھا، اور چوں کہ پانی کی بڑی قلت چل رہی تھی، اس لیے جہاں جہاں گڑھوں میں پانی تھا وہاں کسی نے اپنی ڈھال رکھ دی تھی، کسی نے چمڑا رکھ دیا تھا، کسی نے کوئی اور چیز رکھ دی تھی۔ گویا لوگوں نے اس پانی پر اپنا قبضہ جما لیا تھا۔ ایک جگہ اسی طرح پانی تھا جس کے سلسلہ میں ایک مہاجری حضرت جہجاہ بن قیس (رضی اللہ عنہ) اور ایک انصاری حضرت سنان بن وبرہ (رضی اللہ عنہ) میں جھگڑا ہو گیا، اور اسی میں مہاجری نے انصاری کو زور سے ایک دھپّہ مار دیا، اس پر وہ انصاری چلائے اور انصار کو اپنی مدد کے لئے آواز دی: ”یاللأنصار“ اے انصاریو! آؤ؛ میری مدد کرو۔ اس پر مہاجری نے بھی پکارا: ”یاللمهاجرین “ اے مہاجرین! آؤ؛ میری مدد کرو۔

اب لشکر تو ایک بہت بڑے علاقہ کے اندر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا، اور جہاں ان دونوں میں جھگڑا ہو رہا تھا وہ جگہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کافی دُور تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کی وہ

آوازیں - جو انہوں نے اپنی اپنی جماعت کو مدد کے لئے دی تھی - حضور ﷺ کے کانوں تک پہنچادی۔ جب آپ ﷺ نے یہ جملہ سنا تو ارشاد فرمایا: "ما بال دعوة الجاهلية" یہ جاہلیت والی آواز اور جاہلیت والا نعرہ کہاں سے آرہا ہے؟۔

یہی تعصب ہے

اس کو جاہلیت والا نعرہ اس لیے کہا کہ قبیلے، خاندان، وطن اور اپنی جماعت کی بنیاد پر کسی کو مدد کے لئے بلانا، اور کون حق پر ہے اور کون ناحق؛ یہ سب کچھ دیکھے بغیر ہی ان کا ساتھ دینا؛ یہی تو تعصب کہلاتا ہے، اور اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔ بلکہ اسلام نے تو ایک ہی حکم دیا ہے: تم اپنے بھائی کی مدد کرو، اگر وہ مظلوم ہے تو اس کو ظلم سے چھڑاؤ، اور اگر وہ ظالم ہے تو اس کو ظلم کرنے سے روکو۔ چناں چہ بخاری شریف میں ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "أُنْصُرْ أَخَاكَ ظَالِماً أَوْ مَظْلُوماً" اپنے بھائی کی مدد کرو، چاہے ظالم ہو یا مظلوم۔ کسی نے پوچھا: "أَنْصُرُهُ إِذَا كَانَ مَظْلُومًا. أَفَرَأَيْتَ إِذَا كَانَ ظَالِمًا كَيْفَ أَنْصُرُهُ" اگر وہ مظلوم ہے تو میں اس کی مدد کروں؛ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، لیکن اگر وہ ظالم ہے تو اس کی مدد کیسے کروں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ظالم کو ظلم کرنے سے روکو؛ یہی اس کی مدد ہے۔ اس لیے کہ وہ دوسرے پر ظلم کر کے دراصل خود اپنے ہی ساتھ زیادتی کر رہا ہے، اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا کر کے اللہ کے عذاب کا حقدار بنا رہا ہے، جب آپ اس

کو ظلم کرنے سے روکیں گے تو ایک طرف تو مظلوم کی حمایت ہو جائے گی کہ اس کو ظلم سے بچالیں گے، اور دوسری طرف اس کو بھی ظلم کرنے سے روک کر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہونے اور اس ظلم کے نتیجہ میں قیامت میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچالیں گے۔ اس سے بڑی مدد اور کیا ہو سکتی ہے؟ بہر حال! اسلام نے تو مدد کی بنیاد اور مدار حق اور ناحق پر رکھا۔ ایک مسلمان کی ذمہ داری اور فریضہ ہے کہ وہ حق کی مدد کرے۔ اگر دو آدمیوں میں لڑائی ہو رہی ہو، ایک مسلمان ہو، دوسرا کافر اور غیر مسلم ہو، لیکن مسلمان ناحق پر ہو اور کافر حق پر ہو؛ تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم حق کی طرف داری کریں۔ یہ مسلمان ہے اس وجہ سے اس کی طرف داری کرنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

چناں چہ خود نبیٔ کریم ﷺ کی خدمتِ اقدس میں بھی جب مقدمات آتے تھے تو جو حق پر ہوتا تھا اسی کے مطابق آپ فیصلہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ ایک منافق اور یہودی کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، اور وہ اپنا فیصلہ حضورِ اکرم ﷺ کے پاس لے گئے۔ نبیٔ کریم ﷺ نے اس یہودی کے حق میں فیصلہ دیا۔ تو وہ منافق کہنے لگا کہ: چلو! ہم اپنا یہ فیصلہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے پاس لے کر جائیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) چوں کہ غیر مسلموں کے معاملہ میں بڑے سخت ہیں، تو اس معاملہ میں وہ میری رعایت اور میرے فیور میں فیصلہ کر دیں گے۔ یہودی نے کہا: ٹھیک ہے؛ وہاں چلو۔ چناں چہ دونوں ان کے پاس پہنچے اور اپنا معاملہ پیش کیا۔ یہودی نے کہا: دیکھو! ہم یہ

معاملہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں پیش کر چکے ہیں اور آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اس منافق سے پوچھا: کیا ایسا ہوا ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں! ایسا ہی ہوا ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: اچھا ٹھہرو؛ میں ابھی آتا ہوں۔ گھر میں گئے، تلوار لے کر آئے اور اس منافق کا سر قلم کر دیا اور فرمایا: جو آدمی اللہ کے رسول کے فیصلے پر راضی نہ ہو؛ اس کا یہی فیصلہ ہے۔ اس پر بعض لوگوں نے شور مچایا کہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ایک مسلمان کو قتل کر دیا؛ تو قرآنِ پاک میں آیت نازل ہوئی: ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿٦٥﴾﴾ [سورۃ النسآء]

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اسلام تو یہ حکم دیتا ہے کہ آپ حق کی حمایت کریں، چاہے وہ کسی کے پاس بھی ہو، ایک غیر مسلم بھی اگر حق پر ہے تو آپ فیصلہ اس کے حق میں کریں۔ آپ مسلمان ہیں اور وہ بھی مسلمان ہے اس کی وجہ سے اس کی طرف داری کرنا اور ناحق فیصلہ کرنا؛ شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی؛ یہ تو صریح ظلم و زیادتی ہے، لیکن آج کل ہر جگہ یہی معاملہ ہو گیا ہے کہ میرے خاندان والا ہے، میرے محلے والا ہے، میری بستی والا ہے، میری پارٹی والا ہے؛ اس لیے میں اس کی مدد کروں گا؛ چاہے وہ حق پر ہو یا نہ ہو؛ حالاں کہ اسلام اس کی بالکل اجازت نہیں دیتا، اسی کو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ جاہلیت والا طریقہ ہے "دَعُوهَا، فَإِنَّهَا مُنْتِنَةٌ" اس کو چھوڑو؛ یہ بڑا بدبودار نعرہ ہے۔ اسی دوران قریب تھا کہ جھگڑا طول پکڑ لیتا لیکن حضرت عبادہ بن صامت (رضی اللہ عنہ) بیچ میں

پڑے اور دونوں کو سمجھا کر ایک دوسرے سے معافی تلافی کرائی اور معاملہ ختم ہو گیا اور سب شیر و شکر ہو گئے۔

چوں کہ اس لشکر میں منافقین کی بھی ایک جماعت آئی ہوئی تھی، اور منافقین کا سردار عبداللہ بن اُبی بھی ساتھ آیا ہوا تھا، لیکن جس وقت یہ جھگڑا ہوا وہ وہاں موجود نہیں تھا، اپنی قیامگاہ پر تھا، اس کو بعد میں پتہ چلا کہ آج ایسا جھگڑا ہوا۔ ویسے بھی وہ اندر سے تو مسلمانوں کا مخالف ہی تھا، ظاہری طور پر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، اس نے اپنی ایک مجلس کے اندر جہاں اس کے خاص چیلے چانٹے اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے پوچھا: آج کیا واقعہ ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ ایک مہاجری نے ایک انصاری کو دھپّہ مار دیا تھا۔ تو اس نے کہا: میں تو ہمیشہ کہتا ہی رہتا ہوں کہ تمہیں لوگ ان کو باہر سے بلا کر لائے ہو، اور اپنے گھروں میں پناہ دی ہے، ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا ہے، اب دیکھو! تمہارے ٹکڑوں پر پلے ہوئے آج تمہارے سر پر سوار ہو گئے ہیں۔ تم لوگ اب بھی اگر ہوش میں نہ آئے تو آئندہ اور بہت کچھ دیکھو گے۔ تم کو ابھی بھی سنبھلنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ لوگ تم کو مدینہ میں رہنے بھی نہیں دیں گے۔ اور دیکھو! تم لوگ ان کو کھلا پلا رہے ہو؛ اس لیے وہ اپنے یہاں پڑے ہوئے ہیں، اگر ان پر خرچ کرنا اور کھلانا پلانا چھوڑ دو گے؛ تو وہ سب آپ ہی آپ منتشر ہو جائیں گے اور بھاگ جائیں گے۔ ابھی بھی موقع ہے، یہ فیصلہ کر لو کہ یہاں سے جانے کے بعد ہم میں سے عزت والا ذلیلوں کو نکال دے گا۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے قبیلے والوں کو عزت والا

کہتا تھا، اور نعوذ باللہ حضور اکرم ﷺ اور مہاجرین (جو مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے آئے تھے) کو ذلیل کہتا تھا۔ اور ویسے بھی جس مجلس کے اندر اس نے یہ بات کہی تھی وہاں سب اسی کے لوگ تھے، لیکن اس کے باوجود اس طرح کے لوگ جب ایسی باتیں کرتے ہیں تو ایک دم کھل کر نہیں کرتے، کچھ مبہم ہی کہتے ہیں۔ اس نے بھی یہ بات ایک دم کھل کر نہیں کہی تھی۔ لیکن اس مجلس میں ایک صغیر السّن صحابی حضرت زید بن اَرقم (رضی اللہ عنہ) موجود تھے، ان کا تعلق بھی اسی قبیلۂ خزرج سے تھا، اور عبداللہ بن اُبَی بھی اسی قبیلے کا تھا۔ انہوں نے عبداللہ بن اُبَی کی زبان سے یہ جملے سنے تو فوراً بول پڑے: تو ذلیل آدمی ہے، اللہ کے رسول ﷺ تو عزت والے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت دے رکھی ہے: تو کیا ان کو نکالے گا؟ مَیں ابھی جاکر تیری بات حضور اکرم ﷺ کو بتاتا ہوں۔ یہ سن کر وہ تو سٹپٹا گیا کہ میرا راز فاش ہو گیا، اب یہ بات وہاں پہنچ جائے گی، تو اب اس نے باتیں بنانا شروع کیں کہ میرا مطلب یہ تھا اور وہ تھا۔ حضرت زید بن اَرقم نے کہا: میں تو بات پہنچا ہی دوں گا۔ چناں چہ وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ اپنے چچا کے واسطے سے انہوں نے وہ بات حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچائی کہ عبداللہ بن اُبَی نے آپ کے متعلق یوں کہا ہے۔

اگرچہ عبداللہ بن اُبَی منافق تھا، لیکن اس کا اپنے قبیلے میں ایک مقام تھا، اور وہ نفاق پر اسی لیے تو آمادہ ہوا تھا کہ نبی کریم ﷺ کے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لانے سے

پہلے مدینہ والوں نے اس کو اپنا بادشاہ بنانا طے کرلیا تھا، اس کی تاج پوشی ہونے ہی والی تھی کہ وہاں اسلام پھیلا اور حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس کے سارے معاملے پر پانی پھر گیا، اس لیے اس کے دل میں حسد پیدا ہوا، اور اسی حسد کی آگ کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے ساتھ دشمنی رکھتا تھا اور نفاق پر اتر آیا تھا۔

بہر حال! وہ اپنے قبیلے کا بڑا آدمی تھا اور حضرت زید بن اَرقم (رضی اللہ عنہ) چھوٹی عمر کے صحابی تھے، اپنے قبیلے میں بھی ان کا کوئی زیادہ مقام نہیں تھا۔ جب انہوں نے حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے کہا کہ وہ آپ کے متعلق ایسا کہتا ہے، تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے بھی فرمایا: اے لڑکے! تو جو بات کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے؟ ذرا سمجھ کر بولنا کہ تو کس کے متعلق کہہ رہا ہے؟ حضرت زید نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں سچ کہتا ہوں۔ پھر پوچھا: تم نے برابر سنا ہے؟ تم اونگھ میں تو نہیں تھے؟ انہوں نے کہا: میں نے برابر سنا ہے، اس نے یہی کہا ہے۔ جب انہوں نے یہ بات حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تک پہنچائی تو وہ مسلمانوں میں پھیل گئی، اور پورے لشکر میں اسی کا چرچا ہونے لگا کہ عبد اللہ بن اُبَی نے نعوذ باللہ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ذلیل اور اپنے آپ کو عزت والا کہا ہے۔ اور اس نے یہ بھی کہا کہ ہم جب مدینہ پہونچیں گے تو ان سب کو وہاں سے نکال دیں گے۔ جب یہ بات لشکر میں پھیلی تو حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ اجازت دیجئے کہ میں عبد اللہ بن اُبَی کا سر قلم کر کے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔ اب چوں کہ وہ ظاہر میں تو مسلمان تھا، اس

لیے حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ہم ایسا نہیں کریں گے؛ ورنہ لوگ یوں کہیں گے کہ محمد (ﷺ) اپنے ساتھیوں کو ہی قتل کرواتے ہیں۔ عبداللہ بن اُبی کے ایک بیٹے تھے جن کا نام بھی عبداللہ تھا اور وہ سچے اور مخلص مؤمن تھے، جب ان کو پتہ چلا کہ میرے باپ نے ایسی بات کہی ہے اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے جاکر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں یہ بات عرض کی ہے، لیکن حضور ﷺ نے منع فرمادیا ہے تو وہ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے باپ نے جو بات کہی ہے، اس کی وجہ سے اگر آپ کا ارادہ اس کو قتل کروانے کا ہو تو آپ مجھے حکم دیجیے، سارے مدینہ والے جانتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی بھی اپنے باپ کا اتنا مطیع و فرمانبردار نہیں ہے جتنا میں ہوں، لیکن آپ کے معاملہ میں اس کا سر لاکر میں ہی پیش کرتا ہوں۔ آپ کو اگر یہ کام کروانا ہے تو آپ کسی اور سے نہ کہیے، یہ کام میں ہی کروں گا، اس لیے کہ اگر خدانہ کرے آپ نے کسی اور کو سونپا اور اس نے میرے باپ کا سر قلم کردیا، پھر بعد میں میرے اوپر غیرت طاری ہوئی، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو سوسائٹی میں چلتا پھرتا دیکھ کر اس کو قتل کردوں اور اپنی عاقبت برباد کرلوں، اس لیے قتل کروانے کا ارادہ ہو تو کسی اور سے یہ خدمت لینے کی ضرورت نہیں ہے، اس خدمت کے لئے میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہوں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: نہیں! ہم تو تمہارے باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہتے ہیں، ہمارا ان کو قتل کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔

آنحضور ﷺ کی حکمتِ عملی

پھر حضورِ اکرم ﷺ نے لشکر کو حکم دیا کہ چلو! یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا، لشکر وہاں سے روانہ ہوا اور دن کا بقیہ حصہ چلتے رہے، پھر رات بھر چلے، اور دوسرا دن بھی آدھی دوپہر تک چلتے رہے، گویا پورے چوبیس گھنٹے تک سفر جاری رہا، اتنے لمبے سفر کی وجہ سے لوگ تھک تھکا کر چور ہو گئے، اور جب آپ نے رکنے کا حکم دیا تو لوگ سواریوں سے اترتے ہی سو گئے۔ اور آپ کا مقصد بھی یہی تھا کہ کسی بھی بہانہ سے یہ چرچا بند ہو، اس لیے کہ ایسے چرچے عام طور پر فرصت کے موقعہ پر ہی ہوا کرتے ہیں، جب سب لوگ تھکے ہارے ہوں گے اور نیند کا تقاضا ہو گا تو کون بیٹھے گا؟ اگر کوئی کسی کو پکڑ کر کہے گا کہ آؤ بھائی! بیٹھو، ہم کچھ باتیں کرتے ہیں، تو دوسرا کہے گا کہ: مجھے تو نیند آ رہی ہے۔

خیر! جب لوگ روانہ ہوئے تو عبد اللہ بن اُبَی کو بلا کر حضور ﷺ نے پوچھا کہ تو نے ایسا کہا ہے؟ تو اس نے قسم کھا کر کہا: اللہ کی قسم! میں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہے، جو کچھ یہ لڑکا کہہ رہا ہے وہ سب جھوٹ ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں ایک چھوٹا اور کم عمر لڑکا جو کہہ رہا ہے تو اسی کی بات کو مانا جائے گا، اس چھوٹے کی بات کی طرف کون دھیان دے گا؟ اس لیے لوگوں نے حضرت زید بن اَرقم کو ملامت کرنی شروع کی کہ تو نے یہ کیا حرکت کر ڈالی، ایک بڑے آدمی کو بلا وجہ ذلیل و رسوا اور بدنام کیا۔ حضرت زید بن اَرقم

(رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں تو بالکل سچا تھا، لیکن اس کے مقابلہ میں میری حیثیت بہت کم تھی، اس لیے لوگوں نے اسی کی بات کو سچ مانا اور خود حضور ﷺ نے فرمایا: تم نے ایسا کیوں کیا؟ سارے لوگ مجھے ڈانٹ رہے تھے اور میں لوگوں سے منھ چھپا رہا تھا، لیکن میں اپنے جی میں یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ ضرور میری بات کی سچائی کو ظاہر کریں گے۔ چناں چہ راستہ ہی میں سورۂ منافقون نازل ہوئی، جس میں یہ آیتیں ہیں: ﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ۝۱﴾ اے اللہ کے رسول! جب آپ کے پاس منافقین آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، تو اللہ تعالیٰ بھی جانتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ منافقین جھوٹے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے تیرے کان کی تصدیق کی

اسی سورت میں آگے اللہ تعالیٰ نے وہ ساری باتیں بھی نازل فرمائیں جو حضرت زید بن اَرقم نے حضورِ اکرم ﷺ کو بتلائی تھیں، کہ وہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ ہم میں کا عزت والا جب مدینہ پہنچے گا تو ذلیل کو وہاں سے نکال دے گا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے رسول کے ساتھ آئے ہیں ان پر خرچ مت کرو؛ تاکہ وہ یہاں سے بھاگ جائیں۔ جب یہ سورت نازل ہوئی تو حضرت زید بن ارقم (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ دورانِ سفر ہی میرے پاس

آئے اور میرا کان مروڑ کر فرمایا: اے لڑکے! اللہ تعالیٰ نے تیرے کان کی تصدیق کر دی۔ یعنی تم نے جو کچھ کہا تھا وہی درست تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی تائید آ گئی۔

یہ سورت نازل ہوئی اس سے پہلے حضرت عبادہ بن صامت (رضی اللہ عنہ) اور دوسرے بعض صحابہ نے عبداللہ بن اُبی کو سمجھایا کہ اگر تیری بھول ہو گئی ہو تو حضور ﷺ کے پاس چلا جا، معافی مانگ لے، اور حضور ﷺ سے درخواست کر کہ آپ میرے لیے دعائے مغفرت کریں، آپ ﷺ کی دعا کی برکت سے تیرا گناہ بھی معاف ہو جائے گا، لیکن اس نے غرور کے مارے منھ پھیر لیا کہ مَیں نہیں جاتا۔ اس کے اس رویّے کا بھی قرآنِ پاک کی اس سورت میں تذکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: جب ان کو یوں کہا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول کے پاس آؤ؛ تاکہ وہ تمہارے گناہوں کی معافی مانگیں؛ تو وہ اپنے سر کو پھرا لیتے ہیں اور انکار کرتے ہیں۔ جب یہ ساری باتیں سامنے آ گئیں تو اب تو بات صاف ہو گئی۔

تب اس کو جانے دیا

پھر جب لشکر مدینہ کے قریب پہنچا تو عبداللہ بن اُبی کے بیٹے حضرت عبداللہ نے اپنے باپ کے اونٹ کی نکیل پکڑ کر نیچے بٹھا دیا اور اس پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ: میں تم کو مدینہ میں داخل ہونے نہیں دوں گا جب تک تم اس بات کا اقرار نہ کر لو کہ تم خود ذلیل ہو، اور اللہ کے رسول عزت والے ہیں۔ تو عبداللہ بن اُبی کہنے لگا: میں تو عورتوں

سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، بچوں سے بھی زیادہ ذلیل ہوں، اللہ تعالیٰ کے رسول بڑے عزت والے ہیں۔ حضرت عبد اللہ نے کہا: پھر بھی میں تم کو جانے نہیں دوں گا جب تک کہ نبی کریم ﷺ تم کو مدینہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔ سب لوگ جمع ہوگئے، حضور ﷺ کو بھی پتہ چلا تو آپ تشریف لائے اور صاحبزادہ سے فرمایا: چھوڑدو، اور جانے دو؛ تب انہوں نے اس کو جانے دیا۔

بہر حال! اس قصہ میں حضرت زید بن اَرقم نے حضورِ اکرم ﷺ کو عبد اللہ بن اُبَی کی باتیں پہنچائیں، اور منافقوں کی غلط روش سے حضور ﷺ کو آگاہ کیا؛ وہ ایک طرح کی غیبت تھی، لیکن ان کے شر سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے اس کی ضرورت تھی اور اس کی اجازت ہے۔ اسی کو بتانے کے لیے یہ روایت یہاں لائے ہیں۔

ایک مسئلہ؛ لیکن غلط فہمی نہ ہو

حدیث ۱۵۳۵:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها قالت: قالت هِنْدُ امْرَأَةُ أَبِي سفْيَانَ للنَّبِيِّ ﷺ: إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيحٌ، وَلَيْسَ يُعْطِينِي مَا يَكْفِينِي وولَدِي إِلاَّ مَا أَخَذْتُ مِنْهُ وَهُوَ لا يَعْلَمُ؟ قَالَ: ((خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوفِ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ حضرت ابو سفیان کی بیوی ہند بنت عتبہ نے نبی کریم ﷺ سے مسئلہ پوچھا کہ: ابو سفیان بخیل آدمی ہیں، میری اور میرے بچوں کی ضرورتوں کے مطابق خرچہ نہیں دیتے (جس کی وجہ سے ہم کو تکلیف ہوتی ہے) البتہ اگر میں ان کی بے خبری میں ان کے مال میں سے اپنی اور اپنے بچوں کی ضرورت کے مطابق کچھ نکال لوں تو ہی ہماری ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: تمہارے اور تمہارے بچوں کے لئے دستور کے مطابق جتنا کافی ہو جائے اتنا تم اصولی طور پر لے سکتی ہو۔

افادات:- ہند بنت عتبہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی والدہ ہیں، فتح مکہ کے موقعہ پر اسلام لائی تھیں۔ روایتوں میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ کے مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہونے سے پہلے رات کے وقت ابو سفیان تحقیقِ حال کے لئے ادھر نکلے تو نبی کریم ﷺ کے چوکیداروں نے ان کو گرفتار کر کے حضور کی خدمت میں پیش کر دیا، پھر حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) کی سفارش پر حضور ﷺ نے ان کو چھوڑ دیا، اور اسی موقعہ پر حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) کی تاکید پر انہوں نے ایمان بھی قبول کر لیا، اگرچہ اس وقت دل میں ایمان پختگی کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا، پھر بعد میں پختہ بھی ہو گیا۔ دوسرے روز جب نبی کریم ﷺ مکہ مکرمہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور مکہ والوں نے ایمان لانا شروع کیا تو کوہِ صفا پر بیٹھ کر نبی کریم ﷺ لوگوں سے بیعتِ ایمان لینے لگے، اس وقت عورتوں کی مستقل ایک جماعت آئی اور انہوں نے بھی نبی کریم ﷺ سے بیعتِ ایمان کی، انہیں میں حضرت ہندہ بھی تھیں، چوں کہ

بیعت کے اندر حضور اکرم ﷺ نے گناہوں سے بچنے کی تاکید فرمائی، اس لیے انہوں نے یہ مسئلہ پوچھا۔

اب دیکھئے! یہاں حضرت ہندہ کا ابوسفیان کی غیر موجودگی میں ان کے متعلق حضور ﷺ کی خدمت میں یہ کہنا کہ وہ بخیل آدمی ہے؛ یہ ایک طرح کی غیبت ہی کہی جاسکتی ہے، لیکن چوں کہ ان کو مسئلہ پوچھنا تھا کہ ان کی طرف سے نفقہ دینے میں جو کمی رہ جاتی ہے جس کی وجہ سے بیوی بچوں کو تکلیف ہوتی ہے، اس کا حل کیا ہے، اس لیے انہوں نے سارے حالات حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کیے۔

یہ مسئلہ سن کر کوئی آدمی یہ نہ سمجھ لے کہ مفتی صاحب نے اجازت دیدی تو اب ہماری تجوریاں کھل جائیں گی۔ نبی کریم ﷺ نے جو اجازت دی اس میں ''دستور کے مطابق'' کی قید لگائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی عورت کو اس کا شوہر نفقہ اور خرچہ اس کے حق کے مطابق دیتا ہے، لیکن اس کو فضول خرچی کی وجہ سے کمی کی شکایت رہتی ہے؛ تو پھر ایسی عورت کو شوہر کے مال میں سے بلا اجازت لینے کی گنجائش نہیں ہے۔

اور پچھلی مجلس میں آیا تھا کہ جن صورتوں میں غیبت کی اجازت دی ہے اس میں تیسری شکل ''استفتاء'' تھی یعنی کسی مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھنے کے لئے کسی کے حالات بتلانے ضروری ہو جائیں؛ تو وہ غیبت میں داخل نہیں ہے، اس کی دلیل کے طور پر یہ روایت یہاں پیش کی ہے۔

باب تحریم النمیمة

چغلی حرام ہونے کا بیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ:- هَمَّازٍ مَشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۔(سورۃ القلم: ۱۱)

وقال تعالیٰ:- مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔(سورۃ ق: ۱۸)

زبان کی حفاظت کے سلسلہ میں مختلف عنوانات چل رہے ہیں، اوپر غیبت کا تذکرہ ہوا، اب نیا باب قائم کیا ہے: چغلی کے حرام ہونے کا بیان۔

چغلی کسے کہتے ہیں؟

چغلی کسے کہتے ہیں؟ خود ہی اس کا مطلب بیان فرماتے ہیں:- "وهي نَقْلُ الْكَلَامِ بَيْنَ النَّاسِ عَلَى جِهَةِ الْإِفْسَادِ" فساد پھیلانے اور نقصان پہنچانے کی غرض سے ایک آدمی کی بات دوسروں کے پاس پہنچانا اور دوسروں کے سامنے نقل کرنا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: چغلی کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی نے کسی کے متعلق کوئی بات کہی اور وہ بات برائی اور عیب کی ہو تب ہی چغلی ہے، مثلاً: زید

نے خالد کے متعلق کوئی بات کہی، تو اب سننے والا وہ بات خالد سے جا کر کہے کہ تمہارے متعلق زید نے ایسا ایسا کہا ہے؛ عام طور پر اسی کو چغلی سمجھا جاتا ہے، یہ چغلی ضرور ہے، لیکن چغلی صرف اسی کے اندر محدود نہیں، بلکہ صاحبِ معاملہ کے نزدیک جس بات یا کام کا چھپانا مطلوب و منظور ہو اور وہ اس کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا پسند نہ کرتا ہو، اور اس معاملہ کا سننے یا دیکھنے والا اس کو دوسروں کے سامنے ظاہر کر دے؛ تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔

ہاں! اگر اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچتا ہو تو اس کو ظاہر کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ غیبت کے بیان میں تذکرہ آیا تھا کہ کسی مسلمان کو نقصان سے بچانے کے لئے غیبت کی اجازت تھی، وہی اصول چغلی میں بھی ہے۔ جیسے: کسی آدمی نے کسی کے یہاں سے مال چرایا، اور دوسرے نے دیکھ لیا، مثلاً: زید نے خالد کے گھر سے مال چرایا ہے، تو اب وہ آدمی اگر خالد کو اطلاع کر دیتا ہے کہ زید نے تمہارے گھر سے مال چرایا ہے، تاکہ خالد کا مال اس کو واپس مل جائے؛ تو یہ چغلی میں داخل نہیں ہے۔

لیکن اگر زید نے خود اپنا مال کہیں چھپا کر رکھ رہا تھا(عام طور پر آدمی اپنے مال کو حفاظت کی غرض سے چھپا کر ہی رکھتا ہے) اور کسی نے اس کو چھپاتے ہوئے دیکھ لیا اور پھر وہ لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ اس کے پاس پیسے ہیں جو اس نے فلاں جگہ چھپا کر رکھے ہیں، تو چوں کہ زید اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ میرا یہ بھید لوگوں کے

سامنے ظاہر ہو کہ میرے پاس یہ چیز ہے، اب جس نے دیکھا وہ کسی کے سامنے اس کو بیان کرے گا؛ تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔

چغلی کی مختلف شکلیں

اور ایک بات یہ بھی ہے کہ کہنے والے نے کسی کے متعلق کوئی عیب اور برائی کی بات دوسرے تک پہنچائی اسی کو ہم لوگ چغلی سمجھتے ہیں، لیکن چغلی صرف یہی نہیں ہے، بلکہ اس بات کو پہنچانے کی وجہ سے جس کو پہنچائی گئی اس کو دکھ ہو، یا جس نے کہی تھی اس کو دکھ ہو، یا کسی تیسرے آدمی کو اس سے تکلیف ہو؛ یہ سب چغلی میں شمار ہوگا۔ جیسے: زید اور خالد کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی، اسی دوران یوسف کا تذکرہ آگیا تو زید نے خالد سے یوسف کے متعلق کچھ کہا، اور وہ بکر نے سن لیا، اب بکر عمرو سے کہتا ہے کہ زید اور خالد بات کر رہے تھے اور انہوں نے یوسف کے متعلق یوں کہا ہے۔ اب یوسف کے متعلق زید اور خالد میں جو بات ہوئی تھی، یوسف پسند نہیں کرتا تھا کہ وہ کسی اور کے سامنے آئے، لیکن اس سننے والے بکر نے عمرو تک وہ بات پہنچائی؛ تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔ اور پھر چغلی کے لئے زبان سے کہنا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ کوئی آدمی لکھ کر کسی کو اطلاع کرے، یا اشارے سے اطلاع کرے؛ یہ بھی چغلی ہے۔

اسی طرح کسی کی کوئی بات دوسرے تک پہنچائی وہ بھی چغلی ہے، اور کسی کا کوئی کام دوسرے تک پہنچایا تو وہ بھی چغلی ہے۔ اور جس کو پہنچایا گیا ہے چاہے اس کو دکھ نہ ہوا ہو، کسی تیسرے کو دکھ ہو رہا ہو؛ تو وہ بھی چغلی ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ وہ عیب اور بری بات ہونا ہی ضروری نہیں ہے، بلکہ کوئی اچھا کام یا بات بھی صاحبِ معاملہ چھپانا چاہتا ہو، اس کو دوسروں کے سامنے ظاہر کر دینا بھی چغلی میں داخل ہے، جیسے: کوئی آدمی تنہائی میں بیٹھ کر کسی کتاب کا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کو پسند نہیں کہ میرے اس کتاب کے مطالعہ والے اہم معاملہ کا کسی کو پتہ چلے، اور وہ اپنے طور پر یہ کام چھپ کر کر رہا ہے، کسی نے دیکھ لیا کہ وہ فلاں کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ اب یہاں اگر لوگوں کو پتہ چل جائے گا کہ فلاں آدمی فلاں کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا تو اس کے لیے کوئی عیب نہیں ہے، لیکن چوں کہ وہ اس کا ظاہر ہو جانا پسند نہیں کرتا تھا اور دوسرے نے اس کو ظاہر کر دیا تو یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔

اسی لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: لوگوں کے جو بھی حالات آپ دیکھیں اگر کوئی کام کرتے ہوئے دیکھیں، یا کسی کو کچھ کہتے ہوئے سنیں، تو بس خاموشی اختیار کر لو: اس کام اور بات کا کسی کے سامنے اظہار نہ کرو۔ ہاں! اگر اس کی وجہ سے کسی کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اور صرف اس کو نقصان سے بچانے کی نیت سے وہ بات اس تک پہنچا رہے ہو تو اس کی گنجائش ہے، اور وہ چغلی میں داخل نہیں ہے۔

چغلی برا کام ہے

یہاں چغلی کی برائی کے سلسلہ میں قرآنِ پاک کی دو آیتیں پیش کی ہیں:-﴿هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ﴾ لوگوں پر عیب لگانے والا اور چغلی کرنے والا ہے۔اس آیت میں اس حرکت کو شناعت وقباحت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ چغلی برا کام ہے۔

گناہوں سے روکنے کا موثر ترین ذریعہ

اور باری تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ آدمی جو بھی بات بولتا ہے(تو ہر ایک کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ)اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر ایک چوکس نگران موجود ہے۔

اور دیکھو! آدمی کو گناہوں سے روکنے کے لئے جو چیز زیادہ مؤثر ہے وہ یہی احساس اور خیال کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے، اور میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، چاہے کوئی کام کر رہا ہوں، یا کوئی بات بول رہا ہوں، یا کوئی حرکت کر رہا ہوں؛ میری ہر ہر چیز سے اللہ تعالیٰ واقف ہے، اور مجھے کل اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا جواب دینا ہے۔اگر کسی آدمی کو احتساب کا ڈر ہو گا یعنی یہ احساس ہو گا کہ میرے اس کام کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نگرانی

ہو رہی ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہے؛ تو اس صورت میں اگر وہ تنہائی میں ہو گا تب بھی اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے گا۔

آج حکومت کے قوانین لوگوں کو گناہ سے کیوں نہیں روک پاتے؟ حالاں کہ قوانین ان پر عمل کرانے کے واسطے ہی بنائے جاتے ہیں، اور عمل کرانے والا پولیس کا پورا عملہ ہوتا ہے، اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے لئے باقاعدہ عدلیہ اور کورٹ کا پورا نظام بنا ہوا ہے جو اس کے خلاف کارروائی کر کے اس کو اس جرم کی سزا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود جرائم کا سلسلہ بند نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اسی لیے کہ دلوں میں احتساب کا ڈر اور جذبہ نہیں ہے۔ نبیٔ کریم ﷺ جو دین لے کر آئے ہیں اور دیگر حضرات انبیاء علیہ السلام کی تعلیمات کا بھی خلاصہ یہی ہے کہ آدمی کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا خوف پیدا کر دیا جائے، اور یہ جذبہ بیدار کر دیا جائے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر جواب دینا ہے۔ اگر یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو آدمی لوگوں کے سامنے ہو گا تب بھی، اور تنہائیوں میں ہو گا تب بھی؛ کبھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرے گا، اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ بھلے ہی لوگ مجھے نہیں دیکھ رہے ہیں، میں رات کی اندھیری میں ہوں، یا جنگل کی تنہائیوں میں ہوں، اور میری اس حرکت کو دیکھنے والا میرے سامنے کوئی موجود نہیں ہے، لیکن اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، اور مجھے اس کو جواب دینا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟

حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) ایک مرتبہ سفر میں تشریف لے جا رہے تھے، بھوک کا احساس ہوا تو دیکھا کہ جنگل کے اندر ایک آدمی بکریاں چرا رہا ہے۔ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) نے اس سے کہا: مجھے بھوک لگ رہی ہے، تم مجھے بکری کا دودھ دُوہ کر دے دو۔ چرواہے نے کہا: یہ بکریاں میری نہیں، بلکہ میرے آقا کی ہیں، میں تو غلام ہوں اور میرے آقا نے چرانے کے لئے میرے حوالے کی ہیں، اس کا دودھ دُوہ کر کسی کو دینے کا مجھے اختیار نہیں ہے۔ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) نے سوچا کہ ذرا اس کا امتحان لیا جائے!۔ اس سے کہا: اچھا! میں تم کو ایک تدبیر بتلاتا ہوں جس میں تمہارا بھی فائدہ ہے اور میرا بھی فائدہ ہے۔ پوچھا: وہ کیا ہے؟ فرمایا: ایسا کرو کہ تم ایک بکری مجھے بیچ دو، میں اس کی قیمت تم کو ادا کر دیتا ہوں مجھے بکری مل جائے گی تو پھر میری کھانے پینے کی جو ضرورت ہے وہ دودھ سے پوری ہو جائے گی، اور تم کو بکری کی قیمت مل جائے گی۔ رہا تمہارا آقا! تو اگر وہ تم سے پوچھے کہ ایک بکری کا کیا ہوا؟ تو اس کو بتا دینا کہ بھیڑیا کھا گیا۔ آقا کو کیا پتہ چلے گا، جب تم اس سے یہ کہوگے تو وہ مان لے گا۔ اس لیے کہ اُس زمانہ میں عام طور پر بھیڑیے بکریوں کے ریوڑوں پر حملہ کر دیا کرتے تھے جس کے نتیجہ میں ایک دو بکریاں گھٹ جاتی تھیں۔ یہ سن کر وہ غلام کہنے لگا: "یَاهٰذَا، فَأَيْنَ الله؟" اے بھلے آدمی! پھر اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟ یعنی اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے۔ حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہ) چرواہے کے اس قصے کو بیان فرماتے تھے اور اس کے اس

جملہ کو مزہ لے لے کر دہرایا کرتے تھے کہ: ایک چرواہا جنگل کی تنہائیوں میں یہ کہتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟ اللہ تعالیٰ کہاں گیا؟۔

آدمی کے دل میں جب یہ جذبہ بیدار ہو جائے تو پھر آدمی کہیں بھی، کسی بھی حالت میں ہو؛ کبھی کوئی نافرمانی نہیں کیا کرتا۔ اسی احساس کو مستحضر کرنے کے لئے باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر انسان کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی بول رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اس بول پر ایک نگران (فرشتہ) مقرر ہے جو بالکل چوکس ہے، ذرّہ برابر بھی غفلت میں نہیں ہے، برابر نگرانی کر رہا ہے، آدمی جو چیز بھی بولتا ہے وہ فرشتہ اس کو نوٹ کرلیتا ہے اور اس کا پورا ریکارڈ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا اور اس کو اس کا جواب دینا ہوگا۔ جو آدمی ہر وقت یہ سمجھے گا تو پھر بھلا وہ چغلی، غیبت یا زبان کے کسی بھی گناہ کرنے کی جرأت کرے گا؟

چغل خور جنت میں نہیں جائے گا

حدیث ۱۵۳۶:-

وعن حذيفة (رضی اللہ عنہ) قال قال رسول الله ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) بن یمان فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چغل خور جنت میں نہیں جائے گا۔

افادات:- آج ہمارے معاشرے اور سوسائٹی میں اس طرح کی چیزیں بہت عام ہو چکی ہیں۔ لوگ دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگے رہتے ہیں اور ادھر کی ادھر کرتے رہتے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں بلکہ صرف تفریح کی غرض سے اس میں مبتلا رہتے ہیں کہ کسی کو کچھ کرتے ہوئے دیکھا تو دوسری طرف جاکر دوستوں کی محفل میں تفریح اور وقت گذاری، ٹائم پاس کے طور پر کہتے ہیں کہ: ارے یار! فلاں تو یوں کر رہا تھا۔ بعضوں کا تو مشغلہ ہی یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے جو حالات ان کی نگاہوں کے سامنے آتے ہیں ان کو دوسروں کے سامنے بیان کرتے رہتے ہیں؛ یہ بھی چغلی میں داخل ہے۔ آدمی اپنی نادانی، جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے ایسی چیز اپنی زبان سے بول دیتا ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے اتنی سخت وعید ارشاد فرمائی کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا ہمیشہ نہیں جائے گا؟ حالاں کہ ایمان والوں کو اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر جنت میں جانے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ کیا گیا ہے۔

تو حضراتِ علماء فرماتے ہیں: ”لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ نَمَّامٌ مَادَامَ نَمَّامًا“ وہ چغلی کے اس کے گناہ کی وجہ سے جہنم میں بھیجا گیا اور اس گناہ کی سزا پوری کر کے اس کو اس گناہ سے پاک کر دیا گیا؛ اب تو وہ نمّام یعنی چغل خور نہیں رہا، بلکہ چغلی کا گناہ اس سزا بھگتنے کی وجہ سے صاف ہو گیا، تو اب وہ اس لائق ہو جائے گا کہ اس کو جنت میں بھیجا جائے۔

عذابِ قبر میں مبتلا کرنے والے دو گناہ

حدیث ۱۵۳۷:-

وعن ابن عباسٍ رضی الله عنهما : أنَّ رسولَ الله ﷺ مرَّ بِقَبْرَيْنِ فَقَالَ:((إنَّهُمَا يُعَذَّبَانِ ، وَمَايُعَذَّبَانِ فِى كَبِيرٍ ! بَلَى إنَّهُ كَبِيرٌ : أمَّا أحَدُهُمَا، فَكَانَ يَمْشِى بِالنَّمِيمَةِ ، وأمَّا الآخَرُ فَكَانَ لاَ يَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهِ)). (متفق عَلَيْهِ.وهذا لفظ إحدى روايات البخارى)

قَالَ العلماءُ معنى:((وَمَا يُعَذَّبَانِ فِى كَبِيرٍ)) أىْ: كَبِيرٍ فِى زَعْمِهِمَا.وقِيلَ: كَبِيرٌ تَرْكُهُ عَلَيْهِمَا

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر دو قبروں پر ہوا تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ان دونوں قبر والوں کو قبر میں عذاب ہو رہا ہے، اور کسی بڑی بات پر عذاب نہیں ہو رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ دونوں بہت بڑے گناہ ہیں، ان میں سے ایک تو لوگوں کی چغلی کیا کرتا تھا، اور دوسرا اپنے پیشاب سے نہیں بچتا تھا۔

افادات:- اللہ تعالیٰ عالمِ برزخ کے احوال کبھی کبھار نبی کریم ﷺ پر کھول دیتے تھے تاکہ آپ ﷺ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرکے نصیحت فرمائیں، حتّٰی کہ عبرت کے لئے کبھی کبھی عام انسانوں پر بھی وہاں کے احوال کو کھول دیا جاتا ہے۔

"کسی بڑی بات پر عذاب نہیں ہو رہا ہے" یعنی ان کے خیال اور ذہن میں یہ کوئی بڑی چیز نہیں تھی اور وہ ان کو معمولی سمجھتے تھے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ایسے مشکل کام نہیں تھے

جن کو چھوڑنا مشکل ہو، اگر بچنا چاہتے تو آسانی سے بچ سکتے تھے، اس معنیٰ کر فرمایا کہ وہ کوئی بڑی چیز نہیں تھی۔ ورنہ آگے خود حضور ﷺ ہی فرماتے ہیں کہ حقیقت میں وہ دونوں بہت بڑے گناہ ہیں، لیکن اگر آدمی ارادہ کر لے اور ہمت سے کام لے تو ان سے بچنا کوئی مشکل نہیں۔ جتنے بھی گناہ ہیں ان تمام کے متعلق آدمی اگر یہ سوچ لے کہ مجھے نہیں کرنے ہیں، اور پھر جب بھی دل میں ان گناہوں کے کرنے کا تقاضہ پیدا ہو اس وقت ہمت سے کام لے کر اپنے آپ کو ان سے بچائے اور روک لے؛ تو ان سے بچنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔

”لَا یَسْتَتِرُ مِنْ بَوْلِهٖ“ کا مطلب بعض لوگوں نے یہ بیان کیا ہے کہ پیشاب کرتے وقت لوگوں سے اپنا ستر چھپانے کا جو اہتمام کرنا چاہیے وہ نہیں کرتا تھا، جیسا کہ بعض لوگ سب کے سامنے اپنا ستر کھول کر پیشاب پاخانہ کرنے کے لئے اس طرح بیٹھ جاتے ہیں کہ لوگ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ تو ان میں سے ایک ایسا ہی تھا کہ اپنے ستر کو لوگوں سے چھپانے کا اہتمام نہیں کرتا تھا، لوگوں کے سامنے اپنا ستر کھولے ہوئے پیشاب کر لیا کرتا تھا۔ اور بعضوں نے کہا کہ پیشاب کے چھینٹوں سے اپنے آپ کو بچاتا نہیں تھا؛ اس لیے آدمی کو پیشاب کرتے وقت بہت زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے کہ پیشاب کرنے کے دوران قطرے اور چھینٹے اپنے کپڑوں یا جسم کو لگنے نہ پائیں۔ اگر آدمی اس سے نہیں بچے گا تو عذابِ قبر میں مبتلا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے حفاظت فرمائے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ دیکھو! چغلی ایک ایسا گناہ ہے جس کی وجہ سے آدمی عذابِ قبر میں مبتلا ہو جاتا ہے، حالاں کہ ان سے بچنا بہت آسان ہے پھر بھی لوگ اس کا اہتمام نہیں کرتے۔

سلامتی اسی میں ہے کہ

حدیث ۱۵۳۸:-

وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ :أن النَّبِیّ ﷺ قَالَ: ((أَلَاأُنَبِّئُكُمْ مَا العَضْهُ ؟ هی النَّمِیمَةُ، القَالَةُبَیْنَ النَّاسِ)). (رواہ مسلم)

((العَضْهُ)) : بفتح العین المهملة، وإسكان الضاد المعجمة، وبالهاء عَلَى وزن الوجهِ. ورُوِی ((العِضَةُ)) بكسر العین وفتح الضاد المعجمة عَلَى وزن العِدَة. وهی: الكذب والبُهتان، وعلى الرِّواية الأولى: العَضْهُ مصدرٌ یقال: عَضَهَهُ عَضهاً، أیْ: رماهُ بالعَضْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے نقل ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں بتلاؤں کہ عضہ کیا ہے؟ عضہ یعنی چغلی، لوگوں کے درمیان کسی کی بات کو پیش کرنا۔

آگے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ وضاحت کرتے ہیں کہ بعضوں نے "اَلْعَضْهُ" پڑھا ہے جس کا معنیٰ چغلی کرنا۔ اور بعضوں نے "العِضَةُ" پڑھا ہے جس کا معنیٰ جھوٹ بولنا اور کسی کے اوپر بہتان لگانا۔

افادات:- بہر حال چغلی خطرناک گناہ ہے، آدمی کو اس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کے جو بھی حالات آدمی کی نگاہوں کے سامنے آویں، یا کان میں پڑیں؛ سلامتی اسی میں ہے کہ آدمی خاموش رہے، چاہے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، یا کانوں سے سنا ہو؛ ہر حال میں کسی کے بھی سامنے اس کے اظہار سے اپنے آپ کو بچائے؛ تب ہی چغلی سے بچ سکتا ہے۔

باب النهي عن نقل الحديث وكلام الناس إلى ولاة الأمور إِذَا لَمْ تَدْعُ إِلَيْهِ حاجة كخوف مفسدة ونحوه

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نیا عنوان قائم کیا ہے: حاکموں اور عہدہ داروں کے سامنے بھی لوگوں کی باتوں کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جب کہ کسی قسم کی خرابی اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، ہاں! اگر چند لوگ بیٹھ کر کوئی سازش کر رہے ہیں اور مشورہ کر رہے ہیں کہ مثلاً: کل فلاں کے یہاں چوری کرنی ہے، یا فلاں کو قتل کرنا ہے، اور ان کا یہ پلان کسی نے سن لیا تو اس صورت کے اندر اگر اس کی اطلاع حاکم کو کر دی جائے کہ اس کے نتیجہ میں اس برائی اور نقصان سے لوگوں کی حفاظت ہو جائے گی؛ تو یہ تو ضروری ہے۔ لیکن اگر ایسی بات نہیں ہے، ویسے ہی کچھ لوگ آپس میں مل کر اگر بیٹھتے ہیں، باتیں کرتے ہیں، تو جیسا کہ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ لوگوں کی ہر ہر چیز حکمرانوں تک پہنچاتے رہتے ہیں کہ فلاں فلاں دو آدمی بیٹھے تھے اور ایسی ایسی باتیں کر رہے تھے، یا فلاں آدمی فلاں جگہ گیا تھا؛ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اس سے بھی اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ گناہ اور سرکشی کے کاموں میں لوگوں کی مدد مت کرو۔

میرا سینہ لوگوں کی طرف سے بالکل صاف ہو

حدیث ۱۵۳۹:-

وعن ابن مسعودٍ-رضی اللہ عنہ-قَالَ قَالَ رسُولُ اللهِ ﷺ: ((لا يُبَلِّغُنِي أَحَدٌ مِنْ أَصْحَابِي عَنْ أَحَدٍ شَيْئاً، فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَخْرُجَ إِلَيْكُمْ وَأَنَا سَلِيمُ الصَّدْرِ)). (رواه أبو داود والترمذی)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی میرے صحابہ کے متعلق کوئی بات مجھ تک نہ پہنچائے، اس لیے کہ میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میں تمہارے درمیان ایسی حالت میں آؤں کہ میرا سینہ اور دل لوگوں کی طرف سے بالکل سلامت اور صاف ہو۔

افادات:- اور جب کسی کے متعلق کوئی بات پہنچائی جائے گی تو ظاہر ہے کہ جس کو بات پہنچائی گئی ہے اس کے دل میں جس کی بات پہنچائی گئی ہے اس کے متعلق کدورت اور میل آجائے گا۔ مثلاً: کسی نے کہا کہ آپ کے متعلق فلاں آدمی یوں بول رہا تھا، فلاں آدمی یوں کر رہا تھا، تو اس بات کو سننے کے نتیجہ میں اب اس کے متعلق دل صاف نہیں رہے گا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس منافقین اہلِ ایمان کی باتیں اس طرح پہنچاتے رہتے تھے، تو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا کہ کوئی بھی آدمی میرے صحابہ کی کوئی بات مجھ تک نہ پہنچائے۔ اس لیے کہ اگر کسی کی کوئی بات پہنچے گی تو ظاہر ہے کہ اس کے متعلق دل میں جیسی صفائی رہنی چاہیے وہ نہیں رہے گی، اور دل میں ایک میل سا آجائے گا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں جب تمہارے درمیان میں آؤں تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میرا دل ہر ایک کی طرف سے صاف ہو، اس میں کسی کے متعلق کسی قسم کا میل نہ ہو۔ اور اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اپنی امت کے ساتھ ایک رسول کا تھا اور ظاہر ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کے دل میں کسی کے متعلق کوئی میل ہوا تو آپ کا فیض لوگوں کو نہیں پہنچے گا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ہر ہر فرد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فائدہ اٹھانے والا بن جائے، اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خاص طور سے تاکید فرمائی۔

بَاب ذَمِّ ذِی الْوَجْهَیْنِ

دوچہرے والے کی برائی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دوچہرے والا یعنی ایسا آدمی جس کو ہم اپنی زبان میں ''دوغلا'' کہتے ہیں، قرآن وحدیث میں اس کی بھی بہت سخت برائی اور وعید آئی ہے۔ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿یَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُونَ مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمْ إِذْ یُبَیِّتُونَ مَالَا یَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ، وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُونَ مُحِیطاً﴾ بعض لوگ ایسے ہیں جو گناہ کرتے وقت اپنے آپ کو لوگوں سے تو چھپانے کا اہتمام کرتے ہیں، یعنی ان کی پوری کوشش یہ تو ہوتی ہے کہ ہم کو گناہ کرتے ہوئے کوئی نہ دیکھ لے؛ لیکن اللہ تعالیٰ جو ہر چیز سے واقف ہے جو ان کو دیکھ رہا ہے، اس سے چھپنے کا اہتمام نہیں کرتے؟ جب وہ ایسی چیزوں اور باتوں کی تدبیر کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ خوش نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ ان کے تمام اعمال کو گھیرے ہوئے ہے، بندے جو کچھ بھی کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی ہر ہر چیز سے واقف ہے۔

میں نے شروع میں بتلادیا تھا کہ آدمی کے دل میں ہمیشہ یہ احساس بیدار رہنا چاہیے کہ میں جو کچھ بولتا اور کرتا ہوں؛ اس سب کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کا حساب دینا ہے۔

سب سے برا آدمی

حدیث ۱۵۴۰:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسول الله صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّم: ((تَجِدُونَ النَّاسَ مَعادِنَ: خِيَارُهُم فى الجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُم فى الإِسْلاَمِ إِذَا فَقِهُوا. وتَجِدُونَ خِيَارَ النَّاسِ فى هَذَا الشَّأْنِ أَشَدَّهُمْ كَرَاهِيَةً لَهُ. وَتَجِدُونَ شَرَّ النَّاسِ ذَا الوَجْهَيْنِ، الَّذِى يَأْتِي هؤُلاءِ بِوَجْهٍ، وَهؤُلاءِ بِوَجْهٍ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو تم کانوں کی طرح پاؤ گے۔ ان میں کا جو (گھرانہ اور خاندان) زمانۂ جاہلیت میں عمدہ اور بہتر سمجھا جاتا تھا اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی وہ بہتر ہی رہے گا جب کہ وہ دینی علم حاصل کرلے۔ اور تم لوگوں میں اس آدمی کو بہترین پاؤ گے جو اس امارت کو سب سے زیادہ ناپسند کرتا ہو (مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حکمرانی سے جتنے دور ہیں وہ اتنے ہی اچھے ہیں، اس لیے دل میں اس کا جذبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مجھے کرسی مل جائے۔ کرسی، منصب اور عہدہ سے جو اپنے آپ کو جتنا زیادہ دور رکھے گا وہ اتنا ہی اچھا آدمی ہے۔ ہاں! اگر ناپسندیدگی کے باوجود ذمہ داروں کی طرف سے

زبردستی وہ کام اس کو سونپا گیا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوتی ہے)اور تم لوگوں میں سب سے برا اس آدمی کو پاؤگے جو دو چہرے والا ہو، جو ایک کے سامنے آتا ہے تو ایک بات کرتا ہے اور دوسرے کے سامنے جاتا ہے تو دوسری بات کرتا ہے(ایسا آدمی اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ برا ہے، اور اس کے لئے سخت وعید ہے)۔

افادات: کان؛ جس کو ہم گجراتی میں (ખાણ)اور انگریزی میں (Mainse) کہتے ہیں۔ مختلف چیزوں کی کانیں ہوتی ہیں، جتنے بھی معدنیات ہیں وہ سارے کے سارے کانوں سے حاصل ہوتے ہیں، جیسے: سونا، چاندی، تانبہ، لوہا، کوئلہ، وغیرہ وغیرہ؛ ہر ایک چیز اسی کی کان اور معدن سے ملا کرتی ہے، وہ اس کان کی خصوصیت کہنی چاہیے، اسی طرح لوگوں کا حال بھی ہے۔ یعنی ہر ہر گھرانے اور خاندان کا اپنا خاص وصف اور خصوصیت ہوا کرتی ہے جو اس خاندان کے افراد میں پائی جاتی ہے، جیسے: کوئی گھرانہ علمی ہوتا ہے تو اس کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس گھر کے ہر ہر فرد کو علم سے خاص لگاؤ ہوتا ہے، اور اس کا ہر ایک فرد کسی نہ کسی علمی خدمت کے اندر لگا ہوا ہوتا ہے۔ تو خاندانی اوصاف اور خوبیوں کے ساتھ اگر ایمان بھی مل جائے تو پھر ایمان ان ساری خوبیوں کو اور زیادہ جلا بخش دے گا، جیسے: آج ہی ایک صاحب بتا رہے تھے کہ میں ایک غیر مسلم بھائی سے ملا اور ان سے گفتگو کی نوبت آئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں ساری خوبیاں ہیں، فقط ایمان کی کمی ہے۔ تو ایسا ہوتا ہے کہ بعض گھرانے خاندانی طور پر ایسے ہوتے ہیں کہ اس سے تعلق رکھنے والے تمام افراد میں بھی وہی

سب خوبیاں پائی جاتی ہیں، جیسے: سمجھداری، تحمل وبردباری، سخاوت، بہادری ہوتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان سارے اوصاف کے ہوتے ہوئے بھی جو کام بھی انجام دیئے جائیں گے ان کا اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہونا ایمان کے اوپر موقوف ہے، اگر ان میں ایمان نہیں ہے تو سب چیزیں بیکار ہو جائیں گی۔ اس لیے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ لوگ بھی کانوں کی طرح ہیں، زمانۂ جاہلیت میں جو شریف اور عمدہ سمجھے جاتے تھے، اسلام لانے کے بعد بھی وہ وہی سمجھے جائیں گے، یعنی اسلام نے تو ان کی ان خوبیوں میں گویا چار چاند لگا دیئے۔ جب کہ وہ دینی علم حاصل کرلیں یعنی علمِ دین حاصل کرنے کے بعد اس پر اور زیادہ پالش چڑھ جاتی ہے۔

یہاں تو یہ روایت اس لیے لائے ہیں کہ جو آدمی دو چہرے والا ہو کہ ایک کے سامنے ایک بات کرے اور دوسرے کے سامنے دوسری بات کرے؛ ایسے آدمی کو لوگوں میں سب سے برا فرمایا گیا ہے۔

منافقت یہی ہے

حدیث ۱۵۴۱:-

وعن محمد بن زيدٍ: أَنَّ ناساً قالوا لجدِّه عبد الله بن عمر رضی الله عنهما: إِنَّا نَدْخُلُ عَلَى سَلَاطِيْنِنَا فَنَقُوْلُ لَهُمْ بِخِلَافِ مَا نَتَكَلَّمُ إِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ. قَالَ: كُنَّا نَعُدُّ هٰذَا نِفَاقاً عَلَى عَهْدِ رَسُوْلِ الله ﷺ.

(رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت محمد بن زید کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ہمارے دادا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس حاضر ہوئے اور کہا: ہم جب ہمارے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو ان سے ایسی باتیں کرتے ہیں جو اس کے خلاف ہوتی ہیں جو ان کے پاس سے نکلنے کے بعد ہم کرتے ہیں (یعنی باہر آکر تو ان کی برائی کرتے ہیں لیکن ان کے سامنے ان کی تعریف کرتے ہیں) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا: نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ میں ہم اس کو نفاق شمار کرتے تھے۔

افادات:- منافقت یہی ہے کہ کسی کے سامنے اس کی تعریف کریں اور بعد میں اس کی برائی کریں۔ اگر آپ کا دل اس سے مطمئن ہی نہیں ہے تو پھر سامنے بھی تعریف کیوں کرتے ہو۔ کسی کے سامنے یہ ظاہر کرنا کہ میں آپ کا مداح ہوں اور وہاں سے نکل کر اس کی برائیاں کرنا؛ یہ تو ایک طرح کا دھوکہ اور نفاق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانہ میں ہم اس کو منافقت ہی خیال کرتے تھے کہ ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ ہو۔ آدمی کو ایسا نہیں ہونا چاہیے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

باب تحریم الکذب

جھوٹ کی حرمت کا بیان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قال اللہ تعالیٰ:- وَلَا تَقۡفُ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ ۔ (الاسرأ:۳۶)

وقال تعالیٰ:- مَا یَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَیۡہِ رَقِیۡبٌ عَتِیۡدٌ۔ (ق:۱۸)

زبان کی حفاظت کا بیان چل رہا ہے، زبان کی بے احتیاطی اور غلط استعمال کے نتیجہ میں جو گناہ سرزد ہوتے ہیں ان میں سے غیبت اور چغلی کا پہلے بیان آچکا۔ یہاں علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے نیا باب قائم کیا ہے: جھوٹ کا حرام ہونا۔

جھوٹ بھی وہ گناہ ہے جو زبان سے سرزد ہوتا ہے۔ اور ہر آدمی جانتا ہے کہ جھوٹ کس کو کہتے ہیں، اس کی وضاحت اور تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے، البتہ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ جیسے اور معاملات میں ہوتا ہے یہاں پر بھی ہم لوگوں نے جھوٹ کو کچھ حالات یا چیزوں کے ساتھ خاص کررکھا ہے کہ صرف یہی جھوٹ ہے، حالاں کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں معاشرہ میں ہماری جانب سے بہت سی چیزوں میں جھوٹ کا ارتکاب ہوتا ہے، لیکن مرتکب کا خیال اور وہم بھی اس طرف نہیں جاتا کہ میں جھوٹ کا ارتکاب کررہا ہوں۔ جیسے: ایک سچا

اچھا پڑھا لکھا آدمی جو نماز روزہ کا پابند ہے، بزرگوں کی صحبت میں اٹھتا بیٹھتا ہے اور دین دار ہے، لیکن وہ بھی جب بعض معاملات کو انجام دیتا ہے تو اس کو خیال بھی نہیں ہوتا کہ میں اس کام کو کرکے جھوٹ کے گناہ میں مبتلا ہو رہا ہوں۔ آگے اس سلسلہ میں تفصیل عرض کروں گا۔

جیسا کہ علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ ہر باب کے شروع میں اس موضوع کے مناسب کچھ آیتیں پیش کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایک دو آیتیں پیش کی ہیں:-

﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ جس کا تمہیں علم نہ ہو اس بات کو اپنی طرف سے مت کہو اور اس کے درپے نہ ہو۔ یعنی جو بات تم نہیں جانتے اگر وہ کہوگے تو ظاہر ہے کہ جھوٹ ہو جائے گا اور غلط شہادت کو شامل ہو جائے گا۔ اس لیے کہ گواہی کے لیے یہ ضروری ہے: ﴿إِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ آدمی اس بات کو جانتے ہوئے اس کے متعلق اطلاع دے تب ہی وہ گواہی ہے، لیکن ایک آدمی جانتا نہیں ہے اور وہ اس کے متعلق کہے گا تو وہ جھوٹی گواہی ہو جائے گی۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے اس آیت کو پچھلے ابواب میں بھی ذکر کیا تھا کہ آدمی جو بات بھی اپنی زبان سے نکالتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر ایک چوکس نگراں مقرر ہے جو اس کی زبان سے نکلنے والی ہر ہر بات کو ریکارڈ کرتا ہے۔ اور میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ آدمی کو جب یہ احساس پیدا

ہو جائے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور اس کو محفوظ بھی کیا جا رہا ہے، تو اس صورت میں پھر گناہ اور نافرمانی سے بچنا آسان ہو جائے گا۔ جیسے: ہم اور آپ یہاں بیٹھے ہیں، اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اس جماعت خانہ کے اندر ایسے آلات فٹ کیے گئے ہیں جن کے ذریعہ ہماری ہر حرکت وسکون سے واقف ہوا جاتا ہے، ہم جو کچھ بولتے ہیں اس سے ان آلات کو فٹ کرنے والوں کو واقفیت ہوتی ہے؛ تو ہم اور آپ ہر ہر حرکت بہت احتیاط کے ساتھ انجام دیں گے اور ہر بات بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی زبان سے نکالیں گے۔ تو جب ہمارا یہ ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر آدمی پر باقاعدہ فرشتے مقرر ہیں جو ہر بات کو نوٹ کرتے ہیں تو پھر جیسے ہم دنیا کے حکمرانوں سے ڈرتے ہوئے احتیاط برتتے ہیں، وہاں بھی احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

سچائی کا ایک بہت بڑا فائدہ

حدیث ۱۵۴۲:-

وعن ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) قَالَ : قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ:((إنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى البِرِّ، وإنَّ البِرَّ يَهْدِي إِلَى الجَنَّةِ، وإنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقاً . وإنَّ الكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الفُجُورِ، وإنَّ الفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وإنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّاباً)) (متفقٌ عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: سچ؛ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبر داری کی طرف لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبر داری آدمی کو جنت تک لے جاتی ہے، اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں (صدیق) سچا لکھا جاتا ہے۔ اور بے شک جھوٹ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی جہنم تک پہنچاتی ہے، اور آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں (کذّاب) جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے (گویا اس کے بعد اس کو سچ کی توفیق نہیں ہوتی۔ یعنی آدمی اگر سچائی کی عادت ڈالے تو اس کا خاصہ اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو اللہ تبارک و تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبر داری اور نیکی کے راستہ پر چلنے کی توفیق ہوگی)۔

آسان نسخہ

افادات:- یہاں سچائی کا ایک بہت بڑا فائدہ بتایا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہم اور آپ اپنی زندگی میں جن مختلف گناہوں کے عادی ہو چکے ہیں، متعدد نافرمانیاں ہم سے سرزد ہو جاتی ہیں، اور ہم چاہتے ہیں کہ ان سے اپنے آپ کو بچائیں، اور جب اس کا احساس ہوتا ہے تو اس کے لیے مختلف تدبیریں بھی عمل میں لائی جاتی ہیں لیکن ان تدبیروں کے ذریعہ سے بھی ہم اپنے آپ کو ان برائیوں سے بچانے کے معاملہ میں کامیاب نہیں ہو پاتے؛ اس مقصد کے لئے اس حدیث پاک میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک بڑا آسان نسخہ ہم کو بتلایا ہے کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کریں اور ہر وقت آپ سے نیکی اور بھلائی ہی سرزد ہو تو

ایک چیز کا اہتمام کرلو، اور وہ یہ ہے کہ سچائی اختیار کرلو۔ آپ یہ طے کرلیجئے کہ میں ہمیشہ سچ بولنے کا اہتمام کروں گا، کبھی جھوٹ کے قریب نہیں جاؤں گا، اگر آپ صرف اس ایک نیکی کو اپنے اوپر لازم کرلیں گے تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کا خاصہ اور قدرتی نتیجہ یہ ہوگا کہ نیکی کے راستہ پر چلنے کی توفیق ہوگی، اور جب آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری کریں گے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ جنت تک پہنچ جائیں گے۔ کتنا آسان نسخہ ہے۔!

صرف جھوٹ چھوڑا تو سب گناہ چھوٹ گئے

ایک مرتبہ ایک آدمی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں بہت سارے گناہوں میں مبتلا ہوں، چوری بھی کرتا ہوں، مجھ سے زنا کا بھی ارتکاب ہوتا ہے، شراب بھی پیتا ہوں، جھوٹ بھی بولتا ہوں، اب یہ سارے گناہ یکبارگی چھوڑنے کی مجھ میں طاقت نہیں، میں کوئی ایک ہی گناہ چھوڑ سکتا ہوں؛ اب اس سلسلہ میں آپ فرمائیں کہ کون سا گناہ پہلے چھوڑوں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ آپ ﷺ نے اس کو صرف اسی ایک چیز کی تاکید فرمائی۔ اس نے کہا: ٹھیک ہے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ چناں چہ جب اس نے شراب پینے کا ارادہ کیا تو سوچا کہ میں تو یہ عہد کرکے آیا ہوں کہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اب اگر شراب پیتا ہوں اور بعد میں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ تو نے شراب پی ہے؟ تو مجھے کہنا پڑے گا کہ ہاں! پی ہے؛ تو

پھر شراب کی سزا مجھ پر جاری کی جائے گی، اس لیے میں شراب نہیں پیتا۔ پھر جب چوری کرنے کا ارادہ کیا تو پھر یہی خیال آیا کہ میں نے تو عہد کیا ہے کہ جھوٹ نہیں بولوں گا، اگر بعد میں مجھ سے پوچھا جائے گا کہ کیا تو نے چوری کی ہے؟ اب مجھے جھوٹ تو بولنا نہیں ہے، اس لیے کہنا پڑے گا کہ ہاں! میں نے چوری کی ہے، تو چوری کی سزا مجھ پر جاری ہو گی۔ یہی معاملہ زنا کا بھی ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے سارے ہی گناہ چھوٹ گئے۔ (التذكرة الحمدونية لأبي المعالي، ۴۹/۳)

اپنی اصلاح کا سرا ہمارے ہی ہاتھ میں ہے

دیکھو! اس حدیث میں یہ نہیں بتلایا کہ گناہ کیسے چھوٹتے ہیں، بس! حضور اکرم ﷺ نے تو اجمالی طور پر یہ بتلا دیا کہ اگر آپ سچائی کو لازم پکڑ لو گے تو اس کی برکت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اطاعت و فرمانبرداری کی توفیق عطا فرمائیں گے۔ اب کیسے عطا فرمائیں گے؟ اس کی ایک مثال میں نے آپ کے سامنے پیش کی جو حدیث کی کتابوں میں موجود ہے کہ وہ آدمی دوسرے گناہوں سے کیسے بچ گیا۔ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ اس سچ کی برکت سے دوسرے گناہوں سے بچنے کا راستہ سجھائیں گے اور نیکیوں پر چلنا آسان کر دیں گے۔ اس لیے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگے رہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچائیں تو اس کا آسان راستہ یہی ہے کہ جھوٹ کو چھوڑ کر سچ کو اختیار کر لیں۔

اور آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ آدمی اللہ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے۔ صالح اور نیک لوگوں کے اللہ تعالیٰ کے یہاں چار درجے ہیں۔ ہم روزانہ ہر نماز کی ہر رکعت کے اندر دعا کرتے ہیں: ﴿اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ﴾ اے اللہ! صراط مستقیم یعنی سیدھے راستہ کی ہمیں رہنمائی فرما اور اس پر چلا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا۔ وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا؟ تو قرآن پاک ہی میں دوسری جگہ ان کی چار جماعتیں بتلائی گئی ہیں: ﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيۡقِيۡنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيۡنَ﴾ ایک تو نبیوں کی جماعت، دوسری صدیقوں کی جماعت، تیسری شہیدوں کی جماعت اور چوتھی صالحین اور عام نیک لوگ کی جماعت۔ یہ چار جماعتیں ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا۔ اب ان چار جماعتوں میں پہلی جماعت انبیاء ؑ کی ہے، اور نبوت کسی کے اختیار اور قابو کی چیز نہیں ہے، کوئی آدمی یہ چاہے کہ میں نبوت کے درجے تک پہنچ جاؤں، تو چاہے وہ چوبیس گھنٹے عبادت کرتا رہے تب بھی اپنے ارادہ و اختیار سے وہ نبی نہیں بن سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت کا درجہ اختیاری نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے نبی بنا دیں، اور وہ دروازہ اب بند ہو گیا ہے، نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری کے بعد اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے، لیکن باقی تین جماعتیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا ہے ان تینوں کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ان میں سب سے پہلا درجہ صدیق کا ہے، گویا نبوت کے بعد کا سب سے اونچا درجہ صدیقین کا ہے۔ اور یہ درجہ سچ کے نتیجہ میں آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ حضور اکرم

ﷺ فرماتے ہیں کہ آدمی سچ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ صدیق لکھا جاتا ہے۔ اس لیے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اپنی اصلاح اور نیکی کی راہ اختیار کرنے کے لئے ایک بہت بڑا اسرا ہمارے ہاتھ آ گیا۔ جب ہم اپنی اصلاح کے معاملہ میں سوچتے ہیں کہ ہم سے گناہ چھوٹنے کا نام نہیں لیتے اور برائیاں نہیں چھوٹتیں، ہم کیا تدبیر اختیار کریں، اور پھر ہم مختلف تدبیریں اختیار بھی کرتے ہیں؛ تو یہ بہت اچھی، مختصر اور آسان سی تدبیر ہے، اگر ہم اسی (سچائی) کو لازم پکڑ لیں تو نبی کریم ﷺ وعدہ فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجہ میں طاعت اور نیکی کی توفیق ہوگی۔

خالص منافق کی چار خصلتیں

حدیث ۱۵۴۳:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما : أن النَّبِيّ ﷺ قَالَ : ((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ، كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ، كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْ نِفَاقٍ حَتَّى يَدَعَهَا : إِذَا أُؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)). (متفق عَلَيْهِ)

وَقَدْ سبق بيانه مَعَ حديث أَبِي هريرة بنحوه في ((باب الوفاءِ بالعهدِ))

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار خصلتیں اور عادتیں جس آدمی کے اندر ہوں گی، وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک

خصلت اور عادت ہو گی تو گویا نفاق کی ایک عادت اس میں موجود ہے یہاں تک کہ وہ اس کو چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب کسی سے عہد و پیمان کرے تو اس کے خلاف کرے، اور جب کسی کے ساتھ جھگڑا کرے تو گالی گلوچ پر اتر آئے۔

افادات:- یہاں تو یہ روایت اسی لیے لائے ہیں کہ جھوٹ نفاق کی خصلت و عادت ہے۔ جس کسی میں یہ خصلت ہے، اس سے جب تک توبہ نہیں کرتا گویا اس میں نفاق کی ایک خصلت موجود ہے۔ ویسے اس کو منافق اور کافر نہیں کہیں گے، بلکہ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ ایک منافق کے اندر جتنی برائیاں ہو سکتی ہیں وہ ساری برائیاں کلمہ پڑھتے ہوئے اور ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے اس آدمی کے اندر موجود ہیں، لیکن چوں کہ کلمہ پڑھ رہا ہے اس لیے کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا، ہاں! یہ ضرور کہیں گے کہ یہ آدمی حقیقی معنیٰ میں مؤمن نہیں ہے اور ایمان کی جو برکات اور ثمرات ہیں اس سے محروم ہے۔

یہ بہت ضروری ہے

بعض روایتوں میں یہاں تک ہے کہ ”وَإِنْ صَلّٰى وَصَامَ وَزَعَمَ أَنَّهُ مُؤْمِنٌ“ چاہے ایسا آدمی روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، اور یوں سمجھتا ہو کہ میں ایمان والا ہوں؛ تب بھی وہ مکمل ایمان والا نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ہم نے گویا اسلام اور ایمان کو روزہ نماز تک محدود کر رکھا ہے، ایک آدمی روزہ نماز کا اہتمام کرتا ہے، تو وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں پورے دین پر عمل کر رہا

ہوں، پھر چاہے وہ بازار کے اندر جا کر جھوٹ بولے، امانت میں خیانت کرے، رشوت لے، اور چاہے دوسری بہت ساری برائیوں میں مبتلا رہے، مثلاً: معاملات کی عدم صفائی، فریب ودھوکہ دہی، عہد شکنی اور گالی گلوچ سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا، لیکن یہاں حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ چاہے وہ روزہ رکھتا ہو، نماز پڑھتا ہو، اور یوں سمجھتا ہو کہ میں مؤمن ہوں؛ تب بھی وہ منافق ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام صرف نماز روزہ کا نام نہیں ہے، بلکہ اسلام ان صفات کی بھی ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہمیں اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کرنی چاہئیں اور ان برائیوں سے اپنے آپ کو کلی طور پر بچانے کا اہتمام کرنا ہے؛ یہ بہت ضروری ہے۔

ہر مذہب میں جھوٹ کو برا سمجھا گیا

اور میں آپ کو بتاؤں کہ جھوٹ کی برائی صرف اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ تو ایسا گناہ ہے جو ہر زمانہ اور ہر ملت و مذہب اور ہر قوم میں برا سمجھا گیا ہے، زمانۂ جاہلیت میں بھی جب کہ لوگ ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، کوئی گناہ ایسا نہیں ہوگا جس کا وہ لوگ ارتکاب نہ کرتے ہوں، لیکن وہ لوگ بھی جھوٹ کو اپنے لیے بہت بڑا عیب سمجھتے تھے۔ چناں چہ روایتوں میں آتا ہے کہ جس وقت نبیٔ کریم ﷺ نے قیصرِ روم کے نام دعوتِ اسلام کی غرض سے خط بھیجا، تو جب نبیٔ کریم ﷺ کا نامۂ مبارک اس کے پاس پہنچا اس وقت

وہ ملکِ شام کے سفر پر بیت المقدس کی زیارت کے لئے آیا ہوا تھا، وہیں آپ ﷺ کا نامہ مبارک اس کے پاس پہنچایا گیا۔ حضور اکرم ﷺ کے اس مبارک خط کو پڑھنے سے پہلے اس نے ضروری سمجھا کہ جن شخصیت کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے ان کے متعلق کچھ معلومات حاصل کروں کہ وہ کون ہیں؟ تاکہ اس خط کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ چناں چہ خط کھلوا کر پڑھنے سے پہلے اس نے اپنے درباریوں سے کہا: جن کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے اُن سے واقفیت رکھنے والے کچھ لوگ اگر ہماری مملکت میں ہوں تو ان کو میرے پاس لایا جائے، میں ان سے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جس زمانہ میں نبی کریم ﷺ نے یہ خطوط روانہ کیے تھے وہ صلحِ حدیبیہ کے بعد کا زمانہ تھا، مشرکینِ مکہ کے ساتھ صلح چل رہی تھی، اور یہ خط قیصر روم کے پاس اسی زمانہ میں پہنچا تھا۔ اتفاق کی بات کہ ابوسفیان جو مکہ والوں کے سردار اور آپ ﷺ کے پکے مدِمقابل تھے، وہی ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں پہنچے ہوئے تھے، قیصر کے لوگوں نے اُنہیں کو لاکر دربار میں پیش کر دیا کہ یہ لوگ اسی علاقہ کے رہنے والے ہیں۔ چناں چہ قیصر نے باقاعدہ دربار قائم کیا اور ان لوگوں کو بلاکر اپنے سامنے بٹھایا اور پہلے تو یہ پوچھا کہ یہ خط جن کی طرف سے میرے پاس پہنچایا گیا ہے، ان سے خاندانی اور نسبی رشتہ داری کے اعتبار سے سب سے زیادہ قریب کون ہے؟ اتفاق کی بات کہ ابو سفیان ہی سب سے زیادہ قریب تھے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ کے اجداد میں عبد مناف پر جاکر ان کا اور نبی کریم ﷺ کا نسب مل جاتا ہے، تو ابوسفیان نے کہا: میں نسب کے اعتبار سے

ان کا سب سے زیادہ قریبی رشتہ دار ہوں۔ لہٰذا قیصر نے ان کو آگے بٹھایا اور دوسروں کو پیچھے بٹھایا، پھر اس نے اپنے ترجمان کے ذریعہ پورے قافلہ والوں سے ایک بات کہی کہ: دیکھو! میں اُن کے متعلق اِن سے جو کچھ سوالات کروں گا، اگر یہ غلط جواب دیں تو مجھے بتادینا، پھر اس نے بہت سارے سوالات کیے، جس کا لمبا چوڑا قصہ ہے۔

مَیں اپنی طرف جھوٹ کی نسبت پسند نہیں کرتا

خیر! اصل بات جو میں بتلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بعد میں ابوسفیان کہتے تھے کہ قیصر نے جب میرے قافلہ والوں سے یہ کہا کہ اگر یہ کوئی غلط جواب دیں تو مجھے بتلادیجیو، تو میں یہ بات جانتا تھا کہ اگر حضور ﷺ کے متعلق کوئی غلط جواب دوں گا تو (اگرچہ قیصر نے کہا ہے کہ بتلادیجیو، لیکن) اس مجلس میں میرے قافلہ والوں میں سے کوئی بھی میری تردید نہیں کرے گا، کیوں کہ وہ ان کے سردار تھے اس لیے وہ میرے متعلق قیصر کو کبھی نہ بتاتے کہ یہ غلط بول رہے ہیں، لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہاں سے واپسی کے بعد جب مکہ پہنچیں گے تو وہاں چرچا ہوگا کہ انہوں نے قیصر کے سامنے یہ جواب غلط دیا تھا، اور میری طرف جھوٹ کی نسبت ہوگی، اور مَیں اپنی طرف جھوٹ کی نسبت پسند نہیں کرتا ہوں۔

تو دیکھو! ایک شخص شرک اور بہت ساری برائیوں کے اندر مبتلا ہونے کے باوجود جھوٹ کی نسبت کو اپنے لیے گوارا نہیں کرتا تھا۔اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کو وہ بھی برا سمجھتے تھے۔اور حقیقت میں جھوٹ بڑی خطرناک چیز ہے۔

بچوں کی تربیت میں بھی سچ کا اہتمام کیجئے

یہاں تک کہ بچوں کے ساتھ بھی جھوٹ کا ارتکاب کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، ابوداوٗد شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ ایک عورت اپنے بچے کو بلا رہی تھی کہ ادھر آ!میں کچھ دوں گی۔ نبی کریم ﷺ نے اس عورت سے پوچھا: جس وقت تو اپنے اس بچے کو یوں کہہ رہی تھی کہ آ! میں کچھ دیتی ہوں؛اس وقت تیرے دل میں یہ نیت تھی کہ میں کچھ دوں گی؟اس نے کہا: ہاں!میرے پاس کھجوریں تھی اور میری نیت تھی کہ میں اس کو ایک کھجور دوں گی۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھا جاتا۔

دیکھو!ہم تو اپنے بچوں کے ساتھ جب معاملہ کرتے ہیں تو بہت سی مرتبہ ایسی باتیں بول دیتے ہیں کہ:سو جا!ورنہ کتا آیا۔حالاں کہ کتا نہیں آیا پھر بھی کہتے ہیں کہ کتا آیا،تو یہ جھوٹ ہو گیا،بچے کو سلانے کے لئے ہم اپنے نامۂ اعمال کے اندر جھوٹ شامل کر رہے ہیں۔ ایسی بہت ساری چیزیں ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بچہ جب اپنے ماں باپ کو دیکھے گا کہ وہ بات

بات میں جھوٹ بولتے ہیں، یا جو کہتے ہیں وہ بات سچی نہیں ہوتی، تو اس کی طبیعت پر کیا اثر پڑے گا؟ وہ کیا سیکھے گا؟ یہی سیکھے گا نا کہ جھوٹ گناہ کا کام نہیں ہے، پھر وہ بھی جھوٹ کا عادی بن جائے گا۔ تو اگر ہم بچوں کی صحیح تربیت کرنا چاہتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مزاج میں جھوٹ کی برائی، شناعت اور قباحت بیٹھ جائے تو اس صورت میں ضروری ہے کہ ہم بھی اس کے سامنے جھوٹ بولنے سے بچیں، اور بار بار ان کے سامنے جھوٹ کی برائی بیان کریں۔

بچوں کو جھوٹ سے بچانے کا ایک نسخہ

حضرت قاری امیر حسن صاحب نور اللہ مرقدہٗ جو حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کے خلفاء میں سے تھے، وہ فرماتے تھے کہ: چوں کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ آدمی جب جھوٹ بولتا ہے تو اس کے منھ سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ فرشتہ اس سے میلوں دور چلا جاتا ہے۔ تو جھوٹ بولنے کے نتیجہ میں منھ سے بدبو آنا یہ تو حقیقت ہے، اب اس بدبو کا احساس اگرچہ ہم لوگوں کو نہ ہو، لیکن اہل اللہ کو اس کا احساس ہو جاتا ہے۔ تو حضرت قاری صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرماتے تھے کہ: ہمارے بچپن میں ہمارے گھر کے بڑوں کو دیکھا کہ جب کوئی بچہ کوئی ایسی بات بول دیتا تھا جو جھوٹ کے قبیل کی ہوتی تو بچوں کو سکھانے کے لئے کہتے کہ: منھ سے بدبو آرہی ہے؛ تو ہم اپنا منھ دوسرے بچوں کو سنگھواتے تھے کہ دیکھو! کیا میرے منھ سے بدبو آرہی ہے؟

اور واقعۃً جب حضور ﷺ فرمار ہے ہیں کہ منھ سے بدبو آتی ہے، تو اب اگر ہم بچوں کو جھوٹ سے روکنے کے لئے کہہ دیں کہ تمہارے منھ سے بدبو آرہی ہے؛ تو اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے، اگرچہ ہمیں اس کا احساس نہ ہو۔ بچوں کو جھوٹ سے بچانے کے لئے اور ان کی تربیت کے لئے کتنا اچھا انداز ہے۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بچوں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے ان کو بہلانے پھسلانے کے لئے بھی ہماری زبان سے جھوٹ کا ارتکاب نہ ہو۔

مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں

یہاں تک کہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ حدیث پاک میں آتا ہے نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ایک آدمی لوگوں کو ہنسانے کے لئے جھوٹ بولتا ہے اس کے لئے ہلاکت ہے، یعنی جھوٹ کی وجہ سے جہنم میں جائے گا۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ لوگوں کے سامنے جھوٹی باتیں اس لیے بولتے ہیں تاکہ لوگ اس سے ہنسیں، تو لوگوں کو ہنسانے کی خاطر جھوٹ بولنے کی وجہ سے لوگ تو ہنس رہے ہیں اور یہ جہنم میں جائے گا۔ یہاں تک کہ حضور اکرم ﷺ نے مذاق میں بھی جھوٹ کی اجازت نہیں دی۔

بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی

آپ ﷺ نے مزاح بھی فرمایا ہے لیکن اس میں بھی سچ کا اہتمام فرمایا کرتے تھے، ایک مرتبہ ایک بوڑھی عورت آئی (یہ حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہ تھیں) اور کہنے لگیں: دعا کر دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں بھیج دیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی۔ وہ روتے ہوئے واپس جانے لگیں تو آپ نے فرمایا: ان کو بتادو کہ کوئی بھی بڑھیا بوڑھی ہونے کی حالت میں جنت میں نہیں جائے گی، بلکہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو بھی جنت میں بھیجیں گے تو تینتیس (۳۳) سال کی عمر کی جوان بنا کر بھیجیں گے۔ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے حضور اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ تو مزاح بھی فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: مزاح تو کرتا ہوں لیکن سچ کے علاوہ اپنی زبان سے نہیں نکالتا۔

سواری کے لیے اونٹ کا بچہ

ایک مرتبہ ایک دیہاتی نے آکر آپ سے سواری مانگی: اے اللہ کے رسول! مجھے سواری کے لئے اونٹ دیجئے۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہم تو آپ کو اونٹ کا بچہ دیں گے۔ وہ کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! میں اونٹ کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟ مجھے تو سواری کے لئے جانور چاہیے۔ آپ نے فرمایا: ہر اونٹ اونٹنی کا بچہ ہی ہوتا ہے نا!؟ جیسے ہم میں سے

ہر آدمی اپنی ماں سے ہی پیدا ہوتا ہے، تو ہر آدمی اپنی ماں کا بچہ ہی ہوا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سامنے والا جو بات کہہ رہا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی کی بات کی فوراً تردید نہ کی جائے۔

جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے

اور پھر جھوٹی گواہی کو تو شرک کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ: بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: شرک اور بت پرستی۔ پھر پوچھا گیا کہ اس کے بعد کون سا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ پھر پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا؟ تو آپ ﷺ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے پھر سیدھے بیٹھ گئے اور آپ نے فرمایا: " أَلَا! وَقَوْلَ الزُّوْرِ، أَلَا! وَقَوْلَ الزُّوْرِ " سنو! اس کے بعد جھوٹی گواہی سب سے بڑا گناہ ہے، سنو! اس کے بعد جھوٹی گواہی سب سے بڑا گناہ ہے۔ گویا حضور اکرم ﷺ نے جھوٹی گواہی کی اہمیت کو بتانے کے لیے ایک تو اس کو شرک اور ماں باپ کی نافرمانی کے ساتھ جوڑا، اور پھر اس کی اور زیادہ اہمیت بتلانے کے لئے آپ ﷺ اپنا ٹیک چھوڑ کر سیدھے بیٹھ گئے اور تین تین مرتبہ اس بات کو دہرایا۔

قرآنِ کریم میں بھی ہے:﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ بتوں کی پرستش سے بچو اور جھوٹی بات سے بھی بچو۔ گویا قرآنِ کریم میں بھی بت پرستی اور جھوٹ کو ایک ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جھوٹ کتنا خطرناک گناہ ہے!

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

ہمارے معاشرہ میں جھوٹ کی بعض شکلیں پھیلی ہوئی ہیں جن سے احتیاط نہیں کی جاتی، اسی میں ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی ہے۔ عام طور پر لوگ معمولی معمولی باتوں پر جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بناتے ہیں۔ہاں !اگر کہیں کسی کی جان کا خطرہ ہے، یا کسی ظالم کی طرف سے ناقابلِ برداشت ظلم میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہو؛تب تو بات دوسری ہے، لیکن ایسا نہیں ہوتا ہے پھر بھی بناتے ہیں ۔ مثلاً: ایک آدمی کسی فرم ،یا کمپنی یا کسی فیکٹری میں نوکری کرتا ہے، وہاں سے چھٹی لینے کے لئے جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کردیا جاتا ہے تاکہ چھٹی مل جائے،اس لیے کہ اتفاقی رخصت(Casual)تو وہ جناب وصول کرچکے ہیں،اب بیماری والی چھٹیاں رہ گئیں ہیں اور بیماری والی چھٹیاں بغیر بیماری کے نہیں مل سکتیں ،چوں کہ سرکاری دفاتر میں (Sick Note) رکھنے کے لئے سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہے،تو اس کے لئے وہاں پر جھوٹا سرٹیفکیٹ پیش کیا جاتا ہے؛ تو یہ صریح جھوٹ ہے۔جو بھی ڈاکٹر ایسا سرٹیفکیٹ لکھ دیتا ہے وہ تو جھوٹی گواہی میں آجائے گا،یہ تو اور زیادہ خطرناک گناہ ہو جائے

گا۔اس لیے کہ اس کا گناہ تو جھوٹ سے بھی بڑھ کر ہے اس لیے کہ جھوٹا سرٹیفکیٹ دینے والا ڈاکٹر اس کی جھوٹی تصدیق کرکے خود تو ایک گناہ میں مبتلا ہو ہی رہا ہے ساتھ ہی دوسرے آدمی کو بھی نقصان پہنچارہا ہے۔لہٰذا چھٹیاں لینے کے لئے، یا اسی طرح کے دیگر معاملات کے لئے میڈیکل سرٹیفیکیٹ کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے:بعض مرتبہ کسی کمپنی کی طرف سے بیماری کے علاج معالجہ کے لئے کچھ پیسے دیئے جاتے ہیں،اس کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ پیش کردیا جاتا ہے۔یہ سب اس کی طرف سے تو جھوٹ میں شامل ہے،اور جو ڈاکٹر صاحب ایسا میڈیکل سرٹیفکیٹ دے رہے وہ جھوٹی گواہی کی وعید میں شامل ہو رہے ہیں۔

ایک قصہ

حضرت مولا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ ایک صاحب مجھ سے ملے جو باہر کسی ملک میں ملازمت کرتے تھے،میں نے پوچھا:کب جارہے ہو؟ تو وہ کہنے لگے:ویسے تو میری چھٹی کل پوری ہورہی ہے لیکن مزید آٹھ دن اور بڑھ گئے۔میں نے پوچھا:کیسے؟ کیا ہوا؟ تو کہنے لگے:میں نے وہاں اپنا میڈیکل سرٹیفکیٹ بھیج دیا ہے اس کی وجہ سے آٹھ دن مل جائیں گے۔میں نے کہا:اس میں کیا لکھا؟ کہنے لگے:اس میں لکھوایا کہ میں سفر کے قابل نہیں ہوں۔میں نے کہا: ؟ اللہ کے بندے! آپ تو صوم وصلوۃ کے پابند ہو، بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے والے، تلاوت اور تسبیحات کا اہتمام کرنے والے ہو، کیا آپ

واقعتاً سفر کے قابل نہیں ہیں ؟ ایسا میڈیکل سرٹیفکیٹ جو بھیجا، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کا کیا مطلب ہوا؟ یہ تو صریح جھوٹ ہو گیا۔ تو بہت سی مرتبہ آدمی ایسی باتوں کا ارتکاب کر لیتا ہے اور اس کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔

کیرکٹر سرٹیفکیٹ (تصدیق نامہ)

ایسے ہی کسی کو کیرکٹر سرٹیفکیٹ یا مدرسوں کے لیے تصدیق نامہ دیا جاتا ہے، میں اس کو بہت بھگتتا ہوں، مدرسہ والے ہمارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ تصدیق نامہ لکھ دیجئے۔ ہمارے حضرت مفتی محمود حسن صاحب نوراللہ مرقدہٗ کا معمول یہ تھا کہ کوئی اس طرح کی بات لے کر آتا تو حضرت فرماتے کہ: بھائی دیکھو! میں جس مدرسہ میں گیا ہوں یا جس مدرسہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اس کے متعلق تو میں تصدیق لکھ دوں گا کہ یہ مدرسہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ اس لیے کہ تصدیق کا مطلب ہی ایک گواہی ہے، اور گواہی تو اسی کی ہوتی ہے جو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اور اگر دیکھا ہی نہیں ہے تو پھر کیسے لکھ دوں ؟ اس جواب پر مدرسے والے ناراض ہوتے ہیں۔ آج کل بہت سے لوگ نہیں دیکھا ہوتا پھر بھی اس لیے لکھ دیتے ہیں کہ نیکی کا کام ہے اور کسی کا کام بن جائے گا۔ میں کہتا ہوں کہ کسی کا کام ہو جائے گا یا کسی کی دھوکہ دہی میں مبتلا ہو جائے گا؟ اگر آپ نے نہیں دیکھا ہو تو اس طرح کی تصدیق نہیں لکھی جا سکتی، ہاں! نہ دیکھنے کی صورت میں ویسے ہی امداد

کی درخواست کی جاسکتی ہے، لیکن دیکھنے کی صورت میں جس انداز سے تصدیق نامہ لکھا جاتا ہے اور سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے؛ وہ نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً: کوئی آدمی کسی کو لے کر آیا کہ مفتی صاحب !اس کو ذرا کیریکٹر سرٹیفکیٹ لکھ دیجئے نا۔ تو اگر آپ واقف نہیں ہیں تو کیسے لکھ کر دے سکتے ہیں؟

کیریکٹر سرٹیفکیٹ کب دیں؟

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) ایک آدمی کو کسی جگہ کا گورنر بنانا چاہتے تھے، تو آپ نے اس کے متعلق دوسرے سے پوچھا: اس کا کیا حال ہے؟ جواب دیا: اچھا آدمی ہے۔ پوچھا: تم نے کیسے کہا کہ اچھا آدمی ہے؟ کیا کبھی تمہارا اس کے ساتھ لین دین کا معاملہ ہوا ہے؟ کہا: نہیں۔ پوچھا: کبھی تم نے اس کے ساتھ کوئی سفر کیا ہے؟ کہا: نہیں۔ تو اس پر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: شاید تم نے اس کو رکوع سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ دیکھو! میں حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے الفاظ نقل کر رہا ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کے ساتھ لین دین کا معاملہ کیا جائے اور وہ اس میں کھرا اترے، اور اس کے ساتھ سفر کریں اور وہ دورانِ سفر اپنے اخلاق واعمال کے اعتبار سے کھرا اترے؛ تب ہی آپ اس کے متعلق فیصلہ کرسکتے ہیں۔ ورنہ اس کے بغیر کسی کے متعلق کیرکٹر سرٹیفکیٹ نہیں دیا جاسکتا۔ ہاں یوں کہا جاسکتا ہے کہ میں اس کو دیکھتا ہوں کہ برابر

مسجد میں آتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، باقی اس کے دوسرے حالات سے میں واقف نہیں ہوں۔اس لیے اگر ہم نے کسی کے متعلق لاعلمی میں کیریکٹر سرٹیفکیٹ دے دیا تو ایک تو جھوٹ کا گناہ ہوا، لیکن ساتھ ہی دوسرے کو بھی دھوکہ میں ڈالا۔ اس لیے کہ وہ ہمارے سرٹیفکیٹ ہی کی بنیاد پر اس پر بھروسہ اور اعتماد کرے گا اور ہو سکتا ہے کہ وہ نقصان اٹھائے۔تو دوسرے کو جو نقصان ہو ا اس کا ذریعہ آپ بنیں گے،اس لئے اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔

جھوٹا خواب بیان کرنے کی وعید

حدیث ۱۵۴۴:-

وعن ابن عباس رضی الله عنهما ، عن النبیّ ﷺ قَالَ : ((مَنْ تَحَلَّمَ بِحُلُمٍ لَمْ يَرَهُ ، كُلِّفَ أَنْ يَعْقِدَ بَيْنَ شَعِيرَتَيْنِ وَلَنْ يَفْعَلَ ، وَمَنِ اسْتَمَعَ إِلَى حَدِيثِ قَوْمٍ وَهُمْ لَهُ كَارِهُونَ ، صُبَّ فِی أُذُنَيْهِ الآنُكُ يَوْمَ القِيَامَةِ ، وَمَنْ صَوَّرَ صُورَةً عُذِّبَ وَكُلِّفَ أَنْ يَنْفُخَ فِيهَا الرُّوحَ وَلَيْسَ بنافِخٍ)). (رواہ البخاری)

((تَحَلَّمَ)) : أَیْ قَالَ إِنَّه حلم فی نومه ورأی كذا و كذا ، وَهُوَ كَاذب.

و((الآنُك)) بالمدّ وضم النون و تخفيف الكاف : وَهُوَ الرَّصَاصُ المذاب.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے ایسا خواب بیان کیا جو دیکھا نہیں، تو قیامت کے روز اس کو پابند کیا جائے گا کہ دو جَو کے دانوں

کے درمیان گرہ لگائے (اور جب تک گرہ نہیں لگائے گا وہاں تک وہ عذاب میں مبتلا رہے گا) اور وہ گرہ نہیں لگا سکے گا۔ اور جو آدمی کچھ لوگوں کی باتوں کی طرف کان لگائے اور سننے کی کوشش کرے حالاں کہ وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں؛ تو قیامت کے دن اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ اور جو آدمی کوئی تصویر بنائے گا تو قیامت کے روز اس کو پابند کیا جائے گا کہ جو تصویر تو نے بنائی ہے اس میں جان ڈال، اور وہ اس میں جان نہیں ڈال سکے گا (جب تک وہ ایسا نہیں کرے گا وہاں تک عذاب میں مبتلا رہے گا۔)

افادات:- اس روایت میں جھوٹ کی ایک اور شکل بتلائی ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے، یا دوسروں سے مالی فائدہ حاصل کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ حضرت! میں نے تو آپ کو خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں ہیں۔ یہ سن کر سامنے والا خوش ہو جاتا ہے، اس کے بعد اپنی ضرورتیں اس کے سامنے رکھتے ہیں اور وہ خوش ہو کر پوری کر دیتا ہے۔ اگر ویسے ہی جا کر اس سے کہتے کہ مجھے آپ سے یہ کام ہے، اور مجھے سو روپئے قرض دو، تو وہ نہیں دیتا۔ لیکن اس کے لیے پہلے پلیٹ فارم تیار کر لیا تو کام بن گیا۔ اب ایسا کہنے والا سمجھتا ہے کہ اس میں کوئی بات نہیں ہوئی، حالاں کہ یہ بہت خطرناک گناہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے دکھایا جاتا ہے، لہٰذا بیداری کے اندر جو جھوٹ بولا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں خواب کے متعلق جھوٹ بولنے کی شناعت اور برائی بہت زیادہ ہے، کیوں کہ خواب کے متعلق یہ بھی آیا ہے کہ وہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ بعض لوگ اپنے خوابوں کے ذریعہ مختلف دنیوی اور دینی

فوائد حاصل کرنے کے لئے، یا دوسروں کو اپنا معتقد بنانے کے لئے، یا دوسروں سے اپنا کام نکلوانے کے لئے نعوذ باللہ ویسے ہی کہہ دیتے ہیں کہ میں نے خواب میں حضور ﷺ کو دیکھا اور آپ نے یوں فرمایا۔ یہ بہت خطرناک گناہ ہے۔

گناہ بے لذت

اور جو آدمی کچھ لوگوں کی باتوں کی طرف کان لگا کر سننے کی کوشش کرے اور وہ اس کو ناپسند کرتے ہوں، مثلاً: چند آدمی تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کر رہے ہیں، اور وہ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہماری بات کوئی دوسرا نہ سنے، لیکن کوئی آدمی چپکے سے ان کی طرف کان لگائے۔ یا بعضوں کو دوسروں کے فون سننے کی عادت ہوتی ہے، وہ بھی اس میں داخل ہیں۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کے کانوں میں پگھلایا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ دیکھو! کتنا سخت عذاب ہے۔

ذرا غور کرو کہ دوسروں کی باتیں سن کر کیا فائدہ ہوا؟ کیا کچھ پیسے مل گئے؟ یا مکان ٹھیک ہوگیا؟ کوئی نوکری مل گئی؟ کوئی اور ترقی حاصل ہوگئی؟ کچھ بھی نہیں ملا، صرف گناہ بے لذت ہے، اور اس پر کتنا خطرناک عذاب ہے!۔

سب سے بڑا جھوٹ

حدیث ۱۵۴۵:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((أَفْرَى الفِرَى أَنْ يُرِيَ الرَّجُلُ عَيْنَيْهِ مَا لَمْ تَرَيَا)). (رواه البخاری)

ومعناه: يقول: رأيتُ، فيما لَمْ يَرَهُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمام بہتانوں میں سب سے بڑا بہتان اور سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھلائے جو اس نے نہیں دیکھی ہے۔

افادات:- یعنی خواب میں جو چیز نہیں دیکھی ہے، لیکن لوگوں کے سامنے یوں بیان کرتا اور ظاہر کرتا ہے کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اس میں بھی لوگوں کے سامنے جھوٹ موٹ خواب بیان کرنے کی شناعت بیان فرمائی ہے۔ اور یہ بہت بڑا گناہ ہے، کوئی آدمی اس کو معمولی بات نہ سمجھے۔

حضور اکرم ﷺ کا ایک لمبا خواب

حدیث ۱۵۴۶:-

وعن سَمُرَةَ بنِ جُنْدُبٍ - رضي الله عنه - قَالَ: كَانَ رسُولُ اللهِ ﷺ مِمَّا يُكْثِرُ أَنْ يَقُولَ لأَصْحَابِهِ: ((هَلْ رَأَى أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنْ رُؤْيَا؟)) فَيَقُصُّ عَلَيْهِ مَنْ شَاءَ اللهُ أَنْ يَقُصَّ، وإنَّهُ قَالَ لنا ذَاتَ غَدَاةٍ: ((إنَّهُ أَتَانِي اللَّيْلَةَ آتِيَانِ، وإنَّهُمَا قَالا لِي: انْطَلِقْ، وإنِّي انْطَلَقتُ مَعَهُمَا، وإنَّا أَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ مُضْطَجِعٍ، وَإِذَا آخَرُ قَائِمٌ عَلَيْهِ بِصَخْرَةٍ، وَإِذَا هُوَ يَهْوِي بِالصَّخْرَةِ لِرَأْسِهِ، فَيَثْلَغُ رَأسَهُ، فَيَتَدَهْدَهُ الحَجَرُ هَا هُنَا، فَيَتْبَعُ الحَجَرَ فَيَأْخُذُهُ فَلاَ يَرْجِعُ إِلَيْهِ حَتَّى يَصِحَّ رَأْسُهُ كَمَا كَانَ، ثُمَّ يَعُودُ عَلَيْهِ، فَيَفْعَلُ بِهِ مِثْلَ مَا فَعَلَ المَرَّةَ الأُولَى!)) قَالَ: ((قُلْتُ لهما: سُبْحَانَ اللهِ! مَا هَذَانِ؟ قَالا لِي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ مُسْتَلْقٍ لِقَفَاهُ، وَإِذَا آخَرُ قَائِمٌ عَلَيْهِ بِكَلُّوبٍ مِنْ حَدِيدٍ، وَإِذَا هُوَ يَأْتِي أَحَدَ شِقَّيْ وَجْهِهِ فَيُشَرْشِرُ شِدْقَهُ إِلَى قَفَاهُ، ومِنْخَرَهُ إِلَى قَفَاهُ، وعَيْنَهُ إِلَى قَفَاهُ، ثُمَّ يَتَحَوَّلُ إِلَى الجانبِ الآخرِ، فَيَفْعَلُ بِهِ مِثْلَ مَا فَعَلَ بالجَانِبِ الأَوَّلِ، فَمَا يَفْرَغُ مِنْ ذَلِكَ الجانبِ حَتَّى يَصِحَّ ذَلِكَ الجانبُ كَمَا كَانَ، ثُمَّ يَعُودُ عَلَيْهِ فَيَفْعَلُ مِثْلَ مَا فَعَلَ فِي المَرَّةِ الأُولَى)) قَالَ: ((قُلْتُ: سُبْحَانَ اللهِ! مَا هذانِ؟ قالا لي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى مِثْلِ التَّنُّورِ)) فَأَحْسِبُ أنَّهُ قَالَ: ((فإذا فِيهِ لَغَطٌ، وأصْوَاتٌ، فَاطَّلَعْنَا فِيهِ فإذا فِيهِ رِجَالٌ وَنِسَاءٌ عُرَاةٌ، وَإِذَا هُمْ يَأتِيهِمْ لَهَبٌ مِنْ أَسْفَلَ مِنْهُمْ، فإذا أتاهُمْ ذَلِكَ اللَّهَبُ ضَوْضَوْا. قُلْتُ: مَا هَؤلاءِ؟ قَالا لِي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى نَهَرٍ)) حَسِبْتُ أنَّهُ كَانَ يَقُولُ: ((أَحْمَرُ مِثْلُ الدَّمِ، وَإِذَا فِي النَّهْرِ رَجُلٌ سابحٌ يَسْبَحُ، وَإِذَا عَلَى شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ قَدْ جَمَعَ عِنْدَهُ حِجَارَةً كثيرةً، وَإِذَا ذَلِكَ السَّابِحُ يَسْبَحُ، مَا يَسْبَحُ، ثُمَّ يَأْتِي ذَلِكَ الَّذِي قَدْ جَمَعَ عِنْدَهُ الحِجَارَةَ، فَيَفْغَرُ لَهُ فاهُ، فَيُلْقِمُهُ حَجَراً، فيَنْطَلِقُ فَيَسْبَحُ، ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَيْهِ كُلَّمَا رَجَعَ إِلَيْهِ، فَغَرَ لَهُ فَاهُ، فَأَلْقَمَهُ حَجَراً، قُلْتُ لهما: مَا هذانِ؟ قالا لي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا، فَأَتَيْنَا عَلَى رَجُلٍ كَرِيهِ المرْآةِ، أَوْ كَأَكْرَهِ مَا أنتَ رَاءٍ رجُلاً مَرْأىً، فإذا هُوَ عِنْدَهُ نَارٌ يَحُشُّهَا وَيَسْعَى حَوْلَهَا. قُلْتُ لَهُمَا: مَا هَذَا؟ قالا لي: انْطَلِقِ انْطَلِقْ، فَانْطَلَقْنَا،

فَأَتَيْنَا عَلَى رَوْضَةٍ مُعْتَمَّةٍ فِيهَا مِنْ كُلِّ نَوْرِ الرَّبِيعِ، وَإِذَا بَيْنَ ظَهْرَى الرَّوْضَةِ رَجُلٌ طَوِيلٌ لا أَكَادُ أَرَى رَأْسَهُ طُولاً فِى السَّمَاءِ، وَإِذَا حَوْلَ الرَّجُلِ مِنْ أَكْثَرِ وِلدانٍ رَأَيْتُهُمْ قَطُّ. قُلْتُ: مَا هَذَا؟ وَمَا هؤلاءِ؟ قالا لى: انْطَلِقِ انْطَلِقْ. فَانْطَلَقْنَا. فَأَتَيْنَا إِلَى دَوْحَةٍ عَظِيمَةٍ لَمْ أَرَ دَوْحَةً قَطُّ أَعْظَمَ مِنْهَا، وَلاَ أَحْسَنَ! قالا لى: ارْقَ فِيهَا. فَارْتَقَيْنَا فِيهَا إِلَى مَدِينَةٍ مَبْنِيَّةٍ بِلَبِنٍ ذَهَبٍ وَلَبِنٍ فِضَّةٍ. فَأَتَيْنَا بَابَ الْمَدِينَةِ فَاسْتَفْتَحْنَا، فَفُتِحَ لَنَا فَدَخَلْنَاهَا، فَتَلَقَّانَا رِجالٌ شَطْرٌ مِنْ خَلْقِهِمْ كَأَحْسَنِ مَا أنت راءٍ! وَشَطْرٌ مِنْهُمْ كَأَقْبَحِ مَا أنتَ راءٍ! قالا لَهُمْ: اذْهَبُوا فَقَعُوا فى ذَلِكَ النَّهْرِ، وَإِذَا هُوَ نَهْرٌ مُعْتَرِضٌ يَجْرِى كَأَنَّ ماءهُ الْمَحْضُ فى البَيَاضِ. فَذَهَبُوا فَوَقَعُوا فِيهِ. ثُمَّ رَجَعُوا إِلَيْنَا قَدْ ذَهَبَ ذَلِكَ السُّوءُ عَنْهُمْ، فَصَارُوا فى أَحْسَنِ صُورَةٍ)) قَالَ: ((قالا لِى: هذِهِ جَنَّةُ عَدْنٍ، وهذاك مَنْزِلُكَ، فَسَمَا بَصَرِى صُعُداً. فإذا قَصْرٌ مِثْلُ الرَّبَابَةِ البَيْضاءِ. قالا لى: هذاكَ مَنْزِلكَ؟ قلتُ لهما: بارَكَ اللهُ فيكُما، فذَرانى فأدخُلَه. قالا لى: أَمَّا الآنَ فَلاَ، وأنتَ دَاخِلُهُ. قُلْتُ لَهُمَا: فَإِنِّى رَأَيتُ مُنْذُ اللَّيْلَة عَجَباً؟ فما هَذَا الَّذِى رأيتُ؟ قالا لى: أَمَا إِنَّا سَنُخْبِرُكَ: أَمَّا الرَّجُلُ الأَوَّلُ الَّذِى أَتَيْتَ عَلَيْهِ يُثْلَغُ رَأْسُهُ بِالحَجَرِ، فَإِنَّهُ الرَّجُلُ يَأْخُذُ القُرآنَ فَيَرفُضُهُ، وَيَنَامُ عَنِ الصَّلاةِ الْمَكْتُوبَةِ. وأَمَّا الرَّجُلُ الَّذِى أَتَيْتَ عَلَيْهِ يُشَرْشَرُ شِدْقُهُ إِلَى قَفَاهُ، وَمِنْخَرُهُ إِلَى قَفَاهُ، وَعَيْنُهُ إِلَى قَفَاهُ، فَإِنَّهُ الرَّجُلُ يَغْدُو مِنْ بَيْتِهِ فَيَكْذِبُ الكِذْبَةَ تَبْلُغُ الآفاقَ. وأَمَّا الرِّجَالُ والنِّسَاءُ العُراةُ الَّذِينَ هُمْ فى مِثْلِ بناءِ التَّنُّورِ، فَإِنَّهُمُ الزُّنَاةُ والزَّوانى، وأما الرجلُ الذى أتيتَ عليهِ يَسْبَحُ فى النهرِ، ويلقم الحجارةَ، فإنَّهُ آكلُ الربا، وأَمَّا الرَّجُلُ الكَرِيهُ المرآةِ الَّذِى عِنْدَ النَّارِ يَحُشُّهَا وَيَسْعَى حَوْلَهَا، فَإِنَّهُ مالكٌ خازِنُ جَهَنَّمَ، وأَمَّا الرَّجُلُ الطَّوِيلُ الَّذِى فى الرَّوْضَةِ، فَإِنَّهُ إبراهيم ﷺ، وأَمَّا الوِلدانُ الَّذِينَ حَوْلَهُ، فكلُّ مَوْلُودٍ ماتَ عَلَى الفِطْرَةِ)) وفى رِوايةِ البَرْقَانِيِّ: ((وُلِدَ عَلَى الفِطْرَةِ)) فَقَالَ بعضُ المُسلمينَ: يَا رسولَ اللهِ! وأولادُ المُشركينَ. فقالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((وأولادُ

المشركين، وأما القومُ الذينَ كانُوا شَطْرٌ مِنْهُمْ حَسَنٌ، وشَطْرٌ مِنْهُمْ قَبِيحٌ، فإنَّهُمْ قَومٌ خَلَطُوا عَمَلاً صَالِحاً وآخَرَ سَيِّئاً، تَجاوَزَ اللهُ عنهم)). رواه البخاری.

وفی روايةٍ لَهُ: ((رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ أَتيَانِي فأَخْرَجَانِي إِلَى أَرْضٍ مُقَدَّسَةٍ)) ثُمَّ ذَكَرَهُ وقال: ((فَانْطَلَقْنَا إِلَى نَقْبٍ مثلِ التَّنُّورِ، أَعْلاهُ ضَيِّقٌ وَأَسْفَلُهُ واسِعٌ؛ يَتَوَقَّدُ تَحْتَهُ ناراً، فإذا ارْتَفَعَتِ ارْتَفَعُوا حَتَّى كَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا، وَإِذَا خَمَدَتْ! رَجَعُوا فِيهَا، وفيها رِجالٌ ونِساءٌ عراةٌ)). وفيها: ((حَتَّى أَتَيْنَا عَلَى نَهْرٍ مِنْ دَمٍ)) ولم يشكَّ ((فِيهِ رَجُلٌ قائِمٌ عَلَى وَسَطِ النَّهْرِ وعلى شَطِّ النَّهرِ رجلٌ، وبينَ يديهِ حِجارةٌ، فأقبلَ الرجلُ الذى فى النَّهرِ، فَإِذَا أَرادَ أَنْ يَخْرُجَ رَمَى الرَّجُلُ بِحَجَرٍ فى فِيهِ، فَرَدَّهُ حيثُ كَانَ، فَجَعَلَ كُلَّمَا جَاءَ لِيَخْرُجَ جَعَلَ يَرْمِي فى فِيهِ بِحَجَرٍ، فَيَرْجِعُ كما كَانَ)). وفيها: ((فَصَعِدَا بِي الشَّجَرَةَ، فَأَدْخَلانِي دَاراً لَمْ أَرَ قَطُّ أَحسَنَ مِنْهَا، فيهَا رِجالٌ شُيُوخٌ وَشَبَابٌ)). وفيها: ((الَّذِى رَأَيْتَهُ يُشَقُّ شِدْقُهُ فَكَذَّابٌ، يُحَدِّثُ بِالْكِذْبَةِ فَتُحْمَلُ عَنْهُ حَتَّى تَبْلُغَ الآفَاقَ، فَيُصْنَعُ بِهِ مَا رَأَيْتَ إِلَى يومِ القِيَامَةِ))، وَفِيهَا: ((الَّذِى رَأَيْتَهُ يُشْدَخُ رَأْسُهُ فَرَجُلٌ عَلَّمَهُ اللهُ القُرْآنَ، فَنَامَ عَنْهُ بِاللَّيْلِ، وَلَمْ يَعْمَلْ فِيهِ بالنَّهارِ، فَيُفْعَلُ بِهِ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ، والدَّارُ الأُولَى الَّتى دَخَلْتَ دَارُ عَامَّةِ المُؤمِنِينَ، وأَمَّا هذِهِ الدَّارُ فَدَارُ الشُّهَدَاءِ، وأنا جِبْرِيلُ، وهذا مِيكائيلُ، فَارْفَعْ رَأْسَكَ، فَرَفَعْتُ رَأْسِى، فإذَا فَوْقِي مِثْلُ السَّحابِ، قالا: ذاكَ مَنْزِلُكَ، قُلْتُ: دَعَانِي أَدْخُلْ مَنْزِلى، قالا: إِنَّهُ بَقِيَ لَكَ عُمُرٌ لَمْ تَسْتَكْمِلْهُ، فَلَوِ اسْتَكْمَلْتَهُ أَتَيْتَ مَنْزِلَكَ)). (رواه البخاری)

قَوْله: ((يَثْلَغُ رَأْسَهُ)) هُوَ بالثاءِ المثلثةِ والغينِ المعجمة، أَىْ: يَشْدَخُهُ وَيَشُقُّهُ. قوله: ((يَتَدَهْدَهُ)) أَىْ: يَتَدَحْرَجُ. و((الكَلُّوبُ)) بفتح الكاف وضم اللام المشددة، وَهُوَ معروف. قَوْله: ((فَيُشَرْشِرُ)): أَىْ: يُقَطِّعُ. قَوْله: ((ضَوْضَوا)) وَهُوَ بضادين معجمتين: أَىْ صاحوا. قَوْله: ((

فَيَفْغَرُ)) هُوَ بِالفاء والغين المعجمة، أيْ: يفتح. قَوْله ((الْمَرْآة)) هُوَ بفتح الميم، أيْ: المنظر. قَوْله: ((يَحُشُّها)) هُوَ بفتح الياءِ وضم الحاء المهملة والشين المعجمة، أيْ: يوقِدُها. قَوْله: ((رَوْضَةٍ مُعْتَمَّةٍ)) هُوَ بضم الميم وإسكان العين وفتح التاء وتشديد الميم، أيْ: وافية النَّباتِ طَويلَته. قَوْلُهُ: ((دَوْحَةٌ)) وهِيَ بفتحِ الدال وإسكان الواو وبالحاءِ المهملة: وهِيَ الشَّجَرَةُ الكَبيرةُ. قَوْلُهُ: ((المَحْضُ)) هُوَ بفتح الميم وإسكان الحاء المهملة وبالضَّادِ المعجمة، وَهُوَ: اللَّبَنُ. قَوْلُهُ ((فَسَمَا بَصَرِي)) أيْ: ارْتَفَعَ. وَ((صُعُداً)) بضم الصاد والعين، أيْ: مُرْتَفعاً. وَ((الرَّبَابَةُ)) بفتح الراءِ وبالباءِ الموحدة مكررةً، وهِيَ: السَّحابَةُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سمرہ بن جندب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے صحابہ سے کثرت سے یہ سوال فرماتے تھے کہ تم میں سے کسی نے کوئی خواب دیکھا ہے؟ چناں چہ اللہ تعالیٰ جس کے متعلق چاہتے وہ اپنا خواب حضور اکرم ﷺ کے سامنے پیش کرتا (اور نبی کریم ﷺ اس کی تعبیر بتلاتے۔ روزانہ آپ کا یہی معمول تھا) ایک روز نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز کے بعد اپنا خواب بیان فرمایا (یہ بھی آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ تھی کہ آپ نے خود بھی اگر کوئی خواب دیکھا ہوتا تو فجر کی نماز کے بعد حضور اکرم ﷺ صحابہ کے سامنے اس کو پیش فرماتے تھے۔ عوام میں جو مشہور ہے کہ کسی نے خواب دیکھا ہو تو جب تک کہ سورج نکل نہ جائے اس وقت تک بیان نہ کرے؛ یہ بالکل غلط ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہاں پر دیکھئے! نبی کریم ﷺ فجر کی نماز کے بعد فوراً دریافت فرماتے تھے اس وقت سورج طلوع نہیں ہوا ہوتا تھا۔ بلکہ صبح کا وقت خواب دیکھنے کے زمانہ کے قریب ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ اچھی طرح یاد رہتا ہے۔ اس لیے

جس سے تعبیر لینی ہے اس کے سامنے اسی وقت بیان کر لینا چاہئے اور اگر وہ اس وقت سامنے موجود نہیں ہے اور بعد میں اس سے ملاقات کی توقع ہے تو اسی وقت کم از کم لکھ تو لینا ہی چاہئے، تاکہ خواب کے کچھ اجزاء چھوٹنے نہ پاویں۔ چوں کہ جوں جوں وقت گزرتا ہے آدمی بھولتا جاتا ہے۔ اس لیے کہ عموماً آج کا دیکھا ہوا خواب آج جتنا یاد ہے اسی کو جب کل آپ بیان کریں گے تو اس میں سے تھوڑا بہت تو چھوٹ ہی جائے گا، اس لیے مناسب طریقہ یہی ہے کہ اگر تعبیر معلوم کرنی ہو تو اسی وقت لکھ تو لیا ہی جائے، باقی جب موقع ملے جس سے تعبیر لینی ہو وہ ملے تو اس وقت اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے)۔

پتھر سے سر کچلا جانا

(بہر حال! نبی کریم ﷺ نے ایک صبح کو اپنا خواب صحابہ (رضی اللہ عنہ) کے سامنے بیان کیا) کہ آج رات میرے پاس دو آنے والے آئے (وہ دونوں فرشتے تھے جیسا کہ اخیر میں ایک روایت کے الفاظ پیش کریں گے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام تھے۔ اور ویسے بھی انبیاء کا خواب وحی کے حکم میں ہوتا ہے، نبیِ کریم ﷺ کا خواب بھی وحی ہی ہے اس میں دوسری کوئی بات نہیں ہے۔ خیر!) ان دونوں نے مجھ سے کہا: چلئے! وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے، میں ان کے ساتھ چلا تو ہمارا گزر ایک لیٹے ہوئے آدمی کے پاس سے ہوا، اس کے پاس ایک دوسرا آدمی ایک بڑا پتھر لیے ہوئے کھڑا تھا، اور وہ اس پتھر سے اس کی طرف مارنے کے ارادے سے آگے بڑھتا اور اس کے سر پر مار کر اس کا سر کچل ڈالتا، اور وہ پتھر اس کا

سر کچلنے کے بعد لڑھک کر دور چلا جاتا، چنانچہ وہ کھڑا ہوا آدمی اس پتھر کو لینے کے لئے جاتا، اور جب پتھر لے کر واپس لوٹتا اس درمیان اس کا سر اپنی اصلی حالت پر آجاتا، پھر وہ آکر دوبارہ اس پتھر کو اس کے سر پر پھینکتا تو اس کا سر کچل جاتا، پھر وہ لینے جاتا، یہی سلسلہ جاری رہتا۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ میں نے یہ منظر دیکھ کر ان دونوں آدمیوں سے پوچھا: سبحان اللہ! یہ کیا منظر ہے؟ (میری سمجھ میں نہیں آیا) ان دونوں نے کچھ بتانے کی بجائے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے چل پڑے۔

آنکس سے منھ، ناک، آنکھوں کو چیرا جانا

اب ہمارا گزر ایک اور آدمی کے پاس سے ہوا جو چت لیٹا ہوا تھا اور دوسرا آدمی لوہے کا آنکس (آنکڑا) لیے ہوئے اس کے پاس کھڑا تھا اور لیٹے ہوئے آدمی کے منھ کی ایک بانچھ میں داخل کرکے چیر کر گُدی تک لے آتا (گویا گردن تک کا حصہ چِرا جاتا) پھر اس آنکس کو ناک کے سوراخ میں دائیں طرف داخل کرتا اور کھینچ کر گُدی تک لے آتا، پھر آنکھ کے اندر داخل کرتا یہاں تک کہ اس کو بھی چیر کر پیچھے گدی تک لے جاتا، اس کے بعد دوسری (بائیں) طرف جاتا۔ وہاں بھی منھ میں داخل کرتا اور گدی تک چیر دیتا، پھر (بائیں) نتھنے میں داخل کرتا اس کو بھی گُدی تک چیر دیتا، پھر آنکھ میں داخل کرتا اور اس کو بھی گُدی تک چیر دیتا، ابھی دوسری جانب سے فارغ نہیں ہوتا کہ پہلے والی جانب اصلی حالت پر آجاتی ہے، اور یہی سلسلہ جاری رہتا۔ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں کہ اس منظر کو دیکھ کر میں نے ان

دونوں سے پوچھا: سبحان اللہ! یہ دونوں کون ہیں؟ان دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے چلے۔

تنور میں شور مچاتے ننگے مرد وعورتیں

یہاں تک کہ ہمارا گزر تنور جیسی چیز کے پاس سے ہوا(''تنور'' ایک چولہا ہوتا ہے جس میں روٹی پکتی ہے، کنویں کی طرح ہوتا ہے جس کے اوپر کا منھ تنگ ہوتا ہے اور نیچے اندر چوڑا ہوتا ہے، اس میں آگ جلی ہوئی ہوتی ہے) دور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تنور ہے، لیکن اس میں سے شور کی آوازیں آرہی تھیں، ان آوازوں کو سن کر ہم نے اندر جھانکا تو دیکھا اندر ننگے مرد اور ننگی عورتیں تھیں اور نیچے کی طرف سے آگ کا شعلہ اوپر بلند ہوتا، تو اس کی لپٹ کو اوپر آتا دیکھ کر وہ لوگ شور مچاتے اور چیختے (جیسے کوئی آدمی آگ کی لپٹ کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھے اور اس سے بچنے کا اس کے پاس کوئی علاج نہ ہو، نہ وہاں سے ہٹ سکتا ہو، تو شور مچانے کے علاوہ اور کیا کرے گا؟) میں نے ان دونوں آدمیوں سے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ ان دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے چلے۔

خون کی نہر میں تیرتا ہوا آدمی

پھر ہمارا گزر ایک نہر پر سے ہوا۔ حضرت سمرہ (رضی اللہ عنہ) جو اس روایت کے نقل کرنے والے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: میرا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: وہ نہر ایک دم

لال خون کی طرح تھی، اس نہر میں ایک آدمی تیر رہا تھا اور اس نہر کے کنارے پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جس نے اپنے پاس بہت سارے پتھر جمع کر رکھے تھے، وہ تیرنے والا تیرتے ہوئے جس نے پتھر جمع کر رکھے تھے اس کے پاس پہنچتا تو وہ بیٹھا ہوا آدمی اس کا منھ اپنے ہاتھ سے کھولتا اور اس کے منھ میں ایک پتھر رکھ دیتا۔ پھر وہ واپس چلا جاتا، اور دوبارہ اسی طرح تیرتے ہوئے آتا تو وہ اس کے منھ میں پتھر رکھ دیتا، جب بھی وہ واپس آتا ہے یہ اس کا منھ کھول کر ایک پتھر اس میں رکھ دیتا ہے۔ یہی سلسلہ جاری رہتا۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا: یہ دونوں کون ہیں؟ تو ان دونوں نے مجھ سے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے بڑھے۔

بھیانک شکل والا آدمی

اس کے بعد ہمارا گزر ایک آدمی کے پاس سے ہوا جس کی شکل و صورت ایسی بھیانک تھی جیسی کہ تم بھیانک سے بھیانک آدمی کا تصور کرسکتے ہو۔ اور اس کے پاس آگ تھی جس کو وہ اور زیادہ بھڑکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں سے پوچھا: یہ کون ہے؟ تو انہوں نے کہا: آگے چلئے۔ چناں چہ ہم آگے بڑھے۔

گھنا پھول دار باغ اور بچے

پھر ہم ایک باغ کے پاس پہنچے جو بڑا گھنا اور گنجان تھا، اس میں ہر طرح کے پھول تھے جیسے موسم بہار میں مختلف قسم کے پھول ہوتے ہیں۔ اور اس باغ کے بیچ میں ایک اتنے لمبے آدمی بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کے لمبے پن کی وجہ سے مجھے ان کا سر نظر نہیں آرہا تھا۔ اور ان کے آس پاس بہت سارے ایسے بچے تھے جو کبھی مجھے نظر نہیں پڑے۔ میں نے پوچھا: یہ کون شخص ہیں اور ان کے آس پاس جو بچے ہیں وہ کون ہیں؟ تو ان دونوں نے کہا: آگے چلئے، چناں چہ ہم آگے چل دیے۔

جنتِ عدن

اس کے بعد ہم ایک بڑے درخت کے پاس پہنچے، اتنا بڑا اور اس سے زیادہ خوبصورت درخت میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، ان دونوں نے مجھ سے کہا: اس پر چڑھئے۔ چناں چہ ہم اس پر چڑھے تو ہم ایک ایسی آبادی اور بستی میں پہنچے جس کے مکانات کی ایک اینٹ سونے کی اور ایک اینٹ چاندی کی تھی۔ ہم اس بستی کے دروازے پر آئے اور اس کو کھلوایا تو ہمارے لئے کھولا گیا، چناں چہ ہم اندر داخل ہوگئے۔ تو ہماری ملاقات بہت سارے ایسے آدمیوں سے ہوئی جن کے جسم کا آدھا حصہ تو بڑا ہی بہترین اور ایسا خوبصورت تھا جس کی خوبصورتی آپ تصور کرسکتے ہو۔ اور دوسرا آدھا حصہ ایسا بدصورت تھا جس کی بدصورتی کا آپ تصور کرسکتے ہو۔ تو میرے ساتھ جو دو آدمی تھے انہوں نے ان سب آدمیوں سے ایک

نہر کی طرف اشارہ کر کے کہا: اس میں کود جاؤ۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ وہاں ایک نہر بہہ رہی تھی اور اس کا پانی دودھ کی طرح ایک دم سفید تھا۔ چناں چہ وہ لوگ اس میں کود گئے۔ پھر جب وہاں سے نکل کر ہمارے پاس واپس آئے تو ان کی وہ بد صورتی ختم ہو چکی تھی۔ اور ان کا پورا جسم ایک دم خوبصورت بن چکا تھا اور وہ سب بہترین شکل وصورت میں آچکے تھے۔ ان دونوں نے بتلایا کہ اس وقت ہم جہاں ہیں یہ جنتِ عدن ہے۔

حضور کا گھر

اور اوپر اشارہ کر کے بتلایا کہ وہ آپ کا گھر ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جب ان دونوں نے اوپر اشارہ کیا تو میری نگاہیں آسمان کی طرف اوپر اٹھیں تو میں نے دیکھا کہ سفید بادل جیسا ایک محل ہے،۔ دونوں نے کہا: یہ آپ کا مکان ہے (حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں) میں نے ان سے کہا: اللہ آپ کو برکت دے، مجھے چھوڑیئے تاکہ میں چلا جاؤں۔ انہوں نے کہا: آپ تشریف ضرور لے جائیں گے؛ مگر ابھی نہیں۔

عجیب وغریب مناظر کی تعبیر

پھر میں نے ان سے کہا کہ: میں نے آج رات عجیب وغریب مناظر اور عجیب عجیب چیزیں جو دیکھیں؛ یہ سب کیا ہے؟ ذرا بتاؤ تو سہی۔ تو ان دونوں نے کہا: اب ہم آپ کو بتلاتے ہیں:

غیر عامل حافظِ قرآن

وہ پہلا آدمی جس کے پاس سے آپ گزرے تھے اور جس کا سر پتھر کے ذریعہ سے کچلا جارہا تھا؛وہ وہ آدمی ہے جس نے قرآنِ پاک حفظ کیا، قرآن پاک کے مسائل سے واقف ہے، پھر بھی سویا رہتا ہے اوراور فجر کے لئے نہیں آتا، قرآن پاک کا علم حاصل کیا پھر اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا؛اس کو عالمِ برزخ میں ہمیشہ یہی سزادی جاتی رہے گی۔

جھوٹے پروپیگنڈے کرنے والا

وہ دوسرا جو منظر آپ نے دیکھا تھا کہ ایک آدمی چت لیٹا ہوا ہے اوردوسرے کے ہاتھ میں آنکس(آنکڑا) ہے،اور وہ اس کے منھ کو، نتھنے کواورآنکھ کو دائیں طرف سے چیرتا ہے، پھربائیں طرف جاتا ہے اور اس کو چیرتا ہے اتنی دیر میں دائیں طرف والاٹھیک ہوجاتا ہے؛وہ وہ آدمی ہے جو صبح کے وقت اپنے گھر سے نکلتا ہے اور جھوٹی باتیں لوگوں میں چلاتا ہے اوروہ پھیل جاتی ہیں اس کو عالم برزخ میں قیامت قائم ہونے تک یہی سزادی جاتی رہے گی۔

بس!یہاں اس روایت کو جھوٹ کی برائی بیان کرنے کے لئے لائے ہیں۔

زانی اور زانیہ

اور وہ تنور میں بہت سارے ننگے مرد اور ننگی عورتیں جو دیکھیں، وہ زنا کرنے والے مرد اور زنا کرنے والی عورتیں ہیں؛ ان کو عالم برزخ میں یہی عذاب دیا جاتا رہے گا۔

سود کھانے والا

اور ایک آدمی آپ نے دیکھا تھا جو خون جیسی لال نہر میں تیرتا ہوا کنارے پر آتا تھا اور وہاں ایک آدمی بہت سارے پتھر لیے ہوئے بیٹھا تھا جو اس کا منھ کھول کر اس میں پتھر رکھ دیتا تھا؛ وہ سود کھانے والا ہے؛ اس کو عالم برزخ میں قیامت تک یہی عذاب دیا جاتا رہے گا۔

جہنم کا داروغہ "مالک"

اور وہ ایک بد شکل آدمی جو آپ نے دیکھا تھا جس کے پاس آگ تھی اور وہ اس کو بھڑکا رہا تھا اور اس کے چاروں طرف گھومتا تھا؛ وہ جہنم کا داروغہ "مالک" فرشتہ ہے۔

حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور بچپن میں فوت شدہ بچے

اور باغ میں جو ایک لمبے آدمی دیکھے تھے جن کا سر بھی ان کے لمبے پن کی وجہ سے نظر نہیں آتا تھا وہ حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ اور ان کے پاس جو بہت سارے بچے تھے وہ وہ بچے ہیں جن کی موت فطرت پر واقع ہوئی۔

فطرت کا مطلب

کسی آدمی کے یہاں جب بھی کوئی بچہ ہوتا ہے وہ چاہے مسلمان ہو، غیر مسلم ہو یہودی ہو، نصرانی ہو، مجوسی یا اور کوئی بھی ہو؛ ہر ایک کے گھر جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدائشی طور پر اللہ تعالیٰ نے اس بچے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی توحید اور رسولوں کی رسالت کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھی ہوتی ہے۔ اگر اس کو اپنی اسی حالت پر باقی رکھا جائے اور غلط تربیت کے ذریعہ سے اس کی صلاحیت کو ختم نہ کیا جائے تو وہ مسلمان اور مؤمن ہی باقی رہے گا، لیکن پھر یہ ہوتا ہے کہ اس بچے کی تربیت جس ماحول میں ہوتی ہے اسی ماحول کا اثر دل میں قبول کرلیتا ہے، اب وہ جس چیز کو لے کر آیا تھا وہ باقی نہیں رہتی۔ اگر اس کی غلط تربیت نہ کی جائے، اور وہ جس حالت میں پیدا ہوا ہے اسی کیفیت پر باقی رکھا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی صلاحیت رکھی ہے کہ بڑے ہونے کے بعد خود ہی وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے گا اور اسلام قبول کرے گا۔ چناں چہ جو بچے اسی حالت میں انتقال کر گئے کہ ان کی

اس صلاحیت کو ضائع نہیں کیا گیا تھا، اور ان کی موت بچپن میں آگئی تھی ایسے سب بچے جنت میں حضرت ابراہیمؑ کے پاس ہیں۔

جب آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا، تو صحابہ میں سے کسی نے پوچھا: یارسول اللہ! کافروں کے بچے بھی جو فطرت پر مرے (جنت میں ہوں گے؟) حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مشرکین کی اولاد بھی (جو اپنی فطرت پر انتقال کر گئے؛ جنت میں جائیں گے)۔

گنہگار مومنین

اور وہ باغ جس میں آپ داخل ہوئے تھے اور وہاں بہت سارے مرد نظر آئے تھے، جن کے جسم کا آدھا حصہ خوبصورت اور آدھا بدصورت تھا؛ وہ وہ اہلِ ایمان تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں اچھے اعمال بھی کیے تھے اور برے اعمال بھی کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سے در گزر کا معاملہ کر کے ان کو جنت میں داخل کرے گا۔ اور ان کی بد عملی کی وجہ سے جسم کا آدھا حصہ جو بدصورت تھا، جنت میں جانے کے بعد اس کی بدصورتی دور ہو جائے گی۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔

اسی روایت کی مزید تفصیل

اور بخاری شریف ہی کی دوسری روایت میں یہ ہے:- حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: آج رات میں نے دو آدمیوں کو دیکھا جو میرے پاس آئے، اور مجھے ایک مقدس سرزمین کی طرف لے گئے، پھر آپ ﷺ نے اپنا وہی خواب بیان کیا جو اوپر گزرا، لیکن اس میں آپ نے فرمایا کہ: ہم ایک سرنگ یا غار کے پاس سے گزرے، جو کھائی اور تنور کی طرح تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصہ چوڑا تھا، نیچے آگ جل رہی تھی، جب آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو جو لوگ اندر تھے وہ شعلوں کے ساتھ ساتھ اوپر تک آجاتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی باہر نکل آئیں گے، لیکن وہ نکل نہیں پاتے تھے۔ اور جب وہ شعلہ ٹھنڈا پڑتا اور نیچے ہو جاتا تو وہ پھر اندر بیٹھ جاتے تھے۔ اس میں بہت سارے ننگے مرد اور ننگی عورتیں تھیں۔

اسی راویت میں یہ بھی ہے: پھر ہمارا گزر خون کی ایک نہر پر سے ہوا۔ (اوپر والی روایت میں صرف رنگ بتلایا تھا کہ اس کا رنگ لال خون جیسا تھا، لیکن صاف طور پر یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ خون کی نہر تھی، اور اس روایت میں بلاتردد بتلادیا کہ وہ خون کی نہر تھی) اور نہر کے بیچ میں ایک آدمی کھڑا تھا اور دوسرا آدمی نہر کے کنارے پر تھا، جو نہر کے کنارے پر تھا اس کے پاس پتھر تھے، وہ نہر کے بیچ والا آدمی جب آگے بڑھتا اور باہر نکلنا چاہتا تو یہ پتھر مار کر اس کو واپس اندر ہی ڈھکیل دیتا اور وہ جہاں تھا دوبارہ وہیں پہنچ جاتا۔

اور اس روایت میں یہ بھی ہے کہ: وہ دونوں آدمی مجھے لے کر ایک درخت پر چڑھے، اور مجھے ایک بڑی جگہ میں داخل کیا، جس سے خوبصورت جگہ میں نے پہلے نہیں دیکھی، اس میں بوڑھے بھی تھے، جوان بھی تھے۔

اور اسی روایت میں یہ بھی ہے کہ: وہ جس کی بانچھوں کو چیرا جاتا تھا وہ جھوٹا آدمی ہے جو خوب جھوٹ بولتا تھا، اور وہ جھوٹ دوسرے لوگ اس سے لیتے تھے، یہاں تک وہ دنیا میں پھیل جاتا تھا، اس کو یہ سزا قیامت تک دی جاتی رہے گی۔

اسی روایت میں یہ بھی ہے: وہ جس کا سر پتھر کے ذریعہ سے کچلا جارہا تھا، وہ آدمی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک سکھایا، جس کا تقاضا یہ تھا کہ راتوں کو کھڑا ہو کر نماز کے اندر قرآن پاک کی تلاوت کرتا، اس کے بجائے وہ پڑا سوتا رہا۔ اور دن میں بھی قرآنِ پاک کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا اور شریعت پر عمل نہیں کیا، اس کے ساتھ بھی قیامت تک یہی معاملہ کیا جائے گا۔

اور وہ پہلی جگہ جہاں آپ داخل ہوئے تھے وہ عام مؤمنین کی جنت تھی، اور یہ دوسرا شہداء کا مکان ہے، اور میں جبرئیل اور یہ میکائیل ہیں۔ اور آپ ذرا اپنا سر اٹھایئے۔ تو میں نے سر اٹھایا تو میرے اوپر بہت اونچائی پر ایک بادل کی طرح تھا انہوں نے کہا: وہ آپ کا مکان ہے۔ میں نے کہا: مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے مکان میں داخل ہو جاؤں، تو انہوں

نے کہا: ابھی آپ کی عمر باقی ہے، جو آپ نے پوری نہیں کی ہے، جب آپ اپنی عمر پوری کرلیں گے تو اس میں داخل ہوں گے۔

اس کے بعد علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے روایت کے بہت سارے الفاظ کی تشریح فرمائی ہے۔

باب بیان ما یجوز من الکذب

کن مواقع پر جھوٹ کی اجازت ہے؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ویسے جھوٹ تو حرام ہے لیکن بعض مواقع ایسے ہیں جس میں شریعت کی طرف سے جھوٹ کی اجازت دی گئی ہے۔ اب وہ کون سے مواقع ہیں؟ علامہ نووی نور اللہ مرقدہ اسی کو بتلاتے ہیں:-

إعلَمْ أنَّ الكَذِبَ وإنْ كَانَ أصْلُهُ مُحَرَّماً، فَيَجُوزُ فی بَعْضِ الأحْوَالِ بِشُروطٍ قَدْ أوْضَحْتُهَا فی کتاب: " الأَذْكَارِ " ومُخْتَصَرُ ذَلِكَ: أنَّ الكلامَ وَسيلَةٌ إِلَى المَقَاصِدِ، فَكُلُّ مَقْصُودٍ مَحْمُودٍ يُمْكِنُ تَحْصِيلُهُ بِغَيْرِ الكَذِبِ يَحْرُمُ الكَذِبُ فِيهِ، وإنْ لَمْ يُمْكِنْ تَحْصِيلُهُ إلاَّ بالكَذِبِ، جازَ الكَذِبُ.

ثُمَّ إنْ كَانَ تَحْصِيلُ ذَلِكَ المَقْصُودِ مُبَاحاً كَانَ الكَذِبُ مُبَاحاً، وإنْ كَانَ وَاجِباً، كَانَ الكَذِبُ وَاجِباً. فإذا اخْتَفَى مُسْلِمٌ مِنْ ظَالِمٍ يُرِيدُ قَتْلَهُ، أَوْ أَخذَ مَالِهِ وأخفى مالَه وَسُئِلَ إنْسَانٌ عَنْهُ، وَجَبَ الكَذِبُ بإخْفَائِه.

و کذا لو كَانَ عِندَهُ وديعَةٌ، وأرادَ ظالمٌ أخذها، وجبَ الكذبُ بإخفاءِها. وَالأحْوَطُ فی هَذَا كُلِّهِ أنْ يُوَرِّیَ.

ومعْنَى التَّوْرِيَةِ: أنْ يَقْصِدَ بِعِبَارَتِهِ مَقْصُوداً صَحيحاً لَيْسَ هُوَ كَاذِباً بالنِّسْبَةِ إِلَيهِ، وإنْ كَانَ كَاذِباً فی ظَاهِرِ اللَّفْظِ، وبالنِّسْبَةِ إِلَى مَا يَفْهَمُهُ المُخَاطَبُ. وَلَوْ تَرَكَ التَّوْرِيَةَ وَأطْلَقَ عِبَارَةَ الكَذِبِ، فَلَيْسَ بِحَرَامٍ فی هَذَا الحَالِ.

وَاسْتَدَلَّ الْعُلَمَاءُ بِجَوَازِ الْكَذِبِ فِى هَذَا الْحَالِ بِحَدِيثِ أُمِّ كُلْثُومٍ رضی اللہ عنہا أنہا سمعت رَسُولَ الله صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول: ((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ، فَيَنْمِي خَيْراً أَوْ يَقُولُ خَيْراً)) (متفق عَلَيْهِ)

زاد مسلم فی رواية: قالت أُمُّ كُلْثُومٍ: وَلَمْ أَسْمَعْهُ يُرَخِّصُ فِى شَيْءٍ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ إِلَّا فِى ثَلَاثٍ، تَعْنِى: الْحَرْبَ، وَالإِصْلَاحَ بَيْنَ النَّاسِ، وَحَدِيثَ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ، وَحَدِيثَ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا.

ویسے تو جھوٹ حرام ہے لیکن بعض حالات میں کچھ شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دی گئی ہے جس کو میں نے کتاب الاذکار میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہاں مختصراً بیان کرتا ہوں۔ گفتگو، کلام اور بات یہ تو آدمی کے اپنے مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے، ہر اچھا مقصد جس کو آپ جھوٹ کے بغیر حاصل کر سکتے ہوں، وہاں شریعت نے جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں دی، اور اگر اس کو جھوٹ کے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا؛ تو وہاں گنجائش نکل سکتی ہے۔ اب یہاں علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے جھوٹ کے جواز کی کچھ تفصیل بتائی ہے، لیکن چوں کہ امام نووی نور اللہ مرقدہٗ شافعی المسلک ہیں لہٰذا شافعی مسلک کے اعتبار سے بتلاتے ہیں۔ احناف کے نزدیک جھوٹ کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے، امام ابو حنیفہ نور اللہ مرقدہٗ نے جھوٹ کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دی، یہاں تک کہ اگر کسی آدمی کو جان کا خطرہ ہو اور اس کو یقین ہو کہ اگر میں جھوٹ بولوں گا تب ہی جان بچا سکوں گا، یا اپنے بھائی کی جان بچا سکوں گا؛ تو اس صورت میں بھی اگر توریہ اور تعریض سے کام چل سکتا ہو تو توریہ اور تعریض ہی کرنا چاہیئے، جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے

تعریض کا ایک نمونہ

توریہ اور تعریض کا مطلب یہ ہے کہ ایسی گول مول بات جس کو سنتے ہی سننے والے کے ذہن میں اس کا ایک ظاہری مطلب آجاتا ہے، مگر آپ وہ ظاہری مطلب مراد نہیں لیتے بلکہ آپ اس کا دور کا کوئی مطلب مراد لیتے ہیں۔

جیسا کہ سیرت کی کتابوں میں ایک قصہ آتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ سفر ہجرت میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوئے تو آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) بھی تھے، اُن حضرات کے روانہ ہوچکنے کے بعد مکہ والوں نے ان کو تلاش کیا، یہ حضرات مکہ مکرمہ سے نکلنے کے بعد غار ثور ہی میں ٹھہر گئے تھے جو مکہ مکرمہ کے بالکل قریب ہی ہے، کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ جب مکہ والوں کو پتہ چلے گا کہ یہ حضرات روانہ ہوگئے ہیں تو وہ ضرور تلاش کریں گے، لہٰذا پکڑے نہ جائیں اس لیے تین روز تک غار ثور میں پناہ لی تاکہ جب تلاش و جستجو کا سلسلہ ختم ہو جائے اور لوگ مایوس ہو جائیں اس کے بعد اپنا سفر شروع کیا جائے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا، تین روز کے بعد پھر سفر شروع کیا لیکن چوں کہ مکہ والوں نے نبی کریم ﷺ کے متعلق اعلان کیا تھا کہ جو ان کو زندہ یا مردہ گرفتار کرکے لائے گا اس کو ایک سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ یہ بہت بڑا انعام تھا جیسے: آج کل لاکھوں ڈالروں کے انعام کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس انعام کے لالچ میں بعض لوگ تلاش میں

نکلے تھے، ایک آدمی ان حضرات کو راستے میں مل گیا جو حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو پہچانتا تھا لیکن نبی کریم ﷺ کو نہیں پہچانتا تھا۔ جب اس نے حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا کہ ان کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہیں تو اس نے پوچھا: یہ کون ہیں؟ اب اگر حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) بتادیتے کہ حضور اکرم ﷺ ہیں تو بات کھل جانے کا اندیشہ تھا، اوراس کے نتیجہ میں آپ ﷺ کی جان کو خطرہ تھا، اور اگر کچھ اور کہتے تو جھوٹ ہو جاتا۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں کہا: ”هٰذَا رَجُلٌ يَهْدِيْنِي الطَّرِيْقَ“ یہ آدمی مجھے راستہ بتلاتا ہے۔ اور چوں کہ عام طور پر عرب میں جب کسی آدمی کو لمبا سفر کرنا ہوتا تو راستہ بتلانے والے کو بھی ساتھ لے جاتا تھا۔ اب سننے والا تو یہی سمجھا کہ یہ رہبر (Guide) ہے، اور حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کا اشارہ اس طرف تھا کہ یہ آدمی مجھے جنت کا اور اللہ کی طرف جانے کا اور آخرت کا راستہ بتلاتا ہے۔ گویا دونوں باتیں ہو گئیں؛ اسی کو توریہ اور تعریض کہتے ہیں۔

حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کا توریہ

۱۸۵۷ء میں جب جنگِ آزادی چل رہی تھی اور ہمارے اکابر کا شاملی کے میدان میں انگریزوں کے ساتھ مقابلہ ہوا تو ان کے خلاف وارنٹ جاری کیے گئے، حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہ کے متعلق بھی شکایتیں پہنچیں کہ ان کے پاس ہتھیار ہیں، لہٰذا ان کو بھی گرفتار کرکے

میرٹھ لے گئے، اور جن کے متعلق بھی ان کو شکایت پہنچتی تو فوراً اسی جگہ پر مجسٹریٹ کی مجلس قائم کی جاتی اور فیصلہ کر کے پھانسی پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ جب حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کو گرفتار کر کے لے گئے اور حضرت سے پوچھا: کیا آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ اس وقت حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی اس کو بتلاتے ہوئے فرمایا: ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ہتھیار نہیں ہیں، بلکہ کہا کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ اتنے میں ایک دیہاتی آیا اور دیکھا کہ ان لوگوں نے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کو پکڑ رکھا ہے تو اس نے کہا: اس کو کہاں پکڑا ہے؛ یہ تو ہماری مسجد کا موذن ہے، یہ سن کر ان لوگوں نے حضرت کو چھوڑ دیا۔

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کا توریہ

حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کے خلاف بھی وارنٹ جاری ہوا تھا، حضرت چھتہ مسجد میں رہتے تھے، لہٰذا سرکاری آدمی وارنٹ لے کر حضرت کو گرفتار کرنے کے لئے جب پہنچے تو دیکھا ایک آدمی وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اب چوں کہ حضرت نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ اپنے زمانے کے بڑے زبردست عالم تھے، اس لیے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ اتنا مشہور اور بڑا آدمی ہے تو جبہ ودستار، شیروانی اور عمامہ پہنے ہوئے ہوگا، حالاں کہ حضرت تو بہت سادہ رہتے تھے، نیلی لنگی اور گاڑھے کا کرتہ ہوتا تھا۔ خیر! ان لوگوں نے حضرت ہی سے پوچھا کہ: مولانا

قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ کہاں ہیں؟ حضرت جہاں تھے وہاں سے کچھ ہٹ گئے اور فرمایا: تھوڑی دیر پہلے یہیں تھے۔ وہ یوں سمجھے کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں ہوں گے اب یہاں نہیں ہیں کہیں اور چلے گئے۔ اس کے بعد حضرت وہاں سے نکل گئے۔ اسی کو تعریض وتوریہ کہتے ہیں اور اس کی اجازت ہے۔

جان بچانے کے لیے جھوٹ کی اجازت

ویسے علماء نے لکھا ہے کہ اگر تعریض اور توریہ ممکن نہ ہو اور جان کا خطرہ ہے، یانا قابلِ برداشت ظلم کا اندیشہ ہے؛ تو اس صورت میں احناف کے یہاں بھی جھوٹ کی اجازت دی گئی ہے۔ جیسے: ایک آدمی کے دشمن اس کی جان کے درپے ہیں، اور وہ آپ سے پوچھیں کہ فلاں آدمی کہاں ہے؟ اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے، لیکن آپ کو یقین ہے کہ اگر میں بتادوں گا تو یہ لوگ بلاوجہ اس کی جان لے لیں گے؛ تو اس صورت میں اگر توریہ نہ کرسکتے ہو تو جھوٹ بول کر بھی اس کی جان بچانے کی اجازت ہے؛ اگرچہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ توریہ یعنی گول مول بات کردی جائے۔

تین چیزوں میں جھوٹ کی اجازت

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی روایت پیش کی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:
جو آدمی لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے خلافِ واقعہ بات بولتا ہے؛ تو وہ جھوٹا نہیں ہے۔

مثلاً: دو مسلمان بھائیوں میں یا سگے بھائیوں میں لڑائی ہے، اور آپ ان دونوں میں صلح کرانا چاہتے ہیں، اس لیے آپ ایک سے دوسرے کے متعلق یوں کہیں کہ میں نے خود سنا کہ وہ تو آپ کے لیے دعا کر رہا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ عام طور پر ہر آدمی تمام مسلمانوں کے لئے عمومی دعا کرتا ہی ہے، اور آپ کی مراد بھی یہی ہے کہ عام مسلمانوں میں یہ بھی ہے، اس اعتبار سے یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ آپ کے لیے دعا کر رہا تھا۔ اگرچہ سننے والا سمجھے کہ میرا نام لے کر کوئی مخصوص دعا کر رہا تھا۔ تو اب اس کے دل میں جو میل ہے وہ نکل جائے گا کہ میرا مخالف ہو کر میرے لیے دعا کا اہتمام کرتا ہے، اور یہی چیز آئندہ صلح کے لئے پلیٹ فارم تیار کر دے گی اور آسانی سے صلح ہو جائے گی۔

مسلم شریف کی روایت میں یہ زیادتی ہے، حضرت ام کلثوم (رضی اللہ عنہ) فرماتی ہیں: میں نے حضور اکرم ﷺ کو کبھی جھوٹ کی اجازت دیتے ہوئے نہیں سنا، مگر تین چیزوں میں؛ جنگ کے موقعہ پر دشمن کے مقابلے میں۔ اور لوگوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے۔ اور شوہر اپنی بیوی کو خوش کرنے کے لئے، یا بیوی اپنے شوہر کو خوش کرنے کے لئے۔ (لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو، یا کوئی واجب حق ساقط نہ کرنا پڑتا ہو؛ تب ہی گنجائش دی گئی ہے)۔

باب الحث علی الثبت فیما یقوله ویحکیه

زبان کی حفاظت اور زبان سے جو جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اسی سلسلے کا بیان چل رہا تھا ، آج عنوان قائم کیا ہے: ''آدمی جو بھی بات کہے، یا نقل کرے اس میں پختگی کا اہتمام کرنے کی ترغیب''۔ شریعت نے اسی کی تاکید فرمائی ہے۔ اور جیسا کہ علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ کا معمول ہے شروع میں قرآنِ پاک کی آیتیں پیش کرتے ہیں، یہاں جو آیتیں پیش کی ہیں وہ پہلے بھی کئی ابواب میں آچکی ہیں۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ . (الاسرأ:۳۶) جس چیز کا آپ کو علم نہ ہو اس کے درپے نہ ہوؤ۔

''مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ.(ق:۱۸) ''جو بات بھی آدمی اپنی زبان سے نکالتا ہے؛ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اوپر ایک محافظ نگراں مقرر ہے جو بالکل چوکس ہے، گویا اس کی ہر چیز نوٹ اور ریکارڈ کی جارہی ہے۔

جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے

حدیث ۱۵۴۷:-

وعن ابی هریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان النبی ﷺ قال : كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِباً أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))۔(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے کہ جو چیز بھی سنے اس کو نقل کر دے۔

افادات:- صبح سے شام تک ہمارے کانوں میں بے شمار باتیں پڑتی ہیں اور کان میں پڑنے والی ساری ہی باتیں سچی نہیں ہوا کرتیں، ان میں کچھ باتیں سچی بھی ہوتی ہیں اور کچھ جھوٹی ہوتی ہیں۔ کچھ باتیں ایسی گھڑی ہوئی ہوتی ہیں جن میں جھوٹ کی ملاوٹ ہوتی ہے، لہٰذا کوئی آدمی اگر ایسی عادت ڈال لے کہ جو بھی سنے اس کو لوگوں کے سامنے بیان کر دے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ خود بھی اس جھوٹ کو پھیلانے میں مدد کر رہا ہے۔ جو احتیاط برتنی چاہئے تھی اور جس حزم و احتیاط اور پختگی سے کام لینا چاہئے تھا؛ وہ اس نے نہیں لیا۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ جو آدمی اپنی سنی ہوئی ہر چیز لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہو؛ یہی اس کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے آدمی کے لئے ضروری ہے کہ جو باتیں بھی سنے، پہلے ان کی تحقیق کرے اور جب تک کسی بات کے متعلق سچائی کا یقین نہ ہو جائے، تب تک بیان نہ کرے۔ اور اس میں بھی پھر یہ حکم ہے کہ سچائی کا یقین ہونے کے بعد اگر اس کا بیان کرنا کسی ضرورت یا مصلحت پر مبنی ہو تب تو ٹھیک ہے، اس کو کسی کے سامنے نقل کرے۔ اور اگر کوئی بات چاہے سچی ہو لیکن اگر اس کو نقل کرنے میں غیبت

کا ارتکاب ہو رہا ہو، یا چغل خوری پائی جاتی ہو؛ تو اس صورت میں بھی اس سے بچنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ چغل خوری اور غیبت میں بھی آدمی سچی بات ہی نقل کرتا ہے۔

بہر حال! پہلا مرحلہ یہ ہے کہ جو بھی چیز سنے اس کو نقل کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ اس سلسلے میں پوری احتیاط پر عمل کرتے ہوئے تحقیق ہونی چاہیے، اور تحقیق ہونے کے بعد جس بات کی صداقت اور سچائی کا یقین ہو جائے تو پھر اس کے بیان کی بھی شریعت کی جانب سے اجازت ہونی چاہیے، یا کسی مصلحت کی بناء پر اس کا بیان کرنا ضروری ہو؛ تب ہی اس کو بیان کرے، ورنہ پھر اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی اگر کوئی آدمی ایسا ہے جس نے اپنی عادت ہی ایسی بنالی ہے کہ جو بھی سنتا ہے اس کو لوگوں کے سامنے نقل کر دیتا ہے؛ تو یہی اس کے جھوٹا ہونے کے لئے کافی ہے۔

جھوٹوں میں سے ایک

حدیث ۱۵۴۸:-

وعن سَمُرَةَ - رضی الله عنه - قَالَ : قَالَ رَسُولُ الله ﷺ : ((مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يَرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الكَاذِبَيْنَ.)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت سمرہ بن جندب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی میری طرف سے کوئی ایسی بات نقل کرے کہ جس کے متعلق وہ خود بھی جانتا ہو کہ جھوٹ ہے؛ تو وہ دو جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

افادات:- بعض روایتوں میں ''أَحَدُ الکَاذِبِیْنَ'' آیا ہے کہ، جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا ہے، ویسے بھی کوئی جھوٹ بات نقل کرنا کبیرہ گناہ ہے اور خود نبی کریم ﷺ کی طرف نسبت کرتے ہوئے کسی جھوٹ بات کو پھیلانے کا گناہ تو اور زیادہ ہے۔ بلکہ بعض حضراتِ علماء نے تو ایسے آدمی کے اوپر کفر تک کا فتویٰ لگایا ہے ۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ کے ارشادات کو نقل کرنے کے معاملے میں بھی بہت احتیاط کی ضرورت ہے، جب تک کسی روایت کا صحیح سندوں سے ثبوت نہ ہو، یا کسی معتبر اور قابل وثوق کتاب میں اس کا تذکرہ نہ ہو؛ وہاں تک حضور ﷺ کی طرف نسبت کرکے بیان نہیں کیا جائے گا۔ ہمارے پاس دارالافتاء میں تو کثرت سے ایسے سوالات آتے ہیں کہ فلاں مقرر صاحب نے تقریر کی، اس میں انہوں نے کہا کہ حدیث میں یوں آیا ہے، حالاں کہ وہ چیز حدیث میں نہیں ہوتی۔ لہٰذا حدیث کے نام سے اور حضور اکرم ﷺ کے حوالے سے اور آپ کے نام سے کسی چیز کو بیان کرنا بہت بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔

حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہ) کی احتیاط

حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) جو نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے صحبت یافتہ تھے، اور حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی باتیں اور آپ کے ارشادات براہِ راست اپنے کانوں سے سننے والے تھے، اس کے باوجود اس کے نقل کرنے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لیتے تھے۔

حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ (رضی اللہ عنہ) ان کے والد کی پھوپھی ہوتی ہیں۔ ان کی اہلیہ حضرت اسماء (رضی اللہ عنہ) ام المؤمنین حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہ) کی بہن ہوتی ہیں، اس اعتبار سے وہ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ہم زلف (સાઢુભાઈ) بھی ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ کئی رشتہ داریاں ہیں، اور وہ عشرۂ مبشرہ میں سے بھی ہیں۔ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے: ”لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ وَحَوَارِيَّ الزُّبَيْرُ“ ہر نبی کا ایک خصوصی معاون و مددگار ہوا کرتا ہے، اور میرے خصوصی مددگار حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ اور حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے جن دو صحابی کے متعلق یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا: ”فِدَاكَ أَبِيْ وَأُمِّيْ“ میرے ماں باپ تم پر قربان۔ ان میں ایک یہی حضرت زبیر ہیں، اور دوسرے حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ بہر حال! یہ بہت سارے فضائل کے حامل تھے، اس کے باوجود حدیث بیان کرنے کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) جو صحابی ہیں انہوں نے ایک مرتبہ اپنے ابا حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا کہ: فلاں فلاں (دو آدمیوں کے نام لیے) نبی کریم ﷺ کے حوالے سے کثرت سے باتیں بیان کرتے ہیں، لیکن میں نے آپ کو نہیں دیکھا کہ کبھی بھی آپ حضور ﷺ کے حوالے سے اور حضور ﷺ کا نام لے کوئی بات بیان کرتے ہوں؛ ایسا کیوں؟ اس کے جواب میں حضرت زبیر (رضی اللہ عنہ) نے ارشاد فرمایا: مجھے حضور اکرم ﷺ سے جو قرب اور نزدیکی تھی وہ تمہیں معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ (رضی اللہ عنہ) میری والدہ ہیں، اور ام المؤمنین حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہ) میرے ابا کی پھوپھی ہیں، اور میں نے حضور اکرم ﷺ کی بڑی صحبت اٹھائی ہے، لیکن چوں کہ میں نے حضور اکرم ﷺ کا یہ ارشاد سنا ہے: "مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ" جو آدمی میرے اوپر قصداً جھوٹ باندھے؛ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ اس ارشاد کی وجہ سے میں بہت زیادہ احتیاط کرتا ہوں۔

بہت سارے صحابہ کا معمول یہی تھا کہ حضور اکرم ﷺ سے سنے ہوئے ارشادات کو نقل کرنے کے بعد بھی وہ یوں نہیں کہتے تھے کہ یہ حضور کا ارشاد ہے۔ بعض حضرات نقل کرنے کے بعد احتیاط کے طور پر یوں کہا کرتے تھے کہ: اسی جیسا، یا اس سے ملتا جلتا، یا اس کے قریب قریب ارشاد فرمایا، حالاں کہ جو الفاظ نبی کریم ﷺ کی مبارک زبان سے سنے ہوتے وہ انہیں کو نقل کرتے تھے، اس کے باوجود بھی بعد میں یوں کہا کرتے تھے، تاکہ اگر

نقل کرنے میں ذرا انیس بیس فرق ہو بھی جائے تو اس تعبیر کے اندر آجائے۔ یہ بہت اہم چیز ہے۔

روایت بالمعنیٰ کی اجازت ہے یا نہیں؟

یہاں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کے ارشاد کو بجائے آپ کے الفاظ میں نقل کرنے کے اس کا مفہوم نقل کرنا۔ جس کو روایت بالمعنیٰ کہتے ہیں۔ اس کی اجازت ہے یا نہیں؟ بعض حضراتِ محدثین تو اس سے بالکل ہی منع کرتے ہیں کہ اس کی اجازت ہی نہیں ہے۔ یعنی حضور اکرم ﷺ کے وہی الفاظ جو نبی کریم ﷺ نے اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمائے تھے اگر آپ کو یاد ہیں؛ تب تو اس کو نقل کیجیے، اس صورت میں اگر آپ اس کا مفہوم و مطلب اپنی زبان اور الفاظ میں بیان کریں گے؛ تو اس کی اجازت نہیں ہے۔

لیکن جمہور علماء نے روایت بال معنیٰ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ اس حدیث کو پوری طرح سمجھ کر نقل کرے، تاکہ جو مفہوم نقل کرے اس کے مطلب میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ معلوم ہوا کہ مفہوم نقل کرنے کے اندر بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی جو چیز سنتا ہے اس کے سمجھنے میں اس سے غلطی ہو جاتی ہے، جیسے میں ایک بات کہہ رہا ہوں جس کو آپ اپنے کانوں سے سن رہے ہیں، لیکن میں اپنی بات کا جو مطلب لینا چاہتا ہوں آپ وہ مطلب نہیں سمجھے، بلکہ اس کے

بجائے کوئی دوسرا مطلب سمجھے۔ اب وہ دوسرا مطلب جو آپ سمجھے ہیں اس کو آپ اپنے الفاظ میں بیان کریں گے کہ فلاں صاحب نے یوں کہا؛ تو ظاہر ہے کہ میں نے تو وہ نہیں کہا تھا جو آپ بیان کررہے ہیں، لیکن آپ اس بات کو یہی سمجھ کر نقل کررہے ہیں کہ میں نے جو بات کہی ہے اس کا مطلب اور مفہوم یہی ہے، حالاں کہ میرے کہنے کا وہ مفہوم تھا ہی نہیں، میری بات کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے غلطی ہوئی۔ اب آپ جب اس بات کو میرے نام سے بیان کریں گے تو میری طرف جھوٹی نسبت ہو جائے گی۔ اسی طرح کوئی آدمی حضور اکرم ﷺ کے ارشادات کو اگر مفہوم کی شکل میں پیش کرنا چاہتا ہو تو وہاں پر بھی ضروری ہے کہ اس کو وہ صحیح طور پر سمجھے، اور اپنے الفاظ میں اس کو صحیح طور سے ادا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، یعنی اس کو مفہوم کی تعبیر کی اتنی صلاحیت ہو کہ حضور اکرم ﷺ کی بات اور آپ کے ارشادات کے مضمون کو کماحقہٗ صحیح طریقے سے ادا کرسکے؛ تب تو اس کو مفہوم کے انداز میں حدیث پیش کرنے کی اجازت دی گئی ہے؛ ورنہ نہیں۔

حدیث بیان کرنے میں بے احتیاطیاں

آج کل لوگ احادیث کو نقل کرنے کے معاملہ میں بڑی بے احتیاطیاں کرتے ہیں، اور پھر مشکل یہ ہے کہ اگر اس سلسلے میں ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے بیان میں فلاں بات کہی؛ ذرا بتلا دیجئے؟ کسی کتاب کا حوالے دے دیجئے؟ تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ وہ تو میں نے

کسی سے سنی ہے۔ لوگ ہمارے پاس دارالافتاء میں سوالات بھیجتے ہیں کہ ایک صاحب نے اپنی تقریر میں یوں کہا؛ آپ اس کا حوالہ دیجئے۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تحقیق میں کئی کئی دن نکل جاتے ہیں، لیکن تلاشِ بسیار کے بعد بھی جب کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ تو ہم لکھتے ہیں کہ جنہوں نے یہ بیان کیا ہے انہی سے حوالہ پوچھ لیجئے، اور پھر ہمارے پاس بھی بھیج دیجئے، تا کہ تحقیق کر کے آپ کو بتلائیں کہ جو حوالہ انہوں نے دیا ہے؛ وہ درست ہے یا نہیں؟ تو جواب آتا ہے کہ جنہوں نے یہ بات کہی ہے جب ہم ان سے حوالہ مانگتے ہیں تو وہ صاحب سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی اس بات کی اجازت نہیں دی گئی ہے کہ بغیر حوالے کے حضور ﷺ کی طرف کوئی بھی چیز منسوب کرے۔

آج کل کے وضاعین

لہٰذا جو لوگ تقریروں میں بے احتیاطیاں کرتے ہیں؛ درحقیقت وہ اپنے آپ کو اس وعید کا مستحق بناتے ہیں، اس لیے ایسی باتوں سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ آپ نے کسی بڑے سے بڑے عالم سے کوئی بات سن لی ہو تب بھی اگر آپ کو حوالہ معلوم نہیں ہے، تو اس صورت میں آپ ایک دینی بات کے نام سے اس کو پیش کر سکتے ہیں، لیکن حضور اکرم ﷺ کے حوالے سے اس کو بیان نہ کیا جائے۔ اب کمال تو یہ ہے کہ کسی سے پوچھا جائے کہ آپ نے کس سے سنا؟ تو وہ ان کا نام لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے، اس کی وجہ یہ

ہے کہ در حقیقت وہ گھڑی ہوئی بات ہی ہوتی ہے۔ پہلے زمانے میں جیسے وضاعینِ حدیث تھے کہ حدیثیں گھڑ گھڑ کر بیان کیا کرتے تھے، ویسے ہی آج کل بھی حدیث گھڑ کر پیش کرنے والوں کا مستقل ایک سلسلہ چل پڑا ہے۔ اس سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہ بڑی نادانی اور جہالت کی بات ہے۔

حضور اکرم ﷺ کی طرف نسبت کر کے کسی چیز کو بیان کرنا کتنا اہم ہے وہ ان کو معلوم ہی نہیں۔ اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح بیان کر کے میں ثواب کما رہا ہوں، حالاں کہ اس طرح کر کے وہ حضور کی وعید اور ارشاد کے مطابق اپنے آپ کو جہنم کا حقدار بنا رہا ہے:-

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے
حاصلِ خواجہ بجز پندار نیست

جیسا معاملہ ہے۔ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نیکی کر رہا ہوں، حالاں کہ وہ نیکی ہے ہی نہیں، صرف اس کی سمجھ ہے۔

بہر حال! امام نووی نور اللہ مرقدہٗ نے یہ باب اسی لئے قائم کیا ہے کہ جو بات بھی آپ سنیں اس کو نقل کرنے کے معاملہ میں بہت زیادہ احتیاط اور پختگی کی ضرورت ہے، جب تک کسی حدیث کے متعلق پوری تحقیق نہ ہو جائے وہاں تک تو اس کو بیان نہ کیا جائے۔ حضراتِ محدثین تو اتنی زیادہ احتیاط برتتے ہیں کہ کسی حدیث کی سند اگر کمزور اور ضعیف ہو اور اس کو

آپ بیان کریں تو یوں کہہ کر بیان کرنے کی اجازت ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، ورنہ اس کی اجازت نہیں ہے۔

جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والا

حدیث ۱۵۴۹:-

وعن أسماء رَضِيَ اللهُ عنها: أنَّ امرأةً قالت: يَا رسولَ الله، إنَّ لِي ضَرَّةً فهل عَلَيَّ جُنَاحٌ إنْ تَشَبَّعْتُ مِنْ زَوْجِي غَيْرَ الَّذِي يُعْطِينِي؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((الْمُتَشَبِّعُ بِما لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ)). (متفق عَلَيْهِ)

((الْمُتَشَبِّعُ)): هُوَ الَّذِي يُظْهِرُ الشَّبَعَ وَلَيْسَ بِشَبْعَان. ومعناهُ هُنَا: أنْ يُظْهِرَ أنَّهُ حَصَلَ لَهُ فَضيلَةٌ وَلَيْسَتْ حَاصِلَةً.

((وَلابِسُ ثَوْبَيْ زُورٍ)) أيْ: ذِي زُورٍ، وَهُوَ الَّذِي يُزَوِّرُ عَلَى النَّاسِ، بِأنْ يَتَزَيَّى بِزِيِّ أهْلِ الزُّهْدِ أَو العِلْمِ أَو الثَّرْوَةِ، لِيَغْتَرَّ بِهِ النَّاسُ وَلَيْسَ هُوَ بِتِلْكَ الصِّفَةِ. وَقيلَ غَيرُ ذَلِكَ. والله أعْلَمُ.

ترجمہ:- حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک عورت نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میری ایک سوکن ہے؛ تو کیا میرے اوپر اس بات میں کوئی گناہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی طرف سے کسی ایسی چیز کے ملنے کا اظہار کروں جو مجھے اس کی طرف سے نہیں دی گئی ہے؟ نبی کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: جس کو کوئی چیز کسی کی طرف سے نہ دی گئی ہو اور وہ یہ ظاہر کرے کہ یہ چیز مجھے فلاں کی طرف سے ملی ہے؛ تو وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے (یعنی جھوٹا ہے)

افادات:-"ضَرَّةٌ"یعنی سوکن۔"ضَرَّ،یَضُرُّ" کے معنیٰ نقصان پہنچانا۔ چوں کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے ہی کی فکر میں لگی رہتی ہیں؛ اس لیے اس کو عربی زبان میں "ضَرَّةٌ" کہتے ہیں۔

مثلاً: اس نے کوئی سوٹ پہنا ہوا ہے جو وہ اپنے باپ کے گھر سے لائی ہے، لیکن اپنی سوکن کو کہتی ہے کہ یہ سوٹ ہمارے میاں صاحب نے ہم کو خرید کر دیا ہے۔ یا بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی زیور اس کو میکے سے ملا ہے، لیکن وہ اپنی سوکن کے سامنے یوں ظاہر کرتی ہے کہ یہ زیور مجھے سسرال والوں نے، یا شوہر نے بنا کر دیا ہے۔ اور ایسا اس لیے کہتی ہے تاکہ وہ یوں سمجھے کہ اس کو لا کر دیا اور مجھے نہیں دیا! اور اس کی وجہ سے وہ جل بھن کر تکلیف میں پڑ جائے اور پریشان ہو۔

"جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے" مطلب یہ کہ آدمی عام طور پر دو ہی کپڑے پہنتا ہے: کرتہ یا قمیص اور پائجامہ یا لنگی، اور دو کپڑوں ہی سے آدمی کا پورا بدن ڈھنپا ہوا ہوتا ہے۔ تو گویا ایسا کہنے والا سر سے لے کر پاؤں تک جھوٹ میں ڈھنپا ہوا اور ڈوبا ہوا ہے۔

جو وصف اپنے اندر نہ ہو؛ اس کی بناوٹ نہ کرے

"المُتَشَبِّعُ" عربی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب یہ ہے ایک آدمی کا پیٹ بھرا ہوا نہیں ہے، اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو شکم سیر ظاہر کر رہا ہے۔ یعنی مونچھ پر تیل لگا کر آیا اور

کہتا کہ ابھی بریانی کھا کر آرہا ہوں، حالاں کہ گھر میں فاقے ہو رہے ہیں اور پیٹ کے اندر تو چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ کسی کو مادّی چیزوں میں سے یا معنوی چیزوں میں سے کوئی چیز ملی نہیں ہے، کوئی وصف اور کمال وخوبی اس کے اندر نہیں ہے لیکن وہ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرتا ہے کہ میرے اندر یہ خوبی وکمال اور وصف ہے، مثلاً: کوئی آدمی صوفی اور زاہد نہیں ہے، پھر بھی صوفیوں اور زاہدوں جیسا لباس پہن کر لوگوں کو گویا یہ جتلانا چاہتا ہے کہ میں زاہد اور صوفی ہوں۔ یا کوئی آدمی عالم نہیں ہے لیکن علماء جیسا لباس پہن کر لوگوں میں چلتا ہے، گویا اپنے لباس سے یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میں بھی صاحبِ علم ہوں۔ یہ سب اسی وعید کا مصداق ہیں۔

پہلے زمانہ میں عمامہ پہننے کا عمومی رواج تھا لیکن الگ الگ طبقہ کے لیے الگ الگ رنگ ہوا کرتے تھے، مثلاً: علماء فلاں رنگ کا عمامہ ہی پہنتے تھے، اور عوام فلاں رنگ کا عمامہ ہی پہنتے تھے، تو جس رنگ کا عمامہ اہلِ علم پہنتے، اسی رنگ کا عمامہ اگر کوئی عام آدمی -جو اہل علم میں سے نہیں- پہن لے؛ تو اس کو فتاویٰ عالمگیری میں منع لکھا ہے۔ اس لیے کہ گویا وہ اس رنگ کا عمامہ پہن کر اپنے آپ کو عالم ظاہر کر رہا ہے اور حقیقت میں وہ عالم نہیں ہے۔

جیسے کوئی آدمی فوجیوں جیسا لباس پہن کر آئے حالاں کہ وہ فوجی نہیں؛ تو حکومت کی نگاہ میں ایسا آدمی مجرم شمار ہوگا یا نہیں؟ اسی طرح کوئی آدمی پولس جیسی وردی پہن کر آئے، حالاں کہ وہ پولس کا آدمی نہیں ہے؛ تو اس کو دھوکہ دہی میں شمار کیا جاتا ہے، اگرچہ وہ زبان

سے نہیں کہتا کہ میں پولس مین ہوں۔ اس لیے کہ گویا اس وردی کو پہن کر وہ لوگوں کے سامنے یوں ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ میں پولس کا آدمی ہوں اور پولس کے آدمی جو انداز اختیار کرتے ہیں وہی انداز اختیار کرکے لوگوں کو دھوکہ دے رہا ہے۔ اسی طرح کوئی آدمی مولوی نہیں ہے لیکن اپنے نام کے ساتھ مولانا لکھتا ہے۔ کوئی آدمی پروفیسر نہیں ہے، لیکن اپنے نام کے ساتھ پروفیسر لکھتا ہے۔ کوئی آدمی سید نہیں ہے لیکن اپنے نام کے ساتھ سید لکھتا ہے۔

ایک وضاحت

یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جن کی ماں سادات میں سے ہوتی ہے، لیکن باپ سادات میں سے نہیں ہوتا؛ تو ایسے لوگ سید نہیں کہلائیں گے، اس لیے کہ نسب تو باپ کی طرف سے چلتا ہے۔ ہاں ! جس کا باپ سادات میں سے ہو، چاہے ماں سادات میں سے نہ ہو؛ تو وہ سید کہلائے گا۔ اب بعض لوگ اس بنیاد پر اپنے آپ کو سید لکھتے ہیں کہ ماں سادات میں سے ہوتی ہے؛ تو یہ دُرست نہیں ہے۔

یا کوئی آدمی امراء جیسا لباس پہنتا ہے، گویا اپنے لباس سے یوں ظاہر کرتا ہے کہ میں بھی اہلِ ثروت کے طبقے سے تعلق رکھتا ہوں، حالاں کہ اس طبقہ میں سے نہیں ہے؛ تو یہ بھی دھوکہ ہے۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ جھوٹ صرف زبان سے ہی نہیں بولا جاتا، بلکہ اپنے عمل، اپنے لباس اور اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ سے بھی بولا جاتا ہے جس کی یہ سب شکلیں ہیں اور اس کو بھی گناہ قرار دیا ہے اور اس پر حضور اکرم ﷺ نے سخت وعید ارشاد فرمائی ہے۔

باب بیان غلظ تحریم شهادةِ الزور

جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قَالَ اللهُ تَعَالَى: ﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ.﴾ (الحج:٣٠)

وقال تَعَالَى: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ.﴾ (الإسراء:٣٦)

وقال تَعَالَى: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق:١٨)

وقال تَعَالَى: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (الفجر:١٦)

وقال تَعَالَى: ﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ (الفرقان:٧٢)

چوں کہ زبان سے ہونے والے گناہوں کا تذکرہ چل رہا ہے، اسی میں جھوٹ کا بیان آیا، تو ایک تو جھوٹ ہے اور دوسری جھوٹی گواہی ہے جو جھوٹ کے مقابلہ میں اور زیادہ خطرناک ہے۔ اس لئے علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے اس کو مستقل عنوان قائم کرکے ذکر کیا ہے: ”جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان“۔

ویسے جھوٹ خود بھی ایک کبیرہ گناہ ہے لیکن اگر گواہی کے اندر جھوٹ کا ارتکاب کیا جائے تو اور زیادہ سخت گناہ ہے۔ آج کل تو محاورہ ہے "میاں! سچ سچ بولو؛ مگر کچہری میں نہیں"۔ کچہری میں بیان دے رہے ہیں تو جھوٹ بولنے کی اجازت ہے حالاں کہ گواہی میں جھوٹا بیان دینا عام حالات میں جھوٹ بولنے کے مقابلہ میں اور زیادہ خطرناک ہے۔

آیاتِ قرآنیہ

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ جھوٹی بات سے بچو۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ﴾ اور اس چیز کے درپے نہ ہو (یا ایسی چیز نہ کہو) جس کا تمہیں علم نہ ہو۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ یہ آیت اوپر بھی گذری کہ جو بات بھی تم کہتے ہو اس پر باری تعالیٰ کی طرف سے بڑا چوکس محافظ اور نگران مقرر ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کی تاک میں لگے ہوئے ہیں۔ یعنی بندے جو اعمال کرتے ہیں اللہ تعالیٰ برابر اس کو دیکھتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ﴾ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی خوبیاں اور اوصاف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں وہ ایسے لوگ ہیں جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

بڑے گناہوں میں بھی بڑے گناہ

حدیث ۱۵۵۰:-

وعن أَبِي بَكْرَةَ رضی الله عنه قَالَ: قَالَ رَسُولُ الله ﷺ: ((أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الكَبَائِرِ؟)) قُلْنَا: بَلَى يَا رسولَ اللهِ. قَالَ: ((الإِشْرَاكُ بِاللهِ، وعُقُوقُ الوَالِدَيْنِ)) وكَانَ مُتَّكِئاً فَجَلَسَ، فَقَالَ: ((أَلَا وَقَولُ الزُّورِ)) فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتَّى قلنا: لَيْتَهُ سَكَتَ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو بکرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تم کو بڑے گناہوں میں بھی جو بڑے گناہ ہیں؛ وہ نہ بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا: کیوں نہیں؛ اے اللہ کے رسول! آپ ضرور بتلایئے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، اور ماں باپ کی نافرمانی۔ حضرت ابو بکرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ پہلی دو باتیں جب آپ ﷺ نے ارشاد فرمائیں اس وقت آپ تکیہ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے لیکن پھر آپ نے ٹیک چھوڑ دیا اور سیدھے بیٹھ گئے اور فرمایا: سنو! اور جھوٹی بات (جھوٹی گواہی، جھوٹ بات) آپ اپنے اس ارشاد کو بار بار دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم لوگ اپنے جی میں یوں کہنے لگے: کاش! حضور خاموش ہو جائیں۔

افادات:-- سب سے بڑا گناہ تو شرک ہے، قرآنِ پاک میں بھی کہا گیا ہے: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ شرک بہت بڑا گناہ ہے، اور سارے گناہوں کو اللہ تعالیٰ اگر چاہیں گے تو معاف کر دیں گے، لیکن شرک کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے: ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے، اس کے علاوہ دوسرے گناہوں کی معافی اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے، اگر چاہیں تو معاف کر دیں اور اگر چاہیں تو سزا دیں۔

اولاد کو جائز کام کا حکم کیسے دیں؟

اگر ماں باپ کسی جائز کام کو کرنے کے لئے کہیں بشرطیکہ وہ شریعت کی حدود میں رہ کر ہی ہو، تو ماں باپ کے کہنے کی وجہ سے وہ جائز کام واجب کا درجہ اختیار کر لیتا ہے اور اس پر عمل کرنا ضروری ہو جاتا ہے (اس سلسلے میں پہلے بھی بیان آچکا ہے اور تفصیل بتا چکا ہوں) حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ فرماتے ہیں کہ اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ باپ جب بیٹے کو کوئی کام کرنے کے لئے کہے اور وہ کام جائز امور کے قبیل سے ہو تو یہ نہ کہے کہ "یوں کرو"۔ اس لئے کہ اگر اس کے جواب میں وہ نہیں کرے گا تو گنہگار ہو گا اس لئے کہ اس صورت میں ایک واجب پر عمل نہیں کیا، بلکہ باپ کو چاہیے کہ یوں کہے کہ اگر ایسا کر لو تو اچھا ہے، اور بیٹے کو بھی چاہیے کہ سمجھ جائے کہ باپ کی تمنا اور خواہش یہ ہے کہ یہ کام

کیا جائے، اور ان الفاظ کو اس لیے استعمال کر رہے ہیں تا کہ نہ کرنے کی صورت میں مَیں گنہگار نہ بنوں۔ علماء نے شریعت پر عمل کے معاملہ میں اتنی ساری احتیاطیں سکھلائی ہیں۔ آج کل تو حال یہ ہو گیا ہے کہ باپ کسی کام کے لیے تاکید کر کے کہتا ہے تب بھی بیٹا ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

محبت کا تقاضہ

”لَيْتَهٗ سَكَتَ“ کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔ اس میں جو تمنا کی گئی ہے وہ اس لئے کہ صحابہ کرام کو حضور ﷺ کے ساتھ جو محبت تھی اس کی وجہ سے صحابہ نے محسوس کیا کہ اس طرح بار بار اپنی بات کو دہرانے کی وجہ سے آپ ﷺ کو تکلیف ہو رہی ہے، اور چوں کہ آپ کا مقصد اس گناہ کی شناعت و قباحت اور برائی ہمارے ذہنوں میں بٹھانا تھا، وہ مقصد تو حاصل ہو چکا ہے، اس لیے اب آپ خاموش ہو جائیں تو اچھا ہے۔ جیسے کوئی آدمی کسی کو دھمکا رہا ہو، کسی بات کی تاکید کر رہا ہو، تو وہ زور زور سے بول رہا ہو، اور آپ کو اس کے ساتھ محبت ہو اس کی وجہ سے آپ اس سے یوں کہیں کہ بھائی! آپ کا مقصد مجھے تاکید کرنا تھا اور وہ تو حاصل ہو چکا ہے، آپ کی اس تکلیف سے ہمیں تکلیف ہو رہی ہے، اس لیے اب آپ خاموش ہو جائیں تا کہ آپ کو زحمت نہ ہو۔

باب تحریم لعن انسان بعینه اودابة

کسی متعین شخص یا جانور پر لعنت بھیجنا حرام ہے

بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت ان کی زبان سے لعنت، لعن طعن اور پھٹکار ہی کے الفاظ نکلتے ہیں کہ تیرا یوں ہو جائے اور تو اللہ کی رحمت سے دور رہے۔ لعنت کا مطلب ہے کسی کے لئے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بد دعا کرنا، چوں کہ یہ بھی زبان کے گناہوں میں سے ہے، اس لیے اس کو اس باب میں بتلانا چاہتے ہیں۔

کسی پر لعنت کرنا اس کو قتل کرنے جیسا ہی ہے

حدیث ۱۵۵۱:-

عن أَبي زيدٍ ثابت بن الضَّحَّاك الأنصاريِّ - رضی الله عنه - وَهُوَ من أهلِ بَيْعَةِ الرِّضْوَانِ، قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ بِمِلَّةٍ غَيْرِ الإسْلاَمِ كَاذِباً مُتَعَمِّداً، فَهُوَ كَمَا قَالَ. وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِشَيءٍ، عُذِّبَ بِهِ يومَ القِيَامَةِ، وَلَيْسَ عَلَى رَجُلٍ نَذْرٌ فيما لا يَمْلِكُهُ، وَلَعْنُ المُؤْمِنِ كَقَتْلِهِ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوزید ثابت بن ضحاک انصاری (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں - جو بیعتِ رضوان والوں میں سے ہیں - کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے اسلام کے علاوہ دوسرے

مذہب کے متعلق جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھائی؛ تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا۔ اور جس آدمی نے اپنے آپ کو کسی چیز کے ذریعہ سے قتل کیا (یعنی خود کشی کی، جیسے: چاقو لے کر اپنے سینے میں گھونپ دیا، یا زہر پی لیا، یا اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا، یا اپنے آپ کو کسی اونچی جگہ سے نیچے گرادیا) تو قیامت کے دن اس کو یہی عذاب دیا جائے گا (بلکہ عالمِ برزخ میں قبر کے اندر بھی اس کو یہی عذاب ہوگا کہ وہ چاقو ہاتھ میں لے گا اور گھونپے گا، پھر چاقو ہاتھ میں لے گا پھر گھونپے گا، اور اسی طرح کرتا رہے گا، ہمیشہ اس کو یہی عذاب دیا جاتا رہے گا) اور جو آدمی کسی چیز کا مالک نہ ہو، تو اس کی نذر اس کے اوپر نہیں ہے۔ اور کسی مؤمن پر لعنت کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کو قتل کرنا۔

اہلِ بیعتِ رضوان کی وجہ تسمیہ

افادات:- پہلے بھی آچکا ہے کہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے صحابہ کرام کی جماعت کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لے گئے لیکن مکہ والوں نے آپ کو عمرہ کرنے نہیں دیا اور روک دیا، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ دیا گیا، اسی بنیاد پر حضور اکرم ﷺ نے مکہ والوں سے صلح کر لی، اس موقعہ پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا پیغام مکہ والوں تک پہنچانے کے لئے حضرت عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کو مکہ بھیجا کہ ہم لڑنے کے واسطے نہیں آئے ہیں، ہم تو بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں، ہم کو بیت اللہ کی زیارت کرنے کا موقعہ دے دیا جائے، زیارت سے فارغ ہو کر ہم واپس چلے

جائیں گے۔ جب آپ ﷺ کا یہ پیغام مکہ والوں تک پہنچانے کے لئے حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) تشریف لے گئے تو ان کے خاندان بنو امیہ کو معلوم ہوا کہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کوئی خاص پیغام لے کر آرہے ہیں، اور چوں کہ یہ ان کے خاندان ہی کے آدمی تھے، اس لئے ان کی حمایت اور تائید کے لئے ان کے خاندان والے مکہ سے باہر ان کے استقبال کے لئے آئے اور ان سے کہا کہ آپ جس مشن کے لیے آئے ہیں، وہ پورا کیجئے، ہم سب آپ کی حفاظت کریں گے، کوئی شخص آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ چناں چہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے، اور حضور اکرم ﷺ کا پیغام مکہ کے سرداروں تک پہنچایا۔ اور چوں کہ ابھی تک وہ احرام کی حالت ہی میں تھے، اس لیے کہ حضور اکرم ﷺ کے ساتھ صحابۂ کرام کی جو جماعت آئی تھی ان میں یہ بھی تھے اور سبھی حضرات عمرہ کے لئے آئے تھے تو ان کے خاندان والوں نے ان سے کہا: اب آپ تو یہاں آہی گئے ہیں؛ لہٰذا آپ عمرہ کر لیجئے، آپ کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں کہا: یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو تو وہاں روکا گیا ہے، اور عثمان یہاں عمرہ کر لے؟ میں اکیلا عمرہ نہیں کروں گا۔ یہ جواب ان کے خاندان والوں کو بڑا گراں گزرا کہ ہم نے تو ان کی اتنی حمایت کی کہ جس کام اور مشن کو لے کر آئے تھے اس کو پورا کرنے کے لئے قربانی دی کہ ان کا استقبال کیا، ان کو اپنے ساتھ لے کر آئے، مکہ والوں کو بھی الٹی میٹم دے دیا کہ ان کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا، اور اب ہم اپنی طرف سے یہ پیشکش کر رہے

ہیں، اس پر بھی عمل کرنے کے لئے یہ تیار نہیں؟ اب بھی وہ اُنہیں کے گُن گا رہے ہیں؟ اور پھر ان کے خاندان والوں نے یہ کہہ کر حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کو مکہ ہی میں روک لیا کہ ہم ابھی تم کو واپس جانے نہیں دیں گے۔ جب ان کی واپسی میں دیر ہوئی تو جہاں نبیِ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم قیام پذیر تھے وہاں یہ مشہور ہو گیا کہ نعوذ باللہ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) قتل کر دیئے گئے۔ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جب معلوم ہوا کہ حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے تو حضور کو یہ بات بڑی ناگوار گزری کہ ہم نے اپنے ایک آدمی کو اپنا خصوصی پیغام لے کر وہاں بھیجا اور ان لوگوں نے ان کو قتل کر دیا۔ اس موقعہ پر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تمام صحابہ سے ایک بیعت لی کہ چاہے ہم جان دیدیں گے لیکن حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے خون کا بدلہ ضرور لیں گے۔ تمام ہی صحابہ نے اس بات پر بیعت کی۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کیکر کے ایک درخت نیچے بیٹھ کر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہ) سے یہ بیعت لی تھی اور اس بیعت پر قرآنِ پاک میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ان صحابہ کو یہ بشارت سنائی گئی: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾ اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے خوش اور راضی ہو گیا جب وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیٹھ کر بیعت کر رہے تھے۔ گویا اس بیعت پر صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سرٹیفکیٹ مل گیا (''رضوان'' یعنی خوشنودی) اس لیے اس بیعت کا نام ''بیعتِ رضوان'' ہے۔

صحابہ کرام میں دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت اصحابِ بدر کی ہے جن کا مقام سب سے اونچا ہے، ان کے بعد اصحابِ بیعتِ رضوان ہیں۔ اگر کوئی صحابی بدرین میں سے ہوتا ہے تو چوں کہ یہ فضیلت کی چیز ہے، اس لیے عام طور پر روایتوں میں ان کے نام کے ساتھ اہلِ بدر لکھا جاتا ہے، اور کوئی صحابی اگر اہلِ بیعتِ رضوان میں سے ہے تو روایتوں میں ان کا نام کے ساتھ ”اہلِ بیعتِ رضوان“ ضرور لگایا جاتا ہے؛ تاکہ ان کی فضیلت اور اہمیت کا اندازہ ہو۔ اس روایت کے راوی حضرت ابو زید ثابت بن ضحاک انصاری (رضی اللہ عنہ) ہیں ان کے نام کے ساتھ یہی آیا ہے کہ وہ بیعتِ رضوان والوں میں سے ہیں۔

جملہ کی تفصیل اور مسئلہ کا فرق

”تو وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا“ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ ایسا بول دیتے ہیں کہ اگر میں فلاں کام کرلوں؛ تو میں یہودی ہو جاؤں، یا نصرانی ہو جاؤں، یا ہندو بن جاؤں۔ یا کہہ دیتے ہیں کہ اگر میں نے ایسا کیا ہو، تو میں یہودی، یا نصرانی ہوں؛ تو اس کا مسئلہ کیا ہے؟ یعنی اگر وہ جانتا ہے کہ اُس نے وہ کام کیا ہے، اس کے باوجود ایسا بول رہا ہے، تو ایسا کرنے کی وجہ سے وہ اسلام سے نکل جائے گا یا نہیں؟ اس روایت میں تو حضور اکرم ﷺ نے جو فرمایا کہ ” وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا“ اس بارے میں علماء نے تفصیل لکھی ہے۔

دیکھو! آدمی اسلام سے اس وقت تک نہیں نکلتا جب تک اسلام اور ایمان کے خلاف اپنی زبان سے کوئی بات نہ نکالے، یا کوئی کام جو اسلام اور ایمان کے خلاف ہو؛ وہ نہ کرلے۔ صرف اتنا بول دینا کہ "اگر میں نے یہ کام کیا ہو تو میں یہودی ہوں" یہ چیز اسلام سے نکالنے والی نہیں ہے۔ اس لیے اگر وہ یہ جانتا ہے کہ محض ایسا بولنے کی وجہ سے آدمی یہودی یا نصرانی نہیں بن جاتا، اور پھر ایسا بول رہا ہے تو اس صورت میں وہ اسلام سے نہیں نکلے گا۔ لیکن اگر وہ یہ مسئلہ نہیں جانتا، بلکہ وہ یہی سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا بولوں گا تو اسلام سے نکل جاؤں گا اور پھر ایسا بول رہا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر کفر پر راضی ہے، اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں تو صرف ایسا بول دینے ہی سے وہ کافر ہو گیا۔ مثلاً: کوئی آدمی شراب کا عادی ہے، اور اس نے اپنے آپ کو شراب سے بچانے کے لئے بہت کوشش کی، لیکن نہیں چھوٹتی، تو وہ یوں کہتا ہے کہ اگر آئندہ میں شراب پیوں؛ تو میں یہودی یا نصرانی ہو جاؤں۔ اب ایسا کہنے کے بعد بھی اگر وہ یہ سمجھ کر شراب پی رہا ہے کہ شراب پینا کبیرہ گناہ تو ہے، لیکن شراب پینے کی وجہ سے آدمی یہودی نہیں بن جاتا، اور میرے ایسا کہنے کی وجہ سے کچھ نہیں ہوتا، تو وہ بڑے گناہ کا کام تو کر رہا ہے، لیکن ایسا کہنے کی وجہ سے وہ یہودی نہیں بنے گا۔

اور اگر وہ یہی سمجھتا ہے کہ میں نے چوں کہ ایسا کہہ دیا ہے، اس لیے اب اگر میں شراب پیوں گا تو میں یہودی یا نصرانی بن جاؤں گا، اور یہ سمجھتے ہوئے بھی وہ شراب پیتا ہے تو

اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے آپ کے یہودی بننے پر راضی ہے؛ تو اس صورت میں وہ کفر پر راضی ہو گیا ہے، اور اس کی وجہ سے ایمان سے نکل گیا۔ دونوں کا فرق سمجھ میں آ گیا؟

میں نے یہ تفصیل اس لیے بیان کر دی تاکہ دونوں صورتوں میں جو فرق ہے اس کے سمجھنے میں کسی سے کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے۔

جس چیز کا مالک نہیں، اس کی نذر لازم نہیں

''اور جو آدمی کسی چیز کا مالک نہ ہو تو اس کی نذر اس کے اوپر نہیں ہے'' مثلاً: زید کسی غلام کا مالک ہے، اب وہ یوں کہے کہ میرا بیٹا اگر تندرست ہو جائے تو میرا فلاں غلام آزاد ہے، یا میرا فلاں باغ صدقہ کر دوں گا۔ تو جب اس کا بیٹا تندرست ہو جائے گا تو وہ نذر پوری کرنا اس کے اوپر لازم ہے۔ لیکن اگر وہ غلام اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے کا ہے، یا وہ باغ تو محمد کا ہے، اور اس کے متعلق نذر مانتا ہے کہ اگر میرا بیٹا تندرست ہو جائے گا تو فلاں کا غلام آزاد ہے، یا محمد کا باغ صدقہ کروں گا؛ تو وہ نذر پوری کرنا اس پر لازم نہیں۔

''اور کسی مؤمن کے اوپر لعنت کرنا ایسا ہے جیسا اس کو قتل کرنا'' کسی خاص آدمی کے اوپر لعنت بھیجنا، اور اس کے لئے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بد دعا کرنا قتل سے کیا کم ہے؟ اور کسی مؤمن کو قتل کرنا حرام ہے اسی طرح لعنت بھیجنا بھی حرام ہے۔ بس! یہاں یہ روایت اسی حصہ کی وجہ سے لائے ہیں۔

کثرت سے لعنت کرنے والا صدیق نہیں ہو سکتا

حدیث ۱۵۵۲:-

وعن أَبِي هريرة -رضی الله عنه-: أَنَّ رسُولَ الله ﷺ قَالَ: ((لاَ يَنْبَغِي لِصِدِّيقٍ أنْ يَكُونَ لَعَّاناً))

(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: صدیق کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ بہت زیادہ لعنت کرنے والا ہو۔

افادات:- دراصل ہوا یہ تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کا ایک غلام تھا اس سے حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کسی وجہ سے ناراض ہو گئے، اور اس پر لعنت کے الفاظ کہے، اس پر حضور اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ صدیق کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ لعنت کرنے والا ہو۔ (''لَعَّان'' یعنی کثرت سے لعنت کرنے والا) جب حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے یہ سنا تو فوراً اس غلام کو آزاد کر دیا اور حضور اکرم ﷺ کے پاس آ کر یہ عہد کیا کہ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس آدمی کی زبان پر کثرت سے لعنت کے الفاظ رہتے ہوں؛ تو یہ بات تو طے ہے کہ وہ صدیقیت کے مقام پر فائز نہیں ہو سکتا۔

نہ شفیع ہوں گے، نہ گواہ

حدیث ۱۵۵۳:-

وعن أبي الدرداءِ -رضي الله عنه- قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((لاَ يَكُونُ اللَّعَانُونَ شُفَعَاءَ، وَلاَ شُهَدَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)). رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لعنت بھیجنے والے شفیع نہیں بنیں گے، اور نہ قیامت میں وہ گواہ ہوں گے۔

افادات:- ”شُفَعَآءَ“ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کل قیامت میں ایمان والوں کو ان کے اعمالِ صالحہ کی وجہ سے دوسرے گنہگار ایمان والوں کے لئے شفاعت کی اجازت دیں گے۔ جیسے: ایک حافظ کو اس کے خاندان کے دس آدمیوں کے بارے میں اللہ تعالی کی طرف سے سفارش کی اجازت دی جائے گی۔ اسی طرح ایک نیک آدمی کو بھی اعمالِ صالحہ کی وجہ سے اس کے خاندان کے ماتحت اہل ایمان گنہگاروں کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن جو لوگ لعنت کرنے والے ہیں وہ قیامت کے روز شفعاء نہیں بن سکتے۔ اور بھلا اجازت کیسے دی جائے جبکہ دوسروں کے لئے وہ خود ہی اللہ کی رحمت سے دوری کی بد دعا کرتا ہے؟ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جو اس طرح کے لوگ ہوتے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہادت کی سعادت ہی نصیب نہیں ہوتی۔

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ شہید ب معنیٰ گواہ۔ یعنی قیامت کے روز ان کو گواہ نہیں بنایا جائے گا، اس لیے کہ لعنت کرنا بڑا گناہ ہے، اور لعنت کی وجہ سے وہ فاسق بن گیا، کبیرہ گناہ کا ارتکاب کرنے سے آدمی فاسق بن جاتا ہے، اور فاسق کی گواہی قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے ایسا آدمی جب دنیا کے اندر کسی کی گواہی دینے کے قابل نہیں رہتا، تو قیامت کے روز کیسے بن سکے گا!

اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ قیامت کے روز امتِ محمدیہ کے لوگ اگلی امتوں کے حق میں شہادت دیں گے، نبیوں کے حق میں شہادت دیں گے کہ ان نبیوں نے اللہ کا پیغام اپنے امتیوں تک پہنچایا۔ لیکن ان شہادت دینے والوں میں یہ لوگ نہیں ہوں گے جو دوسروں پر لعنت کرنے والے ہوں۔

ایک دوسرے پر لعنت نہ بھیجا کرو

حدیث ۱۵۵۴ :-

وعن سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لاَ تَلاَعَنُوا بِلَعْنَةِ اللهِ، وَلاَ بِغَضَبِهِ، وَلاَ بِالنَّارِ)) (رواہ أبُو داود والترمذی، وقال: ((حدیث حسن صحیح))

ترجمہ :- حضرت سمرہ بن جندب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے پر اللہ کی لعنت نہ بھیجا کرو، اور نہ اللہ کے غضب اور پھٹکار کی، اور نہ جہنم کی بد دعا کرو۔

افادات:- بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات بات میں کہتے رہتے ہیں کہ تم پر اللہ کی لعنت ہو، یا فلاں پر لعنت برسے، اور اللہ کی پھٹکار ہو، جہنم میں جائے وغیرہ وغیرہ؛ تو ان تینوں قسم کی بد دعاؤں سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے، حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس طرح کسی کے لئے اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بد دعا نہ کیا کرو۔

مومن ایسا نہیں ہوتا

حدیث ۱۵۵۵:-

وعن ابن مسعود -رضی اللہ عنہ- قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَيْسَ المُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلاَ اللَّعَّانِ، وَلاَ الفَاحِشِ، وَلاَ البَذِيِّ)) (رواه الترمذی، وقال: ((حديث حسن))

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن طعن و تشنیع کرنے اور عیب جوئی کرنے والا نہیں ہوتا اور نہ ہی لعنت کرنے والا ہوتا ہے، اور نہ ہی فحش گو ہوا کرتا ہے، اور نہ ہی منھ پھٹ ہوتا ہے۔

افادات:- یعنی مؤمن کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ کسی پر طعن و تشنیع کرے، یہ طریقہ ایمان والوں کی شان کے منافی ہے، جو آدمی ایسا کرتا ہے وہ کامل ایمان والا نہیں ہے۔

یہ طرز زیادہ بگاڑنے کا ذریعہ

طعن و تشنیع بڑی خطرناک چیز ہے، اور اس کی وجہ سے سامنے والے کا دل بالکل ٹوٹ جاتا ہے، بلکہ آج کے زمانہ میں تو تجربہ یہ ہے کہ نئی نسل کے ساتھ اگر ایسا معاملہ کیا جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو سدھارنے کی بجائے ضد میں آکر برائیوں پر اور زیادہ اڑ جاتے ہیں، اسی لیے اگر کوئی بچہ کسی برائی میں مبتلا ہو تو محبت و شفقت اور دل سوزی و ہمدردی سے اس کو سمجھایا جائے، لیکن طعن و تشنیع اور (Tonting) بالکل نہ کی جائے، یہ طرز اس کو سدھارنے کے بجائے اور زیادہ بگاڑنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، اور قرآنِ پاک میں بھی ہے: ”وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ“ طعن و تشنیع کرنے والوں کے لئے ہلاکت ہے۔

بخاری شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کسی کی باندی زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر حد جاری کی جائے یعنی شریعت کی طرف سے جو سزا مقرر کی گئی ہے وہ سزا دی جائے، ”وَلَا يُثَرِّبْهَا“ لیکن اس کو عار نہ دلائی جائے۔ جب باندی تک کو اور وہ بھی ایسی باندی جو زنا جیسے شنیع و قبیح فعل اور حرکت کا ارتکاب کر رہی ہے، اس کے لئے بھی نبی کریم ﷺ شریعت کی مقرر کی ہوئی سزا جاری کرنے کا حکم دے رہے ہیں، لیکن عار دلانے اور طعن و تشنیع کی اجازت نہیں دیتے؛ تو پھر اپنی اولاد اور اپنے ماتحتوں کو اس طرح طعن و

تشنیع کرنا کتنا سخت ہے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، یہ طرز شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے، اور اس کی اجازت بھی نہیں ہے۔ گویا کامل ایمان کی شان یہ نہیں ہے۔ جو آدمی ایسا کرتا ہے وہ حقیقی معنیٰ میں مؤمن کہلانے کا حقدار نہیں ہے۔

پھر لعنت کی اجازت کیونکر دی جاسکتی ہے؟

”مؤمن لعنت کرنے والا نہیں ہوتا“ کسی کے بھی اوپر لعنت بھیجنا ایمان والے کی شان نہیں ہے۔ اب کس کس پر لعنت بھیجی جاسکتی ہے وہ آگے ایک باب قائم کرکے اس میں بیان کریں گے۔ لیکن کسی معین آدمی کے لئے لعنت کی اجازت نہیں ہے، یہاں تک اگر وہ کافر بھی ہو اور وہ سامنے ہو تب بھی اس کو معین کرکے نہ کہا جائے کہ تجھ پر اللہ کی لعنت ہے، اس لیے کہ اس کی موت کفر پر ہی آنے والی ہے اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے کہ کل کو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق نصیب فرمائے، ہاں! یوں کہا جاسکتا ہے کہ کافروں پر اللہ کی لعنت ہے۔

کسی بھی آدمی کے متعلق تحقیر کا جذبہ رکھنے اور اس کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی، یہاں تک کہ کافر کے مقابلہ میں بھی تحقیر کا جذبہ رکھنے کی ممانعت ہے۔ یعنی فی الحال تو مؤمن اپنے آپ کو اچھا سمجھ سکتا ہے کہ اس وقت میں ایمان کی حالت میں ہوں اور یہ کفر کی حالت میں ہے، اور اس نعمت پر اللہ کا شکر بجالائے،

لیکن آئندہ کیا حالات پیش آتے ہیں اور کیا تبدیلی پیش آسکتی ہے؛اس کی کوئی گارنٹی نہیں دی جاسکتی، اور ہم بھی اپنے خاتمہ کے متعلق گارنٹی سے کوئی بات نہیں کہہ سکتے، ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمائے۔جب کسی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی شریعت اجازت دیتی نہیں ہے، تو پھر لعنت کی اجازت کہاں دی جاسکتی ہے؟ اور بددعا بھی ایک طرح کی لعنت ہی ہے، لہٰذا اس سے بھی اپنے آپ کو بچایا جائے۔

فحش گو اور منہ پھٹ نہیں ہوتا

فحش گو کا مطلب یہ ہے کہ اپنی زبان سے بے حیائی کی بات نکالنا۔ ایسی باتیں جو اپنی زبان سے نکالنے کو آدمی برا سمجھتا ہے، یہاں تک کہ اگر وہ بات سچی بھی ہے تب بھی اگر وہ بے حیائی کے بول ہیں تو اس کا اپنی زبان سے اظہار نہ کیا جائے۔ اور نہ ایمان والا منہ پھٹ ہوتا ہے۔یہ ساری چیزیں جو بتلائی گئیں ہیں، ایمان والا ان چیزوں کا حامل نہیں ہوا کرتا، گویا مؤمن ان اوصاف اور برائیوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے۔

لعنت کے متعلق نہایت اہم مضمون

حدیث ۱۵۵۶:-

وعن أَبِي الدرداء - رضى الله عنه - قَالَ : قَالَ رسُولُ الله ﷺ:((إنَّ العَبْدَ إِذَا لَعَنَ شَيْئاً ، صَعدَتِ اللَّعْنَةُ إِلَى السَّماءِ، فَتُغْلَقُ أبوابُ السَّماءِ دُونَهَا ، ثُمَّ تَهْبِطُ إِلَى الأَرْضِ، فَتُغْلَقُ أبوابُهَا

دُونَهَا، ثُمَّ تَأْخُذُ يَمِيناً وَشِمالاً، فَإِذا لَمْ تَجِدْ مَسَاغاً رَجَعَتْ إِلَى الَّذِي لُعِنَ، فَإِنْ كَانَ أَهْلاً لِذلِكَ، وإِلاَّ رَجَعَتْ إِلَى قَائِلِهَا.)) (رواه أبو داود)

لعنت کے سلسلہ میں بڑی اہم روایت ہے جس کو امام ابو داؤد نور اللہ مرقدہ نے اپنی سنن میں ذکر کیا ہے۔

ترجمہ:- حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: بندہ جب کسی چیز پر لعنت بھیجتا ہے (چاہے وہ جاندار ہو، یا بے جان) تو وہ لعنت آسمان کی طرف چڑھتی ہے، آسمان کے دروازے اس کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں، پھر وہ لعنت زمین کی طرف واپس اترتی ہے تو اب زمین کے دروازے بھی اس کے لئے بند کر دیئے جاتے ہیں، اس کے بعد پھر وہ دائیں بائیں گھومتی پھرتی ہے (اِدھر اُدھر جاتی ہے، گویا اپنے لیے جگہ اور ٹھکانہ تلاش کرتی ہے) جب اس کو اپنے لیے کوئی ٹھکانہ نہیں ملتا تو جس چیز پر لعنت کی گئی تھی اس کی طرف جاتی ہے، اگر وہ (اپنی حرکتوں، گناہوں اور بدکاریوں کی وجہ سے) اس لعنت کا حقدار ہوتا ہے (جیسا کہ آگے ایک باب میں بتائیں گے کہ بعض گناہ ایسے ہیں جن پر حدیث پاک کے اندر لعنت آئی ہے تو اس نے بھی کوئی ایسا گناہ کیا ہے کہ جس کی وجہ سے قرآن و حدیث میں اس کے اوپر لعنت بھیجی گئی ہے) تب تو ٹھیک ہے، وہ لعنت اسی پر پڑ جاتی ہے، ورنہ وہ لعنت کہنے والے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

افادات:- کتنا خطرناک معاملہ ہے! اور بد دعا بھی لعنت ہی کی ایک قسم ہے، اس لیے بد دعا کے معاملہ میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بعض لوگ بہت زیادہ زود رنج ہوتے

ہیں، ذرا ذرا سی اور معمولی معمولی باتوں پر لوگوں سے ناراض ہو جاتے ہیں، اور ان کے لئے اپنی زبان سے بد دعا کے الفاظ نکال دیتے ہیں۔ اور بد دعا کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ آسمان کی طرف جاتی ہے تو آسمان کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں، زمین پر اترتی ہے تو اس کے دروزے بھی بند کر دیئے جاتے ہیں، دائیں بائیں جگہ تلاش کرتی ہے، جب جگہ نہیں ملتی تو جس کے لئے کی گئی ہے اس کے پاس جاتی ہے، اگر وہ واقعتاً حقدار ہوتا ہے تب تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ لوٹ کر بد دعا دینے والے کی طرف ہی واپس آتی ہے۔ لہٰذا بد دعا کے معاملہ میں بھی بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

مثلاً: کسی کے ساتھ کوئی معاملہ پیش آیا، کسی نے تکلیف کی کوئی بات کہہ دی، کوئی آدمی غائبانہ آپ کو کوئی نقصان پہنچا گیا، کسی نے آپ کے خلاف کہیں کوئی شکایت کر دی جس سے آپ کو ضرر پہنچ سکتا ہے، اب آپ کسی کو متعین کر کے بد دعا کے کلمات کہیں کہ فلاں کو ایسا ہو جائے؛ تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی یقین کے ساتھ یوں سمجھتا ہے کہ یہ شکایت فلاں نے ہی کی ہے، اب ساری دنیا اس سے کہتی ہے کہ اس نے تیری شکایت نہیں کی، لیکن وہ نہیں مانتا، اور اس کا نام لے کر اس کے لیے بد دعا کرتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے نہیں کی ہے۔ تو وہاں پر بھی یہی صورت پیش آئے گی۔

خود ہی بھگتنا پڑتا ہے

اسی لیے ہمارے حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے ”آپ بیتی“ میں لکھا ہے کہ اگر کسی نے آپ کے ساتھ واقعتاً حد سے زیادہ کوئی معاملہ کیا ہے تب بھی پہلی بات تو یہ ہے کہ بددعا مت کرو، اور کرنی ہی ہے تو کسی کا نام لے کر مت کرو۔ ہاں! یوں کہہ سکتے ہو کہ جس نے بھی میرے ساتھ ایسا کیا ہے اس کے ساتھ اللہ ایسا کرے۔ اس لیے کہ اگر وہی ہے جس کے متعلق آپ کا گمان ہے تب تو ٹھیک بات ہو گئی، ورنہ جو بھی ہو گا اس کو لگے گی۔ لیکن اگر آپ اپنے طور پر متعین کر دیں گے، اور حقیقت میں اس نے نہیں کیا ہو گا تو اس صورت میں یہ چیز خود اپنے آپ پر ہی پڑے گی۔

اسی لیے عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگ جو اپنی زبانوں سے بددعا کے الفاظ نکالتے رہتے ہیں وہ ہمیشہ پریشان، ٹینشن اور تکلیفوں میں ہی پڑے رہتے ہیں، ان کی مصیبتوں کا کبھی خاتمہ ہی نہیں ہوتا، کیوں کہ جب بددعا دینے کی عادت ڈال رکھی ہے تو عام طور پر ان کی زبان سے دوسروں کے لئے ایسی ہی چیزیں نکلتی رہتی ہیں جو اس کے اہل نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خود ہی اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔

لعنت کی مثال گیند جیسی ہے

اس کو ہمارے حضرت مفتی صاحب نوراللہ مرقدہٗ ایک مثال دے کر سمجھایا کرتے تھے اور یہ مثال دراصل علامہ انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کی دی ہوئی ہے جو فیض الباری تقریر بخاری کے اندر موجود ہے۔ لعنت کی مثال تو گیند اور بال جیسی ہے، اگر گیند کو آپ سامنے کسی چیز پر پھینکیں اور وہ جگہ نرم ہے یعنی اس لائق ہے کہ وہ اس گیند کو اپنے پاس کیچ کر سکتی ہے تب تو ٹھیک ہے، اور اگر وہ جگہ سخت ہے تو اس صورت میں وہ گیند جتنی قوت سے اس کی طرف پھینکی گئی تھی اتنی ہی قوت سے لوٹ کر پھینکنے والے کی طرف آئے گی۔ جیسے: آپ نے گیند سامنے پھینکی اور وہاں جالی ہے تو وہ اس گیند کو اپنے اندر کیچ کرلے گی اور گیند اس میں پھنس کر رہ جائے گی، اسی طرح جس کے اوپر بددعا اور لعنت کی گئی ہے وہ اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اگر اس کا حق دار ہے تب تو اس پر پڑے گی۔ ورنہ اگر سامنے دیوار ہے تو دیوار میں تو اس گیند کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، تو اب جتنی قوت سے پھینکی گئی تھی اتنی ہی قوت سے پھینکنے والے کی طرف لوٹ کر آتی ہے۔ اسی طرح جس کے لئے بددعا یا لعنت کی گئی ہے، اگر وہ اپنی بدکرداری کی وجہ سے اس کا حق دار نہیں ہے، تو پھر وہ اس لعنت کرنے والے کی طرف اتنی ہی قوت کے ساتھ لوٹ کر آتی ہے۔ اس حدیثِ پاک کے اندر اس کی صراحت موجود ہے، اس لیے اصل تو یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچائے۔

لعنت کی ہوئی چیز سے بچنے کا اہتمام

حدیث ۱۵۵۷:-

وعن عمران بن الحُصَيْنِ رضی اللہ عنہما ، قَالَ : بَيْنَمَا رسُولُ اللهِ ﷺ فی بَعْضِ أَسْفَارِهِ، وَامْرَأَةٌ مِنَ الأَنْصَارِ عَلَى نَاقَةٍ ، فَضَجِرَتْ فَلَعَنَتْهَا ، فَسَمِعَ ذَلِكَ رسُولُ الله ﷺ فقالَ : ((خُذُوا مَا عَلَيْهَا، وَدَعُوهَا، فَإِنَّهَا مَلْعُونَةٌ)) قَالَ عِمْرانُ : فَكَأَنِّي أَرَاهَا الآنَ تَمْشِي فی النَّاسِ مَا يَعْرِضُ لَهَا أَحَدٌ. (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے کسی سفر میں تھے، اس میں ایک انصاری عورت بھی اپنی ایک اونٹنی پر سوار تھی جس سے وہ تنگ آگئی تھی (کبھی سواری کا جانور اَڑ جاتا ہے، شرارت پر اتر آتا ہے، اور اس کو ٹھیک کرنے سے مالک عاجز اور بے بس ہو جاتا ہے، اس کو ٹھیک کرنے کی ساری تدبیریں کر گزرتا ہے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوتی، تو تنگ آجاتا ہے اور اس کی زبان سے گالیاں اور بد دعائیں نکلتی ہیں۔ یہاں پر بھی یہی ہوا کہ وہ اونٹنی اَڑ گئی ہو گی اور ساری تدبیر کرنے کے باوجود بھی قابو میں آئی نہیں ہو گی تو وہ عورت تنگ آگئی) اور اس عورت نے اس کے لئے لعنت کے الفاظ کہے (اب وہ تو ایک جانور تھا) جب حضور ﷺ نے اس کے یہ الفاظ سنے کہ اس اونٹنی پر لعنت کی گئی ہے تو ارشاد فرمایا: اس اونٹنی پر جو سامان (کجاوہ وغیرہ لادا ہوا ہے) وہ سب اُتار لو، اور اس اونٹنی کو چھوڑ دو، اس لیے کہ وہ لعنت کی گئی ہے (گویا حضور اکرم ﷺ نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ ایسی اونٹنی قافلہ میں

آپ کے ساتھ رہے) حضرت عمران بن حصین (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ بعد میں مَیں نے دیکھا کہ وہ اونٹنی لوگوں کے درمیان چلتی تھی، لیکن کوئی اس کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

حدیث ۱۵۵۸:-

وعن أَبي بَرْزَةَ نَضْلَةَ بْنِ عُبَيْدٍ الأَسْلَمِيِّ -رضی الله عنه- قَالَ: بَيْنَمَا جَارِيَةٌ عَلَى نَاقَةٍ عَلَيْهَا بَعْضُ مَتَاعِ الْقَوْمِ، إِذْ بَصُرَتْ بِالنَّبِيِّ ﷺ وَتَضَايَقَ بِهِمُ الْجَبَلُ فَقَالَتْ: حَلْ! اللَّهُمَّ الْعَنْهَا. فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((لاَ تُصَاحِبْنَا نَاقَةٌ عَلَيْهَا لَعْنَةٌ.)) (رواه مسلم)

قَوْله: ((حَلْ)) بفتح الحاء المهملة وإسكانِ اللاَّمِ: وَهِيَ كَلِمَةٌ لِزَجْرِ الإِبِلِ.

ترجمہ:- یہی واقعہ دوسرے ایک صحابی حضرت ابوبرزہ اسلمی (رضی اللہ عنہ) سے بھی منقول ہے کہ ایک نوجوان عورت اپنی اونٹنی کے اوپر سوار تھی، اور اس اونٹنی پر لوگوں کا کچھ سامان بھی تھا اچانک اس عورت کی نگاہ حضور اکرم ﷺ پر پڑی اور پہاڑی راستہ ان کے لئے تنگ پڑ گیا۔ تو اس عورت نے اونٹنی کو بھگانے کے لئے کہا: ''حَلْ''! اے اللہ! اس پر لعنت بھیج۔ یہ سن کر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہمارے ساتھ قافلہ میں ایسی اونٹنی نہیں رہنی چاہئے جس پر لعنت کی گئی ہو۔

افادات:- سفر کے دوران کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پورا لشکر اور قافلہ میدان میں چل رہا ہوتا ہے تب تو ہر ایک کے لئے چلنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے، ہر آدمی اپنے اپنے طور پر سہولت کے ساتھ چلتا ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میدان ختم ہو کر پہاڑی یا کوئی تنگ راستہ آجاتا ہے، اور تنگ راستہ جب کھلی جگہ کے بعد آتا ہے تو مجمع میں سے ہر آدمی یہ کوشش

کرتا ہے کہ میں پہلے وہاں سے نکلوں۔ یہاں بھی یہی صورت پیش آئی کہ ایک پہاڑی تنگ راستہ سامنے آگیا، اور اس تنگ راستہ پر سے گزرنے کے لئے جلدی میں اس عورت نے اپنی اونٹنی کو وہاں ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ اونٹنی جلدی سے اُدھر نہیں گئی، اس کی وجہ سے وہاں تنگی پیدا ہو گئی، تو اس عورت نے اونٹنی کو بھگانے کے لئے "حَلْ" کہا۔ عرب میں اونٹنی کو تیز چلانے کے لئے لفظ "حَلْ" کہا جاتا ہے، جیسا جانوروں کو تیز چلانے کے لئے، جانوروں کو بٹھانے کے لئے، جانوروں کو کھڑا کرنے کے لئے کچھ مخصوص آوازیں نکالی جاتی ہیں۔ تو اس عورت نے بھی "حَلْ، حَلْ" کہا، لیکن وہ اونٹنی اس کی مرضی کے مطابق نہیں چلی، جس کی وجہ سے اس عورت نے تنگ آکر لعنت کا جملہ کہا۔ اوپر والی روایت میں گزر چکا ہے کہ اس اونٹنی پر سے سامان اتروا کر اس اونٹنی کو چھوڑ دیا گیا۔

ایک بحث

وَاعْلَمْ أَنَّ هٰذَا الحَدِيثَ قَدْ يُسْتَشْكَلُ مَعْنَاهُ، وَلَا إِشْكَالَ فِيهِ، بَلِ المُرَادُ النَّهْيُ أَنْ تُصَاحِبَهُمْ تِلْكَ النَّاقَةُ، وَلَيْسَ فِيهِ نَهْيٌ عَنْ بَيْعِهَا وَذَبْحِهَا وَرُكُوبِهَا فِي غَيْرِ صُحْبَةِ النبيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَلْ كُلُّ ذٰلِكَ وَمَا سِوَاهُ مِنَ التَّصَرُّفَاتِ جَائِزٌ لَا مَنْعَ مِنْهُ، إِلَّا مِنْ مُصَاحَبَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِهَا؛ لِأَنَّ هٰذِهِ التَّصَرُّفَاتِ كُلَّهَا كَانَتْ جَائِزَةً فَمُنِعَ بَعْضٌ مِنْهَا، فَبَقِيَ البَاقِي عَلَى مَا كَانَ، واللهُ أعلم.

اب یہاں یہ بحث ہے کہ ایسا کرنے کی وجہ سے کیا یہ اونٹنی مالک کی ملکیت سے نکل گئی؟ اور کوئی آدمی یہ بھی سوال کر سکتا ہے کہ لعنت کرنے والی عورت نے لعنت کی، اس میں بے چاری اونٹنی کا کیا قصور تھا کہ اس کو قافلہ سے الگ کر دیا؟۔

علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ اس حدیث کے مطلب کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اس حدیث کے مطلب میں ذرا اشکالات ہیں، لیکن حقیقت میں کوئی دشواری نہیں ہے، بلکہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشاد کا حاصل اور خلاصہ صرف اتنا ہی تھا کہ وہ اونٹنی اب آپ کے قافلہ میں نہیں رہنی چاہیے، باقی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ایسا کرنے کی وجہ سے وہ اونٹنی مالک کی ملکیت سے نکل گئی۔ اور حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے منع فرمانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہمارے اس قافلہ کے علاوہ اس پر سوار ہونا، یا اس کو ذبح کر کے اس کا گوشت کھانا، یا کسی کے ہاتھ فروخت کرنا بھی ممنوع ہے، بلکہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے تو صرف یہی فرمایا تھا کہ اب یہ ہمارے ساتھ نہیں چاہیئے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی چیز کو کوئی آدمی اپنے ساتھ رکھنا گوارا نہیں کرتا تو کہتا ہے کہ اب یہ ہمارے ساتھ نہیں ہونی چاہیے، اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا ہے کہ یہ کوئی غلط چیز ہے، یہاں پر بھی ایسا ہی ہے کہ صرف حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ قافلے میں اس کو نہیں رکھا جائے گا، اس کے علاوہ اس میں تمام طرح کے تصرفات درست اور جائز تھے، اس لیے کہ یہ سارے تصرفات پہلے بھی درست تھے، یہاں تک کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ساتھ قافلے میں رکھنا بھی پہلے درست تھا، لیکن جس وقت اس پر لعنت بھیجی گئی تو حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے

صرف اپنے ساتھ رکھنے سے منع فرمادیا، لہٰذا صرف وہی ممانعت رہے گی، باقی ساری چیزیں اپنی جگہ پر جائز درست رہیں گی۔

بابُ جواز لعن بعض أصحاب المعاصی غیر المعیّنین

نام لئے بغیر کسی گناہ کا ارتکاب کرنے والے پورے گروہ اور جماعت پر لعنت کرنے کی اجازت ہے، مثلاً: کوئی جماعت کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کرتی ہو، تو ان پر لعنت بھیجنے کے نمونے قرآن و حدیث میں موجود ہیں۔

نام لئے بغیر لعنت بھیجنے کے نمونے

چناں چہ قرآنِ پاک میں ہے: ﴿أَلَا لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰالِمِينَ﴾ (ھود: ۱۸) سنو! ظالموں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ لہٰذا جو بھی ظالم ہوگا وہ اس کا مصداق ہے۔ آپ کسی کا نام لے کر نہیں کہہ سکتے کہ فلاں پر اللہ کی لعنت ہو، لیکن یوں کہہ سکتے ہیں کہ ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے، لہٰذا اب جو بھی لعنت سے بچنا چاہتا ہو وہ اپنے آپ کو ظلم کرنے سے بچائے۔

﴿فَأَذَّنَ مُؤَذِّنٌ بَيْنَهُمْ أَنْ لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الظّٰالِمِينَ﴾ (الأعراف: ۴۴) حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایک اعلان کرنے والے نے اعلان کیا کہ ظلم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

”وَثَبَتَ فِي الصَّحِيحِ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((لَعَنَ اللهُ الْوَاصِلَةَ وَ الْمُسْتَوْصِلَةَ“ صحیح روایتوں میں آیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایسی عورت کے اوپر لعنت فرمائی جس کے بال

چھوٹے ہوں تو وہ اپنے بالوں کو لمبا کرنے کے لئے دوسری عورتوں کے نکلے ہوئے بالوں کو اپنے بالوں میں جوڑ دے۔ یا کسی دوسری عورت کو اپنے بالوں کے ساتھ بال جوڑنے کے لئے کہے۔ یعنی یا تو خود ہی یہ کام کرے، یا پھر کسی دوسرے سے کروائے؛ دونوں پر اللہ کی لعنت ہے اور حضور ﷺ نے بھی لعنت فرمائی ہے۔ کیوں کہ اس طرح بالوں کو جوڑ کر گویا یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ میرے بال اتنے لمبے ہیں، اس میں ایک طرح کا دھوکہ ہے۔ ہاں! کوئی ایسی چیز لگائی گئی جس سے دھوکے کا شبہ نہیں ہوتا، بلکہ محض زینت مقصود ہے، جیسے: مصنوعی بال لگائے اور لوگ دیکھنے سے پر محسوس کر لیتے ہیں کہ یہ مصنوعی ہیں، تو اس صورت میں فقہاء نے اجازت دی ہے، لیکن محدثین کرام اس سے بھی منع فرماتے ہیں۔

سود کھانے والے پر اللہ کی لعنت

”وَأَنَّهُ قَالَ: ”لَعَنَ اللهُ آكِلَ الرِّبَا“ اسی طرح حدیثِ پاک میں نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کھانے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ دینے والے پر، سود کی گواہی دینے والے پر، اور اس معاملہ کی چٹھی اور ایگریمنٹ لکھنے والے پر۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے مخصوص گناہ کا ارتکاب کرنے والے لوگوں پر لعنت فرمائی ہے۔

”وأَنَّهُ لَعَنَ الْمُصَوِّرِينَ“ کسی بھی جاندار کی تصویر بنانے والے پر بھی نبیٔ کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

زمین کے نشانات بدل دینے والوں پر لعنت

"وأنَّهُ قَالَ: ((لَعَنَ اللهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الأَرْضِ)) أيْ حُدُودَهَا" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی پر بھی لعنت فرمائی جو زمین کے نشانات کو بدل دے۔

لوگوں کی مملوکہ زمینیں اور کھیت کی حد متعین کرنے کے لئے باقاعدہ پتھر وغیرہ کے نشان لگائے جاتے ہیں، جس کو عربی میں "مَنَارُ الأَرْضِ" کہتے ہیں۔ جو لوگ دوسروں کی زمین ہڑپ کرنے والے ہوتے ہیں، وہ ان نشانات کو ہٹا کر اِدھر اُدھر کر دیتے ہیں، ان نشانات کو دیکھ کر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ اس پتھر تک میری زمین ہے، اور اس کے بعد سے دوسرے کی ہے۔ جب اس نشان کو ذرا ہٹا دیا تو ایسا کر کے گویا اس نے دوسرے کی زمین ہڑپ کرنے کی کوشش کی، اور کسی کی زمین ہڑپ کرنا بہت بڑا گناہ ہے، اور اس پر لعنت فرمائی گئی ہے۔ زمین ہڑپ کرنے پر اور بھی وعیدیں آئی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو آدمی کسی کی زمین ہڑپ کر لے، تو قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق بنا کر اس کے گلے میں ڈالا جائے گا۔

چوروں پر اللہ کی لعنت ہو

وأنَّهُ قَالَ:((لَعَنَ اللهُ السَّارِقَ يَسْرِقُ البَيْضَةَ))اور حضور ﷺ نے چور پر لعنت فرمائی ہے۔ ارشاد فرمایا: چور پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جو انڈا چرا تا ہے (بعض روایتوں میں آتا ہے) کہ اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

اب اشکال ہوتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کے لئے تو باقاعدہ نصاب مقرر کیا ہے کہ دس درہم جتنی مقدار یا اس سے زیادہ کی چوری کرے تب ہی ہاتھ کاٹا جائے گا، اور انڈا تو بہت کم قیمت چیز ہے؟ تو اس بارے میں علماء نے بتلایا ہے کہ دراصل چور کے اندر چوری کی جو عادت پڑتی ہے، تو شروعات میں وہ بڑے ہاتھ نہیں مارا کرتا، بلکہ بچپن میں پہلے پہل وہ چھوٹی چھوٹی چوریاں کرتا ہے، جیسے: کسی کا قلم چرا لیا، کسی کی تسبیح یا رومال چرا لیا، کسی کی پنسل اور ربر چرا لیا، اس وقت اس کے مربی کی طرف سے اگر ان چیزوں سے روکا نہیں جاتا، اور اس کے مربی ان چیزوں سے واقف ہونے کے باوجود جب منع نہیں کرتے تو پھر معاملہ آگے بڑھتا ہے، اور پھر دھیرے دھیرے وہ چوری کی لائن میں بڑا نام کماتا ہے۔ بہر حال! چور پر بھی حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے، اس لیے یوں کہا جاسکتا ہے کہ چوروں پر اللہ کی لعنت ہو۔

ماں باپ کو گالی دینے والے پر لعنت

”وأَنَّهُ قَالَ: ((لَعَنَ اللهُ مَنْ لَعَنَ وَالِدَيهِ)) “جو آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت بھیجے یا ان کو گالی دے اس پر بھی حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے لعنت بھیجی ہے۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنے ماں باپ کو گالی دینے کا تذکرہ کیا تو صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: یارسول اللہ! اپنے ماں باپ کو گالی کون دے گا؟ حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: کسی نے دوسرے کو اس کے ماں باپ کی گالی دی، جواب میں اُس نے اِس کے ماں باپ کو گالی دی، تو اپنے ماں باپ پر گالی پڑنے کا ذریعہ اِس کی گالی ہی تو بنی۔ اسی طرح لعنت میں ہو سکتا ہے کہ کسی نے دوسرے کے ماں باپ پر لعنت بھیجی، اس کے جواب میں اُس نے اِس کے ماں باپ پر لعنت بھیجی، تو بتلایا گیا کہ ایسا کرنے والا بھی اللہ کی لعنت کا حقدار ہوتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں تو بعض لوگ اپنے ماں باپ کے ساتھ براہِ راست گالی گلوچ اور لعنت وپھٹکار کا معاملہ کرتے ہیں۔

غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنے والے پر لعنت

وَ((لَعَنَ اللهُ من ذَبَحَ لِغَيْرِ اللهِ)) غیر اللہ کے نام پر جو آدمی جانور ذبح کرے اس پر بھی نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے لعنت فرمائی ہے، اس لیے کوئی بھی حلال جانور ذبح کیا جائے تو وہ اللہ کے نام

پر ہی ذبح ہونا چاہیے۔ زمانۂ جاہلیت میں بتوں کے نام پر جانور ذبح کیے جاتے تھے، جو ایک طرح کا شرک ہے جس پر حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

بدعتی پر لعنت

وَأَنَّه قَالَ: ((مَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثًا أَوْ آوَى مُحْدِثًا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَ الْمَلَائِكَة والنَّاسِ أَجْمَعِينَ))

حضورِ اکرم ﷺ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ جس نے مدینہ منورہ میں کوئی بدعت ایجاد کی، یا کسی بدعتی کو پناہ دی؛ تو اس پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔ گویا بدعت ایجاد کرنے والے پر، یا بدعتی کو پناہ دینے والے پر اور خاص طور پر مدینہ منورہ میں بدعت ایجاد کرنے والے پر حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

واقعۂ بیرِ معونہ اور واقعۂ رجیع

وأنَّه قَالَ: ((اللّٰهُمَّ الْعَنْ رِعْلاً، وَذَكْوَانَ، وعُصَيَّةَ: عَصَوُا اللهَ وَرَسُولَهُ)) وهٰذِهِ ثَلاَثُ قَبَائِلَ مِنَ الْعَرَبِ)) اور حضور اکرم ﷺ نے بددعا کی تھی کہ اے اللہ! رِعْل، ذَکوان اور عُصَیَّہ (یہ تینوں عرب قبائل ہیں) پر لعنت بھیج؛ جنھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی اور ان کا مقابلہ کیا۔

واقعۂ بیرِ معونہ اور واقعۂ رجیع یہ دو واقعے حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں پیش آئے تھے جن کا پہلے بھی کہیں حوالہ آچکا۔ ایک موقعہ پر حضور ﷺ نے دس صحابۂ کرام کو اور بیرِ

معونہ والے واقعہ میں ستّر صحابہ کرام کو۔جو سب کے سب قرآنِ پاک کے حافظ تھے۔خاص مشن کے لئے ایک جگہ پر بھیجا تھا۔ جن لوگوں نے حضور اکرم ﷺ سے درخواست کر کے ان کو بلوایا تھا انہوں نے ہی غداری کر کے بعض مشرک قبائل کو ان کے خلاف بھڑکایا، وہ سب ان کے پیچھے پڑ گئے اور انہوں نے سب صحابہ کو شہید کر دیا، اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی حضور اکرم ﷺ کو اس کی اطلاع دی، تو نبی کریم ﷺ فجر کی نماز میں دو مہینے تک قنوتِ نازلہ پڑھتے رہے اور ان کے لئے بد دعا فرمائی۔ یہاں تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پوری جماعت اور پورے قبیلے پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی۔

مرض الوفات میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے روکا

”وأنَّه قَالَ : لَعَنَ اللهُ اليَهُودَ اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنۡبِيَاءِهِمۡ مَسَاجِدَ“ حضور ﷺ نے وفات کے وقت یہ ارشاد فرمایا تھا۔روایتوں میں آتا ہے کہ جب نبی کریم ﷺ مرض الوفات میں مبتلا تھے اور آپ کی آخری گھڑیاں چل رہی تھیں، اس وقت آپ کی جو کملی اور چادر تھی اس کو آپ کبھی اپنے منھ پر اوڑھ لیتے تھے، پھر جب دم گھٹنے لگتا تو چہرۂ انور کھول دیتے، اس موقعہ پر حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہ) نے سنا کہ آپ اپنی زبانِ مبارک سے فرما رہے تھے کہ یہودیوں پر اللہ کی لعنت جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا دیا یعنی اپنے نبیوں کی قبروں پر سجدہ کرنے لگے اور اس کی پوجا اور عبادت کرنے لگے۔

بخاری شریف کی روایت میں ہے: ”یُحَذِّرُ مَا صَنَعُوا“(۱) ان کے لئے بددعا کرکے آپ ﷺ اپنی امت کو اس حرکت سے بچانا چاہتے تھے جو یہودیوں نے کی۔ گویا دنیا سے تشریف لے جاتے ہوئے حضور اکرم ﷺ کا یہودیوں کی ان حرکت پر بددعا کرنا اپنی امت کو وارننگ اور تنبیہ تھی کہ تم لوگ ایسی حرکت مت کریو۔

زنانے مرد اور مردانی عورتوں پر لعنت

”وأنهُ ((لَعَنَ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّساءِ والْمُتَشَبِّهاتِ مِنَ النِّسَاءِ بالرِّجالِ))“

اور حضور اکرم ﷺ نے ایسے مردوں پر لعنت فرمائی جو عورتوں کے ساتھ مشابہت اختیار کریں، اور ایسی عورتوں پر بھی لعنت فرمائی جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔ یعنی جو مرد عورتوں جیسی وضع قطع، عورتوں جیسی شکل وصورت اور عورتوں جیسی چال ڈھال اور انداز اختیار کریں، جو صفات عورتوں کی شمار ہوتی ہیں ان صفات کو اپنائیں، مثلاً: بالوں میں ایسا طرز اختیار کرلیا جائے جیسا کہ عورتوں کا ہوتا ہے، یا لباس عورتوں جیسا پہن لیا جائے۔ یا جو عورتیں مردوں کی مشابہت اختیار کریں،

(۱) أَنَّ عَائِشَةَ وَعَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ قَالَا لَمَّا نَزَلَ بِرَسُولِ اللهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيصَةً لَهُ عَلَى وَجْهِهِ فَإِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهِ فَقَالَ وَهُوَ كَذَلِكَ: لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُودِ وَالنَّصَارَى اتَّخَذُوا قُبُورَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوا.

مثلاً: مردوں جیسالباس، مردوں جیسا طور و طریق، مردوں جیسے بال، مردوں جیسا انداز اختیار کرنے والی عورتوں پر حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ میں اس کا ترجمہ یوں کرتا ہوں: زنانے مرد اور مردانی عورتوں پر حضور اکرم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

خلاصہ کلام

''وَجَمِيعُ هٰذِهِ الْأَلْفَاظِ فِى الصحيح ؛ بعضُها فى صَحِيحَىِّ البُخارى ومسلمٍ، و بعضهافى أحَدِهِمَا، وإنما قصدت الاختِصَارَ بالإشارةِإِلَيهِمَا، وسأذكر معظمها فى أبوابهامن هٰذَاالكتاب، إن شاء الله تعَالٰى''

علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ: یہ سارے کلمات جو ہم نے نقل کیے ان کے باقاعدہ حوالے نہیں دیئے، اور پوری پوری حدیثیں بھی پیش نہیں کیں، لیکن یہ سب روایتیں صحیح ہیں، اور بعض تو ایسی روایتیں ہیں جو بخاری و مسلم دونوں میں موجود ہیں، اور بعض ایسی ہیں جو ان میں سے کسی ایک میں ہیں۔ اور میں نے تو صرف ایک ایک جملہ پیش کرکے مختصر طور پر اس کی طرف اشارہ کردیا ہے، اور یہ روایتیں اسی کتاب کے دوسرے عنوانات کے ماتحت پہلے بھی آچکی ہیں، یا آئندہ ان شاء اللہ آئیں گی۔

باب تحریم سب المسلم بغیر حقٍ

کسی مسلمان کو ناحق گالی دینا حرام ہے

قَالَ اللہ تَعَالَی: والَّذِینَ یُؤْذُونَ المُؤْمِنِینَ والْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوا، فَقَدِ احْتَمَلُوا بُھْتَاناً وإِثْماً مُبِیناً (الأحزاب:۵۸)

زبان کی حفاظت کا سلسلہ چل رہا تھا اور زبان سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں، ان سے بچنے کے سلسلے میں نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے ارشادات پچھلی کئی مجلسوں سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔ آج نیا عنوان قائم کیا ہے کہ: کسی مسلمان کو ناحق گالی دینا حرام ہے۔ کسی مسلمان کو برا بھلا کہنا، یا کوئی ایسی بات کہنا جس سے اس کی عزت پر آنچ آتی ہو؛ یہ بھی گالی کے حکم ہی میں ہے اور یہ بھی حرام ہے۔ چوں کہ یہ گناہ بھی زبان ہی سے سرزد ہوتا ہے، اس لیے یہاں اسی زبان کی حفاظت کے ماتحت جو چیزیں لا رہے تھے اسی ذیل میں اس کو بھی لائے ہیں۔

پہلے قرآنِ پاک کی آیت پیش کی: اور وہ لوگ جو ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو ایذاء وتکلیف پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہو جو ان کو ایذاء وتکلیف کا حقدار ٹھہراتا ہو- جس کو ناحق کہتے ہیں- ایسے لوگوں نے اپنے سر پر جھوٹ

کا بوجھ اٹھایا ہے (اگر وہ ایذاء قولی اور زبانی ہے) اور (اگر وہ ایذاء فعلی اور ہاتھ سے پہنچی ہو) تو انہوں نے کھلم کھلا گناہ کا بوجھ اپنے سر لیا ہے۔

اس آیت کو لا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ کسی مؤمن مرد یا عورت کو تکلیف پہنچانا- چاہے زبان سے ہو، یا ہاتھ سے ہو، یا کسی اور عضو سے - حرام ہے۔ اور چوں کہ گالی دینا اور بُرا بھلا کہنا زبان ہی سے ہوتا ہے اسی مناسبت سے لائے ہیں۔

مسلمان کو گالی دینا گناہ ہے

حدیث ۱۵۵۹:-

وعن ابن مسعود - رضی الله عنه - قَالَ: قَالَ رسُولُ الله ﷺ: ((سِبَابُ المُسْلِمِ فُسُوقٌ، وَقِتالُهُ كُفْرٌ)) .(متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کو گالی دینا (برا بھلا کہنا، سبّ و شتم کرنا) گناہ ہے، اور اس کے ساتھ لڑنا اور جنگ کرنا کفر ہے۔

افادات:- فسوق یعنی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس کی اطاعت سے اپنے آپ کو نکالنا۔ جیسے کفر ایک بڑا گناہ ہے ویسے ہی مسلمان کے ساتھ جنگ کرنا بھی ایک بڑا گناہ ہے، اور اگر اس کو حلال سمجھ کر کرے گا تو واقعۃً اس کی وجہ سے کافر ہو جائے گا۔

جملہ خود پر ہی لوٹتا ہے

حدیث ۱۵٦۰:-

وعن أبي ذرٍ رضی الله عنه :أنهُ سَمِعَ رسُولَ اللهِ ﷺ يقول: ((لايَرْمِي رَجُلٌ رَجُلاً بِالْفِسْقِ أَوِ الكُفْرِ ،إلاَّ ارْتَدَّتْ عَلَيْهِ ،إنْ لَمْ يَكُنْ صَاحِبُهُ كَذٰلِكَ)) (رواه البخاری)

ترجمہ:-حضرت ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی پر فسق یا کفر کا الزام لگاتا ہے (اور اس کو فسق وکفر سے متہم کرتا ہے) اگر وہ اس کا اہل نہیں ہے تو اس کا کہا ہوا جملہ اسی کی طرف لوٹتا ہے۔

افادات:-یعنی کسی سے یوں کہا: او فاسق ، اے کافر؛ تو یہ بھی ایک طرح کی گالی اور سبّ وشتم ہی ہے، اور گذشتہ باب میں یہ بات آچکی تھی اور اس کی تفصیل بھی بتلادی تھی کہ کسی کے متعلق اگر اس طرح کی بات کی گئی ہے اور وہ اپنے کرتوت یا بد عملی کی وجہ سے اس کا حقدار نہیں ہے تو اس صورت میں کہنے والا اپنی اس بات کے بُرے نتیجہ سے محفوظ نہیں رہ سکتا، گویا اس کے اثرات اور نتائج اسی کو بھگتنے ہوں گے۔

ذمہ داری شروع کرنے والے کی ہے؛ اگر

حدیث ۱۵۶۱:-

وعن أَبِي هريرة رضی الله عنه أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((الْمُتَسَابَّانِ مَا قَالاً ، فَعَلَى الْبَادِي مِنهُمَا حَتَّى يَعْتَدِيَ الْمَظْلُومُ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے کو گالی دینے والے جو بات بھی کہیں گے اس کی ذمہ داری شروع کرنے والے پر ہوگی، یہاں تک کہ جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہ حد سے آگے بڑھ جائے۔

افادات:- یعنی ایک نے پہلے گالی دی، تو اس کے جواب میں سامنے والے نے بھی گالی دی۔ حالاں کہ اگر کوئی آدمی گالی دے اور بُرا سلوک کرے؛ تو اس کو چاہیے تھا کہ عفوو درگزر سے کام لیتا جیسا کہ قرآنِ پاک میں اس کی ترغیب دی گئی ہے: ﴿وَلَمَنْ صَبَرَوَغَفَرَإِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُوْرِ﴾ دوسری جگہ ہے: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ﴾ تمہارے ساتھ اگر کوئی برا سلوک کیا گیا، یا زیادتی کی گئی اور آپ بدلہ لینا چاہتے ہیں تو جتنی زیادتی آپ کے ساتھ کی گئی ہو، اتنا ہی آپ بدلہ لیجیے، اس سے ذرّہ برابر بھی زیادتی اور اضافہ نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر آپ معاف کردیں اور صبر سے کام لیں تو بہت اچھا ہے۔ تو اس کا اصل جواب یہی ہے کہ ہم جواب میں خاموشی اختیار کرلیں، لیکن

اس کے باوجود اگر بدلہ لینا چاہتے ہیں تو اتنی ہی بُری بات جو اس نے کہی ہے؛ ہم بھی کہہ سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ تہمت کے قبیل سے نہ ہو۔ یعنی کسی نے آپ کو ماں کی ایسی گالی دی جس میں ماں پر تہمت کا کوئی جملہ استعمال کیا؛ تو آپ کو اس کے جواب میں تہمت کا جملہ کہنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، لیکن اگر کسی نے آپ کو منافق یا زندیق یا حمار گدھا اور بے وقوف کہا، تو اس کے جواب میں آپ بھی اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہیں، یہاں تک کہ جس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے وہی حد سے آگے بڑھ جائے، یعنی اگر کسی نے آپ کو بے وقوف کہا، تو جواب میں آپ بھی اس کو بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ جواب میں یوں کہیں کہ: تو بے وقوف، تیرا باپ بے وقوف، تیرا بیٹا بے وقوف؛ تو اس صورت میں ظاہر ہے کہ آپ زیادتی کرنے والے ہوں گے، اور زیادتی بہر حال زیادتی ہے، اس صورت میں آپ کو گنہگار قرار دیا جائے گا۔

اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو

حدیث ۱۵۶۲:-

وعنه، قَالَ: أُتِيَ النَّبِيُّ ﷺ بِرَجُلٍ قَدْ شَرِبَ قَالَ: ((اضربوهُ)) قَالَ أَبُو هريرةَ: فَمِنَّا الضارِبُ بِيَدِهِ، والضَّارِبُ بِنَعْلِهِ، والضَّارِبُ بِثَوْبِهِ. فَلَمَّا انْصَرَفَ، قَالَ بَعْضُ القَوْمِ: أَخْزَاكَ اللهُ! قَالَ: ((لا تَقُولُوا هَذَا، لا تُعِينُوا عَلَيْهِ الشَّيْطَانَ)). (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا جنہوں نے شراب پی تھی، نبی کریم ﷺ نے حد جاری کرنے کے طور پر فرمایا: ان کو مارو۔ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: ہم میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے، کسی نے اپنے جوتے سے، کسی نے اپنے کپڑے سے ان کی پٹائی کی۔ جب وہ لوٹنے لگے تو ایک آدمی نے کہا: اللہ تعالیٰ تجھے رسوا کرے۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا مت کہو اور اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو۔

افادات:- شراب پینے پر شروع میں نبی کریم ﷺ مطلقاً پٹائی کا حکم دیا کرتے تھے، بعد میں شریعت کی طرف سے شربِ خمر کی سزا اور حد اسّی کوڑے مقرر کی گئی۔

"اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو" یعنی شیطان تو چاہتا ہے کہ مؤمن کو گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا کر کے اس کی رسوائی کے مواقع فراہم کرے۔ اور جب تم اس کو یہ بد دعا دے رہے ہو اور یوں کہہ رہے ہو کہ اللہ رسوا کرے، تو گویا تم اپنے بھائی کے مقابلہ میں شیطان کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہو اور اس کی مدد کر رہے ہو؛ ایسا مت کرو بلکہ اپنے بھائی کی اس سے حفاظت کی دعا کرنی چاہیے۔

تہمت لگانے والے آقا کی سزا

حدیث ۱۵۶۳:-

وعنه، قَالَ : سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول:((مَنْ قَذَفَ مَمْلُوكَهُ بِالزِّنَا يُقَامُ عَلَيْهِ الحَدُّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، إِلاَّ أَنْ يَكُونَ كَمَا قَالَ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے اپنے غلام پر زنا کی تہمت لگائی تو قیامت کے دن اس پر حد جاری کی جائے گی؛ الّا یہ کہ وہ غلام ایسا ہی ہو جیسا کہ کہا ہے۔

افادات:- اگر کسی آدمی نے کسی پاکدامن عورت، یا مرد - جس نے زنا کا ارتکاب نہیں کیا ہے، اس - پر زنا کی تہمت لگائی؛ تو تہمت لگانے والے کو سزا کے طور پر اسّی کوڑے لگائے جاتے ہیں، اور اگر غلام پر تہمت لگائی تو چالیس کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ اور آقا نے اگر اپنے غلام پر تہمت لگائی اور یہ معاملہ حاکم کے پاس پہنچ بھی جائے، تو اسی کا غلام ہونے کی وجہ سے آقا کو دنیا میں سزا نہیں دی جاتی، لیکن قیامت میں اللہ تعالیٰ اس پر سزا جاری کریں گے، الّا یہ کہ وہ غلام ایسا ہی ہو۔ یعنی اس پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ درست تھی، تو قیامت میں آقا کو یہ سزا نہیں ملے گی۔

باب تحریم سبّ الأموات بغیر حق ومصلحةٍ شرعیة

وَهِيَ التَّحْذِيرُ مِنَ الاقْتِدَاءِ بِهِ فِي بِدْعَتِهِ وَفِسْقِهِ، وَنَحْوِ ذَلِكَ

وَفِيهِ الآيَةُ والأحاديثُ السَّابِقَةُ فِي البَابِ قَبْلَهُ.

مُردوں کو بُرا بھلا مت کہو

جو لوگ انتقال کر چکے ہیں ان کو ناحق اور کسی شرعی مصلحت کے بغیر بُرا بھلا کہنا، ان کی شان میں کوئی ایسی بات کہنا جو ان کے لیے تنقیص کا ذریعہ ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ ہاں! اگر شرعی مصلحت کا تقاضا ہو کہ اس کی کسی بات کو ظاہر کیا جائے جیسے: اس مرنے والے نے کوئی ایسا مضمون لکھا تھا جو بدعت کی ترویج اور بدعت کو پھیلانے کا ذریعہ بن رہا تھا، اب اگر اس کے اس مضمون کا جواب لکھا جائے، اس نے جو باتیں لکھی ہیں ان کی تردید دلائل کے ذریعہ کی جائے،، تو اس کی اجازت ہے، ہاں! اس کی ذات پر کچھ نہ لکھا جائے۔ اس لیے کہ اگر اس کا جواب نہیں دیا جائے گا تو دوسرے لوگ بدعت کے معاملہ میں اس کی پیروی کریں گے۔ یہاں کوئی آدمی اگر یوں کہے کہ وہ تو انتقال کر چکا ہے، اب آپ اس کے متعلق ایسی بات کیوں لکھتے ہیں؟ تو کہا جائے گا کہ شرعی مصلحت کا تقاضہ ہے کہ لکھا جائے، اور اس کی شریعت نے اجازت بھی دی ہے۔

یا کوئی آدمی فاسق وفاجر تھا اور غلط نظریے لوگوں میں پھیلا رہا تھا اور اس کے غلط نظریے کی ترویج ہو رہی ہے، لوگ اس کی ان غلط چیزوں کو مان رہے ہیں، جیسے: غلام احمد قادیانی جھوٹا مدعی نبوت تھا، تو اس کی تردید لازم اور ضروری ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ وہ تو مر چکا ہے، اس کی برائی کیوں کی جائے؟ تو ظاہر ہے کہ اس کی برائی اس لیے کی جاتی ہے کہ لوگ اس کی اقتداء سے بچ جائیں، اس لیے اگر اس کی ان برائیوں کو ظاہر کیا جائے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

وہ اپنے اعمال تک پہنچ چکے ہیں

حدیث ۱۵۶۴:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها قالت: قَالَ رسُولُ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لاتَسُبُّوا الأَمْوَاتَ، فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا.)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہ) فرماتی ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ انتقال کر چکے ہیں انہیں برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ انہوں نے جو اعمال آگے بھیج دیئے، وہ اپنے ان اعمال تک پہنچ چکے ہیں۔

افادات:- یعنی وہ اس عالم میں پہنچ چکے ہیں جہاں ان کے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا، اب آپ اپنی زبان کو ان کے ان کرتوتوں کا تذکرہ کرکے ملوث نہ کریں۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے

حضور جاچکے ہیں، اور انہوں نے بھلا یا برا جو کچھ بھی کیا ہے اس کا بدلہ ان کو وہاں مل جائے گا؛ اب ان کے لئے ہم اپنی زبان کو کیوں خراب کریں؟ اس لیے اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

مُردوں کی برائی سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے

اور مردوں کی برائی کی وجہ سے زندوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے۔

سیرت کی کتابوں میں واقعہ لکھا ہے کہ فتح مکہ کے موقعہ پر نبیٔ کریم ﷺ نے اہل مکہ کے متعلق عام معافی کا اعلان کیا تھا، البتہ گیارہ مرد اور چار عورتیں ایسی تھیں جن کے متعلق نبیٔ کریم ﷺ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ ان کو قتل کر دیا جائے، ان کے لئے امان نہیں تھی، ان گیارہ مردوں میں حضرت عکرمہ (رضی اللہ عنہ) (ابو جہل کے بیٹے) بھی تھے، چوں کہ وہ بھی اپنے باپ کی طرح نبیٔ کریم ﷺ کے بڑے دشمن تھے۔ فتحِ مکہ کے موقعہ پر جن لوگوں کو امان نہیں دی گئی تھی ان میں یہ بھی تھے، جب ان کو پتہ چلا تو وہ وہاں سے یمن کی طرف بھاگ گئے اور یمن جاکر ایک کشتی میں سوار ہوئے، ان کا ارادہ یہ تھا کہ یہاں سے حبشہ یا کسی دوسرے ملک چلے جائیں تاکہ جان بچ جائے۔ کشتی ابھی تھوڑی دور ہی چلی تھی کہ طوفان میں گھِر گئی، یہ مدد کے واسطے لات اور عزّیٰ کو پکارنے لگے تو کشتی چلانے والے نے کہا: لات اور عزّیٰ کو پکاروگے تو کچھ کام نہیں بنے گا، ایک اللہ کو پکارو؛ تب ہی مسئلہ کچھ حل ہو سکتا

ہے۔ انہوں نے اپنے دل میں سوچا کہ جب یہاں سمندر میں ایک اللہ ہی نجات دے سکتا ہے اور اسی کو پکارا جاسکتا ہے؛ تو خشکی میں بھی اسی کو پکارنا چاہیئے اور انہوں نے دل ہی دل میں عہد کرلیا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مخمصہ و مصیبت سے نجات دیدی تو میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دوں گا اور اپنے شرک و کفر سے توبہ کرلوں گا اور ایمان لے آؤں گا، چناں چہ کشتی طوفان سے بچ گئی اور ساحل پر پہنچ گئی۔

اُدھر ان کی بیوی امّ حکیم (رضی اللہ عنہ) بنت حارث بن ہشام جو ان کی چچازاد بہن تھی، اس لیے کہ ابو جہل کا نام عمرو بن ہشام ہے، اور اس کے بھائی حارث بن ہشام کی یہ بیٹی تھی، جب یہ ایمان لے آئیں اس کے بعد انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں درخواست کی کہ آپ میرے شوہر عکرمہ کو امان دیدیں۔ چناں چہ نبی کریم ﷺ نے ان کی درخواست قبول فرمالی اور حضرت عکرمہ (رضی اللہ عنہ) کو امان دیدی۔ اور ان کو معلوم تھا کہ میرے شوہر بھاگ کر یمن جاچکے ہیں، چناں چہ یہ اس امان کی اطلاع لے کر ان کی تلاش میں یمن کی طرف نکلیں، جب وہاں پہنچیں اور اپنے شوہر سے کہا کہ: میں ایک ایسی شخصیت کے پاس سے آرہی ہوں جو ''أَبَرُّ النَّاسِ وَأَوْصَلُ النَّاسَ وَخَيْرُ النَّاسِ'' ہیں، یعنی لوگوں میں سب سے زیادہ نیکوکار، اور سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے اور سب سے زیادہ بھلائی کرنے والے ہیں، اور میں نے ان سے آپ کے لیے امان حاصل کرلی ہے؛ اس لیے آپ واپس چلیئے اور اپنے گناہوں اور قصوروں سے توبہ کیجیے۔ چنانچہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ واپس

ہوئے۔ راستہ میں ان سے صحبت کرنے کا ارادہ کیا تو بیوی نے ان کو روک دیا کہ تم کافر ہو اور میں مسلمان ہوں، تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ انہوں نے کہا: کوئی بہت بڑی چیز ہے جو تم کو میرے ساتھ صحبت کرنے سے روک رہی ہے۔

خیر! میں جو بات بتلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے اور حضور اکرم ﷺ کو معلوم ہوا کہ وہ آرہے ہیں تو حضور کی مجلس میں پہنچنے سے پہلے ہی آپ نے صحابہ کو بتلایا: "سَيَأْتِيكُمْ عِكْرِمَةُ مُؤْمِناً، فَلَا تَسُبُّوا أَبَاهُ . فَإِنَّ سَبَّ الْمَيِّتِ يُؤْذِي الْحَيَّ" عکرمہ مؤمن ہو کر آرہے ہیں، لہٰذا تم ان کے باپ کو گالی مت دینا اور بُرا بھلا مت کہنا؛ اس لیے کہ مُردوں کو برا بھلا کہنا زندوں کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ یہاں بتلانا یہ ہے کہ جس کو گالی دینے سے منع کیا جارہا ہے وہ ابو جہل تھا۔ جس کو "فِرْعَوْنُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ" کہا گیا ہے، اور جو نبی کریم ﷺ کا سب سے بڑا دشمن تھا، اس کے باوجود جب وہ مر چکا تو حضور ﷺ نے صرف اس لیے اس کو برا بھلا کہنے سے منع فرما دیا کہ جب اس کو بُرا بھلا کہا جائے گا تو اس کا اثر زندوں پر پڑے گا۔

مناقبِ عکرمہ

پھر حضرت عکرمہ (رضی اللہ عنہ) حضور اکرم ﷺ کے قریب آئے تو ان کی بیوی امّ حکیم (رضی اللہ عنہ) نقاب ڈال کر برابر میں کھڑی ہو گئی، اور حضرت عکرمہ (رضی اللہ عنہ) نے

حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے سوال کیا کہ: انہوں نے مجھے بتلایا ہے کہ آپ نے مجھے پناہ دی ہے؛ کیا یہ بات صحیح ہے؟ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جی ہاں! میں نے تم کو امان دی ہے۔ پھر انہوں نے عرض کیا: آپ کس چیز کی دعوت دیتے ہیں؟ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: میں اس بات کی دعوت دیتا ہوں کہ اس بات کی گواہی دو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، اور میں اللہ کا رسول ہوں، اور نماز قائم کرو، روزے رکھو، زکوٰۃ ادا کرو۔ حضرت عکرمہ (رضی اللہ عنہ) نے اسی وقت کلمہ پڑھ لیا اور ساتھ ہی ساتھ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے سامنے فرمایا کہ: میں ان سب لوگوں کی موجودگی میں آپ سے اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ آج تک میں نے لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے جتنا مال خرچ کیا ہے؛ آئندہ اس سے دوہرا مال لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے کے لئے اللہ کے راستہ میں خرچ کروں گا۔ اور اللہ اور اس کے رسول کے خلاف جتنی جنگیں کی ہیں؛ آئندہ اُس سے ڈبل جنگیں میں اللہ اور اس کے رسول کے راستہ میں کروں گا۔ اور جہاں جہاں جاکر میں نے لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کے دین سے روکا تھا؛ وہاں وہاں جاکر میں لوگوں کو اس کی دعوت دوں گا۔ چناں چہ اخیر تک وہ برابر اس پر عمل پیرا رہے۔

نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت میں مرتدین کے فتنہ کو دفع کرنے کے لئے حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) نے لشکر کی جو مختلف ٹکڑیاں تیار کی تھیں، ان میں ایک لشکر کا امیر حضرت عکرمہ بن ابی جہل کو بنایا تھا۔ ان

کی حالت بڑی عجیب تھی کہ جب بھی قرآنِ پاک ہاتھ میں لیتے تھے تو یہ کہتے ہوئے ”هٰذَا كِتَابُ رَبِّي، هٰذَا كِتَابُ رَبِّي“ بے ہوش ہو جاتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) ہی کے دورِ خلافت میں واقعہ اجنادین میں شہید ہوئے۔

حاصل کلام

میں تو یہ عرض کر رہا تھا کہ جب حضور اکرم ﷺ ابو جہل جیسے آدمی کی برائی کرنے کی اجازت نہیں دیتے؛ تو پھر دوسرے مسلمان جو دنیا سے جا چکے ہیں ان کی برائی کرنے کی کیسے اجازت ہو گی؟ آج کل ہمارے معاشرہ میں یہ عادت بہت عام ہو چکی ہے کہ جو دنیا سے جا چکے ہیں ان پر بھی زبان درازیاں کی جاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں آپس میں شدید اختلافات، سخت پھوٹ پھاٹ اور شقاق و نفاق پیدا ہوتا ہے۔ حالاں کہ شرعاً اس کی بالکل اجازت نہیں ہے۔

باب النھی عن الایذاء

کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت

قَالَ اللہ تَعَالَیٰ : والَّذِینَ یُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِینَ والْمُؤْمِنَاتِ بِغَیْرِ مَا اکْتَسَبُوا، فَقَدِ احْتَمَلُوا بُھْتَاناً وإِثْماً مُبِیناً (الأحزاب:۵۸)

نیا باب قائم کیا جس کا عنوان ہے: **"کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت"**۔

کسی کو تکلیف پہنچانا، چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم ہو، بلکہ جانوروں تک کو تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا ہے۔ اگر کوئی جانور ہمیں ایذاء پہنچاتا ہے تب تو اس کی ایذا سے بچنے کے لئے کوئی مناسب تدبیر اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ورنہ اس کے بغیر کسی جانور کو بھی بلاوجہ تکلیف دینا جائز نہیں ہے، چہ جائیکہ انسان کو پہنچائی جائے۔

پہلا شعبہ: عبادات

دیکھئے! شریعت نے جو احکامات دیئے ہیں اصولی طور پر ان کو چار شعبوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ ایک شعبہ عبادات کا ہے، جس میں بندہ کا تعلق اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ رہتا ہے، اس کو مد نظر رکھ کر بندہ کے اس رشتہ اور تعلق کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط کرنے کے لئے

مختلف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی شکل میں بتلائے گئے ہیں؛ یہ عبادات کا شعبہ کہلاتا ہے۔ اور دین صرف عبادات ہی تک محدود نہیں، ہم لوگوں نے اپنی کم علمی اور ناسمجھی کی وجہ سے دین کو صرف عبادات تک محدود سمجھا ہوا ہے، ایک آدمی اگر نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، نوافل، تسبیحات، تلاوت کا اہتمام کرتا ہے، تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ مَیں پورے دین پر عامل ہوں، حالاں کہ دین صرف عبادات کا نام نہیں ہے، عبادات تو دین کے چار حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔ اب اگر کوئی آدمی پابندی سے نماز پڑھتا ہے تو عبادات کے اندر بھی جو چار قسمیں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ تھیں ان میں سے ایک کو اس نے لیا ہے، گویا دین کا چوتھائی حصہ عبادات ہے، پھر اس کا بھی چوتھائی حصہ، یعنی سولہواں حصہ، اور وہ بھی صرف نماز کی پابندی کر کے سمجھنا کہ میں پورے دین پر عمل کرتا ہوں؛ اس سے بڑی غلط فہمی کیا ہو سکتی ہے؟ اور دین کی اس سے زیادہ غلط تعبیر اور کیا کی جا سکتی ہے؟۔

بہر حال! ایک شعبہ عبادات کا ہے جو اپنی جگہ پر بڑا اہم ہے۔ اور میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ دین کے تمام شعبے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، کسی بھی ایک شعبے کی کمی دوسرے پر اثر انداز ہوگی۔ اس لیے آدمی کسی ایک شعبہ کو اختیار کر کے اگر یوں سمجھے کہ میں پورے دین کو اختیار کئے ہوئے ہوں؛ تو یہ اس کی نادانی اور جہالت کی بات ہے۔

دوسرا شعبہ: اخلاق

دوسرا شعبہ اخلاق کا ہے یعنی آدمی کے دل میں مال کی محبت نہ ہو، دنیا کی محبت نہ ہو، کبر نہ ہو، غرور نہ ہو اور حسد نہ ہو، کینہ نہ ہو، اچھے اخلاق اس کے اندر ہوں، زہد اور دنیا سے بے رغبتی ہو، تواضع وانکساری ہو، یہ سارے دل کے اوصاف ہیں، ان کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ یہ بھی دین کا ایک شعبہ ہے۔ آج کل تو کوئی آدمی کسی سے ہنس مکھ بات کرلے تو اسی کو اخلاق سے تعبیر کیا جاتا ہے حالانکہ اخلاق سے اس کو کوئی تعلق نہیں۔

تیسرا شعبہ: معاملات

تیسری چیز معاملات ہے۔ کوئی چیز کسی سے خریدی یا کسی کو بیچی، کسی سے کرایہ داری کا کوئی معاملہ کیا، گروی رکھنے کا کوئی معاملہ کیا اور بھی جتنے معاملات ہیں، ان میں اگر کوئی آدمی کمزور ہے تو اس کا اثر بھی پورے دین کے اوپر پڑتا ہے۔ اگر حلال وحرام کے اندر کوئی تمیز نہیں کی جاتی، کوئی آدمی اگر حرام استعمال کرتا ہے تو اس کی کوئی عبادت اور دعا قبول نہیں ہوگی۔

عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں تو یہاں تک ہے کہ کسی آدمی نے دس درہم کا کوئی کپڑا خریدا، اوراس میں نو درہم حلال کے ہیں اور ایک درہم حرام کا ہے، توجب تک وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے گا تب تک اس کی کوئی عبادت نفل یا فرض قبول نہیں ہوگی۔ اس

سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ معاملات کی کتنی اہمیت ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم عبادات کا اہتمام کرتے ہیں اور پھر معاملات کی طرف سے غفلت برتتے ہیں تو جیسا کہ میں نے اوپر کہا کہ دین کے تمام شعبے ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں، اس لیے معاملات کی کمی کوتاہی اس کی عبادات کو بیکار کر دے گی۔

چوتھا شعبہ: معاشرت

چوتھا شعبہ معاشرت کا ہے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ وہ تنہا زندگی نہیں گزار سکتا، جب پیدا ہوتا ہے تو ماں باپ ہوتے ہیں، بھائی بہن ہوتے ہیں، پھر بڑا ہونے کے بعد شادی ہوتی ہے تو بیوی بچے وغیرہ دوسرے رشتہ داروں سے، پاس پڑوس میں رہنے والوں سے۔ اور کاروباری نسبت سے جب باہر نکلتا ہے تو دوسرے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، تو ان تمام لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟ اس میں بنیادی تعلیم یہ ہے کہ ایسا انداز اختیار کیا جائے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے؛ یہی معاشرت کی بنیاد ہے۔

معاشرت کا مطلب یہی ہے کہ زندگی میں جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، چاہے وہ ماں باپ ہوں، بیوی بچے ہوں، دوست احباب ہوں، یا کاروباری لائن کے دوست احباب ہوں؛ غرض یہ کہ جن جن لوگوں کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے، آدمی ان سبھی کے ساتھ ایسا رویہ اور انداز اختیار کرے کہ اس کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اور اس سلسلہ میں شریعتِ

مطہرہ نے قرآن و احادیث کے اندر بے شمار تعلیمات کے ذریعہ ایسی ہدایتیں دی ہیں کہ آدمی اگر ان ہدایتوں کو اختیار کرے تو ان شاء اللہ اس کی معاشرت کامیاب ہو سکتی ہے۔

اور یہ معاشرت کا شعبہ بھی بڑا اہم ہے۔ ہمارے اکابر میں حضرت حکیم الامت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ اس کی طرف بڑی توجہ دلایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ مجھ سے بیعت کا تعلق رکھنے والوں میں سے کسی نے اگر معمولات میں کوتاہی کی ہے تو اس سے دل کو تکلیف تو ہوتی ہے کیوں کہ اس کی وجہ سے اس کا نقصان ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی آدمی کسی دوسرے کو تکلیف پہنچاتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے متعلق دل میں ایک نفرت سی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس نے دوسرے کو تکلیف پہنچائی!

دوسروں کو تکلیف پہنچنے کے کچھ نمونے

یہاں علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے یہی باب قائم کیا ہے: ایذاء اور تکلیف پہنچانے کی ممانعت کا بیان۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے۔ ہم لوگ اعمال و افعال اور اپنے اقوال اور اپنی حرکتوں کے ذریعہ سے بہت سی مرتبہ نادانی میں بلکہ نادانستگی میں ایسا کچھ کر ڈالتے ہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے:-

بیچ راستہ میں ٹھہر کر باتیں کرنا

(۱) ایک آدمی اسکوٹر لے کر جارہا ہے اور سامنے دوسرا دوست اسکوٹر پر سوار ملا اور دونوں کو کچھ بات کرنی ہے تو وہیں بیچ راستہ میں دونوں نے اپنے اسکوٹر کھڑے کر دئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ تو یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم بات چیت کر رہے ہیں، ابھی دو منٹ میں بات ختم ہو جائے گی، لیکن اس کی وجہ سے اِدھر بھی ٹریفک جام ہو گیا، اُدھر بھی ٹریفک جام ہو گیا؛ اس طرح صرف ایک آدمی کو نہیں، بلکہ بے شمار آدمیوں کو تکلیف ہو گئی۔

بے تکی پارکنگ

(۲) آپ نے اپنا اسکوٹر یا اپنی گاڑی بے تکی پارک کر دی جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کے لئے وہاں سے گزرنا مشکل ہو گیا، تو اس سے کتنے لوگوں کو تکلیف ہو گی، اور ایسے لوگوں کو تکلیف ہو گی کہ ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہماری اس حرکت سے کن لوگوں کو تکلیف پہنچی ہے، پھر بعد میں اگر ہمیں احساس بھی ہو کہ واقعۃً مجھ سے یہ بہت غلط ہوا اور لوگوں کو تکلیف پہنچی، اب اگر معافی بھی مانگنا چاہیں تو جن لوگوں کو تکلیفیں پہنچی ہیں وہ تو ہمارے علم میں نہیں ہیں، اور ہم جانتے بھی نہیں ہیں؛ تو پھر کہاں کہاں معافی مانگنے کے لئے جائیں گے۔ ہم سے یہ ایک ایسا گناہ ہو گیا ہے جس کی ہم سے تلافی ممکن ہی نہیں ہے۔

راستہ میں پنڈال

(۳)شادی کے موقعہ پر اس طرح پنڈال (منڈپ) باندھنا کہ آنے جانے والوں کے لئے راستہ بند ہو جائے۔ حالاں کہ راستہ ایک ایسی چیز ہے جس سے کسی کو روکا نہیں جاسکتا۔ بعض مرتبہ شہروں کے اندر تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک اجنبی آدمی سواری لے کر آیا اور یہاں دیکھتا ہے کہ راستہ بند ہے، اب اس کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ دوسرا راستہ کہاں ہے جس کی وجہ سے اس کے گھنٹوں بے کار گزر جاتے ہیں، اور جس کام کے لئے آیا اس کا وہ کام رہ جاتا ہے۔ بعض مرتبہ سفر کے لئے کہیں آگے جانا ہے اور گاڑی چھوٹ جاتی ہے۔ بعض مرتبہ کسی دفتری کام کے لئے آیا ہے اور وہاں پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی اور دفتر بند ہو جاتا ہے۔

آپ لوگوں کو تو اس طرح کے حالات سے واسطہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ جیسے: گنپتی وغیرہ کے موقع پر ایسا ہوتا ہے کہ اس گلی سے گذرو، تو وہاں راستہ بند ہے، دوسری گلی میں جاؤ، تو وہاں بھی یہی حال ہے، اور اس کی وجہ سے ٹریفک الگ جام ہو جاتا ہے۔ اب اگر یہی حرکت کوئی مسلمان بھی کرنے لگ جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ حالاں کہ شریعت ہمیں ایسی تعلیم دیتی ہے کہ ایک مسلمان اس طرح سے زندگی گزارے کہ اس کی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف پہنچنی ہی نہیں چاہیے۔ کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا حرام اور کبیرہ گناہ ہے، اور آج ہم نے اس کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

زور سے ٹیپ بجانا

(۴) آپ اپنے گھر میں ٹیپ ریکارڈ بجا رہے ہیں، آپ نے تو کسی مولانا صاحب کی تقریر کی کیسٹ ڈال دی اور آپ یوں سمجھ رہے ہیں کہ میں نیکی کا کام کر رہا ہوں، اور اتنی زور سے بجارہے ہیں کہ برابر میں جس کا مکان ہے وہاں ایک آدمی بیمار ہے، اس کو رات بھر نیند نہیں آئی اور وہ نیند لانے کے لئے کوشش کر رہا تھا اور آپ نے یہ حرکت کی جس کی وجہ سے اس کی نیند میں حرج ہو رہا ہے، اگر آپ کو ٹیپ ریکارڈ ہی بجانا ہے تو آپ ایسے انداز سے بجاتے کہ آپ خود سن سکتے، دوسروں کو اس میں شریک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ نیکی نہیں ہے بلکہ نیکی کی نمائش ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی ایذاء رسانی ہے۔

میں نے یہ چند نمونے پیش کئے کہ بہت سی مرتبہ آدمی کسی کام کو نیکی سمجھ کر کرتا ہے اور حقیقت میں وہ گناہ ہوتا ہے، گویا آج ہم نے نیکی اور گناہ میں فرق کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔

معاشرت کو درست کرنے والی تعلیم

امام نووی نور اللہ مرقدہٗ نے باری تعالیٰ کا ارشاد پیش کیا ہے: جو لوگ ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسی حرکت کی ہو تو یقیناً ایسے لوگوں نے جھوٹ اور کھلا ہوا گناہ اُٹھایا ہے۔ مطلب یہ ہے جس کو تکلیف

پہنچارہے ہو اس نے کوئی ایسی حرکت کی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسی ایذاءرسانی کا حقدار ٹھہراتھا، مثلاً: اس نے آپ کو مارا اور آپ بدلہ کے طور پر اس کے ساتھ اتناہی معاملہ کر رہے ہیں تو اس کی تو شریعت نے اجازت دی ہے، لیکن اگر اس نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے اس کو تکلیف پہنچائی جاسکے اس کے باوجود آپ اس کو اگر زبان سے تکلیف پہنچاتے ہیں تو یہ بہتان کا ارتکاب ہوا، اور اگر عمل سے تکلیف پہنچاتے ہیں تو وہ کھلم کھلا گناہ کے اندر داخل ہے۔یہ آیت لاکر بتلاناچاہتے ہیں کہ کسی کو بھی تکلیف پہنچانے کی ممانعت صرف حدیث ہی میں نہیں بلکہ قرآنِ پاک کی آیت سے بھی ثابت ہے۔اور جیسا کہ میں نے عرض کیا معاشرت کو درست کرنے کے سلسلہ میں نبیٔ کریم ﷺ نے بے شمار ہدایات دی ہیں ۔روایتوں میں آتاہے کہ اگر تین آدمی ہوں تو ایک کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں، اس لئے کہ جب دوآدمی آپس میں سرگوشی کریں گے تو تیسرے آدمی کو تکلیف پہنچے گی، وہ یوں سمجھے گا کہ میرے متعلق تو کوئی بات نہیں کر رہے ہیں۔

اُس زمانہ میں عام طور سے لوگ ہتھیار ساتھ لے کر چلتے تھے، اور لوگوں کے پاس تیر اور ترکش ہوا کرتے تھے (ترکش یعنی چمڑے کا وہ تھیلا جس میں تیر رکھے ہوئے ہوتے ہیں) اب اگر تیر اس تھیلے میں رکھے ہوئے ہیں تب تو ٹھیک ہے، لیکن بعض مرتبہ آدمی کسی ضرورت کے پیشِ نظر تیر نکال کر چلتاہے، تو حدیث میں آتاہے کہ آدمی اگر کسی مجمع میں سے گزر رہاہو تو تیر کے نوکیلے حصہ کو سامنے کر کے نہ چلے، اسی طرح نیزے کو بھی سامنے کر

کے نہ چلے؛ بلکہ تیر اور نیزے کو جھکا کر چلے، یعنی اس کا نوک والا حصہ جھکا ہوا ہو، اگر سامنے کر کے چلے گا تو جو آدمی دور سے آرہا ہے اگر چہ آپ نے اس کو نیزہ نہیں مارا، لیکن وہ ڈر محسوس کرے گا۔ جیسے: بہت سی مرتبہ آپ نے دیکھا ہو گا کہ سائیکل یا اسکوٹر پر کوئی آدمی لمبا پائپ لے کر جا رہا ہوتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہمیں ڈر محسوس ہوتا ہے کہ شاید لگ نہ جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کوئی بھی ایسی حرکت اور ایسا کوئی بھی انداز اختیار کرنا جس سے سامنے والے کو صرف خطرہ اور اندیشہ پیدا ہو کہ شاید مجھے لگ جائے گا؛ اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ معلوم ہوا کہ اس بات کا بھی اسلام نے کتنا خیال رکھا ہے اور نبی کریم ﷺ بھی اس کا بہت زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات کے بعد بھی ہم ان چیزوں کی طرف توجہ نہ کریں؛ تو اس سے زیادہ نادانی اور کیا ہو سکتی ہے!۔

اور معاشرت کی درستگی کے سلسلہ میں حضور ﷺ کی جو ہدایتیں ہیں ان میں بعض تو جزوی ہیں، اور بعض اصولی حیثیت رکھتی ہیں۔ چناں چہ علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے یہاں دو روایتیں پیش کی ہیں اور دونوں اصولی حیثیت کی حامل ہیں۔

اسلام کی بنیادی تعلیم

حدیث ۱۵۶۵:-

وعن عبداللّٰہ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) قال قال رسول اللّٰہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم: ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ. وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ)). (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی ایذا رسانیوں سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ہر ایسی چیز کو چھوڑ دے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

افادات:- لفظ ''مسلم'' کا مادّہ (سین □ ، لام □ ، میم □) یعنی سلامتی ہے، اسی سے لفظ مسلمان بنا ہے، معلوم ہوا کہ مسلمان کے ہاتھ اور زبان کی ایذاء رسانیوں سے دوسرے لوگ محفوظ ہوں گے۔ اور یہاں زبان کا تذکرہ پہلے ہے، اس لئے کہ زبان سے گالی بھی دے سکتے ہیں، تہمت بھی لگا سکتے ہیں، غیبت بھی کی جا سکتی ہے، ٹھٹھا مذاق اور استہزاء بھی کیا جا سکتا ہے، یہاں تک کہ زبان نکال کر کسی کو اس طرح بتانا (چڑانا) جس سے سامنے والے کو تکلیف ہو تو یہ بھی زبان سے پہنچائی جانے والی تکلیفوں میں داخل ہے مطلب یہ ہے کہ زبان سے تکلیف پہنچانے کے جتنے بھی طریقے ہو سکتے ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسرے اعضاء سے تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پائوں

سے لات مارنا جائز ہو، بلکہ دوسروں کو تکلیف پہنچانے کے لئے عام طور پر یہی دو اعضاء ”زبان اور ہاتھ“ زیادہ استعمال کئے جاتے ہیں، اگر کچھ طاقت ہو تو ہاتھ؛ ورنہ زبان استعمال کی جاتی ہے۔ اور زبان ایک ایسی چیز ہے کہ ہاتھ میں طاقت ہو یا نہ ہو، اگر کوئی اس کو استعمال کرے تو کوئی بھی روک نہیں سکتا اس لئے زبان کو پہلے ذکر کیا کہ عام طور پر جس کا ہاتھ نہیں چلتا اس کی زبان زیادہ چلتی رہتی ہے۔ تو زبان کی ایذاء رسانیوں سے بھی اپنے آپ کو بچانا ضروری ہے اور ہاتھ کی تکلیفوں سے بھی بچنا نہایت ضروری ہے۔ اور ہاتھ کے اندر دیگر تمام اعضاء آ گئے۔

شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری

اور مسلمان کا تذکرہ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر مسلموں کو تکلیف پہنچانا جائز ہے، بلکہ ہم اس ملک میں غیر مسلموں کے ساتھ رہتے ہیں تو اس ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہاں کے شہری ہونے کی حیثیت سے یہاں کی حکومت کے ساتھ اور یہاں کے رہنے والوں کے ساتھ عملی اور قانونی طور پر بھی ہمارا معاہدہ ہے کہ ہماری ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچے گی۔ آج کل تو اسکول کی کتابوں میں شروع ہی میں لکھا ہوتا ہے کہ مَیں اس ملک کا شہری ہوں، کسی کو میری ذات سے تکلیف نہیں پہنچے گی۔ یہ ایک بنیادی تعلیم ہے، اور اسلام بھی اس کو بہت زیادہ اہمیت دیتا ہے۔

مَیں دعویدار بنوں گا

اور مسلمان کا تذکرہ اس لئے بھی کیا گیا کہ عام طور پر مسلمان کی بود و باش اور رہن سہن مسلمانوں کے ساتھ ہی ہوتا ہے، جیسا کہ مسلمانوں کے محلے ہوتے ہیں۔ تو جن کے درمیان میں آدمی رہتا ہے عام طور پر انہیں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ تو جس طرح کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا ناجائز اور حرام ہے، اسی طرح کسی غیر مسلم کو بھی تکلیف پہنچانا ناجائز اور حرام ہے، بلکہ اگر وہ غیر مسلمین اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوں تو ان کو تکلیف پہنچانے کا معاملہ اور زیادہ خطرناک ہوجاتا ہے، اس لیے کہ اُن کے متعلق تو حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم ﷺ یہاں تک فرماتے ہیں کہ کسی غیر مسلم کے ساتھ اگر کسی مسلمان نے تکلیف پہنچانے کا معاملہ کیا تو قیامت کے دن مَیں اس کی طرف سے دعویدار بنوں گا (ابوداؤد شریف) اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو کتنی اہمیت دی گئی ہے۔

بہر حال! اسلام کی بنیادی تعلیم ہے کہ کسی کو ہماری ذات سے کسی بھی طرح سے تکلیف نہ پہنچے۔ نبی کریم ﷺ نے اصولی طور پر بتلادیا کہ ایسا آدمی کامل مسلمان کہلانے کا حقدار ہی نہیں جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے۔ ویسے یہ بات نہیں ہے کہ اگر کوئی آدمی تکلیف پہنچائے گا تو وہ اسلام سے نکل جائے گا، کوئی بھی اس کے کافر یا غیر مسلم ہونے کا فتویٰ نہیں

دے گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے جب آپ کو ”مسلم“ کا اتنا بہترین لقب دیا ہے تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ کی ذات سے ہر ایک کو امن وامان اور سلامتی ملنی چاہیے۔

شرعی ہجرت

”ہجرت“ کے معنیٰ ہیں ”چھوڑنا“۔ شریعت کی اصطلاح میں ہجرت اس کو کہتے ہیں کہ ایسی جگہ جہاں رہتے ہوئے شریعت کے احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، اس کو چھوڑ کر ایسی جگہ کی طرف منتقل ہو جانا جہاں رہ کر شریعت کے احکام پر عمل کر سکتے ہوں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ میں جب ایمان واسلام کی دعوت شروع کی تو تیرہ سال آپ کا قیام مکہ ہی میں رہا، لیکن وہاں پر رہتے ہوئے آپ کو ایذائوں کا معاملہ پیش آیا اور مکہ والوں نے دین پر عمل کرنے کے مواقع میسر نہیں آنے دیئے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو حکم دیا گیا کہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جائیں، آپ کے مدینہ منورہ تشریف لے جانے کے بعد مکہ مکرمہ کا کوئی آدمی اگر ایمان لاتا تھا تو اس کے ایمان کے قبول ہونے کی شرط یہ تھی کہ وہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آجائے، اس لئے کہ مکہ میں رہتے ہوئے اس کے لئے اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا، اور یہ حکم مکہ مکرمہ فتح ہونے تک باقی رہا۔ ۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہو کر اسلامی حکومت کا حصہ بن گیا، اس کے بعد ہجرت کا وہ حکم باقی نہیں رہا۔ اسی لئے حدیث میں آتا ہے: ”لَاهِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ“ مکہ

مکرمہ کے فتح ہونے کے بعد ہجرت کا وہ حکم (مکہ مکرمہ سے ہجرت کا ضروری ہونا) باقی نہیں رہا، لیکن آج بھی نفسِ ہجرت کا حکم باقی ہے۔ آج بھی اگر کوئی آدمی کسی ایسے ملک میں رہتا ہے جہاں ملکی قوانین کے پیشِ نظر نماز پڑھنا اور اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن نہ ہو، تو اس کے لئے وہاں سے ہجرت کر کے کسی ایسی جگہ جانا ضروری ہے جہاں اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن ہو۔ ویسے الحمد للہ آج کل تو کہیں بھی ایسا نہیں ہے، اس لیے کہ پوری دنیا کے انٹر نیشنل آپسی معاہدہ کے نتیجہ میں آپ کسی بھی ملک میں رہتے ہوئے اطمینان سے اپنی نماز ادا کر سکتے ہیں، زکوٰۃ کی ادائیگی میں آپ کے لئے کوئی رُکاوٹ نہیں ہے، روزوں کا رکھنا آپ کے لئے آسان ہے، اسلامی احکام پر عمل کرنے میں عام طور پر کہیں کوئی دشواری نہیں ہے۔ کسی ملک کا قانون جو کچھ بھی ہو؛ لیکن آپ اپنے اسلامی احکام پر عمل کر سکتے ہیں، جیسے: اگر میاں بیوی کے آپس میں جھگڑے ہوں اور طلاق کا معاملہ پیش آئے، اور عورت اگر چاہے تو کورٹ میں جا کر دعویٰ دائر کرے، لیکن وہ خود اسلامی قانون پر عمل کرنا چاہے تو کوئی قانون اس کو زبردستی پکڑ کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم یہاں آؤ اور اپنے شوہر کے خلاف دعویٰ دائر کرو۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی جگہ رہ کر اگر اسلامی احکام پر عمل کرنا ممکن ہے تو اس صورت میں ہجرت کرنا ضروری نہیں ہے۔ اور اگر خدانخواستہ کسی جگہ کے رہنے والوں پر حکومت پابندی لگاتی ہے کہ تم ہمارے یہاں رہتے ہوئے نماز نہیں پڑھ سکتے تو پھر اس

صورت میں اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جانا ضروری ہو جائے گا؛ اسی کو ’’شرعی ہجرت‘‘ کہتے ہیں۔

حقیقی ہجرت

لیکن اس روایت میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حقیقی معنیٰ میں مہاجر کہلانے کا حقدار وہ آدمی ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ اسی لئے علماء لکھتے ہیں کہ ’’ وطنِ طبیعت سے وطنِ شریعت کی طرف منتقل ہو جائے‘‘ اس کو اس طرح بھی تعبیر کیا گیا ہے کہ ’’مَن چاہی چھوڑ کر رَب چاہی اختیار کرنا‘‘ حقیقی معنیٰ میں ہجرت ہے۔ اب اگر آدمی ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک چلا جائے لیکن وہاں جانے کے بعد بھی من چاہی پر ہی عمل کرتا ہے، اللہ کے احکام کو بجا نہیں لاتا، اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں پر عمل کرتا ہے؛ تو ایسی ہجرت کا کیا مطلب ہوا؟ اسی لئے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حقیقی معنیٰ میں مہاجر وہی ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ جیسے کامل مسلمان کہلانے کا حقدار وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ کی تکلیفوں سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں، ایسے ہی کامل مہاجر کہلانے کا حقدار وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

جو آدمی یہ پسند کرتا ہو

حدیث ۱۵۶۶:-

وعنه قَالَ : قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: مَنْ أحبَّ أنْ يُزَحْزَحَ عَنِ النَّارِ، ويُدْخَلَ الجَنَّةَ ، فَلْتَأْتِهِ مَنِيَّتُهُ وَهُوَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَاليومِ الآخِرِ، وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ. (رواه مسلم)

وَهُوَ بعض حديثٍ طويلٍ سبق في بابِ طاعَةِ وُلاَةِ الأُمُورِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی یہ پسند کرتا ہو کہ جہنم سے اس کو دور کر دیا جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے؛ اس کو چاہیے کہ ایسی حالت میں اس کی موت آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو، اور وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسا وہ اپنے لیے لوگوں سے کروانا چاہتا ہے۔

افادات:- قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ تمہاری موت ایسی حالت میں آئے کہ تم مسلمان ہو۔ اب ظاہر ہے کہ جو آدمی چوبیس گھنٹے اسلام پر قائم اور باقی رہنے اور اسلام کے اعمال پر عمل کرنے کا اہتمام کرتا ہو، اس کو کسی بھی وقت موت آئے گی تو اسلام و ایمان کی حالت ہی میں آئے گی۔ اس روایت میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ آپ چوبیس گھنٹے اسلام اور ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کا اہتمام

کیجئے، اگر کوئی آدمی ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور خدانہ کرے اسی وقت موت آگئی تو پھر ایمان پر موت آئی ہوئی نہیں کہلائے گی۔

معاشرت کو درست کرنے والی اصولی تعلیم

"وَلْيَأْتِ إِلَى النَّاسِ الَّذِي يُحِبُّ أَنْ يُؤْتَى إِلَيْهِ" یہ بھی ان اصولی تعلیمات میں سے ہے جو معاشرت کو درست کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے کہ: آپ جب کسی کے ساتھ کوئی معاملہ کررہے ہوں تو پہلے سوچ لیجئے کہ اگر میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے؛ تو کیا مَیں اس کو اپنے لئے پسند کروں گا؟ اگر اپنے لئے پسند کرتے ہیں تو پھر سامنے والے کے ساتھ بھی وہ معاملہ کیجئے، ورنہ جس سلوک کو آپ اپنے ساتھ کیا جانا پسند نہیں کررہے ہیں، تو پھر دوسرے کے ساتھ کیوں وہ سلوک کرتے ہیں؟۔

جیسے: اگر آپ کی بیٹی کسی کے یہاں بیاہ کر گئی ہے، اور اس کے ساتھ اس کے سسرال والے کوئی ایسا معاملہ کرتے ہیں جو آپ کو پسند نہیں آتا ہے، تو آپ دوسرے کی بیٹی جو آپ کے گھر میں بہو (یعنی اپنے بیٹے کی بیوی) بن کر آئی ہے، اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیوں کرتے ہیں؟۔

آپ دوسروں کے ساتھ عزت و توقیر کا معاملہ نہیں کررہے ہیں، بلکہ ایسا توہین آمیز معاملہ کررہے ہیں کہ اگر وہی معاملہ آپ کے ساتھ کیا جاتا تو آپ اس کو اپنے لئے گوارا نہیں

کرتے۔ بخاری شریف میں حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: ”لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ“ تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ گویا اس کو ایمانِ کامل کی علامت بتلایا گیا۔ اور اگر ایسی بات نہیں ہے تو حضور کے ارشاد کے مطابق وہ ایمان والا نہیں ہے۔

کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں حاصل کرے؟

یہ ایسی بنیادی تعلیم ہے جس کی طرف نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے مختلف طریقوں اور مختلف اندازسے متوجہ کیا ہے۔

چناں چہ ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: ”مَنْ يَأْخُذُ عَنِّي هٰؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ، فَيَعْمَلُ بِهِنَّ، أَوْ يُعَلِّمُ مَنْ يَعْمَلُ بِهِنَّ؟“ کون ہے جو مجھ سے یہ چیزیں حاصل کرے، پھر خود اس پر عمل کرے، یا کسی دوسرے کو سکھلائے جو اس پر عمل کرے؟ حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں میں نے کہا: اے اللہ کے رسول! میں اس کے لئے تیار ہوں۔

چناں چہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ چیزیں گنوائیں(۱)۔

سب سے بڑا عبادت گزار

پہلی چیز فرمائی: ”اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ“ اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے بچو؛ تم سب سے بڑے عبادت گزار قرار دیئے جاؤگے۔ سب سے بہترین عبادت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے۔

دیکھو! عبادتیں کرلینا آسان ہے، جیسے: بڑی راتیں آتی ہیں تو جو لوگ دن بھر جوا کھیلتے ہیں وہ بھی غسل کرکے، نہا دھو کر، اچھے کپڑے پہن کر پہلی صف میں براجمان ہو جاتے ہیں، روزانہ کے مسجد میں آنے والے بھی اگر ذرا چوک جاتے ہیں تو اُن کی پہلی صف چلی جاتی ہے۔

(۱) حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ هِلَالٍ الصَّوَّافُ الْبَصْرِيُّ حَدَّثَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ أَبِي طَارِقٍ عَنِ الْحَسَنِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم: مَنْ يَأْخُذُ عَنِّي هَؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ فَيَعْمَلُ بِهِنَّ أَوْ يُعَلِّمُ مَنْ يَعْمَلُ بِهِنَّ. فَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ: فَقُلْتُ أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ. فَأَخَذَ بِيَدِي فَعَدَّ خَمْسًا وَقَالَ: اتَّقِ الْمَحَارِمَ تَكُنْ أَعْبَدَ النَّاسِ، وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللَّهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ، وَأَحْسِنْ إِلَى جَارِكَ تَكُنْ مُؤْمِنًا، وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ تَكُنْ مُسْلِمًا، وَلَا تُكْثِرِ الضَّحِكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضَّحِكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ.

(ترمذی، باب مَنِ اتَّقَى الْمَحَارِمَ فَهُوَ أَعْبَدُ النَّاسِ، حدیث نمبر: ۲۴۷۵)

قَالَ أَبُو عِيسَى هَذَا حَدِيثٌ غَرِيبٌ لَا نَعْرِفُهُ إِلَّا مِنْ حَدِيثِ جَعْفَرِ بْنِ سُلَيْمَانَ. وَالْحَسَنُ لَمْ يَسْمَعْ مِنْ أَبِي هُرَيْرَةَ شَيْئًا هَكَذَا رُوِيَ عَنْ أَيُّوبَ وَيُونُسَ بْنِ عُبَيْدٍ وَعَلِيِّ بْنِ زَيْدٍ قَالُوا لَمْ يَسْمَعِ الْحَسَنُ مِنْ أَبِي هُرَيْرَةَ. وَرَوَى أَبُو عُبَيْدَةَ النَّاجِيُّ عَنِ الْحَسَنِ هَذَا الْحَدِيثَ قَوْلَهُ وَلَمْ يَذْكُرْ فِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم.

اس لئے اس دن روزمرہ والوں کو بھی ذرا اہتمام کرنا پڑتا ہے کہ کہیں پہلی صف نہ چلی جائے، اور پھر وہ لوگ رات بھر عبادت کا اہتمام کرلیتے ہیں، لیکن دوسرے دن سے پھر وہی غفلت کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔

اگر کوئی آدمی نفل عبادت کرے تو اس پر ثواب ہے، اور اگر نہ کرے تو کوئی گناہ نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی ناجائز اور گناہ کے کام کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہے۔

سب سے بڑا مالدار

دوسری چیز ارشاد فرمائی: ”وَارْضَ بِمَا قَسَمَ اللّٰهُ لَكَ تَكُنْ أَغْنَى النَّاسِ“ اللہ تعالیٰ نے قسمت میں تمہارے لئے جو کچھ لکھ دیا ہے، تمہارے حصہ میں جو طے کر دیا ہے، اس پر راضی رہو؛ تم سب سے بڑے مالدار بن جاؤ گے۔ یعنی قناعت حاصل کر لو؛ تم سب سے بڑے مالدار ہو جاؤ گے۔ اس لیے کہ اصل مالداری دل کی مالداری ہے: ”لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ“ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں: سامان کی زیادتی کا نام مالداری نہیں ہے، بلکہ مالداری تو دل کی ایک خاص صفت کو کہتے ہیں۔ بہت سی مرتبہ ایک آدمی کے پاس لاکھوں اور کروڑوں روپیے موجود ہوتے ہیں، لیکن اس کے دل میں سکون نہیں ہوتا، دل میں استغناء کی کیفیت نہیں ہوتی؛ اس کا نام مالداری نہیں ہے۔ اور ایک آدمی کے پاس

ایک پائی بھی نہیں ہے لیکن وہ دل سے مستغنی ہے، اس کو کسی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے؛ تو یہ بڑا مالدار کہلائے گا۔

تم مؤمن کہلاؤ گے

تیسری چیز فرمائی: ''وَأَحۡسِنۡ إِلَى جَارِكَ تَكُنۡ مُؤۡمِنًا'' اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرو؛ تم مؤمن کہلاؤ گے۔ گویا ایمان کی علامت پڑوسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔

تم مسلمان کہلاؤ گے

چوتھی چیز فرمائی: ''وَأَحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفۡسِكَ تَكُنۡ مُسۡلِمًا '' تم لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو اپنے لئے پسند کرتے ہو؛ تو تم مسلمان کہلاؤ گے۔ میں یہی بتلانا چاہتا ہوں۔

ویسے اسلام اور ایمان دونوں کا مفہوم لفظی اعتبار سے الگ الگ ہے، دل سے ماننے کی جو چیزیں ہوتی ہیں اسے ایمان سے تعبیر کیا گیا، جیسے: آخرت پر ایمان لانا، قیامت پر ایمان لانا، اللہ کی وحدانیت پر ایمان لانا، نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی رسالت کو ماننا، اور عملی طور پر کرنے کی جتنی بھی چیزیں ہیں اس کو اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ گویا انقیادِ باطنی؛ ایمان ہے، اور انقیادِ ظاہری؛ اسلام ہے۔ لیکن دونوں لفظ ایسے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے اوپر بولے جاتے ہیں۔

زیادہ ہنسنا دل کو مار دیتا ہے

اور پانچویں چیز ارشاد فرمائی: ”وَلاَ تُكْثِرِ الضِّحكَ فَإِنَّ كَثْرَةَ الضِّحكِ تُمِيتُ الْقَلْبَ“ اور زیادہ مت ہنسا کرو، اس لئے کہ زیادہ ہنسنا دل کو مار دیتا ہے، دل میں آخرت کی یاد باقی نہیں رہتی۔ حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: یَا أُمَّةَ مُحَمَّدٍ! وَاللهِ لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا وَلَضَحِكْتُمْ قَلِيلاً“ آخرت میں پیش آنے والے حالات جو میں جانتا ہوں اگر تم بھی جاننے لگو؛ تو تم روؤ زیادہ، اور ہنسو کم۔

ائمہ ٔحدیث کی منظورِ نظر روایت

میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ اس روایت کے اندر بھی نبی ٔکریم ﷺ نے خاص طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے لئے جو پسند کرتے ہو وہی لوگوں کے لئے بھی پسند کرو، اسی لئے ائمہ ٔحدیث نے اسلام کی بنیادی تعلیمات کے اندر نبی ٔکریم ﷺ کی اس حدیث کو خصوصی حیثیت اور مقام دیا ہے۔ امام نسائی نور الله مرقدهٗ حدیث کے بڑے امام اور ماہر محدث گزرے ہیں، ان کی لکھی ہوئی کتاب ”سنن صغریٰ“ کو ہمارے یہاں مدرسوں کے اندر ”سنن نسائی“ کے نام سے پڑھایا جاتا ہے۔ صحاحِ ستہ یعنی وہ چھ کتابیں جن میں صحیح روایات جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے ان میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے، ان کی دوسری کتاب ”سنن النسائی الکبریٰ“ ہے جس میں انہوں نے گیارہ ہزار سات سوستر (۱۱۷۷۰) روایات

جمع کی ہیں، اس میں آخری حدیث یہی ہے: ”لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لأَخِیهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهِ“ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ کے مناقب

امام ابو داود رحمۃ اللہ علیہ حدیث کے بڑے امام گزرے ہیں، ان کے بارے میں محدث ابراہیم حربی - جو بڑے محدث گزرے ہیں - فرماتے تھے کہ: اللہ تعالیٰ نے علمِ حدیث کو امام ابوداود نور اللہ مرقدہُ کے لئے ایسا ہی نرم کر دیا جیسا کہ حضرت داود علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے لوہا نرم کیا گیا تھا۔

ایک اور محدث موسیٰ بن ہارون ان کے متعلق فرماتے تھے کہ: امام ابوداود دنیا میں حدیث کے لئے اور آخرت میں جنت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ تقویٰ کے اعتبار سے بھی ان کا مقام بہت اونچا تھا۔ ان کی ایک آستین بڑی تھی اور دوسری چھوٹی تھی، اور اس زمانہ میں آستین میں جیب ہوتی تھی۔ کسی نے پوچھا: ایسا کیوں ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ: اس میں چیزیں رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے اس لئے اس کو بڑا رکھا ہے، دوسری میں اس کی ضرورت نہیں تو بلاوجہ اس کو کیوں بڑا رکھوں؟ اس لیے کہ یہ بھی فضول خرچی ہے۔

ایک درہم میں جنت

ایک مرتبہ ایک بڑی کشتی میں تشریف لے جارہے تھے، کنارے پر ایک آدمی کو چھینک آئی، اس نے الحمد للہ کہا۔ تو مسئلہ یہ ہے کہ کسی کو چھینک آئے اور وہ الحمد للہ کہے تو جو مسلمان اس کی الحمد للہ سنے اس کو چاہیے کہ جواب میں یرحمک اللہ کہے، امام ابوداود ایک بڑی کشتی میں جارہے تھے، اس چھینک کھانے والے نے الحمد للہ کہا، اس درمیان میں ان کی کشتی آگے بڑھ گئی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ اس کا جواب اگر یہاں سے دوں گا تو وہاں تک آواز نہیں پہنچے گی، تو اس بڑی کشتی میں سے ایک چھوٹی کشتی ایک درہم سے کرایہ پر لی۔ جنہوں نے اسٹیمروں میں سفر کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ آج کل بھی اس میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہوتی ہیں، جیسے: ہوائی جہاز میں پیراشوٹ ہوتا ہے، تاکہ اگر حادثہ پیش آجائے اور سمندر میں کودنے کی نوبت آجائے تو چھوٹی کشتیاں کام دے سکیں۔ خیر! امام ابوداود نور اللہ مرقدہُ نے ایک چھوٹی کشتی ایک درہم پر کرایہ پر لی اور اس میں بیٹھ کر کنارے پر پہنچے اور جاکر اس آدمی کو یرحمک اللہ کہا۔ خیر! وہ اس کشتی کو واپس لے کر پھر بڑی کشتی میں سوار ہونے کے لئے آگئے۔ لوگوں نے پوچھا: آپ نے اتنا زیادہ اہتمام کیوں کیا؟ تو امام ابوداود نے جواب میں کہا: میں نے سوچا کہ جس نے چھینک کھائی تھی وہ اللہ کا ایک بندہ ہے، مَیں جب اس کو یرحمک اللہ کہوں گا اور اس کے جواب میں وہ ”یَهۡدِيۡكَ اللّٰهُ“

کہے گا، اور ہو سکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مستجاب الدعوات ہو؛ تو میرا کام بن جائے گا۔ چناں چہ اسی کشتی میں ابھی سفر جاری تھا، کچھ لوگوں پر غنودگی طاری ہوئی تو کسی نے خواب میں دیکھا، کوئی کہنے والا کہہ رہا ہے: ابو داؤد نے ایک درہم میں جنت خرید لی۔

دیکھو! ان حضرات کی نگاہیں کہاں تک پہنچتی تھیں اور ایسی چیزوں کے وہ کتنے حریص ہوا کرتے تھے؟ جیسے ہم لوگ دنیا کے لالچی ہیں، وہ آخرت کے لالچی تھے۔

دین پر عمل کے واسطے چار حدیثیں کافی ہیں

امام ابو داود نور اللہ مرقدہٗ بڑے محدث تھے اور بڑے بزرگ بھی تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پانچ لاکھ حدیثیں لکھیں، پھر ان پانچ لاکھ حدیثوں میں سے انتخاب کر کے اپنی کتاب "سنن ابی داود" میں چار ہزار آٹھ سو روایتیں ہیں، ایک عقلمند اور سمجھدار آدمی کے لئے دین پر عمل کے واسطے چار حدیثیں کافی ہیں۔ ان چار میں سے پہلی روایت حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِءٍ مَا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ" اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے، اور آدمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسی کے مطابق معاملہ ہوتا ہے جیسی اس کی نیت ہو، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہو (یعنی اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ایک جگہ کو

چھوڑ کر دوسری جگہ گیا) تو حقیقت میں بھی اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لئے کہلائے گی اور جس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا دنیا حاصل کرنے کے لئے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لئے ہوگا تو اس کی جیسی نیت ہے ویسا ہی معاملہ ہوگا۔

دوسری روایت حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) کی ہے، نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: اَلْحَلَالُ بَیِّنٌ وَالْحَرَامُ بَیِّنٌ وَبَیْنَہُمَا مُشْتَبِہَاتٌ لَا یَعْلَمُهَا كَثِیرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِینِهِ ۔ حلال بھی کھلا ہوا ہے اور حرام بھی کھلا ہوا ہے، اور ان کے بیچ میں کچھ چیزیں مشتبہ ہیں (جن میں یہ احتمال ہے کہ ہو سکتا ہے وہ حلال ہوں اور ہو سکتا ہے حرام ہوں) پس جو آدمی ایسی چیزوں سے اپنے آپ کو بچائے گا اس نے اپنے دین کی حفاظت کر لی۔

تیسری روایت ہے: ”مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ“ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور بیکار چیز (جو دنیا و آخرت کے اعتبار سے کوئی کام کی چیز نہ ہو) چھوڑ دے۔

اور چوتھی روایت یہی ہے: ”لَا يَكُوْنَ الْمَرْأُ مُؤْمِنًا حَتّٰى يَرْضٰى لِأَخِيْهِ مَا يَرْضٰى لِنَفْسِهِ“ تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نور اللہ مرقدہٗ کا مقولہ

حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ: پہلی روایت اعمال اور عبادات کی درستگی کے لئے کافی ہے۔ اور دوسری روایت معاملات کی درستگی کے لئے کافی ہے۔ اور تیسری روایت زندگی کے اوقات کو صحیح استعمال کرنے کے لئے اور اس کی قدر و قیمت پہچاننے کے لئے کافی ہے۔ اور چوتھی روایت معاشرت کی درستگی اور آپس کے تعلقات کی استواری کے لئے کافی ہے۔

سماج قابلِ رشک بن جائے

آج اگر ہم میں سے ہر آدمی اس بات کا اہتمام کرلے کہ" جو معاملہ میرے ساتھ ہو رہا ہے، اگر مَیں اس کو اپنے لئے پسند نہیں کرتا، تو پھر ویسا ہی معاملہ میں کسی دوسرے کے ساتھ بھی نہ کروں؛ تو مَیں سمجھتا ہوں کہ دنیا میں کہیں کوئی جھگڑا نہیں ہوگا، اور ہماری معاشرت قابلِ رشک بن جائے گی۔

امام غزالی نور اللہ مرقدہٗ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک بزرگ تھے، ان کے یہاں چوہے بہت زیادہ ہوگئے، ایک مرتبہ انہوں نے اپنی مجلس میں کہا کہ چوہوں کی وجہ سے بڑی تکلیف ہے۔ کسی نے کہا: حضرت! ایک بلی پال لیجئے، ان چوہوں سے نجات مل جائے گی۔

خیر! بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے دوبارہ پھر وہی کہا: چوہوں کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ جن صاحب نے بلی کا مشورہ دیا تھا انہوں نے بڑے زور سے کہا: حضرت! آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ ایک بلی پال لیجئے، لیکن آپ بلی تو پالتے نہیں۔ اس پر ان بزرگ نے جواب دیا: بلی تو پال لوں لیکن ڈر یہ ہے کہ جب بلی میرے گھر میں آئے گی تو اس کو دیکھ کر چوہے میرا گھر چھوڑ کر پڑوسی کے گھر میں چلے جائیں گے، اور جب ان چوہوں کو میں اپنے گھر کے لئے پسند نہیں کرتا تو پڑوسی کے گھر کے لئے کیسے پسند کر سکتا ہوں، جبکہ نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: تم میں سے کوئی آدمی مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا طرزِ عمل

ہمارے تمام اسلاف اور اکابر کا طرزِ عمل یہی تھا۔ ہمارے بزرگوں میں حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ گزرے ہیں، ان کے حالات میں حضرت مولانا سعید احمد اکبر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت کا قیام ڈابھیل میں تھا، اِس وقت اساتذہ جہاں رہتے ہیں اس کے سامنے بیت الخلاء ہیں، پرانے پڑھے ہوؤں کو معلوم ہے کہ وہ اُسی زمانہ میں بنے تھے، لیکن اُس زمانہ میں اندر پانی کا نل نہیں تھا، باہر سے پانی لے کر جانا پڑتا تھا۔ تو حضرت علامہ استنجاء سے فارغ ہونے کے بعد باہر سے بار بار لوٹا بھر کر اندر پانی ڈالتے

تھے۔ کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا: بدبو زائل کرنے کے لئے ایسا کرتا ہوں۔ کوئی آدمی فلش والے بیت الخلاء میں پہلے گیا ہو اور اس نے اگر پانی برابر استعمال نہ کیا ہو تو بعد میں جانے والے کو بدبو کا احساس ہوتا ہے، اور یہ بدبو اس کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ باہر سے بار بار پانی لے جاکر صرف اس لئے ڈالتے تھے کہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔ اللہ کے ایسے بندے بھی گزرے ہیں۔

دلِ دشمنانِ ہم نہ کردند تنگ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے گلستاں کے اندر ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ:-

ایک مرتبہ ایک اللہ والے کے یہاں چور آگیا، ان کے گھر میں تو کچھ تھا نہیں، صرف ایک گدڑی تھی اسی کو آدھی بچھا کر اور آدھی اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے، چور دروازے سے گھسا اور پورا گھر گھوما لیکن اس کو کوئی چیز چوری کے لائق نہیں ملی۔ وہ بزرگ دیکھ رہے تھے، انہوں نے سوچا کہ یہ چور میرے گھر میں آیا ہے لیکن اس کے کام کی کوئی چیز ہے نہیں، لہٰذا جب وہ دوسری طرف گیا تو انہوں نے اپنی وہی گدڑی نکال کر اس کے راستہ میں ڈال دی کہ بیچارہ امید لے کر میرے گھر میں آیا ہے، محروم اور خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ چناں چہ چور اُسی کو لے کر چلا گیا، یہ قصہ بیان کرنے کے بعد شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا ❁ دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

تُرا کَے میسر شود ایں مقام ❁ کہ با دوستانت خلافست وجنگ

ہم نے سنا ہے کہ اللہ والوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ دشمن کا بھی دل دُکھایا نہیں کرتے۔ اے مخاطب! تجھ کو یہ مقام کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ تیری تو اپنے ہی دوستوں کے ساتھ لڑائی چلتی ہے۔

آج ہمارا حال یہی ہے کہ دوسروں کی بات چھوڑیئے، خود ہمارے ماں باپ، ہمارے بھائی بہن، ہماری بیوی اور اولاد، ہمارے متعلقین اور رشتہ دار ہم سے تنگ ہیں اور پناہ مانگتے ہیں؛ پھر یہ مقام کیسے حاصل ہو سکتا ہے!۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کی ان تعلیمات کو عام کیا جائے اور ان پر عمل کا اہتمام کیا جائے۔ آج کا مسلمان اگر اسی بات کو اپنالے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ پھر اسلام کی دعوت دینے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

النهي عن التباغض والتقاطع والتدابر

آپس میں بغض اور دشمنی، کینہ اور قطع تعلق کی ممانعت

بسم الله الرحمن الرحيم

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ.

أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ.

مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ.

نیا عنوان قائم کیا ہے: آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغض، دشمنی، کینہ اور قطع تعلق کرنے کی ممانعت۔

بڑے مبارک ہیں وہ لوگ

"تباغض" کا مطلب یہ ہے کہ کبھی کسی آدمی پر غصہ آیا اور اپنے غصہ کے تقاضہ کو پورا نہ کرسکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں گھٹتا رہے، اور اس کی وجہ سے اس آدمی کے متعلق دل میں نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے؛ اسی کو کینہ اور بغض سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ دل کا ایک عمل ہے جس پر بڑی وعید آئی ہے۔ آگے ایک روایت پیش کروں گا جس میں نبی کریم

ﷺ نے دل کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ بڑے مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ آئینہ جیسا دل عطا فرمائے، جس میں کسی کے متعلق کینہ کپٹ، بغض و حسد اور برے جذبات نہ ہوں۔ ایسا دل اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اور اگر کسی کو ایسا دل ملا ہے اور وہ صرف فرائض پر اکتفاء کرتا ہے اور نوافل کا زیادہ اہتمام نہیں کرتا؛ تب بھی اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت کے وعدے ہیں۔ بلکہ نبی کریم ﷺ نے دل کے دوسروں کی طرف سے بغض، کینہ کپٹ اور حسد سے پاک ہونے کو اپنا طریقہ اور سنت قرار دیا ہے

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کے مختصر حالات

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نبی کریم ﷺ کے خادمِ خاص تھے ۔ حضورِ اکرم ﷺ ہجرت فرما کر جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو حضرت انس کے سوتیلے والد حضرت ابو طلحہ انصاری (رضی اللہ عنہ) سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی سمجھدار چھوٹا بچہ ہو تو ہمارے حوالہ کر دو، تاکہ ہمارے گھر کے کام کاج میں مدد کرے، حضرت انس کے حقیقی والد حضرت مالک بن انس (رضی اللہ عنہ) کا تو انتقال ہو چکا تھا، اُن کی والدہ کا نکاح حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) سے ہوا تھا، اس لئے وہ اُن کے سوتیلے والد ہوتے تھے حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضرت ابو طلحہ انصاری (رضی اللہ عنہ) مجھے اپنے پیچھے بٹھا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں لے گئے اور کہا: یہ بچہ حاضرِ خدمت ہے۔ جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کئے گئے

تھے اس وقت ان کی عمر دس سال تھی، اور ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ کا قیام مدینہ منورہ میں دس سال رہا، اور حضرت انس (رضی اللہ عنہ) حضور کرم ﷺ کی وفات تک برابر آپ کی خدمت کرتے رہے، اس لیے جب حضور ﷺ کا انتقال ہوا اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔

اب چوں کہ وہ دس سال کے چھوٹے بچے تھے، اور ظاہر ہے کہ چھوٹے بچوں میں ویسے بھی لاپرواہی اور غفلت ہوا ہی کرتی ہے۔ چناں چہ بخاری شریف میں روایت ہے، خود حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) ہی فرماتے ہیں کہ: حضور ﷺ کے یہاں جانے میں اگر کبھی مَیں غفلت اور لا پرواہی سے کام لیتا تھا تو میری والدہ، میری خالہ اور میری نانی مجھے تاکید کرتی تھیں کہ جاؤ! حضور کے یہاں جائو۔ گویا حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں میری طرف سے ہونے والی غفلت اور لا پرواہی پر میری گھر کی عورتیں مجھے ٹوکتی تھیں۔

نبی کریم ﷺ کی اپنے خادمِ خاص کو تاکیدی نصیحت

خیر! انہیں حضرت اَنس کو نبی کریم ﷺ نے خاص تاکیدی وصیت اور نصیحت فرمائی:

"يَا بُنَيَّ! إِنْ قَدَرْتَ أَنْ تُمْسِيَ وَتُصْبِحَ وَلَيْسَ فِي قَلْبِكَ غِشٌّ لِأَحَدٍ؛ فَافْعَلْ" اے میرے پیارے بیٹے! اگر تم سے یہ ہو سکے کہ صبح یا شام ایسی حالت میں کرو کہ تمہارے دل میں کسی کے متعلق کوئی میل نہ ہو، کینہ کپٹ اور حسد نہ ہو، کسی کے متعلق دل میں بغض و عداوت اور دشمنی نہ ہو؛ تو ایسا ضرور کرو، اس کے بعد حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: "يَا بُنَيَّ! إِنَّ ذٰلِكَ

سُنَّتِي وَمَنْ أَحَبَّ سُنَّتِي فَقَدْ أَحَبَّنِي. وَمَنْ أَحَبَّنِي كَانَ مَعِي فِي الْجَنَّةِ" اے پیارے بیٹے! دل کو کینہ کپٹ، حسد اور کسی کے متعلق میل کچیل سے پاک رکھنا میری سنت اور میرا طریقہ ہے، اور جو میری سنت سے محبت رکھے گا اور میری سنت کو پسند کرے گا گویا اس نے مجھ سے محبت رکھی، اور جو مجھ سے محبت رکھے گا؛ قیامت کے دن جنت میں میرے ساتھ ہو گا۔

دیکھو! دل کو کینہ کپٹ، حسد و بغض وغیرہ گندگیوں سے پاک رکھنے پر نبی کریم ﷺ نے کتنا بڑا وعدہ فرمایا ہے! بڑے ہی مبارک ہیں وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ ایسا دل عطا فرمائے۔ اس باب کو لا کر یہی -دل میں بغض، کینہ رکھنے اور آپس میں تعلقات قطع کرنے سے ممانعت کو- بتلاتے ہیں۔

آیاتِ قرآنیہ

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی آیات پیش کی ہیں: "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ" ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں، اور کیا بھائی بھائی سے دشمنی رکھ سکتا ہے؟ اس کے ساتھ قطع تعلق کر سکتا ہے؟ اس کو کبھی چھوڑ سکتا ہے؟ نہیں چھوڑ سکتا۔

ایمان والوں کی خوبی بیان فرمائی ہے: ﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ﴾ ایمان والوں کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتے ہیں، ان کے سامنے ذلیل بن کر رہتے ہیں، اور کافروں کے مقابلہ میں بڑے تن کر اور قوت کے ساتھ رہتے ہیں۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ﴾ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے جو رفقاء (یعنی صحابۂ کرام) ہیں وہ کفار کے اوپر تو بڑے سخت اور آپس میں بڑے رحم دل ہیں۔

معلوم ہوا کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور نرمی سے پیش آنا، دل میں بغض اور کینہ نہ رکھنا، آپس میں ترک تعلقات نہ کرنا، بلکہ آپس میں تعلقات کو باقی رکھنا؛ یہ اہلِ ایمان کی صفات میں سے ہے۔ بقولِ شاعر مشرق:-

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن

آپس میں بغض و دشمنی مت رکھو

حدیث ۱۵٦۷:-

وعن أنس رضی الله عنه: أنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: ((لَاتَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَلَا تَقَاطَعُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بغض، دشمنی اور عداوت مت رکھو، اور آپس میں ایک دوسرے کے اوپر حسد نہ

کرو، اور ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھلائو، اور قطع تعلق مت کرو، اور اللہ کے بندے بھائی بھائی بن کر رہو۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ ترکِ تعلق کرے۔

افادات:- جب کسی کے متعلق دل میں بغض ہوگا تو اسی سے حسد پیدا ہوگا، اور بغض ہی کے نتیجہ میں آدمی دل میں اس سے بدلہ لینے کی سوچتا ہے، اور جس کے ساتھ بغض ہوتا ہے اس کے متعلق یہ بھی سوچتا ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اگر اس کو کوئی راحت پہنچتی ہے، نعمت ملتی ہے تو اس کو تکلیف ہوتی ہے، اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو یہ خوش ہوتا ہے؛ یہی حسد ہے۔ اور ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ جب آمنا سامنا ہو تو اُس نے اُدھر منھ پھیر لیا اور اِس نے اِدھر منھ پھیر لیا۔ اور قطع تعلق مت کرو، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بولنا بند مت کرو۔ اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو، عبدیت اور بندگی کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم دیا جائے، آدمی اپنی نفسانیت، ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر بندہ بن کر اللہ کے اس حکم پر عمل کرے، اور بھائی بھائی بن جائے۔

''کُونُوا عِبَادَاللّٰہِ إِخْوَاناً'' یہاں اہلِ علم موجود ہیں وہ اس بات کو سمجھیں گے کہ بعضوں نے تو ''عباداللہ'' کو مفعول اول اور ''اخوانا'' کو مفعول ثانی مانا ہے، یعنی اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جائو۔ لیکن بعضوں نے ''عباداللہ'' کو منادیٰ مانا، اس صورت میں مطلب یہ ہوا ''کُونُوا عِبَادَاللّٰہِ'' یعنی ''یَاعِبَادَاللّٰہِ! کُونُوْا إِخْوَانًا'' اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔

دل ہی تو ہے، نہ ہے سنگ و خشت

دیکھو! کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے مسلمان بھائی کی طرف سے، یا سگے بھائی کی طرف سے، یا اپنے ملنے والوں کی طرف سے ناگواری کی کوئی بات پیش آتی ہے جس کی وجہ سے آدمی اذیت اور تکلیف محسوس کرتا ہے۔ ایسا تو ہے نہیں کہ تکلیف دینے والا ہمارے ساتھ کوئی برا معاملہ کرے اور ہمارے دل کو تکلیف نہ ہو:

دل ہی تو ہے؛ نہ ہے سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رُلائے کیوں

مطلب یہ ہے کہ کوئی آدمی جب تکلیف دینے والی بات کرے گا تو تکلیف تو پہنچے ہی گی، اور یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ اس کے متعلق دل میں دوری بھی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے شریعت نے انسان کے ان فطری جذبات کا لحاظ بھی کیا ہے، اور تھوڑی سی مدت کے لئے ترکِ تعلق کی اجازت بھی دی کہ تین دن تک تو گنجائش ہے لیکن اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرنا حرام ہے۔

نہایت سخت وعید

بلکہ ابو داود شریف کی روایت میں تو یہ ہے: لَا یَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ یَّهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلٰثَةٍ، فَمَنْ هَجَرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ وَمَاتَ ؛دَخَلَ النَّارَ" جو آدمی اپنے بھائی کے ساتھ تین دن سے زیادہ ترک تعلق کرے اور اسی حالت میں اس کی موت آجائے؛ تو جہنم میں جائے گا۔ کتنا سخت ارشاد ہے! لیکن آج ہمارے سماج میں اس بات کو کوئی حیثیت ہی نہیں دی جاتی ہے، اپنے سگے بھائی کے ساتھ ترکِ تعلق تو گویا معمولی چیز ہو گئی، یہاں تک کہ باپ اور بیٹے کا معاملہ بھی اس طرح کا ہوتا جارہا ہے، جس کے نتیجہ میں مہینوں اور سالوں ایسے گزر جاتے ہیں۔ حالاں کہ شریعت تین دن سے زیادہ ترک تعلق کی اجازت نہیں دیتی، اور جو آدمی ایسی حالت میں مر جائے اس کے لئے حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جہنم میں جائے گا۔ غور کیا جائے کہ کتنی سخت وعید ہے! اور ایسی چیزوں سے دنیا و آخرت کا کون سا فائدہ ہوتا ہے!۔

اور جس نے سلام میں ابتدا کی؛ اس نے تعلق کو باقی رکھا۔ سلام ہی کلام کی ابتدا ہے، کوئی آدمی کسی کے ساتھ بات چیت کرنا چاہتا ہے تو شروعات سلام ہی سے کرتا ہے، جب آپس میں ملتے ہیں تو پہلے سلام ہوتا ہے پھر بات چیت ہوتی ہے، اگر صرف سلام کرتا ہے اور پھر بے رخی سے پیش آتا ہے؛ تو یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ اور اگر ضرورت کے موقعہ پر بھی کلام سے انکار کرتا ہے کہ ایک کی طرف سے کوئی بات کی جاتی ہے تو اس کا جواب بھی نہیں دیتا،

اور ملاقات کے وقت یہ سلام میں ابتدا کرتا ہے، اس کے باوجود سامنے والا اس کے ساتھ تعلق نہیں رکھتا ہے، تو پھر اِس پر گناہ نہیں ہو گا، بلکہ اس صورت میں ذمہ داری دوسرے پر جائے گی۔

ان دونوں کو ابھی چھوڑے رکھو

حدیث ۱۵۶۸:-

وعن أبي هريرة -رضی الله عنه-: أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قالَ: ((تُفْتَحُ أبوابُ الجَنَّةِ يَوْمَ الإثْنَيْنِ ويَوْمَ الخَمِيسِ، فَيُغْفَرُ لِكُلِّ عَبدٍ لا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئاً، إلاَّ رَجُلاً كَانَتْ بينهُ وَبَيْنَ أخِيهِ شَحْناءُ فَيُقَالُ: أنْظِرُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا! أنْظِرُوا هَذَينِ حَتَّى يَصْطَلِحَا!)). رواه مسلم.

وفي روايةٍ لَهُ: ((تُعْرَضُ الأعْمَالُ في كُلِّ يَوْمِ خَمِيسٍ وإثْنَيْنِ)) وذَكَرَ نَحْوَهُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنت کے دروازے پیر اور جمعرات کے دن کھولے جاتے ہیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ پیر اور جمعرات کے دن بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو اس کے گناہوں کو معاف کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے، البتہ وہ آدمی جس کے اور اس کے بھائی کے درمیان دشمنی، عداوت اور کینہ ہو، ان کے متعلق فرشتوں سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی چھوڑے رکھو اور ان کا معاملہ ابھی پیش مت کرو؛ یہاں تک کہ وہ آپس میں صلح کرلیں (یعنی جب تک کہ وہ آپس میں صلح نہیں کرلیتے وہاں تک ان کی معافی رُکی ہوئی رہتی ہے۔)

افادات:-"شَحْنَآء" یعنی عداوت، دشمنی، بغض، کینہ۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور مغفرتوں سے دور کرکے اور اپنے بھائی کے ساتھ دشمنی کرکے ہم نے کیا حاصل کرلیا؟ لوگ اپنی ناک اونچی رکھنے کے زعم میں ایسی برائیوں میں مبتلا رہتے ہیں اور زندگی بھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور اور مغفرت سے محروم رہتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک چیز ہے جس سے اپنے آپ کو بچانے کی اشد ضرورت ہے۔

باب تحریم الحسد

وَهُوَ تمنی زوالُ النعمة عن صاحبها سواءٌ كَانَتْ نعمة دينٍ أَوْ دنيا

حسد کی حرمت کا بیان

قال اللہ تعالیٰ:- أَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ.

وفیه حدیث أنس السابق فی الباب قبله.

حسد بھی دل کا ایک عمل ہے۔ ہمارے ظاہری اعمال میں جس طرح بعض اعمال فرض، بعض واجب ہیں، اس طرح دل کے اعمال میں بھی فرض اور واجب ہیں جیسے: شکر، صبر، زہد، تواضع وغیرہ؛ سارے اعمال فرض اور ضروری ہیں۔ اور جیسے ہمارے اعضاء کے اعمال میں بعض حرام ہیں، جیسے: زنا اور چوری وغیرہ، اسی طریقہ سے دل کے بعض اعمال حرام ہیں، جیسے: کبر، بغض، کینہ، عجب وخود پسندی، دنیا کی محبت مال اور جاہ کی محبت؛ یہ سب حرام ہیں۔ انہیں میں سے ایک حسد بھی ہے جو قلب کے ان اعمال میں سے ہے جس کو اسلام نے حرام قرار دیا ہے اور جس پر بڑی سخت وعید ہے۔

حسد نیکیوں کو کھا جاتا ہے

حدیث ۱۵۶۹:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه أنَّ النَّبيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((إِيَّاكُمْ وَالحَسَدَ فَإِنَّ الحَسَدَ يَأْكُلُ الحَسَنَاتِ كَمَا تَأْكُلُ النَّارُ الحَطَبَ)) أَوْ قَالَ: ((العُشْبَ)) (رواه أبوداود)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: تم حسد سے بچو، اس لئے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے، جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔ راوی کہتے ہیں: یا تو آپ نے یہ فرمایا: جیسے آگ سوکھی گھاس کو کھا جاتی ہے۔

افادات:- اگر سوکھی گھاس یا لکڑی میں آگ لگ جائے تو دھیرے دھیرے وہ آگ لکڑی کو ختم کر دیتی ہے، اسی طریقہ سے جو آدمی حسد کی بیماری میں مبتلا ہوتا ہے تو دل کی یہ بیماری دھیرے دھیرے آدمی کی ساری نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

حسد کیا ہے؟

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کے عنوان کے ساتھ ہی حسد کی تعریف بھی بتلادی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی جو جو نعمتیں اپنے بندوں کو دے رکھی ہیں وہ دو طرح کی ہیں، ان میں سے بعض نعمتیں تو ایسی ہیں جو ہر ایک کو ملی ہوئی ہیں، جیسے: زندگی، آنکھیں، کان، منھ، زبان، ہاتھ،

پاؤں۔ اسی طریقہ سے کائنات میں اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ایسی پیدا کی ہیں جن سے عام فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، جیسے: سورج، چاند، زمین، آسمان، بارش؛ یہ ساری چیزیں تو ایسی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک کے لئے عام ہیں ۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی بعض نعمتیں وہ ہیں جو بعضوں کو دی جاتی ہیں اور بعضوں کو نہیں دی جاتیں، یا بعضوں کو زیادہ مقدار میں دی جاتی ہیں اور بعضوں کو کم مقدار میں دی جاتی ہیں، جیسے: مال و دولت، عہدہ و منصب، حسن و جمال، عزت و شہرت، علم اور صلاح و تقویٰ وغیرہ۔ تو دین کی یا دنیا کی بہت ساری نعمتیں ایسی ہیں جو بعضوں کو ملی ہیں اور بعضوں کو نہیں ملیں۔ یا بعضوں کے پاس زیادہ ہیں اور بعضوں کے پاس کم ہیں۔

اب کسی آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت دے رکھا ہے، یا عزت سے نوازا ہے، کسی کو شہرت کی نعمت اللہ نے دے رکھی ہے، کسی کو عہدہ اور منصب سے نواز رکھا ہے کسی کو اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال عطا فرمایا ہے، کسی کو صحت و تندرستی عطا فرمائی ہے، کسی کو علم دیا ہے، کسی کو صلاح و تقویٰ اور نیکی کی توفیق عطا فرمائی ہے، تو چاہے وہ دین کی نعمت ہو، یا دنیا کی نعمت ہو؛ اس نعمت کو دیکھ کر دل میں جلن اور کڑھن کا پیدا ہونا، اور یہ خیال آنا کہ یہ نعمت اس کو کیوں ملی؟ اس کے پاس یہ نعمت نہیں رہنی چاہیے، اس سے چھن جانی چاہیے؛ اسی کا نام حسد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض

اور غور کرو کہ حسد اتنا بڑا گناہ کیوں ہے؟ حسد کرنے والا حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کر رہا ہے، اس لئے کہ جس کو جو بھی نعمت ملی ہوئی ہے وہ خود اپنے اختیار سے تو نہیں ملی، بلکہ اس کو وہ نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اب یہ آدمی جب اس کی اس نعمت کے اوپر جلن اور کڑھن محسوس کرتا ہے، تو پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر اعتراض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت اس کو کیوں دی؟ آپ ہی اندازہ لگائیں کہ آپ نے کسی کو کوئی چیز دی ہو، اور آپ کا کوئی ملازم اس پر یوں کہے کہ: آپ نے فلاں کو فلاں چیز کیوں دی؟ تو کیا اس کے اس اعتراض کو آپ برداشت کریں گے؟ نہیں کریں گے، بلکہ اس کو اسی وقت چلتا کر دیں گے، یا اس کو جو بڑی سے بڑی سزا دے سکتے ہیں وہ دیں گے۔ تو کسی کو ملی ہوئی نعمت پر جلن یا کڑھن کا محسوس کرنا اور اس سے اس نعمت کے دور ہو جانے کی تمنا کرنا؛ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرنا ہے، اور یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔

حسد کے نتیجہ میں اور کیا کیا ہوتا ہے؟

آج ہمارے معاشرے میں یہ بیماری بہت عام ہو چکی ہے۔ جس کے متعلق آدمی کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے، اس کو اگر کوئی خوشی یا مسرت حاصل ہوتی ہے، یا کوئی نعمت ملتی ہے؛ تو یا تو اِس کو تکلیف ہوتی ہے کہ اُس کو یہ نعمت کیوں ملی؟ اور اگر اس کو کوئی غم، تکلیف اور

مصیبت پہنچتی ہے تو اس پر یہ خوش ہوتا ہے، اس کو بڑا مزہ آتا ہے کہ بہت اچھا ہوا، حالاں کہ کسی مؤمن کو پہنچنے والی تکلیف پر خوش ہونا بھی بڑا گناہ ہے؛ جس کو حدیثِ پاک میں ”شَمَاتَۃٌ“ کہا گیا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ”لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيَرْحَمُهُ اللّٰهُ وَيَبْتَلِيكَ.(رواہ الترمذی)“ اپنے بھائی کو کوئی مصیبت پہنچے، تو اس پر خوشی کا اظہار نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کو تو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔

پھر حسد کرنے والا یہ کوشش کرتا ہے کہ یہ چیز جو اس کو ملی ہوئی ہے وہ اس سے دور ہو جائے، اور اس کے لئے تدبیریں بھی کرتا ہے، اس کو سماج اور سوسائٹی میں نیچا اور کمتر دکھلانے کے لئے اس کی برائیاں بیان کرتا ہے، غیبت کرتا ہے، اس کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں کرتا ہے۔ اور معلوم نہیں اس حسد کی وجہ سے اور کتنے گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور کسی کا حقیقی عیب ظاہر کرنا بھی بڑا گناہ ہے جیسا کہ پہلے آچکا، لیکن یہ آدمی تو حسد کے نتیجہ میں اس کو بدنام کرنے کے لئے ایسی ایسی باتیں گھڑ کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو حقیقت میں اس میں موجود بھی نہیں ہوتیں۔ یہ ساری حرکتیں حسد کرنے والے سے سرزد ہوتی ہیں۔ اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ حسد کے نتیجہ میں آدمی کبھی کفر تک میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لیے کہ حسد کے اندر اندھا ہو کر وہ اس کو نقصان پہنچانے لئے سحر اور جادو تک کرواتا ہے، اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جادو کرنے میں ایسے اعمال کرنے ہی پڑتے ہیں جن

کی وجہ سے آدمی ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، اور ایمان سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حسد کتنی خطرناک بیماری ہے، اسی لئے اس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حسد سے بچو؛ اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں آدمی کی نیکیاں اس طرح ختم ہو جاتی ہیں جیسے آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے۔ اور ایک آگ تو بڑی اور ظاہر ہوتی ہے کہ اگر لگ جائے تو کسی چیز کو فوراً ہی ختم اور بھسم کر دیتی ہے۔ اور ایک آگ ہلکی ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ، آہستہ آہستہ کسی چیز کو ختم کرتی ہے۔ حسد والی آگ بھی جب کسی آدمی کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دھیرے دھیرے اس کی نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے اور اس کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

اور پھر آگ کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ جس چیز میں لگی ہوتی ہے جب وہ چیز جل کر ختم ہو جاتی ہے تو پھر وہ آگ خود اپنے آپ کو ہی کھانا شروع کرتی ہے، آگ کا ایک حصہ دوسرے کو کھاتا ہے یہاں تک کہ وہ خود ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح حسد کرنے والے کا حال بھی ہوتا ہے۔

فارسی کی کہاوت ہے:۔ ”اے حاسد بمیر کہ ایں رنجیست“ اے حسد کرنے والے! تو اپنے اس حسد ہی میں مر جا کہ تیرے لئے یہی ایک مصیبت کافی ہے۔ تو حسد خود اسی کے حق میں ایک آگ ہے، جس پر حسد ہوتا ہے جب وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا تو یہ آدمی خود اندر ہی اندر گُھٹ گُھٹ کر مر جاتا ہے، اور اس کے لئے یہ ایک وبالِ جان ہو جاتا ہے۔

حسد کے تین درجات

پھر حسد کے تین درجات ہیں۔ایک غبطہ جس کو رشک کہتے ہیں،اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی کی نعمت کو دیکھ کر آدمی کو جلن اور کڑھن نہیں ہوتی،بلکہ وہ خوش ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بھائی کو یہ نعمت عطا فرمائی ہے،اور ساتھ ہی وہ یہ تمنا بھی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔جیسے:کسی کا اچھا مکان دیکھ کر دل میں کوئی کڑھن نہیں ہوتی،البتہ آپ کے پاس ایسا مکان نہیں ہے تو آپ یہ تمنا کرتے ہیں کہ کاش!اللہ تعالیٰ ہم کو بھی ایسا ہی اچھا مکان دے۔یا کسی کا اچھا لباس دیکھ کر آپ اپنے لئے ایسے لباس کی تمنا کریں۔کسی کا علم،کسی کا تقویٰ،کسی کا حسن و جمال،کسی کا عہدہ و منصب،کسی کا مال و دولت اور ثروت دیکھ کر اسی جیسی تمنا کرنا اور اس سے جلن اور کڑھن کا محسوس نہ ہونا،اور اس سے اس نعمت کے دور ہونے کی تمنا نہ کرنا،اور ساتھ ہی ساتھ تمنا کرنا کہ مجھے بھی اللہ تعالیٰ ایسی نعمت عطا فرمائے؛اس کو ”رشک“ کہتے ہیں،اسی کو عربی میں ”غبطہ“ کہا جاتا ہے،اور یہ حرام نہیں ہے،بلکہ اس کی اجازت ہے۔بعض مرتبہ ”غبطہ“ کے لئے بھی حسد کا لفظ بولا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے:”لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ“ حسد دو ہی چیزوں میں جائز ہے، ایک تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو قرآن کا علم دیا ہو،اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہو،اور دوسرا وہ آدمی جس کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو،اور وہ نیکی کے کاموں میں دن رات خرچ کرتا ہو۔اس حدیث میں حسد سے غبطہ اور رشک ہی مراد ہے۔یہ پہلا اور ادنیٰ درجہ ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ کسی کی نعمت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔

اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ دل میں یہ خیال اور تمنا پیدا ہو کہ اس کے پاس سے یہ نعمت چھن جائے، چاہے مجھے ملے یا نہ ملے۔ یہ حسد کا سب سے خطرناک اور سب سے گھٹیا درجہ ہے۔

کبڑے کی تمنا

ایک آدمی کبڑا تھا، کسی نے اس سے پوچھا: تیری کیا تمنا ہے؟ اس نے کہا: میں چاہتا ہوں کہ سب لوگ کبڑے ہو جائیں ۔ اس سے کہا گیا: اللہ کے بندے! سب کے کبڑے ہونے کی تمنا کے بجائے یہی تمنا کرتا کہ تیرا کبڑا پن دور ہو جائے؛ تو اچھا تھا۔ تو ایسی سوچ کہ سامنے والے کی نعمت زائل ہو جائے، چاہے مجھے ملے یا نہ ملے، یہ بڑی خطرناک سوچ ہے۔ اس میں سامنے والے کی نعمت کے زائل ہو جانے والا خیال ہے۔

حسد کیوں پیدا ہوتا ہے؟

اور حسد پیدا ہونے کے دو سبب بتلائے گئے ہیں، ایک سبب حبِ جاہ اور حبِ مال ہے۔ آدمی کے دل میں مال کی محبت ہو، عہدہ و منصب کی محبت ہو، تو وہ یہ چاہتا ہے کہ میں سب سے بڑا مالدار بن کر رہوں، لوگوں کے اوپر میرا سکہ چلے۔ مجھے فلاں عہدہ و منصب حاصل

ہو جائے اور میں صاحبِ اقتدار بن جائوں؛ لیکن وہ جب دیکھتا ہے کہ کسی کے پاس مال زیادہ آگیا، کسی کے پاس اقتدار آگیا تو اب اس کو برداشت نہیں ہوتا، اور دل سے یہ تمنا کرتا ہے کہ اس کے پاس سے وہ چیز چھن جانی چاہیے۔ یہ حبِ مال اور حبِ جاہ ہے۔ تو حسد کے پیدا ہونے کا ایک سبب تو عہدہ، منصب اور کرسی کی اور مال کی محبت ہے۔

اور دوسرا سبب بغض اور کینہ ہے۔ جیسا کہ اوپر بتلایا تھا کہ کسی کے اوپر غصہ آیا جس کے نتیجہ میں دل میں سامنے والے سے نفرت بیٹھی، اور اسی نفرت کے نتیجہ میں دل میں اس کی عداوت اور دشمنی بیٹھ گئی۔ پھر جب اس کو کوئی نعمت ملتی ہے تو اسی دشمنی کے نتیجہ میں اس کو وہ پسند نہیں آتی، بلکہ دل سے چاہتا ہے کہ اس کے پاس یہ نعمت باقی نہ رہے اور چھن جائے۔ اس کے پاس دولت ہے تو اسی دشمنی کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ اس کے پاس یہ دولت نہ رہے۔ اس کے پاس کوئی عہدہ و منصب ہے تو دشمنی کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے پاس نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے شہرت و عزت دے رکھی ہے، اسی دشمنی کی وجہ سے یہ چاہتا ہے کہ عزت و شہرت اس کے پاس نہ رہے، اور وہ لوگوں کے درمیان بدنام اور بے عزت ہو جائے۔

حسد کیسے دور ہو؟

اور حسد کو دور کرنے کے علاج بھی بتلائے گئے ہیں۔ ایک علاج تو یہ ہے کہ آدمی یہ سوچے کہ:-

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالَم پیدا کئے ہیں، ایک عالمِ جنت ہے، وہ عالَم تو ایسا ہے کہ اس میں آدمی کو راحت ہی راحت، خوشی ہی خوشی، مسرت ہی مسرت ہے، وہاں غم کا نام و نشان نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نصیب فرمائے۔ آمین۔ جو آدمی جنت میں پہنچ گیا تو وہاں کوئی غم اور فکر اور کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔

دوسرا عالَم جہنم ہے جہاں مصیبت ہی مصیبت، تکلیف ہی تکلیف، رنج ہی رنج اور غم ہی غم ہے، وہاں راحت و آرام کا کوئی نام و نشان نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہماری حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اور تیسرا عالَم یہ دنیا ہے جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ عالمِ دنیا ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے مخلوط بنایا ہے، یہاں کی کوئی راحت ایسی نہیں جس میں رنج اور غم کا کانٹا لگا ہوا نہ ہو، اور یہاں کی کوئی تکلیف اور مصیبت ایسی نہیں جس کے اخیر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی راحت اور نعمت نہ ملتی ہو۔ گویا راحت بھی ہے اور مصیبت بھی ہے، نعمت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے، خوشی بھی ہے اور رنج بھی ہے، مسرت بھی ہے اور مصیبت بھی ہے۔ آپ دنیا کے بڑے سے بڑے اور مالدار سے مالدار آدمی کو پوچھیں کہ کبھی ایسا ہوا کہ تیری ساری تمنائیں پوری ہوئی ہوں؟ تو جواب ملے گا کہ ایسا تو نہیں ہے۔ دنیا میں کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جس کو اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی نعمت نہ ملی ہو، اور ساتھ ہی ساتھ کوئی نہ کوئی تکلیف بھی اس کو نہ ہو۔ ہر ایک کو کچھ نعمتیں ملی ہیں تو ساتھ میں کچھ تکلیفیں بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ سے دنیا کو ایسا ہی بنایا ہے کہ کسی کو کوئی نعمت دی اور کسی کو کوئی

دوسری نعمت دی۔ کسی کو مال و دولت سے نوازا، کسی کو فقر و فاقہ میں مبتلا کیا۔ کسی کو عہدہ و منصب دیا، کسی کو ماتحت بنادیا۔ کسی کو عزت و شہرت عطا فرمائی، کسی کو وہ چیز نہیں ملی۔ کسی کو حسن و جمال سے مالا مال کر دیا، کسی میں وہ بات نہیں ہے۔ کسی کو علم سے نوازا، کوئی آدمی جہالت میں مبتلا ہے۔ کسی کو اللہ تعالیٰ نے صلاح و تقویٰ عطا فرمایا، اس کے برخلاف کوئی فسق و فجور میں مبتلا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سی نعمتیں کسی کو دی اور کسی کو نہیں دیں۔ اب کس کو کیا نعمت دینا ہے اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی جس کے لئے جو مناسب سمجھتا ہے وہ فیصلہ کرتا ہے لہٰذا ہمیں یوں سوچنا چاہیے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان نعمتوں کا پورا پورا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے اور اس نے جس کے لئے جو نعمت مناسب سمجھی اس کو وہ عطا فرمائی، اور ہر آدمی اگر اپنے حالات کو سوچے گا تو دوسرے کے مقابلہ میں کچھ نعمتیں ایسی ضرور ہوں گی جو اپنے پاس ہوں گی اور وہ دوسرے کے پاس نہیں ہوں گی۔ اگر کسی عہدہ و منصب والے کو دیکھیں گے تو ہو سکتا ہے کہ عہدہ و منصب تو اس کو ملا ہے، لیکن ہمیں اللہ تعالیٰ نے دوسری کوئی نعمت ایسی دے رکھی ہوگی جو اس کے پاس نہیں ہوگی۔

ایک آدمی مال و دولت اور ثروت والا ہے، اس کی کئی فیکٹریاں لگی ہوئی ہیں، اس کے مکان کے سامنے کاریں کھڑی ہوئی ہیں، اور بنگلے بنے ہوئے ہیں، بینک بیلنس اور سب کچھ ہے، اور اس کے مقابلہ میں دوسرا آدمی ایسا ہے کہ صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہے اور چند روپے کما کر چٹنی روٹی حاصل کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو صحت و عافیت اور تندرستی

کی نعمت سے نوازا ہے۔ اب یہ مالدار کہے کہ اس کو یہ تندرستی کیوں ملی، اور یہ فقیریوں سوچے کہ اوہو! یہ تو بڑا خوش قسمت ہے کہ اس کی تو فیکٹریاں ہیں، بنگلہ اور کاریں ہیں اور بینک بیلنس بھی خوب ہے؛ لیکن دونوں کے اندر کے حال پر جب غور کرتے ہیں تو کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے، اس کے پاس بنگلہ اور سب کچھ ہے، لیکن اس کے اندر کا حال یہ ہے کہ بہترین سے بہترین بستر مہیا ہونے کے باوجود جب لیٹتا ہے تو نیند ہی نہیں آتی۔ تمام اسبابِ راحت موجود ہیں لیکن راحت نہیں ہے۔ اس کو نیند لانے کے لئے گولیاں کھانی پڑتی ہیں۔ اس کا دستر خوان سجا ہوا ہے، انواع واقسام کے کھانے بنے بنائے موجود ہیں، لیکن ایسی بیماری کا شکار ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹروں نے کہہ رکھا ہے کہ صرف دال کا پانی پیو، دوسرا کچھ کھانے پینے کی اجازت نہیں ہے۔ تو ساری نعمتیں دستر خوان پر موجود ہونے کے باوجود وہ استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ جس تکلیف میں مبتلا ہے وہ دوسروں کو معلوم نہیں۔

اس کے بالمقابل مزدور صبح سے شام تک مزدوری کرتا ہے اور چند روپے جو اس کو ملتے ہیں ان سے چٹنی روٹی حاصل کرتا ہے اور بڑی لذت وبڑے مزے لے لے کر پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور زمین پر سر رکھنے سے پہلے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے۔ جب وہ صاحبِ ثروت و دولت اس کو سوتا ہوا دیکھتا ہے تو رشک کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی صحت

دے رکھی ہے، نیند کی نعمت کے کیسے مزے اڑا رہا ہے، اور میں چاہتا ہوں تب بھی مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔

اسبابِ راحت کا نام راحت نہیں

درحقیقت ہم لوگوں نے اسبابِ راحت کو ہی راحت سمجھ رکھا ہے، حالاں کہ اسبابِ راحت حاصل ہوجانے سے راحت حاصل نہیں ہوجاتی۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ترمذی شریف میں دعا ہے کہ جب آدمی کھانا کھالے تو یہ دعا پڑھے: ’’اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ أَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ‘‘ تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا، اور مجھے بغیر کسی میری کوشش و محنت کے یہ کھانا اپنے فضل سے بطورِ رزق عطا فرمایا۔ جو آدمی یہ دعا پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پچھلے سارے گناہ معاف کردیتے ہیں۔ (سنن أبو داود، جامع ترمذي)

اس دعا میں دو چیزیں ہیں: ’’أَطْعَمَنِیْ هٰذَا، وَرَزَقَنِیْهِ‘‘ ایک تو یہ کہ مجھے کھلایا اور دوسرے یہ کہ مجھے رزق دیا۔ ہم یوں سمجھتے ہیں کہ بظاہر رزق اور کھانا دونوں ایک ہی چیز ہے؛ تو پھر دونوں الفاظ کو الگ الگ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: وہ چیز آپ کو رزق کے طور پر ملی، اور کھانے کے استعمال میں بھی آئی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دولت دے رکھی ہے جس سے یہ کھانا آپ کی ملک

میں آیا، لیکن ضروری نہیں کہ وہ کھانا کھانے کی نوبت بھی آئے، کیوں کہ ایک چیز آپ کو ملی ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے آپ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکتے ہوں۔

اسی طرح ایک آدمی نیند لانے کے لئے بہترین سے بہترین مسہری اور چارپائی تیار کرالے، اس پر نرم بستر لگوا لے، (A/C) لگوا لے، اور دوسرے سارے اسباب اختیار کرلے، لیکن جب سونا چاہے تو نیند ہی نہ آئے؛ تو وہ کیا کر سکتا ہے؟

معلوم ہوا کہ پیسوں سے اسباب تو خریدے جاسکتے ہیں لیکن نیند نہیں خریدی جاسکتی۔ پیسوں سے کھانا تو خریدا جاسکتا ہے، لیکن بھوک نہیں خریدی جاسکتی؛ نیند اور بھوک تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اسی کو عطا فرماتے ہیں۔ پتہ چلا کہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، اور اسبابِ راحت کا نام راحت نہیں ہے۔

ایک آدمی کو صحت و عافیت دے رکھی ہے اور دوسرے کو دولت دے رکھی ہے، اب وہ اسی غم میں گھل رہا ہے کہ اُس کے پاس دولت ہے اور میرے پاس پیسے نہیں ہیں، اور یہ یوں سوچ رہا ہے کہ یہ چار پیسے میرے کسی کام کے نہیں ہیں، مجھے تو اس سے کوئی فائدہ ہی نہیں پہنچ رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو نعمت دی ہے وہ دوسرے کے پاس نہیں ہے۔

لیکن پسر گرمی داراست

اوردوسری بات یہ ہے کہ جس کو جو چیز دی گئی ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی بہت ساری حکمتیں مضمر ہیں۔ بعض مرتبہ آدمی تمنا کرتا ہے کہ مجھے پیسے مل جائیں، لیکن ہو سکتا ہے کہ اگر اس کے پاس پیسے آجاتے تو یہ سرکشی اور تمرد و طغیانی پر آمادہ ہو جاتا، اورایسی حرکتیں کرتا جن کے نتیجہ میں وہ دولت اس کے لئے فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ ہو جاتی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:۔

”آں کس کہ ترا تونگر نمی گرداند، اُو مصلحتِ تواز توبہتر می داند“

وہ ذات جو تجھے مالدار نہیں بناتی، وہ تری مصلحتوں کو تجھ سے بہتر جانتی ہے۔

”پدررا عسل بسیاراست، لیکن پسر گرمی داراست“

باپ کے پاس شہد تو بہت ہے، لیکن بیٹے کی طبیعت میں گرمی بھی بہت زیادہ ہے، اس لیے اس کے پاس شہد ہونے کے باوجود وہ اپنے بیٹے کو نہیں دیتا، چوں کہ باپ جانتا ہے کہ شہد کی خاصیت بھی گرم ہے، اور یہ بھی گرم ہے، اگر گرم چیز کھائے گا تو اور زیادہ مصیبت میں پڑے گا۔ اسی طرح کس کو کیا دینا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس لئے آدمی کو یوں سوچنا چاہیے کہ یہ نعمت جو اس کو ملی ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کو دی ہے، میرے بارے میں اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی تھا کہ مجھے نہ ملے، تو مجھے نہیں ملی: اب

اس پر یہ تمنا کرنا کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے؛ یہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر ایک طرح کا اعتراض ہی تو ہے۔

یہ سوچنا حماقت ہے

دوسری بات یہ ہے کہ آدمی کی جو تمنائیں ہوتی ہیں کہ یہ بھی مجھے ملے اور وہ بھی مجھے ملے؛ ظاہر ہے کہ جتنی نعمتیں ہیں وہ ساری کی ساری تو ہر کسی کو مل ہی نہیں سکتیں؟ آدمی کی جتنی تمنائیں ہیں وہ سب اگر اس کو مل جائیں، اس کے بعد بھی آدمی کچھ نہ کچھ اور تمنا کرتا ہی رہے گا۔ دنیا کا سب سے خوش حال آدمی اگر آپ لے لیں، جیسے ہندوستان کا سب سے بڑا مالدار "عظیم پریم جی" سے جاکر آپ پوچھ لیجئے کہ بھائی! تیری ساری تمنائیں کیا پوری ہوگئیں؟ کیا تیری جتنی خواہشیں تھیں وہ سب پوری ہوگئیں؟ تو وہ یہی جواب دے گا کہ: نہیں! ابھی تو میری بہت ساری تمنائیں پوری ہونا باقی ہیں، ابھی تو مجھے یہ کرنا ہے اور وہ کرنا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں لیکن پھر بھی کم نکلے

دنیا کے بڑے سے بڑے خوشحال اور مالدار آدمی سے یہی سوال کرلو، تو وہ یوں نہیں کہے گا کہ میری ساری تمنائیں اور خواہشیں پوری ہو چکی ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو بنایا ہی

ایسا ہے کہ ایک تمنا پوری نہیں ہوتی کہ دوسری پیدا ہو جاتی ہے، اس لئے آدمی کا یہ سوچنا کہ میری ساری تمنائیں پوری ہو جائیں؛ یہ حماقت ہے۔

ذرا سا بخار

انسان کا مزاج ایسا ہے کہ نعمتوں کے معاملہ میں دوسرے کو دیکھتا ہے، اور مصیبت کے معاملہ میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے۔ ارے بھائی! تمہارے پاس کیا نعمت ہے تم نے کبھی سوچا؟ دراصل ہمارے سوچنے کی نوعیت اور انداز کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت مولانا سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو شدید بخار تھا۔ کسی نے پوچھا: حضرت! طبیعت کیسی ہے؟ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: الحمدللہ! آنکھ بہت اچھی ہے، کان بہت اچھا ہے، ہاتھ بھی درست ہے، پاؤں بھی تندرست ہے، کھانا بھی کھاتا ہوں، بس! ذرا سا بخار ہو رہا ہے۔ حضرت نے پہلے اللہ تعالیٰ کی ساری نعمتوں کو گنوایا، پھر بیماری کو معمولی کر کے بتلایا۔ ہمارے جیسے کو اگر تھوڑا سا بخار آجائے، اور کسی نے پوچھ لیا کہ: کیسی طبیعت ہے؟ تو کہیں گے: ارے جانے دو نا! بہت تیز بخار ہے، میں تو پریشان ہو گیا، اور یہ ہوا، اور فلاں ہوا۔

ایک گلاس آدھا دودھ سے بھرا ہوا ہو، تو اس کو دو طرح سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ایک تعبیر تو یہ ہے کہ آدھا گلاس دودھ سے بھرا ہوا ہے، اور دوسری تعبیر یہ بھی ہے کہ آدھا خالی ہے۔ دونوں باتیں ایک ہی ہیں، لیکن دونوں تعبیرات میں سوچ کا فرق ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو سوچے کہ میرے حال پر اس کی کتنی نعمتیں ہیں۔ جب یہ سوچے گا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہو گی، اور شکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمتوں میں اضافہ بھی ہو گا۔ اور اگر اس طرف نہیں دیکھے گا اور دوسروں کی طرف دیکھتا رہے گا؛ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ہی پیدا ہو گی۔

دوسروں کو دیکھنے کا طریقہ

اور اگر دوسروں کو دیکھنا ہی ہے تو اس کا طریقہ بھی رسول اللہ ﷺ نے بتایا ہے کہ: دنیا کی نعمتوں کے سلسلہ میں اپنے سے کم تر کو دیکھو؛ تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی توفیق ہو۔ اور دین کے معاملہ میں اپنے سے بہتر کو دیکھو؛ تاکہ زیادہ سے زیادہ عمل کی توفیق ہو۔ اور آج ہمارا مزاج دنیا کے معاملہ میں یہ بن چکا ہے کہ اگر ہمارے پاس ایک لاکھ ہیں، تو پانچ لاکھ والے کو دیکھتے ہیں کہ میرے پاس اتنے نہیں ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ہمیں جو ایک لاکھ ملے ہیں ان کی بھی ناشکری ہوتی ہے۔ اور دین کے معاملہ میں اگر دو نمازیں پڑھتا ہے تو سوچتا ہے کہ مَیں فلاں سے تو اچھا ہوں، وہ تو ایک بھی نماز نہیں

پڑھتا۔ ارے بھائی! یہ نہیں دیکھتے کہ تم دو نماز ہی پڑھتے ہو اور تین چھوڑ رہے ہو؟ حالاں کہ تمھیں تو پانچوں وقت کی نماز پڑھنی چاہیے تھی۔

سارے رنج وغم سے بچالیا

حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث، فقیہ اور صوفی گزرے ہیں وہ فرماتے ہیں: مَیں پہلے مالداروں کی رفاقت میں رہتا تھا تو ہر وقت رنج و غم میں اور تکلیف زدہ رہتا تھا، اس لیے کہ جس کو دیکھتا تھا تو سوچتا تھا کہ اس کا لباس میرے لباس سے اچھا ہے، اس کی سواری میری سواری سے اچھی ہے، اس کا مکان میرے مکان سے اچھا ہے۔ میرا مکان اس سے اچھا ہونا چاہیے، میری سواری اس سے اچھی ہونی چاہیے، میرا لباس اس سے اچھا ہونا چاہیے؛ اس طرح مَیں ہمیشہ رنج و غم میں ہی مبتلا رہتا تھا، لہٰذا مَیں نے اپنی رفاقت بدل دی اور غریبوں کے ساتھ رہنا شروع کیا، اب مَیں جس کو بھی دیکھتا تو سوچتا کہ میرا لباس اس کے لباس سے اچھا ہے، میری سواری اس کی سواری سے اچھی ہے، میرا مکان اس کے مکان سے اچھا ہے؛ اس طرح مَیں نے سارے رنج و غم سے اپنے آپ کو بچالیا۔

بہر حال! آدمی کو چاہیے کہ ایک بات تو یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے مجھے یہی دیا ہے۔ اور جس کو جو بھی دیا وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل ہی سے دیا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے وہ جسے جو چاہے دے: ”ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ“ جب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کسی

کو دیا ہے تو اس پر مجھے اور آپ کو اعتراض کرنے کا کیا حق ہے؟ اس لیے حسد کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر اعتراض کرتا ہے۔ لہٰذا اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے، یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔

حسد کا دوسرا علاج

اور حسد کا دوسرا علاج یہ بھی ہے کہ آدمی سوچے کہ جس پر اس کو حسد ہو رہا ہے اس کے ساتھ دشمنی پیدا ہو رہی ہے۔ اور دنیا کا دستور تو یہ ہے کہ آدمی دشمن کا بھلا کبھی بھی نہیں چاہتا، بلکہ ہمیشہ اس کا برا ہی چاہتا ہے، لیکن میں تو حسد کر کے اپنے دشمن کے ساتھ بھلائی کر رہا ہوں۔ وہ کیسے؟ وہ اس طرح کہ آدمی جب حسد کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ خود ہی ہمیشہ رنج و غم میں مبتلا رہتا ہے، اس کو دیکھ کر اس کا دشمن تو خوش ہی ہو گا کہ اچھا ہے وہ رنج و غم میں مبتلا ہے؛ یہ تو دشمن کا دنیوی فائدہ اور خود کا دنیوی نقصان ہے۔

اور آخرت کا نقصان اس طرح ہو گا کہ اسی حسد کے نتیجہ میں اس کی غیبت کرے گا، اس کے عیوب لوگوں کے سامنے بیان کرے گا، اس کو سماج و معاشرہ اور سوسائٹی میں نیچا دکھلانے کی کوشش کرے گا، اس کو بدنام کرنے کے لئے تدبیریں کرے گا؛ اس طرح گویا اپنی نیکیاں اپنے دشمن کو دیتا رہے گا اور اپنی آخرت کا نقصان کرے گا۔

برائی کرنے والے کو مٹھائی

ایک مرتبہ ایک بزرگ اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے، کسی نے آکر کہا: فلاں صاحب آپ کی برائی بیان کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ خاموش رہے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد اس آدمی کی خدمت میں مٹھائی بھیجی۔ کسی نے کہا: حضرت! وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے اور آپ اس کے پاس ہدیہ بھیجتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: بھائی! وہ میری برائیاں کرکے مجھے اپنی نیکیاں دے کر مجھ پر آخرت کا احسان کر رہا ہے، اب میں اس کے ساتھ وہ احسان تو نہیں کر سکتا؛ اس لئے مَیں دنیا کی چیز اس کو بھیج کر اس سے کم درجہ کا بدلہ چکار ہاہوں۔

گھر کی دولت گھر ہی میں رہے

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کبھی اپنی مجلس میں نہ کسی کی غیبت کرتے تھے اور نہ کسی کی غیبت سنتے تھے۔ اور اپنے شاگردوں سے فرمایا کرتے تھے: نہ کسی کی غیبت کرو اور نہ سنو۔ اور اگر غیبت کرنے کا شوق ہی ہو تو اپنے ماں باپ کی کرو؛ تاکہ گھر کی دولت گھر ہی میں رہے، کسی دوسرے کے پاس نہ جانے پائے۔ چوں کہ آدمی جب کسی کی غیبت کرے گا، اپنی نیکیاں اس کو پیش کرے گا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہم عصر ہیں، وہ فرمایا کرتے تھے: امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بہت بخیل ہیں۔ یعنی وہ اپنی نیکی کسی کو دینا نہیں چاہتے، نہ کسی کی غیبت کرتے ہیں، نہ سنتے ہیں۔

نہ اِدھر کے رہے، نہ اُدھر کے رہے

بہر حال! یہ بڑی اہم چیز ہے کہ حسد کرنے والا اس طرح برائیوں میں مبتلا ہو کر اپنی نیکیاں برباد کرتا ہے۔ اپنی آخرت کا بھی نقصان کرتا ہے، اور دنیا کا بھی نقصان اٹھاتا ہے۔ دنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد:

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم
نہ ادھر کے رہے، نہ ادھر کے رہے

والا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو یہ سوچنا چاہیے کہ حسد کر کے مَیں بجائے فائدہ کے اپنا نقصان کر رہا ہوں، لہٰذا مجھے اس سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرنی چاہیے

معاصرانہ رقابت؛ اور اس کا علاج

ایک اور بات بھی ہے کہ کبھی معاصرانہ رقابت کے طور پر دل میں ایسا خیال پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی بعض ساتھی ہم عصر اور ایک درجہ کے ہوتے ہیں، پھر ان میں سے کوئی کسی خوبی

میں آگے بڑھ جاتا ہے تو بعض مرتبہ قدرتی طور پر دل میں اس کے متعلق یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ چیز اس کو کیوں مل گئی؟ وہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا؟ اور اس طرح کبھی غیر اختیاری طور پر حسد والا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے؛ تو اس کا علاج کیا ہے؟۔

دیکھئے! اس کا علاج یہ ہے کہ اگر دل میں ایسا جذبہ پیدا ہو جائے تو اپنی زبان یا اپنے عمل سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوئی تدبیر نہ کی جائے۔ نہ اس کی غیبت کی جائے، نہ اس کو سماج اور سوسائٹی میں نیچا دکھلانے کی کوئی شکل اختیار کی جائے۔ اور نہ ہی اس کو نقصان پہنچانے اور بے عزت کرنے کے لئے کوئی اقدام کیا جائے۔ کبھی ہو سکتا ہے کہ حسد والا جذبہ کسی ایسی بات پر اُبھارے جس سے اس کو نقصان پہنچے، لیکن آدمی اپنے آپ کو ان ساری چیزوں سے بچائے۔

اپنے اس جذبہ کو برا بھی سمجھے کہ میرے دل میں جو خیال پیدا ہو رہا ہے وہ بہت برا ہے۔ اور پھر ایک کام یہ کرے کہ اس کے لیے دعا کرے کہ اللہ تعالیٰ اسے اور زیادہ ترقی دے، تا کہ خود اپنے دل پر آرے چلیں۔ اس دعا کے ذریعہ یہ جذبہ خود بخود کم ہو گا۔ اور اپنے دل میں سے اس جذبہ کے دور ہونے کی بھی دعا کی جائے؛ تب تو ان شاء اللہ اس پر کوئی گرفت اور پکڑ نہیں ہو گی۔

اور اگر آپ نے اس کے خلاف تدبیریں کیں، اس کی غیبت کی، اس کو نیچا دکھلانے کے لئے کوششیں کرتے رہے، اس کو بدنام کرتے رہے، اس کے صحیح یا غلط عیوب لوگوں کے

سامنے پیش کرتے رہے؛ تو یہ حق العبد ضائع ہوا، اس لیے جب تک اس سے معافی نہیں مانگیں گے وہاں تک یہ معاملہ صاف نہیں ہوگا۔

اور اگر آپ نے اپنی زبان اور عمل سے اس کے خلاف کوئی تدبیر نہیں کی، نہ غیبت کی، نہ اس کو نیچا دکھلانے کی کوئی تدبیر کی، نہ اس کے عیوب بیان کئے؛ لیکن دل کے اندر اس کے خلاف جو جذبہ پیدا ہوا ہے اس کو برا بھی نہیں سمجھا اور اللہ تعالیٰ سے اس کے دور ہونے کی دعا بھی نہیں کی، تو اگرچہ بندے کا حق ضائع نہیں ہوا، لیکن عند اللہ آپ گنہگار ہوئے۔ اب جب تک آپ اس سے توبہ نہیں کریں گے وہاں تک یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔ حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: "قَدْ دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ" اگلی امتوں میں جو بیماریاں (بغض، کینہ، حسد وغیرہ) تھیں، وہ تمہارے اندر بھی دھیرے دھیرے آرہی ہیں اور آئیں گی اور یہ مونڈنے والی ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ وہ بالوں کو مونڈ دیتی ہیں؛ بلکہ یہ دین کو مونڈ دیتی ہیں (ترمذی شریف) اس لئے کہ آدمی جب حسد بغض اور کینہ میں مبتلا ہوگا تو اس کو نقصان پہنچانے کے لئے اپنی زبان اور اپنے عمل سے تدبیریں کرے گا، اور وہ سب اس کی نیکیوں کو ختم کرنے والی ہیں۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک بیماری ہے جس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

آسان نسخہ

اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جو آدمی اپنے دل کو ایسے میل اور کینہ سے پاک صاف رکھے گا اس کے لئے جنت کی بشارت ہے۔ مسند احمد میں حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے جس کو حضرت مفتی شفیع صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے معارف القرآن کی آٹھویں جلد (ص:۳۷۹/۳۸۰) میں نقل کیا ہے:-

حضرت اَنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نبیؐ کریم ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: ابھی ایک جنتی آدمی آنے والا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک انصاری صحابی ایسی حالت میں آئے کہ وضو کا پانی ان کے چہرے سے ٹپک رہا تھا اور ان کے بائیں ہاتھ میں جوتے تھے، وہ آکر بیٹھ گئے، صحابہ (رضی اللہ عنہ) نے ان کو دیکھ لیا۔ پھر دوسرے روز بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا آپ ﷺ نے وہی ارشاد فرمایا اور تھوڑی دیر کے بعد صحابہ نے دیکھا کہ وہی کل والے صحابی کل کی طرح آئے کہ وضو کا پانی چہرے سے ٹپک رہا تھا، بائیں ہاتھ میں جوتے تھے اور آکر بیٹھ گئے۔ تیسرے روز بھی اسی طرح ہوا۔ نبیؐ کریم ﷺ تین دن تک مسلسل ان کے متعلق جنت کی بشارت سناتے رہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ ذرا دیکھوں تو سہی کہ ان کا ایسا کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ مسلسل تین دن سے ان کے

متعلق جنت کی بشارت ارشاد فرمارہے ہیں۔ جب حضور کی مجلس ختم ہوئی اور سب باہر نکلے تو میں نے ان صحابی سے عرض کیا: چچا جان! میرا گھر والوں کے ساتھ کچھ جھگڑا ہو گیا ہے، اس لئے میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ تین دن تک اپنے گھر نہیں جاؤں گا، اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے یہاں آکر قیام کرلوں اور ٹھہر جاؤں۔ انہوں نے کہا: ضرور آجاؤ۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ: میں ان کے یہاں گیا اور تین رات تک بیدار رہ کر دیکھتا رہا کہ وہ کیا عمل کرتے ہیں، لیکن وہ تو رات کو آتے، سونے سے پہلے کچھ پڑھتے اور سو جاتے، پھر فجر کے لئے ہی اٹھتے، تہجد کے لئے بھی نہیں اٹھتے۔ اور دن بھر بھی میں نے ان کے اعمال کا جائزہ لیا تو ایک عام مسلمان جس طرح نماز وغیرہ کی پابندی کرتا ہے، وہی ان میں بھی دیکھا۔ تین دن تک میں ان کے ساتھ رہا، رات کو بھی دن کو بھی ان کے اعمال کا جائزہ لیتا رہا، لیکن کوئی ایک عمل بھی مجھے ایسا نظر نہیں آیا جس کے متعلق میرا دل گواہی دے کہ ان کے اس عمل کی وجہ سے جنت کی بشارت سنائی گئی ہے، البتہ اس پورے عرصہ میں مَیں نے ان کی زبان سے کوئی بھی کلمہ بجز کلمۂ خیر کے نہیں سنا۔

جب تین دن پورے ہوئے اور قریب تھا کہ میرے دل میں ان کے عمل کی حقارت آجائے تو میں نے ان سے عرض کیا: چچا جان! میرا تو گھر والوں سے کچھ جھگڑا نہیں ہوا تھا، البتہ حضور اکرم ﷺ نے آپ کے متعلق تین دن تک یہ ارشاد فرمایا تھا، اس لئے میں چاہتا تھا کہ آپ کے اعمال دیکھ کر فیصلہ کروں کہ وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے حضور

ﷺ نے یہ بشارت سنائی ہے، پھر میں تین دن آپ کے ساتھ رہا لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے تو کوئی ایسا عمل نظر نہیں آیا، اب آپ ہی بتلا دیجیے کہ آپ کا وہ کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے آپ نے یہ درجہ پایا ہے؟ انہوں نے کہا: بھائی! میرے پاس تو کوئی عمل نہیں ہے، آپ نے بھی دیکھ لیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں: مَیں مایوس ہو کر واپس ہونے لگا تو انہوں نے مجھے بلایا اور کہا: ہاں! ایک بات ہے کہ "مَیں اپنے دل میں کسی مسلمان کے متعلق کینہ کپٹ، برائی اور میل نہیں پاتا، اور کسی پر حسد نہیں کرتا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہ) نے کہا: بس یہی وہ عمل ہے جس پر نبی کریم ﷺ نے جنت کی بشارت سنائی ہے(۱)۔

اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ دوسرے اعمال تو ہم سے ہوتے نہیں، لیکن یہ ایک بہت آسان نسخہ ہے، اگر ہم اس کا اہتمام کرلیں کہ اپنے دل میں کسی کے متعلق کوئی میل، بغض، کینہ، حسد اور برائیاں نہ رکھیں؛ تو ان شاء اللہ تعالیٰ ہمارے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کی بشارت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے۔

(۱) ابن کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ اس کو نسائی نے بھی عمل الیوم واللیلۃ میں نقل کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح علیٰ شرط الصحیحین ہے۔

النهي عن التجسس
والتسمع لكلام من يكره استماعه

لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنے کی ممانعت

وقال اللہ تعالیٰ:-وَلَا تَجَسَّسُوْا.

وقال تعالیٰ:وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا ، فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وَإِثْماً مُبِيناً (الأحزاب:٥٨)

جاسوسی کی ممانعت

نیا عنوان قائم کیا ہے:لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنا،ان کے حالات کو معلوم کرنے کے لئے جستجو اور کوشش کرنا۔اور کوئی آدمی اگر اپنی بات سنوانا نہ چاہتا ہو پھر بھی اس کو سننے کی کوشش کرنا؛یہ دونوں باتیں ممنوع ہیں۔

سورۂ حجرات کی آیت کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے: ﴿وَلَا تَجَسَّسُوْا﴾ جاسوسی مت کرو، کسی کی حالت اور خبر معلوم کرنے کی کوشش مت کرو۔

سورۂ احزاب کی آیت ذکر کی ہے جو پہلے بھی کئی مرتبہ گزر چکی ہے کہ: جو لوگ ایمان والے مردوں اور عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہو جس کی وجہ سے وہ اس تکلیف کے حقدار بنتے ہوں؛ تو ایسے لوگوں نے اپنے اوپر جھوٹ اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھالیا۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ دوسروں کی باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں، یا ان کے حالات کی ٹوہ اور جستجو میں لگے رہتے ہیں، گویا وہ ان کو ایک طرح کی تکلیف پہنچاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی ایک روایت پیش فرمائی ہے۔ آگے دو عنوانات قائم کریں گے: "النھی عن سوء الظن بالمسلمین من غیر ضرورۃ" مسلمانوں کے ساتھ بلاوجہ بدگمانی میں مبتلا ہونا شرعاً ممنوع ہے۔ اور "تحریم احتقار المسلمین" مسلمانوں کو حقیر سمجھنے کا حرام ہونا، ان ابواب کے ذیل میں بھی حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی اسی روایت کے بعض حصوں کو پیش کریں گے۔ یہاں پوری روایت ذکر کردی ہے۔

تحسُّس اور تجسُّس حرام ہے

حدیث ۱۵۷۰:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه:- أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قالَ: ((إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ، فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الحَدِيثِ، ولا تحسَّسوا وَلاَ تَجَسَّسُوا وَلاَ تَنَافَسُوا، وَلاَ تَحَاسَدُوا، وَلاَ تَبَاغَضُوا، وَلاَ تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ

إِخْوَاناً كَمَا أَمَرَكُمْ . الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ ، لَا يَظْلِمُهُ ، وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ ، التَّقْوَى هَاهُنَا)) وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ((بِحَسْبِ امْرِئٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ ، كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ : دَمُهُ ، وَعِرْضُهُ ، وَمَالُهُ . إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ ، وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ)).

وَفِي رِوَايَةٍ : ((لَا تَحَاسَدُوا ، وَلَا تَبَاغَضُوا ، وَلَا تَجَسَّسُوا ، وَلَا تَحَسَّسُوا ، وَلَا تَنَاجَشُوا وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً)).

وفی روایۃ : ((لَا تَقَاطَعُوا ، وَلَا تَدَابَرُوا ، وَلَا تَبَاغَضُوا ، وَلَا تَحَاسَدُوا ، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً)) وَفِي رِوَايَةٍ : ((وَلَا تَهَاجَرُوا وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ)). (رواہ مسلم بکل ھٰذِہِ الروایات، وروی البخاریؒ أکثرَھَا)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: بدگمانی سے بچو، اس لئے کہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ اور لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی جستجو مت کرو۔ اور (دنیا کی چیزوں کے حاصل کرنے میں) آپس میں ریس نہ کرو۔ اور حسد مت کرو۔ اور آپس میں بغض وعداوت اور دشمنیاں مت رکھو۔ اور ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھاؤ، اور اللہ کے بندے! بھائی بھائی بن کر رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ خود اس پر ظلم کرے، اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑے، اور نہ اس کو حقیر سمجھے؛ اور (چوں کہ تقویٰ ظاہر میں تو نظر نہیں آتا، اس لئے حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا:) تقویٰ یہاں ہے۔ (پھر فرمایا:) ایک آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ایک مسلمان پورا کا پورا دوسرے مسلمان پر حرام ہے؛ اس کا خون بھی، اس کی عزت بھی، اور اس کا مال۔ (پھر

حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا:) اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تو تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔

اسی روایت کے بعض الفاظ دوسری روایت میں بھی آئے ہیں، جس میں ایک جملہ یہ بھی ہے: اور اگر خریدنے کا ارادہ نہ ہو تو خواہ مخواہ اس چیز کا بھاؤ بڑھانے کے لئے قیمتیں مت لگاؤ۔ اور ایک روایت میں یہ بھی ہے: ایک دوسرے کے ساتھ قطع تعلق مت کرو۔ اور ایک آدمی نے کوئی چیز خرید لی ہو تو پھر دوسرا آدمی اس کو نہ خریدے۔

افادات:- کسی کے متعلق کسی گناہ کی کوئی ایسی بات سوچنا جس کو ہم نے اپنی آنکھوں سے کرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، یا کوئی گناہ کی بات کرتے ہوئے ہم نے اپنے کانوں سے نہیں سنا ہے؛ اسی کو "بدگمانی" کہتے ہیں، اور اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے بلکہ جو چیز ہمارے سامنے پیش آئی ہو اس کے متعلق بھی ہمیں چشم پوشی سے کام لینے کی ہدایت ہے، جیسا کہ پہلے ایک مستقل عنوان میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کے متعلق مختلف وساوس اور خیالات میں مبتلا رہتے ہیں، اور سوچتے ہیں کہ اس نے یہ کیا ہوگا، فلاں نے وہ کیا ہوگا۔ ان کے متعلق محض گمان کرتے ہیں، ایسے گمان کی بنیاد پر کسی پر تہمت لگانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ بدگمانی حرام کام ہے جس سے منع کیا گیا ہے۔

"وَلَا تَحَسَّسُوْا وَلَا تَجَسَّسُوْا" لوگوں کے حالات معلوم کرنے کی جستجو مت کرو یہاں دو لفظ "تحسس" اور "تجسس" استعمال کئے گئے ہیں۔ "تجسس" کے متعلق لکھا ہے کہ ہاتھ سے کسی چیز کے چھونے کو کہتے ہیں، یعنی ہاتھ سے کسی کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔ اور "تحسس" حواس سے ماخوذ ہے، یعنی آنکھ، کان وغیرہ حواس کے ذریعہ لوگوں کے حالات کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: لوگ جو چیز ہم سے چھپانے کا اہتمام کریں پھر بھی ہم از خود آگے بڑھ کر اس کو معلوم کرنے کی کوشش کریں؛ اس کو "تجسس" کہتے ہیں، اور عام حالات میں کسی چیز کے معلوم کرنے کے لئے کوشش کرنے کو "تحسُّس" سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ باب اسی لئے قائم کیا ہے کہ لوگوں کے چھپے ہوئے حالات کو معلوم کرنے کی کوشش مت کرو۔ جیسے: بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اسی فکر میں لگے رہتے ہیں کہ فلاں گھر میں جاتا ہے؛ تو کیا کرتا ہے۔ فلاں کے پاس بیٹھتا ہے تو وہاں کیا باتیں ہوتی ہیں؟ کبھی دوسروں سے پوچھتا ہے کہ تم وہاں سے آئے تو کیا باتیں ہو رہی تھیں۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کے فون سنتے ہیں، جیسے کبھی ایسا ہوا کہ فون کا ریسیور اُٹھایا تو دوسروں کی باتیں سنائی دی؛ تو خاموشی سے سنتے رہتے ہیں۔ یا بعض لوگ اپنے گھر ہی میں اپنے بھائیوں اور اپنے رشتہ داروں کے فون یا باتیں سننے کی کوشش کرتے ہیں؛ یہ سب "تجسس" میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ لوگوں کے احوال معلوم کرنے کے لئے ٹوہ میں لگے رہنے کی کوشش کرنے کو ”جاسوسی اور تجسس“ سے تعبیر کیا گیا ہے، شریعت اس کی بالکل اجازت نہیں دیتی، یہ حرام ہے، اور اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔ہاں! کسی کے متعلق اگر یہ اندیشہ ہو کہ اس کی طرف سے ہمیں جانی یا مالی نقصان پہنچانے کی بھرپور کوشش ہو رہی ہے، لہٰذا اس کی ان بری تدبیروں سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس کی ان بری تدبیروں کو معلوم کرنے کی کوشش کی جائے؛ تو اس کی شریعت اجازت دیتی ہے۔

دنیوی چیزوں میں ریس کرنا ممنوع ہے

”وَلَاتَنَافَسُوْا“ اور دنیا کی چیزوں کے حاصل کرنے میں، مال و دولت کی زیادتی میں، عہدہ اور منصب حاصل کرنے کے لئے آپس میں ریس نہ کرو۔ مثلاً: اس نے فلاں عہدہ حاصل کرلیا، وہ ہماری کمیٹی کا صدر بن گیا، تو مَیں بھی صدر بن جاؤں، اس کے لئے آپس میں مقابلہ کرنا، جیسے: دورِ حاضر میں جمہوریت کے نام پر جو الیکشن ہوتے ہیں، اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ اسلام میں تو عہدوں کی تقسیم کا باقاعدہ حق صاحبِ اختیار، بادشاہِ وقت، یا حاکمِ وقت کو دیا گیا ہے کہ وہ جس کے اندر اس عہدہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی صلاحیت دیکھے اور اس عہدہ کے تقاضے پورا کرنے کے لئے جن صفات کی ضرورت ہے وہ صفات جس کے

اندر پائے، اسی کو اپنی طرف سے وہ عہدہ دے، اور اگر کوئی سامنے سے چل کر کسی عہدہ کا مطالبہ کرے تو ایسے آدمی کو عہدہ دینے سے منع کیا گیا ہے۔

چناں چہ حضرت ابوموسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نبیٔ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میرے ساتھ دو آدمی اور بھی ہوگئے، مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ کس مقصد کے لئے حضور کے پاس حاضری دے رہے ہیں، وہاں جاکر انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ سے کسی عہدہ پر مقرر کرنے کی درخواست رکھی، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ہم مناصب اور عہدے ان لوگوں کو نہیں دیتے جو اپنی طرف سے مطالبہ کریں۔ (بخاری ومسلم)

لیکن آج کل تو الیکشن میں خود ہی مطالبے کئے جاتے ہیں کہ مجھے ووٹ دو، گویا اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، حالاں کہ شرعی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ پسندیدہ نہیں ہے، بلکہ لوگ خود ہی ایسے آدمی کو- جو اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی صفات کا حامل ہو- آگے بڑھائیں۔ لیکن عام طور پر ایسے مقابلوں میں ایسے ہی لوگ آتے ہیں جو اس کے اہل نہیں ہوتے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ شریف لوگ تو اس میں حصہ نہیں لیتے ، بلکہ اپنے آپ کو ایسی چیزوں سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

بہر حال! دنیا کی مال و دولت، عہدہ، دنیوی عزت و آبرو کو بڑھانے کے لئے مقابلہ آرائی اور ریس کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہی جذبہ آگے جاکر آپس میں حسد کو پیدا کرنے والا، بغض وعداوت کو پیدا کرنے والا ہوتا ہے؛ اسی لئے فرمایا: حسد مت کرو۔ جب

ریس اور مقابلے ہوں گے تو حسد ضرور پیدا ہوگا، اس لئے ریس اور مقابلے کی ممانعت کرکے حسد کی جڑ ہی کاٹ دی گئی (حسد کے متعلق بیان گذر چکا ہے۔ اور حسد ہی کے نتیجہ میں آپس میں بغض، عداوتیں اور دشمنیاں بھی پیدا ہوتی ہے، اس لیے فرمایا:) آپس میں بغض و عداوت اور دشمنیاں مت رکھو۔

بھائی بھائی بن کر رہو

"وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَاناً كَمَا أَمَرَكُمْ" ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھلاؤ، اور اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن کر رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے۔ قرآنِ پاک کہتا ہے: "إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ" مسلمان مسلمان کا بھائی ہے۔ گویا جس طرح ایک بھائی اپنے بھائی کے ساتھ ہر چیز میں حسنِ سلوک کا اہتمام کرتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان بھی اسلام کی بنیاد پر اپنے مسلمان بھائی کے ساتھ ہر طرح کی بھلائی کا اہتمام کرے۔

گروہ بندیاں تعلیماتِ اسلام کے خلاف

لیکن ہم نے آج کل آپس میں گروہ بندیاں اور اختلافات پیدا کر رکھے ہیں کہ فلاں میرے وطن کا نہیں ہے، تو مَیں اس کے ساتھ بھلائی کیوں کروں؟ فلاں میری کمیونٹی، میرے خاندان اور میری برادری سے تعلق نہیں رکھتا، تو مَیں اس کے ساتھ بھلائی کیوں

کروں؟ فلاں کی میرے ساتھ دوستی نہیں ہے تو میں اس کے ساتھ بھلائی کیوں کروں؟ حالاں کہ ان ساری بنیادوں پر مدد کرنے اور ساتھ دینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، چاہے آپ کی اس سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے، وہ آپ کا ہم وطن نہیں ہے، آپ کی برادری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کوئی دوستی بھی نہیں ہے، لیکن وہ مسلمان ہے، تو اسی ناطے سے اس کی مدد، خیر خواہی اور بھلائی کا معاملہ کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ اسلام کے نام پر ایک حق ہوتا ہے، اسلام نے ساری گروہی عصبیتوں اور پارٹی بندیوں اور فرقہ بندیوں کو ختم کر دیا ہے۔

اور آج کل تو معاملہ ایسا ہو گیا کہ وہ ہماری پارٹی کا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ وہ حق پر نہیں ہے، بلکہ ظالم ہے اور اسی کی غلطی ہے؛ تب بھی اس کے ظلم میں ہم اس کا ساتھ دیتے ہیں، اور وہ بھی مدد کے لئے پکارتا ہے کہ میری برادری، میرے رشتہ دار، میرے وطن والو آجاؤ۔ حالاں کہ وطن اور برادری کی بنیاد پر آپس میں ایک دوسرے کو مدد کے لئے بلانا جاہلیت کا نعرہ ہے، اور اسی کو عصبیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

نعرۂ جاہلیت

غزوۂ مریسیع (جس کو غزوۂ بنو المصطلق بھی کہا جاتا ہے) کے موقعہ پر ایک انصاری اور ایک مہاجری کے درمیان جھگڑا ہو گیا، انصاری نے پکارا: اے انصار! میری مدد کے لئے

آؤ۔ اور مہاجری نے بھی پکارا: اے مہاجرین !میری مدد کے لئے آئو ، حضور پاک ﷺ جہاں تشریف فرماتھے، آپ کے گوشِ مبارک میں جب یہ آوازیں پڑیں تو آپ نے فرمایا: ”مَابَالُ دَعْوَی الجَاھِلِیَّۃِ“ یہ جاہلیت والا نعرہ کہاں سے لائے؟ ”دَعُوھَا فَإِنَّھَا مُنْتِنَۃٌ“ اس نعرہ کو چھوڑو؛ یہ تو بڑا بدبودار ہے۔ (بخاری و مسلم)

حضور ﷺ کا ارشاد ہے: اپنے مسلمان بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ کسی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! اگر وہ مظلوم ہو تو مدد کرنا سمجھ میں آتا ہے اور میں اس کی مدد کروں گا، لیکن ظالم ہو تو پھر مدد کیسی؟ حضور ﷺ نے فرمایا: ظالم ہو تب بھی مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو۔ ایک آدمی غلط لائن پر جارہاہے تو ایسا نہیں ہے کہ آپ اس کا ساتھ دیں، بلکہ اس کو اس غلط لائن سے بچالینا یہ اس کی مدد ہے۔ آج کل تو محض اپنی رشتہ داری، اپنی کمیونٹی اور برادری کی بنیاد پر، محض ہم وطنی کی بنیاد پر، محض دوستی کی بنیاد پر، محض اپنی پارٹی اور جماعت کی بنیاد پر ساتھ دیا جانے لگا ہے، حالاں کہ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے، اور خود اقرار بھی کرتے ہیں، اس کے باوجود اس کا ساتھ دیا جارہاہے، شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

خاندان وقبائل کیوں؟

خاندان قبائل برادریاں سب تعارف کے لئے ہیں، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا﴾ اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد (حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام) اور ایک عورت (حضرت حوا علیہا السلام) سے پیدا کیا ہے، اور خاندان اور برادریاں پہچان کے لیے بنائیں کہ یہ فلاں برادری کا ہے اور وہ فلاں برادری کا ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہیں کہ اس کے ذریعہ ایک دوسرے پر فخر کرو اور اپنی بڑائی جتلاؤ کہ میرا تعلق فلاں خاندان اور فلاں برادری سے ہے، میں اونچا ہوں اور وہ نیچا ہے۔ بلکہ حضورِ اکرم ﷺ نے فتحِ مکہ کے موقعہ پر جو تقریر فرمائی تھی، اس میں فرمایا تھا: تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے، لہٰذا کسی گورے کو کالے پر اور کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت تو تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اسی کو قرآنِ کریم میں بھی فرمایا گیا ہے: ”إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ“ بے شک اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں تم میں سب سے زیادہ شریف اور عزت والا وہ ہے جو تقویٰ والا اور اللہ سے ڈرنے والا ہو ہم کسی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے کہ کون تقویٰ والا ہے، اس لیے کہ تقویٰ تو دل سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے، اسی لئے فرمایا: ”إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ“ تقویٰ کس میں زیادہ اور کس میں کم ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ ہی

بہتر جانتے ہیں، ہم کسی کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے، دلوں کے حال سے اللہ تعالیٰ ہی واقف اور باخبر ہیں۔ اس لئے کسی کے متعلق فیصلہ کرنے کا حق اور اختیار ہمیں نہیں دیا گیا ہے۔

آج کل ہم نے جو بنیادیں قائم کردی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں، حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیم یہی ہے کہ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ تو وہ خود اس پر ظلم کرے گا، اور نہ اس کو بے یارو مددگار چھوڑے گا۔ اگر مسلمانوں پر کسی جگہ ظلم ہو رہا ہے، یا کسی جگہ کوئی پریشانی میں مبتلا ہیں اور وہ آپ کو مدد کے لئے پکار رہے ہیں، اور آپ میں ان کی مدد کرنے کی طاقت ہے؛ تو ان کی مدد کرنا لازم اور ضروری ہے۔ اگر مدد کرنے کی طاقت رکھنے کے باوجود آپ ان کی مدد نہیں کرتے تو آپ گنہگار ہیں۔

کسی کو حقیر نہ سمجھو

"وَلَا يَحْقِرُهٗ" اور حضورِ اکرم ﷺ ایک مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھے۔ کسی کو یا تو دنیاوی کمزوری کی وجہ سے حقیر سمجھا جاتا ہے، یا دینی کمزوری کی وجہ سے حقیر سمجھا جاتا ہے، جیسے: آپ کو اللہ تعالیٰ نے کسی اونچے گھرانے میں پیدا کیا، اس لئے آپ کسی ایسے آدمی کو- جو نسبی اعتبار سے کم درجہ والا ہو- حقیر سمجھیں۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ نے حسن و جمال عطا فرمایا اور کوئی دوسرا بد صورت ہے؛ تو آپ اس کو حقیر

سمجھیں۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ نے دولت وثروت سے مالا مال کیا، اور کسی کے پاس دولت نہیں ہے، وہ بے چارہ غریب ومحتاج ہے، اس بنیاد پر آپ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یا آپ کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہے اور وہ علم سے محروم ہے، اس بنیاد پر آپ اس کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو دی گئیں ہیں تو اس کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کے دوسرے بندوں کو حقیر سمجھیں۔ بلکہ ان نعمتوں کا شکر ادا کرو اور حق ادا کرو، اور ان نعمتوں کی بنیاد پر آپ پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو پورا کرو۔

اس پر فخر کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

شریعت اس بات کی کہاں اجازت دیتی ہے کہ ان نعمتوں کے مل جانے کی وجہ سے اپنے آپ کو اونچا سمجھنے لگو، بلکہ ان نعمتوں میں سے بہت سی نعمتیں ایسی ہیں کہ جن کے حصول میں آدمی کے اپنے کسی عمل کو کوئی دخل بھی نہیں ہے، مثلاً: کوئی آدمی حسین و خوبصورت ہے، تو اس کے خوبصورت ہونے میں کیا اس کے کسی عمل کو دخل ہے؟ اس نے کوئی محنت کی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ خوبصورت اور حسین بن گیا؟ ایسا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو خوبصورت پیدا کیا۔ تو جو چیز تمہارے عمل اور اختیار سے تمہیں حاصل نہیں ہوئی اس پر فخر کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟

اسی طرح ایک آدمی اونچے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو نسبی شرف عطا فرمایا؛ تو اس میں اس کا کون سا کمال ہے؟ لہٰذا اس بنیاد پر کسی ایسے آدمی کو- جو بے چارہ نسبی شرافت سے محروم ہے، یا کسی نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے- حقیر سمجھنے کی کون اجازت دے گا؟

محض اللہ کا فضل

بعض نعمتیں ایسی ہیں جن کا ملنا بظاہر آدمی کے عمل دخل پر موقوف ہوتا ہے، جیسے: دولت وثروت۔ اور بعضوں کو تو دولت وثروت بھی ویسے ہی مل جاتی ہے، جیسے: باپ نے کمایا تھا، وہی دولت اس کو وراثت کے اندر مل گئی؛ تو پھر اس دولت کی وجہ سے کسی غریب کو حقیر سمجھنے کی شریعت کہاں اجازت دے گی؟ اور مان لو کہ اگر آپ نے کمانے کی محنت بھی کی ہے؛ تب بھی جو ملتا ہے وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل ہی سے ملتا ہے۔

تم تو بڑے منحوس ہو

جیسے: میں ہمیشہ ایک قصہ سناتا رہتا ہوں کہ ایک آدمی ایک اونٹ لے کر جا رہا تھا اور اونٹ پر بوجھ لاد رکھا تھا، دونوں طرف دو بوریاں تھیں۔ ایک صاحب جو ذرا پڑھے لکھے اور سمجھدار تھے وہ اس کے ساتھ ہو گئے، راستہ میں دونوں میں آپس میں باتیں ہو رہی تھیں،

اسی درمیان پڑھے لکھے صاحب نے اس سے پوچھا: ان دو بوریوں میں کیا بھر رکھا ہے؟ اس نے کہا: ایک میں تو گیہوں ہیں اور دوسری بوری میں ریت بھر رکھا ہے۔ چوں کہ وہ لوگ صحراء میں (رَن کے اندر) سفر کر رہے تھے تو اس نے کہا: ریت تو یہاں ڈھیروں پڑا ہوا ہے، اس کو بوری میں بھر کر لادنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے کہا: ایک طرف کی بوری کے اندر گیہوں ہیں، میں نے بیلنس کے لئے دوسری بوری میں ریت بھر دی۔ انہوں نے کہا: اللہ کے بندے! بیلنس اور توازن کے لئے تو ایسا بھی کر سکتا تھا کہ آدھے گیہوں دونوں بوریوں میں تقسیم کر دیتا، اس طرح اونٹ پر بوجھ بھی کم ہو جاتا اور سفر بھی آسان ہوتا۔ اس نے کہا: تمہاری بات تو بڑی معقول ہے، چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا، اور دونوں بوریوں میں گیہوں تقسیم کر کے لاد دئے۔ چوں کہ پہلے بوجھ زیادہ تھا اس لئے اونٹ تیز نہیں چل سکتا تھا، اب تیز رفتار ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ اس نے کیسی سمجھداری کی بات کی ہے، یقیناً اس کے پاس مجھ سے بہت زیادہ مال ہوگا۔ وہ دیہات کا رہنے والا تھا اس لئے اس نے پوچھا: تمہارے یہاں گائیں کتنی ہیں؟ اس نے کہا: ایک بھی نہیں۔ اس نے پوچھا: بھینسیں کتنی ہیں؟ اس نے کہا: ایک بھی نہیں۔ اس نے پوچھا: بکریاں تو ہوں گی؟ اس نے کہا: وہ بھی نہیں ۔ اس نے پوچھا: پھر تو تمہاری زمین اور جاگیریں ہوں گی؟ اس نے کہا: یہ سب کچھ بھی نہیں ہے۔ تو وہ کہنے لگا: تم تو بڑے منحوس آدمی ہو، اگر میں تمہاری بات پر عمل کروں گا تو میرے

اندر بھی نحوست آ جائے گی، اس لئے فوراً ایک بوری میں گیہوں بھر کر دوسری بوری میں پھر سے ریت بھری اور اونٹ پر لاد کر توازن برابر کر دیا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اگر عقل کی بنیاد پر روزی ملتی تو جو لوگ بیو قوف و نادان ہیں وہ سب سے زیادہ بھوکے مرتے، حالاں کہ دنیا کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت میں تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اپنے فضل ہی سے دیتے ہیں، وہ یوں سمجھتا ہے کہ میں نے محنت کی ہے، حالاں کہ ہم اور آپ دیکھتے ہیں کہ جن کے پاس دولت ہے، ان سے زیادہ محنت کرنے والے دوسرے بے شمار لوگ ہیں، لیکن ان کے پاس ایک پائی بھی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ملتا ہے۔

ذرا بندِ قبا دیکھ

اسی طرح کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا اور عمل کی توفیق نصیب فرمائی ہے، کسی کو تقویٰ کی دولت عطا فرمائی، اور گناہوں سے بچنے کی سعادت نصیب فرمائی ہے؛ تو یہ سب بھی اللہ تعالیٰ ہی کے فضل سے ملا ہے۔ قرآنِ پاک میں خود باری تعالیٰ فرماتے ہے: ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّي مَن يَشَآءُ﴾ جو لوگ گناہوں سے بچتے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کی دولت عطا فرمائی ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی گناہوں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ غور کیجئے

کہ کتنی تاکید کے ساتھ جملہ آیا ہے: ''مَازَکیٰ مِنۡکُمۡ مِنۡ أَحَدٍأَبدًا'' نکرہ نفی کے ماتحت آیا ہے جو تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ اور ''أبدًا'' کتنی سخت تاکید کے ساتھ لایا گیا ہے۔ ترجمہ اس طرح ہوگا کہ تم میں سے کبھی کسی گناہ سے بچ ہی نہیں سکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گناہوں سے بچنے کی توفیق اور سعادت عطا فرماتا ہے۔ لہٰذا جو آدمی گناہوں سے بچ رہا ہے وہ کبھی کسی گنہ گار کو دیکھ کر اس کو حقیر نہ سمجھے، شریعت کسی گنہ گار کو حقیر سمجھنے کی اجازت نہیں دیتی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: مَیں ہر مسلمان کو فی الحال اور ہر کافر کو فی المآل والاحتمال اپنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔ پتہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کس کے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ ایک کافر گو اس وقت کافر ہے، لیکن ہو سکتا ہے کہ کل کو اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق عطا فرمادے اور اس کی موت ایمان پر ہو جائے اور وہ ہم سے آگے بڑھ جائے۔

بہرحال! اگر کسی کو اللہ تعالیٰ کسی نیکی کی توفیق عطا فرمائے تو اس نیکی کی وجہ سے کسی دوسرے کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اسی کو باری تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''فَلَاتُزَكُّوٓاأَنۡفُسَكُمۡ هُوَأَعۡلَمُ بِمَنِ اتَّقٰی'' اپنی پاکی مت بیان کرو، تمہارے اندر کے حال کو اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں، تمہاری پولوں سے وہ واقف ہے، کون کیسا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی خوب جانتے ہیں:۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ۔۔۔ ذرا بندِ قبا دیکھ

حقیقت یہ ہے کہ جتنی بھی نعمتیں ہیں ان کا شکر ادا کرنا چاہیے، اللہ کا ممنون واحسان مند ہونا چاہیے کہ اے اللہ! تو نے محض اپنے فضل سے یہ چیز عطا فرمائی، میں اس لائق نہیں تھا، اور ان نعمتوں کی وجہ سے جو جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں ان کو ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے، ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی بندے کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس کا بڑا بُرا انجام ہوتا ہے۔

یہ نصیحت خوب یاد رکھیے

یہ نصیحت خوب یاد رکھیے کہ کسی کی تحقیر دل میں نہ آنے پائے۔ اگر کسی کی تحقیر میں مبتلا ہوئے تو اللہ تعالیٰ بڑی آزمائش میں ڈال دیں گے۔ اس لئے اپنے آپ کو ہر ایک کی تحقیر سے بچانے کی پوری کوشش ہونی چاہیے، کسی کے ساتھ بھی تحقیر کا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سناتے تھے:-

ایک صاحب نے آکر مجھ سے کہا: میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔ میں نے اس کو کچھ پیسے دیدیئے۔ ان کے جانے کے بعد ایک اور صاحب میرے پاس آئے اور کہا: آپ کے پاس ابھی جو صاحب آئے تھے شاید انہوں نے یہ کہا ہو گا کہ میری ماں کا انتقال ہو گیا ہے، مجھے پیسوں کی ضرورت ہے؟ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: جی ہاں! یہی کہا تھا۔ انہوں نے کہا: آپ نے پیسے دیدیئے؟ حضرت نے کہا: جی ہاں!

دیئے۔ انہوں نے کہا: حضرت! وہ تو جھوٹا آدمی ہے، آپ نے پیسے کیوں دیئے؟ حضرت نے فرمایا: مجھے بھی معلوم تھا، اس کا چہرہ بتلا رہا تھا، لیکن میں نے تو یہ سوچ کر اس کو پیسے دیئے کہ: اے اللہ! تیرا شکر ہے کہ ایسے حالات سے تو نے مجھے محفوظ رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی کسی بھی حالت میں ہو، اس کو کبھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

"تحقیر" کا انجام بڑا برا ہوتا ہے

طبقات ابن سعد کے اندر ایک عجیب واقعہ لکھا ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر جب آفتاب غروب ہو چکا اور میدانِ عرفات سے روانگی کا وقت ہو گیا تو حضورِ اکرم ﷺ کی سواری تیار تھی، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ آپ ﷺ کسی کا انتظار فرما رہے ہیں، اور یمن کے عمائدین اور بڑے بڑے سر برآوردہ لوگ اس وقت آپ ﷺ کے پاس موجود تھے اور وہ سوچ رہے تھے کہ حضور کیوں رکے ہوئے ہیں؟ آخر کس کا انتظار ہے؟ اتنے میں دیکھا کہ حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہ) آئے۔ حضرت اسامہ کے والد حضرت زید تو گورے چٹے تھے لیکن یہ گورے نہیں تھے، اور اِن کی ناک بھی بھدی تھی، چہرہ بھی سانولا تھا، اور بدن بھی ایسا چھریرا تھا کہ دیکھنے والے آدمی پر کوئی خاص اثر نہ ڈال سکے خیر! جب وہ آئے تو حضور ﷺ نے ان کو اپنے پیچھے بٹھایا اور روانہ ہو گئے اس وقت عمائدینِ یمن کہنے لگے: اچھا! اس کی وجہ سے ہمیں رکنا پڑا اور انتظار کرنا پڑا؟

حضرت عروہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) جو اس واقعہ کو نقل کرنے والے ہیں وہ فرماتے ہیں: ”فَلِذٰلِكَ كَفَرَ أَهْلُ الْيَمَنِ مِنْ أَجْلِ ذَا“ اہلِ یمن اسی وجہ سے کفر و ارتداد میں مبتلا ہوئے۔ اس روایت کو اپنی کتاب میں نقل کرنے والے محمد بن سعد صاحبِ طبقات فرماتے ہیں: میں نے اپنے استاذ یزید بن ہارون سے -جو بہت بڑے محدث ہیں- حضرت عروہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) کے اس جملہ کا مطلب پوچھا کہ: انہوں نے یہ کیوں فرمایا؟ تو انہوں نے کہا: حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے انتقال کے بعد جب ارتداد پھیلا اور جو لوگ ایمان سے محروم ہوئے ان میں یمن والے بھی تھے، اور اس کی وجہ ان کا یہی جملۂ تحقیر تھا۔

کسی کی بھی تحقیر کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بڑی آزمائش میں ڈال دیتے ہیں شیخ ابو عبد اللہ اندلسی کا واقعہ مشہور ہے، اپنے زمانہ کے کتنے بڑے بزرگ تھے۔ وہ بھی آخر اس ابتلاء اور آزمائش میں کیوں ڈالے گئے تھے؟ اس کی وجہ وہ خود فرماتے ہیں کہ: میں نے صلیب کی پوجا کرنے والوں کو دیکھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ یہ عجیب قوم ہے جو صلیب کی پوجا کرتی ہے۔ (مفصل قصہ آپ بیتی ۱/ ۵۶۴ پر قابلِ مطالعہ ہے۔ مرتب) اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں کفر و شرک اور برائیوں سے بچا رکھا ہے تو یہ اس کا احسان ہے۔

علامہ عبد الرؤف مناوی رحمۃ اللہ علیہ بعض اہلِ معرفت کا قول نقل کرتے ہیں: کسی کو بھی حقیر نہ سمجھو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت اس کو پیدا کیا تھا تو اس کی طرف توجہ والتفات فرمایا۔ گویا وہ اس قابل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی توجہ اس کی طرف متوجہ ہوئی، اس

سے بڑی صلاحیت اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور آپ اللہ تعالیٰ کی بناوٹ پر اعتراض کرنا چاہتے ہیں؟ نعوذ باللہ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کیا بنا دیا؟ اگر آپ کی کسی بناوٹ پر کوئی اعتراض کرے؛ تو کیا آپ گوارا کرتے ہیں؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کی صنعت اور خَلقت پر بہت بڑا اعتراض ہے، اس لئے تحقیر کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اور اس کا انجام بڑا برا ہوتا ہے۔

برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے

''اَلتَّقْوٰی هَاهُنَا'' تقویٰ ظاہر میں تو نظر نہیں آتا، اس لئے حضور ﷺ نے اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے ارشاد فرمایا: تقویٰ یہاں ہے۔ پھر فرمایا: ایک آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے، کوئی آدمی اگر کسی کو حقیر سمجھتا ہے تو اس سے برا اور کوئی نہیں ہے، اس کی برائی کے لئے یہی چیز بہت کافی ہے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے دورِ خلافت میں حضرت ابو موسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہ) ایک جگہ کے گورنر تھے، کچھ لوگ ان کی خدمت میں پہنچے جن میں عربی النسل بھی تھے اور کچھ عجمی نژاد بھی تھے (عجمی نژاد یعنی وہ پہلے کبھی غلام رہ چکے تھے) حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) نے عربی نسل والوں کے ساتھ عزت و احترام کا معاملہ کیا اور عجمی نژادوں کے ساتھ ویسا معاملہ نہیں کیا۔ جب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو اس کا پتہ چلا کہ ایسا ہوا ہے تو ان کو تنبیہ فرمائی اور یہی

روایت سنائی: ”بِحَسْبِ امْرِیءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ یَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمِ“ آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

ہر ایک کی ”جان، مال، عزت“ محفوظ ہے

”کُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَی الْمُسْلِمِ حَرَامٌ: دَمُهُ، وَعِرْضُهُ، وَمَالُهُ“ ہر آدمی میں تین چیزیں ہوتی ہیں، ایک اس کا جسم اور اس کی جان، دوسری اس کی عزت و آبرو، اور تیسرا اس کا مال۔ اور ایک مسلمان کی یہ تینوں چیزیں دوسرے مسلمان کے اوپر حرام ہیں، اس کی ذات پر بھی کسی شرعی وجہ کے بغیر ہاتھ اٹھانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس کی عزت و آبرو کو چھیڑنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ آج کل تو کسی کی عزت و آبرو پر دھبہ لگا دینا بہت عام ہو گیا ہے، کسی کے متعلق آدمی جو چاہے بول دیتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک مرتبہ اپنے حواریوں سے پوچھا: اگر تمہارا بھائی سویا ہوا ہو، اور ہوا کی وجہ سے اس کا کپڑا تھوڑا سا ہٹ جائے جس کی وجہ سے اس کا ستر نظر آنے لگے؛ تو تم لوگ کیا کرو گے؟ انہوں نے کہا: ہم تو اس کے ستر کو ضرور ڈھانپ دیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمایا: نہیں! بلکہ تم تو اس کو اور زیادہ کھولو گے انہوں نے کہا: حضرت! ایسا کون کرے گا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: تم لوگ اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہو، اگر اس کی کوئی بات معلوم ہو جاتی ہے تو اس کی چشم پوشی کے بجائے لوگوں

میں اس کو اور مشہور کرتے ہو؛ یہ اس کو اور زیادہ کھولنا نہیں ہوا؛ تو اور کیا ہوا؟ در حقیقت یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ اسی لئے کسی کے مال پر ہاتھ ڈالنے کی، کسی کی جان پر ہاتھ اُٹھانے کی، اور کسی کی عزت و آبرو کو چھیڑنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی ہے، غیبتیں کرنا، کسی پر تہمتیں لگانا، اور کسی کو حقیر سمجھنا؛ یہ سب عزت و آبرو سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں جو حرام ہیں۔

دلوں کی کیفیت دیکھی جاتی ہے

حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: ''إِنَّ اللهَ لاَ يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ ، وَلاَ إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وأَعْمَالِكُمْ'' اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو اور تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتے، بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتے ہیں۔ وہاں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کون کتنا خوبصورت ہے، اور جسمانی اعتبار سے کون بھاری بھرکم، توانا و پہلوان اور طاقتور ہے، بلکہ وہاں تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ ظاہری اور باطنی اعمال کیسے ہیں، تمہارے دلوں میں تقویٰ کی کیفیت کیا ہے۔

یہ تو صریح دھوکہ بازی ہے

اگر خریدنے کا ارادہ نہ ہو تو خواہ مخواہ اس چیز کے بھاؤ بڑھانے کے لئے قیمتیں مت لگاؤ۔ مثلاً: ایک چیز بیچی جا رہی ہے، اور ایک آدمی فقط اس لئے زیادہ قیمت بولتا ہے تا کہ دوسرا کوئی اس کو خرید نہ سکے۔ جیسے: کہیں نیلام ہو رہا ہے، ایک آدمی کا ارادہ اس چیز کے خریدنے کا نہیں ہے، لیکن وہ اس کا بھاؤ اس لئے بڑھاتا جا رہا ہے تا کہ دوسرے لوگ زیادہ بھاؤ دے کر خریدیں۔ آج کل تو بیوپاری لوگ اپنے ایسے چیلے رکھتے ہیں جو جھوٹا بھاؤ بولتے رہتے ہیں، تا کہ کوئی گاہک بیچارہ آکر پھنس جائے؛ یہ کہاں جائز ہو سکتا ہے؟ یہ تو صریح دھوکہ بازی ہے۔

جاسوسی کروانا: اخلاق کو خراب کرنے کا ذریعہ

حدیث ۱۵۷۱:-

وعن معاوية رضی الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقول: ((إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ المُسْلِمِينَ أَفْسَدْتَهُمْ، أَوْ كِدْتَ أَنْ تُفْسِدَهُمْ)). (حديث صحيح، رواه أبو داود بإسناد صحيح.)

ترجمہ:- حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اگر تم مسلمانوں کی اندرونی باتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کرو گے، ان کی ٹوہ میں لگو گے اور ان کے پیچھے پڑو گے؛ تو ان کے اخلاق کو خراب کر دو گے۔

افادات:- یہ حکم ماتحتوں کے متعلق ہے۔ بعض بڑوں کی عادت ہوتی ہے کہ حالات معلوم کرنے کے لئے جاسوس لگائے رکھتے ہیں کہ وہ کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے؟ اس کے نتیجہ میں ان کے اخلاق اور خراب ہوتے ہیں اور ان کی عادتیں زیادہ بگڑتی اور فاسد ہوتی ہیں۔ یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ہاں! جو چیز سامنے آجائے اس پر ضرور ٹوکا جائے، اور جو چیز سامنے نہیں آئی، اس کی ٹوہ میں لگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً: کسی ادارہ کا ذمہ دار اور پرنسپل و مہتمم ہے، یا کسی فیکٹری کا مالک ہے تو اپنے ماتحتوں کے اندرونی حالات کی ٹوہ میں لگنے کی ضرورت نہیں ہے، جو سامنے آئے اس کے مطابق معاملہ کیا جائے۔ معلوم ہوا کہ جاسوسی کروانا اور ٹوہ میں لگے رہنا بڑی خطرناک چیز ہے۔

اندرونی حالات کو ٹٹولنے سے ہمیں منع کیا گیا

حدیث ۱۵۷۲:-

وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ: أَنَّهُ أُتِيَ بِرَجُلٍ فَقِيلَ لَهُ: هَذَا فُلاَنٌ تَقْطُرُ لِحْيَتُهُ خَمْراً. فَقَالَ: إنَّا قَدْ نُهِيْنَا عَنِ التَّجَسُّسِ، ولكِنْ إنْ يَظْهَرْ لَنَا شَيْءٌ، نَأْخُذْ بِهِ. (حديث حسن صحيح، رواه أبو داود بإسنادٍ عَلَى شَرْطِ البخاری ومسلم.)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کے پاس ایک آدمی کو لایا گیا اور آپ سے کہا گیا: اس آدمی کی داڑھی میں سے بھی شراب ٹپک رہی ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا: لوگوں کے اندرونی حالت کے ٹٹولنے اور ان کی ٹوہ میں لگنے سے ہمیں منع

کیا گیا ہے (ہمیں یہ نہیں کہا گیا کہ لوگوں کے گھروں میں گھس کر، یا دروازوں کی دراڑوں میں سے جھانک کر کچھ معلوم کریں) لیکن اگر کسی کا کوئی معاملہ ہمارے سامنے کھل کر آجائے گا (مثلاً: کسی کے منہ سے شراب ٹپک رہی ہو گی) تو پھر ہم اس کی گرفت کریں گے۔

النهي عن سوء الظنّ بالمسلمين من غير ضرورة

مسلمانوں کے ساتھ بلاوجہ بدگمانی کرنا حرام ہے

قَالَ اللہ تَعَالَی: يَأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيراً مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ. (الحجرات:۱۲)

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے ایمان والو! بہت سے گمانوں سے بچو، اس لئے کہ بعض گمان گناہ ہیں۔ اور جب تک کسی گمان کے متعلق یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ گناہ نہیں ہے وہاں تک اس کے قریب جانے کی اجازت نہیں۔ گناہ سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ایسے تمام گمان جن کے گناہ ہونے کا امکان ہو؛ ان سے آدمی دور رہے۔

حدیث ۱۵۷۳:-

وعن أبي هريرة -رضي الله عنه-: أنّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((إيَّاكُمْ والظَّنَّ، فإنَّ الظَّنَّ أكْذَبُ الحَدِيثِ)) (متفق عَلَيْهِ)

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی وہی روایت پیش کی ہے جو اوپر آئی تھی جس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بدگمانی سے بچنا چاہیے اس لیے کہ بدگمانی حرام ہے۔

تحریم احتقار المسلمین

مسلمانوں کو حقیر سمجھنا حرام ہے

قَالَ اللّٰه تَعَالَی: یٰٓأَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوْا لَایَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَومٍ عَسٰی أَنْ یَکُونُوا خَیْرًاًمِنْهُمْ وَلَانِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسٰی أَنْ یَکُنَّ خَیْرًاًمِنْهُنَّ وَ لَاتَلْمِزُوا أَنْفُسَکُمْ وَلَاتَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الاسْمُ الفُسُوقُ بَعْدَ الإِیْمَانِ. وَمَنْ لَمْ یَتُبْ فَأُولَئِكَ هُمُ الظّٰالِمُونَ. (الحجرات:۱۱)

ایک اور باب قائم کیا ہے جس میں یہ بتایا جارہا ہے کہ: مسلمانوں کو حقیر سمجھنا حرام ہے۔ کسی کے اندرونی حالات تو ہمیں معلوم نہیں ہیں پھر صرف کسی کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر اس کو حقیر سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اس سلسلہ میں سورۂ حجرات کی آیت لائے ہیں: اے ایمان والو! تم میں سے کچھ لوگ دوسروں کا ٹھٹھا اور مزاق نہ کریں، ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور تم میں سے کچھ عورتیں دوسری عورتوں کا ٹھٹھا اور مذاق نہ کریں، ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور اپنے لوگوں پر عیب نہ لگاؤ اور برے لقب سے ایک دوسرے کو یاد نہ کرو، ایمان لانے کے بعد تو یہ بڑے فسق کے کام ہیں، اور جو آدمی توبہ نہ کرے گا تو وہ ظلم کرنے والا ہے۔

اس لیے کہ ایک اندھا آیا

دیکھو! حضور اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے بڑے محبوب اور لاڈلے ہیں، آپ ﷺ کے اوصاف اور خوبیوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے، لیکن ایک دو مواقع ایسے بھی ہیں جہاں آپ ﷺ کو عتاب کیا گیا ہے، اسی میں ایک موقعہ وہ ہے کہ ایک مرتبہ قریش کے کچھ اہم ذمہ دار اور سردار لوگ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے ہوئے تھے، اور آپ ﷺ اُن کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کر رہے تھے، اسی دوران ایک نابینا صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتوم (رضی اللہ عنہ) حضور ﷺ کی خدمت میں کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے آ گئے۔ چوں کہ وہ نابینا تھے اس وجہ سے ان کو تو یہ پتہ ہی نہیں تھا کہ حضور ﷺ کسی کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہیں۔ آپ ﷺ نے۔ صرف یہ سمجھ کر کہ یہ تو اپنے آدمی ہیں، بعد میں ان کو مسئلہ بتلا دیا جائے گا۔ ان کی بات کا جواب دینے کے بجائے ان کی طرف سے چہرہ پھیر کر اور رُخ موڑ کر سرداروں کی طرف توجہ فرمائی۔ اور وہ بھی اپنی ذاتی غرض کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس امید پر کہ اگر یہ سردار لوگ اسلام لے آئیں گے تو پوری قوم کے ہدایت پر آنے کی شکلیں پیدا ہو جائیں گی، اس پر باری تعالیٰ کی طرف سے بڑا زبردست عتاب کیا گیا: ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی﴾ منھ بگاڑا اور رُخ پھیرا اس لئے کہ ایک اندھا آدمی آیا۔ یہ کتنی سخت آیت ہے اس کو اہلِ علم سمجھ سکتے ہیں۔ حالاں کہ وہاں تحقیر کا جذبہ بھی پیشِ نظر نہیں تھا، بلکہ رسول اللہ ﷺ نے صرف بے توجہی اور

عدمِ التفات کیا تھا اور وہ بھی اپنی ذاتی غرض سے نہیں، بلکہ اپنے خیال سے تبلیغ و رسالت کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے؛ اس پر بھی یہ تنبیہ آگئی۔ معلوم ہوا کہ یہ بڑی اہم چیز ہے۔

وقال تعَالَی: وَیلٌ لِکُلِّ ھُمَزَةٍ لمزَةٍ.(الھمزۃ:۱) اور باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کے لیے جو پسِ پشت عیب نکالنے والا اور روبرو طعنہ دینے والا ہو۔

حدیث ۱۵۷۴:-

عن أَبي هريرة رضی الله عنه: أَنَّ رسولَ اللهِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((بِحَسْبِ امْرِءٍ مِنَ الشَّرِّ أَنْ يَحْقِرَ أَخَاهُ الْمُسْلِمَ.)) (رواہ مسلم. وقد سبق قریباً بطولہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: آدمی کی برائی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

تکبر کیا ہے

حدیث ۱۵۷۵:-

وعن ابن مسعود رضی الله عنه عن النبیّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((لایَدْخُلُ الجَنَّةَ مَنْ کَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ!)) فَقَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَناً، وَنَعْلُهُ حَسَناً. فَقَالَ: ((إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الجَمَالَ، الكِبْرُ: بَطَرُ الحَقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ)) (رواہ مسلم)

ومعنی ((بَطَرُ الحَقِّ)) دَفْعُه. ((وغَمْطُهُمْ)): احْتِقَارُهُمْ. وَقَدْ سَبَقَ بَيَانُهُ أَوْضَحَ مِنْ هَذَا فی باب الكِبْرِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: وہ آدمی جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ایک ذرّہ برابر بھی تکبر ہو۔ اس پر ایک آدمی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! بعض آدمی اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کا کپڑا اچھا ہو، اور جوتا اچھا ہو (تو کیا یہ بھی تکبر ہے؟) حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: یہ تکبر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جمیل ہیں اور جمال کو پسند کرتے ہیں۔ تکبر تو حق بات کا انکار کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا ہے۔

یہ تکبر نہیں

افادات:- کوئی بات آپ سے کہی جائے تو یہ جاننے کے باوجود کہ حق بات کہی جارہی ہے، کہنے والے کی تحقیر کی بنیاد پر اس حق بات کا انکار کرنا؛ یہ کبر ہے۔ اور لوگوں کو حقیر سمجھنا بھی کبر ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ باقی اگر کوئی آدمی اچھا کپڑا پہننے کا، اچھے لباس، اچھا جوتا اور اچھے رہن سہن کا اہتمام کرتا ہے؛ تو یہ تکبر نہیں ہے۔ پہلے کبر کا بیان گذر چکا ہے اس میں تفصیل آچکی ہے، وہاں اس روایت کا مطلب بہت تفصیل سے بیان کرچکا ہوں۔

ایک رند اور ایک زاہد

حدیث ۱۵۷٦:-

وعن جُندب بن عبدِ الله - رضی اللہ عنہ - قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((قَالَ رَجُلٌ: وَاللهِ لا يَغْفِرُ اللهُ لِفُلانٍ، فَقَالَ اللهُ - عز وجل -: مَنْ ذا الَّذِي يَتَأَلَّى عَلَيَّ أَنْ لا أَغْفِرَ لِفُلانٍ! فَإِنِّي قَدْ غَفَرْتُ لَهُ، وَأَحْبَطْتُ عَمَلَكَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح: حضرت جندب بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (ایک آدمی بڑا گنہگار تھا اور دوسرا آدمی بڑا عبادت گزار تھا۔ عبادت گزار اس گنہگار کو ہمیشہ نصیحت کرتا تھا: اے میرے بھائی! اپنے گناہوں سے باز آجا، لیکن وہ باز نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ) اس عبادت گزار آدمی نے اس گنہگار سے یہاں تک کہہ دیا: اللہ تعالیٰ تیری مغفرت نہیں کریں گے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میرے نام کی قسم کھا کر ایسا کہنے والا تو کون ہوتا ہے؟ (کیا تجھے اختیارات دیئے ہیں؟) جو تو یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مغفرت نہیں کریں گے؟ (سن لے) مَیں نے اس کی تو مغفرت کر دی، اور تیرے اعمال حبط اور ضائع کر دیے۔

افادات:- معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی دوسرے کی تحقیر میں کوئی جملہ اپنی زبان سے نکال دیتا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس بات کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے کہ کسی کی بھی تحقیر ہماری طرف سے پائی نہ جائے۔

لٰہذا آج کی اس مجلس سے اپنے دل و دماغ میں یہ بات بٹھا کر جایئے کہ ہم کسی کی تحقیر نہیں کریں گے، اوراپنے دل سے کسی کو حقیر نہیں سمجھیں گے، اس لیے کہ ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہے! اور تحقیر کی وجہ سے آدمی کو بڑی آزمائشوں اور ابتلاءات میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔

النھی عن إظھار الشماتة بالمُسلم

کسی مسلمان کو تکلیف اور مصیبت پہنچنے پر خوش ہونے کی ممانعت

قَالَ اللهُ تَعَالَى: إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ. (الحجرات:۱۰)

وقال تَعَالَى: إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. (النور:۱۹)

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے نیا عنوان قائم کیا ہے: کسی مسلمان کو تکلیف اور مصیبت پہنچنے پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت۔

جب کسی کے دل میں کسی کے متعلق کینہ، بغض اور حسد پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس کا بغض و عداوت دل میں بیٹھی ہوئی ہوتی ہے اگر اس کو کوئی مصیبت پہنچ جاتی ہے تو یہ آدمی مسرت اور خوشی محسوس کرتا ہے، اور اگر اس کو کوئی نعمت مل جاتی ہے تو اس کو دکھ اور تکلیف ہوتی ہے۔ حالاں کہ کسی مسلمان کو پہنچنے والی مصیبت پر خوشی کا اظہار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی وہی آیت لائے ہیں جو پہلے بھی گذر چکی ہے: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ لہٰذا بھائی چارگی اور اخوت کا

تقاضہ یہ ہے کہ کسی آدمی پر کوئی مصیبت آئے تو اس پر خود بھی دکھ اور تکلیف محسوس کرے؛ نہ یہ کہ اس پر آنے والی مصیبت سے خوش ہو۔

عربوں کی نیک فالی

عربوں میں نام رکھنے کے اندر نیک فالی کا بڑا لحاظ کیا جاتا تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اس وقت عرب کا عجیب حال تھا، نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ کسی کا مال محفوظ تھا، نہ کسی کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ کوئی آدمی گھر سے باہر نکلتا تھا تو صحیح سلامت واپس آجائے گویا یہی اس کے لئے خوش قسمتی کی بات ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ سفر میں بھی وہ لوگ قافلوں اور بڑی بڑی جماعت کی شکل میں جاتے تھے، پھر بھی ان کو خطرہ لگا ہی رہتا تھا کہ کہیں کوئی قبیلے والے حملہ نہ کر دیں اور پورے قافلے کو لوٹ نہ لیں۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں یہ عام تھا کہ قافلوں کو لوٹ لیا جاتا تھا اور سب کو گرفتار کر کے غلام و باندی بنا لیا جاتا تھا۔ گویا جو بھی قافلہ سفر کرتا تھا اس کی واپسی کی کوئی گارنٹی نہیں دی جا سکتی تھی، اسی لئے اہلِ عرب نے اس کا نام ہی " قافلہ " رکھا۔ "قافلہ" عربی زبان کا لفظ ہے: " قَفَلَ، یَقْفُلُ، قُفُوْلًا" کا معنٰی آتا ہے " لوٹنا"۔ "قافلہ" یعنی وہ جماعت جو لوٹ کر واپس آئے۔ اب یہ جماعت تو ابھی سفر پر روانہ ہو رہی ہے، اور ابھی سے ان کو قافلہ کا نام دیا گیا ہے، یہ

دراصل نیک فالی کے طور پر بولا جاتا تھا، گویا ابھی جارہے ہیں لیکن ان کو قافلہ کہو، تاکہ اللہ کرے کسی کی زبان سے نکلا ہوا یہ لفظِ قافلہ قبول ہو جائے اور یہ لوگ صحیح سلامت واپس آجائیں۔

اسی طرح کسی آدمی کو اگر سانپ نے کاٹ لیا ہو تو عربی زبان میں سانپ کے کاٹے ہوئے کو ''سلیم'' کہتے ہیں، حالاں کہ ''سلیم'' کا ترجمہ ہوتا ہے کہ ایسا آدمی جو محفوظ اور سلامت ہو۔ اور عام طور سے ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کو سانپ کاٹ لے تو وہ بچتا نہیں ہے، اس لئے عربوں نے اس کا نام ہی ''سلیم'' رکھا، تاکہ کوئی بھی پوچھے کہ یہ کون ہے؟ اور اس کو کیا ہوا؟ تو کہیں کہ '' ھٰذَا سَلِیْمٌ'' یہ سلیم ہے۔ گویا اللہ کے کسی بندے کی زبان سے لفظِ سلیم نکلے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو جائے تو یہ بچ جائے۔ مطلب یہ ہے کہ نام رکھنے کے اندر وہ لوگ تفاؤل اور نیک فالی کا لحاظ رکھتے تھے۔

قیامت کے مختلف ناموں میں سے ایک نام ''اَلسَّاعَة'' ہے، اور ''ساعة'' ایک گھڑی کو کہتے ہیں، حالاں کہ قیامت کا ایک دن تو پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا، لیکن نیک فالی کے طور پر اس کا ایک نام ''ساعة'' بھی رکھا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ اس کو اہلِ ایمان کے حق میں ایک گھڑی کے برابر بنادے۔

خطابت کا نہایت بلیغ انداز

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزت و آبرو محفوظ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اس لئے نبی کریم ﷺ جب دین کی دعوت لے کر آئے اور لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو آپ نے حجۃ الوداع کے موقعہ پر سب سے اہم جو تعلیم دی وہ یہی تھی۔ اس لیے کہ حجۃ الوداع کے موقعہ پر عالمِ اسلام میں جتنے افراد تھے تقریباً سب ہی آپ ﷺ کے ساتھ اس حج میں شریک ہوئے تھے جن کی بڑی تعداد وہاں موجود تھی، لہٰذا آپ ﷺ نے ان کو جو وہاں موجود تھے اور قیامت تک آنے والی امتِ مسلمہ کو ایک پیغام دیا، اور اتنا ہی نہیں کہ جو لوگ سن رہے ہیں ان کو کہہ دیا بلکہ یہ تاکید کر دی: "فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ" جو لوگ یہاں موجود ہیں اور میری اس بات کو سن رہے ہیں، وہ ان لوگوں تک جو یہاں موجود نہیں ہیں میری یہ بات پہنچائیں۔ اس وعظ اور خطبہ میں آپ ﷺ نے ایک بات خاص طور پر ارشاد فرمائی تھی: "إِنَّ دِمَآءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا فِي شَهْرِكُمْ هٰذَا فِي بَلَدِكُمْ هٰذَا" تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری عزت و آبرو اسی طرح حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت، اس مہینے کی حرمت اور اس شہر اور بستی کی حرمت ہے۔ اس لیے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی وہ لوگ دین سے دور ہونے اور گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود کچھ چیزوں کا احترام کرتے تھے، انہیں میں سے ایک ان کے یہاں حرمت والے چار مہینوں کا احترام تھا جو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے چلے آرہے تھے۔ ان مہینوں میں کسی پر حملہ کرنا، کسی کو لوٹنا، کسی کی جان و مال پر

ہاتھ ڈالنا؛ وہ اپنے لئے معیوب اور گناہ سمجھتے تھے۔ دینِ ابراہیمی کی جو کچھ بچی کچی علامتیں پائی جاتی تھیں ان میں سے ایک یہ بھی تھا۔ ان حرمت والے مہینوں میں سے ایک مہینہ ذوالحجہ کا بھی تھا، اور حج کے ایام بھی اسی میں آتے ہیں، اور پھر خاص طور پر "یوم النحر" یعنی دسویں ذو الحجہ کی حرمت کو تو وہ لوگ اور زیادہ مہتم بالشان سمجھتے تھے۔ اور حدودِ حرم کے اندر کسی کی جان ومال پر حملہ کرنے کو بھی وہ لوگ بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اس لیے حضور اکرم ﷺ نے کسی مسلمان اور مؤمن کی عزت و آبرو اور جان ومال کی حفاظت واہمیت کو ان کے دلوں میں بٹھانے کے لئے کتنا بلیغ وعمدہ اور کتنا اعلیٰ انداز اختیار فرمایا کہ انہیں سے سوالات کیے کہ: اچھا یہ بتاؤ! کہ آج کون سا دن ہے؟ انہوں نے کہا: یوم النحر یعنی دسویں ذو الحجہ ہے۔ پھر سوال کیا: کون سا مہینہ ہے؟ انہوں نے کہا: ذوالحجہ کا مہینہ ہے۔ پھر سوال کیا: کون سا شہر اور بستی ہے؟ انہوں نے کہا: مکہ مکرمہ ہے۔

ان چیزوں کی حرمت کو تو وہ لوگ سمجھتے ہی تھے پھر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہاری جانیں، تمہارے مال، تمہاری عزت و آبرو کی حرمت بھی ایک دوسرے پر اسی طرح ہے۔ گویا ہر مسلمان کی جان تمہاری جان ہے، ہر مسلمان کی عزت و آبرو تمہاری عزت و آبرو ہے، ہر مسلمان کا مال تمہارا مال ہے۔ اگر کسی کی عزت و آبرو پر حملہ ہو رہا ہے تو یہ نہ سمجھو کہ وہ کوئی غیر ہے، بلکہ تمہاری عزت و آبرو پر حملہ ہے۔ اور جیسے آدمی اپنی عزت کا دفاع کرتا ہے اسی طریقہ سے دوسروں کی طرف سے دفاع اور ڈیفنس کرنا بھی ہر ایک کا فریضہ ہے

اسی لئے غیبت کے سلسلہ میں پہلے روایتیں گزر چکی ہیں کہ کسی مجلس میں غیبت اور برائی بیان کی جارہی ہو تو اس کی طرف سے دفاع کرنا ضروری ہے۔ کوئی آدمی اگر طاقت رکھتے ہوئے بھی دفاع نہیں کرے گا تو کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اس کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔

اسلام: پورا پریوار ہے

گویا نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے اسلام کے نام سے ایک پورا کنبہ تیار کیا ہے۔ پہلے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ اپنے خاندان یا وطن کی نسبت پر ایک دوسرے کی مدد کی جاتی تھی (جیسا کہ آج کل بھی ایسا ہی ہوگیا ہے، لوگ سوچتے ہیں کہ فلاں اپنے قبیلہ کا آدمی ہے) پھر اسی نسبت پر مدد کی جاتی تھی۔ یا آپس میں معاہدہ اور اس بات کا اگریمنٹ کیا جاتا تھا کہ میں تمہاری مدد کروں گا تم میری مدد کروگے۔ اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایا: ”لَا حِلْفَ فِي الْإِسْلَامِ“ اسلام میں ایسا اگریمنٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک آدمی نے جب زبان سے کلمہ پڑھ لیا تو اس کے بعد دوسرے تمام کلمہ گو مسلمانوں پر اس کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے ہر طرح کی کوشش کرنا ضروری ہوگیا۔

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان کے اوپر جو بہت سارے حقوق بتلائے ہیں جیسا کہ پچھلے اسباق میں گزر چکا ہے ”اَلْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ وَلَا يَحْقِرُهُ“ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، وہ خود بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، کوئی دوسرا اس کے

ساتھ زیادتی کرتا ہے اور یہ مدد کی طاقت رکھتا ہے تو اس کو بے یارو مددگار بھی نہیں چھوڑتا، بلکہ اس کی بھرپور مدد کرتا ہے۔ کسی کو دل سے کمتر و حقیر بھی نہیں سمجھتا، یعنی شریعت اتنی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ایک ادنیٰ مسلمان کو اپنے دل میں حقیر و ذلیل سمجھا جائے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حضور ﷺ نے اسلام کی نسبت پر ایک پورا کنبہ اور پریوار کا رشتہ قائم کیا ہے۔

آج کل لوگ کسی ادارہ یا کسی جماعت سے منسلک ہو جاتے ہیں، تو اس جماعت کے ممبران اور اس ادارہ سے تعلق رکھنے والوں کو ایک پریوار سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کا ہر ایک فرد دوسرے کی مدد کو ضروری سمجھتا ہے۔ آج اِس زمانہ میں یہ سب ہو رہا ہے، حالاں کہ حضور اکرم ﷺ نے پہلے ہی دن سے اسلام کے نام سے ایک پریوار قائم کیا تھا، ایک آدمی نے اسلام کا کلمہ پڑھ لیا تو آپ چاہے ہندوستان کے کسی کونہ اور گوشہ میں رہتے ہوں، اور دوسرا امریکہ کے کسی کونہ اور گوشہ میں رہتا ہو؛ تب بھی وہ آپ کی ہمدردی کا حقدار ہے، اور آپ کو اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کرنا ہے جیسا کہ اپنی ذات کے ساتھ کرنا ہے۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں آیا ہے: ”لَا یُؤْمِنُ أَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِأَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ“ تم میں سے کوئی آدمی کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے

رشتۂ اسلامی

ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر بہت سارے حقوق ہیں، جیسے: بیمار ہو تو عیادت کرنا، اب یہ حکم کسی رشتہ دار کے ساتھ خاص نہیں ہے کہ تمہارا رشتہ دار بیمار ہو جائے تو اس کی خبر لینے جاؤ، اور تمہارا دوست بیمار ہو جائے تو اس کی خبر لینے جائو، تمہاری پارٹی کا آدمی بیمار ہو جائے تو اس کی خبر لینے جائو؛ بلکہ نبی کریم ﷺ کی طرف سے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو حقوق بتلائے گئے ہیں ان میں عیادت کرنا بھی آیا ہے، اس کے لیے اسلام کا رشتہ ہی کافی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی حقوق ہیں، جیسے: جب اس کی موت واقع ہو جائے تو اس کی نمازِ جنازہ پڑھے اور اس کے جنازہ میں جائے۔ اگر وہ بھوکا ہو تو اس کو کھانا کھلائے۔ وہ ملے تو اس کو سلام کرے۔ اس کو چھینک آئے اور وہ "الحمد للہ" کہے تو جواب میں "یرحمک اللہ" کہے۔ اب آپ اندازہ لگائیے کہ حضور اکرم ﷺ نے ایک ایسا سماج و معاشرہ قائم فرمایا کہ جس کا ہر فرد دوسرے فرد کے ساتھ پوری ہمدردی اور محبت رکھنے والا ہو، یہاں تک کہ دل میں بھی کسی کے متعلق میل اور کینہ رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

پچھلے اسباق کے اندر جو روایتیں گزریں ان میں یہ مضمون تھا کہ دل کے اندر کسی مسلمان کے متعلق کینہ اور میل نہ رکھا جائے، اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور ہر وہ چیز جو مسلمان کی خیر خواہی کے تقاضہ کے خلاف ہو اس کے متعلق صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ اس کو

مت کرو، بلکہ اس کو حرام اور کبیرہ گناہ قرار دیا۔ دراصل ان سارے ابواب میں کبیرہ گناہوں کی پوری فہرست بیان کرنے کا سلسلہ چل رہا ہے کہ آپ کسی مسلمان کو حقیر نہ سمجھئے، کسی کی غیبت نہ کیجئے، کسی کے ساتھ کینہ نہ رکھئے، کسی سے حسد کا معاملہ نہ رکھئے، اور آج جو باب قائم کیا ہے اس میں یہ ہے کہ ایک مسلمان پر کوئی مصیبت آجائے تو اس کی وجہ سے آپ کے دل میں خوشی کا احساس نہیں ہونا چاہیے، حالاں کہ اگر کوئی خوش بھی ہو گیا تو سامنے والے کو اس کی وجہ سے کوئی تکلیف بھی نہیں ہونے والی ہے، کیوں کہ اس کو پتہ بھی نہیں ہے کہ میری مصیبت پر اس کو خوشی ہوئی ہے، لیکن اس کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

جذبۂ خیر خواہی

آج کے اس گئے گزرے دَور میں بھی اس کے نمونے ہمیں خوب دیکھنے کو ملتے ہیں، حالاں کہ ہم اپنی اغراض، دنیا کی اور مال کی محبت کی وجہ سے بہت سی برائیوں میں پڑ گئے ہیں، پھر بھی جب کوئی عام مصیبت آتی ہے تو ہر مسلمان کے دل میں دوسرے مسلمان کے لئے خیر خواہی کا جذبہ اُبھر آتا ہے۔ لیکن شریعت تو یہ چاہتی ہے کہ یہ جذبہ وقتی نہ ہو، کسی بڑی مصیبت کے آنے کے ساتھ مخصوص نہ ہو، بلکہ چوبیس گھنٹے اور بارہ مہینے (یعنی پوری زندگی) یہی معاملہ ہونا چاہیے۔

اور اسلام نے آپس میں سلام کو مشروع کیا کہ جب کوئی بھی مسلمان ملے تو اس کو سلام کرو، اس لئے کہ زمانۂ جاہلیت میں اگر ایک آدمی اِدھر سے جارہا ہوتا اور دوسرا سامنے سے آرہا ہوتا تو دونوں میں سے ہر ایک دوسرے سے خطرہ محسوس کرتے تھے کہ معلوم نہیں سامنے والا میرے ساتھ کیا معاملہ کرے گا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میری جان کا پیاسا ہو جائے، میرے اوپر حملہ کر دے، میری عزت و آبرو پر ڈاکہ ڈال دے، میرا مال چھین لے۔ اسلام نے آکر سلام کا طریقہ جاری کیا، بلکہ سلام کے عام کرنے کو ایمان واسلام کی خاص علامتوں میں سے قرار دیا، اور وہ اعمال جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں ان میں ایک " افشاءِ سلام "یعنی سلام کو پھیلانا بھی بتایا۔ اور سلام کی ابتدا کرنے پر زیادہ فضیلت اسی لیے سنائی کہ اس طرح کرکے گویا آپ اپنی طرف سے سامنے والے کو اطمینان دلا رہے ہیں اور اس بات کی گارنٹی دے رہے ہیں کہ میری طرف سے آپ مطمئن رہیے، میں تو خود آپ کا خیر خواہ ہوں، بھلا مَیں آپ کی جان، مال، عزت و آبرو پر کہاں ہاتھ ڈال سکتا ہوں؟ مَیں تو وہ شخص ہوں جو آپ کے لئے بھلائیاں چاہتا ہے اور دعا کرتا ہے "السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ" کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم پر سلامتی ہو، اور اس کی رحمت تم پر نازل ہو، اور اس کی برکتیں ہوں۔

یہ صرف اسلام ہی کا خاصہ ہے

آپس کی ملاقات کا یہ ایسا عمدہ طریقہ اسلام نے ہمیں بتلایا ہے کہ کسی اور قوم کے پاس ایسا بہترین طریقہ نہیں ہے۔ دوسری قوموں میں بھی ملاقات کے وقت آپس میں کچھ نہ کچھ جملے ادا کرنے کا رواج ہے، جیسے: نمستے، نمسکار، گڈمارننگ اور گڈ ایوننگ، یا آداب وغیرہ؛ لیکن کسی بھی جملہ میں دعا نہیں ہے۔ اور ہمیں جو طریقہ بتلایا گیا وہ دعا والا ہے، اور اس پر بڑے ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے کہ جو آدمی "السلام علیکم" کہے تو دس نیکیاں، اور "ورحمۃ اللہ" بھی کہے تو بیس نیکیاں، اور "وبرکاتہ" بھی کہے تو تیس نیکیاں ملیں گی، اور صرف اتنا ہی نہیں، بلکہ مسلمان کے دل میں خوشی داخل کرنے کا مستقل ثواب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ سے پوچھا گیا: کون سا عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إِدْخَالُ السُّرُوْرِ فِيْ قَلْبِ الْمُسْلِمِ" "مسلمان کے دل میں خوشی کو داخل کرنا۔ اسی لیے یہ تعلیم ہے کہ کسی کی ملاقات کے وقت اپنا منھ ارنڈی کا تیل پیا ہوا مت رکھو، بلکہ کہا گیا ہے: "تَبَسُّمُكَ فِيْ وَجْهِ أَخِيْكَ صَدَقَةٌ" "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا بھی صدقہ ہے۔ اگر کسی سے مسکرا کر ملوگے تو اس کو کتنی خوشی ہوگی۔ ایک آدمی منھ بگاڑ کر ملتا ہے تو سامنے والا سوچتا ہے کہ معلوم نہیں؛ اس کا منھ ایسا کیوں ہے؟ کہیں میری طرف سے کوئی ایسی بات تو

پیش نہیں آئی جس سے اس کا دل دکھا ہو۔ اور اگر خوشی اور مسرت سے ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ملوگے تو سامنے والے کا جی خوش ہو جائے گا، اس لئے شریعت نے یہاں تک حکم دیا کہ اپنے بھائی سے ملو تو مسکراتے ہوئے ملو۔

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اسی طرح ہر موقعہ پر دعائیں بتلائی ہیں کہ اس کے یہاں بچہ پیدا ہو تو آپ مبارک باد دیجئے۔ جب شادی ہو تو شادی کے موقعہ پر دعائیں دیجئے کہ اس کے یہاں خیر و برکت آئی تو اس مناسبت سے اس کے ساتھ معاملہ کیجئے۔ یہاں تک کہ اگر اس نے نیا لباس پہنا تو شریعت یہ دعا بتلاتی ہے کہ کسی کو نیا لباس پہنا ہوا دیکھو تو یوں کہو: ”أَبْلِ وَأَخْلِقْ“ اس کو پرانا کرو اور اس کو اور زیادہ پہنو، یعنی تمہاری زندگی طویل ہو۔ کسی کو ہنستا ہوا دیکھو تو یوں کہو: ”أَضْحَكَ اللّٰهُ سِنَّكَ“ اللہ تعالیٰ تمہیں اور ہنسائے۔ اندازہ لگایئے کہ اسلام کی کتنی بہترین تعلیمات ہیں، آج اگر ان تعلیمات کو ہم اختیار کرلیں تو ہمارا معاشرہ ایسا بن جائے گا:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد
کسے را با کسے کارے نباشد

کسی کو کسی سے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر

سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

ایک مسلمان کی کیفیت یہ ہونی چاہیے اور حضور اکرم ﷺ نے اسی کی تعلیم بھی دی ہے۔

ہمارا حال!

پچھلے اسباق میں اور اس باب میں بھی چھوٹی چھوٹی چیزیں بتلائی جا رہی ہیں، لیکن ان کو چھوٹا نہیں کہا بلکہ گناہِ کبیرہ بتلایا ہے، اور ان میں سے بعض گناہ تو ایسے خطرناک ہیں کہ ان کے متعلق حدیث پاک میں آیا کہ ایسا آدمی جنت میں نہیں جائے گا اندازہ لگایئے کہ شریعت کی نگاہوں میں ان چیزوں کی کتنی اہمیت ہے! لیکن آج ہمارا حال یہ ہے کہ پرائے تو پرائے؛ جن کے ساتھ رشتہ داریاں ہیں، اپنے بھائی، بہن، ماں باپ، اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ وہ معاملہ کرنے کے لئے ہم تیار نہیں ہیں۔ اور حضورِ اکرم ﷺ کی تعلیم تو یہ ہے کہ ہر مسلمان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنا ہے، اور برائی سے پیش آنے سے اپنے آپ کو باز رکھنا ہے۔

دنیا و آخرت میں دردناک عذاب

دوسری آیت لائے ہیں: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ﴾ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ بری چیزوں کی خبریں مسلمانوں

میں پھیلے، ان کے لئے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کی بدنامی کی کوئی بات ہوئی، کسی پر تہمت لگائی گئی، اور وہ تہمت لوگوں میں پھیلائی جارہی ہے، تو برائی کے پھیلنے کی دل سے پسندیدگی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ وعید سنائی گئی ہے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اپنی آنکھوں سے کوئی عیب دیکھو تب بھی اس کو چھپانے کی شریعت نے تاکید کی ہے، نہ یہ کہ جو نہیں دیکھا ہے اس کا بھی لوگوں کے سامنے اظہار کیا جائے۔ پچھلے سبق میں حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقولہ بتلایا تھا کہ انہوں نے اپنے حواریوں سے پوچھا: تمہارا بھائی سویا ہوا ہو، اور ہوا کی وجہ سے اس کا کپڑا ہٹ جائے جس سے اس کا ستر تھوڑا سا کھل جائے؛ تو تم کیا کروگے؟ انہوں نے جواب میں عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم تو اس کو ڈھانپ دیں گے۔ آپ نے فرمایا نہیں! تم ڈھانپو گے نہیں، بلکہ تم تو اور زیادہ کھول دوگے۔ انہوں نے کہا: ایسا کون کرے گا؟ آپ نے فرمایا: تم لوگ ایسا ہی کرتے ہو کہ تمہارے بھائی کا کوئی عیب چاہے حقیقی ہو یا غیر حقیقی؛ جب تمہارے سامنے آتا ہے تو بجائے اس کے کہ تم اس کو چھپائو، تم اس کو لوگوں کے درمیان اور زیادہ پھیلاتے ہو۔

ایمان نہ ہونے کے مرادف ہے

تو حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی بری باتیں پھیلائی جاتی ہیں اور اسی پر لوگ خوش ہوتے ہیں؛ اسی کو ''شماتت'' کہا جاتا ہے، یعنی کسی کی برائی اور تکلیف پر خوش ہونا، اس کی

ایک قسم یہ بھی ہے کہ کسی کی بدنامی ہو رہی ہے، کسی کے خلاف غلط افواہ چل رہی ہے تو آپ بھی اس میں ساتھ دے رہے ہیں اور اس کو پھیلانے میں مدد کر رہے ہیں۔ اس پر تو قرانِ پاک میں دعویٰ ہے کہ ان کے لئے دنیا اور آخرت میں بھی دردناک عذاب ہے۔ اب جس بات پر قرآن وحدیث میں اتنی سخت وعیدات آئیں، اس کے باوجود مسلمان ایسی حرکتوں کا ارتکاب کرتے رہیں، تو یہ تو گویا اللہ اور رسول کی باتوں پر ایمان نہ ہونے کے مرادف ہے۔

بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو؛ ورنہ

حدیث ۱۵۷۷:-

وعَن وَاثِلَةَ بن الأسقع ﷺ قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((لاتُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لأَخِيكَ فَيَرْحَمَهُ اللهُ وَيَبْتَلِيكَ)) (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت واثلۃ بن اسقع (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو؛ کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ کرے اور اس مصیبت سے اس کو نجات دیدے اور تم کو اس کے اندر مبتلا کردے۔

افادات:- چنانچہ ایک روایت میں ہے: "فَيُعَافِيهِ اللهُ" اللہ تعالیٰ اس کو اس مصیبت سے عافیت نصیب فرمائے اور تم مبتلا ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کے فیصلوں کے معاملہ میں دخل دینے والے تم کون ہوتے ہو؟۔

بہر حال! بھائی چارگی اور رشتۂ اخوت کا تقاضہ یہ تھا کہ کسی پر کوئی مصیبت آئے چاہے اس کے ساتھ رشتہ داری ہو یا نہ ہو، کوئی نسبی وطنی تعلق ہو یا نہ ہو، جماعتی تعلق ہو یا نہ ہو؛ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فریضہ اور ذمہ داری ہے اس کی مدد کرنا اور ہمدردی کا اظہار کرنا۔ اسلام نے تو انسانیت کی بنیاد پر بھی بہت سارے حقوق لازم کئے ہیں، ایک انسان پر چاہے وہ آپ کا ہم مذہب نہ ہو، اس کے ساتھ بھی بھلائی کرنے کی تاکید فرمائی ہے، چہ جائیکہ ہم مذہب ہو؛ اس صورت میں تو اور زیادہ تاکید آئی ہے۔

ہے یہ گنبد کی صدا

حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ جس مصیبت میں وہ گرفتار ہے اس کو اللہ تعالیٰ نجات دیدے اور تم کو اس میں ڈال دے؛ تو پھر کیا ہوگا؟ تم اس وقت دوسروں پر ہنستے تھے، اب تم خود ہی دوسروں کا نشانہ بن سکتے ہو۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے:

ہے یہ گنبد کی صدا، جیسی کہے ویسی سنے

دوسروں کے ساتھ جیسا معاملہ کروگے، ہو سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ بھی ویسا معاملہ کیا جائے، اس لئے آدمی ڈرتا رہے۔ اور جس چیز کو ہم اپنی ذات کے لئے پسند نہیں کرتے، اس کو دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کریں۔ ہم اگر مصیبت میں ہوں اور لوگ ہم پر خوش

ہوتے ہوں، اس کو ہم گوارا کریں گے؟ جب ہم اس کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتے تو دوسروں کے لئے یہ نہیں سوچا جاسکتا۔ یہی ایمان کا تقاضہ ہے۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

آج کل اگر ہم کسی کو سمجھاتے بھی ہیں کہ ایسا مت کرو، تو وہ کہتا ہے کہ مولوی صاحب! اس نے میرے ساتھ یہ یہ کیا؛ تو میں ایسا کیوں نہ کروں؟ بھائی! اس نے جو بھی کیا؛ وہ کیا، اب تمہیں جو کچھ کرنا ہے اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ دیکھئے! جتنے بھی اعمال کرنے کے لئے ہمیں کہا گیا ہے، ان کا بدلہ ہمیں انسان سے نہیں لینا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے لینا ہے۔ یہی تو اسلام کی عجیب وغریب خوبی ہے کہ آپس کے جتنے بھی حقوق ہیں ان کی ادائیگی کا حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے، اور ان کی ادائیگی پر جو کچھ بھی انعام اور اجرو ثواب ملنا ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی سے ملنا ہے۔ تم اپنے بھائی کے ساتھ جو بھی بھلائی کا معاملہ کرو گے وہ اس لیے کرو گے کہ شریعت نے حکم دیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بار بار بتلاتا رہا ہوں کہ اسلام میں ہم پر جو بھی حقوق لازم کئے گئے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لازم کئے گئے ہیں، اور ان کی ادائیگی کے نتیجہ میں ہمیں اجرو ثواب بھی اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنا ہے۔ ہم اپنے بھائی کے ساتھ جو بھی بھلائی کریں گے اگر اللہ تعالیٰ کا حکم سمجھ کر کریں گے، تو اس

صورت کے اندر ہمیں اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی دے گا، ہمیں اسی سے توقع ہے۔ اگر سامنے والا دے تب بھی ہمیں لینے کی ضرورت نہیں ہے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

توحقیقت یہ ہے کہ اس کا بدلہ اس سے لے کر اس بڑے بدلہ کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ہے کیوں بند کریں؟ جیسے: کسی بادشاہ نے آپ کے پاس کسی کو چٹھی دے کر بھیجا کہ اس کا فلاں کام کر دو، اور آپ نے اس کا وہ کام کر دیا۔ اب وہ آدمی آپ کو کچھ بدلہ دینے کے لئے آئے؛ تو کیا آپ بدلہ لیں گے؟ آپ کہیں گے کہ: نہیں نہیں بھائی! ہم نے تو بادشاہ سلامت کے کہنے سے تمہارا کام کیا ہے، ہمارا معاملہ تو ان سے ہے۔ یہاں ہم یہ جواب اس لیے دیتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ اس سے بدلہ لے کر کیا کریں گے؟ اور وہ دے گا تو زیادہ سے زیادہ کیا دے گا؟ اسی طرح دوسروں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کر کے ہمیں اس سے کسی بدلے کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

نفس و شیطان کے دھوکہ سے نجات مل جائے گی

آج کل آپس میں جو کچھ رنجشیں ہوتی ہیں وہ بدلے کی بنیاد پر ہوتی ہیں، اسی لئے ہم ان ساری مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ اگر کوئی ہمارے ساتھ کچھ بھی معاملہ کرے اس وقت ہمیں

یہی سوچنا چاہیے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اسی کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ اگر یہ سوچ لیں گے تو ان شاء اللہ ہمارا نفس ہمیں جو دھوکہ دیتا ہے اور شیطان ہمیں جو گمراہ کرتا ہے، اور دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنے سے روکتا ہے؛ اس سے نجات مل جائے گی۔ ہمیں چاہیے کہ بار بار یہی سوچتے رہیں کہ ہم جو کچھ بھی کر رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر عمل کے لیے کر رہے ہیں، یہاں تک کہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی جو بھلائی کریں وہ اس لئے نہ کریں کہ ہمارے دل میں اس کی محبت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا ہے اس لیے کریں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اگر دل میں محبت کی کمی بھی ہوگی تب بھی ہم اس کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کا ارتکاب نہیں کریں گے۔

تحریم الطعن فی الانساب الثابتۃ فی ظاھر الشرع

جو نسب شریعت کے ظاہری حکم کے مطابق ثابت ہو اس میں طعن کرنا حرام ہے

ایک عورت کے ساتھ ایک مرد نے نکاح کیا اور اس عورت کے اس مرد کے نکاح میں آنے کے چھ مہینے کے بعد اس عورت کو بچہ پیدا ہوا؛ تو شریعت یہ کہتی ہے کہ یہ بچہ اس مرد کا کہلائے گا جس کے ساتھ اس کا نکاح ہوا ہے۔ بس! بات ختم ہو گئی۔ اب خدانخواستہ وہ عورت برائی میں مبتلا ہوئی، تو لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بچے کے متعلق کہتے ہیں:

(આ તો પેલા નો લાગે) یہ تو فلاں کا لگتا ہے؛ تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس کا شوہر ہے اور شریعت نے ثبوتِ نسب کے لئے جو اصول و قانون بنائے ہیں وہ سب پائے جا رہے ہیں تو ایسا کہنے کی کیسے اجازت ہو گی؟ یہاں تک کہ زنا سے پیدا ہونے والے بچے کا نسب زنا سے ثابت نہیں ہوتا، حضورِ اکرم ﷺ نے کھلم کھلا فرما دیا ہے: ”اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاشِ وَلِلْعَاھِرِ الْحَجَرُ“ عورت جس کے نکاح میں ہے، بچہ تو اسی کا سمجھا جائے گا، یا جس کی باندی ہے اس کا سمجھا جائے گا، اور زانی کے لیے تو پتھر ہیں، اس سے نسب ثابت نہیں ہو سکتا۔ یعنی اگر خدا نہ کرے زنا کا ثبوت ہو بھی جائے تب بھی نسب کو شوہر ہی سے ثابت مانا جائے گا۔ ہاں! اگر شوہر انکار کر دے تو شریعت نے اس کے لئے ایک قانون رکھا ہے کہ آپس میں لعان کیا جائے گا، اور بچے کے نسب کی وجہ سے جب لعان ہو جائے تو

اس صورت میں قاضی اس کا نسب کی نسل کرے گا، اس لیے کہ اس کے علاوہ اور کوئی شکل نہیں رہی۔

کبیرہ گناہ

آج کل تو معمولی معمولی باتوں کی وجہ سے، اور شک وشبہ کی وجہ سے لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں؛ تو جان لینا چاہیے کہ یہ تہمت کے اندر داخل ہے جو ایک کبیرہ گناہ ہے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی وہی آیت پیش کی ہے جو پہلے بھی کئی مرتبہ آچکی ہے: ﴿والَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ والْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَاناً وإِثْماً مُبِيناً﴾

دو باتیں کفر تک پہنچانے والی ہیں

حدیث ۱۵۷۸:-

وعن ابی ھریرۃ (رضی اللہ عنہ) قال قال رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اثْنَتَانِ فی النَّاسِ هُمَا بهم كُفْرٌ: الطَّعْنُ فِي النَّسَبِ، وَالنِّيَاحَةُ عَلَى الْمَيِّتِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: دو باتیں لوگوں کے اندر ایسی ہیں جو ان کو کفر تک پہنچانے والی ہیں (یعنی ان کا گناہ کفر جیسا ہے) ایک تو کسی کے نسب میں طعن کرنا، اور دوسرا میت پر نوحہ کرنا۔

افادات:-ان دونوں کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ یہ دونوں بہت بڑے گناہ ہیں،ان سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

باب النهی عن الغش والخداع

ملاوٹ اور دھوکہ کی ممانعت

والَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ والمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتاناً وإِثْماً مُبِيناً. (الأحزاب:۵۸)

چوں کہ یہ ساری چیزیں وہی ہیں جو ایمان والوں کو تکلیف پہنچانے والی ہیں اور ہر وہ کام جو کسی مؤمن مرد وعورت کی تکلیف کا ذریعہ بنتا ہو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی وعیدیں آئی ہیں۔ اسی میں دو چیزوں کو اس باب میں بیان کرتے ہیں۔

"غَشٌّ" خیر خواہی میں ملاوٹ کو کہتے ہیں، یعنی بھلائی چاہنے میں کمی کرنا اور خیر خواہی نہ کرنا۔ اور کسی کو دھوکہ دینے کو "خِدَاعٌ" کہتے ہیں۔

وہ ہم میں سے نہیں

حدیث ۱۵۷۹:-

عن أَبِي هريرة - رضی الله عنه: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا، وَمَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا)). (رواه مسلم)

وفی روایة لَهُ: أنَّ رسول الله ﷺ مَرَّ عَلَى صُبْرَةِ طَعَامٍ فَأَدْخَلَ يَدَهُ فِيهَا فَنَالَتْ أصابِعُهُ بَلَلاً، فَقَالَ: ((مَاهٰذَا يَا صَاحِبَ الطَّعَامِ؟))قَالَ:أَصَابَتهُ السَّمَاءُ يَارسول الله. قَالَ:((أفَلاَ جَعَلْتَهُ فَوقَ الطَّعَامِ حَتَّى يَرَاهُ النَّاسُ!مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو ہمارے خلاف ہتھیار اُٹھائے گا (یعنی کسی کو صرف ہتھیار دکھائے گا تو) وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور جو آدمی ہم کو دھوکہ دے (اور ہمارے ساتھ ملاوٹ کرے اور خیر خواہی کا معاملہ نہ کرے) تو وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔

اورایک روایت حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) ہی کی ہے (جس میں اس کی وجہ بتلائی ہے) ایک مرتبہ آپ ﷺ بازار سے گزر رہے تھے، ایک آدمی اناج کا ایک ڈھیر لئے ہوئے بیچنے کے لئے کھڑا تھا، نبیٔ کریم ﷺ نے اپنا ہاتھ اس اناج کے اندر داخل فرمایا، تو اناج کے دانے اندر سے گیلے تھے (چوں کہ اناج کا گیلا ہونا عیب ہے اور اس کی وجہ سے وزن بھی بھاری ہو جاتا ہے) تو حضوراکرم ﷺ نے پوچھا: بھائی! یہ کیا ہے؟ (اندر سے گیلے اوراوپر سے سوکھے؛ ایسا کیوں ہے؟) اس نے جواب دیا: یارسول اللہ! در اصل بارش گر گئی تھی اس کی وجہ سے جو دانے بھیگ گئے تھے ان کو میں نے اندر کر دیا، اور اندر کے جو دانے سوکھے تھے وہ اوپر کر دیئے۔ حضوراکرم ﷺ نے فرمایا: ان کو اوپر کیوں نہیں کیا کہ لوگ دیکھ لیں؟ جو ہمیں دھوکا دے گا اور ہمارے ساتھ ملاوٹ کا معاملہ کرے گا؛ وہ ہم میں سے نہیں (حضور اکرم ﷺ اس کو اپنی جماعت سے خارج بتلا رہے ہیں اور اس کو اپنا امتی کہنے کے لئے راضی نہیں ہیں)۔

افادات:-اس روایت میں ایک تو اسلامی اخوت وبھائی چارگی کے تقاضے بتلائے ہیں۔ بہت سوں کی عادت ہوتی ہے کہ دوسروں کو ڈرانے کے لئے بات بات میں چاقو نکال لیتے ہیں، بات بات میں ڈنڈا اُٹھالیتے ہیں، اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

دوسری بات یہ بتلائی کہ جو ہمیں دھوکہ دے اور ہمارے ساتھ ملاوٹ کا معاملہ کرے؛ وہ ہم میں سے نہیں۔ آج کل تو معمولی نفع اور دو پیسوں کی خاطر دھوکہ دینے کی بات ہوتی ہے، جیسا کہ بہت سے لوگ پوچھتے ہیں اور مفتیانِ کرام سے باقاعدہ سوال کیا جاتا ہے کہ مسالہ کے اکثر دکاندار سوکھی مرچوں میں پانی ڈال دیتے ہیں، اوران کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم پانی نہ ڈالیں تو وہ سوکھی رہتی ہیں جس سے ہمارا نقصان ہوتا ہے؛ تو یہ دھوکہ اور ملاوٹ ہے۔ دارالافتاء کی برکت سے بہت سی چیزیں ہمارے علم میں بھی آجاتی ہیں؛ ورنہ ہمیں تو پتہ بھی نہ چلے۔

امام ابو حنیفہ نور اللہ مرقدہ کا طریقۂ تجارت

پہلے زمانہ میں اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا کہ اگر کوئی عیب ہوتا تو سودا کرنے کے وقت اس کو بتلانا ضروری سمجھتے تھے۔ اگر بھول سے بتانا رہ گیا ہو تو اس کو اپنے لئے گوارا نہیں کرتے تھے۔ امام ابو حنیفہ نور اللہ مرقدہٗ کی کپڑوں کی تجارت تھی اور حفص بن عبد الرحمن امام صاحب کے پارٹنر تھے، ایک تھان ایسا تھا جس میں کوئی عیب تھا تو امام ابو حنیفہ نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے پارٹنر کو بتلایا کہ جب اس تھان کو بیچنا تو خریدنے والے کو عیب بتا دینا، لیکن بیچتے وقت

عیب بتانا وہ بھول گئے ان کو یاد ہی نہیں رہا، اور سارا لاٹ بیس ہزار درہم میں بک گیا۔ اور بیس ہزار درہم کی تقریباً چھ سو پچاس کلو چاندی ہوتی ہے۔ خیر! بعد میں جب امام صاحب کے ساتھ حساب کتاب ہونے لگا تو امام صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے پوچھا: میں نے تم سے کہا تھا کہ ایک تھان کے اندر عیب ہے وہ خریدار کو بتا دینا؛ تو تم نے اس کو بتا دیا تھا؟ اب ان کو یاد آیا اور کہنے لگے: میں تو بھول ہی گیا۔ امام صاحب نے پوچھا: خریدنے والا کون تھا؛ اس کو تلاش کرو۔ بہت تلاش کیا لیکن خریدار کا پتہ نہیں چلا، تو امام صاحب نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اس سودے میں جو منافع ہوا تھا اس کو الگ کر کے صدقہ کر دیا، بلکہ پوری قیمت (بیس ہزار درہم) کا صدقہ کر دیا۔ غور کیجئے کہ کتنی زیادہ احتیاط فرمائی کہ اپنے لئے اس کو گوارا ہی نہیں کیا اور آئندہ کے لیے ان سے شرکت ختم کر لی۔ آج کل تو جان بوجھ کر ایسا کیا جاتا ہے؛ پھر کمائی کیسے درست ہو سکتی ہے؟۔

یہ بھی دھوکہ ہے

حدیث ۱۵۸۰:-

وعنه: أَنَّ رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((لَا تَنَاجَشُوا)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: نجش مت کرو۔

افادات:۔ ’’نجش‘‘ کا مطلب پچھلے سبق کے اندر آچکا کہ کوئی چیز نیلام کی جارہی ہو، اور کسی کا اس چیز کو خریدنے کا ارادہ نہیں ہے پھر بھی اس کی قیمت بڑھائے جارہا ہے؛ تاکہ دوسرے لوگ زیادہ قیمت میں لے لیں۔ آج کل شہروں میں خاص کر فٹ پاتھ پر جو چیزیں نیلام کی جاتی ہیں وہاں نیلام کرنے والے خود ہی اپنے گُرگے رکھ چھوڑتے ہیں جو قیمت بڑھاتے رہتے ہیں۔ کوئی نیا آدمی بیچارہ آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ پینٹ یا شرٹ پانچ روپے میں مل رہا ہے، تو وہ سوچتا ہے کہ کتنا سستا ہے، اتنا سستا تو میں نے کبھی دیکھا ہی نہیں، ابھی وہ قیمت لگانا ہی چاہتا تھا کہ نیلام کرنے والے کا ہی چھوڑا ہوا گُرگا آکر کہتا ہے کہ دس میں دینا ہے، پھر دوسرا پندرہ لگاتا ہے، اوراس کی قیمت بڑھاتے بڑھاتے اس کی جو اصل قیمت ہے اس سے بھی آگے نکل جاتا ہے، چوں کہ ان کا خریدنے کا ارادہ تو ہوتا نہیں پھر بھی قیمت لگاتے ہیں؛ اب جو آدمی حقیقت میں خریدار ہوتا ہے اس کے ساتھ ایک طرح کا دھوکہ ہی ہو جاتا ہے؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

امانت و دیانت کا تقاضہ

حدیث ۱۵۸۱:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنھما: أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی عن النَّجْشِ (متفق عَلَیْہِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ خریدنے کا ارادہ نہ ہو پھر بھی قیمت بڑھائی جائے۔

حدیث ۱۵۸۲:-

وعنه قَالَ: ذَكَرَ رَجُلٌ لِرَسُولِ الله ﷺ: أَنَّهُ يُخْدَعُ فِي البُيُوعِ؟ فَقَالَ رسول الله ﷺ: ((مَنْ بَايَعْتَ، فَقُلْ: لاَ خِلاَبَةَ)). (متفق عَلَيْهِ)

((الخِلاَبَةُ)) بخاءٍ معجمةٍ مكسورةٍ وباءٍ موحدة، وهي: الخديعة.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضور اکرم ﷺ سے اپنا حال بیان کیا کہ مجھے زیادہ سمجھ نہیں پڑتی ہے، اس لئے خریداری میں دھوکہ ہو جاتا ہے۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا: جس کے ساتھ بھی سودا کرو تو یوں کہہ دیا کرو کہ دھوکہ نہیں ہونا چاہیے۔

افادات:- وہ زمانہ خیر و برکت کا تھا، لوگوں میں امانت و دیانت تھی، اس لیے گویا وہ آدمی اپنا حال بتلادے کہ مجھے سودے میں سمجھ نہیں پڑتی ہے، لہٰذا جو بھی معاملہ کرنا برابر کرکے دینا، تو اب دکاندار کو بھی چاہیے کہ ایسے آدمی کے ساتھ دھوکہ نہ کرے۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ خود ہی جانچ پرکھ لیتے ہیں، اس لیے دکاندار بھی ان کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں کر سکتا، اگر کچھ بھی گڑبڑ ہو تو ان کو پتہ چل جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس کا اندازہ لگا نہیں سکتے، اس لیے اگر وہ صاف صاف بات کر لے؛ تو اس صورت کے اندر پھر امانت اور دیانت داری اور اخوتِ اسلامی کا تقاضا یہ ہے کہ جو چیز جیسی ہو

اس کو بتلادی جائے، پھر بھی اگر کسی معاملہ میں اس کے ساتھ دھوکہ کیا گیا تو اس کو معاملہ فسخ کرنے کا اختیار رہے گا۔

ہم میں سے نہیں

حدیث ۱۵۸۳:-

وعن أبي هريرة - رضى الله عنه - قَالَ : قَالَ رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : ((مَنْ خَبَّبَ زَوْجَةَ امْرِءٍ، أَوْ مَمْلُوكَهُ، فَلَيْسَ مِنَّا)). (رواهُ أبو داود)

((خَبب)) بخاءٍ معجمة، ثُمَّ باءٍ موحدة مكررة: أيْ أفسده وخدعه.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے کسی کی بیوی کو شوہر کے خلاف، یا کسی کے غلام کو آقا کے خلاف بھڑکایا؛ تو ایسا آدمی ہم میں سے نہیں ہے۔

افادات:- آج کل یہ ایک عام بیماری ہو چکی ہے کہ میاں بیوی میں بہت اچھا چل رہا ہے، لیکن ایک تیسرا آدمی بیوی کے کان میں پھونک مارتا ہے کہ تیرا شوہر تو ایسا ایسا ہے۔ اب وہ بیچاری بیوقوف بیوی دوسرے کے کہنے پر شوہر کے ساتھ اپنا معاملہ بگاڑ لیتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھیرے دھیرے ان کے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور نوبت طلاق اور جدائی تک پہنچ جاتی ہے۔

یا کسی سیٹھ کے یہاں کوئی نوکر بہت اچھا ہوتا ہے تو کسی کو اس سے حسد ہو جاتا ہے کہ یہ اس کے یہاں سے کسی بھی طرح چلا جائے۔ لہٰذا وہ اپنی صلاحیتیں اس کے لئے استعمال کرنا شروع کرتا ہے اور اس کے دل میں باتیں ڈالتا ہے کہ تمہارے سیٹھ کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، اس کا مزاج تو ایسا ہے کہ اپنے پرانے نوکروں کو چلتا کر دیتا ہے، کہیں تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی نہ کرے، اگر کبھی تجھے بھی چلتا کر دیا تو تم تو فٹ پاتھ پر آجاؤ گے (یعنی کہیں کے نہ رہو گے) ایسی باتیں بنا بنا کر اس کو سیٹھ کے خلاف بھڑکاتا ہے، اور آج کل ایسے طریقے بہت زیادہ چل رہے ہیں۔ تو جو لوگ شوہروں کے خلاف بیویوں کو بھڑکانے کا کام کرتے ہیں، یا آقا اور سیٹھ کے خلاف غلام اور نوکروں کو بھڑکاتے ہیں، ان کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسا آدمی ہم میں سے نہیں۔ دیکھئے! کتنی سخت وعید ہے۔

پھر کس سے توقع لگائی جاسکتی ہے؟

یہ بہت اہم چیز ہے۔ لیکن بہت سے لوگ ایسی حرکت کرتے ہیں اور اس کو کوئی گناہ اور برا کام بھی نہیں سمجھتے، حالاں کہ یہ اتنا خطرناک اور بڑا گناہ ہے کہ نبی کریم ﷺ اس کو اپنا امتی ماننے کے لئے بھی تیار نہیں ہیں۔ اور جس کو حضور ﷺ فرمادیں کہ یہ میرا نہیں؛ تو بھلا اس کا کل قیامت میں کیا حال ہو گا؟ وہاں کے متعلق تو بہت سے گنہگاروں کو بھی یہی آس لگی رہتی ہے کہ حضور ﷺ کی شفاعت نصیب ہو جائے گی اور ہمارے گناہوں پر پردہ پڑ

جائے گا۔ لیکن اگر ہم ایسی حرکتیں کریں اور حضور ہی فرمادیں کہ تو میرا نہیں ہے؛ تو پھر اس کے بعد کون سی توقع قائم کی جاسکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے اور ہمیں صحیح توفیق عطا فرمائے۔

باب تحریم الغدر

عہد شکنی حرام ہے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ. (المائدۃ:۱)

وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً .(الإسراء:۳۴)

نیا عنوان قائم کیا ہے: عہد شکنی کا حرام ہونا۔ آپس میں جو معاہدہ کیا جاتا ہے اس کو پورا کرنے کا قرآنِ پاک میں حکم ہے اسی سلسلہ میں دو آیتیں پیش کی ہیں: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ اے ایمان والو! جو معاملات اور معاہدات آپس میں طے کئے جائیں ان کو پورا کرو۔

اور باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً﴾ معاہدے کو پورا کرو، بے شک اس کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال ہوگا۔

عہد اور معاہدہ میں فرق اور شرعی حکم

اگر ایک فریق دوسرے فریق کو کسی کام کے انجام دینے، یا کسی کام کے چھوڑنے کے متعلق اپنی طرف سے گارنٹی دے اور اطمینان دلائے اور معاملہ یک طرفہ (One Sided)

ہو؛تو وہ تو”وعدہ“کہلاتا ہے۔اور اگر دونوں فریق مل کر کسی کام کرنے یا چھوڑنے کے لئے آپس میں طے کریں،اور کسی کام کے کرنے پر،یا کسی کام کے چھوڑنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں؛تو یہ ” معاہدہ“ کہلاتا ہے۔

اب سوال ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق کیا ہے؟تو دیکھئے!معاہدہ میں تو شرعی طور پر یہ حکم ہے کہ اگر ایک فریق کی طرف سے اس کی خلاف ورزی ہو تو شریعت نے دوسرے کو یہ حق دیا ہے کہ وہ شرعی کورٹ میں قاضی کے پاس جاکر اس کے متعلق مطالبہ کرے اور سامنے والے فریق کو-آپس میں جو بات طے ہوئی ہے اس کے انجام دینے پر- مجبور کرے۔ گویا بذریعۂ قاضی یہ حق وصول کیا جاسکتا ہے۔

جبکہ وعدہ کے اندر ایسا نہیں ہے۔یعنی اگر کسی نے یک طرفہ وعدہ کیا ہو کہ میں فلاں کام کروں گا،یا فلاں کام نہیں کروں گا؛تو اس صورت میں اس وعدہ کو پورا کرنا ایمانی تقاضہ ہے، اوراس کو پورا نہ کرنے کی صورت میں وہ گنہگار ہوگا، لیکن جس کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے وہ کورٹ میں مقدمہ دائر کرکے اور قاضی کا تعاون حاصل کرکے اس سے زبردستی وہ کام نہیں کروا سکتا۔وعدہ اور معاہدہ میں یہی فرق ہے۔ معاہدہ میں وعدہ کے مقابلہ میں قوت زیادہ آتی ہے، اگرچہ دونوں (وعدہ کی خلاف ورزی، اور معاہدہ کی خلاف ورزی) کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے۔

تو معاہدہ کی خلاف ورزی جس کو وعدہ توڑنا اور عہد شکنی کہا جاتا ہے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس پر قرآن وحدیث میں بہت تاکید آئی ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنے کی صورت میں بہت وعیدیں بیان فرمائی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے کہ جو قوم عہد شکنی میں مبتلا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے اوپر دشمنوں کو مسلط کر دیتا ہے۔

معاہدہ کی قسمیں

اب علماء نے معاہدوں کی تین قسمیں بتلائی ہیں: ایک معاہدہ تو بندے کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب ایمان لاتا ہے اور کلمہ پڑھتا ہے، تو اس وقت گویا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک معاہدہ کرتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے احکام اور نبی کریم ﷺ کی ہدایات کو عملی جامہ پہناؤں گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت، فرمانبرداری کروں گا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری میں رسول اللہ ﷺ کی پیروی کروں گا۔ گویا پوری شریعت بندہ کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک طرح کا معاہدہ ہی ہے۔ اب جو آدمی شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے تو یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ عہد شکنی کرنے والا اور معاہدہ کی خلاف ورزی کرنے والا ہے، اور عہد شکنی کرنے پر جن عذابوں سے ڈرایا گیا ہے؛ شریعت کی خلاف ورزی پر بھی ان سارے عذابوں کا امکان ہے۔

معاہدہ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ

اور ایک معاہدہ انسانوں کا انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً: آپ نے کسی آدمی کے ساتھ کوئی معاملہ کیا، چاہے خرید و فروخت کا ہو جس کو عقد اور سودا کرنا کہتے ہیں، چاہے کرایہ داری کا ہو، یا دنیا میں آپس میں جو بہت سارے معاملات کئے جاتے ہیں ان سب معاہدات میں دو فریقوں نے -چاہے وہ دو آدمی ہوں، یا دو جماعتیں ہوں، یا دو حکومتیں ہوں- آپس میں کسی کام کے کرنے، یا نہ کرنے کے متعلق جو بھی طے کیا ہو اور معاہدہ کیا ہو، اگر وہ شریعت کی حدود میں رہتے ہوئے ہے، اور اس میں اللہ اور رسول کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے؛ تو ان کو پورا کرنا دونوں میں سے ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔ اور اگر وہ معاہدہ کسی ناجائز کام کا کر لیا ہو، یعنی معلوم ہی نہیں تھا اور غفلت میں کر لیا، پھر بعد میں کسی نے بتایا کہ آپ لوگوں نے آپس میں جو معاہدہ کیا ہے وہ شرعاً درست نہیں ہے، تو جب کسی ایک فریق کو پتہ چلے تو وہ سامنے والے فریق کو آگاہ کر دے کہ ہمارا معاہدہ تو ہوا تھا، لیکن مجھے شریعت کا حکم معلوم نہیں تھا اب صحیح حکم معلوم ہوا تو پتہ چلا کہ ہمارا یہ معاہدہ شریعت کے اعتبار سے درست نہیں ، لہٰذا اب وہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے، اور پھر اس عہد کی پابندی کرنا ضروری نہیں ہے۔

معاہدہ اپنی ذات کے ساتھ

اور ایک معاہدہ وہ بھی ہے جو آدمی اپنی ذات سے کرتا ہے، جیسے: کسی چیز کی منت مان لی، یا قسم کھالی؛ تو اس کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ منتوں کے پورا کرنے کے سلسلہ میں فقہاء جہاں دلائل قائم کرتے ہیں اس میں اس آیت "وَأَوْفُوا بِالْعَهْدِ إِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولاً" کو بھی پیش کرتے ہیں۔ مثلاً: کسی آدمی نے یہ منت مان لی کہ میرا فلاں کام ہو جائے گا تو میں اتنے روزے رکھوں گا، یا اتنا مال صدقہ کروں گا، یا حج کروں گا، یا فلاں نیک کام کروں گا۔ تو منت کے صحیح ہونے کی جو شرطیں ہیں وہ اگر ان شرطوں کے مطابق ہے، تو گویا یہ ایک معاہدہ ہے جو آدمی اپنی ذات سے کر رہا ہے، اب اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

اسی طرح کسی کام کے متعلق کرنے یا نہ کرنے کی قسم کھالی، مثلاً: کوئی آدمی اللہ کے نام کو بیچ میں رکھ کر قسم کھالے، تو گویا وہ بھی ایک کام کو کرنے کے لئے اپنی ذات سے کہہ رہا ہے؛ تو یہ بھی ایک طرح کا معاہدہ ہے جو انسان اپنی ذات سے کرتا ہے اور اس کا پورا کرنا بھی ضروری ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ یہ باب قائم کر کے بتلانا چاہتے ہیں کہ تینوں میں سے جو نسا بھی معاہدہ ہو، چاہے انسان نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا ہو، یا انسانوں کا آپس میں کیا ہوا ہو، چاہے ایک فرد کا دوسرے فرد کے ساتھ، ایک جماعت کا دوسری جماعت کے ساتھ، ایک حکومت کا

دوسری حکومت کے ساتھ، ایک ملک کا دوسرے ملک کے ساتھ۔ یا ایک آدمی اپنی ذات کے ساتھ جو معاہدہ کرتا ہے؛ یہ سارے معاہدات اگر شریعت کی حدود میں رہ کر ہیں؛ تو ان سب کا پورا کرنا ضروری ہے، اوران کی خلاف ورزی کرنا حرام اور ممنوع ہے۔

منافق کی چار خصلتیں

حدیث ۱۵۸۴:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما : أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ : ((أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقاً خَالِصاً ، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا : إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ، وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی میں چار خصلتیں اور عادتیں ہوں گی، تو وہ خالص منافق ہوگا، اور جس میں ان میں سے کوئی ایک عادت ہوگی تو (یوں کہا جائے گا کہ) نفاق کی عادتوں میں سے ایک عادت ہے، یہاں تک کہ اس کو چھوڑ دے۔ جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے، اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے، اور جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، اور جب جھگڑا کرے تو حد سے آگے نکل جائے۔

افادات:- ”نفاق“ یعنی ظاہر اور باطن کا ایک دوسرے سے مخالف ہونا، اندر کچھ ہو اور باہر کچھ ظاہر کیا جائے؛ اس کو شریعت کی اصطلاح میں نفاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دیکھئے! کفر کی کئی قسمیں ہیں، ایک تو کفر بدیہی ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک ٹھہرایا جائے۔ دوسرا ''کفر جُحود'' ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو جانتے ہوئے بھی اس سے انکار کرے، یعنی دلائل سامنے ہیں جن کی وجہ سے دل بھی ماننے کے لئے آمادہ ہے لیکن پھر بھی انکار کرتا ہے۔ اور تیسرا ''کفر نفاق'' کہلاتا ہے کہ دل کے اندر تو کفر ہی ہے لیکن زبان سے ایمان کا اظہار کرتا ہے، گویا ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن اگر دل کے اندر تو ایمان ہے، اور عملی شکل میں اس کے تقاضوں کی خلاف ورزی کرتا ہے؛ تو یہ نفاق ہی کی ایک شکل ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے مسلمان اکثر وہ ہیں جو دل میں ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے اعضاء و جوارح سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں وہ ایمان کے تقاضوں کے مطابق نہیں ہوتے؛ یہ کفر نہیں ہے، بلکہ اس کو ''نفاقِ عملی'' کہا گیا ہے، ایسا آدمی گنہگار کہلائے گا اور اس کو اپنی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔ اور ان عادتوں کو نفاق کی علامتیں قرار دے کر اہلِ ایمان کو اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ جو آدمی اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے، اس کے شایانِ شان نہیں ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات اس کے اندر پائی جائے، اگر ایسی کوئی بات پائی جاتی ہے تو اس کو فکر کرنی چاہیے، اور ایسی برائی سے اپنے آپ کو جلد از جلد پاک صاف کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔

ایمان کے تقاضے

’’ إِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ‘‘ جب اس کے پاس کوئی چیز امانت رکھی جائے تو وہ خیانت کرے (اس کی تفصیل چوتھی جلد میں امانت کے باب کے اندر آچکی ہے)

’’وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ‘‘ اور جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

’’وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ‘‘ جب عہد کرے تو اس کی خلاف ورزی اور عہد شکنی کرے۔ بعض روایتوں میں ’’إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ‘‘ آیا ہے۔ اور میں نے وعدہ اور معاہدہ کا فرق بتلایا تھا کہ وعدہ یکطرفہ ہوتا ہے، اور معاہدہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ اسی لئے بعض روایتوں میں ’’وَعَدَ‘‘ آیا ہے، اور بعض روایتوں میں اسی کو ’’ عَاهَدَ ‘‘ سے تعبیر کیا ہے۔ معاہدہ کے اندر وعدہ کے مقابلہ میں پختگی زیادہ ہے جیسا کہ میں نے اس کا بھی حکم بتلایا تھا، اسی کو ایگریمنٹ کہتے ہیں۔ لیکن آج کل یہ مصیبت بھی عام ہو گئی ہے کہ آپس میں ایگریمنٹ کرتے ہیں اور پھر اس سے مُکر جاتے ہیں؛ حالاں کہ یہ حرام ہے اور بہت خطرناک گناہ ہے، اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ ایک مرتبہ جب معاہدہ ہوا تو اس کی پابندی کرنا ایمان کا تقاضا ہے۔

انصاف کے تقاضے مت چھوڑو

”وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ“ اور جب جھگڑا کرے تو آپے سے باہر نکل جائے اور گالی گلوچ کرنے لگے۔ حالاں کہ مؤمن کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ جھگڑے کی حالت میں بھی انصاف کے تقاضوں کو نہ چھوڑے، اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى﴾ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف کے تقاضوں کو چھوڑ دو، انصاف پر قائم رہو، یہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ کسی کے ساتھ کیسی ہی دشمنی کیوں نہ ہو، اس کے باوجود ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ اس کو جا و بیجا نقصان پہنچایا جائے۔ آپ انصاف پر قائم رہیے، انصاف کے تقاضوں کو مت چھوڑیئے۔

حب و بغض میں اعتدال

بہت سوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ دوستی ہوگئی تو اس کی تعریف کے اتنے پل باندھ دیئے کہ اس کو آسمان پر چڑھا دیا، اور جب کسی سے دشمنی پر اتر آئے تو ایسے اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اس کا جینا دوبھر کر دیا۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے، اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، اسلامی تعلیم تو یہ ہے، ترمذی شریف کی روایت میں ہے، حضور ﷺ فرماتے ہیں: أَحْبِبْ حَبِيبَكَ هَوْنًا مَا، عَسَى أَنْ يَكُونَ بَغِيضَكَ يَوْمًا مَا، وَأَبْغِضْ بَغِيضَكَ هَوْنًا مَا، عَسَى

أَنْ يَكُونَ حَبِيبَكَ يَوْمًا مَا، دوست سے دوستی کرو تب بھی ہلکی کرو، ہو سکتا ہے کہ کبھی وہ دشمن ہو جائے۔ اور دشمن سے دشمنی کرو تو وہ بھی ہلکی کرو؛ ہو سکتا ہے کبھی وہ دوست ہو جائے۔ بہت سوں کا مزاج ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو دوست بناتے ہیں تو اتنی دوستی بڑھاتے ہیں کہ اپنے سارے راز اور بھید سے اس کو واقف کرا دیتے ہیں پھر جب وہی دوست دشمنی پر اتر آتا ہے تو ایک ایک کر کے سب راز وصول کرتا ہے۔ اور اگر دشمنی میں ہم نے کوئی پوئنٹ چھوڑا ہی نہیں، تو بعد میں اگر دشمنی ختم ہو جائے گی اور دوستی کا وقت آئے گا تو وہ سب باتیں یاد آئیں گی، اور اس کے سامنے دل ہی دل میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس لیے آدمی کو ہر معاملہ شریعت کے حدود کے اندر ہی رہ کر کرنا چاہیے۔

انتہاء درجہ کی رسوائی

حدیث ۱۵۸۵:-

وعن ابن مسعودٍ، وابن عمر وأنس - رضی اللہ عنہم - قالوا: قَالَ النَّبِيّ ﷺ: ((لِكُلِّ غادِرٍ لِواءٌ يَوْمَ القِيَامَةِ، يُقَالُ: هٰذِهِ غَدْرَةُ فلانٍ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- یہ روایت تین صحابہ کرام حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت عبد اللہ بن عمر حضرت أنس (رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین) نقل کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہر عہد شکنی کرنے والے

(ایگریمنٹ کو توڑنے والے) کے لئے قیامت کے روز ایک جھنڈا ہو گا، اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ فلاں کی عہد شکنی ہے۔

افادات:- عرب میں دستور یہ تھا کہ اگر کسی کے ساتھ کوئی عہد شکنی کرتا تو حج کے موقع پر باقاعدہ کالے رنگ کا جھنڈا گاڑا جاتا تھا۔ لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کا ہے کا جھنڈا ہے؟ تو کہا جاتا تھا کہ فلاں نے فلاں کے ساتھ معاہدہ کیا تھا لیکن اس کی خلاف ورزی کی۔ گویا یہ اس کے لیے سماج کے اندر ایک طرح کی شرمندگی کا موقع ہوتا تھا۔

اور اگر کسی نے کسی کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ کیا ہوتا جس کو پورا کرنا واقعتاً مشکل تھا، لیکن جان پر کھیل کر اور تکلیف اُٹھا کر بھی اس عہد کو پورا کرتا تھا تو اس کی نیک نامی کے واسطے سفید رنگ کا ایک جھنڈا گاڑا جاتا تھا، لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کا ہے کا جھنڈا ہے؟ تو بتایا جاتا تھا کہ فلاں نے فلاں کے ساتھ ایک عہد کیا تھا اس کو پورا کیا، یہ اس کا جھنڈا ہے۔ یہ عرب کا ایک دستور تھا اسی کے مطابق سمجھانے کے لئے کہا گیا کہ قیامت کے روز بھی ایسا ہی ہو گا۔

اور دنیا میں حج کے موقعہ پر اُس زمانہ میں اتنے حاجی نہیں ہوتے تھے جتنے آج ہمارے زمانہ میں ہوتے ہیں۔ لیکن اُس وقت کے اعتبار سے زیادہ ہی ہوتے تھے۔ تو جب اس کو اپنے لئے اتنا معیوب اور بدنامی کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا، تو قیامت کے روز جبکہ اولین و آخرین سب جمع موجود ہوں گے اور وہاں اس طرح کا جھنڈا گاڑا جائے گا اور اعلان کیا جائے گا کہ یہ فلاں

کی عہد شکنی کا جھنڈا ہے، تو کتنی بڑی بدنامی کی بات ہو گی۔ گویا انتہاء درجہ کی رسوائی ہو گی، اس لئے اس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کیا جائے۔

اس سے بڑی غداری اور کوئی نہیں ہو سکتی

حدیث ۱۵۸۶ :-

وعن أبي سعيدٍ الخدريّ رضى الله عنه: أنَّ النبيّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ عِنْدَ إِسْتِهِ يومَ القِيَامَةِ يُرْفَعُ لَهُ بِقَدَرِ غَدْرِهِ. أَلَا وَلَا غَادِرَ أَعْظَمُ غَدْرًا مِنْ أَمِيرِ عَامَّةٍ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ہر عہد شکنی (اور اگریمنٹ کی خلاف ورزی) کرنے والے کے لئے اس کی سرین پر جھنڈا گاڑا جائے گا اور (کمال تو یہ ہے کہ) جتنی بڑی عہد شکنی ہو گی وہ جھنڈا بھی اتنا ہی اونچا ہو گا (حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فرماتے ہیں) سنو! ایک حاکمِ اعلیٰ کی غداری کرنے سے بڑی غداری (اور عہد شکنی) کرنے والا اور کوئی نہیں ہے۔

افادات:- جیسی جیسی عہد شکنی ہو گی اسی حساب سے جھنڈے کی اونچائی بھی ہو گی، اگر بڑی عہد شکنی ہو گی تو جھنڈا بھی اسی حساب سے زیادہ اونچا ہو گا۔ اور اگر چھوٹی عہد شکنی ہو گی تو جھنڈا بھی چھوٹا ہو گا۔ اور وہ جھنڈا زمین پر نہیں بلکہ اس کی سرین پر گاڑا جائے گا۔ گویا یہ اس کے لئے اور زیادہ تکلیف اور بدنامی کا ذریعہ ہو گا۔

”حاکم کی غداری کرنے سے بڑی غداری اور کوئی نہیں“ یعنی جس کو حاکم اور امیر بنایا گیا، پھر وہ اپنے وعدہ کو پورا نہ کرتے ہوئے عہد شکنی کرے؛ تو وہ سب سے بڑی غداری ہے۔ جیسے: الیکشن کے موقعہ پر جمہوری حکومتوں کی ہر جماعت کی طرف سے باقاعدہ اپنا ایجنڈا شائع کیا جاتا ہے کہ اگر ہم برسرِ اقتدار آئے تو ہماری طرف سے لوگوں کو سہولت کے طور پر فلاں فلاں چیزیں دی جائیں گی، انہیں وعدوں اور ایگریمنٹ کی بنیاد پر ان کو ووٹ دیئے جاتے ہیں، اب ظاہر ہے کہ اگر ایک فرد کا دوسرے ایک فرد کے ساتھ، یا ایک جماعت کا دوسری ایک جماعت کے ساتھ کوئی معاہدہ اور وعدہ ہو، اور پھر اس کو پورا نہ کیا جائے تو اس کا نقصان محدود ہوتا ہے، لیکن یہاں تو پوری قوم اور ایک جم غفیر کے ساتھ وعدہ و معاہدہ کیا جاتا ہے، اور جب اس کو توڑا جائے گا تو صرف ایک آدمی یا ایک جماعت کا دل نہیں ٹوٹے گا، بلکہ سینکڑوں اور کروڑوں آدمیوں کے دل ٹوٹیں گے۔ اس سے انداز لگایا جا سکتا ہے کہ یہ کتنا خطرناک عمل ہے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ بڑے حکمراں نے جو معاہدہ اور ایگریمنٹ کیا ہو، اس کی خلاف ورزی، غداری اور عہد شکنی کرنے پر ایک دو نہیں، سینکڑوں اور ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کو نقصان پہنچتا ہے اور ان کے دل ٹوٹتے ہیں، اس لیے یہ اتنی بڑی غداری ہے کہ اس سے بڑی غداری اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

ان کے خلاف مَیں خود مدعی بنوں گا

حدیث ۱۵۸۷:-

وعن أَبِي هريرة -رضى الله عنه- عن النبيّ ﷺ قَالَ: ((قَالَ اللهُ تَعَالَى: ثَلَاثَةٌ أَنَا خَصْمُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ: رَجُلٌ أَعْطَى بِي ثُمَّ غَدَرَ، وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا فَأَكَلَ ثَمَنَهُ، وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيراً، فَاسْتَوْفَى مِنْهُ، وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ)). (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: (یہ حدیثِ قدسی ہے) تین آدمی ایسے ہیں جن کے خلاف مَیں خود مدعی بنوں گا (اللہ تعالیٰ جس کے خلاف مدعی بن جائیں گے تو پھر اس کی ہلاکت میں کیا تردد ہو سکتا ہے؟) ایک وہ آدمی جس نے میرا نام لے کر کسی کے ساتھ عہد کیا؛ پھر اس کی خلاف ورزی کی، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد آدمی کو پکڑ کر غلام بنالیا اور اس کو غلام کہہ کر بیچ دیا اور اس کی قیمت کھا گیا۔ اور تیسرا وہ آدمی جس نے کسی کو مزدور بنایا (یعنی کسی سے اجرت کا معاملہ طے کیا کہ میرا یہ کام کر دو، اتنا بوجھ اٹھا کر لے جاؤ) اور اس سے کام تو پورا وصول کیا لیکن اس کو اجرت بالکل ہی نہیں دی، یا پوری پوری نہیں دی (آج کل یہ تیسرا کام بہت زیادہ ہوتا ہے)۔

افادات:- عام طور پر جب لوگ آپس میں معاہدے کرتے ہیں تو اللہ کا نام بیچ میں لایا جاتا ہے، اور اللہ کو گواہ بنایا جاتا ہے، مثلاً: یوں کہتے اور لکھتے ہیں کہ اللہ کو حاضر وناظر سمجھ

کر ہم یہ معاہدہ کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرا نام لے کر اور مجھے بیچ میں رکھ کر جب کوئی معاہدہ کیا جائے؛ پھر اس کی خلاف ورزی کی جائے اور اس معاہدہ کو توڑا جائے؛ تو مَیں اس کے خلاف مدعی بنوں گا جو اس کو توڑے گا۔

"وَرَجُلٌ بَاعَ حُرًّا أَفَأَكَلَ ثَمَنَهُ" پہلے زمانہ میں یہ ہوتا تھا کہ کہیں کوئی قافلہ جارہا ہے، اس پر چھاپہ مار کر اس کو لوٹ لیا اور اس قافلے کے شرکاء کو پکڑ لیا اور دوسری جگہ جا کر ان کو غلام بتا کر بیچ دیا، حالاں کہ یہ لوگ پیدائشی آزاد ہوتے تھے، تو کسی کو اس طرح غلام بنا کر بیچنا اور اس کی قیمت کو کھا جانا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ایسے آدمی کے خلاف میں مدعی بنوں گا۔ پہلے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، اب تو وہ بات نہیں رہی۔

"وَرَجُلٌ اسْتَأْجَرَ أَجِيْراً، فَاسْتَوْفَى مِنْهُ، وَلَمْ يُعْطِهِ أَجْرَهُ" کسی نے کسی مزدور سے اجرت کا معاملہ طے کیا کہ میرا فلاں کام کر دو، یا میرا یہ سامان اُٹھا کر وہاں تک لے جاؤ، اور اس سے وہ کام پورا وصول کیا اور اجرت اس کو نہیں دی، یا اجرت دی لیکن پوری نہیں دی؛ تو یہ بھی بہت خطرناک عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس مستأجر کے خلاف مدعی بنوں گا۔ اگر کسی سے اجرت پر کام لیا جائے تو حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ مزدور کا پسینہ سوکھے اس سے پہلے اس کی اجرت دیدی جائے، اس میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔

باب النهی عن المن بالعطیة ونحوها

کسی کو کوئی بخشش یا ہدیہ وغیرہ دے کر اس پر احسان جتلانے کی ممانعت

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى. (البقرة:۲۶۴)

الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى. (البقرة:۲۶۲)

ہمارے سماج کی عام وبا

کسی کو ہدیہ اور بخشش دے کر اس پر احسان جتلانا؛ یہ بھی کبیرہ گناہ ہے، اور آج کل ہمارے سماج و معاشرہ میں یہ گناہ بھی بہت زیادہ عام ہو گیا کہ جہاں کچھ جھگڑا ہوا، بلکہ اگر اپنے سگے بھائی سے بھی ذرا سا جھگڑا ہوا تو اب وہ سب کچھ گنانے لگ جاتا ہے کہ فلاں دن میں نے تیرے ساتھ یوں کیا تھا، اور تجھے یہ دیا تھا، اور تیرے ساتھ فلاں فلاں احسان کیا تھا، اور تجھے اتنے کپڑے لا کر دیئے تھے، اور تیری بیوی کے کپڑے بھی سلوا دیئے تھے، تجھے مکان بھی بنوا دیا تھا، وغیرہ وغیرہ؛ اسی کو ”احسان جتلانا“ کہتے ہیں۔ حالاں کہ ایک مؤمن کی شان یہ ہے کہ وہ جو بھی نیکی کا کام کرتا ہے، یا کسی کے ساتھ کوئی بھلائی اور حسنِ سلوک کرتا ہے، چاہے اپنے باپ کے ساتھ ہو، بیوی کے ساتھ ہو، اپنے بھائی کے ساتھ ہو، اپنے کسی عزیز اور

دوست کے ساتھ ہو، یا کسی اجنبی کے ساتھ ہو؛ جس کسی کے بھی ساتھ آدمی جب کوئی حسنِ سلوک کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے خاطر اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کے لئے کرتا ہے۔

میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ ایمان لانے کے بعد مؤمن کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے، اس کے بعد پھر ساری دنیا کے ساتھ جو بھی تعلق ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی مؤمن اپنے باپ کی اطاعت اور فرمانبر داری کرتا ہے تو وہ اس لئے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ کی فرمانبر داری کرنے کا اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک اور اس کی خدمت کا حکم دیا ہے، اسی لئے باپ اگر ایسے کام کا حکم کرتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے تو باپ ہونے کے باوجود اس کی اس بات پر عمل نہیں کیا جائے گا، اس لیے کہ شریعت نے ایک قاعدہ بتلادیا ہے: ''لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ''کسی مخلوق کی بات ماننے سے اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہوتی ہو تو پھر وہاں اس مخلوق کی بات مانی نہیں جائے گی، پھر چاہے وہ استاذ ہو، باپ ہو، پیر ہو، بیوی ہو، بھائی ہو، یا اپنے سے بڑا یا چھوٹا؛ کوئی بھی ہو۔ ایک مؤمن کا تعلق کسی کے بھی ساتھ ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے ہے۔

مؤمن کا اپنی بیوی سے تعلق

اسی لیے ایک مؤمن اپنی بیوی کے حقوق بیوی کی محبت سے مجبور ہو کر ادا نہیں کرتا۔ اگر ایسا ہی ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اگر کسی روز کسی وجہ سے بیوی سے جھگڑا ہو گیا اور دل میں

محبت باقی نہیں رہی؛ تو کیا وہ نا انصافی پر اتر آئے گا؟ معلوم ہوا کہ ایک ایمان والا اپنی بیوی کے حقوق اس لیے ادا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حقوق مقرر کئے ہیں؛ اس لئے اس کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوا اور بیوی سے تعلق اللہ کے واسطے ہوا ہے۔ مَیں ہمیشہ ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ آپ کے گھر میں فون ہے، اس کا اصل کنکشن ٹیلی فون ایکسچینج کے ساتھ ہے، اور اس ٹیلی فون ایکسچینج کے واسطے سے پورے شہر اور پورے ملک میں جتنے بھی فون ہیں ان کے ساتھ رابطہ ہے۔ تو پورے ملک اور شہر کے ساتھ آپ کا رابطہ اور کنکشن براہِ راست نہیں ہوتا بلکہ ایکسچینج کے واسطے سے ہوتا ہے، یہاں تک کہ آپ کے مکان اور پڑوسی کے مکان کی دیوار ایک ہے، آپ کے گھر بھی فون ہے اور اس کے گھر بھی فون ہے، تب بھی اس کے گھر کے فون کے ساتھ آپ کے فون کا رابطہ اور تعلق ایکسچینج کے واسطے ہی سے ہے۔ اسی لئے آپ جب بھی اس سے فون پر بات کریں گے تو پہلے آپ کی بات اس ایکسچینج میں جائے گی جو آپ کے مکان سے دو چار میل دور ہے، اور وہاں سے پڑوسی کے فون پر آئے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ دیوار پھاند کر سیدھے اُدھر چلی جائے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ایمان والے کا اصل تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور اللہ تعالیٰ کے واسطے سے دوسروں کے ساتھ ہے چاہے بیوی ہو یا اولاد ہو۔ اسی لئے جب تک کسی سے تعلق اللہ تعالیٰ کے واسطے سے رہے گا تب تک ہر جگہ اس بات کا خیال رکھا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کے ٹوٹنے کی نوبت نہ آئے اور اس کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ آدمی اگر بیوی سے محبت صرف

دوسرے تقاضوں کی وجہ سے ہی قائم کرتا ہے تو پھر بیوی کے کہنے کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے حکموں کی خلاف ورزی بھی کرلے گا، لیکن اگر بیوی سے محبت اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کرتا ہے تو پھر بیوی کی خاطر کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔

بہرحال! آپ جس کے ساتھ جو سلوک کریں، باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ بیوی کے ساتھ، اولاد کے ساتھ، بھائیوں کے ساتھ، یا کسی اجنبی کے ساتھ، پڑوسی کے ساتھ؛ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی وجہ سے کریں۔ اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم سے کررہے ہیں تو پھر وقت آنے پر اس کو جتلانا کیا معنٰی رکھتا ہے؟ اب اگر کوئی آدمی احسان جتلارہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ یہ کیا تھا اور وہ کیا تھا؛ تو یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا تھا وہ اللہ کے واسطے نہیں کیا تھا۔ اگر اللہ کے واسطے کیا ہوتا تو احسان جتلانے کی نوبت ہی نہ آتی۔ اسی لئے جو آدمی احسان جتلاتا ہے اس کا اجر وثواب بھی ختم ہوجاتا ہے۔

احسان جتلانا کبیرہ گناہ

بہرحال! احسان جتلانا کبیرہ گناہ ہے۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَى﴾ اے ایمان والو! اپنی نیکیوں کو (یعنی مال کے ذریعہ صدقات دے کر کسی کو جو بھی فائدہ پہنچاتے ہو، ان کو) احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر ضائع مت کردو۔ کسی غریب کو زکوٰۃ دینے کے بعد اگر آپ کے دل میں اس کی تحقیر

آگئی تو اس کی شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت مولانا محمد عمر صاحب نور اللہ مرقدہٗ فرمایا کرتے تھے کہ: آپ مسجد کا احترام کیوں کرتے ہیں؟ ظاہر ہے مسجد کا احترام ہم اسی لئے کرتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایک فرض کو ادا کرنے کی جگہ ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک فریضہ نماز کی شکل میں یہاں آکر ادا کرتے ہیں، حالاں کہ مسجد تو پتھر، سمینٹ اور روڑوں کی بنی ہوئی ہے۔ آپ جب پتھروں کا بھی احترام کرتے ہو اور اس کے لئے اپنی جانیں تک بھی دیدیتے ہو؛ تو پھر ایک غریب فقیر بھی تو اللہ تعالیٰ کے ایک فریضہ -یعنی زکوٰۃ- کی ادائیگی کی جگہ ہے، اگر وہ نہ ہو تو آپ اس فریضہ کو کہاں ادا کریں گے؟

ویسے بھی علماء نے لکھا ہے اور حدیثِ پاک سے بھی ثابت ہے کہ جب زکوٰۃ کی رقم فقیر کے ہاتھ میں دی جاتی ہے تو پہلے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں جاتی ہے، پھر فقیر کے ہاتھ میں آتی ہے۔ گویا آپ کسی فقیر کو نہیں دے رہے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو دے رہے ہیں اور پھر اللہ تعالیٰ اس فقیر کو دے رہے ہیں۔ قرآنِ کریم میں زکوٰۃ کے مصارف صراحۃً بیان کئے گئے ہیں کہ زکوٰۃ کن کن لوگوں کو دی جائے، اس لیے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے، اور عبادت اللہ کے واسطے ہی کی جاتی ہے۔

آج کل حال یہ ہو گیا ہے کہ کسی کو زکوٰۃ دی ہو اور وہ کوئی کام بتائے اور لینے والا نہ کرے، تو دینے والا کہنے لگتا ہے کہ: ارے! میں نے تجھے اتنی زکوٰۃ دی تھی اور تو ہمارا ہی کام نہیں کرتا؟ گویا اس کو بھی جتلاتے ہیں، ہاں! اگر ہدیہ دیا ہوتا تو کوئی بات بھی تھی، لیکن زکوٰۃ

تو ایک فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے، اس میں بھی جتلاتے ہیں !۔ جیسے: گھر میں نوکرانی ہو اور وہ چلی جائے تو اس کو تنخواہ تو دیتے ہی تھے، اس پر مزید دباؤ ڈالنے کے لئے ایک عام رواج ہو گیا ہے کہ اس کو زکوٰۃ بھی دیتے ہیں، اور وقت آنے پر اس کو خوب سنایا بھی جاتا ہے کہ: دیکھ! ہم تجھے یہ بھی دیتے ہیں اور وہ بھی دیتے ہیں۔ اور میں پہلے بھی مسئلہ بتلا چکا ہوں کہ اس طرح کرنا درست نہیں ہے۔ کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کسی کو کچھ دے کر پھر جتلانا اور اس کو حقیر سمجھنا اس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ کوئی کسی کو حقیر سمجھ کر دے تو یہ تو بہت برا ہے:-

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موتی اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

بلکہ ایمان والوں کی صفت تو یہ بتلائی گئی ہے: ﴿الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى﴾ (البقرة: ٢٦٢) جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرتے ہیں اس کے بعد پھر احسان نہیں جتلاتے اور تکلیف نہیں پہنچاتے، سامنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے۔

اور کمال تو یہ ہے کہ جن مبارک راتوں میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت سب لوگوں کے لیے عام ہوتی ہے، جیسے: شبِ براءت اور شبِ قدر وغیرہ؛ ان میں بھی کچھ لوگوں کے گناہوں کو

معاف نہیں کیا جاتا، ان میں ایک ﴿اَلْمَنَّان﴾ یعنی احسان کر کے جتلانے والا بھی ہے، اس کے گناہوں کو بھی معاف نہیں کیا جاتا۔

بڑے گھاٹے والے تین لوگ

حدیث ۱۵۸۸:-

وعن أبي ذر رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: ((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. قَالَ: فَقَرَأَهَا رَسُولُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث مِرارٍ: قَالَ أَبُو ذرٍ: خَابُوا وَخَسِرُوا مَنْ هُمْ يَا رسول الله؟ قَالَ: ((الْمُسْبِلُ، وَالْمَنَّانُ، وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ)) (رواه مسلم)

وفی روایةٍ لَهُ: ((الْمُسْبِلُ إِزَارَهُ)) يَعْنِي: الْمُسْبِلَ إِزَارَهُ وَثَوْبَهُ أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ لِلْخُيَلَاءِ.

ترجمہ:- حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں جن سے قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بات نہیں کریں گے، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھیں گے، اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین مرتبہ ارشاد فرمائی، تو میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ایسے لوگ تو بڑے گھاٹے، خسارے اور نقصان میں ہیں؛ وہ کون ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ایک تو وہ جو کپڑے کو ٹخنے سے نیچے لٹکائے۔ دوسرا وہ آدمی جو احسان کر کے جتلائے۔ اور تیسرا وہ جو اپنے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ بازار کے اندر چلائے۔

افادات:-"اسبال" یعنی کپڑے کو ٹخنوں تک لٹکا دینا۔ ٹخنوں کو کپڑے سے ڈھانپنے پر کتنی سخت وعید آئی ہے! اب چاہے وہ کپڑا لنگی ہو، پائجامہ ہو، پتلون ہو، یا کرتہ ہو۔ (اس کی تفصیل کتاب اللباس میں گزر چکی ہے)

حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: آدمی کپڑے کو کیچڑ سے بچانے کے لئے اونچا اُٹھالیتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچانے کے لئے اونچا اُٹھانے کی اس کو توفیق نہیں ہوتی، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی لعنت اور غضب میں رہتا ہے۔

﴿وَالْمَنَّانُ﴾ اور وہ آدمی جو احسان کر کے جتلائے۔ اس روایت کو یہاں اسی جملہ کی وجہ سے پیش کیا ہے۔

﴿وَالْمُنْفِقُ سِلْعَتَهُ بِالْحَلِفِ الْكَاذِبِ﴾ جو آدمی اپنے سامان کو جھوٹی قسم کے ذریعہ بازار کے اندر چلاتا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قسم کھا کھا کر مال بیچتا ہو، جیسا کہ بہت سے لوگ خریدار سے کہہ دیتے ہیں کہ ابھی ایک گاہک سو روپے میں لینے کے لئے آیا تھا لیکن میں نے منع کر دیا، حالاں کہ کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ یہ سن کر خریدار سوچتا ہے کہ اس نے سو روپے میں دینے سے منع کیا ہے تو سوا سو روپے دے دوں۔

بہر حال! کسی بھی طرح اپنے سامان کو فروخت کرنے کے لئے جھوٹی قسم کھانا، اس پر بھی یہی وعید ہے۔

باب النهى عن الافتخار والبغي

فخر و غرور اور سرکشی کی ممانعت

قَالَ اللهُ تَعَالَى: فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى. (النجم:۳۲)

وقال تَعَالَى: إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. (الشوری:۴۲)

دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک ”افتخار“ یعنی غرور اور فخر کرنا۔ اور دوسرا ”بَغْی“ یعنی سرکشی اور حد سے تجاوز کرنا۔

فخر اپنی کسی خوبی پر ہوا کرتا ہے، چاہے وہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری؛ مثلاً: ایک آدمی اونچے خاندان سے تعلق رکھتا ہے، تو ظاہر ہے کہ کسی کا اونچے خاندان میں پیدا ہو جانا اختیاری کمال نہیں ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اس خاندان سے جوڑ دیا اور اس میں پیدا ہوا، اس کی وجہ سے فخر و غرور کرے اور اترائے؛ تو یہ بات غلط ہے۔ حالاں کہ جس کمال کو حاصل کرنے میں اپنے اختیار کو دخل ہے، اس کو اپنے اندر لانے کے لیے آدمی نے کچھ محنت اُٹھائی، مشقت سے کام لیا اور مجاہدہ کیا؛ اس پر بھی فخر کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی منع فرمایا ہے، جیسے: کوئی آدمی نیکی کی راہ پر چل رہا ہے، گناہوں سے اپنے

آپ کو بچاتا ہے، تو کسی کو گناہوں سے بچنے کی جو توفیق مل رہی ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہے، اب اگر کوئی آدمی اس پر اِترائے، اور کسی گنہگار کو دیکھ کر اس کو اپنے سے کمتر سمجھے تو شریعت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

خود کو اچھا سمجھنا بھی منع ہے

مَیں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ دینی اعتبار سے کوئی آدمی اگر بری حالت میں ہے یا کسی گناہ میں مبتلا ہے۔ یا دنیوی اعتبار سے خستہ حال ہے۔ یا اس کے پاس کوئی عہدہ و منصب نہ ہونے کی وجہ سے اس کی سماج، سوسائٹی اور معاشرہ میں کوئی حیثیت نہیں؛ تو اسے حقیر سمجھنے کی اجازت نہیں ہے (یہ تو پہلے مستقل عنوان "باب تحریم احتقار المسلمین" کے تحت گزر چکا ہے) یہاں تو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دوسرے کو حقیر نہ سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو اچھا سمجھنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے آیت ﴿فَلَا تُزَكُّوٓا أَنفُسَكُمۡ هُوَ أَعۡلَمُ بِمَنِ ٱتَّقَىٰٓ﴾ وہاں بھی ذکر کی تھی کہ اپنی صفائی مت بیان کرو، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون اللہ سے ڈرتا ہے اور گناہوں سے بچتا ہے۔ اور گناہوں سے بچنا بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی پاکیزہ نہیں بن سکتا تھا، یعنی نیکی کی راہ پر نہیں چل سکتا تھا، اور اپنی دینی حالت کو درست نہیں

کر سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے گناہوں سے بچاتا ہے اور پاکیزگی عطا فرماتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی نعمت - دنیا کی ہو، یا آخرت کی - اگر کسی کو ملی ہوئی ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی توفیق ہی کا نتیجہ ہے:-

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ

آدمی اپنے آپ کو بڑا اور پاک سمجھے کہ میں گناہوں سے بچتا ہوں، اس لئے میں اچھا ہوں اور اس پر فخر کرے؛ تو علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ یہ باب قائم فرما کر فخر سے منع فرمارہے ہیں

اہلِ عرب کا مزاج

زمانۂ جاہلیت کے اندر اہلِ عرب کا خاص مزاج تھا کہ خاندان اور نسب کے اعتبار سے اپنے آپ کو اونچا سمجھتے تھے، اور نسبی اعتبار سے کسی کو اپنا ہمسر قرار نہیں دیتے تھے، اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کرنا؛ یہ چیز ان میں اتنی عام تھی کہ جب کہیں بڑے مجمعے ہوتے، جیسے: حج کا موقعہ ہوتا تو لوگ منیٰ کے اندر جمع ہوتے تو وہاں اپنے بڑوں کی خوبیاں بیان کرنے کے آپس میں باقاعدہ مقابلے ہوتے تھے کہ کون بڑھا ہوا ہے۔ اہلِ عرب کے مزاج میں یہ بات رچی اور بسی ہوئی تھی۔

نبیٔ کریم ﷺ نے جب مکہ مکرمہ فتح کیا تو کعبۃ اللہ کے دروازہ پر کھڑے ہو کر آپ ﷺ نے ایک خطبہ دیا، اس میں ایک جملہ یہ بھی ارشاد فرمایا: اے قریش کی جماعت! اسلام آنے سے پہلے زمانۂ جاہلیت کے اندر اپنے نسب کی وجہ سے تم لوگ جو غرور، نخوت اور تکبر کرتے تھے وہ سب اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا، اور اپنے باپ دادوں کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنے کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی، تم سب کے سب ایک ہی باپ کی یعنی حضرت آدم کی اولاد ہو اور حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے تھے (گویا مٹی ایسی چیز نہیں ہے جس پر آدمی فخر و غرور کرے) پھر نبیٔ کریم ﷺ نے قرآنِ پاک کی آیت تلاوت فرمائی: اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تمہارے مختلف خاندان اور قبیلے بنائے (یہ خاندان اور قبیلے اس لئے نہیں بنائے گئے ہیں کہ ایک خاندان والا دوسرے خاندان پر، اور ایک قبیلے والا دوسرے قبیلے والوں پر اپنے خاندان اور قبیلے کی وجہ سے اپنی برتری اور بڑائی جتائے، فخر و غرور کرے) بلکہ یہ تو فقط آپسی پہچان کے لئے ہے (اس لیے کہ ایک آبادی کے رہنے والے ایک ہی نام کے کئی لوگ ہوتے ہیں تو معلوم ہو جائے کہ یہ کون ہے اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے، فلاں قبیلے، فلاں محلے اور فلاں خاندان سے ہے۔ باقی کسی قبیلے میں پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کو دوسرے پر برتری حاصل نہیں ہے)(۱)۔

(۱) یامعشر القریش! ان اللہ قد اذھب عنکم نَخْوَۃَ الجاھلیۃ وتعظمھا بالآباء، کلکم من آدم وآدم من تراب. ثم تلا ھذہ الآیۃ: یاایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وانثی وجعلنٰکم شعوبا وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم ان اللہ علیم خبیر

اللہ تعالیٰ ہی باخبر ہے

تم میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والا وہی ہے جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچاتا ہو۔ جو جتنا زیادہ گناہوں سے اپنے آپ کو بچاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اختیار کرتا ہے، تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہے؛ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت والا ہے۔ اور کس میں تقویٰ زیادہ ہے، کون اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جاننے والا اور باخبر ہے۔ اسی لئے فرمایا: ”هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى“ تم میں تقویٰ والا کون ہے؛ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔ اور تقویٰ ایک ایسی صفت ہے جس کا تعلق آدمی کے قلب سے ہے، اور کسی کے دل کی کیفیت کوئی بھی نہیں جانتا۔ باپ بھی اپنے بیٹے کے حال سے واقف نہیں ہو سکتا۔ بیٹا اپنے باپ کے حال سے واقف نہیں ہو سکتا۔ دو دوست جو چوبیس گھنٹے ایک ساتھ رہنے والے ہوں، وہ بھی ایک دوسرے کے دل کا حال معلوم نہیں کر سکتے، جب تک کہ وہ خود نہ بتلائے، ہاں! اللہ تعالیٰ اسے بخوبی جانتا ہے۔

دوسری چیز ”والبغی“ یعنی سرکشی کرنا، آدمی کا حد سے آگے نکلنا۔ آدمی جب اپنی حد سے آگے بڑھ جاتا ہے؛ اسی کو بغاوت، سرکشی اور تمرد و طغیان سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ اس سے بھی شریعت نے منع کیا ہے ہر آدمی کو اپنی حد ہی میں رہنا چاہیے، کوئی بھی آدمی جہاں حد سے آگے بڑھے گا تو بڑی بری بات ہو جائے گی۔

جو زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں

﴿إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ گناہ تو ان لوگوں پر ہے جو دوسروں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔ معلوم ہوا کہ آدمی کو اپنی حد میں رہنا چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہے، اس لیے کہ کوئی آدمی جب سرکشی اور تمرد وطغیان پر آتا ہے تو لوگوں کے ساتھ زیادتی اور ظلم کرتا پھرتا ہے۔

کوئی کسی پر فخر وغرور نہ کرے

حدیث ۱۵۸۹:-

وعن عياضِ بن حمارٍ رضي الله عنه قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((إِنَّ اللهَ تَعَالَى أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لا يَبْغِي أَحَدٌ عَلَى أَحدٍ، وَلا يَفْخَرُ أَحَدٌ عَلَى أَحدٍ)). (رواه مسلم)

قَالَ أهلُ اللغةِ: البغيُ: التَّعَدِّي والاستطالَةُ.

ترجمہ:- حضرت عیاض بن حمار (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھ پر وحی بھیجی کہ انکساری اور تواضع اختیار کرو (یعنی آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے) یہاں تک کہ کوئی کسی کے اوپر سرکشی نہ کرے، اپنی حد سے آگے نہ بڑھے، اور کوئی کسی پر فخر وغرور نہ کرے بڑائی نہ جتلائے (اپنی برتری ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے)۔

افادات:-تواضع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کمتر سمجھے، صرف کہنا کافی نہیں ہے؛ بلکہ اپنے آپ کو کمتر سمجھنا چاہیے۔

وہی سب سے زیادہ ہلاکت میں پڑا ہوا ہے

حدیث ۱۵۹۰:-

وعن أَبِي هريرة -رضی الله عنه-: أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((إِذَا قَالَ الرجُلُ: هَلَكَ النَّاسُ، فَهُوَ أَهْلَكُهُمْ)) .(رواه مسلم)

والرواية المشهورة:((أَهْلَكُهُمْ)) بِرَفعِ الكاف. وروى بنصبها: وذلكَ النَّهيُ لِمَن قَالَ ذَلِكَ عُجْباً بِنَفْسِهِ، وتَصَاغُراً لِلنَّاسِ، وارْتِفاعاً عَلَيْهِمْ، فَهَذَا هُوَ الحَرامُ. وَأَمَّا مَنْ قَالَهُ لِما يَرَى فى النَّاسِ مِنْ نَقْصٍ فى أمرِ دِينِهِم، وقَالَهُ تَحَزُّناً عَلَيْهِمْ وعَلَى الدِّينِ، فَلاَ بَأْسَ بِهِ. هكَذَا فَسَّرَهُ العُلَماءُ وفَصَّلُوهُ. وَمِمَّنْ قَالَهُ مِنَ الأَئِمَّةِ الأَعْلامِ: مالِكُ بن أنس، وَالخَطَّابِيُّ، والحُمَيدِي، وآخرونَ. وَقَدْ أَوْضَحْتُهُ فى كتاب:"الأَذْكَار"

ترجمہ:-حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی یوں کہتا ہے کہ لوگ ہلاک ہو گئے، تو وہی سب سے زیادہ ہلاکت میں پڑا ہوا ہے۔

افادات:-علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے ہوئے اور اپنی برتری لوگوں کے سامنے جتلاتے ہوئے دوسرے لوگوں کو اپنے سے چھوٹا اور

گھٹیا سمجھتے ہوئے اور لوگوں کے سامنے اپنی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے جو آدمی ایسا کہے تو گویا وہ یوں سمجھتا ہے کہ لوگوں میں کوئی کمال اور خوبی نہیں ہے، سارا کمال اور خوبی مجھ ہی میں ہے؛ تو وہ دوسروں کے متعلق کیا رونا رو رہا ہے، درحقیقت وہ خود ہی ہلاکت کے اندر پڑا ہوا ہے۔ اور اس کے لئے ایسا کرنا حرام ہے۔

وہ وعید میں داخل نہیں

باقی اگر دینداری کے اعتبار سے کمی آئی ہے، اور کوئی آدمی دل کے درد اور دلسوزی سے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے ایسا بولتا ہے۔ جیسے: کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوست احباب کی مجلس میں حالات کا تذکرہ ہو رہا ہے، اور کسی کی تنقیص و تحقیر اور کسی پر تنقید نہ کرتے ہوئے، واقعی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے معاشرہ میں دینی اعتبار سے جو کمزوری آئی ہے اس کے پیشِ نظر ایسا کہتا ہے، اور اس طرح کہنے سے کسی پر اپنی بڑائی اور برتری جتلانا، کسی کو گھٹیا بتلانا، کسی کو ذلیل سمجھنا، کسی کو حقیر سمجھنا اور کسی کی توہین مقصود و مطلوب نہیں ہے، گویا پورے انصاف اور اعتدال کے ساتھ جائزہ لینا مقصود ہے، اور عام طور سے جو دینی کمزوری پھیلی ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر دل میں کسی کو چھوٹا سمجھتے ہوئے نہیں، بلکہ اپنے آپ کو بھی اسی معاشرہ کا حصہ سمجھتے ہوئے اگر ایسا بولے کہ معاشرہ میں ایسی ایسی خرابیاں پھیلی ہوئی ہیں جس کی وجہ

سے ہمارا معاشرہ نچلی سطح پر پہنچ گیا ہے اور ہلاکت کے کنارے پر کھڑا ہے؛ تو وہ اس وعید میں داخل نہیں ہے۔

اسی کو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت اس آدمی کے لئے ہے جو اپنے آپ پر اِتراتے ہوئے، اور لوگوں کو گھٹیا اور کم تر سمجھتے ہوئے اور لوگوں کے مقابلہ میں اپنی برتری جتلاتے ہوئے اگر ایسا کہتا ہے تو یہ منع اور حرام ہے اور ایسے جملہ کو اپنی زبان سے نکالنا فخر و غرور میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی آدمی یہ بات لوگوں کی دینداری کے اندر کمزوری کے پیشِ نظر اور اظہارِ ہمدردی و بطورِ دلسوزی کہتا ہے کہ کہاں ہمارا یہ زمانہ، اور کہاں ہمارے بزرگوں کا زمانہ! آج سے پچاس، سو سال پہلے ہمارے اسلاف کی جو دینداری تھی، اب وہ باقی نہیں رہی، اور اپنے آپ کو بھی اس میں شامل کر رہا ہے، اپنے آپ کو اس سے الگ ثابت نہیں کرتا؛ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

باب تحريم الهجران بين المسلمين فوق ثلاثة أيام الا لبدعة فى المهجور أو تظاهر بفسق أو نحو ذٰلك

تین دن سے زیادہ قطع تعلق حرام ہے

مسلمانوں کے درمیان آپس میں تین دن سے زیادہ قطع تعلق حرام ہے، البتہ جس کے ساتھ قطع تعلق کیا گیا ہے وہ شریعت کے خلاف کسی چیز میں مبتلا ہے، مثلاً: کسی بدعت کا مرتکب ہے، یا کھلم کھلا فسق والے کسی فعل کا اظہار کرتا ہے، جیسے: اس کی شراب نوشی بالکل عام ہے، یا اور کوئی کھلے فسق میں مبتلا ہے، یا اور کوئی خلافِ شرع ایسی بات ہے، اس کی تنبیہ کے طور پر قطع تعلق کرتا ہے؛ تو پھر اس میں تین دن کی قید نہیں ہے، بلکہ جب تک کہ وہ اپنی اس برائی سے باز نہ آئے وہاں تک اس سے قطع تعلق کرنے کی شریعت نے اجازت دی ہے۔

ویسے آپس کے معاملات کے نتیجہ میں کبھی دو بھائیوں، دو مسلمانوں، دو دوستوں، دو ملنے والوں، یا برابر کا درجہ رکھنے والوں میں ایک دوسرے کے کسی سلوک سے ناگواری ہو جاتی ہے اور دل کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو اس کی جوابی کارروائی کے طور پر اس کے ساتھ تین دن تک تو بولنا بند کر دینے اور قطع تعلق کر لینے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ کی نہیں۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ﴾ ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں، اگر ان میں ناگواری کی کوئی بات پیش آجائے تو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کراؤاور ان کے تعلقات کو درست کراؤ۔

﴿وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ گناہ اور نافرمانی کے کاموں میں تعاون مت کرو۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم

آج کل تو یہ حال ہو گیا ہے کہ کسی کو کسی کے ساتھ ناگواری پیش آئی تو اتنا ہی نہیں کہ اپنا تعلق ختم کر لیتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی مجبور کرتا ہے کہ تم بھی اس کے ساتھ مت بولو، بلکہ کوئی اگر اس کے ساتھ بولنے اور تعلقات درست کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اگر اس کے ساتھ تعلق رکھو گے تو میرے ساتھ تعلق باقی نہیں رہے گا۔ ہمارا معاملہ تو عجیب ہو گیا ہے، ایک تو خود اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی میں مبتلا ہیں، پھر دوسروں کو بھی اسی میں مبتلا کرتے ہیں۔ ”ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لئے ڈوبیں گے“ والا معاملہ ہے۔ ماں باپ کو کسی کے ساتھ ناگواری پیش آگئی تو اب وہ بیٹے کو بھی کہتے ہیں کہ تم بھی اس کے ساتھ بات مت کرو۔ حالاں کہ اگر ماں باپ بھی کوئی ایسا حکم دیں جو شریعت کے خلاف ہو تو اس کو ماننے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

قطع تعلق (کٹّی) مت کرو

حدیث ۱۵۹۱:۔

وعن أنس ﷺ قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((لاتَقَاطَعُوا، وَلاَ تَدَابَرُوْا ، وَلاَ تَبَاغَضُوْا ، وَلاَ تَحَاسَدُوْا، وَكُوْنُوْا عِبَادَاللهِ إِخْوَاناً، وَلاَيَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَأَخَاهُ فَوْقَ ثَلاَث)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قطع تعلق (کٹّی) مت کرو اور ایک دوسرے کو پیٹھ نہ دکھلاؤ (کہ دونوں جب بھی سامنے آرہے ہیں تو وہ یوں منھ پھیرے جارہاہے اور یہ اُدھر منھ پھیر رہاہے) ایک دوسرے کے ساتھ بغض اور دشمنی نہ رکھو اور ایک دوسرے کے اوپر حسد مت کرو، اور اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لئے چھوڑ دے (یعنی تین دن سے زیادہ قطعِ تعلق حرام ہے)

افادات:- کتابوں میں لکھاہے کہ یہ حکم برادرانہ اور ہم عصرانہ تعلق کے متعلق ہے۔ باقی اگر باپ اپنے بیٹے کی اصلاح اور اخلاق کو درست کرنے کے لئے، یا استاذ اپنے شاگرد کی تعزیر کے لئے تین دن سے زیادہ بھی قطع تعلق کرلے، تاکہ وہ اس کو محسوس کرتے ہوئے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو؛ تو اس کی اجازت ہے۔

شریعت کا کمال

حدیث ۱۵۹۲:-

وعن أبي أيوب -رضي الله عنه-: أنَّ رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ: يَلْتَقِيَانِ، فَيُعْرِضُ هَذَا، وَيُعْرِضُ هَذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو أیوب أنصاری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے (کہ دونوں میں آپس میں قطع تعلق ہو) جب آمنے سامنے ہوں تو وہ اِدھر منہ پھیر لے اور یہ اُدھر منہ پھیر لے۔ اور ان دونوں میں بہترین وہ ہے جو سلام سے شروعات کرے (یعنی تعلقات کو درست کرنے میں جو اپنی طرف سے پہل کرے وہ ان دونوں میں افضل ہے)۔

افادات:- دیکھئے! یہ بھی شریعت کا کمال ہے کہ اس نے انسانی جذبات اور مزاج کی رعایت کی۔ اگر کسی کی طرف سے ناگواری کی کوئی بات پیش آجائے تو اس سے آدمی کو تکلیف پہنچتی ہے اور دل شکنی ہو جاتی ہے، اب اگر شریعت یوں کہتی کہ چاہے کیسی ہی ناگواری کی بات پیش آئے تب بھی ایک منٹ اور ایک دن کے لئے بھی تم کو قطع تعلق کرنے کی اجازت نہیں ہے، تو گویا یہ ایک ایسی چیز آدمی کے مزاج اور طبیعت کے اوپر تھوپی جاتی جس کو وہ برداشت نہ کر سکتا، لہٰذا شریعت نے انسان کے جذبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے

اور مزاج وطبیعت کی رعایت کرتے ہوئے کہا کہ اگر تمہیں ناگواری کی بات پیش آئی تو ٹھیک ہے، کٹّی کرلو اور اس سے مت بولو، لیکن یہ سلسلہ تین دن سے زیادہ نہیں چلنا چاہئے، تین دن کے اندر کٹّی والا معاملہ ختم ہو جانا چاہیے۔

کتنی بڑی محرومی

حدیث ۱۵۹۳:-

وعن أبي هريرة (رضی اللہ عنہ) قَالَ: قَالَ رسول الله - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم - : ((تُعْرَضُ الأَعْمَالُ فِي كُلِّ اثْنَيْنِ وَخَمِيسٍ، فَيَغْفِرُ اللهُ لِكُلِّ امْرِءٍ لا يُشْرِكُ باللهِ شَيْئاً، إلاَّ امْرَءاً كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أخِيهِ شَحْنَاءُ، فَيقُولُ: اتْرُكُوا هذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ہر پیر اور جمعرات کو بندوں کے اعمال اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہیں، لہٰذا ہر وہ آدمی جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو (یعنی ایمان سے متصف ہو) اس کے اعمال جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت کا فیصلہ کر دیتے ہیں؛ البتہ اگر کوئی آدمی ایسا ہو کہ اس کے اور اس کے مسلمان بھائی کے درمیان عداوت و دشمنی ہوتی ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ان دونوں کا معاملہ ابھی چھوڑ دو (پینڈنگ "Pending" رکھو) یہاں تک کہ دونوں صلح کرلیں (اور اپنے تعلقات کو ٹھیک کرلیں)۔

افادات:- دیکھئے! تعلقات بگاڑ کر اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور مغفرت سے دور کرنا کتنی بڑی محرومی کی بات ہے۔

آپسی جھگڑے، شیطانی اثر

حدیث ۱۵۹۴:-

وعن جابر -رضی اللہ عنہ- قَالَ: سَمِعْتُ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یقولُ: ((إنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَئِسَ أنْ يَعْبُدَهُ الْمُصَلُّونَ فِي جَزِيرَةِ العَرَبِ، وَلَكِنْ فی التَّحْرِيشِ بَيْنَهُمْ)). (رواہ مسلم) ((التَّحْرِيشُ)): الإِفْسَادُ وتَغْيِيرُ قُلُوبِهِمْ وتَقَاطُعُهُمْ.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا کہ جزیرۃ العرب میں مسلمان اس کی پوجا کریں (یعنی جزیرۃ العرب کے جو حضرات ایمان لے آئے، وہ دوبارہ شرک میں مبتلا ہوں، یا شیطان کی کوئی ایسی بات مان لیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کا ذریعہ بنتی ہو؛ اس طرف سے تو وہ مایوس ہو گیا) لیکن ان کے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے کی طرف سے وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔

افادات:- یعنی اسے امید ہے کہ اگر میں کوشش کروں گا تو آپس کے جھگڑے ضرور کرادوں گا۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نور اللہ مرقدہٗ فرماتے ہیں کہ شیطان کی محنت انسان کے خلاف یہی ہوتی ہے اور وہ پوری کوشش اسی بات کی کرتا ہے کہ آدمی کو

ایمان سے ہٹا کر کفر و شرک میں مبتلا کر دے، لیکن جیسے آدمی ہوتے ہیں اس کی محنت کا اثر بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ اگر آپ نے پتھر اٹھا کر مارا تو جس چیز کے اوپر مارا ہے اگر وہ مضبوط ہے تو وہ چیز تو نہیں ٹوٹے گی، تھوڑا سا اثر ضرور ہو گا، ایسا نہیں ہو گا کہ پتھر مارا ہے تو سامنے کچھ بھی نہ ہو، اس کے اندر تھوڑا سا کریک (Crack) ہو جائے گا، اور اگر وہ چیز کمزور ہو گی تو ٹوٹ ہی جائے گی۔ نبی کریم ﷺ نے حضراتِ صحابہ پر جو محنت کی تھی ان کے متعلق اور اپنے بعد آنے والوں کے متعلق فرماتے ہیں کہ شیطان اس سے تو مایوس ہو گیا ہے اور اس کو اس بات کی تو امید نہیں رہی کہ وہ ان کو شرک میں مبتلا کر دے، ہاں! وہ محنت کر کے آپس کے جھگڑے ضرور کروائے گا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپس کے جھگڑے جو ہوتے ہیں وہ بھی شیطان ہی کا اثر ہوتا ہے، اور اسی کی محنت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور وہ مسلمانوں میں جھگڑے اسی لئے تو کرواتا ہے کہ اس کے نتیجے میں قطع تعلق ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے۔ پھر وہ ایک دوسرے کو تکلیف پہنچانے میں لگ جائیں گے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے۔ پھر ایک دوسرے کی برائیوں میں، غیبت اور تہمت میں مبتلا ہوں گے، جھوٹے الزامات لگائے جائیں گے۔ اس ایک عداوت کے نتیجے میں معلوم نہیں کیا کیا نتائج ظاہر ہوں گے۔

وہ جہنم میں جائے گا

حدیث ۱۵۹۵:-

وعن أبي هريرة-رضى الله عنه-قَالَ قَالَ رسول الله ﷺ: ((لَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثٍ، فَمَنْ هَجَرَ فَوْقَ ثَلَاثٍ فَمَاتَ، دَخَلَ النَّارَ)) (رواه أبو داود بإسناد عَلَى شرط البخاري ومسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے مسلمان بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لئے چھوڑ دے، جس نے تین دن سے زیادہ کے لئے تعلق ختم کر لیا اور اس کی موت آگئی تو وہ جہنم میں جائے گا۔

افادات:- دیکھو! کتنی سخت وعید ہے! بعض لوگ دلوں کے اندر عجیب کینہ رکھے ہوئے ہوتے ہیں کہ ساری دنیا ان کو سمجھا کر تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرتی ہے تب بھی وہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے؛ ایسے لوگوں کے لئے اس روایت میں بڑی سخت وعید ہے۔

حدیث ۱۵۹۶:-

وعن أبي خِرَاشٍ حَدْرَدِ بنِ أَبي حَدْرَدٍ الأسلميِّ. ويقالُ: السُّلَمِيِّ الصحابي-رضى الله عنه-: أَنَّهُ سمع النبيَّ ﷺ يقولُ: ((مَنْ هَجَرَ أَخَاهُ سَنَةً فَهُوَ كَسَفْكِ دَمِهِ)) (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت حَدْرَدْ بن ابی حَدْرَدْ اَسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے اپنے بھائی کے ساتھ ایک سال تک تعلق قطع کرلیا، گویا اس نے اس کا قتل کیا۔

افادات:- یعنی قتل کرنے کا گناہ جتنا ہوتا ہے، ایک سال تک قطع تعلق کا گناہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔

وہ قطع تعلق کے گناہ سے محفوظ ہو جائے گا

حدیث ۱۵۹۷:-

وعن أبي هريرة -رضی الله عنه-: أنّ رسول الله -ﷺ- قَالَ: ((لَا يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَهْجُرَ مُؤْمِناً فَوقَ ثَلَاثٍ، فإِنْ مَرَّتْ بِهِ ثَلَاثٌ. فَلْيَلْقَهُ فَلْيُسَلِّمْ عَلَيْهِ، فَإِنْ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ فَقَدِ اشْتَرَكَا في الأَجْرِ، وَإِنْ لَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ فَقَدْ بَاءَ بِالإِثْمِ، وَخَرَجَ الْمُسَلِّمُ مِنَ الْهِجْرَةِ)). (رواه أبو داود بإسناد حسن.)

قَالَ أَبُو داود: ((إِذَا كَانَتِ الْهِجْرَةُ للهِ تَعَالَى فَلَيسَ مِنْ هَذَا فِي شَيْءٍ))

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی مسلمان کے لئے حلال نہیں ہے کہ اپنے مؤمن بھائی کو تین دن سے زیادہ کے لیے چھوڑ دے۔ اگر تین دن گزر گئے تو اس کو چاہیے کہ اس سے ملے اور اس کو سلام کرے۔ اگر سامنے والے نے بھی اس کے سلام کا جواب دیدیا تو تعلقات کو استوار کرنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو اجر و ثواب ملے گا اس میں دونوں شریک ہوں گے۔ اور اگر (اِس نے تو سلام کیا، لیکن) سامنے والے نے کوئی جواب اور "Response" نہیں

دیا؛تو سارے گناہ کی ذمہ داری سامنے والے پر ہے۔ اور جس نے سلام کیا وہ قطع تعلق کے گناہ سے محفوظ ہو جائے گا۔

افادات:- اس کا مطلب صرف سلام نہیں ہے، اس لیے کہ اصل تو کلام ہے لیکن کلام کی ابتداء عام طور پر سلام ہی سے ہوتی ہے، اس لئے اگر صرف سلام کیا اور ضروری بات نہیں کی، یا صرف سلام کرتا ہے اس کی بات کا جواب نہیں دیتا؛ تو وہ وعید سے نہیں نکلے گا۔ علماء نے یہی تشریح کی ہے۔

النهي عن تناجي اثنين دون الثالث بغير إذنه إلّا لحاجةٍ

وَهُوَ أن يتحدثا سراً بحيث لا يسمعهما

وفي معناه مَا إِذَا تحدثا بلسان لا يفهمه

قَالَ اللهُ تَعَالَى: إِنَّمَا النَّجْوَى مِنَ الشَّيْطَانِ.(المجادلة:۱۰)

ایک کو چھوڑ کر سر گوشی کی ممانعت

کسی بھی مؤمن کو تکلیف اور ایذا پہنچنے سے بچانے کے لئے نبی کریم ﷺ نے مختلف ہدایات دی ہیں ان کو مختلف عنوانات کے ماتحت بیان کر رہے تھے۔ انہی میں سے ایک عنوان قائم کیا کہ: دو آدمیوں کا تیسرے ایک آدمی کو چھوڑ کر آپس میں کانا پھوسی اور سر گوشی کرنا، یعنی تین میں سے دو آدمی کان میں منھ ڈال کر چپکے چپکے اس طرح بات چیت کریں جس کو تیسرا نہ سن سکے؛ تو یہ چیز اس تیسرے آدمی کو غم میں ڈالنے والی ہے، اس صورت میں تیسرا آدمی سوچنے لگتا ہے کہ ان کو شاید میرے اوپر اعتماد نہیں ہے یا ایسا طرز اختیار کرنا جو اس تیسرے کو خوف وہراس میں مبتلا کرنے والا ہو، خاص طور پر جب کہ تنہائی کا سفر ہو، جنگل بیابان ہو اور تین میں سے دو آدمی ایک کو الگ کر کے سر گوشی کرنے لگیں تو اس تیسرے کو یہ شبہ اور اندیشہ ہو سکتا ہے کہ کہیں میرے متعلق تو کوئی اسکیم

تیار نہیں کر رہے ہیں ؟اس لئے بعض علماء کرام نے اس ممانعت کو جنگل بیابان کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء کہتے ہیں کہ یہ حکم ہر حال میں ہے۔ہاں !اگر چار آدمی ہوں اوران میں سے دو سرگوشی کریں، اس صورت میں دو الگ رہیں گے تو پھر ممانعت کا حکم باقی نہیں رہے گا۔ اسی بات کو اس عنوان میں کہا گیا ہے کہ دو آدمیوں کو بغیر اجازت کے اس تیسرے کو الگ رکھ کر سرگوشی کرنے کی ممانعت ہے۔ہاں !اگر اس سے اجازت لے لیں کہ ہم کو ایک خاص بات کرنی ہے، اگر آپ برا نہ مانیں تو ہم آپ کو ہٹا کر کچھ بات چیت کر لیں اوراس تیسرے کو اس پر کوئی اشکال نہ ہو؛تو پھر دونوں بات کرسکتے ہیں۔

ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم

دوسری شکل یہ ہے کہ دو آدمی زور سے تو بات چیت کر رہے ہیں لیکن ایسی زبان میں کر رہے ہیں جس کو تیسرا نہیں سمجھتا؛تو یہ بھی اسی حکم میں ہے۔عام طور پر لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی آدمی دوسرے کسی صوبہ کا ہو جو کوئی اور زبان جاننے والا ہوتا ہے، تو دو آدمی گجراتی میں بات چیت شروع کر دیتے ہیں، اب وہ ’’ٹک ٹک دیدم، دَم نہ کشیدم‘‘ کا مصداق بن جاتا ہے، وہ بے چارہ دونوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ پتہ نہیں یہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ تو جس طرح کسی تیسرے کو اکیلا چھوڑ کر دو آدمیوں کا آپس میں سرگوشی کرنا ممنوع ہے، اسی طرح

تیسرے کو اکیلا چھوڑ کر دو آدمیوں کا کسی ایسی زبان اور لینگویج (Language) میں بات کرنا جس کو وہ تیسرا نہ سمجھتا ہو؛ یہ بھی جائز نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ کے ارشاد پر عمل کے اہتمام کا نمونہ

حدیث ۱۵۹۸:-

وعن ابن عمر رضی الله عنهما أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قالَ: إِذَا كانُوا ثَلاثَةً، فَلاَ يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ الثَّالِثِ (متفق عَلَيْهِ)

ورواه أبو داود وزاد: قَالَ أبو صالح: قُلْتُ لابنِ عُمَرَ: فَأَرْبَعَةً؟ قَالَ: لايَضُرُّكَ.

ورواه مالك فی "الموطأ" عن عبد الله بن دينارٍ، قَالَ: كُنْتُ أنَا وابْنُ عُمَرَ عِنْدَ دَارِ خَالِدِ بنِ عُقْبَةَ الَّتي فی السُّوقِ، فَجَاءَ رَجُلٌ يُرِيدُ أنْ يُنَاجِيَهُ، وَلَيْسَ مَعَ ابْنِ عُمَرَ أَحَدٌ غَيْرِی، فَدَعَا ابْنُ عُمَرَ رَجُلاً آخَرَ حَتَّى كُنَّا أَرْبَعَةً، فَقَالَ لِی وَلِلرَّجُلِ الثَّالِثِ الَّذِی دَعَا: اسْتَأْخِرَا شَيْئاً، فَإِنِّی سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقُولُ: ((لا يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ وَاحِدٍ)).

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کہیں تین آدمی ہوں تو دو آدمی تیسرے کو الگ رکھ کر سر گوشی نہ کریں (یعنی دو آدمیوں کو اگر کوئی بات کرنی ہو تو جب تیسرا وہاں موجود نہ ہو اس وقت کریں، اس کی موجودگی میں یہ نہ کریں)۔

اس کی سند میں ایک راوی ابو صالح ہیں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عمر سے پوچھا: اگر چار ہوں (اور دو آدمی سر گوشی کریں تو کر سکتے ہیں؟) حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اس صورت میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

حضرت عبد اللہ بن دینار (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ: میں اور حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) خالد بن عقبہ کے مکان کے پاس تھے جو بازار میں تھا، ایک آدمی حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کے پاس آیا جو ان سے سر گوشی اور خلوت میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کے پاس اس وقت میرے علاوہ کوئی تیسرا آدمی موجود نہیں تھا، حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) نے چوتھے آدمی کو بلایا، اب ہم کل چار آدمی ہو گئے، پھر مجھے اور جس کو بلایا تھا دونوں سے کہا: (یہ مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے) تم دونوں ذرا پیچھے ہٹ جاؤ (اس کے بعد فرمایا: میں نے ایسا اس لیے کیا کہ) نبیٔ کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: ایک کو اکیلا چھوڑ کر دو آدمی سر گوشی کے انداز میں بات نہ کریں۔

افادات:- دیکھو! حضراتِ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم ﷺ کے ارشادات پر عمل کا کتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے! ہم تو یہ پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں پھر بھی وقت پر ایسی چیزیں یاد نہیں رہتی، اور عمل کا اہتمام نہیں ہوتا۔ ان حضرات کو ان چیزوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام تھا جن سے حضور اکرم ﷺ نے ممانعت فرمائی ہے۔

کسی ایک کو اکیلا نہ چھوڑا جائے

حدیث ۱۵۹۹:-

وعن ابن مسعود-رضی الله عنه-:أنَّ رسول اللهِ ﷺ قَالَ: ((إِذَا كُنْتُمْ ثَلاثَةً، فَلاَ يَتَنَاجَى اثْنَانِ دُونَ الآخَرِ حَتَّى تَخْتَلِطُوا بِالنَّاسِ،مِنْ أَجْلِ أَنَّ ذَلِكَ يُحْزِنُهُ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم تین ہو تو دو آدمی تیسرے کو اکیلا چھوڑ کر گفتگو نہ کریں یہاں تک کہ لوگوں کے ساتھ رل مل جائیں (یعنی دوسرے لوگ بھی آجائیں اور تعداد بڑھ جائے) اس لیے کہ یہ طرز اس کو غم میں ڈالنے والا ہے۔

افادات:- اور یہ بھی یاد رہے کہ اگر چار آدمی ہوں اور تین آدمی بات کریں اور ایک کو الگ کر دیں؛ تو یہ بھی جائز نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی ایک کو اکیلا چھوڑ دیا اور باقی تین یا چار الگ بات کرنے لگ جائیں۔ یہ اس ایک کو غم میں ڈالنے والی بات ہے، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے۔

النهي عن تعذيب العبد والدابة والمرأة والولد بغير سبب شرعي

غلام، جانور، عورت اور اولاد کو بغیر سبب شرعی کے سزا دینے کی ممانعت

قَالَ الله تَعَالَى: وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالاً فَخُوراً۔(النساء:۳۶)

خلاصۂ باب

اس باب میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ شریعت نے جہاں ماتحتوں کو سزا دینے، اوران کی تعزیر وتادیب کی اجازت دی ہے اور اصلاح کی غرض سے مناسب سزا دینے کو درست قرار دیا ہے،وہیں ان کو بلاوجہ اور بلا سبب شرعی سزا دینے سے منع کیا ہے۔ یا جہاں سببِ شرعی موجود ہو وہاں بھی جتنی مقدار میں سزا دینے کی اجازت دی ہے اس سے زیادہ سزا دینے کو حرام قرار دیا ہے۔ جیسے: بچے کو اس کا باپ تعلیم وتربیت ،ادب و اخلاق سکھانے کی غرض سے سزا دے سکتا ہے اور مار بھی سکتا ہے، مثلاً: نماز نہ پڑھنے پر مارنے کا حکم حدیثِ پاک میں موجود ہے کہ بچہ جب دس سال کا ہو جائے اور نماز نہ پڑھے تو اس کو مارنا چاہئے۔ یا مثلاً: باپ

بچہ کو تعلیم دینا چاہتا ہے اور وہ تعلیم کی طرف توجہ نہیں دیتا اور بھاگ جاتا ہے، تو اس صورت میں اس کو مارنے کی اجازت ہے۔ یا اگر استاذ اپنے شاگرد کو تعلیم و تربیت کی غرض سے اور اخلاق سکھانے کے لئے سزا دینا چاہے؛ تو شرعاً اس کی اجازت ہے، لیکن فقہاء نے اس کے لیے حدود بھی مقرر کئے ہیں۔

حدودِ تعزیر و تادیب

ان میں پہلی بات یہ ہے کہ لکڑی کے ذریعہ نہ مارے، ہاتھ سے چپت مار سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چہرے اور سر پر نہ مارے، بلکہ گردن یا پیٹھ پر مار سکتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ تین سے زیادہ نہ مارے۔ اب بہت سے لوگ کہیں گے کہ اس سے تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ لیکن فقہاء نے صراحۃً لکھا ہے کہ اگر استاذ بچے کو تین سے زیادہ مارے گا تو کل کو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو بدلہ دلوائیں گے اور اس سے قصاص لیا جائے گا۔ ایک وقت میں اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے، ہاں ! دوسرے دن یا دوسرے موقعہ پر دوسری مناسبت سے پھر تین چپت مارنے کی اجازت ہے۔

بیوی کے لیے بھی یہی حکم ہے

یہی حکم عورتوں کے متعلق بھی ہے۔ ان کو بھی ان کے کسی ایسے قصور پر جن کی تفصیل فقہاء نے لکھی ہے انہیں شرطوں کے ساتھ مار سکتے ہیں ۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ سالن میں نمک کم ہو گیا تو پٹائی کر دی۔ کپڑے نہیں دھلے ہیں تو پٹائی کر دی۔ گھر میں جھاڑو نہیں دی گئ ہے تو پٹائی کر دی۔ گاہک پر ناراض ہو کر دکان سے آئے اور اس کا غصہ گھر آ کر بیوی پر اتار رہے ہیں؛ ان سب باتوں کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

مواقعِ تعزیر

اب وہ کون سے مواقع ہیں جہاں پر عورت کی پٹائی کی اجازت ہے؟ اس کو بھی فقہاء کرام نے کتابوں میں لکھا ہے، جیسے:-

(۱) شوہر اپنے واسطے زینت کرنے کا حکم دیتا ہے لیکن بیوی شریعت کے حدود میں رہ کر شوہر کے لئے جو زینت کرنی چاہئے وہ نہیں کرتی؛ تو اس صورت میں پہلے تنبیہ کرے، اور تنبیہ کرنے کے بعد بھی نہ مانے تو اس کی پٹائی کرنے کی اجازت دی ہے۔

(۲) بیوی غسلِ جنابت نہیں کرتی، ناپاک ہی رہتی ہے؛ تو اس پر بھی پٹائی کرنے کی اجازت دی ہے۔

(۳) شوہر کی اجازت کے بغیر بلا عذر شرعی گھر سے باہر نکلتی ہے؛ تو پٹائی کی اجازت دی ہے۔

(۴) بچے کو رونے پر مارتی ہے؛ تو شوہر پٹائی کر سکتا ہے۔

(۵) کسی نامحرم کے سامنے چہرہ کھولتی ہے اور بے پردگی کرتی ہے۔

(٦) یا شوہر کے ساتھ اتنی زور سے بات کرتی ہے کہ نامحرموں تک آواز جاتی ہے؛ تو اس پر بھی سزا دی جاسکتی ہے۔ لیکن ان سب صورتوں میں مارنے کی حد اور شرط وہی ہے جو اوپر گزری کہ چہرے اور سر پر نہ مارے، لکڑی سے نہ مارے، اور تین سے زیادہ نہ مارے۔ لیکن آج کل ان حدود کی کوئی بھی رعایت نہیں کرتا۔

عورتوں کو مارنے کے سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے اجازت طلب کی گئی تھی وہ روایت مسلم شریف کے اندر موجود ہے جس کے راوی حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) ہیں جس میں پٹائی کی اجازت دی گئی ہے، لیکن اس میں ایک جملہ ہے: ”وَاضْرِبُوْهُنَّ ضَرْبًا غَيْرَ مُبَرِّحٍ“ ان کی سخت پٹائی نہ کرو۔ اور جس پٹائی کے نتیجے میں جسم پر نشان پڑ جائیں، وہ شریعت کی نگاہ میں ”ضربِ مبرّح“ یعنی ”سخت پٹائی“ کہلاتی ہے۔ شریعت نے ایسی پٹائی کی اجازت دی کہ جس کے نتیجہ میں جسم پر نشان نہ پڑیں۔

ترتیبِ قرآنی اور حضور کا عمل

لیکن اس کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں فرمایا۔ قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ﴾ اگر تم کو عورتوں کی طرف سے اندیشہ ہو کہ وہ تمہاری نافرمانی کریں گی تو پہلے نمبر پر تو ان کو نصیحت کرو اور سمجھائو، ان کی فہمائش سے کام لو، اولِ وہلہ میں ان کو سزا دینے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ بار بار سمجھانے اور فہمائش کرنے کے بعد بھی وہ نافرمانی سے باز نہیں آتی تو نمبر دو پر تدبیر بتلائی کہ اس کا بستر الگ کر دو۔ ان سے اپنا بستر الگ کرنا یہ ایک ایسی تدبیر ہے جو بڑی مؤثر اور کارگر ہے۔ ان کی پٹائی سے بھی وہ اثر نہیں ہوگا جو بستر الگ کرنے سے ہوتا ہے، لیکن اس میں خود بھی بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے اس لئے لوگ اس کو اختیار ہی نہیں کرتے۔ پھر تیسرے نمبر پر مارنے کی اجازت دی گئی ہے۔

اور دیکھئے! قرآنِ پاک میں جو بھی احکام دیئے گئے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے امت کو ان کا نمونہ پیش فرمایا۔ عورتوں کے سلسلہ میں قرآنِ پاک کی اس آیت میں جو حکم دیا گیا اس میں پہلے "فَعِظُوْهُنَّ" ہے، پھر "وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ" ہے کہ پہلے نمبر پر تو ان کو نصیحت کرو، دوسرے نمبر پر ان سے اپنا بستر الگ کر دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ میں ان دونوں پر عمل کر کے بتلایا لیکن آپ نے کبھی ازواجِ مطہرات کی پٹائی نہیں کی۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی غلام، باندی، کسی

عورت یا بچے کی پٹائی نہیں کی۔اور حدیثِ پاک میں آتا ہے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ اپنی عورتوں کی پٹائی کرتے ہیں وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔

ایک مرتبہ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے نبیٔ کریم ﷺ سے عورتوں کی نافرمانی کی شکایت کی کہ آپ نے ان کے سلسلہ میں نہ مارنے کی جو تاکید فرمائی اس کی وجہ سے وہ سر چڑھ گئی ہیں، لہٰذا ان کی پٹائی کی اجازت دی جائے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اجازت دیدی۔ دوسرے روز بہت ساری عورتیں شکایتیں لے کر ازواجِ مطہرات کے گھروں پر جمع ہو گئیں، اس لیے کہ عورتوں کا دستور یہی تھا کہ ان کو اگر نبیٔ کریم ﷺ سے کوئی بات عرض کرنی ہوتی تو ازواجِ مطہرات کے واسطے سے اپنی شکایتیں اور ضرورتیں حضور کی خدمت میں پیش کرتی تھیں۔ دوسرے روز ازواجِ مطہرات کے گھروں پر جب لائن لگ گئی تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''أَحسَنُکُمۡ أَحسَنُکُمۡ لِأَهۡلِهٖ، وَأَنَا أَحسَنُکُمۡ لِأَهۡلِيۡ'' تم میں سب سے اچھے لوگ وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتے ہوں، اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آتا ہوں۔

دنیا ہی میں بھگتنا پڑتا ہے

بہر حال! ہمارے معاشرے اور سماج میں عورتوں کے معاملہ میں بہت زیادتیاں ہوتی ہیں۔ بعضوں کا تو مزاج ہی بن گیا ہے کہ بلاوجہ اور شریعت نے جن حدود کو مقرر کیا ہے ان کی رعایت

کئے بغیر ان پر زیادتیاں کرتے ہیں، ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ان سب باتوں کا اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دینا ہو گا اور اس کا بدلہ دلوایا جائے گا؛ بلکہ دنیا ہی میں اس کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ہمارے یہاں ڈابھیل میں شیخ الحدیث حضرت مولانا ایوب صاحب اعظمی نور اللہ مرقدہٗ تھے۔ شروع میں لڑکوں کی تربیت کی وجہ سے نظامت کی ذمہ داری جب میرے حوالے تھی، تو کبھی کسی وجہ سے کسی کی پٹائی بھی ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی معاملہ حضرت کے پاس پہنچ گیا تو حضرت نے مجھے بلا کر سمجھایا کہ: ”مولوی صاحب! بچوں کی پٹائی مت کیا کرو؛ ورنہ اس کو بھگتنا پڑے گا“۔

حالاں کہ پٹائی کرنے والے ہمارے اساتذہ اور بزرگوں کی نیتوں پر ہم کوئی شک وشبہ نہیں کرتے، وہ بے چارے بچے کی خیر خواہی میں اور اخلاص کے ساتھ ہی ان کی پٹائی کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی آدمی انتقامی جذبہ سے پٹائی کر دے تو وہ تو بڑا خطرناک معاملہ ہے، اس کی تو شریعت کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی، لیکن اگر واقعۃً بچے کی خیر خواہی کی نیت سے پٹائی کی جائے تب بھی مَیں اساتذۂ کرام سے کہا کرتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ دنیا میں ہی بیماریوں کی شکل میں اس کو بھگتواتے ہیں۔ ہم نے اساتذہ اور تربیت کرنے والوں میں ایسے حضرات کو اکثر دیکھا کہ جن کا مزاج پٹائی والا تھا کہ وہ اخیر عمر میں زیادہ تر بیماریوں کا شکار رہے۔ گویا اللہ تعالیٰ دنیا سے اُٹھانے سے پہلے ہی اس کا کفارہ کروا دیتے ہیں۔ اس لیے اس سے اپنے آپ کو بچانے کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔

عنوان اور آیتِ قرآنی

علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان یہی قائم کیا ہے کہ عورت اور بچے کا مسئلہ تو دور کی بات رہی، غلام اور چوپایوں تک کو بلاوجہ مارنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، ہاں! جہاں ضرورت ہو وہاں مارنے کی اجازت دی ہے، لیکن اس کے لئے بھی حد مقرر کی گئی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے قرآنِ پاک کی آیت لائے ہیں۔ یہ آیت پہلے بھی گزر چکی ہے: ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَاناً وَبِذِى الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبَى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالاً فَخُوْراً﴾ (النساء:۳۶) والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو اور رشتہ داروں کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، اور یتیموں، غرباء اور جو قریب کے پڑوسی اور دور کے پڑوسی ہیں اور جو تمہارے پاس بیٹھنے والا ساتھی ہے؛ ان سب کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ، اور مسافر کے ساتھ، اور جن کے تمہارے ہاتھ مالک ہیں (یعنی غلام) ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو۔ اور جو آدمی تکبر کرنے والا، فخر و غرور کرنے والا ہو؛ اس کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے۔ (ایسے ہی لوگ عام طور پر حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں اور حدود کی رعایت نہیں کرتے)۔

دراصل اس آیت کو یہاں ”وَمَامَلَکَتْ أَیمانُکُمْ“ کی وجہ سے لائے ہیں۔ اور چوں کہ عنوان میں غلام کا بھی تذکرہ کیا تھا اور چوپائے کے بھی تم مالک ہو تو ان کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، اور چوپایوں کو سزادینے سے جو منع کیا ہے اس سلسلہ میں آگے روایت پیش کی ہے۔

جہنم میں داخلہ کا سبب

حدیث ۱٦۰۰:-

وعن ابن عمر رضی الله عنهما : أَنَّ رسول الله ﷺ قَالَ: ((عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فی هِرَّةٍ سَجَنَتْهَا حَتَّی مَاتَتْ ، فَدَخَلَتْ فِیهَا النَّارَ ، لاَ هِیَ أَطْعَمَتْهَا وَسَقَتْهَا ، إِذْ حَبَسَتْهَا، وَلاَ هِیَ تَرَکَتْهَا تَأْکُلُ مِنْ خَشَاشِ الأَرْضِ)).(متفق عَلَیْهِ)

((خَشَاشُ الأَرْضِ))بفتح الخاءِ المعجمة وبالشینِ المعجمة المکررة،وهی:هَوَامُّها وَحَشَرَاتُهَا.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک عورت کو ایک بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا کہ اس کو باندھے رکھا یہاں تک کہ وہ مرگئی؛ پس اس کو جہنم میں داخل کیا گیا۔ اس عورت نے اس بلی کو کھانا پینا بھی نہیں دیا اور نہ اس کو چھوڑا کہ وہ از خود حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں کو کھا کر اپنی روزی حاصل کرلے۔

افادات:- دیکھو! اس عورت نے ایک جانور کے ساتھ زیادتی کی تو اس کی وجہ سے اس کو جہنم میں جانا پڑا۔ جب ایک بلی کے ساتھ زیادتی کرنے پر یہ سزادی جاسکتی ہے؛ تو پھر

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنے گھر میں، اپنی بیوی بچوں اور اپنے متعلقین کے ساتھ زیادتی کرنا کتنی خطرناک چیز ہے!

علمی فیض سے محروم ہونے کا سبب

حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کے حالات میں ایک قصہ لکھا ہے۔ حضرت خود فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رشتہ داری میں کہیں شادی تھی، گھر والوں کو وہاں صبح جلدی پہنچنا تھا اور گھر میں مرغیاں پالی ہوئی تھیں، گھر والوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ: صبح فجر کے بعد مرغیاں کھول دینا۔ عام طور پر گھر والے مردوں کو ایسا کام سونپ کر جایا کرتے ہیں، عورتیں اپنے شوہروں کو ایسی چیز کہہ دیا کرتی ہیں۔ اب عادت نہ ہونے کی وجہ سے فجر کے بعد حضرت کو یاد ہی نہیں رہا کہ مرغیوں کو ڈربے سے باہر نکالنا ہے۔ پھر جب حضرت اپنے وقت پر اپنی تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے لئے بیٹھے تو کوئی مضمون ہی نہیں آرہا ہے، بہت سوچا اور لکھنے کی بہت کوشش کی لیکن کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ: اے اللہ! میرے جس قصور و کوتاہی کی وجہ سے مَیں آج اس علمی فیض سے محروم ہوں، وہ مجھے سمجھا دیا جائے تاکہ میں اس سے توبہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے دل میں بات ڈالی کہ مرغیاں ڈربے میں بند پڑی ہیں، چناں چہ فوراً جاکر مرغیوں کو کھولا، اور پھر آکر جب بیٹھے تو فیضان شروع ہوگیا۔ یہ بہت اہم چیز ہے جس کی طرف سے آج کل بڑی غفلت برتی جاتی ہے۔

کسی جاندار کو تکلیف پہنچانے پر لعنت

حدیث ۱۶۰۱:-

وَعَنْهُ: أَنَّهُ مَرَّ بِفِتْيَانٍ مِنْ قُرَيْشٍ قَدْ نَصَبُوا طَيراً وَهُمْ يَرْمُونَهُ، وَقَدْ جَعَلُوا لِصَاحِبِ الطَّيْرِ كُلَّ خَاطِئَةٍ مِنْ نَبْلِهِمْ، فَلَمَّا رَأَوْا ابْنَ عُمَرَ تَفَرَّقُوا، فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: مَنْ فَعَلَ هَذَا؟ لَعَنَ اللهُ مَنْ فَعَلَ هَذَا، إِنَّ رسولَ الله ﷺ لَعَنَ مَنِ اتَّخَذَ شَيْئاً فِيهِ الرُّوحُ غَرَضاً. (متفق عَلَيْهِ)

((الغَرَضُ)) بفتحِ الغَينِ المعجمة والراءِ وَهُوَ الهَدَفُ وَالشَّيءُ الَّذِي يُرْمَى إِلَيْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ وہ قریش کے چند جوانوں کے پاس سے گزرے جنہوں نے ایک پرندے کو باندھ رکھا تھا اور اس پر تیر اندازی کی مشق کر رہے تھے، اور پرندے کے مالک سے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہمارا جو بھی تیر نشانے سے خطا کر جائے وہ تمہارا ہو گا۔ جب ان نوجوانوں نے حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) کو دیکھا تو بھاگ گئے۔ (حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) نے دیکھا کہ ایک پرندہ وہاں بندھا ہوا ہے اور تیر بھی پڑے ہوئے ہیں تو سمجھ گئے کہ تیر اندازی کی مشق کی جا رہی تھی) پوچھا: یہ حرکت کس نے کی ہے؟ جو بھی ایسی حرکت کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔ اور نبی کریم ﷺ نے کسی جاندار چیز کو نشانہ بنانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

افادات:- دراصل اپنا نشانہ ٹھیک کرنے کے لئے کوئی غیر ذی روح چیز ہونی چاہیے تھی، جیسے: لکڑی کا تختہ رکھ دیا جاتا، لیکن ان نوجوانوں نے ایک زندہ پرندہ کو باندھ رکھا تھا

اور اس پر اپنے تیروں کے نشانے کی مشق کر رہے تھے اور پرندہ کا مالک بھی اس پر راضی ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ پرندہ زیادہ قیمتی نہ ہو اور اس کے مقابلہ میں اس کے مالک نے ان تیروں کو ترجیح دی ہو۔ اور شریر لڑکوں کی عادت ہوتی ہے کہ کوئی ایسی ویسی حرکت کر رہے ہوتے ہیں اور کوئی بڑا وہاں سے گزرتا ہے تو سب بھاگ جاتے ہیں۔

اس روایت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی جاندار کو تکلیف پہنچانے پر اللہ تعالیٰ اور نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے لعنت فرمائی ہے۔

نشانہ بنانے کے لیے جانوروں کو باندھنے سے منع کیا ہے

حدیث ۱۶۰۲:-

وعن أنس -رضی اللہ عنه- قَالَ: نهى رسُولُ الله صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم أن تُصْبَرَ البَهَائِمُ. (متفق عَلَيْهِ)

ومعناه: تُحْبَسُ لِلقَتْلِ.

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نقل فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے نشانہ بنانے کے واسطے جانوروں کو باندھنے سے منع فرمایا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ کسی زندہ جانور کو باندھ کر اس پر نشانہ بازی کی جائے اس سے حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے منع فرمایا۔ اور ایسی حالت میں تیر کے ذریعہ اگر وہ مر بھی گیا تو حلال

نہیں ہوگا، اس لئے کہ جو جانور اپنے قابو میں ہو اس کے حلال ہونے کے لئے ذبحِ اختیاری- یعنی باقاعدہ اس کی گردن پر چھری پھیرنا- ضروری ہے، صرف تیر چلانا کافی نہیں ہے۔

انتقامی جذبہ سے ماتحتوں کو سزا دینا

حدیث ۱۶۰۳:-

وعن أَبِي عَلِيٍّ سويدِ بن مُقَرِّنٍ -رضی الله عنه- قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُنِي سَابِعَ سَبْعَةٍ مِنْ بَنِي مُقَرِّنٍ مَا لَنَا خَادِمٌ إِلاَّ وَاحِدَةٌ لَطَمَهَا أَصْغَرُنَا فَأَمَرَنَا رسولُ الله- ﷺ-أَنْ نُعْتِقَهَا. (رواہ مسلم)

وفی روايةٍ: ((سَابِعَ إِخْوَةٍ لِي)).

ترجمہ:- حضرت ابو علی سوید بن مُقَرِّن (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو (مُقَرِّن کے گھرانے میں) اپنے سات بھائیوں میں ساتواں پایا (ان کے والد کا نام مُقَرِّن تھا اور مُقَرِّن کی اولاد میں یہ کل سات بھائی تھے، یہ ان میں ساتویں تھے) ہم سب کی خدمت کے واسطے ایک باندی تھی۔ ایک مرتبہ ہمارے ان بھائیوں میں سے سب سے چھوٹے بھائی نے اس باندی کو طمانچہ مار دیا تو حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اللہ تعالیٰ کے یہاں اس طمانچے کی سزا سے اگر اپنے آپ کو بچانا ہو اور اس کا کفارہ دینا ہو؛ تو) اس کو آزاد کر دو۔

افادات:– غلام اور باندی کو صرف ایک طمانچہ مارنے پر حضور اکرم ﷺ نے ان کو آزاد کر دینے کا حکم دیا، حالاں کہ آقا ان کا مالک ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اپنا انتقامی جذبہ فرو کرنے کے لئے بچوں کو سزا دینے اور مارنے کا کیا حکم ہوگا!۔

جہنم کی آگ تم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی

حدیث ۱۶۰۴:-

وعن أَبي مسعودٍ البدْرِيّ -رضی اللہ عنه- قَالَ: كُنْتُ أَضْرِبُ غُلاماً لِي بالسَّوْطِ، فَسَمِعْتُ صَوْتاً مِنْ خَلْفِي: ((اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ)) فَلَمْ أَفْهمِ الصَّوْتَ مِنَ الغَضَبِ، فَلَمَّا دَنَا مِنِّي إِذَا هُوَ رسولُ الله ﷺ فإذا هُوَ يَقُولُ: ((اعْلَمْ أَبَا مَسْعُودٍ أنَّ اللهَ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَى هَذَا الغُلامِ)). فَقُلْتُ: لا أَضْرِبُ مَمْلُوكاً بَعْدَهُ أَبداً.

وَفِي روايةٍ: فَسَقَطَ السَّوْطُ مِنْ يَدِي مِنْ هَيْبَتِهِ.

وفي روايةٍ: فَقُلْتُ: يَا رسولَ الله، هُوَ حُرٌّ لِوَجْهِ اللهِ تَعَالَى، فَقَالَ: ((أَمَا لَوْ لَمْ تَفْعَلْ، لَلَفَحَتْكَ النَّارُ، أَوْ لَمَسَّتْكَ النَّارُ)). (رواه مسلم بهذه الروايات)

ترجمہ مع تشریح:– حضرت ابو مسعود بدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں اپنے ایک غلام کو کوڑے کے ذریعہ مار رہا تھا، میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی، اے ابو مسعود! دھیان دو، چوں کہ میں بہت غصے میں تھا (اور غلام کو مار رہا تھا) اس وجہ سے پیچھے سے آنے والی آواز کو میں سمجھ نہیں سکا (کہ مجھے ہی خطاب کیا جا رہا ہے) جب وہ آواز دینے والی شخصیت مجھ سے قریب ہوئی تو اچانک کیا دیکھتا ہوں

کہ وہ تو نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ہیں۔ پھر حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اے ابو مسعود! جان لو کہ تم کو اپنے اس غلام پر جتنی قدرت ہے؛ اللہ تعالیٰ تم پر اس بھی سے زیادہ قادر ہے، (یعنی تم اپنے اس غلام کو سزا دینے کی طاقت رکھتے ہو اسی لئے تو اس کو سزا دے رہے ہو، لیکن جاننا چاہیے کہ تم کو اپنے اس غلام کو سزا دینے کی جتنی طاقت ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے بھی زیادہ طاقت حاصل ہے؛ لٰہذا اگر تم اس غلام کے ساتھ زیادتی کروگے تو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اپنے آپ کو نہ بچا سکتے) حضرت ابو مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد سن کر میں نے کہا: آئندہ کبھی بھی کسی غلام کی پٹائی نہیں کروں گا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں، حضرت ابو مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ہیبت سے کوڑا بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

اور ایک روایت میں ہے، حضرت ابو مسعود بدری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: جب حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی زبانِ مبارک سے میں نے یہ بات سنی تو فوراً عرض کیا: یہ غلام اللہ کے واسطے آزاد ہے۔ جب انہوں نے اپنے اس جرم کی تلافی اور کفارہ کے لئے اس غلام کو آزاد کر دیا تو حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اگر تم ایسا نہ کرتے (یعنی غلام کو آزاد نہ کرتے) تو جہنم کی آگ تم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔

بے کئے کی سزا دینے کا کفارہ

حدیث ۱۶۰۵:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: ((مَنْ ضَرَبَ غُلَامًا لَهُ حَدًّا لَمْ يَأْتِهِ، أَوْ لَطَمَهُ، فَإِنَّ كَفَّارَتَهُ أَنْ يُعْتِقَهُ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے اپنے غلام کو کسی ایسے جرم کی سزا دی جو اس نے نہیں کیا ہے۔ یا اپنے غلام کو طمانچہ مارا؛ تو اس کا کفارہ اور تلافی یہی ہے کہ وہ اس کو آزاد کر دے۔

افادات:- مثلاً: اس نے شراب نہیں پی، پھر بھی یوں کہہ کر کہ تو شرابی ہے، اس پر شراب والی سزا جاری کر دی۔ یا شریعت کی طرف سے مقرر کی ہوئی اور کوئی سزا جو کسی جرم پر دی جاتی ہو، اور وہ جرم اس نے نہیں کیا تھا پھر بھی اس کو وہ سزا دی۔ یا اپنے غلام کو طمانچہ مارا؛ تو اس کا کفارہ اور تلافی یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دے۔ اگر وہ آزاد نہیں کرے گا تو وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس جرم کی سزا سے بچا نہیں سکے گا۔ جب غلام کے معاملہ میں اتنی سخت تاکید ہے تو اولاد اور بیوی کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔

اللہ تعالیٰ ان کو قیامت کے روز عذاب دیں گے

حدیث ۱۶۰۶:-

وعن هِشام بن حكيمِ بن حِزَامٍ رضى الله عنهما : أَنَّه مَرَّ بِالشَّامِ عَلَى أُنَاسٍ مِنَ الأَنْبَاطِ، وَقَدْ أُقِيمُوا فى الشَّمْسِ، وَصُبَّ عَلَى رُؤُوسِهِمُ الزَّيْتُ ! فَقَالَ: مَا هَذَا ؟ قيل : يُعَذَّبُونَ فى الخَرَاجِ - وفى رواية : حُبِسُوا فى الجِزْيَةِ - فَقَالَ هِشَامٌ : أشهدُ لَسَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ: إِنَّ اللهَ يُعَذِّبُ الَّذِينَ يُعَذِّبُونَ النَّاسَ فى الدُّنْيَا. فَدَخَلَ عَلَى الأَمِيرِ، فَحَدَّثَهُ، فَأَمَرَ بِهِمْ فَخُلُّوا.

((الأنباط)) الفلاحون مِنَ العَجَمِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ہشام بن حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ملکِ شام میں کچھ کسانوں کے پاس سے میرا گزر ہوا جن کو دھوپ میں کھڑا کیا گیا تھا اور ان کے سر کے اوپر گرم تیل ڈالا گیا تھا۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہو رہا ہے؟ بتایا گیا کہ: ان غلاموں پر خراج مقرر کیا گیا ہے جو ادا نہ کرنے کی وجہ سے ان کو یہ سزا دی جا رہی ہے۔ ایک روایت میں یہ ہے کہ ان کے اوپر حکومت کی طرف سے جزیہ مقرر تھا وہ انہوں نے ادا نہیں کیا ہے اس وجہ سے ان کو قید کیا گیا ہے۔ یہ سن کر حضرت ہشام بن حکیم بن حزام (رضی اللہ عنہ) نے کہا: میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو قیامت کے روز عذاب دیں گے جو دنیا میں لوگوں کو اس طرح کی سزا دیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ حاکم اور امیر کے پاس تشریف لے گئے (چوں کہ جزیہ اور خراج نہ دینے

پر ان کو یہ سزا حاکمِ وقت کے حکم سے دی جارہی تھی) اور اس کے سامنے یہ حدیث بیان کی، چناں چہ اس نے فوراً حکم دیا کہ ان لوگوں کو چھوڑ دیا جائے۔

جانوروں کو داغ دینے اور مارنے میں بھی رعایت

حدیث ۱۶۰۷:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما ، قَالَ : رأی رسولُ اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِمَاراً مَوْسُومَ الوَجْهِ ، فَأَنْكَرَ ذَلِكَ ؟ فَقَالَ : ((واللهِ لا أسِمُهُ إلاَّ أقْصَى شَيءٍ مِنَ الوَجْهِ)) وأمَرَ بِحِمَارِهِ فَكُوِيَ في جَاعِرَتَيْهِ ، فَهُوَ أوَّلُ مَنْ كَوَى الجَاعِرَتَيْنِ.

((الجَاعِرَتَانِ)) : نَاحِيَةُ الوَرِكَيْنِ حَوْلَ الدُّبُرِ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبیِ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ایک گدھے کو دیکھا جس کے چہرے پر داغ تھا، تو نبیِ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس پر نکیر فرمائی (مسلم شریف کی دوسری روایت میں بھی یہی قصہ موجود ہے، اس میں ہے کہ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب نبیِ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا یہ ارشاد سنا تو فرمایا: اللہ کی قسم! آئندہ میں چہرے پر داغ نہیں دوں گا بلکہ چہرے کے آخری حصے میں دوں گا۔ پھر انہوں نے سرین کے اوپر والے حصے پر داغ دینے کا حکم دیا، چناں چہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے جانور کی سرین پر داغ دیا۔

افادات:- ضرورت کے پیشِ نظر نشان کے لئے جانوروں کو داغ لگایا جاتا ہے، چناں چہ چہرے کو چھوڑ کر جسم کے دوسرے کسی بھی حصے پر داغ دینے کی اجازت ہے۔ اور اس وقت تک عربوں میں چہرے پر ہی داغ دینے کا رواج تھا، اس کو ختم کر کے سرین پر داغ دینے کا سلسلہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے جاری کیا۔

حدیث ۱٦۰۸:-

وعنه: أنَّ النبيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلَيْهِ حِمَارٌ قَدْ وُسِمَ فِي وَجْهِهِ، فَقَالَ: ((لَعَنَ اللهُ الَّذِي وَسَمَهُ)). (رواه مسلم)

وفي رواية لمسلم أيضاً: نهى رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الضَّرْبِ فِي الوَجْهِ، وَعَنِ الوَسْمِ فِي الوَجْهِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کا گذر ایک گدھے پر سے ہوا جس کے چہرے پر داغ لگایا ہوا تھا، تو حضور صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جس نے اس کے چہرے پر داغ لگایا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

اور مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے چہرے پر مارنے سے منع فرمایا، چاہے وہ جانور ہو یا انسان ہو۔ اور جانور کے چہرے پر داغ دینے سے بھی منع کیا۔

افادات:- پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ بچے یا بیوی وغیرہ کو بطورِ تعزیر کچھ سزا دینی بھی ہو تو اس کے لئے شریعت نے قانون اور حدود مقرر کئے ہیں، انہیں میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ کسی کے بھی چہرے پر نہ مارا جائے۔

باب تحریم التعذیب بالنار فی کل حیوان حَتّٰی النملة ونحوها

کسی بھی جاندار کو چاہے وہ چیونٹی ہو یا کوئی اور جانور، آگ کے ذریعہ عذاب دینے کی حرمت

حدیث ۱۶۰۹:-

عن أَبِی هریرةَ-رضی الله عنه-قَالَ: بعثنا رسولُ الله ﷺ فی بَعْثٍ، فقَالَ: ((إنْ وَجَدْتُمْ فُلاَناً وفُلاناً)) لِرَجُلَيْنِ مِنْ قُرَيْشٍ سَمَّاهُمَا ((فَأَحْرِقُوهُمَا بِالنَّارِ)) ثُمَّ قَالَ رسولُ الله ﷺ حِيْنَ أَرَدْنَا الخُرُوجَ: ((إنِّي كُنْتُ أَمَرْتُكُمْ أنْ تُحْرِقُوا فُلاناً وفُلاناً وإنَّ النَّارَ لاَيُعَذِّبُ بِهَا إلاَّ الله. فإنْ وَجَدْتُمُوهُمَا فاقْتُلُوهُمَا)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے ہم کو ایک لشکر کے ساتھ بھیجا اور قریش کے دو آدمیوں کا نام لے کر فرمایا کہ: اگر ان کو پاؤ تو ان کو جلا دینا، پھر جب ہم روانہ ہونے لگے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ: میں نے تم لوگوں کو فلاں دو آدمیوں کو جلانے کا حکم دیا تھا، بے شک آگ کا عذاب اللہ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے، اس لیے اگر تم ان کو پاؤ تو قتل کر دینا۔

افادات:- واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ابوالعاص بن الربیع حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہ) کے بھانجے تھے، نبیٔ کریم ﷺ نے ام المؤمنین کی درخواست پر اپنی صاحبزادی حضرت زینب (رضی اللہ عنہ) کا عقد ابوالعاص کے ساتھ کر دیا تھا، بعد ازاں جب سرورِ کائنات ﷺ کو

اللہ تعالیٰ نے نبوت سے سرفراز فرمایا تو قریش نے آپ پر دباؤ ڈالنے کے لیے آپ کی صاحبزادیوں کو طلاق دیدی۔ ابو العاص نے قریش کے شدید اصرار پر حضرت زینب (رضی اللہ عنہ) سے کنارہ کشی اختیار کرلی، اور سعید بن العاص کی بیٹی سے نکاح کرلیا۔

ابو العاص جنگ بدر میں گرفتار ہوئے تو حضرت زینب (رضی اللہ عنہ) جو ابھی مکہ مکرمہ میں تھیں انہوں نے بطور فدیہ قیدی کی رہائی کے لیے اپنے زیورات بھجوادیئے، انہی میں ایک ہار بھی تھا جو ام المؤمنین حضرت خدیجہ (رضی اللہ عنہ) نے اپنی صاحبزادی کو ابو العاص سے نکاح کے موقع پر دیا تھا، یہ دیکھ کر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا دل بھر آیا، چناں چہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے فرمایا: اگر تم چاہو تو اپنے قیدی کو چھوڑ دو اور رہا کردو، اور یہ مال بھی واپس کردو (یہ درخواست تھی، حکم نہیں تھا) صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: بسر و چشم! ہم تو آپ کے غلام ہیں۔ چناں چہ ابو العاص کو رہا کردیا گیا اور مال بھی واپس کردیا گیا- ابو العاص کو گرفتار کرنے والے اور بلا فدیہ رہا کرنے والے صحابی کا نام حضرت خراش بن الصمّہ (رضی اللہ عنہ) ہے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ وہ حضرت عبد اللہ بن جبیر (رضی اللہ عنہ) تھے- نبیؐ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ابو العاص نے یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ حضرت زینب (رضی اللہ عنہا) کو مدینہ منورہ بھجوادیں گے۔ چناں چہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت زینب کو بحفاظت لانے کے لیے حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) اور ایک انصاری صحابی کو مکہ کی طرف روانہ فرمایا تھا۔ ابو العاص نے مکہ پہنچ کر اپنے بھائی کنانہ بن الربیع کے ذریعہ حضرت زینب کو مدینہ پہنچانے کا بندوبست کیا،

قریش کو خبر ہوگئی تو انہوں نے پیچھا کیا اور وادیٔ ذی طویٰ میں حضرت زینب کی اونٹنی کو جالیا۔ ہبار بن الاسود اور نافع بن عبد قیس نے ہودج میں بیٹھی حضرت زینب کو خوفزدہ کیا، ہبار نے اپنے نیزے سے ہودج کو ڈھکیلا تو حضرت زینب ایک چٹان پر گر پڑی، جس سے ان کا حمل ساقط ہوگیا۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو جب اس دردناک واقعہ کی اطلاع ہوئی تو آپ نے ایک لشکر بھیجا جس کا ذکر اس روایت میں آیا ہے۔ اس لشکر کے امیر حضرت حمزہ بن عمرو اسلمی (رضی اللہ عنہ) تھے، ہبار بن الاسود اور نافع بن عبد قیس دونوں بچ نکلے، ہبار بن الاسود بعد میں مسلمان ہوگئے تھے، جب وہ مسلمان ہوکر مدینہ منورہ آئے تو بعض صحابہ ان پر طنز کیا کرتے تھے لیکن نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ان کو اس برتاؤ سے منع فرمادیا۔ حضرت ہبار (رضی اللہ عنہ) امیر معاویہ (رضی اللہ عنہ) کی خلافت کے زمانہ تک زندہ رہے۔

"وإنَّ النَّارَ لا يُعَذِّبُ بِهَا إِلاَّ الله" یہ خبر بمعنیٰ النہی کے قبیل سے ہے، یعنی "آگ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی عذاب دیتے ہیں" یہ فرماکر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آگ کے ذریعہ سزا دینے کی ممانعت بتلانا چاہتے ہیں۔ دوسری روایت میں "لَا يَنْبَغِي" کے الفاظ کی تصریح ہے، چناں چہ ابن اسحٰق کی روایت میں ہے: "ثم رأيت انه لاينبغي أن يعذب بالنّار الّا الله" اسی طرح سنن ابی داؤد میں حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہما) کی مرفوع روایت میں ہے: "انه لاينبغي أن يعذب بالنّار الّارب النّار" یعنی آگ کے ذریعہ عذاب دینا آگ کے پروردگار کے علاوہ کسی کے لیے سزاوار نہیں۔

اس روایت سے علماء نے جو مسائل مستنبط کئے ہیں اس میں یہ بھی ہے کہ پسّو اور دیگر حشرات الارض کو آگ میں جلانا مکروہ ہے، چناں چہ مسند بزار کی روایت میں عثمان بن حبان کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضرت ام الدرداء (رضی اللہ عنہا) کے پاس تھا، ایک پسّو کو پکڑ کر میں نے آگ میں ڈال دیا، اس پر وہ فرمانے لگی کہ میں نے حضرت ابو الدرداء (رضی اللہ عنہ) سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "لایعذب بالنّار الّا رب النّار" ابن أبی شیبہ نے بھی اپنی مصنف میں یہ روایت ذکر کی ہے۔

حدیث ۱۶۱۰:-

وعن ابن مسعودٍ - رضی الله عنه - قَالَ: كُنَّا مَعَ رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فی سَفَرٍ، فانْطَلَقَ لحاجَتِهِ، فَرَأيْنَا حُمَّرَةً مَعَهَا فَرْخَانِ، فَأَخَذْنَا فَرْخَيْهَا، فَجَاءتِ الحُمَّرَةُ فَجَعَلَتْ تَعْرِشُ. فَجَاءَ النَّبيُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَالَ: ((مَنْ فَجَعَ هذِهِ بِوَلَدِهَا؟، رُدُّوا وَلَدَهَا إِلَيهَا)) ورأى قَرْيَةَ نَمْلٍ قَدْ حَرَّقْنَاهَا، فَقَالَ: ((مَنْ حَرَّقَ هذِهِ؟)) قُلْنَا: نَحْنُ قَالَ: ((إنَّهُ لا يَنْبَغِي أنْ يُعَذِّبَ بالنَّارِ إلاَّ رَبُّ النَّارِ)).

(رواه أبو داود بإسناد صحيح)

قَوْله: ((قَرْيَةُ نَمْلٍ)) مَعْنَاهُ: مَوضعُ النَّمْلِ مَعَ النَّمْلِ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، آپ اپنی کسی حاجت کے لیے تشریف لے گئے، ہم نے ایک چڑیا کو دیکھا اس کے ساتھ اس کے دو بچے تھے، ہم نے اس کے دونوں بچوں کو پکڑ لیا، وہ چڑیا آکر ہمارے سر پر چکر کاٹنے لگی، اتنے

میں نبی کریم ﷺ تشریف لے آئے، آپ نے پوچھا: کس نے اس چڑیا کے بچوں کو پکڑ کر اس کو تکلیف پہنچائی؟ اس کے بچے اسے واپس کرو۔ آپ نے چونٹیوں کی رہائش گاہ (بِل) کو دیکھا جس کو ہم نے جلادیا تھا، آپ نے پوچھا: اس کو کس نے جلایا؟ ہم نے عرض کیا: ہم نے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: آگ کا عذاب دینا آگ کے رب (اللہ تعالیٰ) کے علاوہ اور کسی کے لیے مناسب نہیں۔

افادات:- مچھر کو ختم کرنے کے لیے بجلی کا آلہ استعمال کیا جاتا ہے جس میں تار ہوتے ہیں اور بجلی کی رَو اس میں دوڑتی رہتی ہے، مچھر جب اس سے ٹکراتا ہے تو جل کر ختم ہو جاتا ہے، اس کا استعمال درست نہیں۔ (شامی مع الدر ۵/۵۳۰)

باب تحریم مطل الغنی بحق طلبه صاحبه

کسی آدمی کا مالی حق دوسرے پر ہو تو قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرنے کی ممانعت

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا (النساء:۵۸)

فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ.(البقرۃ:۲۸۳)

کسی کا کوئی مالی حق دوسرے پر واجب ہو، اور جس پر واجب ہے وہ اس کی ادائیگی کی طاقت اور قدرت بھی رکھتا ہو، اس کے باوجود ادا نہ کرے اور ٹال مٹول کرتا رہے، تو یہ اس کی طرف سے ایک طرح کا ظلم و زیادتی ہے جس کی وجہ سے وہ گنہگار ہوگا اسی کو اس باب میں بتلا رہے ہیں۔

"مطل" کا ترجمہ " تاخیر" کا بھی کیا گیا ہے، اور ٹال مٹول کا بھی کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾ بے شک اللہ تبارک و تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ امانتیں ان کے حقداروں تک پہنچاؤ (یہ آیت چوتھی جلد میں امانت کے بیان میں گزر چکی ہے، وہاں اس پر تفصیل سے کلام ہے۔ مرتب) کسی کا مالی حق بھی آپ کے پاس امانت ہی ہے، لہٰذا آپ کی ذمہ داری ہے کہ اس کے مالک تک وہ پہنچائیں

اور اس میں تاخیر نہ کریں۔ اور سامنے والے کے مطالبے کے باوجود ادا نہ کرنا، یا ٹال مٹول کرنا اور تاخیر کرنا حرام ہے۔

﴿فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضاً فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ﴾ اگر تم میں سے کوئی کسی کے پاس امانت رکھے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی وہ امانت رکھنے والے کو امانت ادا کر دے۔

تمام ادائیگیاں امانت ہیں

حقوق کی ادائیگی کے سلسلہ میں ایک بات تو یہ ہے کہ کسی کا کسی کے اوپر کوئی مالی حق واجب ہو، مثلاً: بیوی کا نفقہ شوہر کے اوپر، یا ماں باپ کا نفقہ اولاد کے اوپر، یا چھوٹی اولاد کا نفقہ باپ کے اوپر واجب ہوتا ہے، یا کسی نے کسی کے ساتھ اجارہ اور کرایہ داری کا معاملہ کیا، یا کسی مزدور سے کوئی مزدوری کروائی تو کام لینے والے پر اس کی اجرت واجب ہوئی؛ یہ تمام ادائیگیاں امانت ہیں، ان میں ذرا بھی تاخیر اور ٹال مٹول ہوگی تو وہ گناہ شمار ہوگا۔

قرض اور دَیْن میں فرق

اور قرض کی دو شکلیں ہیں: ایک تو دَیْن ہوتا ہے۔ یعنی کسی پر کسی کا مالی مطالبہ ہو، جیسے: کسی نے کسی کے ساتھ کوئی سودا کیا، مثلاً: میں نے آپ سے کپڑا خریدا اور طے کیا کہ اس کی قیمت دو مہینے کے بعد ادا کروں گا، آپ نے منظور کیا کہ ٹھیک ہے، دو مہینے کے بعد پیسے ادا

کرنا، تو اس صورت میں آپ دو مہینے سے پہلے ان پیسوں کا مطالبہ نہیں کر سکتے، جب تک دو مہینے کی مدت پوری نہ ہو وہاں تک ادائیگی مجھ پر واجب نہیں ہوتی، اس کو فقہاء کے یہاں "دَیْن" کہا جاتا ہے۔ اس حدیث کو سامنے رکھ کر یوں نہیں کہہ سکتے کہ تمہارے پاس پیسے موجود ہیں اور میرے پیسے تم پر نکلتے ہیں تو لاؤ، اور اگر تاخیر کروگے تو گنہگار قرار دیئے جاؤگے۔

اور دوسرا قرض ہوتا ہے، یعنی کسی کو نقد رقم قرض کے طور پر دی گئی، اس میں اگر طے بھی کیا گیا کہ ایک سال کے بعد لوٹانا، تو اخلاق اور وعدہ کی پابندی کا تقاضا تو یہی ہے کہ سامنے والا ایک سال سے پہلے اس سے مطالبہ نہ کرے، لیکن اگر آج دینے کے بعد دوسرے دن ہی وہ مطالبہ کرنا چاہے تو مسئلے کی رو سے اس کو ایسا کرنے کا حق ہے اور وہ اپنا دیا ہوا روپیہ واپس لے سکتا ہے۔ دونوں میں یہ فرق ہے۔

یہ ظلم ہے

حدیث ۱۶۱۱:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه: أنَّ رسول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: ((مَطْلُ الغَنِيِّ ظُلْمٌ، وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَعْ)) (متفق عَلَيْهِ)

معنى ((أُتبع)): أُحِيلَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو آدمی مالی حق ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہو، اور اس پر ادائیگی لازم ہو چکی ہو، اس کے باجود ادائیگی میں تاخیر اور ٹال مٹول کرے؛ تو یہ ظلم ہے۔ اور جب تم میں سے کسی کو کسی حیثیت والے کا حوالہ دیا جائے تو چاہیے کہ اس کو قبول کرلے۔

افادات:- آج کل ہمارے سماج اور معاشرہ میں لوگوں کا مزاج بنا ہوا ہے کہ قرض لیتے ہیں اور قرض خواہ بے چارہ اس مدت کے بعد- جو آپس میں طے کر رکھی تھی- مطالبہ کرتا ہے اور اس کے پاس پیسے موجود ہوتے ہیں، دوسری چیزوں میں خرچ کرتا رہتا ہے، لیکن قرض خواہ کے مانگنے پر منھ بگاڑتے ہیں۔ حالاں کہ جب تک سامنے والے کا حق ادا نہ کرے اس کے لئے دوسرے مصارف میں خرچ کرنا جائز بھی نہیں۔ بلکہ ہمارے اکابر تو ایسے آدمی کی دعوت قبول کرنے میں بھی احتیاط کرتے تھے۔

مقروض کی دعوت

ارواحِ ثلاثہ میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت نواب قطب الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو مشکوٰۃ شریف کی شرح "مظاہرِ حق" کے مصنف، اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں میں سے ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کی۔ (حضرت

شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے تھے اور شاہ عبدالعزیز صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین مقرر کئے گئے تھے) تو مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ نے دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ نواب صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے آکر شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شکایت کی کہ میں نے آپ کو دعوت دی تو آپ نے قبول فرمالی، لیکن مفتی صاحب دعوت قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں ؛ کیا ان کو میری کمائی میں کوئی شک وشبہ ہے؟ شاہ محمد اسحاق صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مفتی صاحب نور اللہ مرقدہٗ کو بلایا اور پوچھا: کیا تم کو تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا ہے؟ تم ان کی دعوت کیوں قبول نہیں کرتے؟ کیا ان کی کمائی میں کوئی شک وشبہ ہے؟ مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: حاشاو کلاّ! ان کی کمائی حلال ہے، لیکن حضرت! ایک بات ہے کہ اگرچہ مولویوں کی صحبت میں آنے کی وجہ سے بگڑے ہوئے نواب صاحب ہیں، اور نوابی والی پوری شان تو باقی نہیں رہی لیکن پھر بھی ہیں تو نواب ہی، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ہوں گے ہی۔ اور نواب صاحب مقروض ہیں، جب ہماری دعوت کریں گے تو کچھ تکلفات سے بھی کام لیں گے، لہٰذا جو پیسے اس دعوت میں خرچ کر رہے ہیں اتنا پیسہ اگر وہ اپنے قرض کی ادائیگی میں لگا دیں؛ تو یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ جب شاہ محمد اسحاق صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے مفتی صاحب کی یہ بات سنی تو فرمانے لگے: نواب صاحب! اب تو ہم بھی آپ کی دعوت میں نہیں آئیں گے۔

بہرحال! یہ بڑی اہم چیز ہے اور آج کل ہمارے معاشرہ اور سوسائٹی میں دوسروں کے مالی حقوق کی ادائیگی کی طاقت ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرنا اور سامنے والے کو تکلیف اور پریشانی میں ڈالنا عام بات ہوتی جارہی ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

ایک مسئلہ

”وَإِذَا أُتْبِعَ أَحَدُكُمْ عَلَى مَلِيءٍ فَلْيَتْبَعْ“ اور جب تم میں سے کسی کو کسی حیثیت والے کا حوالہ دیا جائے تو چاہیے کہ اس کو قبول کرلے۔ ہمارے معاشرہ میں ایک لفظ ”حوالہ“ بولا جاتا ہے وہ یہاں مراد نہیں ہے، بلکہ شریعت میں ”حوالہ“ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی اپنے دَیْن کی ادائیگی دوسرے کے سپرد کردے، اور دوسرا اس کو منظور بھی کرلے۔ تو جو آدمی اپنا قرض دوسرے کے ذمہ ڈال رہا ہے وہ ”محیل“ کہلاتا ہے، اور جس کے ذمہ ڈالا جارہا ہے وہ ”محتال علیہ“ کہلاتا ہے۔

یہاں ایک مسئلہ بیان کیا گیا ہے کہ مثلاً: زید کے ذمہ آپ کے پانچ ہزار روپے باقی ہیں، زید آپ سے کہتا ہے کہ میں آپ کے پانچ ہزار روپے خالد کے حوالے کرتا ہوں، آپ خالد سے وصول کرلیں۔ اب خالد اگر صاحبِ حیثیت ہے اور آپ کا قرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہے، اور وہاں آپ کا قرض ضائع ہونے کا کوئی خطرہ بھی نہیں ہے؛ تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ کو بھی چاہیے کہ اس حوالہ کو منظور کرلیں۔ احناف، مالکیہ اور شوافع کے

یہاں مسئلہ یہی ہے کہ جب تک قرض خواہ اس معاملہ کو منظور نہ کرے؛ تب تک یہ معاملہ مکمل نہیں ہوگا۔ اسی لیے کہا گیا کہ قرض خواہ کو چاہیے کہ مقروض جس کے ذمہ اپنا قرض ڈال رہا ہے اور وہ قبول بھی کر رہا ہے، اور اس میں ادائیگی کی طاقت بھی ہے تو پھر قرض خواہ کو چاہیے کہ انکار نہ کرے۔ جب کہ امام احمد بن حنبل نور اللہ مرقدہٗ اور دوسرے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: قرض خواہ منظور کرے یا نہ کرے، محیل کے کہنے اور محتال علیہ کے ذمہ داری لے لینے سے قرض اس کے ذمہ چلا جائے گا۔ اور حوالہ مقروض کے ساتھ ایک طرح کا حسنِ سلوک ہے۔ احناف کے نزدیک قرض خواہ کے لیے حوالہ کو قبول کرنا واجب اور فرض نہیں ہے، بلکہ مستحب کا درجہ رکھتا ہے۔

کراھة عود الإنسان فی ھبة لَمۡ یُسلِّمھا إِلَی الموھوب لَهُ

وفی ھبة وھبھا لولدہ وسلمھا أَوۡ لَمۡ یسلمھا

و کراھة شرائه شَیۡئاً تصدّق بِهِ من الَّذِی تصدق عَلَیۡهِ أَوۡ أخرجه عن زکاة

أَوۡ کفارة ونحوھا وَلَا بأس بشرائه من شخص آخر قَدۡ انتقل إِلَیۡهِ

اس باب میں علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ ایک اور مسئلہ چھیڑ رہے ہیں: کوئی آدمی کسی کو کوئی چیز ہدیہ دے، اس کے بعد اس سے واپس لے لے؛ تو کیا حکم ہے؟۔

ایک ذاتی واقعہ

دیکھو! ہدیہ اور بخشش دینے والا جس کو ہدیہ اور بخشش دے رہا ہے اس کو یوں کہے کہ میں نے تم کو یہ چیز ہدیہ کے طور پر دی، اور سامنے والا کہے کہ میں نے اس کو قبول کرلی، اور پھر اس کے اوپر سامنے والے کا قبضہ بھی ہو جائے؛ تب ہی ہدیہ اور بخشش کا معاملہ مکمل ہوگا۔ جب تک اس چیز پر سامنے والے کا قبضہ نہ ہوگا وہاں تک احناف کے یہاں ایسی بخشش تام اور مکمل نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے اگر اس کے قبضہ کرنے سے پہلے بخشش دینے والے کا انتقال ہو جائے تو اب یہ معاملہ ختم ہو گیا، اور وہ چیز بخشش دینے والے کے ورثاء کی طرف

منتقل ہو جائے گی، جس کو بخشش دی گئی تھی وہ نہیں لے سکتا۔ اس میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔

ہمارے ایک عزیز جدہ میں رہتے تھے، انہوں نے اپنی زندگی میں ایک صاحب کو کچھ رقم دی کہ اس سے فلاں چیز خرید کر میرے (حضرت مفتی صاحب کے) حوالے کر دینا۔ وہ خرید کر میرے حوالے کریں اس سے پہلے جدہ والے عزیز کا انتقال ہو گیا۔ بعد میں ان صاحب نے مجھے بتلایا کہ انہوں نے یہ رقم مجھے دی تھی اور یہ کہا تھا کہ فلاں چیز خرید کر تمہیں دیدوں؛ تو لیجئے! میں یہ لے آیا ہوں۔ میں نے کہا: اس رقم سے نہ تو آپ خرید سکتے ہیں، اور نہ مجھے حوالے کر سکتے ہیں، یہ رقم تو ان کے ورثاء کی ہو گئی۔ آپ تو ان کی طرف سے اس چیز کے خریدنے کے وکیل تھے، اور آپ یہ چیز خریدیں اس سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا، اور مسئلہ یہ ہے کہ انتقال ہو جانے سے وکالت ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے مسائل میں بہت احتیاط کی ضرورت رہتی ہے۔

ایک طریقہ اور اس کی اصلاح

ہمارے معاشرہ اور سماج میں بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ باپ اپنی زندگی میں بیٹوں سے کہتا ہے کہ یہ تجھے دیا اور وہ فلاں کو دیا، لیکن وہ سب ان کے قبضے میں سونپا نہیں جاتا بلکہ باپ ہی کے قبضے میں رہتا ہے، یہاں تک کہ باپ کا انتقال ہو جاتا ہے، اب مسئلہ مفتیوں

کے پاس آتا ہے کہ والد صاحب نے فلاں چیز بخشش کر دی تھی، تو مفتی صاحب مسئلہ بتاتے ہیں کہ جب انہوں نے اپنی زندگی میں اس کا قبضہ نہیں سونپا تھا تو بخشش والا معاملہ مکمل ہی نہیں ہوا تھا اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو اب وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا، اس لیے یہ چیز وراثت میں شمار کی جائے گی، اور جن جن ورثاء کے شریعت نے جتنے حصے مقرر کئے ہیں اس کے مطابق ان سب کو دیا جائے گا۔ ہاں ! والد صاحب نے جو چیز بطور بخشش جس کو دی ہے اگر اس نے وہ چیز قبول بھی کر لی اور والد صاحب نے اس کے حوالے بھی کر دی؛ تو وہ اس کا مالک بن گیا۔

ہدیہ دے کر واپس لینا

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز بخشش دی، اب اس سے وہ چیز واپس لی جا سکتی ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلافی ہے، اسی کو علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ اس باب میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر باپ نے بیٹے کو کوئی چیز بطورِ بخشش دی، اور پھر وہ اس سے واپس لینا چاہے؛ تو لے سکتا ہے، اور اس کے علاوہ کسی اور نے کسی کو بخشش دی ہو اور قبضہ بھی کرا دیا ہو؛ تو اس کے پاس سے واپس نہیں لی جا سکتی۔

احناف کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی نے کسی کو بطورِ بخشش کوئی چیز دی اور اس کو قبضہ بھی سونپ دیا، اس کے بعد بھی اگر واپس لینا چاہے تو اس کی رضا مندی سے واپس لی جا سکتی ہے۔ یاد رکھیے کہ اس کی رضامندی شرط ہے، یعنی وہ اپنی خوشنودی سے واپس

دیدے، یا وہ خوشی سے تو نہیں دیتا مگر ”واہب“ یعنی دینے والے نے یہ معاملہ قاضی کے سامنے پیش کیا، اور قاضی نے اس کو پابند کیا کہ تم اس کو وہ چیز واپس لوٹادو؛ تو اس صورت میں وہ واپس لے سکتا ہے۔ اگرچہ اس طرح واپس لینا اس کے لئے مکروہِ تحریمی قرار دیا گیا ہے۔

شوافع کی دلیل

اس سلسلہ میں دو روایتیں آئی ہیں، ایک روایت تو وہ ہے جس کو علامہ نووی نوراللہ مرقدہٗ اس باب میں پیش کریں گے کہ جو آدمی کوئی بخشش دے کر واپس لیتا ہے، وہ ایسا ہے جیسا کہ قے کر کے اس کو چاٹے۔ اور یہ کتوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب وہ خوب کھانا کھا لیتے ہیں تو کسی آڑ اور کونے میں جا کر کچھ حصہ قے کر کے نکال دیتے ہیں پھر دوسرے موقعہ پر جب بھوک لگتی ہے تو وہیں جا کر اس کو چاٹ لیتے ہیں۔ تو یہاں حضور اکرم ﷺ اس آدمی کو۔ جو کسی کو کوئی چیز ہدیہ اور بخشش دینے کے بعد اس سے واپس لے۔ کتے کے ساتھ تشبیہ دے رہے ہیں جو قے کرنے کے بعد اپنا قے کیا ہوا چاٹ لے۔ اسی روایت کی وجہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بخشش دینے کے بعد واپس لینا درست نہیں ہے۔

احناف کی دلیل

جب کہ احناف فرماتے ہیں کہ دوسری روایت بھی ہے: ''مَنْ وَهَبَ هِبَةً فَهُوَ أَحَقُّ بِهَا مَا لَمْ يُثَبْ مِنْهَا'' کسی آدمی نے کسی کو کوئی چیز ہدیہ دی، اور جس کو دی گئی اس کی طرف سے واہب کو ہدیہ کے بدلہ میں کچھ نہیں ملا، تو نبی کریم ﷺ دینے والے کو اس چیز کا زیادہ حقدار بتلارہے ہیں۔

مثال کے طور پر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم نے کوئی چیز کسی کو ہدیہ میں دی، تو سامنے والے نے بھی اس کے معاوضہ میں کوئی چیز ہمیں ہدیہ دی، چاہے اس سے چھوٹی اور کم قیمت ہی کیوں نہ ہو، جیسے: آپ نے کسی کو گھڑی دی، اور اس نے آپ کو عطر کی شیشی دی، اب آپ کی گھڑی تو پانچ ہزار کی ہے، اور اس کی عطر کی شیشی ڈیڑھ سو روپئے کی ہے، لیکن بہر حال اس نے بھی آپ کو ایک چیز دی؛ تو اب آپ اپنا دیا ہوا ہدیہ واپس نہیں لے سکتے؛ الّا یہ کہ وہ وہی شیشی واپس کرے اور کہے کہ میری گھڑی لاؤ۔

احناف نے نبی کریم ﷺ کے ان دونوں پاکیزہ ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں پر عمل کی شکل یہ نکالی کہ اُس روایت کا مطلب - جس میں واپس لینے کو کتے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے - یہ ہے کہ دیکھو! کتے کے فعل کو گھناؤنا اور ناپسندیدہ تو کہا جا سکتا ہے، لیکن اس پر حرمت کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لیے کہ حلال یا حرام ہونے کا فیصلہ انسانوں کے کاموں

پر تو کر سکتے ہیں، جانوروں کے کاموں کی وجہ سے حلال یا حرام ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ ہاں! جانور کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے گھناؤنا اور قابلِ نفرت کام کہہ سکتے ہیں۔ تو یہاں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کتے کے ساتھ جو تشبیہ دی کہ وہ قے کرتا ہے اور پھر چاٹ لیتا ہے، تو احناف کہتے ہیں کہ اس سے حرمت لازم نہیں آتی، ہاں! اس کا ناپسندیدہ ہونا معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے ہم کہیں گے کہ دے کر واپس لینا مکروہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود کوئی آدمی واپس لے گا اور سامنے والا اپنی رضامندی سے واپس کرے گا، یا وہ اپنی خوشی سے تو واپس نہیں کر رہا ہے لیکن حاکم اور قاضی اس کو حکم دیتا ہے کہ تم واپس کر دو؛ تو ان دونوں صورتوں میں دینے والے کی ملکیت میں وہ چیز واپس آجائے گی۔ اور اگر اس نے نہ تو اپنی خوشی سے واپس کیا، اور نہ حاکم نے واپس کرنے کا حکم دیا؛ تو اب یہ زبردستی نہیں چھین سکتا۔

جب آپسی محبتیں چلتی ہیں

عام طور پر ہمارے معاشرہ میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ جب محبتیں چلتی ہیں تو خوب چلتی ہیں، اور لین دین بھی برابر ہوتا رہتا ہے، اور جہاں لڑائی ہوئی تو پوری لسٹ نکالی جاتی ہے کہ مَیں نے تجھے آج تک یہ دیا اور وہ دیا؛ سب واپس لا۔ تو اب اگر وہ خوشی سے واپس نہیں کرتا، یا دینے سے منع ہی کر دیتا ہے کہ میں نہیں دوں گا؛ تو اس صورت میں زبردستی اس کے پاس سے واپس لیا نہیں جا سکتا، اس لئے کہ اس کو دیدینے کی وجہ سے وہ اس چیز کا مالک ہو

گیا ہے اور وہ چیز اب اس کی ملکیت ہے، تمہاری نہیں۔ ہاں! اگر وہ آپ کے مانگنے کی وجہ سے آپ کی حرکت پر ناراض ہو کر اپنی مرضی سے کہتا ہے کہ جا! میں نے واپس کر دی اور آپ کو سونپ بھی دے، تب تو وہ آپ کی ملکیت میں آجائے گی۔ لیکن اگر وہ اپنی خوشی اور مرضی سے نہیں سونپتا، آپ چھین کر لیں گے تو آپ اس چیز کے مالک نہیں بنیں گے، بلکہ دوسرے کی چیز چھیننے والے شمار ہوں گے۔

بخشش واپس لینے کے سات شرائط

احناف کے نزدیک دی ہوئی چیز واپس لینے کی جو اجازت دی جا رہی ہے وہ اس وقت ہے جب کہ سات باتوں میں سے کوئی بات پائی نہ گئی ہو۔ ہمارے مدارس میں ایک کتاب ”کنز الدقائق“ پڑھائی جاتی ہے، اس میں ”کتاب الھبۃ“ کے اندر ان سات اسباب کو۔ جن کی وجہ سے ہبہ کی ہوئی چیز واپس لینا ممنوع ہے۔ سات حروف ”دَمْعٌ خَزَقَہٗ“ میں جمع کیا گیا ہے۔

(۱) ”اَلدَّالُ : اَلزِّیَادَۃُ الْمُتَّصِلَۃُ“ یعنی جو چیز دی گئی ہے اس میں کسی چیز کی زیادتی نہ ہوئی ہو۔ مثلاً: آپ نے کسی کو زمین ہدیہ میں دی، اور اس نے اس زمین میں مکان بنالیا، اب آپ اس سے مطالبہ کریں کہ میری دی ہوئی زمین مجھے واپس کرو؛ تو آپ نہیں مانگ سکتے؟

اس لیے کہ آپ نے زمین ہدیہ میں دی، اس نے قبول کر لی اور مکان بھی بنا لیا، اب اس زیادتی کے بعد واپسی کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔

(۲) ”وَالْمِیمُ: مَوْتُ أَحَدِ الْمُتَعَاقِدَیْنِ“ دونوں میں سے کسی ایک کا- دینے والے کا یا لینے والے کا- انتقال ہو جائے۔ مثلاً: آپ نے زید کو ایک گھڑی دی پھر زید کا انتقال ہو گیا، اب آپ زید کے بیٹوں اور وارثوں سے کہیں کہ میں نے آپ کے ابا کو ایک گھڑی دی تھی وہ مجھے واپس دو۔ جب اس کا انتقال ہو گیا تو اب واپس نہیں لی جا سکتی۔ یا آپ کا انتقال ہو جائے اس کے بعد آپ کے بیٹے اور ورثاء زید سے وہ گھڑی واپس مانگیں؛ تو وہ بھی نہیں مانگ سکتے۔

(۳) ”وَالْعَیْنُ: الْعِوَضُ“ آپ نے کسی کو کوئی چیز ہدیہ میں دی اور اس نے بھی اس کے بدلے میں کوئی چیز آپ کو ہدیہ دیدی، اور آپ نے وہ قبول کر لی؛ تو اب آپ اپنی دی ہوئی چیز واپس نہیں لے سکتے۔ میں نے اوپر مثال دی تھی کہ آپ نے گھڑی دی اور اس نے آپ کو بدلے میں عطر کی شیشی دی۔ ہاں! آپ عطر کی وہی شیشی اس کو واپس لوٹائیں تو اپنی چیز مانگ سکتے ہیں۔

(۴) ”وَالْخَاءُ: خُرُوجُ الْهِبَةِ عَنْ مِلْكِ الْمَوْهُوبِ لَهُ“ جس کو کوئی چیز ہدیہ میں دی گئی ہے اس نے وہ چیز اپنی ملکیت سے نکال دی ہو، مثلاً: آپ نے اس کو ہدیہ میں گھڑی دی،

اور اس نے وہ بیچ دی، یا اس نے کسی اور کو ہدیہ دیدی، اب آپ اس سے مطالبہ کریں کہ میری گھڑی واپس لاؤ؛ تو یہ مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

(۵)'' وَالزَّائُ:الزَّوْجِیَّۃُ'' اسی طرح دینے والے اور لینے والے کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہو۔ تو اب وہ واپس نہیں لی جاسکتی۔ ہمارے معاشرہ میں یہ بھی ہوتا ہے کہ جب نکاح کا معاملہ ہوتا ہے تو بیوی نے شوہر کو اور شوہر نے بیوی کو کوئی چیز ہدیہ میں دی، بعد میں جب طلاق کی نوبت آتی ہے تو شوہر کی طرف سے پوری لسٹ وہاں بھیجی جاتی ہے کہ ہماری طرف سے یہ یہ چیزیں تم کو ہدیہ میں دی گئی ہیں؛ وہ سب واپس لاؤ۔ لہٰذا جو چیز ہدیہ میں دی گئی وہ واپس نہیں لی جاسکتی۔ ہاں! جو چیز استعمال کے لئے دی جاتی ہے وہ تو واپس لی جاسکتی ہے۔

(۶)'' وَالْقَافُ : اَلْقَرَابَۃُ'' قرابت یعنی دونوں میں ذی رحم محرم کا رشتہ ہو، جیسے: دونوں سگے بھائی ہیں یا آپس میں بھائی بہن ہیں، باپ بیٹے کا رشتہ ہے؛ تو اس صورت میں اگر ایک نے دوسرے کو کوئی چیز ہدیہ میں دی ہے تو وہ واپس نہیں لی جاسکتی۔

(۷)'' وَالْھَاءُ : اَلْھَلَاكُ'' یعنی وہ چیز جو ہدیہ میں دی گئی ہے وہ ہلاک ہوگئی ہو؛ تب بھی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال! ان سات اسباب میں سے کسی بھی ایک صورت میں دی ہوئی چیز واپس نہیں مانگی جاسکتی۔

لیکن ہمارے معاشرے میں یہ بھی ایک بہت بری چیز ہے کہ جب تک آپس میں تعلقات اور محبتیں رہتی ہیں وہاں تک تو اس طرح ہدیوں اور بخششوں کا لین دین بھی رہتا ہے، لیکن جہاں کچھ جھگڑا ہو گیا تو (بہت سے ایسے واقعات ہمارے سننے میں آتے ہیں کہ) باقاعدہ پوری فہرست بھیجتے ہیں کہ میں نے فلاں فلاں وقت پر تم کو یہ چیزیں دی تھیں، وہ سب واپس لاؤ۔ اب وہ چیز ہلاک ہو گئی، اس کے پاس باقی ہی نہیں رہی، پھر بھی اس کے پیسے مانگے جاتے ہیں؛ یہ درست نہیں۔ جیسا کہ میں نے ابھی بتلایا پیسے لینے کا کسی صورت میں بھی حق نہیں پہنچتا۔

بہر حال! ایسی جو باتیں ہوتی ہیں ان کے بارے میں جب تک شرعی حکم معلوم نہ کر لیا جائے وہاں تک کوئی اقدام درست نہیں ہے۔ اس باب میں علامہ نووی نور اللہ مرقدہٗ نے ایک بات تو یہ بتلائی۔

صدقہ واپس لینا

دوسری بات یہ بتلاتے ہیں:- آپ نے کوئی چیز کسی کو بطورِ ہدیہ نہیں، بلکہ بطورِ صدقہ یا زکوٰۃ کے اللہ واسطے دی، یا کفارہ میں کوئی چیز دی، مثلاً: آپ نے کوئی پلاٹ یا مکان زکوٰۃ کے طور پر دیا، یا کوئی گھڑی زکوٰۃ کے طور پر دی؛ بعد میں وہی گھڑی یا پلاٹ اور گھر اس سے واپس خرید رہے ہیں؛ تو یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ ہاں! آپ نے جس کو گھڑی یا پلاٹ یا مکان دیا

تھا اس نے وہ چیز کسی تیسرے کو بیچ دی، اب آپ اس تیسرے آدمی سے خرید رہے ہیں؛ تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ آپ نے جس کو زکوٰۃ یا صدقہ کے طور پر وہ چیز دی ہو اس سے براہِ راست لینا منع کیوں ہے؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے صدقہ کے طور پر وہ چیز اس کو دی، تو چوں کہ آپ کی طرف سے یہ چیز اس کے پاس مفت میں اور بطورِ صدقہ (یعنی اللہ کی نسبت سے) گئی ہے، اب ظاہر ہے کہ جب آپ ہی براہِ راست اس سے وہ چیز لیں گے تو یقیناً وہ قیمت کے معاملہ میں آپ کے ساتھ رعایت برتے گا۔ مثلاً: یہی گھڑی آپ کے علاوہ کسی دوسرے کو بیچتا تو پانچ سو (۵۰۰) سے کم میں نہ بیچتا، لیکن جب آپ نے مانگی تو وہ بھی سوچے گا کہ اسی نے تو مجھے دی تھی، چلو! ساڑھے چار سو (۴۵۰) میں دیدو۔ تو یوں سمجھو کہ اس نے پچاس روپے کی جو کمی کی وہ گویا آپ نے اپنے صدقہ میں سے واپس لے لیا، تو جیسے صدقہ میں دی ہوئی چیز واپس لیتے ایسے ہی اس تعلق اور نسبت کی وجہ سے جتنی قیمت کی کمی ہوئی وہ بھی اسی میں شمار ہوتی ہے؛ اس لئے اس سے منع کیا ہے۔

ہدیہ اور صدقہ میں فرق

ہدیہ اور صدقہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ تو اللہ کی نسبت پر اور ثواب حاصل کرنے کی غرض سے دیا جاتا ہے، اور ہدیہ جس کو دیا جاتا ہے اسی کو خوش کرنے اور تعلقات کو مزید

مضبوط کرنے کی نیت سے اور محبت بڑھانے کے لئے دیا جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "تَهَادَوْا تَحَابُّوْا" آپس میں ہدیہ کا لین دین کرو اس کی وجہ سے آپس میں محبت بڑھے گی۔ تو ہدیہ میں ثواب کا حصول مقصود نہیں ہوتا، اگرچہ اس میں بھی ثواب ملتا ہے، لیکن پیشِ نظر ثواب حاصل کرنا نہیں ہوتا، جبکہ صدقہ میں جس کو صدقہ دیا جا رہا ہے اس کی ذات نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتی، بلکہ وہاں تو نگاہوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے کہ وہ کوئی بھی ہو، مَیں اس کو اللہ کے لئے دے رہا ہوں۔

باب کی روایتیں

حدیث ۱۶۱۲:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما : أنَّ رسول اللہ ﷺ قَالَ: ((الَّذِی يَعُودُ فِی هِبَتِهِ كَالْكَلْبِ يَرْجِعُ فِی قَيْئِهِ)). (متفق عَلَيْهِ)

وفی روایة: ((مَثَلُ الَّذِی يَرْجِعُ فِی صَدَقَتِهِ، كَمَثَلِ الْكَلْبِ يَقِیءُ، ثُمَّ يَعُودُ فِی قَيْئِهِ فَيَأْكُلُهُ))

وفی روایةٍ: ((العائِدُ فِی هِبَتِهِ كالعائِدِ فِی قَيْئِهِ))

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنی بخشش کی ہوئی چیز کو واپس لیتا ہے وہ کتے کی طرح ہے جو اپنی کی ہوئی قے چاٹتا ہے۔

دوسری روایت میں ہے: جو آدمی اپنا دیا ہوا صدقہ واپس لے لیتا ہے، وہ کتے کی طرح ہے جو قے کرتا ہے، پھر اسی قے کو دوبارہ چاٹ کر کھالیتا ہے۔

ایک اور روایت میں ہے: اپنا دیا ہوا ہدیہ واپس لینے والا ایسا ہے جیسا کہ اپنی قے چاٹنے والا۔

حدیث ۱۶۱۳:-

وعن عمر بن الخطاب -رضی الله عنه- قَالَ: حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِی سَبِيلِ اللهِ فَأَضَاعَهُ الَّذِی كَانَ عِندَهُ، فَأَرَدْتُ أنْ أشْتَرِيَهُ، وَظَنَنْتُ أنَّهُ يَبِيعُهُ بِرُخْصٍ، فَسَألْتُ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ: ((لاَ تَشْتَرِهِ وَلاَ تَعُدْ فِی صَدَقَتِكَ وإنْ أعْطَاكَهُ بِدِرْهَمٍ؛ فَإنَّ العَائِدَ فِی صَدَقَتِهِ كَالعَائِدِ فِی قَيْئِهِ)). (متفق عَلَيْهِ)

قَوْله: ((حَمَلْتُ عَلَى فَرَسٍ فِی سَبِيلِ الله)) مَعنَاهُ: تَصَدَّقْتُ بِهِ عَلَى بَعْضِ المُجَاهِدِينَ.

ترجمہ:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے ایک آدمی کو اللہ کے راستے میں جہاد کرنے کے واسطے ایک گھوڑا بطورِ صدقہ دیا لیکن اس نے اس کو ضائع کر دیا (ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی جیسی خدمت کرنی تھی، اور جیسا کھلانا پلانا چاہئے تھا وہ کھلا پلا نہیں سکا، جس کی وجہ سے وہ گھوڑا کمزور ہو گیا) تو میں نے سوچا کہ اس سے خرید لوں اور میں نے یہ بھی سوچا کہ جب میں خود ہی واپس خریدوں گا تو وہ مجھے کچھ سستے میں ہی بیچ گا۔ چناں چہ اس سلسلہ میں مَیں نے حضورِ اکرم ﷺ سے پوچھا: (حضراتِ صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ کوئی بھی کام ہو پہلے حضور ﷺ سے پوچھ لیتے تھے اس کے بعد کرتے تھے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ بڑوں سے پوچھتے ہی نہیں، یا پہلے کر ڈالیں گے، بعد میں پوچھیں گے۔ اصل تو یہ ہے کہ پہلے پوچھو، اس کے بعد کرو۔) حضور ﷺ نے فرمایا:

اپنا صدقہ کیا ہوا مال اس سے واپس مت خریدو، چاہے وہ تم کو ایک روپے میں ہی بیچتا ہو، اس لئے کہ جو آدمی اپنی صدقہ دی ہوئی چیز واپس لیتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کتا اپنی قے کی ہوئی کو واپس چاٹتا ہے۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کوئی چیز صدقہ یا زکوۃ کے طور پر کسی کو دی گئی ہو یا کسی بھی طرح کے کفارہ کے طور پر دی گئی ہو، تو وہ چیز دینے والا خود براہِ راست اس سے نہ خریدے۔ اس لیے کہ اس میں وہی خطرہ رہتا ہے کہ اس کو رعایتی دام میں دے گا تو گویا اللہ کے راستہ میں دی ہوئی اتنی مقدار واپس لینا لازم آئے گا، ہاں! اس نے اگر کسی تیسرے کو بیچ دی ہو اس سے آپ خریدنا چاہیں تو اس کی البتہ اجازت ہے

تاکید تحریم مال الیتیم

یتیم کے مال کی حرمت کی تاکید

قَالَ اللہ تَعَالَی:إِنَّ الَّذِینَ یَأْکُلُونَ أَمْوَالَ الیَتَامَی ظُلْماً إِنَّمَا یَأْکُلُونَ فِی بُطُونِہِمْ نَاراً وَسَیَصْلَونَ سَعِیراً.(النساء:۱۰)

وقال تَعَالَی:وَلاَ تَقْرَبُوا مَالَ الیَتِیمِ إِلاَّ بِالَّتِی ھِیَ أَحْسَنُ.(الأنعام:۱۵۲)

وقال تَعَالَی:وَیَسْأَلُونَکَ عَنِ الیَتَامَی قُلْ إِصْلاَحٌ لَھُمْ خَیْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوھُمْ فَإِخْوَانُکُمْ واللہُ یَعْلَمُ المُفْسِدَ مِنَ المُصْلِحِ.(البقرۃ:۲۲۰)

وہ نابالغ لڑکا یا لڑکی جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو، جب تک وہ نابالغ ہے وہاں تک اس کو ''یتیم'' کہا جائے گا، اس کے بالغ ہوتے ہی شرعی اعتبار سے اس کی یتیمی باقی نہیں رہتی۔ اور جس کے باپ کا انتقال ہو گیا ہو وہی یتیم کہلاتا ہے، ماں کا انتقال ہو گیا ہو اور باپ موجود ہو؛ وہ یتیم نہیں ہے۔

جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں

یتیم کے مال کی حرمت بہت زیادہ سخت ہے اور اس سلسلے میں قرآنِ پاک اور احادیث میں بڑی تاکید آئی ہے۔ چناں چہ قرآن پاک کی ایک آیت پیش کی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِینَ یَأْکُلُونَ

أَمْوَالَ الْيَتَامَى ظُلْماً إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَاراً وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيراً (النساء:۱۰)﴾ جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ کے اندر آگ ڈال رہے ہیں اور عنقریب وہ لوگ جہنم میں جائیں گے۔

یتیم کے مال کے سلسلہ میں زمانۂ جاہلیت میں بڑی بے احتیاطیاں ہوتی تھیں، جب کسی کا انتقال ہو جاتا اور اس کی نابالغ اولاد ہوتی تو عام طور پر مرنے والے کے بھائی، یا اس کی بیوی، یا نابالغ اولاد کے بڑے بھائی بہن، ان کے مالوں پر اپنا قبضہ جما لیا کرتے تھے، اور اس مال میں اس بچے کا جو شرعی حق ہے وہ ادا کرنے کے بجائے اس کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔ اس لئے اس سلسلہ میں قرآن اور حدیث میں بڑی تاکید آئی، اور اس سے بہت ڈرایا گیا کہ جو لوگ یتیم کا مال کھاتے ہیں وہ یوں سمجھیں کہ گویا اپنے پیٹ میں آگ ڈال رہے ہیں۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس آیت میں تشبیہ کے طور پر آگ کہا گیا ہے، لیکن اکثر حضراتِ محققین فرماتے ہیں کہ ایسے آدمی حقیقت میں آگ کھا رہے ہیں، گویا یہ مال ان کے پیٹ میں آگ بن کر ہی جا رہا ہے۔ جیسے: کسی کے ہاتھ میں دیا سلائی ہو تو ہم اس کو کہیں گے کہ تمہارے ہاتھ میں تو بارود ہے۔ اور بارود خانہ بھی بظاہر جلتا ہوا نظر نہیں آتا لیکن لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو بارود کا گولہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ابھی ہم کو بظاہر آگ نظر نہیں آتی لیکن جب وقت آئے گا تو وہ آگ کی شکل اختیار کر لے گا۔ جیسے: کسی کے پاس سنکھیا ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ تو قاتل ہے۔ اب ہاتھ میں لے کر یوں کہے کہ اس نے مجھے کہاں مار ڈالا۔

تو کہیں گے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کو منہ میں رکھیں گے اور پیٹ میں جائے گا تو قاتل ہونے والا اپنا اثر دکھائے گا۔

ناحق کھانے کا مطلب یہ ہے کہ ناحق طریقے سے اس کو اپنے تصرف اور استعمال میں لائے گا، چاہے وہ کھا کر ہو، چاہے پہن کر ہو، چاہے کسی اور طریقے سے استعمال کر کے ہو۔ ”کسی کا مال کھانا“ بول کر ناحق طریقے سے کسی بھی طرح اپنے استعمال میں لانا مراد ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ اس کے ساتھ خرید و فروخت ہوئی، شرعی طریقے سے کچھ بیچا اور کسی نے وہ خریدا، اور اس کے معاوضے میں اس کی قیمت چکائی، تو اب وہ مال یتیم کا نہیں رہا، جس نے خریدا وہ اس کی ملک ہو گیا۔

لیکن اس آیت میں تو یتیم کا مال ناحق طریقے سے استعمال کرنے کی تعبیر اختیار کی گئی۔ معلوم ہوا کہ اس بارے میں بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی تاکید کی جا رہی ہے۔

یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ

دوسری آیت لائے ہیں: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (الأنعام: ۱۵۲)﴾ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ؛ مگر اس طریقے سے جو بہتر ہو۔ یعنی اس کے مال کو ٹھیک کرنے کے لئے، اس کی بھلائی اور خیر خواہی کے لئے اگر آپ اس میں کوئی تصرف کرتے ہیں اور اس کا آپ کو شریعت کی طرف سے اختیار بھی دیا گیا ہے؛ تب تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس میں

آپ کو ہاتھ ڈالنے کی اجازت نہیں، اس کے قریب بھی جانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ بہت زیادہ احتیاط کی چیز ہے۔ اس سلسلے میں ہمارے اکابر بہت زیادہ احتیاط فرماتے تھے۔

ایک واقعہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ: ایک آدمی بیمار تھا، ایک بزرگ اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، وہ اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران اس کا انتقال ہو گیا، رات کا وقت تھا اور چراغ جل رہا تھا، انہوں نے فوراً وہ چراغ بجھا دیا، اور اپنے پاس سے پیسے دے کر تیل منگوایا اور دوسرا چراغ حاصل کر کے اس کو جلوایا، اور کہا: جب تک یہ آدمی زندہ تھا، وہاں تک یہ چراغ اور اس میں جلنے والا تیل اس کی ملکیت تھا، جیسے ہی اس کی موت واقع ہو گئی تو اب اس کی ملکیت نہیں رہی، بلکہ اس کے ورثاء کی ملکیت میں آ گیا۔ اور یہاں اس کے سب ورثاء موجود نہیں ہیں، اور ان کی اجازت کے بغیر اس کو استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

یتیم کے مال میں کسی کو ناحق تصرف کا حق نہیں

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً: ایک آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس کی اولاد میں ایک دو لڑکے لڑکیاں بالغ ہیں، اور دوسری اولاد نابالغ ہے، تو اب ان بالغ اولاد کی بہت بڑی ذمہ

داری ہو جاتی ہے۔ بہت سی مرتبہ ماں اس زعم اور خوش فہمی میں کہ مَیں تو ماں ہوں، جو چاہوں کر سکتی ہوں، یتیم بچوں کے مال کے اندر تصرف کرتی ہے، اور وہ بھی اس وعید کی حقدار بن جاتی ہے۔ اس لیے معلوم ہونا چاہیے کہ شریعت کا اصول اپنی جگہ پر ہے، چاہے ماں ہو یا اور کوئی ہو، کسی کو بھی یتیم کے مال کو ناحق طریقے سے استعمال کرنے کی شریعت کسی بھی حال میں اجازت نہیں دیتی۔

بہت سی جگہوں پر ایسا ہوتا ہے کہ جس مال میں یتیم کا حق ہو اس کو تقسیم کئے بغیر استعمال میں لایا جاتا ہے، اس صورت میں یتیم بچے کا جتنا حق ہوتا ہے خود اس کے استعمال میں تو اس میں سے بہت کم آتا ہے، اور اس کے بڑے بھائی، یا اس کی ماں اور چچا وغیرہ اپنے حق سے زیادہ استعمال کر لیتے ہیں، حالاں کہ اس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس لئے علماء نے سخت تاکید فرمائی ہے کہ یتیم کے مال کو تقسیم کر کے الگ کر دیا جائے اور اس کی ضرورتوں کے علاوہ اس کو استعمال نہ کیا جائے۔

یتیم کے مال کے متعلق قرآنی مشورہ

﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡيَتَٰمَىٰ قُلۡ إِصۡلَاحٞ لَّهُمۡ خَيۡرٞۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمۡ فَإِخۡوَٰنُكُمۡ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ ٱلۡمُفۡسِدَ مِنَ ٱلۡمُصۡلِحِ (البقرۃ:۲۲۰)﴾ اے نبی! یہ لوگ آپ سے یتیموں کے تعلق سے پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اگر ان کے مال اور جائیداد کی درستگی مقصود ہے

تب تو بہتر ہے۔ اور اگر کھانے پینے میں ان کو اپنے ساتھ کر لیتے ہو تو یہ بھی تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور تم میں کون درستگی کا خیال رکھنے والا ہے اور کون بگاڑنے والا ہے دونوں کو اللہ تعالیٰ بخوبی جانتے ہیں۔

دراصل یتیموں کے مال کے سلسلے میں جب قرآن پاک میں اتنی سخت وعیدیں آئیں اور نبی کریم ﷺ نے بھی تاکید فرمائی تو حضراتِ صحابہ ڈر گئے، اور یتیم کا سارا مال الگ کر دیا، اوران کے لئے کھانا انہیں کے مال میں سے الگ پکوایا جانے لگا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک بچہ کے مال میں سے جب اسی کے لیے الگ کھانا پکایا جائے گا تو جتنا پکایا گیا ہے وہ پورا تو نہیں کھا پائے گا، اور اس کے لئے مستقل پکانے میں خرچ بھی زیادہ ہوتا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ وہ پورا نہیں کر پائے تو بگڑ جاتا ہے۔ اور اپنے ساتھ اپنے کھانے میں اس کو ملانے کی صورت میں ڈر لگتا تھا کہ کہیں ان کا مال کھانا لازم نہ آجائے جب یہ صورتیں پیش آئیں تو اس سلسلہ میں باری تعالیٰ نے یہ آسانی پیدا فرمائی کہ تم اپنے کھانے پینے میں ان کو شریک کر لو، اور حساب میں اپنی طرف زیادہ رکھ لو، اُس کی طرف کم رکھ لو؛ تاکہ معاملہ آسان ہو جائے، اور تمہاری نیت یہ ہو کہ اس کو اپنے ساتھ ملا کر کھلانے میں اس کا خرچ کم ہو جائے گا اور اس کے مال کی بھی حفاظت ہو جائے گی، اگر تمہاری نیت یہ ہے اور واقعۃً تم اپنی اس نیت کے مطابق شرعی طریقہ سے اس کے مال کی حفاظت کا اہتمام کروگے، تو اللہ تعالیٰ دلوں کے حال سے بخوبی

واقف ہے کہ کون درستگی کرنے والا ہے، اور کون بگاڑنے والا ہے؛ تو اس صورت میں ان شاء اللہ گرفت نہیں ہوگی۔

یہ سب ناجائز ہے

اور بہت سی جگہوں پر عام رواج ہوتا ہے کہ جب کسی کا انتقال جاتا ہے تو ورثاء کے علاوہ اس کے گھر کے دوسرے بڑے لوگ، جیسے: مرنے والے کے بڑے بھائی وغیرہ تو میت کی اولاد اور بیوی کے ہونے کی وجہ سے وارث نہیں ہوتے، لیکن عام طور سے اس وقت سارا تصرف اور کاروبار گھر کے بڑے لوگ ہی اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں، اس کے جو حقیقی وارث ہیں ان سے تو کوئی پوچھتا ہی نہیں، اور کہہ دیتے ہیں کہ اتنا اناج فقیروں کو دیدو، اور اس کے کپڑے بھی غریبوں میں تقسیم کر دو۔ یہ سب ناجائز ہے، ہمارے معاشرہ کے عام دستور اور رسم ورواج کے تابع ہو کر لوگ ایسی چیزیں کر ڈالتے کہ اس کے لئے صدقہ کر دو۔ اس صورت میں اس کو ثواب تو کیا ملتا، اُلٹا ان کی گرفت ہوتی ہے۔ اور اگر اس پر ثواب کی نیت کر لیں گے تو اس پر علماء نے بڑا سخت حکم لکھا ہے، اس لئے یہ ساری چیزیں بڑی احتیاط کی ہیں۔

علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ پہلے ہر ایک وارث کے حصے تقسیم کر دیئے جائیں، اور ہر ایک کے پاس جب اس کا حصہ آجائے پھر جو اپنی طرف سے جتنا چاہے مرحوم کے لیے صدقہ کرے۔ سب کے سامنے ہر ایک وارث سے اجازت لینے کی صورت میں ہو سکتا ہے

کہ کوئی وارث دل سے تو دینا نہیں چاہتا، لیکن وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ اگر میں منع کروں گا تو لوگ کہیں گے کہ ابا کے لئے دینے کا پوچھا گیا، اس میں بھی اس نے منع کر دیا؛ تو مارے شرم کے وہ اجازت دیدیتا ہے۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ کسی بھی مسلمان کا مال اس کی دلی خوشنودی کے بغیر لینا حلال نہیں ہے۔ اس لئے صدقہ کا بھی بہتر طریقہ یہی ہے کہ پہلے ہر ایک کو اس کا حصہ دیدیا جائے۔ اس سلسلہ میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔

ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو

حدیث ۱۶۱۴:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه عن النبيِّ ﷺ قالَ: ((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ المُوبِقَاتِ!)) قالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ، وَمَا هُنَّ؟ قالَ: الشِّرْكُ باللهِ، والسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتى حَرَّمَ اللهُ إلاَّ بالحَقِّ، وأكْلُ الرِّبَا، وأكْلُ مَالِ اليَتِيمِ، والتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحفِ، وقَذْفُ المُحْصَنَاتِ المُؤْمِنَاتِ الغَافِلاَتِ. (متفق عَلَيْهِ)

((المُوبِقَاتِ)): المُهْلِكَات.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ سات چیزیں کون کون سی ہیں؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (۲) جادو کرنا کرانا (۳) ناحق کسی کو قتل کرنا (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) (اللہ کے راستے میں

لڑائی کے دن مقابلہ سے میدان چھوڑ کر بھاگ جانا(۷) پاک دامن ایمان والی بھولی بھالی عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

افادات:- جادو بہت بڑا گناہ ہے، جو آدمی جادو کر کے لوگوں کو تکلیف اور نقصان پہنچاتا ہے شریعت نے اس کی سزا قتل تک کی مقرر کی ہے۔

اور یتیم کا مال کھانا ایسا کبیرہ گناہ ہے جس کو ہلاک کرنے والی چیزوں میں شمار کرایا گیا ہے۔ اس روایت کو یہاں اسی مناسبت سے لائے ہیں۔

باب تغلیظ تحریم الربوا

سود کی سخت حرمت کا بیان

قَالَ اللهُ تَعَالَى: الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ، ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا، وَأَحَلَّ اللهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا، فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَأَمْرُهُ إِلَى اللهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. يَمْحَقُ اللهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ - إِلَى قَوْلِهِ تَعَالَى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا. (البقرۃ: ۲۷۵ تا ۲۷۸)

تمہارا جو سود باقی ہے وہ بھی چھوڑ دو

باری تعالیٰ فرماتے ہیں: جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے روز اپنی قبروں سے نہیں اٹھیں گے مگر اس آدمی کی طرح جس کو جن نے لپٹ کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ اور یہ سزا ان کو اس لئے دی جائے گی کہ وہ کہتے تھے کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام ٹھہرایا ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچی اس کو سن کر وہ اپنی سود کھانے والی حرکت سے باز آگیا تو پہلے جو کچھ ہو چکا ہو وہ اس کی ملکیت ہے۔ (یعنی سود کے حرام ہونے کا حکم نازل ہونے سے پہلے جو

آدمی سود لے چکا تو اس کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے۔) اور اس کی توبہ سچے دل سے ہے یا کیسی ہے، اس کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اور جو دوبارہ ایسی حرکت کرے ایسے لوگ جہنمی ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔

جس وقت سود کی حرمت کا حکم نازل ہوا تو بہت سوں نے سودی معاملے کر رکھے تھے اور لوگوں کے سود دوسروں کے اوپر حساب میں باقی تھے، ان کے لیے باری تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تمہارا جو سود باقی ہے وہ چھوڑ دو۔

سود لینے دینے والے پر لعنت

حدیث ۱۶۱۵:-

وعن ابن مسعود -رضی اللہ عنہ- قَالَ: لَعَنَ رسول اللہ -صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم- آكِلَ الرِّبَا وَمُوكِلَهُ. (رواہُ مسلم)

زاد الترمذی وغیرہ: وَشَاهِدَيْهِ وَكَاتِبَهُ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے سود دینے والے پر اور سود لینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔

ترمذی شریف کی روایت میں ہے: سود کے معاملہ پر جو دو گواہ بنتے ہیں اور جو سود کی تحریر لکھتے ہیں؛ ان پر بھی لعنت فرمائی ہے۔

افادات:–حالاں کہ یہ تو نہ سود لے رہے ہیں اور نہ دے رہے ہیں، لیکن گواہ تو بن رہے ہیں، اس لیے ان پر بھی لعنت فرمائی۔ اس سے سود کی قباحت و برائی معلوم ہوتی ہے۔

آج کل ہمارے سماج میں سود کا معاملہ بہت زیادہ بڑھتا جا رہا ہے، لوگ اس کی حقیقت سے بھی واقف نہیں۔ اس سلسلہ میں بے شمار روایتیں ہیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قرآنِ پاک کی سات آیتیں اور چالیس سے زیادہ حدیثیں سود کے سلسلے میں آئی ہیں۔ کسی بھی حرام چیز کے سلسلے میں اتنی سخت تاکید قرآن و حدیث میں نہیں ہوگی جتنی سود کے سلسلے میں ہے؛ اس کے باوجود جتنی زیادہ بے احتیاطی سود کے معاملہ میں ہمارے یہاں کی جاتی ہے کسی اور چیز کے معاملہ میں نہیں کی جاتی۔

اَحسن الفتاویٰ کا ایک مضمون

اس سلسلہ میں اَحسن الفتاویٰ(جلد:۷، ص:۱۳۱) میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی نور اللہ مرقدہٗ کا ایک مضمون("بشارۃ اللّظی لِاٰکل الرّبوٰا" کے نام سے) ہے اس کا کچھ حصہ آپ حضرات کو سناتا ہوں، حضرت تحریر فرماتے ہیں:–

جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان (جن) خبطی بنا دے لپٹ کر۔ یہ سزا اس لئے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع (تجارت) بھی تو مثل سود کے ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بیع (تجارت) کو حلال فرمایا ہے

اور سود کو حرام کر دیا ہے، پھر جس شخص کو اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آگیا تو جو کچھ پہلے ہو چکا ہے وہ اسی کا رہا، اور معاملہ اس کا اللہ کے حوالے رہا۔ اور جو شخص پھر عود کرے تو یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اس آیت میں سود خوروں کا عبرت انگیز انجام بیان کیا گیا ہے کہ وہ محشر میں اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے آسیب زدہ خبطی انسان کھڑا ہوتا ہے، چوں کہ یہ لوگ دنیا میں حبِ مال کے مرض میں جنون کی حد تک گرفتار تھے۔ ایسا جنون (پاگل پن) جس نے بیع (تجارت) اور ربا (سود) کا فرق بھی ان پر اوجھل کر دیا، اس لئے قیامت میں بھی اللہ تعالیٰ انہیں اسی کیفیت میں اٹھائیں گے کہ یہ خبط و جنون سارے لوگوں کے سامنے عیاں ہو گا۔ جیسے مومنینِ متقین محشر میں روشن جبین، روشن اعضاء کے ساتھ پہچانے جائیں گے، یونہی یہ سود خور اپنے دیوانہ پن اور غیر انسانی حرکات کے ساتھ پوری انسانیت کے روبرو ذلیل و خوار ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ناقابل معافی گناہوں سے بچو، منجملہ ان کے مالِ غنیمت کی چوری ہے، جو شخص غنیمت کی کوئی چیز چرائے گا، قیامت کے دن اسے لے کر حاضر ہو گا۔ اور سود خوری ہے۔ جس نے سود کھایا وہ قیامت کے دن خبطی اور مجنون بنا کر اٹھایا جائے گا۔ پھر آپ ﷺ نے دلیل میں یہی آیت تلاوت فرمائی۔

(روح المعانی، ص:۴۲/ ج:۳۔ مجمع الزوائد، ص:۱۱۹/ ج:۴)

سود خوروں کی اس سزا کا سبب ان کا یہ قول ”إِنَّمَا البَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا“ ہے، ایک تو ان لوگوں نے ایک قطعی حرام کا ارتکاب کر کے قانونِ الٰہی کی صریح خلاف ورزی کی۔ یہی جرم کچھ کم سنگین نہ تھا کہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر قانون کو چیلنج کر دیا کہ ”بیع بھی تو مثل سود کے ہے“ اس جرم بغاوت کی پاداش میں ہمیشہ کے لئے جہنم کا ایندھن قرار پائے۔

دوسری آیت ہے: اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ پسند نہیں کرتے کسی کفر کرنے والے کو، کسی گناہ کرنے والے کو۔ سودی مال جتنا بھی بڑھ جائے، انجام کار اللہ تعالیٰ اسے مٹا کر نیست و نابود کر دیتے ہیں، ایسا مال نہ دنیا میں پھلتا ہے، نہ آخرت میں بارآور ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کا مال اگرچہ بڑھ جائے مگر اس کا انجام ہمیشہ بے برکتی اور کمی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ (مسند احمد، ص:۵/۶۹۔ ابن ماجہ، ص:۱۶۵۔ حاکم، ص:۳۷/ج:۲)

دیکھو مجھے

اس مالِ خبیث کا کثرت سے قلت کی طرف آنا کوئی نظریاتی مسئلہ نہیں، بلکہ کھلی آنکھوں مشاہدہ ہے کہ سود خور کا مال بڑھ جاتا ہے اور بڑھتے بڑھتے طومار لگ جاتا ہے، حتیٰ کہ بہت سے دیکھنے والوں کی رالیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ یٰلَيْتَنَا مِثْلَ مَا أُوْتِيَ۔

مگر جوں جوں اس پر مصیبت آتی ہے کہ یک بیک کروڑوں سے لڑھک کر لاکھوں میں، پھر لاکھوں سے ہزاروں اور سینکڑوں میں آجاتا ہے، بالآخر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو کر زبانِ حال سے پکار اٹھتا ہے:۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

یہ بھی ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس قسم کے اموال کی نکاسی کسی جائز اور معقول مصرف میں نہیں ہوتی، یہ عموماً چوروں ڈاکوؤں کے پیٹ میں اتر جاتا ہے، یا پولس اور اہل کاروں کا لقمۂ تر بن جاتا ہے، یا پھر ناگہانی آفات و حوادث کی نذر ہو جاتا ہے۔ نیز الیکشن (جس میں چار پانچ ملین کا خرچہ تو معمولی سی بات ہے) کا بھوت بھی ایسے ہی لوگوں کے سر پر سوار ہوتا ہے، اور کون نہیں جانتا کہ قحبہ خانوں، قمار خانوں اور شراب خانوں کی رونق بھی انہیں لوگوں کے دم قدم سے رہتی ہے۔ غرض حرام کا پیسہ "مالِ حرام بود، بجائے حرام رفت" کے مصداق اپنی نکاسی کی راہیں خود ہی تلاش کر لیتا ہے۔

اگر شاذونادر سود کسی کے پاس محفوظ رہ جائے تب بھی سود خور کی طبیعت میں سنگ دلی، تنگ دلی، بزدلی، جنون کی حد تک حرص و ہوس اور خست اور دناءت کے دوسرے مظاہر کی صورت میں اس کے نتائج ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔

یہ اس کا دنیوی انجام تھا، آخرت میں سود کا مال بے سود و بے بہبود ہونا بالکل عیاں ہے، ایسا مال کمانے والے کے گلے کا طوق اور سر کا وبال ہے۔ اس مال سے کیا گیا صدقہ و خیرات، حج اور جہاد اور صلہ رحمی غارت اور اکارت ہے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! سن لو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاکیزہ ذات ہے، اس کی بارگاہ میں صرف پاک مال ہی شرفِ قبول پاتا ہے۔ (صحیح مسلم، ص:۳۲۶/ج:۱)

صدقہ کو اللہ تعالیٰ بڑھاتے ہیں

سود کے برعکس صدقہ کے مال کو اللہ تعالیٰ بڑھاتے ہیں، دنیا میں بھی؛ آخرت میں بھی۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ہر صبح دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں، ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو بدلہ عطا فرما۔ دوسرا کہتا ہے: اے اللہ! مال روک کر رکھنے والے کو بربادی دے۔ (صحیح بخاری، ص:۱۹۴/ج:۱۔ صحیح مسلم، ص:۳۲۵/ج:۱)

رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے پاکیزہ کمائی سے کھجور کے دانے برابر بھی صدقہ کیا - اور اللہ تعالیٰ پاکیزہ مال ہی قبول کرتے ہیں - تو اللہ تعالیٰ داہنے ہاتھ میں لے کر اسے قبول کرتے ہیں، پھر صدقے والے کے لئے اسے بڑھاتے رہتے ہیں جیسا کہ تم میں ایک آدمی اپنے بچھڑے کو پال پوس کر بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ صدقہ بڑھ کر پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے۔

جیسے حرام مال کی تباہی کی قدرے تفصیل بتائی گئی، اسی طرح پاکیزہ مال میں اللہ کی طرف سے برکت اور زیادتی بھی ایک مشاہد حقیقت ہے۔ ایک تو ایسا مال کسی غلط جگہ ضائع نہیں جاتا۔ دوسرے عام لوگ جس مقصد کے لئے بڑی محنت و دولت صرف کرتے ہیں، صالح اور دیندار مسلمان کا وہ مقصد تھوڑے سے مال میں گھر بیٹھے نکل آتا ہے۔

درسِ عبرت

زکوٰۃ و صدقات کی برکت سے مال کا بڑھنا، ان کے روکنے کی نحوست سے مال کا گھٹنا: ایک ایسی روشن حقیقت ہے، جس سے کسی منصف مزاج کافر کو بھی مجالِ انکار نہیں؛ مگر افسوس! رنگ و بو کی ظلمت نے آج کے مسلمان کی نظر سے اس چمکتی اور روشن حقیقت کو بھی او جھل کر دیا۔ اس مسلمان معاشرے میں کتنے مسلمان ہیں جو زکوٰۃ کے فریضے کو چھوڑتے ہیں، انہیں اپنے مال کا چالیسواں حصہ نکالنا گوارا نہیں، مگر دوسری طرف یہ گوارا ہے کہ اچانک بیماری، آفتیں، حوادث، ناجائز مصارف میں ان سے بھی دس گنا زائد مال نکل جائے۔ع

خو سمجھ میں نہیں آتی ترے دیوانوں کی

کوٹھی نہیں جلی

ذیل میں ایک دشمنِ اسلام انگریز کا واقعہ درج کیا جارہا ہے شاید کسی غافل مسلمان کی چشمِ عبرت کھل جائے۔

حضرت اقدس مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ:

میں نے اپنے بچپن میں اپنے والد صاحب سے اور دوسرے کئی لوگوں سے بھی یہ قصہ سنا کہ ضلع سہارنپور میں قصبہ بہٹ سے آگے انگریزوں کی کچھ کوٹھیاں تھیں، منجملہ ان کے پیلو میں۔ جہاں اعلیٰ حضرت رائپوری نوراللہ مرقدہٗ کا وصال ہوا۔ اور اس کے قرب وجوار میں بہت سی کوٹھیاں کاروباری تھیں جن میں ان انگریزوں کے کاروبار ہوتے تھے، اور ان میں مسلمان ملازم کام کیا کرتے تھے، اور وہ انگریز دلی، کلکتہ وغیرہ بڑے شہروں میں رہتے تھے۔ کبھی کبھی معاینہ کے طور پر آکر اپنے کاروبار کو دیکھ جاتے تھے، ایک مرتبہ اس جنگل میں آگ لگی جو کبھی کبھی مختلف وجہوں سے لگتی رہتی تھی اور وہاں کے باغات اور جنگلات کو جلا دیتی تھی۔ ایک دفعہ اس جنگل میں آگ لگی اور قریب قریب ساری کوٹھیاں جل گئیں۔ ایک کوٹھی کا ملازم اپنے انگریز آقا کے پاس دلی بھاگا ہوا گیا اور جا کر واقعہ سنایا کہ حضور! سب کی کوٹھیاں جل گئیں اور آپ کی بھی جل گئی۔ وہ انگریز کچھ لکھ رہا تھا، نہایت اطمینان سے لکھتا رہا، اس نے دھیان بھی نہیں دیا۔ ملازم نے دوبارہ زور سے کہا: حضور! سب جل گیا۔ اس نے دوسری مرتبہ بھی لاپرواہی سے جواب دے دیا کہ میری کوٹھی نہیں جلی، اور بے فکری سے لکھتا رہا۔ ملازم نے جب تیسری مرتبہ کہا تو اس نے کہا کہ: میں مسلمانوں کے طریقے پر

زکوٰۃ ادا کرتا ہوں، اس لئے میرے مال کو نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ وہ ملازم تو جواب دہی کے خوف سے بھاگا ہوا گیا تھا کہ صاحب کہیں گے کہ ہمیں خبر بھی نہیں کی، وہ انگریز کی اس لاپرواہی سے جواب کو سن کر واپس آگیا اور دیکھا تو واقعتاً سب کوٹھیاں جل چکی تھیں، مگر اس انگریز کی کوٹھی باقی تھی۔

اللہ کی شان! کہ اسلامی احکام پر عمل کر کے غیر مسلم تو فائدہ اٹھاویں اور ہم لوگ زکوٰۃ ادا نہ کر کے اپنے مالوں کو نقصان پہنچاویں۔ کہیں چوری ہو جاوے، کہیں ڈاکہ پڑ جاوے، کہیں کوئی اور آفت مسلط ہو جائے۔ (آپ بیتی، ص:۸۸/ ج:۶)

اعلانِ جنگ

ایک اور آیت ہے:-

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر ایمان والے ہو۔ پھر اگر نہ کرو گے تو اشتہار سن لو جنگ کا اللہ کی طرف سے اور اس کے رسول کی طرف سے۔ اور اگر تم توبہ کر لو گے تو تمہیں تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤ گے، نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔

حضراتِ مفسرین نور اللہ مرقدہُ نے ان دونوں آیتوں کا شانِ نزول یہ لکھا ہے کہ ثقیف کے خاندان عمرو بن عمیر کے مخزومی خاندان بنو مغیرہ کے ذمے سودی قرض چلے آرہے

تھے، انھوں نے سود کی حرمت کے بعد جب قرض کا سود کے ساتھ مطالبہ کیا تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اب مسلمان ہونے کے بعد ہم اپنے زمانۂ اسلام کی کمائی میں سے سود ادا نہیں کریں گے۔ دونوں خاندانوں کا معاملہ مکہ مکرمہ کے گورنر حضرت عتاب بن اسید (رضی اللہ عنہ) کی عدالت میں آیا تو انھوں نے یہ قضیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لکھ بھیجا۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں جنھیں لکھ کر حضور ﷺ نے حضرت عتاب (رضی اللہ عنہ) کے پاس روانہ کر دیا۔ قرآن مجید کی یہ دو ٹوک تنبیہ سن کر بنو ثقیف کے لوگ کہنے لگے: ہم اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرتے ہیں اور بچا ہوا سود چھوڑ دیتے ہیں، پس اس میں سے کچھ وصول نہ کیا۔ (ابن کثیر، ص:۳۳۰/ج:۱)

ان دونوں آیتوں میں سود خوری پر دو سخت وعیدیں سنائی گئیں۔ ایک تو سود نہ چھوڑنے پر زمرۂ مومنین سے خارج ہونے کی وعید ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَأَطِيعُوا اللهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾ اس وعید کا خلاصہ یہ ہے کہ: اگر تم مؤمن ہو تو ایمان کا تقاضا پورا کرو اور اس جرم سے باز آجاؤ، ورنہ تمہارے دعویٰ ایمان کا کوئی اعتبار نہیں۔ دوسری وعید سود نہ چھوڑنے کی صورت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا اعلانِ جنگ ہے۔ یہ سود خوری کے لئے سب سے بڑی اور آخری تنبیہ ہے کہ اس جرم سے باز آجاؤ؛ ورنہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں: قیامت کے روز سود خور سے کہا جائے گا کہ: ہتھیار بند ہو کر جنگ اور لڑائی کے لئے آمادہ ہو جا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (ابن کثیر، ص:۳۳۰/ج:۱)

اور آپ ہی سے منقول ہے کہ: جو شخص سود خوری سے باز نہ آئے، تو حاکمِ مسلم پر فرض ہے کہ اول اسے توبہ کی تلقین کرے، اگر باز آجائے تو ٹھیک؛ ورنہ اس کی گردن اڑا دے۔ (حوالہ بالا)

سود خوروں پر اللہ کا غضب اور عذاب اتنا شدید ہے کہ قرآنِ کریم میں شرک کے بعد سود خوری کے سوا کسی بڑے سے بڑے گناہ پر اعلانِ جنگ نہیں فرمایا۔ اگر کسی سود خور کے دل میں ذرّہ برابر بھی آخرت کی فکر ہو؛ تو اسے جھنجھوڑنے کے لئے یہ وعید کافی ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں کبائر کی ایک لمبی فہرست ملتی ہے، مگر کسی کبیرہ سے کبیرہ جرم پر بھی یہ وعید نہیں سنائی گئی۔

شرعی، معاشی، تمدنی، اخلاقی، انسانی نقطۂ نظر سے سنگین جرم

سود صرف شرعی نقطۂ نظر سے نہیں؛ بلکہ معاشی، تمدنی، اخلاقی، انسانی پہلو سے بھی ایک سنگین بدترین اور مہلک ترین جرم ہے۔ سود خور درحقیقت آدم خور درندہ ہے، بلکہ

درندہ سے بھی مہلک تر۔ درندہ بھی اپنے ہم جنس درندے پر بہت کم ہاتھ ڈالتا ہے، مگر انسانی روپ میں یہ درندہ اپنی ہی برادری کا خون چوس چوس کر پلتا ہے۔

امام ابوعبداللہ قرطبی نور اللہ مرقدہٗ نے ﴿فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ایک شخص امام مالک بن انس نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں آیا اور عرض کیا: میں نے شراب کا ایک ایسا رسیا اور نشے میں چور آدمی دیکھا جو چاند کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا، اس پر میں نے کہا: اگر انسان کے پیٹ میں شراب سے بھی بدتر کوئی چیز اترنے والی ہو تو میری بیوی کو طلاق۔ آپ نے فرمایا: ابھی لوٹ جاؤ کہ میں تمہارے مسئلے میں غور کرلوں۔ وہ دوسرے دن آیا تو بھی فرمایا: ابھی لوٹ جاؤ، میں تمہارے مسئلے میں غور کرلوں۔ وہ تیسرے دن آیا تو فرمایا: تمہاری بیوی کو طلاق پڑ گئی۔ اس لئے کہ میں نے کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ میں انتہائی غور و تدبر کیا، مگر سود سے بدتر کوئی چیز نظر نہ آئی، اس لئے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن ۳/۳۶۴)

"يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ، وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ" اے ایمان والو! سود مت کھاؤ کئی حصے زائد، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو؛ امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔ اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

پہلی آیت میں تقویٰ کی تلقین کی گئی کہ اللہ کا خوف کھا کر سود سے باز آ جائو۔ زمانۂ جاہلیت میں عام دستور تھا کہ مہاجن ایک متعین میعاد باندھ کر سود پر قرض دیتے تھے، میعاد گزرنے پر جب قرضدار قرض ادا کرنے کی سکت نہ پاتا تو مہاجن سود کی مقدار بڑھا کر آ گے کے لئے مزید مہلت دے دیتا (جس کو ”چکروَرتی سود“ کہتے ہیں) دوسری میعاد آنے پر بھی جب قرضدار ادا نہ کر پاتا تو سود اور بڑھا دیا جاتا، اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ یہ سود دوچند در دوچند ہو تا جاتا۔ آیتِ بالا میں مسلمانوں کو ڈرایا گیا کہ اس انسانیت کش حرکت سے دور رہیں۔

”أَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً“ کا یہ مطلب نہیں کہ سود صرف اسی صورت میں حرام ہے جب وہ دوچند در دوچند ہو۔ یہ قید احترازی نہیں، بلکہ واقعی ہے، یعنی زمانۂ جاہلیت میں سود لینے دینے کا جو غیر انسانی طریقہ جاری تھا اس کی مذمت ہے، ورنہ سود کی تمام صورتوں کا حرام ہونا اوپر کی آیات میں گزر چکا۔

احادیث دربابِ سود

نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: سات مہلک گناہوں سے بچو۔ صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: یارسول اللہ! وہ کون سے ہیں۔ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی ذات یا صفات میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ جادو کرنا۔ ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جس کا قتل اللہ تعالیٰ

نے حرام قرار دیا، مگر جائز طور پر بحکمِ شریعت۔ سود کھانا۔ یتیم کا مال کھانا۔ اللہ کے دشمنوں سے گھمسان کی جنگ میں پیٹھ پھیر کر بھاگنا۔ اور پاک دامن بے خبر مؤمنہ بیبیوں پر تہمت لگانا۔ (متفق علیہ)

نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: رات میں نے خواب دیکھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے اور مجھے ایک پاکیزہ سرزمین کی طرف لے گئے، ہم چلتے رہے یہاں تک خون کی ایک نہر پر پہنچے جس میں ایک آدمی کھڑا تھا اور نہر کے کنارے ایک اور آدمی کھڑا تھا جس کے سامنے پتھر پڑے تھے۔ جو آدمی نہر کے اندر تھا اس نے چلنا شروع کیا اور جب اس نے نہر سے نکلنا چاہا تو کنارے پر کھڑے شخص نے پتھر مار کر اسے اس کی پہلی جگہ کی طرف لوٹا دیا۔ اسی طرح وہ جب بھی نکلنے کی کوشش کرتا یہ اس کے منھ پر پتھر مار کر اس کی پہلی جگہ کی طرف لوٹا دیتا۔ میں نے پوچھا: یہ کون ہے؟ اس نے کہا: نہر کے اندر کا شخص- جس پر پتھر مارے جا رہے ہیں- سود خور ہے۔ (بخاری)

رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، سود کی تحریر لکھنے والے اور سود پر گواہ بننے والے پر لعنت بھیجی۔ اور فرمایا: یہ سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ (سنن ابی داود، ترمذی)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: چار شخصوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ انہیں جنت میں داخل نہ کریں گے، نہ اس کی نعمتیں چکھائیں گے۔ (۱) شراب کا رسیا (۲) سود کھانے والا (۳) ناحق یتیم کا مال اُڑانے والا (۴) والدین کا نافرمان۔ (مستدرک، ص:۳۷/ ج:۲)

نبیٔ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود میں تہتر گناہ ہیں، جن میں ادنیٰ ترین گناہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنی ماں سے بدکاری کرے، اور بدترین سود کسی مسلمان کی آبروریزی ہے۔(حوالہ بالا)

حضرت عبداللہ بن سلام (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: سود میں بہتّر گناہ ہیں جن میں سے ادنیٰ گناہ یہ ہے کہ کوئی آدمی حالتِ اسلام میں اپنی ماں سے بدکاری کرے۔ اور سود کا ایک درہم تینتیس (۳۳) بار زنا کرنے سے زیادہ برا ہے۔ مزید رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ہر نیک اور بد کو سیدھے طور کھڑا ہونے کا حکم فرمائیں گے سوائے سود خور کے؛ کہ وہ کھڑا نہیں ہو سکے گا مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنادے لپٹ کر۔ (مصنف عبدالرزاق ۱۰/ ۴۶۱۔ شعب الایمان ۴/ ۳۹۲۔ الدر المنثور ۱/ ۳۶۴)

رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے ناجائز طور پر کسی ظالم کی مدد کی تا کہ وہ کسی کا حق دبا لے؛ تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی ذمہ داری سے نکل گیا یعنی دونوں اس سے بیزار اور بری ہیں۔ اور جس نے سود کا ایک درہم کھایا تو یہ تینتیس (۳۳) بار زنا کرنے کے برابر ہے، اور جس کا گوشت اور پوست حرام مال سے پیدا ہوا وہ جہنم میں جانے کا زیادہ حقدار ہے۔

(المعجم الصغیر للطبرانی ۱/ ۱۴۷۔ والاوسط، شعب الایمان، ۴/ ۳۹۳۔ مجمع الزوائد ۴/ ۱۱۷)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: سود کا ایک درہم جسے کوئی جانتے ہوئے استعمال کرے؛ چھتیس(۳۶) زنا سے بدتر ہے۔(مسند احمد ۱۵/۶۹۔ مجمع الزوائد ۴/۱۱۷)

رسولِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس قوم میں زنا اور سود کا ظہور ہوا، اس قوم نے یقیناً اللہ تعالیٰ کا عذاب اپنی جانوں پر اُتار لیا۔(مسند ابی یعلی ۵/۱۳۔ مجمع الزوائد ۴/۱۱۸)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: شبِ معراج میں جب ہم ساتویں آسمان پر پہنچے، تو میں نے اوپر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اچانک گرج، بجلی اور کڑک محسوس کی، آپ ﷺ نے فرمایا: ایک ایسی قوم پر میرا گزر ہوا جن کے پیٹ ایسے تھے جیسے بڑے بڑے کمرے اور مکان، جن میں سانپ بھرے ہوئے تھے جو پیٹوں کے باہر سے نظر آرہے تھے۔ میں نے پوچھا: جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے بتایا: یہ سود خور ہیں۔ (مسند احمد ۲/۲۵۶۔ سنن ابن ماجہ، ص: ۱۶۴۔ مجمع الزوائد ۴/۱۱۷۔ تفسیر ابن کثیر ۱/۳۲۶)

آپ ﷺ نے حجۃ الوداع کے طویل خطبہ میں ارشاد فرمایا: سن لو! زمانۂ جاہلیت کی تمام رسمیں میرے قدموں تلے روند دی گئیں، اور زمانۂ جاہلیت کے خون (یعنی ان کے قصاص ودیت) ختم کر دیئے گئے، سب سے پہلا قتل جسے میں معاف کرتا ہوں اپنے خاندان میں سے ربیعہ بن حارث کا قتل ہے جو قبیلۂ بنو سعد میں شیر خوار تھے اور انہیں قبیلۂ ہذیل نے قتل کر دیا تھا۔ اور زمانۂ جاہلیت کے تمام سود بھی (پاؤں تلے) روند دیے گئے، اور سب سے پہلا سود

جو میں چھوڑتا ہوں وہ (میرے چچا) حضرت عباس بن عبد المطلب (رضی اللہ عنہ) کا سود ہے، وہ سب کا سب چھوڑ دیا گیا۔ (صحیح مسلم ۱/۳۹۷۔ مسند احمد ۲۱/۲۸۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ نجران کے لئے یہ تحریر لکھوائی:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم! یہ وہ عہد نامہ ہے جو محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اہلِ نجران کے لئے لکھوایا۔ (الیٰ قولہ) نجران اور ان کے ملحقات کے لئے اللہ کی پناہ اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے حفاظت کی ذمہ داری ہے، ان جانوں کے لئے، ان کے مذہب کے لئے، ان کی اراضی و اموال اور ان کے غائب و حاضر کے لئے، اور ان کی برادری اور ان کی عبادت گاہوں کے لئے، اور اس بات کی ذمہ داری ہے کہ ان کے دین و مذہب اور حقوق میں سے کسی چیز میں تبدیلی نہ لائی جائے گی، اور ان اہلِ ذمہ میں سے جو آدمی سود کھائے گا تو اس سے (مذکورہ بالا تمام امور میں) مَیں بری الذمہ ہوں۔

قابلِ توجہ بات

ایک بات یاد رہے کہ اسلامی حکومت میں جو غیر مسلم رہ رہیں ہوں ان کو اپنے لیے شراب کا کاروبار کرنے کی اجازت ہے، خنزیر کھا سکتے ہیں، اس پر کوئی پابندی نہیں، لیکن سودی کاروباری کرنے کی ان کو بھی اجازت نہیں، اگر کوئی کرے گا تو اسلامی قانون کے مطابق معاف نہیں کیا جائے گا۔

معاشی نقصانات

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وعیدوں کے بعد سود خوری کی روحانی، اخلاقی اور معاشی تباہ کاریوں پر بھی مختصر سی نظر ڈالی جائے۔ جن اندھوں کو سود کی ظاہری چمک دمک نے خیرہ کر رکھا ہے، شاید ان سطور کو دیکھ کر ان میں سے کسی کی چشمِ بصیرت کھلے اور اسے نظر آجائے کہ یہ منقش سانپ اندر سے کس قدر زہریلا اور تباہ کن ہے۔

(۱) اس حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں کہ سود کی بنیاد خود غرضی، مفاد پرستی اور زر طلبی پر ہے، اس میں چند گنتی کے مہاجن، ساہوکار، بینک کار، بنی نوعِ آدم کا خون چوس چوس کر پلتے ہیں۔ کوئی بتائے کہ جس نظام کا منتہائے مقصود چند افراد کا مفاد ہو، مفاد بھی ایسا جو پوری ملت کی معاشی موت سے وابستہ ہو، اس نظام میں انسانیت کی فلاح و بہبود کہاں سے آئے گی؟۔ اگر اس نظام سے وابستہ افراد میں ایثار و سخاوت، شرافت و انسانیت کا جوہر مٹ کر بالکل نابود ہو جائے، بلکہ اس نظام کے تحت پروان چڑھنے والا پورا معاشرہ ہی خود غرضی، دنیا طلبی اور آخرت سے بیزاری کا مخالف معاشرہ ہو؛ تو یہ تعجب کی بات نہیں۔

(۲) انسانی فطرت اور معاشی اصول کا تقاضا یہ ہے کہ کاروبارِ معاش میں شریک تمام افراد اس کے نفع و نقصان میں بھی یکساں شریک رہیں، اگر منافع ہو تو سب کے لئے، اور نقصان ہو تو سب کے سر پر۔ مگر سود خوروں کا قانون اس فطری اصول سے الگ تھلگ سب

سے نرالا ہے کہ سرمایہ قرض دے کر اندیشۂ سود وزیاں سے بے نیاز ہو کر گھر میں بیٹھ جاتے ہیں، اب کاروبار میں نقصان ہو تو یہ پورا نقصان فقط ان کام کرنے والوں کے کھاتے میں آئے گا جو اپنے جسم وجان کی تمام صلاحیتیں اس پر کھپاتے رہے، اور نفع ہو تو اس میں اولین حصہ سود خوروں کا ہو گا۔

غرض کاروبار میں بچت ہو یا سراسر خسارہ؛ بلکہ اصل سرمایہ ہی ڈوب جائے اور بے چارے قرض داروں کی کری کرائی سب خاک میں مل جائے، مگر ان کے ساہوکاروں کو ان باتوں کا کوئی خرخشہ نہیں، انہیں بہر قیمت سود کی لگی بندھی رقم گھر بیٹھے ملتی رہنی چاہیئے۔ کیا کہنے اس قساوت وشقاوت کے!۔

(۳) طمع ولالچ اور خود غرضی چوں کہ سود خوروں کے رگ وریشے میں رچ بس جاتی ہے، اس لئے وہ سرمایہ صرف انہی لوگوں کو دینا پسند کرتے ہیں جن سے سود زیادہ سے زیادہ ملنے کی امید ہو۔ کسی مسکین اور مفلوک الحال انسان کو قرضِ حسن تو کجا، کم شرح سود پر قرض دینا بھی گوارا نہیں کرتے، خواہ وہ افلاس کے مارے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر ہی جائے۔

اسی طرح مصالحِ عامہ کے کاموں میں امداد یا قرض (گو کم شرح سود پر ہی ہو) دینا بھی ان کے اصولِ زر پرستی کے خلاف ہے۔ اس سنگدلانہ ذہنیت کے نتیجے میں سرمائے کا ایک بڑا حصہ صحیح مصارف میں لگنے کی بجائے غیر اہم اور غیر ضروری کاموں میں لگ جاتا ہے، جس سے ایک طرف تو معاشی توازن بگڑنے لگتا ہے، دوسری طرف زیادہ سے زیادہ شرح سود پر

قرض لینے والے افراد کو یہ لعنت مجبور کرتی ہے کہ جائز اور ناجائز میں تمیز رَوا رکھے بغیر ہر طریقے سے اس سرمایہ کو استعمال کر کے شرح سود بھی بچالیں، اور مزید منافع بھی۔ اگر یہ معاملہ ملکی سطح پر ہو تو سود کی خباثت اور شر انگریزی پوری طرح عیاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ کوئی مسکین ملک کسی سنگین بحران اور مالی مشکلات سے مجبور ہو کر ہی دوسرے ملک سے سودی قرض لیتا ہے، اس کی مالی حالات اس قابل بھی نہیں ہوتے کہ وہ اصل قرض کی قسط ادا کر سکے، مگر اس کے ساتھ سال بہ سال بھاری بھر کم سود بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

مرے کو مارے شاہ مدار

اسے اس مصیبتِ عظمٰی سے نکلنے کی کوئی راہ نہیں دکھتی سوائے اس کے کہ وہ اپنے عوام پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے، مہنگائی میں کمر توڑ اضافہ کرے، کرائے بڑھائے اور ہر حربہ بروئے کار لا کر اربوں کھربوں کی یہ رقم عوام کی جیب سے نکالے۔

غرض سود ایک ایسی لعنت ہے جو افراد واقوام کی معیشت کے لیے غارتگر اور انسانی اقدار کے لیے سمِ قاتل ہے۔

(۴) بینکوں اور دوسرے مالی اداروں تک کسی مسکین ونادار بلکہ متوسط طبقہ کے آدمی کی بھی رسائی ممکن نہیں، سرمایہ دار اور بڑے تاجروں سے قرض لے لیکر کاروبار چلاتے ہیں، انہیں اپنی

حیثیت سے دس گنا قرض بھی بآسانی مل جاتا ہے، مگر کسی مسکین اور کم سرمایہ دار کے لیے قرض کی راہیں مسدود ہیں، یہ چند بڑی مچھلیاں قوم کی پوری معیشت پر چھائی رہتی ہے۔

اشیاءِ صَرف کے نرخ انہی کے رحم و کرم پر رہتے ہیں، جب ان کی مرضی میں آئے اشیاء کے نرخ بڑھا کر آسمان پر پہنچادیں اور جب چاہیں گرا کر تحت الثریٰ تک لے آئیں اور عوام بے چارے تکتے رہیں، مارکٹوں میں آئے دن اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے، ملکی معیشت پر اس کا جو اثر پڑتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔

(۵) جب دولت ہر طرف سے سمٹ کر چند ہاتھوں میں آجاتی ہے تو یہ مغرور لوگ اپنی دولت کے بل پر پسماندہ طبقہ کے جسم و جان، عزت و آبرو اور مال و متاع غرض ہر چیز پر تسلط جما لیتے ہیں، انہیں غلام بنا کر ان کی عزتوں تک سے کھیلتے ہیں ان کی پونجی لوٹ کر انہیں بے آبرو اور بھوکا ننگا کر کے چھوڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ جس ہلکان کاشتکار (کمزور کسان) نیم جان (بے بس) مزدور اور ٹٹ پونجیے سوداگر (معمولی پونجی والے تاجر) کو یقین ہو کہ میری دن بھر کی محنت و مشقت کا ثمرہ (نفع) سموچا (سب کا سب) ساہوکار (سود خور) لے اُڑے گا اور میرے پاس بجز حسرت و یاس کچھ باقی نہ رہے گا، تو کیا یہ سوچنے میں وہ حق بجانب نہیں کہ دن بھر کی جانکاہی (جان کھپانے) سے کیا فائدہ؟

(۱) جس کی پونجی ٹاٹ ہو۔

اگر یہ سوختہ نصیب جی ہار کر بیٹھ جائے، یا زندگی سے تنگ آکر خودکشی کر لے، یا ”تنگ آمد جنگ آمد“ کے مصداق چور، ڈاکو، اُچکا اور اُٹھائی گیرا بن جائے؛ تو یہ بات کچھ انہونی نہیں، بلکہ قرینِ قیاس ہے۔ اب سوچا جائے کہ مسکین اور متوسط طبقہ جو معاشی ڈھانچے کا اصل قِوام اور معاشرہ کا اکثریتی عنصر ہے، اس کا جذبۂ عمل سرد پڑ جانے سے قومی معیشت کس بری طرح متأثر ہوگی؟ لاکھوں افراد کے افلاس، بے روزگاری، ملکی صنعت، تجارت، زراعت و دیگر کاروبارِ زندگی کو کس حد تک مفلوج کر دے گی؟ یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں۔

غرض! اس غیر فطری نظام میں اگر فائدہ ہے تو صرف چند ساہوکار سود خوروں کا، انہی کو یہ پالتا پوستا اور آگے بڑھاتا ہے، باقی تمام عاملین معاش کے لیے پیغامِ مرگ ہے۔ ان کی معیشت و اقتصاد، عزت و ناموس اور اخلاق و روحانیت غرض ہر چیز کا جنازہ نکال دیتا ہے۔

(۶) سودی کاروبار میں لوگوں کا اپنا سرمایہ نہیں ہوتا، یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، جب اس مال پر من جانب اللہ محق کی افتاد پڑتی ہے اور سود خور پورے سرمایہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے تو وہ کبھی سنبھلنے کے قابل نہیں رہتا، ایک بار گرتا ہے تو گرتا ہی چلا جاتا ہے، نتیجہ یہ کہ اس کا اصل سرمایہ اگر کچھ تھا تو صرف وہی گیا اور بنک کا دیا ہوا پورا قرض ڈوب گیا، گویا سود خور کو جب تک نفع ملتا رہا تو وہ اپنی جیب بھرتا رہا، جب خسارہ ہوا تو وہ کُل کا کُل، یا اس کا اکثر حصہ قوم کے سر آرہا۔ ”تلك اذاً قسمة ضيزىٰ“۔

یہ سود کے نقصانات اور تباہ کاریوں کا ایک سرسری جائزہ تھا۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، ان معاشی اور اخلاقی نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآن وحدیث کی وعیدوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کچھ محلِ تعجب نہیں رہتی کہ تمام کبیرہ گناہوں کی بنسبت اسی ایک گناہ پر اتنی سخت وعیدیں کیوں سنائی گئیں؟۔

منہ بولتی شہادتیں

یہ مضمون نامکمل رہے گا اگر سود خوروں کے عبرت آموز انجام کے چند واقعات درج کر کے ارشادِ الٰہی "یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا" (اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتے ہیں) کی صداقت پر منہ بولتی شہادتیں نہ پیش کی جائیں۔ درجِ ذیل دو واقعے ایک ثقہ راوی نے بندے سے بیان کئے، دونوں واقعے اس کے سامنے گزرے ہیں:-

(۱) فلاں شہر کا مشہور ترین زرگر جس کی اَن گنت دولت اور وسیع شہرت کے ناتے پورے شہر پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی، بچے بچے کی زبان پر اس کا نام تھا، اس نے شہر کے ہندو زرگروں سے سودی لین دین شروع کیا تو یکلخت اس کی دولت وشہرت کو بھی گھن لگنا شروع ہو گیا، اس کی نرینہ اولاد نہ تھی، صرف دو لڑکیاں تھیں، دونوں کی شادیاں کیں، بڑا داماد بے دین، جواری اور اَوباش قسم کا لڑکا نکلا، جوئے، تاش اور شراب وشباب میں اس کی دولت لٹاتا رہا۔ آخر ایک روز نشے میں دھت ریل کے نیچے آکر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ کچھ دولت

دوسرے داماد کے ہاتھ لگ گئی۔ سیٹھ صاحب جب تہی دست ہو گئے تو دونوں مکان بیچ کر شہر سے سینکڑوں میل دور ایک جگہ جا پڑے، اور وہیں حسرت کی موت مر گئے۔ ایک وقت تھا کہ پورے شہر میں ان کا طوطی بولتا تھا، مگر اب نام ونشان مٹ چکا۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

(۲) اسی پیشے سے منسلک ایک بہت بڑا سیٹھ جو کروڑوں میں کھیلتا تھا، کام کی اتنی بہتات کہ ایک بار مَیں کسی کام سے اس کی دکان پر گیا تو تل دھرنے کی جگہ نہ تھی، کم وبیش بائیس تیئیس کاریگر بیٹھے مصروفِ کار تھے، طویل رات جاگنے کے سبب سب کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، اسے بھی سودی کاروبار کی لت پڑی، جس کی نحوست سے ساری دولت گنوا کر کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا۔ پوری جائیداد اسی لعنت کی نذر ہو گئی، ساٹھ پینسٹھ لاکھ کی کوٹھی قرض خواہوں کے دباؤ میں آکر اُونے پونے داموں میں بیچ دی۔ اسی طرح لاکھوں روپئے کی قیمتی زمینیں اور دکان بھی نیلام پر چڑھ گئیں۔ جب پوری جائیداد سے بھی قرض پورا نہ ہوا تو تنگ آکر خودکشی کی ٹھان لی۔ جب بار بار کی یہ کوشش بھی ناکام گئی تو قرض خواہوں کے خوف سے روپوش ہو گیا، اور اس خوف کے مارے بچیوں کی شادی تک میں شرکت نہ کی۔ اب بیرونِ ملک کسی جگہ سیاسی پناہ لے کر زندگی کے ایام پورے کر رہا ہے۔ اس کا بھی کسی وقت پورے شہر میں ڈنکا تھا مگر اب:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں

ایک درد بھری کہانی

ایک دوست نے بندہ کو اپنی درد بھری کہانی سنائی:

فلاں بیوپاری نے علاقے میں آکر اُدھار مال خریدا، میں نے قدیم تعلق اور اس کی دیانت داری کی شہرت کے سبب ضمانت اُٹھالی، قرض کی مدت گزر گئی، مگر وہ نہ آیا۔ طویل انتظار کے بعد اس کے گھر لاہور پہنچا، پتہ چلا کہ وہ دیوالیہ ہو چکا، اس لئے قرض خواہوں سے چھپ کر کراچی چلا گیا اور کسی جگہ محنت مزدوری کر رہا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو مجھ سے مزید مہلت طلب کی ،اور طفل تسلیاں دے کر مجھے رخصت کر دیا، آخر انتظار کر کر کے جب دوبارہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ لاہور چلا گیا ہے ،میں وہاں پہنچا تو وہاں سے بھی غائب۔ قصہ کوتاہ کہ ایک لاکھ سے کچھ زائد قرض خواہوں کی رقم میرے سر آپڑی جو میں نے چار وناچار اپنی طرف سے ادا کر دی۔

اس وقت بھی جب یہ سطور زیرِ تحریر ہیں وہ اس کے تعاقب میں کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ کہانی سن کر بندہ کا دل بھر آیا اور اسے سمجھایا کہ اللہ کے بندہ! مالی معاملات میں بہت سوچ بچار سے کام لیا جاتا ہے۔ تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں کہ اس زمانے میں کسی کی ذمہ داری اُٹھانا آپ اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کی حماقت ہے۔ وہ بولا: اس سے میری بیس سال پرانی پہچان ہے ،پہلے بھی میں اس کی ضمانت دیتا رہا، مگر آج تک اس نے وعدہ خلافی نہ کی تھی، بندہ

نے بھی اس بیوپاری کی شہرت سن رکھی تھی، یہ باتیں سن کر مزید حیرت ہوئی کہ اتنے عرصے کے بعد اس پر کیسی اُفتاد پڑی۔ آخر ایک دوسری ملاقات کے دوران اس دوست نے بتلا دیا کہ اس کے گھر جاکر حالات کے تتبع و تلاش سے معلوم ہوا کہ ظالم نے اس بار سود پر رقم لے کر کاروبار شروع کیا تھا۔

سود خور کی بہیمیت کے واقعات

سود خور مال وزر کی محبت میں ایسا مخبوط اور باؤلا ہو جاتا ہے کہ اسے کسی انسان کی جان و مال یا عزتِ نفس کا پاس ولحاظ نہیں رہتا، اسے کوئی چیز عزیز ہے تو اپنی غرض اور اپنا مفاد ہے خواہ کسی قیمت پر ہی حاصل ہو۔ سود خور کی بہیمیت کا اندازہ درجِ ذیل واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

(۱) ایک مسکین شخص نے ساہوکار سے پانچ ہزار روپئے لئے، مگر افلاس و غریبی کے سبب ادائیگی نہ کر سکا۔ ساہوکار نے ایک تو سود پر سود لگانا شروع کر دیا، دوسرے اسے بیوی بچوں سمیت غلام بنا کر بیگار لینا شروع کر دی، ”بیک کرشمہ دوکار“۔ آخر ایک مدت کے بعد ساٹھ ہزار روپے دے کر اس کے پنجۂ ستم سے رہائی پائی۔

(۲) ایک مسکین نے ساہوکار سے کسی وقتی ضرورت کے تحت چند روپے لئے جو بڑھتے چڑھتے کئی ہزار بن گئے، اس نے بھی مسکین کو چنگل میں پھنسا کر پورے گھرانے سمیت غلام بنالیا، دن بھر بیگار لینے کے بعد رات کو مردوں کو بیڑیاں لگا دیتا، آخر آزادی کی صورت یہ نکلی

کہ ساہوکار نے ایک قرض خواہ کے ہاتھ اسے پانچ ہزار میں فروخت کر دیا، اس نے یہ قرض وصول کرکے اسے آزادی دی۔

(۳) ایک آدمی نے پانچ ہزار قرض لئے، اور چودہ ہزار دے کر خلاصی پائی۔

یہ تینوں واقعات ایک بزرگ عالمِ دین نے بندہ کو بتائے اور فرمایا:- سود کی لعنت اور وبال سے تباہ ہونے والے یہ لوگ ابھی زندہ ہیں، ان کے نام اور پتے بھی دیئے۔

علامہ کشمیری نور اللہ مرقدہٗ کے خطبۂ صدارت کے اقتباسات

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ نے ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ علماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور کی صدارت فرمائی، اور اس کے لئے ایک معرکۃ الآراء تاریخی خطبہ تحریر فرمایا۔ اس خطبۂ صدارت میں ۲۸/ عنوانات کے تحت ہندی مسلمانوں کو درپیش مسائل کا تذکرہ اور ہر مسئلے کا شریعت کی روشنی میں بہترین حل پیش کیا گیا ہے۔ اس خطبہ کے چند اقتباسات حضرت کے سوانح نگار اور فرزندِ ارجمند مولانا اَنظر شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت کی سوانح ”نقشِ دوام“ میں پیش کئے ہیں۔ ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں: -

”صاحبِ خطبہ نے ان مہلک رسوم پر طویل تحریر لکھی، اس کے بعد سودی کاروبار پر خاص توجہ فرمائی جس سے مسلمانوں کی اقتصادی حالت تباہ وبرباد ہو کر رہ گئی ہے جیسا کہ سطورِ بالا میں گزرا، یہ سودی قرضے عام طور پر شادی بیاہ اور موت وپیدائش کی غلط رسوم کی ادائیگی

کے لیے لئے جاتے، اور اس طرح عمر بھر کے لیے ایک بے درمان مصیبت کو خرید لیا جاتا، اسلام میں چند گناہوں کو کبائر میں شمار کیا ہے اور جن کی سزا دخولِ جہنم کے سوا اور کچھ نہیں؛ ان میں ایک سودی کاروبار ہے۔

بہر حال !حضرت شاہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے صورتِ حال کی تباہی وبربادی پر توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

سود کی مثال جذام کے مرض جیسی ہے جو بڑھتا ہی جاتا ہے اور کم نہیں ہونے پاتا۔ حسبِ قواعدِ شرعیہٗ محمدیہ ﷺ سود ایک لعنت ہے جو دینے والے،لینے والے، کھانے والے،کھلانے والے،اس پر گواہ بننے والے اور اس کی تحریر لکھنے والے پر مساوی تقسیم ہوتی ہے۔یہ دنیا میں روحانی، اخلاقی جذام ہے،اور آخرت میں جہنم کا موجب ہے۔بلکہ صاحبِ خطبہ نے بعض اسلامی ریاستوں کی تباہی کا سبب نصاریٰ سے بھاری بھاری رقمیں بطور سود لینا اور عدم ادائیگی کے نتیجہ میں ریاستوں کا ہاتھ سے نکل جانا قرار دیا ہے۔ مگر افسوس کہ امتِ محمدیہ ہی کے معاند طبقہ نے اپنے پیغمبرِ جلیل کی حکم عدولی کو اس شعبہ میں بھی ترک نہیں کیا۔

ہماری گردنوں کو پل نہ بنائے

جس زمانہ میں سود کے جواز وعدم جواز کی بحث زور وشور پر تھی، حضرت شاہ صاحب کو پنجاب کے سفر میں لاہور قیام کرنا ہوا۔لاہور کے علماء اور بڑے ذمہ دار لوگ بھی آپ کی

آرام گاہ پر جمع تھے، جن میں اخبار ”زمیندار“ والا بھی تھا اور وہ سود کو مسلمانوں کے لیے فائدہ مند سمجھتا تھا۔ اس نے اس نیت سے شاہ صاحب سے ایک سوال کیا کہ جواز کی کوئی شکل بتائی جائے، حضرت شاہ صاحب نے ڈیڑھ دو گھنٹے سود کی حرمت، اس کی ہلاکت و بلا انگیزیوں پر سیر حاصل گفتگو کی جو سائل کے بالکل خلاف پڑی۔ اس نے اُسلوب بدل کر پھر وہی سوال دُہرایا تو شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ارشاد فرمایا:- ”بھائی! ہم نے مسئلہ صاف کر دیا ہے، اب جس کو جہنم میں جانا ہو، چلا جائے لیکن ہماری گردنوں کو پل نہ بنائے۔“

عبرت انگیز واقعہ

علامہ رشید رضا نے ”المنار“ میں ایک عبرت انگیز واقعہ سود کے متعلق آیات کے تحت اپنے مشہور وطن ”مصر“ کا چشم دید لکھا ہے:-

ایک زاہد اور پاکباز مصری مالدار اپنی دولت سے غریبوں کی بھرپور مدد کرتے، کوئی قرض لیتا تو بے تکلف رقم دیتے، جس کی نہ کوئی تحریر ہوتی، نہ کتابت۔ مقروض خود ہی توجہ دلاتا کہ اطمینان کے لئے کچھ لکھ لیجئے، اس پر ان کا یہ جواب ہوتا کہ: بھائی! لوٹا کر دے دو گے تو تمہارا احسان۔ نہیں دو گے تو خدائے تعالیٰ احسن الجزاء عنایت فرمائیں گے۔ بہر حال میں تو نفع میں ہوں، پھر تحریر لکھ کر اپنے ثواب واجر کو کیوں کم کروں۔ حالات و مزاج نے

رخ پلٹا تو یہی صاحب بد قسمتی سے سود لینے لگے، اور پھر وہ وقت آیا کہ اپنے بیٹے کو بھی رقم دی تو سود ہی پر دی۔

چند واقعات

ہمارے اس ہندوستان میں مہاجنی استبداد اور سودی کاروبار نے لاکھوں انسانوں کو تباہ کیا، اس کی ایک مختصر سی تفصیل یہ ہے کہ:

یوپی کے مشہور شہر ''گورکھپور'' میں ایک صاحب نے مہاجن سے دس ہزار روپے سود پر لئے۔ چار سال کے عرصہ میں پچاس ہزار سود کے نام سے ادا کرنے کے باوجود اصلی رقم کی ادائیگی بدستور قائم رہی۔

شہر ''گیا'' میں ایک اسکول کے ٹیچر نے پندرہ برس پہلے پانچ سو روپئے سود پر لئے، ماہانہ مسلسل ادائیگی کے باوجود جب کہ وہ اصل رقم سے بہتّر گنی یعنی ۳۶/ ہزار روپے دے چکا ہے، لیکن پھر بھی اصل رقم کی ادائیگی ابھی باقی ہے۔

کانپور اور صنعتی شہروں میں فیکٹری کے ملازم جو مہاجنوں کی گرفت میں مبتلا ہیں، ان کا تناسب ستّر فیصدی ہے۔ ان کی تنخواہیں مہاجن وصول کرتے ہیں اور ان غریب مزدوروں کو ایک کوڑی بھی مشاہرہ سے نہیں ملتی۔

جو بربریت، درندگی اور بہیمیت سود خور میں پیدا ہوتی ہے اس کا تازہ المیہ ”جاسنالہ“ میں اس طور پر پیش آیا کہ حال ہی میں اس شہر کی کوئلہ کی کان میں سینکڑوں مزدور پانی بھر جانے کی وجہ سے غرق ہو گئے۔ حکومت نے بطور امداد رقم دی جسے اوپر ہی اوپر مہاجنوں نے وصول کرلی، اور پسماندگان کو انسانوں کی موت کے ساتھ اس امداد کو بھی بطورِ حسرت دیکھنا پڑا جو حکومت نے پیش کی تھی۔

ان چند واقعات سے معلوم ہو گا کہ اسلام کی نظر اِس مہاجنی نظام کی ہلاکت انگیزیوں پر کس قدر دقیق اور دُوررَس تھی کہ اس نے اسلامی معاشرہ میں سود کے لئے کوئی خفی جلی گنجائش باقی نہیں چھوڑی۔

مظلوم طبقے کی آہ وبکا پر حکومتیں متوجہ ہوئیں تو زیادہ سے زیادہ شرحِ سود کم کرنے کی طرف رخ کیا، لیکن سرے سے اس کی ممانعت یا اس ملعون پیشے پر مکمل پابندی بجز اسلام کے اور کسی کے حصے میں نہیں آئی۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ متعصب دنیا اسلامی قوانین کی خوبیوں اور فلاحی اسکیموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہیں۔

باب تحریم الریاء

قَالَ اللهُ تَعَالَىٰ: وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ. (البینۃ: ۵)

وقال تَعَالَىٰ: لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ (البقرۃ: ۲۶۴)

وقال تَعَالَىٰ: يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللهَ إِلَّا قَلِيلًا (النساء: ۱۴۲)

باب کا عنوان

نیا عنوان قائم کیا ہے: دکھلاوا اور شہرت کے واسطے کسی عمل کا حرام ہونا۔

اعمالِ خیر، عبادات اور نیکی کے کام جو اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے لیے کرنے چاہئیں، ان کو انجام دے کر کوئی آدمی لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت اور قدر ومنزلت پیدا کرنا چاہے، اور یوں سوچے کہ جب لوگ مجھے اس طرح کرتا ہوا دیکھیں گے تو ان کے دل میں میرے واسطے عزت پیدا ہوگی، میری قدر ومنزلت اور میری عظمت کا خیال قائم ہوگا، اور اس کے ذریعہ مَیں ان سے مالی یا جاہی فائدہ حاصل کرسکوں گا؛ یہی ریاء کہلاتا ہے، جیسے: نماز اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے پڑھنی چاہیے، مال خرچ کرنا اور صدقہ دینا اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے واسطے ہونا چاہیے، حج کی ادائیگی اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے ہونی چاہیے، علمِ دین حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے

لیے ہونا چاہیے۔ اگر کوئی آدمی نماز اس لیے پڑھتا ہے کہ مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر لوگ سمجھیں گے کہ بڑا عبادت گزار ہے، اور ان کے دلوں میں میرے واسطے مقام پیدا ہو گا، ان کے نزدیک میری قدر و منزلت بڑھ جائے گی، اور میری عزت کریں گے، مجھے ان سے اعزاز و تکریم کا فائدہ پہنچے گا۔

باریک فرق

اور اگر وہ کام عبادات اور اعمالِ خیر کے قبیل سے نہیں ہے اور اس میں کسی نے ایسی کوئی نیت کر لی، مثلاً: کوئی آدمی دنیوی علوم (انجینئرنگ، ڈاکٹری، وکالت وغیرہ) اس لیے پڑھتا ہے تاکہ اس کے ذریعہ مال حاصل کرے، اور لوگ اس کو بڑا ڈاکٹر، بڑا انجینئر سمجھنے لگیں۔ ڈاکٹر اور انجینئر بننے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں مقام و مرتبہ پیدا ہو؛ تو اس کو ریاء نہیں کہیں گے۔

لہٰذا یہ خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ریاء کا تعلق انہیں اعمال کے ساتھ ہے جو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے کیے جانے چاہئیں اور ان میں اس کے بجائے دوسری نیتیں کر لی جائیں تو اس صورت میں ریاء کا تحقق ہوتا ہے۔

پہلی آیت

پہلی آیت کا تعلق عبادات ہی سے ہے اس لیے یہاں پیش کی ہے: ﴿وَمَآ أُمِرُوٓا۟ إِلَّا لِيَعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ ٱلدِّينَ حُنَفَآءَ (البينة:۵)﴾ جو آدمی سب سے کٹ کر صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہو جائے؛ ایسے آدمی کو حنیف کہتے ہیں۔ یہ آیت شروع کتاب میں اخلاص کے بیان میں گزر چکی ہے، اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کو سب سے کٹ کر خالص اپنی خوشنودی کی نیت کرتے ہوئے اپنی ہی طرف متوجہ ہو کر عبادت کرنے کا حکم دیا تھا۔ یعنی آدمی پورے طور پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ ہو، اور اسی کی خوشنودی و قرب حاصل کرنے اور صرف اسی کو راضی کرنے کے لیے عبادت کرے اور دل میں دور دور تک کسی دوسرے کا خیال نہ ہو۔ اس آیت میں "حُنَفَآءَ" کا لفظ اسی لیے لائے ہیں کہ کسی کی طرف کوئی توجہ باقی نہیں رہنی چاہیے۔

اپنے صدقات کو ضائع و باطل مت کرو

﴿لَا تُبْطِلُوا۟ صَدَقَٰتِكُم بِٱلْمَنِّ وَٱلْأَذَىٰ كَٱلَّذِى يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ﴾ اپنے صدقات اور اللہ کے راستہ میں جو مال خرچ کیا جاتا ہے اس کو احسان جتلا کر اور جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذاء پہنچا کر (یا کوئی اور طریقہ اختیار کر کے) ضائع اور برباد مت کر دو، اور جو آدمی لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے وہ بھی اپنے صدقہ کو ضائع اور باطل ہی کرتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو بھی نیک کام لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا جائے گا وہ بے کار اور باطل ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر کوئی اجر وثواب نہیں ملے گا۔

منافقین کا حال

﴿یُرَآءُونَ النَّاسَ وَلَا یَذْکُرُونَ اللّٰہَ إِلَّا قَلِیلًا﴾ منافقین کا حال بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی اور سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ یہاں اعتقادی کاہلی مراد ہے، یعنی نماز کی ادائیگی کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ پر جو اعتقاد ہونا چاہیے وہ ان کے اندر نہیں پایا جاتا، اعتقاد کی اسی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس عبادت کی ادائیگی کے لیے جو مستعدی پائی جانی چاہیے وہ ان میں نہیں پائی جاتی۔ کسی بھی عمل پر ملنے والے اجر وثواب اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں حاصل ہونے والے قرب و درجات پر آدمی کو جب مکمل اعتقاد نہیں ہوتا تو اس عمل کے لئے آدمی کے اندر جو جذبہ بیدار ہونا چاہیے، اور اس عمل کو انجام دینے کے لیے جو نشاط پیدا ہونا چاہیے اور اس کام میں جو قوت آنی چاہیے؛ وہ نہیں آتی۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ آدمی اگر کہیں سفر کر کے آیا ہو اور تھکن کی وجہ سے بدن میں کچھ کاہلی اور سستی محسوس ہو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہاں عقیدے میں تو پختگی پائی جاتی ہے، مگر جسمانی کمزوری اور تھکاوٹ کی وجہ سے فطری کاہلی و سستی پائی جارہی ہے۔

باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ منافقین کا حال یہ ہے کہ چاہے وہ سفر کر کے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، ان کا جسم تعب و تھکن میں مبتلا ہو یا نہ ہو؛ جب بھی وہ عبادت کے لیے اٹھیں گے تو سستی و کمزوری کے ساتھ ہی اس میں مشغول ہوں گے، اس لیے کہ ان کے دلوں میں اعتقاد کی جو پختگی ہونی چاہیے وہ پائی ہی نہیں جاتی۔ اور پھر کمال تو یہ ہے کہ جب وہ ایسی عبادت بھی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لیے نہیں کرتے بلکہ تو لوگوں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ اب جس کی عبادت کا حال ایسا ہو تو پھر اس میں جتنا ذکر اللہ ہونا چاہیے وہ بھی نہیں ہوتا، بلکہ دکھانے کے واسطے برائے نام ہی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں کی نگاہوں میں آتا ہے اس کو تو کرتے ہیں، اور جو نگاہوں میں نہیں آتا اس کو انجام نہیں دیتے۔ بہر حال! یہاں تو ریاء اور دکھلاوے کے لیے کوئی کام کیا جائے اس کا حرام ہونا بتلانا چاہتے ہیں۔

تمام شریکوں میں سب سے زیادہ مستغنی

حدیث ۱٦۱٦:-

وعن أبي هريرة رضی الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ: ((قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلاً أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا: مَیں تمام شریکوں میں شرکت سے سب سے زیادہ مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ دوسرے کسی کو بھی شریک کر لیا؛ تو میں اس کو اور اس کے شریک کو چھوڑ دیتا ہوں۔

افادات:- جب کوئی کام شراکت (پارٹنرشپ) میں کیا جاتا ہے تو ہر شریک اپنا حصہ پورا پورا وصول کرنے کا اہتمام کرتا ہے، لیکن باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے تو پارٹنرشپ منظور ہی نہیں، اگر کوئی آدمی کسی عمل میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کر لیتا ہے، حالاں کہ وہ صرف میرے لیے ہی کیا جانا چاہیے، تو میں کہہ دیتا ہوں کہ ایسا عمل مجھے نہیں چاہیے جس کو شریک کیا ہے اسی کو دے دو۔ میں تو صرف اسی عمل کو قبول کرتا ہوں جو خالص میرے لیے کیا جائے اور اس میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ دنیا والوں کا حال تو یہ ہے کہ پارٹنرشپ میں کیے جانے والے کام کو بھی گوارا کر لیتے ہیں اور اس میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے پارٹنرشپ گوارا ہی نہیں، میں تو تمام شریکوں میں سب سے زیادہ مستغنی ہوں، اسی لیے شرکت والا عمل میرے یہاں قبول ہی نہیں ہوتا، ایسا عمل تو میں اسی کو دے دیتا ہوں۔

اس روایت میں ریاء کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن اس روایت کو یہاں لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ریاء بھی شرک کی ہی ایک قسم ہے۔ اسی لیے لکھا ہے کہ ایک تو شرک جلی ہوتا ہے کہ

کوئی عبادت باقاعدہ اس انداز سے کی جائے کہ عبادت ہی میں اللہ کے ساتھ دوسرے کو شریک ٹھہرایا جائے؛ اس سے تو آدمی اسلام اور ایمان سے ہی نکل جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی کے عقیدے میں تو ایسا نہیں ہے، البتہ عمل کرتے ہوئے دوسرے آدمی کو خوش کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے، یا دوسرے آدمی کی نگاہوں میں اپنی بڑائی یا عظمت ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے؛ تو اسے ریاء اور دکھلاوا کہتے ہیں، یہ بھی پوشیدہ اور خفی قسم کا شرک ہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کسی بھی ایسے عمل کو جس میں ریاء کاری ہو قبول ہی نہیں کرتے۔

بعد میں ریاء شامل ہو گئی تو

ایک بات یہ بھی ہے کہ کسی نے کوئی عمل خالص ریاء اور دکھلاوے کے لیے ہی کیا ہے، تب تو ظاہر ہے کہ وہ عمل قبول نہیں کیا جائے گا، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب عمل کیا تب تو اللہ تعالیٰ کے واسطے ہی تھا، بعد میں اس میں ریاء شامل ہو گئی؛ تو کیا ایسا عمل قبول ہو گا یا نہیں؟

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس صورت میں بھی قبول نہیں ہو گا۔ اور بعض فرماتے ہیں کہ دیکھا جائے گا کہ دونوں پہلو برابر ہیں یا نہیں، اگر اللہ تعالیٰ کے لیے کیے جانے کی نیت غالب ہے تو قبول ہے، اور دوسرا پہلو غالب ہے تو قبول نہیں۔ مثلاً: بعضوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تب تو نماز پڑھیں گے، اور اگر کوئی نہیں دیکھتا تو نہیں پڑھیں گے: تو یہ عمل ایسا ہوا جس میں ریاکاری ہی ہوئی، یہاں نفسِ عمل ہی دکھانے کے واسطے کیا گیا۔

اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ کوئی دیکھے یا نہ دیکھے، نماز تو پڑھیں گے، ہاں! اتنا ہے کہ اگر کوئی دیکھ رہا ہو تو ذرا خشوع و خضوع کا اظہار کریں گے اور رکوع و سجود بھی لمبا کریں گے، اور کسی کے نہ دیکھنے کی صورت میں جلد بازی میں بغیر کسی اہتمام کے پڑھیں گے۔ لہٰذا جو آدمی ایسا ہے کہ نماز تو نہیں چھوڑتا، لیکن کسی کے دیکھنے کی وجہ سے خشوع و خضوع اور دوسری صفات میں خوبی پیدا کرنے کا اہتمام کرتا ہے؛ تو یہ بھی ریا ہی میں داخل ہے، لیکن اس کے نفسِ عمل کا اجر ضائع اور برباد نہیں ہوگا، البتہ ان کیفیات پر جو ثواب مرتب ہونا چاہیے اس میں کمی آجائے گی۔

لینے کے دینے پڑ گئے

حدیث ۱۶۱۷:-

وعنه قَالَ: سَمِعْتُ رسول الله ﷺ يقول: ((إِنَّ أَوَّلَ النَّاسِ يُقْضَى يَومَ القِيَامَةِ عَلَيهِ رَجُلٌ اسْتُشْهِدَ، فَأُتِيَ بِهِ، فَعَرَّفَهُ نِعْمَتَهُ، فَعَرَفَهَا، قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: قَاتَلْتُ فِيكَ حَتَّى اسْتُشْهِدْتُ. قَالَ: كَذَبْتَ، وَلَكِنَّكَ قَاتَلْتَ لأَنْ يُقَالَ: جَرِيءٌ! فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِي النَّارِ.

وَرَجُلٌ تَعَلَّمَ العِلْمَ وَعَلَّمَهُ، وَقَرَأَ القُرآنَ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا؟ قَالَ: تَعَلَّمْتُ العِلْمَ وَعَلَّمْتُهُ، وَقَرَأْتُ فِيكَ القُرآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ، وَلكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ لِيُقَالَ:

عَالِمٌ ! وَقَرَأْتَ الْقُرْآنَ لِيُقَالَ : هُوَ قَارِئٌ، فَقَدْ قِيلَ. ثُمَّ أُمِرَ بِهِ. فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِى النَّارِ.

وَرَجُلٌ وَسَّعَ اللهُ عَلَيْهِ، وَأَعْطَاهُ مِنْ أَصْنَافِ المَالِ، فَأُتِيَ بِهِ فَعَرَّفَهُ نِعَمَهُ، فَعَرَفَهَا. قَالَ: فَمَا عَمِلْتَ فِيهَا ؟ قَالَ: مَا تَرَكْتُ مِنْ سَبِيلٍ تُحِبُّ أَنْ يُنْفَقَ فِيهَا إِلاَّ أَنْفَقْتُ فِيهَا لَكَ. قَالَ : كَذَبْتَ، ولكِنَّكَ فَعَلْتَ لِيُقَالَ : جَوَادٌ! فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهِ فَسُحِبَ عَلَى وَجْهِهِ حَتَّى أُلْقِيَ فِى النَّارِ)). (رواه مسلم)

((جَرِيءٌ)) بفتح الجيم و كسر الراء والمد: أيْ شُجَاعٌ حَاذِقٌ.

ترجمہ مع تشریح:- یہ روایت مسلم شریف اور دوسری کتبِ حدیث میں بھی موجود ہے کہ ایک تابعی حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اس وقت وہ درس دے رہے تھے، جب وہ فارغ ہوئے اور سب لوگ چلے گئے تو انہوں نے حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا: آپ نے کوئی حدیث جو نبیٔ کریم ﷺ سے سنی اور سمجھی ہو اور آپ کو خوب یاد بھی ہو؛ وہ بیان کیجیے۔ حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: میں نے نبیٔ کریم ﷺ سے جو روایت سنی ہے، سیکھی ہے، اور خوب سمجھی ہے، وہی میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں، یہ کہہ کر ان پر غشی طاری ہو گئی اور وہ بے ہوش ہو گئے، جب ہوش میں آئے تو پھر دوبارہ یہی جملہ کہا، پھر بے ہوش ہو گئے، کچھ دیر تک بے ہوش رہے، پھر ہوش میں آئے اور یہی جملہ کہا پھر بے ہوش ہو گئے، اور دیر تک بے ہوش رہے، ہم نے ان کو سہارا دے کر اُٹھایا اور ہوش میں آئے تو دیر تک روتے رہے، پھر یہ روایت بیان کی کہ:

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے روز تمام لوگوں میں سب سے پہلے جس کا فیصلہ کیا جائے گا اور جس کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں فیصلہ کے لیے لایا جائے گا وہ آدمی ہو گا جو اللہ کے راستہ میں شہید کیا گیا تھا، پھر اس کو جو نعمتیں اور صلاحتیں عطا فرمائی تھیں، اللہ تعالیٰ وہ سب اس کے سامنے گنوائیں گے (کہ میں نے تجھے یہ یہ نعمتیں دی تھیں، تجھے یاد ہے؟) وہ اقرار کرے گا (کہ ہاں! باری تعالیٰ! آپ نے مجھے یہ نعمتیں عطا فرمائی تھیں) باری تعالیٰ کی طرف سے پھر سوال ہو گا: میری ان نعمتوں میں تو نے کیا عمل کیا، اور اس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے آپ کے راستہ میں قتال کیا، یہاں تک کہ میں شہید کر دیا گیا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے جواب میں کہا جائے گا: تو نے غلط بات کہی، بلکہ تو نے قتال اس لیے کیا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ بڑا بہادر ہے اور تیری تمنا پوری ہو گئی (تیرے مرنے اور شہید ہونے کے بعد لوگوں نے تیری بہادری کی بڑی تعریفیں کیں) پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم دیا جائے گا اور اس کو چہرے کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہو گا جس نے علمِ دین سیکھا اور لوگوں کو سکھلایا، اس کو باری تعالیٰ کے حضور پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بھی اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے (کہ تجھے یاد ہے میں نے تجھے علمِ دین عطا کیا تھا، تو نے پڑھا پڑھایا) اس کو یاد آجائے گا وہ اس کا اقرار کرے گا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا کہ تو نے اس میں کیا عمل کیا اور میری ان نعمتوں کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں نے علمِ دین سیکھا پھر لوگوں کو خوب سکھایا، اور میں نے تیرے لیے قرآن سیکھا اور سکھایا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے جواب میں کہا جائے گا: تو جھوٹ بولتا ہے، تو نے علم اس لیے سیکھا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ بہت بڑا عالم ہے (بڑے مولوی صاحب ہیں، بڑے اچھے مقرر ہیں، اپنے فن کے بڑے ماہر ہیں،

لوگوں سے واہ واہ حاصل کرنے کے لیے تو نے یہ سارا کارنامہ انجام دیا تھا) اور قرآنِ پاک اس لیے پڑھا تھا تاکہ لوگوں میں کہا جائے کہ بڑا اچھا قاری ہے، تو نے جس مقصد کے لیے یہ کام کیا تھا وہ مقصد حاصل ہو چکا (لوگوں میں تیرے علم کا اور تیرے قاری ہونے کا چرچا ہو گیا) پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق بھی حکم کیا جائے گا اور وہ اوندھے منھ کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

تیسرے آدمی کو لایا جائے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مالی اعتبار سے خوب وسعت عطا فرمائی تھی اور ہر قسم کا مال اس کو دے رکھا تھا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں یاد دلائیں گے کہ میں نے تجھے یہ یہ نعمتیں دی تھیں، وہ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کو پہچان لے گا اور اقرار کرے گا۔ باری تعالیٰ کی طرف سے پوچھا جائے گا: تو نے اس میں کیا عمل کیا اور اس کا کیا حق ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا: باری تعالیٰ! تیرے راستہ میں خرچ کرنے کی جو شکل بھی تجھے پسندیدہ تھی وہ میں نے نہیں چھوڑی (یعنی ہر جگہ خرچ کیا) اور یہ سب تیرے واسطے کیا (مسجد اور مدرسہ میں دیا، مسافر خانہ بنوایا، اور فلاں فلاں جگہ خوب خرچ کیا) باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: تو غلط بولتا ہے، یہ سب تو نے اس لیے کیا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ بڑا سخی ہے (نام آوری، شہرت اور دکھلاوے کے لیے کیا تھا) سو کہا جا چکا (لوگوں نے تیری واہ واہ کر لی) پھر اس کے متعلق بھی حکم ہوگا اور اس کو بھی منھ کے بل کھینچ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

افادات:- اللہ کے راستہ میں جہاد اور قتال میں اپنی جان دے دینا، قرآن کریم کا پڑھنا پڑھانا، سیکھنا سکھانا، نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا؛ یہ سارے بڑے بڑے اعمال ہیں، لیکن دکھلاوے اور شہرت کے لیے کیے گئے تھے، اس لیے اتنا ہی نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ

کے یہاں وہ اعمال ضائع ہوگئے اور ان پر کوئی اجر نہیں ملا، بلکہ وہی اعمال جہنم میں جانے کا ذریعہ بنے۔ اگر صرف ضائع ہوجاتے تب بھی سودا سستا تھا لیکن انہیں اعمال کے نتیجہ میں جہنم میں جانے کی نوبت آگئی، گویا لینے کے دینے پڑگئے۔

ظاہر میں کچھ، باطن میں کچھ

حدیث ۱۶۱۸:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما : أن نَاساً قَالُوا لَهُ : إِنَّا نَدْخُلُ عَلَى سَلاَطِينِنَا فَنَقُولُ لَهُمْ بِخِلاَفِ مَا نَتَكَلَّمُ إِذَا خَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهِمْ؟ قَالَ ابنُ عُمَرَ رضی اللہ عنہما : كُنَّا نَعُدُّ هَذَا نِفَاقاً عَلَى عَهْدِ رسول الله ﷺ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ کچھ لوگوں نے ان سے کہا: ہم لوگ جب اپنے حکمرانوں کے پاس جاتے ہیں تو (ان کو خوش کرنے کے لیے) ان کے سامنے کچھ باتیں کرتے ہیں اور جب ان کے پاس سے باہر آتے ہیں تو اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں فرمایا: حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں ہم لوگ اس طریقہ کار کو نفاق قرار دیتے تھے (کہ ظاہر میں کچھ ہو اور باطن میں کچھ اور ہو)۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی

حدیث ۱۶۱۹:-

وعن جُندب بن عبد اللهِ بن سفيان - رضى الله عنه - قَالَ: قَالَ النبيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللهُ بِهِ، وَمَنْ يُرائِي يُرائِي اللهُ بِهِ)). (متفق عَلَيْهِ. ورواه مسلم أيضاً من رواية ابن عباس رضى الله عنهما)

((سَمَّعَ)) بتشديد الميم، ومعناه: أظهر عمله للناس رِياءً. ((سَمَّعَ اللهُ بِهِ)) أيْ: فَضَحَهُ يَومَ القِيَامَةِ. ومعنى: ((مَنْ رَاءى)) أيْ: مَنْ أظْهَرَ لِلنَّاسِ العَمَلَ الصَّالحَ لِيَعْظُمَ عِنْدَهُمْ. ((رَاءى اللهُ بِهِ)) أيْ: أظْهَرَ سَرِيرَتَهُ عَلَى رُؤُوسِ الخَلائِقِ.

ترجمہ:- حضرت جندب بن عبد اللہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی شہرت کے لیے کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو شہرت دیں گے، اور جو دکھلاوے کے لیے کرے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو دکھلائیں گے۔

افادات:- "سَمَّعَ" اور "یُرَائِي" کا مطلب کیا ہے؟ تو علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: جو آدمی اپنے اعمال کو دکھلاوے اور شہرت کے واسطے لوگوں کے سامنے ظاہر کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو مشہور کریں گے، یعنی قیامت کے دن رسوا کریں گے کہ لوگوں کے سامنے اعلان کیا جائے گا کہ اس نے فلاں عمل شہرت اور نام آوری کے لیے کیا تھا۔ گویا اس دن سب کے سامنے رسوائی ہوگی۔

اور جس نے اپنے نیک عمل کو لوگوں کے سامنے اس لیے ظاہر کیا کہ لوگوں کی نگاہوں میں عزت ملے اور مرتبہ بڑھے؛ تو قیامت کے روز تمام لوگوں کے سامنے اس کی اس بدنیتی کو ظاہر کریں گے، اور دنیا میں دکھلاوے کے لیے جو عمل کیا تھا، اس کا اعلان قیامت کے روز سب کے درمیان میں کریں گے۔

جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا

حدیث ١٦٢٠:-

وعن أبي هريرة -ﷺ- قَالَ: قَالَ رسول الله ﷺ: ((مَنْ تَعَلَّمَ عِلْماً مِمَّا يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللهِ -عز وجل- لاَ يَتَعَلَّمُهُ إلاَّ لِيُصِيبَ بِهِ عَرَضاً مِنَ الدُّنْيَا ، لَمْ يَجِدْ عَرْفَ الجَنَّةِ يَوْمَ القِيَامَةِ)) يَعْنِي: رِيحَهَا. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيحٍ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے ایسا علم حاصل کیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے، لیکن اس کو دنیا کا سامان حاصل کرنے کے لیے سیکھا؛ تو ایسا آدمی قیامت کے روز جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔

افادات:- دنیا کے علوم جو علومِ معاش ہیں، ان کو اگر اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لیے حاصل نہیں کیا، بلکہ دنیا حاصل کرنے اور دولت سمیٹنے کے لیے حاصل کیا جاتا ہے، تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ جیسے: کوئی آدمی ڈاکٹر یا انجینئر اس لیے بنتا ہے کہ میں پیسے حاصل

کروں اور مالدار بن جاؤں تو ڈاکٹری اور انجینئرنگ کا علم اس مقصد کے لیے پڑھنا گناہ کا کام نہیں ہے۔ لیکن دین کا علم اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہے اور علمِ دین کا حاصل کرنا عبادت ہے۔ اور میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ جو اعمال اللہ تعالیٰ کے لیے کیے جانے چاہئیں ان کو کسی دوسرے مقصد (یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کے بجائے دنیا کا سامان حاصل کرنے اور مال و دولت سمیٹنے کے لیے اور لوگوں کی نگاہوں میں عزت پیدا کرنے کے لیے) حاصل کرے؛ تو جنت میں داخل ہونا تو دور کی بات رہی، جنت کی خوشبو بھی اس کو محسوس نہیں ہوگی۔ حالاں کہ دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے۔ اس سے ریاء و دکھلاوے کی شناعت و برائی معلوم ہوتی ہے۔

(اس کتاب کا پہلا باب اخلاص کے سلسلہ میں تھا وہاں اس پر تفصیل سے کلام کیا جا چکا ہے۔)

باب ما يتوهم أنه رياء وليس هو رياء

کسی عمل میں ریا کا شائبہ، حالاں کہ وہ ریا نہیں ہے

بعض مرتبہ ایسی صورت پیش آجاتی ہے کہ آدمی یوں سمجھتا ہے کہ وہ ریا ہے حالاں کہ وہ ریا نہیں ہوتا؛ اسی کو اس باب میں بتلاتے ہیں۔

مؤمن کو دی جانے والی نقد بشارت

حدیث ۱۶۲۱:-

وعن أبي ذرٍ - رضی الله عنه - قَالَ: قِيلَ لِرسولِ الله ﷺ: أَرَأَيْتَ الرَّجُلَ الَّذِي يَعْمَلُ العَمَلَ مِنَ الخَيْرِ، وَيَحْمَدُهُ النَّاسُ عَلَيْهِ؟ قَالَ: ((تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ.)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ سے پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! ذرا یہ بتلایئے کہ ایک آدمی نیکی کا کوئی کام کرتا ہے اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں؟ (کیا یہ بھی ریا ہے؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (نہیں! بلکہ) یہ تو مؤمن کو دی جانے والی نقد بشارت ہے۔

افادات:- ایک آدمی نے نیکی کا کوئی کام خالص اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے، اس کی رضا جوئی اور اسی سے اجر و ثواب حاصل کرنے کے لیے کیا، اور اس عمل کو انجام دیتے ہوئے اس کے دل میں دور دور تک لوگوں سے اپنی عزت کروانے، لوگوں کے دلوں میں اپنے لیے مقام پیدا کرنے اور اپنی شہرت و نیک

نامی حاصل کرنے کا شائبہ نہیں تھا، لیکن قدرت کا بھی اصول ہے کہ کوئی آدمی جب کوئی عمل محض اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کرتا ہے تو اس کے نتیجہ میں وہ اللہ تعالیٰ کا مقرب بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ خود اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے ہیں کہ میں اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، تو حضرت جبرئیل علیہ السلام بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، اس کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمانوں میں اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتے ہیں؛ اے فرشتو! تم سب بھی اس سے محبت کرو، چناں چہ آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روئے زمین میں اس کے لیے مقبولیت رکھ دی جاتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام لوگوں کے دلوں میں اس کے واسطے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔

اہل اللہ کی محبوبیت کا راز یہی ہے۔ حالاں کہ جو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں انہوں نے کبھی ان اللہ والوں کو عبادت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، ان کے عبادت کے احوال سے بھی وہ لوگ واقف نہیں ہوتے۔ ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ان اللہ والوں کو انہوں نے تہجد پڑھتے ہوئے دیکھ لیا تھا، ان کو صدقہ وخیرات کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا، ان کو اللہ کے راستہ میں مجاہدہ اور ریاضت کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ جو لوگ دور دراز رہتے ہیں جنھوں نے کبھی ان کا چہرہ بھی نہیں دیکھا ہوتا وہ بھی ان اللہ والوں سے محبت کرنے لگتے ہیں؛ دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی اسی محبوبیت کا نتیجہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا میں رکھ دی جاتی ہے۔

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور لوگ ان کے اعمال اور خوبیوں کی تعریف کرتے ہیں تو اس کی وجہ سے ان کے دل میں عجب اور خود پسندی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ اس کو سن کر وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سے کہیں محروم نہ ہو جاؤں۔ ویسے تو جنت میں فرشتوں کی طرف سے ان کو اعمال کے قبول ہونے کی بشارتیں دی جائیں گی، لیکن دنیا کے اندر بھی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال کر بشارتیں سنواتے ہیں، گویا یہ فوری فائدہ ہوتا ہے جو ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ انعام دیا جاتا ہے، اور ان اعمال کا اصل اجر و ثواب اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی تو آخرت میں حاصل ہوگی۔

گویا اس کو ریاء سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ جب وہ آدمی لوگوں کی زبانی اپنی تعریفیں سنتا ہے تو اس کے دل میں خود پسندی اور عجب کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اور وہ اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھتا، اور اس کو اپنا کارنامہ نہیں سمجھتا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سمجھتا ہے کہ اسی نے طاقت عطا فرمائی تبھی یہ عمل وجود میں آیا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اے اللہ! تو نے مجھے عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور اس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اجر و ثواب ضائع نہ ہو جائے۔

تحريم النظر إلَى المَرأة الأجنبية والأمرد الحسن لغير حاجة شرعية

اجنبی اور پرائی عورتوں کو دیکھنے اور بے ریش لڑکوں کی طرف نظر کرنے کی حرمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

”**نگاہ وشرمگاہ کی حفاظت** “والا مضمون آج سے تقریباً دس سال قبل درسِ ریاض الصالحین میں حضرت اقدس دام مجدہم نے بیان فرمایا تھا،اس کی افادیت کے شدید احساس کے پیشِ نظر اسے اسی وقت رسالہ کی شکل میں شائع کر دیا گیا تھا، اسی موقعہ پر اس کے لیے ایک افتتاحیہ بھی لکھا تھا۔اب یہ مضمون جب ترتیب کے مطابق”حدیث کے اصلاحی مضامین “(جلد:۱۴) کی زینت بننے جارہا ہے؛تو اس افتتاحیہ کا اعادہ بھی کچھ مضر نہیں، ان شاء اللہ۔ ھوٰذا... (ابوزاہر)

قرآنی اور نبوی تعلیمات سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی اس بات سے ناواقف نہیں ہوگا کہ خالق کائنات اور محسن انسانیت ﷺ کی نگاہ میں نگاہوں کی پاکیزگی اور شرم گاہ کی حفاظت کی کتنی زیادہ اہمیت ہے، اور نگاہوں کی پاکیزگی بھی دراصل شرم گاہ کی حفاظت کے لیے ہی مطلوب ہے، تو اصل مقصد تو حفاظتِ فرج ہی ہے۔ سورۂ مومنون میں فلاح یاب مؤمنین کی صفات کے منجملہ فرمایا: ﴿وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ۙ﴿۵﴾﴾ ”اور وہ لوگ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں“ سورۂ احزاب میں ان حضرات کی فہرست میں جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے مغفرت اور اجرِ عظیم تیار کیا ہے ان مردوں اور عورتوں کو بھی نمبر دیا گیا ہے جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کا اہتمام کرتے ہیں ۔سورۂ معارج میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا ۙ﴿۱۹﴾ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوۡعًا ۙ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَیۡرُ مَنُوۡعًا ۙ﴿۲۱﴾﴾ ”اس میں شک نہیں کہ انسان بڑا بے صبر اواقع ہوا ہے، اگر اسے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو دَھم پچھاڑے کرتا ہے،اور اگر حالات سازگار ہوجائیں تو کنجوس بن جاتا ہے۔“ البتہ وہ لوگ اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں جن میں یہ صفات ہیں، یہاں بھی منجملہ اور صفات کے حفاظتِ فرج کو شمار کیا ہے۔

مذکورہ بالا تینوں مواقع میں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تینوں جگہ جملہ اسمیہ استعمال ہوا ہے جس میں عربیت کے قواعد کی رو سے استمرار اور دوام ہوتا ہے، حاصل یہ نکلا کہ یہ صفت ان کی وقتی نہیں

ہے؛ بلکہ دوامی ہے، یعنی اِکّادُکّا کبھی کبھار کوئی شخص شرم گاہ کے گناہ سے بچ جائے تو یہ کوئی بات نہیں ہوئی، بات تو تب ہے جبکہ آدمی ہمیشہ بچے۔

اوپر جن تین آیتوں کا ترجمہ یا مفہوم پیش کیا گیا، ان میں سے اول و آخر آیت میں اپنی بیویوں اور باندیوں کا استثناء کیا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ بیویوں اور باندیوں کے معاملہ میں کوئی پابندی اور روک ٹوک نہیں ہے؛ کیوں کہ یہ بھی در حقیقت حفاظتِ فروج میں معین و مددگار بننے والی ہیں۔ گھر میں بھوک مٹ جائے تو باہر مارا مارا کیوں پھرے؟

حدیثِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے: اگر کسی اجنبیہ پر اچانک نظر پڑ جانے سے دل میں داعیہ پیدا ہو جائے تو گھر آکر اپنی بیوی کے ساتھ مشغول ہو جائے، چاہے وہ تنور پر ہو (باورچی خانہ میں کتنے ہی اہم کام میں مشغول ہو) کیوں کہ اُس کے پاس وہی ہے جو اِس کے پاس تھا۔ یہ بھی تاکید فرمائی گئی کہ لڑکا لڑکی جب شادی کے لائق ہو جائیں تو پھر شادی میں بلا کسی معقول عذر کے تاخیر نہیں کرنی چاہیے، اگر دیر کی اور وہ گناہ میں مبتلا ہوئے تو ماں باپ بھی گنہگار ہوں گے۔ اگر کوئی شخص تصحیح نیت کے اہتمام کے ساتھ صحبت کرے تو اس کو صدقہ کا ثواب ملتا ہے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب اس پر حیرت کا اظہار کیا تو ارشاد فرمایا کہ: اچھا بتاؤ! اگر یہ شہوت غلط جگہ پوری کرتا تو گناہ ہوتا یا نہیں؟ بلکہ محبت کے ساتھ بیوی کے منھ میں لقمہ دینے پر بھی ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ نکاح کا تحفہ امت کے نوجوانوں کو کس مصلحت کے پیشِ نظر دیا گیا؟ دو ہی بڑی مصالح بتائیں: (۱) نگاہوں کی حفاظت

(۲) شرم گاہ کی پاکی۔ اس کے بعد بھی اگر کسی کی نگاہ میں پاکیزگی نہ آئے اور شرم گاہ محفوظ نہ ہو؛ تو اس میں کسی کا کیا قصور ہے؟ گھر میں کھانا موجود ہوتے ہوئے بھی اگر کوئی بھوکا پیاسا مارا مارا پھرتا ہو؛ تو اس میں بھول کس کی ہے؟ کسی کی تشفی ایک سے نہ ہوتی ہو؛ تو چار تک کی اجازت دی گئی۔

ایک موقع پر حضورِ اکرم ﷺ نے دعا مانگی: اے اللہ! تو میری شرم گاہ کو محفوظ کر دے۔ ایک اور موقع پر فرمایا: اے اللہ! میں اپنی منی کے شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔

مردوں اور عورتوں دونوں کو نگاہیں نیچی رکھنے کی تاکید کی گئی، علاوہ ازیں عورتوں کو بلا ضرورتِ شدیدہ گھر سے نکلنے سے منع کر دیا گیا۔ وقتِ ضرورت نکلنے پر شرعی پردہ کی پابندی عائد کر دی، خوشبو لگا کر نہ نکلے، میلے کچیلے کپڑوں میں نکلے، بجتا زیور پہن کر نہ نکلے، اجنبیوں سے بلا ضرورت بات نہ کرے، اگر بات کرنے کی نوبت آ ہی جائے تو ناز وادا سے بات نہ کرے؛ بلکہ کڑک لہجے میں بات کرے۔ فون ریسیو کرنے والی خواتین توجہ دیں۔ اولاً تو مردوں کی گھر میں موجودگی کی صورت میں انہیں فون ریسیو کرنا ہی نہیں چاہیے۔ اور گھر میں کوئی بھی مرد موجود نہ ہو تو لہجہ اور آواز کو بہ تکلف سخت بنا کر مختصر سی بات کر لینی چاہیے۔ عموماً ہمارے معاشرہ میں مرد فون ریسیو کرنے کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ گھر میں ان کے موجود ہوتے ہوئے عورتوں کا فون ریسیو کرنا؛ مردوں کی غیرت کے خلاف ہے۔ اگر اس بات کے آثار و قرائن غالب ہوں کہ کال (Call) کسی خاتون ہی کا ہے؛ تو بات اور ہے۔

الحاصل !ان تمام احکامات کے جاری کرنے کے پیچھے آخر کون سے مقاصد کار فرما ہیں؟ ظاہر یہی ہے کہ ایک پاکیزہ مثالی معاشرہ وجود میں آئے۔ ”یک در گیر؛ محکم گیر“۔ آج تو ماحول اتنا آلودہ ہے، مادی اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی؛ مگر مادی آلودگی (Polution) کا احساس بھی ہے اور علاج کا فکر بھی ہوتا ہے، مگر معنوی اور روحانی کثافت کا کسی کو احساس ہی نہیں ہے، اس کی پاکیزگی اور نورانیت کا تصور بھی جلدی سے قائم نہیں ہوتا۔ خالقِ کائنات نے جتنی شدت اور تاکید سے ماحول کو روحانی، نورانی اور پاکیزہ بنانے کی طرف توجہ دلائی، آج کے شیاطین الانس اس کو اتنا ہی غلیظ، کثیف اور آلودہ بنانے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں، عورتوں کو یہ پٹی پڑھائی کہ پردہ ان کی آزادی پر حملہ ہے، ان کو اجنبیوں کے سامنے نچوایا، آزادی اور تہذیب کے نام پر عورتوں کے ساتھ ایسی دھوکہ بازی؛ کہ اتنا بڑا دھوکہ شاید انسانیت کی تاریخ میں کسی کے ساتھ نہیں ہوا ہوگا۔ مرد نے اپنی ہوس کی تسکین کی خاطر یا پیسہ بٹورنے کے لیے ایک باعزت صنف کی ساری عزت و عصمت کو تار تار کر دیا۔ اس کو یہ سبق پڑھا دیا کہ تمہیں خوب آراستہ پیراستہ ہو کر گھر سے نکلنا چاہیے۔ گھر میں نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ تم ملازمت کیوں نہیں کرتی؟ تم بزنس کیوں نہیں کر سکتی؟ کون کہتا ہے تم شاپنگ کرنے نہیں جا سکتی؟ تمہیں ناچنے گانے سے کس نے روک دیا؟ خوب ناچو، گاؤ:۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

نتیجہ یہ ہوا کہ عورتوں نے میدان میں اتر کر ہر میدان مارنے کی کوشش کی، خوب بن سنور کر بازاروں میں آئیں، دکانوں پر بیٹھیں؛ تاکہ جو ہوس خور مرد چاہے اُسے دیکھ کر تسکین حاصل کرلے۔ اب ظاہر ہے کہ صرف دیکھ کر تو تسکین ہونے سے رہی؛ اس کا جو بھی نتیجہ ہونا چاہیے وہ ہوا، اور آج حالت یہ ہوگئی کہ جس عورت کو اسلام نے عزت کی چوٹیوں پر پہنچا کر اُسے تقدُّس عطا کیا تھا، آج وہ دوبارہ زمانۂ جاہلیت کی طرح قعرِ مذلت میں جا گری ہے، نہ اس کا کوئی وقار ہے، نہ تقدُّس۔ آج پھر اس کی حیثیت ایک کھلونے کی گڑیا جیسی ہوگئی، یا زَر خرید باندی جیسی۔ لیکن اسلام کی زندہ تعلیمات کا دامن آج بھی پھیلا ہوا ہے کہ خواتین اپنے آپ کو اس سے وابستہ کرکے کھویا ہوا مقام واپس لے لیں۔ دل میں تقویٰ ہو، اور جسم پر شرعی پردہ ہو؛ پھر دیکھو! تمھیں کیا مقام و مرتبہ ملتا ہے؟

دوسری طرف ہمارے نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ عورتوں کے پیچھے لٹو بنے پھرتے ہیں، جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں، دلوں میں آگ لگ گئی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جب تک کسی بھی جائز وناجائز طریقہ سے بجھا نہ لو؛ سکون کہاں ملنے والا ہے؟ اگر ناجائز طریقہ سے بجھائی تو حالت اور نازک ہوجاتی ہے، سکون واطمینان غارت ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ غیر فطری طریقہ میں سکون کہاں؟ آج عموماً یہ حالت ہے کہ مرد کی نگاہ کہیں لڑی ہوئی ہے، بیوی کا گھپلہ کہیں چل رہا ہے، خاندان اور معاشرت کی حالت تباہ وبرباد ہے۔ خمیازہ معصوم ونابالغ بچوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس ڈھٹائی اور بے ہودگی کے ساتھ کھلم کھلا ہمارے مرد اور عورتیں خدا کو ناراض کرنے پر تلے ہوئے ہیں؛ اس کو دیکھ کر آدمی سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ایسے میں آخر سکون ملے تو کیسے ملے، اور کہاں ملے؟ شہر میں پچاسوں تھیٹر اور سینما ہیں جس میں جو فلم چاہو دیکھ لو، گھروں میں ٹی وی ہے، کیبل ہے، جب چاہو، جو تماشہ چاہو؛ دیکھ لو۔ مختلف اخبارات اور ان کے اضافے (પુર્તિયાં) عریاں اور ننگی تصویروں والے موجود۔ رہی سہی کمی انٹرنیٹ نے پوری کر دی۔ بالکل صحیح فرمایا شیخ الاسلام حضرت مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے: ”آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے“۔

یہ ہمارے معاشرے کی افسوسناک صورتِ حال کی ایک جھلک ہے، کچھ لوگ اس سے بھی زیادہ میں مبتلا ہوں گے، انہیں اپنی حالتِ زار پر نظر ثانی کرنے اور اپنے آپ پر اور اپنے بیوی بچوں پر اور انسانی سماج پر رحم کھانے کی ضرورت ہے کہ جس راہ پر آپ نے دَوڑ لگائی ہوئی ہے؛ یہ راستہ ایک بہت گہری اور خطرناک کھائی پر پورا ہوتا ہے، جس میں ایک بار گر جانے کے بعد وہاں سے باہر نکلتے ناک میں دم آجائے گا۔ یقیناً بہت سے لوگ ان گندگیوں سے پاک بھی ہوں گے ایسے لوگ قابلِ صد مبارک باد ہیں۔

اور ہاں! آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ انسانیت کے خود ساختہ علمبرداروں نے انسانیت کو جس راستہ پر ڈالا تھا، اور تعلیماتِ اسلامی سے بے زار کیا تھا، آج وہ خود سر پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں، اور جن سعید روحوں کی قسمت اچھی تھی؛ وہ اسلام اور اس کی تعلیمات کے دامن میں آ آ کر پناہ لے رہی ہیں۔

حضرت اقدس مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم اپنے ایک سفر نامہ میں لندن ٹائمز کے حوالہ سے رقم طراز ہیں: -

''اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان برطانوی نو مسلموں میں بھاری اکثریت خواتین کی ہے۔ اخبار کی اطلاع کے مطابق امریکی نو مسلموں میں بھی خواتین کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں چار گنا زیادہ ہے... مغرب کے لوگ خود اپنی سوسائٹی سے مایوس ہو رہے ہیں جس میں بڑھتے ہوئے جرائم، خاندانی نظام کی تباہی، منشیات اور شراب نوشی کا دَور دورہ ہے، بالآخر وہ اسلام کے دیئے ہوئے نظم وضبط اور تحفظ کی تعریف کرتے ہیں۔

ایک اٹھائیس (۲۸) سالہ برطانوی خاتون جو ''ہُدیٰ خطوب'' کے اسلامی نام سے مشہور ہے، اس نے مسلم خواتین کے لیے ایک کتاب لکھی ہے۔ اسلام اور عیسائیت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتی ہے: ''عیسائیت ہر وقت بدلتی رہتی ہے، مثلاً اب بعض عیسائیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ شادی سے پہلے جنسی تعلقات قائم کرنے میں کچھ حرج نہیں؛ بشرطیکہ یہ اس شخص کے ساتھ ہوں جس سے شادی کرنے کا ارادہ ہو۔ یہ بڑا ڈھیلا ڈھالا مذہب ہے۔ اس کے برعکس جنسی تعلقات کے بارے میں اسلام کی تعلیمات یکساں رہی ہیں۔''

حضرت مفتی صاحب لکھتے ہیں:- ''اگرچہ عام تاثر یہ ہے کہ مغربی خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کو پسند کرتی ہیں، اور اپنی اس خواہش سے دستبردار ہونا ان کے لیے بہت مشکل ہے؛ لیکن

برطانیہ کی جن نو مسلم خواتین سے لندن ٹائمز نے گفتگو کی، اس میں ان خواتین نے بتایا کہ: ہمارے لیے اسلام میں کشش کا سبب ہی یہ ہوا کہ اسلام مرد اور عورت دونوں کے لیے الگ الگ دائرۂ کار تجویز کرتا ہے، جو دونوں کی جسمانی اور حیاتیاتی سانچوں کے عین مطابق ہے۔ ان کے نزدیک مغرب کی تحریکِ نسائیت (Feminism) در حقیقت عورت کے ساتھ بغاوت تھی۔

تحریکِ آزادئ نسواں پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خواتین نے کہا: ”اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ عورتیں مردوں کی نقالی کریں، اور یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں نسوانیت کی اپنی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی“۔

اسکاٹ لینڈ کی نو مسلم ”نوریہ“ کا کہنا ہے: ”اس ملک میں بیشتر خواتین اپنی صنف کے خلاف بغاوت کررہی ہیں، اور یہ طرزِ عمل تقریباً ایسا ہے جیسے ہم سے ہماری نسوانیت چھین لی گئی ہے“۔

”نوریہ“ کی ایک سہیلی ”حسانہ“ کے مطابق ”پردہ سے ہمیں تحفظ کا احساس ہوتا ہے، اور ہماری خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے“۔

لندن ٹائمز لکھتا ہے کہ: بہت سی نو مسلم خواتین نے اسلام اور مغرب کا تقابل کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا کہ ”اسلامی تعلیمات میں عورت کو زیادہ تقدس اور عظمت حاصل ہے، جو مغرب میں عورت کو حاصل نہیں۔

اور ان کے نزدیک مغرب کی تحریکِ آزادیٔ نسواں کا اس کے سوا کوئی نتیجہ نہیں نکلا کہ عورت دوہرے بوجھ تلے دب گئی“۔ (دنیا میرے آگے، ص: از ۹۲ تا ۹۷)

آج ہمارے نوجوانوں کو اس راہ سے بہکانے کے لیے جتنے ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں، وہ ان سے چوکنا ہونے اور بچنے کے بجائے؛ بڑھ بڑھ کر ان کا استقبال کر رہے ہیں، اور اس طرح اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کی سبیل پیدا کر رہے ہیں۔ بادِ مخالف اس تیزی سے چل رہی ہے کہ اس میں اپنی آواز سنائی دینے کی کوئی امید ہی نہیں۔ ماحول کچھ ایسا مسموم بنا دیا گیا ہے کہ قلم ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے، اور زبان لڑکھڑاتی ہے؛ مگر بولنا اور لکھنا تو ہے ہی، کیوں کہ وہ نفع سے خالی نہیں ہے۔

نوجوانو! بیدار ہو جاؤ، سنبھل جاؤ، شُتُرِ بے مہار مت بنو۔ ہوشیار وہ نہیں جو زیادہ سے زیادہ آنکھیں لڑائے، شکار کھیلے، کھانچے مارے، جو اپنے آپ کو خواہشات کے پیچھے ڈال دے، وقتی اور نقد فائدہ کو دیکھ کر ہمیشہ کا اور بعد کا نقصان نظر انداز کردے؛ بلکہ ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کو قابو میں رکھے، اور مابعد الموت کے لیے تیاری کرے، اور ہمیشہ کے نفع کے پیشِ نظر وقتی اور عارضی لذت کو چھوڑنا گوارا کرلے۔ حدیثِ پاک میں ہے: جو مجھے اپنی زبان اور شرم گاہ کی حفاظت کی ضمانت دیدے، مَیں اُسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

تو آؤ! نفس و شیطان اور مغربی تہذیب کے علمبرداروں کی تعلیمات پر پھٹکار بھیجیں، اور قرآنی اور نبوی تعلیمات کا بڑھ کر استقبال کریں، انہیں سینہ سے لگائیں، نفس کی غلامی چھوڑ کر خدا اور رسول کی

غلامی اختیار کریں۔ نفسانی خواہشات کے مزے توخوب اڑائے؛ آیئے! اب ذرا نفس کی مخالفت کا ذائقہ چکھیں، جس پر محبوبِ خدا ﷺ نے حلاوتِ ایمانی کا وعدہ فرمایا ہے۔ نفس کے پیچھے دَوڑ دَوڑ کر بہت تھک گئے؛ آؤ! اب رحمانی سائے میں پناہ لے کر بھی دیکھیں کہ کتنا سکون ملتا ہے!

یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی موضوع پر روشنی ڈال رہی ہے قرآنی اور نبوی حقائق ہیں، واقعات سے سبق ہے۔ دلوں کے قفل کھول لیجئے، پھر عقیدت مندی سے سنئے اور پڑھیے؛ کوئی وجہ نہیں ہے کہ فائدہ نہ ہو۔

مضمون کی اہمیت کے پیش نظر کتاب کو اردو اور گجراتی دونوں زبانوں میں شائع کیا جارہا ہے، حق تعالیٰ قبول فرمائے۔ آئندہ مزید دَر مزید کی توفیق عطا فرمائے۔

آخر میں ایک حدیثِ پاک کا یہ حصہ ضرور درج کر دینے کو جی چاہتا ہے، نبیٔ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سات انسان ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے عرش کا سایہ عنایت فرمائیں گے، جس دن اس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا، منجملہ ان کے وہ نوجوان بھی ہے جسے کوئی خوبصورت شریف اور خاندانی خاتون بدکاری کی آفر (Offer) کرے، اور وہ یہ کہہ دے: مجھے تو خدا سے ڈر لگتا ہے۔

(ابوزاہر)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

أَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ، وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنْ لَّا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لاَ شَرِیْکَ لَہٗ، وَنَشْھَدُ أَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ، صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی آلِہٖ وَأَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْماً کَثِیْراً کَثِیْراً۔ أما بعد:

أَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ،

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ أَبْصَارِھِمْ۔ (النور:۳۰)

وقال تعالٰی: إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ أُولٰئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلاً۔ (الإسراء:۳۶)

وقال تعالٰی: یَعْلَمُ خَائِنَۃَ الْأَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ (غافر:۱۹)

وقال تعالٰی: إِنَّ رَبَّکَ لَبِالْمِرْصَادِ۔ (الفجر:۱۴)

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے عنوان قائم کیا ہے: ”شرعی ضرورت کے بغیر کسی پرائی عورت کو دیکھنا، یا حسین بے ریش لڑکے کی طرف نظر کرنا حرام ہے“۔

گناہ کے اسباب سے بچنا بھی ضروری ہے

اسلام نے جہاں اچھے اور عمدہ صفات اختیار کرنے اور کمالات سے مُتّصِف ہونے کی تعلیم دی ہے، وہیں برائیوں اور بری صفات سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنے کی بھی تعلیم دی ہے۔ فواحش، منکرات، بدکاری اور زنا سے اسلام نے منع فرمایا۔ زناکاری اور اس کے جو مقدمات ہیں -یعنی زنا کو انجام دینے کے لیے جو کام کئے جاتے ہیں ، جیسے: نگاہوں کی بے احتیاطی، کان، زبان ہاتھ وغیرہ کا غلط استعمال؛ان سب کو" فواحش " کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے-ان سے بھی اسلام نے منع کیا ہے۔

ویسے ان کاموں کی برائی تو ایسی ہے کہ اس کے ناپسندیدہ ہونے پر تقریباً دنیا کے تمام مذاہب کا اتفاق ہے، لیکن اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ سدِّ ذرائع کا اہتمام کرتا ہے،یعنی برائیوں تک پہنچنے کے جو راستے اور اسباب، ذرائع اور وسائل ہیں؛ ان پر بھی پابندی لگاتا ہے۔ مثلاً: اسلام نے جہاں شراب پینے سے منع کیا،تو صرف اتنا نہیں کہا کہ شراب پینا منع ہے؛ بلکہ شراب پینے کی ممانعت کو پختہ کرنے کے لیے شراب کے متعلق بہت سارے احکام دیئے، جیسے: شراب کا بنانا، شراب کا بیچنا، کسی کو لے جاکر شراب دینا، کسی کے لیے شراب کا خریدنا، کسی کے سامنے شراب کا پیش کرنا؛یہ ساری چیزیں اسباب ووسائل بن سکتے ہیں ، لہٰذا ان تمام کو بھی حرام قرار دیا۔ جس طرح شراب کا پینا حرام ہے، اسی طرح ان تمام کاموں کا کرنا بھی حرام ہے۔

گنہگاروں کے ساتھ مشابہت بھی منع ہے

یا مثلاً: بت پرستی کو اگر حرام قرار دیا، تو بت پرستی کے اسباب و وسائل پر بھی پابندی لگادی گئی۔ بت تراشی یا تصویر سازی (بتوں کو بنانا، تصویریں بنانا) چاہے وہ ایک مجسمہ (Statue) کی شکل میں ہو، یا کاغذ اور دیوار کے اوپر ہو؛ ان سب کو ممنوع قرار دیا گیا۔

اسی طرح جو چیزیں اس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں، جسے دیکھ کر یہ شبہ ہو کہ آدمی اس برائی تک پہنچ جائے گا؛ اس کو بھی ممنوع قرار دیا۔ جیسے: لوگ آفتاب کی پوجا کیا کرتے تھے، اور آفتاب کی پوجا کے لیے ان کے یہاں خاص خاص اوقات مقرر تھے کہ صبح جب آفتاب طلوع ہو رہا ہو اس وقت اس کی پوجا کی جاتی تھی، دوپہر کو جب سر کے اوپر ہو اس وقت، اور شام کو غروب ہونے کے قریب ہو اس وقت اس کی عبادت کی جاتی تھی۔ لہٰذا اسلام نے ان اوقات میں سجدہ کرنے اور نماز پڑھنے سے منع کیا ہے۔ حالاں کہ نماز پڑھنے والا اور سجدہ کرنے والا آفتاب کی پوجا نہیں کرتا؛ لیکن اس لیے منع کر دیا تا کہ ان کے ساتھ مشابہت بھی لازم نہ آئے۔ گویا اس طرح بت پرستی کے دروازے کو بند کر دیا گیا۔

ایک بہترین مثال

ہمارے یہاں حکومتی سطح پر کوئی ابھیان اور تحریک چلائی جاتی ہے، جیسے: ملیریا (Malaria) نابودی اَبھیان اور تحریک چلائی جاتی ہے، تو اس میں صرف اتنا ہی نہیں ہوتا کہ جنہیں ملیریا کا بخار ہو،

ان کا ہی علاج کر دیا جائے؛ بلکہ ملیریا کی بیماری پیدا ہونے کے جو اسباب اور عوامل ہیں، اور جن راستوں سے یہ بیماری آتی ہے؛ ان سب سے بھی لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے، اور ان اسباب سے بھی بچانے کا اہتمام کرایا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ حضرات جگہ جگہ دیکھ رہے ہیں کہ بڑے بڑے سائن بورڈ لگے ہوئے ہیں جن پر مچھروں کی تصویریں دکھائی گئی ہیں، اور ان کی حقیقتوں سے آگاہ کیا گیا ہے کہ: دیکھو! یہ مچھر ہے، اور یہ مچھر کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ کس جگہ بنتے ہیں؟ آپ اگر اپنے گھر میں نالیوں کو گند رکھیں گے، پانی بہنے کے راستوں کو کھلا رکھا جائے گا، تو وہاں ان کے پیدا ہونے کا زیادہ امکان رہتا ہے۔ اگر آپ کے گھر کے کسی کونہ میں اندھیرا رہتا ہے تو وہاں بھی ان مچھروں کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جن جن راستوں سے یہ بیماری آسکتی تھی ان تمام کو ختم کرنے کے لیے دور دور تک کی تدبیریں اختیار کی گئیں، تب ہی آدمی کامیابی کے ساتھ اس سے بچ سکتا ہے۔

اسی طرح جتنی بھی مہلک بیماریاں ہیں ان سے بچنے کے لیے اور ان کی جڑ ختم کرنے کے لیے، ان کا قلع قمع کرنے کے لیے حکومتی سطح پر، یا دوسرے طریقوں سے جتنی بھی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں ان میں یہی طریقہ کار ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام نے تمام گناہ اور برائیوں کو ختم کرنے کے لیے جہاں ان گناہوں سے منع کیا؛ وہیں ان کے عوامل اور اسباب سے بھی منع کیا ہے۔

اسبابِ زنا پر پابندی

''زنا'' ایک مہلک بیماری اور بہت خطرناک گناہ ہے، جس کے متعلق قرآن پاک میں کہہ دیا گیا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی﴾ (بنی اسرائیل:۳۲) زنا کرنا تو درکنار؛ اس کے قریب بھی مت جاؤ۔ تو اب جہاں زنا سے منع کیا گیا، وہیں زنا کے اسباب اور عوامل پر بھی اسلام نے پابندی لگادی۔ جیسے عورتوں اور مردوں کے آپس میں ملنے جلنے اور عورتوں کے بے پردہ نکلنے سے بھی روکا گیا۔ بلکہ عورتوں کو تاکید کردی گئی: ﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ (سورۂ احزاب:۳۳) اپنے گھروں کے اندر جم کرکے رہو، اور ان کے نکلنے کے معاملہ میں بھی خاص تاکید کردی گئی کہ اگر فلاں فلاں شرعی اسباب اور اعذار ہیں تب تو نکلنے کی اجازت ہے، اس کے بغیر گھر سے نہ نکلو۔ اور اگر نکلو تو برقعہ کے اندر پردے کے اہتمام کے ساتھ، اپنے آپ کو اور اپنی زینت کو چھپاتے ہوئے نکلو؛ یہاں تک کہ بجنے والا زیور پہننے سے بھی منع کیا، اس لیے کہ عورت اگر کہیں سے گزر رہی ہو، اور بجتے ہوئے زیور کی آواز کسی کے کان میں پہنچ گئی؛ تو یہ چیز بھی شہوت کو ابھارنے والی ہے۔

اسی طرح خوشبو لگا کر نکلنے سے بھی منع کیا گیا، حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ: جو عورت خوشبو لگا کر نکلتی ہے، اور مردوں کے پاس سے گزرتی ہے، وہ ایسی ہے، ایسی ہے۔ یعنی اس کو زانیہ قرار دیا گیا (ترمذی ۲/۱۰۶)

اور مردوں کو تعلیم دی گئی کہ کہیں کوئی اجنبی عورت سے کوئی چیز لینے دینے کی ضرورت پیش آجائے تو دیوار اور پردے کی آڑ سے لینے دینے کا سلسلہ ہونا چاہیے۔ اجنبی عورت کو نہ دیکھنا، آنکھوں کی حفاظت کرنا، نگاہوں کو نیچا رکھنا، شرم گاہوں کی حفاظت کرنا؛ یہ سارے احکام صرف زنا سے بچانے کے لیے ہیں۔

تو اسلام کی بنیادی تعلیمات میں خصوصی اہتمام اس بات کا بھی کیا گیا ہے کہ زنا اور اسبابِ زنا سے تاکید کے ساتھ روکا گیا۔

عفت (پاک دامنی) نبی کریم ﷺ کی ایک بنیادی تعلیم

ایک طرف زنا کے بارے میں یہ تعلیمات ہیں۔ اس کے بالمقابل اپنے آپ کو زناکاری، حرام کاری اور بے حیائی کے کاموں اور فواحش سے بچانا؛ عفاف، عفت اور پاک دامنی کہلاتا ہے۔ اس کی بھی بڑی تاکید ہے۔ اور نبیٔ کریم ﷺ کی بنیادی تعلیمات میں اس کو جگہ دی گئی ہے۔

بخاری شریف میں امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے پہلے ہی باب میں ہرقل والی حدیث ذکر کی ہے، اور دوسری جگہوں پر بھی اس روایت کو پیش کیا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت نبیٔ کریم ﷺ نے شاہِ روم ہرقل کے نام دعوتِ اسلام کا خط (نامۂ مبارک) بھیجا اس زمانہ میں وہ اپنی ایک نذر پوری کرنے کے لیے بیت المقدس کی زیارت کے لیے آیا ہوا تھا، اور وہ خط شام کے ایک شہر ''بُصریٰ'' کے

حاکم کے ذریعہ وہیں پہنچایا گیا، جب اس کے پاس نبیٔ کریم ﷺ کا نامۂ مبارک پہنچا تو حضورِ اکرم ﷺ کے متعلق اس نے تحقیقات کیں، چوں کہ وہ خود بھی آسمانی کتابوں اور اپنے مذہب کا بہت بڑا عالم تھا اور نبیٔ آخر الزماں کی علامتوں سے بخوبی واقف تھا، اور اس زمانہ میں عیسائیوں کے اندر دو ہی بڑے عالم تھے، ایک تو اس زمانے کا بڑا لاٹ پادری (یعنی تمام پادریوں کا رئیس اعلی) اور دوسرا یہی ہرقل۔

نبیٔ کریم ﷺ کا نامۂ مبارک جب اس کے پاس پہنچا تو اس کے مضمون سے واقف ہونے سے پہلے اس نے ضروری سمجھا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی شخصیت اور آپ کی ذاتِ اقدس کے متعلق معلومات حاصل کی جائیں، اور یہ معلوم کیا جائے کہ یہ خط بھیجنے والی شخصیت کون ہے؟ کیوں کہ اسی کے ذریعہ خط کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ اس نے اپنے لوگوں سے کہا کہ جن کی طرف سے یہ خط بھیجا گیا ہے ان کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں؛ کیا اس علاقہ کے کچھ لوگ مل جائیں گے؟ لوگوں نے بتلایا کہ: جی ہاں! وہاں کے لوگ تجارت کی غرض سے ملکِ شام آتے رہتے ہیں، آپ اجازت دیں تو تلاش کیا جائے گا۔ چناں چہ معلوم ہوا کہ ایک قافلہ آیا ہوا ہے، اور اتفاق کی بات کہ اس قافلہ کے امیر اور رئیس ابوسفیان تھے- جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے- اور حزبِ مخالف -یعنی کفار اور مشرکینِ مکہ- کے سردار اور لیڈر بھی وہی تھے۔ چناں چہ ان کو قافلہ والوں کے ساتھ بلایا گیا، اور حضورِ اکرم ﷺ کے متعلق ان سے سوالات کئے گئے۔ اور یہ بھی کہا کہ: دیکھو! مَیں ان کے متعلق

سوالات کروں گا، تم ان کا صحیح صحیح جواب دینا۔ اور ساتھیوں کو بھی بتلادیا کہ: اگر یہ غلط جواب دیں تو تم نشان دہی کر دیجیو۔

آپ ﷺ کی تعلیمات کا خلاصہ

مَیں خاص طور پر جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان سوالات میں آخری سوال ہرقل نے یہ پوچھا: ''وَمَا يَأْمُرُكُمْ'' یہ نبی تم کو کس چیز کا حکم دیتے ہیں؟ انہوں نے کہا: وہ ہمیں اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ ہم ایک اللہ ہی کی عبادت کریں، اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبادت اور پوجا نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور آگے فرمایا کہ: یہ نبی ہم کو چار کاموں کا حکم دیتے ہیں: نماز کا، سچائی کا، عفاف کا (یعنی پاک دامنی اختیار کرنے کا، اپنے آپ کو فواحش اور برائی کے کاموں سے بچانے کا) اور صلہ رحمی (یعنی رشتہ داروں کے ساتھ اچھائی اور بھلائی کا سلوک کرنے) کا حکم دیتے ہیں۔ (بخاری شریف ۱/۴)

گویا نبی کریم ﷺ کی جو بنیادی تعلیمات تھیں، ابوسفیان نے وہی بتلائیں۔ اور ایسے موقعوں پر ساری تفصیلات پیش نہیں کی جاتیں، بلکہ خلاصہ اور نچوڑ ہی پیش کیا جاتا ہے۔ اور انہوں نے ہرقل کے سامنے وہی پیش کیا۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ جن چار خوبیوں کا تذکرہ کیا ان میں ایکعفاف (یعنی پاک دامنی) بھی ہے۔

سورۂ یوسف کا اہم سبق

عفت کا مطلب ہے کہ اپنے آپ کو بے حیائی کے کاموں سے، بدکاری اور زنا سے بچانا۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس کو اختیار کرنے کا قرآنِ کریم کے اندر بھی حکم دیا گیا ہے، اور اس کے متعلق حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم میں جو واقعات پیش کئے جاتے ہیں وہ ایک مخصوص مقصد کے پیشِ نظر ذکر کئے جاتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ان واقعات کے ذریعہ اس کے پڑھنے والوں اور جن تک یہ قرآن پہنچ رہا ہے ان سب کو تعلیم دینا اور عبرت دلانا مقصود ہوا کرتا ہے۔

تمہاری عورتیں بھی پاک دامن رہیں گی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں بھی عفت اور پاک دامنی کا سبق دینے کا بڑا اہتمام تھا۔ چناں چہ ایک روایت میں ہے: ”عِفُّوْا،تَعِفُّ نِسَآؤُكُمْ. وَبَرُّوْا آبَائَكُمْ، تَبَرُّكُمْ أَبْنَآؤُكُمْ“ (مجمع الزوائد: ۸/۶۱) تم پاک دامنی اختیار کرو؛ تمہاری عورتیں پاک دامن رہیں گی۔ گویا اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری عورتیں پاک دامن رہیں تو تمہیں خود اس وصف اور خوبی کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اور تم اپنے ماں باپ کے ساتھ فرماں برداری، اطاعت شعاری، حسنِ سلوک اور اچھائی کا معاملہ کرو؛ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ اچھائی کا معاملہ کرے گی۔

قدرت کسی کی رعایت نہیں کرتی

قدرت کا ایک نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں چلایا ہے کہ یہاں جیسا کروگے؛ ویسا بھروگے:

ع یہ ہے گنبد کی صدا؛ جیسی کہے ویسی سنی

اور قدرت اپنے قانون کو جاری کرنے کے معاملے میں کسی کی رعایت نہیں کرتی۔ کسی کے نسب کی، کسی کے منصب کی، کسی کے مقام کی اور کسی کی شخصیت کی کوئی رعایت نہیں کی جاتی، جو بھی اس قانون کے ماتحت آئے گا اس پر قدرت اپنا قانون جاری کر کے رہے گی۔ یہاں بھی نبی کریم ﷺ نے قدرت کا ایک قانون بتلایا کہ تم پاک دامن رہو گے تو تمہاری بیویاں اور تمہاری عورتیں پاک دامن رہیں گی۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ہماری طرف سے پاک دامنی کے تقاضوں کو پورا کرنے میں کوتاہی برتی جائے گی، تو اس کا اثر لازمی طور پر ہماری عورتوں پر پڑے گا۔ چناں چہ واقعات بھی اسی کی شہادت دیتے ہیں۔

ایک عبرت ناک واقعہ

ہمارے ایک قریبی شخص نے سنایا کہ: ایک صاحب باقاعدہ عالمِ دین تھے، ان کا نکاح نہیں ہوا تھا، اور ایک بستی کے اندر خدمت انجام دے رہے تھے۔ وہاں کسی نوجوان لڑکی سے آنکھ لڑ گئی اور بڑھتے

بڑھتے یہ سلسلہ بدکاری تک پہنچا، اور پھر یہ سلسلہ برابر جاری رہا، اور ایسی چیز چھپتی نہیں ہے۔ چناں چہ لوگوں میں اس کا چرچا ہوا، گاؤں اور بستی کے سمجھ دار لوگوں نے سوچا کہ نوجوان ہے، شادی نہیں ہوئی ہے، اس لیے ایسا کریں کہ ان کا نکاح کرادیں، تاکہ وہ اس معصیت سے باز آجائیں۔ پرانے زمانہ کے لوگ عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ ان لوگوں نے بھی ایسا نہیں کیا کہ اولِ وہلہ میں ان کے خلاف کوئی اقدام کرلیا ہو، بلکہ یہ ان کی سمجھداری کی بات تھی کہ ان کو موقعہ دیا۔ اور قدرت کی طرف سے بھی موقعہ دیا جاتا ہے، اور دنیا میں جہاں بھی سنجیدہ قوانین ہیں وہاں انسان کو سدھرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

بہر حال! ان لوگوں نے مولوی صاحب کے مناسب بڑی خوبصورت لڑکی کے ساتھ نکاح کرادیا۔ لیکن ان کا تو ایک مزاج بن چکا تھا، جیسا کہ کہا جاتا ہے نا کہ: "بازار کا کھانے کی عادت ہوجائے؛ تو گھر کا کھانا اچھا نہیں لگتا" ایسا ہی ان کا بھی مزاج بنا ہوا تھا کہ گھر میں بیوی کے ہونے کے باوجود اس کی طرف دھیان نہیں تھا، اور پرائی عورت میں لگے ہوئے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ اپنی بیوی کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتے تھے اور بیوی کی موجودگی میں پرائی عورت اور محبوبہ کے ساتھ بدکاری میں ملوث رہتے تھے۔ جب بستی والوں نے دیکھا کہ ان کا معاملہ نہیں سدھرتا، تو ان کو اپنی بستی سے علاحدہ کردیا۔ بعد میں ایک وقت آیا کہ ان کی بیوی خود اس برائی میں مبتلا ہوئی، اور جب یہ اپنی عمر کی کمزوری کی منزل میں پہنچے تو بیوی ان کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا کرتی تھی اور خود دوسرے مرد کے ساتھ ملوث ہوتی تھی، اور اسی حالت میں ان کا آخری وقت آیا۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ” تم اگر پاک دامنی اختیار کرو گے؛ تو تمہاری عورتیں بھی پاک دامنی اختیار کریں گی“ یہ اس کا ایک نمونہ ہے۔ اور قدرت کا ایک نظام ہے، اس معاملہ میں اگر ہماری طرف سے کوتاہی ہوگی تو قدرت کی طرف سے اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔ اس سلسلے کے اور بھی بہت سے واقعات ہمارے علم میں ہیں۔

دوسرا واقعہ

کتابوں میں ایک واقعہ لکھا ہے، مولانا ذوالفقار صاحب نقشبندی دامت برکاتہم نے بھی یہ واقعہ سنایا تھا۔ ایک سنار تھا جس کی بیوی بڑی حسین و جمیل تھی، نیک سیرت بھی تھی اور نیک صورت بھی تھی۔ ایک مرتبہ جب وہ اپنی دوکان سے واپس آیا تو دیکھا کہ بیوی بہت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ اس نے پوچھا: کیا بات ہے؟ بیوی نے بتلایا کہ: ہمارا یہ نوکر؛ جس کو ہم نے بچپن سے پالا ہے، ہمارے سامنے بچہ تھا، ہم نے پال کر بڑا کیا، اب یہ اتنا نمک حرام بن گیا ہے کہ آج جب سبزی لے کر آیا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا، میں نے محسوس کیا کہ اس کے دل کے اندر شہوت کے جذبات ہیں۔ شوہر نے جب یہ سنا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ بھی رونے لگا۔ بیوی نے پوچھا: آپ کیوں روتے ہیں؟ اس نے کہا: یہ میری بد عملی کی سزا ہے۔ آج دکان پر ایک عورت زیور خریدنے آئی تھی، اس نے مجھ سے کنگن چوڑیاں خریدیں، اور کہا: مجھے پہنا دو۔ جب میں پہنانے لگا تو اس کے ہاتھ بڑے حسین نظر

آئے، تو میں نے پکڑ کر اس کو شہوت کے ساتھ دبایا، اسی کا یہ نتیجہ ہے: ”کَمَا تَدِینُ تُدَانُ“ (کشف الخفاء:۲/۱۶۵) اسی لیے حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: تم پاکدامن رہو؛ تمہاری بیویاں بھی پاکدامن رہیں گی، اور اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کا اہتمام کریں گی۔

ماں باپ کی نافرمانی کا وبال ایک عبرت ناک واقعہ

”بُرُّوْا اٰبَآئَکُمْ ،تَبَرُّکُمْ أَبْنَآؤُکُمْ “ اپنے ماں باپ کے ساتھ تم اگر حسنِ سلوک، احسان اور بھلائی کا معاملہ کروگے؛ تو تمہاری اولاد بھی تمہارے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرے گی۔ کئی صدیوں پہلے کے ایک عالم قاضی ابو علی تنّوخی کی لکھی ہوئی ایک کتاب ”نُشْوَارُالْمُحَاضَرَۃِ“ ہے، اس میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ:-

ایک مرتبہ ایک بیٹے نے اپنے باپ کے پاؤں میں رسی ڈالی اور کھینچ کر گھر سے باہر لے گیا، جب ایک مخصوص جگہ تک پہنچا تو باپ کہنے لگا: بیٹا! بس؛ اب آگے نہ لے جائیو۔ بیٹے نے پوچھا: کیوں ابا جان؟ تو باپ نے کہا: میں نے بھی اپنے باپ کے پاؤں میں رسی باندھی تھی اور ان کو کھینچ کر یہیں تک لایا تھا؛ آج تو بھی میرے ساتھ وہی معاملہ کر رہا ہے۔

اور نالے کے اندر پھینکا

حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم نے ایک واقعہ سنایا کہ: دیوبند میں ایک مٹھائی والے نے ان کو بتلایا کہ: فلاں دکان دار جب جوان تھا، تو ایک مرتبہ اس کا باپ دکان پر بیٹھا ہوا تھا، یہ آیا اور اپنے باپ کو پکڑ کر دکان کے پاس نیچے نالی کے اندر گرایا۔ اس کے بعد باپ کا تو انتقال ہو گیا، اِس کی اولاد میں لڑکے نہیں تھے، چار لڑکیاں ہی تھی، میں سوچتا رہتا تھا کہ علماء اور بزرگوں سے سنا ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ کے ساتھ جیسا معاملہ کرتا ہے، اس کی اولاد بھی اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتی ہے، اور اِس کے لڑکے تو ہیں نہیں، اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ اس نے اپنے باپ کو گرا کر نالی کے اندر پھینکا ہے؛ اب پتہ نہیں اس کا معاملہ کیا ہوگا؟ پھر ایک روز میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس کی ایک لڑکی برقعہ پہنے ہوئے آئی اور اس بوڑھے کو اسی طرح گرا کر نالے کے اندر پھینکا؛ جس طرح اس نے اپنے باپ کو گرا کر نالی کے اندر پھینکا تھا۔

میں عرض کر رہا تھا کہ قدرت کا ایک نظام ہے کہ جیسا کروگے ویسا بھروگے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے بھی برائیوں سے روکنے کے لیے تعلیم دینے کا جو طریقہ اختیار کیا اس میں اس پہلو کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اور اسی کا اثر ہے کہ آدمی برائی کرنے سے رُک جاتا ہے۔

ایک نوجوان کا قصہ اور حضور اکرم ﷺ کی شفقت

ایک مرتبہ ایک نوجوان نبی کریم ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے زنا کی اجازت دیجئے۔ ہمارے پاس آکر کوئی آدمی اگر ایسا کہے تو ہم لوگ اس کی مار پٹائی شروع کردیں گے۔ نبی کریم ﷺ کی شفقت اور محبت پر قربان جایئے کہ آپ نے اس کو اپنے قریب بلا کر بٹھایا اور پوچھا: اچھا یہ بتلاؤ! تم زنا کا جو مطالبہ کر رہے ہو؛ تو وہ کسی عورت کے ساتھ ہی کروگے؟ اس نے کہا: جی ہاں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اچھا! ایسا ہی معاملہ کوئی آدمی تمہاری بہن کے ساتھ کرے؛ تو یہ چیز تمہیں گوارا ہوگی؟ اس نے کہا: نہیں۔ آپ نے پھر کہا: اچھا! ایسا ہی معاملہ کوئی آدمی تمہاری ماں کے ساتھ کرے؛ تو یہ چیز تمہیں گوارا ہوگی؟ اس نے کہا: نہیں۔ تمہاری پھوپھی کے ساتھ کرے؛ تو گوارا ہوگی؟ اس نے کہا: نہیں۔ پھر حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تم جس کے ساتھ بھی ایسا کرنا چاہو گے؛ وہ بھی تو آخر کسی کی بہن، کسی کی ماں، کسی کی خالہ، کسی کی پھوپھی ہوگی؟ فوراً اس نے کہا: ”میں نہیں کروں گا۔“ پھر حضور اکرم ﷺ نے اس کے سینہ پر اپنا دستِ مبارک پھیرا اور کہا: یا اللہ! اس کے گناہ معاف فرما، اس کے قلب سے میل کچیل دور فرما، اور اس کی شرم گاہ کی حفاظت فرما۔ اس واقعہ کو نقل کرنے والے صحابی فرماتے ہیں کہ: اس کے بعد ہم نے دیکھا کہ کبھی اس نوجوان کی نظر نیچے سے اوپر نہیں اُٹھتی تھی۔ یہ حضورِ اکرم ﷺ کی دعا کا اثر تھا۔ (مسند احمد: ۵/۲۵۶)

صحبت کی لذت سے محروم کر دئے جاؤ گے

ایک اور روایت ہے، حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "لَا تَزْنُوا، فَتَذْهَبَ لَذَّةُ نِسَآئِكُمْ. وَعَفُّوا، تَعِفُّ نِسَآئُكُمْ. إِنَّ بَنِيْ فُلَانٍ زَنُوْا، فَزَنَتْ نِسَآءُهُمْ" (کشف الخفاء: ۲/۷۹) تم زنا کا ارتکاب نہ کرو؛ ورنہ تم اپنی عورتوں کے ساتھ صحبت کی لذت سے محروم کر دیئے جاؤ گے۔ عام طور پر جو آدمی زنا کا ارتکاب کرتا ہے اس کو اپنی بیوی کے ساتھ جو پاکیزہ لطف آنا چاہیے اس سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اور آگے فرماتے ہیں: تم پاک دامنی اختیار کرو؛ تو تمہاری عورتیں بھی پاکدامنی اختیار کریں گی۔ پھر فرمایا: فلاں قبیلے والے زنا کے اندر مبتلا ہوئے تو ان کی عورتیں بھی زناکار بن گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے کِفْل کی مغفرت فرمادی

خلاصہ یہ ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے عفت اور پاک دامنی کی بڑی تاکید فرمائی ہے، احادیث کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے اس کی طرف خاص متوجہ کیا ہے۔ ترمذی شریف میں ایک واقعہ ہے جو نبیٔ کریم ﷺ نے اگلی امت کا بیان کیا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ میں نے حضور اکرم ﷺ سے ایک مرتبہ نہیں، دو مرتبہ نہیں، تین مرتبہ نہیں، سات مرتبہ نہیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ مرتبہ سنا۔ یعنی سات مرتبہ سنا ہوتا تب بھی میں بیان نہ کرتا، اس سے زیادہ مرتبہ سنا ہے اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ اپنی امت

کو، صحابہ کو اور اپنے مخاطبین کو اچھے اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے واقعات وغیرہ کی مثالیں دے کر سمجھانے کا اہتمام فرمایا کرتے تھے۔ ہم اور آپ جو بیان کرنے والے ہوتے ہیں وہ ایک دو مرتبہ کوئی واقعہ بیان کر دیتے ہیں تو اس کے بعد یوں سمجھتے ہیں کہ تیسری مرتبہ بیان کروں گا تو لوگوں کو شاید میری صلاحیت کے اوپر شبہ ہو گا کہ کیا اس کو اس کے علاوہ اور کچھ آتا ہی نہیں؟

خیر! نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل میں ایک آدمی تھا جس کا نام ''کِفل'' تھا، ایک مرتبہ ایک عورت اس کے پاس آئی- جس کے بچے فاقہ کا شکار تھے، اور بھوکے مر رہے تھے- عورت نے آکر کفل سے کہا: میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں؛ میری کچھ مدد کر۔ اس نے اس عورت کو ساٹھ دینار اس شرط پر دیئے کہ تو مجھے بدکاری کرنے کی اجازت دے۔ عورت نے وہ ساٹھ دینار لے لیے، اس کے بعد شرط کے مطابق بدکاری کی تیاری کر کے اس کے سامنے بیٹھنے لگا، تو اس عورت کے اوپر لرزہ طاری ہو گیا اور کپکپی آگئی۔ جب بہت کپکپانے لگی تو کفل نے اس عورت سے کہا: میں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی اور زبردستی تو نہیں کی، تو اس کے لیے خوشی سے تیار ہوئی تھی؛ پھر تیری یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس عورت نے کہا: میری یہ کیفیت اس لیے ہے کہ ایسا کام میں نے زندگی میں کبھی نہیں کیا؛ لیکن آج بچوں کی وجہ سے میں مجبور ہوئی ہوں، اس لیے میری طبیعت اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہ کہہ کر وہ بے اختیار رو پڑی، اس آدمی نے جب یہ کیفیت دیکھی تو اس کو بھی آج تک کی اپنی زندگی پر افسوس ہوا، اور اس نے فوراً توبہ کی اور ساٹھ دینار جو دیئے تھے، وہ بھی معاف کر دیئے، پھر اسی رات اس

کا انتقال ہو گیا۔ بنو اسرائیل کے ساتھ قدرت کا دستور یہ تھا کہ کوئی آدمی جب گناہ کرتا تھا تو صبح کو اس کے دروازے کی چوکھٹ پر وہ گناہ بھی لکھا ہوا ہوتا تھا کہ آج اس نے یہ سیاہ و سفید کئے ہیں، اور اگر کوئی آدمی توبہ کرتا اور اس کی توبہ قبول ہو جاتی تو وہ بھی قدرت کی طرف سے لکھا جاتا، اب لوگوں کو اس واقعہ کا پتہ نہیں تھا، لوگ تو سمجھتے تھے کہ یہ بڑا بدکار آدمی ہے، جب اسی رات اس کا انتقال ہو گیا تو صبح کو اس کے دروازے پر لکھا ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کفل کی مغفرت فرمادی، لوگ تعجب کرنے لگے کہ اس کی مغفرت کیسے ہو گئی؟ وہ تو بڑا برا آدمی تھا لیکن ان کو اس کا یہ معاملہ معلوم نہیں تھا۔ (ترمذی شریف:۲/۷۶)

یہ پیغمبرانہ صفت ہے

یہ صفت یعنی اپنے آپ کو گناہوں سے بچانا؛ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے، اور خاص کر جب گناہوں کے اسباب اور وسائل سامنے آجائیں تو ایسے موقعہ پر اپنے آپ کو بچالینا پیغمبرانہ صفت ہے۔

حضرت سلیمان بن یسار (رحمۃ اللہ علیہ) کا عجیب واقعہ

امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ”احیاء العلوم“ میں حضرت سلیمان بن یسار (رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ لکھا ہے جو تابعین میں سے ہیں، بڑے حسین اور جمیل تھے، مدینہ منورہ میں رہتے تھے، فقہائے مدینہ میں ان کا شمار ہے۔ ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مدینہ منورہ سے حج کے ارادہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے، راستے میں مقام ابواء پر ٹھہرے ان کا ساتھی کھانا خریدنے کے لیے بازار گیا، وہ

جہاں ٹھہرے ہوئے تھے وہیں ایک پہاڑی تھی اور اس پہاڑی کی چوٹی کے اوپر بدو کا مکان تھا، ایک بدوی عورت نے -جو بڑی حسین و جمیل تھی- ان کو دیکھا تو ان پر فریفتہ ہوگئی۔ جب اس نے دیکھا کہ ان کا ساتھی کہیں گیا ہوا ہے اور یہ اکیلے ہیں تو وہ پہاڑ سے نیچے اتر آئی اور ان کے سامنے آکر اس نے اپنا چہرہ کھول دیا- ”كَأَنَّهَا قِطْعَةُ قَمَرٍ“ گویا بالکل چاند کا ٹکڑا تھی- اور کچھ کہنے لگی، یہ تو اس کو دیکھ کر ہی گھبرا گئے تھے۔ جب وہ کچھ بولی تو یہ سمجھے کہ کھانا لینے آئی ہے، انہوں نے کھانا تلاش کر کے اس کو دینے کی کوشش کی تو اس نے کہا: مجھے کھانا نہیں چاہیے، بلکہ مجھے تو آپ سے وہ چیز چاہیے جو ایک عورت مرد سے چاہتی ہے۔ انہوں نے کہا: تجھے شیطان نے میرے پاس بھیجا ہے، اور اسی وقت اپنا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر زور زور سے بے تحاشا رونے لگے۔ جب انہوں نے زور زور سے رونا شروع کیا تو وہ عورت گھبرا گئی کہ کہیں رسوائی نہ ہو جائے، لہٰذا بھاگ گئی۔ ان کے ساتھی جو کھانا خریدنے بازار گئے ہوئے تھے جب آئے تو دیکھا کہ ان کا چہرہ پھولا ہوا ہے، آنکھیں سرخ ہیں، اور رو رہے ہیں۔ پوچھا: کیا بات ہے؟ انہوں نے کہا: بال بچے یاد آگئے۔ ساتھی نے کہا: نہیں ہو سکتا! دوسری کوئی بات ہے؛ سچ سچ بتاؤ۔ بال بچے یاد آنے پر کوئی آدمی اتنا نہیں روتا۔ تمہاری کیفیت کچھ اور ہی بتلا رہی ہے۔ جب ساتھی نے بہت اصرار کیا تو انہوں نے بتلا دیا کہ ایسی صورتِ حال ہوئی۔ یہ سن کر ساتھی بھی رونے لگا۔ انہوں نے پوچھا: بھائی! تو کیوں روتا ہے؟ اس نے کہا: اللہ کا شکر و احسان ہے کہ میں نہیں تھا، ورنہ مَیں تو مبتلا ہو ہی جاتا۔ میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری حفاظت کر لی۔

خیر ! پھر جب مکہ مکرمہ پہنچے تو طواف سے فارغ ہونے کے بعد حجرِ اسود اور مقامِ ابراہیم کے بیچ چادر میں لپٹے ہوئے بیٹھے تھے، چوں کہ تھکے ہوئے تھے اس لیے آنکھ لگ گئی، تو خواب میں ایک حسین نوجوان کو دیکھا۔ سلیمان بن یسار نے پوچھا: آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یوسف۔ پوچھا: کون؟ یوسف صدیق؟ انہوں نے کہا: جی ہاں ۔ سلیمان بن یسار نے کہا: آپ کا معاملہ زلیخا کے ساتھ بڑا عجیب وغریب ہے۔ اس کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا: وہ ابواء والی عورت کے ساتھ تمہارا معاملہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔

ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ

آدمی کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جہاں عفت اور پاک دامنی کی اس صفت میں قدرت کی طرف سے آدمی کو آزمایا جاتا ہے۔ بعض آدمی تو وہ ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو برائی میں مبتلا کرنے کے لیے ایسے مواقع کی تلاش ہی میں رہتے ہیں؛ لیکن اللہ کے بعض بندے ایسے ہمت والے ہوتے ہیں کہ جب انہیں ایسے حالات سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بچا لے جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی ان کی بہت ہی قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ایک کتاب ”الترغیب والترھیب“ ہے۔ اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک فنِ حدیث میں ہے جو علامہ منذری (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے، اور دوسری سلوک و تصوف میں ہے جو علامہ عبد اللہ بن اسعد یافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے۔ علامہ یافعی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کتاب میں دو واقعات لکھے ہیں:-

ایک نوجوان تھا، جس کے لباس اور جسم میں سے ہمیشہ مُشک و عنبر کی خوشبو آیا کرتی تھی، جب بھی دیکھو مہک رہا ہے۔ کسی نے کہا: تم بھی عجیب آدمی ہو، خوشبو کے لیے اتنی فضول خرچی کرتے ہو، ہمیشہ خوشبو کا اتنا اہتمام کرتے ہو اور اس کے لیے اتنے پیسے فضول خرچ کرتے ہو؟ اس نوجوان نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے آج تک ایک پائی بھی خوشبو کے لیے استعمال نہیں کی۔ اس نے کہا: پھر یہ خوشبو کیسی؟ نوجوان نے کہا: اس کا ایک راز ہے، اور وہ میں نہیں بتاؤں گا۔ اس نے کہا: ضرور بتاؤ۔ آدمی کا مزاج ہے: ”اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ فِیْمَا مُنِعَ“ آپ کسی سے کہہ دو کہ نہیں بتاؤں گا، تو وہ پیچھے پڑ جاتا ہے کہ بتانا ہی پڑے گا۔ اس نے بھی جب اصرار کیا تو جوان نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ میرے والد کی گھریلو سامان بیچنے کی ایک دکان تھی، ایک مرتبہ ایک بڑھیا آئی اور اس نے بہت سارا سامان خریدا، میں بھی دکان پر تھا، حسین و جمیل تھا، جب وہ سامان خرید چکی تو اس نے میرے ابا سے کہا کہ: اس سامان کی قیمت لینے کے لیے تمہارے بیٹے کو میرے ساتھ گھر بھیج دو۔ چناں چہ میں اس کے ساتھ چلا گیا۔ جب گھر دیکھا تو بہت خوبصورت بڑا شاندار تھا۔ ہم اس گھر میں ایک عالیشان اور خوبصورت کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہاں تخت پر ایک حسین و جمیل نوجوان عورت بیٹھی ہوئی تھی، وہ مجھے دیکھتے ہی میری طرف مائل ہوئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگی، میں تو گھبرا گیا اور میں نے اپنے آپ کو بچانا چاہا؛ لیکن وہ مجھے اپنی طرف کھینچتی اور مائل کرتی رہی۔ مجھے اس وقت کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی سوائے اس کے کہ میں نے اس سے کہا: مجھے بیت الخلاء کی ضرورت ہے؛ صاف کروادو۔ اس زمانہ کے

جو بیت الخلاء ہوتے تھے وہ آج کل کے فلش کی طرح نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ صفائی کر دی گئی اور اس عورت نے کہا: تم ضرورت سے فارغ ہو جاؤ۔ مَیں اندر گیا اور حاجت پوری کی، پھر اپنا پائخانہ خود ہی اپنے ہاتھ سے لے کر اپنے جسم اور کپڑوں پر مَل لیا۔ جب باہر نکلا تو مجھے دیکھ کر وہ عورت ایک دم غصہ ہو گئی اور اس نے اپنی باندیوں سے کہا: یہ پاگل کہاں سے آگیا؟ اس کو یہاں سے نکال دو، چناں چہ مجھے نکال دیا گیا۔ اس وقت میرے پاس ایک درہم تھا، میں نے اس سے ایک صابن خریدا، نہر پر گیا اور غسل کر کے کپڑے دھوئے اور سُکھا کر پہن لیے۔ رات کو جب سویا تو خواب میں دیکھا کہ ایک فرشتہ انسانی شکل کے اندر آیا اور مجھ سے کہا: میں اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا ہوں، اور جس طرح آج تو نے اپنے آپ کو گناہ سے بچایا؛ اس پر تمھیں جنت کی بشارت دی جاتی ہے۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک خوشبو تھی جو اس نے یہ کہتے ہوئے میرے کپڑوں اور جسم پر مل دی کہ: جس طرح تم نے اس گناہ سے بچانے کے لیے اپنے آپ کو نجاست کے اندر ملوث کیا؛ قدرت کی طرف سے اس کا بدلہ یہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جب صبح اُٹھا ہوں تو مجھ میں سے یہ خوشبو آرہی تھی، اور اس دن سے لے کر آج تک اسی طرح آرہی ہے۔

ایک اور نوجوان کا قصہ

علامہ یافعی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک اور قصہ ذکر کیا ہے:-

ایک نوجوان بڑا مالدار تھا، برائیوں اور بدکاریوں میں پیسہ خرچ کیا کرتا تھا، ایک مرتبہ ایک عورت کے بچے فاقہ کا شکار ہونے کی وجہ سے پریشان تھے، ان کے یہاں تین دن سے فاقہ تھا، جب اس عورت سے اپنے بچوں کی تکلیف اور بھوک دیکھی نہیں گئی تو اس نے اپنی پڑوسن سے اچھا لباس لے کر پہنا اور گھر سے باہر نکلی، اس کو اس حالت میں دیکھ کر اس نوجوان نے اس کو اپنے پاس بلایا اور بدکاری کی خواہش کا اظہار کیا، اس عورت نے رونا شروع کیا اور کہا: جب تو نے مجھے بلایا تو میں سمجھی کہ میرے ساتھ کوئی بھلائی کا سلوک کرے گا، لیکن تو میرے ساتھ بدکاری کرنے کی بات کرتا ہے؟ میں ایسی عورت نہیں ہوں، دراصل میرے بچے تین دن سے بھوکے ہیں، ان کی بھوک مجھ سے دیکھی نہیں گئی، اس لیے مجبور ہو کر مانگنے کے واسطے میں گھر سے باہر نکلی ہوں۔ اس نوجوان نے اس کو کچھ پیسے دیدیئے، اور اس کو آج تک کی اپنی حرکتوں پر ندامت ہوئی اور اس نے توبہ کی۔

اس کی یہ عادت تھی کہ جو بھی گناہ کرتا تھا، اپنی ایک کاپی میں اس کو لکھ لیا کرتا تھا آج جب اپنے گھر آیا اور اپنی ماں کو یہ واقعہ بیان کیا، تو اس کی ماں بہت خوش ہوئی کہ آج تک تو میں تجھے روکتی تھی، لیکن تو باز نہیں آتا تھا، آج تو نے ایک اچھا کام کیا ہے؛ اس کو بھی اپنی کاپی میں لکھ لے۔ اس نے کہا: کاپی گناہوں سے بھر چکی ہے، اور کاپی میں جگہ نہیں ہے۔ اس کی ماں نے کہا: حاشیہ میں ہی لکھ لے۔ ماں کا اصرار تھا اس لیے حاشیہ میں لکھ لیا، اور جب رات کو سویا تو اپنی حالت پر ندامت کے ساتھ توبہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے سویا۔ صبح کو جب اٹھا تو پوری کاپی سفید تھی، اور صرف وہی ایک واقعہ - جو

حاشیہ پر لکھا ہوا تھا-موجود تھا، اور اس کے اندر آیت لکھی ہوئی تھی:﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (سورہ ہود:۱۱۴) نیکیاں برائیوں کو لے جاتی ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پاک دامنی

بہر حال! یہ عفت اور پاک دامنی ایک ایسا وصف ہے جو اسلامی تعلیمات میں بہت اہم مقام رکھتا ہے، اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بڑی تاکید فرمائی ہے۔ ہمارے دورِ اول میں حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم جب ملکوں کو فتح کرنے کے لیے نکلے، تو ان کو باز رکھنے کے لیے دشمنوں کی طرف سے جو مختلف تدابیر اور سازشیں کی گئیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ نوجوان حسین لڑکیوں کو ان کے سامنے پیش کیا گیا؛ لیکن وہ اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اپنی نگاہوں کو نیچا رکھتے ہوئے وہاں سے گزر گئے اور اپنی حفاظت کرلی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پچھلی مجلس میں بتلایا تھا کہ اسلام نے جہاں زنا، بدکاری اور فواحش سے منع کیا ہے، وہیں اس کے اسباب سے بھی روکا ہے، اور اسی کے ذیل میں یہ عنوان ہے: پرائی عورت اور بے ریش (بے داڑھی) حسین لڑکے کی طرف نظر کرنا حرام ہے۔

محرم اور نامحرم عورتیں

عورتوں کی دو قسمیں ہیں: ایک نامحرم ہوتی ہے، اور دوسری محرم ہوتی ہے۔ محرم: وہ عورت کہلاتی ہے جس کے ساتھ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں نکاح درست نہ ہو، ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہو۔ جیسے: ماں، دادی، نانی، بیٹی، بہن، پوتی، نواسی، بھتیجی، بھانجی، وغیرہ؛ یہ سب عورتیں ''محرم'' کہلاتی ہیں، اور ان سے پردہ بھی نہیں ہے۔ اور جس عورت کے ساتھ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں نکاح حلال ہو- چاہے ابھی کسی وجہ سے حلال نہ ہو- اسے ''نامحرم'' کہتے ہیں۔ جیسے: ایک عورت کسی دوسرے مرد کے نکاح میں ہے، تو ایک آدمی کے نکاح میں ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ دوسرے کا نکاح درست نہیں ہے؛ لیکن اگر وہ طلاق دیدے اور عدت گزر جائے، اور کوئی دوسرا رشتہ نہیں ہے تو اس کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے میں جس عورت کے ساتھ نکاح درست ہو، ایسی عورت کو ''نامحرم'' کہتے ہیں اور اس کو بلا ضرورتِ شرعیہ دیکھنا حرام ہے۔

معاشرہ میں پھیلا ہوا ایک بڑا گناہ

عورتوں میں چند رشتے ایسے ہیں جن کو ہمارے معاشرہ میں نامحرم ہونے کے باوجود محرم سمجھا جاتا ہے، جیسے: چچی اور ممانی۔ چچی، یعنی چچا کی بیوی، اور ممانی، یعنی ماموں کی بیوی۔ تو چچی اور ممانی نامحرم ہیں ۔اس وقت وہ چچا کے نکاح میں ہے؛ لیکن چچا اگر طلاق دیدیں اور ان کی عدت گزر جائے اور دوسرا کوئی رشتہ نہ ہو؛ تو اس صورت میں چچی کے ساتھ نکاح درست ہو گا۔ یہی حال ممانی کا بھی ہے۔ اسی طرح چچا کی لڑکیاں (چچازاد بہنیں) ماموں کی لڑکیاں (ماموں زاد بہنیں) پھوپھی کی لڑکیاں (پھوپھی زاد بہنیں) خالہ کی لڑکیاں (خالہ زاد بہنیں) ان چاروں قسم سے بھی ہمارے سماج اور معاشرہ اور ہماری سوسائٹی میں پردے کا اہتمام کیا نہیں جاتا؛ حالاں کہ یہ بھی نامحرم ہیں اور ان سے بھی پردہ کرنا ضروری ہے؛ بلکہ ان سے تو ملنے جلنے کی نوبت زیادہ آتی ہے، اس لیے ان سے تو پردہ کرنا اور زیادہ ضروری ہے۔ ہاں! پھوپھی اور خالہ محرم ہیں۔

جن کے شوہر سفر میں ہوں

حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”وَ لَاتَلِجُوْاعَلٰی الْمُغِیْبَاتِ“ (مشکوۃ شریف:۲۶۹) ایسی عورتیں جن کے شوہر غیر حاضر ہوں، سفر میں ہوں؛ ان کے پاس مت جایا کرو؛ کیوں کہ ان کے شوہروں کی غیر حاضری کی وجہ سے ان کی طبیعتوں کے اندر بھی کشش اور طبعی میلان پیدا

ہوتا ہے، ایسی عورتوں کے پاس آدمی جب تنہائی میں جاتا ہے تو نفس اور شیطان بھی آدمی کو گناہ کے لیے اُبھارنے کا کام کرتے ہیں، اور وہاں اسباب زیادہ ہیں اور کوئی رکاوٹ بھی نہیں ہے۔

کسی نے پوچھا: ”یَارسولَ اللہ! (ﷺ) أَرَأَیْتَ الْحَمْوَ؟ قال: اَلْحَمْوُ الْمَوْتُ“ (بخاری شریف، حدیث نمبر:۳۹۳۴)

اے اللہ کے رسول! دیور (شوہر کے بھائی) کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضور ﷺ نے فرمایا: دیور تو موت ہے۔ یعنی جیسے موت سے بھاگا جاتا ہے، ایسے ہی دیور سے بھاگنا چاہیے۔ اس لیے کہ پرائے آدمی کو برائی کے اندر مبتلا ہونے کے لیے تدبیریں بھی کرنی پڑیں گی، اور یہ تو گھر کا فرد ہے ”گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے“۔ خدا نہ کرے اگر آنکھ لڑ گئی اور برائی میں مبتلا ہو گئے تو زندگی بھر برائیاں ہوتی رہیں گی اور پتہ بھی نہ چلے گا، اور بقول اکبر الہ آبادی:-

پردہ دَری کا یہ نتیجہ نکلا
جسے سمجھتے تھے بیٹا؛ وہ بھتیجا نکلا

جیسا معاملہ ہو جائے گا۔

یہ چیز پاکیزگی کا ذریعہ ہے

بہر حال! شریعت نے پردہ اور ”غَضِّ بَصَر“ کا بھی حکم دیا۔ اسی سلسلہ میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے پہلی آیت پیش کی ہے: ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ، ذٰلِكَ اَزْكٰى

لَهُمْ﴾(النور:۳۰) ”اے نبی! آپ ایمان والے مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچا کریں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، یہ چیز ان کے لیے پاکیزگی کا ذریعہ ہے“ اور آگے فرمایا:﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ﴾(النور:۳۱)”اور ایمان والی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں“۔

دیکھئے! قرآنِ پاک کا عام مزاج اور دستور یہ ہے کہ جب کوئی حکم دیا جاتا ہے تو اس میں سب کو ایک ساتھ خطاب کیا جاتا ہے، مردوں کو الگ اور عورتوں کو الگ خطاب نہیں کیا جاتا، جیسے:﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾”اے ایمان والو“ کہہ دیا، اس میں مرد بھی آگئے اور عورتیں بھی آگئیں۔ لیکن یہ ایک حکم ایسا ہے جس میں مردوں کو الگ مخاطب کیا گیا اور عورتوں کے لیے الگ آیت نازل فرمائی ہے۔ اس سے اس حکم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نگاہوں کو نیچا رکھنے کا حکم کتنا اہم ہے۔

بدنظری کی وجہ سے چہرے کا نور ختم ہو جاتا ہے

نبیِ کریم ﷺ یہاں فرماتے ہیں:”لَتَغُضُّنَّ أَبْصَارَكُمْ وَلَتَحْفَظُنَّ فُرُوْجَكُمْ أَوْ لَيَكْسِفَنَّ اللهُ وُجُوْهَكُمْ“(الترغیب:۳/۲۵)”اپنی نگاہوں کو نیچا رکھو اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو؛ ورنہ اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کا نور ختم کردے گا“۔ ”کسوف“ سورج گرہن کو کہتے ہیں، جیسے سورج کو گرہن لگ

جاتا ہے تو اس کا نور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح جو آدمی بد نظری میں مبتلا ہوتا ہے وہ چاہے کیسا ہی حسین ہو، لیکن اس کے چہرے پر رونق نہیں ہوتی۔

بد نگاہی سے بچنا ہی پڑے گا

آج بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ بد نظری کا گناہ ایسا عام ہو چکا ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ،اور مصیبت یہ ہے کہ دورِ حاضر کی جو تہذیب ہے - عام بے حیائی فحاشی، عریانی، عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا - اس کے نتیجے میں بقول مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم "آنکھوں کو پناہ ملنی مشکل ہے" یعنی آدمی باہر جائے تو آنکھوں کا بچانا مشکل ہو گیا ہے؛ لیکن جس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنی ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت کو اپنے دل میں بٹھانا ہو، اپنے دل کی اصلاح مقصود ہو اور اپنے قلب میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنا مطلوب ہو؛ تو اس کو بد نگاہی سے بچنا ہی پڑے گا۔

بد نظری کے ساتھ قلب کی اصلاح نہیں ہو سکتی

بزرگوں نے لکھا ہے کہ: تمام صوفیاء کا اتفاق ہے کہ بد نظری کے ساتھ قلب کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ حالاں کہ اس سے بھی بڑے بڑے دوسرے گناہ ہیں، لیکن یہ گناہ ایسا ہے کہ اس کی نحوست کی وجہ سے جب تک وہ بد نظری کے اندر مبتلا رہتا ہے اس کا قلب کبھی سدھر نہیں سکتا، آدمی کے دل کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ قائم اور استوار ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی کے اندر لکھا ہے کہ: بہت سے ذاکرین ایسے ہیں کہ ذکر کرنے کے نتیجے میں ان کے دلوں میں نور پیدا ہوا؛ لیکن بد نظری کا شکار ہوئے اور اس سے محروم کر دیئے گئے۔

عبادت کی لذت کیوں حاصل نہیں ہوتی؟

آج کل ہم لوگ نمازیں پڑھتے ہیں، قرآنِ پاک کی تلاوت کرتے ہیں، تسبیحات کا اہتمام کرتے ہیں، دیگر ساری چیزوں کا اہتمام کرتے ہیں؛ لیکن نماز، تسبیحات اور تلاوت کی جو لذت ہمیں حاصل ہونی چاہیے؛ وہ نہیں ہوتی۔ اس کی جو مختلف وجوہات ہیں ان میں سے ایک بڑی وجہ یہی "بد نظری" ہے۔

بڑا خطرناک روگ

گویا بد نظری ایک بڑا خطرناک روگ ہے، اور ایسا روگ ہے کہ لگنے کے بعد آسانی سے جانا بھی مشکل ہے۔ ایک آدمی زنا کاری کرے تو زنا کاری کے لیے کچھ اسباب بھی ہونے چاہیے، مثلاً: جسم میں قوت چاہیے، لیکن بقول حکیم الامت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ): بد نظری ایسی بیماری ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکے ہوئے ہیں، آدمی بوڑھا ہو چکا ہے؛ پھر بھی نہیں جاتی۔ بوڑھے بوڑھے بھی بھانپو (نظر باز) بنے ہوئے ہیں، ذرہ برابر حیا اور مروت نہیں رہی، اور اس کو گناہ بھی نہیں سمجھتے، اس گناہ کی شناعت و قباحت اور برائی دلوں سے نکل چکی ہے۔ کسی جگہ بیٹھے ہیں اور ماں بیٹیاں گزر رہی ہیں تب بھی دیکھنے میں ذرا باک نہیں سمجھا جاتا۔ اور یہ گناہ ایسا ہے کہ آدمی چپکے سے کر لے تو کسی کو پتہ بھی نہ چلے بقول حضرت

حکیم الامت (رحمۃ اللہ علیہ): ”مولوی صاحب؛ مولوی صاحب رہے۔ قاری صاحب؛ قاری صاحب رہے“ مطلب یہ ہے کہ اس گناہ کو کرتے ہوئے عام طور پر کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

بہر حال! یہ بڑا خطرناک روگ ہے، اسی لیے اس گناہ سے خاص طور پر روکنے کے لیے گویا باری تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر علاج بتایا ہے:﴿يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ﴾(المؤمن:۱۹) اس علاج کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

اعضاءِ بدن اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾(بنی اسرائیل:۳۶) بے شک کان اور آنکھ اور دل؛ یہ سب کے سب وہ اعضاء ہیں جن کی کارگزاری کے متعلق اللہ تعالیٰ کے یہاں سوال کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا فرمایا، جسم عطا فرمایا اور جسم میں مختلف صلاحیتوں والے مختلف اعضاء ہمیں نصیب کئے۔ دیکھنے کے واسطے آنکھ دی، سننے کے واسطے کان دیئے، بولنے کے لیے زبان دی، پکڑنے کے لیے ہاتھ دیئے، چلنے کے واسطے پاؤں عطا کئے، کھال کے اندر احساس کا مادہ رکھا کہ گرمی سردی وغیرہ کو ہم محسوس کرسکتے ہیں، سوچنے کے لیے دماغ دیا، دل کے اندر جذبات پیدا فرمائے، جسم کے اندر مختلف قسم کی یہ مشینیں قدرت کی طرف سے فِٹ (Fit) کی گئی ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانتیں ہیں، انسان ان چیزوں کا مالک نہیں ہے؛ بلکہ یہ سب کچھ اللہ کی مِلک

ہیں، ہمیں ایک وقتِ مقررہ تک ان کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے، اور یہ ہمارے پاس عاریت اور مانگے کی چیزیں ہیں، ہم ان کو مالک کی ہدایتوں کے مطابق ہی استعمال کریں، جہاں جہاں استعمال کرنے کا حکم دیا ہے وہاں ان چیزوں کو ہمیں استعمال کرنا ہے، اور جہاں استعمال کرنے سے منع کیا ہے ان سے ہمیں اپنے آپ کو باز رکھنا ہے۔

بدنظری کیوں منع ہے؟

’’آنکھ‘‘ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کے ذریعہ جو مناظر دیکھے جاتے ہیں اس کی وجہ سے آدمی کے دل کے اندر مختلف قسم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، انہیں آنکھوں کے ذریعہ اگر ہم نے کعبۃ اللہ کو دیکھا تو اس وقت ہمارے دل کے جذبات اور اس کی کیفیت اللہ تعالیٰ کی عظمت و محبت ہوتی ہے، اور ایسے عمدہ اور اعلیٰ جذبات پیدا ہوتے ہیں جن کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، اور آدمی خواہش مند ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ چیزیں نصیب کرے۔ جب ماں باپ کو، اپنے بڑوں کو، اساتذہ کو اور اہل اللہ کو ہم دیکھتے ہیں؛ اس وقت دل کی کیفیت کچھ الگ ہوتی ہے۔ بیماروں، دکھیوں اور پریشان لوگوں کو جب ہم دیکھتے ہیں، اور یہ مناظر اور تصویریں آنکھ کے ذریعہ ہمارے دل و دماغ تک پہنچتی ہیں تو ہمارے جذبات کے اندر رحم کا مادّہ اُبھر آتا ہے کہ ہم ان کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کریں، ہماری طرف سے کوشش ہوتی ہے کہ ان کو ہم اپنی طرف سے جیسی بھی راحت پہنچا سکتے ہوں؛ پہنچائیں۔ جب ہم کسی

کو دیکھتے ہیں کہ وہ کسی کے ساتھ ظلم کر رہا ہے، ظالمانہ طور پر بے جا پٹائی کر رہا ہے، جب ہم اس منظر کو دیکھتے ہیں اور یہ تصویر آنکھ کے ذریعہ سے دل و دماغ میں پہنچتی ہے تو جس کے ساتھ ظلم کیا جا رہا ہے اس کے ساتھ جذبۂ ترحم (رحم کھانے کا جذبہ) اور ظلم کرنے والے کے ساتھ جذبۂ تنفر (نفرت کرنے کا جذبہ) ہمارے نفس کی کیفیت ہوتی ہے۔ اسی طرح اجنبی عورتوں اور حسین چہروں کے اوپر جب نظر پڑتی ہے اور یہ مناظر دل و دماغ میں پہنچتے ہیں تو شہوت کے جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں جو آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر اُبھارتے ہیں اور اپنی شہوت کو پورا کرنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ سارے مناظر اور تصویریں جب آنکھ کے ذریعہ سے دل و دماغ کے اندر پہنچ گئیں تو ایسا نہیں ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، بلکہ ان مناظر اور تصویروں کے دل و دماغ پر مختلف اثرات ہوتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ہماری یہ آنکھیں ایسا کیمرہ ہیں جس کے ذریعہ منتقل ہونے والے مناظر اور تصویریں اندر جا کر اپنا اثر دکھلاتی ہیں، اور انہی اثرات کے مطابق شریعت کی طرف سے ہمیں دیکھنے اور نہ دیکھنے کے متعلق ہدایتیں دی گئی ہیں۔ بعض چیزوں کے دیکھنے کی ترغیب دی گئی، اور بعض چیزوں کے دیکھنے سے روکا گیا۔

آنکھ عجیب وغریب نعمت

آنکھ اللہ تعالیٰ کی ایسی عجیب وغریب نعمت ہے کہ جس کے پاس یہ نعمت نہیں ہے اس سے ہم پوچھیں کہ بھائی! یہ کیسی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے؟ حضرت مولانا محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ: سائنس دانوں کی تحقیق ہے کہ آنکھ کے اندر اللہ تعالیٰ نے اعصاب اور سنایو(Snayu) رکھے ہیں، آدمی جب اندھیرے سے روشنی میں آتا ہے اور روشنی سے اندھیرے میں جاتا ہے تو آنکھیں پھیلتی ہیں اور سکڑتی ہیں، اس پھیلنے اور سکڑنے میں ایک لمحہ کے اندر وہ نو میل کی مسافت طے کرلیتی ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے۔

نگاہِ محبت سے دیکھنے کی فضیلت

بہر حال! ان مناظر پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف وعدے اور وعیدیں ہمیں دئے گئے ہیں۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے: شوہر اگر اپنی بیوی کو نگاہِ محبت سے دیکھتا ہے، بیوی اپنے شوہر کو نگاہ محبت سے دیکھتی ہے؛ تو اللہ تعالیٰ دونوں کو نگاہ رحمت سے دیکھتے ہیں۔ (التدوین للرافعی: ۲/۴۷)

نگاہِ محبت سے منع نہیں کیا گیا؛ لیکن ہر جگہ نہیں، بلکہ جہاں کرنی چاہیے؛ وہاں کرو۔ آج کل تو معاملہ اُلٹا ہو گیا، بیوی سامنے آرہی ہے تو اس سے نفرت کررہے ہیں اور اجنبی عورت آرہی ہے تو اس

کے متعلق دل میں رحمت اور محبت کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ جس سے روکا گیا ہے وہ ہو رہا ہے، اور جو کرنا ہے اس سے اپنے آپ کو بچا رہے ہیں۔

گھر بیٹھے حج مبرور کا ثواب

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مطیع اور فرمانبردار بیٹا (ماں باپ کی بات ماننے والا، ان کو راحت پہنچانے والا، جس کے دیکھنے سے ماں باپ بھی خوش ہوتے ہوں) جب ماں باپ کو نظرِ رحمت اور مہربانی کے جذبات سے دیکھتا ہے؛ تو اللہ تعالیٰ اس کو ہر ایک نظر پر حجِ مبرور کا ثواب عطا فرماتے ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا انعام ظاہر ہوتا ہے جو بہت معمولی کام پر کیا گیا ہو، اور یہ اندیشہ ہو کہ یہ کام تو بہت سب لوگ کریں گے؛ تو انسانوں کا حال تو یہ ہے کہ انعام کو گھٹا دیتے ہیں، مثلاً: پہلے کو ملے گا، دوسرے کو نہیں ملے گا۔ صحابہؓ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: ”وَلَوْفِي كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ“ اللہ کے رسول! اگر کوئی آدمی ایک دن میں سو مرتبہ اپنے ماں باپ کو نظرِ رحمت سے دیکھے؟ (تب بھی یہی انعام ہے؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”نَعَمْ! اَللّٰهُ أَكْبَرُ وَأَطْيَبُ“ (مکارم الاخلاق للخرائطی، حدیث نمبر: ۲۱۵) جی ہاں! اللہ تعالیٰ کی ذات بہت بڑی اور پاکیزہ ہے۔ معلوم ہوا کہ آپ گھر بیٹھے بیٹھے بھی حجِ مبرور کا ثواب لے سکتے ہیں، کوئی آدمی دن میں سو مرتبہ دیکھے گا تو سو حج مبرور کا ثواب ملے گا۔ ہمیں کہیں عمرہ کرنے کے لیے جانے کی ضرورت نہیں، گھر بیٹھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

بد نظری کے حرام ہونے کی ایک مثال سے وضاحت

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ ان مختلف مناظر کے اپنے اثرات ہیں، اور انہی اثرات کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان کو دیکھنے اور نہ دیکھنے کے احکام دیئے ہیں کہ فلاں چیز آپ دیکھ سکتے ہیں، فلاں چیز آپ نہیں دیکھ سکتے۔ بیمار آدمی جس کو ہارٹ (Heart) کا حملہ ہوا ہو، اور وہ اسپتال میں ہو، جب لوگ اس کو ملنے کے لیے جائیں گے تو ڈاکٹر پہلے سے ہدایت کر دیں گے کہ دیکھو! کوئی اس کے سامنے آنسو مت نکالیو، اگر کسی نے اس کے سامنے اپنی آنکھیں ڈبڈبائیں تو اس کے دل پر اثر ہو گا، پھر کہیں اٹیک (Attack) نہ آجائے۔ اور ایسا آدمی جس کے متعلق یہ خطرہ ہو کہ وہاں جا کر آہ و واویلا کرے گا اس کو جانے ہی نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح جو چیزیں تمہارے دین اور ایمان کے لیے خطرہ بن سکتی ہیں ان تمام چیزوں سے منع کر دیا گیا۔ نامحرم عورتوں اور بے ریش لڑکوں کو دیکھنے سے بھی اسی وجہ سے منع کیا گیا ہے۔

مردوں کے لیے سب سے بڑا فتنہ

عام طور پر شیطان دنیا کے اندر جو فتنہ وفساد پھیلاتا ہے اس کا ایک بڑا ہتھیار آوارہ اور بدکار عورتیں ہیں۔ شیطان ان کو اپنے جال کے طور پر استعمال کرتا ہے، بخاری شریف کی روایت ہے، نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: "مَا تَرَكْتُ بَعْدِي فِتْنَةً أَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ" (بخاری شریف)

”میرے بعد میں نے مردوں کے حق میں سب سے زیادہ نقصان دہ فتنہ عورتوں سے بڑھ کر نہیں چھوڑا“ یہ ایک ایسا فتنہ ہے کہ اس کی وجہ سے اچھے اچھے لوگ پھنس جاتے ہیں۔

اسی لیے حضور اکرم ﷺ ایک مرتبہ عورتوں کو نصیحت فرمارہے تھے، تو آپ نے فرمایا: ”مَارَأَیْتُ مِنْ نَّاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِیْنٍ أَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاکُنَّ“ (بخاری شریف: ۱/۴۴) دین اور عقل کے اعتبار سے ناقص شخصیت کو سمجھ دار اور تجربہ کار آدمی کی عقل اُٹھالے جانے والا تم سے بڑھ کر میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ عقل کے اعتبار سے مرد کے مقابلہ میں کم؛ لیکن بڑے بڑے دانا اور تجربہ کاروں کی عقلوں کو اُڑا کر لے جاتی ہیں۔

بہر حال! ان فتنوں سے بچانے کے لیے ہمیں شریعت نے حکم دیا ہے کہ نگاہوں کو نیچا رکھو۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آنکھ دی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے ہم ہر چیز دیکھتے رہیں؛ بلکہ جن چیزوں کو دیکھنے سے منع کیا گیا ہے (یعنی نامحرم عورتیں) اس سے بچنا چاہیے۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: بعض لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ حسین چہروں کو دیکھ لیا، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی حسین عمارت دیکھ لی؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔

... تو کیا حال ہو

بعض روایتوں میں آتا ہے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ”مَنْ نَظَرَ إِلٰی مَحَاسِنِ إِمْرَأَةٍ يُلْقَ الْآنُكُ فِيْ عَيْنَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ“ (نصب الرایۃ) جس نے کسی عورت کے حسن کو دیکھا تو قیامت کے روز اس کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا۔ آج اگر ایک چھوٹا سا تنکا یا ڈھول کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہماری آنکھ میں جاتا ہے، تو ہم بے چین ہو جاتے ہیں۔ یا ذرا سا پانی چلا جاتا ہے تو اس کی وجہ سے کیسی حالت ہو جاتی ہے، اور گرم پانی گر جائے تو پھر کیا حال ہو؟ لیکن بد نظری کی سزا میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فرماتے ہیں: پگھلا ہوا سیسہ ڈالا جائے گا (اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے)

گناہوں سے بچنے کا نسخہ

اس لیے نگاہوں کے غلط استعمال پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کو یاد کر لینا چاہیے اور ان کا استحضار ہونا چاہیے۔ جرائم کے اوپر جو سزائیں وارد ہوئی ہیں اگر آدمی ان کو سامنے رکھے تو اس کے لیے جرائم سے رُکنا آسان ہو جاتا ہے۔

زہریلا تیر

حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: "اَلنَّظَرُ سَھْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِھَامِ اِبْلِیس، مَنْ تَرَکَھَا مَخَافَتِیْ أَبْدَلْتُهُ اِیْمَاناً یَجِدُ حَلَاوَةً فِیْ قَلْبِهٖ" (المعجم الکبیر للطبرانی:۱۰/۱۷۳) نگاہ؛ شیطان کے تیروں میں سے زہریلا تیر ہے۔ پہلے زمانے میں تیر چلائے جاتے تھے تو پہلے سے اس کو زہر میں ڈبویا جاتا تھا، اس لیے کہ زہر میں بجھایا ہوا نہ ہو، اور خراش لگ جائے تو وہ خراش اچھی ہو سکتی ہے؛ لیکن زہر میں بجھائے ہوئے تیر کی خراش بھی اگر لگ جائے تو وہ جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ شیطان جن تیروں سے انسانوں کا شکار کرتا ہے ان میں ایک آدمی کی اپنی نگاہیں بھی ہیں۔

یہ ایسا تیر ہے جو خود کو پہلے زخمی کرتا ہے

علامہ ابن قیم (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: آدمی جب نامحرموں کو دیکھتا ہے تو اس کی یہ نگاہ دوسرے پر کوئی اثر ڈالے اس سے پہلے خود اس کے لیے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ یہ ایسا تیر ہے جو دیکھنے والے ہی کو پہلے لگتا ہے، اسی لیے نگاہ کی حفاظت کا ہمارے اکابر نے بڑا اہتمام کیا۔ نگاہ کی حفاظت کے سلسلہ میں ہمارے اکابر کتنا اہتمام کرتے تھے اس کو میں ابھی بتلاتا ہوں۔

کتنا بڑا وعدہ ہے

پھر آگے کتنا عظیم وعدہ کیا گیا۔ حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا ارشاد نقل کیا: جو آدمی بد نظری کو میرے ڈر کی وجہ سے چھوڑ دے گا، یہ سوچ گا کہ میری اس بد نظری کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائیں گے، تو مَیں اس کے اس عمل پر معاوضہ کے طور پر ایمان کی وہ کیفیت عطا کروں گا جس کی مٹھاس اور شیرینی وہ اپنے دل کے اندر محسوس کرے گا۔ بھائی! اگر یہ شیرینی لینی ہے تو اس کے لیے تھوڑا مجاہدہ تو کرنا ہی پڑے گا، محنت تو برداشت کرنی ہی پڑے گی۔ کتنا بڑا وعدہ ہے!

طاعت کی لذت سے محروم

اس سے ہم استدلال کر سکتے ہیں کہ جو لوگ اس بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ایمان کی مٹھاس سے محروم ہو جاتے ہیں، ان کو عبادت اور طاعت کی لذت نصیب نہیں ہوتی۔ اسی لیے بزرگوں نے فرمایا: جو آدمی بد نظری میں مبتلا ہوتا ہے تو وہ طاعت کی لذت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے بہت گناہ ہیں لیکن ان پر ایسی سخت وعید نہیں آئی ہے۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: لوگ اس گناہ کو ایسا ہلکا سمجھ بیٹھے ہیں کہ کرنے کے بعد اس کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

گناہ ایک آگ ہے

پھر دوسرے گناہ تو ایسے ہیں کہ آدمی اگر ان کو کئی مرتبہ کرلے تو ان سے دل اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ مثلاً: شراب نوشی ہے، دو بوتل، تین بوتل، چار بوتل پیئے گا؛ اور کتنی پیئے گا؟ آخر تو رُکے گا؟ اسی طرح زنا کا ارتکاب ہے؛ تو زنا کب تک کرے گا؟ جب تک اس کی قوت ساتھ دے گی، آخر کار تو اس کی ٹانگیں ڈھیلی ہو جائیں گی۔ ہر گناہ کا یہی حال ہے کہ ایک حد پر اس کی انتہاء ہو جاتی ہے؛ لیکن بد نظری ایسا گناہ ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں، یہ تو مسلسل چلتی رہتی ہے، ایک گھنٹہ تو ایک گھنٹہ، دو گھنٹے تو دو گھنٹے تک بیٹھے ہوئے ہیں اور گزرنے والی عورتوں پر نظر پڑ رہی ہے اور اپنے زعم میں لطف اور لذت اُٹھا رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھو! یہ لذت نہیں ہے؛ بلکہ آگ ہے آگ۔ یہ مناظر جو اندر محفوظ ہو رہے ہیں ؛ بعد میں پھر وہی یاد آتے ہیں اور ستاتے ہیں۔ نماز کے لیے جب کھڑے ہوتے ہیں، یا دوسرے کام میں لگے ہوتے ہیں؛ تو یہ ساری چیزیں سامنے آتی ہیں اور آدمی کو پریشان کرتی ہیں۔

بے چینی سے بچنے کا سستا سودا

حضرت اقدس تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) سے کسی نے پوچھا: بد نظری کے لیے آنکھیں بہت کوشش کرتی ہیں، جب کوئی عورت سامنے سے گزر رہی ہوتی ہے تو دل یوں کہتا ہے کہ ذرا دیکھ لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ بغیر تمہارے دیکھے وہ گزر جائے اور پتہ نہیں کیسی حسین ہو گی، ذرا ایک نظر دیکھ لو تا کہ افسوس نہ رہ

جائے، اور اسے دیکھے بغیر دل مانتا ہی نہیں۔ دل میں ایک طرح کی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ حضرت نے پوچھا: یہ بے چینی کتنی دیر رہتی ہے؟ کہا: تھوڑی دیر؛ تین چار منٹ رہتی ہے، جب وہ عورت گزر جاتی ہے تو وہ بے چینی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر حضرت نے پوچھا: اچھا! اگر اس کو دیکھ لیا اور اس کی تصویر دل کی میموری (Memory) میں اتر گئی، تو اس کے بعد اس کا خیال بار بار آتا ہے نا؛ وہ کتنا رہتا ہے؟ اس نے کہا: تین چار دن تک تو وہ جاتا ہی نہیں۔ اس پر حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: اگر تین چار دن کی اس بے چینی کے بدلہ میں تین چار منٹ کی بے چینی برداشت کر لی جائے؛ تو یہ سودا سستا ہے۔

سالکین کو خاص ہدایت

بہر حال! اس کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ بڑا خطرناک گناہ ہے۔ مَیں نے پہلے بتلایا تھا کہ حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے ''آپ بیتی'' میں لکھا ہے کہ جو ذاکرین ہیں، خاص کر راہِ سلوک میں لگے ہوئے ہیں، وہ اللہ کے ذکر کا سلسلہ شروع کرتے ہیں تو طبیعت میں ایک لذت اور جوش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، لیکن بد نظری میں مبتلا ہوتے ہیں؛ تو وہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

نسبت کی تعریف اور ایک مثال سے اس کی وضاحت

نسبت؛ صوفیاء کی ایک اصطلاح ہے، یعنی آدمی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے ہر لمحہ اللہ کی یاد ہو، اور اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا تصور ہو، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت

وفرمانبرداری کا اہتمام ہو؛ اسی کو نسبت کہتے ہیں۔ پھر حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ جیسے: دیہاتوں میں عورتوں کو دیکھا ہوگا کہ کنویں کے اوپر دو دو، تین تین، چار چار اور جماعت کی شکل میں سر کے اوپر گھڑے اور برتن لے کر پانی بھرنے جاتی ہیں اور آپس میں باتیں بھی کر رہی ہوتی ہیں، ہنسی مذاق بھی کر رہی ہوتی ہیں؛ لیکن ان کا دھیان ایک منٹ کے لیے بھی اپنے برتن سے نہیں ہٹتا۔ یا جیسے کوئی ڈرائیونگ کر رہا ہو تو ڈرائیونگ کرنے والا باتیں بھی کرتا ہے، ہنسی مذاق بھی کرتا ہے؛ لیکن اس کا دھیان ڈرائیونگ سے چوکتا نہیں۔

نسبت کے ختم ہونے کا ایک سبب

بزرگوں نے لکھا ہے کہ بہت ریاضتیں اور مجاہدے کرنے کے بعد آدمی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہوتا ہے اسی کو نسبت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور ساری ریاضتیں وسارے مجاہدات اسی لیے کرواتے ہیں کہ نسبت پیدا ہو جائے، جیسے: کہا جاتا ہے کہ یہ صاحبِ نسبت بزرگ ہیں، یعنی ان کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک خاص تعلق پیدا ہو چکا ہے۔ تو جو نسبت ریاضت اور مجاہدہ کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے وہ نسبت جن چیزوں سے ختم ہو جاتی ہے، اس کے کئی اسباب ہیں، ان میں ایک بڑا سبب ”بدنگاہی“ بھی ہے۔ گویا حاصل شدہ نسبت بھی بدنگاہی سے ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے راہِ سلوک کی جو

رکاوٹیں اور موانع ہیں ان میں ایک بڑا مانع ”بد نگاہی“ ہے۔ دوسرا مانع ”حرام لقمہ“ ہے۔ اور تیسرا مانع ”غلط صحبت“ ہے۔ معلوم ہوا کہ بد نگاہی بڑی خطرناک چیز ہے اور اس کے بڑے نقصانات ہیں۔

بد نگاہی سے دونوں پر لعنت ہوتی ہے

اور یہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کا حقدار بناتی ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: ”لَعَنَ اللہُ النَّاظِرَ وَالْمَنْظُوْرَ إِلَيْهِ“ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان، مشکوۃ:۲۷۰) جو نامحرم کو غلط اور ناجائز نگاہ سے دیکھتا ہے، تو اس پر اور جس کو دیکھا جارہا ہے؛ دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے۔ اب سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ دیکھنے والے کے اوپر تو لعنت سمجھ میں آنے والی بات ہے؛ لیکن جس کو دیکھا جارہا ہے اس پر لعنت آخر کیوں کی گئی؟ تو اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حضراتِ علماء نے لکھا ہے کہ جس کو دیکھا گیا ہے اس نے بھی تو اس بات کا اہتمام کیا تھا، اپنے آپ کو سنوارا تھا اور زیب و زینت اختیار کی تھی؛ تاکہ لوگ مجھے دیکھیں۔ جیسے: مرد جب لباس پہنتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ عورتیں مجھے دیکھیں اور پسند کریں۔ اور عورتیں بھی جب زیب وزینت کرتی ہیں تو وہ یوں سوچتی ہیں کہ مرد ہمیں دیکھیں اور پسند کریں۔ گویا اس نے بھی اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کیا تھا تو ظاہر ہے کہ اس کے دل میں بھی گناہ ہے، اس لیے اس پر بھی لعنت ہوئی۔

لعنت کتنی خطرناک چیز ہے؟

اللہ تعالیٰ کی لعنت کتنی خطرناک چیز ہے! اس کا تو وجود بھی مصیبت بنتا ہے، اور آپ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے لعنت سے بچنے کا بہت زیادہ اہتمام فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ایک سفر سے واپس تشریف لا رہے تھے، ایک آدمی نے اپنے اونٹ پر کسی وجہ سے لعنت بھیجی۔ صرف اس کی زبان سے لعنت کا لفظ نکلا تو حضور صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کے متعلق حکم دیا کہ اس اونٹ کو قافلہ سے الگ کر دو، لعنت والی چیز ہمارے ساتھ نہیں رہنی چاہیے۔ (مسلم شریف، حدیث نمبر:۲۵۹۵)

انسان کو دھوکہ دے سکتے ہیں؛ لیکن...

تو مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ قرآنِ پاک کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں متنبہ کر دیا کہ اپنی نگاہوں کے متعلق یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے متعلق سوال ہو گا۔ اب کوئی آدمی سوچے کہ سوال تو تب ہو جب اس کا پتہ بھی چلے، جیسا کہ باپ کی طرف سے بچے کو سوال تو اس وقت ہو جب کہ باپ کو پتہ بھی چلے کہ اس نے گڑبڑ کی ہے، تب ہی تو باپ گرفت اور مواخذہ کرے گا، اگر پتہ ہی نہ چلے تو پھر پکڑ کیسے کرے گا؟ تو آگے آیت لائے ہیں: ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (المؤمن:۱۹) آنکھوں کی خیانت کو وہ جانتا ہے۔ آنکھوں کی خیانت یہ ہے کہ کسی جگہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور اجنبی عورت آئی تو ایسا چپکے سے دیکھ لیا کہ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا، جس کو کہتے ہیں کہ کھانچا مار دیا، گویا

سب کو دھوکہ دیدیا۔ تو کھانچا مار کر تم انسانوں کو دھوکہ دے سکتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ کو دھوکہ نہیں دیا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ تو عالم الغیب والشہادۃ ہے۔

کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے؟

بد نگاہی سے بچنے کی تدبیر بھی اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بتلائی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس تصور کو تازہ کرلو کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ: اگر آپ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہاں سے کوئی حسین عورت گزر رہی ہے؛ لیکن آپ کے ابّا موجود ہیں جو ٹکٹکی لگائے ہوئے آپ کو دیکھ رہے ہیں تو آپ اس کو نہیں دیکھیں گے، اس لیے کہ ابا دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح استاذ موجود ہیں جو آپ کو دیکھ رہے ہیں اور آپ کی نگرانی کر رہے ہیں، آپ ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں، اور وہاں سے کیسی ہی حسین عورت گزر جائے تو اگرچہ جی بہت چاہ رہا ہو گا تب بھی استاذ کے موجود ہونے کا خیال کرتے ہوئے آپ اپنی نگاہیں نہیں اُٹھائیں گے۔ یوں سوچیں گے کہ اگر یہ دیکھ لیں گے تو وہ میرے متعلق کیا گمان کریں گے! ایسے ہی اگر پیر اور شیخ دیکھ رہے ہیں، تو ان کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے مرید بد نگاہی نہیں کرے گا۔ یہ تو بڑوں کی بات تھی، اگر اپنے سے چھوٹے وہاں موجود ہوں، جیسے: شاگرد استاد کو دیکھ رہے ہیں، یا مرید پیر کو دیکھ رہے ہیں یا بیٹا باپ کو دیکھ رہا ہے، تو استاذ، پیر اور باپ بد نگاہی نہیں

کریں گے، وہ شرمائیں گے کہ شاگرد، مرید اور بیٹا میرے متعلق کیا سوچیں گے کہ عمر کی اس منزل میں پہنچ کر بھی یہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں!

تو دیکھئے آدمی ان لوگوں سے شرم محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو بدنگاہی سے بچاتا ہے، حالاں کہ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو اس کی وجہ سے کیا نقصان ہوگا؟ کیا ان کے ہاتھوں میں ہماری دنیا اور آخرت کا کوئی اختیار ہے؟ ہماری عمر ان کے ہاتھ میں ہے؟ ہماری روزی ان کے ہاتھ میں ہے؟ بس اتنا ہے کہ وہ ہمیں برا سمجھیں گے، اس کے سوا اور کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔ نہ تو وہ ہماری تنخواہ کاٹ لیں گے، نہ ہماری روزی گھٹائیں گے، ہمارا کوئی معاملہ ان کے اختیار میں نہیں ہے، اس کے باوجود آدمی ان لوگوں کی موجودگی میں اپنے آپ کو گناہوں سے بچاتا ہے، اور جب کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ تمام دروازے — جہاں سے کوئی اس کو دیکھ سکتا ہو — بند کرلیتا ہے؛ بلکہ چھوٹا بچہ بھی وہاں موجود ہو تب بھی گناہ نہیں کرتا ہے کہ بچہ دیکھ رہا ہے۔ حالاں کہ ہمارا تو عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں: ﴿أَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللَّهَ يَرَىٰ﴾ (اقراء:۱۴) ”کیا اسے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے“ بزرگوں نے باقاعدہ اس آیت کا مراقبہ بتایا ہے۔ مراقبہ یعنی آدمی ہر وقت یہ سوچے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ہوں۔ آج کل جگہ جگہ بورڈ لگائے جارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے، مَیں اللہ کی نگاہوں میں ہوں؛ تاکہ یہ تصور ہمارے دل و دماغ میں جم جائے اور ہر وقت یہ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے۔

ایک عمدہ مثال

اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے کہ: اگر ہمیں یہ معلوم ہو کہ یہاں مسجد میں ہم اکیلے ہیں، لیکن یہاں کیمرے لگے ہوئے ہیں اور جہاں ان کیمیروں کی اسکرین ہے وہاں نگران بیٹھے ہوئے ہماری نگرانی کر رہے ہیں، اور اس درمیان کوئی اجنبی عورت یہاں آجائے تو مسجد میں کسی کے موجود نہ ہونے کے باوجود ہم اپنے آپ کو بچائیں گے کہ ہماری (Watch) نگرانی ہو رہی ہے، اسی طرح اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بدنگاہی سے بچنے کی تدبیر بتلائی ہے: ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (المؤمن:۱۹) یاد رکھئے کہ اللہ تعالیٰ تو نگاہوں اور آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے، اور جس وقت تم کسی کو دیکھ رہے ہوتے ہو اس وقت تمہارے دل میں کیا کیا خیالات آتے ہیں، اور تم کیا کیا سوچ رہے ہوتے ہو؛ اللہ تعالیٰ اس کو بھی جانتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے تو اس کا محاسبہ بھی کرے گا اور اس کی سزا بھی دے گا۔

تیرا رب گھات میں ہے

ہم لوگ انسانوں کو اسی وقت دھوکہ دیتے ہیں جب ان کی توجہ ہماری طرف نہ ہو، جب وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہوں، تب ہم کھانچا مار دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی ہمیں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہا ہو تو ہم سوچتے ہیں کہ یہ برابر ہماری طرف دھیان لگائے ہوئے ہے، ابھی موقعہ نہیں ہے۔ اسی بات کو اس

آیت میں بیان فرمایا گیا ہے:﴿إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ (الفجر:۱۴) تیرا رب تیری گھات میں ہے۔ گھات کا مطلب یہ ہے کہ شکاری جس وقت شکار کرنے کے لیے شکار کی طرف بندوق تاکتا ہے اور نشانہ لیتا ہے، تو بندوق کی گولی چھوڑنے سے کچھ پہلے شکار کی طرف جو نگاہ ہوتی ہے؛ اس کو ''مرصاد'' کہتے ہیں۔ اس وقت ساری چیزوں سے بے حس و بے حرکت ہو کر اور سب چیزوں سے توجہ ہٹا کر شکار کی طرف پورا دھیان ہوتا ہے۔ ویسے بھی اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتے ہیں لیکن یہاں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ گھات میں ہیں ،یعنی ہماری طرف پورے طور پر دھیان دیئے ہوئے اور متوجہ ہیں۔ اگر ہمارے دل و دماغ میں یہ تصور جم جائے؛ تو پھر کیا ہم بد نگاہی کریں گے ؟یہی وہ چیز تھی جس نے ہمارے اکابر و اسلاف کو ان چیزوں کے معاملہ میں اتنا محتاط بنا دیا تھا کہ آج ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا عمل

خود نبی کریم ﷺ ان احکام پر کیسا عمل فرماتے تھے؟ علامہ یافعی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک روایت نقل کی ہے کہ جب قبیلہ عبد القیس (جو بحرین کا ایک قبیلہ تھا) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو اس میں ایک بے ریش لڑکا تھا، نبی کریم ﷺ نے اس کو اپنے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا(کشف الخفاء:۲/۲۳۱) حالاں کہ حضور اکرم ﷺ تو معصوم اور پاک تھے؛ لیکن اپنے اس عمل سے اپنی امت کو

سبق دینا چاہتے تھے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: حضرت داؤد علیہ السلام کی قوم اس فتنے میں مبتلا ہو گئی۔ (الترغیب والترہیب للیافعی)

اکابر و اسلاف کے واقعات وارشادات

امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس ایک ”اَمرد“ آیا۔ (اَمرد کی تعریف یہ کی ہے کہ مونچھ کے کچھ ڈورے تو پھوٹ چکے ہوں، لیکن ابھی ڈاڑھی نہ آئی ہو، بہت چھوٹے بچے کو ”اَمرد“میں شامل نہیں کیا ہے؛ بلکہ ایسا لڑکا کہ جس کی طرف عورتیں بھی رغبت رکھتی ہیں، جو لڑکا مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے فتنہ ہو؛ اس کو ” اَمرد“ سے تعبیر کیا ہے۔) تو ایک آدمی اپنے بے ریش لڑکے کو لے کر امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کی خدمت میں حاضر ہوا، امام صاحب نے کہا: آئندہ اس کو مت لانا۔ لوگوں نے عرض کیا: حضرت! آپ اس کی اتنی تاکید کیوں فرما رہے ہیں ؟ فرمایا: میرے اکابر نے مجھے یہی تاکید کی ہے کہ کبھی بھی بے ریش کو اپنے پاس نہ آنے دینا، اس سے اپنے آپ کو بچانا۔

حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے محدث اور فقیہ تھے۔ ایک مرتبہ حمام تشریف لے گئے تو حمام کے مالک نے پانی پہنچانے کی خدمت کے لیے کسی بے ریش کو بھیج دیا، انہوں نے کہا: جلدی سے اس کو یہاں سے نکالو، میں دیکھ رہا ہوں کہ عورت کے ساتھ تو ایک شیطان ہوتا ہے؛ لیکن اس کے ساتھ بارہ، تیرہ شیطان لگے ہوئے ہیں۔

حکم بن ذکوان (رحمۃ اللہ علیہ) بڑے بزرگوں میں گزرے ہیں، وہ فرماتے ہیں: بے ریش لڑکوں کی شکلوں اور صورتوں میں ایسی کشش ہوتی ہے جیسی کنواری لڑکیوں کے چہروں میں ہوتی ہے؛ بلکہ ان کے مقابلہ میں زیادہ ہی ہوتی ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے۔ امام موصلی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: ایسے چالیس بزرگوں کو- جو قطب وابدال کے درجے پر تھے- مَیں نے دیکھا کہ وہ اس سے بہت بچنے کی تاکید کرتے تھے۔ **بہر حال! اپنے آپ کو بد نگاہی سے بچانے کا بہت اہتمام ہونا چاہیے۔**

آنکھوں سے زنا ٹپک رہا ہوتا ہے

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے کہ: آدمی جب گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے سامنے اللہ تعالیٰ سب احوال کھول دیتے ہیں؛ لیکن ایسے بندوں کا ظرف بھی اللہ تعالیٰ بڑا وسیع بنا دیتے ہیں، ان کے اندر اللہ کی شانِ ستاری کی جھلک آجاتی ہے، اس لیے وہ بندوں کی ان برائیوں کو لوگوں کے سامنے ظاہر نہیں کرتے۔

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی مجلس میں ایک آدمی حاضر ہوا جو بد نظری کر کے آیا تھا، حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے چہرہ دیکھ کر پہچان لیا؛ لیکن تنبیہ اس انداز سے فرمائی کہ لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے، فرمایا: لوگوں کا کیا حال ہے کہ مجلس میں ایسی حالت میں آتے ہیں کہ ان کی آنکھوں سے زنا ٹپک رہا ہوتا ہے۔

اعلیٰ حضرت رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کا واقعہ

ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) (۱) نے حضرت رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) (۲) کا واقعہ سنایا تھا، حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) ہی کے حوالہ سے آپ بیتی میں بھی نقل کیا ہے کہ: ایک مرتبہ بڑے حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) وضو فرمارہے تھے، دو آدمی آئے، ایک تو آپ کا مرید تھا، دوسرا اس کے ساتھ آیا تھا، مرید کو دیکھ کر فرمایا: تمہارا تو کچھ بگڑا نہیں؛ سُستی چُستی آدمی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ دراصل وہ مرید معمولات کی پابندی میں کوتاہی کرتا تھا۔ اور دوسرے کے متعلق فرمایا: ایک روگ اس کے دل کے اندر ہے، اور ایک آنکھ کے اندر ہے۔ دراصل وہ دوسرا آدمی بد نگاہی کا شکار تھا اور عقیدہ بھی بگڑا ہوا تھا۔

اور اس پر نگاہ پڑ جائے

ہمارے بزرگ اپنے آپ کو بد نگاہی سے بچانے کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔ حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: جب دو گاڑیوں کا میل (Crossisng) ہوتا ہے (مثلاً: ایک گاڑی بمبئی جانے والی

(۱) فقیہ الامت حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ) مراد ہیں۔

(۲) حضرت مولانا شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) مراد ہیں۔ مرتب۔

اور دوسری گاڑی احمد آباد جانے والی؛ دونوں سورت اسٹیشن کے ایک ایک پلیٹ فارم پر کھڑی ہوں) تو اگر مَیں کھڑکی پر بیٹھا ہوا ہوتا ہوں تو سامنے کھڑی ہوئی دوسری گاڑی پر نظر نہیں کرتا؛ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ دوسری گاڑی کی کھڑکی پر کوئی عورت بیٹھی ہوئی ہو، اور وہ یہ سمجھ کر کہ مجھے کوئی دیکھ نہیں رہا ہے، اپنا چہرہ کھلا ہوا رکھے اور اس پر میری نگاہ پڑ جائے۔

آج ہمارے اس زمانہ میں عورتوں کی بے حیائی اور راستوں پر ان کا بے پردہ چلنا اور آوارہ گردی عام ہو چکی ہے، اُس زمانہ میں اس طرح کھلے چہرے کے ساتھ ان کے نکلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بلکہ اُس زمانے میں عورتیں باہر نکلتی ہی نہیں تھیں۔

عورت چھپانے کی چیز ہے

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے وعظ میں لکھا ہے کہ: بعض لوگ اپنی لڑکیوں سے ایسا پردہ کرواتے تھے کہ ان کے پڑوسیوں تک کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے گھر میں لڑکی ہے، جب شادی ہوتی تھی تو محلے والے کہتے تھے: اچھا! اس کے گھر لڑکی تھی؟ یعنی اس لڑکی کے وجود تک کا پتہ نہیں چلتا تھا، اس کو چھپا کر پردے میں رکھنے کا اتنا زیادہ اہتمام کیا جاتا تھا۔ اور آج کل تو بقول حضرت قاری صدیق صاحب باندوی (رحمۃ اللہ علیہ): یہ حال ہے کہ لڑکی صبح سے گھر سے غائب ہے، شام کو واپس آتی ہے لیکن گھر والوں کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کہاں گئی تھی اور کیوں گئی تھی۔ لیکن اگر گھر کی مرغی تھوڑی دیر کے لیے

اِدھر اُدھر ہو گئی ہو تو سارے گھر والے - بوڑھے بھی، مرد بھی، عورتیں بھی - اس کی تلاش کرنے کے لیے نکلیں گے کہ مرغی غائب ہے، مرغی غائب ہے، دیکھو کہاں چلی گئی۔ (یہ میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ حضرت کا جملہ نقل کر رہا ہوں) تو یہ ایک مزاج بن چکا ہے۔ آج ہمارے سماج میں اس کا کوئی اہتمام ہی نہیں رہا، حالاں کہ ہمارے بزرگوں کے یہاں اتنا زیادہ اہتمام تھا۔

حضور ﷺ کی حیاء

حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم ﷺ کی شرم و حیاء کو بتلایا گیا ہے کہ حضور کے اندر شرم ایسی تھی جیسے کنواری لڑکی اپنے گھر کے اندر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی ہو، اور اس پر شرم غالب ہو (شمائل ترمذی، ص:۲۴) اس حدیث کی شرح کرنے والے علماء نے لکھا ہے کہ: عام طور پر کنواری بچیوں کو گھر کے اگلے حصے میں بھی نہیں، بلکہ اندر کے چھوٹے کمرے میں رکھتے ہیں، جیسے: تجوری ہوتی ہے اور اس تجوری میں بھی چور خانہ ہوتا ہے، تو گھر اور گھر کے اندر بھی چھوٹا حجرہ ہوتا ہے۔ اُس زمانہ میں اتنا اہتمام ہوتا تھا کہ اندر کے کمرہ میں رکھا جاتا تھا۔ لیکن آج یہ بات نہیں رہی۔ آج تو جوان بچیوں کو اپنے ساتھ ہی لے کر نکلتے ہیں، اور وہ جوان لڑکی بے پردہ ہوتی ہیں، ان کے ماں باپ کے سامنے اجنبی لوگ اس کو دیکھ رہے ہوتے ہیں؛ لیکن اس پر ان کو غیرت بھی نہیں آتی۔

ہماری غیرت کہاں چلی گئی؟

علامہ ابن الحاج مالکی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ”المدخل“ میں اپنے زمانہ کی مصری عورتوں کا حال لکھا ہے، حالاں کہ وہ تو آج سے پانچ چھ صدی پہلے کے عالم ہیں؛ لیکن عجیب بات ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہمارے اِس زمانہ کی عورتوں ہی کا حال لکھا ہے کہ: وہ اجنبیوں کے ساتھ دکانوں پر خریدی کرنے کے لیے جاتی ہیں، دکاندار سے باتیں کرتی ہیں۔ اور وہ چلتی ہیں تو اپنی لچک دکھلا کر اور کمر مٹکا کر چلتی ہیں، اور ان کے گھر والے، شوہر، ماں باپ ان کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، تب بھی انہیں کوئی غیرت نہیں آتی۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ چیزیں بڑی احتیاط کی ہیں۔ اور آج کا ماحول یہ ہے کہ آدمی کے لیے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔

ہر آدمی کے لیے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر آدمی کے لیے زنا کا حصہ لکھ دیا ہے جس میں وہ لامحالہ مبتلا ہو گا۔ آنکھ کا زنا نامحرم کو دیکھنا ہے، اس کی تشریح میں مولانا مفتی محمد سلمان صاحب منصورپوری زید مجدہٗ نے جو لکھا ہے وہ مجھے تو بہت پسند آیا کہ: ہر آدمی کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں جس میں ہو سکتا ہے کہ آنکھ کی بے احتیاطی ہو جائے، کان کی بے احتیاطی ہو جائے، زبان کی بے احتیاطی ہو جائے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کیسے زنا میں مبتلا ہوں گے؛ لیکن

ہر آدمی کی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں مبتلا ہو جائے، اور آج کا جو ماحول ہے اس میں آنکھ کی بے احتیاطی سے کون بچ سکتا ہے؟ آپ چوراہوں پر دیکھئے، محلے میں دیکھئے، بازار میں دیکھئے، گھروں کے اندر اوٹوں کے اوپر دیکھئے، اور کمال تو یہ ہے کہ گھر کی دیواروں کے اوپر اور گھر کے اندر جو اخبار آتے ہیں اس پر دیکھئے، اور اگر کوئی اخبار نہ پڑھے تو استعمال کی چیزوں پر دیکھئے، مثلاً: سرمہ کی چھوٹی بوتل لے آئیں تو اس پر بھی عورت کی تصویر بنی ہوئی ہوتی ہے، اور نامحرم عورت کی تصویر کو دیکھنا بھی ایسا ہی گناہ ہے جیسا کہ زندہ عورت کو دیکھنا تو جب اس پر نگاہ پڑے گی تو اس میں مبتلا ہو ہی گیا۔ اب آدمی کتنا بچے گا؟ پھر بھی اللہ تعالیٰ جس کو توفیق دے اور وہ اپنی عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کرتے ہوئے ان چیزوں سے بچنے کا اہتمام کرلے اور پھر بھی کوئی فروگذاشت (کوتاہی) ہوگئی تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کرلے، اپنے آپ کو آگے بڑھنے سے بچائے اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیدیتے ہیں۔

قابلِ تقلید طرزِ عمل

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ: حضرت مولانا حافظ قمر الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے خلیفہ تھے، سہارنپور کی جامع مسجد کے امام تھے، ایک مرتبہ وہ بیمار ہوئے تو ان کی جگہ پر امامت کے لیے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جایا کرتے تھے۔ اُس

زمانہ میں حضرت مولانا الیاس صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) مظاہر علوم سہارنپور میں پڑھاتے تھے۔ تو حضرت کا معمول یہ تھا کہ عصر کے لیے تشریف لے جاتے اور مغرب پڑھا کر واپس آتے، کبھی کبھی عصر کے وقت مَیں بھی ان کے ساتھ جاتا تھا اور مَیں نے بڑے اہتمام سے نوٹ کیا کہ حضرت جب گھر سے باہر نکلتے تو مسجد پہنچنے تک نگاہیں اپنے پاؤں کے اوپر ہی رہتیں، اور مسجد سے نکلتے تو مدرسہ کے دروازہ میں داخل ہونے تک نگاہیں پاؤں پر ہی رہتیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری (رحمۃ اللہ علیہ) بھی جب باہر نکلتے تھے تو نگاہوں کو نیچا رکھنے کا پورا پورا اہتمام فرماتے تھے۔

حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا تقویٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا یونس صاحب دامت برکاتہم کا ابھی جو دورہ ہوا تھا، توڈابھیل میں انہوں نے خود مجھے قصہ سنایا کہ: ان کے ایک ساتھی نے ان کو بتلایا کہ جب میں چھوٹا بے ریش اور اَمرد تھا، اس زمانہ میں ایک مرتبہ سہارنپور مدرسہ میں کسی کمرہ میں چوری ہوئی۔ اور جن پر شبہ ہوتا ہے ان لوگوں کی جیبوں کی بھی تلاشی ہوتی ہے تو جب جامہ تلاشی کی ضرورت پیش آئی، جب میری جامہ تلاشی کی نوبت آئی تو حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) (جو حضرت حکیم الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کے اجلِ خلفاء میں تھے، اور حضرت قاری صدیق صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جن کے خلیفہ تھے) نے اتنی زیادہ

احتیاط فرمائی کہ مجھ سے کہا: پہلے تم اپنی جیب جسم سے الگ کرلو، پھر میری جیب میں ہاتھ ڈالا، تاکہ جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے جسم کے ساتھ نہ لگے۔ یہ حضرات اپنے آپ کو بچانے کا اتنا اہتمام کرتے تھے۔

پہلی نظر معاف؛ مگر نقصان سے خالی نہیں

یہاں ایک مسئلہ اور ہے کہ اچانک کی نظر کو معاف رکھا گیا ہے۔ اور بہت سے لوگ پوچھتے ہیں کہ بلاقصد غیر اختیاری طور پر نظر پڑ جائے؛ تو ہم کیا کریں؟ بھائی! بلاقصد غیر اختیاری طور پر نظر پڑ گئی تو اس کا حکم یہ ہے کہ فوراً نگاہیں نیچی کرلو؛ تب تو وہ معاف ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: ”یَا عَلِیّ! لَا تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ، فَإِنَّ لَكَ الْأُولٰى وَلَيْسَتْ لَكَ الثَّانِيَةُ“ (مشکوۃ شریف:۲۶۹) اے علی! ایک نگاہ کے بعد دوسری نگاہ مت ڈالو، اس لیے کہ پہلی میں تو کوئی نقصان (یعنی گناہ) نہیں ہے؛ لیکن دوسری میں گناہ ہے۔ اب ایسا تو نہیں ہے کہ ان حضرات کو یہ روایت معلوم نہیں تھی، یہ روایت تو ان لوگوں نے بھی پڑھی تھی؛ لیکن وہ حضرات اچانک نظر پڑنے کی بھی نوبت نہیں آنے دیتے تھے۔

اور بلاقصد کسی بھی عورت پر نظر نہ پڑے اس کا اہتمام اس لیے کرتے تھے کہ اچانک کی نظر اگرچہ گناہ کے اعتبار سے تو معاف ہے، لیکن اس کی وجہ سے اگر دل میں کوئی خیال بیٹھ گیا تو اس کے نقصان سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے: بھول سے زہر کھالیا تو گنہگار تو نہیں ہوگا؛ لیکن زہر اپنا

اثر تو کرے گا۔ وہاں مفتی صاحب سے مسئلہ پوچھیں گے کہ: مولوی صاحب! وہ تو یہ سمجھتا تھا کہ کوئی کھانے کی چیز ہے اور کھا گیا اور مر گیا؛ اس کو خودکشی کا گناہ ہوا، یا نہیں ؟ تو جواب ملے گا کہ گناہ تو نہیں ہو گا؛ لیکن جو نقصان پہنچنا تھا وہ تو پہنچ ہی گیا۔ اسی طرح بلا قصد کی نظر اگرچہ گناہ کے اعتبار سے معاف ہو؛ لیکن اس کے اثرات اپنا کام ضرور کریں گے، اس لیے اپنے آپ کو اس سے بچانے کا خصوصی اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔

مخلوط ملازمت کے بارے میں ایک سوال اور حضرت دامت برکاتہم کا تشفی بخش جواب

سوال:- سرکاری دفتروں میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی نوکریاں کرتی ہیں، ساتھ میں نوکری کرنے کی وجہ سے بات چیت بھی کرنی پڑتی ہے، اور چوں کہ وہ نامحرم ہیں، اس لیے گناہ میں شامل ہوں گے ؟

جواب:- دیکھئے ! آدمی اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرلے اور ایک مرتبہ یہ طے کرلے کہ مجھے اپنے آپ کو بچانا ہے؛ تو پھر آسان ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبد الحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ)- جو حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کے اجلِ خلفاء میں تھے- کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت پہلے وکیل تھے، وکالت کا پیشہ پسند نہیں کیا گیا تو اس کو چھوڑ کر ہومیوپیتھک

ڈاکٹر بنے۔ (ہومیو پیتھک ڈاکٹری ذرا آسان ہے) پھر ان کا یہی پیشہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے پاس عورتیں بھی آتی ہیں اور مرد بھی آتے ہیں۔ جب ڈاکٹر بنے تو یہ دوسرا مسئلہ پیش آیا تو ڈاکٹر صاحب خود فرماتے ہیں کہ: میں نے اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنالیا کہ نگاہیں نیچی رہیں، کبھی اونچا دیکھنا ہی نہیں۔ پھر بعد میں تو اتنا آسان ہو گیا کہ کوئی دشواری ہی نہیں رہی۔ جب کوئی آیا اور اس نے اپنی ضرورت بیان کی، اس کے مطابق اس کو دوائی دیدی اور مریض کون ہے اس کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔

ایمان کے لیے ٹی بی

دیکھئے! ایک آدمی کو ٹی بی کی بیماری ہے اور اس کو ڈاکٹروں نے کہا کہ آپ بیڑی پیتے ہیں وہ چھوڑنی پڑے گی، ورنہ آپ کے لیے ہلاکت ہے، تو وہ اس کو چھوڑنے کے لیے تکلیف اٹھاتا ہے۔ اسی طرح بد نظری بھی ہمارے ایمان کے لیے ٹی بی سے کم نہیں ہے، اور اس سے اپنے آپ کو بچانا ہی ہے، اب اپنے آپ کو بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ مشقت تو برداشت کرنی ہی پڑے گی! یہ کڑوا گھونٹ حلق سے نیچے اتارنا ہی پڑے گا۔

مزہ کی بنیاد عادت پر ہے

ہمارے نفس کی لذتوں کا حال ایسا ہے کہ اس کے لیے کوئی معیار نہیں ہے۔ جو لوگ پان کھاتے ہیں اور پان کے ساتھ تمباکو بھی کھاتے ہیں ان کو اس میں لذت آتی ہے؛ لیکن جو آدمی تمباکو نہیں

کھاتا اس کے منہ میں آپ تمباکو رکھ دیجئے؛ تو کیا رکھتے ہی اسے میٹھا لگے گا اور اس کو مزہ آجائے گا؟ نہیں؛ بلکہ کڑوا لگے گا اور کھاتے ہی چکر آجائیں گے؛ لیکن جب وہ ذرا حلق سے نیچے اترے گا تو پھر اس کی وجہ سے ایک سرور کی کیفیت پیدا ہوگی۔ پہلی مرتبہ تھوڑا سا کھلایا تھا، اب دوسری اور تیسری مرتبہ کھایا، تو پھر وہ ایسا عادی ہو گیا کہ اس کے بغیر چلتا ہی نہیں۔ اب جو لوگ نہیں کھاتے وہ دیکھ کر یوں سمجھتے ہوں گے کہ شاید اس کا ذائقہ بڑا شاندار ہوگا۔ حالاں کہ جب وہ کھائیں گے تب پتہ چلے گا کہ ذائقہ شاندار ہے، یا نہیں؟ لیکن جو کھاتے ہیں ان کو پوچھو کہ کیسا مزہ آتا ہے۔

بہر حال! میں تو مزہ کی بات کر رہا ہوں کہ ہمارے نفس کے مزہ کا کوئی معیار نہیں ہے۔ اور مزہ کی بنیاد عادت پر ہے، جس نے بد نظری کو اپنے مزہ کا معیار بنالیا ہے وہ تو بد نظری کر کے مزہ اٹھاتا ہے؛ لیکن اس کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے، اور جو بے چینیاں اندر پیدا ہوتی ہیں وہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے برخلاف آدمی اپنے آپ کو بد نظری سے بچا کر مشقت اُٹھاتا ہے؛ تو پھر دھیرے دھیرے مشقت اُٹھانے میں اس کو مزہ آنے لگتا ہے۔

یہ بھی ایک مزہ ہے

حضرت ابوالدرداء (رضی اللہ عنہ) کا مقولہ آپ نے فضائل کی کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ: مجھے دنیا کی زندگی کی تمنا ہے، لیکن اس لیے نہیں کہ دولت کماؤں، بلکہ گرمی کے دنوں میں روزے رکھوں۔ اب

گرمی کے دنوں میں روزے رکھنا تو بڑا مشکل کام ہے؛ لیکن وہ رکھتے تھے اور ان کو اس میں مزہ آتا تھا، اس لیے اس کی تمنا کرتے تھے۔

بہر حال! نگاہوں کی حفاظت کر کے مشقت برداشت کرنا بھی ایک مزہ کی چیز ہے؛ لیکن اس کے لیے کچھ دنوں کڑواہٹ برداشت کرنی پڑے گی۔

تو زندگی بھر دودھ نہیں چھوٹے گا

علامہ بوصیری (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک قصیدہ "قصیدہ بردہ" ہے جو انہوں نے نبی کریم ﷺ کی شان میں کہا ہے، اس میں ایک شعر ہے:

اَلنَّفْسُ كَالطِّفْلِ إِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلٰى
حُبِّ الرَّضَاعِ وَإِنْ تَفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے، اور دودھ پیتے بچے کا جب دودھ چھڑانے کا وقت آتا ہے تو اس کی ماں کو بڑی تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے۔ جب دودھ چھڑانے کے دن آتے ہیں تو وہ بچہ رات کو نہ خود سوتا ہے، نہ ماں کو سونے دیتا ہے؛ بلکہ پورے گھر کو سونے نہیں دیتا، اور ایسا طوفان مچاتا ہے اور چلاتا ہے کہ سب پریشان ہو جاتے ہیں۔ اب اس کے چلانے اور رونے کو دیکھ کر اس کی ماں یوں سوچے کہ: بیچارہ مر جائے گا اور اس پر رحم کھا کر دودھ پلا دے؛ تو پھر زندگی بھر اس کا دودھ نہیں چھوٹ سکے گا۔

نفس بھی بچہ کی طرح ہے

اب وہ بچہ کیوں چلاتا ہے؟ اس لیے کہ وہ یوں سمجھتا ہے کہ میری مرغوب چیز مجھ سے چھینی جارہی ہے، حالاں کہ اس کو معلوم نہیں ہے کہ دودھ چھڑا کر جب وہ غذا پر آئے گا تو دنیا میں ایسی غذائیں اور ایسی لذتیں اور ایسے ذائقے ہیں جن کا اس وقت اسے تصور بھی نہیں۔ ابھی تو صرف دودھ کا ذائقہ جانتا ہے، جب کھانا سیکھے گا تو ایسے ایسے ذائقے اس کو ملیں گے جن کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اسی طرح بد نظری بھی جب چھوڑیں گے تو روحانی طور پر ایسے ایسے ذائقے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے جائیں گے کہ آدمی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

بہر حال! علامہ بوصیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ نفس بچے کی طرح ہے، اگر تم اس کو مہلت اور ڈھیل دوگے تو وہ اسی دودھ میں جوان اور بڑا ہو جائے گا، اور ماں کا دودھ نہیں چھوڑے گا۔ لیکن اگر ہمت کر کے دودھ چھڑا دوگے تو چھوٹ جائے گا؛ البتہ کچھ دن ہمت اور ارادہ سے کام لینا پڑے گا اور اس میں تمہیں کچھ تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔

کنٹرول آسان ہو جائے گا

جیسے: خارش کا تقاضہ ہوتا ہے، تو آدمی یوں سمجھتا ہے کہ کھجالوں گا تو میرا معاملہ حل ہو جائے گا؛ لیکن ایسا نہیں ہے، اگر کھجالوگے تو یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہو جائے گا، اب اور کھجلاؤ اور کھجلاؤ، یہاں تک کہ

خون نکل رہا ہے، لیکن چین نہیں پڑتا۔ پہلی مرتبہ جب کھجانے کا تقاضہ پیدا ہو، اور دل میں بہت بے چینی ہو، اسی وقت صبر و تحمل سے کام لیا جائے اور طے کرلیا جائے کہ کچھ بھی ہو جائے مجھے نہیں کھجلانا؛ تو تھوڑی دیر تک تو بے چینی رہتی ہے، پھر وہ بے چینی دور ہو جاتی ہے، اس کے بعد دوسری مرتبہ تقاضہ اتنا زوردار نہیں ہوتا۔ اسی طرح آپ ہمت سے کام لیں گے تو دھیرے دھیرے نفس کے یہ تقاضے ختم ہو جائیں گے اور آپ آسانی سے اس پر کنٹرول کر سکو گے۔

روزانہ صبح میں اُٹھنا کیا آسان کام ہے؟

اور ہم یہ چیزیں دنیا کے ہر کام میں کرتے ہیں لیکن جب دین کی بات آتی ہے تو اس میں ہم پیچھے رہ جاتے ہیں۔ دنیا کے معاملات میں ہم تکلیفیں برداشت کرتے ہیں، مثلاً: صبح میں جا کر دکان کھولنا، نوکری اور ملازمت کے لیے "گجرات کوین" میں احمد آباد جاتے ہیں، یا "فلائنگ رانی" میں بمبئی جاتے ہیں۔ اب روزانہ صبح میں اس طرح اُٹھنا کیا آسان کام ہے؟ انہیں لوگوں کو اتوار کو دیکھ لو، گیارہ بجے تک تکیہ سے سر بھی نہیں اٹھائیں گے؛ لیکن روزانہ کیوں جاتے ہیں؟ اس لیے کہ تنخواہ ملے گی، پیسے ملیں گے، لہٰذا ان پیسوں اور تنخواہ نے سردی کے زمانہ میں صبح کے وقت جلدی اُٹھنا ان کے لیے آسان کر دیا۔

مصیبت کیوں سر لیتی ہے؟

ماں کو بچوں سے محبت ہوتی ہے، سردی کے زمانہ میں بچہ پیشاب کر دیتا ہے تو ماں رات کو اُٹھ کر پیشاب صاف کرتی ہے، اس لیے کہ اگر پیشاب ہی میں رہے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ماں رات میں اُٹھتی ہے اور اس کے کپڑے بدلتی ہے، بستر صاف کرتی ہے۔ اگر کسی عورت کو بچہ پیدا نہیں ہوتا تو وہ بچے کے لیے کیسی کیسی تدبیریں کرتی ہے؟ اگر کوئی اس سے کہے کہ تو فلاں کو نہیں دیکھتی کہ اس کا بچہ سردی کی راتوں میں اس کو سونے نہیں دیتا؛ تو یہ مصیبت کیوں سر لیتی ہے؟ تو وہ کہے گی کہ: کوئی بات نہیں، بچے کی محبت کے اندر میں یہ سب برداشت کرلوں گی؛ لیکن مجھے بچہ چاہیے۔

آخر کوئی مزہ تو آتا ہو گا

میں نے بطورِ مثال یہ ساری چیزیں اس لیے سمجھائیں کہ بھائی! ان گناہوں سے بچنے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو انعامات دیئے جائیں گے وہ بہت بڑے ہیں۔ اللہ والے رات رات بھر جاگ رہے ہیں اور عبادتیں کر رہے ہیں؛ تو آخر ان کو کوئی تو مزہ آتا ہو گا تب ہی تو کرتے ہیں! مزہ کے بغیر تو کوئی نہیں کرتا۔ اور پھر یہ دنیا کا مزہ تو ایسا ہے کہ دیکھنے میں مزہ ہے لیکن اس کے اندر بے چینی ہے، دل میں کوئی چین اور قرار نہیں، اے سی (A.C) میں پڑے ہوئے ہیں، گولیوں پر گولیاں کھا رہے ہیں، لیکن نیند نہیں آرہی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں اللہ تعالیٰ نے سکون رکھا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ

کی نعمت ہے، اور اس کی وجہ سے قلب کو جو ٹھنڈک اور اطمینان حاصل ہو گا؛ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی نعمت اور بڑے سے بڑا سرمایہ بھی نہیں کر سکتا۔ اس لیے اس سے تو انکار نہیں کہ یہ تکلیف کی چیز ہے، تب ہی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لذت بھی ملتی ہے۔ لذت ایسے ہی تھوڑے ملتی ہے؟ ہم قربانی دیں گے تو کچھ ملے گا۔ اب آگے اس سلسلہ میں کچھ روایات کو پیش کر رہے ہیں۔

ہر انسان کے لیے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے

حدیث ۱۶۲۲:-

وعن أبي هريرة -رضى الله عنه-: أنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: ((كُتِبَ عَلَى ابْنِ آدَمَ نَصِيبُهُ مِنَ الزِّنَا مُدْرِكُ ذَالِكَ لا مُحَالَةَ: العَيْنَانِ زِنَاهُمَا النَّظَرُ، وَالأُذُنَانِ زِنَاهُمَا الاسْتِمَاعُ، وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الكَلَامُ، وَاليَدُ زِنَاهَا البَطْشُ، وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الخُطَا، والقَلْبُ يَهْوَى وَيَتَمَنَّى، وَيُصَدِّقُ ذَلِكَ الفَرْجُ أَوْ يُكَذِّبُهُ)) (متفق عَلَيْهِ. هَذَا لفظ مسلمٍ، ورواية البخاري مختصرَةٌ.)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انسان پر اس کے زنا کا حصہ لکھ دیا گیا ہے جس کو وہ یقیناً پائے گا۔ آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے، کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا بات کرنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا ہے، پاؤں کا زنا چل کر جانا ہے، دل اس کی خواہش اور تمنا کرتا ہے، اور آدمی کی شرمگاہ ان سارے اعضاء کے اعمال کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

افادات:-اس روایت میں حضورِ اکرم ﷺ نے بتلایا ہے کہ زنا اس فعلِ مخصوص ہی کے لیے خاص نہیں کہ آدمی بدکاری کے طور پر وہی کام انجام دے، بلکہ زنا کے اور بھی درجات ہیں جو اس آخری درجہ تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں، اور یہ درجات ایسے ہیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس کے لیے ان میں سے کسی ایک میں مبتلا ہونا اور پھنسنا مقدر فرمایا ہے وہ اس سے سرزد ہو کر رہتا ہے۔

چناں چہ اجنبی عورتوں اور بے ریش لڑکوں کو دیکھنا؛ یہ آنکھ کا زنا ہے۔ آج اِس زمانہ میں تو نگاہ کے زنا کے مواقع اتنے زیادہ پیش آتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا متقی اور پرہیز گار آدمی بھی (ٹرین، بس، ہوائی جہاز کے سفر میں، یا سڑک پر چلتے ہوئے) اپنے آپ کو بچانا چاہے؛ تو کیسے بچائے گا ؟اِس وقت پوری دنیا کے جو حالات ہیں ان میں آدمی کتنی ہی احتیاط کیوں نہ کرلے، اس کے لیے اپنی نگاہوں کا بچانا مشکل ہو گیا ہے۔ اور چوں کہ انسان کے اعضاء میں سے ہر ایک عضو کا اس عمل میں اپنا اپنا حصہ ہے اس لیے اگر آدمی کی نظر کسی پر پڑ گئی تو وہ بد نظری کا شکار تو ہو ہی گیا، اب اگر آگے کے مراحل سے وہ بچ بھی گیا، تب بھی زنا کا اتنا حصہ تو اس کو مل ہی چکا ہے، اس لیے کہ اجنبی عورت کے دیکھنے کو نبیٔ کریم ﷺ نے آنکھ کے زنا سے تعبیر کیا ہے۔ گویا آنکھوں نے بد نظری کر کے اس نے اپنا حصہ تو حاصل کر ہی لیا۔

کانوں کا زنا نامحرم عورتوں کی باتیں اور گانے سننا ہے جو شہوات کو بھڑکانے والے ہوتے ہیں۔ گویا کان ان باتوں کو سن کر لذت اُٹھاتے ہیں، یہ بھی زنا ہی کا ایک حصہ ہوا۔ زبان کا زنا نامحرم عورتوں

کے ساتھ باتیں کرنا ہے۔ ہاتھ کا زنا نامحرم عورتوں کو چھونا اور پکڑنا ہے۔ پاؤں کا زنا نامحرم سے ملاقات کے لیے، اس کو دیکھنے کے لیے، اس سے بات چیت کرنے کے لیے، اس کو چھونے کے لیے اس کی طرف چلنا اور جانا ہے۔ اور دل اس چیز کی خواہش اور تمنا کرتا ہے۔ گویا اس عمل میں آدمی کا ہر ہر عضو اپنا کچھ نہ کچھ حصہ لگا ہی لیتا ہے۔

بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جاتی، نہ آنکھ کا زنا ہوا، نہ ہاتھ کا، نہ پاؤں کا، نہ زبان کا؛ لیکن دل میں خواہش پیدا ہو جاتی ہے، اور اس سے تو بہت ہی کم لوگ بچ پائیں گے، عام طور پر انسان کا اس میں تو ابتلاء ہو ہی جاتا ہے اسی لیے حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: زنا کا جو حصہ لکھا ہوا ہے وہ تو انسان لامحالہ پا کر ہی رہتا ہے۔ یعنی آدمی کو ایسے حالات سے واسطہ پڑ ہی جاتا ہے جس میں کبھی آنکھ کا بچانا مشکل، کبھی ہاتھ کا بچانا مشکل، کبھی پاؤں کا بچانا مشکل، کبھی زبان کی حفاظت مشکل ہو جاتی ہے۔ سارے ہی اعضاء ان آزمائشوں سے گزرتے ہیں۔

موفَّق مِنَ اللہ ہی بچ سکتے ہیں

"مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لَا مَحَالَةَ" کا خلاصہ صرف اتنا ہی ہے کہ ہر آدمی کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی تو ایسے حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی کیسا ہی متقی اور پرہیزگار کیوں نہ ہو، اس کو بھی ایسے مواقع پیش آتے ہی ہیں کہ نگاہ کا بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی ایسا موقعہ آجاتا ہے کہ نگاہ پڑ جاتی ہے، کبھی نامحرم کی

آواز کان میں پڑ جاتی ہے، کبھی اس سے بات کرنے یا سننے کی نوبت آجاتی ہے۔ اور کم سے کم دل میں خواہش اور تمنا تو پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تب ہی آدمی اپنے آپ کو بچا پاتا ہے۔ اللہ کے بہت کم بندے جو موفَّق مِنَ اللہ ہوتے ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق شاملِ حال ہوتی ہے، وہی عفت و عصمت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آپ کو بچالے جاتے ہیں، ورنہ ہر آدمی کبھی نہ کبھی ایسے حالات سے گزر کر ان میں مبتلا ہو ہی جاتا ہے۔

ان اعضاء کا زنا کب معاف ہو گا؟

البتہ ان سارے مراحل کا آخری درجہ شرمگاہ کا عمل ہے، وہ اس بات کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے کہ شروع کے مراحل زنا تھے یا نہیں۔ اولاً جب نگاہ پڑی تو اس کا حصہ آگیا، پھر بات چیت کرنے کی نوبت آئی تو زبان کا حصہ آگیا۔ اب اگر حالات نے ابتلاء فی الزنا کا موقعہ دیا پھر بھی وہ اللہ تعالیٰ کے ڈر اور اس کے سامنے جواب دہی کے تصور سے اپنے آپ پر کنٹرول کر گیا اور اپنے آپ کو زنا سے بچالے گیا؛ تو شروع کے مراحل کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف کر دیا جائے گا؛ لیکن یہ اسی وقت جبکہ زنا پر پوری قدرت ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بچائے۔ اور جس کی قدرت میں سوائے دیکھنے کے اور کچھ بھی نہ ہو، اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے، کیوں کہ اس کے لیے سوائے دیکھنے کے اور کوئی موقعہ ہی کہاں ہے۔

سرِ راہ بیٹھنے کی اجازت نہیں

حدیث ۱۶۲۳:-

وعن أبي سعيد الخُدريِّ - رضى الله عنه - عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((إيّاكُمْ والجُلُوس فِي الطُّرُقَاتِ!)) قالوا: يَا رسولَ الله، مَا لَنَا مِنْ مَجَالِسِنَا بُدٌّ، نَتَحَدَّثُ فِيهَا. فَقَالَ رسولُ الله -ﷺ-: ((فَإذَا أبَيْتُمْ إلاَّ المَجْلِسَ، فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ)) قَالُوا: وَمَا حَقُّ الطَّرِيقِ يَا رسولَ اللهِ؟ قَالَ: ((غَضُّ البَصَرِ، وَكَفُّ الأَذَى، وَرَدُّ السَّلاَمِ، والأمرُ بالمَعْرُوفِ، والنَّهيُ عنِ المُنْكَرِ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سرِ راہ بیٹھنے سے اپنے آپ کو بچاؤ (جہاں سے لوگوں کا گزر ہوتا ہے وہاں بیٹھنے کی جو جگہ بنائی جاتی ہے، جیسے: آج کل بینچیں رکھی جاتی ہیں، اوٹلے بنے ہوتے ہیں، یا جہاں سے عام طور پر مرد اور عورتیں گزرتی ہیں؛ ایسی جگہوں پر بیٹھنے سے بچو۔ اب حضراتِ صحابہ جن کے پاس گھروں کا معاملہ ایسا تھا جیسے آج کل جھونپڑپٹی میں ہوتا ہے، یعنی ان کے مکانات وسیع نہیں ہوا کرتے تھے، بلکہ لے دے کر ایک جھونپڑا سا ہوتا تھا جہاں گھر کے تمام افراد ساتھ ہی رہتے تھے، اور جب بھی آپس میں مل کر بیٹھنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو ان کے گھر سے باہر صحن ہوتا تھا جو سرِ راہ ہی ہوتا تھا، اسی کو وہ حضرات اپنی بیٹھک اور مجلس کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ گویا ان کے بیٹھنے کے لیے یہی جگہیں ہوتی تھیں، جیسے: آج کل دو چار کمروں کے وسیع مکانات ہوتے ہیں، جس میں ایک بیٹھک روم (Sitting Room) بھی ہوتا ہے جہاں ہماری مجلسیں ہوا کرتی ہیں؛ ان کے گھروں میں اس کی گنجائش کہاں ہوتی تھی؟ اگر ان حضرات کو بیٹھنا پڑتا تو گھر کے صحن اور آنگن ہی کو استعمال کرتے تھے۔ لہٰذا) حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ نے حضورِ اکرم ﷺ

کے اس ارشاد پر عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہماری بیٹھنے کی جگہیں یہی ہیں جو سرِ راہ ہیں (اور آپ سرِ راہ بیٹھنے سے منع فرماتے ہیں۔ اگر آپس میں اپنی ضروری گفتگو کرنے کے لیے بیٹھنا ہو تو ہمارے لیے اور جگہیں کہاں ہیں؟ گویا اپنی ضروری باتوں کو انجام دینے کے لیے وہیں بیٹھنا ضروری ہے) تو حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اگر سرِ راہ بیٹھنا تمہاری ضرورت میں داخل ہے، اور) جب تم بیٹھنا ہی چاہتے ہو تو راستہ کا حق ادا کرو۔ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ نے فوراً دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! راستہ کا حق کیا ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی نگاہوں کو نیچی رکھو (ایسا نہیں کہ وہاں بیٹھے تو جو بھی گزر رہا ہے وہ آپ کی نگاہوں سے بچ کر نہیں جاسکتا، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمہاری نگاہیں کسی نامحرم عورت پر پڑنے نہ پائیں۔ بد نگاہی سے بچو) اور ایذارسانی سے بچو (بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اوٹے پر بیٹھے ہیں اور کوئی گزر رہا ہے تو اس پر کوئی فقرہ چست کر دیا، ٹھٹھا اور مذاق کر دیا، کسی کی ہنسی کھیل کر دی، کسی کو چھیڑ دیا؛ اس طرح کی ایذارسانیوں سے خوب بچو) اور اگر گزرنے والا سلام کر رہا ہے تو اس کے سلام کا جواب دو۔ اور (جہاں ضرورت محسوس ہو وہاں) بھلی بات کا حکم کرو، کوئی برائی ہو رہی ہو تو اس سے روکو (یہ سب راستے کے حقوق ہیں، اگر یہ حقوق ادا کرسکتے ہو تب تو سرِ راہ بیٹھنے کی گنجائش ہے؛ ورنہ نہیں۔)

ایک اشکال اور اس کا جواب

افادات:- اب یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ حضورِ اکرم ﷺ نے جب منع فرمادیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف سے یہ گذارش کیوں کی جارہی ہے؟ اس کا جواب بعض حضراتِ علماء اور شرّاح نے یہ دیا ہے کہ گویا صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو امید تھی کہ ہماری طرف سے یہ گذارش کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور اکرم ﷺ کے ذریعہ کچھ آسانی ہو جائے گی۔

اور بعض حضرات اس کی توجیہ یہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہ سمجھے کہ اصلاً سرِ راہ بیٹھنا گناہ نہیں، لیکن وہ گناہ کا ذریعہ بنتا ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے منع فرمارہے ہیں۔ اب وہ اپنی گذارش سے گویا یہ بتلانا چاہتے تھے کہ یارسول اللہ! یہ تو ہماری ضروریات کا ایک حصہ ہے، اگر یہاں نہیں بیٹھیں گے تو اس صورت میں ہماری ضرورتیں پوری ہی نہیں ہوں گی۔

راستہ کا حق ادا کرو

"**راستہ کا حق ادا کرو**" جیسا کہ آج کل بس اسٹینڈ پر جگہیں بنی ہوتی ہیں، مثلاً: ایک آدمی سفر کرنا چاہتا ہے تو اس کو بس کے انتظار میں لا محالہ وہاں بیٹھنا ہی پڑے گا، وہ اپنے گھر میں بیٹھ کر تو بس کا انتظار نہیں کر سکتا۔ گویا یہ ایک ضرورت ہوئی۔ اب اگر وہاں کوئی آدمی یہ مسئلہ بتائے تو وہ کہے گا کہ: مولوی صاحب! بس میں جانے کے لیے بیٹھنا پڑے گا؛ تو اب کیا کریں؟ تو اس کا طریقہ بتلا دیا کہ اس صورت میں آپ کو راستہ کا حق ادا کرنا ہے۔

اور جیسا کہ میں پہلے بھی بتلا چکا ہوں کہ شریعت جب کسی کام سے منع کرتی ہے اور کسی چیز کو گناہ و ممنوع ٹھہراتی ہے تو اس کے قریبی اسباب و ذرائع پر بھی پابندی عائد کی کرتی ہے تاکہ ان تک پہنچنے کی

نوبت ہی نہ آئے؛ اسی کو سدِ ذرائع کہا جاتا ہے۔ یہاں بھی حضورِ اکرم ﷺ نے بد نگاہی سے بچنے کا جہاں حکم دیا وہیں بد نگاہی کے اسباب سے بھی روکا۔

ایسی بیٹھکوں کا حق یہ ہے

حدیث ۱۶۲۴ :-

وعن أَبي طلحة زيد بن سهل رضى الله عنه قَالَ: كُنَّا قُعُوداً بالأَفْنِيَةِ نَتَحَدَّثُ فِيهَا، فَجَاءَ رسولُ اللهِ ﷺ فَقَامَ عَلَيْنَا، فَقَالَ: ((مَا لَكُمْ وَلِمَجَالِسِ الصُّعُدَاتِ؟ اجْتَنِبُوا مَجَالِسَ الصُّعُدَاتِ)) فَقُلْنَا: إنَّمَا قَعَدْنَا لِغَيْرِ مَا بَأْسٍ، قَعَدْنَا نَتَذَاكَرُ، وَنَتَحَدَّثُ. قَالَ: ((إمَّا لاَ، فَأَدُّوا حَقَّهَا: غَضُّ البَصَرِ، وَرَدُّ السَّلاَمِ، وَحُسْنُ الكَلاَمِ)). (رواه مسلم)

((الصُّعُدات)) بضمِ الصاد والعين: أيْ الطُّرقَاتِ.

ترجمہ:- حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر آپس میں بات چیت کر رہے تھے، حضورِ اکرم ﷺ تشریف لائے اور کھڑے ہو گئے، پھر ارشاد فرمایا: تم لوگ اس طرح سرِ راہ بیٹھک جمائے ہوئے ہو؟ سرِ راہ کی ان بیٹھکوں سے بچو (یعنی راستہ کے کناروں پر اس طرح مت بیٹھو) صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم لوگ کسی غلط کام کے لیے نہیں بیٹھے ہیں، بلکہ اپنی ضرورت کی باتیں کر رہے ہیں اور آپس میں مذاکرہ کر رہے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر بیٹھنا ہی ہے (یعنی اس کے بغیر

چارۂ کار نہیں ہے) تو پھر اس کا حق ادا کرو (اور ان مجلسوں کا حق) نگاہوں کا نیچا رکھنا ہے، سلام کا جواب دینا ہے، اور اچھی بات کرنا ہے۔

اچانک کی نظر کا حکم

حدیث ۱۶۲۵ :-

وعن جریر -رضی اللہ عنہ- قَالَ: سألت رسول اللہ -ﷺ- عن نَظَرِ الفَجْأَةِ فقَالَ: ((إصْرِفْ بَصَرَكَ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے اچانک کی نظر کے متعلق سوال کیا (یعنی اگر غیر اختیاری طور پر، بلا ارادہ اور بلا قصد کسی نامحرم عورت پر نظر پڑ جائے؛ تو کیا حکم ہے؟) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: فوراً اپنی نظریں ہٹالو (اگر آپ نے جمائے رکھی؛ تو گناہ ہے)

افادات:- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی نظر بلا قصد اور غیر اختیاری طور پر کسی نامحرم پڑ جاتی ہے، یعنی اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ اس طرف کوئی نامحرم ہوگی، اور جیسے ہی اُدھر منہ کیا کہ کسی اجنبیہ پر نظر پڑ گئی؛ تو اس صورت میں کیا کیا جائے؟ اگر قصداً نظر ڈالی ہے تو اگرچہ نظر پڑتے ہی ہٹالو گے تب بھی گناہ ہے؛ لیکن اگر بلا قصد اور بلا ارادہ، غیر اختیاری طور پر نگاہ پڑ گئی؛ تو اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ فوراً نگاہ کو پھیر لو۔

ورنہ دل کا روگ بڑھتا ہی رہے گا

علامہ ابن قیم (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: اچانک کی نظر بھی اپنے اندر اثر رکھتی ہے، لیکن اگر آپ فوراً ہٹا لیں گے اور اس سے پیدا شدہ اثر کو دور کرنے کی فوری تدبیر بھی کریں گے؛ تو ان شاء اللہ وہ اثر دور ہو جائے گا۔ اور اگر آپ نے نظر جمائے رکھی، یا بار بار دیکھا؛ تو یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی پلانا۔ یعنی کسی پودے کو اگر ہم بار بار پانی دیتے رہیں تو جیسے اس کا نشو و نما ہوتا رہتا ہے، اسی طرح اگر بد نگاہی کے ذریعہ سے آپ پانی دیتے رہیں گے تو دل کے اندر کا روگ بڑھتا ہی رہے گا۔ اس کا علاج یہی ہے کہ فوراً اُدھر سے نظر ہٹا لی جائے، اور اس اثر کو دور کرنے کی تدبیر اختیار کی جائے۔

حلال طریقہ سے ضرورت پوری کیجئے

چناں چہ روایتوں میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے اس کی تدبیر یہ بتلائی ہے کہ کسی آدمی کی نظر غیر اختیاری طور پر کسی اجنبیہ عورت پر پڑ گئی اور اس کے نتیجہ میں دل میں خواہش پیدا ہوئی، شہوت کا تقاضا اُبھر آیا؛ تو اسے چاہیے کہ فوراً اپنی بیوی کے پاس جا کر اپنی حاجت پوری کر لے۔ اس لیے کہ اس کے پاس بھی وہی ہے جو اس کے پاس ہے۔ چوں کہ دل میں شہوت کے جو تقاضے اُبھرے ہیں وہ اپنا اثر دکھلا کر ہی رہیں گے، ان کے نقصان سے بچنے کے لیے نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو ایک تدبیر بتلائی ہے کہ جب آپ کی بیوی موجود ہے تو آپ حلال طریقہ سے اپنی ضرورت پوری کر لیجیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ

بلکہ مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ حضرت زینب رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے، اس وقت وہ ایک خوشبو بنارہی تھیں، ان کے پاس کچھ عورتیں بھی بیٹھی ہوئی تھیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو آتا ہوا دیکھ کر وہ عورتیں وہاں سے ہٹ گئیں اور آپ کو خلوت کا موقعہ دیدیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ضرورت پوری فرمائی، اس کے بعد باہر تشریف لا کر آپ نے ارشاد فرمایا: عورت جب سامنے آتی ہے تو شیطان کی صورت میں سامنے آتی ہے، یعنی ورغلانے والا انداز ہوتا ہے، پس جب تم میں سے کوئی کسی عورت کو دیکھے اور وہ اس کو پسند آجائے تو چاہیے کہ اپنی بیوی کے پاس آئے یعنی اس سے صحبت کرلے، ایسا کرنے سے وہ خیال دل سے نکل جاوے گا۔ یعنی جب بیوی سے صحبت کرے گا اور منی کا برتن خالی ہو جائے گا تو ذہن اس عورت کی طرف سے ہٹ جائے گا (۱)۔ (مسلم شریف، کتاب النکاح، باب دوم)

(۱) **سوال:۔** نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے، پھر نظر پڑنے سے یہ کیفیت کیوں پیدا ہوئی؟

جواب:۔ ایسا تشریع (قانون سازی) کے پیشِ نظر ہوا تھا، انبیاء جو قانون بناتے ہیں وہ ذوقی ہوتے ہیں، وہ فکری قانون نہیں بناتے، اور اسی وجہ سے فرشتوں کو رسول نہیں بنایا گیا، کیوں کہ اگر فرشتے رسول بن کر آتے تو وہ لوگوں کے لیے غور وفکر کی بنیاد پر قانون بناتے، وہ ذوق کی بنیاد پر قانون نہیں بناسکتے تھے، کیوں کہ ان میں وہ جذبات نہیں جو انسان میں ہیں۔ اور جب نبی انسان ہوتا ہے تو اس پر تمام احوال گزرتے ہیں کیوں کہ وہ بشر ہوتا ہے، چناں چہ ایک بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ کیفیت پیش آئی تا کہ اس کی اہمیت کا اندازہ ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا علاج تجویز فرما سکیں۔ اس کی نظیر یہ ہے کہ انبیاء کبھی بیانِ جواز کے لیے خلافِ اَولیٰ کام بھی کرتے ہیں اور وہ نبی کے حق میں خلافِ اَولیٰ نہیں ہوتے، کیوں کہ وہ تشریع کے لیے ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس کیفیت کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر گزرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں برا نہیں تھا بلکہ ضروری تھا کیوں کہ تشریع اس پر موقوف تھی۔ (تحفۃ الالمعی ۳/۵۹۹)

جسمانی وروحانی بربادی

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ یہ چیز ایسی نہیں کہ اس کی طرف سے غفلت برتی جائے آج کل تو قصداً دیکھ دیکھ کر اپنی شہوات اور جذبات کو اُبھارا جاتا ہے، جس کی وجہ سے حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ یا تو گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے، یا شہوانی جذبات کو ٹھنڈا کرنے اور ان کی تسکین کے لیے حرام طریقے اختیار کیے جاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں آدمی اپنے آپ کو ہلاک اور برباد کر کے رہ جاتا ہے۔ گویا دینی اعتبار سے بھی بربادی ہوتی ہے اور جسمانی اور صحت کے اعتبار سے بھی اپنے آپ کو برباد کرلیتا ہے۔ لہٰذا ان تدبیروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

نظر کی حفاظت عورتوں کے لیے بھی ضروری

حدیث ۱۶۲۶:-

وعن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِیَ اللہُ عنہا قالت: کنتُ عِنْدَ رسول الله ﷺ ، وعندہُ مَیْمُونَۃ. فَأَقْبَلَ ابنُ أُمِّ مَکْتُومٍ، وَذَلِكَ بَعْدَ أنْ أُمِرْنَا بِالْحِجَابِ. فَقَالَ النبيُّ ﷺ : ((احْتَجِبَا مِنْهُ)) فَقُلْنَا: یَا رسولَ اللهِ! أَلَیْسَ هُوَ أَعْمَى، لَا یُبْصِرُنَا وَلَا یَعْرِفُنَا؟ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ : أَفَعَمْیَاوَانِ أَنْتُمَا، أَلَسْتُمَا تُبْصِرَانِهِ!؟. (رواہ ابو داود، والترمذی، وقال: ((حدیث حسن صحیح))

ترجمہ:–اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھی، اس وقت آپ کے پاس حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں (دونوں ازواجِ مطہرات ہیں) اسی دوران حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم تشریف لائے (یہ ایک نابینا صحابی تھے، مہاجرین میں سے تھے اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے) پردے کا حکم نازل ہو چکا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن اُم مکتوم رضی اللہ عنہ کو آتا ہوا دیکھ کر ان دونوں سے کہا: تم دونوں پردے میں چلی جاؤ، ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو اندھے ہیں، نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں، نہ ہمیں پہچان سکتے ہیں (پردہ کرنا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟) حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا تم دونوں بھی اندھی ہو؛ تم ان کو دیکھ نہیں سکتیں؟

افادات:–معلوم ہوا کہ جس طرح نظر کی حفاظت مردوں کے لیے ضروری ہے، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

ایک دوسرے کے ستر کو نہ دیکھو؛ اور ایک ہی چادر میں نہ لیٹو

حدیث ۱۶۲۷:-

وعن أبي سعيد - رضي الله عنه -: أنَّ رسول الله صلى الله عليه وسلم قَالَ: لاَيَنْظُرُ الرَّجُلُ إِلَى عَوْرَةِ الرَّجُلِ، وَلاَ الْمَرْأَةُ إِلَى عَوْرَةِ الْمَرْأَةِ وَلاَ يُفْضِي الرَّجُلُ إِلَى الرَّجُلِ فِى ثَوْبٍ وَاحِدٍ، وَلاَ تُفْضِي الْمَرْأَةُ إِلَى الْمَرْأَةِ فِى الثَّوْبِ الْوَاحِدِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی مرد کسی مرد کے ستر کو نہ دیکھے، اور نہ کوئی عورت کسی عورت کے ستر کو دیکھے۔ اور کوئی مرد ایک کپڑے میں دوسرے مرد کے ساتھ نہ لیٹے، اور کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ برہنہ حالت میں نہ لیٹے۔

افادات:- یعنی ایک چادر اوڑھ کر دونوں اس طرح لیٹیں کہ بدن برہنہ ہو، یہ چیز آدمی کو گناہ میں مبتلا کرنے والی ہے۔

دعا

سبحانك اللّٰهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالىٰ جدك ولا إله غيرك. اللّٰهم صلّ وسلّم وبارك على سيّدنا محمّد وعلىٰ آل سيدنا محمّد كما تحب وترضىٰ بعدد ما تحب وترضىٰ. ربنا ظلمنا أنفسنا وإن لم تغفرلنا وترحمنا لنكونن من الخاسرين

اے اللہ! نگاہوں کی پاکیزگی ہمیں عطا فرما، اے اللہ! اس بد نگاہی نے ہمارے دین کا ستیاناس کر رکھا ہے، اے اللہ! اس بیماری سے ہم کو پورے طور پر پاک اور صاف فرمادے۔ نجات عطا فرمادے۔ اس سے بچنا ہمارے لیے آسان کردے۔ اے اللہ! اس کے نقصان کو ہمارے سامنے ایسا واضح کردے کہ اس سے ہمیں نفرت ہو جائے۔ اے اللہ! اپنے حبیبِ پاک ﷺ کے ارشادات کو اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنانے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! ہمارے بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔ مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ پریشان حالوں کی پریشانیوں کو

دور فرما۔ قید و بند میں محبوسوں کو رہائی نصیب فرما۔ مقدمات میں ماخوذوں کو بری فرما۔ جو جس مصیبت میں گرفتار ہے اے اللہ! اس سے نجات عطا فرما۔ اے اللہ! اس مجلس میں تیرے جتنے بھی بندے موجود ہیں تمام کی جائز مرادوں کو پورا فرما۔ اے اللہ! حضورِ پاک ﷺ نے جتنی بھی خیر اور بھلائی آپ سے مانگی، ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما۔ اور جن شرور و برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری امت کی حفاظت فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ وَتُبۡ عَلَيۡنَا اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ وصلى الله تعالىٰ على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وآله وأصحابه أجمعين برحمتك يا أرحم الراحمين

باب تحریم الخلوۃ بالأجنبیۃ

اجنبیہ کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا حرام ہے

ایک مکان جہاں اجنبی عورت ہو، تو کوئی اجنبی مرد اس کے ساتھ تنہائی کے اندر نہ ملے، اس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بڑی تاکید سے منع فرمایا ہے۔

چناں چہ یہاں سورۂ احزاب کی وہ آیت پیش کی ہے جو پردہ کے سلسلے میں نازل ہوئی: ﴿وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ﴾ جس میں حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ حکم دیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات سے کوئی سامان لینے کی ضرورت ہو، تو سامنے جا کر نہ لیں؛ بلکہ پردے کی آڑ میں سے لیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ گھر میں سے کوئی برتن لینا ہوتا ہے، یا ضرورت کی کوئی چیز مانگنی پڑتی ہے، جیسے: دودھ کے لیے برتن مانگنا پڑا، اور گھر میں مرد موجود نہیں ہوتا، اس لیے عورتوں سے یہ چیز حاصل کرنے کی نوبت آتی ہے، ایسے مواقع پر دونوں اس طرح آمنے سامنے ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں؛ اس کی اجازت نہیں ہے۔

یہ چیز دلوں کو پاک رکھنے والی ہے

یہاں حضراتِ مفسرین لکھتے ہیں کہ: یہ حکم اس جماعت کو دیا جارہا ہے جو امتِ محمدیہ میں سب سے زیادہ پاکباز جماعت (یعنی حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی) ہے، اور جن کے متعلق حکم دیا جارہا ہے وہ نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی ازواجِ مطہرات ہیں جو امت کی مائیں ہیں، جن سے زیادہ پاکباز عورتیں اور کہیں نہیں مل سکتیں۔ اس سے اس حکم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

آج کل لوگ کہتے ہیں کہ اس طرح آمنا سامنا ہونے میں کیا اشکال ہے، جبکہ ہمارا دل تو پاک ہے، ہمارے دل میں کوئی میل نہیں ہے؛ تو نعوذ باللہ یہاں جو حکم دیا جارہا ہے؛ کیا وہ مہمل ہے؟ حالاں کہ اس حکم کا فائدہ اسی آیت میں بتلایا جارہا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، باری تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ذٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِهِنَّ﴾ یہ چیز تمہارے دلوں اور ان کے دلوں کو پاک رکھنے والی ہے۔ کسی مرد کے سامنے کوئی اجنبی عورت آئے اور دل میں وسوسہ نہ آئے؛ یہ ناممکن ہے۔ کیسا ہی پاکباز آدمی کیوں نہ ہو، دل کے وسوسہ سے تو وہ بچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے یہاں اس کا خاص اہتمام کرایا گیا کہ اگر کوئی چیز لینے کی ضرورت پیش آئے تب بھی پردے کی آڑ میں سے لی جائے۔ جب اس کا حکم دیا گیا تو تنہائی میں ملنے کی اجازت کہاں دی جائے گی؟

دیور تو موت ہے

حدیث ۱۶۲۸ :-

وعن عقبة بن عامر رضی الله عنه:أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((إِيَّاكُمْ وَالدُّخُولَ عَلَى النِّسَاءِ!)) فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ الأَنْصَارِ: أَفَرَأَيْتَ الحَمْوَ؟ قَالَ: ((الحَمْوُ المَوْتُ!)). (متفق عَلَيهِ)

((الحَمْو)): قَرِيبُ الزَّوْجِ كَأَخِيهِ، وابْنِ أخِيهِ، وَابْنِ عَمِّهِ.

ترجمہ:-حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اجنبی عورتوں کے پاس تنہائی میں جانے سے بچو۔ ایک انصاری صحابی نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دیور (شوہر کے بھائی) کے متعلق کیا فرماتے ہیں؟ (اس سے بھی تنہائی میں ملنے سے بچنا ضروری ہے؟) حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دیور تو موت ہے۔ (یعنی ان سے بچنا تو ایسا ضروری ہے جیسے موت سے بچا جاتا ہے)

"الحَمْو": یعنی شوہر کے رشتہ دار، شوہر کا بڑا یا چھوٹا بھائی، بھتیجا، یا چچازاد بھائی وغیرہ مراد ہے۔

افادات:-روایت میں ہے کہ اگر اس عورت کا محرم وہاں موجود ہو تو گھر میں داخل ہو سکتے ہیں، لیکن گھر میں محرم نہ ہو، وہ عورت گھر میں تنہا ہو؛ تو اس صورت میں شریعت اجازت نہیں دیتی کہ کوئی مرد اس گھر میں داخل ہو۔

جنید و رابعہ بھی تنہائی اختیار نہ کریں

حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے وعظ میں ایک واقعہ ہے کہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے عورتوں کے پردہ کے سلسلہ میں احتیاط نہیں کرتے تھے، بلکہ بے پردہ عورتوں کو اپنے سامنے آنے کی اجازت دیتے تھے، اور یوں سمجھتے تھے کہ میں عمر کی جس منزل کے اندر رہوں وہاں بدکاری کے گناہ میں مبتلا ہونے کا سوال ہی نہیں دوسرے بزرگ نے ان کو منع کیا کہ شریعت کی طرف سے ہر حال میں پردے کا حکم ہے چاہے تمہاری طبیعت میں اس کا تقاضا باقی رہا ہو، یا نہ رہا ہو۔ یعنی کوئی بوڑھا آدمی یہ نہ سمجھے کہ میں تو عمر کی جس منزل میں پہنچ چکا ہوں وہاں اس کا کوئی امکان نہیں رہا، اس لیے حکم میں تبدیلی آگئی۔ ان بزرگ نے -جو احتیاط نہیں کرتے تھے- نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کو خواب میں دیکھا اور حضور سے یہی مسئلہ دریافت کرتے ہوئے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میں عمر کی جس منزل میں ہوں اس میں مجھے اپنے متعلق یہ اندیشہ نہیں ہے؛ لہٰذا عورتوں کو اپنے پاس بے پردہ آنے دینے میں کوئی حرج تو نہیں؟ حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: مرد اگر اتنا بزرگ ہو جائے جیسے جنید بغدادی، اور عورت اگر اتنی بزرگ ہو جائے جیسے رابعہ بصریہ، اور وہ دونوں کسی مکان کے اندر تنہا ہوں گے؛ تو وہاں تیسرا شیطان ہوگا اور وہ ان دونوں سے کچھ نہ کچھ کروا ہی دے گا۔

اس لیے عورتوں کے ساتھ تنہائی سے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا بہت ضروری ہے، ورنہ آدمی اپنے آپ کو گناہ سے نہیں بچا سکتا۔ ایسے اسباب ہی کیوں اختیار کئے جائیں

،اور آدمی اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ہی کیوں ڈالے؛ جس کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہونے کی نوبت آجائے؟

گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے

”دیور تو موت ہے“ یعنی دیور، اور شوہر کے دوسرے رشتہ دار، جیسے: شوہر کا بڑا یا چھوٹا بھائی، اس کے چچازاد بھائی یا بھتیجے وغیرہ کے ساتھ تنہائی کی نوبت آئے، اس سے بچنا ایسا ہی ضروری ہے جیسے موت سے بچا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ سب تو گھر کے لوگ ہیں۔ دوسرے لوگوں کے لیے تنہائی اختیار کرنا آسان کام نہیں ہوتا، اس لیے کہ جب لوگ دیکھیں گے تو پوچھیں گے کہ اس کے گھر میں کیوں گیا تھا ؟لیکن یہ سب گھر کے افراد ہونے کی وجہ سے ان کے متعلق کوئی ایسا سوچے گا بھی نہیں۔ اور عام طور پر ان لوگوں کا گھر میں آنا جانا رہتا ہے، لہٰذا خدا نہ کرے اگر کوئی ایسی ویسی بات پیش آگئی تو ”گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے“ جیسا مسئلہ ہو جائے گا۔ ان سے جتنا زیادہ خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں جو برائی پیدا ہو گی وہ ایسی ہو گی جو رُکنے کا نام نہ لے گی۔ اور آج کل تو ایسی بے شمار شکایتیں آتی رہتی ہیں۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس سے بچنے کی بڑی تاکید فرمائی۔

ہماری جہالت، معاشرہ کی ہلاکت

آج کل ہمارا معاشرہ بے پردگی کا اتنا زیادہ شکار ہو چکا ہے کہ اگر کوئی بیچاری دیندار لڑکی کسی کے گھر میں بہو بن کر جاتی ہے، اور وہ اپنے شوہر کے بھائی سے پردہ کرتی ہے، تو ساس اس سے ناراض ہو جاتی ہے، اور اس کو طعن و تشنیع کرتی ہے، اور اس سے جھگڑتی ہے۔ ساس کہتی ہے کہ: اچھا! اب تو میرے ہی بیٹوں سے پردہ کرے گی؟! انہی سے تجھے خطرہ لگتا ہے؟ نعوذ باللہ۔! اللہ کے رسول ﷺ جس کے متعلق یہ فرماتے ہیں کہ دیور (شوہر کا بھائی) موت کا درجہ رکھتا ہے، اور اس سے بچنے کو ضروری قرار دیتے ہیں، اور ایک عورت اسی ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اس سے بچنے کا اہتمام کرتی ہے؛ تو اُسے مطعون کیا جاتا ہے۔ پھر اس کی وجہ سے ساس اپنی بہو کی دشمن بن جاتی ہے اور اس کو مختلف طریقوں سے پریشان کرتی ہے۔ بلکہ بعض جگہوں کے متعلق تو یہاں تک سننے میں آیا کہ وہ اپنے بیٹے سے کہتی ہے کہ اس کو طلاق دے کر الگ کردو۔ ہماری یہ جہالت معاشرے کو کہاں تک پہنچانے والی ہے! اس لیے ان چیزوں سے واقفیت اور اپنے گھر والوں کو ایسے مسائل سے واقف کرنا بے انتہاء ضروری ہے۔

کوئی کسی نامحرم سے تنہائی میں نہ ملے

حدیث ۱۶۲۹:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما أنَّ رسولَ اللہ ﷺ قَالَ: ((لَا يَخْلُوَنَّ أَحدُكُمْ بِامْرَأَةٍ إلَّا مَعَ ذِي مَحْرَمٍ))۔ متفق عَلَيْهِ.

ترجمہ:–حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں نہ رہے؛ مگر یہ کہ اس کا محرم وہاں موجود ہو۔

افادات:–اگر اس کا شوہر ہی وہاں موجود ہے تب تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کا باپ، بھائی، بھتیجا وغیرہ کوئی نہ کوئی محرم وہاں موجود ہو؛ تب ہی اس سے ملے، اور بات چیت کرے۔ اس کے بغیر کوئی آدمی تنہائی میں کسی عورت کے ساتھ نہ رہے۔

اللہ کی راہ میں نکلنے والوں کی بیویوں کی حرمت

حدیث ۱۶۳۰:-

وعن بُرَيدَةَ - رضى الله عنه - قَالَ: قَالَ رسولُ الله - ﷺ -: ((حُرْمَةُ نِسَاءِ المُجَاهِدِينَ عَلَى القَاعِدِينَ كَحُرْمَةِ أُمَّهَاتِهِمْ. مَا مِنْ رَجُلٍ مِنَ القَاعِدِيْنَ يَخْلُفُ رَجُلاً مِنَ المُجَاهِدِينَ فى أَهْلِهِ، فَيَخُونُهُ فِيهِمْ إلاَّ وَقَفَ لَهُ يَوْمَ القِيَامَةِ، فَيَأْخُذُ مِنْ حَسَنَاتِهِ مَا شَاءَ حَتَّى يَرْضى)) ثُمَّ التَفَتَ إلَيْنَا رسولُ اللهِ ﷺ فَقَالَ: ((مَا ظَنُّكُمْ ؟)). (رواه مسلم)

ترجمہ:–حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مجاہدین کی عورتوں کی حرمت ان لوگوں پر جو گھروں میں ہیں؛ اپنی ماؤں کی حرمت کی طرح ہے۔ جو لوگ گھروں پر ہیں اور جہاد میں جانے والے کسی آدمی کے گھر والوں کی ضرورتیں پوری کرنے اس کے گھر پر جاتے ہیں، پھر اسی بنیاد پر (آنکھ لڑ گئی، اور غلط

تعلق قائم کر کے)خیانت کے مرتکب ہو جاتے ہیں، ان کو قیامت کے دن کھڑا کیا جائے گا(اور جو اللہ کے راستہ میں گیا تھا اس سے)کہا جائے گا کہ: تو اس کی نیکیوں میں سے جتنی نیکیاں چاہے لے لے؛ یہاں تک کہ تیرا جی خوش ہو جائے۔ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: یہ ارشاد فرما کر حضور اکرم ﷺ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے؟ (یعنی کیا وہ کسی طرح کی بھی کمی پر راضی ہو گا؟)۔

افادات:- جو لوگ دین کی نسبت پر کہیں سفر پر جاتے ہیں، جیسے: تبلیغی جماعت میں نکلتے ہیں، یا جہاد میں جاتے ہیں، اور عام طور پر اس زمانہ میں جہاد ہی کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے کہ گھر میں مرد نہیں ہوتا، اور جانے والا- بھی یہ سمجھ کر کہ امانت داری سے دوستی کا حق ادا کرے گا- خود ہی کہہ جاتا ہے کہ میرے گھر کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، اگر کچھ بازار لا کر دینا ہو، یا باہر سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو پوری کر دینا، اور اسی نسبت پر اس کے گھر کسی کا آنا جانا ہو؛ تو ایسے آدمی کو چاہیے کہ جس طرح اپنی ماں کی عزت و آبرو اور حرمت کا لحاظ کرتا ہے، اسی طرح سفر میں جانے والوں کی عورتوں کی حرمت کا لحاظ کرے۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے سامنے بہت ساری دولت رکھی جائے اور وہ بھی ایسے موقعہ پر جبکہ ہمیں اس کی سخت احتیاج ہو، اور پھر کہا جائے کہ اس میں سے جتنا چاہو لے لو؛ تو ہم اس میں سے کچھ بھی چھوڑیں گے؟ کچھ بھی نہیں چھوڑیں گے، بلکہ سب ہی لے لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی کوئی نیکی نہیں چھوڑے گا۔

باب تحریم تشبہ الرجال بالنساء والنساء بالرجال

فی لباس وحرکۃ وغیر ذٰلك

مردوں کا عورتوں کے ساتھ اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ لباس، حرکت وسکون اور دوسری تمام چیزوں میں مشابہت اختیار کرنا حرام ہے

ایک نیا عنوان قائم کیا ہے کہ عورت اگر کوئی ایسا لباس پہننے لگ جائے جو مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، یا جو طور وطریق اور اندازو وضع قطع مردوں کی ہے اسی کو اختیار کرنے لگ جائے۔ اسی طرح جو وضع قطع، لباس اور جو طور وطریق وانداز عورتوں کا ہے وہ مرد اختیار کرنے لگے؛ تو شریعت اس کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں دیتی، اور یہ حرام ہے۔

ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے، اور ایک باطن

در اصل ہر چیز کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک باطن ہوتا ہے۔ اس کی ظاہری شکل و صورت اور ظاہری جسم ہوتا ہے، اور ایک اس کی اندرونی حقیقت ہوتی ہے جو اس کی جان اور روح کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ان ہی دو چیزوں کے مجموعہ سے وہ چیز وجود میں آتی ہے۔ صرف ظاہری جسم ہو تب بھی وہ بے کار ہے، جیسے: انسان میں اگر جسم ہی جسم ہو، اور روح نہ ہو؛ تو وہ بے کار ہے۔ ہر چیز میں یہی فلسفہ

ہے۔ مثلاً: آم کی ایک شکل و صورت ہے اور ایک اس کی حقیقت یعنی اس کا ذائقہ ہے جو مخفی ہوتا ہے جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح خربوزہ کی بھی ایک ظاہری شکل و صورت ہوتی ہے، اور ایک اس کی مخفی حقیقت یعنی اس کا ذائقہ ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی آدمی خربوزہ کی حقیقت حاصل کرنا چاہے تو آم نہیں خریدے گا، بلکہ خربوزہ کی جو مخصوص شکل وصورت ہے اسی کو خریدے گا، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ میں جس حقیقت کا طلب گار ہوں وہ مجھے اسی میں ملے گی۔ اسی طرح جو آدمی آم کی حقیقت، اور آم کا ذائقہ و ٹیسٹ حاصل کرنا چاہتا ہے، تو وہ امرود نہیں خریدے گا، بلکہ آم کی شکل وصورت کو حاصل کرے گا، اس لیے کہ اسی کے ذریعہ سے اس کو یہ چیز حاصل ہوگی۔

ہر جنس کے مقاصد وفوائد الگ الگ

اللہ تعالیٰ نے تمام جانداروں کو بنایا، ان میں حضرت انسان بھی ہیں، اور انسانوں میں بھی جنس مختلف ہے۔ مرد الگ جنس ہے، اللہ تعالیٰ نے جن مقاصد کے لیے مردوں کو بنایا ہے وہ الگ ہیں اور اس کے فوائد بھی الگ ہیں۔ اور عورتوں کو جس مقصد کے لیے بنایا ہے وہ الگ ہے۔ لہٰذا مرد کی حقیقت مرد ہی کی شکل وصورت میں پائی جائے گی۔ اور عورتوں کی حقیقت عورت ہی کی شکل وصورت میں پائی جائے گی۔ عورت کی حقیقت کو اگر آپ مردانہ شکل وصورت میں ڈھونڈھیں گے تو نہیں ملے گی۔ اسی لیے شریعت یہ چاہتی ہے کہ ہر ایک کی شکل وصورت الگ ہو، اور اس کے امتیازات جن کے ذریعہ

وہ دوسری جنس سے الگ پڑ جاتی ہے وہ بھی جدا ہی رہیں۔ جیسے: آم کی ایک شکل و صورت ہے جس کے ذریعہ وہ امرود سے الگ پڑ جاتا ہے۔ امرود کو دیکھ کر آپ خود ہی کہہ دیں گے کہ یہ امرود ہے، کوئی آپ کو امرود بتا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ آم ہے، یا آم بتا کر یہ نہیں کہہ سکتا کہ امرود ہے۔ گویا آپ اس کی باتوں سے دھوکہ نہیں کھائیں گے۔ اسی طرح ہر ہر چیز کے کچھ ظاہری امتیازات ہوتے ہیں، اور اس کی حقیقت اسی میں پائی جاتی ہے جس کو کسی بھی حال میں بدلا نہیں جاسکتا۔

شریعت نے بھی ان چیزوں کا لحاظ کیا ہے۔ ایک مسلمان کے لیے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ظاہری شکل و صورت بھی بتلائی ہے کہ اس کو کس طرح کا لباس اختیار کرنا چاہیے، کس طرح کے بال رکھنے چاہیے، لباس کی تراش و خراش اور وضع قطع کس طرح کی اختیار کرنی چاہیے، اس کا اُٹھنا بیٹھنا کس انداز کا ہونا چاہیے؛ تاکہ وہ کفار و فساق سے ممتاز ہو جائے۔

اس کا لحاظ دنیوی چیزوں میں بھی کیا جاتا ہے

دنیوی اعتبار سے مکانوں تک میں اس چیز کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ہوٹل کی شکل و صورت الگ ہوتی ہے۔ اسکول کی شکل و صورت الگ ہوتی ہے۔ آدمی دیکھ کر ہی کہہ دیتا ہے کہ یہ اسکول کی عمارت ہے، اس کے اندر کی حقیقت الگ ہے، اور اسکول والی حقیقت اسکول کی شکل و صورت والی عمارت ہی

میں پائی جائے گی۔ اگر کوئی آدمی اسکول کو ہوٹل جیسی بنادے تو لوگ کہیں گے کہ یہ کیا کیا؟ ہوٹل بنایا ہے، یا اسکول؟ اور اس کا یہ طرز اعتراض کا نشانہ بن جاتا ہے۔

مسجد کی شکل وصورت الگ ہوتی ہے اور مندر کی الگ ہوتی ہے، اگر کوئی آدمی مسجد کی شکل وصورت ایسی بنائے جو مندر کی ہوتی ہے، یا مندر کی شکل وصورت مسجد جیسی بنادے؛ تو اس کو قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی شرعی اعتبار سے کچھ احکام ایسے دئے ہیں جن میں اس طرح کے اختلاط کو ممنوع قرار دیا ہے، اور ہر ایک کو اپنی خصوصیتوں کو ممتاز رکھنے کا حکم دیا ہے۔ چناں چہ روایت لائے ہیں:

مشابہت اختیار کرنے والے مرد وعورت پر لعنت

حدیث ۱۶۳۱ :-

عن ابن عباس رضی الله عنهما، قَالَ: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُخَنَّثِينَ مِنَ الرِّجَالِ، وَالْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ.

وفی رواية: لَعَنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ، وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ایسے مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کی مشابہت اختیار کریں۔ اور ان عورتوں پر بھی لعنت فرمائی ہے جو مردوں کی مشابہت اختیار کریں۔

افادات:– یعنی مرد ہو کر عورتوں جیسا لباس پہنیں، مرد ہو کر عورتوں جیسے بال رکھیں، مرد ہو کر عورتوں جیسی چال ڈھال بنائیں، مرد ہو کر بولنے کا انداز ایسا بنائیں جیسا کہ عورتوں کا ہوتا ہے۔ اور عورت ہوتے ہوئے مردوں جیسا لباس پہنیں، عورت ہوتے ہوئے مردوں جیسی چال ڈھال بنائیں، عورت ہوتے ہوئے ان کا بولنا مردوں کے انداز کا ہو۔ وہی سارے طور طریقے اختیار کریں جو مردوں کے ہوتے ہیں؛ ان سب پر لعنت ہے۔

عجیب وغریب دھوکہ

آج کل لباس کے معاملہ میں ایک وبا چل پڑی ہے کہ مرد اور عورت کا کوئی امتیاز ہی باقی نہ رہے۔ بعض مرتبہ آدمی عجیب وغریب دھوکہ کھا جاتا ہے۔

ہمارے ایک ساتھی امریکہ سے آئے تھے، انہوں نے اپنا ایک قصہ سنایا کہ: ایک مرتبہ وہ دعوت وتبلیغ کے ساتھیوں کے ساتھ ملاقات کے لیے ایک مکان پر گئے تو ایک نوجوان سے ملاقات ہوئی، وہاں بیٹھے اور ایک گھنٹہ تک اس سے بات چیت ہوتی رہی، اس کو دین سمجھایا، جب رخصت ہونے کے لیے اُٹھے تو وہ بھی کھڑا ہوا؛ تب پتہ چلا کہ جس سے بات ہو رہی تھی وہ تو لڑکی ہے۔ یعنی اتنی دیر تک بیٹھ کر بات چیت کی تب بھی اندازہ نہیں ہوا۔ یقیناً آج کل لڑکیوں اور لڑکوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

قابلِ لعنت مرد وعورت

حدیث ۱۶۳۲ :-

وعن أبي هريرة - رضی الله عنه - قَالَ: لَعَنَ رسُولُ الله ﷺ الرَّجُلَ يَلْبَسُ لِبْسَةَ المَرْأَةِ والمَرْأَةَ تَلْبِسُ لِبْسَةَ الرَّجُلِ. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے لعنت فرمائی اس مرد پر جو عورتوں جیسا لباس پہنے، اور اس عورت پر جو مردوں جیسا لباس پہنے۔

افادات:- بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو مردوں اور عورتوں میں مشترک ہوا کرتی ہیں؛ اس میں تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، جیسے: اوڑھنے کی چادر اور دوسری استعمال کی بعض چیزیں جو مردوں یا عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں سمجھی جاتیں، اس میں اگر دونوں میں کوئی فرق نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ ہاں! جو چیزیں مردوں کے اعتبار سے الگ ہوتی ہیں اور عورتوں کے اعتبار سے الگ ہوتی ہیں، سب لوگ ہی جانتے ہیں کہ یہ زنانہ (Ladies) ہیں، اور یہ مردانہ (Gants) ہیں؛ ان میں اگر کوئی آدمی خلط ملط کرنا چاہے، تو اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اور یہ چیز قابلِ لعنت ہے۔

جہنمیوں کی دو قسمیں

حدیث ۱۶۳۳ :-

وعنه قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ صِنْفَانِ مِنْ أَهْلِ النَّارِ لَمْ أَرَهُمَا، قَوْمٌ مَعَهُمْ سِيَاطٌ كَأَذْنَابِ البَقَرِ، يَضْرِبُونَ بِهَا النَّاسَ. وَنِسَاءٌ كَاسِيَاتٌ عَارِيَاتٌ مُمِيلاَتٌ مَائِلاَتٌ، رُؤُوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ البُخْتِ المَائِلَةِ، لاَيَدْخُلْنَ الجَنَّةَ وَلاَيَجِدْنَ رِيحَهَا وِإنَّ رِيحَهَا لَيُوجَدُ مِنْ مَسِيرَةِ كَذَا وَ كَذَا)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جہنمیوں کی دو قسمیں ایسی ہیں کہ میں نے ان کو نہیں دیکھا (یعنی آنے والے زمانہ میں ان کا ظہور ہوگا۔ گویا یہ نبیٔ کریم ﷺ کی بتائی ہوئی پیشین گوئیوں میں سے ہے جو آج ظاہر ہورہی ہے) ایک تو وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں گائے کی دم کی طرح کوڑے ہوں گے جن کے ذریعہ وہ لوگوں کی پٹائی کریں گے۔ اور دوسری قسم وہ عورتیں ہیں جو لباس پہنے ہوئے ہوں گی لیکن ننگی ہوں گی، دوسروں کو مائل کرنے والی، اور خود بھی مائل ہونے والی ہوں گی، ان کے سر بختی اونٹ کی جھکی ہوئی کوہانوں کی طرح ہوں گے، وہ جنت میں داخل نہ ہوں گی اور جنت کی خوشبو بھی نہ پائیں گی، حالانکہ جنت کی خوشبو دور سے محسوس کی جاتی ہے۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ جنت کی خوشبو پانچ سو سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے۔

افادات:- علامہ احمد عبد الرحمٰن جو مصر کے بڑے عالم ہیں ان کی ایک کتاب ہے: ”الفتحُ الرّبانی فی ترتیب مسند أحمد بن حنبل الشیبانی“ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ: دورِ حاضر میں محکمۂ شرطہ

کے معاونین مجرموں سے اقرار کرانے کے لیے ایسی ہی چیزوں سے مارنے کا کام لیتے ہیں، وہ اس کا مصداق ہیں۔

کپڑا پہنے ہوئے ہونے کے باوجود ننگی

"نِسَآءٌ کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ" سے کیا مراد ہے؟ کپڑا پہنے ہوئے ہونے کے باوجود ننگی ہوں گی۔ تو علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) اس کی تشریح کرتے ہیں:

(۱) "معنٰی ((کَاسِیَاتٌ)) أَیْ مِنْ نِعْمَةِ اللهِ ((عَارِیَاتٌ)) مِنْ شُكْرِهَا" اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے وہ مزین ہوں گی، یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا لباس ان کو اوڑھا رکھا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ان کو حاصل ہوں گی، لیکن اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے وہ عاری، ننگی اور خالی ہوں گی۔

(۲) "وَقِیلَ مَعْنَاهُ: تَسْتُرُ بَعْضَ بَدَنِهَا، وَتَكْشِفُ بَعْضَهُ إِظْهَاراً لِجَمَالِهَا وَنَحْوِهِ" دوسرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا لباس پہنیں گی کہ لباس پہنے ہوئے بھی ننگی نظر آئیں گی۔

اب لباس پہنے ہوئے ننگی نظر آنے کی کئی شکلیں ہیں: (اس لیے کہ لباس کا مقصد ستر کو چھپانا ہے۔ "ستر" یعنی جسم کا وہ حصہ جس کو چھپانے کا شریعت نے حکم دیا ہے مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنے تک کا حصہ ستر میں داخل ہے جس کا چھپانا ضروری اور فرض ہے۔ عورت کے لیے چہرہ اور ہتھیلیوں کو چھوڑ کر پورا جسم ستر میں داخل ہے جس کا چھپانا ضروری اور فرض ہے۔)

الف:- اگر کوئی عورت ایسا لباس پہنے کہ جسم کا کچھ حصہ کھلا رہ جائے، بازو کھلے رہ جائیں، جیسے: بغیر آستین کا یا آدھی آستین فروک پہنے، تو اس صورت میں ہاتھ کا جتنا حصہ کھلا رہے گا وہ ستر ہونے کہ وجہ سے ایسا سمجھا جائے گا کہ گویا وہ لباس پہننے کے باوجود ننگی ہے۔ شریعت نے جتنا بدن ڈھانپنے کا حکم دیا اس سے وہ محروم ہے۔

ستر ڈھانپنے کا مقصد دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک تو انسان کے جسم کی رنگت نظر نہ آئے کہ کالا ہے یا گورا۔ اگر بدن کھلا ہوا ہو تو جسم کا رنگ نظر آجائے گا۔ اور دوسرا عضو کی سائز اور ساخت نظر نہ آئے۔ اس لیے ستر چھپانے کے لیے جو کپڑا استعمال کیا جاتا ہے اس میں دو باتیں ہونی چاہیے، ایک تو یہ کہ وہ جسم کی رنگت کو چھپانے والا ہو، اور دوسرا یہ کہ اس کو پہننے کے نتیجہ میں جسم کی ساخت اور سائز لوگوں کی نظروں میں نہیں آنا چاہیے۔ اسی لیے لباس موٹا ہونا چاہیے یعنی اتنا باریک نہ ہو کہ پہنے ہونے کے باوجود اندر کا جسم جھلکتا ہو۔

ب:- جو عورتیں ایسا لباس پہنتی ہیں جس کی وجہ سے ان کا جسم جھلکتا نظر آتا ہے، جیسے: پتلا دوپٹہ اوڑھ لیا، یا ایسا پتلا کپڑا پہنا کہ جسم کا اندرونی حصہ باہر سے نظر آتا ہے؛ تو اس صورت میں یوں کہا جائے گا کہ یہ کپڑا پہننے کے باوجود ننگی ہیں۔

ج:- اور ایک شکل یہ ہے کہ کپڑا تو موٹا ہے جس کی وجہ سے جسم کا اندرونی حصہ جھلکتا نہیں ہے؛ لیکن وہ لباس اتنا تنگ ہے جس کی وجہ سے سائز نظر آتی ہے، سینہ نظر آتا ہے، بازو نظر آتے ہیں،

کولھے، سرینیں اور پیٹ نظر آتا ہے، مطلب یہ کہ اس کی سائز معلوم ہو جاتی ہے تو اس صورت میں یہ کپڑا اگرچہ موٹا ہے جس کی وجہ سے اندر کا جسم جھلکتا نہیں ہے؛ لیکن پھر بھی اس کی سائز نظر آنے کی سے یوں ہی سمجھا جائے گا کہ وہ کپڑا پہننے کے باوجود ننگی ہے۔

یہ سب شکلیں عورتیں اپنے جمال اور خوب صورتی کو نمایاں کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں؛ تو یوں سمجھا جائے گا کہ وہ باوجود کپڑا پہننے کے ننگی ہیں۔

(۳)"وَقِيلَ: تَلْبَسُ ثَوباً رَقِيقاً يَصِفُ لَوْنَ بَدَنِهَا" ایک مطلب وہی ہے کہ وہ پتلا اور بارک لباس پہنیں گی کہ لباس پہننے کے باوجود اس کے جسم کا رنگ نظر آتا ہو، اس میں سے جسم جھلکتا ہے؛ تو یوں کہا جائے گا کہ کپڑا پہننے کے باوجود ننگی ہیں۔

(۴)"وَمَعْنَى ((مَائِلَاتٌ)) قِيلَ: عَنْ طَاعَةِ اللهِ وَمَا يَلْزَمُهُنَّ حِفْظُهُ" "مَالَ يَمِيلُ" کا معنیٰ آدمی کا جھکا ہوا ہونا، اور کسی طرف مائل ہونا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری اور اس کے احکام بجا لانے سے ہٹی ہوئی ہیں۔

"((مُمِيلَاتٌ)) أَيْ: يُعَلِّمْنَ غَيْرَهُنَّ فِعْلَهُنَّ الْمَذْمُومَ" یعنی دوسروں کو بھی ایسی حرکتیں کرنے کو سکھاتی ہیں۔ خود بھی راہِ راست سے ہٹی ہوئی ہیں اور دوسری عورتوں کو بھی راہِ راست سے ہٹانے والی

ہیں ۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ خود تو غلط کار ہوتی ہی ہیں اور لوگوں میں بھی اس کی ترویج واشاعت کرتی ہیں۔

(۵)"وَقِيلَ: مَائِلاَتٌ يَمْشِينَ مُتبَخْتِرَاتٍ، مُمِيلاَتٌ لأَكْتَافِهِنَّ" بعضوں نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ وہ مٹکاتی ہوئی چلیں گی۔ اپنے جسم کو خم دیتے ہوئے اور اپنے کندھے کو ہلاتے ہوئے چلیں گی۔

(٦)"وقيلَ:مائلاتٌ يَمْتَشطنَ المِشْطَةَ المَيلاءَ:وهى مِشطةُ البَغَايا، و((مُميلاتٌ)) يُمَشِّطْنَ غَيْرَهُنَّ تِلْكَ المِشْطَةَ" اور بعضوں نے کہا کہ مائلات کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بالوں کی ساخت فاحشہ عورتوں جیسی بناتی ہیں یعنی مانگ ٹیڑھی کرنا وغیرہ۔ اور دوسری عورتوں کو باقاعدہ ایسا بنا کر دینا، یعنی دوسری عورتوں کو بھی بالوں کا ایسا انداز بنا کر دیں گی۔ خود بھی ایسا بناتی ہیں اور دوسروں کو بھی ایسا بنا کر دیتی ہیں، جیسے: بیوٹی پارلرز میں ہوتا ہے کہ خود بھی اپنے لیے ایسی زیب وزینت اختیار کرتی ہیں، اور دوسری عورتوں کو بھی اس طرح کی زیب وزینت بنا کر دیتی ہیں ۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے تکملہ فتح الملہم میں غالباً علامہ قرطبی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "مَائِلاَتٌ" یعنی وہ عورتیں جو زنا اور اسبابِ زنا کی طرف مائل ہیں۔ یعنی وہ ایسا ناز و انداز اختیار کرتی ہیں اور ایسا طور و طریق اور ایسا لباس اپناتی ہیں جس کے نتیجہ میں وہ خود بھی زنا اور اسبابِ زنا کی طرف مائل ہیں اور دوسروں کو بھی زنا کی طرف مائل کرتی ہیں۔ آج کل

جو بھی فیشن رائج ہورہے ہیں ان کا خلاصہ یہی ہوتا ہے کہ خود بھی ان برائیوں کی طرف مائل ہوتی ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف مائل کرتی ہیں۔

بختی اونٹوں کے کوہان

"رُؤوسُهُنَّ كَأَسْنِمَةِ البُخْتِ" أيْ: يُكَبِّرْنَهَا وَيُعَظِّمْنَهَا بِلَفِّ عِمَامَةٍ أَوْ عِصَابَةٍ أَوْ نَحْوِهَا "ان کے سر بختی اونٹوں کے کوہان کی طرح ہوں گے۔ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: وہ کپڑا لپیٹ کر اپنے سر کو بڑا بنا کر ظاہر کریں گی۔ اُس زمانہ میں مصری عورتوں میں یہ فیشن چلا تھا اور چوں کہ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) مصر کے رہنے والے تھے، اس لیے فرماتے ہیں کہ کپڑا لگا کر یا عمامہ جیسا کپڑا لپیٹ کر اپنے سروں کو بڑا اظاہر کرتی ہیں۔ لیکن مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم تکملہ فتح الملہم میں فرماتے ہیں کہ: دورِ حاضر میں عورتوں نے بالوں کی زینت اور فیشن کے طور پر جو مخصوص ساخت شروع کی ہے کہ بالوں کو سر کے اوپر اکٹّھا کر کے جمانے کی کوشش کرتی ہیں؛ وہ بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسے اونٹ کی کوہان ہو۔ اب جس نے یہ شکل نہ دیکھی ہو وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا؛ لیکن حضورِ اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی پیشین گوئی اس طرح پوری ہوتی ہے۔

باب النھی عن التشبہ بالشیطان والکفار

شیطان اور کفار کے ساتھ تشبہ اختیار کرنے کی ممانعت

ایک ہے تشبہ اور ایک ہے مشابہت:

تشبہ کا مطلب ہے: آدمی کا بالقصد اپنے ارادہ واختیار سے اپنے آپ کو ایسا بنانا کہ میں فلاں جیسا نظر آؤں ، مثلاً: کوئی مخصوص طور وطریق اور مخصوص انداز و فیشن ہو اورآدمی اسی طرح کے کپڑے اس لیے پہنے کہ میں بھی ان جیسا نظر آؤں ، جیسے: کوئی آدمی کوٹ پتلون اس لیے پہنتا ہے کہ میں بھی یورپین اورانگریز کی طرح نظر آؤں۔ یا کفار کا کوئی مخصوص لباس اسی نیت سے پہنتا ہے کہ میں بھی ان جیسا نظر آؤں ؛ وہ تو تشبہ ہے، اورتشبہ حرام ہے۔ بلکہ اگر اس نے ایسی چیز کو اختیار کیا جو ان کا مذہبی شعار اور مذہبی علامت سمجھی جاتی ہے؛تو اس صورت میں تو بعض مرتبہ کفر تک پہنچنے کی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن اگراس کی نیت ان جیسا بننے کی نہیں ہے؛ تو اس صورت میں اس کوتشبہ نہیں بلکہ مشابہت کہیں گے،اور یہ بھی مکروہ ہے، لیکن اس کا گناہ پہلے جیسا نہیں ہو گا۔

یہاں نبی کریم ﷺ تشبہ بالشیطان والکفار سے منع فرماتے ہیں کہ شیطان اور کفار کے ساتھ مشابہت اختیار کرنے کی ممانعت ہے۔ کفار کے ساتھ مشابہت اگر ارادہ و قصد کے ساتھ ہو تب تو منع ہے ہی؛ لیکن اگر غیر ارادی طور پر ہو جائے تب بھی شریعت کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ہے؛ لیکن اس

کا گناہ اس درجہ کا نہیں جو بالارادہ اور بالقصد کرنے کی صورت میں ہوتا ہے، اس لیے کہ بالارادہ کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو اسلامی طور وطریق اور اسلامی انداز ناپسند ہے، اور غیر اسلامی انداز پسند ہے۔

بائیں ہاتھ سے کھانا شیطان کے ساتھ مشابہت ہے

حدیث ۱۶۳۴:-

عن جابر رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللہِ ﷺ: ((لَاتَأْكُلُوا بِالشِّمَالِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ وَيَشْرَبُ بِالشِّمَالِ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بائیں ہاتھ سے نہ کھاؤ، اس لیے کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔

افادات:- اس سے معلوم ہوا کہ شیطان بھی حقیقۃً کھاتا اور پیتا ہے، اور روایتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے اس کی عادت بائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے کی ہے، اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: تم بائیں ہاتھ سے مت کھاؤ پیو، بلکہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ پیو؛ ورنہ شیطان کے ساتھ مشابہت ہو جائے گی۔

حدیث ۱۶۳۵:

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما): أَنَّ رسُولَ اللہ ﷺ قَالَ: ((لَايَأْكُلَنَّ أَحَدُكُمْ بِشِمَالِهِ، وَلَا يَشْرَبَنَّ بِهَا، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ وَيَشْرَبُ بِهَا)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی بائیں ہاتھ سے نہ کھائے، اور نہ اُلٹے ہاتھ سے پانی پیئے، اس لیے کہ شیطان اُلٹے ہاتھ سے کھاتا اور پیتا ہے۔

افادات:۔ان روایتوں سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ شیطان جیسا طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے، اگر ہم بائیں ہاتھ سے کھائیں گے تو ہم بھی شیطان جیسے بن جائیں گے۔

غیروں کی مخالفت کا حکم

حدیث ۱۶۳۶:۔

وعن أَبي هريرة - رضى الله عنه -: أَنَّ رسُولَ اللهِ - صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم - قَالَ: ((إنَّ اليَهُودَ وَالنَّصَارى لاَ يَصْبغُونَ، فَخَالِفُوهُمْ)). (متفق عَلَيهِ)

المُرَادُ: خِضَابُ شَعْرِ اللِّحيَةِ والرَّأسِ الأَبيَضِ بِصُفْرَةٍ أَوْ حُمْرَةٍ؛ وأمَّا السَّوَادُ، فَمَنْهِيٌّ عَنْهُ كَمَا سَنَذْكُرُهُ فِي البَابِ بَعْدَهُ إنْ شَاءَ اللهُ تَعَالَى.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: یہود اور نصاریٰ اپنے بالوں کو نہیں رنگتے (یعنی جب ان کے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو جاتے ہیں تو وہ لوگ خضاب نہیں لگاتے) لہٰذا تم ان کی مخالفت کرو (یعنی خضاب لگاؤ)۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: ڈاڑھی اور سر کے جو بال سفید ہو چکے ہوں، ان کو پیلے یا سرخ رنگ سے رنگنا اور خضاب کرنا مراد ہے۔ رہا کالا رنگ؛ تو وہ تو ممنوع ہی ہے جیسا کہ آئندہ باب میں آرہا ہے۔

افادات:- یہاں غور کرنے کی بات ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہ کو خاص تاکید فرمائی کہ یہود و نصاریٰ کے بال جب سفید ہو جاتے ہیں تو وہ خضاب نہیں کرتے؛ لہٰذا تم ان کی مخالفت کرو۔ یا جیسا کہ نبیٔ کریم ﷺ نے مشرکین کے متعلق فرمایا کہ وہ مونچھیں بڑھاتے ہیں اور ڈاڑھی کٹاتے ہیں، لہٰذا تم ان کی مخالفت کرو کہ اپنی ڈاڑھی بڑھاؤ اور مونچھوں کو کترواؤ۔ اور بھی بہت سی چیزوں میں ہمیں یہی تاکید فرمائی گئی ہے۔ گویا جو طور وطریق اور لباس وغیرہ کی تراش وخراش اور کٹنگ ان کے جیسی ہو، تو اس کو اختیار نہ کیا کرو۔ حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" جو آدمی کسی قوم کے ساتھ بالارادہ تشبہ اختیار کرے گا تو وہ بھی ان ہی میں شمار کیا جائے گا۔ قرآنِ پاک میں بھی فرمایا گیا ہے: ﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ﴾ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں ان کی طرف نہ جھکو (ان کے طور وطریق اختیار نہ کرو) کہ جہنم کی آگ تم کو بھی پکڑ لے گی۔

باب نہی الرجل والمرأۃ عن خضاب شعرھما بسواد

مرد ہو یا عورت؛ سیاہ خضاب کرنے کی ممانعت

حدیث ۱۶۳۷:-

عن جابر (رضی اللہ عنہ) قَالَ: أُتِيَ بِأَبِي قُحَافَةَ والِدِ أَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ (رضی اللہ عنہما) يَوْمَ فَتْحِ مَكَّةَ وَرَأْسُهُ وَلِحْيَتُهُ كَالثَّغَامَةِ بَيَاضاً. فَقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: ((غَيِّرُوا هَذَا وَاجْتَنِبُوا السَّوَادَ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) کے والد حضرت ابو قحافہ (رضی اللہ عنہ) کو فتحِ مکہ کے دن لایا گیا تو ان کا سر اور ڈاڑھی ثغامہ پودے کی طرح بالکل سفید تھی، نبی کریم ﷺ نے یہ منظر دیکھ کر فرمایا: اس کو بدل دو (یعنی یہ سفیدی نکال دو، اس کو رنگ دو) لیکن سیاہی سے بچو (یعنی خضاب سیاہ رنگ کا نہیں ہونا چاہیے)

افادات:- حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) کے والد حضرت ابو قحافہ (رضی اللہ عنہ) پہلے ایمان نہیں لائے تھے، جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اس وقت حضرت ابو قحافہ (رضی اللہ عنہ) بہت بوڑھے ہو چکے تھے تو ان کو حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) اپنی گود میں اُٹھا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس وقت حضور اکرم ﷺ نے ان کو کلمہ پڑھایا اور وہ ایمان لائے۔ جب حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) ان کو اُٹھا کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور ﷺ نے فرمایا: ان کو کیوں لائے، مجھے بتاتے تو

میں خود آجاتا۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ان کو ہی آپ کی خدمت میں آنا چاہیے تھا، کہا کہ آپ ان کے پاس تشریف لے جاتے۔ خیر! جب وہ لائے گئے تو چوں کہ وہ بہت بوڑھے ہو چکے تھے، اس وجہ سے ان کی ڈاڑھی اور سر کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔

"ثَغَامَة" ایک پودا ہوتا ہے جو پہاڑوں پر پایا جاتا ہے، جب وہ خشک ہو جاتا ہے تو بالکل سفید برف کی طرح نظر آتا ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ ایک درخت ہے جس کے پھل اور پھول بہت سفید ہوتے ہیں، جب وہ آتے ہیں تو پورا پودا سفید نظر آتا ہے۔

خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب فرمایا ہے، یا نہیں؟ یہ چیز محدثین کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ احناف کے یہاں راجح یہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خضاب نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے کہ حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت آپ کے سر، ڈاڑھی کے بالوں میں اٹھارہ یا انیس بالوں سے زیادہ سفید بال نہ تھے، البتہ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے مہندی اور کَتَم کا خضاب کیا ہے۔

سرخ سیاہی مائل رنگ کی مہندی کا حکم

"کَتَم" بھی مہندی کی طرح کا ایک پودا ہوتا ہے، اس سے بال کا رنگ سیاہی مائل ہو جاتا ہے، اور ان دونوں کو ملایا جائے گا تو اس سے سرخ سیاہی مائل رنگ آجاتا ہے۔ اس طرح کا خضاب لگانے کی اجازت ہے، لیکن خالص سیاہ رنگ کے خضاب کی اجازت نہیں ہے۔

کالی مہندی کا مسئلہ

آج کل ’’کالی مہندی‘‘ کے نام سے ایک خضاب آتا ہے، اس کو بنانے والے بھی عجیب ہیں کہ اس کو نام ہی ’’مہندی‘‘ دے دیا، تاکہ کسی کو زیادہ تحقیق کی ضرورت ہی پیش نہ آئے، اور سب یہی سمجھیں کہ یہ مہندی ہے، حالاں کہ وہ ایک کیمیکل ہے جس کو ’’کالی مہندی‘‘ کا صرف نام دیدیا ہے۔ اس کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ واقعۃً مہندی ہو اور اس سے صرف کالا رنگ آتا ہو؛ تب بھی اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے۔

ہیر ڈائی کا حکم، عورتیں متوجہ ہوں

آج کل بالوں کو رنگنے کے لیے ہیر ڈائی آتی ہے، اس سے بھی اگر صرف رنگ آتا ہے، جیسے مہندی کا رنگ آتا ہے؛ تو اس میں بھی کالے کو چھوڑ کر باقی رنگ، جیسے بھورا، سرخ رنگ کو استعمال کرنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ وہ صرف رنگ ہی ہو، یعنی اس کو لگانے سے رنگ ہی چڑھتا ہو۔ اور اگر وہ اتنا گاڑھا ہو جس کی وجہ سے بالوں پر پرت چڑھ جاتی ہو، جیسے: آئل پینٹ میں ہوتا ہے؛ تو اس صورت میں پھر وضو اور غسل درست نہیں ہوگا۔ جیسے: عورتیں نیل پالش لگاتی ہیں، جس میں ناخن پر باقاعدہ پرت اور پڑ جم جاتا ہے، تو اس صورت میں ان کا نہ غسل ہوگا اور نہ وضو ہوگا، بلکہ خدانخواستہ اگر ایسی حالت میں انتقال ہوگیا تو ناخنوں پر نیل پالش لگی ہوئی ہونے کی وجہ سے ان کا غسل بھی نہیں ہوگا،

اور جب غسل نہیں ہو گا تو نماز بھی نہیں ہو گی، اس لیے کہ مُردہ کو جب تک غسل نہ دیا جائے اس پر نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ عورتوں کے ناخنوں پر اگر نیل پالش لگی ہوئی ہو تو اس کو کھرچا جائے، اگر کھرچا نہیں جائے گا تو ان کا غسل ہی درست نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔

نبی کریم ﷺ نے سیاہ خضاب سے منع فرمایا۔ ابو داود شریف میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بعض لوگ ایسا خضاب استعمال کریں گے جیسے کبوتر کے پوٹے ہوتے ہیں، وہ لوگ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھیں گے (۱)۔ کبوتر کے پورے جسم کا رنگ تو الگ ہوتا ہے، لیکن گلے کے نیچے کے حصہ کا رنگ سیاہ ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کالا خضاب استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ البتہ دشمن کو مرعوب کرنے کے لیے میدانِ قتال میں اگر اس کو استعمال کیا جائے تو اس کی گنجائش دی گئی ہے۔

(۱) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ: یکون قوم یخضبون فی اٰخر الزمان بالسواد کحواصل الحمام، لا یریحون رائحة الجنة. (سنن ابی داود: باب ما جاء فی خِضَابِ السواد۔ حدیث نمبر: ۴۲۱۲)

بَاب النهی عن القَزَع

وإباحة حَلْقِهِ كُلِّهِ للرجل دون المرأة

”قَزَع“ کی ممانعت کا بیان

بال کاٹنے کی اجازت صرف مَردوں کے لیے ہے، عورتوں کے لیے نہیں

”قَزَع“ کا مطلب

”قَزَعٌ“ جمع کا صیغہ ہے، اس کا واحد ” قَزْعَةٌ“ آتا ہے، جس کا اصل معنٰی تو ہے: بادل کا وہ ٹکڑا جو تنہا ہو، آسمان میں بادل کی جماوٹ نہ ہو۔ بعض مرتبہ سر کے بال اس طرح کاٹے جاتے ہیں کہ سر کے کسی حصہ کے کاٹے جاتے ہیں اور کسی حصہ کے رہنے دیئے جاتے ہیں؛ اسی کو” قَزَع“ سے تعبیر کیا گیا ہے کہ سر کے کسی حصہ کے بال کاٹ کر کسی حصہ کے بال کو رہنے دینا۔ اس سے نبیٔ کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ ہاں ! اگر پورے سر کے بال کاٹنا چاہے کہ سر پر بالکل بال رہے ہی نہیں؛ تو کاٹ سکتے ہیں ۔ لیکن سر کے کچھ حصہ کے بال رہنے دینا اور کچھ حصہ کے کاٹنا، جیسا کہ عام طور پر شریعت کے خلاف بال رکھنے والوں کا قدیم زمانہ سے یہی طریقہ چلا آیا ہے کہ کان کے پاس کے بال کاٹ دیئے جاتے ہیں اور سر کے اوپر کے بال رہنے دیئے جاتے ہیں، یا پیچھے گُدی کے حصے کے بال کاٹ دیئے

جاتے ہیں اور باقی بالوں کو رہنے دیا جاتا ہے؛ تو اس کی اجازت نہیں ہے۔ اگر بال رکھنے ہیں تو پورے سر کے رکھے جائیں، اور اگر کاٹنے ہیں تو پورے سر کے کاٹ دیئے جائیں۔

حدیث ۱۶۳۸ :-

عن ابن عمر رضی اللہ عنهما، قالَ: نَهَى رسُولُ اللهِ ﷺ عن القَزَعِ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے قزع سے منع فرمایا۔ (قزع کا مطلب اوپر بتایا جا چکا ہے۔)

بچوں کے بالوں کی تراش خراش کی ذمہ داری والدین کی ہے

حدیث ۱۶۳۹ :-

وعنه، قالَ: رأى رسُولُ اللهِ ﷺ صَبِيّاً قَدْ حُلِقَ بَعْضُ شَعْرِ رَأْسِهِ وَتُرِكَ بَعْضُهُ، فَنَهَاهُمْ عَنْ ذَلِكَ، وقال: ((احْلِقُوهُ كُلَّهُ، أَوِ اتْرُكُوهُ كُلَّهُ)) (رواه أبو داود بإسناد صحيح عَلَى شرط البخاري ومسلم.)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک بچے کو دیکھا جس کے سر کے کچھ حصے کے بال کاٹے گئے تھے، اور کچھ حصے کے چھوڑ دیئے گئے تھے، تو نبی کریم ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا: یا تو پورے کے بال کاٹ دو، یا پورے سر کے بال رہنے دو۔

افادات:- اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بچوں کے بالوں کی تراش وخراش اور بچوں کے لباس کی وضع قطع کے معاملہ میں ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ ان کو شریعت کے مطابق رکھنے کا اہتمام کریں، ورنہ انہیں کا مواخذہ ہو گا۔ یہاں تک کہ کتابوں میں مسئلہ لکھا ہے کہ چھوٹے بچے کو ماں پیشاب یا پائخانہ اس طرح کرا رہی ہے کہ اس بچہ کی پیٹھ، یا اس کا چہرہ قبلہ کی طرف ہو رہا ہے؛ تو یہ درست نہیں ہے۔ اور چھوٹا بچہ چاہے پانچ مہینہ کا ہو، یا ایک سال کا ہو، اور وہ لڑکا ہے تو اس کو ریشمی کپڑا، یا سونے کی چین پہنانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچوں کے ان تمام معاملات میں شریعت کے احکام کی پابندی کروانے کی ذمہ داری ماں باپ کی ہے، اگر ان میں شریعت کی خلاف ورزی ہو گی تو پکڑ ماں باپ کی ہو گی۔

پورے سر کے بال مونڈے جاسکتے ہیں

حدیث ۱۶۴۰:-

وعن عبد الله بن جعفر رضی الله عنهما: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ أَمْهَلَ آلَ جَعْفَرٍ ثَلَاثًا ثُمَّ أَتَاهُمْ فَقَالَ: ((لَا تَبْكُوا عَلَى أَخِي بَعْدَ الْيَوْمِ)) ثُمَّ قَالَ: ((ادْعُوا لِي بَنِي أَخِي)) فَجِيءَ بِنَا كَأَنَّنَا أَفْرُخٌ فَقَالَ: ((ادْعُوا لِي الْحَلَّاقَ)) فَأَمَرَهُ فَحَلَقَ رُؤُوسَنَا. (رواه أبو داود بإسناد صحيح على شرط البخاري ومسلم.)

ترجمہ:۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھرانے والوں کو تین دن (رونے کی) مہلت دی۔ جب تین دن ہوگئے تو نبی کریم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور ارشاد فرمایا: آج کے بعد میرے بھائی کے واسطے مت روئیو، پھر ارشاد فرمایا: میرے بھائی کے بچوں کو میرے پاس لاؤ۔ حضرت عبد اللہ بن جعفر فرماتے ہیں کہ ہمیں آپ ﷺ کے پاس لایا گیا (ہم اتنے چھوٹے بچے تھے) گویا ہم چوزے ہوں (مطلب یہ ہے کہ ہم بہت چھوٹے چھوٹے تھے) پھر حضور ﷺ نے فرمایا: حلّاق کو بلواؤ۔ جب وہ آیا تو حضور ﷺ نے اس سے کہا: ان کے بال مونڈ دو، تو اس نے ہمارے سروں کو مونڈ دیا۔

حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) کے حالات

افادات:۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے تین بیٹے تھے: (۱) محمد (۲) عبد اللہ (۳) عون۔ یہ تینوں بہت چھوٹے چھوٹے تھے، ان میں سے عبد اللہ شکل وشباہت میں نبی کریم ﷺ کے بہت مشابہ تھے، اور بعد میں حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے داماد بھی بنے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ؛ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے، اور نبی کریم ﷺ کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں۔ مکہ مکرمہ سے پہلے ہجرت کرکے حبشہ گئے تھے، پھر وہاں سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ اس وقت پہنچے جب نبی کریم ﷺ غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے جاچکے تھے، چناں چہ وہیں خیبر جاکر نبی کریم ﷺ سے ملاقات کی، اس وقت خیبر

فتح ہوچکا تھا۔ نبی کریم ﷺ نے معانقہ فرمایا، پیشانی پر بوسہ دیا، اور فرمایا کہ: میں یہ نہیں بتلا سکتا کہ مجھے اس وقت کس چیز کی زیادہ خوشی ہے؛ خیبر کے فتح ہونے کی، یا جعفر کی ملاقات کی(۱)۔

حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) بڑے ہی سخی تھے۔ غزوۂ موتہ کے موقعہ پر پہلے امیر تو حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) بنائے گئے تھے، اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر وہ شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ پر حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) امیر ہوں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو امیر حضرت عبد اللہ بن رواحہ (رضی اللہ عنہ) ہوں گے۔ اسی جنگ میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، اور ان کی شہادت کی اطلاع مدینہ منورہ پہنچی۔ ویسے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کو بذریعۂ وحی بھی آگاہ کر دیا تھا، لہٰذا آپ نے مدینہ منورہ میں "الصلوٰۃ جامعۃ" کی آواز لگوا کر لوگوں کو جمع کروایا، پھر منبر پر تشریف فرما ہوئے اور آپ ﷺ کے سامنے میدانِ جنگ کا پورا نقشہ کر دیا گیا تھا، آپ لوگوں بتلاتے جاتے تھے کہ پہلے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے، پھر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ خیر! ان کی شہادت کی اطلاع جب ان کے گھر پہنچی تو گھر والوں کو بڑا غم ہوا، اور وہ رونے لگے۔

(۱) حَدَّثَنَا مِسْعَرٌ، عَنْ عَوْنِ بن أَبِي جُحَيْفَةَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: لَمَّا قَدِمَ جَعْفَرٌ مِنْ هِجْرَةِ الْحَبَشَةِ، تَلَقَّاهُ النَّبِيُّ ﷺ فَعَانَقَهُ، وَقَبَّلَ مَا بَيْنَ عَيْنَيْهِ، وَقَالَ: مَا أَدْرِي بِأَيِّهِمَا أَنَا أَسَرُّ، بِفَتْحِ خَيْبَرَ، أَوْ بِقُدُومِ جَعْفَرٍ. (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث رقم: ۱۴۵۲)

رونا اگر غیر اختیاری طور پر آرہا ہے اور شریعت کے خلاف بھی کسی حرکت کا ارتکاب نہیں کیا جارہا ہے، جیسے: گالوں پر طمانچے نہیں مارے جارہے ہیں، بالوں کو نوچا نہیں جارہا ہے، گریبان پھاڑا نہیں جارہا ہے، اور مرنے والے کے غلط اوصاف بیان کرکے شور و ہنگامہ برپا نہیں کیا جارہا ہے؛ تو رونے کی اجازت ہے۔ خیر! نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے حضرت جعفر (رضی اللہ عنہ) کے گھرانے والوں کو تین دن تک رونے کی مہلت دی، یعنی رونے سے منع نہیں کیا۔ اس روایت کو لاکر علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ پورے سر کے بال مونڈے جاسکتے ہیں۔ اور خاص کر بچوں کے بارے میں تو زیادہ مناسب یہی ہے کہ سر پر بال رکھنے کے مقابلہ میں بالوں کو مونڈ دیا جائے۔

عورت سر کے بال نہ منڈوائے

حدیث ۱۶۴۱:-

وعن عليٍّ -رضی اللہ عنہ- قَالَ: نَهَى رسُولُ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ تَحْلِقَ الْمَرْأَةُ رَأْسَهَا. (رواہ النسائی)

ترجمہ:- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس بات سے منع فرمایا کہ عورت اپنے سر کے بال منڈوائے۔

افادات:– عورتوں کے لیے تو بال کاٹنے کی بھی ممانعت آئی ہے، اس لیے کہ اس میں مردوں کے ساتھ مشابہت ہے۔ اور جو عورت وضع قطع، تراش وخراش اور لباس میں مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرے اس پر نبی کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

باب تحریم وصل الشعر والوشم والوشر ...وھو تحدید الأسنان

بالوں کے ساتھ دوسروں کے بالوں کو جوڑنا، گوندنا لگوانا، دانتوں کو نوکیلا بنانا

اپنے بالوں کے ساتھ دوسروں کے بالوں کو جوڑ کر اپنے بالوں کو بڑا بنانا، جیسا کہ عام طور پر عورتیں کرتی ہیں۔ اور گوندنا لگوانے کی بھی ممانعت ہے، یعنی سوئیوں کے ذریعہ جسم میں سوراخ کرکے اس میں سرمہ یا نیم بھر دینا، جس کی وجہ سے اس کا رنگ بدل جاتا ہے۔ آج کل دیکھا ہوگا کہ بہت سے نوجوان اپنے جسم میں جگہ جگہ مختلف جانوروں -بچھو، شیر- کی تصویریں گوندواتے ہیں، یا اپنا نام لکھواتے ہیں، یا غیر مسلم لوگ اپنی دیوی دیوتاؤں کی شکلیں بنواتے ہیں۔ اہلِ عرب میں بھی اس کا رواج تھا؛ یہی ''وَشْم'' کہلاتا ہے۔ اور ''وَشْر'' یعنی دانتوں کو نوکیلا بنانا۔ اسلام میں ان سب باتوں کی ممانعت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خِلقت کو بدلنا شیطانی فریب ہے

قرآنِ پاک کی آیت پیش کی ہے: ﴿إِنْ يَدْعُونَ مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثاً وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَاناً مَرِيداً،

لَعَنَهُ اللهُ.وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيباً مَفْرُوضاً. وَلَأُضِلَّنَّهُمْ وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللهِ.(النساء: ۱۱۹،۱۱۸،۱۱۷)

ترجمہ:–وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ دوسروں کو پکارتے ہیں، دراصل وہ نہیں پکارتے مگر موئنث اور مادہ کو (یعنی عام طور پر غیر اللہ کو جو پکارا جاتا ہے وہ دیویاں ہی ہوتی ہیں، اور اہلِ عرب میں ہر قبیلہ کا بت علاحدہ ہوا کرتا تھا، اور اس کے لیے ان کے یہاں یہی جملہ استعمال کیا جاتا تھا: ''أُنْثٰى بَنِيْ فُلَانٍ'' فلاں قبیلے کی دیوی۔ ہمارے ملک میں بھی غیر اللہ کی جو پوجا کی جاتی ہے ان میں دیویاں ہی زیادہ ہیں) اور نہیں پکارتے ہیں مگر شیطانِ سرکش کو (حقیقت میں شیطان ہی گمراہ کرتا ہے، اور غیر اللہ کی عبادت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔ گویا اس کے بہکاوے میں آکر جو کچھ کیا جاتا ہے در حقیقت وہ عبادت اور پوجا شیطان ہی کی ہو رہی ہے) اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی رحمت سے دور کر دیا (جس وقت اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی رحمت سے دور کیا اس وقت) وہ کہنے لگا: میں تیرے بندوں میں سے اپنے لیے ایک حصہ مقرر کرلوں گا (مطلب یہ ہے کہ تیرے بندوں میں سے ایک تعداد وہ ہوگی جو میری بات ماننے والی اور میری پیروی کرنے والی ہوگی، میں ان کو اپنا بنالوں گا) اور میں ان کو گمراہ کروں گا، اور میں ان کو تمنائیں دلواؤں گا (اور عام طور پر آدمی تمناؤں اور امیدوں میں پڑ کر ہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں میں مبتلا ہوتا ہے) اور میں ان کو بہکاؤں گا جس کے نتیجہ میں وہ اپنے جانوروں کے کانوں کو چیریں گے، اور ان کو حکم دوں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خِلقت کو بدل دیں۔

افادات:–اس آیت کو یہاں اسی لیے پیش کیا ہے کہ جسموں پر جو گوندنا لگوایا جاتا ہے، اسی طریقے سے دانتوں کو جو باریک کروایا جاتا ہے، اور بالوں کو غلط طریقوں سے تراشا جاتا ہے؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی خِلقت کو بدلنا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بالوں کو عورتوں کے لیے زینت بتلایا ہے، جیسا کہ بعض کتابوں میں بعض فرشتوں کی یہ تسبیح بتلائی گئی ہے: ''سُبْحَانَ مَنْ زَيَّنَ الرِّجَالَ بِاللُّحیٰ وَالنِّسَآءَ بِالذَّوَائِبِ'' پاک ہے وہ ذات جس نے مردوں کو ڈاڑھی کے ذریعہ سے اور عورتوں کو چوٹی کے ذریعہ سے زینت عطا فرمائی۔ آج کل دونوں نے اپنی زینت چھوڑدی ہے، مردوں نے ڈاڑھی ختم کردی اور عورتوں نے چوٹی نکال دی۔

بالوں کو جوڑنے والی اور جُڑوانے والی پر لعنت

حدیث ۱۶۴۲:-

وعن أسماءَ رضی الله عنها أنَّ امْرَأَةً سَأَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَتْ: يارسولَ اللهِ! إنَّ ابْنَتِي أَصَابَتْهَا الحَصْبَةُ، فَتَمَرَّقَ شَعْرُهَا، وإنِّي زَوَّجْتُهَا، أَفَأَصِلُ فِيهِ؟ فقالَ: ((لَعَنَ اللهُ الوَاصِلَةَ وَالمَوْصُولَةَ)). (متفق عليه)

وفي روايةٍ: ((الوَاصِلَةَ، والمُسْتَوْصِلَةَ)).

قَوْلُهَا: ((فَتَمَرَّقَ)) هو بالراءِ ومعناهُ: انْتَثَرَ وَسَقَطَ. ((وَالوَاصِلَةُ)): التي تَصِلُ شَعْرَهَا، أو شَعْرَ غَيْرِهَا بِشَعْرٍ آخَرَ. ((وَالمَوْصُولَةُ)): التي يُوصَلُ شَعْرُهَا. ((والمُسْتَوْصِلَةُ)): التي تَسْأَلُ مَنْ يَفْعَلُ لها ذلك.

ترجمہ:- حضرت اسماء رضی اللہ عنھا سے منقول ہے کہ ایک عورت نے نبیٔ کریم ﷺ سے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! میری بیٹی کو چیچک کی بیماری ہوگئی جس کے نتیجہ میں اس کے بال جھڑ گئے، اور میں نے اس کا نکاح کرا رکھا ہے، تو کیا اب میں اس کے بالوں میں دوسرے بال جوڑ کر اس کے بال لمبے کروں؟ (دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے شوہر نے مطالبہ کیا تھا اور اس نے ساس سے کہا تھا کہ تمہاری بیٹی کے بال جھڑ گئے ہیں تو اس کے بالوں کے ساتھ دوسرے بال جوڑ دو۔ تو اس عورت نے آکر نبیٔ کریم ﷺ سے اس سلسلہ میں اجازت چاہی) نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو عورت اپنے بالوں کو جوڑے اور جس کے بال جوڑے جائیں؛ ان دونوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔

افادات:- اس سلسلہ میں اکثر حضراتِ محدثین اس طرف گئے ہیں کہ کسی بھی حال میں بالوں میں مطلقاً دوسرے بالوں کو جوڑنے کی اجازت نہیں ہے، چاہے وہ انسانی بال ہوں، یا کسی ناپاک یا حلال جانور کے بال ہوں، یا مصنوعی بال ہوں۔ لیکن احناف کے یہاں حکم یہ ہے کہ اگر انسان کے بال ہیں ، یا کسی ناپاک جانور کے بال ہیں ، جیسے سور کے بال ہوں تو ان کو تو جوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر کسی حلال اور پاک جانور کے بال ہیں، یا مصنوعی بال ہیں؛ تو ان کو جوڑنے کی اجازت ہے

وعن عائشة رضی اللہ عنها نحوهٗ. (متفق علیه)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی بات منقول ہے جو اوپر گزری۔

بالوں میں بال جوڑنے کی وجہ سے بنو اسرائیل ہلاک ہوئے

حدیث ۱۶۴۳ :-

وعن حُمیدِبنِ عبد الرحمٰنِ: أَنَّهُ سَمِعَ مُعَاوِيَةَ رضی الله عنه عامَ حَجَّ على المِنْبَرِ وَتَنَاوَلَ قُصَّةً مِنْ شَعْرٍ كَانَتْ فِى يَدِ حَرَسِيٍّ فَقَالَ: يَا أَهْلَ المَدِينَةِ! أَيْنَ عُلَمَاؤُكُمْ؟! سَمِعتُ النَّبِيَّ صلى الله عليه وسلم يَنْهَى عَنْ مِثْلِ هذِهِ، ويقُولُ: ((إِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُو إِسْرَائِيلَ حِينَ اتَّخَذَهَا نِسَاؤُهُمْ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت حمید بن عبد الرحمٰن فرماتے ہیں کہ حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) نے جس سال آخری حج کیا، اس وقت میں نے ان کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا، حال یہ کہ انہوں نے اپنے ہاتھوں میں بالوں کی (چوٹی کا) ایک گُچھا پکڑ رکھا تھا (کسی عورت نے بالوں میں لگائی ہوگی جو الگ ہو کر راستہ میں گر گئی تھی، اور آپ کے سپاہی کو ملی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس کے ہاتھ سے لے کر اپنے ہاتھ میں پکڑا) اور فرمایا: اے مدینہ والو! تمہارے علماء کہاں گئے؟ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حرکت سے (یعنی بالوں کے ساتھ دوسرے بالوں کو جوڑنے سے) منع فرماتے ہوئے سنا ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: بنو اسرائیل ہلاک ہو گئے جب ان کی عورتوں نے اس طرح کے بال بنالیے (یعنی جب ان کی عورتوں نے اپنے بالوں کے ساتھ دوسرے بالوں کو جوڑنا شروع کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عذاب آیا اور وہ ہلاک ہو گئے۔)

علماءِ کرام کی ذمہ داری

افادات:-اس روایت سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ علماءِ کرام کی ذمہ داری اوران کا فریضہ ہے کہ اگرلوگ نبیٔ کریم ﷺ کی ہدایات اور شریعت کے احکام کے خلاف کسی کام میں مبتلا ہوں توان کو تنبیہ کریں،اس کے گناہ سے ان کو آگاہ کرکے اس سے روکنے کی کوشش کریں۔گویا یہ علماء کا فرضِ منصبی ہے،اسی لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اہلِ علم کو خاص طور پر خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ:تمہارے علماء کہاں گئے؟وہ اپنے فرضِ منصبی کوادا کرنے میں کیوں کوتاہی برت رہے ہیں کہ جس کی وجہ سے عوام میں یہ کام کرنے کی نوبت آئی۔معلوم ہوا کہ معاشرہ میں جو بھی بگاڑ پیدا ہورہاہو،اہلِ علم کواس کی طرف پورے طور پر نظر رکھنی چاہیے،اوراس سلسلہ میں لوگوں کو آگاہ اور متنبہ کرتے رہنا چاہیے۔

گوندنا لگانے والی اور لگوانے والی پر لعنت

حدیث ۱۶۴۴:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما: أَنَّ رسُولَ الله - ﷺ - لَعَنَ الوَاصِلَةَ والمُسْتَوْصِلَةَ، والوَاشِمَةَ والمُسْتَوْشِمَةَ. (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے بالوں کو جوڑنے والی اور بالوں کو جُڑوانے والی، اور گوندنا لگانے والی اور گوندنا لگوانے والی عورت پر لعنت فرمائی۔

افادات:- دیکھو! تین لفظ آتے ہیں: (۱) واصلہ (۲) مستوصلہ (۳) موصولہ

① "واصلہ" کا معنیٰ ہے کہ بالوں کو جوڑنے والی۔ اب جوڑنا عام ہے، چاہے اپنے بالوں میں کسی کے بالوں کو جوڑے، یا کسی اور عورت کے بالوں میں دوسرے بال جوڑ کر دے، یعنی جوڑنے کا کام کرے؛ یہ دونوں "واصلہ" کہلائے گی۔

② "موصولہ" اس عورت کو کہتے ہیں جس کے بالوں کے ساتھ دوسرے بالوں کو جوڑا جائے، چاہے اس کی خود کی درخواست پر جوڑے جائیں، یا کسی دوسرے کے کہنے پر جوڑے جائیں۔

③ اگر کسی سے درخواست کر کے اپنے یا دوسری کسی عورت کے بالوں میں دوسروں کے بال جڑوائے؛ تو یہ "مستوصلہ" کہلائے گی۔ جیسے: ماں اپنی بیٹی کو لے کر بیوٹی پارلر والی کے پاس گئی، اور اس سے کہا کہ اِس کے بالوں میں بال جوڑ دو، تو اس صورت میں بیوٹی پارلر والی "واصلہ" کہلائے گی، اور بیٹی جس کے بالوں میں بال جوڑے جا رہے ہیں وہ "موصولہ" کہلائے گی، اور ماں "مستوصلہ" کہلائے گی۔

اور مؤنث کا صیغہ اس لیے لایا گیا کہ عام طور پر اُس زمانہ میں یہ کام عورتیں ہی کرتی تھی؛ لیکن آج کل تو یہ خرابی یہاں تک پہنچ گئی کہ عورتیں بیوٹی پارلروں میں جاکر نامحرم مردوں کے پاس یہ کام کرواتی ہیں۔ ایک تو یہ فعل خود حرام ہے، مزید یہ ہوا کہ نامحرم مرد کا ہاتھ پڑ رہا ہے۔

مَیں ان پر لعنت کیوں نہ کروں؟

حدیث ۱۶۴۵:-

وعن ابن مسعود رضی الله عنه قال:لَعَنَ اللهُ الوَاشِماتِ و المُسْتَوشِمَاتِ وَالمُتَنَمِّصَاتِ، والمُتَفَلِّجَاتِ لِلْحُسْنِ، المُغَيِّرَاتِ خَلْقَ الله. فَقَالَتْ لَهُ امْرَأَةٌ فِي ذَلِكَ فَقَالَ: وَمَا لِي لاَ أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ. وَهُوَ فِي كِتَابِ اللهِ؟ قَالَ اللهُ تعالى: وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا (سورۃ الحشر:۷)(متفق عليه)

((المُتَفَلِّجَةُ)) هِيَ: الَّتِي تَبْرُدُ مِنْ أَسْنَانِهَا لِيَتَبَاعَدَ بَعْضُهَا عَنْ بَعْضٍ قَلِيلاً، وتُحَسِّنُهَا وَهُوَ الوَشْرُ. ((وَالنَّامِصَةُ)): الَّتِي تَأْخُذُ مِنْ شَعْرِ حَاجِبِ غَيْرِهَا، وتُرَقِّقُهُ لِيَصِيرَ حَسَناً. ((وَالمُتَنَمِّصَةُ)): الَّتِي تَأْمُرُ مَنْ يَفْعَلُ بِهَا ذَلِكَ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے گوندنا لگانے والی پر، اور گوندنا لگوانے والی پر، اور اپنے بھوؤں کے بالوں کو اکھاڑنے والی پر، اور خوبصورتی ظاہر کرنے کے لیے اپنے دانتوں کے درمیان ریخیں بنوانے والی پر۔ اس طرح کرکے وہ اللہ تعالیٰ نے ان کی جو شکل وصورت بنائی ہے اس کو بدل رہی ہیں۔ ایک عورت نے حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے کہا: کیا آپ ایسی عورتوں پر لعنت فرمارہے ہیں؟ تو

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: میں ان پر کیوں لعنت نہ کروں جن پر اللہ کے رسول نے لعنت کی ہو، اوراس کا تذکرہ قرآنِ پاک میں بھی ہو؟ (اس عورت نے کہا: میں نے تو پورا قرآن پڑھا، مجھے تو کہیں ایسی آیت نظر نہیں آئی جس میں ان کاموں کو کرنے والی عورت پر لعنت کا تذکرہ ہو؟ بخاری شریف کی روایت میں موجود ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "لَوْ قَرَأْتِيهِ لَوَجَدْتِيهِ" اگر تم دھیان سے قرآنِ کریم کو پڑھتی؛ تو تم کو قرآن میں یہ مل جاتا۔ کیا تم نے قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں پڑھا؟ "مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا") اللہ کا رسول تم کو جو حکم دے اس کو لے لو، اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز آجاؤ۔

افادات:- گویا یہ بھی ان چیزوں میں سے ہے جن سے نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے منع فرمایا ہے، لہٰذا یہ قرآنِ پاک کا ہی حکم ہوا۔

بخاری شریف کی روایت میں اس پر یہ زیادتی موجود ہے کہ جب حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے یہ فرمایا تو ایک عورت نے کہا: آپ اس سے ہمیں منع فرماتے ہیں حالاں کہ آپ کے گھر والے تو ایسا کرتے ہیں؟ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: جاؤ! اندر جاکر دیکھ لو، اس کو گھر میں بھیجا، جب وہ دیکھ کر واپس آئی تو پوچھا: کیا ایسا ہی ہے جیسا کہ تم کہتی ہو؟ اس نے کہا: نہیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اگر وہ ایسا کرتی ہوتی تو میرے گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔ یعنی میں اس کو اپنی بیوی کے طور پر باقی ہی نہیں رکھتا۔

’’مُتَنَمِّصَةٌ‘‘ کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنی بھوؤں کی خوبصورتی کے واسطے اس کے بالوں کو اکھاڑ کر بھوؤں کو باریک لکیر کی طرح کرتی ہیں۔ ایسا کام کر کے دینے والی ’’نَامِصَة‘‘ اور جو عورت ایسا کام کروائے وہ ’’مُتَنَمِّصَةٌ‘‘ کہلائے گی۔

کم عمر بچیوں کے دانتوں کے درمیان باریک فصل ہوا کرتا ہے اور دانت پتلے بھی ہوتے ہیں، یہ چیز ان کی خوبصورتی کی علامت ہوتی ہے؛ لیکن جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، دانتوں کا فاصلہ بھی ختم ہو جاتا ہے، بلکہ ایک دوسرے پر چڑھنے لگتے ہیں اور دانت موٹے بھی ہونے لگتے ہیں، تو عورتیں اپنے آپ کو کم عمر ظاہر کرنے اور خوبصورتی نمایاں کرنے کے لیے دانتوں کو گھِسواتی ہیں؛ ایسی عورتوں پر نبیٔ کریم ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔ جن جن کاموں پر قرآن وحدیث میں لعنت آئی ہے وہ سب گناہ کبیرہ اور حرام ہیں۔

اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ احادیث سے جو احکام ثابت ہیں وہ قرآن ہی کے حکم میں ہیں، اسی لیے احادیث کو وحیٔ غیر متلو کہا جاتا ہے، یعنی ایسی وحی جس کی تلاوت نہیں کی جاتی۔

باب النهي عن نتف الشيب من اللحية والرأس وغيرهما وعن نتف الأمرد شعر لحيته عند أول طلوعه

ڈاڑھی اور سر میں جو سفید بال ہوتے ہیں ان کو اُکھاڑنے کی ممانعت

اور بے ریش لڑکے کا اپنی ڈاڑھی پر آنے والے اِکّادُکّا بال کے اُکھاڑنے کی ممانعت

بے ریش لڑکوں کی جب نئی نئی ڈاڑھی نکلنی شروع ہوتی ہے اور ایک دو بال نکلتے ہیں تو عام طور پر وہ ان کو توڑ دیتے ہیں؛ ایسا کرنا حرام اور ممنوع ہے۔ اسی طریقہ سے سر یا ڈاڑھی میں چند بال سفید ہوتے ہیں تو ان کو نکال دیتے ہیں؛ اس سے بھی منع فرمایا ہے۔

حدیث ١٦٤٦ :-

عن عمرو بن شعيب عن أبيهِ عن جَدِّهِ رضى الله عنه عن النَّبِيِّ ﷺ قال: ((لَا تَنْتِفُوا الشَّيْبَ فَإِنَّهُ نُورُ الْمُسْلِمِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (حديث حسن، رواه أبو داود، والترمذی والنسائی بأسانيد حسنة قال الترمذی: هو حديث حسن)

ترجمہ: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سفید بالوں کو مت اُکھاڑو، اس لیے کہ مسلمان کے لیے قیامت کے دن یہ نور ہوں گے۔

افادات:- آدمی اپنے نور کو اپنے ہی ہاتھوں سے کیوں کم کرے!

ایسا کام مردود ہے

حدیث ۱۶۴۷:-

وعن عائشة رضی الله عنها، قالت: قال رسولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عليهِ أمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہماری شریعت میں ثبوت نہیں ہے؛ تو ایسا کام مردود ہے۔

افادات:- اگر وہ کام دین سمجھ کر کرے گا تو وہ بدعت ہے، اور اگر وہ دین سمجھ کر نہیں کرتا تب بھی وہ کام قابلِ مذمت ورَد ہے۔

باب کراھة الاستنجاء بالیمین

ومس الفرج بالیمین من غیر عذر

داہنے ہاتھ سے استنجاء کرنے اور شرم گاہ کو بلا عذر دائیں ہاتھ سے چھونے کی کراہت

اللہ تعالیٰ نے انسانی اعضاء میں بھی فرق رکھا ہے۔ دائیں کو جو عزت و شرف اور احترام عطا فرمایا؛ بائیں میں وہ بات نہیں ہے۔ چناں چہ جو کام ایسے ہیں جو آدمی کے لیے زینت، یا عزت و کرامت کا باعث ہیں، ان کو تو دائیں ہاتھ سے انجام دیا جاتا ہے، اور جو کام اس کے بر خلاف ہیں ان کو بائیں سے انجام دیا جاتا ہے۔ اسی لیے کوئی چیز لینا دینا ہو تو دائیں ہاتھ سے لیا دیا جاتا ہے۔ مسجد میں داخل ہو تو پہلے دایاں پاؤں رکھے۔ بیت الخلاء سے نکل رہے ہیں تو دایاں پاؤں پہلے نکالا جائے۔ اور مسجد سے نکلتے وقت اور بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت اس کے بر عکس حکم دیا گیا۔ اور استنجاء کے لیے ہاتھ کو استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، تو دائیں کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں، بائیں سے کام چلائیں گے۔ کھانے پینے میں دایاں ہاتھ استعمال کریں گے۔ اور شرم گاہ کو بھی دائیں ہاتھ سے چھونے کی ممانعت ہے۔

حدیث ۱٦۴۸ :-

وعن أبي قتادة رضی الله عنه عن النبیّ ﷺ قال: ((إِذَا بَالَ أَحَدُكُمْ فَلاَ يَأْخُذَنَّ ذَكَرَهُ بِيَمِينِهِ، وَلاَ يَسْتَنْجِ بِيَمِينِهِ، وَلاَ يَتَنَفَّسْ فِي الإِنَاءِ)) (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی آدمی پیشاب کرے تو اپنی شرم گاہ کو دائیں ہاتھ سے نہ پکڑے۔ اور دائیں ہاتھ سے استنجاء بھی نہ کرے۔ پیتے وقت برتن کے اندر سانس بھی نہ لے۔

افادات:- البتہ اگر کسی کا بایاں ہاتھ ہی نہیں، یا بائیں ہاتھ میں کوئی تکلیف ہے، جیسے ٹوٹ گیا ہے، یا پٹہ بندھا ہوا ہے، اس کی وجہ سے دائیں ہاتھ سے استنجاء کرنے کی نوبت آئے تو گنجائش ہے۔

باب كراهة المشي في نعل واحدة أو خف واحد لغير عذر
وكراهة لبس النعل والخف قائماً لغير عذر

بلاعذر کے ایک جوتا، ایک موزہ پہن کر چلنا، یا بلاعذر جوتے اور موزے کو کھڑے کھڑے پہننا ناپسندیدہ ہے

حدیث ۱۶۴۹:-

عن أبي هريرة - رضي الله عنه -: أَنَّ رسُولَ الله ﷺ قال: ((لَا يَمْشِ أَحَدُكُمْ فِي نَعْلٍ وَاحِدَةٍ لِيَنْعَلْهُمَا جَمِيعاً، أو لِيَخْلَعْهُمَا جَمِيعاً)).

وفي رواية: ((أو لِيُحْفِهِمَا جَمِيعاً)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی ایک جوتا پہن کر نہ چلے، یا تو دونوں جوتے پہنے، یا دونوں نکال دے۔

افادات:- یہ حکم آداب کے قبیل سے ہے، واجبات میں سے نہیں ہے۔ ایک جوتا پہن کر چلنا وقار و سنجیدگی کے خلاف ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اس میں توازن (Balance) بھی باقی نہیں

رہتا، اور ہر وہ طریقہ جس میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اس سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔ ہاں! اگر کوئی عذر ہو تو بات دوسری ہے۔

حدیث ۱٦٥٠ :-

وعنه قال: سمعتُ رسولَ الله ﷺ يقول: ((إذا انْقَطَعَ شِسْعُ نَعْلِ أَحدِكُمْ، فَلاَ يَمْشِ فى الأُخْرَى حَتَّى يُصْلِحَهَا)). (رواهُ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: تم میں سے کسی کے جوتے کا تسمہ، یا چپل کی پٹی ٹوٹ جائے تو وہ صرف ایک جوتا یا ایک چپل پہن کر نہ چلے، یہاں تک کہ دوسرے کی پٹی یا دوسرے کا تسمہ درست نہ کروالے۔

افادات:- عام طور پر ایسے ہی وقت اس طرح چلنے کی نوبت آتی ہے، ورنہ کون اس طرح چلتا ہے! یہ بھی آداب میں سے ہے۔ اور یہ نہی تنزیہی ہے، تحریمی نہیں۔

حدیث ۱٦٥١ :-

وعن جابر -رضى الله عنه-: أنَّ رسولَ الله ﷺ نَهَى أنْ يَنْتَعِلَ الرَّجُلُ قَائِماً. (رواه أبو داود بإسناد حسن.)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کھڑے کھڑے جوتا پہننے سے منع فرمایا۔

افادات:- بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ بغیر ہاتھ لگائے وہ جوتا پاؤں میں نہیں جاتا، تو اس صورت میں جھک کر اور ٹیڑھا ہو کر رکوع جیسی شکل بنا کر جوتا نہ پہنے، اس لیے کہ ایسا کرنے کی صورت میں گر جانے کا اندیشہ ہے، اس لیے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ اور اگر جوتا ہاتھ کا سہارا لیے بغیر پہنا جا سکتا ہے تو اس صورت میں بیٹھنے والا حکم نہیں ہے۔

باب النهي عن ترك النار في البيت عند النوم ونحوه سواء كانت في سراج أو غيره

سوتے وقت (یا جب ہم پورے طور پر نگرانی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوں)
آگ کو جلتا چھوڑے رکھنا منع ہے چاہے وہ چراغ کی شکل میں ہو یا اور کسی شکل میں ہو

ہماری دنیوی مصلحتوں کے متعلق رہنمائی والی روایتوں اور مختلف آداب کا سلسلہ چل رہا ہے۔ اسی سلسلہ میں یہ عنوان قائم کیا ہے۔ پہلے زمانہ میں چراغ اور دِیا سلائی ہوا کرتی تھی، مٹی کا ایک پیالہ سا کھلا ہوا ہوتا تھا جس میں تیل ڈال کر اسی کے اندر بتی (wick) لگادی جاتی تھی، پھر دھیرے دھیرے فانوس ایجاد ہوئی اور اب تو بجلی کے قمقمے وغیرہ ایجاد ہوگئے۔ یہاں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ کھلا چراغ جلتا ہوا چھوڑ کر اگر گھر والے سو جائیں گے تو اس صورت میں آگ لگنے کا بڑا قوی امکان رہتا ہے، یا تو ویسے ہی کوئی شکل بن کر آگ پکڑ لے، یا کبھی چوہے کی کارروائی کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ چوہا اس میں لگی ہوئی بتی (wick) کو کھینچ کر لے جائے اور کسی جگہ پھینک دے جس کے نتیجہ میں آگ لگ جائے۔

ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ ایک چٹائی پر تشریف فرما تھے، اسی دوران ایک چوہا چراغ کی بتی (wick) کو کہیں سے کھینچتا ہوا لایا اور اس چٹائی پر ڈال دیا جس کی وجہ سے اس چٹائی کا ایک روپے کے برابر حصہ جل گیا، نبی کریم ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین سے فرمایا دیکھو! شیطان کبھی اس جیسے

(یعنی چوہے) کو شرارت پر آمادہ کرتا ہے اور اس جیسی حرکتیں کرواتا ہے، اس لیے سوتے وقت چراغ بجھا دیا کرو۔ (ابو داود، باب اطفاء النار باللیل)

احتیاطی تدابیر کی تاکید

نبی کریم ﷺ نے جس طرح چراغ بجھانے کی تاکید فرمائی ہے، اسی طرح اگر چولھے میں آگ جل رہی ہو تو اس کو بھی بجھا کر سونے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ غفلت والی حالت میں آگ لگنے کا امکان باقی نہ رہے۔ ہاں! اگر آگ ایسی شکل میں ہو کہ وہ محفوظ ہے کہ اس کو اسی حالت میں چھوڑے رکھنے کی صورت میں آگ لگنے کا امکان نہیں ہے؛ تو پھر گنجائش ہے۔ پھر بھی احتیاطی تدابیر کے طور پر تاکید کی جاتی ہے، جیسے ہمارے اِس زمانہ میں سوتے وقت گیس کے سلنڈر کو بند (Lock) کرنے کی ہدایت دی جاتی ہے، تاکہ غفلت کی وجہ سے کہیں ایسا نہ ہو کہ گیس لیک (Leak) ہو کر کمرہ میں پھیل جائے۔ بہت سی مرتبہ حادثات رونما ہوتے ہیں اور گھر والوں کو تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے۔ اس لیے وہ ہدایت بھی اسی حکم میں داخل ہے کہ احتیاطی تدبیر کے طور پر ایسا معاملہ کر لیا جائے تاکہ امکانی نقصان کا اندیشہ ختم ہو جائے۔ دراصل نبی کریم ﷺ کی یہ ہدایات اپنی امت اور پوری انسانیت کے ساتھ غایتِ شفقت و رحمت کا نتیجہ ہے کہ ہماری دنیوی مصلحتوں سے تعلق رکھنے والی چیزوں کے بارے میں بھی آپ ﷺ نے رہنمائی فرمائی۔ آپ ﷺ کے ایسے احکام جو انسانوں کی دنیوی مصلحتوں سے تعلق رکھتے ہیں

ان کو ”امرِ ارشادی“ سے تعبیر کیا جاتا ہے،اس سے ان کاموں کا وجوب ثابت نہیں ہوتا،بلکہ اگر ہم ان پر عمل نہیں کریں گے تو ہمیں ہی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔

جب سونے لگو تو آگ کو جلتا نہ چھوڑو

حدیث ۱۶۵۲ :-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما عن النبیِّ ﷺ قال:((لَا تَتْرُكُوا النَّارَ فِي بُيُوتِكُمْ حِينَ تَنَامُونَ.)) (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم سونے لگو تو اپنے گھر میں آگ کو (جلتا ہوا) نہ چھوڑو (بلکہ اس کو بجھا دیا کرو)

افادات:- اگر کوئی آدمی کسی گھر میں تنہا ہی ہے تب تو اس حکم کا مخاطب براہِ راست وہی آدمی ہے،لہٰذا اس کو چاہیے کہ اس کو بجھا کر سوئے۔اور اگر کسی گھر میں کئی افراد رہائش اختیار کئے ہوئے ہیں، تو ظاہر ہے کہ جو آدمی اخیر میں سوئے گا اسی پر یہ حکم لاگو پڑے گا،اور اس کی ذمہ داری ہے کہ آگ کو بجھا کر سوئے۔آج کل بجلی کے قمقمے اور ٹیوب لائٹ اور بلب وغیرہ ہوتے ہیں،ان کی وجہ سے آگ لگنے کا تو اندیشہ نہیں ہے لیکن ان کو جلتا ہوا چھوڑ دینا ایک قسم کی فضول خرچی اور اسراف ہے؛اس لیے ان کو بھی بجھا دینا اسی حکم میں داخل ہے۔ہاں! جو نائٹ بلب ہوتا ہے اس کو جلتا ہوا چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

آگ تمہاری دشمن ہے

حدیث ۱٦٥٣ :-

وعن أبي موسى الأشعري رضی الله عنه قال: احْتَرَقَ بَيْتٌ بِالْمَدِينَةِ عَلَى أَهْلِهِ مِنَ اللَّيْلِ، فَلَمَّا حُدِّثَ رَسُولُ اللهِ ﷺ بِشَأْنِهِمْ، قَالَ: ((إِنَّ هٰذِهِ النَّارَ عَدُوٌّ لَكُمْ، فَإِذَا نِمْتُمْ، فَأَطْفِئُوهَا)) (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رات کے کسی حصہ میں مدینہ منورہ کے ایک گھر میں آگ لگ گئی، دوسرے روز نبی کریم ﷺ کی خدمت میں اس کے حالات بیان کئے گئے، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آگ تمہاری دشمن ہے، اس لیے جب تم سونے لگو تو اس کو بجھادیا کرو۔

افادات:- نبی کریم ﷺ کا یہ حکم امر ارشادی کے قبیل سے ہے جو آپ نے ہماری دنیوی مصلحت کی وجہ سے فرمایا ہے۔ یعنی ایک دشمن دوسرے دشمن کے ساتھ جو معاملہ کرتا ہے کہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے دشمن کو جانی یا مالی نقصان پہنچائے، ایسے ہی آگ کے ذریعہ سے انسانوں کو جانی یا مالی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر چہ اس کے فوائد بھی ہیں؛ لیکن فوائد حاصل کرنے کے لیے اہتمام کرنا پڑتا ہے، تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں، جبکہ نقصان بغیر تدبیر کے بھی گلے پڑ جاتا ہے۔

اَلنَّارُ عَدُوٌّ، لَا یَرْحَمُ

پہلی مرتبہ جب حج کے لیے جانا ہوا تھا تو وہاں جگہ جگہ بورڈ لگے ہوئے دیکھے تھے: ’’اَلنَّارُ عَدُوٌّ، لَا یَرْحَمُ‘‘ ان لوگوں نے ایک جملہ اور بڑھا دیا۔ گویا دشمن اگر انسان ہو تو دشمن ہونے کے باوجود کبھی رحم کا معاملہ بھی کر دیتا ہے؛ لیکن آگ ایسا دشمن ہے جو کبھی بھی آپ کے ساتھ رحم کا معاملہ نہیں کرے گا۔

بہ غایتِ شفقت نبوی ہدایات

حدیث ۱۶۵۴:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ عن رسولِ اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قال: ((غَطُّوا الْإِنَاءَ، وَأَوْكِئُوا السِّقَاءَ، وَأَغْلِقُوا الْأَبْوَابَ، وَأَطْفِئُوا السِّرَاجَ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَحُلُّ سِقَاءً، وَلَا يَفْتَحُ بَاباً، وَلَا يَكْشِفُ إِنَاءً، فَإِنْ لَمْ يَجِدْ أَحَدُكُمْ إِلَّا أَنْ يَعْرُضَ عَلَى إِنَائِهِ عُوداً وَيَذْكُرَ اسْمَ اللهِ، فَلْيَفْعَلْ، فَإِنَّ الْفُوَيْسِقَةَ تُضْرِمُ عَلَى أَهْلِ الْبَيْتِ بَيْتَهُمْ.)) (رواہ مسلم)

((الْفُوَيْسِقَةُ)): الفَأْرَةُ. ((وَتُضْرِمُ)): تُحْرِقُ.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: برتن کو ڈھانپو، اور مشکیزہ کے منھ کو بند کرو، اور دروازوں کو بھی بند کر دو، اور چراغ کو بجھا دیا کرو، اس لیے کہ جس مشکیزے کے منھ کو بسم اللہ بول کر بند کیا گیا ہے؛ شیطان اس کو نہیں کھول سکتا، اور جس گھر کا دروازہ (کھڑکی) بسم اللہ بول کر بند کی ہے؛ شیطان اس کو

نہیں کھول سکتا۔اور جس برتن کو بسم اللہ بول کر بند کیا ہے اس کو بھی شیطان نہیں کھول سکتا۔اگر تم میں سے کسی کے پاس برتن کو ڈھانپنے کے لیے ڈھکّن نہیں ہے مگر کوئی لکڑی ہے تو وہی آڑی رکھ دے اور اس وقت اللہ کا نام لے لے (تب بھی مقصد حاصل ہو جائے گا۔اور حضور ﷺ نے چراغ کے متعلق جو ہدایت فرمائی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ) چوہا کبھی گھر میں آگ لگا دیا کرتا ہے۔

افادات:-اس روایت میں بھی نبیٔ کریم ﷺ نے غایتِ شفقت کی وجہ سے کچھ ہدایات ارشاد فرمائی ہیں۔

"برتن کو ڈھانپو" اس روایت میں اس ہدایت کے ساتھ اللہ کا نام لینے کا تذکرہ نہیں ہے۔یہاں اہلِ علم موجود ہیں جو جانتے ہیں اسی روایت میں آگے بسم اللہ کی قید بھی آرہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں راوی نے اگرچہ بسم اللہ کو ذکر نہیں کیا ہے لیکن یہی ہدایت دوسری روایتوں میں ہے ان میں یہ بھی ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر برتن کو ڈھانپو۔معلوم ہوا کہ اللہ کا نام لینے سے ہر جگہ یہ فائدہ حاصل ہو گا۔

نبیٔ کریم ﷺ نے رات کے وقت برتن کو ڈھانپنے کی بڑی تاکید فرمائی ہے تاکہ حشرات الارض اور کیڑے مکوڑوں وغیرہ کے کھانے پینے کے برتن میں گرنے سے حفاظت ہو جائے،اگر کبھی چھپکلی یا کسی اور جانور کی بیٹ دودھ یا پانی میں گر گئی اور اس کو استعمال کیا گیا تو وہ آدمی کے لیے مہلک ثابت ہوتا ہے۔

سال بھر کی کسی ایک رات میں بلائیں اُترتی ہیں

اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ بخاری و مسلم کی ایک روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سال بھر میں ایک رات ایسی آتی ہے جس میں بلائیں اُترتی ہیں، جو بھی برتن کھلا ہوا ہو اس میں وہ پیوست ہو جاتی ہیں، اور جس برتن کو اللہ کا نام لے کر ڈھانپا گیا ہو، اس میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس لیے اپنے برتنوں کو ڈھانپا کرو۔ اب چوں کہ وہ رات متعین نہیں ہے، اس لیے سال بھر میں کوئی بھی رات ہو سکتی ہے، لہٰذا حفاظتی تدبیر کا تقاضہ یہ ہے کہ سال بھر آدمی اپنے برتنوں کو ڈھانپنے کا اہتمام کرے۔ نبی کریم ﷺ کی امت کو یہ تاکید غایتِ شفقت کی وجہ سے ہے۔

مغرب کے وقت بچوں کو گھروں میں لے لو

روایتوں میں آتا ہے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب سورج غروب ہوتا ہے اور رات شروع ہوتی ہے تو اس وقت شیاطین زمین میں پھیلنا شروع ہوتے ہیں۔ گویا اب ان کی کارروائی اور "Activity" کا وقت شروع ہوا، شیاطین الانس بھی اور شیاطین الجن بھی اپنی کارروائیاں زیادہ تر اندھیرے میں ہی کرتے ہیں۔ اس لیے اگر تمہارے بچے باہر کھیل رہے ہوں تو سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ان کو گھر میں بلالو، جب رات کچھ پھیل جائے اور اندھیرا چھا جائے اس کے بعد کوئی حرج کی بات نہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ شیاطین جب اپنی شرارتوں کو پھیلانے کے لیے باہر نکلتے ہیں تو

اگر کبھی کسی بچے پر گزر ہو گیا تو اس پر ان کا اثر ہو جاتا ہے، اور عام طور پر بچے نجاست کا شکار ہوتے ہیں، پیشاب پائخانہ، پاکی ناپاکی کا ان کو خیال نہیں ہوتا، اور شیاطین سے حفاظت کے لیے جو اذکار و دعائیں نبیٔ کریم ﷺ نے امت کو سکھائی ہیں ان دعاؤں کا بھی چھوٹے بچے ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے اہتمام نہیں ہوتا، اس لیے ان پر شیطانی اثرات کا زیادہ امکان رہتا ہے، اس لیے اس وقت خاص طور پر بچوں کی حفاظت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے ہمارے یہاں معاملہ بالکل برعکس ہے، ایسا بچہ جو عام طور پر گھر سے باہر نہیں نکلتا وہ بھی خاص اسی وقت باہر نکلتا ہے اور گھر والے بھی اس کو گھر میں رکھنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ اس لیے عورتوں اور مردوں کو چاہیے کہ بچوں کو اس وقت گھر میں رکھنے کا بہت ہی زیادہ اہتمام کریں۔

شیطانی تہذیب سے بچنے کی راہ: اسلامی تعلیم و تربیت

میں نے اپنے گھر میں اپنے والد صاحب مرحوم کو دیکھا کہ وہ اس کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ مغرب سے پہلے ہی بچوں کو گھر میں بلا لیا کرتے تھے۔ پرانے زمانہ میں گھروں میں اس چیز کی خاص تاکید رہا کرتی تھی؛ لیکن اب یہ ساری اسلامی تعلیمات جو ہمارے سماج و معاشرہ میں عملی شکل میں موجود تھیں، دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہیں، اور والدین و اولیاء کی طرف سے اپنے چھوٹوں کو سمجھانے اور ان کی تربیت اور ان چیزوں کی طرف متوجہ کرنے کا وہ اہتمام جو پرانے لوگوں میں تھا؛ باقی نہیں رہا،

اس لیے ان کی جگہ پر غلط چیزیں پنپ رہی ہیں۔ ایک تو اسلامی تعلیمات باقی نہیں رہی، دوسرے اسلامی تربیت کا اہتمام نہیں رہا، اور پھر ٹی وی اور اب تو انٹرنیٹ نے معاملہ کو اور زیادہ خراب کر دیا جس کے نتیجہ میں شیطانی تہذیب معاشرہ و سماج میں پھیل رہی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے ان چیزوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے۔

جان، مال کی حفاظت کا آسان نسخہ

"مشکیزہ کے منھ کو بند کرو" اس زمانہ میں پانی رکھنے کے لیے مٹکے وغیرہ نہیں ہوتے تھے، بلکہ چمڑے کے بنے ہوئے چھوٹے بڑے مشکیزے ہوا کرتے تھے، ان کو لٹکا دیا جاتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے منھ کو بسم اللہ پڑھ کر بند کر دیا کرو۔

"دروازوں کو بند کر دو" اس کو بھی بسم اللہ پڑھ کر بند کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے اس سے آدمی کی جان کی حفاظت رہتی ہے اور مال کی بھی حفاظت رہتی ہے۔ اسی طرح کھڑکیاں بھی بند کی جائیں تو بسم اللہ بول کر بند کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ ویسے تو شیطان کو اللہ تعالیٰ نے بڑی طاقت دے رکھی ہے؛ لیکن یہ بھی قدرت کا نظام ہے کہ اگر آپ بسم اللہ پڑھ کر گھر کے دروازے کو بند کریں گے تو اس دروازے سے شیطان داخل نہیں ہو سکتا، اس دروازے کو کھولنے کی شیطان میں طاقت ہی نہیں۔ اسی طرح جس

برتن کو بسم اللہ بول کر ڈھانپا جائے گا اس کو بھی وہ نہیں کھول سکتا۔ کمرے کی الماری کو بسم اللہ بول کر بند کریں گے تو اس کو وہ نہیں کھول سکے گا۔ کتنا آسان نسخہ ہے!

دو واقعات

ہمارے حضرت سید مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری (رحمۃ اللہ علیہ) سے میں نے خود کئی مرتبہ یہ قصہ سنا کہ: ایک مرتبہ رات کو میری آنکھ کھلی تو میں نے ایک چھوٹے سے بچے کو دیکھا کہ اس نے نعمت خانہ (جس الماری میں کھانے پینے کا سامان رکھا جاتا ہے اُس زمانہ میں فریج تو ہوتے نہیں تھے) کا دروازہ کھولا اور اندر سے کھانے کی چیز نکال کر کھائی۔ دراصل وہ جن تھا، اور شیطان بھی جنات ہی کی قوم میں سے ہے، اور عام طور پر لفظ شیطان بول کر اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر بسم اللہ بول کر ان چیزوں کا اہتمام کیا جائے تو ایسی چیزوں سے حفاظت رہتی ہے۔

ایک ہمارے جاننے والے ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ مجھے بتلایا کہ گھر میں بڑی پریشانی رہتی تھی، لیکن جب سے حضور اکرم ﷺ کی اس تعلیم پر عمل کا اہتمام کیا کہ بسم اللہ بول کر گھر کا دروازہ بند کرنا شروع کیا؛ اس پریشانی سے نجات ملی۔ بعد میں کچھ عمل پڑھا تو معلوم ہوا کہ ایک جن تھا جو گھر میں آیا کرتا تھا، اور اس جن نے خود بتلایا کہ جس روز سے تم نے بسم اللہ بول کر گھر کا دروازہ بند کرنا شروع کیا، اس دن سے اندر داخل ہونے کی ہماری ہمت نہیں ہوتی۔

گھروں میں اس بات کا ماحول بناؤ

پرانے زمانے میں عورتیں اگرچہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوتی تھیں؛ لیکن ان کی عادت ہوا کرتی تھی کہ کوئی ڈبہ اُٹھاتیں، مثلاً آٹے کا ڈبہ کھولتیں، یا کوئی بھی کام کرنے جاتیں تو پہلے بسم اللہ بولنے کا اہتمام کرتی تھیں، اور آج کل پڑھی لکھی لڑکیاں ہوتی ہیں، لیکن تربیت نہ ہونے کی وجہ سے ان چیزوں کا اہتمام نہیں کرتیں۔ اگر شروع سے صحیح طور پر ان کی تربیت کی جائے اور باقاعدہ ان کو ان کے بولنے کی عادت ڈلوائی جائے تو پھر وہ بھی عادی ہو جائیں گی۔ اور پہلے زمانہ میں بڑی عورتیں ان اذکار کو موقعہ بموقعہ زور سے بولتی تھیں، اس کی وجہ سے چھوٹوں کو سیکھنے کا موقعہ ملتا تھا۔ لہٰذا اپنے گھروں میں اس ماحول کو عام کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ چھوٹے بڑے ان چیزوں کے عادی ہوں۔

بَاب النهی عَن التَّكَلُّفِ

وهو فعل وقول ما لا مصلحة فيه بمشقة

تکلّف کی ممانعت کا بیان

یعنی ایسا کوئی کام یا کوئی بات جس میں دینی یا دنیوی کوئی مصلحت نہ ہو؛ پھر بھی بلاوجہ مشقت اُٹھا کر ان کو کرنا

تکلّف کا سیدھا سادہ مطلب ہے ”بناوٹ کرنا“۔ آدمی کے دل میں جتنی سچائی اور سادگی ہوتی ہے، اتنا ہی وہ اپنے آپ کو بناوٹوں سے باز رکھتا ہے، اور اس میں جتنی کمی ہوتی ہے اتنی ہی وہ اپنی ہر چیز میں (بولنے میں، اپنی حرکت و سکون میں، لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں) بناوٹ کرتا ہے۔ بعض لوگ تو بولنے میں ایسی بناوٹ کرتے ہیں کہ ہر چھوٹا بڑا اس کو محسوس کرتا ہے۔ بناوٹ کا مطلب دھوکہ بازی نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی جو کہہ رہا ہے وہ بہ تکلّف کہہ رہا ہے۔ ایک تو آدمی کی طبیعت کا تقاضہ ہوتا ہے، جیسے مجھے آپ سے محبت ہے، اور میں یہ کہوں کہ بہت اچھا ہوا کہ آپ تشریف لائے، آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی۔ اب اگر میں نے یہ جملے سچائی کے ساتھ کہے ہیں، تو اس کا اثر سامنے والے پر ضرور ہوگا، اور وہ بھی اس کو محسوس کرے گا۔ ”از دِل خیزد بر دِل ریزد“

بات دل سے جو نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے
پَر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

اور اگر بناوٹ ہوگی تو چاہے آپ اس کے دماغ میں بھرنے کی کوشش کریں لیکن وہ اس کی کلّی کردے گا، اس کی طبیعت قبول ہی نہیں کرے گی، وہ سمجھ جائے گا کہ یہ سب بناوٹ کر رہا ہے، اور تکلّف کا معنیٰ بھی یہی ہے۔

حالاں کہ شریعت آپ کو اس بات کا مکلّف ہی نہیں کرتی کہ آپ بلاوجہ ایسی باتیں کریں۔ اگر آپ کے دل میں ایسی بات نہیں ہے، پھر بھی زبان سے ایسا ظاہر کرنا غلط طریقہ ہے۔ اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔ جو دل میں ہو وہی بولو۔

حضراتِ صحابہ کی شان

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس میں انہوں نے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان بیان کی ہے، اس میں ایک جملہ یہ بھی ہے: ''أَقَلُّهُمْ تَكَلُّفًا'' حضراتِ صحابہ لوگوں میں سب سے کم تکلّف والے تھے، یعنی ان کی طبیعتوں میں بناوٹ تھی ہی نہیں۔ آدمی کی طبیعت میں بھی جتنی سادگی اور سچائی ہوتی ہے اتنا ہی وہ بناوٹ سے دور ہوتا ہے، اسی لیے آپ دیہات کے اکثر لوگوں کو دیکھیں گے وہ بالکل سادہ مزاج ہوتے ہیں۔ اب تو وہاں بھی بہت کچھ بناوٹیں آگئی ہیں؛ لیکن دور دراز

کے بہت سے علاقے آج بھی ایسے ماحول و مزاج سے بچے ہوئے ہیں، ان کے دلوں میں جو ہوتا ہے وہی زبان سے ظاہر کر دیا کرتے ہیں۔ اس باب کو لا کر علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) یہی بتلانا چاہتے ہیں کہ ہر ایسا طرز اختیار کرنا- چاہے قولی ہو، یا عملی- جس میں بناوٹ ہو؛ اس کو شریعت پسند نہیں کرتی۔

مَیں بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں

باری تعالیٰ نے حضراتِ انبیاء کی شان بیان فرمائی ہے: ﴿قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَ مَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ. (ص: ۸۶) ﴾ اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ مَیں اللہ تعالیٰ کے جو احکام تم تک پہنچاتا ہوں اس پر کوئی معاوضہ اور اجر نہیں مانگتا، اور میں تکلّف اور بناوٹ کرنے والوں میں سے بھی نہیں ہوں۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں وہ اپنی طرف سے بناوٹ کر کے کہہ رہا ہوں کہ یہ ہدایات اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے نہیں ملیں؛ پھر بھی میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملی ہیں۔ بلکہ میں جو کچھ بھی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھے دیا گیا ہے، اور مجھے پابند کیا گیا ہے کہ میں ان چیزوں کو تم تک پہنچاؤں۔

تکلّف و بناوٹ سے منع کیا گیا

حدیث ۱۶۵۵:-

وعن عمر رضی اللہ عنہ قال: نُهِينَا عَنِ التَّكَلُّفِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہمیں تکلّف اور بناوٹ سے منع کیا گیا۔

افادات:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا یہ جملہ اس موقعہ کا ہے کہ ایک مرتبہ ان کی مجلس میں سورۂ عبس کی تفسیر کے سلسلہ میں ﴿وَفَاكِهَةً وَّأَبًّا﴾ کا تذکرہ آیا تو انہوں نے فرمایا: "فَاكِهَةٌ" (میوہ) کو تو ہم جانتے ہیں؛ لیکن یہ "أَبًّا" کیا چیز ہے؟ پھر فرمایا: اس کو اسی حال پر باقی رہنے دو، "نُهِينَا عَنِ التَّكَلُّفِ" کسی بھی چیز میں تکلّف کرنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔

آدمی کی طبیعت میں کسی کام کی صلاحیت موجود نہ ہو، پھر بھی وہ اس کا اظہار کرنے کی کوشش کرے کہ مجھ میں یہ صلاحیت موجود ہے، تو اس کی اجازت نہیں ہے، مثلاً: بعض علمی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے لیے آدمی کی طبیعت میں صلاحیت موجود نہیں ہوتی، پھر بھی وہ اس کا اظہار کرنا چاہتا ہو تو اس کی اجازت نہیں ہے۔ عام طور پر ہمارے محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ "بہت پُر تکلّف دعوت کی" یعنی میزبان کے اندر جس دعوت کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں تھی، پھر بھی اس نے اپنی طاقت سے زیادہ کا بوجھ اُٹھالیا، اسی کو "پُر تکلّف" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ بناوٹ ہی ہوئی نا! اگر حقیقت ہوتی تو جتنی حیثیت ہوتی اسی کے مطابق دعوت کرتا۔

اگر قناعت ہوتی تو مجھے اپنا لوٹا بیچنا نہ پڑتا

حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) کے یہاں ایک مہمان آیا، اس کی میزبانی کے لیے سوکھی روٹی کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا، انہوں نے اپنا لوٹا بیچا اور اس کے لیے کھانے کا انتظام کیا، جب مہمان صاحب کھانے سے فارغ ہوئے تو دعا کرنے لگے کہ: اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں جو کچھ موجود تھا اس پر قناعت کی توفیق عطا فرمائی۔ حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) کہنے لگے: اگر قناعت ہوتی تو مجھے اپنا لوٹا بیچنا نہ پڑتا۔

لاعلمی کا اظہار کر دینا علم کا تقاضہ ہے

حدیث ۱٦٥٦ :-

وعن مسروقٍ قال دَخَلْنَا علی عبدِ اللهِ بْنِ مَسعُودٍ رضی اللہ عنہم اجمعین فقال: يا أَيُّهَا النَّاسُ! مَنْ عَلِمَ شَيْئاً فَلْيَقُلْ بِهِ، وَمَنْ لَمْ يَعْلَمْ، فَلْيَقُلْ: اللهُ أَعْلَمُ، فَإِنَّ مِنَ العِلْمِ أَنْ يَقُولَ لِمَا لَا يَعْلَمُ: اللهُ أَعْلَمُ. قَالَ اللهُ تَعَالَى لِنَبِيِّهِ ﷺ: قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ وَمَا أَنَا مِنَ الْمُتَكَلِّفِينَ. (رواہ البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت مسروق بن اَجدع (جو حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہما) کے شاگردوں میں سے ہیں، وہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہما) کی خدمت میں حاضر ہوئے (اس وقت ان کے سامنے کسی واعظ کا قصہ نقل کیا کہ وہ اپنی تقریر میں کہہ رہا تھا کہ قیامت سے پہلے ایک دھواں نمودار ہوگا، گویا سورۂ دخان کی اس آیت: "يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ" میں جس دھویں کا تذکرہ ہے، اس سے اس

نے اسی کو مراد لیا) اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) (غصہ ہوگئے، اور) فرمایا: اے لوگو! آدمی جو کچھ جانتا ہو وہی بولے، اور جو آدمی کسی چیز کے بارے میں نہ جانتا ہو تو پھر (بناوٹ کرنے کی اور اپنے آپ کو جاننے والا ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صاف صاف) کہہ دے: اللہ تعالیٰ زیادہ جاننے والے ہیں۔ اس لیے کہ جس چیز کو آپ نہیں جانتے اس کے جواب میں یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے؛ یہی علم کا تقاضہ ہے۔ (جو حقیقی معنٰی میں عالم ہوگا وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے میں ذرہ برابر بھی شرم محسوس نہیں کرے گا) خود اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم ﷺ سے یہ فرمایا: اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ میں اللہ تعالیٰ کے پیغامات جو تم تک پہنچاتا ہوں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا، اور میں تکلّف و بناوٹ کرنے والوں میں سے نہیں ہوں (یعنی کوئی چیز نہ جانتے ہوئے بھی اپنی طرف سے باتیں بنانے والوں میں سے نہیں ہوں۔ حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی یہی حال تھا۔)

مفتی کے لیے پہلا ادب

افادات:- ہمارے یہاں افتاء میں مفتی بننے والوں کو جو آداب سکھائے جاتے ہیں، ان میں نمبر اول پر یہ بات بڑے اہتمام سے بتائی جاتی ہے کہ جو چیز آپ کو معلوم نہ ہو اس کے متعلق صاف کہہ دو کہ میں نہیں جانتا۔ آپ کے یہ جملہ ”میں نہیں جانتا“ کہنے کی وجہ سے آپ کے وقار اور قدر و قیمت میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے۔

ہمارے یہاں افتاء کرنے والے طلبہ سے میں پہلے ہی کہا کرتا ہوں کہ جس ذات کو (یعنی نبیٔ کریم ﷺ کو) اللہ تعالیٰ کی طرف سے سب سے زیادہ علم دیا گیا تھا ان کی طرف سے بھی کبھی یہ جواب دیا

جاتا تھا: ”لا اَدری“ مَیں نہیں جانتا؛ تو پھر ہما شما کا کیا ذکر ہو سکتا ہے! روایتوں میں حضورِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ”أُوتِيتُ عِلْمَ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ“ اگلوں اور پچھلوں کا سارا علم مجھے دیا گیا ہے۔

حضور ﷺ کا لاعلمی ظاہر کرنا

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم نے نبیٔ کریم ﷺ سے سوال کیا: ”أَيُّ الْبِقَاعِ أَفْضَلُ؟“ زمین کا کون ساخطہ سب سے بہتر ہے؟ اس کے جواب میں نبیٔ کریم ﷺ نے فرمایا: میں نہیں جانتا، جب جبرئیل آئیں گے تو میں ان سے پوچھوں گا۔ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے تو حضورِ اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا، انہوں نے کہا: میں نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ چناں چہ وہ گئے پھر آکر کہا: آج تو میں اللہ تعالیٰ سے اتنا قریب ہوا جتنا آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا، اور میں نے باری تعالیٰ سے پوچھا تو باری تعالیٰ نے فرمایا: ”خَيْرُ الْبِقَاعِ مَسَاجِدُهَا“ زمین کے بہترین خطے مسجدیں ہیں۔

ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، حضرت جبریل علیہ السلام انسانی شکل میں آئے اور کچھ سوالات کیے، آپ ﷺ نے اس کے جوابات دیے، لیکن اس وقت حضور ﷺ کو پتہ نہیں چلا کہ سوال کرنے والے حضرت جبریل علیہ السلام ہیں، ان کے اس مجلس سے اُٹھ کر چلے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتایا گیا۔ خیر! وہ اجنبی آدمی کی شکل میں آئے اور حضور ﷺ کے قریب آکر بیٹھ گئے اور سوالات کیے، ان میں ایک سوال یہ بھی کیا تھا: ”مَتَى السَّاعَةُ؟“ قیامت کب ہے؟ اس

کے جواب میں نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: "مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ" جس سے پوچھا گیا، وہ پوچھنے والے سے زیادہ جانتا نہیں ہے۔ یعنی جیسے تم نہیں جانتے کہ قیامت کب ہے، ویسے ہی میں بھی نہیں جانتا۔ اسی کو حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس آدمی سے کہا کہ جو چیز نہیں جانتے تو پھر کہہ دو کہ میں نہیں جانتا۔

آج کل ہمارے طبقۂ علماء میں بھی یہ چیز مصیبت کے طور پر آگئی ہے کہ بعض مرتبہ مسئلہ پورا معلوم نہیں ہوتا پھر بھی اٹکل اور اندازے سے بتانے کی کوشش کرتے ہیں، حالاں کہ اس پر بڑی سخت وعید آئی ہے۔

حضرت امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) کا قول

حضرت امام مالک (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے کئی سوالات کئے، ہر سوال کے جواب میں امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہی ارشاد فرمایا: "لَا أَدْرِيْ" تو وہ کہنے لگا کہ میں لوگوں سے جا کر کیا کہوں؟ حضرت امام مالک (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) نے فرمایا: ان سے کہہ دینا کہ مالک نے ہر سوال کے جواب میں "لَا أَدْرِيْ" کہا۔

بَاب تَحۡرِيمِ النِّيَاحَةِ عَلَى الۡمَيِّتِ وَلَطۡمِ الۡخَدِّ وَشَقِّ الۡجَيۡبِ وَنَتۡفِ الشَّعۡرِ وَحَلۡقِهٖ وَالدُّعَآءِ بِالۡوَيۡلِ وَالثُّبُوۡرِ

مرنے والے کے اوپر رونا چلّانا، گالوں کو طمانچے مارنا، گریبان پھاڑنا، بالوں کو نوچنا، بالوں کو منڈانا اور کسی کی موت پر اپنے لیے ہلاکت وموت کی بددعا کرنا حرام ہے

زمانۂ جاہلیت میں یہ سب چیزیں بہت عام تھیں کہ جب کسی کا انتقال ہو جاتا تو عام طور پر عورتیں بہت اہتمام سے لَے سے آواز نکال کر روتی تھیں۔ آج کل بھی پرانے طرز کے علاقوں میں ایسا ہوتا ہے اور جن لوگوں نے ایسے منظر دیکھے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کسی کے یہاں میّت ہو جاتی تو عورتیں باقاعدہ ان کے گھر پر رونے کے لیے جاتی تھیں۔ اور جب کسی دوسری بستی سے آرہی ہوتی ہیں تو عجیب معاملہ ہوتا ہے کہ آپس میں باتیں کرتی ہوئی آرہی ہوتی ہیں اور جہاں اس محلے کا نکّڑ آجاتا ہے کہ ایک دَم سے چلّانا شروع کر دیتی ہیں، اگر ان کے ساتھ چھوٹا بچہ ہوتا ہے تو وہ بھی ایک دم سے چونک کر

رونا شروع کر دیتا ہے؛ یہ سب بالکل بناوٹ ہوتی ہے۔ اور اس میں بھی گھوم گھوم کر روتی ہیں اور سینہ کوٹتی ہیں، اور اپنے گالوں پر طمانچے مارتی ہیں، بال بکھیر دیتی ہیں، کپڑے پھاڑ دیا کرتی ہیں، اور بالوں کو منڈا دیا کرتی ہیں، اور کبھی اپنے لیے بھی موت مانگتی ہیں کہ اس کی جگہ پر مَیں کیوں نہیں مر گئی؛ اسی کو نوحہ کہتے ہیں۔ در حقیقت اس میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر ایک طرح کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے اس کو حرام قرار دیا گیا ہے، اور یہ کبیرہ گناہوں میں سے ہے۔ احادیث میں اس پر بڑی سخت وعیدات آئی ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں اہلِ عرب میں ان چیزوں کا عام رواج تھا، لیکن چوں کہ ہمارے معاشرہ میں اس کا رواج نہیں ہے اس لیے ہمیں اس کا اندازہ نہیں۔ علامہ نووی (رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ) اس باب میں اس سلسلہ کی روایتوں کو پیش کرتے ہیں۔

نوحہ کی وجہ سے میت کو عذاب ہوتا ہے

حدیث ۱٦٥٧:-

عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ قال قال النّبِیّ ﷺ : المَيِّتُ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهِ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ. وَفِي رِوايَةٍ: مَا نِيحَ عَلَيْهِ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مرنے والے کو قبر میں عذاب دیا جاتا ہے اس چیز کی وجہ سے جس کی وجہ سے اس پر رویا جاتا ہے۔

افادات:۔ایک روایت بخاری شریف اور دیگر کتب حدیث میں ہے: "اِنَّ الْمَيِّتَ يُعَذَّبُ فِي قَبْرِهٖ بِبُكَآءِ أَهْلِهٖ عَلَيْهِ" میت کو اس کی قبر میں اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔

ایک اشکال

اب یہ اشکال ہوتا ہے کہ گھر والے روئیں تو اس کی وجہ سے میت کو کیوں عذاب ہو؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کے ساتھ جو معاملہ کیا جاتا ہے اس سلسلہ میں اسلام نے کچھ اصول و ضوابط بتلائے ہیں، قرآنِ پاک میں ہے: "لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی" کوئی جان دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔ مثلاً: کوئی گناہ اگر آپ نے کیا ہے تو اس کی سزا میں نہیں بھگتوں گا، اور اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو اس کی سزا آپ کو نہیں بھگتنی ہے۔ جب قرآنِ پاک نے یہ اصول بتلادیا تو پھر یہاں یہ کیوں کہا جارہا ہے کہ میت کو اس کی قبر میں اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے؛ یہ چیز بظاہر قرآنِ پاک کی اس آیت کے خلاف معلوم ہوتی ہے؟

پہلا جواب

چناں چہ بخاری و مسلم اور دوسری کتبِ حدیث میں روایت ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے جب یہ روایت نقل کی کہ میت کو اس کی قبر میں اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے عذاب

ہوتا ہے، تو یہ روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے پیش کی گئی۔ اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ابوعبدالرحمٰن (یعنی عبداللہ بن عمر) نے غلط نہیں کہا؛ لیکن ان کو ذرا سہو ہوگیا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ ایک یہودی کا انتقال ہوگیا تھا، نبی کریم ﷺ کا وہاں سے گزر ہوا اور اس کے گھر والے اس پر رو رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مرنے والے کو اس کے گھر والوں کے رونے کے باوجود عذاب ہو رہا ہے۔ اس روایت میں "بِبُکَآءِ أَهْلِهٖ" میں لفظ "باء" آیا ہے، اور یہاں اہلِ علم موجود ہیں جو جانتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے "باء" کو "مع" کے معنٰی میں لیا ہے، "مَعَ بُکَآءِ أَهْلِهٖ" اب ترجمہ یہ ہوگا: گھر والوں کے رونے کے باوجود۔ گویا حضور اکرم ﷺ یہ بتلانا چاہتے تھے کہ گھر والے رو رہے ہیں لیکن ان کے رونے سے اس کو کیا فائدہ ہوا، ان کے رونے کے باوجود اس کو اپنے گناہوں کی وجہ سے جو سزا ہو رہی ہے اس کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر آپ کسی کے لیے روتے ہوں اور آپ کے رونے کی وجہ سے اس کو کوئی فائدہ پہنچتا ہو؛ تو کوئی بات بھی ہے! لیکن یہاں تو آپ کے رونے کی وجہ سے اس کی سزا میں ذرّہ برابر کمی نہیں آتی۔ گویا اس کو عذاب ان رونے والوں کے رونے کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ عذاب تو اس کی بدعملی کی وجہ سے ہوتا ہے۔

دوسرا مطلب

یہ تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد- کہ گھر والوں کے رونے کی وجہ سے مرنے والے کو عذاب ہوتا ہے- صرف حضرت ابن عمر (رضی اللہ عنہما) سے ہی نہیں، بلکہ بہت سارے صحابہ سے منقول ہے، اس لیے حضراتِ محدثین نے دونوں روایتوں کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں کا مطلب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ چناں چہ امام بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے کتاب الجنائز میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ اگر مرنے والا بھی ایسا ہی کرتا تھا (یعنی وہ بھی مرنے والوں پر رویا کرتا تھا) تو اس کو سزا ہوگی۔ گویا اسی نے یہ سلسلہ جاری کیا اور اب اس کے گھر والے اسی کی عملی تعلیم کی وجہ سے رو رہے ہیں، گویا اس کے گھر والوں کے رونے کا سبب یہ خود ہی بنا اس وجہ سے اس کو سزا ہوگی۔ اس لیے کہ حدیثِ پاک میں آتا ہے: ”مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا“ جس آدمی نے کوئی غلط طریقہ جاری کیا تو اس کی سزا اس کو بھگتنی پڑے گی، اور آئندہ اس غلط طریقہ پر جتنے لوگ چلیں گے اس کا عذاب بھی اس کو بھگتنا پڑے گا۔ یہاں بھی اس نے اپنے عملی طریقہ سے اپنے گھر والوں کی غلط تربیت کی تھی اور آج اس کے گھر والے اس لیے رو رہے ہیں کہ وہ خود بھی ایسا ہی کرتا تھا تو گھر والوں کا رونا اس کے رونے کی وجہ سے ہے؛ اس لیے اس کو عذاب ہوگا۔

تیسرا مطلب

اور بعض حضراتِ علماء یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جبکہ اس نے ایسی وصیت کی ہو۔ زمانۂ جاہلیت میں لوگ باقاعدہ اس بات کی وصیت کیا کرتے تھے، آج بھی بعض جگہوں پر ایسی وصیت کی جاتی ہے کہ میرے مرنے کے بعد خوب رونا، تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ فلاں کا انتقال ہوا ہے۔

چوتھا مطلب

بعضوں نے کہا کہ: گھر والوں کے مزاج، ان کی طبیعت اور ان کے درمیان زندگی گزارنے کی وجہ سے اس کو یقین اور اندازہ ہے کہ میرے مرنے کے بعد وہ لوگ زور زور سے روئیں گے، شکوے شکایتیں کریں گے تو پھر اس کی ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ پہلے سے تاکید کر دے کہ میرے مرنے کے بعد رونا مت۔ اب یہ جانتے ہوئے بھی اس نے تاکید نہیں کی تو اس صورت میں اس کو عذاب ہو گا؛ ورنہ نہیں۔ باقی اگر اس نے تو اس بات کی تاکید کی تھی کہ رونا مت، اس کے باوجود گھر والے رو رہے ہیں، تو اس کے ساتھ عذاب کا معاملہ نہیں کیا جائے گا۔

روایتِ مذکورہ بالا کا مطلب

یہاں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) "بِبُكَآءِ أَهْلِهٖ" والی روایتیں لائے ہی نہیں، بلکہ "بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ" والی روایت لائے ہیں، اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ رونے والے اس کی جن خوبیوں کا تذکرہ کر کے روتے ہیں، انہیں کے ذریعہ سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔

زمانۂ جاہلیت میں بعض ایسے کام جو حقیقت میں تو گناہ کے کام ہوتے تھے لیکن ان کو وہ لوگ خوبی کے کام سمجھتے تھے، اورانہیں کو بیان کر کے رویا جاتا تھا، جیسے: ایک آدمی اپنے قبیلے کا سردار تھا، اوراپنی سرداری کی وجہ سے قبیلہ والوں پر ظلم ڈھایا کرتا تھا، اب اس کے مرنے کے بعد رونے والیاں یہ کہتے ہوئے رورہی ہیں کہ "ارے تیرا تو ایسا رعب و دبدبہ تھا کہ کس کی ہمت تھی جو تیرے سامنے بولے، جس کو چاہے تو مار دیتا تھا۔ اب یہ کوئی اچھی بات تھوڑے ہی تھی، بلکہ یہ تو ظلم تھا؛ لیکن وہ عورتیں اسی کو خوبی سمجھ کر بیان کرتی تھی۔

اسی طرح کوئی آدمی اپنی بہادری و قوت کو غلط کاموں میں اور ظلم و ستم میں استعمال کرتا تھا، اس کے مرنے کے بعد رونے والیاں یوں کہتے ہوئے روئیں کہ تو ایسی ہمت والا تھا کہ کسی کو دو گالیاں دیدے، اور کسی کو دو طمانچے ماردے، کسی کی زمین چھین لے؛ تو کون تھا جو تجھے جواب دے سکے، اور کس

کے اندر ہمت تھی کہ تیر امقابلہ کر سکے۔ تو اب گالیاں دینا اور طمانچے مارنا اور کسی کی زمین چھین لینا کوئی نیکی کا کام تھوڑا ہی تھا! لیکن وہ اس کو خوبی کے طور پر بیان کر رہی ہیں۔

یا کوئی آدمی پیسے والا تھا اور اپنے پیسوں کو غلط جگہوں پر استعمال کرتا تھا، اب اسی بات کو وہ خوبی کے طور پر بیان کرتے ہوئے روئیں۔ تو حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ جن چیزوں کو وہ خوبی کے طور پر بیان کرکے رو رہی ہیں، انہیں چیزوں پر تو اس کو عذاب ہو رہا ہے۔ ''بِمَا نِیحَ عَلَیْہِ'' کا یہی مطلب ہے۔

اور بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رونے والی عورتیں کبھی یوں کہا کرتی تھیں: ''وَاجَبَلَاہُ، وَاکَرُبَاہُ، وَانَاصِرَاہُ'' ہائے میرا پہاڑ، ہائے میری جائے پناہ ہائے میرا مددگار۔ تو فرشتے اس کو وہی الفاظ کہتے ہوئے عذاب دیتے ہیں۔ چناں چہ آگے حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہما) کی روایت آئے گی کہ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین جو انصار میں سے ہیں اور غزوۂ موتہ کے موقعہ پر شہید ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ وہ بہت سخت بیمار ہوئے، بے ہوش ہوگئے اور سب کو یہ اندیشہ ہوا کہ اسی بیماری میں موت ہو جائے گی، تو ان کی بہن عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا یہ کہتے ہوئے ''وَاجَبَلَاہُ، وَاکَرُبَاہُ'' رونے لگیں، جب حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ ہوش میں آئے تو اپنی بہن سے کہنے لگے: اس وقت دو فرشتے میرے پاس لوہے کا گُرز لے کر کھڑے تھے، جب تو کہتی تھی: ''وَاجَبَلَاہُ'' تو وہ فرشتے مجھ سے پوچھتے تھے کہ: ہیں! تو ایسا ہے؟ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو وہ لوہے کے گُرز سے میری خبر لے لیتے۔

وہ ہم میں سے نہیں

حدیث ۱٦۵۸ :-

وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ- قال: قال رسولُ اللہِ- صلی اللہ علیہ وسلم -: ((لَيْسَ مِنَّا مَنْ ضَرَبَ الخُدُودَ، وَشَقَّ الجُيُوبَ، وَدَعَا بِدَعْوَى الجَاهِلِيَّةِ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اپنے گالوں پر طمانچے مارے، اور اپنے گریبانوں کو پھاڑا، اور زمانۂ جاہلیت میں جیسی باتیں کہی جاتی تھی ویسی باتیں اپنی زبان سے کہیں؛ وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

میں اس سے بری ہوں

حدیث ۱٦۵۹ :-

وَعَنْ أبي بُرْدَةَ قال: وَجعَ أبو مُوسَى، فَغُشِيَ عَلَيْهِ وَرَأْسُهُ فِي حِجرِ امْرَأَةٍ مِنْ أهْلِهِ، فَأَقْبَلَتْ تَصِيحُ بِرَنَّةٍ فَلَمْ يَسْتَطِعْ أنْ يَرُدَّ عَلَيْهَا شَيْئاً، فَلَمَّا أفَاقَ قَالَ: أنَا بَرِيءٌ مِمَّنْ بَرِئَ مِنْهُ رسُولُ اللهِ - صلی اللہ علیہ وسلم - إنَّ رسُولَ اللهِ - صلی اللہ علیہ وسلم - بَرِئٌ مِنَ الصَّالِقَةِ، والحَالِقَةِ، والشَّاقَّةِ. (متفق عليه)

((الصَّالِقَةُ)): الَّتِي تَرْفَعُ صَوْتَهَا بِالنِّيَاحَةِ والنَّدْبِ. ((وَالحَالِقَةُ)): الَّتِي تَحْلِقُ رَأْسَهَا عِنْدَ المُصِيبَةِ. ((وَالشَّاقَّةُ)): الَّتِي تَشُقُّ ثَوْبَهَا.

ترجمہ:-حضرت ابوبردہ اشعری (رضی اللہ عنہ) (حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) کے صاحبزادے) فرماتے ہیں کہ میرے والد حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے، اسی بیماری میں ان پر بے ہوشی کا دورہ پڑا (اور یہ اندیشہ ہوا کہ اسی بیماری میں ان کی موت ہو جائے گی) اس وقت ان کا سر ان کی بیوی کی گود میں تھا (ان کی یہ کیفیت دیکھ کر) وہ عورت ایک مخصوص لہجہ کے ساتھ رونے لگی (چوں کہ ان پر تو نیم بے ہوشی کی حالت طاری تھی، اس لیے اس بات کا احساس تو تھا کہ یہ عورت رو رہی ہے، لیکن اپنی نیم بے ہوشی کی وجہ سے اس کو کچھ کہہ نہیں سکتے تھے) تو اس حالت میں اس کو روک نہیں سکتے تھے (اس لیے اس کی تردید نہیں کرسکے، لیکن) جب پورے طور پر ہوش میں آگئے تو انہوں نے کہا: جس سے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ نے براءت ظاہر فرمائی، اس سے میں بھی بری ہوں، اور نبی کریم ﷺ "صَالِقَه" اور "حَالِقَه" اور "شَاقَّه" سے بری ہیں۔

افادات:-رونے والیوں کی جو مخصوص لَے اور لہجہ ہوتا ہے اس کے مطابق رونے کو "رَنَّةٌ" کہتے ہیں۔

"صَالِقَه" رونے والی جو مرنے والے پر اپنی آواز کو مخصوص انداز میں بلند کرتی ہے۔

"حَالِقَه" جو عورت مرنے والے کی موت پر اپنے سر کے بال منڈوا دیتی ہے۔ اس زمانہ میں عورت اپنے عزیز قریب، شوہر وغیرہ کی موت پر ترکِ زینت میں اپنے سر کے بال منڈوا دیتی تھی۔

"شَاقَّه" وہ عورت جو اپنے کپڑوں کو پھاڑ دے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مرنے والے کی موت پر نوحہ کرتے ہوئے اور غم کا اظہار کرتے ہوئے زور زور سے رونا، اپنے بالوں کو مونڈ دینا، اپنے کپڑوں کو پھاڑنا؛ اس سے نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اپنی براءت کا اعلان فرمایا کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی مرد اگر ایسے کام کرے تو اس کے لیے یہ وعید نہیں ہے، لیکن چوں کہ عام طور پر ایسی حرکتیں عورتیں ہی کیا کرتی ہیں، اس لیے ان کا تذکرہ آیا، ورنہ اگر ایسی حرکت کوئی مرد بھی کرے گا تو اس کے لیے بھی یہی وعید ہے۔

انہیں کرتوتوں کی وجہ سے عذاب ہوگا

حدیث ١٦٦٠:-

وعن المغيرة بن شعبة رضی اللہ عنہ قال: سمعتُ رسُولَ اللهِ- صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم -يقولُ: ((مَنْ نِيحَ عَلَيْهِ، فَإِنَّهُ يُعَذَّبُ بِمَا نِيحَ عَلَيْهِ يَومَ القِيَامَةِ)).(متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی پر نوحہ کیا گیا (یعنی اس کی موت پر عورتیں اس کے کرتوتوں کو خوبیاں سمجھ کر گنوا کر روئیں) تو قیامت کے روز اس کو انہیں کرتوتوں کی وجہ سے عذاب ہوگا۔

افادات:-میں حدیث نمبر:۱۶۵۷ کے ذیل میں بتلاچکاہوں کہ بہت سی مرتبہ عورتیں مرنے والے کے ان کرتوتوں کا تذکرہ کرتی تھیں جن کو وہ اپنے خیال اورزعم میں مرنے والے کے کمالات سمجھتی تھیں،اور حقیقت میں وہ کمال وخوبی نہیں ہوتی۔اوپر تفصیل گزرچکی ہے۔

ہم نوحہ نہ کریں گی

حدیث ۱۶۶۱ :-

وعن أُمِّ عَطِيَّةَ نُسَيْبَةَ -بِضَمِّ النون وفتحها- رضى الله عنها قالت: أَخَذَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ -صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ- عِندَ البَيْعَةِ أَنْ لاَ نَنُوحَ. (متفق عليه)

ترجمہ:-حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا (جن کا نام نُسَیبَہ ہے۔) فرماتی ہیں کہ جب ہم نے نبیٔ کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کی تو اس وقت آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہم سے جن چیزوں کا وعدہ لیا اس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ہم مرنے والوں کی موت پر نوحہ نہ کریں گی۔

افادات:-چوں کہ عام طورپر عورتیں ایساکرتی تھی،اس لیے نبیٔ کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عورتوں سے بیعت لیتے وقت خاص طورپر نوحہ کا تذکرہ بھی فرماتے تھے۔بیعتِ توبہ میں انہیں چیزوں کو گنوایا جاتا ہے جن کا عام طورپر ارتکاب کیا جاتا ہو۔

فرشتے کہتے ہیں: تو ایسا ہے؟

حدیث ۱٦٦٢ :-

وعن النعمان بن بشير - رضى الله عنهما - قال: أُغْمِيَ عَلَى عَبدِاللهِ بْنِ رَوَاحَةَ - رضى الله عنه - فَجَعَلَتْ أُخْتُهُ تَبْكِي، وَتَقُولُ: وَاجَبَلَاهُ، وَاكَذَا، وَاكَذَا: تُعَدِّدُ عَلَيْهِ. فقالَ حِينَ أَفَاقَ: مَا قُلْتِ شَيْئاً إِلاَّ قِيلَ لِي أَنْتَ كَذَلِكَ؟!. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ پر بیماری میں بے ہوشی کا دورہ پڑا (اور لوگوں کو خیال ہوا کہ شاید اسی بیماری میں وہ چل بسیں گے) تو ان کی بہن رونے لگی (یہاں انہوں نے اپنی والدہ نہیں کہا، اس لیے کہ وہ اس وقت ان کی بہن ہونے کی حیثیت سے رو رہی تھیں، اس لیے کہا کہ ان کی بہن رونے لگی۔ اگر وہ یوں کہتے کہ میری والدہ رونے لگی، تو کس کو پتہ چلتا کہ وہ کیوں رو رہی تھی) اور (زمانۂ جاہلیت کے دستور کے مطابق روتے ہوئے) کہنے لگی: ہائے! میرا پہاڑ (ہائے! میری جائے پناہ) ہائے! فلاں، ہائے! فلاں (یعنی) ان کی خوبیاں گنوا رہی تھی (اس وقت وہ بے ہوش تھے، اور اس وقت اللہ تعالیٰ نے دو فرشتے لوہے کے گرز لے کر بھیجے تھے) جب وہ ہوش میں آئے تو انہوں نے اپنی بہن سے کہا: جب بھی تو اس قسم کا کوئی جملہ بولتی تھی تو (وہ دو فرشتے لوہے کے گرز دکھا کر) مجھ سے کہتے تھے کہ: تو ایسا ہے؟ (اگر میں ہاں کہہ دیتا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ اس گرز سے میری خبر لیتے۔)

افادات:- حضرت نعمان بن بشیر (رضی اللہ عنہ) حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے بھانجے ہوتے ہیں، ان کی والدہ عَمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہا حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں۔ اسی بیماری میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی بیماری کی شدت و کیفیت دیکھتے ہوئے دعا فرمائی تھی کہ: اے اللہ! اگر اس بیماری میں ان کے لیے موت ہے تو ان کو عافیت کے ساتھ موت دے؛ ورنہ ان کو شفا عطا فرما۔ لکھا ہے کہ یہ دعا فرماتے ہی فوراً شفا کے آثار شروع ہو گئے اور پھر وہ تندرست ہو گئے، بعد میں غزوۂ مؤتہ کے موقعہ پر شہید ہوئے۔ بخاری شریف میں ہے کہ جب ان کی شہادت کی اطلاع آئی اور ان کی بہن کو خبر ہوئی تو پھر انہوں نے نوحہ نہیں کیا۔

روایت کے سبق

حضراتِ صحابۂ کرام کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی چاہے وہ مرد ہوں یا عورت؛ کسی بات پر جب ان کو تنبیہ کر دی جاتی تھی تو پھر دوبارہ ان کی طرف سے اس چیز کا صدور نہیں ہوتا تھا۔

اور یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی بیمار کی بیماری ایسی شدت اختیار کر جائے کہ اس کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہو، اور دیکھنے والوں کے لیے بھی تکلیف کا باعث ہو کہ ان سے بھی دیکھا نہ جاتا ہو، تو اس موقعہ پر ایسی دعا کی جاسکتی ہے کہ اس بیماری میں اس کے لیے موت مقدر ہے تو عافیت کے ساتھ اس کو موت دیدے، ورنہ اس کو شفا عطا فرما۔ لیکن سب کے سنتے ہوئے ایسی دعا نہ کی جائے۔

نوحہ کے جملوں کے مطلب

جس شخصیت کا وجود مصیبت کے وقت کسی دوسرے کے لیے پناہ کا ذریعہ ہو اس کی موت پر عام طور پر عورتیں یہ جملہ کہا کرتی تھی: ”وَاجَبَلَاهُ“ ہائے! میرے لیے پہاڑ کی طرح تھا۔ اور بہت سی مرتبہ یہ بھی کہتی تھی: ”وَاكَاسِيَاهُ“ ہائے! مجھے کپڑے پہنانے والا۔ ”وَامُطْعِمَاهُ“ ہائے! مجھے کھلانے والا۔ مطلب یہ کہ تو چلا گیا تو اب ہماری ضرورتیں کون پوری کرے گا؟ ہم کس کی پناہ حاصل کریں گے؟ کس سے مدد چاہیں گے؟ اب ہمارا کیا ہوگا؟ جب آدمی کی نظر کسی پر ہوتی ہے تو ایسے جملے بولا کرتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ پر نظر ہو تو پھر ایسا کہنے کی نوبت نہ آئے۔

آنسو اور غم سببِ عذاب نہیں

حدیث ۱۶۶۳:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما، قال: اشْتَكَى سَعْدُ بْنُ عُبَادَةَ -رضی اللہ عنہ- شَكْوَى، فَأَتَاهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ يَعُودُهُ مَعَ عَبْدِ الرَّحمانِ بْنِ عَوفٍ، وَسَعْدِ بن أبي وقَّاصٍ، وعبدِ اللهِ بن مسعودٍ -رضی اللہ عنہم-. فَلَمَّا دَخَلَ عَلَيْهِ، وَجَدَهُ فِي غَشْيَةٍ. فَقَالَ: ((أَقَضَى؟)) قالوا: لا يا رسول اللهِ، فَبَكَى رسولُ اللهِ- ﷺ -. فَلَمَّا رَأَى القَوْمُ بُكَاءَ النَّبِيِّ - ﷺ - بَكَوْا، قال: ((أَلاَ تَسْمَعُونَ؟ إنَّ اللهَ لاَ يُعَذِّبُ بِدَمْعِ العَيْنِ، وَلاَ بِحُزْنِ القَلْبِ، وَلكِنْ يُعَذِّبُ بِهذَا)) -وَأَشَارَ إِلَى لِسَانِهِ- أَوْ يَرْحَمُ)). (متفق علیہ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بیمار ہوئے (جب نبی کریم ﷺ کو پتہ چلا تو) آپ ﷺ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی کی عیادت کے لیے آدمی تنہا بھی جاسکتا ہے، اور کچھ لوگوں کے ساتھ بھی جاسکتا ہے) جب نبی کریم ﷺ ان کے پاس پہنچے تو ان کو بے ہوشی کی حالت میں پایا۔ حضور اکرم ﷺ نے وہاں موجود لوگوں سے پوچھا: کیا ان کا انتقال ہو گیا؟ لوگوں نے جواب دیا: اے اللہ کے رسول! نہیں! (بلکہ بیہوش ہیں ۔ان کی اس کیفیت کو دیکھ کر) نبی کریم ﷺ کو رونا آگیا۔ جب ساتھ والوں نے نبی کریم ﷺ کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ سب بھی رو پڑے۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سنو! اللہ تعالیٰ آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کی کیفیت کی وجہ سے عذاب نہیں دیتے، اور زبان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: لیکن اس کی وجہ سے عذاب دیتے ہیں، یا اس کی وجہ سے رحم بھی کرتے ہیں۔

افادات:- انصار کے دو قبیلے تھے: اوس اور خزرج، حضرت سعد بن عبادہ (رضی اللہ عنہ) قبیلۂ خزرج کے سردار تھے، اور حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) قبیلۂ اوس کے سردار تھے۔

کسی کے انتقال پر آدمی کے دل میں غم کی کیفیت طاری ہو جائے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں؛ تو یہ غیر اختیاری چیز ہے، اور اس سے شریعت نے منع نہیں کیا ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے دل میں اپنے بندوں کے ساتھ رحمت، محبت و شفقت کا جو جذبہ رکھا ہے، یہ تو اس کا تقاضہ ہے۔ اور

صرف انسانیت کا رشتہ ہی نہیں بلکہ دوسرے رشتے بھی ہوتے ہیں جیسے: مذہبی رشتہ۔ اور نسبی رشتہ، جیسے: باپ بیٹے کا اور بھائی بھائی کا رشتہ ہوتا ہے۔ گویا مختلف حیثیتوں کے تعلقات کی وجہ سے آدمی کے دل میں محبت کا جذبہ ہوتا ہے، اور اس کی وجہ سے سامنے والے کی تکلیف یا موت پر دل میں غم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور اس کا ظہور آنسوؤں سے ہوتا ہے جو ہمیں نظر آتا ہے

حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ: آنکھوں کے آنسو اور دل کے غم کی وجہ سے رونے والے کو اور جس کی وجہ سے رویا جا رہا ہے؛ دونوں کو اللہ تعالیٰ عذاب نہیں دیتے۔ لیکن اگر زبان سے کوئی ایسا جملہ نکالا جو اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر ناراضگی کی دلیل بن سکتا ہے، جیسے: بعض عورتیں کہتی ہیں: میرا ہی بیٹا ملا، کوئی اور نہ دکھا، وغیرہ، بعض عورتیں تو اس سے بھی سخت جملے بولتی ہیں؛ یہ جملے اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سبب بنتے ہیں۔ اور کبھی کوئی ایسا جملہ بولتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر رضامندی اور تسلیم کا پتہ دیتا ہے، جیسے: اللہ تعالیٰ کی چیز تھی، ہمارے پاس امانت تھی، اس کا حکم ہوا تو اس نے ہم سے واپس لے لی۔ تو جیسے غلط جملے زبان سے نکلتے تھے، ایسے ہی اچھے جملے بھی زبان ہی سے نکلتے ہیں؛ تو صحیح باتوں کے نکلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ رحمت کا معاملہ کرے گا، اور غلط چیزوں کے نکلنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ عذاب کا معاملہ کرے گا۔

تارکول کالباس اور خارش کا کرتہ

حدیث ۱۶۶۴ :-

وعن أبي مالك الأشعري رضى الله عنه قال: قال رسولُ اللهِ ﷺ : ((النَّائِحةُ إذا لَمْ تَتُبْ قَبلَ مَوْتِهَا تُقَامُ يومَ القِيامَةِ وَعَلَيْهَا سِرْبَالٌ مِنْ قَطِرَانٍ، وَدِرْعٌ مِنْ جَرَبٍ)).(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو مالک اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: نوحہ کرنے والی اگر موت سے پہلے پہلے اپنے اس گناہ سے توبہ نہیں کرے گی تو قیامت کے روز وہ لوگوں کے سامنے ایسی حالت میں کھڑی کی جائے گی کہ اس کے جسم پر تارکول کا لباس ہو گا، اور خارش کا کرتہ ہو گا۔

افادات:- "قَطِرَان" یعنی تارکول، جس کو ہم "ڈامر" کہتے ہیں، وہ بہت جلدی آگ پکڑ لیتا ہے۔ بعض حضرات نے "قَطِرَان" کا ترجمہ گندھک سے بھی کیا ہے، وہ بھی جلدی سے آگ پکڑتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ پہاڑوں پر چِیڑ کا ایک درخت ہوتا ہے جو بہت لمبا ہوتا ہے، اس کا تیل بھی بہت جلدی آگ کو پکڑ لیتا ہے۔ اس کو آتش گیر مادہ کہہ لو۔ آج کل پیٹرول، ڈیزل اور گیس کی ٹرکوں کے اوپر "Inflammable" لکھا ہوا ہوتا ہے، "قَطِرَان" کا مطلب یہی ہوتا ہے۔

”اس کو تارکول کا لباس پہنایا جائے گا اور خارش کا کرتہ ہوگا“ مطلب یہ ہے کہ پورا جسم خارش میں مبتلا ہوگا۔ آدمی کو بدن میں اگر تھوڑی سی جگہ پر بے چین کرنے والی خارش ہو جاتی ہے تو کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے، اور اگر پورے جسم پر خارش ڈال دی جائے تو یہی اس کے لیے ایک مستقل عذاب ہو جائے گا۔

عورتوں سے بوقتِ بیعت چند کلمات

حدیث ۱٦٦٥:-

وعن أَسِيد بن أبي أَسِيدٍ التابِعِيِّ، عن امْرَأَةٍ مِنَ المُبَايِعاتِ، قالت: كان فِيما أخذَ علَيْنَا رسُولُ اللهِ- صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - فِي المَعْرُوفِ الَّذِي أخَذَ علَيْنَا أنْ لاَ نَعْصِيَهُ فِيهِ: أنْ لا نَخْمِشَ وَجْهاً، ولاَ نَدْعُوَ وَيْلاً، ولاَ نَشُقَّ جَيْبًا، وأنْ لاَ نَنْشُرَ شَعْراً. (رواه أبو داود بإسناد حسن.)

ترجمہ:- حضرت اَسِید بن ابو اَسِید تابعی (رحمۃ اللہ علیہ) ایک ایسی صحابیہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتے ہیں جنھوں نے نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سے بیعت کی تھی، ان صحابیہ نے فرمایا کہ: نبیٔ کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ہم عورتوں سے بیعت لیتے وقت ہم سے وعدہ لیا تھا کہ چند کاموں میں ہم آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی نافرمانی نہیں کریں گی؛ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ کسی کی موت پر ہم اپنے چہروں کو زخمی نہ کریں گی، اور ہم اپنے لیے ہلاکت نہ مانگیں گی، اور ہم گریبان نہ پھاڑیں گی، اور بالوں کو نہ پھیلائیں گی۔

افادات:- قرآنِ پاک میں جہاں مؤمنات عورتوں سے بیعت کا تذکرہ ہے، اس میں ایک بات یہ بھی ہے: ﴿وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ﴾ نیکی کے کاموں میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ وہاں علماء نے لکھا ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کسی کو کوئی چیز کا حکم دیں گے تو یقیناً وہ نیکی ہی کا حکم ہے۔

اس روایت میں چار چیزوں کا تذکرہ آگیا (۱) چہرے کو نوچنا (۲) اپنے لیے ہلاکت و موت کی دعا کرنا (۳) گریبان پھاڑنا (۴) بالوں کو منتشر کرنا، بھوتنی بن جانا؛ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر ناراضگی کو ظاہر کرتی ہیں، اس لیے ان سے منع کیا گیا ہے۔

کیا تو ایسا ہی تھا؟

حدیث ۱٦٦٦:-

وعن أبي موسىٰ رضي الله عنه: أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قال: ((مَا مِنْ مَيِّتٍ يَمُوتُ فَيَقُومُ بَاكِيهِمْ فَيَقُولُ: وَاجَبَلَاهُ وَاسَيِّدَاهُ، أَوْ نَحْوَ ذٰلِكَ، إِلَّا وُكِّلَ بِهِ مَلَكَانِ يَلْهَزَانِهِ: أَهٰكَذَا كُنْتَ؟)) (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

((اللَّهْزُ)): اللَّدْغُ بِجُمْعِ الْيَدِ فِي الصَّدْرِ.

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی مر جاتا ہے اور کوئی رونے والا کھڑا ہوتا ہے، اور نوحہ کرتے ہوئے وہ یوں کہتا ہے: ہائے! میرا پہاڑ۔ ہائے! میرا آقا،

وغیرہ؛تو دو فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کئے جاتے ہیں جو اپنے مکّوں سے مرنے والے کے سینے پر مارتے ہیں اور اس سے کہتے ہیں: کیا تو ایسا ہی تھا؟

افادات:- گویا ان کا بطور نوحہ کے رونا اس میت کے لیے عذاب کا ذریعہ بنتا ہے۔

دو بڑے گناہ

حدیث ١٦٦٧:-

وعن أبي هريرة-رضي الله عنه-قال:قال رسولُ اللهِ- صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -: ((اثْنَتَانِ فِي النَّاسِ هُمَا بِهِمْ كُفْرٌ: الطَّعْنُ فِي النَّسَبِ،وَالنِّيَاحَةُ عَلَى المَيِّتِ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں دو کام ایسے ہیں جو ان کے لیے کفر کی طرح ہیں۔ ایک تو لوگوں کے نسب میں طعن کرنا، اور مرنے والے پر نوحہ کرنا۔

افادات:- جیسے کفر بڑا گناہ ہے، ایسے ہی یہ دونوں بھی بڑے گناہ ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان دونوں کو اگر کوئی آدمی حلال سمجھ کر کرے گا تو وہ کفر تک پہنچ جائے گا (۱) کسی کے نسب کے بارے میں الزام لگانا، مثلاً یوں کہنا کہ: وہ تو اس کے باپ کا نہیں ہے (۲) اور مرنے والے پر بَین کر کے رونا۔

باب النَّهي عن إتيان الكُهّان والمنجِّمين والعُرَّاف وأصحاب الرمل والطوارق بالحصى وبالشعير ونحو ذلك

کاہنوں، نجومیوں، عرّاف اور علمِ رَمل کے جاننے والوں کے پاس جانا، اور کنکر، جَو یا ایسی کسی چیز کے ذریعہ سے پرندوں کو اُڑانا منع ہے

کاہنوں کا اپنا کاروبار چلانے کا نظام

"کاہن" یعنی آئندہ پیش آنے والے واقعات کے متعلق خبر دینے والے۔

جب تک نبی کریم ﷺ کی بعثت نہیں ہوئی تھی اس وقت تک جنات کا آسمانوں پر آنا جانا تھا، اور وہاں کائنات میں پیش آنے والے واقعات سے متعلق جن چیزوں کے تذکرے ہوتے تھے ان کو وہ سنتے تھے، پھر واپس آکر کاہن لوگوں کو بتلاتے تھے۔ جب نبی کریم ﷺ کی پیدائش ہوئی تو شیطانوں کا آسمان پر جانا بند کر دیا گیا، اب وہ اوپر نہیں جاسکتے؛ لیکن پھر بھی ان کو سننے کی جو عادت پڑی ہوئی تھی اس وجہ سے وہ آسمان کے قریب تک جاتے تھے، اور اس کے لیے وہ ایک طریقہ اختیار کرتے تھے (جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے) کہ ایک شیطان کھڑا ہو جاتا تھا اس کے اوپر دوسرا کھڑا ہوتا تھا، اس کے اوپر تیسرا، تیسرے کے اوپر چوتھا کھڑا ہو جاتا تھا، اس طرح آسمان تک پورا سلسلہ قائم کیا جاتا تھا۔ جو

سب سے اوپر والا ہوتا تھا وہ آسمان کی طرف کان لگاتا تھا اور فرشتوں کی باتیں سننے کی کوشش کرتا تھا پھر وہ اپنے سے نیچے والے کو بتاتا، اس طرح یکے بعد دیگرے یہ بات نیچے تک پہنچتی۔ بعد میں پھر شیاطین کو فرشتوں کی باتیں سننے سے روکنے کے لیے قدرت کی طرف سے یہ انتظام کیا گیا کہ ان کو ستارے مارے جاتے تھے جن کو "شہابِ ثاقب" کہا جاتا ہے، آج کل کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ ان کو میزائل مارے جاتے تھے، گویا وہ ستارہ ایک طرح کا میزائل ہے جو ان کو مارا جاتا تھا جس سے وہ جل کر ختم ہو جاتا تھا۔

جب وہ آسمان کے قریب ہو کر باتیں سنتے تھے اور ان کو ستارہ (میزائل) مارا جاتا تھا تو دو شکلیں ہوتی تھی، کبھی تو ایسا ہوتا تھا کہ وہ سنی ہوئی بات اپنے سے نیچے والے کو بتائے اس سے پہلے ہی ستارہ (میزائل) اس کو لگ جاتا تھا، اور وہ جل کر ختم ہو جاتا تھا۔ اور کبھی ایسا ہوتا تھا کہ وہ ستارہ (میزائل) اس کو لگے اس سے پہلے وہ اپنی سنی ہوئی بات اپنے سے نیچے والے کے کان میں کہہ دیتا تھا، اور وہ اپنے سے نیچے والے کے کان میں، اور وہ اپنے سے نیچے والے کے کان میں کہہ دیتا تھا، اس طرح سب سے نیچے والا جو شیطان ہوتا تھا وہ اس کاہن کا دوست ہوتا تھا، وہ جا کر اپنے دوست کاہن کو بتاتا تھا کہ فلاں وقت فلاں جگہ ایسا ایسا ہونے والا ہے۔ چوں کہ وہ بات اوپر سے آئی تھی لہٰذا بالکل پکی ہوتی تھی اور اسی کے مطابق ہوتا تھا۔ بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ لوگ آپس میں اس طرح باتیں کرتے تھے کہ تمہیں پتہ نہیں کہ فلاں نے اس روز فلاں پیشین گوئی دی تھی، وہ برابر نکلی تھی۔ چناں چہ وہ کاہن اس ایک

سچی بات میں اپنی طرف سے سو جھوٹی باتیں ملاتا تھا، اور لوگ اس ایک سچی بات کی وجہ سے اس کی باتوں پر اعتبار اور بھروسہ کرتے تھے۔ اس طرح وہ اپنا کاروبار چلاتا تھا۔

کائنات کا نظام

کائنات کا نظام چلانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مستقل ایک مخلوق پیدا فرمائی ہے جن کو ہم فرشتے کہتے ہیں، ان سے کائنات کے بہت سارے کام لیے جاتے ہیں، جیسے: بارش پر فرشتے مقرر ہیں، کھیتی باڑی کی حفاظت پر فرشتے مقرر ہیں، ہواؤں پر فرشتے مقرر ہیں، اس کے علاوہ بھی دیگر امور کے لیے فرشتوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی ڈیوٹیاں مقرر ہیں، اور ان کو جو جو کام حوالے کئے گئے ہیں ان کے متعلق ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایتیں بھی دی جاتی ہیں۔ جیسے: آپ کی کوئی فیکٹری، کارخانہ، یا دکان ہو تو آپ اپنا نظام چلانے کے لیے اسٹاف رکھتے ہیں، کچھ لوگوں کو ملازمت پر رکھتے ہیں اور انہیں سے اپنا کام چلاتے ہیں، روزانہ ان کو کچھ آرڈر جاری کرتے ہیں، یا ایک روز پہلے ان کو ہدایت دیدیتے ہیں کہ آئندہ کل یہ یہ کام کرنے ہیں۔

اب اللہ تعالیٰ جو کلام فرماتے ہیں وہ ایک تو اصولی انداز میں ہوتا ہے، اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے کلام کی ہیبت کی وجہ سے عام فرشتوں پر ایک طرح کی بے ہوشی سی طاری ہو جاتی ہے، جو مقرب فرشتے ہیں صرف وہی اس کلام کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ کے کلام کا سلسلہ ختم

ہوتا ہے تو عام فرشتوں پر سے بے ہوشی کی کیفیت زائل ہو جاتی ہے، وہ ان مقرب فرشتوں سے دریافت کرتے ہیں کہ ہمیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے کیا احکام جاری فرمائے؟ وہ ان کو بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ یہ احکام جاری فرمائے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو جو آرڈر جاری کئے گئے اس سلسلہ میں فرشتوں میں آپس میں گفتگو ہوتی ہے۔ جیسے: کسی کمپنی کا بڑا آدمی کوئی آرڈر اور ہدایت دیتا ہے تو اپنے قریبی مینیجر سے کہتا ہے، پھر اس کے ماتحت آپس میں ڈسکس اور چرچا کرتے ہیں کہ آج بوس (Boss) نے کیا کہا؟ وہ بتاتا ہے کہ ایسا ایسا آرڈر آیا ہے۔

نجومیوں کے بے بنیاد دعوے

"نجومی" عربی کا لفظ ہے جو نجم سے بنا ہے، اس کی جمع نجوم آتی ہے، ستارے کو کہتے ہیں۔ جو لوگ ستاروں کی چالوں کی وجہ سے آنے والے واقعات کے متعلق خبریں بتانے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کو "نجومی" کہا جاتا ہے۔

آج کل بھی اخبارات میں بارہ برجوں کے نام دیئے جاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ جس کا نام الف سے ہو گا اس کی قسمت ایسی ہوگی۔ گویا پوری دنیا میں جتنے نام الف سے شروع ہوتے ہیں ان سب کی قسمت ایک جیسی ہی ہوگی۔ حالاں کہ یہ بات بدیہی البطلان ہے، بالکل کھلم کھلا غلط ہے۔ ایک سیدھا سادہ آدمی

بھی اس کی غلطی کو محسوس کر سکتا ہے؛ لیکن اس کے باوجود اچھے خاصے سمجھدار لوگوں کو اس کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔

عرّاف اور عامل

"عرّاف" جو کچھ خاص خاص علامتیں دیکھ کر خبریں بتائے۔ عملیات والے بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔

دیکھو! دو باتیں الگ الگ ہیں، بعض باتیں تو مستقبل میں پیش آنے والی ہیں، ان کے متعلق نشانیوں کو دیکھ کر کچھ بتانا۔ اور بعض ایسی چیزیں جو پیش آچکی ہیں لیکن لوگوں کے علم میں نہیں ہے؛ ان کے متعلق بتانا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ ان کے پاس آنے والا شیطان اور جِن کوئی دور کی چیز بتا دیتا تھا، جیسے: کوئی واقعہ دہلی میں پیش آیا، اب ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، ہمیں اس کا پتہ نہیں، اگرچہ آج کل تو مواصلات بہت بڑھ گئے ہیں؛ لیکن اُس زمانہ میں یہ چیز نہیں تھی۔ تو وہ جِن اس واقعہ کی خبر لا کر اس آدمی کو دیتا تھا، اور وہ کہتا تھا کہ وہاں ایسا ہوا ہے۔ آج کل بہت سے عملیات والے بھی اس قسم کے دعوے کرتے ہیں، ان کے پاس بھی ایسی چیزوں کو معلوم کرنے کی نیت سے آنا جانا اسی حکم میں داخل ہے، اس لیے اس سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرنے ضرورت ہے۔ ہاں! کوئی عامل اگر اللہ کے نام کی برکت سے شرعی طور پر علاج کرے؛ تو الگ بات ہے۔ لیکن آج کل لوگوں کا مزاج اس قسم کا بنتا جا رہا ہے کہ عملیات والوں کے پاس جا کر بے تکی باتیں پوچھتے ہیں۔

ایک روز میں مدرسہ سے جارہا تھا تو ایک صاحب مجھ سے ملے اور کہنے لگے: مفتی صاحب! کل ہم آپ کے پاس فتویٰ لینے آنے والے ہیں۔ میں نے پوچھا: بھائی! کیا ہوا؟ تو وہ کہنے لگے: ہمارے یہاں جب بھی شادی کا موقعہ آتا ہے تو کوئی موت میت ہو جاتی ہے؛ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ وہ بیچارے یہ بھی نہیں سمجھ رہے تھے کہ فتویٰ کس چیز کا نام ہے۔ میں نے ان سے کہا: ایسی بات کا فتویٰ نہیں دیا جاتا۔

ہمارا معاملہ عجیب ہو گیا ہے

عام طور پر آدمی کے اوپر آنے والے مصائب کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اس کے اپنے کرتوت اور گناہ ہی ہوتے ہیں؛ لیکن آج کل لوگوں کا مزاج ایسا بن گیا ہے کہ اپنے گناہوں کی طرف سے آنکھیں بالکل پھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا مزاج ختم ہو گیا۔ صحابہ اور تابعین کے حالات پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا جانور اور گھوڑا اگر سرکشی کرتا تھا، بچے نے نافرمانی کر دی؛ تو وہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور آج ہم پر بڑی سے بڑی مصیبت آجاتی ہے تب بھی کبھی یہ توفیق نہیں ہوتی کہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع وانابت کریں، اس کے بجائے یہی سوجھتا ہے کہ کسی عامل کے پاس جاکر پوچھو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ آج کل لوگ یہ ایک سوال بہت کرتے ہیں کہ مولوی صاحب! کوئی بھی نیا دھندا شروع کرتا ہوں تو چلتا ہی نہیں؛ اس کی کیا وجہ ہے؟ ایسا عام مزاج بنتا جارہا ہے۔ ہمارا معاملہ عجیب ہو گیا ہے!

اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں جو تعلیم دی تھی اس سے ہم کتنا دور جارہے ہیں ۔زمانۂ جاہلیت میں لوگ کاہنوں نجومیوں کے پاس اسی طرح کی باتوں کے لیے جایا کرتے تھے۔

کہانت کی حقیقت

حدیث ١٦٦٨ :-

عن عائشة رضی الله عنها، قالت: سأل رسُولَ اللهِ - ﷺ - أنَاسٌ عَنِ الكُهَّانِ، فَقَالَ: ((لَيْسُوا بِشَيءٍ)) فَقَالُوا: يارَسُولَ اللهِ! إنَّهُمْ يُحَدِّثُونَا أحيَاناً بِشَيءٍ، فَيكُونُ حقّاً؟ فقالَ رسُولُ اللهِ - ﷺ -: ((تِلْكَ الكَلِمَةُ مِنَ الحَقِّ يَخْطَفُهَا الجِنِّيُّ فَيَقُرُّهَا في أُذُنِ وَلِيِّهِ، فَيَخْلِطُونَ مَعَهَا مِائَةَ كَذْبَةٍ)). (متفق عليه)

وفی رواية للبخاری عن عائشة رضی الله عنها: أنَّها سمعتْ رسُولَ اللهِ- ﷺ -يقولُ: ((إنَّ المَلائِكَةَ تَنْزِلُ فِي العَنَانِ-وَهُوَ السَّحَابُ-فَتَذْكُرُ الأمْرَ قُضِيَ فِي السَّماءِ، فَيَسْتَرِقُ الشَّيْطَانُ السَّمْعَ، فَيَسْمَعُهُ، فَيُوحِيَهُ إلَى الكُهَّانِ، فَيَكْذِبُونَ مَعَهَا مِئَةَ كَذْبَةٍ مِنْ عِنْدِ أنْفُسِهِمْ)).

قَولُهُ: ((فَيَقُرُّهَا)) هو بفتح الياءِ وضم القاف والراء، أي: يُلْقِيها.

((والعَنَانِ)) بفتح العين.

ترجمہ مع مختصر تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ کچھ لوگوں نے نبی کریم ﷺ سے کاہنوں سے متعلق سوال کیا(کہ کاہن کیا چیز ہے؟) نبی کریم ﷺ نے جواب دیا: کچھ بھی نہیں (اس لفظِ "کچھ بھی

نہیں "کا مطلب مَیں آگے بیان کرتاہوں) اس پر ان سوال کرنے والوں نے کہا: اے اللہ کے رسول! کبھی وہ لوگ ایسی بات بیان کرتے ہیں جو سچی ہوتی ہے (اور آپ فرماتے ہیں کہ کچھ بھی نہیں؟) حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: (ایک بات جو سچی ہوتی ہے وہ دراصل وہ بات ہوتی ہے جو) کوئی جِنّی اوپر جاکر فرشتوں کی باتوں میں سے اُٹھالاتا ہے اور اپنے دوست کاہن کے کان میں ڈال دیتا ہے، اور وہ کاہن دوست اس ایک سچی بات کے ساتھ سو جھوٹ ملاکر اپناکاروبار چلاتا ہے۔(تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے اس ایک سچی بات کی وجہ سے اس پر پورا اعتماد و بھروسہ کرلیا جائے۔)

بخاری شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، فرماتی ہیں کہ میں نے نبیِ کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: فرشتے (آسمان سے نیچے) بادلوں میں اترتے ہیں اور آسمانوں میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) جو فیصلہ ہوتا ہے اس کا آپس میں چرچا کرتے ہیں، تو شیاطین اس کو چوری چھپے کان لگاکر سن لیتے ہیں، پھر اس کو اپنے دوست کاہن تک پہنچاتے ہیں اور وہ اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملادیتا ہے (یہی کہانت کی حقیقت ہے۔)

افادات:- آدمی کا مزاج بھی دیکھو کہ ایسی صورت میں اس ایک سچی بات کی وجہ سے سو جھوٹی بات کو مان لیتا ہے، اور جب پیسوں کی لین دین کی بات آتی ہے تو ننانوے مرتبہ جس کے ساتھ اچھا معاملہ ہوا ہو، اور ایک مرتبہ غلط ہوگیا ہو تو پھر آئندہ کبھی اس پر بھروسہ نہیں کرتا۔ گویا ہم لوگ اپنی دنیا کے معاملہ میں جتنے پکّے ہیں، اللہ کے رسول ﷺ دین کے معاملہ میں بھی ہمیں ویسا ہی پکّا بنانا چاہتے ہیں۔ دنیا کے معاملہ میں اس نے تم سے ایک مرتبہ غداری کی تو تم اس پر کبھی بھروسہ نہیں

کرتے؛ تو پھر یہاں کاہے کو کرتے ہو؟ وہاں ننانوے اچھے معاملوں کو ایک غلط معاملہ کی وجہ سے نہیں مانتے، تو پھر یہاں ننانوے جھوٹ کو ایک سچی بات کی وجہ سے کیوں مان لیتے ہو؟

"لَيْسُوا بِشَيْءٍ" کا مطلب

جو چیز کچھ بھی قابلِ توجہ نہ ہو؛ اس کو "لَيْسُوا بِشَيْءٍ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ جیسے: ہم نے یہاں سے وہاں دور دیکھا کہ کچھ لوگ جمع ہیں اور ہمارے دل میں یہ معلوم کرنے کا جذبہ پیدا ہوا کہ وہاں کیا ہوا ہے، اور اُدھر سے ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: بھائی! وہاں کیا ہوا ہے؟ اس نے جواب میں کہا: کچھ بھی نہیں۔ اب آپ کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! اتنے سارے لوگ وہاں جمع ہیں پھر بھی تو کہتا ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا؟ اس مثال سے میں آپ کو اس لفظِ "کچھ نہیں" کا مطلب سمجھانا چاہتا ہوں کہ "کچھ نہیں" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہاں کچھ تو ہوا ہے لیکن تم جو سمجھ کر پوچھ رہے ہو کہ کوئی اہم بات پیش آئی ہے، ایسی کوئی بات نہیں ہے، یعنی دھیان دینے جیسی چیز نہیں ہے۔ یہاں حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَيْسُوا بِشَيْءٍ" کچھ بھی نہیں، اس کا مطلب یہی ہے کہ کہانت کوئی توجہ اور دھیان دینے جیسی چیز نہیں ہے۔

اس کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی

حدیث ۱٦٦٩:-

وعن صَفِيَّةَ بِنتِ أبي عُبيدٍ عن بعض أزواجِ النَّبِيِّ ﷺ و رضی اللہ عنہا عن النَّبِيِّ ﷺ قال: ((مَنْ أَتَى عَرَّافاً فَسَأَلَهُ عن شَيْءٍ فَصَدَّقَهُ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ أَرْبَعِينَ يَوماً)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت صفیہ بنت ابو عبید (جو حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کی اہلیہ اور تابعیہ ہیں) نبیٔ کریم ﷺ کی ایک زوجۂ مطہرہ رضی اللہ عنہا سے نقل کرتی ہیں (یہ زوجۂ مطہرہ ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں) کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی کسی عرّاف کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کے متعلق پوچھا اور اس نے جو جواب دیا اس کی تصدیق بھی کی؛ تو ایسے آدمی کی چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی۔

افادات:- ”عرّاف“ وہ آدمی کہلاتا ہے جو گم شدہ چیز کا پتہ بتاتا ہو، یا چوری شدہ چیز کے متعلق بتلاتا ہو کہ یہ چوری فلاں نے کی ہے۔ کچھ علامتیں اور کچھ ایسے طریقۂ کار اپنائے جاتے تھے جن کے ذریعہ وہ لوگ گم شدہ یا چوری شدہ چیز کے متعلق بتلایا کرتے تھے۔

”چالیس دن کی نمازیں قبول نہیں ہوں گی“ یعنی فریضہ تو ساقط ہو جائے گا، لیکن قبول نہیں ہو گی، اس پر کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا، کیوں کہ یہ عراف وغیرہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کوئی یقین پر مبنی نہیں

ہوا کرتا، بلکہ ایک طرح کا ظن، تخمینہ اور اٹکل پچو باتیں ہوتی ہیں جو کبھی صحیح بھی ہو جاتی ہیں، لیکن اس پر یقین رکھنے کی شریعت اجازت دیتی نہیں، اور نہ اس کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

عِیافہ، طِیَرہ، طَرْق

حدیث ۱٦٧٠:-

وعَنْ قَبِيصَةَ بنِ المُخَارِقِ رضى الله عنه قال سمعتُ رسُولَ الله ﷺ يقولُ: ((العِيَافَةُ، وَالطِّيَرَةُ، والطَّرْقُ، مِنَ الجِبْتِ)). (رواه أبو داود بإسناد حسن)

وقال: ((الطَّرْقُ)) هُوَ الزَّجْرُ: أَىْ زَجْرُ الطَّيْرِ وَهُوَ أَنْ يَتَيَمَّنَ أو يَتَشَاءمَ بِطَيَرَانِهِ، فإنْ طَارَ إِلَى جِهَةِ اليَمِينِ، تَيَمَّنَ، وإِنْ طَارَ إِلَى جِهَةِ اليَسَارِ، تَشَاءمَ. قال أبوداود: ((والعِيَافَةُ)): الخَطُّ. قالَ الجَوْهَرِيُّ فى الصِّحَاحِ: الجِبْتُ كَلِمَةٌ تَقَعُ عَلَى الصَّنَمِ وَالكاهِنِ والسَّاحِرِ وَنَحْوِ ذٰلِكَ.

ترجمہ:- حضرت قبیصہ بن مخارق (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ”عِیافہ“، ”طِیَرہ“ اور ”طَرْق“؛ جِبت میں سے ہے۔

افادات:- ان سب کے معانی کیا ہیں؟ آگے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے امام ابو داود (رحمۃ اللہ علیہ) کے حوالہ سے ”عِیافہ“ کی تشریح فرمائی ہے کہ ”عِیافہ“ خط اور لکیر کو کہتے ہیں۔ اہلِ عرب کے یہاں یہ بھی بھی ایک خاص طریقہ کار ہوا کرتا تھا جس میں وہ لوگ یہ کرتے تھے کہ زمین اور ریت پر کچھ خطوط کھینچتے

تھے، پھر ان میں سے کچھ خطوط کو مٹادیتے تھے اور کچھ کو باقی رکھتے تھے، اور اسی کے ذریعہ آنے والے حالات کے متعلق کچھ باتیں اور پیشینگوئیاں کیا کرتے تھے؛ اسی کو ''عِیَافہ'' کہتے ہیں۔

اور ''طِیَرَۃٌ'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی پرندے کے اُڑنے کی وجہ سے نیک فالی یا بد فالی لینا۔ اہلِ عرب میں یہ بھی ایک دستور تھا کہ کوئی آدمی کسی کام کے ارادہ سے یا کسی سفر کے لیے یا کسی اور مقصد کے لیے گھر سے باہر نکلتا اور کسی پرندے کو دیکھتا کہ وہ دائیں طرف سے اُڑکر آیا تو وہ یوں سمجھتا تھا کہ میرا کام ہو جائے گا۔ ایسے پرندے کو ''بارح'' کہتے تھے جس کی جمع ''بوارح'' آتی ہے۔ اور اگر وہ بائیں طرف سے اُڑکر آیا تو یوں سمجھتا کہ اس کام میں ناکامی ہوگی، چناں چہ وہ اپنے جس کام کے لیے نکلا ہوتا تھا اس کو چھوڑ کر گھر واپس آجاتا تھا، ایسے پرندے کو ''سانح'' کہتے تھے جس کی جمع ''سوانح'' آتی ہے۔ شریعت میں اسی کو بد فالی اور بد شگونی کہتے ہیں جس سے منع کیا ہے۔

اسی طرح بد شگونی کی اور بھی شکلیں ہوتی ہیں، جیسے کوئی آدمی باہر نکلا اور بلی سامنے سے گزر گئی، چاہے دائیں سے گزری ہو یا بائیں سے۔ یا کچھ مخصوص جانور جن کے سامنے سے گزرنے کی وجہ سے یوں سمجھنا کہ اس کام میں کامیابی نہ ہوگی؛ یہ ''طِیَرَۃٌ'' کہلاتا ہے، اس سے بھی نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا اور اس کو حرام قرار دیا۔

اور ''طَرْقٌ'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی باہر نکلا اور دیکھا کوئی پرندہ ازخود تو نہیں اُڑ رہا تھا، تو اب یہ معلوم کرنے کے لیے کہ مجھے اس کام میں کامیابی ہوگی یا ناکامی؛ کسی بیٹھے ہوئے پرندے کو کنکر یا

پتھر مار کر اُڑاتا تھا، جس کے نتیجہ میں وہ اُڑ تا تھا، اب اگر وہ اُڑ کر دائیں طرف گیا تو سمجھتا تھا کہ کامیابی ہوگی، اور بائیں طرف گیا تو سمجھتا تھا کہ ناکامی ہوگی؛ اسی کو "طَرق" کہتے ہیں۔

ان تینوں کو نبی کریم ﷺ نے 'جِبت' قرار دیا ہے، جس کی قرآنِ پاک میں بھی قباحت اور شناعت آئی ہے۔ آگے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) علامہ جوہری (رحمۃ اللہ علیہ) کی لغت کی کتاب "صحاح" کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ "جِبت" ایک بت کو بھی کہتے ہیں، اور کاہن کو بھی کہتے ہیں، اسی طرح ساحر اور جادوگر کو بھی کہتے ہیں۔ یہ کہانت کی ایک قسم ہے، اور جس طرح کہانت حرام ہے؛ اسی طرح یہ سب بھی حرام ہیں۔

علمِ نجوم سیکھنا جادو سیکھنا ہے

حدیث ۱٦٧١:-

وعن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسولُ الله ﷺ : ((مَنِ اقْتَبَسَ عِلْماً مِنَ النُّجُوم اقْتَبَسَ شُعْبَةً مِنَ السِّحرِ، زَادَ مَا زَادَ.)) (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے علمِ نجوم کا کوئی حصہ سیکھا گویا اس نے جادو کا ایک حصہ حاصل کیا، اور جس نے (علم نجوم) جتنا زیادہ سیکھا؛ اس نے اتنا ہی زیادہ (جادو) سیکھا۔

افادات:- ”علمِ نجوم“ یعنی ستاروں کے طلوع اور غروب اور ان کی چال و رفتار کی بنیاد پر آنے والے حالات کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا، جیسے: آج کل بھی ہنود میں یہ چیزیں بہت زیادہ رائج ہیں۔ ایسا آدمی جو ان چیزوں کو جانتا اور بتلاتا ہو؛ اس کو نجومی کہتے ہیں۔ ”نجوم“ نجم کی جمع ہے اور نجم ستارہ کو کہتے ہیں۔

ستاروں کا ایک علم تو وہ ہے جن سے اوقات، مکانات اور سمتوں کا پتہ لگایا جاتا ہے، جیسے قطب تارے سے سمت معلوم کی جاتی ہے، یا تاروں سے رات کا وقت معلوم کیا جاتا ہے کہ کتنا حصہ گزر گیا۔ اوقات کا اندازہ لگانا کہ نماز کا وقت ہو گیا، صبح صادق ہو گئی یا نہیں۔ تاریخوں، اوقات اور جگہوں کا پتہ چلانے اور راستوں کو معلوم کرنے کے لیے ستاروں سے مدد لی جاتی ہے؛ یہ علمِ ہیئت کے قبیل سے ہے؛ اس کی تو اجازت ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ستاروں کو جن مقاصد کے لیے پیدا کیا ان میں سے ایک مقصد یہ بھی ہے۔

مگر ستاروں کے ذریعہ سے آنے والے حالات کا اندازہ لگانا، جیسے: نجومی کرتے ہیں کہ فلاں ستارہ ایسا ہوا، تو اب قحط ہو گا، یا یوں ہوا تو بڑی مصیبت آنی والی ہے، یا کسی بڑے آدمی کا انتقال ہونے والا ہے: یہ علمِ نجوم کہلاتا ہے۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ اس روایت میں اس کو جادو کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔

ایک صحابی کے سوالات اور آپ ﷺ کے جوابات

حدیث ۱۶۷۲ :-

وعن مُعاوِيَةَ بنِ الحَكَمِ رضى الله عنه قال: قلتُ: يارسُولَ اللهِ ! إِنِّي حديثُ عَهْدٍ بالجاهِلِيَّةِ، وَقَدْ جَاءَ اللهُ تَعَالَى بالإِسْلاَمِ، وإِنَّ مِنَّا رِجَالاً يَأْتُونَ الكُهَّانَ؟ قال: ((فَلاَ تَأْتِهِمْ)) قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَتَطَيَّرُونَ ؟ قَالَ: ((ذَلِكَ شَيْءٌ يَجِدُونَهُ فِي صُدُورِهِمْ، فَلاَ يَصُدُّهُمْ)) قُلْتُ: وَمِنَّا رِجَالٌ يَخُطُّونَ ؟ قَالَ: ((كَانَ نَبِيٌّ مِنَ الأَنْبِيَاءِ يَخُطُّ، فَمَنْ وَافَقَ خَطَّهُ فَذَاكَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت معاویہ بن حکم (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اب تک میرا تعلق زمانۂ جاہلیت کے ساتھ تھا اور اب اللہ تعالیٰ نے مجھے اسلام عطا فرمایا (مطلب یہ ہے کہ میری اب تک کی زندگی غیر اسلامی ماحول میں گزری، اور اس ماحول میں جو صورتیں پیش آتی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ) ہمارے اندر کچھ لوگ کاہنوں، جیوتشیوں اور نجومیوں کے پاس جاتے ہیں اور حالات معلوم کرتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم ان کے پاس مت جائیو (اس سے کاہنوں کے پاس جانے کی ممانعت معلوم ہوئی) پھر میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہم میں سے کچھ لوگ بد شگونی لیتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ ایک خیال ہے جو ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے (حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی) لیکن یہ خیال ان کو اپنے مقصد میں آگے بڑھنے سے باز نہ رکھے۔ پھر میں نے عرض کیا: ہم میں کچھ لوگ خطوط اور لکیریں کھینچتے ہیں

اور ان کے ذریعہ آنے والے حالات کی معلومات دیتے ہیں۔ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ایک نبی اس طرح خط کھینچا کرتے تھے، جس کی لکیر ان کے موافق ہو گئی، وہ ٹھیک ہوتی ہے۔

افادات:۔ لیکن نبی کو اللہ تعالیٰ نے یہ چیز بطور معجزہ عطا فرمائی تھی، اور جو چیز نبی کو بطور معجزہ دی گئی ہو، اس پر دوسرا کوئی قادر نہیں ہوا کرتا۔ اسی لیے شرّاح فرماتے ہیں کہ یہ تعلیق بالمحال کے قبیل سے ہے، یعنی کسی کام کو ایسی چیز پر مشروط کرنا جو عامةً وجود میں نہ آتی ہو۔ یعنی ایسا کرنا درست نہیں۔

وہ نبی کون تھے؟ تو اس بارے میں دو نبیوں کے نام لیے جاتے ہیں، ایک حضرت ادریس، اور دوسرے حضرت دانیال علیہما السلام۔

"یہ ایک خیال ہے جو ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے" اور یہ خیال غیر اختیاری چیز ہے۔ خدا نہ کرے اگر ایسا خیال آ بھی جائے تب بھی اس کی وجہ سے جس مقصد کے لیے چلے ہیں اس سے اپنے آپ کو روکنا نہیں چاہیے۔

اور اس خیال کی وجہ سے جو وسوسے پیدا ہوتے ہیں اس کو دور کرنے کے لیے دعا بھی ہے، جس کے پڑھ لینے کی وجہ سے وہ بھی دُور ہو جائیں گے۔ (یہ دعا آگے حدیث نمبر: ۱۶۷۷ کے تحت آرہی ہے۔)

”حُلْوَانُ الکاھِنِ“ کا مطلب اور حکم

حدیث ۱٦٧٣:-

وعن أَبِي مَسعودٍ البدريّ -رضی الله عنه-: أَنَّ رسُولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنْ ثَمَنِ الكَلْبِ وَمَهْرِ البَغِيِّ وَحُلْوَانِ الكَاهِنِ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو مسعود انصاری بدری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کتا فروخت کر کے اس کی قیمت کو استعمال کرنے سے، اور زانیہ کی اجرت سے، اور کاہن کی خدمت میں جو ہدیہ پیش کیا جاتا ہے اس سے منع فرمایا۔

افادات:- ”حُلْوَانُ الکاھِنِ“ حلوان اصل میں شیرینی اور مٹھائی کو کہتے ہیں۔ اوران لوگوں کا دستور یہ تھا کہ جب کوئی آدمی کسی کاہن کے پاس اپنے حالات معلوم کرنے کے لیے کوئی سوال لے کر جاتا تھا تو اس سے کچھ پوچھنے سے پہلے اس کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا تھا۔ اور شیرینی تو فقط نام ہے؛ لیکن وہ ہدیہ مٹھائی ہی ہو یہ ضروری نہیں، بلکہ جو رقم دی جاتی ہے اس کو بھی ”حلوان“ سے تعبیر کیا جاتا ہے، جس کو ”پرساد“ کہہ لو۔

بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ کہانت کا جو بھی طریقہ کار ہو؛ وہ ممنوع اور حرام ہے۔

باب النهى عن التَّطَيُّرِ

بد شگونی کی ممانعت

فيه الأحاديث السابقة فی الباب قبله.

ابھی جو روایتیں گزری ہیں ان میں بھی بد شگونی کی ممانعت کا تذکرہ تھا، آگے کچھ اور چیزیں پیش فرماتے ہیں۔

حدیث ۱۶۷۴:-

عن أنس رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لاَ عَدْوٰى وَلاَ طِيَرَةَ وَيُعْجِبُنِى الفَألُ)) قالُوا: وَمَا الفَألُ؟ قَالَ: ((كَلِمَةٌ طَيِّبَةٌ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: بیماری میں تعدیہ نہیں (یعنی ایسا نہیں ہے کہ ایک کی بیماری دوسرے کو لگے) اور بد شگونی بھی کوئی چیز نہیں ہے، ہاں! مجھے نیک فالی پسند ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: نیک فالی کیا ہے؟ تو نبی کریم صَلَّى ٱللَّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: کوئی اچھی بات۔

افادات:- ”عَدْوٰی“ کا مطلب ہے: ایک کی بیماری دوسرے کو لگنا۔ زمانۂ جاہلیت میں بعض بیماریوں کے متعلق عربوں کا یہ خیال تھا کہ یہ بیماری از خود اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر، ذاتی تاثیر کی وجہ

سے ایک دوسرے کے قریب آنے کی وجہ سے لگ جاتی ہے (نعوذ باللہ) گویا اس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی بھی ضرورت نہیں۔ اس روایت میں اس نظریہ کی تردید فرمائی گئی ہے۔ ورنہ اگر سبب کے طور پر کہا جائے کہ کسی کی کوئی بیماری کسی دوسرے کو اس کے پاس دیر تک رہنے کی وجہ سے (بطورِ سبب) لگ گئی۔ اس لیے کہ باری تعالیٰ نے دنیا میں مختلف چیزوں کے لیے اسباب رکھے ہیں۔ تو اس کی گنجائش ہے۔

پہلے اونٹ کو خارش کہاں سے لگی؟

چناں چہ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ مجلس میں ارشاد فرمایا: ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی۔ اس پر ایک دیہاتی نے سوال کیا: اے اللہ کے رسول! ہمارے اونٹ ایک دم تندرست ہوتے ہیں، جیسے کہ ہرنیاں ہوتی ہیں (یعنی جیسے ہرنی کا بدن بڑا صاف شفاف ہوتا ہے، ہمارے اونٹ بھی ایسے ہی تندرست ہوتے ہیں کہ ان کے بدن پر کوئی بیماری نہیں ہوتی) لیکن کوئی خارشی اونٹ ان میں آجاتا ہے جس کے نتیجہ میں دوسرے اونٹوں کو بھی خارش ہو جاتی ہے؛ اور آپ تو فرما رہے ہیں کہ ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی؛ تو یہ کیا ہوتا ہے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلا اونٹ جس کو خارش ہوئی وہ کہاں سے لگی؟ کہا: وہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف ہی سے آئی۔ معلوم ہوا کہ جب پہلا اونٹ اللہ تعالیٰ کے حکم سے خارشی ہوا تو دوسرے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے ہوئے۔ ایسا نہ سمجھا جائے کہ اس پہلے کی وجہ سے چیپ لگا۔

"وَلَا طِيَرَةَ" اور بد شگونی کوئی چیز نہیں۔ اوپر بتلایا تھا کہ پرندوں کے اُڑنے کی وجہ سے یوں سمجھنا کہ میرے فلاں کام میں کامیابی نہ ہوگی، یہ طیرہ اور بد شگونی ہے، جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

نیک فالی پسندیدہ ہے

"كَلِمَةٌ طَيِّبَةٌ" کوئی اچھی بات۔ مثلاً: کوئی آدمی امتحان گاہ میں امتحان دینے کے لیے جارہا ہے، راستہ میں سنا کہ کوئی کسی کو "یا فائز" کہہ کر پکار رہا ہے۔ اور "فائز" عربی زبان میں کامیاب ہونے والے کو کہتے ہیں۔ تو اس نے فائز سن کر نیک فالی لیتے ہوئے یوں طے کر لیا کہ ان شاء اللہ میں بھی اس امتحان میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

یا کوئی آدمی کسی بیمار کو لے کر ہسپتال جارہا تھا اور کوئی آدمی کسی کو بلا رہا تھا: اے سالم۔ اور "سالم" تندرست کو کہتے ہیں۔ اب اس نے سالم سن کر یہ سوچا کہ ان شاء اللہ ہمارا بیمار بھی اچھا ہو ہی جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کی زبان سے کوئی جملہ نکلا، اس کو سن کر اچھا نتیجہ اخذ کرنے میں چوں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن ہے، اور بندوں کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن کیا کرو؛ اس لیے اس کو پسند کیا گیا ہے۔ اور بد شگونی میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بد گمانی ہے، اس لیے اس کو ناپسند کیا گیا اور اس سے منع فرمایا۔

اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی

حدیث ۱۶۷۵ :-

وعن ابن عمر (رضی اللہ عنہما) قَالَ قَالَ رسول اللہ ﷺ : ((لاعَدْوٰی وَلاَطِيَرَةَ، وإِنْ کَانَ الشُّؤمُ فی شَیْءٍ فَفِی الدَّارِ، وَالمَرْأَةِ، والفَرَسِ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک کی بیماری کا دوسرے کو لگنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا، اور بدشگونی بھی کوئی چیز نہیں ہے، ہاں! اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو مکان میں، عورت میں، اور سواری کے جانور میں ہوتی۔

افادات:- اہلِ عرب یوں سمجھتے تھے کہ نحوست ہوا کرتی ہے، اور اس سلسلہ میں روایتیں بھی دونوں قسم کی ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تین چیزوں میں نحوست ہوسکتی ہے۔ اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر نحوست ہوتی تو ان میں ہوتی۔ لیکن نحوست کوئی چیز نہیں اس لیے ان میں بھی نہیں ہے۔

کوئی کام آدمی کے مزاج اور طبیعت کے خلاف ہو اس کو نحوست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اب اگر کوئی بات وقتی طور پر مزاج اور طبیعت کے خلاف پیش آئے تو آدمی یہ سوچ لیا کرتا ہے کہ چلو! ایک دو

دن میں معاملہ ختم ہو جائے گا؛ لیکن ان تین چیزوں کا استعمال وقتی نہیں، بلکہ مستقل ہوا کرتا ہے؛اس لیے خاص طور پر ان کا تذکرہ کیا۔

مکان کا مسئلہ زندگی بھر کا ہے، ایسا تو ہے کہ نہیں کہ ایک دو دن کی بات ہو، آدمی نے جب کوئی مکان لے لیا تو زندگی بھر کا مسئلہ ہو گیا۔ اب اگر پڑوسی اچھا نہیں ملا یا مکان میں روشنی اور ہوا نہیں آتی، جس کی وجہ سے بیماریاں ہوتی ہیں؛ تو زندگی بھر کے لیے ٹینشن ہو جاتا ہے۔ اس لیے روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ گھر اگر مزاج کے موافق نہ ہو تو اس کو بدل دیا جائے۔

اسی طریقہ سے بیوی کوئی بار بار بدلنے کی چیز نہیں۔ اگر مزاج کے موافق نہیں، جیسے: عورت بانجھ ہے، یا نافرمان اور زبان دراز ہے، شوہر کو تکلیف پہنچاتی ہے؛ تو یہ کوئی ایک دو دن کی بات تو ہے نہیں۔ اسی لیے علماء نے لکھا ہے کہ اگر ایسا کوئی معاملہ ہے تو پھر آسان طریقہ یہی ہے کہ شریعت کے بتائے طریقہ کے مطابق اس سے نجات حاصل کر کے دوسری تلاش کر لے؛ ورنہ زندگی بھر کے لیے ٹینشن رہے گا۔

اور گھوڑا یعنی سواری کا جانور ایسی چیز ہے جو بار بار نہیں بدلی جاتی۔ اس میں ناموافق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سرکش ہو، یا جہاد میں جہاں کام لینے کی ضرورت ہو وہاں کام نہ آتا ہو۔

آدمی کی خوش بختی کی تین علامتیں

اسی لیے بعض روایتوں میں آتا ہے: ”مِنْ سَعَادَةِ الْمَرْءِ: اَلْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ وَالْمَسْكَنُ الْوَاسِعُ، وَالْمَرْكَبُ الْهَنِيُّ (صحیح ابن حبان)“ آدمی کی خوش بختی میں سے یہ ہے کہ اس کو بیوی نیک ملے، مکان کشادہ ہو، اور اس کی سواری عمدہ ہو۔ یہ تین چیزیں ایسی ہیں جن سے زندگی بھر کا واسطہ رہتا ہے، اس لیے اگر یہ چیزیں مزاج کے ناموافق ہوں تو اس کو نحوست سے تعبیر کیا گیا۔ لیکن نحوست کا جو عام مفہوم لیا جاتا ہے وہ مراد نہیں۔

حضور اکرم ﷺ بد شگونی نہیں لیا کرتے تھے

حدیث ۱٦٧٦:-

وعن بُرَيْدَةَ -رضی الله عنه- أَنَّ النبيَّ ﷺ كَانَ لَا يَتَطَيَّرُ. (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت بریدہ اسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ بد شگونی نہیں لیا کرتے تھے (ہاں! نیک فالی لینا ثابت ہے)

وسوسے دور کرنے کی دعا

حدیث ۱۶۷۷:-

وعن عُروۃ بن عامر رضی اللہ عنه قال: ذُكِرَتِ الطِّيَرَةُ عِنْدَ رَسولِ اللهِ ﷺ فقالَ: ((أَحْسَنُهَا الفَأْلُ وَلاَ تَرُدُّ مُسْلِماً فإذا رَأى أحَدُكُمْ ما يَكْرَهُ فَلْيَقلْ: اللَّهُمَّ لاَ يَأْتِي بِالحَسَناتِ إلاَّ أنْتَ، وَلاَ يَدْفَعُ السَّيِّئاتِ إلاَّ أنْتَ، وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إلاَّ بِكَ)) (حديث صحيح رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت عروہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے سامنے طِیَرَہ کا تذکرہ ہوا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس میں بہترین چیز نیک فالی ہے۔ اور بد شگونی کسی مسلمان کو اپنے کام میں آگے بڑھنے سے باز نہ رکھے۔ البتہ کبھی ایسی ناپسندیدہ چیز آنکھوں کے سامنے آجائے اور اس کی وجہ سے دل میں ایسا وسوسہ پیدا ہو تو اس وقت یہ دعا پڑھ لے: اے اللہ! بھلائیوں کا لانے والا تو ہی ہے، اور برائیوں کو دور کرنے والا بھی تو ہی ہے، اور نہیں ہے گناہ سے بچنے کی قوت، اور نیکی کی طاقت؛ مگر تیرے ہی توفیق دینے سے (اگر یہ دعا پڑھ لے گا تو دل میں وہ جو خیال آیا تھا، اس کے نقصان سے حفاظت ہو جائے گی۔)

افادات:- جیسا کہ ایک آدمی اپنے مقصد کے لیے نکلا اور باہر جن چیزوں سے بد شگونی لی جاتی ہے، مثلاً: بلی سامنے سے گزر گئی، تو سوچنے لگتے ہیں کہ اب پتہ نہیں اس کام میں کامیابی ہوتی ہے یا نہیں۔ اہلِ ایمان کو تو اس کا خیال بھی نہیں آتا، لیکن دوسروں کے ساتھ میل جول کی وجہ سے کبھی ایسا خیال

آجائے تو حضورِ اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ ایسے خیال کی وجہ سے وہ اپنے کام سے باز نہ آجائے، بلکہ جس کام کے لیے نکلا ہے اس میں آگے بڑھے، اور یہ دعا پڑھ لے۔

باب تحریم تصویر الحیوان فی بساط أو حجر أو ثوب أو درهم أو دینار أو مخدة أو وسادة وغیر ذلك

وتحریم اتخاذ الصور فی حائط وسقف وستر وعمامة وثوب ونحوها والأمر بإتلاف الصورة

فرش، پتھر، کپڑے، سکے، دینار، تکیے، بستر، دیوار، چھت پردے اور عمامہ وغیرہ پر

کسی جاندار کی تصویر بنانے کی حرمت اور تصویر کو ختم کرنے کا حکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جس طرح تصویر رکھنا حرام ہے اسی طرح تصویر بنانا بھی حرام ہے۔ اور اگر جاندار کی کوئی تصویر ہو تو ایسی تدبیر اختیار کی جائے کہ اس میں صورت باقی نہ رہے۔

حدیث ۱۶۷۸:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قال: ((إنَّ الَّذِينَ يَصْنَعُونَ هذِهِ الصُّوَرَ يُعَذَّبُونَ يَوْمَ القِيامَةِ، يُقَالُ لَهُمْ: أَحْيُوا مَا خَلَقْتُمْ.)) (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو لوگ تصویریں بناتے ہیں، قیامت کے روز ان کو عذاب دیا جائے گا، ان سے کہا جائے گا: تم نے جو چیز پیدا کی (یعنی جو تصویر تم نے بنائی) اس میں جان ڈالو۔ (دوسری روایت میں ہے کہ وہ جان نہیں ڈال سکیں گے اور اس کی بنا پر ان کو عذاب ہوتا رہے گا)

افادات:- تصویر کا بنانا بھی حرام ہے اور تصویر کا استعمال کرنا بھی حرام ہے، اور اگر تصویر ہو تو اس کو ضائع کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اِلا یہ کہ وہ تصویر ایسی جگہ پر ہو جہاں اس کی عزت نہ ہوتی ہو، بلکہ توہین ہوتی ہو؛ تو اس صورت میں باقی رہتے ہوئے بھی گنجائش ہے۔

قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب

حدیث ۱۶۷۹:-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا، قالت: قَدِمَ رسُولُ الله ﷺ مِنْ سَفَرٍ، وَقَدْ سَتَرْتُ سَهْوَةً لِي بِقِرامٍ فِيهِ تَمَاثِيلُ، فَلَمَّا رَآهُ رَسُولُ اللهِ ﷺ تَلَوَّنَ وَجْهُهُ، وقالَ:

((يَا عائِشَةُ، أَشَدُّ النَّاسِ عَذَاباً عِندَ اللهِ يَوْمَ القِيَامَةِ الَّذِينَ يُضَاهُونَ بِخَلْقِ اللهِ!)) قَالَتْ: فَقَطَعْنَاهُ فَجَعَلْنَا مِنهُ وِسَادَةً أَوْ وِسَادَتَيْنِ. (متفق عليه)

((القِرامُ)) بكسرِ القاف هو: السِّتْرُ. ((وَالسَّهْوَةُ)) بفتح السينِ المهملة. وهى: الصُّفَّةُ تَكُونُ بَيْنَ يَدَيِ البَيْتِ، وقيلَ: هِيَ الطَّاقُ النَّافِذُ فى الحائِطِ.

ترجمہ:۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سفر سے واپس تشریف لائے، میرے گھر میں جو چبوترہ تھا اس کو میں نے ایک پردے کے ذریعہ سے ڈھانپ رکھا تھا، اس پردے میں تصویریں بنی ہوئی تھیں، جب نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس پردے کو دیکھا تو غصہ کی وجہ سے آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور فرمایا: اے عائشہ! قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مشابہت کرتے ہیں (یعنی کسی چیز کو بنانا اور پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، اور تصویر بنانے والے صرف شکل و صورت بنا کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی اس صفتِ تخلیق میں اپنے آپ کو اس کا برابر قرار دینا چاہتے ہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ بھی ان کو سخت عذاب دے گا) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس ارشاد اور تنبیہ کے بعد ہم نے اس پردے کو کاٹ دیا، جس کی وجہ سے وہ تصویر بھی کٹ گئی، پھر اس پردے سے ہم نے ایک یا دو تکیے بنا لیے۔

افادات:۔اس سے معلوم ہوا کہ کسی کپڑے پر، یا جہاں تصویر بنی ہوئی ہے، اگر اس کو اس طرح کاٹ دیا جائے تاکہ تصویر باقی نہ رہے، یا اس کے سر اور چہرہ وغیرہ کو ختم کر دیا جائے؛ تو پھر اس کو استعمال میں رکھنے کی گنجائش ہے۔

"سَهْوَة" چبوترے کو بھی کہتے ہیں۔ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک دوسرا ترجمہ "دیوار کے اندر کا طاقچہ" بھی کیا ہے۔ پرانے زمانہ میں گھروں میں دو کمروں کے بیچ کی دیوار میں بنایا جاتا تھا جس میں دِیا، بتی اور لالٹین رکھی جاتی تھی؛ تاکہ دونوں کمروں میں روشنی ہو۔ بہر حال! وہ پردہ انہوں نے چبوترے پر یا طاقچہ پر لٹکا رکھا تھا۔

ہر تصویر بنانے والا جہنم میں جائے گا

حدیث ۱٦٨٠ :-

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: سمعتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ كُلُّ مُصَوِّرٍ فی النَّارِ يُجْعَلُ لَهُ بِكُلِّ صُورَةٍ صَوَّرَهَا نَفْسٌ فَيُعَذِّبُهُ فی جَهَنَّمَ. قال ابن عباس: فَإِنْ كُنْتَ لَا بُدَّ فَاعِلاً، فَاصْنعِ الشَّجَرَ وَمَا لَا رُوحَ فِيهِ.

(متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:- (حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی یہی روایت مسلم شریف میں ہے جس میں یہ ہے کہ ایک تصویر بنانے والا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور اس نے دریافت کیا کہ میرا پیشہ اور کاروبار ہی تصویر بنانا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اِدھر آؤ، جب وہ قریب آیا تو اس سے کہا اور قریب آؤ، پھر اور قریب بلایا، یہاں تک کہ جب وہ بالکل نزدیک آگیا تو اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا:) میں نے نبیِ کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: ہر تصویر بنانے والا جہنم میں جائے گا، اور جتنی بھی تصویریں بنائی ہیں، ہر ایک تصویر کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ ایک جان پیدا کریں گے جس کے ذریعہ سے اس کو جہنم میں عذاب دیا

جائے گا (گویا وہی اس کے لیے مزید تکلیف پہنچنے کا ذریعہ بنی۔ روایتوں میں ہے کہ جب اس آدمی نے سنا تو وہ بالکل ڈھیلا ہو گیا، اور اس کے حوصلے ختم ہو گئے کہ اب تو میرا کاروبار ختم ہو گیا، اب میں کہیں کا نہیں رہا) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے جب اس کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا: اگر تصویر بنانا ہی ہو (یعنی اگر تصویر بنانے سے ہی تمہارا کاروبار اور پیشہ چلتا ہے اور تمہیں روزی ملتی ہے) تو درخت یا ایسی چیز کی تصویر بنالو جس میں جان نہ ہو (یعنی جاندار کی تصویر مت بناؤ، بے جان چیز کی تصویر بنایا کرو۔)

حدیث ۱۶۸۱ :-

وعنه قال: سمعتُ رسولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقول: ((مَنْ صَوَّرَ صُورَةً فِي الدُّنْيَا، كُلِّفَ أَنْ يَنْفُخَ فِيهَا الرُّوحَ يَوْمَ القِيَامَةِ وَلَيْسَ بِنَافِخٍ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے دنیا میں تصویر بنائی اس کو قیامت کے روز اس بات کا پابند کیا جائے گا کہ اس میں جان ڈال، اور وہ جان نہیں ڈال سکے گا (جب تک جان نہیں ڈالے گا اس کو عذاب دیا جاتا رہے گا۔)

حدیث ۱۶۸۲ :-

وعن ابن مسعودٍ رضی الله عنه قال: سمعتُ رسولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يقولُ: ((إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَاباً يَوْمَ القِيَامَةِ المُصَوِّرُونَ.)) (متفق عليه)

ترجمہ:۔حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قیامت کے روز سب سے زیادہ سخت عذاب والے وہ ہوں گے جو تصویر بناتے ہیں۔

افادات:۔بعض لوگ شوقیہ تصویریں اتارتے رہتے ہیں، جیسے آج کل نوجوانوں میں عام ہوگیا ہے کہ شادی کا موقعہ ہو، یا کہیں تفریح میں چلے گئے، تو کیمرہ ساتھ لے لیتے ہیں، اور اب تو موبائل میں ہی کیمرے ہوتے ہیں، اس سے موقعہ بموقعہ تصویریں بنواتے ہیں، اور دوسروں کی بھی بناتے رہتے ہیں؛ وہ سب ان وعیدوں میں داخل ہیں۔

اس سے بڑا ظالم کون ہوگا

حدیث ۱۶۸۳:۔

وعن أبي هريرة - رضى الله عنه - قال: سمعتُ رسُولَ اللهِ ﷺ يقولُ: ((قال اللهُ تَعَالَى: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِي؟ فَلْيَخْلُقُوا ذَرَّةً أَوْلِيَخْلُقُوا حَبَّةً، أَوْلِيَخْلقوا شَعِيرَةً)). (متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:۔حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اس سے بڑا ظالم اور کون ہوگا جو میری جیسی خِلقت بنانے کی کوشش کرتا ہے (اگر اس میں ہمت ہے تو بڑی مخلوق تو دور کی بات رہی) ایک چیونٹی ہی پیدا کرکے بتائے (اور چیونٹی بھی

زندہ اور چلنے پھرنے والی مخلوق ہے، اس کو بھی چھوڑو) گیہوں کا ایک دانہ، یا جَو کا ایک دانہ ہی پیدا کر کے بتائے (اور گارنٹی ہے کہ وہ پیدا نہیں کر سکتا؛ تو پھر ایسی حرکت کیوں کرتا ہے؟)

افادات:- تخلیق یعنی کسی کو پیدا کرنا اور بنانا تو میرا کام اور میری صفت ہے، اور تصویر بنانے والا تصویر بنا کر میری اس صفت کی برابری کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے باری تعالیٰ اس پر اتنے غضبناک ہوتے ہیں۔

ایسی جگہ فرشتے داخل نہیں ہوتے

حدیث ۱۶۸۴:-

وعن أبي طلحة رضى الله عنه: أنَّ رسُولَ اللهِ ﷺ قال: لاَتَدْخُلُ المَلاَئِكَةُ بَيْتاً فيهِ كَلْبٌ وَلاَ صُورَةٌ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو طلحہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسے مکان اور ایسی جگہ میں فرشتے داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔

افادات:- ”بیت“ سے مراد رہائشی جگہ ہے، چاہے مکان ہو، خیمہ ہو، کچا گھر ہو، پکا گھر ہو۔ شرّاح نے لکھا ہے کہ یہاں رحمت کے فرشتے مراد ہیں۔ ہاں! جو فرشتے آدمی کے اعمال کی نگرانی کے لیے مقرر ہیں وہ تو ساتھ ہی رہتے ہیں، ہاں! رحمت والے فرشتے ایسے مکان یا جگہ میں نہیں آتے جہاں کتا یا تصویر ہوتی ہے۔

جس گھر میں کتا یا تصویر ہو

حدیث ۱٦٨٥:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: وَعَدَ رسُولَ اللهِ ﷺ جِبرِیلُ أنْ یأتِیَهُ، فَرَاثَ عَلَیهِ حَتّٰی اشْتَدَّ عَلٰی رَسُولِ اللهِ ﷺ فخَرَجَ فَلَقِیَهُ جِبریلُ فَشَکَا إلَیهِ، فقَالَ: إنّا لا نَدخُلُ بَیْتاً فِیهِ کَلْبٌ ولاَ صُورَةٌ۔ (رواہُ البُخاری)

((رَاثَ)): أبْطَأَ، وھو بالثاء المثلثة.

ترجمہ مع تشریح:-حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایک مرتبہ نبیٔ کریم ﷺ سے ایک مقررہ وقت میں آنے کا وعدہ کیا، جب وہ مقررہ وقت آیا تو نبیٔ کریم ﷺ ان کی آمد کا انتظار کرتے رہے، لیکن انہوں نے تاخیر کی، یہ چیز نبیٔ کریم ﷺ کو بہت گراں گزری (آئندہ روایت میں آرہا ہے کہ جب ملاقات ہوئی تو نبیٔ کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: اللہ کا ایلچی اور فرشتہ تو وعدہ خلافی نہیں کرسکتا؛ پھر ایسا کیوں کر ہوا؟) جب نبیٔ کریم ﷺ گھر سے باہر نکلے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام باہر ہی موجود تھے، ان سے ملاقات ہوئی اور حضور ﷺ نے شکوہ کیا (کہ آپ نے تو وعدہ کیا تھا، میں کب سے آپ کا انتظار کررہا ہوں، آپ تشریف نہیں لائے؟) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: جس گھر میں کتا یا تصویر ہو اس میں ہم (فرشتے) داخل نہیں ہوتے۔

افادات:—دراصل کتے کا ایک بچہ گھر کے اندر گھس آیا تھا جس کا پتہ حضور ﷺ اور آپ کے گھر والوں کو بھی نہیں تھا، اس وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام اندر نہیں آئے۔

حدیث ۱۶۸۶:-

وعن عائشة رضی الله عنها قالت: واعَدَ رسولَ اللهِ ﷺ جبريلُ عليهِ السَّلامُ فِي سَاعَةٍ أَنْ يَأْتِيَهُ، فَجَاءَتْ تِلْكَ السَّاعَةُ وَلَمْ يَأْتِهِ! قَالَتْ: وَكَانَ بِيَدِهِ عَصاً، فَطَرَحَهَا مِنْ يَدِهِ وَهُوَ يَقُولُ: مَا يُخْلِفُ اللهُ وَعْدَهُ وَلَا رُسُلُهُ، ثُمَّ الْتَفَتَ، فَإِذَا جَرْوُ كَلْبٍ تَحْتَ سَرِيرِهِ. فَقَالَ: مَتَى دَخَلَ هَذَا الْكَلْبُ؟ فَقُلْتُ: واللهِ مَا دَرَيْتُ بِهِ، فَأَمَرَ بِهِ فَأُخْرِجَ، فَجَاءَهُ جِبْرِيلُ عليه السلام فقال رسُولُ اللهِ ﷺ: وَعَدْتَنِي، فَجَلَسْتُ لَكَ وَلَمْ تَأْتِنِي؟ فقالَ: مَنَعَنِي الْكَلْبُ الَّذِي كَانَ فِي بَيْتِكَ، إِنَّا لَا نَدْخُلُ بَيْتاً فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ. (رواه مسلم)

(اس روایت میں بھی وہی قصہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے ذرا تفصیل سے ہے)

ترجمہ:—حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم ﷺ سے ایک مقررہ وقت میں آنے کا وعدہ کیا، جب مقررہ وقت آیا تو حضرت جبرئیل تشریف لے آئے تھے لیکن آپ ﷺ کے پاس گھر میں نہیں آئے۔ نبی کریم ﷺ کے دستِ مبارک میں چھڑی تھی، آپ حضرت جبرئیل علیہ السلام کے انتظار میں بے چین تھے، اسی بے چینی کی حالت میں آپ نے وہ لکڑی زمین پر پٹکی اور فرمانے لگے: اللہ اور اس کا ایلچی تو وعدہ خلافی نہیں کرسکتے؛ پھر ابھی تک کیوں نہیں آئے؟ ایسا کرنے کے بعد جو حضور ﷺ نے مڑ کر دیکھا تو آپ کی چارپائی کے نیچے کتے کا چھوٹا سا پلّا تھا، حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا: یہ کتا کب

گھر میں آگیا؟ (حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے بھی معلوم نہیں کہ یہ کب گھس آیا۔ حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس کتے کے بچے کو گھر سے باہر نکالنے کا حکم فرمایا۔ جیسے ہی اس کو نکالا گیا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام اندر تشریف لائے، حضور اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے شکایت کی کہ آپ نے میرے ساتھ ایک مقرر وقت پر آنے کا وعدہ کیا تھا، میں تو آپ کے انتظار میں بیٹھا رہا لیکن آپ تشریف نہیں لائے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا: کتے کا پِلّا جو گھر میں گھس آیا تھا، اس نے مجھے آنے نہیں دیا، اس لیے کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو؛ ہم (فرشتے) اس گھر میں نہیں آتے۔

افادات:- آج کل تو لوگ گھروں میں شوقیہ تصویریں رکھتے ہیں جس کے نتیجہ میں رحمت کے فرشتوں کا اس گھر میں آنا بند ہو جاتا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ مطلق کتا مراد ہے۔ اور آگے آئے گا کہ بعض صورتوں میں کتے کے پالنے کی اجازت دی گئی ہے، اس لیے بعض علماء فرماتے ہیں کہ جن کتوں کو پالنے کی اجازت دی گئی ہے وہ اگر کسی گھر میں ہوں تو فرشتے ایسے گھر میں آئیں گے۔ لیکن بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ مطلقاً کتے کے گھر میں ہونے کی صورت میں فرشتے گھر میں نہیں آئیں گے۔ یہی حال تصویر کا بھی ہے۔ البتہ اگر تصویر چُھپی ہوئی اور بند ہو؛ تو یہ حکم نہیں ہے۔ اگر کھلی ہوئی ہو اور باعزت جگہ پر رکھی ہوئی ہو تب تو یہی حکم ہے۔

حضورِ اکرم ﷺ کا خاص مشن

حدیث ۱٦٨٧:-

وعن أبي الهَيَّاجِ حَيَّانَ بنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ لِي عَلِيُّ بن أبي طالب رضی الله عنه: ألاَ أبْعَثُكَ عَلَى مَا بَعَثَنِي عَلَيْهِ رَسُولُ اللهِ ﷺ؛ أن لاَ تَدَعَ صُورَةً إلاَّ طَمَسْتَهَا، ولاَ قَبْرًا مُشْرِفاً إلاَّ سَوَّيْتَهُ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوالہیّاج، حیّان بن حُصَین اَسدی فرماتے ہیں کہ مجھے حضرت علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہ) نے ارشاد فرمایا کہ حضورِ اکرم ﷺ نے مجھے اپنی حیاتِ طیبہ میں جس خاص مشن پر روانہ کیا تھا؛ میں تم کو اسی مہم پر نہ بھیجوں ؟ (وہ مشن یہ تھا کہ) جو تصویر بھی دیکھو؛ اس کو مٹادو۔ اور جو قبر بھی اُبھری ہوئی دیکھو؛ اس کو زمین کے برابر کردو۔

افادات:- قبر ایک بالشت تک اونچی رکھنے کی اجازت ہے، اس سے زیادہ ہو؛ تو اس کو کم کر دینا چاہیے۔

باب تحریم اتخاذ الکلب إلا لصید أو ماشیة أو زرع

کتے کو پالنے کا حرام ہونا، سوائے یہ کہ

شکار کے لیے ہو، یا مویشیوں جانوروں اور کھیتی باڑی کی حفاظت کے لیے ہو

اسلام میں کتوں کو پالنے سے منع کیا گیا ہے، نبی کریم ﷺ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو شروع میں آپ نے کتوں کو مارنے کا حکم دیا تھا، چناں چہ جہاں بھی کتے نظر آتے تو حضراتِ صحابہ ان کو ختم کر دیتے تھے، پھر بعد میں مارنے والا حکم تو واپس لے لیا گیا؛ لیکن کتوں کو گھر میں لانے اور پالنے کی ممانعت باقی ہے۔

اعمال کے اجر و ثواب میں روزانہ کمی ہوگی

حدیث ۱۶۸۸:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: سمعتُ رسُولَ اللہِ ﷺ یقولُ: ((مَنِ اقْتَنَى كَلْباً إلاَّ كَلْبَ صَيْدٍ أوْ مَاشِيَةٍ فَإنَّهُ يَنْقُصُ مِنْ أجْرِهِ كُلَّ يَومٍ قِيرَاطَانِ)) (متفق علیه) وفی روایة: ((قِيرَاطٌ))

ترجمہ:۔حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس نے کتا پالا؛ سوائے یہ کہ وہ شکار کے لیے ہو، یا مویشیوں اور جانوروں کی حفاظت کے لیے ہو (گویا ان کا استثناء کر دیا گیا کہ وہ اس حکم میں داخل نہیں) تو اس کے اعمال کے اجر و ثواب میں سے ہر دن دو قیراط کم ہوں گے۔ ایک روایت میں ایک قیراط کا تذکرہ آیا ہے۔

افادات:۔یعنی اگر کسی نے محض شوقیہ کتا پالا جیسا کہ آج کل شوقیہ کتا پالنے کی تہذیب ہو گئی ہے؛ تو اس کا یہی حکم ہے۔

ایک دینار بیس قیراط کا ہوتا ہے، تو ایک قیراط یعنی دینار کا بیسواں حصہ۔ اور اہلِ شام کے نزدیک دینار کا چوبیسواں حصہ ہوتا ہے۔

یہاں قیراط سے کیا مراد ہے؟ تو تمام شرّاح فرماتے ہیں کہ ثواب کی ایک مخصوص مقدار مراد ہے، اور وہ کتنی ہے یہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی کتا پالے گا اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ جتنے بھی نیک اعمال کرے گا اور ان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے جو ثواب بھی مقرر ہے، ان اعمالِ صالحہ پر ملنے والے ثواب میں سے ایک حصہ کاٹ دیا جائے گا۔

آج اگر ہمیں بتلا دیا جائے کہ اگر تم فلاں حرکت کرو گے تو تمہاری تنخواہ میں سے اتنا کٹ جائے گا؛ تو ہم میں سے کوئی بھی وہ حرکت نہیں کرے گا، کیوں کہ دو پیسے ہمیں بڑے مرغوب ہیں۔ تو جہاں

تنخواہ کٹتی ہو وہ کام ہم نہیں کریں گے، اور یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعمال پر جو ثواب دیا جاتا ہے اس کے متعلق بتلایا جارہا ہے کہ کتا پالنے کی صورت میں وہ ثواب کٹ جاتا ہے؛ پھر بھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا جاتا۔

حدیث ۱۶۸۹:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال قالَ رسولُ اللهِ ﷺ: مَنْ أَمْسَكَ كَلْباً، فَإِنَّهُ يَنْقُصُ مِنْ عَمَلِهِ كُلَّ يَوْمٍ قِيرَاطٌ إلاَّ كَلْبَ حَرْثٍ أَوْ مَاشِيَةٍ. (متفق عليه)

وفي رواية لمسلم: ((مَنْ اقْتَنَى كَلْباً لَيْسَ بِكَلْبِ صَيْدٍ، وَلاَ مَاشِيَةٍ وَلاَ أَرْضٍ، فَإِنَّهُ يَنْقُصُ مِنْ أَجْرِهِ قِيرَاطَانِ كُلَّ يَوْمٍ)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے کتا پالا تو ہر دن اس کے عمل میں سے ایک قیراط کے برابر ثواب کم ہو جائے گا؛ سوائے یہ کہ وہ کھیتی باڑی یا مویشیوں کی حفاظت کے لیے پالا ہو۔

اور مسلم شریف کی روایت میں یہ ہے کہ: جس آدمی نے کتا پالا، اگر وہ شکار کے لیے، یا جانوروں اور مویشیوں، یا کھیتی باڑی اور زمین کی حفاظت کے لیے نہیں ہے؛ تو اس کے ثواب میں سے روزانہ دو قیراط کم ہوں گے۔

افادات:- علماء نے یہی لکھا ہے کہ اگر کسی جگہ پر مکان کی حفاظت کتے کے بغیر ممکن نہ ہو؛ تو اس کی حفاظت کے لیے رکھا ہوا کتا اس حکم میں داخل ہے، یعنی اس کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ یا جانوروں کی

حفاظت کے لیے کتا پالا ہو۔ جیسے: بکریوں کو جنگل میں چرانے کے لیے جب بھیجا جاتا ہے، تو عام طور پر وہاں بھیڑیا آکر بکریوں کا شکار کرلیتا ہے، تو بھیڑیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اور بکریوں کو بھیڑیوں کے حملوں سے بچانے کے لیے، یا شکار کے لیے کتا پالنے کی اجازت ہے۔ تو جن جن صورتوں میں شریعت کی طرف سے کتا پالنے کی اجازت دی گئی ہے اگر ان میں سے کوئی صورت ہے تو پھر ثواب میں کمی نہیں آئے گی۔

ثواب میں کمی کیوں آتی ہے؟

اگرچہ کسی حدیث میں اس کی کوئی تفصیل نہیں ہے، لیکن حضراتِ شرّاح نے اس پر کلام کیا ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں: کتے کی وجہ سے کہیں نہ کہیں نجاست میں تلویث ہو ہی جاتی ہے، اس لیے کہ عموماً وہ اپنی رال ٹپکاتا رہتا ہے اور وہ اس کو پالنے والے کے کپڑوں پر، یا زمین کے کسی حصہ پر لگے گی جس کی وجہ سے عبادت میں نقص آجائے گا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: اس کتے کہ وجہ سے چوں کہ آنے جانے والوں کو تکلیف ہوتی ہے، اس لیے کہ اس کی عادت بھونکنے کی ہے، اور اس کے بھونکنے کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں سہم اور ڈر پیدا ہو گا۔ بعض مرتبہ وہ نہیں بھونکتا تب بھی کھڑے ہوئے کتے کی وجہ سے بعض لوگوں کے دل ڈر پیدا ہوتا ہے؛ تو لوگوں کو اس کی وجہ سے تکلیف پہنچتی ہے اس وجہ سے ثواب میں کمی آتی ہے۔

بعض حضرات فرماتے ہیں: آدمیوں کے اعتبار سے کمی ہوگی۔یعنی بعض لوگوں کے اعمال سے ایک قیراط کی کمی آئے گی، بعضوں کے لیے دو قیراط کی کمی ہوگی۔

ایک اور دو قیراط کے بارے میں اکثر شرّاح نے فرمایا ہے کہ جہاں کہیں زیادہ کا عدد ہو؛ وہی مراد ہوتا ہے،یعنی دو قیراط کم ہوں گے۔

باب کراھیۃ تعلیق الجرس فی البعیر وغیرہ من الدواب وکراھیۃ استصحاب الکلب والجرس فی السفر

اونٹ یا دوسرے جانوروں کی گردن میں گھنٹی لٹکانے کی ممانعت اور سفر میں کتے، یا گھنٹی لگے ہوئے جانور کو اپنے ساتھ رکھنے کی ممانعت

حدیث ۱۶۹۰:-

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال قال رسول الله ﷺ: لَا تَصْحَبُ الْمَلَائِكَةُ رُفْقَةً فِيهَا كَلْبٌ أَوْ جَرَسٌ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: وہ رفقاءِ سفر جن کے ساتھ کتا ہو، یا جانور کے ساتھ گھنٹی لگی ہوئی ہو؛ ان کے ساتھ فرشتے نہیں رہتے (گویا فرشتے ان سے دور ہو جاتے ہیں)

افادات:- کتے کی تفصیل اوپر والے باب میں آگئی۔ اور گھنٹی کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں: اس سے بڑی گھنٹی مراد ہے۔ اور ناقوس کے مشابہ ہونے کی وجہ سے اس سے منع کیا گیا ہے، اور اسی علت کی وجہ سے عورتوں اور بچیوں کے لیے بجنے والا ایسا زیور یا پازیب پہننا جس میں گھنٹیاں بجتی ہوں اس کی ممانعت ہے۔

لیکن اکثر حضراتِ شرّاح فرماتے ہیں: ویسے ہی شوقیہ یا لذت حاصل کرنے کے لیے، یا دلوں کو تسلی دینے کے لیے اگر گھنٹی لگائی ہے کہ جب جانور چلے گا تو گھنٹی بجے گی اور اچھا لگے گا؛ تو اس کے لیے یہ حکم ہے۔ لیکن اگر کسی ضرورت کی وجہ سے لگائی ہے، مثال کے طور پر بعض مرتبہ کسی قافلہ کے اندر گھنٹی اس لیے لگائی جاتی ہے کہ اگر قافلہ میں سے کوئی آدمی پیچھے رہ گیا تو گھنٹی کی آواز سن کر اس کو قافلہ کا پتہ چل جائے گا، یا اس وجہ سے گھنٹی لگائی کہ جانوروں کو چلنے میں آسانی ہوگی، اور گھنٹی کی آواز سن کر جانوروں میں چلنے کا جوش پیدا ہوتا ہے؛ تو اس صورت میں اس کی اجازت ہے۔

گھنٹی شیطان کی بنسری ہے

حدیث ۱۶۹۱ :-

وعنه أنَّ النَّبيَّ ﷺ قال: الجَرَسُ مَزَامِيرُ الشَّيْطَانِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:— حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: گھنٹی شیطان کی بنسریاں ہے۔

افادات:— مَزَامِیر، مِزْمارٌ کی جمع ہے، جس کا معنیٰ بنسری ہوتا ہے، جس کو ہم پپُوڑی (پیپُڑی) بھی کہتے ہیں۔ اس روایت سے فرشتوں کے ایسے گھروں میں نہ آنے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔

باب کراهية ركوب الجلالة وهي البعير أو الناقة الّتي تأكل العذرة.

فإن أكلت علفًا طاهرًا فطاب لحمها زالت الكراهة

نجاست کھانے کے عادی جانور پر سواری کی کراہت

بعض حلال جانور ایسے ہوتے ہیں جن کو نجاست کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے، بعض اونٹ ایسے ہوتے ہیں جن کو پاخانہ کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے، یا بعض اونٹنیاں ایسی ہوتی ہیں جو گندگی کھاتی ہیں، گائے بھی کبھی اس کی عادی ہو جاتی ہے، مرغی بھی کبھی گندگی کھانے لگتی ہے۔ تو سواری کے جس جانور کو بھی نجاست کھانے کی عادت پڑ گئی ہو تو اس کے گوشت میں بھی ایک قسم کی سڑانڈ اور بدبو پیدا ہو جاتی ہے، اور اس سے اس کا پسینہ بھی متاثر ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے جانور پر سوار ہونے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ اگر کچھ دن اس کو باندھے ہوئے رکھ کر نجاست کھانے کا موقعہ نہ دیا جائے اور گھاس کھلائی جاتی رہے یہاں تک کہ نجاست کھانے کی وجہ سے اس کے گوشت میں جو اثر آ گیا تھا وہ باقی نہ رہے، اور وہ سرانڈ ختم ہو جائے؛ تو اب اس پر سوار ہونے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ کوئی مرغی بھی اگر نجاست کھانے کی عادی ہو گئی ہو تو اس کے لیے یہی حکم ہے کہ اس کو گھر میں باندھ دیا جائے اور چند روز

کے لیے اس کو نجاست کھانے کا موقعہ نہ دیا جائے یہاں تک کہ نجاست کے وہ اثرات زائل ہو جائیں؛ اس کے بعد پھر اس کو ذبح کیا جائے۔

حدیث ۱۶۹۲:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: نَهَى رسُولُ اللهِ ﷺ عَنِ الجَلاَّلَةِ فی الإبِلِ أنْ يُرْكَبَ عَلَيْهَا. (رواہ أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے سواری کے ایسے اونٹ پر سوار ہونے سے منع فرمایا جو نجاست کھاتا ہو۔

باب النهى عن البصاق فى المسجد، والأمر بإزالته منه إذا وجه فيه، والأمر بتنزيه المسجد عن الاقذار

مسجد میں تھوکنے کی ممانعت، اگر مسجد میں تھوک نظر آجائے تو اس کو دور کرنے اور گندی چیزوں سے مسجد کو پاک رکھنے کا حکم

مسجد میں تھوکنا گناہ ہے

حدیث ۱۶۹۳:-

عن أنس رضى الله عنه أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قال: ((البُصاقُ فى المَسجِدِ خَطِيئَةٌ، وَ كَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا)) (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسجد میں تھوکنا گناہ ہے؛ جس کا کفارہ اس تھوک کو دفن کر دینا ہے۔

والمرادُ بِدَفْنِهَا إذَا كَانَ المَسْجِدُ تُرَاباً أَوْ رَمْلاً ونَحْوَهُ، فَيُوَارِيهَا تَحْتَ تُرَابِهِ. قالَ أبُو المحاسِنِ الرُّويَانِي مِنْ أصحابِنا فى كِتَابِهِ " البحر " وقِيلَ: المُرَادُ بِدَفْنِهَا إخراجُهَا مِنَ المَسْجِدِ، أمَّا إِذَا كَانَ المَسْجِدُ مُبَلَّطاً أَوْ مُجَصَّصاً، فَدَلَكَهَا عَلَيْهِ بِمَدَاسِهِ أَوْ بِغَيْرِهِ كَمَا يَفْعَلُهُ كَثِيرٌ مِنَ الجُهَّالِ، فَلَيْسَ ذَلِكَ بِدَفْنٍ، بَلْ زِيَادَةٌ فِي الخَطِيئَةِ وَتَكْثِيرٌ لِلقَذَرِ فى المَسْجِدِ، وَعَلَى مَنْ فَعَلَ ذَلِكَ أَنْ يَمْسَحَهُ بَعْدَ ذَلِكَ بِثَوْبِهِ أَوْ بِيَدِهِ أَوْ غيرِهِ أَوْ يَغْسِلَهُ.

افادات:–اس باب میں مسجد کے آداب کے متعلق کچھ باتیں بتلانا چاہتے ہیں۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) تھوک کو دفن کرنے کا مطلب بتلاتے ہیں کہ: پہلے زمانہ میں مسجدوں کا فرش ایسا نہیں ہوتا تھا جیسا کہ آج کل پختہ فرش ہوتا ہے جس پر دریاں اور قالین وغیرہ بچھے ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ مسجد کے اندر ریت، مٹی اور کنکریاں بچھی ہوئی ہوتی تھیں۔ آج بھی راجستھان کے علاقہ میں آپ جائیں گے تو بعض مسجدیں ایسی ہی ملیں گی جہاں ریت بچھی ہوئی ہوتی ہے۔ تو اگر مسجد کا فرش پختہ نہیں ہے، بلکہ مٹی ریت یا اس جیسی کوئی اور چیز ہے تو ایسی صورت میں زمین کو کھود کر تھوک کو نیچے چھپادیا جائے، اور اوپر سے دوسری ریت ڈال دی جائے۔ شوافع کے ایک بڑے عالم ابوالمحاسن رویانی کے حوالہ سے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) بتلاتے ہیں کہ: تھوک کو دفن کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تھوک کو مسجد سے نکال دیا جائے۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: حدیث میں جو آیا ہے کہ "تھوک کو دفن کردینا اس گناہ کا کفارہ ہے" یہ اسی وقت ہے جب کہ مسجد میں ریت، مٹی یا کنکر وغیرہ بچھی ہوئی ہو، لیکن اگر مسجد کا فرش پتھر، چونے، گچ، سمینٹ، یا آر، سی، سی (RCC) کا بنا ہوا ہو (یعنی پختہ ہو) اور اس پر تھوک گرا ہوا ہو تو بعض لوگ اس کو اپنے جوتے، پاؤں یا کسی چیز سے مل دیتے ہیں، گویا اس کو وہاں گھِس دیا کرتے ہیں؛ یہ دفن کرنا نہیں ہوا، بلکہ یہ تو مسجد کو اور زیادہ ملوث کرنا ہوا۔ اور اس سے گناہ گھٹے گا نہیں، بلکہ اور بڑھے گا۔ اور اگر کسی آدمی نے نادانی اور ناواقفیت کی وجہ سے ایسا کر لیا ہو تو اس کو چاہیے کہ

کپڑے یا اپنے ہاتھ سے، یا کسی اور طریقہ سے اس کو دھو کر صاف کر دے۔ اور جب تک وہ ایسا نہیں کرے گا اس فعل کے گناہ سے پاک نہیں ہو گا۔

اس روایت سے مسجد میں تھوکنے کی ممانعت معلوم ہوتی ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے خود اہتمام فرمایا

حدیث ۱۶۹۴:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها: أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ رَأَى فِي جِدَارِ القِبْلَةِ مُخَاطاً، أَوْ بُزَاقاً، أَوْ نُخَامَةً، فَحَكَّهُ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ مسجد نبوی میں قبلہ والی (سامنے کی) دیوار میں تھوک یا بلغم دیکھا تو اس کو وہاں سے دور فرما دیا۔

افادات:- بلغم ایک تو گلے سے اوپر کی طرف چڑھتا ہے، جس کو "نُخَامَة" کہتے ہیں۔ اور اگر دماغ سے نیچے اترتا ہے تو اس کو "مُخَاط" کہتے ہیں۔ اردو میں دونوں بلغم ہی کہلاتے ہیں۔

کسی نے تھوکا ہو گا وہ نبی کریم ﷺ نے دیکھا کہ دیوار کے اوپر لگا ہوا ہے، تو آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کو کھرچ کر دُور کر دیا۔ دوسری روایت میں یہ بھی ہے کہ اس کے بعد آپ نے خوشبو منگوائی اور وہاں پر لگائی۔

مسجدوں کو دھونی دینے اور اس میں خوشبو لگانے کا بھی حکم ہے۔ نبیِ کریم ﷺ کے زمانہ میں خوشبو کی دھونی دینے کا معمول تھا۔

مسجدیں گندگی کے لیے نہیں بنائی گئیں

حدیث ۱۶۹۵:-

وعن أنس رضی الله عنه أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: ((إنَّ هذِهِ المَسَاجِدَ لاَ تَصْلُحُ لِشَيْءٍ مِنْ هٰذَا البَوْلِ وَلاَ القَذَرِ، إنَّمَا هِيَ لِذِكْرِ اللهِ تَعَالَى، وَقِرَاءةِ القُرْآنِ)) أَوْ كَمَا قَالَ رسُولُ اللهِ ﷺ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت أنس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسجدیں پیشاب یا گندگی کے لیے نہیں بنائی گئی ہیں، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی یاد (نماز پڑھنے) قرآنِ پاک کی تلاوت (تعلیم اور تسبیحات وغیرہ) کے لیے بنائی گئی ہیں۔

سوال، دعا، اور عمل

افادات:- ایک مرتبہ ایک دیہاتی آیا، اور وہ کسی بھی قسم کے آداب وغیرہ سے واقف نہیں تھا۔ اس نے نبیِ کریم ﷺ سے سوال کیا: ”مَتٰى السَّاعَةُ“ قیامت کب ہے؟ نبیِ کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: ”وَمَا أَعْدَدتَّ لَهَا؟“ تو نے اس کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ آپ ﷺ کا سوال سن کر وہ

تھوڑی دیر تو خاموش ہو گیا، اس کے بعد اس نے عرض کیا: ”مَا أَعْدَدتُّ لَهَا كَثِيْرَ صَلٰوةٍ وَلَا صَوْمٍ“ اس کے لیے میں نے زیادہ نماز روزے کی تیاری تو نہیں کی ہے، صرف فرائض پر اکتفا کرتا ہوں، البتہ آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ یہ سن کر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: ”اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ“ آدمی جس سے محبت رکھتا ہے اسی کے ساتھ رہے گا۔

پھر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور دعا کرنے لگا: أَللّٰهُمَّ ارْحَمْنِيْ وَمُحَمَّدًا، وَلَا تَرْحَمْ مَعَنَا أَحَدًا“ اے اللہ! مجھ پر اور محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر رحم کیجیے، اور کسی پر رحم مت کیجیے۔ اس کی یہ دعا سن کر حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ”لَقَدْ حَجَّرْتَ وَاسِعًا“ اللہ تعالیٰ کی رحمت تو بڑی کشادہ ہے، تو نے اس کو بہت تنگ کر دیا۔

اس کے بعد اس کو پیشاب کا تقاضا ہوا تو وہیں مسجد کے ایک کونے میں پیشاب کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے جب اس کو دیکھا کہ پیشاب کر رہا ہے؛ تو سب ہی اپنی اپنی جگہ سے اس کو دھتکارنے اور ڈانٹنے لگے کہ تو یہ کیا کر رہا ہے؟ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اب تو وہ شروع ہو چکا ہے، اس لیے اس کو پیشاب کر لینے دو۔ اس لیے کہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ بند کر لے گا تو وہ اس کے لیے نقصان دہ ہے۔ یا اُٹھ کر چلنے لگے گا، تو ابھی تو تھوڑی سی جگہ ہی ملوث ہو رہی ہے، اس صورت میں پوری جگہ کو خراب کرے گا۔ اس کے بعد نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے پانی سے بھری ہوئی ایک بالٹی منگوائی اور اس پر ڈلوادی، اس کے بعد نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کو سمجھایا: بھائی! یہ مسجدیں ہیں، مناسب نہیں کہ ان میں پیشاب کیا جائے، یا کوئی بھی گندگی کی جائے؛ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی یاد، نماز، قرآنِ پاک

کی تلاوت و تعلیم اور تسبیحات کے لیے بنائی گئی ہیں۔ گویا آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اس کو بڑی محبت سے مسجد کے مقاصد بتائے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلا دیا کہ مسجد میں کسی بھی قسم کی گندگی نہیں ہونی چاہیے۔

تھوک اور بلغم ویسے تو پاک ہے، اگر ہمارے کپڑوں پر لگا ہوا ہو، یا جسم کے کسی حصہ پر لگا ہوا ہو تو اس کی وجہ سے نماز پر کوئی آنچ نہیں آتی؛ لیکن ایک گندی چیز سمجھی جاتی ہے، اس لیے مسجد کو اس سے صاف رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

باب كراهية الخصومة فى المسجد ورفع الصوت فيه ونشد الضالة والبيع والشراء والإجارة ونحوها من المعاملات

مسجد میں جھگڑنا اور آپس میں بلند آواز میں دنیا کی باتیں کرنا، گمشدہ چیز کا اعلان کرنا، خرید فروخت کرنا، کرایہ داری وغیرہ کسی بھی قسم کا معاملہ کرنا؛ ناپسندیدہ اور ممنوع ہے

مسجد میں جھگڑنا، خرید فروخت کرنا؛ ناپسندیدہ اور ممنوع ہے

مسجد کے آداب میں تیسری چیز بتلاتے ہیں۔ مسجدیں آخرت کے بازار ہیں، یہ دنیا کے مارکیٹ نہیں کہ یہاں خرید و فروخت کی جائے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ’’اَلْمَسَاجِدُ سُوْقٌ مِنْ أَسْوَاقِ الْآخِرَةِ، مَنْ دَخَلَهَا كَانَ ضَيْفًا لِلّٰهِ‘‘ مسجدیں آخرت کے بازار ہیں، جو آدمی اس میں داخل ہوجاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا مہمان بن جاتا ہے۔ مسجد کے آداب کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی چیزیں وہاں نہ ہوں۔ دنیا کی باتیں بھی وہاں نہیں ہونی چاہئیں؛ لیکن آج کل اس کی طرف سے بڑی غفلت برتی جاتی ہے۔

فرشتے کا غصہ

علامہ ابن الحاج مالکی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی کتاب ”المدخل“ میں ایک روایت نقل کی ہے کہ: جب کوئی آدمی مسجد میں بات چیت شروع کرتا ہے تو ایک فرشتہ اس کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے: ”أُسْكُتْ يَاحَبِيْبَ الله“ اے اللہ کے دوست! خاموش ہو جا، اس کے بعد بھی اگر اس کی باتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے تو وہ کہتا ہے: ”أُسْكُتْ يَابَغِيْضَ الله“ اے اللہ کے دشمن! خاموش ہو جا۔ اس کے بعد بھی اگر باتیں چلتی رہتی ہیں تو وہ کہتا ہے: ”أُسْكُتْ، عَلَيْكَ لَعْنَةُ الله“ خاموش ہو جا؛ اللہ کی تجھ پر لعنت ہو۔ غور کرنے کی بات ہے کہ آدمی مسجد میں اس لیے آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت لے کر جائے لیکن اس طرح کی لغویات میں مشغول ہو کر اپنے آپ پر بوجھ لے کر جاتا ہے۔ اس لیے بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہمارے اکابر مسجد کے آداب کی بڑی رعایت کرتے ہیں، خاص کر نماز کے اوقات میں تو بہت ہی زیادہ۔

بقول علامہ شعرانی (رحمۃ اللہ علیہ): نماز کے اوقات تو شاہی دربار لگنے کا وقت ہے، اس وقت تو مزید آداب کا اہتمام ہونا چاہیے۔

مسجدیں اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں

حدیث ۱۶۹۶:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه أنَّه سمعَ رسُولَ اللهِ ﷺ يقولُ: مَنْ سَمِعَ رَجُلاً يَنْشُدُ ضَالَّةً في المَسْجِدِ فَلْيَقُلْ: لاَ رَدَّها اللهُ عَلَيْكَ. فإِنَّ المَسَاجِدَ لَمْ تُبْنَ لِهذَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جو آدمی مسجد میں کسی کو اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتے ہوئے سنے (کہ میرا جانور گم ہو گیا ہے، میری گھڑی گم ہو گئی ہے، میری فلاں چیز گم ہو گئی ہے؛ کسی کو ملی ہو تو مجھے بتلائے) تو اس کو جواب میں کہے: (تو نے مسجد کے اندر یہ اعلان کیا ہے، اس لیے) اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس نہ دے (یعنی اس کو بددعا دینی چاہیے۔ اور بددعا دینے کی وجہ یہ ہے کہ) مسجدیں اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں (اور تو نے مسجد کو اعلان کی جگہ بنادیا۔)

افادات:- آج کل تو مسجد کے مائک سے عجیب عجیب اعلانات ہوتے ہیں۔ اور مائک مسجد کے حصے میں لگے ہوتے ہیں، منارہ مسجد کے اندر داخل ہے، مسجد کی اوپر کی چھت پر مائک لگا ہوتا ہے وہ بھی مسجد کے حکم میں ہے۔ اور مسجد کے اندر کے اسپیکروں سے اس طرح کے کوئی بھی اعلانات کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔ حضور ﷺ نے صراحتاً ارشاد فرمایا: مسجدیں اس لیے نہیں بنائی گئی ہیں۔

حدیث ۱٦۹۷:-

وعنه: أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: إِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَبِيعُ أَوْ يَبْتَاعُ فِى الْمَسْجِدِ، فَقُولُوا: لَا أَرْبَحَ اللهُ تِجَارَتَكَ، وَإِذَا رَأَيْتُمْ مَنْ يَنْشُدُ ضَالَّةً فَقُولُوا: لَا رَدَّهَا اللهُ عَلَيْكَ. (رواه الترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی آدمی کو مسجد میں خرید و فروخت کرتے ہوئے دیکھو تو اس کو یہ دعا دو: اللہ تعالیٰ تیری تجارت میں نفع نہ دے۔ اور اگر کسی آدمی کو دیکھو کہ اپنی گم شدہ چیز کا اعلان کرتا ہے (یا اعلان کے ذریعہ تلاش کرتا ہے) تو اس کو جواب میں کہو: اللہ تعالیٰ تیری چیز تجھے واپس نہ لوٹائے۔

افادات:- ویسے تو حضور اکرم ﷺ خود کسی کو بد دعا نہیں دیتے تھے، لیکن یہاں تو بد دعا کی تلقین فرما رہے ہیں؛ کیوں کہ اس آدمی نے مسجد کے آداب کی رعایت نہیں کی، اس نے مسجد کی حرمت کا خیال نہیں کیا اس لیے وہ اس لائق ہے کہ اس کو یہی کہا جائے۔ ہاں! کسی کی کوئی چیز مسجد ہی میں چھوٹ گئی ہے تو اعلان کیے بغیر اپنے طور پر چپکے سے مسجد میں تلاش کرلے؛ اس کی اجازت ہے۔ لیکن ایسا اعلان کرنا کہ میری فلاں چیز گم ہو گئی ہے، اور یہاں مسجد ہی میں رہ گئی ہے، کسی کو ملی ہو تو مجھے دیدے؛ اس کی اجازت نہیں۔ البتہ مسجد کے احاطہ کے باہر ایسا اعلان کیا جاسکتا ہے۔

تیرا اونٹ تجھے نہ ملے

حدیث ۱۶۹۸:-

وعن بُرَيْدَةَ -رضى الله عنه-: أَنَّ رَجُلاً نَشَدَ فى المَسْجِدِ فَقَالَ: مَنْ دَعَا إِلَى الجَمَلِ الأَحْمَرِ؟ فَقَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((لا وَجَدْتَ، إِنَّمَا بُنِيَتِ المَسَاجِدُ لِمَا بُنِيَتْ لَهُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت بریدہ اسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے مسجد میں اعلان کیا: کون میرا لال اونٹ مجھے دلائے گا (مسلم شریف ہی کی دوسری روایت میں ہے کہ ایک دیہاتی آیا اور مسجد کی کھڑکی میں سے اپنا منھ اندر کر کے کہنے لگا: میرا لال اونٹ گم ہو گیا ہے؛ کون مجھے بتلائے گا؟) حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تیرا اونٹ تجھے نہ ملے، مسجدیں تو اُسی کام کے لیے بنائی گئیں ہیں جس کے لیے ہیں (یعنی نماز، ذکر اور تلاوت وغیرہ کام کے لیے بنائی گئی ہیں)۔

مسجد میں حمد و نعتیہ اشعار پڑھنا

حدیث ۱۶۹۹:-

وعن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جدِّهِ -رضى الله عنه-: أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ نَهَى عَنِ الشِّراءِ والبَيْعِ فى المَسْجِدِ، وَأَنْ تُنْشَدَ فِيهِ ضَالَّةٌ، أَوْ يُنْشَدَ فِيهِ شِعْرٌ. (رواه أبو داود والترمذى، وقال: ((حديث حسن)).

ترجمہ:–حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مسجد میں خرید و فروخت کرنے سے منع فرمایا۔اور اس بات سے بھی منع فرمایا کہ کسی گم شدہ چیز کے لیے مسجد میں اعلان کیا جائے،یا اس میں اشعار پڑھے جائیں۔

افادات:–ہاں!اگر وہ اشعار ایسے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا ہے،یا نبی کریم ﷺ کی نعت ہے،یا نصیحت کی باتیں ہیں؛تو اس کی اجازت ہے۔چنانچہ حضرت حسان بن ثابت (رضی اللہ عنہ) کے لیے نبی کریم ﷺ باقاعدہ منبر رکھواتے تھے اور ان کو اشعار پڑھنے کا حکم دیتے تھے۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے زمانہ میں ایک مرتبہ حضرت حسان (رضی اللہ عنہ) اسی طرح مسجد میں حضورِ اکرم ﷺ کی شان میں اشعار پڑھ رہے تھے،حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فوراً ان کی گرفت کی؛کہ یہ کیا کر رہے ہو؟اور قریب تھا کہ ان کو سزا دیتے کہ انہوں نے کہا:حضورِ اکرم ﷺ نے مجھے اس کے لیے حکم دیا ہے،بلکہ میرے لیے دعا فرمائی ہے کہ حضرت جبرئیل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میری مدد فرماتے ہیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:اس بات کا گواہ کون ہے؟انہوں نے حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کو گواہی میں پیش فرمایا۔

مَیں تمہیں سزا دیتا

حدیث ۱۷۰۰:-

وعن السائبِ بن يزيد الصحابي رضى الله عنه قَالَ: كُنتُ فى المَسْجِدِ، فَحَصَبَنِي رَجُلٌ، فَنَظَرْتُ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الخَطَّابِ رضى الله عنه، فَقَالَ: اذْهَبْ فَأْتِنِي بِهَذَيْنِ، فَجِئْتُهُ بِهِمَا، فَقَالَ: مِنْ أَيْنَ أَنْتُمَا؟ فَقَالا: مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ، فَقَالَ: لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ البَلَدِ، لَأَوْجَعْتُكُمَا، تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِي مَسْجِدِ رَسُولِ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ! (رواه البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت سائب بن یزید (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں مسجدِ نبوی میں تھا کہ ایک آدمی نے (مجھے بلانے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے) میری طرف چھوٹا سا کنکر پھینکا (اس زمانہ میں مسجدِ نبوی میں ریت اور کنکر بچھے ہوئے تھے) میں نے دیکھا (کہ کنکر کس نے پھینکا؟) تو وہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) تھے (انہوں نے بلانے کے لیے آواز نہیں دی، بلکہ کنکر پھینکا۔ میں ان کے پاس گیا) انہوں نے فرمایا: وہ دو آدمی جو مسجد کے دوسرے کونے میں زور زور سے باتیں کر رہے ہیں ان دونوں کو میرے پاس بلا کر لے آؤ (میں ان دونوں کو بلا کر لایا تو) حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے ان سے پوچھا: کہاں کے رہنے والے ہو؟ انہوں نے کہا: ہم طائف کے رہنے والے ہیں۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اچھا! اگر مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا کہ حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی مسجد میں اپنی آواز بلند کرتے ہو؟

افادات:- اس لیے کہ یہاں رہتے ہوئے اور یہاں کی مسجد کے آداب سے پورے طور پر واقف ہوتے ہوئے بھی اس کی خلاف ورزی کرتے ہو؛ لیکن چوں کہ اجنبی ہو، یہاں کے آداب سے پورے طور واقف نہیں ہو، اس لیے چھوڑ دیئے جاتے ہو۔

نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی حیاتِ طیبہ میں بھی حکم یہی تھا: ﴿لَا تَرْفَعُوٓا۟ أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ ٱلنَّبِىِّ﴾ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی مجلس میں ایسے انداز میں بولنا کہ بولنے والے کی آواز نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی آواز سے بلند ہو جائے؛ اس کی اجازت نہیں تھی۔ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی وفات کے بعد بھی مسجدِ نبوی میں ضروری ہے کہ اس بات کا پورا لحاظ کیا جائے۔

باب نهي من أكل ثوما أو بصلا أو كرّاثا أو غيرها مماله رائحة كريهة عن دخول المسجد قبل زوال الرائحة إلا لضرورة

کسی آدمی نے پیاز کھائی، یا لہسن کھایا، یا گندنا کھایا (یہ بھی ایک طرح کی سبزی ہے جو بدبودار ہوتی ہے) یا کوئی ایسی چیز۔ جو بدبودار ہو۔ استعمال کی؛ تو اس کو مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہے جب تک کہ وہ بدبو زائل نہ ہو جائے۔ ہاں! پیاز اگر پکی ہوئی ہو، یا لہسن اگر پکا ہوا ہے، تو اس کے کھانے سے بدبو پیدا نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ بدبودار کوئی بھی چیز استعمال کرنے کے بعد مسجد میں آنا ممنوع ہے۔

جس نے لہسن کھایا ہو

حدیث ۱۷۰۱:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنهما: أنّ النبيّ ﷺ قَالَ: ((مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ -يعني: الثُّومَ- فَلَا يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا)).(متفق عَلَيْهِ)

وفی روايةٍ لمسلم: ((مساجدنا))

ترجمہ:--حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے (لہسن کی طرف اشارہ کرکے) ارشاد فرمایا: جس نے اس پودے کو کھایا ہو وہ ہماری مسجد کے قریب بھی نہ آئے۔ اور مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ مسجدوں کے قریب نہ آئے۔

افادات:--پہلی روایت میں واحد کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، اسی لیے بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حکم مسجدِ نبوی کے ساتھ خاص ہے؛ لیکن امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) دوسری روایت کے الفاظ بھی پیش کررہے ہیں کہ یہ حکم مسجدِ نبوی کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ کسی بھی مسجد میں کچا لہسن استعمال کرنے کے بعد منھ میں بدبو ہوتے ہوئے داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی انسان مسجد میں نہ ہو تب بھی وہاں فرشتے تو ہوتے ہی ہیں، اور جن چیزوں سے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے ان سے فرشتوں کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔ اور اگر جماعت کا وقت ہو یا کوئی مجمع موجود ہو تو فرشتوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کو بھی تکلیف پہنچتی ہے۔

بیڑی، سگریٹ کا بھی یہی حکم ہے

بیڑی، سگریٹ، حقہ وغیرہ یا کوئی ایسی چیز جس کے استعمال سے منھ میں بدبو پیدا ہوتی ہو؛ وہ سب اس حکم میں داخل ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے، خاص کر رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ میں روزہ افطار کرنے کے بعد فوراً بیڑی پیتے ہیں، پھر برابر کلی بھی نہیں کرتے اور جلدی سے دوڑے

ہوئے مسجد میں گھس جاتے ہیں، ان کے منھ سے بدبو کے فوارے نکل رہے ہوتے ہیں، ان کے پاس کھڑا نمازی جو بیڑی نہیں پیتا اس کو اتنی شدت کے ساتھ بدبو محسوس ہوتی ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ نیت توڑ کر وہاں سے ہٹ جائے۔ لیکن جو بیڑی پینے والا ہوتا ہے وہ چوں کہ بدبو میں رہتا ہے اور اس بدبو کا عادی ہو جاتا ہے، اس لیے اس کو بدبو کا احساس ہی نہیں ہوتا۔

بیت الخلاء میں جا کر بیڑی والے بیڑی پیتے ہیں، پھر کوئی ایسا آدمی جو بیڑی نہیں پیتا وہ اگر اندر چلا جاتا ہے تو اس کو فوراً احساس ہوتا ہے کہ یہاں کوئی بیڑی پی کر گیا ہے۔ گویا بیت الخلاء کی بدبو پر بھی بیڑی کی بدبو غالب آجاتی ہے۔ ویسے واقعہ بھی ہے کہ بیت الخلاء کی بدبو کا ہر ایک عادی ہوتا ہے اس لیے اس کا احساس زیادہ نہیں ہوتا۔ اور بیڑی کی بدبو کا بیڑی نہ پینے والا عادی نہیں ہوتا؛ اس لیے اس کا احساس شدید ہوتا ہے۔

بہر حال! بیڑی پینے سے اپنے آپ کو بچایا جائے۔ آج کل تو دنیا والے بھی اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں، اور بیڑی کے معاملہ میں ہر جگہ بیداری پیدا ہو رہی ہے، اور اس کی ممانعت بھی ہوتی ہے۔ ہوائی جہازوں میں مستقل ایسی فلائٹیں شروع ہو گئی ہیں کہ پورے ہوائی جہاز میں سگریٹ اور تمباکو نوشی کی ممانعت ہوتی ہے۔

منہ میں بدبو ہوتے ہوئے دینی مجمعوں میں نہ جائے

حدیث ۱۷۰۲:-

وعن أنس -رضی اللہ عنہ- قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ ﷺ: ((مَنْ أَكَلَ مِنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ فَلَا يَقْرَبَنَّا، وَلَا يُصَلِّيَنَّ مَعَنَا)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اس پودے (یعنی لہسن) کو استعمال کرے وہ (بدبو ہوتے ہوئے) ہمارے قریب نہ آئے اور ہماری مسجد میں ہمارے ساتھ نماز نہ پڑھے (بدبو دور کرنے کے بعد آسکتا ہے)۔

افادات:- یہ حکم صرف مسجد ہی کا نہیں ہے بلکہ دینی جتنے مجمعے بھی ہوں، جیسے: کوئی جلسہ ہو، یا دینی اجتماع ہو، جہاں لوگ دینی کام کے لیے جمع ہوں، ہر ایسے مجمعے میں بدبودار چیز کو استعمال کرکے جانے سے منع کیا گیا ہے۔

بعضوں کو منھ کی بدبو کی بیماری ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے لیے کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کو چاہیے کہ جماعت کی نماز میں بھی حاضری نہ دیں۔ وہ اپنے گھر میں نماز پڑھ لیں گے تب بھی ان کو محض اس لیے جماعت کی نماز کا ثواب مل جائے گا کہ انہوں نے اپنی منھ کی بدبو کی تکلیف سے لوگوں کو بچایا ہے۔

ایسا آدمی ہم سے الگ رہے

حدیث ۱۷۰۳:-

وعن جابررضی الله عنه قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ :مَنْ أَكَلَ ثُوماً أَوْ بَصَلاً فَلْيَعْتَزِلنا، أو فَلْيَعْتَزِلْ مَسْجِدَنَا.(متفق عَلَيْهِ)

وفی روايةٍ لمسلم:مَنْ أَكَلَ البَصَلَ،والثُّومَ،والكُرَّاثَ،فَلاَ يَقْرَبَنَّ مَسْجِدَنَا،فَإنَّ المَلاَئِكَةَ تَتَأَذَّى مِمَّا يَتَأَذَّى مِنْهُ بَنُو آدَمَ.

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے لہسن کھایاہو، یا پیاز کھائی ہو؛وہ ہم سے الگ رہے۔ہماری مسجدوں سے بھی دور رہے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: جس نے پیاز کھائی، یا لہسن یا گندنا کھایا؛وہ ہماری مسجد کے قریب نہ ہو، اس لیے کہ فرشتوں کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے جس سے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔

مسجد سے نکلوادیتے

حدیث ۱۷۰۴:-

وعن عمربن الخطاب رضی اللہ عنہ أنَّہ خَطَبَ یومَ الجمُعَۃِ فقَالَ فی خطبتِہٖ: ثُمَّ إنَّکُمْ أیُّھَاالنّاسُ تأکُلونَ شَجرتَیْنِ مَاأراھُماإلاَّ خَبِیثتَیْنِ: البَصَلَ، وَالثُّومَ. لَقَدْرَأَیْتُ رسولَ اللہ ﷺ إذَا وَجدَ ریحَھُمَامِنَ الرَّجُلِ فی المَسْجِدِ أمَرَبِہٖ، فَأُخْرِجَ إلَی البَقِیعِ، فَمَنْ أکَلَھُمَا، فَلْیُمِتْھُمَا طَبْخاً. (رواہ مسلم)

یہ مسلم شریف کی بڑی لمبی روایت ہے جس کا ایک ٹکڑا یہاں پیش کیا ہے:

ترجمہ:- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ جمعہ کے روز خطبہ دیا، اپنے اس خطبہ میں بہت ساری باتیں کہیں، ان میں ایک بات یہ بھی ارشاد فرمائی: اے لوگو! تم دو خراب پودے (پیاز اور لہسن) کھاتے ہو، حالاں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ کسی آدمی کے منھ سے ان دونوں میں سے کسی کی بدبو محسوس کرتے اور وہ مسجد میں آیا ہوتا تو آپ اس کو مسجد سے باہر نکلوادیتے تھے (کہ جب تک بدبو دور نہ ہو؛ وہاں تک مسجد میں مت آئیو) حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر کوئی ان دونوں سبزیوں کو کھائے تو پہلے پکا کر اس کی بدبو دور کر دے۔

افادات:- مسجدِ نبوی سے باہر جو میدان تھا اس کو بقیع کہتے تھے۔

آج کل تو بعض لوگ یہ ظلم کرتے ہیں کہ اعتکاف کے زمانہ میں مسجد میں سیخ کباب منگواتے ہیں، اور ساتھ میں کچی پیاز بھی ہوتی ہے، اوران لوگوں کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم مسجد میں بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ اعتکاف کے زمانہ میں آدابِ مسجد کا بڑا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے کہ مسجد میں کوئی ایسی چیز نہ آجائے۔ عام طور پر لوگ اس کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔

باب كراهية الاحتباء يوم الجمعة والإمام يخطب لأنه يجلب النوم فيفوت استماع الخطبة ويخاف انتقاض الوضوء

جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو، اس وقت گوٹ لگا کر بیٹھنا منع ہے؛ اس لیے کہ یہ بیٹھک نیند لانے والی ہے، اس کی وجہ سے خطبہ سننے سے رہ جائے گا اور وضو ٹوٹنے کا اندیشہ ہے

اس باب میں ایک اور بات بتلانا چاہتے ہیں کہ جمعہ کے دن گوٹ لگا کر بیٹھنا ممنوع ہے۔ گوٹ لگانے کا مطلب یہ ہے کہ نیچے سے پاؤں کھڑے کر دے، اور دونوں ہاتھوں کے ذریعہ حلقہ بنا لے۔ اور بعض مرتبہ ہاتھوں کو راحت دینے کے لیے پیچھے سے رومال لا کر باندھ دیتے ہیں، اور ہاتھ کھلے رہتے ہیں؛ یہ بھی گوٹ لگا کر بیٹھنا ہی ہوا، اس کو ''حبوہ'' اور '' احتباء'' کہتے ہیں۔ یہ ذرا آرام دہ بیٹھک ہے، اور جمعہ کے دن جب امام خطبہ دے رہا ہو اس وقت گوٹ لگا کر بیٹھنا ممنوع ہے، اس لیے کہ یہ طریقہ نیند لانے والا ہے۔ بعض لوگ جب مسجد میں آتے ہیں تو خطبہ شروع ہوتے ہی اس طرح بیٹھ جاتے ہیں، گویا نیند کو دعوت دے رہے ہوں کہ: آجا نیند؛ مجھے دبوچ لے۔ حالاں کہ خطبہ سننا واجب ہے چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اور اس کی طرف توجہ دینا ضروری ہے۔ چوں کہ یہ بیٹھک نیند کو

کھینچنے والی ہے اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہر وہ بیٹھک جس سے آدمی پر نیند کا غلبہ ہو سکتا ہو؛ اس کو اختیار نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے نیند آجائے گی اور خطبہ سننے کی فضیلت اور ایک واجب کی ادائیگی سے محروم رہ جائے گا۔ اور ساتھ ہی وضو کے ٹوٹنے کا بھی اندیشہ ہے کہ اگر نیند کا زیادہ غلبہ ہو گا تو آدمی زمین دوز ہو جائے گا جس کی وجہ سے وضو ٹوٹ جائے گا، اور ایسی حالت میں بیٹھنے سے کبھی ریح بھی خارج ہو سکتی ہے۔

حدیث ۱۷۰۵:-

عن مُعاذِ بن أنس الجُهَنِيِّ رضى الله عنه: أَنَّ النبيَّ ﷺ نَهَى عَنِ الحِبْوَةِ يَوْمَ الجُمعَةِ وَالإِمَامُ يَخْطُبُ. (رواه أبو داود والترمذی، وقالا: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت معاذ بن انس جہنی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جمعہ کے دن جب امام خطبہ دے رہا ہو اس وقت گوٹ لگا کر بیٹھنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

افادات:- اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر بتلائی جا چکی۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ سب آداب بتلائے ہیں، حضورِ اکرم ﷺ نے بڑی تاکید کے ساتھ یہ تعلیمات دی ہیں، لہٰذا ہمیں ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔ دراصل یہ آپ ﷺ کی شفقت کی بات ہے کہ آداب سے تعلق رکھنے والی ایسی باریک باریک چیزیں بھی اپنی امت کو سکھلائیں، جیسے: ایک باپ جب اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے تو چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ان کو بتلاتا ہے۔

باب نہی من دخل علیہ عشر ذی الحجة

وأراد أن یضحی عن أخذ شیء من شعرہ أو أظفارہ حتی یضحی

جس کا قربانی کرنے کا ارادہ ہو، وہ ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد اپنے ناخن اور بال نہ کٹوائے،

یہاں تک کہ قربانی سے فارغ ہو جائے

اس باب میں ایک ادب بتلاتے ہیں کہ: جس آدمی نے قربانی کا ارادہ کر لیا ہو، چاہے نفلی قربانی کا ارادہ کیا ہو، یا جس پر قربانی واجب ہو؛ تو اس کو ذی الحجہ کا چاند دیکھنے کے بعد اپنے ناخن اور بال کٹوانا منع ہے، جب قربانی سے فارغ ہو جائے اس کے بعد ناخن اور بال کو کٹوائے۔ لیکن جو آدمی قربانی کرنے والا نہ ہو اس کے لیے یہ حکم نہیں ہے۔

حدیث ۱۷۰۶:-

عن أُمِّ سَلَمَةَ رَضِيَ اللهُ عنها قالت: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ: ((مَنْ كَانَ لَهُ ذِبْحٌ يَذْبَحُهُ فَإِذَا أَهَلَّ هِلَالُ ذِي الْحِجَّةِ فَلَا يَأْخُذَنَّ من شَعْرِهِ وَلَا مِنْ أَظْفَارِهِ شَيْئاً حَتَّى يُضَحِّيَ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس نے قربانی کے لیے جانور خرید رکھا ہو، جب ذی الحجہ کا چاند نظر آجائے تو وہ اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے؛ یہاں تک کہ قربانی سے فارغ ہو جائے۔

افادات:- احناف کے یہاں تو یہ حکم مستحب کا درجہ رکھتا ہے، واجب نہیں ہے۔ لیکن بعض ائمہ جیسے امام احمد بن حنبل اور اسحق بن راہویہ وغیرہ اس کو واجب کا درجہ دیتے ہیں۔

رحمتِ حق بہانہ می جوید

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی (رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں بہانے ڈھونڈتی ہیں، جیسے حجاجِ کرام ان دنوں میں احرام کے ساتھ ہوتے ہیں، اور وہ بال و ناخن نہیں کاٹتے، اسی طرح قربانی کرنے والا بھی گویا ان کے ساتھ مشابہت اختیار کر کے ان رحمتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ جس وقت ان حجاج پر رحمت کی بارشیں برسیں تو اس کی بدلی کا کوئی ٹکڑا ہم پر بھی کچھ چھینٹے برسا دے۔ گویا اچھے لوگوں کی شباہت پیدا کرنا بھی بڑی نعمت ہے۔ اور حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب (رحمۃ اللہ علیہ) کا ایک شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے: □

تیرے محبوب کی یارب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے مَیں صورت لے کے آیا ہوں

باب النهي عن الحلف بمخلوق

كالنبي والكعبة والملائكة والسماء والآباء والحياة والروح والرأس وحياة السلطان ونعمة السلطان وتربة فلان والأمانة.

وهي من أشدها نهياً

مخلوق کی قسم کھانے کی ممانعت کا بیان

شریعت میں اللہ تعالیٰ اوراس کی صفات کے علاوہ دوسری چیزوں کی قَسم کھانے کی ممانعت آئی ہے۔اس باب میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) قسم کے متعلق احکام کو بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مخلوق کی قسم چاہے وہ نبی ہو، کعبہ ہو، فرشتے ہوں، آسمان ہو، آباء و اجداد ہوں، زندگی اور روح ہو۔یا کسی کے سر کی قَسم کھانا، بادشاہِ وقت کی زندگی کی قسم کھانا،کسی کے مزار کی قسم کھانا،امانت کی قسم کھانا؛یہ ساری قَسمیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی بھی چیز کی قسم کھانے کی اجازت نہیں۔

غیر اللہ کی قسم کھانا گناہِ کبیرہ ہے

حدیث ۱۷۰۷:-

عن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنهما عن النّبِي ﷺ قَالَ: إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَنْهَاكُمْ أَنْ تَحْلِفُوا بِآبَائِكُمْ، فَمَنْ كَانَ حَالِفاً، فَلْيَحْلِفْ بِاللهِ، أَوْ لِيَصْمُتْ. (متفق عَلَيهِ)

وفي رواية في الصحيح: فَمَنْ كَانَ حَالِفاً فَلَا يَحْلِفْ إِلَّا بِاللهِ، أَوْ لِيَسْكُتْ

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ تم کو منع کرتے ہیں اس بات سے کہ تم اپنے باپ دادوں کی قسم کھاؤ۔ اگر کوئی آدمی قسم کھانا ہی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی قسم کھائے، یا پھر خاموش رہے۔

افادات:- عرب میں آباء واجداد کی قسم کھانے کا عام رواج تھا جس سے منع کیا گیا۔ ایک مرتبہ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کسی سے گفتگو کر رہے تھے، دورانِ گفتگو ان کی زبان سے نکلا: ”وَأَبِي“ میرے باپ کی قسم۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ نے نہایت تاکید سے فرمایا: آباء واجداد کی قسم کھانے سے اللہ تعالیٰ منع فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے نام کی قسم کھائی جاسکتی ہے، جیسے: ”وَاللهِ“ اللہ کی قسم۔ یا اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام کی قسم کھائی جاسکتی ہے، جیسے: رحمن کی قسم، رحیم کی قسم، اور جتنی بھی اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، جیسے:

"وَقُدْرَةِ اللهِ" اللہ کی قدرت کی قسم۔ "وَعِزَّةِ اللهِ" اللہ تعالیٰ کی عزت کی قسم "وَعِلْمِ اللهِ" اللہ تعالیٰ کے علم کی قسم۔ تو علم، عزت، قدرت؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں، لہٰذا ان کی بھی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھانے کی اجازت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھانا گناہِ کبیرہ ہے۔

حدیث ۱۷۰۸:-

وعن عبد الرحمٰن بن سَمُرَةَ رضی الله عنه قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ : ((لَا تَحْلِفُوا بِالطَّوَاغِي، وَلَا بِآبَائِكُمْ)). (رواہ مسلم)

((الطَّوَاغِي)): جَمْعُ طَاغِيَةٍ، وهِيَ الأَصنَامُ. وَمِنْهُ الحَدِيثُ: ((هٰذِهِ طَاغِيَةُ دَوْسٍ)) أَيْ: صَنَمُهُمْ وَمَعْبُودُهُمْ. وَرُوِيَ فِي غير مسلم: ((بِالطَّوَاغِيتِ)) جَمْعُ طَاغُوت، وَهُوَ الشَّيْطَانُ وَالصَّنَمُ.

ترجمہ:- حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بتوں کی اور اپنے باپ دادوں کی قسم نہ کھاؤ۔

افادات:- عرب میں دستور تھا کہ لات، عزیٰ، منات، اور جن جن بتوں کی ان کے یہاں پوجا کی جاتی تھی؛ ان سب کی قسم کھاتے تھے، اور جس چیز کی قسم کھائی جاتی ہے اس کی تعظیم مقصود ہوتی تھی، حالاں کہ تعظیم کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور چیز کی قسم کھانے کی اجازت نہیں، اس سے منع کیا گیا ہے۔

وہ ہم میں سے نہیں

حدیث ۱۷۰۹ :-

وعن بُرَيدَةَ رضى الله عنه أَنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قَالَ: مَنْ حَلَفَ بِالْأَمَانَةِ فَلَيْسَ مِنَّا. (حديث صحيح، رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت بریدہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے امانت کی قسم کھائی؛ وہ ہم میں سے نہیں۔

افادات:- اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو فرائض بندوں کے ذمہ لازم کیے ہیں جیسے: نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، یعنی احکام شرعیہ؛ ان ہی کو قرآنِ پاک میں امانت سے تعبیر کیا گیا ہے: ﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ﴾ اب اگر کوئی آدمی روزہ کی قسم کھائے، نماز کی قسم کھائے، حج کی قسم کھائے؛ تو اس کے متعلق حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ ہم میں سے نہیں۔ بہت بڑی وعید ہے۔ جب اس کی اجازت نہیں دی گئی؛ تو کسی اور چیز کی کیسے اجازت ہو گی؟

جو یہ کہے: میں اسلام سے بری ہوں

حدیث ۱۷۱۰:-

وعنه قال قال رسول الله ﷺ: ((مَنْ حَلَفَ فَقَالَ: إِنِّي بَرِيءٌ مِنَ الإِسْلَامِ، فَإِنْ كَانَ كَاذِباً، فَهُوَ كَمَا قَالَ، وإِنْ كَانَ صَادِقاً، فَلَنْ يَرْجِعَ إِلَى الإِسْلَامِ سَالِماً)). (رواه أبو داود)

ترجمہ:–حضرت بریدہ اسلمی (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے قسم کھاتے ہوئے یہ کہا کہ میں اسلام سے بری ہوں، اب اگر وہ اپنی بات میں جھوٹا ہے؛تب تو ایسا ہی ہے۔اور اگر سچا ہے تب بھی اسلام کی طرف صحیح سلامت نہیں لوٹے گا۔

افادات:–مثلاً: کسی آدمی نے دوسرے سے کسی بات کے متعلق تاکیدی طور پر پوچھا: تم نے فلاں کام کیا ہے؟ اس نے کہا: نہیں! میں نے نہیں کیا، اور اگر میں نے کیا ہو؛ تو میں اسلام سے بری ہوں۔ جیسے: بعض بولتے ہیں کہ میں نے اگر یہ کام کیا ہو تو میں یہودی، یا نصرانی ہوں۔ اب اگر وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہے، یعنی واقعۃً اس نے کیا ہے، اس کے باوجود جھوٹی قسم کھا رہا ہے، تو نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں: وہ ایسا ہی ہے، یعنی اسلام سے نکل جائے گا۔ اور اگر سچا ہے تب بھی اسلام میں صحیح سالم نہیں لوٹے گا۔ یعنی اس قسم کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ہو گا۔ بہر حال! ایسی قسم کھانے سے منع کیا ہے۔

بعض لوگ تاکید کے لیے ایسی قسم کھاتے ہیں کہ اگر میں نے فلاں کام کیا ہو تو میں یہودی، یا مشرک و کافر ہو جاؤں، تو اس کے متعلق فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر وہ قسم کھاتے ہوئے یوں سمجھتا ہے کہ اگر میں نے جھوٹی قسم کھائی تو میں واقعۃً اسلام سے نکل جاؤں گا۔ مثلاً: گذشتہ زمانے سے متعلق چوری کی تحقیق ہو رہی تھی، اس سے بھی پوچھا گیا کہ: بھائی! تو نے چوری کی ہے؟ تو یہ کہنے لگا: میں نے نہیں کی، اور اگر میں نے چوری کی ہو؛ تو میں یہودی ہوں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ تو اس صورت میں اگر وہ یہ سمجھ کر قسم کھا رہا ہے کہ میں جھوٹی قسم کھاؤں گا تو یہودی ہو جاؤں گا اور اسلام سے نکل جاؤں گا؛ تب تو واقعۃً وہ ایمان سے نکل گیا۔ اب اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ایمان کی اور نکاح کی دونوں کی تجدید کرے۔

اور اگر آئندہ کے متعلق کسی کام کے بارے میں یوں کہے کہ مثلاً: اگر میں شراب پیوں تو میں یہودی ہوں، اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں شراب پیوں گا تو میں واقعۃً یہودی ہو جاؤں گا، پھر بھی اس نے شراب پی؛ تو وہ اسلام سے نکل گیا۔ اس لیے کہ جب یہ سمجھتا ہے کہ ایسا کروں گا تو اسلام سے نکل جاؤں گا پھر بھی وہ کام کیا، تو گویا وہ خود ہی اسلام سے نکلنے پر راضی ہے۔ اور کفر پر راضی ہونا بھی کفر ہے۔

اور اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرے ایسا کہنے کے بعد ایسا کام کر لینے کی وجہ سے میں اسلام سے نہیں نکلوں گا، اس لیے کہ ایمان کا تعلق تو دل سے ہے، اور میں تو صرف ایسا بول رہا ہوں، ایسا سمجھتے ہوئے اس نے وہ کام کر لیا؛ تو اس صورت میں وہ ایمان سے نہیں نکلے گا۔ اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا ہی نہیں کہ

ایسا کرنے سے ایمان سے نکل جاؤں گا۔ گویا اس صورت میں کفر پر راضی ہونا لازم نہیں آتا۔ البتہ اس پر قسم کا کفارہ ہو گا۔

اسی لیے فقہانے لکھا ہے کہ بعض لوگ دھمکی دیتے ہوئے یوں کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کروگے تو (نعوذ باللہ) میں کافر ہو جاؤں گا؛ تو ایسا بولتے ہی وہ کافر ہو گیا۔ اس لیے کہ اس کا یہ بولنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ کفر پر راضی ہے، اور کفر پر راضی ہونا کفر ہے۔

جو غیر اللہ کی قسم کھائے

حدیث ۱۷۱۱:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أَنَّهُ سَمِعَ رَجُلاً يقُولُ: لَا وَالْكَعْبَةِ فَقَالَ ابنُ عُمَرَ: لَا تَحْلِفْ بَغَيْرِ اللهِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: مَنْ حَلَفَ بِغَيْرِ اللهِ، فقد كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ. (رواہ الترمذی، وقال: حدیث حسن)

وفَسَّرَ بَعْضُ العُلَمَاءِ قولَهُ: ((كَفَرَ أَوْ أَشْرَكَ)) عَلَى التَّغْلِيظِ، كما روى أَنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: ((الرِّيَاءُ شِرْكٌ.))

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ کعبہ کی قسم کھا رہا تھا، تو اس سے کہا: غیر اللہ کی قسم مت کھاؤ، اس لیے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جو آدمی غیر اللہ کی قسم کھائے گویا اس نے کفر یا شرک کیا۔

افادات:- کعبہ بھی غیر اللہ ہی ہے، اور غیر اللہ کی قسم کھانے سے نبی کریم ﷺ نے منع کیا ہے، اس لیے کعبہ کی قسم کھانا جائز نہیں۔ ہاں! رب کعبہ کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ بہت سی احادیث میں آتا ہے: ورب الکعبۃ۔ کعبہ کے رب (یعنی اللہ تعالیٰ) کی قسم۔ اور پہلے بتلایا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانے سے آدمی حقیقۃً تو کافر نہیں ہو گا؛ لیکن یہ بڑا گناہ ہے۔ گویا گناہ کی بڑائی بتلانے کے لیے نبی کریم ﷺ نے اس کو شرک سے تعبیر کیا۔

باب تغلیظ الیمین الکاذبۃ عمداً

جان بوجھ کر جھوٹی قسم کھانا بڑا سخت گناہ ہے

حدیث ۱۷۱۲:-

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أنّ النّبیّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: ((مَنْ حَلَفَ عَلَى مَالِ امْرِیءٍ مُسْلِمٍ بِغَيْرِ حَقِّهِ لَقِيَ اللهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ)) قَالَ: ثُمَّ قَرَأَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم مِصْدَاقَهُ مِنْ كِتَابِ الله - عز وجل -: { إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيلاً } إِلَى آخِرِ الآيَةِ (آل عمران:۷۷) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جس نے کسی مسلمان کے مال کے معاملہ میں ناحق قسم کھائی (یعنی وہ اس کا مالک نہیں ہے، اس کے باوجود اپنے کو مالک بتلاتا ہے، اور جو مالک ہے اس کے مالک ہونے کا انکار کرتا ہے) تو وہ اللہ تعالیٰ سے قیامت کے روز ایسی حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوں گے۔ حضرت ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں: اس کے بعد نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے قرآنِ پاک کی یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: جو لوگ اللہ کے عہد وپیمان اور اپنی قسموں کے بدلہ میں تھوڑا سا معاوضہ خرید لیتے ہیں (یعنی مال کے بدلہ میں جھوٹی قسم کھالیتے ہیں) تو ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ ان سے بات کریں گے، نہ تو ان کو نظرِ رحمت سے دیکھیں گے، نہ تو ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

افادات:- مثلاً: کسی نے دوسرے کے گھر پر قبضہ کر رکھا تھا اور گھر کے مالک نے اس کے خلاف قاضی کے یہاں دعویٰ کیا کہ یہ مکان میرا ہے، لیکن اس نے اس پر قبضہ کر رکھا ہے؛ مجھے دلوایا جائے۔ اب شریعت میں مسئلہ یہ ہے کہ قاضی اس کے دعویٰ پر اس سے -جس کے قبضہ میں مکان ہے- پوچھے گا: بھائی! یہ دعویٰ کرتا ہے کہ مکان اس کا ہے، کیا تم اقرار کرتے ہو؟ اگر وہ جواب میں یہ کہے: جی ہاں! یہ مکان اسی کا ہے، تو اس کے اقرار سے بات صاف ہوگئی اور اب مدعی سے گواہ مانگنے کی ضرورت نہیں رہی، بلکہ یہ مکان اس کو دلوا دیا جائے گا۔

لیکن اگر وہ انکار کر دے کہ: نہیں! یہ مکان تو میرا ہے، تو اس صورت میں مدعی سے گواہ مانگے جائیں گے، اس کے لیے ضروری ہے کہ دو عادل، دین دار، مسلمان گواہ پیش کرے جو اس بات کی گواہی دیں کہ یہ مکان اس کا ہے۔ اگر وہ گواہ پیش کر دے گا تو اس کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا اور قاضی اس کے حق میں فیصلہ صادر کرے گا، اور وہ مکان اس کو دلوا دے گا۔

اور اگر مدعی نے کہا کہ: میرے پاس گواہ تو نہیں ہیں لیکن اس سے قسم لی جائے کہ یہ مکان میرا (یعنی مدعی کا) نہیں ہے۔ تو اس قبضہ دار سے قسم لی جائے گی، اب اگر یہ جھوٹی قسم کھالیتا ہے، اس لیے کہ اس نے تو ناحق قبضہ کر رکھا ہے، تو اس کے متعلق حضورِ اکرم ﷺ نے اس روایت میں فرمایا ہے کہ: وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوں گے۔

چاہے پیلو کی ایک لکڑی ہی کیوں نہ ہو

حدیث ۱۷۱۳:-

وعن أبي أمامة إياس بن ثعلبة الحارثي (رضی اللہ عنہ) أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قَالَ: ((مَنِ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِىءٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ، فَقَدْ أَوْجَبَ اللهُ لَهُ النَّارَ. وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الجَنَّةَ)) فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: وَإنْ كَانَ شَيْئاً يَسِيراً يَا رسول اللهِ؟ قَالَ: ((وإنْ كَانَ قَضِيباً مِنْ أرَاكٍ)) (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو امامہ ایاس بن ثعلبہ حارثی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس آدمی نے کسی مسلمان کا حق اپنی قسم کے ذریعہ سے چھین لیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جہنم کو واجب کر دیا اور اس پر جنت کو حرام کر دیا۔ ایک آدمی نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: چاہے پیلو کی ایک لکڑی (یعنی معمولی سی چیز) ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- کسی بھی مسلمان کا حق مارنے کے لیے جو آدمی جھوٹی قسم کھائے گا، اس کے لیے یہی وعید ہے۔ بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں قسم کھالیتے ہیں، مثلاً دو روپیہ کا قلم ہوتا ہے لیکن قسم کھالیتے ہیں کہ میرا ہے، حالاں کہ اس کا نہیں ہوتا، تو اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس پر جنت کو حرام کر دیتے ہیں اور جہنم کو واجب کر دیتے ہیں۔

یمینِ غموس

حدیث ۱۷۱۴:-

وعن عبداللہ بن عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہما) عن النبی ﷺ قَالَ: ((الكَبَائِرُ:الإِشْرَاكُ بِاللهِ، وَعُقُوقُ الوَالِدَيْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، واليَمِينُ الغَمُوسُ)). (رواہ البخاری)

وفی روایةٍ لَهُ: أنَّ أعْرابِياً جَاءَ إِلَى النبيِّ ﷺ فَقَالَ: یارسولَ اللهِ! مَا الكَبَائِرُ ؟ قَالَ: ((الإِشْرَاكُ بِاللهِ)) قَالَ: ثُمَّ مَاذا ؟ قَالَ: ((اليَمِينُ الغَمُوسُ)) قلتُ: وَمَا اليَمِينُ الغَمُوسُ ؟ قَالَ: ((الَّذِي يَقْتَطِعُ مَالَ امْرِءٍ مُسْلِمٍ !)) یعنی بِيَمِينٍ هُوَ فِيهَا كَاذِبٌ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بڑے گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ: اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانا ہے، (۲) ماں باپ کی نافرمانی (۳) کسی کو ناحق قتل کرنا (۴) یمین غموس (یعنی جھوٹی قسم کھانا ہے)۔

ایک روایت میں ہے: ایک دیہاتی نبیِ کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: اے اللہ کے رسول! بڑے گناہ کیا کیا ہیں؟ نبیِ کریم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (شرک؛ سب سے بڑا گناہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتے، اِلَّا یہ کہ آدمی توبہ کرے اور باز آجائے) پھر اس نے پوچھا: اس کے بعد کون سا گناہ ہے؟ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: جھوٹی قسم۔ حضرت عبد اللہ بن

عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) کہتے ہیں، میں نے پوچھا: جھوٹی قسم کیا ہے؟ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسی قسم جس کے ذریعہ کوئی آدمی کسی مسلمان کا مال ہڑپ کر لے (یعنی وہ مال اس کا نہیں ہے اس کے باوجود قسم کھا کر اس کو اپنا بتلا کر اس پر قبضہ جما لے۔)

افادات:۔ فقہاء نے قَسَم کی تین قسمیں بتلائی ہیں۔ جو قسم کھائی جا رہی ہے، اس کا تعلق گزشتہ زمانہ سے ہوگا، یا آئندہ زمانہ سے ہوگا۔ اگر اس کا تعلق گزشتہ زمانہ سے ہے، مثلاً: کسی چوری کی تحقیق ہو رہی تھی، اس سے پوچھا گیا کہ: تم نے چوری کی ہے، تو وہ انکار کرتا ہے کہ میں نے چوری نہیں کی، حالاں کہ اسی نے چوری کی ہے، اور قسم بھی کھائی کہ: واللہ! میں نے چوری نہیں کی؛ اسی کو فقہاء کی اصطلاح میں ''یمینِ غموس'' کہتے ہیں؛ اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔

''غموس'' عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہوتا ہے کسی کو ڈُبا دینا۔ گویا یہ قسم اپنے کھانے والے کو گناہ میں اور اس کے بعد جہنم میں ڈُبا دیتی ہے، اس لیے اس کو'' یمینِ غموس'' کہا گیا۔ اس کا کوئی کفارہ نہیں ہوتا، اس کی تلافی صرف توبہ اور استغفار ہی ہے۔

اور اگر گزشتہ زمانہ سے تعلق رکھنے والی کسی بات پر قسم کھائے؛ لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ مَیں سچا ہوں، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ سچا نہیں ہے، اس کو فقط یہ خیال ہے کہ میں سچی قسم کھا رہا ہوں، مثلاً: اس کو کسی نے بتلایا کہ فلاں آدمی سفر سے واپس آگیا، اور وہ یہی سمجھ رہا ہے کہ وہ واپس آگیا ہے، اب کسی نے پوچھا کہ بھائی! فلاں صاحب سفر سے واپس آگئے؟ تو وہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ: جی ہاں! وہ واپس آگئے۔

لیکن واقعہ ایسا نہیں ؛تو ایسی قَسَم کو" یمینِ لغو" کہتے ہیں ۔ اس صورت میں بھی قسم کھانے والا گنہگار نہیں ہوتا، اس لیے کہ وہ جان بوجھ کر جھوٹی قسم نہیں کھا رہا ہے، بلکہ اپنے آپ کو سچا سمجھ کر قسم کھا رہا ہے اور اس کا کفارہ بھی نہیں، پھر بھی آدمی کو ایسی قسم کھانے سے احتیاط کرنی چاہیے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ کوئی بات بہت پہلے پیش آئی تھی، مثلاً: دس سال سے پہلے اس نے کسی کے متعلق کچھ کہا تھا، اب آج اس بات کی تحقیق ہو رہی ہے، اور کسی نے اس سے پوچھا کہ تم نے ایسا کہا تھا؟ اب اس کو تو یاد بھی نہیں رہا کہ میں نے ایسا کچھ کہا تھا، اس لیے وہ ایسا سمجھتے ہوئے - کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے - قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں نے ایسا نہیں کہا ہے، حالاں کہ حقیقۃً اس نے کہا تھا؛ اس یمین کو "یمینِ لغو" کہتے ہیں، اس صورت میں بھی وہ گنہگار نہیں ہو گا۔ اس کی مزید تفصیل آگے آئے گی۔

اس روایت میں تو "یمینِ غموس" کا تذکرہ آیا ہے۔

باب ندب من حلف عَلَى يَمِينٍ فرأى غيرها خيراً مِنْهَا أَنْ يفعل ذٰلِكَ المحلوف عَلَيْهِ ثُمَّ يُكَفِّر عن يمينه

بعض مرتبہ آدمی جوش میں آکر کسی کام کے نہ کرنے کی قسم کھا لیتا ہے، پھر بعد میں اس کو احساس ہوتا ہے کہ میں نے غلط قسم کھائی، مجھے تو وہ کام کرنا چاہیے، اور شرعاً اس کام کے کرنے کو پسندیدہ بھی بتلایا گیا ہے، مثلاً: باپ نے بیٹے کے متعلق ناراض ہو کر قسم کھالی کہ اس کے ساتھ کبھی بھی بات نہیں کروں گا، اور جب ناراضگی دور ہوئی تو اس کو احساس ہوا کہ یہ تو غلط قسم کھائی ہے، باپ ہونے کی حیثیت سے مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے، اب وہ پچھتا رہا ہے، تو ظاہر ہے کہ باپ کے لیے اس کی شفقت و محبت اور اس کے حقوق کی ادائیگی کا یہی تقاضا ہے کہ بیٹے کے ساتھ بات کرلے۔ یہ بہانہ نہ کرے کہ میں نے قسم کھالی ہے، اور میں قسم نہیں توڑ سکتا۔ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ قسم کا بہانہ بنا کر غلط بات پر اڑے رہنا؛ مزید گناہ ہے۔ اس لیے اس کو چاہیے کہ اپنے بیٹے سے بات کرلے، اور جو قسم ٹوٹ گئی اس کا کفارہ ادا کردے۔

جس کام کے نہ کرنے کی قسم کھائی ہے؛اس کو کرلو

حدیث ۱۷۱۵:-

عن عبد الرحمٰن بن سَمُرَةَ-رضی اللہ عنہ-قَالَ: قَالَ لِی رَسُولُ اللہِ ﷺ :((وَإِذَا حَلَفْتَ عَلَی يَمِينٍ، فَرَأَيْتَ غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا، فَأْتِ الَّذِی هُوَ خَيْرٌ وَ كَفِّرْ عَنْ يَمِينِكَ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد الرحمٰن بن سمرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: جب تم کسی بات پر قسم کھالو اور جس چیز کی قسم کھائی اس کے علاوہ دوسرے کام میں بھلائی دیکھو؛ تو جس کام کے نہ کرنے کی قسم کھائی ہے اس کو کرلو، اور اپنی قسم کا کفارہ دیدو۔

جو کام بہتر ہے وہ کرلے

حدیث ۱۷۱۶:-

وعن أَبِی هریرة رضی اللہ عنہ أَنَّ رسولَ اللہِ ﷺ قَالَ: ((مَنْ حَلَفَ عَلَی يَمِينٍ، فَرَأَى غَيْرَهَا خَيْراً مِنْهَا، فَلْيُكَفِّرْ عَنْ يَمِينِهِ، وَلْيَفْعَلِ الَّذِی هُوَ خَيْرٌ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی نے کسی بات پر قسم کھائی اور پھر اس کے علاوہ دوسرے کام میں اس نے بھلائی دیکھی؛ تو وہ اپنی قسم کا کفارہ ادا کردے، اور جو کام بہتر ہے وہ کرلے۔

افادات:۔۔یعنی پہلے وہ کام کرلے تاکہ قسم کے خلاف ہو کر وہ قسم ٹوٹ جائے، اس کے بعد اس کا کفارہ ادا کردے۔

میں جس کام میں بھلائی دیکھتا ہوں اس کو کرلیتا ہوں

حدیث ۱۷۱۷:۔

وعن أَبِي موسىٰ رضي الله عنه أَنَّ رسولَ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: ((إِنِّي واللهِ إِنْ شاءَ اللهُ لا أَحْلِفُ عَلَى يَمِينٍ، ثُمَّ أَرَى خَيراً مِنْهَا إِلاَّ كَفَّرْتُ عَنْ يَمِينِي، وَأَتَيْتُ الَّذِي هُوَ خَيْرٌ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:۔۔حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! میں جب بھی کسی بات پر قسم کھاتا ہوں، پھر اس کے علاوہ دوسرے کام میں بھلائی دیکھتا ہوں؛ تو میں اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں، اور جس کام میں بھلائی دیکھتا ہوں اس کو کرلیتا ہوں۔

افادات:۔۔دراصل آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے یہ ارشاد ایک موقعہ پر فرمایا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ قبیلۂ اشعریین کے پاس ایک غزوہ میں جانے کے لیے سواری نہیں تھی، تو حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) اپنے قبیلہ والوں کی طرف سے اونٹ کی درخواست لے کر نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس وقت میں حضور صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کسی پر کسی وجہ سے ناراض تھے، مجھے معلوم نہیں تھا اور اسی وقت جاکر

میں نے اپنی درخواست پیش کر دی، تو حضور ﷺ نے فرمایا: میرے پاس سواری نہیں ہے، اور پھر آپ نے قسم کھالی کہ میں تم کو سواری نہیں دوں گا۔ یہ سن کر وہ تو واپس ہو گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے پاس کہیں سے کچھ اونٹ آ گئے تو حضور ﷺ نے ان کو بلوایا اور کہا: لو! یہ اونٹ لے جاؤ۔ جب یہ اونٹ لے کر روانہ ہوئے تو ان کو خیال آیا کہ نبی کریم ﷺ نے تو قسم کھالی تھی کہ مجھے سواری نہیں دیں گے، پھر بھی مجھے عطا فرمائے، تو کہیں ایسا تو نہیں کہ حضور ﷺ اپنی قسم بھول گئے ہوں اور بے خبری میں مجھے سواری دیدی ہو۔ اگر بغیر اطلاع کے مَیں لے کر چلا جاؤں گا تو اس میں ہمارے لیے خیر و برکت نہیں ہوگی، اس لیے ہمیں آپ ﷺ کو بتلا دینا چاہیے۔ چناں چہ انہوں نے واپس آکر حضورِ اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے تو قسم کھا کر فرمایا تھا کہ میں تم کو سواری نہیں دوں گا، پھر بھی آپ نے ہمیں یہ سواری دی؟ اس پر حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! میں کسی بات پر قسم کھاتا ہوں، پھر اس کے علاوہ دوسرے کام میں بھلائی دیکھتا ہوں تو میں اپنی قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں، اور جس کام میں بھلائی دیکھتا ہوں اس کو کر لیتا ہوں۔ گویا سواری دینا اچھی چیز ہے، اب اگرچہ میں نے سواری نہ دینے کی قسم کھالی تھی؛ لیکن چوں کہ اس کے خلاف کرنا (یعنی سواری دینا) نیکی کا کام تھا، اس لیے میں نے وہ کام کر لیا اور اب مَیں اپنی قسم کا کفارہ ادا کر دوں گا۔

اللہ کے نزدیک زیادہ گناہ کی بات

حدیث ۱۷۱۸ :-

وعن أبي هريرة -رضي الله عنه- قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ : ((لأَنْ يَلَجَّ أَحَدُكُمْ فِي يَمِينِهِ فِي أَهْلِهِ آثَمُ لَهُ عِنْدَ اللهِ تَعَالَى مِنْ أَنْ يُعْطِيَ كَفَّارَتَهُ الَّتِي فَرَضَ اللهُ عَلَيْهِ)). (متفق عَلَيْهِ)

قَوْلُهُ: ((يَلَجَّ)) بفتح اللام وتشديد الجيم أيْ: يَتَمَادَى فِيهَا، وَلاَ يُكَفِّرُ، وَقَوْلُهُ: ((آثَمُ)) هُوَ بالثاء المثلثة، أيْ: أَكْثَرُ إثْماً.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں کا کوئی آدمی اپنی اس قسم کے سلسلے میں جو گھر والوں کے سلسلے میں کھائی ہے؛ اَڑا رہے، یہ اس کے لیے اللہ کے نزدیک زیادہ گناہ کی بات ہے؛ بہ نسبت اس کے کہ وہ اپنی اس قسم کا کفارہ دے دے۔

افادات:- بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے گھر کے لوگوں کے متعلق قسم کھالیتا ہے، مثلاً: بیوی سے کسی بات پر ناراض ہو گیا اور قسم کھالی کہ اب تیرے ساتھ بات نہیں کروں گا۔ یا قسم کھالی کہ تیرے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ یا تیرے ابا کے گھر نہیں جاؤں گا۔ قسم کھانے کے بعد لوگ سمجھا رہے ہیں کہ تم نے جو قسم کھائی ہے وہ مناسب نہیں، اس سے بات کر لو، تو وہ اپنی قسم کو بہانہ بنا کر کہتا ہے کہ بات کرنے کو تو میرا بھی جی چاہتا ہے؛ لیکن کیا کروں کہ قسم کھالی ہے، اب اگر میں بات کروں گا تو قسم ٹوٹ جائے گی اور گناہ ہو گا۔ تو حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ قسم ٹوٹنے پر جو گناہ

ہو گا اس کی تلافی کے لیے اللہ تعالیٰ نے راستہ بتلایا ہے۔ اس لیے کہ قسم توڑنے کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے نام کی حرمت میں کمی آتی ہے، گویا قسم توڑنا بھی ایک طرح کا قصور، کوتاہی اور گناہ ہے؛ لیکن اس کی تلافی کے واسطے کفارۂ قسم دلوایا جاتا ہے۔ اور اپنی قسم پر اَڑا رہ کر جو اس سے بات نہیں کرے گا تو یہ بھی گناہ کا کام ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس گناہ کے مقابلہ میں زیادہ بڑا گناہ ہے۔ اب آدمی کو فیصلہ کرنے کی ضرورت ہے کہ دو مصیبتوں میں سے جو ہلکی ہو اس کو اختیار کرے۔

باب العفو عن لغو اليمين وأنه لا كفارة فيه وهو ما يجري على اللسان بغير قصد اليمين كقوله على العادة: لا والله، وبلى والله، ونحو ذلك

یمینِ لغو معاف ہے، اس میں کوئی کفارہ نہیں

یمینِ لغو یہ ہے کہ آدمی کی زبان پر بے قصد وارادہ الفاظِ یمین جاری ہو جائیں،

بات بات میں ”لَاوَاللّٰہِ، بَلٰی وَاللّٰہِ“ بولنے کی عادت پڑگئی

پہلے بتلایا تھا کہ قسم کی تین قسمیں ہیں: (۱) ”یمینِ غموس“ (۲) ”یمینِ لغو“ (۳) ”یمینِ منعقدہ“

پہلی قسم: ماضی سے تعلق رکھنے والی بات پر قسم کھانا، اس کی دو شکلیں ہیں: ایک تو یہ کہ آدمی اپنے آپ کو جھوٹا سمجھتے ہوئے قسم کھارہا ہے، یعنی وہ جانتا ہے کہ میں جو قسم کھارہا ہوں وہ جھوٹی ہے؛ اس کو تو ”یمینِ غموس“ کہتے ہیں؛ اور یہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس کا کوئی کفارہ نہیں ہے، صرف توبہ واستغفار ہے۔

دوسری قسم: ماضی سے تعلق رکھنے والی کسی بات پر اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہوئے قسم کھائے، اور واقعۃً وہ اس میں سچا بھی ہو؛ تب تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر واقعۃً سچا نہیں تو یہ ”یمینِ لغو“ کہلائے گی، اس میں کوئی گناہ نہیں ہوتا، اور کفارہ بھی نہیں ہے۔

تیسری قسم: آئندہ سے تعلق رکھنے والی کسی چیز کے متعلق قسم کھانا، یعنی قسم کے ساتھ یوں کہنا کہ میں یہ کام نہیں کروں گا، یا میں فلاں کام کروں گا؛ یہ "یمینِ منعقدہ" کہلاتی ہے۔ آئندہ کے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے سلسلے میں مضبوطی اور پختگی حاصل کرنے کے لیے قسم کھائی جائے۔ اس میں جھوٹ کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ اب اگر وہ آدمی اپنی قسم کو پورا کرے گا؛ تب تو ٹھیک ہے۔ اور اگر اس کے خلاف کرے گا تو قسم ٹوٹ جائے گی، اور اس پر کفارہ واجب ہوگا۔

اس تیسری قسم میں کفارہ آتا ہے، باقی دو قسمیں یعنی "یمین لغو" اور "یمین غموس" جو ماضی سے تعلق رکھنے والی ہیں؛ ان دونوں میں کفارہ واجب نہیں ہوتا۔

قسم کے کفارہ میں تین چیزیں ہیں

قَالَ اللہُ تَعَالَی: { لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُمُ الْأَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهُ إِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسَاكِينَ مِنْ أَوْسَطِ مَا تُطْعِمُونَ أَهْلِيكُمْ أَوْ كِسْوَتُهُمْ أَوْ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ ذَلِكَ كَفَّارَةُ أَيْمَانِكُمْ إِذَا حَلَفْتُمْ وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ } (المائدۃ:۸۹)

ترجمہ:– اللہ تعالیٰ تمہاری قسموں میں جو لغو ہوں، تمہارا مؤاخذہ اور پکڑ نہیں کرتے؛ لیکن تمہاری پکڑ کرتے ہیں ان قسموں میں جو تم نے منعقد اور مضبوط کی ہوں۔ اب اگر اس قسم کے خلاف کام کیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ دس مسکینوں کو درمیانی درجہ کا کھانا کھلاؤ جو تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو، یا ان کو کپڑے دو، یا ایک غلام

آزاد کرو۔اور جس آدمی میں ان چیزوں کی طاقت نہ ہو،وہ تین دن کے روزے رکھے۔یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسمیں کھالو۔اور اپنی قَسموں کی حفاظت کرو۔

افادات:- قسم کے کفارہ میں تین چیزیں بتلائی ہیں (۱) دس مسکینوں اور غریبوں کو دو وقت پیٹ بھر کر درمیانی درجہ کا کھانا کھلانا، جیسے اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو۔یہ اس وقت ہے جب اپنے یہاں بٹھا کر ان کو کھلائے۔اور اگر دے دینا چاہتا ہو تو ایک فطرہ (یعنی پونے دو کیلو گیہوں) کی مقدار ہر ایک مسکین کو دیدے (۲) یا پھر دس غریبوں کو اتنا کپڑا دے کہ جس سے ان کا ستر چھپ جائے۔ اگر مرد ہو تو اس کا ستر ڈھانپنے جتنا لمبا کرتہ یا لنگی ہو۔اور اگر عورت ہے تو اس کا ستر چوں کہ پورا جسم ہے لہٰذا اس کو پورا جسم چھپ جائے اتنا کپڑا دینا ضروری ہے (۳) یا پھر ایک غلام کو آزاد کیا جائے۔اب اگر ان تین باتوں میں سے کسی کی بھی طاقت نہ ہو؛ تو لگاتار تین دن کے روزے رکھے۔

بعض لوگوں کی غریبوں کو کھانا کھلانے کی، یا کپڑا دینے کی طاقت ہوتی ہے، اس کے باوجود روزے رکھ کر یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا کفارہ ادا ہو گیا؛ تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ روزے والی شکل صرف اسی صورت میں ہے جب کہ کھانا کھلانے کی، یا کپڑا دینے کی طاقت نہ ہو۔

یمینِ لغو

حدیث ۱۷۱۹ :-

وعن عائشة رضی اللہ عنہا **قالت: أُنْزِلَتْ هٰذِهِ الآيَة: {لَايُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِی أَيْمَانِكُمْ} فِی قَوْلِ الرَّجُلِ: لا وَاللهِ، وَبَلَی وَاللهِ.** (رواہ البخاری)

ترجمہ:– حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ”لَايُؤَاخِذُكُمُ اللهُ بِاللَّغْوِ فِیْ أَيْمَانِكُمْ“ آدمی کے اس جملہ کے سلسلے میں نازل ہوئی جو یوں کہتا ہے: لَا وَاللهِ بَلٰی وَاللهِ.

افادات:– ”یمینِ لغو“ میں کفارہ نہیں ہے؛ اس کی کیا شکل ہے؟ احناف کے یہاں اس کی شکل یہ ہے کہ گزشتہ کی کسی چیز پر اپنے آپ کو سچا سمجھتے ہوئے قسم کھائے تب ہی ”یمینِ لغو“ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس کی تشریح یہ نقل کی گئی ہے کہ کوئی آدمی بلا ارادہ کسی بات پر قسم کھالے، جیسے بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات بات میں بولتے ہیں: واللہ، باللہ (یعنی اللہ کی قسم) حالاں کہ ان کا ارادہ قسم کا نہیں ہوتا۔ تو احناف کے یہاں بھی اگر قسم کھانے کا ارادہ نہ ہو، پھر بھی زبان سے قسم کے الفاظ نکل جائیں، اور وہ چیز زمانۂ ماضی سے تعلق رکھنے والی ہو؛ تب ہی ”یمینِ لغو“ ہے۔ لیکن اگر آئندہ زمانہ سے تعلق رکھنے والی چیز ہے تو وہ قسم منعقد ہو جائے گی۔ یعنی اگر کسی نے آئندہ کے متعلق کہا کہ: اللہ کی قسم! میں فلاں جگہ نہیں جاؤں گا، اور بعد میں کہتا ہے کہ میرا ارادہ قسم کھانے کا نہیں تھا، مگر میری زبان سے ”واللہ“ نکل گیا؛ تب بھی ہمارے یہاں قسم منعقد ہو جائے گی۔

باب کراھیة الحلف فی البیع وان کان صادقاً

خرید و فروخت میں قسم کھانے کی ممانعت؛ چاہے سچی ہو

حدیث ۱۷۲۰:-

عن أبي هريرةَ رضى الله عنه قال سَمِعتُ رسُولَ اللهِ ﷺ يقولُ: ((الحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ، مَمْحَقَةٌ لِلْكَسْبِ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قسم سامان کو چلادیتی ہے، لیکن کمائی کو مٹا دیتی ہے۔

حدیث ۱۷۲۱:-

وعن أبي قتادة رضى الله عنه أنَّه سمعَ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: ((إيَّاكُمْ وَكَثْرَةَ الحَلِفِ فِي البَيْعِ، فَإنَّهُ يُنَفِّقُ ثُمَّ يَمْحَقُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو قتادہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: تم خرید و فروخت میں زیادہ قسمیں کھانے سے بچو، اس لیے کہ وہ سامان کو تو بکوا دیتی ہے، لیکن برکت کو ختم کر دیتی ہے۔

افادات:- تجارت اور بیوپار میں جھوٹی قسم کھانا تو ہے ہی گناہِ کبیرہ؛ لیکن اگر سچی قسم بھی کھائی جائے تو اس سے منع کیا گیا ہے۔ دنیا کے معمولی سامان کو بیچنے کے لیے اللہ کے نام کو بیچ میں لانا؛ در حقیقت اللہ کی عظمت اور اس کی شان کے خلاف ہے۔ حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں کہ اس سے آدمی کا سامان تو بک جائے گا، لیکن کمائی کی برکت اُٹھ جائے گی۔ لہٰذا خرید و فروخت میں قسم کھانے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے، اور سچی قسم کھانے سے بھی بچنا چاہیے۔

باب کراھة أنْ یسأل الإنسان بوجه الله عز وجل غیر الجنة وکراھة منع من سأل بالله تعالی وتشفع به

اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر جنت کے علاوہ کسی چیز کا سوال کرنا ناپسندیدہ ہے، اور جس سے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر سوال کیا گیا اس کا سوال کو رَد کر دینا بھی ناپسندیدہ ہے

آدابِ معاشرت کا سلسلہ جاری ہے، جس میں آپس کی گفتگو کے مختلف آداب بتا رہے ہیں، اسی ذیل میں ایک باب قائم کیا ہے کہ کوئی آدمی اگر اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر جنت کے علاوہ اور کسی چیز کا سوال کرے تو اس سے منع کیا گیا ہے، اگر اللہ کے واسطے سے کوئی چیز مانگنی ہے تو جنت مانگئے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی شان بہت بلند ہے، اس کی عظمت و کبریائی کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے واسطہ سے دوسری چیزیں نہ مانگی جائیں۔ کسی بڑی شخصیت کا حوالہ دے کر کوئی آدمی معمولی چیز مانگے تو اس میں جس کا واسطہ دیا گیا ہے اس کی ایک طرح کی توہین اور ناقدری ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نام بہت بڑا ہے، اس کی جلالت و عظمت کے پیشِ نظر اس کے واسطہ سے دنیا کی کوئی چیز مانگی ہی نہیں جاسکتی، اس لیے کہ دنیا کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے، ہاں !جنت ایک ایسی چیز ہے جو اللہ کے واسطے سے مانگی جاسکتی ہے۔اسی لیے کوئی انسان اللہ کا واسطہ دے کر جنت کے علاوہ اور کوئی چیز مانگے تو یہ ناپسندیدہ اور ناجائز ہے۔

ایک تو مانگنے والے کو یہ ادب سکھلایا گیا۔ دوسری طرف جن کو اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیا جارہا ہے ان کو تاکید کی جارہی ہے کہ اگر کسی نے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کچھ مانگا، یا کوئی سفارش کی تو پھر آپ انکار مت کرو بلکہ فوراً دیدو۔ اس لیے کہ کتنی بڑی ذات کا آپ کو واسطہ دیا گیا ہے، پھر بھی تم نہ دو؛ تو یہ بھی ایک طرح کی ناقدری اور توہین ہے۔

حدیث ۱۷۲۲:-

عن جابر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ :لَا یُسْأَلُ بِوَجْهِ اللهِ إِلَّا الْجَنَّةُ. (رواہ أبو داود)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر جنت کے علاوہ کوئی چیز نہیں مانگی جاسکتی۔

اگر احسان کا بدلہ چکانے کی قدرت نہ ہو تو؟

حدیث ۱۷۲۳:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ ﷺ :مَنِ اسْتَعَاذَ بِاللهِ، فَأَعِيذُوهُ. وَمَنْ سَأَلَ بِاللهِ، فَأَعْطُوهُ. وَمَنْ دَعَاكُمْ، فَأَجِيبُوهُ. وَمَنْ صَنَعَ إِلَيْكُمْ مَعْرُوفاً فَكَافِئُوهُ. فَإِنْ لَمْ تَجِدُوا مَا تُكَافِئُونَهُ بِهِ فَادْعُوا لَهُ حَتَّى تَرَوْا أَنَّكُمْ قَدْ كَافَأْتُمُوهُ. (حدیث صحیح رواہ أبو داود والنسائی بأسانید الصحیحین)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی تم سے اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر پناہ مانگے تو اسے پناہ دو۔ اور کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کا واسطہ دے کر کوئی چیز مانگے تو اسے دو۔ اور کوئی آدمی آپ کو دعوت دے تو اس کو قبول کرو۔ اور کوئی آدمی آپ کے ساتھ کوئی بھلائی واحسان کرے تو اس کے ساتھ اسی کے مناسب معاملہ کرو (اس کے احسان کا بدلہ چکاؤ) اگر آپ کے پاس اس کے مناسب دینے کے لیے کوئی مادّی چیز نہیں ہے تو اس کے لیے دعا کرو، اور اتنی دعا کرو کہ تمہارا دل یہ گواہی دے کہ تم نے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔

افادات:- (۱) آپ کسی کو کوئی سزا دینا چاہتے ہیں اور اس نے کہا کہ اللہ کے واسطے مجھے سزا مت دو، میرے ساتھ ایسا معاملہ مت کرو، تو جب اس نے اللہ کا واسطہ دیدیا تو اب اس کو پناہ دیدو، اس معاملہ میں اب آگے مت بڑھو۔

(۲) ہم دنیوی اعتبار سے دیکھتے ہیں کہ کوئی بڑا آدمی آکر ہمیں کوئی کام کرنے کے لیے کہے، تو جی نہ چاہتے ہوئے بھی ہم اس کا لحاظ کرتے ہوئے اس کام کو کردیتے ہیں۔ تو جب اللہ تعالیٰ کا واسطہ دیا جا رہا ہو، اس کے بعد بھی کوئی انکار کرے؛ تو بہت غلط اور نامناسب ہے۔

(۳) اگر کسی نے آپ کو ہدیہ میں کوئی چیز دی تو آپ بھی اس کے بدلہ میں اس کو کوئی چیز دیجیے۔ اس نے آپ کے ساتھ جیسا احسان کیا ہے، آپ بھی اس کے ساتھ ویسا ہی احسان کیجیے۔ آپ ﷺ کی عادتِ شریفہ بھی یہی تھی کہ کوئی آدمی آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ بھی اس کے جواب میں اس کو عنایت فرماتے، بلکہ آپ جو دیتے وہ اس سے بہت زیادہ ہوتا تھا۔ اب اگر کسی نے آپ

کو کچھ مال دیا اور آپ کی مالی کمزوری کی وجہ سے اور اقتصادی طور پر استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے آپ اس کے ساتھ ویسا معاملہ نہیں کر سکتے، تو اس کے لیے خوب دعاؤں کا اہتمام کرو۔ اس لیے کہ حدیث پاک میں آتا ہے کہ کوئی آدمی کسی کو کوئی چیز دے اور وہ اس کے جواب میں "جزاک اللہ خیراً" کہے تو اس نے اس کے احسان کا بدلہ چکا دیا۔ اس لیے کہ یہ دعا دے کر گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تو آپ کے احسان کا بدلہ دینے سے قاصر ہوں، اس لیے میں اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کے اس احسان کا بدلہ میری طرف آپ کو چکائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑی چیز آپ اور کیا دے سکتے ہیں؟

تسکین میرٹھی ایک شاعر ہیں جنہوں نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے مکتوبات کو "مکاتیبِ اسعد" کے نام سے جمع کیا ہے، ان کا ایک شعر ہے:

گدا کو بھی اہلِ کرم کم نہ سمجھیں
بہت کچھ دیا جس نے دِل سے دُعا دی

اس لیے کوئی آدمی مادّی طور پر کسی کے احسان کا بدلہ نہ چکا سکتا ہو، تو اس کے لیے دعاؤں کا اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کا دائمی معمول

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں لکھاہے کہ: جن جن لوگوں کے میرے ساتھ جس جس نوع کے بھی احسانات (جانی، مالی، جاہی، علمی، سلوکی، اخلاقی) ہیں؛ مَیں ان کے لیے دعاؤں کا بڑا اہتمام کرتاہوں کہ: اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم، انعام واحسان سے اپنی شایانِ شان ان کے احسانات سے بہت زیادہ بڑھاکر ان کو بدلہ عطا فرمائے۔ میری یہ دعا اپنے سارے محسنوں کے لیے بیس برس کی عمر سے روز مرّہ کی اہم دعاؤں میں شامل ہے۔ اس میں تخلّف تو یاد نہیں کہ کبھی عمر بھر میں ہوا ہو، کئی کئی مرتبہ ہو جاتی ہے، ماہِ مبارک اور سفر حجاز میں تو خوب یاد ہے (اور حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) لکھتے ہیں کہ) یہ سیہ کار، نابکار، بے کار وبدکار اپنے محسنوں کے احسانات کا بدلہ بجز دعا کے اور کچھ نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ ہی اپنے کرم سے قبول فرمائے۔ (انتہیٰ بلفظہٖ)

ویسے شرافت ومروّت کا تقاضہ یہی ہے اور نبی کریم ﷺ کی تعلیم بھی یہی ہے کہ جس کا جو بھی احسان ہو، اس کے لیے اس کے مناسب دعاؤں کا اہتمام کیا جائے۔

باب تحریم قوله: شاهنشاه للسلطان وغيره

لأن معناه ملك الملوك، ولا يوصف بذلك غير الله سبحانه وتعالى

جو القاب حق تعالیٰ کے لیے خاص ہیں ان سے کسی بھی آدمی کو ملقب کرنا حرام ہے

اس باب میں ایک اور ادب سکھایا جاتا ہے کہ بعض القاب وصفات ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں، اس لیے ان القاب وصفات سے اللہ تعالیٰ کے علاوہ اور کسی کو یاد نہ کیا جائے۔ جیسے: "ملک الملوک" بادشاہوں کا بادشاہ۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے، اور یہ لقب اللہ تعالیٰ ہی کو زیب دیتا ہے، اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

ذلیل ترین نام

حدیث ۱۷۲۴:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبيِّ ﷺ قال: إِنَّ أَخْنَعَ اسْمٍ عِنْدَ اللهِ - عز وجل - رَجُلٌ تَسَمَّى مَلِكَ الأَمْلَاكِ. (متفق عليه)

قال سُفيانُ بن عُيَيْنَةَ: ((مَلِكُ الأَمْلَاكِ)) مِثْلُ: شَاهِنْ شَاهِ.

ترجمہ:—حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ذلیل نام اس آدمی کا ہے جس نے اپنے آپ کو "مَلِكُ الأَمْلاَكِ" سے موسوم کیا۔

حضرت سفیان بن عیینہ (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے محدث اور بزرگ تھے جو اس روایت کے ناقلین میں سے بھی ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ: شہنشاہ جو نام رکھا جاتا ہے وہ بھی اسی میں داخل ہے۔

افادات:—یعنی جو آدمی اپنا نام "مَلِكُ الأَمْلاَكِ" رکھے، یا کوئی دوسرا اس کا نام "مَلِكُ الأَمْلاَكِ" رکھے اور وہ اس کو منظور رکھے، تو یہ اس کے حق میں بڑی ذلیل ترین حرکت ہے۔

حضرت سفیان بن عیینہ (رحمۃ اللہ علیہ) کے قول کا حاصل یہ ہے کہ اس روایت میں "مَلِکُ الأمْلاَکِ" کی جو ممانعت آئی ہے وہ عربی زبان کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ کسی بھی زبان میں اس مفہوم کو ادا کرنے والا جو لفظ ہوگا، اس نام سے کسی کو موسوم کرنا جائز نہیں۔ جیسے: فارسی میں شہنشاہ کا لفظ ہے جو اصل میں شاہِ شاہاں ہے، جس میں اضافتِ مقلوبی ہے، جیسے: پیرانِ پیر بولا جاتا ہے، وہ اصل میں پیرِ پیراں تھا، پیروں کے پیر۔ اسی طرح شاہِ شاہاں کو شہنشاہ بولا جاتا ہے۔ اور ہندی زبان میں "مہاراجہ" بھی اسی معنیٰ میں ہے، اس لیے کسی کا ایسا نام رکھنا جائز نہیں ہے۔

سماج میں رائج ایک خرابی

اسی طریقہ سے کوئی ایسا نام ہو جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہو، اگرچہ اس کا نام تو ایسا نہیں رکھا گیا لیکن معاشرہ میں لوگ اس کو اس نام سے پکارتے ہیں؛ تو اس سے بھی بچنا چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے معاشرہ میں اللہ کے کسی نام کے ساتھ "عبد" ملا کر نام رکھا جاتا ہے، جیسے: عبد الرحمٰن، عبد الستار، عبد الجبار۔ تو اب لوگ صرف "رحمٰن، ستار، جبار" کہہ کر پکارتے ہیں؛ یہ درست نہیں ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ: جس معاشرہ و سماج میں ایسا پکارنے کا رواج ہو، وہاں اس طرح کے نام نہیں رکھنے چاہئیں۔ اور بعض لوگ تو پھر ایسے نام کو تصغیر یا توہین کے ساتھ پکارتے ہیں، حالاں کہ علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کے نام کو اگر بگاڑ کر پکارا جائے تو یہ کفر تک پہنچانے والا عمل ہے، اس لیے اس سے اپنے آپ کو بہت بچانے کی ضرورت ہے، لیکن ہمارے معاشرہ میں لوگ اپنی جہالت کی وجہ سے ایسا بولتے ہیں اور اپنی ناواقفیت کی وجہ سے کفر تک پہنچ جاتے ہیں۔

باب النهي عن مخاطبة الفاسق والمبتدع ونحوهما بِسَيِّدي ونحوه

فاسق اور بدعتی یا ان جیسے اللہ کے نافرمان کافر ومشرک کو "میرے آقا" کہہ کر پکارنے کی ممانعت

حدیث ۱۷۲۵:-

عن بُرَيْدَةَ ﷺ قالَ قالَ رسُولُ الله ﷺ : لاَتَقُولُوا لِلْمُنَافِقِ سَيِّدٌ، فَإِنَّهُ إِنْ يَكُ سَيِّداً فَقَدْ أَسْخَطْتُمْ رَبَّكُمْ -عزوجل-. (رواه أبو داود بإسنادٍ صحيح)

ترجمہ:—حضرت بریدہ اَسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: منافق یا فاسق کو سید (سردار) مت کہو؛ اس لیے کہ اگر منافق (فاسق ومشرک) سردار بن گیا تو تم نے (اس کو سردار بنا کر) اپنے رب کو ناراض کیا۔

افادات:—منافق، فاسق، کافر ومشرک؛ یہ سب اللہ تعالیٰ کے نافرمان اور دشمن ہیں، ان کو سید و سردار کہہ کر پکارنا نہایت غلط ہے، جیسے: آپ کے کسی دشمن کو آپ کا بیٹا یا آپ کا دوست یا آپ کا کوئی ماتحت کسی اچھے لقب سے پکارے تو اس کو آپ گوارا کرلیں گے؟ نہیں! بلکہ فوراً اس پر اپنی ناراضگی کا

اظہار کریں گے کہ ہمارے دشمن کو عزت کے القاب سے کیوں پکارتے ہو؟اسی طرح سے یہاں پر بھی ہے کہ کسی فاسق وفاجر اور بدعتی ومشرک کو عزت کالقب دے کر پکارنے کی اجازت نہیں ہے،اس سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔

باب کراھة سبّ الحمّی

بخار کو برا بھلا کہنے کی کراہت وممانعت

بعض مرتبہ کوئی بیماری طول پکڑ جاتی ہے تو اس سے تنگ ہوکر آدمی اس بیماری ہی کو برا بھلا کہنے لگتاہے، حالاں کہ اس کو برا بھلا کہنا کیا معنٰی رکھتاہے؟ یہ بیماری تو اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی آئی ہے۔ جیسے: کوئی آدمی جب مصائب میں گرفتار ہوتاہے اور تکالیف کا شکار ہوتاہے تو وہ زمانہ کو ہی برا بھلا کہنے لگتاہے، گویاوہ یوں سمجھتاہے کہ زمانہ ہی مصائب وتکالیف کو بھیجنے والاہے، اوراس سے یہ برائیاں مجھ تک پہنچی ہیں، حالانکہ حقیقت میں جوکچھ بھی اس کو پہنچتاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے پہنچتاہے۔ جب وہ زمانہ کو برا بھلا کہے گا تو اس کی برائی اللہ تعالیٰ تک پہنچے گی، اس لیے اس سے منع کیا گیاہے۔ ایسے ہی یہاں بھی بخار کو برا بھلا کہنے سے منع کیا گیاہے۔

حدیث ۱۷۲۶:-

عن جابر رضی اللہ عنہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ دَخَلَ علىٰ أُمِّ السَّائِبِ، أو أُمِّ المُسَيِّبِ فَقَالَ: مَا لَكِ يَا أُمَّ السَّائِبِ-أو يَا أُمَّ المُسَيِّبِ- تُزَفْزِفِينَ؟ قَالَتْ: الحُمَّى لَا بَارَكَ اللهُ فِيهَا! فَقَالَ: ((لَا تَسُبِّي الحُمَّى فَإِنَّهَا تُذْهِبُ خَطَايَا بَنِي آدَمَ كَمَا يُذْهِبُ الكِيرُ خَبَثَ الحَدِيدِ)). (رواہ مسلم)

((تُزَفْزِفِينَ)) أَيْ تَتَحَرَّكِينَ حَرَكَةً سَرِيعَةً. وَمَعْنَاهُ: تَرْتَعِدُ. وَهُوَ بِضَمِّ التاء وبالزاي المكررة والفاء المكررة. وَرُوِيَ أيضاً بالراء المكررة والقافين.

ترجمہ:– حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ایک مرتبہ ایک انصاری صحابیہ اُم سائب یا اُم مسیّب کے پاس تشریف لے گئے (بخار کی وجہ سے وہ کانپ رہی تھیں) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے اُم سائب یا اُم مسیّب! کیا بات ہے؟ کیوں کانپ رہی ہو؟ انہوں نے جواب میں کہا: بخار ہے؛ اللہ پاک اس میں برکت نہ دے۔ تو نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: بخار کو برا بھلا مت کہو؛ اس لیے کہ وہ انسانوں کے گناہوں کو اس طرح ختم کرتا ہے جس طرح بھٹّی لوہے کے میل کچیل کو صاف کرتی ہے۔

افادات:– یہاں اگرچہ بخار کو گالی نہیں دی، بلکہ اس سے تنگ آکر اس کے لیے بد دعائیہ جملہ استعمال کیا تھا، اور گالی کے الفاظ بھی تنگ آکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں؛ اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی تنگ آنے والی کیفیت کا اظہار جن الفاظ میں بھی ہو، چاہے بد دعا کی شکل میں ہو یا اور کسی طریقہ سے ہو؛ اس کی ممانعت ہے۔

اور اس روایت سے معلوم ہوا کہ آدمی جب بخار میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے گناہوں سے بالکل پاک صاف ہو جاتا ہے، جیسے: لوہے کو جب بھٹّی میں ڈالا جاتا ہے تو لوہا ایک دم صاف شفاف ہو جاتا ہے۔

باب النهى عن سب الريح وبيان ما يقال عند هُبُوبِهَا

ہَوا کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

اور جب ہَوا چلے تو اس وقت کیا پڑھنا چاہیے؟

حدیث ۱۷۲۷:-

عن أبي المنذِرِ أُبي بن كعب رضى الله عنه قال قالَ رسولُ الله ﷺ: ((لاَ تَسُبُّوا الرِّيحَ، فَإِذَا رَأَيْتُمْ مَا تَكْرَهُونَ، فَقُولُوا: اللَّهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ مِنْ خَيْرِ هٰذِهِ الرِّيحِ وَخَيْرِ مَا فِيهَا وخَيْرِ مَا أُمِرَتْ بِهِ. وَنَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ هٰذِهِ الرِّيحِ وَشَرِّ مَا فِيهَا وَشَرِّ مَا أُمِرَتْ بِهِ)). (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن صحيح)

ترجمہ:- حضرت اُبی بن کعب (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہَوا کو بُرا بھلا مت کہو، اگر کوئی ایسی چیز دیکھو جو تمہاری طبیعت کے خلاف ہے (جیسے آندھی طوفان اور تیز ہَوا چل رہی ہو، تو برا بھلا کہنے مت لگ جاؤ، بلکہ اس وقت) یہ دعا پڑھو: اے اللہ! اس ہَوا کی بھلائی اور اس میں جو بھلائی رکھی گئی ہے، اور یہ ہَوا جن چیزوں کو لے کر بھیجی گئی ہے؛ اس کی بھلائی کا مَیں آپ سے سوال کرتا ہوں۔ اور اس ہَوا کی برائی اور اس کے اندر جو برائی رکھی گئی ہے، اور یہ ہَوا جن بری چیزوں کو لے کر بھیجی گئی ہے؛ اس سے مَیں پناہ مانگتا ہوں۔

افادات:—مطلب یہ ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے اپنا کام کرتی ہے، اگر اس کی طرف سے ہمیں کوئی بھلائی، خیر وراحت اور فائدہ پہنچ رہا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے ہے۔ اور اگر اس کی طرف سے ہمیں کوئی تکلیف و شر پہنچتا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی حکم سے ہے۔ اس لیے اس کے خیر کے ملنے اور اس کے شر سے بچنے کی اللہ تعالیٰ ہی سے دعا کرنی چاہیے۔

ہَوا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے

حدیث ۱۷۲۸ :-

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال سمعتُ رسُولَ اللهِ ﷺ يقولُ: الرِّيحُ مِنْ رَوحِ اللهِ، تَأْتِي بِالرَّحْمَةِ، وَتَأْتِي بِالعَذَابِ، فَإِذَا رَأَيْتُمُوهَا فَلَا تَسُبُّوهَا، وَسَلُوا اللهَ خَيْرَهَا، وَاسْتَعِيذُوا بِاللهِ مِنْ شَرِّهَا. (رواه أبو داود بإسناد حسن)

قوله- ﷺ -: ((مِنْ رَوْحِ اللهِ)) هو بفتح الراء: أي رَحْمَتِهِ بِعِبَادِهِ.

ترجمہ:—حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ہَوا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے (اللہ کے نیک بندوں کے لیے) وہ رحمت لے کر آتی ہے اور (گنہگاروں اور نافرمانوں کے لیے) عذاب بن کر آتی ہے۔ لہٰذا جب تم دیکھو (کہ تیز و تند ہَوا چل رہی ہے) تو اس کو برا بھلا مت کہو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے اس کی خیر مانگو اور اس کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو۔

جب تیز ہَوا چلے اس وقت یہ دعا پڑھے

حدیث ۱۷۲۹:-

وعن عائشة رضی الله عنها قالت: كان النَّبِيُّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - إذا عَصَفَتِ الرِّيحُ قال: ((اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَهَا وَخَيْرَ مَا فِيهَا وَخَيْرَ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ، وأَعُوذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيهَا وَشَرِّ مَا أُرْسِلَتْ بِهِ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبیِ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جب ہَوا کو تیز چلتا ہوا دیکھتے تھے تو یہ دعا پڑھتے تھے: اے اللہ! اس ہَوا کی بھلائی اور جو بھلائی اس کے اندر رکھی ہوئی ہے، اور جس بھلائی کو لے کر وہ بھیجی گئی ہے؛ اس کا مَیں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اور اس ہَوا کی برائی اور جو برائی اس کے اندر ہے، اور جس برائی کے ساتھ وہ بھیجی گئی ہے؛ اس سے مَیں تیری پناہ چاہتا ہوں۔

باب کراھة سب الديك

مرغ کو برا بھلا کہنے کی ممانعت

حدیث ۱۷۳۰ :-

عن زيد بن خالد الجُهَنِيِّ - رضي الله عنه - قال: قال رسُولُ اللهِ ﷺ: ((لَا تَسُبُّوا الدِّيكَ، فَإِنَّهُ يُوقِظُ لِلصَّلَاةِ)).

(رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت زید بن خالد جُھَنِي (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مرغ کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ وہ نماز کے لیے اُٹھاتا ہے۔

افادات:- عام طور پر تہجد کا وقت جب شروع ہوتا ہے اس وقت وہ بولتا ہے، پھر جب صبح صادق ہوتی ہے اس وقت بھی بولتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تو اچھائی کے لیے بولتا ہے، اس لیے اس کو برا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔

اور حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ: مرغ فرشتے کو دیکھ کر بولتا ہے، اور گدھا یا کتا شیاطین کو دیکھ کر چلاتے ہیں۔ اس لیے جب گدھا یا کتا چلاّئے تو "أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ" پڑھنا چاہیے،

اور جب مرغ کی آواز سنو تو اللہ تعالیٰ سے خیر مانگنی چاہیے (۱)۔

(۱) عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رضی اللہ عنہ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ: إِذَا سَمِعْتُمْ صِيَاحَ الدِّيَكَةِ فَاسْأَلُوا اللهَ مِنْ فَضْلِهِ، فَإِنَّهَا رَأَتْ مَلَكًا. وَإِذَا سَمِعْتُمْ نَهِيقَ الْحِمَارِ فَتَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ، فَإِنَّهَا رَأَتْ شَيْطَانًا. (صحیح مسلم، باب اسْتِحْبَابِ الدُّعَاءِ عِنْدَ صِيَاحِ الدِّيكِ)

وعَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: إِذَا سَمِعْتُمْ نُبَاحَ الْكِلَابِ وَنَهِيقَ الْحُمُرِ بِاللَّيْلِ فَتَعَوَّذُوا بِاللهِ فَإِنَّهُنَّ يَرَيْنَ مَا لَا تَرَوْنَ. (سنن ابوداود، باب مَا جَاءَ فِي الدِّيكِ وَالْبَهَائِمِ)

باب النهي عن قول الإنسان: مُطِرنا بِنَوْءِ كَذَا

کسی انسان کا یہ کہنا کہ فلاں ستارہ اور نچھتر کی وجہ سے بارش ہوئی، یہ ممنوع ہے

بعض مخصوص ستاروں کی چال، ہیئت کی وجہ سے نجومی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ آج فلاں ستارہ فلاں بُرج میں پہنچا ہے تو بارش تیز ہو گی، یا ہلکی ہو گی، یا بالکل ہی نہیں ہو گی۔ تو ستاروں کی بنیاد پر بارش وغیرہ کا حساب لگاتے ہیں اس کو نچھتر کہتے ہیں اور عربی میں اُسے ''نَوْءٌ'' کہتے ہیں، اور گجراتی میں ''નક્ષત્ર'' کہتے ہیں۔

شرکیہ عقیدہ

حدیث ۱۷۳۱:-

عن زيد بن خالد رضی الله عنه قال: صلَّى بنا رسولُ الله ﷺ صَلاَةَ الصُّبْحِ بِالحُدَيْبِيَّةِ في إِثْرِ سَمَاءٍ كَانَتْ مِنَ اللَّيْلِ، فَلَمَّا انْصَرَفَ أَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ، فقالَ: ((هَلْ تَدْرُونَ مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ؟)) قالُوا: اللهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ. قال: ((قَالَ: أَصْبَحَ مِنْ عِبَادِي مُؤْمِنٌ بِي، وَكَافِرٌ، فَأَمَّا مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِفَضْلِ اللهِ وَرَحْمَتِهِ، فَذٰلِكَ مُؤْمِنٌ بِي كَافِرٌ بِالكَوْكَبِ، وأما مَنْ قَالَ مُطِرْنَا بِنَوءِ كَذَا وَكَذَا، فَذٰلكَ كَافِرٌ بِي مُؤْمِنٌ بِالكَوْكَبِ)). (متفق عليه)

وَالسَّمَاءُ هُنَا: المَطَرُ.

ترجمہ:– حضرت زید بن خالد جہنی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہم کو مقامِ حدیبیہ میں فجر کی نماز ایسی حالت میں پڑھائی کہ اس رات بارش ہوئی تھی۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور دریافت فرمایا: کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پرودگار نے آج کیا فرمایا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں (جب تک کہ وہ ہمیں نہیں بتائیں؛ ہمیں کیسے پتہ چلے گا) حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ نے یوں فرمایا: میرے بندوں میں بعضوں نے مجھ پر ایمان کی حالت میں صبح کی، اور بعضوں نے میرے ساتھ کفر کی حالت میں صبح کی۔ چناں چہ جن لوگوں نے اس بارش کے نتیجے میں یوں کہا کہ یہ بارش اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہوئی ہے؛ وہ تو مجھ پر ایمان رکھنے والے اور ستاروں (کی تاثیر) کا انکار کرنے والے ہیں۔ اور جو یوں کہتے ہیں کہ فلاں فلاں ستارے کی (تاثیر کی) وجہ سے بارش ہوئی تو وہ میرا انکار کرنے والا اور ستاروں کی تاثیر کو ماننے والا ہے۔

افادات:– یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب نبی کریم ﷺ عمرہ کے ارادہ سے مدینہ منورہ سے احرام باندھ کر آئے تھے اور مکہ والوں نے حضور ﷺ اور صحابہ کو حدیبیہ میں روک دیا تھا، آپ ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہ وہیں قیام پذیر تھے کہ ایک رات بارش ہوئی، اسی دن فجر کی نماز کے بعد آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا۔

علماء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی واقعةً یہ سمجھتا ہو کہ بارش ستاروں کی گردش اور چال کی وجہ سے ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو اس میں دخیل نہ سمجھتا ہو؛ تب تو وہ حقیقةً کافر ہے۔ اور اگر وہ ایسا

نہیں سمجھتا بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ بارش تو اللہ تعالیٰ کی قدرت ہی کی وجہ سے ہوتی ہے؛ لیکن ستارے کو علامت اور نشانی سمجھتا ہے؛ تو اس صورت میں کافر تو نہیں ہو گا؛ لیکن کفریہ عقیدے کی مشابہت کی وجہ سے ایسا بولنا بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

باب تحریم قوله لمسلم: یا کافر

کسی مسلمان کو "اے کافر" کہہ کر پکارنا حرام ہے

زبان سے تعلق رکھنے والی مختلف باتیں اور متفرق آداب پچھلے کئی ابواب سے چل رہے ہیں۔ آج عنوان قائم کیا ہے کہ کوئی آدمی کسی مسلمان کو کافر کہہ کر پکارے؛ تو یہ حرام ہے۔اس سلسلہ میں روایت پیش فرماتے ہیں۔

حدیث ۱۷۳۲:-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قالَ رسولُ اللهِ- صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم -: ((إِذَا قَالَ الرَّجُلُ لأَخِيهِ: يَا كَافِرُ، فَقَدْ بَاءَ بِهَا أَحَدُهُمَا، فَإِنْ كَانَ كَمَا قَالَ وَإِلاَّ رَجَعَتْ عَلَيْهِ)) (متفق علیه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: جب کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی کو "اے کافر" کہہ کر پکارتا ہے؛ تو دونوں میں کوئی ایک ضرور اس لقب کو لے کر لوٹتا ہے۔اب جس کو کافر کہہ کر پکارا ہے اس میں واقعتاً کوئی بات کفر کی پائی جاتی ہے (یعنی اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے، یا کوئی بات ایسی کہی ہے جس کی وجہ سے وہ اصولی طور پر اسلام سے نکل کر کفر میں داخل ہو جاتا ہے) تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ وہ جملہ اس کے کہنے والے کی طرف ہی لوٹے گا۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو مسلمان نہ سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کافر کہا، سب وشتم اور گالی کے طور پر نہیں کہا، بلکہ اس پر کافر ہونے کا حکم ہی لگانا چاہتا ہے؛ تو اس صورت میں یہ ہے کہ جس کو کافر کہا گیا ہے اس میں اگر کفر کی کوئی بات موجود نہیں تو پھر کہنے والا ہی کافر ہو جائے گا۔ اور اگر اس میں کفر کی بات موجود ہے، یا اس کو کافر سمجھ کر کافر نہیں کہا، بلکہ بطور گالی کے یہ جملہ کہا ہے؛ تب بھی ایسا کہنا حرام ہے، اس صورت میں بھی ایسا جملہ کہنا اس کے لیے نقصان سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے حضرت فقیہ الامت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے کہ: نجاست کے دلدل میں کوئی آدمی اگر پتھر پھینکے گا تو اس کے چھینٹے خود اسی پر اڑیں گے۔

ورنہ وہ بول کہنے والے کی طرف لوٹیں گے

لعنت کے سلسلہ میں (حدیث کے اصلاحی مضامین، جلد: ۱۳) میں تفصیل بتائی جا چکی ہے، تکفیر کے سلسلہ میں بھی وہی بات ہے۔ حضرت علامہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) نے لعنت کے سلسلہ میں بہت عمدہ مثال ارشاد فرمائی ہے کہ: گیند کو اگر آپ سامنے کسی جگہ پر ماریں تو اگر وہ جگہ نرم ہوگی اور اس گیند کو اپنے اندر اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوگی؛ تب تو وہ گیند اندر گھس جائے گی اور وہیں رہ جائے گی۔ لیکن اگر وہ جگہ سخت ہوگی تو پھر وہ گیند جتنی قوت سے سامنے کی طرف پھینکی گئی ہے اتنی ہی قوت سے پھینکنے والے کی طرف

لوٹ کر آئے گی۔ ایسے ہی یہاں پر بھی ہے کہ جس کو کافر کہا گیا ہے، اگر اس میں کفر کی کوئی بات موجود ہے، تب تو ٹھیک ہے؛ ورنہ یہ جملہ کہنے والے کی طرف ہی لوٹے گا۔

نقصان کہنے والے ہی کو بھگتنا پڑے گا

حدیث ۱۷۳۳ :-

وعن أبي ذرٍّ رضی الله عنه: أنَّه سَمِعَ رسُولَ اللهِ ﷺ يقولُ: مَنْ دَعَا رَجُلاً بالكُفْرِ، أو قالَ: عَدُوَّ اللهِ، ولَيْسَ كَذلكَ إلاَّ حَارَ عَلَيْهِ. (متفق عليه)

((حَارَ)): رَجَعَ.

ترجمہ:- حضرت ابوذَر غفاری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبیِ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جس آدمی نے کسی مؤمن کو کفر سے یاد کیا (یعنی یوں کہا: اے کافر) یا یوں کہا: اے اللہ کے دشمن (حالاں کہ مؤمن تو اللہ کا دوست ہوتا ہے) اور وہ ایسا نہیں ہے (یعنی اس میں کفر کی کوئی بات نہیں ہے، یا اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے جس کی بنیاد پر اس کو اللہ کے دشمن سے پکارا جائے) تو یہ جملہ اس کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے۔

افادات:- گویا اس صورت میں اس جملہ کا نقصان کہنے والے ہی کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لیے ایسے جملے بولنے سے بہت زیادہ احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا

ویسے بھی فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کسی کے اوپر کفر کا حکم لگانا بہت خطرناک ہے۔ اگر کسی نے کوئی ایک بات کہی جس کے سو مطلب نکل سکتے ہیں اور ان میں سے ننانوے مطلب ایسے ہیں جن سے کفر لازم آتا ہے لیکن ایک مطلب ایسا ہے جس کی وجہ سے کفر لازم نہیں آتا؛ تب بھی اس پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگا سکتے ہیں۔ یہ اس وقت ہے جبکہ اس نے خود اپنی بات کا مطلب متعین نہ کیا ہو، اور اگر وہ یوں کہے کہ میں نے جو جملہ کہا ہے اس کا یہی مطلب ہے، اور وہ مطلب کفریہ ہے؛ تب تو اس پر کفر کا حکم لاگو پڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس نے کوئی وضاحت نہیں کی ہو تو ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ محض احتمال کی وجہ سے اس پر کفر کا حکم لگائیں۔

باب النهي عن الفحش وبذاء اللسان

بے حیائی اور بدزبانی کی ممانعت

اپنی زبان سے ایسی باتیں نکالنا جو بے حیائی کی ہوں ، جیسا کہ بعضوں کا مشغلہ ہی ہوتا ہے کہ لوگوں کو ہنسانے کے لیے بے حیائی کے کلمات بولتے رہتے ہیں؛ تو یہ حرام ہے۔اسی طرح سے بدکلامی کرنے کی بھی ممانعت آئی ہے۔

مومن ایسا نہیں ہوتا

حدیث ۱۷۳۴:-

عن ابن مسعودٍ رضی الله عنه قال قالَ رسولُ اللهِ ﷺ : ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ، وَلاَ اللَّعَّانِ، وَلاَ الْفَاحِشِ، وَلاَ الْبَذِيِّ)) (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن)).

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مؤمن طنز و طعن کرنے والا، اور لعنت بھیجنے والا، اور فحش گو (یعنی اپنی زبان سے بے حیائی کی باتیں نکالنے والا) اور بدکلام نہیں ہوتا۔

افادات:- (۱) ایک بات کسی کو صاف طور پر کہنے کے بجائے لپیٹ کر کہنا؛ جس کو ٹونٹنگ کہتے ہیں۔ کلام کے درمیان ایسے جملے استعمال کرنا جس سے وہ یہ سمجھے کہ اس سے میری ہی طرف اشارہ ہے،

ان الفاظ کے ذریعہ مجھے ہی مخاطب بنایا جارہا ہے اور میرے اوپر ہی الزام لگایا جارہا ہے، تو یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کسی مؤمن کو اس طرح لپیٹ کر مخاطب کرنا جس کی وجہ سے اس کی دل آزاری ہو اور دل دُکھے، اسی کو طنز سے تعبیر کیا جاتا ہے؛ اور یہ حرام ہے۔

پہلے بھی آچکا ہے کہ مؤمن کی عزت و حرمت کی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑی وقعت و اہمیت ہے، اور ایسی کوئی بات کہنا جس سے اس کی عزت کے اوپر آنچ آتی ہو؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

(۲) بات بات میں بددعائیہ کلمات کہنا؛ یہ بھی مؤمن کی شان نہیں ہے۔ پہلے بھی بتایا جاچکا کہ اگر کسی نے کسی پر لعنت بھیجی، یا کسی کو بددعائیہ جملہ کہا، اور جس کو کہا گیا ہے وہ اس کا اہل نہیں ہے؛ تو یہی جملہ خود اس کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے۔

(۳) بے حیائی کی باتوں سے بہت سختی سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پسند نہیں فرماتے۔

(۴) مؤمن بدکلام نہیں ہوتا۔ بے حیائی کے علاوہ زبان کی بے احتیاطیوں کو بذاءت یعنی بدکلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

شرم وحیاء خوبی پیدا کر دیتی ہے

حدیث ۱۷۳۵ :-

وعن أنسٍ رضی اللہ عنہ قال قالَ رسولُ اللہِ ﷺ :((مَا کَانَ الفُحشُ فِی شَیْءٍ إلاَّ شَانَہُ،وَمَا کَانَ الحَیَاءُ فِی شَیْءٍ إلاَّ زَانَہُ)). (رواہ الترمذی،وقال:حدیث حسن)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس چیز میں بے حیائی ہوتی ہے وہ اس میں عیب پیدا کر دیتی ہے۔اور جس چیز میں شرم وحیا ہوتی ہے وہ اس میں زینت وخوبی پیدا کر دیتی ہے۔

افادات:- شرم وحیا جہاں بھی آئے گی وہ خوبی لے کر ہی آئے گی۔اور بے حیائی وبے شرمی عیب لے کر ہی آئے گی۔دورِ حاضر میں جس تہذیب کو پھیلایا جارہا ہے اس کی بنیاد ہی بے حیائی پر ہے،اور پہلے بھی گزر چکا ہے،آپ کو یاد ہوگا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: حیا اور ایمان دونوں جڑواں ہیں، ایک جہاں ہوگا وہاں دوسرا بھی ہوگا،اور جہاں سے ایک رخصت ہوگا وہاں سے دوسرا بھی چلا جائے گا۔

باب كراهة التقعير في الكلام والتشدُّق فيه وتكلف الفصاحة واستعمال وحشي اللُّغة ودقائق الإعراب في مخاطبة العوام ونحوهم

بات کو گلے کے اندر سے بہ تکلف کہنے،

اپنی بات میں فصیح وبلیغ جملے بہ تکلف بولنے کا اہتمام کرنے کی ممانعت

اور اپنے کلام میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جس کا معنٰی عام طور پر لوگ جانتے نہ ہوں،

اور عوام سے بات کرتے ہوئے ان کی سطح سے اوپر کے کلمات استعمال کرنے کی ممانعت

اگر کسی آدمی کی زبان ہی شستہ وصاف ہو کہ غیر اختیاری طور پر اس کی زبان سے فصیح کلمات نکلتے ہیں؛ تب تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اگر کسی کی زبان میں تو یہ خوبی نہیں ہے پھر بھی وہ بہ تکلف ایسے فصیح کلمات نکالتا ہے۔ یا عوام کے ساتھ ان کی سطح سے اونچے الفاظ میں بات چیت کرتا ہے کہ وہ ان الفاظ کے معانی کو آسانی سے سمجھ ہی نہیں سکتے؛ تو اس کو پسند نہیں کیا گیا ہے۔

ایک لطیفہ

جیسے: ایک مرتبہ لکھنؤ کے نواب صاحب کے پاس ان کی رعیت کے کچھ کسان لوگ ملاقات کے لیے آئے تو نواب صاحب نے ان سے پوچھا: اِمسال کِشتِ زارِ گندم میں تقاطرِ اَمطار کیسا ہے؟ یعنی آپ کے گیہوں کے کھیت میں بارش کا کیا حال ہے؟ وہ بیچارے دیہاتی لوگ تھے، اس بات کو کہاں سمجھ پاتے، آپس میں کہنے لگے کہ: اس وقت نواب صاحب کوئی وظیفہ پڑھ رہے ہیں، چلو! بعد میں ملیں گے۔

خلاصہ یہ کہ بات کرتے ہوئے ایسے کلمات استعمال کرنا جس سے سامنے والا بات نہ سمجھ سکے، یہ تکلف ہے جس سے شریعت نے منع کیا ہے۔

"مُتَنَطِّعْ" ہلاک ہوئے

حدیث ۱۷۳۶ :-

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قال: ((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ.)) قَالَهَا ثَلَاثًا. (رواہ مسلم)

((الْمُتَنَطِّعُونَ)): الْمُبَالِغُونَ فِي الْأُمُورِ.

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا: "مُتَنَطِّعْ" ہلاک ہوئے۔

افادات:- ’’مُتَنَطِّعُ‘‘یعنی جو کسی بھی چیز میں مبالغہ آرائی کرنے والے اور حد سے آگے بڑھنے والے ہوں، چاہے بولنے کا ہی معاملہ ہو۔

ٹی وی اور ڈرامے دیکھنے کی نحوست

آج کل سینما، ٹی وی وغیرہ میں جو مختلف ڈرامے دکھلائے جاتے ہیں اور اس میں جتنے بھی ڈائیلاگ اور جملے ہوتے ہیں، وہ سب تکلّفات کے قبیل سے ہی ہوتے ہیں، پھر ان کو دیکھ کر اور سن کر لوگ بھی انہیں جملوں کو استعمال کرنے لگتے ہیں؛ وہ سب اس وعید میں داخل ہیں۔ بہت سے چھوٹے بچے بھی جو تعلیم کی باتیں نہیں سمجھتے لیکن ایسی باتوں کو دیکھ کر اور سن کر جب دُہراتے ہیں تو وہ ایسی اونچی ہوتی ہیں جس کو سن کر آدمی حیرت میں پڑ جائے کہ بڑا ذہین اور سمجھدار بچہ معلوم ہوتا ہے؛ لیکن پڑھائی کے معاملہ میں جب اسی بچے کے متعلق اس کے استاذ سے پوچھا جاتا ہے تو وہ یہ رپورٹ دیتے ہیں کہ بالکل غبی ہے۔ یہ ساری نحوست بچپن سے ٹی وی دیکھتے رہنے کی ہوتی ہے کہ اسی کو دیکھ دیکھ کر اور سن سن کر اس کے عادی بن جاتے ہیں لیکن فہم وسمجھ کو بڑھانے والی صلاحیت ان میں پیدا نہیں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ ایسے آدمی کو ناپسند کرتے ہیں

حدیث ۱۷۳۷ :-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما: أَنَّ رَسُولَ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قال: ((إِنَّ اللهَ يُبْغِضُ البَلِيغَ مِنَ الرِّجَالِ الَّذِي يَتَخَلَّلُ بِلِسَانِهِ كَمَا تَتَخَلَّلُ البَقَرَةُ)). (رواه أبوداود والترمذی، وقال: حديث حسن)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بلاغت کا کلام کرنے والے آدمی کو ناپسند کرتے ہیں جو اپنی زبان کو اس طرح موڑتا ہے جیسے گائے چارا کھاتے وقت اپنی زبان کو موڑتی ہے۔

افادات:- گائے چارا کھا کر پہلے اندر اتار لیتی ہے، پھر جگالی کرنے کے لیے جب اس کو دوبارہ منھ میں واپس لاتی ہے اس وقت اپنی زبان کو پورا موڑ لیتی ہے۔ جو آدمی بہ تکلف بلاغت پیدا کرتا ہے وہ بھی اپنی زبان کو گویا گائے کی طرح موڑتا ہے؛ ایسے آدمی کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کلام کے اندر بھی سادگی پسندیدہ ہے۔

دربارِ نبوت میں محبوب ترین کون؛ اور مبغوض ترین کون؟

حدیث ۱۷۳۸ :-

وعن جابر بن عبد الله (رضی اللہ عنہما) أنَّ رسُولَ الله ﷺ قال: إنَّ مِنْ أحَبِّكُمْ إلَيَّ، وأقْرَبِكُمْ مِنِّي مَجْلِساً يَومَ القِيامَةِ، أحَاسِنَكُمْ أخْلاَقاً، وإنَّ أبْغَضَكُمْ إلَيَّ، وأبْعَدَكُمْ مِنِّي يَوْمَ القِيامَةِ، الثَّرْثَارُونَ وَ المُتَشَدِّقُونَ وَالمُتَفَيْهِقُونَ. (رواه الترمذی، وقال: حديث حسن). وقد سبق شرحه في بَابِ حُسْنِ الخُلُقِ.

ترجمہ:۔حضرت جابر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وپسندیدہ، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ قریب بیٹھنے والے؛ وہ لوگ ہوں گے جو اخلاق کے اعتبار سے اچھے ہوں۔ اور تم لوگوں میں میرے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض و ناپسندیدہ، اور قیامت کے روز مجھ سے سب سے زیادہ دور؛ وہ لوگ ہوں گے جو بات کرنے میں کثرت سے تکلّف کرنے والے ہوں (گویا ان کا مزاج ہی تکلّف والا بن گیا ہو) اور جو بہ تکلّف منھ بھر بھر کر باتیں کرنے کے عادی ہوں، اور جو اپنی بڑائی جتلانے کے لیے بات کرنے والے ہوں۔

افادات:۔جن کے اخلاق اچھے ہیں وہ نبی کریم ﷺ کو بہت زیادہ محبوب اور پسند ہیں اور قیامت کے روز ان کا مقام حضور ﷺ سے قریب ہوگا۔

بعض لوگوں کا بات کرنے کا انداز ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے اپنی بڑائی اور فوقیت جتلانا چاہتے ہیں؛ ایسے لوگ حضور اکرم ﷺ کی نگاہوں میں ناپسندیدہ ہیں اور قیامت کے روز حضور سے دور ہوں گے۔

باب کراھۃ قولہ: خَبُثَتْ نَفْسِی

کسی کلام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دو کلمات ہیں اور دونوں ایک ہی مطلب و مفہوم کو ادا کرتے ہیں؛ لیکن ان میں سے ایک کلمہ بھاری ہوتا ہے، جسے سننے کو طبیعت پسند نہیں کرتی، اور دوسرے کلمہ میں وہ برائی نہیں ہوتی؛ تو شریعت یہ ہدایت دیتی ہے کہ جب اس مفہوم کو ادا کریں تو جس کلمہ میں وہ برائی نہیں ہے اس کو استعمال کیجیے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھئے کہ آپ کسی کو بے وقوف کہنا چاہتے ہیں تو ایک تو یہ ہے کہ آپ اسے بے وقوف کہیں، اور دوسرا یہ ہے کہ آپ اس کو گدھا کہیں۔ جب کسی کو گدھا کہا جاتا ہے تو بڑا بھاری معلوم ہوتا ہے، حالاں کہ دونوں کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہے، بولنے والا گدھا بول کر بھی سامنے والے کو بے وقوف ہی کہنا چاہتا ہے؛ لیکن لفظ گدھا سن کر سننے والے کو زیادہ وحشت ہوتی ہے۔ تو دیکھو! ایک ہی مفہوم کو ادا کرنے کے لیے دو لفظ ہیں لیکن دونوں میں سے ایک لفظ اتنا بھاری نہیں لگتا جتنا دوسرا لگتا ہے۔

تعبیر کے دو انداز

حدیث ۱۷۳۹:-

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا عن النبیؐ - صلی اللہ علیہ وسلم - قال: ((لَا یَقُولَنَّ أَحَدُکُمْ: خَبُثَتْ نَفْسِی، وَلٰکِنْ لِیَقُلْ: لَقِسَتْ نَفْسِی)) (متفق علیہ)

قَالَ الْعُلَمَاءُ: مَعْنَی ((خَبُثَتْ)): غَثَتْ، وَھُوَ مَعْنَی: ((لَقِسَتْ)) وَلٰکِنْ کَرِہَ لَفْظَ الْخُبْثِ

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی "خَبُثَتْ نَفْسی" نہ کہے، بلکہ اس کو چاہیے کہ "لَقِسَتْ نَفْسی" کہے۔

علماء نے فرمایا کہ: "خَبُثَتْ" کا معنیٰ ہے "غَثَتْ" یعنی جی متلانا، اور "لَقِسَتْ" کا مطلب بھی وہی ہے؛ لیکن "خَبُثَتْ" والے لفظ کو حضورِ اکرم ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

افادات:- نبی کریم ﷺ نے کلام کے آداب بھی ہمیں سکھلائے ہیں چناں چہ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ سننے والوں کے لیے وہ بڑے گراں ہوتے ہیں، گویا کان ان الفاظ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے، بقولِ شخصے: کان کُلی کرتے ہیں۔ اسی طرح اس روایت میں بھی حضور اکرم ﷺ الفاظ کا استعمال بتلا رہے ہیں کہ جب کسی کا جی متلا رہا ہو، متلی آرہی ہو، آدمی کی طبیعت میں قے کی کیفیت پیدا ہو رہی ہو، تو اس کو تعبیر کرنے کے لیے عربی زبان میں دو لفظ استعمال کئے جاتے ہیں، ایک لفظ "لَقِسَتْ نَفْسی" ہے کہ میرا جی برا ہو رہا ہے، مجھے متلی آرہی ہے۔ اور دوسری تعبیر "خَبُثَتْ نَفْسی" ہے، اس کا ترجمہ بھی وہی ہوتا ہے؛ لیکن لفظ "خبیث" استعمال ہو رہا ہے کہ میرا جی خبیث ہو رہا ہے، تو "خَبُثَتْ" والے لفظ میں "لَقِسَتْ" کے مقابلہ میں قباحت زیادہ ہے، حالاں کہ دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے؛ لیکن "خَبُثَتْ" والا لفظ ذرا بھاری تھا؛ اس لیے اس کو استعمال کرنے سے منع فرمایا۔

یہودیوں کی شرارتیں

بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دونوں لفظ کا معنیٰ یکساں ہوتا ہے لیکن ایک لفظ ایسا ہے جس میں بعض شر پسندوں کو شرارت کا موقعہ ملتا ہے، دوسرے لفظ کا بھی مفہوم تو وہی ہے لیکن کسی کو شرارت کا موقعہ نہیں مل سکتا؛ تو پھر ایسے لفظ کو استعمال کرنے سے منع کریں گے جس میں شر پسندوں کو شرارت کا موقعہ ملتا ہو۔ جیسے: یہودی جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے تو حضور کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے لفظ ''رَاعِنَا'' کہتے تھے۔ یہ عربی کا لفظ ہے جو ''رَاعیٰ یُرَاعِیْ، مُرَاعَاۃً'' سے بنتا ہے جس کا معنٰی ہے خیال کرنا، ''رَاعِنَا'' یعنی ہمارا بھی خیال کیجئے۔ اب دیکھا جائے تو عربی کے اعتبار سے بڑا اچھا لفظ ہے، لیکن عبرانی زبان میں یہ ایک گالی ہے۔ اور یہود ہمیشہ ایسا کلام استعمال کرتے تھے جس کو سامنے والا آسانی سے سمجھ نہ سکے اور ان کو شرارت کرنے کا موقعہ مل جائے۔

اب یہود آکر ''رَاعِنَا'' کہتے تھے اور یہ عبرانی زبان میں گالی ہے اور وہ اسی مفہوم کی وجہ سے یہ لفظ بولتے تھے؛ لیکن ان کے دیکھا دیکھی مسلمانوں نے بھی ''رَاعِنَا'' کہنا شروع کر دیا۔ اب مسلمان تو عربی مفہوم کی وجہ سے کہتے تھے کہ بڑا اچھا لفظ ہے؛ لیکن یہودی تنہائی میں مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور بہت خوش ہوتے تھے کہ تمہاری گالی برابر چل رہی ہے۔ باری تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آیت نازل فرمائی: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ اے ایمان والو! جب تم حضور اکرم ﷺ کو

اپنی طرف متوجہ کرنا چاہو؛ تو "رَاعِنَا" مت کہو، بلکہ "أُنْظُرْنَا" کہو۔ حالاں کہ "أُنْظُرْنَا" کا مطلب بھی وہی ہے کہ اے اللہ کے رسول! ہماری طرف نظرِ عنایت فرمایئے۔ جو مطلب "أُنْظُرْنَا" کا ہے، وہی مطلب "رَاعِنَا" کا بھی ہے، لیکن چوں کہ یہودی "رَاعِنَا" کو غلط مطلب میں استعمال کرتے تھے اس لیے اس لفظ کے استعمال سے منع فرمادیا۔

اسی طرح یہود جب حضور ﷺ کے پاس آتے تو "السَّلَامُ عَلَيْكُمْ" (تم پر سلامتی ہو) کے بجائے "أَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" کہا کرتے تھے۔ عربی میں "سَام" موت کو کہتے ہیں، یعنی تم پر موت آئے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں معنوں میں کتنا بڑا فرق ہے۔ اگر کوئی آدمی دھیان سے نہ سنے تو اس کو پتہ ہی نہ چلے کہ "السَّلَامُ" کہا، یا "السَّامُ" کہا۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا موجود تھیں اور یہود نے آکر "أَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" کہا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جواب میں کہا: "عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ" (یعنی تم پر موت ہو اور لعنت) گویا مارے غصہ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے لعنت کا لفظ بڑھا دیا، حضورِ اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ذرا نرمی سے کام لو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمانے لگیں: یارسول اللہ! آپ نے سنا نہیں انہوں نے کیا کہا؟ حضور ﷺ نے فرمایا: میں نے جواب میں کیا کہا؛ وہ تم نے نہیں سنا؟ انہوں نے "أَلسَّامُ عَلَيْكُمْ" کہا، تو حضور ﷺ نے صرف "عَلَيْكُمْ" فرمایا، یعنی تم پر بھی وہی ہو۔ "Same To You"

باب کراھة تسمیة العنب کرماً

انگور کو کرم کا نام دینے کی ممانعت

اہلِ عرب کے یہاں سخاوت والی خوبی بہت اعلیٰ سمجھی جاتی ہے، اور ہے بھی ایسا ہی کہ سخاوت بہت ساری خوبیوں کی جڑ ہے۔ اس کے مقابلہ میں بخل ہے جس کی وجہ سے بہت سی برائیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ آدمی جب شراب پیتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے ہوش وحواس برقرار نہیں رہتے، اور شراب پینے کی وجہ سے اس کی طبیعت میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس میں وہ مال بہت خرچ کرتا ہے۔ گویا شراب اپنے نتیجے کے اعتبار سے اس کو مال کے خرچ کرنے پر آمادہ کرنے کا ذریعہ بنی۔ اور شراب بنتی ہے انگور سے، اس وجہ سے اہلِ عرب نے انگور کا نام ہی ''کَرَم'' رکھ دیا۔ کرم یعنی سخاوت۔ اور یہ عمدہ صفت ہے، اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی نام کریم بھی ہے۔ انہوں نے انگور کو یہ نام اس وجہ سے دیا کہ اس سے شراب بنتی ہے اور شراب پینے کے نتیجے میں آدمی کے ہوش وحواس باقی نہیں رہتے، اور اس کے نتیجے میں آدمی مال خوب خرچ کرتا ہے۔ تو گویا اصل اور جڑ تو انگور ہی ہوا۔ اور شراب کو اچھا بتلانے کے لیے انگور کو کرم کا نام دیا گیا۔ تو گویا اس نام کے پیچھے مقصد شراب کو رواج دینا ہوا، اور چوں کہ شراب کو شریعت نے حرام بتلایا ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے انگور کو اس نام سے یاد کرنے سے منع فرمایا۔

کرم مؤمن کا دل ہے

حدیث ۱۷۴۰:-

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسولُ اللهِ ﷺ: لاتُسَمُّوا العِنَبَ الكَرْمَ، فَإِنَّ الكَرْمَ المُسْلِمُ.

(متفق عليه، وهذا لفظ مسلم)

وفي رواية: **فَإِنَّمَا الكَرْمُ قَلْبُ المُؤمِنِ.**

وفي رواية للبخاري ومسلم: **يَقُولُونَ الكَرْمُ، إِنَّمَا الكَرْمُ قَلْبُ المُؤْمِنِ.**

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: انگور کو کَرْم مت کہو، اس لیے کہ کَرْم تو مسلمان ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ: کَرْم مؤمن کا دل ہے۔

افادات:- ایک چیز اعمال ہیں اور ایک چیز اخلاق ہیں، جیسے صدقہ کرنا ایک عمل ہے؛ لیکن آدمی کو صدقہ کرنے پر دل کا جو جذبہ اور کیفیت اُبھارتی ہے وہ سخاوت اور کرم ہے؛ یہ کیفیت "خُلق" کہلاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اعمال کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہے، اور اخلاق کا تعلق دل سے ہے۔ لیکن ہمارے عرف اور محاورہ میں کوئی آدمی لوگوں سے ہنس ہنس کر بات کرے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس کے اخلاق بہت اچھے ہیں، حالاں کہ صرف ہنس کر باتیں کرنے کا نام اخلاق نہیں ہے، بلکہ اخلاق دل کی صفات کا

نام ہے، جیسے: تواضع وانکساری، زہد یعنی دنیا سے بے رغبتی، اخلاص یعنی ہر ایک کام کو اللہ تعالیٰ کے واسطے انجام دینا، اسی طرح سے سخاوت بھی ایک اچھی صفت ہے۔ تو یہ ساری دل کی خوبیاں اور قلب کے اوصاف ہیں، جس دل میں یہ خوبیاں ہوں گی اس کے اعمال پر بھی اس کا اثر پڑے گا اور اسی کے مطابق اس سے اعمال سرزد ہوں گے۔ اسی طرح بداخلاقیاں اور برائیاں ہیں، جیسے: تکبر، بخل، دنیا کی محبت، شہوت وغیرہ صفات بھی دل کی ہیں، ان کا بھی اثر انسان کے اعمال پر پڑتا ہے کہ ان کی وجہ سے انسان کے اعمال بگڑتے ہیں۔

اس روایت میں حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کرم یعنی سخاوت تو بندۂ مؤمن کے قلب کی صفت ہے، اس لیے انگور کو کرم مت کہو۔

حدیث ۱۷۴۱ :-

وعن وائلِ بنِ حُجرٍ رضی اللہ عنہ عن النّبیِّ ﷺ قال: لاتَقُولُوا: الکَرْمُ، وَلٰکِنْ قُولُوا: العِنَبُ، والحَبَلَةُ. (رواہ مسلم)

((الحَبَلَةُ)) بفتح الحاء والباء، ویقال أیضاً بإسکان الباء.

ترجمہ:- حضرت وائل بن حجر (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: انگور کو کرم مت کہو، بلکہ عنب اور حَبَلہ کہو۔

افادات:- انگور کے لیے عربی میں ”عِنَبٌ“ اور ”حَبَلَةٌ“ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

باب النهي عن وصف محاسن المرأة لرجل إلاَّ أن يحتاج إلى ذلك لغرض شرعي كنكاحها ونحوه

کسی مرد کے سامنے کسی عورت کے اوصاف اور خوبیوں کو بغیر شرعی حاجت کے بیان کرنے کی ممانعت

اگر کوئی آدمی کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہے اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہے اور اس کے سامنے کوئی عورت اس کی خوبیاں بیان کرے کہ وہ حسین و جمیل ہے اور اس کے اندر یہ خوبیاں ہیں؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں، اس لیے کہ یہ تو ایک ضرورت کی وجہ سے ہے۔ لیکن اگر کوئی شرعی ضرورت نہیں ہے پھر بھی کسی عورت کی خوبیوں کا کسی مرد کے سامنے ذکر کیا جا رہا ہو، چاہے بیان کرنے والا مرد ہو یا عورت؛ تو اس کی اجازت نہیں۔ عام طور پر دلالی کرنے والی عورتیں دوسری عورتوں کی خوبیوں اور خوبصورتی کو اجنبی مردوں کے سامنے بیان کیا کرتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سننے والوں کے دل میں غیر اختیاری طور پر اس عورت کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، پھر اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کے طریقے سوچتا ہے اور پھر اس کی ملاقات کی تدبیریں کرتا ہے، اور پھر یہی چیز آگے جا کر گناہ میں مبتلا ہونے کا ذریعہ بنتی ہے۔ آج کل یہ شکلیں بہت زیادہ ہو گئی ہیں، حالاں کہ اس سے شریعت نے منع کیا ہے۔ اور کسی عورت کے سامنے کسی مرد کے حالات بیان کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔

یہ حرکت حرام کاری تک پہنچادیتی ہے

حدیث ۱۷۴۲ :-

عن ابن مسعودٍ - رضی اللہ عنہ - قال قال رسول اللہ ﷺ : ((لَاتُبَاشِرِ الْمَرْأَةُ الْمَرْأَةَ فَتَصِفَهَا لِزَوْجِهَا كَأَنَّهُ يَنْظُرُ إِلَيْهَا)). (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کوئی عورت کسی عورت کو اس نیت سے نہ دیکھے، یا اس کے جسم کو اس لیے نہ چھوئے کہ پھر اپنے شوہر کے سامنے اس کے حالات اس انداز سے بیان کرے کہ گویا وہ اس عورت کو دیکھ رہا ہے

افادات:- کسی عورت کا جسم چھو کر اپنے شوہر کو بتانا کہ اس کا جسم تو بڑا گداز اور نرم و نازک ہے، اور فلاں کا چہرہ تو بڑا حسین ہے، آنکھیں ایسی ہیں؛ تو یہ ممنوع ہے۔ اگر بیوی ہی اپنے شوہر کے سامنے کسی اجنبیہ کی خوبیاں اس طرح بیان کرے کہ گویا پورا نقشہ ہی کھینچ کر شوہر کے سامنے رکھ دے تو اس سے منع فرمایا ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ اس کی وجہ سے کبھی ایسی نوبت آجاتی ہے کہ اس عورت کی محبت شوہر کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے، پھر اگر وہ بے نکاحی عورت ہے تو اس کو نکاح کا پیغام دے کر اس سے نکاح کرلے گا اور اس پہلی بیوی کو چلتا کر دے گا۔ گویا اس نے خود ہی اپنے پاؤں پر کلہاڑا مارا۔ یہ تو ممانعت کی ایک وجہ ہوئی۔ لیکن اگر ایسی نوبت نہ آئے تب بھی ہر حال میں کسی اجنبی مرد کی خوبیوں

کو کسی اجنبی عورت کے سامنے اور اجنبی عورت کی خوبیوں کو کسی اجنبی مرد کے سامنے بیان کرنے کی شریعت اجازت نہیں دیتی، اس لیے کہ یہی چیزیں آگے جاکر حرامکاری تک پہنچادیتی ہے۔

باب کراهة قول الإنسان: اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي إِنْ شِئْتَ، بل يجزم بالطلب

دعا کو مشیتِ الٰہی کے ساتھ مقید نہ کرے بلکہ پختگی سے مانگے

مختلف آداب کا سلسلہ پچھلی کئی مجالس سے جاری ہے۔، آج دعا کے سلسلہ میں باب قائم کیا ہے کہ آدمی جب اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ رہا ہو، چاہے اپنی مغفرت کا سوال ہو، یا اور کسی چیز کی دعا مانگ رہا ہو، تو ایسا صیغہ استعمال کرنا جس میں بظاہر اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی درخواست کو پختگی کے ساتھ پیش نہیں کیا جارہا ہے، جیسے یوں کہے کہ: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے معاف کر دے؛ اس طرح سے دعا مانگنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ دعا تو پختگی اور قوت کے ساتھ مانگنی چاہیے کہ: اے اللہ! میری مغفرت کر دے، مجھ پر رحم کر دے، مجھے روزی عطا فرما دے۔ ایسا نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے روزی دے۔

حدیث ۱۷۴۳:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه أنّ رسول الله ﷺ قال: لَا يَقُولَنَّ أَحَدُكُمْ: اللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِي إِنْ شِئْتَ: اللّٰهُمَّ ارْحَمْنِي إِنْ شِئْتَ، لِيَعْزِمِ الْمَسْأَلَةَ، فَإِنَّهُ لَا مُكْرِهَ لَهُ. (متفق عليه)

وفی رواية لمسلم: وَلٰكِنْ لِيَعْزِمْ وَلْيُعَظِّمِ الرَّغْبَةَ فَإِنَّ اللهَ تَعَالَى لَا يَتَعَاظَمُهُ شَيْءٌ أَعْطَاهُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی دعامیں ایسا نہ کہے کہ: اے اللہ! تو اگر چاہے تو مجھے معاف کردے، اے اللہ! تو اگر چاہے تو مجھ پر رحم فرمادے (دوسری روایت میں ہے: ''أَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ إِنْ شِئْتَ'' اے اللہ! تو اگر چاہے تو مجھے روزی دے) بلکہ سوال پختگی اور قوت کے ساتھ کرے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر جبر وزبردستی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے: لیکن پختگی سے مانگے، اور خوب شوق ورغبت ظاہر کرے، کیوں کہ اس کی مطلوبہ چیز اگر اللہ تعالیٰ اسے دیدیں گے تو اس کی وجہ سے (نعوذباللہ) اللہ تعالیٰ پر کوئی بوجھ نہیں پڑے گا، (یا اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں کوئی کمی نہیں آجائے گی۔)

افادات:- اس لیے کہ عام طور جب کسی سے اس انداز سے کوئی سوال ومطالبہ کیا جاتا ہے تو وہاں سامنے والے کو یہ جتلانا مقصود ہوتا ہے کہ تمہیں جو بات کہی جارہی ہے اس میں تمہیں اختیار دیا جارہا ہے، تم چاہو تو کرو، نہ چاہو تو نہ کرو۔ اور عام طور پر آدمی ایسے الفاظ اس وقت استعمال کرتا ہے جبکہ سامنے ایسی شخصیت ہو جس کے متعلق اس کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کو کہنے کے نتیجہ میں وہ میری بات کا بوجھ لے لے گا، اور یہ اپنی بات یا مطالبہ سے اس پر بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ گویا اس طرح کے الفاظ استعمال کرکے سامنے والے کو یہ بتایا جارہا ہے کہ ہم تم سے جو مطالبہ کررہے ہیں اس کو پورا کرنے کے سلسلہ میں ہماری طرف سے تم پر کوئی جبر وزبردستی نہیں ہے، آپ کو اختیار ہے اگر آپ چاہیں تو ہمارے اس مطالبہ کو پورا کیجیے، ورنہ نہیں۔ جیسے باپ نے بیٹے سے کہا کہ کل بمبئی میں فلاں کام ہے، اگر

چاہو تو چلے جاؤ۔ گویا باپ اس طرح کے الفاظ کہہ کر بیٹے کو یہ بتلانا چاہتا ہے کہ اس سلسلہ میں تمہیں اختیار ہے، میری طرف سے تم پر کوئی جبر وزبردستی نہیں ہے۔ گویا سامنے والے کو اپنے کسی معاملہ میں آزاد رکھنے کے لیے اس طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس روایت میں حضور اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ بندہ جب اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ: اے اللہ! اگر آپ چاہیں تو میری مغفرت کر دیجیے، بلکہ پوری قوت کے ساتھ یوں کہے کہ: اے اللہ! میری مغفرت کر ہی دیجیے۔

اب یہ ہے کہ ”إِنْ شِئْتَ “ کے ذریعہ سے چاہنے والا لفظ جو استعمال کیا جاتا تھا اس کا مقصد سامنے والے کو اختیار دینا اور یہ جتلانا ہوتا تھا کہ ہماری طرف سے آپ پر کوئی جبر نہیں ہے۔ اب اگر ہم کتنی ہی قوت کے ساتھ کیوں نہ کہیں، اللہ تعالیٰ پر تو ہمارا کوئی جبر ہے ہی نہیں۔ اسی کو فرماتے ہیں: ”فَإِنَّهُ لَا مُكْرِهَ لَهُ“ کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جبر وزبردستی کرنے والا نہیں ہے، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو ہی دیں گے۔ اس لیے آپ یہ نہ سوچیے کہ اگر میں یوں کہوں گا کہ: اے اللہ! میرے گناہوں کو معاف کر دیجیے، تو اس کی وجہ سے نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی ہو جائے گی۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ دعا میں اپنا مطالبہ پوری قوت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کرے۔ حدیث پاک میں اس کی ایک وجہ یہی بتائی گئی۔

اس طرح سے دعا نہ مانگنے کی ایک اور وجہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اس طرح مطالبہ کرنے میں گویا ایک طرح کی بے رغبتی پائی جاتی ہے۔ مثلاً: آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے، اورآپ کسی سے اس کا مطالبہ کرتے ہیں کہ اگر آپ چاہیں تو مجھے یہ چیز دیدیجئے۔ تو یہ کہہ کر آپ سامنے والے کو یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ ہم نے جو چیز مانگی ہے وہ اگر ہمیں مل جائے تو اچھا ہے، اور اگر نہ بھی ملے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس انداز سے مطالبہ کرنا نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی شان میں ایک طرح کی گستاخی ہے؛ اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔

حدیث ۱۷۴۴ :-

وعن أنس رضی الله عنه قال قال رسولُ اللهِ ﷺ: ((إذا دَعَا أحدُكُمْ فَلْيَعْزِمِ المَسْأَلَةَ، وَلاَ يَقُولَنَّ: اللّٰهُمَّ إنْ شِئْتَ، فَأَعْطِنِي، فَإنَّهُ لاَ مُسْتَكْرِهَ لَهُ)). (متفق علیه)

یہ روایت حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے، اس کا بھی مفہوم وہی ہے جو حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) والی روایت کا تھا، الفاظ کا ذرا سا فرق ہے۔

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی جب دعا کرے تو پختگی اور قوت کے ساتھ سوال کرے۔ یہ نہ کہے کہ: اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے یہ چیز دیدے (اور آپ یہ نہ سوچئے کہ اگر مَیں قوت سے مانگوں گا تو زبردستی ہو جائے گی) اس لیے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی جبر کرنے والا نہیں ہے۔

باب کراھة قول: مَاشَآءَ اللهُ وشَآءَ فُلَانٌ

"اللہ تعالیٰ نے چاہا اور فلاں نے بھی چاہا" کہنا ناپسندیدہ ہے

اللہ تعالیٰ کی شان میں جن آداب کی رعایت کرنا بندوں کے لیے ضروری ہے، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کسی معاملہ میں آدمی جب اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کو ظاہر کر رہا ہو، اور ساتھ ہی بندوں کی مشیت اور ارادے کو بھی بولا جارہا ہے، تو ان دونوں ارادوں کو ظاہر کرنے کے لیے ایسا انداز اختیار نہ کیا جائے جس سے نعوذ باللہ دونوں کی برابری کا شبہ پیدا ہوتا ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کو ظاہر کرنے کے بعد بندے کا ارادہ ظاہر کرنے سے پہلے درمیان میں ایسا لفظ لایا جائے جس سے سننے والوں کے سامنے دونوں کا فرق نمایاں ہوتا ہو۔ یہ بھی آدابِ الوہیت میں سے ہے۔

حدیث ۱۷۴۵ :-

عَنْ حُذَيْفَةَ بْنِ الْيَمَانِ رضی اللہ عنہ **عَنِ النَّبِيِّ** ﷺ **قَالَ: لَاتَقُوْلُوْا: مَاشَآءَ اللهُ وَشَآءَ فُلَانٌ، وَلٰكِنْ قُوْلُوْا: مَاشَآءَ اللهُ، ثُمَّ شَآءَ فُلَانٌ.** (رواه أبو داود بإسناد صحيح)

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسا مت کہو کہ: اللہ تعالیٰ نے چاہا اور فلاں نے چاہا، بلکہ یوں کہو: اللہ تعالیٰ نے چاہا، اس کے بعد فلاں نے چاہا۔

افادات:۔ مثلاً: کوئی یوں کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا اور آپ نے چاہا تو میرا کام بن جائے گا، تو اس جملہ میں لفظ ''اور'' استعمال کیا گیا ہے۔ اس میں لفظ ''اور'' سے پہلے، اور لفظ ''اور'' کے بعد جو بات کہی گئی ہے ان دونوں کی برابری ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی و عظمت کا جو ادب ادا کرنا چاہیے، اس میں کوتاہی ہو رہی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا اور اس کی مدد شاملِ حال ہوئی، اور اس کے بعد آپ کی توجہ ہوگی؛ تو ہمارا کام ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ بندے کے عمل کی حیثیت اس کے مطابق ہونی چاہیے۔ کسی بھی کام میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندے کا ذکر اس طرح کرنا جس میں بظاہر دونوں کی برابری لازم آتی ہو؛ یہ بہت غلط طریقہ ہے، اس لیے نبی کریم ﷺ نے یہ ادب بھی ہمیں سکھایا۔

باب کراهة الحديث بعد العشاء الآخرة

عشاء کی نماز کے بعد بات چیت کی ممانعت

والمُرادُ بِهِ الحَدِيثُ الذى يَكُونُ مُباحاً فى غَيرِ هذا الوَقْتِ، وَفِعْلُهُ وَتَرْكُهُ سواءٌ. فَأَمَّا الحَدِيثُ المُحَرَّمُ أو المَكرُوهُ فى غير هذا الوقتِ، فَهُوَ فى هذا الوقت أَشَدُّ تحريماً وَكَرَاهَةً. وأَمَّا الحَدِيثُ فى الخَيرِ كَمُذَاكَرَةِ العِلْمِ وَحِكَايَاتِ الصَّالِحِينَ، وَمَكَارِمِ الأَخْلاَقِ، والحَدِيث مع الضَّيفِ، ومع طالبِ حَاجَةٍ، ونحو ذٰلك، فلا كَرَاهَة فيه، بل هُوَ مُسْتَحَبٌّ، وكَذَا الحَدِيثُ لِعُذْرٍ وعَارِضٍ لا كَراهَةَ فِيه. وقد تظاهَرَتِ الأحَادِيثُ الصَّحيحةُ على كُلِّ ما ذَكَرْتُهُ.

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) خود بھی اس باب کی کچھ تشریح فرماتے ہیں:-

پہلی بات تو یہ واضح کردینا چاہتے ہیں کہ عشاء کی نماز کے بعد بات چیت کرنے کی جو ممانعت ہے وہ اُس بات چیت کے متعلق ہے جو دیگر اوقات میں فی نفسہٖ جائز ہے؛ لیکن جو باتیں دیگر اوقات میں بھی گناہ اور ممنوع ہیں ان کو عشاء کے بعد اگر کیا جائے گا تو اس کا گناہ اور زیادہ بڑھ جائے گا، اس لیے کہ عشاء کے بعد ان باتوں سے بھی منع کیا گیا ہے جو جائز کی حد میں آتی ہیں؛ تو پھر جو اپنے آپ کو ناجائز باتوں

میں مشغول کرے گا اس کے لیے تو اور زیادہ شناعت وقباحت ہوگی، جیسے: عشاء کے بعد ٹی وی کے سامنے ڈرامہ اور فلم دیکھنے بیٹھ گیا، یا غیبت کی مجلسیں لگائیں۔

بعض باتیں جائز بھی ہیں

البتہ عشاء کے بعد نیکی کی باتوں میں لگنا، جیسے ہمارا یہ سلسلہ (۱) عشاء کے بعد ہی جاری ہے، اسی طرح علمی باتیں اور مذاکرات، نیک لوگوں کے واقعات سننا سنانا، اچھے اخلاق کی تعلیم اور ان کو بیان کرنا، جواز کی حد میں رہتے ہوئے مہمان کے اکرام میں اس سے بات چیت کرنے بیٹھنا، کوئی ضرورت مند عشاء کے بعد آگیا تو اس سے بات چیت کرنا؛ ان جیسی صورتوں میں بات چیت کرنے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ مستحب ہے، اسی طرح کسی عذر اور ضرورت کے حالات کی وجہ سے بات چیت کرنے میں بھی کوئی ممانعت نہیں ہے، جیسے: پڑوسی نے آواز لگائی اور آپ پہنچ گئے اور اس سے بات چیت میں مشغول ہوئے کہ بھائی! کیا بات ہے؟ کیوں آواز لگائی؟ میری کسی مدد کی ضرورت ہے؟ عشاء کی نماز کے بعد بات چیت کے جواز کی جتنی بھی صورتیں یہاں بتائی گئی ہیں ان سب کے سلسلہ میں احادیث موجود ہیں جن سے ان کا درست ہونا ثابت ہوتا ہے۔

(۱) ہر شبِ یکشنبہ کو بعد نمازِ عشاء، مسجدِ انوار، نشاط سوسائٹی، اڈاجن پاٹیا، سورت میں حضرت اقدس مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری دامت برکاتہم ومدت فیوضہم کا عمومی درسِ حدیث کا مقبول سلسلہ جو یکم جمادیٰ الاولیٰ ۱۴۱۷ھ مطابق ۱۴ر ستمبر ۱۹۹۶ء سے تاحال جاری ہے۔ مرتب

عشاء سے پہلے سونا اور عشاء کے بعد بات چیت کرنا ناپسندیدہ ہے

حدیث ۱۷۴۶ :-

عن أبي بَرْزَةَ رضی الله عنه: أنَّ رسولَ الله ﷺ كان يكرهُ النَّومَ قبلَ العِشَاءِ والحَديثَ بَعْدَهَا. (متفقٌ عليه)

ترجمہ:- حضرت اَبوبرزہ اَسلمی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی ٔکریم ﷺ عشاء کی نماز سے پہلے سونے کو اور عشاء کی نماز کے بعد بات چیت کرنے کو ناپسند سمجھتے تھے۔

افادات:- عشاء سے پہلے اگر کوئی سو گیا تو اندیشہ ہے آنکھ لگی رہ جائے اور صبح صادق تک سو رہا تو عشاء کی نماز ہی قضا ہو جائے گی، یا اگر درمیان میں آنکھ کھل بھی گئی تو جماعت تو فوت ہو ہی گئی، اس لیے منع کیا گیا ہے۔ البتہ اگر آپ کو وثوق ہے یا آپ نے کوئی ایسا انتظام کر رکھا ہے جس کے نتیجے میں آپ کو جماعت کے فوت ہونے کا یا نماز کے قضا ہونے کا اندیشہ نہیں ہے، جیسے: کسی کو مقرر کر دیا ہے کہ میں تھکا ہوا ہوں اس لیے ابھی سو جاتا ہوں، ۹-۰۰ بجے کی نماز ہے، لہٰذا مجھے ۸-۳۰ بجے اُٹھا دینا؛ تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں۔

عشاء کے بعد باتیں کرنے سے ممانعت کی وجہ

اور عشاء کے بعد بات کرنے سے جو منع فرمایا وہ اس لیے کہ آدمی اگر عشاء کے بعد فوراً نہیں سوئے گا بلکہ باتوں میں مشغول ہو گا، تو سونے کی یہ تاخیر اُٹھنے میں تاخیر کا باعث بنے گا، جس کے نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ تہجد سے محرومی ہو گی، یا فجر کی جماعت چلی جائے، یا بالکل قضاء ہی ہو جائے۔ بہت سے لوگ رات کو ایک دو بجے تک گپ شپ کرتے رہتے ہیں، ٹی وی دیکھتے رہتے ہیں، واہیات باتوں میں لگے رہتے ہیں؛ یہ بالکل ممنوع ہے۔

راتوں کے جلسوں میں غلو

ہمارے اکابر میں حضرت مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی (رحمۃ اللہ علیہ) گزرے ہیں، ان کے متعلق سنا کہ جب کوئی جلسہ رات دیر تک لمبا چلتا تو اس کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ: جو لوگ نماز کے پابند ہیں وہ کسی حال میں نماز نہیں چھوڑتے، لہٰذا فجر کی نماز تو اگرچہ جماعت کے ساتھ پڑھتے ہیں لیکن رات ایک دو بجے تک ہونے والے اس جلسہ کی وجہ سے نیند کم ہوتی ہے، اس کی وجہ سے طبیعت پر اثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے نماز میں جو نشاط وچستی اور توجہ مطلوب ہے وہ حاصل نہیں ہوتی، اور فجر کی نماز سستی و بے رغبتی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے؛ اس لیے ایسا جلسہ بھی درست نہیں ہے۔ آج کل دینی جلسوں کے معاملہ میں ہم نے یہی غلو اختیار کر رکھا ہے؛ تو پھر دوسری چیزوں کی تو کہاں اجازت دی جائے گی؟

نبی کریم ﷺ کی ایک پیشین گوئی

حدیث ۱۷۴۷:-

عن ابن عمر رضی الله عنهما أنَّ رسولَ اللهِ ﷺ صَلَّى العِشَاءَ فی آخِرِ حَيَاتِهِ، فَلَمَّا سَلَّمَ قال: أرأَيْتَكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهِ؟ فَإنَّ عَلَى رَأسِ مِائَةِ سَنَةٍ لايَبْقَى مِمَّنْ هُوَ عَلَى ظَهْرِ الأرْضِ اليَوْمَ أحَدٌ. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک روز عشاء کی نماز پڑھائی، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے (حضراتِ صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے) ارشاد فرمایا: بتلاؤ! تمہاری آج کی اس رات میں روئے زمین پر جو لوگ موجود ہیں؛ آج سے سو سال بعد ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔

افادات:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں تصریح موجود ہے کہ یہ واقعہ آپ ﷺ کی وفات سے ایک ماہ پہلے کا ہے۔

اس سے انسان مراد ہیں، فرشتے اور جنات مراد نہیں، چناں چہ ہوا بھی ایسا ہی۔ حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کی ایک روایت میں ہے، بعض لوگوں کو اس روایت کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی اور وہ یہ سمجھے کہ سو سال کے بعد ساری دنیا ختم ہو جائے گی اور قیامت آجائے گی، حالاں کہ اس کا مطلب ایسا نہیں ہے، بلکہ حضورِ اکرم ﷺ کے اس ارشاد کا حاصل تو یہ تھا کہ اس وقت انسانوں کی جو نسل زندہ تھی

ان میں کا کوئی بھی باقی نہیں بچے گا۔ چنانچہ صحابہ میں سب سے اخیر میں وفات پانے والے حضرت ابوالطفیل بن عامر (رضی اللہ عنہ) ہیں جن کی وفات کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں، سب سے آخری قول جو کہا گیا ہے وہ ۱۱۰ھ کا ہے، اور نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے یہ بات ۱۰ھ میں ارشاد فرمائی تھی۔ گویا یہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ایک پیشین گوئی تھی جو وقوع پذیر ہوئی۔

اس روایت کو یہاں لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ عشاء کی نماز کے بعد نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک بات ارشاد فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جو عشاء کی نماز کے بعد بھی کی جاسکتی ہیں۔

آدھی رات کی تقریر

حدیث ۱۷۴۸:-

وعن أنس -رضی اللہ عنہ-: أنّھم انتظروا النّبیّ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فَجاءھُمْ قریباً مِنْ شَطْرِ اللَّیْلِ فَصَلَّی بِھِمْ - یَعْنِی: العِشَاءَ - ثُمَّ خَطَبنا فقالَ: ((ألاَ إنَّ النَّاسَ قَدْ صَلُّوا، ثُمَّ رَقَدُوا، وَإنَّکُمْ لَنْ تَزَالُوا فِي صَلاَةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلاَةَ)) (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ نے مسجدِ نبوی کے اندر عشاء کی نماز کے لیے نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا انتظار کیا (لیکن بہت دیر ہوگئی۔ بعض روایتوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ صحابہ بیٹھے بیٹھے سو گئے، پھر اٹھے، پھر سو گئے، دو تین مرتبہ ایسا ہوا) آپ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم آدھی رات

کے قریب تشریف لائے اور عشاء کی نماز پڑھائی، اس کے بعد آپ نے تقریر فرمائی جس میں ارشاد فرمایا: (تم لوگ یہاں مسجدِ نبوی میں میرے انتظار میں بیٹھے رہے؛ لیکن) دنیا کی دوسری مسجدوں میں لوگوں نے اول وقت ہی میں عشاء کی نماز پڑھ لی اور سوگئے (ان کی تو آدھی نیند بھی ہوگئی، لیکن تم لوگ یہ مت سمجھنا کہ اتنی دیر تک تم لوگوں نے میرا انتظار کیا تو تمہارا وقت ضائع اور برباد ہوا، بلکہ) نماز کے انتظار میں جتنی دیر تک تم لوگ بیٹھے رہے؛ نماز ہی کے حکم میں رہے۔

افادات:- اس زمانے میں گھڑی گھنٹے تو تھے نہیں، اس لیے نماز کے اوقات بھی متعین نہیں تھے، حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ اپنے اپنے اندازے سے مسجد میں آجاتے تھے اور جب نبی کریم ﷺ اپنے حجرۂ شریفہ سے باہر تشریف لاتے تھے تو آپ کو آتا ہوا دیکھ کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ اقامت شروع فرمادیا کرتے تھے اور نماز کھڑی ہوجاتی تھی۔

موضوعِ بحث نہیں بناناچاہیے

آج کل کے ہمارے مصلیوں کو تو یہ بات سمجھ میں ہی نہیں آئے گی، اس لیے اگر امام صاحب دو تین منٹ لیٹ ہوجائیں تو پتہ نہیں ان پر کیا کیا تبصرے شروع ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ اوقات کی تعیین کی وجہ سے ان کو بھی پابندی تو کرنی ہی چاہیے، لیکن کبھی کسی وجہ سے معمولی تاخیر ہوجائے -اور ظاہر ہے کہ امام صاحب جان بوجھ کر تو تاخیر کریں گے نہیں- تو اس کو موضوعِ بحث نہیں بناناچاہیے۔

روایت کے اسباق

(۱) ”تم نماز ہی کے حکم میں رہے“ یعنی نماز شروع کر دی ہوتی اور اتنی دیر تک نماز پڑھتے رہتے اوراس پر تمہیں جو ثواب واجر ملتا وہی ثواب واجر اتنی دیر انتظار کرنے پر بھی ملے گا۔ گویا نماز کے انتظار میں تمہاری یہ جو گھڑیاں گزری ہیں ان کو اپنے حق میں بے کار مت سمجھنا۔ اسی سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ آدمی جتنی دیر نماز کے انتظار میں ہوتا ہے اتنی دیر نماز ہی کے حکم میں ہوتا ہے۔ آپ ﷺ اپنے اس ارشاد کے ذریعہ سے حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہ کو دیر تک انتظار کی وجہ سے جو مشقت لاحق ہوئی اس کی تلافی فرما رہے ہیں۔

(۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی بڑے کی وجہ سے ماتحتوں کو کوئی زحمت برداشت کرنی پڑے تو اگرچہ ان کی طرف سے کوئی اعتراض تو ہوتا نہیں، وہ برضا و رغبت اس چیز کو برداشت کر لیتے ہیں، لیکن بڑے کی طرف سے بھی اس کی تلافی کی کوئی شکل ہونی چاہیے تاکہ ان کا جی خوش رہے۔ یہاں پر بھی نبی کریم ﷺ نے دیکھا تو محسوس فرمایا کہ ان حضرات نے دیر تک انتظار کیا جس کی وجہ سے ان کو جو مشقت لاحق ہوئی، لہٰذا اس کی تلافی فرمائی۔

(۳) یہاں تو اس روایت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے عشاء کی نماز کے بعد گفتگو فرمائی۔ معلوم ہوا کہ بوقتِ ضرورت گفتگو کرنے کی اجازت ہے۔

باب تحریم امتناع المرأۃ من فراش زوجھا إِذَا دعاھا ولم یکن لَھَا عذر شرعی

جب شوہر کی طرف سے بیوی سے بستر پر آنے کا مطالبہ ہو، تو اس کے لیے کسی عذرِ شرعی کے بغیر انکار کرنا حرام ہے

ایک تو یہ ہے کہ اس کو عذرِ شرعی لاحق ہو، مثلاً: وہ حالتِ حیض میں ہے تو اس کے ساتھ صحبت کرنا جائز نہیں۔ یا ایسی سخت بیماری میں ہے کہ اس کے لیے اس حالت میں جماع و صحبت قابلِ برداشت نہیں۔ یا دن میں مطالبہ کیا اور رمضان کا فرض روزہ ہے (نفل روزے کا حکم یہ نہیں ہے، وہ آگے آرہا ہے) اس لیے اس نے انکار کیا؛ تب تو اس پر وہ وعید لاگو نہیں پڑے گی جو آگے آرہی ہے۔ لیکن اگر بغیر کسی شرعی عذر کے انکار کیا، جیسا کہ آج کل ایک فیشن بن گیا ہے؛ تو اس پر سخت وعید ارشاد فرمائی گئی ہے۔ بیرون ممالک کے بہت سے لوگ شکایت کرتے ہیں، اور معلوم ہوا ہے کہ وہاں عورتوں کو اس طرح کی ترغیب دی جاتی ہے کہ شوہر کی طرف سے صحبت کا مطالبہ ہو تو اپنی فوقیت ثابت کرنے کے لیے انکار کرکے شوہر کو پریشان کرو؛ تاکہ اس کو بھی تمہارے رتبہ کا پتہ چلے۔ شیاطین نئی نئی

چیزیں سکھلاتے رہتے ہیں، حالاں کہ شریعتِ مطہرہ نے جو بھی آداب بتلائے ہیں وہ شیاطین کی چالوں کے توڑ کے لیے ہی ہیں۔

فرشتے صبح تک لعنت کرتے ہیں

حدیث ۱۷۴۹ :-

عن أبي هريرة رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ :((إِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهُ إِلَى فِرَاشِهِ فَأَبَتْ، فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا، لَعَنَتْهَا المَلَائِكَةُ حَتَّى تُصْبِحَ))(متفق عَلَيْهِ) وفى رواية:((حَتَّى تَرْجِعَ)).

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب مرد نے اپنی بیوی کو اپنے بستر کی طرف (صحبت کے لیے) بلایا تو اس نے انکار کیا اور اس پر شوہر نے اس سے ناراض ہو کر رات گزاری، تو فرشتے اس عورت کے اوپر صبح تک لعنت (یعنی اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بد دعا) کرتے رہتے ہیں۔

اور ایک روایت میں یہ ہے کہ: فرشتے اس عورت کے اوپر لعنت (یعنی اللہ کی رحمت سے دور ہونے کی بد دعا) کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ عورت اپنی اس حرکت سے باز آجائے

افادات:- روایت میں صبح کا تذکرہ اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ عام طور پر شوہر کی طرف سے ایسے مطالبے رات ہی میں ہوا کرتے ہیں۔ باقی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر شوہر کی طرف سے دن میں مطالبہ ہو تو انکار کیا جاسکتا ہے۔ دن کا بھی یہی حکم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ شوہر کے اس مطالبے پر عورت کا

انکار اس کو فرشتوں کی بددعا کا حقدار بنادیتا ہے۔ اور صبح تک بددعا کرنے کا تذکرہ اس لیے کیا کہ عام طور پر شوہر کی ناراضگی صبح تک رہتی ہے۔

نکاح کا فلسفہ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت نے اتنی زیادہ تاکید کیوں فرمائی؟ دراصل بات یہ ہے کہ شریعت یہ چاہتی ہے کہ عفت و عصمت کا جو نظام بنایا ہے وہ برابر باقی رہے یعنی نکاح کا حکم عصمت وعفت کی حفاظت اور پاک دامنی کے لیے دیا گیا ہے، اور مرد جب کسی عورت کو نکاح میں لاتا ہے وہ اسی لیے کہ اس سے اپنی جنسی ضرورت پوری کر کے اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرے، اور اس سے اس عورت کی عفت و عصمت کی بھی حفاظت ہو گی۔ اور شرّاح نے لکھا ہے کہ مرد کی طبیعت میں جب صحبت کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے تو بڑی قوت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، جب مرد کی طبیعت میں عورت کے ساتھ صحبت کرنے کا تقاضہ پیدا ہوا اور بیوی کی طرف سے اگر انکار کر دیا جائے تو پھر وہ دوسری راہیں سوچنے لگتا ہے، گویا بیوی کا یہی انکار مرد کو گناہ کے راستوں تک لے جانے کا ذریعہ بنتا ہے، اور ظاہر ہے کہ نکاح تو اسی لیے کیا گیا تھا کہ زنا سے حفاظت ہو، اور یہاں انکار کی وجہ سے نکاح کے باوجود زنا کی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں؛ تو پھر شریعت کسی عورت کو انکار کرنے کی کیسے اجازت دے سکتی ہے؟ اس لیے عورت کو انکار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

روٹی جل جائے تو جلنے دو

بعض روایتوں میں تو یہاں تک آتا ہے کہ عورت اگر چولہے پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی ہو، اور شوہر کی طرف سے مطالبہ ہو، تو اس کو چاہیے کہ پہلے شوہر کا مطالبہ پورا کرے۔(سنن ترمذی،باب مَا جَاءَ فِي حَقِّ الزَّوْجِ عَلَى الْمَرْأَةِ) اس لیے کہ یہاں بہت سے بہت تو ایک روٹی خراب ہو گی؛ لیکن اس کے انکار کی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شوہر دوسری سوچ پر چلنا شروع کر دیتا ہے، اور اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے اس عورت کے لیے نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں ، اور پھر وہ اس کو طلاق دینے کی سوچتا ہے، اور ازدواجی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس لیے شریعت یہ چاہتی ہے کہ ایک روٹی خطرے میں پڑتی ہے تو پڑتی رہے؛ لیکن اس ذرا سی بات کی وجہ سے ازدواجی زندگی خطرے میں نہیں پڑنی چاہیے۔ اس لیے کہ کسی عورت کے ساتھ نکاح کرنے کا مقصدِ اعظم (بنیادی مقصد) یہی ہے، اس کے علاوہ دوسری جتنی چیزیں ہیں وہ اس کے تابع ہیں؛ اس لیے اس میں کسی طرح کی کمی کوتاہی نہیں آنی چاہیے۔

میاں بیوی کو تاکید

اسی لیے عورت کو یہ حکم بھی دیا گیا کہ وہ شوہر کے لیے زیب وزینت کا اہتمام کرے، اور کسی بھی اجنبی کے سامنے زیب وزینت کرنے کو حرام قرار دیا گیا۔ آج کل تو معاملہ ایسا برعکس ہو گیا ہے کہ بے چارہ شوہر کما کر اس کے لیے بہترین لباس وزیورات لاتا ہے لیکن وہ سارے لباس وزیورات

گویا دوسروں کے لیے ہوگئے ہیں، گھر میں تو وہ بھوتنی ہی بنی رہتی ہے۔ یعنی جس نے زیب وزینت کے اسباب کے لیے پیسے خرچ کئے ہیں وہ تو اس کے جلووں سے محروم رہتا ہے، دوسرے لوگ اس کے جلوے دیکھتے رہتے ہیں؛ یہ بالکل غلط طریقہ ہے، شریعت کسی حال میں بھی اس کی اجازت نہیں دیتی۔ اسی لیے حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر اجنبیوں کے پاس سے گذری، وہ ایسی ہے، ایسی ہے (یعنی زانیہ ہے) نبی کریم ﷺ نے اس کو زانیہ سے تشبیہ دی۔

آج کل عورتوں کا ایک عام مزاج بنتا جا رہا ہے کہ جہاں زیب وزینت کا اہتمام کیا جانا چاہیے تھا وہاں نہیں کیا جاتا، اور جب گھر سے باہر جانے کے وقت آتا ہے تو اس کا بڑا اہتمام کرتی ہیں۔ گویا زیب و زینت کا محل ہی بدل دیا۔

شریعت نے تو اس کا اتنا زیادہ اہتمام کروایا کہ شوہر اگر سفر میں گیا ہو اور واپسی ہو رہی ہے تو اچانک گھر پہنچنے سے نبیٔ کریم ﷺ نے منع فرمایا، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ شوہر کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے عورت نے زیب وزینت کا کوئی اہتمام نہ کیا ہو، اور اس وقت وہ میلے کچیلے لباس میں ہو، اگر شوہر اچانک گھر پر پہنچ گیا اور اس کو ایسے میلے کچلے لباس میں دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے کہ شوہر کے دل میں اس کے لیے نفرت پیدا ہو جائے اور یہی نفرت آگے جا کر ازدواجی زندگی کے لیے خطرہ بن جائے۔

گویا یہ ساری تاکیدات اس وجہ سے کی گئی ہیں کہ ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرتیں باقی رہیں، اور آج کل ہمارے سماج میں قصداً ایسی صورتیں اختیار کی جاتی ہیں جن سے ازدواجی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

باب تحريم صوم المرأة تطوعاً وزوجها حاضر إلاَّ بإذنه

شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر عورت کے لیے نفل روزہ کی ممانعت

دیکھئے! شریعت کی طرف سے شوہر کے حقوق کا کتنا زیادہ اہتمام کروایا جارہا ہے کہ شوہر گھر پر موجود ہے، کہیں سفر میں نہیں گیا ہے، تو شوہر کی اجازت کے بغیر عورت کے لیے نفل روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ شوہر کا حق ادا کرنا واجب اور ضروری ہے، اور نفل روزہ بہر حال نفل اور مستحب کا درجہ رکھتا ہے، اور واجب کو نفل کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے۔

شوہر کے حقوق کی بے مثال تعلیمات

حدیث ۱۷۵۰:-

وعن أبي هريرة -رضي الله عنه-: أَنَّ رسُولَ الله -صلى الله عليه وسلم- قَالَ: لَا يَحِلُّ لِلْمَرْأَةِ أَنْ تَصُومَ وَزَوْجُهَا شَاهِدٌ إِلاَّ بِإِذْنِهِ، وَلاَ تَأْذَنَ فِي بَيْتِهِ إِلاَّ بِإِذْنِهِ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس عورت کا شوہر گھر پر موجود ہو تو اس کی اجازت کے بغیر بیوی کے لیے روزہ رکھنا جائز نہیں ہے، اور شوہر کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر میں کسی کو بھی آنے کی اجازت نہ دے۔

افادات:- نفل روزہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے شوہر کی اجازت لے لے۔ یا اگر اس نے ایک عادت بنا رکھی ہے (مثلاً: بیوی ہر پیر و جمعرات کو روزہ رکھتی ہے) اور شوہر کو معلوم ہے اور اس نے اس کی منظوری بھی دے رکھی ہے، تو پھر الگ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، اس معمول کی منظوری ہی اس دن کی اجازت کے قائم مقام ہو جائے گی۔

اور شوہر کی اجازت کے بغیر شوہر کے گھر میں کسی کو بھی آنے نہ دے، چاہے اس کا کوئی عزیز، رشتہ دار اور محارم میں سے ہی کیوں نہ ہو، جیسے: بیوی کا بھائی (سالا) ہے؛ لیکن اگر شوہر نے منع کر رکھا ہے کہ اس کو آنے مت دیجیو، تو پھر عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی کو بھی گھر میں آنے کی اجازت دے۔ بیوی کے لیے کسی کو بھی بلا اجازت شوہر کے گھر میں داخل ہونے دینا حرام و ممنوع ہے۔ اسی لیے بیوی کے ماں باپ کے متعلق بھی لکھا ہے کہ اگر شوہر ان کے آنے کو پسند نہیں کرتا تو ان کو بھی گھر میں بلانا ممنوع ہے؛ لیکن شریعت نے ان کا حق بھی بالکل ختم نہیں کر دیا، بلکہ کچھ قوانین کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے خود گھر سے باہر نکل سکتی ہے، یا وہ گھر سے باہر رہتے ہوئے اس کی خیر خیریت پوچھ سکتے ہیں۔

باب تحریم رفع المأموم رأسه من الركوع أو السجود قبل الإمام

مقتدی کا امام سے پہلے رکوع وسجدہ سے سر اُٹھانا منع ہے

کچھ متفرق احکام وآداب بتلانے کا سلسلہ جاری ہے، اسی سلسلہ میں آج یہ عنوان قائم کیا ہے کہ: آدمی جب امام کے ساتھ جماعت سے نماز ادا کررہا ہو تو اس کو اس بات کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ امام سے پہلے کوئی کام انجام نہ دے، بلکہ امام کے ساتھ یا امام کے بعد ہی وہ کام کرے۔ چناں چہ رکوع یا سجدے سے سر اٹھانے میں اگر امام سے پہلے سر اٹھالیا تو اس کی اجازت نہیں دی گئی ہے، مقتدی کے لیے ایسا کرنا مکروہِ تحریمی ہے، اور اس پر وعید بتائی گئی ہے۔

نہایت سخت وعید

حدیث ۱۷۵۱:-

عن أبي هريرة رضى الله عنه أنَّ النبيَّ ﷺ قَالَ: أَمَا يَخْشَى أَحَدُكُمْ إِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ قَبْلَ الإِمَامِ أَنْ يَجْعَلَ اللهُ رَأْسَهُ رَأْسَ حِمَارٍ! أَوْ يَجْعَلَ اللهُ صُورَتَهُ صُورَةَ حِمَارٍ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:– حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اس بات سے نہیں ڈرتا کہ اللہ تعالیٰ اس کا سر گدھے جیسا بنادے جبکہ وہ اپنے سر کو امام کے سر سے پہلے اٹھاوے، یا اس کا چہرہ گدھے جیسا بنادے۔

افادات:– گویا اس حرکت پر اتنی سخت وعید سنائی گئی۔

عبرت آموز واقعہ

ملا علی قاری (رحمۃ اللہ علیہ) نے مرقاۃ شرحِ مشکوٰۃ میں ایک محدث کا واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک محدث دوسرے محدث کے پاس حدیث حاصل کرنے کے لیے گئے، استاذ صاحب ہمیشہ پردے میں رہ کر ان کو حدیثیں سناتے رہے، ایک زمانہ تک ان کے پاس آنے جانے کی وجہ سے جب وہ مانوس ہوگئے تو ایک مرتبہ استاذ صاحب نے پردہ ہٹایا، شاگرد نے دیکھا کہ ان کا چہرہ گدھے جیسا ہے، انہوں نے یہ حدیث سنا کر بتایا کہ جب پہلی مرتبہ میں نے یہ حدیث سنی تو میں نے اس کو ناممکن سمجھ کر امام سے پہلے اپنا سر اٹھالیا، جس کی مجھے یہ سزا دی گئی ہے۔

باب کراھة وضع الید علَی الخاصرة فی الصلاة

نماز کی حالت میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے کی کراہت

حدیث ۱۷۵۲ :-

عن أَبی هریرة -رضی الله عنه-: أَنَّ رسولَ الله ﷺ نَهَی عن الخَصْرِ فی الصَّلَاةِ. (متفق عَلَیْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے نماز میں کوکھ پر ہاتھ رکھنے سے منع فرمایا۔

افادات:- نماز کی حالت میں کوکھ کے اوپر ہاتھ رکھنا بھی ممنوع اور مکروہِ تحریمی ہے۔

ممانعت کی وجوہات

اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ طرز نماز میں خشوع و خضوع والی کیفیت کے منافی ہے۔

ایک وجہ اور بھی بتائی جاتی ہے کہ شیطان کو اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر پھینکا اس وقت وہ اسی طرح کوکھ پر ہاتھ رکھ کر کھڑا رہا، اس سے مشابہت ہونے کی وجہ سے منع ہے۔

ایک اور وجہ بھی بتائی جاتی ہے کہ یہ جہنمیوں کی راحت کا سبب ہو گا،یعنی جہنمی جب عذاب سے تھک جائیں گے تو کچھ آرام وراحت حاصل کرنے کے لیے کوکھ پر ہاتھ رکھ کر اسی طرح کھڑے رہیں گے۔ گویا ان کے ساتھ مشابہت ہونے کی وجہ سے اس سے منع کیا گیا ہے۔

بَاب كراهة الصلاة بحضرة الطعام وَنَفْسُهُ تَتُوقُ إِلَيْهِ أَوْمَعَ مدافعة الأخبثين وهما البول والغائط

کھانا موجود ہو اور طبیعت اس کی طرف مائل ہو، یا پیشاب پاخانہ کا تقاضہ ہو رہا ہو؛ ایسی حالت میں نماز پڑھنا مکروہ ہے

یہاں ایک اور مسئلہ بتاتے ہیں کہ کھانا موجود ہو اور طبیعت کھانے کی طرف لگی ہوئی ہو، ایسی حالت میں بھی نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔پہلے کھانے سے فارغ ہو جاؤ، تاکہ طبیعت کھانے کی طرف سے یکسو ہو جائے؛ پھر نماز میں لگو۔ یا پیشاب پاخانہ کا تقاضہ کو دباتے ہوئے بھی نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔ ہر وہ چیز جو نمازی کی توجہ کو نماز سے ہٹانے کا ذریعہ بن سکتی ہو،ایسی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے۔

پھر اطمینان سے نماز پڑھیں گے

ہمارے شیخ الشیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری (رحمۃ اللہ علیہ) ایک مرتبہ سفر سے واپس تشریف لائے، کھانا باقی تھا، نماز پڑھنی بھی باقی تھی اور کھانا تیار تھا،کسی نے کہا: پہلے نماز پڑھ لیں

پھر اطمینان سے کھانا کھائیں گے، تو حضرت نے فرمایا: بھائی! پہلے کھانا کھالیں پھر اطمینان سے نماز پڑھیں گے۔ گویا بتایا کہ اطمینان سے کرنے کا کام نماز ہے، نہ کہ کھانا۔

کھانا نماز بنے

امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: میرا کھانا نماز بنے یہ مجھے زیادہ پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ میری نماز کھانا بنے۔ مطلب یہ ہے کہ طبیعت میں کھانے کا تقاضہ ہو ایسی حالت میں آدمی اگر نماز پڑھے گا تو ظاہراً جسمانی طور پر تو نماز میں ہو گا لیکن اس کا دل کھانے میں لگا ہوا ہو گا، گویا اس کی نماز کھانا بن گئی۔ اس کے بر خلاف اگر وہ پہلے کھانا کھائے گا تو جو نماز کا پابند ہوتا ہے اس کی طبیعت پر عام طور پر نماز کا تقاضہ ایسا غالب ہوتا ہے کہ کھانا کھانے کی حالت میں بھی اس کا جی نماز کی طرف لگا ہوا ہوتا ہے، گویا اس کا کھانا نماز بن گیا۔ اسی طرح پیشاب پائخانہ کے تقاضہ کا بھی حال ہے کہ ایسی حالت میں آدمی اگر نماز پڑھے گا تو اس کا جی نماز میں نہیں لگے گا، اس لیے اس سے بھی منع کیا گیا ہے۔

حدیث ۱۷۵۳:-

عن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها قالت: سَمِعْتُ رسولَ الله ﷺ يقولُ: ((لا صَلاةَ بِحَضْرَةِ طَعَامٍ، وَلاَ وَهُوَ يُدَافِعُهُ الأَخْبَثَانِ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کھانے کی موجودگی میں نماز نہ پڑھی جائے۔اور نہ ایسی حالت میں نماز پڑھی جائے کہ پیشاب وپائخانہ اس کو دھکا دے رہے ہوں (یعنی اپنی طرف متوجہ کر رہے ہوں)

کن صورتوں میں کھانا پہلے، اور کن صورتوں میں نماز پہلے

افادات:۔ اس سلسلے میں فقہاء نے احکام کی تفصیل فرمائی ہے کہ کھانا موجود ہو، تو کن کن صورتوں میں پہلے کھانا کھایا جائے؟ اور کن کن صورتوں میں پہلے نماز پڑھی جائے؟

تو علماء نے لکھاہے کہ (۱) بہت بھوک لگی ہو اور کھانا تیار ہو، تو پہلے کھالے تب نماز پڑھے۔ ایسی حالت میں بغیر کھانا کھائے نماز پڑھنا مکروہِ تحریمی ہے (۲) البتہ اگر وقت اتنا تنگ ہو جائے کہ کھانے کے بعد فرض اور سنتِ مؤکدہ نہیں پڑھ سکے گا، تو پہلے نماز پڑھ لے۔ (۳) اسی طرح اگر جماعت جانے کا خوف ہو اور بھوک اس قدر شدید نہ ہو کہ بے چین کرے، تو پہلے جماعت سے نماز پڑھ لے (۴) اور اگر بھوک ایسی شدید ہو کہ نماز میں خشوع وخضوع قائم نہ رہ سکے گا، تو جماعت کو ترک کرے اور پہلے کھانے سے فارغ ہو جائے۔

قضائے حاجت کے وقت کے احکام کی تفصیل

پیشاب پاخانہ کا تقاضہ ہونے کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے: ایک تو یہ ہے کہ پہلے سے ان چیزوں کا تقاضہ ہے تب تو نماز شروع کرنا ہی درست نہیں، پہلے ان چیزوں سے فارغ ہوجائے پھر نماز شروع کرے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ نماز شروع کرچکا ہے، دورانِ نماز ان کا تقاضہ اور غلبہ ہوجائے جو دل کو مشغول کرے، تب بھی نماز پڑھتے رہنا مکروہِ تحریمی ہے۔ اس کو چاہیے کہ نماز توڑ دے، اور ان حاجات سے فارغ ہوکر وضو کرکے پھر نماز پڑھے۔ اسی حالت میں اگر نماز پڑھتا رہے گا تو گنہگار ہوگا، اور نماز کراہتِ تحریمی کے ساتھ ادا ہوجائے گی۔ ائمہ ٔ اربعہ اس پر متفق ہیں۔ اور جب کراہیتِ تحریمیہ کے ساتھ نماز ادا ہوگی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کے اندر اندر اس نماز کا لوٹانا واجب ہے۔ البتہ اہلِ ظاہر اس طرف گئے ہیں کہ نماز ہوگی ہی نہیں۔ اور یہ حکم تمام نمازوں کا ہے، خواہ وہ فرض ہو، یا واجب ہو، یا نفل ہو۔ لیکن اگر نمازِ جنازہ کے فوت ہونے کا خوف ہو تو اسی حالت میں پڑھ لے، اس لیے کہ وہ دوبارہ حاصل ہونے والی نہیں ہے۔

اور اگر جماعت جاتے رہنے کا خوف ہو تب بھی ان ضروریات سے فارغ ہوکر نماز پڑھے، خواہ جماعت چھوٹ جائے۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ تقاضہ ایسا شدید ہو کہ وہ تقاضہ کو دباتا ہے لیکن

ادھر سے تقاضہ ہوتا ہی رہتا ہے، اس صورت میں تو اس کے لیے نماز پڑھنا ممکن ہی نہیں؛ لہٰذا پہلے فارغ ہو جائے پھر نماز پڑھے۔

اور اگر فرض یا واجب نماز کا وقت اتنا تنگ ہو کہ قضائے حاجت کر کے وضو کرنے تک وقت جاتا رہے گا تو ایسی حالت میں نماز قضا نہ کرے، بلکہ وقت کے اندر نماز پڑھ لے، کیوں کہ وقت کی رعایت مقدم ہے، اور کراہت کے ساتھ ادا کرنا بالکل قضا کرنے سے اَولیٰ ہے۔

اور اگر تقاضہ اتنا شدید نہیں ہے، بلکہ ہلکا سا تقاضہ تھا، ذرا سا دبانے کی صورت میں تقاضہ جاتا ہی رہا، تب تو نماز پوری کر لے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس وقت نماز پڑھ رہا ہو اس وقت طبیعت ادھر متوجہ نہیں ہونی چاہیے۔

باب النهى عن رفع البصر إلى السماء فى الصلاة

نماز میں نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھانے کی ممانعت

نماز کے علاوہ عبرت کے لیے نگاہیں آسمان کی طرف اٹھانے میں کوئی حرج نہیں، بلکہ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کی ان بڑی بڑی مخلوقات میں غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے: ﴿اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ ﴿۱۷﴾ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ ﴿۱۸﴾﴾ جب آدمی ان کو دیکھ کر ان میں غور وفکر کرے گا تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی معرفت ومحبت حاصل ہوگی، اس لیے اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے؛ لیکن نماز کی حالت میں آسمان کی طرف دیکھنے کی ممانعت آئی ہے۔

حدیث ۱۷۵۴:-

عن أنس بن مالك رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسولُ الله ﷺ: ((مَا بَالُ أَقْوامٍ يَرْفَعُونَ أَبْصَارَهُمْ إِلَى السَّمَاءِ فِى صَلَاتِهِمْ!)) فَاشْتَدَّ قَوْلُهُ فِى ذٰلِكَ حَتّٰى قَالَ: ((لَيَنْتَهُنَّ عَنْ ذٰلِكَ، أَوْ لَتُخطفَنَّ أَبْصَارُهُمْ!)) (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کیا حال ہے ان لوگوں کا جو نماز کی حالت میں اپنی نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھاتے ہیں (حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پھر) اس بارے میں آپ ﷺ نے اور زیادہ شدت اختیار فرمائی یہاں تک کہ ارشاد فرمایا: یا تو وہ لوگ آسمان کی طرف آنکھ اُٹھانے سے باز آجائیں، یا پھر ان کی نگاہیں اُچک لی جائیں گی (اور وہ بینائی سے محروم کردئے جائیں گے)۔

باب کراھۃ الالتفات فی الصلاۃ لغیر عذر

نماز کی حالت میں بغیر عذر کے اِدھر اُدھر دیکھنا مکروہ ہے

دیکھنے کی تین شکلیں ہیں:

(۱) پہلی شکل یہ ہے کہ اس طرح دیکھے کہ اس کا سینہ قبلے سے پھر جائے۔ اس صورت میں تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اور ٹوٹ جائے گی۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ سینہ تو قبلہ کی طرف رہے، البتہ چہرہ پھیر کر دیکھے، یہ مکروہِ تحریمی ہے۔ اور اگر چہرہ پھیر کر اتنی دیر تک دیکھتا رہا کہ دور سے دیکھنے والا اس کے متعلق یہ یقین کرے کہ یہ نماز میں نہیں ہے؛ تب تو نماز فاسد ہی ہو جائے گی۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ سینہ اور چہرہ تو قبلہ کی طرف ہی ہے، البتہ کنکھیوں اور آنکھ کے کونوں سے دیکھ رہا ہے، تو اگر یہ کسی ضرورت کی وجہ سے ہے تب تو جائز ہے، اس میں کوئی کراہت بھی نہیں۔ اور اگر بلا ضرورت ہے تو مکروہِ تنزیہی ہے یعنی اس کو اچھا نہیں سمجھا گیا۔

شیطان کا نماز میں سے اُچک لینا

حدیث ۱۷۵۵:-

عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: سألتُ رسُولَ الله ﷺ عَنِ الالتفَاتِ فی الصَّلاَةِ. فَقَالَ: هُوَ اختِلاَسٌ يَختَلِسُهُ الشَّيطَانُ مِن صَلاَةِ العَبدِ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم ﷺ سے نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کے متعلق پوچھا تو نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: یہ شیطان کی طرف سے آدمی کی نماز میں سے اچانک اُچک لینا ہے۔

افادات:- کسی کے پاس کوئی چیز ہو اس کو جھپٹ مار کر لے لینا "اختلاس" کہلاتا ہے۔ گویا شیطان بھی اسی انتظار میں رہتا ہے کہ جب کوئی بندہ نماز میں مشغول ہو تو اس میں سے کچھ چھین لے۔ جیسے: جیب کترا ہمیشہ موقعہ کے انتظار میں رہتا ہے کہ کسی کی طرف سے ذرا سی غفلت ہو تو وہ اپنا کام کر لے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ شیطان آدمی کی نماز میں سے اپنا حصہ لینے کے انتظار ہی میں رہتا ہے، جیسے ہی آدمی نے اِدھر اُدھر دیکھا تو شیطان نے نماز کا اتنا حصہ لے لیا، اس لیے کہ اتنی دیر تک اس کی توجہ بجائے نماز کے دوسری چیز کی طرف ہو گئی، تو نماز کا اتنا حصہ نکل گیا، اس پر شیطان نے قابو پا لیا۔ اسی کو "اختلاس" سے تعبیر کیا۔

نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا ہلاکت ہے

حدیث ۱۷۵۶ :-

وعن أنس رضی الله عنه قَالَ قَالَ رسولُ اللهِ ﷺ : إِيَّاكَ والالتِفَاتَ فِي الصَّلَاةِ فَإِنَّ الالتفَاتَ فی الصَّلَاةِ هَلَكَةٌ، فَإِنْ كَانَ لَابُدَّ فَفِي التَّطَوُّعِ لَا فی الفَرِيضَةِ. (رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن صحیح)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا: نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے سے بچو، اس لیے کہ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنا ہلاکت ہے۔ اور اگر دیکھنا بہت ضروری ہی ہو؛ تو نفل میں دیکھیو، فرض میں نہیں۔

افادات:- گویا فرض نماز کی طرف زیادہ توجہ اور اہتمام ہونا چاہیے۔ ویسے نوافل کے اندر فرائض کے مقابلہ میں کچھ چیزوں میں تسامح برتا گیا اور کچھ چھوٹ چھاٹ دی گئی ہے، جیسے: فرض نماز کھڑے ہونے کی قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھیں گے تو درست نہیں ہوگی، اور نفل نماز باجود کھڑے ہونے کی طاقت وقدرت کے بھی بیٹھ کر پڑھیں گے؛ تو درست ہو جائے گی۔

بَاب النھی عن الصلاۃ إِلَی القبور

قبر سامنے ہوتے ہوئے نماز پڑھنے کی ممانعت

اس سلسلے میں فقہاء نے تفصیل بتلائی ہے، وہ یہ ہے کہ:

اگر نمازی کے سامنے قبر موضعِ سجود کے بقدر نزدیک ہو۔ یعنی آدمی کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہا ہو اور اس کی نگاہیں سجدے کی جگہ پر جمی ہوئی ہوں اور سامنے سے کوئی گزرے تو نمازی کی نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں (جس کی تحدید نمازی کے کھڑے ہونے کی حالت میں اس کے پاؤں سے دو صف کے برابر تقریباً نو (۹) یا دس (۱۰) فٹ بتلائی ہے) قبر کے اتنے سامنے ہوتے ہوئے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ اور اگر نمازی اور قبر کے درمیان میں دس فٹ سے زیادہ فاصلہ ہو، یا درمیان میں کوئی سترہ حائل ہو؛ تو پھر مکروہ نہیں۔

سُترہ کے متعلق مسئلہ کی وضاحت

اور امام کا سترہ مقتدیوں کے لیے اور ایک مقتدی کا سترہ دوسرے کے لیے کافی نہیں جبکہ سب کے سامنے قبریں ہوں۔ یہاں ایک مسئلہ اور ہے کہ کھلے میدان میں نماز پڑھی جارہی ہے اور آگے

سے کسی کے گزرنے کا امکان ہو اور امام اپنے سامنے کوئی سترہ اور آڑ رکھ لے تو امام کا اپنے سامنے رکھا ہوا سترہ مقتدیوں کے لیے کافی ہو جائے گا

لیکن اگر نمازیوں کے سامنے قبریں ہیں اور امام نے قبروں اور اپنے درمیان سترہ رکھا تو اس کا یہ سترہ مقتدیوں کے لیے کافی نہیں ہو گا۔ مثلاً: امام کے سامنے قبر ہے اور اس نے اپنے سامنے سترہ رکھا تو اس کے لیے تو کافی ہو جائے گا، اور اس کے مقتدیوں میں پہلی صف کے کونے میں ایک آدمی کھڑا ہے جس کے سامنے بھی موضعِ سجود میں قبر پڑتی ہے تو امام والا سترہ اس کے لیے کافی نہیں ہو گا، اس کو اپنے لیے الگ سے آڑ رکھنی پڑے گی۔

اور اگر قبرستان میں کوئی جگہ نماز کے لیے بنائی گئی ہو جہاں قبریں یا نجاست نہ ہو تو نماز پڑھنا مکروہ نہیں۔ اور اگر قبریں دائیں بائیں یا پیچھے ہوں تب بھی مکروہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنے کی جگہ بنائی ہو اور قبروں کے درمیان میں آڑ کر دی گئی ہو تو نماز پڑھنا جائز ہے۔

قبروں کی طرف چہرہ کر کے نماز مت پڑھو

حدیث ۱۷۵۷:-

عن أَبِي مَرْثَدٍ كَنَّازِ بْنِ الْحُصَيْنِ رضی الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ يقولُ: لا تُصَلُّوا إِلَى الْقُبُورِ، وَلاَ تَجْلِسُوا عَلَيْهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:–حضرت ابو مَرثَد کَنَّاز بن حُصَین (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: قبروں کی طرف چہرہ کرکے نماز مت پڑھو، اور نہ ان پر بیٹھو۔

افادات:–ویسے قبر کا بھی اپنا ایک احترام ہے، قبر میں جو مردہ سویا ہوا ہے اس کو ان سب چیزوں سے تکلیف ہوتی ہے جن سے زندوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اسی لیے قبروں پر پیشاب پاخانہ کرنے سے حدیثِ پاک میں ممانعت آئی ہے کہ یہ چیز مردے کے لیے باعثِ تکلیف ہے، اس سے اپنے آپ کو بچاؤ۔ اسی طریقے سے قبر پر ٹیک لگانے اور اس پر بیٹھنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

باب تحریم المرور بَيْنَ يدى المصلّى

نمازی کے سامنے سے گزرنے کی ممانعت

حدیث ۱۷۵۸ :-

عن أَبِي الجُهَيْمِ عبد اللهِ بن الحارِثِ بن الصِّمَّةِ الأَنْصَارِيِّ رضى الله عنه قَالَ قَالَ رسُولُ الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : لَوْ يَعْلَمُ المَارُّ بَيْنَ يَدَيِ المُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ أَنْ يَقِفَ أَرْبَعِينَ خَيْراً لَهُ مِنْ أَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ.

قَالَ الراوى: لا أَدْرِى قَالَ: أَرْبَعِينَ يَوماً، أَوْ أَرْبَعِينَ شَهْراً، أَوْ أَرْبَعِينَ سَنَةً. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوجُہَیم عبداللہ بن حارث بن صِمَّہ انصاری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نمازی کے سامنے سے گزرنے والا اگر یہ جان لے کہ اس گزرنے پر اس کے لیے کیا وبال ہے تو نمازی کے سامنے سے گزرنے کے مقابلہ میں چالیس تک کھڑا رہنا اس کے لیے زیادہ بہتر ہو۔

(چالیس سے کیا مراد ہے؟) راوی کہتے ہیں کہ مجھے پتہ نہیں کہ چالیس دن مراد ہیں، یا چالیس مہینے مراد ہیں، یا چالیس سال مراد ہیں۔

افادات:- دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چالیس سال تک کھڑا رہنا گوارا کرے گا لیکن نمازی کے آگے سے گذرنا گوارا نہیں کرے گا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نمازی کے آگے سے

گذرنا کتنا خطرناک ہے، چوں کہ یہ نمازی کی توجہ کو ہٹانے والا ہے۔ اگر نمازی کے آگے سترہ اور آڑ رکھی ہوئی ہو اور آڑ کے اُس طرف سے کوئی گذرے تو اس کی اجازت ہے۔

بڑی اور چھوٹی مسجد کی تحدید اور حکم

اور اگر کھلے میدان میں نماز پڑھ رہا ہے، یا بڑی مسجد ہے تو اس صورت میں نمازی کے موضعِ سجود کے آگے سے گذرنے کی اجازت ہے۔ (اور موضعِ سجود کا مطلب اوپر بتلایا کہ آدمی کھڑے ہو کر نماز ادا کر رہا ہو اور اس کی نگاہیں سجدے کی جگہ پر جمی ہوئی ہوں اور سامنے سے کوئی گذرے تو نمازی کی نگاہیں اس کو نہ دیکھ سکیں۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: بندے نے اس کا اندازہ لگایا تو نمازی کے کھڑے ہونے کی حالت میں اس کے پاؤں سے دو صف کے برابر ہوا، جو تقریباً نو (۹) یا دس (۱۰) فٹ ہوتا ہے۔)

اور چھوٹی مسجد ہو تو پھر نمازی اور قبلہ والی دیوار کے درمیان میں سے گذرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور چھوٹی مسجد کی تفصیل بھی فقہاء نے لکھی ہے کہ اگر ایسی چھوٹی مسجد یا کمرے میں نماز پڑھ رہا ہے جس کا کل رقبہ (ایریا) چالیس (۴۰) ہاتھ یعنی ساٹھ (۶۰) فٹ سے کم ہے؛ تو نمازی کے سامنے سے گذرنا مطلقاً ناجائز ہے، خواہ قریب سے گذرے یا دور سے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بڑی مسجد کا جو رقبہ ساٹھ (۶۰) فٹ بتایا تو کیا کل ۶۰/ اسکویر فٹ مراد ہے؟ یا ۶۰x۶۰ یعنی ۳۶۰۰/ اسکویر فٹ مراد ہے؟ تو اس سلسلہ میں مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی (رحمۃ اللہ علیہ) نے تو یہی فتویٰ دیا ہے کہ کل ۶۰/ اسکویر فٹ مراد ہے؛ لیکن ہمارے اکابر میں سے حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی نوراللہ مرقدہٗ نے فرمایا ہے کہ: ۴۰x۴۰ ہاتھ (یعنی ۶۰x۶۰ فٹ) کے کل ۳۶۰۰/ اسکویر فٹ ہوتے ہیں، اس سے بڑی مسجد ہو تو اس صورت میں نمازی جہاں کھڑا ہے اس سے دو صف جتنی جگہ (یعنی نو (۹) یا دس (۱۰) فٹ) چھوڑ کر آگے سے کوئی گذرنا چاہے تو گذر سکتا ہے، اور اگر اس سے چھوٹی مسجد ہے تو اس صورت میں پھر نمازی اور قبلہ والی دیوار کے درمیان میں سے گذرنے کی اجازت نہیں۔ اس سلسلہ میں یہ تفصیل ہوئی۔

سامنے سے گزرنے والا گنہگار یا نمازی؟

ایک اور مسئلہ ہے کہ نمازی کے آگے سے گزرنے میں جبکہ کوئی سترہ یا آڑ نہ ہو؛ تو گنہگار ہونے کی چار صورتیں ہیں:

(۱) پہلی یہ کہ گزرنے والے کے لیے گنجائش موجود ہو کہ وہ نمازی کے سامنے سے نہ گزرے، اور نمازی نے بھی راستہ نہ روکا ہو۔ یعنی نمازی ایسی جگہ نماز پڑھ رہا ہے کہ اس کی وجہ سے جانے والے کا راستہ نہیں رکتا ہے، اور گزرنے والا نمازی کے سامنے سے گزرے بغیر بھی اپنا راستہ نکال لے سکتا ہے،

پھر بھی وہ نمازی کے آگے سے گزرا؛ تو اس صورت میں گناہ گزرنے والے پر ہوگا، نمازی پر کوئی گناہ نہیں۔ اس لیے کہ کوتاہی گزرنے والے کی طرف سے ہو رہی ہے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ دوسری طرف کو اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں، اور نمازی نے راستہ روک لیا ہے۔ یعنی نمازی ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے لوگوں کے آنے جانے کا راستہ ہے (بعض لوگ ایسا ہی کرتے ہیں) تو اس صورت میں گناہ نمازی پر ہوگا، گزرنے والے پر نہیں۔ اس لیے کہ یہاں کوتاہی نمازی کی طرف سے پائی گئی ہے۔ اس کو سوچ سمجھ کر ایسی جگہ پر کھڑا رہنا چاہیے تھا جہاں سے گزرنے والوں کے راستے میں رکاوٹ پیدا نہ ہوتی ہو۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ نمازی نے راستہ تو روک لیا ہے لیکن گزرنے والا اور طرف سے بھی نکل سکتا ہے، پھر بھی نمازی کے سامنے سے گزرا؛ تو اس صورت میں دونوں گنہگار ہوں گے۔ نمازی اس لیے کہ راستہ روکا، اور گزرنے والا اس لیے کہ اس کے لیے بچنا ممکن تھا پھر بھی وہ سامنے سے گزرا۔

(۴) چوتھی شکل یہ ہے کہ نمازی نے راستہ نہیں روکا، اور گزرنے والے کے لیے بھی اور کوئی راستہ نہیں ہے، اور آدمی نمازی کے سامنے سے گزرے؛ تو اس صورت میں دونوں میں سے کوئی بھی گنہگار نہیں ہوگا۔

باب کراهة شروع المأموم فی نافلة بعد شروع المؤذن في إقامة الصلاة، سواء كَانَتْ النافلة سنة تلك الصلاة أَوْ غيرها

جماعت کھڑی ہوچکنے کے بعد مسجد ہی میں سنتیں یا نوافل پڑھنا مکروہ ہے

اس باب میں ایک مسئلہ اور بتلاتے ہیں کہ کسی نماز کے لیے اقامت کہہ دی گئی (یعنی جماعت کھڑی ہوگئی) تو اس مسجد میں اور کوئی نماز شروع نہ کی جائے، چاہے وہ نماز اسی وقت کی سنت ہو، یا کوئی نفل ہو۔

فجر کے علاوہ دوسری چار نمازوں میں سے ظہر عصر اور عشاء سے پہلے سنتیں ہیں اور اس میں بھی عصر و عشاء سے پہلے کی سنتیں تو غیر مؤکدہ ہیں، لیکن ظہر سے پہلے سنتِ مؤکدہ ہیں۔ ان تینوں میں مسئلہ یہی ہے کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے اس کے بعد کوئی اور نماز شروع کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ البتہ فجر میں کوئی آدمی مسجد آیا اور جماعت کھڑی ہوچکی ہے تو اس صورت میں حضراتِ ائمہ میں دورائیں ہیں، امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما اس بات کے قائل ہیں کہ چوں کہ احادیثِ مبارکہ میں فجر کی سنتوں کے متعلق بڑی تاکید آئی ہے، اور اتنی زیادہ تاکید دوسری سنتوں کے متعلق نہیں ہے، اس لیے اگر فجر کی جماعت شروع ہوچکی ہو اور اس کو اندازہ ہو کہ میں اپنی سنتیں پڑھنے کے بعد بھی جماعت

میں شریک ہو جاؤں گا، اور مجھے جماعت کی فضیلت حاصل ہو جائے گی؛ تو اس صورت میں وہ مسجد سے ہٹ کر باہر کوئی جگہ ہو تو مسجد سے باہر سنتیں پڑھ لے۔ جیسے: ہماری اس مسجد میں باہر جگہ موجود ہے، اوپر بھی جگہ ہے، جماعت خانہ کے اندر جماعت چلتے ہوئے سنتیں پڑھنے کی قطعاً اجازت نہیں۔

اور اگر کسی مسجد میں جماعت خانہ کے علاوہ جگہ ہی نہ ہو، تو پھر کسی کونہ میں پڑھے۔ صف میں جماعت کے نمازیوں کے ساتھ کھڑے ہو کر نہ پڑھے؛ کہ اس کو مکروہ قرار دیا ہے۔ دوسری رائے آگے آرہی ہے۔

حدیث ۱۷۵۹:-

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبي ﷺ قال: إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کسی فرض نماز کے لیے اقامت کہی جائے (یعنی جماعت شروع ہو جائے) تو اب فرض نماز کے علاوہ اور کوئی نماز پڑھنا درست نہیں۔

افادات:- اسی لیے امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما اس طرف گئے ہیں کہ فجر کے اندر بھی جماعت کھڑی ہو گئی ہو تو سنتیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اوپر تفصیل بتلادی گئی۔

باب کراھة تخصیص یوم الجمعة بصیام أوْ لیلته بصلاة من بین اللیالی

جمعہ کے دن خصوصیت سے روزہ رکھنا اور شبِ جمعہ میں خصوصیت سے عبادت کرنا مکروہ ہے

پچھلی کئی مجلسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) متفرق آداب و مسائل بتارہے ہیں۔ آج ایک عنوان قائم کیا ہے کہ: خصوصیت کے ساتھ جمعہ کے دن روزہ رکھنے، یا خصوصیت کے ساتھ جمعہ کی رات میں عبادت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ چناں چہ روایت پیش کرتے ہیں۔

حدیث ١٧٦٠:-

عن أَبِی هریرة رضی الله عنه عن النبیِّ ﷺ قَالَ:((لا تَخُصُّوا لَیْلَةَ الْجُمُعَةِ بِقِیَامٍ مِنْ بَیْنِ اللَّیَالِی، وَلاَ تَخُصُّوا یَوْمَ الْجُمُعَةِ بِصِیَامٍ مِنْ بَیْنِ الأَیَّامِ، إِلاَّ أَنْ یَکُونَ فِی صَومٍ یَصُومُهُ أَحَدُکُمْ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ علیہ) نبیِٔ کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ: راتوں میں سے جمعہ کی رات کو عبادت کے لیے خاص مت کرو، اور دنوں میں سے جمعہ کے دن کو روزہ کے لیے مخصوص مت کرو؛ البتہ جمعہ کا دن کسی ایسے دن پڑ جائے کہ اس میں آدمی کے روزہ رکھنے کی عادت ہے (تو اس کی اجازت ہے)۔

افادات:–مثلاً: کوئی آدمی ہر مہینہ کے پہلے چاند کو روزہ رکھتا ہے۔یا ہر مہینہ کے دسویں چاند کو روزہ رکھتا ہے، اور اب کی مرتبہ پہلا یا دسواں چاند جمعہ کو ہی پڑ گیا؛ تو پھر کوئی حرج نہیں۔ لیکن جمعہ کے دن جمعہ ہونے کی حیثیت سے روزہ رکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔ہاں ! صرف جمعہ کا روزہ نہ رکھتے ہوئے اس سے آگے یا پیچھے ایک روزہ ملا لیا جائے یعنی جمعرات اور جمعہ کا روزہ رکھا، یا جمعہ کے ساتھ سنیچر کو ملا کر روزہ رکھ لیا؛ تو اس کی اجازت ہے، جیسا کہ اگلی روایت میں آرہا ہے۔

آگے پیچھے ایک روزہ ملا لیا کرے

حدیث ۱۷۶۱:-

وعنه قَالَ: سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ: لاَ يَصُومَنَّ أَحَدُكُمْ يَوْمَ الْجُمُعَةِ إِلاَّ يَوماً قَبْلَهُ أَوْ بَعْدَهُ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: کوئی آدمی جمعہ کا روزہ نہ رکھے مگر یہ کہ اس سے پہلے ایک دن یا اس کے بعد ایک روزہ رکھ لے۔ (تو رکھ سکتا ہے)

حدیث ۱۷۶۲:-

وعن محمد بن عَبَّادٍ قَالَ: سَأَلْتُ جَابِراً رضی الله عنه: أَنَهَى النَّبِيُّ ﷺ عَنْ صَومِ الْجُمُعَةِ؟ قَالَ: نَعَمْ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت محمد بن عباد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے پوچھا: کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن کے روزہ سے منع فرمایا ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ (صرف جمعہ کے دن کا اکیلا روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے۔)

حدیث ۱۷۶۳ :-

وعن أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ جويرية بنت الحارث رَضِيَ اللهُ عنها: أَنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم دَخَلَ عَلَيْهَا يَوْمَ الْجُمُعَةِ وهِيَ صَائِمَةٌ، فَقَالَ: أَصُمْتِ أَمْسِ؟ قالت: لا. قَالَ: تُرِيدِينَ أَنْ تَصُومِي غَداً؟ قالت: لاَ. قَالَ: فَأَفْطِرِي. (رواه البخاری)

ترجمہ:-ام المؤمنین حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے یہاں جمعہ کے دن تشریف لائے اور ان کا روزہ تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: گذشتہ کل (یعنی جمعرات) کا تم نے روزہ رکھا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو پوچھا کہ: آئندہ کل (یعنی سنیچر) کا روزہ رکھنے ارادہ ہے؟ تو کہا: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر یہ روزہ توڑ ڈالو۔

افادات:-کوئی آدمی نفل روزہ توڑ ڈالے تو اس کی قضاء کے سلسلہ میں ائمہ کے درمیان میں اختلاف ہے، احناف کے یہاں یہ ہے کہ اس کی قضاء ضروری ہے۔ بہر حال! یہاں تو یہ بتلانا ہے کہ صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنے سے، اور اکیلی جمعہ کی رات میں عبادت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

باب تحریم الوصال فی الصوم

وَهُوَ أنْ يصوم يومَينِ أَوْ أكثر وَلاَ يأكل وَلاَ يشرب بينهما

صومِ وصال کی حرمت کا بیان

صومِ وصال کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دو یا زیادہ دنوں کا روزہ مسلسل اس طرح رکھے کہ درمیان میں نہ تو افطار کرے، نہ سحری؛ اس کو صومِ وصال کہتے ہیں، اور اس کی اجازت نہیں ہے۔ اور ایک شکل یہ ہے کہ روزانہ کا روزہ رکھے جس میں افطار بھی کرے، رات میں کھائے پیئے اور سحری بھی کرے؛ اس کو صومِ دہر کہتے ہیں؛ اس کی اجازت ہے۔

حدیث ۱۷۶۴:-

عن أَبِي هريرة وعائشة رضى الله عنهما: أَنَّ النبيَّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - نهى عن الوِصَالِ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے صومِ وصال سے منع فرمایا۔

میرا معاملہ تمہاری طرح نہیں ہے

حدیث ۱۷۶۵:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: نَهَى رسُولُ اللهِ - ﷺ -عَنِ الوِصَالِ. قالوا: إنَّكَ تُواصِلُ؟قَالَ:((إنِّي لَسْتُ مِثْلَكُمْ،إنِّي أُطْعَمُ وَأُسْقَى)). (متفق عَلَيْهِ.وهذا لفظ البخاری)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے صومِ وصال سے منع فرمایا،تو صحابہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: یارسول اللہ ! آپ کا معمول تو صومِ وصال کا ہے؟ (اورامت کو تو آپ کے اتباع و پیروی کا حکم دیا گیا ہے)تو نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:(صومِ وصال میری خصوصیت ہے)میں تمہاری طرح نہیں،مَیں کھلایا پلایا جاتا ہوں۔

افادات:- بعض عبادات ایسی تھیں جن کی آپ ﷺ کے لیے تو اجازت تھی؛ لیکن امت کو اس کی اجازت نہیں۔یا آپ کے لیے واجب تھی اورامت کے لیے واجب نہیں۔جو کام ایسے ہوں جو امت کے لیے منع ہوں لیکن آپ کے لیے ممنوع نہ ہوں؛وہ آپ ﷺ کی خصوصیات کہلاتی ہیں؛ لیکن کسی بھی چیز کا خصوصیت ہونا اس وقت تک ثابت نہیں مانا جائے گا جب تک کہ اس سلسلہ میں کوئی روایت موجود نہ ہو۔یہاں صومِ وصال کے متعلق روایت موجود ہے۔

”مَیں کھلایا پلایا جاتا ہوں“یعنی ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی روحانی نعمتیں دی جاتی ہوں جو کھانے پینے کے قائم مقام ہو جاتی ہوں، اور ایک آدمی کو کھانے پینے سے جو قوت حاصل ہوتی ہے وہی قوت آپ کو ان نعمتوں سے حاصل ہو جاتی ہوں، اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرا معاملہ تمہاری طرح نہیں ہے۔

باب تحریم الجلوس علیٰ قبر

قبر کے اوپر بیٹھنے کی ممانعت

ایک مؤمن کا جو ادب واحترام اس کی زندگی میں ملحوظ رکھا جاتا ہے وہی ادب و احترام اس کی موت کے بعد ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چناں چہ اس کی قبر کے ساتھ کوئی ایسا معاملہ کرنا جو اس کے ادب و احترام کے خلاف ہو؛ اس کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ اسی لیے زیارتِ قبر کے سلسلہ میں جو طریقہ بتلایا گیا ہے اس کے متعلق کتبِ فقہ میں فقہاء نے لکھا ہے کہ آدمی صاحبِ قبر کی پائنتی قبلہ کی طرف اس طرح کھڑا ہو کہ اس کا چہرہ صاحبِ قبر کے سامنے ہو، اور پیٹھ قبلہ کی طرف ہو۔ اور وہاں ایک بات خاص لکھی ہے کہ صاحبِ قبر کی زندگی میں اس سے جتنا قریب اور دور رہتا تھا، زیارتِ قبر کے وقت بھی اسی لحاظ سے رہے۔ جیسے: کوئی استاذ یا شیخ کی قبر ہے جن کی زندگی میں آپ ان سے دو چار گز دور بیٹھتے تھے تو جب ان کی قبر کی زیارت کے لیے جائیں تب بھی اسی مناسبت سے دور کھڑے رہنا چاہیے۔

حدیث ۱۷۶۶:-

عن أبي هريرة رضى الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ((لأن يجلس أحدكم على جمرة، فتحرق ثيابه فتخلص إلى جلده خير له من أن يجلس على قبر)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی انگارے کے اوپر بیٹھے اور وہ انگارا اس کے کپڑوں کو جلا کر اس کی کھال تک پہنچ جائے (اور اس کی وجہ سے اس کی کھال متاثر ہو اور اس کو تکلیف ہو) یہ اس کے لیے بہتر ہے بہ نسبت اس بات کے کہ وہ کسی قبر کے اوپر بیٹھے۔

افادات:- اس سے قبر کے اوپر بیٹھنے کی ممانعت معلوم ہوئی۔ اسی لیے بعض علماء اس کو حرام قرار دیتے ہیں۔ بعضوں نے اس کو مکروہ بتلایا ہے۔ ہاں! قضائے حاجت کے لیے بیٹھنا بالاتفاق حرام ہے۔

باب النهی عن تجصیص القبر والبناء علیه

قبروں کو پختہ بنانے اور ان پر (قبہ، کمرہ وغیرہ) تعمیر کرنے کی ممانعت

حدیث ۱۷۶۷:-

عن جابر رضی الله عنه قَالَ: نَهَى رسولُ الله ﷺ أن يُجَصَّصَ القَبْرُ، وأنْ يُقْعَدَ عَلَيْهِ، وَأنْ يُبْنَى عَلَيْهِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبر کو پختہ (پکّا) بنایا جائے، اور اس پر بیٹھنے سے بھی منع فرمایا، اور اس پر قبہ، کمرہ وغیرہ تعمیر کرنے سے بھی منع فرمایا۔

باب تغليظ تحريم إباق العبد من سيده

غلام کا اپنے آقا کے یہاں سے بھاگ جانا سخت حرام ہے

حدیث ۱۷۶۸:-

عن جرير رضى الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ((أَيُّمَا عَبْدٍ أَبَقَ، فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ الذِّمَّةُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو غلام بھاگ گیا تو اس سے اسلام کا ذمہ بری ہے۔

افادات:- اس کو اللہ ورسول کی طرف سے جو امان دیا گیا ہے، یا جو وعدے کئے گئے ہیں وہ سب اس کے بھاگ جانے کی وجہ سے باقی نہیں رہیں گے۔

کفر سے مراد کیا ہے؟

حدیث ۱۷۶۹:-

وعنه عن النبيِّ ﷺ: إِذَا أَبَقَ الْعَبْدُ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةٌ. (رواه مسلم)

وفي رواية: ((فَقَدْ كَفَرَ))

ترجمہ:--حضرت جریر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کوئی غلام بھاگ جاتا ہے تو اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ اس نے گویا کفر کیا۔

افادات:--یعنی اگرچہ نماز درست ہو جائے گی اور اس کا ذمہ بری ہو جائے گا، اس کے اوپر اس نماز کی قضاء واجب نہیں ہوگی، کل قیامت میں نماز کے اوپر یہ مؤاخذہ و گرفت نہیں ہوگی کہ نماز نہیں پڑھی، لیکن قبول نہیں ہوگی یعنی اس کی نماز پر اس کو کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ کفر کا معنٰی ناشکری۔ یعنی اس نے آقا کے احسان کی ناشکری کی۔ یا اگر اس نے اس حرکت کو حلال سمجھتے ہوئے کیا یعنی اس کے لیے بھاگنا حرام ہے اور وہ حلال سمجھتے ہوئے بھاگا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ کفر شمار ہوگا۔

باب تحریم الشفاعۃ فی الحدود

شریعت کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کے متعلق سفارش حرام ہے

اس باب میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مقررہ سزائیں ہیں ان کے سلسلہ میں سفارش کرنا جائز نہیں ہے۔

حدودِ اربعہ

چار گناہ ایسے ہیں کہ جن میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا مقرر کر دی گئی ہے، جن کو "حدودِ اربعہ" کہا جاتا ہے:

(ا) **زنا:-** کوئی آدمی اگر زنا کا ارتکاب کرے اور وہ محصَن (یعنی شادی شدہ) ہے، اور ساتھ میں کچھ دیگر شرطیں بھی ہیں، تو اس کی سزا "رجم" یعنی سنگسار کر دینا ہے، اس کو پتھر مار مار کر ختم کر دیا جائے، چاہے مرد ہو یا عورت ہو۔ اور اگر وہ غیر محصَن (یعنی غیر شادی شدہ) ہے تو اس کی سزا سو کوڑے ہیں۔ ایک گناہ تو زنا ہوا کہ جس میں شریعت کی طرف سے سزا مقرر ہے۔

(۲) سرقہ:- دوسرا گناہ چوری کا ہے کہ کسی پر اگر شرعی اعتبار سے کچھ شرائط کے ساتھ چوری کا ثبوت ہو جائے، یا وہ اقرار کرلے، تو اس کا داہنا ہاتھ پہنچے سے کاٹ دیا جائے گا، یہ سزا بھی شریعت کی طرف سے مقرر ہے۔

(۳) شراب نوشی:- تیسرا گناہ شراب نوشی کا ہے اس کی سزا اسّی کوڑے ہے۔

(۴) تہمتِ زنا:- چوتھا گناہ یہ ہے کہ اگر کسی پاک دامن مرد یا عورت کے اوپر زنا کی تہمت لگائے، اور اپنے اس دعوے پر چار گواہ پیش نہ کرسکے؛ تو اس کو بھی بطورِ سزا کے اَسّی کوڑے لگائے جائیں گے۔ یہ چار سزائیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہیں، انہیں کو شریعت کی اصطلاح میں "حد" کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر جرائم میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے۔ ہاں! حاکمِ وقت اس کے مناسب جو سزا ہو وہ اس کے لیے تجویز کرسکتا ہے۔

حدود کے سلسلہ میں سفارش کرنا جائز نہیں

تو حدود کے سلسلہ میں سفارش کرنا جائز نہیں ہے۔ سفارش کا مطلب یہ ہے کہ کسی کا معاملہ حاکم کے پاس پہنچ گیا اور اس کے اوپر زنا کا ثبوت اس کے اقرار کی وجہ سے، یا گواہوں کی کاروائی کے نتیجے میں ہو گیا؛ تو اس پر جو سزا شریعت نے لازم کی ہے، حاکم وہ سزا اس پر ضرور جاری کرے گا۔ اب اس سلسلہ میں کسی کے لیے بھی جائز نہیں کہ حاکم کے پاس جاکر اس کی سفارش کرے کہ اس کو معاف کردو، ہم

اس کی طرف سے اتنا معاوضہ دیدیتے ہیں، یا اتنا تاوان (ڈنڈ) بھر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سفارش کرنا حرام ہے۔ چاروں گناہوں کا یہی حکم ہے۔

ایک شکل میں سفارش کی اجازت ہے

البتہ کتابوں میں لکھا ہے کہ کوئی معاملہ حاکم کے پاس پہنچے اس سے پہلے کوئی آدمی ان گواہوں سے سفارش کا معاملہ کرے تو اس کی اجازت ہے، مثلاً: کسی کو زنا کرتے ہوئے گواہوں نے دیکھا اور وہ حاکم کے پاس یہ معاملہ پہنچانے والے ہیں، اب وہ لوگ یہ معاملہ وہاں لے کر جائیں اس سے پہلے کوئی آدمی ان گواہوں سے کہے کہ: تم یہ معاملہ حاکم کے پاس مت لے جاؤ؛ تو اس کی اجازت ہے۔ اور وہاں بھی صرف سفارش کی جاسکتی ہے، ان کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن معاملہ جب حاکم کے پاس پہنچ گیا تو اب سفارش کی اجازت نہیں۔ یہی حال چوری کا بھی ہے۔

لیکن فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس میں بھی یہ دیکھا جائے گا کہ صرف اسی آدمی کے متعلق سفارش کی جاسکتی ہے جس کی زنا کی عادت نہیں ہے، بلکہ ماحول کا شکار ہو کر وہ پھنس گیا اور اس سے زنا کا صدور ہو گیا۔ لیکن اگر کوئی آدمی ان گناہوں کا عادی بن چکا ہو، تو پھر حاکم کے پاس جانے سے پہلے بھی سفارش کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ اس صورت میں تو یہ کوشش کی جائے کہ معاملہ حاکم کے پاس پہنچے، پھر اس کا ثبوت ہو، اور اس کو سزا ملے، تاکہ آئندہ یہ بھی باز رہے، اور لوگوں کو بھی عبرت حاصل ہو۔

قرآنی آیت

قالَ اللہ تَعَالَیٰ: الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ. (النور:۲)

ترجمہ:- زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو پورا کرنے کے معاملہ میں تمہیں ان پر کوئی رحم نہ آئے، اگر تم اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حد جاری کرنے کے معاملہ میں ان پر ذرا بھی رحم کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس آیت کو پیش کرکے بتلانا چاہتے ہیں کہ اس معاملہ میں کسی کی کوئی سفارش قبول نہ کی جائے۔

اس معاملہ میں تم سفارش کرتے ہو؟

حدیث ۱۷۷۰:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها: أَنَّ قُرَيْشاً أَهَمَّهُمْ شَأْنُ الْمَرْأَةِ الْمَخْزُومِيَّةِ الَّتِي سَرَقَتْ، فَقَالُوا: مَنْ يُكَلِّمُ فِيهَا رَسُولَ اللهِ ﷺ؟ فقالوا: وَمَنْ يَجْتَرِءُ عَلَيْهِ إِلَّا أُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ، حِبُّ رَسُولِ اللهِ ﷺ. فَكَلَّمَهُ أُسَامَةُ،

فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ : أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ تَعَالَى ؟! ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ، ثُمَّ قَالَ: إِنَّمَا أَهْلَكَ الَّذِينَ قَبْلَكُمْ أَنَّهُمْ كَانُوا إِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الشَّرِيفُ تَرَكُوهُ، وَإِذَا سَرَقَ فِيهِمُ الضَّعِيفُ، أَقَامُوا عَلَيْهِ الحَدَّ، وَايْمُ اللهِ! لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. (متفق عَلَيْه)

وفی روایةٍ: فَتَلَوَّنَ وَجْهُ رَسُولِ الله صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ ، فَقَالَ: أَتَشْفَعُ فِي حَدٍّ مِنْ حُدُودِ اللهِ!؟ فَقَالَ أُسَامَةُ: اسْتَغْفِرْ لِي يَا رَسُولَ اللهِ. قَالَ: ثُمَّ أَمَرَ بِتِلْكَ المَرْأَةِ فَقُطِعَتْ يَدُهَا.

ترجمہ مع مختصر تشریح:- حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ قبیلۂ مخزوم کی اس عورت کے معاملہ نے قریش کو بہت فکر میں ڈال دیا جس نے چوری کی تھی (یہ واقعہ فتحِ مکہ کے وقت کا ہے کہ قبیلۂ مخزوم کی ایک عورت فاطمہ بنت اسود سے چوری کا صدور ہوا اور وہ معاملہ نبیٔ کریم صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں پہنچ گیا، چوری کا ثبوت بھی ہو گیا ادھر قریش کو بڑی فکر لاحق ہوئی کہ یہ عورت قبیلۂ مخزوم کی ہے جو قریش کا باعزت قبیلہ ہے، اگر چوری کی وجہ سے اس کا ہاتھ کاٹا گیا تو یہ اس کے لیے بھی اور پورے خاندان کے لیے بھی بڑی بے عزتی کی چیز ہو گی، اس لیے کوئی ایسی تدبیر و کوشش ہونی چاہیے کہ اس کا ہاتھ کٹنے کی نوبت نہ آئے۔ حضراتِ صحابہ کو معلوم نہیں تھا کہ یہ ایسا معاملہ ہے کہ جس میں سفارش نہیں چل سکتی، اس لیے ان کی آپس میں میٹنگ ہوئی اور اس بات پر غور و فکر ہوا کہ کون ہے جو اس معاملہ میں حضورِ اکرم صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کی خدمت میں جا کر سفارش کرنے کی ہمت کرے) آپس میں کہنے لگے کہ اس سلسلہ میں حضور صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سے کون بات کرے گا؟ (اس لیے کہ حضورِ اکرم صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ سے اس قسم کی بات کرنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی) پھر انہوں نے آپس میں طے کیا کہ اس سلسلہ میں بات کرنے کی ہمت حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے علاوہ اور کوئی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ نبیٔ کریم صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کے محبوب اور لاڈلے ہیں

(حضورِ اکرم ﷺ ان سے بڑی محبت فرماتے تھے، ان کے والد حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بھی نبی کریم ﷺ بڑی محبت فرماتے تھے، ان کا لقب بھی حِبُّ الرسول تھا) چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں نبی کریم ﷺ سے گفتگو کی (کہ آپ اس کو معاف کر دیجئے) دوسری روایت میں یہ ہے کہ حضرت اُسامہ کی اس بات کو سن کر نبی کریم ﷺ کے چہرۂ انور کا رنگ مارے غصے کے بدل گیا اور آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی سزاؤں میں سے ایک سزا کے سلسلے میں تم سفارش کرتے ہو؟ یہ سن کر حضرت اُسامہ سہم گئے اور درخواست کی کہ: اے اللہ کے رسول! میرے لیے دعائے مغفرت کیجئے، مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔

(روای کہتے ہیں کہ حضرت اسامہ کو تو تنبیہ فرمادی؛ لیکن حضور ﷺ جانتے تھے کہ یہ بھی لوگوں کے کہنے سے سفارش کرنے آئے ہیں اور اس سلسلہ میں امت کو رہنمائی کرنے کا ایک موقعہ تھا) اس لیے نبی کریم ﷺ کھڑے ہوئے اور آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں ارشاد فرمایا: تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں ان کو اسی بات نے ہلاک و برباد کر دیا کہ ان میں جب کوئی شریف اور اونچے گھرانے کا آدمی چوری کرتا تھا (تو اس پر شریعت کی مقرر کردہ سزا جاری نہیں کرتے تھے) اس کو چھوڑ دیتے تھے، اور جب کوئی کمزور و معمولی درجہ کا آدمی چوری کرتا تھا تو اس پر سزا جاری کرتے تھے۔ پھر فرمایا: اللہ کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (اعاذھا اللہ منھا) بھی چوری کرے گی تو میں اس کا ہاتھ کاٹوں گا۔

(حضرت لیث بن سعد کی روایت میں یہ ہے کہ جب یہ جملہ آئے تو "أعاذھا اللہ منہا" کہنا چاہیے۔)

حضور ﷺ کے چہیتے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا قصہ

افادات:- حضرت زید رضی اللہ عنہ دراصل غلام تھے، ان کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ ان کے قبیلے پر دوسرے قبیلے والوں نے چھاپا مارا (اس زمانے میں لوٹ مار چلتی رہتی تھی، ایک قبیلہ دوسرے کے اوپر حملہ آور ہو کر ان کے ساتھ زیادتیاں کرتا تھا) اس حملے میں دوسرے قبیلے والوں نے ان کے قبیلے کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کرلیا، مال بھی لوٹ لیا، اس میں حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی گرفتار کئے گئے اور ان کو مکہ مکرمہ لاکر بیچ دیا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ نے ان کو خریدا، جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کا نکاح حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہوا تو انہوں نے ان کو نبی کریم ﷺ کو ہبہ کردیا۔ ان کے والد ان کی جدائی میں بہت غمگین رہتے تھے، اور ان کی جستجو و تلاش میں تھے کہ میرا بیٹا کہاں ہے، لوگوں سے پوچھتے رہتے تھے، ہر آتے جاتے قافلوں سے بھی دریافت کرتے رہتے۔ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے، انہوں نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو دیکھا تو جاکر ان کے والد کو اطلاع کی کہ تمہارا بیٹا وہاں ہے۔ چناں چہ ان کے والد ان کے چچا کو لے کر مکہ مکرمہ آئے، اور معلوم کیا کہ ہمارا بیٹا کس کی غلامی میں ہے، معلوم ہوا کہ حضورِ اکرم ﷺ کی غلامی میں ہے، تو دونوں بھائی حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان کے والد نے حضور ﷺ کے سامنے سارا معاملہ رکھا کہ میں اپنے بیٹے کو لینے کے لیے آیا ہوں، اور آپ تو بڑے شریف ہیں اور آپ کے بہت اونچے اوصاف ہیں، آپ تو لوگوں کے ساتھ احسان کرتے ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے جواب

میں ارشاد فرمایا: ٹھیک ہے! مگر پہلے ان سے تو معلوم کرلیا جائے کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ آنے کے لیے تیار بھی ہیں یا نہیں؟ اگر وہ آنا چاہتے ہیں تو میں نہیں روکوں گا، میری طرف سے ان کو اجازت ہے؛ لیکن اگر وہ آپ کے ساتھ آنا نہیں چاہتے تو میں تمہارے ساتھ زبردستی کیسے بھیجوں؟ ان کے والد یہ سمجھتے تھے کہ وہ تو ساتھ آہی جائے گا، چناں چہ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے والد اور چچا کو بٹھاکر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں۔ پوچھا: کون ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں، اگر تم کو ان کے ساتھ جانا ہے تو میری طرف سے تم کو اجازت ہے۔ انہوں نے فوراً کہا: میں تو جانا نہیں چاہتا، آپ کے پاس ہی رہنا چاہتا ہوں۔ ان کے والد بہت سٹپٹائے اور ناراض بھی ہوئے کہ عجیب آدمی ہو، غلامی کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ: میں نے ان سے جو سلوک دیکھا ہے اس کے بعد میں آپ لوگوں کے ساتھ آنا پسند نہیں کرتا۔ جب انہوں نے یہ کہا تو نبیٔ کریم ﷺ نے ان کو آزاد بھی کردیا اور ان کو اپنے ساتھ لے کر حرم میں گئے اور اعلان کیا کہ سب لوگ گواہ رہو کہ آج سے میں نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا۔ اور اس زمانے میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی آدمی کسی کو منھ بولا بیٹا بنالیتا تھا تو اسی کی طرف اس کی نسبت کرتے تھے، جیسے سگے باپ کی طرف کی جاتی ہے۔ چناں چہ لوگ ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارنے لگے۔ بعد میں جب سورۂ احزاب کی آیت نازل ہوئی جس میں منھ بولے بیٹوں کو بجائے حقیقی باپ کے بیٹا بنانے والے کی

طرف منسوب کرنے کی ممانعت آئی، اور حکم آیا کہ حقیقی باپ کی طرف منسوب کرو۔ چناں چہ اس کے بعد ان کو زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

مشہور قیافہ شناس کی گواہی

حضرت زید رضی اللہ عنہ حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بڑے لاڈلے تھے، ان کے صاحبزادے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ ہیں، حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہ جنہوں نے نبیٔ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بچپن میں کھلایا تھا انہیں کے ساتھ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا، اور انہیں سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔ چوں کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ بڑے حسین و جمیل تھے؛ لیکن ماں حضرت ام ایمن حبشیہ سیاہ فام تھیں اس لیے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا رنگ سانولا تھا، تو بعض لوگ ان کی رنگت کی وجہ سے اور چہرہ باپ کے مشابہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کے نسب کے معاملہ میں شک وشبہ کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ دونوں مسجدِ نبوی کے صحن میں چادر اوڑھے لیٹے ہوئے تھے، دونوں کے چہرے ڈھنپے ہوئے تھے اور پاؤں کھلے ہوئے تھے، عرب کا ایک مشہور قیافہ شناس مُجَزِّز مُدْلِجِي جب وہاں سے گزرا اور اس نے دونوں کے پاؤں دیکھے تو کہا: ”إِنَّ هٰذِهِ الْأَقْدَامَ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ“ یہ دونوں پاؤں باپ بیٹے کے معلوم ہوتے ہیں، یہ سن کر حضورِ اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو بڑی مسرت ہوئی۔ (بخاری و مسلم)

چوں کہ اہلِ عرب قیافہ شناسوں کی باتوں کو بڑی اہمیت دیتے تھے، گویا ایک ایسے آدمی کی بات سے اس کی تائید ہوگئی جن پر ان لوگوں کو بھی اعتماد تھا۔

میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں

خیر! حضرت زید رضی اللہ عنہ کی وجہ سے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑی محبت فرماتے تھے۔ بخاری شریف میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو اپنی ایک ران پر بٹھایا اور اپنے نواسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دوسری ران پر بٹھایا اور فرمایا: ''اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أُحِبُّهُمَا وَأَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهُمَا'' اے اللہ! مَیں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، جو ان دونوں سے محبت رکھے تو ان سے محبت رکھیو۔ (بخاری شریف، بَابُ مَنَاقِبِ الْحَسَنِ وَالْحُسَيْنِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا)

تحقیر؛ فتنہ میں مبتلا کرتی ہے

بہر حال! حضرت اسامہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے لاڈلے تھے، اور عام طور پر سفر میں جب یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے تو حضور ان کو اپنی سواری پر اپنے پیچھے بٹھاتے تھے۔ حجۃ الوداع کے موقعہ پر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عرفات سے مزدلفہ روانہ ہو رہے تھے، غروبِ شمس ہو چکا تھا، روانگی کی تیاری تھی، لیکن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کا انتظار فرما رہے ہیں، اس وقت یمن کے کچھ معزز حضرات بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، وہ آپس میں سرگوشی کرنے لگے

کہ: کس کی وجہ سے تاخیر ہو رہی ہے؟ اتنے میں دیکھا کہ ایک نوجوان آیا اور اس کو نبیٔ کریم ﷺ نے اونٹ پر اپنے پیچھے بٹھایا اور روانہ ہوئے، وہ حضرت اسامہ تھے۔ اور چوں کہ یہ لوگ یمن والے تھے حضرت اسامہ کو پہچانتے نہیں تھے، اور حضرت اسامہ سانولے رنگ کے جوان لڑکے تھے، ناک بھی چپٹی تھی، ان کی شکل و صورت دیکھ کر وہ لوگ آپس میں کہنے لگے کہ: ان کی وجہ سے ہمیں رکنا پڑا؟ گویا ان کو معمولی سمجھا۔

اس واقعہ کو نقل کرنے والے حضرت عروہ بن زبیر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم ﷺ کی وفات کے بعد ارتداد کا جو فتنہ پھیلا اور یمن کے لوگ ارتداد میں مبتلا ہوئے؛ وہ ان کی اسی تحقیر کی وجہ سے ہوئے۔ اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ کسی کو بھی معمولی اور حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔

”قانون کی نگاہوں میں سب برابر ہیں“ کا مطلب

اس روایت سے نبیٔ کریم ﷺ نے یہ واضح فرمادیا کہ شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں کو جاری کرنے کے معاملہ میں کسی کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ ”قانون کی نگاہوں میں سب برابر ہیں“ کا یہی مطلب ہے کہ جس گناہ کے لیے جو قانون مقرر کیا گیا ہے اس کا ارتکاب چاہے کوئی بڑا کرے تو اس پر بھی وہ سزا جاری کی جائے گی، بڑا ہونے کی وجہ سے اس کی رعایت نہیں کی جائے گی۔ اور چھوٹے نے وہ قصور کیا ہو تو اس پر بھی وہی سزا جاری کی جائے گی۔

باب النهی عن التغوط فی طریق الناس وظلهم وموارد الماء ونحوها

لوگوں کے راستے میں یا لوگ جہاں سایہ حاصل کرتے ہوں یا پانی کی جگہوں پر پیشاب پاخانہ کرنے کی ممانعت

قَالَ اللہ تَعَالَی: وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوابُهْتَاناًوَإِثْماًمُبِيناً.(الأحزاب:۵۸)

ترجمہ:- جو لوگ ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں کو بغیر اس کے کہ انہوں نے کوئی ایسا کام کیا ہو (جس کی وجہ سے ان کو تکلیف دی جائے) تکلیف دیتے ہیں، تو وہ ایسا کر کے اپنے اوپر بہت بڑا بہتان اور بڑے گناہ کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

افادات:- معلوم ہوا کہ کوئی بھی ایسا کام جس سے ایمان والوں کو تکلیف پہنچتی ہو؛ اس کا ارتکاب حرام ہے۔ پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ کسی بھی کام سے کسی کو بے جا تکلیف پہنچے، جیسے راستے میں ایسی پارکنگ کر دی جس کی وجہ سے آنے جانے والوں کے لیے تکلیف ہو؛ تو یہ حرام ہے۔

لعنت والے دو کام

حدیث ۱۷۷۱:-

وعن أَبِی هريرة رضی الله عنه: أَنَّ رَسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: اتَّقُوا اللاَّعِنَيْنِ. قالوا: وَمَا اللاَّعِنَانِ؟ قَالَ: الَّذِی يَتَخَلَّى فِی طَرِيقِ النَّاسِ أَوْ فِی ظِلِّهِمْ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: دوایسے کام جو لعنت کو لانے والے ہیں ان سے بچو (یعنی جس کی وجہ سے لوگ ان کاموں کے کرنے والوں پر لعنت کرتے ہیں) صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: لعنت والے دو کام کونسے ہیں؟ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لوگوں کے راستے میں یا جہاں لوگ سایہ حاصل کر کے بیٹھتے ہوں وہاں قضائے حاجت کرنا۔

افادات:- راستے میں کسی نے پاخانہ کر دیا تو جو بھی وہاں سے گزرے گا وہ برا بھلا کہے گا کہ کس نالائق اور کس کمبخت نے ایسا کیا۔ گویا یہ حرکت آدمی کے لیے لعنت کا باعث بنتی ہے۔ اسی طریقہ سے جہاں درخت کا سایہ ہے، یا ایسی جگہ ہے جہاں لوگ جائز کام کے لیے بیٹھتے ہیں، جیسے: دیہاتوں میں عام طور پر اس کا دستور ہوتا ہے؛ وہاں پیشاب پاخانہ کرنے کے متعلق بھی یہی وعید ہے۔ اور سایہ تو گرمی کے زمانہ میں حاصل کیا جاتا ہے لیکن جہاں لوگ سردی کے زمانہ میں دھوپ کھانے کے لیے بیٹھتے ہوں؛ اس کا بھی وہی حکم ہے۔

ایک اور مسئلہ

اوراس جگہ پر ایک مسئلہ یہ بھی لکھاہے کہ وہ جگہ اگرایسی ہے جہاں لوگ ناجائز کام کے لیے بیٹھتے ہوں ،مثلاً:لوگ وہاں جوا کھیلنے ،یاسینمادیکھنے کے لیے،یاکسی بھی حرام وناجائز کام کے لیے بیٹھتے ہیں؛توپھر وہاں پاخانہ کرنے میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

باب النهی عن البول ونحوه فی الماء الراكد

ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب وغیرہ کرنے کی ممانعت

حدیث ۱۷۷۲:-

عن جابر رضی الله عنه: أنَّ رسولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهَى أَنْ يُبَالَ فِي المَاءِ الرَّاكِدِ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا۔

افادات:- اس کا مطلب یہ نہیں کہ بہتے ہوئے پانی میں پیشاب کرسکتے ہیں، وہاں بھی کرنی تو نہیں چاہیے؛ لیکن اگر کوئی کرلے گا تو اس کا اثر پانی کے بہاؤ کی وجہ سے جلدی ختم ہو جائے گا، اور ٹھہرے ہوئے پانی میں کوئی آدمی اگر پیشاب کرے گا تو اس کا اثر ختم نہیں ہو گا، اور یہی چیز آگے چل کر اس پانی کو خراب وفاسد کرنے کا سبب بنے گی؛ اس لیے اس سے خصوصیت سے منع فرمایا۔

باب كراهة تفضيل الوالد بعض أولاده على بعض في الهبة

باپ کا اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو دوسری اولاد کے مقابلے میں بخشش اور ھدیے کے معاملہ میں ترجیح اور فضیلت دینا

باپ کا اپنی اولاد میں سے کسی کو بخشش اور ھدیے کے معاملہ میں ترجیح اور فضیلت دینا

ماں یا باپ اپنی اولاد کو کوئی چیز دیتے ہیں تو اس میں بعض مرتبہ تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک کو دیا اور دوسروں کو محروم کر دیا، یا سب کو دیا لیکن کسی کو زیادہ اور کسی کو کم دیا۔ یہ باب قائم کر کے بتلاتے ہیں کہ ایسا طریقہ اختیار کرنا شریعت کی نگاہوں میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں روایت پیش کرتے ہیں۔

حدیث ۱۷۷۳:-

عن النعمان بن بشير رضى الله عنهما: أنَّ أباه أتى بِهِ رسُولَ اللهِ ﷺ فقال: إنِّي نَحَلْتُ ابْنِي هَذَا غُلاماً كَانَ لِي، فقال رسولُ الله ﷺ: أكُلَّ وَلَدِكَ نَحَلْتَهُ مِثْلَ هَذَا؟ فقال: لا، فقالَ رسولُ اللهِ ﷺ: فَأَرْجِعهُ.

وفي روايةٍ: فقال رسولُ اللهِ ﷺ: أَفَعَلْتَ هذا بِوَلَدِكَ كُلِّهِمْ؟ قال: لا، قال: اتَّقُوا الله، واعْدِلُوا فِي أَوْلادِكُمْ. فَرَجَعَ أبي، فَرَدَّ تِلْكَ الصَّدَقَةَ.

وفی روایةٍ: فقال رسولُ اللهِ ﷺ: یَابَشِیْرُ! أَلَكَ وَلَدٌ سِوَی هَذَا؟ فقالَ: نَعَمْ، قال: أَكُلَّهُمْ وَهَبْتَ لَهُ مِثْلَ هذَا؟ قال: لا. قال: فَلَا تُشْهِدْنِي إذاً فَإِنِّي لَا أَشْهَدُ عَلَى جَوْرٍ.

وفی روایةٍ: لَا تُشْهِدْنِي عَلَى جَوْرٍ.

وفی روایة: أَشْهِدْ عَلَى هذَا غَيْرِي! ثُمَّ قال: أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فی البِرِّ سَوَاءً؟ قال: بَلَى، قال: فَلَا إذاً.

(متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے ابا حضرت بشیر رضی اللہ عنہ ان کو لے کر نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: میں نے اپنے اس بیٹے کو ایک غلام ہدیہ و بخشش میں دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے دریافت کیا: کیا تم نے اپنی تمام اولاد کو اسی طرح ہدیے میں غلام دیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اس کو واپس لے لو۔

دوسری روایت میں یہ ہے: حضور اکرم ﷺ نے پوچھا: تم نے ایسا معاملہ اپنی تمام اولاد کے ساتھ کیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اور اپنی اولاد کے معاملہ میں انصاف سے کام لو۔ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ابا نے وہ غلام مجھ سے واپس لے لیا۔

تیسری روایت میں یہ ہے: نبی کریم ﷺ نے ان سے پوچھا: اے بشیر! کیا اس کے علاوہ بھی تمہاری اولاد ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے پوچھا: تم نے سب کو اسی طرح دیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایسی بات پر مجھے گواہ نہ بناؤ؛ مَیں ایسی ناانصافی کی بات پر گواہ نہیں بنتا۔

ایک اور روایت میں یہ ہے: تم مجھے ایسی ناانصافی کی بات پر گواہ مت بناؤ۔

ایک اور روایت میں یہ ہے: کسی دوسرے کو گواہ بناؤ۔ پھر فرمایا: اے بشیر! کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری اولاد تمہارے ساتھ حسنِ سلوک کے معاملہ میں برابر رہے؟ (یعنی کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمام اولاد تمہاری خدمت کرے، اور تمہاری بات مانے اور تمہارے ساتھ اچھائی سے پیش آئے؟ ظاہر ہے کہ تمام ماں باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے، کوئی بھی یہ نہیں چاہتا کہ ایک ہی میرا فرمانبردار ہو اور باقی تمام نافرمان ہوں) انہوں نے کہا: کیوں نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر ایسا مت کرو (یعنی جب تمہاری یہ خواہش ہے تو پھر تمہاری بھی ذمہ داری ہے کہ تم بھی تمام اولاد کے ساتھ برابری کا سلوک کرو۔)

واقعہ/روایت کا پس منظر

افادات:۔ یہ ایک واقعہ ہے جو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں پیش آیا تھا جس کو یہاں بیان کیا ہے، اور علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے کئی روایتوں کے مختلف الفاظ پیش کئے ہیں۔ روایتوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی والدہ کا نام عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہ تھا جو حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں (عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ انصار میں سے بڑے جلیل القدر صحابی ہیں، شاعر بھی تھے، غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے ہیں) وہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، اور یہ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر سب سے پہلے

بیعت کی تھی، جس وقت سقیفۂ بنو ساعدہ میں بیعت والا واقعہ پیش آیا اور حضرت ابو بکر سے حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے درخواست کی تھی کہ آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے، ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہتے ہیں، جب حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ بڑھایا تو یہ دونوں حضرات ان کے ہاتھ پر بیعت ہوں اس سے پہلے حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے ہاتھ پکڑلیا اور سب سے پہلے بیعت ہوگئے۔ ان کا تعلق قبیلۂ خزرج سے ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب حضرت عمرہ بنت رواحہ رضی اللہ عنہ حضرت نعمان رضی اللہ عنہ سے حاملہ تھیں، جب ولادت کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے شرط رکھی کہ بچہ پیدا ہونے والا ہے، اگر تم میرے اس ہونے والے بچہ کو ہدیہ میں باغ دو، تب تو مَیں اس کی پرورش کروں گی اور اس کا خیال رکھوں گی، ورنہ مَیں اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ حضرت بشیر رضی اللہ عنہ نے ایک باغ ہدیہ میں دینے کی آمادگی پہلے ظاہر کی؛ لیکن پھر ان کا دل نہیں مانا تو انہوں نے وہ باغ ہدیے میں نہیں دیا۔ ان کی اور بھی بیویاں تھیں جن سے اور اولاد بھی تھیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس روایت میں تو غلام کا تذکرہ ہے؟ تو شراح نے اس کی یہی تشریح فرمائی ہے کہ پہلے یہی شکل پیش آئی تھی، مسلم شریف کی روایت سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت انہوں نے وہ باغ نہیں دیا، پھر کچھ زمانہ گزر گیا پھر بھی حضرت عمرہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اصرار باقی رہا تو انہوں نے ایک غلام دینے کا ارادہ کیا، اور چوں کہ پہلے باغ دینے کا ارادہ کیا تھا پھر ارادہ ترک

کر دیا تھا، تو ان (حضرت عَمرہ رضی اللہ عنہ) کو اندیشہ لاحق ہوا کہ غلام کے معاملہ بھی کہیں ایسا ہی نہ ہو، اس لیے انہوں نے ضروری سمجھا کہ بات پکی کروالی جائے اس لیے انہوں نے کہا کہ اس وعدہ پر نبیٔ کریم ﷺ کو گواہ بناؤ؛ تاکہ بعد میں اس وعدہ سے پھرنے کی نوبت نہ آئے۔ چناں چہ وہ حضرت نعمان کو اپنی گود میں اُٹھا کر لے گئے اور نبیٔ کریم ﷺ سے جو کچھ عرض معروض ہوئی وہ اوپر روایت میں گزری، اور آپ حضرات نے سن لی۔

روایت سے مستنبط مسئلہ اور حکم

اسی روایت سے فقہاء نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ کوئی آدمی اگر اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو کچھ بخشش کرنا چاہتا ہو تو تمام ہی اولاد کو برابر بخشش کرے، چاہے لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔ اور اس بخشش کے معاملہ میں کسی ایک کو دوسرے پر فضیلت نہ دے، یعنی ترجیحی معاملہ نہ کرے۔ یعنی ایسا نہ کرے کہ کسی کو دیا اور کسی کو محروم رکھا، یا کسی کو زیادہ دیا اور کسی کو کم دیا؛ بلکہ سب کو یکساں طور پر دے۔

اب یہاں ایک یہ بات زیرِ بحث آتی ہے کہ سب کو یکساں طور پر دینا ضروری اور واجب ہے؛ یا مستحب اور بہتر کا درجہ رکھتا ہے؟ یہ چیز ائمۂ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ چناں چہ اکثر حضرات امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ اس بات کے قائل ہیں کہ: یہ فرض اور واجب نہیں ہے، بلکہ بہتر ہے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو ناپسندیدہ سمجھا جائے گا؛ لیکن اس کے باوجود اگر کسی نے اس

طرح دے دیا تو اس کا یہ عملی تصرف درست ہو جائے گا، اور جس کو دیا گیا ہے وہ اس کا مالک بن جائے گا۔یعنی باپ کے انتقال کے بعد دوسری اولاد یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ چیز واپس لاؤ تاکہ میراث میں تقسیم کیا جائے۔ کسی کی طرف سے ایسا مطالبہ نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے معاشرہ کا رواج

آج کل ہمارے معاشرہ میں بھی ایسی شکایتیں بہت ہوتی ہیں، خاص کر کسی کی اگر ایک سے زیادہ بیویاں ہیں تو ایسی نوبت آتی ہے کہ جس بیوی سے اس کا دل اُتر چکا ہے، یا جس بیوی کے ساتھ زیادہ ربط و ضبط نہیں ہے، اس کی اولاد کی طرف سے غفلت اور بے التفاتی برتتا ہے۔ اور جس بیوی کے ساتھ زیادہ تعلق ہوتا ہے اور جو ابھی اس کے دل پر قابض بنی ہوئی ہے، اس کی اولاد کے ساتھ زیادہ اچھائی کا سلوک کرتا ہے، خاص کر جبکہ اس کی طرف سے تقاضہ اور پریشر ”Pressure“ بھی ہو کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہمارے سماج میں ایسی جو شکلیں ہوتی ہیں وہ سراسر شریعت کے خلاف ہیں۔ باپ ہونے کی حیثیت سے اس پر اولاد کے لیے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے وہ تمام اولاد کے لیے یکساں ہے۔

اولاد کو یکساں نہ دینے کے نقصانات

اور حضور اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اس کی وجہ بھی بتلائی کہ جب کوئی ماں باپ ایسا کرتے ہیں تو اس سے بڑا نقصان ہوتا ہے:

(۱) ایک نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ اولاد کے اندر آپس میں بغض، کینہ اور حسد پیدا ہوتا ہے، اولاد میں سے جس کو نہیں دیا گیا ہے وہ اس کی دشمن بن جاتی ہے جس کو دیا گیا ہے، اور آئندہ چل کر اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ دو بھائیوں کے درمیان صلہ رحمی، اور حقوق کی ادائیگی کا جو معاملہ ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا، اور مصیبت تو یہ ہے کہ اس کا ذریعہ بھی ماں باپ بنے، انہوں نے ہی ان کے درمیان ایسی شکل پیدا کر دی، اگر ماں باپ کی طرف سے یہ معاملہ نہ ہوا ہوتا اور کسی ایک کو نہ دیا گیا ہوتا، تو ان کے آپس میں دشمنی پیدا نہ ہوتی۔ گویا قطع رحمی کا ذریعہ خود ماں باپ ہی بنے۔

(۲) دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اولاد میں سے جس کو نہیں دیا گیا وہ احساس کمتری کا شکار ہوتی ہے۔ وہ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی بھی ہماری خیر خبر لینے والا نہیں ہے۔ ہمارے ماں باپ کی ہم پر کوئی توجہ ہی نہیں ہے۔ وہ ہماری بھلائی نہیں چاہتے۔ اور اس کے نتیجہ میں ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں، ہمتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور ان کو اپنی لائن میں -چاہے پڑھنے پڑھانے میں لگی ہو، یا کاروبار و تجارت میں- جس نوع کی ترقی کرنی چاہیے وہ اسی کمزوری کی وجہ سے ترقی نہیں کر پاتی۔

(۳) تیسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ماں باپ کے متعلق نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں جس کے نتیجہ میں ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی ہے۔ وہ یہ سوچتا ہے کہ جب ہمارے ابا نے باپ ہوتے ہوئے ہمارے ساتھ ایسا معاملہ کیا کہ دوسروں کو دیدیا اور ہمیں نہیں دیا؛ تو پھر ہم ان کی خدمت کیوں کریں؟ ہم کیوں ان کے ساتھ بھلائی سے پیش آئیں؟ اسی کو

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: کیا تمہیں یہ بات پسند ہے کہ تمہاری تمام اولاد حسنِ سلوک کے معاملہ میں تمہارے ساتھ برابر ہو؟ تو پھر تم جو کرنے جا رہے ہو اگر وہی کروگے، تو کبھی بھی وہ ہونے والا نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ماں باپ کی یہ حرکت بہت ساری خرابیوں کو جنم دینے والی ہے اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس کے متعلق تاکید فرمائی۔

زندگی میں جائیداد تقسیم کرنے والوں کے لیے ہدایات

اب ایک بات یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنی زندگی میں اپنی اولاد کو دینا چاہتا ہے، جیسے بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ میں اپنی زندگی ہی میں اپنی جائیداد کو تقسیم کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہ پتہ نہیں میرے مرنے کے بعد کیا ہوگا! اگر آپ کو ایسا اندیشہ ہے تو تو پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ اپنی اولاد کو وصیت کر سکتے ہیں کہ مرے مرنے کے بعد میری جائیداد کو شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ کے مطابق تقسیم کی جائے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام کے حصے مقرر کیے جا چکے ہیں۔ پھر بھی آدمی اپنی زندگی ہی میں تقسیم کرنا چاہتا ہے تو فقہاء نے لکھا ہے کہ اس صورت میں تو لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو برابر دینا چاہیے۔ بہت سے ماں باپ ایسا کرتے ہیں کہ لڑکوں کو دیتے ہیں اور لڑکیوں کو کچھ نہیں دیتے؛ یہ بالکل درست نہیں ہے۔ ہاں! میراث کے طور پر جو ملتا ہے وہ ہمارا دیا ہوا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے میراث کے حق کے طور پر لڑکے کو ڈبل دیا اور لڑکی کو سنگل دیا۔

لیکن اگر کوئی آدمی زندگی میں باپ ہونے کی حیثیت سے دینا چاہیے گا تو وہ میراث نہیں ہے، اس لیے کہ آدمی جب تک زندہ ہے وہاں تک اس کی میراث کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اپنی زندگی میں وہ خود اپنے مال و جائیداد اور دیگر چیزوں کا مالک ہے۔ اور اس صورت میں باپ کی طرف سے جو کچھ دیا جارہا ہے اس کو میراث کا نام دینا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ تو بخشش اور ہدیہ ہے۔ اور بخشش کے لیے شریعت کا یہی قانون ہے کہ اپنی سب اولاد کو یکساں دیا جائے، چاہے وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں۔

ہاں! یہ ہوسکتا ہے کہ لڑکیوں کو پہلے کچھ دے چکے ہیں، مثلاً: جس وقت لڑکیوں کا نکاح کرایا تھا تو ان کو زیورات اور جہیز کے طور پر کچھ مال سامان دیا تھا، تو اب برابری کرنے کے لیے اگر اتنی مقدار کم کرکے ان کو دیا جائے تو اس کی گنجائش ہے۔ لیکن بہرحال سب کو یکساں طور پر دینا چاہیے۔

مخصوص حالات میں کمی بیشی کی اجازت ہے۔۔ فطری کمزوری

اب اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بالکل کمی بیشی کر ہی نہیں سکتے، بلکہ بعض مخصوص حالات میں مخصوص اسباب کی وجہ سے کمی بیشی کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً: کسی کے چار بیٹے ہیں، ان میں سے ایک بیٹا پیدائشی اور فطری طور پر کوئی بیماری لے کر آیا ہے جس کی وجہ سے اس کا جیسا نشو و نما ہونا چاہیے تھا اور اس کی جیسی ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی، سمجھ بوجھ کم رکھتا ہے، دوسرے بچے تو کاروبار میں بہتر طریقے سے لگ گئے اور سیٹ ہوچکے ہیں اور اس میں صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے اور اس کی نشو و نما

کماحقہٗ نہ ہونے کی وجہ سے وہ کمزور رہ گیا، تو اب آپ اس کی اس کمزوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کو کچھ زیادہ دیں، تاکہ آئندہ چل کر وہ بھی کسی پریشانی کا شکار نہ ہو؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

دینی مشغولیت

یا اولاد میں سے کوئی بیٹا دین کے کسی کام میں لگا ہوا ہے، جیسے: آپ نے اپنے کسی بیٹے کو عالم بنایا، اب ظاہر ہے کہ اس کو پڑھانا آپ کے حق میں اسی وقت مفید ہوگا جب کہ یہ بچہ آگے چل کر پڑھائے، تب ہی تو وہ صدقۂ جاریہ بن سکتا ہے، اگر پڑھنے کے بعد وہ بھی تجارت میں لگ گیا تو پڑھانے کا مقصد کیا حاصل ہوگا؟ لہٰذا اس بیٹے نے پڑھنے کے بعد یہی سلسلہ جاری رکھا، اب ظاہر ہے کہ اسی لائن پر چلنے کے نتیجہ میں وہ آپ کے کاروبار میں ویسا حصہ نہیں لے پاتا جیسا آپ کے دوسرے بیٹے لیتے ہیں، جس کی وجہ سے اقتصادی طور پر مالی اعتبار سے دوسرے بیٹوں کے مقابلہ میں کمزور ہے، تو یہ دیکھتے ہوئے کہ آگے چل کر اس کی دینی خدمات کا سلسلہ قائم رہے، اس کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے اس کو کچھ زیادہ دیا جائے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔

ایک بیٹا تبلیغ میں لگا ہوا ہے اور اس نے اپنے آپ کو اسی کے لیے فارغ کر رکھا ہے، تو آپ اس کی اس مشغولی کی وجہ سے اور آگے چل کر اس کے لیے اس سلسلہ میں اور زیادہ تقویت ہو اس کے پیشِ

نظر اس کو کچھ زیادہ دیتے ہیں؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں ” بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ایسوں کو زیادہ دینا چاہیے“۔

دلی چاہت اور رائے

ایک مرتبہ مدرسوں کے جلسوں میں میرا افریقہ جانا ہوا تھا، تو وہاں کے لوگوں سے مَیں نے ایک بات کہی کہ آپ کے خاندان کے اندر اگر آپ کے بھائی نے تعلیم حاصل کی ہے، تو اب آپ اس کو مجبور نہ کیجئے کہ وہ بھی آپ کے کاروبار میں آپ کی طرح برابر کا حصہ لے۔ آپ نے تو یہ علم پڑھا نہیں، اس لیے آپ کو تو پورے طور پر کاروبار میں حصہ لینا ہے؛ لیکن اس نے تو دینی علم حاصل کیا ہے، اب اگر یہ اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ پہنچا سکتا ہے تو اس کو اس کا موقعہ دیا جائے، اور آپ کی طرف سے اس کو فری ”Free“ کر دیا جائے۔ اس کو آپ ہی کی طرف سے یہ آفر ”Offer“ دیدی جائے کہ تم اپنے کام میں لگے رہو، اِدھر تجارت کی فکر نہ کرو، یہ سب ہم سنبھال رہے ہیں اور اس میں تمہارا شیئر ”Share“ اور حصہ رہے گا۔

یہ سوچ بالکل ہی غلط ہے

بہت سی مرتبہ ہمارے سامنے یہ بات آتی ہے کہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ دینی کام کرنے والا بھائی تو کوئی کام کرتا ہی نہیں ہے، ہم ہی کاروبار میں لگے ہوئے ہیں، اور ہم ہی محنت کرتے ہیں، وہ تو بس مفت کا کھاتا ہے۔ یہ سوچ بالکل ہی غلط ہے۔ ہمارے سامنے ایسے نمونے موجود ہیں۔ ایک مولوی صاحب ایک مدرسہ میں پڑھاتے تھے، ان کے بھائیوں نے ان کو مجبور کیا کہ تمہیں بھی ہمارے ساتھ دُکان پر لگنا ہی پڑے گا، وہ بے چارا میرے پاس آکر رونے لگا اور نہایت ہی پریشان تھا۔ میں نے کہا: جب بھائی مانتے ہی نہیں تو پھر کیا کریں گے، تمہارے لیے گھر میں جھگڑا ہے۔ لہٰذا اس کو پڑھانے کا سلسلہ ختم کر کے کاروبار میں لگنا پڑا۔

سوچو؛ کس کی ماننی چاہیے!

مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارا یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ہم محنت کرتے ہیں تو یہ کھاتا ہے اور ہمارے ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے، نبیِ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: ”إِنَّكُمْ لَتُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ“ یقیناً تمہاری مدد کی جاتی ہے اور تمہیں روزی دی جاتی ہے تمہارے کمزوروں کی وجہ سے۔ کس کو کس کی وجہ سے روزی ملتی ہے اس کی ہم کوئی گارنٹی نہیں دے سکتے۔ دیکھنے میں یہی

لگتا ہے کہ دُکان پر یہ بیٹھتا ہے، محنت یہ کرتا ہے، پیسے یہ کماتا ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں حقیقت یہ ہے کہ اِس کو جو کچھ مل رہا ہے، وہ اُس کی وجہ سے مل رہا ہے جو گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔

اب دنیا یہ کہتی ہے اور یہ بھی یہی سمجھتا ہے کہ مَیں کما رہا ہوں، اور میری وجہ سے روزی مل رہی ہے، اور نبی ٔ کریم ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ وہ جو بیٹھا ہوا ہے اُس کی وجہ سے اِسے روزی مل رہی ہے۔ اب سوچو کہ کس کی بات سچی مانی جائے؟ ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ نبی ٔ کریم ﷺ کی بات پر ہمیں ایمان رکھنا چاہیے۔

کون سی کمائی عمدہ ہے!

اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ جس طرح اپنی کمائی میں سے اس کو حصہ دے رہے ہیں؛ اسی طرح وہ بھی تو جو کچھ کما رہا ہے اس میں آپ کا حصہ لگ رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون سی کمائی عمدہ ہے! آپ جو کما رہے ہیں وہ دنیا کی کمائی ہے، اور وہ جو کما رہا ہے وہ آخرت کی کمائی ہے۔ اب اگر آخرت کی کمائی میں آپ کا حصہ لگ جائے؛ تو آپ کے لیے اس سے بڑی سعادت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے!

خلاصہ کلام

میں یہ عرض کررہا تھا کہ" اولاد کو دینے کے سلسلہ میں نبیؐ کریم ﷺ نے برابری کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی خارجی سبب کی وجہ سے اولاد میں سے کسی ایک کو زیادہ دیا جائے؛ تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ ہاں !یہ ضروری ہے کہ وہ وجہ, شرعی اور معقول ہونی چاہیے۔ کسی اولاد کو دانستہ طور پر نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو۔"

تحریم إحداد المرأة علی میت فوق ثلاثة أیام إلا علی زوجها أربعة أشهر وعشرة أیام

کسی عورت کا کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ منانا (ترکِ زینت کرنا) حرام ہے، سوائے شوہر کے؛

شوہر کی موت پر چار مہینے دس دن (ترک زینت کرکے) سوگ منانے کی اجازت ہے

”احداد“یعنی سوگ منانا یعنی ترکِ زینت کرنا۔ کسی کے شوہر کا انتقال ہو گیا تو اس کے لیے شریعت نے چار مہینے دس دن متعین کیے ہیں کہ ان دنوں میں وہ گھر سے باہر نہ نکلنے کے ساتھ ساتھ زینت والے رنگین کپڑے نہیں پہنے گی، خوشبو اور سرمہ، پاؤڈر اور کریم اور ایسی تمام چیزیں جو زینت کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں؛ ان کا استعمال نہیں کرے گی، جیسے: زیورات وغیرہ۔ گویا زینت چھوڑنے کا نام ”سوگ منانا“ ہے۔

سوگ منانے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حکم عورتوں ہی کے لیے خاص ہے، یعنی عورتیں ہی سوگ منائیں گی اور زینت نہیں کریں گی۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ شوہر کے معاملے میں چار مہینے دس دن سوگ منانے کا حکم ہے، اس کے علاوہ کسی اور رشتہ دار کے انتقال پر تین دن تک کا حکم ہے، اس سے زیادہ سوگ منانے کی کسی حال میں اجازت نہیں، اگر کوئی ایسا کرے گی تو اس پر وعید آئی ہے۔

اور اگر وہ نکاح والی عورت ہے اور اس کا شوہر زینت چھوڑنے سے اس کو منع کرتا ہے، تو اس صورت میں کسی اور رشتہ دار پر بھی ترکِ زینت کی اجازت نہیں ہوگی، اس کو شوہر کی بات ماننی پڑے گی۔

سوگ منانے میں ہمارے معاشرہ کا طرز

اب ہمارے یہاں کیا ہوتا ہے؟ سوگ منانا عورتوں کے ساتھ ساتھ مردوں نے بھی شروع کر دیا۔ اور پھر یہ سوگ تین دن نہیں چلتا، بلکہ بہت لمبا چلتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں کیا ہوتا ہے؟ مثلاً: کسی کا انتقال ربیع الاول میں ہوا ہے، اس کے سات مہینے کے بعد رمضان عید آئی تو گھر والے کہتے ہیں کہ اس سال ہم نئے کپڑے نہیں سلائیں گے، اور ہمارے یہاں کھانا نہیں پکے گا۔ یہ سب ہمارے سماج و معاشرہ میں ہو رہا ہے، حالاں کہ ایسا سوگ منانا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے۔ سوگ منانے کا حکم حدیث میں مخصوص لوگوں کے لیے اور مخصوص دنوں کے ساتھ دیا گیا ہے۔

اور عورت کو بھی سوگ منانا صرف ترکِ زینت میں ہے، اگر کوئی عورت سوگ منانے میں بھوکی رہے گی؛ تو اس کی اجازت نہیں ہے۔ شریعت نے جو طریقہ اور جتنا طریقہ اور جس کے لیے بتایا ہے؛

وہیں تک محدود رہے گا، اس کے آگے جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے وہ سب شریعت کے طریقے سے ہٹ کر ہے، اور ناجائز ہے۔

تعزیت بھی تین دن تک ہی ہو سکتی ہے

تعزیت کے لیے بھی شریعت نے تین دن کا وقت مقرر کیا ہے، اور جو لوگ جنازہ میں گئے ہیں ان کو بھی کہا گیا ہے کہ تدفین کے بعد مل کر وہاں سے چلے جاؤ، وہاں زیادہ نہ ٹھہرو۔ اور تین دن کے بعد اگر کوئی آدمی سفر سے آیا تو وہ تعزیت کر سکتا ہے؛ لیکن جو لوگ یہیں موجود تھے وہ تین دن کے بعد تعزیت نہیں کر سکتے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کسی کے یہاں ربیع الاول میں انتقال ہوا، اس کے سات مہینے کے بعد عید آئی تو لوگ اس کے گھر تعزیت کے لیے جاتے ہیں۔ ہمارے سماج و معاشرہ میں یہ بھی ہو رہا ہے جو بالکل درست نہیں ہے۔ شریعت کے احکام کے خلاف ہے۔ اس کا خیال رکھا جائے۔

حضرات اُمہات المؤمنین اور صحابیات نبی کریم ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرنے کے معاملہ میں کیسی پکی تھیں، وہ آگے آنے والے واقعات سے پتہ چلے گا۔

حضرات اُمہات المؤمنین کا طرزِ عمل

حدیث ۱۷۷۴:-

عن زينب بنتِ أبي سلمة رضى الله عنهما قالت: دَخَلْتُ عَلَى أُمِّ حَبِيبَةَ رضى اللهُ عنها، زَوجِ النَّبِيِّ- ﷺ -حِينَ تُوُفِّيَ أَبُوهَا أَبُو سُفْيَانَ بن حرب - رضى الله عنه -. فَدَعَتْ بِطِيبٍ فِيهِ صُفْرَةٌ خَلُوقٍ أَوْ غَيرِهِ. فَدَهَنَتْ مِنهُ جَارِيَةً، ثُمَّ مَسَّتْ بِعَارِضَيْهَا، ثُمَّ قَالَتْ: واللهِ مَا لِي بِالطِّيبِ مِنْ حَاجَةٍ، غَيْرَ أَنِّي سَمِعْتُ رسولَ اللهِ - ﷺ - يقُولُ عَلَى المِنْبَرِ: ((لا يَحِلُّ لامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَاليَوْمِ الآخِرِ أَنْ تُحِدَّ على مَيِّتٍ فوقَ ثَلاَثِ لَيَالٍ، إلاَّ عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً)). قالَتْ زَيْنَبُ: ثُمَّ دَخَلْتُ عَلَى زَيْنَبَ بنْتِ جَحْشٍ رضى الله عنها حين تُوُفِّيَ أَخُوهَا، فَدَعَتْ بِطِيبٍ فَمَسَّتْ مِنْهُ ثُمَّ قَالَتْ: أَمَا وَاللهِ مَا لِي بِالطِّيبِ مِنْ حَاجَةٍ، غيرَ أَنِّي سَمِعْتُ رسُولَ اللهِ - ﷺ - يقُولُ عَلَى المِنْبَرِ: ((لا يَحِلُّ لامْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللهِ وَاليَوْمِ الآخِرِ أَنْ تُحِدَّ على مَيِّتٍ فَوقَ ثَلاَثٍ، إلاَّ عَلَى زَوْجٍ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت زینت بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہ (جو اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہ کے اگلے شوہر حضرت ابو سلمہ کی بیٹی ہیں، انہوں نے حضورِ اکرم ﷺ کے گھر میں پرورش پائی، حضور اکرم ﷺ کی ربیبہ ہیں) فرماتی ہیں کہ میں اُم المؤمنین حضرت اُم حبیبہ رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئی جس زمانہ میں ان کے والد حضرت ابو سفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا (ان کا انتقال نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد ہوا تھا) اس وقت انہوں نے ایک خوشبو منگوائی جس میں پیلا پن تھا، اور وہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ایک بچی کو لگائی اور پھر جو اثر اپنے ہاتھوں

پر رہا اس کو اپنے گالوں پر پھیر لیا، اس کے بعد ارشاد فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے (یعنی اس وقت میں عمر کی جس منزل میں ہوں اور نبی کریم ﷺ دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں تو میرے دل میں خوشبو لگانے کی کوئی خواہش اور شوق نہیں ہے، پھر بھی میں نے اپنے رخسار پر خوشبو لگائی اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ) میں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جو عورت اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی کے انتقال پر تین دن سے زیادہ زینت کرنا چھوڑ دے، سوائے شوہر کے انتقال پر کہ؛ اس کے لیے عورت چار مہینے دس دن سوگ منائے گی۔

یہی حضرت زینت بنت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتی ہیں: اس کے بعد (کسی اور دن کا واقعہ ہے کہ) میں ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے پاس حاضر ہوئی جس زمانہ میں ان کے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا، انہوں نے بھی خوشبو منگوا کر اس میں سے کچھ اپنے اوپر لگائی، اس کے بعد فرمایا: اللہ کی قسم! مجھے خوشبو لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور شوق بھی نہیں، مگر یہ کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: جو عورت اللہ تعالیٰ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی کے انتقال پر تین دن سے زیادہ سوگ منائے، سوائے شوہر کے انتقال پر کہ؛ اس کے لیے عورت چار مہینے دس دن سوگ منائے گی۔

روایت کے اسباق

افادات: (۱) ”خَلُوق“ ایک مخصوص قسم کی خوشبو ہوتی ہے جو اس زمانہ میں عورتیں اپنے استعمال کے لیے تیار کرتی تھیں، جس میں زعفران کے علاوہ دوسری چیزیں بھی ملائی جاتی تھی؛ لیکن بڑا

حصہ زعفران کا ہوتا تھا اس لیے وہ پیلے رنگ کی ہوتی تھی، اور وہ عورتوں کی مخصوص خوشبو سمجھی جاتی تھی، مرد اس کو استعمال نہیں کرتے تھے۔

(۲) حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے تین بھائی تھے:

(الف) ایک تو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے تھے، یہاں وہ مراد نہیں ہیں، اس لیے کہ جس زمانہ میں غزوۂ اُحد پیش آیا تھا اس وقت حضرت زینب بنت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی عمر بہت کم تھی۔

(ب) دوسرے بھائی عبید اللہ بن جحش تھے۔ یہ وہی ہیں جن کے نکاح میں پہلے حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا تھیں، یہ دونوں ایمان لائے تھے اور دونوں ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے اور وہیں قیام کے زمانہ میں عبید اللہ نے اسلام کو چھوڑ کر نصرانیت اختیار کر لی تھی، اور بعد میں اسی حالت میں ان کی موت ہوئی۔ بعد میں حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے نکاح میں آئیں۔ نجاشی نے نکاح پڑھایا اور انہوں نے ہی مہر ادا کیا تھا اور حضور اکرم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی طرف سے چھوارے بھی تقسیم کئے تھے۔

(ج) ان کے تیسرے بھائی ابو احمد تھے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جن کے انتقال کا اس روایت میں تذکرہ ہے، وہ یہی ابو احمد ہیں۔

یہی جذبہ مطلوب ہے

(۳) دیکھئے! ان دونوں اُمہات المؤمنین نے اس ارشاد پر عمل کا کتنا زیادہ اہتمام فرمایا۔ چوں کہ قریبی زمانہ میں ایک کے والد کا اور دوسروں کے بھائی کا انتقال ہوا تھا، اور تین دن پورے ہو گئے تھے، ان کو خوشبو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی، پھر بھی قصداً خوشبو منگوا کر استعمال فرمائی، تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ خوشبو اس لیے نہیں لگا رہی ہیں کہ ان کے رشتہ دار کا انتقال ہو گیا ہے۔ یہ ہے نبیؐ کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ارشاد پر عمل کا اہتمام! جب تک کہ یہ کیفیت اور جذبہ ہمارے اندر پیدا نہ ہو وہاں تک وہ برکات ہمیں حاصل نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ان چیزوں کی طرف توجہ کی جائے۔

باب تحريم بيع الحاضر للبادي وتلقي الركبان والبيع على بيع أخيه والخِطبة على خطبته إلا أنْ يأذن أو يردّ

شہر کے رہنے والے کا دیہاتی کے لیے فروختگی کا معاملہ کرنا اور

جو قافلے مال لے کر شہر میں بیچنے کے لیے آرہے ہوں ان سے شہر سے باہر بالا ہی بالا سودا کرلینا

اوراپنے بھائی کے سودے پر سودا کرنا

اور کسی کے پیغام نکاح پر پیغام نکاح دینا ان سب باتوں کی ممانعت

خرید وفروخت سے متعلق نبی کریم ﷺ نے کچھ ہدایتیں ارشاد فرمائی ہیں یہاں ان کو بتلاتے ہیں۔

جو عنوان قائم کیا ہے اس میں پہلی بات یہ ہے کہ دیہات سے جو لوگ مال بیچنے کے لیے شہر میں آتے ہیں ان سے کوئی شہری یوں کہے کہ: تم اپنا سارا مال میرے پاس رکھ دو، جب بھاؤ اچھا ہوگا تو میں اس کو بیچ دوں گا۔یعنی شہری کا اس کے لیے دلال بن جانے اور بھاؤ بڑھنے تک اس مال کو روکے رکھنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔اگلی روایت میں اس ممانعت کی وجہ بھی آرہی ہے۔

حدیث ۱۷۷۵ :-

عن أنس - رضی الله عنه - قالَ: نَهَى رَسُولُ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - أَنْ يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ وَإِنْ كَانَ أَخَاهُ لِأَبِيهِ وَأُمِّهِ.

(متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شہری کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی دیہاتی سے اس کا مال فروخت کرنے کا معاملہ کرے، چاہے وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کی ایک روایت میں ہے جو آگے آرہی ہے کہ "وَلاَ يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ" کوئی شہری آدمی کسی دیہاتی کے لیے اس کے مال کو بیچنے کا معاملہ نہ کرے۔ گویا یہ شہری اس دیہاتی کا آڑتی نہ بن جائے، اسی کو حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں: "لاَ يَكُونُ لَهُ سِمْسَاراً" اس کا دلال نہ بن جائے۔

اور اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ جیسا اس حدیث میں دیہاتی کا تذکرہ ہے اور دوسری روایتوں میں تو اس بات کی صراحت بھی ہے کہ دیہات کا رہنے والا جب اپنا مال لے کر شہر میں بیچنے کے لیے آئے گا تو ایک تو وہ اپنا ایک نظام الاوقات بنا کر آئے گا کہ صبح جا کر شام کو واپس لوٹنا ہے، اس کی طبیعت پر یہ تقاضہ ہوگا کہ جلدی سے میرا مال بک جائے تو میں اپنے گھر لوٹ جاؤں۔ اور ظاہر ہے کہ جب کوئی آدمی مال لے کر بازار میں آتا ہے تو وہ نقصان کے ساتھ نہیں بیچتا۔ تو یہ دیہاتی بھی جو اپنا مال لے کر آیا ہے اس میں وہ اپنا نفع رکھ کر بیچے گا، اور ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنی واپسی کے لیے جو نظام بنایا ہے اس کو بھی

ملحوظ رکھے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جلدی سے فارغ ہونے کے لیے وہ لوگوں سے زیادہ قیمت نہیں مانگے گا، بلکہ ایک معتدل اور مناسب قیمت لگا کر وہ مال بیچ دے گا۔ اس کا فائدہ خریداروں کو یہ ہو گا کہ زیادہ دام نہ لینے کی وجہ سے ان کو آسانی ہو جائے گی۔ اسی لیے ایک روایت میں نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ: چھوڑ دو! اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے روزی دیتا ہے۔

اب اگر دیہاتی کے پاس سے یہ مال مقامی شہری آدمی لے لے، تو ظاہر ہے کہ اس کو تو واپسی کی جلدی ہے نہیں، وہ تو اس مال کو اپنے گودام میں رکھ دے گا اور اس بات کا انتظار کرے گا کہ جب بھاؤ بڑھیں گے تب میں اس کو بیچوں گا تاکہ نفع زیادہ ہو، تو اس کے اس طریقے کو اختیار کرنے کی وجہ سے خریدنے والوں کو براہِ راست دیہاتی سے خریدنے میں جو سہولت و آسانی تھی، اور وہی مال ان کو کم قیمت میں مل جایا کرتا تھا، وہ سہولت باقی نہیں رہی؛ اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔

لیکن اگر کوئی شہری کسی دیہاتی کا دلال بنتا تو ہے لیکن اس کی وجہ سے مقامی خریداروں کے لیے کوئی دشواری پیدا نہیں ہوتی؛ تو اس کی گنجائش بھی ہے۔ گویا ممانعت کی جو علت تھی وہ باقی نہیں رہتی تو اس صورت میں احناف کے یہاں اس کی اجازت ہے۔

”غُرَر“ اور ”ضَرَر“

حدیث ۱۷۷۶:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قالَ رسولُ اللہِ ﷺ : ((لَاتَتَلَقَّوُا السِّلَعَ، حَتّٰی یُهْبَطَ بِهَا إِلَى الأَسْوَاقِ)). (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو قافلے سامان لے کر باہر سے شہر میں فروخت کرنے کے لیے آتے ہیں، ان سے شہر سے باہر جاکر سامان خرید مت لیا کرو، جب وہ بازار میں آجائیں تب خریدو۔

افادات:- پہلے زمانہ میں باہر کے قافلے سامان لے کر شہر میں فروخت کرنے کے لیے آیا کرتے تھے تو شہر کے لوگ باہر جاکر ہی وہ تمام تجارتی سامان کا سودا کرلیا کرتے تھے، اس سے بھی نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔ اس سے منع کرنے کی دو وجہیں ہیں:-

(۱) ایک تو یہ ہے کہ ایسا کرنے میں ان قافلے والوں کے ساتھ دھوکہ دہی بہت ہوتی ہے، وہ اس طرح سے کہ یہ سامان خریدنے کے لیے شہر سے باہر جانے والا اس قافلے والوں سے اس سامان کا شہر میں جو بھاؤ چل رہا ہے وہ چھپاتا ہے، مثلاً: شہر میں اس سامان کا پانچ روپے کا بھاؤ چل رہا ہے، اور وہ قافلے والوں کو بتلاتا ہے کہ چار کا بھاؤ چل رہا ہے، اور اس طرح ان سے وہ مال چار میں خرید لیتا ہے۔ اب ان

قافلے والوں کو تو بعد میں پتہ چلے گا کہ وہ سامان بازار میں پانچ میں بک رہا ہے۔ تو شہر سے باہر جاکر قافلہ والوں کو شہر کے بھاؤ اور ریٹ سے اندھیرے اور غفلت میں رکھ کر ان سے فائدہ اٹھایا جو دھوکہ کی شکل ہے۔ گویا اس میں ''غُرَرْ'' ہے، اس لیے اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

(۲) اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ آدمی قافلہ والوں سے خرید کر شہر میں نہیں بیچتا، حالاں کہ شہر میں اس سامان کی تنگی ہوتی ہے، اور لوگوں کو اس سامان کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ایسا اس لیے کرتا ہے کہ اس سامان کی تنگی اور زیادہ ہو، یہاں تک کہ جب اس کے بھاؤ خوب اونچے چڑھ جائیں تب بیچوں۔ تو ایسا کرنے کی وجہ سے شہر والوں کے لیے نقصان ہوا، تو گویا اس میں ''ضَرَرْ'' ہے۔ اگر یہ باہر جاکر اس سامان کو نہ خریدتا، تو قافلے والے خود بازار میں آتے اور خریدنے والوں سے سودا کر کے بیچتے؛ تو شہر والوں کے دشواری پیش نہ آتی۔

پھر تو حرج نہیں

گویا اس میں یا تو ''غُرَر'' یعنی دھوکہ ہے، یا ''ضَرَر'' یعنی نقصان ہے، اس لیے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نے اس سے منع فرمایا۔ لیکن ممانعت کی دونوں علتیں اگر نہ پائی جائیں، یعنی قافلہ والوں سے شہر کا بھاؤ چھپایا نہیں، بلکہ صحیح ریٹ بتلا کر ان سے سودا کیا، اور پھر شہر میں لاکر تنگی پیدا نہیں کی، بلکہ اپنا معمولی نفع رکھ

کر اس سامان کو بیچ دیا، گویا نہ قافلہ والوں کو دھوکہ دیا اور نہ شہر والوں کو نقصان پہنچایا؛ تو اس صورت میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ایجنٹ اور دلال نہ بنے

حدیث ۱۷۷۷:-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قالَ رسُولُ اللهِ ﷺ: ((لاَ تَتَلَقَّوُا الرُّكْبَانَ، وَلاَ يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ)) فقالَ لَهُ طَاوُسٌ: مَا: لاَ يَبِيعُ حَاضِرٌ لِبَادٍ؟ قال: لاَ يَكُونُ لَهُ سِمْسَاراً. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: قافلہ والوں کے پاس پہلے سے جاکر مال نہ لو، اور کوئی شہر کا رہنے والا کسی دیہاتی کے لیے مال کی خرید و فروخت نہ کرے۔ تو ان کے شاگرد امام طاؤس نے اپنے استاذ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ”کوئی شہر کا رہنے والا کسی دیہاتی کے لیے مال نہ بیچے“ اس کا کیا مطلب ہے؟ حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے ارشاد فرمایا: وہ اس کا ایجنٹ اور دلال نہ بنے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں کسی ایک فریق کو نقصان ہوتا ہو، تب تو یہ حکم ہے؛ ورنہ گنجائش ہے۔

کسی بھی طرح نقصان پہنچانے سے منع فرمایا

حدیث ۱۷۷۸:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه قال: نَهَى رسولُ الله ﷺ أنْ يَبِيعَ حَاضِرٌ لِبَادٍ، وَلاَ تَنَاجَشُوا، وَلاَ يَبِيعِ الرَّجُلُ عَلَى بَيْعِ أخِيهِ، وَلاَ يَخْطُبْ عَلَى خِطْبَةِ أخِيهِ، وَلاَ تَسْأَلِ المَرْأَةُ طَلاَقَ أُخْتِهَا لِتَكْفَأَ مَا فِي إنَائِهَا.

وفي رواية قال: نَهَى رَسُولُ الله ﷺ عَنِ التَّلَقِّي، وَأَنْ يَبْتَاعَ المُهَاجِرُ لِلأعْرَابِيِّ، وَأَنْ تَشْتَرِطَ المَرْأَةُ طَلاَقَ أُخْتِهَا، وأنْ يَسْتَامَ الرَّجُلُ على سَوْمِ أخِيهِ، وَنَهَى عَنِ النَّجْشِ والتَّصْرِيَةِ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شہر کا رہنے والا کسی دیہاتی کے لیے مال بیچے۔ اور اگر خریدنے کا ارادہ نہ ہو تو قیمت میں اضافہ مت کرو۔ اور کوئی اپنے بھائی کے بیچنے پر نہ بیچے (بیع پر بیع نہ کرے) اور اپنے بھائی کے پیغام پر پیغام نہ دے۔ اور کوئی مسلمان عورت اپنی مسلمان بہن کی طلاق کا مطالبہ نہ کرے، تا کہ اس کے برتن میں جو کچھ ہے وہ اپنے برتن میں انڈیل لے۔

ایک اور روایت میں یہ ہے کہ: نبیٔ کریم ﷺ نے قافلے والے باہر سے جو سامانِ تجارت لے کر آتے ہیں ان سے شہر کے باہر ملاقات کر کے سامان خریدنے سے منع فرمایا۔ اور مہاجر (یعنی شہر کے اندر رہنے والا) دیہاتی کے لیے بیچنے کا معاملہ کرے اس سے بھی منع فرمایا (جیسا کہ اوپر آگیا) اور کوئی عورت اپنی مسلمان بہن کی طلاق کی شرط لگائے اس سے بھی منع فرمایا، کوئی آدمی اپنے بھائی کے بھاؤ پر بھاؤ کرے اس سے بھی منع فرمایا۔ اور خریدنے کا ارادہ نہ ہو پھر بھی

قیمت بڑھانے کے لیے بولی لگانے سے بھی، اور دودھ روک لینا تاکہ گاہک زیادہ دودھ نکلتا دیکھ کر خرید لے؛ اس سے بھی نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا (اس کا مطلب آگے بتلاتا ہوں)

افادات:- ”نجش“ یعنی نیلام۔ مثلاً: کہیں نیلام سے مال بک رہا ہو تو اس میں یہی ہوتا ہے کہ لوگ اپنا اپنا بھاؤ پیش کرتے ہیں، ایک نے دس کا بھاؤ دیا، دوسرا اس کے مقابلہ میں پندرہ کہتا ہے، پھر یہ بڑھاتا ہے کہ میں بیس دوں گا، اور جو آدمی زیادہ بھاؤ دیتا ہے اسی کے ہاتھوں میں وہ مال فروخت ہوتا ہے۔ اب ایک آدمی بھاؤ بڑھاتا ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے تاجر جو یہ مال لینے آئے ہیں وہ اس مال کا بھاؤ بڑھائیں؛ لیکن اس کا اپنا ارادہ اس سامان کے خریدنے کا نہیں ہے، تو دوسرے خریداروں کو بھاؤ بڑھا کر کہنے کے لیے مجبور کرنے کی وجہ سے ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کو ”نجش“ کہتے ہیں۔ اس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا، اس لیے کہ اس میں اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچانا ہے۔

”رِنگ (Ring) بنانا“ کیسا ہے؟

لیکن علماء نے لکھا ہے کہ جو آدمی سامان نیلام کر رہا ہے، اس سامان کا خریدنے والے اتنا بھاؤ بھی نہیں بول رہے ہیں جو اس سامان کا عام بھاؤ ہوتا ہے، اس صورت میں چاہے خریدنے کا ارادہ نہ ہو تب بھی اس مال کی قیمت اتنی بڑھا سکتا ہے جس سے بائع کو اس مال کی پوری قیمت مل جائے۔ مثلاً: اس سامان

کا عام بھاؤ پانچ سو روپے ہے، جب وہ سامان نیلام کے لیے پیش کیا گیا تو خریدنے آنے والے اس کا بھاؤ چار سو، ساڑھے چار سو بول رہے ہیں، کوئی اس سے آگے بڑھتا ہی نہیں۔

آج کل ایسا بہت ہو رہا ہے، ایک مرتبہ گودھرا سے ہمارے یہاں دارالافتاء میں سوال آیا تھا کہ ”رنگ بنا کر سامان خریدنا کیسا ہے؟“ ہم نے کہا کہ ”رنگ بنانا“ کیا ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آیا، تب انہوں نے یہ شکل بتائی کہ سرکاری لکڑیوں کا (لاٹ) لوٹ (جتھا) خریدنے جاتے ہیں تو تمام بیوپاری آپس میں سمجھوتہ کر لیتے ہیں کہ دیکھو! یہ آدمی خریدے گا اور اتنے میں خریدے گا، دوسرے کوئی بھی اس سے زیادہ قیمت نہیں بولیں گے، اس طرح وہ خرید لیتے ہیں اس کے بعد اس کا دوبارہ سودا کرتے ہیں اور جو زائد رقم آتی ہے وہ آپس میں بانٹ لیتے ہیں، اس کو ”رنگ بنانا“ بولتے ہیں۔ اور یہاں خریدنے والے سمجھوتہ اس لیے کر رہے ہیں تاکہ بائع کو اپنے مال کی قیمت پوری نہ ملے۔ لہٰذا اگر کوئی آدمی یہ دیکھ رہا ہے کہ خریدنے والے اس طرح سمجھوتہ کرکے اور رنگ بنا کر بائع کو نقصان میں ڈالنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ آدمی قیمت بڑھا کر بولتا ہے جس سے بائع کو اس مال کی پوری قیمت مل جائے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ اس صورت میں قیمت بڑھانے کو منع نہیں کیا گیا۔ اور اگر اس کا ارادہ خریدنے کا ہے اور بھاؤ بڑھاتا ہے؛ تب تو کوئی حرج کی بات ہے ہی نہیں۔

بھاؤ بڑھانے کی دو شکلیں

اب بھاؤ بڑھانے کی دو شکلیں ہیں، ایک شکل تو یہ ہے مالک کو پتہ نہیں اور کوئی دوسرا اس مال کی قیمت بڑھارہا ہے، اس صورت میں مالک گنہ گار نہیں ہے، وہ بڑھانے والا گنہگار ہو گا۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ مالک نے ہی اپنے گُرگے چھوڑ رکھے ہیں جو مجمع میں گھس کر بھاؤ بڑھاتے ہیں، جیسے: فٹ پاتھ پر کٹ پیس اور لوٹ شوٹ کی دکانیں لگتی ہیں، جس میں عام طور پر مالک ہی ایسے لوگوں کو چھوڑ رکھتا ہے کہ میں ایک بھاؤ بولوں تو دوسرا اس سے بڑھا کر بولے، تاکہ باہر سے کوئی خریدار آیا ہو وہ اس میں پھنس جائے؛ اس صورت میں دونوں گنہگار ہوں گے۔

اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے

''کوئی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے'' اس کی شکل یہ ہے کہ ایک آدمی کو کسی چیز کی ضرورت تھی، اس نے وہ خریدی، اور خریدنے والے نے اپنے لیے اختیار بھی رکھا تو شریعت کی طرف سے یہ بھی ایک سہولت اور فیسلیٹی دی گئی ہے۔ مثلاً: مجھے ایک گھڑی کی ضرورت تھی اور میں نے فلاں کے پاس سے دوسو روپے میں خریدی اور ساتھ ہی ساتھ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے تین دن کا اختیار ہے، اگر اس دوران میں چاہوں گا تو اس سودے کو کینسل کروں گا۔ یہ خیارِ شرط کہلاتا ہے، اور شریعت میں اس کی اجازت ہے۔ اب میں نے خیارِ شرط کے ساتھ یہ گھڑی خریدی ہے اس کا آپ کو پتہ ہے تو آپ میرے

پاس آئے اور پوچھا کہ: آپ یہ گھڑی کتنے میں لائے؟ میں نے کہا: دو سو روپے میں لایا۔ تو آپ کہتے ہیں کہ آپ اس کو واپس کر دو، ایسی ہی گھڑی میرے پاس ہے، اور میں آپ کو وہ ڈیڑھ سو میں دیتا ہوں۔ یہ ایک کی بیع پر بیع کرنا ہوا۔ اگر میں نے خیارِ شرط نہ رکھا ہوتا تو پھر میں یہ سودا کینسل نہیں کر سکتا تھا؛ لیکن چوں کہ میں نے اختیار رکھا ہے اس لیے سودا کینسل کر سکتا ہوں اور میرے اس معاملہ کا آپ کو پتہ ہے اس لیے آپ مجھے ایسا کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں؛ تو اس کی اجازت نہیں ہے۔ بیع پر بیع کرنے کی شکل یہی ہے۔

اپنے بھائی کے بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے

دوسری شکل یہ ہے کہ ابھی پکا سودا نہیں ہوا تھا، صرف بھاؤ تال چل رہا تھا، یہ آگے آ رہا ہے "عَلیٰ سَوْمِ أخِیہِ" یعنی بھائی کے بھاؤ پر بھاؤ نہ کرے، اس لیے بعض علماء نے بیع پر بیع کا مطلب یہ بھی بتلایا ہے کہ میں نے ابھی سودا پکا نہیں کیا تھا، ابھی تو بات چیت چل رہی ہے، مثلاً: میں نے پوچھا: یہ گھڑی کتنے میں بیچو گے؟ دوسرے نے کہا کہ: ڈھائی سو میں دوں گا، میں نے کہا: ڈھائی سو نہیں، بلکہ کم کرو، یہاں تک کہ دو سو پر بھاؤ پہنچا، آپ یہ سارا معاملہ دیکھ رہے ہیں اور آپ نے اندازہ کر لیا کہ میں دو سو میں خریدنے والا ہوں، میرا رجحان بھی ہو چلا تھا اور میری طبیعت دو سو پر آ چکی تھی اور میں خریدنے کے

لیے گویا آمادہ تھا ہی، اور آپ نے بیچ میں یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ یہ مت لو، میں آپ کو ایسی ہی گھڑی ڈیڑھ سو میں دیتا ہوں۔ تو یہ اپنے بھائی کے بھاؤ پر بھاؤ کرنا ہوا، جس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

ہاں !اس کی اجازت ہے

لیکن بھاؤ تال کرنے والے ابھی کسی ایک بات پر جمے نہیں ہیں، ابھی تو بھاؤ تال ہی چل رہا ہے، دونوں کا سودا نہیں ہوا ہے، یا دونوں کسی ایک بات پر جمے نہیں ہیں، اس سے پہلے دوسرا آدمی دخل دینا چاہے تو اس کی اجازت ہے۔

خریدنے پر خریدنا بھی ممنوع ہے

اور جس طرح بیع پر بیع کرنا ممنوع ہے، اسی طرح خریدنے پر خریدنا بھی ممنوع ہے۔ جیسے: میں کسی کے پاس سے گھڑی دو سو میں خرید رہا ہوں اور آپ آکر کہتے ہیں کہ میں یہ گھڑی سوا دو سو میں خریدتا ہوں، حالاں کہ وہ دو سو میں دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا، اور بات فائنل ہونے والی تھی کہ آپ نے بیچ میں کود کر میرے دو سو والے معاملہ کو رکوا دیا؛ یہ بھی ممنوع ہے۔ آج کل زمینوں کے معاملہ میں ایسا بہت ہوتا ہے کہ بات چیت طے ہونے والی ہوتی ہے اور دوسرے کو پتہ چلتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ وہ پانچ لاکھ دیتا ہے، لو! میں آٹھ لاکھ دیتا ہوں؛ یہ جائز نہیں ہے۔ بلکہ زمینوں میں تو سودا ہو چکنے کے بعد بھی لوگ پھر جاتے ہیں؛ یہ تو بالکل جائز نہیں ہے۔ ایسا کر کے وہ گنہگار ہوتے ہیں۔

پیغامِ نکاح پر پیغام دینے کی شکلیں

پیغام پر پیغام دینے کی کئی شکلیں ہیں اوران کے احکام بھی الگ ہیں:

پیغامِ نکاح کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ ابھی تو صرف پیغام وہاں بھیجا گیا، گھر والے ابھی تحقیق کررہے ہیں، انہوں نے اپنے دل میں کوئی معاملہ پکا سوچا نہیں ہے؛اس صورت میں تو دوسرے کو بھی گنجائش ہے کہ وہاں پیغامِ نکاح بھیجے۔ ایک نے بھیجا، دوسرے نے بھی بھیجا، تیسرے نے بھی بھیجا، اب وہ جہاں جی چاہے رشتہ کرے۔

دوسری شکل یہ ہے کہ ایک آدمی نے پیغام بھیجا، اور لڑکی والوں نے اس کے متعلق پوری تحقیق کرلی اوران کو اطمینان ہوگیا، اندرونی طور پر معاملہ طے ہوگیا، اب وہ بالکل تیار ہیں کہ کل ہاں کہلوادیں گے، اور رات میں کوئی بیچ میں کودا، اوراس نے کہا کہ ہمارے یہاں سے بھی اس کے لیے رشتہ ہے؛ تواس کی اجازت نہیں ہے۔

اور بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ رشتہ طے ہوجاتا ہے اور بعض لوگ ایسا کہہ کر تڑوا دیتے ہیں کہ اس سے اچھا رشتہ دلواتا ہوں ۔ یہ چیزیں آپس میں نفرت اور عداوت پیدا کروانے والی ہیں ۔ اسلامی تعلیمات تو یہ ہیں کہ ’’لَاتَبَاغَضُوْا،وَلَاتَنَافَرُوْا،وَلَاتَدَابَرُوْا‘‘ آپس میں بغض نہ رکھو، نفرت نہ رکھو، ایک

دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ اب ہم خود ہی ایسی حرکتیں کریں جس کے نتیجہ میں آپس میں نفرتیں اور دشمنیاں پیدا ہوں؛ تو ایسی شکلوں کی شریعت کبھی بھی اجازت نہیں دے گی۔

طلاق کا مطالبہ نہ کرے

"طلاق کا مطالبہ نہ کرے" اس کی بھی دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ کہ ایک عورت کسی کے نکاح میں پہلے سے موجود ہے، اب وہ مرد کسی دوسری عورت سے بھی نکاح کرنا چاہتا ہے، اور اس نے اس دوسری عورت سے کہا کہ میں تجھ سے نکاح کرنا چاہتا ہوں، تو اس عورت نے یہ شرط لگائی کہ تمہارے نکاح میں جو عورت پہلے سے ہے اس کو چلتی کرو، تب ہی میں تمہارے نکاح میں آسکتی ہوں۔ گویا اس نے سوچا کہ وہ اگر رہے گی تو اس کا حصہ رہے گا، اور اگر وہ نہیں رہی تو اس کے پورے حصے کی مَیں اکیلی مالک بن جاؤں گی

دوسری شکل یہ ہے کہ پہلے سے ایک عورت نکاح میں تھی، اور اس مرد نے دوسرا نکاح کیا، تو اس نے دھیرے دھیرے اس کے دل پر قبضہ جمایا اور اب اصرار کر رہی ہے کہ اس کو چلتا کرو؛ تو ان دونوں سے ممانعت کی گئی ہے۔

اس کے لیے وہی ہے جو اس کی قسمت میں لکھا ہے

دوسری روایت میں ہے نبی کریم ﷺ نے اسی موقعہ پر فرمایا: اس کے لیے تو وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی قسمت میں لکھا ہے(۱)۔ یعنی وہ یہ سمجھتی ہو کہ اس کو چلتا کرواؤں گی تو میرا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا، تو اس کا یہ سمجھنا درست نہیں۔ اس لیے کہ بہت سی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی مسلمان بہن کو طلاق دلوا کر رخصت کرواتی ہے، اس کے باوجود بھی اس کے شوہر کا دل اس پر پورا نہیں آتا۔ گویا اس نے جو سوچا تھا کہ اس کو چلتا کروا کر اس کے دل پر میں قابض ہو جاؤں گی، وہ اپنی اس اسکیم میں کامیاب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارے لیے جو لکھا گیا ہے اس میں کوئی کمی آنے والی نہیں ہے، اس لیے یہ سوچنا کہ اس کی محبت کا حصہ بھی مجھے ملے؛ یہ درست نہیں ہے۔

یہ بھی دھوکہ کی ایک شکل ہے

"تَصرِیَۃ" یعنی دودھ والا جانور جب بیچنے کا ارادہ ہوتا تو اس کا مالک ایسا کرتا تھا کہ جب خبر ملتی کہ کل صبح میں گاہک آنے والا ہے تو آج شام کے وقت اس کا دودھ نہیں دوہتا تھا، تاکہ کل صبح

(۱) لَا تَسْأَلِ الْمَرْأَةُ طَلَاقَ أُخْتِهَا لِتَسْتَفْرِغَ صَحْفَتَهَا وَلْتَنْكِحْ فَإِنَّ لَهَا مَا قُدِّرَ لَهَا. (بخاری شریف)

جب گاہک آئے گا اوراس کے سامنے دوہیں گے تو دودھ زیادہ نکلے گا۔ ویسے توروزانہ ایک وقت دو لیٹر دودھ دیتی ہے؛ لیکن آج گاہک دیکھے گا کہ چار لیٹر دودھ نکلا، تووہ سمجھے گا کہ یہ روزانہ ایک وقت چارلیٹر دودھ دیتی ہے، اور یہ سمجھ کر وہ خرید لے گا، اس کو ''تَصرِیَۃ'' کہتے ہیں۔ اس سے بھی نبیٔ کریم ﷺ نے منع فرمایا، اس لیے کہ یہ بھی دھوکہ کی ایک شکل ہے۔

اگر وہ خود اجازت دے تو......

حدیث ۱۷۷۹:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أنَّ رسُولَ اللہ ﷺ قال: ((لَایَبِعُ بَعْضُکُمْ عَلَی بَیْعِ بَعْضٍ، وَلَا یَخْطُبْ عَلَی خِطْبَۃِ أَخِیہِ إلاَّ أنْ یَأْذَنَ لَہُ)). (متفق علیہ۔ وھذا لفظ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی کسی کی بیع پر بیع نہ کرے، اوراپنے بھائی کے رشتہ پر رشتہ نہ بھیجے؛ مگر یہ کہ وہ خود اجازت دے۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ جس کے رشتہ کی بات ہورہی تھی اس نے خود کہا کہ تم رشتہ بھیجنا چاہو تو میری طرف سے اجازت ہے، اگر وہ تمہارا رشتہ پسند کرتے ہوں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے؛ تو پھر کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس لیے کہ ممانعت کی جو علت تھی یعنی اس کے دل میں تمہارے لیے عداوت ودشمنی پیدا ہوگی، وہ علت یہاں نہیں پائی گئی۔

بلکہ اس صورت میں تو رشتہ طے ہو چکا ہو تب بھی اجازت ہے، مثلاً: ایک کا رشتہ طے ہو چکا تھا، پھر اس کو معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ بھی ہے (اور وہ بھی وہاں سے چھٹکارا چاہتا ہے) تو اس نے آپ کو اجازت دے دی کہ: بھائی! آپ کوشش کرو، اگر وہ آپ کو منظور کرلیں تو مجھے کوئی پروبلم "Problem" نہیں ہے؛ تو پھر اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔

حدیث ۱۷۸۰:-

وعن عقبة بن عامر رضی الله عنه: أنَّ رسُولَ الله ﷺ قال: ((اَلْمُؤْمِنُ أَخُو الْمُؤْمِنِ، فَلاَ يَحِلُّ لِمُؤْمِنٍ أنْ يَبْتَاعَ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ وَلاَ يَخْطُبَ عَلَى خِطْبَةِ أَخِيهِ حَتَّى يَذَرَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسلمان مسلمان کا بھائی ہے (اس لیے) ایک مؤمن کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی کی بیع پر بیع کرے، اور اپنے بھائی کے رشتہ پر رشتہ بھیجے؛ یہاں تک کہ وہ خود ہی چھوڑ دے۔

افادات:- اخوت و بھائی چارگی کا تقاضہ یہ ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے جس سے اپنے بھائی کو نقصان پہنچے، بلکہ اس کی خیر خواہی کرنی چاہیے۔

باب النهي عن إضاعة المال في غير وجوهه التي أذن الشرع فيها

شریعت نے جہاں مال خرچ کرنے کی اجازت نہیں دی ہے وہاں مال خرچ کر کے ضائع کرنے کی ممانعت

ایک مسئلہ اور بتلانا چاہتے ہیں، مال کو ضائع کرنا۔ جس کو اسراف وفضول خرچی کہتے ہیں۔ یہ ممنوع ہے۔

فضول خرچی کی دو شکلیں ہیں، ایک تو یہ ہے کہ جہاں خرچ کرنے سے شریعت نے منع کیا ہے، اور جو گناہ کے کام ہیں، مال کو ان جگہوں پر خرچ کرنا۔ جیسے: سنیما دیکھنا شراب پینا وغیرہ۔؛ یہ ''تبذیر'' کہلاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اسی کو فرمایا ہے:﴿إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا إِخْوَانَ الشَّيَاطِيْنِ﴾ تبذیر یعنی فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔

دوسری شکل یہ ہے کہ جہاں خرچ کرنے کی اجازت دی ہے وہاں ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا؛ یہ بھی ممنوع ہے۔ اس لیے کہ مال کے ہم مالک نہیں ہیں، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے پاس امانت ہے، ہمیں اپنی ضرورتوں میں بھی اتنا ہی خرچ کرنے کی اجازت ہے جس سے ہماری ضرورت پوری ہو جائے، اگر اس سے زیادہ خرچ کریں گے تو گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی اجازت ملی تھی اس میں زیادتی کرنے والے شمار ہوں گے۔

وضو کے پانی میں بھی اسراف کا گناہ ہے

یہاں تک کہ کوئی آدمی وضو جیسی عبادت میں بھی ضرورت سے زیادہ پانی استعمال کرے گا تو گنہگار ہوگا، جیسے: کسی نے اگر تین کے بجائے چار مرتبہ چہرہ دھویا تو یہ چوتھی مرتبہ دھونا جائز نہیں ہے۔

تمام فقہاء نے بالاتفاق حرام لکھا ہے

اب اگر اس نے اپنے گھر میں اپنا پانی زیادہ استعمال کیا، تو اس میں اس نے حرمت کا ارتکاب نہیں کیا؛ لیکن اگر وقف کے مال میں ایسا کیا، جیسے: مسجد کا پانی اس طرح زیادہ استعمال کیا ہے؛ تب تو حرام کا ارتکاب کیا۔

ہمارے یہاں تو وقف کے مال کا حال یہ ہے کہ وضو کے لیے جو نل والی جگہیں بنائی جاتی ہیں وہاں لوگ نل کھول کر بیٹھتے ہیں اور باتیں کرتے رہتے ہیں اور پانی گرتا رہتا ہے؛ یہ تو کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ بلکہ ایسا کرنا تو اپنے گھر میں بھی جائز نہیں ہے، اس لیے کہ یہ بھی فضول خرچی ہوئی۔ اس کو تمام فقہاء نے بالاتفاق حرام لکھا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ

میں پہلے بھی حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کا قصہ بیان کر چکا ہوں جو ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) بیان فرمایا کرتے تھے: حضورِ اکرم ﷺ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ اگر کوئی آدمی کوئی ضرورت لے کر آتا تو آپ خود پوری فرما دیتے، اور اگر آپ کے پاس گنجائش نہ ہوتی تو حضراتِ صحابہ میں سے کسی کے پاس بھیج دیتے۔ چناں چہ ایک مرتبہ ایک حاجت مند نبی کریم ﷺ کے پاس آیا، اور کچھ مانگا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ عثمان کے پاس جاؤ، رات کا وقت تھا، وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچا، دروازہ کے قریب پہنچا تو اس کے کان میں آواز آئی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ زور زور سے کچھ کہہ رہے ہیں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اپنی اہلیہ سے -جو نبی کریم ﷺ کی صاحبزادی ہی تھیں- یہ کہہ رہے تھے کہ چراغ کی بتی اتنی اونچی کیوں کر رکھی ہے کہ اس کی وجہ سے تیل زیادہ جل رہا ہے، اس کے کان میں جب یہ الفاظ پڑے تو وہ سوچنے لگا کہ آدمی تو اپنی بیوی کے بہت کچھ قربان کر دیتا ہے، یہاں تو وہ اپنی بیوی -اور وہ بھی حضور ﷺ کی صاحبزادی- کو صرف اتنی سی بات پر ٹوک رہے ہیں اور اس پر ناراض ہو رہے ہیں کہ چراغ کی بتی ذرا سی اونچی ہو گئی کہ اس کی وجہ سے تیل زیادہ جل رہا ہے؛ اب یہ میری حاجت کیا پوری کریں گے! لہٰذا ان سے کچھ کہنے کے بجائے وہ وہیں سے واپس لوٹ گیا۔

دوسرے روز جب وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضورِ اکرم ﷺ نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ (جیسے آپ کسی کو کسی کام کے لیے کہیں بھیجیں گے تو بعد میں اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کام کا کیا ہوا) پہلے تو اس نے کچھ نہیں بتلایا لیکن حضور ﷺ کے اصرار پر بتلایا کہ ایسا ایسا ہوا، اس لیے میں نے ان سے بات ہی نہیں کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا کچھ نہیں ہے، تم ان کے پاس جاؤ، اور اپنی حاجت ان سے کہو۔ چناں چہ وہ گیا اور اپنی حاجت ان کے سامنے پیش کی تو اس نے جتنی توقع رکھی تھی اس سے بھی بہت زیادہ دیا، تب اس نے رات والی بات کہی کہ میں تو رات میں بھی آیا تھا لیکن میں نے آپ کی زبان سے ایسے الفاظ سنے اس لیے لوٹ گیا، اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم سمجھے ہی نہیں، ہم تو نبی کریم ﷺ کی منشاء کو دیکھتے ہیں، آپ ﷺ جہاں خرچ کرنے کے لیے فرمائیں گے وہاں اپنا سب کچھ لُٹا دینے کے لیے تیار ہیں، اور جہاں آپ ﷺ منع فرمائیں گے وہاں ہم ایک پائی بھی خرچ نہیں کرسکتے۔ ایک مؤمن کی شان یہی ہونی چاہیے۔ لیکن آج ہمارا معاملہ اُلٹ گیا، جہاں شریعت نے منع کیا وہاں سب کچھ خرچ کررہے ہیں، اور جہاں خرچ کرنے کا حکم دیا وہاں بخل سے کام لیتے ہیں۔

اپنی چیز بھی سلیقہ سے استعمال کریں

اگر اپنی کوئی چیز ہو اس میں بھی شریعت ایسا طریقہ اختیار کرنے کی تلقین کرتی ہے جس سے اس چیز کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کی مثال سن لیجئے کہ پہلے زمانہ میں چمڑے کے مشکیزے ہوتے تھے جس

میں پینے کا پانی رکھا جاتا تھا، تو حدیثِ پاک میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: مشکیزہ کا منھ موڑ کر پانی نہ پیو۔ اس کے منھ پر عام طور پر ہاتھ لگا کرتا ہے جس کی وجہ سے وہ جگہ میلی ہو جاتی ہے۔ جن کی طبیعتیں نفیس ہوتی ہیں وہ وہاں منھ لگا کر پانی پینے کو ناگوار سمجھتے ہیں، اور اپنی نفاست کی وجہ سے اس مشکیزہ کا منھ موڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے اندر کا صاف شفاف حصہ باہر آجاتا ہے اور وہاں منھ لگا کر پیتے ہیں؛ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دو تین مرتبہ اس کا منھ موڑنے کی وجہ سے وہ حصہ کٹ جاتا ہے اور مشکیزہ بیکار ہو جاتا ہے۔ تو اس کا منھ موڑ کر پینا اس مشکیزے کے لیے نقصان دہ تھا اس لیے نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ آپ کو اگر نفاست کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر اس سے منھ لگا کر کیوں پیتے ہیں، کسی برتن میں نکال کر ہی پی لو، تاکہ آپ کی نفاست کا بھی لحاظ ہو جائے، اور مشکیزے کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔

بائیک پر دو سے زیادہ سواری منع ہے

کسی بھی طرح کے مال کو استعمال کرنے میں یہی تعلیم ملحوظ رکھنی چاہیے۔ سواری کے جانور تک میں بھی یہی تعلیم دی گئی ہے کہ اگر اس جانور پر تین چار آدمی سوار ہو جائیں گے تو اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ پڑ جائے گا، اس کو تکلیف ہو گی، اس پر ظلم و زیادتی ہو گی اور اس کا حق ضائع ہو گا۔ اگر اس کی وجہ سے وہ جانور ہلاک ہو جائے گا تو مال کا نقصان ہو گا۔

آج کل کی سواریاں جیسے: سائیکل یا بائیک وغیرہ اگرچہ جاندار نہیں ہیں لیکن پھر بھی اس پر اگر اس کی "Capacity" (طاقت و صلاحیت) سے بڑھ کر سوار ہوں گے؛ تو یہ طریقہ اس مال کو ضائع کرنے کا سبب بنے گا، اس لیے شریعت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ ہمارے اپنے مال کے بھی ہم خود مالک نہیں ہیں، بلکہ ہم امین ہیں، لہٰذا امانتداری کا تقاضہ یہی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کو استعمال کریں۔

پسندیدہ اور ناپسندیدہ تین باتیں

حدیث ۱۷۸۱ :-

عن أبي هريرة رضی الله عنه قال قال رسولُ اللهِ ﷺ : إنَّ اللهَ تعالیٰ يَرْضَى لَكُمْ ثَلاثاً، ويَكْرَهُ لَكُمْ ثَلاثاً، فَيَرْضَى لَكُمْ أنْ تَعْبُدُوهُ، وَلاَتُشْرِكُوا بِهِ شَيئاً، وَأَنْ تَعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللهِ جَمِيعاً وَلاَ تَفَرَّقُوا. وَيَكْرَهُ لَكُمْ قِيلَ وَقَالَ، وَ كَثْرَةَ السُّؤَالِ، وإِضَاعَةَ المَالِ. (رواه مسلم، وتقدم شرحه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری تین باتوں کو پسند کرتے ہیں اور تین چیزوں کو ناپسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو، اور آپس میں اختلاف و انتشار نہ پھیلاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے لیے قیل و قال کو، اور بے کار سوال کرنے کو، اور مال کو ضائع کرنے کو ناپسند کرتے ہیں۔

افادات:- 'قیل و قال' یعنی بحث و مباحثہ جس کو ہم گجراتی زبان میں "પારકી પંચાત" کہتے ہیں۔

"کثرۃ السوال" کا مطلب یا تو یہ ہے کہ معلومات کے متعلق سوال کرنا۔ بعض لوگوں کا حال ایسا ہوتا ہے کہ غیر ضروری سوالات کرتے رہتے ہیں، ہمارے یہاں دارالافتاء میں بھی ایسے سوالات آتے رہتے ہیں۔ حالاں کہ نبی کریم ﷺ نے اس کو ناپسند فرمایا ہے، اور آپ ﷺ کی خدمت میں جب ایسی باتیں پیش کی جاتی تھیں تو آپ اس پر ناراضگی کا اظہار فرماتے تھے۔

اور "کثرۃ السوال" کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا۔ ضرورت کی وجہ سے بھی کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) کا خط

حدیث ۱۷۸۲:-

عَنْ وَرَّادٍ كاتب المغيرة قال: أَمْلَى عَلَيَّ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ فِي كِتَابٍ إِلَى مُعَاوِيَةَ - رضى الله عنه -: أَنَّ النَّبِيَّ - ﷺ - كَانَ يَقُولُ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلاَةٍ مَكْتُوبَةٍ: ((لاَ إِلَهَ إِلاَّ اللهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ، وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، اللَّهُمَّ لاَ مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلاَ مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلاَ يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ)) وَكَتَبَ إِلَيْهِ أَنَّهُ كَانَ يَنْهَى عَنْ قِيلَ وَقَالَ، وَإِضَاعَةِ الْمَالِ، وَكَثْرَةِ السُّؤَالِ، وَكَانَ يَنْهَى عَنْ عُقُوقِ الأُمَّهَاتِ، وَوَأْدِ الْبَنَاتِ، وَمَنْعٍ وَهَاتِ. (متفق عليه، وسبق شرحه)

ترجمہ:- حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) کے کاتب (Writer) وَرّاد فرماتے ہیں کہ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے ایک خط میں تحریر کروایا جو انہوں نے حضرت معاویہ (رضی اللہ عنہ) کے نام ارسال فرمایا تھا کہ: نبی کریم ﷺ ہر فرض نماز کے بعد یہ دعا پڑھتے تھے: "لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ. اللّٰهُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ" اور اسی خط میں یہ بھی لکھوایا کہ حضور ﷺ قیل و قال سے، اور مال کو ضائع و برباد کرنے سے، اور غیر ضروری سوال کثرت سے پوچھنے سے منع فرماتے تھے۔ اور ماؤں کی نافرمانی سے، لڑکیوں کو زندہ دَر گور کرنے سے، اور دوسروں کے حقوق کو روکنے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے سے منع فرماتے تھے۔

افادات:- بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ اپنا حق تو برابر وصول کرتے ہیں اور دوسروں کے حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔ اس کو ہمارے یہاں یوں بولتے ہیں کہ "اس کے پاس لام زیر لِے تو ہے، لیکن دال زیر دِے نہیں ہے"۔

باب النهي عن الإشارة إلى مسلم بسلاح ونحوه سواء كان جاداً أو مازحاً والنهي عن تعاطي السيف مسلولاً

کسی مسلمان کی طرف ہتھیار یا اس جیسی کسی چیز سے اشارہ کرنے کی ممانعت چاہے وہ واقعۃً ہو یا مذاق میں ہی ہو، اور کھلی ہوئی تلوار کسی کو دینے کی ممانعت

پہلے بھی بتلایا تھا کہ کوئی بھی ایسی شکل یا انداز اختیار کرنا جس سے سامنے والے مسلمان بھائی کے دل میں خوف یا ہیبت طاری ہو جائے، یا وہ اپنے لیے خطرہ محسوس کرے؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ جیسے: آپ کے پاس کوئی ہتھیار، تلوار، بندوق وغیرہ ہو، جس کو کسی کی طرف، یا کسی کے اوپر تاک دینا، یا کسی کو چھری بتانا کہ دیکھو میرے ہاتھ میں چھری ہے، جیسے کسی کو مارنے کے لیے آگے کی جاتی ہے کہ اس کی نوک سامنے والے کی طرف ہو، یا کوئی بھی ہتھیار کسی کو بتلانا، چاہے سچ مچ بتا رہا ہو، یا بطورِ مذاق کے؛ یہ سب ممنوع اور ناجائز ہے۔

اسی طرح کوئی آدمی کسی کو تلوار دینا چاہتا ہو تو وہ کھلی ہوئی حالت میں نہ دے، بلکہ وہ میان کے اندر بند ہونی چاہیے۔ یا جیسے چھری کھلی ہوئی ہے، تو اس کی نوک کسی کی طرف کرکے دینا بھی درست

نہیں۔ اگر کسی کو دے تو اس کا پھل اپنی طرف پکڑ کر دینی چاہیے، یا پھر ٹیبل یا زمین پر رکھ دے، اور سامنے والا اپنے ہاتھ سے اُٹھالے۔

شاید شیطان اس کے ہاتھ سے چھڑ وادے

حدیث ۱۷۸۳:-

عن أبي هريرة رضي الله عنه عن رسولِ اللهِ ﷺ قال: ((لاَ يُشِرُ أحَدُكُمْ إلَى أخِيهِ بِالسِّلاحِ، فَإنَّهُ لاَ يَدرِى لَعَلَّ الشَّيْطَانَ يَنْزِعُ فِي يَدِهِ فَيَقَعُ فِي حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ)). (متفق عليه)

وفى رواية لمسلم قال: قال أبو القاسم ﷺ : ((مَنْ أشَارَ إلَى أخِيهِ بِحَدِيدَةٍ، فَإنَّ المَلاَئِكَةَ تَلْعَنُهُ حَتَّى يَنْزِعَ، وَإنْ كَانَ أخَاهُ لأبِيهِ وأُمِّهِ)).

قوله- ﷺ -: ((يَنْزِع)) ضُبِطَ بالعين المهملة مع كسر الزاى، وبالغين المعجمة مع فتحها، ومعناهما مُتَقَارِبٌ، وَمَعنَاهُ بالمهملةِ يَرْمِي، وبالمعجمةِ أيضاً يَرْمِي وَيُفْسِدُ. وَأصْلُ النَّزْعِ: الطَّعْنُ وَالفَسَادُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے کوئی آدمی اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار کے ذریعہ اشارہ نہ کرے، اس لیے کہ پتہ نہیں شیطان اس کے ہاتھ سے اس کو نکال کر اس کی طرف پھکوادے (جس کے نتیجہ میں وہ زخمی ہو جائے، یا خدانہ کرے کوئی دوسری بات پیش آگئ اور اس کی جان ہی نکل گئ) تو اس کی وجہ سے جہنم کے گھڑے میں جا کر گرے گا۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ نبیؐ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی لوہے کی دھاردار چیز کے ذریعہ اپنے بھائی کی طرف اشارہ نہ کرو، اس لیے کہ فرشتے ایسا کرنے والے کے اوپر لعنت کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ باز آجائے، چاہے وہ اس کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:– ظاہر ہے کہ حقیقت میں تو ایسا کرنے کی کہاں اجازت ہوگی، لیکن مذاق کے طور پر بھی ایسا کرنے میں کبھی انجام کار برا ہو جاتا ہے، اس لیے اس سے منع کیا گیا ہے۔ بعضوں کی عادت ہوتی ہے کہ مذاق کے طور پر بھرا ہوا (Loaded) ہتھیار کسی پر تاک دیتے ہیں، اس کی اجازت نہیں۔ اس لیے کہ خدانخواستہ اگر ٹریگر پر انگلی لگ گئی اور گولی نکل گئی تو اس کے لیے دنیوی واخروی ہلاکت کا ذریعہ بنے گی۔

اور عام طور پر مسلمان کو مسلمان سے ہی واسطہ پڑتا ہے اس لیے مسلمان کہا گیا ہے، ورنہ مسلمان کی ہی قید نہیں ہے، غیر مسلم معاہد کا بھی یہی حکم ہے۔ معاہد یعنی اسلامی حکومت میں جو غیر مسلم امن وامان کا پروانہ لے کر رہتا ہو۔

کھلی ہوئی تلوار دینا منع ہے

حدیث ۱۷۸۴:-

وعن جابر رضی اللہ عنہ قال: نہی رسول اللهِ ﷺ أَنْ يُتَعَاطَى السَّيْفُ مَسْلُولاً. (رواہ أبو داود والترمذی، وقال: حدیث حسن)

ترجمہ:– حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی ٔکریم ﷺ نے تلوار کھلی ہوئی ہونے کی حالت میں کسی دوسرے کو دینے سے منع فرمایا ہے۔

افادات:– مطلب یہ ہے کہ چھری، تلوار، یا لوڈ کیا ہوا کوئی ہتھیار لینے دینے میں ایسی کوئی بھی شکل اختیار کرنا جس میں سامنے والے کو خطرہ رہتا ہو؛ اس سے منع کیا گیا ہے۔

باب كراهة الخروج من المسجد بعد الأذان إلا لعذر حتّٰى يصلي المكتوبة

اذان ہو جانے کے بعد مسجد سے نکلنا منع ہے؛ مگر یہ کہ کوئی شرعی عذر ہو

اذان کے بعد اگر گھر پر ہو تو نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آنا چاہیے، چہ جائیکہ مسجد کے اندر ہو، اور وہاں سے نماز پڑھے بغیر نکل جائے۔

حدیث ۱۷۸۵:-

عن أبي الشَّعْثَاءِ قالَ كُنَّا قُعُوداً مَعَ أبي هريرة ﷺ في المَسْجِدِ فَأَذَّنَ المُؤَذِّنُ، فَقَامَ رَجُلٌ مِنَ المَسْجِدِ يَمْشِي، فَأَتْبَعَهُ أَبُو هُرَيْرَةَ بَصَرَهُ حَتَّى خَرَجَ مِنَ المَسْجِدِ فقال أبو هريرة: أَمَّا هذَا فَقَدْ عَصَى أَبَا القَاسِمِ ﷺ. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو شعثاء (رحمۃ اللہ علیہ) (تابعی) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مرتبہ حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، موٴذن نے اذان دی (اذان ہو چکنے کے بعد) ایک آدمی مسجد سے گھر جانے کے لیے اُٹھا، حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) اس کو دیکھتے رہے (کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی کسی ضرورت کے لیے اُٹھتا ہے، جیسے: کونے میں سے قرآنِ پاک لینے کے لیے اُٹھا، یا پیچھے اپنی کوئی چیز رکھی ہوئی تھی اس کو لینے کے لیے اُٹھا، اس لیے اس کو دیکھتے رہے کہ واقعۃً واپس جارہا ہے، یا یہیں کسی کام کے لیے اُٹھا ہے؛ لیکن) جب وہ نکل کر باہر چلا گیا تب حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اس آدمی نے نبی کریم ﷺ کی نافرمانی اور حکم عدولی کی۔

افادات:۔معلوم ہوا کہ اذان ہوچکنے کے بعد جس نماز کے لیے اذان دی جاچکی ہے اس نماز کو پڑھے بغیر مسجد سے نکلنا درست نہیں ہے،ہاں ! اگر کوئی عذر ہے، مثلاً: پیشاب کا تقاضہ شدید ہے اور قضاءِ حاجت کے لیے جاتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ آج کل تو یہ ضرورتیں بھی مسجد کے احاطہ ہی میں پوری ہو جاتی ہیں، لیکن اگر ایسی کوئی ضرورت مسجد میں پوری نہ ہو رہی ہو،اور واپس آنے کے ارادہ کے ساتھ گھر جانا پڑے؛تو کوئی حرج نہیں۔اسی طرح کسی دوسری مسجد میں اذان یا امامت کی ذمہ داری ہے؛تب بھی گنجائش ہے۔

باب کراھة رد الریحان لغیر عذر

کوئی خوشبودار چیز (پھول وغیرہ) کوئی آدمی دے تو بلاوجہ اس کو نہ لینا ممنوع ومکروہ ہے

حدیث ۱۷۸۶:-

عن أبی هريرة -رضی الله عنه- قال قال رسول اللهِ ﷺ: مَنْ عُرِضَ عَلَيْهِ رَيْحَانٌ، فَلاَ يَرُدَّهُ، فَإِنَّهُ خَفِيفُ الْمَحْمِلِ، طَيِّبُ الرِّيحِ. رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جس کے سامنے خوشبو (تیل، عطر وغیرہ) پیش کی گئی تو اس کو واپس نہ کرے، اس لیے کہ وہ بہت ہی ہلکی اور خوشبودار چیز ہے۔

افادات:- "خَفِيفُ الْمَحْمِلِ" یعنی اس کے لینے میں کوئی زیادہ بوجھ نہیں ہے، اور دینے والے پر بھی کوئی بوجھ نہیں ہے، جیسے: کسی نے ہدیہ میں عطر دیا، تو دینے والے پر بھی کوئی بوجھ نہیں ہے، اور لینے والے پر بھی بوجھ نہیں ہے۔ بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ کوئی قیمتی چیز ہوتی ہے تو دینے والے کے لیے بھی اس میں بار ہوتا ہے، اور لینے والے کو بھی اس قیمتی چیز کی وجہ سے اپنے اوپر احسان کا ایک بوجھ محسوس ہوتا ہے

حدیث ۱۷۸۷:-

عن أنس بن مالكٍ رضی اللہ عنه: أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَا يَرُدُّ الطِّيبَ.(رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ خوشبو کو واپس نہیں فرمایا کرتے تھے۔

افادات:- ہاں! اگر کوئی قیمتی چیز ہے، یا زیادہ مقدار میں ہے، اور اس کے لینے میں آدمی اپنے لیے بوجھ محسوس کررہا ہے، تو پھر اس میں سے ذرا سا قبول کرلے، اور بقیہ واپس کرنے کی گنجائش ہے۔ لیکن آج ہمارا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ اگر زیادہ ہوگا تب تو لے لیں گے، اور تھوڑا ہوگا تو واپس کردیں گے۔

باب كراهة المدح فى الوجه لمن خيف عليه مفسدة من إعجاب ونحوه وجوازه لمن أمِنَ ذلك فى حقه

کسی کے منہ پر اس کی تعریف کرنے کی کچھ شرائط کے ساتھ ممانعت

کسی کے سامنے اس کی تعریف کرنا ممنوع ہے، خاص کر کہ ایسے آدمی کے حق میں جس کے متعلق یہ اندیشہ ہے کہ وہ عجب، خود پسندی و کبر میں مبتلا ہو جائے گا۔ ہاں! جس آدمی کے متعلق ایسا اندیشہ اور خطرہ نہ ہو تو اس کے حق میں تعریف کرنا جائز ہے۔

اس سلسلہ میں دونوں قسم کی روایتیں آئی ہیں، اس لیے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے جو عنوان قائم کیا ہے اس میں ایسا انداز اختیار کیا کہ دونوں قسم کی روایتوں کا مطلب واضح ہو جائے، آگے چل کر پھر الگ سے اس پر کلام بھی کریں گے۔

اس کی پشت ہی کاٹ دی

حدیث ۱۷۸۸:-

عن أبي موسى الأشعري رضى الله عنه قال: سَمِعَ النَّبِيُّ ﷺ رَجُلاً يُثْنِي عَلَى رَجُلٍ وَيُطْرِيهِ فى المِدْحَة. فقال: أَهْلَكْتُمْ -أَوْ قَطَعْتُمْ- ظَهْرَ الرَّجُلِ. (متفق عليه)

((وَالإِطْرَاءُ)): المُبَالَغَةُ فِي المَدْحِ.

ترجمہ:–حضرت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ دوسرے آدمی کی تعریف کررہا ہے، اور تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہا ہے، اس کو سن کر نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: تم نے اس کی پشت ہی کاٹ دی، یا تم نے اس کو ہلاک کردیا۔

افادات:–عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایسے موقعہ پر جو خوبیاں اس میں نہیں ہوتی وہ بھی خوبیاں بنا کر بتلائی جاتی ہیں، یا ایسا ہوتا ہے کہ جتنی مقدار میں وہ خوبی اس میں ہوتی ہیں اس سے زیادہ اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے؛ اسی کو مبالغہ آرائی سے تعبیر کرتے ہیں، جس کو گجراتی میں (અતિશ્યોક્તિ) کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمہاری تعریف کے نتیجہ میں وہ آدمی خود پسندی یا تکبر میں مبتلا ہوجائے گا، اوراگر اس کا ظہور کسی کے ساتھ ہوگیا تو دنیوی اعتبار سے بھی ہلاکت اور آخرت کے اعتبار سے بھی ہلاکت کا سبب بنے گی۔

کسی کی تعریف کرنے کے متعلق معتدل تعلیمات

حدیث ۱۷۸۹:-

وعن أبي بكرة رضی الله عنه: أنَّ رجلاً ذُكِرَ عند النبيِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم فَأَثْنَى عَلَيْهِ رَجُلٌ خَيْراً، فقال النبيُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم: ((وَيْحَكَ! قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ)) يَقُولُهُ مِرَاراً

((إِنْ كَانَ أَحَدُكُمْ مَادِحاً لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ: أَحْسِبُ كَذَا وَ كَذَا إِنْ كَانَ يَرَى أَنَّهُ كَذَلِكَ وَحَسِيبُهُ اللهُ، وَلَا يُزَكِّى عَلَى اللهِ أَحَدٌ.)) (متفق علیہ)

ترجمہ:–حضرت ابو بکرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ کے سامنے ایک آدمی کا تذکرہ کیا گیا تو دوسرے آدمی نے اس کی تعریف کی (اس کے متعلق تعریفی کلمات استعمال کئے) نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہارے لیے ہلاکت ہو؛ تم نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ دی (یعنی اس طرح تعریف کرکے تم نے اس کو عجب وخود پسندی میں مبتلا کرکے اس کو نقصان پہنچایا) نبیٔ کریم ﷺ نے کئی مرتبہ یہی ارشاد فرمایا (پھر فرمایا) اگر کوئی آدمی واقعۃً کسی کی تعریف کرنا ہی چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ یوں کہے: فلاں آدمی کے متعلق مَیں ایسا سمجھتا ہوں کہ وہ ایسا ہے (میرے خیال میں وہ ایسا ہے، اور مَیں جو سمجھتا ہوں وہ بتلاتا ہوں) اور وہ واقعۃً اس کے خیال میں ایسا ہی ہو، ہاں! اس کے اندرون کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، اور کوئی بھی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی کی صفائی نہ کرے۔

افادات:– بعض مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے دل میں سامنے والا ایسا نہیں ہوتا پھر بھی صرف زبان سے ایسا بولتا ہے؛ تب تو ایسا بولنے کی اجازت ہی نہیں، اس لیے کہ وہ تو جھوٹ ہوگیا۔ اگر واقعۃً وہ دل سے اس کو ایسا ہی سمجھتا ہو تو اپنے اس خیال کا یوں کہہ کر اظہار کرسکتا ہے کہ میں فلاں کو ایسا سمجھتا ہوں۔ اپنے علم وجانکاری کے اعتبار سے میں اس کے متعلق جو جانتا ہوں اس کی بنیاد پر میں یہ بات کہتا ہوں، اب اندرون کا معاملہ کیا ہے وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اس کے چہرہ پر مٹی ڈالو

حدیث ۱۷۹۰:-

وعن همام بن الحارث عن المِقْدَادِ رضی الله عنه: أَنَّ رَجُلاً جَعَلَ يَمْدَحُ عُثْمَانَ رضی الله عنه، فَعَمِدَ المِقْدَادُ، فَجَثَا عَلَى رُكْبَتَيْهِ، فَجَعَلَ يَحْثُو فِي وَجْهِهِ الحَصْبَاءَ. فقال لَهُ عُثْمَانُ: مَا شَأْنُكَ؟ فقال: إِنَّ رسولَ اللهِ ﷺ قال: ((إِذَا رَأَيْتُمُ المَدَّاحِينَ، فَاحْثُوا فِي وُجُوهِهِمُ التُّرَابَ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ہمام بن حارث حضرت مقداد (رضی اللہ عنہ) کے حوالہ سے بیان فرماتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کی تعریف کررہا تھا، یہ سن کر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ اپنے گھٹنوں کے اوپر اس طرح بیٹھ گئے جیسے گویا بھاگنے کے لیے تیار ہوں، اور کنکریاں لے کر اس کے منھ پر مارنے لگے۔ حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) نے جب یہ منظر دیکھا تو پوچھا: (اے مقداد!) آپ یہ کیا کررہے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ: نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم تعریف کرنے والے کو دیکھو؛ تو اس کے چہرہ پر مٹی ڈالو (گویا میں اس پر عمل کررہا ہوں)

افادات:- مٹی ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس کا ایک تو یہی ظاہری مطلب ہے، چناں چہ حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے یہی مطلب لے کر اس کے مطابق عمل کیا۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ ''ان کے چہروں پر مٹی ڈالو'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دو۔ عام طور پر تعریف کرنے والا اس سے - جس کی تعریف کی جارہی ہے - اپنا کوئی نہ

کوئی فائدہ اوراپنی غرض حاصل کرنا چاہتا ہے، تو آپ اس کے منھ پر مٹی ڈالو یعنی اس کو اس کی غرض میں کامیاب نہ ہونے دو۔ وہ جو کام لے کر آپ کے پاس آیا، اور تعریف کر کے اپنا کام نکلوانا چاہتا ہے، اس کا کام مت کرو۔

اور بعض حضرات جیسے علامہ بیضاوی (رحمۃ اللہ علیہ) جو بڑے مفسر ہیں وہ فرماتے ہیں کہ: ''مٹی ڈالو'' یعنی وہ جو چیز چاہتا ہے؛ دے دو۔ گویا انہوں نے مال کو مٹی سے تعبیر کیا کہ جو کچھ بھی مال ہے وہ مٹی ہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اس کو منھ پر مٹی ڈالو یعنی اس کو مٹی سمجھ کر اس کے منھ پر مارو۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) کا تجزیہ

فهذه الأحاديث في النهي، وجاء في الإباحة أحاديث كثيرة صحيحة.

قال العلماء: وطريق الجمع بين الأحاديث أن يقال: إن كان الممدوح عنده كمال إيمانٍ ويقينٍ، ورياضة نفسٍ، ومعرفة تامة بحيث لا يفتتن، ولا يغتر بذلك، ولا تلعب به نفسه، فليس بحرامٍ ولا مكروهٍ.

وإن خيف عليه شيء من هذه الأمور، كره مدحه في وجهه كراهة شديدة، وعلى هذا التفصيل تنزل الأحاديث المختلفة في ذلك.

ومما جاء في الإباحة قوله - صلى الله عليه وسلم - لأبي بكرٍ رضي الله عنه:- ((أرجو أن تكون منهم)) أي من الذين يدعون من جميع أبواب الجنة لدخولها.

وَفِي الحَدِيثِ الآخر: ((لَسْتَ مِنْهُمْ)): أَيْ لَسْتَ مِنَ الَّذِينَ يُسْبِلُونَ أُزُرَهُمْ خُيَلَاءَ.

وَقَالَ- صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -لِعُمَرَ-رضى الله عنه-: ((مَا رَآكَ الشَّيْطَانُ سَالِكًا فَجًّا إِلَّا سَلَكَ فَجًّا غَيْرَ فَجِّكَ)).

والأحاديثُ فى الإباحة كثيرةٌ، وقد ذكرتُ جملةً مِنْ أَطْرَافِهَا فى كتاب "الأذكار".

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

کسی کے منھ کے سامنے تعریف کی ممانعت کے سلسلہ میں یہ سب حدیثیں ہیں اور منھ پر تعریف کے جائز ہونے کے سلسلہ میں بھی روایتیں آئی ہیں۔ گویا دونوں قسم کی روایتیں ہیں؛ تو اب ان دونوں طرح کی روایتوں کو آپس میں کیسے تطبیق دیں گے؟ چناں چہ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) خود ہی تطبیق کی شکل بتلاتے ہیں:

جس کی تعریف کی جارہی ہے وہ اپنے ایمان ویقین کے اعتبار سے بڑا مضبوط ہو، ریاضتوں اور مجاہدوں کی وجہ سے اپنے نفس کے اوپر قابو یافتہ ہو، اور اپنے اندرونی حال سے بخوبی واقف ہو، اور اس کو اپنی حالت کی معرفتِ تامہ حاصل ہو، اس لیے تعریف کرنے والوں کی تعریفوں کی وجہ سے دھوکہ اور فتنہ میں نہ پڑے، اور اس کا نفس اس کے ساتھ کھلواڑ نہ کر سکتا ہو، اور لوگوں کی تعریفوں کے ذریعہ اس کو دھوکہ میں ڈال کر اس کا نفس اس سے کوئی غلط حرکت نہ کرواتا ہو۔ اگر وہ آدمی ایسا ہے تب تو اس کے سامنے اس کی تعریف کرنا نہ تو حرام ہے اور نہ ہی مکروہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے

سامنے اس کی تعریف کرنے کی وجہ سے وہ آپے سے باہر نہیں ہوگا اور اس کے کسی بھی طرح کے نقصان میں پڑنے کا اندیشہ نہیں ہے، وہ خود پسندی اور تکبر میں مبتلا نہیں ہوگا، اپنے متعلق کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ تم چاہے میری کتنی ہی تعریف کرتے رہو، میری حقیقت مجھے معلوم ہے۔ اگر ایسے آدمی کے سامنے اس کی تعریف کی جائے؛ تو کوئی حرج کی بات نہیں۔

دلال اور گھوڑا

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب ان کی تعریف کی جاتی ہے تو اپنے اندرونی حال سے بخوبی واقف ہونے کے باوجود بھول جاتے ہیں، جیسے: ایک آدمی کا گھوڑا بڑا سرکش تھا، کسی بھی طرح کے کام کا نہیں تھا، اس لیے وہ اس گھوڑے کو بیچنے کے لیے مارکیٹ میں گیا اور دلال سے کہا کہ یہ گھوڑا بیچنا ہے۔ دلال اس کو لے کر مارکیٹ میں گیا اور گھوڑے کی خوبیاں بیان کرنے لگا کہ ایسا ہے اور ایسا ہے، گاہک بھی آنے لگے تو گھوڑے والا کہنے لگا کہ: بھائی! اگر میرا گھوڑا اتنی خوبیوں والا ہے تو پھر رہنے دو، مجھے نہیں بیچنا۔ دلال نے کہا: ارے اللہ کے بندے! میں تو لوگوں کو بتلا رہا ہوں اور تو تو جانتا ہی ہے کہ یہ گھوڑا کیسا ہے، پھر بھی میری تعریف کی وجہ سے دھوکے میں پڑ گیا۔ اسی طریقہ سے آدمی کا بھی حال ہے کہ اپنی اندرونی حالت سے خود بخوبی واقف ہوتا ہے کہ مجھ میں کونسی کمزوریاں اور عیوب ہیں، اس کے

باوجود کسی نے تعریف کے دو جملے کہہ دیئے تو دھوکہ میں آجاتا ہے اور اپنے متعلق خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

معتدل بات

چناں چہ اس سلسلہ میں مختلف روایات آئی ہیں، کسی موقعہ پر تو حضور ﷺ نے یہ فرمایا کہ: تم نے اپنے بھائی کو ہلاک کر دیا، اس کی پیٹھ کاٹ دی۔ یہ اس موقعہ پر فرمایا جہاں اس کے خوش فہمی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اور کسی موقعہ پر آپ ﷺ نے خود کسی کی تعریف فرمائی، یا آپ کے سامنے کسی کی تعریف کی گئی تو آپ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ وہاں دوسرا موقعہ تھا کہ وہاں ان میں سے کسی بات کا خطرہ نہیں تھا۔

جن کو ہر دروازے سے پکارا جائے گا

اور جائز ہونے کے سلسلہ میں جو روایات آئی ہیں ان میں سے وہ روایت بھی ہے جس میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) سے فرمایا تھا کہ: مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہوگے۔ دراصل ایک موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے جنت کے دروازوں کا تذکرہ کیا کہ کسی آدمی نے روزے رکھے ہیں تو وہ روزے والے دروازے سے جنت میں داخل ہوگا۔ کسی نے فلاں عمل کیا ہوگا تو وہ فلاں دروازے سے جنت میں داخل ہوگا، اس طرح جنت کے آٹھوں دروازوں کے متعلق آپ

ﷺ نے فرمایا کہ فلاں عمل کرنے والے کو فلاں دروازے سے پکارا جائے گا، فلاں عمل کرنے والے کو فلاں دروازے سے پکارا جائے گا۔ جب آپ ﷺ یہ بیان فرما چکے تو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کسی کو اگر جنت کے ایک دروازے سے بھی پکارا جائے تو پھر اس کو ضرورت نہیں ہے کہ دوسرے کسی دروازے سے پکارا جائے، اس لیے کہ مقصد تو جنت میں داخل ہونا ہے اور وہ ایک دروازے سے پکارا جائے تب بھی حاصل ہو جائے گا، لیکن کیا کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا کہ جس کو سارے دروازوں سے پکارا جائے؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہاں! اور مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہوگے۔ یہاں دیکھئے! حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے متعلق آپ ﷺ نے یہ فرما کر گویا ان کی تعریف فرمائی؛ لیکن چوں کہ یہ حضرات وہ تھے جن کے متعلق یہ اندیشہ اور خطرہ نہیں تھا۔

میں پہلے بھی کئی مرتبہ بتلا چکا ہوں کہ نبیٔ کریم ﷺ کی طرف سے جن کو جنت کی بشارت سنائی گئی تھی اور جن کے مناقب نبیٔ کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے بہت زیادہ ارشاد ہوئے ہیں، اس کے باوجود وہ حضرات اپنے متعلق نفاق کا خطرہ محسوس کرتے تھے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) سے پوچھتے تھے کہ حذیفہ! ذرا بتلاؤ کہ نبیٔ کریم ﷺ نے منافقین کے جو نام تمہیں بتلائے ہیں ان میں کہیں عمر کا نام تو نہیں ہے۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) یہ تمنا کرتے ہیں کہ: کاش کہ میں تنکا ہوتا جس کو کوئی جانور کھا جاتا۔ یعنی براہِ راست حضورِ اکرم ﷺ کی زبانِ مبارک سے ساری بشارتیں سنے ہوئے ہونے کے باوجود اپنے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتے تھے، بلکہ ڈرتے رہتے

تھے۔ اور ہمارا حال یہ ہے کہ کوئی آکر ہم کو کہہ دے کہ آج رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں بہت اونچے درجہ پر تھے، تو پھر دیکھو ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟۔

ایک دوسرے موقعہ پر حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اپنا پائجامہ اور لنگی کبر کی وجہ سے اپنے ٹخنے سے نیچے لٹکائے گا تو وہ جہنم کے اندر رہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! میرے پیٹ کا حصہ بڑھا ہوا ہونے کی وجہ سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میرے ارادہ کے باوجود میری لنگی ٹخنے سے نیچے پہنچ جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: آپ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنے پائجامہ یا لنگی کو کبر اور غرور کی وجہ سے لٹکاتے ہیں۔ گویا حضور ﷺ نے ان کے کبر کی نفی فرمائی۔

شیطان بھی راستہ بدل لیتا ہے

اسی طرح ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ اپنے دولت کدہ پر تشریف فرما تھے اور ساری ازواجِ مطہرات امہات المؤمنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن حضور ﷺ کو گھیرے ہوئے نفقہ کے سلسلہ میں کچھ مطالبات کر رہی تھیں، ان کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اسی درمیان حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے اندر داخلے کی اجازت چاہی، جیسے ہی حضراتِ امہات المؤمنین نے ان کی آواز سنی تو سرک کر پردہ کے پیچھے چلی گئیں، حالاں کہ ابھی تو اندر آنے کی طلبِ اجازت کی صرف آواز آئی تھی، حضور ﷺ نے ابھی اندر آنے کی اجازت نہیں دی تھی؛ لیکن ان کی ہیبت اتنی تھی کہ وہ اندر چلی گئیں۔ یہ دیکھ کر حضور ﷺ

ہنسنے لگے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اندر آنے کی اجازت دی، جب وہ اندر تشریف لائے تو دیکھا کہ حضور ﷺ مسکرا رہے ہیں، انہوں نے عرض کیا: "أَضْحَكَ اللهُ سِنَّكَ" اللہ تعالیٰ آپ کو اور ہنسائے؛ ہنسنے کی کیا وجہ ہے؟ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ابھی تو اِن کی آوازیں اپنے مطالبات میں میری آواز پر بلند ہو رہی تھیں، اور آپ کی آواز سن کر سب اندر چلی گئیں۔ اس پر حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے حضرات اِمہات المؤمنین سے خطاب کر کے کہا: "يَاعَدُوَّاتِ أَنْفُسِهِنَّ" اے اپنی جانوں کی دشمنو! مجھ سے تو ڈرتی ہو، اور اللہ کے رسول سے نہیں ڈرتیں؟ اندر سے امہات المؤمنین نے کہا: آپ تو اکھڑ مزاج اور سخت دل آدمی ہیں۔ جب ان کی طرف سے یہ جواب ملا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے ابن خطاب! اور کہو؛ تمہارا حال تو یہ ہے کہ شیطان جب تم کو کسی گلی میں آتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بھی دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ یعنی تمہاری ہیبت اور ڈر تو ایسا ہے کہ شیطان بھی تم سے ڈرتا ہے۔ دیکھئے! نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کی تعریف فرمائی۔

"يَاعَدُوَّاتِ أَنْفُسِهِنَّ" اے اپنی جانوں کی دشمنو! اس جملے کے متعلق علامہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ حضرات اِمہات المؤمنین کو اس طرح خطاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کر سکتے ہیں، کسی اور کے لیے گنجائش نہیں۔

تعریف کے مقاصد الگ الگ ہوتے ہیں

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ ’’ مداحین ‘‘ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت زیادہ تعریف کرنے والا۔ اب مطلب یہ ہے کہ تعریف کرنے کے مقاصد الگ الگ ہوتے ہیں ، کبھی تو تعریف کا مقصد اپنی کسی غرض کو حاصل کرنا ہوتا ہے اس لیے تعریف کرنے والا سامنے والے کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے کام لیتا ہے، تب تو وہی حکم ہو گا کہ اس کے چہرے پر مٹی ڈالو۔ اور اگر کسی نے تعریف کے اندر مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ حدود میں رہتے ہوئے کسی کی تعریف کی ہے تو پھر اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

اور اگر تعریف کرنے والے کا مقصد تشجیع ہے، یعنی کسی نے کوئی اچھا کام کیا اور کوئی آدمی اس کی تعریف کر کے ہمت افزائی کرنا چاہتا ہے، جیسے: کبھی بچوں کی کسی نیک اور اچھے کام کی وجہ سے ہمت و حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، تاکہ آئندہ اور زیادہ اچھے اعمال کریں، یا دوسرے لوگوں کو اس عمل کی ترغیب ہو؛ تو اس میں بھی کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

باب کراھة الخروج من بلد وقع فیھا الوباء فراراً منه و کراھة القدوم علیه

جہاں وبائی بیماری پھیلی ہوئی ہو وہاں سے نکل بھاگنا یا وہاں جانا مکروہ ہے

قال اللہ تعالیٰ: أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ. (النساء:۷۸)

وقال تعالیٰ: وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ. (البقرة:۱۹۵)

کسی شہر میں یا علاقہ میں کوئی عام بیماری پھیلی ہو، جیسے: طاعون؛ اور کوئی آدمی اس بیماری کے پھیلنے سے پہلے اگر وہاں موجود ہو تو اس بیماری کے پھیلنے کے بعد اس آدمی کا یہ سمجھ کر وہاں سے نکل جانا ناجائز ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں گا تو بچ جاؤں گا۔ اور جو آدمی پہلے سے اس علاقہ، اس بستی، اس شہر میں موجود نہیں تھا، تو اس کا وہاں جانا بھی درست نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں دو آیتیں پیش کی ہیں۔

تم جہاں کہیں بھی ہوگے، موت تم کو پکڑ لے گی

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ. (النساء:۷۸)﴾

ترجمہ:- تم جہاں کہیں بھی ہوگے، موت تم کو پکڑ لے گی، چاہے تم مضبوط قلعوں میں ہی کیوں نہ ہو۔

افادات:– مطلب یہ ہے کہ جس کے لیے اس کا وقتِ موعود آچکا ہے اور اس کی موت طے ہو چکی ہے، وہ اگر یہ سمجھتا ہو کہ میں کسی مضبوط قلعہ میں جا کر رہوں گا تو موت کے حملہ سے بچ جاؤں گا؛ تو اس کا یہ سوچنا غلط ہے۔ وہ کہیں بھی ہو موت اس کو گرفتار کر کے رہے گی۔

ایک عبرتناک واقعہ

چناں چہ اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں مفسرین نے اگلی امتوں میں سے کسی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے، حافظ ابن کثیر (رحمۃ اللہ علیہ) نے ابن جریر کی روایت سے یہ واقعہ لکھا ہے:

ایک عورت کو دردِ زہ شروع ہوا، لڑکی پیدا ہوئی، اس نے اپنے ملازم کو آگ لینے کے لیے بھیجا، جب وہ گھر سے باہر نکلا تو ایک آدمی سے اس کی ملاقات ہوئی، اس نے پوچھا: اس گھر میں عورت نے کیا جنا ہے؟ اس نے بتلایا: لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ اس آدمی نے کہا: یہ لڑکی سو آدمیوں کے ساتھ زنا کرے گی اور ایک مکڑی کے ذریعہ اس کی موت واقع ہو گی۔ اس ملازم نے سوچا کہ یہ سو آدمیوں کے ساتھ زنا کرے گی تو بجائے آگ لے کر واپس جانے کے گھر آیا اور چھرا لے کر نومولود پیدا شدہ بچی کا پیٹ چاک کر دیا اور یہ سمجھ کر کہ وہ مر گئی ہے وہاں سے بھاگ گیا۔ بچی کی ماں نے اس بچی کا پیٹ سی لیا اور وہ زندہ بچ گئی۔ وہ ملازم تو وہاں سے بھاگ کر کسی دوسرے ملک چلا گیا اور کمانے کھانے لگا۔ اِدھر یہ بچی بڑی ہوئی اور شہر کی خوب صورت ترین عورتوں میں اس کا شمار ہونے لگا، پھر وہ برائیوں میں مبتلا

ہو گئی اور بہت سارے لوگوں کے ساتھ ملوث ہوئی۔ ایک زمانہ کے بعد وہ ملازم- جو اس کو مار کر بھاگ گیا تھا- خوب روپیہ پیسہ کما کر اسی شہر میں واپس آیا، ایک بوڑھیا سے ملاقات ہوئی، اس نے اس کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار کیا کہ یہاں کی حسین ترین لڑکی سے میں نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ بوڑھی نے کہا: یہاں ایک حسین ترین لڑکی ہے، چناں چہ اسی لڑکی کو دکھلایا گیا، اس کو پسند بھی آگئی اور نکاح ہو گیا۔ نکاح کے بعد جب دونوں ملے تو اس لڑکی نے اس سے پوچھا: تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ اس نے اپنا سارا قصہ سنایا کہ میں تو اسی شہر کا رہنے والا ہوں، ایک لڑکی کا پیٹ چاک کر کے یہاں سے بھاگ گیا تھا، یہ سن کر وہ لڑکی بولی: وہ لڑکی تو میں ہی ہوں۔ اس نے اپنا پیٹ بتلایا جس پر نشان موجود تھے، یہ دیکھ کر اس نے کہا: اگر تو وہی لڑکی ہے، تو دو باتیں اور سن لے، ایک تو یہ کہ تو نے سو آدمیوں کے ساتھ بدکاری کرائی ہے۔ اس نے اقرار کیا کہ ہاں مجھ سے ایسا ہوا ہے لیکن تعداد یاد نہیں۔ مرد نے کہا: یقیناً تعداد سو ہی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ایک مکڑی کے ذریعہ تیری موت واقع ہوگی۔ لیکن چوں کہ یہ اس کے دل میں گھر کر چکی تھی اس لیے اس اقرار کے بعد بھی اس نے اس کو نکاح سے الگ نہیں کیا، اور اس کی حفاظت کے لیے اس نے ایک بہت خوبصورت سنگ مرمر کا محل تعمیر کیا، اور ایسا صاف شفاف رکھتا تھا کہ مکڑی جالا نہ تان سکے۔ دونوں ساتھ رہنے لگے، ایک مدت کے بعد دونوں میاں بیوی پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے کہ اس عورت نے ایک مکڑی دیکھی، تو کہنے لگی کہ یہ مکڑی ہے جس سے تم مجھے ڈرایا کرتے ہو؟ شوہر نے کہا: ہاں! یہ مکڑی ہے۔ اس نے کہا: ابھی میں اس کو مار دیتی ہوں۔ چناں چہ اس

نے اس کو نیچے گرایا اور اپنے پاؤں کے ذریعہ اس کو مسل دیا، مکڑی تو مر گئی لیکن پاؤں سے مسلنے کے نتیجہ میں مکڑی کا ڈنک اس کو ایسا لگا کہ اس کا زہر سارے جسم میں سرایت کر گیا اور وہ زہر ایسا چڑھا کہ اس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ (معارف القرآن سورۂ نساء)

گویا اس آیت کو لا کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اگر کسی جگہ عام وبا پھیل چکی ہو اور جس کی موت مقرر ہو چکی ہے وہ وہاں سے یہ سمجھ کر بھاگے کہ میں بھاگ کر اپنی جان بچا لوں گا، تو اس کا یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ اگر وقتِ موعود آچکا ہے تو وہ مر کر ہی رہے گا۔ اس لیے وہاں سے بھاگنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے، اس کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پر یقین اور توکل رکھتے ہوئے وہیں رہے۔

اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو

دوسری آیت کا ایک حصہ پیش کیا ہے: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ. (البقرۃ:۱۹۵)﴾

ترجمہ:- اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

افادات:- اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کا کیا مطلب ہے؟ تو اس سلسلہ میں ایک مطلب تو حضرت ابو ایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ: ایک مرتبہ میدانِ جنگ کے اندر ایک آدمی تنِ تنہا صفِ قتال سے آگے نکل کر دشمنوں کے لشکر پر حملہ آور ہوا، اس کو اس طرح کرتا ہوا دیکھ کر لوگ کہنے لگے: یہ تو اپنے آپ کو خود ہی ہلاکت میں ڈال رہا ہے، حالاں کہ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ

فرماتے ہیں: ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِأَيْدِيْكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، یہ سن کر حضرت ابوایوب انصاری (رضی اللہ عنہ) فرمانے لگے: اس آیت کا مطلب ہم سے پوچھو، یہ آیت تو ہم انصار کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے۔

ہوا یہ کہ جب نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اور حضراتِ مہاجرین ہجرت کرکے مدینہ منورہ آئے تو ہم انصار نے دین کی نصرت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا اور ہم اپنے سارے کاروبار چھوڑ چھاڑ کر اسی کام میں لگ گئے، یہاں تک کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کو قوت عطا فرمائی، اسلام پھیلا اور عرب کا بڑا علاقہ اسلام میں داخل ہوا۔ جب دین کو قوت حاصل ہوگئی تو ہم انصار میں سے بعض لوگوں نے آپس میں بیٹھ کر ایک میٹنگ کی اور مشورہ کیا کہ ہم لوگوں نے دین کو آگے بڑھانے کے لیے اور دین کی تقویت کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا؛ لیکن اب دین ہمارے تعاون کا محتاج نہیں رہا، اب تو الحمدللہ دین کافی آگے بڑھ چکا ہے، اور اتنے طویل زمانہ تک ہم نے اپنے کاروبار، کھیتی باڑی کی طرف سے غفلت برتی اس لیے وہ سب آگے پیچھے ہوگیا ہے، اس لیے اب ہم اُدھر بھی کچھ دھیان دیدیں۔ اِدھر ہمارے اس کام کی طرف توجہ دینے کے نتیجہ میں دین اور اسلام پر تو کچھ آنچ آنے والی نہیں ہے، اور ہمارا کاروبار، کھیتی باڑی بھی درست ہوجائے گی۔ جب ہم نے یہ طے کیا تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، یعنی دین کی نصرت و محنت کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس سے اپنے آپ کو الگ نہ کرو؛ یہی اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

بہت سی جگہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دین کی خدمت کے کسی سلسلے میں لگا ہوا ہوتا ہے، اور شروع میں جس وقت وہ اس کام میں لگا تھا اُس وقت اس میں لگنے والے بہت کم تھے اور اس کام میں ضرورت بھی تھی، اب اس کام کو اللہ تعالیٰ نے ترقی عطا فرمائی اور بہت سارے لوگ اس میں لگ گئے ہیں، اس لیے وہ آدمی یوں سوچتا ہے کہ ہماری محنت کی کوئی زیادہ ضرورت نہیں رہی، اور اپنے متعلق یوں سوچتا ہے کہ اب اپنے کاروبار کی طرف ہم ذرا دھیان دیں اور اس کو بھی درست کرلیں؛ ایسے مواقع کے لیے یہ آیت نازل ہوئی۔ ترمذی شریف میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے یہی منقول ہے۔

لیکن دیگر صحابہ سے اس کا ایک اور مطلب بھی نقل کیا گیا ہے کہ ایک آدمی کا دشمنوں کی صف پر اس طرح حملہ آور ہونا جہاں اس کی موت یقینی ہو، اور دشمن کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچتا ہو؛ تو یہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہوا، اور اس سے منع کیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ از خود ایسے اسباب اختیار کرنا جس میں یقین یا غالب گمان ہو کہ اس کی موت آجائے گی؛ اس سے اپنے آپ کو بچانے کی ضرورت ہے۔

یہاں یہ آیت بطورِ استشہاد پیش کی ہے کہ وبا والے علاقہ میں جانے سے نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے منع فرمایا ہے۔

دورِ فاروقی کا ایک واقعہ

حدیث ۱۷۹۱ :-

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما: أنَّ عمرَ بن الخطاب -رضی اللہ عنہ- خرج إلی الشَّامِ حتَّی إذا کَانَ بسَرْغَ لَقِیَهُ أُمَرَاءُ الأَجْنَادِ -أَبُو عُبَیْدَةَ بنُ الجَرَّاح وأَصْحَابُهُ- فأَخْبَرُوهُ أنَّ الوَبَاءَ قَدْ وقعَ بِالشَّامِ. قَال ابن عباس: فقال لی عمر: ادْعُ لِی المُهَاجِرِینَ الأَوَّلِینَ، فَدَعَوْتُهُمْ فَاسْتَشَارَهُمْ وَأَخْبَرَهُمْ أَنَّ الوَبَاءَ قَدْ وَقَعَ بالشَّامِ، فَاخْتَلَفُوا، فَقَالَ بَعْضُهُمْ: خَرَجْتَ لأَمْرٍ، وَلاَ نَرَی أَنْ تَرْجِعَ عَنْهُ. وَقَالَ بعضهم: مَعَكَ بَقِیَّةُ النَّاسِ وأَصْحَابُ رسُولِ اللہِ - صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ -، وَلاَ نَرَی أَنْ تُقْدِمَهُمْ عَلَی هَذَا الوَبَاء. فقال: ارْتَفِعُوا عَنِّی. ثُمَّ قَالَ: ادْعُ لِی الأَنْصَارَ، فَدَعَوْتُهُمْ، فَاسْتَشَارَهُمْ، فَسَلَکُوا سَبیلَ المُهَاجِرینَ، وَاخْتَلَفُوا کَاخْتِلاَفِهِمْ، فقال: ارْتَفِعُوا عَنِّی. ثُمَّ قَالَ: ادْعُ لِی مَنْ کَانَ هاهُنَا مِنْ مَشْیَخَةِ قُرَیشٍ مِنْ مُهَاجِرَةِ الفَتْحِ، فَدَعَوْتُهُمْ، فَلَمْ یَخْتَلِفْ عَلَیهِ مِنْهمْ رَجُلاَنِ، فَقَالُوا: نَرَی أَنْ تَرْجِعَ بِالنَّاسِ، وَلاَ تُقْدِمَهُمْ عَلَی هَذَا الوَبَاءِ، فَنَادَی عُمَرُ -رضی اللہ عنہ- فی النَّاسِ: إنِّی مُصَبِّحٌ عَلَی ظَهْرٍ، فَأَصْبِحُوا علیْهِ.

فقال أبو عبیدة بن الجراح -رضی اللہ عنہ-: أَفِرَاراً مِنْ قَدَرِ اللہ؟ فقالَ عُمَرُ رضی اللہ عنہ: لو غَیْرُكَ قَالَهَا یا أبا عبیدَةَ! -وَکَانَ عُمَرُ یَکْرَهُ خِلاَفَهُ- نَعَمْ، نَفِرُّ مِنْ قَدَرِ اللہِ إلی قَدَرِ اللہِ. أَرَأَیتَ لَو کَانَ لَكَ إبِلٌ، فَهَبَطَتْ وَادِیاً لَهُ عُدْوَتَانِ، إحْدَاهُمَا خَصبَةٌ، وَالأُخْرَی جَدْبَةٌ، أَلَیسَ إنْ رَعَیتَ الخصْبَةَ رَعَیْتَهَا بِقَدَرِ اللہِ، وَإنْ رَعَیتَ الجَدْبَةَ رَعَیْتَهَا بِقَدَرِ اللہِ؟

قَالَ: فَجَاءَ عَبدُ الرَّحمٰنِ بنُ عَوفٍ رضی الله عنه وَكَانَ مُتَغَيِّباً فِى بَعْضِ حاجَتِهِ،فقالَ:إنَّ عِنْدِى من هَذَا علماً،سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ:إِذَا سَمِعْتُمْ بِهِ بِأَرْضٍ فَلاَ تَقْدَمُوا عَلَيْهِ،وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلاَ تَخْرُجُوا فِرَاراً مِنْهُ فَحَمِدَ اللهَ تَعَالَى عُمَرُ -رضى الله عنه- وانصَرَفَ.(متفق عَلَيْهِ)

و((العُدْوَةُ)): جَانِبُ الوادِي.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ شام کی طرف روانہ ہوئے، جب وہ مقامِ سَرغ (جو شام کی پہلی منزل ہے اور جہاں حجاز کا علاقہ ختم ہوتا ہے) پہنچے تو وہاں آکر سپہ سالارِ اعظم حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور اطلاع دی کہ شام کے علاقوں میں دوبارہ وبا اور بیماری بڑی قوت وشدت کے ساتھ شروع ہوچکی ہے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عام دستور اور عادتِ شریفہ یہ تھی کہ کوئی بھی اہم معاملہ ہوتا تو مشورہ فرماتے تھے) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ سے فرمایا کہ (ہمارے قافلہ میں جو) مہاجرینِ اولین ہیں ان کو بلاؤ۔ میں نے ان حضرات کو اطلاع دی (کہ امیر المؤمنین آپ کو بلاتے ہیں) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے مشورہ طلب کیا کہ (ہم اپنا ایک کام اور مقصد لے کر چلے تھے) اب یہاں پہنچنے پر اطلاع ملی ہے کہ شام میں طاعون پھیل چکا ہے، اب آپ حضرات مشورہ دیجئے کہ ہم لوگ آگے بڑھیں، یا واپس ہوجائیں ؟ ان حضرات کی رائے میں آپس میں اختلاف ہوگیا۔ بعضوں نے کہا: آپ ایک خاص مقصد لے کر نکلے ہیں، اب ہماری رائے یہ نہیں ہے کہ آپ واپس ہوجائیں، بلکہ آپ تو آگے ہی بڑھتے رہیے۔ بعضوں نے کہا: نبیٔ کریم ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کا بچا کچا خاص حصہ (لوگوں کا کریم) آپ کے ساتھ ہے (اگر آپ ان کو لے کر اس وبا اور بیماری والے علاقہ میں جارہے ہیں

تو گویا یوں کہنا چاہتے ہیں کہ:" آبلا؛ میر اگلا پکڑ" جیسی بات ہو گی) اس لیے ہماری رائے تو یہ ہے کہ آپ واپس ہو جائیں (گویا ایک ہی جماعت میں سے کچھ لوگوں نے یہ مشورہ دیا اور کچھ نے دوسرا مشورہ دیا) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کا یہ اختلاف پسند نہیں آیا تو فرمایا: آپ حضرات تشریف لے جایئے (حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔)

حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں: پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: انصار کو بلالاؤ (اس لیے کہ انصار کا مقام ان کے بعد کا ہے) چناں چہ مَیں انصار کو بلالایا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے بھی مشورہ مانگا کہ: بھائیو! آپ حضرات بتاؤ؛ ہم کیا کریں؟ چناں چہ یہ بھی مہاجرین والے راستہ پر ہی چلے (یعنی جیسا اُن میں اختلاف ہوا تھا، اِن میں بھی ویسا ہی اختلاف ہوا اور ان میں بھی دو گروہ ہو گئے) حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تم لوگ بھی یہاں سے اُٹھ جاؤ۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: یہاں قریش کے وہ بڑے لوگ جو مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے؛ ان کو بلالاؤ (مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد ہجرت والا حکم باقی نہیں رہا تھا اور پہلے بھی آچکا ہے کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو نبیٔ کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اعلان فرما دیا:" لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ" پھر بھی جو لوگ مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد مکہ مکرمہ والا وطن اور اس کی رہائش چھوڑ کر مدینہ منورہ آئے اور وہیں رہائش اختیار کر لی، تو ظاہری طور پر ایک وطن چھوڑ کر دوسرے وطن میں ہجرت تو ہوئی، اور وہ بھی فائدے سے خالی نہیں تھی) چناں چہ مَیں ان کو بلالایا، وہ حضرات آئے تو حضرت عمر رضی اللہ

عنہ نے ان سے بھی اس بارے میں رائے لی تو ان میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہوا، سب نے بالاتفاق یہ مشورہ دیا کہ ہماری رائے ہے کہ آپ واپس ہو جائیں اور لوگوں کو ہلاکت اور مصیبت پر پیش نہ کریں۔ جب ان کی طرف سے یہ متفقہ مشورہ ملا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اعلان کروادیا کہ کل صبح مَیں اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر واپس ہونے والا ہوں، تم لوگ بھی واپسی کی تیاری کر لو (یعنی فیصلہ کر دیا کہ کل واپس جانا ہے)۔

(جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ ظاہر کر دیا اور اعلان کروادیا) تو حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے کہا: (امیر المؤمنین! اس علاقہ میں طاعون پھیلا ہوا ہے اس لیے یہاں سے واپس ہو کر گویا) آپ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگنا چاہ رہے ہیں؟ راوی فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کا یہ جملہ سن کر فرمایا: ابو عبیدہ! کاش کوئی دوسرا آدمی یہ بات بولا ہوتا (پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا بڑا عجیب و غریب جواب دیا۔ حضراتِ علماء فرماتے ہیں کہ اس جواب نے تقدیر سے تعلق رکھنے والے سارے اشکالات کو دور کر دیا۔ فرمایا:) جی ہاں! ہم اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کی طرف ہی جارہے ہیں (پھر اس بات کو سمجھانے کے لیے ایک بات ارشاد فرمائی) آپ میرے ایک سوال کا جواب دیجئے: آپ اپنے جانوروں کو لے کر چَرانے کے لیے کسی وادی اور میدان میں پہنچے جس کے دو حصے ہیں، ایک طرف کا حصہ سرسبز و شاداب ہے، اور دوسرا حصہ خشک ہے؛ تو کیا یہ بات نہیں ہے کہ اگر تم خشک حصہ میں جانوروں کو چرانے کے لیے چھوڑو گے تب بھی تقدیر ہی کی وجہ سے چراؤ گے، اور اگر سرسبز حصہ میں چھوڑو گے تب بھی تقدیر ہی کی وجہ سے چراؤ گے (لیکن مجھے بتاؤ کہ جب آپ کو فیصلہ کا اختیار ملا ہے تو ان کو چَرنے کے لیے کہاں چھوڑو گے؟ ظاہر ہے کہ آدمی سرسبز و شاداب جگہ پر ہی چھوڑے گا۔

حالاں کہ ان کی قسمت میں پیٹ بھرنا لکھا ہے تو خشک حصہ میں بھی ان کا پیٹ بھرے گا، اور ان کی قسمت میں پیٹ بھرنا نہیں لکھا ہے تو سبز حصہ میں بھی نہیں بھرے گا؛ یہ بات تو طے ہے، پھر بھی ہم کیا کرتے ہیں؟)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس جواب کے بعد حضرت عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تشریف لائے (یہ بھی عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور بڑے صحابی ہیں) جب یہ سارا مشورہ اور فیصلہ ہوا وہاں تک وہ اس جگہ موجود نہیں تھے، اپنی کسی حاجت کے لیے کہیں باہر گئے ہوئے تھے (ان کے سامنے یہ بات آئی کہ میری غیر حاضری میں یہاں ایسی باتیں ہوئی ہیں) انہوں نے کہا: اس سلسلہ میں میرے پاس نبیٔ کریم ﷺ کی ہدایت موجود ہے (کہا گیا: ضرور بتائیے، تو انہوں نے کہا:) میں نے حضور ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جب تمہیں معلوم ہو کہ کسی علاقہ میں طاعون پھیل چکا ہے (اور تم وہاں پہلے سے موجود نہ ہو) تو وہاں مت جاؤ، اور اگر کسی جگہ طاعون پھیلا ہو اور پہلے سے تم وہاں پر موجود ہو تو اس سے بھاگ کر اس بستی سے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ (پہلے سے نہیں تھے تو جانے کی ضرورت نہیں ہے، اور پہلے سے موجود ہو تو وہاں سے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو قسمت میں ہے وہ ہو کر رہے گا) حضور ﷺ کا یہ ارشاد سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان فرمائی اور واپس لوٹے (گویا انہوں نے جو فیصلہ کیا تھا وہ حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق تھا۔)

افادات:- یہ واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۱۸ھ ربیع الآخر کا ہے، ۱۸ھ کے شروع میں محرم اور صفر میں شام کے علاقہ میں طاعون پھیل گیا تھا، اور بہت سارے لوگ موت کا

شکار ہوئے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا پہلے سے شام جانے کا ارادہ تھا، لیکن جب پتہ چلا تھا کہ وہاں طاعون پھیلا ہوا ہے تو آپ نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، جب طاعون ختم ہو گیا تو آپ کو اطلاع کی گئی کہ آپ اپنا سفر شروع کر سکتے ہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مہاجرین اور انصار کے اکابرِ صحابہ کی ایک جماعت کو اپنے ساتھ لے کر شام کی طرف روانہ ہوئے۔

اس زمانہ میں شام کے علاقہ کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا، ایک دمشق، دوسرا فلسطین، تیسرا حمص، چوتھا قنّسرین، پانچواں اُردن؛ گویا شام کی الگ الگ پانچ چھاؤنیاں تھیں اور ہر چھاؤنی کا ایک الگ سپہ سالار مقرر تھا، جو حضرات وہاں کے سپہ سالار تھے ان کے نام یہ ہیں: حضرت ابوعبیدہ بن الجراح، حضرت خالد بن ولید، حضرت یزید بن ابی سفیان، حضرت شرحبیل بن حسنہ، اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ- اوران میں سب کے سپہ سالارِ اعظم حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ تھے۔

مہاجرین اولین

"مہاجرین اولین" وہ حضراتِ صحابہ کہلاتے ہیں جو شروع میں ایمان لائے تھے اور جنہوں نے مدینہ منورہ اس وقت ہجرت کی تھی جب کہ قبلہ بیت المقدس تھا۔ نبی کریم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لائے اس وقت قبلہ بیت المقدس تھا، سولہ یا سترہ مہینے تک وہی قبلہ رہا، اس

کے بعد تحویلِ قبلہ کا حکم نازل ہوا اور بیت اللہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آیا۔ تو تحویلِ قبلہ کا حکم آنے سے پہلے جو لوگ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تھے؛ ان سب کو مہاجرینِ اولین کہا جاتا ہے۔

طاعون

"طاعون" ایک مخصوص قسم کی بیماری ہے جس کو پلیگ کہتے ہیں۔ سورت والے تو جانتے ہی ہیں(۱) جہاں جہاں جوڑ والی ہڈی ہوتی ہے وہاں ایک گانٹھ اور گلٹی سی پیدا ہو جاتی ہے، عام طور پر بغل میں اور کبھی ران کے اندر جو جڑ ہے وہاں پر بھی نکلتی ہے، پھر اس کی وجہ سے کھال کا وہ حصہ سرخ یا سبز ہو جاتا ہے، اور اس کے نمودار ہونے نتیجہ میں آدمی کو بخار آتا ہے، قے ہونے لگتی ہے، اور ایک دو دن ہی میں معاملہ نمٹ جاتا ہے۔ طاعون اور پلیگ کی بیماری ایک وبا کی شکل اختیار کرتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی یہ بیماری پھیلی تھی جس کو" طاعونِ عمواس" کہتے ہیں۔

(۱) ۱۹۹۳ء میں سورت میں بھی طاعون پھیلا تھا اور غیر مسلموں کی بڑی تعداد اس میں ہلاک ہوئی تھی۔ مرتب

مناقبِ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح (رضی اللہ عنہ)

”اے ابوعبیدہ !کاش کوئی دوسرا ایسا کہتا“یعنی آپ کی زبان سے یہ بات مجھے اچھی نہیں لگی۔ یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے آدمی نے ایسی بات کہی ہوتی تو کوئی بات تھی، آپ جیسا سمجھ دار آدمی ایسی بات کرتا ہے؟اور بعض حضرات نے کہا: حضرت عمر رضی اللہ عنہ گویا یہ کہنا چاہتے تھے کہ: آپ بڑے آدمی ہیں، اگر کوئی دوسرا کہتا تو میں اس کی خبر لیتا۔

چوں کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا مقام اونچا تھا، عشرۂ مبشرہ میں سے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ: کثرتِ فتوحات نے سب کو بدل دیا لیکن ابوعبیدہ اپنے حال پر ہی باقی ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں آیا۔

حضورِ اکرم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات کے بعد جب انصار ثقیفۂ بنو ساعدہ میں اپنا امیر منتخب کرنے کے لیے جمع ہوئے، ادھر مہاجرین کو پتہ چلا تو ان کو سمجھانے کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لے کر گئے۔ وہاں ان سے بہت ساری باتیں ہوئیں، اخیر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو تقریر فرمائی، اس میں یہ بھی کہا کہ ان دو (یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ) میں سے جس کے ہاتھ پر تم لوگ چاہو بیعت کرلو۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا وقت آیا اس سے پہلے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ انتقال کر چکے تھے، اس وقت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہوتے تو میں انہیں کو اپنا جانشین مقرر کرتا، مجھے کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کا الہامی جواب

"ہم اللہ کی تقدیر سے بھاگ کر اللہ کی تقدیر ہی کی طرف جارہے ہیں" یعنی انسان کا کوئی بھی قول و فعل اور حرکت تقدیر سے ہٹ کر تو ہے نہیں، جو بھی ہوگا تو وہی ہوگا جو تقدیر میں لکھا ہے، اس لیے اگر تم یہ کہتے ہو کہ تقدیر سے بھاگ کر جارہے ہو؛ تو سن لو کہ ہم یہاں سے جو جارہے ہیں وہ تقدیر میں لکھا ہے تبھی جارہے ہیں۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ کچھ لوگ دیہات سے آئے اور نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے سوال کیا کہ: اللہ کے رسول! ذرا بتلائیے کہ ہم جو کچھ پڑھ کر دم کرتے ہیں اور علاج و معالجہ یا پرہیز کرتے ہیں؛ اس سے اللہ کی تقدیر بدل جاتی ہے؟ اللہ کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا: یہ بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں سے ہے۔

تقدیر اور تدبیر

جو لوگ کہتے ہیں کہ تقدیر اور تدبیر میں لڑائی ہوتی ہے۔ تو سمجھ لو کہ دونوں میں کوئی لڑائی نہیں ہوتی۔

تدبیر کا مفید اور کار گر ہونا تقدیر میں لکھا ہے تب تو تدبیر کار گر ہو گی، ورنہ نہیں۔ تقدیر سے ہٹ کر کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔

حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ زندگی کے ہر شعبہ میں جب کوئی ایسا موقعہ آتا ہے اور ہمیں اپنی عقل و سمجھ سے فیصلہ کرنا ہوتا ہے تو آدمی فیصلہ اسی چیز کا کرتا ہے جو عقل اور تدبیر کا تقاضا ہوتا ہے۔ وہاں آدمی کا دُور دُور تک خیال نہیں ہوتا کہ میں اس پر عمل کرکے اپنے آپ کو اللہ کی تقدیر سے بچا رہا ہوں۔ سیدھی بات ہے۔ مثلاً: آپ کے پاس زمین ہے، آپ اس کو بیچنا چاہتے ہیں، آپ کے پاس بہت سے پرپوزل اور فرمائشیں آئیں، اب آپ ہی بتلایئے کہ ان میں سے کونسی فرمائش کو آپ اختیار کریں گے؟ ظاہر ہے کہ جو آپ اپنے لیے مفید سمجھیں گے، حالاں کہ فائدہ آپ کے حصہ میں لکھا ہوا ہے تو کسی بھی فرمائش پر آپ عمل کریں گے تو فائدہ ہی ہو گا، اور اگر نقصان لکھا ہوا ہے تو آپ دیکھنے میں کیسی ہی اچھی فرمائش پر عمل کریں گے؛ نقصان ہی ہو گا؛ لیکن جب فیصلہ کرنے کا وقت آتا ہے تو آدمی اسی پہلو کو اختیار کرتا ہے جس میں زیادہ فائدہ نظر آتا ہے۔ گویا یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے، ہماری زندگی کے ہر موڑ پر جب ہمیں کوئی فیصلہ کرنے کا موقعہ آتا ہے اور ہمارے ہاتھ میں اختیار ہوتا ہے تو ہم اپنی عقل اور سمجھ و تدبیر کو سامنے رکھ یہی فیصلہ کرتے ہیں۔ آج جب ہمارے لیے یہ فیصلہ کرنے کا وقت آیا کہ ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے، یا ہمیں واپس ہو جانا چاہیے، تو ظاہر ہے کہ سمجھ و تدبیر اور عقل کا تقاضا یہی تھا کہ آگے بڑھنے کی بجائے واپس ہو جانا چاہیے، جبکہ ہمیں

معلوم ہے کہ وہاں بیماری پھیلی ہوئی ہے، اس لیے اگر میں نے یہ فیصلہ کیا تو اس میں مَیں کونسا تقدیر سے بھاگا؟ دیکھو! کیسا عجیب وغریب جواب دیا ہے اور کیسی عمدہ تعبیر اختیار فرمائی ہے!

اور اس تعلیم میں بھی دراصل بڑی حکمتیں ہیں۔ ایک آدمی پہلے سے جس جگہ ہے، وہاں ایسی کوئی وبا اور بیماری پھیلی، اگر وہاں سے یہ سمجھ کر نکل جاتا ہے کہ میں اس بیماری سے بچ جاؤں گا، اب اگر وہاں سے نکلنے کے بعد اس کو وہ بیماری نہیں لگے گی، تب تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں وہاں سے بھاگ کر نکل آیا اس لیے میری جان بچ گئی، حالاں کہ ایسا نہیں ہے کہ وہاں سے بھاگ کر نکل آیا اس لیے موت نہیں آئی، بلکہ سیدھی سادی بات یہ ہے کہ دراصل موت لکھی ہوئی تھی ہی نہیں اس لیے نہیں آئی۔ اور اگر ایک آدمی پہلے سے وہاں نہیں تھا اور بیماری و وبا پھیل جانے کے بعد وہاں پہنچا اور اس کو موت آگئی تو لوگ یوں بات کریں گے کہ وہاں گیا اس لیے مر گیا۔

”اگر مگر“ شیطان کا دروازہ کھول دیتا ہے

دیکھو! تقدیر کا ایک فیصلہ واقع ہونے سے پہلے پہلے کوئی تدبیر اختیار کرنے کی پوری اجازت ہے، لیکن تقدیر کا فیصلہ واقع ہو چکنے کے بعد ہمارے دل ودماغ میں جو خیالات اُٹھتے ہیں کہ اگر یوں کرتے تو یوں ہو جاتا؛ اس کی شریعت اجازت نہیں دیتی۔ اسی لیے جب نبیٔ کریم ﷺ کے سامنے کوئی نقصان ہو جاتا (جیسے: کوئی برتن گر کر ٹوٹ گیا) اور کوئی کہتا کہ اگر ایسا کرتا تو بچ جاتا؛ تو حضور ﷺ

فرماتے: ایسا مت بولو، اگر کوئی اور بات ہوتی تو وہی ہوتی۔ یعنی اگر اس برتن کا نہ ٹوٹنا اللہ تعالیٰ کے یہاں مقدر ہوتا تو پھر نہ ٹوٹتا؛ لیکن جب وہ برتن ٹوٹ گیا تو اب کچھ مت بولو۔ گویا تقدیر کا فیصلہ واقع ہوجانے کے بعد ایسی جو باتیں ہوتی ہیں، وہ دراصل تقدیر کا ایک طرح سے انکار ہوتا ہے جو بالکل درست نہیں ہے۔ ہاں! جب تک کوئی بات وجود میں نہیں آئی اس سے پہلے تدبیریں کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس سے پہلے آپ جو چاہیے بولیے، مشورہ کیجیے، فیصلہ کیجیے، اس لیے کہ تقدیر میں کیا ہونے والا ہے وہ ہمارے سامنے نہیں ہے، لیکن تقدیر کا فیصلہ سامنے آچکنے کے بعد پھر ایسا بولنے کی اجازت نہیں کہ میں یوں کرتا تو یوں ہوجاتا۔

مثلاً: ایک آدمی بمبئی جارہا تھا، کسی نے اس سے کہا کہ آج مت جانا، میرا جی نہیں چاہتا کہ آج تم جاؤ، وہ کہنے لگا کہ: مجھے بہت ضروری کام ہے اس لیے میں تو جاؤں گا، اب وہ گیا اور راستہ میں ٹرین کا حادثہ ہوا اور اس کی موت واقع ہوگئی، تو وہ کہتا ہے کہ: میں نے اس سے کہا تھا کہ میرا دل نہیں مانتا، تُو مت جا، پھر بھی وہ گیا۔ اگر میری بات مان لیتا تو بچ جاتا۔ اس کا یہ کہنا بالکل غلط ہے۔ ارے بھائی! اگر اس کا بچ جانا مقدر ہوتا تو وہ تمہارا کہا ضرور مانتا۔ حدیثِ پاک میں آتا ہے: ”وَإِيَّاكَ وَاللَّوَّ، فَإِنَّ اللَّوَّ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ“ تم ”اگر مگر“ سے بچو، اس لیے کہ ”اگر مگر“ شیطان کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ (شرح مشکل الآثار)

طاعون زدہ علاقہ سے نکلنے کی تین صورتیں

یہاں غور کیجئے کہ یہ ارشاد فرمایا ہے: ’’فَلَا تَخْرُجُوا فِرَاراً مِنْهُ‘‘ بھاگ کر نہ نکلو۔ تو نکلنے کی تین شکلیں ہیں:

(۱) پہلی شکل تو یہ ہے کہ آدمی وہاں سے یہ سمجھتے ہوئے بھاگ کر نکلے کہ میں بچ جاؤں؛ یہ تو حرام ہے۔

(۲) دوسری شکل یہ ہے کہ پہلے سے اس کا پروگرام طے تھا، جیسے: آج کل ایک دو مہینے پہلے سے ٹکٹ بک کروا کر رکھا جاتا ہے، اور جس وقت پروگرام طے کیا اس وقت کوئی بیماری بھی نہیں تھی، اتفاق کی بات کہ آپ کا سفر ہونے والا تھا اس کے دس پندرہ دن پہلے بیماری پھیل گئی اور خوب چل رہی ہے اور آپ کی تاریخ آ گئی، تو اب ایسا نہیں ہے کہ آپ اس بیماری کی وجہ سے جا رہے ہیں، بلکہ آپ کا پروگرام تو پہلے ہی سے طے تھا؛ تو اس میں کوئی اشکال نہیں، آپ بے تکلّف نکل کر جا سکتے ہیں۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ آپ کا پہلے سے کوئی پروگرام نہیں تھا، بیماری آئی اور آپ کا بھی کوئی کام نکل آیا اس لیے آپ وہاں سے جانا چاہتے ہیں، تو اس صورت میں جائیں یا نہ جائیں؟ تو بعض حضرات کہتے ہیں کہ: نہ نکلے۔ اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس کام کی وجہ سے جانا چاہتا ہے تو جا سکتا ہے، اس کے دل میں یہ خیال نہیں ہونا چاہیے کہ میں یہاں سے جاؤں گا تو بچ جاؤں گا۔

الحمد للہ! ہمارے یہاں سورت میں جب طاعون (پلیگ) پھیلا تھا تو کمزور ایمان والے بھی مضبوطی سے جمے رہے اور اللہ تعالیٰ نے سب کو ایمان کی وہ طاقت عطا فرمائی کہ ہر ایک کہتا تھا کہ یہاں سے کوئی جاتا نہیں ہے، اگر موت آنی مقدر ہے تو یہاں بھی آئے گی، اور جہاں جائیں گے وہاں بھی آئے گی۔

طاعون زدہ علاقہ کے متعلق حکم

حدیث ۱۷۹۲:-

وعن أسامة بن زيد رضى الله عنه عن النبيِّ ﷺ قَالَ: ((إِذَا سَمِعْتُمُ الطَّاعُونَ بِأَرْضٍ، فَلَا تَدْخُلُوهَا، وَإِذَا وَقَعَ بِأَرْضٍ، وأَنْتُمْ فِيهَا، فَلَا تَخْرُجُوا مِنْهَا)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب تم سنو کہ کسی علاقہ میں طاعون (پلیگ) پھیل چکا ہے؛ تو وہاں مت جاؤ۔ اور جب کسی جگہ طاعون (پلیگ) پھیل جائے اور تم وہاں پہلے سے موجود ہو؛ تو وہاں سے مت نکلو۔

افادات:- وہاں سے نکلنے کی ممانعت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر سبھی بھاگ جائیں گے تو جو لوگ اس بیماری کا شکار ہو چکے ہیں ان کی خیر خبر کون لے گا۔ اور جن لوگوں کی موت واقع ہو جائے گی ان کی تکفین و تدفین کون کرے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ ساری ذمہ داریاں کون ادا کرے گا؟

بَابُ التَّغْلِيظِ فِيْ تَحْرِيمِ السِّحْرِ

جادو کے سخت حرام ہونے کا بیان

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے جادو کی حرمت کی شدّت اور اس کی شناعت وقباحت کو بتلانے کے لیے یہ باب قائم کیا ہے۔

جادو کی حقیقت

لفظِ ''سِحر'' عربی زبان میں ایسے اثر کے لیے بولا جاتا ہے کہ جس کا سبب ظاہر نہ ہو، بلکہ مخفی ہو۔ کسی بھی چیز پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں عام طور پر ان کے اسباب ہماری نگاہوں کے سامنے ہونے کی وجہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس پر فلاں سبب کے نتیجہ میں یہ اثر مرتب ہوا ہے، جیسے: کھانا کھایا اس کی وجہ سے بھوک دور ہوگئی، پانی پیا اس کی وجہ سے پیاس دور ہوگئی، کسی نے مارا اس کی وجہ سے زخم ہوا۔ اور جتنے بھی ظاہری اسباب ہیں جب ان کے نتیجہ میں اثرات مرتب ہوتے ہیں تو ان کو ہر آدمی جان لیتا ہے، وہ اسباب آدمی کی نگاہوں اور علم میں آتے ہیں، اور اُن کو جاننے کی وجہ سے مرتب ہونے والے اثرات پر طبیعت کے اندر تعجب پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن بعض اثرات ایسے ہوتے ہیں جن کے حقیقت میں تو اسباب ہوتے ہی ہیں جن کی وجہ سے اثر مرتب ہوتا ہے؛ لیکن وہ اسباب لوگوں کی

نگاہوں سے پوشیدہ ہوتے ہیں؛ ایسے اثر کو عربی زبان میں ''سحر'' اور اردو زبان میں ''جادو'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور پوشیدہ سبب کبھی معنوی کلمات ہوتے ہیں جو زبان سے ادا کئے جاتے ہیں اور ان کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جیسے اچھے کلمات کی اچھی تاثیر ہوتی ہے، ویسے ہی برے کلمات کی بری تاثیر ہوتی ہے؛ لیکن عام طور پر اچھے کلمات کا اثر تو لوگوں کو معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ اچھے کلمات سب لوگوں کے سامنے کھل کر پڑھے جاتے ہیں، تو لوگوں کے علم میں ہوتے ہیں اس لیے لوگوں کو اس پر تعجب نہیں ہوتا، جیسے: کسی کو سر میں درد ہوا اور الحمد شریف پڑھ کر دم کر دیا اور وہ اچھا ہو گیا۔ کوئی دعا پڑھی اور اس دعا کا اثر ظاہر ہوا؛ یہ بھی معنوی اسباب ہی ہیں لیکن لوگ دیکھتے ہیں کہ کسی نے پڑھ کر دم کر دیا تو وہ اچھا ہو گیا اور دیکھنے والے بھی سمجھ جاتے ہیں کہ اُس نے پڑھا جس کی وجہ سے یہ ہوا، اس سے کوئی تعجب نہیں ہوتا۔

اور کچھ کلمات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر ہوتا ہے لیکن وہ کلمات عام طور پر لوگوں کے علم میں نہیں ہوتے، ان کو زبان سے ادا کرنے کے نتیجہ میں جب کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے تو چوں کہ لوگوں کو ان کلمات کا پتہ نہیں چلتا، البتہ ان کا اثر لوگوں کے سامنے آتا ہے، اور لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، یا کانوں سے محسوس کرتے ہیں؛ اسی کو ''سحر'' اور ''جادو'' کہا جاتا ہے۔

اور یہ معنوی اثر کبھی کسی غیر محسوس شخصیات کا ہوتا ہے، وہ شخصیتیں لوگوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتیں، جن کو شیاطین اور جنات کہا جاتا ہے۔ جادوگر ایسے کلمات پڑھتے ہیں، یا ایسے کام کرتے ہیں جن کلمات یا کاموں کے ذریعہ سے وہ کسی شیطان اور جن کو خوش کر دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں پھر شیطان وہی کام کرتا ہے جو یہ آدمی چاہتا ہے، مثلاً: کسی کو تکلیف پہنچانی ہے، تو اب یہ شخص شیطانوں کو خوش کرنے کے لیے کچھ کلمات اپنی زبان سے بولتا ہے جن میں ان کی تعریفیں ہوتی ہیں اور ان کو بڑا بناتا ہے۔ یا پھر وہ ایسے کچھ کام کرتا ہے جو ان کو پسند ہوتے ہیں، مثلاً: نجاست میں ملوث ہونا، کسی کو قتل کر کے اس کا خون پینا، یا کسی کو قتل کر کے اس کا خون بہانا، ہمیشہ ناپاکی اور غلاظت میں رہنا، یا نعوذ باللہ شریعت کی کچھ چیزیں جن کی تعظیم واحترام ضروری ہے ان کی بے حرمتی کرنا، جیسے: قرآن کریم، اللہ تعالیٰ اور رسولِ پاک کے نام میں نجاست ڈال دینا، ایسی چیزوں سے شیاطین اور خبیث جنات بہت خوش ہوتے ہیں، اور ایسا کر کے یہ آدمی ان سے اپنا کام نکلواتا ہے۔ آج کل کی زبان میں جس کو "سپاری دینا" کہتے ہیں کہ کسی کو رقم دے کر خوش کر کے کسی کو مروا دینا۔ تو گویا شیطان اور خبیث روحوں کو ان کی تعریف اور ان کے پسندیدہ کام کر کے "سپاری" دی جاتی ہے، اور ان سے کہا جاتا ہے کہ تم ایسا ایسا کرو، تو وہ ان کو ویسی ہی تکلیف پہنچاتے ہیں جیسی یہ چاہتا ہے۔

شیاطین سے زیادہ احمق دوسری کوئی قوم نہیں

در حقیقت ان شیاطین سے زیادہ احمق دوسری کوئی قوم نہیں ہے کہ بس ایک مرتبہ ان کی تعریف میں کسی نے چند کلمات کہہ دیئے کہ پھر سال بھر کے لیے وہ ایک ڈیوٹی پر لگ جاتے ہیں۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ اگر دس مرتبہ کھانا کھلاؤ تو ایک مرتبہ کام کرے گا، جتنے رشوت لے کر کام کرنے والے ہیں وہ ہر ہر کام کے لیے الگ الگ رشوت لیتے ہیں، روزانہ الگ رشوت دیتے رہو اور کام کرواتے رہو، ایسا نہیں ہے کہ ایک مرتبہ ان کو خوش کر دیا تو سال بھر کے لیے ڈیوٹی پر لگ جائیں؛ لیکن شیاطین کی قوم ایسی ہے کہ ان کی ایک مرتبہ ذرا تعریف کر دی اور کہا کہ فلاں کی آنکھ پر مسلط ہو جاؤ تو وہ آنکھ کی بینائی پر بیٹھ جاتے ہیں اور جن رگوں سے روشنی کا تعلق ہے ان پر مسلط ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کی بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ اگر کان پر مسلط کیا تو اس پر لگ جاتے ہیں، گلے پر لگایا تو اسی پر لگے رہیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں جہاں تکلیف پہنچانی مقصود ہوتی ہے، وہاں سال بھر کے لیے مسلط رہتے ہیں، جب سال پورا ہونے آتا ہے تو مخصوص دن یا مخصوص وقت دوبارہ ان کی تعریف کر دی جاتی ہے اور ان کی خواہش کے مطابق کام کر دیا جاتا ہے تو پھر اس کا "جادو اور سحر" رینیو (Renew) ہو جاتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سحر میں جادوگر جو کلمات پڑھتا ہے یا جو کام کرتا ہے ان میں شیاطین کی تعریف ہوتی ہے یا جن سے شیاطین خوش ہوتے ہیں اور ان میں اکثر کلمات اور کام کفریہ و شرکیہ ہی ہوتے ہیں

اس لیے کہ ایسے ہی کلمات اور ایسی ہی حرکتوں سے وہ خوش ہوتے ہیں۔ چناں چہ بعض ساحروں کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے جوتے کے تلوے میں قرآنِ کریم لگایا اور اسی کو پہن کر چلتے تھے، یا حیض کا خون پلایا جاتا تھا، مطلب یہ ہے کہ قرآن کو نجاست میں لگائے رکھتے تھے، اور ناپاکی میں ملوث رہتے تھے۔ ایک ساحر کے متعلق کتاب میں لکھا ہے کہ چالیس سال تک اس نے غسل نہیں کیا، اس طرح کی گندگیاں شیاطین کو پسند آتی ہیں پھر ساحرین ان کو جو کہتے ہیں اس کے مطابق وہ کرتے ہیں۔ بعض مرتبہ کلمات کے اثرات ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ غیر محسوس چیزوں (یعنی شیاطین، جنات اور خبیث روحوں) کے ذریعہ سے کام لیا جاتا ہے۔ جیسے آدمی جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں فرشتوں کی مدد آتی ہے، ایسے ہی غلط کاموں کی وجہ سے شیاطین مدد کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں یہ قدرت دے رکھی ہے اور دنیا کا نظام اسی طرح چلتا ہے۔ تو کچھ منتر پڑھ کر دوسروں کو تکلیف پہنچانا، یا شیاطین اور خبیث روحوں کو خوش کرکے ان سے اپنے مَن چاہے کام نکلوانا؛ اسی کو سحر کہتے ہیں۔ یہ سحر کی حقیقت ہے۔

جادو سیکھنا سکھانا کفر ہے

قرآنِ پاک کی ایک آیت پیش کی ہے: ﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَكِنَّ الشَّيَاطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ یہودیوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے شریعت کے جو احکام اور آسمانی کتابیں دی گئی تھی ان کو

چھوڑ کر وہ لوگ جادو اور سحر کے سیکھنے سکھانے میں مشغول ہو گئے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں یہ سلسلہ بڑے عروج پر تھا، بعض یہودیوں نے کہا کہ جادو حضرت سلیمان علیہ السلام سکھاتے ہیں، گویا ان کی طرف غلط نسبت کی، تو قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی براءت ظاہر فرمائی کہ نعوذ باللہ وہ اس میں ملوث نہیں ہیں، وہ اس الزام سے پاک ہیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جادو سکھا کر یا سیکھ کر کفر اختیار نہیں کیا، ہاں! شیاطین ایسی حرکتیں کرتے تھے اور لوگوں کو سحر اور جادو سکھاتے تھے۔

دیکھو! یہاں قرآنِ کریم نے جادو کے سیکھنے اور سکھانے کو کفر سے تعبیر کیا ہے، چناں چہ علماء نے لکھا ہے کہ اکثر و بیشتر ایسا ہی ہوتا ہے کہ جادو کے سیکھنے اور سکھانے میں جو کام کروائے جاتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں جن کے نتیجے میں آدمی کا ایمان محفوظ نہیں رہتا، اسی لیے اس کی حرمت بڑی شدید ہے۔

جادو کے متعلق اسلامی حکم

اور سحر کے متعلق اسلامی حکم یہ ہے کہ اگر کسی کے متعلق حاکمِ وقت کو معلوم ہو جائے کہ وہ اپنے سحر کے ذریعہ لوگوں کو اذیّتیں اور تکلیفیں پہنچاتا ہے تو حاکم کو چاہیے کہ اس کو قتل کر کے لوگوں کو اس کے شر سے نجات دے۔

ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو

حدیث ۱۷۹۳:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه عن النبيّ ﷺ قَالَ:((اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوبِقَاتِ)) قالوا: يَا رسولَ اللهِ! وَمَا هُنَّ ؟ قَالَ:((الشِّرْكُ بِاللهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ، وأَكْلُ الرِّبَا، وأَكْلُ مَالِ الْيَتِيمِ، وَالتَّوَلِّي يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ الْغَافِلاَتِ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہلاک کرنے والی سات چیزوں سے بچو۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! ہلاک کرنے والی وہ چیزیں کونسی ہیں؟ حضورِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: (۱) اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا (۲) جادو سیکھنا اور سیکھانا (۳) کسی ایسی جان کو قتل کرنا جس کا قتل اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے (۴) سود کھانا (۵) یتیم کا مال کھانا (۶) میدانِ جنگ میں پیٹھ پھیرنا (۷) ایمان والی ایسی پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا جو برائی کی چیزوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

جادو میں شعائر اللہ کی توہین کرنی پڑتی ہے

افادات:- یہ سب کبیرہ گناہ ہیں۔ اور جادو، سحر کے سیکھنے سکھانے میں کوئی نہ کوئی کفریہ و شرکیہ کلمہ زبان سے بولنا ہی پڑتا ہے، یا کوئی نہ کوئی شرکیہ و کفریہ کام کرنا ہی پڑتا ہے، کبھی دیوی دیوتاؤں کے

سامنے بھینٹ چڑھانی پڑتی ہے، ان کے سامنے سجدہ کرنا پڑتا ہے، یا قرآنِ کریم وغیرہ شعائر اللہ کی توہین کرنی پڑتی ہے۔

ایک صاحب جو ہمارے حضرت فقیہ الامت (رحمۃ اللہ علیہ) کے مجاز ہیں انہوں نے سنایا کہ ایک ساحر نے اپنے بستر کے نیچے قرآن کے اوراق بچھار کھے تھے اور اپنے جوتے میں قرآن رکھوایا تھا اُسی پر وہ چلتا تھا۔ گویا ساحر جتنی زیادہ ایسی بیہودہ حرکتیں کرے گا اُتنی ہی اس کے سحر میں تاثیر زیادہ آئے گی اور شیاطین اس کی مدد زیادہ کریں گے۔

کیا قتل حلال بھی ہے؟

"کسی ایسی جان کو قتل کرنا جس کا کو قتل کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہو" بعض مرتبہ کوئی آدمی ایسا کام کرلیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی جان حلال ہو جاتی ہے، مثلاً: کوئی آدمی اسلام لانے بعد مرتد ہو گیا اور کفر اختیار کر لیا تو اس کی وجہ سے اس کا قتل حلال ہو جاتا ہے۔ یا کسی نے کسی کو ناحق قتل کیا اس کی وجہ سے قصاص اور بدلہ میں اس کو قتل کرنا حلال ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر ایسا کچھ نہیں پھر بھی کسی کو ناحق قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے۔

پاک دامن پر تہمت لگانا

اور پاک دامن عورتوں کا تذکرہ اس لیے کیا کہ عام طور پر ایسی نوبت عورتوں کے ساتھ ہی پیش آتی ہے۔ ورنہ کسی پاک دامن مرد پر تہمت لگانے کا گناہ بھی کبیرہ ہی ہے۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْمُسَافَرَةِ بِالْمُصْحَفِ اِلٰى بِلَادِ الْكُفَّارِ اِذَا خِيْفَ وُقُوْعُهُ بِأَيْدِي الْعَدُوِّ

کفار کی سرزمین میں قرآنِ کریم لے کر جانے کا حکم

کوئی آدمی کافروں کی سرزمین میں قرآنِ کریم لے کر جائے تو کیا حکم ہے؟ تو علماء نے لکھا ہے کہ اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ قرآنِ کریم لے کر جانے والے آدمی کے ساتھ کوئی ناروا سلوک کیا جائے، یا اس کے سامان میں زیادتی کی جائے گی، اور اگر قرآنِ کریم ان کے ہاتھوں میں آگیا تو وہ اس کی بے حرمتی کریں گے؛ تو ایسی صورت میں وہاں قرآنِ کریم لے کر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ اور اگر ایسا کوئی اندیشہ نہیں ہے، بلکہ غالب گمان یہ ہے کہ وہ لوگ قرآنِ پاک کو نہیں چھیڑیں گے؛ تو اُس صورت میں قرآنِ کریم ساتھ میں لے جانے کی اجازت ہے۔

حدیث ۱۷۹۴ :-

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قَالَ: نَهَى رسولُ اللهِ- صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -أَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى أَرْضِ الْعَدُوِّ. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ دشمن کی سرزمین میں قرآنِ کریم لے کر جانے سے نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے منع فرمایا۔

افادات:- یہ حکم اُس وقت ہے جب کہ قرآنِ کریم کی بے حرمتی کا اندیشہ اور غالب گمان یا یقین ہو؛ لیکن اگر ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے تو پھر قرآنِ کریم ساتھ میں لے جانے کی اجازت ہے۔

بَابُ تَحْرِيمِ اِسْتِعْمَالِ إِنَاءِ الذَّهَبِ وَإِنَاءِ الْفِضَّةِ فِي الْأَكْلِ وَالشُّرْبِ وَالطَّهَارَةِ وَسَائِرِ وُجُوهِ الْاِسْتِعْمَالِ

سونے چاندی کے برتن کو کھانے پینے اور پاکی میں استعمال میں لینا حرام ہے

ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ سونا چاندی بطورِ زیور استعمال کرنا عورتوں کے لیے جائز ہے، مردوں کے لیے جائز نہیں۔ لیکن سونے یا چاندی کا برتن کھانے پینے یا طہارت کے لیے استعمال کرنا، یا سونے چاندی سے بنا ہوا قلم، گھڑی وغیرہ استعمال کرنا کیسا ہے؟ اسی مسئلہ کو یہاں بتلانا چاہتے ہیں کہ عورت کے لیے بھی سونے چاندی کو زیور کے طور پر استعمال کرنا تو جائز ہے، لیکن زیور کے علاوہ سونے چاندی کے برتن، گھڑی، قلم وغیرہ کو استعمال کرنا اس کے لیے بھی جائز نہیں۔ سونے چاندی کے برتن، گھڑی، قلم وغیرہ چاہے مرد استعمال کرے یا عورت؛ دونوں کے لیے ممنوع اور ناجائز ہے۔

حدیث ۱۷۹۵:-

عن أُمِّ سلمة رَضِيَ اللهُ عنها: أَنَّ رسُولَ اللهِ ﷺ قَالَ: الَّذِي يَشْرَبُ فِي آنِيَةِ الفِضَّةِ، إِنَّمَا يُجَرْجِرُ فِي بَطْنِهِ نَارَ جَهَنَّمَ. (متفق عَلَيْهِ)

وفی روایة لمسلم: إِنَّ الَّذِی یَأْکُلُ أَوْ یَشْرَبُ فی آنِیَةِ الفِضَّةِ والذَّھَبِ.

ترجمہ:-امّ المؤمنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنھا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو آدمی چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے، وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ اُنڈیل رہا ہے۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ: چاندی اور سونے کے برتن میں کوئی آدمی کھائے، یا پانی پیئے؛ تو گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ کو اُنڈیل رہا ہے۔

افادات:-پہلی روایت میں صرف چاندی کا تذکرہ تھا، دوسری روایت سے معلوم ہو گیا کہ صرف چاندی نہیں بلکہ سونے کا بھی یہی حکم ہے، اور یہ حکم مرد اور عورت دونوں کے لیے عام ہے۔

کافروں کے لیے دنیا میں اور ہمارے لیے آخرت میں

حدیث ۱۷۹۶:-

وعن حُذَیفَةَ-رضی اللہ عنه-قَالَ: إِنَّ النبیَّ-ﷺ-نھانا عنِ الحَرِیرِ، وَالدِّیبَاجِ، وَالشُّرْبِ فی آنِیَةِ الذَّھَبِ وَالفِضَّةِ، وقَالَ: ھُنَّ لَھُمْ فی الدُّنْیَا، وَھِیَ لَکُمْ فِی الآخِرَةِ. (متفق عَلَیْه)

وفی روایة فی الصحیحین عن حُذَیْفَةَ-رضی اللہ عنه-: سَمِعْتُ رسولَ اللہ ﷺ یقولُ: لاَ تَلْبَسُوا الحَرِیرَ وَلاَ الدِّیبَاجَ وَلاَ تَشْرَبُوا فِی آنِیَةِ الذَّھَبِ وَالفِضَّةِ وَلاَ تَأْکُلُوا فی صِحَافِھَا.

ترجمہ:- حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں ریشم اور دیباج (جو ریشم کی ہی ایک قسم ہے) کو پہننے سے اور سونے چاندی کے برتن میں پینے سے منع فرمایا، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: یہ سب چیزیں کافروں کے لیے دنیا میں ہے اور ہمارے لیے آخرت میں ہے۔

دوسری روایت میں ہے، حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ریشم اور دیباج مت پہنو، اور سونے چاندی کے برتن میں مت پیو، اور اس کی پلیٹ میں مت کھاؤ۔

سر پھوٹ جاتا

افادات:- بخاری اور مسلم وغیرہ میں ایک قصہ منقول ہے کہ حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) فارس کے علاقہ میں مدائن کے گورنر تھے، ایک مرتبہ انہوں نے ایک دیہات کے رہنے والے فارسی النسل آتش پرست مجوسی سے پانی منگوایا، وہ گاؤں کا چودھری تھا، چاندی کے برتن میں پانی لے کر آیا، حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) نے اس کو وہ گلاس ایسے زور سے مارا کہ اگر لگتا تو اس کا سر پھوٹ جاتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ لانے والا مسلمان تو تھا نہیں ؛ پھر اس کو کیوں مارا؟ تو حضرت حذیفہ (رضی اللہ عنہ) نے اس کی وجہ بھی بتلائی کہ پہلے بھی میں اس کو بتلا چکا ہوں کہ مجھے چاندی کے برتن میں پانی لا کر مت دینا، اس کے باوجود یہ نہیں مانتا، اس لیے میں نے اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا۔

(صحیح بخاری، حدیث رقم: ۵۶۳۲، بَابُ الشُّرْبِ فِي آنِيَةِ الذَّهَبِ)

برتن بدل دو

حدیث ۱۷۹۷:-

وعن أنس بن سِيرين قال: كنتُ مَعَ أنس بن مالك -رضی الله عنه- عِنْدَ نَفَرٍ مِنَ المَجُوسِ، فَجِيءَ بِفَالُوذَجٍ عَلَى إِنَاءٍ مِنْ فِضَّةٍ، فَلَمْ يَأْكُلْهُ، فَقِيلَ لَهُ: حَوِّلْهُ، فَحَوَّلَهُ عَلَى إِناءٍ مِنْ خَلَنْجٍ وَجِيءَ بِهِ فَأَكَلَهُ. (رواه البيهقي بإسناد حسن)

((الخَلَنج)): الجفْنَة.

ترجمہ:- حضرت اَنس بن سیرین (رحمۃ اللہ علیہ) (تابعی) فرماتے ہیں کہ میں حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) (جو صحابی ہیں اور نبیٔ کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے خادم تھے) کے ساتھ تھا اور وہ مجوسیوں کی ایک جماعت کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، چاندی کے برتن میں فالودہ لایا گیا تو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے نہیں کھایا۔ لانے والے کو کسی نے کہا کہ یہ برتن بدل دو، چناں چہ اس نے لکڑی کے برتن میں فالودہ ڈالا، تب حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نے اس کو کھایا۔

بَابُ تَحْرِيمِ لَبْسِ الرَّجُلَ ثَوْباً مُزَعْفَراً

زعفران سے رنگاہوا کپڑا مرد کے لیے پہننا حرام ہے

زعفران سے رنگاہوا کپڑا پہننے کی مردوں کے لیے اجازت نہیں، عورتوں کے لیے اجازت ہے، اور زعفران کو بطورِ رنگ کے کپڑوں پر لگانے سے منع کیا گیا ہے۔

حدیث ۱۷۹۸:-

عن أنس رضی الله عنه قَالَ نَهى النبيُّ ﷺ أَنْ يَتَزَعْفَرَ الرجُل. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم ﷺ نے مرد کو زعفران لگانے سے منع فرمایا۔

یہ کافروں کا لباس ہے

حدیث ۱۷۹۹:-

وعن عبد اللهِ بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما قَالَ: رأى النَّبِيُّ ﷺ عَلَيَّ ثَوْبَيْنِ مُعَصْفَرَيْنِ، فَقَالَ: ((أُمُّكَ أَمَرَتْكَ بِهٰذا؟)) قلتُ: أَغْسِلُهُمَا؟ قَالَ: ((بَلْ أَحْرِقْهُمَا)).

وفى رواية، فَقَالَ: إِنَّ هَذَا مِنْ ثِيَابِ الكُفَّارِ فَلاَ تَلْبَسْهَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے میرے جسم پر دو کپڑے عُصفُر سے رنگے ہوئے دیکھے تو فرمایا: کیا تمہاری ماں نے یہ حکم دیا ہے؟ (ایسا اس لیے کہا کہ ان کا ایسے کپڑوں کا پہننا نادانی اور جہالت کی بات تھی، اور جہالت بے پڑھے لکھے آتی ہے، اسی لیے بے پڑھے لکھے آدمی کو "اُمّی" کہتے ہیں) حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! کیا اس کو دھوڈالوں؟ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: بلکہ اس کو جلادو۔

اور ایک روایت میں یہ بھی ہے: حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ کافروں کا لباس ہے اس کو مت پہنو۔

افادات:- "**عُصفُر**" ایک خوشبو ہے جو زعفران سے تیار کی جاتی ہے اور اس میں زعفران کا رنگ غالب ہوتا ہے۔

بَابُ النَّھِیِ عَنْ صَمْتِ یَوْمٍ اِلَی اللَّیْلِ

دن بھر خاموش رہنے کی ممانعت

پہلی امتوں میں خاموشی کا روزہ بھی ہوا کرتا تھا جس کو ”صومِ سکوت“ کہتے تھے، اور لوگ اس کی باقاعدہ منّت مانتے تھے، اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔

حدیث ۱۸۰۰:-

عن عليٍّ رضی اللہ عنہ قَالَ: حَفِظْتُ عَنْ رَسُولِ اللهِ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ -: لَا يُتْمَ بَعْدَ احْتِلَامٍ، وَلَا صُمَاتَ يَوْمٍ إِلَى اللَّيْلِ. (رواه أبو داود بإسناد حسن)

قَالَ الْخَطَّابِيُّ فِي تَفْسِيرِ هَذَا الحديث: كَانَ مِنْ نُسُكِ الْجَاهِلِيَّةِ الصُّمَاتُ. فَنُهُوا فِي الْإِسْلَامِ عَنْ ذَلِكَ وأُمِرُوا بِالذِّكْرِ وَالْحَدِيثِ بِالْخَيْرِ.

ترجمہ:- حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سے یہ دو باتیں برابر یاد رکھی ہیں: (۱) بالغ ہونے کے بعد یتیمی نہیں (۲) دن بھر خاموشی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے علامہ خطابی (رحمۃ اللہ علیہ) کا جملہ نقل کیا ہے کہ: زمانۂ جاہلیت میں خاموش رہنے کو بھی عبادت سمجھا جاتا تھا، اسلام نے اس سے منع کیا بلکہ بھلائی کی بات یا ذکر کرنے کا حکم دیا۔

افادات:- ایک لڑکا یا لڑکی جب بالغ ہوگئے، اب اگر اس کے والد کا انتقال ہو جائے تو وہ یتیم نہیں کہلائے گا، ہاں! بچپن میں اگر انتقال ہو گیا ہو تو وہ یتیم ہے لیکن بالغ ہونے کے بعد وہ بھی یتیم نہیں رہا۔

ایک صاحب سال میں ایک دو مرتبہ میرے پاس آتے رہتے ہیں، جب بھی آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ میں یتیم ہوں، میری مدد کرو۔ جب میں ان کا یہ جملہ سنتا ہوں تو مجھے ہنسی آتی ہے۔

پرانے زمانہ میں لوگ جب اعتکاف میں بیٹھتے تھے تو بولنے کو برا سمجھتے تھے، حالاں کہ مطلب یہ ہے کہ دنیوی باتیں کرنا ممنوع ہے، بھلائی کی باتیں یا ذکر کرنے کی اجازت ہے۔

عبادت سمجھ کر خاموش رہنا جائز نہیں

حدیث ۱۸۰۱:-

وعن قیس بن أَبِی حازم، قَالَ: دَخَلَ أَبُو بکر الصِّدِّیق رضی اللہ عنه عَلَی امْرأَةٍ مِنْ أَحْمَسَ یُقَالُ لَهَا: زَیْنَبُ، فَرَآهَا لَا تَتَكَلَّمُ. فَقَالَ: مَا لَهَا لا تتکلمُ ؟ فقالوا: حَجَّتْ مصمِتةً، فقالَ لها: تَكَلَّمِی، فَإِنَّ هَذَا لَا یَحِلُّ، هَذَا مِنْ عَمَلِ الجَاهِلِیَّةِ، فَتَكَلَّمَتْ. (رواہ البخاری)

ترجمہ:- حضرت قیس بن ابی حازم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق (رضی اللہ عنہ) ایک مرتبہ قبیلۂ اَحْمس کی ایک عورت کے یہاں تشریف لے گئے جس کا نام زینب تھا، تو دیکھا کہ وہ عورت بالکل بات نہیں کرتی، وہاں موجود لوگوں سے پوچھا: کیا بات ہے، یہ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ لوگوں نے بتلایا کہ اس عورت نے پورا حج

خاموشی کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے اس عورت کو سمجھایا کہ باتیں کرو؛ عبادت سمجھ کر خاموش رہنا جائز نہیں ہے، یہ تو جاہلیت کا عمل ہے، تب اس عورت نے بولنا شروع کیا۔

بَابُ تَحۡرِيۡمِ اِنۡتِسَابِ الۡاِنۡسَانِ اِلَى غَيۡرِ أَبِيۡه وَتَوَلِّيۡهِ اِلَى غَيۡرِ مَوَالِيۡه

آدمی کاخود کواپنے باپ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف منسوب کرنا

اور غلام کااپنے آزاد کرنے والے آقا کے علاوہ

کسی دوسرے کی طرف آزاد کرنے والا ہونے کی نسبت کرنا حرام ہے

حدیث ۱۸۰۲ :-

عن سعد بن أَبِي وقاص -رضي الله عنه-: أَنَّ النبيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: ((مَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ غَيْرُ أَبِيهِ، فالجَنَّةُ عَلَيْهِ حَرَامٌ)). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: کوئی آدمی اپنے باپ کے علاوہ دوسرے کی طرف اپنی نسبت کرے حالاں کہ اس کو معلوم ہے کہ میں جس کی طرف نسبت کررہا ہوں وہ میرا باپ نہیں ہے؛ تو ایسے آدمی پر جنت حرام ہے۔

افادات:- زمانۂ جاہلیت میں ایک دستور یہ بھی تھا کہ اگر کوئی آدمی کسی کو منھ بولا بیٹا بناتا، جیسے: کسی کی اولاد نہیں ہے تو کسی دوسرے کے بچہ کو اپنا بیٹا بنالیا، تو اب جس کو منھ بولا بیٹا بنایا ہے اس کو اپنی ہی طرف منسوب کرتا تھا، یعنی منھ بولے بیٹے کو حقیقی اولاد کی طرح سمجھا جاتا تھا، اور جیسے باپ کے

مرنے کے بعد حقیقی بیٹا باپ کے مال میں وارث بنتا ہے اسی طرح یہ منھ بولا بیٹا بھی بیٹا بنانے والے کے مال میں باقاعدہ حقیقی بیٹے کی طرح وارث بنتا تھا۔ اور جیسے حقیقی بیٹا اپنی نسبت اپنے باپ کی طرف کرتا ہے اسی طرح منھ بولا بیٹا بھی اپنی نسبت بیٹا بنانے والے کی طرف کرتا تھا۔

اسی طرح زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنے آپ کو بڑا بتلانے کے لیے اپنا نسب بجائے اپنے حقیقی باپ کے دوسرے کی طرف جوڑ دیا کرتے تھے، اور دوسرے کے ساتھ اپنا نسب جوڑ کر اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے بڑا ظاہر کرتے تھے۔ یا کبھی اقتصادی اور مالی فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ جب تک اسلام میں کوئی حکم نہیں آیا تھا وہاں تک یہی سلسلہ جاری تھا۔ لیکن بعد میں قرآنِ کریم میں اس سلسلہ میں ممانعت کا حکم نازل ہوا تو حضورِ اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمادیا۔

حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) کا واقعہ

حضرت زید بن حارثہ (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ دراصل یہ پیدائشی غلام نہیں تھے، بلکہ خاندانی اعتبار سے شریف النسب تھے؛ لیکن ان کا واقعہ یہ ہوا تھا کہ ان کے قبیلے پر دوسرے قبیلے والوں نے چھاپا مارا۔ اس زمانے میں لوٹ مار چلتی ہی رہتی تھی، ایک قبیلہ دوسرے کے اوپر حملہ آور ہوکر ان کے ساتھ زیادتیاں کرتا تھا۔ اس حملے میں دوسرے قبیلے والوں نے ان کے قبیلے کے بہت سے لوگوں کو گرفتار کرلیا، مال بھی لوٹ لیا، اس میں حضرت زید بھی گرفتار کیئے گئے،

اوران کو مکہ مکرمہ لاکر بیچ دیا، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ نے ان کو خریدا، جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ کا نکاح حضور اکرم ﷺ کے ساتھ ہوا تو انہوں نے ان کو نبی کریم ﷺ کو ہبہ کردیا۔

ادھر ان کے والد ان کی جدائی میں بہت غمگین رہتے تھے، اوران کی جستجو وتلاش میں تھے کہ میرا بیٹا کہاں ہے، لوگوں سے پوچھتے رہتے، ہر آتے جاتے قافلوں سے دریافت کرتے رہتے۔ ایک مرتبہ ان کے قبیلے کے کچھ لوگ مکہ مکرمہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے، انہوں نے حضرت زید کو دیکھا تو جاکر ان کے والد کو اطلاع کی کہ تمہارا بیٹا وہاں ہے۔ چناں چہ ان کے والد ان کے چچا کو لے کر مکہ مکرمہ آئے، اور معلوم کیا کہ ہمارا بیٹا کس کی غلامی میں ہے، معلوم ہوا کہ حضور اکرم ﷺ کی غلامی میں ہے، تو دونوں بھائی حضورِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اوران کے والد نے حضور ﷺ کے سامنے سارا معاملہ رکھا کہ ہمارا بیٹا آپ کے یہاں ہے اور میں اپنے بیٹے کو لینے کے لیے آیا ہوں، اور آپ تو بڑے بھلائی کرنے والے ہیں، بڑے گھرانے والے ہیں، آپ ہماری مصیبت میں مدد کیجئے اور ہمارا بیٹا ہمارے حوالہ کیجئے، اگر آپ قیمت چاہتے ہوں تو ہم قیمت بھی دیدیں گے۔ حضورِ اکرم ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ٹھیک ہے! مگر پہلے ان سے تو معلوم کرلیا جائے کہ وہ آپ لوگوں کے ساتھ آنے کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں؟ اگر وہ آپ کے ساتھ آنے کے لیے تیار ہے تو میری طرف سے انکار نہیں ہے، لیکن اگر وہ میرے پاس رہنے کے لیے راضی ہو تو تمہارے ساتھ زبردستی نہیں بھیج سکتا۔ ان کے والد یہ سمجھتے تھے کہ وہ تو ساتھ آہی جائے گا۔ چنانچہ حضورِ اکرم ﷺ نے ان کے والد

اور چچا کو بٹھا کر حضرت زید کو بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ ان کو پہچانتے ہو؟ کہا: ہاں۔ پوچھا: کون ہیں؟ کہا: یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے چچا ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے فرمایا: یہ لوگ تمہیں لینے کے لیے آئے ہیں، اگر تمہیں ان کے ساتھ جانا ہو تو میری طرف سے تم کو اجازت ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اب تک نبی کریم ﷺ کا محبت اور شفقت والا جو سلوک اور رویہ دیکھا تھا اس کے پیشِ نظر فوراً کہا کہ: میں تو یہیں رہوں گا، میں ان کے ساتھ جانا نہیں چاہتا۔ ان کے باپ ایک دم حیرت میں پڑ گئے اور ناراض بھی ہوئے کہ عجیب آدمی ہو، غلامی کی زندگی کو آزادی کی زندگی پر ترجیح دیتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ: میں نے ان سے جو سلوک دیکھا ہے اس کے بعد میں آپ لوگوں کے ساتھ آنا پسند نہیں کرتا۔ جب انہوں نے یہ کہا تو نبی کریم ﷺ نے ان کو آزاد بھی کر دیا اور ان کو اپنے ساتھ لے کر حرم میں گئے اور آپ نے اعلان کیا کہ سب لوگ گواہ رہو کہ آج سے میں نے ان کو اپنا بیٹا بنالیا۔ اور اس زمانے میں دستور یہی تھا کہ جب کوئی آدمی کسی کو منھ بولا بیٹا بنالیتا تھا تو اسی کی طرف اس کی نسبت کرتے تھے، جیسے سگے باپ کی طرف کی جاتی ہے، چناں چہ لوگ ان کو زید بن محمد کے نام سے پکارنے لگے۔

بعد میں جب سورۂ احزاب کی آیت نازل ہوئی ﴿اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْۤا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِی الدِّیْنِ وَمَوَالِیْكُمْ﴾ اگر کسی کو منھ بولا بیٹا بنایا ہے تو آج تک بیٹا بنانے والے کی طرف جو نسبت کی جاتی تھی آئندہ یہ ہونا نہیں چاہیے، بلکہ ان کے سگے باپ کی طرف ہی نسبت کیا کرو؛ یہی انصاف کا تقاضہ ہے۔ اور اگر (ان کو ایسی جگہ سے لایا گیا کہ) تم لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ ان کا باپ کون

ہے، تو پھر یہ تمہارے دینی بھائی اور تمہارے آزاد کردہ غلام ہیں۔ چنانچہ اس کے بعد ان کو زید بن حارثہ کے نام سے پکارا جانے لگا۔

موجودہ دَور کا غلط دستور

گویا زمانۂ جاہلیت کا یہ دستور اسلام کو قابلِ قبول نہیں ہے۔ہاں !کوئی آدمی کسی بچہ کی پرورش کے لیے محبت و شفقت کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہے کہ میں نے اس کو منھ بولا بیٹا بنایا ہے، اور اس نسبت سے اس کو بیٹا بیٹا کہہ کر پکارتا ہے، لیکن اس کی نسبت اپنی طرف نہیں کرتا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ لیکن آج کل مسلمان شریعت کے اس حکم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے جن کو منھ بولی بیٹی یا بیٹا بناتے ہیں اس کی باقاعدہ اپنی ہی طرف نسبت کرتے ہیں، اور شادی کے موقعہ پر اپنی بیٹی کی طرح اپنی طرف نسبت کرکے کارڈ کی تقسیم کرتے ہیں، اور اپنی طرف ہی منسوب کرکے نکاح کرتے ہیں؛ یہ شرعی حکم کی کھُلّم کھُلّا خلاف ورزی ہے۔ اور اگر کوئی آدمی اس حکم کا انکار کرتا ہے تو اس کی وجہ سے کافر ہو جاتا ہے۔ اور اگر انکار نہیں کرتا لیکن قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے؛ تب بھی بڑا گنہگار ہے۔

اس نے کفر کیا

حدیث ۱۸۰۳:-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه عن النبيّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم قَالَ: ((لَا تَرْغَبُوا عَنْ آبَائِكُمْ، فَمَنْ رَغِبَ عَنْ أَبِيهِ، فَهُوَ كُفْرٌ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ: اپنی نسبت کو اپنے باپ سے مت توڑو، اور جو آدمی اپنی نسبت اپنے باپ سے کاٹے گا (یعنی اپنی نسبت بجائے باپ کے دوسرے کی طرف کرے گا) تو اس نے کفر کیا۔

اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت

حدیث ۱۸۰۴:-

وعن يزيد بن شريك بن طارقٍ، قَالَ: رَأيتُ عَلِيّاً رضى الله عنه عَلَى الْمِنْبَرِ يَخْطُبُ، فَسَمِعْتُهُ يقُولُ: لَا واللهِ مَا عِنْدَنَا مِنْ كِتَابٍ نَقْرَؤُهُ إِلَّا كِتَابَ اللهِ، وَمَا فِي هٰذِهِ الصَّحِيفَةِ. فَنَشَرَهَا فَإِذَا فِيهَا أَسْنَانُ الإِبِلِ، وَأَشْيَاءُ مِنَ الْجِرَاحَاتِ، وَفِيهَا: قَالَ رسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم : ((الْمَدِينَةُ حَرَمٌ مَا بَيْنَ عَيْرٍ إِلَى ثَوْرٍ، فَمَنْ أَحْدَثَ فِيهَا حَدَثاً، أَوْ آوَى مُحْدِثاً، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ اللهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفاً وَلَا عَدْلاً. ذِمَّةُ الْمُسْلِمِينَ وَاحِدَةٌ، يَسْعَى بِهَا أَدْنَاهُمْ، فَمَنْ أَخْفَرَ مُسْلِماً، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لَا يَقْبَلُ

اللهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفاً وَلاَ عَدْلاً. وَمَنِ ادَّعَى إِلَى غَيْرِ أَبِيهِ، أَوِ انْتَمَى إِلَى غَيْرِ مَوَالِيهِ، فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلاَئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ، لاَ يَقْبَلُ اللهُ مِنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ صَرْفاً وَلاَ عَدْلاً)). (متفق عَلَيْهِ)

((ذِمَّةُ الْمُسْلِمِينَ)) أَيْ: عَهْدُهُمْ وأَمَانَتُهُمْ. ((وأَخْفَرَهُ)): نَقَضَ عَهْدَهُ.

((وَالصَّرْفُ)): التَّوْبَةُ، وَقِيلَ الْحِيلَةُ. ((وَالعَدْلُ)): الفِدَاءُ.

ترجمہ:- حضرت یزید بن شریک بن طارق (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ کی قسم! ہمارے پاس کتاب اللہ کے علاوہ کوئی اور کتاب نہیں ہے جس کو ہم پڑھتے ہوں، اور یہ پرچہ ہے جس میں کچھ احکام ہیں جو حضورِ اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ہمیں بتلائے ہیں، چنانچہ وہ پرچہ کھولا تو اس میں اونٹوں کی عمریں لکھی ہوئی تھیں، اور اس میں یہ بھی تھا کہ نبیٔ کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا: مدینہ منورہ کا عیر اور ثور کا درمیانی حصہ حرم ہے۔ اور جو آدمی کوئی بدعت ایجاد کرے گا، یا کسی بدعت ایجاد کرنے والے کو پناہ دے گا، اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ اس کی طرف سے نفل قبول کریں گے، نہ فرض (عام طور پر "صَرْفاً وَلَا عَدْلاً" کا یہی ترجمہ کیا جاتا ہے؛ لیکن علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس روایت کے بعد الفاظ کا جو لغوی ترجمہ کیا ہے، وہاں "صَرْفاً" کا ترجمہ توبہ اور حیلہ کیا ہے، اور "عَدْلاً" کا ترجمہ فدیہ کیا ہے، یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ نہ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے، نہ اس کی طرف سے فدیہ قبول فرمائیں گے، بلکہ اس کو عذاب ہی دیا جائے گا۔) اگر کسی مسلمان کی طرف سے کسی کو امان دی گئی، تو وہ سب کی طرف سے سمجھی جائے گی۔ کم سے کم درجے کا مسلمان بھی امان دے سکتا ہے، پھر ہر شخص کو اس کے امان کا لحاظ کرنا پڑے گا۔ اور اگر کوئی آدمی مسلمان کی طرف سے دیئے گئے عہد وامان کو توڑے گا تو اس پر

اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے اور نہ اس کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔ اور جس نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کی طرف منسوب کیا (یعنی اپنا نسب اپنے باپ کے بجائے دوسرے کے ساتھ جوڑا، مثلاً: زید یوسف کا بیٹا ہے اور وہ اپنے آپ کو بتلاتا ہے کہ میں محمد کا بیٹا ہوں؛ تو یہ درست نہیں) یا کسی غلام کو آقا نے آزاد کیا اور وہ اپنے آزادی کی نسبت آزاد کرنے والے کے علاوہ کی طرف کرتا ہے؛ تو ایسے آدمی پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ تو اس کی توبہ قبول فرمائیں گے نہ اس کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

افادات:- اس روایت میں مختلف باتیں بیان فرمائی گئی ہیں:

حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے پاس مخصوص علم تھا؟

(۱) بعض لوگوں نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ نبیِ کریم ﷺ نے علم کے قبیل سے کچھ چیزیں ان کو خصوصیت کے ساتھ عنایت فرمائی ہیں، گویا ان کے پاس وہ چیزیں ہیں جو دوسروں کے پاس نہیں، اس سلسلہ میں کسی نے حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے پوچھ لیا کہ آپ کے پاس قرآن کے علاوہ کچھ اور بھی ہے جو حضورِ اکرم ﷺ نے آپ کو مخصوص طور پر دیا ہو؟ تو حضرت علی (رضی اللہ عنہ) نے جواب میں فرمایا: نہیں! قرآنِ کریم کے علاوہ کوئی اور کتاب ہمارے پاس نہیں ہے، اور یہ پرچہ ہے جس میں کچھ احکام لکھے ہوئے ہیں جو حضورِ اکرم ﷺ نے ہمیں بتلائے

ہیں۔ اور جب وہ پرچہ کھولا تو اس میں اونٹوں کی عمریں لکھی ہوئی تھیں، یعنی دیت میں جو اونٹ ادا کئے جاتے ہیں وہ اونٹ کس عمر کا ہونا چاہیے۔ اسی طرح اونٹوں میں جو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کی تفصیل لکھی ہوئی تھی، اور آپس میں لڑائی کے موقعہ پر ایک دوسرے کو جو زخم لگایا جاتا ہے (جیسے: کسی کی آنکھ پھوڑدی، کسی کا ہاتھ کاٹ دیا، کسی کا دانت توڑدیا) تو ان کے قصاص یا دیت کے طور پر کیا واجب ہوتا ہے؛ یہ سب احکام اس پرچہ میں لکھے ہوئے تھے۔

کیا حرم مدینہ کا حکم حرم مکہ جیسا ہی ہے؟

(۲) نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "مدینہ منورہ کا عیر اور ثور کا درمیانی حصہ حرم ہے۔" عیر اور ثور؛ یہ دونوں مدینہ منورہ میں پہاڑ ہیں اور نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کو حرم قرار دیا۔ اب یہاں ایک مسئلہ پیش آیا کہ حرمِ مکّی (یعنی مکہ مکرمہ کے آس پاس کا مخصوص علاقہ ہے جس کی حد بندی کردی گئی ہے اور جو حرم کہلاتا ہے، اس) کے متعلق تو کچھ مخصوص احکام ہیں کہ وہاں کی تازہ سرسبز گھاس نہ کاٹی جائے، وہاں کے درختوں کو نہ اُکھاڑا جائے، وہاں کسی جانور کا شکار نہ کیا جائے۔ اس پر تو تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ کوئی آدمی اگر ایسا کوئی کام کرلے گا تو اس پر جزا واجب ہوگی یعنی اس کے برابر قیمت کا صدقہ ادا کرنا پڑے گا جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں موجود ہے؛ لیکن کیا مدینہ منورہ کے متعلق بھی یہی حکم ہے؛ یا کچھ فرق ہے؟

تو علماء نے لکھا ہے کہ ویسے تو مدینہ منورہ کا بھی اپنا ایک احترام و عظمت ہے، لیکن حرمِ مکّی کے متعلق جو حکم دیا گیا ہے کہ وہاں شکار کرنا جائز نہیں، گھاس اُکھاڑنا جائز نہیں، درخت کاٹنا جائز نہیں؛ یہ حکم حرمِ مدنی کے لیے نہیں ہے، ہاں! اس کی عظمت اور ادب واحترام کا پورا لحاظ ہونا چاہئے۔ البتہ بعض علماء اس طرف گئے ہیں کہ حرمِ مدنی کا بھی وہی حکم ہے جو حرمِ مکّی کا ہے، اور وہ حضرات اسی روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ مدینہ منورہ عیر سے لے کر ثور تک حرم ہے۔

جسے کسی کی طرف سے بھی امان دیا گیا

(۳) اگر کسی مسلمان کی طرف سے کسی کو امان دی گئی تو وہ سب کی طرف سے سمجھی جائے گی۔ ایسا نہیں ہے کہ کوئی بڑا آدمی کسی کو امان دے تو معتبر ہے اور کوئی چھوٹے درجہ کا آدمی کسی کو امان دے تو وہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی بھی مسلمان نے کسی کو امان دیدی تو اُس امان کا لحاظ کرنا اور اس کی حرمت کو ملحوظ رکھنا سب مسلمانوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی آدمی مسلمان کے دیئے گئے عہد اور امان کو توڑے گا تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ اس کی توبہ قبول فرمائیں گے اور نہ اس کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

یہ سراسر خیانت ہے

(۴) ایک آدمی کسی کا غلام تھا اور اس کو کسی آقا نے آزاد کیا، چاہے پیسے لے کر ہی آزاد کیا ہو، تو جس آقا نے اس کو آزاد کیا ہے شریعت کی طرف سے اس کو کچھ مخصوص حقوق حاصل ہوتے ہیں، اور آزاد کرنے والا اس کا ”مولائے عتاقہ“ کہلاتا ہے۔ بعض صورتوں میں اسی کو غلام کی وراثت بھی ملتی ہے، یعنی اس غلام کا کوئی نسبی وارث نہ ہو (جیسے: اس کی کوئی اولاد نہ ہو) تو اس آقا ہی کو اس کے مال میں وراثت ملے گی۔ اب اگر یہ غلام اپنے آپ کو آزاد کرنے والے آقا کے علاوہ دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے تو گویا شریعت نے آزاد کرنے والے آقا کو جو حقوق اور اختیارات دئے تھے وہ کسی دوسرے کو دینا چاہتا ہے جو سراسر خیانت ہے، اسی لیے اس پر ایسی سخت وعید ارشاد فرمائی گئی کہ ایسے غلام پر اللہ تعالیٰ کی اور فرشتوں کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے روز نہ تو اس کی کوئی توبہ قبول فرمائیں گے، نہ اس کی طرف سے فدیہ قبول کیا جائے گا۔

سخت وعید

حدیث ۱۸۰۵:-

وعن أَبِي ذَرٍّ رضی اللہ عنہ: أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللہ ﷺ يقول: ((لَيْسَ مِنْ رَجُلٍ ادَّعَى لِغَيْرِ أَبِيهِ وَهُوَ يَعْلَمُهُ إِلاَّ كَفَرَ، وَمَنِ ادَّعَى مَا لَيْسَ لَهُ فَلَيْسَ مِنَّا، وَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ،

وَمَنْ دَعَا رَجُلاً بِالْكُفْرِ، أَوْ قَالَ: عَدُوَّ اللهِ، وَلَيْسَ كَذَلِكَ إِلاَّ حَارَ عَلَيْهِ)). (متفق عَلَيْهِ، وهذا لفظ رواية مسلم)

ترجمہ:۔ حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: جس آدمی نے اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کی طرف منسوب کیا حالاں کہ وہ جانتا ہے (کہ میرا باپ یہ نہیں ہے) تو وہ کافر ہوگیا۔ اسی طرح کسی آدمی نے کسی ایسی چیز (مثلاً: کسی مکان زمین وغیرہ) کا دعویٰ کیا جس کا وہ مالک نہیں ہے ایسا آدمی ہم میں سے نہیں۔ ایسے آدمی کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے۔ اسی طرح کسی آدمی نے کسی کو کفر کی طرف منسوب کیا (یعنی مسلمان کو کافر کہہ دیا) یا اس کو یوں کہہ دیا کہ اے اللہ کے دشمن، حالاں کہ وہ ایسا نہیں ہے؛ تو وہ بات کہنے والے کی طرف لوٹتی ہے۔

بَابُ التَّحْذِيْرِ مِنْ اِرْتِكَابِ مَا نَهَى اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ أَوْرَسُوْلُهُ ﷺ عَنْهُ

اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ نے جن کاموں سے منع کیا ہے ان کا ارتکاب کرنے سے ڈرانے کا بیان

ارشاداتِ ربّانی

باری تعالیٰ کے چند ارشادات پیش کئے ہیں۔

﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِيْنَ يُخَالِفُوْنَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيْبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيْبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ﴾

ترجمہ:- جو لوگ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس بات سے ڈریں کہ ان کو کوئی آزمائش پہنچے، یا وہ دردناک عذاب میں ڈالے جائیں۔

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ﴾

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے (یعنی تم اگر اللہ تعالیٰ کے حکم کو توڑو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو سزا دے گا)۔

﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾

ترجمہ:- بے شک تیرے پروردگار کی گرفت اور پکڑ بڑی سخت ہے۔

﴿وَكَذٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ﴾

ترجمہ:- تیرے پروردگار کی گرفت اور پکڑ کا یہ حال ہے کہ جب وہ کسی بستی کو پکڑتا ہے جب کہ وہ اس کے حکم کو توڑنے والے ہوتے ہیں تو بے شک اللہ تعالیٰ کی گرفت بڑی سخت اور خطرناک ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے

حدیث ۱۸۰۶:-

وعن أبي هريرة -رضى الله عنه-: أنَّ النبيَّ - صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قالَ: ((إنَّ اللهَ تَعَالَى يَغَارُ، وَغَيْرَةُ اللهِ، أنْ يَأْتِيَ المَرْءُ مَا حَرَّمَ اللهُ عَلَيْهِ(متفق عليه.)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے، اور اللہ کی غیرت کی بات یہ ہے کہ آدمی وہ کام کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا (یعنی جس کام سے منع کیا اُس کام کو کرے گا تو اللہ تعالیٰ پکڑیں گے)۔

بَابُ مَا يَقُولُهُ وَيَفْعَلُهُ مَنِ ارْتَكَبَ مَنْهِيًّا عَنْه

کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے منع کئے ہوئے کسی کام کا ارتکاب کرے؛ تو اس کی تلافی کیا ہے؟

قرآنی آیات

﴿وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطَانِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ﴾

ترجمہ:- اگر شیطان تمہیں پھیر دے تو اللہ تعالیٰ سے پناہ چاہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ شیطان کی طرف سے اگر وسوسہ ڈالا جائے اور وہ تمہیں اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے پھیرنا چاہے تو ایسے موقعہ پر تم اللہ کی پناہ حاصل کرو، اور اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت پر جمائے رکھو۔

﴿إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُونَ﴾

ترجمہ:- بے شک جو لوگ ڈرتے ہیں جب ان کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ پہنچتا ہے، اور اللہ کی نافرمانی پر اُبھارنے والا اُبھارتا ہے تو وہ چوکنّا ہو جاتے ہیں، وہ اللہ کو یاد کر لیتے ہیں اور اللہ کی ذات کا استحضار کر لیتے ہیں، ان کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں اور وہ اللہ کی نافرمانی سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں۔

﴿وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ

الذُّنُوبَ إِلاَّ اللّٰهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ. أُولٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِيْنَ﴾

ترجمہ:- وہ لوگ جب کوئی گناہ کا کام کرتے ہیں، یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں (یعنی اس کے عذاب کو یاد کرتے ہیں) اور اپنے گناہوں سے معافی چاہتے ہیں، اور سوائے اللہ کے گناہوں کو کون معاف کرے گا۔ اور جو کام انہوں نے غلط کئے اس پر اَڑے اور جمے نہیں رہتے یہ جانتے ہوئے کہ جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ غلط ہے۔ جو لوگ ایسا کرتے ہیں ان کا بدلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت یعنی گناہوں سے معافی ہے اور ایسے باغات و جنتیں ہیں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور نیک عمل کرنے والوں کا بڑا ہی اچھا بدلہ اور اجر ہے۔

﴿وَتُوبُوا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعاً أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾

ترجمہ:- اے ایمان والو! اللہ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔

افادات:- ان ساری آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی سے اگر کوئی گناہ سرزَد ہو جائے، یا کوئی غلط بات زبان سے نکل جائے تو فوراً اس غلطی کا احساس کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، اور اپنے گناہ سے توبہ کرنی چاہیے۔

گناہ کی تلافی

حدیث ۱۸۰۷:-

وعن أبي هريرة - رضى الله عنه - عن النبيِّ ﷺ - قال: ((مَنْ حَلَفَ فَقَالَ فى حَلِفِهِ: بِاللَّاتِ وَالعُزَّى فَلْيَقُلْ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ، وَمَنْ قَالَ لِصَاحِبِهِ: تَعَالَ أُقَامِرك فَلْيَتَصَدَّقْ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر کسی نے قسم کھائی اور اس میں یوں کہا کہ لات وعزیٰ کی قسم، تو اس کو چاہیے کہ لا الٰہ الّا اللہ کہے۔ اور کسی آدمی نے اپنے ساتھی سے کہا کہ: آؤ! جوا کھیلیں، تو اس کی تلافی یہ ہے کہ صدقہ کرے

افادات:- چوں کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ ایسی قسمیں کھانے کے عادی تھے، اسلام لانے کے بعد پرانی عادت کی وجہ سے کبھی بھول سے زبان سے ایسا جملہ نکل جاتا تھا۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ اگر نادانستہ ایسا جملہ زبان سے نکل جائے تو اس کی وجہ سے آدمی کافر تو نہیں ہوگا؛ لیکن اس کی تلافی میں لا الٰہ الّا اللہ کہہ دے۔ اور اگر جان بوجھ کر ایسی قسم کھائی ہے تو آدمی کافر ہو جائے گا۔

اسی طرح کسی آدمی نے اپنے ساتھی سے بھولے سے کہہ دیا کہ آؤ! جوا کھیلیں، حالاں کہ جب اسلام نے جُوے کو حرام قرار دیا تو اس نے چھوڑ دیا تھا؛ لیکن بے خبری میں ایسا کہہ دیا؛ تو نبیٔ کریم ﷺ

نے اس کی تلافی یہ بتلائی کہ صدقہ کردے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جس رقم کے جیب میں ہونے کی وجہ سے یہ جذبہ پیدا ہوا تھا، اُسی رقم کو صدقہ کردے گا؛ تب ہی تلافی ہوگی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ کوئی غلط بات زبان سے نکل جائے تو فوراً توبہ اور استغفار کے ساتھ اس کی تلافی کرلینی چاہیے، اور ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا نیک کام بھی کرلینا چاہیے، تب ہی اس کے نامۂ اعمال میں بجائے گناہ کے نیکی لکھی جائے گی۔

بَابُ الْمَنْثُوْرَاتِ وَالْمُلَحِ

باب أحاديث الدّجال وأشراط الساعة وغيرها

یہاں سے کچھ متفرق اور دلچسپ چیزیں جو احادیث میں آئی ہیں ان کو پیش کر رہے ہیں۔

ظہورِ مہدی، فتنۂ ظہورِ دجّال، نزولِ حضرت مسیح

حدیث ۱۸۰۸:-

عن النواس بن سمعان - رضی الله عنه - قال: ذَكَرَ رَسُولُ اللهِ-(ﷺ) -الدَّجَّالَ ذَاتَ غَدَاةٍ، فَخَفَّضَ فِيهِ وَرَفَّعَ حَتَّى ظَنَنَّاهُ فِى طَائِفَةِ النَّخلِ. فَلَمَّا رُحنَا إِلَيهِ، عَرَفَ ذٰلِكَ فِينَا، فَقَالَ: ((مَا شَأْنُكُمْ؟)) قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! ذَكَرْتَ الدَّجَّالَ الغَدَاةَ، فَخَفَّضْتَ فِيهِ وَرَفَّعْتَ، حَتَّى ظَنَنَّاهُ فِي طَائِفَةِ النَّخلِ، فقالَ: ((غَيْرُ الدَّجَّالِ أَخْوَفُنِي عَلَيْكُمْ، إِنْ يَخْرُجْ وَأَنَا فِيكُمْ، فَأَنَا حَجِيجُهُ دُونَكُمْ؛ وَإِنْ يَخْرُجْ وَلَسْتُ فِيكُمْ، فَامْرُؤٌ حَجِيجُ نَفْسِهِ، واللهُ خَلِيفَتِى عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ. إِنَّهُ شَابٌّ قَطَطٌ عَيْنُهُ طَافِيَةٌ، كَأَنِّي أُشَبِّهُهُ بِعَبْدِ العُزَّى بنِ قَطَنٍ، فَمَنْ أَدْرَكَهُ مِنْكُمْ، فَلْيَقْرَأْ عَلَيْهِ فَوَاتِحَ سُورَةِ الكَهْفِ؛ إِنَّهُ خَارِجٌ خَلَّةً بَيْنَ الشَّامِ وَالعِرَاقِ، فَعَاثَ يَمِيناً وَعَاثَ شِمَالاً، يَا عِبَادَ اللهِ فَاثْبُتُوا)) قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ! وَمَا لُبْثُهُ فِى الأَرْضِ؟ قَالَ: ((أَرْبَعُونَ يوماً: يَوْمٌ كَسَنَةٍ، وَيَوْمٌ كَشَهْرٍ، وَيَوْمٌ كَجُمُعَةٍ، وَسَائِرُ أَيَّامِهِ كَأَيَّامِكُمْ)) قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللهِ، فَذٰلِكَ اليَوْمُ الَّذِى كَسَنَةٍ أَتَكْفِينَا فِيهِ صَلَاةُ يَوْمٍ؟ قَالَ: ((لَا، اقْدُرُوا لَهُ قَدْرَهُ)). قُلْنَا: يا رسولَ اللهِ، وَمَا إِسْرَاعُهُ فِى الأَرْضِ؟ قَالَ: ((كَالْغَيْثِ اسْتَدْبَرَتْهُ الرِّيحُ، فَيَأْتِي عَلَى القَوْمِ، فَيَدْعُوهُم فَيُؤْمِنُونَ بِهِ وَيَسْتَجِيبُونَ لَهُ، فَيَأْمُرُ السَّمَاءَ فَتُمْطِرُ،

وَالأَرْضَ فَتُنْبِتُ، فَتَرُوحُ عَلَيْهِمْ سَارِحَتُهُمْ أَطْوَلَ مَا كَانَتْ ذُرًى وَأَسْبَغَهُ ضُرُوعاً، وَأَمَدَّهُ خَوَاصِرَ، ثُمَّ يَأْتِي الْقَوْمَ فَيَدْعُوهُمْ، فَيَرُدُّونَ عَلَيْهِ قَوْلَهُ، فَيَنْصَرِفُ عَنْهُمْ، فَيُصْبِحُونَ مُمْحِلِينَ لَيْسَ بِأَيْدِيهِمْ شَيْءٌ مِنْ أَمْوَالِهِمْ، وَيَمُرُّ بِالْخَرِبَةِ فَيَقُولُ لَهَا: أَخْرِجِي كُنُوزَكِ، فَتَتْبَعُهُ كُنُوزُهَا كَيَعَاسِيبِ النَّحْلِ، ثُمَّ يَدْعُو رَجُلاً مُمْتَلِئاً شَبَاباً فَيَضْرِبُهُ بِالسَّيْفِ، فَيَقْطَعُهُ جِزْلَتَيْنِ رَمْيَةَ الْغَرَضِ، ثُمَّ يَدْعُوهُ، فَيُقْبِلُ، وَيَتَهَلَّلُ وَجْهُهُ يَضْحَكُ، فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ بَعَثَ اللهُ تَعَالَى الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ (ﷺ)، فَيَنْزِلُ عِنْدَ الْمَنَارَةِ الْبَيْضَاءِ شَرْقِيَّ دِمَشْقَ بَيْنَ مَهْرُودَتَيْنِ، وَاضِعاً كَفَّيْهِ عَلَى أَجْنِحَةِ مَلَكَيْنِ، إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهُ قَطَرَ، وَإِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ، فَلاَ يَحِلُّ لِكَافِرٍ يَجِدُ رِيحَ نَفَسِهِ إِلاَّ مَاتَ، وَنَفَسُهُ يَنْتَهِي إِلَى حَيْثُ يَنْتَهِي طَرْفُهُ، فَيَطْلُبُهُ حَتَّى يُدْرِكَهُ بِبَابِ لُدٍّ فَيَقْتُلُهُ، ثُمَّ يَأْتِي عِيسَى (ﷺ) قَوماً قَدْ عَصَمَهُمُ اللهُ مِنْهُ، فَيَمْسَحُ عَنْ وُجُوهِهِمْ وَيُحَدِّثُهُمْ بِدَرَجَاتِهِمْ فِي الْجَنَّةِ، فَبَيْنَمَا هُوَ كَذَلِكَ إِذْ أَوْحَى اللهُ تَعَالَى إِلَى عِيسَى (ﷺ): أَنِّي قَدْ أَخْرَجْتُ عِبَاداً لِي لاَ يَدَانِ لأَحَدٍ بِقِتَالِهِمْ، فَحَرِّزْ عِبَادِي إِلَى الطُّورِ وَيَبْعَثُ اللهُ يَأْجُوجَ وَمَأْجُوجَ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُونَ، فَيَمُرُّ أَوَائِلُهُمْ عَلَى بُحَيْرَةِ طَبَرِيَّةَ فَيَشْرَبُونَ مَا فِيهَا، وَيَمُرُّ آخِرُهُمْ فَيَقُولُونَ: لَقَدْ كَانَ بِهَذِهِ مَرَّةً مَاءٌ، وَيُحْصَرُ نَبِيُّ اللهِ عِيسَى (ﷺ) وَأَصْحَابُهُ حَتَّى يَكُونَ رَأْسُ الثَّوْرِ لأَحَدِهِمْ خَيْراً مِنْ مِئَةِ دِينَارٍ لأَحَدِكُمُ الْيَوْمَ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللهِ عِيسَى (ﷺ) وَأَصْحَابُهُ - رضي الله عنهم - إِلَى اللهِ تَعَالَى، فَيُرْسِلُ اللهُ تَعَالَى عَلَيْهِمُ النَّغَفَ فِي رِقَابِهِمْ، فَيُصْبِحُونَ فَرْسَى كَمَوْتِ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، ثُمَّ يَهْبِطُ نَبِيُّ اللهِ عِيسَى (ﷺ) وَأَصْحَابُهُ - رضي الله عنهم - إِلَى الأَرْضِ، فَلاَ يَجِدُونَ فِي الأَرْضِ مَوْضِعَ شِبْرٍ إِلاَّ مَلأَهُ زَهَمُهُمْ وَنَتْنُهُمْ، فَيَرْغَبُ نَبِيُّ اللهِ عِيسَى (ﷺ) وَأَصْحَابُهُ - رضي الله عنهم - إِلَى اللهِ تَعَالَى، فَيُرْسِلُ اللهُ تَعَالَى طَيْراً كَأَعْنَاقِ الْبُخْتِ، فَتَحْمِلُهُمْ، فَتَطْرَحُهُمْ حَيْثُ شَاءَ اللهُ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ - عز وجل - مَطَراً لاَ يُكِنُّ مِنْهُ بَيْتُ مَدَرٍ وَلاَ وَبَرٍ، فَيَغْسِلُ الأَرْضَ حَتَّى يَتْرُكَهَا كَالزَّلَقَةِ، ثُمَّ يُقَالُ لِلأَرْضِ: أَنْبِتِي ثَمَرَتَكِ، وَرُدِّي بَرَكَتَكِ، فَيَوْمَئِذٍ تَأْكُلُ الْعِصَابَةُ مِنَ الرُّمَّانَةِ، وَيَسْتَظِلُّونَ بِقِحْفِهَا، وَيُبَارَكُ فِي الرِّسْلِ حَتَّى أَنَّ اللِّقْحَةَ مِنَ الإِبِلِ لَتَكْفِي الْفِئَامَ مِنَ النَّاسِ،

وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْبَقَرِ لَتَكْفِي الْقَبِيلَةَ مِنَ النَّاسِ، وَاللِّقْحَةَ مِنَ الْغَنَمِ لَتَكْفِي الْفَخِذَ مِنَ النَّاسِ، فَبَيْنَمَا هُمْ كَذٰلِكَ إِذْ بَعَثَ اللهُ تَعَالَى رِيحاً طَيِّبَةً فَتَأْخُذُهُمْ تَحْتَ آبَاطِهِمْ فَتَقْبِضُ رُوحَ كُلِّ مُؤْمِنٍ وَكُلِّ مُسْلِمٍ، وَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ يَتَهَارَجُونَ فِيهَا تَهَارُجَ الْحُمُرِ، فَعَلَيْهِمْ تَقُومُ السَّاعَةُ)). (رواه مسلم)

قوله: ((خَلَّةً بَيْنَ الشَّامِ والعِرَاقِ)): أي طريقاً بَيْنَهُمَا. وقولُهُ: ((عَاثَ)) بالعين المهملة والثاء المثلثة، وَالعَيْثُ: أَشَدُّ الفَسَاد. ((وَالذُّرَى)): بضم الذال المعجمة وهو أعالى الأَسْنِمَةِ وهو جمع ذِروةٍ بضمِ الذالِ و كسرها ((وَاليَعَاسِيبُ)): ذُكُورُ النَّحْلِ. ((وَجِزْلَتَيْنِ)): أيْ قِطْعَتَيْنِ. ((وَالغَرَضُ)): الهَدَفُ الَّذِى يُرْمَى إِلَيْهِ بِالنَّشَّابِ، أيْ: يَرْمِيهِ رَمْيَةً كَرَمْيَةِ النَّشَّابِ إلى الهَدَفِ. ((وَالمَهْرُودَةُ)) بالدال المهملة والمعجمة، وهى: الثَّوْبُ المَصْبُوغُ. قَوْلُهُ: ((لَا يَدَانِ)): أيْ لَا طَاقَةَ. ((وَالنَّغَفُ)): دُودٌ. ((وَفَرْسَى)): جَمْعُ فَرِيسٍ، وَهُوَ القَتِيلُ. وَ ((الزَّلَقَةُ)): بفتح الزاى واللام وبالقاف، وَرُوِى: الزُّلْفَةُ بضم الزاى وإسكان اللام وبالفاء و هى المِرْآةُ. ((وَالعِصَابَةُ)): الجَمَاعَةُ. ((وَالرِّسْلُ)) بكسرِ الراء: اللَّبَنُ. ((وَاللِّقْحَةُ)): اللَّبُونُ. ((وَالفِئَامُ)) بكسر الفاء وبعدها همزة ممدودة: الجماعةُ. ((وَالفَخِذُ)) مِنَ النَّاسِ: دُونَ القَبِيلَة

ترجمہ مع تشریح:- حضرت نواس بن سمعان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے خطبہ میں دجّال کا تذکرہ کیا (قربِ قیامت کی جو علامات اور نشانیاں بتائی گئی ہیں ان میں ایک نشانی دجّال کا ظہور بھی ہے۔ دجّال، دَجَل سے ماخوذ ہے، اور دَجَل کا معنٰی دھوکہ دینا۔ گویا دجّال لوگوں کو دھوکہ دے کر اپنی ذات کے متعلق غلط نظریے ان کے دل و دماغ میں جمانے کی کوشش کرے گا، شروع میں تو وہ نبوت کا دعویٰ کرے گا اور آخر میں الوہیت اور خدائی کا دعویٰ کردے گا۔ اور اس سے پہلے بہت سے چھوٹے چھوٹے دجّال ظاہر ہوں گے، اور قربِ قیامت میں امام مہدیؒ کے ظہور کے ساتویں سال یہ بڑا دجّال ظاہر ہوگا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دجّال کے سلسلہ میں سارے نشیب و فراز بتلادیئے ہیں) اس خطبے میں آپ نے اپنی آواز کو پست بھی کیا اور بلند بھی کیا (بعض حضرات

ترجمہ فرماتے ہیں کہ دجّال کا حال بیان فرماتے ہوئے آپ (ﷺ) نے اس کی تحقیر بیان فرمائی یعنی اس کی اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں کوئی حیثیت نہیں ہے، وہ کانا ہے، اس میں فلاں فلاں کمزوریاں ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتلایا کہ اس کا فتنہ بڑا خطرناک ہے۔) اس روایت کے راوی حضرت نواس بن سمعان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے دجّال کا تذکرہ ایسے انداز میں فرمایا گویا ہم نے یہ گمان کیا کہ وہ قریب ہی نخلستان (یعنی کھجوروں کے درختوں کے جھنڈ) میں کہیں موجود ہے (کبھی کسی کے بیان کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ جس کو سن کر طبیعتوں پر ایسا اثر ہوتا ہے کہ جو چیز پیش کی جارہی ہے وہ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے) جب وہ بیان ختم ہوا اور شام کو ہم نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے (تو صبح کی تقریر کا ہمارے دل ودماغ پر اثر تھا اور سب کے چہروں سے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ صبح کے بیان سے بہت متاثر ہیں) اور حضورِ اکرم (ﷺ) نے اس کا اثر ہمارے اندر محسوس بھی کیا تو پوچھا: تمہارا کیا حال ہے؟ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ نے صبح دجّال کا تذکرہ فرمایا، اس کے سارے نشیب وفراز سے آگاہ کیا، آپ کے بیان کی وجہ سے ہم ایسا گمان کرنے لگے ہیں کہ وہ کھجوروں کے جھنڈ میں ہی ہے۔ حضور (ﷺ) نے جب محسوس کیا کہ ان کی طبیعتیں زیادہ مضمحل ہیں، تو اس گھبراہٹ کو کم کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: (اگرچہ دجّال خطرہ کی چیز ہے لیکن مجھے تمہارے متعلق اور چیزوں کا بھی خطرہ ہے) دجّال کے علاوہ دوسری چیزوں کا مجھے تم پر زیادہ اندیشہ ہے (بعض روایتوں میں ہے، آپ (ﷺ) نے فرمایا: مجھے ایسے حُکّام کا خطرہ ہے جو تمہیں دین سے ہٹانے کا کام کریں گے۔ پھر حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا:) تم لوگ گھبراؤمت، اگر دجّال نکل آیا اور مَیں تمہارے درمیان موجود ہوؤں گا تو تمہاری طرف سے مَیں اس کا مقابلہ کروں گا۔ اور اگر وہ ایسی حالت میں ظاہر ہوا کہ میں تمہارے درمیان موجود نہ رہا تو پھر ہر آدمی اپنی طرف سے جواب دہ ہوگا، اور میرے بعد اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کا مددگار ہوگا۔

(پھر حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی کچھ اور نشانیاں بتلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:) وہ ایک نوجوان ہوگا جس کے بال بہت زیادہ گھنگریالے ہوں گے، اس کی آنکھ اُبھری ہوئی ہوگی۔ (دجّال کی آنکھ کے سلسلہ میں دو لفظ بیان کئے گئے ہیں، ایک "طَافِیَۃٌ" اور "طَافِئَۃٌ" آتا ہے۔ اور بعض روایتوں میں "مَمْسُوْحَۃٌ" بھی آتا ہے، یعنی مِٹی ہوئی اگر "طِفْأٌ" ہمزہ سے آئے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کی آنکھ میں روشنی نہیں ہوگی۔ گویا اس کی بائیں آنکھ ایسی ہوگی جیسے بعضوں آنکھ بالکل سپاٹ ہوتی ہے اور اس میں ذراسا معمولی شگاف ہوتا ہے، لیکن اس سے نظر نہیں آئے گا۔ اور دائیں آنکھ اُبھری ہوئی یعنی آگے کو نکلی ہوئی ہوگی جس سے دیکھنے کا کام لے گا۔ بعض روایتوں میں اس کو ایسے انگور کے خوشہ کے دانہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو خوشہ سے باہر اُبھرا ہوا ہوتا ہے۔ ویسے تو انگور کے دانے بالکل ترتیب سے ہوتے ہیں لیکن اس میں سے کوئی دانہ آگے نکل آتا ہے، اسی طرح اس کی آنکھ اُبھری ہوئی ہوگی۔ پھر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ) میں اس کو عبدالعزیٰ بن قَطَن سے زیادہ مشابہ پاتا ہوں (یہ قبیلۂ خزاعہ کی شاخ بنو المطلب کا ایک آدمی تھا جو زمانۂ جاہلیت میں انتقال کر چکا تھا، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں وہ اُسی کی شکل وشباہت کا آدمی تھا) تم میں سے جو آدمی اس کو پالے تو اس کے سامنے سورۂ کہف کی شروع کی آیتیں پڑھ لے (بعض روایتوں میں تین آیتوں کا تذکرہ ہے، اور بعض میں دس کا تذکرہ ہے۔ علماء نے فرمایا ہے کہ دس آیتیں پڑھے تو زیادہ احتیاط کی بات ہے، اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ دجّال سے بھی اور دجّال کے فتنوں سے بھی محفوظ رکھے گا، لہٰذا اس کا معمول بنالینا چاہیے) شام اور عراق کے درمیان کے راستے پر وہ ظاہر ہوگا اور وہ دائیں بائیں خوب فساد پھیلائے گا، اے اللہ کے بندو! جس وقت وہ ظاہر ہو اُس وقت تم ثابت قدم

رہنا (راوی کہتے ہیں) ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دجّال زمین میں کتنا رہے گا؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: چالیس دن۔ اس کا پہلا دن ایک سال کے برابر لمبا ہوگا (اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک سال کے برابر ہوگا تو کیا سورج کی رفتار کو سست کر دیا جائے گا؟ تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ وہ اپنے دجل وفریب سے لوگوں کی ایسی نظر بندی کرے گا کہ لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ دن موجود ہے، اور یہ کیفیت ایک زمانے تک رہے گی) اور ایک دن ایک مہینے کے برابر ہوگا، اور ایک دن ہفتہ کے برابر ہوگا اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے۔ صحابہؓ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! وہ دن جو ایک سال کے برابر ہوگا اس میں کیا ایک دن کی نمازیں ہمارے لیے کافی ہو جائیں گی؟ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا: (نہیں! پانچ نمازیں کافی نہیں ہوں گی) بلکہ عام دنوں کی طرح وقت کو شمار کرتے رہنا (یعنی جب فجر کی نماز پڑھتے ہو اس وقت فجر پڑھنا، اس کے بعد جتنے فصل سے ظہر پڑھتے ہو اس وقت ظہر پڑھنا، پھر جتنے فصل سے عصر پڑھتے ہو عصر پڑھنا، مغرب اور عشاء کا بھی یہی طریقہ رہے گا۔ اسی طرح سال بھر میں جتنی نمازیں پڑھی جاتی ہیں اُتنی ہی پڑھی جائیں گی۔ یہیں سے علماء کا وہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ قطبِ شمالی اور قطبِ جنوبی جہاں پر چھ مہینے رات اور چھ مہینے دن ہوتا ہے، وہاں کے لیے یہی حساب بنایا جائے گا۔)

ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! زمین میں اس کی تیز رفتاری کیسی ہوگی؟ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اس بادل کی طرح ہوگی جس کے پیچھے ہوا لگی ہو۔ چناں چہ وہ کچھ لوگوں کے پاس آئے گا اور ان کو اپنی خدائی کی دعوت دے گا، وہ لوگ اس پر ایمان لائیں گے، اس کی پکار پر لبّیک کہیں گے، چناں چہ وہ آسمان کو حکم کرے گا تو آسمان بارش برسائے گا، زمین کو حکم کرے گا تو زمین غلہ

اُگائے گی، ان کے چوپائے چرنے کے بعد جب واپس لوٹیں گے تو ان کی کوہانیں بڑی اونچی ہوں گی (یعنی خوب کھاپی کر تازہ ہوگئے ہوں گے) اوران کے تھن دودھ سے خوب بھرے ہوئے ہوں گے، اوران کی کوکھیں بڑی لمبی ہوں گی (مطلب یہ ہے کہ ان کے جانور تروتازہ ہوں گے)۔

اس کے بعد دوسرے لوگوں کے پاس جائے گا، ان کو بھی اپنی خدائی کی دعوت دے گا، وہ لوگ اس کی بات کو نہیں مانیں گے۔ جب وہ واپس لوٹے گا تو وہ سب لوگ قحط زدہ ہو جائیں گے، اوران کے پاس مال میں سے کوئی چیز نہیں رہے گی، نہ چوپائے، نہ ساز وسامان (سب ختم ہو جائے گا) جب وہ غیر آباد اور بنجر زمین سے گزرے گا تو کہے گا کہ اپنے خزانے نکال۔ تو زمین کے خزانے اس کے پیچھے پیچھے چلیں گے، جیسے شہد کی مکھیاں اپنے راجا کے پیچھے پیچھے چلتی ہیں (اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقتی طور پر ڈھیل دی جائے گی)۔

اس کے بعد وہ ایک آدمی کو بلائے گا جو جوانی سے بھر پور ہو گا، اس پر تلوار کا ایک وار کرکے اس کے دو ٹکڑے کر دے گا، دونوں ٹکڑے دور جا گریں گے، پھر جس کے دو ٹکڑے کئے تھے اس کو پکارے گا تو وہ زندہ ہو کر اس کے پاس آئے گا اوراس کا چہرہ کِھلا ہوا ہو گا (بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ حضرت خَضِر (علیہ السلام) ہوں گے، دوسری روایتوں میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اور کوئی اللہ کا نیک بندہ ہو گا، لوگ کہیں گے کہ وہاں مت جاؤ۔ وہ ان سے کہیں گے کہ تمہارا بادشاہ دجّال کہاں ہے؟ پھر یہ دجّال کے لیے غلط الفاظ استعمال کریں گے تو اس کا محافظ دستہ کہے گا کہ ہمارے آقا کے متعلق غلط بات بولتا ہے؛ اس کو قتل کر دو۔ وہ دستہ مارنا چاہے گا تو دوسرے یوں کہیں گے کہ

ہمارے آقا نے کہا ہے کہ میری اجازت کے بغیر کسی کو مت مارنا۔ وہ ان کو وہاں لے جائیں گے اور جب پیش کریں گے تو یہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جس کی ہمارے نبی نے خبر دی ہے) دجّال اسی حال طرح فتنہ پھیلاتا پھر رہا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھیجیں گے، وہ دمشق کے شرقی جانب کے سفید منارہ پر، زَرد رنگ کے دو کپڑوں میں ملبوس، اپنے دونوں ہاتھوں کو دو فرشتوں کے پَروں پر رکھے ہوئے اتریں گے۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جب اپنے سر کو جھکائیں گے تو پانی کے قطرے ٹپکیں گے، اور جب اپنے سر کو سیدھا کریں گے تو سر سے سفید چاندی کی طرح صاف شفّاف موتی جیسے پانی کے قطرے آپ کے چہرے پر سے لُڑھکیں گے (جیسے کوئی آدمی غسل کرکے نکلتا ہے تو اس کے سر میں سے پانی کے قطرے ٹپکتے ہیں، اور جب سر کو سیدھا کرے تو پانی کے قطرے اس کے چہرے پر سے لُڑھکتے ہیں)۔

(اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سانس میں اللہ تعالیٰ ایسی تاثیر رکھ دے گا کہ) جس کافر تک ان کی سانس پہنچے گی وہ مر جائے گا (کتابوں میں لکھا ہے کہ ان کی سانس میں ایک تاثیر تو وہ تھی کہ جب دم کرتے تھے تو مردہ زندہ ہو جاتا تھا، اور یہاں زندہ مر جائے گا) اور (آدمی کی سانس تو اس کے قریب ہی رہتی ہے لیکن) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سانس اتنی دور تک جائے گی جہاں تک ان کی نگاہ پہنچے گی۔ پھر حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دجّال کو تلاش کریں گے (دراصل اُسی کو تو مارنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ (علیہ السلام) کو اُتارا ہو گا۔ اور دجّال حضرت مہدی کے ظہور کے سات سال بعد ظاہر ہو گا۔ ایک جگہ پر عصر کی نماز کے لیے اقامت کہی جا رہی ہو گی کہ اسی دوران حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اُتریں گے، حضرت مہدی ان کو امامت کی پیش کش

کریں گے کہ آپ نماز پڑھائیے، تو وہ کہیں گے: نہیں! اقامت آپ کے لیے ہی کہی گئی ہے، چناں چہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) وہ نماز حضرت مہدی کے پیچھے پڑھیں گے۔ بعد میں امام مہدی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنا لشکر حوالے کریں گے، اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) دجّال کو تلاش کریں گے) یہاں تک کہ اس کو بابِ لُد کے پاس پالیں گے اور اس کو قتل کر دیں گے۔

(بابِ لُد بیت المقدس کے قریب آج بھی ایک شہر ہے۔ البلاغ کے تازہ شمارہ میں حضرت مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی دامت برکاتہم کا سفر نامہ بھی آیا ہے، اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہمارا وہاں سے گزر ہوا تو ہمارے رہبر نے کہا کہ یہاں یہودیوں نے ایک تختی لگا رکھی ہے، جس پر انہوں نے لکھا ہے کہ سلامتی کا بادشاہ یہاں ظاہر ہوگا۔ یہودی بھی دجّال کے نکلنے کا انتظار کرتے ہیں اور وہ اس کو اپنا مسیحا سمجھتے ہیں موجودہ اسرائیل کی حکومت نے دجّال کے قیام کے واسطے ایک محل بھی بنا رکھا ہے۔ اور دجّال یہودی خاندان ہی سے ہوگا۔ خیر! حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس کو قتل کریں گے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اس کو قتل نہ بھی کریں تب بھی وہ آپ کی سانس سے ایسا پگھلے گا جیسے نمک پانی میں پگھلتا ہے، لیکن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) باقاعدہ لوگوں کو بتلانے کے لیے اس کو قتل کریں گے، اور اس کا خون نیزے پر لے کر لوگوں کو بتلائیں گے)۔

اس کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) ایسے لوگوں کے پاس جائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے دجّال کے فتنہ سے محفوظ رکھا تھا، ان کی تکالیف کو دور کریں گے اور جنّت میں ان کو جو درجے ملنے والے ہیں وہ بتائیں گے۔ اسی حال میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی طرف وحی بھیجیں گے کہ میں نے اپنے ایسے بندوں

کو نکالا ہے کہ جن کا مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے، آپ میرے (ایمان والے) بندوں کو لے کر کوہِ طور پر چلے جایئے۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہِ طور پر چلے جائیں گے۔ پھر اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کو بھیجیں گے، وہ اتنی کثیر تعداد میں ہوں گے کہ ایسا معلوم ہوگا کہ ہر اونچی جگہ سے وہ پھسل رہے ہوں۔ یاجوج ماجوج کے لشکر کا شروع دستہ بحیرۂ طبریہ پر سے گزرے گا (طبریہ: طبرستان کی طرف نسبت ہے، وہاں ایک سمندر ہے) اور وہ اس سمندر میں جتنا پانی ہوگا سب پی جائیں گی، اسی لشکر کے آخر والے جب وہاں سے گزریں گے (اور اُس سمندر کو دیکھیں گے) تو کہیں گے کہ یہاں کسی زمانے میں پانی رہا ہوگا (حالانکہ ان کا ہی شروع دستہ وہ سب پی کر گیا ہوگا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ) اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے رفقاء بالکل بند اور محصور ہوکر رہ جائیں گے، کھانے پینے کی اتنی قلت ہوگی کہ بیل کی ایک سری ان کو اتنی مہنگی ملے گی کہ جیسے آج سو دینار کے بدلے میں ملے۔ اتنی تکلیفوں کی وجہ سے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے رفقاء اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر دعا کریں گے اور ان کی دعا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ یاجوج ماجوج کی گردنوں میں کیڑے پیدا کردیں گے ("نَغَفْ" ایک قسم کا کیڑا ہوتا ہے جو جانور کی ناک یا گردن میں پیدا ہوتا ہے، جانور اس سے مرجاتا ہے) جس کے نتیجہ میں وہ سب ایک ساتھ مرجائیں گے۔ اور حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جو کوہِ طور پر ایمان والوں کو لے کر محصور ہوگئے تھے وہ وہاں سے نیچے اتریں گے تو زمین میں ایک بالشت بھی جگہ ایسی نہیں پائیں گے جہاں یاجوج ماجوج کی چربی اور بدبو نہ ہو، سب جگہ ان کی لاشیں پڑی ہوئی ہوں گی اور بدبو پھیل گئی ہوگی۔ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) اور ان کے رفقاء اللہ تعالیٰ کی طرف گریہ

وزاری کریں گے تو اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں جیسے بڑے بڑے پرندے بھیجیں گے جو یاجوج ماجوج کی لاشوں کو اُٹھاکر لے جائیں گے اور ایسی جگہ ڈال دیں گے جہاں اللہ تعالیٰ چاہے گا، اس طرح زمین سے ان کی لاشیں ہٹادی جائیں گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بارش بھیجیں گے تو کوئی کچا یا پکا مکان باقی نہیں رہے گا جو اس سے محفوظ رہے۔ چالیس دن تک بارش برسے گی، اس کا پانی ہر مکان کے اندر تک پہنچ جائے گا، وہ بارش زمین کو دھو کر بالکل صاف کر دے گی، یہاں تک کہ آئینہ کی طرح ہو جائے گی۔ اس کے بعد زمین سے کہا جائے گا کہ اپنے پھلوں کو اُگا، اور اپنی برکت کو لُٹا، چناں چہ اُس وقت جو پھل ہوں گے ان کا حال یہ ہو گا کہ ایک انار اتنا بڑا ہو گا کہ ایک بڑی جماعت کھا کر پیٹ بھر لے گی، اور اس کا چھلکا اتنا بڑا ہو گا کہ اس کے نیچے کئی لوگ سایہ میں بیٹھ سکیں گے۔ اور دودھ والے جانوروں میں اتنی برکت ہو گی کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی کئی انسانوں کی جماعتوں کے لیے کافی ہو جائے گی، اور دودھ دینے والی ایک گائے پورے خاندان کو کافی ہو جائے گی، اور دودھ دینے والی ایک بکری ایک گھرانے کے لیے کافی ہو جائے گی۔ لوگ اسی طرح خوشحالی میں ہوں گے (اور کئی سال اس طرح گزریں گے کہ کسی کے دل میں کسی کے متعلق کوئی کینہ بھی نہیں ہو گا، سب کے دل ایک دم پاک اور صاف ہوں گے۔)

پھر اللہ تعالیٰ ایک خوشبودار ہوا بھیجیں گے جو ایمان والوں کی بغلوں کے نیچے سے گزرے گی تو ہر مومن اور مسلمان کی روح قبض کرلی جائے گی۔ اس کے بعد روئے زمین پر بدترین لوگ رہ جائیں گے جو ایسے بے حیا ہوں گے جیسے گدھے کہ وہ جس طرح لوگوں کے سامنے آپس میں جفتی کرتے ہیں اسی طرح یہ بھی لوگوں کے سامنے جفتی کریں گے، اور ان ہی پر قیامت قائم ہو جائے گی۔

پانی آگ اور آگ پانی

حدیث ۱۸۰۹:-

وعن رِبعِيِّ بنِ حِرَاشٍ قال: انطلقت مع أبي مسعود الأنصاري إلى حُذَيفَةَ بن اليمان رضی الله عنهم فقال له أبو مسعود: حَدِّثْنِي ما سَمِعْتَ مِنْ رَسُولِ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) فى الدَّجَّالِ. قال: ((إنَّ الدَّجَّالَ يَخْرُجُ وإنَّ مَعَهُ مَاءً وَنَاراً. فَأَمَّا الَّذِي يَرَاهُ النَّاسُ مَاءً فَنَارٌ تُحْرِقُ، وأمَّا الَّذِي يَرَاهُ النَّاسُ نَاراً، فَمَاءٌ بَارِدٌ عَذْبٌ. فَمَنْ أَدْرَكَهُ مِنْكُمْ، فَلْيَقَعْ فِي الَّذِي يَرَاهُ نَاراً، فَإِنَّهُ مَاءٌ عَذْبٌ طَيِّبٌ)) فقال أبو مسعود: وَأَنَا قَدْ سَمِعْتُهُ. (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ربعی بن حراش (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابو مسعود انصاری (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ حضرت حذیفہ بن یمان (رضی اللہ عنہ) کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ سے کہا: آپ نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دجّال کے سلسلہ میں جو سنا ہو وہ بیان فرمایئے۔ حضرت حذیفہؓ نے کہا: دجّال ظاہر ہو گا اور اس کے ساتھ پانی ہو گا اور آگ ہو گی، لوگ جس کو پانی دیکھ رہے ہوں گے وہ حقیقت میں آگ ہو گی۔ اور جس کو لوگ آگ دیکھ رہے ہوں گے وہ ٹھنڈا اور شیریں پانی ہو گا۔ تم میں سے جو آدمی دجّال کو پاوے، اس کو چاہئے کہ جس چیز کو آگ دیکھے اس میں گر پڑے، اس لیے کہ وہ ٹھنڈا اور شیریں پانی ہو گا۔ یہ سن کر حضرت ابو مسعود انصاری (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: میں نے بھی حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد سنا ہے۔

افادات:- اللہ تبارک وتعالیٰ دجّال کے ہاتھ پر بطورِ استدراج (ڈھیل) بہت سی چیزیں دکھلائیں گے۔ آج بھی بعض ایسے لوگ جو اللہ کو نہیں مانتے اور باطل پر ہوتے ہیں ان کے ہاتھوں پر خرقِ عادت کے طور پر ایسی کچھ چیزیں ظاہر ہوتی ہیں جس سے لوگ حیرت میں پڑ جاتے ہیں، اور ناواقف

لوگ ان چیزوں کو اس کی حقّانیت اور سچائی کی دلیل سمجھ لیتے ہیں، لیکن در حقیقت وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے استدراج (ڈھیل) کا معاملہ ہوتا ہے جو ان کے ساتھ کیا جاتا ہے، اور اُس کا بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے وقت مقرر ہوتا ہے، جب وہ وقت ختم ہو جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی گرفت ہوتی ہے اور وہ ساری چیزیں چھین لی جاتی ہیں اور حقیقت لوگوں کے سامنے کھل جاتی ہے، لیکن جن کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش اور فتنہ میں مبتلا ہونا مقدّر ہوتا ہے وہ ناواقفیت کی وجہ سے اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

دجّال کے ساتھ بھی ایک طرف باغ نظر آئے گا جس میں نہریں ہوں گی جس میں عیش و عشرت کا سامان نظر آئے گا، اور دوسری طرف سزا دینے کے لیے آگ کی شکل ہوگی۔ جو آدمی بھی اس پر ایمان لائے گا وہ اس کو اس باغ میں داخل کرے گا۔ اور جو اس کو نہیں مانیں گے ان کو آگ میں ڈالے گا۔ لیکن جب اپنے ماننے والوں کو اس باغ میں داخل کرے گا جو باغ نظر آرہا ہوگا تو وہ باغ ان کے لیے آگ بن جائے گی۔ اور اس کا انکار کرنے والوں کو جب وہ آگ میں ڈالے گا تو وہ آگ ان کے لیے باغ بن جائے گی۔ ان سب کرشموں کو دیکھ کر لوگ یوں سمجھیں گے کہ یہ دجّال جو خدائی کا دعویٰ کررہا ہے اس میں سچا ہے، حالاں کہ خود نبیٔ کریم ﷺ کا ارشاد پہلے بھی گزر چکا، اور آئندہ بھی آئے گا کہ اس کے چہرہ ہی میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی باتیں ایسی رکھی ہیں جن کو دیکھ کر ہر معمولی ایمان والا بھی ـ جس میں کچھ سوجھ بوجھ ہوگی ـ آسانی سے فیصلہ کرلے گا کہ یہ خدا نہیں ہو سکتا، مثلاً: اس کی

آنکھ میں جو عیب ہو گا وہ خود اپنے ہی اس عیب کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہو گا، تو بھلا وہ خدا کیسے بن سکتا ہے!

اور دوسری روایت میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر باقاعدہ ”ک، ف، ر“ یعنی کافر لکھا ہوا ہو گا جس کو ہر ایمان والا پڑھ لے گا، چاہے وہ پڑھا لکھا ہو، یا پڑھا لکھا نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ جان لے گا کہ یہ نہ تو خدا ہے، اور نہ نبی ہے۔

ختمِ دجّال کے بعد کا منظر

حدیث ۱۸۱۰:-

وعن عبد الله بن عمرو بن العاص رضی الله عنهما، قال: قال رسول الله (ﷺ): ((يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فی أُمَّتِي فَيَمْكُثُ أَرْبَعِينَ، لَا أَدْرِي أَرْبَعِينَ يوماً أو أَرْبَعِينَ شَهْراً، أو أَرْبَعِينَ عاماً، فَيَبْعَثُ اللهُ تَعالَى عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ (ﷺ)، فَيَطْلُبُهُ فَيُهْلِكُهُ، ثُمَّ يَمْكُثُ النَّاسُ سَبْعَ سِنِينَ لَيسَ بَينَ اثْنَينِ عَدَاوةٌ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ -عز وجل- رِيحاً بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ، فَلَا يَبْقَى عَلَى وَجْهِ الأَرْضِ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيرٍ أو إِيمَانٍ إِلاَّ قَبَضَتْهُ، حَتَّى لو أَنَّ أَحَدَكُمْ دَخَلَ فِي كَبِدِ جَبَلٍ، لَدَخَلَتْهُ عَلَيهِ حَتَّى تَقْبِضَهُ، فَيَبْقَى شِرَارُ النَّاسِ فی خِفَّةِ الطَّيْرِ، وأَحْلامِ السِّبَاعِ، لَا يَعْرِفُونَ مَعْرُوفاً، ولا يُنْكِرُونَ مُنْكَراً، فَيَتَمَثَّلُ لَهُمُ الشَّيْطَانُ، فَيَقُولُ: أَلَا تَسْتَجِيبُونَ؟ فَيَقُولُونَ: فَمَا تَأْمُرُنَا؟ فَيَأْمُرُهُمْ بِعِبَادَةِ الأَوْثَانِ، وَهُمْ فی ذٰلِكَ دَارٌّ رِزْقُهُمْ، حَسَنٌ عَيشُهُمْ، ثُمَّ يُنْفَخُ فی الصُّورِ، فَلَا يَسْمَعُهُ أَحَدٌ إِلَّا أَصْغَى لِيتاً وَرَفَعَ لِيتاً، وَأَوَّلُ مَنْ يَسْمَعُهُ رَجُلٌ يَلُوطُ حَوْضَ إِبِلِهِ فَيُصْعَقُ ويُصْعَقُ النَّاسُ حولهُ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ -أو قَالَ: يُنْزِلُ اللهُ- مَطَراً كَأَنَّهُ الطَّلُّ أو الظِّلُّ، فَتَنْبُتُ مِنهُ

أَجْسَادُ النَّاسِ، ثُمَّ يُنْفَخُ فِيهِ أُخْرَى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَنْظُرُونَ، ثُمَّ يُقَالُ: يَا أَيُّهَا النَّاسُ هَلُمَّ إِلَى رَبِّكُمْ، وَقِفُوهُمْ إِنَّهُمْ مَسْئُولُونَ، ثُمَّ يُقَالُ: أَخْرِجُوا بَعْثَ النَّارِ. فَيُقَالُ: مِنْ كَمْ؟ فَيُقَالُ: مِنْ كُلِّ أَلْفٍ تِسْعَمِئَةٍ وَتِسْعَةً وَتِسْعِينَ، فَذَلِكَ يَوْمٌ يَجْعَلُ الوِلْدَانَ شِيباً، وَذَلِكَ يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ)). رواه مسلم.

((اللِّيتُ)): صَفْحَةُ العُنُقِ. وَمَعْنَاهُ يَضَعُ صَفْحَةَ عُنُقِهِ وَيَرْفَعُ صَفْحَتَهُ الأُخْرَى.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میری امّت میں دجّال ظاہر ہوگا اور وہ چالیس تک رہے گا (راوی کہتے ہیں کہ) مجھے یاد نہیں کہ چالیس دن فرمایا، یا چالیس مہینے، یا چالیس سال (لیکن پہلے آچکا ہے کہ چالیس دن رہے گا۔ پہلا دن ایک سال کے برابر ہوگا، دوسرا دن ایک مہینے کے برابر ہوگا اور تیسرا دن ہفتہ کے برابر ہوگا، اور باقی دن عام دنوں کے برابر ہوں گے) اللہ تعالیٰ دجّال کے ظاہر ہونے کے بعد حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو بھیجیں گے جن کو آسمان پر اُٹھالیا گیا ہے۔ وہ دجّال کو تلاش کریں گے اور اس کو ہلاک کر دیں گے (پہلے آچکا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی سانس میں ایسی تاثیر رکھیں گے کہ جس کافر تک بھی اُن کی سانس پہنچے گی وہ پگھل جائے گا اور ہلاک ہوجائے گا، اور دجّال بھی پگھلنا شروع ہوگا لیکن حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) باقاعدہ اس کو نیزے کے ذریعہ ختم کریں گے اور اس کا خون لوگوں کو دکھلائیں گے) دجّال کی ہلاکت کے بعد لوگوں پر سات سال ایسے آئیں گے کہ لوگوں کے درمیان بالکل امن وامان کا عالم ہوگا، کسی دو آدمیوں کے دل میں ایک دوسرے کے متعلق دشمنی، حسد، کینہ اور بغض نہیں ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ملکِ شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا بھیجیں گے، روئے زمین پر کوئی ایسا آدمی جس کے دل میں ذرّہ برابر بھی بھلائی یا ایمان ہوگا اس کو وہ ہوا نہیں چھوڑے گی مگر یہ کہ اس کی روح کو قبض کرلے گی (یعنی جس کو بھی وہ ہوا لگے گی اس کا انتقال ہوجائے گا)

یہاں تک کہ اگر کوئی آدمی پہاڑ کے جگر میں داخل ہو گیا ہو گا تو وہ ہوا اس کے اندر بھی پہنچے گی اور اس کی روح کو قبض کرے گی (دنیا سے سب اچھے لوگ ختم ہو جائیں گے) اور ایسے بدترین قسم کے لوگ دنیا میں باقی رہ جائیں گے جو پرندوں کی طرح ہلکے اور درندوں جیسی سوجھ بوجھ والے ہوں گے (یعنی یہ لوگ برائی اور شہوتوں کی طرف ایسے لپکیں گے جیسے پرندہ کسی چیز کی طرف لپکتا ہے۔ اور آپس میں ایک دوسرے کو ایسا نقصان اور ضرر پہنچائیں گے جیسے درندے پہنچاتے ہیں) وہ کسی نیک بات کو ذرّہ برابر نہیں جانیں گے، اور کسی گناہ کو ذرّہ برابر بُرا نہیں سمجھیں گے (یعنی ان میں سے نیکی کو نیکی اور گناہ کو گناہ سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جائے گی) پھر ان کے سامنے شیطان ظاہر ہو گا جو کہے گا: کیا تم ہماری بات نہیں مانو گے؟ لوگ کہیں گے: کیا حکم دیتے ہو؟ تو وہ ان کو بتوں کی عبادت کرنے کا حکم دے گا، وہ اسی حالت میں ہوں گے کہ ان کی روزی ان پر برس رہی ہو گی (یعنی کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہو گی) ان کی زندگی بہت آرام سے گزر رہی ہو گی، اسی حالت میں صور پھونکا جائے گا، جو بھی اس کو سنے گا اپنی گردن کا ایک حصہ جھکائے گا اور ایک حصہ اُٹھائے گا (مطلب یہ ہے کہ اس کو سننے کی وجہ سے بے ہوشی کی ایسی کیفیت ہو جائے گی کہ کبھی وہ گردن جھکائیں گے اور کبھی گردن اُٹھائیں گے) اور سب سے پہلے صور کی آواز جو آدمی سنے گا وہ وہ شخص ہو گا جو اپنے اونٹوں کے پانی پلانے کے لیے حوض کو لیپ رہا ہو گا (پلاسٹر کر رہا ہو گا) وہ اس آواز کو سن کر بے ہوش ہو جائے گا، پھر دوسرے لوگ بھی سن کر بے ہوش ہو جائیں گے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایسی بارش بھیجے گا جیسے شبنم ہوتی ہے (یعنی بارش کی ہلکی سی پھوار ہو گی) جس کی وجہ سے مرے ہوئے لوگوں کے جسم اُگ آئیں گے (یعنی لوگ دوبارہ پیدا ہو جائیں گے) پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا اور لوگوں میں ایک دم جان پڑ جائے گی جیسے کھڑے دیکھ رہے

ہوں۔پھر لوگوں سے کہا جائے گا: اے لوگو! اپنے رب کی طرف چلو(یعنی میدانِ حشر کی طرف لے جایا جائے گا) پھر کہا جائے گا: میدانِ حشر میں کھڑے رہو، تاکہ تم سے سوال جواب ہو۔پھر اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ انسانوں میں سے جہنم کا جو حصہ ہے وہ نکال لو۔پوچھا جائے گا: کتنے میں سے کتنے؟ کہا جائے گا: ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے جہنم کے لیے۔اور یہ وہ دن ہو گا کہ جو بچہ کو بوڑھا بنا دے گا اور اُس دن تجلّیٔ ساق ظاہر ہوگی۔

افادات:۔روایت میں آتا ہے کہ جب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ ارشاد فرمایا کہ: حضرت آدم (علیہ السلام) سے کہا جائے گا کہ جہنم کا حصہ الگ کرو۔ تو وہ پوچھیں گے: کتنا؟ کہا جائے گا: ایک ہزار میں سے نو سو ننانوے۔اس پر حضراتِ صحابہ چیخ پڑے اور ان پر غم کی سی کیفیت طاری ہو گئی کہ پھر تو کون بچے گا۔ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: کافروں کے مقابلہ میں اہلِ ایمان کی تعداد کا حال ایسا ہے جیسے سفید بیل کے جسم میں سیاہ ناخن ہو۔ یعنی بیل پورا سفید ہو لیکن ذرا سا سیاہ نشان ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اہلِ کفر کی تعداد اہلِ ایمان کے مقابلہ میں ہر زمانہ میں زیادہ ہی رہی ہے، اس حساب سے اگر دیکھا جائے تو ہزار میں سے نو سو ناوے والا عدد کفّار کے ذریعہ پورا کیا جائے گا۔

دجّال مکہ ومدینہ میں داخل نہیں ہوسکے گا

حدیث ۱۸۱۱:-

وعن أنس رضی الله عنه قال قال رسول الله (ﷺ) :((لَيسَ مِنْ بَلَدٍ إلاَّ سَيَطَؤُهُ الدَّجَّالُ إلاَّ مَكَّةَ وَالمَدِينَةَ، وَلَيْسَ نَقْبٌ مِنْ أَنْقَابِهِمَا إلاَّ عَلَيْهِ المَلاَئِكَةُ صَافِّينَ تَحْرُسُهُمَا. فَيَنْزِلُ بالسَّبْخَةِ، فَتَرْجُفُ المَدِينَةُ ثَلاَثَ رَجَفَاتٍ، يُخْرِجُ اللهُ مِنْهَا كُلَّ كَافِرٍ وَمُنَافِقٍ.)) (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: کوئی شہر ایسا نہیں مگر یہ کہ دجّال اس کو روند ڈالے گا (مطلب یہ کہ دجّال چالیس دن میں پوری دنیا میں گھوم جائے گا اور کوئی شہر ایسا نہیں ہوگا جہاں وہ نہ پہنچے) سوائے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے (کہ وہاں جائے گا تو سہی، لیکن اندر داخل نہیں ہوسکے گا، اس لیے کہ) مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے راستوں میں سے کوئی راستہ اندر داخل ہونے کا ایسا نہیں ہوگا مگر ان پر فرشتے صف لگا کر حفاظت کے لیے کھڑے ہوں گے (تاکہ دجّال اندر نہ جاسکے) جب وہ مدینہ منورہ میں داخلے کے لیے پہنچے گا (تو فرشتوں کے پہرے کی وجہ سے اندر تو نہیں جاسکے گا) مگر وہ مدینہ کے باہر شور اور کھاری جگہ (میدان) میں ٹھہر جائے گا، اُس وقت مدینہ منورہ میں (زلزلے کے) تین جھٹکے آئیں گے، ان جھٹکوں کی وجہ سے مدینہ میں جتنے بھی منافق اور کافر ہوں گے وہ خود بخود مدینہ منورہ سے باہر نکل کر دجّال سے مل جائیں گے، اور اہلِ ایمان باقی رہ جائیں گے۔

دجّال کے لشکر میں ستّر ہزار یہودی ہوں گے

حدیث ۱۸۱۲:-

وعنه رضی الله عنه: أَنَّ رسُولَ الله (ﷺ) قال:((يَتْبَعُ الدَّجَّالَ مِنْ يَهُودِ أَصْبَهَانَ سَبْعُونَ أَلْفاً عَلَيْهِم الطَّيَالِسَةُ)).(رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اصبہان کے یہودیوں میں سے ستّر ہزار یہودی دجّال کے ساتھ اس کے لشکر میں ہوں گے جو اپنے کندھوں پر شال ڈالے ہوئے ہوں گے (اور جیسا کہ روایتوں میں آتا ہے خود دجّال بھی قوم کے اعتبار سے یہودی ہوگا)

فتنۂ دجّال کے وقت اہلِ ایمان کا حال

حدیث ۱۸۱۳:-

وعن أم شريكٍ رضی الله عنها: أنها سَمِعَتِ النَّبِيّ - (ﷺ) - يقولُ: ((لينْفِرَنَّ النَّاسُ مِنَ الدَّجَّالِ فِي الجِبَالِ)).رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت اُمِ شریک (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ انہوں نے نبی کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا: لوگ (یعنی اہلِ ایمان) دجّال کے فتنے سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لیں گے۔

دجّال سے بڑا کوئی فتنہ نہیں

حدیث ۱۸۱۴:-

وعن عمران بن حُصينٍ(رضی اللہ عنہما)قال: سمعتُ رسولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) يقولُ:((مَا بَيْنَ خَلْقِ آدَمَ إلى قِيَامِ السَّاعَةِ أَمْرٌ أكْبَرُ مِنَ الدَّجَّالِ)).(رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت عمران بن حصین(رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر قیامت کے قائم ہونے تک دجّال سے بڑھ کر کوئی بڑا فتنہ نہیں ہے۔

افادات:- سب سے بڑا فتنہ اور آزمائش دجّال کا ظہور ہے، حالانکہ دنیا میں بڑے بڑے واقعات اور بڑے بڑے حوادث ہوں گے، لیکن اس سے بڑھ کر کوئی حادثہ نہیں ہوگا۔

ایک مؤمن اور دجّال کا مقابلہ

حدیث ۱۸۱۵:-

وعن أبي سعيدٍ الخدري-رضی الله عنه-عن النبيّ-(صلی اللہ علیہ وسلم)-قال: ((يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فَيَتَوجَّهُ قِبَلَهُ رَجُلٌ مِنَ المُؤمِنِينَ فَيَتَلَقَّاهُ المَسَالحُ: مَسَالحُ الدَّجَّال. فيقولُونَ لَهُ: إلى أيْنَ تَعمِدُ فَيقُولُ: أعْمِدُ إلى هذَا الَّذِي خَرَجَ فَيَقُولُونَ لَهُ: أوَمَا تُؤْمِنُ بِرَبِّنَا؟ فيقولُ: مَا بِرَبِّنَا خَفَاءٌ! فَيقُولُونَ: اقْتُلُوهُ. فيقولُ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ: أَلَيْسَ قَدْ نَهَاكُمْ رَبُّكُمْ أنْ تَقْتُلُوا أحَداً دُونَهُ. فَيَنْطَلِقُونَ بِهِ إلى الدَّجَّالِ، فَإِذَا رَآهُ المُؤْمِنُ قَالَ: يا أَيُّهَا النَّاسُ! إنَّ هذَا الدَّجَّال الَّذِي ذَكَرَ رَسُولُ الله (صلی اللہ علیہ وسلم)؛ فَيَأْمُرُ الدَّجَّالُ بِهِ فَيُشَبَّحُ؛ فَيَقُولُ: خُذُوهُ

وَشُجُّوهُ. فَيُوسَعُ ظَهْرُهُ وَبَطْنُهُ ضَرْباً. فَيقُولُ: أَوَمَا تُؤْمِنُ بِي؟ فَيَقُولُ: أَنْتَ الْمَسِيحُ الْكَذَّابُ! فَيُؤْمَرُ بِهِ، فَيُؤْشَرُ بِالْمِنْشَارِ مِنْ مَفْرِقِهِ حَتَّى يُفَرِّقَ بَيْنَ رِجْلَيْهِ. ثُمَّ يَمْشِي الدَّجَّالُ بَيْنَ الْقِطْعَتَيْنِ ثُمَّ يَقُولُ لَهُ: قُمْ، فَيَسْتَوِي قَائِماً. ثُمَّ يَقُولُ لَهُ: أَتُؤْمِنُ بِي؟ فَيَقُولُ: مَا ازْدَدْتُ فِيكَ إِلَّا بَصِيرَةً. ثُمَّ يَقُولُ: يَاأَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّهُ لَا يَفْعَلُ بَعْدِي بِأَحَدٍ مِنَ النَّاسِ، فَيَأْخُذُهُ الدَّجَّالُ لِيَذْبَحَهُ، فَيَجْعَلُ اللهُ مَا بَيْنَ رَقَبَتِهِ إِلَى تَرْقُوَتِهِ نُحَاساً، فَلَا يَسْتَطِيعُ إِلَيْهِ سَبِيلاً، فَيَأْخُذُهُ بِيَدَيْهِ وَرِجْلَيْهِ فَيَقْذِفُ بِهِ، فَيَحْسَبُ النَّاسُ أَنَّهُ قَذَفَهُ إِلَى النَّارِ، وَإِنَّمَا أُلْقِيَ فِي الْجَنَّةِ)). فَقَالَ رَسُولُ اللهِ - (ﷺ) : ((هذا أَعْظَمُ النَّاسِ شَهَادَةً عِنْدَ رَبِّ الْعَالَمِينَ)). (رواه مسلم. وروى البخاري بعضه بمعناه)

((المسالح)): هُمُ الْخُفَرَاءُ وَالطَّلَائِعُ.

ترجمہ:۔ حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں: دجّال نمودار ہو گا تو ایک ایمان والا شخص اس کے پاس جائے گا، دجّال کا مسلّح اور ہتھیار بند دستہ اس آدمی سے ملے گا اور پوچھے گا: کہاں جانا چاہتا ہے؟ مؤمن کہے گا: یہ جھوٹا آدمی ہے، میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ دجّال کا دستہ کہے گا: تو ہمارے رب پر ایمان نہیں رکھتا؟ مؤمن جواب دے گا: ہمارا رب کوئی چھپی ہوئی چیز نہیں ہے، میں تو اپنے رب پر ایمان رکھتا ہوں (تیرے رب پر ایمان لانے کی کیا ضرورت ہے؟) اس مؤمن کا یہ جواب سن کر وہ ہتھیار بند دستہ آپس میں کہے گا کہ اس کو قتل کر دو۔ اسی دستہ میں سے کچھ لوگ کہیں گے: کیا تمہارے رب (دجّال) نے تم کو اس کے حکم کے بغیر کسی کو قتل کرنے سے منع نہیں کیا؟ (لہٰذا اس کو کیسے قتل کر سکتے ہو؟) چناں چہ وہ دستہ اس مؤمن کو دجّال کے پاس لے جائے گا۔ جب وہ مؤمن دجّال کو دیکھے گا تو زور سے پکار کر کہے گا: اے لوگو! یہ وہی دجّال ہے جس کا نبیٔ کریم (ﷺ) نے تذکرہ فرمایا ہے۔ دجّال حکم دے گا تو اس مؤمن کو لمبا کھینچ کر لِٹایا جائے گا اور دجّال کہے گا اس کو پکڑو اور زخمی کرو۔ چناں چہ اس کی پیٹھ اور پیٹ پر مارا جائے گا، پھر دجّال اس مؤمن سے کہے گا: ابھی بھی تو میرے

اوپر ایمان نہیں لاتا؟ وہ مؤمن کہے گا: تو تو دجّال جھوٹا ہے (جب یہ ایمان لانے سے انکار کرے گا) تو دجّال حکم دے گا اور آرے کے ذریعہ سے سر کے بالوں کی مانگ سے اس کو چیر کر اس کے دو ٹکڑے کر دئے جائیں گے، ایک ٹکڑا اِدھر اور ایک ٹکڑا اُدھر گرے گا۔ دجّال اس کے بیچ میں سے گزرے گا (تاکہ دیکھنے والے لوگوں کو یقین آجائے کہ دو ٹکڑے کر دئے گئے ہیں) پھر دجّال حکم دے گا کہ اُٹھ جا۔ چناں چہ وہ آدمی زندہ ہو کر اُٹھ جائے گا (دیکھو! اللہ تعالیٰ دجّال کو کتنی ڈھیل دیں گے کہ مارنے اور زندہ کرنے کی بھی طاقت دیں گے) پھر دجّال اس مؤمن سے پوچھے گا: اب تو تو میرے اوپر ایمان لائے گا کہ نہیں؟ اس کے جواب میں مؤمن کہے گا: اب تو مجھے اور زیادہ یقین ہو گیا کہ تو دجّال ہی ہے۔ پھر وہ مؤمن کہے گا: اے لوگو! میرے بعد یہ ایسا معاملہ نہیں کر سکے گا (یعنی اب اس میں کسی کو مارنے کی طاقت نہیں ہے) چناں چہ دجّال دوبارہ اس مؤمن کو پکڑ کو ذبح کرنا چاہے گا، اللہ تعالیٰ اس مؤمن کی گردن کا حصہ تانبے کی طرح بنا دیں گے جس کی وجہ سے دجّال کا کوئی ہتھیار اس پر نہیں چلے گا۔ پھر وہ اس کے دونوں ہاتھ اور دونوں ٹانگیں پکڑ کر اس آگ میں جو اس کے ساتھ ہوگی پھینک دے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس کو آگ میں ڈالا گیا حالاں کہ وہ تو جنّت میں ڈالا گیا ہوگا۔ حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: یہ شخص جس کو دجّال سب سے پہلے قتل کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بڑی شہادت والا ہے۔

دجّال کے پاس روٹیوں کا پہاڑ اور پانی کی نہر ہوگی

حدیث ۱۸۱۶:-

وعن المغيرة بن شعبة - رضى الله عنه - قال: ما سألَ أحدٌ رسولَ الله-(ﷺ) - عَنِ الدَّجَّالِ أَكْثَرَ مِمَّا سَأَلْتُهُ، وإِنَّهُ قَالَ لِي: ((مَا يَضُرُّكَ)) قُلْتُ: إِنَّهُمْ يَقُولُونَ: إِنَّ مَعَهُ جَبَلَ خُبْزٍ وَنَهَرَ مَاءٍ. قَالَ: ((هُوَ أَهْوَنُ عَلَى اللهِ مِنْ ذَلِكَ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبئ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دجّال کے متعلق مجھ سے زیادہ کسی نے سوالات نہیں کئے۔ میرے اس باربار پوچھنے پر حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا: تمہیں کیا ڈر ہے؟ مَیں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! لوگ یوں کہتے ہیں کہ اس کے ساتھ روٹیوں کا پہاڑ ہوگا اور پانی کی نہر ہوگی؟ (مطلب یہ کہ جس کو چاہے گا کھانا دے گا، اور جس کو چاہے گا کھانا نہیں دے گا) اس پر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ کی نگاہوں میں وہ اس سے زیادہ حقیر ہے۔

افادات:- یعنی اس کے پاس روٹیوں کا پہاڑ ہوگا اور پانی کی نہر ہوگی، اس کے باوجود ان چیزوں کی وجہ سے اہلِ ایمان گمراہ نہیں ہوں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتنی ساری ڈھیل دیئے جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی اتنی حیثیت نہیں ہے کہ وہ کسی مؤمن کو گمراہ کرسکے، گمراہ وہی ہوں گے جو کافرو مشرک ہیں۔

ہر نبی نے دجّال سے ڈرایا ہے

حدیث ۱۸۱۷:-

وعن أنس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) :مَامِنْ نَبِيٍّ إلاَّ وَقَدْ أَنْذَرَ أُمَّتَهُ الأَعْوَرَ الكَذَّابَ، أَلاَ إِنَّهُ أَعْوَرُ وإنَّ رَبَّكُمْ عَزَّوَجَلَّ لَيْسَ بِأَعْوَرَ، مَكْتُوبٌ بَيْنَ عَيْنَيْهِ ك ف ر. (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبئ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ہر نبی نے اپنی امّت کو جھوٹے اور کانے (یعنی آنکھ میں عیب والے) دجّال سے ڈرایا؛ اور سنو! اس کی ایک آنکھ بالکل سپاٹ ہوگی (اور دوسری

آگے کو نکلی ہوئی ہوگی، اور اس کا یہ ظاہری عیب ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا نہیں ہے، جو خود اپنا عیب دور کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو؛ وہ خدا کیا بن سکتا ہے؟) اور تمہارا رب آنکھ میں عیب والا نہیں ہے۔ اور اس کی پیشانی پر ک، ف، ر (یعنی کافر) لکھا ہوا ہے۔ (آگے ایک روایت آئے گی جس میں ہے کہ اس کو ہر مؤمن جو پڑھا لکھا ہو وہ بھی، اور جو پڑھا لکھا نہ ہو وہ بھی پڑھ لے گا)۔

وہ ایک بات جو کسی نبی نے نہیں بتائی

حدیث ۱۸۱۸:-

وَعَنْ أبِی هریرۃَ -رضی اللہ عنہ- قال: قالَ رسولُ اللهِ -(صلی اللہ علیہ وسلم)-: ((ألا أُحدِّثُكُمْ حديثاً عن الدجّالِ ما حدَّثَ بِهِ نبِیٌّ قومَهُ! إنَّهُ أعورُ، وإنَّهُ يجيءُ مَعَهُ بِمِثالِ الجنَّةِ والنَّارِ، فالتي يقولُ إنَّها الجَنَّةُ هی النَّار)). (متفقٌ علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مَیں دجّال کے متعلق ایسی بات نہ بتلاؤں جو کسی نبی نے اپنی قوم کو نہیں بتلائی؟ (وہ یہ ہے کہ) دجّال آنکھ میں عیب والا ہے، اور وہ اپنے ساتھ جنّت اور جہنم کے نمونے لائے گا، لیکن جس کو وہ جنّت کہتا ہوگا وہ حقیقت میں دوزخ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں عیب نہیں ہے

حدیث ۱۸۱۹:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما أنَّ رسولَ اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ذَكَرَ الدَّجَّالَ بَيْنَ ظَهْرَانَی النَّاسِ، فَقَالَ: ((إنَّ اللهَ لَيْسَ بِأعْوَرَ، ألاَ إنَّ المَسِيحَ الدَّجَّالَ أعْوَرُ العَيْنِ اليُمْنَى، كَأنَّ عَيْنَهُ عِنَبَةٌ طَافِيَةٌ)). (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کے سامنے دجّال کا تذکرہ کیا، چناں چہ ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کی آنکھ میں عیب نہیں ہے، اور دجّال کی دائیں آنکھ عیب دار ہے، ایسی باہر نکلی ہوئی ہے جیسے انگور کا دانہ (خوشے میں سے) آگے نکلا ہوا ہوتا ہے۔

قیامت سے پہلے مسلمان اور یہودیوں کی جنگ ہوگی

حدیث ۱۸۲۰:-

وعن أبي هريرة -رضی اللہ عنه-: أنَّ رسولَ اللهِ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- قال: ((لاَ تَقُومُ السَّاعَةُ حَتَّى يُقَاتِلَ المُسْلِمُونَ اليَهُودَ. حَتَّى يَخْتَبِئَ اليَهُودِيُّ مِنْ وَرَاءِ الحَجَرِ وَالشَّجَرِ. فَيَقُولُ الحَجَرُ وَالشَّجَرُ: يَا مُسْلِمُ هذَا يَهُودِيٌّ خَلْفِي، تَعَالَ فَاقْتُلْهُ؛ إلاَّ الغَرْقَدَ فإنَّهُ مِنْ شَجَرِ اليَهُودِ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ مسلمان یہودیوں سے جنگ کریں گے، یہاں تک کہ کوئی یہودی اگر کسی پتھر یا درخت کے پیچھے چھپے گا وہ تو پتھر اور درخت بھی کہے گا کہ: اے مسلمان! یہودی میرے پیچھے چھپا ہوا ہے؛ آ! اور اس کو مار۔ سوائے غرقد کے درخت کے کہ یہ یہودی درخت میں سے ہے۔

افادات:- ”غرقد“ یہودی درخت کہلاتا ہے، جب کوئی یہودی اس درخت کے پیچھے چھپے گا تو وہ نہیں بتائے گا۔ ایک صاحب نے بتلایا کہ آج کل اسرائیل میں یہودی غرقد کے درخت کثرت سے بو رہے ہیں تا کہ ان کو چھپنے کی جگہ ملے۔

قربِ قیامت ٹینشن انتہا کو پہنچ جائے گا

حدیث ۱۸۲۱:-

وعنه رضی الله عنه قال قالَ رسولُ اللهِ (ﷺ) :((والَّذِی نَفْسِی بِيَدِهِ لاَ تَذْهَبُ الدُّنْيَا حَتَّى يَمُرَّ الرجُلُ على القَبْرِ، فَيَتَمَرَّغَ عَلَيْهِ وَيَقُولُ: يَالَيْتَنِي كُنْتُ مَكَانَ صَاحِبِ هذَا القَبْرِ، وَلَيْسَ بِهِ الدِّينُ، ما بِهِ إلاَّ البَلاَءُ.)) (متفق علیه)

ترجمہ:۔۔حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! دنیا ختم نہیں ہوگی یہاں تک کہ کوئی آدمی قبر پر سے گزرے گا تو اُس قبر پر لوٹے گا (جیسے کوئی آدمی پیٹ میں درد کی وجہ سے لوٹتا ہے) اور کہے گا: کاش! اس قبر والے کی جگہ پر میں ہوتا (حضور (ﷺ) فرماتے ہیں) اس کی یہ تمنا دینداری کی وجہ سے نہیں ہوگی، بلکہ آزمائش اور ٹینشن کی وجہ سے ہوگی۔

افادات:۔۔بعض مرتبہ آدمی موت کی تمنّا اس لیے کرتا ہے کہ وہ ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے کہ اس کو ایمان کا اندیشہ ہوتا ہے، تو دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! میرے ایمان پر آنچ آوے اس سے پہلے مجھے دنیا سے اُٹھا لے؛ یہ تمنّا تو پسندیدہ ہے۔ لیکن کسی مصیبت کی وجہ سے ایسی تمنّا کرنا ناپسندیدہ ہے۔

آج کل ہر آدمی ٹینشن میں ہے اور قربِ قیامت ٹینشن انتہا کو پہنچ جائے گا، ہر چیز ہونے کے باوجود آدمی اتنے ٹینشن میں ہوگا کہ کسی قبر پر سے گزرے گا تو اس پر لوٹے گا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اُس وقت حالات کیسے سخت ہوں گے!

دریائے فرات میں سے سونے کا پہاڑ نمودار ہو گا

حدیث ۱۸۲۲ :-

وعنهُ قال: قال رسولُ اللهِ -(ﷺ)-: ((لَاتَقُومُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَحْسِرَ الفُرَاتُ عَنْ جَبَلٍ مِنْ ذَهَبٍ يُقْتَتَلُ عَلَيْهِ، فَيُقْتَلُ مِنْ كُلِّ مِئَةٍ تِسعَةٌ وَتِسعُونَ، فَيَقُولُ كُلُّ رجُلٍ مِنْهُمْ: لَعَلِّي أَنْ أَكُونَ أنَا أَنْجُو)).

وَفي رواية: ((يُوشِكُ أنْ يَحْسِرَ الفُرَاتُ عَنْ كَنْزٍ مِنْ ذَهَبٍ، فَمَنْ حَضَرَهُ فَلَا يَأْخُذْ مِنْهُ شَيْئاً)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قیامت قائم نہیں ہوگی یہاں تک کہ دریائے فرات سونے کے ایک پہاڑ کو کھول دے گا، جس کو حاصل کرنے کے لیے آپس میں قتل و قتال ہوگا، اور اُس جنگ میں اتنی کثرت سے آدمی مارے جائیں گے کہ سو میں سے ننانوے آدمی ہلاک ہوجائیں گے، (گویا اس جنگ میں ننانوے فیصد آدمی مارے جائیں گے، صرف ایک فیصد لوگ بچیں گے) ہر آدمی اس امید اور لالچ پر اس جنگ میں حصہ لے گا کہ شاید مَیں بچ جاؤں (اور یہ سونا میرے ہاتھ لگ جائے)۔

دوسری روایت میں ہے کہ: دریائے فرات سونے کے خزانے کھول دے گا، جو اُس زمانے کو پائے وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔

افادات:- ”حَسَرَ يَحْسِرُ“ کا مطلب یہ ہے کہ دریائے فرات کا پانی خشک ہوجائے گا اور جیسے ندی میں کوئی چیز چھپی ہوئی ہو اور اس کا پانی خشک ہوجائے تو لوگ اس کو دیکھ لیتے ہیں، اسی طرح دریائے فرات سے سونے کا ایک پہاڑ کھل جائے گا یعنی دریائے فرات کا پانی خشک ہوجائے گا اور اندر

سے سونے کا ایک پہاڑ نمودار ہو گا۔ اب ہو سکتا ہے کہ وہ پہاڑ کی شکل میں ہو۔ یا خزانے کی کثرت اور زیادتی کو پہاڑ سے تعبیر کیا ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) نے اپنی امّت کو تاکید فرمائی کہ جو اُس زمانے کو پائے وہ اس میں سے کچھ نہ لے۔ اس لیے کہ اس میں سے لینا آپس کی لڑائی اور فتنہ کا باعث ہو گا اور فتنے سے اپنے آپ کو بچانے کا اسلم راستہ یہی ہے کہ آدمی اس سے دُور رہے۔

پالتو جانور بھی وحشی بن جائیں گے

حدیث ۱۸۲۳:-

وعنهُ قال: سمعتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) يقولُ: ((يَتْرُكُونَ المَدِينَةَ عَلَى خَيْرِ مَا كَانَتْ، لا يَغْشَاهَا إلاَّ العَوَافِي يُريد - عَوَافِي السِّبَاعِ والطَّيرِ - وَآخِرُ مَنْ يُحْشَرُ رَاعِيَانِ مِنْ مُزَيْنَةَ يُرِيدَانِ المَدِينَةَ يَنْعِقَانِ بِغَنَمِهِمَا فَيَجِدَانِهَا وُحُوشاً، حَتَّى إذَا بَلَغَا ثَنِيَّةَ الوَدَاعِ خَرَّا عَلَى وُجُوهِهِمَا)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا: لوگ مدینہ منورہ کی رہائش کو چھوڑ دیں گے باوجود اس کے کہ وہاں کی سکونت اور رہائش خیر اور بھلائی کا ذریعہ ہو گی، اور مدینہ منورہ میں صرف جانور (درندے اور پرندے) ہی آئیں گے۔ اور آخر میں جو وہاں سے نکلیں گے وہ قبیلہ مُزَیْنَہ کے دو چرواہے ہوں گے، وہ مدینہ جانا چاہیں گے اور اپنے ساتھ اپنے چوپایوں، مویشیوں اور جانوروں کو لے جانے کے لیے ان کو آواز دیں گے لیکن اس وقت وہ اپنے جانوروں کو بالکل وحشی پائیں گے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں چرواہے جب مقامِ ثنیۃ الوداع تک پہنچیں گے تو اپنے منھ کے بل نیچے گر جائیں گے اور ختم ہو جائیں گے۔

افادات:۔یہ صورت قربِ قیامت میں پیش آئے گی کہ پالتو جانور بھی متوحش ہو جائیں گے،حالاں کہ بکریاں ، بھینس وغیرہ پالتو جانور ہوتے ہیں ، جن کی عادت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے چرواہے کی آواز پر۔جہاں وہ لے جانا چاہتا ہے۔فوراً چلے جاتے ہیں ، لیکن اس وقت ان میں وہ بات نہیں رہے گی، وہ جانور جنگلی جانوروں کی طرح ہو جائیں گے کہ ان چرواہوں کی آواز پر ان کے ساتھ نہیں چلیں گے بلکہ اِدھر اُدھر منتشر ہو جائیں گے۔اور مدینہ منورہ کو چھوڑنا کیوں ہو گا؟ بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حُکّام کے جور و ظلم اور زیادتی کی وجہ سے یہ صورت حال پیدا ہو گی۔

مال کی کثرت ہو جائے گی

حدیث ۱۸۲۴:۔

وعن أبي سعيد الخدري -رضي الله عنه-: أنَّ النبيَّ -(صلى الله عليه وسلم)- قال: ((يَكُونُ خَلِيفَةٌ مِنْ خُلَفَائِكُمْ فِي آخِرِ الزَّمَانِ يَحْثُو الْمَالَ وَلَا يَعُدُّهُ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:۔حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: آخری زمانہ میں تمہارے خلفاء میں سے ایک خلیفہ (بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ) ایسا ہو گا جو لپیں بھر بھر لوگوں کو مال دے گا، اور گنے گا بھی نہیں۔

افادات:- یعنی مال کی اتنی کثرت ہو گی، اور وہ حاکم بھی اتنا سخی ہو گا کہ اس کے پاس مال لینے کے لیے آنے والے لوگوں کو مال گن کر نہیں بلکہ لپیں بھر بھر کر دے گا۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت مہدیؒ ہیں کہ ان کے زمانے میں مال کی ایسی ہی کثرت ہو گی۔

قربِ قیامت کی دو نشانیاں؛ مال اور عورتوں کی کثرت

حدیث ۱۸۲۵:-

وعن أبي موسى الأشعريِّ - رضى الله عنه -: أنَّ النبيَّ - (ﷺ) - قال: ((لَيَأْتِيَنَّ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَطُوفُ الرَّجُلُ فِيهِ بِالصَّدَقَةِ مِنَ الذَّهَبِ فَلاَ يَجِدُ أَحَداً يَأْخُذُهَا مِنهُ، وَيُرَى الرَّجُلُ الوَاحِدُ يَتْبَعُهُ أَرْبَعُونَ امْرَأَةً يَلُذْنَ بِهِ مِنْ قِلَّةِ الرِّجَالِ وَكَثْرَةِ النِّسَاءِ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ کے طور پر دینے کے لیے اپنا سونا لے کر پھرے گا اور کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں پائے گا جو اس کو قبول کرے (ہر ایک منع کر دے گا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ وہ یوں کہے گا کہ پہلے آیا ہوتا تو میں لے لیتا اب تو میرے پاس بھی بہت ہے) اور مردوں کی کمی اور عورتوں کی کثرت کی وجہ سے (ایسا حال ہو گا کہ) ایک آدمی کے پاس چالیس چالیس عورتیں پناہ حاصل کر رہی ہوں گی۔

افادات:- یعنی عورتوں کی زیادتی اتنی ہو جائے گی کہ ایک ایک مرد کی نگرانی میں چالیس چالیس عورتیں-اس کی بیوی، بیٹیاں، بہنیں وغیرہ-ہو جائیں گی۔

اب مردوں کی کمی اور عورتوں کی زیادتی کیوں ہوگی ؟تو بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آخری زمانے میں جنگیں اور لڑائیاں کثرت سے ہوں گی، اور چوں کہ عام طور پر لڑائیوں اور جنگوں میں مرد ہی حصہ لیتے ہیں، اس لیے مرد کثرت سے مریں گے اور عورتیں بچیں گی، اس لیے ان عورتوں کی نگرانی کرنے والا ایک مرد ہوگا اور اس کے ماتحت چالیس چالیس عورتیں ہوں گی۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ آخری زمانے میں عورتوں کی پیدائش ہی بڑھ جائے گی، اس وجہ سے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔

دلچسپ واقعہ

حدیث ۱۸۲۶:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه عن النبيِّ (ﷺ) قال: ((اشْتَرَى رَجُلٌ مِنْ رَجُلٍ عَقَاراً، فَوَجَدَ الَّذِي اشْتَرَى الْعَقَارَ فِي عَقَارِهِ جَرَّةً فِيهَا ذَهَبٌ، فَقَالَ لَهُ الَّذِي اشْتَرَى الْعَقَارَ: خُذْ ذَهَبَكَ، إِنَّمَا اشْتَرَيْتُ مِنْكَ الأَرْضَ وَلَمْ أَشْتَرِ الذَّهَبَ، وَقَالَ الَّذِي لَهُ الأَرْضُ: إِنَّمَا بِعْتُكَ الأَرْضَ وَمَا فِيهَا، فَتَحَاكَمَا إِلَى رَجُلٍ، فَقَالَ الَّذِي تَحَاكَمَا إِلَيْهِ: أَلَكُمَا وَلَدٌ ؟ قَالَ أَحَدُهُمَا: لِي غُلاَمٌ، وقَالَ الآخَرُ: لِي جَارِيَةٌ قال: أَنْكِحَا الغُلاَمَ الجَارِيَةَ، وأَنْفِقَا عَلَى أَنْفُسِهِمَا مِنْهُ وَتَصَدَّقَا.)) (متفق عليه)

ترجمہ:–حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی نے دوسرے آدمی سے زمین خریدی، جس نے زمین خریدی تھی اس کو اُس زمین میں سے سونے سے بھرا ہوا ایک گھڑا ملا۔ تو اس نے اس سے جس سے زمین خریدی تھی کہا کہ: یہ سونا تیرا ہے؛ تو لے لے، اس لیے کہ میں نے تو صرف زمین خریدی تھی، سونا نہیں خریدا تھا۔ اور جس کی زمین تھی اس نے کہا: میں نے تو یہ زمین اس میں جو کچھ ہے اس کے ساتھ تجھے بیچ دی ہے (یہ گھڑا بھی اس میں آگیا؛ اب میں یہ نہیں لوں گا۔ وہ دینے پر اصرار کرتا ہے، اور یہ لینے سے انکار کرتا ہے) یہ دونوں اپنا جھگڑا ایک آدمی کے پاس لے گئے (اور اس کو اپنا حکم اور فیصل بنایا) اس فیصل نے ان دونوں سے پوچھا: تمہاری کوئی اولاد ہے؟ ان میں سے ایک نے کہا: میرا ایک لڑکا ہے۔ دوسرے نے کہا: میری لڑکی ہے۔ تو اس نے کہا کہ فیصلہ بہت آسان ہو گیا، ایسا کرو کہ تمہارے لڑکے کا نکاح اس کی لڑکی سے کرا دو، اور یہ مال ان دونوں پر خرچ کر دو، اور جو بچ جاوے اس کا صدقہ کر دو (چناں چہ انہوں نے ایسا ہی کیا)۔

افادات:–ویسے ہماری شریعت میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی آدمی نے کسی کو اپنی زمین بیچی اور اس میں اس نے اپنا خزانہ یا کوئی چیز رکھی تھی؛ تو اب وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا، خریدنے والا زمین خریدنے کی وجہ سے اس خزانے کا مالک نہیں بنتا۔

دلچسپ فیصلہ

حدیث ۱۸۲۷:-

وعنهُ -رضی الله عنه-: أَنَّه سمعَ رسُول الله -(صلی اللہ علیہ وسلم)- يقولُ: ((كانت امْرَأَتَانِ مَعَهُمَا ابْنَاهُمَا، جَاءَ الذِّئْبُ فَذَهَبَ بابْنِ إِحْدَاهُمَا. فَقَالَتْ لِصَاحِبَتِهَا: إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ، وقالتِ الأخرَى: إِنَّمَا ذَهَبَ بِابْنِكِ. فَتَحَا كَمَا

إلى دَاوُدَ -(ﷺ) - فَقَضَى بِهِ لِلْكُبْرَى، فَخَرَجَتَا عَلَى سُلَيْمَانَ بْنِ دَاوُد -(ﷺ) - فَأَخْبَرَتَاهُ. فَقَالَ: ائْتُونِي بِالسِّكِّينِ أَشُقُّهُ بَيْنَهُمَا. فَقَالَتِ الصُّغْرَى: لَا تَفْعَلْ! رَحِمَكَ اللهُ، هُوَ ابْنُهَا. فَقَضَى بِهِ لِلصُّغْرَى)). (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ انہوں نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: دو عورتیں تھیں، ان کے پاس اپنا اپنا بچہ تھا، ایک بھیڑیا آیا اور ایک کے بیٹے کو لے گیا۔ جس کے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا تھا اس نے دوسری کے بیٹے کو لے لیا اور اس سے یوں کہا: تیرے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا (یہ میرا بیٹا ہے) دوسری نے کہا: نہیں! تیرے بیٹے کو بھیڑیا لے گیا (یہ میرا بیٹا ہے) دونوں عورتیں اپنا فیصلہ حضرت داود (علیہ السلام) کے پاس لے گئیں۔ حضرت داود (علیہ السلام) نے جو بڑی عورت تھی اس کے حق میں فیصلہ دیدیا (اب سوال ہوتا ہے کہ بڑی کے حق میں فیصلہ کیوں دیا؟ تو روایت میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، اور گواہ بھی دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس قرینہ کی وجہ سے انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہو کہ جس وقت دونوں عورتیں مقدمہ لے کر ان کے پاس گئیں، اس وقت بچہ بڑی کے قبضہ میں تھا۔ خیر! فیصلہ ہو گیا) اس کے بعد یہ دونوں عورتیں باہر نکلیں، حضرت سلیمان (علیہ السلام) ملے، انہوں نے پوچھا: کیا بات ہے؟ دونوں نے بتلایا کہ اس طرح کا واقعہ پیش آیا (اور حضرت نے ایسا فیصلہ کیا ہے۔ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے قرائن سے معلوم کیا کہ یہ بچہ بڑی کا نہیں ہے، بلکہ چھوٹی کا ہے) تو حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے کہا: ایک چاقو لاؤ، میں اس بچہ کے آدھے آدھے ٹکڑے کر کے دونوں کو بانٹ دیتا ہوں۔ جب حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا تو چھوٹی عورت - جس کے حق میں فیصلہ نہیں ہوا تھا - نے کہا: حضرت! اللہ تعالیٰ آپ پر رحم فرمائے؛ آپ ایسا مت کیجئے، بچہ اسی کے پاس رہنے دو (میں اپنا دعویٰ چھوڑ دیتی ہوں۔ اور بڑی نے کچھ نہیں کہا) حضرت سلیمان (علیہ السلام) سمجھ گئے کہ بچہ اس چھوٹی عورت کا ہے، اس لیے کہ یہ اس بچہ کے دو ٹکڑے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔

چناں چہ انہوں نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ کر دیا گیا(ہو سکتا ہے کہ بعد میں بڑی نے بھی حقیقتِ حال کا اقرار کر لیا ہو)۔

افادات:۔۔مسئلہ یہ ہے کہ اگر کسی چیز کے متعلق دو فریق میں اختلاف ہو جائے، اور اس پر قبضہ کسی ایک کا ہو، اور دوسرا کہے کہ یہ چیز میری ہے، تو اس سے گواہ مانگے جاتے ہیں، اگر وہ گواہ پیش کر دے تب تو ٹھیک ہے، ورنہ دوسرے کی قسم سے اسی کے حق میں فیصلہ ہو جاتا ہے۔

نیک لوگ آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہوں گے

حدیث ۱۸۲۸:۔

وعن مِرداس الأسلمی رضی الله عنه قال قال النبیُّ (ﷺ) : ((یَذْهَبُ الصَّالِحُونَ الأَوَّلُ فَالأَوَّلُ، وَیَبْقَى حُثَالَةٌ كَحُثَالَةِ الشَّعِیرِ أَوِ التَّمْرِ لَا یُبَالِیهِمُ اللهُ بَالَةً)). (رواہ البخاری)

ترجمہ:۔۔حضرت مرداس اسلمی (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: نیک لوگ آہستہ آہستہ دنیا سے رخصت ہوں گے، اور اخیر میں کوڑا کرکٹ (نکمّا حصہ) رہ جائے گا، جیسے جَو اور کھجور میں سے رہ جاتا ہے (پھر ان پر جیسے بھی حالات آویں) اللہ تعالیٰ ان کی کوئی پرواہ نہیں کرے گا۔

اصحابِ بدر کی فضیلت

حدیث ۱۸۲۹ :-

وعن رفاعة بن رافع الزُّرَقِيِّ رضی الله عنه قال: جاء جبريل إلى النبيّ (ﷺ) قال: مَا تَعُدُّونَ أَهْلَ بَدْرٍ فِيكُمْ؟ قال: ((مِنْ أَفْضَلِ الْمُسْلِمِينَ)) أَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا. قال: وَ كَذٰلِكَ مَنْ شَهِدَ بَدْرًا مِنَ الْمَلَائِكَةِ. (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت رفاعہ بن رافع زُرَقی (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نبی کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا: بدر میں شریک ہونے والوں کو آپ اپنے درمیان کیسا شمار کرتے ہیں (یعنی صحابہ کرامؓ میں سے جو حضرات غزوۂ بدر میں شریک ہوئے تھے؛ آپ کے درمیان ان کی پوزیشن اور مقام کیا ہے؟) نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: غزوۂ بدر میں شریک ہونے والے صحابہ دوسرے سب کے مقابلہ میں افضل سمجھے جاتے ہیں۔ یا ایسا ہی کوئی جملہ ارشاد فرمایا جس سے بدر والوں کی فضیلت معلوم ہوتی تھی۔ اس پر حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نے فرمایا: ہمارے فرشتوں میں بھی جو فرشتے غزوۂ بدر میں شریک ہوئے ان کو دوسرے تمام فرشتوں کے مقابلہ میں -جو بدر میں شریک نہیں ہوئے- افضل سمجھا جاتا ہے۔

عمومی عذاب کی لپیٹ میں سب ہی آجاتے ہیں

حدیث ۱۸۳۰ :-

وعن ابن عمر رضی الله عنهما قال: قال رسولُ اللهِ - (ﷺ) -: ((إِذَا أَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى بِقَوْمٍ عَذَاباً، أَصَابَ الْعَذَابُ مَنْ كَانَ فِيهِمْ، ثُمَّ بُعِثُوا عَلَى أَعْمَالِهِمْ)). (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب اللہ تعالیٰ کسی قوم پر عذاب نازل کرتے ہیں تو اس وقت جتنے بھی لوگ موجود ہوتے ہیں سب پر وہ عذاب آتا ہے، البتہ قیامت کے روز لوگ اپنے اپنے اعمال اور نیتوں کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔

افادات:- یعنی عام دستور یہی ہے کہ کسی بد عملی کی وجہ سے کسی قوم پر کوئی عذاب آتا ہے تو جو لوگ اس گناہ میں مبتلا نہیں ہوتے وہ بھی اس عذاب کا شکار ہو جاتے ہیں، جیسے عذاب کے طور پر زلزلہ آیا، تو اس میں وہ لوگ بھی مریں گے جو گنہگار نہیں تھے اور جن کے گناہوں کو اس زلزلہ کے آنے میں کوئی دخل نہیں تھا۔ اسی طرح سیلاب آیا اور اس میں بہت سے لوگ ڈوب گئے تو جتنے میں بھی اس قوم میں ہوں گے ان سب کو وہ عذاب پہنچے گا۔ دنیوی عذاب کسی کو بھی نہیں چھوڑے گا، ہاں! جو نیک ہیں آخرت میں ان کے ساتھ ان کے اعمال کے مطابق معاملہ ہوگا۔

اسطوانۂ حنّانہ

حدیث ۱۸۳۱:-

وعن جابر -رضی اللہ عنہ- قال: كَانَ جِذْعٌ يَقُومُ إِلَيْهِ النَّبِيُّ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- يَعْنِي فِي الْخُطْبَةِ- فَلَمَّا وُضِعَ الْمِنْبَرُ سَمِعْنَا لِلْجِذْعِ مِثْلَ صَوْتِ الْعِشَارِ، حَتَّى نَزَلَ النَّبِيُّ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- فَوَضَعَ يَدَهُ عَلَيْهِ فَسَكَنَ.

وَفِي رِوَايَةٍ: فَلَمَّا كَانَ يَوْمُ الْجُمُعَةِ قَعَدَ النَّبِيُّ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- عَلَى الْمِنْبَرِ، فَصَاحَتِ النَّخْلَةُ الَّتِي كَانَ يَخْطُبُ عِنْدَهَا حَتَّى كَادَتْ أَنْ تَنْشَقَّ.

وفی روایۃ: فصَاحَتْ صِيَاحَ الصَّبِيِّ، فَنَزَلَ النَّبِيُّ (ﷺ)، حَتَّى أَخَذَهَا فَضَمَّهَا إِلَيهِ، فَجَعَلَتْ تَئِنُّ أَنِينَ الصَّبِي الَّذِي يُسَكَّتُ حَتَّى اسْتَقَرَّتْ، قال: ((بَكَتْ عَلَى مَا كَانَتْ تَسْمَعُ مِنَ الذِّكْرِ)). (رواہ البخاری)

ترجمہ:–حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ مسجدِ نبوی میں ایک تنا تھا، آپ (ﷺ) جب خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو کھجور کے اسی تنے سے ٹیک لگاتے تھے (ایک بڑھئی آیا اور اس نے ایک منبر بنادیا) جب وہ منبر رکھا گیا اور جمعہ کے دن پہلی مرتبہ نبیٔ کریم (ﷺ) خطبہ دینے کے لیے بجائے کھجور کے اس تنے کے پاس کھڑے ہونے کے منبر پر تشریف فرما ہوئے تو کھجور کا وہ تنا رونے لگا، اور اس میں سے ایسی آواز آئی جیسے گابھن اونٹنی روتی ہے، یہاں تک کہ نبیٔ کریم (ﷺ) منبر سے نیچے اترے اور آپ نے اپنا دستِ مبارک اس پر رکھا تو اس کو سکون ملا۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ: منبر بن کر آیا اور آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے تو کھجور کا تنا زور زور سے چلّا کر رونے لگا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پھٹ جائے گا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ: جیسے بچّہ بلبلا کر روتا ہے اس طرح رویا۔ حضور اکرم (ﷺ) منبر سے نیچے اترے، اس کو اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے سینے سے لگایا (جیسے بچّہ روتا ہو تو اس کو چپ کرانے کے لیے تسلّی دی جاتی ہے) اور بچّہ جیسے ہچکیاں لیتا ہے اس طرح اس تنے نے بھی ہچکیاں لیں یہاں تک کہ وہ سکون پذیر ہوگیا۔ وہ اس لیے رویا تھا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) اس کے پاس کھڑے رہ کر جو خطبہ دیتے تھے (اس فضیلت سے وہ محروم ہوگیا)

ترجمہ:–روایتوں میں ہے کہ اس کے بعد نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس کو اختیار دیا کہ اگر تو چاہے تو مسجد میں لگائے جانے سے پہلے تو جیسا ہرا بھرا درخت تھا، ایسا ہی تجھے ہرا بھرا درخت کردیا جائے، اور اگر تو چاہے تو جنّت میں بھیج دیا جائے؛ تو اس نے جنّت میں جانے کو پسند کیا، چناں چہ مسجدِ نبوی میں اسی جگہ پر اس کو دفن کردیا گیا۔ مسجدِ نبوی

کے جن ستونوں کی زیارت کی جاتی ہے ان میں ایک یہ ”اسطوانۂ حنّانہ“ بھی ہے۔ آپ (ﷺ) کی محراب سے بالکل لگ کر وہ جگہ ہے۔

جامع روایت

حدیث ۱۸۳۲ :-

وعن أبي ثعلبة الخُشَنِيِّ جُرثومِ بنِ ناشر رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ (ﷺ) قال: ((إنَّ اللهَ تَعَالَى فَرَضَ فَرَائِضَ فَلاَ تُضَيِّعُوهَا، وَحَدَّ حُدُوداً فَلاَ تَعْتَدُوهَا، وَحَرَّمَ أَشْيَاءَ فَلاَ تَنْتَهِكُوهَا، وَسَكَتَ عَنْ أشْيَاءَ رَحْمَةً لَكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلاَ تَبْحَثُوا عَنْهَا)) (حديث حسن. رواه الدارقطني وغيره)

ترجمہ:- حضرت ابو ثعلبہ خُشنی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض کی ہیں، ان کو ضائع مت کرو (یعنی ان کو انجام دو) اور اللہ تعالیٰ نے کچھ حدود مقرر فرمائے ہیں، ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے، ان کی حرمت مت توڑو (یعنی ان چیزوں کا ارتکاب نہ کرو) اور کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ تم پر رحم کھاتے ہوئے اس سے خاموشی اختیار فرمائی ہے (اس سلسلہ میں کوئی بھی بات ارشاد نہیں فرمائی) تو ایسی چیزوں میں بحث نہ کرو۔

افادات:- معلوم ہوا کہ جن چیزوں کے متعلق شریعت میں کوئی صراحت نہیں آئی ہے اس کے بارے میں آدمی کو خاموشی اختیار کرنی چاہیے، اس میں بحث و مباحثہ میں نہیں پڑنا چاہیے۔

حضورِ اکرم (ﷺ) کی نوش فرمائی ہوئی ایک غذا (ٹڈی)

حدیث ۱۸۳۳:-

وعن عبد الله بن أبي أَوْفَى رَضِيَ اللهُ عَنهما، قالَ: غَزَوْنَا مَعَ رَسولِ اللهِ -(ﷺ)- سَبعَ غَزَوَاتٍ نَأكُلُ الجَرَادَ. (متفق عليه)

وَفِي رِوَايةٍ: نَأكُلُ مَعَهُ الجَرَادَ.

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن ابی اوفیٰ (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم (ﷺ) کے ساتھ سات غزوات میں حصہ لیا اور اس موقعہ پر ہم ٹِڈّیاں کھاتے تھے۔

ایک روایت میں ہے کہ ہم حضور اکرم (ﷺ) کے ساتھ ٹِڈّیاں کھاتے تھے۔

افادات:- ”ٹڈّی“ اُڑنے والا ایک حلال جانور ہے، اس میں ذبح کرنے کی بھی شرط نہیں ہے، جیسے مچھلی کا ذبح کرنا ضروری نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور اکرم (ﷺ) نے بھی ٹِڈّی نوش فرمائی ہے۔

ایمان والا بڑا محتاط ہوتا ہے

حدیث ۱۸۳۴:-

وعن أبي هريرة -رضى الله عنه-: أنَّ النبيَّ -(ﷺ)- قال: ((لَا يُلْدَغُ المُؤْمِنُ مِنْ جُحْرٍ وَاحِدٍ مَرَّتَيْنِ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایمان والا ایک سوراخ سے دومرتبہ ڈسا نہیں جاتا۔

افادات:- ایمان والا بڑا محتاط ہوتا ہے۔ زندگی میں جو حالات، واقعات اور عبرت انگیز چیزیں پیش آتی ہیں ان سے وہ بڑے سبق لیتا ہے، اگر کسی کی طرف سے اس کے ساتھ دھوکہ دہی ہوئی ہو تو پھر دوسری مرتبہ وہ غفلت میں رہ کر ایسا دھوکہ نہیں کھاتا۔

علامہ انور شاہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے: اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی غفلت پر کسی نے تنبیہ کی، یا اس کی وجہ سے سزا بھگتنے کی نوبت آئی، تو پھر ایمان والا دوبارہ کبھی ایسی غفلت نہیں برتتا۔ جیسے: فیکٹری میں کسی قانون کی خلاف ورزی ہوگئی اور اس کی وجہ سے پینلٹی آگئی؛ تو ایمان والے کے ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ آئندہ کبھی ایسا کوئی اقدام نہ کرے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ زندگی میں پیش آنے والے حالات سے وہ عبرت اور سبق حاصل نہ کرے، اور اس کی طرف سے بار بار ایسی ہی صورتیں پیش آتی رہیں۔

وہ تین آدمی جن سے اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتے ہیں

حدیث ۱۸۳۵:-

وعنه قال: قال رسول الله -(صلی اللہ علیہ وسلم)-: ((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: رَجُلٌ عَلَى فَضْلِ مَاءٍ بِالْفَلَاةِ يَمْنَعُهُ مِنِ ابْنِ السَّبِيلِ. وَرَجُلٌ بَايَعَ رَجُلًا سِلْعَةً بَعْدَ

الْعَصْرِ فَحَلَفَ بِاللهِ لَأَخَذَهَا بِكَذَا وَكَذَا فَصَدَّقَهُ وَهُوَ عَلَى غَيْرِ ذٰلِكَ. وَرَجُلٌ بَايَعَ إِمَامًا لَا يُبَايِعُهُ إِلَّا لِلدُّنْيَا فَإِنْ أَعْطَاهُ مِنْهَا وَفَى وَإِنْ لَمْ يُعْطِهِ مِنْهَا لَمْ يَفِ)). متفق علیه

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ تو ان سے بات کریں گے، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھیں گے، اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، بلکہ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا (۱) ایک وہ آدمی جس کے پاس جنگل، صحراء اور رَن میں اس کی ضرورت سے زائد پانی موجود ہو اور کسی مسافر کو استعمال کرنے سے منع کرے (۲) دوسرا وہ آدمی جس نے عصر کے بعد کسی کے ہاتھ کوئی سامان بیچا اور اس وقت قسم کھا کر یوں کہا کہ میں نے یہ سامان اتنے روپیہ میں خریدا ہے اور سامنے والے نے بھی اس کی بات کو سچ مان لیا، حالاں کہ اس کی بات صحیح نہیں تھی (۳) تیسرا وہ آدمی جس نے امامِ مسلمین (حاکمِ وقت) کے ہاتھ پر اطاعت و فرماں برداری کی بیعت صرف دنیا حاصل کرنے کے لیے کی (گویا اس کی یہ بیعت اللہ کے واسطے نہیں، حالاں کہ حکّام کے ہاتھ پر ان کی اطاعت و فرماں برداری کے لیے اللہ کے واسطے بیعت کرنی چاہیے) اب اگر اس کو سرکاری خزانہ سے کچھ ملتا ہے تب تو وہ اس حاکم کی فرمانبرداری کرتا ہے (بیعت کے تقاضہ پر عمل کرتا ہے) اور اگر وہ حاکم کچھ نہیں دیتا تو پھر وہ بیعت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

افادات:- بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کو کرنے والا سزا کا مستحق تو بنتا ہے پھر بھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف کردیں گے، لیکن اس روایت میں جن تین کا تذکرہ ہے وہ ایسے لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کریں گے، بلکہ ان کو اپنے کئے کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی:-

(۱) پہلا وہ آدمی جس نے مثلاً کوئی کنواں کھودا اور اس میں سے پانی نکلا پھر اس کی ضرورت پوری ہوگئی اور زائد پانی بچا ہے، پھر کوئی مسافر وہاں سے گزرا جو ضرورت مند اور پیاسا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس پانی کے ذریعہ اس کی پیاس بجھے، لیکن یہ کہتا ہے کہ یہ کنواں میرا ہے، میں اس میں سے پانی پینے نہیں دوں گا، حالاں کہ یہ پانی اس کی ضرورت سے زائد ہے۔

(۲) جو آدمی عصر کے وقت جھوٹی قسم کھاکر کاروبار کرتا ہے۔ ویسے تو کسی بھی وقت پر غلط طریقہ سے سامان بیچنا گناہ ہے، لیکن عصر کے بعد کا وقت بڑا بابرکت سمجھا جاتا ہے، اس وقت کوئی آدمی ایسی حرکت کرے گا تو اس میں اور زیادہ قباحت و برائی پیدا ہو جاتی ہے۔

(۳) پہلے زمانہ میں جب اسلامی حکومت تھی تو بادشاہِ وقت جب حکومت پر آتا تھا تو وہ تمام لوگوں سے بیعت اور عہد و پیمان لیتا تھا کہ تم سب میری اطاعت کروگے، اب جس آدمی نے حاکمِ وقت کے ہاتھ پر بیعت صرف دنیا حاصل کرنے کے لیے کی، اس کا مقصد حاکم کی اطاعت و فرمانبرداری نہیں تھی، پھر اگر اس کو سرکاری خزانہ سے کچھ وظیفہ ملتا ہے تب تو حاکم کی مانتا ہے اور بیعت کے تقاضہ پر عمل کرتا ہے، لیکن اگر حاکم اس کو کچھ نہیں دیتا تو پھر وہ بھی بیعت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔

یہ تین گناہ ایسے ہیں جن کو کرنے والا ان کی سزا ضرور بھگتے گا، اس کو معاف نہیں کیا جائے گا۔

دو صور کے درمیان کا فاصلہ

حدیث ۱۸۳۶:-

وعنه، عن النبيّ -(ﷺ) -قال:((بَيْنَ النَّفْخَتَيْنِ أَرْبَعُونَ)) قالوا: يَا أَبَا هُرَيْرَةَ أَرْبَعُونَ يَوْماً ؟ قَالَ: أَبَيْتُ، قَالُوا: أَرْبَعُونَ سَنَةً ؟ قال: أَبَيْتُ. قالوا: أَرْبَعُونَ شَهْراً؟ قَالَ: أَبَيْتُ. ((وَيَبْلَى كُلُّ شَيْءٍ مِنَ الإِنْسَانِ إِلاَّ عَجْبَ الذَّنَبِ، فِيهِ يُرَكَّبُ الخَلْقُ، ثُمَّ يُنَزِّلُ اللهُ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَيَنْبُتُونَ كَمَا يَنْبُتُ البَقْلُ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ: دو مرتبہ صور پھونکے جانے کے درمیان کا فاصلہ چالیس ہے۔ سننے والوں نے پوچھا: اے ابوہریرہ! چالیس دن مراد ہیں؟ انہوں نے کہا: مجھے یقین کے ساتھ معلوم نہیں۔ پوچھنے والوں نے پوچھا: چالیس سال؟ اس پر بھی انہوں نے جواب میں فرمایا: میں (تعین کے ساتھ کہنے سے) انکار کرتا ہوں (یعنی مجھے یقین کے ساتھ یاد نہیں) پھر لوگوں نے پوچھا: چالیس مہینے؟ انہوں نے اس کا بھی وہی جواب دیا۔ (ویسے دوسری روایتوں سے چالیس سال کی تعین ہوتی ہے) پھر آگے حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اس (درمیانی مدّت) میں انسان کے جسم کی ہر چیز گل سڑ کر ختم ہو جائے گی، سوائے ریڑھ کی ہڈّی کے آخری سرے کے (کہ وہ باقی رہ جائے گا) اور ساری مخلوق کی دوبارہ پیدائش اُسی سے کی جائے گی، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ آسمان سے پانی برسائیں گے جس کے نتیجے میں لوگ اس طرح نکل آئیں گے جیسے پانی سے سبزہ نکل آتا ہے۔

افادات:- پہلا صور پھونکے جانے پر ساری مخلوق ختم ہو جائے گی، اور سب پر موت طاری ہو جائے گی، اس کے بعد جب دوسرا صور پھونکا جائے گا تو اس کے نتیجے میں سب لوگ دوبارہ زندہ

ہو جائیں گے۔ان دونوں صوروں کے پھونکے جانے کے درمیان کی مدّت اور زمانہ چالیس سال ہو گا جیسا کہ دوسری روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔

"ریڑھ کی ہڈّی کا آخری سرا" یعنی آدمی کی پیٹھ میں بیچ میں جو ہڈّی ہے اس میں نیچے دو سُرینوں کے بیچ میں جو نوکیلا حصہ ہوتا، آپ وہاں انگلی سے ایک نوک سی نکلی ہوئی محسوس کر سکتے ہیں۔

جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو

حدیث ۱۸۳۷:-

وعنه، قال: بَيْنَمَا النَّبِيُّ -(ﷺ) - في مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ القَوْمَ، جَاءَ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ: مَتَى السَّاعَةُ؟ فَمَضَى رسولُ الله (ﷺ) - يُحَدِّثُ، فقالَ بَعْضُ القَومِ: سَمِعَ مَا قَالَ فَكَرِهَ مَا قَالَ، وَقَالَ بَعْضُهُمْ: بَلْ لَمْ يَسْمَعْ، حَتَّى إِذَا قَضَى حَدِيثَهُ قَالَ: أَيْنَ السَّائِلُ عَنِ السَّاعَةِ؟)) قال: هَا أَنَا يَا رسُولَ الله. قال: ((إِذَا ضُيِّعَتِ الأَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ)) قال: كَيفَ إِضَاعَتُهَا؟ قال: ((إِذَا وُسِّدَ الأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ)). (رواه البخاری)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (ﷺ) اپنی مجلس میں تشریف فرما تھے اور آپ کی تقریر جاری تھی اسی دوران ایک دیہاتی آیا (اب چاہیے تو یہ تھا کہ نبیٔ کریم (ﷺ) جو گفتگو فرمارہے تھے اس کے ختم ہونے کا وہ انتظار کرتا، اور جب آپ اپنی گفتگو ختم فرمالیتے اس کے بعد اس کو جو پوچھنا تھا وہ پوچھتا، لیکن چوں کہ وہ دیہات کا رہنے والا تھا، اور اس نوع کے آداب وغیرہ کی ان کے یہاں کوئی رعایت نہیں ہوتی تھی، اس لیے دورانِ گفتگو ہی) اس نے سوال

کر لیا کہ: قیامت کب ہے؟ اس کے سوال کے بعد بھی نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا سوال سنا ہی نہیں۔ مجلس میں بیٹھے ہوئے حضراتِ صحابہؓ آپس میں یوں کہنے لگے: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا سوال تو سن لیا ہے لیکن آپ نے اس کے سوال کو ناپسند سمجھا، اس لیے آپ نے اس کا جواب نہیں دیا۔ بعضوں نے کہا: نہیں! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا سوال سنا ہی نہیں، اس لیے جواب نہیں دیا (گویا آپ کی مجلس میں بیٹھے حضرات صحابہ کشمش میں پڑ گئے) یہاں تک کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اپنی گفتگو ختم کر چکے تو آپ نے فرمایا: بھائی! وہ قیامت کے متعلق پوچھنے والا کہاں گیا؟ (اب لوگوں کو معلوم ہوا کہ ہاں! حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سوال تو سنا تھا اور اس کو جواب کے قابل بھی سمجھا تھا، لیکن فوری جواب کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے آپ نے اپنی گفتگو کے سلسلہ کو جاری رکھا) اس شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول! جی ہاں؛ میں حاضر ہوں۔ چناں چہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سائل کی طرف خصوصی طور پر مخاطب ہو کر فرمایا: جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو۔ اس نے پوچھا: امانت ضائع کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جب معاملات نااہلوں کے حوالے کئے جائیں۔

افادات:- علماء نے لکھا ہے کہ اگر عقیدہ کے متعلق سوال ہو، یا کسی ایسی چیز کے متعلق ہو جس پر فوری عمل کرنا ہو؛ تو اس کا جواب فوری دینا ضروری ہے۔ اسی لیے بعض روایتوں میں ایک واقعہ آتا ہے کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) جمعہ کے روز خطبہ دے رہے تھے، ایک آدمی نے آکر دین کے متعلق سوال کیا۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خطبہ روک دیا اور اس کے سوال کا جواب دیا (مسلم شریف، کتاب الجمعۃ) گویا جیسا موقع ہو، ویسا معاملہ کیا جائے۔ اگر ایمر جنسی صورتِ حال ہے تو ظاہر ہے کہ ایمر جنسی امداد پہنچائی جائے گی۔ اور عقیدہ کی درستگی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اب یہاں اس کا سوال قیامت کے متعلق تھا کہ کب آئے

گی۔اس سوال سے معلوم ہو گیا کہ وہ قیامت کا تو قائل ہے، لیکن پوچھنا چاہتا ہے کہ کب آئے گی۔تو ظاہر ہے کہ اس کا کوئی وقت متعین نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ اس لیے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا فوری جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور اپنی گفتگو جاری رکھی۔

امانت کے ضائع ہونے کا مطلب

"جب معاملات نااہلوں کے حوالے کئے جائیں" تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ امانت ضائع ہو رہی ہے۔ جیسے: کسی ایسے آدمی کو امام بنایا جائے جو امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کسی ایسے آدمی کو تدریس کا کام سونپا جو تدریس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کسی ایسے آدمی کو قوم کا سردار بنایا گیا جو قوم کا سردار بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ کسی ایسے آدمی کو مسجد کا متولّی بنایا گیا جو یہ جانتا ہی نہیں کہ شرعی طور پر متولّی کی ذمہ داریاں کس طرح ادا کرنی چاہئیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ دینی یا دنیوی اعتبار سے جن لوگوں کے ہاتھ میں اختیارات اور پاورس ہیں، اور جو لوگ ذمہ داری کے کام دوسروں کے حوالہ کرسکتے ہیں، ان کا فریضہ ہے کہ جن کے متعلق ان کو اس بات کا یقین اور پورا وثوق و اعتماد ہو کہ وہ اس کام کو انجام دینے کی صلاحیت رکھتا ہے، انہیں کو وہ کام سپرد کریں۔ صرف رشتہ داری کی بنیاد پر، یا کسی کی سفارش کی بنیاد پر، یا صرف تعلقات کی بنیاد پر، یا قومی، خاندانی، نسلی، وطنی اعتبار سے تعلقات کی بنیاد پر کوئی ذمہ داری سپرد نہ کریں، کہ فلاں میری بستی کا رہنے والا ہے، فلاں میرے محلہ کا رہنے والا ہے، اس لیے میں اس کو عہدہ دے دوں، حالاں کہ وہ جانتا ہے کہ اس میں یہ کام کرنے کی پوری

صلاحیت نہیں ہے؛ تو اس کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ اس بات کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی۔ قرآنِ پاک میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ امانتیں جو اس کے اہل اور حقدار ہیں؛ انہیں کے حوالے کرو۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین نے بالاتفاق لکھا ہے کہ: عہدے اور مناصب جن حکّام کے اختیار میں ہوا کرتے ہیں، ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان عہدوں اور مناصب کو ایسے لوگوں کے حوالے کریں جن کے اندر ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہو اور وہ پوری امانت و دیانت کے ساتھ ان فرائض کو انجام دے سکیں۔ حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ جب مناصب اور عہدے نااہلوں کے حوالے کئے جائیں تو پھر قیامت کا انتظار کرو۔ امانت کے ضائع ہونے کا یہی مطلب ہے۔

ذمہ دار کی کوتاہی کا وبال اسی پر

حدیث ۱۸۳۸:-

وعنه: أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ - (ﷺ) - قَالَ: ((يُصَلُّونَ لَكُمْ، فَإِنْ أَصَابُوا فَلَكُمْ، وَإِنْ أَخْطَئُوا فَلَكُمْ وَعَلَيْهِمْ)). (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ایک موقعہ پر نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: (ایسے حکّام آئیں گے جو نماز کو اُس کے وقت سے ہٹا کر اتنی دیر کر کے پڑھائیں گے کہ اس نماز کا وقتِ مستحب نکل جائے گا اور مکروہ وقت آجائے گا۔ یا تو وقت بالکل ہی نکل جائے گا، اب) جو حاکم صحیح طریقہ سے پڑھائے گا تو تمہارے لیے ثواب ہو گا، اور جو صحیح وقت پر نہیں پڑھائے گا (اور اس میں تمہاری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہو گی۔ یعنی تم تو وقت

پر نماز کے لیے آ گئے، اور اس کے انتظار میں رہے، لیکن وہی دیر سے آیا) تو اس میں تمہارے لیے ثواب ہی ہو گا، البتہ ان کے اوپر اس کا وبال ہو گا اور ساری ذمہ داری ان پر آئے گی۔

افادات:- پہلے زمانہ میں جو حاکم ہوا کرتے تھے امامت کی ذمہ داری انہیں کی ہوا کرتی تھی، بعد میں ایسے حکّام آنے لگے جو امامت کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے تو پھر دونوں عہدے منقسم ہوئے، ورنہ خود نبیٔ کریم (ﷺ) نے اپنی پوری حیاتِ طیبہ میں نماز کی امامت کرائی، آپ (ﷺ) کے بعد جب حضراتِ خلفائے راشدین کا دور آیا تو سب ہی اپنے اپنے زمانے میں جہاں حکومت کے اختیارات سنبھالتے تھے، وہیں نماز کی امامت کی ذمہ داری بھی انہیں کی ہوا کرتی تھی۔ ان کے بعد کچھ خلفاء تک یہ سلسلہ رہا، اور وہ جن لوگوں کو اپنے علاقہ میں حاکم مقرر کرتے تھے، یا کسی شہر میں کسی کو گورنر بناتے تھے؛ وہاں کی امامت کی ذمہ داری بھی انہیں کی ہوا کرتی تھی۔

بہترین لوگ

حدیث ۱۸۳۹:-

وعنه -رضی الله عنه-: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ [البقرة:۱۱۰] قَالَ: خَيْرُ النَّاسِ لِلنَّاسِ يَأْتُونَ بِهِمْ فِي السَّلَاسِلِ فِي أَعْنَاقِهِمْ حَتَّى يَدْخُلُوا فِي الإِسْلَامِ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ باری تعالیٰ کے ارشاد: تم بہترین امّت ہو، لوگوں کے حق میں بھلائی کے لیے پیدا کئے گئے ہو، اس کے متعلق ارشاد فرمایا کہ: دوسری تمام امتوں کے مقابلہ میں تمہارا وجود سب

سے بہتر ہے، لوگوں کو زنجیروں میں جکڑ کر، ان کے گلوں میں زنجیر ڈال کر لائیں گے، یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔

پابہ زنجیر جنت میں

حدیث ۱۸۴۰:-

وعنه عن النبیّ (ﷺ) قال: ((عَجِبَ اللهُ عزوجل مِنْ قَوْمٍ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ فِي السَّلَاسِلِ.)) (رواهما البخاری)

معناه: يُؤْسَرُونَ وَيُقَيَّدُونَ ثُمَّ يُسْلِمُونَ فَيَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ.

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ بڑے خوش ہوتے ہیں ان لوگوں سے جو جنت میں زنجیروں کے ساتھ داخل ہوں گے۔

افادات:- یعنی غیر مسلموں کے ساتھ جنگ ہوئی جس میں کچھ لوگ قید پکڑے گئے، ان کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا گیا، لیکن اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا گیا، اس لیے کہ اگر جبری طور پر کوئی آدمی ایمان لاتا ہے تو وہ دل سے مؤمن نہیں ہوتا۔ جب ان کو اسلامی ماحول ملا اور مسلمانوں کے اعمال، اخلاق اور خوبیاں دیکھیں جس کی وجہ سے ان کے دل میں ایمان داخل ہوا اور وہ اسلام لائے۔ گویا قید کے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام و مسلمانوں کی خوبیاں دیکھنے کا موقعہ دیا تو وہ اسلام لائے۔

حضرت ثمامہ بن اُثال (رضی اللہ عنہ) کے اسلام لانے کا واقعہ

حضرت ثمامہ بن اُثال (رضی اللہ عنہ) قبیلۂ بنو حنیفہ کے سرداروں میں سے تھے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صحابہ کی ایک ٹکڑی ایک علاقہ میں حضرت محمد بن مسلمہ (رضی اللہ عنہ) کی سرکردگی میں بھیجی، جب وہ لوگ وہاں سے واپس لوٹ رہے تھے تو قبیلۂ بنو حنیفہ کے سردار حضرت ثمامہ بن اُثال (رضی اللہ عنہ) کی -جو اپنے علاقہ سے عمرہ کرنے کے ارادہ سے مکہ مکرمہ جارہے تھے- صحابۂ کرام کی جماعت سے مڈ بھیڑ ہوگئی، صحابہؓ نے اُن کو قید کرلیا اور مسجدِ نبوی میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پیش کیا۔ اُس زمانہ میں مستقل کوئی قید خانہ نہیں تھا، اور نہ ہی کوئی مہمان خانہ تھا۔ جو مہمان حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں آتے تھے ان کو بھی، اور قیدیوں کو بھی مسجدِ نبوی ہی میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ لوگ مسلمانوں کی نماز اور اسلامی ماحول دیکھتے تھے، جس کا ان کی طبیعتوں پر اثر ہونا لازمی تھا۔ حضرت ثمامہ کو بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسجد کے ایک ستون کے ساتھ بندھوا دیا۔ دوسرے دن فجر کی نماز کے لیے جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تشریف لائے تو ان سے پوچھا: کیا حال ہے اور میرے متعلق تمہارا کیا گمان ہے؟ میں تمہارے ساتھ کیا معاملہ کروں گا؟ انہوں نے جواب دیا: آپ کے متعلق میرا خیال اچھا ہی ہے، اگر آپ میرے قتل کا حکم صادر کریں گے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایک ایسے آدمی کے قتل کا حکم صادر کریں گے جو قتل کا حقدار ہے۔ اور اگر آپ مجھے معاف کرکے مجھ پر احسان کریں گے تو ایک شکر گزار آدمی پر احسان کریں گے۔ اور اگر آپ کو مال چاہئے تو فرمائیے کہ کتنا مال چاہئے؟ وہ

پیش کر دیا جائے گا۔ نبیٔ کریم (ﷺ) نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوسرے دن پھر نبیٔ کریم (ﷺ) ان کے پاس سے گزرے تو وہی سوال پوچھا۔ اُس وقت انہوں نے کہا: اگر آپ معاف کر دیں گے تو ایک شکر گزار آدمی پر احسان کریں گے، اور آپ سے یہی توقع ہے۔ تیسرے دن پھر وہی سوال پوچھا تو انہوں نے کہا: میرا وہی جواب ہے جو میں دے چکا ہوں ۔ اب وہ تین دن مسجد میں رہے تھے اور حضراتِ صحابہ کے اعمال دیکھے تھے تو ان کے دل میں ایمان آچکا تھا، چناں چہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے حکم دیا کہ ان کو کھول دو۔ ان کو کھول دیا گیا، وہیں مسجد کے قریب کھجور کے درختوں کا جھنڈ تھا، وہ سیدھے وہاں تشریف لے گئے، غسل کیا اور فوراً نبیٔ کریم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کلمہ پڑھ لیا، پھر عرض کیا کہ: آج سے پہلے میرے نزدیک آپ کی ذات سے زیادہ مبغوض اور قابلِ دشمنی اور کوئی ذات نہیں تھی، اور اب آپ کی ذات سے زیادہ محبوب اور کوئی ذات نہیں ہے۔ اور آج سے پہلے آپ کے شہر سے زیادہ مبغوض کوئی شہر نہیں تھا، اور اب آپ کے شہر سے زیادہ محبوب کوئی شہر نہیں۔ یہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی نگاہوں کی تاثیر تھی کہ بڑے سے بڑا کافر بھی ایک مرتبہ آپ کے پاس آگیا تو اس کے دل کی کایا پلٹ جاتی تھی۔

پھر انہوں نے عرض کیا: میں اپنے علاقہ سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے نکلا تھا کہ آپ کے لوگوں نے مجھے راستہ میں پکڑ لیا، اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ حضور (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: آپ عمرہ کے ارادہ سے نکلے ہو تو عمرہ کر کے اپنے گھر واپس جاؤ، چناں چہ وہ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ ان کے مکہ مکرمہ پہنچنے سے پہلے ہی ان کے سارے واقعہ کی تفصیل مکہ مکرمہ پہنچ چکی تھی اور

مکہ والوں کو پتہ چل گیا تھا کہ یہ ایمان لا چکے ہیں، جب یہ مکہ مکرمہ پہنچے تو کسی نے ان کو طعنہ دیا کہ یہ اپنے دین سے پھر گیا ہے۔ انہوں نے کہا: نہیں! بلکہ میں حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لایا ہوں۔ اور چوں کہ مکہ مکرمہ والے گیہوں کی جو روٹیاں کھاتے تھے وہ گیہوں یمامہ سے ہی آتے تھے، تو انہوں نے کہا: اب یمامہ سے گیہوں کا ایک دانہ بھی یہاں نہیں بھیجوں گا یہاں تک کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اجازت دیں۔ چناں چہ وہ یمامہ گئے اور گیہوں بند کر دیئے۔ مکہ والے پریشان ہو گئے تو مجبور ہو کر ابو سفیان نے - جو اُس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے - مدینہ منورہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں خط لکھا کہ آپ تو لوگوں کو صلہ رحمی کا حکم دیتے ہیں، ثمامہ نے ہمارا غلّہ بند کر دیا ہے، آپ ان کو لکھ بھیجیں کہ وہ غلہ بھیجنا بدستور جاری کر دیں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت ثمامہ رضی اللہ عنہ کو خط لکھا کہ ان کا غلّہ بند نہ کیا جائے۔ (بخاری شریف، باب وفد بني حنيفة)

وہ کہاں اور تم کہاں!

اسی سے علماء نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جن کے ساتھ باقاعدہ جنگ جاری ہو، ان کی بھی بنیادی ضرورتیں - کھانا، پینا وغیرہ - بند نہیں کی جائیں گی۔ دیکھو! یہاں مکہ والوں کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ تھی، کوئی صلح بھی نہیں ہوئی تھی، گویا مکہ والے اہلِ حرب تھے، پھر بھی نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان کا غلہ بند کرنے سے حضرت ثمامہ بن اثال رضی اللہ عنہ کو منع فرمایا۔ لیکن آج کل کی سُدھری ہوئی اور ترقی یافتہ دنیا اور حقوقِ انسانی کے اتنے بلند بانگ دعوے کرنے والوں کا عمل دیکھو کہ جب وہ کسی سے رُوٹھتے

ہیں تو ساری بنیادی ضرورتوں پر روک لگادیتے ہیں یہاں تک کہ دوائیاں تک بند کردیتے ہیں؛ یہ کہاں کی ترقی اور حقوقِ انسانی کا کیسا دعویٰ ہے!

محبوب ترین اور مبغوض ترین جگہیں

حدیث ۱۸۴۱:-

وعنه عن النبيّ (ﷺ) قال: ((أَحَبُّ البِلادِ إلَى اللهِ مَسَاجِدُهَا، وَأَبْغَضُ البِلاَدِ إلَى اللهِ أَسْوَاقُهَا)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: زمین کے تمام حصوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ حصے مسجدیں ہیں، اور زمین کے حصوں میں اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ حصے بازار ہیں۔

افادات:- مساجد میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے، اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے، کتاب اللہ کی تلاوت کی جاتی ہے، بھلائی کی باتیں کی جاتی ہیں، تعلیم و تعلّم کا سلسلہ رہتا ہے، یہ سارا خیر ہی خیر ہے، اس لیے اس کو ’’اَحبُّ الْبِلَاد‘‘ کہا گیا۔ اور بازاروں میں دغابازی، دھوکہ دہی، جھوٹی قسمیں اور لوگوں کے ساتھ خیانت کا معاملہ ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو ’’أَبْغَضُ الْبِلَاد‘‘ کہا گیا۔

بازار شیطان کا دارالسلطنت ہے

حدیث ۱۸۴۲:-

وعن سلمان الفارسی -رضی اللہ عنہ- من قولہ قال: لَاتَکُونَنَّ إن اسْتَطَعْتَ أَوَّلَ مَنْ يَدْخُلُ السُّوقَ، وَلاَ آخِرَ مَنْ يَخْرُجُ مِنْهَا، فَإِنَّهَا مَعْرَكَةُ الشَّيْطَانِ، وَبِهَا يَنْصِبُ رَايَتَهُ. (رواہ مسلم ھکذا.)

ورواہ البرقانی فی صحیحہ: عن سلمان، قال: قال رسولُ اللہِ -(ﷺ)- :((لاَ تَكُنْ أَوَّلَ مَنْ يَدْخُلُ السُّوقَ، وَلاَ آخِرَ مَنْ يَخْرُجُ مِنْهَا. فِيهَا بَاضَ الشَّيْطَانُ وَفَرَّخَ))

ترجمہ:- حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا: اگر تم سے ہوسکے تو سب سے پہلے بازار میں جانے والے نہ بنو، اور مارکیٹ سے سب سے آخر میں آنے والے مت بنو (مطلب یہ ہے کہ جتنا کم وقت مارکیٹ میں لگاسکتے ہو؛ لگاؤ۔ سب سے پہلے جاؤگے اور سب سے آخر میں نکلوگے تو زیادہ وقت مارکیٹ میں لگے گا۔ پھر آگے اس کی وجہ بتلائی) اس لیے کہ وہ شیطان کا میدان ہے، اور وہیں شیطان اپنا جھنڈا گاڑتا ہے۔

اور بُرقانی نے حضرت سلمان فارسی (رضی اللہ عنہ) سے نقل کیا ہے کہ نبیِ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلے بازار میں جانے والے مت بنو، اور سب سے آخر میں وہاں سے واپس آنے والے مت بنو، اس لیے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں شیطان نے انڈے بھی دئے اور بچّے بھی جنے۔

افادات:- ”فَرَّخَ“یعنی جیسے مرغی انڈے سیتی ہے، اسی طرح شیطان کے انڈے بھی یہیں بنتے ہیں اور بچّے بھی یہیں بنتے ہیں۔ اس لیے اگر شیطان کے اثرات سے بچنا ہو تو ضروری ہے کہ آدمی بازار کے ساتھ کم سے کم تعلق رکھے۔

بازار گویا شیطان کا دارالسلطنت ہے، اگر کاروبار کرنے کے لیے وہاں جانا ہے تو کاروبار کرنے کی حد تک جاؤ، ویسے ہی وہاں بیٹھنے کی عادت مت ڈالو۔ بہت سے لوگوں کا مزاج ایسا بنا ہوا ہے کہ اگر بازار میں نہ جائیں تو گویا ان کا کھانا ہی ہضم نہیں ہوتا حالاں کہ ان کی وہاں نہ کوئی دوکان ہے، نہ کوئی کاروبار ہے، پھر بھی دوسروں کی دوکان پر جاکر ویسے ہی بیٹھتے ہیں، ان کو مسجد میں بیٹھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔

حضور اکرم (ﷺ) کی امت کے لیے دعائے مغفرت

حدیث ۱۸۴۳:-

وعن عاصمٍ الأحوَلِ، عن عبدِ اللهِ بن سَرْجِسَ -رضی الله عنه- قال: قلتُ لِرسولِ اللهِ -(ﷺ)-: يا رسولَ اللهِ، غَفَرَ اللهُ لَكَ، قال: ((وَلَكَ)) قال عاصمٌ: فَقُلْتُ لَهُ: أَسْتَغْفَرَ لَكَ رَسُولُ اللهِ -(ﷺ)-؟ قال: نَعَمْ وَلَكَ، ثُمَّ تَلاَ هٰذِهِ الآيَةَ: ﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ﴾ [محمد:۱۹] (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عاصم احولؒ (تابعی) حضرت عبد اللہ بن سرجس (رضی اللہ عنہ) سے نقل کرتے ہیں (حضرت عبد اللہ بن سرجس (رضی اللہ عنہ) ایک مرتبہ حضورِ اکرم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے، اس موقعہ

پر اور باتیں بھی ہوئی تھی، انہیں میں سے یہ ہے کہ) انہوں نے حضورِ اکرم (ﷺ) سے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے۔ اس پر حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری بھی مغفرت فرمائے۔ جب انہوں نے یہ روایت نقل کی تو عاصم فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا: اللہ کے رسول (ﷺ) نے آپ کے لیے دعائے مغفرت فرمائی؟ انہوں نے کہا: جی ہاں؛ اور تمہارے لیے بھی فرمائی۔ پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی: اے نبی! اپنے آپ کے لیے اور اہلِ ایمان مرد اور عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیجئے (جب اللہ تعالیٰ نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو مؤمنین اور مؤمنات کے لیے دعائے مغفرت کا حکم دیا ہے تو ظاہر ہے کہ آپ (ﷺ) نے اس پر عمل فرمایا ہے، لہٰذا اس میں تم بھی آگئے)

افادات:- **"اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت فرمائے"** یہاں علماء نے لکھا ہے کہ حضورِ اکرم (ﷺ) کے لیے مغفرت کی نسبت کی جائے تو اس کا مطلب یہ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضورِ اکرم (ﷺ) کے درجات بلند کئے جائیں، اور آپ (ﷺ) کی تعظیم و تکریم کی جو بھی شکلیں ہو سکتی ہیں وہ سب اس دعا کے نتیجے میں آپ (ﷺ) کو ملیں گی۔

بے شرم بن، پھر جو چاہے کر

حدیث ۱۸۴۴:-

وعن أبي مسعودٍ الأنصاري - رضي الله عنه - قال: قال النبيّ -(ﷺ)-: ((إنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)). (رواه البخاري)

ترجمہ:– حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اگلے انبیاء کی تعلیمات اور ان کے کلام میں سے ایک کلمہ اور جملہ یہ بھی ہے کہ ”جب تمہارے اندر حیا کا مادہ نہ ہو؛ تو پھر جو چاہے کرو۔“

افادات:– حیا اور شرم ایسی چیز ہے جو آدمی کو ایسے تمام کاموں سے بچاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ہوں۔ یہی وہ صفت ہے جو آدمی کو گناہوں سے روکتی ہے۔ اگر کسی آدمی نے حیا ہی کو ختم کر دیا تو پھر شرم و حیا کی وجہ سے جن برے کاموں سے اپنے آپ کو بچاتا تھا ان سے بچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ فارسی کی کہاوت ہے: ”بے حیا باش؛ وہرچہ خواہی کن“ بے شرم بن جا، پھر جو چاہے کر۔ اسی لیے حیا کو ایمان کی ایک بڑی شاخ کہا گیا۔ حدیثِ پاک میں ہے: ”اَلْحَیَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْاِیْمَانِ“ اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔

قیامت کا سب سے پہلا فیصلہ

حدیث ۱۸۴۵ :-

وعن ابن مسعودٍ - رضی اللہ عنہ - قال: قالَ رسُولُ اللہ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- : ((أَوَّلُ مَا يُقْضَى بَيْنَ النَّاسِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي الدِّمَاءِ)). (متفق علیہ)

ترجمہ:– حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز سب سے پہلے لوگوں کے درمیان خون کے سلسلہ میں فیصلہ کیا جائے گا

افادات:۔یعنی کسی نے کسی کو قتل کیا، کسی کی جان کو نقصان پہنچایا، تو وہاں سب سے پہلے اسی کے فیصلے ہوں گے۔ بعض روایتوں میں نماز کے متعلق آتا ہے۔ تو علماء نے دونوں میں تطبیق دیتے ہوئے یوں کہا کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق میں نماز کے متعلق پہلا فیصلہ ہوگا، اور بندوں کے حقوق کے سلسلہ میں جان سے متعلق پہلا فیصلہ ہوگا۔

کون کس چیز سے بنا؟

حدیث ۱۸۴۶:۔

وعن عائشة رضی اللہ عنہا قالت: قال رسول اللہ۔(ﷺ)۔:((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُورٍ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ مَارِجٍ مِنْ نَارٍ، وَخُلِقَ آدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: فرشتے نور سے پیدا کئے گئے، اور جانّ کو آگ کی لپک (یعنی آگ میں سے جو شعلہ نکلتا ہے جس میں دُھویں کا بھی اثر ہوتا ہے، اس) سے پیدا کیا گیا، اور حضرت آدم (علیہ السلام) مٹی سے پیدا کئے گئے۔

افادات:۔جانّ سے مراد کیا ہے؟ تو بعض نے کہا کہ ابلیس مراد ہے۔ بعضوں نے کہا کہ اس سے مراد جنات کی جنس ہے، جیسے انسان ایک جنس ہے اسی طرح جنات بھی ایک جنس ہے۔ بعض حضرات نے جنوں کا جدِ اعلیٰ کو "جانّ" قرار دیا، جیسے انسانوں کے جدِّ اعلیٰ حضرت آدم (علیہ السلام) ہیں، اسی طرح جنات کے جدِ اعلیٰ کا نام "جانّ" ہے۔

قرآنِ کریم کا عملی نمونہ

حدیث ۱۸۴۷:-

وعنہا رضی اللہ عنہا قالت: کان خُلُقُ نَبِیِّ اللہِ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- القُرْآن (رواہُ مسلم فی جملۃ حدیث طویل)

ترجمہ:- (ایک مرتبہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق کے متعلق پوچھا گیا، تو) حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق قرآن ہی ہیں۔

افادات:- یعنی جو کچھ قرآنِ پاک میں علمی طور پر ہے وہی سب کچھ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ بابرکات میں عملی طور پر موجود تھا۔ گویا کسی کو قرآنِ کریم کا عملی نمونہ دیکھنا ہو تو وہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ بابرکات کو دیکھ لے۔

مؤمن اور کافر کی موت کا منظر

حدیث ۱۸۴۸:-

وعنہا قالت: قال رسُولُ اللہِ (صلی اللہ علیہ وسلم): ((مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللہِ أَحَبَّ اللہُ لِقَاءَہُ، وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ اللہِ کَرِہَ اللہُ لِقَاءَہُ)) فقلتُ: یا رسولَ اللہِ! أَکَراھِیَۃُ المَوتِ، فَکُلُّنَا نَکْرَہُ المَوتَ؟ قال: ((لَیْسَ کَذٰلِكَ، ولٰکِنَّ المُؤْمِنَ إِذَا بُشِّرَ بِرَحْمَۃِ اللہِ وَرِضْوَانِہِ وَجَنَّتِہِ أَحَبَّ لِقَاءَ اللہِ فَأَحَبَّ اللہُ لِقَاءَہُ، وإِنَّ الکَافِرَ إِذَا بُشِّرَ بِعَذَابِ اللہِ وَسَخَطِہِ کَرِہَ لِقَاءَ اللہِ و کَرِہَ اللہُ لِقَاءَہُ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ سے ملنے کو پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند فرماتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند فرماتے ہیں (مطلب یہ ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ سے تعلق اور محبت ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچیں اور اللہ تعالیٰ کا اعمالِ صالحہ پر اجر کا جو وعدہ ہے وہ ہم اللہ تعالیٰ سے حاصل کریں) میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہاں اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے مراد موت ہے؟ اور موت کو تو ہم میں سے ہر آدمی ناپسند کرتا ہے؟ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایسی بات نہیں ہے (بلکہ اس کو یوں سمجھو کہ جب تک موت کا مقررہ وقت نہیں آیا ہے وہاں تک تو آدمی کے دل میں ایسا خیال، جذبہ اور اُمنگ و تمنّا ہوتی ہے کہ اور موقع مل جائے) لیکن مؤمن کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب (اس کی موت کا مقررہ وقت آجاتا ہے، اور جس گھڑی اس کی روح نکالی جانے والی ہوتی ہے، اس سے کچھ پہلے) اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اس کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی، اس کی رحمتیں اور جنّت کے درجات (جو اس کو حاصل ہونے والے ہیں اس) کی بشارت سنائی جاتی ہے (وہاں کے مناظر دکھلائے جاتے ہیں، تو عین اس گھڑی میں جب کہ اس کی روح قبض کی جانے والی ہوتی ہے اس کے دل کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ) وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے (اس کا جی چاہتا ہے کہ بس میں دنیا سے جلدی سے نکل جاؤں) اور اس وقت اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں۔ اور کافر کا حال یہ ہوتا ہے کہ جب (اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو عین اس گھڑی میں جب اس کی روح قبض کی جانے والی ہوتی ہے، اس سے کچھ پہلے) اس کو جہنم میں جو عذاب ہونے والا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کے نتیجہ میں اس کے ساتھ جو معاملہ کیا جانے والا

ہے، وہ ساری چیزیں اس کو دکھلائی جاتی ہیں، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ بھی اس کی ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں۔

افادات:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے سوال کا حاصل یہ تھا کہ موت کو تو ہر انسان طبعی طور پر ناپسند اور ناگوار سمجھتا ہے، کون ہے جو موت کو چاہتا ہو؟ ہر آدمی چاہتا ہے کہ جتنی ٹل سکتی ہے؛ ٹل جائے، لیکن حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جواب میں ارشاد فرمایا: اس سے اگر موت مراد لی جائے تب بھی عین وہ گھڑی جو آدمی کے لیے اللہ کی طرف سے موت کی مقرر ہے، اس سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بشارتیں دی جاتی ہیں، اس کی وجہ سے مؤمن کے دل کی کیفیت بدل جاتی ہے۔

شیطان انسان کے جسم میں خون کی طرح گردش کرتا ہے

حدیث ۱۸۴۹:-

وَعَنْ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ صَفِيَّةَ بِنتِ حُيَيٍّ رَضِیَ اللهُ عَنها قالتْ: كان النبيُّ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- مُعْتَكِفاً، فَأَتَيْتُهُ أَزُورُهُ لَيلاً، فَحَدَّثْتُهُ ثُمَّ قُمتُ لأَنْقَلِبَ فقامَ مَعِي لِيَقْلِبَنِي، فَمَرَّ رَجُلاَنِ مِنَ الأنْصَارِ رضیَ اللهُ عَنهُما، فَلَمَّا رَأَيَا النَّبِيَّ -(صلی اللہ علیہ وسلم)- أَسْرَعَا، فقال -(صلی اللہ علیہ وسلم)-: ((عَلَى رِسْلِكُمَا، إنَّهَا صَفِيَّةُ بِنْتُ حُيَيٍّ)) فَقَالاَ: سُبحانَ اللهِ يَا رسولَ اللهِ، فقالَ: ((إنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ ابْنِ آدَمَ مَجْرَى الدَّمِ، وَإنِّي خَشِيتُ أَنْ يَقْذِفَ فِي قُلُوبِكُمَا شَرّاً - أَوْ قَالَ: شَيْئاً -)). (متفق علیه)

ترجمہ مع تشریح:- اُمُّ المؤمنین حضرت صفیہ بنت حیّ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اعتکاف میں تھے، ایک مرتبہ رات کو میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت اور ملاقات کے لیے حاضر ہوئی (دوسری روایتوں سے معلوم

ہوتا ہے کہ وہاں اور ازواجِ مطہرات بھی تھیں، وہ سب ہی حضورِ اکرم (ﷺ) کی ملاقات کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعتکاف کی حالت میں معتکف کی ملاقات کے لیے جہاں اور لوگ آتے ہیں، وہیں اگر اس کے گھر والے بھی آنا چاہیں تو آسکتے ہیں، اور ان کے ساتھ مباح اور جائز قسم کی گفتگو بھی کی جاسکتی ہے۔ بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ دوسری ازواجِ مطہرات کے بعد حضرت صفیّہ (رضی اللہ عنہا) پہنچی تھیں، جب تمام ازواجِ مطہرات واپس جانے لگیں تو چوں کہ دوسروں کے حجرے قریب تھے اور حضرت صفیہ (رضی اللہ عنہا) کا حجرہ دُور تھا، اور حضور (ﷺ) کسی کام میں مشغول تھے، اس لیے حضورِ اکرم (ﷺ) نے اِن سے کہا: تم ٹھہر جاؤ، مَیں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں، تو یہ ٹھہر گئیں، جب آپ (ﷺ) اس کام سے فارغ ہوئے) تو مجھے چھوڑنے کے لیے آپ (ﷺ) (مسجد کی حد تک) تشریف لائے (اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر معتکف کی ملاقات کے لیے کوئی آدمی آیا ہو، اور اس کے اکرام کے طور پر اس کو چھوڑنے کے لیے مسجد کی حدود تک وہ آئے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے) اس وقت دو انصاری صحابی وہاں سے گزرے، جب انہوں نے حضورِ اکرم (ﷺ) کو دیکھا (اور یہ بھی دیکھا کہ آپ کے ساتھ کوئی خاتون ہے) تو وہ دونوں صحابی جلدی سے لوٹنے لگے، حضورِ اکرم (ﷺ) نے فرمایا: ٹھہر جاؤ؛ یہ صفیہ بنت حیّ ہے (ان دونوں حضرات کی طبیعت پر ایسا اثر ہوا کہ کیا حضورِ اکرم (ﷺ) کے قلبِ مبارک میں یہ خیال آیا کہ ہمیں آپ پر کوئی بدگمانی ہوئی ہوگی، اس لیے) انہوں نے کہا: سبحان اللہ؛ اے اللہ کے رسول! (یعنی ہم اپنے دل میں کوئی ایسا خیال لا بھی نہیں سکتے، آپ کو یہ وضاحت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟) تو حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: شیطان انسان کے اندر ایسا گردش کرتا ہے جیسے خون

انسان کے جسم میں اپنے اثرات ڈالتا ہے، مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ تمہارے دل میں کوئی وسوسہ نہ آجائے (اور اگر کسی مؤمن کے دل میں حضورِ اکرم (ﷺ) کے متعلق کوئی بدگمانی پیدا ہوگئی تو وہ تو ایمان سے محروم ہوجائے گا۔ اس لیے آپ نے ان کی حفاظت اور خیر خواہی کے لیے یہ وضاحت فرمادی تاکہ شیطان کو وسوسہ ڈالنے کا موقعہ ہی نہ ملے۔)

افادات:- اسی سے دلیل پکڑتے ہوئے علماء نے لکھا ہے کہ مقتدا اور پیشوا لوگوں کو اپنا طرزِ عمل اس انداز سے رکھنا چاہیے کہ کسی کو ان پر بدگمانی کا موقعہ نہ ملے۔ اگرچہ کسی کے ساتھ بلا کسی سبب کے بدگمانی کرنا گناہ ہے، لیکن لوگوں کو بدگمانی میں ڈالنے کے اسباب پیدا کرنا بھی منع ہے۔ اگر ہمارا کوئی کام ایسا ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ کسی کو شاید کوئی خیال آجائے گا تو اس کی وضاحت کردینا مناسب ہے، خاص کرکے جو مقتدا اور اہلِ علم ہیں ان کے لیے تو بہت ہی زیادہ ضروری ہے، تاکہ ان کے فیض سے لوگ محروم نہ ہوجائیں۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہوگی، اور پھر اس کے ذریعہ ان کو فائدہ نہیں ہوگا۔

غزوۂ حنین

حدیث ۱۸۵۰:-

وعن أبي الفضل العباس بن عبد المطلب - رضی الله عنه - قال: شَهِدْتُ مَعَ رَسُولِ اللهِ - (ﷺ) - يَوْمَ حُنَيْنٍ، فَلَزِمْتُ أنا وأبو سُفْيَانَ بن الحارِثِ بن عبد المطلب رَسُولَ الله - (ﷺ) -، فَلَمْ نُفَارِقْهُ، وَرَسُولُ اللهِ

(ﷺ) - عَلَى بَغْلَةٍ لَهُ بَيْضَاءَ، فَلَمَّا الْتَقَى الْمُسْلِمُونَ وَالْمُشْرِكُونَ، وَلَّى الْمُسْلِمُونَ مُدْبِرِينَ، فَطَفِقَ رَسُولُ اللهِ - (ﷺ) - يَرْكُضُ بَغْلَتَهُ قِبَلَ الْكُفَّارِ، وأنا آخِذٌ بِلِجَامِ بَغْلَةِ رَسُولِ اللهِ - (ﷺ) - أَكُفُّهَا إِرَادَةَ أَنْ لاَ تُسْرِعَ، وأبو سُفْيَانَ آخِذٌ بِرِكَابِ رَسُولِ اللهِ - (ﷺ) -. فقالَ رَسُولُ الله - (ﷺ) -: ((أيْ عَبَّاسُ، نَادِ أَصْحَابَ السَّمُرَةِ)). قالَ العَبَّاسُ - وَكَانَ رَجُلاً صَيِّتاً - فَقُلْتُ بِأَعْلَى صَوْتِي: أَيْنَ أَصْحَابُ السَّمُرَةِ، فَوَاللهِ لَكَأَنَّ عَطْفَتَهُمْ حِينَ سَمِعُوا صَوْتِي عَطْفَةُ البَقَرِ عَلَى أَوْلادِهَا، فقالوا: يَا لَبَّيْكَ يَا لَبَّيْكَ، فَاقْتَتَلُوا هُمْ وَالْكُفَّارُ، وَالدَّعْوَةُ فِي الأَنْصَارِ يَقُولُونَ: يَا مَعْشَرَ الأَنْصَارِ، يَا مَعْشَرَ الأَنْصَارِ، ثُمَّ قَصُرَتِ الدَّعْوَةُ عَلَى بَنِي الحَارِثِ بْنِ الخَزْرَجِ، فَنَظَرَ رَسُولُ اللهِ - (ﷺ) - وَهُوَ عَلَى بَغْلَتِهِ كَالْمُتَطَاوِلِ عَلَيْهَا إِلَى قِتَالِهِمْ، فَقَالَ: ((هَذَا حِينَ حَمِيَ الوَطِيسُ))، ثُمَّ أَخَذَ رَسُولُ اللهِ - (ﷺ) - حَصَيَاتٍ فَرَمَى بِهِنَّ وُجُوهَ الكُفَّارِ، ثُمَّ قَالَ: ((انْهَزَمُوا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ))، فَذَهَبْتُ أَنْظُرُ فَإِذَا القِتَالُ عَلَى هَيْئَتِهِ فِيمَا أرَى، فَوَاللهِ مَا هُوَ إِلاَّ أَنْ رَمَاهُمْ بِحَصَيَاتِهِ، فَمَا زِلْتُ أَرَى حَدَّهُمْ كَلِيلاً وَأَمْرَهُمْ مُدْبِراً. (رواه مسلم)

((الوَطِيسُ)) التَّنُّورُ، ومعناهُ: اشْتَدَّتِ الحَرْبُ. وقوله: ((حَدَّهُمْ)) هو بالحاء المهملة: أيْ بَأْسَهُمْ.

ترجمہ مع تشریح:- ابوالفضل حضرت عباس بن عبدالمطلب (رضی اللہ عنہ) - جو حضورِ اکرم (ﷺ) کے چچا ہیں - فرماتے ہیں کہ میں حضورِ اکرم (ﷺ) کے ساتھ غزوۂ حنین میں شریک ہوا تو میں نے اور حضرت ابوسفیان بن حارث (رضی اللہ عنہ) نے نبیٔ کریم (ﷺ) کو لازم پکڑ لیا (یعنی ہم حضور (ﷺ) کے ساتھ ہی رہے۔ روایت میں آتا ہے کہ حضور (ﷺ) کے خچّر کی لگام حضرت عباسؓ نے اور رِکاب حضرت ابوسفیان بن حارثؓ نے پکڑی ہوئی تھی) اور حضور (ﷺ) اپنے سفید خچّر کے اوپر سوار تھے، جب مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان مدبھیڑ ہوئی تو (اچانک حملہ کی وجہ سے) مسلمان پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) اس حالت میں بھی اپنے خچّر کو ایڑ لگا کر کفار کی طرف آگے بڑھ رہے تھے۔ مَیں حضورِ اکرم (ﷺ) کے خچّر کی لگام پکڑے ہوئے

تھا اور مَیں اس خچّر کو روکنا چاہتا تھا کہ تیزی سے آگے نہ بڑھے، اور حضور (ﷺ) اس کو ایڑ لگا کر تیزی سے آگے بڑھانا چاہتے تھے (یہ حضور (ﷺ) کی شجاعت و بہادری کی بات ہے۔ اسی لیے ایک صحابی نقل کرتے ہیں کہ جو صحابی میدانِ جنگ میں حضور (ﷺ) سے زیادہ قریب ہوتا تھا وہ سب سے زیادہ شجاع اور بہادر سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ میدانِ جنگ میں جو جگہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتی تھی حضور (ﷺ) وہاں موجود ہوتے تھے) اور حضرت ابوسفیان بن حارث (رضی اللہ عنہ) حضور (ﷺ) کی رِکاب تھامے ہوئے تھے جب مسلمانوں نے بھاگنا شروع کیا تو حضور (ﷺ) نے فرمایا: اے عباس! کیکر والوں کو آواز دو ("اصحاب السمرۃ" یعنی کیکر والے۔ حدیبیہ کے موقعہ پر کیکر کے درخت کے نیچے جن لوگوں نے نبی کریم (ﷺ) کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی، جن کو "اصحابِ بیعت الرضوان" بھی کہا جاتا ہے، جس بیعت پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں آیت (۱) نازل فرمائی جس میں ان کو اپنی خوشنودی کا پروانہ عطا کیا۔ حضرت عباسؓ بلند آواز والے آدمی تھے، ان کی آواز اتنی بلند تھی کہ جبلِ سلع پر کھڑے ہو کر رات کے آخری حصہ میں جب وہ اپنے غلاموں کو جو غابہ میں بکریاں چَرا رہے ہوتے تھے آواز دیتے تھے تو ان کی آواز وہاں تک پہنچتی تھی، حالاں کہ جبلِ سلع اور غابہ کے درمیان بارہ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ اور ان کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب کبھی وہ اپنی بکریاں چَرانے جاتے تھے اور بھیڑیا آتا تھا تو اتنی زور سے آواز لگاتے تھے کہ بھیڑیے کا پتہ پھٹ جاتا تھا) حضرت عباس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے بلند آواز سے کہا: حضور کے ہاتھ پر کیکر کے نیچے بیعت کرنے والے کہاں ہیں؟

(۱) لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾

جب میری آواز ان صحابہ نے سنی تو ایسے پلٹے، جیسے گائے اپنے بچے کی طرف پلٹتی ہے (گائے جب اپنے بچے کی طرف پلٹتی ہے تو کسی کا خیال نہیں کرتی، سب کو روند ڈالتی ہے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ صحابہ نے جب یہ آواز سنی تو ان کی ایسی حالت ہوگئی کہ اتنی جلدی سے پلٹنا چاہا کہ جو اونٹوں پر سوار تھے اور ان کے اونٹ جلدی سے پلٹ نہیں سکے تو انہوں نے اپنی زرہیں نکال کر اونٹوں کی گردنوں میں ڈالیں اور اپنی تلوار اور ڈھال لے کر پیدل ہی حضور (ﷺ) کی طرف دوڑ پڑے) اور ''ہم حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں'' کہتے ہوئے لپکے اور کفار کے ساتھ مقابلہ شروع کیا۔ اور انصار کو بلانے کے لیے یہ ندادی گئی تھی: اے انصار کی جماعت، اے انصار کی جماعت۔ چناں چہ وہ بھی آئے۔ اور انصار کے قبیلۂ خزرج کا ایک خاندان بنو حارث ہے، ان کا نام لے کر بھی پکارا تو وہ بھی دوڑ کر پہنچے (حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب مسلمان پلٹے اور کافروں پر جھپٹے) اس وقت حضور (ﷺ) اپنے خچّر پر سوار تھے، اور آپ اپنا سرِ مبارک اونچا کر کے صحابہ کے اس مقابلہ کو دیکھ رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ اب میدان گرم ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ (ﷺ) نے کچھ کنکر لیے (روایتوں میں آتا ہے کہ جب آپ جھکے تو آپ کا خچّر بھی جھکا اور آپ نے مٹھی بھری) اور وہ کافروں کی طرف پھینکے، اور فرمایا: محمد (ﷺ) کے رب کی قسم! یہ لوگ شکست کھا گئے (حضرت عباسؓ فرماتے ہیں کہ) میں دیکھ رہا تھا کہ جنگ اسی طرح برابر جاری تھی، اللہ کی قسم! جیسے ہی حضورِ اکرم (ﷺ) نے یہ کنکریاں ڈالیں تو دشمنوں کی دھار کُند (بُھتّھی) ہوگئی، وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگے اور مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی عطا فرمائی۔

افادات:- ''حنین'' مکہ مکرمہ سے طائف جاتے ہوئے عرفات کے بعد راستہ میں ایک جگہ آتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں ذوالمجاز نامی ایک بازار لگا کرتا تھا، اسی کے دامن میں یہ وادی واقع ہے۔

"غزوۂ حنین" دورِ نبوت میں جو غزوات اور جنگیں پیش آئیں ان میں سے ایک غزوہ ہے۔ ۸ھ میں نبی کریم (ﷺ) نے مکہ مکرمہ کو فتح کیا اور چوں کہ مکہ مکرمہ کے آس پاس کے علاقہ میں ایک بڑا قبیلہ ہَوازِن آباد تھا جس کی مختلف شاخیں تھیں، بنو سعد بھی اسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں جو نبی کریم (ﷺ) کی رضاعی ماں کا قبیلہ ہے۔ اور قبیلۂ ثقیف طائف میں آباد تھا۔ قریش کا تو اپنا سب سے اونچا مقام تھا ہی، لیکن یہ دونوں قبائل (ہَوازن اور ثقیف) بھی زمانۂ جاہلیت میں امتیازی شان اور اہمیت کے حامل تھے، اور دونوں جنگجو اور لڑاکو قبائل سمجھے جاتے تھے۔ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا اور قریش نبیٔ کریم (ﷺ) کے تابع ہوگئے تو ان دونوں قبیلے کے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ مکہ مکرمہ تو فتح ہوگیا، اب یقیناً ہماری باری ہے، اور اب یہ مسلمان ہم پر حملہ آور ہوں گے۔ اس لیے ان لوگوں نے یہ مشورہ کیا کہ وہ ہم پر لشکر لے کر آویں اس سے پہلے ہم ہی کیوں نہ تیاری کرلیں اور ان پر حملہ کردیں۔ چناں چہ ہوازن کی جتنی بھی شاخیں تھی ان کے تمام سردار آپس میں ملے اور مشورہ کرکے یہ طے کیا کہ ہمیں مسلمانوں پر چڑھائی کرنی ہے۔ دو تین قبیلے بنو کعب، بنو کلاب وغیرہ ایسے بھی تھے جنہوں نے اس میں حصّہ لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ: محمد (ﷺ) کے مقابلہ میں ساری دنیا آئے گی تب بھی وہ کامیاب نہیں ہوسکتی، اس لیے ہم اس میں حصّہ لینا نہیں چاہتے۔ لیکن اکثر قبائل نے اس میں حصّہ لیا۔ ان کا لشکر تیار ہوا اور مالک بن عوف نضری جو قبیلۂ نضر کا سردار تھا، وہ بڑا سپہ سالار اور رئیسِ اعلیٰ قرار پایا۔ اس نے سب کو اس بات کا پابند کیا کہ اپنے بیوی بچوں اور اپنے جانوروں کو اپنے ساتھ لیں۔ اس نے اس خیال سے یہ تدبیر اختیار کی تھی کہ جب بیوی بچّے بھی میدانِ جنگ میں ساتھ ہوں گے تو

آدمی خوب جم کر لڑے گا، اور میدان سے بھاگے گا نہیں۔ اس کو یہ ڈر لگے گا کہ اگر میں بھاگ جاؤں گا تو میرے بیوی بچّے ہلاک ہو جائیں گے۔

جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ پتہ چلا کہ وہ لوگ لشکر جمع کر رہے ہیں، اور حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں تو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن ابی حدرد رضی اللہ عنہ کو تحقیق و تفتیش کے لیے بھیجا کہ تم جاؤ اور ان کے درمیان ایک دو دن رہو، اور پتہ چلاؤ کہ ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ چناں چہ وہ گئے اور ایک دو دن ان کے درمیان رہے اور سارے حالات سے باخبر ہو کر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اطلاع دی کہ بات بالکل صحیح ہے، وہ لوگ حملے کا ارادہ رکھتے ہیں اور تیاریاں کر چکے ہیں۔ تو حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مناسب سمجھا کہ وہ ہم پر حملہ آور ہوں اس سے پہلے ہم ہی ان کا جواب دیں۔ چناں چہ ماہِ شوال کی آٹھ تاریخ کو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ مکرمہ سے حنین کے لیے روانہ ہوئے جس وقت مدینہ منورہ سے چلے تھے تو دس ہزار صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کا لشکر ساتھ تھا اور مکہ مکرمہ کے جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ان میں سے بھی بعض حضرات ساتھ تھے، اور جو لوگ ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے ایسے بھی بعض لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے ساتھ ہو گئے تھے، اور ایسے لوگوں کی تعداد دو ہزار کے قریب تھی، اس طرح ایک قول کے مطابق کل بارہ ہزار کی تعداد تھی۔

جب حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) روانہ ہونے لگے تو راستہ میں ایک آدمی کی زبان سے یہ جملہ نکلا: ”لَنْ نُّغْلَبَ الْيَوْمَ عَنْ قِلَّةٍ“ آج تعداد کی کمی کی وجہ سے ہم شکست نہیں کھائیں گے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گوشِ مبارک میں جب یہ جملہ پہنچا تو آپ کو بڑا ناگوار گذرا۔ چوں کہ اس جملہ کا مطلب یہ تھا کہ

کثرت ہی لوگوں کے لیے کامیابی اور فتح کا سبب بنتی ہے، گویا اس قائل کی نظر اسباب کی طرف ہوئی، اور ایمان والوں کی نظر تو اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔ آگے جا کر یہی جملہ خطرناک ثابت ہوا۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) منگل کے دن شام کو وادئ حنین میں پہنچے تھے، اور بدھ کی صبح کو جب مقابلہ کے لیے آگے بڑھے تو شروع شروع میں ان لوگوں نے پسپائی اختیار کی جس سے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم یوں سمجھے کہ یہ لوگ شکست کھا رہے ہیں، اور ان کی پسپائی کو دیکھ کر کچھ لوگ مالِ غنیمت کو حاصل کرنے میں پڑ گئے، دراصل انہوں نے پہلے سے ہی ایسی تدبیر اختیار کر رکھی تھی کہ پہاڑوں میں اپنے تیر اندازوں اور تلوار بازوں کو چھپا رکھا تھا۔ جب مسلمان یہ سمجھ کر آگے بڑھے کہ ہم کامیاب ہو گئے ہیں تو اچانک ان لوگوں نے حملہ کر دیا جس کی وجہ سے بہت سوں کے پاؤں اُکھڑ گئے، لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے خچّر پر سوار اپنی جگہ پر مضبوطی سے جمے رہے۔ آپ کے ساتھ حضراتِ صحابہ میں سے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عباسؓ اور ان کے صاحبزادے حضرت فضل بن عباسؓ، حضرت ابو سفیان بن حارثؓ ان کے صاحبزادے حضرت جعفر بن ابی سفیانؓ اور حضرت اسامہ بن زید (رضی اللہ عنہم) موجود تھے۔ کچھ لوگ تو میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے اور کچھ لوگ وہ بھی تھے جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دور تھے۔ اسی موقع کا یہ واقعہ ہے۔

ابو سفیان بن حارث اور عبد اللہ بن ابی اُمیہ کے اسلام کا قصہ

حضرت ابو سفیان بن حارث (رضی اللہ عنہ) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چچازاد بھائی ہوتے ہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سب سے بڑے چچا حارث بن عبد المطلب کے بیٹے ہیں۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رضاعی بھائی بھی ہوتے ہیں، حضرت حلیمہ سعدیہؓ نے جس طرح حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دودھ پلایا تھا اس طرح ان کو بھی دودھ پلایا تھا۔ بڑے شاعر تھے اور ان کا چہرہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بہت زیادہ مشابہ تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں بچپن اور جوانی میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بڑے اچھے دوست تھے، جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ نے لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو یہ آپ کے پکے دشمن بن گئے، اپنے اشعار میں نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی برائی کرتے تھے۔ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں پر بھی مکہ مکرمہ سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہجو میں ان کے اشعار پہنچتے تھے، جن کا جواب حضرت حسّان بن ثابتؓ دیا کرتے تھے۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری تھا، جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ مکرمہ فتح کرنے کے لیے مدینہ منورہ سے لشکر کے ساتھ روانہ ہوئے، اس موقعہ پر یہ اسلام لانے کے لیے مکہ مکرمہ سے اپنے بیٹے جعفر کو اپنے ساتھ لے کر چلے۔ اس موقعہ پر ایک اور صاحب عبد اللہ بن ابی اُمیہ بھی ساتھ چلے۔

یہ عبد اللہ بن ابی اُمیہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پھوپھی زاد بھائی ہوتے ہیں، حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پھوپھی حضرت عاتکہ بنت عبد المطلب کے صاحبزادے ہیں، انہوں نے بھی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بڑی تکلیفیں پہنچائی تھیں، بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ اگر آسمان تک سیڑھی لگائی جائے اور میں اپنی آنکھوں

سے دیکھوں کہ یہ آسمان پر چڑھے، آسمان میں داخل ہوئے اور اپنے ساتھ کچھ اوراق لے کر آئیں اوران کے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں اوروہ مجھ سے یوں کہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بھیجا ہے؛ پھر بھی میں ان پر ایمان نہیں لاؤں گا۔

جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ مکرمہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہوئے توراستہ میں مقامِ ابواء میں یہ دونوں (پھوپھی زاد بھائی اور چچازاد بھائی) آئے اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے منع فرمادیا کہ میرے پاس مت آنا، میں تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ام المؤمنین حضرت ام سلمہ (رضی اللہ عنہا) جو اس وقت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ تھیں ، انہوں نے سفارش کی کہ اے اللہ کے رسول! آپ تو بڑے بڑے دشمنوں کو معاف کردیا کرتے ہیں اور یہ دونوں تو آپ کے چچازاداور پھوپھی زاد بھائی ہیں، وہ آپ کے الطاف وعنایات سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں!

جب حضرت ابوسفیان بن حارث کو پتہ چلا کہ حضور نے مجھے حاضری کی اجازت نہیں دی ہے تو کہنے لگے کہ: اگر حضور مجھے حاضری کی اجازت نہیں دیں گے تو میں جنگل میں چلاجاؤں گا اور بھوک سے مرجاؤں گا اور میرا بیٹا بھی مرجائے گا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ ایک کام کرو کہ تم حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے جاؤ، اور حضرت یوسف (علیہ السلام) کے بھائیوں نے ان سے جو کہا تھا تم بھی وہی کہو: ”تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِـِٕيْنَ“ اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہم پر فضیلت دی ہے، اور ہم ہی قصوروار تھے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طبیعتِ مبارکہ میں حیا بہت زیادہ ہے، جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے جاکر یہ کہوگے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) انکار نہیں فرمائیں گے۔ چناں چہ انہوں حضور کے سامنے جاکر یہی

آیت پڑھی تو حضور (ﷺ) نے جواب میں وہی ارشاد فرمایا: ''لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ؕ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۡوَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ﴿۹۲﴾ '' تم پر آج کوئی گرفت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو معاف کرے، اور وہ سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ چناں چہ وہ ایمان لے آئے اور ایسا پختہ ایمان لائے کہ پھر فتح مکہ کے بعد یہ جنگ حنین ہوئی ہے جس میں وہ حضور (ﷺ) کے ساتھ ایسے جمے رہے کہ ذرا بھی نہیں ہٹے۔ روایتوں میں آتا ہے کہ مارے حیا کے پوری زندگی کبھی حضورِ اکرم (ﷺ) کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ اور حضور اکرم (ﷺ) نے ان کو جنت کی بشارت بھی سنائی تھی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

متفرق احادیث پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ آج ایک بہت اہم روایت پیش کی ہے۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد بہت بنیادی ہدایات پر مشتمل ہے۔ انسانی زندگی میں جو چیزیں مؤثر ہیں اور جو عوامل کار فرما ہیں ان میں روزی کا مسئلہ بھی ہے، رزقِ حلال بہت بنیادی حیثیت رکھتا ہے، انسان کی ساری زندگی کی درستگی کا مدار اس پر ہے اور اس کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ" اسلام کے بنیادی فرائض - نماز، روزہ وغیرہ - کے بعد حلال روزی کو حاصل کرنا ایک فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔ آج جو روایت پیش کی ہے اس میں اسی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

رزقِ حلال کی اہمیت

حدیث ۱۸۵۱:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله (صلى الله عليه وسلم): ((أَيُّهَا النَّاسُ! إِنَّ اللهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا طَيِّباً، وإِنَّ اللهَ أَمَرَ الْمُؤْمِنِينَ بِمَا أَمَرَ بِهِ الْمُرْسَلِينَ. فقالَ تعالى: يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحاً (المؤمنون:٥١) وقال تعالى: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ (البقرة:١٧٢). ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيلُ السَّفَرَ أَشْعَثَ أَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ إِلَى السَّمَاءِ: يَارَبِّ يَا رَبِّ، وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ، وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ، وملبسُهُ حرامٌ، وَغُذِّيَ بِالْحَرَامِ، فَأَنَّى يُسْتَجَابُ لِذَلِكَ؟ (رواه مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے اور وہ پاک چیز کو ہی قبول کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو بھی اسی چیز کا حکم دیا جس کا رسولوں اور نبیوں کو حکم دیا (ایمان والوں کو کیا حکم دیا؟ اور نبیوں کو کیا حکم دیا؟ تو آگے حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں آیتیں پیش فرماتے ہیں، پہلی آیت میں رسولوں کو حکم دیا گیا ہے) اے رسولو! حلال پاکیزہ مال (روزی) کھاؤ، اور نیک عمل کرو۔ اور باری تعالیٰ نے فرمایا: اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی روزی میں سے حلال کھاؤ (حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ) حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ ارشاد فرمانے کے بعد ایک آدمی کا تذکرہ کیا جو ایک لمبے سفر پر روانہ ہوتا ہے (اور جن لوگوں کی دعائیں اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہیں ان میں ایک مسافر بھی ہے۔ اب وہ سفر چاہے حج کا ہو یا عمرہ کا ہو، طلبِ علم کا ہو یا تبلیغ کا ہو؛ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی نیک کام کے لیے سفر کیا جائے، اور کوئی آدمی مباح کام کے لیے سفر میں نکلے تو کیسی ہی سہولتیں کیوں نہ ہوں، پھر بھی کچھ نہ کچھ تو آدمی کے مزاج کے خلاف ہو ہی جاتا ہے جس کی وجہ سے طبیعت پر اثر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے آدمی کی طبیعت پر ایک طرح کی شکستگی طاری ہوتی ہے، اسی شکستگی کی وجہ سے مسافر کی دعا اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوتی ہے۔ تو سفر کی وجہ سے ویسے بھی وہ اس قابل تھا کہ اس کی دعا قبول کی جاتی) اور ساتھ ہی اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، کپڑے غبار آلود ہیں، ایسی حالت میں دعا کے واسطے آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھاتا ہے اور پکارتا ہے: اے میرے پروردگار، اے میرے پروردگار (یعنی دعا کرتا ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس کی اس حالت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ اس کی دعا ضرور قبول ہوتی، لیکن اس کا حال تو یہ ہے کہ) اس کا کھانا حرام، اس کا پینا حرام، اس کا لباس حرام، اور حرام غذا کے

ذریعہ اس کی پرورش ہوئی ہے؛تو بھلااس کی دعا کیسے قبول ہوگی؟(معلوم ہوا کہ حرام غذا کے اثرات یہ ہیں کہ اس کی وجہ سے دعا بھی قبول نہیں ہوتی)۔

افادات:- جو بھی چیز اس کی بارگاہ میں پیش کی جائے اگر اس میں کوئی غلط طریقہ اختیار نہ کیا گیا ہو؛اسی کو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبولیت کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ ناپاک اور حرام چیز کو اللہ تعالیٰ قبول نہیں کیا کرتے۔ ترمذی شریف کی پہلی روایت ہے، نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد ہے: ”لَا تُقْبَلُ صَلَاۃٌ بِغَیْرِ طُھُوْرٍ،وَلَا صَدَقَۃٌ مِنْ غُلُوْلٍ“ بغیر پاکی کے نماز قبول نہیں ہوتی اور حرام مال کے ذریعہ جو صدقہ کیا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جائز، ناجائز طریقے سے مال کماؤ، اوراس میں سے کچھ اللہ کے راستہ میں خرچ کردو؛تو وہ اس کا کفارہ ہو جائے گا؛حالاں کہ ان کا ایسا سوچنا بالکل صحیح نہیں ہے۔اس لیے کہ حرام کمائی میں سے کتنا ہی خرچ کیوں نہ کیا جائے؛اِس سے اُس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

ناپاک کپڑا ناپاکی کے ذریعہ پاک نہیں کیا جاسکتا

حضرت سفیان ثوری (رحمۃ اللہ علیہ) جو بہت بڑے محدث بھی تھے اور بہت بڑے فقیہ بھی تھے۔ ائمۂ فقہاء میں بھی ان کا شمار ہوتا ہے، اور ائمۂ محدثین میں بھی۔ ان کا ارشاد ہے کہ: حرام مال کا صدقہ اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتے۔ پھر فرماتے تھے کہ: ناپاک کپڑے کو ناپاکی کے ذریعہ پاک نہیں کیا جاسکتا، مثلاً: کسی کے کپڑے پر پاخانہ لگ جائے اور کوئی آدمی اس کو پیشاب کے ذریعہ دھوکر پاک کرنا چاہے؛

تو کیا وہ پاک ہو گا؟ نہیں! بلکہ وہ تو پانی سے ہی پاک ہو گا۔ اسی طرح کوئی آدمی اگر حرام مال حاصل کرتا ہے اور پھر اس میں سے کچھ صدقہ کرتا ہے تو حدیث پاک میں آتا ہے کہ وہ صدقہ اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو اس کے لیے اور زیادہ وبال ہے۔

غلط فہمی نہ ہو

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اگر کسی کے پاس کوئی مال غلط طریقہ سے آگیا جس کا مالک معلوم نہیں ہے، جیسے بینک سے سود ملا، یا کسی کو گری ہوئی کوئی چیز (پاکٹ، بیگ تھیلی وغیرہ) ملی، اور اس کا مالک معلوم نہیں ہے، تو وہاں شریعت نے صدقہ کا طریقہ بتلایا ہے۔ ایسے ہی کوئی آدمی حرام مال کمائے اور اس پر قیاس کرتے ہوئے صدقہ کرے کہ اس سے میری ذمہ داری پوری ہو جائے گی؛ تو اس کا یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، اس لیے کہ وہاں دوسری حیثیت ہے۔ وہاں تو یہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اگر آپ کے پاس کسی کا ایسا مال آگیا جس کا حقدار معلوم نہیں تو سب سے پہلے آپ کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کے مالک کو تلاش کیجیے، اگر مالک معلوم ہو جائے تو اسی کو لوٹانا ضروری ہے۔ اور اگر مالک موجود نہیں رہا، اس کا انتقال ہو چکا ہے تو جیسے اس کا دیگر مال اس کے ورثاء کو ملتا ہے، اسی طرح یہ مال بھی اس کے ورثاء تک پہنچانا ضروری ہے۔ اور اگر اس کے ورثاء تک پہنچانے کی بھی کوئی شکل نہیں ہے تو پھر آخری صورت میں صدقہ کیا جائے گا۔ اور وہ صدقہ اپنی طرف سے شمار نہیں ہوتا بلکہ اس کے مالک کی طرف سے شمار ہوتا ہے۔ جیسے مالک خود آپ کو وکیل بناتا اور آپ اس کی طرف سے صدقہ کرتے، ایسے ہی

یہاں پر بھی شریعت نے آپ کو اس کی طرف سے صدقہ کرنے کا اختیار دیا ہے کہ اس کے مال کو صدقہ کر دیجئے۔ وہاں جو صدقہ ہو رہا ہے وہ آپ کی طرف سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ مالک کی طرف سے ہو رہا ہے۔ اور جب صدقہ کیا جاتا ہے تو اس پر ثواب ملتا ہے، اور ثواب در حقیقت اس صدقہ کی اللہ تعالیٰ کے یہاں سے ملنے والی قیمت ہے، لہٰذا وہ اسی کو ملے گی جو اس مال کا مالک ہے۔ اب اگرچہ ہم نہیں جانتے کہ اس مال کا مالک کون ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو تو معلوم ہے کہ اس مال کا مالک کون ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا ثواب اُسی کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ اور یہاں اس صدقہ کا تذکرہ ہے کہ جان بوجھ کر غلط مال حاصل کیا جائے اور اس کا صدقہ کر کے اس کا ثواب اپنے نام پر چڑھانا چاہے، اور ایسا کر کے یوں سمجھے کہ میں کوئی کارنامہ انجام دوں اور ثواب حاصل کروں یا اپنے گناہوں کا کفارہ کرلوں؛ تو ایسا ہونے والا نہیں ہے۔

گویا جہاں مال کا اصلی مالک معلوم نہ ہو سکتا ہو، وہاں اس مال کے حقدار تک حق پہنچانے کا ایک طریقہ شریعت نے ہمیں بتلایا ہے۔ لیکن جہاں مالک معلوم ہو، جیسے ایک آدمی نے کسی کو قرض دیا، اور اس قرض پر اس کے پاس سے سود لیا، اب وہ یوں سوچے کہ اس سود کو میں خود استعمال نہ کروں گا بلکہ اس کا صدقہ کر دوں گا؛ تو یہاں صدقہ سے کام نہیں چلے گا۔ اس لیے کہ یہاں تو اس مال کا اصلی مالک معلوم ہے، لہٰذا اسی کو واپس دینا پڑے گا۔ اور اگر اس کا انتقال ہو گیا ہے تو اس کے وارثوں تک پہنچانا پڑے گا۔ اس مال کا صدقہ کر دینے سے ذمہ داری پوری نہیں ہو گی۔

حلال مال کھاؤ اور نیک عمل کرو

"حلال پاکیزہ مال (روزی) کھاؤ، اور نیک عمل کرو" اس کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ حلال روزی کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ آدمی کے پیٹ میں جائے گی تو خود بخود اعمالِ صالحہ کی توفیق ہوگی۔ جیسے: آپ کوئی عمدہ خمیرہ، یا کشتہ استعمال کریں گے، یا کسی ڈاکٹر نے کوئی ٹانک (Tonic) آپ کے لیے تجویز کیا جو آپ کے پیٹ میں جائے گا تو وہ اپنا اثر ضرور دکھلائے گا۔ اب چاہے آپ جان کر وہ استعمال کریں، یا انجانے میں استعمال کریں۔ یعنی آپ کو معلوم ہے کہ یہ مقوی غذا ہے تب بھی اس کا فائدہ آپ کو پہنچے گا اور اگر کسی نے آپ کو بے خبری میں کوئی کشتہ کھلا دیا، یا ٹانک پلا دیا، تب بھی اس کا اثر آپ کے پیٹ میں جا کر وہی ہوگا۔ بس! بالکل یہی حال روزی کا بھی سمجھو۔ اگر روزی حرام ہے تو پیٹ میں جانے کے بعد اس کا اثر غلط ہی ہوگا، اور اس کی وجہ سے آدمی کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہونا پڑے گا۔

روزی کا قدرتی اثر

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری (رحمۃ اللہ علیہ) بڑے بزرگ اور صوفیاء میں سے گزرے ہیں، امام غزالی (رحمۃ اللہ علیہ) نے احیاء العلوم میں ان کا مقولہ نقل کیا ہے: "مَنْ أَكَلَ الْحَرَامَ، عَصَتْ جَوَارِحُهُ، شَآءَ أَمْ لَمْ يَشَأْ، عَلِمَ أَوْ لَمْ يَعْلَمْ" جس نے حرام غذا استعمال کی تو اس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کریں گے، وہ

آدمی چاہے، یانہ چاہے۔ اُس کو معلوم ہو یا نہ ہو کہ میں حرام کھارہاہوں۔ اس لیے کہ قدرتی بات ہے کہ جب پیٹ میں گیاتو اس کا اثر تو ہونا ہی ہے۔ جیسے: بگڑا ہوا کھانا کھالیا، تو جب وہ پیٹ میں جائے گاتو ظاہری طور پر آپ کے جسم کو نقصان پہنچائے گا، چاہے آپ جان بوجھ کر کھائیں، چاہے بھول کر کھائیں۔ مثلاً: آپ نے زہر استعمال کیاتو جب وہ پیٹ میں جائے گاتو وہ اپنا اثر دکھلائے گا۔ یہ بات اور رہی کہ اگر جان بوجھ کر زہر کھایاہے تو یہ خودکشی ہوئی اور اس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔ اس صورت میں تو نقصان بھی ہو گا اور گناہ بھی ہو گا۔ دنیا بھی برباد اور آخرت بھی برباد۔ اور اگر بے خبری میں بھول سے زہر کھالیا تو چوں کہ اس کو معلوم نہیں تھا تو اس صورت میں گناہ تو نہیں ہو گا لیکن جسم کو نقصان ہو گا۔

پھر حضرت سہل (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: ’’وَمَنْ كَانَ طَعَامُهُ حَلَالًا أَطَاعَتْهُ، وَوُفِّقَ بِالْخَيْرَاتِ‘‘ جس کا کھانا حلال ہو گا تو اس کے اعضاء اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرماں برداری کریں گے اور اس کو نیک کام کی توفیق دی جائے گی۔ چناں چہ حالات وواقعات اس کی پوری تائید کرتے ہیں۔

ایک لقمہ کا اثر

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی (رحمۃ اللہ علیہ) دارالعلوم دیوبند کے سب سے پہلے صدر مدرس، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے استاذ تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے: ایک صاحب کے یہاں دعوت میں تشریف لے گئے، ابھی پہلا ہی لقمہ حلق سے نیچے اترا تھا کہ

احساس ہو گیا کہ کھانا مشتبہ اور مشکوک ہے (جس کو گجراتی میں ”શંકાસ્પદ“ اور انگریزی میں (Doubtful) کہتے ہیں۔) انہوں نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ جب تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ واقعتاً ایسا ہی ہے، لیکن اس ایک لقمہ کا اثر یہ ہوا کہ باوجود توبہ واستغفار کرنے کے دو مہینے تک اس کی ظلمت محسوس ہوتی رہی، اور برابر یہ خیال ووسوسہ آتا رہا کہ فلاں گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں، اس ایک لقمہ کا اثر تھا۔

شاہ جی عبد اللہ کا واقعہ

اس کے بر خلاف اگر اچھی غذا پیٹ میں جائے گی تو اس کے بھی اپنے اثرات ہوں گے۔ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ کے ملفوظات و مواعظ میں ایک قصہ ہے، اور میں نے براہِ راست ان کی زبان سے حضرت کی مجلس میں اور تقریر میں بھی سنا کہ: دیوبند میں ایک بزرگ شاہ جی عبد اللہ شاہ صاحب نامی بڑے نیک اور صالح تھے، ان کا ذریعۂ معاش گھاس کھود (۱) کر بیچنا تھا، اسی پر ان کی گزراوقات تھی۔ روزانہ جنگل جاکر گھاس کا گٹھر لاکر بیچتے تھے اور اس کی قیمت بھی چھ پیسے متعین تھی، نہ کم نہ زیادہ۔ اور ان کا طریقہ یہ تھا کہ دو پیسے تو وہیں صدقہ کردیتے تھے اور دو پیسے اپنے گھر کی ضرورت کے لیے رکھتے تھے، اور دو پیسے جمع کرتے تھے۔ دیوبند کے لوگ بھی اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ اپنے جانوروں کے لیے انہیں سے گھاس خریدیں تاکہ برکت حاصل ہو،

(۱) ”گھاس کھودنا“ اردو کا ایک محاورہ ہے، یعنی جنگل میں جاکر گھاس کاٹنا۔

اس لیے جب وہ لوگ بازار میں جاتے تھے تو ان کے آنے کا انتظار کرتے تھے۔ چناں چہ جب ان کو آتا ہوا دیکھتے تھے تو دوڑتے تھے، جس نے جا کر ان کے گٹھر کو پہلے ہاتھ لگا دیا وہ اس کا ہو جاتا، اور وہ اس گٹھر کو وہیں ڈال دیتے تھے کہ لاؤ! میرے چھ پیسے دو۔ اور ان کی ایک عادت یہ بھی تھی وہ جو پیسے جمع کرتے تھے اس سے جب ایک معتدبہ رقم ہو جاتی تھی تو اکابرِ دارالعلوم کی دعوت کیا کرتے تھے، جس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ اور دوسرے بزرگ ہوتے تھے اور ہنڈیا میں کھچڑی پکتی تھی۔ اور لکھا ہے کہ یہ سارے اکابر ان کی دعوت کے منتظر رہتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان کی دعوت کھانے کے بعد چالیس روز تک دل کے اندر ایک نور رہتا تھا اور طبیعت میں نیکی کے کاموں کے اچھے اچھے جذبات اُبھرتے تھے کہ یہ نیکی کر لوں، یہ نفلیں پڑھ لوں، تلاوت بھی کر لوں، اور یہ ذکر کر لوں۔

ظالموں کو اہل اللہ کا مال راس نہیں آتا

ایک مرتبہ وہ جنگل سے گٹھر لے کر آرہے تھے، ایک سپاہی گھوڑے پر جا رہا تھا۔ ان لوگوں کی تو ظلم وزیادتی کی عادت ہی ہوتی ہے، ان کا یہی طریقہ ہوا کرتا ہے کہ اِس سے کچھ لیا، اُس کو مارا اور کچھ چھینا۔ اس نے دیکھا کہ گھاس کا گٹھر لے کر ایک آدمی جا رہا ہے تو اس نے ایک چابک مار کر کہا کہ: گٹھر یہیں ڈال دے۔ خیر! انہوں نے گٹھر وہیں ڈال دیا اور آگے چلتے ہو گئے۔ جیسے ہی اس نے اپنے گھوڑے کو کھلایا تو گھوڑا تڑپنے لگا۔ وہ گھبرا گیا کہ یہ کیا ہو گیا؟ کسی نے کہا کہ: ان کی گھاس

تیرے گھوڑے کو ہضم نہیں ہوگی، تُو فوراً جا، اور ان کے پیسے دے۔ وہ دوڑا دوڑا آیا، معافی مانگی اور ایک بڑی رقم پیش کی۔ شاہ جی کہنے لگے: مجھے تو میرے چھ پیسے چاہئیں۔

بہترین مثال

دیکھو! اہل اللہ حضرات ایسی ہی حساس طبیعت والے ہوتے ہیں کہ جیسے ہی ان کے حلق سے ایسا کوئی لقمہ اترتا ہے تو ان کو اس کا بھی احساس ہو جاتا ہے۔ جیسے: ایک آدمی ہمیشہ مِنرَل واٹر پینے کا عادی ہو، اور وہ کسی دوسرے پانی کو ہاتھ ہی نہ لگاتا ہو، پھر اگر اس کو انجانے میں بھی دوسرا پانی دو گے تو ایک گھونٹ حلق سے نیچے اترتے ہی اس کو اندازہ ہو جائے گا کہ اس میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اسی طرح جو حضرات گناہوں سے بچنے کا خیال اور اہتمام رکھتے ہیں ان کو فوراً اس بات کا احساس ہو جاتا ہے۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے کہ جو آدمی اندھیریوں کا عادی ہو، جیسے جو لوگ دیہات اور جنگل کے رہنے والے ہوتے ہیں، جہاں بجلی نہیں ہوتی اور اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے، ان کو اندھیروں سے وحشت بھی نہیں ہوتی، اب اگر سورت شہر میں یا جہاں کبھی بجلی نہیں جاتی، وہاں اگر پانچ منٹ بھی بجلی چلی جائے گی تو وہاں کے لوگ پریشان ہو جائیں گے، تھوڑا سا اندھیرا بھی ان کو برداشت نہیں ہوگا، چوں کہ ان کو اندھیرے کی عادت نہیں ہے۔

گناہ نہ چھوٹنے کا ایک اہم سبب

روزی کے اپنے اثرات ہوتے ہیں، اسی کو کہا گیا: یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا (المؤمنون:۵۱) حلال کھاؤ اور نیک عمل کرو۔ گویا حلال کھاؤ گے تو قدرتی طور پر نیک عمل کرو گے۔ اور حرام کھاؤ گے تو قدرتی طور پر برائیاں سرزد ہوں گی۔ آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر نیکی آوے اور آپ کی اولاد اور گھر والے نیک و فرماں بردار ہوں تو آپ اس بات کا اہتمام کیجیے۔ بہت سی مرتبہ آدمی اچھے ارادے کرتا ہے، دینی مجلسوں میں بیٹھتا ہے، اللہ و رسول کی باتیں سنتا ہے تو اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ میں اپنی ان برائیوں کو چھوڑ دوں، لیکن چاہنے کے باوجود نہیں چھوٹتیں، اس کے مختلف اسباب ہیں، جن میں ایک اہم سبب روزی کی خرابی ہے، اس کے نتیجہ میں باوجود ارادے کی بھی وہ برائیاں نہیں چھوٹتیں۔ اس لیے اپنے آپ کو اس سے بچانے کا اہتمام بہت ضروری ہے۔ جب تک یہ نہیں کرے گا وہاں تک احساس و ارادے کے باوجود بھی برائیاں نہیں چھوٹ سکتیں۔ اگر ہزاروں اور لاکھوں حرام کے مل رہے ہوں، ان کی حلال کے ایک کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حلال کا ایک بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں بڑا قابلِ قدر و قیمت ہے، اسی لیے نبیٔ کریم (ﷺ) نے اس کی بڑی تاکید فرمائی۔

جو گوشت حرام غذا سے پرورش پائے

حرام کے ایک لقمہ کی بھی شریعت اجازت نہیں دیتی، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے: لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ، وَكُلُّ لَحْمٍ نَبَتَ مِنَ السُّحْتِ كَانَتِ النَّارُ أَوْلٰى بِهٖ. (مشکوٰۃ، بحوالہ رواہ احمد والدارمي والبيهقي في شعب الايمان) جو گوشت حرام غذا سے پرورش پائے گا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا، اور ہر وہ گوشت جو حرام غذا سے پرورش پایا جہنم اس کی زیادہ حقدار ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک اور ارشاد ہے: ”لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ جَسَدٌ غُذِّیَ بِالْحَرَامِ (مشکوٰۃ شریف) جو جسم حرام غذا سے پرورش پائے وہ جنت میں نہیں جائے گا۔

اجازت کے بغیر ذبح کی ہوئی بکری

حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ نے حکایاتِ صحابہ میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک صحابی کو دفن کرنے کے بعد واپس لوٹ رہے تھے، ایک عورت نے دیکھا کہ حضور تشریف لے جارہے ہیں اور اس کی نیت حضور کی دعوت کرنے کی تھی لہٰذا اس نے آپ کے پاس آدمی بھیجا کہ میں نے آپ کے لیے دعوت کا کھانا تیار کیا ہے، آپ تشریف لائیے، حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہ کے ساتھ تشریف لے گئے، آپ کے سامنے بکری کا گوشت پیش کیا، آپ نے ایک لقمہ دہنِ مبارک میں رکھا تو محسوس ہوا کہ کچھ گڑبڑ ہے، لہٰذا آپ نے منھ سے نکال دیا اور ارشاد فرمایا: یہ گوشت ایسی بکری کا

معلوم ہوتا ہے جو مالک کی اجازت کے بغیر ذبح کی گئی ہے۔ اس عورت سے پوچھا گیا: کیا بات ہے؟ اس نے کہا: میں نے آدمی کو پیسے لے کر بکری خریدنے کے لیے بازار بھیجا تھا، وہاں بکری نہیں ملی، ہمارا پڑوسی ایک بکری خرید کر کے لایا تھا، میں نے وہاں پیسے لے کر آدمی بھیجا تو وہ پڑوسی خود موجود نہیں تھا، اس کی بیوی نے یہ بکری بھیج دی اور میں نے اس کو ذبح کر دی۔ گویا مالک کی اجازت نہیں پائی گئی۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: یہ کھانا قیدیوں کو کھلا دیا جائے۔

آقا اور غلاموں کے احوال کا فرق

ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ: نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک رات بستر پر کروٹیں لے رہے تھے، آپ کو نیند نہیں آرہی تھی، جس ام المؤمنین (رضی اللہ عنہا) کے یہاں آپ آرام فرما رہے تھے انہوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ آپ کو نیند نہیں آرہی ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: گھر میں ایک کھجور پڑی ہوئی دیکھی تھی، اور وہ ضائع نہ ہو جائے اس خیال سے میں نے اُٹھا کر کھالی، اب یہ خیال آتا ہے کہ کہیں وہ صدقہ کی نہ ہو۔ چوں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے صدقہ کھانا جائز نہیں تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو صرف یہ تصور آیا اس لیے نیند نہیں آرہی ہے، حالاں کہ اپنے گھر میں سے اٹھایا تھا۔ حضرت شیخ نور اللہ مرقدہٗ اس واقعہ کو لکھ کر فائدہ کا ''ف'' کر کے اس میں لکھتے ہیں کہ آقا کا تو یہ حال ہے کہ صرف اس احتمال اور خیال سے نیند اُچاٹ ہو گئی، اور غلاموں کا یہ حال ہے کہ رشوت کا، چوری کا، سود کا جو بھی آیا اس کو ہڑپ اور ہضم کر رہے ہیں۔

ایک اہم تعلیم

اس قصہ میں ایک اہم تعلیم یہ بھی ہے کہ کھانے پینے کی کوئی چیز اگر اپنی ملکیت کی ہے، اور وہ کہیں پڑی ہوئی ہو؛ تو اس کو اُٹھا کر صاف کر کے کھالی جائے، اسے ایسے ہی چھوڑ نہ دی جائے، وہ چیز ضائع نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ کھانے کے دوران اگر ہاتھ سے گر جائے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں کہ اس کو شیطان کے لیے مت چھوڑو، شیطان تو چوٹّا ہے، وہ تو منتظر ہی رہتا ہے کہ کسی طرح سے اس کا حصہ لگ جائے۔ جب آپ نے بسم اللہ بول کر کھانا شروع کیا تو اس کا اندر حصہ نہیں رہا، لیکن وہ تاک لگا کر ہی بیٹھا رہتا ہے کہ کوئی لقمہ آپ کے ہاتھ سے نیچے گر گیا اور آپ نے اٹھا کر کھالیا تب تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ کھالے گا۔ اس کو تو بھوکا ہی مارنا چاہیے، اپنے دشمن کو کون طاقت پہنچائے گا، ہمیں چاہیے کہ ایک دانہ بھی اس کے پیٹ میں نہ جانے دیں۔ تو جو لقمہ گر جائے اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھانے کا جو حکم حدیث پاک میں دیا گیا ہے وہ دراصل اسی لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ضائع نہ جائے۔ ہمارے اکابر کے یہاں اس کا بڑا اہتمام تھا۔

ہمارے اکابر اور نعمتوں کی قدردانی

حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ کے یہاں دیکھا کہ کوئی آدمی پانی گلاس میں لیتا اور پینے کے بعد بچا ہوا گرادیتا تو حضرت شیخ اس پر تنبیہ فرماتے کہ اس کو ضائع کیوں کیا؟ اور آج کل ہم تو ایسا بہت کچھ کررہے ہیں جس کا ہمیں احساس تک نہیں ہے۔

حضرت شیخ کے یہاں ہدایا میں کوئی پھل فروٹ آجاتا اور اس کے مزہ میں ذرا سا فرق آجاتا تو اس کے کھانے کو بعض طبائع پسند نہیں کرتی۔ اگر مہمان کے سامنے پیش کرنے کے قابل نہیں رہا لیکن ابھی قابلِ استعمال ہوتا تو حضرت فرماتے: بھائی! اس کو کون کھائے گا؟ حضرت کا مقصد یہ ہوتا کہ یہ ضائع نہ جائے، جب حضرت یہ دریافت فرماتے تو ظاہر ہے کہ سب ہی آگے بڑھتے۔

حضرت شیخ کے یہاں جو خطوط آتے تھے اس میں اگر آدھے کاغذ پر لکھا ہوا ہوتا تھا اور آدھا کاغذ صاف ہوتا تو اس کو کٹوا کر رکھ لیتے تھے، اور کسی موقع پر جب کسی کو دو تین سطر کی چٹھی لکھنی ہوتی تو اسی کو استعمال فرمالیا کرتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر دانی ہے۔

حضرت قاری فتح محمد صاحب پانی پتی (رحمۃ اللہ علیہ) کے حالات میں پڑھا کہ کھانا کھانے کے بعد پہلی کُلّی کو نگل لیتے تھے، تاکہ کھانے کے جو ذرّات منہ میں ہیں وہ کلّی کے ساتھ باہر آکر ضائع نہ ہوں، بلکہ پیٹ میں چلے جائیں۔ اللہ کے ایسے بندے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ایسی قدر کرتے ہیں۔

ظریفانہ مقولہ

مَیں یہ عرض کر رہا تھا کہ مشتبہ مال سے بھی احتیاط کیا جائے۔ ہمارے حضرت مفتی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقیؒ(۱) کا ایک ظریفانہ مقولہ سناتے تھے کہ بھائی! ہمارا معدہ مشتبہ اور (Doubtful) کو تو قبول نہیں کرتا، لیکن خالص حرام کو قبول کرلیتا ہے۔

میں اپنا تھوکا ہوا چاٹ بھی سکتا ہوں

حضرت مولانا عبد الحلیم صاحب صدیقی (رحمۃ اللہ علیہ) کا نام آیا تو ان کا ایک لطیفہ سنا دوں۔ ان کی طبیعت میں ظرافت بہت تھی، ان کی ظرافت کا حال یہ تھا کہ وہ پان بہت کھایا کرتے تھے اور کثرت کا حال یہ تھا کہ تھوک کے ذرّات اُڑاُڑ کر ان کا کرتہ آگے سے لال رہتا تھا، سفر میں بھی پان کا سامان ساتھ میں رہتا تھا، ایک مرتبہ ٹرین میں جا رہے تھے، پان کھا کر اس کی پیک کو کھڑکی میں سے تھوکا اور ٹرین چل رہی تھی، اتفاق کی بات کہ وہ پیک برابر والی کھڑکی سے اندر جا کر کسی خاتون کے چہرے پر لگی، وہ بڑی ناراض ہوئی اور بولنے لگی کہ پتہ نہیں کون گستاخ اور بے ادب ہے، اور اُدھر سے اُٹھ کر آئیں تو دیکھا کہ بڑے میاں بیٹھے ہیں ۔ اس نے کھڑے کھڑے اُن کو خوب لتاڑا، یہ خاموشی سے نظریں جھکا کر بیٹھے سنتے رہے، کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دیر تک بولتی رہیں اور جو بولنا تھا وہ سب بول دیا، اور جب خاموش ہو گئیں تو یہ کہنے لگے کہ: محترمہ! آپ اتنی ناراض کیوں ہوتی ہیں، آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنا تھوکا ہوا چاٹ بھی سکتا ہوں۔ ان کے اور بھی بہت لطیفے ہیں، میں اس وقت بیان نہیں کروں گا۔

(۱) لکھنؤ کے رہنے والے تھے، ڈابھیل میں شیخ الحدیث رہے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا احتیاط

اللہ کے ایسے بندے بھی ہیں جن کا معدہ مشتبہ چیز کو قبول نہیں کرتا۔ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے متعلق لکھا ہے کہ جیسے ہی کوئی مشتبہ لقمہ ان کے حلق سے نیچے اترتا تھا کہ ان کو قے ہو جاتی تھی۔ انہی کی صاحبزادی "اُمّی بی" تھیں جو حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ اور مولانا الیاس صاحبؒ کی نانی ہوتی ہیں، بڑی نیک خاتون تھیں، تذکرۃ الخلیل کے شروع میں ان کے حالات مذکور ہیں۔

خیر! یہ حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب کاندھلوی (رحمۃ اللہ علیہ) حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے شاگردوں میں تھے، بڑے متقی اور پرہیزگار تھے، ان کے تقویٰ کا یہ عالَم تھا کہ کبھی دہلی سے کاندھلہ جاتے تو بہلی والے سے معاملہ کر لیتے تھے اور اس کو اپنا سامان بتلا دیتے تھے، اس کے بعد جب روانہ ہونے کا وقت آتا اور کوئی آدمی لا کر کوئی خط دیتا کہ حضرت! یہ فلاں صاحب کو پہنچا دیجئے گا، تو حضرت اس سے کہتے: دیکھو بھائی! میں اس بہلی والے کو اپنا سامان بتلا چکا ہوں، یہ خط اس میں نہیں تھا، تم اس کو بتا کر اس سے اجازت لے لو، تو میں لے جاؤں گا، ورنہ نہیں۔ ہم اور آپ ہوتے تو یوں سوچتے کہ اس کی وجہ سے کون سا وزن بڑھ جانے والا ہے۔

ان کے حالات میں لکھا ہے کہ دلّی میں طالب علمی کے زمانہ میں بھی صرف روٹی کھانے پر اکتفاء کرتے تھے، سالن نہیں کھاتے تھے، اس لیے کہ اس زمانہ میں دلّی میں ہر سالن کے اندر کھٹائی کے

لیے اچور ڈالی جاتی تھی، اور حضرت فرماتے تھے کہ دلّی کے اطراف میں آم کے باغات کی بیع صحیح نہیں ہوتی۔

لوگ بھی ان کی دعوت کرتے ہوئے اسی وجہ سے ڈرتے تھے کہ کہیں ہماری رسوائی نہ ہو جائے۔ ایک مرتبہ کاندھلہ تشریف لے گئے تو خاندان کے کسی بزرگ نے -جو سرکاری ملازم تھے- ان کی دعوت کی، لیکن اس تنخواہ سے نہیں، بلکہ اپنے باغ کی پیداوار سے جو آمدنی ہوئی تھی اس سے ان کی دعوت کا اہتمام کیا اور ملازم کو بھی بہت تاکید کی کہ دیکھیو! کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے، ورنہ رسوائی ہو جائے گی۔ ایک ملازم کو دودھ جلیبی کے واسطے دودھ لینے بازار بھیجا، وہ دودھ لے آیا۔ خیر! سب کچھ تیار کر کے دستر خوان پر لگایا گیا، جیسے ہی دودھ جلیبی کا پہلا لقمہ منھ میں رکھا کہ قے ہو گئی، فوراً شور ہو گیا کہ یہ کیا ہوا؟ انہوں نے اس ملازم کو پکڑا کہ میں نے تجھے اتنی تاکید کی تھی، اب سچ سچ بتا: تو نے کیا گڑبڑ کر دی؟ اس نے کہا: بات دراصل یہ ہوئی کہ میں آپ کی دی ہوئی رقم سے دودھ لے کر آرہا تھا کہ میرے ہاتھ سے برتن چھوٹ گیا اور سارا دودھ گر گیا، تو میں دوبارہ جا کر اس کے پاس سے مفت میں دودھ لے آیا۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کا احتیاط

حکایاتِ صحابہ میں حضرت شیخ نوراللہ مرقدہٗ نے حضرت ابو بکرؓ کا واقعہ لکھا ہے: ان کا ایک غلام تھا جس کو انہوں نے خِراج پر اُٹھایا تھا، ایک مرتبہ وہ کچھ کھانا لایا اور حضرت ابو بکرؓ کے سامنے رکھا،

حضرت ابو بکرؓ کا ایک دو وقت کا فاقہ تھا اس لیے انہوں نے اس میں سے ایک لقمہ لے کر منھ میں ڈال دیا۔ ابھی حلق سے نیچے اُترا ہی تھا کہ اُس غلام نے کہا: حضرت! روزانہ تو آپ پوچھتے ہیں کہ یہ چیز کہاں سے لایا؟ کس طرح کمایا؟ آج آپ نے نہیں پوچھا؟ حضرت نے فرمایا: آج بھوک بڑی تیز لگی ہوئی تھی اس لیے پوچھنا رہ گیا۔ ٹھیک ہے؛ اب بتادے کہ یہ کہاں سے لایا ہے۔ اس نے کہا: بات دراصل یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں (اسلام لانے سے پہلے) میں نے کچھ کہانت (۱) کی تھی اور مجھے کہانت آتی بھی نہیں تھی، ویسے ہی میں نے ایک بات کہہ دی تھی اور وہ صحیح نکل آئی تھی۔ ان لوگوں نے وعدہ کیا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس تمہیں معاوضہ دینے کے لیے کچھ نہیں ہے، آئندہ جب ہمارے پاس وسعت ہوگی تو دیدیں گے۔ آج میں وہاں سے گزرا تو اُن کے یہاں کوئی تقریب چل رہی تھی، کھانا پکا ہوا تھا، ان لوگوں نے اُسی کہانت کے معاوضہ میں مجھے یہ کھانا دیا۔ یہ داستان سن کر حضرت ابو بکرؓ فرمانے لگے: تُو تو مجھے مار ہی ڈالتا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے حلق کے اندر اُنگلی ڈال کر وہ لقمہ نکالنا چاہا، لیکن ایک ہی لقمہ تھا اور وہ بھی دو تین وقت کے فاقہ کے بعد اندر گیا تھا؛ بھلا کیسے نکلتا؟ کسی نے کہا: حضرت! زیادہ مقدار میں پانی پی لیں، پھر نکالنے کی کوشش کریں، شاید پانی کے ساتھ نکل آئے۔ تو بڑے پیالے میں پانی منگوایا اور خوب پیا، اس کے بعد حلق میں اُنگلی ڈال کر تے کی تب بڑی مشکل سے وہ لقمہ باہر نکلا۔

کہانت یعنی آگے پیش آنیوالی باتیں بتلانا۔ اور عرب میں اس کا بڑا رواج تھا، ایسے لوگ کاہن (جوتشی) کہلاتے ہیں۔ ان کو ہدیہ اور معاوضہ بھی دیا جاتا ہے، جس کو "حلوان الکاہن" کہا جاتا ہے۔

ان کی یہ ساری مشقت دیکھ کر کسی نے کہا: حضرت! ایک ہی تو لقمہ تھا، اس کے لیے آپ نے اتنی زحمت برداشت فرمائی؟ حضرت ابو بکرؓ نے جو جواب دیا وہ ہمارے لیے قابلِ غور و عبرت ہے۔ فرمایا: اگر یہ لقمہ میری جان کے ساتھ نکلتا تب بھی میں اس کو نکال کر رہتا، اس لیے کہ میں نے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنا ہے کہ ہر وہ گوشت جو حرام غذا سے پرورش پائے، جہنم کی آگ اس کی زیادہ حقدار ہے۔ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ اس مال سے پرورش نہ پا جائے جس کی وجہ سے مجھے جہنم میں جانا پڑے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ ارشاد ہم اور آپ بھی سنتے ہیں لیکن ہمارے دلوں پر اس ارشاد کا کتنا اثر ہوتا ہے؟ اور اس پر عمل کا کتنا اہتمام کرتے ہیں؟ اور دوسری طرف حضرت ابو بکر صدیقؓ کا حال دیکھئے کہ کیا ہے؟

امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) کی احتیاط

اسی لیے ہمارے بزرگوں میں حرام سے بچنے کا بڑا اہتمام تھا۔ امام ابو حنیفہؒ کے حالات میں لکھا ہے کہ: آپ کی کپڑوں کی تجارت تھی، حفص بن عبد الرحمٰن آپ کے شریک (پارٹنر) تھے، ایک مرتبہ امام صاحب نے ان کے پاس کپڑوں کے کچھ تھان فروخت کرنے کے لیے بھیجے، اور کہا کہ اس میں سے فلاں کپڑے کے تھان میں عیب ہے، جب کسی کو بیچو تو خریدار کو بتا دینا۔ وہ کچھ غفلت میں رہے اور خریدار کو بتانا بھول گئے۔ انہوں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا اور وہ کپڑا بیچ دیا۔ وہ سب مال بیس ہزار درہم کی قیمت کا تھا، جب وہ حساب دینے کے لیے آئے تو پوچھا کہ خریدار کو وہ عیب بتا

دیا تھا؟ انہوں نے کہا: بھول گیا۔ پوچھا: کس کو بیچا؟ کہا: یاد نہیں رہا۔ تو فقط اتنی بات پر امام صاحب نے۔ صرف منافع نہیں۔ بلکہ پوری رقم بیس ہزار درہم (یعنی باسٹھ (۶۲) کلو سونا) صدقہ کر دیئے، اور ان سے شرکت بھی ختم کر دی۔

ایک مرتبہ جنگل میں کوئی قافلہ جا رہا تھا وہ لوٹ لیا گیا اور اس قافلہ کی بکریاں بھی لوٹی گئیں، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ لوٹی ہوئی وہ بکریاں کوفہ کے بازار میں بکی ہیں، گویا کوفہ کی بکریوں میں وہ بکریاں بھی رَل مل گئی ہیں۔ امام صاحب نے تحقیق فرمائی کہ بکری کی عمر کتنی ہوتی ہے؟ بتایا گیا: سات سال۔ تو سات سال تک کوفہ میں رہتے ہوئے کبھی بکری کا گوشت نہیں کھایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حرام سے اپنے آپ کو بچانا بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کی بڑی ضرورت ہے۔

جس کی غذا حرام ہو گی

علامہ ذہبی (رحمۃ اللہ علیہ) بہت بڑے محدث ہیں، ان کی ایک کتاب ''الکبائر'' ہے، اس میں انہوں نے ایک روایت نقل کی ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس پر ایک فرشتہ مقرر کر رکھا ہے، جو دن رات یہ اعلان کرتا ہے کہ جس کی غذا حرام ہو گی اس کی کوئی عبادت قبول نہیں ہو گی، نہ فرض نہ نفل۔

تہامہ پہاڑ کے برابر نیکیاں ضائع

ایک اور روایت انہوں نے نقل کی ہے کہ: قیامت کے روز بہت سے ایسے لوگ آئیں گے جن کے پاس تہامہ پہاڑ کے برابر نیکیاں ہوں گی، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی ساری نیکیوں کو بالکل ختم کردیں گے۔ پوچھیں گے کہ کیوں ایسا ہوا؟ کہا جائے گا کہ یہ لوگ نمازیں بھی خوب پڑھتے تھے، روزے بھی رکھتے تھے، حج وعمرے بھی کرتے تھے، صدقے بھی خوب دیتے تھے، لیکن ان کی کمزوری یہ تھی کہ جب ان کے سامنے مال آتا تھا تو یہ نہیں دیکھتے تھے کہ یہ حلال ہے یا حرام؛ بس! سب لے لیتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا۔

ایک زمانہ آنے والا ہے

حدیثِ پاک میں حضورِ اکرم (ﷺ) کا ارشاد ہے: ”يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِي الْمَرْءُ مَا أَخَذَ مِنْهُ، أَمِنَ الْحَلَالِ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ“ (صحیح بخاری، باب من لم يبال من حيث كسب المال) لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ اس وقت آدمی جب کوئی مال حاصل کرے گا تو اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا کہ یہ حلال سے آرہا ہے یا حرام سے۔

حالاں کہ یہ بہت اہم چیز ہے اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔ بات یہ چل رہی تھی کہ حلال مال کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو نیک کام کی توفیق ہوتی ہے۔

دعا قبول نہیں

’’بھلا اس کی دعا کیسے قبول ہو گی؟‘‘ اس سے معلوم ہوا کہ حرام غذا کے اثرات یہ ہیں کہ اس کی وجہ سے دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ فضائل رمضان میں حضرت شیخ ؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے: کوفہ کے اندر مستجاب الدعوات لوگوں کی ایک جماعت تھی، جب بھی کوئی ظالم حاکم آتا وہ اس کے لیے بد دُعا کرتے تھے اور وہ ہلاک ہو جاتا تھا۔ حجّاج بن یوسف جب کوفہ کا گورنر اور حاکم بن کر آیا تو اس کو معلوم تھا کہ یہاں اس قسم کے خطرناک لوگ ہیں تو اس نے پہلا انتظام یہ کیا کہ ایک دعوت کی، اور اس دعوت میں خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کو بھی شریک کیا۔ جب دعوت کھائی جا چکی تو وہ کہنے لگا کہ: اب میں ان کی بد دُعا سے محفوظ ہو گیا، اس لیے کہ ان کے پیٹ میں حرام کی غذا پہنچ گئی۔

نماز قبول نہیں

مشکوۃ شریف میں حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) کی روایت ہے کہ نبی ٔکریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ’’ مَنِ اشْتَرىٰ ثَوْبًا بِعَشَرَةِ دَرَاهِمَ، وَفِيهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ، لَمْ يَقْبَلِ اللهُ لَهُ صَلَاةً مَادَامَ عَلَيْهِ، قَالَ: ثُمَّ أَدْخَلَ أُصْبُعَيْهِ فِي أُذُنَيْهِ، ثُمَّ قَالَ: صُمَّتَا إِنْ لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم) سَمِعْتُهُ يَقُوْلُهُ‘‘ جس آدمی نے کوئی کپڑا دس درہم میں خریدا، اور اس میں (نو درہم حلال کے ہیں) ایک درہم حرام کا ہے (گویا اس کپڑے میں ۹۰ / فیصد (90٪) حلال ہے، اور ۱۰ / فیصد (10٪) حرام ہے، اس

کے باوجود حضور (ﷺ) فرماتے ہیں کہ) جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا، اس کی کوئی نماز اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول نہیں ہوگی۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ڈال کر فرماتے ہیں: اگر حضور (ﷺ) کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے میں نے نہ سنا ہو تو میرے دونوں کان بہرے ہو جائیں۔ (باب الکسب وطلب الحلال، الفصل الثالث. رواہ أحمد والبیهقي في شعب الایمان)

بہر حال! یہ بڑی اہم چیز ہے۔ آج کل اس کی طرف سے بڑی غفلت ہو رہی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اپنی طرف سے کوشش جاری رکھے اور غلط طریقوں سے اپنے آپ کو بچانے کا اہتمام کرے۔ شریعت نے کاروبار کے، معاملات کی درستگی کے جو طریقے بتلائے ہیں ان مسائل کو معلوم کرے، ان کو اختیار کرے، اور ان پر عمل کا اہتمام کرے۔ آج اگر کوئی بندہ اس طرح کا اہتمام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اس کے لیے آسانی کر دی جاتی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اس باب میں متفرق احادیث اور کچھ دلچسپ چیزیں جو احادیث میں آئی ہیں ان کو پیش کر رہے ہیں۔

ناقابلِ معافی تین گناہ

حدیث ۱۸۵۲:-

وعنه -رضی الله عنه- قال: قال رسولُ اللهِ (ﷺ): ((ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَلَا يُزَكِّيهِمْ، وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ، وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ: شَيْخٌ زَانٍ، وَمَلِكٌ كَذَّابٌ، وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ)). رواه مسلم.

((العَائِلُ)): الفَقِيرُ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تین آدمی ایسے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ (ان پر ناراض ہونے کی وجہ سے) ان کے ساتھ قیامت کے روز بات نہیں کریں گے، اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کریں گے، اور نہ ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھیں گے، اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا: (۱) وہ بوڑھا جو زناکاری میں مبتلا ہو (۲) جو بادشاہ جھوٹ بولنے والا ہو (۳) فقیر جو تکبّر کرنے والا ہو۔

افادات:- حضراتِ شرّاح نے لکھا ہے کہ زنا، جھوٹ اور تکبر؛ تینوں برائیاں کسی کی طرف سے بھی صادر ہوں، وہ ناپسندیدہ اور گناہ ہیں، لیکن بعض گناہ ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی کے حالات کے تقاضہ کی وجہ سے اس سے صادر ہو جاتے ہیں، جیسے: نوجوان میں شہوت کا غلبہ ہوتا ہے، وہ ناتجربہ کار ہوتا ہے، اس گناہ کے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں اس سے بھی واقف نہیں ہوتا، اس لیے اگر شہوت

کے غلبہ میں، ناتجربہ کاری کی وجہ سے وہ ایسی برائی میں مبتلا ہو جائے تو قرینِ قیاس ہے۔ اگرچہ زنا اپنی جگہ پر حرام کام ہی ہے، اس سے اس کو بچنا ہی چاہیے تھا، پھر بھی مخصوص حالات کے پیشِ نظر جب وہ زنا میں مبتلا ہوگا تو کبیرہ گناہ ہونے کے باوجود لوگ یوں سمجھیں گے کہ حالات کی وجہ سے اس میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن بوڑھا آدمی اگر زنا میں مبتلا ہو جاتا ہے تو بڑی عجیب بات سمجھی جاتی ہے، اس لیے کہ بڑھاپا ویسے بھی شہوت کا زمانہ نہیں رہتا، اور نہ شہوت کا غلبہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے عمر کے تجربہ کی وجہ سے اس کو اتنی سمجھ بھی دی ہوتی ہے کہ ایسی کوئی حرکت کرلے گا تو اس کے نتیجہ میں کیا کیا نقصانات بھگتنے پڑتے ہیں، اور وہ حرکت اس کے لیے رسوائی کا باعث ہوگی۔ لہٰذا جو عمر اس بات کی متقاضی نہیں، اور گناہ کے مخالف حالات کے باوجود بھی اگر اس گناہ میں مبتلا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا غصّہ اس پر بہت زیادہ ہوتا ہے۔

یہی حال جھوٹ بولنے والے بادشاہ کا ہے۔ اس لیے کہ کوئی بھی آدمی جھوٹ اس لیے بولتا ہے کہ اس کو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر میں سچ بتلادوں گا تو سامنے والے کی طرف سے مجھے سزا دی جائے گی، یا مجھ پر زیادتی کا معاملہ کیا جائے گا، لیکن بادشاہ تو خود صاحبِ اختیار ہوتا ہے، اس کو جھوٹ بول کر اپنی بات چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ گویا اس کے حالات اس گناہ کے خلاف ہیں، اس کے باوجود وہ اس میں مبتلا ہوا، تو اس صورت میں اس کی شناعت اور برائی بہت زیادہ بڑھ جائے گی۔

یہی حال متکبر اور گھمنڈی فقیر کا ہے۔ اس لیے کہ گھمنڈ اور کبر مال و منال اور منصب کی وجہ سے ہوتا ہے، یا کوئی ایسی چیز جو اس کو کبر میں ڈال سکتی ہے جس کی وجہ سے وہ گھمنڈ اور تکبر کرتا ہے تو

قرینِ قیاس ہے۔ لیکن جیب بالکل خالی ہو اور دماغ آسمان پر رہے، تو اس پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی بہت زیادہ ہوتی ہے۔

دنیا میں جنت کی چار نہریں!

حدیث ۱۸۵۳:-

وعنهُ -رضی الله عنه- قال: قال رسولُ اللهِ (ﷺ): ((سَيْحَانُ وَجَيْحَانُ، وَالفُرَاتُ وَالنِّيلُ كُلٌّ مِنْ أَنْهَارِ الْجَنَّةِ))۔ (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: سَیحان، جَیحان، فُرات اور نیل؛ یہ چاروں جنت کی نہروں اور دریاؤں میں سے ہیں۔

افادات:- سیحان اور جیحان کہاں ہیں؟ اس سلسلہ میں قاضی عیاضؒ نے فرمایا ہے کہ: خراسان جو قدیم سوویت یونین میں اسلامی ریاستوں کا علاقہ تھا جس کو ماوراء النہر کہا جاتا ہے، آمو دریا والا جو علاقہ ہے وہاں یہ دونوں دریا واقع ہیں۔ لیکن علامہ نوویؒ نے شرحِ مسلم میں اس قول کی تردید کی ہے کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں چھوٹے دریا ہیں، جو روم کے ساتھ شام کی جہاں سرحد لگی ہوئی ہے وہاں مقامِ مِسِّیسہ (ایک شہر ہے، اس) کے قریب واقع ہے۔

"دریائے فُرات" عراق کے اندر ہے۔ دریا یعنی جس کو ہم لوگ گجراتی میں ندی کہتے ہیں، جیسے "تاپتی ندی" بولتے ہیں، اردو میں اس کو "دریائے تاپتی" بولیں گے۔ اور "دریائے نیل" مصر میں

واقع ہے۔ ان چاروں کے بارے میں حضور (ﷺ) نے فرمایا کہ: یہ چاروں جنت کی نہروں میں سے ہیں۔

جنت کی نہروں کا مطلب

اب سوال یہ ہے کہ جنت کی نہروں کا کیا مطلب ہے؟ تو بعض حضرات نے کہا کہ: ان کی افادیت کے پیشِ نظر ان کو جنت کی نہروں کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ گویا ان کا پانی اتنا عمدہ ہے کہ اس سے کھیتی باڑی بھی بہت اچھی ہوتی ہے اور انسانوں، جانوروں کی ضروریات کے لیے بھی نہایت کارآمد ہے، اس معنٰی کر جنت کی نہروں میں سے قرار دیا گیا ہے۔

اور بعضوں نے کہا کہ: جن علاقوں میں یہ دریا واقع ہیں وہاں کے رہنے والے تقریباً سب ہی اہلِ ایمان ہیں، گویا ان سے فائدہ اُٹھانے والے اہل ایمان ہیں جو جنت میں جائیں گے، اس لیے ان کو جنت کی نہروں سے تعبیر کیا گیا ہے۔

بعضوں نے کہا کہ: جنت میں بھی ان ناموں کی نہریں ہیں، گویا یہ بتلایا جارہا ہے کہ جس طرح دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی نعمتیں رکھی ہیں وہ دراصل جنت کی نعمتوں کا ایک معمولی ساخاکہ پیش کرتی ہیں، جیسے جنت میں پھل ہوں گے، آم، سیب وغیرہ، لیکن ایسے نہیں جیسے دنیا کے ہیں۔ وہاں کی نعمتیں اور پھل تو ایسے ہیں کہ ”مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ“ ایسی نعمتیں

ہوں گی کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنیں، اور نہ کسی کے دل میں خیال آیا۔ آدمی ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بہر حال! ان کے ساتھ نام کی مشابہت ہے۔

بعضوں نے کہا کہ: دیکھنے میں دنیا میں جیسی نہریں ہیں، ویسی ہی جنت کے اندر بھی نہریں ہیں۔

محققین کا راجح قول

لیکن محققین نے اس کا راجح مطلب یہ بتلایا ہے کہ: ان چاروں دریا کے منبع اور سَوت یعنی جہاں سے یہ دریا نکلتے ہیں وہ جنت کے اندر ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے وہ اللہ ہی بہتر جانے۔ اس لیے کہ اہلِ جغرافیہ دوسرے دریاؤں کے متعلق تو بتلاتے ہیں کہ ان کے سوت کہاں ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کی ”دریائے تاپتی“ کا منبع کیا ہے؟ تو بتاتے ہیں سات پوڑہ میں سے نکل کر آتی ہے۔ اسی طرح سے دریائے گنگا اور دریائے جمنا وغیرہ کا منبع اور سَوت جہاں سے وہ نکل کر چلتی ہے وہ سب کو معلوم ہے، لیکن دریائے نیل کے متعلق جغرافیہ دانوں کے اندر آج تک بڑے اختلافات ہیں۔ دنیا اور سائنس اتنی ترقی کر گئی اس کے باوجود اس کا صحیح منبع کیا ہے؛ وہ آج تک معلوم نہیں کر سکے۔

اور دوسرے دریاؤں کے مقابلہ میں دریائے نیل میں کچھ نمایاں فرق بھی ہے۔ ایک تو یہ جتنے دریا اور ندیاں ہیں وہ عام طور پر شمال سے نکل کر جنوب کی طرف چلتی ہیں، ندی اور دریاؤں کا عام دستور یہی ہے۔ لیکن دریائے نیل جنوب سے چل کر کے شمال کی طرف جاتا ہے، اور دنیا کا سب سے لمبا دریا یہی ہے، اس سے زیادہ طویل اور لمبا دریا دوسرا کوئی نہیں ہے۔

کون سے دن کیا پیدا کیا گیا؟

حدیث ۱۸۵۴:-

وعنه، قال: أَخَذَ رسُولُ اللهِ (ﷺ) بِيَدِي فَقَالَ: ((خَلَقَ اللهُ التُّرْبَةَ يَومَ السَّبْتِ، وَخَلَقَ فيها الجِبَالَ يَومَ الأَحَدِ، وَخَلَقَ الشَّجَرَ يَومَ الإِثْنَينِ، وَخَلَقَ المَكْرُوهَ يَومَ الثُّلاثَاءِ، وَخَلَقَ النُّورَ يَوْمَ الأَرْبِعَاءِ، وَبَثَّ فِيهَا الدَّوابَّ يَومَ الخَمِيسِ، وَخَلَقَ آدَمَ (ﷺ) بَعْدَ العَصْرِ مِنْ يَومِ الجُمُعَةِ فِي آخِرِ الخَلْقِ فِي آخِرِ سَاعَةٍ مِنَ النَّهَارِ فِيمَا بَيْنَ العَصْرِ إِلَى اللَّيْلِ)). رواه مسلم.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے میرا ہاتھ پکڑ کر کے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نے زمین کو سنیچر کے دن پیدا کیا، اوراس کے اندر پہاڑوں کو اتوار کے دن پیدا کیا، اور درختوں کو پیر کے دن، اور ناپسندیدہ چیزوں کو منگل کے دن، اور نور (روشنی) کو بدھ کے دن پیدا کیا، اور جمعرات کے دن جانوروں کو پیدا کر کے زمین میں پھیلایا، اور حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد، آخری مخلوق دن کی آخری گھڑی میں عصر سے رات تک کے وقت کے درمیان پیدا کی گئی (اسی لیے جمعہ کے دن کو عبادت کے لیے مخصوص کیا گیا ہے کہ انسان کو اسی دن میں پیدا کیا گیا ہے۔)

جنگ موتہ اور حضرت خالد بن ولیدؓ

حدیث ۱۸۵۵:-

وعن أَبي سليمان خالد بن الوليد - رضي الله عنه - قَالَ: لَقَدِ انْقَطعتْ في يَدِي يَوْمَ مُؤْتَةَ تِسعَةُ أسْيَافٍ، فَما بَقِيَ فِي يَدِي إلاَّ صَفِيحَةٌ يَمانِيَّةٌ. (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت خالد بن ولید (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ جنگ موتہ والے دن میرے ہاتھ میں نو(۹) تلواریں ٹوٹیں، اخیر میں ایک یمنی تلوار میرے ہاتھ میں بچی۔

افادات:- جنگ موتہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں جمادی الاولیٰ ۸ھ میں ہوئی۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک صحابی حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو سفیر بنا کر بُصریٰ کے حاکم کے پاس ایک خط لے کر بھیجا تھا (بُصریٰ شام میں واقع ہے) ابھی وہ راستہ ہی میں تھے کہ شرحبیل بن عمرو غسانی (جو اسی کے ماتحت تھا) نے ان کو گرفتار کرکے حاکمِ بُصریٰ کے پاس پیش کیا اور اس نے ان کو قتل کر دیا۔ کسی سفیر اور ایلچی کو قتل کرنا اُس زمانہ میں بھی بین الاقوامی قوانین کے اعتبار سے بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا، بلکہ یہ ایک گھٹیا درجہ کا اعلانِ جنگ ہے۔ جب نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت حارث بن عمیرؓ کو قتل کر دیا گیا ہے تو اگرچہ اس وقت مسلمانوں کے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ جنگ کے لیے کوئی نیا محاذ کھولا جائے، اس لیے کہ ابھی مکہ فتح نہیں ہوا تھا، اور قریش کے ساتھ مقابلہ جاری تھا مدینہ منورہ کے اوپر ہر وقت خطرات منڈلاتے رہتے

تھے، ایسے حالات میں اگر شام کے علاقہ پر حملہ کریں گے تو چوں کہ وہ روم کے ماتحت تھا جس کا بادشاہ ہرقل تھا اس کو اپنا دشمن بنانا تھا جو اس زمانہ کی بڑی طاقت تھی، لیکن نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس بات کو گوارہ نہیں سمجھا کہ اس پر خاموشی اختیار کی جائے، آپ نے حضرات صحابہ کرامؓ کو ترغیب دے کر تین ہزار کا لشکر تیار فرمایا اور اس لشکر کا امیر حضرت زید بن حارثہؓ کو مقرر فرمایا جو نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منھ بولے بیٹے تھے، اور اس وقت یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اگر زید شہید ہو جائیں تو جعفر امیر ہوں گے، اور وہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے، اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر مسلمان مشورہ کر کے جس کو مقرر کریں وہ امیر ہو گا۔ جس وقت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ ارشاد فرما رہے تھے اس وقت ایک یہودی عالم یہ سن رہا تھا تو اس نے حضرت زید بن حارثہؓ سے کہا کہ: اے زید! بنی اسرائیل میں یہ دستور تھا کہ جب کوئی نبی کسی لشکر کو مقابلہ کے لیے روانہ کرتا تھا اور اس موقع پر اگر اس طرح کی بات کرتا کہ فلاں امیر رہے گا اور اگر وہ شہید ہو جائے تو فلاں امیر ہو گا، تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ جس کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی ہے وہ یقیناً شہید ہو گا، لہٰذا اگر یہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سچے نبی ہیں تو تمہاری شہادت یقینی ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ اگر میں ان کو یہ کہوں گا تو ڈر جائیں گے، حضرت زید بن حارثہؓ نے کہا: میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے نبی ہیں۔

خیر! آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس لشکر کو دشمن کی اُس بری حرکت کی سزا دینے کے لیے شام میں بلقاء کے علاقہ کی طرف روانہ فرمایا۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہلِ مدینہ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے لیے ثنیۃ الوداع تک گئے، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت زید کو یہ تاکید فرمائی تھی کہ جس جگہ پر حضرت

حارث بن عمیرؓ شہید کئے گئے ہیں وہاں سب سے پہلے جانا اور ان کو اسلام کی دعوت دینا، اگر وہ لوگ اسلام قبول کرلیں تو فبہا، اور اگر اسلام قبول نہ کریں تو پھر ان کا مقابلہ کرنا۔ جب لشکر مقامِ معان - ایک جگہ تھی جو بلقاء والے علاقہ کا ایک شہر تھا، وہاں - پہنچا تو ان کو معلوم ہوا کہ خود قیصرِ روم ہرقل بھی ایک لاکھ کا لشکر لے کر مقابلہ کے لیے آچکا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ لَخْم، جُذام، قَیْن، بَحراء وغیرہ عربی قبائل جو نصرانی مذہب اختیار کئے ہوئے تھے اور اس علاقے میں آباد تھے، ان سب کو بھی حاکمِ بُصریٰ نے جمع کر رکھا ہے جن کی تعداد بھی ایک لاکھ تھی، گویا ایک لاکھ کا مقامی لشکر اور ایک لاکھ کا رومی تربیت یافتہ لشکر؛ کُل دولاکھ کا لشکر مقابلہ پر جمع تھا، اس کے مقابلہ میں یہاں حضراتِ صحابہ تو کُل تین ہزار تھے۔ جب ان حضرات کو صورتِ حال کا اندازہ ہوا تو مشورہ کے لیے بیٹھے کہ کیا کریں؟ اور ان حالات میں ایسا مشورہ کرنا قرینِ قیاس بھی تھا۔ بعضوں نے یہ تجویز رکھی کہ نبی کریم ﷺ کو حالات سے آگاہ کیا جائے، اس کے بعد آپ جو ہدایت دیں اس کے مطابق عمل کریں گے، اگر آپ مناسب سمجھیں گے تو مدد کے واسطے کمک بھیجیں گے، یا پھر جو ارشاد فرماویں۔ جب سب لوگ اپنی بات کہہ چکے تو حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اُٹھے اور بڑی زوردار تقریر فرمائی، جس میں انہوں نے یوں کہا: اے قوم! کیا تم لوگ اسی چیز (یعنی شہادت) کو ناپسند کر رہے ہو جس کی تمنا میں اپنے گھر سے نکلے ہو، اور آج تک ہمارا دشمنوں کے ساتھ جو بھی مقابلہ ہوا وہ ہتھیاروں اور تعداد کی بنیاد پر نہیں ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے دین کی جو عزت ہمیں عطا فرما رکھی ہے اسی بنیاد پر ہوا ہے، اس لیے آگے بڑھو، دو میں سے ایک سعادت ضرور حاصل ہوگی، یا تو دشمن پر غلبہ ہوگا یا پھر شہادت نصیب ہوگی۔ ان کی یہ بات سن کر

سب نے کہا کہ: ٹھیک ہے، چلو؛ آگے بڑھو۔ سبھی آگے بڑھے، مقامِ موتہ میں پہنچے جو قریب ہی تھا، اور دشمن کے دولاکھ کے لشکر سے مقابلہ ہوا۔ دورانِ جنگ حضرت زید بن حارثہؓ لڑتے لڑتے شہید ہوئے۔

ان کے شہید ہونے کے بعد جھنڈا حضرت جعفرؓ نے اُٹھایا، وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر مقابلہ کر رہے تھے کہ دشمنوں نے چاروں طرف سے تلواروں، نیزوں اور تیروں سے ان پر ایسا حملہ کیا کہ گھوڑے کا آگے بڑھنا مشکل ہو گیا تو وہ اپنے گھوڑے سے اُتر گئے اور پیدل آگے بڑھنا شروع کیا، ان کے دائیں ہاتھ میں جھنڈا تھا، کسی نے ان کا وہ ہاتھ کاٹ دیا تو جھنڈا بائیں ہاتھ میں پکڑ لیا، جب وہ بھی کٹ گیا تو دونوں بازؤوں کو جوڑ کر جھنڈے کو تھامنے کی کوشش کی اور اسی حال میں شہید ہو گئے۔ ان کے متعلق بخاری شریف میں موجود ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ شہادت کے بعد ان کے جسم پر شمار کیا گیا تو تلوار، نیزے اور تیر وغیرہ کے نوّے (۹۰) زخم کے نشان تھے جن میں سے ایک بھی پیٹھ پر نہیں تھا، سب آگے ہی تھے۔

ان کے شہید ہونے کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے جھنڈا اُٹھایا اور آگے بڑھے، بہت وقت سے انہوں نے کچھ کھایا نہیں تھا، ان کے کسی عزیز نے ان کو گوشت کی ایک بوٹی دی کہ آپ یہ کھالو تاکہ کچھ طاقت آجائے، وہ کھا ہی رہے تھے کہ مسلمانوں کے لشکر پر دشمن کے حلّے کی زوردار آواز آئی تو اپنے نفس کو ملامت کرنے لگے کہ لوگ تو جہاد میں مشغول ہیں اور تو یہ کھانے میں

لگاہوا ہے؟وہ بوٹی پھینک دی اور آگے بڑھے اور مقابلہ میں مشغول ہوگئے یہاں تک کہ وہ بھی شہید ہوگئے۔

ان کے شہید ہونے کے بعد ایک انصاری صحابی حضرت ثابت بن اُخرمؓ آگے بڑھے اورانہوں نے جھنڈا گرنے نہیں دیا، بلکہ فوراً اُٹھالیااور کہا کسی کوامیر مقرر کروتاکہ میں اس کو یہ دیدوں۔لوگوں نے کہا: آپ ہی ہمارے امیر ہیں، انہوں نے کہا: نہیں! میں امیر بننے کے لائق نہیں ہوں، اورانہوں نے ہی وہ جھنڈا حضرت خالد بن ولیدؓ کے ہاتھوں میں دیا، تولوگوں نے انہیں کوامیر مقرر کیا۔

یہ سب معاملہ یہاں میدانِ موتہ میں ہورہاتھااوراللہ تعالیٰ نے اس علاقہ کا پورا نقشہ نبیٔ کریم (ﷺ) کی نگاہوں کے سامنے کھول دیا، چناں چہ اس وقت آپ نے ”الصلوٰۃ جامعۃ“کا اعلان کرواکر صحابہ کو مسجد میں جمع فرمایا، منبرپر تشریف فرماہوئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بیان فرمارہے تھے کہ:زید آگے بڑھے اور لڑتے لڑتے شہید ہوگئے اور جنت میں داخل ہوئے۔پھر جھنڈا جعفر نے اُٹھایا، ان کا دایاں ہاتھ کٹ گیاتو جھنڈا بائیں ہاتھ میں لیا، وہ بھی کٹ گیاتو دونوں ہاتھوں سے تھاما، پھروہ بھی شہید ہوگئے اور جنت میں داخل ہوئے، اوران کے دونوں بازوؤں کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جنت میں دوبازوعطافرمائے جس سے وہ جنت میں اُڑتے پھرتے ہیں۔پھر عبداللہ بن رواحہ نے جھنڈا اُٹھایا، وہ بھی آگے بڑھے اوردشمن کامقابلہ کیا، یہ فرماکر حضور(ﷺ) کچھ دیر ٹھہر گئے، پھر فرمایا: وہ بھی شہید ہوگئے۔پھر ارشاد فرمایا کہ: اب جھنڈا اللہ کی تلواروں میں ایک تلوار کے ہاتھ میں پہنچاہے، اللہ ان کے ہاتھوں پر مسلمانوں کو فتح دیں گے۔

چوں کہ حضرت خالد بن ولیدؓ میدانِ جنگ کے بڑے ماہر تھے، انہوں ایسی تدبیر اختیار کی کہ دشمن بھاگنے پر مجبور ہوا۔ انہوں نے شکل یہ اختیار کی کہ دوسرے روز مسلمانوں کے لشکر کی ترتیب ہی بدل دی، جو آگے تھے ان کو پیچھے کر دیا، پیچھے والوں کو آگے کر دیا، دائیں والوں کو بائیں اور بائیں والوں دائیں کر دیا۔ اور لشکر کا تھوڑا سا حصہ الگ کر کے رات کو ایک جگہ چھپا دیا کہ جب ہماری لڑائی چل رہی ہو، عین اس وقت تم لوگ ظاہر ہو کر آنا تا کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ باہر سے مدد آگئی ہے، اس تدبیر کا رومیوں پر بڑا اثر ہوا اور میدان چھوڑ کر کے بھاگ گئے۔

اب اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دو لاکھ کے مقابلہ میں تین ہزار تھے اور اس میں صرف بارہ مسلمان شہید ہوئے تھے۔ اور حضرت خالد بن ولیدؓ فرماتے ہیں کہ اس روز میرے ہاتھ میں نو(۹) تلواریں ٹوٹیں۔ اور یہ بات یاد رکھنا کہ یہ تلواریں کوئی پتھر پر مار کر نہیں توڑی تھیں، بلکہ دشمنوں کی گردنیں کاٹتے کاٹتے ٹوٹی تھیں۔ اس سے ان حضرات کی بہادری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے! ہم لوگ تو ایک تلوار لے کر پتھر پر توڑنے جائیں تو دن بھر تو کیا؛ مہینہ بھر ہمارا ہاتھ درد کرتا رہے گا۔ فرماتے ہیں کہ اخیر میں میرے ہاتھ میں ایک یمنی تلوار بچی۔

دوہرا اجر؛ورنہ ایک ثواب

حدیث ۱۸۵۶:-

وعن عمرو بن العاص -رضي الله عنه-: أَنَّه سَمِعَ رسولَ اللهِ (صلى الله عليه وسلم) يقولُ: ((إِذَا حَكَمَ الحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ، ثُمَّ أَصَابَ، فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ وَاجْتَهَدَ، فَأَخْطَأَ، فَلَهُ أَجْرٌ)) (متفق عَلَيْه)

ترجمہ:- حضرت عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ انہوں نے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: جب کسی حاکم نے فیصلہ کیا، اور اس کے لیے اپنی پوری صلاحیت اور غور فکر کو استعمال کیا جس کے نتیجہ میں اس نے صحیح فیصلہ کیا؛ تو اس کو دوہرا (ڈبل) ثواب ملے گا، اور اگر فیصلہ کیا اور اپنی پوری صلاحیت کو استعمال کیا لیکن اس میں وہ خطا کھا گیا تو اس کو ایک ثواب ملے گا۔

افادات:- یہاں علماء نے لکھا ہے کہ فیصلہ کرنے والے کے لیے جو شرائط رکھے گئے ہیں ان ساری چیزوں سے وہ واقف ہو، یعنی اس کو قرآن واحادیث کا علم ہو، اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) و حضراتِ خلفاء راشدین اور دیگر حضرات صحابہ نے جو فیصلے کئے اور ان فیصلوں کے جو طریقے اسلام نے بتلائے ہیں ان کا اس کو علم ہو۔ یعنی فیصلہ کرنے کے لیے جن شرعی کمالات وصلاحیتوں کی ضرورت ہے وہ سارے اس کے اندر موجود ہیں، اور انہیں کو استعمال کرتے ہوئے پوری سمجھ اور پورے غور فکر کے بعد اس نے کوئی فیصلہ کیا اور صحیح فیصلہ کیا تو دوہرا ثواب (یعنی ایک تو اس محنت کا، اور دوسرا اس صحیح فیصلہ کرنے کا) ملے گا۔ اور خدانہ کرے اس میں اگر کوئی غلطی ہوگئی تب بھی ایک ثواب (یعنی جو محنت کی ہے اس کا) تو ملے گا۔

اور اگر وہ شرائط اس میں موجود نہیں ہیں یعنی وہ صلاحیتیں اور کمالات اس میں نہیں پائے جاتے تو اس کے لیے فیصلہ کرنا ہی جائز نہیں۔ اگر اس صورت میں وہ فیصلہ کرے گا تو گنہگار ہو گا، بلکہ اگر صحیح فیصلہ کرے گا تب بھی گنہگار ہو گا۔ اس لیے کہ اس کو شریعت کی طرف سے فیصلہ کرنے کا اختیار ہی نہیں دیا گیا ہے۔

بخار اور اس کا علاج

حدیث ۱۸۵۷:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها: أنَّ النبيَّ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) قَالَ: ((الحُمَّى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَأَبْرِدُوهَا بِالْمَاءِ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے ارشاد فرمایا: بخار جہنم کی لپٹ میں سے ہے، اس کو پانی سے ٹھنڈا کرو۔

افادات:- آپ (صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) نے بخار کے علاج کے طور پر پانی کو استعمال کرنے کا فرمایا ہے، لیکن بعض لوگوں نے اس موقعہ پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ بخار کی حالت میں ٹھنڈے پانی کا استعمال بجائے مفید ہونے کے مضر ہے۔

تو اس کی مختلف تاویلات کی گئی ہیں۔ بعض حضرات نے تو یوں کہ کہا کہ: یہاں پانی استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ پانی کا صدقہ کرو۔ کہیں کنواں کھدوا دو، کہیں بورنگ کروا دیا، کہیں پانی کا کسی طریقہ سے بھی انتظام کروا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ صدقہ کے نتیجہ میں بلا دور ہوتی ہے اور آدمی بیماری سے شفا

پاتا ہے، تو گویا پانی والا صدقہ اس کے لیے شفا کا ذریعہ بنے گا۔ بعضوں نے کہا: بخاری شریف ہی میں موجود ہے کہ ایک مرتبہ ایک بیمار عورت کو لایا گیا تو حضرت اسماء (رضی اللہ عنہا) نے پانی پر دم کر کے اس عورت کے گریبان میں چھڑکا۔ گویا کچھ پڑھ کر پانی پر دَم کر کے اس کو چھڑکنا مراد ہے۔

بعضوں نے کہا: اس بیمار کو خوب لحاف اور چادر اُوڑھا دی جائے، جب وہ اس میں رہے گا تو اس کی وجہ سے پسینہ چھوٹے گا اور بخار اتر جائے گا۔ تو پانی سے پسینے کا پانی مراد ہے۔

لیکن راجح قول یہ ہے کہ اس سے پانی ہی مراد ہے، اور بخار مختلف قسم کے ہوتے ہیں، عرب کے علاقہ میں گرمی کی شدت کی وجہ سے لُو لگنے سے بخار ہوتا ہے، اور اس بخار کے متعلق اطباء بھی یہی کہتے ہیں کہ اگر ٹھنڈا پانی استعمال کیا جائے تو بیمار صحتیاب ہو جاتا ہے۔ گویا اس علاقہ میں جو مخصوص بخار ہوا کرتا تھا اس کے لیے ٹھنڈا پانی ہی مفید ہے۔

میت کے ذمہ فرائض باقی ہوں تو؟

حدیث ۱۸۵۸:-

وعنها رَضِيَ اللهُ عنها، عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: ((مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ، صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ.)) (متفق عَلَيْهِ)

وَالْمُخْتَارُ جَوَازُ الصَّوْمِ عَمَّنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ صَوْمٌ لِهٰذَا الْحَدِيثِ. وَالْمُرادُ بالوَلِيِّ: القَرِيبُ وَارِثاً كَانَ أَوْ غَيْرَ وَارِثٍ.

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی روایت ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس آدمی کا انتقال ہو گیا اور اس کے ذمہ روزہ باقی ہو تو اس کی طرف سے اس کا ولی (رشتہ دار) وہ روزہ رکھے۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: مرنے والے کے ذمہ اگر روزے باقی ہوں اور اس کا رشتہ دار روزہ رکھ لے؛ تو درست ہو جائے گا۔ اسی قول کو مختار قرار دیا گیا ہے۔

افادات:- دراصل یہ مسئلہ ائمہ کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ ظاہر یہ، امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) اور امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کا قولِ قدیم اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ولی کا روزہ رکھ لینا درست ہے۔ لیکن امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کا قولِ جدید، امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ)، امام ابو حنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) اور دیگر حضرات کا مسلک یہ ہے کہ جس طرح کسی کی نمازیں باقی ہوں تو اس کے انتقال کے بعد اس کے ولی یا رشتہ دار کا اس کی طرف سے نمازیں پڑھنا کافی نہیں ہے، اسی طرح روزہ میں بھی ہے۔

تو پھر اشکال ہوتا ہے کہ اس روایت کا مطلب کیا ہے؟ تو اس روایت کا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کا ولی اس کی طرف سے اس روزے کا فدیہ ادا کرے تو وہ فدیہ اس روزہ کی طرف سے کافی ہو جائے گا، اسی کو "صَامَ عَنْهُ وَلِيُّهُ" سے تعبیر کیا ہے۔

امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) چوں کہ شافعی المسلک ہیں اس لیے ان کا اور شوافع میں سے امام بیہقی (رحمۃ اللہ علیہ) کا نظریہ اس سلسلہ میں امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کے قولِ قدیم کے مطابق ہے، لیکن خود مشائخ شافعیہ کا یہ مسلک نہیں ہے جیسا کہ اوپر بتایا کہ امام شافعی (رحمۃ اللہ علیہ) کا قولِ جدید یہی ہے کہ روزہ رکھنا کافی نہیں ہے، بلکہ فدیہ ادا کیا جائے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے حضرت عائشہؓ کی ناراضگی کا قصہ

حدیث ۱۸۵۹:-

وعن عوف بن مالِك بن الطُّفَيلِ: أنَّ عائشة رَضِيَ اللهُ عنها حُدِّثَتْ أنَّ عبدَ اللهِ بن الزبير رضى الله عنهما، قَالَ فی بَيْعٍ أَوْ عطاءٍ أعْطَتْهُ عَائِشَةُ رَضِيَ اللهُ تَعَالَى عنها: واللهِ لَتَنْتَهِيَنَّ عَائِشَةُ أَوْ لأَحْجُرَنَّ عَلَيْهَا، قالَتْ: أَهُوَ قَالَ هَذَا؟ قالوا: نَعَمْ. قَالَتْ: هُوَ للهِ عَلَيَّ نَذْرٌ أنْ لا أُكَلِّمَ ابْنَ الزُّبَيْرِ أَبداً، فَاسْتَشْفَعَ ابْنُ الزُّبَيْرِ إِلَيْهَا حِيْنَ طَالَتِ الهِجْرَةُ. فَقَالَتْ: لاَ، واللهِ لاَ أُشَفِّعُ فِيهِ أبداً، وَلاَ أَتَحَنَّثُ إِلَى نَذْرِي. فَلَمَّا طَالَ ذٰلِكَ عَلَى ابْنِ الزُّبَيْرِ كَلَّمَ المِسْوَرَ بْنَ مَخْرَمَةَ، وَعبدَ الرحمانِ ابْنَ الأَسْوَدِ بْنِ عَبْدِ يَغُوث وقَالَ لَهُمَا: أَنْشُدُكُمَا اللهَ لَمَا أَدْخَلْتُمَانِي عَلَى عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عنها، فَإِنَّهَا لاَ يَحِلُّ لَهَا أنْ تَنْذِرَ قَطِيعَتِي، فَأَقْبَلَ بِهِ المِسْوَرُ، وَعَبدُ الرحمانِ حَتَّى اسْتَأْذَنَا عَلَى عَائِشَةَ فَقَالاَ: السَّلاَمُ عَلَيْكِ وَرَحْمَةُ اللهِ وبَرَكَاتُهُ، أَنَدْخُلُ؟ قالت عَائِشَةُ: ادْخُلُوا. قالوا: كُلُّنَا؟ قالتْ: نَعَمْ ادْخُلُوا كُلُّكُمْ، وَلاَ تَعْلَمُ أَنَّ معهُمَا ابْنَ الزُّبَيْرِ، فَلَمَّا دَخَلُوا دَخَلَ ابْنُ الزُّبَيْرِ الحِجَابَ فَاعْتَنَقَ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عنها، وَطَفِقَ يُنَاشِدُهَا وَيَبْكِي، وَطَفِقَ المِسْوَرُ، وَعَبدُ الرَّحمانِ يُنَاشِدَانِهَا إِلاَّ كَلَّمَتْهُ وَقَبِلَتْ مِنْهُ، وَيَقُولاَنِ: إِنَّ النَّبِيَّ (صلى الله عليه وسلم) نَهَى عَمَّا قَدْ عَلِمْتِ مِنَ الهِجْرَةِ؛ وَلاَ يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فوقَ ثَلاَثِ لَيَالٍ، فَلَمَّا أَكْثَرُوا عَلَى عَائِشَةَ مِنَ التَّذْكِرَةِ وَالتَّحْرِيجِ طَفِقَتْ تُذَكِّرُهُمَا وَتَبْكِي، وَتَقُولُ: إِنِّي نَذَرْتُ وَالنَّذْرُ شَدِيدٌ، فَلَمْ يَزَالاَ بِهَا حَتَّى كَلَّمَتِ ابْنَ الزُّبَيْرِ، وأَعْتَقَتْ فِي نَذْرِهَا ذٰلِكَ أَرْبَعِينَ رَقَبَةً، وَكَانَتْ تَذْكُرُ نَذْرَهَا بَعدَ ذٰلِكَ فَتَبكِي حَتَّى تَبلَّ دُمُوعُهَا خِمَارَهَا. (رواه البخاری)

اس روایت میں ایک واقعہ بیان کیا ہے۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عوف بن مالک بن طفیل (جو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے بھتیجے کے لڑکے تھے) فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کو بتلایا گیا کہ عبد اللہ بن زبیرؓ نے -ان عطیات کے سلسلہ میں جو حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے دیئے تھے- یہ کہا ہے: حضرت عائشہؓ اپنے اس طرز عمل سے باز آجائیں، ورنہ میں بطورِ حاکم ان پر پابندی لگادوں گا کہ ان کا کوئی تصرف اور معاملہ درست نہ ہو۔ (جب حضرت عائشہؓ کے کان میں یہ بات پڑی تو ان کو یقین نہیں آیا کہ میرے متعلق وہ ایسا کہہ سکتے ہیں) اس لیے انہوں نے کہا: کیا انہوں نے میرے متعلق ایسا کہا ہے؟ لوگوں نے بتایا: جی ہاں! کہا ہے (حضرت عائشہؓ کو ان کی اس بات پر بڑی ناگواری ہوئی) کہنے لگیں: اگر ایسا ہے تو میرے اوپر اللہ کے واسطے نذر ہے (یعنی پھر تو مَیں بھی قسم کھاتی ہوں) کہ میں ابن زبیرؓ سے کبھی بات نہیں کروں گی (اب وہ حضرت عائشہؓ پر کیا پابندی لگاتے، اُلٹی ان پر ہی پابندی لگ گئی۔ اب جب بھی وہ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اندر آنے کی اجازت چاہتے تو اجازت نہ ملتی) جب حضرت عائشہؓ کی طرف سے ان کے ساتھ یہ معاملہ طول پکڑ گیا، اور ان سے یہ جدائی اور قطعِ تعلق برداشت نہیں ہوا تو انہوں نے لوگوں سے سفارشیں کروائیں (کہ جاؤ! میری طرف سے عرض کرو کہ میں معافی مانگتا ہوں) حضرت عائشہؓ نے کہا: اللہ کی قسم! میں کسی کی سفارش قبول نہیں کروں گی، اور نہ میں اپنی نذر توڑوں گی۔ جب زمانہ اور طویل ہوگیا تو حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے مسور بن مخرمہؓ اور عبد الرحمن بن اسود بن عبد یغوثؒ سے اس سلسلہ میں بات چیت کی (یہ دونوں اس زمانہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے اور اخوال الرسول کہے جاتے تھے، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ننھیالی رشتہ دار تھے۔ قبیلۂ بنی زہرہ سے ان کا تعلق تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی والدہ حضرت آمنہ بھی اسی قبیلۂ بنو زہرہ سے تعلق رکھتی تھیں، اس لیے قبیلۂ بنو زہرہ کا جو بھی آدمی ہوتا تھا وہ خال الرسول سے یاد کیا جاتا تھا۔ جیسے: ہمارے یہاں بھی بولتے ہیں کہ یہ ہمارے رشتہ

کے ماموں ہیں۔ حضرت عائشہؓ بھی ان لوگوں کا بڑا خیال رکھتی تھیں) حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے ان سے کہا: میں تمہیں اللہ کی قسم کی دے کر درخواست کرتا ہوں کہ مجھے کسی بھی طرح حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچا دو (کسی طرح کی بھی تدبیر کرو اور مجھے لے جاؤ۔ اور ہو سکتا تھا کہ ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا کہ انہوں نے تو قسم کھالی ہے، اب ہم تمہیں کیسے ان کے پاس لے جائیں، اس لیے) انہوں نے کہا: حضرت عائشہؓ کا میرے ساتھ اس طرح قطع تعلق کرنا کسی حال میں بھی درست نہیں (اس لیے کہ میں تو ان کا بھانجہ ہوں۔ اور اُدھر حضرت عائشہؓ نے ان کے ساتھ جو قطع تعلق کیا تھا وہ اللہ واسطے تھا، اس لیے کہ حضرت عائشہؓ جو کثرت سے مال خرچ کرتی تھیں وہ اپنی نفسانیت اور اغراض کے لیے نہیں ہوتا تھا، بلکہ اللہ کے راستہ میں ہوتا تھا، اور اس پر حضرت زبیرؓ نے یہ جملہ کہا تھا کہ میں پابندی لگا دوں گا۔ تو ان کا یہ جملہ حضرت عائشہؓ کو ناگوار گزرا تھا کہ میں نے کونسا گناہ کا کام کیا تھا جو انہوں نے یہ بات کہی، اور وہ بھی میرا بھانجہ ہو کر، جبکہ میں بھی ان کے ساتھ محبت و شفقت کا سلوک کرتی ہوں، اس لیے ناراض ہوئیں) چناں چہ انہوں نے ایک تدبیر کی، یہ دونوں حضرات مسور بن مخرمہؓ اور عبد الرحمن بن اسودؓ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی خدمت میں ان کے مکان پر حاضر ہوئے اور حضرت عائشہؓ سے اجازت چاہی (اس لیے کہ جو بھی آتا تھا وہ باہر ہی سے اجازت چاہتا تھا کہ ہم اندر آسکتے ہیں) ان دونوں نے سلام کیا اور کہا: کیا ہم اندر آسکتے ہیں؟ (ان لوگوں نے یہ کیا تھا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو اپنے بیچ میں رکھا تھا اور اپنی چادر میں اس طرح لپیٹ لیا تھا کہ وہ نظر نہ آئیں اور حضرت عائشہؓ سے اجازت مانگی کہ ہم آسکتے ہیں؟ انہوں نے کہا: آسکتے ہو۔) پوچھا: ہم سب آجائیں؟ کہا: ہاں! سب آجاؤ (حضرت عائشہؓ کو تو معلوم نہیں تھا کہ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ بیچ میں

لپٹے ہوئے ہیں۔ جب حضرت عائشہؓ نے کہا کہ سب آجاؤ، تو عبد اللہ بن زبیرؓ کے لیے بھی گنجائش نکل آئی) چناں چہ وہ اندر داخل ہوگئے (اب گھر میں طریقہ یہ تھا کہ آنے والوں کے لیے کھلی جگہ تھی، وہاں آکر لوگ بیٹھتے تھے اور حضرت عائشہؓ پردہ کے پیچھے ہوتی تھیں، کسی کو پوچھنا ہوتا، کچھ بات چیت کرنی ہوتی تو وہیں سے پردہ میں رہ کر بات چیت کرلیتے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ تو بھانجے تھے اس لیے پردہ کا سوال نہیں تھا) جب یہ لوگ گھر میں داخل ہوگئے تو عبد اللہ بن زبیرؓ پردہ کے اندر گھس گئے اور حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے لپٹ گئے، اور قسمیں دینے گے اور رونے لگے (کہ میں اللہ کا واسطہ دیتا ہوں، معاف کردو) اور یہ دونوں حضرات بھی پردہ کے پیچھے سے حضرت عائشہؓ کو اللہ کا واسطہ دیتے رہے کہ آپ ان کو معاف کردیں، ان کا عذر قبول کرلیں (یہ دونوں سفارش کر رہے تھے اور وہ اندر معافی مانگ رہے تھے) یہ دونوں حضرات کہتے تھے کہ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کسی کے ساتھ قطع تعلق کرنے سے منع کیا ہے، اور (یہ بھی معلوم ہے کہ) کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق رکھے۔ یہ دونوں حضرات دیر تک حضرت عائشہؓ کو ایسی ترغیبی اور ترہیبی باتیں سناتے رہے اور ان کو یہ سب یاد دلایا اور حضرت عائشہؓ بھی ان کو نصیحت کرتی رہیں اور روتی رہیں، اور جواب میں یوں کہتی رہیں کہ (تمہیں معلوم ہی ہے کہ) میں نے تو نذر مان لی ہے، اس لیے میرے لیے ضروری ہے کہ میں ان سے بات نہ کروں، اور نذر کا معاملہ بڑا سخت ہوتا ہے (ان حضرات کا حال یہی تھا کہ اللہ کا نام لے کر جو بات کہی جاتی تھی اس کے معاملہ میں بہت ڈرتے رہتے تھے) لیکن یہ دونوں حضرات بھی برابر سمجھاتے رہے، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ نے ابن زبیرؓ سے بات کرلی اور ان کو معاف کردیا۔ جب عبد اللہ بن زبیرؓ سے بات کرلی تو ان کی قسم ٹوٹ گئی جس کی تلافی میں حضرت عائشہؓ نے چالیس غلام آزاد کئے (حالاں کہ قسم توڑنے پر کفارہ میں ایک غلام آزاد کرنا پڑتا ہے،

یا کھانا کھلانا پڑتا ہے) اور اس کے بعد جب بھی حضرت عائشہؓ اپنی نذر والی بات یاد کرتی تھیں تو بہت روتی تھیں (کہ میں نے ایک نذر توڑدی، اور اتنا روتیں کہ) آنسوؤں سے ان کی اوڑھنی تر ہو جاتی تھی (گویا اللہ کا نام لے کر میں نے جو بات کہی تھی، اس کی پابندی نہیں کر سکی۔)

افادات:–عبد اللہ بن زبیرؓ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے بھانجے ہوتے ہیں، ان کی والدہ حضرت اسماء (رضی اللہ عنہا) حضرت ابو بکر صدیقؓ کی صاحبزادی ہیں۔ ویسے تو دونوں کی والدہ الگ الگ ہیں، گویا حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماءؓ دونوں باپ شریک بہنیں تھیں۔ حضرت عائشہؓ کی والدہ کا نام اُم رومان ہے، اور حضرت اسماء کی والدہ کا نام قَتیلہ بنت عبد العزیٰ عامریہ ہے۔ انہی حضرت اسماءؓ کے صاحبزادے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ ہیں۔

روایتوں میں آتا ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کے بڑے لاڈلے تھے، حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حضرت ابو بکرؓ کے بعد حضرت عائشہؓ ان سے بہت زیادہ محبت کا معاملہ کرتی تھیں، اور یہ بھی اپنی سعادت مندی کی وجہ سے حضرت عائشہؓ کے ساتھ بڑے احسان کا سلوک کرتے تھے۔ اور حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں بطورِ ہدیہ کثرت سے مال بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن حضرت عائشہؓ کی عادتِ شریفہ یہ تھی کوئی مال اپنے پاس جمع نہیں رکھتی تھیں، جو بھی آتا فوراً ضرورتمندوں پر خرچ کر دیا کرتی تھیں۔

حضرت شیخ (رحمۃ اللہ علیہ) نے فضائلِ صدقات میں واقعہ لکھا ہے کہ: ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے پاس بہت بڑی رقم آئی اور حضرت عائشہؓ نے سب تقسیم کر ڈالی، حالاں کہ اس دن وہ روزہ سے تھیں، افطار

کے لیے گھر میں کچھ نہیں تھا، باندی نے کہا: ایک آدھ درہم رکھ لیتیں تو افطار کے لیے کچھ سامان آجاتا۔ کہنے لگیں کہ: اللہ کی بندی! پہلے سے بولا ہوتا تو رکھ لیتی، مجھے کیا معلوم کہ گھر کے اندر کچھ بھی نہیں۔ یہ ان کا حال تھا۔ اور چوں کہ ان کا بہت بڑا وظیفہ بیت المال میں سے مقرر تھا، اور ہر زمانہ میں خلفاء اور دیگر لوگ ان کی خدمت میں ہدایا بھیجتے رہتے تھے۔ لیکن یہ کثرت سے خرچ کرنے والی تھیں، ایک پائی بھی اپنے لیے نہیں رکھتی تھیں۔

یہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ امیر المؤمنین تھے، وہ ان کے پاس کثرت سے مال بھیجا کرتے تھے اور ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ حضرت عائشہؓ اس کو اپنی ضرورتوں میں استعمال کریں۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کو پتہ چلا کہ حضرت عائشہؓ کو ضرورت ہے اس لیے انہوں نے ایک بڑی رقم ان کے پاس ہدیہ میں بھیجی، لیکن حضرت عائشہؓ نے وہ پوری رقم ہدیہ اور صدقہ کے اندر خرچ کر دی، حالاں کہ وہ اس نیت سے بھیجتے تھے کہ حضرت عائشہؓ اس کو اپنی ضرورت میں خرچ کریں۔ جب کسی نے ان کو بتایا کہ آپ کی دی ہوئی رقم تو دوسروں پر خرچ کر دی اور اب خود تنگی اٹھا رہی ہیں، تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو نہایت گراں گزرا اور ان کی زبان سے یہ جملہ نکلا کہ: حضرت عائشہؓ اپنے اس طرزِ عمل سے باز آجائیں، ورنہ میں بطورِ حاکم ان پر پابندی لگادوں گا کہ ان کا کوئی تصرف اور کوئی معاملہ درست نہ ہو۔

حاکم کی طرف سے بعض مواقع ایسے آتے ہیں کہ کسی آدمی پر اس طرح کی پابندی لگادی جاتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی مقروض ہے، لوگوں کے حقوق اس پر ہیں وہ ادا نہیں کرتا، تو حاکم اس طرح کی پابندی لگادیتا ہے۔ اور حاکم کی طرف سے کسی آدمی کے معاملات میں اور کسی چیز کے خرید و فروخت

میں اور اس کے دینے لینے پر پابندی عائد کی جاتی ہے اس کو شریعت کی اصطلاح ''حجر'' کہتے ہیں۔ کتب فقہ میں مستقل ایک عنوان ''کتاب الحجر'' قائم کیا جاتا ہے جہاں اس کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی تمنا

بعض روایتوں میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ کہتی تھیں کہ: کاش! میں نے یہ کہنے کے بجائے یوں کہا ہوتا کہ اگر بات کروں تو میرے اوپر اتنا لازم ہو گا۔ مطلب یہ کہ میں اس سے بات کروں تو میرے لیے ضروری ہے ایک لاکھ کا صدقہ کروں، یا میں اس سے بات کروں تو میرے لیے ضروری ہے کہ دس روزے رکھوں۔ حضرت عائشہؓ یہ تمنا کرتی تھی کہ: کاش! اس کے بجائے یوں کہا ہوتا۔ تو کم سے کم دل کو تو اطمینان ہوتا میں نے جو کہا اس کے مطابق نذر توڑنے کی صورت میں دس روزے رکھے۔ حالاں کہ انہوں نے مطلق نذر مانی تھی، اور جیسا کہ میں نے بتلایا وہ قسم کے حکم میں ہے، اور اس کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرنا کافی ہے، لیکن پھر بھی وہ حضرات اللہ تعالیٰ کے نام پر کہی ہوئی بات کے معاملہ میں بہت محتاط تھے۔

حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنی امت کے بارے میں خدشہ

حدیث ۱۸۶۰:-

وعن عُقْبَةَ بن عامرٍ رضی الله عنه: أَنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) خَرَجَ إِلَى قَتْلَى أُحُدٍ، فَصَلَّى عَلَيْهِمْ بَعْدَ ثَمَانِ سِنِينَ كَالْمُوَدِّعِ لِلأَحْيَاءِ وَالأَمْوَاتِ، ثُمَّ طَلَعَ إِلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ: ((إِنِّي بَيْنَ أَيْدِيكُمْ فَرَطٌ وَأَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ

وإنَّ مَوْعِدَكُمُ الحَوْضُ، وإنِّي لَأَنْظُرُ إِلَيْهِ مِنْ مَقَامِي هَذَا، أَلَا وإنِّي لَسْتُ أَخْشَى عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا، وَلَكِنْ أَخْشَى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوهَا)) قَالَ: فَكَانَتْ آخِرَ نَظْرَةٍ نَظَرْتُهَا إِلَى رَسُولِ اللهِ (ﷺ). (متفق عَلَيْهِ)

وفي رواية: ((وَلَكِنِّي أَخْشَى عَلَيْكُمُ الدُّنْيَا أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا، وَتَقْتَتِلُوا فَتَهْلِكُوا كما هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ)). قَالَ عُقْبَةُ: فكانَ آخِرَ مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ (ﷺ) عَلَى المِنْبَرِ.

وفي روايةٍ قَالَ: ((إنِّي فَرَطٌ لَكُمْ وَأَنَا شَهِيدٌ عَلَيْكُمْ وإنِّي واللهِ لَأَنْظُرُ إِلَى حَوْضِي الآنَ، وإنِّي أُعْطِيتُ مَفَاتِيحَ خَزَائِنِ الأَرْضِ، أَوْ مَفَاتِيحَ الأَرْضِ، وإنِّي واللهِ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تُشْرِكُوا بَعْدِي، وَلَكِنْ أَخَافُ عَلَيْكُمْ أَنْ تَنَافَسُوا فِيهَا)).

وَالمُرَادُ بِالصَّلَاةِ عَلَى قَتْلَى أُحُدٍ: الدُّعَاءُ لَهُمْ، لَا الصَّلَاةُ المَعْرُوفَةُ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عقبہ عامرؓ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) شہدائے اُحد کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور ان پر آٹھ سال کے بعد نمازِ جنازہ پڑھی، گویا کہ آپ زندوں اور مردوں کو الوداع کہہ رہے تھے (شہدائے اُحد کی زیارت کرکے واپس آنے کے بعد) آپ (ﷺ) منبر پر تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: میں تم سے پہلے تمہارے لیے تیاری کرنے جارہا ہوں اور میں تم پر گواہ ہوؤں گا (یعنی تمہارے نیک اعمال کے متعلق اور تم لوگوں نے اللہ کے راستہ میں جو مالی وجانی قربانیاں دی ہیں اور دین کے لیے جو مشقتیں اٹھائی ہیں، ان سب باتوں پر قیامت کے روز میں گواہی دوں گا) اور تم سے حوضِ کوثر پر ملاقات کا وعدہ ہے، میں اس وقت اپنی اس جگہ سے حوضِ کوثر کو دیکھ رہا ہوں (گویا اللہ تعالیٰ نے آپ (ﷺ) پر اس وقت حوضِ کوثر منکشف کردیا تھا) اور سنو! مجھے تمہارے متعلق یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم شرک میں مبتلا ہوجاؤ گے، لیکن تمہارے متعلق یہ ڈر ہے کہ تم دنیا حاصل کرنے میں مشغول ہوجاؤ گے اور اس میں ایک

دوسرے سے مقابلہ اور ریس کروگے (حضرت عقبہ بن عامرؓ جب یہ واقعہ بیان کر رہے تھے اس وقت کہتے ہیں کہ) یہی آپ (ﷺ) کی میں نے آخری زیارت کی (اس کے بعد آپ کے دیدار اور زیارت کی نوبت نہیں آئی، یعنی حضور (ﷺ) کا انتقال ہوگیا)۔

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ: لیکن مجھے تم لوگوں کے متعلق دنیا کا یہ ڈر ہے کہ دنیا کے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ اور ریس کروگے، اور آپس میں ایک دوسرے سے لڑوگے اور اسی طرح ہلاکت میں پڑوگے جیسے تم سے پہلے لوگ ہلاکت میں پڑے۔

ایک روایت میں ہے کہ: میں تم سے پہلے تیاری کے لیے جا رہا ہوں، میں تمہارے اوپر گواہ ہوں۔ میں اس وقت اپنے حوض کو دیکھ رہا ہوں۔ مجھے زمین کے خزانوں کی کنجیاں دی گئی ہیں (دوسری روایت میں ہے: تم خزانوں کو حاصل کروگے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے حضور (ﷺ) سے فرمایا کہ: آپ کی امت کو خزانے دیئے جائیں گے اور فتوحات ہوں گی) اور اللہ کی قسم! میں تم لوگوں پر اس بات سے نہیں ڈرتا کہ تم لوگ شرک میں مبتلا ہوگے (یعنی امت اجتماعی طور پر شرک میں مبتلا نہیں ہوگی، ہاں! کچھ لوگ اس میں پھنس گئے تو الگ بات ہے) لیکن مجھے اس بات کا ڈر ہے کہ دنیا کی خاطر ایک دوسرے سے آپس میں مقابلہ کروگے اور اسی میں ہلاک اور برباد ہوجاؤگے۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: یہاں جو ''صلوٰۃ'' کا لفظ آیا ہے، اس سے معروف نمازِ جنازہ مراد نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد شہداء کے لیے دعا ہے۔

افادات:- امام نووی (رحمۃ اللہ علیہ) یہ اس لیے فرمارہے ہیں کہ چوں کہ ایک مسئلہ ہے کہ شہید کے اوپر نمازِ جنازہ پڑھی جائے یا نہیں؟ کیوں کہ عرفی شہید کو غسل تو نہیں دیا جاتا، لیکن اس پر نمازِ جنازہ کے سلسلہ میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، احناف کے یہاں نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے، اور شوافع کے یہاں نہ غسل دیا جاتا ہے اور نہ نمازِ جنازہ کی ضرورت ہے، اس کو یوں ہی دفن کر دیں گے۔ چوں کہ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) شافعی المسلک ہیں اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں "صَلَّى" کا مطلب نمازِ جنازہ نہیں ہے، بلکہ دعا ہے۔ لیکن تمام شراح یہی فرماتے ہیں کہ یہاں تاویل اس لیے نہیں چل سکتی کہ دوسری روایتوں میں "صَلَّى عَلَيۡهِمۡ صَلٰوته عَلَى الۡمَيِّتِ" کی صراحت موجود ہے، یعنی جس طرح مرنے والوں پر نماز پڑھی جاتی ہے، اسی طرح آپ نے نماز پڑھی۔ اگر "صَلَّى" کا معنٰی دعا ہوتا تو لفظ "صَلٰوته عَلَى الۡمَيِّتِ" نہ آتا، کیوں کہ "صلٰوۃ" کے معنٰی دعا کے نہیں آتے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ "بَعۡدَ ثَمَانِ سِنِيۡنَ" کا لفظ بھی بتاتا ہے کہ زیارت اور دعا کے لیے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) باربار تشریف لے جاتے تھے، لیکن یہاں تو کہا ہے کہ آٹھ سال کے بعد۔ یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں مراد معروف نماز ہے جو جنازہ کی ہوا کرتی ہے۔

یہ واقعہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مرض الوفات کے شروع کا ہے، اس وقت آپ چل پھر رہے تھے، اسی زمانہ میں آپ ایک مرتبہ صبح کے وقت بقیع میں اور شہدائے احد کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے تھے، اور وہاں آپ نے نماز پڑھی۔

پوری امت کے لیے بڑی تسلی کی بات

"فَرَط" عربی زبان میں ان لوگوں کو کہتے ہیں کہ جب کوئی قافلہ یا لشکر روانہ ہوتا تو کچھ لوگ آگے جاکر جہاں پڑاوڈالنا ہوتا تھا وہاں قافلہ والوں کے لیے پانی قیام وغیرہ کے انتظامات کرتے تھے، تاکہ جب لشکر وہاں پہنچے تو اس کو سہولت رہے۔ اس لیے کہ اس زمانہ میں ہمارے زمانہ جیسی سہولیات نہیں ہوتی تھی۔ گویا حضور (ﷺ) صحابہؓ سے فرماتے ہیں کہ میں تم لوگوں کے لیے فرط (یعنی پہلے جارہا) ہوں اور تم بعد میں آنے والے ہو، میں وہاں جاکر تمہارے لیے انتظام کرتا ہوں۔ اس لفظِ فرط میں صحابہ کے لیے اور پوری امت کے لیے بڑی تسلی کی بات ہے۔

حضور اکرم (ﷺ) نے پورے دن وعظ فرمایا

حدیث ۱۸۶۱ :-

وعن أَبِي زيد عمرِو بن أَخْطَبَ الأنصارِيّ -رضی الله عنه- قَالَ: صلَّى بِنَا رَسُولُ اللهِ (ﷺ) الفَجْرَ، وَصَعِدَ المِنْبَرَ، فَخَطَبَنَا حَتَّى حَضَرَتِ الظُّهرُ فَنَزَلَ فَصَلَّى، ثُمَّ صَعِدَ المِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتَّى حَضَرَتِ العَصْرُ، ثُمَّ نَزَلَ فَصَلَّى، ثُمَّ صَعِدَ المِنْبَرَ فَخَطَبَنَا حَتَّى غَرَبَتِ الشَّمْسُ، فَأَخْبَرَنَا بِمَا كَانَ وَبِمَا هُوَ كَائِنٌ، فَأَعْلَمُنَا أَحْفَظُنَا. (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوزید عمرو بن اخطب انصاری (رضی اللہ عنہ) (قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے ہیں) فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ہمیں فجر کی نماز پڑھائی اور آپ منبر پر تشریف لے گئے اور ایک خطبہ دیا یہاں تک کہ ظہر کا وقت آگیا تو آپ منبر سے نیچے تشریف لائے، ظہر کی نماز پڑھائی پھر منبر پر تشریف لے گئے، پھر خطبہ دینا شروع

کیا یہاں تک کہ عصر کا وقت آ گیا، پھر اترے، عصر کی نماز پڑھائی، پھر منبر پر تشریف لے گئے یہاں تک کہ سورج غروب ہو گیا اور (اس لمبے وعظ و خطبہ میں) حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہ تمام اہم اہم واقعات جو اب تک دنیا میں پیش آئے اور جو آئندہ قیامت تک پیش آنے والے ہیں وہ سب بتلائے۔ ہم میں جو زیادہ یاد رکھنے والا تھا (اس نے وہ سب یاد رکھ لیے اور) وہ ہم میں زیادہ عالم بن گیا۔

افادات:- حضرت حذیفہؓ کی بھی ایک روایت اسی طرح کی ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک مرتبہ دنیا میں جو اہم اہم واقعات پہلے ہوئے، اور جو آئندہ ہونے والے ہیں وہ سب اپنے بیان میں لوگوں کو بتلائے، لیکن لوگ بھول گئے۔ جب ان میں کوئی معاملہ اور واقعہ پیش آتا ہے تو یاد آتا ہے کہ یہ تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بتلایا تھا۔ جیسے: کسی آدمی کو دیکھ کر پھر اس کو آدمی بھول جاتا ہے لیکن جب وہ سامنے آتا ہے اور اس کا چہرہ دیکھتا ہے تو یاد آتا ہے کہ ہاں اس کو تو پہلے دیکھا ہے۔

نیکی کی نذر درست ہے، گناہ کی نہیں

حدیث ۱۸۶۲:-

وعن عائشة رَضِيَ اللهُ عنها قالت: قَالَ النَّبِيُّ (صلی اللہ علیہ وسلم): ((مَنْ نَذَرَ أَنْ يُطِيعَ اللهَ فَلْيُطِعْهُ، وَمَنْ نَذَرَ أَنْ يَعْصِيَ اللهَ فَلَا يَعْصِهِ)). (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرماتی ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اس بات کی نذر مانے کہ اللہ کی اطاعت کرے گا تو اس کو چاہیے کہ اس کو پوری کرے (یعنی اطاعت بجالائے) اور جو آدمی اس بات کی نذر مانے کہ اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی کرے گا تو وہ اس کو پورا نہ کرے (یعنی معصیت نہ کرے)۔

افادات:- نذر کے صحیح ہونے کے لیے فقہاء نے جو شرطیں لکھی ہیں اس میں یہ بھی ہے کہ جس چیز کی نذر مانی جارہی ہے وہ عبادتِ مقصودہ کے قبیل سے ہو، تب ہی نذر درست ہوگی۔ اور اگر وہ عبادت کے قبیل سے نہیں ہے، تو اس صورت میں اس کی نذر درست ہی نہیں ہوگی۔ اور اگر کسی نے کسی گناہ کے کام کی نذر مانی، تو وہ نذر درست ہی نہیں ہے۔

گرگٹ، چھپکلی کو مارنے میں نیکیاں ملیں گی

حدیث ۱۸۶۳:-

وعن أُمِّ شَرِيكٍ رَضِىَ اللهُ عنها: أنَّ رسولَ اللهِ (ﷺ) أمرها بِقَتْلِ الأَوْزَاغِ وقال: ((كَانَ يَنْفُخُ عَلَى إِبْرَاهِيمَ)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ام شریک (رضی اللہ عنہا) سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (ﷺ) نے ان کو گرگٹ کو مارنے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالنے کے لیے نمرود کی طرف سے آگ جلائی گئی تھی تو یہ اس کو بھڑکانے کے لیے پھونک مار رہا تھا۔

حدیث ۱۸۶۴:-

وعن أَبِي هريرة -رضى الله عنه- قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ): ((مَنْ قَتَلَ وَزَغَةً فِي أَوَّلِ ضَرْبَةٍ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حَسَنَةً، وَمَنْ قَتَلَهَا فى الضَّرْبَةِ الثَّانِيَةِ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حسَنَةً دُونَ الأولَى، وَإِنْ قَتَلَهَا فِي الضَّرْبَةِ الثَّالِثَةِ فَلَهُ كَذَا وَكَذَا حَسَنَةً)).

وفى رواية: ((مَنْ قَتَلَ وَزَغاً فى أَوَّلِ ضَرْبَةٍ كُتِبَ لَهُ مِئَةُ حَسَنَةٍ، وفى الثَّانِيَةِ دُونَ ذَلِكَ، وفى الثَّالِثَةِ دُونَ ذَلِكَ)). رواه مسلم.

قَالَ أهلُ اللُّغة: ((الوَزَغُ)) العِظَامُ مِنْ سَامِّ أَبْرَصَ.

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی چھپکلی یا گرگٹ کو پہلے وار میں ماردے گا اس کو اتنی اتنی نیکیاں ملیں گی، اور جو دوسرے وار میں مارے گا اس کو اس سے کم نیکیاں ملے گی، اور جو تیسرے وار میں مارے گا اس کو اس سے بھی کم نیکیاں ملیں گی۔

اور ایک روایت میں ہے کہ: جو آدمی چھپکلی یا گرگٹ کو پہلے وار میں ماردے گا اس کے لیے سو نیکیاں لکھی جائیں گی، اور جو دوسرے میں مارے گا اس کو اس سے کم، اور جو تیسرے وار میں مارے گا اس کو اس سے بھی کم نیکیاں ملیں گی۔

افادات:- ''اَوْزاغ'' وَزَغ کی جمع ہے، وزغ کے معنٰی گرگٹ اور چھپکلی ہے۔ عربی میں دونوں کے لیے یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ گویا چھپکلی اور گرگٹ دونوں کو مارنے کا یہی حکم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ پھونک تو اُس زمانہ کے گرگٹ نے ماری تھی، پھر اس کی سزا قیامت تک آنے والے گرگٹوں کو کیوں دی جارہی ہے؟ تو اس کا یہ جواب دیا ہے کہ دراصل اس کا مقصد اس کی خباثتِ طبع کو بتلانا ہے۔

روایتوں میں ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالنے کے لیے جب آگ بھڑکائی جارہی تھی تو دنیا کے جتنے بھی جانور تھے سب اس کو بجھانے کے لیے آرہے تھے، سوائے گرگٹ اور چھپکلی کے؛ کہ وہ دونوں اس کو بھڑکانے میں لگے تھے۔ گویا اس حکم سے ان کی طبیعت کے کمینہ پن کو بتلایا جارہا ہے کہ اس جنس کے اندر ہی خباثت موجود ہے، گویا پوری جنس ہی بگڑی ہوئی ہے، اس لیے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو مارنے کا حکم فرمایا۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے چھپکلی مارنے کے لیے بھالا رکھا

ایک تابعیہ کہتی ہیں کہ میں حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) کے پاس گئی تو دیکھا کہ ان کے ہاتھ میں ایک بھالا تھا، میں نے پوچھا: یہ کیوں رکھا ہے؟ تو کہا کہ: چھپکلی مارنے کے لیے رکھا ہے۔ اس لیے کہ جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو آگ میں ڈالا گیا تو اس کے علاوہ تمام جانور اس کو بجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے، یہ اس کو بھڑکانے کے لیے پھونک مار رہا تھا۔ (سنن الکبریٰ للنسائی، باب قَتْلِ الْوَزَغ)

گویا ایسے انداز سے مارو کہ پہلے ہی وار میں کام نمٹ جائے اور جان بچا کر بھاگنے کی نوبت نہ آئے۔

اخلاص سے دیا ہوا صدقہ فائدہ سے خالی نہیں [ایک قصہ]

حدیث ۱۸۶۵:-

وعن أبي هريرة -رضي الله عنه- أنَّ رَسُولَ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) قَالَ: ((قَالَ رَجُلٌ لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ سَارِقٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى سَارِقٍ! فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ زَانِيَةٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلَى زَانِيَةٍ! فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ عَلَى زَانِيَةٍ! لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدِ غَنِيٍّ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى غَنِيٍّ؟ فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ عَلَى سَارِقٍ وَعَلَى زَانِيَةٍ وعلى غَنِيٍّ! فَأُتِيَ فقيل لَهُ: أَمَّا صَدَقَتُكَ عَلَى سارِقٍ فَلَعَلَّهُ أَنْ يَسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهِ، وأَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا تَسْتَعِفُّ عَنْ زِنَاهَا، وأَمَّا الغَنِيُّ فَلَعَلَّهُ أَنْ يَعْتَبِرَ فَيُنْفِقَ مِمَّا أَعْطَاهُ اللهُ.)) (رواه البخاري بلفظه ومسلم بمعناه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی نے نذر کے طور پر کہا کہ: میں صدقہ کروں گا (یہ امم سابقہ میں سے کسی کا قصہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جس پر صدقہ کیا جاتا تھا اس کا محتاج اور صالح ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا) چناں چہ وہ اپنی اس نذر اور منت کے مطابق اپنے صدقے کا مال لے کر نکلا (اب اس نے تو اپنے طور پر اس بات کی کوشش کی کہ جو محتاج اور صالح ہو اسی کو دوں، پھر اپنے طور پر پوری جستجو اور اطمینان کر لینے کے بعد) اس نے وہ صدقہ ایک آدمی کے ہاتھ میں رکھ دیا اور وہ چور تھا (اس کو معلوم نہیں تھا کہ جس کو دے رہا ہوں وہ چور ہے، بلکہ بے خبری میں دیا) جب صبح ہوئی تو لوگوں میں چرچا ہوا کہ آج تو کوئی آدمی کسی چور کو اپنے صدقہ کا مال دے گیا (لوگوں میں بات چلی تو اس کے کان میں بھی پڑی، وہ سوچنے لگا کہ میں نے بڑی محنت اور سوچ سمجھ کر ایک آدمی کو حقدار اور نیک سمجھ کر صدقہ دیا تھا لیکن وہ تو چور نکلا۔ خیر! جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ یہاں تسلیم ورضا کی کیفیت بھی بتلانی ہے) کہنے لگا: اے اللہ! تیرے ہی لیے ساری تعریف ہے۔ اس نے پھر طے کیا کہ آج میں پھر صدقہ کروں گا، چناں چہ دوسری رات صدقہ کا مال لے کر نکلا، اور ایک عورت کو حقدار سمجھ کر دیا لیکن وہ زانیہ اور بدکار عورت تھی اس کے ہاتھ میں رکھ دیا (یہاں پر اس نے اپنے طور پر اس بات کی کوشش کی تھی کہ صحیح جگہ پر مال پہنچے لیکن پھر اس میں کامیاب نہیں ہوا) جب صبح ہوئی تو لوگوں میں چرچا ہوا کہ آج رات کوئی آدمی اپنا مال بطورِ صدقہ ایک بدکار عورت کو دے گیا (اس کے کان میں بھی پڑی کہ آج رات میں نے جو صدقہ کیا وہ ایک بدکار عورت کو پہنچ گیا) کہنے لگا: اے اللہ! تیرا احسان وشکر اور تیری تعریف ہے اس بات پر کہ میرا صدقہ زانیہ کے ہاتھ میں چلا گیا (یعنی میں اپنا ارادہ پورا نہ کر سکا، تیری جو مرضی تھی وہی ہوا) اس نے پھر طے کیا کہ میں صدقہ کروں گا (دراصل وہ یہ چاہتا تھا کہ اپنا صدقہ صحیح جگہ پر خرچ ہو جائے) چناں چہ وہ اپنا صدقہ لے کر رات کو نکلا اور ایک مالدار آدمی کے ہاتھ میں دے آیا۔ صبح کو لوگوں میں چرچا ہوا کہ آج تو کسی نے لکھ پتی کے ہاتھ میں صدقہ کا مال دیدیا (پھر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آیا اس پر تسلیم ورضا کا

اظہار کرتے ہوئے) کہنے لگا: اے اللہ! تیری تعریف ہے اس بات پر کہ میرا صدقہ پہلے چور کے ہاتھ میں گیا، دوسرے دن زانیہ کے ہاتھ میں گیا اور تیسرے دن مالدار کے پاس گیا (اب وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ میرا سارا صدقہ ضائع گیا، اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا) چناں چہ اس کو خواب میں دکھلایا گیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے نے بتایا (کہ تونے اخلاص کے ساتھ عمل کیا اور اس عمل کو صحیح کرنے کے لیے اپنے طور پر جتنی کوشش ہو سکتی تھی اس میں اپنی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی، اب چاہے وہ ناحق جگہ پر پہنچ گیا پھر بھی فائدہ سے خالی نہیں) تیرا پہلے دن کا صدقہ جو چور کے ہاتھ میں پہنچا تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی چوری سے باز آجائے (یعنی تو اس بات پر کیوں بے چین اور پریشان ہوتا ہے کہ میرا صدقہ صحیح جگہ پر نہیں پہنچا، دراصل وہ بیچارہ چوری اس لیے کرتا تھا کہ محتاج تھا اور مجبوری میں یہ کام کرتا تھا۔ حضراتِ شراح نے لکھا ہے کہ اس جملہ ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس چور کی چوری کی عادت اپنے احتیاج کی وجہ سے تھی۔ گویا اس کو خواب میں بتایا گیا اس کے ہاتھ میں تیرا صدقہ پہنچا اور اس کی حاجت پوری ہوگئی تو بھلا وہ کیوں چوری کرے گا؟ گویا تیرا یہ صدقہ چور کے لیے چوری سے بچاؤ کا سبب ہوا۔) اسی طرح بدکار عورت جو بدکاری کراتی تھی، اب امید ہے کہ وہ اپنی بدکاری سے باز آجائے گی (یعنی وہ اپنی احتیاج، اور فقر و فاقہ کی وجہ سے زنا کراتی تھی، اس کے پاس مال نہیں تھا اور کوئی ذریعۂ معاش بھی نہیں تھا، اس لیے بدرجۂ مجبوری اس سے یہ حرکت صادر ہوتی تھی، جب تیرے صدقہ کا مال اس کے ہاتھ میں پہنچ گیا تو وہ یہ کام نہیں کرائے گی) رہا وہ مالدار؛ تو امید ہے کہ وہ عبرت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ نے جو مال اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے (وہ مالدار ہونے کے باوجود اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتا تھا، آج تیرا صدقہ جب غیر اختیاری طور پر اس کے ہاتھ میں پہنچا، تو اس کو بھی سبق ملے گا اور عبرت ہوگی اور اللہ تعالیٰ اس کو توفیق دیں گے۔ اس کے دل پر چوٹ لگے گی کہ ایک آدمی تو اپنا صدقہ چھپا کر میرے جیسے مالدار کے ہاتھ میں دے گیا اور میں مالدار ہونے کے باوجود ان چیزوں کا اہتمام نہیں کرتا)۔

افادات:- اس روایت کو حضرات محدثین امام بخاری، امام مسلم وغیرہ کتاب الزکوٰۃ میں اس جگہ لاتے ہیں کہ جب کوئی آدمی اپنا زکوٰۃ کا مال کسی ایسے آدمی کو حقدار سمجھ کر دیدے جو حقیقت میں زکوٰۃ کا حقدار نہ ہو، جیسے: کسی کو غریب سمجھ کر زکوٰۃ کا مال دیا، اور اپنے طور پر اطمینان حاصل کر لیا تھا کہ یہ مستحقِ زکوٰۃ ہے، بعد میں پتہ چلا کہ وہ تو مالدار تھا؛ تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ عام طور پر حضراتِ محدثین اس روایت کو اسی بیان میں لاتے ہیں۔

اور حضرات محدثین نے اس روایت سے جو نتائج نکالے ہیں اس میں یہ بھی ہے کہ اس آدمی کی اس صفتِ تسلیم و رضا کو بتلانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ معاملہ اس کے ساتھ پیش آیا، اس میں اس نے بے قراری، بے چینی اور ناراضگی کا اظہار نہیں کیا، بلکہ کہا کہ میں نے تو اپنے طور پر کوشش کر ڈالی تھی کہ جو اس کا صحیح حقدار ہے اس کے ہاتھ میں جائے، لیکن میں اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہو پایا، تو ہی قدرت والا ہے، تو نے جو چاہا وہ ہو گیا۔ مؤمن کی شان یہی ہونی چاہیے کہ ایک آدمی اپنے طور پر ایک کام کرنے کے لیے چلا اور اپنے طور پر اس نے پوری کوشش کر ڈالی، جو اسباب و وسائل ہو سکتے تھے اس نے اختیار کر لیے، پھر بھی وہ کام نہ ہوا، تو اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی کو صدقہ چھپ کر اور اخلاص کے ساتھ کرنا چاہیے، اس کے ثمرات و فوائد ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تیرے اس عمل میں تو نے اگرچہ اپنے طور پر پوری کوشش کی پھر بھی صدقہ صحیح جگہ پر نہیں پہنچا سکا، لیکن جہاں پہنچا ہے وہ بھی فائدہ سے خالی نہیں۔

قصۂ شفاعت در میدانِ قیامت

حدیث ۱۸۶۶:-

وعنه قَالَ: كُنَّا مَعَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) فِى دَعْوَةٍ، فَرُفِعَ إِلَيْهِ الذِّرَاعُ، وَكَانَتْ تُعْجِبُهُ، فَنَهَسَ مِنْهَا نَهْسَةً وقال: أَنَا سَيِّدُ النَّاسِ يَوْمَ القِيَامَةِ، هَلْ تَدْرُونَ مِمَّ ذَاكَ؟ يَجْمَعُ اللهُ الأَوَّلِينَ وَالآخِرِينَ فِى صَعِيدٍ وَاحِدٍ، فَيُبْصِرُهُمُ النَّاظِرُ، وَيُسْمِعُهُمُ الدَّاعِى، وَتَدْنُو مِنْهُمُ الشَّمْسُ، فَيَبْلُغُ النَّاسَ مِنَ الغَمِّ وَالكَرْبِ مَا لَا يُطِيقُونَ وَلَا يَحْتَمِلُونَ، فَيَقُولُ النَّاسُ: أَلَا تَرَوْنَ مَا أَنْتُمْ فِيهِ إِلَى مَا بَلَغَكُمْ، أَلَا تَنْظُرُونَ مَنْ يَشْفَعُ لَكُمْ إِلَى رَبِّكُمْ؟ فَيَقُولُ بَعْضُ النَّاسِ لِبَعْضٍ: أَبُوكُمْ آدَمُ، فَيَأْتُونَهُ فَيَقُولُونَ: يَا آدَمُ أَنْتَ أَبُو البَشَرِ، خَلَقَكَ اللهُ بِيَدِهِ، وَنَفَخَ فِيكَ مِنْ رُوحِهِ، وَأَمَرَ المَلَائِكَةَ فَسَجَدُوا لَكَ، وَأَسْكَنَكَ الجَنَّةَ، أَلَا تَشْفَعُ لَنَا إِلَى رَبِّكَ؟ أَلَا تَرَى إِلَى مَا نَحْنُ فِيهِ وَمَا بَلَغَنَا؟ فَقَالَ: إِنَّ رَبِّي غَضِبَ اليَوْمَ غَضَباً لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ، وَلَا يَغْضَبُ بَعْدَهُ مِثْلَهُ، وَإِنَّهُ نَهَانِي عَنِ الشَّجَرَةِ فَعَصَيْتُ، نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي، اذْهَبُوا إِلَى غَيْرِي، اذْهَبُوا إِلَى نُوحٍ، فَيَأْتُونَ نوحاً فَيَقُولُونَ: يَا نُوحُ، أَنْتَ أَوَّلُ الرُّسُلِ إِلَى أَهْلِ الأَرْضِ، وَقَدْ سَمَّاكَ اللهُ عَبْداً شَكُوراً، أَلَا تَرَى إِلَى مَا نَحْنُ فِيهِ، أَلَا تَرَى إِلَى مَا بَلَغَنَا، أَلَا تَشْفَعُ لَنَا إِلَى رَبِّكَ؟ فَيَقُولُ: إِنَّ رَبِّي غَضِبَ اليَوْمَ غَضَباً لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ، وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ، وَإِنَّهُ قَدْ كَانَتْ لِي دَعْوَةٌ دَعَوْتُ بِهَا عَلَى قَوْمِي، نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي، اذْهَبُوا إِلَى غَيْرِي، اذْهَبُوا إِلَى إِبْرَاهِيمَ، فَيَأْتُونَ إِبْرَاهِيمَ فَيَقُولُونَ: يَا إِبْرَاهِيمُ، أَنْتَ نَبِيُّ اللهِ وَخَلِيلُهُ مِنْ أَهْلِ الأَرْضِ، اشْفَعْ لَنَا إِلَى رَبِّكَ، أَلَا تَرَى إِلَى مَا نَحْنُ فِيهِ؟ فَيَقُولُ لَهُمْ: إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ اليَوْمَ غَضَباً لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ، وَإِنِّي كُنْتُ كَذَبْتُ ثَلَاثَ) كَذَبَاتٍ، نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي، اذْهَبُوا إِلَى غَيْرِي، اذْهَبُوا إِلَى مُوسَى، فَيَأْتُونَ مُوسَى فَيَقُولُونَ: يَا مُوسَى أَنْتَ رَسُولُ اللهِ، فَضَّلَكَ اللهُ بِرِسَالَاتِهِ وَبِكَلَامِهِ عَلَى النَّاسِ، اشْفَعْ لَنَا إِلَى رَبِّكَ، أَلَا تَرَى إِلَى مَا نَحْنُ فِيهِ؟ فَيَقُولُ: إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ اليَوْمَ غَضَباً لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ،

وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ، وَإِنِّي قَدْ قَتَلْتُ نَفْساً لَمْ أُومَرْ بِقَتْلِهَا. نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي، اذْهَبُوا إِلَى غَيْرِي، اذْهَبُوا إِلَى عِيسَى. فَيَأْتُونَ عِيسَى فَيَقُولُونَ: يَا عِيسَى، أَنْتَ رَسُولُ اللهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَى مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِنْهُ، وَكَلَّمْتَ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ، اشْفَعْ لَنَا إِلَى رَبِّكَ، أَلَا تَرَى إِلَى مَا نَحْنُ فِيهِ؟ فَيَقُولُ عِيسَى: إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ الْيَوْمَ غَضَباً لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ، وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ، وَلَمْ يَذْكُرْ ذَنْباً. نَفْسِي نَفْسِي نَفْسِي، اذْهَبُوا إِلَى غَيْرِي، اذْهَبُوا إِلَى مُحَمَّدٍ (صلی اللہ علیہ وسلم).

وفي رواية: فَيَأْتُونِي فَيَقُولُونَ: يَا مُحَمَّدُ أَنْتَ رَسُولُ اللهِ وَخَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ، وَقَدْ غَفَرَ اللهُ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ. اشْفَعْ لَنَا إِلَى رَبِّكَ، أَلَا تَرَى إِلَى مَا نَحْنُ فِيهِ؟ فَأَنْطَلِقُ فَآتِي تَحْتَ الْعَرْشِ فَأَقَعُ سَاجِداً لِرَبِّي، ثُمَّ يَفْتَحُ اللهُ عَلَيَّ مِنْ مَحَامِدِهِ وَحُسْنِ الثَّنَاءِ عَلَيْهِ شَيْئاً لَمْ يَفْتَحْهُ عَلَى أَحَدٍ قَبْلِي، ثُمَّ يُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ، سَلْ تُعْطَهُ، وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ، فَأَرْفَعُ رَأْسِي، فَأَقُولُ: أُمَّتِي يَا رَبِّ، أُمَّتِي يَا رَبِّ، أُمَّتِي يَا رَبِّ. فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ أَدْخِلْ مِنْ أُمَّتِكَ مَنْ لَا حِسَابَ عَلَيْهِمْ مِنَ الْبَابِ الْأَيْمَنِ مِنْ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، وَهُمْ شُرَكَاءُ النَّاسِ فِيمَا سِوَى ذَلِكَ مِنَ الْأَبْوَابِ. ثُمَّ قَالَ: وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، إِنَّ مَا بَيْنَ الْمِصْرَاعَيْنِ مِنْ مَصَارِيعِ الْجَنَّةِ كَمَا بَيْنَ مَكَّةَ وَهَجَرَ، أَوْ كَمَا بَيْنَ مَكَّةَ وَبُصْرَى. (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک مرتبہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک دعوت میں شریک ہوئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں دست کا گوشت پیش کیا گیا، اور حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دست کا گوشت بہت مرغوب اور پسند تھا، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کو اپنے دانتوں سے توڑا (یعنی گوشت نوش فرمارہے تھے) اسی دوران ارشاد فرمایا: میں قیامت کے دن لوگوں کا سردار ہوؤں گا۔ اور تمہیں معلوم ہے کہ میری سرداری اور سیادت کا ظہور کیسے ہوگا؟ (یعنی میری سرداری کا لوگوں کو پتہ کیسے چلے گا؟ وہ اس طرح سے کہ) قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اگلے اور پچھلے (یعنی حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر قیامت تک کے) تمام

انسانوں کو ایک میدان میں جمع کرے گا (وہ سب ایسے میدان میں ہوں گے کہ) دیکھنے والا سب کو ایک نظر میں دیکھ سکے گا، اور پکارنے والا اپنی آواز سب کو سنا سکے گا، اور سورج بالکل قریب ہوگا جس کی وجہ سے لوگ تکلیف اور پریشانی میں اس انتہا کو پہنچ جائیں گے کہ لوگوں میں اس کی نہ طاقت ہوگی اور نہ برداشت کرسکیں گے (لوگ اسی طرح کھڑے ہوں گے اور کچھ کارروائی نہیں ہو رہی ہوگی۔ جب اسی پریشانی، کلفت و مشقت اور تکلیف کے عالم میں ایک لمبا وقت گذر جائے گا تو لوگ آپس میں کہیں گے) کیا دیکھتے نہیں ہو کہ تم سب کس تکلیف کے عالَم میں مبتلا ہو؛ چلو! کوئی ایسا آدمی تلاش کرو جو اللہ تعالیٰ سے تمہارے لیے سفارش کرے (بعض روایتوں میں آتا ہے کہ لوگ کہیں گے: یہ انتظار کب تک رہے گا، حساب کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے؛ چاہے کچھ بھی فیصلہ ہو۔ پھر چرچا کریں گے کہ ایسا کون ہے جو اللہ تعالیٰ کے حضور میں درخواست کرے کہ حساب و کتاب کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ لوگ آپس میں ایک دوسرے سے کہیں گے: ہمارے جد امجد اور ابا حضرت آدم علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والسلام ہیں، ان کے پاس جا کر درخواست کی جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کریں کہ ہمارے حساب و کتاب کا سلسلہ شروع کیا جائے) چناں چہ لوگ حضرت آدم (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کریں گے: اے آدم! آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو براہِ راست اپنے دستِ قدرت سے پیدا کیا اور آپ کے اندر روح ڈالی، پھر فرشتوں کو حکم دیا تو انہوں نے آپ کو سجدہ کیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو جنت کے اندر ٹھہرایا (جب کسی آدمی سے اپنی کوئی درخواست کی جاتی ہے اور اپنا کام نکالنا ہوتا ہے تو اس کے اوصاف بیان کئے جاتے ہیں کہ آپ تو ایسے ایسے ہیں، ذرا ہمارا کام کر دیجئے۔ اسی طرح یہاں بھی لوگ وہی کریں گے کہ آپ کی یہ ساری خوبیاں و کمالات اور خصوصیتیں ہیں) کیا آپ پروردگار کے حضور ہمارے لیے سفارش نہیں کریں گے؟ (کہ ہمارے

حساب و کتاب کا سلسلہ شروع کیا جائے) آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کس قدر تکلیف اور مشقت میں پہنچ چکے ہیں۔ حضرت آدم (علیہ السلام) جواب میں فرمائیں گے: میرا رب آج ایسا غضبناک ہوا ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غضبناک ہوا تھا، اور نہ آئندہ ایسا غضبناک ہوگا، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا تھا لیکن میں نے اس حکم پر عمل نہیں کیا، آج تو مجھے اپنی فکر ہے، مجھے اپنی فکر ہے، میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ (یعنی میں اگر یہ بات لے کر گیا اور مجھ ہی سے سوال ہوگیا کہ تم کو ایک بات کہی گئی تھی، تم نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ جب کہیں سفارش کا معاملہ آتا ہے تو آدمی ایسا سب سوچتا ہے۔ اور حضراتِ انبیاء اللہ تعالیٰ کے شئون سے جتنا واقف ہوتے ہیں؛ دوسرا کون ہوسکتا ہے؟ اور جو آدمی کسی کا جتنا زیادہ مقرب ہوتا ہے، وہ اس سے اتنا ہی زیادہ ڈرتا ہے) تم لوگ حضرت نوح کے پاس جاؤ، چناں چہ لوگ حضرت نوح (علیہ السلام) کے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے: اے نوح! آپ زمین والوں کی طرف اللہ تعالیٰ کے سب سے پہلے رسول ہیں، اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے شکر گزار بندہ کے لقب سے نوازا ہے۔ آپ دیکھتے نہیں ہے کہ ہم کس تکلیف میں ہیں، ہماری مشقت کس انتہا کو پہنچ چکی ہے؟ کیا آپ اپنے پروردگار کے حضور ہمارے لیے سفارش نہیں کریں گے؟ حضرت نوح (علیہ السلام) عرض کریں گے: میرا پروردگار آج ایسا غضبناک ہوا ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غضبناک ہوا، اور نہ آئندہ کبھی ایسا غضبناک ہوگا، مجھ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری ایک دعا قبول ہوگی، میں نے اس دعا کو اپنی قوم کی ہلاکت میں استعمال کرلیا (گویا مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس سلسلہ میں مجھ سے پوچھ نہ ہوجائے) آج تو مجھے اپنی جان کی فکر ہے، مجھے اپنی جان کی فکر ہے، مجھے اپنی جان کی فکر ہے، کسی دوسرے کے پاس جاؤ۔ (ایسا کرو) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس جاؤ۔ چناں چہ سب لوگ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے: اے ابراہیم! آپ اللہ کے نبی ہیں اور زمین والوں میں سے اس کے خلیل ودوست ہیں، آپ اپنے پروردگار سے ہمارے

لیے سفارش کیجئے، آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کیسی تکلیف میں ہیں؟ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) فرمائیں گے: آج میرا رب ایسا غضبناک ہوا ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غضبناک ہوا تھا، اور نہ آج کے بعد کبھی ایسا غضبناک ہوگا۔ اور میں نے تین جھوٹ بولے تھے، آج تو مجھے اپنی جان کی فکر ہے، مجھے اپنی جان کی فکر ہے، مجھے اپنی جان کی فکر ہے۔ میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ (ایک کام کرو) حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاؤ۔ اب لوگ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے پاس حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے: اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے لیے آپ کے ساتھ کلام فرما کر دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو فضیلت دی، آپ اللہ تعالیٰ سے ہماری سفارش کیجئے ہم کس تکلیف میں ہیں وہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بھی وہی جواب دیں گے کہ: آج میرا پروردگار ایسا غضبناک ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غضبناک ہوا، اور نہ آج کے بعد ایسا غضبناک ہوگا، اور میں نے ایک جان کو مار دیا تھا جس کی مجھے اجازت نہیں تھی (حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے ایک قبطی کو گھونسا مارا تھا، اگرچہ اس کو مار ڈالنے کا ارادہ نہیں تھا، لیکن اس کے نتیجہ میں اس کی موت واقع ہوگئی تھی) مجھے تو اپنی جان کی فکر ہے، مجھے تو اپنی جان کی فکر ہے، مجھے تو اپنی جان کی فکر ہے، میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ (ایک کام کرو) حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس جاؤ، چناں چہ لوگ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے پاس حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے: اے عیسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں، اور اللہ کے کلمۂ کن ہیں جو اللہ نے حضرت جبرئیل کے ذریعہ حضرت مریم کے اندر ڈالا تھا، اور اللہ ہی کی پیدا کی ہوئی مخصوص روح ہیں، آپ نے گہوارہ میں لوگوں سے بات کی (یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے) آپ اپنے پروردگار سے ہماری سفارش کیجئے۔ آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کس تکلیف میں ہیں؟ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) جواب میں فرمائیں گے: میرا رب آج ایسا غضبناک ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ایسا غضبناک ہوا، اور نہ اس کے بعد کبھی ایسا غضبناک ہوگا۔ راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی کسی کوتاہی کا تذکرہ نہیں کیا (لیکن بعض روایتوں میں اس کا تذکرہ آتا ہے کہ وہ کہیں گے: لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ

کر میری اور ماں کی عبادت کرنی شروع کر دی تھی) آج تو مجھے میری جان کی فکر ہے، میری جان کی فکر ہے، میری جان کی فکر ہے، میرے علاوہ کسی اور کے پاس جاؤ، (ایک کام کرو) حضرت محمد (ﷺ) کے پاس جاؤ۔ (حضور (ﷺ) فرماتے ہیں) اس کے بعد لوگ میرے پاس آئیں گے اور عرض کریں گے کہ: آپ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم الانبیاء ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کی اگلی پچھلی سب خطائیں معاف کر دی ہیں، آپ اپنے پروردگار سے ہماری سفارش کیجئے، آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کس تکلیف میں ہیں۔ لوگوں کی یہ بات سن کر مَیں چلوں گا، اور عرش کے نیچے آؤں گا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ میں گر جاؤں گا اور اس وقت اللہ تعالیٰ مجھ پر حمد و ثنا کے ایسے ایسے کلمات کھولیں گے جو مجھ سے پہلے کسی پر نہیں کھولے گئے اور اللہ تعالیٰ کی خوبیاں اور کمالات اور اس کی حمد و ثناء ایسے ایسے الفاظ میں بیان کروں گا کہ آج تک ان الفاظ میں کسی نے بھی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان نہیں کی (جب دیر تک اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا رہوں گا) تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: اے محمد! اپنا سر اٹھائیے، آپ سوال کیجئے؛ آپ کا سوال پورا کیا جائے گا۔ آپ سفارش کیجئے؛ آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ چناں چہ مَیں اپنا سر اٹھاؤں گا اور عرض کروں گا: اے میرے رب! میری امت۔ اے رب! میری امت۔ میری اس عرض پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: اے محمد! اپنی امت میں سے جن پر حساب نہیں، ان کو جنت کی داہنی طرف کے دروازہ سے داخل کیجئے (امت کے ایسے افراد ستر ہزار ہوں گے جن کو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل کیا جائے گا) اور آپ کی امت کے لوگ اور لوگوں کے ساتھ دوسرے دروازوں سے داخل ہونے میں شریک ہوں گے (یعنی جنت کے دوسرے دروازوں سے جہاں اور امتیں داخل ہوں گی وہاں آپ کی امت کے لوگ بھی داخل ہوں گے، لیکن دائیں طرف کا دروازہ تو آپ کی امت کے لیے ہی مخصوص ہے) قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جنت کے دو کواڑوں کے درمیان کا فاصلہ اتنا

ہے جتنا مکہ مکرمہ اور ہجر کے درمیان میں ہے، یا جتنا فاصلہ مکہ مکرمہ اور بُصریٰ کے درمیان ہے (ہجر: یمن کا شہر تھا، جہاں کے مٹکے مشہور تھے۔ اور بُصریٰ: شام کا ایک شہر ہے۔)

افادات:- اس روایت سے مندرجۂ ذیل مضامین مستفاد ہوتے ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ اگر چاہتے تو لوگوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی جاسکتی تھی کہ اول وہلہ ہی میں حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس پہنچ جاتے، لیکن ایسا نہیں ہوگا، وہ دراصل اس لیے کہ میری سیادت اور سرداری کا ظہور ہو کہ جو کام کوئی نہ کرسکا وہ اللہ تعالیٰ میرے ذریعہ سے کروائیں گے۔

(۲) بکرے کے اگلے جو دو پیر ہوتے ہیں، جیسے آدمی کے آگے کے دو ہاتھ ہوتے ہیں، اس کو اردو میں دست، اور عربی "ذراع" کہتے ہیں۔ حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دست کا گوشت بڑا مرغوب تھا۔ اور اس کے مرغوب ہونے کی ایک وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ جلدی سے گل جاتا ہے، ویسے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہمیشہ گوشت میسر نہیں آتا تھا جب میسر آجاتا تو تقاضہ ہوتا تھا کہ جلدی سے تیار ہوجائے۔

اور دوسری وجہ یہ بھی بتلائی جاتی ہے کہ یہ حصہ غلاظت کی جگہ سے دور ہوتا ہے، اس معنیٰ کر اس کی لذت بھی دوسرے حصوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے، اس لیے حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو زیادہ مرغوب تھا۔ غزوۂ خیبر کے موقعہ پر ایک یہودیہ نے ایک بکری بھون کر اس میں زہر ملا کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں پیش کی تھی، تو اس نے دست والے حصہ ہی میں زیادہ زہر یہی سوچ کر ملایا تھا کہ آپ کو یہ گوشت زیادہ مرغوب ہے، اس لیے آپ پہلے اسی کو نوش فرمائیں گے۔

(۳)"**سورج بالکل قریب ہوگا**" روایتوں میں آتا ہے کہ ایک میل قریب ہوگا۔ اب "میل" سے کیا مراد ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان میں سرمہ دانی کے سلائی کو بھی "میل" کہتے ہیں، اور مخصوص فاصلہ کے لیے بھی لفظِ میل بولا جاتا ہے۔ اور راوی بھی کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ کون سا میل مراد ہے۔ اس لیے اگر فاصلہ ہی مراد ہو تب بھی اس کی تپش بہت تیز ہوگی، اس لیے کہ دنیا میں سورج زمین سے ۹/کروڑ ۳۳/لاکھ میل دور ہے، اس کے باوجود اس کی تیزی کا حال یہ ہے کہ گرمی کے دنوں میں اس کی تپش کی وجہ سے لوگ بدحواس ہو جاتے ہیں؛ تو جب وہ صرف ایک میل دور ہوگا تو اس وقت لوگوں کی کلفت اور مشقت کا کیا عالم ہوگا!

(۴)"**شکر گذار بندہ**" حضرت نوح علی نبینا وعلیہ السلام کے متعلق قرآنِ پاک میں ہے: "إِنَّهُ كَانَ عَبْداً شَكُوْراً" وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے۔ ان کے متعلق لکھا ہے کہ جب بھی وہ کوئی نعمت استعمال کرتے تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے، جیسے: کھانا کھاتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَطْعَمَنِي، وَلَوْ شَاءَ أَجَاعَنِي" اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے کھلایا، اگر وہ چاہتا تو بھوکا رکھتا۔ جب پانی پیتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي سَقَانِي، وَلَوْ شَاءَ أَظْمَأَنِي" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے پانی پلایا، اگر وہ چاہتا تو پیاسا رکھتا۔ جب لباس پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي كَسَانِي وَلَوْ شَاءَ أَعْرَانِي" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے لباس پہنایا، اگر وہ چاہتا تو ننگا رکھتا۔ جوتا پہنتے تو کہتے: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي حَذَّانِي، وَلَوْ شَاءَ أَحْفَانِي" اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے جوتا پہنایا، اگر وہ چاہتا تو ننگے پیر رکھتا۔ اور قضائے حاجت کے بعد کہتے: "أَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَخْرَجَ عَنِّي أَذَاهُ، وَلَوْ شَاءَ حَبَسَهُ" اللہ کا شکر ہے جس نے تکلیف دہ چیز کو مجھ سے نکال دیا، اگر وہ چاہتا تو اس کو

اندر ہی روک دیتا۔(جامع البيان في تفسير القرآن للطبري: سورۂ بنی اسرائیل) گویا وہ ہر کام پر اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرتے تھے اس لیے ان کو ”عَبۡدًا شَكُورًا“ شکر گزار بندہ کہا گیا۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے توریہ کے تین واقعات

(۵) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے متعلق جو فرمایا کہ میں نے تین باتیں کذب کے قبیل سے کہی تھیں۔ اس کے متعلق حضراتِ شرّاح نے لکھا ہے کہ حقیقت میں وہ باتیں جھوٹ نہیں تھیں، بلکہ تعریض و توریہ کے قبیل سے تھیں۔ ان میں سے دو کا تذکرہ تو قرآنِ پاک میں ہے:

(الف) پہلی یہ کہ ان کی قوم تہوار منانے کے لیے آبادی سے باہر جا رہی تھی، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے کہا کہ تم بھی ہمارے ساتھ چلو، اور چوں کہ ان کی قوم نجوم کو مانتی تھی ”فَنَظَرَ نَظۡرَةً فِي النُّجُومِ فَقَالَ إِنِّي سَقِيمٌ“ اس لیے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا: میں بیمار ہوں۔ گویا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے عذر کر دیا، وہ لوگ یوں سمجھے کہ ستارے دیکھ کر ان کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ بیمار ہونے والے ہیں، اس لیے معذرت کر رہے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنے ساتھ لے جانے پر مجبور نہیں کیا اور معذور سمجھ کر چھوڑ دیا۔ تو یہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا ”إِنِّي سَقِيمٌ“ کہنا بطورِ توریہ تھا۔

توریہ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ایک بات کہہ کر اس کا ایسا مطلب مراد لے جو اس کے نزدیک درست ہو، لیکن سننے والے کے ذہن میں اس جملے کا کوئی قریبی مطلب آئے، حالاں کہ بولنے والے کی مراد وہ نہ ہو؛ اس کو توریہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ: یہاں حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے آپ کو "سَقِيمُ الْحُجَّةِ" کہا تھا کہ میں تمھیں اپنی بات سمجھانے سے قاصر ہوں۔ اگر میں تم لوگوں سے یوں کہوں کہ تم لوگ جو تہوار منانے کے لیے جا رہے ہو، وہاں بتوں کی پرستش کروگے، اور غیر اللہ کی عبادت کروگے، اور یہ حرام کام ہے اس لیے وہاں مت جاؤ؛ تو تم لوگ میری بات نہیں مانوگے۔ گویا اپنی بات کو پوری طرح سمجھانے سے میں قاصر ہوں۔

اور بعض حضرات نے فرمایا کہ: "سَقِيمٌ" سے مراد یہ نہیں ہے کہ "ابھی بیمار ہوں" بلکہ بیمار ہونے والا ہوں۔ اس لیے کہ عربی زبان میں اسم فاعل کا صیغہ جیسے حال کی خبر دینے کے لیے آتا ہے، وہیں مستقبل کی خبر دینے کے لیے بھی آتا ہے۔ جیسے: کوئی یوں کہے: "إِنِّيْ ذَاهِبٌ إِلىٰ كَذَا" میں فلاں جگہ جانے والا ہوں، یعنی ابھی نہیں، بلکہ آئندہ کبھی جاؤں گا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: "إِنِّيْ سَقِيمٌ" میں بیمار ہونے والا ہوں، اور ظاہر ہے کہ آدمی کو موت تک کوئی نہ کوئی بیماری پیش آتی ہی ہے۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ اس وقت واقعتاً حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بیمار تھے، ان کو بخار تھا۔ اور حضرت علامہ عثمانی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: کوئی آدمی مکمل طور پر صحت مند ہوتا ہی نہیں ہے، اس کو کوئی نہ کوئی معمولی سا عارضہ ہوتا ہی ہے، جس کی بنیاد پر وہ اپنے آپ کو بیمار کہہ سکتا ہے۔

دراصل حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ کی جو معرفت و قرب تھی اس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کا اہل نہیں سمجھتے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کا جو قرب حاصل تھا اس کی وجہ سے ان کی طبیعت پر گویا ایک قسم کا خوف طاری تھا اس لیے وہ اس توریہ و تعریض کو بھی جھوٹ سے تعبیر فرمارہے ہیں، حالاں کہ حقیقت میں وہ جھوٹ نہیں تھا۔

(ب) دوسرا موقعہ جس کو انھوں نے جھوٹ سے تعبیر کیا، وہ یہ ہے کہ: جب وہ لوگ تہوار میں چلے گئے، اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) رک گئے، اب ان کو تو ایک کام انجام دینا تھا کہ وہ بت خانوں کے بتوں کو توڑنا چاہتے تھے۔ چناں چہ وہ ان کے بت خانہ میں گئے، وہاں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: کیوں کھاتے پیتے نہیں ہو؟ ظاہر ہے کہ کوئی جواب نہیں مل سکتا تھا۔ پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے تمام بتوں کو توڑ دیا اور جو سب سے بڑا بت تھا اس کے کندھے پر کلہاڑا رکھ دیا۔ جب لوگ تہوار منا کر واپس لوٹے اور یہ منظر دیکھا تو سمجھ گئے کہ یہ کام ابراہیم ہی کا ہے، اس لیے انھی سے پوچھا: یہ سب کس نے کیا؟ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب دیا: بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا ”بلکہ ان کے اس بڑے بت نے کیا۔ حالاں کہ کرنے والے خود حضرت ابراہیم (علیہ السلام) ہی تھے، پھر بھی اس بڑے بت کی طرف نسبت کی۔

اس کی وجہ علامہ زمخشری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کا یہ جملہ بطور تمسخر اور مذاق اڑانے کے تھا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیے: آپ بہت عمدہ خطاط (کاتب) اور بہترین رائٹر ہیں، آپ نے کوئی تحریر تیار کی، آپ کا کوئی ایسا دوست جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتا وہ آپ سے پوچھے کہ: یہ آپ نے لکھا ہے؟ اور آپ اس کے جواب میں کہیں: جی نہیں! بلکہ آپ نے لکھا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کو ایسا کہہ کر اپنی طرف سے نفی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ ایک طرح کا تمسخر اور اس کی مذاق مقصود ہوا کرتی ہے کہ اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے، یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے ہی لکھا ہے۔ اسی طریقہ سے یہاں بھی ہے کہ جب لوگوں نے پوچھا: اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسا معاملہ تو نے کیا؟ تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جواب میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ: اس میں پوچھتے کیا ہو؟ یہ میرا ہی کیا ہوا ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا: حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بطریقۂ الزام کہہ رہے ہیں کہ: اگر آپ لوگ تحقیق کرنا چاہتے ہو کہ یہ کس نے کیا؟ تو میں الزام کے طور پر یوں کہوں گا کہ اس بڑے نے ہی یہ سب کیا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کا دستور ہے کہ بڑا سانپ چھوٹے سانپ کو اور بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جایا کرتی ہے۔ بڑا بادشاہ چھوٹی سلطنتوں کو ہڑپ کیا کرتا ہے؛ اسی طرح اس بڑے نے دوسرے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا ہے۔ کیا تمہارے پاس کوئی دلیل ہے کہ یہ کام میں نے کیا؟ گویا بطورِ خبر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ بطورِ الزام کہہ رہے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اسی سے پوچھ لو، اگر وہ بولتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں بول سکتے۔ اس طرح حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کو خاموش کر دیا۔

(ج) تیسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب اپنی اہلیہ محترمہ حضرت سارہ کو لے کر ایک ملک سے گزر رہے تھے تو وہاں کا بادشاہ بڑا ظالم تھا، اس کو جب معلوم ہوتا کہ کسی کی بیوی حسین و جمیل ہے، تو اس کو چھین لیا کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) جب وہاں سے گزر رہے تھے اور حضرت سارہ بڑی حسین و جمیل تھیں، اس بادشاہ کو معلوم ہوا تو اس نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو بلایا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حضرت سارہ سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ وہ جب تمہارے متعلق پوچھے گا تو میں بتاؤں گا کہ یہ میری بہن ہے، تم میری اس بات کی تردید مت کرنا۔ چوں کہ اس وقت روئے زمین پر اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والا میرے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے، اس اعتبار سے گویا تم میری دینی اور ایمانی بہن بھی ہو۔ تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جو "هٰذِهٖ أُخْتِيْ" کہا تھا، یہ توریہ تھا کہ یہ میری دینی و ایمانی بہن ہے۔

(٦) "يَارَبِّ أُمَّتِيْ" بعض حضرات نے ایک اشکال پیدا کیا ہے کہ: جب سبھی لوگ اپنی پریشانی رفع کرنے کی سفارش کرنے کی درخواست لے کر نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، تو پھر حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صرف اپنی امت ہی کو کیوں یاد فرمایا؟ تو اس کا جواب بعض لوگوں نے یہ دیا کہ: دیگر حضرات انبیاء علیٰ نبینا و علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جو نبوت ملی، وہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے ہی سے ملی، گویا ان کی امتیں بھی بالواسطہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی امت ہیں، اس معنیٰ کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے صرف امتِ محمدیہ مراد نہیں لی، بلکہ تمام انسانیت کو مراد لیا ہے۔

حضرت شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں: دوسری روایتوں میں ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) باری تعالیٰ سے پہلے تو مطلقاً حساب وکتاب شروع کرنے کے سلسلہ میں عرض کریں گے، اور اللہ تعالیٰ آپ کی وہ عرض قبول فرمالیں گے، اس کے بعد آپ دوبارہ سجدہ میں جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کریں گے اور اس موقعہ پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کے لیے سفارش فرمائیں گے۔ گویا راوی نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے کہ آپ کی امت کی سفارش کرنے والے الفاظ تو بیان کئے ہیں، اور پوری انسانیت کے لیے آپ نے جو سفارش فرمائی تھی - کہ ان کے حساب وکتاب کا سلسلہ شروع کیا جائے - اس کو حذف کر دیا ہے۔

(۷) جنت کے دو کواڑوں کے درمیان کے فاصلے روایتوں میں مختلف بیان کئے گئے ہیں، اس کی توضیح یہ کی گئی ہے کہ مجلس میں کئی قسم کے لوگ ہوتے تھے، کبھی یمن کی طرف کے رہنے والے لوگ موجود تھے تو ان کو سمجھانے کے لیے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ جتنا فاصلہ مکہ مکرمہ اور ہجر کے درمیان ہے۔ اور کبھی شام کے علاقہ کے لوگ تھے تو ان کو سمجھانے کے لیے فرمایا کہ جتنا فاصلہ مکہ مکرمہ اور بُصریٰ کے درمیان ہے۔

حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے گھرانے کی قربانیوں کی تاریخ

حدیث ۱۸۶۷:-

وعن ابن عباس رضی الله عنهما، قَالَ: جاءَ إبراهيم (صلى الله عليه وسلم) بِأُمِّ إسماعِيلَ وَبِابْنِهَا إِسْمَاعِيل وَهِيَ تُرْضِعُهُ، حَتَّى وَضَعها عِنْدَ البَيْتِ، عِنْدَ دَوْحَةٍ فَوقَ زَمْزَمَ فِي أَعْلَى المَسْجِدِ، وَلَيْسَ بِمَكَّةَ يَوْمَئِذٍ أَحَدٌ، وَلَيْسَ بِهَا مَاءٌ، فَوَضَعَهُمَا هُنَاكَ، وَوَضَعَ عِنْدَهُمَا جِرَاباً فِيهِ تَمْرٌ، وَسِقَاءً فِيهِ مَاءٌ، ثُمَّ قَفَّى إِبْرَاهِيمُ مُنْطَلِقاً، فَتَبِعَتْهُ أُمُّ إِسْمَاعِيلَ فَقَالَتْ: يَا إِبْرَاهِيمُ، أَيْنَ تَذْهَبُ وَتَتْرُكُنَا بِهَذَا الوَادِي الَّذِي لَيْسَ فِيهِ أَنِيسٌ وَلاَ شَيْءٌ؟ فَقَالَتْ لَهُ ذَلِكَ مِرَاراً، وَجَعَلَ لاَ يَلْتَفِتُ إِلَيْهَا، قَالَتْ لَهُ: آللهُ أَمَرَكَ بِهَذَا؟ قَالَ: نَعَمْ، قَالَتْ: إذاً لاَ يُضَيِّعُنَا؛ ثُمَّ رَجَعَتْ، فَانْطَلَقَ إِبْرَاهِيمُ (صلى الله عليه وسلم)، حَتَّى إِذَا كَانَ عِنْدَ الثَّنِيَّةِ حَيْثُ لاَ يَرَوْنَهُ، اسْتَقْبَلَ بِوَجْهِهِ البَيْتَ، ثُمَّ دَعَا بِهؤُلاءِ الدَّعَوَاتِ، فَرَفَعَ يَدَيْهِ فَقَالَ: { رَبِّ إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ } حَتَّى بَلَغَ { يَشْكُرُونَ } (إبراهيم: ۳۷) وَجَعَلَتْ أُمُّ إِسْمَاعِيلَ تُرْضِعُ إِسْمَاعِيلَ وَتَشْرَبُ مِنْ ذَلِكَ المَاءِ، حَتَّى إِذَا نَفِدَ مَا فِي السِّقَاءِ عَطِشَتْ، وَعَطِشَ ابْنُهَا، وَجَعَلتْ تَنْظُرُ إِلَيْهِ يَتَلَوَّى - أَوْ قَالَ يَتَلَبَّطُ - فَانْطَلَقَتْ كَرَاهِيَةَ أَنْ تَنْظُرَ إِلَيْهِ، فَوَجَدَتِ الصَّفَا أَقْرَبَ جَبَلٍ فِي الأَرْضِ يَلِيهَا، فَقَامَتْ عَلَيْهِ، ثُمَّ اسْتَقْبَلَتِ الوَادِي تَنْظُرُ هَلْ تَرَى أَحَداً؟ فَلَمْ تَرَ أَحَداً. فَهَبَطَتْ مِنَ الصَّفَا حَتَّى إِذَا بَلَغَتِ الوَادِي، رَفَعَتْ طَرَفَ دِرْعِهَا، ثُمَّ سَعَتْ سَعْيَ الإِنْسَانِ المَجْهُودِ حَتَّى جَاوَزَتِ الوَادِي، ثُمَّ أَتَتِ المَرْوَةَ فَقَامَتْ عَلَيْهَا، فَنَظَرَتْ هَلْ تَرَى أَحَداً؟ فَلَمْ تَرَ أَحَداً، فَفَعَلَتْ ذَلِكَ سَبْعَ مَرَّاتٍ. قَالَ ابن عباس رضى الله عنهما: قَالَ النبيُّ (صلى الله عليه وسلم): ((فَلِذَلِكَ سَعْيُ النَّاسِ بَيْنَهُمَا))

فَلَمَّا أَشْرَفَتْ عَلَى الْمَرْوَةِ سَمِعَتْ صَوْتاً فَقَالَتْ: صَهْ - تُرِيدُ نَفْسَهَا - ثُمَّ تَسَمَّعَتْ، فَسَمِعَتْ أَيضاً. فَقَالَتْ: قَدْ أَسْمَعْتَ إِنْ كَانَ عِنْدَكَ غَوَاثٌ، فَإِذَا هِيَ بِالْمَلَكِ عِنْدَ مَوْضِعِ زَمْزَمَ، فَبَحَثَ بِعَقِبِهِ - أَوْ قَالَ بِجَنَاحِهِ - حَتَّى ظَهَرَ الْمَاءُ، فَجَعَلَتْ تُحَوِّضُهُ وَتَقُولُ بِيَدِهَا هٰكَذَا، وَجَعَلَتْ تَغْرِفُ مِنَ الْمَاءِ فِي سِقَائِهَا وَهُوَ يَفُورُ بَعْدَ مَا تَغْرِفُ. وفي رواية: بِقَدَرِ مَا تَغْرِفُ. قَالَ ابن عباس رضي الله عنهما: قَالَ النبيُّ (ﷺ) :((رَحِمَ اللهُ أُمَّ إِسْمَاعِيلَ لَوْ تَرَكَتْ زَمْزَمَ - أَوْ قَالَ لَوْ لَمْ تَغْرِفْ مِنَ الْمَاءِ - لَكَانَتْ زَمْزَمُ عَيْناً مَعِيناً)). قَالَ: فَشَرِبَتْ وَأَرْضَعَتْ وَلَدَهَا، فَقَالَ لَهَا الْمَلَكُ: لاَ تَخَافُوا الضَّيْعَةَ فَإِنَّ هاهُنَا بَيْتاً لِلّٰهِ يَبْنِيهِ هٰذَا الْغُلاَمُ وَأَبُوهُ، وإِنَّ اللهَ لاَ يُضَيِّعُ أَهْلَهُ، وكان الْبَيْتُ مُرْتَفِعاً مِنَ الأَرْضِ كَالرَّابِيَةِ، تَأْتِيهِ السُّيُولُ، فَتَأْخُذُ عَنْ يَمِينِهِ وَعَنْ شِمَالِهِ، فَكَانَتْ كَذٰلِكَ حَتَّى مَرَّتْ بِهِمْ رُفْقَةٌ مِنْ جُرْهُمٍ، أَوْ أَهْلُ بَيْتٍ مِنْ جُرْهُمٍ مُقْبِلِينَ مِنْ طَرِيقِ كَدَاءَ فَنَزَلُوا فِي أَسْفَلِ مَكَّةَ؛ فَرَأَوْا طَائِراً عَائِفاً، فَقَالُوا: إِنَّ هٰذَا الطَّائِرَ لَيَدُورُ عَلَى مَاءٍ، لَعَهْدُنَا بهذا الْوَادِي وَمَا فِيهِ مَاء. فَأَرْسَلُوا جَرِيًّا أَوْ جَرِيَّيْنِ، فَإِذَا هُمْ بِالْمَاءِ. فَرَجَعُوا فَأَخْبَرُوهُمْ؛ فَأَقْبَلُوا وَأُمُّ إِسْمَاعِيلَ عِنْدَ الْمَاءِ، فقالوا: أَتَأْذَنِينَ لَنَا أَنْ نَنْزِلَ عِنْدَكِ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، وَلٰكِنْ لاَ حَقَّ لَكُمْ فِي الْمَاءِ، قَالُوا: نَعَمْ. قَالَ ابن عباس: قَالَ النبيُّ (ﷺ) :((فَأَلْفَى ذٰلِكَ أُمَّ إِسْمَاعِيلَ، وهي تُحِبُّ الأُنْسَ)) فَنَزَلُوا، فَأَرْسَلُوا إِلَى أَهْلِيهِمْ فَنَزَلُوا مَعَهُمْ، حَتَّى إِذَا كَانُوا بِهَا أَهْلَ أَبْيَاتٍ وَشَبَّ الْغُلاَمُ وَتَعَلَّمَ الْعَرَبِيَّةَ مِنْهُمْ، وَأَنْفَسَهُمْ وَأَعْجَبَهُمْ حِينَ شَبَّ، فَلَمَّا أَدْرَكَ زَوَّجُوهُ امْرَأَةً مِنْهُمْ: وَمَاتَتْ أُمُّ إِسْمَاعِيلَ، فَجَاءَ إِبْرَاهِيمُ بَعْدَمَا تَزَوَّجَ إِسْمَاعِيلُ يُطَالِعُ تَرِكَتَهُ، فَلَمْ يَجِدْ إِسْمَاعِيلَ؛ فَسَأَلَ امْرَأَتَهُ عَنْهُ فَقَالَتْ: خَرَجَ يَبْتَغِي لَنَا - وفي روايةٍ: يَصِيدُ لَنَا - ثُمَّ سَأَلَهَا عَنْ عَيْشِهِمْ وَهَيْئَتِهِمْ، فَقَالَتْ: نَحْنُ بِشَرٍّ، نَحْنُ فِي ضِيقٍ وَشِدَّةٍ؛ وَشَكَتْ إِلَيْهِ، قَالَ: فَإِذَا جَاءَ زَوْجُكِ اقْرَئِي عَلَيْهِ السَّلاَمَ، وَقُولِي لَهُ يُغَيِّرْ عَتَبَةَ بَابِهِ. فَلَمَّا جَاءَ إِسْمَاعِيلُ كَأَنَّهُ آنَسَ شَيْئاً، فَقَالَ: هَلْ جَاءَكُمْ مِنْ أَحَدٍ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، جَاءَنَا شَيْخٌ كَذَا وَكَذَا، فَسَأَلَنَا عَنْكَ فَأَخْبَرْتُهُ، فَسَأَلَنِي: كَيْفَ عَيْشُنَا فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّا فِي جَهْدٍ وَشِدَّةٍ. قَالَ: فَهَلْ أَوْصَاكِ بِشَيْءٍ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، أَمَرَنِي أَنْ أَقْرَأَ عَلَيْكَ السَّلاَمَ، وَيَقُولُ: غَيِّرْ عَتَبَةَ

بَابِكَ، قَالَ: ذَاكَ أَبِي وَقَدْ أَمَرَنِي أَنْ أُفَارِقَكِ! الْحَقِي بِأَهْلِكِ. فَطَلَّقَهَا وَتَزَوَّجَ مِنْهُمْ أُخْرَى، فَلَبِثَ عَنْهُمْ إِبْرَاهِيمُ مَا شَاءَ اللهُ، ثُمَّ أَتَاهُمْ بَعْدُ فَلَمْ يَجِدْهُ، فَدَخَلَ عَلَى امْرَأَتِهِ فَسَأَلَ عَنْهُ. قَالَتْ: خَرَجَ يَبْتَغِي لَنَا قَالَ: كَيْفَ أَنْتُمْ ؟ وَسَأَلَهَا عَنْ عَيْشِهِمْ وَهَيْئَتِهِمْ، فَقَالَتْ: نَحْنُ بِخَيْرٍ وَسَعَةٍ، وَأَثْنَتْ عَلَى اللهِ. فَقَالَ: مَا طَعَامُكُمْ ؟ قَالَتْ: اللَّحْمُ، قَالَ: فَمَا شَرَابُكُمْ ؟ قَالَت: الماءُ، قَالَ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي اللَّحْمِ وَالْمَاءِ. قَالَ النَّبِيُّ (ﷺ): وَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ يَوْمَئِذٍ حَبٌّ وَلَوْ كَانَ لَهُمْ دَعَا لَهُمْ فِيهِ. قَالَ: فَهُمَا لَا يَخْلُو عَلَيْهِمَا أَحَدٌ بِغَيْرِ مَكَّةَ إِلَّا لَمْ يُوَافِقَاهُ.

وَفِي رواية: فَجَاءَ فَقَالَ: أَيْنَ إِسْمَاعِيلُ ؟ فَقَالَتْ امْرَأَتُهُ: ذَهَبَ يَصِيدُ، فَقَالَتْ امْرَأَتُهُ: أَلَا تَنْزِلُ، فَتَطْعَمَ وَتَشْرَبَ ؟ قَالَ: وَمَا طَعَامُكُمْ وَمَا شَرَابُكُمْ ؟ قَالَتْ: طَعَامُنَا اللَّحْمُ وَشَرَابُنَا الْمَاءُ، قَالَ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَهُمْ فِي طَعَامِهِمْ وَشَرَابِهِمْ. قَالَ: فَقَالَ أَبُو القاسم (ﷺ): بَرَكَةُ دَعْوَةِ إِبْرَاهِيمَ. قَالَ: فَإِذَا جَاءَ زَوْجُكِ فَاقْرَئِي عَلَيْهِ السَّلَامَ وَمُرِيهِ يُثَبِّتُ عَتَبَةَ بَابِهِ. فَلَمَّا جَاءَ إِسْمَاعِيلُ قَالَ: هَلْ أَتَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، أَتَانَا شَيْخٌ حَسَنُ الْهَيْئَةِ، وَأَثْنَتْ عَلَيْهِ، فَسَأَلَنِي عَنْكَ فَأَخْبَرْتُهُ، فَسَأَلَنِي كَيْفَ عَيْشُنَا فَأَخْبَرْتُهُ أَنَّا بِخَيْرٍ. قَالَ: فَأَوْصَاكِ بِشَيْءٍ ؟ قَالَتْ: نَعَمْ، يَقْرَأُ عَلَيْكَ السَّلَامَ وَيَأْمُرُكَ أَنْ تُثَبِّتَ عَتَبَةَ بَابِكَ. قَالَ: ذَاكَ أَبِي، وَأَنْتِ الْعَتَبَةُ، أَمَرَنِي أَنْ أُمْسِكَكِ. ثُمَّ لَبِثَ عَنْهُمْ مَا شَاءَ اللهُ، ثُمَّ جَاءَ بَعْدَ ذَلِكَ وَإِسْمَاعِيلُ يَبْرِي نَبْلاً لَهُ تَحْتَ دَوْحَةٍ قَرِيباً مِنْ زَمْزَمَ، فَلَمَّا رَآهُ قَامَ إِلَيْهِ، فَصَنَعَا كَمَا يَصْنَعُ الْوَالِدُ بِالْوَلَدِ وَالْوَلَدُ بِالْوَالِدِ. قَالَ: يَا إِسْمَاعِيلُ، إِنَّ اللهَ أَمَرَنِي بِأَمْرٍ، قَالَ: فَاصْنَعْ مَا أَمَرَكَ رَبُّكَ ؟ قَالَ: وَتُعِينُنِي، قَالَ: وَأُعِينُكَ، قَالَ: فَإِنَّ اللهَ أَمَرَنِي أَنْ أَبْنِي بَيْتاً هَاهُنَا، وَأَشَارَ إِلَى أَكَمَةٍ مُرْتَفِعَةٍ عَلَى مَا حَوْلَهَا، فَعِنْدَ ذَلِكَ رَفَعَ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ، فَجَعَلَ إِسْمَاعِيلُ يَأْتِي بِالْحِجَارَةِ وَإِبْرَاهِيمُ يَبْنِي حَتَّى إِذَا ارْتَفَعَ الْبِنَاءُ، جَاءَ بِهَذَا الْحَجَرِ فَوَضَعَهُ لَهُ فَقَامَ عَلَيْهِ، وَهُوَ يَبْنِي وَإِسْمَاعِيلُ يُنَاوِلُهُ الحجارة وَهُمَا يَقُولَانِ: {رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (البقرة:۱۲۷).

وفی روایةٍ: إنَّ إبْرَاهِيمَ خرَجَ بِإسْمَاعِيلَ وَأُمِّ إسْمَاعِيلَ، مَعَهُمْ شَنَّةٌ فِيهَا مَاءٌ، فَجَعَلَتْ أُمُّ إسْمَاعِيلَ تَشْرَبُ مِنَ الشَّنَّةِ فَيَدِرُّ لَبَنُهَا عَلَى صَبِيِّهَا، حَتَّى قَدِمَ مَكَّةَ، فَوَضَعَهَا تَحْتَ دَوْحَةٍ، ثُمَّ رَجَعَ إبْرَاهِيمُ إلَى أهْلِهِ، فَاتَّبَعَتْهُ أُمُّ إسْماعيلَ حَتَّى لَمَّا بَلَغُوا كَدَاءَ، نَادَتْهُ مِنْ وَرَائِهِ: يَا إبْرَاهِيمُ! إلَى مَنْ تَتْرُكُنَا؟ قَالَ: إلَى اللهِ. قَالَتْ: رَضِيتُ باللهِ. فرَجَعتْ وَجَعَلَتْ تَشْرَبُ مِنَ الشِّنَّةِ وَيَدُرُّ لَبَنُهَا عَلَى صَبِيِّهَا، حَتَّى لَمَّا فَنِيَ المَاءُ، قَالَتْ: لَوْ ذَهَبْتُ فَنَظَرْتُ لَعَلِّي أُحِسُّ أَحداً. قَالَ: فَذَهَبَتْ فَصَعِدَتِ الصَّفَا، فَنَظَرَتْ وَنَظَرَتْ هَلْ تُحِسُّ أحداً، فَلَمْ تُحِسَّ أَحداً، فَلَمَّا بَلَغَتِ الوَادِي سَعَتْ، وأتَتِ المَرْوَةَ، وَفَعَلَتْ ذٰلِكَ أشْوَاطاً، ثُمَّ قَالَتْ: لَوْ ذَهَبْتُ فَنَظَرْتُ مَا فَعَلَ الصَّبِيُّ، فَذَهَبَتْ فَنَظَرَتْ فَإذَا هُوَ عَلَى حَالِهِ، كَأَنَّهُ يَنْشَغُ لِلْمَوْتِ، فَلَمْ تُقِرَّهَا نَفْسُهَا فَقَالَتْ: لَوْ ذَهَبْتُ فَنَظَرْتُ لَعَلِّي أُحِسُّ أحداً، فَذَهَبَتْ فَصَعِدَتِ الصَّفَا، فَنَظَرَتْ ونظرت فَلَمْ تُحِسَّ أَحداً، حَتَّى أتَمَّتْ سَبْعاً، ثُمَّ قَالَتْ: لَوْ ذَهَبْتُ فَنَظَرْتُ مَا فَعَلَ، فَإذَا هِيَ بِصَوْتٍ، فَقَالَتْ: أَغِثْ إنْ كَانَ عِنْدَكَ خَيْرٌ، فَإذَا جِبْرِيلُ فَقَالَ بِعقِبِهِ هٰكَذَا، وَغَمَزَ بِعَقِبِهِ عَلَى الأرْضِ، فَانْبَثَقَ المَاءُ فَدَهِشَتْ أُمُّ إسْمَاعِيلَ، فَجَعَلَتْ تَحْفِنُ... وَذَكَرَ الحَدِيثَ بِطُولِهِ، رواه البخاری بهذه الروايات كلها.

((الدَّوْحَةُ)) الشَّجَرَةُ الكَبِيرَةُ. قولُهُ: ((قَفَّى)): أيْ: وَلَّى. ((وَالجَرِيُّ)): الرَّسُولُ. ((وَأَلْفَى)): معناه وَجَدَ. قولُهُ: ((يَنْشَغُ)): أيْ: يَشْهَقُ.

یہ ایک لمبی روایت ہے جس میں سیدنا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے وہ اپنی اہلیہ حضرت ہاجرہ اور ان کے صاحبزادہ حضرت اسماعیل (علیہما السلام) کو مکہ مکرمہ کی سرزمین پر چھوڑ گئے تھے۔ یہ بخاری شریف کی روایت ہے۔

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) حضرت ہاجرہ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل کو لے کر آئے، یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت اسماعیل دودھ پی رہے تھے (ان کی عمر دو سال

کے قریب تھی) اور حضرت ہاجرہ کو کعبۃ اللہ کے پاس بڑے درخت کے نزدیک زمزم کے کنویں والی جگہ پر مسجد کے اوپر والے حصہ میں چھوڑا (اس وقت کعبۃ اللہ اور زمزم کا کنواں نہیں تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اِس وقت جہاں کعبۃ اللہ اور زمزم کا کنواں واقع ہے وہاں لاکر بٹھایا، اور بعد میں جب مسجد بنی تو وہی اوپر والا حصہ کہلایا) اس وقت مکہ میں کوئی بھی آباد نہیں تھا (وہ جگہ بالکل غیر آباد اور ایک دم بنجر تھی) اور نہ وہاں پانی تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کو لاکر وہاں چھوڑ دیا، اور ایک چمڑے کی تھیلی جس میں کھجوریں تھیں اور ایک مشکیزہ پانی ان کے حوالہ کیا، اور ان کو چھوڑ کر (بغیر کچھ کہے) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) وہاں سے پیٹھ پھیر کر لوٹنے لگے۔ حضرت اسماعیل کی والدہ (حضرت ہاجرہ) ان کے پیچھے پیچھے ہو گئیں اور کہہ رہی تھیں: اے ابراہیم! آپ ہمیں اس میدان میں چھوڑ کر کہاں جارہے ہیں؟ یہاں اُنس حاصل کرنے کے لیے کوئی آدمی موجود نہیں، اور کوئی چیز بھی نہیں۔ حضرت ہاجرہ نے یہ بات بار بار کہی لیکن حضرت ابراہیم (علیہ السلام) مڑ کر ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ حضرت ہاجرہ کے دل میں ایک بات آئی اور انہوں نے پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس بات کا حکم دیا ہے؟ (تو ان کی طرف رخ کئے بغیر صرف اتنا) جواب دیا: جی ہاں۔ یہ جواب سن کر حضرت ہاجرہ کہنے لگیں: تب تو وہ (اللہ تعالیٰ) ہمیں ضائع نہیں کرے گا، اور کہہ کر لوٹ گئیں (اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا اللہ تعالیٰ کی ذات پر اعتماد کیسا تھا!) جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) چلتے چلتے ایک درّے (یعنی پہاڑی کی گھاٹی) کے پاس ایسی جگہ پہنچے جہاں سے ماں بیٹے ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے تو اپنا چہرہ بیت اللہ کی طرف کیا (اُس وقت وہاں بیت اللہ نہیں تھا، خالی جگہ تھی) اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے اور کہا: اے میرے پروردگار! میں نے اپنی اولاد کو ایک ایسے میدان میں جو کھیتی کے لائق نہیں ہے، تیرے حرمت اور عزت والے گھر کے پاس ٹھہرایا ہے، اے میرے پروردگار! یہ اس لیے کیا تاکہ وہ نماز قائم کریں، لہٰذا (اے اللہ) تو لوگوں کے دلوں کو ان

کی طرف مائل کردے (اور یہاں کھیتی باڑی تو ہے نہیں کہ دانہ بو کر کچھ کھانے کا انتظام کر سکیں) تو ان کو پھلوں کے ذریعہ سے روزی دینا، تاکہ وہ تیرا شکر ادا کریں (حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جہاں کھڑے ہو کر یہ دعا مانگی تھی وہ مروہ والی پہاڑی کا وہ حصہ ہے جہاں دروازہ پر ''باب المُدّعیٰ'' (یعنی دعا والا دروازہ) لکھا ہوا ہے۔ وہیں سے باہر نکلتے ہیں تو چھپرا بازار آتا ہے(۱) ترکوں کے زمانہ میں تو وہاں ایک مسجد بنی ہوئی تھی جس کا نام بھی ''اَلْمَسْجِدُ الْمُدّعیٰ'' تھا)۔

(آس پاس کوئی انسانی آبادی نہیں، صرف حضرت ہاجرہ ہیں اور ان کے دودھ پیتے بیٹے حضرت اسماعیل ہیں جن کی عمر دو سال بھی نہیں) اب حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کو دودھ پلاتی رہیں، اور پانی پیتی رہیں جو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) مشکیزہ کے اندر ان کو دے گئے تھے۔ جب وہ پانی ختم ہو گیا تو یہ بھی پیاسی ہوئیں اور بچہ بھی پیاسا ہوا۔ حضرت ہاجرہ اس بچہ کو دیکھ رہی ہیں کہ وہ پیاس کی بے چینی کی وجہ سے زمین پر تڑپ رہا ہے، ان سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تو وہاں سے دور چلی گئیں، اور سب سے قریب صفا پہاڑی تھی اسی پر چڑھ گئیں، اور سامنے جو کھلا میدان تھا اس میں نظر دوڑانے لگیں کہ شاید کوئی آدمی نظر آئے، لیکن کوئی نظر نہیں آیا، تو صفا سے نیچے اتریں یہاں تک کہ وادی (نیچی جگہ) میں پہنچیں (اب تک تو صفا پہاڑی پر تھیں جہاں سے حضرت اسماعیل کو بھی دیکھ سکتی تھیں، لیکن جب وہاں سے اُتر کر مروہ پہاڑی پر جا رہی تھیں، اور اترتے اترتے زیادہ نیچائی پر پہنچیں جہاں سے حضرت اسماعیل نظر نہیں آ رہے تھے، تو اس نچلے حصہ کو دوڑ کر پار کیا،

(۱) اب تو یہ چھپرا بازار بھی نہیں رہا۔

یہی وہ جگہ ہے جس کو " مِیلَینُ اَخضَرَین" کہا جاتا ہے، جہاں سعی میں دوڑتے ہیں اور وہاں بطورِ نشانی سبز نشان بنے ہوئے ہیں) تو اپنے کرتے کا ایک کونہ جو (نیچے تک لٹکے ہوئے ہونے کی وجہ سے) دوڑنے میں رُکاوٹ بن سکتا تھا اس کو پکڑ کر اُٹھایا اور ایک تھکے ہوئے آدمی کی طرح دوڑنے لگیں، یہاں تک کہ اس نیچائی والے حصہ کو پار کیا، اور مروہ پر پہنچیں تو وہاں سے چاروں طرف نظر دوڑائی کہ کوئی نظر آئے (تاکہ کھانے پینے کی کچھ مدد ہو) لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ اس طرح سات مرتبہ کیا۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: یہی وہ سعی ہے جو صفا و مروہ کے درمیان کی جاتی ہے (گویا اس عمل کو حج و عمرہ کے رکن میں اللہ تعالیٰ نے جاری کر دیا۔ یہ عمل ایسے ہی تھوڑا جاری ہوا، بلکہ اس کے پیچھے ایسی عظیم قربانی دی گئی ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے اور وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسی قبول ہوگئی کہ قیامت تک حج کے لیے آنے والوں کے لیے اس عمل کو ضروری قرار دیا۔ آج جہاں مکہ مکرمہ واقع ہے اس پورے علاقہ کا تصور کیجئے کہ کوئی فرد بشر نہ ہو اور اسی جگہ تنہا عورت اپنے چھوٹے دودھ پیتے بچہ کو لے کر رہ رہی ہو؛ تو کیا حال ہو؟) اخیر میں جب وہ ساتواں چکر پورا کر کے مروہ پر پہنچیں تو ایک آواز کان میں پڑی، تو اپنے آپ سے کہنے لگیں: چپ رہ۔ پھر دوسری مرتبہ کان لگائے کہ آواز کہاں سے آرہی ہے، تو پھر آواز سنائی دی، تو وہ بولیں: بولنے والا کون ہے، تمہاری آواز تو میں نے سن لی، کیا تمہارے پاس ہماری مدد کے لیے کچھ ہے؟ تو دیکھا کہ جہاں زمزم کا کنواں ہے وہاں ایک فرشتہ تھا (یہ حضرت جبرئیل تھے) اس نے اپنی ایڑی یا اپنے پَروں سے زمین کو کریدا، یہاں تک کہ پانی نکلا، تو وہ اپنے ہاتھ سے حوض (منڈیر) بنانے لگیں (تاکہ دوسری طرف چلا نہ جائے) اور اپنے ہاتھ میں پانی لے کر مشکیزہ میں ڈالنے لگیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جتنا پانی ابلتا تھا وہ مشکیزہ میں ڈال دیتیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ پر رحمت بھیجے، اگر وہ زمزم کو اسی حالت میں چھوڑ دیتیں، اور حوض (منڈیر) نہ بناتیں تو یہ ایسا چشمہ ہوتا جو ہمیشہ کے لیے بہتا ہی رہتا۔

حضرت ابن عباسؓ نبی کریم (ﷺ) کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ: حضرت ہاجرہ نے وہ پانی خود بھی پیا جس کے نتیجہ میں ان کی پیاس دور ہوئی اور دودھ بھی اترنے لگا تو بچہ کو دودھ پلایا۔ (اللہ تعالیٰ نے اس پانی میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ پیاس بجھانے کے ساتھ ساتھ غذا کا کام بھی دیتا ہے۔ چناں چہ آج بھی ایسے لوگ ہیں جو اس کو پی کر اپنی غذا اور پانی دونوں کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں) پھر اس فرشتہ (یعنی حضرت جبرئیل) نے حضرت ہاجرہ سے کہا: تم ضائع ہونے کا اندیشہ اور ڈر مت رکھنا، یہاں اللہ تعالیٰ کا ایک گھر بننے والا ہے جس کو یہ لڑکا اور اس کے والد مل کر بنائیں گے، اللہ تعالیٰ اس کو اور اس کے گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا (سب سے پہلے بیت اللہ کو حضرت آدم (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بنایا تھا، پھر طوفانِ نوح کے وقت وہ گھر اُٹھالیا گیا لیکن) بیت اللہ والی جگہ زمین سے اُٹھی ہوئی ٹیلہ کی طرح سے موجود تھی، سیلاب کا پانی آتا رہتا تھا اور اس کے دائیں بائیں سے گزر جاتا تھا۔ اسی طرح حضرت ہاجرہ وہاں قیام پذیر رہیں (وہ خود بھی پانی پیتی تھیں جس سے ان کی غذائیت کی ضرورت پوری ہوتی تھی، اور بچے کو دودھ پلاتی تھیں) یہاں تک کہ ان کے پاس سے قبیلۂ جرہم کا ایک قافلہ، یا قبیلۂ جرہم کا ایک خاندان اور گھرانہ گزرا، وہ لوگ اوپر کی طرف سے ''کَدَاء'' والے راستہ سے آئے (حَجُون والا علاقہ جہاں مکہ مکرمہ کا قبرستان ہے، وہ مکہ کا بالائی والا حصہ کہلاتا ہے، اس کو ''کَدَاء'' کہتے ہیں۔ اور اس کے سامنے مِسْفَلَہ والا جو حصہ پڑتا ہے، اس کو ''کُدیٰ'' کہتے ہیں) اور نیچائی والی جگہ پر ٹھہرے (جہاں حضرت ہاجرہ تھیں وہاں نہیں پہنچے تھے، چوں کہ چاروں طرف

پہاڑیاں بھی تھیں) انہوں نے وہاں ایک پرندہ دیکھا (اور وہ پرندہ عام طور پر پانی کے آس پاس ہی ہوا کرتا ہے) تو وہ کہنے لگے کہ: یہ پرندہ تو پانی پر گھوم رہا ہے۔ اور اس علاقے کے متعلق ہماری معلومات (اور آج تک کا ہمارا تجربہ) یہ ہے کہ یہاں پانی نہیں (پھر یہ پرندہ یہاں کہاں؟) چناں چہ ایک دو آدمیوں کو بھیجا (کہ جہاں وہ پرندہ اڑ رہا ہے وہاں جاکر دیکھو کہ کیا وہاں پانی ہے؟) ان دو آدمیوں نے آکر دیکھا کہ (وہاں حضرت ہاجرہ تھیں، اور) پانی تھا، انہوں نے واپس جاکر قافلہ، یا خاندان کو اطلاع دی۔ چناں چہ وہ سارے لوگ وہاں آئے، حضرت اسماعیل کی والدہ پانی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں، ان قافلہ والوں نے کہا: کیا آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیں گی کہ ہم یہاں ٹھہریں؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! ٹھہریئے، لیکن اس پانی پر تمہیں اختیار نہیں ہوگا (پانی کی مالک میں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں پینے کو ملے گا، لیکن اس پر اختیارات میرے ہیں اور رہیں گے) انہوں نے کہا: جی! ٹھیک ہے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: حضرت اسماعیل کی والدہ نے وہ چیز پالی جو وہ پسند کرتی تھیں کہ کچھ لوگ یہاں ہوں، تاکہ رہنے میں انسیت ہو۔ چناں چہ وہ قافلہ والے وہاں ٹھہر گئے۔ پھر انہوں نے اپنے خاندان والوں کو بھی کہلوایا کہ (یہاں پانی کا انتظام ہے) وہ بھی آئے اور یہاں ٹھہر گئے (گویا ایک آبادی سی ہوگئی) یہاں تک کہ کئی گھرانے یہاں آکر آباد ہوگئے، اور حضرت اسماعیل نوجوان ہوئے، اور (قبیلۂ جرہم کی زبان عربی تھی) ان سے عربی زبان سیکھی (ان سے سب سے پہلے عربی سیکھنے والے حضرت اسماعیل ہیں) حضرت اسماعیل جب جوان ہوئے تو اس قبیلہ والوں کو بڑے اچھے لگے (تمام خوبیوں میں سب سے فائق تھے) جب بالغ ہوئے اور شادی کی عمر کو پہنچے تو قبیلۂ جرہم والوں نے اپنی ایک لڑکی سے ان کا نکاح کرادیا۔ پھر حضرت ہاجرہ کا انتقال ہوگیا اور حضرت اسماعیل کی شادی ہوگئی، اس کے بعد ایک روز حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنے چھوڑے ہوئے (بال بچوں) کی خبر لینے کے لیے آئے تو حضرت اسماعیل

نہیں تھے، ان کی بیوی سے پوچھا: کہاں گئے ہیں؟ اس نے کہا: ہمارے لیے روزی تلاش کرنے کے لیے گئے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ: شکار کرنے کے لیے گئے ہیں (ان کا ذریعۂ معاش حلال پرندوں اور جانوروں کا شکار تھا جن کا گوشت کھاتے تھے) پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے ان کی بیوی (اپنی بہو) سے پوچھا کہ: تمہارا گزران کیسا چل رہا ہے؟ حالات کیا ہیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ: ہم تو بہت تکلیف، تنگی و پریشانی میں ہیں، بہت شکوے شکایتیں کیں (دیکھو! اتنی دور سے خیر خبر لینے کے لیے آئے تھے، اور مقصد حالات معلوم کرنا تھا وہ پورا ہو گیا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حضرت اسماعیل کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا) حضرت اسماعیل کی بیوی سے کہا: جب تمہارا شوہر آجائے تو اسے میرا سلام کہنا، اور کہنا کہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ بدل دو۔ جب حضرت اسماعیل آئے تو انہوں نے محسوس کیا کہ کوئی آکر گیا ہے (بعض روایتوں میں آتا ہے کہ انہوں نے انوارات محسوس کئے تو احساس ہوا کہ ابا آکر گئے ہیں) انہوں نے آتے ہی اپنی بیوی سے پوچھا: کوئی آیا تھا؟ اس نے کہا: جی ہاں! (اور اچھا نام لے کر نہیں بتایا، بلکہ بطورِ استہزاء کہا کہ) ایسا ایسا بوڑھا آدمی آیا تھا، آپ کے متعلق پوچھا، میں نے بتلایا، اس نے یہ بھی پوچھا کہ: تمہارا گزر بسر کیسے ہے؟ میں نے بتایا: ہم بڑی تکلیف، پریشانی اور تنگی میں زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت اسماعیل نے پوچھا: کچھ کہہ کر گئے ہیں؟ (کچھ وصیت، کوئی پیغام دے کر گئے ہیں؟) کہا: جی ہاں! مجھے کہا کہ تمہارے شوہر کو سلام کہنا، اور یہ بھی کہہ گئے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ بدل دو۔ حضرت اسماعیل نے کہا: وہ میرے ابا تھے، اور مجھے کہہ کر گئے ہیں کہ میں تجھے الگ کر دوں۔ جا! تو اپنے گھر والوں کے یہاں چلی جا۔ یہ کہہ کر حضرت اسماعیل نے اس کو طلاق دیدی۔ اس کے بعد انہی میں سے ایک دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنے وہاں ایک زمانہ تک ٹھہرے، پھر دوبارہ آئے، اب کی مرتبہ بھی حضرت اسماعیل کو گھر پر نہیں پایا (کہیں باہر گئے ہوئے تھے) ان کی بیوی (اپنی بہو) کے

پاس پہنچے، اس سے ان کے متعلق پوچھا، اس نے کہا: ہمارے لیے روزی تلاش کرنے کے لیے گئے ہیں۔ پوچھا: تم لوگ کیسے ہو؟ کس طرح گزارا ہوتا ہے؟ گزرانِ زندگی کے متعلق حالات معلوم کئے۔ اس نے کہا: الحمد للہ! بہت آرام اور کشادگی سے ہیں (اس نے اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا) اور اللہ کی حمد وثنا بیان کی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے پوچھا: کیا کھاتے ہو؟ اس نے بتایا: گوشت کھاتے ہیں۔ پوچھا: کیا پیتے ہو؟ بتایا: پانی پیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دعا دی: اے اللہ! ان کو پانی اور گوشت میں خوب برکت دیجئے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ان کے وہاں غلہ اور اناج تو ہوتا ہی نہیں تھا، اگر ہوتا تو اس کی برکت کی دعا کر دیتے۔ یہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کی برکت ہے کہ وہاں کوئی آدمی گوشت اور پانی پر گزارا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، جبکہ مکہ مکرمہ کے علاوہ (کسی اور جگہ) کوئی آدمی گوشت اور پانی پر گزارا نہیں کر سکتا۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ: جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) آئے تو ان کے گھر والوں سے پوچھا کہ حضرت اسماعیل کہاں گئے؟ ان کی بیوی نے کہا: وہ شکار کے لیے گئے ہیں۔ حضرت اسماعیل کی بیوی نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) سے کہا: آپ اترتے نہیں، کچھ کھاپی لیجئے۔ تو پوچھا: تم لوگ کیا کھاتے پیتے ہو؟ کہا: ہمارا کھانا گوشت ہے، اور پینا پانی ہے، تو انہوں نے دعا دی کہ: اے اللہ! ان کے کھانے میں اور پینے میں برکت دے۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: یہ سب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کی دعا کی برکت ہے۔

بعض روایتوں میں یہ بھی ہے کہ: جب حضرت ابراہیم (علیہ السلام) آئے تو آپ کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ حضرت اسماعیل کی اہلیہ (ان کی بہو) نے کہا: آپ اترتے نہیں کہ میں دھو دیتی ہوں۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنی سواری پر رہے، اس نے پتھر لا کر رکھا، تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اس پتھر پر پاؤں رکھا اور سر جھکایا، تو اس نے ایک طرف کے بال دھو دیئے، پھر وہ پتھر دوسری طرف رکھا تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے دوسری طرف پیر رکھا، اور دوسری طرف سر جھکایا تو اس نے اس طرف کے بال دھو دیئے۔ جب جانے لگے تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا: جب تمہارا

شوہر آئے تو میرا سلام کہنا،اور یہ پیغام پہنچادینا کہ اپنی چوکھٹ کو سنبھالے رکھنا۔جب حضرت اسماعیل آئے (تو محسوس کیا کہ کوئی آکر گیا ہے)گھر والوں سے پوچھا:کوئی آیا تھا؟کہا:جی ہاں !ایک بڑی عمر کے بزرگ آئے تھے جو بہت حسین وجمیل تھے اور ان کی بڑی تعریف اور خوبیاں بیان کیں اور انہوں نے آپ کے متعلق مجھ سے پوچھاتو میں نے انہیں بتایا کہ شکار کرنے گئے ہیں ، اور یہ بھی پوچھا کہ:تمہاری گزر بسر کیسے ہورہی ہے؟میں نے بتایا کہ بہت اچھی طرح گزررہی ہے،اور ہم بہت اچھی طرح رہ رہے ہیں۔حضرت اسماعیل نے پوچھا:کیاکچھ کہہ کر گئے ہیں ؟ کہا:جی ہاں ! آپ کو سلام کہا ہے،اور یہ کہہ کر گئے ہیں کہ اپنے گھر کی چوکھٹ کو سنبھالے رکھنا۔حضرت اسماعیل نے کہا:وہ میرے اباتھے،تو ہی میرے گھر کی چوکھٹ ہے،اور مجھے تاکید کر گئے ہیں کہ تجھے سنبھالے رکھوں ۔پھر حضرت اسماعیل ایک زمانہ تک اپنے یہاں رہے اس کے بعد حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پھر خیر خبر لینے آئے تواس بار حضرت اسماعیل موجود تھے جو زمزم کے پاس ایک بڑے درخت کے نیچے لکڑی چھیل رہے تھے۔جب حضرت اسماعیل نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو دیکھاتو کھڑے ہوگئے اور دونوں نے وہی کیا جو باپ بیٹے کے ساتھ اور بیٹا باپ کے ساتھ کرتا ہے(یعنی آپس میں ملے،معانقہ کیا،انہوں نے ہاتھ کو بوسہ دیا،انہوں نے پیشانی چومی) اور پھر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا:اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے،حضرت اسماعیل (علیہ السلام) نے کہا:اباجان!اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا ہے اس کو آپ ضرورانجام دیجئے۔پوچھا:تم میری مدد کروگے ؟ کہا:سرآنکھوں پر؛ ضرور مدد کروں گا۔فرمایا:اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ یہاں (اللہ کا)ایک گھر بناؤں ، اور وہاں مٹی کا ایک ٹیلہ سابنا ہوا تھااس کی طرف اشارہ کیا۔چناں چہ انہیں بنیادوں کوان دونوں نے اٹھایا(روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نے آکر بتایا کہ یہاں اس کی دیواریں ہیں ،جب کھودا گیاتو وہاں بیت اللہ کی بنیادیں نکلیں)چناں چہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) پتھر لاتے تھے،اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) دیوار بناتے تھے یہاں تک کہ جب وہ عمارت اونچی ہوگئی(اور ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا)تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ کوئی پتھر لاؤ تاکہ میں اس

پر کھڑے رہ کر دیوار اونچی کروں۔ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) پتھر تلاش کرنے گئے تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ ایک پتھر وہاں رکھوا دیا، کسی نے بتایا کہ یہ پتھر تمہارے کام کا ہے) تو انہوں نے اسی پتھر کو لا کر رکھ دیا، چناں چہ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے اسی پر کھڑے ہو کر آگے کا کام پورا کیا (اس پتھر کی خاصیت یہ تھی کہ جوں جوں دیوار اونچی ہوتی گئی وہ پتھر بھی آٹومیٹک اونچا ہوتا گیا، جب نیچے ضرورت ہوتی تو وہ بھی نیچا ہوتا، اس پر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے قدموں کے نشانات بھی ہو گئے: یہی مقامِ ابراہیم ہے) حضرت ابراہیم (علیہ السلام) بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے، اور حضرت اسماعیل پتھر لا کر دے رہے تھے اور دونوں باپ بیٹے دعا کرتے جا رہے تھے: ﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ﴾ (البقرۃ:۱۲۷) اے ہمارے پروردگار! ہمارے اس عمل کو قبول کر لیجیے، تو دعاؤں کو سننے والا اور دلوں کے حال سے واقف ہے۔

ایک اور روایت میں یہ بھی ہے کہ: حضرت ابراہیم (علیہ السلام) حضرت اسماعیل اور ان کی والدہ کو لے کر نکلے (شام میں رہتے تھے وہاں سے مکہ مکرمہ آئے) ان کے ساتھ پرانا مشکیزہ تھا جس میں پانی تھا، حضرت اسماعیل کی والدہ مشکیزہ میں سے پانی پیتی رہیں اور ان کا دودھ اترتا رہا (جو بچے کو پلاتی رہیں) یہاں تک کہ وہ مکہ مکرمہ پہنچے تو حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے حضرت اسماعیل کی والدہ کو ایک بڑے درخت کے نیچے ٹھہرا دیا اور حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اپنے گھر واپس جانے لگے، حضرت اسماعیل کی والدہ ان کے پیچھے پیچھے چلیں، یہاں تک کہ جب "کَداء" (یعنی اوپر والے حصہ) تک پہنچے تو حضرت اسماعیل کی والدہ پکار کر کہنے لگیں: اے ابراہیم! آپ ہمیں کہاں چھوڑ کر جا رہے ہو؟ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) نے جواب میں صرف اتنا کہا: اللہ کے حوالے۔ یہ سن کر حضرت ہاجرہ نے کہا: میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں، چناں چہ وہ واپس لوٹ گئیں، اور مشکیزے میں سے پانی پیتی رہیں، ان کا دودھ بھی اترتا تھا جو بچہ کو پلاتیں۔ یہاں تک کہ جب پانی ختم ہو گیا، تو اپنے جی میں سوچا کہ میں ذرا اِدھر اُدھر جا کر دیکھوں، شاید

کوئی آدمی مل جائے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ وہ گئیں اور صفا پر چڑھیں اور اِدھر اُدھر بار بار دیکھتی رہیں کہ کوئی آدمی نظر آئے، لیکن کوئی آدمی نظر نہیں آیا۔ تو وہاں سے اتریں (اب تک تو آہستہ آہستہ چلتی تھیں اس لیے کہ حضرت اسماعیل نظر آتے تھے) جب نشیبی حصہ میں پہنچیں تو بچہ نظر نہیں آیا تو ایک دوڑ لگائی اور مروہ پر پہنچیں اسی طرح کئی چکر لگائے، پھر وہ اپنے جی میں کہنے لگیں کہ جا کر اپنے بچے کو تو دیکھوں کہ اس کا کیا حال ہے۔ بچے کے قریب جا کر دیکھا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مرنے کے بالکل قریب ہے، ان کو چین نہیں پڑا تو سوچا کہ جا کر دیکھوں، شاید کوئی نظر آ جائے، پھر صفا پر چڑھیں، اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی، لیکن کوئی نظر نہیں آیا، یہاں تک کہ سات چکر پورے کئے، پھر جی میں کہنے لگیں: ذرا بچے کو دیکھوں کہ اس کا کیا حال ہے؟ کہ اچانک کوئی آواز کان میں پڑی (کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا) انہوں نے کہا: اگر تمہارے پاس کوئی بھلائی ہو، یا کچھ مدد ہو سکتی ہو؛ تو کرو۔ وہ حضرت جبرئیل تھے، چناں چہ انہوں نے زمین پر اپنی ایڑی ماری، وہاں سے پانی پھوٹ پڑا، حضرت اسماعیل کی والدہ یہ دیکھ کر ایک دم گھبرا گئیں اور وہ اپنے چلو میں پانی بھرنے لگیں......... (پھر آگے پوری روایت بیان فرمائی)۔

کھمبی منّ کی قسم ہے

حدیث ۱۸۶۸:-

وعن سعيد بن زيد رضی الله عنه قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ (ﷺ) يقولُ: ((الكَمْأَةُ مِنَ المَنِّ، وَمَاؤُهَا شِفَاءٌ لِلْعَيْنِ.)) (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:-حضرت سعید بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو فرماتے ہوئے سنا: کھُمبی مَنّ کی قسم میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھ کے لیے شفاء ہے۔

افادات:-اللہ تعالیٰ نے جس زمانہ میں بنی اسرائیل کو وادی تیہ میں روک دیا تھا اور وہاں کھانے پینے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مَنّ وسلویٰ اتارا تھا۔

"مَنّ" گوند کے مشابہ ایک چیز تھی جو منجانب اللہ درختوں کی شاخوں پر گرتی تھی، اور گوند کی طرح درختوں پر جم جایا کرتی تھی، اردو میں اس کا ترجمہ ترنجبین سے کرتے ہیں۔

"سلویٰ" ایک پرندہ کا نام ہے جس کو اردو میں بُٹیر کہتے ہیں۔

عربی زبان میں "مَنَّ یَمُنُّ" کا معنیٰ احسان کرنا ہوتا ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے بطور احسان بغیر محنت کے یہ چیز ان کو عطا فرمائی تھی۔

مذکور حدیث میں "الکَمْأَۃُ" جو ایک پودا ہے جس کو اردو میں کھُمبی اور سانپ کی چھتری کہتے ہیں جو برسات کے موسم میں اُگتی ہے، اور انڈے کی طرح سفید ہوتی ہے، اس کو "مَنّ" کی قسم سے قرار دیا گیا، کیوں کہ یہ پودا بغیر بیج ڈالے نکل آتا ہے، اس کے لیے کوئی محنت ومشقت نہیں کرنی پڑتی، بالکل مفت میں یہ سبزی مل جاتی ہے اس لیے حضور (ﷺ) نے اس کو "مَنّ" سے تعبیر فرمایا۔

کھمبی کا پانی آنکھ کے لیے شفاء ہے

"اس کا پانی آنکھ کے لیے شفاء ہے" یعنی اس کے پانی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ آنکھ کی بیماریوں کو ختم کرتی ہے، اور آنکھ کو فائدہ ہوتا ہے۔

حضراتِ شراح نے لکھا ہے کہ کھُنبی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک زہریلی بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو آدمی حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اس ارشاد پر پورے اعتماد کے ساتھ عمل کرے گا اس کو توان شاء اللہ اس سے کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے، اور جو آدمی ایسا ہو کہ تذبذب کرے کہ استعمال کروں یا نہ کروں؛ تو اس کو چاہئے کہ کسی طبیب سے مشورہ کر کے اس کے مطابق عمل کرے۔

بعضوں نے یہ بھی کہا کہ: سرمہ کے پتھر کو اس کے پانی میں ایک مدت تک رہنے دیا جائے یہاں تک کہ اس کا پانی اس کے اندر جذب ہو جائے، پھر اس پتھر کو پیس لیا جائے اور اس کے سرمہ کو استعمال کیا جائے تو اس سے آنکھ کو فائدہ ہو گا۔

كِتَابُ

الْاِسْتِغْفَارِ

بَابُ الْأَمْرِ بِالْإِسْتِغْفَارِ وَفَضْلِهِ

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے نیا عنوان ”کتاب الاستغفار“ قائم کیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت اور معافی طلب کرنا۔ اس سلسلہ میں شروع میں چند آیتیں پیش کی ہیں:

استغفار کے متعلق آیاتِ قرآنیہ

﴿وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ.﴾ (محمد:۱۹)

ترجمہ:- آپ اپنے قصور اور کوتاہی کے لیے، اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتوں کے لیے مغفرت طلب کیجئے۔

﴿وَاسْتَغْفِرِ اللهَ إِنَّ اللهَ كَانَ غَفُوراً رَّحِيماً.﴾ (النساء:۱۰۶)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کیجئے، بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

﴿فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً.﴾ (النصر:۳)

ترجمہ:- اپنے رب کی حمد وثنا کے ذریعہ اس کی پاکی بیان کیجئے اور اس سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کیجئے، بیشک وہ توبہ کو قبول کرنے والا ہے۔

﴿لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ﴾ إلى قولِهِ -عز وجل-: ﴿وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ﴾ (آل عمران:۱۵، ۱۶، ۱۷)

ترجمہ:- جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (اور گناہوں سے بچتے ہیں) ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے یہاں باغات ہیں جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ آگے ان کے اور بھی اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ اور وہ رات کے آخری حصہ میں (صبح کے وقت) اپنے گناہوں سے مغفرت طلب کرتے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءاً أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللهَ يَجِدِ اللهَ غَفُوراً رَحِيماً﴾ (النساء:۱۱۰)

ترجمہ:- جو آدمی کوئی برا کام کرے، یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرکے اپنی جان پر ظلم کرے، پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت اور معافی چاہے، تو وہ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا اور مہربان پائے گا۔

عذاب الٰہی سے بچانے والی دو چیزیں

وقال تعالیٰ: {وَمَا كَانَ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ} (الأنفال:۳۳)

ترجمہ:- اللہ تعالیٰ ایسے نہیں ہیں کہ آپ کے ان کے درمیان موجود ہوتے ہوئے ان کو عذاب دیں، اور اللہ تعالیٰ ان کو عذاب نہیں دیں گے ایسی حالت میں کہ وہ لوگ گناہوں سے مغفرت طلب کررہے ہوں۔

افادات:- یعنی کسی بھی نبی کے قوم کے درمیان موجود ہوتے ہوئے اللہ کا عمومی عذاب نہیں آسکتا۔ چناں چہ مکہ والوں کی طرف سے بہت زیادہ مخالفت ہوئی اور ایمان کے انکار کے باوجود جب تک کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ مکرمہ میں تشریف فرمارہے، اور ہجرت کرکے مدینہ منورہ نہیں گئے وہاں

تک ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی عذاب نہیں آیا۔ جب آپ (ﷺ) ہجرت کر کے تشریف لے گئے اس کے بعد بدر اور اُحد وغیرہ پیش آئے، اور مکہ والوں کو سزا دی گئی۔

اور جب تک کوئی قوم اپنے گناہوں سے معافی چاہتی رہے گی اور مغفرت طلب کرتی رہے گی، ان پر عذاب نہیں آئے گا۔ گویا دو چیزیں ایسی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امان میں سے ہیں، ایک تو نبی کا وجود، اور دوسرا لوگوں کا مغفرت طلب کرنا؛ یہ دونوں اللہ کے عذاب سے امان ہیں۔

اللہ کے علاوہ کون معاف کرنے والا ہے

وقال تعالیٰ: { وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ } (آل عمران: ۱۳۵)

ترجمہ:- اور جو کسی بدکاری کا ارتکاب کرتے ہیں، یا کوئی معصیت و نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر لیتے ہیں، پھر (اپنی گرفت کو محسوس کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ کے یہاں جواب دینا پڑے گا) تو فوراً اللہ تعالیٰ کا ذکر کر لیتے ہیں، اور اپنے گناہوں سے مغفرت چاہتے ہیں۔ اور کون ہے جو اللہ کے علاوہ گناہوں کو معاف کرے۔ اور یہ جانتے ہوئے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ ہی گناہوں کو معاف کر سکتے ہیں اپنے ان کرتوتوں پر اڑے نہیں رہتے۔

"والآیات فی الباب کثیرۃ معلومۃ" اور اس سلسلہ میں بہت ساری آیتیں ہیں۔

حضور (ﷺ) کا استغفار کا اہتمام

حدیث ۱۸۶۹:-

وعن الأغَرِّ المزنی -رضی الله عنه-: أنَّ رسُول اللهِ (ﷺ) قال: ((إنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي، وإنِّي لأَسْتَغفِرُ اللهَ فی اليَوْمِ مِئَةَ مَرَّةٍ)). (رواه مسلم)

ترجمہ:- حضرت اَغر مزنی (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: میرے دل پر بھی بادل سے چھا جاتے ہیں۔ اور میں دن بھر میں اللہ تعالیٰ سے سو مرتبہ مغفرت طلب کرتا ہوں۔

افادات:- نبی کریم (ﷺ) تو معصوم تھے، آپ کے لیے گناہوں کا کوئی تصور ہی نہیں ہو سکتا، اس کے باوجود آپ (ﷺ) استغفار کا کتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے۔ یہ دراصل امت کو تعلیم دینے کے لیے ہوتا تھا۔

"لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي" کا مطلب بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ: نبی کی شان تو یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر آن مراتبِ قربِ خداوندی میں ترقی کرتے رہتے ہیں، گویا اللہ تعالیٰ سے ان کا قرب بڑھتا ہی رہتا ہے، جب وہ اوپر والے درجہ پر پہنچتے ہیں تو نیچے والے درجہ کی کمی کا احساس پیدا ہوتا ہے، اس پر وہ استغفار کرتے ہیں۔ جیسے: جب کوئی آدمی کسی اونچے مقام پر پہنچتا ہے اور اس کو اب تک کی کمی کا اندازہ ہوتا ہے اور اب تک کی حالت پر افسوس ہوتا ہے کہ اتنا زمانہ یونہی گزر گیا۔

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ: نبی کریم (ﷺ) کا قلبِ مبارک ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں اور اس کی یاد میں مشغول رہتا تھا، لیکن اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے تعلیم و تبلیغ میں مشغول ہونا پڑتا تھا، اس مشغولی کی وجہ سے آپ کا قلب مبارک اُدھر سے ہٹ کر اِدھر متوجہ ہوتا تھا، تو گویا اتنا زمانہ اور وقت جو دوسری مشغولی میں گزرا، اس پر آپ (ﷺ) استغفار فرماتے تھے۔

روزانہ ستّر سے زیادہ مرتبہ استغفار

حدیث ۱۸۷۰:-

وعن أبي هريرة رضي الله عنه قال: سَمعتُ رَسُولَ اللهِ (ﷺ) يقولُ: ((وَاللهِ إِنِّي لَأَسْتَغْفِرُ اللهَ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ فِي الْيَوْمِ أَكْثَرَ مِنْ سَبْعِينَ مَرَّةً)) (رواه البخاري)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم (ﷺ) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا: اللہ کی قسم! میں ہر روز اللہ تعالیٰ سے ستر سے زیادہ مرتبہ مغفرت طلب کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ اور رجوع کرتا ہوں۔

افادات:- روایت میں فوق کا تذکرہ آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کثرت سے استغفار کرتا ہوں۔

انسانوں کی پیدائش کا ایک خاص مقصد

حدیث ۱۸۷۱:-

وعنه رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللهِ (ﷺ) :((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوا، لَذَهَبَ اللهُ تَعَالَى بِكُمْ، وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ يُذْنِبُونَ، فَيَسْتَغْفِرُونَ اللهَ تَعَالَى، فَيَغْفِرُ لَهُمْ)) (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اگر تم گناہ نہ کرو، تو اللہ تعالیٰ تم کو ختم کر کے ایسی قوم پیدا کرے گا جو گناہ کرے گی، پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرے گی، اور اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو معاف فرمائیں گے۔

افادات:- اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو جو پیدا فرمایا ہے اس میں دراصل انسان سے ایک مخصوص قسم کی عبادت مطلوب ہے۔ اس لیے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے سے فرشتے موجود تھے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی خلقت اور ان کا مزاج اور طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ان کے اندر نافرمانی اور گناہ کا مادّہ ہے ہی نہیں۔ وہ تقاضہ جس کی بنا پر انسان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں مبتلا ہوتا ہے وہ تقاضہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے اندر رکھا ہی نہیں ہے۔ ان کو تو اللہ تعالیٰ جو حکم دیتے ہیں، وہی کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرِمو تجاوز نہیں کرتے۔ اگر فرشتے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا بھی چاہیں؛ تو نہیں کرسکتے۔ جیسے ایک نابینا یوں کہے کہ میں کبھی کسی نامحرم عورت کو نہیں دیکھتا، سینما اور ٹی وی نہیں دیکھتا؛ تو آپ کیا کہیں گے؟ بھائی! تجھ میں دیکھنے کی

صلاحیت ہی نہیں ہے، تو چاہے تب بھی نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں! ایک آدمی بینا ہے، جس میں دیکھنے کی طاقت ہونے کے باوجود اور دل میں تقاضہ ہونے کے باوجود ان تقاضوں پر قابو پاکر اپنے آپ کو بد نظری سے بچاتا ہے؛ تو وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ثواب اور اجر کا حقدار ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مزاج میں نافرمانی کا مادّہ ہی نہیں رکھا ہے اور وہ صرف وہی کرتے ہیں جس کا ان کو باری تعالیٰ حکم دیتے ہیں، تو گویا ان کا مزاج اور طبیعت ہی عبادت واطاعت ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی عبادت فرشتوں کے ذریعہ سے ہو ہی رہی تھی، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت کے لیے انسان کو پیدا فرمایا۔ گویا انسان سے ایک خاص قسم کی عبادت چاہی گئی ہے جو عند اللہ مطلوب تھی، اور وہ انسان ہی کر سکتا تھا، فرشتے نہیں کر سکتے تھے۔

اسی لیے جب انسان کی پیدائش کے ارادہ کا فرشتوں کے سامنے اظہار کیا کہ میں اپنا ایک خلیفہ اور نائب بنانے والا ہوں، تو فرشتوں نے کہا: باری تعالیٰ! آپ ایسی مخلوق پیدا فرمائیں گے جو زمین میں فساد مچائے گی اور خون بہائے گی، حالاں کہ ہم آپ کی حمد وثنا کے ذریعہ پاکی اور آپ کی تقدیس بیان کرتے ہیں، یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں ان کو خاموش کرتے ہوئے فرمایا: میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ اس کے بعد جب حضرت آدم (علیہ السلام) پیدا کیے گئے اور ان کو اللہ تعالیٰ نے مخصوص چیزوں کا علم عطا فرما کر فرشتوں کے سامنے پیش کیا، اور فرشتوں سے کچھ سوالات کیے کہ بتاؤ، تو وہ نہیں بتا سکے اور حضرت آدم (علیہ السلام) نے بتا دیئے۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے مقابلہ میں ان کی فوقیت ظاہر فرمائی۔

کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو بنایا تو اس کے مزاج کے اندر فرمانبر داری اور نافرمانی، گناہ اور نیکی، اطاعت اور معصیت دونوں مادّے رکھے: ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرما کر اس کے مزاج میں گناہوں کے تقاضے بھی رکھے اور تقویٰ یعنی گناہوں سے بچنے والا مزاج بھی بنایا، گویا دونوں صفتیں رکھیں۔ جب گناہوں کے تقاضوں کے باوجود اپنے آپ کو گناہوں سے بچا کر اطاعت اور فرمانبر داری کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی بہت زیادہ قدر و قیمت ہوگی۔ اس لیے کہ کسی کام کو انجام دینے کے لیے، اور کسی ذمہ داری کو بجالانے کے لیے حالات کا ساز گار اور موافق ہونا ضروری ہوتا ہے، لیکن ایک آدمی کے حالات ساز گار نہیں ہیں، مخالف حالات کے باوجود وہ اس حکم کو پورا کرتا ہے اور اپنے فریضۂ منصبی کو ادا کرتا ہے؛ تو اس کی اللہ تعالیٰ یہاں بڑی قدر و قیمت ہوتی ہے۔

گناہ کا مادّہ رکھنے کی پہلی وجہ

اب یہاں ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو یہ نہیں چاہتے ہیں کہ اس کی نافرمانی کی جائے؛ پھر گناہ کا مادّہ کیوں پیدا کیا؟

جواب یہ ہے کہ اصل میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سے حکم تو یہی ہے کہ اس کی معصیت اور نافرمانی نہ کی جائے، لیکن چوں کہ اللہ تعالیٰ کی ایک شان بندوں کے گناہوں کو معاف کرنے کی بھی ہے، اب اگر کوئی مخلوق ایسی نہ ہو جو گناہوں کا ارتکاب کرے؛ تو پھر اللہ تعالیٰ کی اس صفت اور شان کا ظہور

کیسے ہو گا؟ گویا اللہ تعالیٰ کی صفتِ غفاریت اور صفتِ رحمت کا ظہور ہو، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کا مزاج ایسا بنایا۔

دوسری وجہ

دوسری بات یہ بھی ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی سے جب گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کی طبیعت اور مزاج پر اس گناہ کا احساس ایسی شدت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو بالکل ہیچ قرار دیتا ہے۔ پھر روتا اور گڑگڑاتا ہے، اور اپنی کوتاہی وگناہ پر اللہ تعالیٰ کے سامنے خوب گریہ وزاری کرتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے مراتب اتنے زیادہ بلند ہوتے ہیں جتنے مراتب عبادت کے نتیجے میں بلند نہ ہوتے:

زاہد غرور داشت سلامت نبرد راہ
رِند اَز راہِ نیاز بہ دارالسلام رفت

اللہ کی عبادت کرنے والا اپنی عبادت پر غرور اور فخر رکھتا تھا، اس لیے اپنا راستہ سلامت نہیں رکھ سکا اور ہلاک ہو گیا۔ اور ایک گنہگار آدمی اللہ تعالیٰ کی نیاز مندی اور گریہ وزاری کے راستہ سے جنت تک پہنچ گیا۔ تو دراصل اللہ تعالیٰ کے یہاں عبدیت مطلوب ہے، یعنی آدمی اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سپر ڈال دے، اور اپنے آپ کو مٹا دے؛ یہی صفتِ عبدیت ہے۔

حضرت آدم (علیہ السلام) کی صفتِ عبدیت

حضرت علامہ کشمیری (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: حضرت آدم (علیہ السلام) کی صفت عبدیت ہی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی خلافت کے لیے منتخب فرمایا، اور علم تو صرف فوقیت ظاہر کرنے کے لیے دیا گیا تھا، ورنہ اصل صفت جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے وہ عبدیت ہی ہے؛ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا، اس وقت روئے زمین پر دو مخلوق موجود تھی، ایک جنات وشیاطین تھے اور دوسرے فرشتے تھے، اور اللہ تعالیٰ کے اظہارِ ارادہ اور علم کے سامنے کچھ بھی عرض کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، اس کے باوجود فرشتے عرض کرنے لگے کہ: باری تعالیٰ! کیا آپ ایسی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے جو خون بہائے گی؟ بھائی! جب آپ کو اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور منشاء معلوم ہو گیا تو اب آگے کچھ لب کشائی کی ضرورت نہیں رہتی، لیکن پھر بھی ان کی طرف سے یہ بات پیش کی گئی، اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کہہ کر ان کو خاموش کر دیا کہ میں جو جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ تو اس پر فرشتوں نے فوراً کہا: ﴿سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲﴾ گویا انہوں نے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا منشاء کے ظاہر ہونے کے بعد ایک بات تو عرض کر دی۔

اور شیطان کا معاملہ تو بہت ہی آگے نکل گیا۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کو پیدا کرنے کے بعد ان کے سامنے سجدہ کرنے کے لیے کہا گیا، تو اس نے یہی کہہ دیا کہ میں ان کو کیسے سجدہ کروں؟ آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور ان کو مٹی سے پیدا کیا؛ بھلا میں بہتر ہونے کے باوجود ان کو کیسے سجدہ کر سکتا ہوں؟

ایک حضرت آدم (علیہ السلام) تھے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے کوئی چون و چرا نہیں کیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا کرنے کے بعد جنت میں آباد کیا، اور ان سے یہ کہا گیا کہ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ پھر ان سے قصور ہوا، اور اس کے قریب پہنچ گئے، اور اس کو استعمال کر لیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی باز پرس ہوئی۔ تو روایتوں میں آتا ہے کہ وہ خاموش رہے اور صرف روتے ہی رہے، کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ توبہ کے کلمات بھی زبان سے نکالنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

وہ کلمات بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دل پر القاء کئے گئے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں موجود ہے: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ﴾ حضرت آدم (علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کی طرف سے کچھ کلمات کو حاصل کیا، اور وہ یہی تھے: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳﴾ اے ہمارے رب! ہم نے تیرے حکم کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر تو نے ہمیں معاف نہیں کیا تو ہم بڑے گھاٹے اور خسارہ میں رہیں گے۔ گویا توبہ کے کلمات بھی جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکھائے گئے تب اپنی زبان سے ادا کئے، ورنہ ان کلمات کو بھی ادا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ یہ ان کی طرف سے عبدیت کا پورا پورا اظہار ہوا۔

صفتِ غفاریت کا ظہور اس طرح ہو گا

اسی کو حضور اکرم (ﷺ) نے فرمایا: اگر تم گناہ نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ تم کو ختم کر کے دوسری مخلوق کو پیدا کریں گے جو گناہ کرے گی پھر اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گی اور اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی یوں کہنے لگے کہ ہم کو گناہ کرنے کی چھوٹ دیدی گئی ہے۔ایسا نہیں ہے؛ بلکہ ہمیں تو پیدا ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی مکمل اطاعت وفرمانبرداری کریں، لیکن ہماری کوشش اور چاہت کے باوجود ہم سے کچھ نہ کچھ کوتاہیاں ہو ہی جائیں گی؛ تو اس وقت پھر ہم اپنے گناہوں سے معافی طلب کریں گے۔

ایک مجلس میں سو مرتبہ استغفار

حدیث ۱۸۷۲:-

وعن ابن عمر رَضِیَ اللہ عنہما قال: كُنَّا نَعُدُّ لرسولِ اللهِ (ﷺ) فی المَجْلِسِ الواحِدِ مِئَةَ مَرَّةٍ: ((رَبِّ اغْفِرْ لِی وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ)). (رواه أبو داود والترمذی، وقال: ((حديث حسن صحيح غريب)).

ترجمہ:-- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک ایک مجلس میں نبی کریم (ﷺ) کا یہ جملہ سو سو مرتبہ شمار کرتے تھے: ”رَبِّ اغْفِرْ لِي وَتُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ“ اے اللہ! تو مجھے معاف کر دے اور میری توبہ قبول فرما، بیشک تو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

افادات:-- یعنی آپ (ﷺ) استغفار کا اتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے کہ ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ اور وہ بھی زور سے یہ دعا پڑھتے رہتے تھے۔ اور جیسا کہ اوپر بھی آیا، آپ (ﷺ) خود ارشاد فرماتے ہیں کہ: میں ہر دن میں سو مرتبہ اپنے گناہوں سے معافی چاہتا ہوں۔

استغفار پر تین بڑے بڑے وعدے

حدیث ۱۸۷۳:-

وعن ابن عباس رضی الله عنهما قال قال رسول اللهِ (ﷺ): ((مَنْ لَزِمَ الاسْتِغْفَارَ جَعَلَ اللهُ لَهُ مِنْ كُلِّ ضِيقٍ مَخْرَجاً، وَمِنْ كُلِّ هَمٍّ فَرَجاً، وَرَزَقَهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ)). (رواه أبو داود)

ترجمہ:-- حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرنے کو لازم کر لے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر تنگی سے راستہ نکالیں گے، اور ہر غم سے کشادگی عطا فرمائیں گے، اور ایسی جگہ سے اس کو روزی دیں گے جہاں اس کو گمان بھی نہیں ہو گا۔

جو وعدے تقویٰ پر وہی استغفار پر

افادات:- اب دیکھئے! قرآنِ کریم میں ہے: ﴿وَمَنۡ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجۡعَلۡ لَّهٗ مَخۡرَجًا ۙ﴿۲﴾ وَّيَرۡزُقۡهُ مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ ؕ﴾ جو آدمی گناہوں سے بچے گا (تقویٰ اختیار کرے گا) اللہ تعالیٰ اس کے لیے راستہ نکالے گا، اور ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا۔ تو قرآنِ کریم میں جو وعدے تقویٰ (یعنی گناہوں سے بچنے) پر کیے گئے ہیں؛ اگر کسی آدمی سے نادانستہ طور پر گناہوں کا صدور ہو جائے، یا غفلت کی وجہ سے اس سے گناہ سرزد ہو جائیں، تو اس کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، اگر وہ آدمی توبہ و استغفار کا اہتمام کرے گا، تو یہ حدیثِ پاک ہمیں بتاتی ہے کہ استغفار کرنے پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو وہی نعمتیں ملیں گی جو گناہ سے بچنے پر ملا کرتی ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس کے لیے تنگی میں راستہ پیدا فرمائیں گے، اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوگا۔

استغفار کے ایک جملہ پر عجیب نتیجہ

حدیث ۱۸۷۴:-

وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم): ((مَنۡ قَالَ: أَسۡتَغۡفِرُ اللهَ الَّذِی لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ وَأَتُوۡبُ إِلَیۡهِ، غُفِرَتۡ ذُنُوۡبُهُ وَإِنۡ كَانَ قَدۡ فَرَّ مِنَ الزَّحۡفِ.)) (رواه أبو داود والترمذي والحاكم، وقال: حديث صحيح على شرط البخاري ومسلم)

ترجمہ:—حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو آدمی یہ کلمات کہے (جن کا ترجمہ یہ ہے): میں اپنے گناہوں کی مغفرت اور معافی طلب کرتا ہوں اس اللہ سے جس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں، جو زندہ اور باقی رہنے والا ہے، اور میں اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں؛ تو اس کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے، چاہے وہ میدانِ جنگ سے بھاگا ہو۔

افادات:—میدانِ جنگ سے بھاگنا کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہو تو وہ بھی اللہ تعالیٰ اس استغفار کی برکت سے معاف کردیتے ہیں۔

سیّد الاستغفار

حدیث ۱۸۷۵:-

وعن شَدَّادِ بْنِ أَوسٍ رضی اللہ عنہ عن النبیّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: ((سَيِّدُ الاسْتِغْفَارِ أَنْ يَقُولَ العَبْدُ: اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لاَ إلهَ إلاَّ أَنْتَ خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وأبُوءُ بِذَنْبِي، فَاغْفِرْ لِي، فَإنَّهُ لاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إلاَّ أنْتَ. مَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوقِناً بِهَا، فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُمْسِي، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الجَنَّةِ، وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ، وَهُوَ مُوقِنٌ بِهَا، فَمَاتَ قَبْلَ أنْ يُصْبِحَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الجَنَّةِ)). (رواہ البخاری)

((أبُوءُ)) بباءٍ مَضمومةٍ ثم واوٍ وهمزة ممدودة ومعناه: أُقِرُّ وَأَعْتَرِفُ.

ترجمہ:—حضرت شدّاد بن اوسؓ سے منقول ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سید الاستغفار یہ ہے کہ بندہ یوں کہے: اے اللہ! تو میرا رب ہے۔ تیرے علاوہ اور کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو نے مجھے پیدا کیا، میں تیرا بندہ

ہوں (اورایک بندہ جب کلمہ پڑھ کر ایمان لاتا ہے، تو اس کے ذریعہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کے احکام واطاعت کا عہد وپیمان کرتا ہے) تجھ سے کئے گئے عہد وپیمان اور وعدہ پر جتنی مجھ میں سکت وطاقت ہے اس کے بقدر میں قائم ہوں۔ میں نے جتنے بھی گناہ کئے ہیں، مَیں ان سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ تو نے جو نعمتیں اور انعامات مجھ پر کئے ہیں ان کا مَیں اقرار کرتا ہوں۔ اور مَیں اپنے گناہ کا بھی اقرار کرتا ہوں۔ پس اے اللہ! تو میرے گناہ کو معاف کردے، تیرے علاوہ گناہوں کو اور کوئی معاف نہیں کرسکتا۔ (حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں) جو آدمی یہ کلمات صبح کے وقت اس کے مضامین پر دل سے یقین رکھتے ہوئے کہے، اور پھر اسی دن شام سے پہلے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو وہ جنتی ہے۔ اور جو آدمی رات میں یہ کلمات کہے اور صبح سے پہلے پہلے اس کا انتقال ہوجائے تو وہ جنتی ہے۔

افادات:۔ یہ کلمات سید الاستغفار کہلاتے ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی معافی طلب کرنے کے لیے جتنے بھی کلمات کہے جاتے ہیں ان تمام کلمات کے اندر ان کو سرداری کی حیثیت حاصل ہے، گویا استغفار کا یہ صیغہ تمام صیغوں میں سردار اور بادشاہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی اور مغفرت طلب کرنے کا بیان چل رہا ہے۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اس کا کتنا زیادہ اہتمام فرماتے تھے، جس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی امت کو اس کی تعلیم دینا چاہتے تھے کہ استغفار کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ میں پچھلی مجلس میں تفصیل آگئی تھی۔ آج مزید روایات پیش کرتے ہیں۔

عبادات کے اختتام پر استغفار

حدیث ۱۸۷۶:-

وعن ثوبان -رضی اللہ عنہ- قال: كَانَ رَسُولُ اللهِ (صلی اللہ علیہ وسلم) إِذَا انْصَرَفَ مِنْ صَلَاتِهِ اسْتَغْفَرَ اللهَ ثَلَاثًا وَقَالَ: ((اللَّهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ، وَمِنْكَ السَّلَامُ، تَبَارَكْتَ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ)) قِيلَ لِلْأَوْزَاعِيِّ -وَهُوَ أَحَدُ رُوَاتِهِ: كَيْفَ الْاسْتِغْفَارُ؟ قَالَ: يَقُولُ: أَسْتَغْفِرُ اللهَ، أَسْتَغْفِرُ اللهَ. (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ثوبان (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اپنی نماز سے فارغ ہوتے تھے، تو اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی تین مرتبہ مغفرت طلب کرتے تھے، اور ساتھ ہی یہ دعا بھی پڑھتے تھے: اے اللہ! تو ہی سلام ہے اور سلامتی تیری ہی طرف سے ملتی ہے، تو بڑا بابرکت ہے اے جلالت و عزت والے۔ اس روایت کے راویوں میں امام اوزاعی بھی ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ (روایت میں جو فرمایا گیا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) تین مرتبہ مغفرت طلب فرماتے تھے) تو اس کی کیفیت اور طریقہ کیا ہوا کرتا تھا؟ اس کے جواب میں

انہوں نے فرمایا کہ: حضورِ اکرم (ﷺ) نماز کا سلام پھیر کر تین مرتبہ " استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ " کہا کرتے تھے۔

افادات:- ویسے بھی عام طور پر تمام عبادات کے اختتام پر جو دعائیں آئی ہیں ان میں استغفار کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ جیسے: آدمی رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے اس کے بعد اس کے پسندیدہ عمل کو قرآنِ کریم میں یوں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ﴾ وہ لوگ رات کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ سے طلبِ مغفرت کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی طرح نماز کے اخیر میں بھی جو دعا ماثور ہے اس میں استغفار ہی کا اہتمام کرایا گیا ہے: "أَللّٰهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْماً كَثِيْراً الخ" اسی طرح روزہ کھولتے وقت یہ دعا سکھلائی گئی: "يَا وَاسِعَ الْفَضْلِ إِغْفِرْلِي" تقریباً تمام عبادات کے ختم پر استغفار کا اہتمام کرایا گیا ہے۔

زندگی کے آخری ایام میں استغفار کی کثرت

حدیث ۱۸۷۷:-

وعن عائشة (رضي الله عنها) قالت: كان رَسُولُ اللهِ - (ﷺ) - يُكْثِرُ أَنْ يَقُولَ قَبْلَ مَوْتِهِ: ((سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، أَسْتَغْفِرُ اللهَ، وأتوبُ إِلَيْهِ)) (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) اپنی وفات سے پہلے کثرت سے یہ پڑھا کرتے تھے: "سُبْحَانَ اللهِ وَبِحَمْدِهِ، أَسْتَغْفِرُ اللهَ، وأتوبُ إِلَيْهِ"

افادات:- زندگی کے آخری ایام میں بھی آدمی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادات کے اہتمام کے ساتھ ساتھ طلبِ مغفرت کی طرف خصوصی توجہ دے۔ حضورِ اکرم (ﷺ) پر جو آخری سورت نازل ہوئی وہ سورۃ النصر تھی جس میں یہ ہے: ﴿فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَاسۡتَغۡفِرۡهُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا ۝۳﴾ اے نبی! جب اللہ تعالیٰ کی مدد آجائے اور مکہ فتح ہو جائے تو آپ اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی مغفرت طلب کرو۔ گویا اس طرح آپ (ﷺ) اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے گئے اس حکم پر عمل فرماتے تھے جو اوپر روایت میں آیا۔

نماز میں بھی حضور اکرم (ﷺ) اس کا خصوصی اہتمام فرماتے تھے جیسا کہ بخاری کی روایت میں ہے۔

استغفار سے شرک کے علاوہ سب گناہ معاف ہو جاتے ہیں

حدیث ۱۸۷۸:-

وعن أنس - رضي الله عنه - قال: سمعتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) يقولُ: ((قَالَ اللهُ تَعَالَى: يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِي وَرَجَوْتَنِي غَفَرْتُ لكَ عَلَى مَا كَانَ مِنْكَ وَلاَ أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِي، غَفَرْتُ لَكَ وَلاَ أُبَالِي. يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ أَتَيْتَنِي بِقُرَابِ الأَرْضِ خَطَايَا، ثُمَّ لَقِيتَنِي لا تُشْرِكُ بِي شَيْئاً، لأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً)) (رواه الترمذي، وقال: حديث حسن)

((عَنَانَ السَّمَاءِ)) بفتح العين: قِيلَ هُوَ السَّحَابُ، وَقِيلَ: هُوَ مَا عَنَّ لَكَ مِنْهَا، أيْ ظَهَرَ. ((وَقُرَابُ الأَرْضِ)) بضم القاف، ورُوِيَ بكسرِها، والضم أشهر. وَهُوَ ما يُقَارِبُ مِلأَهَا.

ترجمہ:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اے انسان! جب تک تو مجھ سے مانگتا رہے گا اور امید قائم رکھے گا، میں تیری مغفرت کروں گا، چاہے تیری طرف سے جو کچھ بھی پیش آیا ہو اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوگی (چاہے بڑے سے بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہو؛ سوائے شرک کے) اے انسان! اگر تیرے گناہ آسمان کے بادلوں تک پہنچ جائیں، اس کے بعد پھر تو مجھ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہے گا، تو میں تیرے گناہوں کو معاف کردوں گا اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔ اے انسان! اگر تو میرے پاس زمین بھر کر گناہ لے کر آئے گا اور پھر تو میرے پاس ایسی حالت میں پہنچے گا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرا رہا ہو گا تو میں زمین بھر کر تیرے پاس مغفرت لے کر آؤں گا۔

افادات:- آدمی نے اگر شرک سے بچنے کا اہتمام کیا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے گناہ معاف کردیئے جاتے ہیں۔ طلبِ مغفرت پر تو معاف کر ہی دیئے جاتے ہیں، لیکن مغفرت کی طلب کے بغیر بھی جس کو اللہ تعالیٰ چاہے معاف کردیتا ہے۔ شرک کی مغفرت نہیں ہوتی، قرآن پاک میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ط﴾ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتے، باقی جس کو چاہتے ہیں معاف کر دیتے ہیں۔ ہاں! اگر آدمی شرک سے بھی توبہ کرکے توحید اختیار کرلے، تو وہ بھی معاف ہو جاتا ہے۔

”وَلَا أُبَالِی“ اور مجھے کوئی پرواہ نہیں ہوگی۔ انسان جب کسی کو معاف کرتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس کا قصور کس درجہ کا ہے، معاف کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ باتیں نہیں ہیں۔

معلوم ہوا کہ آدمی اگر اپنے گناہوں سے معافی مانگنے کا اہتمام کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے گناہوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔

عورتوں کو کثرت استغفار کا حکم

حدیث ۱۸۷۹:-

وعن ابن عمر رضی اللہ عنہما: أَنَّ النبیَّ (ﷺ) قال: ((یامَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ، وأَكْثِرْنَ مِنَ الاسْتِغْفَارِ، فَإِنِّي رَأَيْتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ)) قالت امرأةٌ مِنهُنَّ: مَا لَنَا أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ؟ قَالَ: ((تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ العَشِيرَ. مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَغْلَبَ لِذِي لُبٍّ مِنْكُنَّ)) قالت: ما نُقْصَانُ العَقْلِ وَالدِّينِ؟ قال: ((شَهَادَةُ امْرَأَتَيْنِ بِشَهَادَةِ رَجُلٍ، وَتَمْكُثُ الأَيَّامَ لاَ تُصَلِّي)). (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت عبد اللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اے عورتوں کے گروہ اور جماعت! اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرو اور کثرت سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، اس لیے کہ میں نے تم کو جہنم والوں میں کثرت سے دیکھا ہے (جہنم میں زیادہ تعداد عورتوں کی دیکھی) ان میں سے ایک عورت نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا بات ہے کہ ہم عورتیں ہی جہنم والوں میں زیادہ تعداد میں ہوں گی؟ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: تم لعن طعن بہت کثرت سے کرتی ہو، اور شوہر کی ناشکری کی بہت مرتکب ہوتی ہو۔ اور ایسی شخصیت جو عقل و دین کے اعتبار سے ناقص شمار ہوتی ہو، اس کے باوجود عقلمند آدمی کی عقل کو تم سے زیادہ اڑا دینے والی میں نے نہیں دیکھا۔ اس عورت نے پوچھا: عقل اور دین کی کمی سے کیا مراد ہے؟ تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: عقل کے اعتبار سے کمی یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی

کے برابر قرار دیا ہے۔ اور دین کی کمی یہ ہے کہ مہینہ میں (حالت حیض کی وجہ سے) کئی دن عورت ایسے گزارتی ہے جس میں نماز نہیں پڑھ پاتی۔

افادات:- عقل اور سمجھ کے اعتبار سے تمہارا مقام مردوں کے مقابلہ میں اونچا نہیں ہے، گویا عورتوں میں سمجھ اور عقل کم ہی ہوا کرتی ہے، اس کے باوجود سمجھدار آدمی کی عقل کو اُڑا لے جانے کا تم کام کرتی ہو۔

"تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ، وَتَكْفُرْنَ العَشِيرَ" عورتوں کی زبان سے عام طور پر بددعائیہ کلمات نکلتے رہتے ہیں، اور لعن طعن کرتی رہتی ہیں۔ اسی طرح سے شوہر کی طرف سے چاہیے کتنا ہی اس کے ساتھ احسان و بھلائی کا معاملہ کیا جائے، مگر کبھی کسی وقت ذرا سی ناگواری اور مزاج کے خلاف بات پیش آجاتی ہے تو اس کی زبان سے ناشکری کے الفاظ نکلتے ہیں۔ بقول حضرت گنگوہی (رحمۃ اللہ علیہ): وہ یہ کہے گی کہ: تمہارے یہاں آکر میں نے دیکھا ہی کیا ہے! ایک ٹھیکرا، ایک چیتھڑا۔ وہ برتن کو تو ٹھیکرے سے، اور کپڑے کو چیتھڑے سے تعبیر کرتی ہے۔

بہر حال! اس روایت میں عورتوں کو کثرت سے طلبِ مغفرت کا حکم ہے، اس وجہ سے علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ روایت یہاں پیش کی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باب بیان مَا أعدَّ الله تَعَالیٰ للمؤمنین فی الجنة

اس باب میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) ان آیات اور احادیث کو پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے جنت میں جو نعمتیں رکھی ہیں ان کا تذکرہ فرمایا ہے۔

جنت میں کدورت اور تھکاوٹ نہیں ہوگی

قَالَ اللہ تَعَالَی: إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَاناً عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ. (الحجر: ۴۸،۴۷،۴۶،۴۵)

ترجمہ:- بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں (گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں) وہ باغات اور چشموں میں ہوں گے (اور ان سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا:) ان باغات میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ (اور باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے داخل ہونے سے پہلے) ہم ان کے دلوں کے اندر سے ایک دوسرے کے متعلق جو میل اور خفگی ہوگی وہ سب نکال دیں گے، وہ بھائی بھائی بن کر اندر داخل ہوں گے، مسہریوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے، اور ان جنت والوں کو جنت میں نہ تھکاوٹ کا احساس ہوگا، اور نہ وہ وہاں سے کبھی نکالے جائیں گے۔

افادات:- ”وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ“ ہم ان کے دلوں کے اندر سے ایک دوسرے کے متعلق جو میل اور خفگی ہوگی وہ سب نکال دیں گے، یعنی دنیا کے اندر غیر اختیاری طور پر بعض چیزیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ ایک دوسرے کی طرف سے خفگی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک تو کوئی آدمی محض دنیوی غرض کی وجہ سے کسی کے ساتھ دل میں کینہ رکھے، پھر ساتھ ہی ساتھ اس کینہ کی وجہ سے ایسی تدبیر اور کوشش میں لگا رہے کہ اس کو نقصان پہنچایا جائے؛ یہ تو اللہ تعالیٰ کے یہاں بالکل معاف نہیں ہے، بلکہ حدیث پاک میں آتا ہے جس کے دل میں کینہ ہو گا وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ لیکن کبھی غیر اختیاری طور پر کسی سے بعض باتیں ایسی پیش آ گئیں جس کی وجہ سے دوسرے کے دل میں اس کے متعلق ناراضگی اور خفگی کے جذبات پیدا ہوئے، یا کسی دینی معاملہ کی وجہ سے اس کے دل میں ناراضگی ہوئی اور وہ اخیر تک باقی رہی، اور موت تک دلوں کی صفائی کی نوبت نہیں آئی، ان کو جب اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کریں گے تو داخلے سے پہلے ان کے دلوں میں سے ان ساری چیزوں کو نکال دیا جائے گا، اور دلوں کو پاک صاف کر کے جنت میں بھیجا جائے گا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) فرماتے تھے کہ: مَیں امید کرتا ہوں کہ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ کے ساتھ میرا جو معاملہ ہے وہ بھی اسی میں شمار ہو گا، اور اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں داخل کرنے سے پہلے ان چیزوں سے پاک صاف کر دے گا۔

”لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ“ ان جنت والوں کو جنت میں نہ تھکاوٹ کا احساس ہو گا، اور نہ وہ وہاں سے کبھی نکالے جائیں گے، یعنی جنت کی نعمتوں کو استعمال کرنے اور برتنے کے

نتیجہ میں ان کو کسی قسم کی تھکاوٹ نہیں ہوگی۔ دنیا کا حال تو یہ ہے کہ عیش و آرام کی چیزوں کے استعمال کرنے میں بھی آدمی اُکتا جاتا ہے۔ لیکن جنت میں یہ کیفیت نہیں ہوگی۔

یہی وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنائے گئے

﴿يَا عِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ.﴾ (الزخرف: ۶۸ تا ۷۳)

ترجمہ مع تشریح:- میرے بندو! آج تم پر کوئی ڈر نہیں، اور نہ آج تم غمگین ہوگے۔ اللہ کے وہ بندے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائے اور وہ ہمارے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرتے رہے (اطاعت اور فرمانبرداری کرتے رہے۔ ان کو باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا) تم اور تمہاری بیویاں جنت میں خوش و خرم داخل ہو جاؤ (''سرور'' انتہائی خوشی کو کہتے ہیں، یعنی بہت خوشی اور مسرت کے عالم میں داخل ہو جاؤ) ان جنت والوں پر جنت کے اندر (کھانے کی چیزوں سے بھری ہوئی) سونے کی رکابیاں اور گلاس پیش کئے جائیں گے۔ اور ان باغات کے اندر ان کے لیے ہر وہ چیز ہوگی جس کا ان کا جی چاہے گا، اور جس سے ان کی آنکھیں لذت محسوس کریں گی، اور تم اس کے اندر ہمیشہ رہو گے۔ یہی وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنائے گئے ہو ان اعمال کی وجہ سے جو تم کرتے تھے۔ تمہارے لیے اس کے اندر بہت سارے میوے ہیں جس میں سے تم اپنی مرضی کے مطابق کھاتے رہو گے۔

خوشحال آدمی کے لیے جو ہو سکتا ہے وہ سب جنت میں ہو گا

وقال تعالیٰ: اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۣ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰىهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾ (الدخان)

ترجمہ:- بیشک اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے امن وامان کی جگہ میں ہوں گے، باغات اور نہروں میں ہوں گے، وہاں لباس کے طور پر باریک اور موٹا ریشم (دونوں طرح کا لباس) پہنیں گے، ایک دوسرے کے آمنے سامنے ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو استعمال کرتے رہیں گے۔ اور ہم ان کا نکاح گورے بدن والی، بڑی آنکھوں والی عورتوں سے کرادیں گے۔ اور وہ ان باغات اور جنتوں میں ہر طرح کا میوہ (پھل، فروٹ) امن وامان کے ساتھ منگوائیں گے (یعنی وہاں ان کو کوئی خطرہ اور خوف محسوس نہیں ہو گا) وہاں پہنچنے کے بعد وہ موت کا مزہ نہیں چکھیں گے، سوائے اس موت کے جو پہلی مرتبہ دنیا میں آچکی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھیں گے۔ یہ سب پروردگار کی مہربانی ہے، اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

افادات:- "حَوْرَآء" کی جمع "حُوْرٌ" آتی ہے۔ یعنی ایسی حسین عورت جس کے سامنے نگاہیں خیرہ ہو جائیں، جیسے سورج کے سامنے خیرہ ہو جاتی ہیں۔

ان آیات میں ایک خوشحال آدمی کے لیے جو جو چیزیں ہو سکتی ہیں ان سب کو بیان کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ آدمی کا مکان امن وامان والا ہو، عمدہ ہو؛ تو" مَقَامٍ أَمِينٍ" میں اس طرف اشارہ کر دیا۔ دوسرا یہ کہ لباس عمدہ ہو، کھانے پینے کی چیزیں عمدہ ہوں، اور شریک حیات مزاج کے موافق ہو۔ ساتھ ہی ساتھ وہ نعمتیں جو اس کو ملی ہوئی ہیں کبھی ختم ہونے والی نہ ہوں؛ یہ ساری چیزیں جنت کی نعمتوں میں پائی جاتی ہیں۔

مقربین کے لیے جنت کا ایک چشمہ

﴿إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ﴿٢٢﴾ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ﴿٢٣﴾ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ﴿٢٤﴾ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ﴿٢٥﴾ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ﴿٢٦﴾ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ﴿٢٧﴾ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ﴿٢٨﴾﴾ (المطففین: ۲۲ تا ۲۸)

ترجمہ:- اللہ کے نیک بندے نعمتوں میں ہوں گے، مسہریوں پر بیٹھے ہوئے جنت کی نعمتوں اور عجائبات کا نظارہ کر رہے ہوں گے، اے مخاطب تو ان کے چہروں پر جنت کی نعمتوں کی خوشحالی اور مسرت محسوس کرے گا، ان کو خالص مہر لگی ہوئی شراب پلائی جائے گی، اس کی مہر مشک کی ہو گی۔ اور اسی کے اندر مقابلہ کرنے والے مقابلہ کرتے ہیں۔ اور خالص شراب کی ملاوٹ تسنیم کے پانی سے ہو گی (اہلِ عرب جب شراب کا استعمال کرتے تھے تو اس میں تھوڑا پانی بھی ملایا کرتے تھے۔ جنت کی خالص شراب کے اندر تسنیم کی ملاوٹ ہو گی۔ تسنیم کیا ہے؟) جنت کا ایک چشمہ ہے جس کے اندر سے اللہ کے مقرب بندے پیتے رہتے ہیں (گویا اللہ کے مقرب بندوں کو تو وہ پانی مستقل پینے کے

لیے دیا جائے گا، اس لیے کہ وہ تو اعلیٰ درجہ کے تھے، ان کو ہمیشہ وہی پانی دیا جائے گا۔ اور ”ابرار“ و ”اصحاب الیمین“ کو صرف شراب میں ملاوٹ کے طور پر دیا جائے گا۔)

”والآیات فی الباب کثیرۃ معلومۃ“ علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: جنت کی نعمتوں کو بیان کرنے کے سلسلہ میں قرآنِ پاک میں بہت کثیر تعداد میں آیتیں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں آگے کچھ حدیثیں نقل کرتے ہیں:-

جنتیوں کو قضائے حاجت کی ضرورت پیش نہیں آئے گی

حدیث ۱۸۸۰:-

وعن جابر -رضی اللہ عنہ- قال: قال رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم): ((یَأْكُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ فِيهَا، وَيَشْرَبُونَ، وَلَا يَتَغَوَّطُونَ، وَلَا يَمْتَخِطُونَ، وَلَا يَبُولُونَ، وَلَكِنْ طَعَامُهُمْ ذَلِكَ جُشَاءٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ، يُلْهَمُونَ التَّسْبِيحَ وَالتَّكْبِيرَ، كَمَا يُلْهَمُونَ النَّفَسَ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت جابر (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت والے جنت میں کھائیں گے اور پئیں گے، قضائے حاجت نہیں کریں گے، اور ان کی ناک میں سے ریزش بھی نہیں نکلے گی، اور نہ وہ پیشاب کریں گے، البتہ ان کو کھانے کے نتیجہ میں ایک ڈکار آئے گی (ویسے تو ڈکار کی وجہ سے دنیا میں بدبو پھیلتی ہے، لیکن وہاں اس ڈکار کی وجہ سے خوشبو پھیلے گی) اور ان کا پسینہ مشک کی طرح ہو گا، ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلسل تسبیح و تکبیر پڑھوائی جائے گی، جیسے مسلسل سانس چلتی رہتی ہے۔

افادات:- ”وَلَا يَتَغَوَّطُونَ“ ایک یہودی عالم نے سوال کیا تھا کہ جنت والے جنت میں کھائیں گے ،پئیں گے ؛تو پھر قضائے حاجت کا تقاضہ بھی ہو گا؟ اور یہ چیز جنت والوں کے حال کے مناسب نہیں ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: وہاں قضائے حاجت کی نوبت نہیں آئے گی۔اس لیے کہ قضائے حاجت کی نوبت تو اسی وقت آتی ہے کہ جو غذا استعمال کی جائے اس میں کچھ مواد فاضل بھی ہو،اور وہ فاضل مواد پیشاب، پاخانہ کے راستہ سے باہر نکالا جائے، لیکن جنت کی غذاؤں میں فضلہ کے قبیل سے کوئی چیز ہے ہی نہیں، لہٰذا پیشاب پاخانہ بننے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

اللہ کا ذکر سانس کی طرح جاری رہے گا

”يُلْهَمُونَ التَّسْبِيحَ وَالتَّكْبِيرَ، كَمَا يُلْهَمُونَ النَّفَسَ“ جیسے دنیا میں آدمی چلتے پھرتے سانس لیتا رہتا ہے، آدمی کو سانس لینے کے لیے کوئی ارادہ نہیں کرنا پڑتا، اسی طرح اہلِ جنت کو جنت میں اللہ تعالیٰ کی معرفت اور محبت کا وہ مقام حاصل ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کا ذکر تسبیح و تکبیر ان کے لیے ایسا ہو جائے گا جیسے سانس لیتے ہیں ،یعنی ان کو ارادہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، بلکہ غیر اختیاری طور پر یہ چیز ان کی طرف سے ہوتی رہے گی۔

آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان

حدیث ۱۸۸۱:-

وعن أَبِي هريرة - رضى الله عنه - قَالَ: قَالَ رسولُ اللهِ (ﷺ) : ((قَالَ اللهُ تَعَالَى: أَعْدَدْتُ لِعِبَادِي الصَّالِحِينَ مَا لاَ عَيْنٌ رَأَتْ، وَلاَ أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلاَ خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ، وَاقْرَؤُوا إنْ شِئْتُمْ: {فَلاَ تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ} (السجدة:۱۷))). (متفق عَلَيْهِ)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: میں نے جنت میں اپنے نیک بندوں کے لیے ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال آیا۔ پھر حضور اکرم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اگر تم چاہو تو قرآنِ کریم کی یہ آیت تلاوت کرو: کسی انسان کو معلوم نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے جنت کے اندر کیا کیا پوشیدہ چیزیں رکھی ہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ہے، یہ ان کے ان اعمال کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔

افادات:- گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایسی نعمتیں دی جائیں گی کہ دنیا کے اندر انسان تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان میں سے کچھ چیزیں تو وہ ہیں جن کا قرآن و حدیث میں تذکرہ ہے، وہ تو آدمی کے علم میں آگئیں، لیکن وہاں بعض نعمتیں ایسی بھی ہوں گی جن کو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا، نہ تو کسی کان نے سنا، نہ کسی نے اس کا تصور بھی کیا

جنت میں داخل ہونے والی پہلی دو جماعتوں کی کیفیت

حدیث ۱۸۸۲:-

وعنه قَالَ قَالَ رسولُ الله (ﷺ) :((أَوَّلُ زُمْرَةٍ يَدْخُلُونَ الجَنَّةَ عَلَى صُورَةِ القَمَرِ لَيْلَةَ البَدْرِ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ عَلَى أَشَدِّ كَوْكَبٍ دُرِّيٍّ فِي السَّمَاءِ إضَاءةً. لاَ يَبُولُونَ، وَلاَ يَتَغَوَّطُونَ، وَلاَ يَتْفُلُونَ، وَلاَ يَمْتَخِطُونَ. أَمْشَاطُهُمُ الذَّهَبُ، وَرَشْحُهُمُ المِسْكُ، وَمَجَامِرُهُمُ الأُلُوَّةُ - عُودُ الطِّيبِ - أَزْوَاجُهُمُ الحُورُ العِينُ، عَلَى خَلْقِ رَجُلٍ وَاحِدٍ، عَلَى صُورَةِ أَبِيهِمْ آدَمَ سِتُّونَ ذِرَاعاً فِي السَّمَاءِ.)) (متفق عَلَيْهِ)

وفي رواية البخاري ومسلم: ((آنِيَتُهُمْ فِيهَا الذَّهَبُ، وَرَشْحُهُمُ المِسْكُ. وَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمْ زَوْجَتَانِ يُرَى مُخُّ سَاقِهِمَا مِنْ وَرَاءِ اللَّحْمِ مِنَ الحُسْنِ، لاَ اخْتِلاَفَ بَيْنَهُمْ، وَلاَ تَبَاغُضَ، قُلُوبُهُمْ قَلْبُ وَاحِدٍ، يُسَبِّحُونَ اللهَ بُكْرَةً وَعَشِياً)).

قوله: ((عَلَى خَلْقِ رَجُلٍ واحِدٍ)). رواه بعضهم بفتح الخاء وإسكان اللام وبعضهم بضمها وكلاهما صحيح.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: سب سے پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی وہ چودھویں رات کے چاند کی سی ہوگی (حدیثپاک میں ان کی تعداد ستر ہزار بتلائی ہے، اور بعض روایتوں میں سات لاکھ بتلائی ہے۔ وہ سب بیک وقت جنت میں داخل ہوں گے) پھر اس کے بعد وہ لوگ داخل ہوں گے جو ان کے قریب ہوں گے جو آسمان میں سب سے زیادہ روشن ستارے جیسے چہرے والے ہوں گے۔ جنت میں پہنچنے کے بعد نہ تو ان کو پیشاب کا تقاضہ ہوگا اور نہ پاخانہ کا، نہ وہ تھوکیں گے اور نہ ناک میں سے ریزش نکلے گی۔ ان کے کنگھے سونے کے ہوں گے (ویسے تو بالوں کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں

ہو گی لیکن بطورِ زینت کنگھی کریں گے)اوران کا پسینہ مشک کا ہو گا۔ان کی دھونی دان خالص عود کی ہو گی۔بڑی آنکھوں والی حوریں ان کی بیویاں ہوں گی۔وہ سب تقریباً ان کے ابا حضرت آدم(علیہ السلام) کی شکل وصورت پر ملتے جلتے چہرے والے ہوں گے،ان کا قد لمبائی کے اعتبار سے ساٹھ ہاتھ ہو گا (حضرت آدم(علیہ السلام) کا اصلی قد بھی اتنا ہی تھا)۔

روایت میں جو لفظ"مَجَامِرُ"آیا ہے،وہ"مِجْمَرَةٌ"کی جمع ہے،لوبان دانی کو کہتے ہیں جس میں عود وغیرہ خوشبو ڈال کر دھونی کی جاتی ہے۔

بخاری اور مسلم کی روایت میں ہے کہ: ان کے برتن سونے کے ہوں گے،ان کا پسینہ مشک کی طرح مہکتا ہو گا،ہر جنتی کو دو بیویاں دی جائیں گی (بعض روایتوں میں بہت ساری حوروں کا تذکرہ آتا ہے۔تو حضراتِ شراح فرماتے ہیں کہ اگر کسی کی دنیا میں دو بیویاں ہوں گی تو وہی دو اس کو وہاں بھی ملیں گی۔لیکن اگر کسی کی دنیا میں دو بیویاں نہیں تھیں، ایک ہی تھی؛ تو وہاں دوسری عورت کے ساتھ اس کا نکاح کرا دیا جائے گا،اس طرح گویا اس کو وہاں دوسری بیوی بھی دی جائے گی)اوران کی پنڈلیوں کی ہڈیوں کا گودا گوشت کے اندر سے خوبصورتی کی وجہ سے نظر آئے گا(یعنی وہ ایسی خوبصورت ہوں گی کہ ان کی پنڈلیوں کی ہڈیوں کے اندر کا گودا بھی نظر آئے گا اوراس کی وجہ سے ان کے حسن میں کمی نہیں آئے گی،بلکہ حسن اور زیادہ نکھرے گا)اور ان کے درمیان مزاجوں کے اعتبار سے کوئی اختلاف نہیں ہو گا،اور نہ آپس میں عداوت اور بغض ہو گا،ان کے دل ایک آدمی کی طرح (متحد و متفق)ہوں گے۔وہ سب صبح وشام اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے رہیں گے (گویا ان کی زبانوں پر ذکر اللہ جاری رہے گا)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ آخری باب جنت کی نعمتوں کے متعلق چل رہا ہے، چند ہی روایتیں باقی رہ گئی ہیں۔ ویسے جنت کی ان نعمتوں سے متعلق جو روایتیں ہیں، علماء نے شروحات میں ان کی تشریح و تفصیل بیان کی ہیں، اس میں عام طور پر جنت کی نعمتوں سے متعلق جو روایتیں ہیں ان کے مضامین کو ذہن سے قریب کرنے کے لیے دوسری روایتوں ہی سے تفصیل پیش کی جاتی ہیں۔ اور یہ مضامین ایسے ہیں کہ عام طور پر لوگوں کو سننے نہیں ملتے، نہ سنائے جاتے ہیں، اور نہ لوگوں کے پڑھنے میں آتے ہیں۔ حالاں کہ قرآنِ پاک کے نزول کے جو مقاصد ہیں ان میں ایک مقصد یہ بھی ہے کہ جنت کی نعمتوں سے لوگوں کو روشناس کرا کر اس کے حصول کی ترغیب دی جائے۔ میرے دل میں آیا کہ اس سلسلہ کی کچھ تفصیلی روایتیں بھی آپ حضرات کے سامنے آجائیں۔

چناں چہ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیم (رحمۃ اللہ علیہ) کی عربی زبان میں ایک بہت ہی عمدہ کتاب ہے: ’’حَادِی الْأَرْوَاحِ إِلٰی بِلَادِ الْأَفْرَاحِ‘‘ جس میں انہوں نے روایتوں کے ذریعہ سے جنت کے حالات بڑی تفصیل سے پیش فرمائے ہیں۔ دو تین روز سے وہی کتاب میرے مطالعہ میں تھی، اور میں نے یہی طے کیا تھا کہ اس کی عبارت پڑھ کر کچھ تشریح بیان کر دوں گا۔ آج دوپہر کے بعد خیال آیا کہ ’’حَادِی الْأَرْوَاحِ‘‘ کی عربی عبارت پڑھوں پھر اس کا اردو میں ترجمہ کروں تو اس میں وقت بھی زیادہ لگ جائے گا۔ تو مجھے ایک اور کتاب ’’التذکرۃ فِی أَحوالِ الْموتٰی وأُمورِ الآخرۃِ‘‘ کا خیال آیا جو علامہ

قرطبی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ہے جو ایک بہت بڑے محدث اور عالم گزرے ہیں، جس میں انہوں نے موت سے لے کر جنت، دوزخ اور قیامت کے سارے حالات بیان کئے ہیں۔ اور علامہ شعرانی (رحمۃ اللہ علیہ) بھی بہت بڑے عالم گزرے ہیں، انہوں نے ان کی اس کتاب کا اختصار کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں -اصل کتاب ”التذکرۃ“ اور اس کا اختصار -ملتی ہیں، اسی کا اردو میں ترجمہ حضرت مولانا حبیب اللہ مختار صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) نے کیا ہے جو حضرت مولانا یوسف صاحب بنوری (رحمۃ اللہ علیہ) کے داماد تھے، جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کے آخر میں مہتمم بھی رہے اور شہید کر دیئے گئے۔ تو یہ کتاب میرے ذہن میں آئی اور مناسب بھی یہی معلوم ہوا کہ اسی کتاب میں سے جنت کے متعلق جو مضامین ہیں وہ آپ حضرات کے سامنے پیش کئے جائیں۔ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی جب احادیث میں جنت کی ان نعمتوں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اور قرآن پاک کی بہت سی آیتیں گزشتہ مجلس میں آگئی تھیں۔ تو ضرورت ہے کہ ہم لوگ ان چیزوں کو پڑھیں اور سنیں۔ چوں کہ عام طور پر یہ چیزیں ہمارے سامنے نہیں آتیں، اس لیے میرا جی چاہا کہ اسی کتاب میں سے آپ کے سامنے پڑھ کر سناؤں۔ اگر آج کی مجلس میں مضمون پورا ہو گیا تب تو ٹھیک ہے، ورنہ آئندہ اس کو مکمل کریں گے۔

جنت اور اس میں جنتیوں کے لیے تیار کردہ نعمتوں کا بیان

امام مسلم وغیرہ سے مروی ہے کہ: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ تیار کر رکھا ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی

کے دل پر اس کا گزر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ذخیرہ کر رکھا ہے، یہ اس کے علاوہ ہے جس پر تم مطلع ہو (جس کی تفصیل قرآن پاک وغیرہ میں آئی ہے) پھر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ آیتِ کریمہ تلاوت کرتے: ﴿فَلاَ تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَا أُخۡفِيَ لَهُمۡ مِنۡ قُرَّةِ أَعۡيُنٍ﴾ کسی کو علم نہیں جو جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک کا ان کے لیے خزانہ غیب میں مخفی ہے۔ (یہ روایت گذشتہ مجلس میں آگئی تھی۔)

ابن ماجہ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے صحابہ سے فرمایا: جنت کے لیے کوئی تیاری کرنے والا ہے؟ اس لیے کہ جنت میں کوئی خطرہ نہ ہو گا، رب کعبہ کی قسم! جنت؛ چمکتا ہوا نور، لہلہاتا ہوا پھول، مضبوط محل، بہتی نہر، بے شمار پکے پھل، خوبصورت حسین بیوی، اور بے شمار پوشاکوں کا نام ہے ایک ایسے مقام میں جو ہمیشہ رہنے والا ہے، نعمتوں اور تروتازگی کی جگہ ہے، ایسا بلند و بالا گھر جو تابناک اور سلامتی والا ہو گا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! ہم اس کے لیے تیاری کرنے والے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: ان شاء اللہ کہہ دو۔

امام ترمذی حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ: میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مخلوق کو کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ فرمایا: پانی سے۔ میں نے پوچھا: جنت کو کس چیز سے بنایا گیا ہے؟ فرمایا: ایک اینٹ سونے کی، ایک اینٹ چاندی کی۔ اس کا گارا تیز خوشبودار مشک ہے، اس کی کنکریاں موتی اور یاقوت ہیں، اور اس کی مٹی زعفران ہے۔ جو وہاں داخل ہو گا کبھی مایوس نہیں ہو گا، ہمیشہ رہے گا کبھی موت نہیں آئے گی۔ نہ ان کے کپڑے بوسیدہ ہوں گے، اور نہ ان کی جوانی کبھی ختم ہو گی۔

جنت کی نہروں، پہاڑوں

اور اس میں سے جو دنیا میں ہے ان کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ ۖ فِيهَا أَنْهَارٌ مِّن مَّاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِّن لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۖ وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ﴾ (سورۂ محمد) جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کی کیفیت یہ ہے کہ اس کی نہریں نہ بدلنے والے پانی کی ہوں گی۔ اور نہریں ذائقہ نہ بدلنے والے دودھ کی ہوں گی۔ اور نہریں پینے والوں کے لیے خوش ذائقہ شراب کی ہوں گی۔ اور نہریں صاف شہد کی ہوں گی، اور وہاں ان کے لیے ہر قسم کے پھل ہوں گے۔

روایت میں آتا ہے کہ: وہاں کی نہریں قدرتِ الٰہی کی برکت سے بغیر کسی نالی کے بہیں گی (دنیا میں تو نہر نالی میں بہتی ہے وہاں بغیر نالی کے اللہ کی قدرت سے بہے گی۔) حدیث میں رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت کی نہریں مشک کے ٹیلے یا پہاڑوں کے نیچے سے بہیں گی۔ اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت کے پہاڑوں میں سے چار پہاڑ، جنت کی نہروں میں سے چار نہریں جنت کے غزوات میں سے چار غزوات ہیں۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! پہاڑ کون سے ہیں؟ ارشاد فرمایا: جبلِ اُحد جو ہم سے محبت کرتا ہے، اور ہم اس سے محبت کرتے ہیں۔ اور کوہِ طور جنت کے پہاڑوں میں سے ہے۔ اور لبنان جنت کے پہاڑوں میں سے ہے۔ چوتھے پہاڑ کا ذکر اس

روایت کے ان تمام نسخوں میں ساقط ہو گیا ہے جس پر میں مطلع ہوا ہوں۔ اور چار نہریں؛ نیل، فرات، سیحان، اور جیحان ہیں (یہ روایت پہلے آگئی ہے) اور چار جنگیں اور غزوات: بدر، احد، خندق اور خیبر ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ہو سکتا ہے چوتھا پہاڑ وہ ہے جسے ''خُصَیِّف'' کہا جاتا ہے، اس پر وہ روایت دلالت کرتی ہے جس میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ''غزوۂ ابواء'' لڑا۔ جب ''رَوْحاء'' نامی مقام پر ''عِرْقُ الظَّبْیَۃ'' میں پہنچے تو نماز پڑھی، پھر فرمایا: جانتے ہو اس پہاڑ کا کیا نام ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے۔ فرمایا: یہ جنت کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ''خُصَیِّف'' ہے۔ اے اللہ! اس میں اور اس کے رہنے والوں میں برکت دیدیجئے۔ اور ''رَوْحاء'' کے بارے میں فرمایا: یہ ''سَبْخَآء'' ہے۔ ''مَسْبَخ'' جنت کی وادیوں میں ایک وادی ہے۔ مجھ سے پہلے اس مسجد میں ستر (۷۰) نبیوں نے نماز پڑھی ہے۔ اور حضرت موسیٰ (علیہ السلام) اس ''رَوْحاء'' کے پاس سے گزرے، انہوں نے دو قُطوانی عبائیں پہنی تھیں، وہ ناقہ وَرْداَء پر سوار تھے، ستر ہزار بنو اسرائیل ان کے ساتھ تھے، یہاں تک کہ بیت اللہ تک پہنچ گئے۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک سمندر پانی کا ہے، ایک شہد کا، ایک دودھ کا، اور ایک شراب کا ہے۔ پھر اس سے نہریں نکلتی ہیں۔

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: سیحان، جیحان، نیل اور فرات؛ جنت کی نہروں میں سے ہیں۔

حضرت کعب احبارؒ فرمایا کرتے تھے کہ: نہرِ دجلہ جنت کے پانی کی نہر ہے، اور نہرِ فرات جنت میں دودھ کی نہر ہے، اور نہرِ مصر جنت کی شراب کی نہر ہے، اور نہرِ سیحان اس کی شہد کی نہر ہے، اور یہ چاروں نہریں نہر کوثر سے نکلتی ہیں۔

حدیثِ اسراء میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دو نہروں کے پاس سے گزر ہوا جہاں سے لوگوں کو ہٹایا جارہا تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دریافت فرمایا: اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا: نیل اور فرات۔

یاجوج ماجوج کے خروج کے وقت ان نہروں اور قرآنِ کریم کے اُٹھنے کا بیان

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ جل شانہ نے دنیا میں پانچ نہریں نازل فرمائی ہیں، سَیحُون جو نہرِ ہند ہے، اور جَیحُون جو نہرِ بلخ ہے، اور دجلہ و فرات جو عراق کی نہریں ہیں، اور نیل جو مصر کی نہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کے سب سے نچلے درجوں کے چشموں میں سے ایک چشمے سے حضرت جبرئیل کے پیروں پر نازل فرمایا، اور پہاڑوں میں ودیعت رکھا اور زمین پر جاری فرمایا، اور ان میں لوگوں کی مختلف ضرورتوں کے لیے بہت سے فوائد رکھ دیئے، اسی جانب درجِ ذیل فرمانِ مبارک میں اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ﴾ (پ:۱۸/آیت:۱۸) ہم نے آسمان سے اندازے کے ساتھ پانی برسایا، پھر ہم نے اسے زمین میں ٹھہرایا۔ پھر جب یاجوج ماجوج کے خروج کا وقت آئے گا تو اللہ جل شانہٗ حضرت جبرئیل کو بھیجیں گے تاکہ وہ روئے زمین سے قرآنِ کریم، علم اور پانچوں نہریں اٹھا کر آسمان پر لے

جائیں، یہی مراد ہے درجِ ذیل فرمانِ الٰہی کی: ﴿وَاِنَّا عَلٰی ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ﴾۱۸ اور ہم اس کے معدوم کرنے پر بھی قادر ہیں۔ جب ان چیزوں کو روئے زمین سے اُٹھالیا جائے گا تو روئے زمین والے دین ودنیا کی بھلائیوں سے محروم ہو جائیں گے۔

مسعودی روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کے دور میں نہرِ فرات کو بڑھایا گیا، تو لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: اس کے پھیلانے کو ناپسند مت کرو، اس لیے کہ عنقریب ایک ایسا وقت آئے گا جب لوگ اس میں پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ تلاش کریں گے، لیکن انہیں وہ بھی نہیں ملے گا۔ اور یہ اس وقت ہو گا جب ہر پانی اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا، اور کچھ باقی ماندہ پانی اور چشمے شام میں رہ جائیں گے۔

امام بخاری وغیرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لایا، نماز قائم کی، رمضان کے روزہ رکھے، اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہو گا کہ وہ اسے جنت میں داخل فرمائیں، خواہ اس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد کیا ہو، یا اس جگہ پر بیٹھا رہا ہو جہاں پیدا ہوا۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم لوگوں کو یہ خوش خبری نہ سنائیں؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے تیار رکھے ہیں، ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان وزمین کے درمیان ہے، تم جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو جنت الفردوس مانگا کرو، اس لیے کہ وہ جنت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے، اس کے اوپر رحمٰن جلّ جلالہٗ کا عرش ہے، اور وہیں سے جنت کی نہریں پھوٹ کر نکلتی ہیں۔ علماء نے لکھا ہے کہ جنت کا اعلیٰ

درجہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ جنت الفردوس عرض میں جنت کے درمیان میں واقع ہے، اور جنت کا اعلیٰ ترین درجہ ہونے سے اس کی بلندی اور ارتفاع مراد ہے۔

امام نسائی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جس نے دنیا میں ریشم پہنا، وہ آخرت میں اسے نہیں پہن سکے گا۔ اور جس نے دنیا میں شراب پی، وہ اسے آخرت میں نہیں پیئے گا۔ اور جس نے دنیا میں سونے کے برتن میں کھایا، وہ آخرت میں اس میں نہیں کھائے گا۔ پھر رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: یہ اہلِ جنت کا لباس، اہلِ جنت کا مشروب، اور اہلِ جنت کے برتن ہوں گے۔

علماء نے لکھا ہے کہ جنت میں ریشم پہننا، شراب پینا، سونے چاندی کے برتن میں کھانا اور مزے اُڑانا اس وقت منع ہو گا کہ جب وہ مرنے سے پہلے ان گناہوں سے توبہ نہ کرے، اس لیے کہ نبیؐ کریم (ﷺ) کا ارشاد ہے جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی، اللہ تعالیٰ آخرت میں اس پر اسے حرام کر دیں گے۔ یہی بات ریشم پہننے اور سونے چاندی کے برتن میں کھانے کے بارے میں ہے۔ جبکہ صحیح روایت میں آتا ہے کہ جس نے دنیا میں ریشم پہنا، وہ آخرت میں اسے نہیں پہنے گا خواہ جنت میں داخل کیوں نہ ہو، اور جنتی اسے پہنیں گے لیکن یہ اسے نہیں پہنے گا۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا: اگر یہ راوی کا قول نہ ہو، تو یہ نہایت صریح نص ہے، بلکہ اگر یہ راوی کا قول ہو تب بھی۔ اس لیے کہ راوی نبیؐ کریم (ﷺ) کی مراد دوسروں سے زیادہ سمجھتا ہے، اور ایسی کوئی بات اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتا۔

جنت کے درختوں پھلوں اور ان پھلوں کا بیان جو دنیا میں جنت کے پھلوں کے مشابہ پائے جاتے ہیں

امام ترمذی حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، نہ کسی کے دل پر ان کا گزر ہوا، اور چاہو تو استشہاد کے لیے یہ آیتِ کریمہ پڑھ لو: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ کسی کو علم نہیں ہے جو جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک کا ان کے لیے خزانۂ غیب میں مخفی ہے، یہ بدلہ ہے ان کے نیک اعمال کا۔

فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایہ میں سو سال تک سوار چلتا رہے گا پھر بھی اسے طے نہ کر سکے گا، چاہو تو یہ آیت پڑھ لو: ﴿وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ﴾ اور لمبا سایہ ہو گا۔ اور جنت میں ایک کوڑے کے برابر جگہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سب سے بہتر ہے، چاہو تو یہ آیتِ کریمہ پڑھ لو: ﴿فَمَن زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ﴿١٨٥﴾﴾ جو شخص دوزخ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا وہی کامیاب ہوا، اور دنیا کی زندگی تو کچھ بھی نہیں سوائے ایک دھوکہ کے سودے کے۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ: جنت میں ایک درخت ہے جس کے سایے میں سوار ستر سال چلے گا (یا فرمایا کہ) سو سال چلے گا، یہ "شَجَرَةُ الْخُلْد" ہے۔

اور حضرت کعب احبار (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے: قسم ہے اس ذات کی جس نے حضرت موسیٰ (علیہ السلام) پر تورات، اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآنِ کریم نازل فرمایا، جنت میں ایک درخت ہے، اگر کوئی شہسوار طاقتور اونٹ پر سوار ہو کر اس کے تنے کے نیچے چلے تو اس کے کنارہ تک نہیں پہنچ سکے گا یہاں تک کہ بوڑھا ہو کر گر پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے دستِ مبارک سے اسے بویا، اپنی طرف سے اس میں روح پھونکی، اس کی شاخیں جنت کی چار دیواری کے باہر ہوں گی، اور جنت کی ہر نہر اس درخت کے نیچے سے نکلتی ہے۔

ترمذی کی روایت میں ہے، رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب مجھے ساتویں آسمان پر سدرۃ المنتہیٰ لے جایا گیا، تو میں نے دیکھا کہ اس کے پھل ہِجر کے مٹکوں کے برابر ہیں (ہِجر: یمن میں ایک شہر ہے جہاں بڑے بڑے مٹکے بنتے تھے) اور پتے ہاتھی کے کانوں کے برابر تھے، اس کے تنے کے پاس سے دو ظاہری نہریں نکل رہی تھیں اور دو باطنی۔ میں نے پوچھا: اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ تو فرمایا: باطنی نہریں جنت میں ہیں، اور ظاہری نہریں نیل اور فرات ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ: سدرۃ المنتہیٰ جنت کا اعلیٰ ترین حصہ ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ: سدرۃ المنتہیٰ کا پھل ایسا ہے کہ اس کے ہر پھل کے دانہ سے بہتّر (۷۲) قسم کے کھانے نکلیں گے، اور ہر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوگا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ: ایک دیہاتی نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں پھل ہوں گے؟ آپ (ﷺ) نے فرمایا: ہاں! ایک درخت ہے جسے طوبیٰ کہا جاتا ہے۔ اس نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! دنیا کے درختوں میں سے کون سا درخت اس کے مشابہ ہے؟ فرمایا: وہ تمہاری سرزمین کے درختوں کے کسی کے بھی مشابہ نہیں، لیکن کیا تم شام گئے ہو؟ اس لیے کہ وہاں ایک درخت ہے جسے اخروٹ کا درخت کہا جاتا ہے، جو ایک تنے پر نکلتا ہے، اور اس کا اوپر کا حصہ پھیل جاتا ہے، یہ درخت اس کے مشابہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! اس کی جڑ کتنی موٹی ہو گی؟ فرمایا: اگر تم اپنے اونٹوں میں سے جوان اونٹ چلاؤ تو وہ اس کی جڑ کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں تک کہ بوڑھاپے کی وجہ سے اس کی گردن ٹوٹ جائے۔ پوچھا: وہاں انگور ہوں گے؟ فرمایا: جی ہاں۔ پوچھا: اس کا خوشہ کتنا بڑا ہو گا؟ فرمایا: کالے سیاہ داغ والے اس کوے کی ایک ماہ کی مسافت کی مقدار جو اُڑنے سے تھکے نہیں۔ پوچھا: اس کا انگور کتنا بڑا ہو گا؟ فرمایا: بڑے ڈول کے برابر۔ پوچھا: اے اللہ کے رسول! اس کا تو ایک دانہ میرے اور میرے گھر والوں کا پیٹ بھر دے گا۔ فرمایا: جی ہاں! اور تمہارے دوسرے عزیز واقارب کا بھی۔

حضرت ابو عبیدہ (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ: جنت کے نخلستان جڑ سے شاخ تک تہہ بہ تہہ ہوں گے، اور اس کے پھل مٹکوں کے برابر ہوں گے، جب کوئی پھل توڑا جائے گا تو اس کی جگہ دوسرا پھل خود بخود لگ جائے گا، اس کا پانی بغیر نالی کے بہے گا، اور اس کے انگور کا ہر خوشہ بارہ ہاتھ ہو گا۔

حضرت ابو امامہ باہلی (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ: طوبیٰ؛ جنت کے ایک درخت کا نام ہے، جنت کے ہر گھر میں اس کی ایک ٹہنی ہو گی، وہاں ہر خوبصورت پرندہ ہو گا، ہر عمدہ قسم کی کھجور اس میں ہو گی۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو جنت کے پھلوں کے مشابہ ہو، سوائے کیلے کے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أُكُلُهَا دَآئِمٌ﴾ اس کا پھل دائمی ہو گا، اور کیلا گرمی سردی میں ہمیشہ ملتا ہے۔

حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دو تھال انجیر ہدیہ کئے گئے، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے کھایا اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا: اسے کھالو، میں اگر کہوں کہ کوئی پھل جنت سے اُترا ہے تو اس انجیر کے بارے میں کہوں گا، اس لیے کہ جنت کے پھل میں گٹھلی نہیں ہو گی۔ اس کو کھایا کرو، اس لیے کہ وہ بواسیر کو ختم کرتا ہے، اور نِقرِس میں فائدہ پہنچاتا ہے۔ (نِقرِس: وہ درد جو پاؤں کے انگوٹھے میں ہوتا ہے (فیروز: ۱۳۶۹))

حضرت عاصم بن صبرہ حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: تربوز سے لطف اندوز ہوا کرو، اور اس کو اچھا سمجھو، اس لیے کہ اس کا پانی جنت سے ہے، اور اس کی شیرینی جنت کی شیرینی میں سے ہے۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اس میں ایک لقمہ کھائے مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کے پیٹ میں ستر دوائیں داخل کرتے ہیں، اور اس سے ستر بیماریاں نکال دیتے ہیں، اور ہر لقمہ پر اس کے لیے دس نیکیاں لکھتے ہیں، اور دس برائیاں مٹاتے ہیں، اور دس درجات بلند کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے درجِ ذیل آیت تلاوت فرمائی: ﴿وَأَنۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّن

یَّقۡطِیۡنٍ﴿۱۴۶﴾ (الصافات)﴾ اور ہم نے اس پر ایک بیل دار درخت بھی اُگا دیا۔ پھر فرمایا کہ: کدّو اور تربوز جنت سے آئے ہیں۔

جنت کے درخت اور نہریں، جنت والوں کے کپڑے، گھوڑے اور اونٹنیاں بنائیں گے

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے فرمایا کہ: جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبیٰ کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے کہیں گے کہ میرے بندے کے لیے وہ بنا دو جو وہ چاہے، چناں چہ وہ اس کے لیے گھوڑا، زین، لگام اور سامان کے ساتھ نکالے گا جیسا وہ چاہے گا۔ اور اونٹنی، کجاوے، لگام اور جیسی شکل و صورت وہ چاہے گا اس کے ساتھ۔ اور اونی کپڑے نکالے گا۔

نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہما) سے روایت ہے کہ: ایک صاحب نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے اور عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ہمیں جنتیوں کے کپڑے کے بارے میں بتائیے۔ کیا انہیں پیدا کیا جائے گا، یا بنایا جائے گا؟ بعض لوگ ہنسنے لگے، تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: کیوں ہنستے ہو؟ ایک جاہل عالم سے دریافت کر رہا ہے۔ وہ کچھ دیر بیٹھے، پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت کے کپڑوں کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ بتایا گیا کہ اے اللہ کے رسول! وہ یہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: انہیں بنایا نہیں جائے گا، بلکہ جنت کے پھل انہیں بنائیں گے۔ یہ بات آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تین مرتبہ فرمائی۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) نے فرمایا: جنت کے نخلستان کے تنے سبز زمرد کے، اس کی ٹہنیاں سرخ سونے کی، اور اس کی شاخیں جنتیوں کی چادریں ہوں گی۔ اس سے ان کے کپڑے اور پوشاکیں بنیں گی۔ اور اس کے پھل مٹکوں اور ڈولوں کے برابر، دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیرین، اور مکھن سے زیادہ نرم ہوں گے، ان میں گٹھلی نہیں ہو گی۔

حدیث میں آتا ہے، ایک صاحب نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں کھجور کے درخت ہوں گے؟ مجھے کھجور کے درخت بہت پسند ہیں۔ فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے! اس کے تنے سونے کے، اور ٹہنی کاٹنے کے بعد جو حصہ تنے میں رہ جاتا ہے وہ سونے کا ہو گا۔ ٹہنیاں سونے کی ہوں گی، اور شاخیں ایسی بہترین پوشاک ہوں گی جو کسی شخص نے دیکھی نہیں ہو گی۔ اور اس کے گچھے کی جڑ سونے کی ہو گی، اور اس کے گچھے سونے کے ہوں گے۔ اور نیچے کی پینیدی سونے کی، پھل مٹکوں کے برابر، مکھن سے زیادہ نرم اور شہد سے زیادہ شیرین ہوں گے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی (رضی اللہ عنہ) نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے ہاتھ میں ایک لکڑی تھامی، اور فرمایا: اے جریر! اگر تم جنت میں اتنی سی لکڑی بھی مانگو تو تمہیں ملے گی۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے کہا: پھر کھجوروں کے درخت اور دوسرے درخت کہاں ہوں گے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اس کی جڑیں موتی اور سونے کی اور اوپر کا حصہ پھلوں سے لدا ہوا ہو گا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت میں کوئی درخت نہیں ہوگا مگر یہ کہ اس کا تنا سونے کا ہوگا۔

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) ایک روز یہ گفتگو فرمارہے تھے کہ ایک جنتی نے پروردگار سے کھیتی کی اجازت مانگی۔ آپ کے پاس دیہات کا ایک آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ پروردگار نے اس جنتی سے فرمایا: کیا تمہیں یہاں سب کچھ نہیں ملا جو تم کھیتی چاہتے ہو؟(یعنی ہر قسم کی نعمتیں تو ملی ہوئی ہیں؟)اس نے کہا: کیوں نہیں! لیکن میں کھیتی پسند کرتا ہوں۔ فرمایا: اس نے بیج ڈالے، پلک جھپکتے میں وہ اُگے، اور تنے دار ہوگئے، اوران کے کاٹنے کا وقت ہوگیا اور وہ پہاڑ کے برابر ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: اے ابن آدم! لے لے؛ تیرا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرے گا۔ اس دیہاتی نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ کھیتی کا مطالبہ کرنے والا کوئی قریشی یا انصاری ہوگا، اس لیے کہ یہ لوگ کھیتی والے ہیں، ہم تو کھیتی والے نہیں۔ رسول اللہ (ﷺ) مسکرادیئے۔

جنت کے دروازے، ان کی تعداد، اور یہ کہ وہ کس کے ہوں گے، ان کے نام کیا ہیں؟ اور وہ کتنے کشادہ ہوں گے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا﴾ یہاں تک کہ جب جنت کے پاس پہنچ جائیں تو اس کے دروازہ کھلے ہوں گے۔ اہلِ علم کی ایک جماعت نے لکھا ہے کہ: یہ "واو" ثمانیہ (یعنی آٹھ) کا ہے، جنت کے آٹھ دروازہ ہیں، اورانہوں نے نبی کریم (ﷺ) کے اس فرمانِ

مبارک سے استدلال کیا کہ: تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں کہ وہ وضو کرے اور اچھی طرح سے وضو کرے، پھر ''أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ'' پڑھے، مگر یہ کہ اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں، وہ جس سے چاہے جنت میں داخل ہو جائے۔

اور بخاری و مسلم کی روایت میں بعض اعمال کے کرنے والوں کے لیے ان دروازوں کی تعیین بھی کی گئی ہے، چناں چہ فرمایا: جو آدمی اللہ تعالیٰ کے راستہ میں دو دو چیزیں خرچ کرے گا؛ اُسے جنت میں آواز دی جائے گی کہ اے اللہ کے بندے! یہ بہت اچھا ہے۔ جو نماز والا ہو گا اسے نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا۔ جو جہاد والا ہو گا اسے جہاد کے دروازے سے۔ جو صدقہ والا ہو گا اس کو صدقہ کے دروازے سے۔ جو زیادہ روزے رکھنے والا ہو گا اسے ''باب الرّیّان'' (سیر ابی کے دروازے) سے بلایا جائے گا۔ حضرت ابو بکر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! کسی کو اس کی حاجت تو نہیں ہو گی کہ اسے سب دروازوں سے بلایا جائے (یعنی جب ایک دروازے سے داخلہ مل گیا تو وہ کافی ہے) لیکن کیا کوئی ایسا آدمی بھی ہو گا جسے ان سب دروازوں سے بلایا جائے؟ فرمایا: جی ہاں! اور مجھے امید ہے کہ تم ان میں سے ہو گے۔

امام مسلم نے ایک روایت میں ان دروازوں پر اضافہ فرمایا ہے توبہ کا دروازہ، غصہ کو پینے والوں کا دروازہ، رضا بالقضا والوں کا دروازہ، وہ دایاں دروازہ جس سے وہ لوگ داخل ہوں گے جن پر کوئی حساب و کتاب نہ ہو گا۔

اورابو عبداللہ حکیم ترمذی(رحمۃ اللہ علیہ)نے یہ دروازہ بھی زائد نقل کیا ہے؛باب محمد(صلی اللہ علیہ وسلم) جو باب الرحمۃ ہے۔اور بعض نے کہا ہے کہ: یہ باب التوبہ ہے،اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بنانے کے ساتھ کھلا رکھا ہے،اور اسے اس وقت تک بند نہیں کیا جائے گا جب تک کہ سورج مغرب سے نہ نکلے۔جب مغرب سے نکلے گا تو اس دروازہ کو بند کر دیا جائے گا،پھر قیامت تک نہیں کھلے گا۔ اور دوسرے دروازے نیکیوں پر تقسیم ہیں،جیسے: نماز،روزہ،زکوٰۃ،صدقہ،حج،جہاد،صلہ رحمی،عمرہ؛اس طرح ان دروازوں کی تعداد گیارہ بن جاتی ہے۔

حافظ ابو بکر آجری رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ جنت میں ایک دروازہ ہے جسے باب الضحیٰ (چاشت کا دروازہ) کہا جاتا ہے،قیامت کے روز ایک پکارنے والا پکارے گا: وہ لوگ کہاں ہیں جو چاشت کی نماز پر مداومت کرتے تھے؟ یہ تمہارا دروازہ ہے،اس لیے اس سے داخل ہو جاؤ۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جنت کا ایک دروازہ کسی کے ساتھ خاص نہیں،بلکہ وہ تمام امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ان افراد کے لیے ہے جن پر کوئی ایسا عمل غالب ہو جس سے وہ پہنچانے جاتے ہوں،وہاں لوگ ہجوم کریں گے،یہاں تک کہ قریب ہو گا کہ ہجوم کی کثرت کی وجہ سے ان کے کاندھے نکل جائیں۔

جنت کے دروازوں کی وسعت اور کشادگی کے بارے میں حضرت عتبہ بن غزوان(رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے،وہ اپنے وعظ میں فرماتے تھے کہ ہمیں یہ بتایا گیا کہ جنت کے دروازے کی دو چوکھٹوں کے

درمیان چالیس سال کی مسافت ہو گی، اور اس پر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ بھیڑ کی زیادتی کی وجہ سے وہ بھرا ہوا ہو گا۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ: جنت کی چوکھٹوں میں سے دو چوکھٹوں کے درمیان اتنی مسافت ہو گی جتنی مکہ اور ہجر، یا جتنی مکہ اور بُصریٰ کے درمیان ہے، یا اس سے بھی زیادہ۔

ایک روایت میں ہے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میری امت کے ستر ہزار یا سات لاکھ افراد اس طرح جنت میں داخل ہوں گے کہ وہ ایک دوسرے کو پکڑے ہوں گے، ان کا پہلا اس وقت تک داخل نہیں ہو گا جب تک کہ آخری داخل نہ ہو (یعنی ستر ہزار افراد کی اس طرح لائن ہو گی کہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہوں گے اور ایک ساتھ دروازہ میں سے داخل ہوں گے۔ اس سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جنت کا دروازہ کتنا چوڑا ہو گا) ان کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔

امام قرطبی (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا: ممکن ہے کہ جنت کے دروازے وسعت اور کشادگی میں مختلف ہوں گے، بعض چالیس سال کے برابر کشادہ ہوں گے، اور بعض کی وسعت مکہ اور ہجر کے درمیان جتنی ہو گی، اس لیے اس میں کوئی تناقض نہیں۔

فرمایا: حدیث میں جو آتا ہے کہ جس نے اللہ کے راستہ میں دو دو خرچ کئے اس سے مراد ہے ہر چیز کے دو دو ہیں۔ مثلاً: دو درہم، دو جوتے، دو موزے، دو کپڑے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان سے مراد

دو دن کی نمازیں، دو روزے۔ لیکن پہلی توضیح زیادہ ظاہر ہے، اس لیے حضرت ابوذر (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آپ کے اس فرمان میں مروی ہے کہ: جس نے اللہ کے راستہ میں دو دو خرچ کیئے، تو جنت کے داروغے اس کی طرف جلدی کرتے ہیں۔ پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: دو اونٹ، دو درہم، دو کپڑے، دو جوتے۔ (اس لیے جب کہیں خرچ کرنا ہو تو کم سے کم دو چیزیں ضرور نکالو)۔

صحیحین کی روایت میں ہے کہ باب الریان سے روزہ دار داخل ہوں گے، جب ان کا آخری آدمی داخل ہو جائے گا تو اسے بند کر دیا جائے گا، اور اس سے اور کوئی داخل نہیں ہو گا۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا: اس طرح کی بات جنت کے ان دوسرے دروازوں کے بارے میں بھی کہی جائے گی جو مخصوص عمل والوں کے ساتھ خاص ہیں۔

ابو داود کی روایت ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ایک آدمی کو جنت کے دروازہ پر لے جایا گیا، اس نے سر اٹھایا تو جنت کے دروازہ پر لکھا تھا: صدقے کا دس گنا ثواب ملتا ہے، اور قرضہ کا اٹھارہ گنا۔ اس لیے کہ قرض لینے والا اس وقت آپ سے قرض لینے آتا ہے جب اسے حاجت ہوتی ہے، اور بعض اوقات صدقہ لاعلمی میں غنی اور مالدار کو بھی دیدیا جاتا ہے۔

جنت کے درجات کا بیان اور یہ کہ مومن کو کون سا درجہ ملے گا

امام بخاری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا آسمان اور زمین کے درمیان۔ اور جنت الفردوس اس

کا سب سے اعلیٰ درجہ ہے، اسی سے جنت کی چاروں نہریں بہتی ہیں، اس کے اوپر عرش ہے، لہٰذا جب تم اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو جنت الفردوس مانگا کرو۔

ایک دوسری روایت میں یہ الفاظ بھی زائد ہیں کہ: جنت کے پہلے درجہ کے مکان کے کمرے، دروازے، تخت، تالے؛ سب چاندی کے ہوں گے۔ اور دوسرے درجہ کے گھر، کمرے، دروازے، تخت، دروازے کے تالے؛ سونے کے ہوں گے۔ اور تیسرے درجہ کے گھر، کمرے، دروازے، تخت، دروازے کے تالے؛ یاقوت موتی اور زبرجد کے ہوں گے۔ اور ستانوے (۹۷) درجات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کیا ہیں۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت میں سو درجات ہیں ،اگر تمام عالم والے ان میں سے ایک میں جمع ہو جائیں تو وہ ان کے لیے کافی ہو جائے گا۔

ابن ماجہ کی ایک روایت میں ہے کہ رسول (ﷺ) نے فرمایا: قرآن کا حافظ جب جنت میں داخل ہو جائے گا تو اس سے کہا جائے گا کہ تو پڑھ اور چڑھ۔ وہ قرآن شریف پڑھتا جائے گا اور جنت کے درجات چڑھتا جائے گا، ہر آیت پر ایک درجہ بڑھے گا، یہاں تک کہ آخری آیت تک پہنچ جائے گا۔

ابو داود کی روایت ہے کہ قرآنِ کریم کے قاری سے کہا جائے گا: تو پڑھ اور چڑھ، اور اس طرح ترتیل سے پڑھنا جس طرح تم دنیا میں ترتیل سے پڑھتے تھے، اس لیے کہ تمہارا ٹھکانہ اس آخری آیت پر ہو گا جسے تم پڑھو گے۔

ایک روایت میں ہے: جنت کے درجات قرآنِ کریم کی آیات کے مطابق ہیں، ہر آیت کا ایک درجہ ہے (قرآنِ کریم کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو سولہ (۶۲۱۶) ہے) ہر دو درجوں کے درمیان زمین وآسمان کے درمیان کی مسافت کا فاصلہ ہو گا۔ اس کو اعلیٰ علیین میں لے جایا جائے گا، اس کے ستر ہزار گوشے ہوں گے، اور وہ ایک یاقوت ہو گا جو تین دن رات کی مسافت سے روشن ہو گا۔

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرمایا کرتی تھیں: قرآنِ کریم کی آیات کی تعداد جنت کے درجات کی تعداد کے برابر ہیں۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہمارے علماء نے لکھا ہے کہ قراء اور حاملینِ قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کے احکام اور حلال وحرام کو جانتے، اور اس میں جو کچھ ہے اس پر عمل کرتے ہوں، صرف الفاظ کے قاری اور زبانی قرآن یاد کرنے والے مراد نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بعض اوقات قرآنِ کریم کو وہ شخص پڑھتا ہے جس میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔ اور ابواب النار (دوزخ کے دروازوں) میں اس آدمی کی سزا گزر چکی ہے جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا، اس لیے ہم یہاں اسے دوبارہ ذکر نہیں کرتے۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جس نے قرآنِ کریم سیکھا اور اور اس کو سکھایا اور اس پر عمل نہیں کیا، بلکہ اس میں تحریف کی، قرآن اس کے لیے جہنم کا سفارشی اور رہنما

بنے گا۔ اور جس نے قرآنِ کریم کو سیکھا اور اس پر عمل کیا تو اس کے لیے جنت تک پہنچانے والا، اور جنت کا سفارشی بنے گا۔

بخاری شریف میں ہے کہ ایسے مؤمن کی مثال جو قرآنِ کریم پڑھتا ہے، ترنجبین کی طرح ہے جس کا مزا اچھا اور خوشبو عمدہ ہوتی ہے۔ اور اس مؤمن کی مثال جو قرآنِ کریم پڑھتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا اس کھجور کی طرح ہے جس کا مزہ اچھا ہے لیکن اس میں کوئی خوشبو نہیں۔ اور اس منافق کی مثال جو قرآنِ کریم پڑھتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ایلوے کی طرح ہے جس کا مزہ کڑوا ہے اور اس میں کوئی خوشبو نہیں۔ اور پہلے یہ گزر چکا ہے کہ قرآن پڑھنے والا جب اس پر عمل بھی کرتا ہے، تو جنت کے تمام درجات پار کرے گا۔

بالاخانوں اور اس کے مستحقین کا بیان

مسلم کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت والے اوپر کے بالاخانوں کے آپسی درجات کے تفاوت کی وجہ سے اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم اس روشن ستارے کو دیکھتے ہو جو اُفق میں ہو، مشرق یا مغرب میں غروب ہو رہا ہو۔ عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ انبیاء کے درجات ہوں گے جن تک ان کے علاوہ اور کوئی نہیں پہنچ سکتا؟ فرمایا: نہیں؛ قسم ہے اس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے! یہ وہ لوگ ہوں گے جو اللہ جل شانہٗ پر ایمان لائے اور رسولوں

کی تصدیق کی، یعنی جس کا انہیں حکم دیا گیا اس پر عمل کیا، اس لیے کہ بغیر عمل کی تصدیق پر ایسا درجہ نہیں مل سکتا۔

امام ترمذی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمانِ الٰہی: یہ وہ لوگ ہیں جن کو صبر کی وجہ سے بالا خانہ ملے گا، اور فرمانِ الٰہی: وہ بالا خانوں میں امن سے ہوں گے، اس کے بارے میں فرمایا: ایک ایک بالا خانہ ایک سرخ یاقوت، یا سبز زمرد، یا سفید موتی کا ہو گا۔ اس میں نہ خلا ہو گا، نہ جوڑ۔ اور اہلِ جنت ایک دوسرے کو بالا خانوں میں اس طرح دیکھیں گے جیسے تم آسمان کے کنارے پر مشرق یا مغرب میں ستارے کو دیکھتے ہو (یعنی ایک ہی ستارہ یہاں سے بھی نظر آتا ہے اور وہاں بھی وہی نظر آتا ہے، اس طرح اونچائی پر دیکھیں گے)

حضرت ابن مسعود (رضی اللہ عنہ) روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لیے باہمی محبت کرنے والے سرخ یاقوت کے ستون پر ہوں گے، ستون کے اوپر کے حصے پر ستر ہزار بالا خانے ہوں گے، ان کا حسن اہلِ جنت پر اس طرح روشن ہو گا جیسا دنیا والوں کے لیے سورج روشن ہوتا ہے۔ جنت والے ایک دوسرے سے کہیں گے: چلو! چل کر اللہ کے لیے آپس میں محبت کرنے والوں کا نظارہ کریں۔ جب وہ ان کو دیکھیں گے تو ان کا حسن جنت والوں پر اس طرح روشنی ڈالے گا جس طرح سورج دنیا والوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ انھوں نے سبز سُندُس اور ریشم کے کپڑے پہنے ہوں گے، ان کی پیشانیوں پر لکھا ہو گا: یہ اللہ تعالیٰ کے لیے آپس میں محبت کرنے والے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: علیین والے اہلِ جنت کو دیکھیں گے، جب علیین والوں میں سے کوئی آدمی جنت میں جھانکے گا تو اس کے چہرے کی روشنی سے جنت چمک اُٹھے گی۔ جنتی کہیں گے: یہ نور کیسا ہے؟ کہا جائے گا: سچے نیک فرمانبردار علیین والوں میں سے ایک شخص نے جھانکا ہے۔

امام ترمذی حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایسے بالاخانے ہوں گے جن کا باہر کا حصہ اندر سے اور اندر کا باہر سے نظر آئے گا۔ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر پوچھا: اے اللہ کے رسول! یہ بالاخانے کسے حاصل ہوں گے؟ فرمایا: جس نے نرم بات کی، کھانا کھلایا، مسلسل روزے رکھے، اور رات کو نماز پڑھی جب لوگ سوئے پڑے ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ: یہ اس کے لیے ہے جو سلام کو پھیلائے۔

ابو نُعَیم کی ایک روایت میں ہے کہ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! اس کی کون طاقت رکھتا ہے؟ فرمایا: میری امت اس کی طاقت رکھتی ہے، اور مَیں تمہیں بتاؤں کہ کون اس کی طاقت رکھتا ہے؟ جو شخص اپنے مسلمان بھائی سے ملے، سلام کرے اس نے سلام کو پھیلایا۔ اور جس نے اپنے اہل وعیال کو پیٹ بھر کر کھلایا، اس نے کھانا کھلانا۔ اور جس نے پورے رمضان کے اور ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھے، اس نے گویا مسلسل روزے رکھے۔ اور جس نے عشاء جماعت سے پڑھی، اس نے اس حال میں نماز پڑھی کہ لوگ (یعنی یہود و نصاریٰ) سوئے ہوئے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ جنت میں ایسے بالاخانے ہیں کہ جن کے اوپر چھت اور نیچے ستون نہیں ہوں گے۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! اس میں رہنے والے وہاں کس طرح داخل ہوں گے؟ فرمایا: پرندوں کی طرح داخل ہوں گے۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! یہ کس کے ہوں گے؟ فرمایا: بیماروں، تکالیف اور مصیبتوں اور درد والم والوں کے لیے۔

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ: قیامت میں کچھ لوگوں کو لایا جائے گا جو نہ نبی ہوں گے اور نہ شہید۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی وجہ سے انبیاء و شہداء ان پر غبطہ اور رشک کریں گے، وہ نور کے ممبروں پر ہوں گے۔ پوچھا گیا: اے اللہ کے رسول! وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ جل شانہٗ کو لوگوں کا محبوب بناتے ہیں اور لوگوں کو اللہ جل شانہٗ کا۔ اور اللہ کی رضا کے لیے لوگوں کو زمین پر نصیحت کرتے پھرتے ہیں۔ ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ اللہ جل شانہٗ کو لوگوں کا محبوب بناتے ہیں یہ تو ٹھیک ہے، لیکن لوگوں کو اللہ تعالیٰ کا محبوب کس طرح بناتے ہیں؟ فرمایا: انہیں اچھی باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں۔ جب لوگ ان کی بات مانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتا ہے۔

جنت کے محلّات، مکانات اور کمروں کا بیان اور یہ کہ وہ مؤمنوں کو کس طرح حاصل ہوں گے

حافظ ابو بکر آجُرّیؒ حضرت عمران بن حصین اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہما) سے اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ﴾ اور وعدہ کر رکھا ہے پاکیزہ مکانوں کا ہمیشہ کے باغوں میں؛ اس سلسلہ میں نقل کرتے ہیں کہ آپ باخبر سے ملے ہیں، ہم نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کے بارے میں دریافت کیا تھا تو آپ نے فرمایا: جنت میں ایک موتی کا محل ہو گا، اس محل میں سرخ یاقوت کے ستر (۷۰) گھر ہوں گے، ہر گھر میں سبز زبرجد کے ستر (۷۰) کمرے ہوں گے، ہر کمرے میں ستر (۷۰) تخت ہوں گے، ہر تخت پر مختلف قسم کے ستر (۷۰) بچھونے ہوں گے، ہر بچھونے پر ستر (۷۰) بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی، ہر کمرے میں ستر (۷۰) دستر خوان ہوں گے، ہر دستر خوان پر ستر (۷۰) قسم کے کھانے ہوں گے۔ ہر کمرے میں ستر (۷۰) غلام اور باندیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ مؤمن کو ایک صبح میں اتنی قوت دے گا کہ وہ ان سب کو استعمال کر سکے۔

حدیث میں آتا ہے کہ: جنتیوں کے محلات میں سے ایک محل میں ستر (۷۰) بالاخانے ہوں گے، ہر بالاخانے میں موٹی موٹی آنکھوں والی ستر (۷۰) حوروں میں بیویاں ہوں گی۔ ہر بالاخانے میں ستر (۷۰) دروازے ہوں گے، ہر دروازے سے جنت کی خوشبوؤں میں سے ایسی خوشبو آئے گی جو دوسرے دروازے سے نہیں آتی ہو گی۔ پھر فرمایا: یہی مراد ہے فرمانِ الٰہی: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ

لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ﴾ کسی کو علم نہیں ہے جو جو سامان آنکھوں کی ٹھنڈک کا ان کے لیے خزانۂ غیب میں پوشیدہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جس نے دس مرتبہ ”قل ھو اللہ أحد“ پڑھی اس کے لیے جنت میں ایک محل بنے گا۔ اور جو بیس مرتبہ پڑھے گا، اس کے لیے دو محل بنیں گے۔ اور جو تیس مرتبہ پڑھے گا اس کے لیے تین محل بنیں گے۔ حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پھر تو ہم اپنے لیے خوب محل بنائیں گے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ جل شانہ کا فضل اس سے بہت زیادہ ہے۔

صحیح حدیث میں آتا ہے کہ: اللہ جل شانہٗ جب کسی بندے کے بیٹے کو اُٹھا لیتے ہیں تو فرشتوں سے پوچھتے ہیں کہ میرے بندے نے کیا کہا؟ وہ کہتے ہیں کہ: آپ کی تعریف کی اور انا للہ پڑھی۔ ارشاد فرماتے ہیں کہ: اس کے لیے جنت میں بیت الحمد نامی گھر بنا دو۔ (اللہ جل شانہٗ ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو ان درجات کا اہل بنائے)۔

جنت کے خیموں اور بازاروں کا بیان

امام مسلم حضرت ابو موسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک کھوکھلے موتی کا خیمہ ہو گا جس کا عرض (چوڑائی) ساٹھ میل ہو گا، اس کے ہر ایک

گوشہ میں مؤمن کے گھر والے ہوں گے جو دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے، مؤمن ان کے ساتھ صحبت کرے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ آسمان میں اس کا طول ساٹھ میل ہو گا۔

مسلم کی روایت میں ہے کہ: جنت میں ایک بازار ہو گا جہاں پر جنتی جمعہ کے دن آئیں گے۔ شمال کی جانب سے ایک ہوا چلے گی۔ ان کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکاؤ کرے گی، جس سے وہ حسن و جمال میں اور بڑھ جائیں گے۔ جب وہ حسن و جمال میں اضافہ کے ساتھ اپنے گھر والوں کے پاس آئیں گے تو ان کے گھر والے کہیں گے: بخدا! ہم سے جدا ہونے کے بعد آپ اور زیادہ حسین و جمیل ہو گئے ہیں ۔وہ بھی کہیں گے: بخدا! تم بھی تو ہم سے جدا ہونے کے بعد اور زیادہ حسین و جمیل ہو گئیں۔

امام ترمذی حضرت سعید بن مسیب (رحمۃ اللہ علیہ) سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک روز حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے ملے تو حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) نے ان سے کہا: میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اور تمہیں جنت کے بازار میں اکٹھا کرے۔ حضرت سعیدؒ نے پوچھا: کیا جنت میں بازار ہو گا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! اور حدیث ذکر کی۔

ایک روایت میں ہے کہ: جنت میں ایک بازار ہے، فرشتے اسے گھیرے رہتے ہیں، لوگوں نے اس جیسا بازار نہ دیکھا ہو گا، اور نہ کانوں نے اس جیسے بازار کے بارے میں سنا ہو گا، نہ دلوں پر اس کا خیال گزرا ہو گا۔ وہاں سے ہمارے لیے وہ کچھ لایا جائے گا جو کچھ ہم چاہیں گے، وہاں خرید و فروخت نہ ہو گی۔ جنتی اس بازار میں ایک دوسرے سے ملیں گے، بڑے درجے والا اپنے سے کم درجے والے سے ملے گا حالانکہ ان میں سے کوئی بھی معمولی نہیں ہو گا، اور وہ اس کے لباس کو دیکھ کر حیرت زدہ

ہو جائے گا، لیکن ابھی اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی ہو گی کہ اسے محسوس ہو گا کہ وہ اس سے زیادہ اچھالباس پہنے ہوئے ہے، اور یہ اس لیے کہ کسی جنتی کے لیے وہاں حزن وملال کا نام ونشان نہ ہو گا۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک بازار ہو گا جس میں خرید وفروخت نہ ہو گی، صرف مردوں اور عورتوں کی تصویریں ہوں گی، جب کوئی شخص کوئی صورت پسند کرے گا وہ صورت اسے مل جائے گی۔

حدیث میں آتا ہے کہ: جنت میں ایسی بازاریں ہوں گی جن میں خرید و فروخت نہ ہو گی، لیکن جنتی جب وہاں پہنچ جائیں گے تو موتی اور مشک کی مٹی پر ٹیک لگا کر بیٹھے جائیں گے، ان بازار میں اس طرح متعارف ہوں گے جس طرح دنیا میں ہوتے تھے، اور وہ یاد کریں گے کہ دنیا کیسی تھی، اور وہ اپنے پروردگار کی کس طرح عبادت کرتے تھے، رات کو جاگ کر کس طرح عبادت کرتے تھے، دن کو روزہ رکھتے تھے، دنیا کا فقر ومالداری کیسی تھی، موت کیسی تھی، اور اتنی طویل بوسیدگی کے بعد ہم کس طرح اہلِ جنت میں سے بن گئے۔

جنت میں کوئی شخص بغیر پاسپورٹ کے داخل نہ ہو سکے گا

ابو بکر خطیب روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں کوئی شخص بغیر پاسپورٹ کے داخل نہ ہو گا۔ اور پاسپورٹ یہ ہو گا: بسم اللہ الرحمن الرحیم؛ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فلاں بن فلاں کے لیے کتاب (تحریر) ہے، اسے بلند وبالا ایسی جنت میں داخل کردو جس کا پھل قریب

کو لٹکا ہوا ہو۔ امام قرطبیؒ نے فرمایا: یہ شاید ان کے علاوہ کے لیے ہو گا جو جنت میں بلا حساب و کتاب داخل ہوں گے۔

اہلِ جنت کے مراتب، عمریں، لمبائی، شباب، بالاخانوں، کپڑوں، کنگھیوں، دھونی، بیویوں اور عورتوں وغیرہ کا بیان

امام مسلم حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: میری امت کی پہلی وہ جماعت جو جنت میں داخل ہو گی وہ چودھویں رات کے چاند کے مانند ہو گی، پھر جو لوگ ان کے بعد ہوں گے وہ آسمان کے چمکدار ستاروں کی طرح ہوں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ پھر اس کے بعد والے درجات والے ہوں گے، وہ وہاں نہ پیشاب کریں ، نہ پاخانہ، نہ تھوکیں گے، نہ ناک کی ریزش ہو گی، ان کی کنگھیاں سونے چاندی کی ہوں گی، ان کا پسینہ مشک کی خوشبو والا ہو گا، ان کی دھونی اَگر کی ہو گی، اور ان کی بیویاں موٹی موٹی آنکھوں والی حوریں ہوں گی۔

ایک روایت میں ہے کہ: ان میں سے ہر ایک کو دو بیویاں ملیں گی جن کی پنڈلی کا گودا حُسن کی وجہ سے گوشت کے باہر سے نظر آئے گا، ان میں نہ اختلاف ہو گا، نہ بغض و حسد۔ ان کے دل ایک آدمی کے دل کی طرح متحد ہوں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ: ان کے اخلاق ایک آدمی کے اخلاق کی

طرح ہوں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ: ان کی لمبائی ان کے جدِ امجد حضرت آدم (علیہ السلام) کی لمبائی کے مطابق ہو گی۔ ایک روایت میں ہے کہ: آسمان میں اپنے جد امجد کی صورت پر ساٹھ ہاتھ کے ہوں گے۔

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ: جنت میں عورتیں مردوں سے زیادہ ہوں گی، اس لیے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے کہ ان میں سے ہر شخص کو دو ایسی بیویاں ملیں گی جن کی پنڈلی کی ہڈی کا گودا گوشت کے باہر سے نظر آئے گا، اور جنت میں کوئی غیر شادی شدہ نہ ہو گا۔

امام ترمذی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت کی عورتوں میں سے ہر عورت کی پنڈلی کی سفیدی ستر (۷۰) پوشاکوں میں سے نظر آئے گی، یہاں تک کہ اس کی ہڈی کا گودا بھی نظر آئے گا، اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ﴾ گویا وہ یاقوت اور مرجان ہے۔ یاقوت ایسا پتھر ہے کہ اگر تم اس میں سے تاگا داخل کر کے صاف کر دو تو وہ نظر آنے لگے۔

بخاری شریف میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مروی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اگر کوئی جنتی عورت زمین کی طرف جھانک دے، تو آسمان وزمین کے درمیان کا حصہ روشن ہو جائے گا، اور وہ اسے خوشبو سے بھر دے گا، اس کے سر کا دوپٹہ دنیا اور جو کچھ اس میں ہے اس سب سے بہتر ہے۔

ترمذی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنتی بے بال بے ریش، سرمگیں آنکھوں والے، تیس یا تینتیس سال کے ہوں گے۔

ایک روایت میں ہے کہ: جنتی بے بال اور بے ریش ہوں گے، سوائے حضرت موسیٰ بن عمران کے؛ کہ ان کی ڈاڑھی ناف تک ہوگی۔

اور ترمذی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اگر کوئی جنتی جھانک دے اور اس کا کنگن ظاہر ہو جائے تو اس کی وجہ سے سورج کی روشنی ایسی ماند پڑ جائے جس طرح ستاروں کی روشنی کو سورج ختم کر دیتا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنتیوں میں سے جب کوئی چھوٹا بڑا مرتا ہے تو جنت میں ان سب کو تینتیس سال کا بنا دیا جائے گا، اور وہ اس سے زیادہ عمر کے نہ ہوں گے۔ یہی حال دوزخیوں کا بھی ہوگا۔ (علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں) میں کہتا ہوں کہ دوزخیوں کے تینتیس سال کا ہونے میں اہلِ کشف نے طویل کلام کیا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ جنت میں کنگھی کی کیا ضرورت ہوگی؟ اس لیے کہ بال غبار آلود نہ ہوں گے، اور نہ ان میں میل کچیل جمے گا۔ اور دھونی کی کیا ضرورت ہوگی؟ اس لیے کہ ان کے پسینہ کی خوشبو مشک سے زیادہ بہتر ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنتیوں کی نعمتیں اور وہاں کا لباس کسی پریشانی اور تکلیف کو دور کرنے کے لیے نہیں ہوگا، اسی طرح ان کا کھانا پینا بھی بھوک پیاس کو مٹانے کے لیے نہیں ہوگا، اسی طرح خوشبو لگانا بھی بدبو کی وجہ سے نہ ہوگا، بلکہ یہ مختلف قسم کی پے در پے نعمتیں ہوں گی۔ کیا آپ دیکھتے نہیں اللہ جل شانہٗ نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے فرمایا تھا: ﴿إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعْرَىٰ ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظْمَأُ فِيهَا وَلَا تَضْحَىٰ ﴿١١٩﴾﴾ اس جنت میں تو یہ ہے کہ تم نہ تو کبھی بھوکے ہوگے اور

نہ ننگے۔ اور اس میں نہ تم پیاسے ہو گے، اور نہ دھوپ میں تپو گے۔ اس میں بظاہر حکمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ جنت کو اس نوع کی نعمتیں عطا فرمائیں جن سے وہ دنیا میں مستفید ہوتے تھے، اور اس پر اتنا اضافہ فرمایا کہ جس کا صحیح اندازہ سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں۔ یہی حکمت دوزخیوں کے لیے بھی ہے۔ فرمایا: ﴿إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ ۖ يُسْحَبُونَ ﴿٧١﴾ فِي الْحَمِيمِ﴾ جبکہ ان کی گردنوں میں طوق اور زنجیریں ہوں گی، اور ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے ہوئے پانی میں لے جایا جائے گا۔ اور فرمایا: ﴿إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا ﴿١٢﴾﴾ ہمارے یہاں تو بیڑیاں ہی ہیں اور دوزخ ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اس نوع کا عذاب دیا جس طرح کا عذاب وہ دنیا میں دیا کرتے تھے۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں کے پاؤں میں بیڑیاں اس خوف سے ڈالی ہیں کہ کہیں وہ بھاگ نہ جائیں؟ نہیں! بخدا یہ بات نہیں؛ بلکہ جب وہ بلند ہونا چاہیں گے تو آگ انہیں اوپر اُٹھائے گی، پھر نیچے لے آئے گی، ان سے کبھی جدا نہ ہو گی۔

حضرت ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: ہمیں روایت پہنچی ہے کہ اہلِ جنت کی زبان عربی ہو گی، اور جب وہ قبروں سے نکلیں گے تو ان کی زبان سریانی ہو گی۔

اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ: ہمیں روایت پہنچی ہے کہ قیامت کے روز لوگ جنت میں داخل ہونے سے پہلے سریانی زبان بولیں گے، جب جنت میں داخل ہو جائیں گے تو عربی بولیں گے۔

بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں، ان کی گفتگو اور عورتوں کا جواب اور ان کے حسن وجمال کا بیان

علماء نے لکھا ہے کہ دنیاوی عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں گی اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں کی مختلف اقسام کی ہوں گی، چھوٹی بھی اور بڑی بھی، اور جیسا جنت والوں کا دل چاہے گا۔

امام ترمذی حضرت علی (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں کی ایک اجتماع گاہ ہوگی، وہ ایسی پیاری آواز سے اشعار پڑھیں گی کہ اس جیسی آواز مخلوق نے نہ سنی ہوگی، وہ کہیں گی: ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، کبھی ختم نہ ہوں گی۔ ہم نعمتوں میں رہنے والیاں ہیں، کبھی خستہ حال نہ ہوں گی۔ ہم ہمیشہ راضی رہنے والیاں ہیں، کبھی ناراض نہ ہوں گی۔ اچھائی ہے اس کے لیے جو ہمارا ہو، اور ہم جس کے ہوئے۔ حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) فرمایا کرتی تھیں: جب موٹی آنکھوں والی حوریں یہ بات کہیں گی تو دنیا کی مؤمن عورتیں انہیں یہ جواب دیں گی کہ: ہم نماز پڑھنے والیاں ہیں، تم نے تو کبھی نماز نہیں پڑھی۔ ہم روزہ رکھنے والیاں ہیں، تم نے تو کبھی روزہ نہیں رکھا۔ ہم وضو کرنے والیاں ہیں، تم نے وضو نہیں کیا۔ ہم صدقہ کرنے والیاں ہیں، تم نے کبھی صدقہ نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: بخدا! وہ دنیا والیاں ان پر غالب آگئیں۔

اور محمد بن کعب قرظیؒ فرمایا کرتے تھے: قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں: اگر موٹی آنکھوں والی حوروں میں سے کوئی حور اوپر سے اپنا کنگن ظاہر کر دے، تو اس کا نور چاند سورج کے

نور پر غالب آجائے گا، پھر اس حور کا حال کیا ہو گا جو سر تا پا آراستہ اور منور ہو؟ اسی طرح ان کپڑوں اور زیورات سب کا حال ہو گا کہ ان کا نور اور چمک دمک سورج کی روشنی پر غالب ہو گی۔

حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ: جنت میں ایسی حور ہو گی جسے ”عَیناء“ کہا جاتا ہو گا، وہ جب چلے گی تو اس کے دائیں بائیں ستر ستر ہزار غلام چلیں گے، اور وہ یہ کہتی ہو گی کہ: کہاں ہیں اچھی باتوں کا حکم دینے والے، اور بری باتوں سے روکنے والے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرمایا کرتے تھے کہ: جنت میں ایک حور ہو گی جسے ”لُعبہ“ کہا جائے گا، اگر وہ کھاری سمندر میں تھوک دے تو اس کا تمام پانی میٹھا ہو جائے۔ اس کے سینے پر لکھا ہو گا: جس کو یہ پسند ہو کہ اسے مجھ جیسی حور ملے تو اسے میرے پروردگار عزوجل کی عبادت کرنا چاہیے۔

اسراء اور معراج کی حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسراء والی رات ایک حور کی تعریف فرمائی، اور فرمایا کہ: میں نے اس کی پیشانی کو چاند کی طرح روشن دیکھا، اس کی لمبائی ایک ہزار تیس گز تھی، اس کے سر میں سو لٹیں بندھی تھیں، ہر لٹ کے درمیان ستر ہزار گیسو تھے جو چودھویں رات کے چاند سے زیادہ روشن تھے۔ اس کی پازیب موتیوں اور مختلف قسم کے جواہرات سے جڑی ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر دو سطریں موتی اور جواہرات سے لکھی ہوئی تھی، پہلی سطر میں لکھا تھا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور دوسری میں لکھا تھا کہ: جو مجھ جیسی حسینہ کو حاصل کرنا چاہے، اسے میرے پروردگار کی فرمانبرداری کرنا چاہیے۔ پھر حضرت جبرئیل (علیہ السلام) نے مجھ سے فرمایا: اے محمد! یہ

اور اس جیسی حوریں آپ کی امت کے لیے ہیں، آپ کو مبارک ہو، اور اپنی امت کو بھی یہ خوشخبری دیدیجئے، اور انہیں حکم دیجئے کہ وہ اللہ جل شانہٗ کی خوب اطاعت کی کوشش کریں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ: موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں میں سے ایک حور ایسی ہوگی کہ اس کی پنڈلی کی ہڈی کا گوشت اور ہڈی ستر (۷۰) پوشاکوں کے اندر سے اس طرح نظر آئے گی جس طرح سرخ شربت سفید گلاس میں سے نظر آتا ہے۔

اور حضرت حیّان بن ابی جبلہ (رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ: دنیا کی عورتوں میں سے جو جنت میں داخل ہوں گی وہ ان حوروں سے بڑے درجہ والی ہوں گی، اس لیے کہ دنیا میں انہوں نے اللہ جل شانہٗ کی رضا کے لیے عبادت اور نیکیاں کی تھیں۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اہلِ جنت دنیا کی عورتیں موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں سے ستر ہزار گنا زیادہ بہتر ہوں گی۔

موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں کا مہر اعمالِ صالحہ ہے

ارشادِ ربانی ہے: ﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ﴾ اور ان لوگوں کو خوش خبری سنادیجئے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے کہ ان کے لیے جنت کے باغ ہیں، ان کے نیچے دریا بہہ رہے ہوں گے، انہیں جب کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ بول اُٹھیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے

پہلے مل چکا ہے۔ اور انہیں وہ دیا ہی جائے گا جو اس سے ملتا جلتا ہو گا۔ اور ان کے لیے پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور وہ ان جنتوں میں ہمیشہ کے لیے ہوں گے۔

حکیم ترمذی نوادر الاصول میں حضرت ابو مسعود غفاریؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ: کوئی شخص ایسا نہیں جو رمضان کا ایک روزہ رکھے مگر یہ کہ اس کی شادی ایک موٹی آنکھوں والی حور سے کھوکھلے موتی کے خیمہ میں کرائی جائے گی۔ اور جس کی توثیق اللہ جل شانہٗ نے اپنے اس فرمان میں کی ہے: ﴿حُوۡرٌ مَّقۡصُوۡرٰتٌ فِی الۡخِیَامِ ﴿۷۲﴾﴾ گورے رنگ والیاں خیموں میں محفوظ ہوں گی۔ ان میں سے ہر حور پر ستر پوشاکیں ہوں گی، کوئی پوشاک دوسرے سے مشابہ نہ ہو گی۔ ستر قسم کی خوشبوئیں دی جائیں گی، جن میں سے ہر ایک دوسرے سے مختلف ہو گی۔ ان میں ہر عورت کو سرخ یاقوت کی ایسی ستر مسہریاں ملیں گی جو موتیوں سے جڑی ہوئی ہوں گی، ہر مسہری پر ستر بچھونے ہوں گے، ہر بچھونے پر مزین اور آراستہ تخت ہو گا، ان میں سے ہر عورت کو اس کی خدمت وضروریات پوری کرنے کے لیے ستر ہزار خادمائیں اور ستر ہزار خادم ملیں گے، ہر خادم کے پاس سونے کا ایک پیالہ ہو گا جس میں مختلف قسم کے کھانے ہوں گے، ان میں سے ہر ایک کا ایسا منفرد ذائقہ اور لذت ہو گی جو دوسرے کی نہیں۔ اس حور کے شوہر کو بھی اتنا ہی کچھ دیا جائے گا، وہ سرخ یاقوت کی مسہری پر ہو گا، اس نے سونے کے دو کنگن پہنے ہوں گے جن میں سرخ یاقوت ہوں گے۔ یہ اعزاز ہر اُس روزے پر ہو گا جو انسان نے رمضان کے مہینے میں رکھا ہو گا اور نیکیوں کے علاوہ۔

اور پہلے ترمذی کی حدیث میں رسول اللہ (ﷺ) کا یہ فرمانِ مبارک گزر چکا ہے کہ: موٹی موٹی آنکھوں والی بہتّر (۷۲) حوروں سے شہید کی شادی کرائی جائے گی

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ: مسجدوں میں جھاڑو دینا موٹی موٹی آنکھوں والی حوروں کا مہر ہے۔

حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ مسجد سے کوڑا کرکٹ نکالنا حورِ عین کا مہر ہے۔

اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) فرمایا کرتے تھے کہ: تم میں سے ایک شخص فلاں بن فلاں کی بیٹی سے شادی کرنے کے لیے اتنی بڑی رقم خرچ کرتا ہے، اور ایک لقمے، ایک کھجور اور ایک ٹکڑے کے بدلے حاصل ہونے والی حورِ عین کو چھوڑ دیتا ہے؟

امام سحنون (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے تھے کہ: مصر میں سعید نامی ایک شخص تھا، ان کی والدہ بڑی نیک وصالحہ تھیں، ان کے بیٹے رات کو ان کی امامت کیا کرتے تھے، جب ان پر نیند کا غلبہ ہوتا اور وہ اونگھنے لگتے تو ان کی والدہ ان سے کہتیں: اے سعید! وہ شخص سوتا نہیں جسے دوزخ کی آگ کا ڈر ہو، اور جو خوبصورت حوروں کو پیغامِ نکاح بھیجنا چاہتا ہو۔ یہ سن کر وہ مرعوب اور دہشت زدہ ہو کر جاگ جاتے۔

حضرت ثابت بنانی (رحمۃ اللہ علیہ) نے ایک حور کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا: تم کس کی ہو؟ اس نے کہا: ان کی جو رات میں اس وقت تہجد پڑھتے ہیں جب سب پڑے ہوئے سوتے ہیں۔

ایک صاحب نے ایک نہایت حسین و جمیل حور کو دیکھ کر اس سے کہا: تم کس کی ہو؟ اس نے کہا: جو چار ہزار مرتبہ قرآنِ پاک کو ختم کرے۔ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ اس شخص کا اس دن انتقال ہوا جس دن اس نے چار ہزار قرآنِ پاک مکمل کر لیے۔ وہ پرانی مشک کی طرح لاغر اور دبلے ہو گئے تھے۔

شیخ نصر القاری (رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ: ایک دن مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا، میں تہجد نہ پڑھ سکا، میں نے خواب میں ایک خوبصورت لڑکی دیکھی، میں نے اس سے زیادہ حسین لڑکی کبھی نہ دیکھی تھی، اس کے پاس ایک پرچہ تھا جس میں کچھ لکھا ہوا تھا، اس نے مجھ سے کہا: شیخ صاحب! کیا آپ پڑھ سکتے ہیں؟ میں نے کہا: جی ہاں ۔ اس نے مجھے وہ کاغذ دیا جس میں اشعار لکھے ہوئے تھے، جن کا ترجمہ یہ ہے: ”تمہیں لذات اور خواہشات نے جنت الفردوس اور پھلوں سے لدے ہوئے گچھوں سے غافل بنا دیا۔ نیند کی لذت نے ایسی بہترین زندگی سے غافل کر دیا جو حسیناؤں کے ساتھ جنت کے بالاخانوں میں ملے گی۔ اُٹھو! اپنی نیند سے جاگ جاؤ؛ اس لیے کہ تہجد میں قرآنِ کریم کی تلاوت سونے سے بہت بہتر ہے۔

حضرت مالک بن دینار (رحمۃ اللہ علیہ) فرمایا کرتے تھے کہ: میرا ایک معمول تھا جسے میں ہر رات پڑھا کرتا تھا۔ نیند کی وجہ سے ایک رات اُسے نہ پڑھ سکا، اور سو گیا۔ خواب میں ایک لڑکی آئی جو نہایت خوبصورت ترین تھی، اس کے ہاتھوں میں ایک پرچہ تھا، اس نے مجھ سے کہا: آپ پڑھ سکتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں ۔ اس نے وہ پرچہ مجھے دیا، اس میں اشعار لکھے ہوئے تھے جن کا ترجمہ یہ ہے: ”تجھے سونے نے آرزؤوں کے حاصل کرنے سے روک دیا، اور جنت کی ان رہنے والیوں سے جہاں تم

ہمیشہ ہمیش رہوگے، اس میں موت کبھی نہیں آئے گی، اور حسیناؤں کے ساتھ خیموں میں مزے کرتے رہوگے۔ تم نیند سے جاگو، اس لیے کہ سونے سے تہجد میں قرآنِ کریم پڑھنا بہتر ہے۔

حوریں کس چیز سے پیدا کی گئیں

روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا گیا کہ: حورِ عین کس چیز سے پیدا کی گئی ہے؟ فرمایا: تین چیزوں سے؛ ان کا نچلا حصہ مُشک سے بنا ہے، درمیانی حصہ عنبر سے، اور اوپر کا حصہ کافور سے۔ ان کے بال اور ابروئیں (بھویں) نور میں ایک سیاہ لکیر ہے۔

حدیث پاک میں آیا ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ میں نے عرض کیا کہ: اے جبرئیل! آپ مجھے بتلایئے کہ اللہ تعالیٰ حورِ عین کو کیسے پیدا فرمائیں گے؟ فرمایا: اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! اللہ جل شانہٗ نے انہیں عنبر اور زعفران کی ٹہنیوں سے پیدا کیا ہے، ان پر خیمے لگے ہیں، سب سے پہلے ان کی جو چیز پیدا ہوگی وہ خوشبودار اور سفید مُشک کا سینہ ہوگا، اس پر سارا جسم بنے گا۔

حضرت عبد اللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) فرمایا کرتے تھے کہ: اللہ جل شانہٗ نے حورِ عین کو ان کے پاؤں کی انگلیوں سے گھٹنے تک زعفران سے پیدا کیا ہے، اور گھٹنے سے سینے تک خوشبودار مشک سے، اور سینہ سے گردن تک عنبرِ اشہب سے، اور گردن سے سر تک سفید کافور سے۔ ان پر ستر ہزار پوشاکیں گلِ لالہ کی طرح ہوں گی۔ جب وہ سامنے آئے گی تو اس کا چہرہ روشن نور سے ایسا چمکے گا جیسے دنیا والوں کے لیے سورج چمکتا ہے، اور ان کے کپڑوں اور کھال کی باریکی کی وجہ سے اس کا جگر اور کلیجی نظر آئے گی۔ اس

کے سر میں ستر ہزار گیسو (لٹیں) ہوں گے۔ اس کے پاس ایک خادمہ ہوگی جو اس کا دامن اُٹھا کر چلے گی اور یہ کہتی ہوگی: یہ ثواب ہے اولیاء کا، بدلہ ہے اس کا جو آپ اعمالِ صالحہ کیا کرتے تھے۔ اس لیے اے بھائیو! نیک اعمال کیا کرو اور اعمال سے تنگ دل مت ہو، اس لیے کہ اس عظیم جزا کو سننے کے بعد جو اعمالِ صالحہ سے تنگ ہوا، اس سے چوپائے بھی زیادہ بہتر ہیں۔

دنیا میں جو کنواری سے شادی کرے گا وہ آخرت میں اس کی بیوی بنے گی

امام مالک (رحمۃ اللہ علیہ) نے روایت کیا ہے کہ حضرت زبیر بن عوام (رضی اللہ عنہ) اپنی بیوی اسماء بنت ابی بکر صدیق (رضی اللہ عنہا) کو بہت مارا کرتے تھے، ایک روز ان کی اجازت کے بغیر وہ گھر سے نکلی تو انہوں نے اس کی سوکن کے بال سے ان کے بال باندھ کر انہیں خوب مارا۔ ان کی سوکن کی ناک اسماء سے زیادہ اچھی تھی اس لیے اسماء کو اور زیادہ مار پڑی۔ انہوں نے اپنے والد حضرت ابو بکر صدیقؓ سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا: بیٹی! صبر کرو، اس لیے کہ زبیر نیک آدمی ہیں، ہو سکتا ہے کہ جنت میں وہ تمہارے شوہر بنیں۔ اور فرمایا کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کنواری سے شادی کرے تو جنت میں بھی اس سے شادی کرے گا۔

امام ابو بکر بن عربیؒ نے فرمایا: اگر کسی عورت کی کئی مردوں سے شادی ہوئی ہو تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس بارے میں یہ مروی ہے کہ: اُسے ان شوہروں کے بارے میں اختیار دیا جائے گا، جس شوہر کو وہ پسند کرے گی اس کی بن جائے گی۔

ایک روایت میں ہے: حضرت حذیفہ بن یمانؓ نے اپنی بیوی سے فرمایا: اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اور مجھے جنت میں جمع کر دے اور تم یہ چاہو کہ تم وہاں بھی میری بیوی بنو تو میرے بعد کسی سے شادی مت کرنا، اس لیے کہ جنت میں عورت آخر والے شوہر کی ہوگی۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیانؓ نے حضرت ام درداء (رضی اللہ عنہا) کو پیغام نکاح بھیجا، انہوں نے شادی سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ: میں نے ابو درداء کو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے کہ: آخرت میں عورت سب سے بعد والے شوہر کی ہوگی، اس لیے تم میرے بعد شادی نہ کرنا۔

حدیث پاک میں آتا ہے کہ حضرت ام حبیبہ (رضی اللہ عنہا) نے فرمایا: اے اللہ کے رسول! اگر کسی عورت کے دنیا میں دو شوہر ہوئے ہوں، پھر دونوں مر جائیں اور دونوں جنت میں ہوں تو عورت پہلے شوہر کو ملے گی یا بعد والے کو؟ فرمایا: دونوں میں سے جو اس کے ساتھ دنیا میں اچھے اخلاق سے پیش آنے والا ہوگا۔ پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: اے ام حبیبہ! حسنِ اخلاق دنیا اورآخرت دونوں کی بھلائی لے گیا۔ اس لیے اے برادرانِ اسلام! دنیا میں اپنی بیویوں کے ساتھ اپنے اخلاق اچھے بنایئے، تاکہ وہ آخرت میں بھی آپ کو مل سکے۔

جنت میں ہر نعمت دائمی اور ابدی ہو گی نہ وہ پرانی ہو گی اور نہ اس کو فنا اور زوال ہو گا

امام مسلم حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہما) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ: جنت میں ایک پکارنے والا آواز دے گا کہ تمہارے لیے ہمیشہ صحت و تندرستی ہے، تم کبھی بیمار نہ ہو گے۔ تمہارے لیے اس میں ہمیشہ حیات ہے، کبھی مرو گے نہیں۔ تم ہمیشہ جوان رہو گے، کبھی بوڑھے نہ ہو گے۔ ہمیشہ نعمت میں رہو گے، کبھی خستہ حال نہ ہو گے۔ یہی مراد ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الاعراف) اور انہیں نداء دی جائے گی کہ یہی وہ جنت ہے جس کے اب تم وارث ہو گئے بعوض اس کے جو تم کرتے رہے۔ اور نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ فرمانِ مبارک پہلے گذر چکا ہے کہ جو جنت میں داخل ہو گا وہ ہمیشہ نعمتوں میں رہے گا کبھی خستہ حال نہیں ہو گا، نہ کپڑے پرانے ہوں گے، نہ جوانی ختم ہو گی۔ اور حورِ عین کا یہ قول بھی کہ: ہم ہمیشہ رہنے والیاں ہیں، کبھی ختم نہ ہوں گی۔

جنتی عورت دنیا والے اپنے شوہر کو دنیا ہی میں دیکھتی ہے

حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ: اہلِ جنت کی عورت سے کہا جائے گا کہ کیا تم یہ پسند کرتی ہو کہ ہم تمہیں دنیا والا تمہارا شوہر دکھا دیں؟ وہ کہے گی: جی ہاں۔

چناں چہ حجابات ہٹادیئے جائیں گے، اور اس عورت اور دنیاوی مرد کے درمیان دروازے کھول دیئے جائیں گے، یہاں تک کہ وہ اسے دیکھ اور پہچان لے گی، اس سے آنکھوں آنکھوں میں معاہدہ کرے گی، یہاں تک کہ وہ اس کے آنے کو بہت بعید سمجھے گی، اوراس کی ملاقات کی ایسی مشتاق ہوگی جیسی دنیاوی عورت اپنے سفر پر گئے ہوئے غائب شوہر سے ملاقات کی مشتاق ہوتی ہے۔

بعض مرتبہ یوں ہوتا ہے کہ اس مرد اوراس کی دنیاوی بیوی کے درمیان کوئی لڑائی جھگڑا ہو جاتا ہے جو دنیا میں زن وشوہر میں ہوتا ہی رہتا ہے، اور دنیاوی عورت اس مرد سے ناراض ہوگی تو یہ جنت والی بیوی پر بڑا شاق گزرے گا، اوروہ اس سے کہے گی کہ ہلاکت ہو تیرے لیے؛ اسے تکلیف مت پہنچا، وہ تیرے ساتھ چند راتوں کا مہمان ہے۔

امام ترمذیؒ نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس معنٰی کی حدیث روایت کی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: دنیا میں کوئی عورت اپنے شوہر کو ایذاء پہنچاتی ہے تو اس کی حورِ عین والی بیوی کہتی ہے: اُسے تکلیف مت دے، خدا تمہارا بیڑا غرق کرے، وہ تو تمہارے پاس چند رات کا مہمان ہے، قریب ہے کہ تجھے چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح دنیاوی عورتیں بیوی ہوتی ہیں اسی طرح حوریں بھی بیوی بنیں گی۔

جنت کے پرندوں، گھوڑوں اور اونٹوں کا بیان

امام ترمذی حضرت انسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نہرِ کوثر کے پانی کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ: یہ جنت کی ایک نہر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمائی ہے، جو دودھ سے زیادہ سفید، شہد سے زیادہ شیرین ہوگی۔ اس میں ایسے پرندے ہوں گے جن کی گردنیں بختی اونٹوں کی طرح ہوں گی۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہ تو بڑے مزے کے ہوں گے؟ تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: ان کے کھانے والے ان سے زیادہ اچھے ہوں گے۔

ثعلبی کی ایک روایت میں ہے کہ: جنت میں ایسے پرندے ہوں گے جن کی گردنیں بختی اونٹ کے برابر ہوں گی۔ وہ اللہ جل شانہٗ کے ولی کے ہاتھ میں اِدھر سے اُدھر پھرتے ہوں گے۔ ان میں سے ایک کہے گا: اے اللہ کے ولی! تم عرش کے نیچے سبزے میں پھرے اور عینِ تسنیم سے پانی پیا، اب مجھے بھی کھالو۔ چناں چہ یہ پرندہ اس کے سامنے رہے گا یہاں تک کہ اس کے دل میں آئے گا کہ کھالوں۔ وہ اس کے سامنے مختلف قسم کے کھانے بن جائے گا (یعنی وہ پرندہ خود بخود مختلف شکلوں میں بن جائے گا جیسے کباب، کوفتہ وغیرہ) وہ اس سے حسبِخواہش کھائے گا، جب اس کا پیٹ بھر جائے گا تو پرندے کی ہڈیاں جمع ہوں گی، پھر وہ اُڑ کر جنت میں جہاں چاہے گا چرنے لگے گا

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ ایک صاحب نے نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا: کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے ؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اگر تمہیں جنت میں داخل فرمادیا، تو تم اگر یہ چاہو گے کہ سرخ یاقوت کے گھوڑے پر سواری کرو، اور وہ تمہیں جہاں تم چاہو لے کر اُڑے؛ تو ایسا ہو جائے گا۔

حضرت بریدہؓ نے فرمایا کہ: آپ سے ایک اور صاحب نے سوال کیا کہ: اے اللہ کے رسول! کیا جنت میں اونٹ ہوں گے ؟ فرمایا: آپ نے ان کو وہ جواب نہ دیا جو دوسرے کو دیا تھا۔ یہ فرمایا کہ: اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں جنت میں داخل فرمادیا تو وہاں سب کچھ ملے گا جو تمہارا نفس چاہے گا اور آنکھ کو بھلا معلوم ہو گا۔

صحیح مسلم میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک صاحب نکیل والی اونٹنی لائے اور عرض کیا کہ: اے اللہ کے رسول! اسے اللہ کے راستہ میں دیتا ہوں ۔رسول اللہ(صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: قیامت کے روز تمہیں اس کے بدلے میں سات سو نکیل والی اونٹنیاں ملیں گی۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے یہ روایت نقل کرتے تھے کہ: جنت میں جو سب سے کم درجے کا جنتی ہو گا وہ دس لاکھ ایسے لڑکوں کے ساتھ ہو گا جو اس کے ساتھ ہمیشہ رہنے والے خادم ہوں گے۔ یہ سرخ یاقوت کے گھوڑے پر ہو گا،اس گھوڑے کے سونے کے پر ہوں گے ،جب تم وہاں دیکھو گے تو نعمتوں اور بڑی حکومت کو دیکھو گے۔

حدیث میں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مروی ہے، فرمایا: اہلِ جنت کی نعمتوں میں سے یہ ہو گا کہ وہ سواریوں اور اونٹنیوں پر ایک دوسرے کی زیارت کریں گے۔ جمعہ کے روز انہیں ایک ایسا گھوڑا دیا جائے گا جو زین اور لگام والا ہو گا، وہ لید نہیں کرے گا، نہ پیشاب۔ یہ اس پر سوار ہوں گے، جہاں چاہیں گے وہاں چلے جائیں گے۔

دنبے اور بکرے کا جنت کے چوپایوں میں سے ہونے کا بیان

بزار رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ: بکری کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا کرو، اور اس سے تکلیف دہ چیز کو دور کیا کرو، اس لیے یہ جنت کے چوپایوں میں سے ہے۔

اور ابن ماجہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ: دنبہ جنت کے چوپایوں میں سے ہے۔

جنت میں کم سے کم تر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر درجے والے کو کیا کچھ ملے گا؟

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے اپنے پروردگار سے سوال کیا کہ اے رب! جنت میں سب سے کم درجے والے کو کیا ملے گا؟ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک شخص آئے گا، حق جل جلالہٗ اس سے فرمائیں گے کہ جنت میں داخل ہو جا۔ وہ کہے گا: پروردگار! کیسے جاؤں؛ وہاں تو سب لوگ اپنی اپنی جگہ

پکڑ چکے ہیں، اور اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے ہیں۔ اس سے کہا جائے گا: کیا تجھے یہ پسند نہیں کہ تجھے اتنا دیا جائے جتنا دنیا کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کے پاس ہوتا ہے؟ وہ کہے گا: اے رب! بالکل ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔ ارشاد ہوگا: تجھے یہ اور اتنا ہی اور، اتنا اور، اتنا اور دیا جاتا ہے، وہ پانچویں مرتبہ میں کہے گا: اے پروردگار! مجھے منظور ہے، ارشاد ہوگا: تجھے یہ، اور اس کا دس گنا اور زیادہ دیا جاتا ہے، اور تجھے وہ بھی ملے گا جو تیرا نفس چاہے، اور تیری آنکھوں کو بھلا معلوم ہو۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں خوش ہوں۔

حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے فرمایا: اے میرے رب! سب سے اعلیٰ درجے والے کو کیا ملے گا؟ فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کا میں نے اعزاز کیا، ان کے اکرام کا سامان میں نے خود اپنے دستِ قدرت سے بنایا ہے، اور اس پر مُہر لگا دی، پس نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے اس کے بارے میں سنا، اور نہ کسی دل پر اس کا گزر ہوا۔

صحیح بخاری میں ہے: رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت میں جنتیوں میں سب سے اخیر میں داخل ہونے والے اور دوزخیوں میں سب سے اخیر میں دوزخ سے نکلنے والا شخص وہ ہوگا جو وہاں سے گھسٹتا ہوا نکلے گا، اس سے اس کا پروردگار کہے گا: جاؤ! جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ کہے گا: یارب! جنت تو بھری ہوئی ہے۔ وہ اس سے تین مرتبہ یہ بات فرمائیں گے۔ وہ تینوں مرتبہ یہی کہے گا کہ پروردگا! جنت بھری ہوئی ہے۔ فرمائیں گے: تجھے دنیا کا دس گنا دیا جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ: جنتیوں میں سب سے کم درجے والا شخص وہ ہوگا جسے سات محل ملیں گے، ایک محل سونے کا، ایک چاندی کا، ایک موتی کا، ایک زمرّد کا، ایک یاقوت کا، ایک وہ جسے نگاہیں نہ پاسکیں۔ اور ایک محل عرش کے رنگ کا۔ اور ہر محل میں ایسے ایسے زیورات پوشاک اور حورِ عین ہوں گی جسے اللہ کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔

اور پہلے یہ گزر چکا ہے کہ جنت میں سب سے کم درجے والا وہ ہوگا جو دس لاکھ خادموں کے ساتھ ہوگا۔

امام ترمذی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ: جنت میں سب سے کم درجے کا وہ شخص ہوگا جو اپنے باغات نعمتوں، خادموں اور مسہریوں کو ایک ہزار سال کی مسافت تک دیکھے گا، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں معزز و مکرم وہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کے چہرۂ انور کو صبح و شام دیکھے گا۔ پھر رسول اللہ (ﷺ) نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت کی: ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿٢٢﴾ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿٢٣﴾﴾ کتنے ہی چہرے اس روز ہشاش بشاش ہوں گے، اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

ترمذی کی ایک روایت میں ہے کہ جنت میں سب سے کم درجے والا وہ ہوگا جس کے پاس اسّی ہزار خادم اور بہتّر (۷۲) بیویاں ہوں گی۔ اور اس کے لیے موتیوں زبرجد اور یاقوت کا اتنا بڑا ایک قبہ بنایا جائے گا جتنی جابیہ سے صنعاء مسافت ہے (جابیہ شام میں ہے، اور صنعاء یمن میں ہے) حضرت مجاہد فرمایا کرتے تھے: جنت میں سب سے کم درجے والا وہ شخص ہوگا جو اپنی مملکت میں ہزار سال چل سکے گا، وہ دور کے حصے کو اس طرح دیکھے گا جس طرح قریب والے کو دیکھتا ہے۔ اور جنتیوں میں سب سے برتر وہ ہوگا جو اپنے پروردگار کو صبح و شام دیکھے گا۔

اللہ جل شانہٗ کی رضا کا پروانہ جنتیوں کے لیے جنت کی تمام نعمتوں سے افضل ہے

امام بخاری حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ اہلِ جنت سے فرمائیں گے: اے اہلِ جنت! وہ کہیں گے: اے پروردگار! ہم حاضر ہیں، تمام خیر و بھلائی آپ ہی کے دستِ قدرت میں ہے۔ ارشاد ہوگا: کیا تم خوش ہوگئے؟ وہ کہیں گے: اے پروردگار! ہم کیوں خوش نہ ہوں جبکہ آپ نے ہمیں وہ کچھ عطا فرمادیا ہے جو اپنی مخلوق میں کسی کو عطا نہیں فرمایا؟ ارشاد ہوگا: کیا میں تمہیں اس سے افضل و اعلیٰ چیز نہ دوں؟ وہ کہیں گے: اے پروردگار! اس سے افضل و اعلیٰ کیا چیز ہے؟ فرمائیں گے: میں تم سے راضی ہو جاؤں گا پھر اس کے بعد کبھی ناراض نہیں ہوں گا۔

اللہ جل شانہٗ کا دیدار جنتیوں کو تمام نعمتوں سے زیادہ محبوب ہوگا

امام مسلم وغیرہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ: جب اہلِ جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو اللہ تبارک و تعالیٰ فرمائیں گے: کیا تمہیں کچھ چاہئے تاکہ میں اور دے دوں؟ وہ کہیں گے: کیا آپ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کئے ہیں؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں

فرمایا؟ اور جہنم سے چھٹکارا عطا نہیں فرمایا؟ فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ ان سے حجاب دور کر دیں گے، چناں چہ انہیں کوئی چیز اس سے زیادہ محبوب نہیں دی گئی ہو گی، وہ اپنے پروردگار کا دیدار کریں گے۔

ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ: پھر ارشاد باری تعالیٰ ہو گا: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ط﴾ جو لوگ نیکی کرتے رہے ان کے لیے بھلائی ہے، اور اس کے علاوہ بھی۔

ابو داود طیالسی کی روایت میں ہے کہ: جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا جنتیوں کو پکارے گا: کہ اللہ جل شانہٗ کے پاس تمہارے لیے ایک وعدہ ہے جسے وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہیں گے: کیا اللہ تعالیٰ نے ہمارے چہرے روشن نہیں کیے؟ ہمارے اعمال نامے کو بھاری نہیں کیا؟ ہمیں دوزخ سے پناہ نہیں دی؟ فرمایا: پھر حجاب ہٹا دیئے جائیں گے اور وہ اللہ جل شانہ کا دیدار کریں گے۔ بخدا! اللہ جل شانہٗ نے اُنہیں اپنے دیدار سے زیادہ محبوب ترین اور آنکھوں کو ٹھنڈی کرنے والی کوئی چیز عطا نہیں کی ہو گی۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ (ﷺ) سے درجِ ذیل آیت کے بارے میں پوچھا گیا: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ط﴾ جو لوگ نیکی کرتے رہے، ان کے لیے بھلائی ہے اور زیادتی ہے۔ فرمایا کہ: ''اَحْسَنُوْا'' سے دنیا میں اعمالِ صالحہ کرنا مراد ہے، اور ''الْحُسْنٰى'' جنت ہے، اور ''زِيَادَةٌ'' سے مراد اللہ تعالیٰ کے چہرۂ انور کی زیارت ہے۔

ایک روایت میں حضرت ابوموسیٰ اشعری (رضی اللہ عنہ) سے مروی ہے کہ انہوں نے بصرہ کے منبر پر فرمایا: اللہ جل شانہٗ قیامت کے دن جنتیوں کے پاس ایک فرشتہ بھیجیں گے، وہ کہے گا کہ: اللہ تعالیٰ نے تم سے جو وعدہ فرمایا تھا؛ وہ پورا کر دیا؟ وہ دیکھیں گے تو انہیں وہ زیورات، پوشاکیں، پھل، نہریں اور پاکیزہ بیویاں نظر آئیں گی۔ وہ کہیں گے: جی ہاں! اللہ جل شانہٗ نے ہم سے جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا فرما دیا۔ فرشتہ کہے گا: کیا تمہارے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا فرما دیا؟ تین دفعہ یہ بات کہے گا۔ وہ اس کے کئے ہوئے وعدوں میں سے کوئی چیز غیر موجود نہیں پائیں گے۔ وہ کہیں گے: جی ہاں! پورا کر دیا۔ وہ کہے گا: تمہارے لیے ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: جن لوگوں نے اچھے کام کئے ان کے لیے ''حُسنٰی'' ہے اور اس پر اضافہ بھی ہے۔ سن لو! ''الْحُسنٰی'' جنت ہے، اور زیادتی سے مراد اللہ جل شانہ کے چہرۂ انور کی زیارت ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صحیح روایات میں آتا ہے کہ: اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں کے سامنے تجلی فرمائیں گے تو اس کی آنکھوں سے پردے ہٹا دیں گے، جب وہ دیدارِ خداوندی کریں گے تو نہریں بہنے، درخت لہلانے، تخت اور بالاخانہ چرچرانے لگیں گے، اور بہنے والے چشمے ترنم پیدا کریں گے، ہوائیں چلنے لگیں گی، گھروں اور محلات میں خوشبودار مُشک اور کافور اُگ آئے گا، پرندے چہچہانے لگیں گے، اور موٹی موٹی آنکھوں والی حوریں جھانکنے لگیں گی۔

مسلم کی حدیث میں ہے کہ: لوگوں کو ان کے پروردگار کے دیدار کے درمیان کبریائی اور عظمت کی وہ چادر حائل ہو گی جو اس نے جنتِ عدن میں اپنے چہرۂ انور پر ڈالی ہو گی۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: چادر سے مراد وہ حجاب ہے جو اس ذات کے احاطہ سے مانع ہے، اس لیے کہ یہ وہ حجاب ہے جس کا ہٹانا کبھی درست نہیں، اس لیے کہ اگر وہ اُٹھ گیا تو لوگ اپنے پروردگار کو پہچان لیں گے کہ وہ کیسا ہے، جو محال ہے۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کی روایت میں ہے کہ: ہم رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس تھے، آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھ کر فرمایا: تم اپنے پروردگار کو اپنی آنکھوں سے اسی طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو بلا کسی روک ٹوک کے دیکھ رہے ہو، لہٰذا اگر تم یہ کر سکتے ہو کہ اس نماز کا اہتمام کرلو جو طلوعِ آفتاب سے پہلے اور غروب سے پہلے ہے تو ایسا کرلو (یعنی فجر اور عصر) پھر آپ نے یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ۝۳۹﴾ اور اپنے پروردگار کی تسبیح کرتے رہو حمد کے ساتھ آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے۔

سب سے کم درجے والا اور سب سے اونچے درجے والا کون؟

حدیث ۱۸۸۳:-

وعن المغيرةِ بن شعبة - رضی الله عنه - عن رسُولِ الله (صلى الله عليه وسلم) قال: ((سأَلَ مُوسَى (عليه السلام) رَبَّهُ: ما أَدْنَى أَهْلِ الجَنَّةِ مَنْزِلَةً؟ قال: هُوَ رَجُلٌ يَجِيءُ بَعْدَ مَا أُدْخِلَ أَهْلُ الجَنَّةِ الجَنَّةَ. فَيُقَالُ لَهُ: ادْخُلِ الجَنَّةَ. فَيَقُولُ: أَيْ رَبِّ! كَيْفَ وَقَدْ نَزَلَ النَّاسُ مَنَازِلَهُمْ، وأَخَذُوا أَخذَاتِهِمْ؟ فَيُقَالُ لَهُ: أَتَرْضَى أَنْ يَكُونَ لَكَ مِثْلُ مُلْكِ مَلِكٍ مِنْ مُلُوكِ الدُّنْيَا؟ فَيَقُولُ: رَضِيتُ رَبِّ. فَيَقُولُ: لَكَ ذٰلِكَ وَمِثْلُهُ وَمِثْلُهُ وَمِثْلُهُ وَمِثْلُهُ. فَيَقُولُ فِي

الخَامِسَةِ: رَضِيتُ رَبِّ. فَيَقُولُ: هٰذَا لَكَ وَعَشَرَةُ أَمْثَالِهِ، وَلَكَ مَا اشْتَهَتْ نَفْسُكَ، وَلَذَّتْ عَيْنُكَ. فَيَقُولُ: رَضِيتُ رَبِّ. قَالَ: رَبِّ فَأَعْلَاهُمْ مَنْزِلَةً؟ قَالَ: أُولٰئِكَ الَّذِينَ أَرَدْتُ، غَرَسْتُ كَرَامَتَهُمْ بِيَدِي، وَخَتَمْتُ عَلَيْهَا، فَلَمْ تَرَ عَيْنٌ، وَلَمْ تَسْمَعْ أُذُنٌ، وَلَمْ يَخْطُرْ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت مغیرہ بن شعبہ (رضی اللہ عنہ) نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے نقل فرماتے ہیں کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا کہ: حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام نے اپنے پروردگار سے سوال کیا کہ جنتیوں میں سب سے کم درجے والا کون ہے؟ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: کہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو تمام جنتیوں کے جنت میں داخل ہو چکنے کے بعد آئے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو کہا جائے گا کہ: جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ اس کے جواب میں عرض کرے گا: باری تعالیٰ! میں کیسے جاؤں جبکہ سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر قابض ہو چکے ہیں اور ہر ایک نے اپنے حصے پر قبضہ کر لیا ہے (گویا اب وہاں کچھ بچا نہیں ہے، سب بھر گیا ہے) اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس بندے سے پوچھا جائے گا: اچھا! دنیا کے بادشاہوں میں کسی بادشاہ کے پاس جو سلطنت تھی اتنا ملک تجھے دیا جائے؛ تو کیا تو اس پر راضی ہے؟ وہ کہے گا: جی ہاں! میں اس پر راضی اور خوش ہوں۔ تو باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: کہ جا! تجھے بادشاہ جیسی سلطنت، اتنا ہی اور، اتنا ہی اور، اتنا ہی اور (پانچ گنا) دیا جاتا ہے۔ پانچ گنا پر وہ کہے گا: باری تعالیٰ پانچ گنا پر میں راضی ہوں۔ تو باری تعالیٰ کی طرف سے کہا جائے گا: کہ یہ اور اس کا دس گنا دیا جاتا ہے (گویا پچاس گنا ہو گیا) اور پھر یہ بھی کہا جائے گا کہ تیرا جی جتنا چاہے اور تیری آنکھیں جس سے لذت اور خوشی محسوس کریں وہ سب بھی ملے گا۔ اس پر وہ عرض کرے گا کہ: اس پر میں راضی اور خوش ہوں۔

اس پر حضرت موسیٰ (علیہ السلام) نے باری تعالیٰ سے پوچھا: جنت میں سب سے اونچے درجے والے کو کیا ملے گا؟ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ وہ لوگ ہیں جن کو معزز اور مکرم بنانے کے لیے میں نے اپنے ہاتھ سے ان کا تخم

اور بیچ ڈالا، اور اس پر میں نے مُہر لگا دی، اور کسی آنکھ نے نہ اس جیسی چیز کبھی دیکھی، اور نہ کسی کان نے سنی، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا (ان کو ایسی ایسی نعمتیں ملیں گی جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا)۔

سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والے جنتی کی جنت

حدیث ۱۸۸۴:-

وعن ابن مسعود -رضی الله عنه- قال: قال رسول اللهِ (ﷺ): ((إِنِّي لأَعْلَمُ آخِرَ أَهْلِ النَّارِ خُرُوجاً مِنْهَا، وَآخِرَ أَهْلِ الجَنَّةِ دُخُولاً الجَنَّةَ. رَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ حَبْواً. فَيقُولُ اللهُ -عز وجل- له: اذْهَبْ فادْخُلِ الجَنَّةَ، فَيأتِيهَا، فَيُخَيَّلُ إلَيهِ أنَّهَا مَلأَى، فيَرْجِعُ، فيقُولُ: يَا رَبِّ وَجَدْتُهَا مَلأَى! فَيَقُولُ اللهُ -عز وجل- له: اذْهَبْ فَادْخُلِ الجَنَّةَ، فيأتِيهَا، فَيُخَيَّلُ إليهِ أنَّهَا مَلأَى، فيَرْجِعُ. فَيَقولُ: يا رَبِّ وَجَدْتُهَا مَلأَى، فيقُولُ اللهُ -عز وجل- لَهُ: اذهبْ فَادخُلِ الجَنَّةَ. فإنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشَرَةَ أَمْثَالِهَا؛ أَوْ إنَّ لَكَ مِثْلَ عَشرَةِ أمْثَالِ الدُّنْيَا، فيقُولُ: أَتَسْخَرُ بِي، أَوْ تَضْحَكُ بِي وَأنْتَ المَلِكُ))

قال: فَلَقَدْ رَأَيْتُ رسولَ اللهِ (ﷺ) ضَحِكَ حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ فَكَانَ يقولُ: ((ذلِكَ أَدْنَى أَهْلِ الجَنَّةِ مَنْزِلَةً.)) (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت عبد اللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ: جہنمیوں میں سے سب سے آخر میں جہنم سے نکلنے والا اور جنتیوں میں سب سے آخر میں جنت میں داخل ہونے والا کون آدمی ہے وہ مَیں خوب جانتا ہوں۔ وہ آدمی وہ ہو گا جو جہنم سے سرین کے بل گھسٹتا ہوا نکلے گا (جیسے بچہ گھسٹتا ہوا چلتا ہے) جب وہ جہنم سے نکلے گا تو باری تعالیٰ اس سے کہیں گے: جا! جنت میں چلا جا۔ وہ جنت کے پاس پہنچے گا، تو اس کو ایسا نظر آئے گا کہ جنت بالکل بھر چکی ہے۔ وہ وہاں سے واپس آئے گا اور عرض کرے گا: باری تعالیٰ! جنت تو بھر چکی ہے (اس میں جگہ نہیں ہے) باری تعالیٰ پھر سے اس سے کہیں گے کہ: جا! جنت میں چلا جا۔ چناں چہ پھر وہ جنت کے پاس پہنچے

گا تو اس کو ایسا محسوس ہو گا کہ جنت بھری ہوئی ہے۔ پھر لوٹے گا اور عرض کرے گا کہ: میں نے تو اس کو بھرا ہوا دیکھا۔ تیسری مرتبہ باری تعالیٰ فرمائیں گے: جا! جنت میں داخل ہو جا۔ تجھے دنیا اور دنیا جیسا دس گنا ملے گا۔ یا یوں فرمایا جائے گا کہ: تجھے دنیا کا دس گنا دیا جاتا ہے۔ تو وہ عرض کرے گا کہ: باری تعالیٰ! آپ تو مالک الملک ہیں اس کے باوجود میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ اس کی یہ بات نقل کرنے کے بعد حضورِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کو میں نے دیکھا کہ آپ اتنے ہنسے کہ آپ کے نوکیلے دانت (کَنچلیاں) نظر آنے لگے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: یہ جنتیوں میں سب سے کم درجے والا ہے (جس کو دنیا کا دس گنا ملے گا۔)

افادات:- آج تو کسی کے پاس ذرا سا کچھ ہو، جیسے پورے بمبئی یا سورت کا مالک نہیں، بلکہ اس کے ایک پورے خطے کا بھی مالک نہیں، بلکہ دو چار بلڈ گوں کا بھی اگر مالک بن جائے جس کی قیمت آج کل کے حساب سے کئی ارب روپے ہو جاتی ہے، تو یوں سمجھا جاتا ہے کہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جنت کتنی بڑی نعمت ہو گی کہ ادنیٰ جنتی کے لیے پوری دنیا کا دس گنا ہے۔ آج ہم دنیا کے کسی بڑے سے بڑے مالدار کے لیے بھی یہ تصور نہیں کر سکتے کہ وہ پورے سورت کا مالک بن جائے گا، حالاں کہ دنیا کے نقشے میں سورت کی کیا حیثیت ہے؟ دنیا کا نقشہ اُٹھا کر سورت کو ڈھونڈیں گے تو ملے گا بھی نہیں۔

’’One piece‘‘جنت

حدیث ۱۸۸۵:-

وعن أبي موسى رضي الله عنه: أَنَّ النبيَّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: ((إِنَّ لِلْمُؤْمِنِ فِي الْجَنَّةِ لَخَيْمَةً مِنْ لُؤْلُؤَةٍ وَاحِدَةٍ مُجَوَّفَةٍ طُولُهَا فِى السَّمَاءِ سِتُّونَ مِيلاً. لِلْمُؤْمِنِ فِيهَا أَهْلُونَ يَطُوفُ عَلَيْهِمُ الْمُؤْمِنُ فَلاَ يَرَى بَعْضُهُمْ بَعْضاً)) (متفق عليه)

((الْمِيلُ)): سِتَّةُ آلافِ ذِرَاعٍ.

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو موسیٰ اَشعری (رضی اللہ عنہ) نقل فرماتے ہیں کہ نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: مؤمن کے لیے جنت کے اندر ایک خیمہ ایک ہی کھوکھلے موتی سے بناہوا ہوگا (یعنی اس میں کوئی جوڑ لگاہوا نہیں ہوگا) آسمان میں اس کی لمبائی ساٹھ میل ہوگی (آج اگر کسی کا مکان ایک ہی پیس کا بناہوا ہو تو ساری دنیا اس کو دیکھنے جائے گی نا! یہاں تو اس کو ساٹھ میل لمبا ”One piece“ مکان ملے گا) اس مؤمن کے کئی گھر والے اس میں رہتے ہوں گے (یعنی اس کی کئی بیویاں ہوں گی جو اس مکان میں رہتی ہوں گی) یہ مؤمن ان کے پاس (کبھی اس کے پاس، کسی وقت دوسری کے پاس) جائے گا، لیکن جب کسی کے پاس جائے گا تو دوسرے اس کو نہیں دیکھ سکیں گے (حالاں کہ وہ گھر ایک موتی سے بناہوا ہوگا)۔

جنت کا ایک درخت اور اس کا سایہ!

حدیث ۱۸۸۶ :-

وعن أبی سعید الخدری ﷺ عن النبیِّ (ﷺ) قال: إنَّ فی الجَنَّةِ شَجَرَةً یَسِیرُ الرَّاکبُ الجَوَادُ المُضَمَّرُ السَّرِیعُ مِئَةَ سَنَةٍ مَا یَقْطَعُھا. (متفق علیہ)

ورویاہ فی الصحیحین أیضاً من روایة أبی ھریرة -رضی اللہ عنہ- قال: ((یَسِیرُ الرَّاکِبُ فی ظِلِّھا مئةَ سَنَةٍ مَا یَقْطَعُھا))

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک درخت ہے، کوئی سوار تیز رفتار تضمیر کئے ہوئے عمدہ گھوڑے کے اوپر سوار ہو کر اس کو پار کرنا چاہے گا تو سو سال تک اس گھوڑے پر چلتا رہے گا تب بھی اس درخت کو پار نہیں کر سکے گا۔ اور ایک روایت میں ہے کہ اس کا سایہ اتنا ہو گا کہ وہ اس سایہ کو سو سال میں بھی پار نہیں کر سکے گا۔

افادات:- وہ شجرۂ طوبیٰ ہے جس کی شاخ ہر جنتی کے مکان میں پہنچی ہوئی ہو گی۔

"تضمیر کیا ہوا گھوڑا" یعنی اس زمانے میں گھوڑوں کو تیز رفتاری کے لیے ایک خاص انداز سے تیار کیا جاتا تھا۔ وہ اس طرح کہ چالیس دن تک اس کو روزانہ غذا بڑھا کر کھلائی جاتی تھی، یعنی آج جتنی کھلائی دوسرے دن اس سے زیادہ، تیسرے دن اس سے زیادہ، اس طرح چالیس دن تک اس گھوڑے کو کھلا کر خوب موٹا تازہ بناتے تھے، اس کے بعد اس کو ایک بند مکان میں رکھ کر اس کے اوپر بہت سارے کپڑے ڈال دیتے تھے، پھر اس کی غذا جس طریقے سے بڑھائی تھی اسی طرح سے کم کی جاتی

تھی، اوران کپڑوں کے اس کے اوپر ڈالے ہوئے ہونے کی وجہ سے اس گھوڑے کو خوب پسینہ نکلتا تھا،اس کی وجہ سے وہ گھوڑا ایکدم چھریرے بدن کا ہو جاتا تھا،لیکن وہ اتنا مضبوط ہو جاتا تھا کہ تیز رفتاری میں بہت اعلیٰ بن جاتا تھا۔ایسا گھوڑا کبھی پیچھے نہیں رہتا تھا، ایسے گھوڑے کو ”مضمر“،تضمیر کیا ہوا کہتے ہیں۔

جنتیوں کا اپنا الگ الگ بنگلہ ہو گا

حدیث ۱۸۸۷:-

وعنه عن النبيِّ (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: ((إنَّ أهلَ الجنَّةِ لَيَتَرَاءَوْنَ أَهْلَ الغُرَفِ مِن فَوْقِهِمْ كَمَا تَرَاءَوْنَ الكَوْكَبَ الدُّرِّيَّ الغَابِرَ فِي الْأُفُقِ مِنَ الْمَشْرِقِ أَوِ الْمَغْرِبِ لِتَفَاضُلِ مَا بَيْنَهُمْ)) قالوا: يا رسول الله! تِلْكَ مَنَازِلُ الْأَنْبِيَآءِ لَا يَبْلُغُهَا غَيْرُهُمْ؟ قال: ((بَلَى وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ! رِجَالٌ آمَنُوا بِاللهِ وَصَدَّقُوا الْمُرْسَلِينَ)). (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) ہی کی روایت ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت والے بالاخانے والوں کو اپنے اوپر ایسا دیکھیں گے جیسا کہ تم لوگ چمکدار ستارے کو مشرق یا مغرب کی اُفق میں دیکھ لیتے ہو (جیسے ایک ستارہ یہاں نظر آتا ہے،دوسرا وہاں نظر آتا ہے ایسے ہی جنت والے دوسرے جنتیوں کے مکانوں کو دیکھیں گے کہ کسی کا مکان وہاں چمکدار نظر آئے گا تو دوسرے کا دوسری طرف چمکے گا۔ گویا فضا میں الگ الگ مکانات ہوں گے،روہاؤس "Row House" جیسے ملے ہوئے نہیں ہوں گے، بلکہ ہر ایک کا اپنا الگ الگ بنگلہ ہو گا۔) صحابہؓ نے پوچھا: یارسول اللہ! کیا وہ انبیاء کے مکانات اور مقامات

ہوں گے جہاں دوسرے نہیں پہنچ سکتے؟ تو نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: بلکہ قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور نبیوں کو سچا جانا وہ سب اس کے اندر رہیں گے۔

جنت کی ایک کمان کی لکڑی کا آدھا حصہ دنیا سے بہتر ہے

حدیث ۱۸۸۸ :-

وعن أبي هريرة رضى الله عنه:- أَنَّ رسولَ اللهِ (ﷺ) قال: ((لَقَابُ قَوْسٍ فِي الجَنَّةِ خَيْرٌ مِمَّا تَطْلُعُ عَلَيْهِ الشَّمْسُ أَوْ تَغْرُبُ.)) (متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت کے اندر ایک کمان کی ایک قاب والا حصہ اتنا قیمتی ہوگا جس پر سورج طلوع ہوتا ہے یا غروب ہوتا ہے (یعنی ساری دنیا سے بہتر ہوگا)۔

افادات:- قاب یعنی کمان کی جس لکڑی کے ساتھ ڈوری اور رسی باندھی جاتی ہے اس لکڑی کے بیچ میں ایک پکڑ بنائی جاتی ہے۔ ایک طرف کا حصہ ایک قاب کہلاتا ہے۔ تو ایک کمان میں دو قاب ہوتی ہیں۔ گویا کمان کی لکڑی کا آدھا حصہ۔

جنت کی تو ہر چیز دنیا سے بہتر ہے، اس لیے کہ دنیا تو فانی اور ختم ہونے والی ہے اور جنت کی ہر نعمت باقی رہنے والی ہے۔

جنت کا بازار اور اس کی کیفیت

حدیث ۱۸۸۹:-

وعن أنس-رضی الله عنه-:أَنَّ رسولَ اللهِ (ﷺ) قَالَ: ((إِنَّ فِي الْجَنَّةِ سُوقاً يَأْتُونَهَا كُلَّ جُمُعَةٍ. فَتَهُبُّ رِيحُ الشَّمَالِ، فَتَحْثُو فِي وُجُوهِهِمْ وَثِيَابِهِمْ، فَيَزْدَادُونَ حُسناً وَجَمَالاً فَيَرْجِعُونَ إِلَى أَهْلِيهِمْ، وَقَدْ ازْدَادُوا حُسْناً وَجَمَالاً. فَيَقُولُ لَهُمْ أَهْلُوهُمْ: وَاللهِ لَقَدِ ازْدَدْتُمْ حُسْناً وَجَمَالاً! فَيَقُولُونَ: وَأَنْتُمْ وَاللهِ لَقَدِ ازْدَدْتُمْ بَعْدَنَا حُسْناً وَجَمَالاً!)). (رواہ مسلم)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت انس (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت کے اندر بازار ہو گا جہاں جنتی ہر جمعہ کو جائیں گے (جیسے یہاں بازار میں لوگ تفریح کے لیے جاتے ہیں ایسے ہی جنتی بھی وہاں کے بازار میں تفریح اور پکنک کے واسطے جائیں گے) تو ایک خوشنما ہوا چلے گی جو ان کے چہروں اور لباسوں کے اندر اپنا اثر پہنچائے گی جس کے نتیجہ میں جن جنتیوں کو وہ ہوا لگے گی ان کی خوبصورتی اور ان کے حسن وجمال میں اضافہ ہو جائے گا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ جنت کے بازاروں میں بھی عورتیں نہیں جائیں گی، صرف مرد ہی جائیں گے۔ جنت کے اندر بھی مخلوط طریقہ نہیں ہے) جب وہ بازار سے اپنے گھر والوں کے پاس واپس لوٹیں گے تو ان کی بیویاں ان کو دیکھ کر کہیں گی: ارے! تمہاری خوبصورتی اور حسن وجمال میں تو بہت اضافہ ہو گیا ہے! یہاں سے گئے تھے اس سے زیادہ حسین و جمیل بن کر آئے ہو! تو یہ شوہر اپنی بیویوں سے کہیں گے: جس وقت ہم تم کو گھر میں چھوڑ کر گئے تھے اس وقت تم جتنی حسین تھی تم بھی اس سے زیادہ حسین ہو گئی ہو

(اور جیسے کہ پہلے روایت میں آیا تھا کہ جنت کے بازاروں میں کیا چیزیں ہوں گی؟صورتیں اور نئی نئی خوبصورت شکلیں ہوں گی کسی جنتی کو کوئی شکل پسند آئے گی تو اس کی وہی شکل بن جائے گی)۔

ہر جنتی کا مکان دور دور ہو گا

حدیث ۱۸۹۰:-

وعن سهل بن سعد - رضی اللہ عنہ -: أنَّ رسول الله (صلی اللہ علیہ وسلم) قال: ((إنَّ أهْلَ الجَنَّةِ لَيَتَرَاءونَ الغُرَفَ فِي الجَنَّةِ كَمَا تَتَرَاءونَ الكَوكَبَ فِي السَّمَاءِ))(متفق عليه)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت والے جنت میں بالاخانوں اور حویلیوں کو ایسا دیکھیں گے جیسا کہ تم ستاروں کو آسمان میں دیکھتے ہو۔

افادات:- مطلب یہ ہے کہ ایک جنتی دوسرے جنتی کا مکان اتنا دور دیکھے گا۔

جنت میں ایسی نعمتیں ہوں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی، نہ کسی کے دل میں خیال اور وسوسہ گزرا

حدیث ۱۸۹۱:-

وعنه -رضی الله عنه- قال: شَهِدْتُ مِنَ النبيّ (ﷺ) مَجْلِساً وَصَفَ فِيهِ الجَنَّةَ حَتَّى انْتَهَى، ثُمَّ قَالَ في آخِرِ حَدِيثِهِ: ((فِيهَا مَا لاَ عَيْنٌ رَأَتْ، وَلاَ أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلاَ خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ)) ثُمَّ قَرَأَ: { تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ } إلى قوله تعالى: { فَلاَ تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ } [السجدة: 16-17] (رواه البخاری)

ترجمہ:- حضرت سہل بن سعد (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم (ﷺ) کی ایک مجلسِ مبارک میں حاضر ہوا، جس میں حضورِ اکرم (ﷺ) نے جنت کے حالات بیان کئے یہاں تک جب آپ حالات بیان کر چکے تو اخیر میں نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: جنت کے اندر ایسی نعمتیں ہوں گی جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال اور وسوسہ گزرا، اس کے بعد نبی کریم (ﷺ) نے (سورۂ سجدہ کی) یہ آیتِ کریمہ تلاوت فرمائی: کسی کو معلوم نہیں کہ جنت میں اللہ تعالیٰ نے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیسا کیسا سامان چھپا رکھا ہے۔

جنتی ہمیشہ نعمتوں میں رہیں گے

حدیث ۱۸۹۲:-

وعن أبي سعيد وأبي هريرة رضی الله عنهما أنَّ رسولَ اللهِ (ﷺ) قال: ((إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الجَنَّةِ الجَنَّةَ يُنَادِي مُنَادٍ: إنَّ لَكُمْ أنْ تَحْيَوْا، فَلاَ تَمُوتُوا أبَداً،

وإنَّ لَكُمْ أنْ تَصِحُّوا، فلا تَسْقَمُوا أبداً، وإنَّ لكمْ أنْ تَشِبُّوا فلا تَهْرَمُوا أبداً، وإنَّ لكمْ أَنْ تَنْعَمُوا، فَلاَ تَبْأَسُوا أَبَداً)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا: تم لوگ اس جنت میں ہمیشہ رہو گے کبھی تمہیں موت نہیں آئے گی۔ تم اس جنت کے اندر ہمیشہ تندرست رہو گے کبھی کوئی بیماری نہیں آئے گی۔ تم اس جنت میں ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ تم لوگ اس جنت میں ہمیشہ خوش و خرم رہو گے کبھی کوئی دکھ اور تکلیف نہیں آئے گی (گویا ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں رہو گے)۔

جنتی تمنا کرے گا وہ سب اور اس کا دوگنا دیا جائے گا

حدیث ۱۸۹۳:-

وعن أبي هريرة-رضي الله عنه-: أنَّ رسولَ اللهِ (صلى الله عليه وسلم) قال: ((إنَّ أدْنَى مَقْعَدِ أَحَدِكُمْ مِنَ الجَنَّةِ أنْ يَقُولَ لَهُ: تَمَنَّ، فَيَتَمَنَّى وَيَتَمَنَّى فَيقُولُ لَهُ: هَلْ تَمَنَّيتَ؟ فيقولُ: نَعَمْ، فيقُولُ لَهُ: فَإنَّ لَكَ ما تَمَنَّيتَ وَمِثْلَهُ مَعَهُ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جنت کے اندر تم میں سب سے کم درجے والا وہ ہوگا جس سے کہا جائے گا کہ تم اپنے لیے کچھ تمنا کرو۔ چناں چہ وہ تمنا کرے گا اور تمنا کرے گا اور تمنا کرے گا، یہاں تک کہ اس سے باری تعالیٰ پوچھیں گے: کیا تو نے تمنا کرلی؟ وہ کہے گا: جی ہاں۔ تو باری تعالیٰ اس سے کہیں گے: جنتی تو نے تمنا کی وہ سب اور اس کا دوگنا تجھے دیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایسی خوشنودی جس کے بعد کبھی ناراضگی نہیں

حدیث ۱۸۹۴:-

وعن أبي سعيد الخدری -رضی الله عنه-: أنَّ رسول الله (ﷺ) قال: ((إنَّ الله -عز وجل- يَقُولُ لأَهْلِ الجَنَّةِ: يَا أَهْلَ الجَنَّةِ، فيقولونَ: لَبَّيكَ رَبَّنَا وَسَعْدَيكَ، وَالخَيْرُ فِي يَدَيْكَ، فَيقُولُ: هَلْ رَضِيتُم؟ فَيقُولُونَ: وَمَا لَنَا لاَ نَرْضَى يَا رَبَّنَا، وَقَدْ أَعْطَيْتَنَا مَا لَمْ تُعْطِ أحداً مِنْ خَلْقِكَ. فَيقُولُ: ألاَ أُعْطِيكُمْ أفْضَلَ مِنْ ذلِكَ؟ فَيقُولُونَ: وَأيُّ شَيءٍ أفْضَلُ مِنْ ذلِكَ؟ فَيقُولُ: أُحِلُّ عَلَيكُمْ رِضْوَانِي فَلاَ أسْخَطُ عَلَيكُمْ بَعْدَهُ أبداً)). (متفق عليه)

ترجمہ مع تشریح:- حضرت ابو سعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (ﷺ) نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ جنتیوں سے فرمائیں گے کہ: اے جنتیو۔ اس کے جواب میں جنت والے عرض کریں گے: اے پروردگار! ہم حاضر ہیں، فرمائیے کیا ارشاد ہے، ہر طرح کی خیر آپ ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ باری تعالیٰ پوچھیں گے کہ: کیا تم لوگ خوش اور راضی ہو؟ اس کے جواب میں جنت والے عرض کریں گے: باری تعالیٰ! ہم کیوں راضی نہ ہوں، حال یہ کہ آپ نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جو آپ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو نہیں دیا (یعنی ایسی ایسی نعمتیں آپ نے ہمیں دی؛ پھر ہم کیوں خوش نہ ہوں) باری تعالیٰ فرمائیں گے: کیا اس سے بہتر چیز تم کو نہ دوں؟ جنتی کہیں گے: اس سے بھی بہتر کوئی چیز ہے؟ (ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ یہی سب سے بہتر چیزیں ہیں اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہ ہو گی) باری تعالیٰ فرمائیں گے: میں اپنی خوشنودی تمہیں عطا کرتا ہوں، اب کبھی تم سے ناراض نہیں ہوؤں گا (اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے تو پھر ساری نعمتیں حاصل ہو جائیں گی، جیسے بادشاہ جس کا ہو جائے تو پھر ساری حکومت اسی کی ہوتی ہے)۔

ہر ایک کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار آسانی کے ساتھ ہو جائے گا

حدیث ۱۸۹۵:-

وعن جریر بن عبد اللہ - رضی اللہ عنہ - قال: كُنَّا عِنْدَ رَسُولِ اللهِ (ﷺ) فَنَظَرَ إِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ، وَقَالَ: ((إِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا كَمَا تَرَوْنَ هَذَا الْقَمَرَ، لَا تُضَامُونَ فِي رُؤْيَتِهِ)) (متفق علیہ)

ترجمہ:- حضرت جریر بن عبد اللہ (رضی اللہ عنہ) فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم (ﷺ) کے پاس بیٹھے ہوئے تھے (رات کا وقت تھا) آپ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف نظر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ: تم اپنے پروردگار کو اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھوگے جس طرح اس چاند کو دیکھتے ہو کہ اس کو دیکھنے میں کوئی دھکا پیل نہیں ہوتی۔

افادات:- اگر لاکھوں اور کروڑوں کا مجمع بھی ہو اور چاند کو دیکھنا ہو تو کوئی بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے، سب لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے اطمینان سے اس چاند کو دیکھ سکتے ہیں، کسی کو کسی دوسرے کی طرف سے کوئی شکایت اور رکاوٹ نہیں ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ ہر ایک جنتی کو اللہ تبارک وتعالیٰ کا دیدار آسانی کے ساتھ ہو جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا دیدار جنت کی ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہو گا

حدیث ۱۸۹۶:-

وعن صُهیب - رضی اللہ عنہ -: أَنَّ رسول اللہ (ﷺ) قال: ((إِذَا دَخَلَ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ يَقُولُ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى: تُرِيدُونَ شَيْئاً أَزِيدُكُمْ؟ فَيَقُولُونَ: أَلَمْ تُبَيِّضْ وُجُوهَنَا؟

أَلَمْ تُدْخِلْنَا الْجَنَّةَ وَتُنَجِّنَا مِنَ النَّارِ ؟ فَيَكْشِفُ الْحِجَابَ، فَمَا أُعْطُوا شَيْئاً أَحَبَّ إِلَيْهِمْ مِنَ النَّظَرِ إِلَى رَبِّهِمْ)). (رواہ مسلم)

ترجمہ:- حضرت صہیب (رضی اللہ عنہ) سے منقول ہے کہ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا: جب جنتی جنت کے اندر داخل ہو جائیں گے تو باری تعالیٰ فرمائیں گے کہ کوئی اور چیز تمہیں چاہیے جو میں تم کو دوں؟ اس کے جواب میں جنتی عرض کریں گے: باری تعالیٰ! کیا آپ نے ہمارے چہروں کو روشن نہیں بنایا؟ کیا آپ نے ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا اور جہنم سے نجات نہیں دی؟ (مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی ملنا چاہیے وہ سب تو آپ نے دے رکھا ہے؛ اب ہمیں مزید کیا چاہیے؟) اس وقت اللہ تبارک وتعالیٰ وہ پردہ جو اپنے دیدار سے آڑ ہوگا اس کو ہٹا دیں گے، اس وقت جنت والوں کو اپنے رب کے دیدار سے زیادہ محبوب وپسندیدہ اور کوئی چیز نہیں ملی ہوگی (گویا اپنے رب کا دیدار جنت کی ساری نعمتوں سے بھی بڑھ کر ہوگا)۔

اخیر میں علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے باری تعالیٰ کا یہ ارشاد نقل کیا:

قال اللہ تعالی: { إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ يَهْدِيهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيمَانِهِمْ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهِمُ الأَنْهَارُ فِي جَنَّاتِ النَّعِيمِ دَعْوَاهُمْ فِيهَا سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ وَتَحِيَّتُهُمْ فِيهَا سَلاَمٌ وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ } [یونس:۹-۱۰]

ترجمہ مع تشریح:- بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمالِ صالحہ کئے، ان کا پروردگار ان کے ایمان واعمالِ صالحہ کی وجہ سے ان کو ایسی نعمت والی جنت کے اندر پہنچا دے گا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان جنتیوں کی دعا اور پکار وہاں یہی ہوگی: سُبْحَانَكَ اللَّهُمَّ (ان کی

زبانوں سے بار بار یہی جملہ نکلے گا) اور ان کا سلام آپس میں السلام علیکم ورحمۃ اللہ ہو گا (یا مطلب یہ ہے کہ جنت میں ان کا استقبال لفظِ سلام سے کیا جائے گا۔ جب کوئی آدمی کسی جگہ پہنچتا ہے تو اس کے استقبال کے لیے خوش آمدید اور "welcome" اور "أَهْلًا وَّسَهْلًا" کہتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے جنتیوں کو بطورِ استقبال "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کہا جائے گا) اور ان کی آخری دعا یہ ہو گی: تمام تعریف اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

علامہ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) نے اسی پر اپنی کتاب ختم فرمائی: "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ هَدَانَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِىَ لَوْلَآ أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ" "تمام تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہم کو اس چیز کی طرف رہنمائی فرمائی، اگر اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی نہیں فرماتے تو ہم راہ یاب نہیں ہو سکتے تھے" "اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُولِكَ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ، كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وعلى آلِ إِبْرَاهِيمَ. وَبَارِكْ عَلَى مُحَمَّدٍ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ، وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ، كَمَا بَارَكْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَعَلَى آلِ إبراهيم فى العالَمِينَ إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ." اے اللہ! درود بھیج ہمارے آقا نبی اُمّی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جو آپ کے بندے اور رسول ہیں اور آپ کی آل اور آپ کی ازواجِ مطہرات اور ذُرّیات پر، جیسا کہ آپ نے درود بھیجا حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام اور ان کی آل پر۔ اور اے اللہ! برکت نازل فرما ہمارے آقا نبی اُمّی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور آپ کی آل اور آپ کی ازواجِ مطہرات اور ذُرّیات پر، جیسا کہ آپ نے برکت نازل فرمائی حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام اور ان کی آل پر، بے شک آپ خوبیوں والے بزرگی والے ہیں۔

قال مؤلِّفُهُ يحيى النَّوَوِيُّ غَفَرَ اللهُ لَهُ: فَرَغْتُ مِنْهُ يَوْمَ الإِثْنَيْنِ رَابِعَ عَشَرَ رَمَضَانَ سَنَةَ سَبْعِينَ وَسِتِّمِئَةٍ.

اس کتاب کے جمع کرنے والے امام ابوزکریا یحییٰ نووی (رحمۃ اللہ علیہ) فرماتے ہیں کہ: میں اس کتاب کی تالیف سے پیر کے روز ۱۴/ رمضان المبارک ۶۷۰ھ میں فارغ ہوا۔

جَلَّ جَلَالُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ جَلَّ جَلَالُہٗ

الحمد للہ! ہماری یہ کتاب آج پوری ہوئی جو ۳۰/ ربیع الآخر ۱۴۱۷ھ کو شروع ہوئی تھی، اور آج ۱۲/ ربیع الآخر ۱۴۲۶ھ ہے، گویا اسلامی حساب سے نو سال میں اٹھارہ دن کم ہیں۔ اور انگریزی حساب سے ۱۴/ ستمبر ۱۹۹۶ء کو شروع ہوئی تھی اور آج ۲۱/ مئی ۲۰۰۵ء ہے، گویا اس حساب سے نو سال میں چار مہینے کم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے میری نالائقی اور بد عملی کے باوجود آج اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی مجھے سعادت عطا فرمائی۔

عرض مرتب:- راقم الحروف عرض گزار ہے کہ میرے بے شمار گناہوں اور کوتاہیوں اور عدمِ ادائیگیٔ حقوق کے باوجود اللہ تبارک وتعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے آج ۲۷/ جمادی الاخری ۱۴۳۶ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۲۰۱۵ء بروز بدھ صبح ۲۵-۸ پر مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃً وسلاماً کے صحن میں بیٹھ کر یہ اخری سبق لکھنے کی سعادت مجھے نصیب فرمائی۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتِ۔ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائے اور اپنی رضا و خوشنودی اور نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حقیقی قرب عطا فرما کر ذریعۂ نجات بنائے۔ آمین۔

دعا

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا اِلٰهَ غَيْرُكَ.

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدًا. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذُوْ الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ.

اَللّٰهُمَّ يَا عَلِيْمُ يَا حَلِيْمُ يَا كَرِيْمُ يَا رَحِيْمُ، أَللّٰهُمَّ يَا كَبِيْرُ يَا سَمِيْعُ يَا بَصِيْرُ يَا مَنْ لَّا شَرِيْكَ لَهٗ وَلَا وَزِيْرَ لَهٗ، وَيَا خَالِقَ الشَّمْسِ وَالْقَمَرِ الْمُنِيْرِ، وَيَا عِصْمَةَ الْبَائِسِ الْخَائِفِ الْمُسْتَجِيْرِ، وَيَا رَازِقَ الطِّفْلِ الصَّغِيْرِ، وَيَا جَابِرَ الْعَظْمِ الْكَسِيْرِ، أَدْعُوْكَ دُعَآءَ الْبَائِسِ الْفَقِيْرِ كَدُعَاءِ الْمُضْطَرِّ الضَّرِيْرِ، دُعَآءَ مَنْ خَضَعَتْ لَكَ رَقَبَتُهٗ، وَفَاضَتْ لَكَ عَبْرَتُهٗ، وَذَلَّ لَكَ جِسْمُهٗ، وَرَغِمَ لَكَ أَنْفُهٗ.

أَللّٰهُمَّ يَا مُؤْنِسَ كُلِّ وَحِيْدٍ، وَيَا صَاحِبَ كُلِّ فَرِيْدٍ، وَيَا قَرِيْبًا غَيْرَ بَعِيْدٍ، وَيَا شَاهِدًا غَيْرَ غَائِبٍ، وَيَا غَالِبًا غَيْرَ مَغْلُوْبٍ، يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ. يَا نُوْرَ السَّمٰوَاتِ وَ الْأَرْضِ، يَا زَيْنَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، وَيَا جَبَّارَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، يَا عِمَادَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، يَا قَيَّامَ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ. يَا صَرِيْخَ الْمُسْتَصْرِخِيْنَ، وَ مُنْتَهَى الْعَائِذِيْنَ، وَالْمُفَرِّجَ عَنِ الْمَكْرُوْبِيْنَ، وَالْمُرَوِّحَ عَنِ الْمَغْمُوْمِيْنَ، وَمُجِيْبَ دَعْآءِ الْمُضْطَرِّيْنَ، وَيَا كَاشِفَ الْكُرَبِ، يَا إِلٰهَ الْعٰلَمِيْنَ، وَيَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ . يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ. لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحٰنَكَ إِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ.

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ وَلَكَ الشُّكْرُ كُلُّهٗ وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهٗ وَاِلَيْكَ يَرْجِعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ۔ اَللّٰهُمَّ لَآ اُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَآ اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ.

أَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا إِبْرَاهِيْمَ. إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ. اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى سَيِّدِنَا إِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى آلِ سَيِّدِنَا إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ.

أَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ صَلٰوةً تُنَجِّيْنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ الْاَهْوَالِ وَالْاٰفَاتِ وَتَقْضِيْ لَنَا بِهَا جَمِيْعَ الْحَاجَاتِ وَتُطَهِّرُنَا بِهَا مِنْ جَمِيْعِ السَّيِّئَاتِ وَتَرْفَعُنَا بِهَا عِنْدَكَ اَعْلَى الدَّرَجَاتِ وَتُبَلِّغُنَا بِهَآ اَقْصَى الْغَايَاتِ مِنْ جَمِيْعِ الْخَيْرَاتِ فِي الْحَيٰوةِ وَبَعْدَ الْمَمَاتِ، إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْئٍ قَدِيْرٌ.

أَللّٰهُمَّ صَلِّ صَلَاةً كَامِلَةً، وَ سَلِّمْ سَلَامًا تَامًّا عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ، تَنْحَلُّ بِهِ الْعُقَدُ، وَتَنْفَرِجُ بِهِ الْكُرَبُ، وَتُقْضٰى بِهِ الْحَوَائِجُ، وَ تُنَالُ بِهِ الرَّغَائِبُ، وَحُسْنُ الْخَوَاتِيْمِ، وَيُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ فِيْ كُلِّ لَمْحَةٍ وَّنَفَسٍ بِعَدَدِ كُلِّ مَعْلُوْمٍ لَّكَ.

أَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ كَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى بِعَدَدِ مَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى.

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۫ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ.

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ.

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا، اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ.

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ. رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ.

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا.

رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ڰ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا، اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا.

رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ڰ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ، رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ.

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا.

رَبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا.

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ.

أَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا كُلَّهَا، دِقَّهَا وَجِلَّهَا، عَلَانِيَتَهَا وَسِرَّهَا، أَوَّلَهَا وَآخِرَهَا، ظَاهِرَهَا وَبَاطِنَهَا.

أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَتُوْبُ إِلَيْكَ مِنَ الْمَعَاصِي كُلِّهَا، لَا نَرْجِعُ إِلَيْهَا أَبَداً.

أَللّٰهُمَّ مَغْفِرَتُكَ أَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِنَا وَرَحْمَتُكَ أَرْجیٰ عِنْدَنَا مِنْ أَعْمَالِنَا.

أَللّٰهُمَّ إِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ رَحِيْمٌ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنَّا.

أَللّٰهُمَّ إِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِيَنَا وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ، لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا، فَإِذَا فَعَلْتَ ذَالِكَ بِنَا، فَكُنْ أَنْتَ وَلِيَّنَا وَاهْدِنَا إِلٰى سَوَآءِ السَّبِيْلِ.

أَللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْإِيْمَانَ، وَ زَيِّنْهُ فِيْ قُلُوْبِنَا، وَ كَرِّهْ إِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِيْنَ.

أَللّٰهُمَّ أَعْطِ نُفُوْسَنَا تَقْوٰهَا، وَزَكِّهَا فَأَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا، أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا.

أَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّيَّةِ وَالْهُدٰى.

أَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا هَادِيْنَ مُهْتَدِيْنَ، غَيْرَ ضَالِّيْنَ وَلَا مُضِلِّيْنَ، سِلْمًا لِأَوْلِيَآئِكَ وَحَرْبًا لِأَعْدَآئِكَ، نُحِبُّ بِحُبِّكَ مَنْ أَحَبَّكَ، وَنُعَادِيْ بِعَدَاوَتِكَ مَنْ خَالَفَكَ مِنْ خَلْقِكَ.

أَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ مِنَ النِّفَاقِ، وَعَمَلِيْ مِنَ الرِّيَآءِ، وَلِسَانِيْ مِنَ الْكِذْبِ، وَعَيْنِيْ مِنَ الْخِيَانَةِ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ.

أَللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِأَسْمَاعِنَا، وَأَبْصَارِنَا، وَقُوَّتِنَا مَا أَحْيَيْتَنَا، أَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ الْوَارِثَ مِنَّا، أَللّٰهُمَّ اجْعَلْ ثَأْرَنَا عَلٰى مَنْ ظَلَمَنَا، أَللّٰهُمَّ انْصُرْنَا عَلٰى مَنْ عَادَانَا، وَلَا تَجْعَلْ مُصِيْبَتَنَا فِيْ دِيْنِنَا، وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْيَا أَكْبَرَ هَمِّنَا، وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا، وَلَا تُسَلِّطْ عَلَيْنَا مَنْ لَا يَخَافُكَ وَلَا يَرْحَمُنَا. أَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا، وَ أَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا، وَأَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا، وَآثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا، وَأَرْضِنَا عَنْكَ وَأَرْضَ عَنَّا.

أَللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي الْمَوْتِ وَفِيْمَا بَعْدَ الْمَوْتِ.

أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى.

أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ عِلْمًا نَّافِعًا، وَرِزْقًا وَّاسِعًا. وَشِفَآءً مِّنْ كُلِّ دَآءٍ.

أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْأَمَانَةَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَاءَ بِالْقَدْرِ.

أَللّٰهُمَّ إِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنْ جُهْدِ الْبَلَآءِ، وَدَرْكِ الشِّقَآءِ، وَسُوْءِ الْقَضَاءِ، وَشَمَاتَةِ الْأَعْدَآءِ.

أَللّٰهُمَّ لَا سَهْلَ إِلَّا مَا جَعَلْتَهُ سَهْلًا وَأَنْتَ تَجْعَلُ الْحَزْنَ سَهْلًا إِذَا شِئْتَ.

لاَ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ الْحَلِيمُ الْكَرِيمُ، سُبْحَانَ اللهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، أَسْأَلُكَ مُوجِبَاتِ رَحْمَتِكَ، وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ، والعصمة من كل ذنب، وَالْغَنِيمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ، وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ إِثْمٍ، لاَ تَدَعْ لنا ذَنْبًا إِلاَّ غَفَرْتَهُ، وَلاَ هَمًّا إِلاَّ فَرَّجْتَهُ، وَلَاضُرًّا إِلَّا كَشَفْتَهُ، وَلَاحَاجَةً هِيَ لَكَ رِضًا إِلاَّقَضَيْتَهَا، يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ.

اے اللہ! تو ہمارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری خطاؤں سے درگذر فرما۔ گنہگار ہیں، خطاکار ہیں، قصوروار ہیں، اے اللہ! اب تک کی اپنی زندگی تیری نافرمانی میں گنوادی، جن کاموں کو کرنے کا تونے حکم دیا ان کو بجانہیں لائے، اور جن کاموں سے منع کیا انہیں کاارتکاب کرتے رہے، اے اللہ! تیری نعمتیں استعمال کرکے تیرا مقابلہ کرتے رہے، اے اللہ! ہمارے اس جرم عظیم کو معاف فرمادے۔ اگر تونے ہماری مغفرت نہیں فرمائی تو ہمارا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا، اے اللہ! گناہوں کی عادتیں ہمیں پڑچکی ہیں، عافیت کے ساتھ ان عادتوں کو چھڑوادے۔

اے اللہ! ہماراایک ایک عضو گناہوں میں مبتلا ہے، اے اللہ! تمام اعضاء کو تو اپنی اطاعت کے لیے قبول فرمالے۔ اے اللہ! گناہوں کی نفرت ہمارے قلوب کے اندر بٹھادے۔ طاعات اور نیکیوں کی رغبت ہمارے دلوں میں ڈال دے۔

اے اللہ! تیری مرضیات پر زیادہ سے زیادہ چلاکر تیری نامرضیات سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما، نفس اور شیطان کی شرارتوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔

اے اللہ! تو ہماری زندگیوں میں خوشگوار انقلاب پیدا فرمادے۔

اے اللہ! تیری نافرمانیوں والی زندگی سے نکال کر تیری فرمانبرداری والی زندگی عطا فرما۔

اے اللہ! گناہوں والی زندگی سے سچی پکی توبہ عطا فرما کر نیکیوں والی زندگی عطا فرما۔

اے اللہ! معصیت سے نجات عطا فرما کر طاعات کی توفیق عطا فرما۔ ہر چھوٹے بڑے گناہ سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔

اے اللہ! تقویٰ کی دولت سے ہمیں مالامال فرما۔ نبیٔ کریم (ﷺ) کی سنتوں اور طریقوں کو اپنی زندگی کے ہر ہر شعبے میں جاری کرنے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔

اے اللہ! حضور اکرم (ﷺ) کے طریقوں کی محبت اور غیروں کے طریقوں کی نفرت ہمارے قلوب کے اندر بٹھا دے۔

اے اللہ! ہم پر اپنا خصوصی فضل فرما دے۔

اے اللہ! اپنے نیک بندوں کی راہوں پر ہمیں چلنے کی توفیق عطا فرما۔

اے اللہ! محض اپنے فضل سے اس کتاب کو شروع سے لے کر اخیر تک پہنچانے کی تونے توفیق عطا فرمائی، اے اللہ! تیرے حبیب پاک (ﷺ) کے ان ارشادات کو حرزِ جان بنا کر اپنی زندگیوں میں پورے طور پر اپنانے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! اس کی محبت ہمارے دلوں کے اندر ڈال دے۔ اے اللہ! ہم پر اپنا خصوصی فضل فرما دے۔

اے اللہ! محاسنِ اخلاق سے مزین فرما۔ ایمان ویقین عطا فرما، اسلام وطاعت عطا فرما۔ اے اللہ! زہدوورع سے مالامال فرما۔ اے اللہ! تقویٰ وطہارت سے نواز دے۔ اے اللہ! تسلیم ورضا، صبر وشکر کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! عفو ومعافات سے نواز دے۔ تیری ذات عالی کے اوپر توکل واعتماد کی دولت عطا فرما۔ تیری معرفت ومحبت سے ہمارے قلوب کو منوّر فرما۔

اے اللہ! تمام محاسنِ اخلاق سے مزین فرما کر تمام رذائل سے پاک وصاف فرما دے، کفر وشرک سے، شقاق ونفاق سے نجات عطا فرما۔ اے اللہ! دنیا کی مال کی جاہ کی محبت سے ہمارے قلوب کو پاک صاف فرما۔ اے اللہ! عجب سے خود بینی وخود پسندی سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! بغض کینہ وحسد سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! تمام رذائل سے ہمیں پاک وصاف فرما دے۔

اے اللہ! اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرما۔ اس پر مداومت عطا فرما۔

اے اللہ! تیری یاد سے ہمارے دلوں کو آباد فرما دے۔

اے اللہ! تو ہم سے راضی ہو جا، اور ہمیں اپنے سے راضی فرما لے۔

اے اللہ! زندگی کے ہر لمحے کو تیری اطاعت وفرمانبرداری میں گزارنے کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! ایک لمحے کے لیے بھی تیری نافرمانی میں مبتلا ہونے سے ہماری پوری حفاظت فرما۔

اے اللہ! گناہوں کی نفرت ہمارے قلوب کے اندر بٹھادے۔ اے اللہ! ہم تو بہت گنہگار ہیں ، تمام گناہوں کو معاف فرما۔ اے اللہ! پورے پوری مغفرت فرمادے۔ اے اللہ! تو ہم سے راضی ہوجا۔ اے اللہ! ہم پر اپنا خصوصی فضل فرمادے۔

اے اللہ! تو ہماری، ہمارے والدین کی، ہمارے اہل وعیال کی، ہمارے بھائی بہنوں کی، ہمارے اعزاء واقارب کی، ہمارے اساتذہ ومشائخ کی، دوست واحباب کی، محسنین و متعلقین کی، جنہوں نے ہم کو دعاؤں کے لیے کہا یا لکھا، یا جو ہم سے دعاؤں کی توقع اور امید رکھتے ہیں ان کی اور تمام مؤمنین ومؤمنات، مسلمین ومسلمات پوری امتِ محمدیہ کی مغفرت فرما۔ اے اللہ! تو ہمارے چھوٹے اور بڑے، ظاہر وپوشیدہ اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کو معاف فرما۔ ہماری سیئات کو حسنات سے مبدّل فرما۔

اے اللہ! تو ہماری تمام اولاد کو علومِ نافعہ، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ فاضلہ سے مالامال فرما۔ اپنی شانِ ربوبیت سے ان سب کی بہترین تربیت فرما۔ برے اخلاق سے، برے کردار وگفتار سے، برے عادات واطوار سے، بری صحبتوں اور برے ماحول کے برے اثرات سے، اور برے لوگوں کی بری عادتوں کا نشانہ بننے سے ان کی پورے پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہمارے اہل وعیال کی طرف سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی فرما۔

اے اللہ! ہم سب کو صحت وقوت اور عافیت وسلامتی عطا فرما۔ ہر قسم کی ظاہری باطنی، روحانی جسمانی بیماریوں سے ہمیں شفاءِ کلّی عطا فرما۔

اے اللہ! ہر قسم کی برائیوں سے ہماری حفاظت فرما۔ اے اللہ! اس زمانہ کے روز مرّہ پیش آنے والے نئے نئے فتنوں سے ہماری پوری پوری حفاظت فرما۔ ہمارے ایمان کی، ہمارے اعمالِ صالحہ کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہم پر اپنا خصوصی فضل فرما۔

اے اللہ! تیرے دین کے لیے محنت کرنے والا ہمیں بنا دے۔ اے اللہ! تیرے دین ہی کے لیے اپنی صلاحیتوں کا استعمال کرنے والا بنا دے۔ اے اللہ! تیری دی ہوئی ساری نعمتوں اور صلاحیتوں کو تیرے دین ہی کے لیے استعمال کرنے کی توفیق عطا فرما دے۔

اے اللہ! تمام مدارسِ عربیہ، مکاتبِ قرآنیہ، مراکزِ دینیہ، خانقاہوں اور مساجد کی، تبلیغی اور دینی مراکز کی اور اے اللہ! تیرے دین کا کام جہاں کہیں بھی جن شکلوں میں ہو رہا ہے اور تیرے یہاں مقبول وپسندیدہ ہے ان سب کی بھرپور حفاظت فرما۔ کام کرنے والوں کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما۔ اے اللہ! جہاں مساجد کی ضرورت ہے ان کی تعمیر کی شکلیں پیدا فرما۔ جہاں مکاتب کا قیام ضروری ہے وہاں ان کے قائم ہونے کی صورتیں پیدا فرما۔ جہاں تبلیغی سلسلے جاری ہیں ان کی بھرپور نصرت فرما۔ اے اللہ! مدارس کی، مکاتب کی، تبلیغی جماعت کی، خانقاہوں کی اور مساجد کی؛ ہر قسم کے فتنوں سے پوری حفاظت فرما۔ اے اللہ! ان کاموں میں لگے ہوؤں کو اخلاص و استقامت، ہمت وحوصلہ عطا فرما۔ ان سب کی تمام ضروریات کی اپنے خزانۂ غیب سے کفالت فرما۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما دے۔ اے اللہ! باطل طاقتوں کو ختم فرما دے۔ اے اللہ! اسلام

اوراہلِ اسلام کی بھرپور نصرت فرما۔اے اللہ! پورے عالم میں ان کے تعلق سے جوجو غلط فہمیاں پھیلائی گئی ہیں، اے اللہ! عافیت کے ساتھ ان کو دور فرمادے۔

اے اللہ! مسلمانوں کو عزت و سرخروئی والا مقام عطا فرما۔ ذلتوں سے حفاظت فرما۔اے اللہ! حضوراکرم (ﷺ) کا امتی جہاں کہیں بھی ہو،اس کے ایمان واسلام کی،جان ومال کی،عزت وآبرو کی، اہل وعیال کی، تجارت وزراعت وکاروبار کی اوراس سے متعلق ہر چیز کی پوری پوری حفاظت فرما۔

اے اللہ! حرمین شریفین کی حفاظت فرما۔اے اللہ! ہمارے عراقی بھائیوں کی اور فلسطینی بھائیوں کی بھرپور نصرت فرما۔اے اللہ! پورے عالم میں جہاں کہیں بھی مسلمان مظلومیت کا شکار ہیں ان کی نصرت فرما۔اے اللہ! مسلمان کو ظالم اور مظلوم بننے سے محفوظ فرمادے۔اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرمادے۔اے اللہ! امن وامان کی فضائیں قائم فرما۔اے اللہ! ایمان واسلام کی دعوت کو ہمارے غیر مسلم بھائیوں تک پوری دل سوزی کے ساتھ پہنچانے کی ہمیں توفیق عطا فرما۔اوراس کے لیے مناسب تدبیریں اختیار کرنے کی توفیق عطا فرما۔

اے اللہ! بیماروں کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔اے اللہ! جو جس بیماری میں مبتلا ہے ان سب کو مکمل طور پر شفا عطا فرما۔اے اللہ! جو لوگ آسیب وسحر کا شکار ہیں ان کو اس کے اثرات سے نجات عطا فرما۔جو لوگ مہلک بیماریوں میں ہیں ان کو صحتِ کاملہ عاجلہ مستمرہ عطا فرما۔

اے اللہ! جو مقروض ہیں ان کے قرضوں کی ادائیگی کی شکلیں پیدا فرما۔ عافیت کے ساتھ ان کے قرضے اپنے خزانۂ غیب سے ادا کروا دے۔

اے اللہ! جو کاروبار میں گھاٹے کا شکار ہیں اے اللہ! ان کے گھاٹے کو دور فرما کر دوبارہ نفع بخش تجارت ان کو عطا فرما دے۔ اے اللہ! کاروباری لائن سے جتنے بھی تیرے بندے پریشانیوں میں مبتلا ہیں ان کی پریشانیوں کو دور فرما دے۔ اے اللہ! سب کو حلال برکت والی کشادہ روزی عطا فرما۔ حرام سے مکمل حفاظت فرما۔ ہماری تمام ضروریات کی اپنے خزانۂ غیب سے کفالت فرما کسی کا محتاج اور دست نگر نہ بنا۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما دے۔

اے اللہ! جن کی اولادیں نافرمان ہیں ان کی اولاد کو مطیع و فرمانبردار بنا کر ماں باپ کی آنکھوں کو ٹھنڈا فرما دے۔ اے اللہ! جنہوں نے اپنی اولاد کو حصولِ علمِ دین کے لیے وقف کیا ہے، اے اللہ! ان کی یہ تمنائیں اپنی اولاد کی طرف سے پوری فرما۔ ان کی ان تمام اولاد کو علومِ نافعہ، اعمالِ صالحہ، اور اخلاقِ فاضلہ سے مالا مال فرما، ان کی طرف سے ماں باپ کی آنکھیں ٹھنڈی فرما۔ بری صحبتوں سے ان کی حفاظت فرما۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما دے۔

اے اللہ! جو بے اولاد ہیں ان کو اولادِ صالح عطا فرما۔ جو نرینہ اولاد کے خواہش مند ہیں ان کو نرینہ اولاد عطا فرما۔ جن کی اولاد شادی کی عمر کو پہنچ چکی ہے۔ سب کو صالح جوڑ عطا فرما۔ جن کے لیے شادی کے اسباب نہیں ہیں عافیت کے ساتھ ان کو نکاح کے اسباب مہیا فرما۔ اے اللہ! جن کی ازدواجی زندگی تلخی کا شکار ہے ان کو ازدواجی زندگی کی حقیقی مسرتیں عطا فرما۔ جو بے گھر ہیں ان کو

گھر عطا فرما۔ جو بے سہارا ہیں ان کو سہارا عطا فرما۔ جو جس مصیبت میں گرفتار ہے، اے اللہ! اس کو اس سے نجات عطا فرما۔

اے اللہ! تیرے بے شمار بندے قید و بند میں محبوس ہیں، اے اللہ! محض اپنے فضل سے ان کی رہائی کی شکلیں صورتیں پیدا فرما دے۔ اے اللہ! جو مقدمات میں ماخوذ ہیں ان کو عافیت کے ساتھ بری فرما دے۔ اے اللہ! اپنا خصوصی فضل فرما دے۔ پورے عالَم میں تیری اور تیرے دین کی نسبت پر تیرے جن بندوں کو گرفتار کیا گیا ہے اے اللہ! عافیت کے ساتھ ان کو رہائی عطا فرما دے۔ اے اللہ! سب پر اپنا فضل فرما۔

اے اللہ! ہم سب سے راضی ہو جا۔

اے اللہ! تیرے جن جن بندوں کی جو جو حاجتیں ہیں، سب کے دلوں کے بھید سے اور دلوں کے حال سے تو واقف ہے اور تیرے خزانے بھرے ہوئے ہیں، اے اللہ! سب کی جائز مرادیں محض اپنے فضل و کرم سے پوری فرما۔

اے اللہ! تیرے جن بندوں نے دعاؤں کے لیے کہا یا لکھا، یا توقع اور امید رکھتے ہیں ان سب کی جائز مرادیں پوری فرما دے۔

اے اللہ! یہ سلسلہ جب سے چلا ہے، تو نے محض اپنے فضل سے آج اس کتاب کی تکمیل کی سعادت عطا فرمائی، اے اللہ! اس کے ترجمہ و تشریح میں کوئی کوتاہی اور غفلت ہوئی ہو تو محض اپنے

فضل سے معاف فرما۔ اور جو کچھ بھی ہوا ہے اس کو محض اپنے فضل سے قبول فرمالے اور آئندہ مزید کی توفیق عطا فرمادے۔ اس پر عمل کی توفیق عطا فرما۔ اے اللہ! تیرے تمام بندوں، کو سننے والوں سنانے والوں کو اور اس کے لیے سعی کرنے والوں کو بے انتہاء قبول فرمالے۔

اے اللہ! حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جتنی خیر و بھلائی آپ سے مانگی، وہ سب ہمیں اور پوری امت کو عطا فرما۔ اور جن شرور و برائیوں سے پناہ چاہی، ان سے ہماری اور پوری امت کی بھرپور حفاظت فرما۔ اے اللہ! ہماری دعاؤں کو محض اپنے فضل و کرم سے قبول فرما۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خاتمہ

اُسی کے فضل سے آغاز کا انجام ہوتا ہے
اُسی کی مہربانی سے جہاں کا کام ہوتا ہے

خداوندی تعلیم وہدایت کا جو سرمایہ خاتم النبیین، فخر دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طفیل دنیا کو میسرا ہوا اس کے دو جزء ہیں: (۱) "قرآن مجید" جو لفظاً و معنیً کلام اللہ ہے۔ (۲) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وہ ارشادات اور آپ کی وہ تمام قولی و عملی ہدایات وتعلیمات جو آپ، اللہ تعالیٰ کے نبی ورسول، اس کی کتاب کے معلّم وشارح اور اس کی مرضی کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے امت کو دیتے تھے، آپ کی تعلیمات وہدایات کے اس حصہ کا نام وعنوان "حدیث اور سنت" ہے۔

نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اپنی عمر طبعی گزار کر اس دنیا سے تشریف لے گئے؛ لیکن ہمیشہ کے لیے انسانی دنیا کی رہنمائی کے واسطے اپنی لائی ہوئی تعلیم وہدایت کے یہ دونوں سلسلے یعنی قرآنِ کریم اور حدیث شریف اپنے پیچھے چھوڑ گئے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے ذریعہ روشنی اور ہدایت عام کرنے کے ہر دَور میں ظاہری وباطنی انتظامات فرمائے، کہ یہ غور وتدبر کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی اور حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے معجزوں میں سے ایک زندہ معجزہ ہے۔

ان ہی خداوندی انتظامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جس دَور میں کتاب وسنت کی جس قسم کی ضرورت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کے دلوں میں اس کا داعیہ پیدا کرکے ان کو اس کی طرف متوجہ فرمادیتے ہیں، عہدِ نبوی سے لے کر اس وقت تک قرآن شریف وحدیث نبوی کی خدمتیں جن جن مختلف شکلوں میں انجام دی گئی ہیں، اگر کوئی تفکر کی نگاہ سے دیکھے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ جو کچھ ہوا، ہر دَور کی ضرورتوں کا ایک خداوندی انتظام تھا اور ہے، اور جن بندوں کے ذریعہ ہوا وہ صرف اور صرف آلہ کار ہیں:

کارِ زلفِ تست مشک افشانی اما عاشقاں
مصلحت راتہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

ترجمہ: در حقیقت مشک آگیں خوشبو بکھیرنا تیری ہی زلفوں کا کمال ہے؛ لیکن یاروں نے کسی مصلحت سے یہ الزام غزالانِ دشت (جنگل کے ہرن) پر لگا رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے اسی دَور میں اپنے ایک ناتواں بندے سے حدیثِ نبوی کی ایسی خدمتیں کرائیں جن کی اس دَور میں ضرورت تھی، اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ "حدیث کے اصلاحی مضامین" ہیں، جس کا پس منظر اور تکمیل کی کارگزاری آگے آرہی ہے۔

اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں اظہارِ شکر ومسرت کے لیے سجدہ ریز ہوں کہ اپنے ناتواں اور نااہل بندے سے ایک اہم کام لے لیا، یہ موقع انتہائی خوشی ومسرت کا ہے، اس موقع پر خوشی کے اظہار کی اصل موجود ہے، اور اکابر علمائے امت کا تعامل بھی۔ جس کی تفصیل یہ ہے:

تکمیل پر اظہارِ مسرت کی اصل

تاریخِ اسلام میں ایسے مبارک دنوں کی کمی نہیں تھی جن کی خوشی ہر سال اجتماعی طور پر منائی جاسکے، دنیا ہی کا نہیں اس پوری کائنات کا سعید ترین دن وہ تھا جس میں سرورِ کائنات فخرِ دوعالم حضرت نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) اس دنیا میں تشریف لائے، یا وہ دن تھا جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت کا عظیم منصب عطا فرمایا گیا، اور دنیا کے لیے آخری پیغامِ ہدایت قرآن کریم کی شکل میں نازل ہونا شروع ہوا، اس دن کی عظمت بھی ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدینۂ منورہ کو اپنا مستقر بنا کر پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی، اسی طرح اس دن کی شان وشوکت کا کیا ٹھکانہ جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے تین سو تیرہ نہتے جاں نثاروں نے بدر کے میدان میں باطل کے مسلح لشکر کو شکستِ فاش دی اور جسے خود قرآنِ کریم نے "یوم الفرقان" (یعنی حق وباطل کے درمیان امتیاز کا دن) قرار دیا، اس دن بھی مسلمانوں کی بے انتہا فرحت ومسرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جب مکۂ مکرمہ فتح ہوا اور کعبے کی چھت سے پہلی بار حضرت بلالؓ کی اذان گونجی؛ غرض آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتِ طیبہ میں ایسے جگمگاتے ہوئے دن بے شمار ہیں جنھیں مسلمانوں کے لیے جشنِ مسرت کی بنیاد بنایا جاسکتا تھا؛ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حضور سرورِ دوعالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیاتِ طیبہ کا ہر دن عظیم تھا، جس میں مسلمانوں کو کوئی نہ کوئی دینی یا دنیوی دولت نصیب ہوئی۔

لیکن اسلام کی یہ شان نرالی ہے کہ، پوری امت کی سالانہ عید مقرر کرنے کے لیے اِن میں سے کسی دن کا انتخاب نہیں کیا گیا، اور دینی طور پر مسلمانوں کی لازمی سالانہ عید مقرر کرنے کے لیے یکم شوال اور ۱۰/ ذی الحجہ کی تاریخیں منتخب کی گئیں، جن سے بہ ظاہر تاریخ کا کوئی امتیازی واقعہ وابستہ نہیں تھا؛ بلکہ یہ دودن ایسے مواقع پر مقرر کیے گئے جن پر پوری امت ایک ایسی اجتماعی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتی ہے جو سال میں ایک بار ہی انجام دی جاتی ہے، عید الفطر اس وقت منائی جاتی ہے جب مسلمان رمضان المبارک میں نہ صرف روزوں کی تکمیل کرتے ہیں؛ بلکہ اس مقدس مہینے کے ایک تربیتی دور سے گذر کر اپنی روحانیت کو جلا بخشتے ہیں، اور عید الاضحی اس وقت منائی جاتی ہے جب ایک دوسری سالانہ عبادت یعنی حج کی تکمیل ہوتی ہے، اور لاکھوں مسلمان عرفات کے میدان میں اپنے پروردگار سے مغفرت کی دعائیں کر کے ایک نئی زندگی کا آغاز کر چکے ہوتے ہیں، اور جو لوگ براہ راست حج میں شریک نہیں ہوسکے وہ قربانی کی عبادت انجام دیتے ہیں۔ اس طرح اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے سالانہ عید منانے کے واسطے کسی ایسے دن کا انتخاب نہیں کیا جو ماضی کے کسی یادگار واقعہ سے وابستہ ہو، اس کے بہ جائے مسلمانوں کی عید ایسے واقعات سے وابستہ کی گئی ہے جو تکمیل عبادت سے متعلق ہے۔

اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا: اس آیت کے نزول کی خاص شان ہے: عرفہ کا دن ہے جو تمام سال کے دنوں میں "سید الایام" ہے، اور اتفاق سے یہ عرفہ جمعہ کے دن واقع ہوا جس کے فضائل معروف ہیں، مقام میدان عرفات کا جبل

رحمت کے قریب ہے جو عرفہ کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے نزولِ رحمت کا خاص مقام ہے، وقت عصر کے بعد کا ہے جو عام دنوں میں بھی مبارک وقت ہے، اور خصوصاً یوم جمعہ میں کہ قبولیتِ دعا کی گھڑی بہت سی روایات کے مطابق اسی وقت آتی ہے، اور عرفہ کے روز اَور زیادہ خصوصیت کے ساتھ دعائیں قبول ہونے کا خاص وقت ہے، حج کے لیے مسلمانوں کا سب سے بڑا پہلا عظیم اجتماع ہے جس میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ صحابہٴ کرام رضی اللہ عنہم شریک ہیں، رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) صحابہٴ کرام کے ساتھ جبلِ رحمت کے نیچے اپنی ناقہٴ عضباء پر سوار ہیں، اور آپ حج کے بڑے رکن یعنی وقوف عرفات میں مشغول ہیں؛ان فضائل وبرکات اور رحمتوں کے سایہ میں یہ آیتِ کریمہ رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی۔

ایک مرتبہ چند علمائے یہود حضرت فاروقِ اعظمؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ: تمھارے قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر یہود پر نازل ہوتی تو وہ اس کے نزول پر ایک ”جشنِ عید“ مناتے، فاروق اعظمؓ نے سوال کیا کہ: وہ کون سی آیت ہے؟ انھوں نے یہی آیت الیوم أکملت لکم دینکم پڑھ دی، حضرت فاروق اعظمؓ نے ان کے جواب میں فرمایا کہ: ہاں ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت کس جگہ اور کس دن نازل ہوئی؟ اشارہ اسی بات کی طرف تھا کہ وہ دن ہمارے لیے دوہری عید کا دن تھا: ایک عرفہ، دوسرے جمعہ۔

اس کائنات میں اکمالِ دین اور اتمامِ شریعت کے مبارک دن سے کوئی بڑا بابرکت دن نہیں ہو سکتا، اس مسعود دن میں حضرات صحابہٴ کرامؓ بے حد مسرور وخوش ہوئے، تفسیر رازی وغیرہ

کے الفاظ ہیں: روي أنه (صلى الله عليه وسلم) لما قرأ هذه الآية على الصحابة فرحوا جدا وأظهروا السرور العظيم یعنی بیان کیا گیا ہے کہ: نبیٔ کریم (صلى الله عليه وسلم) نے جب آیت کریمہ الیوم أكملت إلخ صحابہ رضی اللہ عنہم کو پڑھ کر سنائی، تو صحابہ رضی اللہ عنہم خوش ہوئے اور بے حد مسرت کا اظہار فرمایا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی دینی نعمت کے حصول پر مختلف انداز سے مسرت کا اظہار صرف جائز ہی نہیں؛ بلکہ امرِ مستحسن ہے۔ نبیٔ کریم (صلى الله عليه وسلم) کے مبارک ارشادات اور قولی و عملی ہدایات وتعلیمات، قرآن مجید ہی کی شرح وبیان ہے۔ آج احادیث مبارکہ کا ایک مستند مجموعہ (ریاض الصالحین اور اس کی تشریح) پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس پر ہم جتنے خوش ہوں کم ہے۔

حضرات اکابر کا معمول

متقدمین نے ایسے مبارک مواقع پر مختلف انداز سے خوشی کا اظہار کیا، کتبِ تواریخ وسیر میں کسی تصنیف کی تکمیل پر جشن منانے کے واقعات موجود ہیں، اکابر علمائے دیوبند، ہمارے سلسلے کے بزرگوں اور موجودہ اکابر کے واقعات میں بھی کسی کتاب کے اختتام پر اظہارِ مسرت اور انعقادِ تقریب کے دل چسپ نمونے موجود ہیں جو ہمارے لیے بہترین اسوہ ہیں۔

تکمیلِ بذل المجہود پر حضرت سہارن پوریؒ کا اظہار مسرت اور دعوت

(۱) سنن ابی داود کی بے شمار شروحات لکھی گئی ہیں، جن میں مختصر اور مفصل ہر طرح کی شروح موجود ہیں؛ لیکن دورِ آخر میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری ثم مہاجر مدنیؒ نے ”بذل المجہود“ کے نام سے جو شرح لکھی ہے، وہ اپنی جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ ”بذل المجہود“ مکمل ہونے پر حضرت سہارنپوریؒ کس قدر مسرور تھے اس کا اندازہ حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی میرٹھیؒ کی تحریر سے کیجیے، فرماتے ہیں:

”بذل کے ختم پر حضرت کو اس درجہ مسرت وخوشی ہوئی کہ جس کا مقابلہ دنیا کی بڑی سے بڑی خوشی نہیں کرسکتی، ہفت اقلیم کی سلطنت کا ملنا انتہائے خوشی کا محاورہ استعمال کیا جاتا ہے؛ مگر اہل اللہ کو دنیوی لذتوں کے حصول میں تو خوشی مفقود ہوجاتی ہے؛ اس لیے میرے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے حضرت کی اس خوشی کا اندازہ ناظرین کو کراسکوں“۔

آپ نے ختم پر ۲۳/ شعبان یوم جمعہ کو علمائے مدینہ اور احباب حاضرین کی ضیافت کا سامان کیا، اور خاص اپنے پیسہ سے اور بڑے اہتمام کے ساتھ عربی طرز کی ضیافت کا سامان کیا، کہ آپ کا رُواں رُواں شکرِ الٰہی میں چور اور انعامِ باری تعالیٰ پر اتنا فرحاں ومسرور تھا کہ اس کا اندازہ وہیں کے رہنے والے حاضر باش حضرات نے کیا ہوگا۔ آپ نے دعوت کے خطوط طبع کرائے اور ایک بڑے پیمانہ پر ”جیرانِ رسول“ کی میزبانی کا شوق پورا کیا۔

اِس خوشی کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان دعوتی خطوط میں حضرت نے اپنے ہندی خدام کو بھی فراموش نہ فرمایا، اور ہر چند کہ سمندر پار شرکت محال تھی؛ مگر اس اطلاع کے لیے کہ حق تعالیٰ نے یہ مبارک وقت دیکھنا نصیب فرمایا جس کی بہ ظاہرِ اسباب کوئی توقع نہ تھی، اس کی خوشی میں اپنے جن دوستوں کو ہندوستان رہتے وقت شریکِ دعوت فرماتے، ان کو بھی خطوط بھیجے کہ تصور وخیال میں تو وہ شریکِ ضیافت تھے ہی، چناں چہ بندۂ ناچیز کو بھی دعوتی خط بھیجا اور تحریر فرمایا کہ:

”گزشتہ ہفتہ میں بحمد اللہ ”بذل المجهود“ کی پانچویں جلد سے بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے فراغت ہوگئی، فالحمد للّٰه علیٰ ذلك. بدھ کو اختتام ہوا، اور جمعہ کو مدینۂ منورہ کے علما وفضلا کی دعوت کا جلسہ قرار پایا۔ بہ جز کھانے کے اَور کسی تقریر وغیرہ کا نظم نہیں کیا گیا؛ البتہ دعوتی خطوط طبع کیے گئے، جو آپ حضرات کی مسرت کے لیے آپ کے پاس بھی ارسال ہیں“۔

مولانا سید احمد صاحب مہاجر فیض آبادی نے -جن کے مکان پر حضرت کا قیام تھا اور وہ حضرت کی اس روحانی مسرت کا پہلے سے خوب اندازہ فرما رہے تھے- بندہ کو اس طرح تحریر فرمایا:

”تعلیقِ ابوداود قریب الختم ہے، حضرت مُدّ ظلّہ کی طرف سے سب خدام کی دعوت ہوگی، کاش! آپ بھی رونق افروز ہوتے۔ غالب گمان ہے کہ ۲۵/ شعبان سے پہلے ختم ہو جائے گی؛ لہٰذا اس تاریخِ مذکورہ تک عریضہ پہنچنا تو مشکل معلوم ہوتا ہے؛ اس لیے جب بھی عریضہ پہنچ جائے آپ اس خوشی کی دعوت کی نیت سے اچھے اچھے کھانے گھر میں پکوا کر سب گھر بھر مل کر کھا لیجیے۔ ہم دور افتادوں کو بھی یاد کر لیجیے، جس طرح کہ ہم آپ کو یاد کیے بغیر نہیں رہیں گے۔ فقط“

بہر حال! اس خوشی کے وقت حضرت نے اپنے اُن خدّام کو جو نظروں سے دور تھے؛ مگر دل سے دور نہ تھے، اس طرح شریک کیا کہ دعوتی خطوط ہر ایک کے نام جدا جدا آئے، اور لکھا کہ خیالی شرکت تم صاحبوں کی ضرور ہے، اور مسرت کے لیے خطِ مطبوعہ ارسال ہے۔ وہ مطبوعہ خط جو مدینۂ منورہ کے مطبعة طيبة القيحاء میں طبع ہوا، اور مدعو کا نام قلم سے لکھنے کے لیے جگہ چھوٹی ہوئی تھی، یہ تھا:

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وحده والصلاة والسلام على من لا نبي بعده عالی

حضرت الشيخ.............................المحترم مد فيوضهم

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته

وبعد: فقد منّ الله على الداعي أن مَنَحَه بتاليف بذل المجهود في حل أبي داود، وجعل ختامه ببلدة صاحب المعجزات عليه وعلى آله أفضل الصلوات وأزكى التسليمات، جعله الله خالصا لوجهه الكريم ونفع به الإسلام والمسلمين آمين.

فنؤمل تشريفكم بعد صلاة الجمعة في ٢٣ شعبان ١٣٤٥ه إلى مدرسة العلوم الشرعية الكائنة في زقاق البدور لتناول ما حضر؛ إتماما للمسرة بقدومكم وشكراً لله تعالى.

والسلام

داعيكم: خادم الطلبة خليل أحمد عفي عنه

ترجمہ: سلام کے بعد! عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اِس داعی پر احسان فرمایا کہ ”بذل المجهود فی حل ابي داود“ کی تالیف عطا فرمائی اور اُس کا اختتام صاحبِ معجزات (ﷺ) کے شہر میں قرار دیا، اللہ تعالیٰ اس کو صرف اپنی کریم ذات کے لیے قرار دیں اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کو نفع پہنچائیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ۲۳ر شعبان ۱۳۴۵ھ جمعہ کی نماز کے بعد ”مدرسۃ العلوم الشرعیۃ“ واقع: گلی زقاق البدور میں ماحضر تناول فرمانے کے لیے تشریف لائیں؛ تاکہ آپ کی تشریف آوری سے مسرت کی تکمیل ہو اور حق تعالیٰ شانہٗ کا شکر ادا ہو۔

والسلام

الداعي: طلبہ کا خادم خلیل احمد عفی عنہٗ

لامع الدراری کی تکمیل پر حضرت شیخ کی شادمانی

حضرت سہارنپوری کے فیضِ صحبت کا نتیجہ تھا کہ، بقیۃ السلف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ -جو اکابر علمائے دیوبند کی ایک ایک ادا پر قربان ہونے کو اپنی سعادت جانتے تھے- نے جب ۱۳۸۸ھ میں ” لامع الدراری علیٰ جامع البخاری“ پر تعلیقات کا اختتام کیا (یہ لامع حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے افادات درس بخاری ہیں، حضرت گنگوہیؒ نے آنکھوں میں نزولِ آب کی حالت میں حضرت مولانا یحییٰ صاحبؒ کو صحاح ستہ پڑھائی تھی، اس کی تقریر کو حضرت مولانا نے درس کے بعد عربی زبان میں محفوظ کر لی تھی، جس کو بعد میں حضرت شیخ

نے اپنے قیمتی حواشی اور وجیز مقدمہ کے ساتھ مزین کر کے طبع فرمایا تھا۔ اس موقع پر حضرت شیخؒ نے بڑی مسرت کے ساتھ بہ طورِ شکرانہ شاندار دعوت کا اہتمام فرمایا تھا۔

تکملۂ فتح الملہم کی تکمیل پر شیخ الاسلام کا سرور وابتہاج

۱۴۱۵ھ میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب عثمانی دامت برکاتہم نے صحیح مسلم کی نادر المثال شرح (فتح الملہم) کی تکمیل فرمائی، تو جامع مسجد دارالعلوم کراچی میں اظہارِ تشکر و مسرت کے طور پر تاریخی تقریب منائی، جس میں بڑے بڑے علما موجود تھے، جنھوں نے حضرت مولانا عثمانی کو مبارک بادیاں پیش فرمائیں اور خود حضرت نے ”ایک خوشی کا واقعہ“ سے اِس پر مضمون لکھ کر ”جنگ“ اخبار میں شائع کروایا، جو بعد میں ”فکر و نظر“ کے مجموعۂ مضامین میں شامل کیا گیا۔ وہ اپنے اس مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

”میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کے حکم سے اللہ تعالیٰ کے نام پر ۱۹۷۶ء میں اِس شرح کی تکمیل کا کام شروع کیا تھا، ”تکملۂ فتح الملہم“ کے نام سے اس کی چار ضخیم جلدیں اب تک شائع بھی ہوچکی ہیں، اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر میں بہ مشکل ڈیڑھ، دو گھنٹہ یومیہ اس کام میں صرف کرپاتا تھا اور پے درپے سفروں کی وجہ سے بیچ میں طویل وقفے بھی آجاتے تھے؛ لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اٹھارہ سال نو مہینے کے بعد اِس ہفتے [۳۰/ اگست

۱۹۹۴ء کو] یہ کام پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا، ایک طویل سفر کے مسافر کو منزل پر پہنچ کر جو سرور اور سکون میسر آتا ہے دِل نے چاہا کہ اپنے قارئین کو بھی اس کی مسرت میں شریک کروں الخ‘‘

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی دامت برکاتہم تو مارے خوشی کے بے تحاشا رو پڑے، چناں چہ فرماتے ہیں:

جس دن انہوں نے یہ کام (تکملۂ فتح الملہم) مکمل کیا، ظہر سے پہلے کا کچھ وقت تھا، یہ (مؤلف مدظلہ) خوشی خوشی سارے مسودے اٹھا کر میرے پاس تشریف لائے، جب انہوں نے یہ سارے رجسٹر میرے سامنے رکھے تو میں بے تحاشا رو پڑا، کہ آج دنیا میں اس کی قدر کرنے والے شاذ و نادر ہی رہ گئے، آج ان اکابر کا سایہ بھی ہمارے سروں سے اٹھ چکا ہے جن کی تمنائیں بار آور ہوئیں‘‘۔

بہر حال! ریاض الصالحین کی اس شرح کی تکمیل پر خوشی کا اظہار ایک فطری امر ہے، اس سلسلہ میں بھی مذکورہ اکابر کے نمونے ہمارے سامنے ہیں، احقر نے چوں کہ اس شرح میں جگہ جگہ ہمارے اکابر کے واقعات ملفوظات کا سہارا لیا ہے، ان سے استدلال کیا ہے؛ اس لیے خاتمہ میں بھی ان کا مبارک اسوہ ذکر کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔ حاشا و کلّا ان واقعات سے ہر گز یہ مقصود نہیں کہ ’’حدیث کے اصلاحی مضامین‘‘ ان کی کتب کے ہم پلہ ہے۔

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک　　　کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر

گرچہ ماند در نوشتن شَیر و شِیر

پاک حضرات کے کاموں کو اپنے اوپر قیاس مت کر، اگرچہ لکھنے میں شَیر اور شِیر ایک ہی طرح لکھے جاتے ہیں؛ لیکن شیر آدمی کو کھاتا ہے، اور شِیر (دودھ) کو آدمی استعمال کرتا ہے۔

"بذل المجہود" سے صرف ظاہری اِتنی مناسبت ہے کہ "بذل" کی تکمیل مدینہ منورہ کی مبارک فضا میں ہوئی اور احقر کی اِس کتاب کا آخری درس مسجدِ نبوی علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلاماً کے صحن میں لکھا گیا، کیا بعید ہے کہ باری تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے بابرکت جگہ میں بابرکت بندوں کے ساتھ مشابہت کو قبول فرما کر نواز دیں۔

تیرے خلیل کی یارب! شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں

کتاب کا پس منظر

سیدی ومولائی فقیہ الامت حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی وفاتِ حسرت آیات (۱۴۱۷ھ) کے بعد سورت میں مقیم معتقدین و منتسبین خصوصاً محب مکرم مولانا محمد علی منیار زید مجدہم ومکارمہم (مجاز حضرت فقیہ الامتؒ) کا تقاضاواصرار رہا کہ، کسی ایک دن آپس میں مل بیٹھنے کی کوئی صورت نکالی جائے، اپنی نااہلیت کی بنا پر کچھ عرصہ تک اس کو عملی جامہ پہنانے میں تردّد رہا، اسی دوران حضرت اقدس قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہٗ (م ۱۴۱۹ھ) کا ورودِ مسعود ہوا، حضرت فقیہ الامت کے وصال کے بعد اہم امور میں احقر حضرت باندوی کی طرف رجوع کرتا تھا، احقر نے حضرت کا عندیہ معلوم کرنے کی غرض سے احباب کی مذکورہ خواہش اور اصرار کا تذکرہ کیا، تو حضرت نے بڑی حوصلہ افزائی کے ساتھ تاکید فرمائی کہ یہ سلسلہ ضرور شروع کیا جائے اور خوب دعائیں دیں، اس کے بعد کچھ ڈھارس بندھی اور ہمت کر کے شب یکشنبہ مل بیٹھنے کے لیے طے ہوئی۔ یہ رات طے کرنے کی وجہ لوگوں کی سہولت ہے، کاروباری اور ملازم حضرات عام طور پر اتوار کو فارغ ہوتے ہیں؛ اس لیے رات کو صبح کام کاج پر جانے کا فکر نہیں ہوتا ہے، اس پروگرام میں عشاء کی نماز کے بعد ”ریاض الصالحین“ سنانا طے پایا، نیت یہ تھی کہ احباب کی معیت میں دین کی باتوں کے مذاکرہ سے خود بھی مستفیض ہوں گا۔ اس مجلس میں ہونے والے حدیث کے مضامین کو بہ ذریعۂ کیسٹ ضبط کرنے کا اہتمام دوسری مجلس ہی سے عزیز مکرم

مولوی عبد المنان بن شیخ محمد منیار صاحب سلمہٗ (فاضلِ جامعہ ڈابھیل) نے کیا، جس کا سلسلہ اخیر تک برابر جاری رہا۔ اس وقت عزیز موصوف ہی نے بعض احباب کی حوصلہ افزائی اور ترغیب پر ان مجالس کو کیسٹ میں (اور بعد میں سی ڈی میں) محفوظ کر کے بہ غرضِ افادہ اس کو بالاقساط اشاعت کی خواہش ظاہر کی تھی، اور دیگر احباب نے بھی ان کی تائید کی، غور وخوض کے بعد اپنے لیے باعثِ اجر وثواب اور ذریعۂ نجات سمجھ کر احقر نے بھی اشاعت کی اجازت دے دی تھی، الحمدللہ یوں یہ سلسلہ جلد پندرہ پر اپنی انتہاء کو پہنچا۔

تشکر وامتنان

"ریاض الصالحین" شروع کرتے وقت دُور دُور تک وہم وگمان بھی نہیں تھا کہ آئندہ اسے محفوظ ومطبوع شکل دی جائے گی، اللہ تعالیٰ کے تکوینی نظام کے تحت جب یہ کام وجود میں آہی گیا تو:

اوّلاً: اللہ تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ اس نے اپنے بعض بندوں کے دلوں میں کتاب کے مضامین ضبط کر کے تنقیح وتہذیب کی توفیق بخشی؛ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ احقر کا اس میں کوئی دخل نہیں۔

ثانیاً: نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاک کلام کی برکت ہے، کہ جس کی تاثیر نے سامعین اور احباب کو متأثر کیا۔

ثالثاً: حضرت قاری سید صدیق احمد صاحب باندوی نور اللہ مرقدہ کی توجہات اور دعاؤں کی برکت جن کے ارشاد؛ بلکہ حکم سے یہ مبارک سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ اسی طرح حضرت اقدس سید

مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوریؒ کی دعا کی برکت ہے جو جلد اول کی تقریظ میں مرقوم ہے کہ: ’’اللہ کرے کہ بقیہ قسطیں بھی جلد از جلد منظر عام پر آویں‘‘۔

کتاب کے مضامین ضبط کرنے سے قابلِ طباعت بنانے میں جن جن احباب نے معاونت کی ہے ان کی فہرست طویل ہے، احقر ان تمام حضرات کا دل سے شکر گزار ہے، بالخصوص عزیز مکرم مولوی عبد المنان بن شیخ محمد منیار سلمہٗ سورتی کا، کہ موصوف نے شروع سے اخیر تک مضامین کی کتابت، تہذیب اور تیاری میں بہ طور خاص جس عرق ریزی کا مظاہرہ کیا ہے، اور جس قابلیت اور سلیقے کے ساتھ عناوین قائم کرنے میں محنت کی ہے، ان کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔

اسی طرح عزیز مکرم مفتی محمد طاہر سلمہٗ سورتی (فاضلِ جامعہ ڈابھیل) کا ممنون ہوں کہ ہر جلد کی ابتدا میں اداریہ تحریر کرکے اس جلد کے مضامین کا لب لباب اور عطر کشیدہ پیش کرنے میں غیر معمولی محنت اٹھائی ہے۔ اسی طرح دیگر مخلصین و محبین حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کسی بھی نوع کا تعاون پیش کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ ان تمام کو جزائے خیر عطا فرمائے، ان کو علم، عمر اور عمل میں ظاہری و باطنی ترقیات سے مالامال فرمائے، اور ان کو صدق واخلاص کے ساتھ دین کی خدمت کی بیش از بیش توفیقِ ارزانی نصیب کرے۔

میرے جن بزرگوں اور اہلِ علم نے کتاب پر تقاریظ لکھ کر میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے، اُن کا بھی دِل کی گہرائی سے ممنون ہوں کہ اُن حضرات نے احقر کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہوئے میری حیثیت سے بڑھ کر وقیع کلمات تحریر فرمادیے ہیں۔ فجزاهم الله تعالىٰ خيراً وّ أحسن الجزاء في الدارين

اپنے ناقص الفاظ میں دعا دینے کے بہ جائے دعا کرتا ہوں کہ: اللہ تعالیٰ تمام محسنین کو احادیث کی حفاظت اور نشر واشاعت کے بارے میں نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبانِ مبارک سے نکلے ہوئے حسبِ ذیل الفاظ مبارک اور مقبول دعا کا مصداق بنائے:

نضّر الله عبداً سمع مقالتي فحفظها ووعاها وأداها (اللہ تعالیٰ اُس بندہ کو تر و تازہ رکھے (یعنی اُس کی قدر و منزلت بڑھائے اور دین و دنیا میں اُس کو بہت زیادہ خوش وخرم رکھے) جس نے میری بات (حدیث) سنی، اور پھر اس کو یاد کیا اور ہمیشہ یاد رکھا اور پھر اس کو جس طرح سنا تھا اُسی طرح لفظ بہ لفظ دوسرے لوگوں تک پورا پورا پہنچایا (یعنی الفاظِ حدیث کی بھی روایت کی اور اُس کے معنیٰ و مراد اور مطالب بھی بتائے اور سمجھائے)۔

من حفظ علیٰ أمتي أربعين حديثا من أمر دينهم بعثهُ الله يوم القيامة فقيها عالما (جو شخص میری امت کے لیے امورِ دین سے متعلق چالیس حدیثیں حفظ کرلے، بروز قیامت اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو طبقۂ علماء وفقہاء کے زمرے میں سے اٹھائے گا)۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں یوں مذکور ہے کہ، نبیٔ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: من حفظ علیٰ أمتي أربعين حديثا مما يحتاجون إليه من الحلال و الحرام كتبه الله فقيها عالما (جو شخص میری امت کے لیے حلال وحرام کے مسائل سے متعلق چالیس ایسی احادیث یاد کرے، جن کی انہیں ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ اسے عالم اور فقیہ لکھ دے گا)۔

سیدنا ابن عباسؓ کی بیان کردہ روایت میں ہے کہ، رحمت دو عالم(ﷺ) نے فرمایا: من حفظ علیٰ أمتي أربعین حدیثا فی السنة کنتُ له شفیعا یوم القیامة(جو شخص میری امت کے لیے میری سنتوں سے متعلق چالیس احادیث یاد کرلے، بروز قیامت اس کی شفاعت کروں گا)۔

سیدنا عبد اللہ ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ شافعِ محشر(ﷺ) نے فرمایا:من حفظ علیٰ أمتي أربعین حدیثا ینفعهم الله بها قیل له أدخل من أی أبواب الجنة شئت(جو شخص میری امت کے لیے چالیس احادیث یاد کرلے جس سے اللہ پاک انہیں نفع دے، تو اس سے کہا جائے گا جس دروازے سے چاہے جنت میں داخل ہو جا)

وفی روایة ابن عمر: کُتِب فی زمرة العلماء وحُشِر فی جملة الشهداء. حضور اکرم(ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ:جو شخص میری امت کے فائدہ کے واسطے دین کے کام کی چالیس احادیث یاد کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو عالموں کی جماعت میں شامل فرمادے گا، اور قیامت کے دن شہیدوں کی جماعت میں اٹھائے گا۔

من حفظ ... کنتُ له یوم القیامة شافعا وشهیدا. (شعب الإيمان) جو شخص میری امت کے فائدہ کے واسطے دین کے کام کی چالیس احادیث یاد کرے گا، میں اس کے لیے سفارشی اور گواہ بنوں گا۔

(الروایات فی هذا الباب کثیرة بألفاظ مختلفة. انظر: کنز العمال، الباب الثالث فی آداب العلم، وفیه فصلان: الفصل الأول فی روایة الحدیث وآداب الکتابة)

اعتذار

اِس کتاب کے مطالعہ کے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے؛ بلکہ احباب کی مجلس میں بہ نیتِ درس کی ہوئی باتیں ہیں جو کیسٹوں اور سی ڈی کی مدد سے تیار کی گئی ہیں؛ لہٰذا اس کا اسلوب تحریری نہیں بلکہ خطابی ہے، خطاب برجستہ ہوتا ہے، جب تقریر مرتب کر کے لائی گئی تو اگرچہ اس پر نظرِ ثانی کی گئی ہے، پھر بھی اس میں ایک بشر ہونے کے ناطے زبانی تعبیر کی کمزوری رہنا مستبعد نہیں؛ بلکہ مسامحات کا ہونا قرینِ قیاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتاب: قرآن مجید کے علاوہ کسی بھی کتاب کے بارے میں تسامح سے خالی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔

امام مزنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: میں نے کتاب الرسالہ کو حضرت سیدنا امام شافعیؒ کی خدمت میں اَسّی سے زائد بار پڑھا، اِسی دوران آپ ہر بار کسی نہ کسی غلطی پر مطلع ہوتے رہے، یہاں تک کہ بالآخر تھک کر فرمانے لگے: هيه! أبى الله أن يكون كتابا صحيحا غير كتابه. لہٰذا اِس کتاب میں کسی صاحب کو غلطی نظر آئے تو مطلع فرما کر ممنون فرمائیں، احقر ایسے حضرات کو اپنا محسن سمجھے گا، اور ان کے شکریہ کے ساتھ آئندہ ایڈیشن میں تصحیح و تدارک کی کوشش کی جائے گی ان شاء اللہ۔ سرِ دست اس وقت دو تسامح کی نشان دہی کی جاتی ہے:

(۱) جلد ششم (ص: ۲۵۷) میں ”باب زيارة أهل الخير ومجالستهم وصحبتهم ومحبتهم“ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت یوشع علیہ السلام کے واقعہ میں ایک عنوان ”حضرت موسیٰ علیہ

السلام کی گوشمالی'' نام سے ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کے لیے گوشمالی کا لفظ مناسب نہیں، اس سے سوئے ادب کی بو آتی ہے، آئندہ ایڈیشن میں ان شاء اللہ یہاں عنوان میں یہ ترمیم کی جائے گی: ''حضرت موسیٰ علیہ السلام کو من جانب اللہ سبق''۔

(۲) اسی جلد میں ص/ ۲۵۵ میں چھپا ہے:

''حُقُب'' یہ ''حُقْبَۃٌ'' کی جمع ہے، تیس سال کو کہا جاتا ہے۔ اور ''حُقْبَۃٌ'' جمع ہے، اور عربی میں جمع کا صیغہ کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اِس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایک سو بیس سال ہو جاتے ہیں۔ انتھیٰ۔

آئندہ ایڈیشن میں ان شاء اللہ حسبِ ذیل ترمیم ہو گی:

حقباً، حقبة کی جمع ہے، اہل لغت نے کہا کہ: ''حُقْبَۃٌ'' اَسّی سال کی مدت ہے، بعض نے اُس سے زیادہ کو ''حُقْبَۃٌ'' قرار دیا، صحیح یہ ہے کہ زمانۂ دراز کو کہا جاتا ہے، تحدید و تعیین کچھ نہیں۔ (معارف القرآن، سورۂ کہف ۵/ ۶۰۹)

آخری گزارش

سنا ہے کہ بعض احباب ''حدیث کے اصلاحی مضامین'' کو مساجد ومجالس میں سنانے کا اہتمام کرتے ہیں، جب کہ بعض مدرسین ''ریاض الصالحین'' کے مطالعہ میں اس سے استفادہ کرتے ہیں، متعدد حضرات نے روبہ رو اور بذریعۂ فون کتاب کے مضامین کی افادیت کا اظہار بھی فرمایا، فللّٰہ الحمد والمنة. ایسے تمام باتوفیق ناظرین وسامعین سے گزارش ہے کہ: کتاب کا مطالعہ وسماعت خالص علمی سیر کے طور پر ہرگز نہ کیا جائے؛ بلکہ آں حضرت (ﷺ) کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے کے لیے اور عمل وہدایت اور اپنی اصلاح کی نیت سے کیا جائے، نیز مطالعہ کے وقت نبیٔ کریم (ﷺ) کی عظمت ومحبت کو دل میں ضرور مستحضر ومتصور کیا جائے، اور اس طرح ادب وتوجہ سے پڑھا جائے، سنا جائے کہ گویا حضور اقدس (ﷺ) کی مجلس اقدس میں حاضر ہیں، اور آپ ارشاد فرما رہے ہیں اور ہم سن رہے ہیں؛ اگر اس کا اہتمام کیا گیا تو اس کے انوار وبرکات روزِ روشن کی طرح ان شاء اللہ نقد نصیب ہوں گے۔ وباللّٰہ التوفیق۔

دل سے دعا ہے کہ: اللہ تعالیٰ کتاب کے مضامین کو ہم سب کے لیے مفید ونافع بنائے، اور آخرت میں ذخیرہ ونجات کا ذریعہ بھی۔ اٰمین بحرمة سید المرسلین وصلی اللّٰہ علیه وعلیٰ اٰله وأصحابه أجمعین.

أملاہ: العبد احمد خانپوری عفی عنہ

۳۰/ محرم الحرام ۱۴۴۳ھ قبیل الجمعہ

”حدیث کے اصلاحی مضامین“ کی تمام جلدوں کی اجمالی فہرست

جلد اول (۱)

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
۱	اخلاص	۳۳
۲	توبہ	۹۵
۳	صبر	۲۱۳

جلد دوم (۲)

۱	صدق	۳۱
۲	مراقبہ	۵۷
۳	تقویٰ	۱۳۱
۴	یقین وتوکل	۱۶۳
۵	استقامت	۲۳۷
۶	خدا کی مخلوق میں غور وفکر	۲۶۱
۷	نیکی کی طرف لپکنا	۲۶۷
۸	مجاہدہ	۳۲۷

جلد سوم (۳)

۱	اخیر عمر میں نیکیوں کی کثرت	۴۷
۲	نیکی کے راستے بہت ہیں	۶۳
۳	عبادات میں درمیانی راہ	۱۱۵
۴	اعمال کی پابندی	۱۷۵
۵	سنتوں کا اہتمام	۱۹۱
۶	حکم الٰہی کی تابعداری	۲۵۱
۷	بدعات سے ممانعت	۲۷۵
۸	کسی نیک یا برے عمل کی بنیاد ڈالنا	۳۰۱
۹	بھلائی کی طرف رہنمائی	۳۲۱
۱۰	نیکی اور تقویٰ میں مدد و تعاون	۳۴۳
۱۱	خیر خواہی اور بھلائی	۳۵۹
۱۲	بھلائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا	۳۷۱
۱۳	قول اور عمل میں تضاد پر سخت سزا	۴۲۹

جلد چہارم (۴)

۱	ادائے امانت کی تاکید	۳۳
۲	ظلم کی حرمت	۱۱۱
۳	مسلمانوں کی عزتوں کا احترام	۱۸۴
۴	پردہ دری کی ممانعت	۲۷۲
۵	مسلمانوں کی ضرورتیں پوری کرنا	۲۸۹
۶	سفارش کرنا	۲۹۶
۷	آپس کے تعلقات درست کرانا	۳۱۱
۸	خستہ حال مسلمانوں کی فضیلت	۳۸۱

جلد پنجم (۵)

۱	یتیم اور لڑکیوں کے ساتھ نرم روی ومہربانی	۳۳
۲	عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید	۱۰۵
۳	بیوی پر شوہر کے حقوق	۲۲۱
۴	اہل وعیال پر خرچ کرنا	۲۴۴
۵	محبوب اور عمدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کرنا	۲۹۵
۶	تعلیم وتربیتِ اولاد	۳۱۱
۷	پڑوسیوں کے حقوق کی تاکید	۳۵۱

جلد ششم (۶)

۱	والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادانہ کرنے کی حرمت	۲۹
۲	والدین کی نافرمانی اور رشتہ داری کے حقوق ادانہ کرنے کی حرمت	۱۱۵
۳	والدین، رشتہ داراور بیوی کے تعلق والوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید	۱۳۷
۴	اہلِ بیت کے اکرام کی فضیلت	۱۵۹
۵	علماء، بڑوں اور فضل وکمال والوں کا احترام وتعظیم کرنا	۱۸۹
۶	نیک لوگوں کی زیارت اور صحبت میں جانااوران سے محبت رکھنا	۲۴۷
۷	اللہ کے واسطے آپس میں محبت رکھنے کی فضیلت اوراس کی تاکید	۳۱۹
۸	اللہ تعالیٰ کی بندے سے محبت رکھنے کی نشانیاں	۳۷۱
۹	نیک اور کمزوروں کوتکلیف دینے سے اپنے آپ کو بچانا	۴۰۷
۱۰	ظاہر کے مطابق معاملہ کرودل کاحال اللہ کے حوالے کرو	۴۲۵

جلد ہفتم (۷)

۱	اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کا بیان	۳۳
۲	اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کا بیان	۷۷
۳	اللہ تعالیٰ سے اُمید رکھنے کی فضیلت	۲۰۹
۴	خوف اور امید کو جمع کرنا	۲۲۵
۵	اللہ تعالیٰ کی خشیت اور اس کی محبت میں رونے کی فضیلت	۲۳۹
۶	دنیا سے بے رغبتی کی فضیلت	۲۶۷
۷	بھوک وفاقہ برداشت کرنا اور سادہ زندگی بسر کرنا	۳۷۹

جلد ہشتم (۸)

۱	قناعت اختیار کرنا، سوال سے بچنا، معیشت میں میانہ روی	۳۹
۲	بغیر سوال اور اشرافِ نفس کے کوئی چیز ملے؛ اس کو لینا	۸۱
۳	کمانے کے لیے محنت کرنے اور سوال و سوالی جیسی صورت بنانے سے بچنے کی ترغیب	۸۹
۴	سخاوت اختیار کرنا اور اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتے ہوئے نیکی کے کاموں میں مال خرچ کرنا	۹۵
۵	بخل اور لالچ ملے ہوئے بخل کی مذمت	۱۳۹
۶	ایثار اور غم خواری	۱۴۵
۷	آخرت کے کاموں میں سبقت لے جانے اور برکت والی چیز کو زیادہ حاصل کرنے کا اہتمام کرنا	۱۵۷
۸	شکر گزار مالدار کی فضیلت	۱۶۳
۹	موت کے یاد کرنے اور تمناؤں کو مختصر کرنے کا بیان	۱۸۱
۱۰	مردوں کے لیے قبرستان جانے کا مستحب ہونا، اور وہاں کے اعمال	۲۱۵
۱۱	مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا	۲۳۳
۱۲	احتیاط سے کام لینا اور مشتبہ سے بچنا	۲۴۷

۱۳	خلوت گزینی کا مستحب ہونا	۲۷۳
۱۴	لوگوں سے اختلاط کی شرائط	۲۸۳
۱۵	تواضع اختیار کرنا	۲۹۱
۱۶	تکبر اور خود پسندی	۳۳۱
۱۷	اچھے اخلاق	۳۵۳
۱۸	حلم، وقار، نرمی	۳۷۵
۱۹	نادانوں کو معاف کرنا اور چشم پوشی سے کام لینا	۴۲۱
۲۰	پہنچائی جانے والی تکلیف کو برداشت کرنا	۴۳۵
۲۱	شعائرِ دین کی بے حرمتی کے وقت غصہ کرنا	۴۳۹

جلد نہم (۹)

۱	اصحابِ اقتدار اپنے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اختیار کریں، ان کی خیر خواہی اور ان کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ کریں، ان کو دھوکہ نہ دیں، بے جا سختی نہ کریں، ان کی مصالح سے پہلو تہی نہ کریں	۳۷
۲	انصاف سے پیش آنے والا حکمران	۶۱
۳	حاکموں کی اطاعت کے احکام	۷۵
۴	عہدہ طلب کرنے کی ممانعت اور اختیاری صورت میں عہدہ قبول نہ کرنا	۱۱۳
۵	بادشاہ اور قاضی وغیرہ حکمرانوں کو اپنے لیے صالح مشیر رکھنے کی ترغیب اور برے ساتھیوں سے بچنے کی تاکید	۱۲۵
۶	شرم کا بیان اور اس کی فضیلت اور شرم اختیار کرنے کی ترغیب	۱۳۵
۷	کسی کے بھید کی حفاظت کرنا، رازداری سے کام لینا	۱۴۵
۸	عہد و پیمان اور وعدہ پورا کرنا	۱۶۵
۹	نیک کاموں کی عادت کو باقی رکھنا	۱۸۷
۱۰	خوش کلامی اور ملاقات کے وقت چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنے کا پسندیدہ ہونا	۲۰۵
۱۱	بات کو مخاطب کے سامنے صاف اور واضح انداز میں کرنا اور اگر بغیر تکرار کے نہ سمجھتا ہو، تو مکرر کرنا	۲۱۷

۱۲	اپنے ہم نشین کی بات کی طرف دھیان دینا اور عالم و واعظ کا حاضرین کو اپنی بات سنانے کے لیے خاموش کرنا	۲۲۲
۱۳	وعظ و نصیحت میں میانہ روی	۲۲۵
۱۴	سنجیدگی اور اطمینان کی عادت	۲۳۵
۱۵	مہمان کا اعزاز و اکرام کرنا	۲۴۷
۱۶	اپنے کسی ساتھی اور دوست کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرنا اس کے لیے دعا کرنا اور اس سے دعا کی درخواست کرنا	۲۷۹
۱۷	استخارہ اور مشورہ کرنا	۲۹۵
۱۸	عید کی نماز کے لیے مختلف راستوں سے آنا جانا	۳۲۵
۱۹	ہر اچھے کام میں دائیں طرف سے شروع کرنا مستحب ہے	۳۳۵
۲۰	کھانے کے آداب	۳۵۱
۲۱	پینے کے آداب	۴۵۹

جلد دہم (۱۰)

۱	سفید لباس مستحب ہے۔لال، ہرا، پیلا، اور کالا جائز ہے روئی، کتان، بال اور اون کا لباس جائز ہے۔ مردوں کے لئے ریشم جائز نہیں	۲۹
۲	کُرتے کا استعمال پسندیدہ ہے	٦٧
۳	سونے اور لیٹنے کے آداب	۱۱۱
۴	مجلس کے آداب	۱۳۹
۵	خواب اور اس سے متعلقہ چیزوں کا بیان	۱۵۹
٦	سلام کے احکام وآداب	۱۸۱
۷	کسی کے یہاں جانے پر اجازت لینے کے احکام وآداب	۲۳۱
۸	چھینک کھانے والے کو جواب دینے کا مستحب ہونا؛ اگر وہ الحمدللہ کہے اگر وہ الحمدللہ نہ کہے تو اس کو جواب نہ دیا جائے اور چھینک کھانے اور جمائی لینے کے آداب	۲۴۸
۹	ملاقات کے وقت مصافحہ کا مستحب ہونا چہرے کو مسکراتا ہوا رکھنا۔نیک آدمی کے ہاتھ چومنا، اور اپنی اولاد کو محبت سے بوسہ دینا۔ اور اگر کوئی آدمی سفر سے واپس آئے تو اس سے معانقہ کرنا اور جھکنے کا ناپسندیدہ ہونا	۲۵۳

۱۰	بیمار کی خبر گیری اور تیمارداری	۲۶۳
۱۱	نماز جنازہ کا بیان۔ جنازہ کے ساتھ جانا اور تدفین میں شریک ہونا، اور عورتوں کا دفن میں شریک ہونا	۳۲۲
۱۲	سفر کے آداب	۳۷۳

جلد یازدہم (۱۱)

۱	قرآن کریم پڑھنے کی فضیلت	۴۷
۲	قرآنِ پاک کی بعض سورتوں اور آیتوں کے فضائل	۷۶
۳	وضو کی فضیلت کا بیان	۹۳
۴	اذان کی فضیلت کا بیان	۱۰۴
۵	نمازوں کی فضیلت کا بیان	۱۱۹
۶	سننِ مؤکدہ کی تعداد اور اس کی فضیلت	۱۹۰
۷	یوم جمعہ کی فضیلت، جمعہ کی نماز کا فرض ہونا اور دیگر متعلقات جمعہ کا بیان	۲۵۴
۸	تہجد کی نماز کی فضیلت	۲۷۴
۹	قیامِ رمضان یعنی تراویح مستحب ہے	۳۱۰
۱۰	لیلۃ القدر میں عبادت کی فضیلت اور کونسی رات کے متعلق شبِ قدر ہونے کی زیادہ امید ہے	۳۱۶
۱۱	مسواک کے فضائل اور فطرت کی باتیں	۳۲۸
۱۲	زکوٰۃ کے واجب ہونے کا مؤکد اور پختہ ہونا	۳۴۳
۱۳	رمضان کے روزوں کا فرض ہونا، روزوں کی فضیلت اور اس سے متعلق دوسری چیزوں کا بیان	۳۷۳

۱۴	روزے کے چند مسائل	۴۲۵
۱۵	حج کا وجوب اور اس کے فضائل	۴۵۰

جلد دوازدہم (۱۲)

۱	کتاب الجهاد، جہاد کا وجوب اور اللہ کے راستے میں صبح وشام کی فضیلت	۳۳
۲	شہیدوں کی فضیلت اور احکام	۱۰۷
۳	غلام کو آزاد کرنے کی فضیلت	۱۱۴
۴	فتنوں اور حالات کے زمانہ میں عبادت کرنے کی فضیلت	۱۳۲
۵	باب فضل السماحة فی البیع والشراء والأخذ إلخ	۱۳۶
۶	کتاب العلم، باب فضل العلم تعلماً وتعليماً للہ	۱۵۳
۷	اللہ تعالیٰ کی حمد وتعریف اور اس کے شکر کا بیان	۱۸۷
۸	نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود بھیجنے کا بیان	۱۹۹
۹	ذکر کی فضیلت اور اس کی ترغیب	۲۱۹
۱۰	صبح اور شام اللہ تبارک وتعالیٰ کا ذکر کرنا	۲۸۰
۱۱	دعاؤں کا بیان، نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منقول مختلف دعاؤں کی فضیلت اور ان کا حکم	۳۰۷
۱۲	دعا کے چند مسائل	۳۴۱

۱۳	بَابُ الدُّعَاءِ عِنْدَ الْكَرْبِ	۳۵۶
۱۴	اللہ کے نیک بندوں کی کرامتیں اور ان کی فضیلتیں	۳۶۵

جلد سیز دہم (۱۳)

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
۱	كِتَابُ الْأُمُوْرِ الْمَنْهِي عَنْهَا، غیبت کی حرمت اور زبان کی حفاظت	۳۵
۲	چغلی کسے کہتے ہیں	۱۲۳
۳	دو چہرے والے کی برائی	۱۳۶
۴	جھوٹ کی حرمت کا بیان	۱۴۰
۵	جھوٹی گواہی کی سخت حرمت کا بیان	۱۹۳
۶	کسی متعین شخص یا جانور پر لعنت بھیجنا حرام ہے	۱۹۷
۷	کسی مسلمان کو ناحق گالی دینا حرام ہے	۲۲۴
۸	کسی کو تکلیف پہنچانے کی ممانعت	۲۳۵
۹	آپس میں بغض اور دشمنی، کینہ اور قطع تعلق کی ممانعت	۲۶۰
۱۰	حسد کی حرمت کا بیان	۲۶۸
۱۱	لوگوں کے احوال کی ٹوہ میں رہنے کی ممانعت	۲۹۰

۱۲	مسلمانوں کو حقیر سمجھنا حرام ہے	۳۱۲
۱۳	کسی مسلمان کو تکلیف اور مصیبت پہنچنے پر خوش ہونے کی ممانعت	۳۱۶
۱۴	ملاوٹ اور دھوکہ کی ممانعت	۳۳۳
۱۵	عہد شکنی حرام ہے	۳۴۰
۱۶	فخر و غرور اور سرکشی کی ممانعت	۳۵۹
۱۷	غلام، جانور، عورت اور اولاد کو بغیر سبب شرعی کے سزا دینے کی ممانعت	۳۷۸
۱۸	یتیم کے مال کی حرمت کی تاکید	۴۱۵
۱۹	سود کی سخت حرمت کا بیان	۴۲۳

جلد چہاردہم (۱۴)

نمبر شمار	عناوین	صفحہ
۱	اجنبی اور پرائی عورتوں کو دیکھنے اور بے ریش لڑکوں کی طرف نظر کرنے کی حرمت	۴۵
۲	اجنبیہ کے ساتھ تنہائی اختیار کرنا حرام ہے	۱۲۳
۳	مردوں کا عورتوں کے ساتھ اور عورتوں کا مردوں کے ساتھ مشابہت اختیار کرنا حرام ہے	۱۳۰
۴	مرد ہو یا عورت؛ سیاہ خضاب کرنے کی ممانعت	۱۴۳
۵	کسی جاندار کی تصویر بنانے کی حرمت اور تصویر کو ختم کرنے کا حکم	۲۲۳
۶	مخلوق کی قسم کھانے کی ممانعت کا بیان	۲۶۰
۷	بے حیائی اور بدزبانی کی ممانعت	۳۰۰
۸	شریعت کی مقرر کی ہوئی سزاؤں کے متعلق سفارش حرام ہے	۳۶۴
۹	باپ کا اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو دوسری اولاد کے مقابلے میں بخشش اور ہدیے کے معاملہ میں ترجیح اور فضیلت دینا	۳۷۷
۱۰	جادو کے سخت حرام ہونے کا بیان	۴۵۱

۱۱	اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) نے جن کاموں سے منع کیا ہے ان کا ارتکاب کرنے سے ڈرانے کا بیان	۴۷۶
۱۲	کوئی آدمی اللہ تعالیٰ کے منع کئے ہوئے کسی کام کا ارتکاب کرے؛ تو اس کی تلافی کیا ہے؟	۴۷۸